نجوم الفرقان

من تفسیر آیات القرآن

جلد اول

از رشحات قلم

حضرت علامہ مولانا

عبد الرزاق

ناشر

ضیاء العلوم پبلی کیشنز راولپنڈی پاکستان

[illegible]

کتاب لاریب کی توضیحات وتشریحات، علوم عقلیہ ونقلیہ کی روشنی میں
علمی وتحقیقی ذوق رکھنے والوں کے لئے قدیم وجدید احکامات ومسائل پر ابحاث کا حسین مرقع
تفسیر القرآن بالقرآن، ارشادات نبویہ، اقوال صحابہ، تحقیقات اسلاف اور روایات صحیحہ پر مشتمل تفسیر

مسمّٰی بہ

نجوم الفرقان

من تفسیر آیات القرآن

جلد اوّل

مقدمہ تفسیر وسورۂ فاتحہ

از رشحات قلم

محقق اہلسنت
استاذ العلماء حضرت علامہ مولانا
عبد الرزاق بھترالوی حطاروی
مدظلہ العالی

ناشر ضیاء العلوم پبلی کیشنز راولپنڈی پاکستان

اشاعتی ضابطہ

نام کتاب: نجوم الفرقان من تفسیر آیات القرآن

تصنیف: علامہ مولانا عبد الرزاق چشتی بھترالوی

کمپوزنگ: ضیاء العلوم کمپوزنگ سنٹر سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی

کمپیوٹر گرافکس: قاضی محمد یعقوب چشتی، اظہر اقبال اعوان

ضخامت: $\frac{20 \times 30}{8}$ 424 صفحات

پروف ریڈنگ: حافظ محمد صدیق چشتی گولڑی، خواجہ وقار احمد، حافظ محمد رستم بھترالوی

بار طبع: دوم فروری 2007ء

قیمت: =/160 روپے

ناشر: سید شہاب الدین شاہ
ضیاء العلوم پبلی کیشنز راولپنڈی پاکستان

رابطہ: 0333- 5166587 - Fax 051-4580404
Email:ziauloom@isb.paknet.com.pk

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اظہارِ تشکر

راقم نے تفاسیر کے گہرے مطالعہ کی غرض سے تفاسیر سے کچھ مضامین و نکات کو قلمبند کرنا شروع کیا تا کہ متوسط درجہ کے طلباء بھی ان سے فائدہ حاصل کر سکیں۔

منتہی طلباء کرام اور علماء عظام یقیناً راقم سے بہتر عربی تفاسیر سے مضامین اخذ کر سکتے ہیں۔

بہر حال راقم کی محنت و کاوش کو سراہتے ہوئے اور جس طرح مبتدی طالب کی تقریر و تحریر پر اسے مزید محنت جاری رکھنے کے لئے کوئی محقق و مدقق ھدیہ تبریک پیش کرے۔

اسی طرح استاذ العلماء رئیس الاتقیاء حضرت علامہ پیر سید حسین الدین شاہ مدظلہ العالی شیخ الحدیث جامعہ رضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی نے بھی راقم کی حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے۔ عظیم اور جامع و مانع تقریظ تحریر فرما کر راقم پر احسان عظیم فرمایا۔

باوجود اس کے کہ آپ گوناگوں مصروفیات میں ہمہ وقت رہتے ہیں۔ راقم آپ کا شکرگذار ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزاء خیر عطا فرمائے۔ آمین

-راقم کی کتب کی طباعت محترم و مکرم حضرت علامہ سید شہاب الدین صاحب مدظلہ العالی ناظم اعلیٰ جامعہ رضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ مالی بوجھ کو اٹھانا ایک عظیم کام ہے۔ آپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دعاگو ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزاء خیر عطا فرمائے، علم و عمل و عمر میں برکت عطاء فرمائے۔ آمین

کمپوزنگ میں عزیزم مولانا محمد اسحاق ظفر صاحب مدرس جامعہ رضویہ ضیاء العلوم اور مولانا محمد یعقوب صاحب اور انکے رفقاء معاونت فرماتے ہیں۔ ان تمام کا بھی شکرگذار ہوں اللہ تعالیٰ ان کو جزاء خیر عطا فرمائے

اللھم وفقنا لما تحب و ترضی یا رب العالمین

آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ

عبدالرزاق بھترالوی

1-7-2002

﴿پیش لفظ﴾

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشۡرَفِ الۡاَنۡبِیَاءِ وَالۡمُرۡسَلِیۡنَ

أما بعد ! خالق کائنات جل جلالہ نے اپنے پیارے حبیب ﷺ کی نسبتِ جلیلہ کا صدقہ اس اُمت کو جو ابدی پیغام قرآن مجید فرقانِ حمید کی صورت میں انعام فرمایا وہ بے مثال کلام ہے۔ یہ عظیم معجزہ ہونے کے ساتھ ساتھ علم ومعرفت کا بحر زخار ہے۔ اس بحر بے کنار میں جس نے بھی نیک نیتی سے غوطہ لگایا نئے موتی نکال کر لایا۔ اس کے دُرہائے یگانہ غیر متناہی ہیں۔ نہ ختم ہونیوالے اس سلسلہ کو اُمتِ مسلمہ کے کاملین نے ہر دور میں اپنائے رکھا اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے حکمت و دانش کے عظیم باب رقم فرماتے رہے۔

باب مدينة العلم حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عظمت قرآنی اور اس کے رموز و دقائق کے دُرہائے بے بہا اور نہ ختم ہونے والی حقیقتوں کے متعلق مرفوعاً روایت فرمائی ہے۔

" قال اما انی سمعت رسول الله ﷺ يقول الا انها ستكون فتنة قلت ما المخرج منها يا رسول الله ؟ قال كتاب الله ، فيه نبأ ما قبلكم و خبرما بعدكم و حكم ما بينكم ، هو الفصل ليس بالهزل ، من تركه من جبار قصمه الله ومن ابتغى الهدىٰ فى غيره اضلّه الله ، وهو حبل الله المتين ، وهو الذكر الحكيم ، وهو الصراط المستقيم ، هو الذى لا تزيغ به الأهواء ولا تلبس به الألسنة ، ولا يشبع منه العلماء ، ولايخلق عن كثرة الرد ، ولا ينقضى عجائبه هو الذى لم تنتبه الجنُّ اذا سمعته حتى قالوا انا سمعنا قرانا عجبًا يهدى الى الرشد فامنا به من قال به صدق ، ومن عمل به اجر ، ومن حكم به عدل ، ومن عاد اليه هدى الى صراط مستقيم . "

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خبردار میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے آپ فرماتے تھے خبردار بے شک یہ قصہ عنقریب فتنہ بنے گا۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ اس کے نکلنے کی جگہ کوئی ہوگی۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ کی کتاب: کیونکہ اس میں تم سے پہلے اور بعد والی امتوں کی خبریں ہیں اور تمہارے درمیان جو حوادث ہیں ان کا بھی فیصلہ ہے۔ یہ قرآن حق و باطل کے درمیان فرق کرنیوالا ہے۔ جس نے اس کو کسی جبار کی وجہ سے چھوڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ اس کو توڑ دے گا اور جس نے اس کے غیر میں ہدایت کو تلاش کیا اللہ نے اس کو گمراہ کر دیا۔ کیونکہ یہ اللہ کی مضبوط رسی ہے۔ یہ ذکر، حکم اور صراط مستقیم ہے۔

یہ وہ کلام ہے کہ اہل ہواء اس کی تبدیلی پر قادر نہیں ہیں۔ اس کی وجہ سے زبانوں پر التباس نہیں آتا۔ اس سے علماء سیر نہیں ہوتے۔ اس کی قرأت کی تکرار بار بار لوٹاتے، قرأت کی لذت دوسروں سے سننے کی وجہ سے زائل نہیں ہوتی، کیونکہ اس کے عجائب ختم نہیں ہوتے، یہ وہ چیز ہے کہ جنوں نے جب اس کو سنا تو اس پر بلاتوقف کہا کہ: ہم نے تعجب میں ڈالنے والے قرآن کو سنا ہے، جو بھلائی کی طرف ہدایت دیتا ہے، ہم اس پر ایمان لائے، جس نے اسکے ساتھ کلام کیا وہ سچا ہوا، اور جس نے اس پر عمل کیا اس کو اجر دیا گیا، اور جس نے اس کے ساتھ فیصلہ کیا اس نے عدل کیا، جس نے اس کی طرف بلایا اس کو صراط مستقیم کی طرف ہدایت دی گئی۔

حضرت امام شعرانی اپنی مشہور زمانہ تصنیف ''الیواقیت والجواہر'' میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا وہ ارشاد گرامی نقل کرتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر سورۂ فاتحہ شریف کی تفسیر لکھوں تو اس ایک چھوٹی سورت کے رموز کی تفسیر کا حجم اونٹوں کا بوجھ بن جائے مگر پھر بھی فاتحہ شریف کے رموز باقی رہیں گے۔

تاہم جس نے بھی اپنی فکر و دانش کو غالب کر کے قرآن مجید کے مفاہیم کو بیان کرنے کی کوشش کی اس کیلئے " **من قال فی القرآن برأیه فقد أخطأ** " کے مصداق خائب و خاسر ہونا ہی نصیبہ بنا ہے

استاذ العلماء حضرت مولانا عبدالرزاق چشتی بھترالوی کہنہ مشق، نہائت محنتی اور فاضل مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ زود نویس اور سہل نگاری کے بھی جامع ہیں۔ آپ ان خوش نصیبوں میں سے ہیں جنہیں قسام ازل نے پیارے حبیب لبیب ﷺ کی نسبت صدقہ خدمت دین کی سعادت رفیق فرمائی ہے۔

اللہ تعالیٰ جل مجدہ نے علامہ موصوف کو اسلام کی خدمت اور بالخصوص قرآن وسنت کے مفاہیم اور مطالبِ عالیہ کو قلم و قرطاس کے ذریعہ سہل انداز میں پیش کر کے عامۃ الناس کو بہرہ مند کرنے کا بہترین ملکہ ودیعت فرمایا ہے۔

حضرت مولانا فطری اور طبعی طور پر تدریسی شعبے سے متعلق ہیں۔ علمی خانوادے کا چشم و چراغ ہونے کے ناطے معقولات و منقولات میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ زندگی کا بیشتر حصہ اسی نہج پر راہ نوردی کرتے گزار دی ہے۔ آپ کے تلامذہ میں سے کئی محقق علماء اپنے علم و تحقیق کا لوہا منوا چکے ہیں۔

درس و تدریس سے متعلق آدمی کے لئے آسان پیرائے میں لکھنا کافی مشکل کام ہوتا ہے؛ کیونکہ ایسے شخص کو...... جو ہمہ وقت فنی اصطلاحات اور علمی محاورات بولنے اور کہنے کا عادی ہو...... مشکل تراکیب کو ترک کرنا قدرے دشوار ہوتا ہے۔ مگر مولانا موصوف اپنی تحریر میں پختگی زود نویسی کے ساتھ

عامۃ الناس کے فہم وادراک کا بھی پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔

آپ کے قلم سے کئی علمی شہپارے منصہء شہود پر آچکے ہیں، اہل علم اور قدر دان عامۃ الناس کے ہاں قبولیت کا شرف پاچکے ہیں۔ میرے خیال میں آپ کی تصنیفات میں بالخصوص نصابی کتب کی شروحات وحواشی آپ کا بہت ہی وقیع کارنامہ ہے۔ اردو خواں طبقہ کے لئے یا درمیانے درجے کے خطباء کے لئے اردو کتابیں ہی بڑا اسرمایا ہیں۔ ایسی کتابوں کی مقبولیت مصنف کے لئے حوصلہ افزائی کا باعث ضرور بنتی ہے لیکن وہ پائیدار فائدہ جس سے قابل علماء و مدرسین پیدا ہوتے ہیں وہ درسی کتابوں کا فہم وادراک ہی ہے۔

مولانا موصوف کی تصانیف میں عام قاری اور زیر تعلیم طلباء کیلئے ہی نہیں بلکہ ایک استاد کی سہولت کیلئے کافی علمی مواد موجود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی عربی تصنیفات کو اہل علم کے ہاں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ چند سال پہلے مجھے ساؤتھ افریقہ جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک علمی مجلس میں انڈیا سے تشریف لائے ہوئے ایک عالم دین سے ملاقات ہوئی، جب انہیں یہ علم ہوا کہ میرا تعلق جامعہ رضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی پاکستان سے ہے تو بڑی خوشی کا اظہار فرمایا اور بتایا کہ حضرت مولانا عبدالرزاق چشتی بھترالوی کا نور الایضاح پر عربی حاشیہ ہمارے ہاں بڑا مقبول ہے۔ اس حاشیہ وتوضیح کو اہل علم نے بڑا پسند کیا ہے۔ ہندوستان میں اس حاشیہ کی الگ سے طباعت کرا کر دینی مدارس میں تقسیم کیا جارہا ہے۔

حضرت علامہ بھترالوی کا انداز تحریر انتہائی سادہ اور عام فہم ہے۔ آپ قلم براشتہ لکھنے کے عادی ہیں۔ ادبی موشگافیوں کی طرف کم ہی توجہ دیتے ہیں۔ تاہم مسائل و مفاہیم کا تذکرہ کرتے وقت اسلاف کرام کا تتبع کرتے ہوئے کوئی پہلو تشنہ چھوڑنے کو عار سمجھتے ہیں۔ آپ کی تحریر کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ درس نظامی کے باذوق طلباء کو دور اسلاف کا کوئی عظیم مدرس سبق پڑھا رہا ہے اور کتاب کی عبارت کے مالھا اور ماعلیہا سے کوئی بھی نکتہ چھوڑنا نہیں چاہتا۔

حضرت مولانا ایک طویل مدت تک جامعہ رضویہ ضیاء العلوم کے تدریسی شعبہ میں عظیم الشان خدمات انجام دیتے رہے۔ ہم نے آپ کو انتہائی محب اور شفیق پایا۔ آپ کی ہمہ جہت شخصیت میں اور خوبیوں کے علاوہ ایک خوبی یہ بھی ہے کہ آپ وقت کی قدر کو جانتے ہیں۔ اور ضیاع وقت اور اس کے نقصانات کا انہیں بھرپور احساس ہے۔ اس لئے اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کرتے۔ تدریسی خدمت بھی

بہت محنت اور محبت سے انجام دیتے ہیں ، بلکہ طلباء پر شفقت کرتے ہوئے ادارہ کے مقررہ تعلیمی وقت سے زائد اضافی اسباق پڑھاتے ہیں ۔ یہ استاد کی شفقت اور اپنے تلامذہ سے انتہائی محبت کی علامت ہے کہ زانوئے تلمذ طے کرنے والے طلباء کی تعلیم و تربیت شفقت و محبت سے انجام دے ۔

زیر نظر تصنیف قرآن مجید فرقانِ حمید کی تفسیر کا مقدمہ اور سورۃ فاتحہ کی تفسیر جو کہ حضرت مولانا کی تدریسی و علمی تحقیقات کا پَرتَو اور مظہر ہے ۔ اگر چہ میں اس کا پورے طور پر مطالعہ نہیں کر پایا تاہم چند ایک مقامات سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ۔ دیکھ اور پڑھ کر دل سے دعا نکلتی ہے ۔ **اللھم زد فزد ۔**

مقدمہء تفسیر کو دیکھ کر جو تأثر قائم ہوا ہے وہ یہ کہ حضرت علامہ کی زندگی درس و تدریس کرتے گزری ہے ۔ طلباء و علماء کو پڑھانے ، سمجھانے ، ان کے ذوق طبع کے مطابق انداز بیاں اور حسب استعداد طرز تکلم اپنانے کا سلیقہ ومہارت ہے ۔ اور دوسری طرف فقہی مسائل و معاملات سے متعلق فتاوٰی کی ذمہ داری بھی ایک عرصہ سے نباہ رہے ہیں جس کے باعث عامۃ الناس کو درپیش مسائل اور ان کے افہام و تفہیم کا تجربہ بھی رکھتے ہیں ۔ بایں ہمہ دارالحکومت اسلام آباد میں امامت و خطابت کی سرکاری ذمہ داری کے باعث دورِ جدید کی ضروریات ، جدت پسند طبقہ کی مذہبی و فکری ترجیحات و رجحانات اور ذہنی ارتقاء و تنزل سے بخوبی واقف ہیں ۔ لہٰذا آپ کی تحریر میں ہر طبقہ کے لوگوں کی علمی تشفی کا ساماں ہے ۔ البتہ آپ کی حیات پر تدریسی رنگ غالب ہونے کی وجہ سے آپ کی اس تصنیف میں بھی تشریف و توضیحات کے ضمن میں یہی تدریسی ذوق غالب نظر آتا ہے ۔

اسلاف کرام کی محبت ومودت میں راسخ ہیں ۔ اختلاف آراء کی بھول بھلیوں میں بھی اسلاف کرام کی تحقیقات انیقہ سے اکتساب فیض کرنے کو اپنے لئے سعادت گردانتے ہیں ۔ انتہائی کھلی طبیعت کے مالک ہیں ۔ جی میں آئی بات کو کہہ گزرنے میں باک نہیں رکھتے ۔

حضرت علامہ کا تعلق جس علمی خانوادے سے ہے وہ اپنی عظیم تاریخ اور روشن ماضی کے اعتبار سے انتہائی اعلیٰ اقدار کا حامل ہے ۔ عصر حاضر کی ہمہ ہمی میں کئی ایک سلف صالحین کے راہِ حق کو خیر باد کہہ چکے ہیں مگر آپ کے پائے ثبات میں کوئی لغزش نہ آئی ۔ یہ آپ کی ثابت قدمی کا ہی مظہر ہے کہ تنہا آپ نے تحریری میدان میں وہ کام کر دکھایا جو ایک پوری جماعت کے لئے بھی مشکل نظر آتا ہے ۔

حق گوئی و بے باکی کے ساتھ ساتھ مولانا جب بھی اپنے مذہبی و مسلکی مخالفین کو مخاطب کرتے

ہیں یا کسی اختلافی مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہیں تو اسلامی و اخلاقی اقدار کا بھرپور خیال رکھتے ہوئے انتہائی شستہ انداز میں مخاطب کرتے ہیں۔ اور اصلاح و تبلیغ کے جذبہ سے سرشار ہو کر مخالفین اور ان کے پیروکاروں کو راہِ خطر سے محفوظ کرنے کا تہیہ کئے نظر آتے ہیں۔

دعا: اے ارحم الراحمین! اے اجیب دعوۃ الداع اذا دعان کی شان والے رب! تیرے جود و سخا کے مظہر، تیری رحمتوں کی بھرن عطا کرنے والے حبیب لبیب ﷺ نے تیری یہ شان ہمیں بتائی ہے کہ تو اپنے منگتوں کو خالی دامن نہیں لوٹاتا۔ اپنے سائل کو خالی ہاتھ لوٹاتے ہوئے تجھے حیا آتی ہے۔

الٰہی! تیری اسی کریمی کا واسطہ دے کر التجا کرتا ہوں کہ میری اس دعا کو شرف قبولیت سے نواز!

''مولائے کریم حضرت مولانا کے علم و عمل میں برکتیں عطا فرما۔ ان کی اس تصنیف کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں اپنی خصوصی نصرت عطا فرما۔ ان کے فیضان علمی کو اور زیادہ وسعتیں دے ان کی ذریت نسبی و حسبی کو ان کا حقیقی متبع بنا۔ ہم سب کو اپنے پیارے حبیب ﷺ کی حقیقی محبت سے آشنا فرما اور اسی میں زندہ رکھ اور اسی محبت میں ہمارا خاتمہ فرما۔''

ایں دعائے من واز جملہ جہاں آمین باد

ان دعوات صالحہ اور ہدیہ تحسین کے ساتھ حضرت مولانا موصوف بلکہ ہر پائیدار، نفع بخش اور محنت طلب کام میں مصروف بزرگ کو مشورہ پیش کرتا ہوں کہ کئی دفعہ معاصرانہ چشمک سے پیدا ہونے والے مرض تحاسد یا ناپختہ اذہان کی کج بحثی فروعی و غیر ضروری ابحاث کے گرداب میں پھنسا کر دانستہ یا نادانستہ طور پر مقاصد عالیہ کی راہ سے برگشتہ کر لیتے ہیں۔ مقصد رفع کی خاطر ان سے تغافل برتنا ضروری ہے و گرنہ اصلی مقصود پیش نظر رہنے کی بجائے ''شخصیت'' مقصد بن جاتی ہے۔ لہٰذا خیر خواہی اسی میں ہے کہ ایسے جذبات انگیز موقع پر نہایت صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے " والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس "اور " اذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما "کو مشعل راہ بنایا جائے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد و علی آلہ واصحابہ اجمعین

ابوالخیر حسین الدین غفرلہ (مہتمم و شیخ الحدیث)
جامعہ رضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی پاکستان

مقدمہ

﴿ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾

" اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ الْقُرْآنَ عَلٰی اَفضَلِ الْاَنبِیَاءِ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَفضَلِ الْخَلْقِ مُحَمَّدِ ۨ الْمُصْطَفٰی وَعَلٰی آلِہِ الْمُجْتَبٰی اَمَّا بَعْدُ !

فضائل القرآن:

قرآن پاک تمام کتب سے افضل ہے پھر قرآن کی بعض سورتیں بعض سے اور بعض آیات بعض سے مراتب، کثرتِ ثواب اور مضامین کی اہمیت کے لحاظ سے فضلیت رکھتی ہیں۔

نبی کریم ﷺ کے ارشادات سے یہ مسئلہ بہت واضح طور پر سمجھ آ سکتا ہے۔ ارشادات مصطفویہ کو دیکھیں۔

" یٰس قلب القرآن " سورۂ یٰسین قرآن پاک کا دل ہے۔"فاتحة الكتاب افضل سور القرآن " سورۂ فاتحہ قرآن پاک کی سورتوں میں سے افضل ہے۔" وآية الكرسی سيدة آی القرآن " آیت الکرسی قرآن پاک کی آیتوں کی سردار ہے۔"قل هو الله احد تعدل ثلث القرآن" سورۂ قل هو الله احد قرآن پاک کے تہائی حصہ کے برابر ہے۔

اس طرح بعض کی بعض پر افضلیت کے بیان میں بہت سی احادیث مبارکہ موجود ہیں:

" عن عثمان قال قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم خيركم من تعلم القرآن وعلمه " (رواه البخاری، مشکوة باب فضائل القرآن)

'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے بہتر وہ ہے جس نے قرآن پاک سیکھا اور سکھایا ''۔

نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی میں "خیر کم " سے مراد آپ کی تمام امت ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا اے میری امت کے لوگو تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جس نے قرآن پاک

پڑھا اور پڑھایا۔

" والحاصل انه اذا كان خير الكلام كلام الله فكذالك خير الناس بعد النبيين من يتعلم القرآن ويعلمه ، لكن لابد من تقسيم التعلم والتعليم بالاخلاص " (مرقاة ج ۴ ص ۳۳۳)

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ سب کلاموں سے بہتر کلام اللہ تعالیٰ کا ہے۔تو یقیناً اس بہتر کلام کو پڑھنے والا اور پڑھانے والا۔ انبیائے کرام کے بعد سب لوگوں سے افضل ہوگا۔لیکن البتہ یہ ضروری ہے کہ پڑھنے اور پڑھانے والے کے دل میں خلوص پایا جائے۔صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مندی مقصد ہو۔ریا کاری ،دنیاوی مقاصد نہ پائے جائیں۔

" عن عائشة رضى الله عنها قالت قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الماهر بالقرآن مع السفرة الكرام البررة والذى يقرأ القرآن ويتتعتع فيه وهو عليه شاق له اجران " (بخاری ومسلم ، مشکوۃ باب فضائل القرآن)

" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قرآن پاک کے ماہر کو نیک مکرم سفرۃ کا قرب حاصل ہوگا۔وہ شخص جو قرآن پاک پڑھنے میں اٹکتا ہے کیونکہ اسے قرآن پڑھنے میں مشقت درپیش آتی ہے اسے دو اجر حاصل ہوتے ہیں "

وضاحت حدیث: ماہر قرآن سے مراد یہ ہے کہ وہ شخص قرآن پاک کو عمدگی سے یاد کئے ہوئے ہے یعنی اچھا حافظ قرآن ہے اور الفاظ کو عمدہ طریقہ سے ادا کرتا ہے۔

"السفرۃ " مسافر کی جمع ہے۔اگر یہ لفظ "سفر " سے بنا ہے تو اس کا معنی ہے کاتب اب اس معنی کے لحاظ پر معنی یہ ہوگا کی ماہر قرآن کو لکھنے والے نیک مکرم حضرات کا قرب حاصل ہوگا۔اس سے مراد فرشتے ہوں گے کہ انہوں نے کتب سماویہ کو لوح محفوظ سے لکھ کر منتقل کیا ہے۔اور کراماً کاتبین فرشتے بھی مراد ہو سکتے ہیں کہ وہ لوگوں کے اعمال لکھتے ہیں۔اور اس سے مراد نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام بھی ہو سکتے ہیں کہ انہوں نے ہی سب سے پہلے قرآن پاک کو لکھا اور جمع کیا۔

اور اگر یہ لفظ "سفارۃ" سے لیا جائے تو اب معنی یہ ہوگا کہ ماہر قرآن کو نیک مکرم سفیروں کے قریب ہونے کا شرف حاصل ہوگا، سفیروں سے مراد بھی فرشتے ہوسکتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ اور انبیائے

کرام کے درمیان واسطہ ہوتے ہیں اور سفیر ہوتے ہیں۔اور اسی طرح سفیروں سے مراد انبیائے کرام بھی ہوسکتے ہیں کہ وہ لوگوں اور اللہ تعالیٰ کے درمیان سفیر ہوتے ہیں۔اور اس سے مراد نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام اور قیامت تک آنے والے علمائے ربانیین ۔بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ نبی کریم ﷺ کے احکام کو بعد والے لوگوں تک پہنچانے کا ذریعہ بنے یہ ان کی سفارت ہی ہے۔

اگر یہ لفظ سِفار (سین کی زیر سے) مشتق ہو تو معنی ہوگا اصلاح کرنے والے۔ اب معنی یہ ہوگا کہ ماہر قرآن کو نیک ،مکرم اصلاح کرنے والے حضرات کا قرب حاصل ہوگا۔ اس سے مراد بھی فرشتے ،انبیاء اور علماء ہوں گے کیونکہ یہ بندوں کی اصلاح کرنے والے ہیں۔

مقصد واضح ہوا کہ قرآن پاک کا ماہر، حافظ ،عمدہ طور پر الفاظ کو پڑھنے والا دنیا میں انبیائے کرام اور علماء وصلحاء کے متبعین میں سے ہوتا ہے اور قیامت میں ان شاء اللہ تعالیٰ ان کی رفاقت اسے حاصل ہوگی۔

"ویتتعتع" کا مطلب یہ ہے کہ قرآن پاک پڑھتے ہوئے اسے روانگی میں مشقت اٹھانی پڑتی ہے زبان اس کی اٹکتی ہے ۔لیکن وہ حافظہ کی کمی کی وجہ سے روانگی نہ ہونے کے باوجود قرآن پاک کو پڑھنے کی محنت جاری رکھے ہوئے ہے۔مشقت برداشت کر رہا ہے۔تو اسے دو اجر حاصل ہوتے ہیں۔ ایک قرآن پاک پڑھنے کا اور دوسرا مشقت اٹھانے کا۔

لیکن یہ بھی خیال رہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ماہر قرآن سے افضل ہوتا ہے۔تاہم حدیث پاک سے یہ واضح ہوا کہ قرآن پاک کو پڑھنا باعث اجر وثواب ہے ۔خواہ وہ مہارت سے پڑھے یا مشقت سے پڑھے:

" عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ لا حسد الاعلی اثنین رجل آتاه الله القرآن فهو يقوم به آناء الليل و آناء النهار ورجل آتاه الله مالا فهو ينفق منه آناء الليل و آناء النهار " (بخاری ،مسلم ،مشکوۃ باب فضائل القرآن)

''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اچھا رشک صرف دو شخصوں پر کیا جائے ۔ایک وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک حفظ کرنے کی توفیق عطا فرمائی وہ دن رات اس کی تلاوت کرتا ہے اور دوسرا وہ شخص ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا کیا ہے وہ دن رات اس سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتا رہتا ہے ''۔

وضاحت حدیث: حدیث شریف میں لفظ ''حسد'' استعمال ہوا لیکن اس کا حقیقی معنی مراد نہیں بلکہ مجازی معنی مراد ہے۔ چونکہ حسد کی دو قسمیں ہیں حقیقی اور مجازی۔ حسد حقیقی یہ ہے کہ کسی کی نعمت کا زوال طلب کیا جائے اور خواہش کی جائے کہ اس کی نعمت اس سے زائل ہو کر مجھے مل جائے:

'' وهو حرام باجماع المسلمين مع النصوص الصريحة ''

مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ یہ حسد حرام ہے کیونکہ صریح نصوص اس کی حرمت پر دلالت کر رہی ہیں۔

حسد کی دوسری قسم ہے مجازی، حسد مجازی کی پھر دو صورتیں ہیں، ایک دنیاوی کاموں میں اور دوسرا دینی کاموں میں۔ حسد مجازی کو غِبطَه کہا جاتا ہے اس میں یہ خواہش تو پائی جاتی ہے کہ مجھے اس قسم کی نعمت مل جائے لیکن یہ خواہش نہیں ہوتی کہ دوسرے کی نعمت زائل ہو جائے۔

دنیاوی کاموں میں غبطہ یعنی رشک کرنا مباح ہے لیکن دینی کاموں میں مستحب ہے۔ نبی کریم ﷺ نے جن دو چیزوں کا ذکر کیا ہے وہ دونوں دینی کام ہیں لہٰذا ان میں غبطہ کرنا مستحب ہے۔ کہ اللہ کرے مجھے بھی یہ نعمتیں حاصل ہو جائیں جسے حاصل ہیں اللہ تعالیٰ اسے نصیب کرے۔

تنبیہ:

''غبطہ'' ان دو چیزوں میں بند نہیں حدیث کے ظاہری الفاظ سے لوگ دھوکہ کھا لیتے ہیں۔ حدیث پاک کا مفہوم یہ ہے:

'' والمراد فی حدیث لا غبطة محمودة الافی هاتین الخصلتین یعنی فیهما و امثالها ''

حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ اچھا غبطہ ان دو چیزوں میں ہے یا ان کی مثل میں ہے۔ گویا کہ یوں کہا جائے کہ ارشاد مصطفوی کا مفہوم یہ ہے کہ اچھا غبطہ اس قسم کی اچھی چیزوں میں ہے جیسے یہ دو ہیں جن کا ذکر حدیث میں کیا جا چکا ہے۔

اسی وجہ سے علامہ مظہر رحمہ اللہ نے فرمایا:

''انسان کے لئے یہ لائق نہیں کہ وہ کسی نعمت کی تمنا کرے ہاں مگر یہ کہ وہ نعمت اللہ تعالیٰ کا تقرب عطاء کرے جیسے قرآن پاک کی تلاوت، مال کا صدقہ کرنا اور ان کی

طرح بھلائی کے کام، یعنی عبادات بدنیہ، طاعات مالیہ کے حصول کی تمنا مستحب ہے "۔

(مرقاۃ ج ۴ ص

" عن ابی موسی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مثل المؤمن الذی یقرأ القرآن مثل الاترجة ریحها طیب وطعمها طیب ومثل المؤمن الذی لا یقرأ القرآن مثل التمرة لا ریح لها وطعمها حلو مثل المنافق الذی لا یقرأ القرآن کمثل الحنظلة لیس لها ریح وطعمها مر ومثل المنافق الذی یقرأ القرآن مثل الریحانة ریحها طیب وطعمها مر "

(بخاری، مسلم، مشکوٰۃ باب فضائل القرآ

"حضرت ابوموسی (اشعری) رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن جو قرآن پڑھتا ہے وہ ایسے ہے جیسا کہ اُتْرُجَہ (ہمزہ اور را پر پیش، ایک پھل کا نام ہے) اس کی خوشبو بھی اچھی ہے اور اس کا ذائقہ بھی اچھا ہے۔ اور وہ مومن جو قرآن نہیں پڑھتا اس کی مثل ایسے ہے جیسا کہ کھجور ہے، اس کی خوشبو نہیں لیکن ذائقہ اس کا میٹھا ہے۔ اور منافق جو قرآن پڑھتا ہے اس کی مثال ایسے ہے جیسا کہ ریحانہ (پودا ہے غالباً نیازبو اسے کہا جاتا ہے) اس کی خوشبو اچھی ہے لیکن ذائقہ کڑوا ہے۔"

حدیث پاک کے ترجمہ سے ہی واضح ہے کہ مومن میں اس وقت ایک خاص کمال آجاتا ہے جب وہ قرآن پڑھتا ہے وہی مومن جب قرآن پاک نہیں پڑھتا تو اس خصوصی کمال سے محروم رہتا ہے۔ اور منافق جب قرآن پڑھتا ہے تو ظاہری طور پر لوگ اس کے قرآن پڑھنے کو اچھا سمجھتے ہیں لیکن وہ اندر سے کالا ہی ہوتا ہے۔ اور منافق جب قرآن بھی نہ پڑھے تو وہ اس ظاہری اچھائی سے بھی محروم ہوتا ہے جو اسے قرآن پڑھنے سے حاصل ہو رہی تھی۔

قرآن باعث رفعت اور قرآن سے دوری باعث ذلت:

" عن عمر بن الخطاب قال قال رسول اللہ ﷺ ان اللہ یرفع بهذا الکتاب اقواما ویضع به آخرین " (رواہ مسلم، مشکوٰۃ باب فضائل القرآن)

حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ اس کتاب (قرآن پاک) کے ذریعے بعض قوموں کو بلندی درجات عطاء کرتا ہے اور اسی کے ذریعے بعض کو پست کرتا ہے۔

قرآن کو کتاب کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ قرآن پاک کو بہت بلندی مقام حاصل ہے اس میں وہ بزرگی پائی گئی ہے جو کسی اور کتاب میں نہیں ۔اس کے دلائل اتنے واضح ہیں جو دوسری کتابوں میں اتنے واضح دلائل نہیں خواہ وہ آسمانی کتابیں ہی کیوں نہ ہوں۔گویا کہ قرآن پاک کو کتاب کہہ کر یہ بتایا کہ جو اسے مقام حاصل ہے وہ کسی اور کتاب کو حاصل نہیں۔

قرآن کے ذریعے بلندی درجات اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب قرآن پر ایمان ہو اور قرآن کی تعظیم شان اس سے پائی جائے اور قرآن پر عمل اس کا ہو۔

بلندی درجات سے مراد یہ ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی کثیر مراتب سے نوازتا ہے ۔اور ان کو حیات طیبہ سے زندہ رکھتا ہے ۔اور یہی حیاۃ طیبہ ان کو قبر اور حشر میں بھی حاصل ہوگی بلکہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے خاص قرب والے لوگوں کا اسے تقرب حاصل ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ قرآن پاک کی عظمت کا لحاظ نہیں کرتے اس کے مطابق عمل نہیں کرتے ان کا مرتبہ کم اور پست ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض لوگ "اسفل السافلین" کے مقام تک پہنچ جاتے ہیں کیونکہ وہ قرآن پاک کے منکر ہو جاتے ہیں۔

رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی "يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا" (گمراہ ہوتے ہیں اسی کے ذریعے بہت اور ہدایت حاصل کرتے ہیں اس کے ذریعے بہت) کا بھی یہی مطلب ہے۔

"فهو ماء للمحبوبين ودماء للمحجوبين" قرآن پاک اللہ کے محبوب بندوں کیلئے پانی کی طرح مفید ہے۔اور اللہ تعالیٰ سے دور رہنے والوں کیلئے ایسے ہے جیسا کہ ان کو خون پلا دیا جائے۔

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴾

''اور ہم قرآن میں اتارتے ہیں وہ چیز جو ایمان والوں کے لئے شفاء اور رحمت ہے اور اس سے ظالموں کو نقصان ہی بڑھے گا''۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا:

" من قراه وعمل به مخلصا رفعه الله ومن قراه مرائيا غير عامل به وضعه الله "

''جس شخص نے قرآن پاک پڑھا اور اس پر خلوص سے عمل کیا اللہ تعالیٰ اس کے مدارج کو بلند کرتا ہے اور جس شخص نے قرآن پاک ریا کاری کے لئے پڑھا اور اس پر عمل نہ کیا رب تعالیٰ اسے پست کرتا ہے''۔

علامہ بغوی نے اسناد کے ساتھ ''معالم التنزیل'' میں ذکر کیا ہے کہ حضرت نافع بن حارث، حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ کو عسفان میں ملے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو مکہ مکرمہ میں عامل بنایا تھا تو ان کے عسفان میں موجود ہونے پر آپ نے پوچھا۔ مکہ والے لوگوں پر تم نے کسے خلیفہ بنایا انہوں نے عرض کیا ''ابن ابزی'' کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا ابن ابزی کون ہے؟ انہوں نے عرض کیا وہ ہمارے غلاموں میں سے ایک غلام ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تعجب سے پوچھا غلام کو تم نے ان پر خلیفہ بنا دیا۔ تو انہوں نے عرض کیا اے امیر المؤمنین!

" انه رجل قاری القرآن عالم بالفرائض قاض فقال عمر اما ان نبیکم ﷺ قال ان اللہ تعالیٰ یرفع بهذا القرآن اقواما ویضع به آخرین "

وہ شخص قرآن کا قاری ہے، فرائض کا عالم ہے، قاضی ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہاں یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، بیشک اللہ تعالیٰ اس قرآن پاک کے ذریعے بعض قوموں کے مدارج بلند فرماتا ہے اور اسی قرآن کے ذریعے بعض لوگوں کا مقام پست کرتا ہے۔

صحابی سے فرشتوں کا قرآن سننا:

" عن ابی سعید الخدری ان اسید بن حضیر قال بینما هو یقرأ من اللیل سورة البقرة وفرسه مربوطة عنده اذ جالت الفرس فسکت فسکنت فقرأ فجالت فسکت فسکنت ثم قرأ فجالت الفرس فانصرف وکان ابنه یحیٰ قریبا منها فاشفق ان تصیبه ولما اخره رفع رأسه الی السماء فاذا مثل الظلة فیها امثال المصابیح فلما اصبح حدث النبی ﷺ فقال اقرأ یاابن حضیر اقرأ یا ابن حضیر قال فاشفقت یا رسول اللہ ان تطأ یحیٰ وکان منها قریبا فانصرفت الیه ورفعت رأسی الی السماء فاذا مثل

الظلة فیها امثال المصابیح فخرجت حتی لااراها قال وتدری ماذاک قال لا قال تلک الملائکة دنت لصوتک ولو قرأت لاصحبت ینظر الناس الیها لاتتواری منهم (متفق علیه) واللفظ للبخاری وفی مسلم عرجت فی الجو بدل فخرجت علی صیغة المتکلم "

(مشکوة باب فضائل القرآن)

" حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا بیشک اسید ابن حضیر (دونوں نام مصغر ہیں) نے بتایا وہ ایک رات کو سورہ بقرہ پڑھ رہے تھے اور ان کی گھوڑی ان کے پاس ہی باندھی ہوئی تھی وہ چکر لگانے لگی، گھومنے لگی وہ خاموش ہو گئے گھوڑی بھی پرسکون ہو گئی۔ انہوں نے پھر پڑھنا شروع کیا گھوڑی نے پھر گھومنا شروع کر دیا پھر وہ خاموش ہو گئے گھوڑی کو پھر سکون آ گیا انہوں نے پھر پڑھنا شروع کیا گھوڑی نے پھر گھومنا شروع کیا وہ وہاں سے پھر گئے۔ اس لئے کہ ان کا بیٹا یحیٰ قریب ہی تھا ان کو یہ خوف ہوا کہ گھوڑی کہیں یحیٰ کو روند نہ ڈالے انہوں نے بیٹے کو وہاں سے ہٹایا اور سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا کہ وہاں ایک بادل کا ٹکڑا ہے۔ جس میں چراغوں کی طرح چمک دار چیزیں ہیں جب صبح ہوئی نبی کریم ﷺ کو بتایا۔ آپ نے فرمایا اے ابن حضیر تم پڑھتے رہتے، اے ابن حضیر تم پڑھتے رہتے انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں ڈر گیا تھا کہ کہیں یحیٰ کو روند نہ دے جو اس کے قریب ہی تھا۔ اس لئے میں اس (بچے) کی طرف ہو گیا اور سر کو میں نے آسمان کی طرف اٹھایا تو مجھے ایک بادل کے ٹکڑے کی طرح کوئی چیز نظر آئی گویا کہ اس میں چراغ ہیں۔ پھر میں نکلا یہاں تک کہ میں ان کو نہ دیکھ سکا نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو وہ کیا تھا۔ انہوں نے عرض کیا نہیں (میں نہیں جانتا) آپ نے فرمایا وہ فرشتے تھے جو تمہاری آواز کے قریب آ گئے تھے۔ اگر تم پڑھتے رہتے اسی حال میں صبح ہو جاتی لوگ ان فرشتوں کو دیکھ لیتے وہ لوگوں سے نہ چھپتے "۔

وضاحت حدیث: "فرس" کا لفظ مذکر اور مؤنث دونوں پر بولا جاتا ہے یہاں سے مراد مؤنث ہے یعنی گھوڑی اس لئے کہ مؤنث کے دوسرے صیغے (مربوطة، جالت ، سکنت) اس کی وضاحت کر رہے ہیں۔

"فجالت" وہ گھوڑی گھومنے لگی، چکر کاٹنے لگی، یعنی اسے قرار نہیں آ رہا تھا۔ اسے قرار نہ آنے

کی دو وجہ تھیں۔

"قیل تحرک الفرس کان لنزول الملائکہ لا ستماع القرآن خوفا منھم"

بعض حضرات نے کہا کہ گھوڑی کی بے قراری فرشتوں کو دیکھ کر ان سے خوف تھا جب کہ وہ قرآن پاک سننے کے لئے نازل ہوئے تھے۔

جب وہ واپس آسمانوں پر چلے گئے یا یہ کہ جب ابن حضیر پڑھنا چھوڑتے تو فرشتے غائب ہو جاتے تو گھوڑی کو بھی قرار مل جاتا۔

"او تحرک الفرس لو جدان الذوق بالقراء ۃ" یا گھوڑی کی بے قراری کی وجہ یہ تھی کہ اسے قرآن پاک کی قراءت کو سن کر ذوق آ رہا تھا۔یعنی اس پر یہ کیفیت تھی کہ وہ خوشی سے جھوم رہی تھی۔ جب ابن حضیر پڑھنا چھوڑ دیتے اس کی یہ کیفیت ذوق والی بھی جاتی رہتی اور جھومنا چھوڑ دیتی۔

خیال رہے کہ شارحین نے تو اس طرح بیان کیا ہے کہ ان دو وجہ میں سے ایک تھی۔لیکن راقم کے نزدیک دونوں کے اجتماع میں کوئی مانع (رکاوٹ) نہیں۔اس لئے کہ فرشتوں کو دیکھ کر گھوڑی کو خوف ہوا اس خوف کی وجہ صرف فرشتوں کی نورانیت نہ ہو بلکہ قرآن پاک سن کر ذوق آیا ہو جس کی وجہ سے گھوڑی نے جھومنا شروع کر دیا ہو۔اور فرشتوں کو دیکھ کر خوف باری تعالیٰ اور بڑھا ہو جس نے ذوق کو اور بڑھا دیا ہو۔ **(واللہ اعلم)**

"ولما اخرہ" اسکا مطلب ہے کہ اسید ابن حضیر نے اپنے بیٹے یحیٰ پر ڈر محسوس کیا کہیں اسے روند نہ دے کیونکہ یحیٰ گھوڑی کے قریب تھے۔لہٰذا وہ بیٹے کے پاس گئے اور اسے وہاں سے ہٹایا۔

"الظلۃ" ہر وہ چیز جو دھوپ سے بچائے ، بادل، چھت ، چھتری وغیرہ البتہ یہاں مراد یہ ہے کہ وہ بادل کی طرح کوئی ٹکڑا نظر آ رہا تھا۔

"اقرأ یا ابن حضیر" اگرچہ " اقرأ " امر کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے پڑھ ۔لیکن اس کی نسبت ماضی کی طرف ہے اور اس میں ایک کام کو جاری رکھنا اور ہمیشگی کا معنی پایا گیا ہے۔جس کا مطلب یہ ہے اے ابن حضیر تم پڑھتے رہتے۔

"ظلة اور مصابیح" سے مراد فرشتے ہی ہیں۔یعنی فرشتوں کا قرآن پاک سننے کے لئے ہجوم کی شکل میں آنا اور ایک ساتھ ہی واپس لوٹنا ان کے جسم بادل کی طرح نظر آرہے تھے اور ان کے چہرے کی نورانیت چراغوں کی طرح نظر تو آرہی تھی:

"ولا مانع من ان الاجسام النورانية اذا ازدحمت تكون كالظلة"

کوئی یہ خیال نہ کرے کہ نورانی مخلوق بادل کی طرح کیسے نظر آرہی تھی اس لئے کہ اس میں کوئی مانع موجود نہیں کہ نورانی جسم جب کثیر تعداد میں جمع ہو جائیں تو وہ بادل کی طرح نظر آئیں۔
(مرقاة ج ۴ ص ۳۳۹)

سورۂ فاتحہ کی عظمت:

" وعن ابی سعيد بن المعلی قال كنت اصلی فی المسجد فدعانی النبیﷺ فلم اجبه ثم اتيته فقلت يا رسول الله انی كنت اصلی قال الم يقل الله استجيبوا لله وللرسول اذا دعاكم ثم قال الا اعلمک اعظم سورة فی القرآن قبل ان تخرج من المسجد فاخذ بيدی فلما اراد ان نخرج قلت يارسول الله انک قلت لا علمنک اعظم سورة من القرآن قال الحمد لله رب العلمين هی السبع المثانی والقرآن العظيم الذی اوتيته " (رواه البخاری ، مشكوة باب فضائل القرآن)

"ابوسعید ابن معلٰی فرماتے ہیں میں مسجد میں نماز ادا کر رہا تھا۔ مجھے نبی کریمﷺ نے بلایا میں نے آپ کو کوئی جواب نہ دیا کچھ دیر کے بعد میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا میں نے کہا یارسول اللہ میں نماز پڑھ رہا تھا آپ نے فرمایا کیا اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا "اللہ اور رسول کے بلانے پر حاضر ہو" پھر آپ نے فرمایا کیا میں تمہیں مسجد سے نکلنے سے پہلے ایک عظیم سورۃ نہ سکھاؤں؟ پھر آپ نے میرا ہاتھ پکڑا جب ہم نے نکلنے کا ارادہ کیا تو میں نے کہا یارسول اللہ بیشک آپ نے فرمایا تھا میں تمہیں قرآن کی ایک عظیم سورۃ سکھاؤں گا۔آپ نے فرمایا " اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ " ہے جو سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے جو مجھے عطاء کی گئی ہے"۔

وضاحت حدیث: " استجیبوا " کا معنی ہے مطیع ہو جاؤ، حکم کو قبول کرو، تسلیم کرو۔ آیت

کریمہ میں ہے "اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ" (جب رسول تمہیں اس چیز کے لئے بلائیں جو تمہیں زندگی بخشے)۔ یہاں زندگی سے مراد دین اور شریعت کا علم ہے اس لئے کہ علم حیات ہے اور جہالت موت ہے اسی وجہ سے کہا گیا ہے:

" لا تعجبن الجهول حلته فذاک میت وثوبه کفن" (جاہل کے کپڑوں کا (شاندار) جوڑا تمہیں تعجب میں نہ ڈالے اس لئے کہ جاہل مردہ ہے اور اس کے کپڑے اس کا کفن ہیں)۔

" قال الطیبی دل الحدیث علی ان اجابة الرسول لا تبطل الصلوة کما ان خطابه بقولک السلام علیک ایها النبی لا یبطلها "

علامہ طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا حدیث پاک سے یہ پتہ چل رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کو تسلیم کرنے اور آپ کے پاس حاضر ہونے سے نماز باطل نہیں ہوتی جس طرح کہ آپ کو "السلام علیک ایها النبی" سے خطاب کرنے سے نماز باطل نہیں ہوتی حالانکہ اور کسی کو نماز میں خطاب کریں تو نماز باطل ہو جاتی ہے۔

تاہم خیال رہے کہ اس مسئلہ میں ائمہ کا اختلاف ہے کہ دوران نماز نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے سے نماز باطل ہوتی، یا کہ باطل نہ ہوتی۔ اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ اتفاق ہے:

"والظهر من الحدیث ان الاجابة واجبة مطلقا فی حقه صلی الله علیه وسلم کی یفهم من اطلاق الأیة ایضا "

کہ زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ حدیث پاک سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ حضور ﷺ کا حکم ماننا واجب تھا حدیث پاک اور آیت کریمہ سے حکم مطلقاً سمجھ آ رہا ہے۔

" السبع المثانی والقرآن العظیم " کی تفصیل سورۃ فاتحہ کے ناموں کی بحث میں مذکور ہے جو ترتیب کے لحاظ سے آگے آئے گی۔

حافظ قرآن کی شان:

" عن معاذ الجهنی قال قال رسول الله ﷺ من قرا القرآن وعمل بما فیه البس والداه تاجا یوم القیامة ضوءه احسن من ضوء الشمس فی

بیوت الدنیا لو کانت فیکم فماظنکم بالذی عمل بھذا "

(رواہ احمد و ابو داؤد، مشکوۃ کتاب فضائل القرآن)

" حضرت معاذ جہنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے قرآن پڑھا اور اس پر عمل کیا تو اس کے والدین کو قیامت کے دن تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی سورج کی روشنی جو گھروں پر پڑتی ہے اس سے بھی زیادہ حسین ہوگی ۔ (یعنی بالفرض وہ سورج تمہارے گھروں میں ہوا) جو قرآن پر عمل کرے گا اس کے مطابق تمہارا کیا گمان ہے؟"

وضاحت حدیث: "من قرأ القرآن قال ابن حجر ای حفظه عن ظهر قلب"

جس نے قرآن پڑھا، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے قرآن حفظ کیا اور زبانی پڑھا۔

اگرچہ پختہ طریقہ سے قرآن پڑھنے والا معنی بھی مراد لیا گیا ہے تاہم زیادہ مناسب معنی پہلا ہی ہے کہ مراد حفظ قرآن ہی لیا جائے۔

حافظ قرآن جبکہ قرآن پاک کے مطابق عمل بھی کرے تو قیامت کے دن اس کے والدین کو تاج پہنایا جائے گا۔ جس کے ہیرے اور جواہر ایسے چمکدار ہوں گے اور ایسے خوبصورت، زیب و زینت میں ہوں گے جس طرح سورج اپنی چمک اور روشنی کے ساتھ بالفرض گھروں میں داخل ہو جائے تو اس کی روشنی باہر سے اور زیادہ نظر آئے اس سے بھی بڑھ کر تاج کی روشنی ہوگی۔

" فماظنکم بالذی عمل بھذا ". یعنی جب حافظ کے والدین کی یہ شان ہوگی تو تمہارا کیا خیال ہے کہ قرآن پر عمل کرنے والے حافظ و قاری کا اپنا کیا مرتبہ ہوگا:

" یعطی للقاریٔ العامل به من الکرامة والملک ما لا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر "

"یعنی قرآن پڑھ کر اس پر عمل کرنے والے کو وہ کرامت اور بادشاہی حاصل ہوگی جو کسی آنکھ نے دیکھی نہیں ہوگی اور کسی کان نے سنی نہیں ہوگی اور کسی انسان کے دل پر کھٹکی نہیں ہوگی"۔ (مرقاۃ)

تلاوت قرآن دلوں کو جلاء عطاء کرتی ہے:

" عن ابن عمر قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان هذه القلوب تصدأ كما يصدأ الحديد اذا اصابه الماء قيل يا رسول الله وماجلاؤها قال كثرة ذكر الموت وتلاوة القرآن "

(رواه البيهقي ، مشكوة كتاب فضائل القرآن)

" حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک یہ دل زنگ آلود ہوجاتے ہیں جس طرح لوہا پانی پڑنے سے زنگ آلود ہوجاتا ہے آپ سے پوچھا گیا یا رسول اللہ ﷺ ان دلوں کی جلاء کس چیز سے ہوتی ہے؟ آپ نے فرمایا موت کو زیادہ یاد کرنے سے اور قرآن پاک کی تلاوت سے"۔

واضح ہوا کہ تلاوت قرآن سے دلوں کا زنگ دور ہوجاتا ہے۔اور دل روشن اور چمکدار ہوجاتے ہیں ان کی یہی جلاء ہے۔

قرآن پاک پڑھنے میں کثرت کرے:

" يستحب الاكثار من قراءة القرآن وتلاوته "

" قرآن پاک کو زیادہ سے زیادہ پڑھنا اور زیادہ سے زیادہ تلاوت کرنا مستحب ہے"۔

کیونکہ رب تعالیٰ نے قرآن پڑھنے والوں کی شان میں یہ ارشاد فرمایا:

﴿ يَتْلُوْنَ آيَاتِ اللهِ آنَاءَ اللَّيْلِ ﴾ (وہ اللہ کی آیتیں رات بھر تلاوت کرتے رہتے ہیں)۔

☆ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے نبی کریم ﷺ کا ارشاد بیان فرمایا:

" لا حسد الا فى اثنين رجل آتاه الله القرآن فهو يقوم به آناء الليل وآناء النهار "

" صرف دو شخصوں سے رشک کیا جائے ایک وہ شخص جسے رب تعالیٰ نے قرآن کا علم دیا وہ اس پر دن رات قائم رہے"

یعنی دن رات اس کی تلاوت کرتا ہے اور اس پر عمل بھی کرتا ہے۔ (متفق علیہ)

☆ حضرت ابن مسعود سے روایت کردہ حدیث پاک میں ہے:

" من قرأ حرفا من كتاب الله فله به حسنة والحسنة بعشر امثالها "

''جس شخص نے قرآن پاک کے ایک حرف کو پڑھا اسے اس کی وجہ سے نیکی حاصل ہوگی، وہ نیکی دس نیکیوں کے برابر ہوگی'' (ترمذی)

یعنی قرآن پاک کے ایک حرف پڑھنے سے دس نیکیاں حاصل ہوتی ہیں۔

☆ ابوامامہ سے مروی حدیث میں ذکر ہے:

" اقرؤا القرآن فانه يأتى يوم القيامة شفيعا لاصحابه " (مسلم)

''قرآن پاک پڑھو۔ بیشک قیامت کے دن یہ پڑھنے والوں کی شفاعت کرے گا''۔

مذکورہ احادیث سے واضح ہوا کہ قرآن پاک جتنا زیادہ پڑھ سکے، اتنا ہی زیادہ ثواب ہے تین دنوں میں ختم کرنے کا ذکر ملتا ہے چار دنوں کا ذکر ملتا ہے کہیں پانچ دن، کہیں چھ دن، کہیں سات دن، کہیں پندرہ دن، کہیں ایک ماہ، کہیں چالیس دن، کہیں دو ماہ کا ذکر ملتا ہے کہ اتنے دنوں میں ختم کیا جائے۔ یہ سب مختلف شخصوں کا اعتبار کرتے ہوئے ذکر کیا گیا ہے۔ (ماخوذ از الاتقان ج ۱ ص ۱۰۴)

قرآن پاک یاد کر کے بھلا دینا بہت بڑا گناہ ہے:

''نسيانه كبيرة صرح به النووى فى الروضة وغيرها "

قرآن پاک یاد کر کے بھلا دینا گناہ کبیرہ ہے جیسا کہ علامہ نووی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب میں صراحۃً ذکر فرمایا ہے۔

یعنی تلاوت کرنا چھوڑ دیا تو بھول گیا تو گناہ ہوگا۔ لیکن حافظہ کی کمی کی وجہ سے بھول جانے کو گناہ سے تعبیر نہیں کیا جاسکے گا۔

☆ حدیث شریف میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" عرضت على ذنوب امتى فلم ارذنبا اعظم من سورة القرآن او آية اوتيها رجل ثم نسيها " (ابوداؤد)

''مجھ پر میری امت کے گناہ پیش کیے گئے میں نے کوئی گناہ اس سے بڑا نہیں دیکھا کہ کسی کو

قرآن کی سورۃ یا آیۃ کا علم دے دیا گیا پھر اس نے اسے بھلا دیا۔"

☆ اور ایک حدیث میں ارشاد مصطفوی ہے:

" من قرأ القرآن ثم نسیه لقی الله یوم القیامة اجذم "

"جس نے قرآن پڑھا اور پھر اسے بھلا دیا وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے تو وہ شخص کوڑھی ہوگا"۔ (ماخوذ از الاتقان ج ا ص ۱۰۵)

آداب تلاوت:

تلاوت قرآن پاک میں چند چیزیں مستحب ہیں جن پر عمل کرنے سے ثواب حاصل ہوتا ہے اور نہ عمل کرنے پر کوئی گناہ نہیں۔ یعنی جواز ہوگا اگر چہ زیادہ ثواب نہیں ہوگا۔

مستحب یہ ہے کہ قرآن پاک باوضوء ہو کر پڑھے، کیونکہ قرآن پاک بھی اللہ تعالیٰ کے ذکروں میں سے افضل ذکر ہے نبی کریم ﷺ بغیر وضوء کے اللہ تعالیٰ کے ذکر کو بہتر نہیں سمجھتے تھے۔ تاہم آپ نے بیان جواز کے لئے بے وضوء قرآن پاک پڑھا ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ بغیر وضوء کے قرآن پاک پڑھنا جائز ہے۔

لیکن یہ خیال رہے کہ یہ مسئلہ زبانی پڑھنے کا ہے قرآن پاک کو ہاتھ لگانے اور ہاتھ سے اوراق کو پلٹنے کے لئے وضوء کرنا ضروری ہے بغیر وضوء کے قرآن پاک کو ہاتھ لگانا جائز نہیں۔

جنبی شخص (جس پر غسل کرنا فرض ہو) اور حیض والی عورت یا نفاس والی عورت کے لئے قرآن پاک کو ہاتھ لگانا بھی ناجائز ہے اور پڑھنا بھی ناجائز ہے۔ البتہ وہ قرآن پاک کو دیکھ سکتے ہیں اور زبان چلانے کے بغیر دل پر قرآن کو جاری کریں تو جائز ہے۔

(۱) صاف ستھری جگہ قرآن پاک کا پڑھنا مستحب ہے بلکہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ مسجد میں قرآن پڑھے عورت اپنی نماز کی جگہ قرآن پاک کی تلاوت کرے یہ اس کے لئے افضل ہے۔

(۲) مستحب یہ ہے کہ تلاوت کرنے کے لئے قبلہ کی طرف منہ کر کے بیٹھے، بڑے خشوع، بڑے آرام اور پروقار طریقے سے بیٹھے اور سر کو جھکا کر بیٹھے۔

(۳) مستحب ہے کہ قرآن پاک پڑھنے کے لئے مسواک کرے کیونکہ اس سے منہ کو خصوصی نظافت حاصل ہوگی۔اور قرآن پاک کی تعظیم بھی پائی جائے گی۔

ابن ماجہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے موقوف حدیث بیان کی اور مسند بزار نے سند جید سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہی مرفوع حدیث بیان کی:

" ان افواھکم طرق للقرآن فطیبوھا بالسواک "

''بے شک تمہارے منہ قرآن پڑھنے کا ذریعہ ہیں ان کو مسواک سے صاف ستھرا کرلیا کرو''۔

(۴) قرآن پاک کی تلاوت سے پہلے تعوذ پڑھنا مستحب ہے بلکہ سنت ہے اس لئے کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴾

''جب تم قرآن پڑھنے کا ارادہ کروتو مردود شیطان سے اللہ کی پناہ پکڑ لیا کرو''

تعوذ کے لئے **''الصیغۃ المختارۃ''** سب سے بہتر اور مختار الفاظ وہی ہیں جو سب سے زیادہ مشہور بھی ہیں۔ یعنی ان الفاظ سے پڑھے " اَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ "۔

تاہم مختلف الفاظ سے پڑھنا بھی ثابت ہے،وہ تمام بھی جائز ہیں:

" اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطن الرجیم ، اعوذ باللہ القادر من الشیطان الغادر ، اعوذ باللہ القوی من الشیطن الغوی ، اعوذ باللہ العظیم من الشیطن الرجیم ، اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم انه هو السمیع العلیم "

(۵) اگر کوئی شخص قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہوئے چھوڑ کر کسی کام کے لئے گیا،پھر دوبارہ تلاوت کرنے کی غرض سے لوٹ آیا،تو اسے چاہئے کہ دوبارہ تعوذ پڑھ کر تلاوت شروع کرے۔

(٦) جب بلند آواز سے قراءت کرنا چاہے تو تعوذ بھی بلند آواز سے پڑھے جس طرح تلبیہ بلند آواز سے پڑھا جاتا ہے اور تکبیرات تشریق بلند آواز سے پڑھی جاتی ہیں اسی طرح تعوذ بھی بلند آواز سے پڑھے۔

(۷) تلاوت کے شروع میں تعوذ کے بعد تسمیہ پڑھے اسی طرح دوران تلاوت جب کوئی نئی سورۃ

شروع ہو تو تسمیہ پڑھے البتہ سورہ براءۃ کے شروع میں بسم اللہ نہیں پڑھنی، نہ پڑھنے کی وجہ یا یہ ہے کہ وہ پہلی سورۃ کا ہی حصہ ہے مستقل علیحدہ سورۃ نہیں۔ یا یہ کہ اس میں کفار کا زیادہ ذکر ہے اس لئے تسمیہ نہیں پڑھنی۔

(۸) یہ بھی خیال رہے کہ اگر کوئی شخص سورۃ براءۃ سے ہی تلاوت کی ابتداء کر رہا ہو تو وہ ابتداء تلاوت میں بسم اللہ پڑھے گا قرآن پاک کو ترتیل سے پڑھے کہ الفاظ علیحدہ علیحدہ سمجھ میں آئیں کیونکہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا ﴾ (قرآن کو ترتیل سے پڑھو)۔

(۹) قرآن پاک کی تلاوت کا مقصد عظیم قرآن میں تدبر کرنا اور اپنی طاقت کے مطابق سمجھنے کی مکمل کوشش کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰہُ اِلَیْکَ مُبٰرَکٌ لِّیَدَّبَّرُوْا اٰیٰتِہٖ ﴾ (یہ ایک کتاب ہے کہ ہم نے تمہاری طرف اتاری برکت والی تاکہ اس کی آیتوں کو سوچیں)۔

اسی طرح اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ﴾

''قرآن میں (یہ لوگ) تدبر کیوں نہیں کرتے''۔

مقصد یہ ہے کہ قرآن پاک کو پڑھتے ہوئے اس کے معانی میں غور وفکر کرے، قرآن پاک کو سمجھے کہ اس میں یہ اوامر ہیں اور یہ نواہی۔ تاکہ ان کو قبول کرنے کا عقیدہ رکھے اور ان پر عمل کرے۔

(۱۰) قرآن پاک کو خشوع وخضوع سے پڑھے۔ اگر قرآن پاک پڑھتے ہوئے رونا بھی آجائے تو یہ بڑی ہی خوش قسمتی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ قُلْ اٰمِنُوْا بِہٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِہٖۤ اِذَا یُتْلٰی عَلَیْہِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ☆ وَّیَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ کَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ☆ وَیَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ یَبْکُوْنَ وَیَزِیْدُہُمْ خُشُوْعًا ☆ ﴾

''تم فرماؤ کہ تم لوگ ایمان اس پر لاؤ یا نہ لاؤ۔ بے شک وہ جنہیں اس کے اترنے سے پہلے علم ملا جب ان پر پڑھا جاتا ہے۔ ٹھوڑی کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں

اور کہتے ہیں پاک ہے ہمارے رب کو بیشک ہمارے رب کا وعدہ پورا ہونا تھا اور ٹھوڑی کے بل گرتے ہیں روتے ہوئے اور یہ قرآن ان کے خشوع کو بڑھاتا ہے''۔

بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے سامنے قرآن پاک کی تلاوت کی تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

بیہقی میں سعد ابن مالک رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث ہے:

" ان ھذا القرآن نزل بحزن و کآبة فاذا قرأ تموہ فابکوا فان لم تبکوا فتباکوا "

'' بیشک یہ قرآن غم اور مصائب ساتھ لاکر نازل ہوا ہے جب تم قرآن پڑھو تو روؤ۔ اگر رو نہ سکو تو رونے کی شکل بنالو''۔

مسند ابی یعلی میں ہے:

" اقرؤا القرآن بالحزن فانه نزل بالحزن "

'' قرآن غمناک حال میں پڑھو، کیونکہ قرآن غم کو ساتھ لایا ہے''۔

طبرانی میں ہے:

" احسن الناس قراء ۃ من اذا قرأ القرآن یتحزن "

'' لوگوں میں سے قرآن پاک کو اچھا پڑھنے والا وہ شخص ہے کہ جب وہ قرآن پڑھے تو اس پر غم طاری ہو جائے''۔

(۱۱) قرآن پاک اچھی آواز سے مزین کر کے پڑھنا مستحب ہے ابن حبان کی حدیث میں ہے۔

"زینوا القرآن باصواتکم " (اپنی اچھی آوازوں سے قرآن کی زینت سے پڑھو)۔

دارمی میں ہے:

" حسنوا القرآن باصواتکم فان الصوت الحسن یزید القرآن حسنا "

'' اپنی اچھی آواز سے قرآن پاک کو حسین بناؤ۔ بیشک اچھی آواز سے قرآن پاک میں زیادہ حسن آتا ہے''۔

(۱۲) بعض احادیث میں آہستہ قرآن پاک پڑھنے کی فضیلت ملتی ہے اور بعض احادیث میں بلند آواز سے قرآن پاک پڑھنے کی فضیلت سمجھ میں آتی ہے علامہ نووی رحمہ اللہ نے ان میں تطبیق اس طرح دی ہے۔ ریاء کا خوف ہو، نمازیوں کو تکلیف ہو رہی ہو، سوئے ہوئے لوگوں کو تکلیف

ہوان صورتوں میں آہستہ پڑھنا افضل ہے۔اگر ایسی کوئی صورت نہ ہوتو بلند آواز سے پڑھنا افضل ہے کیونکہ اس میں زیادہ عمل پایا گیا ہے۔یعنی پڑھنا ایک عمل ہے اور بلند آواز سے پڑھنا دوسرا عمل ہے اور بلند آواز سے پڑھنے کی وجہ سے سننے والوں کو بھی فائدہ حاصل ہو گا۔پڑھنے والے کا دل بیدار رہے گا اور اس کا ارادہ فکر کی طرف زیادہ ہوگا اور پڑھنے والا خود بھی اپنی قراءت کی طرف کان لگائے گا اس کی نیند دور ہوگی اسے چستی حاصل ہوگی۔

ابوداؤد نے حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی:

" اعتكف رسول الله صلى الله عليه وسلم فى المسجد فسمعهم يجهرون بالقراء ة فكشف الستر وقال الاكلكم مناج لربه فلا يؤذين بعضكم بعضا ولا يرفع بعضكم على بعض فى القراء ة "

''رسول اللہ ﷺ مسجد میں اعتکاف بیٹھے ہوئے تھے آپ نے سنا کہ کچھ حضرات بلند آواز سے قرآن پڑھ رہے ہیں آپ نے پردہ ہٹایا اور ارشاد فرمایا خبردار تم میں سے ہر شخص مناجات کر رہا ہے ایک دوسرے کو ہرگز تکلیف نہ پہنچاؤ ،اور تم میں بعض حضرات دوسرے بعض پر قراءت کو بلند نہ کریں''۔

(۱۴) قرآن پاک کو ترتیب وار پڑھنا مستحب ہے اسی طرح لگاتار پڑھنا مستحب ہے۔اگر ترتیب کو الٹ کردے،مثلاً پہلے " قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ " پڑھ لے پھر " قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ " پڑھ لے۔یا اسی طرح متفرق طور پر سورتوں کی تلاوت کرے تو یہ جائز ہے خیال رہے کہ نماز میں بھی قرآن پاک کے پڑھنے میں ترتیب مستحب ہے۔بھول کر ترتیب الٹ ہو جائے تو کوئی حرج نہیں جان بوجھ کر ترتیب کو الٹا کرنا بہتر نہیں۔

طبرانی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی:

" انه سئل عن رجل يقرأ القرآن منكو سا قال ذاك منكوس القلب "

''کہ ان سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص قرآن پاک الٹی ترتیب سے پڑھتا ہے اس کا کیا حکم ہے آپ نے فرمایا وہ الٹے دل والا ہے''۔

راقم کہتا ہے خیال رہے کہ بچوں کو بعض اوقات چھوٹی چھوٹی سورتیں پہلے یاد کرانی مقصود ہوتی

ہیں ان کو آخری پارہ سے یاد کرانا شروع کرایا جاتا ہے اس میں کوئی خاص حرج نظر نہیں آتی کیونکہ مقصد اس میں نیک ہوتا ہے کہ بچہ پہلے چھوٹی چھوٹی سورتیں شوق سے یاد کرتا ہے اور کہتا ہے میں نے اتنی سورتیں یاد کر لی ہیں۔اس مقصد کے لئے آخر سے پیچھے آنے میں کوئی حرج نہیں۔

(ماخوذ از الاتقان ج ۱ ص ۱۰۴ تا ص ۱۰۸)

(۱۴) حافظ قرآن کو چاہئے کہ وہ قرآن اکثر اوقات پڑھتا رہے۔اگر وہ قرآن پڑھتا رہے تو اسے یاد رہے گا۔اور اگر اس نے پڑھنا چھوڑ دیا تو اسے بھول جائے گا۔مسلم نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت بیان کی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" انما مثل صاحب القرآن کمثل صاحب الابل المعلقة ان عاهد علیهما امسکها وان اطلقها ذهبت واذا قام صاحب القرآن فقرأه باللیل والنهار ذکره واذا لم یقم به نسیه "

" حافظ قرآن، اونٹ والے شخص کی طرح ہے اگر اس نے اونٹ کو باندھ کر رکھا تو وہ رکا رہے گا اور اگر اس نے اس کی رسی کو کھول دیا تو وہ چلا جائے گا۔اسی طرح اگر حافظ قرآن نے دن رات تلاوت کو جاری رکھا تو اسے یاد رہے گا اور اگر اس نے اس کی تلاوت کو جاری نہ رکھا تو اسے بھول جائے گا "۔

عوام الناس کے لئے بھی یہ حکم ہے لیکن حافظ قرآن ، قاری قرآن ،عالم قرآن کے لئے بالخصوص یہ حکم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا رہے اور اس کی نعمت کا شکریہ ادا کرتا رہے اور رب تعالیٰ کا ذکر کرتا رہے اور اسی پر توکل رکھے،اور اسی سے امداد طلب کرے،اور اسی کی طرف رغبت کرے،اور اسی پر سہارا رکھے،اور موت کو یاد کرتا رہے،اور موت کی تیاری رکھے،گناہوں سے خوف رکھے لیکن رب تعالیٰ کی رحمت کی امید بھی رکھے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا" لا یموتن احدکم الا وهو یحسن بالله الظن "(تم میں سے ہر شخص پر موت صرف اسی حال میں آئے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر اچھا گمان رکھے)۔یعنی وہ امید رکھے کہ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے گا۔ (از قرطبی ج ۱ ص ۲۰)

(۱۵) حافظ قرآن ،قاری قرآن ، عالم قرآن کو چاہئے کہ جاہل جھگڑا کریں تو یہ ان سے جھگڑا نہ

کرے بلکہ معاف کر دے اس لئے کہ یہ تو قرآن پاک کا علم رکھنے والا ہے۔ اسی طرح شبہات کے طریقوں سے اپنے آپ کو بچا کر رکھے کم ہنسے اور محافل قرآن میں بالخصوص اور عام محافل میں بالعموم لا یعنی کلام سے گریز کرے، حلم اور وقار سے رہے، فقراء غرباء کے سامنے بھی عجز اختیار کرے، تکبر سے دور رہے، فتنہ کے خوف سے دنیا اور دنیا داروں سے دور رہے۔ (از قرطبی ج ۱ ص ۲۱)

آداب تلاوت قرآن:

☆ قرآن پاک پڑھنے کے دوران بغیر کسی ضرورت کے دنیاوی باتوں سے اجتناب کرے:

☆ قرآن پاک پڑھتے ہوئے اگر جمائی آجائے تو قراءت سے رک جائے، اس لئے کہ قرآن پڑھنے والا رب سے مناجات کر رہا ہے۔ اور جمائی شیطان کی طرف سے ہے۔

☆ قرآن پاک پڑھتے ہوئے اگر کسی کام کے لئے اٹھنا پڑے تو قرآن پاک کو بند کر کے جائے کھلا نہ چھوڑے۔

☆ قرآن پاک کے اوپر کوئی اور کتاب نہ رکھے، تا کہ قرآن پاک کی عظمت کا لحاظ پایا جائے کہ سب سے بلند ہے۔

☆ قرآن پاک کو پڑھتے ہوئے گود میں رکھے، یا کسی تکیہ، رحل وغیرہ پر رکھے، زمین پر نہ رکھے۔

☆ قرآن پاک کے الفاظ مبارکہ کو تھوک سے کسی تختی، کاغذ وغیرہ سے نہ مٹائے بلکہ پانی سے دھوئے اور وہ پانی بھی ناپاک جگہ پر نہ بہائے۔ اور راستہ پر بھی نہ بہائے کیونکہ وہ پانی بھی حرمت والا ہے:

" وکان من قبلنا من السلف منهم من يستشفي بغسالته "

"ہم سے پہلے ہمارے سلف صالحین قرآن پاک کے الفاظ مبارکہ کو دھو کر اس پانی سے شفا حاصل کرتے تھے"

☆ قرآن پاک کے اوراق کو دوسری کتب کی جلد کی حفاظت کے لئے ان پر نہ چڑھائے اگر ایسا کرے گا تو یہ ظلم عظیم ہوگا ہاں اگر قرآن پاک کے سیاہی سے لکھے ہوئے الفاظ پانی سے مٹ جائیں پھر کاغذ کو استعمال کرے تو جائز ہوگا۔

☆ قرآن پاک کی ہر دن میں ایک مرتبہ ضرور زیارت کیا کرو۔ کیونکہ قرآن پاک کو دیکھنا بھی عبادت ہے قرآن پاک کو دیکھنے سے دل پر ایک عجیب پر اسرار کیفیت طاری ہوتی ہے:

"عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعطوا اعینکم حظھا من العبادۃ قالوا یا رسول اللہ وما حظھا من العبادۃ قال النظر فی المصحف والتفکر فیہ والاعتبار عند عجائبہ"

"حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنی آنکھوں کو عبادت کا حصہ دو، صحابہ کرام نے عرض کیا یارسول اللہ آنکھوں کا عبادت میں کیا حصہ ہے؟ آپ نے فرمایا قرآن پاک کو دیکھنا اور اس میں تفکر کرنا اور اس کے عجائب کو دیکھ کر عبرت پکڑنا"۔

سبحان اللہ نبی کریم ﷺ کو جوامع الکلم (بات مختصر، مطالب زیادہ) کا کیسا عظیم معجزہ حاصل تھا سوال ایک تھا کہ آنکھوں کا عبادت میں کیا حصہ ہے؟ آپ نے جواب تین مختصر الفاظ میں دیئے کہ قرآن پاک کو دیکھنا آنکھوں کی عبادت ہے قرآن پاک میں تفکر کرنا دل کی عبادت ہے قرآن پاک کے عجائب کو دیکھ کر عبرت پکڑنا منصب عظیم کا حصول ہے۔

"عن عبادۃ بن الصامت قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افضل عبادۃ امتی قراءۃ القرآن نظرا"

میری امت کی افضل عبادت قرآن پاک کو دیکھ کر پڑھنا ہے۔ یعنی قرآن پاک کے پڑھنے کا علیحدہ ثواب ہوگا۔ قرآن پاک کو دیکھنے کا ثواب علیحدہ حاصل ہوگا۔

☆ جب لوگ جمع ہو کر قرآن پاک پڑھ رہے ہوں تو آہستہ آہستہ پڑھیں بلند آواز سے نہ پڑھیں۔ اس لئے کہ ایک تو شوروغل نظر آئے گا جو قرآن پاک کے ادب کے منافی ہے دوسرا ایک دوسرے کی توجہ کا ادھر ادھر بٹ جائے گی۔ قرآن پاک کی طرف کامل توجہ نہیں ہوگی۔ (بعض حضرات کے نزدیک مطلقاً نماز کے اندر یا باہر قرآن پاک کی تلاوت کا سننا فرض ہے)۔ بے وقوف، جہلاء کی محافل میں قرآن پاک نہ پڑھا جائے جب وہ قرآن پاک کو نہ سنیں بلکہ اپنی باتوں میں مشغول رہیں ایسے ہی بازاروں میں جہاں لوگ اپنی خوش گپیوں میں

لگے ہوں وہاں قرآن پاک نہ پڑھے۔

☆ قرآن پاک کو تکیہ نہ بنائے قرآن پاک پر بازو وغیرہ کا سہارا نہ لے۔قرآن پاک جب دوسرے کو پکڑانا ہوتو بڑے ادب واحترام سے پکڑائے دوسرے کی طرف پھینکے نہیں۔

☆ قرآن پاک چھوٹے چھوٹے خط میں جیبی سائز کے لکھنے منع ہیں ۔اس لئے کہ اس میں قرآن پاک کی عظمت نظر نہیں آتی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا" **لایصغر المصحف**" قرآن پاک کے نسخوں کو چھوٹا نہ بنایا جائے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کے ہاتھ میں قرآن پاک کا ایک چھوٹا سا نسخہ دیکھا آپ نے پوچھا "**من کتبہ**" یہ کس نے لکھا ہے؟ اس شخص نے کہا "**انا**" میں نے لکھا ہے "**فضربہ بالدرۃ**" آپ نے اسے کوڑا مار دیا۔ اور فرمایا "**عظموا القرآن**" "قرآن پاک کو عظیم بناؤ ۔یعنی قرآن پاک کی تعظیم کرو اور اسے بڑے سائز میں لکھنا اس کی عظمت ہے اور چھوٹے سائز میں لکھنا عظمت نہیں:

" **روی عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ نہی ان یقا ل مسیجد اور مصیحف** "

"نبی کریم ﷺ نے مسجد کو مسیجد (چھوٹی سی مسجد) کہنے سے اور مصحف کو مصیحف (چھوٹا سا قرآن) کہنے سے منع فرمایا"۔

☆ " **روی لیث عن مجاھد قال لا بأس ان تکتب القرآن ثم تسقیہ المریض** "

(لیث مجاہد سے روایت کیا ہے کہ قرآن پاک لکھ کر (دھوکر) مریض کو پلانے میں کوئی حرج نہیں۔

بلکہ اس میں شفا ہے جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ سلف صالحین قرآن پاک کے الفاظ مبارکہ کو دھوکر پانی سے شفا حاصل کرتے رہے:

" **عن ابی جعفر قال من وجد فی قلبہ قساوۃ فلیکتب "یس" فی جام بزعفران ثم یشربہ**"

(ابوجعفر کہتے ہیں جس شخص کے دل میں سختی ہو اسے پیالہ (برتن) میں زعفران سے سورۃ یٰسین لکھ کر پلائی جائے یعنی اسے قساوۃ قلب (سختی دل) سے نجات حاصل ہوگی۔

ہاں البتہ یہ خیال رہے کہ قرآن پاک کے الفاظ مبارکہ سے تعویذ لکھے تو اسے چمڑے میں یا چاندی میں یا اس طرح کی کسی چیز میں بند کر کے گلے میں ڈالے تو بیت الخلاء میں جانا جائز ہوگا۔کھلا تعویذ گلے میں ڈال کر، بیت الخلاء میں جانا جائز نہیں اس میں قرآن پاک کی توہین ہے۔

(ماخوذ از قرطبی ج ۱ ص ۲۸ تا ص ۳۱)

ختم قرآن مجید :

قرآن پاک جب ختم کرے تو مستحب یہ ہے کہ ساتھ ابتداء سے پھر پانچ آیات کی مقدار پڑھ لے تا کہ پتہ چلے کہ اس نے قرآن کو ختم کر کے چھوڑ نہیں دینا بلکہ پھر پڑھتے رہنا ہے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ایک شخص آیا اس نے پوچھا یا رسول اللہ کون سا عمل افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

"علیک الحال والمرتحل" تم اپنے آپ پر حال ومرتحل کو لازم کرلو صحابی نے عرض کیا "ماالحال والمرتحل ؟ "یارسول اللہ حال و مرتحل کیا ہے؟ آپ نے فرمایا:

"صاحب القرآن یضرب من اولہ حتی یبلغ آخرہ ثم یضرب فی اولہ کلما حل ارتحل"

قرآن پاک پڑھنے والا اول سے شروع کر کے جب آخر تک پہنچ جائے تو پھر سے شروع کرے۔یعنی جب پہنچے پھر کوچ کرلے یعنی وہاں ختم پر ہی قرار نہ پکڑے۔

(قرطبی ج ۱ ص ۳۰)

" اخرج الدارمی بسند حسن عن ابن عباس عن ابی بن کعب ان النبی ﷺ کان اذا قرأ قل اعوذ برب الناس افتتح من الحمد ثم قرأ من البقرة الی واولئک ھم المفلحون ثم دعا بدعاء الختمة ثم قام "

''ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ جب بھی " قل اعوذ برب الناس" پڑھتے (یعنی قرآن پاک ختم فرماتے) تو پھر سے الحمد کو شروع فرما لیتے اور سورۃ بقرہ کی ابتدائی آیات " اولئک ھم المفلحون "تک پڑھتے پھر آپ ختم قرآن کی دعاء فرماتے پھر کھڑے ہوتے (یعنی ختم قرآن کی دعاء کے بعد مجلس برخاست فرماتے)

سبحان اللہ ! اہل سنت و جماعت کا مسلک کیا جگمگاتا ہوا سنت مصطفیٰ ﷺ کے مطابق ہے۔لوگ اپنی بے سمجھی سے ختم قرآن کی محافل میں ''چہار قل ، فاتحہ ، سورۃ بقرہ کی ابتدائی آیات'' پڑھنے پر معترض ہوتے رہتے ہیں۔کاش کہ ضد،عناد کو چھوڑ کر کتب کا مطالعہ کر کے اپنی اصلاح فرمائیں۔

☆ ختم قرآن کے بعد دعاء کرنا مستحب ہے طبرانی وغیرہ نے عرباض ابن ساریہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث بیان کی ہے ''من ختم القرآن فله دعوة مستجابة '' جو شخص قرآن پاک ختم کرے اس کی دعاء کو قبول کیا جاتا ہے۔

☆ '' **وفي الشعب من حديث انس مرفوعا من قرأ القرآن وحمد الرب وصلى على النبي ﷺ واستغفر ربه فقد طلب الخير مكانه** ''

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے مرفوع حدیث بیان کی کہ جس شخص نے قرآن پاک پڑھا اور رب تعالیٰ کی حمد کی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھا اور رب تعالیٰ سے بخشش طلب کی تو اس نے خیر طلب کر لی۔

واضح ہوا کہ ختم قرآن کے بعد انسان کو مقام خیر حاصل ہوجاتا ہے اسے قبولیتِ دعاء کا شرف حاصل ہوجاتا ہے۔

☆ '' **اخرج ابن ابي داؤد عن جماعة من التابعين وان يحضر اهله واصدقاءه** ''

ابن ابوداؤد نے بیان فرمایا کہ تابعین کی ایک جماعت (یعنی کئی لوگوں) کا طرز عمل یہ تھا کہ وہ ختم قرآن پر اپنے اہل واعیال کو اور اپنے احباب کو جمع کرتے تھے وجہ یہی تھی کہ یہ مقام قبولیتِ دعا ہے لہذا زیادہ احباب کی شرکت اجتماعی دعاء کے لئے اور زیادہ مفید ہے۔

☆ '' **اخرج الطبراني عن انس انه كان اذا ختم القرآن جمع اهله ودعا** ''

طبرانی نے بیان کیا حضرت انس رضی اللہ عنہ سے جب قرآن پاک ختم فرماتے تو اپنے اہل وعیال کو جمع کر کے دعاء کرتے۔

☆ '' **واخرج ابن ابي داؤد عن الحكم بن عتيبة قال ارسل الى مجاهد وعنده ابن ابي امامة وقالا انا ارسلنا اليك لانا اردنا ان نختم القرآن والدعاء يستجاب عند ختم**

القرآن"

ابن ابوداؤد کہتے ہیں کہ حکم ابن عتیبہ کے پاس ابوامامہ بھی موجود تھے انہوں نے مجاہد کو بلوایا پھران دونوں (حکم اورابوامامہ) نے کہا کہ ہم قرآن پاک ختم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں چونکہ ختم قرآن پر دعاء مقبول ہوتی ہے اس لئے ہم نے تمہیں بھی بلایا ہے کہ تم بھی دعاء میں شریک ہو جاؤ۔

☆ "واخرج عن مجاهد قال كانوا يجتمعون عند ختم القرآن ويقول عنده تنزل الرحمة"

مجاہد کہتے ہیں کہ (تابعین حضرات) ختم قرآن پر سب مل کر دعاء کرتے کیونکہ ختم قرآن پر رحمت کا نزول ہوتا ہے۔

(ماخوذ از الاتقان ج ۱ ص ۱۱۰، ۱۱۱)

" عن حميد الاعرج قال من قرء القرآن وختمه ثم دعا امن على دعائه أربعة آالاف ملك ثم لا يزالون يدعون له ويستغفرون ويصلون عليه الى المساء اوالى الصباح"

حضرت حمید اعرج کہتے ہیں جو شخص قرآن پاک ختم کرے پھر دعا کرے اس کی آمین پر چار ہزار فرشتے آمین کہتے ہیں پھر وہ دعاء کرتے رہتے ہیں اوراس کے لئے بخشش طلب کرتے رہتے ہیں۔ اور اس کے لئے دعا ورحمت کرتے رہتے ہیں صبح تک یا شام تک۔

یعنی اگر دن کو وہ ختم قرآن پر دعاء کرے تو فرشتے اس کے لئے شام تک دعاء کرتے ہیں اور اگر رات کو ختم قرآن پر دعاء کرے تو فرشتے اس کے لئے صبح تک دعاء کرتے رہتے ہیں۔

قرآن پاک کی ترتیب:

صحابہ کرام نے قرآن پاک کو جمع کرنے میں بہت بڑی کوشش کی ۔مختلف چیزوں پر لکھا ہوا قرآن جو چمڑے کے ٹکڑوں پر، کھجور کے پتوں وغیرہ پر اسے جمع کرنے میں ایک جگہ لکھنے میں کتنی محنت کی گئی ہر صاحب عقل سمجھ سکتا ہے لیکن یہ محنت صرف اسی درجہ کی تھی ۔قرآن پاک کی ترتیب کوئی صحابہ کرام نے اپنی طرف سے نہیں دی بلکہ وہی ترتیب تھی جو نبی کریم ﷺ نے بیان فرمائی

تھی۔ اور وہ لوح محفوظ کے مطابق تھی وہی ترتیب بفضلہ تعالیٰ ہمارے پاس موجود ہے۔

" کتبوہ کما سمعوہ من رسول اللہ ﷺ من غیر ان قدموا او اخروا شیئا او وضعوا لہ ترتیبا لم یاخذ وہ من رسول اللہ ﷺ "

صحابہ کرام نے قرآن پاک اسی طرح لکھا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ سے سنا تھا اس میں ذرا بھر کوئی تقدیم، کوئی تاخیر نہیں پائی گئی۔ اور نہ ہی کوئی ایسی ترتیب صحابہ کرام نے اپنی طرف سے دی جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہ ہو۔

" کان رسول اللہ ﷺ یلقن اصحابہ ویعلمھم ما ینزل علیہ من القرآن علی الترتیب الذی ھو الآن فی مصاحفنا بتوقیف جبریل علیہ السلام ایاہ علی ذلک واعلامہ عند نزول کل آیۃ ان ھذہ الآیۃ تکتیب عقب آیۃ کذا فی سورۃ کذا "

" نبی کریم ﷺ اپنے صحابہ کرام کو تلقین فرماتے تھے اور ان کو بتاتے تھے کہ ترتیب اس طرح ہے یہ وہی ترتیب تھی جو آج بھی ہمارے پاس قرآن پاک کتابی شکل میں موجود ہے یہ ترتیب درحقیقت جبرائیل علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حکم سے بیان فرمائی۔ کیونکہ جب کوئی آیت لاتے تو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کرتے کہ اس آیت کو فلاں آیت کے بعد لکھا جائے اور فلاں سورۃ میں لکھا جائے۔ "

" فثبت ان سعی الصحابۃ کان فی جمعۃ فی موضع واحد لا فی ترتیبہ فان القرآن مکتوب فی اللوح المحفوظ علی النحو الذی ھو فی مصاحفنا الآن "

واضح ہوا کہ صحابہ کرام نے صرف اس میں کوشش کی کہ انہوں نے قرآن پاک کو ایک جگہ جمع کر دیا انہوں نے خود اپنی طرف سے قرآن پاک کو کوئی ترتیب نہیں دی۔ بیشک قرآن پاک لوح محفوظ میں اسی ترتیب پر ہے جو ترتیب ہمارے پاس موجود ہے۔ (خازن ج ا ص ۸)

ابھی تفسیر خازن کے حوالہ سے جو بحث ذکر کی ہے تقریباً وہی علامہ بغوی نے شرح السنۃ میں بیان کی ہے اسے نقل کرنے کے بعد علامہ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

" فان القرآن مکتوب فی اللوح المحفوظ علی ھذا الترتیب انزلہ اللہ جملۃ الی السماء الدنیا ثم کان ینزلہ مفرقا عند الحاجۃ وترتیب النزول غیر ترتیب التلاوۃ "

بیشک قرآن پاک لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے اسی ترتیب کے مطابق تمام کا تمام ایک مرتبہ ہی آسمان دنیا پر نازل کر دیا گیا پھر ضرورت کے مطابق آہستہ آہستہ نبی کریم ﷺ پر نازل ہوتا رہا۔

ہاں یہی بات سمجھنے کے قابل ہے کہ قرآن پاک کے نزول کی ترتیب اور ہے اور قرآن پاک کی تلاوت کے لحاظ پر اور لوح محفوظ پر ہونے کے لحاظ سے اور آسمان دنیا پر ہونے کے لحاظ سے ترتیب اور ہے

" وقال ابن الحصار ترتيب السور ووضع الآيات مواضعها انما كان بالوحي كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول ضعوا آية كذا في موضع كذا وقد حصل اليقين من النقل المتواتر بهذا الترتيب من تلاوة رسول الله صلى الله عليه وسلم ومما اجمع الصحابة على وضعه هكذا في المصحف "

ابن حصار نے بیان فرمایا ہے سورتوں کی ترتیب، آیات کی ترتیب، ہر آیت کا اپنی جگہ میں رکھا جانا، یہ وحی سے ثابت ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے کہ یہ آیت فلاں جگہ پر رکھو متواتر طور پر یہ منقول ہوتا آ رہا ہے کہ یہ یہی ترتیب رسول اللہ ﷺ کی تلاوت کی تھی اور اسی پر صحابہ کرام کا اجماع ہے اب یقینی علم حاصل ہو گیا۔ کہ ہمارے پاس قرآن پاک اسی ترتیب پر ہے جو لوح محفوظ میں۔ اور جسے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا:

" وقال الطيبي انزل القرآن اولا جملة واحدة من اللوح المحفوظ الى السماء الدنيا ثم نزل مفرقا على حسب المصالح ثم اثبت في المصاحف على التاليف والنظم المثبت في اللوح المحفوظ "

'' علامہ طیبی رحمہ اللہ نے بھی یہی بیان کیا کہ قرآن پاک تمام کا تمام ایک مرتبہ ہی لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر نازل ہو گیا پھر مصلحت کے مطابق یعنی بحسب ضرورت آہستہ آہستہ اس کا نزول ہوتا رہا لیکن قرآن پاک جو کتابی صورت میں جمع ہے یہ وہی ترتیب ہے جو لوح محفوظ پر ہے۔

(ماخوذ از الاتقان ج ص ۲۱، ۲۳)

قرآن پاک شک وشبہ سے بالاتر ہے:

علامہ زرقانی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ قرآن پاک کو لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر اتارا۔ پھر

نبی کریم ﷺ کے قلب مبارک پر اتارا۔ یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ قرآن پاک شک وشبہ سے بالاتر ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کے قلب مبارک کے علاوہ دو اور جگہ بھی قرآن پاک محفوظ ہے۔

(مناهل العرفان ج ۱ ص ۳۹، معارف القرآن)

سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات:

جب آپ کی عمر مبارک چالیس سال تھی غارِ حرا میں پہلی بار سورۃ " اقرا " کی پانچ آیتیں نازل ہوئیں ۔اس کے بعد کچھ دیر تک یہ سلسلہ رکا رہا۔محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ سلسلہ وحی کے رک جانے کے بعد سب سے پہلے سورۂ مدثر کی آیتیں نازل ہوئیں ۔آپ حرا سے واپس آ رہے تھے کہ ایک آواز سنائی دی آپ نے ادھر ادھر دیکھا کچھ نظر نہ آیا اوراوپر دیکھا تو وہی فرشتہ جبریل نظر آیا۔(جو پہلے اقرأ کی آیات لاچکا تھا)۔حضور ﷺ حضرت خدیجہ کے پاس آئے فرمایا مجھے چادر دو اور مجھے ٹھنڈا پانی ڈال دو ۔ اسی حالت میں یہ آیتیں نازل ہوئیں ﴿ یاایها المدثر، قم فانذر ، وربک فکبر﴾

(فیوض الباری شرح بخاری ج ۱ ص ۶۹)

وحی کے مراتب: علماء کرام نے وحی کے کئی مراتب بیان کئے ہیں:

اول مرتبہ : رؤیاء صالحہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنھا کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ابتدا میں جو چیز سب سے پہلے ظاہر ہوئی وہ رؤیاء صالحہ ہے۔اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ "وکان لا یری الاجاء ت مثل فلق الصبح " یعنی حضور کی رؤیا ایسی ہوتی جیسے صبح صادق کا طلوع ہونا کتابوں میں مذکور ہے یہ کیفیت چھ مہینہ رہی ۔چنانچہ اس عرصہ میں نبوت میں کلام ہے۔(صحیح یہ ہی ہے کہ نبوت کا اعلان کرنے کا حکم نزول آیات اقرأ سے ہوا)۔

دوسرا مرتبہ : وحی کا یہ تھا کہ جبرائیل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے قلب شریف میں القاء کرتے تھے بغیر اس کے کہ حضور علیہ السلام جبرائیل کو دیکھیں جیسا کہ آپ نے فرمایا کہ میرے دل میں روح قدس نے القاء والہام کیا ہے کہ ہرگز اس وقت تک کوئی نہیں مرے گا جب تک کہ اپنا رزق پورا نہ کرے(آخر حدیث تک)اس حدیث کو حاکم نے روایت کر کے صحیح کہا ہے۔

تیسرا مرتبہ: وحی کا یہ تھا کہ جبرائیل علیہ السلام کسی آدمی کی صورت اختیار کر کے حضور ﷺ کے پاس آتے تھے اور اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچاتے تھے تا کہ آپ اسے یاد کر لیں اکثر طور پر حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی صورت میں آتے تھے۔

چوتھا مرتبہ: وحی کا یہ تھا کہ صلصلة الجرس یعنی رہٹ (یا گھنٹی) کی مانند آواز سنائی دیتی تھی اور نبی کریم ﷺ کے سوا کوئی دوسرا وحی کے کلمات اور معانی کو نہیں سمجھ سکتا تھا وحی کی تمام قسموں سے یہی قسم آپ پر زیادہ سخت تھی یہاں تک کہ شدید سردی کے دنوں میں آپ کی پیشانی مبارک سے پسینہ ٹپکنے لگتا تھا اور اگر آپ اونٹ پر سوار ہوتے تو وہ شدید بوجھ محسوس کرتے ہوئے بیٹھ جاتا تھا ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ پر اس طرح وحی آئی اس وقت آپ اپنا سر مبارک زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی ران پر رکھے ہوئے تھے ان کی ران اتنی وزنی ہوگئی کہ قریب تھا کہ وہ ٹوٹ جائے۔

طبرانی نے زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ پر وحی آنے کی حالت لکھتا ہوں کہ جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو آپ پر اتنی شدت وسختی ہوتی کہ چہرے پر چاندی کے دانوں کی مانند پسینہ ٹپک آتا تھا ایک دن آپ میری ران پر سر رکھے ہوئے تھے اسی حالت میں وحی آئی میری ران اتنی وزنی ہوگئی کہ قریب تھا کہ میرا پاؤں ٹوٹ جائے۔ اور میں نے گمان کیا کہ اب میں کبھی اپنے پاؤں پر نہ چل سکوں گا۔ اسی طرح جس وقت سورۂ مائدہ نبی کریم ﷺ پر نازل ہوئی تو قریب تھا کہ نبی کریم ﷺ کی اونٹنی کی ٹانگیں اس سے ٹوٹ جائیں۔

وحی میں مطلقاً ثقل و بوجھ بھی آیا ہے۔ چنانچہ جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو آپ اس کی وجہ سے سختی محسوس فرماتے اور آپ کے روئے تابان کا رنگ متغیر ہو جاتا۔ اور خاکستری رنگ کی مانند ہو جاتا اور آپ کا سر مبارک جھک جاتا آپ کے اصحاب بھی اپنے سر جھکا لیتے جب یہ کیفیت ختم ہوتی تو اپنا سر مبارک جھکا لیتے۔

عجیب حکمت: علماء محققین نے اس کی وجہ بیان فرمائی کہ ایسا کیوں ہوتا کہ کبھی جبرائیل انسانی شکل میں آتے اور کبھی نبی کریم ﷺ پر یہ کیفیت طاری ہوتی اس کی وجہ یہ ہے فیض حاصل کرنے اور فیض پہنچانے میں یکسانیت و مناسبت شرط ہے۔ اسی لئے جبرائیل جب کبھی اپنی اصلی نورانی حالت

میں حاضر ہوتے تو حضور ﷺ پر بھی نورانیت غالب ہو جاتی اس وقت یہ شدت والی کیفیت ہوتی تھی کیونکہ اس وقت نورانیت بشریت پر غالب ہوتی تھی۔ اور بعض اوقات نبی کریم ﷺ کی بشریت جبرائیل کی نورانیت پر بھی غالب ہو جاتی تھی۔ اس وقت جبرائیل کو بھی بشری شکل میں آنا پڑتا۔

پانچواں مرتبہ: یہ تھا کہ کبھی جبرائیل علیہ السلام اپنی اصلی صورت میں (مع تین سو یا چھ سو پروں کے) آتے اور وحی پہنچاتے اس صورت میں جبرائیل صرف دو بار حاضر ہوئے۔

چھٹا مرتبہ: وحی کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر اس حالت میں وحی فرمائی جب کہ آپ آسمانوں کے اوپر شب معراج کو تشریف لے گئے نماز وغیرہ کی وحی اسی طرح فرمائی تھی۔

اسی وحی کی حالت میں رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو علوم کے وہ خزانے عطاء فرمائے جن کو صرف رب تعالیٰ یا اس کے رسول ﷺ ہی جانتے ہیں دوسرے کسی انسان کو معلوم نہیں وہ کیا دیا، کتنا دیا حقیقت یہی ہے کہ بہت بہت کچھ عطا فرمایا رب تعالیٰ نے فرمایا۞ فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى۞ وحی کی اپنے بندے کی طرف جو وحی کی۔

اے غافل انسان! جب رب تعالیٰ نے یہ نہیں بتایا کہ میں نے کیا دیا ہے صرف اتنا فرمایا جو دینا تھا دیا۔ تو تجھے کیا ہوا تو اپنی عاقبت کیوں برباد کر رہا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے علم کو پیمانوں سے ناپ رہا ہے۔

ساتواں مرتبہ: وحی کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نبی کریم ﷺ سے براہ راست کلام فرمانا جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا یعنی حجاب میں کلام فرمایا۔

یعنی شب معراج کو بعض چیزیں بلاواسطہ جبرائیل آپ کے دل پر القاء کی گئیں اور کچھ براہ راست کلام سے عطاء ہوئیں، سبحان اللہ کیا مقام ہے میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ کا کتنی عظمت ہے لیکن ایمان ہو تو سمجھ میں آئے۔ معاملہ قسمت کا ہے کوئی علم کی وسعت بیان کر رہا ہے کوئی بے علم اس ذات کے علم کا ناپ تول کر رہا ہے جس ذات کے علم کے سمندر کے مقابلہ میں ساری مخلوق کا علم ایک قطرہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

آٹھواں مرتبہ: وحی کا یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ سے اللہ تعالیٰ نے بغیر حجاب کے اپنے دیدار

سے مشرف فرما کر کلام فرمایا یہی حق مذہب یہی قول تحقیق پر مبنی ہے کہ حضور ﷺ شب معراج کو دیدار باری تعالیٰ سے مشرف ہوئے۔ (ماخوذ از مدارج النبوۃ ج ۲ بعنوان مراتب وحی)

آیات کا مکی اور مدنی ہونا:

آیات کے مکی ہونے یا مدنی ہونے میں تین قول ہیں لیکن ان میں زیادہ مشہور، زیادہ صحیح اور زیادہ معتبر قول یہ ہے:

"ان المکی مانزل قبل الھجرۃ والمدنی مانزل بعدھا"

مکی وہ ہیں جو ہجرت سے پہلے نازل ہوئیں اور مدنی وہ ہیں جو ہجرت کے بعد نازل ہوئیں۔

یعنی ہجرت کے بعد فتح مکہ کے سال مکہ میں نازل ہونے والی آیات اسی طرح حجۃ الوداع کے سال مکہ میں نازل ہونی والی آیات یا وہ آیات جو دوران سفر نازل ہوئیں بعد از ہجرت وہ سب مدنی ہیں۔اس معتبر قول کے مطابق سب آیات یا مکی ہیں یا مدنی۔کوئی آیت ایسی نہیں جو نہ مکی ہو اور نہ ہی مدنی ہو۔

دوسرا قول: مکی وہ آیات ہیں جو مکہ میں اتریں خواہ ہجرت کے بعد ہی کیوں نہ اتری ہوں۔ اور مدنی وہ ہیں جو مدینہ میں اتریں اس قول کے مطابق مکہ اور مدینہ سے باہر دوران سفر نازل ہونے والی آیات نہ مکی ہوں گی اور نہ ہی مدنی۔

تیسرا قول: جن آیات میں اہل مکہ کو خطاب ہے وہ مکی ہیں اور جن آیات میں خطاب اہل مدینہ کو ہے وہ مدنی ہیں۔ (از اتقان ج ۱ ص ۹)

تنبیہ: چونکہ مکی اور مدنی آیات کون سی ہیں؟ جب ان کی تعریف میں مختلف قول ہیں تو بعض آیات کے مکی اور مدنی ہونے میں بھی اختلاف نظر آئے گا لیکن پہلے معتبر قول کے مطابق ہی مکی اور مدنی ہونے کا تعین ہی بہتر ہے۔

مکی اور مدنی سورتوں کی تعداد:

" عن ابی سلمة الحضرمی سمعت ابن عباس قال سألت ابی بن کعب عما نزل من القرآن بالمدنية فقال نزل بها سبع وعشرون سورة وسائرها بمكة "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ مدینہ میں کتنا قرآن پاک نازل ہوا انہوں نے کہا ستائیس سورتیں یہاں نازل ہوئیں باقی مکہ میں نازل ہوئیں یہ بھی خیال رہے بعض نے انتیس سورتیں مدنی بیان کی ہیں۔

بعض سورتیں مکی لیکن کچھ آیات مدنی ہیں:

مثلاً سورۃ انعام مکی ہے لیکن اس میں تین آیتیں " قل تعالوا اتل ......الخ "مدنی ہیں اسی طرح سورۃ حج مکی ہے اس میں تین آیتیں " هذان خصمان......الخ " مدنی ہیں۔ اسی طرح اور مکی سورتوں میں بھی کچھ آیات مدنی ہیں اس بات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہی بعض لوگ غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہ سورۃ مکی ہے اس میں وہ احکام کیسے جن کا تعلق ہجرت کے بعد ہے۔

مدنی سورتیں:

" ويل للمطففين ، البقرة ، آل عمران ، الانفال ، الاحزاب ، المائدة ، الممتحنة النساء ، اذازلزلت ، الحديد ، محمد ، الرعد ، الرحمن ، هل اتى على الانسان الطلاق ، لم يكن ، الحشر ، اذجاء نصر الله ، النور ، الحج ، المنافقون ، المجادلة ، الحجرات ، ياايها النبی لم تحرم ، الصف ، الجمعة ، التغابن ، الفتح ، براء ة "

یہ بھی خیال رہے کہ بعض سورتوں کے مکی اور مدنی ہونے میں اختلاف بھی پایا گیا ہے۔ الاتقان خازن وغیرہ کو دیکھا جائے۔

اعتراض: تم نے بیان کیا ہے کہ سورۃ اقرأ کی ابتدائی آیات سب سے پہلے نازل ہوئیں پھر سورۃ مدثر کی پہلی آیات حالانکہ ذکر کیا گیا ہے " اول ما انزل من القرآن اقرأ باسم ربک ثم ن ثم یاایھا المزمل ثم یا ایھا المدثر" . سب سے پہلے ﴿اقرأ باسم ربک﴾ نازل ہوئی پھر سورۃ "ن" پھر "یاایھا المزمل" پھر "یاایھا المدثر" سورۃ" مدثر" کو دوسرے نمبر پر رکھنا کس طرح صحیح ہے؟

جواب: یہاں جو ترتیب میں سورۃ مدثر کو چوتھے نمبر پر بیان کیا گیا ہے اس سے مراد پہلی آیات کے بعد والی سورۃ ہے اور جو دوسرے نمبر پر ذکر کیا ہے اس سے مراد پہلی آیات "فکبر" تک ہیں۔

مکی سورتوں کی پہچان کے لئے قاعدہ کلیہ:

ہر وہ سورۃ جس میں احناف کے مسلک کے مطابق سجدہ کی آیت پائی جائے وہ مکی ہے ہر وہ سورۃ جس میں لفظ "کلا" آیا ہوا ہے وہ مکی ہے یہ بھی خیال رہے کہ یہ لفظ پندرہ سورتوں میں تینتیس مرتبہ استعمال ہوا ہے جن آیات میں یہ لفظ استعمال ہوا وہ تقریباً قرآن پاک کے آخری نصف حصہ میں ہیں۔ ہر وہ سورۃ جس میں آدم علیہ السلام اور شیطان کا ذکر ہے البتہ سورۃ بقرہ میں یہ ذکر ہونے کے باوجود وہ مدنی ہے۔

مدنی سورتوں کی پہچان کے لئے قاعدہ کلیہ:

وہ آیات جن میں منافقین کا ذکر ہے وہ مدنی ہیں۔ خواہ وہ مدنی سورتوں میں ہوں یا مکی میں ہوں۔ اسی طرح وہ آیات جن میں جہاد کا حکم کیا گیا ہے یا جہاد کے متعلق کوئی احکام ذکر ہیں وہ بھی مدنی ہیں۔

مکی سورتوں کی پہچان کے لئے اکثریہ قاعدہ:

پہلے یہ سمجھ لیا جائے کہ قاعدہ کلیہ وہ ہوتا ہے جو ہر جگہ جاری ہوتا ہے اور قاعدہ اکثریہ وہ ہوتا ہے جو زیادہ جگہ پر جاری ہوتا ہے لیکن کبھی اس کے خلاف بھی پایا جاسکتا ہے۔ عام طور چھوٹی چھوٹی آیتیں اور

چھوٹی سورتیں مکی ہیں۔وہ آیتیں جو "یاایھا الناس " سے شروع ہیں وہ زیادہ طور پر مکی ہیں۔وہ آیات جن میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبی کریم ﷺ کی رسالت کا ذکر ہے۔یا قیامت کے احوال کا ذکر پہلی امتوں کے حالات ،واقعات کا ذکر ہے وہ مکی ہیں۔اسی طرح مکی سورتوں میں مثالیں ،تشبیہات وغیرہ زیادہ ذکر ہیں۔اسی طرح مکی سورتوں میں کفار،مشرکین ،بت پرست لوگوں کا زیادہ ذکر ہے۔

مدنی سورتوں کی پہچان کے لئے قاعدہ اکثریہ:

مدنی آیات بڑی ہیں اسی طرح مدنی سورتیں بھی بڑی ہیں۔زیادہ طور پر مدنی آیات "یاایھا الذین امنوا " سے شروع ہیں مدنی سورتوں یا مدنی آیات میں زیادہ طور پر احکامات پائے گئے ہیں جیسے سورۃ بقرہ کو ہی دیکھا جائے کہ اس سورۃ میں کتنے احکامات موجود ہیں۔روزہ، حج ،ھدی ، جہاد ، چاند، نکاح ،طلاق ،قسم وغیرہ کے احکام موجود ہیں مکی سورتوں میں اس طرح بساطت سے احکام مذکور نہیں۔مدنی سورتوں میں تمثیلات وتشبیہات وغیرہ تقریباً نہیں پائے گئے بلکہ عام سا طریقہ استعمال کیا گیا ہے۔اسی طرح مدنی سورتوں میں زیادہ طور پر منافقین کا ذکر ہے اور یہود ونصاری کا ذکر ہے۔

یہ مسئلہ سمجھنا کوئی مشکل نہیں:

یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ مکہ مکرمہ میں مشرکین سے واسطہ تھا اس لئے وہاں نزول آیات میں وہی منافقین تھے۔

اور مدینہ طیبہ میں یہود نصاری زیادہ تعداد میں تھے لہذا مخاطبین وہی تھے خصوصاً عبداللہ ابن ابی جو منافقوں کا سردار تھا نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے اسے مدینہ کا رئیس بنانے اور اس کی تاج پوشی کا انتظام مکمل ہو چکا تھا آپ کے آنے سے اس کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا تو وہ منافق ہو گیا کیونکہ ظاہر طور پر مخالفت وہ کر نہیں سکتا تھا۔تو اوپر سے مسلمان بن کر مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا تھا۔چونکہ منافقین کا ٹولہ بھی مدینہ طیبہ میں ہی تھا اس لئے وہاں نازل ہونے والی آیات میں ان کو بھی مخاطب بنایا گیا۔

قرآن پاک کا سات حروف پر ہونا:

تقریباً اکیس صحابہ کرام سے یہ حدیث روایت کی گئی " نزل القرآن علی سبعة احرف " (قرآن پاک کو سات حروف پر نازل کیا گیا)۔"وقد نص ابو عبیده علی تواتره " ابوعبیدہ نے بیان کیا ہے کہ یہ حدیث تواتر سے مروی ہے۔راقم کے خیال میں اکیس صحابہ کرام کی تعداد سے ہی تواتر سمجھ آ رہا ہے کیونکہ تواتر کا مطلب ہی یہ ہے کہ اتنے راوی ہوں جو جھوٹ پر متفق نہ ہوسکیں۔

بخاری مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

" انا رسول الله صلی الله علیه وسلم قال اقرأ نی جبریل علی حرف فراجعته فلم ازل استزیده ویزدنی حتی انتهی الی سبعة احرف "

"نبی کریم ﷺ نے فرمایا جبرائیل نے مجھے ایک حرف پر پڑھنے کے متعلق کہا میں اسے لوٹاتا رہا اور زیادہ حروف پر پڑھنے کا مطالبہ کرتا رہا وہ (ایک ایک حرف) کو زیادہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ سات حروف تک انتہاء کی"۔

مسلم میں ابی کی حدیث میں ہے:

" ان ربی ارسل اقرأ القرآن علی حرف فرددت الیه ان هون علی امتی فارسل الی ان اقرأه علی حرفین فرددت ان هون علی امتی فارسل ان اقرأه علی سبعة احرف "

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے پاس رب تعالیٰ نے پیغام بھیجا کہ میں ایک حرف پر قرآن پڑھوں میں نے پیغام رساں کو اس کی طرف لوٹایا۔اور عرض کیا کہ میری امت پر آسانی فرما پھر مجھے دو حرفوں پر پڑھنے کے متعلق کہا میں نے پھر امت کے لئے آسانی کی درخواست کی (اس طرح میں عرض کرتا رہا یہاں تک کہ) مجھے سات حرفوں پر پڑھنے کی اجازت دی گئی"۔

سات حرفوں والی احادیث سے مراد کیا؟

اگرچہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ اس میں چالیس اقوال ہیں تاہم ان سے مشہور اقوال یہاں نقل کر رہا ہوں تقریباً وہ تمام ہی مراد ہو سکتے ہیں ان میں کوئی اختلاف نہیں۔

پہلا قول: سات حروف سے مراد سات وجوہ ہیں۔

(۱) مختلف حرکات پڑھنے کی اجازت جو کہ لفظ معنی اور شکل نہ بدلے جیسے "ولا یضار کاتب" میں راء پر زبر بھی جائز ہے اور پیش بھی۔

(۲) فعل بدل جائے بعض قراءتوں میں ماضی ہو اور بعض میں امر وغیرہ ہو جیسا کہ "باعد بین اسفارنا" میں ماضی اور امر کی دونوں قراءتیں پائی گئی ہیں اور اسی طرح "باعد" اور "بعد" میں بھی دونوں صورتیں پائی گئی ہیں۔

(۳) دونوں قراءتوں میں لفظ بدلے ہوئے ہوں معنی ایک ہو جیسا کہ "ننشزھا" میں ایک قراءت راء مہملہ سے ہے اور دوسری قراءت زاء معجمہ سے ہے۔

(۴) ایک قراءت میں ایک حرف استعمال ہے جب کہ دوسری قراءت میں دوسرا قریب المخرج لفظ استعمال ہے جیسا کہ "طلح منضود" میں حاء سے بھی ہے اور عین سے بھی "طلع منضود" پڑھا گیا ہے۔

(۵) تقدیم وتاخیر پائی گئی ہو جیسا "وجاءت سکرۃ الموت بالحق" میں "وسکرۃ الحق بالموت" بھی آیا ہوا ہے۔

(۶) زیادتی یا نقصان سے تغیر پایا جائے جیسا کہ ایک قراءت میں "والذکر والانثی" اور دوسری میں "وما خلق الذکر والانثی" ہے۔

(۷) الفاظ مختلف ہوں جیسا کہ ایک جگہ کا لعھن المنفوش ہے اور دوسری قراءت میں کالصوف المنفوش ہے۔ خیال رہے کہ یہ قول ابن ابی قتیبہ کا ہے اس پر قاسم بن ثابت نے اعتراض بھی کیا ہے تاہم جواب یہ دیا گیا ہے کہ ہوسکتا ہے ابن ابی قتیبہ ان تمام صورتوں کے جواز پر قراء کے اتفاق پر مطلع ہوئے ہوں۔ اور قاسم بن ثابت اس پر مطلع نہ ہو سکے ہوں۔

دوسرا قول: یہ قول تقریباً پہلے قول کے کچھ قریب ہے جو ابوالفضل رازی کا ہے کہ سات حروف سے مراد سات وجوہ ہیں:

(۱) اسماء میں اختلاف یعنی افراد، تثنیہ، جمع اور تذکیر، تانیث میں مختلف قراءتوں میں اختلاف ہو۔

(۲) افعال کی گردانوں میں اختلاف ہو ماضی ہو ،مضارع ہو، یا امر ہو یعنی کسی قراءت میں ماضی ہو اور کسی میں مضارع ہو۔

(۳) مختلف حرکات ہوں کسی قراءت میں ایک حرکت ہو اور کسی میں دوسری۔

(۴) کمی اور زیادتی کسی قراءت میں لفظ کم ہوں اور کسی میں زیادہ ہوں۔

(۵) تقدیم و تاخیر کسی قراءت میں بعض لفظ پہلے ہوں اور کسی قراءت میں وہی لفظ بعد میں ہوں۔

(۶) ابدال بعض قرأتوں میں جو لفظ ہو دوسری قرأت میں وہ لفظ نہ ہوں بلکہ اسی معنی میں اور لفظ ہو۔

(۷) اختلاف لغات، یعنی ادغام و اظہار وغیرہ میں اختلاف کسی قراءت میں ایک لفظ مدغم ہے تو دوسری میں وہی مظہر یعنی غیر مدغم ہے اسی طرح امالہ اور فتح (غیر امالہ) ترقیق اور تفخیم وغیرہ کا اختلاف پایا جائے۔

تیسرا قول: " ان المراد سبع لغات " سات حروف سے مراد سات لغات ہیں ابوعبید اور زہری اور ان کے علاوہ کئی حضرات کا یہی قول ہے۔

فائدہ: سورۃ فاتحہ ، اخلاص ، کوثر ، تبت ، لم یکن ، نصر ، فلق ، الناس ، انعام۔ یہ تمام سورتیں مکمل مکمل نازل ہوئیں۔ اس طرح نہیں جس طرح "اقراء" کی پہلی آیات " ما لم یعلم " تک پہلے نازل ہوئیں اور بعد والی بعد میں نازل ہوئیں اسی طرح "والضحی" کی پہلی آیات " فترضی " تک پہلے نازل ہوئیں باقی بعد میں۔ زیادہ سورتیں متفرق، متفرق طور پر ہی نازل ہوئیں۔

(ماخوذ از اتقان ج ۱ ص ۳۷)

فائدہ: " ان احرف القرآن فی اللوح المحفوظ کل حرف منها بقدر جبل قاف ان تحت کل حرف منها معانی لا یحیط بها الا الله "

''لوح محفوظ میں قرآن پاک کے حروف میں ہر حرف کوہ قاف کی طرح ہے اور ہر حرف کے نیچے کتنے معانی ہیں۔ ان کا احاطہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کرسکتا ہے''۔

(الاتقان ج ۱ ص ۳۳)

• اسی سے ایک اور فائدہ حاصل ہوگیا کہ نبی کریم ﷺ پر جب قرآن پاک نازل ہوا تو یقیناً آپ کو تمام حروف کے معانی کا علم عطا کیا گیا ہے۔ تو آپ کے علوم کو بھی اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

خیال رہے کہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے یہ قول نقل کیا ہے اس بحث میں کہ قرآن پاک کے الفاظ ومعانی نازل ہوتے ہیں، یا صرف معانی تاہم جو فائدہ راقم نے نقل کیا ہے وہ بھی واضح ہے اس میں کوئی اخفاء نہیں۔

فائدہ: "عن سفیان الثوری قال لم ینزل وحی الا بالعربیة ثم ترجم کل نبی لقومه"

سفیان ثوری رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ ہر نبی پر وحی عربی میں ہی نازل ہوئی۔ بعد میں ہر نبی نے اپنی اپنی قوم کے لئے ان کی زبان میں ترجمہ کیا۔

فائدہ: اکثر سورتوں کا ایک ایک نام ہے لیکن بعض سورتوں کے دو یا دو سے زیادہ نام ہیں جیسا کہ سورۃ فاتحہ کے پچیس نام بیان کئے گئے ہیں۔

قرآن پاک تین مرتبہ جمع ہوا:

پہلی مرتبہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں۔ لیکن یہ لوگوں کے سینوں میں جمع ہوا۔ اگرچہ آیات مبارکہ کی ترتیب نزول کے لحاظ پر اور تھی۔ لیکن پڑھنے کے لحاظ پر ترتیب نبی کریم ﷺ نے جو بیان فرمائی وہی آج بھی ہے۔ (از اتقان ج ا ص ۵۹)

اعتراض: "عن زید بن ثابت قال قبض النبی ﷺ ولم یکن القرآن جمع فی شی"

حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ جب دنیا سے تشریف لے گئے۔ تو اس وقت تک قرآن پاک کسی چیز میں جمع نہیں تھا۔

اس سے تو یہ ثابت ہو رہا ہے کہ قرآن پاک نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے بعد جمع ہوا کس طرح کہا جاتا ہے کہ پہلی مرتبہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں جمع ہوا۔

جواب: حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ قرآن پاک کتابی شکل میں آپ کے زمانہ میں جمع نہیں ہوا۔ بلکہ مختلف چیزوں پر نزول کے لحاظ پر آیات لکھی ہوئی تھیں یہ جو بیان کیا گیا ہے کہ آپ کے زمانہ میں جمع ہوا اس کا مطلب پہلے ہی واضح کر دیا گیا ہے کہ وہ پڑھنے کی ترتیب کے لحاظ پر لوگوں کے سینوں میں جمع کیا گیا تھا کتابی شکل میں تمام قرآن پاک کو ایک جگہ نہیں لکھا گیا تھا۔

" قال مسروق عن عائشة رضی اللہ عنہا عن فاطمة علیها السلام اسر الی النبی ﷺ ان جبریل کان یعارضنی بالقرآن کل سنة وانه عارضنی العام مرتین ولااراه الا حضراجلی "

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ میرے ساتھ نبی کریم ﷺ نے راز کے طور پر یہ بات فرمائی کہ بیشک جبرائیل میرے ساتھ ہر سال ایک مرتبہ قرآن پاک کا دور کرتے تھے اس مرتبہ انہوں نے میرے ساتھ دو مرتبہ دور کیا ہے۔ مجھے یہی یقین ہو رہا ہے کہ میرے وصال کا وقت آ چکا ہے۔

" عن ابن عباس رضی اللہ عنهما قال کان النبی ﷺ اجود الناس بالخیر واجود مایکون فی شهر رمضان لان جبریل کان یلقاه فی کل لیلة فی شهر رمضان حتی ینسلخ یعرض علیه رسول اللہ ﷺ القرآن فاذا لقیه جبریل کان اجود بالخیر من الریح المرسلة "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ سب لوگوں سے بھلائی کے کاموں میں زیادہ سخی تھے آپ رمضان شریف میں بہت زیادہ سخاوت فرماتے تھے اس لئے کہ جبرائیل آپ سے رمضان کے مہینے میں ہر رات ملاقات فرماتے تھے یہاں تک کہ اسی حال میں رمضان گزر جاتا۔ نبی کریم ﷺ ان سے قرآن کا دور کرتے تھے جب آپ کو جبرائیل ملتے تو آپ بارش کی خوشخبری لانے والی ہوا سے بھی زیادہ سخاوت فرماتے تھے۔

" عن ابی هریرة قال کان یعرض علی النبی ﷺ القرآن کل عام مرة فعرض علیه مرتین فی العام الذی قبض فیه وکان یعتکف فی کل عام عشرا فاعتکف عشرین فی العام الذی قبض فیه "

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں (جبرائیل) نبی کریم ﷺ سے ہر سال ایک مرتبہ دور کرتے تھے۔ جس سال نبی کریم ﷺ کا وصال ہوا اس سال دو مرتبہ دور کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال دس دن اعتکاف بیٹھتے تھے جس سال آپ کا وصال ہوا اس سال بیس دن اعتکاف بیٹھے۔

(احادیث ثلاثه من بخاری باب کان جبرایل یعرض القرآن علی النبی صلی اللہ علیه وسلم)

مختصر وضاحت احادیث:

"یعرض بکسر الراء ای یقرأ والمراد یستعرضه"

" ما اقرأه ایاه " یعرض کا معنی ہے پڑھنا یہاں مراد ہے کہ کسی کو پڑھ کر سنانا۔ چونکہ بعض احادیث میں باب مفاعلہ سے "عارض" لفظ استعمال ہے۔ جو جانبین سے فعل کے پائے جانے کا تقاضا کرتا ہے۔ اس لئے معنی یہ ہوگا کہ جبرائیل مجھے پڑھ کر سناتے اور میں انہیں پڑھ کر سناتا۔

" اجود الناس " حدیث شریف پہلے مطلق ذکر کیا کہ آپ تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے تا کہ یہ وہم نہ ہو کہ آپ صرف رمضان میں ہی سخاوت فرماتے تھے۔

جبرائیل کی ملاقات اور رمضان شریف میں نبی کریم ﷺ بہت زیادہ سخاوت فرماتے تھے:

" وذلک انه اثبت له اولا وصف الاجودیة ثم اراد ان یصفه بازید من ذالک فشبه جو د بالریح المرسلة "

پہلے مطلقا نبی کریم ﷺ کا تمام لوگوں سے زیادہ سخی ہونے کا ذکر کیا کہ آپ ہر زمانہ میں، ہر وقت، ہر شخص سے زیادہ سخی تھے پھر رمضان شریف میں جبرائیل کی ملاقات پر بہت زیادہ سخاوت کو "ریح مرسلہ " سے تشبیہ دی۔

" الریح المرسله " یہ وہ ہوا ہے جس کے متعلق رب تعالیٰ نے فرمایا:

"وهو الذی یرسل الریاح بشرا بین یدی رحمته " (وہ اللہ تعالیٰ جو ہواؤں کو اپنی رحمت کی بشارت بنا کر بھیجتا ہے)۔ یعنی وہ ہوائیں جو بارش سے پہلے آ کر بارش کا پتہ دیتی ہیں ان کو "مرسلہ " کہا جاتا ہے۔

فائدہ: نبی کریم ﷺ کی سخاوت کو ہوا سے تشبیہ دے کر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ آپ کی سخاوت ہوا سے بھی زیادہ تھی۔ اس لئے کہ ہوا کبھی رک جاتی ہے اور نبی کریم ﷺ کی سخاوت کبھی رکتی نہیں تھی۔ ہوا کبھی نقصان دہ بھی ہوتی ہے لیکن نبی کریم ﷺ کے سخاوت نفع مند ہی ہوتی تھی نقصان دہ ہونے کا تصور بھی نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے " الریح " کے ساتھ "المرسلہ" کو ذکر کیا کہ آپ کی سخاوت میں فقط اس

طرح نفع ہوتا جیسا کہ بارش کی بشارت دینے والی ہوا میں ہوتا ہے۔

لیکن یہ بھی خیال رہے کہ بارش کی خبر دینے والی ہوا کے متعلق کبھی انسان کا گمان غلط نکلتا ہے۔ وہ نفع مند سمجھتا ہے اور واقع میں وہی اس کے لئے عذاب ہوتی ہے۔جیسا کہ قوم عاد کے متعلق رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا بَلْ هُوَمَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾

''پھر جب انہوں نے عذاب کو دیکھا بادل کی طرح آسمان کے کنارے میں پھیلا ہوا ان کی وادیوں کی طرف آتا ہے بولے یہ بادل ہے کہ ہم پر برسے گا (اللہ نے فرمایا) بلکہ وہ تو ہے جس کی تم جلدی کر رہے تھے ۔ایک آندھی ہے جس میں دردناک عذاب ہے''۔

لیکن نبی کریم ﷺ کے جود میں ہمیشہ نفع ہی نفع ہے اسی لئے آپ کے جود کو تشبیہ دینے میں "الریح المرسلہ" کہا گیا ہے، کہ حقیقت میں وہ ہوا بارش کی خوشخبری دینے والی ہو نہ کہ صرف گمان کے مطابق ہو۔

اسی طرح یہ بھی ذہن میں رہے کہ "الریح المرسلہ" وہ ہوا ہے جو لگاتار چند دن برسے اسے سے یہ بھی واضح ہو گیا "وکذا کان عملہ صلی اللہ علیہ وسلم فی رمضان دیمۃ لا ینقطع" کہ نبی کریم ﷺ کا عمل رمضان میں لگاتار جاری رہتا اس میں انقطاع نہیں ہوتا تھا۔اس تشبیہ سے ایک اور بات یہ سمجھ میں آئی۔" ان الجود من النبی ﷺ حقیقۃ ومن الریح مجاز" بیشک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت حقیقی ہے اور ہوا کی مجازی ہے کیونکہ ہوا جب خیر کی ہو تو اس میں جود پایا جاتا ہے۔لیکن جب خیر کی نہ ہو تو اس میں کوئی جود نہیں۔

احادیث مذکورہ سے حاصل ہونے والے فوائد:

۱) رمضان شریف کی فضیلت سمجھ میں آئی کہ اس میں قرآن پاک کا نزول ہوا یعنی لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر نزول رمضان میں ہوا۔

(۲) نبی کریم ﷺ اور جبرائیل کے قرآن پاک کا دور کرنے سے اور ہی زیادہ فضیلت رمضان کو حاصل ہوگئی۔

(۳) جبرائیل نبی کریم ﷺ کے پاس جتنا زیادہ رمضان شریف میں حاضر ہوتے اتنا اور کسی مہینہ میں نہیں آتے تھے۔

(۴) رمضان میں بہت زیادہ خیرات و برکات کا نزول ہوتا ہے۔ جتنا اور مہینوں میں نہیں ہوتا۔

(۵) رمضان شریف میں حفاظ کرام کا قرآن پاک کا دور کرنا سنت رسول اللہ ﷺ اور سنت جبرائیل ہے۔

(۶) " **ان فضل الزمان انما یحصل بزیادۃ العبادۃ** " عبادت کی زیادتی سے زمانہ کو بھی فضیلت حاصل ہوجاتی ہے۔ چونکہ رمضان میں عبادت زیادہ ہوتی ہے لہذا رمضان کو بھی فضیلت حاصل ہوجاتی ہے۔

(۷) قرآن پاک کی جتنی زیادہ تلاوت کی جائے اتنی ہی زیادہ خیر و برکت حاصل ہوتی ہے۔

(۸) آخری عمر میں زیادہ سے زیادہ عبادت کرنا مستحب ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اپنی عمر کے آخری سال قرآن پاک کا دور دو مرتبہ کیا جب کہ پہلے ایک مرتبہ کرتے تھے۔ اور آپ نے اپنی عمر کے آخری سال اعتکاف بیس دن کیا جب کہ پہلے آپ کا اعتکاف دس دنوں کا ہوتا۔

(۹) " **ومذاکرۃ الفاضل بالخیر والعلم وان کان ھو لا یخفی علیہ ذلک لزیادۃ التذکرۃ والاتعاظ** " جس کو علم اور بھلائی عطاء کر کے فضیلت عطاء کی گئی ہو اس کا ذکر خیر کرتے رہنا چاہئے۔ بیشک اس کے کمالات واضح ہوں کسی سے مخفی نہ ہوں اس لئے کہ نیک لوگوں کے تذکرہ سے نصیحت حاصل ہوتی ہے۔ اور دوسروں کو بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کا موقع مل جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے اوصاف کا تذکرہ فرمایا۔

(۱۰) " **وفیہ ان لیل رمضان افضل من نھارہ** " اور یہ بھی واضح ہوا کہ رمضان کی رات دن سے افضل ہے کیونکہ جبرائیل نبی کریم ﷺ کے پاس رات کو حاضر ہوتے اور قرآن پاک کا دور کرتے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ قرآن پاک کی تلاوت میں مقصد عظیم قرآن پاک سمجھنا اور تدبر کرنا ہے وہ

رات میں زیادہ حاصل ہوسکتا ہے کیونکہ دن میں انسان کو اور مشاغل بھی حاصل ہوتے ہیں اس لئے کامل توجہ اس طرف نہیں ہوسکتی۔ (ماخوذ از فتح الباری ج ۸ ص ۲۵۹ تا ص ۲۶۲)

دوسری مرتبہ قرآن پاک کا جمع کرنا:

" ان زيد ابن ثابت رضى الله عنه قال ارسل الى ابوبكر الصديق مقتل اهل اليمامة فاذا عمر بن الخطاب عنده ،قال ابوبكر رضى الله عنه ان عمر اتانى فقال ان القتل قد استحر يوم اليمامة بقراء القرآن وانى اخشى ان استحر القتل بالقراء بالمواطن فيذهب كثير من القرآن وانى ارى ان تامر بجمع القرآن ، قلت لعمر كيف نفعل شيأ لم يفعله رسول الله صلى الله عليه وسلم قال عمر هذا والله خير فلم يزل عمر يراجعنى حتى شرح الله صدرى لذلك ورأيت فى ذلك الذى رأى عمر قال زيد قال ابوبكر انك رجل شاب عاقل لا نتهمك وقد كنت تكتب الوحى رسول الله ﷺ فتتبع القرآن فاجمعه فو الله لو كلفونى نقل جبل من الجبال ماكان اثقل على مما امرنى به من جمع القرآن ،قلت كيف تفعلون شيأ لم يفعله رسول الله ﷺ قال هو والله خير لم يزال ابوبكر يراجعنى حتى شرح الله صدرى الذى شرح له صدر ابى بكر وعمر رضى الله عنه فتتبعت القرآن اجمعه من العسب واللخاف وصدور الرجال حتى وجدت آخر سورة التوبة مع ابى خزيمة الانصارى لم اجدها مع احد غير (لقد جاء كم رسول من انفسكم عزيز عليه ما عنتم) حتى خاتمة براء ة فكانت الصحف عند ابى بكر حتى توفاه الله ثم عنده عمر حياته ثم عند حفصة بنت عمر رضى الله عنه "

(بخاری باب جمع القرآن)

" حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اہل یمامہ کے شہید ہونے کے بعد میری طرف پیغام بھیجا۔(میں حاضر ہوا) تو آپ کے پاس حضرت عمر ابن خطاب رضی للہ عنہ بھی تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا بیشک عمر میرے پاس آئے ہیں انہوں نے کہا ہے کہ بیشک یمامہ کے دن بہت زیادہ حفاظ قرآن شہید ہو گئے مجھے یہ ڈر ہے کہ ایسا نہ ہو کہ لڑائیوں میں اسی

طرح حفاظ قرآن کی کثرت سے شہادت پر کہیں قرآن پاک کا کثیر حصہ ضائع ہی نہ ہوجائے۔ بیشک میری رائے یہ ہے کہ آپ قرآن پاک کو ایک جگہ جمع کرنے کا حکم نافذ فرمائیں۔ (حضرت ابوبکر کہتے ہین) میں نے عمر کو کہا ہم وہ کام کیسے کریں گے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا لیکن عمر میری طرف ہمیشہ رجوع کرتے رہے (یعنی قران پاک کو جمع کرنے کا مطالبہ کرتے رہے) یہاں تک اللہ تعالیٰ نے میرے سینہ کو بھی اس کام کے لئے کھول دیا۔ میرے رائے بھی عمر کی رائے کے مطابق ہوگئی۔ حضرت زید کہتے ہیں حضرت ابوبکر نے کہا تم ایک جوان اور عقل مند شخص ہو (اور تمہاری سستی اور عدم توجہ کی وجہ سے آیات کے چھوٹ جانے پر) ہمیں تم پر کوئی بدگمانی نہیں۔ اس لئے کہ تم رسول اللہ ﷺ کے کاتب وحی ہو اس لئے تم قرآن پاک میں تتبع (غوروفکر) کرو اور اسے جمع کردو۔ حضرت زید کہتے ہیں قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اگر مجھے یہ حضرات کسی پہاڑ کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کی تکلیف دیتے تو میں اسے بھاری نہ سمجھتا۔ جتنا کہ قرآن پاک کے جمع کرنے کا جو حکم دیا گیا وہ میں نے بھاری سمجھا۔ میں نے کہا تم وہ کام کیسے کرنا چاہتے ہو جو کام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ حضرت ابوبکر نے کہا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی یہ بہتر کلام ہے۔ ابوبکر ہمیشہ میری طرف رجوع کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرے سینہ کو اس کام کے لئے کھول دیا جس کے لئے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سینہ کو کھولا۔ میں نے قرآن پاک کو بڑے تدبر سے مختلف جگہوں سے جمع کرنا شروع کر دیا۔ جو کھجور کے پتوں، کھجور کی چھڑیوں، پتھروں (ہڈیوں لکڑیوں) وغیرہ پر لکھا ہوا تھا سورۃ توبہ کی آخری آیت "لقد جاء کم رسول" مجھے حضرت ابوخزیمہ انصاری سے ملی۔ اس طرح سورۃ توبہ کی تکمیل بھی ہوگئی مکمل قرآن پاک مجتمع شکل میں جب تیار ہوگیا تو وہ نسخہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس تاحیات رہا۔ آپ کے وصال کے بعد وہ نسخہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس زندگی بھر رہا۔ پھر ان کی وفات کے بعد وہ نسخہ ام المؤمنین حضرت حفصہ بنت عمر بن خطاب کے پاس محفوظ رہا"۔

مختصر وضاحت حدیث:

مسیلمہ کذاب نے اگرچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری ایام میں دعوی نبوت کر دیا تھا۔ لیکن آپ کی ظاہری حیات میں اسے قتل نہ کیا جا سکا۔ آپ کے وصال کے بعد کئی عرب "العیاذ

باللہ " مرتد ہوکر اس سے مل گئے تھے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں حضرت خالد ابن ولید رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت اس سے شدید لڑائی ہوئی آخر کار وہ قتل ہو کر جہنم میں پہنچ گیا۔ اس لڑائی میں صحابہ کرام بھی کثیر تعداد میں شہید ہوگئے۔

" والمراد باهل اليمامة هنا من قتل بها من الصحابة فی الوقعة مع مسليمة الكذاب "

" حدیث شریف میں جو لفظ اہل یمامہ کا استعمال ہے اس سے مراد وہ صحابہ کرام ہیں جو مسیلمہ کذاب کے ساتھ لڑائی میں شہید ہوئے"۔

" قد استحر " سے مراد بہت زیادہ حرارت، اصل میں حرارت کا استعمال ناپسندیدہ چیز کے لئے کیا جاتا تھا اور برودت کا لفظ پسندیدہ چیز کے لئے۔

جس طرح کہا جاتا " اسخن الله عينه واقر عينه " جس کے لئے بد دعاء کرنی مقصود ہوتی اس کے لئے کہا جاتا "اسخن الله عينه" اللہ اس کی آنکھ کو گرم کرے۔ اور جس کے لئے دعاء کرنی مقصود ہوتی تھی اس کے لئے کہا جاتا تھا " اقر الله عينه" اللہ اس کی آنکھ کو ٹھنڈا کرے۔ لیکن کبھی "استحر " صرف شدت اور کثرت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے حدیث شریف میں اسی معنی میں استعمال ہے۔

عسب " عین پر پیش ہے عسیب کی جمع ہے۔ "وهو جريد النخل " کھجور کی شاخ (اور پتے) مراد ہے۔

" اللخاف " لام کے نیچے زیر ہے۔ "هی الحجارة الرقاق " اس سے مراد پتلے پتلے پتھر ہیں۔

حدیث سے حاصل ہونے والے فوائد:

" وقد كان القرآن كله كتب فی عهد النبی صلى الله عليه وسلم لكن غير مجموع فی موضع واحد ولا مرتب السور "

" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہی مکمل قرآن پاک لکھا جا چکا تھا لیکن ایک

جگہ پر یعنی کتابی شکل میں جمع نہیں تھا۔اور نہ ہی سورتوں کو ترتیب وار لکھا گیا تھا''۔

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جیسے جیسے قرآن پاک نازل ہوتا رہا ایسے ایسے لکھا جاتا رہا۔البتہ پڑھنے اور یاد کرنے کی ترتیب آپ بیان فرماتے رہے جس ترتیب سے ہمارے پاس ہے اسی ترتیب سے صحابہ کرام نے یاد کیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں تمام قرآن پاک کو ایک جگہ جمع کر کے لکھا گیا۔سورتوں کو ترتیب وار لکھا گیا:

''وکان القرآن مکتو با فی الصحف لکن کانت متفرقة فجمعها ابوبکر فی مکان واحد''

قرآن پاک مختلف اشیاء میں لکھا ہوا تھا لیکن متفرق تھا اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک جگہ جمع کیا۔

ابتدائی طور پر حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ نے قرآن پاک کے جمع کرنے کو ناپسند سمجھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کام نہیں کیا۔لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مستقبل کے فوائد پر مطلع فرمایا تو ان دونوں نے اپنے قول سے رجوع کر لیا:

'' ودل ذلک علی ان فعل الرسول اذا تجرد عن القرائن وکذا ترکہ لایدل علی وجوب ولاتحریم''

یہاں سے یہ واضح ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ نے کوئی کام کیا یا چھوڑا اس کے وجوب اور تحریم پر جب قرائن موجود نہ ہوں تو اسے واجب یا حرام نہیں کہا جا سکتا۔

'' وقد فھم عمر ان ترک النبی ﷺ جمعہ لا دلالة فیہ علی المنع ''

'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سمجھا کہ نبی کریم ﷺ کا قرآن پاک کے جمع کرنے کو چھوڑنے سے ممانعت پر کوئی دلیل نہیں پائی گئی''۔

کاش کہ جھوٹے محبان صحابہ کو یہ بات سمجھ آ جائے ادھر دعویٰ کہ ہم حضرت عمر کے محبّ ہیں ادھر حضرت عمر کے دلائل سے انکار بات بات پر، یہ کام نبی کریم ﷺ نے نہیں کیا لہذا حرام ہے۔یہ جہالت نہیں تو اور کیا ہے یہ مخالفت صحابہ نہیں تو اور کیا ہے کیا میں ان لوگوں کی بات کو مانوں۔یا جلیل القدر صحابہ کرام حضرت ابوبکر،حضرت عمر،حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہم کے دلائل کو مانوں۔یقیناً دلائل صحابہ ہی سے مجھے پیار ہو سکتا ہے۔''اللھم انا نعوذ بک من الجاھلین''

اعتراض : حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ جب خود حافظ تھے تو آپ کے غور و فکر اور دوسروں سے پوچھنے اور سورۃ توبہ کی آخری آیت ابوخزیمہ انصاری سے حاصل کرنے کا کیا مطلب ہے؟

جواب: "وکان یفعل ذلک مبالغة فی الاحتیاط" آپ بہت ہی زیادہ احتیاط سے کام لے رہے تھے کہ کوئی آیت کوئی حرف چھوٹنے نہ پائے، ترتیب میں فرق نہ آئے اور تمام صحابہ کرام کی تائید حاصل رہے۔

(ماخوذ از فتح الباری ج ۸ از ص ۶۲۷ تا ۶۳۱)

فائدہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حکم سے جب قرآن پاک جمع ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ اس مجموعہ کا کوئی نام رکھ دو مختلف نام تجویز کئے گئے بعض آپ نے رد فرمائے لیکن حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا۔" **رأیت بالحبشة کتابا یدعونه المصحف فسموه به**" میں نے حبشہ میں ایک کتاب دیکھی جسے وہ مصحف کہتے تھے ان کے اس قول کے مطابق قرآن پاک کے نسخے کا نام بھی مصحف رکھ لیا گیا:

"وکان ابوبکر اول من جمع کتاب الله وسماه المصحف"

''حضرت ابوبکر پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو جمع کیا اور اس کا نام مصحف رکھا''۔ (الاتقان ج ۱ ص ۵۱)

تیسری مرتبہ قرآن پاک کا جمع کرنا:

"عن انس بن مالک ان حذیفة بن الیمان قدم علی عثمان وکان یغازی اهل الشام فی فتح ارمینیة واذر بیجان مع اهل العراق فافزع حذیفة اختلافهم فی القراء ة فقال حذیفة لعثمان یاامیر المؤمنین ادرک هذه الامة قبل ان یختلف فی الکتاب اختلاف الیهود والنصاری فارسل عثمان الی حفصة ان ارسلی الینا بالصحف ننسخها فی المصاحف ثم نردها الیک فارسلت بها حفصة الی عثمان فامر زید بن ثابت وعبد الله بن الزبیر، وسعید بن العاص وعبد الرحمن بن الحارث بن هشام فنسخوها فی المصاحف وقال عثمان للرهط القرشیین الثلاثة اذا اختلفتم انتم وزید بن ثابت فی شئی من القرآن فاکتبوه بلسان قریش

فانما نزل بلسانهم ففعلوا حتى اذا نسخوا الصحف في المصاحف رد عثمان الصحف الى حفصة فارسل الى كل افق بمصحف مما نسخوا وامر بما سواه من القرآن في كل صحيفة او مصحف ان يحرق "

(بخاری باب جمع القرآن)

'' حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ کہ حذیفہ ابن یمان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے جب کہ اہل شام اہل عراق سے مل کر ارمینیہ اور آذر بیجان کو فتح کرنے کے لئے جنگ کر رہے تھے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا اے امیر المؤمنین اس امت کو اللہ کی کتاب (قرآن پاک) میں اختلاف سے بچا لیں ایسا نہ ہو کہ ان میں اختلاف یہود ونصاریٰ کے اختلاف کی طرح ہو جائے ۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی طرف پیغام بھیجا کہ آپ ہماری طرف قرآن پاک کا نسخہ بھیج دیں (یعنی وہ نسخہ جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے لکھوایا تھا اور وہ آپ کے پاس موجود ہے) ہم اور نسخے لکھوا کر تمہیں وہ نسخہ واپس کر دیں گے۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے وہ نسخہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف بھیج دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے زید ابن ثابت، عبد اللہ ابن زبیر، سعید ابن عاص، عبد الرحمن ابن حارث ابن ھشام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ اس نسخہ کو دیکھ کر چند نسخے تیار کر لو انہوں نے مختلف نسخے تیار کرنے کا کام شروع کر دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تینوں قریشی حضرات کو کہا کہ اگر تمہارا قرآن پاک کے کسی مقام پر زید ابن ثابت سے اختلاف ہو جائے تو قریش کی زبان (لغت) کے مطابق لکھنا۔ کیونکہ قرآن قریش کی لغت کے مطابق نازل ہوا ہے۔ تو ان حضرات نے اسی نصیحت کے مطابق عمل کیا۔ جب مختلف نسخے تیار ہو گئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا نسخہ ان کے حوالے کر دیا۔ مختلف نسخے آپ نے مختلف علاقوں میں بھیج دیئے۔ باقی تمام نسخوں کو جلا دینے کا حکم دیا''۔

مقصد بیان: ابتدائی طور پر قرآن کی قراءت کرنے کی مختلف علاقوں کی مختلف عربی زبانوں میں اجازت تھی ۔ یعنی جس طرح اپنی پنجابی سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک ہی مقصد کو کئی الفاظ سے بیان کیا جاتا ہے اگر چہ ہوتی وہ پنجابی ہی ہے لیکن ہر علاقہ کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ اسی طرح شروع میں

قران پاک کے قریش کی لغت میں اترنے کے باوجود عربی زبان کے دوسرے الفاظ میں ادا کرنے کی اجازت تھی لیکن جب لوگوں نے اختلاف کرنا شروع کر دیا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تمام زبانوں کی ادائیگی ختم کر دی صرف قریش کی زبان کو جاری رکھا۔ کیونکہ قرآن پاک نازل ہی قریش کی زبان میں ہوا۔

" فلما انقض نزوله بوفاته صلی الله علیه وسلم الهم الله الخلفاء الراشدین ذلک وفاء لوعد الصادق بضمان حفظه علی هذه الامة المحمدیة زادها الله شرفا "

(فتح الباری ج ۸ ص ۶۲۹)

اللہ تعالیٰ نے چونکہ وعدہ فرمایا کہ قرآن پاک کی حفاظت میرے اپنے ذمہ ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾

" بیشک ہم نے ذکر (قرآن) کو نازل کیا اور بیشک ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔"

اسی وعدہ کے مطابق جب نبی کریم ﷺ کا وصال ہو گیا قرآن پاک کا نازل ہونا ختم ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے خلفاء راشدین میں سے حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے دل میں القاء کیا کہ قران پاک پڑھنے کی ترتیب پر ایک جگہ جمع کر کے اسے کتابی شکل دے دی جائے۔

پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دل میں القاء کیا کہ صرف ایک لغتِ قریش کو جاری رکھا جائے۔ اور باقی تمام لغات کو ختم کر دیا یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور منشاء کے مطابق ہی ہوا۔ اسی سے ایک اور بات سمجھ میں آ گئی کہ سات حروف کا اگر یہ معنی لیا جائے کہ سات لغات کی اجازت تھی تو وہ ختم ہو گئی اب سات حروف کا معنی سات صفات ہی صحیح رہے گا جو "دوسرا قول" کے عنوان سے پہلے بیان ہو چکا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا جبرائیل سے آخری دور بھی صرف لغت قریش کے مطابق ہی تھا۔ مسند احمد، ابوداؤ، طبری میں عبیدہ ابن عمر و سلمانی سے روایت بیان کی گئی ہے:

" ان الذی جمع علیه عثمان الناس یوافق العرضة الاخیرة "

" بیشک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جس لغت پر لوگوں کو جمع کیا یہ نبی کریم ﷺ کے آخری دور کے مطابق ہے۔ (فتح الباری ج ۸ ص ۶۲۱)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نسخوں کی تعداد:

اس میں اگر چہ اختلاف تو ہے کہ جو نسخے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تیار کروا کر مختلف علاقوں میں بھیجے وہ کتنے تھے بعض حضرات نے کہا وہ نسخے کل چار تھے جو باہر بھیجے گئے اور بعض نے کہا کل پانچ نسخے لکھوائے گئے اور بعض نے کہا کل سات نسخے لکھوائے گئے ایک مکہ میں بھیجا گیا۔ دوسرا شام میں ،تیسرا یمن میں ،چوتھا بحرین میں ،پانچواں بصرہ میں اور چھٹا کوفہ میں اور ساتواں مدینہ میں رکھا گیا۔لیکن راقم کے نزدیک تمام اقوال کا مطلب ایک ہے کوئی اختلاف نہیں اس لئے کہ کل پانچ نسخے لکھوائے گئے ان میں سے ایک مدینہ طیبہ میں رکھ لیا گیا اور چار باہر علاقوں میں بھیج دیئے گئے۔

چونکہ چار کی تعداد والوں نے یہ کہا "ارسل عثمان اربعة مصاحف " حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چار نسخے باہر بھیجے انہوں نے پانچویں نسخے کا انکار نہیں کیا جو مدینہ طیبہ میں تھا کیونکہ وہ باہر بھیجا نہیں گیا بلکہ "حبس بالمدينة واحدا "ایک نسخہ مدینہ طیبہ میں روک لیا گیا وہ کہیں نہیں بھیجا گیا۔

سات والوں کا قول بھی درست ہے کیونکہ اسناد صحیح سے حضرت ابراہیم نخعی سے ایک روایت آتی ہے آپ فرماتے ہیں:

" قال لی رجل من اهل الشام مصحفنا و مصحف اهل البصرة اضبط من مصحف اهل الكوفة "

" مجھے شام کے لوگوں میں سے ایک شخص نے بتایا کہ ہمارا مصحف (قرآن کا نسخہ) اور بصرہ والوں کا نسخہ کوفہ والے نسخہ سے ہی ضبط کیا گیا "۔

راقم کے نزدیک "اضبط" کا یہی معنی کیا جائے تو بہت سے الجھنوں سے نجات مل جاتی ہے اور تین قول ایک ہی نظر آئیں گے صرف انداز بیان مختلف ہوگا۔کسی نے ابتدائی طور پر لکھوانے کی تعداد کو دیکھ کر پانچ کہا اور کسی نے باہر علاقوں میں بھیجنے کی تعداد کو دیکھ کر چار بیان کیا۔اور کسی نے پہلے پانچ جو لکھوائے گئے ان کو دیکھ کر اور کوفہ کے نسخہ سے دو اور جو لکھوائے گئے ان تمام کی مجموعی تعداد کو دیکھتے

ہوئے سات بیان کر دیا۔ واللہ اعلم بالصواب

" وامر بما سواه من القرآن فی کل صحیفة او مصحف ان یحرق "

آپ نے جو نسخے لغت قریش کے مطابق اس نسخہ سے لکھوائے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لکھوایا تھا اور انکے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس وہ نسخہ محفوظ رہا پھر وہی نسخہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی حفاظت میں تھا وہی نسخہ ان سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حاصل کیا۔

یہ نسخے جب تیار ہو گئے تو مختلف علاقوں میں بھیج دیئے گئے باقی لغات میں جو نسخے موجود تھے ان کو جلا دینے کا حکم دیا اس مسئلہ کو علامہ حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی (المتوفی ۸۵۲ھ) نے تفصیل سے ذکر کیا آئے دن اختلافات حرام کے ارتکاب اور کفر کے فتاوی کے پیش نظر اس تفصیل کو ذکر کیا جا رہا ہے۔

" فی روایة الاکثر ان یخرق بالخاء المعجمة " اکثر حضرات نے نقطے والی خاء سے " ان یخرق " بیان کیا ہے جس کا معنی یہ ہے کہ آپ نے باقی تمام نسخوں کو پھاڑ دینے کا حکم دیا۔

" وللمروزی بالمهملة " لیکن مروزی کی روایت میں حاء بغیر نقطہ کا ہی ذکر ہے۔جس کا معنی یہ ہے کہ آپ نے باقی تمام نسخوں کو جلا دینے کا حکم دیا۔

" ورواه الاصیلی بالوجهین والمعجمة اثبت " اصیلی کی روایت میں دونوں طرح آیا ہوا ہے نقطہ کے ساتھ خاء اور بغیر نقطہ کے حاء البتہ نقطہ والی روایت کو زیادہ معتبر سمجھا گیا۔

اب مطلب یہ ہو گا کہ آپ نے باقی نسخوں کو ختم کر دینے کا حکم دیا خواہ وہ پھاڑ کر ختم کر دیئے جائیں یا جلا کر ختم کیے جائیں تاہم جلانے والی روایت کا ہی زیادہ اعتبار کیا گیا ہے۔

"وفی روایة الاسما عیلی ان تمحی او تحرق " اسماعیلی کی روایت میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ آپ نے باقی نسخوں کے الفاظ مٹا دینے یا جلا دینے کا حکم دیا۔

" وقد فی روایة شعیب عند ابن ابی داؤد والطبرانی وغیرهما ، وامرهم ان یحرقوا کل مصحف یخالف المصحف الذی ارسل به "

شعیب کی روایت ابو داؤد نے اور طبرانی نے اور دیگر حضرات نے بیان کی اس میں یہ ذکر گیا ہے کہ آپ نے جو مصحف بھی کسی علاقہ میں بھیجا۔ اس مصحف کے بغیر باقی تمام نسخوں کو جلا دینے کا حکم دیا یعنی جو لغت قریش کے مخالف ہو اسے جلا دیا جائے۔

" قال فذالک زمان حرقت المصاحف بالعراق بالنار "

'' اس زمانہ میں لغت قریش کے مخالف قران پاک کے تمام نسخے عراق میں آگ سے جلا دیئے گئے تھے''۔

" وفی روایة سوید بن غفلة علی قال لا تقولوا لعثمان فی احراق المصاحف الاخیرا "

'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قرآن پاک جلا دینے کے حکم کو سوائے اچھے الفاظ کے نہ ذکر کرو''۔

مطلب یہ تھا کہ آپ کی نیت میں خلوص تھا۔ مقصد قرآن پاک میں اختلاف کو ختم کرنا تھا۔ جب تک دوسرے تمام نسخے ختم نہ کئے جاتے اس وقت تک یہ اختلاف ختم نہیں ہوسکتا تھا۔

راقم کا خیال ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آنے والے حالات سے مطلع ہو کر فرمایا کہ میری محبت کے جھوٹے دعویدار کہیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شان میں گستاخی نہ کریں۔ اور یہ نہ کہیں کہ انہوں نے قرآن پاک کے نسخوں کو جلا دیا تھا لوگ ان کی بات کو نہ مانیں بلکہ میری طرف توجہ کریں۔

" وفی روایة بکیر بن الاشج فامر بجمع المصاحف فاحر قها ثم بث فی الاجناد التی کتب "

- بکیر ابن اشج کی روایت میں ہے کہ آپ نے تمام نسخے جمع کرنے کا حکم دیا پھر ان کو جلا دیا پھر وہ نسخے جو آپ نے لکھوائے تھے وہی باہر اطراف میں پھیلا دیئے۔

" ومن طریق مصعب بن سعد قال ادرکت الناس متوافرین حین حرق عثمان المصاحف فاعجبهم ذلک اوقال لم ینکر ذلک منهم احد "

مصعب ابن سعد سے مروی ہے کہ میں نے بہت سے لوگوں کو تعجب کرتے ہوئے پایا جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تمام نسخوں کو جلا دیا یا راوی نے یہ بیان کیا کہ کسی نے آپ کے اس فعل کا انکار نہیں کیا۔

دوسرے قول سے یہ پتہ چلا کہ تعجب بوجہ انکار نہیں تھا بلکہ آپ کے فعل کو قابل تحسین سمجھتے ہوئے تعجب کیا گیا تھا۔

" وفی روایة ابی قلابة فلما فرغ عثمان عن المصحف کتب الی اهل الامصار ،انی قد صنعت کذا و کذا ومحوت ماعندی فامحوا ما عندکم والمحوا عم من ان یکون بالغسل او التحریق "

ابو قلابہ کی روایت میں ہے جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قرآن پاک کے لکھوانے سے فارغ ہوئے تو آپ نے مختلف شہروں میں خطوط لکھے کہ میں نے لغت قریش کے مطابق قرآن پاک کے چند نسخے لکھوا لئے ہیں اور میرے پاس جو نسخہ قریش کی لغت کے خلاف تھا میں نے اسے مٹا دیا۔تمہارے پاس بھی جو نسخے ہیں ان کو مٹا دو محو کرنا(مٹا دینا) عام ہے چاہے تو ان کو دھو دیا جائے اور چاہے تو ان کو جلا دیا جائے۔

"واکثر الروایات صریح فی التحریق فهو الذی وقع "اکثر روایات میں واضح طور پر جلا دینے کا ہی ذکر ہے۔"ویحتمل وقوع کل منهما بحسب مارأی من کان بیده شئی من ذلک " یہ بھی احتمال ہے کہ آپ نے حکم فرمایا ہو کہ دوسرے نسخے ختم کر دیئے جائیں تو آپ کے اس حکم پر کسی نے جلا دیا ہو اور کسی نے پانی سے دھو دیا ہو۔

"وقد جزم عیاض بانهم فسطوها بالماء ثم احرقوها مبالغة فی اذهابها "

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے صرف اسی قول پر کامل وثوق کیا ہے کہ پہلے پانی سے تمام نسخے دھوئے گئے پھر ان کو جلا دیا گیا مقصد یہ تھا کہ وہ کامل طور پر ختم ہو جائیں:

" قال ابن بطال فی هذا الحدیث جواز تحریق الکتب التی فیها اسم الله بالنار وان ذلک اکرام لها وصون عن وطئها بالاقدام "

ابن بطال نے کہا ہے کہ اس حدیث سے یہ سمجھ آیا کہ وہ کتابیں جن میں اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی لکھا ہوا ہو ان کو آگ میں جلانا جائز ہے اس لئے کہ یہ عزت ہے مبارک ناموں کی اور ان کو قدموں سے روندے جانے کو محفوظ کرنا تھا۔

" وقد اخرج عبدالرزاق من طریق طاؤس انه کان یحرق الرسائل التی فیها البسملة اذا اجتمعت و کذا فعل عروة و کرهه ابراهیم "

مصنف عبد الرزاق میں ہے کہ حضرت طاؤس کے پاس جب رسالے جمع ہوجاتے جن میں "بسم اللہ" لکھی ہوتی تو آپ ان کوجلا دیتے تھے اور حضرت عروہ بھی اسی طرح کرتے تھے البتہ حضرت ابراہیم نخعی ناپسند سمجھتے تھے۔

"وقال ابن عطية الرواية بالحاء المهملة اصح" ابن عطیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں بغیر نقطہ کے حاوالی روایت زیادہ صحیح ہے یعنی یہی صحیح ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تمام نسخے جلا دینے کا حکم دیا۔

"وهذا الحكم هو الذى وقع فى ذلك الوقت واما الآن فالغسل اولى لما دعت الحاجة الى ازالته"

یہ وہ حکم ہے جو اس وقت واقع ہوا لیکن اب اگر قرآن پاک کے الفاظ کو زائل کرنا مقصود ہو تو دھودینا زیادہ بہتر ہے۔ (فتح الباری ج ۸ ص ۲۳۷ تا ۲۳۸)

"اذا انخرق القرآن العزيز وبليت الاوراق يدفن فى اللحد او يحرق ويلقى رماده فى البحر كما ثبت ان ذوالنورين احرق الصحائف"

(حاشیہ ترمذی ۳ باب ماجاء قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم اللحد لنا والشق لغیرنا)

جب قرآن پاک پھٹ جائے اور اوراق بوسیدہ ہوجائیں تو ان کو لحد (قبر کی سامی) میں دفن کردیا جائے۔ یا ان کوجلا کر ان کی راکھ دریا میں بہادی جائے جیسا کہ حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے قرآن پاک کے نسخوں کوجلا دینے کے حکم سے ثابت ہے۔

"المصحف اذا صار خلقا لا يقرأ منه ويخاف ان يضيع يجعل فى خرقة طاهرة ويدفن ودفنه اولى من وضعه موضعا يخاف ان يقع عليه النجاسة او نحو ذلك ويلحد له لانه لوشق ودفن يحتاج الى اهالة التراب عليه وفى ذلك نوع تحقير الا اذا جعل فوقه سقف بحيث لايصل التراب اليه فهو حسن ايضا كذا فى الغرائب المصحف اذاصار خلقاو تعذرت القراء ة منه لا يحرق بالنار اشاراليه شيبانى الى هذا فى السير الكبير وبه نأخذ كذا فى الذخيرة"

"قرآن پاک جب پرانا ہوجائے اس سے پڑھنے کا مقصد حاصل نہ ہو اور یہ خوف ہو کہ یہ ضائع ہوجائے گا تو اسے کسی پاک کپڑے میں لپیٹ کر دفن کردیا جائے ان کو

اسی طرح رکھے رہنے سے دفن کرنا بہتر ہے کیونکہ ان بوسیدہ اوراق پر نجاست کے واقع ہونا کا خطرہ ہے پاؤں کے نیچے روندنے جانے کا خطرہ ہے۔البتہ ان کو دفن کرنے کے لئے بھی قبر کی طرح گڑھا کھودا جائے ایک طرف لحد (بغلی قبر، یا قبر کی سامی کہا جاتا ہے) بنائی جائے تا کہ مٹی براہ راست ان اوراق پر نہ پڑے قبر بھی شق (چیروں قبر، درمیانی جگہ میں مردہ کے لئے جگہ بنانا) نہ بنائی جائے کیونکہ اس میں مٹی براہ راست بوسید اوراق پر پڑے گی۔اس میں بھی تحقیر ہے ہاں البتہ اگر ان پر چھت بنادی جائے (جس طرح مردہ شخص پر پتھروں وغیرہ کی چھت بناتے ہیں) پھر اس پر مٹی ڈالی جائے تو بہتر ہے۔قرآن پاک جب بوسیدہ ہوجائے۔اور پڑھنا متعذر ہوجائے تو اسے آگ میں نہ جلایا جائے۔امام محمد ابن حسن شیبانی رحمہ اللہ نے سیر کبیر میں اسی طرف اشارہ کیا ہے ہم بھی اسی پر عمل کرتے ہیں ذخیرہ میں اسی طرح مذکور ہے"۔

(عالمگیری ج ۵ ص ۳۲۳)

راقم کی علماء کرام کو دعوتِ فکر:

علماء کرام کی خدمت میں بصد ادب واحترام عرض ہے کہ وہ اس سے ہٹ کر کہ فلاں نے یہ لکھا ہے لہذا میں نے اس کی مخالفت ضرور کرنی ہے، میرا دل یہ کہتا ہے لہذا میں نے اس کے خلاف کو حرام کہنا ہے، میرے جیسا کوئی علامہ نہیں فلاں کو کیا پتہ ہے، وہ تو جاہل ہے، ان چیزوں سے ہٹ کر سوچیں اور بتائیں کیا راقم کا موقف درست ہے یا غلط پہلے ان چند چیزوں کو مد نظر رکھیں پھر راقم اپنا موقف بیان کرے گا اسی کی طرف دعوتِ فکر ہے۔

(۱) علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی وفات ۸۵۲ھ میں ہے۔اس وقت اختلاف ضد کی وجہ سے نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ صرف تحقیقی اختلاف ہوتا تھا۔

(۲) فتح الباری سے تفصیلی بحث کی کہ سلف صالحین میں سے بعض نے بوسیدہ اوراق کو جلانا پسند کیا اور بعض نے ناپسند۔

(۳) جواز اور عدم اولی کا جمع ہونا کوئی محال نہیں یہ ہوسکتا ہے کہ ایک کام جائز ہو لیکن بہتر نہ ہو۔

(۴) یہ کوئی ضروری نہیں کہ جو کام اولی (بہتر) نہیں وہ جائز بھی نہیں۔ ناجائز ہونا اور ہے عدم اولی (بہتر نہ ہونا) اور ہے۔

(۵) نیت کے فرق سے احکام بدل جاتے ہیں مسجد کو کوئی شہید کر دے کہ یہاں سڑک ہونی چاہئے مسجد کیوں ہے یہاں نمازیوں کو دیکھ کر میرا دل جلتا ہے کہ یہ نماز کیوں ادا کرتے ہیں۔ نمازیوں کی کثرت سے میرے آقا امریکی صدر ناراض ہوتے ہیں۔ لہذا مسجد کو گرادو ایسا بیہودہ شخص مسجد کی توہین کر رہا ہے۔ اور اگر مسجد کو اس لئے شہید کر دیا جائے کہ دوبارہ اسی جگہ پر خوبصورت بنائیں گے، کشادہ بنائیں گے، یہی مسجد کی تعظیم ہے۔

" وضع المصحف تحت رأسه فی السفر للحفظ لابأس به وبغیر الحفظ یکره کذا فی خزانة الفتاوی "

سفر میں چوروں کے خوف یا گر جانے کے خوف کے پیش نظر قرآن پاک کے نسخہ کو حفاظت کے لئے سر کے نیچے رکھنا جائز ہے اور حفاظت کی نیت نہ ہو صرف تکیہ بنانا مقصود ہو تو ناجائز ہوگا۔

(عالمگیر ج۵ ص ۳۲۲)

" رجل وضع رجله علی المصحف ان کان علی وجه الاستخفاف یکفر والافلا کذا فی الغرائب "

اگر کوئی شخص قرآن پاک کو گھٹیا سمجھ کر (معاذ اللہ) اس پر پاؤں رکھے تو وہ کافر ہو جائے گا۔ اگر قران پاک کو گھٹیا تو نہیں سمجھا لیکن پاؤں پھر بھی اس پر رکھ دیا تو وہ کافر نہیں ہوا بلکہ صرف گنہگار ہوگا۔

(۶) پہلے زمانہ میں قرآن پاک ہاتھ سے لکھا جاتا تھا اسے پانی سے مٹانا آسان تھا۔ اور قرآن پاک کے نسخے بہت کم مقدار میں ملتے تھے اب پریس کی وجہ سے ہر مسجد میں سینکڑوں کی تعداد میں قرآن پاک نظر آتے ہیں۔

(۷) شہری آبادی میں دفن کے لئے زمین کا ملنا بہت مشکل ہے۔ ہر شہر میں کوئی بڑا دریا نہیں کہ قرآن پاک کے بوسیدہ اوراق کو دریا میں ڈال دیا جائے۔

اس تمہید کے بعد راقم کا موقف یہ ہے کہ اگر قرآن پاک کے بوسیدہ اوراق کے دفن کے لئے

زمین مل جائے تو سب سے بہتر دفن کرنا ہی ہے کوئی بڑا دریا ہو اور اوراق کو بوری وغیرہ میں ڈال کر ان میں کوئی پتھر بھی ڈال دیا جائے تا کہ وہ بوری سطح زمین پر رہے۔اس طرح دریا میں ڈال دینا بھی بہتر نظر آتا ہے۔

اگر کوئی اور صورت نہ ہو تو اس نیت سے کہ قرآن پاک کے اوراق کی بے حرمتی ہو رہی ہے پاؤں کے نیچے آرہے ہیں۔بکھرے پڑے ہیں پیٹھ آرہی ہے جن بوریوں اور تھیلیوں میں ہیں ان کے پیچھے لوگ اپنے جوتے بھی رکھ لیتے ہیں۔اس طرح کی بے حرمتیوں سے بچانے کے لئے اگر کوئی شخص قرآن پاک کے اوراق کو جلا کر راکھ کر دفن کر دے یا کسی دریا میں بہا دے تو جائز ہے۔راقم خود جلانے پر عمل کرنے سے ڈرتا رہتا ہے دل نہیں مانتا جہلا کے ہنگاموں کا ڈر، جاہل اور مولویوں کے خلاف ہونے اور پولیس کا ڈر بھی ذہن پر سوار رہتا ہے۔لیکن عجیب مشکل یہ ہے کہ جس مسجد میں امام وخطیب ہوں وہ بہت چھوٹی سی ہے۔اوراق سے بھری پڑی ہے کبھی کبھی کوئی دوست بوسیدہ اوراق کو لے جاتے رہے۔راول ڈیم میں بھی دو تین مرتبہ اوراق کو ڈالا۔لیکن اب اس پر پابندی لگادی گئی ایک مرتبہ راول ڈیم کے بھر جانے اور کھولے جانے سے ہمارے ڈالے ہوئے اوراق دریائے سواں میں پہنچ گئے جہاں نالہ لئی سواں سے ملتا ہے وہاں کنارے پر لگ گئے ان اوراق میں مسجد میں پڑھنے والے بچوں کا ایک رجسٹر حاضری تھا جس پر'' مسجد غوثیہ F 6.1 '' اسلام آباد تحریر تھا۔کسی منچلے نے ہمارے خلاف مقدمہ دائر کرا دیا۔اخبار میں دیکھا دعاء کی اے اللہ تعالیٰ شر سے بچا ہم نے تو اوراق راول ڈیم میں ڈالے تھے۔رب تعالیٰ نے دعاء کو قبول کیا شائد کوئی تھانیدار نیک تھا اس نے ہمیں مجرم نہ سمجھتے ہوئے بغیر بلانے کے معاف کر دیا۔

راقم نے اپنا موقف بیان کر دیا ہے۔ہوسکتا ہے کوئی اتفاق کرے گا کوئی مخالفت لیکن خدا را مخالفت برائے مخالفت سے ہٹ کر کچھ سوچیں آئے دن اخبارات میں یہ شائع کرانا فلاں جگہ پر قرآن جلا دیئے گئے لوگوں کو اشتعال دلانا کون سا دینی کام ہے۔ہاں البتہ قرآن پاک کے بوسید اوراق کو ادب واحترام سے کسی گتہ اور کاغذ بنانے والی فیکٹری میں پہنچا دیا جائے ان سے گتہ یا نیا کاغذ بن جائے تو یہ بھی ایک بہتر حل نکل سکتا ہے۔

صحابہ کرام میں حفاظ:

صحابہ کرام میں حفاظ کی تعداد بہت زیادہ تھی علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا:

" قد قتل يوم اليمامة سبعون من القراء وقتل في عهد النبی ﷺ ببير معونة مثل هذا العدد "

یمامہ کی جنگ میں شہید ہونے والے صحابہ کرام میں ستر حفاظ کرام تھے۔اسی تعداد کے مطابق حفاظ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں بئر معونہ پر شہید ہوئے۔

البتہ زیادہ مشہور حفاظ سات تھے ۔حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت زید ابن ثابت، حضرت ابی ابن کعب، حضرت عبداللہ ابن مسعود، حضرت ابو الدرد اور حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہم تھے ۔

(الاتقان ج ۲ ص ۶۰ م ۶۱)

اعتراض: مشہور تو یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں صرف چار حفاظ تھے اس پر خود نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے عبداللہ ابن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

" سمعت النبی ﷺ يقول خذوا القرآن من اربعة من عبد الله بن مسعود وسالم ومعاذ وابی بن كعب "

(بخاری باب القراء من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا قرآن چار حضرات سے حاصل کرو وہ یہ ہیں۔عبداللہ ابن مسعود، سالم، معاذ اور ابی ابن کعب رضی اللہ عنہم۔

جواب: عوام میں جو یہ مشہور ہے کہ صحابہ کرام میں یہی چار حفاظ تھے یا یہ مشہور ہے کہ یہ چار پہلے حفظ کرنیوالے تھے۔یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ان چار کا ذکر اس لئے کیا گیا تھا کہ یہ عام طور پر دوسروں کو محبت سے پڑھاتے تھے اور حفظ میں ماہر بھی تھے۔اور یہ سب نبی کریم ﷺ کے بعد بھی زندہ رہے۔شائد اس طرف بھی اشارہ ہو کہ ان حضرات سے لوگ دیر تک فائدہ حاصل کر سکیں گے۔کیونکہ ان میں سے سالم یمامہ کی جنگ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں شہید ہوئے۔اور معاذ خلافتِ عمر (رضی اللہ عنہما) میں فوت ہوئے۔ابی ابن کعب اور ابن مسعود خلافتِ عثمان (رضی اللہ عنہم) میں فوت ہوئے۔"ولا يلزم من ذالک ان لايكون احد فی ذلک الوقت شاركهم فی

حفظ القرآن" حدیث پاک سے یہ لازم نہیں آ رہا کہ اس وقت ان کے ساتھ کوئی اور حفظِ قرآن میں شریک نہیں تھا۔ یعنی یہ کہنا غلط ہے کہ اس وقت ان چار کے بغیر اور حافظ ہی نہیں تھا۔ "بل کان الذین یحفظون مثل الذین حفظوہ وازید منہم جماعۃ من الصحابۃ" بلکہ بہت تعداد میں صحابہ کرام کی ایک جماعت حفاظ کی تھی۔ ان جیسے یا ان سے بھی زیادہ ماہر کئی اور حفاظ موجود تھے۔

(فتح الباری ج ۸ ص ۲۲۲)

اعتراض: تم نے یہ بیان کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی زمانہ میں کثیر صحابہ کرام حفاظ تھے تو ان دو حدیثوں کا کیا مطلب ہے۔

(۱) حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "حتی وجدت آخر سورۃ التوبۃ مع ابی خزیمۃ الانصاری لم اجدھا مع احد غیرہ لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم" (بخاری باب جمع القرآن)

(۲) حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

" فقدت آیۃ من الاحزاب حین نسخنا المصحف قد کنت اسمع رسول اللہ ﷺ یقرأ بھا فالتمسناھا فوجدنا ھا مع خزیمۃ بن ثابت الانصاری من المؤمنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ فالحقنا ھا فی سورتھا فی المصحف "

(بخاری باب جمع القرآن)

"میں نے سورۃ احزاب کی ایک آیت کو نہ پایا جب ہم قران پاک کو منتقل کر رہے تھے (یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں) جو میں رسول اللہ ﷺ سے پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا ہم نے اسے حاصل کرنے کی کوشش کی تو وہ ہمیں خزیمہ ابن ثابت انصاری سے حاصل ہوئی۔ وہ آیت یہ ہے "من المؤمنین رجال صدقوا ماعاھدوا اللہ علیہ" تو ہم نے اسے قرآن پاک کے نسخہ کی سورۃ میں ملا دیا"۔

ان دو حدیثوں سے تو پتہ چلا کہ صحابہ کرام میں زیادہ حافظ نہیں تھے۔ ورنہ یہ آیات اور صحابہ سے بھی مل جاتیں۔ اور ایک عجیب الجھن یہ پیدا ہو رہی ہے۔ کہ پہلا نسخہ جو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا یہ وہی تھا۔ جو حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مطالبہ پر تیار کیا تھا اگر اسی نسخہ میں سورۃ احزاب کی آیت نہیں تھی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تقریباً بارہ

سال تک قرآن پاک میں ایک آیت شامل نہ ہوسکی۔

جواب: اگرچہ کچھ ذکر پہلے ہوچکا ہے۔تاہم تفصیلی طور پر جواب کو دیکھئے اور سمجھئے کہ قرآن پاک کا محافظ تو رب تعالیٰ ہے اس میں کوئی نقص رہنا ممکن ہی نہیں ۔ورنہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں فرق لازم آئے گا۔البتہ اس قسم کے اعتراضات کا سبب علم کی کمی ہوسکتا ہے۔احادیث کو صحیح نہ سمجھنا صرف ظاہری معانی کو دیکھنا اس قسم کے خدشات کا سبب بنتا ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

" **انا نحن نزلنا الذکر و انا له لحافظون**" ہم نے ہی ذکر (قرآن) نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

(۲) " **فان القرآن مکتوب فی اللوح المحفوظ علی النحو الذی ہو فی مصاحفنا الآن** "

بیشک قرآن پاک لوح محفوظ میں اسی ترتیب سے لکھا ہوا جو ترتیب ہمارے پاس موجود قرآن پاک کے نسخوں کی ہے۔ (خازن ج ۱ ص ۸)

" **فان القران مکتوب فی اللوح المحفوظ علی هذا الترتیب انزله الله جملة الی السماء الدنیا**" (الاتقان ج ۱ ص ۲۱)

بیشک قرآن پاک لوح محفوظ پر اسی ترتیب سے ہے جس ترتیب پر ایک مرتبہ مکمل قرآن آسمان دنیا پر اترا (وہی ترتیب ہمارے پاس ہے)۔

(۳) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر اور حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہما کو حکم دیا " **اقعدا علی باب المسجد فمن جاء کما بشاهدین علی شئی من کتاب الله فاکتباه** " تم دونوں مسجد کے دروازے پر بیٹھ جاؤ جب تمہارے پاس کوئی شخص کتاب اللہ سے (لکھی ہوئی آیات) اس طرح لائے جس طرح گواہ بڑے وثوق سے گواہی دیتے ہیں تو تم اسے لکھ لو۔اس حکم کی وجہ کیا تھی؟ اگرچہ اس میں کئی وجوہ بیان کی گئی ہیں لیکن سب سے بڑی وجہ یہ تھی ۔

" **وکان عرضهم ان لا یکتب الامن عین ماکتب بین یدی النبی ﷺ لا من مجرد الحفظ** " (فتح الباری ج ۸ ص ۶۳۱)

ان کی غرض یہ تھی کہ تمام قرآن پاک لکھا ہوا آنکھوں سے دیکھ کر لکھو صرف اپنے حافظہ پر اعتبار

نہ کرنا کہیں کوئی بھول نہ جائے کیونکہ اصل وجہ اس کی یہ تھی۔

" وقد کان القرآن کلہ کتب فی عہد النبی ﷺ لکن غیر مجموع فی موضع واحد ولامرتب السور" (فتح الباری ج ۸ ص ۶۲۹)

کہ تمام قرآن پاک نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں لکھا گیا تھا۔لیکن وہ نازل ہونے کی جو ترتیب تھی اسی طرح مختلف اشیاء پرلکھا گیا تھا مجموعی طور پر وہ کسی ترتیب پر نہ تھا۔جب تمام قرآن پاک لکھ ہوا تھا تو اسے جمع کرتے وقت اور ترتیب دیتے وقت آنکھوں سے دیکھنا ضروری تھا یہی عقل اور ایمان کا تقاضا تھا۔

(۴) " قام عمر فقال من کان تلقی من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شیا من القرآن فیأت بہ وکانوا یکتبون ذلک فی الصحف والالواح والعسب قال وکان لا یقبل من احد شیأ حتی یشہد شاھدان وھذا یدل علی ان زیدا کان لا یکتفی بمجرد وجدانہ مکتوبا حتی یشہد بہ من تلقاہ سماعا مع کون زید کان یحفظہ وکان یفعل ذلک مبالغۃ فی الاحتیاط " (فتح الباری ج۸ ص ۶۳۱

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوگئے (آپ کو جو بھی ملتا اسے) کہتے کہ کسی کے پاس رسول اللہ ﷺ سے حاصل کیا ہوا قرآن کا کوئی حصہ ہے تو وہ لے آئے۔لوگ کاغذ کے صحیفے، تختیاں، کھجور کی (پتوں والی) چھڑیاں لا رہے تھے۔پھر آپ بھی دو گواہوں کی گواہی کے بعد قبول کرتے کہ ہاں واقعی یہ قرآن پاک کا حصہ رسول اللہ ﷺ نے خود لکھوایا تھا یہ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ بیشک زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ صرف لکھے ہوئے کو دیکھ کر ہی قبول نہیں کر رہے تھے بلکہ اس پر گواہیاں بھی طلب کر رہے تھے کہ ہاں واقعی تم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا تھا۔ یا یہ لکھا ہوا حاصل کیا تھا۔یہ سب کچھ احتیاط کے پیش نظر کیا جارہا تھا ورنہ حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ بہت عظیم ماہر حافظ تھے۔

خلاصہ جواب: اگرچہ صحابہ کرام میں کثیر تعداد میں حفاظ موجود تھے جمع کرنے والے حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ خود بھی عظیم ماہر حافظ تھے۔لیکن فیصلہ یہ کیا گیا تھا کہ قرآن پاک جمع کرتے وقت حفاظ کے سینوں سے بھی حاصل کیا جائے۔اسی پر بھی گواہی طلب کی جائے کہ ہاں واقعی یہ نبی کریم ﷺ سے سنا گیا۔اسی طرح صرف حفاظ کے حافظے پر اعتبار نہ کیا جائے بلکہ لکھا ہوا بھی

دیکھا جائے کیونکہ تمام قرآن پاک نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں مکمل ہو چکا تھا لیکن مختلف حصے مختلف لوگوں کے پاس تھے ان کو جمع کرنا مقصود تھا۔اس پر بھی گواہی طلب کی جا رہی تھی کہ ہاں یہ وہی تحریر ہے جو نبی کریم ﷺ کے حکم سے معرض وجود میں آئی تھی ۔پھر تمام حفاظ سے اس کی تائید کرائی جا رہی تھی۔اس طرح قرآن پاک کے جمع ہونے میں صحابہ کرام کا اتفاق تھا۔یہ قرآن پاک کی ترتیب اجماع امت سے حاصل ہے۔لوح محفوظ کی تریب کے مطابق ہے رسول اللہ ﷺ نے خود حفاظ کو ترتیب سے یاد کرایا۔ہم تک تواتر سے پہنچا بلا ریب ہے رب تعالیٰ اس کا خود محافظ ہے نہ رب تعالیٰ کی حفاظت میں کمی آ سکتی ہے اور نہ ہی قرآن میں کوئی کمی آئی اور نہ آئے گی ۔تا قیامت قرآن پاک مکمل موجود رہے گا۔یہ بھی دنیاوی نسخوں کی بات ہے۔ورنہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔اللہ تعالیٰ کی صفات کی کوئی انتہا نہیں اس لئے قرآن پاک نہ ختم ہونے والا کلام ہے۔اس کی انتہا آئی ہی نہیں۔

آیئے اصل مقصد کی طرف:

معترض نے جو پہلی حدیث سے اعتراض کیا ہے کہ سورۃ توبہ کی آخری آیات صرف ابوخزیمہ انصاری سے حاصل ہوئیں کسی اور سے حاصل نہ ہوئیں ۔تو پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرام میں زیادہ حفاظ نہیں تھے اور قرآن پاک کا ثبوت تواتر سے نہیں آیئے غور کریں کہ شارحینؒ نے اس حدیث کی وضاحت میں ان اعتراضات کے جواب پہلے ہی کیسے خوب انداز پر پیش کر دیئے ہیں۔

" لم اجدها مع احد غیرہ ای مکتوبة لما تقدم من انه کان لا یکتفی بالحفظ دون الکتابة ولا یلزم من عدم وجدانه ایاها حینئذ ان لاتکون تواترت عند من لم یتلقها من النبی ﷺ وانما کان زید یطلب التثبت عمن تلقاها بغیر واسطة "

(فتح الباری ج۸ ص ۶۳۲)

حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا کہ مجھے سورۃ توبہ کی آخری آیات سوائے ابوخزیمہ انصاری کے کسی اور سے حاصل نہ ہوئیں اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی اور سے لکھی ہوئی یہ آیات نہ ملیں پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ صرف حافظہ پر اعتبار نہیں کیا جا رہا تھا بلکہ لکھی ہوئی آیات کو بھی آنکھوں سے دیکھا جا رہا تھا۔لکھی ہوئی آیت کا صرف ایک صحابی سے حاصل ہونا تواتر کے منافی نہیں اس لئے کہ

اسے کثیر تعداد میں حفاظ کی تائید حاصل تھی۔حضرت زید ابن ثابت بہت زیادہ احتیاط سے کام لے رہے تھے۔آپ صرف ان حضرات سے تحریر وصول کر رہے تھے یا صرف ان حفاظ سے آیات سن رہے تھے جنہوں نے خود براہ راست بغیر کسی واسطہ کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی تھیں۔

دوسری حدیث جو معترض نے پیش کی کہ سورۃ احزاب کی آیت "من المؤمنین رجال" ہم نے خزیمہ ابن ثابت انصاری سے پائی۔اس کے متعلق ایک احتمال تو یہ ہے۔

" وقع فی روایة ابراهیم بن اسماعیل بن مجمع عن ابن شهاب انفقده ایاها انما کان فی خلافة ابی بکر حتی وجدها مع خزیمه ابن ثابت وجزم ابن کثیر بما وقع فی روایة ابن مجمع "

'' ابراہیم ابن اسمٰعیل ابن مجمع نے ابن شہاب سے روایت کی ہے کہ سورۃ احزاب کی آیت کا گم پانا اور پھر خزیمہ ابن ثابت انصاری سے ملنا یہ واقع حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جمع کرتے وقت در پیش آیا۔ابن کثیر نے بھی اسی ابن مجمع والی روایت پر کامل اعتماد کیا ہے کہ یہی صحیح ہے یہی باوثوق ہے''۔

اگر چہ علامہ ابن حجر عسقلانی اور علامہ بدر الدین ابو محمد بن احمد عینی رحمہما اللہ نے اس پر اعتماد کیا ہے کہ سورۃ احزاب کی آیت کے نہ پانے کا واقعہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں جمع کرنے کے وقت در پیش آیا۔کیونکہ "والصحیح ما فی الصحیح "صحیح وہ ہے جو صحیح بخاری میں پایا گیا ہے۔

(فتح الباری ج ۸ ص ۲۳۸ ، عمدة القاری المعروف بعینی ج ۲۰ ص ۱۹)

لیکن راقم کا جزم بھی علامہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے جزم کے مطابق ہی ہے کہ یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ کی بات ہے اور مراد بھی یہی ہے کہ یہ آیت لکھی ہوئی سوائے خزیمہ ابن ثابت انصاری سے کہیں نہ ملی۔

راقم نے ابن کثیر کے قول کو کیوں ترجیح دی۔اس لئے کہ حدیث پاک میں صراحۃً کوئی زمانہ بھی مذکور نہیں۔کیونکہ حدیث پاک یہ ہے۔

" قال ابن شهاب واخبرنی خارجة بن زید بن ثابت سمع زید بن ثابت قال فقدت آیة من الاحزاب حین نسخنا المصحف قد کنت اسمع رسول الله ﷺ یقرأ بها فالتمسناها فوجدناها مع خزیمة بن ثابت

الانصاری من المؤمنین رجال صدقوا ماعاهدوا اللہ علیه فالحقناها فی المصحف" (بخاری باب جمع القرآن)

"حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب ہم قرآن پاک کا نسخہ لکھ رہے تھے۔ تو میں نے سورۃ احزاب کی آیت "من المؤمنین" کوگم پایا حالانکہ میں رسول اللہ ﷺ سے سنا کرتا تھا ہم نے تلاش کی تو وہ آیۃ حضرت خزیمہ ابن ثابت انصاری سے مل گئی ہم نے اسے مصحف میں شامل کرلیا"۔

حدیث پاک میں ایک تو جمع کا صیغہ "نسخنا" سے وہم پڑھنا ہے دوسرا اسی صیغہ سے وہم پڑھنا کہ اس کا معنی تو منتقل کرنا ہے۔ لہذا اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ کے متعلق ہے۔

لیکن غور کرنے سے اور اپنے روز مرہ کے محاورات پر نظر کرنے سے روز روشن کی طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بیشک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جمع کے وقت حضرت زید ابن ثابت نے کہا ہوگا لیکن بات ماضی کی ہے کہ ہم نے جب پہلی مرتبہ جمع کیا تھا تو اس وقت سورۃ احزاب کی ایک آیت کہیں سے بھی لکھی ہوئی نہیں ملی البتہ خزیمہ ابن ثابت سے مل گئی۔

اگر علامہ عسقلانی اور عینی رحمۃ اللہ علیہما کی بات کو مان لیا جائے تو پھر جواب یہ ہوگا کہ یہ آیت حفاظ کے سینوں میں موجود تھی۔ پہلی مرتبہ جمع کرتے وقت اسے شامل بھی کرلیا گیا تھا۔ لیکن ہوسکتا ہے کہیں اس مصحف سے مٹ گئی ہو لیکن دلوں سے نہیں مٹی تھی حضرت زید ابن ثابت تو برملا کہہ رہے کہ میں وہ رسول اللہ ﷺ سے سنتا تھا۔

ایک علمی بحث:

سورۃ توبہ کی آخری آیات اور سورۃ احزاب کی آیت ایک ہی صحابی سے حاصل ہوئیں یا وہ علیحدہ علیحدہ شخص تھے؟ اس مسئلہ میں روایات مختلف ہیں ایک روایت عبد الرحمٰن ابن مہدی کی ابراہیم ابن سعد سے ہے۔ اس میں سورۃ توبہ کی آخری آیات کے متعلق ہے کہ وہ خزیمہ ابن ثابت سے ملیں ترمذی اور مسند احمد میں یہی ہے۔ ایک روایت شعیب زہری سے ہے جس میں یہ ہے کہ سورۃ توبہ کی آخری آیات خزیمہ

انصاری سے ملیں۔طبرانی نے مسند الشامیین میں جوروایت ابو الیمان کے واسطہ سے شعیب سے ذکر کی ہے اس میں خزیمہ ابن ثابت انصاری ذکر ہے ابن داؤد یونس ابن یزید کے واسطہ سے ابن شہاب نے بھی خزیمہ ابن ثابت انصاری ذکر کیا ہے ابراہیم ابن سعد نے روایت کی ہے کہ سورۃ توبہ کی آخری آیات ابو خزیمہ سے ملی ہیں۔

" والا رجح ان الذی وجد معه آخر معه آخر سورة التوبة ابو خزیمه بالكنية والذی وجد معه الآية من الاحزاب خزیمه "

زیادہ راجح قول یہی ہے کہ وہ صحابی جن سے سورۃ توبہ کی آخری آیات ملیں وہ ابوخزیمہ ہیں جوکنیت سے مشہور ہیں نام ان کا اوس ابن یزید ابن احرم ہے یا ان کا نام حارث بن خزیمہ ہے۔

لیکن وہ صحابی جن سے ''سورۃ احزاب'' کی آیت لکھی ہوئی ملی وہ حضرت خزیمہ ابن ثابت انصاری ہیں۔ یہ وہ خوش نصیب صحابی ہیں جن کی گواہی کو دو مردوں کی گواہی کے برابر ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ (ماخوذ از فتح الباری ج۸ص ۶۳۱،۶۳۲)

تاہم یہ بھی واضح ہے کہ بعض روایات کے مطابق سورۃ توبہ کی آخری آیات اور سورۃ احزاب کی آیت حضرت خزیمہ ابن ثابت انصاری سے ہی ملیں۔علامہ بدرالدین عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ " لا محذور فی کون کلیتهما مکتوبتين عنده دون غيره " (عینی شرح بخاری ج ۱۹ ص ۱۱۲)

کہ اس میں کوئی ممانعت نہیں کہ دونوں آیتیں ایک ہی صحابی خزیمہ ابن ثابت انصاری سے ملی ہوں کہ لکھی ہوئی ان کے پاس ہی ہوں کسی اور کے پاس نہ ہوں۔

فائدہ: حضرت خزیمہ ابن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کو دو شخصوں کی گواہی کے برابر گواہی دینے کا اعزاز کیوں ملا؟

"عن عمارة بن خزيمه ان عمه حدثه وهو من اصحاب النبی ﷺ ان النبی ﷺ ابتاع فرسا من اعرابی فاستبعه النبی ﷺ ليقضيه ثمن فرسه فاسرع رسول الله ﷺ المشی وابطأ الاعرابی فطفق رجال يعترضون الاعرابی فيسا ومونه بالفرس ولا يشعرون ان النبی ﷺ ابتاعه فنادی

الاعرابی رسول الله ﷺ فقال ان کنت مبتاعا هذا الفرس والا بعته فقام النبی ﷺ حین سمع نداء الاعرابی فقال او لیس قد ابتعته منک ؟ قال الاعرابی لا والله ما بعتکه فقال النبی ﷺ بلی قد ابتعته منک فطفق الاعرابی یقول هلم شهیدا فقال خزیمة بن ثابت انا اشهد انک قد بایعته فاقبل النبی ﷺ علی خزیمة فقال بم تشهد؟ فقال بتصدیقک یا رسول الله فجعل النبی ﷺ شهادة خزیمة بشهادة رجلین "

(ابو داود کتاب الشہادات)

" حضرت عمارہ ابن خزیمہ کہتے ہیں کہ میرے چچا نے حدیث بیان کی جو نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام میں سے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے ایک اعرابی سے گھوڑا خریدا۔آپ نے اسے پیچھے چلنے کے متعلق کہا تا کہ آپ اسے گھوڑے کی رقم ادا کریں۔رسول اللہ ﷺ جلدی جلدی (رقم کی ادائیگی کے لئے) چل رہے تھے اور اعرابی آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔اس اعرابی کو کوئی اور لوگ ملنے لگ گئے۔اور گھوڑے کا سودا کرنے لگے ان کو معلوم نہیں تھا کہ نبی کریم ﷺ نے اس سے گھوڑا خرید لیا ہے اعرابی نے رسول اللہ ﷺ کو ندا دی کیا تم نے یہ گھوڑا خریدا ہے؟ ورنہ میں اسے فروخت کردوں اعرابی کی ندا کو سن کر نبی کریم ﷺ کھڑے ہوئے اور فرمایا کیا میں نے تم سے یہ خرید نہیں لیا؟ اعرابی نے کہا قسم ہے اللہ تعالیٰ کہ میں نے تم پر یہ نہیں بیچا۔نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں میں نے تو تم سے خرید لیا ہے اعرابی کہنے لگا تم گواہ لاؤ خزیمہ ابن ثابت نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں بیشک تم نے یہ نبی کریم ﷺ پر بیچ دیا ہے۔نبی کریم ﷺ خزیمہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا تم نے کیسے گواہی دی؟ انہوں نے کہا آپ کی تصدیق کرتے ہوئے یا رسول اللہ تو نبی کریم ﷺ نے خزیمہ اکیلے کی گواہی دو شخصوں کے برابر کردی"۔

وضاحت حدیث: "فاستتبعه ، ای طلب منه ان یتبعه " یعنی آپ نے اس اعرابی کو اپنے پیچھے پیچھے چلنے کا ارشاد فرمایا۔

" فطفق ، ای اخذ " یعنی اور لوگوں نے اس اعرابی سے سودا کرنا شروع کر دیا۔

طبقات ابن سعد میں اور مرقاۃ شرح مشکوۃ میں اس حدیث سے کچھ الفاظ زائد بھی ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ ان سودا کرنے والوں میں سے بعض نے اعرابی کو زیادہ رقم دینے کے متعلق کہا اس رقم

سے جو نبی کریم ﷺ نے اس سے طے کی تھی۔ زیادہ ثمن کے ملنے کی پیشکش پر ہی اعرابی نے نبی کریم ﷺ کو پکار کر کہا کہ اگر تم خریدنا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ میں فروخت کرنے لگا ہوں۔ جب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں تو خرید چکا ہوں۔ تو اعرابی نے کہا میں نے ابھی تک فروخت نہیں کیا اعرابی کے یہ کہنے کا مقصد یہ تھا کہ اب دوبارہ بھاؤ طے ہونا چاہیئے تا کہ مجھے رقم زیادہ مل جائے۔

نبی کریم ﷺ نے جب یہ فرمایا کہ میں نے تو پہلے ہی خرید لیا ہے سودا طے ہو چکا ہے تو دوسرے خریدار جو بے خبری سے اس سے سودا کر رہے تھے ان میں کچھ مسلمان بھی تھے جنہوں نے اس اعرابی کو کہا" ویلک ان رسول اللہ ﷺ لم یکن لیقول الاحقا " تمہاری بربادی رسول اللہ ﷺ تو صرف حق بات ہی کہتے ہیں۔

لیکن خوش قسمت صحابی حضرت خزیمہ ابن ثابت نے بغیر کسی خوف اور تفکر کے کہا" انا اشھد " میں گواہی دیتا ہوں۔ کیونکہ وہ اعرابی گواہ پیش کرنے کا مطالبہ کر رہا تھا۔

نبی کریم ﷺ نے جب حضرت خزیمہ سے پوچھا کہ تم نے گواہی کیسے دی؟ جب کہ تم وہاں ہمارے سودے کے وقت موجود ہی نہیں تھے تو انہوں نے عرض کیا "بتصدیقک یا رسول اللہ " جب آپ نے فرما دیا ہے کہ میں نے تم سے خرید لیا ہے۔ تو مجھے معلوم ہے کہ آپ نے سچ فرمایا ہے لہذا میں نے آپ کی تصدیق کر دی۔

طبقات ابن سعد میں حضرت خزیمہ ابن ثابت کا جواب بڑے خوبصورت انداز میں ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے عرض کیا " انا اصدقک بخبر السماء ولا اصدقک بما تقول " میں آپ کی آسمانوں کی خبروں کو سچا مانتا ہوں۔ تو کیا وجہ تھی کہ آپ کے اس ارشاد کو سچا نہ مانتا جو آپ اعرابی کو فرما رہے تھے۔

مقصد عرض ان کا یہ تھا کہ یا رسول اللہ آپ فرماتے ہیں جنت ہے، جہنم ہے، فرشتے ہیں اور آپ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ ہے اور وہ وحدہ لاشریک لہ ہے تو میں کہتا ہوں آپ نے سچ کہا ہے میرا اس پر ایمان ہے میرے ایمان کا یہ بھی تقاضا تھا کہ میں نے بیشک آپ کے سودے کو دیکھا سنا

نہیں تھا۔لیکن آپ کی بات کو اعرابی سے کرتے ہوئے سنتے ہی میرے ایمان نے کہا خزیمہ گواہی دے کہ حضور سچ ارشاد فرما رہے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کو انعام سے نوازا بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ کرام کو یہ اعزاز حاصل نہ ہوسکا جو حضرت خزیمہ کو حاصل ہوا کہ ایک کی گواہی دو کے برابر ہے۔

(ماخوذ از عون المعبود ج ۱۰ ص ۲۷،۲۶)

تنبیہ: بعض احادیث مختلف انداز پر مروی ہیں۔یہی گواہی کا واقعہ نور الانوار میں اونٹنی خریدنے اور قیمت کے ادا کرنے کے اختلاف سے بیان کیا گیا ہے۔یقیناً ان کے سامنے بھی کوئی روایت ہوگی۔

قرآن پاک کے نام قرآن پاک سے:

قرآن پاک کے پچپن نام اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائے ہیں:

﴿ **کتاب اور مبین**،ارشاد باری تعالیٰ ہے "حم والکتاب المبین"

...... **قرآن اور کریم**،اللہ تعالیٰ نے فرمایا "انه لقرآن کریم"

...... **کلام**،رب قدوس نے فرمایا "حتی یسمع کلام الله"

...... **نور**،رب کائنات نے ذکر فرمایا "وانزلنا الیکم نور مبینا"

...... **هدی اور رحمة**،مالک الملک نے فرمایا "هدی ورحمة للمؤمنین"

...... **فرقان**،رب کریم نے فرمایا "نزل الفرقان علی عبده"

...... **شفا**،خالق کائنات نے ارشاد فرمایا "وننزل من القرآن ماهو شفاء"

...... **موعظة**،رب رحیم نے فرمایا "قد جاتکم موعظة من ربکم"

...... **ذکر اور مبارک**،ارشاد رب غفور ہے "وهذا ذکر مبارک انزلناه"

...... **الحکیم**،رب بصیر نے ارشاد فرمایا "تلک آیات الکتاب الحکیم"

...... **مهیمن**،رب رحمٰن نے فرمایا "مصدقا لما بین یدیه من الکتاب و مهیمنا علیه"

...... **حبل**،رب عزیز نے فرمایا "واعتصموا بحبل الله"

صراط مستقیم، رب رزاق نے فرمایا"وان هذا صراطی مستقیما"

قیم، رب ماجد نے فرمایا" قیما لینذر "

قول اور فصل، رب باسط نے فرمایا" انه لقول فصل"

نبأ عظیم، رب واسع نے فرمایا"عم یتساء لون عن النبا العظیم "

احسن الحدیث اور مثانی اور متشابه، واحد غفار نے ارشاد فرمایا:

" الله نزّل احسن الحدیث کتابا متشابها مثانی

تنزیل، رب العالمین نے فرمایا"وانه لتنزیل رب العلمین "

روح، رؤف رحیم نے فرمایا " اوحینا الیک روحا من امرنا"

وحی، ذات کبریا کاارشاد ہے "انما انذر کم بالوحی "

عربی، اللہ سمیع وعلیم کا ارشاد ہے" اناانزلناہ قرآناعربیا "

بصائر، رب محمد ﷺ نے فرمایا" هذا بصائر"

بیان، رب ذوالجلال نے فرمایا"هذا بیان للناس"

علم، مولائے کائنات نے فرمایا"من بعد ماجاء ک من العلم "

حق، خالق جن وانس نے فرمایا"ان هذا لهو القصص الحق"

هادی، خلاق ملائکہ نے ارشاد فرمایا" ان هذا القرآن یهدی للتی هی اقوم "

عجب، عالم الغیب والشهادة کا ارشاد گرامی ہے" قرآنا عجبا "

تذکرہ، ذوالقوۃ المتین کا ارشاد ہے "وانه لتذکرة"

العروۃ الوثقی، رب بے مثل نے فرمایا"فقد استمسک بالعروة الوثقی"

صدق، ذات بے مثال نے فرمایا"والذی جاء بالصدق"

عدل، لم یلد ذات نے فرمایا"وتمت کلمة ربک صدقاوعدلا"

امر، لم یولد ذات نے فرمایا "ذلک امر الله انزله الیکم "

منادی، سلامتی عطاء کرنے والے نے فرمایا" منادیا ینادی للایمان"

بشری، امن دینے والے نے کہا ؛ هدی وبشری"

......**مجید**، رب مجید نے فرمایا" بل هو قرآن مجید"

......**زبور**، رب حمید نے فرمایا"ولقد کتبنا فی الزبور"

......**بشیر ونذیر**، رب بشیر ونذیر نے فرمایا" کتاب فصلت آیاته قرآنا عربیا لقوم یعلمون بشیرا ونذیرا"

......**عزیز**، عزیز رحیم ذات نے ارشاد فرمایا" وانه لکتاب عزیز"

......**بلاغ**، سمیع وبصیر نے فرمایا" هذا بلاغ للناس"

......**قصص**، ذوالجلال والاکرام ذات نے فرمایا" احسن القصص"

......**صحف اور مکرمه اور مرفوعه اورمطهره**، ان چار ناموں کو ایک ہی آیت کریمہ میں ذکر فرمادیا" فی صحف مکرمة مرفوعة مطهرة "

قرآن کو قرآن کہنے کی وجہ:

بعض حضرات نے کہا کہ یہ اسم علم ہے اور اللہ تعالیٰ کے کلام سے خاص ہے بغیر ہمزہ کے ہے اس صورت میں " ق ر ا ن " ہوں گے اور وزن ہوگا "فعال" ابن کثیر اور امام شافعی رحمہ اللہ نے اسے ہی اختیار کیا ہے یعنی یہ اسی طرح نام ہے جس طرح توراۃ اور انجیل نام ہیں کسی لفظ سے مشتق نہیں۔ بعض حضرات نے کہا یہ مشتق ہے مشتق کہنے والے حضرات میں سے اشعری اس طرف ہیں کہ یہ مشتق ہے " قرنت الشی بالشی " (ایک چیز کا دوسری چیز سے ملنا) سے۔ اس صورت میں بھی ہمزہ نہیں ہوگا۔ بلکہ "فعال" کا وزن ہوگا چونکہ قرآن پاک میں بھی سورتیں ایک دوسری سے ملی ہوئی ہیں۔ آیتیں اور حروف ایک دوسرے سے متصل ہیں اس لئے کلام اللہ کا نام قران رکھا گیا۔

فراء نے کہا ہے کہ یہ مشتق ہے " قرائن " سے جو اصل میں " قراین " ہے۔ جمع ہے قرین کی چونکہ قران کی آیات بعض بعض کی تصدیق کرتی ہیں اور ایک دوسری کے مشابہ ہیں اس وجہ سے آیات قرائن ہوئیں یہی وجہ ہے قران نام رکھنے کی۔ لیکن خیال رہے کہ اس صورت میں بھی ہمزہ نہیں اور نون اصل ہے وزن " فعال " ہی ہے۔

زجاج نے کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ قرآن میں ہمزہ تو پایا گیا ہے البتہ کبھی تخفیف کے طور پر ہمزہ نہیں پڑھا جاتا۔ بلکہ ہمزہ کی حرکت نقل کر کے ماقبل (راء) کو دی اور ہمزہ کو حذف کر دیا۔

جن حضرات نے ہمزہ سے قرآن کہا ہے ان میں پھر مختلف قول ہیں۔ بعض حضرات نے کہا یہ مصدر ہے جیسے رجحان اور غفران مصدر ہیں۔ البتہ معنی مفعول والا ہو یعنی قرآن کو اس لئے قرآن کہا گیا کہ یہ مقرو پڑھا ہوا ہے کیونکہ جتنا قرآن پاک کو پڑھا جاتا ہے اتنا کسی کتاب کو نہیں پڑھا جاتا۔

کچھ اور حضرات نے کہا کہ یہ مشتق ہے " قرء " سے جس کا معنی ہے جمع کرنا، عام طور پر کہا جاتا ہے " قراء ت الماء فی الحوض " میں نے حوض میں پانی جمع کیا۔ اس معنی کے لحاظ سے قرآن کو قرآن کی وجہ یہ ہوگی کہ اسمیں تمام علوم جمع ہیں اور سورتیں بعض، بعض کے ساتھ جمع ہیں۔

راغب اصفہانی نے کہا " **لایقال لکل جمع القرآن ولا لجمع کل کلام قرآن** " ہر جمع ہونے والی اشیاء کو قرآن نہیں کہا جاتا اور ہر جمع ہونے والے کلام کو بھی قرآن نہیں کہا جاتا۔

" **قال وانما سمی قرآنا لکونه جمع ثمرات الکتب السالفة المنزلة وقیل لانه جمع انواع العلوم کلها** "

علامہ راغب نے کہا قران کو قرآن کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ پہلی آسمانی کتب کے تمام فوائد کا جامع ہے بلکہ بعض حضرات نے یہ بیان کیا کہ یہ تمام علوم کا جامع ہے۔

" قرء " کا ایک معنی نکالنا بھی ہے جس طرح کہا جاتا ہے "**ماقرأت الناقة سلا** " اونٹنی نے آج تک بچہ نہیں جنا (پیٹ سے بچہ نہیں نکالا) اس معنی کے لحاظ سے قرآن کا معنی ہوگا۔ نکالا ہوا یعنی پڑھنے والا اپنے منہ سے الفاظ کو نکالتا ہے۔ (ماخوذ از اتقان ص ۵۰، ۵۱)

خیال رہے کہ جتنے نام ذکر کئے ہیں تمام کی وجہ تسمیہ (نام رکھنے کی وجہ) کو علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے وضاحت سے بیان کیا لیکن اختصار کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے صرف قرآن کی وجہ تسمیہ کو ذکر کیا گیا ہے۔

سورۃ کو سورۃ کہنے کی وجہ:

یہ لفظ یا تو لیا ہوا ہے " **سور الطعام** " سے (اس میں ہمزہ ہے ہمزہ کو واؤ بنا کر سورۃ کہا گیا ہے) جس کا معنی ہے "**طعام کا بقیہ**" اس معنی کے لحاظ سے سورۃ کو اس لئے سورۃ کہا گیا ہے کہ

یہ قران پاک کا ایک قطعہ ہے یا اس کو بناء سے تشبیہ دی گئی ہے جس طرح وہ مختلف اینٹوں وغیرہ کے قطعات سے بنتی ہے۔اسی طرح مختلف سورتوں سے قرآن پاک بھی مرکب ہے۔

یا یہ لفظ " سو ر البلد " سے لیا ہوا ہے(اس میں واؤ ہے ہمزہ نہیں)اس کا معنی ہے شہر کا احاطہ کرتے والی دیوار،سورۃ بھی چونکہ آیات اور مضامین کا احاطہ کرتی ہے اس لئے اسے سورۃ کہا جاتا ہے۔

سورۃ بلند مکان بلند منزل کو بھی کہا جاتا ہے چونکہ اللہ کا کلام رفیع الشان ہے اس لئے اس کے ہر حصہ کو سورۃ کہا گیا ہے۔ نابغہ نے کہا:

ألم تر أن الله اعطاک سورة
تری کل ملک حولها یتذبذب

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں رفعت عطاء فرمائی ہے تم ہر بادشاہ کو اس کے ارد گرد پھرتا ہوا دیکھو گے۔

سورۃ کا معنی "چڑھنا" بھی ہے جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔" اذ تسوروا المحراب "جب وہ حجرہ کی دیواروں پر چڑھے چونکہ سورۃ میں بھی ترکیب پائی جاتی ہے اور پہلی سورۃ سے دوسری کی طرف جانا گویا کہ بلندی پر چڑھنا ہے۔

☆ سورۃ میں کم از کم تین آیتوں کا پایا جانا ضروری ہے۔

☆ کسی سورۃ کا نام اس میں ذکر کئے گئے مضامین میں سے کسی ایک مضمون کی مناسبت سے ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ بعض سورتوں کا ایک ایک نام ہے اور بعض کے دو دو نام ہیں اور زیادہ بھی ہیں جیسا کہ سورۃ فاتحہ کے بیس ناموں سے بھی زائد ہیں، اسی طرح سورۃ توبہ کا دوسرا نام سورۃ براءۃ ہے۔اسی طرح سورۃ طلاق کا دوسرا نام سورۃ النساء القصری ہے۔

(ماخوذ از اتقان ج ۱ ص ۵۲ تا ص ۵۵)

تفصیل دیکھنی ہو تو علامہ سیوطی رحمہ اللہ کی الاتقان کی جزء اول کو دیکھئے۔

فائدہ جلیلۃ: مسند احمد وغیرہ میں واثلہ ابن اسقع سے حدیث مروی ہے بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" اعطیت مکان التوراۃ السبع الطوال واعطیت مکان الزبور المئین واعطیت مکان الانجیل المثانی وفضلت بالمفصل " (الاتقان ج ۱ ص ۵٦)

مجھے توراۃ کی جگہ سبع طوال عطا کی گئیں اور مجھے زبور کی جگہ مئین عطا کی گئیں۔اور مجھے انجیل کی جگہ مثانی عطا کی گئیں اور مفصل سے مجھے فضیلت عطا کی گئی۔

نتیجہ تقریباً واضح ہی ہے کہ قرآن پاک آسمانی تینوں کتب توراۃ، زبور، انجیل کے مجموعہ سے بھی زیادہ فضیلت حاصل ہے "سبع طوال " کیا ہے؟ سبع طوال سورۃ بقرہ سے لے کر سورۃ توبہ تک، یعنی آخری سورۃ انفال ہے یہ سات سورتیں ہیں اس لئے ان کو سبع کہا گیا اور بڑی سورتیں ہیں اس لئے ان کو طوال (لمبی) کہا گیا ہے۔

" مئون رمئین" ان سورتوں کو کہا گیا ہے جو ان کے ساتھ آگے آرہی ہیں ان میں سو سے زیادہ آیتیں یا سو کے قریب آیتیں پائی جاتی ہیں اس لئے ان کو مئون کہا جاتا ہے۔

" مثانی " وہ سورتیں ہیں جو " مئین " کے بعد ہیں ان کے آیتیں سو سے زیادہ کم ہیں یعنی سو کے قریب نہیں ان کو مثانی کہنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان کو آیات کی تعداد سے مئین کے بعد دوسرا درجہ حاصل ہے درجہ ثانیہ حاصل ہونے کی وجہ سے ان کو مثانی کہہ لیا گیا۔دوسری وجہ ان کو مثانی کہنے کی یہ ہے کہ ان سورتوں کی آیتوں کو دو مرتبہ جمع کریں تو ان کی تعداد "طوال یا مئین " کے قریب ہوتی ہے۔

" مفصل " وہ سورتیں ہیں جو " مئون " کے بعد ہیں یہ چھوٹی سورتیں ہیں ان کو مفصل کہنے کہ وجہ بھی یہ ہے کہ ان میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر بسم اللہ سے ان میں فرق کر دیا جاتا ہے۔بعض حضرات نے کہا ان میں منسوخیت بہت کم ہی واقع ہوئی اس لئے ان کو مفصل کہا گیا ہے اور اسی وجہ سے ان کا دوسرا نام محکم بھی ہے۔ (از اتقان ج ا ص ٦٣)

تنبیہ: ہر فن والوں کی اپنی اپنی اصطلاحات ہیں۔اصول قرآن والے حضرات کی اصطلاح میں مفصل کی تقسیم اس طرح ہے۔

" طوال مفصل " مثانی کے بعد چھوٹی سورتیں جہاں سے شروع ہوئی ، جن کی آیات پچاس کے قریب بھی نہیں وہاں سے شروع کر کے "عم یتساء لون " تک طوال مفصل ہیں۔

" اوساط مفصل " عم یتساء لون سے لےکر "والضحی "تک اوساط مفصل ہیں۔

" قصار مفصل " والضحی سے لےکر والناس تک قصار مفصل ہیں۔

(از اتقان ج ا ص ۲۴)

فقہائے کرام کی اصطلاح میں سورۃ الحجرات سے لےکر والسماء ذات البروج تک طوال مفصل اور والسماء ذات البروج سے لےکر " لم یکن "تک اوساط مفصل اور لم یکنْ سے لےکر والناس تک قصار مفصل ہیں۔ (عینی شرح کنز)

سورتوں کی آیتیں:

آیات کی تعداد کے لحاظ سے سورتوں کی تین قسمیں ۔ایک قسم یہ ہے کہ ان کی تعداد میں اتفاق ہے ۔سب کے نزدیک ایک ہی تعداد ہے اور آیات میں بھی کوئی اختلاف نہیں ایک آیت یہاں سے ختم ہوئی وہاں ختم ہوئی اسی طرح دوسری ،تیسری وغیرہ اس میں بھی اتفاق ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ آیتوں کی تعداد میں تو اتفاق ہے ۔لیکن بعض حضرات کے نزدیک شمار اور آیت اور بعض کے نزدیک اور شمار میں آتی ہے۔

تیسری قسم یہ ہے کہ سورتوں کی آیتوں کی تعداد میں ہی اختلاف بعض کے نزدیک تعداد کم اور بعض کے نزدیک زیادہ۔

پہلی قسم ،کل چالیس سورتیں ہیں:

﴿یوسف ،	آیات ۱۱۱	......الحجر ،	آیات ۹۹
......النحل ،	آیات ۱۲۸	......الفرقان،	آیات ۷۷
......الاحزاب	آیات ۷۳	......الفتح	آیات ۲۹

...... الحجرات ۱۸ ...... التغابن ۱۸ ...... ق ۴۵

...... الذاریات ۶۰ ...... القمر ۵۵ ...... الحشر ۲۴

...... الممتحنة ۱۳ ...... الصف ۱۴

...... الجمعة ، المنافقون الضحی ، العادیات (ہرایک میں) ۱۱

...... التحریم ۱۲ ...... ن ۵۲ ...... الانسان (الدھر) ۳۱

...... المرسلات ۵۰ ...... التکویر ۲۹ ...... الانفطار ۱۹

...... سبح اسم ربک ۱۹ ...... التطفیف ۳۶ ...... البروج ۲۲

...... الغاشیه ۲۶ ...... البلد ۲۰ ...... اللیل ۲۱

...... الم نشرح، التین ، الھٰکم (ہرایک میں) ۸

...... الھمزہ ...... الفیل ، الفلق ، تبت (ہرایک میں) ۵

...... الکافرون ۶ ...... الکوثر ۳ ...... النصر ۳

دوسری قسم کل چار سورتیں ہیں۔القصص کی آیات کی تعداد بالاتفاق اٹھاسی ہے لیکن اھل کوفہ نے طسم کو ایک آیت شمار کیا ہے۔اور دوسرے حضرات کے نزدیک ایک آیت میں دو آیتیں ہیں طسم آیت نہیں وہ "امة من الناس یسقون" کو ایک آیت شمار کرتے ہیں۔

عنکبوت کی آیات تو بالاتفاق انہتر ہے لیکن اہل کوفہ کے نزدیک الم ایک آیت ہے۔اور اہل بصرہ کے نزدیک یہ آیت نہیں بلکہ "مخلصین له الدین" ایک آیت ہے۔اور اہل شام کے نزدیک "وتقطعون السبیل" پر ایک آیت ختم ہوتی ہے۔

الجن، کی آیات بالاتفاق اٹھائیس ہیں۔کی حضرات کے نزدیک "لن یجیرنی من الله احد" اور باقی حضرات کے نزدیک اس کے بدل "ولن اجد من دونه ملتحدا" ہے۔

"العصر" بالاتفاق اس کی تین آیتیں ہیں۔لیکن مدنی حضرات کے نزدیک "والعصر" ایک

مستقل آیت ہے۔اور باقی حضرات کے نزدیک "والعصر" مستقل آیت نہیں بلکہ "وتواصوا بالحق" آیت ہے اور "وتواصوا بالصبر" علیحدہ آیت ہے۔

سورۃ فاتحہ کی آیات سات ہیں۔سات کا قول کرنے والے بعض حضرات نے "بسم اللہ" کو ایک آیت شمار کیا ہے اور "انعمت علیھم" پر آیت کا اختتام نہیں مانا۔اور بعض حضرات کے نزدیک "بسم اللہ" سورۃ فاتحہ کا جزء نہیں بلکہ یہ اسی طرح ہے۔جس طرح دوسری سورتوں میں "بسم اللہ" فرق کرنے کے لئے آتی ہے۔البتہ ان کے نزدیک "انعمت علیھم" پر آیت ختم ہو جاتی ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے نزدیک آٹھ آیتیں ہیں۔وہ "بسم اللہ" کو بھی ایک آیت تسلیم کرتے ہیں اور "انعمت علیھم" پر بھی آیت کا اختتام تسلیم کرتے ہیں۔

کچھ حضرات کے نزدیک چھ آیتیں ہیں وہ "بسم اللہ" کو بھی آیت نہیں تسلیم کرتے اور "انعمت علیھم" پر بھی آیت کا اختتام تسلیم نہیں کرتے۔

اور کچھ حضرات کے نزدیک نو آیتیں ہیں "بسم اللہ" بھی ایک آیت ہے "ایاک نعبد" علیحدہ مستقل آیت ہے اور "انعمت علیھم" پر بھی آیت کا اختتام ہو رہا ہے۔

(ماخوذ از الاتقان ج ۱ ص ۶۷ تا ۶۹)

قرآن پاک میں سورتوں کی تعداد:

قرآن پاک میں کل سورتیں ایک سو چودہ ہیں۔البتہ بعض حضرات نے سورۃ انفال اور سورۃ توبہ کو ایک سمجھا ہے انہوں نے ایک سو تیرہ بیان کی ہیں۔

کل آیات: چھ ہزار دو سو دس ہیں۔یہ تعداد ہمارے پاس جو آیات شمار ہیں۔(چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ کا بھی ایک قول ہے) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول یہ ہے کہ کل آیات چھ ہزار چھ سو سولہ آیتیں ہیں۔

دانی رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ چھ ہزار آیتوں تک تو اتفاق ہے اوپر کی تعداد میں اختلاف ہے

بعض کے نزدیک اوپر دو سو چار ہیں۔ بعض کے نزدیک اوپر دو سو چودہ ہیں بعض کے نزدیک اوپر دوسوانیس ہیں بعض کے نزدیک اوپر دوسوپچیس ہیں اور بعض کے نزدیک اوپر دوچھبیس ہیں۔

اصل میں اختلاف کی وہی وجہ ہے جو سورتوں کی آیتوں میں بیان کی جا چکی ہے۔ بعض کے نزدیک ایک آیت ہوتی ہے اور بعض کے نزدیک اسی ایک آیت کی دو آیتیں ہوتی ہیں

حروف کی تعداد: تین لاکھ تئیس ہزار چھ سو اکہتر کل حروف ہیں۔ (از الاتقان ج ۱ ص ۶۷)

فضیلت تفسیر: ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے علم کی تعریف کی کسی شخص نے آپ کو کہا "جعلت فداء ک تصف جابرا بالعلم و انت انت" میں آپ پر قربان آپ جابر کے علم کی تعریف کر رہے ہیں حالانکہ آپ خود بہت بڑے عالم ہیں تو آپ نے فرمایا۔ "انه كان يعرف تفسير قوله تعالىٰ ان الذى فرض عليك القرآن لرادك الى معاد" وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد "ان الذى فرض" کی تفسیر جانتے تھے۔

"وقال مجاهد احب الخلق الى الله تعالىٰ اعلمهم بما انزل"

مجاہد رحمہ اللہ نے کہا اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق سے مجھے وہ محبوب ہے جو قرآن کا زیادہ علم رکھتا ہو۔

" وقال الحسن والله ما انزل الله آيـةالا احب ان يعلم فيما انزلت وما يعنى بها"

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا قسم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اللہ تعالیٰ نے جو آیت بھی نازل فرمائی میں یہی پسند کرتا ہوں کہ میں اس کے نزول کی وجہ اور اس کے مطالب کو سمجھ لوں۔

" وقال الشعبى رحل مسروق الى البصرة فى تفسير آيـةفقيل له ان الذى يفسرها رحل الى الشام فتجهز ورحل الى الشام حتى علم تفسيرها"

شعبی کہتے ہیں حضرت مسروق رحمہ اللہ بصرہ میں سفر کر کے ایک آیت کی تفسیر معلوم کرنے کے لئے گئے۔ وہاں جب پہنچے تو پتہ چلا کہ وہ تفسیر بیان کرنے والے شخص تو شام چلے گئے آپ وہاں سے شام گئے یہاں تک کہ وہاں جا کر انہوں نے اس شخص سے ایک آیت کی تفسیر حاصل کی۔

" وقال عكرمة فی قوله عزوجل ومن يخرج من بيته مهاجرا الى الله ورسوله طلبت اسم هذا الرجل الذی خرج من بيته مهاجرا الى الله ورسوله اربع عشرة سنة حتى وجدته وقال ابن عبد البر هو ضمرة بن حبيب "

حضرت عکرمہ کہتے ہیں میں نے '' ومن یخرج من بیتہ '' کے متعلق چودہ سال طلب کرنے کے بعد پایا کہ وہ کون شخص تھا جس کے متعلق اس آیت میں ذکر کیا گیا۔ ابن عبدالبر نے بیان کیا وہ ضمرہ ابن حبیب تھے۔

راقم کا خیال ہے کہ حضرت عکرمہ نے کسی سے نہیں پوچھا ہوگا خود ہی جستجو میں رہے ہوں گے یہاں تک کہ آپ کو کسی طرح علم حاصل ہوگیا ہوگا۔ جیسا کہ راقم اعلی حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کے ایک شعر کو نعت خوانوں سے سن کر ایک لفظ کو کئی سال نہ سمجھ سکا۔ جب حدائق بخشش خریدی تو دیکھ کر سمجھا۔ وہ شعر یہ ہے:

میرے کریم سے گر قطرہ کسی نے مانگا　　دریا بہا دیئے ہیں دُر بے بہا دیئے ہیں

چونکہ پڑھنے والے '' دُر بے '' اکٹھا پڑھتے ہیں بہا دیئے ہیں علیحدہ پڑھتے ہیں میں کئی سال سمجھنے کی کوشش کرتا رہا کہ '' در بے '' کس زبان کا لفظ ہے اس کا کیا معنی ہے لیکن جب لکھا ہوا شعر دیکھا تو سمجھا کہ اصل تلفظ اس کا اس طرح ہے۔ دُر بے بہا۔ دیئے ہیں۔ (قیمتی موتی دیئے ہیں)۔

میں بھی کئی سال خود ہی جستجو میں رہا کسی سے پوچھا نہیں۔ پوچھتا تو شائد اسی وقت پتہ چل جاتا۔

" قال ابن عباس مكثت سنتين اريد ان اسأل عمر من المرأتين اللتين تظاهرتا على رسول الله ﷺ ما يمنعنى الامهابته فسألته فقال هى حفصة وعائشة "

'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سورۃ تحریم میں رب تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں سے دو کا ان الفاظ مبارکہ سے ذکر فرمایا" فان تظاهرا عليه " میں چاہتا تھا کہ مجھے پتہ چلے کہ یہ دو کون ہیں ''۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھنا چاہتا تھا لیکن آپ کا بہت رعب تھا جس کی وجہ سے دو سال ہی گزر گئے کہ آج پوچھتا ہوں کل پوچھتا ہوں آخر کار میں نے پوچھ ہی لیا آپ نے فرمایا وہ حفصہ اور

عائشہ (رضی اللہ عنہا) تھیں۔

" وقال اياس ابن معاوية مثل الذين يقرء ون القران وهم لايعلمون تفسيره كمثل قوم جاء هم كتاب من ملكهم ليلا وليس عندهم مصباح فتداختلهم الرعبة ولا يدرون مافى الكتاب او مثل الذى يعرف التفسير كمثل رجل وعند هم بمصباح فقرء وا ما فى الكتاب "

(از تفسیر قرطبی ج ۱ ص ۲

" حضرت ایاس ابن معاویہ نے کہا جو لوگ قرآن پڑھتے ہیں اور اس کی تفسیر نہیں جانتے وہ اسطرح ہیں جیسا کہ کسی قوم کے پاس ان کے بادشاہ کا خط رات کو پہنچے ان کے پاس چراغ نہ ہو وہ یہ تو نہ سمجھ سکیں کہ اس میں کیا ہے البتہ ان پر رعب طاری رہے لیکن جو لوگ قران کی تفسیر بھی جانتے ہیں اس کی مثال ایسے ہے جیسا کہ ایک شخص کے پاس رات کو خط آئے۔لیکن اس کے پاس چراغ ہو وہ خط کو پڑھ کر سمجھ جائے کہ اس میں کیا ہے "۔

تفسیر بالرائے:

" عن ابن عباس عن النبى ﷺ قال اتقوا الحديث على الا ماعلمتم فمن كذب على متعمدا فليتبوأ مقعده من النار ومن قال فى القرآن برأيه فليتبوأ مقعده من النار " (ترمذی ،قرطبی ج ۱ ص ۳۲)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد بیان فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جب تک تمہیں یقینی علم حاصل نہ ہو اس وقت تک میری حدیث بیان کرنے سے بچو۔جس شخص نے جان بوجھ کر میری طرف سے جھوٹی حدیث بیان کی اس نے اپنا ٹھکانا جہنم میں بنایا۔اور جس نے قران کو اپنی رائے سے بیان کیا اس نے اپنا ٹھکانا جہنم میں بنایا۔

" عن جندب قال قال رسول الله ﷺ من قال فى القرآن برأيه فاصاب فقد اخطأ "

(ترمذی ،قرطبی ج ۱ ص ۳۲)

جندب کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے قرآن کو اپنی رائے سے بیان کیا۔اس نے اگرچہ درست بھی بیان کیا لیکن پھر بھی غلطی کی۔

" وزاد رزین ومن قال برأیه فأ خطأ فقد کفر "

رزین میں یہ الفاظ بھی زائد ہیں جن کا معنی یہ ہے کہ جس نے قرآن کو رائے سے بیان کیا اور غلط بیان کیا تحقیق وہ کافر ہوگیا۔

وضاحت احادیث: پہلی حدیث جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ قرآن پاک کے مشکل الفاظ کو صحابہ کرام اور تابعین کے مذہب کے خلاف اپنی مرضی سے بیان کر کے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کو حاصل کرے۔

دوسرا مطلب یہ ہے جو زیادہ صحیح ہے " **من قال فی القران قولا یعلم ان الحق غیره فلیبتوأ مقعده من النار** "جس شخص نے قرآن پاک کے حق مطلب کو جانتے ہوئے اس کے خلاف بیان کیا اس نے اپنا ٹھکانا جہنم بنایا۔

دوسری حدیث جو جندب سے مروی ہے اس کی سند پر بھی کلام ہے کہ اس میں ایک راوی سہیل بن ابی حزم جس کا نام مہران اور لقب عبداللہ ہے وہ ضعیف راوی ہے۔ اور اس میں وجہ یہ کہ اس حدیث میں رائے بمعنی ھوی (خواہش ہے) ہے اس معنی کے لحاظ سے حدیث کا مفہوم یہ ہے۔

" من قال فی القرآن قولا یوافق هواه لم یاخذ عن ائمة السلف فاصاب فقد اخطأ "

جس شخص نے قرآن پاک کے مطالب اپنی خواہشات کے مطابق بیان کئے سلف صالحین سے نہ حاصل کیے تو اس نے خطاء کی اس لئے کہ اس نے قرآن پر وہ حکم لگایا ہے جسے وہ جانتا ہی نہیں تھا اور نہ ہی اصحاب اثر اور اصحاب نقل کے مذاہب کی اسے واقفی حاصل ہوئی یہی اس کی خطاء ہے۔

ابن عطیہ نے یہ بیان کیا کہ اس وعید کا تعلق اس سے ہے کہ کوئی شخص کسی سے قرآن پاک کا مطلب پوچھے تو وہ بغیر غور وفکر کے اپنی رائے سے بیان کر دے تو اس نے خطاء کی۔

یہ تفسیر بالرائے نہیں:

" واقتضته قوانین العلم کالنحو، والاصول، ولیس یدخل فی هذاالحدیث ان یفسر اللغویون لغته والنحویون نحوه والفقهاء معانیه ویقول کل واحد

باجتهاده المبنی علی قوانین علم ونظر فان القائل علی هذه الصفة لیس قائل بمجرد رأیه"

"جو علم کے قوانین کا تقاضا ہے مثلاً نحو کے قوانین اور اصول فقہ وغیرہ کے وہ اس حدیث میں داخل نہیں لغت والے حضرات لغوی بحث کریں نحوی حضرات نحو کے مسائل بیان کریں۔ فقہاء فقہی مسائل بیان کریں تو ان کا یہ بیان کرنا علم کے قوانین کے مطابق ہوتا ہے اور ان کے مسائل نظر وفکر سے حاصل ہوتے ہیں ان کو اس حدیث میں داخل نہیں کیا جاسکتا کہ وہ تفسیر بالرائے کر رہے ہیں۔

تنبیہ : بعض لوگوں نے کہا کہ تفسیر صرف سماع پر موقوف ہے انہوں نے بطور دلیل یہ آیت پیش کی " فان تنازعتم فی شئی فردوہ الی اللہ والرسول " (سورۃ النساء آیۃ ۵۹)

لیکن علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے ان کے موقف کا رد کرتے ہوئے فرمایا "هذا فاسد " ان کا یہ قول فاسد ہے اس لئے کہ اگر صرف یہی مراد ہو کہ قرآن پاک کی تفسیر فقط ان اقوال سے کی جاسکتی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنے گئے ہوں تو یہ کہنا باطل ہے کیونکہ صحابہ کرام نے قرآن پاک پڑھا لیکن تفسیر میں ان کا کئی مقام میں اختلاف پایا جاتا ہے اگر تفسیر کا تعلق صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سننے پر موقوف ہوتا تو کبھی صحابہ کرام کا اختلاف نہ ہوتا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس کے لئے دعاء ان الفاظ مبارکہ سے فرمائی "اللھم فقهه فی الدین وعلمه التاویل " اے اللہ اس کو دین میں سمجھ عطا فرما اور اسے تاویل کا علم عطا فرما۔

" فان کان التاویل مسموعا کالتنزیل فما فائدة تخصیصه بذلک " اگر تاویل بھی صرف سننے پر موقوف ہے جیسے قرآن پاک کا تعلق صرف نبی کریم ﷺ سے سننے پر موقوف ہے تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے لئے یہ خصوصی دعاء کرنے کا کیا مقصد ہوسکتا ہے۔

سورۃ نساء کی آیت کا مطلب یہ ہے کہ اپنی خواہشات کے مطابق تفسیر نہ کرو اگر تمہارا اختلاف ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے کلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو فیصل تسلیم کرو۔

اور یہ مطلب ہے کہ قرآن پاک کے ظاہری الفاظ سے مطالب حاصل کرنے کی کوشش نہ کرو بلکہ ان کے حقیقی مطالب کو سمجھنے کی کوشش کرو۔اس لئے آیت کریمہ سے ان کا استدلال باطل ہے۔

(از قرطبی ج ا ص ۳۳،۳۴)

قرآن پاک میں رائے کے جواز پر اور قرآن پاک میں اجتہاد کرنے پر کثیر دلائل موجود ہیں۔ارشاد باری تعالیٰ ہے۔"افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالها" قرآن پاک میں (یہ لوگ) تدبر کیوں نہیں کرتے کیا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔رب تعالیٰ کا اور ارشاد گرامی ہے "کتاب انزلناه الیک مبارک لید بروا آیاته ولیتذکر اولو الالباب" ہم نے آپ کی طرف برکت والی کتاب نازل کی تاکہ اس کی آیات میں تدبر کریں اور عقل والے اس سے نصیحت حاصل کریں۔

صوفیاء کرام کی تفاسیر صحیح اور درست ہیں:

قرآن پاک میں دقیق اشارات پائے گئے جو ارباب سلوک پر ہی منکشف ہوتے ہیں ان میں اور ظاہر مطالب میں تطبیق دینی ممکن ہوتی ہے اسی کا نام صوفیاء کرام کی تفاسیر ہیں۔

" قال ابن مسعود من اراد علم الاولین والآخرین فلیتل القرآن "

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جو شخص اولین وآخرین کے علوم حاصل کرنا چاہتا ہے وہ قرآن پاک پڑھے۔

"ومن المعلوم ان هذا لایحصل بمجرد تفسیر الظاهر" یہ واضح طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ ظاہری معانی اور ظاہری تفاسیر سے اولین وآخرین کے علوم حاصل نہیں ہو سکتے۔

بعض اہل علم جن پر وثوق کیا جاسکتا ہے ان کا قول یہ ہے " لکل آیة ستون الف فهم " ہر آیت کے ساٹھ ہزار مطالب ہیں اس سے بھی واضح ہوا کہ یہ صرف ظاہری معانی ومطالب سے حاصل نہیں ہو سکتے۔

حضرت حسن سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لکل آیة ظهر وبطن

ولکل حرف حد ولکل حد مطلع " ہر آیت کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی ہر حرف کی حد ہے اور ہر حد کا مطلع۔ ظاہر سے مراد وہ معانی جو ظاہر ہوں یعنی ظاہری علوم رکھنے والے حضرات ان کو سمجھ لیں اور باطن سے مراد وہ اسرار ہیں جن پر اللہ تعالیٰ ارباب حقائق، اصحاب معرفت، سالکین حضرات کو مطلع فرماتا ہے۔

ہر حرف کی حد ہے یعنی ہر حرف کے معنی کی وہاں انتہاء ہو جاتی ہے جہاں اللہ تعالیٰ اس کی انتہاء کا ارادہ فرماتا ہے ہر حد کا مطلع ہے یعنی جو بھی معانی اور احکام پوشیدہ ہوتے ہیں ان کی معرفت کے کوئی نہ کوئی ذرائع ہیں جن کے ذریعے ان کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔

روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ ہر آیت کا کوئی نہ کوئی باطنی معنی بھی ہوتا ہے اس معنی پر مطلع کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی ذرائع ہوتے ہیں وہ صوفیاء کرام ہی ہیں۔

خیال رہے کہ صوفیاء کرام ظاہری معانی کا انکار نہیں کرتے بلکہ ظاہری معانی مراد لینے کے بعد باطنی مطالب بھی بیان کرتے ہیں لیکن اصحاب رائے صرف اپنی مرضی کے ڈھکوسلے بیان کرتے ہیں۔

صوفیاء کرام کی تفاسیر اور اپنی خواہشات کے مطابق ظاہر کے خلاف تفاسیر بیان کرنے والوں کی تفاسیر کو ایک درجہ میں رکھنا حماقت سے خالی نہیں۔

صرف ظاہری معانی مراد لینے والے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو دیکھ کر اپنی غلطی کا اعتراف کریں ﴿وَتَفْصِيْلًا لِكُلِّ شَيْءٍ﴾ قران ہر چیز کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ اور رب تعالیٰ کا فرمان ذیشان ﴿مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ﴾ (ہم نے قرآن میں کسی چیز کے بیان کو نہیں چھوڑا) بھی ان کو نظر آنا چاہئے۔

عجیب تماشہ یہ ہے کہ وہ یہ ماننے کے لئے تیار ہیں کہ دیوان متنبی میں الفاظ کئی کئی معانی پر مشتمل ہیں لیکن وہ کلام جو رب العلمین کا ہے۔ خاتم المرسلین پر نازل ہے اس کے باطنی معانی کو صرف ضد کی وجہ سے ماننے کیلئے تیار نہیں۔

" مامن حادثة ترسم بقلم القضاء في لوح الزمان الاوفي القرآن العظيم اشارة اليها فهو المشتمل على خفايا الملک و الملكوت وخبايا قدس الجبروت "

کوئی ایسا واقعہ نہیں جو تقدیر کی قلم سے اس زمانہ کی تختی پر منقش ہوتا ہے کہ وہ قرآن پاک میں موجود نہ ہو یعنی یوں سمجھئے کہ ملک وملکوت کی ہر مخفی چیز اور مالک الملک کے پوشیدہ راز قرآن پاک میں موجود ہیں۔ ابن خلکان نے اپنی تاریخ میں ذکر کیا ہے کہ سلطان صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ نے جب حلب شہر کو فتح کیا تو قاضی محی الدین نے انہیں اپنا قصیدہ بائیہ سنایا جس میں انہوں نے ان فتوحات اور کئی امور کے واقع ہونے کے اوقات لکھے ہوئے تھے قاضی نے اپنے قصیدہ میں ایک شعر یہ بھی سنایا:

وفتحک القلعة الشهباء في صفر　　　　مبشر بفتوح القدس فی رجب

یہ رنگ برنگا خوبصورت قلعہ تم پر صفر میں فتح ہوگا　　　　اور بیت المقدس کے فتح کی تمہیں رجب کی بشارت ہو

جیسا انہوں نے اپنا قصیدہ پہلے سے لکھا ہوا تھا جسے لوگ جانتے تھے جب فتوحات اسی کے مطابق واقع ہوئیں تو قاضی سے پوچھا گیا تمہیں یہ علم کیسے حاصل ہوا؟ انہوں نے کہا میں نے قرآن پاک کے الفاظ مبارکہ ﴿ الٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ﴾ کی تفسیر ابن برجان سے حاصل کئے ہیں مؤرخ کہتے ہیں جب میں نے ابن برجان کی تفسیر کو اسی مقام پر دیکھا تو اس میں ایک طویل حساب سے یہی استنباط کیا گیا تھا جو قاضی نے اشعار میں پیش کیا۔

اور یہ بھی مشہور ہے کہ ابن کمال نے قرآن پاک کی آیت ﴿ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ ﴾ سے استنباط کیا کہ مصر سلطان سلیم کے ہاتھوں فتح ہوگا ایسا ہی ہوا۔

" فالانصاف کل الانصاف التسلیم للسیادة الصوفیة الذین هم مرکز للدائرة المحمدیة ماهم علیه واتهام ذهنک السقیم فیما لما یصل لکثرة العوائق والعلائق الیه "

انصاف کامل انصاف یہ ہے کہ صوفیا کرام کو بلند ہستیاں تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ وہ دائرہ محمدیہ کا مرکز ہیں ان سے ہی تو مقام مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا پتہ چلتا ہے اگر ان کا مقام تیرے بیمار ذہن میں نہ آئے جس پر کھوٹ، کینہ، حسد، عناد، ضد، ہٹ دھرمی کا زنگ لگا ہوا ہے تو کم از کم صاف ذہنوں والے حضرات کی بات ہی تسلیم کرے۔

واذا لم تر الهلال فسلم　　　　لاناس رأوه بالابصار

جب تو نے چاند نہیں دیکھا تو پھر بھی مان لے کیونکہ اور لوگوں نے تو اپنی نظروں سے دیکھ لیا ہے۔
(ماخوذ از روح المعانی ج ص ۷ ۱ ۸)

صوفیائے کرام کے استنباط کی ایک جھلک:

"اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ" رحمٰن نے قرآن سکھایا۔ اس ظاہری معنی کا تو کسی کو انکار نہیں صوفیاء کرام نے یہ معنی تسلیم کرتے ہوئے قرآن پاک کے علوم کے سمندر سے ہیرے، لعل و جواہر نکال کر سمجھایا کہ قرآن پاک علوم کا خزینہ ہے لیکن اسے سمجھنے کے لئے علم، معرفت کے ساتھ ساتھ رب تعالیٰ کا تقرب اور مصطفےٰ کریم ﷺ کی نظر عنایت کا ہونا ضروری ہے۔

صوفیاء کرام فرماتے ہیں۔ ﴿ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ﴾ سے اس طرف بھی اشارہ ہے کہ بندے پر جب رحمٰن تجلیات ڈالتا ہے تو وہ بندہ لذت رحمانیہ حاصل کرتا ہے اور اسے معرفت قرآنیہ حاصل ہوتی ہے اور اسے یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ رب تعالیٰ کا علم صرف اس کے اسماء اور اس کی صفات سے حاصل ہوسکتا ہے۔

قرآن پاک کا نام چونکہ فرقان ہے جب ﴿ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ﴾ پڑھا تو خود بخود " فرقان " بھی ذہن میں آ گیا۔ جب فرقان کا معنی ہے فرق کرنے والا تو اس سے رب تعالیٰ کے اسماء اور صفات کی مختلف انواع کا پتہ چل گیا جب یہ پتہ چل جائے کہ اللہ تعالیٰ کی بعض صفات بعض سے مختلف ہیں اور بعض اسماء بعض سے مختلف ہیں تو اسی سے یہ واضح ہو جائے گا کہ رب تعالیٰ کا منعم ہونا اور ہے منتقم ہونا اور اور رب تعالیٰ کی صفت رضاء اور ہے اور صفت غضب اور ہے اسی طرح حدیث قدسی سے اشارہ ملتا ہے رب تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿ سبقت رحمتی غضبی ﴾ میری رحمت، میرے غضب پر سبقت لے گئی۔ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کسی صفت میں نقص ثابت نہیں کیا جاسکتا کسی صفت کو گھٹیا نہیں کہا جاسکتا ہاں البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ بعض صفات کو بعض پر فضیلت حاصل ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

" اعوذ بمعافاتک من عقوبتک واعوذ برضاک من سخطک واعوذ بک منک لا احصی ثناء علیک "

تیرے معاف کرنے کی پناہ تیرے عذاب دینے سے اور تیرے رضاء کی پناہ تیری ناراضگی سے تیری پناہ تجھ سے (تیرے غضب سے) تجھ پر جو ثناء کی اسے شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی سے یہ واضح ہو گیا کہ معافاۃ افضل ہے عقوبت سے، رضاء افضل ہے ناراضگی سے، کیونکہ پناہ فضیلت والی چیز کی پکڑی جاتی ہے۔

"اعوذ بک منک" کا کیا مطلب ہے؟ اگرچہ بظاہر یہ سمجھ آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت احدیت میں بھی فرق ہے کیونکہ عرض کیا گیا ہے "تیری پناہ تجھ سے" لیکن یہ فرق مختلف حالات کے لحاظ پر ہے اسی لئے راقم نے بریکٹ میں غضب تحریر کیا ہے۔

ابوسعید رحمہ اللہ کہتے ہیں میں نے اللہ تعالیٰ کو ضدین کے جامع ہونے کی وجہ سے ہی پہچانا کہ وہ بے مثل ذات ہے کہ منعم بھی ہے اور منتقم بھی اور رحمت بھی فرماتا ہے اور غضب بھی، ناراض بھی ہوتا ہے اور راضی بھی۔

اور خاص کر کے نبی کریم ﷺ جو خاتم النبیین اور امام المرسلین ہیں آپ نے قرآن وفرقان کے ذریعے ہر چیز کو بیان فرمایا رب تعالیٰ کے ارشادات بھی اسی پر شاہد ہیں۔ رب نے فرمایا:

"وکل شیء فصلناہ تفصیلا" اور ارشاد باری تعالیٰ ہے "مافرطنا فی الکتاب من کل شئی"

قرآن وفرقان سے اور یہ سمجھ آیا:

جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ قرآن کا معنی جمع ہونا متصل ہونا اور فرقان کا معنی فرق کرنا ان دونوں الفاظ کے معانی سے مقام جمع اور فرق کی طرف اشارہ ملتا ہے اسی لئے بیان کیا گیا ہے کامل بندے کے لئے ان دونوں چیزوں کا پایا جانا ضروری ہے۔

"من لاتفرقة له لا عبودية له ومن لاجمع له لامعرفة له"

جسے تفریق حاصل نہیں اسے کامل عبودیت حاصل نہیں اور جسے جمع حاصل نہیں اسے معرفت حاصل نہیں

جمع کا مطلب یہ ہے کہ اشیاء کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ شہود اور کسی چیز سے پھرنا اور کسی چیز کی طاقت حاصل ہونا صرف اللہ تعالیٰ سے ہی تصور کرنا اس کے بغیر کسی کی طرف تصور نہ کرنا۔ اور ایک مقام ہے جمع الجمع کا وہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو کلی طور پر فناء کے درجہ میں سمجھے صرف اللہ تعالیٰ کی ذات میں اپنے

آپ کو فناء سمجھے اسے ہی مرتبہ احدیت بھی کہتے ہیں۔فرق کے مختلف درجے ہیں۔ پہلا درجہ پرانی رسومات پر قائم رہنا اور مخلوق کا حق تعالیٰ سے اس کے لئے حجاب بننا۔فرق کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی معرفت کے ساتھ مخلوق کی طرف بھی کامل توجہ رہے وحدت کو کثرت میں اور کثرت کو وحدت میں اس طرح دیکھنا کہ کوئی ایک دوسرے کے لئے حجاب نہ بنے۔

فرق الوصف یہ ہے کہ واحد ذات کو اوصاف کے ذریعے جاننا یقیناً ایک وصف دوسرے وصف سے علیحدہ حیثیت رکھتا ہے فرق الجمع یہ ہے کہ ایک ذات میں تکثر ماننا مختلف حالات کے لحاظ سے جس طرح رب تعالیٰ نے خود اسی کو ان الفاظ مبارکہ سے بیان فرمایا:

"کل یوم هو فی شأن"

فرق الجمع اور فرق الوصف بہت قریب قریب ہیں ان میں معمولی اعتباری فرق ہے۔

(ماخذ از روح المعانی ج ا ص ۱۱)

قارئین کرام توجہ کریں تدبر سے کام لیں کہ صوفیاء کرام کی یہ بحث جو میں نے "الرحمن علم القران" کی تفسیر میں ذکر کی ہے یہ تقریباً چوتھا حصہ ہے ابھی مزید تین حصے اور روح المعانی میں دیکھیں اور خود سمجھ آئے گا کہ اس طرح کی بحثوں سے قران پاک کی عظمت سمجھ آتی ہے اور واضح ہوتا ہے کہ قرآن پاک کے ایک ایک لفظ میں کتنے کمالات پائے جاتے ہیں۔

قرآن پاک پر ایمان کے لئے حدیث پر ایمان ضروری ہے:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ﴾

"(اے اللہ تعالیٰ) ہمیں سیدھی راہ چلا"

سیدھی راہ پر چلنا ہی انسان کی کامیابی ہے۔اور دین و دنیا میں ذریعہ نجات ہے سیدھی راہ کا حصول بغیر علم کے ناممکن ہے۔علم کے ذریعے ہی انسان حق و باطل میں تمیز کرسکتا ہے علم مومن کے دل میں نور ہے۔وہی علم دل کو منور کرے گا جس میں نبی کریم ﷺ کی راہنمائی ہوگی ذریعے ہی انسان اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کے احکام کی ہدایت حاصل کرسکتا ہے۔

اگر انسان کو یہ علم بغیر کسی انسان کے حاصل ہو تو وہ علم لدنی کہلائے گا۔ پھر اس کی تین قسمیں ہیں یہ علم وحی کے ذریعے حاصل ہوگا یا الہام کے ذریعے اور یا فراست کے ذریعے۔

وحی : اللہ تعالیٰ کا وہ کلام ہے جو نبی کریم ﷺ کی قلب پر بواسطہ جبرائیل نازل ہو الفاظ بھی رب تعالیٰ کی طرف سے آئیں اور جبرائیل کا واسطہ بھی ہو تو وہ قرآن پاک ہے۔ جبرائیل کا واسطہ نہ ہو اور الفاظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے دل پر القاء ہوں یعنی مقام شھود میں حاصل ہوں تو وہ حدیث قدسی۔ اور معانی و مطالب آپ کو بغیر واسطہ جبرائیل کے حاصل ہوں تو وہ مطلقاً حدیث نبوی ہے۔

الہام: اللہ تعالیٰ کی طرف سے دل میں القاء ہونے والے مطالب الہام ہیں الہام غیر نبی کو بھی ہوسکتا ہے۔

فراست: کچھ چیزوں کے آثار کو دیکھ کر امور غیبیہ پر مطلع ہو فراست کہلاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "اتقوا فراسة المؤمن فانه ینظر بنور الله" مومن کی فراست سے بچ کر رہو وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

کسبی علم: اگر انسان کسی اور انسان سے علم حاصل کرے تو وہ کسبی علم ہوگا اکثر عوام الناس کا علم کسبی ہی ہوتا ہے۔ شریعت مصطفوی کا علم قرآن پاک و حدیث پاک، اور اجماع امت اور قیاس سے حاصل ہوتا ہے۔

" لا یکمل الاعتصام بالکتاب الابیان کشفه من السنة النبویة "

(مرقاۃ ج ۱ ص ۱۰)

قرآن پاک پر انسان اس وقت تک کامل عمل کر ہی نہیں سکتا۔ جب تک کہ حدیث نبوی کے ذریعے قرآن پاک کی وضاحت نہ پائی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ﴾ لوگوں کی طرف جو (اوامر، نواہی) نازل کیا گیا آپ اسے بیان فرمائیں۔

قرآن پاک میں احکام مجمل ذکر کیے گئے ہیں۔ حدیث پاک میں ان کی وضاحت ہے قرآن

پاک میں نماز کا ذکر ہے لیکن اوقات ،تعداد رکعات ارکان ،شرائط واجبات سنتیں مکروہات ،مفسدات حدیث پاک سے ہی ثابت ہیں۔اسی طرح زکوۃ کا قرآن پاک میں ذکر ہے۔لیکن زکوۃ کی مقدار نصاب کی تفصیل حدیث پاک سے ثابت ہے۔اسی طرح روزہ، حج اور تمام امور شرعیہ کی تفصیل حدیث پاک سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

تمام قضایا،احکام دینیہ،حلال وحرام میں تمیز اور اخروی احوال کی تفصیل قرآن پاک ،حدیث پاک اور اجماع امت سے حاصل کی جائے۔منکرین حدیث کے باطل اقوال کی طرف توجہ کر کے متردد ہونا یا انکار حدیث پاک دین ودنیا کو برباد کرنے کے مترادف ہے۔

حضرت مقدام معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خبردار مجھے قرآن دیا گیا اور اس کے ساتھ اس کی مثل " **اَلَا يُوْشِکُ رَجُلٌ شعبان علی اریکته یقول علیکم بهذا القرآن فما وجدتکم فیه من حلال فاحلوا فما وجدتهم فیه من حرام فحرموا ان ماحرم رسول الله کما حرم الله**"(ابوداؤد دارمی، **مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ**)خبردار ایک وقت آئے گا۔

جس میں ایک دولت مند شخص آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر کہے گا تم صرف قرآن پر عمل کرو جو اس میں حلال پاؤ اسے حلال سمجھو اور جو اس میں حرام پاؤ اسے ہی حرام سمجھو(آپ نے فرمایا)حالانکہ اللہ کے رسول نے جس چیز کو حرام کیا وہ ایسے ہی حرام ہے جیسے اللہ نے حرام کیا۔

اس حدیث پاک میں کتنا واضح طور پر فرمایا کہ منکرین حدیث کا پیشوا کیسا شخص ہوگا۔حدیث کے انکار کی ابتداء کرنے والے شخص غلام احمد پرویز کی گلبرگ لاہور میں کوٹھی اور اس کے عیش وعشرت کو دیکھیں تو حدیث پاک کی طرف نظر کریں تو واضح ہو جائے گا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد حرف بحرف سچا ہوا خیال رہے کہ حدیث پاک کا انکار بھی اپنا ٹھکانا جہنم میں بنانا ہے۔اور جھوٹی حدیث بیان کرنا بھی اپنے آپ کو جہنمی بنانا ہے۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

" من کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعده من النار"

(بخاری مشکوۃ کتاب العلم)

جس شخص نے جان بوجھ کر میری طرف جھوٹ منسوب کیا اس نے اپنا ٹھکانا جہنم میں بنایا۔حدیث پاک بیان کرنے والے نبی کریم ﷺ کے خلفاء ہیں۔حضرت ابن عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔بے شک رسول اللہ ﷺ ایک دن اپنے حجرہ شریفہ سے نکلے اور آپ نے فرمایا:

"اَللّٰھُمَّ ارحم خلفائی "اے اللہ میرے خلفاء پر رحم فرما۔ہم نے پوچھا یا رسول اللہ آپ کے خلفاء کون ہیں تو آپ نے فرمایا:"خلفاء الذین یروون سنتی ویعلم منھا الناس" میرے خلفاء وہ لوگ ہیں جو میری سنن واحادیث کو بیان کرتے ہیں اور لوگ ان سے احادیث کا علم حاصل کرتے ہیں۔بیشک جابر ابن عبداللہ انصاری ایک حدیث کا علم حاصل کرنے کے لئے مدینہ طیبہ سے ایک ماہ کی مسافت طے کر کے گئے۔ (از مرقاۃ ج ۱۰)

حقیقت یہ ہے اگر بڑی متانت سے غور کیا جائے تو یہ سمجھنا مشکل نہیں رہتا کہ بغیر حدیث کے قرآن پاک پر عمل ہو ہی نہیں سکتا۔کون کہہ سکتا ہے قرآن پاک میرے سامنے نازل ہوا میں نے جبرائیل کو آتے ہوئے دیکھا،میرے سامنے جبرائیل نے قرآنی آیات کو پڑھا مجھے اللہ تعالیٰ نے خود براہ راست بتایا یہ جبرائیل ہے اسے میں نے بھیجا ہے یہ جو کلام سناتا ہے وہ میرا کلام ہے۔

صحابہ کرام سے لے کر آج تک جب ایسا کوئی شخص نہیں پایا گیا تو حدیث اور قرآن میں اس طرح فرق کرنا جس سے انکار حدیث لازم آئے یہ حماقت،بدبختی اور جہنم میں جانے کے بغیر کچھ نہیں قرآن پاک ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ہی حاصل ہوا صحابہ کرام اور تابعین اور تبع تابعین کے ذریعے ہم تک پہنچا اور حدیث پاک بھی زبان مصطفوی سے ہی حاصل ہوئی اور ہم تک پہنچنے کے ذرائع وہی ہیں جو قرآن پاک پہنچنے کے ہیں۔

حدیث بحیثیت حدیث اس طرح واجب العمل ہے جس طرح قرآن پاک ہے فرق صرف یہ ہے کہ قرآن پاک تواتر سے پہنچا لیکن احادیث تواتر، شہرت، احاد سے منقول ہیں پھر صحیح ،حسن، ضعیف وغیرہ قسمیں صرف راویوں کے حالات سے بنیں ورنہ احادیث میں ذاتی طور پر کوئی تقسیم نہیں۔

یہ بھی خیال رہے کہ اگر کسی ایک راوی کے متعلق بعض اہل علم نے غیر ثقہ ہونے کے متعلق کہا ہے اور دوسرے اہل علم نے اسے ہی ثقہ کہا ہے تو وہ مطلقاً غیر ثقہ کے زمرے میں نہیں آسکتا۔

اگر معاذ اللہ نبی کریم ﷺ گناہگار ہوتے اپنی خواہشات کے مطابق مسائل گھڑتے تو احادیث کے انکار کا کوئی پہلو نکلتا جب تمام انبیاء کرام نبوت سے پہلے اور بعد صغائر اور کبائر گناہوں سے پاک ہوتے ہیں۔اور دین اپنی خواہشات کے مطابق نہیں گھڑتے تو انبیاء کرام کے اقوال وافعال کا انکار کیسے؟

خصوصاً نبی کریم ﷺ کے متعلق رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ﴾

(پ ۲۷)

اور وہ کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں کرتے وہ تو نہیں کرتے مگر جو نہیں وحی کی جاتی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اگر اجتہاد سے کوئی کلام فرمایا تو اس میں اللہ تعالیٰ کا اذن ہوتا اور اس اجتہاد کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لی۔حضور ﷺ کا اجتہاد اپنی خواہشات کے مطابق نہیں ہوا کرتا تھا۔بلکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی رضا خوشنودی ہوتی۔یعنی آپ کا اجتہاد منشاء ایزدی ہوتا۔اسی مضمون کو علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

"ان الله اذا سوغ له عليه الصلوة والسلام الاجتهاد كان الاجتهاد ما يسند اليه وحيا لا نطقا عن الهوى"

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات لکھا کرتے تھے یعنی آپ کے ہر قول کو لکھ لیا کرتے تھے۔تو کچھ قریش نے کہا کہ حضور ﷺ کبھی کلام غصہ کے حال میں فرماتے ہیں آپ بھی انسان ہیں۔تم آپ کے ہر قول کو نہ لکھا کرو تو انہوں نے لکھنا بند کر دیا لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھی عرض کر دیا کہ میں نے کچھ لوگوں کے کہنے پر آپ کے ارشادات کو لکھنا بند کر دیا ہے جب کہ پہلے لکھا کرتا تھا تو آپ نے فرمایا:

" اكتب فوالذى نفسى بيده ماخرج منى الاالحق "

اے عبد اللہ تم میری ہر بات کو لکھ لیا کرو اس ذات کی قسم جس کے دست قدرت میں میری جان ہے۔میری زبان سے کبھی کوئی بات حق کے سوا نہیں نکلی۔

(از ضیاء القرآن)

حقیقت یہی ہے کہ اہل ایمان کے لئے قرآن پاک کے ساتھ ساتھ احادیث نبویہ کو تسلیم کرنا اور ان پر عمل کرنا ضروری ہے۔

قول حق قرآن ہے قول پیغمبر ہے حدیث
اہل دل کے سامنے تقریر ہے دونوں کی ایک

اس نے پھیرا دل اور اس نے دعوت ایمان دی
وہ خدا اور یہ نبی تدبیر ہے دونوں کی ایک

نجوم الفرقان:

راقم اپنی کاوش کو ''نجوم الفرقان'' کے نام سے موسوم کر رہا ہے۔ دعاء ہے اللہ تعالیٰ اسے شرف قبولیت عطاء فرمائے کوئی لغزش ہو جائے تو اسے معاف فرمائے۔ ابھی تک تو صرف سورۃ فاتحہ کی تفسیر ختم کی ہے مقدمہ بعد میں ساتھ ملا رہا ہوں یعنی یہ مقدمہ الحاقیہ ہے کوشش اور ارادہ یہی ہے کہ جہاں تک صحت اور زندگی اجازت دے قرآن پاک کی خدمت کو جاری رکھوں۔

نجوم الفرقان لکھنے کا خیال کیوں ہوا:

کئی احباب نے تفسیر لکھنے کے متعلق ارشاد فرمایا۔ خصوصا میرے اپنے گاؤں کہ حافظ محمد رستم خان خطیب مسجد جیلانیہ اسلام آباد، اور مولانا ضمیر احمد ساجد خطیب مسجد سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے اپنے اپنے مطالبہ کو کئی مرتبہ دہرایا۔

ان کے دو مرتبہ مطالبہ کے بعد میرے مخلص، مہربان، استاذ الاساتذہ محقق ومدقق حضرت علامہ مولنا عبدالرشید قریشی صاحب مدرس جامعہ رضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی نے بھی تفسیر لکھنے کا حکم فرمایا۔

لیکن میں اس عظیم کام کا اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھتا تھا اسی وجہ سے کافی دیر اسی غور وخوض میں ہو گئی۔ کہ میرے جیسا کم علم انسان کیا اتنا عظیم کام کر سکے گا یا نہیں۔

میری کتاب تذکرۃ الانبیاء کو دیکھ کر گوجرانوالہ سے ایک مولانا صاحب مجھے ملنے کی غرض سے جامعہ رضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی میں تشریف لائے لیکن میں وہاں سے چھٹی کر کے اسلام آباد اپنی رہائش گاہ میں آچکا تھا۔وہ ایک عزیز طالب علم نصیر الدین کو ساتھ لے کر اسلام آباد آ گئے۔

انہوں نے بھی تفسیر لکھنے کے متعلق فرمایا خیال رہے کہ میں مولانا صاحب کے اسم گرامی کو تو بھول گیا ہوں لیکن ان کے اخلاق حسینہ کو نہیں بھولا۔ان تمام ارشادات کی تعمیل پر عمل کرنے میں جہاں رکاوٹ کم علمی تھی وہاں یہ بھی خیال آرہا تھا کہ تفسیر نعیمی کے آٹھ پارے حضرت علامہ مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ کی علمی، تحقیقی تفسیر ہے اس سے آگے آپ کے صاحبزادہ اقتدار احمد خان صاحب کی بھی بہتر تفسیر ہے مجھے بولنے کا کچھ سلیقہ ہی تفسیر نعیمی سے آیا اس تفسیر کے ہوتے ہوئے۔اور مفکر اسلام حضرت علامہ پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ کی عظیم تفسیر ضیاء القرآن کے ہوتے ہوئے اور حضرت علامہ ابوالحسنات رحمہ اللہ کی تفسیر حسنات کے ہوتے ہوئے میرا تفسیر لکھنا کس مقصد کے پیش نظر ہوگا۔وہ مقصد یوں سامنے آ گیا کہ ایک مرتبہ کمال مہربانی فرماتے ہوئے استاذی المکرم حضرت مولانا عبد الحکیم شرف قادری مدظلہ العالی غریب خانہ میں تشریف لائے۔تو آپ نے دوران گفتگو فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ میں قرآن پاک کی خدمت کروں کیونکہ جس کتاب کو سمجھنے کے لئے ہم کتنے ہی علوم کتنے سالوں میں پڑھتے ہیں۔اس کا بھی تفصیلی مطالعہ کرنا چاہئے۔گویا کہ آپ کا مطلب یہ تھا کہ جب تک قرآن پاک کی تفسیر لکھنی نہ شروع کی جائے اس وقت تک تفصیلی طور پر تفاسیر کا مطالعہ نہیں ہوسکتا۔آپ کے اسی ارشاد سے میرے دل میں بھی تفاسیر کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوگیا۔لیکن پھر بھی تحریر کی طرف آتے ہوئے ڈر محسوس ہورہا تھا۔دل کو تسلی دیتا پھر ارادہ بدل لیتا۔

تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ''المصطفیٰ ویلفیر سوسائٹی ایف سکس ون اسلام آباد'' میں مجھے درس قرآن کے لئے مدعو کیا گیا وہاں سٹیج سیکرٹری رانا گل نواز صاحب نے میرا تعارف کراتے ہوئے یہ بھی کہا کہ یہ آج کل قرآن پاک کے حاشیہ کا کام کررہا ہے۔اگرچہ میں نے اپنے درس کی ابتداء میں ہی کہہ دیا کہ قرآن پاک کے حاشیہ کا کام میں نہیں کررہا بلکہ یہ ایک تصوراتی خاکہ ہے لیکن میں نے اپنے لئے اس اعلان کو نیک فال سمجھتے ہوئے جمعہ کو درس تھا پیر کو بوقت سحر اس نیک کام کا آغاز کردیا صحت

وزندگی کہاں تک ساتھ دیتی ہیں اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

اگرچہ عزیزم مولانا محمد اسحٰق ظفر صاحب بار بار یہ کہہ رہے ہیں کہ تفسیر پر کچھ بزرگ کام کر چکے ہیں کچھ کر رہے ہیں کچھ کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں تم درس نظامی کی نصابی کتب ہدایہ ودیگر عربی کتب پر حواشی و شروحات لکھو کیونکہ اس سے پہلے میں تلخیص المفتاح ،نور الایضاح ،قدوری اور کنز الدقائق پر عربی حواشی تحریر کر چکا ہوں۔

مولانا محمد اسحٰق ظفر صاحب مدرس جامعہ رضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی کا یہ مطالبہ کرنا کہ درسی کتب پر عربی حواشی تحریر کرنا بنسبت اردو تفسیر کے زیادہ ضروری ہے بہت وزن رکھتا ہے تاہم میرا تفاسیر کے مطالعہ کا شوق اور ذریعہ نجات کی امید بھی ایک بلند حیثیت رکھتے ہیں ۔ صرف ہدایہ کا حاشیہ بھی ایک دن کا کام نہیں کم از کم چار سال کا تقاضا کرتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کام وہی ہوگا جو رب تعالیٰ کو منظور ہوگا۔ جو کام بھی ہوا مسلک کو فائدہ ہوگا دل تو چاہتا ہے کہ بہت کام کروں لیکن صحت اجازت نہیں ۔ یقین جانئے کہ میں تصنیف کا کام خود اپنی سوچ اور اپنے ہاتھ سے کرتا ہوں۔ کسی سے تعاون حاصل نہیں کرتا۔ پروف ریڈنگ کی صرف دوست احباب سے معاونت طلب کر لیتا ہوں تحریر ایک اعصاب شکن کام ہے لیکن مسلک اور دین کی خدمت سمجھ کر کام کرتا رہتا ہوں۔

اظہار تشکر:

اصل میں سب سے بڑا کام تفاسیر کا حصول تھا کیونکہ جامعہ رضویہ کی لائبریری اگرچہ بہت بڑی ہے لیکن اس سے نفع حاصل کرنا میرے لئے اس وجہ سے ممکن نہیں کہ جامعہ کا قانون یہ ہے کہ ہر وہ کتاب جس کا ایک ایک نسخہ ہے وہ باہر جاری نہیں ہوسکتی بلکہ جامعہ کی لائبریری میں بیٹھ کر ہی اس سے فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ میں چونکہ تصنیف کا کام زیادہ طور پر سردیوں میں سحری کے وقت کرتا ہوں۔ رہائش اسلام آباد ہے اس وقت لائبریری سے کیسے نفع حاصل کروں۔ تصنیف کا کام میں اپنی

ذاتی کتب کی امداد سے کرتا ہوں۔ یا برادرم مولانا عبد الرشید صاحب مہربانی فرماتے ہیں لمبے وقت کے لئے کتب مطالعہ کے لئے عنایت فرماتے ہیں یہ ان کی مہربانی ہے۔

میرے پاس یہ تفاسیر ہیں۔مفاتیح الغیب المعروف بالکبیر للرازی، روح المعانی، تفسیر ابی السعود، مدارک التنزیل للنسفی ، جلالین ، مظهری ، زبدة التفسیر خلاصه فتح القدیر ، ضیاء القرآن ، الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ، بیضاوی سورة بقره ، حاشیه شیخ زاده سورة بقره، نعیمی سولہ پارے، شیعہ حضرات کی تفسیر قمی۔

مولانا عبد الرشید صاحب نے فراہم کیں۔احکام القرآن للجصاص ،تفسیر ابن عربی ، تفسیر عزیزی، صاوی ،حقانی ، مختصر تفسیر ابن کثیر للصابونی ، معارف القرآن

عزیزم مولانا سکندر حیات نے حاشية الشهاب علی البيضاوی ،مولوی محمد محمود احمد نے تفهیم القرآن عزیزم عظمت شاہ نے تبصیر الرحمن اور قاری محمد یعقوب صاحب نے ڈاکٹر غلام مرتضی کی انوار القرآن فراہم کیں (انوار القرآن کو علمی تفسیر نہیں پایا تقریباً ایسا ہی پایا جیسا کہ کوئی شخص بزعم خویش اپنے آپ کو علامہ سمجھے اور دوسرے علماء کو جاہل لیکن اس کی تحریر وتصنیف سے اس کی علمیت کا پتہ نہ چلے)۔تفسیرات احمدیہ مولانا عبد الحمید صاحب نے عطا کی ۔ جواہر طنطاوی جامعہ کی لائبریری سے حاصل ہوگئی۔ میرے زیر انتظام چلنے والے جامعہ جماعتیہ مہر العلوم شکریال راولپنڈی کے مدرس مولانا سمیع الدین صاحب نے الحسنات اور در منثور جس کے حاشیہ پر تفسیر ابن عباس بھی ہے عطا کیں تاہم مولانا ابوالحسنات رحمہ اللہ نے الحسنات کے مقدمہ میں ذکر کیا کہ افسوس تفسیر ابن عباس اصلی حالت میں آج موجود نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

میرے جامعہ کے ہی مدرس مولانا ضیاء الحق قریشی صاحب نے اپنے رشتہ دار میرے مہربان مولانا حبیب الرحمٰن صاحب آف سہال سے کچھ کتابیں جامعہ کے لئے لائیں۔ جوانہوں نے جامعہ کو بطور ہدیہ دیں۔ ان میں تفسیر خازن اور تفسیر ابن کثیر اور صدیق بھوپالوی کی فتح البیان تھیں۔

اس طرح مذکورہ بالا تفاسیر کا مطالعہ شروع کر دیا ہے ۔اللہ تعالیٰ حق سمجھنے اور لکھنے کی توفیق عطا فرمائے تمام تعاون کرنے والے حضرات کا شکر گزار ہوں اللہ تعالیٰ ان کو جزاء خیر عطا فرمائے۔

جامعہ کا ذکر آ گیا تو اس ضمن میں بھی دعاء کرنا ضروری سمجھا کہ اللہ تعالیٰ جامعہ جماعتیہ مہر العلوم کے ابتدائی بانی وسرپرست حاجی غلام احمد صاحب اور حاجی حبیب الرحمٰن صاحب (شکریال) اور اپنے دوست احباب علماء کرام اور اپنے محلہ ایف سکس ون اسلام آباد کے مہربان حضرات کے دین ودنیا کو بہتر بنائے ان کو نیک مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے۔

نجوم الفرقان میں ترجمہ:

پہلا ترجمہ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ہے اور دوسرا ترجمہ راقم کا لیکن راقم کا ترجمہ زیادہ طور پر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی نقل ہی رہے گا ممکن ہے کہیں کہیں حضرت علامہ پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ علیہ کے ترجمہ سے نقل کرنے کی ضرورت در پیش آجائے یا مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ اور علامہ احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ کے ترجمہ سے نقل کرنا پڑے۔ یوں سمجھیں کہ راقم کے ترجمہ میں انداز راقم کا اپنا ہوگا ترجمہ مذکورہ بالا تراجم میں سے کسی ایک سے حاصل ہوگا۔

نجوم الفرقان کو سمجھنے کے لئے:

☆ جس آیت کے متعلق وضاحت کی جارہی ہوگی اسی کے ضمن میں اگر کسی تفسیر سے مطلب حاصل کیا جائے گا تو اس پر جزء نمبر اور صفحہ نمبر لکھنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اگر کوئی حوالہ اس جگہ سے ہٹ کر ہوگا تو پھر ضرورت ہوگی کہ جزء اور صفحہ کا نمبر دیا جائے۔

☆ فقہ کی کتب کے عربی حواشی میں، میں نے بعض جگہ دو تین کتب کی عبارات کو جوڑ کر ایک عبارت تیار کی تو وہاں آخر میں، میں نے ان کتابوں کا نام ایک ہی بریکٹ میں تحریر کر دیا ہے۔ ممکن ہے وہ صورت یہاں بھی در پیش آجائے۔

☆ جب کسی تفسیر سے مطالب حاصل کرتا ہوں تو آسانی کے لئے میں اس پر کوئی نہ کوئی عنوان قائم کر دیتا ہوں۔ اگر دو تین عنوانات کے بعد کوئی حوالہ آرہا ہو۔ تو پہلے عنوانات کا حوالہ بھی وہی سمجھا جائے۔

☆ جہاں ''ماخوذ از'' یا ''از'' تحریر ہوگا (جیسے ماخوذ از کبیر۔ یا۔ از کبیر) وہاں یہ سمجھیں کہ اس تفسیر

سے مطلب تو حاصل کیا گیا ہے لیکن لفظی ترجمہ نہیں بات کو سمجھانے کے لئے آسان طریقہ قائم کیا گیا ہے۔ یقیناً اس میں کمی وبیشی بھی ہوگی تاہم کوشش یہی رہی اور یہی رہے گی۔ ان شاء اللہ کہ اس تفسیر کا مطلب نہ بدلنے پائے۔

☆ مفسرین کے اختلافات کو نہیں بیان کیا جارہا۔ کسی ایک تفسیر کو صرف ذہن میں بٹھا کر دوسری تفاسیر کو رد کرنے کا بفضلہٖ تعالیٰ کوئی ارادہ نہیں۔ مختلف تفاسیر کو مطالعہ کرنے کے بعد جو بات ذہن قبول کرے گا اسے ہی انشاء اللہ نقل کیا جائے گا یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ علامہ آلوسی نے کیا لکھا اور علامہ رازی نے کیا لکھا۔

میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ جن لوگوں کو تفسیر کبیر سمجھ آتی ہے وہ تو کبیر کو واقعی کبیر سمجھتے ہیں جن کو نہیں سمجھ آتی وہ صدیق بھوپالوی کی طرح یہی راگ الاپتے ہیں۔ " فیہ کل شئی الا التفسیر "اس میں ہر چیز کا ذکر ہے سوائے تفسیر کے۔ دراصل ان لوگوں کو یہ کہنے کی ضرورت اس لئے درپیش آتی ہے کہ تفسیر کبیر کے ہوتے ہوئے شان انبیاء کرام میں ان کو حملہ کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ اگر ایسی ناپاک جسارت کریں تو پہلے کبیر کے متعلق اپنے دل کی بھڑاس نکالیں گے پھر کہیں گستاخانہ کلمات ناپاک قلم سے معرض تحریر میں لائیں گے۔

محترم شاہ عبد الحق ابن پیر شاہ تراب الحق مدظلھما نے ایک مرتبہ برادرم قاری محمد آصف صاحب کے ذریعے راقم کی طرف پیغام بھیجا کہ کبیر سے نکات ایک کتابی شکل میں جمع ہوجائیں لیکن میں نے کہا کہ جب تک کبیر کا مکمل اور وسیع مطالعہ نہ کیا جائے ایسا ممکن نہیں پتہ یہ چلا کہ جن کو کبیر سمجھ آتی ہے وہ صدیق بھوپالوی جیسے لوگوں کے جال میں نہیں پھنستے۔

☆ میں نے اپنی تصنیفات میں حضرت علامہ پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ کے ساتھ عقیدت کے پیش نظر اور تفسیر ضیاء القرآن کو عظیم سمجھتے ہوئے جابجا اس کے لمبے لمبے اقتباسات پیش کئے۔ لیکن تفسیر میں ارادہ یہی ہے کہ بغیر کسی مجبوری کے ضیاء القرآن کی لمبی عبارت نہ پیش کی جائے تاکہ اس کی حسین عبارات اور اس کا حسن وجمال اسی کے ساتھ قائم رہے۔ تاہم ان شاء اللہ حصول برکت کے لئے چھوٹے چھوٹے اقتباسات پیش کرنے کا ارادہ ہے۔

☆ جن عربی، فارسی تفاسیر سے میں خود مسائل کو استنباط کروں گا وہی مسائل کسی اور اردو تفسیر میں بھی ہوئے اور یقیناً ہونے ہی ہیں وہ نقل نہیں ہوگی۔

☆ اگر کسی اردو تفسیر سے ہی وہ مسئلہ لیا گیا تو ان شاء اللہ اس کا حوالہ ضرور دیا جائے گا۔ وہ حوالہ دینے میں اپنے بزرگوں کے نام لکھنے میں اعزاز ہوگا اور برکت ہوگی اور سلف صالحین کی یاد ہوگی۔

☆ مسلک کے لحاظ پر کسی عالم سے اگرچہ تعلق نہ بھی ہو لیکن جب ان حضرات کو کسی تفسیر یا حاشیہ وغیرہ سے کچھ ذکر کیا تو ان شاء اللہ حوالہ ضرور دیا جائے گا۔

☆ اللہ کے فضل وکرم سے میں نے اپنی کسی تصنیف میں بھی کسی قول کو اپنی طرف منسوب نہیں کیا۔

☆ میں مجتہد نہیں ہوں بلکہ سلف صالحین کے ارشادات کو نقل کر کے جمع کرتا رہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سلف صالحین کی تفاسیر کو صحیح سمجھنے اور صحیح لکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

☆ جو شخص سلف صالحین سے ہٹ کر بزعم خویش اپنے دور کا بے مثل اور مجتہد اعظم بنا وہ دراصل سر کے بل گرا، بھٹکا لوگوں کو اس نے بھٹکایا۔

آج ﴿ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ ﴾ کی بحث میں الجھانیوالے اہلسنت وجماعت کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنیوالے اغیار کو فائدہ پہنچانیوالے بھی اسی قسم کے مجتہد اعظم ہیں۔

راقم کی پہچان:

راقم نے نور الایضاح کے عربی حاشیہ ذریعۃ النجاح کے ابتدائیہ میں اپنا اور اپنے خاندان اور اپنے مشائخ اور اپنے اساتذہ اور جن حضرات کے مدارس میں بحیثیت مدرس کام کیا (ان تمام) کا اجمالی تذکرہ کیا تھا۔ اب خیال تھا کہ کچھ تفصیلی طور پر ذکر کر دوں کہ مجھے میری اپنی حیثیت سے کم دیکھا جائے بلکہ میرے بزرگوں کی نسبت (خواہ حسب ونسب سے ہو یا تعلم کی حیثیت سے ہو یا ارادت کے طور پر) سے دیکھا جائے۔

لیکن ۲۶ نومبر ۲۰۰۰ء کو اپنے شیخ کامل حضرت پیر سید غلام محی الدین اور سید الاولیاء حضرت پیر مہر علی شاہ رحمھما اللہ گولڑوی کے مزار پر انوار دربار گہر بار پر حاضر ہونے کا اتفاق ہوا وہاں محفل سماع میں شریک ہوا ایک شعر سن کر ذہن وضمیر نے یہی کہا کہ تیری یہی پہچان، یہی تعریف کافی ہے۔ ہاں ہاں

یہ راہنمائی کیوں نہ ملتی میرے شیخ اب بھی میری راہنمائی کرر ہے ہیں گویا کہ آپ نے مجھے یوں کہا اے ناکارہ انسان تو اپنی پہچان اسی شعر سے کرادے یہی کافی ہے:

میں نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں　　نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکوں　　میں وہ مشت غبار ہوں

(عبدالرزاق بھترالوی حطاروی)

☆☆☆☆☆

﴿ اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴾

''اللہ کی پناہ شیطان مردود سے''

اعوذ: مشتق ہے عوذ سے، اس کے دو معنی ہیں:

(۱) التجاء واستجارہ (پناہ پکڑنا) (۲) التصاق (ملنا) کہا جاتا ہے۔ '' اطیب اللحم عوذہ '' اچھا گوشت وہ ہے جو ہڈی سے ملا ہوا ہے پہلی صورت میں معنی ہو گا اللہ کی پناہ یعنی '' التجیٰ الی رحمة الله وعصمته '' میں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اسی کی طرف سے عصمت (بچاؤ کا سہارا لیتا ہوں)۔

دوسری صورت میں معنی ہوگا۔ '' التصق نفسی بفضل الله وبرحمته '' میں اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے ملا رہا ہوں۔

الشیطان: اس میں دو قول ہیں۔ (۱) یہ مشتق ہے '' شطن '' سے جس کا معنی ہے دوری عام طور پر کہا جاتا ہے ''شطن دارک ''تمہارا گھر دور ہے۔

اس معنی کے لحاظ پر ہر سرکش کو شیطان کہا جائے گا خواہ وہ جن ہو یا انسان یا حیوان کیونکہ وہ سیدھی راہ سے دور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ ﴾

(اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن کئے ہیں انسانوں اور جنوں میں سے شیطان)۔

'' فجعل من الانسان شیاطین '' انسانوں میں سے شیطان بنائے گئے ہیں یعنی سیدھی راہ سے دور انبیاء کرام کے دشمن خواہ انسانی شکل میں نظر آئیں وہ درحقیقت شیطان ہی ہیں۔

الرجیم: اس کا معنی ہے، مرجوم، یعنی فعیل بمعنی مفعول ہے۔ جس طرح کہا جاتا ہے کف خضیب ای مخضوب رنگی ہوئی ہتھیلی۔ اسی طرح کہا جاتا ہے ''رجل لعین ای ملعون '' یعنی لعنت کیا ہوا شخص۔

مرجوم ہونے میں دوصورتیں ہیں۔

(۱) مرجوم ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر لعنت کی گئی ہو۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّکَ رَجِیْمٌ﴾ یہاں سے (جنت سے) نکل جا بیشک تو مردود ہے اسی معنی میں یعنی زبان سے لعن وطعن کرنے میں یہ ارشادات گرامیہ بھی استعمال ہیں۔

﴿ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّکَ ﴾

﴿ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ یٰنُوْحُ لَتَکُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِیْنَ ﴾

﴿ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّکُمْ ﴾

(۲) شیطان کو اس لئے مرجوم کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ اسے گرزوں سے ہانک کر آسمانوں سے نکال دیتے ہیں اس معنی کے لحاظ پر بھی ہر سرکش شریر پر رجیم کا اطلاق ہوگا کہ اسے ہاتھوں اور آلات سے بھگایا جاتا ہے رجیم کا معنی جب اردو میں مردود کیا جائے گا تو ان دونوں معنوں کو شامل ہوگا۔

تعوذ پڑھنے کا حکم: اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴾ (النحل ۹۸)

''تو جب تم قرآن پڑھو تو اللہ کی پناہ مانگو شیطان مردود سے''

﴿ وَاِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴾

(الاعراف ۲۰۰)

'' اور اے سننے والے اگر شیطان تجھے کوئی کونچا دے (وسوسہ ڈالے) تو اللہ کی پناہ مانگ بے شک وہی سننے والا جاننے والا ہے''

سورۃ حم السجدۃ میں بھی یہی آیت ہے صرف اس کے آخری الفاظ یہ ہیں '' اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ''۔

﴿ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ ﴾ (المؤمنون ۹۷)

''اور تم عرض کرو اے میرے رب تیری پناہ شیاطین کے وسوسوں سے''

تعوذ پڑھنے کا ثبوت احادیث سے:

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ دو شخص نبی کریم ﷺ کے پاس ایک دوسرے کو گالی دینے لگے ان میں سے ایک شخص بہت غضب میں ہوا یہاں تک کہ خیال کیا جاتا کہ شدید غصہ سے اس کی ناک پھٹنے لگی ہے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" انی لا علم کلمة لو قالها لذهب عنه ما یجد من الغضب فقال ما هی یا رسول الله قال یقول اللهم انی اعوذ بک من الشیطان الرجیم "

کہ میں ایک کلمہ جانتا ہوں اگر یہ شخص وہ پڑھے تو اس کا غصہ جاتا رہے۔ تو آپ سے پوچھا گیا یارسول اللہ وہ کون سا کلمہ ہے تو آپ نے فرمایا وہ یہ پڑھے:

" اللهم انی اعوذ بک من الشیطن الرجیم " اے اللہ بے شک مجھے تیری پناہ شیطان مردود سے۔

اس میں فائدہ یہ ہے کہ انسان کو چونکہ معلوم ہے کہ وہ اس جہان کے مصالح (بہتر کام) اور مفاسد (بربادی والے کام) کو بہت کم ہی جانتا ہے۔ وہ تھوڑا علم اپنی عقل کی مدد سے حاصل کرتا ہے اور غضب کے وقت اس کی عقل زائل ہو جاتی ہے غصہ کے حال میں جو کام کرتا ہے یا جو بات کہتا ہے وہ قانون، اعتدال سے ہٹ کر ہوگی۔ جب عقل میں غصہ خلل انداز ہو گیا اور اپنے قول وفعل پر اعتماد نہ رہا تو ضروری ہے کہ خیرات کے حصول اور آفات سے بچاؤ کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہوئے کہے **" اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم "**

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ انسان جب کسی دوسرے سے لڑتا ہے تو دونوں کو یقینی طور پر کوئی علم حاصل نہیں ہوتا کہ کون حق پر ہے اس لئے اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کی سپرد کرتے ہوئے " اعوذ باللہ " پڑھے کہ اے اللہ اگر میں حق پر ہوں تو میرے خصم (مدمقابل) کو یہ توفیق عطا فرما کہ وہ میرے حق پر ہونے کا اعتراف کرے مجھے میرے حقوق دے دے اور مجھ پر کوئی ظلم نہ کرے اور اگر میرا مدمقابل حق پر ہے تو اے اللہ تعالیٰ مجھے یہ توفیق عطا فرما کہ میں اس کے حقوق کی پاسداری کرسکوں اور کسی قسم کا اس پر ظلم نہ کروں۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ انسان کو جب غصہ آتا ہے تو وہ اپنے آپ کو بڑا بہادر اور قوی سمجھتا ہے۔ چاہتا یہ ہے کہ میں اپنے مدمقابل کو اپنی گرفت میں لے لوں اس پر قہر وغضب کروں اسے چیر پھاڑ دوں۔ لیکن جب وہ یہ خیال کرے کہ اللہ تعالیٰ مالک کائنات مجھ سے زیادہ قوت اور قدرت کا مالک ہے میرے گناہ عیوب بار بار دیکھنے کے باوجود مجھے معاف کر رہا ہے تو اسے یقیناً یہ بھی خیال آئے گا کہ مجھے بھی اس شخص کو معاف کرنا چاہئے کیونکہ مجھے تو یہ بھی یقین نہیں کہ حق پر کون ہے جب کہ رب تعالیٰ میرے حق پر نہ ہونے اور گناہ کرنے کے باوجود معاف فرما رہا ہے تو میں کیوں نہ معاف کروں۔

حضرت معقل ابن یسار رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا:

" من قال حين يصبح ثلاث مرات اعوذ بالله من الشيطن الرجيم وقرأ ثلاث آيات من آخر سورة الحشر وكل الله به سبعين الف ملك يصلون عليه حتى يمسي فان مات في ذلك اليوم مات شهيدا ومن قولها حين يمسي كان بتلك المنزلة "

" جس شخص نے صبح کے وقت تین مرتبہ " اعوذ بالله من الشيطن الرجيم " پڑھا اور اس کے بعد سورۃ حشر کی آخری تین آیات کی تلاوت کی اللہ تعالیٰ اس پر ستر ہزار فرشتے مقرر کر دیتا ہے جو شام تک اس کے لئے دعاء رحمت کرتے رہتے ہیں اگر اس شخص کی اسی دن وفات ہوگئی تو اسے شہید کی وفات حاصل ہوئی۔ اور اگر کوئی شام کو پڑھے گا تو صبح تک اسے یہی مرتبہ حاصل رہے گا "۔

حدیث پاک سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ انسان جب " اعوذ بالله " پڑھے گا تو اسے اپنا کامل طور پر عاجز ہونا سمجھ آئے گا اور کامل طور پر اپنی کوتاہیوں کو جان لے گا۔ اور سورۃ حشر کی آخری تین آیات میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی صفات کا ذکر ہے اس لئے ان کو پڑھنے سے اللہ تعالیٰ کے کمال و جمال اور عظمت کا مشاہدہ حاصل ہوگا۔ انسان کو عبودیت میں کامل مقام ان دو چیزوں کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔

یعنی انسان دراصل وہی انسان ہے جو اللہ تعالیٰ کے عبادت کرنے اور اپنے عجز میں کامل درجہ رکھتا ہو اور یہ مقام اس وقت تک نہیں حاصل ہوسکتا جب تک انسان کو اپنے عاجز ہونے اور رب تعالیٰ

کے بزرگ ترین ہونے کا علم حاصل نہ ہو۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا :

" من استعاذ فی الیوم عشر مرات وکل اللہ تعالیٰ بہ ملکا یذود عنہ الشیطان "

جس شخص نے دن میں دس مرتبہ " اعوذ باللہ " پڑھا اللہ تعالیٰ اس کے لئے ایک فرشتہ مقرر کردیتا ہے جو اس شخص سے شیطان کو دور رکھتا ہے۔

انسان جب " اعوذ باللہ " پڑھے گا تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ مجھے خود کوئی طاقت اور علم حاصل نہیں جو کچھ حاصل ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے حاصل ہے جب یہ بات اسے سمجھ آئے گی تو شیطان بھی اسے وسوسہ نہیں ڈال سکے گا کیونکہ وہ اعتراف کرچکا ہے کہ اے اللہ تیرے نیک بندوں کو میں راہِ راست سے بھٹکا نہیں سکوں گا اور اس شخص پر بڑے شیطان یعنی نفس امارہ کا داؤ بھی نہیں چل سکے گا۔

☆ خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" من نزل منزلا فقال اعوذ بکلمات اللہ التامات من شر ماخلق لم یضرہ شئی حتی یرتحل من ذلک المنزل "

" جو شخص کسی جگہ پر قیام کرے تو یہ پڑھے " اعوذ بکلمات اللہ التامات من شر ماخلق " تو اسے کوئی چیز نقصان نہیں پہنچائے گی یہاں تک کہ وہ اس جگہ سے کوچ کر جائے "۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ واضح ہے کہ روحانی شخصیات زیادہ ہیں جسمانی شخصیات سے کیونکہ آسمان پاک ارواح سے بھرے ہوئے ہیں جس طرح نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" اطت السماء وحق لھا ان تئط مافیھا موضع قدم الاوفیہ ملک قائم او قاعد "

آسمان چر چرایا اور اس کا حق ہے کہ چر چرائے کیونکہ اس میں ایک قدم رکھنے کی جگہ بھی نہیں مگر یہ کہ اس میں کوئی نہ کوئی فرشتہ کھڑا یا بیٹھا ہے یعنی عبادت کر رہا ہے۔

☆ عمرو بن شعیب اپنے باپ، دادا سے روایت کرتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب

تم میں سے کوئی شخص نیند میں ڈرے تو یہ پڑھے:

" اعوذ بكلمات الله التامة من غضبه وعقابه وشرعباده ومن شر همزات الشياطين وان يحضرون "

......ان الفاظ کو پڑھنے سے (اس کا ڈر جاتا رہے گا) اور اسے کوئی نقصان نہیں ہوگا حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جب بھی کوئی غلام بالغ ہوتا آپ اسے یہی کلمات سکھاتے تا کہ وہ پڑھے:

"ومن لم يبلغ كتبها في صك ثم علقها في عنقه"

اور جو بالغ نہ ہوتا تو آپ کسی کاغذ پر لکھ کر اسکے گلے میں ڈال دیتے تھے۔صحابی رسول اللہ ﷺ کے فعل سے تعویذ لکھ کر گلے میں ڈالنا ثابت ہے اسی پر اہل اعلم، اہل تقوی کا آج بھی عمل ہے۔

☆ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ حضرت امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما کے لئے ان الفاظ سے تعوذ پڑھتے:

" اعيذ كما بكلمات الله التامة من كل شيطن وهامة ومن كل عين لامة "

اور آپ فرماتے کہ میری جد امجد ابراھیم علیہ السلام بھی ان الفاظ سے ہی حضرت اسماعیل اور حضرت اسحٰق علیھما السلام کے لئے تعوذ پڑھتے۔

☆ حضرت سوید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو منبر پر یہ پڑھتے ہوئے سنا " اعوذ بالله من الشيطن الرجيم " اور آپ نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے " اعوذ بالله من الشيطن الرجيم " پڑھتے ہوئے سنا۔" فلا احب ان اترك ذلك مابقيت " میں نہیں چاہتا کہ ان الفاظ کو پڑھنا چھوڑ دوں جب تک میں زندہ ہوں۔

☆ نبی کریم ﷺ اکثر اوقات میں تعوذ ان الفاظ سے پڑھتے تھے :

" اعوذ برضاك من سخطلك واعوذ بعفوك من غضبك واعوذ بك منك "

تعوذ پڑھنے کی وجہ: "والمقصود من الاستعاذة رفع شر الشيطان"

تعوذ پڑھنے کا اصل مقصد شیطان کے شر سے بچنا ہے شیطان کا شر وسوسہ سے ہوتا ہے یا اس کے علاوہ کوئی اور وجہ ہوگی۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سود کھانے والوں کے متعلق فرمایا:

"لا یقومون الا کمایقوم الذی یتخبطه الشَّیْطٰنُ من المس "

قیامت کے دن نہ کھڑے ہوں گے مگر جیسے کھڑا ہوتا وہ جسے آسیب نے چھوکر مخبوط بنادیا ہو۔یعنی جس طرح شیطان کا چھوا ہوا آسیب زدہ سیدھا کھڑا نہیں ہوسکتا قیامت کے دن سودخور بھی اسی طرح ہوگا۔یہاں سے واضح ہوا کہ شیطان کبھی چھوکرانسان کونقصان پہنچاتا ہے شیطان کا یہ شر وسوسہ کے علاوہ ہے۔

شیطانی وسوسہ سے پناہ پکڑنے کا حکم:

" وقل رب اعوذ بک من همزات الشیاطین ☆واعوذ بک رب ان یحضرون"

اورتم عرض کرواے میرے رب تیری پناہ شیطان کے وسوسوں سے اور اے میرے رب تیری پناہ کہ وہ میرے پاس آئیں۔

ان آیات میں واضح طور پر شیطانی وسوسوں سے پناہ پکڑنے کا رب تعالٰی نے حکم فرمایا ہے۔

﴿ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ☆ مَلِكِ النَّاسِ☆ اِلٰهِ النَّاسِ ☆ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ☆الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ☆مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ☆ ﴾

" تم کہو میں اس کی پناہ میں آیا جو سب لوگوں کا رب، سب لوگوں کا بادشاہ، سب لوگوں کا خدا، اس کے شر سے جودل میں برے خطرے ڈالے اور دبک رہے۔وہ جولوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتے ہیں جن اور آدمی"

اس سورۃ سے بھی واضح ہوا کہ رب تعالٰی نے شیطان کے وسوسوں سے پناہ پکڑنے کا حکم دیا۔اور یہ بھی واضح ہوا کہ شیطان وسوسے ڈالنے والے جنوں میں سے ہوتے ہیں اور انسانوں میں سے بھی ہوتے ہیں۔ (ازکبیر)

وسوسہ کیا ہے؟ " الخواطر ان کانت تدعو الی الرذائل فهی وسوسة وان کانت الی الفضائل فهی الهام " (مرقاۃ ج اول ص ۱۳۳)

دل میں آنے والے خیالات اگر رذیل (برے) کاموں کی دعوت دیں تو یہ وسوسہ ہے اور اگر اچھے کاموں کی دعوت دیں تو یہ الہام ہے۔

خیال رہے کہ انبیاء کرام کا الہام تو حجت ودلیل ہوتا ہے لیکن دوسرے نیک لوگوں کا الہام حجت ودلیل نہیں کیونکہ انبیاء کرام کے خواطر (دل میں آنے والے خیالات) باوثوق ہوتے ،لیکن باقی لوگوں کے ایسے نہیں۔

شیطان کے وسوسہ کا ذکر احادیث سے:

اس سے پہلے جب ذکر کیا جاچکا ہے کہ قرآن پاک سے واضح طور پر ثابت ہے کہ شیطان کے وسوسوں سے پناہ پکڑنے کا رب تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔اب اسی مسئلہ پر احادیث مبارکہ کو پیش کیا جاتا ہے کہ شیطان انسان کو وسوسے ڈال کر بھٹکاتا ہے گمراہ کرتا ہے لغزش میں مبتلا کرتا ہے۔

☆ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"ان الشیطان یجری من الانسان مجری الدم"

بیشک شیطان انسان میں خون کی طرح سرایت کرجاتا ہے (یعنی تمام رگوں میں جاری ہوتا ہے) (متفق علیہ)

"ان الشیطان ای کیدہ ووسواسہ یجری ای یسری من الانسان ای فیہ"

یعنی شیطان کا مکروفریب اور وسوسہ ڈالنا انسان میں اس طرح اثر انداز ہوتا ہے اور ایسے سرایت کرتا ہے جس طرح انسان کی رگوں میں خون سرایت کرتا ہے شیطان کے وسوسہ ڈالنے کو خون کی سرایت سے تشبیہ دینے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جس طرح خون کی سرایت کو انسان نہیں محسوس کرتا ایسے ہی شیطان کے وسوسوں کو محسوس نہیں کرسکتا۔اور دوسری وجہ تشبیہ یہ ہے کہ جس طرح خون تمام رگوں اور تمام اعضاء میں سرایت کرتا ہے اسی طرح شیطان کو بھی رب تعالیٰ کی طرف سے مہلت دی گئی ہے لہذا وہ انسان کو بھٹکانے میں کامل طور پر قادر ہوتا ہے اور خصوصاً نفس امارہ کے ذریعے وہ کامل طور پر تصرف کی اہلیت رکھتا ہے کیا خوب کہا یحیٰ بن معاذ نے :

"الشیطان فارغ وانت مشغول وھو یراک وانت لاتراہ وانت تنسی الشیطان وھو لا ینساک ومن نفسک للشیطان علیک عون"

شیطان فارغ رہتا ہے اور تو مشغول ہے وہ تمہیں دیکھ رہا ہوتا ہے اور تم اسے نہیں دیکھ سکتے تم شیطان کو بھول جاتے ہو اور وہ تمہیں نہیں بھلاتا اور تمہارا اپنا نفس ہی

تمہارے خلاف شیطان کا مددگار ہے۔

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا اِنَّمَا یَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِیَکُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ ﴾

بیشک شیطان تمہارا دشمن ہے تو تم بھی اسے دشمن سمجھو وہ تو اپنے گروہ اسی لئے بلاتا ہے کہ دوزخیوں میں ہوں۔

اور رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّیْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴾ خبردار بیشک شیطان کا گروہ ہی خسارہ میں ہے۔

لیکن اس کے برخلاف یوں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ خبردار اللہ ہی کی جماعت کامیاب ہے۔

واضح ہوا کہ شیطان وسوسہ ڈال کر اپنے گروہ میں انسان کو داخل کرتا ہے۔ اور شیطانی گروہ خسارہ میں ہے۔ جب انسان "اعوذ باللہ" پڑھ کر اپنے تمام امور اللہ تعالیٰ کے سپرد کردے گا اپنے عجز کا اعتراف کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی جماعت میں داخل ہوجائے گا۔ جس پر شیطان کا مکر نہیں چل سکے گا۔ تو انسان کو کامیابی حاصل ہوگی اور شیطان کا انسان میں خون کی طرح جاری ہونے کا یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ جس طرح زندگی بھر انسان کی رگوں اور اعضاء میں خون جاری رہتا ہے جب دورانِ خون بند ہوجائے تو موت واقع ہوجاتی ہے اسی طرح شیطان بھی انسان کا زندگی بھر پیچھا کرتا رہتا ہے ہر وقت بھٹکانے کی فکر میں رہتا ہے۔ (از مرقاۃ ج اول ص ۱۳۸)

☆ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" مامنکم من احد الا وقد وکل به قرینه من الجن وقرینه من الملائکة قالوا وایاک یارسول الله قال وایای ولکن الله اعاننی علیه فاسلم فلایامرنی الابخیر " (رواہ مسلم)

تم میں سے کوئی ایک شخص بھی نہیں مگر یہ کہ اس پر اس کا ایک صاحب جنوں میں سے مسلط کردیا جاتا ہے اور ایک صاحب فرشتوں سے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا آپ کے ساتھ بھی یارسول اللہ؟ آپ نے فرمایا ہاں میرے ساتھ بھی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے خلاف میری امداد فرمائی وہ میرا مطیع ہوگیا۔ مجھے سوائے بھلائی کے کوئی حکم نہیں دے سکتا۔

شیطانوں سے جو قرین (صاحب) مسلط کیا جاتا ہے اس کا نام ہی وسواس ہوتا ہے اور وہ ابلیس کی اولاد سے ہوتا ہے جس طرح انسان تمام بنی آدم ہیں۔

اور یہ انسانوں کو شر کا حکم دے گا۔یعنی برے کاموں کی طرف لگانے کی کوشش میں رہے گا اور فرشتوں سے قرین (صاحب) کا نام ملہم ہوتا ہے وہ انسانوں کو نیکی کی راہنمائی کرتا۔یہ قرین مقرر کرنے میں حکمت یہ ہوتی ہے کہ عاصی کی خست (نافرمان کی ذلت) اور فرمانبردار کی شرافت واضح ہوجائے۔واللہ اعلم حدیث شریف میں استعمال لفظ " فاسلم "کو دو طرح پڑھا گیا ہے ایک میم کی پیش سے جس کا معنی یہ ہے " اسلم انا منه " میں اس سے سلامتی میں ہوں اور ایک میم کی زبر سے اس کا معنی ہے " استسلم وذل وانقاد " وہ میرا مطیع ہوگیا مجھ سے عاجز ہوگیا۔

شیطان کا شیخ نجدی کی شکل آ کر مشرکین مکہ کو مشورہ دینا:

ایک دفعہ مشرکین مکہ اپنے میٹنگ کے مکان میں جمع ہوئے ،کہ محمد ﷺ سے کس طرح اپنے آپ کو بچایا جائے اور اس سے کس طرح جان چھڑائی جائے:

" فدخل عليهم ابليس فی صورة شيخ فقال انا من نجد سمعت اجتماعكم فاردت ان احضركم ولن تعدموا منی رأيا ونصحا "

ان کے پاس شیطان ایک بزرگ کی شکل میں آ گیا، کہنے لگا کہ میں نجد سے آیا ہوں ،میں نے تمہارے (محمد کے خلاف) اجتماع کے متعلق سنا تو میں نے ارادہ کیا کہ میں تمہیں نصیحت کروں اور اپنی رائے دوں اس لئے میں تمہارے پاس آ گیا ہوں امید ہے کہ تم میری رائے اور نصیحت کو رد نہیں کرو گے۔پہلے تم اپنی رائے پیش کرو۔جس کی رائے مجھے پسند آئی میں اس کی تائید کروں گا۔امید ہے کہ تم تمام اسے ہی پسند کرو گے۔

ابوالبختری نے کہا میری رائے یہ ہے کہ اس شخص کو ایک مکان میں بند کر دیا جائے۔دروازے بند کر دیئے جائیں آنے جانے کا کوئی راستہ نہ ہو بلکہ صرف ایک روشن دان ہو جس سے اندر کھانے پینے کی چیزیں پھینک دی جائیں اسی حال میں وہ شخص رہے یہاں تک کہ مرجائے۔

شیخ نجدی نے کہا یہ رائے بہت بری ہے اس میں تمہیں کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی کیونکہ اس کی قوم کے لوگ آ کر تمہارے ساتھ جنگ کر کے اسے چھڑا کر لے جائیں گے۔

ہشام بن عمرو نے کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ اسے ایک اونٹ پر سوار کر کے اپنی سرزمین سے نکال دیا جائے پھر اسے واپس نہ آنے دیا جائے اس پر تمہارا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

شیخ نجدی نے کہا یہ رائے بھی بہت بری ہے کیونکہ وہ شخص جہاں جائے گا وہاں لوگوں کو فساد میں (گمراہی میں) مبتلا کرے گا (معاذ اللہ) اور وہ لوگ اس کے ساتھ مل کر تمہارے ساتھ مقابلہ کریں گے اور جنگ کر کے تمہیں مغلوب کر دیں گے۔

ابوجہل نے کہا میری رائے یہ ہے کہ ہر قبیلہ سے ایک نوجوان کو منتخب کیا جائے اور ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک تلوار دے دی جائے، وہ سب مل کر ایک بار ہی حملہ کر کے اسے قتل کر دیں اس طرح خون مختلف قبائل میں بکھر جائے گا بنو ہاشم تمام قبائل سے لڑنے کی طاقت تو نہیں رکھیں گے البتہ وہ دیت طلب کریں گے وہ ہم دے دیں گے۔

شیخ نجدی نے اس کی رائے کو پسند کیا اسی رائے پر مجلس برخاست ہوگئی۔

(از مرقات ج ۱۱ ص ۲۱۸)

اس سے واضح ہوا کہ شیطان گمراہوں کا ساتھی ہے ہر برے کام میں ان کا مشیر ہوتا ہے۔ شیطان اور ابوجہل میں یگانگت تھی۔ شیطان اپنا مکر کرتا رہا۔ لیکن رب تعالیٰ کی خفیہ تدبیر کا مقابلہ نہ کر سکا۔ کافروں نے اپنا پروگرام ترتیب دے کر یکبارگی حملہ کرنے کے لئے نوجوانوں کو جمع کر لیا۔ لیکن ان کے محاصرہ کے دوران ہی رب تعالیٰ نے اپنے پیارے حبیب علیہ الصلوۃ والسلام کو ہجرت کا حکم دے کر اور بحفاظت آپ کو وہاں سے نکال کر شیطان کے مکر کو خاک میں ملا دیا۔ "اعوذ باللہ" پڑھنے سے انسان جب رب کی حفاظت میں آ جاتا ہے تو شیطان منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔

جنات وشیاطین کا ذکر قرآن پاک سے:

کچھ آیات کا ذکر پہلے "پناہ پکڑنے" کی بحث میں گزر چکا ہے مزید کچھ آیات مبارکہ کو دیکھا

جائے تو واضح ہو جائے گا کہ قرآن پاک میں مختلف مقامات میں جنوں اور شیطانوں کا ذکر ہے :

﴿ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴾ (الحجر ۲۷)

''اور جن کو اس (انسان) سے پہلے بنایا بے دھوئیں کی آگ سے''

﴿ وَاِذْ صَرَفْنَا اِلَیْکَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ یَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْا اَنْصِتُوْا فَلَمَّا قُضِیَ وَلَّوْا اِلٰی قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِیْنَ قَالُوْا یَا قَوْمَنَا اِنَّا سَمِعْنَا کِتَابًا اُنْزِلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰی مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ یَهْدِیْ اِلَی الْحَقِّ وَاِلٰی طَرِیْقٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴾

''اور جب کہ ہم نے تمہاری طرف کتنے جن پھیرے کان لگا کر قرآن سنتے پھر جب وہاں حاضر ہوئے آپس میں بولے خاموش رہو پھر جب پڑھنا ہو چکا اپنی قوم کی طرف ڈر سنانے پلٹے ۔ بولے اے ہماری قوم ہم نے ایک کتاب سنی کہ موسیٰ کے بعد اتاری گئی اگلی کتابوں کی تصدیق فرماتی حق اور سیدھی راہ دکھاتی''۔

ان آیات میں جنوں کا نبی کریم ﷺ سے فجر کی نماز میں قرآن پاک کے سننے کا ذکر ہے۔

یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب کہ آپ نے فجر کی نماز مکہ اور طائف کے درمیان بطن نخلہ میں ادا فرمائی تھی یہ اسی وقت جو جن حاضر تھے انہوں نے قرآن پاک کو سن کر ایمان لایا اور پھر نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی پر اپنی قوم (دوسرے جنوں) کو دعوتِ ایمان دینے گئے ۔صرف ان دو مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے ورنہ قرآن کی بہت سی آیات مبارکہ میں جنوں اور شیطانوں کا ذکر موجود ہے۔

تعوذ پڑھنے میں فوائد نمبر ا:

جب حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کے لئے دعا کی کہ اے اللہ یہ میرا بیٹا ہے جو میری اہل سے ہے رب تعالیٰ نے فرمایا یہ تمہاری اہل سے نہیں اس کے عمل اچھے نہیں یعنی کافر ہے ۔تو نوح علیہ السلام نے عرض کیا :

'' رب انی اعوذ بک ان اسالک مالیس لی بہ علم ''

عرض کی اے میرے رب میں تیری پناہ چاہتا ہوں کہ تجھ سے وہ چیز مانگوں جس کا مجھے علم نہیں۔

" فعند هذا اعطاه الله خلعتین و السلام و البرکات " جب نوح علیہ السلام نے اعوذ کو پڑھا تو رب تعالیٰ نے آپ کو دو انعام عطا فرمائے ایک سلام اور دوسرا برکات۔ رب تعالیٰ نے ان دو نعمتوں کا ذکر ان الفاظ مبارکہ سے فرمایا ﴿قِیْلَ یٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَکٰتٍ عَلَیْکَ﴾ فرمایا گیا اے نوح کشتی سے اتر ہماری طرف سے سلام اور برکتوں کے ساتھ۔

جب حضرت یوسف علیہ کو عزیز مصر کی زوجہ (زلیخا) نے اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی تو آپ نے کہا " فعاذ الله انه ربی احسن مثوای " کہا اللہ کی پناہ وہ عزیز تو میرا پرورش کرنے والا ہے اس نے مجھے اچھی طرح رکھا جب حضرت یوسف علیہ السلام نے تعوذ کو پڑھا تو رب تعالیٰ نے آپ کو دو نعمتوں سے نوازا۔ ایک برائی کا آپ سے دور رکھنا۔ اور دوسری بے حیائی سے دور رکھنا۔ ان دو نعمتوں کو رب تعالیٰ نے ذکر کرتے ہوئے فرمایا ﴿کَذٰلِکَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ﴾ ہم نے یوں ہی کیا کہ اس سے برائی اور بے حیائی کو پھیر دیں۔

اسی طرح یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی بنیامین کو رب تعالیٰ کی مرضی کے مطابق چوری کا الزام لگا کر اپنے پاس رکھ لیا تو آپ کے بھائیوں نے کہا ﴿فَخُذْ اَحَدَنَا مَکَانَهٗ﴾ تو ہم میں سے اس کی جگہ کسی کو لے لو۔ تو آپ نے ان کے جواب میں فرمایا:

﴿مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗ﴾ کہا اللہ کی پناہ کہ ہم لیں مگر اسی کو جس کے پاس ہمارا مال ملا۔ تو رب تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے تعوذ پڑھنے پر ان کو اس عظیم نعمت سے نوازا۔ ارشاد باری تعالیٰ دیکھئے ﴿وَرَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَی الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا﴾ اور اپنے ماں باپ کو تخت پر بٹھایا اور سب اس کے لئے سجدہ میں گرے یعنی رب تعالیٰ نے آپ کو ماں باپ سے ملایا اور ماں باپ کو عزت وتکریم سے بٹھانے کی توفیق عطا فرمائی اور آپ کے ماں باپ اور بھائیوں سے تعظیمی سجدہ کرا کر آپ کی خواب کو سچا فرمایا جو آپ نے ایک مرتبہ خواب دیکھا تھا کہ "میں دیکھ رہا ہوں کہ مجھے چاند اور سورج اور گیارہ ستارے سجدہ کر رہے ہیں"۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تعوذ پڑھنے کا ذکر رب تعالیٰ نے فرمایا جب کہ آپ نے اپنی قوم کو

ایک مردہ کے زندہ کرنے کے لئے گائے کو ذبح کرنے کا حکم دیا۔تو آپ کی قوم نے کہا﴿ اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا قَالَ اَعُوْذُ بِاللهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴾ کیا آپ ہمیں مسخرہ بناتے ہو؟ فرمایا اللہ کی پناہ کہ میں جاہلوں سے ہوں۔

یعنی قوم نے جب کہا کہ مردہ کو ذبح کی گئی گائے کے گوشت کے ٹکڑہ مارنے سے زندہ کرنا عقل کے خلاف ہے۔اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ تم ہمارے ساتھ استہزاء اڑا رہے ہو۔آپ نے فرمایا کہ استہزاء (ٹھٹھا، بیہودہ مزاح) اڑانا تو جاہلوں کا کام ہے میں تو نبی ہوں لیکن پھر بھی آپ نے اپنا معاملہ رب کے سپرد کرتے ہوئے تعوذ کو پڑھا۔اس تعوذ پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو دو نعمتیں عطاء کیں " ازالۃ التھمة واحیاء القتل " ایک استہزاء کی تہمت کا زائل کرنا اور دوسری مردہ کو زندہ کرنا۔

ان نعمتوں کا تذکرہ رب تعالیٰ نے یوں فرمایا:

﴿ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ ﴾ تو ہم نے فرمایا اس مقتول کو اس گائے کا ایک ٹکڑا مارو اللہ یوں ہی مردے زندہ کرے گا اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے۔

اسی طرح جب موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اس کی قوم نے قتل کی دھمکی دی تو آپ نے رب تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے کہا:

﴿ وَاِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ﴾

اور میں پناہ لیتا ہوں اپنے رب اور تمہارے رب کی اس سے کہ تم مجھے سنگسار کرو۔

اور دوسرے مقام پر آپ کے تعوذ کا ذکر ان الفاظ مبارکہ سے کیا گیا" وقال موسی انی عذت بربی وربکم من کل متکبر لایؤمن بیوم الحساب " اور موسیٰ نے کہا میں تمہارے اور اپنے رب کی پناہ لیتا ہوں ہر متکبر سے کہ حساب کے دن پر یقین نہیں لاتا۔

موسیٰ علیہ السلام کی اس تعوذ پر کیا انعام حاصل ہوا؟

" فاعطاه الله تعالیٰ مراده فافنی عدوهم واورثهم ارضهم وديارهم "

اللہ تعالیٰ نے آپ کی مراد کو پورا فرمایا (یعنی آپ کو دشمن پر برتری عطا فرمائی بنی اسرائیل کو نجات

دی) آپ کے دشمن کو ہلاک کیا۔اور آپ کو اور آپ کی قوم بنی اسرائیل کو ان کی زمین اور شہروں کا (یعنی تمام جائیداد کا) وارث بنایا۔

حضرت مریم علیہا السلام نے جب دیکھا کہ خلوت میں جبریل انسانی شکل میں آپ کی طرف آرہا ہے تو آپ نے اسے انسان ہی سمجھتے ہوئے کہا:

﴿ قَالَتْ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْکَ اِنْ کُنْتَ تَقِیًّا ﴾

بولی میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں اگر تجھے خدا کا ڈر ہے۔

حضرت مریم کے تعوذ پڑھنے پر آپ کو کیا ثمرہ (فائدہ) حاصل ہوا؟

" فوجدت نعمتین ولدا من غیر اب وتنزیه الله ایاها بلسان ذلک الولد عن السوء "

آپ کو دو نعمتیں حاصل ہوئیں بغیر باپ کے بیٹا آپ کو حاصل ہوا اور شیر خوار بیٹے کی زبان سے یہ کہلوا کر " انی عبد الله " (میں اللہ کا بندہ ہوں) آپ سے تہمت کو دور کر دیا اور آپ کی پاک دامنی کا اعلان کرادیا۔

اس بحث سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ انبیاء کرام اور بزرگ ہستیاں تعوذ پڑھتی رہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو اپنی نعمتوں سے نوازتا رہا۔

نمبر ۲: " اعوذ بالله " سے انسان کو مخلوق سے خالق کی طرف عروج حاصل ہوتا ہے اور ممکن سے واجب کی طرف عروج حاصل ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو اپنے عاجز ہونے اور رب تعالیٰ کے غنی اور قادر ہونے کی معرفت حاصل ہوتی ہے جو اس کے عروج کا سبب بنتی ہے انسان جب " اعوذ بالله " پڑھتا ہے تو وہ اپنے آپ کو کامل طور پر محتاج سمجھتا ہے اور اپنے محتاج ہونے کا گویا کہ برملا اظہار کرتا ہے۔اور ساتھ ہی یہ بھی اعتراف کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام خیرات کا عطا کرنے والا ہے اور تمام مصائب کا دور کرنے والا ہے دوسرے کسی کو ذاتی طور پر حاجات کو پورا کرنے اور مصائب کو دور کرنے کی کوئی طاقت نہیں جب انسان کو یہ حال حاصل ہوجاتا ہے تو وہ کامل طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نور جلال میں مستغرق ہوجاتا ہے اور مقام مشاہدہ کو پالیتا ہے یہی انسان کا مقامِ عروج ہے۔

نمبر ۳: جب انسان " اعوذ باللہ " پڑھ کر اپنے آپ کے عاجز ہونے اور رب تعالیٰ کے قادر ہونے کا اعتراف کرتا ہے تو اسی سے یہ فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ انسان اگر رب تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے بغیر عاجزی اور انکساری کے یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوسکتا۔

اسی پر نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے "من عرف نفسه فقد عرف ربه" جس نے اپنے نفس کو پہچانا تحقیق اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ :

" من عرف نفسه بالضعف والقصور عرف ربه بانه هو القادر علی کل مقدور" جس نے اپنے آپ کو ضعیف و عاجز اور کم ہمت اور قصور وار سمجھا اسے یہ معلوم ہو گیا کہ بیشک تمام قدرتوں کا مالک اللہ تعالیٰ ہے " ومن عرف نفسه بالجهل عرف ربه بالفضل والعدل" جس شخص نے اپنے آپ کو جاہل سمجھا اسے یہ پتہ چل گیا کہ رب تعالیٰ ہر قسم کے فضل اور عدل کا مالک ہے۔

" ومن عرف نفسه باختلال الحال عرف ربه بالکمال والجلال "

" جس شخص نے اپنے آپ کو اس طرح پہچانا کہ اس کے حال میں خلل اور نقص پایا جاتا ہے تو وہ رب تعالیٰ کے کمال اور جلال کو پہچان لے گا "۔

نمبر ٤: انسان " اعوذ باللہ " پڑھ کر رب تعالیٰ قادر مطلق کی پناہ پکڑتے ہوئے اپنے آپ سے آفات وبلیات (مصائب وآلام) کا دفاع چاہتا ہے پھر وہ کام جن میں شیطان وسوسہ ڈالتا ہے ان میں سے ہی قرآن پاک کا پڑھنا بھی ہے۔ کیونکہ جو شخص قرآن پاک پڑھتا ہے اور اس کے ذریعے رب تعالیٰ کی عبادت کی نیت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے وعد وعید (عذاب سے ڈرانا) آیات اور دلائل میں غور وفکر کرتا ہے تو اس کی نیکیوں پر عمل کرنے اور حرام کاموں سے خوف کی وجہ سے بچنے کی طرف رغبت زیادہ ہوجاتی ہے اسی وجہ سے قرآن پاک کا پڑھنا عظیم عبادت ہے جتنی عظیم عبادت ہو اتنی ہی شیطان کی کوشش بھی زیادہ ہوتی ہے کہ انسان کو اس سے دور رکھا جائے لہذا انسان قرآن پاک پڑھتے ہوئے شیطان کے وسوسہ مکروفریب سے بچنے کا زیادہ محتاج ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک پڑھنے سے پہلے " اعوذ باللہ " پڑھنے کا خصوصی طور پر حکم دیا گیا۔

نمبر ٥: شیطان انسان کا دشمن ہے جس طرح رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا﴾ بیشک شیطان تمہارا دشمن ہے تو تم بھی اسے دشمن سمجھو۔

اور رحمٰن انسان کا مولیٰ خالق اور مشکلات کا حل کرنیوالا ہے۔ پھر انسان جب طاعات وعبادات کو شروع کرتا ہے دشمن کا خوف رکھتا ہے۔

لیکن کوشش کرتا ہے کہ اپنے خالق کو راضی کر لے اور دشمن سے اپنے آپ کو بچالے۔ جب انسان عبادت میں خلوص، عجز اور انکساری سے دل کو حاضر کرلیتا ہے۔ تو وہ رب تعالیٰ کی رحمت وکرامت کے آثار کا مشاہدہ کرتا ہے تو اسے دشمن بھول جاتا ہے وہ کامل طور پر اپنے حبیب (اللہ تعالیٰ) کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

پہلا مقام شیطان سے دوری اور اسے بھول جانا یہ غیروں سے فرار ہے اور رب کی طرف توجہ ہے۔ اس مقام پر دلالت ہے **اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم** سے۔ اور دوسرا مقام کہ اپنے آپ کو رب تعالیٰ کے دربار میں حاضر سمجھے اور اپنی توجہ کا کامل طور پر مرکز رب تعالیٰ کو ہی سمجھے اس مقام پر دلالت ہے "**بسم اللہ الرحمن الرحیم**" سے۔

نمبر٦: اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ لَا يَمَسُّه' اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴾ اسے (قران پاک کو) نہ چھوئیں مگر باوضو۔

انسان کا دل جب غیر اللہ (اللہ کے ماسوا) کی طرف متوجہ ہو اور دل کا تعلق غیر اللہ سے ہو اور زبان سے غیر اللہ کا ذکر جاری ہو تو اس کی عبادت مکدر اور ملوث ہوگئی (گویا کہ گندگی سے مل جل گئی) اب ضروری ہے کہ اسے پاک کرنے کے لئے اس چیز کو استعمال کیا جائے جس میں پاک کرنے کی صلاحیت موجود ہو جب انسان "**اعوذ باللہ**" پڑھے گا تو اسے طہارت حاصل ہو جائے گی۔ اب وہ نمازِ حقیقی کے لئے اپنے آپ کو تیار سمجھے گا او وہ نماز حقیقی کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کا ذکر، اسے کے بعد کہے گا "**بسم اللہ الرحمن الرحیم**" گویا کہ تعوذ کے ذریعے اس نے اپنے آپ کو تسمیہ کے قابل بنالیا۔

تنبیہ: نماز حقیقی کے لفظ سے کوئی اس غلطی میں مبتلاء نہ ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں

مشغول رہنے سے نماز حقیقی جب حاصل ہوگئی تو ظاہری نماز ادا کرنے کی ضرورت نہ رہی۔ایسا سوچنا دین حق سے بغاوت ہے۔اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کون شخص رب تعالیٰ کی یاد میں زیادہ مشغول ہوسکتا ہے جب آپ نے نماز کو ترک نہیں فرمایا تو دوسرے کسی کی کیا مجال ہے یہ صرف بے دین لوگ کہتے ہیں کہ ہم ہر وقت اللہ کی یاد میں رہتے ہیں ہمیں نمازوں کی کیا ضرورت علماء اہل سنت (بریلوی مسلک) اس قسم کے ملنگوں، بھنگیوں، چرسیوں کو ولی نہیں کہتے ان کی آڑ میں کوئی شخص متقی اہل علم اولیاء کو اگر برا بھلا کہے تو یہ اس کی حماقت ہے۔

نمبر ۷: انسان کے دو دشمن ہیں ایک ظاہری دوسرا باطنی۔ان دونوں کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ظاہری دشمن کے متعلق رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَايُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ ﴾ قتال کرو ان لوگوں سے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور باطنی دشمن کے متعلق فرمایا ﴿ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ﴾ بیشک شیطان تمہارا دشمن ہے تو تم بھی اسے اپنا دشمن سمجھو۔مراد یہی ہے کہ اپنے باطنی دشمن شیطان سے جنگ کرو۔

ظاہری دشمن سے لڑائی اللہ تعالیٰ کی امداد کے بغیر نہیں ہوسکتی صحابہ کرام کی امداد رب تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعے کی جس کا ذکر فرمایا:

﴿ يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ الٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴾

تمہارا رب تمہاری مدد کو پانچ ہزار فرشتے نشان والے بھیجے گا۔

جب باطنی دشمن سے جنگ کرتے ہو تو وہاں بھی اللہ تعالیٰ کی امداد کی ضرورت ہے رب تعالیٰ نے شیطان کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

﴿ اِنَّ عِبَادِىْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ﴾ بے شک میرے بندوں پر تیرا کچھ قابو نہیں۔

باطنی دشمن سے جنگ کرنا زیادہ بہتر اور زیادہ ضروری ہے بنسبت ظاہری دشمن کے اس لئے کہ ظاہری دشمن تو دنیاوی نقصان دے سکتا ہے لیکن باطنی دشمن دین وایمان میں نقصان پہنچا سکتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ انسان ''اعوذ باللہ'' پڑھ کر باطنی دشمن یعنی شیطان سے اپنے آپ کو بچالے۔

نمبر ۸: بیشک مومن کا دل تمام مقامات سے اعلیٰ اشرف اور برتر ہے خوبصورت شہر، لہلہاتے

ہوئے باغات ، خوبصورت خوشنما پھول بھی دل سے مقابلہ نہیں کر سکتے ۔ بلکہ مؤمن کا دل صفائی میں آئینہ کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ آئینہ سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ آئینہ کے سامنے اگر حجاب (پردہ) آجائے تو کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی۔

" وقلب المؤمن لا یحجبه السموات السبع والکرسی والعرش "

"لیکن مؤمن کے دل کے سامنے سات آسمان کرسی اور عرش بھی حجاب نہیں بن سکتے"۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُه ﴾ اسی کی طرف چڑھتا ہے پاکیزہ کلام اور جو نیک کام ہے وہ اسے بلند کرتا ہے۔ بلکہ دل کے سامنے جتنے حجاب زیادہ آئیں اتنا ہی زیادہ دل اللہ تعالیٰ کے جلال کا مطالعہ کرتا ہے اور باری تعالیٰ کی صفات اتنی ہی زیادہ دل میں آتی ہیں۔

مومن کا دل تمام مقامات سے اشرف ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا " القبر روضة من ریاض الجنة " قبر جنت کے باغات میں سے ایک باغ ہے۔

قبر کو جنت کے باغ کی حیثیت صرف اس لئے حاصل ہوگی کہ اس میں میت اللہ کا نیک بندہ ہو تو اس حدیث سے واضح ہوا کہ مومن کا دل معرفت الٰہی کا تخت ہے اور اسے عرش الٰہی ہونے کا شرف حاصل ہے۔

اور اسی سے واضح ہوا ، تمام مقامات سے اعلیٰ ہے گویا رب تعالیٰ کی طرف سے بندے کو یہ کہا جاتا ہے : "یاعبدی قلبک بستانی وجنتی بستانک "

اے میرے بندے تیرا دل میرا باغ ہے اور میری جنت تیرا باغ ہے۔

اگر تو نے اپنے باغ سے میرے لئے کنجوسی نہ کی یعنی اپنے دل میں میری معرفت کو جگہ دی تو میں اپنے باغ سے تمہیں نہیں منع کروں گا گویا آسان لفظوں میں یوں کہا جائے کہ رب تعالیٰ کہتا ہے اے میرے بندے تو مجھے یاد کر تو بلا رکاوٹ میری جنت میں آجا۔ اس سے بھی واضح ہوا کہ مؤمن کا دل تمام مقامات سے اعلیٰ ہے۔

رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْكٍ مُّقْتَدِرٍ ﴾

بیشک پرہیز گار باغوں اور نہر میں ہیں سچ کی مجلس میں عظیم قدرت والے بادشاہ کے حضور۔ اللہ تعالیٰ نے صرف "ملیک" (بادشاہ) نہیں کہا بلکہ "مقتدر" (قدرت والا) بھی ساتھ کہا کہ قیامت کے دن بادشاہی صرف رب تعالیٰ کی ہوگی اور تمام بندے اس قادر مطلق کے غلام ہونے کی حیثیت میں اس کے حضور ہوں گے۔

اسی سے اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ رب تعالیٰ انسان کو کہتا ہے کہ اگر تو نے میری جنت میں آنا ہے تو اپنے دل میں مجھے بسا لے۔ لیکن اگر اپنے دل میں مجھے بسانا ہے تو پہلے اپنے دل سے اپنے دشمن شیطان کو نکالنا ہوگا۔ یہ اسی وقت حاصل ہوگا جب تمہیں میری قاہر حکومت کا پتہ ہو میری جنت میں آنے کی تمنا کرو۔ واضح ہوا کہ مؤمن کا دل رب کی رحمت کا مسکن ہے لہذا تمام مقامات سے اعلیٰ ہے۔ یوں سمجھو کہ رب تعالیٰ نے کہا کہ اگر شیطان کو دل سے نکالنا ہے اور اس سے بچنا ہے تو پڑھو "اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم"۔

اعتراض: جب مومن کا دل اللہ تعالیٰ کا باغ ہے تو شیطان اس سے خود ہی کیوں نہیں نکل جاتا؟

جواب: اہل معرفت نے یہ کہا ہے کہ یوں سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کو یہ کہا جاتا ہے کہ اے انسان تو نے اپنے دل کے مکان میں معرفت کے بادشاہ کو لانا ہے۔ جو شخص یہ چاہے کہ وہ اپنے گھر میں بادشاہ کو لائے

"وجب علیه ان یکنس تلک الحجرة وان ینظفها ولا یجب علی السلطان تلک الاعمال"

تو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے گھر میں جھاڑو دے اپنے گھر کو صاف ستھرا رکھے یہ کام اسی شخص نے کرنے ہیں بادشاہ نے نہیں کرنے۔

جب تو رب تعالیٰ کو دل میں بسانا چاہتا ہے اس کے نور سے دل کو جگمگانا چاہتا ہے اس کی معرفت حاصل کرنا چاہتا ہے

" فنظف انت حجرة قلبک من لوث الوسوسة فقل اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم "

تو اپنے دل کے مکان کو وسوسہ کی گندگی سے صاف کر لے اس کے لئے تو پڑھ " اعوذ باللہ "۔

نمبر ۹ : گویا کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے اے انسان کیا تمہیں معلوم ہے کہ میرے اور شیطان کے درمیان کیا چیز حائل ہوئی جب کہ وہ فرشتوں کی طرح میری عبادت بھی کرتا تھا اور ظاہر طور پر میری خدائی کو بھی مانتا تھا؟ ہاں میرے اور اس کے درمیان صرف یہ چیز حائل ہوگئی کہ میں نے اسے تمہارے باپ آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کرنے کا حکم دیا اس نے تکبر کیا اور انکار کیا تو میں نے اسے اپنی خدمت سے ہٹا دیا دراصل اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ تمہارے باپ کا دشمن تھا۔ تمہارا کیا انصاف ہے کہ وہ عرصہ دراز سے تمہارے ساتھ بھی دشمنی کر رہا ہے لیکن تم اس کے ساتھ محبت کئے جا رہے ہو۔ وہ ہر نیکی کے کام میں تمہاری مخالفت کرتا ہے تم اس کی ہر مزاد کو پورا کرنے میں اس کی موافقت کئے جا رہے ہو۔

" فاترک هذه الطریقة المذمومة واظهر عداوته فقل اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم "

اے انسان تو یہ برا طریقہ چھوڑ دے اور شیطان کی عداوت ظاہر کر اور کہہ اعوذ باللہ۔

نمبر ۱۰ : اے انسان ذرا یوں تو خیال کر کہ تیرے باپ آدم علیہ السلام کو بھلانے اور جنت سے نکالنے میں شیطان نے کیا کہا؟ اس نے یہ کہا تم دونوں کا خیر خواہ ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النَّاصِحِينَ﴾

اور ان دونوں (آدم وحوا) سے قسم اٹھائی کہ میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں۔

اور اے انسان تیرے متعلق تو رب تعالیٰ سے مہلت لے کر یہ کہہ کر آیا ہے:

﴿ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ﴾

بولا تیری عزت کی قسم ضرور میں ان سب کو گمراہ کر دوں گا مگر جو ان میں تیرے چنے ہوئے بندے ہیں۔

اے انسان ذرا سوچ، غور کر جب وہ تیرے باپ کا خیر خواہ بن کر بھلانے اور جنت سے نکالنے کا سبب بن چکا ہے تیرے ساتھ تو کھلا اعلان جنگ کر چکا ہے۔ رب تعالیٰ کے سامنے قسم اٹھا کر برملا تجھے گمراہ کرنے کا وعدہ کر چکا ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کو گمراہ کرنے سے عجز کا اظہار کر چکا ہے اس لئے تو بھی " اعوذ باللہ " پڑھ کر اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہوئے رب تعالیٰ کے نیک

پندوں میں داخل ہو جاتا کہ شیطان کے مکروفریب سے بچ جائے۔

نمبر ۱۱: اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی لفظ "**اللّٰہ**" کا مطلب یہ ہے کہ وہ مستحق عبادت ہے مستحق عبادت وہی ہوسکتا ہے جو قادر علیم اور حکیم بھی ہو گویا کہ " اعوذ باللہ " پڑھنے سے مطلب یہ حاصل ہوگا " اعوذ بالقادر العلیم الحکیم " اس طرح یہ نام انسان کو گناہوں سے کامل طور پر بچانے کے لئے زجر (ڈانٹ ڈپٹ) کی حیثیت رکھے گا۔ اس لئے کہ انسان کو جب یہ معلوم ہو کہ یہ مال بادشاہ کا ہے جو چور کو سزا دینے پر قادر ہے تو وہ چوری کرنے میں ڈرے گا لیکن اگر اسے یہ معلوم ہوا کہ بادشاہ کو چوری کا علم حاصل نہیں ہوگا تو وہ چوری کرنے کی خواہش کرے گا۔ اور اگر اسے یہ پتہ ہو کہ بادشاہ کو میری چوری کا پتہ چل جائے گا۔ تو وہ پھر ڈر محسوس کرے گا۔ لیکن اگر اسے یہ پتہ چل جائے کہ بادشاہ حکیم نہیں (دانائی وحکمت سے خالی ہے) وہ چوروں کو چوری سے روکتا نہیں پھر بھی چوری کرنے کی تمنا کرے گا اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ بادشاہ چوروں کو چوری نہیں کرنے دیتا تو وہ یقیناً چوری سے دور رہے گا۔

اسی طرح " اعوذ باللہ " پڑھنے والے کو جب یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ رب تعالیٰ قادر ہے علیم ہے حکیم ہے تو وہ گناہوں سے بچ کر رہے گا کیونکہ اسے پتہ ہے رب میرے گناہوں کو جانتا ہے، **گناہ** کرنے پر ناراض ہوتا ہے اور گناہوں کی سزا دینے پر بھی قادر ہے **تو یقیناً وہ گناہوں** سے اجتناب **کرے گا۔**

نمبر ۱۲: انسان جب " اعوذ باللہ " پڑھے گا تو **اس کا مقصد یہ ہوگا** کہ وہ شیطان کو پسند نہیں کرتا کیونکہ وہ عاصی (نافرمان) ہے اس طرح اللہ تعالیٰ **انسان کو شیطان** کے عصیان (نافرمانی) سے بچائے گا۔ کیونکہ بندہ جب شیطان کو صرف اس لئے نہیں **پسند کر رہا کہ وہ عاصی** ہے تو بندہ عین معصیت (بعینہ گناہ) کو کیسے پسند کرے گا؟

نمبر ۱۳: شیطان نام ہے اور رجیم صفت ہے۔ اگرچہ لفظ **شیطان** سے بھی پتہ چل رہا تھا کہ وہ رب تعالیٰ کی رحمت سے دور ہے لیکن رب تعالیٰ نے صرف اس کا نام ہی ذکر نہیں کیا بلکہ اس کی صفت کو بھی ذکر کیا تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ جس نے ہزاروں سال اللہ تعالیٰ کی عبادت کی کوئی نافرمانی نہیں کی رب کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کی۔ لیکن جب حکم کو ٹال دیا تکبر کیا ایک پل میں رجیم (مردود دربار سے دھتکارا ہوا) ہو گیا۔ تو اس سے واضح ہوا کہ اے انسان تو بھی اس کی محفلوں سے دور رہ ورنہ وہ

تمہیں بھی رب تعالیٰ کی لعنت کا مستحق بنا دے گا اور اپنے ساتھ جہنم میں لے جانے کی سرتوڑ کوشش کرے گا۔لہذا "اعوذ باللہ" پڑھ کر اس سے بیزاری کا اعلان کر دے رب کے قریب ہو جا رب کی پناہ میں آ جا اپنے عجز کا اظہار کرتا کہ شیطان مردود سے تیرے بچاؤ کا ذریعہ بن جائے۔

نمبر۱٤: ہوسکتا ہے کہ کسی انسان کے ذہن میں یہ بات آئے کہ "**اعوذ بالْمَلٰئِکَةِ**" کیوں نہیں کہا حالانکہ فرشتوں میں سے کوئی فرشتہ کم مرتبہ رکھنے والا بھی شیطان دور بھگانے کے لئے کافی ہے جب فرشتوں کی پناہ حاصل کرنے سے مطلب ہوسکتا تھا:

"**فما السبب ان جعل ذکر ھٰذا الکلب فی مقابلة ذکر اللہ تعالیٰ**" تو کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں اس کتے (شیطان) کا ذکر کیا گیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ گویا رب تعالیٰ یہ کہتا ہے "**عبدی انه یراک وانت لاتراہ**" اے میرے بندے بیشک وہ تمہیں دیکھ رہا ہوتا ہے لیکن تم اسے نہیں دیکھ رہے ہوتے۔

اسی پر رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے:﴿ **اِنَّه' یَرٰکُمْ هُوَ وَقَبِیْلُه' مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ** ﴾ بے شک وہ اور اس کا کنبہ تمہیں وہاں سے دیکھتے ہیں کہ تم نہیں دیکھ سکتے اسی وجہ سے شیطان دھوکہ دینے میں کامیاب ہوجاتا ہے کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہوتا ہے اور تم اسے نہیں دیکھ رہے ہوتے۔

اس لئے اے میرے بندو تم بھی اس کا سہارا حاصل کرو جو شیطان کو دیکھ رہا ہوتا ہے لیکن شیطان اسے نہیں دیکھ رہا ہوتا اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے لہذا اپنے تمام معاملات اسی کے سپرد کرتے ہوئے "**اعوذ باللہ**" پڑھو۔

نمبر۱۵: "**اعوذ باللہ من الشیطان**" پر الف لام جنسی ہے تاکہ ہر قسم کے شیطانوں سے پناہ پکڑی جاسکے خواہ وہ شیطان جنوں میں سے ہوں یا انسانوں میں سے،خواہ نظر آئیں یا نہ آئیں۔اگر الف لام عہد خارجی ہوتا تو شیطان سے مراد خاص طور پر فقط ابلیس مراد ہوتا۔لیکن جب الف لام جنسی بنایا جائے گا تو مراد جنس شیطان ہوگا کیونکہ کبھی نظر آنے والا شیطان نہ نظر آنے والے سے اشد ہوتا ہے۔

جیسا کہ ایک حکایت بیان کی گئی کہ کسی شخص نے محفل میں یہ بیان کیا کہ جب انسان صدقہ کرنا چاہے تو ستر شیطان اس کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔کوئی اس کے ہاتھوں سے لپک جاتا ہے۔

کوئی اس کے پاؤں سے چمٹ جاتا ہے کوئی اس کے دل پر حاوی ہو جاتا ہے اس طرح وہ اسے صدقہ سے روک دیتے ہیں۔قوم میں سے کسی شخص نے یہ سنکر کہا آج میں ستر شیطانوں سے جنگ کروں گا۔مسجد سے نکلا گھر میں آ گیا اور گندم سے اپنے دامن کو بھرا ارادہ کیا کہ گھر سے نکل کر صدقہ کرے لیکن اس کی زوجہ جلدی سے اس کے سامنے آ گئی اس سے جھگڑا کرنے لگی (یہ دانے کدھر لئے جا رہے ہو) لڑتے ہوئے اس نے خاوند کے دامن سے گندم کو چھڑا لیا۔وہ شخص رسوا ہو کر واپس مسجد میں لوٹ آیا۔تقریر کرنے والے حضرت اس سے پوچھنے لگے ."ماذا عملت" تم نے کیا عمل کیا؟ " فقال هزمت السبعين ـفجاء ت امهم فهزمتني " پس اس نے کہا میں نے ستر شیطانوں کو تو شکست دے دی تھی لیکن ان کی ماں آ گئی جس نے مجھے شکست دے دی۔

خیال رہے کہ الف لام عہد خارجی ہو اور مراد خاص شیطان ابلیس ہو تو پھر بھی ٹھیک ہے کیونکہ ابلیس ہی دوسرے شیطانوں کو انسانوں کی طرف گمراہ کرنے کے لئے بھیجتا ہے اور جتنا زیادہ کوئی بھٹکانے میں کامیاب ہوتا ہے اس سے وہ زیادہ خوش ہوتا ہے۔جب ابلیس سے پناہ حاصل ہوگئی تو اس کے تمام چیچوں ،کڑچھوں سے پناہ حاصل ہو جائے گی۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔بیشک ابلیس اپنا تخت پانی پر رکھتا ہے پھر وہ اپنے چھوٹے چھوٹے لشکر لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے بھیجتا ہے" فَادْنَاهُمْ منزلة اعظمهم فتنة " جتنا کوئی بڑا فتنہ برپا کرتا ہے اتنا ہی زیادہ وہ اس کے قریب ہوتا ہے ان میں سے ایک آتا ہے وہ کہتا ہے میں نے یہ کیا ہے وہ کیا ہے (یعنی مختلف اپنے فتنوں کی خبر دیتا ہے) ابلیس کہتا ہے تو نے کچھ نہیں کیا پھر ایک اور آتا ہے وہ کہتا ہے۔

" ما تركته حتى فرقت بينه وبين امرأته قال فيدنيه منه ويقول نعم انت قال الاعمش اراه قال فيلتزمه ". (مسلم)

میں نے ایک شخص کو نہیں چھوڑا یہاں تک کہ اس کے اور اس کی زوجہ کے درمیان تفریق کر دی اس (اپنے چیلے) کو ابلیس اپنے قریب کرتا ہے اور کہتا ہے ہاں واقعی تو نے صحیح کام کیا ہے راوی اعمش کہتے ہیں میرا خیال یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا وہ اسے گلے لگا لیتا ہے۔

میاں بیوی کی جدائی پر اور کئی فتنہ کے دروازے کھلتے ہیں اسی لئے ابلیس خوش ہوتا ہے کیونکہ اس سے بدکاری، غیبت، قطع رحمی، غیظ وغضب جیسے مفاسد جنم لیتے ہیں۔

☆ شیطان کا لفظ لیا ہوا ہے " شطن " سے جس کا معنی دور ہونا۔اس کو رب تعالیٰ نے اپنی رحمت سے دور کر دیا لیکن رب تعالیٰ کی اطاعت کرنے والا انسان رب کے قریب ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے " واسجد واقترب " اور سجدہ کرو اور ہم سے قریب ہوجاؤ اور رب تعالیٰ بھی اپنے بندوں کے قریب ہے مالک الملک نے فرمایا﴿وَاِذَاسَأَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ﴾ اور اے محبوب جب تم سے میرے بندے میرے متعلق پوچھیں تو میں نزدیک ہوں۔" الرجیم " کا معنی ہے مرجوم یعنی مردود،لعنت اور بدبختی کے تیر اس پر برسائے گئے۔اور رب کا بندہ نیک بختی کی رسی سے متعلق ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا﴿ وَاَلْزَمَھُمْ کَلِمَةَ التَّقْوٰی﴾ اور پرہیزگاری کا کلمہ ان پر لازم فرمایا اس بحث سے واضح ہوا کہ شیطان رب سے دور ہے رب کا بندہ رب کے قریب ہے اور رب تعالیٰ اپنے بندے کے قریب ہے شیطان کبھی رب کے قریب نہیں ہوسکتا اس لئے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا﴿ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللہِ تَحْوِیْلاً﴾ اور ہرگز اللہ کے قانون کو ٹلتا نہیں پاؤ گے۔یوں سمجھئے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا کہ اے انسان ﴿ اَعُوْذُ بِاللہِ ﴾ پڑھ کر شیطان سے دوری اختیار کر لے وہ تمہیں اپنے قریب کرنا چاہتا ہے لیکن یہ یاد رکھو کہ اگر تم اس کے قریب ہوئے جو رب سے دور ہے تو تم بھی رب سے دور ہوجاؤ گے لیکن اگر تم شیطان سے دور رہے تو رب تعالیٰ کے قریب ہوجاؤ گے۔یہی رب تعالیٰ کا قانون ہے جو بدل نہیں سکتا۔

نمبر ۱۷: حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک پڑھنے سے تعوذ پڑھنے کا خصوصی طور پر حکم اس لئے دیا کہ انسان کی زبان کبھی جھوٹ ،غیبت اور چغلخوری سے ناپاک ہوتی ہے اِس لئے انسان کو تعوذ پڑھنے کا حکم دیا کہ پہلے وہ اپنی زبان کو پاکیزہ کرے پھر اللہ تعالیٰ کا پاک کلام پڑھے۔

نمبر ۱۸: یوں سمجھئے کہ رب تعالیٰ کہتا ہے :

" انه شیطان رجیم وانا رحمن رحیم فابعد عن الشیطان الرجیم لتصل الی الرحمن الرحیم " کہ وہ مردود شیطان ہے اور میں رحمٰن ورحیم ہوں اس لئے اے انسان اگر تو رحمٰن ورحیم تک پہنچنا چاہتا ہے تو پہلے مردود شیطان سے دور ہوجا۔

نمبر ۱۹: شیطان تمہارا دشمن ہے تم اس سے غافل ہو اور وہ تم سے غائب ہے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّه، یَرٰکُمْ هُوَ وَقَبِیْلُه، مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ﴾ بیشک وہ اور اس کا قبیلہ تمہیں دیکھتا ہے وہاں سے، جہاں سے تم اسے نہیں دیکھتے۔ "**فعلی هذا لک عدو غائب ولک حبیب غالب**" اس سے معلوم ہوا کہ تمہارا دشمن تم سے غائب ہے اور تمہارا حبیب (اللہ تعالیٰ) غالب ہے۔

رب تعالیٰ نے فرمایا" واللہ غالب علی امرہ " اللہ تعالیٰ اپنے امر پر غالب ہے۔ لہٰذا اے انسان جب تیرا غائب دشمن تجھے بھٹکانا چاہے تو تو "اعوذ باللہ" پڑھ کر اپنے غالب حبیب کی پناہ میں آجا۔

تعوذ میں مختصر الفاظ لیکن کثیر معانی:

انسان کے کئی اعمال اسے دینی طور پر نقصان پہنچاتے ہیں یعنی ہر کام جس سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے منع فرمایا ہو اس پر عمل کرنا یقیناً اسے دینی طور پر نقصان پہنچائے گا۔

دنیاوی طور پر نقصان پہنچانے والی اشیاء یہ ہیں ہر قسم کے درد، بیماریاں، جلنا، غرق ہونا، فقر واحتیاجی چلنے پھرنے کے قابل نہ رہنا اعضاء کا مفلوج ہوجانا، اندھا پن وغیرہ اس قسم کے بیشمار چیزیں انسان کے لئے دنیا میں نقصان دہ ہیں۔

"اعوذ باللہ" پڑھتے ہوئے ان تمام نقصانات دینیہ اور دنیویہ کو مدنظر رکھے ان سے بھی پناہ پکڑے کیونکہ کسی نہ کسی ذریعے سے شیطان کی دخل اندازی ان میں ضروری ہوتی ہے کیونکہ بیماری سے انسان تنگ آکر رب تعالیٰ کی شان کے خلاف کوئی لفظ بول جاتا ہے یہ دراصل شیطان کا بہکانا ہی ہے۔ بعض ایسے نقصانات ہیں جن کی کوئی حد نہیں ان نقصان دہ چیزوں میں جہالت بھی ہے اسکی

کوئی حد نہیں کیونکہ اس کے مدمقابل علم ہے۔جب علم کی کوئی حد نہیں تو یقیناً اس کے مدمقابل کی بھی کوئی حد نہیں۔" اعوذ باللہ " پڑھتے ہوئے جہالت سے پناہ پکڑے کیونکہ زیادہ طور پر کفر، بدعات، گمراہیوں کی دارومدار جہالت پر ہی ہے۔

اسی طرح فسق کی بھی کوئی حد نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اوامر اور نواہی (جن چیزوں کا حکم دیا یا جن چیزوں سے روکا) ان کی مخالفت کا نام فسق ہی ہے لہذا "اعوذ باللہ" پڑھتے ہوئے فسق سے بھی پناہ پکڑے کیونکہ اس میں بھی شیطان دخل انداز ہوتا ہے۔اسی طرح مکروھات، آفات وبلیات اور مخافات (خوف دلانے والی اشیاء) بھی کثیر اور بیحد ہیں ان میں بھی کہیں نہ کہیں شیطان کے اثرات پائے جاتے ہیں لہذا اعوذ باللہ پڑھتے ہوئے ان سے بھی پناہ حاصل ہوگی۔غرضیکہ جب شیطان مردود سے پناہ پکڑے تو ذہن میں یہ لائے کہ اے اللہ مجھے شیطان کے ہر وسوسہ اور ہر طرح بہکانے اور اس کے اثر انداز ہونے سے بچا۔

(ماخوز از تفسیر مفاتیح الغیب المعروف بالکبیر للامام فخر الدین رازی رحمہ اللہ بالا ختصار والتصرف)

مسئلہ: قرآن پاک پڑھنے سے پہلے " تعوذ " کا پڑھنا مستحب ہے زیادہ اہل علم کا یہی قول ہے۔اگرچہ بعض حضرات نے وجوب کا قول بھی کیا ہے اور بعض نے سنت کہا ہے البتہ نماز میں قراءت سے پہلے " تعوذ " کا پڑھنا سنت ہے راقم تلاوت سے پہلے بھی سنت کا ہی قائل ہے۔اور نماز میں تعوذ فاتحہ کے تابع ہے جس نے قراءت نہیں کرنی اس نے تعوذ بھی نہیں پڑھنی یہی قول معتبر ہے اس مسئلہ میں اختلاف اور ہر طرف سے دلائل ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

مسئلہ جو غلط طور پر مشہور ہوگیا: عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ شاگرد کا استاذ کے سامنے " تعوذ " پڑھنا جائز نہیں حالانکہ اصل مسئلہ اس طرح نہیں۔ علامہ ابن عابد بن شامی کے البحر الرائق کے حاشیہ منحۃ الخالق سے ایک عبارت نقل کر کے اس کا وہ مطلب بیان کرنا چاہتا ہوں جو میں نے سمجھا۔

" وحاصله انه اذ اراد ان يقول بسم الله الرحمن الرحيم لاياتی بالتعوذ قبلها الااذا اراد بها القراءة اما اذا اراد بها افتتاح الكلام كما ياتی بها التلميذ فی اول درسه للعلم لا يتعوذ لان البسملة تخرج عن القرآنية بقصد الذكر " (البحر الرائق الجزء الاول ص ۳۱۱)

حاصل کلام یہ ہے کہ جب کوئی شخص ﴿ بسم اللہ الرحمن الرحیم ﴾ پڑھنے کا ارادہ کرے تو اس کے لئے اس سے پہلے تعوذ پڑھنا سنت نہیں۔ ہاں اگر اس نے تسمیہ کو بطور تلاوت قرآن پڑھا تو اس سے پہلے تعوذ کا پڑھنا سنت ہے جب کسی کام کو شروع کرنے کے لئے تسمیہ پڑھے تو اس سے پہلے تعوذ سنت نہیں کیونکہ اس صورت میں بسم اللہ ذکر ہے تلاوت نہیں جس طرح طالب علم سبق کے شروع میں بسم اللہ پڑھتا ہے تو اس کے لئے بھی تعوذ سنت نہیں کیونکہ جب بھی بسم اللہ کو ذکر کے طور پر پڑھا جائے گا اس پر احکام قرآن جاری نہیں ہوں گے۔ خیال رہے کہ میں نے " لایتعوذ " کا معنی تعوذ سنت نہیں کیا ہے کیونکہ اس سے پہلے کی عبارت کو دیکھنے سے یہ عقدہ بھی حل ہو جائے گا۔

" وفی الذخیرة لیس فی المشروعیة وعدمها بل فی الاستنان وعدمه ای فتسن للقراء ة ولا تسن لغیرها ونفی السنیة لاینافی المشروعة ونص عبارة الذخیرة هکذا اذا قال الرجل بسم الله الرحمن الرحیم فان اراد به قراء ة القرآن یتعوذ قبله لقوله تعالیٰ فاذا قرأت القرآن فاستعذ بالله وان اراد افتتاح الکلام کما یقرأ التلمیذ علی الاستاذ لا یتعوذ قبله لانه لایرید قراء ة القرآن "

ذخیرہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ عام اذکار سے پہلے یا دیگر امور سے پہلے اعوذ باللہ پڑھنے کے جائز ہونے یا جائز نہ ہونے میں تو کوئی کلام نہیں صرف سنت کے ہونے یا نہ ہونے میں کلام ہے یعنی قراءت کے لئے سنت ہے باقی مقاموں میں سنت نہیں۔ سنت کی نفی سے جواز کی نفی نہیں ہوتی۔

ذخیرہ میں یہی ذکر ہے کہ جب بسم اللہ قراءت کی غرض سے پڑھے تو اس سے پہلے اعوذ باللہ سنت ہے اور جب کسی کام کے شروع میں بسم اللہ پڑھی جائے تو اس سے پہلے بسم اللہ سنت نہیں جس طرح طالب علم سبق سے پہلے بسم اللہ پڑھے تو اس سے پہلے اعوذ باللہ سنت نہیں۔

اصل مسئلہ اس طرح ہے کہ طالب علم سبق سے پہلے جب بسم اللہ پڑھے تو اس سے پہلے اعوذ باللہ پڑھنا سنت نہیں۔ لیکن اگر پڑھ لے تو جائز ہے بلکہ مستحب ہے تا کہ ایک دوسرے کی طرف (دوران سبق) دیکھنے اشارے کرنے، سبق کو غور سے نہ سننے کے شیطانی وسوسوں سے بچ سکیں۔

سورۂ فاتحہ

اس سورۃ میں سات آیتیں، ایک رکوع ہے اور یہ مکی ہے، الفاظ پچیس، حروف ۱۲۳۔

سورۃ فاتحہ کے نام:

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے الاتقان میں سورۂ فاتحہ کے پچیس نام ذکر کئے ہیں۔

فاتحۃ الکتاب: حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

"**ھی ام القرآن وھی فاتحۃ الکتاب وھی السبع المثانی**" یہ سورت ام القرآن ہے فاتحۃ الکتاب ہے سبع مثانی ہے فاتحہ اس لئے کہا گیا ہے کہ قرآن پاک کی ترتیب میں اس سے ابتداء کی گئی ہے۔ تعلیم میں اسی سے ابتداء ہوتی ہے نماز میں قراءت کی اسی سے ابتداء ہوتی ہے ایک قول یہ بھی ہے کہ لوح محفوظ میں سب سے پہلے اسی سورۃ کو لکھا گیا ہے۔

فاتحۃ القرآن: چونکہ قرآن پاک کو "الکتاب" بھی کہا گیا ہے اور "القران" بھی۔ اس لئے جو جو فاتحۃ الکتاب میں بیان کی گئی ہیں وہی فاتحۃ القرآن میں بھی ہیں۔

ام الکتاب: ام کا معنی ماں اور اصل ہے۔ سورۂ فاتحہ کو ام الکتاب کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ مقدم ہے اور باقی اس کے تابع ہیں۔ اسی وجہ سے جنگ میں استعمال ہونے والے جھنڈے کو" ام الحرب" بھی کہا گیا ہے جس طرح "رأیۃ الحرب" کہا جاتا ہے ام کہنے کی یہی وجہ ہے کہ جھنڈا آگے ہوتا ہے اور لشکر اس کے پیچھے ہوتا ہے اور مکہ مکرمہ کو "ام القری" بھی اسی لئے کہا گیا ہے کہ وہ سب شہروں، بستیوں سے پہلے بنا ہے۔ ام الشئی، اصل الشئی کو بھی کہا جاتا ہے چونکہ فاتحہ اصل القرآن ہے کیونکہ قرآن پاک کی تمام اغراض کو شامل ہے اور قرآن پاک میں جتنے علوم اور حکمتیں ذکر ہیں فاتحہ ان کا خلاصہ ہے فاتحہ کس طرح خلاصہ ہے؟ اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد کا ذکر ہے، عبادت کا ذکر ہے، نہی کا ذکر ہے وعدہ اور وعید کا ذکر ہے قرآن پاک کی آیات ان چیزوں سے خالی نہیں۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے فرمایا تمام قرآن پاک میں چار چیزوں کا بیان مقصود ہے الٰھیات، معاد، نبوت، قضاء وقدر کا اثبات۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ میں الٰھیات کا ذکر ہے مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ میں معاد یعنی قیامت کا ذکر ہے اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں جبریہ فرقہ کا رد ہے اور قضاء اور تقدیر کا ثبوت ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ سے لے کر سورۃ کے آخر تک نبوت کا ذکر بھی ہے اور قضاء کا بھی۔

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ فاتحہ میں "احکام نظریہ احکام عملیہ یعنی صراط مستقیم پر چلنے کے احکام نیک لوگوں کے مراتب پر مطلع ہونا۔ بدبختوں کے مقام کا پتہ چلنا" مذکور ہیں یہی چیزیں قرآن پاک میں موجود ہیں۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا کہ فاتحہ میں علوم کی چار قسمیں مذکور ہیں جن پر دین کی وارومدار ہے:

پہلی قسم: علم اصول یعنی عقائد، اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی صفات کا ذکر اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ میں ہے۔ نبوت کی معرفت ﴿ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ﴾ سے سمجھ میں آگئی ہے کیونکہ جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے ان میں اولین مقام انبیاء کرام کا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ ﴾

اور قیامت کا ﴿مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ﴾ سے پتہ چلتا ہے۔ یہ سب عقائد ہیں یعنی چار میں سے یہ پہلی قسم ہے۔

دوسری قسم: فروع کا علم یعنی عبادات کا علم وہ ﴿ اِیَّاکَ نَعْبُدُ ﴾ سے حاصل ہو رہا ہے۔

تیسری قسم: اخلاقیات کا علم جن سے انسان رب تعالیٰ کے حضور پہنچتا ہے اور اسی کی پناہ میں آتا ہے۔ اور طریق مستقیم پر چلتا ہے یہ چیزیں ﴿ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ﴾ سے سمجھ آ رہی ہیں۔

چوتھی قسم: پہلی امتوں کے واقعات اور ان میں سے نیک لوگوں اور ان پر احسانات وانعامات کا علم حاصل ہونا اسی طرح ان میں سے بدبختوں کے عذاب اور وعید کا پتہ چلنا ﴿ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ﴾ میں مذکور ہے۔

علامہ غزالی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا کہ فاتحہ میں چھ چیزوں کا ذکر ہے تین چیزیں اصل ہیں یعنی اہم ہیں اور تین چیزیں ان کے تابع ہیں پہلی تین چیزیں اللہ تعالیٰ کی حمد جو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ میں مذکور ہے اور طریق مستقیم جس کو واضح طور پر ﴿اَلصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ﴾ سے بیان کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع یعنی آخرت کا ذکر ﴿مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾ میں کیا گیا ہے۔ دوسری تین چیزیں، نیک لوگوں کے احوال کا ذکر ﴿ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ﴾ میں ہے۔ منکرین کے حالات کو ﴿غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ﴾ میں بیان کیا گیا ہے منازل الطریق یعنی صراط مستقیم کی منزلیں اور اس پر قائم رہنے کے ذرائع کو ﴿ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ سے بیان کیا گیا ہے۔ (الاتقان ص ۱۵۷)

اس بحث سے واضح ہو گیا کہ سورۂ فاتحہ قرآن پاک کے تمام مضامین کا خلاصہ اور اصل ہے اسی لئے اسے ''ام الکتاب'' کہا گیا ہے۔

'' ام الکتاب '' کہنے کی اور وجہ یہ بھی ہے کہ قوم کے رئیس اور سردار کو '' ام القوم '' کہا جاتا ہے اس لئے سورۂ فاتحہ کو دوسری سورتوں پر افضیلت حاصل ہونے کی وجہ سے ''ام الکتاب '' کہا گیا ہے۔

ام القرآن : سورۂ فاتحہ کا اور نام '' ام القرآن '' بھی ہے اس میں تمام وہی وجوہ ہیں جو '' ام الکتاب '' میں بیان کی گئی ہیں خیال رہے کہ جمہور کے نزدیک فاتحہ کا نام '' ام الکتاب '' صحیح ہے البتہ حضرت انس، حضرت حسن بصری اور ابن سیرین رضی اللہ عنہم کا اختلاف ہے وہ فاتحہ کا '' ام الکتاب '' نام نہیں رکھتے۔

حضرت حسن بصری کہتے ہیں '' ام الکتاب '' حلال وحرام کو کہا گیا ہے رب تعالیٰ نے فرمایا'' آیات محکمات ھن ام الکتاب واخر متشابھات '' کچھ آیتیں محکم ہیں وہی کتاب کی اصل ہیں اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں۔

حضرت انس اور ابن سیرین کہتے ہیں ام الکتاب لوح محفوظ کو کہا گیا ہے رب تعالیٰ نے فرمایا ''وانہ فی ام الکتاب'' بیشک وہ اصل کتاب میں ہے یعنی قرآن پاک لوح محفوظ میں ہے۔

ام القرآن نام رکھنے میں بھی حضرت انس وابن سیرین رضی اللہ عنہما کا اختلاف ہے لیکن راقم کے نزدیک وجوہ اختلاف ضعیف ہیں جمہور کا قول ہی صحیح ہے کیونکہ فاتحہ کو بھی ام الکتاب کہا گیا ہے۔آیات محکمات کو بھی ام الکتاب کہا گیا ہے اور لوح محفوظ کو بھی ام الکتاب کہا گیا ہے کئی چیزوں کا ایک نام ہوجائے تو اس میں کیا حرج ہے؟اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جو حدیث پہلے ذکر کی ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "الحمد للہ" ام القرآن ہے ام الکتاب ہے سبع مثانی ہے اس حدیث کو ترمذی نے "صحیح حسن" کہا ہے اور بخاری میں ہے:

"وسميت ام الكتاب لانه يبتدأ بكتابتها في المصاحف ويبدأ بقراء تها في الصلوة"

فاتحہ کا نام "ام الکتاب" رکھا گیا ہے کیونکہ اسے ابتداء میں لکھا جاتا ہے اور نماز کی قرءات کی اسی سے ابتداء ہوتی ہے۔

القرآن العظیم : یہ نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ سورۃ قرآن پاک کے تمام علوم کو شامل ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد اور اس کی صفات کمالیہ اور صفات جلالیہ کا ذکر ہے، اور اس میں عبادات اور عبادات میں خلوص کا حکم دیا گیا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی معاونت کے بغیر کسی چیز کو قائم کرنا امور کو بجالانے میں عاجز ہونے کے اعتراف کو اس میں بیان کیا گیا ہے، صراط مستقیم کی ہدایت میں بھی اسی کی طرف رجوع کرنے کا ذکر اس میں موجود ہے، نیک لوگوں یعنی مستحقین انعام کا ذکر اس میں موجود ہے اور منکرین کے عذاب کو اس میں بیان کیا گیا ہے، یہی وجوہ ہیں جن کے پیش نظر اس سورۃ کو القرآن العظیم کا نام دیا گیا ہے۔

اس پر ایک حدیث پاک بھی دلالت کر رہی ہے جو مسند احمد میں مذکور ہے:

" عن ابی هريرة ان النبی صلی الله عليه وسلم قال لام القرآن هی ام القران وهی السبع المثانی وهی القرآن العظيم "

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بیشک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے "ام القرآن " (فاتحہ) کے متعلق فرمایا کہ یہ " ام القران " ہے یہ سبع مثانی ہے اور یہ قرآن عظیم ہے۔

سبع المثانی : یہ نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ "السبع" کا معنی ہے سات چونکہ اس سورۃ میں سات آیتیں ہیں لہذا اس وجہ سے اس کے نام میں " السبع" آ گیا۔المثانی کہنے کی یہ وجہ ہے کہ ہوسکتا ہے یہ لفظ " الثناء " سے لیا گیا ہو چونکہ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ کی ثناء موجود ہے لہذا اسے " المثانی" کہہ دیا گیا ہے، اور ممکن ہے کہ یہ لفظ " الثنیا " سے لیا گیا ہو جس کا معنی ہے علیحدہ کرنا چونکہ یہ سورۃ اس امت کے لئے علیحدہ کر کے رکھ دی گئی تھی اس لئے اسے "مثانی" کہہ دیا گیا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ لفظ " تثنیه " سے لیا گیا ہو چونکہ اسے ہر رکعت میں پڑھا جاتا ہے تو اس وجہ سے مثانی کہا گیا ہو کہ اس کو نماز میں کئی بار پڑھا جاتا ہے یہ وجہ تمام وجوہ سے قوی نظر آتی ہے کیونکہ اس پر ایک حدیث جریر نے بسند حسن عن عمر پیش کی ہے وہ حدیث یہ ہے :

" عن عمر قال السبع المثانی فاتحة الکتاب تثنی فی کل رکعة "

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سورۂ فاتحہ کو سبع مثانی اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ بار بار پڑھی جاتی ہے یعنی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ دو مرتبہ نازل ہوئی اس لئے اسے سبع مثانی کہا جاتا ہے خیال رہے کہ سورۂ فاتحہ کے مکی اور مدنی ہونے میں بھی دو مختلف قول ہیں ان میں تطبیق بھی بعض حضرات نے اسی قول سے دی کہ ایک مرتبہ ہجرت سے پہلے نازل ہوئی لہذا مکی ہے اور ایک مرتبہ ہجرت سے بعد میں ہوئی لہذا مدنی ہے لیکن مکی ہونے والا قول ہی زیادہ معتبر ہے اسی لئے عنوان میں اسی کو ذکر کیا ہے۔

ثناء اور دعا پر مشتمل ہونے کی وجہ سے سبع مثانی کہلاتی ہے اور الفاظ مبارکہ کی فصاحت اور معانی کی بلاغت پر مشتمل ہونے کی وجہ سے بھی اسے سبع مثانی کہا گیا ہے۔

الوافیة: یہ نام رکھنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ سورۃ قرآن پاک کے معانی پر مشتمل ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ تنصیف (آدھا کرنا) کو قبول نہیں کرتی کیونکہ باقی سورتوں میں سے کچھ حصہ بھی نماز میں ادا کر دیا جائے تو جائز ہے لیکن فاتحہ کو جب تک مکمل نہ پڑھا جائے وجوب ادا نہیں ہوتا۔

تیسری وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بھی ہے اور بندے کی عبادت و استعانت کا ذکر بھی ہے لہذا بندے کے ذکر اور رب تعالیٰ کے ذکر پر مشتمل ہونے کی وجہ سے بھی وافیہ کہلاتی ہے۔ کیونکہ وافیہ کا معنی پورا ہونے والی۔

الکنز : یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کہ یہ سورۃ قرآن پاک کے تمام مضامین کا خلاصہ ہے اور قرآن پاک تمام مسائل کا خزانہ ہے

"وقال ابن مسعود من اراد علم الاولین والآخرین فلیتل القرآن"

(روح المعانی الجز الاول ص۷)

ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا جو شخص سب اگلوں اور پچھلوں کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ قرآن پاک کی تلاوت کرے واضح ہوا کہ یہ سورۃ بھی کنز ہے یہ نام حدیث پاک سے ثابت ہے۔

" قد خرج البیهقی فی الشعب من حدیث انس مرفوعا ان الله اعطانی فیما مّن به علی انی اعطیتک فاتحة الکتاب وهی من کنوز عرشی "

(الاتقان ص ۳۸)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیشک مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنا احسان فرماتے ہوئے یہ فرمایا کہ میں نے تمہیں فاتحۃ الکتاب دی جو میرے عرش کے خزانوں میں سے ہے۔

الکافیة : یحیٰ ابن کثیر کہتے ہیں " لانها تکفی عن سواها ولایکفی سواها عنها " سورۃ فاتحہ کو اسلئے " کافیہ " کہا گیا ہے کہ یہ غیر کی جانب سے کفایت کرتی ہے اور اس کا غیر اس کی جانب سے کافی نہیں۔اس پر ایک روایت دلالت کر رہی ہے جو محمد بن خلاد اسکندرانی سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" ام القرآن عوض من غیرها ولیس غیرها منها عوضا "

ام القرآن (فاتحہ) اس کے غیر سے عوض ہے اور اس کا غیر اس سے عوض نہیں۔

الاساس : اساس کا معنی ہے بنیاد یہ اصل قرآن ہے اور مکمل سورۃ بحیثیت سورۃ سب سے پہلے یہی نازل ہوئی۔ایک شخص نے شعبی رحمہ اللہ کی خدمت میں عرض کیا۔میرے پہلو میں درد ہے انہوں نے کہا:

" علیک باساس القرآن فاتحة الکتاب " تم اساس القرآن یعنی فاتحۃ الکتاب پڑھو (یعنی پڑھ کر دم کرو)۔شعبی بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا ہر چیز کی اساس (بنیاد، اصل) ہے۔

" **واساس الدنیا مکة** " دنیا کی اساس مکہ ہے کیونکہ سب سے پہلے زمین کو وہاں سے پھیلانا شروع کیا گیا۔

" **واساس السموات عریبا** " آسمانوں کی اساس عریبا ہے یہ ساتویں آسمان کا نام ہے۔ بعض جگہ پر عریبا بھی آیا ہوا ہے۔

" **واساس الارض عجیبا** " زمین کی اساس عجیبا ہے یہ سب سے نیچے ساتویں زمین کا نام ہے۔

" **واساس الجنان جنة عدن** " جنتوں کی اساس جنت عدن ہے یہ سب جنتوں کی ناف کی حیثیت رکھتی ہے جس سے جنت کی بنیاد رکھی گئی۔

" **واساس النار جهنم** " آگ کی اساس جہنم ہے یہ دوزخ کے طبقوں میں سے نیچے طبقہ کا نام ہے۔

" **واساس الخلق آدم** " مخلوق کی اساس آدم ہیں کیونکہ آپ ہی سب سے پہلے انسان ہیں جو دنیا میں آئے۔

" **واساس الانبیاء نوح** " انبیاء کی اساس حضرت نوح علیہ السلام ہیں۔ سب سے پہلے کفار آپ کے زمانے میں ہی ہوئے جن کو آپ نے تبلیغ فرمائی۔

" **واساس بنی اسرائیل یعقوب** " بنی اسرائیل کی اساس حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں کیونکہ آپ کا نام ہی اسرائیل تھا۔

" **واساس الکتب القرآن** " کتابوں کی اساس قرآن پاک ہے کیونکہ یہ اصل الکتب ہے۔

[illegible] **ـحة** " قرآن پاک کی اساس فاتحہ ہے۔

" **واساس الفاتحة بسم الله الرحمن الرحیم** " فاتحہ کی اساس بسم اللہ الرحمن الرحیم ہے۔

اس تمام بیان کے بعد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا " **واذ اعتللت و اشتکیت فعلیک بالفاتحة تشفی** " جب تم بیمار ہو یا تمہیں درد ہو تو فاتحہ پڑھو (یعنی فاتحہ پڑھ کر دم کرو) تمہیں شفا حاصل ہو گی۔

الشفاء : دارمی نے ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" فاتحة الکتاب شفاء من کل سم " سورۃ فاتحہ ہر زہر یعنی ہر بیماری سے شفاء ہے۔دارمی نے ہی عبد الملک بن عمیر سے روایت ذکر کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:" فی فاتحة الکتاب شفاء من کل داء " فاتحۃ الکتاب میں ہر بیماری سے شفاء ہے۔

(مشکوۃ فضائل القرآن)

الشافیة: اس نام کی وہی وجوہ ہیں جو الشفاء کی ہیں۔

الرقیة: دم کرنا ،یعنی فاتحہ دم ہے ۔حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بیشک نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام سفر میں تھے وہ عرب کے قبائل میں سے ایک قبیلہ سے گزرے ان سے انہوں نے مہمانی طلب کی (کھانا طلب کیا) انہوں نے ان کی مہمانی نہ کی (کھانا نہ دیا) تھوڑی ہی دیر بعد ان میں سے کچھ آدمی آئے انہوں نے کہا ،کیا تم میں کوئی دم کرنے والا ہے؟ کیونکہ ہماری قوم کے سردار کو کسی سانپ وغیرہ نے ڈس لیا ہے ایک شخص نے ان میں سے کہا ہاں وہ آئے سورۃ فاتحہ پڑھ کر اس پر دم کیا۔وہ شخص ٹھیک ہوگیا انہوں نے ہمیں کچھ (تیس کی تعداد میں) بکریاں دیں ہم نے قبول کرنے سے انکار کردیا (کہ پہلے رسول اللہ ﷺ سے پوچھیں گے)ہم نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا تو آپ نے وہ بکریاں لینے کی اجازت دے دی:

" فقال یا رسول اللہ واللہ مارقیت الابفاتحة الکتاب فتبسم وقال ما ادراک انھارقیة "

وہ دم کرنے والے صحابی عرض کرنے لگے یارسول اللہ قسم ۔ہے اللہ تعالیٰ کی میں نے تو صرف سورۃ فاتحہ کو پڑھ کر دم کردیا تھا۔آپ نے فرمایا تمہیں معلوم نہیں کہ یہ بھی دم ہے۔

اورآپ نے فرمایا تم وہ بکریاں لے لو اور میرا حصہ بھی رکھ لو (یہ دراصل صحابہ کرام کے دل کی تسلی کے لئے تھا کہ وہ ذرا بھر بھی اس کے جائز ہونے میں شک نہ کریں کیونکہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا حصہ بھی رکھا۔

(مسلم ج۲ ص ۲۳۲ باب جواز الاخذ اجیرۃ علی الرقیة)

الصلوٰۃ: اس سورۃ کو الصلوۃ اس لئے کہا گیا ہے کہ حدیث قدسی میں آتا ہے رب تعالی کا ارشاد یہ ہے " **قسمت الصلوة بيني وبين عبدى** " میں نے صلوۃ اپنے اور اپنے بندے کے درمیان تقسیم کردی۔

اس اجمال کی تفصیل حدیث پاک کا زیادہ حصہ پڑھنے سے سمجھ میں آئیگی۔آیئے ذرا تفصیل دیکھیں

"(قال ابوهريرة) فانی سمعت رسول الله ﷺ يقول يقول الله عزوجل قسمت الصلوة بينى وبين عبدى نصفين فنصفهالى ونصفها لعبدى ولعبدى ماسأل قال رسول الله ﷺ اقرؤا يقول العبد الحمد لله رب العلمين يقول الله عزوجل حمدنى عبدى يقول العبد الرحمن الرحيم يقول الله عزوجل اثنى على عبدى يقول العبد مالک يوم الدين يقول الله عزوجل مجدنى عبدى يقول العبد اياک نعبد واياک نستعين فهذه الاية بينى وبين عبدى ولعبدى ماسأل يقول العبد اهدنا الصراط المستقيم صراط الذين انعمت عليهم غير المغضوب عليهم ولا الضالين فهؤلاء لعبدى ولعبدى ما سأل يقول العبد اهدنا الصراط المستقيم صراط الذين انعمت عليهم غير المغضوب عليهم ولا الضالين فهؤلاء لعبدى ولعبدى ما سأل"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے بیشک میں نے رسول اللہ ﷺ کو کہتے ہوئے سنا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں نے صلوٰۃ اپنے اور اپنے بندے کے درمیان تقسیم کردی۔اس کے دو حصے بنا دیئے نصف میرے لئے ہے اور نصف میرے بندے کے لئے میرے بندے کے لئے وہ ہے جو اس نے سوال کیا۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (فاتحہ کو) پڑھو۔بندہ کہتا ہے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری حمد بیان کی۔بندہ جب پڑھتا ہے ﴿الرحمن الرحیم﴾ رب تعالیٰ کہتا ہے میرے بندے نے میری ثناء بیان کی۔بندہ جب ﴿مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾ پڑھتا ہے تو ارشاد باری تعالی ہوتا ہے میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی بندہ جب عرض کرتا ہے ﴿اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ مالک کائنات فرماتا ہے یہ آیت میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے اور بندے کے لئے وہی ہے جو اس نے سوال کیا۔

بندہ جب تلاوت کرتا ہے ﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ، صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ،غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴾ (تو رب ذوالجلال فرماتا ہے) یہ میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے کے لئے وہ جو اس نے سوال کیا۔

مختصر وضاحت : " قال العلماء المراد بالصلوة ههنا الفاتحة " علماء نے حدیث پاک کی وضاحت کرتے ہوئے بیان کیا کہ حدیث پاک میں جو لفظ " الصلوة " واقع ہے اس سے مراد فاتحہ ہے اب معنی حدیث پاک کا یہ ہوگا کہ میں نے اپنے اور اپنے بندے کے درمیان فاتحہ کو نصف نصف تقسیم کر دیا ہے۔ فاتحہ کو صلوۃ کیوں کہا گیا؟ اس لئے کہ ہر نماز میں فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے امام یا منفرد فاتحہ کو نہ پڑھیں تو نماز ان کی کامل نہیں ہوگی۔ کیونکہ واجب چھوٹ گیا۔

نصف نصف تقسیم کرنے کا یہ مطلب ہے کہ تین آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی حمد ثنا اور بزرگی کا ذکر ہے اور تین آیتوں میں بندے کی دعاء کا ذکر ہے اور ایک آیت میں اشتراک ہے۔ کہ عبادت اور استعانت کی اللہ تعالیٰ سے تخصیص ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ اور بندے کا عجز اور امداد طلب کرنے کی وجہ سے بندے کے لئے ہے۔ ذکر کردہ بحث سے واضح ہو گیا کہ فاتحہ کا ایک نام "صلوۃ" بھی ہے۔

سورة الحمد: فاتحہ کا ایک نام " الحمد " ہے کیونکہ اس میں " الحمد " کا ذکر ہے اس مناسبت سے نام ہی " سورہ الحمد" ہوگیا جس طرح سورۃ الاعراف کا نام اسی وجہ سے " الاعراف " ہے کہ اس میں " الاعراف " کا ذکر ہے "الانفال" کا نام الانفال کے ذکر کی وجہ سے ہے التوبۃ کا نام " التوبة " کے ذکر کی وجہ سے ہے اسی طرح اور کئی سورتوں کے نام رکھنے میں بھی یہی وجہ آپ کو نظر آئے گی۔

" سورة الحمد الاولى " جب اس میں الحمد ذکر ہے تو نام الحمد ہو گیا اور ترتیب میں سب سے پہلے ذکر کرنے کی وجہ سے اس سورۃ کا نام " الاولیٰ " ہو گیا مجموعی نام " سورة الحمدا لاولی" ہوگیا۔

سورۃ الحمد القصری:

چھوٹی سورۃ الحمد : پانچ سورتوں کو الحمد سے شروع کیا گیا ہے یہ ان تمام سے چھوٹی ہے اس لئے اس کا نام ہی "سورۃ الحمد القصری" رکھ لیا گیا۔

سورۃ النور : فاتحہ کا ایک نام نور بھی ہے جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے اور انبیاء کرام کا بھی چونکہ رب تعالیٰ نے اپنی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا ﴿ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کو منور کرنے والا ہے نبی کریم ﷺ کے نور کو ذکر فرماتے ہوئے ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے ﴿ قَدْ جَآءَ کُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ ﴾ تحقیق تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور کتاب مبین آئی۔ نور سے مراد نبی کریم ﷺ اور کتاب مبین سے مراد بھی آپ کی ہی ذات یا قرآن پاک۔

فاتحہ کو اور نور کہنے کی وجہ یہ ہے کہ فاتحہ قرآن پاک کا خلاصہ ہے اور قرآن پاک کو رب تعالیٰ نے نور کہا ہے ارشاد ہوتا ہے ﴿ وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا ﴾ ہم نے تمہاری طرف روشن نور کو نازل کیا۔ جب قرآن پاک نور ہوا تو یقیناً اس کا خلاصہ یعنی فاتحہ بھی نور ہے۔

سورۃ فاتحہ کو نور کہنے کی اور وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں انبیاء کرام، صدیقین شھداء، صالحین کا ذکر ہے اور قرآن پاک کا خلاصہ ہے جب کہ مشہور سورۂ نور جس میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی براءت اور آپ کی شان کا ذکر ہے اس کا بھی فاتحہ یقیناً خلاصہ ہے۔ کیونکہ عائشہ صدیقہ بنت صدیق اکبر زوجہ نبی الانبیاء کا جس سورۃ میں وضاحت سے ذکر ہے اس کا نام سورۂ نور ہے تو جس سورۃ میں اجمالی طور پر ذکر ہے اس کا نام بھی نور ہو گیا ایک حدیث پاک سے نور ہونا واضح ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ کے پاس میں بیٹھا ہوا تھا اوپر سے ایک آواز سنائی دی۔ آپ نے اپنے سر کو آسمان کی طرف اٹھایا آپ نے فرمایا کہ بیشک آسمانوں میں سے ایک دروازہ کھولا گیا ہے۔ جو اس سے پہلے نہیں کھولا گیا اس سے ایک فرشتہ نازل ہوا اس نے کہا:

" یا محمد ابشر بنورین لم یؤتھما احد من قبلک فاتحۃ الکتاب وخواتیم سورۃ البقرۃ "

اے محمد دونوروں پر خوش ہو جایئے جو آپ سے پہلے کسی ایک (نبی) کو نہیں دیئے گئے ایک نور فاتحۃ الکتاب اور دوسرا نور سورۃ بقرہ کی آخری آیات۔

سورۃ الشکر: جب اس سورۃ میں حمد کا ذکر ہے تو یقیناً ساتھ ساتھ شکر کا بھی ذکر پایا گیا ہے اس لئے حمد کی قسموں سے وہ حمد جس میں اللہ تعالیٰ کی تعریف زبان سے ہو اور رب تعالیٰ کی نعمت کے مقابل ہو یعنی اللہ تعالیٰ کی ان گنت نعمتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جب حمد کی جائے گی تو یہ شکر بھی ہے اسی لئے اس کا نام "سورۃ الشکر" بھی ہے۔

سورۃ السوال: چونکہ اس سورۃ میں بندہ اپنے رب سے سوال کرتا ہے اس لئے اس کا نام ہی سورۃ السوال ہو گیا جیسا کہ پہلے حدیث پاک میں گزر گیا " فلعبدی ماسأل " رب تعالیٰ کہتا ہے میرے بندے کے لئے وہ ہے جو اس نے سوال کیا۔

سورۃ الدعاء: جب اس سورۃ میں بندے کی دعاء کا ذکر پایا گیا ہے تو اس کا نام سورۃ الدعاء ہو گیا بندہ رب تعالیٰ کے حضور عرض کرتا ہے ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ (اے اللہ) ہمیں سیدھی راہ پر چلا یہ دعا ہی ہے۔

سورۃ تعلیم المسئلۃ: " لان فیها آداب السوال لانها بدئت بالثناء قبله " بیشک اس سورۃ میں رب تعالیٰ سے سوال کرنے دعاء کرنے کے آداب بیان کئے گئے کیونکہ پہلے رب تعالیٰ نے اپنی حمد کا ذکر کیا اپنی رحمت کاملہ کا ذکر فرمایا قیامت کی جزاء اور وہ اسی کے قبضہ قدرت میں ہے اس کا ذکر کیا بندے کے عجز کا ذکر کیا کہ بندہ اعتراف کرتا ہے کہ اے اللہ عبادت تیرے ساتھ ہی خاص ہے اور امداد تجھ سے ہی طلب کرتے ہیں پھر بندہ دعا کرتا ہے گویا اس سورۃ میں دعا کرنے کی تعلیم دی گئی کہ اے انسان پہلے تو رب تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کر پھر رب تعالیٰ سے سوال کر اور دعاء کر اب اس سورۃ کا نام " تعلیم المسئله " ہونے کی حکمت واضح ہوگئی۔

فائدہ جلیلہ: فضالہ بن عبید کہتے ہیں ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوئے تھے ایک شخص آیا اس نے نماز ادا کی اور اس کے بعد متصل ہی دعا کی " اللهم اغفرلی وارحمنی " اے

اللہ میری مغفرت فرما اور مجھ پر رحم فرما۔تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم نے جلدی کی اے نمازی " اذ اصليت فقعدت فاحمد الله بماهوا هله وصل علی ثم ادعه" جب تم نماز پڑھ لو تو بیٹھ جاؤ، اللہ تعالیٰ کی حمد کرو اور مجھ پر درود پڑھو، پھر دعاء کرو۔

" قال ثم صلی رجل آخر بعد ذلک فحمد الله وصلی علی النبی ﷺ
فقال له النبی ﷺ ايها المصلی ادع تجب "

(ترمذی ،ابوداؤد ،نسائی ،مشکوۃ باب الصلوۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

راوی کہتے ہیں۔پھر ایک اور شخص آئے انہوں نے نماز ادا کی ۔اس کے بعد
اللہ تعالیٰ کی حمد کی اور نبی کریم ﷺ پر درود پڑھا۔تو نبی کریم علیہ وسلم نے
فرمایا۔اے نمازی دعاء کرو تمہاری دعاء کو قبول کیا جائے گا

"عجلت ايها المصلی" (اے نمازی تم نے جلدی کی) پر حضرت علامہ علی قاری رحمہ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

" فيه دلالة علی ان من حق السائل ان يتقرب الی المسئول منه
بالوسائل قبل طلب الحاجة بما يوجب الزلفی عنده ويتوسل بشفيع له
بين يديه ليكون اطمع فی الاسعاف وارجی بالاجابة فمن عرض السوال
قبل الوسيلة فقداستعجل " (مرقاۃ ج ۲ ص ۳۴۴)

اس سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ سائل وسائل کے ذریعے اس ذات کا قرب حاصل کرتا ہے جس سے مانگ رہا ہے یعنی یہ حالت حاجت کی طلب سے پہلے ہوتا کہ اس کا قرب حاصل ہو وسیلہ بھی اس ہستی کو بنانا چاہئے جو اس کے سامنے شفاعت (سفارش) کر سکے تا کہ یہ اپنی مراد کے پورا ہونے کا طمع کر سکے اور دعا کی قبولیت کی امید کر سکے۔جس شخص نے بغیر وسیلہ کے سوال کرلیا اس نے گویا کہ جلدی کر لی۔

اب روز روشن کی طرح واضح ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ کے بغیر دعا کی مقبولیت کا کوئی یقین نہیں اور آپ کا وسیلہ حاصل کرنے کے لئے آپ پر درود شریف پڑھے۔

خصوصاً درود شریف رب تعالیٰ کی تعریف بھی ہے اور رسول اللہ ﷺ کی تعظیم بھی اس میں پائی جاتی ہے۔ایک حدیث پاک اور اس کی مختصر وضاحت سے یہ مسئلہ بھی نکھر کر سامنے آجائے گا۔

آیئے حدیث پاک کی طرف توجہ فرمائیں:

" عن ابی بن کعب قال قلت یا رسول اللہ انی اکثر الصلوۃ علیک فکم اجعل لک من صلاتی فقال ماشئت قلت الربع قال ماشئت فان زدت فھو خیر لک قلت النصف قال ماشئت فان زدت فھو خیر لک قلت فالثلثین قال ماشئت فان زدت فھو خیر لک قلت اجعل لک صلوتی کلھا قال اذا تکفی ھمک ویکفر لک ذنبک "

(ترمذی، مشکوۃ باب الصلوۃ علی النبی ﷺ)

ابی بن کعب کہتے ہیں میں نے کہا یارسول اللہ میں آپ پر زیادہ وقت درود پاک پڑھنا چاہتا ہوں کتنا وقت آپ پر درود پڑھوں؟ آپ نے فرمایا جتنا چاہتے ہو، میں نے کہا وقت کا چوتھا حصہ پڑھ لیا کروں؟ آپ نے فرمایا جتنا چاہتے ہو، اگر زیادہ کرلو تو تمہارے لئے بہتر ہے۔ میں نے کہا نصف وقت پڑھ لیا کروں؟ آپ نے فرمایا جتنا چاہتے ہو۔ اگر زیادہ کرلو تو تمہارے لئے بہتر ہے۔ میں نے کہا دوتہائی وقت پڑھ لیا کروں؟ آپ نے فرمایا جتنا چاہتے ہو اگر زیادہ کرلو تو تمہارے لئے بہتر ہے، میں نے کل وقت ہی پڑھ لیا کروں؟ آپ نے فرمایا یہ تو تمہارے مقاصد کو پورا کرنے کے لئے کافی ہوگا اور تمہارے گناہوں کو مٹا دے گا۔

خیال رہے کہ وقت سے مراد " اجعل ربع اوقات دعائی لنفسی مصروفا للصلوۃ علیک " میں اپنی دعا کے اوقات میں سے چوتھا حصہ آپ پر درود پڑھ لیا کروں۔ اسی طرح نصف، دوتہائی کل وقت سے مراد بھی اوقات دعا ہی ہیں۔ صحابی عرض کرتے رہے نبی کریم ﷺ زیادہ وقت صرف کرنے پر برانگیختہ کرتے رہے یہاں تک کہ صحابی نے عرض کیا:

" اجعل لک صلوتی کلھا ای اصلی علیک بدل ما ادعو بہ لنفسی فقال اذن تکفی ھمک ای ما اھمک من امر دینک ودنیاک وذلک لان الصلوۃ علیہ مشتملۃ علی ذکر اللہ وتعظیم الرسول ﷺ والاشتغال باداء حقہ عن اداء مقاصد نفسہ وایثارہ بالدعاء علی نفسہ ما اعظمہ من خلال جلیلۃ الاخطار واعمال کریمۃ الآثار " (مرقاۃ ج ۲ ص ۳۴۳)

کہ یارسول اللہ میں کل وقت آپ پر درود پڑھ لیا کروں یعنی دعاء کرنے کی بجائے دعا کے تمام

وقت میں آپ پر درود ہی پڑھ لیا کروں؟ تو آپ نے فرمایا یہ تمہارے ارادہ کیلئے کافی ہے یعنی دین اور دنیا کے امور میں جو بھی تم ارادہ کرو گے تمہارے لئے یہ کافی ہوگا کیونکہ درود میں اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی ہے اور رسول کریم اللہ ﷺ کی تعظیم بھی اسلئے کہ دعاء میں اپنے حقوق ومقاصد مدنظر ہوتے ہیں۔ اپنے مقاصد سے حضور کے حقوق کو ادا کرنا ہی یقیناً بہتر ہے۔ اپنے لئے دعا کرنے پر رسول اللہ ﷺ کے عظیم ذکر کو ترجیح دیجائے تو یہ خود بخود مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہوگا اور گناہوں کا کفارہ بنے گا۔

صرف نام محمد ﷺ بھی ذکر خدا ہے:

نبی کریم ﷺ کا نام رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کے دادا عبدالمطلب کو الہام کیا کہ آپ کا نام "**محمد**" رکھا جائے تا کہ زمین وآسمان والے آپ کی تعریف کریں اسی امید سے حضرت عبدالمطلب نے آپ کا نام "**محمد**" رکھا اللہ تعالیٰ نے آپ کی امید کو پورا کیا بخاری نے اپنی تاریخ میں ذکر کیا۔

" وشق له من اسمه ليجله فذو العرش محمود وهذا محمد "

اللہ تعالیٰ نے اپنے نام سے آپ کے نام کو مشتق کیا تا کہ آپ کو بزرگی حاصل ہو پس صاحب عرش محمود ہے اور یہ محمد ہیں

واضح ہوا کہ جب مشتق کو ذکر کریں تو مصدر اس میں خود ہی معتبر ہوتا ہے جب نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم پڑھیں گے تو یقیناً آپ کے ذہن میں "**محمود**" بھی آئے گا۔

درود شریف کے بغیر دعاء موقوف رہتی ہے:

درود شریف کے بغیر دعاء موقوف رہتی ہے:

" وعن عمر بن الخطاب رضى الله عنه قال ان الدعاء موقوف بين السماء والارض لا يصعد منها شئى حتى تصل على نبيك "

(ترمذی، مشکوۃ باب الصلوۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک دعاء زمین وآسمان کے درمیان معلق رہتی ہے اس کا کچھ حصہ بھی اوپر نہیں چڑھتا یہاں تک کہ تم اپنے نبی کریم ﷺ پر درود پڑھو۔

" الخطاب عام لا یختص بمخاطب دون مخاطب" خطاب عام ہے کسی خاص مخاطب سے مختص نہیں۔ یعنی اے ہر شخص دعاء کرنے والے تو کسی حاجت کا بھی اللہ تعالیٰ سے سوال کرنا چاہے تو اپنی دعا سے پہلے بھی نبی کریم ﷺ پر درود پڑھ اور آخر میں بھی۔

" فان اللہ سبحانہ یکرمہ یقبل الصلوتین وھو اکرم من ان یدع ما بینھما"

بیشک اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اول و آخر پڑھے ہوئے درود شریف کو قبول فرمائے گا تو اس کی شان کریمی کے یہ خلاف ہے کہ وہ درمیان میں کی ہوئی دعا کو چھوڑ دے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب یہ فرمایا تم اپنے نبی (کریم صلی اللہ علیہ وسلم) پر درود پڑھو تو اس سے یہ سمجھ آ گیا کہ نبی مشتق ہے نبوۃ سے جس کا معنی ہے رفعت و بلندی تو مطلب یہ ہوا:

" لا یرفع الدعاء الی اللہ تعالیٰ حتی یستصحب الرافع منہ یعنی ان الصلوۃ علی النبی ﷺ ھی الوسیلۃ الی الاجابۃ " (مرقاۃ ج ۲ ص ۳۴۸)

کہ رب تعالیٰ کے حضور دعاء کو رفعت حاصل نہیں ہوگی جب تک اس کے ساتھ اس کو بلند کرنے والی کوئی چیز نہیں ہوگی جب نبی کریم ﷺ کو بلندی و رفعت حاصل ہے تو آپ کی طرف منسوب ہونے والا درود پاک بھی رفیع و بلند ہوگا جب درود کو رفعت کے پیش نظر شرفِ قبولیت حاصل ہوگی تو یہ دعاء کی قبولیت کا وسیلہ بن جائے گا۔

سورۃ المناجاۃ: سورۂ فاتحہ کا نام مناجاۃ رکھنے کی یہ وجہ ہے کہ انسان ﴿ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ﴾ پڑھ کر رب تعالیٰ سے مناجاۃ کرتا ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ پہلے غائب کا ذکر ہے یعنی ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ﴾ سے لے کر ﴿ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ﴾ تک اس کے بعد ﴿ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ﴾ میں خطاب ہے اس میں عجیب حکمت ہے اس کا ذکر انشاء اللہ فاتحہ کی ان آیات کی تفسیر میں ہی آئے گا۔

سورۃ التفویض: تفویض کا معنی ہے سپرد کرنا سورۂ فاتحہ کا نام تفویض اس لئے رکھا گیا ہے کہ انسان جب ﴿وایاک نستعین﴾ پڑھتا ہے اور رب تعالیٰ سے " استعانت" کو خاص کرتا ہے تو گویا کہ اپنے تمام معاملات کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے گویا یوں کہیں کہ بندہ کہتا ہے اے مولیٰ کائنات میں کچھ نہیں سب کچھ تو ہی ہے اسی وجہ سے اس سورۃ کا نام ہی "تفویض" ہو گیا۔ (بحث اسماء فاتحہ ماخوذ از اتقان والجامع للاحکام للقرطبی)

﴿بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾

''اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا''

''اللہ کے نام سے شروع جونہایت مہربان، رحم کرنے والا ہے''

لفظ باء کے متعلق مسائل:

باء حرف جار (زیر دینے والا) ہے اس کا تعلق کسی پوشیدہ لفظ سے ہے اس لئے ''شروع'' کسی مذکور لفظ کا معنی نہیں۔ پوشیدہ لفظ اسم ہوگا یا فعل پھر مقدم ہوگا یا مؤخر کل یہ چار صورتیں ہیں:

(۱) اگر مقدم ہو اور فعل ہو تو تقدیر عبارت کی یہ ہو ''ابدأ باسم اللہ'' میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے۔

(۲) اگر مقدم ہو اور اسم ہو تو تقدیر عبارت کی یہ ہوگی ''ابتداء الکلام باسم اللہ'' شروع کلام اللہ کے نام سے۔

(۳) اگر مؤخر ہو اور فعل ہو تو عبارت اصل میں اس طرح ہوگی ''باسم اللہ ابدأ'' اللہ کے نام سے میں شروع کرتا ہوں۔

(۴) اگر مؤخر ہو اور اسم ہو، تو حقیقت میں عبارت یوں ہوگی ''باسم اللہ ابتدائی'' اللہ کے نام سے شروع یہ سب معنی درست ہیں ان کے جائز ہونے میں کوئی کلام نہیں بلکہ چار صورتیں اور بھی اسی طرح ہیں کہ جو کام ہو رہا ہو۔ اس کے مطابق خاص فعل یا خاص اسم اول میں ہو یا آخر میں۔

پڑھنے لگے تو اس کے مطابق اقرأ اور قراءتی مقدر ہوں صرف دیکھنا یہ ہے کہ ان تمام معانی سے بہتر کون سا معنی ہے کیونکہ ''اسم اللہ'' کو مقدم ذکر کیا گیا ہے اور وہ کلمہ جس سے تعلق ہے وہ مؤخر ہے جیسے ''باسم اللہ مجراھا و مرساھا'' میں۔ اسم اللہ مؤخر ہے اور وہ کلمہ جس سے تعلق ہے وہ مقدم جیسے ''اقرأ باسم ربک'' میں۔

اس تمہید کے بعد علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں " **التقدیم عندی اولی**" میرے نزدیک اسم اللہ کو مقدم ذکر کرنا ہی بہتر ہے اس پر آپ نے دلائل قائم کیے ہیں کہ "**باسم اللہ**" پہلے بہتر ہے اور جس کلمہ سے تعلق ہے وہ بعد میں بہتر ہے:

(۱) بیشک اللہ تعالیٰ قدیم واجب الوجود ہے اس کا وجود تمام موجودات سے پہلے ہے بلکہ آپ یوں بھی نہیں کہہ سکتے کہ اس کے وجود کی ابتداء باقی موجودات کی ابتداء سے پہلے ہوئی۔اس لئے کہ اس کی کوئی ابتداء نہیں۔"**والسابق بالذات یستحق السبق فی الذکر**" وہ ذات جس کی ابتداء ہی نہیں اور سب سے پہلے ہے اس کا ذکر بھی پہلے ہونا چاہئے۔

(۲) رب تعالیٰ نے اپنی شان بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا "**ھو الاول والآخر**" وہی اول ہے اور وہی آخر۔یعنی اس کی نہ ابتداء ہے نہ انتہاء اس لئے اسی ذات کا ذکر سب سے پہلے بہتر ہے کیونکہ اس نے خود اپنا ذکر لفظ "ھو" کیا ہے جو کہ پہلے ذکر ہے۔اور رب تعالیٰ نے فرمایا " **للہ الامر من قبل ومن بعد**" اللہ تعالیٰ کے لئے ہی امر ہے اس سے پہلے اور بعد۔یہاں بھی رب تعالیٰ نے اپنا ذکر لفظ "للہ" سے کیا ہے جو پہلے مذکور ہے۔

(۳) " **التقدیم فی الذکر ادخل فی التعظیم**" پہلے ذکر سے زیادتی تعظیم سمجھ آتی ہے عظیم ذات سمجھ کر ہی پہلے ذکر کیا جاتا ہے۔

(۴) اسی سورۃ میں رب تعالیٰ نے ﴿ **ایاک نعبد**﴾ ذکر کیا ہے ﴿ **ایاک** ﴾ سے خطاب رب تعالیٰ کو ہے جو پہلے مذکور ہے لہذا اس بحث سے واضح ہوا کہ تقدیر عبارت کی "**باسم اللہ ابتدائی**" ہونی چاہئے اور یہی بہتر ہے۔

(۵) شیخ والد ضیاء الدین عمر رحمہ اللہ کو کہتے ہوئے سنا انہوں نے شیخ ابو القاسم قشیری رحمہ اللہ کو کہتے ہوئے سنا جب کہ انکے پاس شیخ بن ابوسعید بن ابی الخیر آئے تو قشیری کہنے لگے کہ محققین حضرات کہتے ہیں ہم نے جس چیز کو بھی دیکھا اسکے بعد اللہ تعالیٰ کو دیکھا یعنی مخلوق کو دیکھ کر رب تعالیٰ کا علم حاصل ہوتا ہے۔ابوسعید بن ابی الخیر نے کہا یہ مقام تو مریدین کا ہے جن کو تم محققین کہہ رہے ہو دراصل محققین حضرات وہ ہیں جو ہر چیز سے پہلے رب تعالیٰ کو دیکھتے ہیں۔

تحقیق کلام یہ ہے کہ مخلوق سے خالق کا علم حاصل کرنا یہ کم درجہ کی دلیل ہے جس کو اہل علم برھانِ انی کہتے ہیں کیونکہ اس میں اثرات کو دیکھ کر مؤثر کا پتہ چلایا جاتا ہے معلول کو دیکھ کر علت کا پتہ چلایا جاتا ہے۔لیکن خالق سے مخلوق کا پتہ چلانا اعلیٰ درجہ کی دلیل ہے جسے اہل علم نے برھان لمی کہا ہے اس میں مؤثر کو دیکھ کر اثر کا پتہ چلایا جاتا ہے علت سے معلول کو حاصل کیا جاتا ہے یہی اعلیٰ دلیل ہے واضح ہوا کہ جب اعلیٰ درجہ کی دلیل سے یہ پتہ چلا کہ رب تعالیٰ سے مخلوق کا علم حاصل ہوتا ہے۔ جب خالق کائنات کا علم پہلے ہے تو اس کا ذکر بھی پہلے ہونا چاہئے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ فعل کو مقدر نکالنا بہتر ہے یا اسم کو۔اس میں کچھ حضرات نے فعل کو مقدر نکالنا پسند کیا ہے لیکن علامہ رازی فرماتے ہیں "واقول لقائل ان یقول بل اضمار الاسم اولی" میں کہتا ہوں کہ یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ بنسبت فعل کے اسم کا مقدر نکالنا بہتر ہے۔اب اس صورت میں عبارت یوں ہوگی" بسم اللہ ابتداء کل شئی "اللہ کے نام سے شروع ہر چیز۔

اتنے الفاظ سے ہی واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ بذاتہ تمام چیزوں کا مبدأ ہے اور ساری کائنات کا خالق ہے کوئی کہنے والا کہے یا نہ کہے کوئی ذکر کرنے والا ذکر کرے یا نہ کرے۔

یقینی بات یہی ہے کہ یہ معنی لینا ہی بہتر ہے جس سے خود بخود بغیر کسی کے کہنے کے پتہ چل جائے کہ اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا خالق ہے۔ (ماخوذ از کبیر جز اول ص ۱۰۱)

تراجم کا تقابلی جائزہ:

علامہ رازی رحمہ اللہ کی اس تقریر دل پذیر کے بعد اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کے ترجمہ کنز الایمان کی فوقیت واضح ہوگئی۔

"شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم والا ہے" (محمود الحسن صاحب)

"شروع ساتھ نام اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والے مہربان کے" (شاہ رفیع الدین صاحب)

"شروع اللہ نہایت رحم کرنے والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے" (عبد الماجد صاحب دریا آبادی)

"شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان اور نہایت رحم والے ہیں" (اشرف علی صاحب)

''شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے'' (فتح محمد صاحب)

'' اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا'' (مولانا احمد رضا خان بریلویؒ)

اس مقام میں مولانا احمد رضا خان رحمہ اللہ کے ترجمہ میں لفظ ''اللہ'' پہلے ہے اور ''شروع'' بعد میں لیکن دیگر تراجم میں ''شروع '' پہلے اور لفظ ''اللہ'' بعد میں۔

علامہ رازی رحمہ اللہ کی بحث کا خلاصہ دیکھیں کہ اصل عبارت یہ ہوگئی ''بسم اللہ ابتداء کل شئی '' اللہ کے نام سے شروع ہر کام۔

واضح ہوا کہ علامہ رازی رحمہ اللہ کی تفسیر کبیر کا مطالعہ کرنے کے بعد تسمیہ کا معنی بہت خوب مولانا احمد رضا رحمہ اللہ نے کیا ہے۔

اعتراض: قرآن پاک میں تو بہتر تراکیب کو ہی استعمال کیا گیا ہے کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ ﴿اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ﴾ میں ''اسم رب '' بعد میں اور اقرأ پہلے ہے یہ جائز تو ہے بہتر نہیں۔

جواب: ﴿ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ ﴾ میں کسی نے بھی یہ نہیں بیان کیا کہ یہ صرف جائز ہے بہتر نہیں بلکہ یہاں بعد میں ہونے کے باوجود بہتر وہی صورت ہے جو استعمال ہے :

''وانما قدم الفعل فی بالقراء ۃ باسم ربک لانھا اول سورۃ نزلت فی قول وکان الامر بالقراء اھم کان تقدیم الفعل اوقع '' (مدارک)

'' اقرأ باسم ربک'' میں فعل کو مقدم ذکر کیا گیا کیونکہ اس سورۃ کی پہلی چند آیات سب سے پہلے نازل ہوئیں اس لئے یہاں قراءت زیادہ مقصود تھی تو اقرأ کو پہلے ذکر کیا گیا۔

خیال رہے کہ یہ قول صاحب مفتاح کا ہے صاحب کشاف نے تو اس مقام پر بھی ''باسم ربک'' کو پہلے ''اقرأ'' کے متعلق کیا ہی نہیں بلکہ دوسرے ''اقرأ '' کے متعلق کیا ہے جو بعد میں ہے لہذا پہلے ''اقرأ '' کا معنی صرف ''اوجد القراۃ'' ہے یعنی قرأت کو موجود کیجئے پڑھئے صرف پڑھنے کا حکم ہے پھر کہا اپنے رب کے نام سے پڑھئے۔واضح ہوا کہ اعتراض اپنی کم سمجھی پر تو ہوسکتا ہے قرآن پاک کی ترکیب پر نہیں وہ تو بلاشبہ ایسی بلاغت پر مشتمل ہے جسے دیکھ کر ہی علم بلاغت کے ضابطے بنے۔

(از مطول ص ۱۴۸)

تنبیہ : کوشش ان شاء اللہ یہ ہوگی کہ مفسرین کرام کے مختلف اقوال کو اگر جمع کرنا ممکن ہوا تو جمع کرلوں اور اگر ایک مفسر نے ایک قول بیان کیا دوسرے نے دوسرا قول اپنے موقف پر ہر ایک نے دلائل دیئے اور دوسرے کا ردکیا۔ ان اقوال کو جمع کرنا بھی ممکن نہیں تو جو بات راجح نظر آئے گی اسے ان شاء اللہ ذکر کروں گا کئی تفاسیر بفضلہ تعالیٰ میرے سامنے ہیں میں کافی حد تک دیکھنے کی کوشش کررہا ہوں۔

لفظ باء کے معانی : بسم اللہ میں جو لفظ باء ہے یہ حرف جار ہے اس کے کئی معانی ہیں لیکن یہ لفظ یہاں کونسے معانی میں استعمال ہے؟

لفظ "باء" بمعنی مصاحبة : خیال رہے کہ "با" کبھی الصاق کے معنی میں استعمال ہوتی ہے اس کا معنی اتصال "ملنا، متصل ہونا) ہے لیکن جب "با" مصاحبۃ کے معنی میں استعمال ہو تو اس وقت لفظ "مع" کا معنی ہوگا یعنی معیت کا حصول۔ اب معنی یہ ہوگا کہ "اللہ کے نام سے تبرک حاصل کرتے ہوئے ہر کام کی ابتداء" عام طور پر اہل لسان (عربی زبان والے) "باسم اللہ اقرأ متبرکا" کہا کرتے تھے "با" کا یہ معنی نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے بھی سمجھ آتا ہے حدیث شریف میں ذکر ہے " **بسم اللہ الذی لا یضر مع اسمه شئی فی الارض ولا فی السماء**" اللہ کے نام سے شروع جس کے نام کی معیت میں زمین وآسمان میں کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

نبی کریم ﷺ نے لفظ "مع" استعمال فرمایا ہے۔ جس سے واضح ہو رہا ہے کہ یہاں "با" مصاحبت کے معنی میں بھی استعمال ہے "با" کو مصاحبت کے معنی میں لینا بھی ایک خصوصی فضیلت رکھتا ہے:

"ان المصاحبة ادل علی ملابسة جمیع اجزاء الفعل لا سم اللہ"

مصاحبت کا معنی لینا زیادہ مناسب اس لئے ہے کہ اس سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ فعل (کام) کے تمام اجزاء کو اللہ کے نام کی معیت حاصل ہے۔

(ماخوذ از بیضاوی مع حاشیہ ص ۴)

خیال رہے کہ "با" کا تبرک کے لئے آنا کوئی علیحدہ معنی نہیں البتہ اسی مصاحبت والے معنی سے تبرک والا معنی بھی خود بخود سمجھ آ رہا ہے۔

لفظ "باء" بمعنی استعانت : جب "با" کو استعانت کے معنی میں لیا جائے گا تو معنی یہ ہوگا "اللہ کے نام کی امداد سے شروع" یہ معنی بھی خصوصی فضائل کو سمیٹے ہوئے ہے کیونکہ اس میں انسان اپنی عاجزی کا اظہار کرتا ہے اور اظہارِ عبودیت (اپنے بندہ ہونے کو ظاہر) کرتا ہے۔اس میں کامل ادب پایا جاتا ہے کیونکہ اپنی طاقت کی نفی کرتا ہے اور رب تعالیٰ کو ہی مؤثر حقیقی مانتا ہے اسی سے رحمت کے دروازے کھلتے ہیں اور ساتھ ہی اسے " لاحول ولا قوة الا بالله " (گناہوں سے پھرنے اور نیکی کی طاقت سوائے اللہ تعالیٰ کے نہیں) کا خزانہ بھی حاصل ہو جائے گا۔"با" کو استعانت کے معنی میں بنانا اس لئے بھی بہتر ہے کہ قرآن پاک میں صراحۃً " استعینوا " کے ساتھ تعلق آیا ہوا ہے ﴿اِسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ﴾ امداد طلب کرو صبر اور نماز سے "استعینوا بالله " امداد طلب کرو اللہ سے۔"با" کو استعانت کے معنی میں لینے سے مشرکین کا واضح طور پر رد بھی ہو جائے گا کیونکہ وہ اپنے بتوں، معبود ان باطلہ کو رب تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ مانتے تھے مسلمان " بسم الله " پڑھ کر ہی واضح کر دیتا ہے کہ ہمارا معبود تو فقط ایک ہے ہم کسی کی عبادت کر کے کسی کو رب تعالیٰ کا شریک ٹھہرا کر اس کے قرب کا ذریعہ نہیں مانتے۔

(ماخوذ از روح المعانی جزء اول ص ۴۷)

مزید تفصیل ان شاء اللہ ﴿وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ کی تفسیر میں آئے گی۔

هیرے اور موتی : " کسرت الباء فی البسملة تعليما للتوصل الى الله تعالىٰ " باء کا کسرہ (زیر) اس پر دلالت کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچنے کا ذریعہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو عاجز کرے، اپنی خودی مٹا دے، اپنی عبودیت سے اپنے آپ کو پست کر لے پھر رب تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا " فلا يتوصل الى نوع من انواع المعرفة الابنوع من انواع الذل والكسر " اس وقت تک معرفت حاصل نہیں ہو سکتی جب تک عجز وانکساری حاصل نہ ہو۔

حضرت عمر بن فارض رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ولو كنت لی من نقطة الباء خفضة ... رفعت الى ما لم تنله حيلة

اگر مجھے باء کے نقطہ سے بھی زیادہ پستی حاصل ہوتی ...... تو میں اتنے بلند منازل حاصل کر لیتا، جنھیں کسی حیلہ سے بھی نہ پا سکتا

☆ رب تعالیٰ کی ذات کے ساتھ صفات کا قیام ہے اس طرح ذات کا مرتبہ اولیٰ اور صفات کا مرتبہ ثانیہ بیان کیا جا سکتا ہے اس طرح حروف تہجی میں الف پہلے اور باء بعد میں الف سے اشارہ ذات کی طرف اور باء سے صفات کی طرف ہے "باسم اللہ" کو باء سے شروع کیا جو صفات پر دلالت کر رہی ہے نیز اللہ تعالیٰ کی صفات کوئی جمالیہ ہیں اور کوئی جلالیہ لیکن جمالیہ کو سبقت حاصل ہے جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے "سبقت رحمتی عضبی" میری رحمت کو غضب پر سبقت حاصل ہے۔

گویا کہ باء سے رب تعالیٰ کی رحمت کی طرف اشارہ پایا گیا پھر ظاہر طور پر "رحمن اور رحیم" کا ذکر کر کے اسے واضح کر دیا۔

☆ حروف جار فعلوں اور اسموں کے درمیان رابطہ کا ذریعہ ہیں باء چونکہ حرف جار ہے اسی سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خالق اور مخلوق کے درمیان واسطہ اور ذریعہ ہیں:

" واما اشارة الی الحقیقة المحمدیة والتعین الاول المشار الیه بقوله صلی اللہ علیه وسلم اول ماخلق اللہ نور نبیک یاجابر وبواسطته حصلت الافاضة کما یشیر الیه لو لاک ماخلقت الافلاک "

لفظ باء سے حقیقت محمدیہ اور آپ کی اولیت پر اشارہ ملتا ہے اس پر خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے جس میں آپ نے فرمایا اے جابر سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی کے نور کو پیدا کیا۔ اور یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ حضور ﷺ کائنات کے وجود کا ذریعہ اور واسطہ ہیں آپ نہ ہوتے تو کائنات کا نظام قائم نہ ہوتا۔ اس پر حدیث قدسی دلالت کر رہی ہے رب تعالیٰ نے فرمایا اے محبوب اگر آپ نہ ہوتے تو میں آسمانوں کو پیدا نہ کرتا۔

(ماخوذ از روح المعانی جزء اول ص ۱۵)

لفظ "اسم" کے متعلق بحث:

"اسم الشئی ما یعرف به ، فاسماء اللہ تعالیٰ ھی الصور النوعیة التی تدل بخصائصها" (جزاول ص۸ ابن عربی)

کسی چیز کا اسم وہ ہے جس سے اس کی پہچان ہو اللہ تعالیٰ کے اسماء، صور نوعیہ ہیں جو اپنی

خصوصیات پر دلالت کر رہی ہیں یعنی صفت رزّاقیۃ اس کے رزاق ہونے پر، صفت رحمت اس کے رحمٰن ورحیم ہونے پر دلالت کر رہی ہے اسی طرح دوسری صفات کو بھی مدنظر رکھا جائے۔لفظ اسم اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھی بولا جاتا ہے اور اس کی صفات پر بھی کیونکہ صفات بھی اس کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہیں اور صفات سے ذات باری تعالیٰ کی معرفت بھی حاصل ہوتی ہے۔ (ابن عربی)

اسم کا لفظ کس لفظ سے بنا؟

زیادہ معتبر قول یہ ہے کہ اصل میں یہ لفظ سمو (سین پر زیر اور میم ساکن) تھا۔جس کا معنی ہے بلندی یعنی اسم اپنے مسمی (جس کا نام ہے) کی رفعت اور بلندی شان پر دلالت کرتا ہے جیسے ابو خالد نے مبارک کی مدح میں کہا:

﴿ واللہ اسماک سمی مبارک ، اثرک اللہ بہ ایثار کا ﴾

اللہ تعالیٰ نے تمہیں بلند کیا رفعت عطا کی تمہارا نام ہی مبارک رکھا گیا۔اللہ تعالیٰ نے تمہیں فضیلت سے مبارک بنایا۔

ایک قول یہ ہے کہ اسم کا اصل وسم ہے جس کا معنی ہے علامت۔یعنی اسم اپنے مسمی پر علامت اور نشانی کی حیثیت رکھتا ہے۔

علم نحو پڑھے ہوئے حضرات کو بخوبی علم ہے کہ پہلا قول ہی زیادہ معتبر ہے گرائمر کی زیادہ پیچیدہ بحثوں سے اجتناب کیا جارہا ہے اہل علم کی دل چسپی کے لئے کچھ بحثیں علمی سطح کی ذکر کرنی بھی مجبوری ہوتی ہے لیکن عوام کے ذہنوں کو الجھاؤ سے بچانا بھی ضروری ہوتا ہے۔اس لئے کوشش یہی ہے کہ بات آسان بھی ہو اور علمی بھی تاکہ عوام اور دینی مدارس کے طلباء کے لئے یکساں مفید ہو۔

لفظ اسم کے متعلق مختصر تفصیل:

علامہ رازی رحمہ اللہ نے اسم کے متعلق بہت تفصیل سے لکھا۔اس سے مختصر بحث دینی مدارس کے طلباء کے لئے شامل کی جارہی ہے اگرچہ عوام کے لئے اس بحث کو ذکر کرنا کوئی خاص ضروری نہ تھا۔

بعض فرقوں (حشویہ، کرامیہ وغیرہ) نے یہ کہا ہے کہ اسم مسمی کا عین ہے۔ معتزلہ نے کہا کہ اسم مسمی کا غیر ہے لیکن تسمیہ کا عین ہے۔

اہل سنت و جماعت کا صحیح مذھب یہ ہے کہ اسم مسمی اور تسمیہ دونوں کا ہی غیر ہے یہی بات تحقیق پر مبنی ہے:

(۱) کیونکہ اسم کبھی موجود ہوتا ہے لیکن مسمی معدوم ہوتا ہے۔ کبھی مسمی موجود ہوتا ہے اسم معدوم ہوتا یعنی جن موجودات کے نام نہ رکھے جائیں۔ ان کے ہی نام رکھ لیں تو دونوں موجود ہوں گے۔ یہ بات ہر ذی شعور کو سمجھ آسکتی ہے کہ موجود اور معدوم ایک نہیں معدوم تو کوئی چیز ہی نہیں۔

(۲) مسمّٰی (ذات) کبھی ایک ہوتا ہے لیکن نام اس کے کثیر ہوتے ہیں جیسے مترادف نام کبھی ہوتے ہیں اسی طرح کبھی ایک نام ہوتا ہے اور شخص کئی ہوتے ہیں۔ جیسے مشترک کا نام۔

(۳) اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿وَلِلّٰہِ الاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْہُ بِھَا﴾ اللہ تعالیٰ کے لئے اچھے نام ہیں ان سے اس کو بلاؤ۔

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا" ان للہ تعالیٰ تسعة وتسعین اسما " بیشک اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں اس سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ایک ہے لیکن نام اسکے بہت ہیں۔

(۴) جب رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَلِلّٰہِ الاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْہُ بِھَا﴾ اس سے پتہ چلا کہ رب تعالیٰ کے تمام نام اچھے ہیں ان ناموں سے ہمیں اللہ تعالیٰ نے دعاء کرنے اسے بلانے کا حکم دیا اس سے یہ بات بخوبی واضح ہو رہی ہے کہ رب تعالیٰ کے اسماء ذریعہ دعاء ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعاء کی جاتی ہے وہ ذات مدعو ہوئی۔ یقینی بات ہے کہ ذات مدعو اور ہے اور الفاظِ دعا اور ہیں۔

(۵) " بسم اللہ " میں اسم مضاف ہے اور لفظ اللہ مضاف الیہ اسی طرح " تبارک اسم ربک " میں اسم مضاف ہے اور رب مضاف الیہ ہے۔ جب کہ یہ بھی واضح ہے کہ مضاف اور مضاف الیہ ایک نہیں ہوتے تو یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اسم اور وہ ذات جس کا وہ نام ہے ایک نہیں۔

(۶) ہم اسماء کی تعریف تو ان کے عربی ہونے اور فارسی ہونے سے کر لیتے ہیں ہم کہتے ہیں:

" اللہ اسم عربی و خدای اسم فارسی و اماذات اللہ تعالیٰ فمنزہ عن کونہ کذلک "

لفظ اللہ عربی ہے اور ''خدا'' اسم فارسی ہے لیکن رب تعالیٰ کی ذات کے متعلق تو اس طرح بیان کرنا ممکن نہیں پتہ چلا کہ اسم اور ہے اور مسمی اور ہے۔ (از کبیر ص ۱۰۹)

''اسم '' کا اطلاق (بولا جانا) جن چیزوں پر:

اسم سے ذات اور حقیقت ، اور وجود اور عین مراد لئے جاتے ہیں ''وھی عندھم اسماء مترادفة '' یہ چار لفظ ایک دوسرے کے مترادف ہیں یعنی سب کا ایک مطلب ہے ﴿ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ ﴾ میں اسم سے مراد ذات ہے صرف نام نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے رب کی ذات کی پاکی بیان کرو۔

اسی طرح رب تعالیٰ نے کفار کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ﴿ ماتعبدون من دُوْنِہٖ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْھَآ ﴾ اس آیت میں بھی اسماء سے مراد ذاتیں ہیں۔ کیونکہ کفار بتوں کی ذاتوں کی عبادت کرتے تھے صرف ان کے ناموں کی نہیں۔ اسلئے آیت کا مطلب یوں ہوگا ''اللہ کے بغیر تم نہیں عبادت کرتے مگر ان ذاتوں کی جن کو تم نے مقرر کر رکھا ہے۔'' اگرچہ ظاہری معنی یہ ہے کہ وہ نام جو تم نے رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن اسماء سے مراد ذوات ہیں۔ (از روح المعانی ص ۵۳)

رب تعالیٰ کے اسم گرامی لفظ ''اللہ'' کے متعلق بحث:

جس طرح رب تعالیٰ کی ذات خیال ، قیاس گمان اور وہم سے بالاتر ہے اسی طرح رب تعالیٰ کے اسم گرامی لفظ ''اللہ'' میں بھی اہل علم سرگرداں رہے کہ اسے مشتق کہا جائے یا جامد۔ اگر مشتق ہے تو کس لفظ سے مشتق ہے۔

راقم کے خیال میں یہ اختلاف کوئی اختلاف نہیں بلکہ باعث رحمت ہے اس سے رب تعالیٰ کے اسم گرامی کی شان دوبالا ہو رہی ہے ہر قول میں ایک عجیب کمال ، عجیب ذوق ، عجیب حلاوت اور عجیب

شوق پایا جاتا ہے۔

لفظ "اللّٰہ" جامد ہے: علم نحو کے امام خلیل اور سیبویہ کا قول یہ ہے کہ لفظ "اللہ" کسی لفظ سے نہیں بنا۔ بلکہ جامد ہے (جامد کہا ہی اسے جاتا ہے جو کسی سے نہ بنے اور اس سے کوئی نہ بنے) اور رب تعالیٰ کی ذات پر دلالت کر رہا ہے۔

" لا الہ الا اللہ " کا معنی کریں گے تو کہیں گے "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں" لفظ اللہ کا کوئی معنی نہیں کیا۔

اگر مشتق ہوتا تو کوئی نہ کوئی معنی مذکور ہوتا۔ بلکہ واضح طور پر کلمہ توحید سے توحید ہی تب سمجھ میں آتی ہے جب کہ اس کو صرف "علم" رکھا جائے اور معنی مشتقی نہ کیا جائے۔

جو شخص بھی کسی کی صفات ذکر کرنا چاہے پہلے وہ ذات ذکر کرتا ہے پھر اس کی صفات کو جیسے کہا جائے "خالد الفقیہ النحوی الاصولی" خالد فقہ، نحو، اصول فقہ کا عالم ہے۔

جب کہ لفظ "اللہ" رب تعالیٰ کی ذات پر دلالت کرتا ہے یعنی اُس کا ذاتی نام ہے تو اسے پہلے ذکر کیا جاتا ہے اور صفات کو بعد میں مثلاً کہا جاتا ہے " اللہ العالم القادر الحکیم " یہاں اللہ تعالیٰ کا قادر ہونا، عالم و حکیم ہونا بعد میں ذکر کیا گیا اسی سے واضح ہو گیا کہ لفظ "اللہ" رب تعالیٰ کا ذاتی نام ہے اور جامد ہے۔

اعتراض: قرآن پاک کی سورۂ ابراہیم میں ہے:

﴿ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ اللهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ﴾

یہاں صفات یعنی العزیز الحمید کو پہلے ذکر کیا گیا ہے اور موصوف یعنی لفظ "اللہ" بعد میں اس سے تو پتہ چلا کہ یہ قاعدہ کلیہ نہیں کہ موصوف پہلے ہو اور صفات بعد میں۔

جواب: قاعدہ تو کلیہ ہے البتہ بعض اوقات اشتباہ اس لئے ہوتا ہے کہ ایک اور ضابطہ کو مدنظر نہیں رکھا جاتا وہ ضابطہ یہ ہے کہ بعض اوقات صفات کو ذکر کر کے ان پر کوئی حکم لگانا مقصود ہوتا ہے۔ ذکر کرنے کے بعد خیال آتا ہے پتہ نہیں کسی کو پتہ چلا ہے یا نہیں کہ یہ شخص کون ہے پھر وہ نام بھی

ذکر کر دیتا ہے۔اس صورت میں علم نحو میں نام کو صفت کا درجہ دیا جاتا ہے اور صفت پر دلالت کرنے والے الفاظ کو موصوف کی حیثیت حاصل ہوجاتی ہے۔جس طرح کہا جائے " هذه الدار ملك للفاضل العالم حامد" یہ گھر عالم،فاضل،حامد کی ملکیت ہے۔

پہلے صرف یہ کہنا مقصود تھا کہ یہ گھر صاحب فضل،صاحب علم شخصیت کا ہے۔پھر خیال کیا کہ نام بھی ذکر کر دیا جائے تا کہ سننے والوں کو پتہ چل جائے کہ یہ مکان اس شخص کا ہے جس کا نام حامد ہے اس لئے کہ عالم وفاضل تو اور بھی ہو سکتے ہیں اس ترکیب میں الفاضل،العالم موصوف ہیں اور حامد صفت ہے۔

یہاں بھی ذات پر دلالت کرنے والے الفاظ پہلے ہیں۔اور صفات پر دلالت کرنے والے لفظ بعد میں یعنی ترکیب بالعکس ہے۔

لفظ ''اللہ'' کو اسم علم نہ ماننے والوں کے دلائل:

بعض اہل علم اس طرف گئے ہیں کہ لفظ ''اللہ'' رب تعالیٰ کا ذاتی نام نہیں مشتق ہے صفاتی نام ہے پھر رب تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہو گیا اب کسی اور کو ''اللہ'' نہیں کہا جا سکتا۔ان حضرات نے اپنے مذہب پر یہ دلائل قائم کئے ہیں۔

(۱) رب تعالیٰ نے فرمایا﴿ وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ ﴾ اور فرمایا ﴿ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ ان دونوں آیتوں میں ضروری ہے کہ لفظ ''اللہ'' کا صفتی معنی لیا جائے کیونکہ اہل لسان کا محاورہ " هو العالم الزاهد في البلد" یہاں صفات کو ذکر کیا گیا ہے یہ نہیں کہا جاتا " هو زيد في البلد" اسی طرح " هو بكر" وغیرہ ہی نہیں کہا جاتا۔اس محاورہ کو دیکھ کر یہی کہا جا سکتا ہے کہ آیات میں بھی صفتی معنی ہے۔

یہ بھی خیال رہے کہ ترکیب میں مبتداء خبر ہیں۔موصوف وصفت نہیں کیونکہ ضمیر نہ موصوف ہوتی ہے نہ صفت بلکہ وہ الفاظ جو خبر بن رہے ہیں ان میں معنی صفتی معتبر ہے ان سے مراد ذات نہیں۔

جب لفظ ''اللہ'' کو مشتق مانا جائے تو یہ مسائل خود بخود ثابت ہو جائیں گے۔

(۱) ''الا له'' کا معنی ہوگا معبود خواہ وہ معبود بالحق ہو یاباطل طریقہ سے معبود ہو۔اصل میں عبادت صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے کیونکہ وہ ہر قسم کے انعام عطا کرنے والا ہے اور وہی تمام کائنات کا خالق ہے اور جب اعلیٰ قسم کے انعامات صرف وہی عطا کرتا ہے تو اعلیٰ قسم کی تعظیم کا بھی وہی مستحق ہے وہ اعلیٰ قسم کی تعظیم عبادت ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ جب دوسرا کوئی عظیم انعامات عطاء کرنے کا اہل نہیں تو عظیم تعظیم کا بھی مستحق نہیں۔یعنی عبادت کے لائق صرف وہی ذات ہے۔

(۲) تقوی کے اعلیٰ مقام پر فائز حضرات یہ کہتے ہیں کہ عبادت کرنے والے کا مقصد صرف رب تعالیٰ کو راضی کرنا ہو۔

ثواب کی طلب،عذاب سے بچنے کی خواہش۔جنت حاصل کرنے کی تمنا جہنم سے بچنے کا خوف مقصد نہ ہو۔کیونکہ اگر مقصود یہ چیزیں ہوجائیں تو ان کا مرتبہ اولیت درجہ رکھے گا۔اور رب تعالیٰ کا مقام ثانوی (دوسرا درجہ) ہوجائے گا:

" ومن کان کذالک لم یکن محبا اللہ ولم یکن راغبا فی عبادۃ اللہ "

جوشخص اس طرح عبادت کرے گا کہ اس کا مقصد حصول ثواب اور جنت ہوگا وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے میں خالص نہیں ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں کامل رغبت کرنے والا نہیں ہوگا۔

اس لئے اے انسان عبادت کرتے وقت تیرا مقصود صرف رب تعالیٰ ہو۔صرف اس کی رضا ہو اس طرح تیری نظر میں ثواب وجنت کا دوسرا مرتبہ ہوگا۔رب تعالیٰ مقصود حقیقی ہوگا جب وہ راضی ہوگا خود بخود جنت حاصل ہوگی اور ثواب بھی حاصل ہوگا۔یہ لفظ''اللہ '' سے مسئلہ حاصل ہوا کہ وہ معبود حقیقی ہے۔

مصادر کے لحاظ سے لفظ''اللہ'' کی حالتیں:

(۱) "الہ (ف) الوھۃ". الاھۃ سے مشتق جب مانا جائے تو اس کا معنی ہوتا ہے بندگی کرنا "الالہ " کا معنی معبود،خدا جب باب تفعیل سے آئے گا تو معنی ہوگا،معبود بنانا،خدا کا مرتبہ دینا،پرستش کرنا۔

چونکہ لفظ''اللہ'' اصل میں " الہ " ہے ہمزہ کو حذف کرکے،الف،لام اس پر داخل کیا گیا لام کو

لام میں ادغام کیا تو لفظ ''اللہ'' بن گیا اب معنی معبود ہی ہوگا۔و منه قوله الموحدين " لا اله الا اللہ" معناه " لا معبود غير الله " یعنی اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں۔

(۲) " اله (س) الها (بفتح الهمزة و اللام)، حیران ہونا۔ یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوتا ہے کہ وہ فلاں کام میں حیران ہے اسے کوئی راہ نہیں سوجھتی۔

رب تعالیٰ کی ذات میں بھی عقلیں حیران ہیں۔اس لئے کہ اس کی شان یہ ہے ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ﴾ اسے نظریں نہیں پا سکتی وہ نظروں کو پالیتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب وہ نظر نہیں آتا تو غلطی سے اگر عقل اس کے وجود کا انکار کر دے تو خود ہی انسان کا نفس عقل کو جھوٹا قرار دیتا ہے۔کیونکہ ساری کائنات اپنے وجود میں رب تعالیٰ کی محتاج ہے یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ مخلوق موجود ہو خالق موجود نہ ہو محتاج موجود ہو، اور وہ ذات موجود نہ ہو جس کی کائنات موجود ہے۔

اور عقل اگر رب تعالیٰ کو پہچاننے میں یوں غلطی کرے کہ عقل کہے کہ ہاں اللہ تعالیٰ خیال میں آ سکتا ہے۔حواس میں آ سکتا ہے تو انسان کا نفس اپنی عقل کو جھوٹا کہتا ہے کہ اے عقل تجھے کیا ہوگیا عقل ہونے کے باوجود بے عقلی کا مظاہرہ کیسے؟ کیونکہ جو چیز خیال اور حس میں آ جائے وہ تو حادث ہوتی ہے یعنی اپنے وجود میں غیر کی محتاج ہوتی ہے اور وہ فنا بھی ہوجاتی ہے رب تعالیٰ تو قدیم ہے نہ اس کی ابتداء ہے اور نہ انتہاء۔

معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ کو پہچاننے میں عقل متحیر ہے عقل کو سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ وہ یہ اعتراف کرے کہ رب تعالیٰ موجود ہے، اسے کمال حاصل ہے، دیگر کائنات کو موجود کرنے والا ہے، لیکن ساتھ ساتھ عقل اپنے عجز کا بھی اعتراف کرے کہ وہ ادراک سے بالاتر ہے۔بلکہ عقل اتنی عاجز ہے کہ یہ تصور بھی نہیں کرسکتی کہ اس کا ادراک کیا جا سکتا ہے۔اس لئے کہ ادراک کی درک (یعنی سمجھ لینے کا تصور) بھی ادراک ہے۔وہ تو ادراک میں نہ آنے والی ذات ہے یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے عقلاء کی عقلیں رب تعالیٰ ... پہچاننے سے عاجز ہیں۔اور کسی کی کیا مجال ہے جب کہ سید الانبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ فرماتے ہیں "ما عرفناک حق معرفتک" ہم نے تمہیں ایسا نہیں پہچانا جیسا کہ پہچاننے کا حق ہے۔

(۳) اگر مشتق " الهت الی فلان " سے ہو، تو معنی ہوگا "سکنت الیه "میں نے فلاں سے سکون حاصل کیا۔اب لفظ "اللہ" کا معنی یہ ہوگا کہ یہ وہ ذات ہے جس سے سکون حاصل ہوتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر عقول کو سکون حاصل نہیں ہوتا۔اسی کے ذکر سے سکون حاصل ہوتا ہے۔ رب تعالیٰ کا اپنا ارشاد گرامی ہے:

﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ "خبردار اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے"۔

اسی طرح روحوں کو اس وقت تک عروج حاصل نہیں ہوتا جب تک اس کی ذات کو اس کی صفات کے ذریعے نہ پہچانا جائے۔

رب تعالیٰ کا ذکر اور اس کی صفات کی معرفت باعث سکون قلب کیوں؟ اس لئے کہ یہ بات واضح ہے کہ کمال کو حاصل کرنا ہر شخص پسند کرتا ہے یعنی کمال ہر شخص کا محبوب ہے۔حقیقی کمال صرف رب تعالیٰ کو ہی حاصل ہے " وما سوی الحق فهو ناقص لذاته "اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز ذاتی طور پر ناقص ہے کیونکہ ساری مخلوق ممکن اور حادث ہے جو چیز بھی ممکن اور حادث ہو وہ عدم سے وجود میں آتی ہے واضح ہوا کہ عدم سے وجود میں آنے والی چیز ناقص ہوتی ہے۔

اور یہ بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ جو چیز لذاتہ ناقص ہو۔وہ اگر کمال حاصل کرنا چاہے تو اسے کمال اسی چیز سے حاصل ہوگا جو خود کامل لذاتہ ہو۔کامل لذاتہ صرف رب تعالیٰ ہے۔جب کامل لذاتہ محبوب ہے تو واضح ہوا کہ رب تعالیٰ ہی انسان کا حقیقی محبوب ہے محبوب کے ذکر سے دل کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

اور خاص کر کے ممکن کا اپنا کوئی ذاتی وجود نہیں ہوتا بلکہ وہ وجود حقیقی کا محتاج ہوتا ہے۔جب وجود خارجی میں وہ اپنے قیام اور وجود میں ذات باری تعالیٰ کا محتاج ہے تو یقیناً وجود عقلی میں بھی اسی ذات کا محتاج ہے اسی کی رحمت کا منتظر رہتا ہے دل اسی کے فضل وکرم کے دامن سے لپٹنے کے لئے بے تاب ہوتا ہے۔جب انسان کے دل کو رب تعالیٰ کے فضل وکرم کا سہارا مل جاتا ہے تو اسے قرارر حاصل ہو جاتا ہے اسے سکون مل جاتا ہے۔

واضح ہو گیا کہ رب تعالیٰ کا نام لفظ ''اللہ'' اپنے اس اشتقاقی معنی کے لحاظ سے بے چین دلوں کا چین ہے بے قراروں کو اسی نام سے قرار ملتا ہے یہی نام ہے جس سے سکونِ قلب حاصل ہوتا ہے یہی وہ نام ہے جس سے اضطرار اور پریشانی کا زوال ہوتا ہے۔سبحان اللہ لفظ ''اللہ'' پڑھنے سے بے سہاروں کو سہارا مل گیا بے چاروں کو چارہ مل گیا۔

(۴) لفظ ''اللہ'' یا مشتق ہے " اله الفصيل " سے جس کا معنی ہے اونٹنی یا گائے کا بچہ اپنی ماں کی طرف لپکا۔

اس معنی کے لحاظ سے رب تعالیٰ کے اسم گرامی ''اللہ'' کا مطلب یہ ہوگا " **ان العباد مولهون مولعون بالتضرع اليه في كل الاحوال**" بیشک بندے اپنے تمام احوال میں عجز وانکساری سے اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں اسی سے شدید محبت کرتے ہیں۔

حقیقت یہی ہے کہ انسان جب کسی عظیم مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے اور کسی مضبوط آفت میں مبتلا ہوتا ہے تو وہاں ہر چیز کو بھول جاتا ہے صرف رب تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے "**فيقول بقلبه ولسانه يا رب يارب**" وہ اپنے دل اور اپنی زبان سے "یار ب یارب" کہہ کر پکارتا ہے اے میرے رب اے میرے رب۔لیکن جب وہ مصائب وآلام سے نکل آتا ہے آسائش میں آجاتا ہے نعمتیں اسے حاصل ہو جاتی ہیں پھر وہ اپنی خلاصی کو ضعیف اسباب اور گھٹیا احوال کی طرف منسوب کر دیتا ہے یہ حالت پہلی حالت کے مخالف ہے اس لئے کہ یہی اسباب واحوال اگر نجات دھندہ تھے تو مصائب وآلام کے وقت بھی ان کی طرف ہی رجوع کرنا تھا۔

" وان كان مصلح المهمات هو الله تعالىٰ في وقت البلاء وجب ان يكون الحال كذلك في بسائر الاوقات "

جب کہ مصیبت کے وقت مشکلات کو دور کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے تو تمام اوقات میں یعنی مصیبت کے ٹل جانے پر بھی اللہ تعالیٰ کو ہی " دافع البليات "(مصائب کو ہٹانے والا) كاشف المهمات (مشکلات کا دور کرنے والا) سمجھے۔

اور وجہ یہ ہے کہ خیر اور راحت اللہ تعالیٰ سے ہی مطلوب ہے تو انسان کا مطلوب ومقصود بھی وہی ہوگا اسی کی طرف توجہ ہوگی اور وہی محبت کا مرکز ہوگا۔

اعتراض: " ان المحسن فی الظاهر اما اللہ او غیرہ " بیشک ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ احسان فرماتا ہے۔ اسی طرح اس کی مخلوق میں سے بھی اس کے بندے احسان فرماتے ہیں۔ پھر کیا مطلب ہے بندہ تمام احسان صرف رب تعالیٰ کی طرف سے ہی سمجھے۔

جواب: " فان کان غیرہ فذلک الغیر لا یحسن الا اذا خلق اللہ فی قلبہ داعیۃ الاحسان فالحق سبحانہ وتعالیٰ ھو المحسن فی الحقیقہ ، والمحسن مرجوع الیہ فی کل الاوقات ، والخلق مشغو فون بالرجوع الیہ "

(کبیر جزء اول ص)

اگر بظاہر یہ سمجھ آئے کہ احسان کرنے والا اللہ تعالیٰ کا بندہ ہے تو وہ احسان بھی درحقیت اللہ کا ہی ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہی اسے احسان کرنے کی قدرت دی۔ اللہ تعالیٰ نے ہی اس کے دل میں یہ ڈالا کہ تو نے فلاں پر احسان کرنا ہے تو اسی وجہ سے اللہ کے بندے نے احسان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ محسن حقیقی ہے۔ اور اس کی مخلوق کا احسان اس کی عطا سے ہے وہ احسان کرنے میں بھی اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

لہذا یہ کہنا کہ تمام احسان صرف رب تعالیٰ کے ہیں یہ صحیح ہے۔ اور یوں کہنا بھی درست ہے کہ یہ احسان رب تعالیٰ کی عطا اور اس کے فضل سے اس کے بندے نے کیا ہے۔

ایک بات یہ بھی ذہن میں رکھ لی جائے تا کہ اسے دوبارہ ﴿وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ کی بحث میں نہ ذکر کرنا پڑے، کیونکہ رب تعالیٰ معاون حقیقی ہے اور اس کی مخلوق اسی کی عطاء کردہ طاقت، اسی کے انعام، اسی کی بے پایاں رحمت، اسی کے فضل وکرم اور اسی کی رضا سے معاون مجازی ہے۔ کاش کہ لوگ جہالت، ضد، ہٹ دھرمی کو دور کر کے اہل علم کی کتابوں کا مطالعہ کریں تو انہیں سمجھ آئے کہ دین کیا ہے۔

واصلین الی الحق کا مقام:

ابھی تک جو بحث جاری ہے اس سے یہ سمجھ آیا کہ وہ حضرات جن کو تقوی کا اعلیٰ مقام حاصل ہو جاتا ہے ان کے دل میں اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی اور کا مقام نہیں رہتا، بلکہ وہ اپنے آپ کو فانی سمجھتے ہیں اور تمام مخلوق کو درجہ فنا میں سمجھتے ہیں۔ اسی پر علامہ رازی رحمہ اللہ نے ایک واقعہ بیان فرمایا ذرا آپ بھی سنیں۔

ایک بزرگ شیخ کے پاس ملن کے مرید آئے کہ ہم اکثر اوقات وسوسوں میں مبتلا رہتے ہیں ان سے نجات حاصل کرنے کا کیا ذریعہ ہے؟ شیخ نے کہا میں دس سال لوہاروں کا کام کرتا رہا دس سال دھوبیوں کا اور دس سال چوکیدار بن کر دروازہ پر پہرہ دیتا رہا، پھر کہیں غیروں کے خیالات دل سے نکلے اور واپس لوٹنے کی جگہ نہ ملی۔

آپ کے مریدین نے کہا ہم نے تو آپ کو یہ کام کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ آپ نے کہا کام تو یہ میں کرتا رہا البتہ تم دیکھ نہیں سکے۔

ہاں اب سمجھنے کی کوشش کرو۔ بیشک دل لوہے کی طرح ہے میں لوہار بن کر جھنم کی آگ کے خوف کے ہتھوڑے سے دس سال اسے کوٹتا رہا۔ اس کے بعد دس سال میں اسے گناہوں ،لغزشوں کی میل کچیل سے دھو کر صاف کرتا رہا اس کے بعد پھر دس سال میں " لا الہ الا اللہ " کی تلوار لے کر دل کے دروازے پر پہرہ دیتا رہا پھر کہیں غیروں کی محبت کو دل سے نکالنے میں کامیاب ہوا، اس وقت سے لے کر آج تک اس دل میں صرف اللہ تعالیٰ کی محبت جاگزیں ہے۔ کیونکہ جب دل کا میدان غیر اللہ سے خالی ہوجائے اور اس میں رب تعالیٰ کی محبت راسخ ہوجائے۔ تو اللہ تعالیٰ کے جلال کے سمندروں میں سے ایک نور کا قطرہ اس کے دل میں آجاتا ہے۔ اب وہ دل اس ایک قطرہ میں غرق ہوجاتا ہے۔ باقی تمام چیزیں اس دل کو مستغرق اور فانی سمجھ کر اس سے دور ہوجاتی ہیں لیکن حقیقت میں اب دل کو بقاء حاصل ہوئی۔ وہ دل اللہ تعالیٰ کے راز "لا الہ الا اللہ "کا مسکن بن گیا۔

واضح ہوا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگیا اس کے دل میں صرف اللہ تعالیٰ سما سکتا ہے اگر کوئی اللہ کا محبوب اس کے دل میں آئے گا تو وہ صرف اس وجہ سے کہ وہ اللہ کا محبوب ہے۔ یا اللہ مدد، یا اللہ مدد کے نعرے اور دیواروں ،بسوں اور ویگنوں پر یا اللہ مدد اور صرف خدا سے مانگو کے اشتہار اور چوراہوں پر چندہ مانگنے کے کیمپ یہ دوغلی پالیسی یہ دھوکہ بازی، مکاروں کے مکروفریب کو واضح کرتی ہے۔ ہاں مشائخ کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی کا نہ آنا، رب کا قرب خاص حاصل ہونے کی علامت ہے۔

(۵) لفظ اللہ یا مشتق ہے "ولہ " (ض،س) سے جس کا معنی ہے متحیر ہونا ،عقل کا چلا جانا۔ اس

معنی کے لحاظ پر رب تعالیٰ کا اسم گرامی ''اللہ'' کا معنی ہوگا کہ وہ ذات جس کی معرفت کے حصول میں عقلیں گم ہوگئیں۔

اس لئے کہ مخلوق کی دوقسمیں ہیں ایک وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی معرفت کے سمندر کے ساحل (کنارہ) پر پہنچ جاتے ہیں ان کو واجدین کہا جاتا ہے۔ اور دوسرے وہ ہیں جو اس مقام تک بھی نہ پہنچنے کی وجہ سے محرومین کہلاتے ہیں۔

واجدین یعنی ساحلِ بحرِ معرفت تک پہنچنے والے اس لئے عقلیں گم کئے ہوتے ہیں کہ وہ جب معرفت کے سمندر کے کنارے تک پہنچتے ہیں تو وہ صمدیت کے میدانوں میں سرگرداں ہوجاتے ہیں۔ یعنی اس سے آگے ان کو اللہ تعالیٰ کی بے نیازی کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ اس مقام پر اپنے آپ کو تنہا سمجھتے ہیں اس سے یہ پتہ چلا کہ مقام ولایت کے اعلیٰ مقام پر فائز حضرات بھی رب تعالیٰ کی معرفت میں متحیر اور عقلیں گم کئے ہوتے ہیں۔

محرومین یعنی وہ لوگ جو معرفت کے دریا کے کنارے تک بھی نہیں پہنچ پاتے وہ حیرت کی تاریکیوں اور جہالت کی ضلالت (بھٹک) میں سرگرداں ہونے کی وجہ سے عقلوں کو گم کئے ہوتے ہیں۔

یادوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ انسانی روحیں ایک دوسرے سے توحید وتمجید کے میدان میں سبقت لے جانے کی کوشش کرتی ہیں۔ کوئی آگے نکل جاتی ہیں کوئی پیچھے رہ جاتی ہیں۔

پیچھے رہ جانے والی روح گویا کہ غبار کی تاریکیوں میں آجانے کی وجہ سے متحیر ہوتی ہیں جس طرح عقل گم کیا ہوا وادی میں بھٹک رہا ہوتا ہے اور آگے نکل جانے والی روح عالم انوار میں پہنچ جاتی ہیں اس لئے وہ عالم کرامات کے انوار میں آجانے کی وجہ سے متحیر ہوتی ہیں۔ کیونکہ وہ اور آگے جانے کی فکر میں ہوتی ہیں۔ ذات باری تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوجائے، لیکن وہاں تک رسائی حاصل نہ ہونے کی وجہ سے ان کا بھی وہی حال ہوتا ہے جو عقل گم کئے ہوئے حضرات کا ہوتا ہے۔

(۲) اگر لفظ ''اللہ'' مشتق ہو " لاہ یلیہ لیھا " سے تو اس وقت معنی ہوگا بلند ہونا رب تعالیٰ کو مرتفع (بلند) کہنے کی وجہ کیا ہے؟ جب کہ وہ بلندی وپستی سے پاک ہے کیونکہ ان چیزوں کا تعلق مکین

سے ہے وہ تو مکان سے پاک ہے اس ذات کبریاء کے بلند ہونے کی وجہ یہ ہے:

" والحق سبحانه وتعالیٰ هو المرتفع عن مشابهة الممكنات ومناسبة المحدثات "

رب تعالیٰ ممکنات کی مشابہت سے پاک ہے اور حادث اشیاء کی مناسبت سے پاک ہے یہی اس کی حالت ارتفاع ہے کہ وہ ممکنات وحوادث کی مناسبت ومشابہت سے مرتفع ہے۔

"لان الواجب لذاته ليس الا هو" "اس لئے کہ واجب لذاتہ سوائے اس ذات کے اور کوئی نہیں"۔

" الكامل لذاته ليس الا هو" "کیونکہ کامل لذاتہ اس کے بغیر اور کوئی نہیں"۔

" والاحد الحق فی هويته ليس الا هو " "اپنی حقیقت وماہیت میں ایک اور حق اس کے علاوہ اور کوئی نہیں"۔

" والموجد لكل ماسواه الا هو " "تمام چیزوں کو معرض وجود میں لانے والا اس کے بغیر اور کوئی نہیں"۔

ہاں اگر یوں کہہ دیا جائے کہ رب تعالیٰ کو مکان کے لحاظ سے بلندی حاصل ہے تو یہ کہنا بھی جائز ہے البتہ یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ کیسے؟ وہ اس طرح کہ تمام کائنات کو مکان میں مکین ہونا بالعرض حاصل ہے۔ جب کوئی چیز مکان میں ہوگی تو اسے مکان کے لحاظ سے بلندی یا پستی حاصل ہوگی۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ جب مکین کو مکان سے بلندی حاصل ہوگی تو مکان اس سے پہلے بلند ہوگا۔ اگر یہی بات رب تعالیٰ کی ذات میں تسلیم کی جائے تو لازم یہ آئے گا۔

" فلو كان هذا الارتفاع بسبب المكان لكان ذلك المكان اعلى واشرف من ذات الرحمن "

یعنی اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ رب تعالیٰ کو ارتفاع (بلندی) مکان کی وجہ سے حاصل ہے تو رب تعالیٰ کی ذات سے مکان کو اعلیٰ اور اشرف ماننا پڑے گا یہ سراسر باطل ہے کہ تصور بھی کیا جا سکے کہ اللہ تعالیٰ کو علو (بلندی) حاصل ہے کہ اس کا مکان اعلیٰ ہے۔

ہاں پھر کس طرح رب تعالیٰ کی بلندی مکان کے لحاظ پر تسلیم کی جائے؟" فهو تعالیٰ مرتفع عن ان يقال ان ارتفاعه بحسب المكان " وہ یوں کہا جائے گا کہ رب تعالیٰ کے متعلق یہ کہنا کہ اسے مکان کی وجہ سے ارتفاع حاصل ہے وہ اس تصور، خیال، اقوالِ باطلہ سے مرتفع ہے۔

یہ ہے رب تعالیٰ کی بلندی مکان کے حساب سے۔ آسان لفظوں میں یوں کہیں رب تعالیٰ کو بلندی حاصل ہے بالذات، اس کی بلندی اسباب ومکانات کے تابع نہیں اور مخلوق کی بلندی بالعرض

ہے جو اسباب اور مکانات کے تابع ہے۔

(۷) اگر لفظ ''اللہ'' کو '' لاہ یلوہ ولوھا '' سے مشتق مانا جائے تو معنی ہوگا محجوب ہونا۔ یہ بھی خیال رہے کہ اصل میں معنی ہے ''سراب کی چمک '' لیکن جس طرح ریت دور سے اپنی چمک سے پانی دکھائی دیتی ہے لیکن پانی محجوب ہوتا ہے اسی مناسبت سے محجوب ہونے کا معنی لیا گیا ہے۔

رب تعالیٰ کو محجوب کہنے کی وجہ یہ ہے ''انه بکنه صمدیته محتجب عن العقول '' بیشک اللہ تعالیٰ اپنی حقیقت صمدیت (بے نیازی) کی وجہ سے عقلوں سے محجوب ہے کہ عقلیں اسے پانے سے قاصر ہیں۔

بلکہ یوں کہا جائے کہ جس طرح سورج کی روشنی جب دیواروں پر پڑ رہی ہوتی ہے سورج سامنے ہوتا ہے تو انسان بظاہر یہ سمجھتا ہے کہ دیوار خود بخود روشن ہے لیکن سورج کے غائب ہونے پر پتہ چلتا ہے کہ وہ روشنی دراصل سورج کی تھی۔ اسی طرح کائنات کا وجود دراصل رب کائنات کے وجود حقیقی کا عکس ہے بظاہر پتہ چلتا ہے کہ لوگ خود بخود موجود ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں اگر رب تعالیٰ کی ذات پر طلوع ہونا، غروب ہونا محال نہ ہوتا تو یہ کہا جاسکتا تھا کہ اگر بالفرض محال اللہ تعالیٰ غائب ہوتا تو کائنات کا وجود بھی غائب ہوجاتا۔ اس لئے کہ کائنات کا وجود ذاتی طور پر اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں وجود باری تعالیٰ کا محتاج ہے کائنات کا وجود۔ رب تعالیٰ کے وجود کی ضوء کا عکس ہے کائنات کے وجود کی ضوء۔ لیکن لوگوں کی عقلوں سے یہ بات محجوب ہے اسی لئے بعض محققین نے کیا خوب کہا:

''سبحان من احتجب عن العقول بشدة ظهوره واختفى عنها بكمال نوره''

پاک ہے وہ ذات جو بہت زیادہ ظاہر ہونے کے باوجود عقلوں سے محجب (عقل میں نہ آنے کی وجہ سے پوشیدہ) ہے اور کامل طور پر بوجہ نورانیت کے آب وتاب سے چمکتے ہوئے بھی عقلوں سے مخفی ہے۔

(۸) لفظ ''اللہ'' کبھی مشتق ہوتا ہے الہ (س) الھا، سے جس کا معنی کبھی '' الهت علیه '' سے لیا جاتا ہے جس کا معنی ہوتا ہے ''میں نے اس پر بہت جزع وفزع کیا'' اور کبھی معنی ہوتا ہے کسی کے پاس جا کر جزع وفزع کرنا، پریشانی کا اظہار کرنا جب اپنی پریشانی کو بے قراری کی حالت میں کسی کے

سنانے بیان کیا جائے، تو اسے رحم آتا ہے اسوقت کہا جاتا ہے " فالھه (بروزن سمعه) ای اجاره " یعنی اس نے اس شخص کو پناہ دے دی۔

ہر مصیبت ، ہر پریشانی سے پناہ دینے والا رب تعالیٰ ہی ہے لہذا اس کے معنی کے لحاظ پر مولائے کائنات کو اس لئے اللہ کہا جاتا ہے کہ وہ ہر مشکل میں پناہ دینے والا ہے۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾
تم فرماؤ کس کے ہاتھ ہے ہر چیز کا قابو اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے خلاف کوئی پناہ نہیں دے سکتا

اسی کی طرف رجوع کیا جائے کیونکہ منعم حقیقی وہی ہے "وما بکم من نعمة فمن الله" تمہارے پاس جو نعمت ہے سب اللہ کی طرف سے ہے انسان کو طعام عطا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی تو ہے ﴿وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ﴾ وہ کھلاتا ہے اور کھانے سے پاک ہے۔ کائنات کو موجود کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے ﴿ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ﴾ فرما دو ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ ہر پریشانی میں رب تعالیٰ کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور وہی پناہ عطا فرماتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

بحث مذکور سے اقوال اولیاء کرام کی حلاوت:

ابھی تک رب تعالیٰ کے اسم گرامی لفظ "اللہ" کے متعلق جو بحث کی اسی سے واضح ہو جاتا ہے کہ اولیاء عظام کے کلمہ توحید کے معانی اسی بحث کی۔ " لا مقصود الا الله " اللہ کے بغیر اور کوئی مقصود ہی نہیں۔

اور یہ معنی کیا جاء تجلی ہیں۔ عام مشہور معنی میں تو اتفاق ہے کسی کا کوئی اختلاف نہیں کہ " لا اله الا الله " کا معنی اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔

تا ہم یہ معانی بھی ذوق وحلاوت سے خالی نہیں۔" لا اله الا الله " کا معنی یہ کیا جائے "لا مطلوب الا الله " اللہ کے سوا کوئی مطلوب نہیں۔

اور معنی یہ کیا جائے " لاموجود الا الله " اللہ کے بغیر وجود حقیقی کے لحاظ سے کوئی موجود ہی نہیں۔

سبحان اللہ! کیا خوب تھے وہ لوگ جنہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی معرفت میں قرآن وحدیث کو سمجھنے میں عمریں صرف کر دیں۔ دنیا کی عیاشی ان کے سامنے مچھر کے پر سے بھی زیادہ حقیر تھی۔ آج بھی اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے دینی مدارس میں پڑھنے والے طلباء اور انکے والدین اور پڑھانے والے علماء کرام اسی طرز پر چل رہے ہیں۔

لیکن افسوس کہ انگریز کے آلہ کار یہودیوں کے پٹھو، زہر پر مٹھائی چڑھا کر یعنی کمپیوٹر اور انگریزی تعلیم سے بڑے عہدے مل جانے کی لالچ دلا کر علماء کو جاہل بنانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں تا کہ ہماری مرضی کے مطابق یہ فتوے دے دیا کریں۔ نہ دین کو سمجھیں اور نہ ہی کسی بات پر اڑ جائیں کہ یہ دین کے خلاف ہے گریجویٹ نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں یہ ڈاکٹر، وکیل، انجینئر، سائنس دان کو مولوی بنانے کی ترغیب نہیں دیتے البتہ مولوی کو انگریز کا آلہ کار بنانے کی فکر ہمیشہ ان کو کھائے جا رہی ہے مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ یہ خواب ان کا پورا نہیں ہوگا۔ تاریخ کا وہ سیاہ دن ہو گا جس دن دینی مدارس حکومت کی سرپرستی کو قبول کر لیں گے۔ بہاولپور یونیورسٹی جیسا ہی حال ہوگا۔

اسم اعظم کیا ہے: ایک قول کے مطابق " ذوالجلال والاکرام " ایک اور قول یہ ہے "الحی والقیوم " اور بعض حضرات نے کہا ﴿ اَللّٰہُ لَا اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ﴾ بعض حضرات اس کے قائل ہیں " اسماء اللہ کلها عظیمة مقدسة ولا یجوز وصف الواحد منها بانه اعظم " اللہ تعالیٰ کے تمام نام ہی عظیم اور مقدس ہیں کسی ایک کو اعظم نہ کہا جائے۔ لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ نے اس قول کو ترجیح دی ہے کہ اسم اعظم لفظ ''اللہ'' ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا حقیقی نام ہے۔ اور ذات مخصوصہ پر دلالت کر رہا ہے اور باقی تمام صفاتی نام ہیں۔

(از کبیر جزء اول ص ۱۱۵)

عربی کا کوئی بھی لفظ اللہ کی مثل نہیں:

جس طرح رب تعالیٰ کی ذات پاک بے مثل ہے اسی طرح اس کا نام مبارک لفظ اللہ بھی بے مثل ہے عربی کا کوئی لفظ بھی ہو جب اس سے کوئی حرف حذف کر دیا جائے (ہٹا دیا جائے) تو اس کی

اپنی اصلی حیثیت معنوی ختم ہو جاتی ہے یا تو وہ بالکل بے معنی رہ جاتا ہے۔اور یا معنی بدل جاتا ہے لیکن سبحان اللہ مولائے کائنات کا اسم گرامی کتنا ہی ذیشان ہے کتنا ہی باکمال ہے کہ اس سے کوئی لفظ بھی حذف کیا جائے اس کی معنوی حیثیت برقرار رہتی ہے۔وہ ہر حال میں خالق کائنات پر ہی دلالت کرتا ہوا نظر آئے گا۔

آیئے ذرا اس لفظ ''اللہ'' کے کمال کی جھلک کو دیکھئے۔اگر لفظ ''اللہ'' کے الف کو حذف کریں اور باقی لفظ کو اپنے حال پر رہنے دیں تو لفظ ہوگا ''للہ'' یہ لفظ بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہی خاص ہے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ اللہ کے لئے ہی ہیں آسمانوں اور زمین کے لشکر۔اور ارشاد گرامی ﴿وَ لِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہیں آسمانوں اور زمین کے خزانے۔

الف کو حذف کرنے کے ساتھ ساتھ لام بھی حذف کر دیا جائے تو اب لفظ باقی رہنے والا ''لہ'' ہے یہ لفظ بھی رب تعالیٰ کی ذات کے لئے بولا گیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ اسی کی قبضہ قدرت میں آسمانوں اور زمین کی چابیاں ہیں۔رب تعالیٰ کا اور ارشاد گرامی ہے ﴿لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ﴾ اسی کی بادشاہی ہے اور اسی کے لئے حمد ہے۔

اگر الف لام کے حذف کرنے کے بعد دوسرے لام کو بھی حذف کر دیا جائے تو باقی رہے گا ''ہٗ'' یہ لفظ بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ فرما دیجئے وہ اللہ ایک ہے اور فرمایا ﴿هُوَ الْحَيُّ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ وہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہے اس کے بغیر اور کوئی معبود نہیں۔

اعتراض: جو تم نے مثالیں ذکر کی ہیں ان میں ''ھو'' ہے اور لفظ ''اللہ'' کا الف اور دونوں لاموں کے حذف کرنے سے لفظ ''ہٗ'' رہ جاتا ہے مثال سے مسئلہ کس طرح ثابت ہوتا ہے۔

جواب: جب پیش کو کھینچ کر پڑھا جائے تو ''واوٗ'' خود بخود سمجھ میں آتی ہے۔اس لئے ''ہٗ'' پر الٹی پیش اور ''ھو'' کا ایک ہی مطلب ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ ''ھو'' کی واوٗ معرض زوال میں ہے

کیونکہ تثنیہ میں "هما" اور جمع میں "هم" ہے جو لفظ معرض زوال میں ہو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

(از کبیر جزء اول ص ۱۶۳)

رب تعالیٰ کا کوئی اسم گرامی لفظ اللہ کا مثل نہیں:

ابھی تک جو بیان کیا گیا ہے وہ لفظ "اللہ" کی لفظی حالت اور لفظی خوبی تھی۔ لیکن غور وفکر کرنے سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ لفظ "اللہ" کی معنوی خوبی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے کسی اور اسم گرامی کو حاصل نہیں۔ اس لئے کہ جب اللہ تعالیٰ کے لئے "رحمن ورحیم" کو ذکر کیا تو اس کی صفت رحمت کو ذکر کیا اور جب "قهار" کہا تو اس کے قہر کو ذکر کیا اور جب "علیم" کہہ کر پکارا تو اس کی صفت علم کو ذکر کیا اور جب "قدیر" اور "قادر" کہا تو اس کی صفت قدرت کو ذکر کیا۔ غرضیکہ ایک اسم گرامی سے ایک صفت کا پتہ چلا دوسری کا پتہ نہ چل سکا۔ اسی طرح دوسرے اسم گرامی سے اور ایک صفت کا پتہ چلا اس صفت سے بھی کسی دوسری صفت کا علم حاصل نہ ہوا۔ "واما اذا قلت یا الله فقد وصفته بجميع الصفات" لیکن جب تم "یااللہ" کہو تو تم نے تمام صفات ذکر کردیں "لان الا له لایکون الها الا اذاکان موصوفا بجميع هذه الصفات" اس لئے کہ "اله" اس وقت تک "اله" نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ ان تمام صفات کمالیہ سے متصف نہ ہو:

"فثبت ان قولنا "الله" قد حصلت له هذه الخاصية التي لم تحصل لسائر الاسماء"

اسی سے یہ ثابت ہوا کہ بیشک رب تعالیٰ کے اسماء گرامی میں سے جو خاصیت اور فوقیت لفظ اللہ کو حاصل ہے وہ کسی اور اسم گرامی کو حاصل نہیں۔

(کبیر جزء اول ص ۱۶۴)

لفظ اللہ کے بغیر کلمہ شہادت کی تکمیل نہیں:

بیشک کلمہ شہادت وہ کلمہ ہے جس کی وجہ سے کافر کفر سے اسلام کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔ لیکن کافر کو اسلام لفظ "اللہ" کی وجہ سے حاصل ہوا۔

"فلو ان الكافر قال اشهد ان لا اله الاالرحمن او الا الرحيم او الا الملک او الا القدوس لم يخرج من الكفر ولم يدخل فی الاسلام"

اگر کافر یہ کہے " اشهد ان لا اله الا الرحمن "یا کہے "اشهد ان لا اله الا الرحیم " یا کہے "اشهد ان لا اله الا الملک "یا یہ کہے "اشهد ان لا اله الا القدوس" تو وہ کفر سے نہیں نکلے گا،اور نہ ہی اسلام میں داخل ہوگا۔"اما اذا قال اشهد ان لا اله الا الله،فانه یخرج من الکفر ویدخل فی الاسلام " لیکن جب کافر نے "اشهد ان لا اله الا الله "کہا تو وہ کفر سے نکل جائے گا اور اسلام میں داخل ہو جائے گا۔اس سے واضح ہوا کہ جو خاصیت وفوقیت لفظ''اللہ'' کو حاصل ہے وہ کسی اور اسم گرامی کو حاصل نہیں۔

اللہ اللہ کرنے کا عظیم فائدہ:

اللہ تعالیٰ کے ذکر میں عظیم فائدہ ہے اور اسے شرف وکمال حاصل ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

" اذا ذکرنی عبدی فی نفسه ذکرته فی نفسی واذا ذکرنی فی ملأ ذکرته فی ملأ خیر من ملأه"

جب میرا بندہ مجھے دل میں یاد کرتا ہے تو میں اسے دل میں یاد کرتا ہوں ۔ اور جب وہ مجھے جماعت میں یاد کرتا ہے تو میں اسے اس کی جماعت سے بہتر جماعت میں یاد کرتا ہوں۔

جب یہ ثابت ہوا تو اسی سے یہ بھی واضح ہوا " افضل الاذکار ذکر الله بالثناء الخالی عن السوال " سب ذکروں سے بہتر''اللہ'' کا ذکر ہے کیونکہ اس میں صرف اللہ تعالیٰ کی تعریف ہے جو سوال سے خالی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا رب تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: " من شغله ذکری عن مسئلتی اعطیته افضل ما اعطی السائلین " جو شخص میرے ذکر میں مشغول رہنے کی وجہ سے مجھ سے سوال نہ کرے میں اسے سوال کرنے والوں سے زیادہ عطا کرتا ہوں۔

بندہ چونکہ فقیر اور محتاج ہے جو شخص فقیر اور محتاج ہوتا ہے وہ جب بھی کسی کی خدمت کرتا ہے اور اسے کوئی خطاب کرے تو اس میں وہ ایسے آداب استعمال کرتا ہے جس سے طلب اور سوال کی جھلک نظر آتی ہے۔

جب فقیر غنی کو کہے "یا کریم" اسی سے پتہ چل گیا کہ وہ دراصل یہ کہنا چاہتا ہے "اکرم" مجھ پر کرم کرو، احسان کرو، مہربانی کرو۔ اور اگر کہے "یا نفاع" اے نفع دینے والے تو اسی سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ مجھے نفع پہنچاؤ یعنی مجھ پر مہربانی کرو مجھے کوئی مال عطا کرو۔

اس بحث سے ہی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بندہ جب کہتا ہے "یا رحمن" تو اس بندے کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ اے اللہ مجھ پر رحم کر۔ خواہ وہ ظاہر طور پر رحم کا سوال کرے یا نہ کرے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے باقی ناموں میں بھی کسی چیز کی طلب کا سوال نظر آتا ہے۔ یا کسی چیز سے بچنے کا سوال نظر آئے گا مثلاً جب یہ کہے "یاقھار" اے قہر کرنے والے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے اللہ مجھے اپنے قہر و غضب سے بچا۔

" وقد بینا ان الذکر انما یعظم شرفه اذا کان خالیا عن السوال والطلب "

جب ہم پہلے واضح کر چکے ہیں کہ وہی ذکر بہتر ہے جو سوال اور طلب سے خالی ہو۔ جب انسان کہے " یااللہ " "یاھو " ان میں سوال کی جھلک نہیں پائی گئی بلکہ خالص اللہ تعالیٰ کا ذکر پایا گیا۔ "فوجب ان یکون اعظم الاذکار " پس ضروری ہے کہ خالص اللہ تعالیٰ کا ذکر یعنی "یا اللہ یا اللہ" کرتے رہنا اسی طرح "یاھو، یاھو" کرنا ہی بہتر ذکر ہے۔

(از کبیر جزء اول ص ۱۵۱)

الرحمن الرحیم : دونوں اسم ہیں مبالغہ کا معنی ان میں پایا گیا ہے۔ یعنی بہت رحم کرنے والے کو رحمٰن اور رحیم کہا جاتا ہے۔ یہ الفاظ رحم رحما (س) سے لئے ہوئے ہیں۔ "الرحمة" کا لغوی معنی یہ ہے دل کا نرم ہونا اور نفس کا میلان جو کسی پر مہربانی کرنے اور احسان کرنے کا تقاضا کرے۔

اعتراض: اللہ تعالیٰ تو دل اور جسمانی تمام اعضاء سے پاک ہے۔ وہاں دل کا نرم ہونا اور احسان کرنے والا معنی مراد نہیں لیا جا سکتا تو کس طرح رب تعالیٰ کو رحمٰن و رحیم کہا جائے گا۔

جواب: "اسماء اللہ تعالیٰ انما تؤخذ باعتبار الغایات " اللہ تعالیٰ کے وہ اسماء جو ظاہری معنی کے لحاظ سے اس کی ذات پر نہیں بولے جا سکتے ان میں غایات (نتائج و مقاصد) کا اعتبار

کیا جاتا ہے۔رب تعالیٰ کو "رحمن ورحیم" صرف اس معنی کے لحاظ سے کہا جائے گا کہ وہ مہربانی کرتا ہے اور فضل فرماتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کو المستھزیٔ (ٹھٹھا کرنے والا) نہیں کہا جائے گا بلکہ اس کا معنی ہوگا وہ ٹھٹھا کرنے والوں کو بدلہ دینے والا ہے۔اسی طرح رب تعالیٰ کو "الماکر" اس لئے نہیں کہا جاتا کہ وہ مکر کرنے والا ہے بلکہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ خفیہ تدبیر کرنے والا ہے۔

رحمن اور رحیم میں فرق : عربی کا ایک مشہور ضابطہ ہے:" زیادۃ المبانی تدل علی زیادۃ المعانی " حروف کی زیادتی معانی کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے۔جیسے قطع (طاء مخفف) کا معنی ہے،اس نے کاٹا۔اور قطّع (طاء مشدد) کا معنی ہے،اس نے ٹکڑے ٹکڑے کیا۔

رحمان میں پانچ حروف ہیں (رحمٰن کی کھڑی زبر دراصل الف ہی ہے) اور رحیم میں چار حروف ہیں۔یقیناً رحمٰن کے معنی میں زیادتی ہوگی بنسبت "رحیم" کے۔

اس زیادتی کا اعتبار دوطرح ہے ایک کمیت (مقدار،تعداد) کے لحاظ سے اور دوسرا کیفیت کے لحاظ سے۔

مقدار کے لحاظ سے "رحمن" کے معنٰی میں زیادتی کا اعتبار اس طرح کریں گے کہ کہا جائیگا "یا رحمن الدنیا" اے دنیا میں رحم کرنے والے۔چونکہ دنیا میں رب تعالیٰ کی رحمت عام ہے مومنوں اور کافروں سب کو شامل ہے۔اور کہا جائے گا "یارحیم الآخرۃ" اے آخرت میں رحم کرنے والے۔آخرت میں رب تعالیٰ کی رحمت مومنوں سے خاص ہوگی۔اس لئے واضح ہوا کہ "رحمان" کے معنی میں زیادتی ہے۔

کیفیت کے لحاظ سے اس کا عکس (الٹ) اعتبار کرنا پڑے گا ،یعنی کہا جائے گا "یا رحمن الآخرۃ "اے آخرت میں رحم کرنے والے اور کہا جائے گا"یا رحیم الدنیا" اے دنیا میں رحم کرنے والے چونکہ اخروی نعمتیں عظیم ہیں جلیل القدر ہیں اس لئے کیفیت کے معنی کے لحاظ سے "رحمان" کا تعلق اخروی نعمتوں سے زیادتی ثابت کرے گا کیونکہ دنیا کی نعمتیں اخروی نعمتوں کے مدمقابل گھٹیا حقیر یعنی تھوڑی شان والی ہیں۔

رحمٰن کو مقدم کرنے کی وجہ:

جب رحمان کے معنی میں زیادتی ہے تو عقل کا یہ تقاضا ہے کہ رحیم کو پہلے ذکر کیا جاتا کیونکہ ادنی سے اعلی کی طرف ترقی ہوتی ہے لیکن جب دنیا کی نعمتوں سے نفع حاصل کرنا پہلے ہے اور اخروی نعمتوں کا حصول بعد میں تو اس لئے "رحمن" کو پہلے ذکر کیا گیا کیونکہ رحمٰن کا تعلق جب دنیا سے ہوگا مومنوں اور کافروں پر رحمت کرنے کا اعتبار ہوگا تو رحمٰن کا ذکر یقیناً پہلے ہی مناسب ہوگا۔

(از بیضاوی ص ۵)

سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی حکمت کو کامل طور پر انسان کی ناقص عقل کیسے سمجھ سکتی ہے۔

لفظ "رحمٰن" رب تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہے:

اگر چہ لغوی معنی کے لحاظ سے ہر رحم کرنے والے انسان کو بھی رحمٰن کہنا بظاہر عقل کا تقاضا تھا لیکن " انه صار کالعلم من حیث انه لایوصف به غیره "یہ لفظ اللہ تعالیٰ کا حقیقی علم (نام) کی حیثیت میں ہوگیا، یہ نام کسی اور کا نہیں ہوسکتا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ منعم حقیقی ہے۔ بہت زیادہ رحم کرنے والا ہے، انتہاء درجہ تک رحم کرنا صرف رب تعالیٰ کا خاصہ ہے کسی اور سے اتنا عظیم رحم کرنے کا تصور ممکن ہی نہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مخلوق میں سے کوئی بھی اگر مہربانی کرتا ہے انعام عطا کرتا ہے تو وہ اس کا بدلہ حاصل کرنے کی تمنا رکھتا ہے یا وہ آخرت میں ثواب حاصل کرنا چاہتا ہے یا وہ چاہتا ہے کہ دنیا میں لوگ میری تعریف کریں یا وہ چاہتا ہے کہ مجھے اس کے بدلہ میں مال مل جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے انعامات، اس کے فضل وکرم اور احسان اور رحم کرنے میں کسی قسم کے بدلہ کی امید کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے لفظ رحمٰن رب تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہے۔

اور وجہ یہ ہے کہ مخلوق میں سے اگر کوئی رحم کرتا ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی عطاء کردہ قوت سے ذاتی طور پر مخلوق کو رحم کرنے کی قدرت وطاقت نہیں۔ لیکن باری تعالیٰ کا فضل وکرم اور رحم کرنا ذاتی ہے۔ اس لئے رحمٰن کا لفظ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہوگیا۔ (از بیضاوی)

" والحق ان الرحمن ابلغ لزيادة البناء ولذا اختص بالله دون الرحيم قال ابن عباس هما اسمان رقيقان احدهما ارق من الآخر " (مظهری)

حق یہ ہے کہ رحمٰن کے معنی میں زیادہ مبالغہ ہے کیونکہ اس میں الفاظ زیادہ ہیں۔ اسی وجہ سے یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ لیکن رحیم کا لفظ رب تعالیٰ سے خاص نہیں۔ بلکہ نبی کریم ﷺ کے اوصاف میں بھی "رؤف رحیم" ذکر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ دونوں نام ہی رقیق ہیں لیکن ایک ان میں سے بنسبت دوسرے کے زیادہ ہی رقیق ہے۔

تین اسماء گرامی اور ان کی ترتیب میں فائدہ:

اللہ تعالیٰ نے اپنے اسماء گرامی میں تین کا ذکر کیا اور ان میں سے پہلے لفظ "اللہ" ذکر کیا اس لئے کہ یہ رب تعالیٰ کا ذاتی نام ہے۔ یقیناً ذات پہلے ہوتی ہے۔ پھر اس ذات کے ساتھ صفات کا تعلق ہوتا ہے اس کے بعد لفظ رحمٰن کا ذکر کیا کیونکہ یہ رب تعالیٰ کا صفاتی نام ہے لیکن رب تعالیٰ کی ذات سے خاص ہونے کی وجہ سے دوسری جگہ پر اسے ذکر کیا۔ اس کے بعد لفظ رحیم کو ذکر کیا اس لئے کہ یہ رب کائنات کا صفاتی نام ہے اور اس کی ذات سے خاص بھی نہیں۔

تین نام ذکر کر کے واضح کر دیا کہ معبود حقیقی وہی ہے اس کے بغیر کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اور دنیاوی اور اخروی نعمتیں دینے والا فقط وہی ہے مصائب وآلام میں اسی کی طرف رجوع کیا جائے۔ اور فقط اسی کی عبادت کی جائے جب کسی بندے کو رحم کرنے والا سمجھے تو پھر بھی عقیدہ یہی ہو کہ یہ رب تعالیٰ کی طرف سے دی ہوئی طاقت سے مجھ پر رحم کر رہا ہے۔ (از بیضاوی بزیادۃ)

تین نام ذکر کرنے کی اور حکمت یہ ہے:

کہ قرآن پاک میں مخاطبین کی تین قسمیں ہیں۔ جس طرح رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَّمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ ﴾

یعنی ان تین قسموں میں سے ایک وہ لوگ ہیں جو اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والے ہیں یعنی گناہوں میں مبتلاء رہتے ہیں، دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو بین بین ہوتے ہیں نیکی بھی کر لی گناہ بھی ہو گئے، تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو نیکیوں میں سبقت لے جانے والے ہیں۔

اس کے بعد یوں سمجھیں کہ رب تعالیٰ نے گویا کہ تسمیہ میں اس طرح ذکر فرما دیا ﴿اِنَّا اللّٰہُ لِلسَّابِقِیْنَ﴾ وہ لوگ جو نیکیوں میں سبقت لے جانے والے ہیں ان کے لئے میں اللہ ہوں یعنی جمیع صفات کمالیہ کا مالک ہوں۔ وہ ہمہ وقت میری الوہیت کا خیال کریں مجھے ہی فقط اپنے دل میں بسائے رہیں۔ توجہات کا مرکز مجھے ہی بنائیں۔

"وانا الرحمن للمقتصدین" اور میں مقتصدین (یعنی بین بین راہ چلنے والے جو کبھی گناہ بھی کر لیتے ہیں اور نیکی بھی کرتے ہیں) کے لئے رحمٰن ہوں۔ وہ اگر کوئی غلطی کر لیں تو میری رحمت سے فائدہ اٹھائیں توبہ کریں۔

"وانا الرحیم للظالمین" اور میں ظالموں کے لئے رحیم ہوں یعنی بڑے سے بڑا گنہگار بھی میری رحمت سے مایوس نہ ہو بلکہ صدق دل سے توبہ کرے تو میں اسے بھی بخش دوں گا اور میری رحمت کے دروازے اس کے لئے بھی کھلے ہیں۔ اور رب تعالیٰ نے تسمیہ میں اپنے تین نام ذکر فرما کر گویا کہ یوں ارشاد فرمایا:

" اَللّٰہُ ھُوَ مُعْطِی الْعَطَاءِ وَالرَّحْمٰنُ ھُوَ الْمُتَجَاوِزُ عَنْ زَلَّاتِ الْاَوْلِیَاءِ ،
وَالرَّحِیْمُ ھُوَ الْمُتَجَاوِزُ عَنِ الْجَفَاءِ "

وہ ذات کبریاء اللہ ہے کیونکہ وہ انعامات عطا فرماتا ہے، اور رحمان اس لئے ہے کہ وہ اپنے دوستوں کی لغزشوں سے درگزر فرماتا ہے، اور رحیم اس لئے کہ اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والوں کے ظلم کو بھی معاف فرما دیتا ہے وہ اس کے حضور گردن جھکا کر تو دیکھیں۔

رب تعالیٰ کی رحمت کاملہ کو دیکھیں:

اب رب تعالیٰ کی رحمت کاملہ کا انداز آپ یوں کریں کہ وہ مالک کائنات انسان کے بہت بڑے جرائم کو دیکھتا ہے لیکن پردہ پوشی فرماتا ہے۔ انسان بعض اوقات ایسے جرائم میں مبتلا ہوتا ہے کہ اگر اس کے ان جرائم پر اس کے ماں باپ مطلع ہو جائیں تو یہ بھی اسے چھوڑ جائیں۔ اگر اس کی زوجہ کو پتہ چل جائے تو وہ بھی اس سے بگڑ جائے اس پر جفا کرنے کی راہیں تلاش کرنی شروع کر دے اگر اسکے متبعین

اس پر مطلع ہو جائیں۔ تو وہ بھی اس سے دور بھاگ جائیں۔ اگر اس کے پڑوسی کو پتہ چل جائے تو وہ گھر کو برباد کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن رب تعالیٰ اس کے جرائم کو دیکھ کر گویا کہ یوں کہتا ہے اے انسان

"وانا اعلم کل ذلک واستره بکرمی لتعلم انی اله کریم"

میں تیرے تمام جرائم، غلط کاریوں کو جانتا ہوں لیکن پھر بھی میں اپنے کرم سے ان کی پردہ پوشی کر رہا ہوں تا کہ تجھے معلوم ہو جائے میں "اللہ کریم" ہوں۔

(از کبیر جزء اول ص ۱۷۱)

بسم اللہ شریف کا ہر حرف اپنے دامن میں کمال لئے بیٹھا ہے:

الباء۔ بسم الله کی باء بَر (باء کی زبر) پر دلالت کر رہی ہے "فھو البار علی المؤمنین" یعنی وہ مومنوں پر مہربان ہے دنیا اور آخرت میں مختلف انعامات واکرامات سے نوازنے کی وجہ سے اس کی مہربانی کوئی مخفی نہیں

"واجل بره ان یکرمھم یوم القیامة برؤیته"

رب تعالیٰ کی عظیم مہربانی یہ ہوگی کہ وہ اپنے بندوں کو قیامت کے دن اپنے دیدار سے مشرف فرمائے گا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ کسی مسلمان بزرگ کا پڑوسی یہودی بیمار ہو گیا وہ اس کی عیادت کے لئے گئے اور اسے کہا، تو اسلام قبول کر لے اس نے کہا میں کس وجہ سے ایمان قبول کروں؟ وہ بزرگ کہنے لگے جہنم کی آگ کے خوف سے اس نے کہا مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ وہ بزرگ کہنے لگے جنت کے حصول کی کامیابی کے لئے ہی اسلام قبول کر لو۔ وہ کہنے لگا مجھے اس کی خواہش نہیں۔ انہوں نے پوچھا تم کیا چاہتے ہو اس یہودی نے کہا "علی ان یرینی وجھه الکریم" میں اس شرط پر ایمان لاتا ہوں کہ وہ مجھے اپنا دیدار کرا دے۔

اس بزرگ نے کہا" اسلم علی ان تجد ھذا المطلوب "اسلام قبول کر لو تمہیں یہ مطلوب حاصل ہو جائے گا۔ اس یہودی نے کہا تم مجھے اس کے متعلق ایک خط لکھ دو کہ وہ مجھے اپنی زیارت کرا دے انہوں نے اسے خط لکھ دیا۔ اس نے اسلام قبول کر لیا اس کے ساتھ ہی اس کی وفات ہو گئی۔

مسلمانوں نے اس کی نماز جناہ ادا کی اور دفن کیا۔وہی بزرگ کہتے ہیں میں نے اسے خواب میں دیکھا کہ وہ (جنت میں) ٹہل رہا ہے۔(خراماں خراماں چل رہا ہے) میں نے اس سے پوچھا اے شمعون تیرے رب نے تیرے ساتھ کیا سلوک کیا؟

اس نے کہا "غفرلی وقال لی اسلمت شوقا الی " میری رب نے میری بخشش فرما دی اور مجھے کہا (کہ یہ میرا انعام تم پر اس لئے ہے) کہ تم نے میرے ملاقات کے شوق کی وجہ سے ایمان قبول کیا۔

السین : بسم اللہ کے لفظ سین سے رب تعالیٰ کے سمیع ہونے کی خبر ملتی ہے کہ وہ اپنے بندوں کی دعاؤں کو سنتا ہے۔

روایت کیا گیا ہے کہ حضرت زید ابن حارثہ ایک منافق کے ساتھ مکہ سے طائف کی جانب چلے جب یہ دونوں جنگل میں یعنی بے آباد زمین میں پہنچے تو منافق کہنے لگا کہ ہمیں اس جنگل میں کچھ دیر آرام کر لینا چاہئے۔اس طرح وہ دونوں جنگل میں داخل ہو گئے۔حضرت زید سو گئے تو منافق نے آپ کو مضبوطی سے باندھ دیا اور قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔حضرت زید نے اس سے کہا تو مجھے کیوں قتل کرنا چاہتا ہے؟ " قال ان محمد ا یحبک وانا ابغضه " اس منافق نے کہا محمد ﷺ تمہارے ساتھ محبت کرتے ہیں اور میں ان سے بغض رکھتا ہوں۔(یعنی میں محمد (ﷺ) سے بغض رکھنے کی وجہ سے ان کے محبوب کو قتل کرنا چاہتا ہوں۔

زید نے عرض کیا " یا رحمن اغثنی " اے رحمٰن میری فریاد کو پہنچ۔ اچانک منافق نے آواز سنی کہ کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے۔ "ویحک لاتقتله " تو برباد ہو جا اسے قتل نہ کر منافق اس بیابان جنگل سے باہر نکلا۔ادھر ادھر اس نے دیکھا اسے کوئی نظر نہ آیا اس نے پھر قتل کرنے کا ارادہ کیا۔اسے پھر ایک آواز آئی جو پہلے کی بنسبت قریب تھی کہ اسے نہ قتل کر۔ منافق نے پھر دیکھا اسے کوئی نظر نہ آیا اس نے تیسری مرتبہ پھر قتل کا ارادہ کیا۔اب اس نے اور زیادہ قریب سے آواز سنی اسے نہ قتل کر ابھی جنگل سے باہر نکل کر اس نے دیکھنے کا ارادہ کیا ہی تھا "فرأى فارسا معه رمح فضربه الفارس ضربة فقتله " تو اسے ایک سوار نظر آیا۔جس کے پاس نیزہ تھا اس گھڑ سوار نے اسے نیزہ مارا اور قتل کر دیا۔پھر اس سوار نے اس بیابان جنگل میں داخل ہو کر حضرت زید کی رسی کو کھولا اور انہیں کہا۔کیا تم مجھے

پہچانتے ہو پھر اس نے خود ہی اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا:

"انا جبریل حین دعوت کنت فی السماء السابعة فقال الله عزوجل ادرک عبدی وفی الثانیة کنت فی السماء الدنیا وفی الثالثة بلغت الی منافق"

کہ میں جبریل ہوں جب تم نے دعاء کی تو میں ساتویں آسمان میں تھا۔اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا کہ میرے بندے کی امداد کرو (تو میں نے وہاں سے ہی آواز دی) دوسری مرتبہ آسمان دنیا (پہلے آسمان) پر تھا۔اور تیسری مرتبہ میں منافق کے پاس پہنچ گیا۔(اس کا کام تمام کر دیا)۔سبحان اللہ! مالک الملک بندے کی دعاء کو سن کر کیسے شرف قبولیت بخشتا ہے۔

المیم: "اما المیم فمعناه من العرش الی ما تحت الثری ملکه وملکه"

بسم اللہ شریف کے میم سے پتہ چل رہا ہے کہ عرش سے لے کر تحت الثریٰ (سب زمینوں سے نیچے تر زمین) تک تمام کائنات رب تعالیٰ کی ملکیت میں ہے اور اسی ذات کی بادشاہی عرش سے تحت الثریٰ تک ہے۔

مطلب واضح ہے کہ میم سے "من العرش" میں "من" کے میم اور "ما تحت الثری" میں "ما" کی میم کی طرف اشارہ ہے۔

سدی نے بیان کیا حضرت سلیمٰن ابن داؤد علیہما السلام کے زمانہ میں قحط پڑ گیا لوگ آپ کے پاس آئے اور کہنے لگے" یا نبی الله لوخرجت بالناس الی الاستسقاء " اے اللہ کے نبی اگر آپ لوگوں کو لے کر باہر نکلیں اور بارش طلب کرنے کے لئے دعاء کریں تو بہت ہی بہتر ہے آپ لوگوں کو لے کر نکلے تو آپ نے دیکھا کہ ایک چیونٹی اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر ہاتھ پھیلا کر یہ دعا کر رہی ہے

"اللهم انا خلق من خلقک ولا غنی لی عن فضلک"

اے اللہ تیری مخلوق میں سے میں بھی مخلوق ہوں میں تیرے فضل سے بے پرواہ نہیں۔

" فصب الله تعالیٰ علیهم المطر" اللہ تعالیٰ نے اسی وقت ان پر بارش برسا دی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا:

" ارجعوا فقد استجیب لکم بدعاء غیر کم "لوٹ چلو تمہارے لئے دعا اور مخلوق کی قبول ہوگئی۔

یہاں تک "باسم" کی لفظی بحث بیان کی گئی لفظ اللہ اور الرحمٰن اور الرحیم کے متعلق تفصیلا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔

تاہم لفظ ''اللہ'' کے ذکر کے متعلق علامہ رازی رحمہ اللہ اپنا موقف یوں بیان کرتے ہیں۔

اے لوگو! یقین کرلو، جان لو میں اپنی ساری زندگی ''اللہ، اللہ'' کرتا رہا جب میری موت آئے گی میں کہوں گا ''اللہ'' جب قبر میں مجھ سے سوال ہوگا میں کہوں گا اللہ اور جب قیامت میں حاضر ہوں گا تو کہوں گا اللہ۔ اور جب میں نامہ اعمال اپنے ہاتھ میں پکڑوں گا تو کہوں گا ''اللہ'' اور جب میرے اعمال کا وزن ہوگا تو میں کہوں گا ''اللہ'' اور جب میں پل صراط سے گزروں گا تو کہوں گا ''اللہ'' اور جب میں جنت میں داخل ہوں گا تو کہوں گا ''اللہ'' اور جب میں رب تعالیٰ کے دیدار سے مشرف ہوں گا تو کہوں گا ''اللہ''۔ (از کبیر جز، اول ۱۷۰)

فائدہ: ﴿ اَللّٰهُ يُوْجِبُ وَلَايَتِهٖ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ☆ وَالرَّحْمٰنُ يُوْجِبُ مَحَبَّتِهٖ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ☆ وَالرَّحِيْمُ يُوْجِبُ رَحْمَتِهٖ، وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ﴾

تسمیہ میں رب تعالیٰ نے اپنے اسم گرامی ''اللہ'' کو ذکر کر کے اپنے بندوں کو سمجھایا کہ جب تم میری الوھیت کا تذکرہ کرو گے اور اس پر ایمان لاؤ گے تو تمہیں میری ولایت حاصل ہوگی جس طرح خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ اللہ ولی ہے ایمان والوں کا۔

اور الرحمٰن ذکر کر کے یہ واضح کیا کہ اے میرے بندو مجھے الرحمٰن کہہ کر یاد کرنے والو میرے الرحمٰن ہونے پر ایمان لانے والو تمہیں میری محبت حاصل ہوگی ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُو الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا﴾ بیشک وہ جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے عنقریب ان سے رحمٰن محبت کرے گا۔

اور الرحیم ذکر کر کے بتایا کہ اے میرے بندو مجھے الرحیم ماننے والو اور الرحیم کہہ کر میرا ذکر کرنے والو تمہیں میری رحمت حاصل ہوگی تمہیں میرا یہ ارشاد یاد رہنا چاہئے ﴿وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا﴾ وہ مومنوں پر رحم کرنے والا ہے۔

بسم اللہ شریف پڑھنے کے فضائل:

(۱) ایک مرتبہ موسیٰ علیہ السلام شدید مریض ہو گئے اور پیٹ میں درد ہو گیا اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی تکلیف کے مندفع (دور) ہونے کی التجا کی۔ رب تعالیٰ نے آپ کو ایک جڑی بوٹی بطور دوا کھانے کا حکم دیا آپ نے وہ بوٹی کھائی تو آپ کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے شفا حاصل ہو گئی۔

کچھ عرصہ بعد آپ کو پھر تکلیف ہو گئی آپ نے اسی جڑی بوٹی (جنگلی گھاس) کو پھر استعمال کیا لیکن مرض میں اضافہ ہو گیا۔ آپ نے رب کے حضور عرض کیا مولائے کائنات ماجرا کیا ہے میں نے پہلے وہی دوا استعمال کی شفاء حاصل ہو گئی دوبارہ اس سے تکلیف میں اضافہ ہو گیا؟ رب تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ پہلی مرتبہ تم اس گھاس کے پاس میرے حکم سے گئے تھے اور میرے حکم سے ہی تم نے اسے استعمال کیا تھا اس لئے تمہیں شفا حاصل ہوئی دوسری مرتبہ اس گھاس کے پاس خود ہی چلے گئے تھے کہ شائد اس گھاس میں یقینی طور پر شفاء ہے تو تمہاری مرض میں اضافہ ہو گیا۔

" اما علمت ان الدنیا کلها سم قاتل وتریاقها اسمی "

کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تمام دنیا زہر قاتل ہے اس کا تریاق صرف میرا نام ہے۔ واضح ہوا کہ شفاء رب تعالیٰ کے نام میں ہے

دوا صرف ظاہری سبب ہے۔ اس لئے دوا استعمال کرنے سے پہلے بسم اللہ شریف پڑھے اور ایمان یہ ہو کہ شفاء تو رب تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہوتی ہے دوا تو صرف ایک ذریعہ ہے۔

(کبیر جزء اول ص ۱۴۷)

(۲) حضرت عمر بن ابی سلمہ کہتے ہیں میں چھوٹا تھا نبی کریم ﷺ کے زیر پرورش تھا میرا ہاتھ برتن میں گھوم رہا تھا (یعنی میں کبھی ادھر سے کھاتا، کبھی ادھر سے) تو نبی کریم ﷺ نے مجھے فرمایا:

" بسم اللہ و کل بیمینک و کل مما یلیک " (بخاری، مسلم، مشکوۃ، کتاب الاطعمة)

بسم اللہ پڑھو اور اپنے دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور جو تمہارے قریب ہو وہ کھاؤ۔

وضاحت حدیث: سم امر کا صیغہ ہے (باب تفعیل سے) جس کا معنیٰ " قل باسم اللہ" اور " اذکر اسم اللہ " اللہ کا نام کہو (ابتداء طعام میں) یا معنیٰ یہ ہے کھانے کی ابتداء میں

''اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کرو'' مفہوم دونوں کا ایک ہی ہے۔

" کل مما یلیک ، ای مما یقربک لا من کل جانب "

جو کھانا تمہارے قریب ہو سامنے ہو وہ کھاؤ ہر طرف سے نہ کھاؤ اور ادھر ادھر ہاتھ نہ بڑھاؤ۔

" وھذا الحکم اذا کان الطعام فی جمیع الجوانب بمثابة واحدة اما اذا کان فیه اختلاف یعتد به فلا بأس بالأ کل من کل جانب " (مرقاة)

یہ حکم جو ہے کہ ادھر ادھر سے کھانا نہ کھایا جائے بلکہ سامنے سے کھایا جائے یہ اس وقت ہے جب تمام جانب کھانا ایک جیسا ہو اگر دستر خوان پر مختلف کھانے ہوں تو اپنی طبیعت کے مطابق کوئی کھانا بھی لیا جا سکتا ہے۔

اس حکم پر دلیل ترمذی کی حدیث ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ نبی کریم ﷺ کے سامنے ایک طشت لایا گیا جس میں کھجوریں تھیں لیکن وہ مختلف قسم کی تھیں یعنی کوئی پکی اور کوئی کچی تو آپ نے حضرت عکراش ابن ذویب کو فرمایا:

" یا عکراش کل من حیث شئت فانه غیر لون واحد "

اے عکراش جہاں سے چاہو وہاں سے کھاؤ کیونکہ یہ مختلف رنگوں کی کھجوریں ہیں۔

(۳) نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" من اکل ولم یسم الله فاکل معه الشیطٰن " (رواہ فی شرح السنة)

''جس شخص نے کھانا کھایا اور بسم اللہ نہ پڑھی شیطان اس کے ساتھ کھانا کھاتا ہے''

(۴) حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ ہوتے جب کھانا لایا جاتا ہم اس وقت تک ہاتھ کھانے پر نہیں رکھتے تھے جب تک نبی کریم ﷺ شروع نہ فرماتے اور اپنا ہاتھ کھانے پر نہ رکھتے ایک دفعہ ہم حاضر تھے آپ کے پاس کھانا لایا گیا ایک چھوٹی لڑکی دوڑتی ہوئی آئی اس نے اپنے ہاتھ کو طعام کی طرف بڑھایا۔" فاخذ رسول الله صلی الله علیه وسلم یدها " نبی کریم ﷺ نے اس کے ہاتھ کو پکڑ لیا۔ پھر ایک اعرابی بہت تیزی سے آیا اس نے اپنا ہاتھ کھانے پر رکھا آپ نے اس کے ہاتھ کو بھی پکڑ لیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

" ان الشیطان یستحل الطعام ان لایذکر اسم الله علیه "

بیشک شیطان اس کھانے کو اپنے لئے حلال سمجھتا ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ کا نام ذکر نہ

کیا جائے۔

بیشک شیطان اس لڑکی کو لے آیا تھا تا کہ اس کے ذریعے وہ اپنے لئے طعام حلال کر سکے۔ میں نے اس کے ہاتھ کو پکڑ لیا پھر وہ اعرابی کو لے آیا تا کہ اس کے ذریعے طعام کو حلال کر سکے۔ میں نے اس کے ہاتھ کو پکڑ لیا۔

" والذی نفسی بیده ان یده فی یده مع یدها " (مسلم ،مشکوۃ کتاب الاطعمة)

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے بیشک اس (شیطان) کا ہاتھ اس لڑکی کے ہاتھ کے ساتھ میرے ہاتھ میں ہے۔

(۵) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" اذااکل احدکم فنسی ان یذکر الله علی طعامه فلیقل بسم الله اوله و آخره (ای فی اوله و آخره یعنی علی جمیع اجزائه " (ترمذی ،ابو داؤد ،مشکوۃ)

جب کوئی شخص تم میں سے کھانا کھائے اللہ کا نام لینا بھول جائے تو یہ پڑھے "بسم الله اوله وآخره " یعنی میں اللہ کے نام سے ابتداء کر رہا ہوں اور اسی کے نام سے انتہاء کر رہا ہوں یعنی کھانے کے تمام اجزاء میں اللہ تعالیٰ کے نام کو شامل کر رہا ہوں۔

(۶) امیہ بن مخشی کہتے ہیں ایک شخص کھانا کھا رہا تھا اس نے بسم اللہ نہ پڑھی جب اس کا طعام سوائے ایک لقمہ کے باقی نہ رہا جب اس نے وہ لقمہ اپنے منہ کی طرف اٹھایا تو کہا "بسم الله اوله وآخره " تو نبی کریم ﷺ مسکرائے اور فرمایا:

"مازال الشیطان یاکل معه فلما ذکر اسم الله استقاء ما فی بطنه "

(ابو داؤد ،مشکوۃ کتاب الاطعمة)

شیطان اس کے ساتھ کھاتا رہا جب اس نے اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کیا تو شیطان نے قے کر کے جو اس کے پیٹ میں تھا باہر نکال دیا۔

قے کرنے سے مراد برکت کا لوٹ آنا ہے جو برکت بسم اللہ کے نہ پڑھنے سے زائل ہوگئی تھی گویا کہ وہ برکت شیطان کے پیٹ میں بطور امانت تھی جب بسم اللہ پڑھی تو وہ واپس طعام کی طرف لوٹ آئی۔ (از مرقاۃ)

(۷) مستحب یہ ہے کہ بسم اللہ ہر فعل کے اول میں پڑھے کھانا کھاتے وقت، کوئی پینے کی چیز پیتے وقت، ذبح کے وقت، (البتہ ذبح کے وقت مکمل تسمیہ نہ پڑھے بلکہ "بسم اللہ، اللہ اکبر" پڑھے) جماع کے وقت، طہارت کے وقت، کشتی وغیرہ پر سوار ہوتے وقت وغیرھا۔

رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ﴾ کھاؤ اسے جس پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیا گیا ہو۔اور ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے ﴿وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖهَا وَمُرْسٰهَا﴾ اور (نوح نے) کہا سوار ہو جاؤ اس (کشتی) میں اللہ کے نام سے ہی اس کا چلنا ہے اور اس کا لنگر انداز ہونا ہے۔

(۸) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اغلق بابک واذکر اسم اللہ واطفئ مصباحک واذکر اسم اللہ وخمر اناءک واذکر اسم اللہ واوک سقاءک واذکر اسم اللہ" (قرطبی)

تم اپنا دروازہ بند کرو تو اللہ کا نام ذکر کرو، اپنا چراغ بجھاؤ تو اللہ کا نام ذکر کرو، اپنے برتن کو ڈھانپو تو اللہ کا نام ذکر کرو، اپنے مشکیزہ وغیرہ کا منہ بند کرو تو اللہ کا نام ذکر کرو۔

یعنی ان تمام کاموں میں "بسم اللہ" پڑھنے کا حکم دیا گیا تا کہ شیطان سے بچاؤ ہو سکے اور خیر و برکت حاصل ہو سکے۔

(۹) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"لو ان احدکم اذا اراد ان یأتی اھلہ قال بسم اللہ اللھم جنبنا الشیطن وجنب الشیطن ما رزقتنا فانہ ان یقدر بینھما ولد فی ذلک لم یضرہ شیطن"

اگر تم میں سے کوئی شخص اپنی زوجہ سے جماع کرنے کا ارادہ کرے تو بسم اللہ پڑھے پھر یہ دعاء پڑھے "اللھم جنبنا الشیطن وجنب الشیطن ما رزقتنا" اے اللہ ہمیں شیطان سے دور رکھ اور جو تو نے ہمیں ولد عطاء کرنا ہے اسے بھی شیطان سے بچا۔

اگر اس کی تقدیر میں اس جماع سے کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو اسے شیطان کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ (قرطبی جزء اول ص ۹۸)

عثمان ابن العاص نے جب اسلام قبول کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے جسم میں درد ہوتا ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا " ضع یدک علی الذی تألم من جسدک وقل بسم الله ثلاثا " اپنے ہاتھ کو اپنے جسم میں درد کی جگہ رکھ کر تین مرتبہ بسم اللہ پڑھو۔پھر سات مرتبہ یہ دعا پڑھو:

" اعوذ بعزة الله وقدرته من شرما اجد واحاذر " (قرطبی)

(۱۱) " عن عائشة رضی الله عنها قالت كان رسول الله ﷺ اذا مسی طهوره سمی الله تعالیٰ ثم یفرغ الماء علی یدیه " (دار قطنی، قرطبی)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب وضو کرنے کے لئے لوٹے کو ہاتھ میں لیتے تو بسم اللہ پڑھتے ، پھر اپنے ہاتھوں پر پانی انڈیلتے۔

(۱۲) " قال النبی صلی الله علیه وسلم سترمابین الجن وعورات بنی آدم اذا دخل الکنیف ان یقول بسم الله " (ابن ماجہ، ترمذی، قرطبی)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ انسانوں کے ننگیز اور جنوں کے درمیان پردہ حائل ہوجاتا ہے جب کوئی شخص بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت بسم اللہ پڑھے۔یعنی بسم اللہ پڑھنے سے انسان کے ننگے جسم پر شیاطین مطلع نہیں ہوسکتے۔

(۱۳) نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" کل امر ذی بال لم یبدأ فیه باسم الله فهو ابتر " (بیضاوی)

ہر ذی شان کام جو بسم اللہ کے بغیر شروع کیا جائے وہ بے برکت ہوتا ہے۔

(۱۴) سعید بن ابی سکینۃ کہتے ہیں مجھے خبر ملی ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو " بسم الله الرحمن الرحیم " لکھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا "جودها فان رجلا جودها فغفرله" اسے عمدہ طریقہ سے لکھو کیونکہ ایک شخص نے بسم اللہ شریف کو عمدہ طور پر لکھا تو اس کی بخشش ہوگئی۔

سعید کہتے ہیں مجھے یہ خبر ملی کہ ایک شخص نے ایک کاغذ کو دیکھا جس میں "بسم الله الرحمن

الرحیم " لکھا ہوا تھا " فقبلہ ووضعہ علی عینیہ فغفرلہ " اس نے اس کاغذ کو چوما اور اپنی آنکھوں پر لگایا تو اس کی مغفرت ہوگئی۔

اسی سے قرآن پاک کو چوم کر آنکھوں پر لگانا باعث برکت ہونا ثابت ہوگیا۔ ہر ہر مسئلہ میں کسی نہ کسی سرپھرے کا آڑے آنا عجیب حماقت ہے۔ قرآن پاک کو چوم کر آنکھوں پر لگانے کے مخالفین بھی نظر آئیں گے سبحان اللہ ان کی کیا بدقسمتی۔

بشر حافی کی توبہ : وفیات الاعیان اور رسالہ قشیریہ میں ذکر کیا گیا ہے ایک مرتبہ بشر حافی کہیں جا رہے تھے راستہ میں انہوں نے ایک کاغذ دیکھا جس پر اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی لکھا ہوا تھا لیکن وہ پاؤں کے نیچے روندا جا رہا تھا انہوں نے وہ کاغذ اٹھایا، مہنگے داموں خوشبو خرید کر اس کاغذ پر لگائی اور اسے دیوار کے سوراخ میں ڈال دیا، رات کو سو گئے خواب میں دیکھتے ہیں کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے " یا بشر طیبت اسمی لا طیبنک فی الدنیا والأخرة " اے بشر تو نے میرے نام کو خوشبو لگائی ہے میں تجھے دنیا اور آخر میں خوشبودار بناؤں گا۔ بشر جب نیند سے بیدار ہوئے تو گناہوں سے توبہ کر لی پہلے چور تھے پھر ولی بن گئے۔ (از قرطبی مع حاشیہ)

(۱۵) قیصر روم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف خط لکھا کہ میرے باپ کے سر کو درد ہوتا ہے اسے آرام نہیں آ رہا آپ کے پاس کوئی دوا ہو تو بھیج دو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی طرف ایک ٹوپی بھیج دی جب وہ ٹوپی اپنے باپ کے سر پر رکھتا تو اسے آرام آ جاتا۔ اور جب ٹوپی اتار لیتا تو اسے پھر سر درد شروع ہو جاتا اسے بڑا تعجب لاحق ہوا :

" ففتش القلنسوة فاذا فیها کاغذ مکتوب فیه بسم الله الرحمن الرحیم "

(اس نے ٹوپی کی تفتیش کی تو دیکھا کہ اس میں ایک کاغذ ہے جس میں "بسم الله الرحمن الرحیم" لکھا ہوا ہے۔ (کبیر)

(۱۶) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" مَنْ تَوَضَّأَ وَلَمْ يَذْكُرِ اسْمَ اللهِ كَانَ طَهُوْرًا لِتِلْكَ الْاَعْضَاءِ وَمَنْ تَوَضَّأَ وَذَكَرَ اسْمَ اللهِ تَعَالٰى كَانَ طَهُوْرًا لِجَمِيْعِ بَدَنِهٖ "

جس شخص نے وضو کیا اور اللہ تعالیٰ کا نام اس میں ذکر نہ کیا تو اسے صرف وضو والے
اعضاء کی پاکیزگی حاصل ہوگی۔ اور اگر وضو کرتے وقت کسی شخص نے اللہ تعالیٰ کے
نام کا ذکر کر لیا۔ تو اس کے تمام بدن کو پاکیزگی حاصل ہو جائے گی۔

اے انسان ذرا غور کر، جب وضو کرتے وقت اللہ تعالیٰ کے نام کے ذکر سے تمام بدن کو پاکیزگی حاصل ہو جاتی ہے تو یقیناً جب تو خلوص قلب، صمیم قلب سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے گا تو تیرے دل کو بھی کفر اور بدعات سے پاکیزگی حاصل ہوگی۔ (کبیر)

(۱۷) ایک مرتبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک قبر سے گزر ہوا آپ نے دیکھا کہ عذاب والے فرشتے اس میت کو عذاب دے رہے ہیں۔ پھر کہیں آپ کا اسی قبر سے گزر ہوا تو آپ نے دیکھا کہ رحمت کے فرشتے وہاں موجود ہیں نور کی شعائیں وہاں سے اٹھ رہی ہیں آپ نے بڑا تعجب کیا نماز پڑھی اللہ سے دعا کی کہ اے مولائے کائنات ماجرا کیا ہے پہلے اسے عذاب ہو رہا تھا اب اسے فیضانِ رحمت حاصل ہے رب تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی اور بتایا اے عیسیٰ! یہ شخص بڑا گنہگار تھا جب سے مرا ہے اس وقت سے عذاب میں مبتلا تھا لیکن جب یہ فوت ہوا تھا اس کی زوجہ حاملہ تھی اس کا ایک بچہ پیدا ہوا اس نے اس بچے کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ بڑا ہو گیا اور اس نے ایک مکتب میں بچے کو چھوڑا جہاں معلم نے اسے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" پڑھایا "فاستحییت من عبدی ان اعذبه بنار ای فی بطن الارض وولده یذکر اسمی علی وجه الارض" مجھے حیا محسوس ہوئی کہ میں اپنے بندے کو آگ کا عذاب دوں زمین کے اندر، جس زمین کے اوپر اس کا بچہ میرا نام ذکر کر رہا ہے۔ (کبیر)

(۱۸) عمرہ فرغانیہ ایک عارفہ ولیہ کاملہ تھیں ان سے کسی نے سوال کیا کہ اس میں کیا حکمت ہے کہ جنبی اور حیض والی عورت کو قرآن پاک پڑھنے سے منع کیا گیا ہے لیکن "بسم اللہ" پڑھنے سے منع نہیں کیا گیا۔ انہوں نے بہت خوبصورت جواب دیا "لان التسمیة ذکر اسم الحبیب والحبیب لا یمنع من ذکر الحبیب" اس لئے کہ تسمیہ میں حبیب (اللہ تعالیٰ) کے نام کا ذکر ہے اور یہ قانون ہے کہ حبیب کو حبیب کے ذکر سے منع نہیں کیا جاتا۔

(۱۹) بسم اللہ میں رب تعالیٰ کا اسم گرامی "رحیم" مذکور ہے۔ رب تعالیٰ کی رحمت کاملہ کا ظہور چھ

مقاموں میں بہت واضح ہو گا۔قبر میں اور اس کے حشرات سے بچاؤ کے لئے ، قیامت اور اس کی تاریکیوں میں ، نامہ اعمال پڑھتے وقت اور اس وقت جو خوف طاری ہو گا ، پل صراط اور اس سے گزرنے کے خوف کے وقت ، جھنم کی آگ اور اس کے مقامات سے بچاؤ کیلئے ۔

(از کبیر)

(۲۰) ایک نیک ، بزرگ ، عارف شخص تھے ۔انہوں نے "بسم اللہ الرحمن الرحیم " لکھ کر احباب کو دے دی اور وصیت کی کہ اسے میرے کفن میں رکھ دینا آپ سے پوچھا گیا اس کا تمہیں کیا فائدہ ہو گا؟ انہوں نے کہا:

" اقول یوم القیمة الھی بعثت کتابا وجعلت عنوانه بسم اللہ الرحمن الرحیم فعاملنی بعنوان کتابک "

میں قیامت کے دن عرض کروں گا اے میرے مولا تو نے ہمیں اپنی مقدس کتاب عطا فرمائی۔جس کا عنوان تو نے "بسم اللہ الرحمن الرحیم "کو بنایا۔لہذا اب میرے ساتھ اسی قسم کا معاملہ فرما جو تیری کتاب کے عنوان سے واضح ہو رہا ہے۔

اسی سے کفن پر بسم اللہ ،کلمہ شریف لکھنے کا ثبوت بھی مل گیا۔

(۲۱) "بسم اللہ الرحمن الرحیم " میں انیس حرف ہیں اس میں دو فائدے ہیں ۔ایک یہ کہ جہنم کے "زبانیه "فرشتے انیس کی تعداد میں ہیں جس طرح رب تعالیٰ نے فرمایا"علیها تسعة عشر " جہنم پر محافظ فرشتے انیس مقرر ہیں "فاللہ تعالیٰ یدفع باسمھم بھذہ الحروف التسعة عشر "اللہ تعالیٰ بسم اللہ کے انیس حروف کے تیروں سے ان زبانیہ کو دور فرمادے گا یعنی ان کی برکت سے ان سے محفوظ فرمائے گا۔

دوسرا فائدہ یہ ہے اللہ تعالیٰ نے دن رات میں چوبیس ساعتیں بنائی ہیں پھر پانچ نمازیں پانچ ساعتوں میں فرض کیں ان پانچ ساعتوں کے گناہوں کے لئے پانچ نمازوں کو کفارہ بنایا باقی انیس ساعتوں کے لئے "بسم اللہ الرحمن الرحیم " کے انیس حرفوں کو کفارہ بنایا۔

(از کبیر جزء اول ص ۱۷۲)

(۲۲) دیلمی نے مسند فردوس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوع حدیث بیان کی " ان المعلم اذا قال للصبی قل بسم الله الرحمن الرحیم فقال کتب للمعلم وللصبی لا بویه براء ة من النار " (الدر المنثور جزء اول ص ۹)

کہ معلم جب بچے کو "بسم الله الرحمن الرحیم " پڑھاتا ہے تو اس معلم اور بچے اور بچے کے والدین کے لئے آگ سے بری ہونا لکھ دیا جاتا ہے۔

(۲۳) بیان کیا گیا ہے کہ فرعون نے خدائی کا دعویٰ کرنے سے پہلے ایک محل بنوایا اور حکم دیا کہ اس کے باہر والے دروازہ پر "بسم اللہ "لکھ دی جائے۔ جب اس نے خدائی کا دعویٰ کیا۔ رب تعالیٰ نے اسے اپنا حکم پہنچانے کے لئے موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا آپ نے اسے دعوت حق دی لیکن اس پر کوئی بھلائی کا اثر نہ ہوا۔

موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا اے باری تعالیٰ میں نے اسے کتنی مرتبہ ایمان لانے کی دعوت دی لیکن مجھے اس میں کوئی بھلائی کی راہ نظر نہیں آئی۔

رب تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ:

" لَعَلَّکَ تُرِیْدُ اَھْلَکَہ، ،اَنْتَ تَنْظُرُ اِلی کُفْرِہٖ وَاَنَااَنْظُرُ اِلَی مَا کَتَبَہٗ عَلٰی بَابِہٖ "

تم چاہتے ہو کہ اسے ہلاک کر دیا جائے لیکن تم اس کے کفر کو دیکھ رہے ہو، میں اس کے دروازہ پر لکھی ہوئی "بسم الله الرحمن الرحیم " کو دیکھ رہا ہوں۔

جس شخص نے اپنے خارجی دروازہ پر "بسم اللہ "کو لکھا تو وہ جب تک اس محل میں رہا ہلاکت سے محفوظ رہا تو وہ شخص جس نے اپنے سیاہ دل پر کفر اور کبائر سے تائب ہوتے ہوئے " بسم اللہ " کو لکھ دیا اس کا حال کیا ہوگا؟ یقیناً اس کے دل کو نورانیت حاصل ہوگی۔ (از کبیر)

(۲۴) رب تعالیٰ نے جب "بسم اللہ " میں اپنے نام " رحمن اور رحیم " ذکر فرمائے ہیں۔تو یقیناً وہ اپنے ناموں کے مطابق بندوں سے سلوک فرمائے گا البتہ جب بندے بھی اس کے بندے **بنیں**۔

ایک مرتبہ ایک سائل ایک شخص کے گھر آیا جس گھر کا دروازہ بڑا بلند تھا سوال کیا اس نے معمولی سا عطیہ دے دیا۔ دوسرے دن وہ سوالی ایک کلہاڑا لے کر آ گیا دروازہ کو خراب کرنا شروع کر دیا اسے کہا گیا تو یہ کیا کر رہا ہے اس نے کہا "اما ان یجعل الباب لائقا بالعطیة او العطیة لائقة بالباب" اونچے دروازے والو یا دروازہ عطیہ کے مطابق کر دو یا عطیہ دروازہ کی شان کے مطابق کر دو۔

بلاتشبیہ وتمثیل جب ہمارے رب تعالیٰ کی رحمت کا ایک ذرہ ،لوگوں کی رحمت کے دریا پر بھی بھاری ہے تو اس کے حضور "بسم اللہ" پڑھنے والا گویا کہ عرض کر رہا ہوتا ہے اے مولائے کائنات جب تو نے اپنی مقدس کلام قرآن مجید کی ابتداء میں ہی اپنے بندوں کو اپنی صفات بتادی ہیں "فلا تجعلنا محرومین عن رحمتک وفضلک" تو ہمارے ساتھ ایسا سلوک نہ فرمانا جو ہمیں تیری رحمت اور تیرے فضل سے محروم کر دے۔ (از کبیر)۔

(۲۵) اکثر طور پر دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ بادشاہ کے غلام جب بھی کوئی مال ،گھوڑے، خچر، گدھے وغیرہ خریدتے ہیں تو ان پر خصوصی نشانات لگا دیتے ہیں کہ یہ شاہی گھوڑے وغیرہ ہیں۔ تا کہ ان کے دشمن یا چور وغیرہ ان پر ہاتھ نہ ڈالیں جب انسان بھی ہر وقت اپنے دشمن شیطان کے حملہ سے دوچار ہے تو اسے چاہیے کہ وہ " بسم اللہ الرحمن الرحیم " پڑھ کر اللہ تعالیٰ کے اسماء گرامی کو اپنے لئے نشان بنالے کہ میں رب تعالیٰ کا بندہ ہوں مجھ پر حملہ کرنے والے خبردار مجھے ایک عام انسان نہ سمجھنا۔ اس طرح وہ شیطان کے حملہ سے محفوظ رہے گا۔ (از کبیر)

رب تعالیٰ کی رحمت عظیمہ:

اللہ تعالیٰ کی رحمت اپنے بندوں پر کتنی ہی زیادہ ہے اس کا اندازہ لگانا بھی انسانی طاقت سے بالاتر ہے۔ آیئے دیکھئے کہ اگر کسی نے قرض دینا ہو تو وہ مدیون جب اسے شخص کو دور سے دیکھے جس کا اس نے قرض دینا ہوتا ہے تو وہ اس سے دور بھاگتا ہے کہ کہیں یہ مجھ سے قرض کا مطالبہ ہی نہ کر دے لیکن اللہ تعالیٰ وہ کریم ذات ہے کہ بندے اس کے مقروض ہیں جو اس کے حقوق کو کما حقہ ادا نہیں کر رہے گناہوں کا بوجھ بھی اپنے سروں پر اٹھائے ہوئے ہیں لیکن یوں کہیں کہ رب تعالیٰ کی طرف سے

آواز آتی ہے۔" لا تفروا منی ، بل اقول ففروا الی الله "اے میرے بندو میرے مقروضو مجھ سے دور نہ بھاگو، بلکہ میری طرف بھاگ کر آ ؤ۔میری رحمت کی پناہ لےلو " فانی اناالذی اقضی دیونکم واغفر ذنوبکم " میں تو وہ رحیم ہوں کہ جب تم میرے پاس آ ؤ گے مجھ سے فریاد کرو گے تو میں خود ہی تمہارے قرضے ادا کردوں گا یعنی تمہارے قرضے معاف کردوں گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دوں گا۔تم دنیا کے نظام کو دیکھتے ہو لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میری رحمت کے انداز کچھ اور ہی ہیں:

" ان الملوک یغلقون ابوابھم عن الفقراء دون الاغنیاء وانا افعل ضد ذلک "

بادشاہ غریبوں کو دیکھ کر اپنے دروازے بند کر لیتے ہیں امیروں کے لئے اپنے دروازے کھلے رکھتے ہیں۔لیکن میں غریبوں ،فقیروں کے لئے دروازے کھلے رکھتا ہوں۔ان کو ہی اپنا قرب عطا کرتا ہوں وہی اللہ والے کہلاتے ہیں۔

وہ امیر وہ اغنیاء جو میرے حقوق نہیں ادا کرتے ،فقیروں کی حاجت مندی کا خیال نہیں کرتے اپنے مال ودولت کی وجہ سے اتراتے ہیں میں ان کے لئے اپنے دروازے بند کر لیتا ہوں ان کو مجھ سے دوری حاصل رہتی ہے۔ (از کبیر جزء اول ص ۱۶۲)

قیامت کے دن رب تعالیٰ کی رحمت بہت زیادہ ہوگی:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" ان الله تعالیٰ مائة رحمة انزل منها رحمة واحدة بین الجن والانس والطیر والبهائم والهوام فیها یتعاطفون ویتراحمون واخر تسعة وتسعین رحمة یرحم بهاعباده یوم القیامة "

بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنی سو رحمتوں میں سے صرف ایک رحمت دنیا والوں کو عطا کی ہے اسی کی وجہ سے جن ،انسان ، پرندے ، چوپائے اور کیڑے مکوڑے ایک دوسرے پر مہربانی کرتے ہیں اور رحم کرتے ہیں اور ننانوے رحمتیں رب تعالیٰ اپنے بندوں پر قیامت کو فرمائے گا۔

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے صرف سمجھانے کے لئے یہ ارشاد فرمایا ہے یعنی بات مثال کے طور پر یہ ہے کہ یوں سمجھیں گویا کہ ایک سو میں ایک رحمت دنیا والوں کو حاصل ہے " والافبحار الرحمة غير متناهية " ورنہ رب تعالیٰ کی رحمت کے دریا لا محدود ہیں ان کی کوئی حد نہیں اور نہ ہی کوئی شمار ہے۔ (از کبیر)

قیامت میں گناہگاروں سے کلام:

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" ان الله عزوجل يقول يوم القيامة للمذنبين هل احببتم تعالىٰ ، فيقولون نعم أى رب فيقول الله تعالىٰ ولم ؟ فيقولون رجونا عفوك وفضلك ، فيقول الله تعالىٰ ان قد اوجبت لكم مغفرتى "

" بے شک اللہ تعالیٰ قیامت کے دن گناہگاروں سے فرمائے گا کیا تم میرے ساتھ ملاقات کرنا پسند کرتے ہو وہ عرض کریں گے ہاں اے اللہ تعالیٰ (ہم تجھ سے ملنے کو محبوب سمجھتے ہیں) رب تعالیٰ فرمائے گا کیوں؟ وہ کہیں گے ہم تیری طرف سے معافی اور تیرے فضل کی امید کرتے ہیں رب تعالیٰ ارشاد فرمائے گا بے شک میں نے تمہارے لئے مغفرت کو لازم کر دیا"۔

بچے پر ماں اتنا رحم نہیں کرتی جتنا اللہ تعالیٰ بندوں پر رحم کرتا ہے:

ایک جنگ میں ایک بچہ شدید گرمی کی وجہ سے بے قرار تھا۔ ندا دی جا رہی تھی کہ کون اسے شدید گرمی سے بچائے اور اس پر رحم کرے۔ ایک عورت نے دیکھا وہ بچے کے پاس آئی اسے پکڑا، اور اپنے پیٹ کے ساتھ اسے لگایا پھر خود گرم سنگریزوں والی زمین پر لیٹ گئی بچے کو شدید گرمی سے بچانے کے لئے اپنے سینے پر بٹھایا اور کہہ رہی تھی "ابنی ،ابنی " یہ میرا بیٹا ہے یہ میرا بیٹا ہے۔

لوگوں نے جب یہ ماجرا دیکھا تو ان کی آنکھوں میں آنسو جاری ہو گئے، ماں کی ممتا پر تعجب کرتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے یہ دیکھتے ہوئے ارشاد فرمایا:

" اعجبتم من رحمة هذه بابنها فان الله تعالٰی ارحم بکم جمیعا من هذه المرأة بابنها "

کیا تم اس پر تعجب کرتے ہو کہ یہ اپنے بیٹے پر اتنی زیادہ رحیم ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ تم تمام پر اس سے بھی زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ (از کبیر)

رحمٰن و رحیم سے متعلق عجیب بحث:

تمام اشیاء کی چار قسمیں ہیں:

(۱) وہ جو نفع مند ہوں اور ضروری بھی۔ (۲) وہ جو نفع مند ہوں اور ضروری نہ ہوں۔

(۳) وہ جو ضروری ہوں نفع مند نہ ہوں۔ (۴) نفع مند نہ ہوں اور ضروری بھی نہ ہوں۔

پہلی قسم: وہ جو نفع مند ہو اور ضروری بھی ہوں۔ ان کی پھر دو قسمیں ہیں کیونکہ ان کا تعلق یا دنیا سے ہوگا یا آخرت سے۔ جب دنیا میں اس کا ہونا ضروری ہو اور نفع مند بھی، اس کی مثال سانس ہے، کیونکہ سانس ایک لحظہ بھی منقطع ہو جائے۔ تو موت واقع ہو جائے۔ وہ جس کا تعلق آخرت سے ہے اس کی مثال اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے اس لئے کہ اگر دل سے ایک لحظہ بھی زائل ہو جائے تو دل مردہ ہو جاے اور دائمی عذاب کا مستحق ہو جائے۔

دوسری قسم: وہ جو نفع مند ہوں لیکن ضروری نہ ہوں۔ جیسا کہ دنیا میں مال اور تمام دنیاوی علوم وغیرہ۔

تیسری قسم: وہ چیزیں جو ضروری ہوں لیکن نفع مند نہ ہوں یہ وہ تمام چیزیں ہیں جن کو ہم بظاہر نقصان دہ، ضرر انداز سمجھتے ہیں جس طرح بیماریاں، موت، غربت، بڑھاپا۔

لیکن خیال رہے کہ اس قسم کا تعلق آخرت سے نہیں اس لئے کہ آخرت میں جن چیزوں میں منافع پائے جاتے ہیں ان میں ضرر کے پائے جانے کا کوئی احتمال نہیں یہی چیزیں جن کا ذکر کیا ہے آخرت میں یہی نفع مند ہیں۔

چوتھی قسم: وہ جو نفع مند نہ ہوں اور ضروری بھی نہ ہوں جیسے دنیا میں فقر اور آخرت میں عذاب۔ ان میں کوئی نفع نہیں اور ان کا پایا جانا ضروری بھی نہیں۔

تنبیہ : فقر تیسری قسم اور چوتھی قسم کی مثال دی ہے اس لئے کہ مطلقاً فقر ضروری ہے کیونکہ کوئی نہ کوئی تو فقیر ہونا ہی ہے لیکن ہر شخص کا فقیر ہونا ضروری بھی نہیں اب دونوں قسموں کی مثال بنانا واضح ہوگیا۔

اس تمہید کے بعد جو ابھی تک چار قسموں کی صورت میں پیش کی ہیں اس سے جب یہ واضح ہو چکا ہے کہ سانس ضروری ہے اور نفع مند بھی کیونکہ اگر ایک لحظہ سانس منقطع ہو جائے تو موت واقع ہوجائے۔اسی طرح یہ بھی بیان کیا جاچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت آخرت میں ضروری اور نفع مند ہے کیونکہ اگر ایک لحظہ دل سے زائل ہو جائے تو دل مردہ ہو جائے۔

اسی سے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ سانس منقطع ہونے سے جو موت واقع ہوتی ہے وہ آسان ہے کیونکہ اس میں تکلیف ایک معمولی وقت کے لئے ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی معرفت کے زوال سے دل پر آنے والی موت بہت مشکل ہے اس لئے کہ اس کا درد ہمیشہ کے لئے باقی رہے گا۔

سانس کے اثرات : سانس کے دو اثر ہیں۔ایک یہ کہ اچھی، پاکیزہ، خوشگوار ہوا انسان کے اندر داخل ہوتی ہے اور دل تک پہنچتی ہے جس کی وجہ سے دل معتدل اور سلامتی میں رہتا ہے۔

سانس کا دوسرا اثر یہ ہے کہ فاسد گرم اور جلا دینے والی ہوا دل سے باہر نکالی جاتی ہے۔

فکر کے اثرات: سانس کی طرح فکر کے بھی دو اثر ہیں ایک یہ کہ حجت و برھان (دلائل یقینیہ) کی بادِ نسیم کا دل تک پہنچانا جس کی وجہ سے ایمان اور معرفت میں اعتدال برقرار رہے۔

فکر کا دوسرا اثر یہ ہے کہ شکوک و شبہات کی وجہ سے پیدا ہونے والی ہوا کو دل سے نکالنا تا کہ یہ دل کو برباد نہ کردے۔

<u>ان کے بعد یہ جاننا ضروری ہے:</u> ان تمام امور کے جاننے کے بعد انسان کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ یہ جانے کہ یہ تمام محسوسات اپنی مقدار میں متناہی (ایک حد پر ختم ہونے والی) ہیں اور وجود کے بعد آخر میں ان پر فنا نے بھی واقع ہونا ہے جو شخص ان حالات پر مطلع ہوگیا وہ آفات سے امن میں باقی رہے گا اور بھلائی اور خوشی کو حاصل کرلے گا۔

حصولِ کمال کب؟ اتنا علم حاصل ہونے کے باوجود اس وقت تک کمال حاصل نہیں ہو گا جب تک اے انسان تیری عقل پر یہ بات منکشف نہ ہوجائے اور تجھے یہ پتہ نہ چل پائے:

" کل ما وجدته ووصلت اليه فهو قطرة من بحار رحمة الله وذرة من انوار احسانه فعند هذا ينفتح على قلبک معرفة کون الله تعالیٰ رحمانا رحیما "

'' کہ تجھے جو بھی حاصل ہوا جس مقام تک تو پہنچا وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بے حد سمندروں میں سے ایک قطرہ ہے اور اس کے احسانوں کے انوار میں سے ایک ذرہ ہے ۔جب تجھے یہ علم حاصل ہوجائے گا تو تیرے دل پر معرفت کے دروازے کھل جائیں گے۔اور تجھے پتہ چل جائے گا کہ اللہ تعالیٰ رحمٰن ورحیم ہے''۔(از کبیر جز،اول ص ۱۶۴)

عجیب سے عجیب تر بحث: اے انسان اگر تو رب تعالیٰ کے رحمٰن ورحیم ہونے کو پہچاننا چاہتا ہے تو یہ سمجھ لے کہ تو ایک ایسا جو ہر ہے جو مرکب ہے نفس ، بدن ، روح اور جسم سے۔ تیرا نفس ابتدائی طور پر جاہل تھا کچھ نہیں جانتا تھا جس طرح رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاللهُ اَخرَجَكُمْ مِن بُطُوْنِ اُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعلَمُوْنَ شَيْاً ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ پ ۱۴ آیت ۷۸

'' اور اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ سے پیدا کیا۔کہ تم کچھ نہ جانتے تھے ۔اور تمہیں کان اور آنکھ اور دل دیئے کہ تم احسان مانو ''

پھر اے انسان آہستہ آہستہ تو حساس قوتوں کے مراتب میں سوچ کرنے سے اور قوت محرکہ کے مراتب میں فکر کرنے سے اور قوت مدرکہ کے مراتب میں تأمل کرنے سے اور قوت عاقلہ کے مراتب میں غور وفکر سے کچھ سمجھ حاصل کرتا ہے پھر عقل سے سمجھ میں آنے والی اشیاء اور ان کی جہات میں غور و فکر سے کچھ ادراک حاصل کرتا ہے۔

لیکن یہ بات تو اچھی طرح سمجھ لے کہ ان چیزوں کی کوئی انتہاء نہیں ۔اس لئے کہ اگر کوئی عقل مند شخص معقولات کے علم کو حاصل کرنا شروع کر دے اور اس کے حصول میں بجلی کی تیز رفتاری کی طرح کام کرے اور تیز آندھی کی طرح ،تیزی دکھائے پھر بھی وہ اس تگ ودو میں ہمیشہ ہی رہے گا کسی حد کو

نہیں چھو سکے گا کیونکہ ساری عمر کی محنت اور تیزی پھرتیلا پن، اور طوفانی رفتار سے حصول کے باوجود ایک معمولی سا علم اور معرفت کا حصہ پا سکے گا۔ اس لئے کہ معلومات غیر متناھیہ (بے حد) ہیں ان تک پہنچنا ممکن نہیں۔ متناہی (ایک حد تک) درجہ کا حاصل ہونے والا علم غیر متناہی (لامحدود) کے مقابل قلیل ہی قلیل ہے۔ اے انسان جب تجھے یہ سمجھ آجائے گی تو تیرے سامنے، اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿وَمَا اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلاً﴾ (تمہیں علم نہیں دیا گیا مگر تھوڑا) کی حقانیت وصداقت جگمگانے لگے گی۔

تیرا بدن چار چیزوں سے مرکب ہے "آگ، مٹی، پانی، ہوا" ہر ایک تاثیر میں مختلف ہے آگ کو حرارت (گرمی) حاصل ہے مٹی کو یبوست (خشکی) حاصل ہے۔ پانی کو رطوبت (تری، نمی) حاصل ہے ہوا کو برودت حاصل ہے۔

جب تجھے یہ معلوم ہو جائے کہ تیرے اعضاء میں کیا منافع پائے جاتے ہیں اور کیا آثار ان میں مرتب ہوتے ہیں تو تمہیں رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ (اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرو، تو شمار نہیں کر سکو گے) کا مطلب روز روشن کی طرح سمجھ آجائیگا۔

" وحینئذ ینجلی لک اثر من آثار کمال رحمته فی خلقک وهدایتک ،فتفهم شیأ قلیلا من قوله الرحمن الرحیم " (الکبیر)

اب تم پر یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ اس کی رحمت کے آثار تمہارے اخلاق اور ھدایت میں کیسے کیسے پائے جاتے ہیں۔

رب تعالیٰ رحیم ہے اور بندے بھی رحیم ہیں فرق کیا ہے؟

" قلنا الحق ان الرحمة لیست الا لله ثم بتقدیر ان تکون لغیر الله رحمة الا ان رحمة اکمل من رحمة غیره "

حق یہ ہے کہ رحمت صرف رب تعالیٰ کو ہی حاصل ہے، یعنی وہی حقیقی رحمت ہے، وہی کامل رحمت ہے، وہی رحمت وہ رحمت ہے جو کسی سے نہیں حاصل ہوئی۔ اگر بالفرض یہ تسلیم کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر اوروں کو بھی رحمت حاصل ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی عطا سے حاصل ہوگی رب تعالیٰ کی رحمت کی مقابل ناقص ہوگی۔ پہلی بات پر دلائل ملاحظہ فرمائیں کہ رحمت رب تعالیٰ کو ہی حاصل ہے:

(۱) بیشک اللہ تعالیٰ کا جود بغیر کسی بدلہ کے پایا جاتا ہے۔اور بندوں کی سخاوت میں بدلہ پیش نظر ہوتا ہے ۔بدلہ کی کئی صورتیں ہیں۔

ایک جسمانی اور دوسری روحانی۔ جسمانی جس طرح کسی کو روپے دیئے کہ یہ مجھے کپڑا دے گا۔ روحانی میں پھر مختلف وجوہ پائی جاتی ہیں:

ایک یہ کہ اس لئے مال دیا جائے کہ یہ میری خدمت کرے گا ۔دوسری وجہ یہ ہے کہ مال دیا جائے کہ اس سے تعاون حاصل ہو گا۔تیسری وجہ یہ ہے کہ اس لئے مال عطا کیا جائے کہ یہ میری اچھی تعریف کرے گا ۔چوتھی وجہ یہ ہے کہ اس لئے کسی کو مال دیا جائے کہ اس میں مجھے بہت بڑا ثواب حاصل ہوگا۔پانچویں وجہ مال دے کر عوض حاصل کرنے کی یہ ہے کہ انسان چاہتا یہ ہے میں کسی کو مال عطا کروں تا کہ میرے دل سے مال کی محبت جاتی رہے اور مجھے محبت مال کی دوری سے رب تعالیٰ کا قرب حاصل ہو جائے ۔چھٹی وجہ یہ ہے کہ انسان کبھی مال اس لئے دیتا ہے کہ میری رقت جنسیہ زائل ہو جائے کیونکہ انسان کبھی کمزور دل ہوتا ہے کہ مال خرچ کرنے سے اس کا دل تھوڑا ہوتا ہے اس کے زوال کے لئے وہ مال خرچ کرتا ہے۔

یہ تمام قسمیں روحانی عوض کی ہیں جو ابھی تک بیان کی ہیں۔لہذا اس بحث سے واضح ہوا کہ انسان اس لئے عطا کرتا ہے کہ اسے اس عطا کے ذریعے کوئی نہ کوئی کمال حاصل ہو جائے " **فیکون ذلک فی الحقیقة معاوضة ولایکون جودا ولاھبة ولا عطیة** "اس قسم کی عطا کو حقیقت میں معاوضہ کہا جائے گا نہ یہ جود ہے اور نہ ہی ھبہ اور نہ ہی عطیہ۔

" اما الحق سبحانه وتعالى فانه كامل لذاته فيستحيل ان يعطي ليستفيد به كمالا ،فكان الجواد المطلق والراحم المطلق هو الله تعالىٰ "

لیکن اللہ تعالیٰ کامل لذاتہ ہے اس کے لئے محال ہے کہ وہ اس لئے کوئی چیز عطا کرے کہ اس کے ذریعے وہ کمال حاصل کرے رب تعالیٰ جواد مطلق ہے اور راحم مطلق ہے یعنی اس کا جود اور اس کی رحمت بلاغرض اور بلاعوض ہے۔لہذا حقیقت میں رحمت کاملہ اسے ہی حاصل ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کے بغیر ساری کائنات اپنے وجود میں رب تعالیٰ کی محتاج ہے۔یعنی رب تعالیٰ نے

کائنات کو پیدا کیا۔اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جب تک کسی کو وجود وحیات ہی حاصل نہ ہو اس نے کسی پر رحم کیسے کرنا ہے،اور جب وجود حاصل ہوتا ہے تو رب تعالیٰ کی عطاء سے، یقیناً انسان کا کسی پر رحم کرنا دراصل رب تعالیٰ کی عطا سے ہے اس لئے واضح ہوا کہ حقیقت میں رحم کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

(۳) انسان کبھی کوئی کام کرتا ہے اور کبھی چھوڑتا ہے جب انسان کسی کام کے کرنے کو چھوڑنے پر ترجیح دیتا ہے تو اس کے دل میں کام کرنے کی تمنا پیدا ہوتی ہے وہ اس کام کو ترجیح دیتا ہے جب تک اس کے دل میں کام کرنے کی تمنا نہ ہو تو وہ کسی پر رحم بھی نہیں کرسکتا۔اور جب اس کے دل میں کسی کی مجبوری اور پریشان حالی کو دیکھ کر یا رشتہ داری وقربت کو دیکھ کر رحم کرنے کی خواہش پیدا ہوگی تو وہ رحم کرے گا۔دل میں کسی پر رحم کرنے کی تمنا پیدا کرنا اور اس کے لئے اسباب پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کا ہی کام ہے کیونکہ سب چیزوں کا وہی خالق ہے:

" وماذاک الااللہ تعالیٰ فیکون الراحم فی الحقیۃ ھو اللہ تعالیٰ "

جب رحم کرنے کی طاقت اسباب اور خواہش اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی اور سے حاصل نہیں تو حقیقت میں رحم کرنے والا بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

(۴) اگر کوئی شخص یہ کہے کہ فلاں شخص نے گندم بطور عطیہ دے دی لیکن اس وقت تک اس سے نفع حاصل کرنا ممکن نہیں جب تک معدہ کا نظام ہضم درست نہ ہو۔اس کا یہ کہنا کافی نہیں۔

اسی طرح اگر کوئی شخص یہ کہے کہ فلاں شخص نے باغ تو بطور عطیہ دے دیا ہے لیکن اس باغ کو لہلہاتے ہوئے پھولوں سے اس وقت تک دل کو خوش نہیں کیا جاسکتا جب تک نظر درست نہ ہو یہ کہنا بھی کافی نہیں۔بلکہ حق یہ ہے کہ یوں کہا جائے کھیتوں اور باغوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے ان کو آفات وبلیات سے بچانا صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔گندم سے اور باغ سے نفع اسی وقت حاصل کیا جاسکے گا جب اللہ تعالیٰ چاہے گا۔نظام ہضم کو درست ہونے کے باوجود آنکھوں کی بینائی صحیح وسلامت ہونے کے باوجود اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت نہ ہوئی تو انسان نفع نہیں حاصل کر سکے گا " فوجب ان یقال ، المنعم والراحم فی الحقیقۃ ھو اللہ تعالیٰ " پس ضروری ہے کہ یہ کہا جائے کہ حقیقی طور منعم اور رحم کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر تسلیم کرلیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر اس کی مخلوق بھی رحم کرتی ہے تو یہ کہنا پڑے گا" ان رحمة الله اکمل و اعظم " ہاں یہ ٹھیک ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی کامل اور عظیم تر ہے۔

اس کی بھی چند وجوہ ہیں:

(۱) یہ بات کسی صاحب عقل پر پوشیدہ نہیں کہ انعام عطا کرنے والے کی شان بلند ہوتی ہے اور جسے انعام دیا جائے اس کی شان گھٹیا ہوتی ہے اور اسے منعم یعنی انعام دینے والے کے سامنے عاجز ہونا پڑتا ہے۔اسی سے یہ واضح ہوا کہ " فاذا حصل التواضع بالنسبة الی حضرة الله فذاک خیر من حصول هذه الحالة بالنسبة الی بعض الخلق "انسان کو چاہئے کہ وہ مخلوق کے سامنے عاجز ہونے کے بجائے رب تعالیٰ کی تواضع کرے یہی اس کے لئے بہتر ہے۔ (از کبیر)

یہ تو ہر ذی شعور انسان سمجھ سکتا ہے کہ کہاں انسان کے سامنے عجز وانکساری اور کہاں رب کائنات کے حضور اپنے عجز وانکساری کو پیش کرنا۔پتہ چلا کہ بندے سے رحمت کا حصول پست مقام رکھتا ہے اور رب تعالیٰ سے رحمت کا حصول علومرتبت کا سبب ہے۔

(۲) اے انسان ایک اور خیال تو کر اللہ تعالیٰ جب تجھے دنیا میں نعمتوں سے نوازتا ہے تو تم سے ایسے اعمال کا مطالبہ کرتا ہے جو تمہیں اخروی نعمتوں کے حاصل ہونے کا مستحق بنا دیتے ہیں۔اور اللہ تعالیٰ کے بغیر جب کوئی اور رحم کرے گا تو وہ تمہیں حکم دے گا کہ تم میری خدمت میں مشغول رہو۔اور میرے مقاصد کو پورا کرنے کے لئے ہی اپنا وقت صرف کرو۔

" ولاشک ان الحالة الاولی افضل "

''یقینی بات ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی افضل اور اعلیٰ ہے''۔

(۳) جس پر انعام کیا جائے اور رحم کیا جائے وہ انعام کرنے والے کا اپنے آپ کو غلام سمجھتا ہے "وعبودیة الله اولی من عبودیة غیر الله "اللہ تعالیٰ کی غلامیت ہی مخلوق کی غلامیت سے بہتر ہے پتہ چلا کہ رحمت باری تعالیٰ کو ہی مخلوق کی رحمت پر برتری حاصل ہے وہی اعلیٰ اور اکمل ہے۔

(۴) بادشاہ جب تم پر انعام کرتا ہے تو وہ تمہارے حالات کی تفاصیل سے بے خبر ہوتا ہے بعض

اوقات تمہیں ایسے انعام سے نوازتا ہے جس کی تمہیں ضرورت نہیں ہوتی۔اور جس چیز کی تمہیں ضرورت ہے وہ تمہیں نہیں عطا کرتا۔اور وہ تمہاری امداد تمام اوقات میں کرنے کی طاقت ہی نہیں رکھتا اور تمہاری تمام مرادیں پوری نہیں کرسکتا لیکن اللہ تعالیٰ تمام معلومات کو جانتا ہے تمام ممکنات پر قادر ہے تمہاری ہر حاجت کو جانتا ہے۔جب تمہیں کوئی حاجت درپیش آئے وہ اسے جانتا ہے اگر تم اس سے کسی چیز کا مطالبہ کرو تو وہ عطا کرنے پر قادر ہے یقیناً اس کی رحمت افضل ہے۔ (از کبیر)

(۵) جس شخص سے انعام حاصل ہو، انسان اس کا احسان مند ہوتا ہے۔خواہ وہ احسان جتلائے یا نہ جتلائے "وقبول المنة من الحق افضل من قبولها من الخلق" اللہ تعالیٰ کے احسان کو قبول کرنا اور اسی کا احسان مند ہونا ہی افضل ہے بنسبت مخلوق کے احسان کو قبول کرنے سے۔ (کبیر)

علامہ رازی رحمہ اللہ کی فیصلہ کن بات:

" فثبت بما ذکر نا ان الرحمن الرحیم هو الله تعالیٰ وبتقدیر ان یحصل
رحمن آخر رحمة الله تعالیٰ اکمل وافضل واعلی واجل والله اعلم "

ابھی تک جو ہم نے ذکر کیا ہے اس سے یہ ثابت ہوا کہ رحمٰن اور رحیم اللہ تعالیٰ ہی ہے۔اور اگر مخلوق میں سے کسی کی رحمت کو مانا جائے تو یقیناً اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی اکمل اور افضل اور اعلیٰ اور اجل (بزرگ تر) ہے۔ (از کبیر جز اول ص ۱۶۷)

تنبیہ: یہ بات ذہن میں رکھی جائے تاکہ دوبارہ نہ لوٹائی جائے کہ رحمت کی نسبت جب بندوں کی طرف کریں تو وہ رحمت رب تعالیٰ کی عطا سے ہوگی رب تعالیٰ کی رحمت کے مقابل ناقص ہوگی، غیر حقیقی ہوگی۔اور جب رحمت کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف کریں تو وہ حقیقی ہوگی، اعلیٰ ہوگی، ذاتی ہوگی، عظیم تر ہوگی۔﴿ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ﴾ کی بحث میں بھی یہی نکتہ ذہن میں ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ سے استعانت حقیقی ہے اور غیروں سے غیر حقیقی اللہ تعالیٰ کی معاونت ذاتی ہے باقیوں کی اس کی عطاء سے ہے۔

مسائل: سورۃ نمل میں جو بسم اللہ شریف ہے ﴿ اِنَّهٗ مِنْ سُلَیْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴾ میں یہ مکمل آیت نہیں بلکہ آیت کا حصہ ہے اس میں سب کا اتفاق ہے کہ یہ آیت کی جزء ہے اور قرآن پاک کا حصہ ہے لیکن وہ "بسم الله" جو سورتوں کے اول میں ہے اس میں اگرچہ کئی

اقوال ہیں صحیح قول یہ ہے کہ وہ بھی قرآن پاک کی آیت ہے لیکن ہر سورۃ میں نہیں بلکہ تمام سورتوں میں سے ایک سورۃ کا حصہ ہے کوئی سورۃ معین نہیں۔ کسی ایک سورۃ میں بھی حصہ سمجھ لیں تو درست ہے دوسری سورتوں میں صرف فرق کرنے کے لئے ہے کہ معلوم ہو جائے ایک سورۃ ختم ہوگئی دوسری شروع ہو رہی ہے۔ (از قمر الاقمار حاشیہ نور الانوار)

مسئلہ: امام جب بلند آواز سے قراءت کرے تو تعوذ اور تسمیہ آہستہ آواز میں پڑھے اس مسئلہ پر کئی احادیث مبارکہ شاہد ہیں تا ہم صحاح ستہ سے کچھ حدیثیں نقل کی جارہی ہیں۔

☆ " عن انس ان النبی ﷺ وابابکر وعمر کانوا یفتتحون الصلوة بالحمد لله رب العلمین (رواہ الشیخان) وزاد مسلم لایذکرون بسم الله الرحمن الرحیم فی اول قراء ة ولا فی اخرھا " (بخاری باب ما یقرأ بعد التکبیر، مسلم باب حجة من قال لایجھر بالبسملة)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نماز الحمد لله رب العلمین سے شروع فرماتے تھے مسلم کی روایت میں یہ بھی مزید ذکر ہے کہ (یہ تینوں حضرات) بسم الله الرحمن الرحیم قراءت کے اول میں اور آخر میں نہیں پڑھتے تھے۔ مراد یہی ہے کہ بلند آواز سے نہیں پڑھتے تھے۔ جیسا کہ دوسری حدیثوں میں واضح طور پر ذکر ہے۔

☆ " وعنه قال صلیت مع رسول الله صلی الله علیه وسلم وابی بکر وعمر وعثمان رضی الله عنهم فلم اسمع احدا منهم یقرأ بسم الله الرحمن الرحیم " (مسلم باب مذکور)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر اور عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے ساتھ نماز ادا کی میں نے ان میں سے کسی ایک سے بسم الله الرحمن الرحیم پڑھتے ہوئے نہیں سنا۔

☆ " وعنه قال صلیت خلف رسول الله ﷺ وابی بکر وعمر وعثمان رضی الله عنهم فلم اسمع احدا منهم یجهر بسم الله الرحمن الرحیم "

(نسائی باب ترک الجهر بسم الله الرحمن الرحیم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز ادا کی اور ابوبکر اور عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے پیچھے نماز ادا کی کسی ایک کو بھی بسم الله الرحمن الرحیم بلند آواز سے پڑھتے ہوئے نہیں سنا۔

اللہ تعالیٰ کی صفات کی بحث دینی طلباء کے ذوق کے لئے:

جس طرح پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں اہل علم سرگرداں ہیں۔کما حقہ اس کی معرفت کسی کو بھی حاصل نہ ہوئی آخری فیصلہ یہی ہوا کہ وہ ذات پاک ''برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم '' خیال، قیاس، گمان اور وہم سے بالاتر ہے۔ادراک کے تمام مدارج سے ماوراء ہے۔

اسی طرح اس کے اسم گرامی میں بھی اہل علم نے اپنے اپنے علم کے گھوڑے دوڑائے اتفاقی طور پر ایک منزل حاصل نہ ہو سکی ذاتی نام اسم جامد بھی کہا گیا۔مشتق ہو کر بھی ذاتی نام کا قول کیا گیا۔مشتق مانتے ہوئے صفاتی نام کہا گیا پھر کس لفظ سے مشتق ہے مختلف قول ہیں یعنی لفظ اللہ میں بھی اہل علم سرگرداں رہے تمام نے باہم اتفاق کرتے ہوئے کوئی فیصلہ نہ کیا۔اسی طرح رب تعالیٰ کی صفات میں یہی صورت حال ہے:

" ولصعوبة هذا المقام ذهب المعتزلة والفلاسفة الى نفى الصفات والكرامية الى نفى قدمها والاشاعرة الى نفى عينيتها وغيريتها " (شرح عقائد)

اللہ تعالیٰ کی صفات کی بحث کا مقام مشکل ہونے کی وجہ سے معتزلہ اور فلاسفہ نے اس کی صفات کا ہی انکار کیا ہے۔اور کرامیہ فرقہ نے رب تعالیٰ کی صفات کے قدیم ہونے کا انکار کیا ہے اور اشاعرہ نے صفات کی عینیت اور غیریت کی نفی کی ہے۔

اہل حق کا مذہب رب تعالیٰ کی صفات میں یہ ہے "وھی لا ھو ولا غیرہ "یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات نہ عین ذات ہیں اور نہ ہی ذات کا غیر ہیں۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات قدیم ہیں اگر ان کو ذات کا غیر مانا جائے تو لازم یہ آئے گا کہ رب تعالیٰ کے غیر کو قدیم ہونے کا مقام حاصل ہو جائے یہ بھی درست نہیں اور اگر صفات باری تعالیٰ کو عین ذات مانا جائے تو کثیر قدماء تسلیم کرنے پڑیں گے۔حالانکہ ایک ہی ذات پاک قدیم ہے۔جب رب تعالیٰ کی صفات کو نہ ذات کا عین تسلیم کیا اور نہ ہی غیر تو یہ دونوں در پیش آنی والی مشکلات حل ہو گئیں "فلایلزم قدم الغیر ولا تکثر القدماء "نہ غیر کا قدیم ہونا لازم آئے گا اور نہ قدماء میں تکثر۔

نصاری کا باطل قول:

نصاری تین اقنوم مانتے ہیں اقنوم یونانی اور رومی زبان میں بمعنی ''اصل'' آتا ہے۔ وہ ایک اقنوم کو وجود اور دوسرے کو علم اور تیسرے کو حیوۃ (حیات) کہتے ہیں۔ان کے گمان میں رب تعالیٰ کی ذات مقدسہ میں یہی تین صفات ہی ہیں۔وہ ان کو اقانیم ثلاثہ اس لئے کہتے ہیں کہ یہ تین ہی ان کے نزدیک اصل الموجودات ہیں۔پھر وہ وجود کو اب (باپ) اور علم کو ابن (بیٹا) اور حیوۃ کو روح القدس کہتے ہیں۔پھر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اقنومِ علم عیسیٰ علیہ السلام کے بدن کی طرف منتقل ہوگیا ہے۔

ان کا مذہب باطل ہی اس لئے ہے کہ وہ تکثر قدماء کے گویا کہ قائل ہیں۔اور رب تعالیٰ کی صفات کے انتقال اور ذات باری سے جدا ہونے ختم ہونے کے قائل ہیں۔ یہ سب لغویات ہیں۔اگر کسی نے نصاری کے باطل اقوال کا تفصیلی مطالعہ کرنا ہو تو راقم کی کتاب تذکرۃ الانبیاء کا مطالعہ کرے۔

معتزلہ کا عجیب انداز پر بھٹکنا:

معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عالم تو ہے لیکن اسے صفت علم حاصل نہیں، قادر ہے لیکن صفت قدرت اسے حاصل نہیں، سمیع ہے لیکن صفت سمع حاصل نہیں، وغیر ذلک۔

لیکن یہ ان کا کہنا غلط ہے اتنی واضح بات ہے کہ صفت کے بغیر موصوف کو موصوف ہونے کا مقام کیسے مل سکتا ہے۔ہم روز مرہ مشاہدات سے یہ حاصل کر سکتے ہیں کہ بغیر سواد کے اسود کا پایا جانا ممکن نہیں۔

رب تعالیٰ نے بھی اپنی صفات کا ذکر فرمایا مثال کے طور پر دیکھیں کہ ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے ''ان اللہ علیم قدیر'' بیشک اللہ تعالیٰ علیم وقدیر ہے۔یقینی بات ہے کہ بغیر علم اور قدرت کے علیم وقدیر کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق کچھ تفصیل:

<u>صفات ازلیہ یا صفات حقیقیہ یہ ہیں:</u> علم، قدرۃ، حیوۃ، قوۃ، سمع، بصر، ارادہ و مشیت۔

ان صفات حقیقیہ میں سے صرف ایک صفت "**حیوۃ**" وہ صفت ہے جس میں اضافت ونسبت نہیں۔اور باقی صفات میں اضافت ونسبت کا اعتبار پایا گیا ہے۔مثال کے طور پر "**علم**" ہے یہ ایسی صفت ہے کہ اس کا معلوم کے ساتھ تعلق لازم ہے اسی طرح "**قدرۃ**" وہ صفت ہے جس کا تعلق ایجاد مقدور سے لازم ہے۔

"**فهذه الصفات وان كانت حقيقية الا انه يلزمها لوازم من باب النسبة والاضافات**"

یہ صفات اگر چہ حقیقیہ ہیں مگر ان کو اضافت ونسبت قیاس کیا جائے۔

صفات اضافیہ کی چند قسمیں ہیں:

(۱) اس کا معلوم ومذکور ہونا جس طرح مسبح ،مجد (مفعول) جس طرح کہا جاتا ہے "**يا ايها المسبح بكل لسان يا ايها الممدوح عند كل انسان يا ايها المرجوع اليه فى كل حين واوان**" "اے ہر زبان سے تسبیح بیان کی ہوئی ذات ،اے ہر انسان کے ممدوح، اے وہ ذات کہ ہر وقت میں تیری طرف ہی رجوع کیا جاتا ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا فاعل ہونا افعال کے لئے یہ صفت اضافیہ محضہ ہے۔لیکن یہ اس وقت ہوگا جب تکوین کو صفت زائدہ نہ تسلیم کیا جائے۔اب اس تمہید کے بعد یہ بات سمجھی جائے کہ جس ذات کو موجد کہا جائے گا اسے فقط مطلقا موجد کہنا مقصود ہوگا یا کہ فلاں چیز کا اور فلاں حکمت کے پیش نظر وہ موجد ہے یہ کہنا مقصود ہوگا۔جب صرف موجد کہنا مقصود ہو تو اس کے لئے مختلف الفاظ مترادفہ استعمال کئے جاتے ہیں۔

اگر چہ بظاہر وہ تمام الفاظ قریب المعنی ہوتے ہیں لیکن ان میں فرق بھی پایا گیا ہے۔ وہ کل دس الفاظ ہیں۔

﴿الموجد ، المحدث ، المكون ، المنشئى ، المبدع ، المخترع ، الصانع ، الخالق ، الفاطر ، البارى ، الموجد معناه المؤثر فى الوجود﴾

موجد اسے کہا جاتا ہے جو وجود میں مؤثر ہو "**المحدث معناه الذى جعله موجودا بعد ان كان معدوما**" محدث اسے کہا جاتا ہے جو معدوم کو موجود کرے "**المكون**" تقریبا الموجد کا مرادف

ہے " المنشئی " یہ مشتق ہے " النشؤ " سے جس کا معنی ہے النماء (بڑھنا) "وھو الذی یکون قلیلا قلیلا علی التدریج " یہ اسے کہا جاتا ہے جو آہستہ آہستہ تدریجی طور پر کسی چیز کو معرض وجود میں لائے۔"المبدع ھو الذی یکون دفعۃ واحدۃ " مبدع وہ ہے جو کسی چیز کو یکا یک معرض وجود میں لائے اس میں تدریج نہیں المنشی اور المبدع کو الموجد کی انواع ہونے کی حیثیت حاصل ہے اور الموجد کو جنس کی حیثیت حاصل ہے "المخترع "کا معنی المبدع کے قریب ہی ہے۔"الصانع " تقریبا اسے کہا جاتا ہے جو تکلف سے کوئی کام کرے۔"الخالق " کا مشہور معنی پیدا کرنے والا رب تعالیٰ کی طرف جب منسوب ہو تو علم قدرۃ ارادہ ومشیت کو مستلزم ہوگا۔"الفاطر "مشتق ہے الفطر سے جس کا معنی پھاڑنا اس کا معنی بھی تقریبا یہ ہے کہ دفعۃ واحدۃ (یکا یک) کسی چیز کو معرض وجود میں لانا"الباری "کسی چیز کو اس کی مصلحت کے مطابق معرض وجود میں لانا عام طور پر کہا جاتا ہے "برئی القلم " قلم کو درست کر دیا اور غرض معین کے موافق کر دیا۔

یہ تمام الفاظ صرف کسی کے موجد ہونے پر دلالت کر رہے ہیں۔اگر کسی معین چیز کی ایجاد مراد لی جائے تو اس کے لئے اس چیز کے مطابق لفظ استعمال ہوگا۔جیسے نفع مند چیز کی تخلیق کی وجہ سے نافع کہا جائے ،تکلیف دہ چیز کی تخلیق کی وجہ سے ضار کہا جائے ، حیات کی تخلیق کی وجہ "محیی"، موت کی تخلیق کی وجہ سے " ممیت" کہا جائے ، جب کسی کو اکرام سے خاص کرے تو "بر لطیف" کہا جائے۔جب کسی کو قہر سے خاص کرے تو " قھار وجبار" کہا جائے اور جب کسی کو کم عطاء کرے تو "قابض "اور جب کسی کو زیادہ عطا کرے تو "باسط " کہا جائے۔اور اگر گناہوں کی جزاء عذاب سے دے تو "منتقم " اور اگر گناہوں کو معاف فرما دے تو" غفور ،رحیم ، رحمن" کہا جائے۔خیال رہے اگر حال میں اعطاء کم ہو "قابض " اور اگر زیادہ ہو تو "باسط " کہا جاتا ہے لیکن اگر مرتبہ،حشمت میں کمی کرے تو "خافض " اور اگر زیادہ کرے تو" رافع " کہا جاتا ہے۔

" اذا عرفت ھذا فنقول ان اقسام مقدورات اللہ تعالیٰ بحسب الانواع والاجناس غیر متناھیۃ فلا جرم یمکن ان یحصل اللہ تعالیٰ اسماء غیر متناھیۃ بحسب ھذا الاعتبار "

جب یہ واضح ہو گیا تو ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے مقدورات انواع واجناس کے لحاظ پر

غیر متناہی (لامحدود) ہیں تو اس اعتبار سے اس کے نام بھی غیر متناہی ہی ہوں گے۔

تنبیہ: اللہ تعالیٰ کے اسماء گرامی توقیفیہ ہیں یا غیر توقیفیہ اس کی بحث انشاء اللہ صفات کی بحث کے بعد ہوگی۔

فائدہ: ایک چیز کے مقابل جب دوسری چیز ہو تو وہ پہلی کی ضد ہوگی۔ یا اسے عدم سے تعبیر کیا جائے گا جیسا کہ المعز اور المذل اور اسی طرح المحیی اور المميت ایک دوسرے کے مقابل ہیں ان کو ایک دوسرے کی ضد کہا جائے گا۔لیکن القابض اور الباسط اسی طرح الخافض اور الرافع بھی ایک دوسرے کے مقابل ہیں لیکن ان میں تقابل عدم اور وجود کا ہے۔وجہ اس کی یہ ہے کہ "قبض" کا معنی ہے کثیر مال نہ عطا کرنا اور "بسط" کا معنی ہے کثیر مال عطا کرنا۔اسی طرح "خفض" کا معنی ہے بڑا مرتبہ نہ دینا اور "رفع" کا مطلب ہے بڑا مرتبہ دینا۔لیکن اعزاز اور اذلال میں یہ صورت نہیں پائی جاسکتی۔وہ ایک دوسرے کی ضد نہیں "لانه فرق بين ان لايعزه وبين ان يذله" اس لئے کہ کسی کو عزت نہ دینا اور ذلیل کرنا علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔یہ ضروری نہیں کہ جس کو عزت نہ دی جائے۔اسے ذلیل بھی کیا جائے عزت نہ دینے کو ذلت مستلزم نہیں۔

فائدہ: کبھی الفاظ ایک دوسرے کے معنی کے لحاظ سے قریب ہوتے ہیں۔پتہ چلتا ہے کہ ان میں ترادف ہے لیکن کامل تأمل سے ان میں ایک لطیف فرق بھی واضح ہوجاتا ہے۔مثال کے طور پر "الرؤف" اور "الرحیم" کا ایک معنی سمجھ آتا ہے لیکن ان میں فرق پایا جاتا ہے:

" الرؤف اميل الى جانب ايصال النفع والرحيم اميل الى جانب دفع الضرر "

اس لئے کہ رؤف اسے کہا جاتا ہے جس کا میلان نفع پہنچانے کی جانب ہو۔اورالرحیم اسے کہا جاتا ہے جس کا میلان ضرر (نقصان ،تکلیف) کو دور کرنے کی جانب ہو۔اسی طرح الفاتح ، الفتاح اور النافع ،النفاع اور الواهب ، الوهاب کا ایک ہی معنی نظر آتا ہے۔لیکن ان میں بھی فرق ہے:

" الفاتح يشعر باحداث سبب الخير، والواهب يشعر بايصال ذلك الخير اليه ، والنافع يشعر بايصال ذلك النفع اليه بقصد ان ينتفع ذلك الشخص به "

کیونکہ الفاتح کا معنی ہے خیر (بھلائی ،بہتری) کے اسباب پیدا کرنے والا۔اورالواهب کا

معنی ہے وہ بھلائی اس تک پہنچانا النافع کا معنی ہے کہ نفع اس تک پہنچانا اور یہ ارادہ بھی رکھنا کہ اسے نفع حاصل ہو جائے کہ وہ اس سے فائدہ حاصل کر سکے۔

صفات سلبیہ : اللہ تعالیٰ کی صفات سلبیہ کو جاننے کے لئے ایک ضابطہ کو ذہن میں رکھا جائے۔وہ یہ ہے کہ سلب یا تو ذات کی طرف لوٹے گی، اور یا صفات کی طرف عائد ہوگی، اور یا افعال کی طرف اسے منسوب کیا جائے گا، وہ سلب جو ذات کی طرف عائد ہے اس کے بہت افراد ہیں آسان لفظوں میں یوں کہا جائے "انه تعالیٰ لیس کذا ولا کذا" کہ بیشک اللہ تعالیٰ اس طرح نہیں اور اس طرح نہیں۔مثلاً یہ کہا جائے وہ جوہر نہیں، وہ جسم نہیں، وہ مکان میں نہیں، وہ حیز میں نہیں، وہ حال نہیں، وہ محل نہیں۔

فائدہ : اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔﴿ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ ﴾ اللہ تعالیٰ غنی ہے اور تم فقیر ہو۔

اور ارشاد ہے۔ ﴿وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ﴾ اور آپ کا رب غنی، رحمت والا۔ان ارشادات گرامیہ سے پتہ چلا کہ وہ جب غنی ہے تو محتاج نہیں۔لہذا واضح ہوا کہ وہ اپنی ذات میں اور صفات حقیقیہ میں اور صفات سلبیہ میں کسی کا محتاج نہیں۔یہاں سے ہی ایک اور بات سمجھ آ گئی کہ وہ ﴿ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ﴾ ہے کیونکہ کسی کا باپ ہونا یا اولاد ہونا اس کی احتیاجی پر دلالت کرتا ہے جب وہ محتاجی سے پاک ہے تو یقیناً باپ ہونے اور اولاد ہونے سے بھی پاک ہے۔

☆ وہ سلب جو صفات کی طرف عائد ہے اس کے لئے آسان قانون یہ ہے " کل صفة تكون من صفات النقائص فانه يجب تنزيه الله تعالیٰ عنها " ہر صفت جو نقص پر دلالت کرتی ہو اللہ تعالیٰ کا اس سے پاک ہونا ضروری ہے۔صفات کی طرف عائد ہونے والی صفات کی چار قسمیں ہیں۔

(۱) بعض وہ ہیں جو علم کی اضداد (ضدوں) کے قبیلہ سے ہیں۔

(۲) بعض وہ ہیں جو قدرۃ کی اضداد کے قبیلہ سے ہیں۔

(۳) بعض وہ ہیں جو استغناء کی اضداد کے قبیلہ سے ہیں۔

(۴) بعض وہ ہیں جو وحدۃ کی اضداد کے قبیلہ سے ہیں۔

جن کا تعلق علم کی اضداد سے ہے : ان کی پھر چند قسمیں ہیں:

(۱) **نیند،** اس لئے کہ جب تک کوئی شخص نیند کی حالت میں ہوتا ہے اسے علم حاصل نہیں ہوتا۔اتنی دیر کے لئے اس کا علم موقوف ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ کا علم موقوف رہے ایک معمولی وقت کے لئے بھی اسے بے علم تسلیم کیا جائے (العیاذ باللہ) یہ ممکن ہی نہیں۔یہی وجہ ہے کہ خود مالک الملک نے اپنی صفات کو بیان کرتے ہوئے فرمایا ﴿ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ﴾ اسے نہ اونگھ آئے نہ نیند۔

(۲) **نسیان** ،(بھولنا) اللہ تعالیٰ نسیان سے پاک ہے اس لئے کہ نسیان کی حالت میں بھی علم کا زوال ہے خواہ معمولی ہی ہو کیونکہ جتنی مقدار میں نسیان ہوگا۔اور جتنی دیر کے لئے نسیان ہوگا اسی مقدار اور اسی وقت کے لئے علم موقوف ہوگا۔اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا﴾ اور آپ کا رب بھولنے والا نہیں۔

(۳) **جہالت**،اللہ تعالیٰ جہالت سے پاک ہے جب واضح بات ہے کہ جہالت علم کی ضد ہے تو جہالت سے علم کا اٹھنا لازم آئے گا۔رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ﴾ اس سے غائب نہیں ذرہ بھر کوئی چیز آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔

(۴) عام طور پر بعض چیزوں کا علم دوسری بعض چیزوں کے علم سے مانع ہوتا ہے کیونکہ انسان جب بعض معلومات کی طرف مشغول ہوتا ہے تو دوسری بعض معلومات کی طرف توجہ ہی نہیں کرسکتا۔لیکن اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے اسے ہر وقت ہر چیز کا علم حاصل ہے" فانه تعالیٰ لایشغله شأن عن شأن" بیشک اللہ تعالیٰ کو ایک حال دوسرے حال سے پھیر نہیں سکتا۔

جن کا تعلق قدرة کی اضداد سے ہے:

وہ صفات سلبیہ جو قدرت کی اضداد کے قبیلہ سے ہیں۔ان کی بھی چند قسمیں ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ اپنے افعال میں تھکاوٹ اور مشقت سے پاک ہے اس لئے کہ جو تھک ہار جائے وہ زمین وآسمان کا نظام کیسے چلا سکتا ہے وہ تو اپنی مخلوق سے کسی وقت بھی غافل نہیں۔رب تعالیٰ کا اپنا ارشاد گرامی ہے ﴿وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴾ اور تھکان ہمارے پاس نہ آئی۔

(۲) رب تعالیٰ اپنے فعل میں آلات وذرائع کا محتاج نہیں۔اور اسے کسی چیز کے معرض وجود میں لانے کے لئے نہ تو مادہ کی ضرورت ہے جسطرح انسان کوئی کرسی بنانا چاہے تو اسے لکڑی اور لکڑی کاٹنے اور درست کرنے کے لئے آلات کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے اور نہ ہی اسے مدت کی ضرورت ہے وہ جب چاہے اسی وقت وہ چیز موجود ہوجاتی ہے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَا اَرَدْنَاهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴾ جو چیز ہم چاہیں اس سے ہمارا فرمانا یہی ہوتا ہے۔کہ ہم کہیں ہو جاوہ فوراً ہوجاتی ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی قدرت میں کثیر کام کرنے یا قلیل کام کرنے میں کوئی فرق نہیں۔جب کہ انسان تھوڑا کام بڑی چستی سے اور پھر تیلے طریقہ سے کر لیتے ہیں لیکن زیادہ کام سے انہیں تھکان محسوس ہوتی ہے۔بعض اوقات تو زیادہ کام کرنے سے انسان عاجز ہی آجاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا اپنی شان بیان فرماتے ہوئے ارشاد گرامی ملاحظہ ہو۔﴿ وَمَا اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴾ اور قیامت کا معاملہ نہیں مگر جیسے ایک پلک کا جھپکنا بلکہ اس سے بھی قریب بیشک اللہ سب کچھ کرسکتا ہے۔

(۴) اللہ تعالیٰ کی قدرت کی انتہاء ہوجائے اور عجز آجائے یہ ناممکن ہے اللہ تعالیٰ ہمیشہ کے لئے قادر ہی قادر ہے اس کی قدرۃ کی نہ ابتداء ہے نہ انتہاء رب کائنات نے ارشاد فرمایا:

﴿ لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِیَاءُ سَنَكْتُبُ مَاقَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْبِیَاءَ بِغَیْرِ حَقٍّ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ☆ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ﴾

بے شک اللہ نے سنا جنہوں نے کہا کہ اللہ محتاج ہے اور ہم غنی اب ہم لکھ رکھیں گے ان کا کہا اور انبیاء کو ان کا ناحق شہید کرنا اور فرمائیں گے کہ چکھو آگ کا عذاب یہ بدلا ہے اس کا جو تمہارے ہاتھوں نے آگے بھیجا اور اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو عذاب کا مستحق ٹھہرایا جنہوں نے اس ذات کبریاء کو محتاج کہا یا انبیاء کرام کو ناحق شہید کیا تو واضح ہوا کہ ایسی کوئی گھڑی نہیں آسکتی جس میں رب

تعالیٰ کی قدرت ختم ہو جائے اور محتاجی آ جائے لیکن انسانوں میں ہم آئے دن مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ ان کی طاقت کا اختتام ہوتا رہتا ہے اور عجز آتا رہتا ہے۔

وہ سلب جو استغناء کی طرف عائد ہے:

جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔﴿ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ﴾ اور وہ کھلاتا ہے کھانے سے پاک ہے۔ اور رب تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ﴿ وَهُوَ يُجِيْرُ وَلَايُجَارُ عَلَيْهِ ﴾ اور وہ پناہ دیتا ہے اس کے خلاف کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔

وہ سلب جو وحدۃ کی طرف عائد ہے:

یعنی اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں اس سے شرکت کی نفی پائی گئی جن آیات واحادیث میں رب کے شرکاء اور اضداد اور انداد کی نفی پائی گئی ہے۔ ان تمام میں سلب وحدۃ کی طرف عائد ہے کہ وہ ذات وحدہ لاشریک لہ ہے۔

سلب کی وہ قسمیں جو افعال کی طرف عائد ہیں:

اس کے لئے آسان ضابطہ یہ ہے کہ جہاں یہ ذکر ہوگا اللہ تعالیٰ اس طرح نہیں کرتا وہاں افعال کی طرف سلب کی نسبت ہوگی۔ کہ یہ افعال اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں اس کی مثالیں قرآن پاک میں بہت زیادہ پائی گئی ہیں دس مثالیں اس کی علامہ رازی رحمہ اللہ نے بیان کی ہیں۔ لیکن ان دس مثالوں میں مسئلہ بند نہیں۔ اس لئے علامہ نے فرمایا" فالقرآن مملوا منہ " قرآن اس سے بھرا ہوا ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے کسی، چیز کو باطل (بے فائدہ بے مقصد) پیدا نہیں فرمایا، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا﴿ وَمَاخَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلاً ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ اور ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے بے کار نہ بنائے یہ کافروں کا گمان ہے اور اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی حکایت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ﴿وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً ﴾ اور آسمانوں اور زمین کی

پیدائش میں غور کرتے ہیں (اور کہتے ہیں) اے رب ہمارے تو نے یہ بیکار نہ بنایا۔

(۲) رب تعالیٰ نے کسی چیز کو کھیل نہیں بنایا۔اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ☆ وَمَاخَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ﴾ اور ہم نے نہ بنائے۔ آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔کھیل کے طور پر ہم نے انہیں نہ بنایا مگر حق کے ساتھ۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کو عبث (بے فائدہ) پیدا نہیں فرمایا اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ ﴿ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ☆فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ﴾ تو کیا یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں بیکار بنایا اور تمہیں ہماری طرف پھرنا نہیں تو بہت بلندی والا ہے اللہ سچا بادشاہ۔

(۴) اللہ تعالیٰ کفران نعمت پسند نہیں فرماتا ارشاد باری تعالیٰ یہ ہے ﴿ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ﴾ اور اپنے بندوں کی ناشکری اسے پسند نہیں۔

(۵) اللہ تعالیٰ ظلم کا ارادہ نہیں فرماتا، رب کائنات کا ارشاد گرامی ہے ﴿ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ﴾ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کا ارادہ نہیں فرماتا۔

(۶) اللہ تعالیٰ کو فساد پسند نہیں رب قدوس کا ارشاد یہ ہے ﴿ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴾ اور اللہ فساد کو پسند نہیں فرماتا۔

(۷) اللہ تعالیٰ بغیر کسی جرم کے سزا نہیں دیتا، ارشاد رب کائنات یہ ہے۔ ﴿ مَايَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ ﴾ اور اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم حق مانو اور ایمان لاؤ۔

(۸) مطیع لوگوں کی اطاعت کا رب تعالیٰ کو کوئی فائدہ نہیں اور گنہگاروں کے معاصی سے رب تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں رب کائنات نے ارشاد فرمایا ﴿ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَأْتُمْ فَلَهَا ﴾ اگر تم بھلائی کرو گے اپنا بھلا کرو گے اور اگر برا کرو گے تو اپنا (ہی برا کرو گے)۔

(۹) کسی ایک کو کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور افعال میں کوئی اعتراض کرے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ ﴾ اس سے نہیں

پوچھا جاتا جو وہ کرے اور ان سب سے سوال ہوگا۔

(۱۰) اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ اور وعید کی مخالفت نہیں فرماتا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ مَایُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ وَمَا اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ﴾ میرے ہاں بات بدلتی نہیں اور نہ میں بندوں پر ظلم کروں۔

تنبیہ : اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور افعال کی طرف منسوب ہونے والی سلب کی قسمیں ان مذکورہ اقسام میں بند نہیں، یہ صرف سمجھانے کے لئے چند مثالیں پیش کیں۔ ورنہ ان کی کوئی حد نہیں۔ ضابطہ ان کے لئے وہی ہے جو صفات سلبیہ کی بحث کی ابتداء میں بیان کر دیا گیا ہے۔ کہ ہر وہ چیز جس میں نقص ہو، عیب ہو، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں ہوسکتی۔

اس پر یہ خیال کرنا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ تو یہ چیزیں اس کی قدرت سے باہر کیسے ہیں کہ وہ جھوٹ نہیں بول سکتا، اور وہ چوری نہیں کرسکتا وغیرہ، اس کا آسان جواب صرف یہ ذہن میں رکھ لیا جائے کہ عیوب ونقصائص اس قابل نہیں کہ رب تعالیٰ کی قدرت میں داخل ہوں، کیونکہ یہ اس کی شان کے مطابق محال ہیں۔ محالات قدرت سے باہر ہیں۔

فائدہ : اللہ تعالیٰ واحد ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں، یعنی اس کی حقیقت مخصوصہ میں اس کا کوئی شریک نہیں، اور نہ ہی صفت الٰہیہ میں کوئی اس کا شریک ہے اور نہ ہی ارواح واجسام کی تخلیق میں اس کا کوئی شریک ہے۔ اور نظام عالم اور تدبیر عرش میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی "القدوس" ہے، اسی سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ، وہ ذات اپنی حقیقت میں تمام ماہیات سے مختلف ہے۔ اس لئے کہ رب تعالیٰ اپنی حقیقت میں کامل ترین ہے۔ باقی حقیقتیں اور ماہیتیں سب کی سب ناقص ہیں۔ رب تعالیٰ کا اسم گرامی "السلام" ہے۔ جو اس معنی پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ ذات کسی ایسی صفت سے متصف نہیں کہ جس میں نقص پایا جائے وہ تمام ناقص صفات سے پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی "العزیز" ہے جس سے پتہ چل رہا ہے کہ اس کی کوئی نظیر نہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے جو اسماء گرامی ہیں ان سے اللہ تعالیٰ کی صفات کا پتہ چل جاتا ہے۔ کہ ان صفات کا تعلق کون سی صفات سے ہے۔ علامہ رازی رحمہ اللہ نے اگرچہ یہاں طویل بحث

کی ہے کہ بعض اسماء صفات حقیقیہ پر دلالت کر رہے ہیں۔اور بعض صفات سلبیہ پر لیکن طوالت سے بچتے ہوئے اپنی اس مختصر تحریر میں شامل نہیں کر رہا۔ (صفات کی بحث ماخوذ از کبیر جز اول ص ۱۳۰ تا ص ۱۳۸)

دینی مدارس کے طلباء کے ذوق کے لئے ایک اور بحث:

اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء مبارکہ توقیفیہ ہیں یا اصطلاحیہ یعنی غیر توقیفیہ ہیں۔

بعض حضرات نے کہا اللہ تعالیٰ کے اسماء مبارکہ توقیفیہ ہیں ۔

توقیفیہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ قرآن پاک اور احادیث صحیحہ پر موقوف ہیں ۔یعنی اللہ تعالیٰ پر کسی اسم اور صفت پر اس وقت تک اطلاق نہیں ہوسکتا۔جب تک ان کا ذکر قرآن مجید میں یا صحیح حدیثوں میں نہ ہو۔ بعض حضرات نے کہا" **كل لفظ دل على معنى يليق بجلال الله و صفاته فهو جائز و الافلا** " ہر وہ لفظ جو اللہ تعالیٰ کی شان اور اس کی بزرگی ،اور اسی طرح اس کی صفات کی عظمت پر دلالت کرے اس کا اطلاق جائز ہے ورنہ جائز نہیں ہوگا۔

نکتہ: علامہ غزالی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ اسم اور چیز ہے صفت اور۔آپ نے فرمایا:

" **اسمي محمد و اسمک ابوبكر فهذا من باب الاسماء و اما الصفات فمثل هذا الانسان بكونه طويلا فقيها كذا و كذا** "

میرا نام محمد ہے اور تمہارا نام ابوبکر ہے اسے اسم کہا جاتا ہے لیکن جب کہا جائے کہ یہ انسان لمبا ہے۔یہ فقیہ ہے زاہد ہے، متقی ہے، سخی ہے وغیرہ یہ صفات ہیں۔

" **اذا عرفت هذا الفرق فيقال اما اطلاق الاسم على الله فلايجوز الا عند وروده في القرآن والخبر و اما الصفات فانه لا يتوقف على التوقيف** "

جب تمہیں اسم اور صفت میں فرق کا پتہ چل گیا۔تو اب یہ کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء تو وہی ہوں گے جن کا ذکر قرآن پاک اور احادیث میں ہوگا البتہ صفات اللہ تعالیٰ کی بے حد ہیں وہ توقیفیہ نہیں۔

اسماء کو توقیفیہ کہنے والوں کی دلیل:

وہ حضرات یہ کہتے ہیں کہ ہم دیکھتے ہیں ایک شخص عالم طبیب ہوتو اس علم طب کی وجہ سے طبیب کہہ لیا جاتا ہے۔اسی طرح اسے فقیہ، متیقن، متبین کہاجاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کو عالم تو کہہ سکتے ہیں لیکن طبیب ،فقیہ، متیقن اور متبین نہیں کہہ سکتے۔

اس دلیل کا جواب یہ دیا گیا کہ طبیب تو اللہ تعالیٰ کو کہنا جائز ہے کیونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ بیمار ہو گئے تو آپ کو کہا گیا کہ ہم کوئی طبیب لے آئیں تو آپ نے فرمایا" الطبیب امرضنی " میرا طبیب تو وہی ہے جس نے مجھے بیمار کیا ہے۔

البتہ رب تعالیٰ کو فقیہ نہیں کہہ سکتے لیکن اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ فقیہ وہ ہوتا ہے جو متکلم کے کلام سے شبہات کے داخل ہونے کے بعد اس کی غرض کو سمجھے۔اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق یہ معنی درست نہیں لہذا وہ فقیہ نہیں۔

اللہ تعالیٰ کو متیقن نہ کہہ سکنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ لیا ہوا ہے "یقن الماء فی الحوض " سے یہ اس وقت بولتے ہیں جب پانی حوض میں جمع ہوجائے اس لغوی معنی کے مطابق "یقین " یہ ہے کہ بہت سی علامات جمع ہوجائیں ان کی اجتماعی حالت سے یقین حاصل ہوجائے۔اللہ تعالیٰ کا علم علامات واسباب سے پاک ہے۔

اللہ تعالیٰ کو متبین نہ کہہ سکنے کی یہ وجہ ہے کہ تبیین کا مطلب یہ ہے" خفاء کے بعد ظہور" اس لئے کہ تبیین کو بینونۃ اور ابانۃ سے لیا ہوا ہے جس کا معنی ہوتا ہے دوا مر متصل کے درمیان تفریق کرنا۔اور جب دل میں اشتباہ پڑ جائے کہ شائد یہ اس کے مشابہ ہے پھر اس کی وضاحت حاصل ہوجائے کہ دونوں کا حکم علیحدہ علیحدہ ایک دوسرے سے حکم میں جدا ہیں اسی کا نام بینونۃ ہے اور اسی وضاحت کی وجہ سے اس کا نام بیان اور تبیین ہوگیا۔

اللہ تعالیٰ اشتباہ کے بعد وضاحت ،اخفاء کے بعد ظہور سے پاک ہے اس لئے اس کو متبین نہیں کہہ سکتے۔

جو حضرات توقیف کے قائل نہیں ان کے دلائل:

(۱) اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات فارسی، ترکی اور ہندی میں بھی پائے گئے ہیں حالانکہ کسی کا بھی ذکر قرآن پاک اور احادیث میں نہیں۔ باوجود اس کے کہ مسلمانوں کا اجماع ہے اس پر کہ یہ جائز ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا﴾ اللہ تعالیٰ کے اچھے نام ہیں ان سے ہی اسے پکارو کسی اسم کو اس وقت تک حسین نہیں کہا جاسکتا جب تک وہ صفات مدح اور نعوت جلالیہ پر دلالت نہ کرے۔

لہٰذا واضح ہوا کہ ہر وہ اسم جو مدح والی صفات اور بزرگی والی صفات پر دلالت کرے گا وہ حسین ہوگا اور اسی کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی ذات پاک پر صحیح ہوگا۔

(۳) الفاظ کا کامل فائدہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب کہ معانی کی رعایت پائی جائے۔ جب معانی صحیح ہوں تو ان سے منع کرنا اور صرف معین الفاظ کا اطلاق صحیح قرار دینا درست نہیں۔

فائدہ: علامہ غزالی رحمہ اللہ نے فرمایا ایسے نام جن میں عیوب اور نقائص پائے جائیں وہ ہم آپس میں ایک دوسرے کے لئے بولیں تو خلاف ادب سمجھا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے لئے ایسے الفاظ کا استعمال یقیناً بے ادبی ہوگا۔

" اما ذکر الصفا ت بالالفاظ المختلفة فهو جائز فی حقنا من غیر منع فکذلک فی حق الباری تعالیٰ "

لیکن مختلف الفاظ کے ذریعے تعریف کرنا، صفات بیان کرنا، جب ہمارے حق میں جائز ہے تو اسی طرح اللہ تعالیٰ کے حق میں بھی جائز ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ کا موقف:

آپ فرماتے ہیں میں نے پند ونصائح کی کتب میں سے کسی کتاب میں دیکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے چار ہزار نام ہیں۔

ایک ہزار قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں مذکور ہیں۔اور ایک ہزار تورات میں اور ایک ہزار انجیل میں اور ایک ہزار زبور میں۔

اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ان کے علاوہ ایک ہزار اور نام لوح محفوظ میں ہیں جن کو عالم بشر میں نہیں بھیجا گیا۔

اس کے بعد آپ اپنا موقف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔" واقول هذا غير مستبعد فانا بيّنا ان اقسام صفات الله بحسب السلوب والاضافات غير متناهية " میں کہتا ہوں یہ کوئی بعید بات نہیں اس لئے کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات سلبیہ اور صفات اضافیہ بے حد ہیں۔

پھر اس آگے ترقی کر کے مزید یہ فرماتے ہیں بلکہ ہم کہتے ہیں کہ جس شخص کو عالم اعلیٰ کی تدبیر اور عالم اسفل کی تدبیر میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے آثار کا جتنا زیادہ علم ہوگا۔اسے اللہ تعالیٰ کے ناموں کا بھی اتنا ہی زیادہ علم ہوگا۔اور اسے زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی صفات جو قابل مدح ہوں گی ان کا علم حاصل ہوگا۔اگر کوئی شخص صرف انسان کے بدن کی تشریح کا ہی مطالعہ کرے تو اسے پتہ چل جائے گا کہ بدنِ انسان میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کی دس ہزار قسمیں پائی جاتی ہیں۔تو اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ کے دس ہزار ناموں پر اس شخص کو واقفی حاصل ہوگی اسی مقدار میں اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت بھی زیادہ پائی جائے گی۔

تنبیه : بعض الفاظ قرآن پاک میں وارد ہیں بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ شائد یہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں لیکن وہ بغیر تاویل کے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں ہوسکتے۔﴿ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ ۔ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۔ هُوَ خَادِعُهُمْ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف بغیر کسی تاویل کے استہزاء اور مکر اور مخادعت کی نسبت کرنا ناجائز ہے تاویل کے ساتھ جائز ہے راقم کی کتاب تسکین الجنان کا مطالعہ کیا جائے تو وہ تاویلیں سمجھ آجائیں گی۔

خلاصه کلام : اس تمام بحث سے راقم کو یہی پتہ چلا کہ وہی بات زیادہ عقل میں آتی ہے جس کا پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء گرامی تو " توقیفیه " ہیں البتہ صفات کے لحاظ سے

مختلف صفتوں کے لحاظ سے مختلف نام نظر آتے ہیں۔یہی موقف درست ہونے پر اوراد و وظائف میں مختلف صفات کا ذکر درست ہوگا۔جیسا کہ پڑھا جاتا ہے۔"یاشا فی الامراض ، یا کافی المھمات ، یا مسبب الاسباب ، یا کاشف المھمات " اس قسم کے تمام الفاظ پر صحیح ہونے کا قول اسی ضابطہ کے مطابق ہوگا۔

رب تعالیٰ کے اسماء گرامی کا اثر:

جس طرح بارش کی تاثیر یہ ہے کہ زمین میں پودہ جات اگتے ہیں کھیت سرسبز وشاداب ہوجاتے ہیں باغ لہلہانے لگ جاتے ہیں لیکن وہی بارش شور زمین ،ریگستان میں یہ تاثیر نہیں کرسکتی۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اسماء گرامی میں برکت اور عجیب تاثیر پائی جاتی ہے لیکن زبان کسی متقی، پرہیز گار کی ہو اور جس پر ان کا ورد کریں اس میں بھی اثر قبول کرنے کی صلاحیت پائی گئی ہو تو اثر ہوگا اور اثر نہ ہونے کی صورت میں یا تو ورد کرنے والے کی زبان میں اثر نہیں ہوگا اور یا جس پر وہ ورد پڑھا جارہا ہے وہ اس قابل نہیں کہ اس پر اثر ہو۔

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے سنا ہے کہ شیخ ابوالنجیب بغدادی سہروردی اپنے مرید کو چالیس مرتبہ یا دو مرتبہ اسم باری تعالیٰ کا ورد کرنے کا حکم فرماتے ،یعنی مرید کے حال کو دیکھ کر ورد کرنے کی تعداد کو معین فرماتے۔

اس کے ورد کرنے کے بعد آپ خود اس پر اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماء گرامی پڑھتے پھر اس کے چہرہ کی طرف دیکھتے اگر آپ سمجھتے کہ اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تو آپ اسے فرماتے "اخرج الی السوق واشتغل بمھمات الدنیا فانک ما خلقت لھذاالطریق " بازار کی طرف چلا جا، دنیاوی کاموں میں مشغول ہوجا،اس لئے کہ تجھے طریقت کی راہ پر چلنے کے لئے پیدا ہی نہیں کیا گیا۔

" فان رآہ متاثرا عند سماع اسم خاص مزید التاثر امرہ بالمواظبة علی ذلک الذکر " (مکمل بحث از کبیر جزء اول ص ۱۵۲ تا ص ۱۵۶)

اگر آپ دیکھتے کہ اس پر اثر ہورہا ہے تو آپ اسے جس اسم گرامی کا حکم فرماتے اس پر ہمیشہ عمل کرنے کی تاکید فرماتے۔

ائمہ کرام کے لئے ایک مفید مسئلہ:

مساجد کی امامت کراتے ہوئے ایک یہ تجربہ بھی ہوا ہے کہ جہلا بعض اوقات علماء کو مسائل سمجھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ جب کہ ان کے سمجھائے ہوئے مسائل اکثر طور پر غلط ہی ہوتے ہیں، صحیح وہی ہوتے ہیں جو علماء کرام بتاتے ہیں۔کبھی کبھی وقف پر بھی کوئی نہ کوئی شخص معترض نظر آئے گا۔کہ یہاں وقف نہیں ہونا چاہئے یہاں ہونا چاہئے ایسے لوگوں کو جواب دینے کے لئے وقف کا یہ ضابطہ ضرور یاد کیا جائے:

" واعلم ان الوقف لا بد ان یقع علی احد هذه الاوجه الثلاثة وهو ان یکون قصا او کافیا او کاملا فالوقف علی کل کلام لا یفهم بنفسه ناقص ، والوقف علی کل کلام مفهوم المعانی الا ان ما بعده یکون متعلقا بما قبله یکون کافیا ، والوقف علی کل کلام تام ویکون ما بعده منقطعا یکون وقفا تاما "

جان لو بیشک وقف کے لئے ضروری ہے کہ وہ تین قسموں میں سے ایک قسم ہوگا وہ تین قسمیں یہ ہیں (۱) ناقص (۲) کافی......(۳) کامل......ایسی جگہ پر وقف کرنا جو بذاتہ سمجھ نہ آسکے یہ وقف ناقص ہے یعنی ایسی جگہ پر وقف نہ کیا جائے کیونکہ وہ ناقص ہے ،اگر ایسی جگہ وقف کرے جس کا مفہوم تو سمجھ آ رہا ہے لیکن ماقبل سے اس کا تعلق بھی ہے۔تو اسے وقف کافی کہا جائے گا۔یعنی اگر وقف نہ کرے تو بہتر ہے اگر وقف کرے تو جائز ہوگا صحیح درست ہوگا۔

اگر ایسی جگہ وقف کرے جہاں مطلب مکمل ہو رہا ہو اور ماقبل سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو تو وہاں وقف کرنا تام ہے۔

تسمیہ میں "بسم " پر وقف کرنا ناقص اور قبیح ہے ."بسم اللہ" پر وقف کرنا یا "بسم اللہ الرحمن " پر وقف کرنا وقف کافی ہے جو صحیح اور درست ہے،اور "بسم اللہ الرحمن الرحیم " پر وقف کرنا وقف تام ہے یعنی کامل طور پر صحیح ہے۔ (کبیر بمع تقدیم وتاخیر جز اول ص ۱۰۳)

تسمیہ کی بحث میں آخری بات:

تسمیہ کی مختصر بحث کا اختتام اس بابرکت بات سے کر رہا ہوں کہ تسمیہ انبیاء کرام کا وظیفہ رہا۔ کیونکہ نوح علیہ السلام نے کشتی پر سوار ہوتے ہوئے پڑھا﴿ بِسْمِ اللهِ مَجْرهَا وَمُرْسَاهَا ﴾ اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کو جو خط لکھا اس کی ابتداء میں لکھا :﴿ وَانَّه' بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ اور نبی کریم ﷺ نے ہر ذیشان ہر اچھے کام کی ابتداء میں ﴿بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ پڑھنے کا حکم دیا اور خود بھی " بسم الله " شریف سے ابتداء فرماتے تھے۔

اللہ تعالیٰ اس بحث کو پڑھنے، لکھنے والے کو عمل کی توفیق عطا فرمائے اور خصوصاً لکھنے والے کے گناہوں کا کفارہ بنائے۔

آمین بحرمة سيد المرسلين۔

☆☆☆☆☆

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾

سب خوبیاں اللہ کو جو مالک سارے جہان والوں کا

تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو مالک تمام جہان والوں کا

ال: الف لام جنس ہو تو معنی ہوگا ''جنس حمد اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہے'' اور اگر الف لام استغراقی ہو تو معنی یہ ہوگا ''تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں:

" اذالحمد فی الحقیقة کله له اذ ما من خیر الا وھو مولیه بواسطه اوغیر واسطه کما قال الله تعالیٰ ، وما بکم من نعمة فمن الله "

جب کہ حقیقت میں تمام حمدیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہیں ۔اس لئے کہ ہر بھلائی کا عطا کرنے والا وہی ہے ۔خواہ بالواسطہ عطا کرے یا بغیر واسطہ کے۔ کیونکہ کوئی انسان بھی جب کسی پر احسان کرے گا انعام عطا کرے گا تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی عطا سے ہوگا اسی لئے رب تعالیٰ نے خود فرمایا (ترجمہ) :جو بھی تمہیں نعمت حاصل ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے۔

اسی سے یہ بھی فائدہ حاصل ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ حی ، قادر ، مرید ، عالم (ہمیشہ کیلئے زندہ ، قدرت رکھنے والا ، ارادہ رکھنے والا ، اور علم رکھنے والا) ہے ۔کیونکہ حمد کا مستحق وہی ہوسکتا ہے جس میں یہ تمام صفات پائی جائیں۔ (از بیضاوی)

حمد: "الحمد ھو الثناء باللسان علی قصد التعظیم نعمة کان اوغیرھا"

حمد اس تعریف کو کہا جاتا ہے جو زبان سے کی جائے اور تعظیم کے ارادہ سے ہو ،خواہ نعمت کو مدنظر رکھ کر تعریف کی جائے یا نعمت کو مدنظر نہ رکھے ۔

کلام عرب میں حمد کا مشہور اور مختصر معنی یہ "الثناء الکامل "کامل تعریف کرنا۔

مسلمانوں کا اجماع اس پر ہے کہ اللہ تعالیٰ محمود ہے اپنی تمام نعمتوں پر ،اس کی ہر نعمت قابل حمد ہے اور سب نعمتیں اسی سے حاصل ہیں ۔تحمید میں بنسبت حمد کے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ

"والمحمد الذی کثرت خصاله المحمودة" محمد اس ذات گرامی کا اسم مبارک ہے جس میں کثیر "قابل تعریف صفات وعادات پائی گئی ہیں" یعنی جس کی زیادہ سے زیادہ اور بار بار تعریف کی جائے اسے محمد کہا جاتا ہے یہ صرف ایک ذات سید الانبیاء کی ہی ہے۔

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کیا خوب کہا:

"فشق له من اسمه ليجله ، فذوالعرش محمود وهذا محمد"

رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو بزرگی عطا کرنے کے لئے آپ کے نام کو اپنے نام سے مشتق کیا ہے۔ صاحب عرش محمود ہے اور یہ محمد ہیں۔ (از قرطبی)

حمد، مدح، شکر کی بحث : عام طور پر تعریف کے طور پر استعمال ہونے والے الفاظ کو یہی تین نام دیئے جاتے ہیں۔ ہر لفظ کا علیحدہ مطلب ہے۔ البتہ مجازی طور پر کبھی ایک لفظ دوسرے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا رہتا ہے۔

حمد اور مدح میں فرق:

(۱) حمد کے لئے ضروری ہے کہ ذوی العقول کے فعل اختیاری پر تعریف ہو الفاظ کوئی بھی ہوں۔

مدح عام ہے ذوی العقول کی ہو یا غیر ذوی العقول کی ہو۔ فعل اختیاری پر ہو یا غیر اختیاری پر ہو۔ جیسے کہا جاتا ہے "مدحت اللؤ لؤ علی صفائها" میں نے موتی کی مدح کی اس کے صاف ہونے پر۔ موتی ذوی العقول سے نہیں اور موتی کی صفائی اور اس کی چمک و دمک اس کے اختیار میں بھی نہیں۔

(۲) حمد کے لئے شرط ہے کہ وہ صادر ہو علم سے (یعنی اس میں یقین پایا جائے) صرف گمان سے صادر نہ ہو اور یہ ہے کہ حمد ایسی صفات محمودہ پر ہوگی جن کو کامل صفات کہا جا سکے ان میں نقص نہ ہو۔ مدح عام ہے خواہ علم یقین ہو یا گمان۔ یعنی جب صرف یہ گمان ہی پایا جائے کہ فلاں کو یہ صفات حاصل ہیں تو مدح ہو سکے گی۔ اور ایسی اچھی صفات جن میں کچھ نقص بھی ہو ان کی وجہ سے بھی مدح کی جا سکے گی۔

(۳) حمد میں بہت عظمت اور بلندی شان پائی جاتی ہے کیونکہ حمد عقلاء اور عظیم شخصیات کی ہوسکے گی "واکثر اطلاقا علی اللہ تعالیٰ" اور اکثر طور پر حمد کا اطلاق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہوتا ہے۔مدح کا تعلق صرف عقلاء یا عظیم شخصیات سے نہیں بلکہ عام ہے ،غیر ذوی العقول اور معمولی چیزوں کی اچھائی پر بھی مدح ہوسکتی ہے۔

(۴) حمد غیر کے محاسن کی خبر دینے کا نام ہے جب کہ اس غیر سے محبت ہو اور اس کی بزرگی بھی مدنظر ہو مدح عام ہے صرف غیر کے محاسن کی خبر دینا ہے اس میں محبت واجلال کا بھی ساتھ پایا جانا ضروری نہیں یہی وجہ ہے کہ علم نحو میں "الحمد للہ "کو جملہ خبریہ لفظا اور انشائیہ معنی کہا جاتا ہے۔یا اس طرح کہا جائے "الحمد اخبار یتضمن انشاء" حمد خبر ہے لیکن انشاء کو متضمن ہے لیکن مدح خبر محض ہے اس میں انشاء نہیں۔

(۵) حمد کا حکم دیا گیا ہے کہیں حمد سے منع نہیں کیا گیا احادیث مبارکہ میں ہے " من لم یحمد الناس لم یحمد اللہ " جو بندوں کی حمد نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کی حمد کرنے والا بھی نہیں۔لیکن مدح سے منع بھی کیا گیا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے "احثوا فی وجوہ المدا حین التراب "مدح کرنے والوں کے منہ میں مٹی ڈالو۔ (از روح المعانی)

فائدہ : جب یہ معلوم ہوگیا کہ مدح ذوی العقول اور غیر ذوی العقول ،جماد اور غیر جماد یعنی ذی روح اور غیر ذی روح اور فاعل مختار ہو یا غیر مختار ہو۔سب کی ہوسکتی ہے تو اگر اللہ تعالیٰ کی تعریف میں "امدح اللہ" کہا جائے تو یہ تعریف کامل نہیں ہوگی کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ کا فاعل مختار ہونا سمجھ نہیں آئے گا۔اور اس سے فلاسفہ کا رد بھی نہیں ہوگا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کو فاعل مختار نہیں مانتے بلکہ موجب بالذات مانتے ہیں۔ (از کبیر)

سبحان اللہ رب تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب کی ابتداء "الحمد للہ" سے کر کے عقل کے دعویداروں کو بتادیا کہ تم صرف اپنے آپ کو پڑھا لکھا کہتے ہو اپنے فلسفہ پر ناز کرنے والو کسی علم والے کے پاس بیٹھو کسی مولوی سے "حمد" کی تعریف پڑھ لو تو تمہیں سمجھ آئے گا کہ میں فاعل مختار ہوں۔

مدح سے ممانعت والی حدیث کی وضاحت:

جس حدیث کا اوپر ذکر ہوا ہے۔یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:" اذا رأیتم المداحین فحثوا فی وجوههم التراب " جب تم کسی (کے سامنے اس) کی مدح کرتے ہوئے کسی کو دیکھو تو مدح کرنے والوں کے منہ میں مٹی ڈالو۔

اس حدیث کے متعلق ایک تو یہ سمجھا جائے کہ منہ میں مٹی ڈالنے کا کیا مطلب ہے؟"هذا الحدیث قد حمله علی ظاهره المقداد الذی هو راویه " اس حدیث پاک کا حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے اوران کے ساتھ کچھ اور ساتھیوں نے ظاہری معنی مراد لیا ہے کہ مدح کرنے والوں کے منہ میں فی الواقع مٹی ڈالی جائے۔

" وقال آخرون معناه خیبوهم فلا تعطوهم شیأ لمدحهم " لیکن دوسرے حضرات نے اس کا مجازی معنی مراد لیا ہے کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مدح کرنے والوں کو رسوا کرو ان کو مدح کرنے پر کوئی مال نہ دو۔ بلکہ ان کا رد کیا جائے ان کو عام مجلس میں منع کیا جائے۔لیکن افسوس آج کل مدح کرنے والے چاپلوسی کرنے والے، چمچہ گیری کرنے والے ،مبالغہ آمیزی کرنے والے ،مقبول نظر ہوتے ہیں ،وہی آنکھوں کا تارا ہوتے ہیں، ان کو ہی نوازا جاتا ہے، حقائق بیان کرنے والے دل سے کسی کی قدر کرنے والے محروم ہی رہتے ہیں ۔اس معاملہ میں سلطان ، وزراء ، وڈیرے ،چوہدری ، سردار ،نون ، ٹوانے ، چٹھے ،لغاری ،مزاری ، وٹو ،کھٹو تو کیا علماء کرام اور پیران عظام بھی مبتلا نظر آتے ہیں۔

حدیث پاک کی طرف یہ نظر کرنی بھی ضروری ہے "وقد جاء ت احادیث کثیرة فی الصحیحین بالمدح فی الوجه " تحقیق بخاری ، مسلم میں کثیر احادیث میں ایک دوسرے کے سامنے (منہ پر) تعریف کرنے کا ذکر بھی موجود ہے تو اس حدیث مبارک میں یا کچھ اور احادیث میں سامنے مدح کرنے سے منع کرنے کا کیا مطلب ہے؟

اس کا جواب دیتے ہوئے علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اہل علم نے ان احادیث میں تطبیق اس طرح دی ہے:

" ان النهی محمول علی المجازفة فی المدح والزیادة فی الاوصاف او علی من یخاف علیه فتنة ونحوه اذا سمع المدح "

جن احادیث میں کسی کے سامنے مدح کرنے سے منع کیا ہے ان کا مطلب یہ ہے کہ ایسی مدح نہ کی جائے جس کا تعلق تخمینہ، انکل سے ہو۔ اس کے اوصاف کا پتہ نہیں اپنے تخمینہ سے اس کے کمالات کا ذکر کرتا چلا جائے اسی طرح اگر اوصاف زیادہ بیان کرے جو اس میں نہ ہوں تو اس مدح سے بھی منع کیا گیا ہے۔ اور اگر یہ خیال ہو کہ اس کی مدح کی تو یہ متکبر ہو جائے گا۔ خودستائی میں مبتلا ہو جائے گا تو اس فتنہ سے بچنے کے لئے مدح کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

" واما من لا یخاف علیه ذلک لکمال تقواه ورسوخ عقله ومعرفته فلا نهی فی مدحه فی وجهه اذا لم یکن فیه مجازفة بل ان کان یحصل بذلک مصلحة کنشطه للخیر او الازدیاد منه اوالدوام علیه اوالا قتداء به کان مستحبا "(واللہ اعلم)۔

اگر کسی پر اس قسم کا خوف نہیں یعنی جو برائیاں اوپر ذکر کی ہیں۔ ان کا خوف نہیں کیونکہ اس کے تقوی کمال عقل اور معرفت پر کامل بھروسہ ہو تو اس کی تعریف اس کے سامنے منع نہیں۔ لیکن اس میں بھی شرط یہ ہے کہ تعریف حقائق پر مبنی ہو فقط تخمینہ پر مبنی نہ ہو۔

اسی طرح اگر یہ معلوم ہو کہ اس کی مدح کی گئی تو یہ نیکی کے کام میں زیادہ چستی دکھائے گا۔ اور پہلے سے زیادہ نیکی کے کاموں میں حصہ لے گا۔ یا یہ نیکی کے کاموں پر قائم ودائم رہے گا۔ یا اس کی مدح سے دوسرے لوگ بھی اس کی اقتداء کرتے ہوئے نیکی کے کام کریں گے تو ان صورتوں میں مدح کرنی جائز ہے۔ اس میں کوئی ممانعت نہیں۔

لیکن یہ خیال رہے کہ مدح جہاں بھی جائز ہوگی وہ حقائق پر مبنی ہو۔ اگر حقائق سے ہٹ کر کذب بیانی سے مدرسہ، مسجد کے لئے چندہ بٹورنے کے لئے فساق کو مقام ولایت، غوثیت تک پہنچا دیا جائے تو وہ مدح کرنے والے مذمت کے مستحق ہوں گے کاش کہ علماء کرام اس مسئلہ کو مدنظر رکھیں۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

حمد اور شکر میں فرق:

(۱) شکر فی مقابلة النعمة قولا وعملا واعتقادا " شکر اس تعریف کا نام ہے جو نعمت کو مدنظر رکھتے ہوئے کی جائے۔لیکن عام ہے خواہ زبان سے تعریف کی جائے یا ارکان (اعضاء) سے عمل کیا جائے یا خدمت کی جائے۔یا اسی طرح دل سے محبت واعتقاد رکھا جائے۔یہ سب شکر ہیں۔
(از بیضاوی وروح المعانی)

(۲) حمد اور شکر میں فرق یہ ہے " ان الحمد یَعُمُّ ما اذا وصل ذلک الانعام الیک اوالی غیرک " بیشک حمد عام ہے کہ وہ انعام تمہیں حاصل ہو یا کسی اور کو حاصل ہو تو تم تعریف کرو۔" واما الشکر فھو مختص بالانعام الواصل الیک " لیکن شکر صرف اس تعریف کو کہیں گے جو تمہیں انعام حاصل ہو تو تم تعریف کرو۔ (کبیر)

تنبیہ: یہ ان حضرات کے نزدیک ہے جو حمد اور شکر دونوں میں ہی نعمت کا لحاظ کرتے ہیں۔فرق صرف زبان سے تعریف کو حمد اور زبان ارکان اور دل سے تعریف کرنے کو شکر کہنے سے کرتے ہیں۔

اس معنی کے لحاظ سے بھی "الحمد لله " کہنا "الشکر لله " کہنے سے بہتر ہے کیونکہ "الحمد لله " اللہ تعالیٰ کی ثناء ہے ہر انعام پر جو اس سے صادر ہوا خواہ حمد کرنے والے کے غیر کو ہی کیوں نہ حاصل ہو۔

لیکن شکر اسی انعام پر ہوگا جو اس شکر کرنے والے کو حاصل ہوگا۔یقیناً پہلی صورت میں تعریف میں عموم ہے وہی بہتر ہے اور وہی حمد ہے اب تقدیر عبادت کی یہ ہوگی گویا کہ بندہ "الحمدلله " کہہ کر رب تعالیٰ کے حضور یہ کہہ رہا ہے۔

" سواء واعطیتنی او لم تعطنی فانعامک واصل الی کل العالمین وانت مستحق للحمد العظیم "

اے اللہ تو نے مجھے انعام عطا کیا ہے یا نہیں لیکن تو عظیم حمد کا مستحق ہے اس لئے کہ تیرا انعام تمام جہان والوں کو پہنچنے والا ہے۔

(۳) حمد اور شکر میں اور فرق یہ ہے "الحمد علی مادفع الله من البلاء والشکر علی ما

اعطیٰ من النعماء " اللہ تعالیٰ کی مصیبتوں کو دور کرنے پر تعریف کرنے کو حمد کہا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمتوں کے حاصل ہونے پر تعریف کرنے کو شکر کہا جائے گا۔

اعتراض: جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی ہوئی نعمتیں زیادہ ہیں بنسبت مصائب کو دور کرنے کی نعمتوں کے تو کیا وجہ ہے کہ اکثر کو ذکر نہیں کیا اور کم کو ذکر کر دیا ہے؟

جواب نمبر ۱: الحمد للہ کہنے والا گویا کہ یہ کہہ رہا ہوتا ہے اے مولائے کائنات جب تیری کم مقدار نعمتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میں تیری حمد کر رہا ہوں تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تیری کثیر نعمتوں پر تیرا شکر گزار نہ ہوں۔ بلکہ یہ بھی خیال رہے کہ جب حمد کا مشہور معنی لیا جائے کہ نعمت کے مقابل ہو یا نہ ہو اور شکر کے لئے نعمت کا مقابل ہونا مراد لیا جائے تو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اے باری تعالیٰ نعمتوں کو مدنظر رکھنے کے بغیر ہی جب میں تیری حمد کر رہا ہوں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ تیری نعمتوں پر تیرا شکر گزار نہ بنوں۔

جواب نمبر ۲: انسانی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ انعامات کو اتنا زیادہ اہم نہیں سمجھتا جتنا کہ نفع کو حاصل کرنا اہم سمجھتا ہے اسی وجہ سے حمد کو ذکر کیا گیا ہے جس کا تعلق دفع بلاء سے ہے۔ کیونکہ مصیبت کے دور ہونے سے ہی نفع حاصل کیا جاسکے گا۔

عربی زبان کا کمال دیکھیں:

دو جملے ہیں " الحمد لله " (سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں) اور "احمد الله " (میں اللہ تعالیٰ کی تعریف کرتا ہوں)۔ ان میں سے پہلا جملہ اسمیہ ہے اور مبتداء پر الف لام استغراقی ہے۔ اور خبر پر لام کے کئی معانی ہیں جن کا ذکر انشاء اللہ قریب ہی آ رہا ہے ان میں سے ایک معنی ہے "اختصاص " ۔

دوسرا جملہ فعلیہ، مضارعیہ ہے۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ جملہ اسمیہ دوام استمرار پر دلالت کرتا ہے اور مضارعیہ تجدد پر۔

اس تمہید کے بعد ان میں فرق دیکھیں کہ "الحمد لله " میں کیا کمال ہے؟ جو "احمد الله " میں نہیں۔

(۱) اگر "احمد اللہ" کہا جائے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ شائد حمد کرنے والا از خود حمد کرنے پر قادر ہے۔اس کی حمد کی وجہ سے رب تعالیٰ محمود ہے۔لیکن "الحمد للہ" کہنے والا گویا کہ یوں عرض کر رہا ہوتا ہے کہ اے رب کائنات میرا حمد کرنا بھی تیری توفیق سے اور تیری عطا سے ہے اگر تو مجھ پر انعام نہ فرماتا اور مجھے توفیق نہ عطا فرماتا تو میں تیری حمد کیسے کرسکتا **"فھو تعالیٰ محمود من الازل الی الابد بحمدہ القدیم و کلامہ القدیم"** اور گویا کہ یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ تو ہمیشہ کے لئے جب حمد کا مستحق ہے تو میں جانتا ہوں کہ تو میری حمد سے محمود نہیں بنے گا بلکہ اے اللہ تو ازل سے ابد تک اپنے کلام قدیم اور حمد قدیم سے ہی محمود ہے تو حمد کرنے والوں سے پہلے ہی محمود ہے اور تو شکر کرنے والوں سے پہلے ہی محمود کوئی حمد کرے یا نہ کرے کوئی شکر کرے نہ کرے تیری شان محمودیت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

(۲) "الحمد للہ" کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مستحق حمد ہے اور سب کائنات کی حمد اس کی ملکیت ہے جب اللہ تعالیٰ کے انعامات کثیر ہیں اور مختلف قسم کے انعامات ہیں تو وہ حمد کا مستحق لذاتہ ہے۔**"فقولنا الحمد للہ معناہ ان الحمد للہ حق یستحق لذاتہ"** جب ہم کہیں گے **"الحمدللہ"** تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔جو ذاتی طور پر حمد کا مستحق ہے۔

لیکن اگر "احمد اللہ" کہا جائے تو اس سے اس ذات پاک کا مستحق حمد لذاتہ ہونا نہیں سمجھ آئے گا۔

" ومعلوم ان اللفظ الدال علی کونہ مستحقا للحمد اولی من اللفظ الدال علی ان شخصا واحدا احمدہ "

اس سے واضح ہو گیا کہ بیشک وہ الفاظ مبارکہ ہی بہتر ہیں جن سے رب تعالیٰ کا مستحق حمد ہونا سمجھ آ رہا ہے لیکن وہ الفاظ جن سے صرف ایک شخص کا حمد کرنا سمجھ آئے وہ اس کے مقابل کہاں ہو سکتے ہیں۔

(۳) اگر انسان "احمد اللہ" کہے تو اس سے صرف اتنا سمجھ آ سکتا ہے کہ فلاں شخص اللہ تعالیٰ کی حمد کر رہا ہے۔لیکن اس سے یہ نہیں سمجھ آ سکتا کہ حمد اس ذات کے لائق ہے۔لیکن جب **"الحمد للہ"** کہے گا تو اس سے یہ پتہ چلے گا کہ وہ گویا کہ یہ کہہ رہا ہے **"من انا حتی احمدہ ؟ لکنہ محمود بجمیع حمد الحامدین"** میں کون ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی حمد کامل طور پر کرسکوں رب تعالیٰ کی ذات تو

وہ ذات ہے جس کی حمد کرنے والی ساری کائنات ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ جب تم سے کوئی یہ سوال کرے کہ فلاں شخص کے تم پر انعامات ہیں؟ یہ شخص جواب دے ہاں تو یہ تعریف ناقص ہے اگر یہ جواب دے کہ ہاں اس کے انعامات تو بہت سے لوگوں پر ہیں تو یہ تعریف کامل ہے۔

(۴) "الحمد لله" دل کی صفت ہے گویا کہ اعتقاد یہ پایا جاتا ہے کہ جس ذات کی حمد کی جارہی ہے وہ بڑی فضیلت کا مالک ہے۔ وہ انعامات عطا کرنے والا ہے وہ مستحق تعظیم ہے، وہ بہت بڑا بزرگ ہے، وہ مستحق حمد ہے۔ پڑھنے والا خواہ حضور قلب سے پڑھے یا پڑھتے وقت دل غافل ہو ہر لحاظ پر اللہ تعالیٰ کی حمد ہے اس لئے کہ پڑھنے والے کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ ذاتی طور پر مستحق حمد ہے۔

لیکن "احمد الله" پڑھنے والا اگر حاضر دل سے پڑھے تو یہ حمد ہے اور اگر غافل دل سے پڑھے تو یہ کذب ہے کیونکہ اس میں اس ذات کبریا کا مستحق حمد ہونا نہیں سمجھ آیا۔ سبحان اللہ! مالک الملک نے اپنے بندوں پر کتنا انعام کیا کتنا احسان ہے اس ذات پاک کا کہ بندے اس کی حمد کسی حال پر بھی کریں ان کو ثواب ہو ان کی طرف سے کذب بیانی نہ بنے۔ (از کبیر)

یہ کمال عربی زبان کو ہی حاصل ہے کہ معمولی فرق سے معانی و مطالب میں عظیم فرق سمجھ آتا ہے یہ وہی حضرات سمجھ سکتے ہیں جو عربی گرائمر پر کامل دسترس رکھتے ہیں۔ کہاں ہمارے جیسے ہیچ مدان یا ہم سے بھی گئے گزرے ہوئے دعویدار بن بیٹھیں۔ کہ میں بھی سب کچھ سمجھتا ہوں میں تو یہ کہتا ہوں سلف صالحین کے تفاسیر بھی سمجھ آ جائیں تو یہ بھی بہت بڑی غنیمت ہے۔

لام جارہ: للہ میں لفظ اللہ سے پہلے جو لام ہے اسے لام جارہ کہتے ہیں۔ یعنی زیر دینے والا۔ یہاں اس کے کئی معانی بن سکتے ہیں۔

(۱) اختصاص، لائق، اس معنی کے لحاظ پر ترجمہ یہ ہوگا تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں اللہ تعالیٰ کے لائق ہیں۔

(۲) ملک جیسے کہا جاتا "الدار لزید" گھر زید کی ملکیت ہے اس معنی کے لحاظ پر ترجمہ یہ ہوگا۔ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں ہیں۔ یعنی تمام تعریفوں کا وہی مالک ہے۔

(۳) قدرۃ ، استیلاء اس معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں کہ اسے حمد پر ولایت وغلبہ حاصل ہے۔اس لئے کہ اللہ تعالیٰ واجب لذاتہ ہے۔اور اس کے ماسوا ممکن لذاتہ ہیں۔واجب لذاتہ کو ممکن لذاتہ پر ولایت حاصل ہے۔گویا کہ اسی سے یہ بات بھی سمجھ آ گئی کہ اسے تمام مخلوق پر ولایت حاصل ہے۔اور اسے تمام مخلوق پر بلندی حاصل ہے۔

(از کبیر جزاول ص ۲۲۰)

فائدہ : الحمد للہ کے آٹھ حروف ہیں اور جنت کے آٹھ دروازے ہیں ۔جس شخص نے سچے دل سے ،صفائی قلب سے الحمد للہ پڑھا اسے معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ معبود حقیقی ہے اس کے اوامر ونواہی کو تسلیم کرنا ہے ،تو اس پر جنت کے آٹھ دروازے کھول دیئے جائیں گے ۔جس دروازے سے چاہے گا داخل ہو سکے گا۔ (از کبیر)

اعتراض: تم نے بیان یہ کیا ہے کہ حمد کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے ۔حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انعام کرنے والا جس پر انعام کرتا ہے اس کی حمد کا مستحق ہوتا ہے ،استاذ طالب علم کی حمد کا مستحق ہوتا ہے، عادل بادشاہ ،رعیت کی حمد کا مستحق ہوتا ہے ، نبی کریم ﷺ نے بھی ارشاد فرمایا ”من لم یحمد الناس لم یحمد اللہ “ جو شخص اللہ تعالیٰ کی حمد نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کی حمد بھی نہیں کرتا۔اب حمد کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہونے کا کیا مطلب ہوگا؟

جواب: حقیقت میں انعام عطا کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے اس لئے کہ کوئی انسان انعام عطا کرے گا تو اسے طاقت اللہ تعالیٰ نے دی۔اس کے دل میں اللہ تعالیٰ نے ڈالا ہے وہ نعمت اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے۔اگر اللہ تعالیٰ نعمت کو پیدا نہ کرتا انعام عطا کرنے والے کے دل میں نہ ڈالتا اسے دینے کی طاقت نہ دیتا۔ لینے والے کو نفع حاصل کرنے کی طاقت نہ دیتا تو اس نعمت سے نفع حاصل کرنا ممکن نہ تھا ” فثبت ان المنعم فی الحقیقة ھو اللہ تعالیٰ “ پس ثابت ہوا کہ منعم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے اور وہی حمد کا مستحق ہے۔

فائدہ : جب یہ ثابت ہوا کہ غیر اللہ کے انعام عطا کرنے سے اور غیر اللہ کی حمد کرنے سے رب تعالیٰ کے منعم حقیقی ہونے اور مستحق حمد ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔تو اسی سے واضح ہوا کہ رب تعالیٰ

مستعان (جس سے مدد طلب کی جائے) حقیقی ہے، اور مخلوق مجازی طور پر مدد کرنے والی ہے۔ اور مجازاً ہی مخلوق سے امداد طلب کی جاتی ہے مکمل بحث ان شاء اللہ ﴿و ایاک نستعین﴾ میں آئے گی۔

(از کبیر)

اللہ تعالیٰ کے مستحق حمد ہونے پر عقلی دلائل:

(۱) اللہ تعالیٰ منعم حقیقی ہے۔ انسان کو منعم رب تعالیٰ نے بنایا اس کے دل میں انعام دینے کی خواہش و محبت رب تعالیٰ نے ڈالی ہے۔ اس لئے عقل کا تقاضا ہے کہ یہ تسلیم کیا جائے کہ مستحق حمد صرف رب تعالیٰ ہی ہے۔

(۲) جو شخص بھی کسی غیر پر انعام کرتا ہے وہ اس کا بدلہ طلب کرتا ہے۔ خواہ ثواب ہی طلب کرے یا یہ چاہے کہ وہ میری تعریف کرے یا اس کا تقاضا ہو کہ میرا حق مجھے مل جائے۔ یا اس کی تمنا ہو کہ بخل کی عادت سے نفس کو چھٹکارا مل جائے۔ جو انعام پر بدلہ طلب کرے وہ حقیقی منعم نہیں اور نہ ہی حقیقی طور پر حمد کا مستحق ہے۔

" اما اللہ سبحانہ وتعالیٰ فانہ کامل لذاتہ والکامل لذاتہ لایطلب الکمال "

''لیکن اللہ تعالیٰ کامل لذاتہ ہے جو ذات کامل لذاتہ ہے وہ کسی سے کمال طلب نہیں کرتا''۔

اللہ تعالیٰ کی عطا خالص جود ہے اور خالص احسان ہے "فلا جرم کان مستحقا للحمد، فثبت انہ لا یستحق الحمد الا اللہ تعالیٰ" اس سے عقل نے یہ یقین کر لیا کہ اللہ تعالیٰ مستحق حمد ہے اور اس کے بغیر حقیقی طور پر کوئی مستحق حمد نہیں۔

(۳) ہر نعمت موجودات ممکنۃ الوجود سے ہے۔ ہر وہ چیز جس کا پایا جانا ممکن ہو اس کا موجد حقیقی اللہ تعالیٰ ہی ہے خواہ بلاواسطہ ہو یا بالواسطہ۔ تو اسی سے واضح ہو گیا کہ جب ہر نعمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ تو عقل یہ تسلیم کرتی ہے کہ مستحق حمد صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ (وجب القطع بان احدا لایستحق الحمد الا اللہ تعالیٰ)۔

(۴) نعمت اس وقت تک کامل نہیں ہوتی جب تک اس میں تین چیزیں نہ پائی جائیں:

☆ نعمت میں کمال اس وقت ہوگا جب اس میں منفعت پائی جائے۔ کسی چیز سے نفع وہی حاصل

کرے گا جسے حیات اور ادراک (سمجھ) حاصل ہو۔اور حیات وادراک اللہ تعالیٰ کی ایجاد کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتے۔

☆ کسی چیز میں نفع پایا بھی جائے پھر بھی وہ نعمت اس وقت تک کامل نہیں ہوسکتی جب تک وہ ضرر غم سے خالی نہ ہو"واخلاء المنافع عن شوائب الضرر لا یحصل الا من اللہ تعالیٰ"نقصان دہ چیزوں سے منافع کا خالی ہونا سوائے اللہ تعالیٰ کے حاصل نہیں۔

☆ نعمت اس وقت تک کامل نہیں ہوتی جب تک اس کے ختم ہونے کا خوف نہ ہو یہ چیز بھی صرف اللہ تعالیٰ سے ہی حاصل ہوگی "اذا ثبت ھذا فالنعمۃ الکاملۃ لا تحصل الامن اللہ تعالیٰ فوجب ان لا یستحق الحمد الکامل الا اللہ تعالیٰ" جب یہ ثابت ہوگیا تو اسی سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ نعمت کاملہ صرف اللہ تعالیٰ سے ہی حاصل ہے تو ضروری ہے کہ کامل حمد کا مستحق بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ (از کبیر)

انسان حمد اور شکر سے عاجز ہے:

انسان خود رب تعالیٰ کی حمد کامل طور پر کرسکے یا رب تعالیٰ کا شکر ایسا ادا کرسکے جیسا ادا کرنے کا حق ہے یہ انسان کی طاقت نہیں انسان اس سے عاجز ہے۔اس پر چند وجوہ دلالت کرتی ہیں۔

(۱) حمد اور شکر انسان اسی وقت کرسکتا ہے۔جب اس کے دل میں اللہ تعالیٰ یہ ڈال دے کہ حمد اور شکر کرنا چاہئے اور اس کی رکاوٹیں اور حائل ہونے والی اشیاء کو بھی دور کیا جائے۔یہ کام صرف اللہ تعالیٰ ہی کرسکتا ہے جب حمد وشکر کی توفیق اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے تو یہ بھی اس کی نعمت ہے ہر نعمت پر شکر واجب ہے پھر حمد وشکر کرے گا تو وہ بھی رب تعالیٰ کی توفیق سے حاصل ہوگا۔اس طرح انسان کماحقہ حمد وشکر کرنے سے عاجز ہے۔

(۲) عام انسان اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا علم حاصل کرسکے یہ ممکن ہی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو نہیں شمار کرسکو گے۔ جب انسان کا علم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے تو حمد وشکر ہر نعمت پر کیسے بجا لاسکتا ہے۔

(۳) اصل حمد صرف زبان سے "الحمد للہ" کہہ دینا کافی نہیں بلکہ جس شخص پر انعامات کئے گئے ہیں اس سے یہ بھی معلوم ہو کہ انعام کرنے والا کتنی عظیم صفات کا مالک ہے:

" وکل ماخطر ببال الانسان من صفات الکمال والجلال فکمال اللہ وجلالہ اعلی واعظم من ذلک المتخیل والمتصور "

انسان کے دل ودماغ میں اللہ تعالیٰ کی صفات کمال وجلال جو بھی آئیں گی دراصل اللہ تعالیٰ کی صفات جلال وکمال ان سے بہت عظیم بہت بلند ہوں گی جب انسان رب تعالیٰ کی صفات کے علم سے قاصر ہے تو یقیناً اس کی حمد کو حقیقی طور پر بجالانے سے بھی عاجز ہے۔ (از کبیر)

بندہ رب تعالیٰ کی نعمتوں کا حق ادا کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا:

کوئی انسان یہ تصور بھی نہیں کرسکتا کہ وہ رب تعالیٰ کی نعمتوں کا حق ادا کر سکے اس لئے کہ اس کی نعمتیں ان گنت، لامحدود ہیں جب وہی علم میں نہیں تو ان کی حمد کرنا، ان کا شکر ادا کرسکنا، اور ان کا حق ادا کرسکنا انسان کے تصور وہم وگمان سے بھی بالاتر ہے۔ اور وجہ یہ ہے کہ بندہ اپنی ذات اور صفات اور اپنے جمیع احوال میں رب تعالیٰ کا محتاج ہے۔ "واللہ تعالیٰ غنی عن شکر الشاکرین وحمد الحامدین" اور اللہ تعالیٰ شکر کرنے والوں کے شکر اور حمد کرنے والوں کی حمد سے بے پرواہ ہے۔ لہذا عاجز محتاج یہ کیسے تصور کرسکتا ہے کہ وہ بے پرواہ ذات کی کماحقہ حمد کرسکتا ہے یا اس کا حق ادا کرسکتا ہے۔ (از کبیر)

رب تعالیٰ کا بندے پر احسانِ عظیم:

یہی وجہ ہے کہ بندہ کما حقہ حمد کرنے سے عاجز ہے۔ تو رب تعالیٰ نے بندے کو یہ نہیں کہا "احمدوا اللہ" تم اللہ تعالیٰ کی حمد کرو۔ کیونکہ اگر یہ کہا جاتا تو بندے کو وسعت سے زائد تکلیف دی جاتی جب "الحمد للہ" کہا تو اس سے یہ واضح ہوگیا کہ حمد اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور اس کی ملکیت ہے برابر ہے بندہ اس کو ادا کرنے پر قدرت رکھے یا نہ رکھے۔

☆ حضرت داؤد علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا کہ اے باری تعالیٰ میں تیرا شکر کیسے

ادا کروں۔ جب کہ جو شکر بھی ادا کرتا ہوں وہ تیری توفیق سے، تیری عطاء سے کرتا ہوں۔ تیرے اس انعام کا شکر ادا کروں تو پھر وہ تیرے انعام سے اس طرح میں شکر ادا کرنے سے عاجز ہوں۔

"فقال یا داؤد لما علمت عجزک عن شکری فقد شکرتنی بحسب قدرتک وطاقتک"

رب تعالیٰ نے فرمایا اے داؤد تمہارا یہ جان لینا کہ تم میرا شکر کرنے سے عاجز ہو بس یہی میرا شکر ہے کہ تم نے اپنی طاقت وقدرت کے مطابق میرا شکر ادا کر دیا۔

☆ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"اذا انعم الله علی عبده نعمة فیقول العبد الحمد لله فیقول الله تعالیٰ انظروا الی عبدی اعطیته ما لاقدر له فاعطانی مالاقیمة لهٗ"

"جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو نعمت عطا فرماتا ہے تو بندہ "الحمد للہ" کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے کو دیکھو میں نے اسے وہ چیز دی جس کی کوئی قدر نہیں اس نے مجھے وہ چیز دی جس کی قیمت ادا نہیں ہو سکتی"۔

یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ جب بھوکا ہوتا ہے رب تعالیٰ اسے طعام عطا فرماتا ہے اور جب پیاسا ہوتا ہے اسے سیراب کرتا ہے اور جب ننگا ہوتا ہے اسے کپڑا عنایت فرماتا ہے۔ اس نعمت کے اظہار شکر پر جب بندہ "الحمدللہ" کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ جتنے حمد کرنے والے حمد کر چکے ہیں ان تمام حمدوں کا مستحق اللہ تعالیٰ ہے۔ اور جتنے حمد کرنے والے حمد کریں گے اگرچہ ابھی انہوں نے حمد نہیں کی لیکن ان سے حمد متوقع ہے وہ تمام حمدیں بھی اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔

"الحمد للہ" میں ملائکہ عرش اور کرسی اور آسمانوں میں رہنے والے تمام فرشتوں کی حمد بھی آ گئی اور آدم علیہ السلام سے لے کر آخر الزمان نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تک تمام انبیاء کرام کی حمد کو بھی شامل ہے۔ اور تمام اولیاء کرام اور تمام علماء کرام کی حمد بھی اس میں مذکور ہے۔ اور تمام مخلوق کی حمد کو بھی شامل ہے اور ان محامد کو بھی شامل جو اس قول کے وقت ہوں گی:

"دعواهم فیها سبحانک اللهم وتحیتهم فیها سلام وآخر دعواهم ان الحمد لله رب العلمین"

ان کی دعا اس میں یہ ہو گی کہ اے اللہ تجھے پاکی ہے اور ان کے ملتے وقت خوشی کا پہلا بول سلام ہے اور ان کی دعا کا خاتمہ یہ ہے کہ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو سب جہانوں کا مالک ہے اسی طرح "الحمدللہ" ان محامد کو بھی شامل جن کی کوئی حد نہیں اور نہ ہی ان کی کوئی انتہا ہے۔

گویا کہ حدیث پاک کا یہ مطلب ہوا کہ رب تعالیٰ کہتا ہے " انظروا الی عبدی قد اعطیته نعمة واحدة لا قدر لها فاعطانی من الشکر ما لاحد له ولا نهایة له " میرے بندے کو دیکھو میں نے اسے ایک نعمت دی جس کی کوئی قدر نہیں لیکن میرے بندے نے میرے حضور شکر وحمد کا وہ تحفہ پیش کیا۔ جس کی کوئی حد نہیں اور نہ ہی اس کی کوئی انتہا ہے۔ (از کبیر)

یہ بھی خیال رہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ احسان عظیم ہے کہ بندے کی حمد کو رفعت و بلندی بعطا فرمائی۔ ورنہ رب تعالیٰ کی نعمتیں بھی ان گنت اور غیر محدود ہیں۔

اعتراض: "سبحان اللہ وبحمدہ "میں تسبیح کا ذکر پہلے ہے قرآن پاک کی ابتداء "الحمد" سے کیوں کی گئی۔

جواب :"الحمد للہ " کے ضمن میں تسبیح کا ذکر بھی موجود ہے کیونکہ تسبیح کا مطلب ہے کہ وہ اپنی ذات وصفات میں نقائص اور آفات سے پاک ہے یہ معنی بھی حمد میں موجود ہے اور اس سے زائد معنی بھی پایا گیا ہے کہ وہ اپنی مخلوق پر احسان فرمانے والا انعام عطا کرنے والا اور رحم کرنیوالا ہے۔ اس لئے حمد کا ذکر کرنا تسبیح کے ذکر سے بہتر ہے۔

نظام دنیا کی ابتدا وانتہاء حمد سے:

" اول کلمة ذکرها ابونا آدم هو قوله الحمد للہ وآخر کلمة یذکرها اهل الجنة هو قولنا الحمد للہ "

سب سے پہلے ہمارے باپ آدم علیہ السلام نے کہا "الحمد للہ " اور آخر میں جنت والے بھی کلمہ ذکر کریں گے۔ وہ انشاء اللہ ہمارا قول الحمد للہ ہوگا۔

یعنی جب آدم علیہ السلام کی روح ناف تک پہنچی تو آپ کو چھینک آئی آپ نے کہا ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ اور جنت والوں کی حمد کو رب تعالیٰ نے ان الفاظ مبارکہ سے ذکر فرمایا ﴿ وَاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ان کی دعا کا خاتمہ یہ ہے کہ سب تعریفیں اللہ رب العلمین کیے لئے ہیں:

" ففاتحة العالم مبنية على الحمد و خاتمته مبنية على الحمد "

''جہان کی ابتدا کی دار و مدار بھی حمد اور انتہا بھی حمد پر ہے''۔

اس لئے اے انسان تو بھی کوشش کر کہ تیرے اعمال کی ابتدا حمد سے ہو اور انتہا بھی حمد پر ہو۔اس لئے کہ انسان عالم صغیر (چھوٹا جہان) ہے۔چاہیے یہ کہ اس کے احوال عالم کبیر (بڑا جہان) کے احوال کے موافق ہوں۔

حمد کے ارکان: حمد کے پانچ رکن ہیں حامد، محمود، محمود علیہ، محمود بہ، صیغہ حمد۔جس طرح کوئی شخص کہے "استاذی شفیق لانه يحسن الى " میرا استاذ شفیق ہے کیونکہ وہ مجھ پر احسان کرتا ہے۔کلام پیش کرنے والا حامد، استاذ محمود، شفقت محمود بہ احسان محمود علیہ۔اور اس کا ''استاذی شفیق'' کہنا صیغہ حمد ہے۔

حمد کے مواقع: بعض اوقات حمد سنت ہے۔جیسا کہ چھینک کے بعد "الحمد لله " کہنا لیکن تین مرتبہ تک اس کے بعد زکام کی صورت میں بار بار "الحمد لله " کہنا مسنون نہیں۔اگر چہ استحباب سے خالی بھی نہیں۔

اسی طرح نکاح کے خطبہ میں اور دعا کی ابتدا میں اور ہر اچھے کام کی ابتدا میں اور کھانے پینے کے بعد وغیر ذلک **الحمد لله** کہنا مستحب ہے۔

ناپاک، گندگی کے مقامات میں الحمد للہ پڑھنا مکروہ ہے۔گناہ پر خوش ہو کر اور حرام مال کھانے کے بعد **الحمدلله** پڑھنا حرام ہے۔

نصيحة عظميه: "الحمد لله " پڑھنا اگر چہ باعث ثواب ہے اور یہ کلمہ شرافت وجلالت کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے لیکن اچھے محل میں ادا کرے تو مقصد حاصل ہوگا۔ورنہ مقصد حاصل نہیں ہوگا۔

حضرت سری سقطی رحمہ اللہ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ میں تیس سال سے استغفار کر رہا ہوں کیونکہ میں نے ایک مرتبہ "الحمدلله " پڑھنے کی غلطی کی تھی۔کسی نے آپ سے تعجب کے طور پر پوچھا یہ کیسے؟ آپ نے فرمایا بغداد کے بازار میں میری دکان تھی اس بازار میں آگ لگ گئی، اس میں زیادہ دکانیں اور گھر جل گئے لیکن میری دکان جلنے سے محفوظ رہی۔جب مجھے بتایا گیا کہ تمہاری دکان نہیں

جلی۔تو میں نے پڑھا "الحمد للہ" لیکن مجھے اس کے بعد جلدی ہی خیال آ گیا کہ مجھے اپنی دکان کے نہ جلنے کی خوشی ہوئی حالانکہ دین اور مروت کا تقاضا یہ تھا کہ مجھے دوسرے لوگوں کی دکانیں اور گھروں کے جلنے پر غمناک ہونا چاہئے تھا ان کی طرح پریشان ہونا چاہئے تھا۔بس میں یہی اپنی غلطی سمجھ کر تیس سال ہو گئے ہیں۔اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کر رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے اس جرم کو معاف فرمادے۔ (از کبیر)

سبحان اللہ بزرگان دین کا کیسا عظیم تقوی ہے کہ جسے ہم کوئی جرم نہیں سمجھتے وہ بظاہر معمولی بات کو اپنے لئے عظیم جرم سمجھ کر استغفار کرتے رہتے ہیں۔اللہ تعالیٰ بزرگانِ دین کے نقش قدم پر چلائے نیک اعمال کی توفیق عطا فرمائے۔کسی کی پریشانی پر خوش ہونا احمقوں کا کام ہے۔

الحمد للہ پڑھنے کے فضائل:

" روی ابن حاتم عن ابن عباس انه قال الحمد لله كلمة الشكر واذا قال العبد الحمد لله قال الله شكرني عبدي "

" ابن حاتم نے حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنھم) سے روایت کی کہ بیشک انہوں نے کہا الحمد للہ کلمہ شکر ہے۔ جس شخص نے الحمد للہ کہا تو اللہ تعالیٰ کہتا ہے میرے بندے نے میرا شکرادا کیا "۔

یعنی الحمد للہ پڑھنے والا رب تعالیٰ کے ہاں کتنا مقبول ہے کہ رب قدوس اس کا تذکرہ فرشتوں کے سامنے کر رہا ہے۔

☆ " روی ابن جریر عن الحکم بن عمیر وکانت له صحبة قال قال النبی ﷺ اذا قلت الحمد لله رب العلمین فقد شکرت الله فزادک "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب تم نے کہا کہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ"

تو تم نے اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا وہ نعمت اور زیادہ کرے گا۔یعنی اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ پورا فرمائے گا " لئن شکرتم لازیدنکم " اگر تم نے میرا شکرادا کیا تو میں تم پر نعمتیں اور زیادہ کروں گا۔

☆ " اخرج عبد الرزاق فی المصنف والدیلمی فی مسندالفردوس والبیھقی فی الادب والحکیم الترمذی فی نوادار الاصول والخطابی فی الغریب ." عن عبد الله بن عمر

وبن العاص عن رسول الله صلی الله علیه وسلم انه قال الحمد رأس الشکر ما شکر الله عبد لایحمده "

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا الحمد اصل شکر ہے جس نے اللہ کا شکر نہ کیا وہ اللہ کی حمد بھی نہیں کرتا۔

تنبیہ : پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ حمد اور شکر میں فرق بھی بیان کیا جاتا ہے لیکن مجازاً بھی ایک دوسرے پر بھی بولے جاتے ہیں۔

☆ "واخرج الترمذی وحسنه والنسائی وابن ماجه وابن حبان والبیهقی عن جابر قال قال رسول الله ﷺ افضل الذکر لا اله الا الله وافضل الدعاء الحمد لله "

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: افضل ذکر " لا اله الا الله " ہے اور افضل دعا "الحمد لله " ہے یعنی دعا کا مستحب طریقہ یہ ہے کہ دعا کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرے اور نبی کریم ﷺ پر درود پاک بھیجے۔اور دعا کے آخر میں پھر درود پاک پڑھے۔جس دعا کے اول وآخر درود شریف نہ پڑھا جائے وہ دعا معلق رہتی ہے۔

☆ " واخرج البیهقی فی شعب الایمان عن جابر قال قال رسول الله ﷺ ما من عبد ینعم علیه بنعمة الا کان الحمد افضل منها "

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی بندہ نہیں کہ اسے نعمت عطا کی جائے مگر حمد اس سے افضل ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے عظیم نعمت یہ ہے کہ کسی کو ربّ تعالیٰ حمد کرنے کی توفیق عطا فرما دے۔

☆ " واخرج مسلم والنسائی واحمد عن ابی مالک الاشعری قال قال رسول الله ﷺ الطهور شطر الایمان والحمد لله تملأ المیزان "

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پاکیزگی نصف ایمان ہے اور الحمد للہ (قیامت کے دن) میزان کو بھر دے گی۔یعنی حمد سے نیکیوں میں برکت ہوگی میزان کے وقت آسانی ہوگی حمد کی برکت سے نیکیوں والا پلڑا بھاری ہوگا۔

☆ " واخرج البیهقی عن انس قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم فی ما من احب الی الله من الحمد"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کو حمد سے زیادہ کوئی چیز پسند نہیں۔یقینی بات ہے اللہ تعالیٰ کی

محبوب چیز ہی اعلیٰ ہے اور بندے کو بھی چاہئے کہ وہ بھی اسی چیز کو محبوب سمجھے جو رب تعالیٰ کی محبوب ہے۔

☆ "واخرج مسلم عن انس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الله ليرضى عن العبد ان ياكل الاكلة فيحمده عليها او يشرب الشربة فيحمده عليها"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ بندے سے پسند فرماتا ہے کہ وہ کھانا کھائے تو اس کے بعد الحمد للہ پڑھے اور کوئی پینے کی چیز پئے تو اس پر حمد کرے۔غرضیکہ ہر اچھے کام میں حمد باعث برکت ہے اور حمد نہ کرنا ہے بے برکتی کی علامت ہے۔"واخرج البيهقى عن ابى هريرة قال قال رسول الله ﷺ كل امر ذى بال لا يبدأ فيه بحمد الله فهو اقطع" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر اچھے کام کی ابتداء اللہ تعالیٰ کی حمد سے نہ کی جائے تو وہ بے برکت ہوتا ہے۔ (ماخوذ از تفسیر ابن کثیر)

رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ : " الرب فى الاصل مصدر بمعنى التربية وهى تبليغ الشئى الى كماله شيأ فشيأ "رب اصل وضع میں مصدر ہے جس کا معنی تربیۃ۔یعنی ایک چیز کو آہستہ آہستہ کمال تک پہنچانا

کمال تک پہنچانے کا مطلب یہ ہے کہ چیز جس کے ذریعے اپنی صفات میں کامل ہوجائے۔اسی طرح قوت سے فعل کی طرف نکلنا۔لیکن خیال رہے علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے "بحسب استعداده الازلى" کی قید کا اضافہ کیا ہے۔یعنی رب اسے کہاجاتا ہے۔جو چیز کو اس کی ازلی استعداد کے مطابق تدریجاً۔یعنی آہستہ آہستہ کمال تک پہنچائے۔یہی معنی کامل نظر آتا ہے۔

کیونکہ انسان مختلف صفات وکمال صرف ازلی استعداد کی کمی اور زیادتی کی وجہ سے ہی رکھتے ہیں"رب" کے اور معانی یہ ہیں۔﴿خالق،سید،مالک،منعم،مصلح،معبود،صاحب﴾ لفظ"رب" اللہ تعالیٰ پر اضافت کے بغیر بھی استعمال ہوتا اور اضافت کے ساتھ بھی۔لیکن اللہ تعالیٰ کے غیر پر صرف اضافت سے استعمال ہوتا ہے جس طرح کہاجائے"رب الدار" "رب الدين وغیرہ۔جب معنی مالک کیاجائے تو تقریباً یہ تمام معانی کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے:

"جو مالک سارے جہان والوں کا" صرف پالنے والا معنی کرنا اتنا کامل نہیں۔

(بيضاوى، حاشية الشهاب، روح المعانى، مفردات راغب)

" العلمین " جمع ہے عالم کی جس کا معنی ہوتا ہے جس کے ذریعے کسی چیز کا علم حاصل ہو۔اس وزن پر آنے والا ہر لفظ اسی طرح کا معنی دے گا۔فاعل جس کے ذریعے فعل پایا جائے۔خاتم۔جس کے ذریعے کسی کو ختم کیا جائے۔اللہ تعالیٰ کے ماسوا تمام کائنات عالم ہے کہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا علم حاصل ہوتا ہے۔ (از بیضاوی)

العالمین کو جمع لانے کی وجہ:

جب تمام کائنات عالم میں داخل ہے تو جمع لانے کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف انواع،اور اقسام کے لحاظ سے جمع ذکر کیا گیا ہے۔جس طرح عالم علویات، عالم سفلیات، عالمِ مجردات، عالم مادیات، عالم روحانیات، عالم جسمانیات وغیرہ۔" والعوالم کثیرة لا تحصیھا الارقام " اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں اتنے عالم ہیں کہ ان کو کوئی لکھنا چاہے تو لکھ نہیں سکتا:

" وروی فی بعض الاخبار ان اللہ تعالیٰ خلق مائة الف قندیل وعلقها بالعرش والسموات والارض وما فیھنّ حتی الجنة والنار فی قندیل واحد ولا یعلم ما فی باقی القنادیل الا اللہ تعالیٰ "

" بعض اخبار میں روایت آتی ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ قندیل پیدا فرمائے اور ان کو عرش سے معلق فرمایا تمام آسمان اور تمام زمینیں اور ان زمین وآسمان میں رہنے والی مخلوق یہاں تک جنت ودوزخ تمام کے علوم ایک قندیل میں ہیں باقی قادیل میں کتنے جہانوں کو بند کیا گیا اور ان میں کتنے علوم ہیں یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے"۔ (روح المعانی)

راقم کو اچھی طرح یاد ہے کہ استاذ المحققین والمدققین استاذی المکرم حضرت علامہ مولانا ابوالحسنات محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی نے بیضاوی شریف پڑھاتے ہوئے حاشیہ عبدالحکیم رحمہ اللہ سے یہی عبارت بیان فرمائی تھی۔جو روح المعانی کے حوالہ سے ابھی بیان کی اس وقت میرے پاس زیر مطالعہ حاشیہ عبدالحکیم نہیں۔

"وقال کعب الاحبار لایحصی عدد العلمین " کعب اخبار نے فرمایا کہ کل کتنے عالم ہیں؟ ان کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا"وما یعلم جنود ربک الا ھو "رب کے

لشکروں کو سوائے اس کے اور کوئی نہیں جانتا جہان میں کوئی ایسی چیز نہیں جو اللہ تعالیٰ کے احاطہ قدرت میں نہ ہو اور اس کے زیر تربیت نہ ہو وہی ہر چیز کا مربی ہے " لو فرض انقطاع آثار التربية عنه اٰناً واحدا لما استقرله القرار ولا اطمأ نت به الدار " اگر اللہ تعالیٰ کی تربیت جہان میں سے ایک لمحہ کے لئے بھی ہٹ جائے تو جہان کا قرار ختم ہو جائے اور اطمینان ختم ہو جائے جہان میں تباہی و بربادی آ جائے۔

اے غافل انسان رب کی ربوبیت کو سمجھ:

جب یہ واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا رب ہے۔اس کے احسان اور اس کی ربوبیت میں اس کو کوئی شریک نہیں اس کے احسانات ان گنت ہیں۔ہم اس کے بحر جود میں تیرنے سے قاصر ہیں۔اس کے شکر کو ادا کرنے سے عاجز ہیں۔کیا خوب کہا کسی عارف باللہ نے:

" انه تعالىٰ يملك عبادا غيرک وانت ليس لکَ ... سواه ثم انک تتساهل فی خدمته والقيام فی وظائف طاعته " (از روح المعانی)

" بیشک اللہ تعالیٰ تیرے بغیر اور بندوں کا بھی مالک ہے لیکن اس کے بغیر تیرا اور کوئی رب نہیں۔پھر تو اس کی خدمت سے سستی کر رہا ہے۔اس کی طاعت کو ادا نہیں کر رہا"۔

عالمین کو جمع مذکر سالم لانے کی وجہ:

واؤ ،نون اور یا،نون سے جمع ذوی العقول کی ہوتی ہے اور عالمین میں تو تمام کائنات داخل ہے جس میں غیر ذوی العقول بھی ہیں تو جمع مذکر سالم لانے کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ عقلاء کو ان کی شرافت وقدر ومنزلت کا لحاظ کرتے ہوئے غالب سمجھ کر اسطرح جمع لائی گئی اور یہی وجہ ہے کہ مذکر کو مؤنث پر بھی غالب کیا گیا ہے۔بعض حضرات نے کہا اصل میں عالم (بفتح) کا اطلاق ہی ذوی العقول پر ہے باقی ان کے تابع ہو کر اس میں داخل ہیں۔

ایک اور عجیب حکمت:

جمع مذکر سالم میں دو احتمال ہیں جمع قلت کا جو دس افراد تک بولی جاتی ہے اور جمع کثرت کا جو

دس سے اوپر تک بھی چلی جاتی ہے۔کیونکہ جمع سالم الف لام کے بغیر جمع قلت ہے اور الف لام کے ساتھ جمع کثرت ہے۔اس میں اس بات کی طرف انسان کو متنبہ(خبردار) کیا گیا ہے "ان العوالم وان کثرت قلیلة بل اقل من القلیل فی جنب عظمة الله تعالیٰ وکبریائه " بیشک جہاں اگرچہ بہت زیادہ ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی کے مقابلہ میں بہت ہی قلیل ہیں۔

سبحان اللہ قرآن پاک کی فصاحت وبلاغت کو انسان کیا بیان کرے ایک ایک لفظ کتنے کتنے مسائل کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔

علم والوں کو پتہ ہے کہ صرف عالم کی جمع عالمین آنے سے ہی یہ ثابت ہو رہا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور یہ واضح ہو رہا ہے کہ مرد کو عورت پر افضلیت برتری حاصل ہے اور یہ پتہ چل گیا کہ جہان بہت زیادہ ہیں۔اور یہ سمجھ آیا کہ ساری کائنات رب کے مقابل قلیل ہے رب عظمت کا مالک ہے۔

کل جہان کتنے ہیں؟

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابو العالیہ سے رب العلمین کی تفسیر میں روایت ذکر کی ہے:

" الانس عالم والجن عالم وما سوی ذلک ثمانیة عشر الف عالَم من الملئکة وللارض اربع زوایا فی کل زاویة ثلاثة آلاف عالم وخمسمائة عالم خلقهم لعبادته " (الدر المنثور)

''انسان کا ایک جہان ہے جنوں کا ایک جہان ہے اس کے ماسوا فرشتوں کے اٹھارہ ہزار جہان ہیں اور زمین کے چار کونے ہیں ہر کونے میں تین ہزار جہان ہیں اور پانچ سو جہان اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے لئے پیدا فرمائے ہیں''۔

☆ ابو الشیخ اور ابو نعیم نے حلیہ میں وھب سے روایت بیان کی "ان الله عزوجل ثمانیة عشر الف عالم الدنیا منها عالم واحد"(الدر المنثور) بیشک اللہ تعالیٰ نے اٹھارہ ہزار جہان بنائے دنیا کا جہان ان میں سے ایک ہے۔

حقیقت یہ ہے: "وقال کعب الاحبار لایعلم عدد العوالم الا الله عزوجل"
(بغوی،ابن کثیر)

کعب احبار فرماتے ہیں کہ کل کتنے جہان ہیں؟ ان کی تعداد سوائے رب تعالیٰ کے اور کوئی نہیں جانتا۔

مختصر الفاظ میں تفسیر: **رب العلمین**:"

" رب کل ذی روح رب علی وجه الارض ومن اهل السماء ویقال سید الجن والانس ویقال خالق الخلق ورازقهم ومحولهم من حال الی حال "

(تفسیر ابن عباس)

" تمام جہانوں کا رب ہے یعنی روئے زمین پر چلنے والے تمام ذی روح، آسمانوں والی تمام مخلوق کا رب ہے جنوں اور انسانوں کا مالک ہے، تمام مخلوق کا خالق ہے، تمام مخلوق کا رازق ہے، تمام مخلوق کو ایک حال سے دوسرے حال کی طرف پھیرنے والا ہے "۔

رب تعالیٰ کی تربیت کی عظمت:

(۱) کبھی ایک انسان دوسرے کی تربیت کرتا ہے لیکن وہ اس میں ثواب کی یا تعریف کی امید رکھتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی تربیت میں اس کی اپنی کوئی غرض نہیں ہوتی۔ "انه تعالیٰ یربی عبیده لا لغرض نفسه بل لغرضهم" بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی تربیت کرتا ہے ان کی غرض کے لئے، نہ کہ اپنی غرض کے لئے۔

(۲) بندہ جب مال کے ذریعے کسی کی تربیت کرتا ہے۔ جتنی مقدار میں وہ کسی کو مال دیتا ہے اتنی مقدار میں اس کا مال کم ہوجاتا ہے۔ " وهو تعالیٰ عن النقصان والضرر " لیکن اللہ تعالیٰ نقصان اور ضرر سے بلند وبالا ہے۔ اس کے مال اور خزانوں میں کمی واقع نہیں ہوسکتی۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے "وان من شئیءالا عند نا خزائنه وما ننزله الا بقدر معلوم" کوئی ایسی چیز نہیں مگر اس کے خزانے ہمارے پاس ہیں اور ہم اسے نہیں نازل کرتے مگر معلوم اندازے سے

(۳) بندے سے جب کوئی بار بار سوال کرے تو وہ اس پر غصہ کرتا اسے کچھ نہیں دیتا خالی لوٹا دیتا

ہے لیکن اللہ تعالیٰ سے جتنا زیادہ اور بار بار سوال کیا جائے وہ خوش ہوتا ہے اور اس پر اپنی عطا کی بارش کرتا ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا" ان اللہ تعالیٰ یحب الملحین فی الدعاء " بے شک اللہ تعالیٰ بار بار سوال کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔

(۴) بندے سے جب تک کوئی احسان کرنے کا سوال نہ کرے وہ عطا نہیں کرتا۔لیکن اللہ تعالیٰ بغیر مانگنے کے دیتا ہے۔مانگنے پر اور ہی زیادہ عطا کرتا ہے اے انسان کیا تو دیکھتا نہیں کہ وہ ذات جس نے تیری پرورش اس وقت کی جب تو ماں کے پیٹ میں تھا۔اور جب تو بے سمجھ تھا اس وقت بھی اس نے تیری پرورش کی ،تیرا کیا خیال ہے کہ وہ تجھے اب محروم کردے گا جب تجھے اس نے ہدایت دی۔عقل وسمجھ دی اور تو اس سے سوال بھی کررہا ہے؟ یقینی بات ہے کہ وہ تجھے اس حال میں محروم نہیں کرے گا۔

(۵) بندے کا احسان اس کے محتاج وفقیر ہونے پر ختم ہوجاتا ہے۔اس کے غیب ہونے پر ختم ہوجاتا ہے اور اس کی موت پر ختم ہوجاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا احسان دائمی ہے ختم ہونے والا نہیں اس لئے کہ وہ فقر واحتیاج سے پاک ہے اور اس کے غیب ہونے کا تصور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کہیں دور چلا جائے اس پر موت کا وقوع نہیں۔

(۶) بندوں کا احسان محدود ہوتا ہے۔وہ متعلقین پر احسان کرتے ہیں ایک قوم پر احسان کیا دوسری پر نہ کیا لیکن اللہ تعالیٰ کا احسان وسیع ہے ساری مخلوق پر وہ احسان فرماتا ہے ساری مخلوق کی وہ تربیت کرتا ہے رب تعالیٰ کا ارشاد ہے﴿ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْئٍ ﴾ میری رحمت ہر چیز کو وسیع ہے۔

واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت میں وہ عظمت پائی جاتی ہے جو مخلوق کی تربیت میں نہیں۔وہ تمام مخلوق کا محسن ہے وہ تمام مخلوق کا رب ہے اسی لئے رب تعالیٰ نے اپنی شان میں کہا﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾

فائدہ عظیمہ: جب کوئی کسی کی مدح کرتا ہے تو اس میں چار وجہ سے کوئی ایک وجہ پائی جاتی ہے:

(۱) کبھی کسی کے کمالات ذاتیہ اور صفات ذاتیہ کو دیکھ کر مدح کی جاتی ہے اگرچہ اس کے

احسانات اس شخص پر نہ ہوں۔

(۲) کبھی اس لئے کسی کی تعریف کی جاتی ہے کہ اس کے احسانات پائے جاتے ہیں۔

(۳) کبھی تعریف کرنے والا تمنا کرتا ہے کہ اس پر وہ احسان کر دے یعنی مستقبل میں احسانات کا امیدوار ہوتا ہے۔

(۴) کبھی کسی کے رعب، دبدبہ اور اس کے قہر و غضب سے بچنے کے لئے اس کی تعریف کی جاتی ہے۔

جب تعظیم اور مدح کے یہ اسباب ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے تو گویا کہ رب تعالیٰ یوں فرما رہا ہے۔

"ان کنتم ممن یعظمونْ الکمال الذاتی فاحمدونی فانی اله العلمین " اگر تم وہ لوگ ہو جو کسی کے کمالات ذاتیہ کو دیکھ کر اس کی عظمت بیان کرتے ہو تو میری ہی حمد بیان کرو۔ بیشک میں " اله العلمین " ہوں "الحمدللہ" سے یہی مراد ہے۔

"وان کنتم ممن یعظمون الاحسان فانا رب العلمین " اگر تم ان لوگوں سے ہو جو کسی کے احسانات کو دیکھ کر اس کی عظمت بیان کرتے ہیں تو میری حمد کرو کیونکہ میں "رب العلمین" ہوں۔

" وان کنتم تعظمون للطمع فی المستقبل فانا الرحمن الرحیم "

"اگر تم مستقبل میں احسانات کے طمع پر عظمت بیان کرتے ہو تو میری حمد کرو میں رحمٰن ورحیم ہوں"۔

" وان کنتم تعظمون للخوف فانا مالک یوم الدین "

"اگر تم خوف کی وجہ سے عظمت بیان کرتے ہو تو میری حمد کرو کیونکہ میں مالک یوم الدین ہوں"۔

☆☆☆☆☆☆

﴿ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴾

''بہت مہربان ، رحمت والا''

''نہایت مہربان، رحم کرنے والا''

بسم اللہ شریف کی بحث میں کافی حد تک الرحمٰن الرحیم کے متعلق بیان کیا جا چکا ہے۔ مختصر ذکر یہاں بھی کیا جا رہا ہے پہلے جو ذکر کیا اس کا خلاصہ اتنا ذہن میں رہے کہ الرحمٰن میں عام رحمت ہے وسیع تر رحمت ہے بنسبت رحیم کے اور ''الرحمن'' اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے لیکن ''الرحیم'' کا اطلاق انبیاء کرام اور دوسرے رحم کرنے والوں پر بھی صحیح ہے۔

☆ ''قال ابن مبارک الرحمن اذا سئل اعطی و الرحیم اذا لم یسئل یغضب''

ابن مبارک کہتے ہیں رب تعالیٰ رحمٰن اس لئے ہے کہ جب اس سے سوال کیا جائے وہ عطا کرتا ہے۔ اور رحیم اس لئے ہے کہ اگر اس سے سوال نہ کیا جائے تو وہ ناراض ہوتا ہے۔

☆ ابن مبارک کا یہ قول اس حدیث کے مطابق ہے جو ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی آپ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

'' من لم یسئل اللہ یغضب '' جو شخص اللہ تعالیٰ سے سوال نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوتا ہے۔ (مشکوۃ کتاب الدعوات، ابن کثیر)

اسی حدیث کی شرح میں علامہ علی قاری رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں ۔

'' لان ترک السوال تکبر و استغناء وھذا لایجوز للعبد والمراد بالغضب ارادۃ ایصال العقوبۃ '' (مرقاۃ)

اس لئے کہ رب تعالیٰ سے سوال نہ کرنا تکبر ہے اور رب تعالیٰ سے اپنے آپ کو بے پرواہ کرنا ہے یہ بندے کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے آپ کو مولائے کائنات سے بے پرواہ سمجھے، رب تعالیٰ کے ناراض ہونے کا یہ مطلب ہے کہ دعا نہ کرنے والے نہ مانگنے والے کو وہ عذاب دے گا۔

☆ ابن مبارک کا قول اس حدیث کے مطابق بھی ہے جو ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ

رضی اللہ عنہ سے روایت کی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"لیس شئی اکرم علی اللہ من الدعاء"

"اللہ تعالیٰ کو دعا سے زیادہ کوئی چیز پسند نہیں"۔

اس حدیث کی شرح میں علامہ قاری رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں:

"من الدعاء ای من حسن السوال بلسان القال او ببیان الحال لان فیه اظهار العجز والافتقار والتذلل والانکسار والاعتراف بقوة الله وقدرته وغناه واغنیانه وکبریانه" (مرقاۃ کتاب الدعوات)

"دعا اللہ کے ہاں مکرم کیوں ہے؟ اس لئے کہ دعا میں اچھی طرح سوال ہوتا ہے زبان سے یا دل سے اور دعا کرنے والا انسان اپنی احتیاجی اور انکساری اور عجز وکمتری کا اظہار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی قوت وقدرت، غنی ہونے، غنی کرنے اور اس کی کبریائی کا اعتراف کرتا ہے"۔

☆ ابن مبارک کا قول اس حدیث کے بھی مطابق ہے جو ترمذی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "سلوا الله من فضله فان الله یحب ان یسئل وافضل العبادة انتظار الفرج" (مشکوۃ کتاب الدعوات) اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کا ذکر کرو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے کہ اس سے سوال کیا جائے۔ افضل عبادت کشادگی کا انتظار ہے۔

"(فان الله) ای لا تصافه بانه کریم منعم وهاب معط غنی مغن باسط" (مرقاۃ)

اللہ تعالیٰ کو کیوں پسند ہے کہ اس سے سوال کیا جائے؟ اس لئے کہ وہ کریم ہے انعام عطاء کرنے والا ہے غنی ہے غنی کرنے والا ہے کشادہ رزق کا مالک ہے:

"سبحان الله، الرحمن الرحیم"

کی یہ تفسیر اگر سمجھ آجائے تو سارے مسئلے حل ہو جائیں اور سارے جھگڑے ختم ہو جائیں۔ یعنی جنازہ کے بعد دعا فرض نماز کے بعد دعا تمام نماز کے فارغ ہونے کے بعد اجتماعی دعا، جمعرات کو ختم قرآن دعا، سوئم پر دعاء، چہلم پر دعاء سب جائز ہیں۔ اس لئے کہ رب تعالیٰ سے بار بار دعا کریں تو وہ خوش ہوتا ہے۔ اس سے نہ مانگیں تو وہ ناراض ہو جاتا ہے۔ اب خود فیصلہ کریں کہ رب تعالیٰ کو راضی

رکھتا ہے یا ناراض۔خاص کر کے جب انسان کو یہ معلوم ہو جائے یقین حاصل ہو" کہ اللہ تعالیٰ کریم ہے، اللہ تعالیٰ انعام عطا کرنے والا ہے، اللہ تعالیٰ غنی ہے، اللہ تعالیٰ غنی کرنے والا ہے، کشادہ رزق کا مالک ہے"۔تو اسے اللہ تعالیٰ سے مانگنے میں کوئی شرم نہیں آئے گی۔بلکہ وہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ سے زیادہ مانگے گا کیونکہ وہ ایسی صفات کا مالک ہے کہ ان صفات میں کوئی اس کا شریک نہیں۔جب دینے والے کی رحمت میں کوئی کمی نہیں تو لینے والے کو اپنی حماقت سے اپنے دامن کو تنگ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

رب تعالیٰ کے اندازِ رحمت کو وہ خود ہی جانتا ہے:

خالق کائنات، مالک دنیا و آخرت، رب قدوس علیم وحکیم ہے اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں انسان انجام سے بے خبر ہونے کی وجہ سے اس کی حکمت کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے رب تعالیٰ کیسے رحمت فرماتا ہے؟ ذرا اس کی جھلک دیکھئے۔

☆ حضرت ابراھیم ادھم رحمہ اللہ ایک بار کسی دعوت پر مدعو ہوئے، دستر خوان بچھایا گیا کھانا اس پر سجایا گیا مہمان آ کر بیٹھے ہی تھے کہ ایک کوا آیا اور ایک روٹی اٹھا کر چلتا بنا۔حضرت ابراہیم ادھم ایک بزرگ ، ولی اللہ تھے انہوں نے کوے کے روٹی اٹھا کر لے جانے کی حکمت کو سمجھنے کی کوشش کی۔آپ اس کے پیچھے پیچھے چلے کہ دیکھیں یہ کہاں جاتا ہے اور روٹی سے کیا کام لیتا ہے۔آپ نے دیکھا اس کوے نے روٹی کو ایک وادی میں پھینک دیا دیکھا کہ وہاں ایک شخص کو باندھ کر قید کیا ہوا ہے۔روٹی اس کے منہ کے پاس گری جس نے روٹی کو کھانا شروع کیا۔تو ابراہیم ادھم رحمہ اللہ نے سمجھا کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوسکتا اس کی رحمت کے انداز وہی جانے بندہ جانے تو کیا جانے؟

☆ حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں ایک دن گھر میں بیٹھا ہوا تھا میرے دل میں اضطراب پیدا ہوا، میں دل بہلانے کے لئے دریائے نیل کی طرف چلا گیا۔میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا بچھو بھاگتا ہوا جا رہا ہے، دریا کے کنارے ایک مینڈک کی پیٹھ پر سوار ہو گیا، وہ مینڈک دریا میں چلا گیا یہ کہتے ہیں کہ میں بھی ایک کشتی پر سوار ہو گیا۔وہ مینڈک دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچا تو بچھو اس

کی پیٹھ سے اتر کر پھر تیز چلنے لگا میں بھی پیچھے پیچھے چل کر ماجرا دیکھ رہا تھا۔ دیکھا کہ آگے ایک بہت بڑا اژدھا ہے اس سے کچھ فاصلے پر ایک آدمی درخت کے نیچے سویا ہوا ہے۔ بچھو نے اژدھا کو کاٹا اور اژدھا نے بچھو کو کاٹا، یہ دونوں مر گئے لیکن وہ شخص جو درخت کے نیچے سویا ہوا تھا اللہ تعالیٰ نے اسے محفوظ رکھا حضرت ذوالنون اس واقعہ کو دیکھ کر سمجھ گئے کہ رب تعالیٰ کی رحمت کے انداز انوکھے ہی ہیں۔

☆ حکایت بیان کی جاتی ہے کہ کوے کا بچہ جب انڈے کے خول سے باہر آتا ہے تو اس کے پر نہیں ہوتے وہ سرخ گوشت کا ٹکڑا نظر آتا ہے۔ اسے اس حال میں دیکھ کر اس کی ماں بھاگ جاتی ہے چونکہ وہ خوف زدہ ہو جاتی ہے کہ یہ کیا چیز ہے۔ اس حال میں جب اس بچے کی پرورش کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ تو اس کی پرورش رب تعالیٰ کس انداز پر کرتا ہے؟ رب تعالیٰ اس کی پرورش کا انتظام یوں فرماتا ہے کہ اس کے اردگرد مچھر جمع ہو جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ مردہ جانور کا گوشت کا ٹکڑا ہے۔ جب مچھر اس کے پاس آتے ہیں تو وہ انکو اپنا لقمہ بنالیتا ہے

یہی اس کی غذا ہوتی ہے جب اس کے پر نمودار ہو جاتے ہیں تو اس کی ماں بھی اس کی طرف لوٹ کر آجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عربی حضرات کی دعاؤں میں ایک دعا کے اندر یہ الفاظ بھی آئے ہیں "یارازق النعاب فی عشه؟" اے رزق دینے والے کوے کے بچے کو اس کے گھونسلے میں۔

(نعاب بتشد یدالعین وضم النون کوے کا بچہ، عش بضم العین وتشدید الشین گھونسلہ)

" فظهر بهذه الامثلة ان فضل الله عام واحسانه شامل ورحمته واسعة "

''ان مثالوں سے ظاہر ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا فضل عام ہے اور اس کا احسان ہر کسی پر ہے اور اس کی رحمت وسیع ہے''۔ (از کبیر)

رب تعالیٰ کی طرف سے مصائب کو رحمت سمجھے:

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ہم اپنے روزمرہ کے معمولات کو دیکھیں تو بات بخوبی سمجھ آجائے گی۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے بچوں کو سکول نہ بھیجے دینی مدرسہ میں نہ بھیجے کسی قسم کے کھیل کود سے نہ روکے جس قسم کے لڑکے ان کے ساتھ کھیلیں وہ ان کو یہ نہ کہے کہ فلاں لڑکا اچھا ہے

اس کے ساتھ کھیلو فلاں برا ہے اس کے ساتھ نہ کھیلو۔ان کے کسی قول وفعل پر ان کی سرزنش نہ کرے۔ ان کو ادب نہ سکھائے ان کی صحیح تربیت نہ کرے بظاہر یہ شفقت ورحمت ہے لیکن درحقیقت ان پر زیادتی ہے۔اور اگر ضرورت پر سرزنش کرے،ان کو تعلیم دلائے،انکو ادب سکھائے،بظاہر یہ ان پر زیادتی اور سختی ہے۔گرمیوں،سردیوں میں مکتب میں جانا، بھاری بستہ اٹھانا، ڈانٹ ڈپٹ یہ چیز درحقیقت اس کی زندگی میں مستقبل میں نفع مند ہونے کی وجہ سے اس کے لئے رحمت ہے۔

بلا تشبیہ اب اصل مسئلہ کو سمجھنے کی کوشش کریں اس دنیا میں بظاہر محنت ،مصیبت،مشقت اور درد کئی چیزوں میں معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوتی ہے اور وہ چیزیں حکمت کے تقاضا کے مطابق ہوتی ہیں۔یہ ظاہری تکالیف انسان کے لئے باعث ثواب اور مدارج کی بلندی کا سبب بنتی ہے۔اس پر رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کو دیکھیں۔

☆ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "من یرد اللہ بہ خیرا یصب منہ" (بخاری ،مشکوۃ باب عیادۃ المریض)

اللہ تعالیٰ جس پر مہربانی کا ارادہ فرماتا ہے۔اسے رب تعالیٰ کی طرف سے تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے بیان فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

" ما یصیب المسلم من نصب ولا وصب ولا ھم ولا حزن ولا اذی ولا غم حتی الشوکۃ یشاکھا الا کفر اللہ بھا من خطایاہ "

(بخاری ،مسلم ،مشکوۃ باب عیادۃ المریض)

کسی مسلمان کو جو تھکن ،بیماری ،بے چینی ،حزن ،اذیت اور غم پہنچے اس سے اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو مٹاتا ہے۔یہاں تک کہ اگر اسے کانٹا بھی چبھے وہ بھی اس کے گناہوں کا کفارہ بنتا ہے۔

واضح ہوا کہ تکالیف جب گناہوں کا کفارہ بنتی ہیں تو یقینا وہ باعث رحمت ہیں یوں سمجھیں کہ ثواب، رحمت کے مقابل تکالیف بہت معمولی ہیں ان تکالیف کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔اسی وجہ سے کہا جاتا ہے "ان ترک الخیر الکثیر لاجل الشر القلیل شر کثیر" معمولی تکلیف کی وجہ سے

بہت بڑے ثواب کو چھوڑ دینا بہت بری بات ہے۔ (از کبیر)

مقصد تکالیف: تکالیف سے مقصود حقیقت میں جسمانی کدورتوں سے روحوں کو پاک کرنا ہوتا ہے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ﴾ اگر تم بھلائی کرو گے تو وہ تمہارے اپنے بھلے کے لئے ہوگی۔ آگ کے پیدا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ خوف دلا کر برے لوگوں کو نیک لوگوں کے اعمال کی طرف لایا جائے اور رب تعالیٰ سے دور بھاگنے والوں کو اس کے حضور لایا جائے جس طرح رب تعالیٰ نے فرمایا "ففروا الی اللہ" "اللہ تعالیٰ کی طرف بھاگ کر آؤ۔ (از کبیر)

الرحمٰن کو الرحیم سے پہلے ذکر کرنے میں حکمت:

بظاہر عقل کا تقاضا یہ ہے کہ جب "الرحمن" میں رحمت عامہ کا ذکر ہے اور "الرحیم" میں رحمت خاصہ کا۔ تو ہونا یہ چاہئے تھا کہ ادنیٰ (کم رحمت والے) کو اعلیٰ (زیادہ رحمت والے) سے پہلے ذکر کیا جاتا کیونکہ ضابطہ یہ ہے کہ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف انتقال ہوتا ہے۔ لیکن یہاں عجیب حکمت پائی گئی ہے کہ بڑے منصب والوں سے معمولی حقیر چیز کا مطالبہ نہیں کیا جاتا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کوئی شخص کسی بڑے آدمی کے پاس گیا کہ میں آپ کے پاس کسی معمولی کام کے لئے آیا ہوں تو اس نے کہا "اطلب للمهم اليسر رجلا يسيرا" معمولی کام کے لئے معمولی آدمی ہی تلاش کرو۔ گویا کہ بندہ اپنی توہین سمجھتا ہے کہ میں بڑا ہوں۔ مجھ سے چھوٹی چیز کا مطالبہ کیوں کیا جا رہا ہے۔ لیکن رب تعالیٰ نے پہلے اپنی رحمت عامہ کا ذکر فرمایا کہ مجھ سے ہر شخص مانگے ہر کچھ مانگے ہر چھوٹی چیز، بڑی چیز مجھ سے مانگو دنیا کی بھلائی مجھ سے طلب کرو، آخرت کی بھلائی کا سوال مجھ سے ہی کرو۔ کیونکہ میں "رحمن" ہوں لیکن انسان نظام دنیا کی خبر رکھتا ہے۔ اس لئے ہوسکتا تھا کہ چھوٹی چیز مانگنے سے شرم محسوس کرتا کہ وہ تو عظیم ذات ہے اس سے چھوٹی چیز کا مطالبہ کیسے کروں حالانکہ رحمٰن میں یہ ذکر ہو چکا تھا کہ ہر چھوٹی اور بڑی چیز کا مطالبہ مجھ سے کرو۔ لیکن لوگوں کی غلط فہمی کو دور کر دیا کہ مجھے عظیم سمجھ کر یہ نہ خیال کر بیٹھنا کہ مجھ سے چھوٹی چیزوں کا سوال کرنے سے میں ناراض ہوتا ہوں بلکہ یوں خیال کر:

" كما علمتني رحمانا تطلب منى الامور العظيمة ،فانا ايضارحيم

فاطلب مني شراک نعلک وملح قدرک "

جیسے تو مجھے رحمٰن سمجھ کر مجھ سے بڑے بڑے کاموں کا مطالبہ کرتا ہے اسی طرح یہ بھی سمجھ کہ میں رحیم ہوں مجھ سے اپنے جوتے کا تسمہ بھی مانگ اور مجھے سے اپنی ہنڈیا کے لئے نمک بھی مانگ۔

جس طرح رب تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا " یا موسٰی سلنی عن ملح قدرک وعلف شاتک " اے موسی مجھ سے اپنی ہنڈیا کے لئے نمک کا سوال کرو اور مجھ سے اپنی بکری کے لئے چارہ بھی طلب کرو۔ (از نبیر)

نصیحت عظیمہ: روایت میں آتا ہے کہ ایک جوان موت کے قریب تھا۔اس کی زبان پر کلمہ " لا الہ الا اللہ " جاری نہیں ہو رہا تھا کچھ حضرات نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس صحابی کے معاملہ کی خبر دی۔آپ تشریف لائے اس صحابی کے سامنے کلمہ شریف پڑھا " وھو یتحرک ویضطرب ولایعمل لسانہ " وہ حرکت کرتے ہیں مضطرب ہوتے ہیں ۔ان کی زبان کام نہیں کرتی۔

نبی کریم ﷺ نے پوچھا کیا یہ شخص نماز ادا کرتا تھا؟ کیا یہ شخص روزہ رکھتا تھا؟ کیا یہ شخص زکوٰۃ دیا کرتا تھا؟ وہاں موجود حضرات نے جواب دیا ہاں یارسول اللہ یہ تمام کام تو وہ کیا کرتا تھا۔پھر آپ نے فرمایا کیا یہ والدین کا نافرمان تو نہیں تھا؟ آپ کو بتایا گیا ہاں یارسول اللہ (یہ اپنی ماں کا نافرمان تھا) آپ نے فرمایا اس کی ماں کو بلاؤ وہ آ گئی بوڑھی عورت تھی اس کی ایک آنکھ ضائع تھی ۔نبی کریم ﷺ نے اسے فرمایا، کیا تو اسے معاف نہیں کرتی اس نے عرض کیا "لااعفو لانہ لطمنی ففقأ عینی " میں اسے معاف نہیں کرتی اس لئے کہ اس نے ایک مرتبہ مجھے تھپڑ مار کر میری آنکھ کو ضائع کردیا تھا۔

حضور ﷺ نے فرمایا۔لکڑیاں اور آگ لے آؤ۔

اس عورت نے پوچھا ، یارسول اللہ آپ آگ اور لکڑیوں کو کیا کریں گے۔آپ نے فرمایا:

" احرقہ بالنار بین یدیک جزاء لما عمل بک "جو اس نے تمہارے ساتھ سلوک کیا ہے اس کے بدلہ میں میں اسے آگ میں جلانا چاہتا ہوں۔

ماں نے کہا"عفوت عفوت" میں نے اسے معاف کر دیا، میں نے معاف کر دیا۔کیا میں نے آگ کے لئے اسے نو ماہ پیٹ میں اٹھایا تھا؟ کیا میں نے اسے آگ کے لئے دوسال دودھ پلایا تھا۔

"فاین رحمة الام ؟ فعند ذلک انطلق لسانه وذکر اشهد ان لا اله الا الله " کہاں ماں کی رحمت؟ اسی وقت اس کی زبان پر جاری ہوا "اشهد ان لااله الاالله "

علامہ رازی رحمہ اللہ اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں، ماں صرف رحیمہ ہے رحمانہ نہیں، اور اسے رحمت بھی معمولی حاصل ہے، اس نے قلیل رحمت کے باوجود اپنے بیٹے کو جلانے کی اجازت نہیں دی۔رب تعالیٰ کی وہ ذات ہے جو اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔رحیم بھی ہے رحمٰن بھی ہے وہ کیسے پسند کرے گا کہ اپنے اس بندے کو آگ میں ہمیشہ جلائے جس نے ایمان قبول کیا اور کلمہ شہادت پر ہمیشہ قائم ودائم رہا۔ (از کبیر)

خیال رہے اس صحابی کا نام تحفہ نصائح میں علقمہ ذکر کیا گیا یہ واقعہ کہیں اور نظر سے نہیں گزرا۔تاہم اپنی قلت علمی اور قلت مطالعہ کا اعتراف ہے کہاں علامہ رازی رحمہ اللہ اور کہاں میرے جیسا ہیچ مدان۔

فائدہ جلیلہ: نبی کریم ﷺ کا احد میں جب دانت کا کچھ شہید ہو گیا اور آپ کا چہرہ مبارک زخمی ہو گیا۔تو صحابہ کرام نے آپ کو کفار کے ہلاک وبرباد ہونے کی دعا کے متعلق کہا آپ نے یہ دعا فرمائی "اللهم اهد قومی فانهم لا یعلمون "اے اللہ تعالیٰ میری قوم کو ہدایت دے بیشک یہ نہیں جانتے۔

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ آپ قیامت کے دن فرمائیں گے "امتی ، امتی "اے اللہ میری امت کو بخش دے۔"فهذا کرم عظیم منه فی الدنیا والآخرة " آپ کا یہ کرم عظیم ہے دنیا اور آخرت میں آپ کے اس احسان عظیم کی وجہ اصل میں یہ ہے کہ آپ تمام جہانون کے لئے رحمت ہیں۔

رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾

" ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر سب جہانوں کے لئے رحمت بنا کر"۔

" فاذا کان اثر الرحمة الواحدة بلغ هذا المبلغ فکیف کرم من هو رحمٰن رحیم " نبی کریم ﷺ صرف رحیم ہیں رحمٰن نہیں ہیں جب ایک رحمت کا یہ عظیم مقام ہے تو اس ذات کی رحمت کا کیا مقام ہوگا۔جو رحمٰن بھی ہے، اور رحیم بھی ہے۔

توجہ فرمائیں : نبی کریم ﷺ کی رحمت کا اندازہ کریں کہ آپ نے ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کیا:

"اللهم اجعل حساب امتی علی یدی" اے اللہ میری امت کا حساب میرے ہاتھ میں کر دے۔لیکن دوسرے رخ کو بھی دیکھئے کہ آپ نے ایک شخص کا جنازہ پڑھانے سے اس لئے انکار فرما دیا تھا کہ وہ دو درھم کا مقروض تھا۔صرف اس لئے کہ لوگ قرض لے کر ادا کرنے کی کوشش بھی کریں۔ورنہ صحابہ کرام کو نماز جنازہ ادا کرنے کا حکم دیا تھا اسی طرح ایک مرتبہ اپنی ازواج مطہرات سے ایک ماہ تک بائیکاٹ فرما دیا تھا کیونکہ انہوں نے زیادہ خرچ کا مطالبہ کیا تھا۔جسے نبی کریم ﷺ نے ناپسند فرمایا تھا۔کیونکہ نبی کی بیویوں کو صبر وشکر سے کام لینا چاہئے۔

اس کی وجہ یہ ہی تھی کہ آپ ﴿ وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴾ کے مصداق ہونے کے باوجود ایک رحمت کے مالک تھے یعنی رحیم تھے ،رحمان نہیں تھے اس لئے شریعت میں رخنہ اندازی آپ کے لئے قابل برداشت نہیں ہوتی تھی اگر چہ آپ اپنی ذاتی تکالیف کو برداشت کر کے کبھی انتقام نہیں لیتے تھے۔

لیکن رب تعالیٰ رحمٰن بھی ہے رحیم بھی اس کی رحمت کی کوئی حد نہیں ۔مومن بندے جب رب کے بندے ہیں اگر چہ ان میں کچھ گنہگار بھی ہیں لیکن ان کے گناہوں کی کچھ حد بھی ہے۔جب ان کے محدود گناہ رب تعالیٰ کی رحمت کے غیر محدود سمندر میں گریں گے تو وہ فنا ہو جائیں گے ۔اگر معمولی سرزنش ہوئی بھی تو انشاء اللہ سونے کی طرح نکھر کر آب وتاب سے جنت میں پہنچ جائیں گے کیونکہ وہ رحمٰن ورحیم کی رحمت سے فائدہ حاصل کر چکے ہوں گے۔ (ماخوذ از کبیر)

☆☆☆☆☆

﴿ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾

(۱) ''روزِ جزا کا مالک'' (۲) ''جزا کے دن کا مالک''

مالک : اس لفظ میں چار لغات ہیں ایک تو یہی'' مالک'' دوسری ملک (میم کی زبر لام کی زیر سے) تیسری ملک (میم کی زیر اور لام کے سکون سے) اور چوتھی ملیک (قرطبی) زیادہ مشہور اس میں پہلی دو صورتیں ہیں عاصم، کسائی اور یعقوب نے مالک پڑھا ہے انہوں نے اپنی قراءت پر دلیل اس آیت کو بنایا ﴿ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِنَفْسٍ شَيْأً ﴾ کچھ دوسرے قراء نے ''ملک'' پڑھا ہے۔انہوں نے بطور دلیل یہ آیت پیش کی ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ﴾ (از بیضاوی) اگر چہ دونوں لفظ اپنے معنی میں مشترک ہیں "متصرف فی الامور " یعنی جسے تصرف کرنے کا حق حاصل ہوتا ہم دونوں حضرات نے اپنی اپنی قراءت کی فوقیت پر دلائل قائم کیے ہیں۔

''مالک'' پڑھنے کی افضلیت پر دلائل:

(۱) مالک میں چار حرف ہیں۔اور ملک میں تین۔جس میں حرف زائد ہوں اس کے پڑھنے میں ثواب زیادہ ہوتا ہے۔

(۲) قیامت میں بادشاہ تو کئی ہوں گے لیکن وہ ذات جس کو جزاء کے دن کامل حق حاصل ہوگا وہ مالک ہی ہوگا یہ حق صرف رب تعالیٰ کو ہی حاصل ہوگا۔

(۳) مالک وہ ہوتا ہے جسے عام تصرف حاصل ہو۔بادشاہ محافظ اور مدبر تو ہوتا ہے لیکن قومی خزانہ کا مالک نہیں ہوتا اس لحاظ پر بھی مالک پڑھنے میں افضلیت پائی جاتی ہے بنسبت ملک (بادشاہ) کے۔

(۴) ملک (بادشاہ) کی بادشاہت کا تعلق رعیت سے ہوتا ہے۔لیکن مالک کا تعلق غلاموں سے ہوتا ہے بادشاہ کا رعیت پر اتنا قہر اور دبدبہ نہیں ہوتا۔جتنا کہ مالک کا اپنے غلاموں پر قہر اور تسلط ہوتا ہے۔اس لحاظ سے بھی مالک والی قراءت افضل ہے بنسبت ملک والی قراءت سے۔

(۵) رعیت کبھی اپنے اختیارات کو استعمال کر کے اپنے آپ کو بادشاہ سے آزاد بھی کرالیتی

ہے۔لیکن غلام کوایسی طاقت کبھی حاصل نہیں ہوتی کہ وہ اپنے اختیارات سے اپنے آپ کو مالک سے آزاد کرا لے۔

واضح ہوا کہ مالک کو بنسبت ملک کے زیادہ قہر حاصل ہے۔ذات باری تعالیٰ کوبھی جب سب سے زیادہ قہر ودبدبہ حاصل ہےتو اس کے لئے لفظ مالک ہی زیادہ مناسب ہے۔

(٦) ملک (بادشاہ) کے لئے ضروری ہے کہ وہ رعیت کے حال کی رعایت کرے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا:"**کلکم راع و کلکم مسؤل عن رعیته**"تم میں سے ہر شخص رعیت رکھنے والا ہےاورتم میں سے ہر شخص سے رعیت کے متعلق سوال ہوگا۔لیکن رعیت پر واجب نہیں کہ وہ بادشاہ کی خدمت کرے۔

"**ولا یجب علی الرعیة خدمة الملک**"

لیکن مملوک (غلام) پرلازم ہے کہ وہ مالک کی خدمت کرے۔وہ مولی کی اجازت کے بغیر اپنے معاملات میں مستقل کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔وہ قاضی نہیں بن سکتا۔وہ امام نہیں بن سکتا۔(یعنی غالبا غلام جاہل ہوتا ہےاس لئے اس کی امامت مکروہ ہوتی ہے اگر عالم ہوتو اس کی امامت بغیر کراھیت کے جائز ہے)اس کی گواہی قبول نہیں۔مولیٰ سفر کی نیت کرےتو وہ خود ہی مسافر بن جاتا ہےاور مولی اقامت کی نیت کرےتو وہ مقیم ہوجاتا ہے۔

ابھی تک جو دلائل قائم کئے ہیں ان سے واضح ہوگیا کہ مالک کوافضلیت حاصل ہے ملک پر لہٰذا "مالک" پڑھنا افضل ہوگا۔کیونکہ اللہ تعالیٰ کے لئے وہی لفظ استعمال کیا جائے جس میں اس کا کامل رعب، دبدبہ اس کے بندوں کا اس کے حکم کے تابع ہونا چون وچرا نہ کرسکنا اس کے بندوں کا اس کا عبادت گزار ہونا سمجھ آئے وہ لفظ مالک ہی ہے۔

"ملک" کی قراءت کی افضلیت پر دلائل:

(١) ہر شہر میں ہر شخص کسی نہ کسی چیز کا مالک ہوتا ہے۔لیکن ملک (بادشاہ) ہر ایک نہیں ہوتا۔بلکہ کوئی بڑا شخص اور اعلیٰ شخص ہوتا ہے۔اس سے پتہ چلا کہ ملک اعلیٰ ہے مالک سے لہٰذا رب تعالیٰ کے

لئے بھی لفظ ملک ہی استعمال کیا جانا بہتر ہے۔

(۲) تمام قراء کا اتفاق ہے کہ ﴿ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ ﴾ میں لفظ ملک ہی متعین ہے اگر ملک اعلیٰ نہ ہوتا مالک سے تو یہاں کیوں متعین ہوتا اور تمام قراء کا اتفاق نہ ہوتا۔

(۳) ملک مختصر لفظ ہے اور مالک اس سے بڑا لفظ ہے زندگی کا پتہ نہیں کہ کبھی سانس آنا ختم ہو جائے۔ ہوسکتا ہے کہ اتنی زندگی ہو کہ تین لفظ ادا کر سکے اور چار نہ ادا کر سکے۔ تو ملک مکمل ادا کر سکے گا لیکن مالک ادا کرتے ہوئے لام تک پہنچے گا یعنی مال تک ادا کرنے سے زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ تو بہتر یہ ہے کہ ملک کو فضیلت دی جائے مالک پر۔

علامہ رازی رحمہ اللہ کا شاندار محاکمہ:

" ثم نقول انه يتفرع على كونه ملكا احكام وعلى كونه مالكااحكام اخر "

اللہ تعالیٰ ملک بھی ہے اس لحاظ پر اس کی طرف اور احکام منسوب ہوتے ہیں۔ اور مالک بھی ہے اس لحاظ پر اس کی طرف اور احکام منسوب ہوتے ہیں۔ یعنی جب دونوں قراء تیں پر عظیم المرتبۃ قراء ہیں۔ تو دونوں قراء تیں درست ہیں دونوں کو ملا کر جو ذیشان نتیجہ نکلے گا۔ اس میں کمال، ذوق، چاشنی عجیب انداز ہوں گے۔

جن احکام کا تعلق ہے ملک ہونے سے:

(۱) سیاست کی چار قسمیں ہیں:

سیاست ملاک، سیاست ملوک، سیاست ملائکہ، سیاست ملک الملوک۔ سیاست ملوک (بادشاہوں کی سیاست) میں زیادہ قوت وطاقت پائی جاتی ہے بنسبت سیاست ملاک (مالکوں کی سیاست) کے۔ کیونکہ اگر سارے مالک جمع ہو جائیں تو ایک بادشاہ سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔

ایک اور وجہ سے بھی واضح ہوتا ہے کہ ملک کو مالک پر برتری حاصل ہے۔ کیونکہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مالک اپنے مملوک (غلام) کو حد نہیں لگا سکتا۔ لیکن اس پر اجماع امت ہے کہ بادشاہ کو لوگوں پر حد لگانے کی ملکیت حاصل ہے۔

سیاست ملائکہ (فرشتوں کی سیاست) کوسیاست ملوک پر فضیلت اور فوقیت حاصل ہے کیونکہ سارے جہان کے بادشاہ ایک طرف ہوجائیں تو وہ ایک فرشتے سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ملک الملوک (بادشاہوں کے بادشاہ مراد اللہ تعالیٰ) کی سیاست فرشتوں کی سیاست سے اعلیٰ اور کامل، افضل واکمل ہے رب تعالیٰ کے ارشادات سے یہ بہت واضح ہے۔﴿ یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا لَّا یَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴾ جس دن جبریل کھڑا ہوگا اور فرشتے صف بنا کر کوئی نہیں بول سکے گا سوائے اس کے کہ جسے رحمٰن نے اجازت دی اور اس نے ٹھیک بات کہی۔

یعنی قیامت کے دن رب تعالیٰ کی اجازت کے بغیر تمام فرشتے بات کرنے کی طاقت نہیں رکھیں گے یہاں تک کہ جبرائیل بھی اگر رب تعالیٰ نے اجازت دے دی تب ہی وہ کوئی بات کرسکیں گے اور اسی وقت وہ درست بات کرسکیں گے۔ ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ وہ کون ہے جو اس کے ہاں سفارش کرے اس کے حکم کے بغیر۔

یعنی رب تعالیٰ کے ہاں سفارش کرنے کے لئے جلیل القدر حضرات یعنی انبیاء کرام اور فرشتے اس کی اجازت اور اس کے حکم کے منتظر ہوں گے۔ مالک الملک نے فرشتوں کے متعلق ہی یہ فرمایا ﴿وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی وَهُمْ مِّنْ خَشْیَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ﴾ اور شفاعت نہیں کرتے مگر اس کے لئے جسے وہ پسند فرمائے اور وہ اس کے خوف سے ڈر رہے ہیں۔ بادشاہوں اور ان کی رعایا کو اللہ تعالیٰ کے جزا کے دن ملک (بادشاہ) ہونے کے متعلق گویا کہ ان الفاظ سے بتایا گیا:

> " یاایها الملوک لاتفتروا بما لکم من المال والملک فانکم اسراء فی قبضة مالک یوم الدین ویاایها الرعیة اذا کنتم تخافون سیاسة الملک افما تخافون سیاسة ملک الملوک الذی هو مالک یوم الدین "
>
> '' اے بادشاہو! اپنے مال اور بادشاہت پر ناز نہ کرنا کہیں مال ودولت اور بادشاہت کے گھمنڈ کی وجہ سے رب تعالیٰ سے غافل نہ ہوجانا۔ تم تمام اس کے قبضہ قدرت میں ہواور ہر وقت یہ بات ذہن میں رکھنا کہ وہ مالک یوم الدین ہے۔ اے بادشاہوں کی رعیت لوگو جب تم بادشاہ کی سیاست سے ڈرتے ہوتو تم اس ذات کی سیاست سے کیوں نہیں ڈرتے جو ملک الملوک (بادشاہوں کا بادشاہ ہے) ہے اور وہ جو مالک یوم الدین ہے''۔

(۲) اور حکم جس کا تعلق ملک سے ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسا بادشاہ ہے کہ کوئی بادشاہ اس سے مشابہت کا

تصور نہیں کرسکتا۔اس لئے کہ دنیا کے بادشاہ جب کسی کوکوئی مال دیں تو ان کے خزانوں میں کمی آ جاتی ہے۔لیکن اللہ تعالیٰ وہ بادشاہ ہے کہ اس کے ملک میں عطا اوراحسان سے کوئی کمی واقع نہیں ہوتی ۔ بلکہ وہ جتنا زیادہ عطا کرتا ہے اس کی بادشاہت میں اتنی ہی زیادتی ہوتی ہے۔اس مسئلہ کو ایک مثال سے سمجھئے اللہ تعالیٰ کسی شخص کو جب ایک بچہ عطا کرے تو اس کے احکام کا تعلق اس ایک بچہ سے ہوگا۔اور اگر دس عطا کرے تو اس کے احکام کا تعلق دس سے ہوگا۔دس ہی اس کے اوامر ونواہی کے مکلّف ہوں گے۔اس سے واضح ہوا کہ جتنی اس کی عطا زیادہ ہوتی چلی جاتی ہے اس کی بادشاہت میں اتنی ہی وسعت زیادہ ہوتی چلی جاتی ہے۔

(۳) ایک اور حکم جس کا تعلق اس کے ملک ہونے سے ہے۔وہ یہ ہے کہ بادشاہ کی بادشاہت کا تعلق رحمت سے ہے۔بادشاہ میں جتنی رحمت زیادہ ہوگی اتنا ہی زیادہ اس کی بادشاہیت میں کمال ہوگا۔جب اللہ تعالیٰ کو رحمت کاملہ ،رحمت عظیمہ حاصل ہے تو وہ سب بادشاہوں کا بادشاہ ہے اس کی بادشاہت میں وہ کمال ہے جو کسی اور کو حاصل نہیں رب تعالیٰ کی رحمت کاملہ پر کئی دلیلیں ہیں۔ان میں سے ایک تو ماقبل بیان کی ہوئی تفسیر کو دیکھیں کہ وہ رب ہے وہ رحمٰن ہے اور وہ رحیم ہے کتنی زیادہ اس میں رحمت ہے؟اس کو مختصر انداز میں پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔

☆ اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ﴾ وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ۔ہر غیب اور ظاہر کو جاننے والا وہی ہے بڑا مہربان رحم کرنے والا۔پھر اس کے بعد فرمایا﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ﴾ وہی اللہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ بادشاہ۔پھر اس کے بعد ذکر فرمایا﴿اَلْقُدُّوْسُ﴾ وہ نہایت پاک یعنی وہ ظلم اور جور سے پاک ہے۔پھر اس کے بعد ذکر فرمایا ''اَلسَّلَامُ'' وہ سلامتی دینے والا یعنی اس کے بندے اس کے ظلم کا تصور کرنے سے بھی سلامتی میں ہیں۔یعنی اس کا ظلم کرنا تو درکنار یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ظلم کرتا ہے پھر فرمایا﴿ اَلْمُؤْمِنُ ﴾ وہ امان بخشنے والا۔یعنی اللہ کے بندے اس کے ظلم سے امن میں ہیں۔کیونکہ وہ ظلم نہیں کرتا یہ ذہن میں لانا بھی ممکن نہیں کہ وہ ظلم کرتا ہے۔اس بحث سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہی کامل ملک (بادشاہ) ہے کیونکہ کامل رحمت اسے ہی حاصل ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ کی رحمت کاملہ پر اور دلیل یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اَلْمُلْکُ یَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ﴾ اس دن سچی بادشاہی رحمٰن کی ہے۔ جب رب تعالیٰ نے اپنی بادشاہت کا ذکر فرمایا تو اس سے وہم ہوسکتا تھا کہ شائد اسے دنیا کے عام بادشاہوں کی طرح صرف قہر ہی حاصل ہوگا۔ تو اس وہم کو زائل کرنے کیلئے اس کے بعد اپنے رحمٰن ہونے کا ذکر کیا تا کہ خوف جاتا رہے اور معلوم ہوجائے کہ اسے رحمت کاملہ حاصل ہے۔

☆ رب تعالیٰ کی رحمت کاملہ پر اور دلیل یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِکِ النَّاسِ ﴾ تم کہو میں اس کی پناہ میں آیا جو سب لوگوں کا رب سب لوگوں کا بادشاہ۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے اپنے بادشاہ ہونے اور رب ہونے کو ایک جگہ ذکر کر کے بتایا کہ میں رب ہوں رب وہی ہے جو بہت مہربان اور رحم کرنے والا ہے اسی وجہ سے گویا کہ رب تعالیٰ نے اپنی کامل بادشاہت کا بھی ذکر فرمادیا۔ ابھی تک جو دلائل پیش کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو کامل رحمت حاصل ہے اور کمالِ رحمت کی وجہ کمالِ بادشاہت حاصل ہے اس سے یہ نتیجہ واضح ہوا :

" یا ایھا الملوک اسمعوا ھذہ الآیات وارحموا ھؤلاءالمساکین
ولاتطلبوا مرتبۃ زائدۃ فی الملک علی ملک اللہ تعالیٰ "

اے بادشاہو! ان آیات کو سن لو اور ان مسکینوں پر رحم کرو تم اپنی بادشاہت میں اللہ تعالیٰ کی بادشاہت سے زیادہ مطالبہ نہ کرو یعنی تم رب تعالیٰ سے بڑے بادشاہ نہیں۔ تمہاری بادشاہت اس کی بادشاہت سے بڑی نہیں تو پھر تم رحم کیوں نہیں کرتے۔

(۴) اور حکم جس کا تعلق ملک سے ہے۔ رعیت پر بادشاہ کی فرمانبرداری لازم ہے۔ اگر رعیت کے لوگ اس کی اطاعت نہ کریں تو قتل وغارت کا بازار گرم ہوجائے۔ اضطراب اور پریشانی حاصل ہو۔ جہان میں تخریب کاری نمودار ہوجائے نظام عالم برباد ہوکر رہ جائے۔ مخلوق فنا ہوجائے۔ جب تم آئے دن مشاہدہ کررہے ہو کہ مجازی بادشاہ کی مخالفت بربادی اور مخلوق کے تباہ ہونے کا سبب ہے تو دیکھو کہ بادشاہ حقیقی بادشاہوں کے بادشاہ کی مخالفت کے اثرات مصلحت کے زوال اور فسادات کے حصول میں کتنے واقع ہوں گے ۔ رب تعالیٰ نے کفر کو جہان کی بربادی کا سبب قرار دیا۔ ﴿ تَکَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴾ قریب

ہے کہ آسمان اس سے پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ گر جائیں ڈھ کر اس پر کہ انہوں نے رحمٰن کے لئے اولاد بتائی۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی اولاد ثابت کرنا کفر ہے اور کفر کو زمین و آسمان اور پہاڑوں کی بربادی کا سبب بیان کیا گیا ہے اور اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو مصلحت کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَأْمُرْ اَهْلَکَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَانَسْأَلُکَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُکَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴾ اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دے اور خود اس پر ثابت رہ کچھ ہم تجھ سے روزی نہیں مانگتے ہم تجھے روزی دیں گے۔ اور انجام کا بھلا پرہیز گاری کے لئے۔

یعنی اے انسان تیرا نماز قائم کرنا اور گھر والوں کو بھی نماز کا حکم دینا تیرے لئے رزق کا ذریعہ ہے اور اس کا انجام اچھا ہوگا واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ فرمانبرداری بھلائی کے حاصل ہونے کا ذریعہ ہے۔ نتیجہ یہ حاصل ہوا کہ گویا کہ بادشاہوں کو یوں کہا گیا ہے۔" یاایها الملوک کونوا مطیعین لملک الملوک حتی تنظم مصالح العالم " اے بادشاہو تم بادشاہوں کے بادشاہ کے مطیع ہو جاؤ تا کہ نظام عالم درست رہے۔

(۵) ایک اور حکم جس کا تعلق ملک سے ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت ملک یوم الدین بیان کر کے گویا کہ اپنے کامل عدل کو بیان فرما دیا اور اپنے ظلم نہ کرنے کو ان الفاظ مبارکہ سے بیان فرمایا ﴿وَمَارَبُّکَ بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيْدِ ﴾ اور آپ کا رب بندوں پر ظلم نہیں فرماتا اور اپنے عدل کی کیفیت کو یوں بیان کیا ﴿ وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْأً ﴾ ہم انصاف کے میزان رکھیں گے۔ قیامت کے دن کسی نفس پر کچھ بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

جب یہ بات واضح ہے کہ مجازی بادشاہ عادل ہو تو اسے بادشاہ حق کہا جاتا ہے۔ اور اگر عدل نہ کرے تو وہ باطل بادشاہ جھوٹا ،فراڈی کہلاتا ہے۔ زبان سے کہتا بھی رہے کہ عدالتیں کام کر رہی ہیں انصاف ہوگا۔ انصاف ہو رہا ہے۔ اس کذاب ،غاصب ،لیٹرے ،قانون کی دھجیاں بکھیرنے والے کی بات کو کون مانے گا۔ جب اس نے ڈنڈے کے زور پر ججوں کو اپنا ہم نوا بنا لیا ہو عدل کا نام ونشان نہ ہو۔

اگر بادشاہ حق پر قائم ہو۔عادل ہوتو اس کے عدل کی برکت کی وجہ سے جہان میں خیر و برکت ،راحت وآرام ،سکون وچین ہوتا ہے اور اگر بادشاہ ظالم ہوتو جہان سے خیر و برکت اٹھ جاتی ہے۔جب ہر طرف لوگ ظلم کی چکی میں پس رہے ہوں۔لوگوں سے ٹیکس لے کر خود گلشرے اڑائے جارہے ہوں۔لوگوں کو بے روزگار کیا جارہا ہو مساجد کو ڈھایا جارہا ہو۔دینی مدارس کے خلاف منصوبے بنائے جارہے ہوں۔اور نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد "اتقوا دعوۃ المظلوم"...... (مظلوم کی بددعا سے بچ کر رہو)...... کی طرف دھیان نہ کیا جارہا ہوتو یہ لوگ انشاء اللہ اپنے برے انجام کو پہنچیں گے۔ہاں ان شاءاللہ جلدی کیونکہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے۔﴿ وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ اور ہرگز اللہ تعالیٰ کو غافل نہ سمجھو جو ظالم عمل کررہے ہیں۔

بادشاہ کے ظلم کے فقط ارادہ سے ہی نحوست آجاتی ہے:

بیان کیا جاتا ہے کہ نوشیرواں ایک دن شکار کیلئے نکلا۔اپنے گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے آگے نکل گیا۔اس کالشکر پیچھے رہ گیا اور اس پر پیاس کا غلبہ ہوا تو یہ ایک باغ میں گیا وہاں انار کے درختوں کو دیکھا جو بچہ وہاں باغ میں تھا اسے کہا مجھے ایک انار دے دو۔اس نے ایک انار دے دیا۔نوشیرواں نے اسے توڑا دانے نکال کر ان کا رس نچوڑا۔رس کافی مقدار میں نکلا۔اس نے پیا،اسے وہ انار عجیب سالگا ،کیونکہ اس نے پہلے اتنا رس بھرا انار کبھی نہیں دیکھا تھا۔دل میں ارادہ کیا کہ یہ باغ مالک سے لے لیا جائے۔باغ میں موجود بچے سے اس نے پھر ایک اور انار مانگا۔اس نے ایک اور انار دے دیا۔اسے جب نچوڑا اس میں سے بہت تھوڑا رس نکلا۔وہ کڑوا جسے پینا دشوار ہوگیا۔نوشیروان نے بچے سے پوچھا یہ کیسا انار ہے؟ بچے نے جواب دیا شائد ہوسکتا ہے کہ ہمارے ملک کے بادشاہ نے ظلم کا ارادہ کرلیا ہے۔تو اس کے ظلم کی نحوست سے یہ انار اس طرح ہوگیا یعنی رس کم ہوگیا ذائقہ کڑوا اور ضرر رساں ہوگیا۔نوشیرواں نے دل ہی دل میں اپنے اس ظلم سے توبہ کرلی جو وہ اس باغ کو زبردستی مالک سے لینا چاہتا تھا۔اس نے بچے کو پھر کہا مجھے ایک اور انار دے دو اس نے ایک اور انار دے دیا جب اسے نچوڑا گیا۔تو پہلے انار سے بھی اس میں زیادہ رس اور ذائقہ اس سے بھی زیادہ اچھا اور میٹھا پایا گیا۔نوشیرواں نے اس بچے سے پوچھا یہ انار اس حال میں کیسے تبدیل ہوگیا؟ بچے نے جواب

دیا" لعل ملک البلد تاب عن ظلمه " ہوسکتا ہے کہ ہمارے ملک کے بادشاہ نے اپنے ظلم کے ارادہ سے توبہ کر لی ہو۔جب نوشیرواں نے بچے کا کلام سنااور اسے اپنے دل کے حال کے مطابق پایا۔یعنی جس طرح اس کا اراادہ بدلتا رہا اسی طرح انار کا حال بدلتا رہا۔تو اس نے ظلم سے مکمل طور پر توبہ کر لی۔

" فلاجرم بقی اسمه مخلدا فی الدنیا بالعدل " (از کبیر)

" یہی وجہ ہے کہ یقیناً اس کا نام رہتی دنیا تک عدل وانصاف کے طور پر زندہ رہے گا"۔

اس واقعہ سے حاصل ہونے والے فوائد:

نوشیرواں نے بچے کو یہ نہیں بتایا تھا کہ میں اس ملک کا بادشاہ ہوں ۔نوشیرواں نے اپنے دل میں ارادہ کیا تھا۔اس پر بچے کو مطلع نہیں کیا تھا۔بادشاہ نے ظلم کاارادہ کر کے بھی دیکھ لیا تھا۔اوراس سے سچے دل سے توبہ کر کے بھی دیکھ لیا تھا کہ بچہ سچ کہہ رہا ہے۔بچہ کسی نیک گھرانے کا تربیت یافتہ تھا،نیک تھا،صاحب علم تھا بلکہ کسی کو نصیحت کرنے میں اس کی اس وقت کوئی نظیر نہ تھا۔بادشاہ عقل مند تھا،سمجھ گیا، توبہ کر لی ہمارے زمانہ کے بادشاہوں کی طرح نہیں تھا کہ رب تعالیٰ کی طرف سے ان کو جھنجوڑا بھی جائے لیکن ان کو ہوش نہ آئے۔ظلم کا بازار اس وقت تک گرم رکھتے ہیں جب تک ان کو ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹ کر باہر نہ نکالا جائے۔ظلم کی نحوست کا کیا حال ہوگا ۔جب صرف ظلم کے ارادہ کی نحوست سے باغ کے پھلوں پر یہ اثر ہوگیا تھا۔

یقیناً ظلم کرنے سے نظام عالم برباد ہوکر رہ جاتا ہے۔تخریب کاری کے اڈے قائم ہوجاتے ہیں۔قتل وغارت کا بازار گرم ہوجاتا ہے۔

اور بچے کے کہے ہوئے سنہری جملے یاد رکھنے کے قابل ہیں پہلا جملہ یہ ہے" **لعل ملک البلد عزم علی الظلم فلاجل شؤم ظلمه صار الرمان هكذا** " شائد ملک کے بادشاہ نے ظلم کا ارادہ کرلیا ہے اس کی نحوست کی وجہ سے انار اس طرح ہوگیا۔اوراس کا دوسرا جملہ یہ تھا" **لعل ملک البلد تاب عن ظلمه** " شائد ملک کے بادشاہ نے اپنے ظلم سے توبہ کر لی ہو۔

مالک کی طرف منسوب ہونے والے احکام:

یعنی ایک قراءت میں مالک یوم الدین ہے اس لحاظ پر علیحدہ احکام حاصل ہوتے ہیں۔اور جس قراءت میں ''ملک'' پڑھا گیا اس لحاظ پر علیحدہ احکام ہیں۔جن کو ذکر کیا جاچکا ہے:

(۱) مالک سے زیادہ امید کی جا سکتی ہے جو ملک (بادشاہ) سے نہیں۔اس لئے کہ بادشاہ سے زیادہ سے زیادہ عدل وانصاف کا مطالبہ کر کے جان بچائی جا سکتی ہے۔یعنی کسی انسان کی نجات کے لئے عدل وانصاف کی درخواست کی جا سکتی ہے۔لیکن مالک کا غلام اس سے طعام طلب کرتا ہے۔لباس طلب کرتا ہے رحمت اسی سے چاہتا مالک ہی اس کی پرورش کرتا ہے ہر قسم کی اس کی تربیت کرتا ہے یوں سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے گویا کہ یہ کہتا ہے اے میرے بندو ''انا مالککم فعلی طعامکم وثیابکم وثوابکم وجنتکم'' میں تمہارا مالک ہوں میں ہی تمہیں طعام عطا کرنے والا ہوں۔کپڑے تمہیں میں ہی دیتا ہوں۔تمہاری عبادات نیکیوں پر ثواب عطا کرنا میرے قبضہ قدرت میں ہی ہے۔جنت عطا کرنے والا میں ہی ہوں۔

(۲) ملک اگرچہ مالک سے بے پرواہ ہوتا ہے لیکن پھر بادشاہ کو رعایا سے طمع ہوتی ہے کہ یہ میرے موافق رہیں۔رعایا پر مظالم ڈھانے والے رعایا کو اپنا مخالف بنانے والے تھوڑے ہی عرصہ میں چلتا بنتے ہیں۔لیکن مالک وہ ہے کہ غلام اس میں طمع رکھتا ہے مالک کو غلام کے راضی ہونے کی تمنا نہیں ہوتی۔اور نہ ہی مالک غلام سے کسی چیز کے حاصل کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔قیامت کے دن رب تعالیٰ کو ہماری عبادات،طاعات،خیرات کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ ہمیں یہ ضرورت ہوگی کہ رب تعالیٰ سے ہم درگزر کرنے،مغفرت کرنے اور اپنے فضل سے جنت عطا کرنے کی خواہش رکھیں گے۔یہی وجہ ہے کسائی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں ﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ پڑھتا ہوں کیونکہ یہ قراءت اللہ تعالیٰ کے کثیر فضل اور اس کی وسیع رحمت پر دلالت کرتی ہے۔

(۳) بادشاہ اپنے لشکر کے لئے قوی بدن،صحیح مزاج،بہادر لوگوں کا انتخاب کرتا ہے۔ضعیف مریض،جسمانی کمزور لوگوں کو دھتکار دیتا ہے۔ان کو اپنے لشکر میں بھرتی کر کے تنخواہ دینے کا اس سے

تصور ممکن نہیں۔لیکن مالک اپنے مریض غلام کا علاج کراتا ہے۔اگر ضعیف ہو تو اس کی امداد کرتا ہے۔اگر مصیبت میں ہو تو اسے خلاصی دلاتا ہے۔اس لئے ''مالک'' پڑھنے میں گناہگاروں اور مسکینوں کے لئے تسلی ہے کہ وہ مالک ہے کسی کو اپنے در سے دور نہیں کرتا۔

(۴) ملک (بادشاہ) کو ہیبت اور دبدبہ حاصل ہوتا ہے۔لیکن مالک مہربان اور رحم کرنے والا ہوتا ہے۔ہم رحمت اور مہربانی کے زیادہ محتاج ہیں۔ہیبت اور رعب اور دبدبہ کی ہمیں اتنی احتیاجی نہیں۔اس سے بھی واضح ہوا کہ ''مالک'' پڑھنا زیادہ بہتر ہے۔

نتیجہ واضح ہوا کہ وہ ملک بھی ہے، مالک بھی ہے۔ملک ہونا اور حیثیات سے ہے اور مالک ہونا اور حیثیات سے ہے۔دونوں قراءتوں پر جلیل القدر قراء ہیں۔ہر قراءت کے مطابق مولائے کائنات کی شان ہی شان نظر آتی ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

مالک تو ہمیشہ مالک ہے یوم الدین کی تخصیص کیوں؟

اللہ تعالیٰ جب ہمیشہ کے لئے مالک ہے تو پھر ﴿مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾ (جزا کے دن کا مالک) کہنے کا کیا مطلب ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا میں کئی اور بھی دعویدار ہیں کہ ہم بھی مالک ہیں۔ہم بھی بادشاہ ہیں۔جیسے فرعون اور نمرود نے صرف مالکیت اور بادشاہت کے دعوی پر اکتفا نہیں کیا تھا۔بلکہ خدا ہونے کا بھی دعوی کر بیٹھے۔لیکن قیامت کے دن تمام خدائی کے دعویداروں کے دعوے ختم ہو جائیں گے۔کوئی بادشاہی کا دعویدار نہیں ملے گا کوئی مالکیت کا دعوی کرتا ہوا نظر نہیں آئے گا۔سب رب تعالیٰ کے حضور سر جھکائے ہوں گے۔اس کی بادشاہت میں کسی کا تنازع نہیں ہوگا۔اسی لئے رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا ﴿لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ﴾ یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ پوچھے گا آج کس کی بادشاہی ہے؟ تمام مخلوق جواب دے گی ﴿لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ صرف اللہ واحد وقہار کی۔ (از قرطبی)

فائدہ جلیلہ: نبی کریم ﷺ کا ارشاد بھی ایک، رب تعالیٰ کے ارشاد ﴿مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾ سے مطابقت رکھتا ہے۔

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" انا سید ولد ادم یوم القیمة ولا فخر وبیدی لواء الحمد ولا فخر وما من نبی یومئذ ادم فمن سواہ الا تحت لوائی " (مشکوۃ باب فضائل سیدالمرسلین)

میں تمام انسانوں کا قیامت کے دن سردار ہوں گا اس پر کوئی فخر نہیں۔ میرے ہاتھ میں لواء الحمد ہوگا اس پر کوئی فخر نہیں اس دن تمام نبی، آدم علیہ السلام اور ان کے سواء میرے جھنڈے کے نیچے ہی ہوں گے۔

تشریح حدیث : علامہ ہروی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" السید هو الذی یفوق قومه فی الخیر " سیّد اسے کہتے ہیں جو قوم پر ہر قسم کی بھلائی میں فوقیت رکھتا ہو۔ اور دیگر جمہور اھل علم فرماتے ہیں:

" السید هو الذی یفزع الیه فی النوائب والشدائد فیقوم بامورهم ویتحمل عنهم مکارههم ویدفعها عَنْهُمْ "

سید اسے کہتے ہیں جس کی طرف قوم اپنے مصائب وآلام میں پناہ پکڑے وہ ان کی حاجات کو پورا کرے خود مشقتیں برداشت کر کے ان کی تکالیف کو دور کرے۔

سبحان اللہ کسی کو اگر صرف سید کا معنی پتہ چل جائے اور یہ پتہ ہو کہ حضور ﷺ سید الکائنات ہیں۔ تو اسے یہ بات خود سمجھ آجائے کہ حضور ﷺ رب تعالیٰ کی عطا کردہ طاقت سے حاجت روا ہیں۔

اعتراض: نبی کریم ﷺ نے قیامت کے دن کا ذکر فرمایا کہ مجھے قیامت کے دن سرداری حاصل ہوگی حالانکہ آپ کو دنیا میں بھی تمام پر سرداری حاصل ہے پھر قیامت کے دن کے ذکر کا کیا مطلب؟

جواب: " ان فی یوم القیمة یظهر سودده لکل احد ولا یبقی منازع ولا معاند "

بیشک قیامت کے دن آپ کی برتری تمام پر ظاہر ہوجائے گی کوئی جھگڑا کرنے والا جھگڑا نہیں کرے گا۔ اور کوئی شخص عناد نہیں کرے گا۔ (نووی، مرقاۃ)

کیونکہ دنیا میں کفار مشرکین نے آپ کی فضیلت کو تسلیم نہیں کیا۔ دنیا میں اگرچہ بہت لوگ آپ کے وسیلہ جلیلہ کے بغیر براہ راست خدا تک رسائی حاصل کرنے کے دعویدار ہیں۔ لیکن قیامت کے دن

تمام کو ہی حبیب پاک علیہ التحیۃ والثناء کا وسیلہ تلاش کرنا پڑیگا۔ نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مطابق ہے کہ قیامت کو رب تعالیٰ پوچھے گا۔ "لمن الملک الیوم" آج کس کی بادشاہی ہے تو مخلوق جواب دے گی "للہ الواحد القھار" اللہ واحد وقہار کی، اور ایک قول یہ بھی ہے۔ کہ مخلوق سر جھکائے جواب دینے کی طاقت نہیں رکھے گی رب تعالیٰ خود ہی اس کا جواب بھی دے گا۔ (ازنووی)

تنبیہ : کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ اس حدیث سے نبی کریم ﷺ کی افضلیت اولاد آدم پر تو ثابت ہو رہی ہے لیکن خود آدم علیہ السلام پر آپ کی افضلیت ثابت نہیں ہو رہی۔ ذہن میں واقع ہونے والے اس وہم کے دو جواب دئے گئے ہیں۔

پہلا جواب: "فانھم یستعملون ولد آدم بمعنی نوع الانسان" (نبراس) عربی زبان والے حضرات "ولد آدم" کو بمعنی نوع انسان لیتے ہیں۔ یعنی عام محاورہ کے مطابق صرف اولاد آدم معنی نہیں۔ بلکہ تمام انسان مراد ہیں۔ جن میں آدم علیہ السلام بھی ہیں اس طرح اب معنی یہ ہوگا کہ "تمام انسانوں پر مجھے فضلیت حاصل ہے۔"

دوسرا جواب: "ان للحدیث تتمۃ موضحۃ للمطلوب وھو قولہ علیہ السلام وما من بنی یومئذ آدم فمن سواہ الا تحت لوائی" (نبراس)

یعنی دوسرا جواب یہ ہے کہ مطلب کو واضح کرنے کے لئے حدیث پاک کے آخری الفاظ سے تکمیل ہو رہی ہے کہ آدم علیہ السلام اور آپ کے سواء تمام ہی میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔ یعنی تمام انسان بمع انبیاء کرام میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔ اس سے واضح ہو رہا ہے۔ کہ جب آدم علیہ السلام کو بھی قیامت کے دن میرے پیارے نبی کریم ﷺ کی احتیاجی ہوگی تو یقیناً آپ کو آدم علیہ السلام پر بھی افضلیت حاصل ہوگی۔

ولا فخر کا مطلب: "ولا فخر ای ولا اقولہ تفاخرا بل اعتدادا بفضلہ وتحدثا بنعمتہ وتبلیغا لما امرت بہ"

یعنی میں یہ فخر کے طور پر نہیں بیان کر رہا بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور نعمت کو بیان کرنے کے لئے ذکر کر رہا ہوں اور جس چیز کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔ میں وہ امت کو پہنچانے کے لئے ذکر کر رہا

ہوں۔"وامتثالا لامر اللہ تعالیٰ واما بنعمة رَبِّکَ فحدث "آپ نے اپنے مراتب اللہ تعالیٰ کے حکم کی تابعداری کرتے ہوئے بیان فرمائے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا﴿وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّث﴾ اپنے رب کی نعمتوں کو خوب بیان کرو۔یعنی آپ نے اپنی سرداری کو لوگوں کے سامنے فخر کے طور پر نہیں بیان کیا بلکہ آپ کے بیان کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ آپ پر لازم تھا کہ اپنا مقام ومرتبہ امت کے سامنے بیان کریں تا کہ امت کو آپ کا مقام معلوم ہوجائے۔دوسری وجہ یہ تھی کہ یہ رب تعالیٰ کا آپ پر انعام تھا کہ آپ کو تمام انسانوں پر فضیلت دی۔اور رب تعالیٰ نے خود اپنی نعمتوں کے بیان کرنے چرچا کرنے کا حکم بھی دیا۔

"مالک یوم الدین" میں حکمت:

واجبات کی دو قسمیں ہیں۔ حقوق اللہ، حقوق العباد……

حقوق اللہ میں معافی کا امکان پایا جاتا ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام جہانوں سے بے پرواہ ہے۔اگر وہ چاہے تو اپنے حقوق معاف فرمادے۔لیکن حقوق العباد کو معاف نہیں فرمائے گا بلکہ ان کا بدلہ دلائے گا۔قیامت کے دن ظالم کی نیکیاں مظلوم کو دے دی جائیں گی اگر اس کا حق پورا ہوگیا تو بہتر نہیں تو مظلوم کے گناہ ظالم کے پلڑے میں ڈال دیئے جائیں گے۔دنیا میں ظالم سے انتقام مظلوم کو بادشاہ حکام کبھی تو عجز کی وجہ سے نہیں دلا سکتے۔کبھی جہالت کی وجہ سے اور کبھی وہ ظلم پر راضی ہوتے ہیں۔یعنی وہ چمچوں سے مخلصین پر ظلم کرا کے اپنی فرعونیت کو ثابت کرتے ہیں۔لیکن افسوس کہ وہ فرعون کے انجام کو نہیں دیکھتے ایک دن آتا ہے دیکھتے ،دیکھتے فرعون ذلیل ہوجاتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ان تینوں چیزوں سے پاک ہے اس لئے قیامت کے دن مظلومین کے لئے ظالموں سے ضرور انتقام لے گا۔اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ وہ ذات﴿مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾ ہے ہر اچھائی اور برائی کی جزا عطا کرے گا۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور حقوق العباد:

امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ علیہ کے تقوی کی ایک جھلک دیکھیں اور اس تقوی کے اثرات

دیکھیں۔ اور یہ سمجھیں کہ آپ نے حقوق العباد کا کیسے خیال کیا۔

امام صاحب نے ایک مجوسی سے کچھ قرضہ لینا تھا۔ ایک مرتبہ آپ اس کے گھر گئے تا کہ اس سے اپنے قرضہ کا مطالبہ کریں۔ جب آپ اس کے گھر کے دروازے پر پہنچے۔ تو آپ کے نعلین میں سے ایک نعل کو نجاست لگ گئی۔ آپ نے جب نعلین کو جھاڑا۔ تو وہ نجاست مجوسی کی دیوار پر لگ گئی۔ آپ اس معاملہ کو دیکھ کر بہت حیران ہیں کہ کروں تو کیا کروں اگر نجاست کو مجوسی کی دیوار پر رہنے دوں تو دیوار گندی نظر آئے گی۔ اور اگر نجاست کو دیوار سے کھرچتا ہوں تو دیوار کی مٹی بھی گرے گی۔ آپ نے مجوسی کا دروازہ کھٹکایا ایک غلامہ باہر آئی۔ آپ نے اسے کہا کہ اپنے مالک کو جا کر بتاؤ دروازے پر ابو حنیفہ کھڑا ہے وہ مجوسی باہر آیا اس نے سمجھا کہ آپ اپنا قرض لینے کے لئے آئے ہیں۔ اس نے عذر پیش کرنا شروع کیا حیلے، بہانے بنانے لگا۔ امام صاحب نے فرمایا کہ اب تو ایک اور معاملہ درپیش ہے۔ آپ نے اس سے دیوار کا معاملہ بتایا اور فرمایا "**وانه کیف السبیل الی تطهیره**" اس دیوار کو پاک کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ یعنی مقصد یہ تھا کہ اگر یہ اجازت دے دے تو دیوار سے کھرچ کر نجاست کو ہٹایا جائے۔ لیکن مجوسی نے امام صاحب کی بات کو سن کر کہا "**فانا ابدأ بتطهیر نفسی فاسلم فی الحال**" میں پہلے اپنے نفس کو پاک کر لوں یہ کہتے ہوئے اسی وقت اسلام قبول کر لیا۔

اس واقعہ کے بیان سے نکتہ یہ بیان کرنا ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے جب مجوسی پر ظلم سے اجتناب کیا۔ (حالانکہ بظاہر یہ معمولی بات تھی) تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے ظلم سے بچنے کی برکت سے مجوسی کو ایمان کی دولت عطا فرما دی۔ تو جو شخص ظلم سے بچے گا اس کا قیامت کے دن رب تعالیٰ کے ہاں کتنا عظیم مرتبہ ہوگا۔ یعنی قیامت کے دن اس کے ﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ کے جلوے ظاہر ہوں گے یہ سب آنکھوں دیکھا حال ہوگا۔

کسی کی نیکی بھی ضائع نہیں ہوگی:

قیامت کے دن ایک شخص کو اللہ تعالیٰ کے دربار میں لایا جائے گا۔ وہ اپنے اعمال کی طرف نظر کرے

گا۔تو اسے کوئی نیکی نظر نہیں آئے گی۔اسی حال میں اسے ایک آواز آئے گی اے فلاں شخص تو اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں داخل ہو جا۔وہ شخص تعجب سے عرض کرے گا۔اے اللہ میری کون سے نیکی ہے؟ جواب آئے گا ایک مرتبہ تو سویا ہویا تھا تو نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا تھا ''اللہ'' تو پھر سو گیا تھا، تجھے بھول گیا لیکن مین سوتا نہیں مجھے اونگھ نہیں آتی مجھے کوئی چیز بھولتی نہیں مجھے تیری نیکی یاد ہے۔

لیکن یہ خیال رہے یہ فضل کی بات ہے یہ رب تعالیٰ کی مشیت ہے کہ معمولی نیکی سے مومن کو بخش دے لیکن اے انسان رب تعالیٰ کے عدل اور قہر سے بھی غافل نہ رہ اگر ایک ایک گناہ کی جزا دی گئی تو مشکل ہوگی۔اس حال کو بھی نہ بھول صرف فضل کو دیکھتے دیکھتے کہیں نیکیوں سے دور رہ کر اپنی عاقبت کے انجام خیر کو گنوا نہ بیٹھنا۔

فائدہ: رب تعالیٰ نے اپنے پانچ نام ذکر فرمائے۔ ''اللہ ، رب ، الرحمن ، الرحیم ، مالک'' اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ گویا کہ یوں ارشاد فرما رہا ہے:

" خلقتک اولا فانا اله ثم بربیتک بوجوه النعم فانا رب ثم عصیت فسترت علیک فانا رحمن ثم تبت فغفرت لک فانا رحیم ثم لا بد من ایصال الجزاء الیک فانا مالک یوم الدین "

''میں نے تمہیں پہلے پیدا کیا کیونکہ میں اللہ ہوں پھر میں نے مختلف نعمتوں سے تمہاری تربیت کی اس لئے کہ میں رب ہوں پھر تو نے نافرمانی کی میں نے تیری پردہ پوشی کی میں رحمٰن ہوں پھر تو نے توبہ کی میں نے تیری مغفرت کی اس لئے کہ میں رحیم ہوں پھر ضروری ہے کہ میں تجھے جزا عطا کروں اس لئے کہ میں مالک یوم الدین ہوں''۔

تنبیہ: تمام اعمال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے بندے کو اللہ تعالیٰ نے اعمال کا اختیار دے رکھا ہے۔بندہ اپنے اختیار سے اچھے یا برے عمل کرتا ہے۔رب تعالیٰ نے نیکیوں پر اچھی جزا اور برائیوں پر بری جزا کا بھی اعلان فرما رکھا ہے۔برے کام کا کسب برا ہے برے اعمال کی تخلیق بری نہیں۔اللہ تعالیٰ جزا کے دن کا مالک ہے کوئی اس سے بھاگ نہیں سکے گا۔

☆☆☆☆☆

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ

(۱) ''ہم تجھی کو پوجیں اور تجھی سے مدد چاہیں''

(۲) ''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد طلب کرتے ہیں''

غیب سے خطاب کی طرف التفات:

اس سے پہلے تمام اسم ظاہر ذکر کئے گئے ہیں جو غیب کا درجہ رکھتے ہیں ۔ جس کے متعلق بات ہو اسے ''غیب'' کہاجاتا ہے" **الحمد للہ** ، **رب العلمین** ، **الرحمن** ، **الرحیم** ، **مالک یوم الدین** '' تمام درجہ غیب میں ہیں۔ یہاں خطاب شروع ہوگیا "**ایاک نعبد و ایاک نستعین**'' ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی امداد طلب کرتے ہیں۔اس میں کئی وجوہ ہیں:

(۱) عربی حضرات کی عادت ہے کہ وہ غیب سے خطاب ،خطاب سے غیب وغیرہ ذکر کرتے ہیں۔ تا کہ سامع توجہ کرے غوروفکر کرے ،چست ہوکر رہے اسی طرح بلا توجہ نہ گزر جائے۔

(۲) متکلم کے خصوصی اظہارفن کا مظاہرہ بھی ہوتا ہے کہ وہ علم معانی کی التفات کی تمام قسموں سے باخبر ہے۔

(۳) غیب سے شہود کی طرف انتقال پایاجاتا ہے گویا کہ جو پہلے فقط معلوم تھا وہ اب سامنے ہے اور جوغیب تھا وہ حاضر ہوگیا۔

(۴) گویا کہ جو پہلے برھان سے ذہن میں لایاجارہا تھا اب وہ سامنے ہے یعنی برہان (دلیل) سے عیان کی طرف ترقی پائی گئی۔

(۵) سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کا ذکر جب الحمد للہ سے کرتا ہے۔اور تمام آفاق اورنفوس میں تفکر کرتا ہے اسے ایک ہی ذات مولائے کائنات کی رب العلمین نظر آتی ہے وہ جب بار بارتوجہ کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے وہ رحمٰن ہے اور رحیم ہے ۔پھر جب یہ خیال کرتا

ہے کہ مومنین پر سب سے زیادہ اس کی رحمت قیامت میں پائی جائے گی۔تو وہ سمجھتا ہے کہ وہ مالک یوم الدین ہے۔

ان صفات میں غور وفکر سے اسکی صفت، اس کی عظمت شان، اوراس کی غالب سلطنت کو جب پہچان لیتا ہے، اوراس تک پہنچنے کے لئے وہ معرفت کے سمندر میں غوطہ زن ہوتا ہے۔تو اہل مشاہدہ سے ہوجاتا ہے اب وہ اپنے آپ کواس درجہ میں سمجھتا ہے کہ گویا کہ میں رب تعالیٰ کو ظاہر ظاہر دیکھ رہا ہوں۔" اللهم اجعلنا من الواصلين الى العين دون السامعين للاثر "(بیضاوی مع حاشیۃ الشہاب مدارک)

یا اس طرح کہا جائے: مقام ولایت کی منازل کو طے کرنے والا، راہ سلوک پر چلنے والا، جب اپنے نفس کا تزکیہ کرتا ہے اوراپنے دل کے آئینہ کو روشن وصاف کرلیتا ہے۔تو اس پر ولایت کی عنایت کے انوار روشن ہوجاتے ہیں جب وہ اپنے پاکیزہ نفس کو دنیا سے ہٹا کر صرف رب تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوکر اس کی کامل نعمتوں کے آثار دیکھتا ہے اور بے حد مہربانیوں کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے "الحمد للہ "۔جب وہ الحمد للہ کا ذکر کرتا ہے تو اس سے رب العلمین کے معنی سے عزت کے پردوں سے حجاب ہٹ جاتے ہیں۔اس کیفیت کے بعد وہ اللہ تعالیٰ کے بغیر ہر چیز کو مقام فنا میں سمجھتا ہے اور ہر ایک کو تربیت کا محتاج سمجھتا ہے اب غیروں کی طرف سکون حاصل کرنے کی ظلمت سے نجات طلب کرتا ہے جب انسان اس حال میں پہنچتا ہے کہ اس کی توجہ کا مرکز صرف اللہ تعالیٰ ہوتا ہے تو رب قدوس کی طرف سے بھی اس پر رحمٰن ورحیم کی مہربانیوں کی باد نسیم کے جھونکے اسے حاصل ہوتے ہیں پھر وہ انسان گویا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے "لمن الملک الیوم "کی آواز سنتا ہے تو اپنے آپ کو اس ذات کبریاء کے سپرد کرتے ہوئے یوں کہتا ہے "مالک یوم الدین "۔

پھر وہ راہ سلوک پر چلنے والا، ولایت کی منازل طے کرنے والا اپنے آپ کو اس مقام پر سمجھتا ہے کہ گویا کہ رب تعالیٰ کا مشاہدہ کر رہا ہے۔اور براہ راست خطاب کرتے ہوئے گویا کہ یوں کہہ رہا ہوتا ہے "اسلمت نفسی الیک واقبلت بکلیتی علیک " اے مولائے کائنات میں نے اپنے آپ کو تیرے سپرد کردیا۔اور کلی طور پر اپنے آپ کو تیری طرف متوجہ کرتا ہوں۔اب وہ مقام وصول میں ہوتا ہے اور یہ کہتا ہے "فحققت نسبۃ العبودیۃ " میں اپنی عبودیت کی نسبت کو ثابت

کرتا ہوں۔اب وہ رب کے حضور عرض کرتا ہے "ایاک نعبد " یہاں سالک کے مقام کی انتہا ہوجاتی ہے:

" الا یری الی سید الخلق وحبیب الحق کیف عبر عن مقامه هذا بقوله ،
سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلاً "

کیا یہ نہیں دیکھا جاتا کہ مخلوق کے سردار رب کے حبیب علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنے اس مقام کو کس طرح بیان فرمایا اس قول سے" پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندہ کو رات کے تھوڑے سے حصہ میں سیر کرائی"

یہ مصطفیٰ کریم ﷺ کی رب تعالیٰ کی طرف رسائی کا ذکر ہے آپ کے معراج کا ذکر ہے لیکن بندوں کی معراج کیا ہے؟ "الصلوۃ معراج المؤمنین " نماز مومنوں کی معراج ہے۔

خلاصہ کلام: انسان جب رب تعالیٰ کی حمد کرتا ہے اور رب العلمین کہتا ہے اور رحمن ورحیم کہتا ہے اور مالک یوم الدین کہتا ہے اور اپنے آپ کو اس قابل سمجھتا ہے کہ میں گویا کہ رب تعالیٰ کا مشاہدہ کررہاں ہوں تو وہ مقام احسان میں ہوتا ہے۔ (از روح المعانی)

احسان کیا ہے؟ ایک طویل حدیث ہے جس میں ذکر ہے کہ جبرائیل انسانی شکل میں آئے۔اور نبی کریم ﷺ سے چند سوال کئے تا کہ صحابہ کرام انکے جوابات سے علم حاصل کرلیں ۔اس حدیث پاک میں ایک سوال یہ تھا"قال فاخبرنی عن الاحسان " جبرائیل نے عرض کیا (یا رسول اللہ) مجھے احسان کے متعلق خبر دیں کہ احسان کیا ہے؟"قال ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانه یراک " آپ نے فرمایا یہ کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو پس اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو بیشک وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

الفاظ مذکورہ کی وضاحت:

عبادت کے متعلق انشاء اللہ بعد میں ذکر آرہا ہے۔یہاں بعد والے الفاظ کی وضاحت ذکر کی جا رہی ہے۔نبی کریم ﷺ کے یہ مختصر الفاظ جوامع الکلم سے ہیں جو کثیر معانی پر مشتمل ہیں اس کی مختلف وجوہ ہیں۔

(۱) یعنی تیری عبادت ایسی ہو جیسا کہ تو اسے دیکھ کر عبادت کر رہا ہے یقیناً اس عبادت میں ایک عجیب کیفیت پائی جائے گی۔

(۲) دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ تو اس ذات کی عبادت کر اس حال میں کہ تو اپنے آپ کو اس ذات کے مشابہ سمجھ جو رب تعالیٰ کو دیکھ کر عبادت کر رہا ہے یقیناً جو رب تعالیٰ کی عبادت اس طرح کر رہا ہو اس کے دل میں خوف، حیاء، خضوع وخشوع، ادب، صفائی قلب اور وفاء پائی جائے گی۔ یعنی بندہ جب اپنے رب تعالیٰ کے حضور کھڑا ہو۔ تو اپنی طاقت کے مطابق عمل میں احسان (خلوص) میں سے کچھ چیز بھی نہ چھوڑے۔ اور اس کی توجہ ذات کبریاء کے بغیر کسی اور کی طرف نہ جائے۔ اصل عبادت یہی ہے کہ باوجود اس کے کہ وہ جس ذات کے لئے عمل کر رہا ہے اسے نہ دیکھ رہا ہو پھر بھی عمل میں خلوص پایا جائے۔ لیکن جب عمل کرنے والا اس ذات کو دیکھ رہا ہو جس کے لئے وہ عمل میں کوشش کر رہا ہے تو یقیناً وہ اپنے عمل میں اور زیادہ حسن وکمال پیدا کرنے کی کوشش کرے گا۔ "**فان لم تکن تراہ فانہ یراک**" اگر تم اس سے ایسا معاملہ نہیں کر رہے جو دیکھنے والا کرتا ہے تو وہ تمہارے ساتھ دیکھنے والے کا مطالعہ کر رہا ہے گویا کہ یوں فرمایا گیا ہے "**فاحسن فی عملک فانہ یراک**" "اپنے عمل میں حسن ونکھار پیدا کرو۔ خلوص سے عمل کرو کیونکہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

بعض عارفین نے فرمایا پہلا مقام مکاشفہ کا ہے یعنی جب تو اپنے عبد ہونے میں خلوص پیدا کرے گا رب تعالیٰ کی عبادت خشوع وخضوع سے کرے گا۔ اور غیروں کی طرف دھیان نہیں جائے گا تو تیرے دل میں رب تعالیٰ کے انوار کی تجلیات روشن وعیاں ہو جائیں گی۔ یہی مطلب ہے حدیث پاک میں استعمال شدہ الفاظ مبارکہ "**کانک تراہ**" گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے۔

دوسرا مقام مراقبہ کا ہے کہ اگر عبادت کرنے والا مقام کشف تک نہیں پہنچا تو یہ خیال کرے کہ میں نے اپنی عبادت میں خلوص خشوع وخضوع سے درجہ مکاشفہ تک پہنچنا ہے ابھی تک وہ مقام انتظار میں ہے گردن جھکا کر مقام تصور میں اس مقام کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جسے عارفین کی اصطلاح میں مراقبہ کہا گیا ہے۔ حدیث پاک کے الفاظ مبارکہ "**فان لم تکن تراہ فانہ یراک**" (اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے) کا یہی مطلب ہے کہ مقام مراقبہ میں کمال پیدا کرتا کہ تجھے مقام مکاشفہ حاصل ہو جائے۔

لب لباب: حاصل کلام یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کر ایسے حال میں کہ تجھے اپنے وجود کا شعور حاصل ہو یعنی زندگی بھر عبادت کر۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ﴾ اپنے رب کی عبادت کر یہاں تک کہ تجھے موت آ جائے۔ اس لئے جب تم فنا ہو جاؤ گے حقیقی طور پر یعنی تم پر ظاہری طور پر جب موت آ جائیگی۔ " تراه رؤية حقيقة وترتفع العبادات التكليفية " تو تم رب تعالیٰ کو حقیقۃً دیکھ لو گے اور تم سے عبادات تکلیفیہ اٹھالی جائیں گی:

" واذا مت موتا مجاز یاو دخلت فی حال الفناء وبقیت فی مقام البقاء تراه رؤية مشاهدة غيبة تسقط عنك ثقل العبادات البدنية او نفس الاعمال الظاهرية عند غليات الجذبات الباطنية "

" جب تجھے مجازی طور پر موت آئے یعنی تو فنافی اللہ کے مقام میں پہنچ جائے اس وقت تو حقیقۃً مقام بقاء کو حاصل کرے گا اس حال میں تو رب تعالیٰ کا غیبی مشاہدہ کرے گا یعنی اگرچہ وہ تجھ سے بظاہر غیب ہی ہوگا لیکن تیرے تصور میں تجھے نظر آ رہا ہو گا جب تو مقام مجذوبیت میں پہنچ جائے گا۔ یعنی تجھے اپنے آپ کا بھی جب پتہ نہ رہے تو تجھ سے بدنی عبادات کا بوجھ اور ظاہری اعمال کی تکلیف کو اٹھا لیا جائے گا"۔

کانک تراه کا مطلب واضح ہو گیا: اب یہاں سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ حضور ﷺ نے " کانک تراه " (گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے) یہ نہیں فرمایا "انک تراه " کہ بیشک تو اسے دیکھ رہا ہے۔ اس لئے کہ حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھنا دنیا میں واقع نہیں ہوگا کیونکہ مسلم شریف میں نفی رؤیت کا ذکر ہے "واعلموا انکم لن تروا ربکم حتی تموتو "جان لو بیشک تم اپنے رب کو ہرگز نہیں دیکھ سکو گے یہاں تک کہ تم فوت ہو جاؤ۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دنیا میں بصر کو فناء کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس لئے اس میں طاقت نہیں کہ باقی (اللہ تعالیٰ جو باقی رہنے والا ہے) کو دیکھ سکے:

" بخلافه فی الآخرة فانه لما خلق للبقاء الابدی قوی وقدر علی نظر الباقی سبحانه "

بخلاف آخرت کے کہ وہاں بصر کو بقاء ابدی حاصل ہوگی۔ اس لئے اس میں یہ قوت وقدرت بھی حاصل ہوگی کہ باقی رہنے والی پاک ذات کو بھی دیکھ سکے۔

اعتراض: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محققین حضرات نے تو یہ فرمایا "رؤیته صلی الله عليه وسلم ليلة الاسراء بعين رأسه " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج کی رات سر کی

آنکھوں سے رب تعالیٰ کو دیکھنا ثابت ہے۔ یہ قول حدیث پاک کے کس طرح مطابق ہوگا کہ رب تعالیٰ کو موت سے پہلے دیکھنا ممکن نہیں۔

جواب: " اما علی انه مستثنی و اما لکونه فی الملکوت الاعلی الذی لایصدق علیه الدنیا ونزاع المعتزلة معروف فی هذه المسئلة "

اس کے دو جواب دیئے گئے ہیں ایک تو یہ ہے کہ حدیث پاک کے عموم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیکھنا دوسری احادیث سے مستثنیٰ ہے دوسرا جواب یہ ہے کہ جس حدیث پاک میں رب تعالیٰ کو دیکھنے سے ممانعت ثابت ہو رہی ہے اس کا تعلق دنیا سے ہے کہ اس دنیا میں رہتے ہوئے رب تعالیٰ کو کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔ نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ کو اس دنیا میں تو نہیں دیکھا بلکہ آپ نے تو ملکوت اعلیٰ میں دیکھا لہذا اعتراض خود بخود ہی اٹھ گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ کے رب تعالیٰ کو دیکھنے میں معتزلہ نے انکار کیا ہے۔ ان کا اختلاف مشہور و معروف ہے تاہم ہمیں معتزلہ سے کیا۔ ہم تو محققین اہل سنت و جماعت کی محبت بھری تحقیق کو مانتے ہیں۔

نکتہ عجیب: جبرائیل نبی کریم ﷺ سے سوال کرتے جا رہے تھے اور آپ جواب دے رہے تھے جب بھی آپ جواب دیتے جبرائیل کہتے "صدقت" یا رسول اللہ آپ نے سچ ارشاد فرمایا لیکن احسان کے جواب میں جبرائیل نے "صدقت" نہیں کہا اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے:

" ان الاحسان هو الاخلاص وهو سر من اسرار الله تعالیٰ لایطلع علیه ملک مقرب ولا نبی مرسل "

" بے شک احسان اخلاص ہے وہ اللہ تعالیٰ کے رازوں میں سے ایک راز ہے جس پر کوئی مقرب فرشتہ مطلع نہیں اور کوئی نبی مرسل اس پر مطلع نہیں "۔ (از مرقاۃ ج اول ص ۲۰، ۲۱)

سبحان اللہ ! جسے جبرائیل نہ جانے، کوئی فرشتہ، کوئی نبی نہ جانے اسے میرے حبیب پاک علیہ التحیۃ والثناء جانیں۔

﴿ اِیَّاكَ نَعْبُدُ ﴾ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔

یہ تخصیص والا معنی "ایاک" ضمیر کے فعل سے پہلے آنے کی وجہ سے کیا جاتا ہے کیونکہ عربی کا

ایک ضابطہ ہے "التقديم ماحقه التاخير يفيد الحصر" جس کا حق مؤخر ذکر کرنا ہو، اسے مقدم ذکر کیا جائے تو تخصیص کا فائدہ حاصل ہوگا۔

عبادت کیا ہے؟ "العبادة اقصى غاية الخضوع والتذلل" بہت زیادہ خضوع اور اپنے آپ کو کم تر بنانے کا نام عبادت ہے۔ اسی وجہ سے جس راستہ پر لوگ زیادہ چلیں اسے "طريق معبد" کہتے ہیں۔ یعنی اس راستہ کو زیادہ روندا جاتا ہے۔ (بیضاوی) "وفي الشرع وهي ما يجمع كمال المحبة والخضوع والخوف" شریعت میں عبادت اسے کہا جاتا ہے جو کمالِ محبت اور کمالِ خضوع اور کمالِ خوف کا مجموعہ ہو۔ (ابن کثیر)

قیام اور جھکنا عبادت نہیں:

عبادت میں جب بہت زیادہ تعظیم انتہائی درجہ کی تعظیم کا پایا جانا ضروری ہے تو واضح ہوا کہ "فخرج القيام والانحناء لنوع تعظيم" قیام اور جھکنا عبادت سے خارج ہیں کیونکہ ان میں اعلیٰ درجہ کی تعظیم یعنی جو تعظیم کا انتہائی درجہ ہے وہ نہیں پائی گئی بلکہ صرف تعظیم کی ایک قسم پائی گئی ہے۔

(تفسیر الصی)

راغب نے بیان کیا ہے عبادت فعل اختیاری ہے خواہشات بدنیہ کے خلاف چیز کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ کے تقرب کی نیت سے اور شریعت کی طاعت کے ارادہ سے رب کے حضور جھکنے کو عبادت کہا جاتا ہے۔ بندے کو جتنی رب تعالیٰ کی معرفت زیادہ حاصل ہوتی ہے اتنا ہی اس کا مقام عبودیت میں زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے انبیاء کرام اور اولو العزم ہستیوں کو عبادات میں بھی ایک خصوصی مقام حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ انہیں معرفت زیادہ حاصل ہوتی ہے۔

(مرقاۃ ج اول ص ۲۰)

عبادت کے تین درجے ہیں: عبادۃ، عبودیۃ، عبودۃ۔ (روح المعانی، مرقاۃ)

پہلا درجہ عبادت: جب انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے مقصد ثواب کو حاصل کرنا ہو اور عذاب سے بچنا مقصود ہو اسے عبادت کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ درجہ پست ہے۔ کیونکہ اس میں معبود حقیقت

میں ثواب ہو گیا۔ جب مطلوب ثواب ہوا اور اللہ تعالیٰ اس مطلوب کے حصول کا ذریعہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مخلوق کو مقصود بنالیا گیا۔ (کیونکہ ثواب بھی مخلوق ہے) اور خالق کو ذریعہ اور وسیلہ یہ مقام عبادت کا گھٹیا مقام ہے۔

دوسرا درجہ: اللہ تعالیٰ کی عبادت اس لئے کرتا ہے کہ عبادت اعلیٰ چیز کا نام ہے یا اس لئے کہ مجھے رب تعالیٰ نے مکلف بنایا ہے احکام تکلیفیہ کو قبول کرنے میں شرافت وعزت ہے۔ یا اس لئے کہ میں نے عبادت کی تو میری نسبت عبادت کی طرف ہوگی مجھے عابد کہا جائے گا یہ درجہ پہلے درجہ سے اعلیٰ ہے لیکن اس میں بھی بہت کمال نہیں پایا گیا کیونکہ اس میں بھی مقصود بالذات غیر اللہ ہے۔

تنبیہ: روح المعانی اور مرقاۃ میں اس درجے کا نام عبودیۃ رکھا گیا ہے اور تیسرا درجہ جس کا ذکر ان شاء اللہ قریب ہی آرہا ہے۔ اس کا نام عبودۃ رکھا ہے۔ لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ علیہ نے پہلے اور دوسرے دونوں کا نام عبادۃ رکھا ہے البتہ دو درجے بنا دیئے ہیں اور تیسرے کا نام انہوں نے عبودیت رکھا ہے۔ میں چونکہ تفسیر کبیر سے لکھ رہا ہوں۔ اس لئے آنے والی بحث اور نام کبیر کے حوالہ سے ہی دیکھیں جائیں۔

تیسرا درجہ: انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے صرف اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ معبود ہے خالق ہے اور میں اس کا عبد (بندہ) ہوں رب تعالیٰ کو جب الہ (معبود) تصور کر کے عبادت کرے گا تو اس کی الوھیۃ سے ہی اس کی ہیبت اس کا رعب اور اس کا غالب ہونا سمجھ آجائے گا۔ اور جب یہ تصور کرے گا کہ میں اس کا عبد ہوں تو اپنی عبودیۃ کے تصور سے ہی خضوع اور عجز وانکساری اور اپنے آپ کا پست حقیر، گھٹیا ہونا سمجھ آجائے گا۔ یہ مقام اعلیٰ اور اشرف ہے اس کا نام عبودیۃ ہے:

" والیه الاشارة بقول المصلی فی اول الصلوة اصلی لله فانه لو قال اصلی لثواب الله او للهرب من عقابه فسدت صلوته "

• یہ جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ نماز میں عبادت میں صرف اللہ تعالیٰ کا خیال ہو ثواب حاصل ہونے اور عذاب سے بچنے کی طرف دھیان نہ ہو یہ نماز کی نیت سے ہی سمجھ میں آتا ہے کہ نمازی نیت کرتا ہی تو کہتا ہے۔ "اصلی لله " میں اللہ کے لئے نماز ادا کر رہا ہوں یہ نیت درست ہے اس سے نماز صحیح ادا ہو

گی۔لیکن اگر وہ نیت کرتے ہوئے یوں کہے"اصلی لثواب الله " میں نماز اس لئے ادا کر رہا ہوں تا کہ اللہ تعالیٰ سے ثواب حاصل ہور یا اس طرح نیت کرے" اصلی للهرب من عقاب الله " میں اس لئے نماز ادا کر رہاں ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ جاؤں تو ان دونوں صورتوں میں نیت صحیح نہیں ہوگی۔ بلکہ "فسدت صلوته "اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔

فائدہ: علامہ رازی رحمہ اللہ کے یہ الفاظ "والیه الاشارة بقول المصلی فی اول الصلوة اصلی لله" کو بار بار پڑھو۔غور اور توجہ سے پڑھیں ترجمہ کی طرف کامل توجہ کریں۔نمازی کی نماز کی ابتداء میں "اصلی لله " (میں اللہ کے لئے نماز ادا کر رہا ہوں) کہنے سے اس طرف اشارہ پایا گیا ہے (کہ عبادت صرف اللہ کے لئے ہو)۔تو اس توجہ سے یہ مسئلہ حل ہو گیا کہ نماز میں زبان سے نیت کرنا سلف صالحین سے چلا آ رہا ہے اگرچہ فرض صرف دل سے نیت کرنا ہے لیکن زبان سے ادا کرنا مستحب ہے تا کہ زبان اور دل کی نیت موافق ہو جائیں۔اس مسئلہ میں اختلاف اور اشتہار بازی صرف پاکستان اور ہندوستان کے جہلاء کی ہے۔ورنہ اہل علم نے استحباب پر عمل کرنے سے کبھی کسی کو نہیں روکا۔

عبادت اور عبودیت کا مقام اشرفیت:

یہ بھی خیال رہے کہ عبادت فی ذاتہ اعلیٰ اور اشرف مقام رکھتی ہے۔یہ تین درجے عبادت کے ایک دوسرے درجے کی طرف نسبت کرنے سے حاصل ہوئے۔اس لحاظ پر کسی کو اعلیٰ کسی کو گھٹیا اور کسی کو درمیانے درجہ کا ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ورنہ عبادت کے کسی درجہ کو بھی اس وقت تک گھٹیا کہنا شدید غلطی ہوگی جب تک ان میں ایک دوسرے کی طرف نسبت کا لحاظ نہ کیا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے مطلقاً ذکر فرمایا" واعلم ان العبادة والعبودية مقام عال شريف" تو جان لے کہ بیشک عبادت اور عبودیت بلند اور اشرف مقام رکھتی ہیں۔اس کے بعد فرمایا کہ ان کی بلندی ،رفعت اور اشرفیت پر کئی آیات دلالت کرتی ہیں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّکَ یَضِیْقُ صَدْرُکَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ

وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ۞

اور بیشک ہمیں معلوم ہے کہ ان کی باتوں سے تم دل تنگ ہوتے ہو تو اپنے رب کی تعریف کرتے ہوئے اس کی پاکی بیان کرو اور سجدہ کرنے والوں میں ہو جاؤ۔ اور مرتے دم تک اپنے رب کی عبادت میں رہو۔ ایک تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ۞وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ۞ نبی کریم ﷺ کو رب تعالیٰ نے حکم دیا کہ آپ ہمیشہ عبادت کرتے رہنا یہاں تک کہ تمہارا اس دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آ جائے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی وقت میں بھی عبادت میں خلل واقع نہ ہونے دیا جائے "وذلک یدل علی غایة جلالة امر العبادة " اسی سے واضح ہو گیا کہ امر عبادت میں اعلیٰ درجہ کی بزرگی شرافت اور رفعت پائی گئی ہے۔

اور استدلال کی دوسری وجہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ۞ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ۞ بیشک ہمیں معلوم ہے کہ ان کی باتوں سے تم دل تنگ ہوتے ہو۔ اس کے بعد چار چیزوں کا حکم دیا تسبیح کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا فَسَبِّحْ ! تَحْمِيْدَ کا حکم ان الفاظ مبارکہ سے دیا "بِحَمْدِ رَبِّكَ "اور سجود کا حکم دیتے ہوئے یہ ذکر فرمایا ۞وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۞ اور عبادت کا حکم دیا تو یہ ارشاد فرمایا ۞وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ۞ رب تعالیٰ نے جس ترتیب سے ذکر فرمایا کہ کافروں کی باتوں سے آپ کے دل کو تنگی ہوتی ہے۔ آپ اپنے رب کی تسبیح بیان کریں اور اپنے رب کی حمد کریں اور رب کے حضور سر بسجود ہو جائیں اور مرتے دم تک اپنے رب کی عبادت کریں۔ اس ترتیب سے ہی پتہ چل گیا کہ عبادت دل کی تنگی کو ختم کرتی ہے اور سینہ کو کشادگی عطا کرتی ہے:

" وما ذاک الا لان العبادة توجب الرجوع من الخلق الی الحق وذلک یوجب زوال ضیق القلب "

اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ عبادت کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق سے توجہ ہٹا کر رب تعالیٰ کی طرف رجوع کیا جائے جب یہ حالت حاصل ہو گی تو یقینی بات ہے کہ دل سے پریشانیوں کا زوال ہو گا کیونکہ دل تنگی تب ہی حاصل ہوتی ہے جب مخلوق کی طرف توجہ کی جائے جب ہمہ تن خالق کی طرف توجہ ہو گی تو کوئی پریشانی دل میں نہیں رہے گی۔

عبودیت کی اشرفیت پر دلیل:

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ ﴿ سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلاً ﴾ پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے عبد (بندے) کو رات کے تھوڑے سے حصہ میں سیر کرائی۔ اس آیۃ کریمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ مقام معراج کا ذکر فرمایا اس اعلیٰ مقام میں آپ کا وصف عبد ہونا ذکر فرمایا تو اس سے واضح ہوا کہ عبودیت کو اشرف مقام حاصل ہے۔

نبی کی عبودیت نبی کی رسالت سے اعلیٰ ہے:

" العبودیة اشرف من الرسالة لان بالعبودیة ینصرف من الخلق الی الحق وبالرسالة ینصرف من الحق الی الخلق وایضا بسبب العبودیة ینعزل عن التصرفات وبسبب الرسالة یقبل علی التصرفات واللائق بالعبد الانعزال عن التصرفات "

عبودیت رسالت سے اشرف ہے کیونکہ عبودیت میں مخلوق سے توجہ ہٹا کر رب تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا ہوتا ہے اور رسالت میں رب تعالیٰ کے احکام بندوں تک پہنچانے ہوتے ہیں اس لئے مخلوق کی طرف متوجہ ہونا بھی رب تعالیٰ کے حکم سے ضروری ہوتا ہے۔ جتنی دیر مخلوق کی طرف توجہ ہوگی اتنی دیر یقیناً خالق کی طرف توجہ میں کمی واقع ہوگی''۔

اور وجہ یہ ہے کہ عبودیت میں تصرفات کو ختم کرنا ہوتا ہے صرف خالق کی عبادت میں مشغول ہونا ہے لیکن رسالت میں تصرفات کو قبول کرنا ہوتا ہے۔ یعنی تبلیغ دین میں مشغولیت بھی ضروری ہوتی ہے۔ اس لئے عبودیت کا مقام اشرف ہوتا ہے کہ بندے کے لائق یہی ہے۔ کہ وہ تصرفات سے دور رہے اور خالق کی ذات ہی اس کے مدنظر رہے۔ "وایضا العبد یتکفل المولی باصلاح مهماته والرسول هو المتکفل باصلاح مهمات الامة " عبودیت کے اشرف ہونے کی اور وجہ یہ ہے کہ عبد اپنے مہمات کی اصلاح کے لئے مولیٰ کو اپنا کفیل بناتا ہے۔ اور رسول کو اپنی امت کی مہمات (مشکل کام) میں اپنے آپ کو کفیل بنانا ہوتا ہے۔

تنبیہ: ابھی جو بیان کیا ہے کہ عبودیت ،رسالت سے افضل، اعلیٰ، اشرف ہے اس عبودیت سے مراد نبی کی عبودیت ہے، کسی عام انسان کی عبودیت کو رسالت سے افضل ہونے کا قول کر کے اپنے ایمان کا رگڑا نہ نکال دینا۔

عبودیت کی اشرفیت پر اور دلیل:

عیسیٰ علیہ السلام ابھی چند دنوں کے ہی تھے تو آپ نے پہلا کلام یہ فرمایا" انی عبداللہ " میں اللہ کا بندہ ہوں آپ کا رب تعالیٰ کی عبودیت کا ذکر آپ کی والدہ کی پاک دامنی کا سبب بنا۔اور اپنی ذات سے طعن کی دوری کا ذریعہ بنا۔اور ہر قسم کی بھلائی کے حصول کا باعث بنا۔اور تمام آفات کو دور رکھنے کا سبب بنا:

" وایضا لما کان اول کلام عیسی ذکرالعبودیة کانت عاقبة الرفعة کماقال اللہ تعالیٰ ورافعک الی "

اور کمال کی بات یہ ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام نے دنیا میں تشریف لاتے ہی اپنی عبودیت کا ذکر کیا تو رب تعالیٰ نے اس کے انعام میں آپ کو اپنی طرف بلا کر رفعت عطا فرمائی۔یعنی ذکر عبودیت حصول رفعت کا سبب ہے۔اور عجیب بات اس میں یہ پائی گئی کہ جب صرف زبانی دعوٰی عبودیت کا جنت میں رفعت حاصل کرنے کا سبب ہے۔تو یہ کیسے ہوسکتا ہے جو کئی سال عمل کے ذریعے رب تعالیٰ کی عبادت کر رہا ہو تو وہ جنت سے محروم رہے۔

عبودیت کی اشرفیت پر اور دلیل:

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا ﴿ اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰـہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ ﴾ بیشک میں ہی ہوں اللہ کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری بندگی کرو۔

اللہ تعالیٰ نے توحید کے بعد عبودیت کا ذکر فرمایا کیونکہ توحید اصل ہے اور عبودیت فرع ہے یا یوں کہا جائے کہ توحید ایک درخت کی مثال ہے اور عبودیت پھل کی مثال ہے، جس طرح درخت اور پھل کا ایک دوسرے کے بغیر قیام نہیں اسی طرح توحید بغیر عبودیت کے نامکمل ہے اور عبودیت بغیر توحید کے بے اصل ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول زرین:

حضرت علی رضی اللہ عنہ رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا کرتے تھے:

" کفی بی فخرا ان اکون لک عبدا وکفی بی شرفا ان تکون لی ربا اللھم انی وجدتک الھا کما اردت فاجعلنی عبدا کما اردت "

مجھے اس پر فخر ہے کہ میں تیرا بندہ ہوں۔ میرے لئے یہی مقام شرافت کافی ہے کہ تو میرا رب ہے۔ اے اللہ میں نے تجھے ایسا ہی معبود پایا جیسا میں چاہتا تھا اے اللہ تو مجھے ایسا بندہ بنادے جیسا تو چاہتا ہے۔

اِیَّاکَ نَعْبُدُ کہا نعبدک نہیں کہا:

دینی مدارس کے طلباء کی توجہ کے لئے علمی نکتہ ذکر کر رہا ہوں۔ اگر چہ اس قسم کے مسائل ان کے ذہن میں ہوتے ہیں لیکن توجہ دلانی مقصود ہے۔ ایاک ضمیر منصوب منفصل ہے اور اگر کہا جاتا "نعبدک" تو "ک" ضمیر منصوب متصل ہوتی۔ اصل یہی ہے کہ ضمیر متصل لانی چاہئے اگر منفصل ضمیر لائی جائے تو اس میں کوئی نکتہ پایا جاتا ہے۔ یہاں کیا نکتہ پایا گیا ہے اس میں چند وجوہ ہیں:

(۱) ایک وجہ تو پہلے ذکر کی جاچکی ہے کہ "ایاک" کو پہلے ذکر کرنے میں تخصیص پائی گئی ہے۔ یعنی "ایاک نعبد" سے معنی یہ حاصل ہوا "لا معبود الا اللہ" اللہ کے بغیر اور کوئی معبود نہیں۔ یہی معنی کلمہ توحید کا ہے۔ تو گویا کہ یوں کہا جائے کہ اس ترتیب سے کلمہ توحید " لا الہ الا اللہ" حاصل ہو گیا۔

(۲) "ایاک" کو پہلے ذکر کر کے رب تعالیٰ نے اپنی ذات کے متعلق بتادیا کہ اے عبادت کرنے والے تو پہلے مجھے یاد کر تا کہ تجھے معلوم ہو جائے کہ معبود صرف میں ہی ہوں جب تجھے یہ معلوم ہو جائے گا کہ معبود برحق صرف اللہ تعالیٰ ہے تو تعظیم میں تو سستی نہیں کرے گا اور دائیں بائیں نہیں توجہ کرے گا۔" عرفه ذاته اولا حتی تحصل العبادة مع الحشمة فلا تمتزج بالغفلة " تو پہلے اللہ تعالیٰ کی ذات کو پہچان تا کہ جب تو عبادت کرے تو تجھے اس ذات کا رعب اور اس کی حشمت بھی حاصل

رہے گی اس طرح تو عبادت میں غفلت کونہیں آنے دے گا۔

(۳) جب تجھ پر طاعات بھاری ہو جائیں عبادات کو تو مشکل سمجھے یعنی قیام، رکوع اور سجود کو تو اپنے لئے مشکل سمجھے، تو "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" کہہ کر پہلے مجھے یاد کر اور میری معرفت کو اپنے دل میں حاضر کر جب تو میرے جلال اور میری عظمت وعزت کو یاد کرے گا تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ میں تیرا مولی ہوں اور تو میرا اعبد (بندہ) ہے جب تجھے یہ معلوم ہو جائے گا تو تجھ پر عبادت آسان ہو جائے گی۔

حقیقت یہی ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ عاشق اپنے معشوق کے سامنے اس کی مرضی کے مطابق مشکل کام کو آسان سمجھتا ہے تو وہ شخص جو عبادت میں اپنے آپ کو اس درجہ میں سمجھتا ہے کہ گویا کہ وہ اپنے رب تعالیٰ کے جمال کا مشاہدہ کر رہا ہے تو یقینی بات ہے کہ وہ عبادت کو آسان سمجھے گا اسے کوئی مشکل نظر نہیں آئے گی۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طَآئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَاهُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴾ بیشک وہ جو متقی ہیں جب ان کو کوئی شیطانی خیال مس کرتا ہے تو وہ یاد کرتے ہیں (یعنی اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں) اس وقت ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ یعنی نفس کو شیطان اسی وقت مس کرتا ہے جب کہ اس میں سستی پائی جائے اور غفلت پائی جائے۔ اور نفس میں گناہوں کی دلیری پائی جائے۔ لیکن متقی لوگ یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے شیطان کے اثر انداز ہوتے ہی اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں۔ اور اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان کی آنکھیں جلدی ہی کھل جاتی ہیں۔ وہ شیطان کے اثر انداز ہونے کو بہت جلدی محسوس کر لیتے ہیں۔ جب انسان "ایاک نعبد" کہہ کر پہلے اللہ تعالیٰ کو یاد کرے گا تو عبادت کے ادا کرنے میں اپنے آپ کو تیار کرے گا اور شیطانی اثر سے محفوظ رہے گا۔

(۵) اگر انسان "نعبدک" کہتا تو "نعبد" کا مطلب ہوتا ہم عبادت کرتے ہیں ابھی تک "ک" کے ذکر سے پہلے یہ معلوم نہیں تھا کہ کس کی عبادت کرتے ہیں۔ ابلیس کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا ہوسکتا ہے وہ "ک" تیری کہنے سے پہلی ہی یہ وہم ڈالتا کہ یہ عبادت بتوں کے لئے ہے۔ یا سورج کی عبادت ہے، یا چاند کی عبادت لیکن جب "ایاک" پہلے آ گیا تو مقصود پہلے ذکر کر دیا گیا کہ تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اس میں توحید میں ایک خصوصی کمال پیدا ہو گیا۔ اور شرک کا

احتمال ختم ہو گیا۔ابتدائی لفظ سے ہی ابلیس مایوس ہو جاتا ہے۔

(۶) جب اللہ تعالیٰ قدیم ذات ہے۔واجب الوجود ہے تمام مخلوق سے پہلے ہے۔جس کی کوئی ابتدا ہی نہیں تو اس ذات کا ذکر بھی سب اذکار سے پہلے ہونا چاہئے اس لئے جب "ایاک" پہلے پایا گیا تو اللہ تعالیٰ کا ذکر پہلے آ گیا اس کے بعد "نعبد" ہے جس میں انسان کے عبادت کرنے کا ذکر ہے یہی ترتیب ضروری جو ذکر کی گئی۔

(۷) بعض محققین نے بیان کیا ہے کہ جس شخص کی نظر نعمت کے وقت نعمت عطا کرنے والے کی طرف ہو نعمت کی طرف نہ ہو اس کی نظر مصیبت کے وقت بھی مصیبت نازل کرنے والے کی طرف ہوتی ہے مصیبت کی طرف نہیں ہوتی۔ایسی صورت میں وہ تمام احوال میں اللہ تعالیٰ کی معرفت میں مستغرق ہوگا:

نہ نعمت کی خوشی، نہ مصیبت کا غم   رکھتے ہیں نظر خدا پہ ہم

اس شخص کو سعادات میں اعلیٰ مراتب حاصل ہوں گے، عبادات میں عجیب کیف وسرور حاصل ہوگا۔لیکن جس شخص کی نظر نعمت کے وقت نعمت کی طرف ہو نعمت عطا کرنے والے کی طرف نہ ہو اس کی نظر مصیبت کے وقت بھی مصیبت کی طرف ہوگی مصیبت نازل کرنے والے کی طرف نہیں ہوگی۔ایسے شخص کے اوقات غیر اللہ کی یاد میں بسر ہوں گے۔یہ ہمیشہ بدبختی اور مصیبت میں رہے گا کیونکہ نعمت کے حاصل ہونے پر نعمت کے زوال کا خوف رہے گا یہ بھی ایک عذاب ہی ہے اور مصیبت کے وقت رسوائی اور ذلت میں اپنے آپ کو گرفتار سمجھے گا۔اسلئے " ایاک " پہلے ذکر کر کے بندے کو بتایا گیا ہے کہ تیری نظر صرف رب تعالیٰ پر ہو نعمت کا حصول یا مصائب کا وقوع سب ہی رب تعالیٰ کی طرف سے سمجھا جائے۔

فائدہ: اسی تحقیق سے یہ بات بھی حاصل ہوگئی کہ موسیٰ علیہ السلام کی امت کو رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ ﴾ اے بنی اسرائیل یاد کرو میری نعمتوں کو۔جب کہ بنی اسرائیل اپنی کوتاہی سے صرف نعمتوں کی طرف نظر کرتے تھے نعمت عطا کرنے والے کی طرف ان کو نظر نہیں ہوتی تو رب تعالیٰ نے بھی صرف نعمتوں کو یاد کرنے کا حکم دیا۔لیکن نبی کریم ﷺ کی امت کو حکم دیا

فَاذْکُرُوْنِیْ اَذْکُرْکُمْ ﴾ تم یاد کرو مجھے میں تمہیں یاد کروں گا۔اس لئے کہ امت مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کی نظر انعام عطا کرنے والے پر ہوتی ہے نعمتوں پر نہیں۔ یہ حالت خاص لوگوں کی ہے اوران کی حالت کو بیان کر کے عوام کو یہ سمجھایا کہ تم مجھے یاد کرو تمہاری نظر میری طرف ہی ہونی چاہئے صرف نعمتوں کو ہی دیکھنا تمہاری شان کے لائق نہیں تم عظیم نبی کی عظیم امت ہولہذا تم اپنے افعال واقوال میں اپنی عظمت کا ہی لحاظ رکھا کرو۔اب واضح ہوا کہ جب "ایاک" پہلے کہہ کر رب تعالیٰ کو خطاب کرے گا تو گویا کہ وہ رب تعالیٰ کے جلال کے انوار کے مشاہدہ میں مستغرق ہوگا۔

حصول منازل رفعیه: جب انسان اس مقام پر پہنچتا ہے تو وہ رب تعالیٰ کی صفات کا مظہر بن جاتا ہے اس پر حدیث پاک دیکھیں:

"عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ ان الله تعالیٰ قال من عادلی ولیا فقد اذنته بالحرب وما تقرب الی عبدی بشئی احب الی مما افترضت علیه ومایزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی احبیته فاذا احبیته فکنت سمعه الذی یسمع به وبصره الذی یبصر به ویده التی یبطش بها ورجله التی یمشی بها وان سألنی لاعطینه ولئن استعاذنی لا عیذنه"

(بخاری ، مشکوۃ باب ذکر الله عزوجل والتقرب الیه)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا بیشک رب تعالیٰ فرماتا ہے جس شخص نے میرے کسی ایک ولی سے دشمنی کی تو میں اسے لڑائی پر مطلع کرتا ہوں (یعنی اسے اپنے ساتھ جنگ کرنے کا چیلنج کرتا ہوں) میرا بندہ کسی چیز سے بھی اتنا میرے قریب نہیں ہوتا۔جتنا فرائض کی ادائیگی سے ہوتا ہے (فرائض پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ) جب بندہ نوافل کے ذریعے میرے قریب ہوتا ہے تو میں اس سے محبت کرتا ہوں یہاں تک کہ جب میں اسے اپنا محبوب بنا لیتا ہوں۔تو میں اس کی سمع بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور میں اس کی بصر بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور میں اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے۔اور میں اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے سوال کرے تو میں اسے عطا کرتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے پناہ طلب کرے تو میں اسے پناہ دیتا ہوں۔اس حدیث پاک کی تائید میں ایک اور حدیث دیکھئے تو مسئلہ کو سمجھنا بہت آسان ہوجائے گا:

" عن ابن عمر ان عمر بعث جيشا وامر عليهم رجلا يدعى سارية فبينما عمر يخطب فجعل يصيح يا ساری الجبل فقدم رسول من الجيش فقال يا امير المؤمنين يقيناً فاسندنا ظهورنا الى الجبل فهزمهم الله تعالىٰ "

(رواه البيهقي في دلائل النبوة ،مشكوة باب الكرامات)

" حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بیشک حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے ایک لشکر کو بھیجا ان پر امیر ساریہ کو بنایا۔خطبہ دیتے ہوئے آپ نے بلند آواز سے کہا" یا ساری الجبل " اے ساریہ پہاڑ کو لازم پکڑو یعنی اسے پیٹھ کے پیچھے کر دو لشکر میں سے ایک قاصد آیا۔اس نے کہا اے امیر المؤمنین ہمارے دشمن نے جب ہمارا سامنا کیا تو قریب تھا کہ وہ ہمیں شکست دے دیتے لیکن ہم نے ایک آواز سنی ۔جس میں کہا گیا اے ساریہ پہاڑ کو لازم پکڑو یعنی پہاڑ کو پیٹھ پیچھے کر دو ہم نے پہاڑ کو پیچھے کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو شکست دے دی"۔

اس حدیث پاک کی شرح میں علامہ قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدینہ طیبہ میں مسجد نبوی میں خطبہ دے رہے تھے کثیر لوگ موجود تھے۔اکابر صحابہ کرام اور تابعین کا اجتماع تھا۔جن میں حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما بھی تھے۔اور فرماتے تھے:

" وفيه انواع من الكرامة له رضى الله عنه كشف المعركة وايصال صوته وسماع كل منهم لصيحته وفتحهم ونصرتهم ببركته " (مرقاة)

اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کئی کرامات واضح ہوتی ہیں۔آپ نے مدینہ طیبہ میں میدان جنگ کو دیکھ لیا (حالانکہ تقریباً تین سو میل دور وہ میدان جنگ تھا،غالباً ملک کا نام نہاوند تھا) اور آپ نے اپنی آواز وہاں پہنچائی۔وہاں تمام مسلمانوں نے آواز کو سنا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی برکت سے فتح نصیب ہوئی۔ (مرقاة)

مسئلہ واضح ہوگیا کہ نظر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تھی طاقت اس میں رب تعالیٰ کی جلوہ گر تھی۔آواز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تھی طاقت اس میں رب تعالیٰ کی کام کر رہی تھی۔کان حضرت ساریہ رضی اللہ عنہ کے، اور مسلمانوں کے لشکر کے تھے۔لیکن ان میں سننے کی قوت رب تعالیٰ سے حاصل ہو رہی تھی۔

اعتراض: الحمد للہ میں للہ الحمد کیوں نہیں کہا تا کہ تخصیص حاصل ہوتی؟

جواب: ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ "للہ" میں لام تخصیص کا ہے۔ مقام بھی حمد کا تھا اس لئے حمد کو پہلے ذکر کرنے کے باوجود تخصیص بھی پائی گئی لیکن "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" میں سوائے "ایاک" کے مقدم ذکر کرنے کے اور کوئی وجہ تخصیص نہیں تھی۔ اور عجیب نکتہ اس میں یہ بھی ہے۔ کہ حمد غیر اللہ کی بھی جائز ہے اس لئے اس میں تخصیص کی اتنی زیادہ ضرورت بھی نہیں۔ لیکن عبادت غیر اللہ کی جائز نہیں اس لئے اس میں تخصیص کی زیادہ ضرورت تھی۔ اس لئے "الحمدللہ" میں لام کو تخصیص کا نہ بھی مانا جائے اور "للہ" کو مقدم نہ کیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن ایاک نعبد میں "ایاک" کو مقدم نہ کیا جاتا تو تخصیص نہ پائی جاتی اس طرح مقصد عظیم فوت ہو جاتا۔

اعتراض: "نعبد" صیغہ جمع کا ہے۔ اب اس میں دو احتمال ہیں کہ جمع کا صیغہ تعظیم کے لئے لایا گیا۔ یا جمع کا معنی مراد لینے کے لئے دونوں صورتیں باطل ہیں۔ اس لئے کہ جب عبادت کرنے والا ایک شخص ہے تو جمع لانا کس طرح صحیح ہے؟ اور اگر تعظیم کا معنی مراد لیا جائے تو یہ بھی باطل ہے اس لئے کہ وہ عبادت ادا کر رہا ہے۔ عبادت کرتے ہوئے انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے عجز کا اظہار کرے، تعظیم اور رفعت تو تکبر پر دلالت کرتی ہیں۔ رب تعالیٰ کے حضور اپنی عظمت کا ذکر کیسے صحیح ہے۔

جواب: دونوں لحاظ پر جمع کا صیغہ درست ہے۔ خواہ تعظیم کے لئے مراد ہو یا جمع کا معنی ہی مراد لیا جائے ہر ایک معنی مراد لینے میں ایک خصوصی کمال پایا جاتا ہے۔

جمع کا صیغہ بوجہ تعظیم: یہ اصل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیضان ہے بندے کو خصوصی انعام سے نوازا گیا ہے گویا کہ یوں کہا گیا ہے اے انسان جب تو نماز سے باہر ہو اور اکیلے کوئی کام کرے تو یہ کہہ کہ "میں نے یہ کام کیا ہے" یہ نہ کہہ کہ "ہم نے یہ کام کیا ہے" بیشک تیرے ساتھ ہزاروں غلام ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن جب تو نماز میں آئے اور میری عبودیت کا اظہار کرے تو اب کہہ "نعبد" ہم عبادت کرتے ہیں۔ تا کہ سب لوگوں کو پتہ چل جائے "کل من کان عبدالنا کان ملک الدنیا والآخرۃ" کہ جو رب کا عبد ہے وہ دنیا اور آخرت کا بادشاہ ہے۔ وہ اکیلا نہیں اس کے ساتھ اس کی

رعایا بھی ہے۔

اور سب سے عظیم بات یہ ہے کہ "نعبد" میں بظاہر اپنی عظمت اور تکبر نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں اس میں عجز پایا جاتا ہے لیکن "اعبد" میں بظاہر عجز ہے لیکن حقیقت میں اس میں تکبر کی بو پائی جاتی ہے۔اس لئے کہ جب کہے گا "ایاک اعبد" تو اس کا مطلب ہوگا "انی انا العبد" میں ہی تیری عبادت کر رہا ہوں۔اس میں جہاں رب تعالیٰ کی عبادت کی تخصیص ہے وہاں اپنا عبادت گزار ہونے کا بھی دعویٰ پایا گیا۔جب یہ کہا جائے کہ میں عبادت گزار ہوں تو اس میں انداز تکبرانہ ہے۔لیکن جب یہ کہے گا "اِیَاکَ نَعْبُدُ" ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں تو اس میں گویا کہ وہ انسان یہ کہہ رہا ہے کہ اے اللہ تیرے بندے تیری عبادت کرتے ہیں اور تیرے بندوں میں سے میں بھی ایک عاجز بندہ ہوں۔

اب واضح ہوگیا کہ عبادت کرتے ہوئے "میں" اور "ہم" کہنے میں کیا فرق ہے۔اور خصوصاً ظاہر و باطن میں ایک عجیب فرق ہے۔یہی وجہ ہے کہ "من تواضع لله رفعه الله ومن تكبر وضعه الله" جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے لئے عجز اختیار کیا رب تعالیٰ نے اسے رفیع (بلند) مقام عطا کر دیا۔اور جس نے تکبر کیا رب تعالیٰ نے اسے پست کر دیا۔

جمع کا صیغہ بحیثیت جمع: جب جمع کا صیغہ ذکر کیا جائے۔اور مراد بھی جمع ہی لیا جائے۔ تو اس میں بھی خصوصی کمالات پائے جاتے ہیں ۔ان کمالات پر دلالت کرنے والی بھی مختلف وجوہ پائی گئی ہیں۔

(۱) جمع کے صیغہ میں یہ مسئلہ واضح ہوگیا ہے کہ انسان کو چاہئے کہ نماز جماعت سے ادا کرے۔جماعت سے نماز ادا کرنے میں بہت بڑی فضیلت پائی جاتی ہے۔

☆ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "التكبيرة الاولى فى صلوة الجماعة خير من الدنيا وما فيها" جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے میں پہلی تکبیر میں ہی وہ ثواب ہے جو دنیا اور دنیا کی ہر چیز سے بہتر ہے۔

☆ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" صلوۃ الجماعۃ تفضل صلوۃ الفذ بسبع وعشرین درجۃ " جماعت سے نماز ادا کرنا، اکیلے ادا کرنے سے ستائیس درجہ افضل ہے۔ (بخاری ،مسلم ،مشکوۃ باب الجماعۃ وفضلھا)

پھر ایک عجیب حکمت کو دیکھئے مسئلہ یہ ہے کہ انسان کچا پیاز یا تھوم کھا کر مسجد میں نہ آئے تا کہ دوسرے انسانوں کو اس سے تکلیف نہ ہو گویا کہ یہ واضح ہو گیا کہ جماعت سے نماز ادا کرنے میں بڑا ثواب ہے۔ لیکن وہ ثواب مکمل نہیں ہو سکتا جب کہ کوئی انسان دوسرے انسان کو پیاز اور تھوم کی بو سے تکلیف پہنچائے:

" فاذا کان ھذا الثواب لا یفی بذلک فکیف یفی بایذاء المسلم و کیف یفی بالنمیمۃ و الغیبۃ و السعایۃ"

جب جماعت کا ثواب صرف اس وجہ سے مکمل حاصل نہیں ہوتا کہ یہ انسان دوسرے شخص کو پیاز یا تھوم کی بو سے تکلیف پہنچا رہا ہے تو دوسرے مسلمان کو مختلف طریقوں سے ایذا پہنچانا کبھی چغلی سے کبھی غیبت سے، کبھی اسے نقصان پہنچانے کی کوشش میں لگے رہنا کب جماعت کے ثواب کو مکمل کرے گا۔

کاش کی مساجد کی کمیٹی کے لوگوں کو یہ سمجھ آ جائے۔ جو علماء کو ستا کر، ان کی غیبت کر کے، ان کی مخالفت کر کے اپنی نمازوں کو برباد کر رہے ہیں۔ ایسے لوگ مساجد کی خدمت سے ثواب کے بجائے عذاب حاصل کر رہے ہیں۔

(۲) انسان جب جماعت سے نماز ادا کر رہا ہوتا ہے۔ اس وقت اس کا "نعبد" کہنا واضح ہے کہ اے اللہ ہم سب مل کر تیری ہی عبادت کر رہے ہیں۔ لیکن جب اکیلے وہ نماز ادا کر رہا ہو۔ تو پھر بھی جمع کا صیغہ ہی استعمال کرے اس لئے کہ اس کی عبادت کے ساتھ فرشتے بھی شریک ہیں۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ اے اللہ میں اور تیرے فرشتے مل کر تیری ہی عبادت کر رہے ہیں۔ اس لئے جمع کا صیغہ " نعبد " (ہم عبادت کر رہے ہیں) ہی استعمال ہوگا۔

(۳) تمام مومنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ اگر یہ "ایاک اعبد" پڑھتا تو اس میں وہ اپنے عبادت کا تذکرہ تو کرتا لیکن اپنے دوسرے مومنین بھائیوں کی عبادت کا کوئی ذکر نہ ہوتا۔ جب وہ "

ایاک نعبد" کہتا ہے تو وہ اپنی عبادت کے ساتھ دوسرے مشرق ومغرب شمال وجنوب میں رہنے والے مومن بھائیوں کی عبادت کا تذکرہ بھی کرتا ہے۔گویا کہ وہ اپنے مومن بھائیوں کی مہمات کی اصلاح میں کوشش کرتا ہے:

" واذا فعل ذلک قضی اللہ مهماته لقوله علیه السلام من قضی لمسلم حاجة قضی اللہ له جمیع حاجاته "

جب انسان دوسروں کی مشکلات کی بہتری کی کوشش کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ اس کی مشکلات کو دور فرماتا ہے۔اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو کسی مسلمان کی حاجت کو پورا کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ اس کی تمام حاجات کو پورا فرماتا ہے۔

(۴) یہ رب تعالیٰ کا بندے پر خصوصی انعام ہے کیونکہ بندہ جب رب تعالیٰ کی تعریف کرتا ہے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ کہتا ہے تو اسے رب تعالیٰ کے حضور شرف مقبولیت حاصل ہو جاتا ہے۔اب یوں سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے گویا کہ یوں آواز آتی ہے:

" فوضت الینا جمیع محامد الدنیا والآخرة فقد عظم قدرک عندنا وتمکنت منزلتک فی حضرتنا فلا تقتصر علی اصلاح مهماتک وحدک ،ولکن اصلح حوائج جمیع المسلمین فقل ایاک نعبد وایاک نستعین "

اے میرے بندے جب تو نے دنیا اور آخرت کی تمام حمدیں میرے سپرد کر دیں تو تیرا مرتبہ میرے نزدیک عظیم ہو چکا ہے اب صرف اپنی حاجات اور مشکلات کی اصلاح میں کوشش نہ کر۔ بلکہ تو تمام مسلمانوں کی حاجات کو پورا کرنے کیلئے میرے حضور یوں عرض کر ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد طلب کرتے ہیں۔

گویا کہ آسان لفظوں میں یہ کہا جائے خلوص دل سے رب تعالیٰ کی حمد بیان کرنے والا اور عبادت کرنے والا رب تعالیٰ کا مقبول ہو جاتا ہے مقرب ہو جاتا ہے اندازہ لگائیں کہ جمع کے صیغہ میں کیا کمال ہے اور کتنی ہی زیادہ عجیب حکمت ہے۔وہ مسئلہ یہ ہے ، ایک شخص کو کسی دوسرے سے خود رب

تعالیٰ دوسرے مسلمانوں کا حاجت روا بنا دیتا ہے۔

(۵) ایک شرعی مسئلہ کو سامنے رکھئے! اگر ایک شخص دوسرے سے مثال کے طور پر دس بکریوں کا ایک ہی سودا کرے کہ میں ان تمام دس بکریوں کے تمہیں دس ہزار روپے دوں گا۔ بعد میں اسے ایک بکری پسند نہ آئے تو وہ ایک بکری واپس نہیں کر سکتا کہ اس میں عیب ہے۔ بلکہ یا تمام رکھے یا تمام واپس کرے۔

اب اس مسئلہ کے بعد توجہ کریں کہ بندہ رب کے حضور گویا کہ یوں عرض کرتا ہے اے مولائے کائنات میری عبادت اس درجہ کی نہیں کہ میں تیرے حضور پیش کر سکوں کیونکہ وہ تقصیرات کے ساتھ ملی جلی عبادت ہے۔ وہ کوتاہیوں پر مبنی ہے اس لئے رب کائنات میں اپنی عبادت کو تیرے عابدین، متقین کی عبادت کے ساتھ ملا کر تیری حضور پیش کر رہا ہوں ہوسکتا ہے کہ ان کی کامل عبادت سے مل کر میری ناقص عبادت بھی تیرے حضور شرف قبولیت عطا کرے۔

اب مسئلہ جو بیان کیا ہے اس کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں کہ یہ ہو نہیں ہوسکتا کہ وہ اللہ تعالیٰ جو رب العلمین ہے اور رحمٰن ورحیم ہے تمام متقین کی عبادت کو رد کردے۔ جب سب کی عبادت قبول ہوگی۔ تو یہ اس کی شان کریمی سے دور ہے کہ ایک کی عبادت کو رد کردے:

" وحننيذ عبادة هذا القائل مقبولة ببركة قبول عبادة غيره "

''اس وقت اس شخص کی عبادت دوسروں کی عبادت کی برکت سے قبول ہو جائے گی''

گویا یہ شخص عرض کرتا ہے کہ مولائے کائنات اگر میری عبادت قبولیت کے قابل نہیں تو اسے رد نہ کر کیونکہ میں اکیلا نہیں میرے ساتھ تو تیرے مقبول بندوں کی عبادت بھی ہے۔ لہذا انبیاء کرام ملائکہ اور اولیاء کرام کی عبادت کے وسیلہ جلیلہ سے ہر شخص کی عبادت قبول ہو جائے گی، خواہ عبادت کرنے والا اپنی عبادت میں کوتاہیاں ہی کیوں نہ کرے۔

کمالات عبادت:

جس شخص کو عبادت کے فوائد اور کمالات کا پتہ چل جائے وہ عبادت میں مشغولیت آسان سمجھے گا۔ اور دوسرے کاموں میں مشغولیت کو مشکل سمجھے گا۔ اس میں چند وجوہ پائی جاتی ہیں:

(۱) کمال خود ذاتی طور پر محبوب چیز کا نام ہے۔ انسان کے احوال میں کمال اور قوت پیدا ہوتی ہے

جب وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی سعادت حاصل کرنے میں مشغول ہوتا ہے۔اس کا دل انوار الالٰہیہ سے جگمگانے لگتا ہے۔ذکر اور قراءت کی شرافت کی وجہ سے اس کی زبان کو بھی شرافت حاصل ہوجاتی ہے۔اللہ تعالیٰ کی خدمت کی وجہ سے اس کے اعضاء میں جمال آجاتا ہے۔ان احوال سے ہی عبادت کرنے والے کے مراتب انسانیہ اور درجات بشریہ میں بزرگی اور شرافت آجاتی ہے۔یہی وہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے اس کی سعادت میں روز بروز ترقی ہوتی چلی جاتی ہے اور اس کے کمالات نمایاں نظر آتے ہیں جو شخص ان چیزوں سے واقف ہوتا ہے اسے عبادت میں خاص ذوق حاصل ہوتا ہے۔وہ عبادت کو روحِ جان سمجھتا ہے اسے عبادت گراں نہیں گزرتی۔

(۲) عبادت امانت ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ﴾

بیشک ہم نے امانت پیش فرمائی آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور آدمی نے اٹھالی۔ بیشک وہ اپنی جان کو مشقت میں ڈالنے والا بڑا نادان ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس آیت میں امانت سے مراد طاعت اور فرائض ہیں امانت کے ادا کرنے کا حکم بھی خود رب قدوس نے فرمایا ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ﴾ بیشک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں جن کی ہیں انہیں سپرد کر دو۔امانت کا ادا کرنا کامل صفات میں سے ایک صفت کاملہ ہے۔جو خود بذاتہ ایک محبوب کام ہے جب ایک طرف سے امانت ادا کردی جائے تو دوسری طرف سے بھی اس امین کا خیال کیا جاتا ہے۔

صحابہ کرام میں سے ایک صحابی بیان فرماتے ہیں ایک اعرابی مسجد کے دروازے پر آیا اپنی اونٹنی سے اترا اس نے اونٹنی کو وہیں اسی طرح چھوڑ دیا مسجد داخل ہوکر بڑے اطمینان سے نماز ادا کی اور جو چاہتا تھا وہ دعاء کی ۔ہم اس پر تعجب کر رہے تھے (کہ اسے اونٹنی کی کوئی فکر نہیں کہ اونٹنی کو باندھے کے بغیر اور کسی کے سپرد کرنے کے بغیر چھوڑ آیا ہے)جب وہ نماز دعا وغیرہ سے فارغ ہوکر نکلا اس نے اونٹنی کو نہ پایا تو رب تعالیٰ کے حضور یہ عرض کرنے لگا۔"الھی ادیت امانتک فاین امانتی "اے

اللہ میں نے تیری امانت کو ادا کر دیا میری امانت کہاں ہے۔

راوی کہتے ہیں ہمیں اور زیادہ تعجب ہوا زیادہ دیر نہ گزری کہ ایک شخص اونٹنی پر سوار آیا جس کا ہاتھ کٹا ہوا تھا اس نے اونٹنی اس شخص کے حوالے کر دی "**والنکتة انه لماحفظ امانة الله حفظ الله امانته**" یہاں سے نکتہ یہ سمجھ آیا کہ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی امانت کی حفاظت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی امانت کی حفاظت کرتا ہے۔

یہی مطلب ہے جو نبی کریم ﷺ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو ارشاد فرمایا "**یاغلام احفظ الله فی الخلوات یحفظک فی الفلوات**" اے لڑکے تم اللہ تعالیٰ کے احکام کی حفاظت کرو خلوتوں میں وہ تمہاری حفاظت فرمائے گا وسیع بیابان جنگلوں میں۔

(۳) جب انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہوتا ہے تو وہ غرور وتکبر سے نکل کر سرور کی طرف آ جاتا ہے یعنی اسے عبادت کرنے میں سرور حاصل ہوتا ہے۔ جب کہ عبادت سے مانع غرور تھا وہ ختم ہو چکا ہے۔ اور عبادت میں مشغولیت کی وجہ سے مخلوق سے توجہ ہٹ جاتی ہے اور خالق کی طرف کامل طور پر توجہ ہو جاتی ہے اس صورت حال سے انسان کو وہ سرور اور لذت حاصل ہوتی ہے کہ دنیا سے اور اپنی ذات سے بے خبر ہو جاتا ہے۔

☆ حکایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک مرتبہ ایک چھت سے ایک سانپ گرا وہاں جو لوگ موجود تھے وہ سب ادھر ادھر بھاگ کھڑے ہوئے لیکن امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ علیہ نماز ادا فرما رہے تھے آپ نے نماز کو جاری رکھا آپ کو یہ محسوس بھی نہ ہوا کہ لوگ سانپ دیکھ کر بھاگ رہے ہیں۔

☆ حضرت عروہ ابن زبیر کے کسی عضو کو متعدی زخم کی وجہ سے کاٹنے کی ضرورت درپیش آئی، کہ اگر اس عضو کو رہنے دیا تو گویا کہ متعدی بیماری (کینسر) دوسرے اعضاء کو بھی بیکار کر دے گی۔ لیکن اس وقت کے انتظامات کے پیش نظر ایک عضو کو کاٹنا بہت مشکل تھا بیہوش کر کے اپریشن کرنے کا اس وقت تصور نہ تھا۔ آخر کار لوگوں نے یہ سوچا کہ جب یہ نماز ادا کر رہے ہوں تو عضو کو کاٹ دیا جائے ایسا ہی کیا گیا آپ کو ذرا بھر علم نہ ہوا کہ میرا عضو کاٹ دیا گیا ہے۔

☆ نبی کریم ﷺ جب نماز شروع فرماتے "کانوا یسمعون من صدره ازیزا کازیز المرجل" تو صحابہ کرام آپ کے سینہ مبارک سے اس طرح آواز سنتے جس طرح دیگ کے ابلنے کی آواز آتی ہے۔

☆ اگر تمہاری عقل میں یہ باتیں نہ آئیں تو قرآن پاک پڑھ کر دیکھئے رب تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے تذکرہ میں ارشاد فرمایا﴿ فَلَمَّا رَاَیْنَہٗ اَکْبَرْنَہٗ وَقَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ ﴾ جب عورتوں نے یوسف کو دیکھا اس کی بڑائی بولنے لگیں اور اپنے ہاتھ کاٹ لئے۔ یعنی مصر کی عورتوں نے جب یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو آپ کے جمال کا ان کے دل پر یہ اثر ہوا کہ وہ غلبہ محبت میں یہاں پہنچ گئیں کہ اپنے ہاتھ اپنے ہی ہاتھوں میں لئے چھریوں سے کاٹ لئے انہیں محسوس نہ ہوسکا۔

جب ایک انسان کے جمال کا یہ اثر ہوسکتا ہے تو ذات کبریاء کی عظمت کا اثر کیوں نہ ہو کہ وہ اپنے آپ سے بے خبر نہ ہو۔ پھر یہ بھی خیال رہے کہ رب تعالیٰ محبوب بھی ہے اور اس کا رعب اور ہیبت بھی دلوں پر چھائی ہوئی ہے۔ جب ہم دنیا کے بادشاہوں کو دیکھتے ہیں کہ جب ان کا رعب اور دبدبہ کسی پر چھاجائے تو اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ اپنے قریب بیٹھے ہوئے اپنے جانے پہچانے احباب کو بھی نہیں پہچان سکتا تو مالک الملک اور ملک الملوک کے سامنے کھڑے ہونے سے جب یہ کیفیت حاصل ہوجائے تو اس میں کون سا تعجب ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

مختلف اعضاء کی مختلف عبادات: حقیقت میں عبادت یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کی تعظیم بجالانا۔ شرع میں عبادت کی بہت سی قسمیں ہیں۔ بعض کا تعلق ظاہر سے ہے اور بعض کا باطن سے۔ پھر ہر ایک کی مختلف قسمیں ہیں۔

زبان کی عبادت: تلاوت قرآن وتسبیح وتہلیل ودیگر ادعیہ خواندن ودعا کردن۔ قرآن پاک کی تلاوت کرنا، سبحان اللہ پڑھنا، لا الہ الا اللہ پڑھنا اور دعائیں پڑھنا اور دعا کرنا۔

آنکھ کی عبادت: "وآنچہ تعلق بچشم دار ،دیدن مشاہد خیر مثل کعبہ شریف وقرآن مجید ودیدن بزرگان مثل انبیاء واولیاء وزیارت قبور شہداء وصالحان"

وہ عبادت جن کا تعلق آنکھ سے ہے وہ یہ ہے کہ خیر و برکت والے مقامات کی زیارت کرنا، جیسے کعبہ شریف کی زیارت کرنا، قرآن پاک کی زیارت کرنا، بزرگان دین کو دیکھنا، جیسے خوش قسمت لوگوں نے انبیاء کرام کی زیارت کی۔ اسی طرح اولیاء کرام کی زیارت کرنا اور شہداء اور نیک لوگوں کی قبروں کی زیارت کرنا۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ انسان اپنے آپ کو نیکی کے کاموں میں لگائے گا اور رب تعالیٰ کی یاد میں اپنا وقت صرف کرے گا یعنی دراصل یہ عبادت حقیقی کے ذرائع ہیں اس لئے مجازاً انہیں بھی عبادت کا نام دیا گیا ہے۔ اسی طرح آسمان کو دیکھنا، ستاروں کو دیکھنا اور دریا میں کشتی کو دیکھنا تاکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی حکمت پر ان چیزوں سے دلیل پکڑے تو یہ بھی حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کے اسباب ہیں جو مجازی طور پر عبادت کا درجہ رکھتے ہیں۔

کان کی عبادت: وبگوش شنیدن قران مجید وشنیدن ذکر، وسماع آنچہ محبت او تعالی دردل افزاید وشوق طاعت او بر انگیزد۔

کانوں سے تعلق رکھنے والی عبادت یہ ہے کہ قرآن پاک کو سننا اللہ تعالیٰ کے ذکر کا سننا اور ہر اس کلام کا سننا جو دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کو بڑھائے، اور اس کی طاعت کے شوق کو زیادہ کرے یہ تمام کان کی عبادت کا درجہ رکھتے ہیں۔

ہاتھوں کی عبادت: وبدست نوشتن قرآن ونوشتن اسمای۔

ہاتھ سے تعلق رکھنے والی عبادت یہ ہے کہ قرآن پاک کا لکھنا اور اسماء گرامی لکھنا، مطلق اسماء گرامی سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ وہ اسماء گرامی اللہ تعالیٰ کے ہوں یا رسول اللہ ﷺ کے اسماء گرامی ہوں۔ بلکہ حدیث پاک لکھنا، فقہ اور دینی مسائل پر مشتمل کتب لکھنا سب یہی حکم رکھتی ہیں۔

پاؤں کی عبادت: وپا رفتن بمسجد وبحج وبرائے زیارت صلحاء وبرائے جہاد اعدای او وبکار ادائی بندگان بیچارہ۔

پاؤں سے تعلق رکھنے والی عبادت یہ ہے کہ مسجد میں جانا، حج کے لئے جانا، نیک لوگوں کی زیارت کے لئے جانا، جہاد کے لئے جانا، بیچارے، ضعیف لوگوں کی حاجات کو پورا کرنے کے لئے جانا۔

☆ یہ جو عبادت ذکر کی گئی ہیں ان کا تعلق ظاہر سے ہے باطن سے تعلق رکھنے والی عبادات بھی مختلف ہیں۔

عقل کی عبادت: اللہ تعالیٰ کی آیات میں فکر کرنا، قران پاک کے معانی میں غور وفکر کرنا، اور شریعت کے احکام میں غور وفکر کرنا۔

نفس کی عبادت: جن چیزوں سے انسان کو محبت ہے ان کو چھوڑ کر صبر کرنا نفس کی عبادت ہے روزہ رکھنا، اعتکاف بیٹھنا، مصیبتوں پر صبر کرنا، جزع وفزع کو مصائب پر چھوڑنا، حرام اور گناہوں والے کاموں سے رکنا یہ سب نفس کی عبادات ہیں۔

دل کی عبادت: اما عبادت قلب پس محبت است بمحبوبان او وبغض داشتن به مبغوضان او وامید داشتن از ثواب او وترسیدن از عذاب او۔

دل کی عبادت یہ ہے کہ رب تعالیٰ کے محبوبوں سے محبت رکھنا اور رب تعالیٰ جن سے ناراض ہو جو اس کے نزدیک بغض کے مستحق ہیں ان سے بغض رکھنا اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھنا اور اس کی عذاب سے ڈرنا۔

روح کی عبادت: واما عبادت روح پس سعی کردن است درمشاہدہ وانس ولذت یا فتن از مراقبه او۔روح کی عبادت یہ ہے کہ رب تعالیٰ کے انوار کی تجلیات کے مشاہدہ کرنے میں کوشش کرنا، اور مراقبہ میں اس کی ذات وصفات سے انس پکڑنا اور لذت حاصل کرنا۔

سر (راز) کی عبادت: واما عبادت سر پس مستغرق بودن در معرفت او۔ راز اور گویا کہ روح کی جان کی عبادت یہ ہے کہ وہ انسان رب تعالیٰ کی معرفت میں مستغرق ہو۔

مال سے متعلق عبادت: ہر وہ نیکی کے کام جن کا تعلق مال سے ہے خواہ زکواۃ ہو، یا صدقہ ہو، یا خیرات یہ سب چیزیں مال سے تعلق رکھنے والی عبادات ہیں۔واز ینجا معلوم شد که

عبادت درحقیقت مشغول کر دن است تمام اعضاء وقوی ظاہر وباطن رادرراہ اوبمرضیات او۔یہاں سے واضح ہوگیا کہ عبادت درحقیقت تمام اعضاء اور قوی خواہ ظاہری ہوں یا باطنی۔انہیں اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق اس کی راہ میں لگانا ہے۔(ازعزیزی)

وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ:

جس طرح "ایاک نعبد" میں بیان کیا جاچکا ہے کہ "ایاک" کے پہلے ذکر کرنے کی وجہ سے تخصیص پائی گئی ہے اسی طرح یہاں بھی تخصیص پائی گئی ہے۔"نستعین ای نطلب المعون والتائید والتوفیق" نستعین کا معنی یہ ہے کہ ہم امداد طلب کرتے ہیں۔ہم تائید طلب کرتے ہیں ہم توفیق طلب کرتے ہیں اور "ایاک نستعین" کا مکمل معنی یہ ہوا کہ ہم تجھ سے ہی امداد طلب کرتے ہیں ہم تجھ سے ہی تائید طلب کرتے ہیں ہم تجھ سے ہی توفیق طلب کرتے ہیں۔ (قرطبی)

یہاں استعانت کی دو قسمیں:

"والمراد طلب المعونة فی المهمات کلها او فی العبادات" (بیضاوی)

امداد طلب کرنے کے یہاں دو معنی مراد ہیں ایک یہ کہ ہم تمام مہمات ومشکلات میں تجھ سے ہی امداد طلب کرتے ہیں۔دوسرا معنی یہ ہے کہ ہم عبادت میں تجھ سے ہی امداد طلب کرتے ہیں۔

عبادت میں امداد طلب کرنا:

"وایاک نستعین بک نستعین علی عبادتک ومنک نستوثق علی طاعتک" (تفسیر ابن عباس)

ہم تجھ سے ہی تیری عبادت پر امداد طلب کرتے ہیں اور ہم تجھ سے ہی تیری طاعت پر وثوق طلب کرتے ہیں۔

"قال صاحب الکشاف الاحسن ان یراد الاستعانة به وبتوفیقه علی اداء العبادة" (روح المعانی)

صاحب کشاف نے کہا ہے کہ بہتر یہی ہے کہ یہاں معنی یہ مراد لیا جائے کہ ہم عبادت کے ادا کرنے میں تجھ سے ہی امداد اور تیری ہی توفیق طلب کرتے ہیں۔

عبادت میں امداد طلب کرنا کیوں؟

یہ بات واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معصیت سے اس وقت تک بچنا ممکن نہیں جب تک اللہ تعالیٰ اسے محفوظ نہ رکھے اور اللہ تعالیٰ کی طاعت کی توفیق اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک اللہ تعالیٰ توفیق نہ عطا فرمائے اس پر نقلی اور عقلی دلائل موجود ہیں۔

عقلی دلائل: (۱) جس شخص کو قدرت حاصل ہو تو یقیناً وہ کام کے کرنے اور کام کے چھوڑنے پر ایک جیسا قادر ہے جب تک کام کے کرنے یا نہ کرنے پر وجہ ترجیح نہ پائی جائے تو اس وقت تک کسی ایک پر عمل ممکن نہیں۔ یہ ترجیح کی وجہ بندے سے پائی جانی ممکن نہیں کیونکہ بندے کو آخر کار اللہ تعالیٰ سے ہی طلب کرنا پڑتا ہے واضح ہوا کہ بندہ جو عبادت کا کام کرے گا اس میں اللہ تعالیٰ کی امداد کا محتاج ہوگا۔

(۲) تمام مخلوق دین حق اور سچا اعتقاد طلب کرتی ہے حالانکہ سب قدرت، عقل کوشش اور طلب میں برابر ہیں۔لیکن بعض لوگ حق کو نہیں پاسکتے اور بعض لوگ حق کو پالیتے ہیں۔ یقیناً جن لوگوں نے حق کو پالیا ہے ان کا کوئی معین (مددگار) تھا جس کی امداد سے انہوں نے حق کو پالیا ہے:" **وماذاک المعین الا اللہ تعالیٰ لان ذلک المعین لو کان بشرا او ملکا لعاد الطلب فیہ** "وہ مدگار صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اس لئے کہ اگر کسی انسان یا فرشتے کی امداد اور راہنمائی سے اسے راہ حق مل گیا تو وہ بھی دراصل اللہ تعالیٰ کی امداد ہی ہے کیونکہ اس بندے اور فرشتے کا مددگار اللہ تعالیٰ ہے۔

(۳) انسان کبھی کوئی کام کرنا چاہتا ہے۔لیکن وہ اس پر عمل نہیں کرسکتا باوجود اس کے کہ کتنا عرصہ ہی اس کے دل میں تمنا پائی جاتی ہے۔لیکن پھر اچانک وہ کبھی اس کام پر عمل کر لیتا ہے اپنی خواہش کے مطابق کسی چیز کو طلب کر لیتا ہے۔ یہ حالت جو اسے حاصل ہوئی کہ اس کام کے اسباب کا حصول اس کی رکاوٹوں کی دوری اور اس کام کرنے کی توفیق کا حاصل ہونا جس کام کی تمنا تھی اس کا حاصل ہوجانا صرف اللہ تعالیٰ کی امداد سے ہی حاصل ہوا ہے لہذا معلوم ہوا کہ عبادت کرنے کی توفیق رب تعالیٰ سے ہی حاصل ہوتی ہے اس لئے عبادت میں اسی سے امداد طلب کی جائے۔

نقلی دلائل: (۱) ایک تو یہی دلیل ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا" وایاک نستعین " ہم تجھ سے ہی امداد طلب کرتے ہیں جیسا کہ تفسیر ابن عباس اور روح المعانی سے ذکر کر دیا گیا ہے کہ یہاں عبادت میں امداد طلب کرنا مراد ہے۔

(۲) ارشاد باری تعالیٰ ہے "استعینوا باللہ "اللہ سے امداد طلب کرو۔عبادت میں امداد طلب کرنے کو بھی یہ الفاظ مبارکہ شامل ہیں۔ان آیات سے جبریہ اور قدریہ فرقوں کا بھی رد ہو گیا۔جبریہ فرقہ وہ ہے جو انسان کو پتھر کی طرح مجبور مانتا ہے اور قدریہ فرقہ وہ ہے جو انسان کو اپنے اعمال کا خالق مانتا ہے اسی فرقہ کو معتزلہ بھی کہا گیا ہے۔ان کاردان سے اس طرح واضح ہے کہ اگر انسان مجبور محض ہے تو امداد طلب کرنے کا مقصد ہی کچھ نہیں۔اور اگر انسان اپنے اعمال کا خود خالق ہو تو پھر بھی امداد طلب کرنے کا مطلب نہیں نکل سکتا۔اس لئے کہ وہ نیکیوں کو خود پیدا کرنے والا جب ہے تو اسے کسی سے امداد طلب کرنے کی ضرورت نہیں واضح ہوا کہ یہ دونوں فرقے باطل ہیں۔خیال رہے کہ صحیح عقیدہ یہ ہے کہ بندہ ذاتی طور پر کچھ قدرت نہیں رکھتا البتہ رب تعالیٰ نے بندے کو کام کے کرنے نہ کرنے کی قدرت دے رکھی ہے اسی لئے بندہ مختار ہے کہ کام کرے یا نہ کرے۔بندے کو کاسب فعل (کام کرنے والا) کہا جاتا ہے اور رب تعالیٰ افعال کا خالق ہے خواہ وہ افعال خیر ہوں یا شر ہوں۔یہ بھی خیال رہے کہ بری چیز کا کسب برا ہے بری چیز کی تخلیق بری نہیں تخلیق صرف امتحان کے لئے ہے۔(ماخوذ از کبیر)

اعتراض: جب عبادت کے لئے استعانت (امداد طلب کرنا) ہے تو عقل کا تقاضا یہ ہے کہ امداد پہلے طلب کی جاتی اور عبادت بعد میں ﴿اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ کو " ایاک نعبد " سے پہلے ہونا چاہئے تھا بعد میں آنے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: اس میں چند وجوہ ہیں:

(۱) عبادت امانت ہے جس طرح رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ﴾

بے شک ہم نے امانت پیش فرمائی آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور آدمی نے اٹھالی۔ اس امانت سے مراد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنھما کے قول کے مطابق طاعت وفرائض ہیں۔ عبادت جب امانت ہے اور امانت کا ادا کرنا بہت اہم ہے تو عبادت کو پہلے ہی ذکر کرنا ضروری تھا۔

(۲) جب متکلم عبادت کی نسبت اپنی طرف کرتا ہے۔ بیشک اوروں کو بھی ساتھ ملاتا ہے پھر بھی وہم ہوتا ہے کہ یہ اپنی عبادت پر اعتبار کر رہا ہے اور اپنے آپ سے صادر ہونا بیان کر رہا ہے جب اس کے بعد ﴿وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ کہتا ہے تو واضح کر دیتا ہے " **ان العبادة مما لاتتم الابمعونة وتوفيق و اذن منه سبحانه** " بیشک عبادت ان چیزوں میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ کی امداد اور توفیق اور اذن کے بغیر حاصل نہیں ہوتیں۔

(۳) عبادت سے جس طرح رب تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے اس طرح استعانت سے تقرب حاصل نہیں ہوتا لہٰذا عبادت کا پہلے ذکر کرنا ہی ضروری ہے۔

(۴) استعانت عبادت کی قبولیت کا وسیلہ بنایا گیا ہے عبادت مقصود ہے اس لئے مقصد عظیم کو پہلے ذکر کیا گیا تاکہ مقصد اور مقصد کی قبولیت کے ذریعہ اور واسطہ میں فرق پیش نظر رہے۔

(۵) رب تعالیٰ کا بندوں سے مطالبہ ہے کہ میری عبادت کرو بندوں کا رب تعالیٰ سے مطالبہ اور عرض یہ ہے کہ اے اللہ تعالیٰ عبادت کو صحیح ادا کرنے اور اس کی قبولیت میں تو ہی ہماری امداد فرما۔ پتہ چلا کہ عبادت رب تعالیٰ کا مطلوب ہے اور استعانت بندوں کا مطلوب ہے۔ اس لئے بندے کو چاہئے کہ پہلے رب تعالیٰ کے مطلوب کا ذکر کرے اور پھر اپنے مطلوب کا تاکہ بندے کی عبودیت میں خلوص اور صداقت پائی جائے۔

(۶) بندوں پر عبادت لازم ہے۔ سوائے کسی عذر شدید کے انسان کے لئے کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ عبادت کو چھوڑ دے بلکہ جنوں اور انسان کی تخلیق کی وجہ ہی عبادت ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ﴾ اور میں نے جنوں اور انسان کو نہیں پیدا کیا سوائے اس کے کہ وہ میری عبادت کریں۔

(۷) ﴿ مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ﴾ میں یوم جزاء کا ذکر کیا گیا ﴿ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ﴾ میں امداد کی طلب کا ذکر ہوا اور ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ﴾ میں صراط مستقیم پر چلنے کی درخواست پائی گئی ہے۔عقل بھی یہی چاہتا ہے کہ جب جزاء کے دن کا ذکر کیا گیا تو اس پر رب تعالیٰ کی عبادت کی جائے جب عبادت سے رب تعالیٰ کا قرب حاصل ہوجائے گا تو دعاؤں میں مقبولیت آجائے گی اب امداد طلب کرنے کی دعاء اور ہدایت طلب کرنے کی دعاء میں خصوصی مقبولیت آجائے گی۔(از روح المعانی)

تمام امور میں رب تعالیٰ سے امداد طلب کرنا:

" وایاک نستعین فی امور الدنیویة والاخرویة کالصحة والغنی والمال والولد واهم الحاجات واداء العبادات " (الجواهر الطنطاوی)

ہم تجھ سے ہی امداد طلب کرتے ہیں تمام کاموں میں خواہ وہ دنیاوی ہوں یا اخروی جیسے صحت تجھ سے ہی طلب کرتے ہیں غناء (مالداری) تجھ سے ہی طلب کرتے ہیں مال تجھ سے ہی طلب کرتے ہیں اولاد تجھ سے ہی طلب کرتے ہیں تمام حاجات کو پورا کرنے کی امداد تجھ سے ہی چاہتے ہیں۔اور عبادات کے ادا کرنے میں تجھ سے ہی امداد طلب کرتے ہیں۔

ایک اور تقسیم سے استعانت کی دو قسمیں:-

ضروریه / ممکنه ، غیر ضروریة / میسرة۔

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے استعانت کی تقسیم فرماتے ہوئے ذکر فرمایا کہ دو قسمیں ہیں ضروریہ اور غیر ضروریہ اصول فقہ کی کتب نور الانوار وغیر میں ان ہی دو قسموں کے نام ذکر فرمائے۔ممکنہ اور میسرہ۔

ضروریه / ممکنه: ایک ہی چیز کے دو نام ہیں خواہ ضروریہ کہہ لیا جائے یا اسی کو ممکنہ سے کردیا جائے:

" الضرورية مالایتاتی الفعل دونه کاقتدار الفاعل وتصوره وحصول آلة

ومادة يفعل بها فيها وعند استجماعها يوصف الرجل بالاستطاعة ويصح ان يكلف بالفعل "

قدرۃ ممکنہ یا قدرۃ ضروریہ اسے کہا جاتا ہے جس کے بغیر کوئی کام کرنا ممکن ہی نہ ہو جس طرح کام کرنے والے کا کام کرنے پر قادر ہونا۔ اس کام کے لئے جن آلات کی ضرورت ہے ان کا پایا جانا اس کام کا تصور، خیال پایا جانا۔ جس چیز سے کسی کو بنانا ہے اس چیز کا پایا جانا یعنی کسی چیز کی اصل اور اس کے مادہ کا موجود ہونا۔ جب یہ تمام چیزیں پائی جائیں گی تو کہا جائے گا کہ انسان کو استطاعت حاصل ہے۔ اسی پر کسی کام کے لازم ہونے اور انسان کے مکلّف ہونے کی دار و مدار ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے قدرۃ ممکنہ کے طلب کرنے کا یہ مقصد ہے کہ اے اللہ تعالیٰ جب تو نے مجھ پر احکام کو فرض کیا ہے اور بعض کاموں سے اجتناب کرنے کا حکم دیا ہے تو مجھے طاقت بھی عطاء فرما کہ میں تیرے احکام کو بجالاسکوں اور جن کاموں سے تو نے روکا ہے ان سے مجھے رکنے کی طاقت بھی حاصل ہو۔

غیرضروریہ رمیسرہ:

" وغير الضرورية تحصيل مايتيسر به الفعل ويسهل كالراحلة فى السفر للقادر على المشى ويقرب الفاعل الى الفعل ويحثه عليه وهذا القسم لايتوقف عليه صحة التكليف "

قوۃ میسرہ یا غیرضروریہ اسے کہا جاتا ہے کہ کام جس کے ذریعے آسان ہو جائے اور کام کرنے والے کو سہولت حاصل ہو جائے۔ جیسے ایک شخص چل سکتا ہو لیکن سفر وہ سواری کے ذریعے کرنے کی قوت کو طلب کر رہا ہو۔ قوۃ میسرۃ اسے بھی کہا جاتا ہے جو کام کرنے والے کو کام کرنے کے قریب پہنچا دے اور اسے کام پر ابھارے اس قسم پر صحت تکلیف کی دار و مدار نہیں۔

یعنی حج اس شخص پر فرض ہو جائے گا جس کے پاس آنے جانے کا خرچ ہو سواری کا کرایہ ادا کر سکے اور جتنی دیر اسے حج کرنے پر صرف ہو اتنی دیر کے لئے اس کے اھل وعیال کا خرچ بھی ہو۔ حج میں قوت میسرہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ کئی سواریاں ہوں کئی خدام ہوں۔ ہر طرح کی آسائش حاصل ہو لیکن حج کے فرض ہونے کے لئے یہ قوت حاصل ہونا ضروری نہیں۔

تنبیہ: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص چلنے پر قادر ہو بیشک سواری کا کرایہ ادا کرنے پر نہ قادر ہو تو اس پر حج فرض ہونا چاہئے کیونکہ اسے قوت ممکنہ حاصل ہے لیکن ایسا نہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا جو ارشاد ہے ﴿وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلاً﴾ اللہ کے لئے لوگوں پر حج بیت اللہ فرض ہے جو اس تک پہنچنے کی طاقت رکھیں اس میں استطاعت سے مراد بغیر حرج اور تکلیف کے وہاں جاسکیں۔اس لئے حج کے لئے جانے میں قوت ممکنہ میں سواری کا ہونا داخل ہے۔ عام معمولی سفر در پیش ہو تو اس میں پیدل چل سکنا قوۃ ممکنہ اور سواری کا ساتھ ہونا قوۃ میسرہ ہے۔

(ماخوذ از بیضاوی، شیخ زادہ، نور الانوار، قمر الاقمار)

قوۃ میسرہ کی دو قسمیں:

قوۃ میسرہ کی پھر دو قسمیں ہیں مثلاً ایک شخص نے گندم کی کٹائی کرنی ہے، مکان بنانا ہے کوئی ایسا کام کرنا ہے جس میں اسے معاونت کی ضرورت ہے اکیلے وہ کام نہیں کرسکتا تو وہ یہ تمنا رکھے کہ کاش مجھے معاون مل جائیں۔معاونین کے ملنے کی تمنا کو کہا جائے گا "**طلب استطاعة اليسر**" آسانی کی طاقت طلب کرنا۔قوۃ میسرہ کی دوسری قسم یہ ہے کہ وہ شخص اپنے احباب یا مزدوروں کو کہے میرے ساتھ مل کر گندم کی کٹائی کر دو، مکان بنا دو، گاڑی کو دھکا لگا دو وغیرہ۔اسے "**طلب اليسر بالشركة**" کہا جائے گا یعنی یہ طلب ہوگی کہ میرے ساتھ کام میں شریک ہو جاؤ۔

خیال رہے کہ یہ دو قسمیں بیضاوی سے ہی حاصل ہو رہی ہیں۔ذرا پھر سے غور و فکر سے بیضاوی کی عبارت جو درج کی جاچکی ہے اسے پڑھیں تو "**تحصيل مايتيسر به الفعل**" اور "**او يقرب الفاعل بالفعل**" سے سمجھ آجائیں گی سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی جائے ذہن و ضمیر پر باطل کے تالے لگ جائیں تو سمجھ آنا ممکن نہیں۔ (ماحصل من بیضاوی)

رب تعالیٰ سے امداد طلب کرنا حرام بلکہ کفر:

قوۃ میسرہ کی دوسری قسم "**طلب اليسر بالشركة**" جس کا ابھی ذکر کیا ہے یہ اللہ تعالیٰ سے طلب نہیں کی جاسکتی اگر طلب کرے گا تو حرام اور گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا اگر اس کا عقیدہ یہ ہو کہ

رب کائنات یہ کام کرتا ہے تو وہ کافر ہو جائے گا۔

چونکا دینے والا عنوان راقم نے قائم کیا ہے لیکن طیش میں آنے کی بجائے غور وفکر سے کام لیں جوش میں نہ آئیں بلکہ ہوش میں آئیں غصہ سے سر دھننے کو چھوڑ کر تدبر کا سر دھنئے آیئے آپ کو دعوت فکر دیتا ہوں۔

خدارا انصاف کیجئے ! کیا یہ کہنا جائز ہے؟ کہ اے رب کائنات میں اکیلا ہوں میرے ساتھ مل کر تو مجھے گندم کٹوا کر میری امداد کر، میں صرف تجھ سے ہی امداد طلب کرنے کا قائل ہوں۔

کیا یہ کہا جا سکتا ہے؟ کہ میں نے مکان بنانا ہے، اینٹیں اٹھانی ہیں۔ سیمنٹ، ریت، بجری کا کام کرنا ہے۔ یہ سارے کام تو میں سرانجام دے نہیں سکتا میں کسی اور سے امداد طلب کرنا جائز نہیں مانتا اس لئے اے رب قدوس تجھ سے ہی امداد طلب کرتا ہوں یہ میرے کام تو ہی آ کر کر دے۔

کیا یہ کہنا جائز ہے؟ کہ میرے سامنے کھانا پڑا ہوا ہے۔ میری طبیعت سے کچھ زائد ہے۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ یہ ضائع ہو جائے بلکہ میں یہ کھانا ختم کرنے کے لئے امداد طلب کرتا ہوں۔ لیکن اے مولائے کائنات تو جانتا ہے کہ میں تیرے بغیر کسی اور سے تو امداد طلب نہیں کرتا۔ اس لئے تجھ سے ہی امداد طلب کرتے ہوئے درخواست کرتا ہوں ذرا میرے ساتھ کھانے میں شریک ہو جا تا کہ یہ کھانا ختم ہو جائے۔

یہ چند مثالیں صرف سمجھانے کے لئے بیان کی ہیں اس قسم کی ہزاروں صورتیں ایسے ہی ہیں جن میں رب تعالیٰ سے امداد طلب کرنا حرام ہے۔ جائز سمجھ کر امداد طلب کرنا کفر ہے۔

رب تعالیٰ اوراس کے بندوں سے امداد طلب کرنا حرام ہے:

اللہ تعالیٰ نے خود ہی ایک دوسرے کی امداد کا ایک ضابطہ بیان فرما دیا ہے۔ یقیناً اسی ضابطہ کے مطابق ہی امداد طلب بھی کی جائے گی۔ اور کسی کی امداد کی بھی جائے گی ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ نیکی اور پرہیزگاری پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی پر باہم مدد نہ کرو۔

یہاں سے مسئلہ روز روشن کی طرح واضح ہوگیا کہ کسی قسم کی معصیت پر کسی سے بھی امداد طلب کرنی حرام ہے خواہ بندوں سے طلب کرے۔ یا رب تعالیٰ سے اس لئے کسی کو کہنا ڈاکہ مارنے میں، قتل کرنے میں میری امداد کرنا جس طرح حرام ہے اسی طرح رب تعالیٰ سے یہ درخواست کرنی بھی حرام ہے کہ اے اللہ مجھے ڈاکہ مارنے اور قتل وغارت کی توفیق عطا فرما۔

غیر اللہ سے امداد طلب کرنے کے بغیر انسان کی زندگی محال ہے:

اگر یہ کہا جائے کہ استعانت (امداد طلب کرنا) اللہ کے بغیر کسی اور سے ناجائز ہے تو انسان کا زندگی گزارنا ممکن نظر نہیں آتا۔ انسان تو ہر وقت کسی نہ کسی کا محتاج ہوتا ہی ہے غیر اللہ سے امداد حاصل کرتا ہی ہے۔ پیدا ہوتے ہوئے دایہ کا محتاج، پھر تربیت میں ماں باپ کا محتاج، استاذ کا محتاج، درزی کا محتاج، موچی کا محتاج، مستری کا محتاج، دکاندار کا محتاج، سواریوں کے مالکان کا محتاج غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ میں کسی نہ کسی کا محتاج ہے اس کے بغیر کوئی زندگی گزار کر تو دکھائے۔

تمام امور (کاموں) میں رب تعالیٰ سے امداد طلب کرنیکا کیا مطلب؟

جواہر طنطاوی کے حوالہ سے جو بیان کیا گیا ہے کہ انسان صحت کے حصول، مال کی طلب وغیرہ تمام دنیاوی اور اخروی امور میں اللہ تعالیٰ سے امداد طلب کرے تو اس کا کیا معنی؟ اس کا ایک ہی جواب ہے کہ حقیقت میں امداد کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ لیکن اس نے بندوں کو خود ہی طاقت دے رکھی ہے اور اسباب بنا دیئے ہیں۔ ان اسباب اور ذرائع سے امداد طلب کرنا دراصل اللہ تعالیٰ سے ہی امداد طلب کرنا ہے۔ ڈاکٹر سے دوالی تو شفا حاصل ہوگئی شفا تو رب تعالیٰ نے ہی دی ہے دوا کو مؤثر چونکہ رب تعالیٰ نے ہی بنایا ہے اور ڈاکٹر کو علم طب رب تعالیٰ نے ہی عطا کیا ہے۔

اللہ مدد، اللہ ہی کافی ہے کا یہی مطلب ہے:

یہ وجہ جو بیان کی جاچکی ہے بس صرف اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اللہ مدد اور ''مجھے اللہ ہی کافی ہے'' کہا جاسکتا ہے۔ جگہ جگہ پر یہی اشتہار لگانے والوں کو چندے کے کیمپ چوراہوں میں لگائے دیکھتا

ہوں تو تعجب سے مسکراتے ہوئے وہاں سے گزرتا ہوں کہ سبحان اللہ اشتہار ''اللہ مدد'' اور ''مجھے اللہ ہی کافی ہے'' کے کہاں اور یہ چندہ بٹورنے کے کمپ کہاں؟ ہاں ہاں انہیں بھی یہی کہنا پڑے گا اللہ تعالیٰ ہی ہمیں اغنیاء سے دلا رہے ہیں ۔ یہ اغنیاء تو صرف ایک ذریعہ ہیں دینے والا تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔جب ہر مسلمان کا عقیدہ یہی ہے تو اشتہار بازی کا کیا مقصد مسلمانوں کو اختلافات پیدا کر کے اسلام سے متنفر کرنے کا کیا مقصد؟

تنبیہ : انبیاء کرام اور اولیاء عظام کے توسل کو عام طور پر شرک سے تعبیر کر دیا جاتا ہے آئیے پہلے شرک کا معنی سمجھا جائے کہ شرک کیا ہے مسلمانوں کو مشرک بنانے والے حقیقت میں جہلاء ہیں جو علم سے خالی ہیں۔

شرک کسے کہتے ہیں: ''الاشراک هو اثبات الشريک في الالوهية بمعنى وجوب الوجود كما للمجوس او بمعنى استحقاق العبادة كما لعبدة الاصنام'' (شرح عقائد ص ٦١)

یعنی شرک کی دو قسمیں ہیں ، ایک یہ ہے کہ مجوسیوں کی طرح مستقل خدا ، واجب الوجود اور معبود سمجھ کر کسی دوسرے کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرا دیا جائے کیونکہ وہ مستقل طور دو خدا مانتے تھے۔ایک نیکیوں کو پیدا کرنے والا ہے اور دوسرا برائیوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ نیکیوں کو پیدا کرنے والے خدا کا نام یزدان ہے اور برائیوں کا پیدا کرنے والا خدا اہرمن ہے۔

شرک کی دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ معبود حقیقی کے بغیر کسی اور کو عبادت کا مستحق ہونا تسلیم کیا جائے۔جس طرح بت پرست اپنے بتوں کو عبادت کے لائق تسلیم کرتے تھے۔یعنی اگر چہ مجوسیوں کی طرح یہ اپنے بتوں کو مستقل خدا نہیں مانتے تھے لیکن پھر بھی معبود مانتے تھے ان کے سامنے سجدہ کرتے تھے۔مستقل خدا ماننے کا یہ مطلب ہے کہ وہ خدا خود خالق ہے مخلوق نہیں اپنے وجود میں کسی کا محتاج نہیں ۔

بتوں کی پوجا کرنے والے اپنے بتوں کو مخلوق مانتے تھے یہ بھی تسلیم کرتے تھی کہ یہ ہم نے خود تراشے ہیں لیکن وہ اپنے بتوں کو عبادت کا مستحق اس طرح مانتے تھے۔جس طرح مسلمان اللہ تعالیٰ کو عبادت کا مستحق مانتے ہیں۔

مسلمانوں اور مشرکوں میں امتیازی فرق

مشرکوں کا پہلا فرقہ: (مجوسی)

مشرکوں کا پہلا فرقہ مجوسی ہیں ان کا عقیدہ اگرچہ بیان کیا جاچکا ہے لیکن کچھ وضاحت کی جاتی ہے:

(۱) مجوسی ایک خدا کے ساتھ دوسرا خدا اسی طرح مانتے ہیں جس طرح ایک خدا خالق ہے اسی طرح دوسرا خدا بھی خالق ہے۔

(۲) مجوسی کہتے ہیں کہ جس طرح ایک خدا اپنے وجود میں کسی کا محتاج نہیں اسی طرح دوسرا خدا بھی کسی کا محتاج نہیں۔

(۳) مجوسیوں کا کہنا یہ ہے کہ جس طرح ایک خدا کی ابتداء اور انتہا نہیں اسی طرح دوسرے خدا کی ابتدا اور انتہا نہیں۔

(۴) مجوسیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ جس طرح ایک خدا عطا کرنے میں خود مستقل ہے کسی کا محتاج نہیں اسی طرح دوسرا خدا بھی عطا کرنے میں خود ہی مستقل ہے وہ کسی کا محتاج نہیں۔

مسلمان کا عقیدہ:

اس فرقہ کے مدمقابل مسلمانوں کے عقیدہ کو بھی دیکھئے پھر انصاف کیجئے کیا مسلمانوں میں ذرا بھر شرک کی بو بھی پائی جاتی ہے۔ جب ایسا نہیں تو کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں کو مشرک بنا کر اپنی عاقبت برباد کی جارہی ہے:

(۱) انبیاء کرام اور اولیاء کرام مخلوق ہیں خالق نہیں۔ خالق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ اپنے وجود میں کسی کا محتاج نہیں لیکن انبیاء کرام اور اولیاء کرام اپنے وجود میں اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ انتہا۔ لیکن انبیاء کرام اور اولیاء کرام کی ابتدا ہے اور انتہا بھی ہے۔

(۴) اللہ تعالیٰ عطا کرنے میں خود قادر ہے کسی کا محتاج نہیں لیکن انبیاء کرام اور اولیاء کرام عطا کرنے میں خود قادر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں یہ رب تعالیٰ سے ہی دلاتے ہیں۔

مشرکوں کا دوسرا فرقہ:

مشرکوں کا دوسرا فرقہ یعنی بت پرست اگرچہ خدا کو بھی مانتے تھے جیسا کہ قرآن پاک میں آتا ہے:

﴿ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴾ (پ ۲۱)

اگر آپ ان سے سوال کریں زمین وآسمان کا خالق کون ہے تو وہ البتہ ضروری یہی کہیں گے ''اللہ''۔

لیکن خدا کو ماننے کے باوجود بتوں کو واجب الوجود نہ ماننے کے باوجود عبادت کا مستحق سمجھتے تھے ان کے اس عقیدہ کو قرآن پاک میں بیان کر دیا گیا ہے کہ وہ بتوں کو صرف وسیلہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ معبود مانتے تھے:

﴿ وَعَجِبُوْا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ۫ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ﴾ (پ ۲۳)

''اور انہیں اس پر تعجب ہوا کہ ان کے پاس ان سے ہی ایک ڈر سنانے والا تشریف لایا اور کافر بولے یہ جادوگر ہے بڑا جھوٹا۔ کیا اس نے بہت خداؤں کا ایک خدا کر دیا ہے بیشک یہ عجیب بات ہے''۔

﴿ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ۭ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ﴾ (پ ۲۳ ص ۱۵)

''ہاں خالص اللہ ہی کی بندگی ہے اور وہ جنہوں نے اس کے سوا اور ولی بنا لئے ہیں وہ کہتے ہیں ہم تو انہیں صرف اتنی بات کے لئے پوجتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے پاس نزدیک کر دیں''۔

ان بیان کردہ آیات سے واضح ہوا کہ کافر، مشرکین عرب برملا کہہ رہے ہیں کہ ہم ان بتوں کو خدا مانتے ہیں کیا سارے خداؤں کو ایک مان لیں؟ ہم تو ان کی عبادت کرتے ہیں تا کہ اللہ کے قریب کریں۔

مسلمانوں کا عقیدہ: انبیاء کرام اور اولیاء کرام اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ اس کے مقبول بندے ہیں معبود نہیں انبیاء کرام اور اولیاء کرام کو معبود ماننا تو بفضلہ تعالیٰ امت مصطفیٰ ﷺ کے کسی جاہل کا عقیدہ بھی نہیں۔ علماء کا یہ باطل عقیدہ کیسا ہوسکتا ہے؟ یہ بہتان عظیم ہے خدارا عقل سے کام لیجئے

مسلمانوں کو مشرک بنانا جہالت عظیمہ ہے جہالت سے بچتے نہیں تو ہم ہی دعا کرتے ہیں "اللھم انا نعوذ بک من الجاھلین المخربین الشیاطین" مشرکوں کے دونوں فرقوں سے مسلمانوں کا امتیازی فرق بیان کردیا گیا ہے اللہ تعالیٰ سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے اور ضد، عناد، ہٹ دھرمی سے بچائے۔ضدی، معاند کا راہ راست پر آنا بہت مشکل ہے۔

اہل سنت و جماعت کا انبیاء کرام اور اولیاء کرام کے متعلق عقیدہ:

(۱) کوئی نبی کوئی ولی معبود نہیں عبادت کے لائق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

(۲) ہر نبی، ہر ولی کی قبر کے سامنے سجدہ کرنا حرام ہے سجدہ صرف رب قدوس کی ذات کو ہوسکتا ہے۔

(۳) کوئی نبی کوئی ولی رب تعالیٰ کی ذات اور صفات میں اس کا شریک نہیں۔

(۴) اولیاء کرام اور انبیاء کرام کے توسل سے دعا کرنا جائز ہے اور دعا میں قبولیت ہوتی ہے۔

(۵) انبیاء کرام اور اولیاء کرام کو قبروں میں زندگی حاصل ہے۔

(۶) انبیاء کرام اور اولیاء کرام کے تصرفات بعد از وفات بھی جاری ہیں۔

(۷) انبیاء کرام اور اولیاء کرام کا مشکل کشا ہونا اور دستگیر ہونا اللہ تعالیٰ کی عطا سے ہے۔گویا کہ یہ ذریعہ ہوتے ہیں حقیقی طور پر یہ صفات اللہ تعالیٰ کو حاصل ہیں۔

(۸) نعمتیں اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے اور یہ اس کی عطا کا ذریعہ ہیں دیتا وہی ہے دلاتے یہ ہیں۔

مفتی محمد شفیع دیو بندی ﴿وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ کی تفسیر تفصیلی طور پر بیان کرنے کے بعد بطور خلاصہ یوں ذکر فرماتے ہیں:

> وسیلہ استعانت اور استمداد کے مسئلہ میں بکثرت لوگوں کو اشکال رہتا ہے امید ہے کہ اس تشریح سے اصل حقیقت واضح ہوجائے گی اور یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ انبیاء واولیاء کو وسیلہ بنانا نہ مطلقاً جائز ہے اور نہ مطلقاً ناجائز۔ بلکہ اس میں وہ تفصیل ہے جو اوپر ذکر کی گئی ہے کہ کسی کو مختار مطلق سمجھ کو وسیلہ بنایا جائے تو شرک وحرام ہے۔اور محض واسطہ اور ذریعہ سمجھ کر کیا جائے تو جائز ہے۔ (معارف القرآن جلد اول ص۱۰۲)

بفضلہٖ تعالیٰ علماء اہل سنت و جماعت بریلوی کا یہی مسلک ہے کبھی مختار مطلق، قادر مطلق کسی

نبی کسی ولی کو نہیں مانا پھر جھگڑا کس کا؟ آئے دن جہلاء اپنے اکابر کے راستہ سے کیوں ہٹ رہے ہیں۔

مولانا محمود الحسن دیوبندی ﴿وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ پر حاشیہ آپ نے ان الفاظ سے رقم فرمایا:

> اس آیت شریف سے معلوم ہوا کہ اس کی ذات پاک کے سوا کسی سے حقیقت میں مدد مانگنی بالکل ناجائز ہے۔ہاں اگر کسی مقبول بندہ کو محض واسطہ رحمت الٰہی اور غیر مستقل سمجھ کر استعانت ظاہری اس سے کرے تو یہ جائز ہے کہ یہ استعانت درحقیقت حق تعالیٰ ہی سے استعانت ہے۔

مسئلہ واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کو جب رحمت الٰہی کا ذریعہ اس کی عطا کا سبب مانا جائے تو وہ امداد حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہوگی۔مولنا کے متبعین کی خدمت میں عرض ہے کہ وہ ان کے یہ الفاظ ''درحقیقت حق تعالیٰ ہی سے استعانت ہے'' کو پڑھیں اور سوچیں وہ کیا لکھ گئے۔اعانت نہیں لکھا بلکہ استعانت لکھا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کو رب تعالیٰ کی عطا کا ذریعہ مان کر ان سے امداد طلب کرنی درحقیقت رب تعالیٰ سے ہی امداد طلب کرنی ہے۔سبحان اللہ ایک اور مسئلہ سمجھ میں آ گیا کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے اس کی صفات کا مظہر ہیں ان کی امداد ظاہری ہوگی ان میں حقیقت رب تعالیٰ کی طاقت جلوہ گر ہوگی۔یہی وجوہ راقم نے ''الحمد للہ'' کی بحث میں اور ''رب العلمین'' کی بحث میں اور ''الرحمن الرحیم'' کی بحث میں علامہ رازی رحمہ اللہ کی تفسیر کبیر سے پہلے ذکر کر دی ہیں اور ساتھ ساتھ نشاندہی کر دی تھی کہ ان عبارات کو دھیان میں رکھا جائے تا کہ ﴿وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ کی بحث میں کام آئیں۔

خلاصہ ان کا یہ ہے کہ جب یہ کہا گیا ہے کہ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں تو جب ہم بندوں کی تعریف کرتے ہیں تو پھر رب تعالیٰ سے تخصیص کا کیا معنی ہوگا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بندوں کی یا کسی اور چیز کی تعریف کرنی بھی حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی ہی تعریف ہوگی۔کیونکہ ان چیزوں کو قابل تعریف اللہ تعالیٰ نے ہی بنایا ہے۔اسی طرح ﴿رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام جہانوں کا رب ہے حالانکہ بندے بھی بندوں کے مربّی ہیں تو صرف رب تعالیٰ کے مربّی ہونے کا کیا مطلب؟ تو اس کا جواب بھی یہی ہے کہ بندوں کو مربّی اللہ تعالیٰ نے ہی بنایا ہے اس لئے حقیقت میں ربوبیت صرف اللہ تعالیٰ کو ہی حاصل ہے۔

یہی وجہ ﴿الرحمن الرحیم﴾ میں بھی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ہی رحمٰن ورحیم ہے تو بندوں کے رحم کرنے کا کیا مقصد ہوگا؟ تو اس کا جواب بھی یہی دیا جائے گا کہ بندوں کی رحمت رب تعالیٰ کی عطا سے ہے لہذا حقیقت میں رحم کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ یہی نکتہ مولنا محمود الحسن صاحب کے حاشیہ سے سمجھ آیا کہ ﴿اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ سے جب یہ واضح ہوا کہ ''ہم صرف تجھ سے ہی امداد طلب کرتے ہیں'' تو اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں سے امداد طلب کرنے کا کیا مطلب تو اس کا جواب مولنا نے یہ دیا کہ اللہ کے مقبول بندوں کو رب تعالیٰ کا واسطہ سمجھا جائے گا تو وہ حقیقت میں امداد رب تعالیٰ سے ہی طلب ہوگی اگرچہ بظاہر مقبولانِ خدا سے استعانت ہوگی کاش کہ یہ بات ان کے اپنوں کو بھی سمجھ آجائے۔

خیال رہے کہ مولنا محمود الحسن صاحب کے ترجمہ قرآن پر سورۃ بقرۃ پر حاشیہ بھی ان کا اپنا ہی ہے اس کے بعد مولنا شبیر احمد عثمانی کا حاشیہ ہے۔

شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں:

'' درینجا باید فہمید کہ استعانت از غیربوجھی کہ اعتماد براں غیر باشد واورا مظہر عون الٰہی ندا ندا حرام است واگرالتفات محض بجانب حق است واور ایکے از مظاہر عون دانستہ ونظر بکار خانہ اسباب وحکمت اوتعالیٰ دراں نمودہ بغیر استعانت ظاہری نماید ،دور از عرفان نخواہد بود ،درشرع نیز جائز ورواست وانبیاء واولیاء ایں نوع استعانت بغیر کردہ اند ودرحقیقت ایں نوع استعانت بغیر نیست بلکہ استعانت بحضرت حق است لاغیر''

(تفسیر عزیزی پ اول ص ۱۰)

﴿اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ کو سمجھنے کے لئے یہ بات سمجھنی چاہئے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے غیروں سے اس طرح امداد طلب کرے کہ ان پر ہی کلی طور پر اعتماد ہو یعنی ان کو ہی مستقل امداد کرنے والا سمجھے۔ ان کو اللہ تعالیٰ کی امداد کا واسطہ، ذریعہ اور مظہر نہ سمجھے تو یہ حرام ہے۔ لیکن اگر توجہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہو کہ حقیقت میں امداد کرنے والا وہی ہے لیکن اس نے خود اپنے کارخانہ قدرت میں اسباب بھی بنا

دیئے ہیں ان ظاہری اسباب سے امداد طلب کرنے میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے، یہ عقیدہ رکھنے والا عرفان سے دور نہیں یہی عقیدہ شرع میں جائز ہے۔

انبیاء کرام اور اولیاء کرام سے امداد طلب کرنے کو بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ غیر سے امداد طلب کی جا رہی ہے حالانکہ حقیقت میں یہ " استعانت بالغیر "(غیر سے امداد طلب کرنا) ہے ہی نہیں بلکہ یہ استعانت صرف رب تعالیٰ سے ہی ہے اور کسی سے نہیں۔

سبحان اللہ اہل سنت وجماعت بریلوی مسلک کا عقیدہ صاف ستھرا بلاغبار ہے، ابھی تک جو تین حوالے نقل کئے ہیں ان سب کا نچوڑ اور خلاصہ یہ ہے کہ نبیوں اور ولیوں سے مانگنا رب تعالیٰ سے مانگنا ہے، ان سے استعانت رب تعالیٰ سے استعانت ہے، ان کی عطا رب تعالیٰ کی عطا ہے۔ یہی بات میں اپنی طرف سے کہتا تو شائد میری برادری کے لوگ مجھ پر کیا کیا فتوے لگاتے مشرک کہنے سے نیچے ان کا کوئی فتویٰ نہیں۔ لیکن مجھے کچھ کہنے سے پہلے سوچنا کہ تمہارے فتویٰ کی زد میں کہیں مفتی محمد شفیع صاحب، مولنا محمود الحسن صاحب اور شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ تو نہیں آرہے۔ ہاں ذرا ہوش سے ذرا سمجھ سے کام لینا۔

انبیاء کرام اور اولیاء کرام زندہ ہیں:

ابھی جس مسئلہ کو ثابت کیا گیا ہے کہ انبیاء کرام اور اولیاء کرام سے استعانت جائز ہے جب انہیں رب تعالیٰ کی عطا کا واسطہ مانا جائے۔ یہ استعانت اسی وقت ممکن ہوگی جب کہ انبیاء کرام اور اولیاء کرام کی وفات کے بعد زندگی ثابت ہو۔ اس مسئلہ کو تفصیلی طور پر کوئی دیکھنا چاہے تو رئیس المحققین والمدققین استاذی المکرم حضرت علامہ مولنا ابوالحسنات محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی کی کتاب ''جلاء الصدور'' کا مطالعہ کرے۔ یہاں تو بہت مختصر بحث ذکر کی جاتی ہے جس سے کچھ نہ کچھ مسئلہ سمجھ میں آسکے۔ آیئے ذرا توجہ فرمائیں شہید کی زندگی قرآن پاک سے یعنی نص قطعی سے ثابت ہے ارشاد باری ہوتا ہے:

﴿ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴾ (پ ۲)

''اور جو خدا کی راہ میں مارے جائیں انہیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں ہاں تمہیں خبر نہیں''۔

یعنی شہید کی زندگی میں شک کرنے والا وہ ہوگا جسے شعور نہیں، خبر نہیں۔ شعور والے تو یقین

رئیں گے کہ یہ رب تعالیٰ کا حکم ہے اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ﴾ اور جو اللہ کی راہ میں مارے گئے ہرگز انہیں مردہ نہ خیال کرنا بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں روزی پاتے ہیں۔

مقام توجہ: جب شہید نبی کریم ﷺ کی امت کا ایک فرد ہونے کی وجہ سے ایسی زندگی حاصل کر لیتا ہے کہ اس کو مردہ کہنا اور مردہ خیال کرنا بھی منع ہے تو یقیناً نبی کو بھی زندگی حاصل ہوگی اس لئے کہ نبی کا مقام شہید کے مقام سے بلند ہے۔ یہ عقل کے بھی خلاف ہے کہ غلام قبر میں زندہ رہیں، اور آقا مردہ (معاذ اللہ) اسی لئے علامہ علی قاری رحمہ اللہ مرقاۃ باب الجمعہ میں " قال ان الله حرم على الارض ان تاكل اجساد الانبياء فنبى الله حى يرزق "(ابن ماجہ، مشکوۃ باب الجمعہ) نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاء کرام کے جسموں کو کھائے اللہ کے نبی زندہ ہوتے ہیں ان کو رزق دیا جاتا ہے۔اس حدیث کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں:

" فان الله تعالىٰ قال فى حق الشهدا من امته بل احياء عند ربهم يرزقون فكيف سيدهم بل رئيسهم لانه حصل له ايضا مرتبة الشهادة مع مزيد السعادة باكل الشاة المسمومة وعودسمها المغمومة " (مرقاۃ)

بیشک اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی امت کے شہداء کے حق میں فرمایا ہے" وہ اپنے رب کے ہاں زندہ ہیں ان کو رزق دیا جاتا ہے" تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ امت کے شہداء کے سردار بلکہ ان کے رئیس زندہ نہ ہوں جب کہ ان کو مرتبہ شہادت بھی حاصل ہوا ہے اور مزید سعادت بھی حاصل ہے۔ نبی کریم ﷺ کو مرتبہ شہادت اس طرح حاصل ہوا کہ آپ کو خیبر میں ایک یہودیہ نے زہر آلود بکری کا گوشت کھلا دیا تھا۔ وقت وصال وہی زہر کا اثر لوٹ کر آیا تھا اس طرح آپ کو مرتبہ شہادت سے بھی رب تعالیٰ نے نواز دیا تھا۔

تنبیہ: " وانما عصمة الله تعالىٰ من الشهادة الحقيقية للبشاعة الصورية لاظهار القدرة الكاملة بحفظ فرد من بين اعدائه من شر البرية " (مرقاۃ)

آپ کو اللہ تعالیٰ نے ظاہری شہادت سے دو وجہ سے نہیں نوازا۔ ایک وجہ یہ تھی کہ آپ کی ظاہری

شکل مبارک کی شان وشوکت برقرار رہے ایسا نہ ہو کہ کفار آپ کی صورت مبارک میں بگاڑ نہ پیدا کریں۔دوسری وجہ یہ تھی کہ رب تعالیٰ نے اپنی قدرت کو ظاہر فرمایا کہ ایک فرد کو کثیر مخلوق کے شر سے کیسے بچایا۔

فائدہ : اسی حدیث مذکور کی وضاحت بیان کرتے ہوئے علی قاری رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں "اولیاء اللہ لا یموتون ولکن ینتقلون من دارا الفناء الی دار البقاء "(مرقاۃ) اللہ کے ولی مرتے نہیں بلکہ اس فانی دنیا سے باقی رہنے والے جہان کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔

نبی کی زندگی شہید کی زندگی سے اعلیٰ ہے:

شہید کی زندگی اگرچہ نص قطعی سے ثابت ہے لیکن نبی کی زندگی سے کم درجہ ہے کیونکہ شہید زندہ ہونے کے باوجود دنیاوی احکام میں مردہ والے احکام رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ لوگوں کو ان کی زندگی کا شعور نہیں۔

شہید کی زوجہ بیوہ ہوتی ہے: شہید کی بیوہ کو عدت وفات گذارنی پڑتی ہے عدت گزارنے کے بعد جہاں چاہے نکاح کرلے پتہ چلا کہ شہید پر کئی احکام دنیا میں مردہ والے لاگو ہوتے ہیں۔

نبی کی بیویاں نبی کے نکاح میں: اللہ تعالیٰ نے ارشادفرمایا:

﴿ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ﴾ (پ۲۲ص۴)

''اوران کے بعد کبھی ان کی بیبیوں سے نکاح نہ کرو''۔

نکاح کی ممانعت اسی وجہ سے کی گئی کہ نبی زندہ ہوتے ہیں ان کی بیویاں ان کے نکاح میں ہوتی ہیں۔بیوہ نہیں ہوتیں کہ کسی اور سے نکاح کرلیں۔

شہید کی وراثت تقسیم ہوتی ہے: شہید زندہ ہونے کے باوجود جب اس ظاہری دنیا سے چلا جاتا ہے اس کی وراثت تقسیم ہوتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ دنیاوی احکام میں وہ مردہ کی طرح ہے۔

نبی کی وراثت تقسیم نہیں ہوتی: رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

"انا معاشر الانبیاء لانرث ولا نورث ماترکناہ صدقة" ہم انبیاء کرام نہ کسی کے وارث ہوتے ہیں اور نہ ہمارا کوئی وارث ہوتا ہے ہم جو مال چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔

اس سے بھی پتہ چلا کہ نبی کی قبر میں زندگی ایسے ہی ہے جیسے دنیا میں ظاہری طور پر تھی بلکہ دنیا کی زندگی سے اعلیٰ ہوتی ہے۔ اسی پر مولانا اعزاز علی دیو بندی کی عبارت ملاحظہ فرمائیں جو انہوں نے نور الایضاح باب زیارۃ النبی کے حاشیہ پر لکھی ہے:

> "مثله صلی الله علیه وسلم بعد وفاته کمثل شمع فی حجرة اغلق بابها فهو مستور عمن هو خارج الحجرة ولکن نوره کماکان بل ازید وهذا حرم نکاح ازواجه بعده صلی الله علیه وسلم لم یجر احکام المیراث فیما ترکه لانهما من احکام الموت"

نبی کریم ﷺ کی مثال دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد اسی طرح ہے جس طرح ایک شمع کو باہر سے کمرہ میں لے جائیں اور اس کا دروازہ بند کر دیا جائے اگرچہ وہ شمع کمرے سے باہر والوں سے چھپ گئی لیکن اس کی روشنی اسی طرح ہے بلکہ پہلے سے بھی زیادہ کیونکہ باہر روشنی کم تھی اندر جا کر زیادہ ہوگئی (اسی طرح نبی کریم ﷺ قبر شریف میں اگرچہ باہر والے لوگوں سے مستور ہیں لیکن آپ کی زندگی پہلے سے بھی زیادہ ارفع و بلند ہے) اسی وجہ سے آپ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے باوجود آپ کی ازواج مطہرات سے نکاح کرنا حرام ہے اور آپ کے ترکہ پر وراثت کے احکام جاری نہیں ہوئے کیونکہ یہ دونوں کام مردہ لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

انبیاء کرام اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں:

> " اخرجه مسلم عن انس ان النبی ﷺ لیلة اسری به مر بموسیٰ علیه السلام وهو یصلی فی قبره"

مسلم شریف حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نبی کریم ﷺ معراج کی رات موسیٰ علیہ

السلام کی قبر سے گزرے تو وہ اپنی قبر میں نماز ادا کر رہے تھے۔

" عن انس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون "

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہیں نماز ادا کر رہے ہیں۔ (بیہقی)

" عن سعید بن مسیب انہ کان یلازم المسجد ایام الحرۃ والناس یقتتلون قال فکنت اذا حانت الصلوۃ اسمع اذانا یخرج من قبل القبرا لشریف "(طبقات ابن سعد، دارمی)

سعید بن میتب کہتے ہیں کہ میں مسجد نبوی میں ہی ہوتا تھا جب ایام حرہ کا واقعہ درپیش آیا لوگ جنگ کرنے میں مشغول ہوتے میں قبر شریف سے نماز کے وقت اذان کی آواز سنتا۔

تنبیہ : یزیدی دور میں جب مدینہ طیبہ پر حملہ کیا گیا ظلم وستم ہوا مسجد نبوی میں تین دن تک اذانیں نمازیں بند رہیں اس واقعہ کو ایام حرہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

"الانبیاء بعد ما قبضوا ردت الیھم ارواحھم فھم احیاء بھم کالشھداء"

انبیاء کرام کی وفات کے بعد ان کی روحوں کو ان پر لوٹا دیا جاتا ہے وہ اسی طرح زندہ ہیں جس طرح شہداء زندہ ہیں۔ (بیہقی) (انباء الاذکیاء بحیاۃ الانبیاء الحاوی للفتاوی)

نبی کریم ﷺ سے استعانت:

" عن ابی الجوزاء قال قحط اھل المدینۃ قحطا شدیدا فشکوا الی عائشۃ فقالت انظروا قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاجعلوا فیہ کوی الی السماء حتی لایکون بینہ وبین السماء سقف ففعلوا فمطروا فطرا حتی نبت العشب وسمنت الابل تفتقت من الشحم فسمی عام الفتق "

(دارمی ، مشکوۃ باب الکرامات)

ابوجوزاء سے مروی ہے اہل مدینہ ایک مرتبہ سخت قحط سالی میں مبتلا ہو گئے یعنی بارش نہیں ہو رہی تھی۔انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آکر شکایت کی آپ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کے مزار انور کو دیکھو اور ان کے حجرہ (یعنی روضہ شریف) کی چھت سے تھوڑا سا سوراخ کر دو۔یہاں

تک کہ آپ کی قبر انور اور آسمان کے درمیان چھت کا حجاب نہ رہے صحابہ کرام نے ایسا ہی کیا تو اتنی کثیر بارش ہوئی جس کی کثرت سے بہت زیادہ گھاس پیدا ہوئی۔درخت سرسبز وشاداب ہوگئے اونٹ (کھا کھا کر) اتنے موٹے ہوگئے کہ چربی کی وجہ سے ان کی کوہانیں پھٹ گئیں اس سال کا نام ہی عام الفتق (پھٹنے کا سال) پڑ گیا۔اسی حدیث کی شرح میں علامہ علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وقيل انه صلى الله عليه وسلم كان يستشفع به عند الجذب فتمطر السماء فامرت عائشة بكشف قبره مبالغة فى الاستشفاع فلا يبقى بينه وبين السماء حجاب " (مرقاة)

بیان کیا گیا ہے کہ قحط سالی میں جب بھی نبی کریم ﷺ کے وسیلہ سے بارش طلب کی جاتی تو بارش ہو جاتی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ کی قبر کی چھت میں سوراخ کا حکم توسل میں مبالغہ ثابت کرنے کے لئے دیا تاکہ آپ کے اور آسمان کے درمیان کوئی حجاب نہ رہے۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ کے بعد آپ کے وسیلہ سے دعا کرنے کا حکم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دیا اور صحابہ کرام نے اس پر عمل کیا۔اگر یہ ناجائز ہوتا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس کا حکم نہ دیتیں اور نہ ہی صحابہ کرام اس پر عمل کرتے۔ذرا انصاف سے بتائیں کیا یہ نبی کریم ﷺ سے استعانت نہیں؟

استاذ العلماء حضرت علامہ مولانا مفتی عبد القیوم ہزاروی اپنی عربی کتاب العقائد والمسائل میں توسل کے جواز پر دلیل قائم کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

" الدليل على ذلک احاديث كثيرة صحيحة صريحة منها مارواه الترمذى والنسائى والبيهقى والطبرانى باسناد صحيح عن عثمان بن حنيف رضى الله عنه ان رجلا اعمى جاء الى النبى صلى الله عليه وسلم فقال يارسول الله ادع الله ان يكشف عن بصرى فقال ان شئت دعوت وان شئت صبرت فهو خيرلک ،قال فادعه فامره ﷺ ان يتوضأ فيحسن وضوئه ويدعو بهذا الدعاء اللهم انى اسئلک واتوجه اليک بنبيک محمد نبى الرحمة ،يا محمد انى اتوجه بک الى ربى فى

حاجتی هذه لتقضی لی ،اللهم شفعه فی فذهب ثم رجع وقد کشف الله عن بصره ، وفی روایة البیهقی فقام وقد ابصر''

(ترمذی ابواب الدعوات ، ابن ماجه صلوة الحاجة نسائی فی عمل الیوم واللیلة ، بیهقی فی الدلائل باب ماجاء فی تعلیمه الضریر ،بخاری فی التاریخ الکبیر)

(مزید حوالے ''عقائد ومسائل'' میں دیکھیں) توسل کے جواز پر کثیر احادیث موجود ہیں ان میں سے ایک حدیث جو ترمذی ،نسائی ،بیہقی اور طبرانی نے اسناد صحیح سے بیان کی ہے وہ یہ ہے۔عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ سے مروی ہے بیشک ایک نابینا شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کرنے لگا یا رسول اللہ! آپ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے نظر عطا فرمادے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم چاہتے ہو تو میں دعا کر دیتا ہوں اور اگر تم صبر کرو تو تمہارے لئے بہتر ہے۔ اس شخص نے عرض کیا آپ دعا فرمادیں نبی کریم ﷺ نے اس شخص کو حکم دیا کہ اچھی طرح وضو کر کے آؤ پھر یہ دعا کرو۔

ترجمہ: '' اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیرے نبی محمد جو رحمت ہیں ان کے وسیلہ سے تیری طرف میں متوجہ ہوتا ہوں اے محمد میں تمہارے وسیلہ سے اپنی حاجت کے لئے اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں تا کہ وہ میری حاجت پوری فرمائے اے اللہ ان کو (اپنے نبی کریم کو) میرا شفیع بنا ''۔

وہ (نابینا صحابی) گیا پھر واپس لوٹ کر آیا تو اسے نظر حاصل ہو چکی تھی بیہقی کی ایک روایت میں ہے کہ اسے اٹھتے ہی نظر مل گئی۔

حدیث پاک سے حاصل ہوا:

نبی کریم ﷺ کی نظر آنے والے پرفتن دور کی طرف تھی کہ لوگ وسیلہ کے منکر ہوں گے اسی لئے آپ نے نابینا صحابی کو اپنے وسیلہ سے دعا کرنے کے متعلق ارشاد فرمایا اور اسے کہا کہ تم دعا کرو حالانکہ اس صحابی نے آپ کو دعا کرنے کے متعلق کہا تھا۔ نبی کریم ﷺ کے وسیلہ سے دعاء کرنے کا طریقہ بھی خود نبی کریم ﷺ بتائیں اور دعا صحابی کریں پھر بھی کسی کو شک رہے تو یوں ہی سمجھیں کہ آپ کے ارشادات پر ابوجہل ،ابولہب کو شک ہی رہا تھا۔

انبیاء کرام سے استعانت:

" ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ان الشمس تدنو یوم القیمة حتی یبلغ العرق نصف الاذن فبینماھم کذلک استغاثوا بآدم ، ثم بموسی ، ثم بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم الحدیث " (بخاری کتاب الزکواۃ)

بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا تحقیق قیامت کے دن سورج قریب ہوگا یہاں تک کہ پسینہ کانوں کے نصف تک پہنچ رہا ہوگا اسی دوران لوگ حضرت آدم علیہ السلام سے فریاد طلب کریں گے پھر موسیٰ علیہ السلام سے پھر محمد ﷺ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ الہام ان کو اس استغاثہ کی تعلیم دی جائے گی۔ پتہ چلا کہ انبیاء کرام سے استغاثہ دنیا اور آخرت میں جائز ہے۔اسی کا نام استعانت بھی۔
(از العقائد والمسائل ص ۲۲)

سید امام احمد بن زینی دحلان رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" والحاصل ان مذھب اھل السنة والجماعة جواز التوسل والاستغاثة بالاحیاء والاموات لانا لانعتقد تاثیرا ولا نفعا ولاضرا الاللہ وحدہ لا شریک لہ والانبیاء لا تاثیر لھم فی شئی وانما یتبرک بھم ویستغاث بمقامھم لکونھم احباء اللہ تعالیٰ " (خلاصة الکلام فی بیان امراء البلد الحرام ص ۳۴۴ بحوالہ العقائد والمسائل)

اہل سنت وجماعت کا مذہب یہ ہے کہ توسل جائز ہے۔زندہ اور فوت شدہ کو فریاد کے لئے پکارنا جائز ہے اس لئے کہ ہمارا یہ عقیدہ ہی نہیں کہ وہ ذاتی طور پر کوئی تاثیر رکھتے ہیں۔بلکہ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ وہ ذاتی طور پر نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی نقصان ،ذاتی طور پر یہ قدرت صرف رب تعالیٰ کو حاصل ہے جس کا کوئی شریک نہیں ۔انبیاء کرام اگرچہ ذاتی طور پر کوئی تاثیر نہیں رکھتے لیکن ان سے تبرک حاصل کیا جاسکتا ہے ان کے مرتبہ اور بلندی مقام کی وجہ سے ان سے فریاد طلب کی جاسکتی ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے توسل:

" عن انس ان عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کان اذا قحطوا استسقی

بالعباس بن عبد المطلب فقال اللھم انا کنا نتوسل الیک بنبیھا فتسقنا وانا نتوسل بعم نبینا فاسقنا فسقوا" (رواہ البخاری ،مشکوۃ ص ۱۲۴)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں لوگ قحط سالی میں مبتلا ہو گئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کے وسیلہ سے بارش کی دعا کی عرض کیا اے اللہ ہم اپنے نبی کریم ﷺ کے وسیلہ سے تجھ سے بارش طلب کرتے تھے تو ہمیں بارش عطا کرتا تھا اب ہم اپنے نبی کریم ﷺ کے چچا کے وسیلہ سے دعا کر رہے ہیں کہ تو ہمیں بارش عطا فرما (ان کی دعا قبول ہوئی) بارش عطا کر دی گئی''۔

اعتراض: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے توسل سے دعا کرنا اس بات کی علامت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ظاہری حیات کے بعد آپ کے توسل سے دعا کرنا جائز نہیں اگر جائز ہوتا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے وسیلہ سے دعا نہ کی جاتی معلوم یہ ہوا کہ زندہ کے وسیلہ سے دعا کرنا جائز ہے۔لیکن جو دنیا سے رخصت ہو گئے ان کے وسیلہ سے جائز نہیں۔

پہلا جواب: اس سے پہلے واضح کیا جا چکا ہے کہ انبیاء کرام اور اولیاء کرام کو اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد بھی زندگی حاصل ہوتی ہے لہذا زندہ ،مردہ کا فرق بیان کرنا ہی بیہودہ ہے۔جاہلوں نے اسی لئے انبیاء کرام کو مردہ کہنا شروع کر دیا تا کہ اپنے جاہلانہ عقیدہ کو کسی نہ کسی طرح ثابت کیا جا سکے جیسا کہ ان کے دوسرے بھائی نبی کریم ﷺ کی ایک بیٹی ثابت کرتے ہیں تین کا انکار کرتے ہیں کہ کہیں حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کی شان نہ ماننی پڑے۔دلائل کا انداز دونوں یاروں کا ایک جیسا ہے۔

دوسرا جواب: معترضین جو یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے وسیلہ سے دعا کرنا ، نبی کریم ﷺ کے وسیلہ سے دعا کرنا ،ناجائز ہونے کا تقاضا کرتا ہے یہ غلط ہے:

" فان التوسل کما ھو جائز بالاحیاء کذالک جائز بالاموات وعمر رضی اللہ عنہ فعل احد الجائز ین وھذا کما یستدل احد بان التوسل بالاعمال الصالحۃ لیس بجائز والالما توسل عمر بالذات وھذہ

سفسطة ظاهرة" (البصائر)

جس طرح زندہ کے وسیلہ سے دعا کرنا جائز ہے اسی طرح جو حضرات دنیا سے رخصت ہو جائیں ان کے وسیلہ سے دعا کرنا بھی جائز ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دو جائز کاموں میں سے ایک جائز پر عمل کیا ہے آپ کے ایک جائز کام پر عمل کرنے سے دوسرے جائز کو ناجائز نہیں کہا جا سکتا۔

یہ اعتراض تو اس طرح ہے جیسے کوئی شخص اس سے یہ دلیل پکڑے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چونکہ ایک ذات انسان یعنی حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے وسیلہ سے دعا کی لہذا نیک اعمال کے وسیلہ سے دعا کرنا جائز نہیں۔ اگر جائز ہوتا تو آپ نیک اعمال کے وسیلہ سے دعا کرتے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے وسیلہ سے دعا نہ کرتے۔ یہ سوال ایسا لغو اور بے حیثیت ہے جس کی اہل علم کے نزدیک ایک بلبلہ جیسی بھی حیثیت نہیں۔ بلکہ معترض کی اس اعتراض سے جہالت ظاہر ہو رہی ہے۔

پس یہی سمجھیں کہ نبی کریم ﷺ کے توسل پر اعتراض کی وجہ بھی جہالت و دیوانگی ہے عقل سے دوری کی علامت ہے جب کہ نیک اعمال سے استعانت (امداد طلب کرنا) قرآن و حدیث سے ثابت ہے تو اس ناپختہ دلیل سے قرآن و حدیث کا انکار کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔

آیئے ایک مثال قرآن پاک سے اور ایک حدیث پاک سے پیش کرتا ہوں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

☆ ﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ﴾ (پ ۲)

"اے ایمان والو نماز اور صبر سے امداد طلب کرو"۔

☆ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تین آدمی راستہ میں چل رہے تھے کہ بارش آ گئی وہ پہاڑ کی غار میں چلے گئے پہاڑ سے ایک پتھر گرا جس نے غار کے منہ کو بند کر دیا وہ اس غار میں بند ہو گئے وہ ایک دوسرے کو کہنے لگے اپنے اپنے اعمال کی طرف نظر کرو جو تم نے خالص اللہ کے لئے نیکی کے اعمال کئے ہیں ان کے وسیلہ سے دعا کرو شائد اللہ تعالیٰ اس پتھر کو ہٹا دے۔

ایک نے ان سے کہا اے اللہ میرے والدین بوڑھے تھے اور میرے بچے چھوٹے تھے میں بھیڑ بکریاں چراتا تھا جب میں شام کو واپس لوٹتا تو دودھ دوہ کر اپنے بچوں سے پہلے اپنے والدین کو پلاتا ایک دن میں کہیں دور چلا گیا جب میں شام کو واپس لوٹا تو میں نے والدین کو سویا ہوا پایا میں نے دودھ

دوہا جس طرح پہلے دوہا کرتا تھا دودھ کا برتن لئے ہوئے میں آ گیا اور ان کے سر کی جانب کھڑا ہو گیا میں نے ان کو جگانا ناپسند سمجھا اور بچوں کو والدین سے پہلے دودھ دینا بھی پسند نہ سمجھا میرے بچے بھوک کی وجہ سے چلاتے ہوئے میرے قدموں سے لپٹ رہے تھے صبح تک یہی معاملہ رہا۔ اے اللہ جب تو جانتا ہے کہ میں نے یہ کام فقط تیری رضا کے لئے کیا تھا تو اس پتھر کو اتنا ہٹا دے کہ ہم آسمان کو دیکھ سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے غار کے منہ کو اتنا کھول دیا کہ وہ آسمانوں کو دیکھنے لگے۔

دوسرے نے عرض کیا اے اللہ جس طرح لوگ عورتوں سے محبت کرتے ہیں میں ان سے بڑھ کر اپنے چچا کی بیٹی سے محبت کرتا تھا ایک دن میں نے اس سے اپنی خواہشات کے پورا کرنے کا مطالبہ کیا لیکن اس نے انکار کر دیا کہ پہلے ایک سو دینار پیش کرو۔ میں نے کوشش کر کے ایک سو دینار جمع کر لئے وہ پیسے لے کر میں نے اس سے ملاقات کی۔ جب میں اس سے جماع کرنے کے لئے مکمل تیار ہوا اس نے کہا اے اللہ کے بندے اللہ سے ڈر۔ پردہ بکارت کو نہ کھول میں اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا اے اللہ جب تو جانتا ہے کہ یہ کام میں نے فقط تیری رضاء کے لئے کیا ہے تو اس پتھر کو اور ہٹا دے اللہ تعالیٰ نے اسے اور ہٹا دیا۔

تیسرے نے کہا اے اللہ میں نے ایک شخص کو مزدوری پر لگایا کہ تجھے دو صاع چاول (تقریبا آٹھ کلو) دوں گا۔ جب وہ اپنے کام کو ختم کر چکا تو کہنے لگا کہ میری مزدوری مجھے دو۔ جب میں نے اس کی مزدوری اس کے سامنے پیش کی (اس نے اختلاف کرتے ہوئے) مزدوری کو چھوڑا اور چلا گیا۔ میں ان چاولوں کو کاشت کرتا رہا یہاں تک کہ میں نے ان چاولوں کی پیداوار کے ذریعے کئی گائے خرید لیں اور ان کے لئے ایک چرواہا خرید لیا (یعنی غلام خرید لیا) کچھ عرصہ کے بعد وہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا اے شخص اللہ سے ڈر مجھ پر ظلم نہ کر میرا حق مجھے دے دے میں نے اسے کہا جا، وہ گائے اور ان کا چرواہا لے جا۔ اس نے کہا اللہ سے ڈر میرے ساتھ مزاح نہ کر، میں نے کہا میں تمہارے ساتھ مزاح نہیں کر رہا۔ وہ گائے اور ان کا چرواہا لے جا وہ شخص تمام گائے اور چرواہا لے گیا۔ اے اللہ جب تو جانتا ہے کہ یہ کام میں نے صرف تیری رضا کے لئے کیا ہے باقی پتھر کو بھی ہٹا دے تو اللہ تعالیٰ نے باقی پتھر کو بھی ہٹا دیا۔ (بخاری، مسلم، مشکوۃ باب البر والصلۃ)

اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ نیک اعمال کے وسیلہ سے دعا کرنا صرف جائز ہی نہیں ہے بلکہ اس سے مصیبتیں دور ہوجاتی ہیں۔اگر یہ خیال کیا جائے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے وسیلہ سے دعا کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ دعا صرف زندہ شخص کے وسیلہ سے ہوسکتی ہے لہذا نیک اعمال کے وسیلہ سے دعا کرنی منع ہے۔یہ دلیل لغو، من گھڑت، بے حقیت ہے قرآن پاک اورحدیث پاک کا صریح انکار ہے دین سے بغاوت ہے۔

تیسرا جواب: حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے وسیلہ سے دعا بھی حقیقت میں نبی کریم ﷺ کے وسیلہ سے ہی دعا تھی اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا "**اللھم انا کنا نتوسل بنبینا وانا نتوسل الیک بعم نبینا صلی اللہ علیہ وسلم**" اے اللہ ہم اپنے نبی کے وسیلہ سے دعا کرتے تھے اب ہم اپنے نبی کریم ﷺ کے چچا کے وسیلہ سے دعا کررہے ہیں:

" **فھذہ الاضافۃ دلیل علی ان المنظور فیہ قرابۃ النبی ﷺ** " (البصائر ص ۲۶)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے وسیلے سے دعا کی وہ نبی کریم ﷺ کا چچا سمجھ کر وسیلہ پیش کیا :"**بعم نبینا**" یہاں اضافت پائی گئی جو دلالت کررہی ہے کہ مقصود نبی کریم ﷺ کی قرابت مقصود تھی ورنہ اور کئی جلیل القدر صحابہ کرام بھی موجود تھے۔اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی دعا بھی اس پر دلالت کررہی ہے کہ حقیقت میں دعا نبی کریم ﷺ کے وسیلہ سے ہی تھی کیونکہ جو آپ نے دعا کی اس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں "**اللھم ان القوم توسلوابی لمکانی من نبیک**" اے اللہ بیشک قوم نے مجھے تیرے نبی کا قریبی سمجھ کر میرا وسیلہ پیش کیا۔

چوتھا جواب: یہ کہنا غلط ہے کہ دنیا سے رخصت ہونے کے بعد انبیاء کرام اور اولیاء کرام سے استعانت منع ہے اس سے پہلے "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث نبی کریم ﷺ کے مزار کے توسل سے بارش کی دعا" گزر چکی ہے اور مدارک نے زیر آیۃ ﴿ وَلَوْ اَنَّھُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ جَآءُ وکَ ﴾ کے یہ بیان کیا ہے:

" قیل جاء اعرابی بعد دفنہ علیہ السلام فرمی بنفسہ علی قبرہ وحثا من ترابہ علی رأسہ وقال یارسول اللہ قلت فسمعنا وکان فیما انزل علیک ولوْ انّھُمْ اذْ

ظلموا انفسھم ... الایۃ وقد ظلمت نفسی وجئتک استغفر اللہ ذنبی
واستغفرلی من ربی فنودی من قبرہ قد غفرلک " (مدارک)

نبی کریم ﷺ کے دفن ہونے کے بعد ایک اعرابی آیا اور قبراطہر سے لپٹ کر قبر انور کی خاک سر پر ڈالتے ہوئے نہایت حالت زار سے عرض کررہا ہے۔ یارسول اللہ میں نے اپنی جان پر ظلم کیا آپ نے اللہ کا نازل کردہ ارشاد فرمایا ہم نے سنا ﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ﴾ پوری آیۃ صحابی نے تلاوت کرنے کے بعد عرض کیا یارسول اللہ میں نے اپنی جان پر ظلم کیا اور میں آپ کے پاس حاضر ہوا۔ میں خود تو اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کررہا ہوں آپ بھی رب سے میرے لئے استغفار فرمائیں قبر اطہر سے آواز آئی تمہیں بخش دیا گیا۔

نبی کریم ﷺ کے جبہ مبارک سے استعانت:

نبی کریم ﷺ کا جبہ مبارک تھا جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا۔ اس کے بعد وہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے پاس آیا۔ اس جبہ مبارک کو دھو کر اس کے پانی سے بیمار شفا حاصل کرتے تھے۔

حضرت اسماء فرماتی ہیں:

" وکان النبی ﷺ یلبسھا فنحن نغسلھا للمرض لنشفی بھا"
(مسلم ج ۲ باب تحریم اناء الذھب والفضۃ علی الرجال)

نبی کریم ﷺ کا وہ جبہ جسے آپ پہنا کرتے تھے ہم اسے مریضوں کی صحت یابی کے لئے دھو کر اس کے پانی کو استعمال میں لاتے تھے مریضوں کو شفا حاصل ہو جاتی تھی۔

اس حدیث کی وضاحت میں علامہ نووی بیان فرماتے ہیں:

"وفی ھذا الحدیث دلیل علی استحباب التبرک بآثار الصالحین وثیابھم "

یعنی اس حدیث پاک میں دلیل ہے کہ آثار صالحین اور ان کے کپڑوں سے تبرک حاصل کرنا مستحب ہے واضح ہوا کہ آثار صالحین سے استعانت صرف جائز ہی نہیں بلکہ مستحب ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام سے بعد از وفات استعانت:

" تخاصم اهل مصر وتشاجر فی دفنه کل یجب ان یدفن فی محلتهم حتی هموا بالقتال فرأوا ان یعملوا له صندوقا من مر مر وجعلوه فیه ودفنوا فی النیل بمکان یمر علیه الماء ثم یصل الی مصر لیکونوا کلهم فیه شرعا "

'' حضرت یوسف علیہ السلام کی وفات کے بعد اہل مصر نے جھگڑا کیا۔تمام نے آپ کو دفن میں کوشش کی کیونکہ ہر ایک یہی پسند کرتا تھا کہ آپ کو ہمارے محلہ میں دفن کیا جائے یہاں تک کہ جنگ کا خطرہ پیدا ہو گیا۔آخر کار اس بات پر صلح ہوئی کہ آپ کو سنگ مرمر کے صندوق میں بند کر کے دریائے نیل میں دفن کر دیا جائے تا کہ وہاں سے پانی گزر کر شہر میں آئے اور سب ہی اس پانی سے فائدہ حاصل کریں۔اس طرح سب کو حضرت یوسف علیہ السلام سے امداد حاصل ہو جائے گی'' (مدارک زیر آیته توفنی مسلماء والحقنی بالصالحین پ ۱۳)

واضح ہوا کہ ہر زمانے میں ایمان والے انبیاء کرام سے مدد طلب کرتے رہے اور ان کو فائدہ حاصل ہوتا رہا۔

علم والوں کی استعانت علم والوں سے:

" قال الامام الشافعی انی لاتبرک بابی حنیفة رحمه الله واجئ الی قبره فاذا عرضت لی حاجة صلیت رکعتین وسألت الله عنده قبره فتقضی سریعا "

'' حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے تبرک حاصل کرتا ہوں آپ کے مزار انور پر حاضری دیتا ہوں جب کوئی حاجت درپیش آتی ہے تو دو رکعت نماز نفل ادا کرتا ہوں پھر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی قبر کے پاس آ کر اللہ تعالیٰ سے سوال کرتا ہوں اللہ تعالیٰ میری حاجت کو جلدی پورا کر دیتا ہے''۔(شامی جلد اول)

" معروف الکرخی بن فیروز من المشائخ الکبار مستجاب الدعوات یستقی بقبره وهو استاذ السری السقطی " (شامی جلد اول)

سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ کرخی بن فیروز جو بہت بڑے مشائخ سے تھے جن کی دعا کو قبول کیا جاتا تھا ان کی قبر سے توسل سے دعا کی جاتی تھی۔

انبیاء کرام سے استعانت تو اولیاء کرام سے استعانت کیوں؟

" قال الشیخ عفیف الدین الیافعی الاولیاء ترد علیهم احوال یشاهدون فیها ملکوت السموات والارض وینظرون الانبیاء احیاء غیر اموات کما نظر النبی صلی الله علیه وسلم الی موسی علیه السلام فی قبره قال وقد تقرر ان ماجاز للانبیاء معجزة جاز للاولیاء کرامة بشرط عدم التحدی " (الحاوی للفتاوی)

'' شیخ عفیف الدین یافعی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے برگزیدہ بندوں پر احوال پیش کیے جاتے ہیں۔وہ زمین وآسمان کے ملکوت کا مشاہدہ کرتے ہیں اور انبیاء کرام کو زندہ حالت میں دیکھتے ہیں نہ کہ مردہ حالت میں جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے موسی علیہ السلام کو قبر میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا''۔

اس کے بعد شیخ یافعی فرماتے ہیں کہ یہ بات واضح ہے کہ جو چیز انبیاء کرام کے لئے بطور معجزہ ثابت ہوسکتی ہے وہ اولیاء کرام کے لئے بطور کرامت ثابت ہوسکتی ہے۔البتہ انبیاء کرام کے معجزات چیلنج کے جواب میں ثابت ہوئے ہیں۔یعنی وہ جب کسی کو کہیں میں تمہارے مطالبہ پر یہ کر کے دکھاتا ہوں تو وہ کر کے دکھادیتے ہیں لیکن کرامت میں چیلنج اور چیلنج کا جواب نہیں ہوتا۔اس سے پتہ چلا کہ جس طرح انبیاء کرام سے استعانت جائز ہے اسی طرح اولیاء کرام سے استعانت جائز ہے۔

کاش کی معترضین اپنے اکابر کی بات مانیں:

قصائد قاسمی میں مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند فرماتے ہیں:

مدد کر اے کرم احمدی کہ تیرے سوا
نہیں ہے قاسم بیکس کا کوئی حامئی کار

اس شعر میں لفظ ''اے'' ذکر ہے جو ''یا'' کا ترجمہ ہے اس شعر میں نبی کریم ﷺ کا پکار کر استعانت (مدد طلب) کی گئی ہے خاص کر کے ''مدد کر'' لفظ بھی بہت واضح ہے کہ حضور ﷺ سے امداد طلب کی گئی ہے پھر سب کی نفی کردی گئی کہ اے حضور آپ کے بغیر ''قاسم بیکس کا کوئی حامی کار نہیں''

عجیب بات یہ ہے کہ ہم عربی میں ''یارسول اللہ'' کہہ کر پکاریں تو اس فریاد اور استعانت پر اعتراض ہو لیکن آپ کے مولنا عربی لفظ ''یا'' کا معنی ''اے'' سے پکاریں تو جائز۔ہم کہیں نبی کریم ﷺ امداد فرماتے ہیں تو ''ایاک نستعین'' کے مخالف ہو جائیں اور اس سے شرک لازم آئے۔لیکن آپ کے مولنا کہیں کہ نبی کریم ﷺ کے بغیر کوئی امداد کر سکتا ہی نہیں تو یہ عین ایمان ہو۔

ایک ہی کام سے ایک مومن رہے اور دوسرا مشرک ہو جائے ۔یہ کہاں کا انصاف ہے اس پر تعجب بلکہ افسوس نہ کیا جائے تو اور کیا **کیا جاتے**۔

مولنا اشرف علی تھانوی صاحب نے اپنی کتاب ''نشر الطیب'' کے آخر میں ''شیم الحبیب'' کے عربی اشعار کا ترجمہ کیا ہے۔جس کا نام ''شیم الطیب'' رکھا ہے اس کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

یاشفیع العباد خذ بیدی ، انت فی الاضطرار معتمدی
دستگیری کیجئے میری ، نبی ، کشمکش میں تم ہی ہو میری ولی
لیس لی ملجا سواک اغث ، مسنی الضر سیدی سیدی
جز تمہارے ہے کہاں میری پناہ ، فوج کلفت مجھ پہ آ غالب ہوئی
غشنی الدھر ابن عبد اللہ ، کن مغیثا فانت لی مددی
ابن عبداللہ زمانہ ہے خلاف ، اے میرے مولیٰ خبر لیجئے مری

ان اشعار میں حرف ندا بھی استعمال ہوا اور حضور ﷺ سے امداد بھی طلب کی گئی ہے ''ایاک نستعین'' کا کوئی خلاف نہیں ہوا۔

مولوی اشرف علی تھانوی صاحب کے پیر و مرشد حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ نے ایک طویل نعت لکھی ہے ہر شعر کے آخر میں ''یارسول اللہ'' ہے اس کا ایک شعر یہ ہے:

جہاز امت کا کر دیا ہے آپ کے ہاتھوں ، تم اب چاہو ڈباؤ یا تراؤ یارسول اللہ

اس شعر میں اہل سنت و جماعت کا مکمل عقیدہ ذکر کر دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ (اور دوسرے انبیاء کرام اور اولیاء کرام) کو اختیار دیا ہے وہ امت کی کشتی کو پار لگا دیں یا ڈبا دیں۔

اعتراض: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جبرائیل سے امداد طلب نہیں کی جب کہ آپ

کو آگ میں ڈال دیا گیا تھا اگر اللہ تعالیٰ کے غیروں سے امداد جائز ہوتی تو آپ بھی ضرور جبرائیل سے امداد طلب کرتے۔

پہلا جواب: ابھی تک جو بحث ذکر کی گئی ہے اس سے واضح ہو رہا ہے کہ امداد انبیاء کرام اور اولیاء کرام سے طلب کی جاتی ہے۔ امداد طلب کرنے والے ان کو اپنے آپ سے اعلیٰ اور برتر مانتے ہیں۔

انبیاء کرام سب فرشتوں سے اعلیٰ ہیں۔ اس لئے ابراہیم علیہ السلام نے جبرائیل سے امداد طلب نہیں کی کہ مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں اپنے سے کم درجہ والے سے امداد طلب کروں۔ لیکن یہ بھی خیال رہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ اپنے سے کم درجہ والے سے امداد طلب کرنا جائز نہیں اسی لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا " من انصاری الی اللہ " اللہ کے دین میں میری کون امداد کرے گا " قال الحواریون نحن انصار اللہ " حوارین نے کہا ہم اللہ کے دین میں آپ کی امداد کریں گے۔

واضح ہوا کہ اپنے سے کم درجہ والے سے کوئی شخص امداد نہ طلب کرے تو سنت ابراہیمی پر عمل ہوگا۔ اور اگر کوئی شخص اپنے سے کم درجہ والے سے امداد طلب کرے تو سنت عیسوی پر عمل ہوگا۔ جس پر کوئی چاہے عمل کرے دونوں راہ انبیاء کرام نے اپنے اپنے عمل سے متعین کر دیئے ہیں۔ کسی کو بھی ناجائز نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہ بھی خیال رہے کہ اپنے سے اعلیٰ درجہ والے سے امداد طلب کرنے کی ممانعت ثابت نہیں کی جا سکتی۔

دوسرا جواب: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے توکل کا اعلیٰ معیار قائم کیا۔ ہر انسان سے یہ کیسے ہو سکتا ہے:

" لما قید نمرود رجلیه ویدیه ورماه فی النار جاء جبریل علیه السلام وقال له هل لک من حاجة ؟ فقال اما الیک فلا فقال سله فقال حسبی من سوالی علمه بحالی " (کبیر الجزاء الاول ص ۲۵۴)

'' نمرود نے جب ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ، پاؤں کو باندھ کر آپ کو آگ میں ڈال دیا۔ تو آپ کے پاس جبرائیل علیہ السلام آئے اور عرض کیا کہ آپ کو میری کوئی حاجت ہو تو فرمائیں آپ نے فرمایا مجھے تم سے کوئی حاجت نہیں جبرائیل نے کہا اچھا اپنے رب تعالیٰ سے ہی سوال کر لیجئے۔ آپ نے کہا وہ میرے سوال کے بغیر ہی مجھے کافی ہے وہ میرے حال کو جانتا ہے''

سبحان اللہ ! ابراہیم علیہ السلام پر اپنے آپ کو قیاس کرنے والو''اللہ مدد'' اور''اللہ ہی مجھے کافی ہے'' کی اشتہاری بازی کرنے والوکبھی ایسا کر کے تو دکھاؤ۔کبھی اغنیاء سے چندے کی اپیل،کبھی پولیس سے امداد طلب کرنا،کبھی وکلاء سے امداد طلبی،کبھی ڈاکٹر کے پاس جانا،کبھی مستری کے پاس کام کرنے کی حاجت لے کر جانا،کبھی ایک کے پاس،کبھی دوسرے کے پاس۔کہنا یہ کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کی سنت پر عمل کر رہے ہیں لیکن یہ صرف زبانی دعوی عمل کا اس کے مطابق نام تک بھی نہیں۔پھر عذر لنگ یہ پیش کرنا کہ ہم تو مردوں سے امداد طلب کرنا منع کرتے ہیں زندوں سے منع تو نہیں کرتے ذرا یہ تو بتائیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے قیامت تک زندہ رہنے والے جبرائیل کی امداد کو کیا رد نہیں کیا تھا۔تم پھر زندہ سے امداد کیوں طلب کر رہے ہو۔کیا ابراہیم علیہ السلام نے رب تعالیٰ سے بھی سوال کرنے کی جبرائیل کی درخواست کو رد نہیں کیا تھا؟ تم گلا پھاڑ پھاڑ کر دعائیں کیوں کرتے ہو؟ اللہ مدد کہنا پھر کیسے صحیح ہوگا۔پھر زندہ،مردہ کا سوال ہی غلط ہے۔جب کہ انبیاء کرام اور اولیاء کرام کی وفات کے بعد بھی زندگی ثابت ہے جیسا کہ معمولی بحث اس پر بھی پیش کر دی گئی ہے۔

ہم بھی استعانت (طلب امداد) زندہ سے ہی کر رہے ہیں۔معاملہ اصل میں قسمت کا ہے کوئی کہہ رہا ہے ہمارا نبی مردہ ہے کوئی کہہ رہا ہے ہمارا نبی زندہ ہے کوئی کہہ رہا ہے ہمارا نبی بے اختیار ہے کوئی کہہ رہا ہے ہمارا نبی با اختیار ہے اسے رب نے مختار بنایا ہے تو تجھے کیا؟ کوئی کہتا ہے ہمارے نبی کو دیوار کے پیچھے کا علم نہیں کوئی کہتا ہے ہمارے نبی کو لوح محفوظ کا علم اور ماکان وما یکون کا علم دے دیا گیا ہے جھگڑا کچھ نہیں اپنی اپنی قسمت کی بات ہے۔

حرف آخر: انبیاء کرام اور اولیاء کرام سے استعانت کے جواز پر شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ اور مفتی محمد شفیع صاحب اور مولنا محمود الحسن کے جو فتاوی ذکر کیے ہیں کہ کون سی استعانت جائز ہے۔اور کون سی استعانت ناجائز ہے وہی عقیدہ اہل سنت وجماعت بریلوی مسلک کا ہے۔یعنی انبیاء کرام کے توسل سے دعا رب تعالیٰ سے مانگنا واسطہ انبیاء کرام اور اولیاء کرام کا یا آسان لفظوں میں یوں کہیں کہ ہمارا عقیدہ یہ ہے دیتا وہ اور دلاتے یہ ہیں۔اسی طرح انبیاء کرام اور اولیاء کرام کو اس عقیدہ سے پکارنا کہ ان کو رب تعالیٰ مطلع فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہی ان کو تصرفات کی اجازت دے رکھی

ہے۔اس عقیدہ کو مختصر طور پر بیان کر دیا گیا اگر ان حوالوں کو ہی جمع کیا جائے تو ضخیم کتاب بن سکتی ہے۔صرف سمجھانے کے لئے مختصر بیان کر دیا گیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ تفسیری انداز پر یہ بحث بھی طویل ہوگئی ہے لیکن میری اپنی ہی برادری کے حضرات ﴿اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ پر بڑا زور دیتے ہیں۔اسی وجہ سے میرے عزیز قاضی سعید الرحمٰن ابن قاضی عبد الطیف صاحب آف بلاول نے کہا کہ اس مسئلہ پر کچھ تفصیل ضرور ذکر ہوتو اسی اشارہ پر کچھ بحث مختصر ہونے کے باوجود اپنے خیال میں بسیط ہوگئی۔ایک ہی نقطہ یاد رکھیں جو میں نے ذکر کیا ہے اس پر سلف صالحین کا اجماع ہے اس کے خلاف جہلاء کا ضدی گروہ ہے ماننا انہوں نے بھی نہیں منوانا ہمارا خیال بھی نہیں اپنے احباب کو مسئلہ بتانا مقصود تھا۔نبی کریم ﷺ کے ارشادات کو کفار نے نہیں مانا تو میری بات کون مانے گا۔

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾

(۱)''ہم کو سیدھا راستہ چلا (۲) چلا ہمیں راستہ سیدھا''

''اهد'' امر کا صیغہ ہے هدایۃ سے لیا ہوا ہے جس کا معنی ہے''ہدایت دے''''نا'' جمع متکلم ضمیر منصوب متصل ہے جس کا معنی ہے ہمیں'' الهداية دلالة بلطف'' ہدایۃ کا معنی ہے مہربانی سے کسی کی راہنمائی کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب ہدایت حاصل ہوگی ساتھ ہی اس کی طرف سے مہربانی اور لطف بھی حاصل ہوگا اور جس کو ہدایت دی جائے گی اس پر بھلائی ہوگی اسی لئے ہدایت کا استعمال بھلائی کے کاموں میں ہوتا ہے۔

اس پر اعتراض یہ ہوگا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا''فاهدوهم الى صراط الجحيم''(فرشتوں کو قیامت کے دن حکم ہوگا کہ اللہ کے بغیر اوروں کی عبادت کرنے والوں کو) ہانکو دوزخ کی طرف۔اس آیت میں هدایۃ کا استعمال ہے لیکن خیر میں نہیں تو اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ اس میں '' تهكم '' پایا گیا ہے جیسا کہ ﴿فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ میں تہکم پایا گیا ہے۔مجازی طور پر هدایۃ کا معنی تقدم بھی آتا ہے، کہا جاتا''هداه'' وہ اس سے مقدم ہوا۔اسی سے وحشی جانوروں کے سردار کو ''هو ادى

الوحش " کہا جاتا ہے کہ وہ بھی مقدم ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی اتنی قسمیں ہیں جو شمار میں نہیں آ سکتیں اس لئے کہ ہدایت اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔اور اللہ تعالیٰ نے فرایا:

﴿ وإنْ تعُدُّوْا نِعْمَةَ اللهِ لا تُحْصُوْهَا ﴾ اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتیں شمار کرو تو شمار نہیں کرسکو گے۔

البتہ چند قسمیں اس طرح بیان کی جاسکتی ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ نے انسان کو وہ قوتیں عطا کی ہیں جن کی وجہ سے انسان مصلحت حاصل کرنے کی قدرت رکھتا ہے جیسا کہ انسان کو رب تعالیٰ نے قوۃ عقلیہ عطا کی، حواس ظاہرہ اور حواس باطنہ عطا کئے۔

(۲) انسان کو رب تعالیٰ نے ایسے دلائل عطا کئے جن کی وجہ سے حق و باطل میں فرق کیا جاسکتا ہے اور صلاح وفساد میں امتیاز کیا جاسکتا ہے اسی طرف رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی سے اشارہ ملتا ہے جب کہ ارشاد فرمایا ﴿وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ﴾ اور اسے دوا بھری دو چیزوں کی راہ دکھائی (یعنی بچے کو ماں کے دودھ بھرے دو پستانوں کی ہدایت دی) واضح ہوا بچے کو اس کی اصلاح کے لئے دودھ پینے اور نفع مند سمجھنے کی ہدایت رب تعالیٰ نے ہی دی۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول بھیج کر کتابیں نازل فرما کر اپنے بندوں کو ہدایت دی۔ یہ مسئلہ اللہ تعالیٰ کے ارشادات گرامیہ سے واضح ہورہا ہے ﴿وجعلْنا منْهُمْ اَئِمَّةً يَهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا ﴾ اور ہم نے ان کو (اسحٰق، یعقوب، لوط، ابراہیم علیہم السلام) امام کیا کہ ہمارے حکم سے بلاتے ہیں۔اور ارشاد ہوا:

﴿ اِنَّ هذا الْقُرْاٰنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ ﴾ "بیشک یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو سب سے سیدھی ہے"۔

(۴) " والرابع ان يكشف على قلوبهم السرائر ويريهم الاشياء كما هي بالوحي او الالهام والمنامات الصادقة وهذا قسم يختص بنيله الانبياء والاولياء " (بیضاوی)

ھدایت کی چوتھی قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں چھپی ہوئی چیزوں کو منکشف کر دیتا ہے اور ان کو چیزیں دکھا دیتا ہے کبھی وحی، کبھی الہام سے، اور کبھی سچے خوابوں کے ذریعے لیکن ہدایت کی یہ

چوتھی قسم صرف انبیاء کرام اور اولیاء کرام کو حاصل ہوتی ہے۔

غیب کا علم لوگ تو نبی کریم ﷺ کے علم غیب میں بھی شک کرتے ہیں لیکن قاضی بیضاوی رحمہ اللہ علیہ نے تو یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اولیاء کرام کو بھی چھپی چیزوں پر مطلع کر دیتا ہے۔

ھدایۃ کا ایک اور معنی: " قیل الاصل فیه الامالة " بعض نے کہا کہ ھدایت کا معنی مائل کرنا، پھیرنا جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا" انا ھدنا الیک " بیشک ہم تیری طرف میلان کرتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ جب مرض وصال میں مسجد میں نماز کے لئے تشریف لائے تو اسے ان الفاظ مبارکہ سے بیان کیا گیا "یتھادی بین اثنین " دو آدمیوں کے درمیان (ان کے سہارے پر) آپ حرکت فرمارہے تھے۔

اس وجہ سے ہدیہ کو بھی ہدیہ کہا جاتا ہے کہ اس میں بھی وہ چیز ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف منتقل ہوجاتی ہے۔حج سے رکاوٹ وغیرہ جب احرام کے بعد ہوتو احرام سے آزاد ہونے کے لئے حرم میں ذبح کے لئے جو جانور بھیجا جاتا ہے اسے "ھدی " کہا جاتا ہے کہ اسے حرم کی طرف چلایا جاتا ہے۔اب ﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴾ کا معنی ہوگا ہمارے دلوں کا دین حق کی طرف میلان قائم رکھ (قرطبی)۔

الھدیٰ اور الھدایۃ میں فرق: لغوی معنی کے لحاظ سے دونوں کا معنی ایک ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے "الھدی " کو اپنے ساتھ مخصوص فرمایا کسی انسان کی طرف اسے منسوب نہیں کیا البتہ "ھدایۃ "کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف بھی ہے اور بندوں کو ہدایت دینے کا اختیار بھی اللہ تعالیٰ نے دے رکھا ہے، اس لئے ہدایت رب تعالیٰ کے ساتھ مطلقاً خاص نہیں حقیقی طور پر وہی ہادی ہے اور مجازی طور پر بندے بھی ہادی ہیں۔ (ماحصل من مفردات راغب)

اھتداء: لفظ اھتداء خاص ہے اس سے جو انسان کوشش کرے اپنے اختیار سے خواہ وہ امور دنیا کے حصول میں کوشش ہو، یا اخروی امور کے حصول میں کوشش ہو۔

فائدہ: ھدایت کی تکمیل دو چیزوں پر موقوف ہے ہدایت دینے والے کی طرف سے تعلیم اور

تعریف پائی جائے اور ہدایت حاصل کرنے والے میں صلاحیت پائی جائے، جس طرح بارش زمین میں پودہ جات اگانے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔لیکن بارش کا نفع اسی زمین کو ہوتا ہے۔جس میں اگانے کی صلاحیت ہو۔ ریتلی زمین ،شور زمین کو بارش سے کوئی نفع نہیں ہوتا اسی طرح ہدایت تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہرایک کو حاصل ہوتی ہے لیکن نفع صرف ان کو ہی ہوتا ہے جن میں ہدایت کو قبول کرنے کی صلاحیت ہو۔

اسی بحث سے ﴿وَاللّٰهُ لَایَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ﴾(اللہ تعالیٰ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا)اور ﴿وَاللّٰهُ لَایَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ﴾(اللہ تعالیٰ کافر قوم کو ہدایت نہیں دیتا) کا مفہوم بھی سمجھ آ گیا کہ ان میں سمجھنے، ماننے ،ایمان لانے کی گویا کہ صلاحیت ہی نہیں ۔کہ وہ رب تعالیٰ کی ہدایت سے نفع حاصل کرسکیں۔ (ازمفردات راغب)

الصراط: اصل میں سین سے سراط ہے چونکہ طاء حروف مطبقہ سے تھا اور سین منخفضہ مہموسہ سے تھا اس لئے دونوں کی صفات میں تباین تھا لہذا سین کو صاد سے تبدیل کردیا گیا کیونکہ صاد بھی مطبقہ سے ہے۔

سراط لیا ہوا ہے "سرط الطعام" سے جس کا معنی ہے اس نے طعام کو نگلا۔راستہ کو بھی اسی وجہ سے سراط کہا گیا ہے کہ وہ بھی اپنے پر چلنے والا کو نگل لیتا ہے۔اسی وجہ سے راستہ کو "لقم" (لام پر زبر قاف ساکن) بھی کہا گیا ہے۔کہ وہ چلنے والے کو لقمہ بنالیتا ہے۔یا چلنے والا اسے لقمہ بنالیتا ہے کہ اسے طے کرتا ہے خیال رہے سیدھے راستہ کو "لقم" (لام اور قاف پر زبر) کہا جاتا ہے۔

فائدہ: قریش کی لغت (۱) صاد سے "صراط" ہے اور بنی قیس کی لغت (۲) میں سین سے "سراط" ہے۔اور کچھ باقی حضرات نے صاد کو اس انداز پر پڑھا ہے کہ اس میں معمولی سی "زاء" کی آواز بھی آتی ہے۔اگرچہ تینوں صورتیں جائز ہیں۔تاہم مصحف عثمان رضی اللہ عنہ میں صرف صاد والی لغت ہی استعمال ہے۔اس لئے یہی سب سے بہتر ہے۔ (بیضاوی وشیخ زادہ)

المستقیم:" المستوی لااعوجاج فیه "(روح المعانی) مستقیم کا معنی سیدھا ہونا جس میں ٹیڑھا پن نہ پایا جائے۔

صراط مستقیم بمعنی وسط الطریق:

جب صراط مستقیم صراط مستوی (سیدھے راستہ) کو کہا جاتا ہے۔تو صراط مستوی کو درمیانہ راستہ ہونا ضروری ہے۔اسی لئے ذکر کیا گیا ہے "الصراط المستقیم وھو الذی یکون معتدلابین الافراط والتفریط" صراط مستقیم اس راستہ کو کہا جاتا ہے جو افراط اور تفریط کے درمیان ہو۔

(نور الانوار ص ۲)

افراط اور تفریط دونوں ہی مذموم ہیں:

☆ عبادت میں افراط یہ ہے کہ ہندوؤں کی طرح جسے چاہا معبود بنالیا۔اور تفریط یہ ہے کہ دنیا کے مشاغل اور کاروبار زندگی سے اپنے آپ کو فارغ نہ کرے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے کوئی وقت نہ نکالے: چنانچہ معمول فرقه انگریز ودیگر ملاحده است جیسا کہ انگریزوں اور دوسرے بے دین لوگوں کا طریقہ ہے۔

☆ استعانت میں افراط (زیادتی) یہ ہے کہ ہر چیز کو مؤثر سمجھ کر امداد طلب کرے ستاروں کو مؤثر سمجھے، دنوں سے نحوست اور برکت کی کامل تاثیر سمجھتا ہو اور تفریط (نقص، کمی) یہ ہے کہ دوا غذا کو بھی مؤثر نہ سمجھے، کسی قسم کے پرہیز کو بھی غیر مؤثر سمجھے "ومثل صحبت نیکاں وصحبت بداں ودعاء والتجا درجناب الهی ساقط الاعتبار انکارند" بلکہ نیک لوگوں کی صحبت کے فوائد کا انکار کرے اور برے لوگوں کی صحبت کے نقصانات کو تسلیم نہ کرے اور رب تعالیٰ سے دعا کرنے کے متعلق بھی کہے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ (عزیزی)

صراط مستقیم جبر وقدر کے وسط:

جبریہ فرقہ اس کا قائل ہے کہ انسان پتھر کی طرح مجبور محض ہے نہ وہ خالق ہے اور نہ ہی اسے کسب کرنے کا کوئی اختیار ہے جو کام بھی وہ کرتا ہے اس سے جبریہ طور پر اللہ تعالیٰ کراتا ہے یہ فرقہ باطل ہے ان کا مذہب حق مانا جائے تو ثواب وعذاب باطل ہو کر رہ جائیں گے۔قدریہ فرقہ یہ کہتا ہے کہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے ان کا مذہب باطل ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہ واللہ

خلقکُم وَمَا تعمَلُونَ ﴿﴾ اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا کیا اور جو تم عمل کرتے ہو۔

اس سے واضح ہوا کہ تمام افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا" القدریة مجوس هذه الامة" قدریہ فرقہ والے اس امت کے مجوسی ہیں۔

ان دونوں فرقوں کے درمیان اہل سنت و جماعت کا مذہب ہے وہی صراط مستقیم ہے اہل سنت و جماعت کا مذہب یہ ہے کہ بندہ کسی چیز کا خالق تو نہیں البتہ اللہ تعالیٰ نے بندہ کو کام کے کرنے یا نہ کرنے کا اختیار دے رکھا ہے۔ اسی وجہ سے اسے ثواب حاصل ہوتا ہے اور عذاب بھی ہوگا۔

(نور الانوار مع قمر الاقمار)

رفض وخروج کے درمیان صراط مستقیم:

رافضیوں نے اکثر صحابہ کو چھوڑ دیا اسی وجہ سے وہ رافضی کہلائے انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق وحضرت عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت کا انکار کیا، موزوں پر مسح کا انکار کیا تاکہ ان کا باطل مذہب پاؤں پر مسح کرنا ثابت ہو جائے۔ اور انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی صحابہ کرام کو گالیاں دیں، وہ صحابہ کرام کو گالیاں دے کر محبت علی کا دم بھرتے ہیں۔ یہ مذہب باطل ہے کیونکہ انہوں نے محبت علی میں افراط سے کام لیا ہے۔

خارجیوں نے محبت علی میں تفریط کی ہے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا انکار کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لڑائیاں کیں بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عداوت کی وجہ سے آپ کے سسر ہونے کے ناطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی گالیاں دیں (معاذ اللہ) یہ مذہب بھی حق سے دور ہے سرے سے باطل مذہب ہے۔

صراط مستقیم ان کے درمیان ہے جو اہل سنت و جماعت کا مذہب ہے کہ صحابہ کرام تمام عادل ہیں۔ اپنے اپنے وقت تمام خلفاء راشدین کی خلافتیں برحق تھیں۔

(نور الانوار مع قمر الاقمار وسر الاسرار)

اسی مسئلہ کو علامہ نووی رحمہ اللہ نے کچھ تفصیل سے بیان کیا ہے عوام وخواص کے فائدہ کے لئے

اسے نقل کر رہا ہوں تاکہ وہ اپنے ایمان کو درست رکھ سکیں" اختلف الناس فی تفضیل بعض الصحابة " بعض لوگوں نے صحابہ کرام کو بعض کو بعض پر فضیلت سے انکار کیا لیکن جمہور حضرات اس طرف ہیں کہ صحابہ کرام میں بعض حضرات کو بعض پر فضیلت حاصل ہے۔

" فقال اهل السنة افضلهم ابوبکر صدیق ثم عمر قال جمهورهم ثم عثمان ثم علی "

" اہل سنت وجماعت کا اس پر اتفاق ہے کہ تمام صحابہ کرام سے افضل حضرت ابوبکر صدیق، پھر حضرت عمر پھر حضرت عثمان پھر حضرت علی المرتضیٰ (رضی اللہ عنہم) ہیں"۔ اہل سنت میں سے بعض حضرات نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر فضیلت دی ہے "والصحیح المشهور تقدیم عثمان " لیکن صحیح اور مشہور یہی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو فضیلت حاصل ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے"قال ابو منصور البغدادی اصحابنا مجمعون علی ان افضلهم الخلفاء الاربعة علی الترتیب المذکور "ابو منصور بغدادی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ہمارے اصحاب اس پر متفق ہیں کہ تمام صحابہ کرام سے افضل چار خلفاء راشدین ہیں۔ ان میں فضیلت کی وہی ترتیب ہے جو ان کی خلافت میں ہے۔ پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا درجہ بھی پہلا ہے۔ اور دوسرے خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا درجہ بھی دوسرا ہے اور تیسرے خلیفہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا درجہ بھی تیسرا ہے اور چوتھے خلیفہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا درجہ بھی چوتھا ہے۔

" واما عثمان رضی الله عنه فخلافته صحیحة بالاجماع وقتل مظلوما وقتلته فسقة لان موجبات القتل مضبوطة ولم یجر منه رضی الله عنه مایقتضیه "

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت صحیح ہے اس پر اجماع امت ہے آپ کو مظلومیت کی حالت میں شہید کیا گیا۔ آپ کو فاسقوں نے قتل کیا ہے۔ آپ نے ان کی منشاء کے مطابق کام نہیں کیا تو انہوں نے اپنے آپ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے میں حق بجانب سمجھا۔ اور اپنے زعم باطل میں آپ کو شہید کرنے کے اسباب مضبوط سمجھے:

" ولم یشارک فی قتله احد من الصحابة وانما قتله همج ورعاع من غوغاء القبائل وسفلة الاطراف والارزال تحربوا وقصدوه من مصر فعجزت الصحابة عن دفعهم فحصروه حتی قتلوه رضی الله عنه"

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کوشہید کرنے میں کوئی صحابی بھی شریک نہیں تھا۔ بلکہ آپ کو بے وقوف منافقین اور دہقانیوں نے شہید کیا۔ جومختلف اطراف سے کمینے اور گھٹیا لوگ جمع ہو گئے تھے۔ جنہوں نے تخریب کاری کی یہ مصر سے آئے ہوئے لوگ تھے (جن کا قائد عبد اللہ بن سبا یہودی منافق تھا) ان لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کا محاصرہ کر کے آپ کوشہید کر دیا، صحابہ کرام ان کے دفاع کرنے سے عاجز آ گئے (کیونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قتال کی اجازت نہیں دے رہے تھے):

" واما علی رضی اللہ عنہ فخلافتہ صحیحۃ بالاجماع و کان ھو الخلیفۃ فی وقتہ لا خلافۃ لغیرہ '

'' لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت صحیح ہے آپ اپنے دور کے خلیفہ برحق تھے اس وقت خلافت کا دوسرا کوئی حقدار نہیں تھا''

"واما معاویۃ فھو من العدول الفضلاء والصحابۃ النجباء " لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ عادل، فاضل حضرات میں سے ہیں۔ یعنی عادل اور صاحبِ فضیلت صحابی ہیں۔ اور عظیم المرتبت اور رب تعالیٰ کے مقبول صحابہ میں سے ہیں۔

جولڑائیاں صحابہ کرام کے درمیان واقع ہوئیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہرگروہ اپنے اپنے شکوک وشبہات کی وجہ سے اپنے آپ کوحق پر سمجھتا تھا یہی وجہ ہے کہ "وکلھم عدول " تمام صحابہ کرام عادل تھے۔ چونکہ ان کے اختلافات اورلڑائیوں میں ہر ایک اپنی اپنی تاویل پیش کرتا (اپنی حقانیت پر دلائل پیش کرتا) اسی وجہ سے "ولم یخرج شئی من ذالک احدا منھم من العدالۃ " ان میں سے کسی ایک کوبھی ان وجوہ نے عدالت سے نہیں نکالا بلکہ تمام صحابہ کرام بفضلہ تعالیٰ عادل تھے۔ (کوئی بھی ظالم نہیں تھا)۔

ان کے اختلاف ایسے ہی تھے جیسے ائمہ مجتہدین کے اختلافات ہوتے ہیں۔ ان کی اجتہادی خطا کی وجہ سے کسی پر عیب نہیں لگایا جاسکتا (اسی طرح صحابہ کرام کے جو اختلافات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت اور خون کا بدلہ لینے کے مطالبہ پر شروع ہوئے وہ بھی اجتہادی خطا اور اپنی اپنی طرف سے

دلائل کے پیش کرنے کی وجہ سے تھے لہذا تمام کو عادل اور نیک متقی سمجھا جائے گا بڑے بڑے اولیاء کی ساری عمر کی نیکیاں ان کے ایک لمحہ کے برابر نہیں ہوسکتیں جو انہوں نے نبی کریم ﷺ کی صحبت میں گزارا)۔

جب صحابہ کرام کی لڑائیوں کے اسباب مشتبہ تھے، شدید اشتباہ کی وجہ سے ہر شخص اپنی اپنی رائے کے مطابق عمل کر رہا تھا۔ ہر ایک کے پاس کوئی نہ کوئی دلیل تھی اس صورت حال میں صحابہ کرام کے تین گروہ بن گئے ۔ کچھ لوگ ایک گروہ کو حق پر سمجھنے لگے اور ان کی امداد کرنا اپنے آپ کے لئے واجب سمجھنے لگے اور دوسرے گروہ کو باغی سمجھنے لگے اسطرح بعض ایک گروہ سے مل گئے ۔ کچھ لوگ دوسرے گروہ کو حق پر سمجھتے ہوئے ان کے ساتھ مل گئے انہوں نے ان کے ساتھ تعاون کرنے کو واجب سمجھا۔ اور دوسرے گروہ کو باغی سمجھا۔ تیسرے حضرات وہ تھے جو کوئی فیصلہ نہ کر پائے بلکہ متحیر رہے کہ کس فریق کو حق پر سمجھا جائے جب ان سے کوئی فیصلہ نہ ہوسکا "فاعتزلوا الفریقین" تو انہوں نے دونوں فریقوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی:

" وکان ھذا الاعتزال ھو الواجب فی حقھم لانہ لایحل الاقدام علی قتال مسلم حتی یظھر انہ مستحق لذالک "

جن لوگوں کو یہ نہ پتہ چل سکا کہ کون سا فریق حق پر ہے ان کا ہر فریق سے کنارہ کش ہونا ان کے لئے واجب تھا۔ اس لئے کہ کسی مسلمان کو ناحق بغیر تحقیق کے قتل کرنا جائز نہیں۔ اگر ان کو معلوم ہوتا کہ ایک فریق حق پر ہے دوسرا باغی ہے تو یقیناً ان کے لئے حق کا ساتھ دینا واجب ہوتا، حق سے کنارہ کشی ان کے لئے لازم نہ ہوتی" ولھذا اتفق اھل الحق ومن یعتد بہ فی الاجماع علی قبول شھاداتھم ورو ایاتھم وکمال عدالتھم رضی اللہ عنھم "اسی لئے اہل حق کا اس پر اتفاق ہے اور جن لوگوں کا اجماع معتبر ہے وہ اس پر متفق ہیں کہ تمام صحابہ کرام کی شہادات قابل قبول ہیں اور ان کی روایات معتبر ہیں وہ سب ثقہ راوی ہیں اور تمام کامل عادل ہیں "رضوان اللہ علیھم اجمعین" (از نووی شرح مسلم ج ثانی کتاب فضائل الصحابۃ) میں اپنے عزیز طلباء کرام کو عام طور پر دو حدیثیں یاد رکھنے کی ترغیب دیتا ہوں کہ ایمان بڑی چیز ہے:

" عن عبد الله بن مغفل قال قال رسول الله ﷺ الله الله فی اصحابی لا تتخذوھم غرضا من بعدی فمن احبھم فبحبی احبھم ومن ابغضھم فببغضی ابغضھم ومن آذاھم فقد آذانی ومن آذانی فقد آذی الله ومن آذی الله فیوشک ان یاخذہ ......رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث غریب" (مشکوۃ باب مناقب الصحابۃ)

'' عبداللہ ابن مغفل سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ سے ڈرتے رہو اللہ سے ڈرتے رہو میرے صحابہ کے حق میں ،میرے بعد ان کو مورد طعن و تشنیع نہ بنانا۔جو شخص ان سے محبت کرے گا وہ میرے ساتھ محبت رکھنے کی وجہ سے ہی ان سے محبت کرے گا۔اور جو شخص ان سے بغض رکھے گا وہ میرے ساتھ بغض رکھنے کی وجہ سے ہی ان سے بغض رکھے گا۔جس شخص نے ان کواذیت پہنچائی اس نے مجھے اذیت پہنچائی۔جس نے مجھے ایذا (تکلیف) پہنچائی اس نے اللہ کو ایذا پہنچائی جس نے اللہ تعالیٰ کوایذا پہنچائی قریب ہے کہ اللہ اسے اپنی گرفت میں لے لے''۔

بہت واضح ہوا کہ گستاخ صحابہ درحقیقت گستاخ رسول ہے اور گستاخ رسول درحقیقت گستاخ خدا ہے۔اور گستاخ خدا قیامت کے دن اسی کی گرفت میں ہوگا۔

محبّ صحابہ کرام درحقیقت محبّ مصطفیٰ ہے۔اور محبّ مصطفیٰ ہی درحقیقت محبّ خدا ہے اب جس کا جو دل مانے وہ راستہ اختیار کرے چاہے تو گمراہ ہو، چاہے تو مومن رہے ﴿ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ ﴾

ہاں خیال رہے کوئی شخص ضعیف ایمان والا حدیث پاک میں " ھذا حدیث غریب " کے الفاظ دیکھ کر حدیث ضعیف کہہ کہ لوگوں کو گمراہ نہ کرے اس عقل کے اندھے سے پوچھئے کیا حدیث غریب صحیح اور حسن نہیں ہوسکتی ۔غریب وضعیف کا فرق نہ سمجھنا ،طنز صحابہ کرام پر کرنا، سبحان اللہ کیسی علمیت ، جہلاء کا کام ہے شور وغل کرنا ،اور سنجیدہ حضرات کا کام ہے متانت سے بات کرنا، یہی حق وباطل کا فرق ہے:

" عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ اذا رأیتم الذین یسبون اصحابی فقولوا لعنۃ الله علی شرکم......... رواہ الترمذی " (باب مشکوۃ مناقب الصحابۃ)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم دیکھو ان لوگوں کو جو میرے صحابہ کو گالیاں دے رہے ہوں تو تم کہو اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو تمہارے شر پر۔

سبحان اللہ میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ کا کیسا پیارا ارشاد گرامی ہے کہ فتنہ بازوں سے الجھنے کی ضرورت نہیں۔ صحابہ کرام کی شان میں ان کے گستاخانہ کلمات کو سن کر ان کی فتنہ بازیوں پر لعنت کرو یعنی انہیں منحوس سمجھو اس لئے کہ وہ بد بخت خود تو گمراہ ہیں کہیں تمہیں بھی گمراہ نہ کر دیں۔

اہل سنت و جماعت صراط مستقیم پر:

اہل سنت و جماعت کا شاندار عقیدہ جس میں صحابہ کرام واہل بیت عظام کی عظمت کا پاس کیا گیا ہے:

" ونعم ماقال الامام فخر الدین الرازی فی تفسیرہ نحن معاشر اهل السنة بحمد الله رکبنا سفینة محبة اهل البیت واهتدینا بنجم هدی اصحاب النبی ﷺ فنرجو النجاة من اهوال القیامة ودرکات الجحیم والهدایة الی مایوجب درجات الجنان والنعیم المقیم " (مرقاۃ باب مناقب اهل البیت)

" علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے کتنا اچھا اپنی تفسیر میں بیان فرمایا ہم اہل سنت بحمد اللہ محبت اہل بیت کی کشتی پر سوار ہیں اور صحابہ کرام کی ہدایت کے ستاروں سے ہدایت حاصل کر رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہمیں قیامت کی ہولناکیوں اور جہنم کے تمام طبقات سے نجات حاصل ہوگی اور ایسے راستے کی ہدایت حاصل ہوگی جو ہمیں جنت اور نعیم مقیم میں پہنچا دے گا"۔

علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا عقیدہ اور تمام اہل سنت کا عقیدہ دو حدیثوں کو یکجا جمع کر کے ان کا نچوڑ اور خلاصہ بیان فرمایا ہے۔ ایک حدیث پاک وہی ہے جس کی شرح میں علامہ علی قاری رحمہ اللہ نے علامہ رازی رحمہ اللہ کا یہ قول ذکر فرمایا حدیث پاک کی طرف توجہ فرمائیں:

" عن ابی ذر انه قال وهو اخذ بباب الکعبة سمعت النبی ﷺ یقول الا ان مثل اهل بیتی فیکم مثل سفینة نوح من رکبها نجا ومن تخلف عنها هلک " (رواہ احمد ،مشکوۃ باب مناقب اهل بیت)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے بیشک آپ نے کعبہ کے دروازہ کو پکڑ کر فرمایا میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا خبردار بیشک تم میں میرے اہل بیت کی مثال نوح علیہ السلام کی کشتی کی ہے جو اس میں سوار ہوا وہ نجات حاصل کر گیا اور جو

اس میں سوار ہونے سے پیچھے رہ گیا وہ ہلاک ہو گیا۔

دوسری حدیث پاک جس کو اس حدیث سے ملا کر نتیجہ نکالا گیا، وہی نتیجہ اہل سنت و جماعت کا عقیدہ ہے۔ وہ حدیث یہ ہے:

" عن عمر بن الخطاب قال سمعت رسول الله ﷺ يقول سألت ربي عن اختلاف اصحابي من بعدى فاوحي الي يا محمد ان اصحابک عندي بمنزلة النجوم في السماء بعضها اقوى من بعض ولكل نور فمن اخذ بشئي مما هم عليه من اختلافهم فهو عندي على هدى قال وقال رسول الله ﷺ اصحابي كالنجوم فبايهم اقتديتم اهتديتم " (رواه رزين، مشكوة باب مناقب الصحابة)

" حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا میں نے اپنے رب سے اپنی موت کے بعد صحابہ کے اختلاف کے متعلق سوال کیا میری طرف وحی کی گئی اے محمد بیشک آپ کے صحابہ میرے نزدیک آسمان میں ستاروں کی مانند ہیں، بعض بعض سے قوی ہیں اور ہر ایک کو نورانیت حاصل ہے ان کے اختلافات میں سے کسی نے کوئی چیز حاصل کر لی وہ میرے نزدیک ہدایت پر ہوگا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں ان میں سے جس کی بھی اقتداء کرو گے ہدایت پا جاؤ گے "

وضاحت حدیث:

نبی کریم ﷺ کا سوال فروع شرائع میں اختلاف کی حکمت کے متعلق تھا۔ آسمان میں ستاروں کی طرح ہونے کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہدایت دیں گے۔ غلط راہ کو باطل کریں گے جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ﴾ ستاروں سے وہ ہدایت حاصل کرتے ہیں۔ بعض کا بعض سے قوی ہونا اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ انوار سے مراتب میں بعض صحابہ کرام کو بعض سے فوقیت حاصل ہے۔ ہر ایک کو نور حاصل ہے یعنی تمام صحابہ کرام کو بقدر استعداد نور حاصل ہے۔

☆ ان کے اختلافات کے باوجود کوئی شخص کسی صحابی کے مسلک پر چلے وہ ہدایت پر ہوگا اس سے ثابت ہوا کہ امت کا اختلاف فروع دین میں رحمت ہے اصول دین میں اختلاف گمراہی کا سبب ہے۔

☆ سب کا ہدایت پر ہونا یہ دلیل ہے کہ صحابہ کرام کا اختلاف فروع دین میں تھا اصول دین میں

نہیں تھا۔

"ان مراده ﷺ الاختلاف الذی فی الدین من غیر اختلاف للغرض الدنیوی"

نبی کریم ﷺ نے جس اختلاف کا ذکر فرمایا اس سے مراد وہ اختلاف ہے جو دین میں ازروئے تحقیق کے ہو دنیاوی غرض حائل نہ ہو۔ (مرقاۃ)

اعتراض: صحابہ کرام کا اختلاف تو خلافت وحکومت میں تھا۔ یہ اختلاف تو دنیاوی غرض کی وجہ سے تھا دینی غرض کی وجہ سے نہیں تھا اس اختلاف کو رشد وہدایت کیسے کہا جا سکتا ہے۔

جواب: "الظاهر ان اختلاف الخلافة ایضا من باب اختلاف فروع الدین الناشئی عن اجتهاد کل لاعن الغرض الدنیوی الصادر عن الحظ النفسی" (مرقاۃ)

یہ ظاہر بات ہے کہ صحابہ کرام کا اختلاف، خلافت کے معاملہ میں بھی فروعِ دین میں ہی اختلاف تھا جو ہر ایک کے اجتہاد کی وجہ سے اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ اس میں خواہشات نفسانیہ کی وجہ سے کوئی دنیاوی غرض حائل نہیں تھی۔ دونوں حدیثوں کے مطالب سمجھنے کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ دنیا میں کفر، گمراہیاں، بدعات، جہالتیں اور غلط قسم کی خواہشات سمندر کی موجوں کی طرح ہیں۔ گہرے دریا کی ظلمات سے نکلنے کے لئے کشتی کی ضرورت ہے۔ بغیر کشتی کے سمندر کی موجوں کی تھپیڑوں سے نکلنا ممکن نہیں۔ وہ کشتی اہل بیت کی محبت کی کشتی ہے۔ جب تک اہل بیت کی محبت کی کشتی پر سوار نہیں ہوگا۔ سمندر کی موجوں میں پھنسا رہے گا۔ لیکن یہ بھی خیال رہے کہ کشتی کا تاریکی میں ستاروں سے راہنمائی حاصل کرنے کے بغیر کنارے پر پہنچنا ممکن نہیں ہوتا۔

اس لئے محبت اہل بیت کی کشتی پر سوار ہونے کے باوجود صحابہ کرام سے راہنمائی حاصل کرنی ضروری ہے۔ کیونکہ وہ ستاروں کی طرح ہیں سبحان اللہ نبی کریم ﷺ نے اپنے دونوں ارشادات میں کیسا خوب رابطہ قائم فرمایا کہ صحابہ کرام کو ستاروں سے تشبیہ دی اور فرمایا کہ جس نے ان کی اقتداء کی وہ ہدایت حاصل کر گیا اور اہل بیت کو نوح علیہ السلام کی کشتی سے تشبیہ دی۔ اہل سنت و جماعت کیسے خوب عقیدہ پر قائم ہیں اسی کا نام صراط مستقیم ہے۔

تشبیہ و تعطیل کے درمیان صراط مستقیم:

ایک فرقہ مشبھہ ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو مخلوق سے تشبیہ دی اس کے لئے جسم تسلیم کیا انہوں نے کہا رب تعالیٰ کھاتا ہے اور پیتا بھی ہے۔

دوسرا فرقہ تعطیلیہ ہے جنہوں نے رب تعالیٰ کو معطل مانا ہے کہ اس نے صرف عقل اول کو پیدا کیا ہے اور عقل اول نے عقل دوم کو اس طرح وہ دس عقول مانتے وہی نظام عالم چلا رہے ہیں۔ اہل سنت و جماعت کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جسمیت، کھانے، پینے وغیرہ سے پاک ہے۔ اور وہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہ خود ہی نظام عالم کو چلانے والا ہے۔ **مصرف الامور وہ خود ہی ہے۔**

(نور الانوار مع قمر الاقمار)

محبت و عقل کے درمیان صراط مستقیم:

ایسا عشق محض بھی نہ ہو جو مجذوبیت تک پہنچادے۔ اور ایسا عقل محض بھی نہ ہو جو ملحد، بے دین بنا دے جس کی وجہ سے انسان صرف ظاہری اسباب کا پجاری بن جائے۔ اور اس کے ذہن سے خالق کا تصور جاتا رہے۔ اس کے درمیان راہ سلوک ہے کہ شریعت کے مطابق چلے زہد و تقوی اختیار کرے عشق محض میں مبتلاء ہو کر اپنے آپ کو مقام مجذوبیت تک نہ پہنچائے اور فلاسفہ کی طرح ہر چیز کو فقط اسباب کے تابع نہ سمجھے بلکہ یہ ایمان رکھے کہ ان تمام چیزوں کو معرض وجود میں لانے والا صرف خالق کائنات ہے بس یہی صراط مستقیم ہے۔

(نور الانوار مع قمر الاقمار)

صراط مستقیم بمعنی عفت:

ایک راہ یہ ہے کہ انسان خواہشات نفسانیہ میں واقع ہو فسق و فجور میں مبتلا ہو دوسرا راستہ یہ ہے کہ انسان پر جمود (خشکی) طاری رہے، بخیل ہو، مال کو اپنے پاس روک کر رکھے بہت ہی حاجتمند کو ضرورت کے وقت مال نہ دے یہ دونون راستے باطل ہیں۔ ان کے درمیان عفت ہے وہی صراط مستقیم ہے خواہشات ہوں لیکن شریعت کے تابع ہوں فسق و فجور سے دور رہے نیکی و تقوی اختیار کرے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرے حاجتمندوں کی حاجات کو پورا کرے۔

صراط مستقیم بمعنی شجاعت:

ایک راہ یہ ہے کہ انسان بلا مقصد ہر وقت پیشانی پر تیوری چڑھائے رکھے اسے دیکھیں تو آدم خور نظر آئے بے مقصد بلاوجہ جلدی سے طیش میں آجائے ،ظالم ہو۔دوسرا راستہ یہ ہے کہ بزدل ہو ،جہاد کرنے سے ڈرے ،ہر کسی کا خوف اس پر طاری ہو ،ہر وقت غم اور پریشانی میں مبتلا ہو ،جزع وفزع کرے یعنی صبر نہ کر سکے۔یہ دونوں راستے باطل ہیں۔

ان دونوں راستوں کے درمیان صراط مستقیم ہے وہ یہ ہے کہ انسان خوش اخلاق ہو اس کا چہرہ ہنس مکھ ہو بلاوجہ کسی پر غصہ نہ کرے عدل وانصاف کرے صرف خوف خدا دل میں ہو جب خوف خدا دل میں ہوگا ،بزدلی خود بخود جاتی رہے گی جہاد کے لئے شجاعت و بہادری حاصل ہوجائے گی ،اسی طرح مخلوق کا خوف وحزن زائل ہوجائے گا جزع وفزع دور ہوجائیں گے ،صبر حاصل ہوگا ،اسی کا نام شجاعت ہے۔

صراط مستقیم بمعنی حکمت:

انسان کی ایک راہ یہ ہے کہ اسے جہالت حاصل ہو غباوت (کند ذہنی) حاصل ہو اور بلادت (بے وقوفی) حاصل ہو۔دوسرا راستہ یہ ہے کہ انسان مکروفریب سے کام لے ،دھوکہ باز ہو کسی اچھے کام سے دور رہے اور برے کاموں کو حاصل کرنے میں حیلہ باز ہو اس کی ہر رائے غلط طیش دلانے والی ہو۔اس کے درمیان صراط مستقیم ہے جسے حکمت کہا گیا ہے۔وہ یہ ہے کہ انسان علم دین حاصل کرے کم از کم اختیاری غباوت اور بلادت سے دور رہے ،حق گوئی سے کام لے مکروفریب نہ کرے کسی کو ظاہر وباطن ایک جیسا رکھ کر نفع پہنچانے کی کوشش کرے ،دھوکہ بازی سے کام نہ لے ،حیلہ بازی سے نیکی کے کاموں کو چھوڑنے اور برائیوں کو حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے ہر شخص کو اچھی رائے دے لوگوں کو لڑانے کی کوشش نہ کرے۔

صراط مستقیم بمعنی عدل:

عدل کا معنی ہی چونکہ برابر ہے اس کا مدمقابل لفظ ظلم ہے جس کا معنی ہے "وضع الشئی فی غیر

محلہ " کسی چیز کو اپنے محل کے غیر میں رکھنا۔ چور، ڈاکو، جواباز، ہر قسم کے لیٹرے، قتل وغارت کا بازار گرم کرنے والوں کو چھوڑ دینا ان سے پیسے لے لینا، یا ان کے حق میں سفارش قبول کر لینا، یا اپنی نوکریاں بچانے کے لئے غاصبوں، لیٹروں، قانون کی دھجیاں بکھیرنے والوں کو حقدار سمجھ لینا ظلم عظیم ہے۔

اسی طرح چوروں کو سزا نہ دینا، قرآنی سزاؤں کو یہود ونصاری کو خوش کرنے کے لئے وحشیانہ سزائیں کہنا بھی ظلم عظیم ہے۔

اس کے درمیانی راستہ کو ہی عدل کہا جائے گا وہی صراط مستقیم ہے عدل کو چھوڑ دینے کی وجہ سے ہی آج ہر طرف افراتفری کا بازار گرم ہے ہر طرف تخریب کاری کے اڈے قائم ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق عقیدہ صراط مستقیم:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ایک عقیدہ یہود کا ہے۔ جنہوں نے آپ کو معاذ اللہ ولد الزنا کہا ہے آپ کی والدہ مکرمہ پر ناجائز بہتان باندھا ہے اور معاذ اللہ حضرت مریم کے ناجائز تعلقات یوسف نجار سے ثابت کئے۔ یہود نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق تفریط سے کام لیا کہ آپ کے مرتبہ کو کم کرنے کی ناپاک کوشش کی۔

دوسرا فرقہ نصاری کا ہے جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو خدا تسلیم کیا بعض نے خدا کا بیٹا آپ کو کہا بعض نے آپ کو خدا کے ساتھ تیسرا خدا کا شریک مانا۔ ان لوگوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق افراط سے کام لیا ہے یعنی حد سے تجاوز کیا۔

لیکن اہل سنت وجماعت نے آپ کے متعلق وہ عقیدہ پیش کیا ہے جو عیسیٰ علیہ السلام نے خود بچپن میں اپنی والدہ کی پاکدامنی کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا " قال انی عبد اللہ اتنی الکتاب وجعلنی نبیا " کہ بیشک میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب عطا کی اور مجھے نبی بنایا۔

بس یہی صراط مستقیم ہے کہ آپ کو خدا نہ مانا جائے بلکہ خدا کا بندہ مانا جائے معاذ اللہ آپ پر بہتان تراشی سے اپنا ایمان برباد نہ کیا جائے بلکہ آپ کو اللہ تعالیٰ کا سچا نبی مانا جائے۔

(از جواهر طنطاوی)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق عقیدۂ صراط مستقیم:

" عن علی قال قال رسول اللہ ﷺ فیک مثل من عیسی ابغضته الیهود حتی بهتوا امه واحبته النصاری حتی انزلوه بالمنزلة التی لیست له ثم قال یهلک فی رجلان محب مفرط یقرظنی بما لیس فی ومبغض یحمله شنانی علی ان یبهتنی ۔۔۔۔ رواه احمد " (مشکوۃ باب مناقب علی)

" حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہاری مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہے یہود نے ان سے بغض کیا یہاں تک کہ ان کی والدہ پر بہتان لگایا اور نصاری نے ان سے محبت کی یہاں تک کہ ان کو وہ مرتبہ دیا جو ان کا نہیں تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا میرے حق میں دو شخص ہلاک ہو جائیں گے ایک وہ جو میرے ساتھ بہت زیادہ محبت کریں گے اور میری مدح میں وہ چیزیں ذکر کریں گے جو مجھ میں نہیں۔ اور دوسرا وہ جو مجھ سے بغض رکھے گا جس کی وجہ سے وہ میرے ساتھ عداوت کرے گا اور مجھ پر بہتان باندھے گا"۔

وضاحت حدیث: " یهلک فی " کا معنی یہ ہے کہ میرے حق میں بھٹک جائیں گے "رجلان" سے مراد دو گروہ ایک خارجی فرقہ اور دوسرا رافضی فرقہ "محب مفرط" کا معنی یہ ہے کہ حد سے زیادہ محبت میں مبالغہ کرنے والا "یقرظنی" تقریظ سے لیا ہوا ہے جس کا معنی ہے کسی کی مدح کرنا عام طور پر کتب کے شروع میں تقریظات ہوتی ہیں ان کا بھی یہی مطلب ہوتا ہے کہ مصنف اور اس کی تصنیف شدہ کتاب کی مدح کی جاتی ہے "بما لیس فی" کا مطلب یہ ہے کہ گویا کہ مجھے تمام صحابہ پر فضیلت دے گا جس کا میں مستحق نہیں۔ بعض لوگ مجھے انبیاء کرام پر فضیلت دے کر گمراہ ہوں گے حالانکہ اس منصب کا مجھ میں تصور تک بھی نہیں کیا جا سکتا اور کچھ لوگ مجھ میں اپنی نادانی کی وجہ سے الوهیت ثابت کریں گے جس کا مجھ میں وہم و گمان کرنا بھی ممکن نہیں۔

عجیب نکتہ: محبّ کے ساتھ مفرط کی قید ہے لیکن مبغض کے ساتھ مفرط ذکر نہیں "لان البغض باصله ممنوع بخلاف اصل الحب ممدوح" اس لئے کہ بغض کرنا مطلقاً ممنوع ہے۔ لیکن محبت کرنا قابل تعریف ہے لیکن حد سے زیادہ محبت کرنا، جس کی وجہ سے اس میں وہ اوصاف

بیان کئے جائیں جو اس میں نہیں یہ منع ہے "شنانی" کا معنی "عداوتی" میرے ساتھ عداوت (دشمنی) کرے گا "علی ان یبھتنی ......ای یتکلم علی البھتان وینسب الی الزور والعصیان" یعنی مجھ پر بہتان کی کلام کرے گا اور جھوٹ اور گناہ کی طرف مجھے منسوب کرے گا۔

☆ "وعن علی قال یحبنی اقوام حتی یدخلوا النار فی حبی ویبغضنی اقوام حتی یدخلوا النار فی بغضی" (مسند احمد فی المناقب)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کئی قومیں مجھ سے محبت کریں گی وہ میری محبت کی وجہ سے جھنم میں جائیں گی اور کئی قومیں مجھ سے بغض رکھیں گی وہ میرے ساتھ بغض رکھنے کی وجہ سے وہ جھنم میں جائیں گی۔

☆ "وعن السدی قال قال علی اللھم العن کل مبغض لنا وکل محب لنا غال" (مسنداحمد فی المناقب)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رب تعالٰی کے حضور عرض کیا اے اللہ ہم سے بغض رکھنے والوں پر لعنت فرما اور اے اللہ ہم سے محبت میں حد سے تجاوز کرنے والوں پر لعنت فرما۔ اہل سنت وجماعت کا عقیدہ ہی درحقیقت صراط مستقیم ہے یہ وہ عقیدہ ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا

"لایحب علیا منافق ولا یبغضه مؤمن" (مسند احمد ،ترمذی ،مشکوۃ باب مناقب علی)

حضرت علی سے کوئی منافق محبت نہیں کرے گا اور کوئی مومن بغض نہیں رکھے گا۔

حدیث پاک سے واضح ہوا کہ محبت علی ایمان ہے اور بغض علی منافقت ہے۔

"عن ام سلمة قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم من سب علیا فقد سبنی" (مسند احمد ،مشکوۃ باب مناقب علی)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے علی کو گالیاں دیں اس نے مجھے گالیاں دیں"۔ (از مرقاۃ)

واضح ہوا کہ توہین علی المرتضی درحقیقت توہین رسول خدا ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی گستاخی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گستاخی ہے نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے محبوب ،برگزیدہ صحابی اور اپنے وقت میں خلیفہ برحق ہیں۔

صراط مستقیم بمعنی کتاب اللہ:

" عن علی بن ابی طالب رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ الصراط المستقيم كتاب الله "

" حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا صراط مستقیم سے مراد کتاب اللہ (قرآن پاک) ہے"۔

صراط مستقیم بمعنی اسلام : " وقال ميمون بن مهران عن ابن عباس في قوله تعالىٰ ......اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ قال ذاك الاسلام"

میمون ابن مہران کہتے ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ کے متعلق پوچھا گیا کہ صراط مستقیم کیا ہے تو آپ نے فرمایا "وہ اسلام ہے"۔" عن ابن مسعود عن ناس من اصحاب النبی ﷺ اهدنا الصراط المستقيم قالو هو الاسلام" حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور دوسرے کئی صحابہ نے یہی فرمایا ہے کہ "صراط مستقیم" سے مراد اسلام ہے۔

صراط مستقیم بمعنی نبی کریم ﷺ وحضرت ابوبکر وحضرت عمر رضی اللہ عنہما:

" عن عاصم الاحوال عن ابی العالیۃ اهدنا الصراط المستقيم قال هو النبی ﷺ وصاحباه من بعده قال عاصم فذكرنا ذلک للحسن فقال صدق ابو العالیة ونصح "

عاصم احوال کہتے ہیں ابوالعالیہ نے کہا کہ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ میں صراط مستقیم سے مراد نبی کریم ﷺ اور آپ کے بعد آنے والے آپ کے دو یار ہیں۔یعنی نبی کریم ﷺ کی اتباع اور آپ کے بعد آپ کے دو یاروں یعنی حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی اقتداء کرنے کا نام صراط مستقیم ہے۔عاصم کہتے ہیں میں نے حضرت حسن (بصری رحمہ اللہ) سے ذکر کیا کہ ابوالعالیہ یہ کہتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ ہاں انہوں نے سچ کہا ہے اور ہم بھی اسے صحیح قرار دیتے ہیں۔

صراط مستقیم بمعنی حق :"وقال مجاهد اهدنا الصراط المستقيم قال الحق وهذا الشمل " مجاہد نے کہا کہ صراط مستقیم سے مراد "حق" ہے یعنی دعاء یہ کی جاتی ہے کہ

اے اللہ مجھے حق پر چلا۔ یہ معنی مراد لینا زیادہ مناسب ہے کیونکہ یہ تمام معانی کو شامل ہے۔

صراط مستقیم بمعنی دین خدا:

"وقال ابن الحنفية قوله تعالیٰ اهدنا الصراط المستقيم قال هو دين الله الذی لا يقبل من العباد غيره"

ابن حنفیہ فرماتے ہیں کہ صراط مستقیم سے مراد اللہ تعالیٰ کا دین ہے کیونکہ وہ اپنے بندوں سے اپنے دین کے غیر کو پسند نہیں فرماتا۔

تنبیہ: خیال رہے کہ صراط مستقیم کا معنی اسلام مراد لیا جائے یا اللہ تعالیٰ کا دین مقصد ایک ہی ہے اس لئے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ﴾ بیشک دین اللہ تعالیٰ کے ہاں (پسندیدہ) اسلام ہے۔اور یہ بھی خیال رہے کہ جب صراط مستقیم کا معنی "حق" مراد لیا جائے تو یہ درمیانے راستہ کو بھی شامل ہے کیونکہ افراط وتفریط کے درمیان والا راستہ ہی حق راہ ہے۔

تمام اقوال صحیح ہیں اور یہ ایک دوسرے کو لازم ہیں:

جتنے اقوال پیش کئے گئے ہیں کہ صراط مستقیم کیا ہے؟ ان میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ تمام اقوال صحیح ہیں تمام ہی صراط مستقیم ہیں کسی ایک سے بھی روگردانی ممکن نہیں:

" فان من اتبع النبی صلى الله عليه وسلم واقتدى باللذين من بعده ابی بكر وعمر فقد اتبع الحق ومن اتبع الحق فقد اتبع الاسلام ومن اتبع الاسلام فقد اتبع القرآن وهو كتاب الله وحبله المتين وصراطه المستقيم"

"جس شخص نے نبی کریم ﷺ کی تابعداری کی اور آپ کے بعد آپ کے دو یاروں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی اقتداء کی اس نے حق کی اتباع کی اور جس نے حق کی اتباع کی اس نے اسلام کی اتباع کی اور جس نے اسلام کی اتباع کی اس نے قرآن کی اتباع کی۔یہی اللہ کی کتاب ہے اور اس کی مضبوط رسی ہے اور یہی صراط مستقیم"۔

واضح ہوا کہ صراط مستقیم تمام چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ کسی ایک کو بھی چھوڑے گا تو صراط مستقیم سے ہٹا ہوا ہوگا نبی کریم ﷺ کے ایک ارشاد گرامی سے پتہ چلتا ہے کہ صراط مستقیم تمام چیزوں کا مجموعہ ہے۔

" عن النواس بن سمعان عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال ضرب الله مثلا صراطا مستقيما وعلى جنبي الصراط سوران فيهما ابواب مفتحه وعلى الابواب ستور مرخاة وعلى باب الصراط داع يقول ياايها الناس ادخلوا الصراط جميعا ولا تعوجوا وداع يدعو من فوق الصراط فاذا اراد الانسان ان يفتح شيأ من تلک الابواب قال ويحک لا تفتحه فانک ان تفتحه تلجه فالصراط الاسلام والسوران حدود الله والابواب المفتحة محارم الله وذالک الداعي على رأس الصراط كتاب الله والداعي من فوق الصراط واعظ الله في قلب كل مسلم "

''نواس بن سمعان روایت کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے صراط مستقیم کی مثال بیان فرمائی ہے کہ راستہ کے دونوں طرف دو دیواریں ہوں ان میں دروازے کھلے ہوئے ہوں دروازوں پر پردے لٹکے ہوئے ہوں اور راستے کے دروازے پر ایک شخص بلانے والا ہو جو یہ کہہ رہا ہو کہ اے لوگو! سب کے سب راستے میں داخل ہو جاؤ ٹیڑھے نہ ہو (یعنی سیدھے راستہ پر چلو دائیں بائیں نہ بھٹکو) اور ایک دعوت دینے والا راستے کے ایک طرف موجود ہو۔ جب کوئی انسان ان دروازوں میں سے کوئی دروازہ کھولنے کا ارادہ کرے تو وہ داعی کہتا ہے کہ تم پر افسوس ہے بلاوجہ دروازہ کھولنے کا ارادہ نہ کرو اگر تم دروازہ کھولنا ہی چاہتے ہو تو پھر اس میں داخل بھی ہو جاؤ۔ (مثال کی وضاحت آپ نے یوں فرمائی) راستہ اسلام ہے دو دیواریں اللہ کی حدیں ہیں کھلے ہوئے دروازے اللہ تعالیٰ کے محارم ہیں۔ (یعنی جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے) راستے پر داعی اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور راستے کے سرے پر دعوت دینے والا اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصیحت دینے والا (واعظ) ہر مسلمان کے دل میں پایا جاتا ہے''۔ (ماخوذ از تفسیر ابن کثیر)

ابھی تک بیان کردہ بحث سے واضح ہوگیا کہ صراط مستقیم کے متعلق بیان کردہ تمام اقوال کے

مطابق عمل کرنے کا نام ہی صراط مستقیم ہے۔

میرا استاذ عظیم ترین استاذ: رئیس المحققین، استاذ المدققین، اشرف المدرسین ابوالحسنات حضرت علامہ مولانا محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی (راقم کے استاذ مکرم) فرماتے تھے کہ جب کسی مسئلہ میں مختلف اقوال پائے جاتے ہوں ان میں تعارض نہ پایا جائے اور ان کو جمع کرنا ممکن ہو تو جمع کرلیا جائے۔ ابن کثیر کی بحث پر نظر کرنے سے میرے دل سے بے ساختہ آواز اٹھی "میرا استاذ عظیم ترین استاذ ہے"۔

انسانوں کے مدارج کے مطابق صراط مستقیم کے مدارج:

جس طرح انسانوں میں کوئی عام ہیں اور کوئی خاص اسی کے مطابق ہر ایک کے درجات علیحدہ علیحدہ ہیں تو یقیناً صراط مستقیم کے بھی اسی طرح درجات ہیں۔ عوام تو کفر، فسق، جہالت، بدعات، خواہشات سے بچنے اور شریعت پر چلنے، علم حاصل ہونے، اچھے اخلاق کے حصول کی دعا کرتے ہیں یہی ان کے لئے صراط مستقیم ہے۔ جس کو یہ حال حاصل ہوجائے وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت، قبول دعا اور صراط مستقیم کے حاصل ہونے پر اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرے اگر یہ صورت نہ حاصل ہو تو اپنے آپ کو ملامت کرے۔

خواص چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی تجلیات کے مشاہدات کا حصول چاہتے ہیں چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے جلال و جمال کی نعوت کی کوئی حد نہیں انسان جتنا مقرب ہو وہ اس سے اور زیادہ ترقی چاہتا ہے۔ اس کا صراط مستقیم یہ ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ مجھے وہ مقام حاصل ہوجائے کہ اللہ تعالیٰ کی قوت میرے ہاتھ بن جائے کہ میں اس سے پکڑوں اور میرے پاؤں بن جائے کہ میں اس سے چلوں اور میری آنکھیں بن جائے کہ میں اس سے دیکھوں اور میرے کان بن جائے کہ میں اس سے سنوں۔

مقربین ہمیشہ ترقی کی راہ پر گامزن ہوتے ہیں اس ترقی کی راہ میں جب رکاوٹ دیکھتے ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کر کے اس رکاوٹ کو دور کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ

فرماتے ہیں "انه لیغان علی قلبی فاستغفر الله فی الیوم واللیلة سبعین مرة " بیشک میرے دل پر جب غبار چھا جاتا ہے تو میں دن رات میں اللہ تعالیٰ سے ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔مطلب اس کا یہ ہے کہ جب مخلوق کی طرف متوجہ ہونے ،دنیاوی مشاغل ،گھریلو معاملات ،اللہ تعالیٰ کی طرف کامل توجہ کرنے میں حائل ہوجاتے ہیں تو میں اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کے لئے اس سے استغفار کرتا ہوں۔مقصد واضح ہوا کہ جس طرح کسی انسان کا درجہ ہوگا اسی کے مطابق اس کا صراط مستقیم ہوگا۔اس پر قائم رہنے کی وہ دعاء کرے گا بلکہ اس سے درجہ رفیعہ کی طرف ترقی کی دعاء کرے گا۔

مسلمان ہے نماز ادا کر رہا ہے تو پھر اس کا یہ دعاء کرنے کا کیا مطلب ہے کہ اے اللہ ہمیں صراط مستقیم کی ہدایت دے اس دعاء سے تو بظاہر یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ ہدایت پر نہیں۔

پہلا جواب: " قلنا المراد طلب اثبات علیه او حصول المراتب المرتبة علیه والزیادة علی الهدی الذی اعطوه" (کمالین)

ہم کہتے ہیں کہ یہاں مراد اس ہدایت پر ثابت رہنے کی طلب ہے جو اسے پہلے ہی حاصل ہے اور جو مراتب اس ہدایت پر مرتب ہیں جو اسے پہلے ہی حاصل ہے ان مراتب کے حصول کی دعاء ہے اور جو ہدایت حاصل ہے اس سے زیادتی کے حصول کی دعاء ہے۔

واضح ہوا کہ دعاء کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ تعالیٰ جو ہدایت تو نے ہمیں دے رکھی ہے اس پر ہمیں ثابت رکھ قائم ودائم رکھ تاکہ ہمیں اس کے ذریعے خصوصی مراتب حاصل ہوں اور پہلے سے زیادہ مدارج حاصل ہوتے رہیں۔

اس جواب کے بعد اعلیٰ حضرت مولانا الشاہ احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کے ترجمہ کو دیکھیں تو باکمال ترجمہ نظر آئے گا۔﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ﴾ ہم کو سیدھا راستہ چلا۔(مولانا احمد رضا خان رحمہ اللہ)۔

لیکن اس کے خلاف کچھ اور تراجم دیکھیں ان میں آپ کو وہ کمال نظر نہیں آئے گا بلکہ اعتراض مندفع نہیں ہوگا۔

"بتلا ہم کو سیدھی راہ" (مولنا محمود الحسن)

"بتلایئے ہم کو رستہ سیدھا" (مولنا اشرف علی)

''ہمیں سیدھا راستہ دکھا'' (مودودی صاحب)
'' دکھا ہم کو راہ سیدھی'' (شاہ رفیع الدین)۔

بتلا اور دکھا کا یہی مطلب ہے کہ ہدایت حاصل ہونے کی درخواست کر رہا ہے۔اسی پر اعتراض ہوا لیکن جب یہ ترجمہ کیا جائے ''ہم کو سیدھا راستہ چلا'' تو اس سے واضح ہوگا کہ جو ہدایت حاصل ہے اسی پر قائم رہنے کی درخواست کی جا رہی ہے۔

فائدہ : علامہ محی الدین ابن عربی (شیخ اکبر) رحمہ اللہ نے بھی معنی یہی کیا ہے " ثبتنا علی الهداية " ہمیں ہدایت پر ثابت رکھ۔تاہم آپ نے استقامت اور صراط مستقیم کی تفسیر کرتے ہوئے یہ ذکر فرمایا۔اے اللہ ہمیں جو تو نے نعمت خاصہ رحیمیہ عطا کر رکھی ہے اسی راستہ پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرما وہ نعمت خاصہ اللہ تعالیٰ کی معرفت ومحبت ہی کا نام ہے۔اور حدایت سے مراد کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت حقانیہ ،ذاتیہ عطا فرمائے جو انبیاء کرام، شہداء ،صدیقین اور اولیاء کرام کو حاصل ہے جس کی وجہ سے انہوں نے رب تعالیٰ کی تجلیات کا اول وآخر میں مشاہدہ کیا اور ظاہر وباطن ان کا اسی مشاہدہ میں رہا بلکہ وہ رب تعالیٰ کے انوار کی تجلیات کے مشاہدہ میں اس طرح مستغرق رہے کہ مقام فناء سے ان کو مقام بقاء حاصل ہوگیا۔یعنی وہ دنیا کی زندگی میں ہی فنا فی اللہ کے مقام سے ترقی کر کے باقی باللہ کے مقام پر پہنچ گئے۔ (ابن عربی)

دوسرا جواب :جس راستہ پر قائم رہنے کی دعاء کی جا رہی ہے۔وہ پہلے انبیاء کرام کا راستہ ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کو حاصل کرنے کے لئے بہت بڑی مشقتیں برداشت کیں۔حضرت نوح علیہ السلام کو ہر دن کئی مرتبہ مارا جاتا تھا۔جس سے آپ بیہوش ہو کر گر پڑتے تھے۔لیکن آپ ہر مرتبہ یہی کہتے "اللهم اهد قومي فانهم لا يعلمون " اے اللہ میری قوم کو ہدایت دے بیشک یہ نہیں جانتے۔گویا کہ جن کو یہ مرتبہ حاصل ہے وہ اس پر قائم رہنے کی دعا کرتے ہیں۔جن کو یہ مرتبہ حاصل نہیں ان کی دعا کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اے اللہ تعالیٰ تو نے ہمیں ایمان کی ہدایت سے جس طرح نوازا ہے اسی طرح ہمیں اور بلند مراتب عطا فرما تا کہ ہم بھی تیری رضا کے لئے مشقتیں جھیلیں لیکن اف تک بھی نہ کریں۔

اعتراض: نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ رب کے حضور عرض کیا "اللهم اهد قومي فانهم

لا یعلمون " لیکن نوح علیہ السلام ہرروز کئی کئی مرتبہ جب یہی عرض کرتے تو بظاہر نوح علیہ السلام کا مقام بلند نظر آئے گا یہ کس طرح درست ہوسکتا ہے؟

جواب: جب ہم نے واضح کر دیا کہ جن لوگوں کو پہلے انبیاء کرام کے مراتب حاصل تھے وہ ان پر قائم رہنے کی دعا کرتے تھے نبی کریم ﷺ کونوح علیہ السلام سے جب یہی مرتبہ بلند وبالا حاصل تھا کیونکہ وہ کون سے مصائب نہیں جو میرے حبیب پاک علیہ التحیۃ والثناء نے نہیں برداشت کئے؟ جب آپ ان مراتب پر رہنے کے لئے ہرنماز کی ہر رکعات میں "اھدنا الصراط المستقیم" پڑھتے تو گویا کہ یہ بھی خود بخود رب تعالیٰ کے حضور دعا ہوجاتی "اللھم اھد قومی فانھم لایعلمون"۔

تیسرا جواب: جب پہلے یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ "صراط مستقیم" سے مراد افراط وتفریط کے درمیان راستہ ہے۔جس طرح رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا ﴾ "ہم نے تمہیں امت وسط بنایا"

یعنی عدل اور درست راہ کا نام درمیانہ راستہ ہے وسط ہی حق ہے افراط وتفریط مذموم ہیں۔انسان جب رب تعالیٰ کو دلائل کے ذریعے پہچان کر مومن ہوجاتا ہے تو وہ رب تعالیٰ کی ہدایت کو حاصل کرلیتا ہے۔ تو اب اس کے دعا کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اے اللہ مجھے اعمال شہوانیہ اور اعمال غضبانیہ سے بچا کر رکھنا اور مجھے درمیانے راستہ پر قائم رکھنا۔

چوتھا جواب: اللہ تعالیٰ کے وجود،قدرت،علم،رحمت اور حکمت پر ممکنات میں تمام چیزوں میں دلائل موجود ہیں انسان اللہ تعالیٰ کو بعض دلائل سے جب پہچانتا ہے تو اس کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ میں ممکنات کی تمام چیزوں میں پائے جانے والے دلائل کو پہچان سکوں اور ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی معرفت بھی اسی طرح زیادہ حاصل ہوتو وہ رب تعالیٰ کے حضور ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ عرض کرتا ہے کہ اے مولائے کائنات مجھے اپنی معرفت کے دلائل جو تو نے دے رکھے ہیں ان سے اور زیادہ عطا فرما۔

پانچواں جواب: رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ وَاِنَّكَ لَتَهْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ﴾

اور بیشک تم سیدھی راہ بتاتے ہو اللہ کی راہ کہ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں۔

پ ۲۵ آیت ۵۳

اور رب تعالیٰ نے فرمایا "وان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ " اور یہ ہے میرا سیدھا راستہ تو اسی پر چلو۔

ان آیات میں رب تعالیٰ نے صراط مستقیم کی ہدایت دینے کا حکم نبی کریم ﷺ کو دیا اور بندوں کو صراط مستقیم پر چلنے کا حکم فرمایا۔اور صراط مستقیم کا اعلیٰ درجہ یہ ہے "ھو ان یکون الانسان معرضا عما سوی اللہ مقبلا بکلیۃ قلبہ وفکرہ وذکرہ علی اللہ " کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سوا تمام چیزوں سے اعراض کر کے کامل طور پر اپنے دل کو اللہ تعالیٰ کے ذکر وفکر میں لگا دے۔

اس سے واضح ہوا کہ مومن رب تعالیٰ کے حضور عرض کرتا ہے کہ اے رب قدوس تو نے مجھے ایمان ،اعمال صالحہ کی ہدایت کی دولت سے مالا مال کر دیا لیکن میں تجھ سے یہ دعا کرتا ہوں کہ تو میرے دل کو صرف اپنی طرف لگا دے دنیا کی مشاغل سے میری توجہ کو ہٹا دے مجھے اس مرتبہ پر پہنچا دے کہ اگر تیرا حکم بظاہر بڑا سخت بھی ہو تو میں اس کی اطاعت کر سکوں کسی قسم کی چون وچرانہ کروں۔جیسا کہ تو نے اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنے بیٹے کو میری رضاء کی خاطر ذبح کر دو تو آپ نے اس کی اطاعت کی اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ ذبح ہونے کے لئے تیار ہو جاؤ تو وہ اس حکم کے مطیع ہو گئے۔حضرت یونس علیہ السلام کو دریا میں ڈالنے کے لئے دوران سفر کشتی میں بیٹھے ہوئے امتحان آ گیا تو انہوں نے اپنے آپ کو کشتی میں ڈالے جانے پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ حضرت خضر علیہ السلام کی شاگردگی اختیار کر لو تو آپ بلا چون وچرا چل پڑے۔اور جب حضرت یحیٰ علیہ السلام اور حضرت زکریا علیہ السلام کو حکم ہوا کہ تم نے اچھے کاموں کا حکم دینا ہے اور برے کاموں سے روکنا ہے ہوسکتا ہے تمہیں قتل کر دیا جائے تمہیں دو دو ٹکڑے کر دیا جائے۔لیکن تم نے میرے حکم سے پیچھے نہیں ہٹنا ان دونوں باپ بیٹے جلیل القدر نبیوں نے رب کے حکم کو ماننے سے ٹال مٹول کا خیال تک نہیں کیا بلکہ رب تعالیٰ کے حکم کے سامنے سر جھکا دیا اور ان کو شہید کر دیا گیا۔

مطلب واضح ہو گیا کہ ہدایت ایمان واسلام حاصل ہونے کے باوجود انسان یہ دعا کر رہا ہے کہ اے اللہ مجھے انبیاء کرام کے نقش قدم پر چلا اور ان کی طرح مصائب وآلام برداشت کرنے

کی توفیق عطا فرما اور اپنے احکام کی بجا آوری کا عظیم مرتبہ عطا فرما تا کہ میں تیرے کسی حکم سے بھی روگردانی نہ کرسکوں۔

فائدہ: یہ بھی خیال رہے کہ رب تعالیٰ کے احکام ماننے میں جن لوگوں نے مشکلات برداشت کیں ان کو انعامات سے نوازا گیا۔مشکلات کے بعد ان کو آسانیاں عطا ہوئیں۔اسی لئے رب تعالیٰ نے انسان کو دعا کرنے کا حکم دیا۔دعا بتائی ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ لیکن اس کے بعد یہ نہیں فرمایا کہ اے انسان تو یہ کہہ "صراط الذین ضربوا و قتلوا" کہ اے اللہ مجھے ان لوگوں کی راہ پر چلا جن کو مارا گیا اور قتل کیا گیا۔بلکہ یہ کہا کہ اے انسان تو یہ کہہ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ اے اللہ مجھے ان لوگوں کی راہ پر چلا جن پر تیرا انعام ہے پتہ چلا کہ اصل مقصد انعام عطا کرنا ہے جس کے لئے امتحانات سے بھی گزارا جاتا ہے۔

چھٹا جواب: انسان رب تعالیٰ کے حضور عرض کرتا ہے کہ اے اللہ جس طرح تو نے مجھے پہلے ہی ہدایت عطا فرما رکھی ہے۔پھر بھی میں عرض کرتا ہوں کہ مجھی تائبین کا مرتبہ عطا فرما دے۔اس لئے کہ میں دیکھتا ہوں کہ کئی لوگ گناہوں میں مبتلاء ہوتے ہیں معاصی کا ارتکاب کرتے ہیں لیکن موت سے پہلے ان کو توبہ کی توفیق حاصل ہوجاتی ہے۔وہ تیرے دربار میں جھک جاتے ہیں۔تیری رحمت کو طلب کرتے ہیں تو اپنے وعدہ کے مطابق ان کی توبہ کو قبول کر کے ان کو جہنم سے نجات دے دیتا ہے اور جنت کا مستحق بنا دیتا ہے۔

میں بھی یہ عرض کرتا ہوں کہ اگر مجھ سے کوئی لغزش ہو جائے تو مجھے بھی توبہ کی توفیق عطا فرمانا تا کہ میں تیرے حضور حاضر ہونے پر شرمندہ نہ ہوں۔

واضح ہوا کہ ایمان واسلام کی ہدایت کے حاصل ہونے کے بعد درجہ تائبین کے حصول کی دعا کی جارہی ہے۔

ساتواں جواب: انسان یہ کہتا ہے اے مولائے کائنات بہت سے راستے ہیں احباب مجھے اور راستہ کی طرف لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔اعداء (دشمن) اور راہ پر چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔اور شیطان اور ہی غلط باطل راہوں پر چلانے کے لئے دن رات مجھے بھٹکانے پر لگا ہوا

ہے۔سیدھی راہ پر چلنے والی رکاوٹوں میں شہوت ،غضب ،کینہ اورحسد پائے جاتے ہیں۔اسی طرح اے رب کائنات راہ راست سے بھٹکانے کے لئے باطل فرقے دن رات تقریروں اورتحریروں سے کوشش کررہے ہیں ۔کہیں تشبیہیہ فرقہ ہے تو کہیں تعطیلیہ کہیں جبریہ فرقہ ہے تو کہیں قدریہ۔کہیں رافضیہ فرقہ ہے تو کہیں خارجیہ کہیں آزادی نسواں کے نام پر لٹیرے راہ پر بیٹھے ہیں کہیں سائنسی ترقی کی خوشخبریاں سنا سنا کر اسلام سے دور کرنے والے ہیں۔کوئی یہودیوں کے یار اسلام سے دور ہٹانے کی کوشش کررہے ہیں اورعیسائیوں کے غمخوار دینی تعلیم کو بند کرنے یا اسے گھٹانے کی فکر میں ہیں۔کہیں قادیانی اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر کے اسلام کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کررہے ہیں۔اس لئے رب کائنات تو جانتا ہے ”والعقل ضعیف والعمر قصیر والصناعة طویلة والتجربة خطرة والقضاء عسیر “ عقل کمزور ہے عمر تھوڑی ہے کام بہت ہیں تجربہ کوئی خاص حاصل نہیں فیصلہ کرنا مشکل ہے۔اے رب قدوس میں راہ راست پر تیری مہربانی کے بغیر نہیں چل سکتا۔میری طاقت تو جواب دے چکی ہے میں خود تو حیران ہوں کہ ہر راہ پر بیٹھے لٹیروں سے اپنے آپ کو بچاؤں تو کیسے بچاؤں اس لئے تیرے حضور عرض کرتا ہوں کہ تو مجھے ان راہزنوں سے بچائے رکھ مجھے راہ راست پر قائم ودائم رکھ۔

کامیابی اسی میں ہے کہ انسان یہ سمجھے کہ میری عمر زیادہ گزرگئی اورتھوڑی رہ گئی۔اسی کے متعلق حضرت ابراہیم ادھم رحمہ اللہ کے زرین اقوال کی طرف توجہ فرمائیں۔آپ ایک مرتبہ بیت اللہ شریف کی طرف پیدل ہی چل رہے تھے آپ کو ایک دیہاتی شخص سواری پر سوار ملا اس نے آپ سے پوچھا اے بڑے میاں کہاں جارہے ہو؟ آپ نے فرمایا بیت اللہ شریف کی طرف اس نے کہا تم پاگل تو نہیں ہو ۔سواری تمہارے پاس، میں نہیں دیکھ رہا راستے کا خرچ تمہارے پاس نہیں سفر بہت لمبا ہے۔حضرت ابراہیم ادھم رحمہ اللہ نے جواب دیا میرے پاس بڑی سواریاں ہیں جو تمہیں نظر نہیں آ رہیں اس نے بڑے تعجب سے پوچھا وہ کون سی سواریاں تمہارے پاس ہیں؟ آپ نے فرمایا:

" اذا نزلت علی بلیة رکبت مرکب الصبر "

”جب مجھ پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو میں صبر کی سواری پر سوار ہوجاتا ہوں“۔

" واذا نزلت علی نعمة رکبت مرکب الشکر "

''جب مجھ پر کوئی نعمت نازل ہوتی ہے تو شکر کی سواری پر میں سوار ہو جاتا ہوں''۔

" واذا نزل بی القضاء رکبت مرکب الرضاء "

''جب کوئی تقدیر مجھ پر نازل ہوتی ہے تو میں رضاء کی سواری پر سوار ہو جاتا ہوں''۔

" واذا دعتنی النفس الی شئی علمت ان مابقی من العمر اقل مما مضی "

''اور جب مجھے نفس کسی برائی کی طرف بلائے تو میں اپنے آپ کو خبردار کرتا ہوں کہ زیادہ عمر گزر گئی اور تھوڑی رہ گئی''۔

" فقال الاعرابی سر باذن الله فانت الراکب وانا الراجل "

''اس دیہاتی شخص نے کہا اے میرے بزرگ آپ اللہ کے حکم، اس کی اجازت، اس کی مہربانی سے چلئے یقینی بات ہے کہ آپ سوار ہیں اور میں پیدل ہوں'' (ماخوذ از تفسیر)

''اھدنا'' کہنے میں حکمت:

بعض اوقات انسان اکیلے نماز پڑھ رہا ہوتا ہے یا اکیلے ہی دعاء کر رہا ہوتا ہے۔ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کہے "اھدنی" مجھے ہدایت دے لیکن وہ پھر بھی کہتا ہے "اھدنا" ہمیں ہدایت دے اس میں چند وجہ سے حکمت پائی گئی ہے کہ جمع کا صیغہ ذکر کرنا ہی بہت مفید ہے:

(۱) " ان الدعاء کلما کان اعم کان الی الاجابة اقرب " بیشک دعاء جب بھی عام ہو یعنی اس میں اور لوگوں کو بھی شامل کیا جائے وہ قبولیت کے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کسی عاقل متقی، عالم نے اپنے شاگردوں کو کہا کہ کسی خطبہ میں کسی خاص بزرگ کا تذکرہ کرتے ہوئے جب تم یہ پڑھو "رضی الله عنک وعن جماعة المسلمین "(اللہ تم سے راضی ہو اور مسلمان کی جماعت سے راضی ہو) تو "رضی الله عنک " میں میری نیت بھی کر لینا کہ اے استاذ اللہ تم سے بھی راضی ہو۔ اگر تم ان الفاظ کو پڑھتے ہوئے میری نیت کر لو گے تو بہتر ہوگا لیکن اگر تم نے ان الفاظ کو پڑھتے ہوئے میری نیت نہ کی تو کوئی حرج بھی نہیں لیکن جب تم "وعن جملة المسلمین " پڑھو تو مجھے بھی نہ بھلانا اس لئے کہ "رضی الله عنک "میں تخصیص پائی جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ دعاء میرے حق میں قبول نہ ہو۔ لیکن " عن جماعة المسلمین " چونکہ تمام مسلمانوں کے لئے دعاء ہے جس کی

قبولیت واضح طور پر نظر آتی ہے۔اس لئے کہ تمام مسلمانوں میں کتنے ہی نیک لوگ پائے جاتے ہیں جن کے حق میں دعا کی قبولیت تقریباً درجہ یقین میں ہوتی ہے" **واذا اجاب الله الدعاء فی البعض فهو اکرم من ان یرده فی الباقی** "اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی شان کریمی سے یہ بعید ہے کہ وہ بعض کے حق میں دعا قبول کرے اور بعض کے حق میں رد کردے۔

" ولهذا السبب فان السنة اذا اراد ان یذکر دعاء ان یصلی اولا علی النبی صلی الله علیه وسلم ثم یدعو ثم یختم الکلام بالصلوة علی النبی صلی الله علیه وسلم ثانیا ، لان الله تعالیٰ یجیب الداعی فی صلوته علی النبی صلی الله علیه وسلم ، ثم اذا اجیب فی طرفی دعائه امتنع ان یرد فی وسطه "

" اسی وجہ سے مسنون طریقہ یہ ہے کہ جب انسان دعاء کا ارادہ کرے تو پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھے، پھر دعاء کرے، پھر اپنی دعا کو درود شریف پر ختم کرے۔اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کریم ﷺ پر پڑھا ہوا درود شریف قبول فرماتا ہے۔جب دونوں طرفوں کو قبول فرمائے گا، تو اس کی شان کریمی کے لائق یہی ہوگا، کہ وہ درمیان والی دعاء کو رد نہیں فرمائے گا"۔

(۲) نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: " **ادعوا الله بألسنة ما عصیتموه بها** " اللہ تعالیٰ سے دعاء ان زبانوں سے کرو، جن سے تم نے اس کی نافرمانی نہیں کی۔

" **قالوا یا رسول الله ومن لنا بتلک الألسنة** " صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ ایسی زبانیں ہم میں کیسے حاصل ہو سکتی ہیں؟

(یعنی صحابہ کرام نے تعجب کیا کہ ہر انسان سے کوئی نہ کوئی غلطی ہو سکتی ہے کہ وہ لغو ، بیہودہ بات کبھی نہ کبھی کر سکتا ہے، یہ تو بہت مشکل ہے کہ سوائے انبیاء کرام کے اور کسی انسان کو یہ منصب حاصل ہو، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے تعجب کا جواب دیا)۔

" قال یدعو بعضکم ، لبعض ، لانک ما عصیت بلسانه وهو ما عصیٰ بلسانک "

آپ نے فرمایا کہ تم میں سے بعض ،بعض کے لئے دعا کرے، کیونکہ تم نے اس کی زبان سے

کوئی نافرمانی نہیں کی اور اس نے تمہاری زبان سے کوئی نافرمانی نہیں کی ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ تم ایک دوسرے کے لئے دعا کیا کرو، اسے مقام قبولیت حاصل ہوتا ہے ۔ کیونکہ اپنے حق میں کی گئی دعاء کو ممکن ہے کہ مقبولیت کا وہ مقام حاصل نہ ہو، جو دوسرے کے حق میں حاصل ہوتا ہے، اس لئے کہ اپنی زبان اپنے حق میں لغزش کا شکار ہوسکتی ہے، لیکن دوسرے کے حق میں وہی زبان معصیت سے پاک ہے۔

(۳) انسان نے جب شروع میں "الحمد للہ" کہا احمد اللہ ،نہیں کہا، تو اس کا مطلب یہ تھا کہ سب تعریف کرنے والوں کی تعریفیں اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہیں ۔ تو گویا کہ دعائیہ کلمات سکھاتے ہوئے بھی رب تعالیٰ نے فرمایا کہ اے میرے بندے جب حمد میں تو نے اور لوگوں کی حمد کو اپنے ساتھ اس غرض سے ملایا تھا کہ دوسرے لوگوں کی حمد جب قبول ہو گی تو میری حمد بھی قبول ہو گی ۔ اسی نکتہ کو دعاء میں بھی نہ بھول کہ جب تو دعاء میں بھی اور لوگوں کی دعاء کو اپنی دعاء سے ملائے گا تو دوسرے نیک لوگوں کی دعاء کی برکت سے تیری دعاء کو بھی مقام مقبولیت حاصل ہوگا۔

(۴) بندہ رب تعالیٰ کے حضور گویا کہ یہ عرض کر رہا ہے" اے مولائے کائنات جب تیرے رسول ﷺ نے جماعت کو رحمت قرار دیا، اور فرقت (علیحدگی) کو عذاب" تو اسی لئے میں نے جب تیری حمد بیان کی تو تمام حمد کرنے والوں کی حمد کو ساتھ ملایا، تا کہ میری حمد انبیاء کرام اور صلحاء کی حمد کے ساتھ مل کر شرف قبولیت حاصل کر لے ۔ اور جب میں نے عبادت کی اور عبادت کا ذکر کیا تو پھر بھی اپنی عبادت کو تیری عبادت کرنے والے تمام لوگوں کی عبادت کے ساتھ ذکر کیا، تا کہ میری عبادت انبیاء کرام اور صلحاء کی عبادت کے ساتھ مل کر مقبول ہو جائے ۔ اور جب میں نے استعانت کا ذکر کیا تو اپنی استعانت کو تمام کی استعانت کے ساتھ ملایا تا کہ میری استعانت انبیاء کرام اور نیک لوگوں کی استعانت کے ساتھ مل کر تیرے حضور مقام مقبولیت اختیار کر لے ۔ اور جب میں نے صالحین کی اقتداء طلب کی تو سب کی اقتداء طلب کرتے ہوئے کہا ﴿ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴾ تا کہ مجھے انبیاء کرام اور متقین کی اقتداء حاصل ہو جائے، جس کی وجہ سے میرے اعمال ترے نزدیک قبولیت کے درجہ میں پہنچ جائیں ۔ اور جب میں نے مردود لوگوں سے دور رہنے کا مطالبہ کیا تو تمام سے دور رہنے کا مطالبہ کیا، اس لئے کہ انبیاء کرام اور صالحین حضرات تمام مردودوں سے ہی دوری اختیار کرتے رہے، تو میں نے

چاہا کہ میرا افرار بھی انبیاء کرام اور صالحین کے فرار سے مل کر مقبولیت کے درجہ کو حاصل کر لے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے بغیر کسی استثناء کے کہا:

﴿ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ﴾

اے مولائے کائنات جب میں ہدایت طلب کر رہا ہوں، تو سب کے لئے طلب کر رہا ہوں گویا کہ اپنی ہدایت کے مطالبہ کو انبیاء کرام اور صلحاء کے مطالبہ ہدایت سے ملا کر شرف قبولیت کے امید رکھتا ہوں۔

تمام کو ہر موقع پر ساتھ ملانے کی اصل وجہ اپنی بگڑی بنانا ہے: " فلما لم افارق الانبیاء والصالحین فی الدنیا فارجو ان لا افارقهم فی القیامة " اس لئے کہ جب میں اپنی تحمید، عبادت، استعانت، طلب ہدایت، طلب اقتداء اور طلب فرار کو انبیاء کرام اور صالحین کی ان صفات سے دنیا میں اپنے آپ کو جدا نہیں کیا، تو میں امید کرتا ہوں کہ مجھے قیامت کے دن بھی ان سے مفارقت حاصل نہیں ہوگی بلکہ ان کی معیت (نزدیکی) حاصل ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ بندے کی اس امید اور اس التجاء کو قبول کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا ﴾

اور جو اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانے تو اسے ان کا ساتھ ملے گا، جن پر اللہ نے فضل کیا یعنی انبیاء اور صدیق اور شہید اور نیک لوگ، یہ کیا ہی اچھے ساتھی ہیں: (از کبیر)

کاش کہ یہ نکات سمجھ آجائیں:

اجتماعی دعا کے فوائد میں جو حکمتیں اور نکات علامہ رازی رحمہ اللہ نے بیان فرمائے ہیں۔ اللہ کرے کہ یہ ان لوگوں کو بھی سمجھ میں آجائیں جو فرض نماز کے بعد اجتماعی دعاء کے قائل نہیں۔ تمام نماز سے فارغ ہونے پر اجتماعی دعاء کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ یہ ثابت نہیں۔ کبھی نماز جنازہ کے بعد دعاء کرنے پر جھگڑا، فساد برپا کرتے ہیں۔ خدا سے مانگنے پر بھی اعتراض، درحقیقت ان کی جہالت وحماقت پر واضح ثبوت ہے۔

طلب صراط مستقیم کی وجوہ:

علم ریاضی والوں کے نزدیک خط مستقیم اس خط کو کہتے ہیں جو دو نقطوں کو قریب ترین سے ملا دے۔ یہ خط بنسبت ٹیڑھے خطوط کے چھوٹا ہوتا ہے۔اس تمہید کے بعد سمجھا یہ جائے کہ بندہ رب تعالیٰ سے صراط مسقیم کا مطالبہ کرتا ہے اس کی چند وجوہ ہیں:

☆ جب یہ واضح ہوا کہ صراط مستقیم قریب ترین راہ ہے اور دوسرے راستوں کی بنسبت چھوٹا راستہ ہے، تو اسی وجہ سے بندہ رب تعالیٰ سے اسی راہ پر قائم رہنے کی درخواست کرتا ہے، گویا کہ بندہ یوں کہہ رہا ہوتا ہے " وانا عاجز فلایلیق بضعفی الا الطریق المستقیم "کہ اے اللہ میں عاجز ہوں اپنے عجز وضعف کی وجہ سے سوائے صراط مستقیم کے اور راستوں پر چلنے کی طاقت نہیں رکھتا۔

☆ چونکہ صراط مستقیم ایک ہی ہوتا ہے۔ لیکن ٹیڑھے راستے کئی ہوتے ہیں، اور ٹیڑھا پن میں وہ ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں، انسان کوئی فیصلہ نہیں کرپاتا کہ کس راستہ پر چلوں، لیکن صراط مستقیم کسی اور راستہ کے مشابہ نہیں ہوتا، اس لئے اس پر چلنے کا فیصلہ کرنا آسان ہوتا ہے کیونکہ وہ راستہ متعین ہوتا ہے، شکوک وشبہات سے محفوظ ہوتا ہے:

" فکان ابعد عن الخوف والآفات واقرب الی الامان "

یہاں تک کہ صراط مستقیم خوف اور آفات سے محفوظ ہوتا ہے اور منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے آسان اور قریب ہوتا ہے۔

☆ صراط مستقیم منزل مقصود تک پہنچا دیتا ہے، لیکن دوسرے ٹیڑھے راستے منزل مقصود تک نہیں پہنچاتے۔

☆ یہ بھی واضح ہے کہ صراط مستقیم ایک ہی ہوتا ہے، اس میں تبدیلی نہیں ہوتی، لیکن صراط مستقیم سے ہٹ کر، دوسرے چھوٹے چھوٹے ٹیڑھے راستے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

جب منزل تک پہنچنے کی ایک ہی راہ ہو تو انسان بغیر بھٹکنے کے اور بغیر بھولنے کے منزل تک پہنچ سکے گا لیکن جب وہ راستے تبدیل ہوتے رہے تو ان راستوں پر چلنے والا کبھی دائیں اور کبھی بائیں بھٹکتا رہے گا، اس کا منزل تک پہنچنا دشوار ہو جائے گا۔ (از کبیر)

اے اللہ راقم کی بھی یہی دعا قبول فرما "اھدنا الصراط المستقیم بحرمۃ النبی الرؤف الرحیم"۔

﴿ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴾

(۱) راستہ ان کا جن پر تو نے احسان کیا (۲) راستہ ان کا کہ انعام کیا ہے تو نے ان پر

یہاں " صراط " بدل الکل ہے، پہلے صراط سے، یا عطف بیان ہے دینی مدارس کے طلباء بدل الکل اور عطف بیان کی تعریفوں اور فرق سے بخوبی واقف ہیں۔ یہاں نحوی مسائل کی بحث مقصود نہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ "ہمیں صراط مستقیم پر قائم رکھ، صراط مستقیم ان لوگوں کی راہ ہے جن پر تیرا انعام ہے۔
(ابو سعود، روح المعانی)

اَنْعَمْتَ: " الانعام ایصال الاحسان الی الغیر من العقلاء "

انعام کا مطلب یہ ہے کہ ذوی العقول میں سے کسی دوسرے پر احسان کرنا، ذوی العقول کی قید لگائی، اس لئے کہ غیر ذوی العقول کے لئے انعام کے لفظ کا استعمال نہیں ہوتا۔ اسی لئے یہ نہیں کہا جاتا "انعم علی فرسه" اس نے اپنے گھوڑے پر انعام کیا۔ اسی طرح نعمت کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ کسی سے نفع حاصل ہو، بغیر عوض کے، یعنی جس چیز کا کوئی بدلہ حاصل کرلیا جائے اسے نعمت نہیں کہا جاتا۔ (روح المعانی)

" **نعمة** " جس میں نون کے نیچے کسرہ (زیر) ہے یہ مشتق ہے " **نعمة** " سے جس میں نون پر فتح (زبر) ہے۔ اس کا معنی ہے نرم ہونا، لذت حاصل کرنا۔ نعمتوں سے بھی چونکہ لذت حاصل ہوتی ہے۔ گویا کہ نعمت کی وجہ تسمیہ (نام رکھنے کی وجہ) بھی یہی ہے۔ از بیضاوی وحاشیۃ الشہاب)

اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اگرچہ کثیر ہیں جو شمار میں نہیں آسکتیں کیونکہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ﴾ اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتیں شمار کرنا چاہو تو شمار نہیں کر سکتے۔

لیکن ان کی دو قسمیں بیان کی جاسکتی ہیں: (۱) دنیوی (۲) اخروی

دنیوی کی پھر دو قسمیں ہیں۔ (۱) موہبی (۲) کسبی۔

موہبی کی پھر دو قسمیں ہیں: (۱) روحانی (۲) جسمانی۔

روحانی : جن کا تعلق روح سے ہوگا جس طرح بدن میں روح پھونکنا ،اور عقل کے ذریعے روشن ہونا ،اس لئے کہ روح کا تعلق بدن سے ہو بھی جائے تو پھر بھی ادراک اس وقت تک حاصل نہیں ہوگا ، جب تک نور عقل سے منور نہیں ہوگا۔یعنی روح کے بدن سے تعلق کے بعد جب عقل کی نورانیت حاصل ہوگی ،تو فہم حاصل ہوگا ،جس سے انسان کو تصورات اور تصدیقات کا ادراک حاصل ہوگا۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" ان اللہ خلق الخلق فی ظلمة ثم رش علیھم من نورہ فمن اصابه ذلک النور فقد اھتدی ومن اخطأ فقد ضل "

بیشک اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو تاریکی میں پیدا کیا ،پھر ان پر اپنے نور کی پھوار برسائی ،جسے وہ نور پہنچ گیا ،وہ ہدایت پر آ گیا ،اور جسے وہ نور نہیں پہنچا وہ بھٹک گیا۔

جسمانی : موہبی کی دوسری قسم جسمانی ہے اس کی مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بدن کی تخلیق کر کے ،پھر اس میں مختلف قوتیں رکھ دی ہیں ۔قوۃ خادمہ ،قوۃ مخدومہ متصرفہ ، پھر کچھ قوتیں کسی شخص سے متعلق ہوتی ہیں ۔اور کچھ کسی نوع سے جیسی قوۃ نامیہ ،قوۃ غاذیہ ،قوۃ جاذبہ ،قوۃ دافعہ ، اسی طرح کچھ ہیئتیں عارضی ہوتی ہیں ۔جیسے صحت اور اعضاء کی سلامتی ، یہ تمام چیزیں نعمت موہبی جسمانی سے متعلق ہیں۔

کسبی : دنیوی نعمتوں کی ایک قسم موہبی کی دونوں قسمیں روحانی اور جسمانی کا بیان ہو چکا ہے۔اب دنیوی نعمتوں کی دوسری قسم کسبی کو بیان کیا جاتا ہے۔

کسبی نعمتیں وہ ہیں جن میں انسان کے کسب کو دخل ہو اگر چہ انسان کا عمل اس نعمت کے حاصل کرنے میں مستقل تو نہیں ،وہ نعمت بھی رب تعالیٰ کی طرف سے ہی عطا ہوتی ہے تاہم ظاہر طور پر اس میں انسان کا عمل ذریعہ اور سبب نظر آتا ہے۔جس طرح مریض نے کسی طبیب سے علاج کرالیا تو شفا حاصل ہوگئی ،شفا تو اللہ تعالیٰ نے دی لیکن بظاہر علاج سبب نظر آتا ہے۔اگر چہ مفسر علیہ الرحمۃ نے کسبی کی بظاہر تقسیم تو نہیں کی لیکن مثالوں سے اس طرف اشارہ کر دیا ہے کہ کسبی بھی عام ہے روحانی اور

جسمانی کوشامل ہے۔ کبھی روحانی نعمتیں جیسا کہ اپنے آپ کو رذیل، گھٹیا کاموں سے پاک رکھنا، اچھے اخلاق سے مزین کرنا، ہر قسم کے ایسے کام کرنا جو اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہوں۔

کبھی جسمانی جیسا کہ بدن کو مزین کرنا کہ لوگ اسے اچھا سمجھیں، میل کچیل کو دور کرنا، صاف ستھرا ہونا، مونچھیں کاٹنا، ناخن کاٹنا وغیرہ، اسی طرح اچھے لباس وغیرہ کے ذریعے اپنے آپ کو مزین کرنا، لوگوں میں اچھا مرتبہ حاصل کرنا، اور حلال طریقہ سے مال و دولت حاصل کر کے لوگوں میں ایک مقام پیدا کرنا۔

نعمت اخروی: ابھی تک نعمت دنیوی کی تمام قسموں کا ذکر ہوا نعمت اخروی کا ذکر اب کیا جارہا ہے۔ اخروی نعمتیں، جس طرح کہ ایسی چیزوں کا علم حاصل ہو، جن سے اللہ تعالیٰ کی رضا مندی حاصل ہو۔ اور اس کی کوتاہیوں کو اللہ تعالیٰ کا معاف کرنا، اور اس کی روح کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا کرنا، تاکہ یہ مقرب فرشتوں کے ساتھ ہمیشہ کے لئے رہے اور جنت میں مقام عطاء کرنا، اس طرح کی تمام نعمتیں اخروی ہیں۔ ان تمام نعمتوں سے اعلیٰ نعمت ایمان ہے جس پر باقی تمام نعمتوں کے حاصل ہونے **کا** دار و مدار ہے۔

کون سی نعمت مراد ہے؟ تمام نعمتیں جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں سے **انعمت علیهم** میں نعمت اخروی مراد ہے۔ یا نعمت اخروی تک پہنچانے کے ذرائع ہیں۔ جیسا کہ تزکیہ نفس وغیرہ۔

(از بیضاوی، شیخ زادہ، حاشیۃ الشہاب)

وہ کون لوگ ہیں جن پر انعام ہے؟

اس میں مختلف قول ہیں کہ وہ کون سے حضرات ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے:

1)...... بعض حضرات نے کہا کہ اس سے مراد مطلقاً مومن لوگ ہیں۔

۲)...... بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس سے مراد انبیاء کرام ہیں۔

۳)...... بعض حضرات نے کہا کہ تحریف اور نسخ سے پہلے جو موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کے اصحاب تھے وہ مراد ہیں۔

۴)...... بعض حضرات نے کہا کہ اس سے مراد نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام ہیں۔

۵)...... بعض حضرات نے کہا کہ اس سے مراد نبی کریم ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔

۶)...... بعض نے کہا کہ اس سے مراد نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام اور آپ کے اہل بیت ہیں۔

(روح المعانی، خازن)

تمام اقوال کا جامع قول:

جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے ان کا ذکر قرآن پاک میں دوسرے مقام پر موجود ہے لھذا وہی لوگ مراد ہیں۔ تمام اقوال اسی میں سمٹ کر آ جائیں گے۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ وَمَنْ يُطِعِ اللهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِيْقًا ﴾

اور جو اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانے تو اسے ان کا ساتھ ملے گا جن پر اللہ نے فضل کیا یعنی انبیاء اور صدیق اور شہید اور نیک لوگ، یہ کیا ہی اچھے ساتھی ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول بھی اسی کی تائید کرتا ہے:

"وقال الضحاک عن ابن عباس صراط الذین انعمت علیهم بطاعتک وعبادتک من ملائکتک وانبیائک والصدیقین والشهداء والصالحین"

ضحاک نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "صراط الذین انعمت علیهم" کا مطلب یہ ہے کہ (ہمیں صراط مستقیم پر چلا) وہ راستہ ہے ان لوگوں کا جن پر تیرا انعام ہے بوجہ اس کے کہ وہ تیری طاعت اور عبادت کرتے ہیں وہ کون لوگ ہیں؟ وہ ملائکہ، انبیاء کرام، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

فائدہ جلیلہ: رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی (اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ، صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ) یدل علی امامة ابی بکر رضی الله عنه" حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر دلالت کر رہا ہے، اس لئے کہ جب یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے وہ انبیاء کرام

،صدیقین ،شہداء اور صالحین ہیں تو اسی سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ:

" ولاشک ان رأس الصديقين ورئيسهم ابوبكر الصديق رضى الله عنه ، فكان معنى الآية ان الله امرنا ان نطلب الهداية التى كان عليها ابوبكر الصديق وسائر الصديقين ،ولو كان ابوبكر ظالما لما جائز الاقتداء به فثبت بما ذكرناه دلالة هذه الآية على امامة ابى بكر رضى الله عنه " (تفسیر کبیر)

'' اس میں کوئی شک نہیں کہ صدیقین کے سردار اور رئیس ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ آیت کا معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اس راہ کی ہدایت طلب کریں ،جس پر ابوبکر صدیق اور دوسرے تمام صدیقین ہیں ۔اگر (معاذ اللہ) ابوبکر ظالم ہوتے تو ان کی اقتداء جائز نہ ہوتی''۔

اس بحث سے یہ واضح ہوگیا جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امامت وخلافت پر دلالت کر رہی ہے۔

تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہیں:

ہر وہ چیز جو مخلوق کو نفع کے لئے عطا ہو اور ضرر کو دور کرے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور وہی نعمت ہے ۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وما بكم من نعمة فمن الله " جو نعمت بھی تمہیں حاصل ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے نعمت کی تین قسمیں ہیں سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں ۔ان میں ایک قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ایجاد میں منفرد (اکیلا) ہے۔جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور رزق دیا۔ان میں سے دوسری قسم یہ ہے کہ وہ نعمت بظاہر اللہ تعالیٰ کے غیر سے حاصل ہوتی ہے ،لیکن حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہوتی ہے ۔اس لئے کہ اس نعمت کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے اور بظاہر جو نعمت دینے والا ہے اس کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہے ،اور اس کے دل میں انعام عطاء کرنے کی محبت ڈالنے والا بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے ۔لیکن بظاہر وہ نعمت اللہ تعالیٰ بندے سے دلاتا ہے اس لئے بندے کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔اگرچہ حقیقی طور پر اللہ تعالیٰ کا ہی شکریہ ادا کرنا چاہیے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اَنِ اشْکُرْلِیْ وَلِوَالِدَیْکَ ﴾ میرا شکریہ ادا کرو اور اپنے والدین کا (بھی شکریہ ادا کرو) رب تعالیٰ اپنا ذکر پہلے کر کے واضح کر دیا کہ کوئی انعام بھی اللہ تعالیٰ کی مہربانی کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ ان نعمتوں میں تیسری قسم یہ ہے کہ جو ہماری طاعت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی نعمتوں سے نوازتا ہے۔ وہ نعمت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی حاصل ہوتی ہے، اس لئے کہ طاعت کی توفیق اس نے عطاء کی اس کی امداد سے ہم طاعت کر سکتے ہیں۔ طاعت کی ہدایت وہی دیتا ہے۔ ہم سے عذر وہی زائل کرتا ہے۔

اس بحث سے یہ مسئلہ کھل کر واضح ہوگیا کہ تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ سے ہی حاصل ہیں کوئی بالواسطہ ،اور کوئی بلاواسطہ۔ (از کبیر)

انسان کے لئے سب سے پہلی نعمت:

اللہ تعالیٰ کی طرف سے سب سے پہلی نعمت اپنے بندوں پر یہ ہے کہ ان کو زندگی عطاء کی، عقل کا بھی یہی تقاضا ہے کہ نعمت اس وقت تک اپنے کمال کو نہیں پہنچتی جب تک اس سے نفع حاصل کرنا ممکن نہ ہو اور نفع انسان اس وقت تک حاصل نہیں کرسکتا جب تک اسے زندگی حاصل نہ ہو، اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر وہ چیز جس میں حیات ہی نہیں وہ نفع حاصل نہیں کرسکتی جس طرح پتھر ،غیرہ۔ اس سے ثابت ہوا کہ تمام نعمتوں کی اصل حیات ہے۔ نقلی دلیل بھی اس پر موجود ہے، رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَکُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاکُمْ ﴾ تم اللہ تعالیٰ سے کیسے کفر کرتے ہو حالانکہ تم کچھ نہیں تھے اس نے تمہیں زندگی عطاء کی۔ اس کے بعد فرمایا:

﴿ ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ﴾

''وہ ذات جس نے تمہارے نفع کے لئے زمین میں تمام چیزوں کو پیدا کیا''

جب رب تعالیٰ نے پہلے حیات کے عطاء کرنے کا ذکر کیا پھر تمام چیزوں کا نفع مند ہونا ذکر فرمایا ،یہ انداز بیان ہی اس پر دلالت کر رہا ہے کہ تمام نعمتوں کی اصل اور پہلی نعمت انسان کو جو عطا ہوئی وہ حیات ہے:

فائدہ: جب یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بے شمار ہیں ﴿اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ﴾ میں جو نعمت مراد ہے وہ اخروی نعمتیں ہیں ۔خصوصا ایمان کا حاصل ہونا جس پر تمام نیکیوں اور مدارج کا دارومدار ہے۔اور آیۃ کریمہ سے جب یہ بھی واضح ہے کہ یہ نعمت عطا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے تو اس سے معتزلہ کا قول بھی باطل ہو گیا کہ ان کے نزدیک بندہ خود خالق افعال ہے ۔اگر ان کے قول کو صحیح مانا جائے تو لازم آئے گا کہ سب نعمتوں سے عظیم نعمت عطاء کرنے والا بندہ ہے ، اس طرح بندے کے انعام کا مقام اللہ تعالیٰ کے انعام سے بلند ہوگا ،حالانکہ یہ ممکن نہیں تو پتہ چلا کہ ایمان جیسی عظیم نعمت کا خالق اور معطی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

اثر عظیم: جب ہر مومن صراط مستقیم کی ہدایت طلب کرتا ہے ،اور صراط مستقیم ان لوگوں کا راستہ ہے جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے تو گویا کہ ہر مومن کی دعاء کو شرف قبولیت عطا فرماتے ہوئے رب تعالیٰ انعام سے نوازتا ہے ۔اور رب تعالیٰ کا انعام معمولی انعام نہیں بلکہ عظیم انعام ہے اور انعام اس وقت تک عظیم انعام نہیں بن سکتا جب تک عذاب مندفع نہ ہو، تو اس سے یہ مسئلہ سمجھ آ گیا کہ کوئی مؤمن ہمیشہ آگ میں نہیں رہے گا۔

رب تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں:

اسی آیۃ کریمہ سے یہ مسئلہ بھی ثابت ہو گیا کہ رب تعالیٰ پر یہ لازم اور واجب نہیں کہ وہ بندوں کی بہتری اور بھلائی کے مطابق انہیں کوئی چیز عطاء کرے البتہ وہ مہربان ہے رحیم وکریم ہے اپنی تمام مخلوق پر نوازشیں کرتا رہتا ہے ۔اور مؤمنین کو خصوصی انعامات سے نوازتا ہے۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے مؤمنین پر انعامات ہیں تو یہ خود بخود واضح ہو گیا کہ رب تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں کیونکہ واجب کی ادائیگی انعام نہیں۔

مؤمنین پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی انعام:

اللہ تعالیٰ کی بعض مہربانیاں عام ہیں جن سے مؤمن اور کافر سب ہی فائدہ اٹھاتے ہیں ۔ جیسا

کہ انسان کو کام کرنے کی قدرت عطا کرنا، اس کی راہنمائی کرنا، اس سے عذر اور تکالیف کو دور کرنا وغیرہ، اسی قسم کی مہربانیاں عام ہیں جو مؤمنین کے ساتھ خاص نہیں۔ لیکن یہاں جن مہربانیوں اور انعامات کا ذکر ہے وہ ان چیزوں سے بڑھ کر اخروی نعمتیں اور ایمان جیسی عظیم نعمت سے سرفراز کرنا ہے یہ صرف ایمان والوں کو ہی نصیب ہیں۔

تنبیہ: قرآن پاک میں کوئی تعارض نہیں۔ لیکن بعض اوقات اپنی کم علمی کی وجہ سے یہ سمجھتا ہے کہ قرآن پاک میں تعارض ہے وہ اپنی جہالت کا تو علاج نہیں کرتا البتہ قرآن پاک پر اعتراض کرتا رہتا ہے۔ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ رحمٰن ہے اس کی رحمت عامہ مؤمنین اور کفار سب کو شامل ہے۔ اسی طرح رب تعالیٰ کا رب العلمین ہونا بھی واضح کر رہا ہے کہ اس کی ربوبیت سے فائدہ حاصل کرنے والے جس طرح مؤمنین ہیں اسی طرح کفار بھی ہیں۔ رب تعالیٰ نے انسانوں کو جو سب سے پہلی نعمت عطا کی یعنی حیات وہ بھی سب کو حاصل ہے۔ اس میں بھی مؤمنین کی کوئی تخصیص نہیں بلکہ یہ کفار کو بھی حاصل ہے۔

اسی طرح کام کرنے کی طاقت عطا کرنا، عذر کو دور کرنا وغیرہ ایسی نعمتیں بھی مؤمنین اور کفار کو حاصل ہیں۔ لیکن رب تعالیٰ کا یہ ارشاد ......

﴿ ولا یحسبنّ الّذین کفروْا انّما نُملی لھُمْ خیرٌ لانفُسھمْ انّما نُملی لھُمْ لیزْدادُوْا اِثْمًا ﴾

کفار یہ گمان نہ کریں کہ ہم ان کو مہلت ان کے نفع کے لئے دیتے ہیں ہم تو ان کو مہلت دیتے ہیں کہ وہ اور بھی زیادہ گناہ کرلیں۔

...... اس پر دلالت کر رہا ہے کہ کافروں کو اللہ تعالیٰ کی نعمتیں حاصل نہیں۔ بظاہر تعارض نظر آرہا ہے لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ دنیا کی زندگی آخرت کی زندگی کے مقابل قلیل ہے اور دنیا کی نعمتیں آخرت کی نعمتوں کے مقابل قلیل ہیں۔ (اسی لئے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ قُلْ متاعُ الدُّنیا قلیْلٌ ﴾ اے محبوب فرما دو دنیا کا سامان قلیل ہے) تو واضح ہوجاتا ہے کہ کفار پر دنیا میں اللہ تعالیٰ کی مہربانیاں، نعمتیں ہیں لیکن آخرت میں نہیں ہوں گی لہذا ان پر نعمتیں ہونے کے باوجود نہ ہونے کے برابر ہیں۔

﴿ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ ﴾

(۱) ''نہ ان کا جن پر غضب ہوا اور نہ بہکے ہوؤں کا''

(۲) ''نہ ان کا (راستہ) جن پر غضب کیا گیا اور نہ گمراہوں کا''

مطلب یہ ہوا کہ اے اللہ تعالیٰ ہمیں ان لوگوں کی راہ پر نہ چلانا جن پر تیرا غضب ہے اور ان لوگوں کی راہ پر بھی نہ چلانا جو گمراہ اور بھٹکے ہوئے ہیں۔اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ جن پر غضب ہے اور جو گمراہ ہیں ان کی راہ صراط مستقیم نہیں، بلکہ ان کی راہ ٹیڑھی راہ ہے۔اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے وہ رب تعالیٰ کے غضب اور گمراہی سے محفوظ ہیں۔

غضب: لغت میں غضب کا معنیٰ ہے ''شدت'' کہا جاتا ہے "رجل غضوب" شدید خلق والامرد (یعنی بد اخلاق انسان) اور خبیث سانپ کو بھی الغضوب کہا جاتا ہے کہ اس میں شدت پائی جاتی ہے۔اونٹ کے چمڑے کے ٹکڑے کو جس کے بعض حصے کو بعض سے لپیٹا جائے، شدت کی وجہ سے کہا جاتا ہے "الغضبة" اسی طرح پہاڑ میں مرکب سخت پتھر کو بھی "الغضبة" کہا جاتا ہے۔غضب کی تفسیر بیان کی گئی ہے " هو ثوران دم القلب لارادة الانتقام " دل کے خون کا جوش مارنا اور انتقام لینے کے ارادہ سے دل کی آگ کا بھڑکنا۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

" اتقوا الغضب فانه جمرة تتوقد فی قلب ابن آدم الم تروا الی انتفاخ اوداجه وحمرة عينيه "

غضب سے بچو، بیشک یہ ایک آگ کی چنگاری ہے جو انسان کے دل میں بھڑک اٹھتی ہے کیا تم دیکھتے نہیں کہ اس انسان کی گردن کی رگیں پھول جاتی ہیں اور آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں۔اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔" ان الصدقة لتطفی غضب الرب " بیشک صدقہ رب تعالیٰ کے غضب (کی آگ) کو بجھا دیتا ہے۔ (ماخوذ از قرطبی، روح المعانی، خازن)

اعتراض: اللہ تعالیٰ کی طرف غضب کی نسبت کس طرح درست ہو سکتی ہے جب وہ ''انتقام کی غرض سے خون کے جوش مارنے'' سے پاک ہے؟

جواب: ایک قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ تمام اعراض نفسانیہ جیسے رحمۃ، فرح، سرور، غضب، حیاء،

غیرۃ، مکر، خداع، تکبر، استہزاء ان کی ابتدائی حالت بھی ہے اور انتہائی حالت بھی۔ رب تعالیٰ کی طرف ان کی ابتدائی حالت منسوب نہیں ہو سکتی لیکن ان کی انتہائی حالت کا رب تعالیٰ کی طرف منسوب ہونا جائز ہے۔ غضب کی ابتدائی حالت ''دل کے خون کا جوش مارنا'' اور اس کی انتہاء اور مقصد یہ ہے کہ جس پر غضب کیا جائے اسے ضرر (نقصان) پہنچایا جائے اس معنی کے لحاظ سے ہی کہا جاتا ہے ''فلاں پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہے''۔

اسی طرح مثال کے طور پر حیاء کی ابتدائی حالت ''نفس میں انکسار حاصل ہونا'' اور اس کا مقصد اور انتہائی حالت ''کام کو چھوڑ دینا'' حیاء کا استعمال اللہ تعالیٰ کے لئے ''کام کو چھوڑ دینے'' کے معنی میں ہوتا ہے۔ لیکن نفس کو انکسار حاصل ہونا، یعنی طبیعت کا سکڑ جانا، اس معنی میں حیاء کو رب تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ (از کبیر)

علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" هو صفة لانقة لله تعالیٰ بجلال ذاته لا اعلم حقيقتها ولا كيف هي والعجز عن درک الادراک ادراک " (روح المعانی)

سلف صالحین نے یہی کہا کہ غضب اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جس طرح اس کی شان کے لائق ہے اس کی حقیقت اور کیفیت کا علم نہیں یہ پتہ چل جانا کہ میں اسے نہیں سمجھ سکتا یہ بھی ایک علم ہے۔ یہ قاعدہ یاد رکھا جائے اور دیکھا جائے کہ قرآن پاک کا ترجمہ کرنے والے حضرات کہاں کہاں بھٹکے ہیں جب بعض مترجمین کئی مقامات پر صحیح ترجمہ نہیں کر سکے تو ان متراجم کو دیکھ کر یہ دعوی کرنے والے قرآن ہمیں بھی سمجھ میں آتا ہے کیسے ان کو عالم مان لیا جائے، اور کیسے یہ کہا جائے کہ ان کی سمجھ درست ہے۔

ضَلَال: ضالین چونکہ ضلال سے ماخوذ ہے۔ ضلال کے مختلف معانی ہیں۔ درمیانے طریقہ سے ہٹ جانا اور حق راہ سے ہٹ جانا اور کبھی اس کا معنی ہوتا ہے گم ہونا کہا جاتا ہے ''ناقة ضالة'' گم شدہ اونٹنی۔ اور کہا جاتا ہے ''ضل اللبن فی الماء ای غاب'' دودھ پانی میں گم ہو گیا۔ یہی معنی مراد ہے ''ء اذا ضللنا فی الارض'' کیا ہم موت کی وجہ سے غائب ہو جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے۔ جیسا کہ کسی شاعر نے کہا:

الم تسال فتخبرک الدیار ، عن الحی المضلل این ساروا

کیا تم نے نہیں پوچھا؟ تمہیں شہر خبر دیتے، گم شدہ قبیلہ کی کہ وہ کہاں گئے ہیں۔

کن پر غضب اور کون گمراہ؟

• " عن عدی بن حاتم قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ان المغضوب علیهم الیهود و ان الضالین النصاری "

(مسند احمد ، صحیح ابن حبان ، والترمزی ، وقال الترمذی هذا حسن ، مظهری)

ابن مردویہ نے ابوذر رضی اللہ عنہ سے اسی قسم کی روایت ذکر کی ابن جریر اور ابن حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر یہی بیان کی۔ کہ جن لوگوں پر غضب ہے وہ یہود ہیں۔ اور گمراہ ہونے والے نصاری (عیسائی) ہیں۔(مظہری)

" واخرج ابن مردویه من طریق عبد الله بن شقیق عن ابی ذر قال سألت رسول الله ﷺ عن المغضوب علیهم قال الیهود ولا الضالین النصاری " (در منثور)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا "المغضوب علیهم" کون لوگ ہیں؟ تو آپ نے فرمایا وہ یہود ہیں۔ اور ضالین سے مراد نصاری ہیں۔

" واخرج سفیان بن عینیه فی تفسیره وسعید بن منصور عن اسمعیل بن ابی خالد ان النبی ﷺ قال المغضوب علیهم الیهود والضالون هم النصاری "

سفیان ابن عینیہ نے اپنی تفسیر میں اور سعید ابن منصور نے اسمعیل ابن ابی خالد سے روایت بیان کی بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا جن پر غضب ہے وہ یہود ہیں اور جو گمراہ ہیں وہ نصاری ہیں۔ (درمنثور)

یہ مسئلہ اتفاقی ہے: "قال ابن ابی حاتم لا اعلم فی ذلک خلافا بین المفسرین "

(در منثور ، مظهری)

ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ مجھے کوئی معلوم نہیں کہ اس میں مفسرین کے درمیان کوئی اختلاف ہو یعنی تمام مفسرین کرام کا اتفاق ہے کہ غضب جن پر ہے وہ یہود ہیں اور جو ضالین ہیں وہ نصاری ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ میں جب واضح طور پر موجود ہے تو کسی کو اختلاف کی کیسے مجال ہے؟

اختلاف ہے، تو دلائل میں :

جن پر غضب ہے وہ یہود ہیں اس سے مراد یہود کیوں ہیں؟ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے یہود پر "غضب" کا ذکر دوسری آیت میں بھی کیا ہے ﴿ مَنْ لَعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ ﴾ یہاں یہود پر غضب کا ذکر ہے۔ اسی طرح نصاری پر ضلالت کا ذکر اس آیت میں پایا گیا ہے ﴿ وَقَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴾ ان دلائل کا بعض مفسرین نے ضعف بیان کیا ہے کہ رب تعالیٰ نے تو قاتل کے لئے بھی غضب کا ذکر کیا ہے۔ کفار کے لئے بھی اور اسی طرح ضلال کا استعمال فساق اور کفار کے لئے بھی ہوا۔ ان مفسرین کا مطلب تقریباً یہ ہے کہ دلیل صرف احادیث مبارکہ کو بنانا کافی ہے۔ قرآن پاک میں دوسرے مقام پر یہود کے لئے غضب کا ذکر ہے اور نصاری کے لئے ضلال کا، یہ دلیل نامکمل ہے۔ ہاں اگر کسی کا اصل مسئلہ میں اختلاف ہو تو وہ درست نہیں کیونکہ اس میں احادیث کی مخالفت لازم آئے گی، راقم کی اس بحث سے روح المعانی کے جلالیہ انداز سے لوگ جلال میں نہیں آئیں گے۔

اعتراض : تقریباً تمام مفسرین اسے بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہاں کفار، یہود، نصاری، فساق لوگوں کی راہ پر نہ چلانے کی دعا ہے جب یہ عام ہے تو احادیث مبارکہ میں یہود اور نصاری کی تخصیص کیسے؟ بلکہ یوں کہا جائے کہ جب احادیث مبارکہ میں یہود و نصاری کی تخصیص تو مفسرین نے اس میں عموم ثابت کر کے کیا احادیث کی مخالفت نہیں کی۔

جواب: "واللفظ عام یعم الکفار والعصاۃ والمبتدعۃ" (مظہری)

لفظ عام ہیں اس لئے یہ اپنے عموم معنی کے لحاظ سے کافروں، نافرمانوں، بدعتیوں کو شامل ہیں۔ اب معنی مقصودی اس طرح ہو جائے گا کہ اے اللہ تعالیٰ ہمیں یہود و نصاری کے راستہ پر نہ چلانا، اور اسی طرح ہمیں کافروں، نافرمانوں، بدعتیوں کے راستہ پر نہ چلانا۔ یہی ضابطہ قرآن پاک میں جا بجا استعمال ہوتا ہے کہ آیت کریمہ شان نزول کے لحاظ پر خاص ہوتی ہے لیکن عموم الفاظ اور عموم معانی کے لحاظ پر عام ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ احکام تا قیامت جاری و ساری ہیں۔

عجیب نکتہ:

" ان الیهود علموا الحق فترکوه وحادوا عنه علی علم ، فاستحقوا غضب الله ، والنصاری حادوا عن الحق جهلا فکانوا علی ضلال مبین فی شان عیسٰی علیه السلام" (زبدة التفسیر من فتح القدیر)

یہودیوں نے حق کو جانتے ہوئے چھوڑا اور علم کے باوجود حق کو ماننے سے دور رہے، اور اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہوئے اور نصاریٰ نے حق سے روگردانی جہالت کی وجہ سے کی اور عیسیٰ علیہ السلام کی جاہلانہ انداز پر شان بیان کر کے کھلی گمراہی میں مبتلا ہو گئے۔

واضح ہوا کہ انسان عالم ہو یا جاہل ہو راہ راست سے بھٹک سکتا ہے۔اس لئے رب تعالیٰ سے دعاء کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے راہ راست پر قائم رکھ مجھے خود کوئی طاقت حاصل نہیں کہ میں ہمیشہ راہ راست پر قائم رہ سکوں۔

مودودی صاحب کا غلط ترجمہ:

ابھی تک یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ ﴿ اَلْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ ﴾ سے مراد اصل میں یہود ہیں۔ البتہ عموم لفظ کے لحاظ سے کفار اور فساق بھی مراد ہیں۔مطلب یہ ہوا کہ ہمیں اس راہ پر نہ چلا جو راستہ ان لوگوں کا ہے جن پر غضب کیا گیا یعنی یہود، کفار اور فساق ہیں لیکن مودودی صاحب ﴿ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ ﴾ کا ترجمہ لکھتے ہیں ''جو معتوب نہیں ہوئے''۔یہ ترجمہ اس لئے غلط ہے کہ عتاب تو دوستوں کو پیار سے جھڑکنے کو بھی کہا جاتا ہے۔یعنی انبیاء کرام کو بھی عتاب ہوا جب انبیاء کرام بھی معتوب ہوئے تو مودودی صاحب کے ترجمہ سے یہ پتہ چلا کہ مومن دعا یہ کرتے ہیں کہ اے اللہ ہمیں انبیاء کے راستہ پر نہ چلا کیونکہ وہ تو معتوب ہیں ہم تو ان کی راہ پر چلنا چاہتے ہیں جو معتوب نہیں ہوئے۔(معاذ اللہ)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "عاتبنی فیه ربی " (خازن، بغوی ج ۷ ص ۱۷۴) میرے رب نے مجھے اس میں عتاب کیا۔" فعتب الله علیه موسی علیه السلام " (بخاری ج اول ص ۶۳)

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر عتاب فرمایا۔ "فعتب الله علیه " (مسلم ج ۲ ص ۲۷۷) موسیٰ علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے عتاب فرمایا۔

ضالین ،مومنین نہیں ہو سکتے:

" لما حکم الله علیهم بکونهم ضالین امتنع کونهم مؤمنین و الالزم انقلاب خیر الله الصدق کذبا " (کبیر)

جن لوگوں کو رب تعالیٰ نے ضالین (گمراہ) کہہ دیا ہے وہ مومنین نہیں ہو سکتے ۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کی سچی خبر کا (معاذ اللہ) جھوٹا ہونا لازم آئے گا یہ محال ہے اور یہ بھی قانون ہے جو چیز محال تک پہنچائے وہ بھی محال ہوتی ہے۔

اسی آیۃ کریمہ سے انبیاء کرام اور ملائکہ کا معصوم ہونا ثابت ہے ﴿ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ﴾ سے پتہ چل رہا ہے کہ انبیاء کرام اور فرشتوں کا کوئی عمل اور کوئی عقیدہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے انعام کے مستحق نہ رہیں اگر معاذ اللہ ان کا عقیدہ یا عمل اس قسم کا ہو جس کی وجہ سے وہ انعام کے مستحق نہ رہیں تو یہ ضلال ہے ۔ ضالین کی اقتداء جائز نہیں ان سے ہدایت حاصل کرنا ممکن ہی نہیں ۔ اور ضالین اللہ تعالیٰ کے انعام سے دور ہیں ۔ لہذا یہ ممکن نہیں کہ انبیاء کرام اور ملائکہ میں یہ وصف باطل پایا جائے لہذا ان کا معصوم ہونا بھی ثابت ہو گیا۔

" ولما کان ذلک باطلا علمنا بهذه الآیة عصمة الانبیاء و الملائکة علیهم السلام " (از کبیر)

فائدہ: سورۃ کے اول میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور مدح کا ذکر کیا ، اور آخر میں ان لوگوں کی مذمت بیان کی جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے سے اعراض کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طاعت کا اقرار نہیں کرتے۔

اس سے یہ واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیرات کا حصول اور سعادات کا حاصل ہونا اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے سے ہے اور آفات اور خوف وعذاب کا مسلط ہونا اللہ تعالیٰ سے اعراض اور اس کی طاعت سے دوری اور اس کی خدمت سے اجتناب کی وجہ سے ہے۔

آیۃ کریمہ سے تین فرقوں کا ثبوت:

جس طرح پہلے ثابت کیا جا چکا ہے کہ عموم الفاظ سے یہود، نصاریٰ، کفار اور فساق سب سمجھ آرہے ہیں۔ اسی کو ذہن میں رکھتے ہوئے توجہ کی ضرورت ہے کہ آیۃ کریمہ میں مکلفین کے تین فرقوں کا ذکر ہے۔ ایک اہل طاعت ہیں۔ ان کا ذکر ﴿اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ میں ہے۔ اور دوسرے اہل معصیت ہیں ان کا پتہ ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ﴾ سے چلا۔ اور تیسرا فرقہ اہل جہالت کا یعنی جو اللہ تعالیٰ کے دین سے جاہل ہیں اور کافر ہیں اس کا اشارہ ﴿وَلَا الضَّالِّينَ﴾ سے ملتا ہے۔
(از کبیر)

حکمت: تین فرقے جن کا ذکر کیا گیا ان میں اہل طاعت کا ایک فرقہ ہے۔ اور اہل معصیت کے دو فرقے ہیں اس میں عجیب حکمت یہ ہے کہ جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان والے ہیں اور ان کے اعمال بھی نیک ہیں۔ تو گویا کہ اہل طاعت وہ ہیں جن میں ایمان اور اعمال صالحہ مجموعی طور پر پائے جاتے ہوں۔ لیکن اہل معصیت کے دو فرقے اس لئے ہیں کہ ایک فرقہ وہ ہے جو ایمان تو رکھتے ہیں لیکن ان کے اعمال برے ہیں ان کو فساق کہا جاتا ہے اور دوسرا فرقہ وہ ہے جو ایمان ہی نہیں رکھتا وہ کفار ہیں۔ (از کبیر)

''آمین'' قرآن پاک کا حصہ نہیں:

"ولیست من القرآن وفاقا ولکن یسن ختم سورۃ الکریمۃ بھا" (ابو سعود)

اس پر تمام کا اتفاق ہے کہ آمین قرآن پاک کا حصہ نہیں۔ البتہ مسنون طریقہ یہی ہے کہ سورۃ کے آخر میں آمین پڑھی جائے۔ اس پر دلیل نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "علمنی جبرآئیل آمین عند فراغی من قراءۃ الفاتحۃ" جب میں فاتحہ (کے پڑھنے) سے فارغ ہوا تو جبرائیل نے مجھے آمین سکھائی (یعنی مجھے آمین پڑھنے کے متعلق کہا) اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی یہ ہے "آمین کالختم علی الکتاب" جس طرح خط پر مہر ہوتی ہے اسی طرح آمین سورۃ فاتحہ کی مہر ہے۔
(از بیضاوی وشیخ زادہ)

''آمین'' کو سورۃ فاتحہ کے ساتھ نہ لکھا جائے:

" لانه لم يكتب في الامام ولم ينقل احد من الصحابة والتابعين ومن بعدهم رضی اللہ عنہم انہ قرآن" (شیخ زادہ)

اس لئے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مصحف میں آمین کو فاتحہ کے اختتام پر نہیں لکھا گیا۔ تمام صحابہ کرام اور تابعین اور ان کے بعد میں آنے والے اہل علم میں سے کسی ایک سے بھی ثابت نہیں کہ کسی نے کہا ہو کہ آمین قرآن پاک کا حصہ ہے۔

پڑھنے میں بھی فرق کیا جائے:

" وليست من القرآن اجماعا ولذا سن الفصل بينها وبين السورة بسكتة لطيفة " (روح المعانی)

آمین کا قرآن پاک سے نہ ہونا جب اتفاقی مسئلہ ہے تو اسی وجہ سے اس میں سنت طریقہ یہی ہے کہ سورۃ فاتحہ کے پڑھنے کے بعد معمولی سکتہ (خاموشی) اختیار کرے پھر آمین پڑھے۔ راقم کے نزدیک پسندیدہ صورت یہ ہے کہ آواز میں بھی تھوڑا سا فرق کیا جائے، عام تلاوت میں سورۃ فاتحہ کو جس لہجہ سے پڑھ رہا ہے، آمین کو اسی لہجہ سے نہ پڑھے تا کہ پڑھتے ہوئے فرق سمجھ آ جائے۔

آمین کا معنی: مشہور معنی تو یہ ہے " استجب " قبول کر۔ تاہم اور معانی بھی ذکر کئے گئے ہیں وہ یہ ہیں۔ اسی طرح کر'' ہم تیری طرف ہی ارادہ کرتے ہیں'' ہم تیری ثناء کو تجھ تک پہنچانے سے عاجز ہیں'' ہم تجھ سے دعاء کی قبولیت کی امید کرتے ہیں'' ہم تمام چیزوں سے اعراض کر کے تیری طرف ہی رجوع کرتے ہیں۔ جو بھی تو ہمارے لئے فیصلہ کرے ہم اسی پر راضی ہیں۔

تمام معانی میں درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف کامل طور پر اپنے عجز کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہی ہر بھلائی کی اصل ہے۔ اور اسی سے حق کی طرف پہنچنے کے راستہ کی تکمیل ہوتی ہے اور آفات سے سلامتی حاصل ہوتی ہے۔

" سلمنا الله عنها بمحض فضله ومنه انه ارحم الرحمين وصلى الله على سيدنا محمد وآله اجمعين " (تیسیر الرحمن)

تنبیہ: " ذکر غیر واحد ان من قال ﴿ان آمین من القرآن کفر﴾ بہت سے اہل علم نے یہ واضح کیا ہے کہ اگر کسی شخص نے کہا کہ آمین قرآن پاک کا حصہ ہے تو وہ کافر ہو جائے گا۔ (روح المعانی)

آمین کا تلفظ: مد سے بھی پڑھا گیا ہے اور یہی مشہور ہے اور نبی کریم ﷺ سے بھی زیادہ اسی طرح پڑھنا ثابت ہے کیونکہ '' ومدبھا صوتہ '' کے الفاظ احادیث مبارکہ میں موجود ہیں۔ کہ آپ نے اپنی آواز کو لمبا کیا۔ تاہم بغیر مد کے امین بروزن فعیل پڑھنا بھی جائز ہے۔ (بیضاوی بزیادۃ ونقصان)

آمین کہنے کی فضلیت:

" عن ابی میسرۃ ان جبریل علیہ السلام اقرأ النبی صلی اللہ علیہ وسلم الفاتحۃ فلما قال ولا الضالین قال لہ قل آمین " (بیھقی فی الدلائل، ابی ابن شیبہ، مظھری)

'' ابومیسرہ سے مروی ہے بیشک جبرائیل علیہ السلام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فاتحہ پڑھنے کے متعلق عرض کیا جب آپ نے " ولا الضالین " پڑھا تو جبرائیل نے عرض کیا آپ آمین بھی کہیں ''۔

" کان النبی ﷺ اذا قرأ ولا الضالین قال آمین" (ابو داود، ترمذی، دار قطنی، صحیح ابن حبان، مظھری)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ولا الضالین پڑھتے تو آمین (بھی) کہتے۔

نماز میں آمین آہستہ کہی جائے:

" عن ابی موسی الاشعری قال، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا قرأ (یعنی الامام) غیر المغضوب علیھم ولا الضالین فقولوا آمین یحبکم اللہ " (مسلم، ابو داود، نسائی، ابن ماجہ، ابن ابی شیبہ، روح المعانی)

'' حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب امام ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ﴾ پڑھے تو تم کہو آمین اللہ تعالیٰ تم سے محبت رکھے گا ''۔

" واخفائھا مذھب سادتنا الحنفیۃ وھو مذھب امیر المؤمنین علی کرم اللہ

تعالیٰ وجهه وعبد الله بن مسعود وعند الشافعية يجهر بها " (روح المعانی)

ہمارے سادات حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ آمین آہستہ کہی جائے ،اور یہی مذہب امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا بھی ہے اور یہی مذہب حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا بھی ہے۔البتہ اس مسئلہ میں شافعیہ کا اختلاف ہے وہ آمین بلند آواز سے پڑھنے کا مذہب رکھتے ہیں۔

" وروى الاخفاء عن رسول الله ﷺ عبد الله بن مغفل وانس رضى الله عنهما " (كشاف ، روح المعانی)

" آمین آہستہ کہنے والی روایات عبداللہ ابن مغفل اور انس رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ ﷺ سے بیان کی ہیں"۔

" ورواية الجمهور محمولة على التعليم " جن حضرات نے بلند آواز سے کہنے والی روایات کوذکر کیا ہے ان میں تعلیم امت کے لئے کبھی کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معمولی آواز سے آمین کہا ہے جیسا کہ قراءت میں کبھی ایسا ثابت ہے۔ (روح المعانی)

☆ " عن ابى هريرة ان رسول الله ﷺ قال اذا قال الامام غير المغضوب عليهم ولا الضالين فقولوا آمين فانه من وافق قوله تعالىٰ قول الملائكة غفرله ماتقدم من ذنبه "
(بخاری باب جهر المأموم بالتامين)

" حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ۔ بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب امام ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ﴾ کہے تو آمین کہو۔ بیشک جس کا قول (آمین کہنا) ملائکہ کے قول کے موافق ہوگیا اس کے اس سے پہلے گناہ معاف کر دیئے گئے"۔

☆ " عن ابى هريرة ان رسول الله ﷺ قال اذا قال احدكم آمين وقالت الملائكة فى السماء آمين فوافقت احداهما الاخرى غفرله ما تقدم من ذنبه " (بخاری باب فضل التامين)

" حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ نے کہا بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی ایک آمین کہے تو آسمانوں میں فرشتے آمین کہتے ہیں جب ایک آمین دوسری آمین کے موافق ہوگئی تو اس کے پہلے گناہ معاف کر دیئے گئے"۔

وضاحت: " وقد اجتمعت الامة على ان المنفرد يؤمن وكذالك الامام والمأموم فى الصلوة السرية وكذالك قال الجمهور فى الجهرية " (نووی علی مسلم ج ۱ ص ۱۹۲)

امت کا اس مسئلہ پر اجماع ہے کہ بیشک منفرد ،امام اور مقتدی آمین کہیں سری (آہستہ آواز سے پڑھنے والی) نمازوں میں اور جہری (بلند آواز سے پڑھنے والی) نمازوں میں بھی سب کا آمین پڑھنا ہی جمہور علماء کا مذہب ہے"۔

وانه ينبغي ان يكون تامين الماموم مع تامين الامام لاقبله ولا بعده لقوله عليه السلام واذا قال الامام " غير المغضوب عليهم ولا الضالين ...... وفي رواية اذا امن فامنوا فمعناها اذا اراد التامين " (نووی ج ۱ ص ۱۹۴)

حدیث پاک کا معنی یہ ہے مناسب یہ ہے کہ امام جب آمین کہے تو ساتھ ہی مقتدی بھی آمین کہیں نہ پہلے اور نہ بعد اور جن روایات میں یہ ہے " واذا امن الامام فامنوا "جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو۔ ان کا مطلب یہ نہیں کہ امام جب آمین کہہ چکے (اور تم اس کی آمین کو سن لو) تو تم آمین کہو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب امام آمین کہنے کا ارادہ کرے تو تم بھی آمین کہو۔

حدیث پاک میں ذکر ہے جس کی آمین ملائکہ کی آمین کے موافق ہوگی اس کے پہلے گناہ معاف ہوں گے ،اس سے بھی واضح ہو رہا ہے کہ ملائکہ کی آمین کے موافق ہونے میں چند احتمال ہیں۔ انسان کی آمین اور ملائکہ کی آمین ایک وقت میں ہو،ایک طرح ہو یعنی ریاء کاری نہ ہو،انداز تکبرانہ نہ ہو کسی کو سنانا اور چرچا کرنا مقصود نہ ہو۔ یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ آہستہ آواز میں آمین کہی جائے کیونکہ فرشتوں کی آمین آہستہ آواز میں ہوتی ہے۔اگر یہ بات کسی کو تسلیم نہ ہو تو وہ شخص کوئی ایک صحیح حدیث ، احادیث کی کتب میں سے نکال کر دے ،جس میں یہ ذکر ہو کہ فرشتے بلند آواز سے آمین کہتے ہیں ۔ جب یہ کوئی بھی نہ ثابت کر سکے تو سمجھ لیجئے کہ حدیث پاک سے آہستہ آواز میں آمین کہنا ثابت ہو رہا ہے ،بلند آواز سے آمین کہنے پر اس حدیث کو دلیل بنانا درست نہیں۔

خیال رہے کہ بخاری نے اس حدیث کا عنوان قائم کیا ہے۔ "**باب جهر الامام بالتامين**" (**امام** کے بلند آواز سے آمین کہنے کا باب) لیکن بخاری کا یہ عنوان قائم کرنا صحیح نہیں ،اس لئے کہ اس عنوان میں جو حدیث قائم کی گئی اس میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس کا معنی بلند آواز سے آمین کہنا ہو۔ وہی حدیث بخاری رحمہ اللہ سے پہلے امام محمد رحمہ اللہ نے ذکر فرمائی اور آمین آہستہ آواز سے کہنا ثابت کیا ہے:

"عن ابی هریرة ان رسول الله ﷺ قال اذا آمین الامام فامنوا فانه من وافق تامینه تامین الملائکة غفرله ماتقدم من ذنبه قال (مالک) فقال ابن شهاب کان النبی ﷺ یقول آمین"

"حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب امام آمین کہنے کا ارادہ کرے تو تم بھی آمین کہو بیشک جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہوگی اس کے پہلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے"۔

امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ابن شہاب نے کہا کہ نبی کریم ﷺ آمین کہتے تھے۔اس حدیث پاک کو بیان کرنے کے بعد امام محمد رحمہ اللہ نے فرمایا:

"قال محمد وبهذا نأخذ ینبغی اذا فرغ الامام من ام الکتاب ان یؤمن الامام ویؤمن من خلفه ولا یجهرون بذلک" (مؤطا امام محمد باب آمین فی الصلوة)

امام محمد رحمہ اللہ نے کہا ہم اسی پر عمل کرتے ہیں کہ جب امام فاتحہ پڑھنے سے فارغ ہو تو وہ بھی آمین کہے اور جو اس کے پیچھے ہیں وہ بھی آمین کہیں اور بلند آواز سے نہ کہیں۔

"عن ابی هریرة قال کان رسول الله ﷺ یعلمنا یقول لا تبادروا الامام اذا کبر فکبروا واذا قال ولا الضالین فقولوا آمین واذا رکع فارکعوا واذا قال سمع الله لمن حمده فقولوا اللهم ربنا لک الحمد" (مسلم باب ائتمام الماموم بالامام)

"حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (نماز کا طریقہ) ہمیں سکھاتے تھے آپ فرماتے امام سے پہلے کوئی کام نہ کرو، امام جب تکبیر کہے تو تم تکبیر کہو، اور جب ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو اور جب امام رکوع کرے تو تم رکوع کرو اور جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم "اللهم ربنا لک الحمد" کہو۔

اس حدیث پاک سے پتہ چلا کہ آمین آہستہ آواز میں کہی جائے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے جب نماز کا طریقہ بتایا تو آمین بلند آواز سے کہنے کا ذکر نہیں فرمایا۔اور حدیث پاک کے دوسرے احکام سے بھی پتہ چل رہا ہے کہ آمین آہستہ کہی جائے کیونکہ ربنالک الحمد آہستہ کہنا ہے تو آمین کو بھی آہستہ کہا جائے گا کیونکہ حکم ایک ہے۔

"عن ابراهیم قال خمس یخفیهن الامام سبحانک اللهم وبحمدک والتعوذ وبسم الله الرحمن الرحیم وآمین واللهم ربنا لک الحمد"

(مصنف عبد الرزاق ج ۲ ص ۸۷، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۲ ص ۵۳۶)

حضرت ابراہیم نخعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں پانچ چیزیں امام مخفی رکھے۔

۱...... سبحانک اللھم وبحمدک (ثناء)۔ ۲......تعوذ (اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم)۔

۳......بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ ۴......آمین۔ ۵......اللھم ربنا لک الحمد۔

اس مسئلہ پر اگر کوئی تفصیلی بحث دیکھنا چاہے تو راقم کی کتاب ''نماز حبیب کبریاء'' کا مطالعہ کرے۔

امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے کا مسئلہ:

احناف کا مسلک: نماز میں قراءت کا مسئلہ احناف کے نزدیک یہ ہے کہ اگر ایک شخص نماز اکیلے پڑھ رہا ہے یا وہ امام ہے دوسروں کو نماز پڑھا رہا ہے تو اس شخص کے لئے مطلقاً قراءت فرض ہے۔ یعنی فاتحہ پڑھ لی یا اور کوئی سورۃ کہیں سے پڑھ لی یا چھوٹی تین آیتیں، یا بڑی کوئی آیت پڑھ لی تو اس کا فرض ادا ہو گیا۔

فاتحہ پڑھنا واجب ہے اسی طرح اور سورۃ ملانا واجب ہے۔ اگر اور کہیں سے قراءۃ کر لی اور فاتحہ کو جان بوجھ کر چھوڑ دیا تو واجب چھوڑ دیا لہذا نماز کا دوبارہ پڑھنا واجب ہے۔ اگر فاتحہ کو بھول کر چھوڑ دیا تو نماز سجدہ سہو سے درست ہو جائے گی کیونکہ بھول کر واجب کے چھوٹ جانے پر سجدہ سہو واجب ہوتا ہے۔ یہی حکم اور سورۃ کا ہے۔ فاتحہ پڑھ لی اور کہیں سے قراءۃ نہ کی۔ اگر جان بوجھ کر ایسا کیا تو نماز کا لوٹانا واجب ہے۔ بھول کر ایسا ہوا تو سجدہ سہو واجب ہوگا۔

مقتدی کی قراءت کا حکم:

جو شخص امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہے اسے فاتحہ پڑھنا یا کوئی اور سورۃ پڑھنا منع ہے۔ امام کا پڑھنا ہی مقتدی کا پڑھنا سمجھا جائے گا۔ یہ حکم سب نمازوں کا ایک جیسا ہے خواہ امام بلند آواز سے قرآن پاک پڑھ رہا ہو یا آہستہ آواز سے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴾

''اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور خاموش رہو کہ تم پر رحم ہو''۔

" عن ابن مسعود انه صلى باصحابه فسمع انا سا يقرء ون خلفه فلما انصرف قال اما ان لكم ان تفقهوا اما آن ان تعقلو واذا قرئ القران فاستمعوا له وانصتوا كما امركم الله تعالىٰ "(روح المعانی وهكذا فی المظهری)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں کو نماز پڑھا رہے تھے، آپ نے سنا کہ کچھ لوگ ان کے پیچھے قراءت کر رہے ہیں نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے فرمایا کیا تمہارے لئے سمجھنے اور عقل رکھنے کا وقت نہیں آیا کہ جب قرآن پڑھا جائے تو غور سے سنو اور خاموش ہو جاؤ۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے۔

" عن ابى موسى قال علمنا رسول الله ﷺ قال اذا قمتم الى الصلوة فليؤمكم احدكم واذا قرَاَ الامام فانصتوا "

(مسلم باب التشهد فی الصلوة ج ۱ ص ۱۷۴ مسند احمد ج ۱ ص ۴۱۵)

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہمیں نبی کریم ﷺ نے (نماز کی) تعلیم دی آپ نے فرمایا جب تم نماز ادا کرنے کا ارادہ کرو تو تم میں سے ایک شخص تمہاری امامت کرے اور جب امام قرآن پڑھے تو تم خاموش رہو۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ امام جب قرات کرے تو مقتدی خاموش ہو کر سنیں۔ ''قال النيموى وهو حديث صحيح'' علامہ نیموی نے کہا کہ حدیث صحیح ہے۔ (آثار سنن ص ۱۷۲)

" عن ابى هريرة قال قال رسول الله ﷺ انما جعل الامام ليئو تم به فاذا كبر فكبروا واذا قرأ فانصتوا " (ابوداود، نسائی، ابن ماجه، مسند احمد)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ بیشک امام اسی لئے بنایا جاتا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ قرآن پڑھے تو تم خاموش رہو۔ ''وهذا حديث صحيح...... (آثار سنن ص ۱۷۵) یہ حدیث صحیح ہے یعنی قابل حجت واستدلال ہے۔

" قال محمد اخبرنا داؤد بن قيس القراء المدنى، اخبرنى بعض ولد سعد بن ابى وقاص انه ذكر له ان سعدا قال وددت ان الذى يقرأ خلف

الامام فی فیه جمرة " (موطا امام محمد ص ۹۸)

حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ پسند ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے پڑھے اس کے منہ میں چنگاری ہو۔

" قال محمد اخبرنا داؤد بن قیس القراء اخبرنا محمد بن عجلان ان عمر بن الخطاب قال لیت فی فم الذی یقرأ خلف الامام حجرا "

(موطا امام محمد ص ۹۸)

حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کاش کہ اس آدمی کے منہ میں پتھر ہو جو امام کے پیچھے قراءت کرتا ہے۔

اعتراض : نبی کریم ﷺ کے ایک ارشاد میں مطلقاً ذکر ہے کہ فاتحہ پڑھنے کے بغیر نماز ہوتی ہی نہیں:

" عن عبادة بن الصامت ان رسول اللہ ﷺ قال لاصلوة لمن لم یقرأ بفاتحة الکتاب " (بخاری، مسلم)

عبادہ ابن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو فاتحہ نہ پڑھے۔

جواب : جب پہلے احادیث سے ثابت کیا جا چکا ہے کہ امام کے پیچھے قراءت سے منع کیا گیا ہے۔ تو یقینی بات یہ ہے کہ اس حدیث میں مقتدی کے بغیر امام اور اکیلے شخص کا ذکر ہے۔ مقتدی کو قراءت حاصل ہو جاتی ہے کیونکہ وہ امام کے پیچھے اس کی اقتداء میں ہوتا ہے۔ امام کی قراءت کی وجہ سے مقتدی کو قراءت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس پر حدیث پاک دیکھیں۔

" ابو حنیفه عن موسی عن عبد اللہ بن شداد عن جابربن عبد اللہ ان رسول اللہ ﷺ قال من کان له امام فقراء ة الامام له قراء ة " (مسند امام اعظم)

حضرت جابر ابن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کا امام ہو تو امام کی قراءت اسی کی قراءت ہے۔

واضح ہو گیا کہ امام کی اقتداء میں مقتدی کو قراءت کرنا منع ہے۔ کیونکہ امام کی قراءت مقتدی کی قراءت ہے۔

تنبیہ: یہ بھی خیال رہے کہ " لاصلوۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب " کا یہ معنی درست نہیں ''جو شخص فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ہوتی ہی نہیں'' بلکہ اس کا صحیح معنی یہ ہے ''جو شخص فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز کامل نہیں ہوتی'' یعنی نفی نماز کی نہیں بلکہ نماز کے کمال کی نفی ہے۔کئی احادیث میں لفظ ''لا'' کمال کی نفی کے لئے آیا ہوا ہے۔اس کی ایک مثال دیکھئے:

" عن انس قال قلما خطبنا رسول اللہ ﷺ الا قال لاایمان لمن لا امانۃ لہ و لا دین لمن لاعھد لہ (بیھقی فی شعب الایمان ، مشکوۃ ص ۱۵)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے اکثر اوقات ہمیں خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا جس شخص کو امانت کا پاس نہیں اس کا ایمان کامل نہیں اور جس شخص کو وعدہ کا پاس نہیں اس کا کامل دین نہیں۔فاتحہ والی حدیث میں بھی کمال کی نفی کرنا ہی درست ہے۔اس لئے کہ اس معنی پر ایک اور حدیث دلالت کر رہی ہے:

" عن ابی ہریرۃ عن النبی ﷺ قال من صلی صلوۃ لم یقرأ فیھا بام القرآن فھی خداج ثلاثا غیر تمام " (مسلم ج ۱ باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے نماز ادا کی اور اس میں سورۃ فاتحہ کو نہ پڑھا اس کی نماز ناقص ہے۔یہ آپ نے تین مرتبہ فرمایا۔

حدیث پاک میں لفظ استعمال ہوا "خداج ، بکسر الخاء المعجمۃ ھو النقصان (من نووی) یعنی خداج کا معنی نقصان ہے۔خود حدیث پاک میں وضاحت کر دی گئی کہ ''خداج'' کا معنی ''غیر تمام'' نامکمل ہونا ہے۔حدیث پاک میں یہ نہیں کہا گیا کہ جو شخص نماز میں فاتحہ نہیں پڑھے گا اس کی نماز سرے سے نہیں ہوگی یہ بھی نہیں فرمایا گیا کہ اس کی نماز فاسد ہوگی بلکہ یہ فرمایا گیا اس کی نماز ناقص ہوگی۔

اب واضح ہوا کہ مسلک احناف کا ہی حق ہے کہ فاتحہ پڑھنا واجب ہے، رکن نہیں۔کیونکہ ترک واجب سے نقصان لازم آتا ہے اور ترک رکن سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔اس مسئلہ کو بہت تفصیل سے بفضلہ تعالیٰ راقم نے اپنی کتاب ''نماز حبیب کبریاء'' میں بیان کیا ہے اس کا مطالعہ ضرور کریں تمام اعتراضات وجوابات کا انشاء اللہ آپ کو بخوبی علم حاصل ہوگا۔

فضائل فاتحہ:

" عن ابی ہریرۃ قال فانی سمعت رسول اللہ ﷺ یقول قال اللہ تعالیٰ قسمت الصلوة بینی وبین عبدی نصفین ولعبدی ما سأل فاذا قال العبد الحمد للہ رب العلمین قال اللہ تعالیٰ حمدنی عبدی واذا قال الرحمن الرحیم قال اللہ تعالیٰ اثنی علی عبدی فاذا قال مالک یوم الدین قال مجدنی عبدی وقال مرۃ فوض الی عبدی فاذا قال ایاک نعبد وایاک نستعین قال ھذا بینی وبین عبدی ولعبدی ماسال فاذا قال اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولاالضالین قال ھذا لعبدی ولعبدی ما سأل " (مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا اللہ تعالیٰ نے فرمایا نماز میں نے اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کر دی۔ میرے بندے کے لئے وہ ہے جو اس نے سوال کیا:

☆ جب بندہ کہتا ہے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ رب تعالیٰ کہتا ہے میرے بندے نے میری حمد بیان کی۔

☆ جب بندہ کہتا ہے ﴿اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری ثناء بیان کی۔

☆ جب بندہ کہتا ہے ﴿مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾ رب قدوس کہتا ہے میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی۔ پھر رب تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے اپنے تمام معاملات میرے سپرد کر دیئے۔ جب بندہ کہتا ہے ﴿اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ رب تعالیٰ فرماتا ہے یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے میرے بندے کے لئے وہ ہے جو اس نے سوال کیا۔

☆ پھر جب بندہ کہتا ہے ﴿اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ﴾ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ میرے بندے کے لئے ہے (یعنی اس کے سوالات ہیں) میرے بندے کے لئے وہی ہے جو اس نے سوال کیا (یعنی میں اپنے بندے کو وہی عطا کرتا ہوں جو مجھ سے مانگ رہا ہے)۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی سے سورۃ فاتحہ کی شان اور اہمیت بیان کی۔

وضاحت حدیث: اللہ تعالیٰ کا قول جو حدیث پاک میں ذکر ہے " قسمت الصلوۃ بینی وبین عبدی نصفین " (نماز میں نے اپنے اور اپنے بندے کے درمیاں دوحصوں میں تقسیم کردی) اس سے پتہ چل رہا ہے کہ شریعت کی دار ومدار، مخلوق کی مصلحتوں کی رعایت پر ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ﴾

''اگر تم بھلائی کرو گے اپنا بھلا کرو گے اور اگر برا کرو گے تو اپنا''۔

انسان کے لئے سب کاموں سے اہم کام یہ ہے کہ وہ اپنے دل کو رب تعالیٰ کی معرفت سے منور کرے، پھر اپنے آپ کو عبد سمجھے کہ میں عاجز ہوں اور رب کی عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہوں۔ یہی بات رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی سے سمجھ میں آ رہی ہے:

﴿ وَمَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴾

﴿ اور میں نے جن اور انسان اس لئے ہی پیدا کئے ہیں کہ وہ میری عبادت کریں ﴾

جب یہ سمجھ آ جائے تو خود بخود یہ واضح ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ نبی کریم ﷺ پر نازل فرمائی اور اس کا پہلا نصف حصہ اپنی ربوبیت کی معرفت کا ذکر فرمایا اور دوسرے حصہ میں عبودیت کی معرفت کا ذکر فرمایا تا کہ اس سورۃ میں انسان کو کامل طریقہ سے معلوم ہو جائے کہ میں نے عبادت کرنی ہے اور عبادت بھی اس ذات کی کرنی ہے جو خالق، رب، رحمٰن اور رحیم ہے۔ جب بندہ کہتا ہے "الحمد للہ" تو اللہ تعالیٰ فرماتا "حمدنی عبدی" میرے بندے نے میری حمد کی۔ یہ دلالت کرتا ہے اس پر کہ حمد کا مقام ذکر کے مقام سے اعلیٰ ہے۔ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے تمہیدی طور پر یہ سمجھا جائے جب بندہ کہتا ہے ﴿بسم اللہ الرحمن الرحیم﴾ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے " ذکرنی عبدی " میرے بندے نے میرا ذکر کیا (مجھے یاد کیا) یہاں سے چند چیزیں حاصل ہوئیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿ فَاذْكُرُوْنِيْۤ اَذْكُرْكُمْ ﴾ تم میری یاد کرو میں تمہارا چرچا کروں گا۔ یہاں بندے کو ذکر کرنے کا پہلے حکم ہے اس کے ذکر کے بعد رب تعالیٰ کے ذکر کو بیان کیا گیا جس سے واضح ہو گیا کہ بندہ اگر کسی جماعت میں رب تعالیٰ کا ذکر کرے گا تو یقیناً رب تعالیٰ کا فرشتوں کی جماعت میں اس بندے کا ذکر بہتر ہوگا۔

(۲) عبودیت میں ذکر کا مقام بہت ہی بلند حیثیت رکھتا ہے کیونکہ بندے کے ذکر سے ابتداء ہوئی ہے اس لحاظ پر اللہ کے ذکر میں کمال پایا گیا ہے کہ رب تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔جب حکم دینے والا خالق کائنات ، مالک کائنات اور رب العلمین ہے تو یقیناً اس کا حکم بھی کامل درجہ رکھتا ہے۔اس آیت ﴿فَاذْكُرُوْنِیْ اَذْكُرْكُمْ﴾ کے علاوہ اورآیات میں بھی ذکر کا حکم دیا گیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا﴾ اے ایمان والو اللہ کو بہت یاد کرو۔اور فرمایا ﴿اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ﴾ جو اللہ کی یاد کرتے ہیں کھڑے اور بیٹھے اور کروٹ پر لیٹے۔اور فرمایا ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَاهُمْ مُّبْصِرُوْنَ﴾ بیشک وہ جو ڈر والے ہیں جب انہیں کسی شیطانی خیال کی ٹھیس لگتی ہے ذکر کرتے ہیں (ہوشیار ہوجاتے ہیں)اسی وقت ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔آسان لفظوں میں یوں سمجھیں کہ مقام عبودیت میں کسی چیز کا بھی اتنا بیان نہیں جتنا کہ ذکر کو بیان کیا گیا ہے۔

(۳) "ذکرنی عبدی" (میرے بندے نے میرا ذکر کیا) سے پتہ چلتا ہے کہ "اللّٰہ" رب تعالیٰ کا ذاتی نام ہے اس کے ساتھ مختص ہے صفاتی نام نہیں اور رحمٰن ورحیم صفاتی نام ہیں۔جب بندہ نے ﴿بسم اللہ الرحمن الرحیم﴾ پڑھا تو رب تعالیٰ نے کہا میرے بندے نے مجھے یاد کیا ہے۔تو واضح ہوا کہ بسم اللہ میں لفظ اللہ سے ہی یہ پتہ چلا کہ وہ صرف رب تعالیٰ کا ہی ذکر کر رہا ہے۔یہ تب ہی پتہ چلا جب کہ یہ تسلیم کیا کہ "اللّٰہ "رب تعالیٰ کا ذاتی نام ہے اسی کے ساتھ خاص ہے۔اس تمہید کے بعد پتہ چلا کہ بندہ جب کہتا ہے "الحمد للّٰہ" رب تعالیٰ کہتا ہے ﴿حَمِدَنِیْ عَبْدِیْ﴾ میرے بندے نے میری حمد کی۔"ھذا یدل علی ان مقام الحمد ا علی من مقام الذکر "یہ دلالت کرتا ہے کہ مقام حمد، مقام ذکر سے اعلیٰ ہے۔کیونکہ اس عالم کی تخلیق میں سب سے پہلے جس کلام کا ذکر ہوا وہ "الحمد " ہی ہے اس پر دلیل یہ ہے کہ فرشتوں نے آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے کہا ﴿وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ﴾ ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح بیان کرتے ہیں اور تیری پاکیزگی کا ذکر کرتے ہیں۔اور جب یہ جہان فنا ہو جائے گا اس وقت بھی جس کلام کا ذکر ہوگا وہ "الحمد " کا ذکر ہی ہوگا۔اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت والوں کے کلام

کا ذکران الفاظ مبارکہ سے فرمایا﴿وَاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ اوران کی دعاء کا خاتمہ یہی ہے کہ سب حمدیں اللہ کے لئے ہیں جو رب ہے سارے جہان کا۔اورحمد کی افضلیت پر عقل کا بھی تقاضا ہے کیونکہ فکر اللہ تعالیٰ کی ممکن نہیں ۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا:

" تفکروا فی الخلق ولا تفکروا فی الخالق "

'' مخلوق میں تفکر کرواور خالق میں تفکر نہ کرو''۔

اس لئے کہ کسی چیز میں تفکر کے لئے ضروری ہے کہ اس چیز کا تصور پہلے آئے ۔لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات وحقیقت کا تصور وادراک ممکن نہیں ۔لہذا اس کی ذات میں تفکر بھی ممکن نہیں اسی وجہ سے تفکر صرف اس کے افعال اوراس کی مخلوقات میں ہوسکتا ہے پھر یہ بھی دلائل سے ثابت ہے کہ خیر مطلوب بالذات ہے ۔اورشر مطلوب بالعرض ہے ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کی مخلوقات ومصنوعات میں تفکر کرے گا اسے رب تعالیٰ کے فضل اس کی رحمت اوراس کے احسانات کا علم حاصل ہوگا اوراسے یہ بھی علم حاصل ہوگا کہ اس کے احسانات ان گنت ہیں ۔لہذاان کی حمد اوران کا شکر بھی بہت ہی زیادہ ہونا چاہیے اسی وجہ سے کہا﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ سب حمدیں اللہ کے لئے ہیں جوتمام جہانوں کامالک ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رب تعالیٰ بھی اس کی حمد کی تعریف کرتا ہے کہ "حمدنی عبدی " میرے بندے نے میری حمد کی ہے۔گویا کہ رب تعالیٰ نے گواہی دے دی کہ بندہ دنیا اورآخرت کے میرے فضل اوراحسانات پر واقف ہوچکا ہے۔اسی وجہ سے وہ میری حمد کررہا ہےاس کی زبان اس کے دل کی ترجمان ہے۔اوروہ شخص ایمان کے دریا میں مستغرق ہےاوراللہ تعالیٰ کے کرم کا دل سے بھی اقرار کررہا ہے،زبان سے بھی،عقل سے بھی اور بیان سے بھی اس کی نعمتوں کااقرار کررہا ہےاس وضاحت کے بعد یہ مسئلہ روز روشن کی طرح نکھر کرسامنے آ گیا کہ حمد کو بہت بڑی فضلیت حاصل ہے۔

جب بندہ "الرحمن الرحیم "کہتا ہےتو رب تعالیٰ فرماتا ہے"عظمنی عبدی" میرے بندے نے میری عظمت بیان کی خیال رہے کہ بسم اللہ میں بھی رحمٰن ورحیم کا ذکر ہے بندہ جب بسم اللہ پڑھتا ہےتو رب تعالیٰ فرماتا ہے "ذکرنی عبدی "بندے نے مجھے یاد کیا ہےاس میں "عظمنی عبدی " (میرے بندے نے میری عظمت بیان کی)نہیں کہا اس میں حکمت کیاہے؟ اس میں حکمت

یہ ہے کہ حمد میں رحمن ورحیم کے ذکر سے پہلے جب بندہ کہتا ہے الحمد للہ تو وہ اللہ کے کمالات ذاتیہ کا اقرار کرتا ہے اور یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ دوسروں کو کمال عطا کرنے والا اور ان کی تکمیل کرنے والا بھی وہی ہے پھر اس کے بعد جب بندہ کہتا ہے: "رب العلمین" تو یہ دلیل ہے اس پر کہ "اللہ تعالیٰ کامل لذاته" غیروں کو کامل کرنے والا شریک سے پاک ہے یعنی اس کا کوئی شریک نہیں۔ پھر جب بندہ کہتا ہے "الرحمن الرحیم" تو یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کامل لذاتہٖ ہے غیروں کو کامل کرنے والا ہے وہ شریک، نظیر، مثل وغیرہ سے پاک ہے اور بہت زیادہ رحم کرنے والا، فضل فرمانے والا اپنے بندوں پر کرم کرنے والا ہے یقینی بات ہے کہ عقل وفہم میں رب تعالیٰ کا کمال وجلال اور اس کا فضل واحسان حمد کے بعد رحمن ورحیم کے الفاظ مبارکہ سے سمجھ آیا جو بسم اللہ سے سمجھ نہیں آیا۔ اسی وجہ سے اس مقام پر ہی رب تعالیٰ نے فرمایا "عظمنی عبدی" میرے بندے نے میری عظمت بیان کی۔ جب بندہ کہتا ہے ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ رب تعالیٰ فرماتا ہے ﴿مَجَّدَنِیْ عَبْدِیْ﴾ میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی یعنی جو چیزیں میری شان کے لائق نہیں ان سے میرے بندے نے میری تقدیس پاکیزگی بیان کی۔

اللہ تعالیٰ کی تقدیس بیان کرنے کا مطلب کیا ہے؟ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے یہ سمجھا جائے کہ انسان جب دنیا میں دیکھتا ہے کہ ظالم لوگوں کو مظلوموں پر تسلط حاصل ہے۔ طاقت ور لوگوں کو ضعیفوں پر غلبہ حاصل ہے عالم، زاہد، کامل، متقی حضرات عیش کی تنگی میں ہوتے ہیں اور کافر، فاسق راحت میں ہوتے ہیں قابل رشک عظیم نعمتوں میں ہوتے ہیں۔ یہ حال دیکھ کر بڑے بڑے نیک لوگ بھٹک جاتے ہیں وہ کہتے ہیں کیا یہی ارحم الراحمین کی رحمت کا تقاضا ہے؟ کیا یہی احکم الحاکمین کے فیصلے ہیں کہ کافروں اور فاسقوں کو نوازا جائے اور مومنوں کو محروم کیا جائے (معاذ اللہ)۔ اسی حال کو ایک شاعر احمد ابن یحیی ابن اسحاق روندی نے یوں بیان کیا:

کم عاقل عاقل اعیت مذاهبه ، وجاهل جاهل تلقاه مرزوقا

هذا الذی ترک الاوهام حائرة ، وصیر العالم النحریر زندیقا

کتنے ہی کامل عاقل ایسے ہوتے ہیں جن کا ذریعہ معاش تنگ کر دیتا ہے کتنے کامل جاہل عیش وعشرت میں ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے جس نے وہموں کو متحیر (حیرت زدہ) کردیا ہے اور پختہ علم رکھنے والے علما کو بے دین کر دیا ہے۔اس نازک صورت حال میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر خاص رحم وکرم فرماتا ہے انہیں روز جزاء کی سمجھ عطا کرتا ہے وہ انسان سمجھ جاتے ہیں کہ ہاں قیامت کے دن ظالموں سے مظلوموں کوانصاف دلایا جائے گا۔نیک لوگوں کو ثواب ،اجر عظیم عطاء کیا جائے گا۔کافروں کو عذاب دیا جائے گا۔جب اللہ تعالیٰ کے بندوں کو یہ سمجھ عطا ہوجاتی ہے۔تو وہ کہتے ہاں اللہ تعالیٰ یقیناً ارحم الرامین ہے اس کے احکم الحاکمین ہونے میں کوئی شک نہیں۔وہ ہر شخص کو قیامت کے دن اس کے اعمال کے مطابق جزاءعطاء کرے گا۔تو اس طرح باطل تصورات سے دوررہ کر گویا کہ رب تعالیٰ سے ظلم کرنے اور ظلم کے تشبیہ سے بھی اسے پاک تصور کر کے اس کی شان کے لائق جو نہیں تھا اس سے رب تعالیٰ کی پاکیزگی بیان کی۔

اسی وجہ سے بندے کے ﴿مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾ کہنے پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "مجدنی عبدی" میرے بندے نے میری تقدیس بیان کی۔جب بندہ کہتا ہے ﴿اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "ھذا بین وبین عبدی "یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے یعنی خالق میں ہوں حکم میں دیتا ہوں عبادت کی توفیق میں عطا کرتا ہوں بندے کی امداد میں کرتا ہوں۔بندہ میری دی ہوئی قدرت سے عمل کرتا ہے میری عبادت کرتا ہے مجھ سے ہی امداد طلب کرتا ہے۔جب بندہ ﴿اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ﴾ کہتا ہے رب تعالیٰ فرماتا ہے ﴿ھٰذَا لِعَبْدِیْ وَلِعَبْدِیْ مَاسَاَلَ﴾ یہ میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے کے لئے وہ ہے جو اس نے سوال کیا ہے۔بندہ جب دیکھتا ہے کہ مسائل الالٰھیہ ہوں یا نبوت کے مسائل ہوں یا قیامت کے ساتھ متعلق مسائل ہوں تمام میں لوگ اختلاف کا شکار ہیں۔کسی کا تعلق نفی سے اور کسی کا اثبات سے اس مشکل سے نکلنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت حاصل نہ ہوتو وہ رب تعالیٰ کے حضور عرض کرتا ہے۔﴿اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ﴾ تو رب تعالیٰ بھی اپنی مہربانی سے اپنے بندے کو ہدایت عطا فرما دیتا ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ تمام ملائکہ اور انبیاء کرام بھی اپنی التجائیں رب کے حضور ہی کرتے رہے۔لہٰذا

امت کو بھی چاہیے کہ وہ بھی رب تعالیٰ سے مانگنے میں غافل نہ ہوں۔اسی حدیث سے یہ بھی فائدہ حاصل ہوگیا کہ سورۂ فاتحہ کی آیات سات ہیں اور نماز میں ظاہری اعمال بھی سات ہیں۔قیام،رکوع رکوع کے بعد کھڑا ہونا پہلا سجدہ، پہلے سجدہ کے بعد بیٹھنا، دوسرا سجدہ، اور قعدہ فاتحہ کی آیات ان اعمال کی تعداد کے مساوی ہیں اور اعمال جسم کی مثال ہیں اور فاتحہ ان میں روح کی حیثیت رکھتی ہے۔کمال اسی وقت حاصل ہوگا جب روح جسم سے ملے۔﴿بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ قیام کے مقابل ہے چند وجہ سے اسے قیام کے مقابل سمجھا جاسکتا ہے۔اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ با جب "اسم اللہ" کے ساتھ ملتی ہے تو اسے مرتفع رکھا جاتا ہے۔یعنی بلند کر کے لکھا جاتا ہے جس سے قیام کی طرف اشارہ ملتا ہے۔اور وجہ یہ ہے کہ کاموں کی ابتداء میں "بسم اللہ" شریف وخیر وبرکت کے لئے پڑھی جاتی ہے۔ورنہ کام بے برکت ہوتا ہے نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "کل امر ذی بال لایبدأ فیه ببسم الله فهو ابتر" ہر ذی شان کام جس کی ابتداء بسم اللہ سے نہ ہو وہ بے برکت ہوتا ہے۔اور رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَذَكَرَاسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى﴾

"بیشک مراد کو پہنچا جو ستھرا ہوا اور اپنے رب کا نام لے کر نماز پڑھی"۔

اسی طرح اعمال کی ابتداء بھی اکثر اوقات قیام سے ہوتی ہے۔لہذا قیام اور بسم اللہ میں مناسبت پائی گئی ہے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ کو رکوع کے مقابل ہونے کی حیثیت حاصل ہے اس لئے کہ بندہ مقام تحمید میں رب تعالیٰ کی طرف بھی نظر کرتا ہے اور مخلوق کی طرف بھی۔کیونکہ حمد کا مطلب ہے تعریف کرنا اکثر طور پر لوگ انعام کے حاصل ہونے پر کسی کی تعریف کرتے ہیں بندہ گویا کہ حمد کرنے میں کبھی منعم کی طرف توجہ کرے گا اور کبھی نعمت کی طرف۔جب وہ منعم کی طرف نظر کرے گا تو اسے بحر توحید میں مستغرق ہونے کی کیفیت حاصل ہوگی اور جب نعمت کی طرف نظر کرے گا تو یہ نظر مخلوق کی طرف ہوگی کیونکہ ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے گویا یہ مقامِ اعراض ہوگا یعنی خالق سے نظر پھیر کر مخلوق کی طرف نظر کی گئی۔جس طرح یہ حالت،استغراق اور اعراض کے درمیان ہے اسی طرح رکوع بھی قیام اور سجود کے درمیان ہوتا ہے۔ تو پتہ چلا کہ حمد کو رکوع کے مقابل ہونے کا مقام حاصل ہے۔اور وجہ یہ

بھی ہے کہ حمد کثیر نعمتوں پر دلالت کرتی ہے اور کثیر نعمتیں، پیٹھ پر بوجھ کی حیثیت رکھتی ہیں اور بوجھ سے پیٹھ ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔اسی طرح رکوع کے حال میں بھی انسان کی پیٹھ جھکی ہوتی ہے۔جس سے واضح ہوتا ہے کہ حمد اور رکوع میں ایک خاص مناسبت پائی جاتی ہے۔الرحمٰن الرحیم جب بندہ کہتا ہے تو اسے رکوع کے بعد کھڑا ہونے کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔اس لئے کہ رکوع میں انسان رب کے حضور جھک کر اپنے عجز کا اظہار کرتا ہے اس کی عظمت بیان کرتا ہے اس کے بعد کھڑا ہو جاتا ہے۔اسی طرح رب تعالیٰ اپنی رحمت و مہربانی سے عاجز لوگوں، جھکے ہوئے لوگوں کو سیدھا کھڑا کر دیتا ہے۔یعنی ان کی حالت کو سنوار دیتا ہے۔

﴿ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ کو پہلے سجدہ سے مناسبت حاصل ہے۔اس لئے کہ ﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ سے رب تعالیٰ کے کامل قہر اور جلال اور کبریائی کا پتہ چلتا ہے اس سے شدید خوف حاصل ہوتا ہے۔جس سے بہت زیادہ خشوع وخضوع حاصل ہوتا ہے کامل خشوع وخضوع پر دلالت کرنے والا نماز کا رکن سجدہ ہی ہے۔﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ دو سجدوں کے درمیان بیٹھنے کی حالت کے مناسب ہے اس لئے کہ "ایاک نعبد" سے پہلے سجدہ کی خبر حاصل ہوتی ہے اور ﴿اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ سے دوسرے سجدہ کی توفیق حاصل کرنے کی دعا کی جاتی ہے۔﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴾ دوسرے سجدہ کے مناسب ہے اس لئے کہ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴾ سے بہت اہم چیزوں کا سوال کیا جاتا ہے یہ اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے۔جب بہت زیادہ خشوع وخضوع پایا جائے چونکہ کامل خشوع وخضوع دوسرے سجدہ میں ہی پایا جاتا ہے۔﴿ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴾ سے لے کر آخر تک قعدہ کے مناسب ہے اس لئے کہ بندہ جب بہت ہی عجز کا اظہار کرتا ہے۔تو اللہ تعالیٰ اسے اکرام عطا فرماتا ہے اور اپنے سامنے بیٹھنے کا حکم دیتا ہے یہ رب تعالیٰ کی طرف سے بندے پر عظیم انعام ہے یہ کیفیت ﴿ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴾ کے بہت ہی مناسب ہے۔

فائدہ جلیلہ : نبی کریم ﷺ کو جب رب تعالیٰ نے معراج کرایا اور عظیم انعام سے نوازا کہ آپ کو قاب قوسین کی رفعت عطا فرمائی تو آپ نے رب تعالیٰ کے حضور اپنی عبادات قولیہ، بدنیہ اور مالیہ کا تحفہ پیش فرماتے ہوئے عرض کیا "التحیات للہ والصلوات والطیبات" یا ایک روایت کے مطابق

یہ عرض کیا "التحیات المبارکات الصلوات الطیبات للہ" یہ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج اور رفعت کی بات ہے۔لیکن مومن کی معراج کیا ہے؟

" الصلوۃ معراج المؤمن " "نماز مؤمن کی معراج ہے"۔

جب مؤمن اپنی معراج کے انتہائی اکرام کے درجے پر پہنچتا ہے کہ اسے رب تعالیٰ کے حضور بیٹھنے کا شرف حاصل ہوتا ہے تو اس کے لئے بھی ضروری ہے کہ رب تعالیٰ کے حضور اپنا نذرانہ عقیدت ان الفاظ سے ہی پیش کرے جو رسول اللہ ﷺ نے پیش فرمائے۔بندہ جب یہ الفاظ پڑھے گا تو اسے نبی کریم ﷺ کے معراج کے شمس (سورج) سے ایک ادنی سی جھلک حاصل ہوجائے گی۔اور آپ کے معراج کی برکات کے سمندر سے ایک قطرہ حاصل ہوجائے گا۔کیا ہی خوب مقام ﴿فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللہُ عَلَیْھِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ﴾ کا اسے حاصل ہوجائے گا۔

<u>یاد رکھئے!</u> سورۃ فاتحہ کی سات آیات ہیں جو سات اعمال (جن کا ذکر ابھی ہوا) کی روح کی حیثیت رکھتی ہیں۔اور یہ سات اعمال انسان کی تخلیق میں سات مراتب کی روحیں ہیں۔وہ سات مراتب جن کا ذکر ان آیات مبارکہ میں ہے:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَۃٍ مِّنْ طِیْنٍ☆ ثُمَّ جَعَلْنٰہُ نُطْفَۃً فِیْ قَرَارٍ مَّکِیْنٍ ☆ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَۃَ عَلَقَۃً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَۃَ مُضْغَۃً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَۃَ عِظٰمًا فَکَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰہُ خَلْقًا اٰخَرَ ط فَتَبٰرَکَ اللہُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ﴾

"اور بے شک ہم نے آدمی کو چنی ہوئی مٹی سے بنایا پھر اسے پانی کی بوند کیا ایک مضبوط ٹھہراؤ میں۔پھر ہم نے اس پانی کی بوند کو خون کی پھٹک کیا۔پھر خون کی پھٹک کو گوشت کی بوٹی،پھر گوشت کی بوٹی کو ہڈیاں پھر ان ہڈیوں پر گوشت پہنایا پھر اسے اور صورت میں اٹھان دی تو بڑی برکت والا ہے اللہ سب سے بہتر بنانے والا ہے"۔

اسی سے ایک اور مسئلہ سمجھ میں آ گیا کہ جس طرح جسموں کے کثیر مراتب ہیں اسی طرح روحوں کے مراتب بھی کثیر ہیں۔روح الارواح اور نور الانوار، اللہ تعالیٰ ہی ہے اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے فرمایا﴿ وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی ﴾۔

فائدہ عظیمہ : الصلوۃ معراج العارفین ، نماز عارفین کی معراج ہے۔

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے کچھ تفصیل ہے۔ نبی کریم ﷺ کے معراج کی دو قسمیں ہیں ایک ظاہری اور دوسری باطنی۔ معراج ظاہری کی پھر دو قسمیں ہیں۔ ایک مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک اور دوسری مسجد اقصیٰ سے لے کر اللہ تعالیٰ کی ملکوت کی بلندیوں تک۔ باطنی معراج جس کا تعلق عالم ارواح سے ہے اس کی بھی دو قسمیں ہیں ایک عالم شہادۃ سے لے کر عالم غیب تک اور دوسرا عالم غیب سے لے کر عالم غیب الغیب تک۔ یہ دونوں دو قوسوں کے درجہ میں ہیں جو آپس میں ملی ہوں، نبی کریم ﷺ نے ان دو قوسوں کے فاصلہ کو بھی پھلانگ کر ختم کر دیا اور زیادہ قرب اختیار کرلیا۔ رب تعالیٰ کے ارشاد ﴿ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی﴾ پھر وہ (جلوہ) نزدیک ہوا پھر خوب اتر آیا تو اس جلوے اور اس محبوب میں دو ہاتھ کا فاصلہ رہا بلکہ اس سے بھی کم) کا بھی یہی مطلب ہے گویا کہ "او ادنی" کا اشارہ فناء فی اللہ کی طرف ہے کہ وہ محبوب رب تعالیٰ کے جلوہ میں مستغرق ہو گیا۔ انتقال عالم شہادۃ سے عالم غیب تک کو یوں سمجھئے کہ ہر وہ چیز جس کا تعلق جسم اور جسمانیات سے ہے وہ عالم شہادت ہی ہے کیونکہ انسان اپنی بصر سے ان کا مشاہدہ کرتا ہے۔ پھر روح کا انتقال عالم اجساد (جسموں والے جہاں) سے عالم ارواح کی طرف یہ عالم شہادۃ سے عالم غیب کی طرف انتقال اور سفر ہے۔

عالم ارواح ایسا عالم ہے جس کی انتہا نہیں۔ عالم اجساد سے تعلق رکھنے والی ارواح میں اعلیٰ درجہ ارواح بشریہ کا ہے پھر آسمانوں سے متعلق ارواح، پھر کرسی، پھر عرش سے متعلقین ارواح ملائکہ، پھر انتہا اس ذات کی طرف ہوتی ہے جسے مسبب الاسباب، مبدأ الکل، منبع الرحمة، مبدأ الخیر اور نور الانوار کہا جاتا ہے۔ وہ ذات کبریاء ہے یہاں سے ثابت ہوا عالم ارواح حقیقت میں عالم غیب ہے۔ حضرت جلال ربوبیت غیب الغیب ہے۔ ابھی تک جو بیان کیا ہے اس سے یہ واضح ہوا کہ معراج کی دو قسمیں ہیں۔ عالم شہادۃ سے عالم غیب کی طرف معراج اور عالم غیب سے عالم غیب الغیب تک معراج، یہ ثبوت برھان یقینی سے ہے۔

اب اس تمہید کے بعد مقصد کو بیان کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج کو پہنچے اور واپس لوٹنے کا ارادہ فرمایا تو رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا اے رب العزۃ مسافر جب اپنے وطن کو لوٹنے کا ارادہ کرتا ہے تو اپنے اصحاب واحباب کے لئے تحفے لے کر جاتا ہے۔ میں کیا تحفہ

لے کر جاؤں؟ تو رب تعالیٰ کی طرف سے کہا گیا "ان تحفة امتک الصلوة" بیشک تیری امت کا تحفہ نماز ہے کیونکہ یہ معراج جسمانی اور معراج روحانی کی جامع ہے۔اس لئے کہ جسمانی معراج افعال سے ہوتی ہے اور روحانی اذکار سے۔اے بندے! جب تم اس معراج کو شروع کرنے کا ارادہ کرو تو پہلے پاکیزگی اختیار کرو کیونکہ یہ مقام مقدس مقام ہے اس لئے تم اپنے کپڑے پاکیزہ رکھو، جسم پاکیزہ رکھو، اس لئے کہ تمہیں اب ایسا مقام حاصل ہے جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کو نبوت کے حاصل ہوتے وقت حاصل تھا۔جیسا کہ رب تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ اِنَّكَ ۚ بِالْوَادِي الْمُقَدَّسِ طُوًى﴾

تم اپنے جوتے اتار ڈالو بیشک تم پاک وادی طوی میں ہو۔

اے انسان تو یہ بات کبھی نہ بھول کہ تیرا ساتھی فرشتہ بھی ہے اور شیطان بھی تو خود فیصلہ کر کہ تو نے کس کا ساتھ دینا ہے۔دین اور دنیا میں سے تو نے کس کا انتخاب کرنا ہے۔عقل اور خواہشات سے تو نے کسے اختیار کرنا ہے۔خیر وشر، صدق وکذب، حق وباطل، حلم (بربادی) وطیش، قناعت (تھوڑی چیز پر اکتفاء) وحرص، غرضیکہ تمام صفات متضادہ (ایک دوسرے کی مخالف صفات) میں سے تو نے کسے حاصل کرنا ہے۔یقیناً تو نے ایک جانب کو اختیار کرنا ہے اور دوسری جانب کو چھوڑنا ہے۔اے انسان اگر تو معراج کا مقام حاصل کرنا چاہتا ہے تو یقیناً تجھے وہ راہ اختیار کرنی پڑے گی جو نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کی ہے۔پھر تجھے کون سا مقام حاصل ہوگا؟ اسے ان واقعات کی روشنی میں دیکھ اور اپنی قسمت پر ناز کر "الاترى ان الصديق اختار صحبة محمد عليه السلام فلزمه فى الدنيا وفى القبر وفى القيامة وفى الجنة" کیا تم دیکھتے نہیں کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی صحبت کو اختیار کیا دنیا میں ہر مقام پر ان کے ساتھ رہے سفر ہو یا حضر، مکہ ہو یا مدینہ، مقام امن ہو یا مقام جنگ تو آپ کو نبی کریم ﷺ کا ساتھ قبر میں بھی حاصل ہوگیا اور قیامت میں بھی ساتھ حاصل ہوگا اور جنت میں بھی۔"وان كلب اصحاب الكهف صحبهم فلزمهم فى الدنيا وفى الآخرة" بیشک اصحاب کہف کے کتے نے ان کی مصاحبت کی تو دنیا میں ہمیشہ کے لئے اسے ان کا ساتھ حاصل ہوا اور آخرت میں بھی ان کا ساتھ حاصل ہوگا۔یہی راز اس آیت کریمہ سے سمجھ آرہا ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِيْنَ ﴾

''اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ''۔

اے اللہ کے بندے جب تو پاکیزہ صفات کو حاصل کر کے پاکیزگی بھی حاصل کر لے اب تو اپنے ہاتھوں کو کانوں تک اٹھا۔ ہاتھ اٹھانے میں اس طرف اشارہ ہوگا کہ تو دنیا اور آخرت کو الوداع کر رہا ہے۔ ان سے مکمل طور پر نظر کو ہٹا رہا ہے اب تیرے دل، روح، نفس، عقل، فہم اور ذکر و فکر کا مل توجہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہو۔ پھر تو کہہ "اللہ اکبر" معنی یہ ہے کہ تمام موجودات سے بڑا ہے تمام سے اعلیٰ ہے تمام سے زیادہ عظیم المرتبۃ ہے ہر ایک سے بڑھ کر عزیز ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ وہ قیاس سے بلند تر ذات ہے۔

پھر تو کہہ "**سبحانک اللھم وبحمدک**" جب تجھے تسبیحات کے نور کی تجلیات حاصل ہوں گی اور پھر تو تسبیح سے تحمید کے مقام پر جب پہنچ جائے گا۔ تو پھر تو کہہ "وتبارک اسمک" اس سے تجھ پر ازلی اور ابدی نور منکشف ہوگا۔ اس لئے کہ "تبارک" سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ وہ ذات معدوم ہونے اور فنا ہونے سے پاک ہے اسے ہمیشہ کے لئے بقا حاصل ہے۔ پھر تو کہہ "وتعالیٰ جدک" اس سے یہ واضح ہوگا کہ رب تعالیٰ تمام موجودات سے زیادہ علم رکھتا ہے اور وہ تمام موجودات سے زیادہ عظمت کا مالک ہے۔ اس لئے کہ تمام صفات جلالیہ اور تمام صفات کمالیہ کا صرف وہی مالک ہے۔ پھر تو کہہ "ولا الہ غیرک" اس سے یہ پتہ چل جائے گا کہ تمام صفات کمالیہ اور تمام صفات جلالیہ صرف اسے ہی حاصل ہیں اس کے بغیر کسی اور کو حاصل نہیں۔ کامل صرف وہی ذات ہے اس کے بغیر کوئی کامل نہیں۔ مقدس صرف وہی ذات ہے اس کے بغیر کوئی مقدس نہیں "وفی الحقیقة لاھو الاھو ولا الہ الا ھو" حقیقت میں اس کے بغیر کسی کو حقیقی وجود حاصل نہیں۔ اس کے بغیر اور کوئی معبود نہیں۔ اس ذات کو سمجھنے سے عقل عاجز ہے۔ اس کی تعریف کما حقہ کرنے سے زبان گنگ ہے۔ اس ذات پاک کا ادراک کرنے سے فہم قاصر ہوتی ہے اس کا کامل کما حقہ تصور کرنے سے خیال متحیر ہے۔

ان چیزوں کو سمجھنے کے بعد تو کہہ ﴿ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ

وَالْاَرْضَ﴾ بیشک میں نے اپنے آپ کو زمین وآسمان کے بنانے والے کی طرف متوجہ کیا۔اب اس تمہید کے بعد اے بندے تو یہ سمجھ کہ "سبحانک اللھم وبحمد ک "ملائکہ مقربین کی معراج ہے کیونکہ انہوں نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا"ونحن نسبح بحمد ک ونقدس لک "اور نبی کریم ﷺ کی معراج بھی ہے کیونکہ نماز آپ کی بھی معراج ہے اور نماز کی ابتداء "سبحانک اللھم وبحمدک " سے ہے اور "انی وجھت وجھی ......الخ" ابراہیم علیہ السلام کی معراج ہے۔اور اے بندے تو نماز کی ابتداء میں جب "انی وجھت ......الخ " اور "ان صلوتی ......الخ "اور ثناء کے ذکر کو جمع کرے گا تو تجھے ملائکہ مقربین اور عظیم انبیاء کرام کا معراج حاصل ہوگا۔

جب تو ثناء پڑھ لینے سے فارغ ہوجائے تو ﴿اَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ﴾ پڑھ تاکہ تجھے اپنے مقام کی بلندی کے حصول پر فخر اور تکبر حاصل نہ ہو اور شیطان کے مکر سے بھی محفوظ رہے۔

اے بندے تو یہ بھی خیال کر کہ تجھے کتنا بلند مقام حاصل ہوجائے گا کہ ثناء اور فاتحہ پڑھنے سے تیرے لئے جنت کے آٹھ دروازے کھول دیئے جائیں گے۔اسے یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔کہ جب معرفت کے آٹھ دروازے سورۃ فاتحہ سے کھل جاتے ہیں تو جنت کے آٹھ دروازے بھی کھول دیئے جاتے ہیں۔

پہلا : باب معرفۃ ثناء سے کھل جاتا ہے۔

دوسرا: باب ذکر ہے جو ﴿بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ سے کھل جاتا ہے۔

تیسرا: باب شکر ہے وہ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ سے کھل جاتا ہے۔

چوتھا : باب رجاء ہے جو الرحمٰن الرحیم سے کھل جاتا ہے۔

پانچواں : باب خوف ہے جو مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْن سے کھل جاتا ہے۔

چھٹا: باب اخلاص ہے جو معرفت عبودیۃ اور معرفت ربوبیۃ سے حاصل ہوتا ہے وہ ﴿اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ سے کھل جاتا ہے

ساتواں: باب دعاء وتضرع ہے جس طرح رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ

اِذَا دَعَاهُ ہ (یا وہ جولاچار کی دعا کوقبول کرتا ہے) اورارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ﴾ مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا ان آیات سے باب تضرع ودعاء کا پتہ چلا اور یہ دروازہ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ سے کھلتا ہے۔

آٹھواں: باب اقتداء ہے جوارواح طیبہ کی اقتداء کے انوار سے ہدایت حاصل کرنے کا ہے یہ ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ سے کھل جاتا ہے۔اے بندے جب تو سورہ فاتحہ کواس تصور سے پڑھے گا۔نماز کوخشوع اور خضوع سے ادا کرے گا اورابھی معرفت کے جن آٹھ دروازوں کاذکرکیاجب ان کاتصور تجھے حاصل ہوگا تو تیرے لئے جنت کے آٹھ دروازے کھول دیئے جائیں گے۔

یعنی اب "جنات عدن مفتحة لهم الابواب "(جنات عدن کے دروازے ان کے لئے کھول دیئے جائیں گے) کامقام حاصل ہوجائے گا۔جب یہ واضح ہوگیا کہ معرفت ربانیہ کی جنت کے دروازے فاتحہ سے کھل جاتے ہیں اور معرفت ربانیہ کے دروازے کھل جانے سے جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں تو یہی معراج روحانی ہے جونماز ادا کرنے اوراس میں سورۂ فاتحہ پڑھنے سے حاصل ہوتی ہے اسی کانام عارفین کی معراج ہے۔کیونکہ عارفین نماز میں سورۂ فاتحہ کو پڑھتے وقت اسرارمعرفت کواپنے دل میں جمائے ہوتے ہیں۔

معراج جسمانی: پہلامرتبہ معراج جسمانی کا یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کے حضوراس طرح کھڑا ہو جس طرح اصحاب کہف کے قیام کاذکرکرتے ہوئے رب تعالیٰ نے ارشادفرمایا ﴿اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ جب کھڑے ہوکر بولے کہ ہمارا رب وہ ہے جوآسمان اور زمین کارب ہے بلکہ تیراقیام ان لوگوں کی طرح ہو جورب تعالیٰ کے حضور قیامت کے دن بڑی انکساری سے کھڑے ہوں گے جن کاذکررب تعالیٰ نے فرمایا ﴿يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ہ﴾ (اس دن لوگ رب العلمین کے حضور کھڑے ہوں گے) جب تجھے اس طرح قیام حاصل ہوجائے تو ﴿اِنِّیْ وَجَّهْتُ﴾ اور ﴿اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ﴾ پڑھتے ہوئے نماز کوشروع کرکے ثناء پڑھ پھر فاتحہ پڑھ پھرقرآن پاک جہاں سے آسان ہو وہاں سے پڑھ:

" واجتهد فی ان تنظر من اللہ الی عبادتک حتی تستحقرھا وایاک ان
تنظر من عبادتک الی اللہ "

پھر کوشش کر کہ تیری توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی عبادت کی طرف ہو یہاں تک کہ تو اسے حقیر سمجھے اور تو اس سے اجتناب کر کہ اپنی عبادت سے رب تعالیٰ کی طرف توجہ کرے۔ یعنی تیری نظر عبادت کی طرف نہ ہو اپنی عبادت کو عظیم نہ سمجھنا بلکہ اپنی عبادت کو حقیر سمجھنا اور تمہاری نظر صرف رب تعالیٰ کی طرف ہو اور یہ خیال کرنا کہ مجھے عبادت کی توفیق بھی ذات باری تعالیٰ سے حاصل ہوئی ہے۔ اگر تو نے عبادت کو اولیت دی اور رب تعالیٰ کو پیچھے کیا تو تو خسارہ میں ہوگا اور تو ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ کے راز کو سمجھنے سے قاصر رہا کیونکہ اس کا تو راز ہی یہ ہے کہ اے اللہ ہم عبادت بھی تیری امداد سے ہی کرتے ہیں۔

پھر جب تو رکوع اور دونوں سجدے کر لے گا، اور رکوع میں رب تعالیٰ کی تسبیحات اور اس کی عظمت کو ذکر کر لیا اور سجود میں رب تعالیٰ کی تسبیحات اور علومرتبت (بلند مرتبہ) کا ذکر جب تو نے کر لیا تو تین قسم کی طاعتیں تو نے حاصل کر لیں اور تین قسم کی مہلک چیزوں سے تو نے نجات حاصل کرنے کی سعی جمیل کر لی۔ تین قسم کی طاعتیں یہ ہیں ایک رکوع اور دو سجدے اور تین مہلک چیزیں اور باعث عذاب یہ ہیں ایک شہوات جو عذاب کا سبب بنتی ہیں ان سے نجات رکوع کے ذریعے حاصل ہوتی ہے اور دوسری چیز غضب ہے جو تمام موذی چیزوں میں سے رئیس ہے۔ اس سے نجات پہلے سجدہ سے حاصل ہوتی ہے۔ اور تیسری چیز وہ خواہش ہے جو تمام مہلک چیزوں اور گمراہ کن چیزوں تک پہنچانے والی ہو اس سے نجات دوسرے سجدہ سے حاصل ہوتی ہے۔ جب اے انسان تو ان تینوں ہلاک کرنے والی چیزوں سے نجات حاصل کر لے گا تو تجھے بلند درجات حاصل ہو جائیں گے۔ جب تو عظیم منصب حاصل کر لے گا تو تجھے رب تعالیٰ کی رحمت کے دروازہ کی دہلیز پر پہنچنے کا موقع مل گیا اب تو رب تعالیٰ کے حضور اپنی عبادات قولیہ، بدنیہ، مالیہ کا تحفہ پیش کرتے ہوئے یوں ادب سے عرض کر "التحیات للہ والصلوت والطیبات" اس کے بعد اے بندے تیری روح کی نورانیت بلندی کی طرف چڑھتی ہے لیکن اسے وہ بلندی حاصل نہیں ہو سکتی کہ وہ روح محمد ﷺ کی نورانیت سے فائدہ حاصل کر سکے اس

لئے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی رحمت کا تو کیا اندازہ کر سکتا ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کی نورانیت خود تیجے آ کر تیرے روح کی نورانیت کو گلے لگالے گی۔اب تجھے راحت حاصل ہوگی سرور حاصل ہوگا جنت کی خوشبودار ہوائیں تیری پاس آنے لگیں گی اس لئے کہ تجھے روح محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نورانیت سے عظیم مقام حاصل ہوگیا۔اب تیرا بھی حق ہے کہ تو اپنے پیارے مصطفےٰ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور نذرانہ سلام پیش کرتے ہوئے یوں عرض کر: "السلام علیک ایھا النبی ورحمة اللہ وبر کاته"۔

اب تیرے سلام پیش کرنے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یوں ارشاد فرمائیں گے:

" السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین "

اس کے بعد گویا کہ تجھے یوں کہا جائے گا کہ ذرا تو غور کر کہ تجھے یہ نعمتیں کس نے عطا کیں اور کس کے وسیلہ جلیلہ سے تو نے ان نعمتوں کو پایا ہے؟ ہاں تو اس بات کو نہ بھول یہ نعمتیں تجھے رب تعالیٰ نے عطا کی ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے وسیلہ سے تجھے یہ حاصل ہوئی ہیں۔اب تیرے لئے یہ ضروری ہو چکا ہے کہ تو یوں عرض کر "اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمد اعبدہ ورسولہ "اب تجھ سے گویا کہ یوں سوال ہوگا کہ نبی کریم ﷺ کی ان مہربانیوں پر تو کیا ہدیہ پیش کرنا چاہتا ہے؟ پھر خود ہی تیری راہنمائی کرتے ہوئے تجھے یوں کہا جائے گا کہ تو کہہ "اللھم صل علی محمد وعلی آل محمد " پھر تجھے یاد دلایا جائے گا کہ تجھ پر ساری مہربانیوں نبی کریم ﷺ کی ہیں لیکن ان کے آنے کی دعاء ابراھیم علیہ السلام نے کی عرض کیا ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ﴾ (اے ہمارے رب ان میں ان سے ہی رسول مبعوث فرما) تجھے رسول معظم ملے تو ابراہیم علیہ السلام کی وجہ سے اب تجھے چاہیے کہ تو کہہ "کماصلیت علی ابراھیم وعلی آل ابراھیم "ابراہیم علیہ السلام کی دعاء سے تجھے رسول اللہ ﷺ ملے اور رسول اللہ ﷺ کے واسطہ سے تجھے عظمت ملی اور تجھے انعامات سے نوازا گیا۔لیکن سب کچھ عطا تجھے رب تعالیٰ نے ہی کیا ہے لہذا تو کہہ "انک حمید مجید" بندہ جب رب تعالیٰ کو جماعت میں یاد کرتا ہے تو رب تعالیٰ اس سے بہتر ملائکہ کی جماعت میں اپنے بندے کو یاد کرتا ہے۔رب تعالیٰ کے یاد کرنے پر فرشتے بندے کو ملنے کے لئے مشتاق ہوتے ہیں۔گویا کہ وہ

اس کے قریب آ گئے اسی وجہ سے بندے کو کہا جاتا ہے تو فرشتہ کو سلام دے اور کہہ "السلام علیکم ورحمة الله" اب تک جو بیان کیا اس سے واضح ہو گیا کہ بندے کو نماز پڑھنے سے معراج جسمانی حاصل ہوتی ہے۔ بیان کردہ حدیث سے جو بحث امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے کی ہے اس کو راقم کی کتاب ''نماز حبیب کبریاء'' میں دیکھیں۔ (ماخوذ از کبیر)

اعتراض: عام طور پر یہ مشہور ہے کہ مشبہ کم درجہ رکھتا ہے مشبہ بہ سے۔ نماز میں جو درود شریف پڑھنے کا حکم دیا گیا اس میں نبی کریم ﷺ کو صلوۃ کے لحاظ پر ابراہیم علیہ السلام سے تشبیہ دی گئی تو کس طرح نبی کریم ﷺ کا افضل الانبیاء ہونا ثابت ہوگا؟

اور یہ بھی خیال رہے کہ نبی کریم ﷺ نے خود اسی طرح نماز میں درود شریف پڑھنے کا حکم دیا حدیث شریف ملاحظہ ہو

" عن کعب بن عجرة قال قلنا یارسول الله هذا السلام علیک قد علمنا فکیف الصلوة علیک قال قولوا اللهم صل علی محمد وعلی آل محمد کماصلیت علی ابراهیم انک حمید مجید وبارک علی محمد وعلی آل محمد کمابارکت علی ابراهیم انک حمید مجید " (ترمذی باب ماجاء فی صفه الصلوة علی النبی صلی الله علیه وسلم)

کعب ابن عجرہ کہتے ہیں ہم نے کہا یارسول اللہ یہ آپ پر سلام ہے جس کو ہم نے پہچان لیا ہے۔ آپ پر صلوۃ کیسے بھیجیں آپ نے فرمایا تم کہو " اللهم صل علی محمد.....الخ" یہ سوال نماز میں درود شریف کے متعلق تھا اسی حدیث پر حاشیہ ترمذی میں ہے "هذا السلام علیک قد علمنا ای فی التحیات لله بواسة لسانک " یعنی التحیات لله (تشہد) میں سلام آپ پر پیش کرنے کا طریقہ تو آپ کی زبان مبارک سے ہی معلوم ہو گیا اس لئے اب آپ (تشہد کے بعد) صلوۃ کا طریقہ بھی اپنی زبان ذیشان سے ہی ارشاد فرما دیں۔ اور یہ بھی ذہن سے نہ نکلنے دیں کہ رب تعالیٰ نے صلوۃ اور سلام دونوں چیزوں کا حکم دیا ہے ارشاد فرمایا ہے "صلوا علیه وسلموا تسلیما" آپ پر صلوۃ اور سلام بھیجو۔ نماز میں تو سلام کا ذکر "السلام علیک ایها النبی ورحمة الله وبرکاته " میں آ گیا ہے۔ اور بعد میں درود ابراہیمی میں صرف صلوۃ کا ذکر ہے۔ اس لئے رب

تعالیٰ کے حکم پر کامل طور پر عمل ہوگیا۔لیکن نماز کے باہر صرف درود ابراہیمی پڑھنے کی رٹ لگانے والے یہ خیال نہیں کرتے کہ نماز کے باہر اگر درود ابراہیمی پڑھیں گے تو اس میں سلام کا ذکر نہیں تو رب تعالیٰ کے حکم پر کیسے عمل ہوگا۔

راقم نے یہ بحث علامہ نووی رحمہ اللہ کی شرح مسلم ج اول کے پہلے صفحہ سے لی ،اس لئے راقم کے نزدیک اگر کسی کو ندائیہ الفاظ سے درود شریف میں الرجی ہوتی ہو وہ صرف درود ابراہیمی ہی پڑھنا چاہتا ہے تو نماز کے باہر درود پڑھنے پر لفظ سلام کا اضافہ کرے اور یوں پڑھے:

" اللهم صل وسلم علی محمد وعلی آل محمد کماصلیت وسلمت علی ابراهیم وعلی آل ابراهیم انک حمید مجید "

پہلا جواب: اب ذرا اصل سوال کے جوابات کی طرف توجہ کریں کہ نبی کریم مشبہ ہیں اور ابراہیم علیہ السلام مشبہ بہ ہیں تو حضور کی افضلیت کیسے ثابت ہے؟اس کا پہلا جواب یہ ہے "انه قال تواضعا " نبی کریم ﷺ نے یہ عاجزی کے طور پر ارشاد فرمایااور ساتھ ساتھ اپنے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ادب واحترام کا لحاظ فرمایا اس سے ابراہیم علیہ السلام کی نبی کریم ﷺ سے افضلیت ثابت نہیں ہوتی۔

دوسرا جواب: "ان التشبيه فی الاصل لافی القدر کما فی قوله تعالیٰ واحسن کما احسن الله الیک " یہاں تشبیہ اصل صلوۃ میں ہے قدرِ صلوۃ میں نہیں۔یعنی مطلب یہ ہے کہ اے اللہ تو صلوۃ بھیج محمد (ﷺ) پر جیسا کہ تو نے ابراہیم (علیہ السلام) پر صلوۃ بھیجی۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ تو اتنی مقدار میں صلوۃ آپ پر بھیج جتنی مقدار میں ابراہیم علیہ السلام پر بھیجیں۔یقینی بات ہے جب صلوۃ زیادہ مقدار میں نبی کریم ﷺ پر ہوگی تو شان بھی آپ کی ہی زیادہ ہوگی۔یہاں تشبیہ کی وہی صورت ہے جو کہ قرآن پاک میں" قارون کی قوم کا مطالبہ قارون سے" مذکور ہے۔" احسن کما احسن الله الیک " تو احسان کر جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ پر احسان کیا۔یہ کہنے والے لوگ نیک تھے ان کا یہ مطلب نہیں تھا کہ تو لوگوں پر اتنے احسان کر جتنے تجھ پر رب تعالیٰ نے کئے ہیں بلکہ ان کا مطلب یہ تھا کہ تو بھی لوگوں پر احسان کر کیونکہ رب تعالیٰ نے تجھ پر احسان کیا ہے۔

تیسرا جواب: "ان الکاف للتعلیل " کماصلیت " میں "کاف" تعلیل کے لئے ہے تشبیہ کے لئے نہیں ۔اب معنی یہ ہوگا اے اللہ تو صلوۃ بھیج محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کیونکہ تو نے صلوۃ بھیجی ہے ابراہیم علیہ السلام پر۔ جب تشبیہ ہی ثابت نہیں تو مشبہ بہ کی افضلیت ثابت ہو رہی ہے مشبہ افضل کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ سوال ہی وارد نہیں ہوسکتا۔

چوتھا جواب: "ان التشبیه یتعلق بقوله وعلی آل محمد " تشبیہ کا تعلق آل محمد سے ہے اب معنی یہ ہوگا کہ اے اللہ محمد ﷺ پر صلوۃ بھیج (یہاں وقف) پھر۔ اے اللہ صلوۃ بھیج آل محمد پر جیسا کہ تو نے ابراہیم علیہ السلام پر صلوۃ بھیجی۔ اس معنی کے لحاظ پر ابراہیم علیہ السلام کی افضلیت نبی کریم ﷺ پر ثابت نہ ہوئی بلکہ آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر افضلیت ثابت ہوئی یہ درست ہے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔

پانچواں جواب: اعتراض میں جو تم نے ضابطہ بیان کیا ہے وہ اکثر یہ ہے کلیہ نہیں کبھی اس کے خلاف بھی واقع ہوتا ہے "قد یکون التشبیه بالمثل وبما دونه "کبھی تشبیہ مثل سے بھی ہوتی ہے اور کبھی کم درجہ سے بھی ہوتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی میں ہے "مثل نوره کمشکوة فیها مصباح "اس کے نور کی مثال ایسی جیسے ایک طاق کہ اس میں چراغ ہو۔

یقینی بات ہے کہ یہاں چھوٹی الماری طاق جس میں چراغ ہو اس سے تشبیہ اللہ کے نور کو اللہ تعالیٰ نے دی بہت چھوٹی واضح ہے کہ یہاں مشبہ بہ گھٹیا ہے ۔اور مشبہ افضل ہے۔

(حاشیہ ترمذی بر حدیث مذکور)

☆ "عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ والذی نفسی بیده ما انزل فی التوراة ولا فی الانجیل ولا فی الزبور ولا فی القرآن مثلها وانها فهی السبع المثانی التی آتانی الله عزوجل " (ترمذی ،مستدرک حاکم ،مظهری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے نہ تو رات میں ایسی (کوئی سورت) نازل ہوئی ۔اور نہ ہی انجیل میں اور نہ ہی زبور میں اور نہ ہی قرآن میں بیشک وہ سورۃ فاتحہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا کی۔

☆ "وعن ابن عباس قال بینا رسول اللہ ﷺ وعندہ جبریل اذ سمع نقیضا من فوقه فرفع جبریل علیه السلام بصرہ الی السماء فقال هذا باب فتح من السماء مافتح قط قال فنزل منه ملک فاتی النبی ﷺ فقال ابشر بنورین اوتیتهما لم یؤتهما نبی قبلک فاتحة الکتاب وخواتیم سورة البقرة لن تقرأ حرفا منها الا اعطیته" (رواہ مسلم ،مظہری)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ایک مرتبہ ہمارے درمیان رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے اور آپ کے پاس جبرائیل تھے جب انہوں نے اوپر سے ایک آواز سنی تو جبرائیل نے اپنی نظر کو آسمان کی طرف اٹھایا اور کہا یہ آسمانوں کا دروازہ جو کھولا گیا ہے وہ اس سے پہلے کبھی نہیں کھولا گیا اور کہا وہاں سے ایک فرشتہ نازل ہوا وہ نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور کہنے لگا۔ آپ کو دو نوروں کی بشارت ہو۔ یہ دونوں آپ کو ہی دیئے گئے آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیئے گئے۔ وہ سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ کی آخری آیات ہیں۔ آپ ہرگز کوئی ایک حرف بھی نہیں پڑھیں گے مگر یہ کہ آپ کو اس کے مطابق عطاء کر دیا جائے گا۔

☆ رواہ البخاری والبیهقی والحاکم من حدیث انس " افضل القرآن الحمد للہ رب العلمین " قرآن پاک میں سے افضل الحمد للہ رب العلمین (یعنی مکمل سورۃ فاتحہ) ہے۔ (مظہری)

☆ روی البخاری فی مسندہ من حدیث ابن عباس "فاتحة الکتاب تعدل ثلثی القرآن " سورۃ فاتحہ قرآن پاک کے دوتہائی مرتبہ کے ثواب کا درجہ رکھتی ہے۔ (مظہری)

☆ "عن السائب بن یزید قال عوذنی رسول اللہ ﷺ بفاتحة الکتاب فی تفلا ......رواہ الطبرانی فی الاوسط "

سائب ابن یزید سے مروی ہے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ فاتحہ سے دم کیا اور میرے منہ میں اپنا لعاب مبارک لگایا (مظہری) (فاتحہ کے ذریعے دم کرنا اور شفاء حاصل کرنا سنت ہے فاتحہ کے اسماء کی بحث میں یہ ذکر ہو چکا ہے۔

☆ وعن انس اذا وضعت جنبک علی الفراش وقراءت فاتحة الکتاب وقل هو اللہ احد فقد امنت کل شئی الا الموت " (رواہ البزار)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب تم بستر پر لیٹوتو سورۃ فاتحہ اور قل ھو اللہ احد پڑھوتو تم ہر چیز سے امن میں ہوگے (یعنی ہر چیز سے محفوظ ہو جاؤ گے) سوائے موت کے۔

النبذۃ : سورۃ فاتحہ ام القران ہے اصل القرآن ہے اور رئیس القرآن ہے قرآن پاک کے تفصیلی مسائل کو اجمالی طور پر شامل ہے۔اس لئے کہ اسے قرآن پاک کے عنوان اور دیباچہ کی حیثیت حاصل ہے۔عنوان اور دیباچہ سے اجمالی طور پر علم حاصل ہو جاتا ہے۔سورۃ فاتحہ سے فقہی احکام حاصل ہو سکتے ہیں اعتقاد واصول کے قواعد حاصل ہو سکتے ہیں اور علم الکلام کے مسائل کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔اسی سورۃ سے یہ حاصل ہو رہا ہے کہ رب تعالیٰ واجب الوجود ہے۔اور وہ **وحدہ لاشریک لہ** ہے ساری حمدیں اسی کی ذات کے ساتھ خاص ہیں۔بندوں کے تمام افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔رازق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے انسان خواہ وہ رزق حلال ذرائع سے حاصل کرے یا حرام طریقہ سے یہ اس کے اپنے دیئے ہوئے اختیارات کے استعمال کی وجہ ہے۔طاعت کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ انعامات سے نوازتا ہے اور کفار کو عذاب دیتا ہے یوم حشر نے یقیناً قائم ہونا ہے اور حساب کا ہونا حق ہے پل صراط سے گزرنا بھی یقینی جنت دوزخ پیدا کی جاچکی ہیں۔عبادت کو خلوص سے ادا کیا جائے عبادت کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے اللہ تعالیٰ جسے چاہے ہدایت عطا فرمادے اور جسے چاہے ہدایت سے محروم رکھے۔

ہم نے اپنے نبی کریم ﷺ کی شریعت پر ہی عمل کرنا ہے اگر کوئی اعمال پہلی شریعتوں کے ہماری شریعت میں آجائیں تو ہم ان پر صرف اس لئے عمل کریں گے کہ یہ ہمارے نبی کریم ﷺ کی شریعت کا مسئلہ ہے اس لئے نہیں کہ یہ تورات یا انجیل کا مسئلہ ہے ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اہل سنت وجماعت مسلمانوں کے طریقہ کی تابعداری کریں۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے مجتہدین ،علماء صالحین ،کاملین کا اجماع امت ہے جو حجت ودلیل ہے جس سے احکام ثابت ہوتے ہیں۔یہ تمام مسائل جو النبذۃ (خلاصہ کلام) میں ذکر کئے ہیں ان کو پہلے ذکر کی ہوئے بحثوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔غور وفکر سے ان مسائل کو حاصل کرنا کوئی مشکل نہیں۔ (ماخوذ از تفسیرات احمدیہ)

مسائل ضروریہ : بسم اللہ شریف کا پڑھنا ہر رکعت میں فاتحہ سے پہلے مسنون ہے "وان قرأھا مع کل سورۃ فحسن "ہر سورۃ کے شروع میں "بسم اللہ کا پڑھنا مستحسن ہے۔بسم اللہ کا پڑھنا

واجب نہیں سورۃ فاتحہ سے پہلے بھی اور ہر سورۃ سے پہلے بھی اس لئے کہ یہ ہر سورۃ کا حصہ نہیں اور ہر سورۃ میں تکرار کی احتیاج نہیں:

" عن ابن عباس قال کان النبی ﷺ لایعرف فصل السورتین حتی ینزل بسم اللہ الرحمن الرحیم "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کو دو سورتوں کے درمیان فرق کی پہچان کے لئے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" نازل کی گئی۔ جن نمازوں میں امام نے قراءت بلند آواز سے کرنی ہے۔ بسم اللہ ان میں بلند آواز سے نہیں پڑھی جائے گی بسم اللہ کا بلند آواز سے پڑھنا بدعت ہے۔ "روی حماد عن ابراهیم قال کان عمر یخفیها ثم یجهر بفاتحة الکتاب " حضرت ابراہیم سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مخفی پڑھتے (یعنی ثناء، تعوذ، تسمیہ آہستہ آواز میں پڑھتے) پھر بلند آواز سے فاتحہ پڑھتے۔ " قال ابراهیم کان عبد اللہ بن مسعود واصحابه یسرون قراءۃ بسم اللہ الرحمن الرحیم لایجهرون بها" ابراہیم نے کہا عبد اللہ ابن مسعود اور ان کے احباب "بسم اللہ الرحمن الرحیم" آہستہ آواز میں پڑھتے تھے بلند آواز سے نہیں پڑتے تھے۔ " روی انس ان ابابکر وعمر کانا یسران بسم اللہ الرحمن الرحیم " حضرت انس سے روایت ہے کہ بیشک حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما بسم اللہ آہستہ پڑھتے تھے:

" وکذالک روی عنه عبد اللہ بن المغفل وروی المغیرۃ عن ابراهیم قال جهر الامام ببسم اللہ الرحمن الرحیم فی الصلوۃ بدعة "

عبد اللہ بن مغفل نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی اور مغیرہ نے ابراہیم سے روایت بیان کی کہ امام کا بلند آواز سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا پڑھنا بدعت ہے۔ (از احکام القرآن للجصاص)

خاتمہ بالخیر: سورۃ فاتحہ کی تفسیر کو ایک عظیم قول پر ختم کر رہا ہوں۔ جس کا تعلق سورۃ فاتحہ کی فضلیت سے بھی ہے اور نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت سے بھی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے ذکر خیر میں میرے روح جان میرے دل کی دھڑکن، میرے قلب کا سرور، ہر وقت میرے دل میں موجود رہنے والی ایک عظیم ہستی محسن اہل سنت، مفکر اسلام، مفسر قرآن ضیاء الامت حضرت علامہ پیر محمد کرم شاہ بھیروی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف بے مثال "ضیاء النبی"

میں درج فرمایا۔علامہ ابوالقاسم سہیلی لکھتے ہیں:

" ان ابلیس لعنه الله رن اربع رنات ،رنة حین لعن ، رنة حین اهبط ورنة حین ولد رسول الله صلی الله علیه وسلم ورنة حین انزلت فاتحة الکتاب قال والرنین والنخار من عمل الشیطن" (روض الانف جلد اول ص ۱۸۱)

ابلیس ملعون زندگی میں چار مرتبہ چیخ مار کر رویا پہلی مرتبہ جب اس کو ملعون قرار دیا گیا دوسری مرتبہ جب اسے بلندی سے پستی کی طرف دھکیلا گیا۔تیسری مرتبہ جب سرکار دوعالم کی ولادت باسعادت ہوئی۔چوتھی مرتبہ جب سورۂ فاتحہ نازل ہوئی۔علامہ ابن کثیر نے بھی علامہ سہیلی کی اس عبارت کو السیرۃ النبویہ ص۲۱۲ جلد اول میں جوں کا توں نقل کیا ہے۔اور ابن سید الناس نے "عیون الاثر" ص ۲۷ جلد اول میں بھی اس روایت کو بعینہ درج کیا ہے۔ (ضیاء النبی ج ۲ ص ۵۶)

شکرِ باری تعالیٰ:

نبی کریم ﷺ کی رحمت کاملہ اور میرے مرشد حضرت پیر غلام محی الدین المعروف بابو جی گولڑوی رحمہ اللہ تعالیٰ اور ان کے پوتے حضرت پیر نصیر الدین نصیر مدظلہ العالی کی نظر عنایت اور میرے والدین کی دعاؤں اور اساتذہ کرام کی مہربانیون بالخصوص رئیس المحققین والمدرسین استاذی المکرم حضرت علامہ محمد اشرف صاحب سیالوی مدظلہ العالی کی نظر شفقت سے اللہ تعالیٰ نے عظیم انعام سے نوازا کہ میں نے 6 جمادی الاولی 1412ھ 7 اگست 2000ء بروز پیر بوقت سحر سورۂ فاتحہ کی تفسیر کو شروع کیا تھا۔آج 28 رجب 1412ھ 27 اکتوبر 2000ء بروز جمعہ مبارک بعد از نماز فجر ختم کیا ابھی مقدمہ ترتیب دینا ہے رب تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آئندہ بھی قرآن پاک کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ

(عبد الرزاق بهترالوی ، حطاروی ابن قاضی عبد العزیز)

(ابن قاضی فیض احمد ابن غلام نبی رحمهم الله تعالی)

نجوم الفرقان

من تفسیر آیات القرآن

جلد دوم

از رشحات قلم

حضرت علامہ مولانا

عبد الرزاق بھترالوی حطاروی

ناشر

ضیاء العلوم پبلی کیشنز راولپنڈی پاکستان

نجوم الفرقان فی تفسیر القرآن

کتاب لاریب کی توضیحات وتشریحات، علوم عقلیہ ونقلیہ کی روشنی میں
علمی وتحقیقی ذوق رکھنے والوں کے لئے قدیم وجدید احکامات ومسائل پر ابحاث کا حسین مرقع
تفسیر القرآن بالقرآن، ارشادات نبویہ، اقوال صحابہ، تحقیقات اسلاف اور روایات صحیحہ پر مشتمل تفسیر

مسمّٰی بہ

نجوم الفرقان

من تفسیر آیات القرآن

جلد دوم

از رشحات قلم

محقق اہلسنت
استاذ العلماء، حضرت علامہ مولانا
عبد الرزاق بھترالوی حطاروی
مدظلہ العالی

ناشر ضیاء العلوم پبلی کیشنز راولپنڈی پاکستان

نجوم الفرقان فی تفسیر القرآن

نام کتاب — نجوم الفرقان من تفسیر آیات القرآن

تالیف — حافظ عبدالرزاق چشتی بھترالوی

کمپوزنگ — ضیاء العلوم کمپوزنگ سنٹر سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی

کمپیوٹر گرافکس — قاضی محمد یعقوب چشتی، اظہر اقبال اعوان

بار طباعت — اوّل — تاریخ اشاعت مارچ 2004ء

ناشر — سید شہاب الدین شاہ

ضیاء العلوم پبلی کیشنز 128 بازار تلواڑاں راولپنڈی

0333-5166587-051-4450404-FAX-051-4580404

Email: ziauloom@isb.paknet.com.pk

ملنے کے پتے

- ☆ ضیاء القرآن پبلی کیشنز گنج بخش روڈ لاہور، اردو بازار کراچی
- ☆ مکتبہ رضویہ نزد دستا ہوٹل گنج بخش روڈ لاہور
- ☆ فرید بک سٹال اردو بازار لاہور
- ☆ جامع مسجد غوثیہ ایف سکس ون اسلام آباد
- ☆ مکتبہ تنظیم المدارس جامعہ نظامیہ لوہاری گیٹ لاہور
- ☆ مکتبہ غوثیہ محلہ فرقان آباد سبزی منڈی کراچی
- ☆ مکتبہ برکاتیہ گنج بخش روڈ لاہور
- ☆ احمد بک کارپوریشن کمیٹی چوک راولپنڈی
- ☆ نیو مکتبہ ضیائیہ بوہڑ بازار راولپنڈی

Note: entry 498 and 499 are printed as one title spanning two lines ("498 لوگ رب تعالیٰ سے براہ راست" / "499 فیض کیوں حاصل نہیں کر سکتے؟").

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

۲۵ رجب مطابق ۳ ر اکتوبر ۱۴۲۳ھ کو مولانا علی احمد سندیلوی کے ہمراہ حضرت استاذ العلماء والفضلاء مولانا علامہ سید حسین الدین شاہ مدظلہ العالی کے یاد فرمانے پر فقیر جامعہ رضویہ ضیاء العلوم، سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی حاضر ہوا اور حسب فرمان ''درس بخاری شریف'' کے پروگرام میں مختصر سا خطاب کیا۔ یہ حضرت شاہ صاحب کی عنایت اور نوازش ہے اللہ تعالیٰ انہیں سلامت رکھے۔

اسی موقع پر حضرت مولانا سید شہاب الدین شاہ صاحب نے مجھے فاضل جلیل حضرت علامہ عبدالرزاق بھترالوی حفظہ اللہ تعالیٰ کی تازہ تصنیف ''نجوم الفرقان'' من تفسیر آیات القرآن'' جلد اوّل کا ایک نسخہ عنایت کیا، اس کے جستہ جستہ مقامات کے مطالعہ سے دلی مسرت ہوئی، یہ ۴۲۴ صفحات اور بڑی تقطیع پر مشتمل ہے اس میں تفسیر قرآن پاک کا مقدمہ اور سورۂ فاتحہ کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔

علامہ بھترالوی صاحب کہنہ مشق مدرس، محقق فاضل اور کتب کثیرہ کے مصنف ہیں اس سے پہلے نورالایضاح، تلخیص المفتاح، سراجی، قدوری اور کنز الدقائق پر عربی زبان میں حواشی لکھ کر علمی دنیا میں اپنا نام متعارف کرا چکے ہیں۔ اب انہوں نے بجا طور پر تفسیر لکھنے کا فیصلہ کیا ہے اور اس جلد میں بیش بہا معلومات کا خزانہ جمع کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت و تندرستی کے ساتھ اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔

استاذ الاساتذہ، فخر اہل سنت مولانا سید حسین الدین شاہ مدظلہ العالی کے پیش لفظ نے اس کتاب کی اہمیت کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ ضیاء العلوم پبلی کیشنز راولپنڈی نے علامہ بھترالوی کی دیگر تصانیف کی طرح اس کتاب کو بھی دیدہ زیب اور عمدہ معیار کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اراکین ادارہ بھی مصنف کے ساتھ ساتھ مستحق صد تبریک و تحسین ہیں۔

والسلام

محمد عبدالحکیم شرف قادری

سورة البقرة

سورۂ بقرہ کا نام "بقرہ" اس لئے رکھا گیا کہ اس میں بنی اسرائیل کے ایک مقتول کے قاتلوں کا پتہ چلانے کے لئے رب تعالیٰ نے بقرہ (گائے) کو ذبح کر کے اس کے گوشت کا ٹکڑا مارنے کا حکم دیا کہ مقتول زندہ ہو کر اپنے قاتلوں کا خود بتائے گا۔

اس واقعہ کے ذکر کی وجہ سے نام سورۃ البقرۃ رکھ لیا گیا۔

سورۂ بقرہ مدنیہ ہے۔ اس میں آیات دو سو چھیاسی ہیں۔ چھ ہزار اکیس کلمات ہیں۔ پانچ ہزار پانچ سو حروف ہیں۔ یہ سورۃ سب سورتوں سے بڑی ہے۔ اس سورۃ میں آیۃ مداینۃ سب آیتوں سے بڑی آیت ہے اس ایک آیت میں بیس حکم پائے گئے ہیں۔ اس سورۃ میں جتنے احکام بیان کئے گئے ہیں اتنے کسی اور سورۃ میں بیان نہیں ہوئے۔ (از عزیزی پ ۱ ص ۷۹)

علامہ محی الدین ابن عربی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا: اس سورۃ میں ایک ہزار اوامر، ایک ہزار نواہی، ایک ہزار احکام، ایک ہزار خبریں پائی گئی ہیں (قرطبی ج ۱ ص ۱۵۲)۔۔۔۔۔۔ اس سورۃ میں پندرہ مثالیں ہیں۔ (روح المعانی ج ص ۹۹)

اس سورۃ پاک میں علوم کے کتنے خزانے ہیں؟ صرف اس سے اندازہ کریں کہ بے شمار مسائل وعلوم اس میں ذکر ہیں:

"تعلمها عمر رضي الله عنه بفقهها وما تحتوي عليه في اثنتي عشرة سنة، وابنه عبد الله في ثماني سنين" (قرطبی)

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سورۃ کے علوم و مسائل کو بارہ سالوں میں حاصل کیا، اور آپ کے بیٹے عبداللہ نے آٹھ سالوں میں"

ذرا غور تو کریں! کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان عربی نہیں تھی کہ آپ عربی الفاظ کا ترجمہ پڑھ رہے تھے۔ نہیں نہیں بات اصل میں یہ تھی کہ پڑھنے والے حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے اور پڑھانے والے نبی کریم ﷺ تھے۔ کتنے مسائل، کتنے علوم آپ کو پڑھائے گئے ان کو وہ جانیں جنہوں نے

پڑھایا اور وہ جانیں جنہوں نے پڑھا۔

اسی سے یہ سمجھ آ گیا کہ حضرت عبداللہ ابن عمر کا علم سورۃ بقرہ کے متعلق بنسبت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کم تھا کیونکہ تھوڑے عرصہ میں تھوڑے علوم حاصل کئے اور حضرت عمر نے زیادہ عرصہ میں زیادہ علوم حاصل کئے۔

سورۃ بقرہ کے اور نام: اس سورۃ کا ایک نام ''فسطاط'' بھی ہے جس کا معنی ہے ''خیمہ'' اس میں زیادہ احکام جمع ہونے اور اس کی عظمت کے پیش نظر اس کا نام فساط رکھا گیا۔ ایک اور نام اس کا ''سنام القرآن'' ہے یہ بھی بلندی اور عظمت کی وجہ سے ہی نام رکھا گیا ہے کیونکہ ''سنام'' ہر چیز کے بلند حصہ کو کہا جاتا ہے جیسا کہ اونٹ کی کوہان کو بھی سنام کہا جاتا ہے۔ (از الاتقان ج ۱ ص ۵۴)

فضائل سورة بقرة:

''عن ابی هريرة قال بعث رسول الله ﷺ بعثا وهم ذوو عدد وقدم عليهم احدثهم سنا لحفظه سورة البقرة وقال له اذهب فانت اميرهم'' (ترمذی)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے چند لوگوں کو (کہیں) بھیجا ان کا امیر ان میں سے چھوٹی عمر والے کو بنایا۔ ارشاد فرمایا جاؤ تم ان کے امیر ہو اس لئے کہ اسے سورۃ بقرہ یاد تھی''

''عن ابی امامة الباهلی قال سمعت رسول الله ﷺ يقول اقرء وا سورة البقرة فان اخذها بركة و تركها حسرة ولا يستطيعها البطلة، قال معاوية بلغنی ان البطلة، السحرة'' (مسلم)

''امامہ باھلی فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا سورۃ بقرہ پڑھو اس کے پڑھنے میں برکت ہے اس کے چھوڑنے میں حسرت ہے جادوگر اس کی طاقت نہیں رکھیں گے''

حدیث کے ایک راوی نے بطلہ کی وضاحت سحرہ (جادوگر) سے کی۔

''عن ابی هريرة ان رسول الله ﷺ قال لا تجعلوا بيوتكم مقابر ان الشيطن ينفر من البيت الذی تقرأ فيه سورة البقرة'' (مسلم)

''حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ جس گھر میں سورۃ بقرہ پڑھی جائے بیشک شیطان اس سے بھاگ جاتا ہے''

" عن سهل بن سعد قال قال رسول الله ﷺ ان لكل شئى سناما و ان سنام القرآن سورة البقرة ومن قرأها في بيته ليلا لم يدخل الشيطن بيته ثلاث ليال ومن قرأها نهارالم يدخل الشيطن بيته ثلاثة ايام قال ابو حاتم البستي قوله ﷺ لم يدخل الشيطن ثلاثة ايام اراد مردة الشياطين "

(صحیح البستی)

''سہل ابن سعد کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر چیز کی کوئی بلندی ہوتی ہے۔ قرآن پاک کی بلندی سورۃ بقرہ ہے جس نے اسے رات کو اپنے گھر میں پڑھا اس کے گھر میں تین راتیں شیطان داخل نہیں ہوگا اور جس نے اسے دن کو پڑھا سکے گھر تین دن شیطان داخل نہیں ہوگا۔ ابو حاتم بستی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ شیطان سے مراد سرکش شیطان ہیں''

" عن الشعبي قال قال عبد الله من قرأ عشر آيات من سورة البقرة في ليلة لم يدخل ذلك البيت شيطان تلك الليلة حتى يصبح اربعا من اولها و آية الكرسي و آيتين بعدها و ثلاثا خواتيمها ، اولها لله ما في السموات "

(دارمی)

''شعبی سے مروی ہے حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا جس شخص نے سورۃ بقرہ کی دس آیات رات کو پڑھیں اس تمام رات صبح تک شیطان اس گھر میں داخل نہیں ہوگا۔ وہ دس آیتیں یہ ہیں پہلی چار آیتیں اور آیۃ الکرسی اور اس کے بعد دو آیتیں اور آخری تین آیتیں جن کی پہلی آیت لله ما في السموات سے شروع ہو رہی ہے''

" وعن الشعبي عنه ، لم يقربه ولا اهله يومئذ شيطان ولا شئى يكرهه ، ولا يقرأن على مجنون الا افاق "

(دارمی)

''حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے ہی شعبی نے روایت ذکر کی (کہ جس شخص نے مذکورہ دس آیات بقرہ کی پڑھیں) اس کے اور اس کے اھل وعیال کے قریب اس دن شیطان نہیں آئے گا اور بھی کوئی ناپسندیدہ چیز ان کو لاحق نہیں ہوگی۔ اگر سورۃ بقرہ کو مجنون پر پڑھا جائے تو مجنون کو افاقہ ہوگا''

راقم کے نزدیک پڑھنے والا باکمال ہو اور زبان بااثر ہو تو یقیناً قرآن پاک کا اثر عظیم تر ہوگا ورنہ یہ صورت ہوگی:

میں جب کہتا ہوں یا الٰہی میرا حال دیکھ　　حکم ہوتا ہے پہلے اپنا نامہ اعمال دیکھ

لبید بن ربیعہ زمانہ جاہلیت کے شعراء سے ہیں انہوں نے زمانہ اسلام کو پایا صدق دل سے

اسلام کو قبول کرلیا اسلام میں آ کر انہوں نے شعر کہنے چھوڑ دیئے دو شعر صرف ان کے زمانہ اسلام میں ملتے ہیں وہ یہ ہیں:

الحمد للہ اذ لم یاتنی اجلی

حتی اکتسیت من الاسلام سر بالا

الحمد للہ ! میری موت (کفر میں) نہیں آئی یہاں تک کہ میں نے اسلام کا لباس پہن لیا

ما عاتب المرء الکریم کنفسه

والمرء یصلحه القرین الصالح

انسان اپنی ذات کی طرح ہی کسی کریم انسان پر عتاب نہ کرے۔ نیک ساتھی ہی انسان کو نیک بناتا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں لبید کو شعر سنانے کے لئے کہا تو انہوں نے سورۃ بقرہ کی تلاوت شروع کر دی۔ آپ نے فرمایا میں نے تمہیں شعر سنانے کے متعلق کہا ہے۔ تو لبید نے جواب دیا:

"ما کنت لا قول بیتا من الشعر بعد اذ علمنی اللہ البقرة و آل عمران" .

"جب سے اللہ تعالیٰ نے مجھے سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران کا علم دیا اسکے بعد میں نے شعر نہیں کہے"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے اس قول پر تعجب کرتے ہوئے ان کے حصہ میں جو دو ہزار درہم عطیہ تھا اس پر پانچ سو درہم اور بڑھا کر عطا فرمائے۔ (ماخوذ از قرطبی)

سورۃ بقرہ میں اہم مسائل:

مؤمنین، کفار و منافقین کا ذکر، جنت اور اس کی نعمتوں کا ذکر، آدم علیہ السلام کی تخلیق اور جنت میں رہنا اور جنت سے باہر آنا، موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کا ذکر، گائے کے ذبح کا واقعہ، ہاروت و ماروت کا واقعہ، نبی کریم ﷺ کو راعنا کہہ کر پکارنے سے منع کرنا، ابراہیم علیہ السلام کا ذکر، تحویل قبلہ، شہید کی زندگی، قصاص، رمضان، حج، حیض، قسم، طلاق، ازواج کا نفقہ، جالوت کو داؤد علیہ السلام کا قتل کرنا، نذر، بیع سلم، رھن، ربوا جیسے اہم مسائل سب سورۃ بقرہ میں ہی مذکور ہیں۔

﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾

تفسیر ''تیسیر الرحمن'' میں بسم اللہ کی تفسیر ہر سورۃ سے پہلے اسی کے مناسب بیان کی۔ سورۂ بقرہ سے پہلے ان الفاظ سے تفسیر بیان کی۔

" باسم الله الذی تجلی بذاته و صفاته فی کتابه الشامل علی بیان کمالاته الرحمن بنفی الریب عنه بجعله معجز اللکل الرحیم بجعله هدی للمتقین "

'' اللہ کے نام سے شروع جس کی ذات وصفات کی تجلیات اس کی کتاب میں پائی گئی ہیں وہ کتاب جو اس کے کمالات کے بیان پر مشتمل ہے وہ ذات رحمٰن ہے کہ اس نے کتاب سے شک کی نفی فرمائی اور کتاب کو معجزہ بنایا جس کے مقابلہ سے سب عاجز آ گئے وہ رحیم ہے کہ اس نے کتاب کو متقین کے لئے ہدایت بنایا''

الٓمّٓ " الله ورسوله اعلم بمراده " ان الفاظ مبارکہ کی مراد کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ ہی جانتے ہیں۔ بعض سورتوں کی ابتداء میں جو اس قسم کے الفاظ آئے ہوئے ہیں ان کو ''حروف مقطعات'' کہا جاتا ہے ان کو علیحدہ علیحدہ کر کے پڑھا جاتا ہے۔ یعنی یوں پڑھا جاتا ہے۔ الف، لام، میم۔ یہ متشابھات سے ہیں۔ ''متشابہ'' اسے کہا جاتا ہے جس کی مراد کو پہچاننے کی امید ختم ہو جائے، جو بہت زیادہ خفاء میں ہو، جس کے ظاہر ہونے کی امید بالکل نہ پائی جائے۔

متشابہ کا حکم یہ ہے کہ عقیدہ یہ ہو کہ ان سے جو بھی اللہ تعالیٰ کی مراد ہے وہ حق ہے۔ ہمیں ان کا علم قیامت تک حاصل نہیں ہو سکے گا۔

" واما بعد القیمة فیصیر مکشوفا لکل احد ان شاء الله تعالی "

لیکن قیامت کے بعد ان شاء اللہ ہر ایک پر منکشف ہو جائیں گے۔

" وهذا فی حق الامة واما فی حق النبی علیه السلام فکان معلوما والا تبطل فائدة التخاطب وبصیر التخاطب بالمهمل کالتکلم بالزنجی مع العربی "

متشابہات کی مراد کا علم حاصل نہ ہونے کا تعلق امت سے ہے البتہ نبی کریم ﷺ کو یقیناً

علم تھا اور نہ آپ سے خطاب کا کوئی فائدہ نہ ہوگا یہ تو ایسا ہی ہو جائے گا جیسا کہ مہمل سے خطاب کرنا مثلاً زنگی جو عربی نہ جانتا ہو اس سے عربی میں خطاب مہمل بے مقصد ہوگا۔

اگر نبی کریم ﷺ کو متشابہات کا علم حاصل نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کا خطاب (معاذ اللہ) مہمل اور بے مقصد ہو جائے گا۔ (از نور الانوار ص ۹۳)

متشابہات میں نبی کریم ﷺ کے علم کی نفی دراصل رب تعالیٰ کی توہین ہے:

" واما بالنسبة الى النبى ﷺ فمعلوم وقت نزول القرآن بلا تفرقة بينه وبين سائر القرآن كيلا يلزم السفه لان التخاطب بما لا يفهم المخاطب سفه " (حاشیه اصول شاشی ص ۲۵)

نبی کریم ﷺ کو قرآن پاک کے نازل ہوتے وقت ہی علم حاصل ہو جاتا خواہ وہ متشابہات ہوں یا غیر متشابہات ورنہ سفاہت (بیوقوفی) لازم آئے گی اس لئے کہ ایسے شخص سے خطاب کرنا جو اس خطاب کو سمجھ ہی نہ سکے بے وقوفی ہوا کرتی ہے۔ خدارا انصاف کیجئے خدا سے ڈرئے کیا یہ کہنا رب تعالیٰ کی شان ہے؟ کہ متشابہات کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اور کسی کو بھی حاصل نہیں یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ بھی نہیں جانتے۔

یہ خدا کی شان بیان کی یا حقارت؟ کیا یہ توحید ہے یا توہین؟ نام نہاد توحیدیو! ذرا جہالت کا کپڑا سر سے اتار کر علم کی ہوا بھی لگنے دو۔ ذہن وضمیر سے جہالت کے زنگ کو دور کر کے علم کی روشنی سے چمکا دو۔ آؤ شمع رسالت کے پروانوں سے توحید سیکھو! پھر کہیں توحیدی ہونے کا دعویٰ تمہارا سچا ہوگا۔

اگر یہ کہا جائے کہ نبی کریم ﷺ کو متشابہات کا علم نہیں تھا تو اس سے نبی کریم ﷺ کی شان میں تو کوئی فرق لازم نہیں آئے گا۔ لیکن معاذ اللہ رب تعالیٰ کی شان میں گستاخی لازم آئے گی۔ رب تعالیٰ کی توہین ہوگی گویا کہ تم نے اپنی ہی زبان سے (معاذ اللہ) رب تعالیٰ کو سفیہ (بے وقوف) کہہ دیا کیونکہ اگر نبی کریم ﷺ نہیں جانتے آپ میں سمجھنے کی صلاحیت نہیں تھی تو رب تعالیٰ نے آپ پر متشابہات کو نازل ہی کیوں کیا۔ مخاطب نہ سمجھ سکے تو سفاہت کی نسبت متکلم کی طرف ہوتی ہے مخاطب کی شان میں کوئی فرق لازم نہیں آتا۔

اعتراض: تم نے کہا ہے کہ متشابہات کا علم نبی کریم ﷺ کو حاصل ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ ﴿وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ﴾ متشابہات کی تاویلات کا علم سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو نہیں۔ تمہارا یہ کہنا کیسے صحیح ہے کہ نبی کریم ﷺ کو علم حاصل ہے۔

جواب: تفصیلی بحث تو ان شاء اللہ اسی آیت کریمہ کی وضاحت میں آئے گی البتہ اختصار سے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اس میں اختلاف ہے کہ وقف ﴿وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ﴾ پر ہے یا کہ ﴿وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ﴾ پر ہے۔ پہلا قول احناف کا ہے اور دوسرا امام شافعی رحمہ اللہ کا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک تو "راسخون فی العلم" (علم میں پختگی رکھنے والے حضرات) کو بھی متشابہات کا علم حاصل ہے تو یقیناً نبی کریم ﷺ کو علم حاصل ہونا ہی ہے۔

ہمارے نزدیک اگرچہ عطف " الا اللہ " پر ہے لیکن پھر بھی یہ حکم امت کے لئے ہے۔ نبی کریم ﷺ کو علم حاصل ہے آیۂ کریمہ کا مفہوم یوں ہوگا " وما یعلم تاویلہ بدون الوحی الا اللہ" متشابہات کا علم اللہ تعالیٰ کو ہی حاصل ہے دوسرا کوئی بھی بغیر وحی کے علم نہیں رکھتا" فالنبی ﷺ کان عالما بتاویلہ بالوحی لاغیرہ" نبی کریم ﷺ کو علم وحی کے ذریعے حاصل تھا۔ آپ کے بغیر کسی اور کو اس کا علم حاصل نہ ہو سکا:

> " متشابہات القرآن ومستودعات اسرارہ فانہا سر بین اللہ ورسولہ لا یعلمہا احد غیرہ "
>
> قرآن پاک کے متشابہات اور اس میں ودیعت رکھے گئے اسرار اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان راز ہیں ان کو اور کوئی نہیں جانتا۔ اگر نبی کریم ﷺ کو بھی علم حاصل نہ ہو تو رب تعالیٰ اور آپ کے درمیان راز کیسے ہوں گے؟

فائدہ جلیلہ:

> " ثم اعلم ان الکلام فی العلم الکسبی واما العلم الکشفی الغیر الاختیاری فلو حصل لبعض الاولیاء الکرام فلا امتناع فیہ "
>
> " ابھی تک جو بحث بیان کی گئی اس کا تعلق علم کسبی سے تھا لیکن علم کشفی غیر کسبی، غیر اختیاری اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اگر بعض اولیاء کرام کو بھی حاصل ہو جائے تو اس میں کوئی مانع نہیں"

متشابہات کی دو قسمیں:

ایک قسم متشابہات کی یہ ہے کہ ان کا معنی ہی معلوم نہ ہو وہ یہی حروف مقطعات ہیں اور دوسری قسم یہ ہے کہ ان کا لغوی معنی تو معلوم ہو لیکن ان کی مراد صرف رب تعالیٰ کو ہی معلوم ہو۔ جیسے ﴿ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ ☆ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰہِ ﴾ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہاتھ اور چہرے سے پاک ہے اسی طرح ﴿ اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی ﴾ بھی متشابہ کی اسی قسم میں داخل ہے کیونکہ استواء کا ایک معنی بیٹھنا بھی ہے رب تعالیٰ عرش پر بیٹھنے سے پاک ہے۔

(ماخوذ از نور الانوار مع قمر الاقمار ص ۹۳، ۹۴)

تنبیہ: بعض اہل علم نے حروف مقطعات کو متشابہات میں داخل نہیں کیا بلکہ انہوں نے کہا کہ یہ رمز ہیں یعنی اشارات ہیں بعض مطالب کی طرف۔ ان حضرات میں سے بعض نے الف سے مراد ''انا'' (میں) لیا ہے۔ لام سے مراد ''اعلم'' (میں جانتا ہوں) اور ''میم'' کا مطلب ''مرادہ'' لیا ہے یعنی میں ہی ان کی مراد جانتا ہوں۔ (قمر الاقمار برنور الانوار ص ۹۴)

بعض نے کہا الف سے مراد ''اللہ'' لام سے مراد جبریل میم سے مراد محمد مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے بواسطہ جبرائیل قرآن پاک محمد ﷺ پر نازل کیا۔ بعض نے کہا الف سے مراد ''اللہ'' لام سے مراد ''لطیف'' میم سے مراد ''مجید'' ہے مطلب یہ ہوا کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے میں اللہ بھی ہوں لطیف بھی اور مجید بھی۔ بعض نے کہا الف سے مراد ''انزلت'' لام سے مراد ''لوح'' میم سے مراد ''محفوظ'' مطلب یہ ہوا '' **انزلت علیک ھذا الکتاب من اللوح المحفوظ** '' میں نے آپ پر یہ کتاب لوح محفوظ سے نازل کی۔

لیکن خیال کریں کہ ان حضرات کو بھی آخر کار یہی کہنا پڑتا ہے کہ حقیقی مراد اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ ہی جانتے ہیں۔ (از قرطبی)

جو معنی بھی لیا جائے اسی پر اہل علم کے اقوال ملتے ہیں۔ خواہ متشابہات سے بنائیں اور ان کو اسرار کہیں یا رمز بنائیں اور ان کے معانی کا اعتبار کریں۔

قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک حق یہ ہے کہ یہ حروف مقطعات متشابہات سے ہیں لیکن یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے درمیان راز ہیں عام لوگوں کو سمجھانے کا ارادہ نہیں کیا، بلکہ رسول اللہ ﷺ کو ان کے معانی سمجھائے گئے ہاں البتہ نبی کریم ﷺ کے کامل متبعین میں سے جسے چاہے رب تعالیٰ علم عطا فرمادے یہ کوئی بعید نہیں:

" قال البغوی قال ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ فی کل کتاب سر وسر اللہ تعالی فی القرآن اوائل السور "

بغوی رحمہ اللہ نے کہا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہر کتاب (خط) میں راز ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کے راز قرآن پاک میں سورتوں کی ابتداء میں ہیں۔

" وقال علی رضی اللہ عنہ ان لکل کتاب صفوۃ وصفوۃ ھذا الکتاب حرف التھجی "

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہر کتاب (خط) میں کچھ برگزیدہ، منتخب، چنے ہوئے مضامین ہوتے ہیں اس کتاب (قرآن پاک) میں چنے ہوئے (سورتوں کے اول میں) حروف تہجی ہیں۔

" وحکاہ الثعلبی عن ابی بکر وعن علی و کثیر " ثعلبی حضرت ابوبکر، حضرت علی اور کثیر حضرات (صحابہ کرام) سے نقل کیا ہے کہ حروف مقطعات اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے درمیان راز ہیں۔ سمرقندی نے یہی قول حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے نقل کیا ہے۔ قرطبی نے یہی قول سفیان ثوری، ربیع ابن خثیم، ابوبکر ابن انباری، ابن ابی حاتم اور محدثین کی ایک جماعت سے نقل کیا سجاوندی نے کہا کہ اول زمانہ سے یہی منقول ہوتا چلا رہا ہے:

" انھا سر بین اللہ وبین نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم وقد یجری بین المحرم کلمات معمیات یشیر الی اسرار بینھما "

کہ یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی کریم ﷺ کے درمیان راز ہیں عام طور پر یہی طریقہ چلا آرہا ہے کہ ایک دوسرے کے محرم راز آپس میں جب خط وکتابت کرتے ہیں تو ان میں کچھ راز کے الفاظ لکھتے ہیں۔

(از مظھری)

بین المحبین سر لیس یفشیہ ، قولہ ولا قلم للخلق یحکیہ

ایک دوسرے سے محبت کرنے والوں کے درمیان راز ہوتے ہیں ان کو افشاء نہیں کرسکتا۔ نہ کوئی قول اور نہ ہی قلم کہ وہ مخلوق کے سامنے بیان کیے جائیں

" اذ ارباب الذوق یعرفونھا وھم کثیرون فی المحمدین والحمد للہ "

ارباب ذوق ہی ان کے معانی کو جانتے ہیں وہ نبی کریم ﷺ کے متبعین میں الحمد للہ بہت حضرات موجود ہیں۔

نجوم سماء کلما انقض کوکب بدا کوکب تاوی الیه کو اکبه

(غلامانِ مصطفیٰ) آسمان کے ستارے ہیں جب بھی کوئی ستارہ ٹوٹتا ہے دوسرا ستارہ اس کی جگہ قائم ہو جاتا ہے بلکہ ایک کی جگہ کئی قائم ہو جاتے ہیں۔

ہمیں اگر ان کی مراد کا نہ پتہ چل سکے تو اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ اس میں عظمت قرآن پاک سمجھ آئے گی کہ ہمیشہ کے لئے دل ان کی طرف متوجہ رہیں گے کاش کہ یہ سمجھ آ جائے پھر جب تھک ہار کر یہ کہا جائے گا کہ یہ تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے درمیان راز ہیں تو کیا خوب مقام قرآن ذہن میں منقش ہو گا ہمارے لئے تو اتنا ہی ضروری ہے:

" ویکون من ذلک ظهور کمال الانقیاد من المأمور للآمر ونهایة التسلیم والامتثال للحکیم القادر "

کامل طور پر ہماری طرف سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت پائی جائے ان رازوں کو تسلیم کر لیں اور رب تعالیٰ جو حکیم وقادر ہے اسی کے اوامر کی فرمانبرداری کریں اور یہ ایمان رکھیں کہ نبی کریم ﷺ جب پتھروں کا کلام سنتے سمجھتے ہیں۔ ہرن کی بات، اونٹ کی بات، درختوں کی بات کو سنتے اور جانتے ہیں تو وہ کون سی مشکل ہے کہ آپ کو متشابہات کا علم حاصل نہ ہو۔ (از روح المعانی)

آیئے علامہ آلوسی کی اس عبارت کو دیکھیں کیا خوب فیصلہ کن بات آپ نے بیان کی:

" فلا یعرفه بعد رسول الله ﷺ الا الاولیاء الورثة فهم یعرفونه من تلک الحضرة وقد تنطق لهم الحروف کما تنطق لمن سبح فی کفه الحصی " (روح المعانی)

ان حروف کے معانی رسول اللہ ﷺ جانتے ہیں اور ان کے بعد اولیاء کرام کو نبی کریم ﷺ کے حضور سے علم حاصل ہوتا ہے کبھی یہ حروف خود بول کر اولیاء کرام کو اپنے مطالب سے آگاہ کرتے ہیں۔ جیسا کہ یہ حروف نبی کریم ﷺ کو بول کر اپنے مطالب اسی طرح بیان کرتے ہیں جیسا کہ آپ کے ہاتھ مبارک میں کنکریوں نے

تسبیحات پڑھیں"

" وروی عن ابن عباس انا من الراسخین فی العلم وانا فمن یعلم تاویله "

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں میں بھی ﴿ رَاسِخُونَ فِی الْعِلْمِ﴾ سے ہوں میں بھی ان کی تاویلات کو جانتا ہوں''

رمز کہنے والے حضرات کی جو تاویلیں پہلے ذکر کی ہیں وہ تمام تفسیر ابن عباس میں بھی موجود ہیں۔ ان حضرات نے ہی حروف مقطعات کو سورتوں کے نام بھی کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء گرامی بھی کہا ہے جیسا کہ ابن ماجہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ کہتے تھے "یا کھیعص اغفرلی "

" وعن الربیع بن انس کھیعص معناہ من یجیر علیه ولا یجار علیه "

ان کا معنی (اور وہ پناہ دیتا ہے اس کے خلاف کوئی پناہ نہیں دیتا) بعض حضرات نے کہا یہ قرآن پاک کے اسماء گرامی ہیں۔

(از مظهری)

مفتی محمد شفیع صاحب (دیوبندی) لکھتے ہیں ہوسکتا ہے کہ رسول کریم ﷺ کو اس کا علم بطور ایک راز کے دیا گیا ہو جس کی تبلیغ امت کے لئے روک دی گئی ہو۔ آگے چل کر لکھتے ہیں اور بعض اکابر علماء سے جو ان حروف کے معنی منقول ہیں اس سے صرف تمثیل وتنبیہ اور تسہیل مقصود ہے یہ نہیں کہ مرادِ حق تعالیٰ یہی ہے اس لئے اس کو بھی غلط کہنا تحقیق علماء کے خلاف ہے۔

(معارف القرآن ج اول ص ۱۰۷)

راقم کی مکمل بحث کو مفتی صاحب کے قول سے تائید مل گئی کاش کہ ان کے متبعین کو بھی سمجھ آجائے۔ اپنے ہی اکابرین کی بات کو یہ لوگ کیوں نہیں مانتے؟ اس کا پتہ نہیں۔

تاہم راقم نے معتبر تفاسیر اور کتب اسلاف سے جو بحث نقل کی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو یقینی طور پر علم تھا۔ لیکن مفتی صاحب نے کہا ہوسکتا ہے علم ہو یہ وجہ فرق بھی ہے ان کے اور راقم کے نظریات میں۔

﴿ ذٰلِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ فِیْهِ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ﴾

''وہ بلندرتبہ کتاب (قرآن) کوئی شک کی جگہ نہیں اس میں ہدایت ہے ڈروالوں کو''

''یہ وہ بلندمرتبہ کتاب ہے کوئی شک کی گنجائش نہیں اس میں پرہیزگاروں کیلئے ہدایت ہے''

ذٰلِکَ: اشارہ بعید ہے جس کا معنی ہوتا ہے وہ ''ذالک الکتاب'' کی اصل عبارت یا تو اس طرح ہے ''ھذا الکتاب ھو القرآن'' یہ کتاب وہ قرآن ہے یا اس کا مفہوم یہ ہے ''ھذا الکتاب الذی وعدتک به'' یہ وہ کتاب ہے جس کا میں نے تم سے وعدہ کیا تھا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ سے وعدہ فرمایا تھا کہ میں تمہاری طرف ایسے کتاب نازل کروں گا جسے پانی نہیں مٹا سکے گا بار بار لوٹانے سے وہ پرانی نہیں ہوگی۔

مطلب یہ تھا کہ قرآن پاک کو کوئی ختم نہیں کر سکے گا اس کو مومنوں کے سینوں میں محفوظ کردوں گا اس کا میں خود محافظ ہوں۔ ایک ہی بات کو بار بار کرنے سے ذوق ختم ہو جاتا ہے لیکن قرآن پاک وہ کتاب ہے جو بار بار پڑھنے سے بار بار سنانے سے بار بار بیان کرنے سے ذوق میں اضافہ کرتی ہے۔
جب قرآن پاک نازل ہوا تو فرمایا ''ذالک الکتاب'' جس کا مطلب یہ ہے ''ھذا ذلک الکتاب الذی وعدتک به'' یہ وہی کتاب ہے جس کا میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا۔ ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے وعدہ فرمایا تھا کہ میں ''اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد سے ایک رسول مبعوث کروں گا اور اس پر ایک کتاب (قرآن) نازل کروں گا۔
جب نبی کریم ﷺ نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی وہاں بہت تعداد میں یہود تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو یاد دلایا:

> ''ذالک الکتاب'' ای ھذا الکتاب الذی وعدت به علی لسان موسٰی ان انزله علی النبی الذی ھو من ولد اسمعیل'' (از خازن)
> ''یہ وہی کتاب ہے جس کا میں نے تمہارے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے وعدہ کیا تھا کہ میں اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے آنے والے اپنے نبی پر نازل کروں گا''

ایک قول یہ ہے" ھذا القرآن الذی انزلته علیک بالمدینة ذلک الکتاب الذی وعدتک ان اوحیه الیک بمکة " جب مدینہ طیبہ میں قرآن پاک کا کچھ حصہ نازل ہوا تو فرمایا گیا یہ وہی کتاب جس کا میں نے تم سے مکہ میں وعدہ کیا تھا کہ میں تمہاری طرف وحی نازل کروں گا۔

ایک اور قول یہ ہے " ذالک ، اشارة الی اللوح المحفوظ " یہ وہی کتاب ہے جو لوح محفوظ میں ہے۔کسائی رحمہ اللہ نے کہا" ذالک ، اشارة الی القرآن الذی فی السماء لم ینزل بعد " یہ وہ کتاب ہے جو آسمان دنیا میں اتار دی گئی لیکن ابھی تک آپ پر مکمل نازل نہیں ہوئی۔

مبرد نے کہا اس کا مطلب یہ ہے:

" ھذا القرآن ذلک الکتاب الذی کنت تستفتحون به علی الذین کفروا "
" یہ قرآن وہی کتاب ہے جس کے ذریعے (جس کا نام لے کر واسطہ دے کر) تم کافروں پر فتح طلب کرتے تھے"

تمام اقوال سے عظیم قول:

" ذالک الی ھذا... الخ ، اشار بذالک الی ان حق الاشارة ان یؤتی بھا للقریب وانما اتی بما یدل علی البعید للتعظیم لکون القرآن مرفوع المرتبة وعظیم القدر " (صاوی)

یعنی صاحب جلالین نے "ھذا" کا لفظ ذکر کر کے اشارہ کیا ہے کہ یہاں حق یہ تھا کہ اشارہ قریب ہوتا لیکن اشارہ بعید لایا "تعظیم کیلئے" اس لئے کہ قرآن پاک رفیع القدر اور عظیم القدر ہے۔

" او تعظیمه بالبعد نحو الم ذلک الکتاب تنزیلا لبعد درجته ورفعة محله منزلة بعد المسافة " (مختصر المعانی)

یعنی مسند الیہ کو معرفہ اشارہ بعید کے ساتھ لانے کا یہ فائدہ ہے وہ بلندی رتبہ اور رفعت مقام پر ایسی دلالت کر رہا ہے جس طرح مسافت بعید پر دلالت کرتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمہ اللہ یہی بیان کرتے ہیں:

" ذلک الکتاب " یعنی: است آں کتاب کہ بسبب علو درجہ کمال خود

ودقت اسرار ودقائق خود از وہم وفہم سامعان غائب واز حامی جولان افکار وانظار بعید واست لهذا در حق او آکتاب گفته میشود که دلالت بربعد دارد نه ایں کتاب که دلالت بر قرب مسیکند۔ (عزیزی)

یعنی وہ کتاب کہ اپنے کمال درجہ کی بلندی کی وجہ سے اور اپنے دقیق اسرار کی وجہ سے سامعین کی فہم سے دور ہے اور فکر ونظر کی پہنچ سے دور ہے اسی وجہ سے " ذلک " لایا گیا ہے جس کا معنی ہے ''وہ'' یہ اشارہ بعید کا ہے قریب کا اشارہ ''ھذا '' نہیں لایا جس کا معنی ہے ''یہ''۔

سبحان اللہ قرآن پاک کی عظمت کو کوئی بیان کرسکتا ہے۔ جس کا ایک ایک لفظ بتا رہا ہے کہ جس طرح بعید کا اشارہ مکان کی دوری پر دلالت کرتا ہے اسی طرح شان کی دوری، بلندی پر بھی دلالت کرتا ہے۔ لہٰذا اشارہ قریب کی جگہ بعید لاکر رب تعالیٰ نے قرآن پاک کی بلندی رتبہ اور عظیم القدر ہونے کو بیان کردیا۔

الْکِتَابُ: کتب کے بہت سے معانی ہیں:

(۱) چمڑے کو چمڑے سے ملا کر سینا، جس طرح کہا جاتا ہے " کتبت السقاء" میں نے مشکیزہ کو سیا

(۲) لکھنا، کہا جاتا ہے " کتبت بالقلم " میں نے قلم سے لکھا۔

(۳) کتاب، صحیفہ جیسے ﴿ قال انی عبد الله آتنی الکتاب ﴾ بیشک میں اللہ کا بندہ ہوں مجھے اللہ تعالیٰ نے کتاب دی۔

(۴) فرض کرنا، تقدیر جیسے ﴿ کتب علیکم الصیام ﴾ تم پر روزے فرض کئے گئے۔

(۵) حکم، جیسے ﴿واولو الارحام بعضهم اولی ببعض فی کتاب الله ﴾اولوالارحام بعض بعض سے اولیٰ (بہتر) ہیں اللہ کے حکم میں۔

(۶) بنانا، ثابت کرنا جیسے ﴿فاکتبنا مع الشاهدین ﴾ ہمیں شاہدین کی جماعت میں کردے۔

(۷) نامہ اعمال جیسے "مال هذا الکتاب لا یغادر صغیرة ولا کبیرة الا احصاها" یہ کیسا نامہ اعمال ہے جو کسی چھوٹی چیز یا بڑی چیز کو نہیں چھوڑتا مگر یہ کہ اسے شمار کرلیتا ہے۔

(۸) لوح محفوظ " ان ذلک فی کتاب " یہ لوح محفوظ میں ہے۔

(۹) علم، تحقق، اعتقاد (۱۰) مکاتب بنانا۔ (۱۱) جمع کرنا۔ (از مفردات راغب)

قرآن پاک کو کتاب کہنے کی وجہ:

چونکہ ایک معنی ہے جمع کرنا جیسے لشکر کو کتیبہ کہا جاتا ہے۔اس معنی کے لحاظ سے قرآن پاک کو کتاب اس لئے کہا گیا ہے:

" لکونه مسائل مجتمعه و علوما جمة اجتمع بعضها مع بعض "

کہ اس میں بہت مسائل جمع ہیں اور وافر مقدار میں علوم اس میں پائے گئے ہیں۔گویا کہ مسائل وعلوم بعض، بعض کے ساتھ جمع ہیں۔رب تعالیٰ کا اپنا ارشاد اس پر دلالت کر رہا ہے ﴿ولا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین﴾ کوئی تر اور خشک چیز ایسی نہیں جو کتاب مبین میں نہ ہو۔

(از صبح زادہ)

لکھنے والا معنی لیا جائے تو پھر بھی یہی مطلب ہوگا کہ اس میں بہت علوم ومسائل لکھے ہوئے ہیں۔ الکتاب میں الف لام حقیقۃ پر دلالت کر رہا ہے اور کتاب سے مراد جنس کتاب اب معنی اسطرح ہوا "ان ذلک هو الکتاب الکامل " یہی کتاب کامل کتاب ہے جس طرح کہا جاتا ہے " هو الرجل ای الکامل فی الرجولية " وہی مرد ہے یعنی اچھی خصال اس میں ہی پائی گئی ہیں لہٰذا کامل مرد وہی ہے۔ جب ہم نے یہ معنی مراد لے لیا کہ کامل کتاب صرف قرآن پاک ہی ہے تو پتہ چل گیا " کان ماعداه من الکتب فی مقابلته ناقص " کہ اسکے ماسوا تمام کتابیں اس کے مقابل ناقص ہیں۔

(از کبیر، ابو سعود)

اعتراض: قرآن پاک کے بغیر باقی کتابوں کو ناقص کہنا تو کسی طرح بھی درست نہیں کیونکہ اس سے تو یہ لازم آئے گا کہ آسمانی کتب ناقص ہوں انکو ناقص کہنا کیسے صحیح ہے؟

جواب: ناقص کا معنی "گھٹیا" نہیں بلکہ کم ہونا ہے۔علامہ رازی رحمہ اللہ پر اعتراض کرنے کی غلطی کا سبب ہی یہ ہے کہ ناقص کا معنی "گھٹیا" سمجھ لیا گیا ہے۔مطلب بہت ہی واضح ہے کہ قرآن پاک کے بغیر دوسری تمام کتب غیر آسمانی ناقص ہیں۔ان کے مضامین کم ہیں یہاں معنی کم شان کرنا بھی صحیح نہیں کہ ان کی شان قرآن پاک کی شان سے کم ہے بلکہ سب ہی عظیم الشان ہیں لیکن آسمانی کتب

کے مجموعی مضامین بھی قرآن پاک میں موجود ہیں اوران سے زائد بھی موجود ہیں اب مطلب یہ ہوا کہ قرآن پاک کے بغیر دوسری آسمانی کتب بلندشان رکھنے کے باوجود مضامین ان کے کم ہیں:

" ذالک الکتاب البعید درجة کماله لجمعه ما فی الکتب الالهية قبله مع رفعه کل ریب "

یہ کتاب تمام کتب الاھیہ سے بلند مرتبہ ہے کیونکہ ان کے مجموعی مضامین کو بھی شامل ہے اوراس میں شک کی بھی نفی پائی گئی ہے کیونکہ شک کی نفی پر دلائل قائم ہیں۔شبہات کے دور ہونے پر قرآن پاک کا معجزہ ہونا بھی دلالت کر رہا ہے اوراسی قرآن کے ذریعے پہلی کتب کی تصدیق پائی گئی اور پہلی کتب میں تحریف پائی گئی قرآن پاک تحریف سے محفوظ ہے۔ (از تبصیر الرحمن)

اب بات سمجھ میں آ گئی کہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے اورابوسعود رحمہ اللہ نے قرآن کو کامل کتاب بیان کر کے تفسیر کا حق ادا کر دیا ہے کہ قرآن کتنی عظیم کتاب ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ سے عظمت اور کمال سمجھ میں آ رہا ہے۔

فائدہ جلیلہ : اصولِ احکام دین چار چیزیں ہیں۔کتاب،سنت،اجماع،قیاس۔بعض احکام دین کتاب اللہ سے ثابت ہیں۔جیسے نماز،روزہ اورزکوۃ کی فرضیت اور خنزیر کی حرمت اور بعض احکام سنت (نبی کریم ﷺ کے اقوال وافعال) سے ثابت ہیں جس طرح نماز جنازہ کا فرض (کفایہ) ہونا اور گدھے کا حرام ہونا۔

بعض احکام اجماع امت سے ثابت ہیں جیسے ام ولد کی بیع کا حرام ہونا اور دو غلامہ کے ساتھ ملک یمین کی وجہ سے وطی کا حرام ہونا۔بعض احکام قیاس سے ثابت ہیں جیسے شراب کی حرمت پر باقی نشہ آور چیزوں کی حرمت کو قیاس کیا گیا ہے۔لیکن تمام دلیلوں کی اصل کتاب اللہ (قرآن پاک) ہی ہے۔
کیونکہ قیاس وہ معتبر ہے جو کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ ﷺ یا اجماع سے حاصل ہو۔
اجماع وہ معتبر ہے جو کتاب اللہ اور سنت کے تابع ہو اور سنت چونکہ نبی کریم ﷺ کے اقوال اور افعال کو کہا جاتا ہے نبی کریم ﷺ کی نبوت قرآن پاک سے ثابت ہے قرآن پاک آپ کا معجزہ ہے تو اس سے واضح ہو گیا کہ چار دلیلوں میں اصل کتاب اللہ ہی ہے اور باقی اسی کے تابع ہیں۔ (از عزیزی)

﴿ لَارَيْبَ فِيْهِ ﴾

(۱) ''شک کی جگہ نہیں اس میں (۲) اس میں شک کی گنجائش نہیں''

یہاں نفی میں عموم پایا گیا ہے کیونکہ نکرہ پر حرف نفی آئے تو وہ عموم پر دلالت کرتا ہے اسی وجہ سے ''ریب'' مبنی برفتحہ ہے ''ریب'' کے تین معنی ہیں۔

(۱) ریب بمعنی شک، جیسا کہ عبداللہ ابن زبعری نے کہا:

لیس فی الحق یا امیمة ریب	انما الریب مما یقول الجهول
اے امیمہ حق میں شک کی گنجائش نہیں ہوتی	شک وہاں ہوسکتا ہے جہاں جہلاء کا کلام ہو

(۲) ریب بمعنی تہمت جیسا کہ جمیل نے کہا:

بثینة قالت یاجمیل اربتنی	فقلت کلانا یا بثین مریب
بثینہ نے کہا اے جمیل تم نے مجھ پر تہمت لگائی	تو میں نے کہا ہم میں سے ہرایک تہمت لگانے والا ہے

(۳) ریب بمعنی حاجت، جیسا کہ کعب ابن مالک انصاری فرماتے ہیں:

قضینا من تهامة کل ریب	وخیبر ثم اجمعنا السیوفا
ہم نے ہر حاجت کو پورا کردیا مقام تہامہ میں	اور خیبر میں پھر ہم نے اپنی تلواروں کو جمع کرلیا

(از قرطبی)

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے فرمایا ریب اصل میں مصدر ہے کہا جاتا ہے ''رابنی الشئی'' فلاں چیز نے مجھے ریب میں ڈال دیا۔ ریب اگرشک کے معنی میں مشہور ہے لیکن اصل میں اس کا معنی نفس میں قلق اور اضطراب پایا جانا چونکہ شک میں بھی قلق (بے اطمینانی) اور اضطراب پایا جاتا ہے اس لئے ریب کا معنی شک کرلیا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے ''دع ما یریبک الی ما لا یریبک'' جو چیز تمہارے نفس کے لئے قلق واضطراب کا ذریعہ بنے اسے چھوڑ دو اس پر عمل کرو جو اضطراب کا سبب نہ بنے۔ یعنی جس چیز کے بارے میں شک ہو کہ یہ حلال ہے یا حرام تو وہ باعث اضطراب ہے اطمینان قلب اس میں نہیں پایا جاتا اس لئے اسے چھوڑ دیا جائے اور جس چیز کے حلال

ہونے میں یقین ہوگا اس میں اطمینان حاصل ہوگا وہ سکون قلب، اطمینان قلب کا سبب بنے گی اس پر عمل کرنا ضروری ہوگا۔

ایک اور حدیث شریف میں ارشاد ہے " **فان الصدق طمانینة والکذب ریبة** " بیشک سچ اطمینان ہے اور جھوٹ اضطراب ہے جب ریب کا اصل معنی اضطراب ہے تو یہی وجہ ہے کہ کہا جاتا ہے "**ریب الزمان**" جس کا معنی مراد ہوتا ہے زمانے کے مصائب چونکہ وہ بھی دل کے اطمینان وسکون کو ختم کر دیتے ہیں اور اضطراب کا سبب بنتے ہیں۔ (بیضاوی بمع شیخ زادہ)

یہ بھی خیال رہے کہ شک دونقیضوں میں کسی ایک کو ترجیح نہ دے سکنے کو کہا جاتا ہے۔

مقام توجہ: لاریب کہا ہے لاشک نہیں کہا اس لئے کہ اس میں بہت وسیع مضامین کو پیش کر دیا گیا کہ قرآن پاک میں شک کی گنجائش نہیں۔ قرآن پاک میں یہ تہمت نہیں لگائی جاسکتی کہ (**معاذاللہ**) یہ نبی کریم ﷺ نے اپنی طرف سے پیش کیا قرآن پاک لوگوں کی ناجائز حاجات کو پورا نہیں کرتا۔ قرآن پاک میں اطمینان پایا گیا قلق واضطراب نہیں پایا گیا۔ قرآن پاک میں حوادثات زمانہ نہیں پائے گئے کہ حوادثات زمانہ کی وجہ سے اس میں کوئی تغیر وتبدل پایا گیا ہو۔ قرآن پاک میں کوئی ایسی وجوہ نہیں پائی گئی جن سے دل میں پریشانی پائی جائے اور وہ غیظ وغضب کا سبب بنیں۔ یہ اتنے فوائد لاریب سے حاصل ہوئے جو "**لاشک**" سے حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔

اعتراض: تم نے بیان کیا ہے کہ ﴿ **لَارَیْبَ فِیْهِ** ﴾ میں عموم نفی ہے جس کا معنی یہ ہے کہ قرآن پاک میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں یعنی شک کا کوئی ایک فرد بھی نہیں پایا گیا یہ کہنا کیسے صحیح ہے؟ جب کہ مرتابین کثیر تعداد میں پائے گئے ہیں رب تعالیٰ کا ارشاد اس پر دلالت کر رہا ہے۔

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا...... الخ ﴾

قانون یہ ہے کہ کثرت مرتاب مستلزم ہے کثرت ریب کو یعنی شک کرنے والے تب ہی زیادہ ہوں گے جب اس میں شک زیادہ ہوگا۔ جب کوئی ایک بھی شک کرنے والا ہو تو شک کی کلی طور پر نفی نہیں ہوسکتی۔

جواب: یہاں یہ مراد نہیں کہ اس میں کوئی شک کرنے والا نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ قرآن پاک

وحی الٰہی سے نازل ہوا اس پر واضح اور روشن دلائل موجود ہیں جب کوئی عقلمند اسمیں غور کرے تو وہ کبھی اسمیں شک نہیں کرسکتا "حیث خرج عن کونه مظنة للریب" کیونکہ شک کی جگہ سے نکل گیا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا کلام ہونے کی وجہ سے حق اور سچ ہے اسمیں کوئی عقل مند شخص تو شک نہیں کرسکتا ہاں کوئی اپنے جہالت، ضد، حسد، عناد اور کفر کی وجہ سے شک کرے تو اسکے شک کرنے کی وجہ سے قرآن پاک میں شک نہیں آجائے گا اسکا شک کرنا ہی باطل ہے۔ (از شیخ زادہ)

کنز الایمان کا کمال:

ابھی تک جو بحث کی گئی کہ "ذالک" اشارہ بعید کالا کر قرآن پاک کی عظمت کا ذکر کیا گیا یا ابھی جو سوال وجواب ذکر کیے گئے اسکو دیکھتے ہوئے تراجم کو دیکھیں تو یقیناً اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ کنز الایمان منفرد اور امتیازی شان رکھنے والا نظر آئے گا۔ تراجم دیکھئے خود فیصلہ کیجئے یقیناً آپکو پتہ چلے گا کہ دو لفظوں سے بہت بڑے بحثیں سمیٹ کر ترجمہ میں سمو دی گئیں۔

﴿الٓمّٓ ☆ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ﴾

☆ یہ کتاب کہ کوئی شبہ اس میں نہیں	(عبد الماجد دریا آبادی)
☆ اس کتاب میں کچھ شک نہیں	(محمود الحسن صاحب)
☆ یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں	(اشرف علی صاحب)
☆ اس کتاب میں کچھ شک نہیں	(شاہ عبد القادر صاحب)
☆ یہ اللہ کی کتاب ہے اس میں کوئی شک نہیں	(مودودی صاحب)
☆ یہ کتاب (قرآن مجید) اس میں کچھ شک نہیں	(شاہ رفیع الدین صاحب)
☆ وہ بلند مرتبہ کتاب (قرآن) کوئی شک کی جگہ نہیں اس میں	(مولانا احمد رضا خان بریلوی)

راقم نے اپنے ترجمہ میں ایک اور اشارہ کر دیا:

ابھی تک جو اعتراض نقل کیا گیا ہے اسکا ایک جواب نقل کیا ہے لیکن اسکا ایک اور جواب یہ دیا گیا ہے:

" وقیل معناه لا ریب فیه للمتقین وهدی حال من الضمیر المجرور
والعامل فیه الظرف الواقع صفة للمنفی " (بیضاوی)

بعض حضرات نے کہا" للمتقین " خبر ہے " لا "کی اور " هدی " حال ہے "فیه" کی مجرور ضمیر سے اور عامل اس میں ظرف ہے جو منفی (ریب) کی صفت ہے۔

اب جواب کا خلاصہ یہ ہوا کہ شک کی نفی تمام لوگوں سے نہیں بلکہ متقین سے ہے اب مطلب یہ ہوگا۔ اس میں شک نہیں متقین کو دراں حالیکہ اس میں ہدایت ہے۔ پہلا جواب جو زیادہ مشہور اور قوی اور زیادہ صحیح ہے اسکے مطابق راقم کے ترجمہ کو یوں پڑھیں " یہ وہ بلند مرتبہ کتاب ہے کوئی شک کی گنجائش نہیں اس میں۔ پرہیز گاروں کیلئے ہدایت ہے" اور دوسرا جواب جو کم مشہور ہے اور " قیل " سے تعبیر کر کے اس کا کچھ ضعف بھی بیان کیا گیا ہے اسکے مطابق راقم کا ترجمہ یوں پڑھیں یہ وہ بلند مرتبہ کتاب ہے کوئی شک کی گنجائش نہیں اس میں پرہیز گاروں کے لئے۔ ہدایت ہے (اس میں)۔

علمی نکتہ:

مسند کی تقدیم تخصیص پر دلالت کرتی ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے جنتی شراب طہور کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا "لا فیھا غول " صرف جنتی شراب میں مستی نہیں (غول کا معنی سردرد، اعضاء کا بوجھل ہونا، مراد مست ہونا) " بخلاف خمور الدنیا فان فیھا غولا " بخلاف دنیا کے شراب کے اس میں مستی پائی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے ﴿لا رَیْبَ فِیْهِ﴾ کہا گیا ہے لیکن ﴿لا فِیْهِ رَیْبَ﴾ نہیں کہا گیا" لئلا یفید تقدیمه علیه ثبوت الریب فی سائر کتب اللہ " تا کہ مسند کی تقدیم سے تخصیص والا معنی لے کر یہ نہ ثابت ہو کہ شائد اللہ تعالیٰ کی باقی کتب میں شک پایا جاسکتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی تمام کتب شک سے پاک ہیں۔

سبحان اللہ قرآن پاک کتنی عظیم کتاب ہے جس کی وضاحت و بلاغت کی کوئی حد نہیں۔

(از مختصر المعانی)

﴿ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴾

''پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے''

''ھدایة '' کے دو معنی ہیں ایک راہ دکھانا، دوسرا منزل مقصود تک پہنچانا۔

اعتراض: پہلے معنی پر اعتراض یہ ہوگا کہ قرآن پاک تو تمام لوگوں کو راہ دکھانے کے لئے نازل ہوا ہے صرف متقین سے اس کو خاص کیسے کیا گیا ہے۔

پہلا جواب: ھدایة کا معنی یہاں مقصود تک پہنچانے والا لیا گیا ہے کیونکہ یہی معنی ''ضلالة'' کا مقابل ہے اللہ تعالیٰ کے قول میں یہی مذکور ہے '' انک لعلی ھدی او فی ضلال مبین '' کیونکہ مھدی اسے کہا جاتا ہے جو مطلوب تک ہدایت حاصل کرلے '' واختصاصه بالمتقين لانهم المهتدون به والمنتفعون بنصبه '' ہدایت کو متقین سے اسی وجہ سے خاص کیا گیا کہ قرآن پاک کے ذریعے ہدایت کو انہوں نے ہی قبول کیا اور وہ دلائل جو اللہ تعالیٰ نے مقصود تک پہنچانے کے قائم فرمائے ان سے نفع انہوں نے ہی حاصل کیا۔

دوسرا جواب: ھدایة کا معنی تو راہ دکھانا ہے اسی لئے دوسرے مقام پر قرآن پاک کی صفت ان الفاظ مبارکہ سے کی ''ھدی للناس ''قرآن پاک لوگوں کو راہ دکھاتا ہے یہ عام ہے سب مومنوں اور کافروں کو شامل ہے یعنی قرآن پاک اگرچہ تمام مومنوں اور کافروں کے لئے ھادی بن کر آیا لیکن اس راہ پر چلے فقط مومنین، متقین اسی لئے متقین کا ذکر کیا۔

اس مسئلہ کو یوں سمجھیں کہ جس طرح غذا بدن کی مصلحت کے لئے ہوتی ہے لیکن اسی شخص کو غذا نفع دیتی ہے جس کو صحت حاصل ہو مریض کو نفع مند نہیں ہوتی اسی طرح جن لوگوں کو عقل سلیم حاصل ہوئی کفر و نفاق کے زنگ سے ان کی عقل محفوظ رہی آیات میں تدبر کیا معجزات کو دیکھا نبوت کو پہچانا اور ایمان لایا انہوں نے قرآن پاک سے نفع حاصل کیا۔

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی سے یہ مسئلہ بہت واضح ہوجاتا ہے:

﴿ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ وَلَا يَزِيدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴾

''اور ہم قرآن میں اتارتے ہیں وہ چیز جو ایمان والوں کے لئے شفا ہے اور رحمت ہے اور اس سے ظالموں کو نقصان ہی بڑھتا ہے''

یعنی مومن قرآن پاک کے احکام پر عمل کر کے اور قرآن کے مطابق اپنے اعتقادات درست کر کے رحمت کے مستحق ہوتے ہیں اور جسمانی اور روحانی امراض سے شفا حاصل کر لیتے ہیں لیکن کافر اپنے کفر پر قائم رہنے کی وجہ سے نقصان میں رہتے ہیں۔ جتنا زیادہ آیات کا انکار کرتے ہیں اتنا ہی زیادہ ان کو خسارہ ہوتا ہے۔ (ماخوذ از بیضاوی مع شیخ زادہ)

اعتراض: تمام قرآن پاک کو کیسے ہادی کہا گیا ہے جب کہ اس میں مجمل اور متشابہ بھی ہیں ان سے تو کوئی راہنمائی نہیں ملتی۔

جواب: مجمل پر توقف کرنا کہ شریعت کی طرف سے جو بیان آئے گا وہی مراد ہوگی اور متشابہ پر ایمان رکھنا کہ جو اللہ تعالیٰ کی مراد ہے وہی درست ہے یہی ہدایت ہے ایمان حاصل ہونے سے بڑھ کر اور کیا ہدایت حاصل ہوگی۔ (ماخوذ از بیضاوی)

اعتراض: متقین تو پہلے ہدایت پر ہوتے ہیں جن حضرات کو ہدایت حاصل ہو ان کو پھر ہدایت دینے کا کیا مطلب؟

جواب: " هدى للمتقين الى الصائرين الى التقوى بامتثال الاوامر واجتناب النواهي اشار بذالک الى ان فى الكلام مجاز الاول الى المتقين فى علم الله او من يؤول الى كونهم متقين " (جلالين مع الصاوى)

یا تو اس کا یہ مطلب ہے کہ قرآن پاک ان لوگوں کے لئے ہدایت ہے جو اللہ تعالیٰ کے علم میں متقین ہیں اور یا یہ مطلب ہے کہ جو آئندہ اوامر پر عمل کر کے اور نواہی سے اجتناب حاصل کر کے متقی بننے والے ہیں ''متقین'' جمع ہے متقی کی اصل ماخذ تقویٰ اور متقی کا وقی ہے دینی مدارس میں پڑھنے والے چھوٹی کلاسوں کے بچے بھی جانتے ہیں کہ باب افتعال کے فاء کلمہ میں واؤ اور یا (ہمزہ سے بدل نہ

ہو) آئے تو اس واؤ اور یا کو تا سے بدل کر ادغام کر دیتے ہیں اس طرح اوتقاء سے اتقاء بن گیا موتقی سے متقی بن گیا "وقی" کا لغوی معنی بچنا ہے۔ لیکن اہل شرع کے نزدیک تقویٰ یہ ہے "ھی صیانۃ عما یضرہ فی الآخرۃ لا مطلق الصیانۃ" کہ ایسی چیزوں سے بچنا جو آخرت میں نقصان دہ ہوں۔ مطلقاً کسی نہ کسی چیز سے بچنے کا نام شریعت میں تقویٰ نہیں۔

خیال رہے کہ آخرت میں نقصان دینے والی چیزوں سے انسان اسی وقت اجتناب کرے گا جب اس کے دل میں خوف خدا ہوگا اسی لئے تقویٰ کا معنی ڈرنا بھی کیا جاتا ہے اور پرہیز کرنا بھی معنی کیا جاتا ہے اسی لئے متقی کو پرہیز گار کہا جاتا ہے۔

تقویٰ کے تین درجے: تقویٰ عوام، تقویٰ خواص، تقویٰ اخص الخواص۔

تقویٰ عوام: دائمی عذاب سے بچنا یعنی شرک سے باز رہنا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَالْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى﴾ سے یہی معنی سمجھ آ رہا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث پاک اسی مفہوم کی تائید کر رہی ہے آپ نے فرمایا:

"المتقی من یتقی الشرک والکبائر والفواحش وعلیه قوله تعالیٰ والزمهم کلمة التقوی"

متقی وہ ہوتا ہے جو شرک، کبیرہ گناہوں اور فواحش سے اجتناب کرے اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿وَالْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى﴾ اسی پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ آیۂ کریمہ میں کلمۃ التقویٰ سے مراد کلمہ توحید ہے اور وہ کلمہ "لاالٰه الا الله" ہے اگر شرک سے بچنے کا نام تقویٰ نہ ہوتا تو کلمہ توحید کو کلمہ تقویٰ نہ کہا جاتا۔

تقویٰ خواص: ہر گناہ والے کام سے بچنا، یہاں تک کہ بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ صغائر سے بھی پرہیز کرنا تقویٰ کی اسی قسم میں داخل ہے اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی سے یہ تقویٰ بھی سمجھ میں آ رہا ہے اور شریعت میں یہی تقویٰ زیادہ مشہور ہے وہ ارشاد باری تعالیٰ یہ ہے:

﴿وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾

"اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور ڈرتے تو ضرور ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتیں کھول دیتے"

چونکہ اس آیت میں پہلے "امنوا" ذکر ہوا جس کا مطلب ہی شرک سے بچنا ہے پھر

"واتقوا" ذکر کیا تو یقیناً اس کے معنی میں شرک سے بچنے کے معنی میں زیادتی بھی ہے وہ یہی ہے کہ گناہوں سے اجتناب کیا جائے۔

تقوی اخص الخواص: ہر وہ چیز جو اللہ تعالیٰ کیطرف کامل متوجہ ہونے میں رکاوٹ بنے اس سے اجتناب کرنا اور کامل طور پر دنیا سے منقطع ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا۔ یہ معنی اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے سمجھ آ رہا ہے:

﴿یا ایها الذین امنوا اتقوا الله حق تقاته﴾

اے ایمان والو اللہ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے۔

صوفیاء کرام اولیاء عظام اسی کو تقوی حقیقی کہتے ہیں ان کے نزدیک یہی مطلوب ہوتا ہے۔

(ماخوذ از بیضاوی مع شیخ زادہ)

تقویٰ کے اسی مقام کو استاذی المکرم حضرت مولانا محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی غالباً حضرت عبدالعزیز دباغ رحمہ اللہ کے قول سے بیان فرماتے تھے۔ " طالب الدنیا مؤنث و طالب العقبی مخنث و طالب المولیٰ مذکر " دنیا کا طلبگار عورت کے مقام پر ہے آخرت کا طلب گار یعنی جنت کی طلب کرنے والا اور جہنم سے بچاؤ کا طلب گار خنثٰی کی مثال ہے اور مولیٰ کو طلب کرنے والا مذکر ہے۔ کیونکہ جب صرف یہ طلب ہو کہ مولیٰ تو راضی ہو جا تو رب تعالیٰ کی رضا جب حاصل ہو گی تو دنیا میں رحمت کے دروازے بھی کھل جائیں گے اور جہنم سے بچنا بھی نصیب ہوگا اور جنت بھی حاصل ہو گی:

تجھ کو تجھی سے مانگ کر مانگ لی ساری کائنات ، مجھ سا کوئی گدا نہیں تجھ سا کوئی بادشاہ نہیں

شائد اسی قانون کو مدنظر رکھتے ہوئے حضرت محمد بخش کھڑی شریف والے نے فرمایا:

ہر مشکل دی کنجی یارو مرداں دے ہتھ آئی ، مرد دعا کرن جس ویلے مشکل رہے نہ کائی

یعنی آپ نے بھی اولیاء کرام کو مرد کہا ہے کیونکہ حقیقت میں مرد ہیں ہی وہی خصوصاً داڑھی منڈانے والے تو نظر ہی مؤنث آتے ہیں۔

تنبیہ: بعض حضرات نے تقوی کی تیسری قسم شبہات سے بچنا بیان کیا ہے۔ اس لئے راقم کے خیال میں اگر یوں تقسیم کر دی جائے تو ممکن ہے کہ اہل علم اس کی تائید کر دیں۔ تقوی عوام شرک سے بچنا،

تقوی خواص بالاعم ، گناہوں سے بچنا، تقوی خواص بالاخص ، شبہات سے بچنا، تقوی اخص الخواص ، رب سے توجہ ہٹانے والی چیزوں سے بچنا۔

احادیث مبارکہ سے وضاحت: حضرت ابن عباس اور حضرت عبد اللہ ابن مسعود اور کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ یعنی نورا للمتقین " یعنی اس مقام میں ہدایت کا معنی نور ہے مفہوم پھر بھی یہی ہوگا کہ قرآن پاک ان کے لئے سیدھی راہ روشن کرتا ہے کہ اس پر چل کر کامیابی حاصل کریں اور تقوی والے ہو جائیں:

☆ " عن ابن عباس قال هدى للمتقين قال هم المومنون الذين يتقون الشرك بى ويعملون بطاعتى "

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے هدى للمتقين میں جن متقین کا ذکر ہے یہ وہ ہیں جن کے متعلق رب تعالیٰ یہ کہتا ہے کہ مومنین وہ لوگ ہیں جو مجھ پر ایمان لانے اور مجھ سے ڈرنے کی وجہ سے شرک سے اجتناب کرتے ہیں اور میری طاعت کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

اس حدیث سے تقوی کا وہ معنی کامل طور پر سمجھ آ گیا جو پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ تقوی کی قسموں میں سے ایک ''تقوی خواص'' ہے۔

☆ " عن ابن عباس للمتقين قال الذين يحذرون من الله عقوبته فى ترك ما يعرفون من الهدى ويرجون رحمته فى التصديق بما جاء به "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ میں جن لوگوں کا ذکر ہے یہ وہ ہیں۔ جو ہدایت کے راستہ کو پہچان کر اس سے دور رہنے سے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے ہیں اور (رسول اللہ ﷺ رب تعالیٰ کی طرف سے) جو لایا ہے اس کی تصدیق کر کے اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید کرتے ہیں۔

یہ تقوی بھی خواص کا ہی ہے کیونکہ گناہوں سے اجتناب کرنا اور رحمت باری تعالیٰ کی امید ''تقوی خواص'' ہی ہے۔

☆ " عن الحسن البصرى قوله للمتقين قال اتقوا ما حرم الله عليهم وادوا ما افترض عليهم "

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے بھی متقین کے متعلق کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ان چیزوں سے اجتناب کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان پر حرام کی ہیں اور ان کو ادا کرتے ہیں جو رب تعالیٰ نے ان پر فرض کی ہیں۔

☆ " عن عطیة السعدی قال قال رسول الله ﷺ لا یبلغ العبد ان یکون من المتقین حتی یدع مالابأس به حذرا مما بأ س به "

عطیہ سعدی کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندہ متقین کے درجہ میں اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا یہاں تک کہ وہ ان چیزوں کو بھی چھوڑ دے جن میں حرج تو نہیں لیکن (ان کو اس لئے چھوڑ دے) تا کہ حرج والی چیزوں سے بچ جائے۔

یہ تقوی شبہات سے بچنے کے قریب ہے کیونکہ جس طرح جانوروں کو چرانے والے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ زمین میں کسی کے کاشت شدہ فصل کو بچانے کے لئے اپنے جانوروں کو اس زمین کے اردگرد لگی باڑ، حد بندی کے قریب بھی نہ جانے دے۔اسی طرح وہ کام جو جائز تو ہے لیکن اسی کے ساتھ متصل آگے ناجائز کام کی ابتداء ہو رہی ہو تو اس ناجائز کام سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی حد پر واقع ہونے کے ڈر سے جائز کام کو بھی چھوڑ دے تا کہ اسے تقوی حاصل ہو۔

☆ ''ایک مرتبہ حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ سے سوال کیا تقوی کیا ہے؟ انہوں نے کہا " اما سلکت طریقا ذاشوک قال بلی قال فما عملت قال شمرت واجتهدت قال فذلک التقوی " کیا تم کبھی کانٹوں والے راستے پر نہیں چلے آپ نے فرمایا کیوں نہیں انہوں نے کہا تم وہاں کیا کرتے ہو تو آپ نے کہا کہ میں وہاں اپنے کپڑے سمیٹ لیتا ہوں یعنی جہاں تک ممکن ہو کپڑوں کو اوپر چڑھا لیتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ ان سے بچ جاؤں ابی ابن کعب نے کہا کہ یہی تقوی ہے۔یعنی گناہوں سے بچنے میں مکمل کوشش کرنا تا کہ کہیں گناہوں میں ملوث نہ ہو یہ تقوی ہے۔ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ کے اسی قول کو دیکھتے ہوئے ابن معتز نے یہ کہا:

" خل الذنوب صغیر ها ، وکبیرهاذاک التقی ، واصنع کماش فوق ارض ، الشوک یحذر ما یری ، لا تحقرن صغیرة ، ان الجبال من الحصی "

"چھوڑ دے گناہوں کو چھوٹے ہوں یا بڑے یہی تقوی ہے تو ایسے کر جیسے کانٹوں والی زمین پر چلنے والا جب کانٹے دیکھتا ہے تو ان سے بچتا ہے۔ چھوٹے گناہوں کو حقیر نہ سمجھ بیشک پہاڑ چھوٹے چھوٹے سنگریزوں سے ہی بنے ہیں" (ابن کثیر بحذف)

" التقوى فيها جماع الخير كله وهي وصية الله في الاولين والآخرين وهي خير ما يستفيده الانسان "

تقوی میں ہر قسم کی بھلائیاں جمع ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگلے اور پچھلے تمام لوگوں کو تقویٰ کی نصیحت کی گئی انسان جن چیزوں میں فائدہ سمجھتا ہے ان سے تقوی بہتر ہے۔

ابوالدرداء کو جب کہا گیا کہ تمہارے دوست تو شعر بھی کہتے تھے کیا تم بھی کوئی اپنا شعر سنا سکتے ہو؟ تو آپ نے یہ شعر بیان کئے:

يريد المرأ ان يؤتى مناه ويابى الله الا ما اراده
يقول المرأ فائدتي ومالي وتقوى افضل ما استفادا

انسان چاہتا ہے کہ اسے ممنوع چیزیں دیں جائیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ انکار کرتا ہے وہی عطا کرتا ہے جس کا وہ ارادہ کرتا ہے انسان کہتا ہے اس میں میرا فائدہ ہے یہ میرا حال ہے۔ حالانکہ تقوی ہی افضل ہے ان چیزوں سے جن کو وہ فائدہ مند سمجھتا ہے

☆ " عن ابی امامة عن النبی ﷺ انه كان يقول ما استفاد المؤمن بعد تقوى الله خيرا له من زوجة صالحة ان امرها اطاعته وان نظر اليها سرته وان اقسم عليها ابرته وان غاب عنها نصحته في نفسها وماله " (ابن ماجه)

ابوامامہ نے کہا بیشک نبی کریم ﷺ فرمارہے تھے اللہ تعالیٰ کے تقوی کے بعد انسان اپنے فائدہ کے لئے کوئی چیز طلب کرے جو اس کے لئے بہتر ہو تو وہ نیک زوجہ ہے۔ اگر یہ اسے کوئی حکم دے وہ اس کی اطاعت کرے اگر یہ اسے دیکھے تو وہ اسے خوش کرے اگر یہ اس پر کوئی قسم اٹھا دے تو وہ اسے پورا کرے (یعنی اگر یہ کہہ دے قسم ہے اللہ تعالیٰ کی کہ میری زوجہ یہ کام کرے گی وہ کام ناجائز نہ ہو تو عورت اس طرح کام کر کے خاوند کی قسم کو پورا کر دے) اور اگر یہ غائب ہو جائے تو وہ اپنے نفس اور اپنے خاوند کی مال کی حفاظت کرے۔ (از قرطبی)

فائدہ عظیمہ : تمام لوگ عاقبت کے لحاظ سے سات قسم ہیں کیونکہ یا تو وہ سعید (نیک بخت) ہوں گے اور یا وہ شقی (بد بخت) ہوں گے۔ جو سعید ہوں گے ان کی پھر دو قسمیں ہیں ایک اصحاب یمین جن کو نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ دوسرے وہ جو ان سے بھی بلند مرتبہ والے ہوں گے جن کو السابقون المقربون کہا گیا ہے رب تعالیٰ نے ان تینوں قسموں یعنی اصحاب شمال، اصحاب یمین السابقون المقربون کا ذکر ان آیات مبارکہ میں کیا:

﴿ وَكُنْتُمْ اَزْوَاجاً ثَلٰثَةً ☆ فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ☆ مَآاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ☆ وَاَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ مَا اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ☆ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ☆ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ☆ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴾

''اور تم تین قسم کے ہو جاؤ گے تو داہنی طرف والے کے داہنی طرف والے، اور بائیں طرف والے کے بائیں طرف والے اور جو سبقت لے گئے وہ تو سبقت ہی لے گئے وہی مقرب بارگاہ میں چین کے باغوں میں''

شقی لوگ اصحاب شمال ہوں گے یعنی ان کے بائیں ہاتھ میں نامہ اعمال ہوگا اصحاب شمال کی پھر مختلف قسمیں ہیں ان میں سے کچھ ''مطرودون'' ہوں گے یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے متعلق عذاب دینے کا اللہ تعالیٰ کا وعدہ ثابت ہو چکا ہے ایسے لوگوں کا ذکر اس آیت میں کیا گیا: ﴿وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ﴾ اور تحقیق ہم نے جہنم کے لئے پیدا کئے بہت سے جن اور انسان۔ اسی طرح حدیث قدسی میں بھی ان لوگوں کا ذکر کیا گیا" ھؤلاء خلقتھم للنار ولا ابالی" یہ لوگ ہیں جن کو میں نے جہنم کے لئے پیدا کیا ہے مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔

اصحاب شمال میں سے ایک گروہ وہ ہے جسے ''منافقون'' کہا جاتا ہے منافق وہ لوگ ہیں جن کو پیدائشی فطرت کے لحاظ سے تو اس قابل بنایا گیا تھا کہ یہ اپنے دلوں کو نور ایمان سے منور کر لیں لیکن رذیل کاموں (یعنی منافقت) اور گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے ان کے دل زنگ آلود ہو گئے وہ چوپاؤں والے اعمال (کھانے اور شہوات) اور درندوں والے اعمال (درندگی، چیر پھاڑنے) میں مبتلا ہو گئے شیطان کے مکر و فریب کے جال میں پھنس گئے یہاں تک کامل گناہگاروں والی ہیئت ان میں راسخ (پختہ) ہو گئی۔ ان کے نفسوں میں جو ملکہ یعنی نور ایمان کو حاصل کرنے والی جو استعداد پائی گئی تھی وہ

تاریک ہوگئی ان کے دلوں پر تاریکیوں کے انبار لگ گئے۔

وہ اس کیفیت سے متحیر (حیران) اور بھٹکنے والے ہوکر " لا الی ھؤلاء ولا الی ھؤلا " (نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے) کا مصداق بن گئے ان کے اعمال برباد ہوکر رہ گئے قیامت کے دن ندامت کی وجہ سے اور رب تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے سر جھکائے ہوں گے یہ لوگ سب سے زیادہ شدید عذاب میں مبتلا ہوں گے رب تعالیٰ نے ان کے عذاب کو یوں ذکر فرمایا ﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ﴾ بیشک منافق دوزخ کے سب سے نیچے طبقہ میں ہوں گے۔ یہ لوگ پہلے درجہ والے یعنی "مطرودون" سے بہت ہی برے حال میں ہوں گے۔

دو فریق اصحاب یمین اور اصحاب دنیا میں سے بعض وہ ہوں گے جن کو "اھل فضل وثواب" کہا جائے گا یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے ایمان لایا اور اچھے عمل کئے کہ جنت مل جائے وہ جنت کی امید رکھنے والے ہوں گے اور اس پر راضی بھی ہوں گے ان کے متعلق ہی رب تعالیٰ نے فرمایا "فوجدوا ما عملوا حاضرا" اپنے اعمال (کے بدلہ) کو سامنے پالیں گے۔

البتہ ان کے مدارج جنت میں ان اعمال کے مطابق ہوں گے۔ اعمال کے درجات کی بلندی جنت میں بلندی مرتبت کا سبب بنے گی۔

ان اصحاب یمین اور اصحاب دنیا میں سے ہی بعض وہ لوگ ہوں گے جن کو "اھل رحمۃ" کہا جائے گا یہ وہ لوگ ہوں گے جو اپنے نفوس کی سلامتی پر باقی رہیں گے ان کے دل صاف ہوں گے ان کو اپنے اعمال کے کمالات کے مطابق درجات حاصل نہیں ہوں گے بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل ورحمت کے مطابق مدارج حاصل ہوں گے۔ یعنی جس طرح رب تعالیٰ کا فضل ہوگا کسی پر کم اور کسی پر زیادہ اسی کے مطابق ان کے درجات ہوں گے۔

ان اصحاب یمین اور اصحاب دنیا میں سے ہی بعض "اھل عفو" ہوں گے یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے نیک اور برے عمل ملے جلے ہوں گے۔

اھل عفو کی پھر دو قسمیں ہیں ایک وہ ہوں گے جن کو صحیح عقیدہ پر قائم رہنے اور گناہوں پر جے نہ

رہنے اور کم لغزش کے واقع ہونے اور توبہ کرنے کی وجہ سے مکمل طور پر معاف کر دیا جائے گا ان لوگوں کے حق میں ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمْ حَسَنٰتٍ﴾ ان لوگوں کی غلطیوں کو رب تعالیٰ نیکیوں سے بدل دے گا۔

دوسرے وہ لوگ ہوں گے جن کو کچھ دیر کے لئے عذاب دیا جائے گا کیونکہ ان کے معاصی (گناہ) ان میں راسخ تھے۔ یہاں تک کہ جب یہ اپنے گناہوں کی میل کچیل سے پاک ہو جائیں گے تو ان کو نجات دے دی جائے گی یہ اصحاب عدل وعقاب ہوں گے ان لوگوں کے متعلق ہی رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْ ہٰؤُلَآءِ سَیُصِیْبُہُمْ سَیِّاٰتُ مَا کَسَبُوْا﴾

وہ لوگ جو ان میں سے (اپنی جانوں پر) ظلم کرنے والے ہوں گے ان کو انکے کسب کردہ گناہ پہنچیں گے (یعنی وہ عذاب میں مبتلا ہوں گے) لیکن البتہ پھر انکو رحمت اپنے دامن میں لے لی گی۔

السابقون المقربون اللہ تعالیٰ کے محبوب لوگ ہیں۔ ان کے پھر دو درجے ہیں۔ ایک تو وہ ہیں، جن کے متعلق رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿جَاہِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِہَادِہٖ﴾ کہ انہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا جیسا جہاد کرنے کا حق ہے یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا جیسا رجوع کرنے کا حق ہے ان کو ہی اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ کی ہدایت دی۔ محبوبین کا ایک اور درجہ یہ ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے ازلی طور پر ہی چن لیا محبوب بنا لیا اور صراط مستقیم کی ہدایت دی مقربین کے یہ دونوں درجے ''اہل اللہ'' کہلاتے ہیں۔

نتیجہ یہ حاصل ہوا: عاقبت کے لحاظ پر بندوں کی ابتدائی طور پر تین قسمیں ہیں اصحاب الشمال، اصحاب الیمین، السابقون المقربون اصحاب الشمال کی دو قسمیں مطرودون (یعنی کفار) اور منافقون

اصحاب یمین کی چار قسمیں ہیں: اہل فضل وثواب، اہل رحمۃ، اہل عفو، اصحاب عدل وعقاب۔

اس طرح دو اور چار مل کر کل چھ قسمیں ہوئیں۔ ساتویں قسم السابقون المقربون ہیں جن کو محبوبین خدا کہا جاتا ہے

اب توجہ فرمائیں: قرآن پاک تمام لوگوں کو راہ دکھانے کے لئے آیا ہے اسی وجہ سے

اس کی شان میں "ھدی للناس" کہا گیا ہے لیکن اس کی ہدایت کو دو گروہوں کی قسمت میں قبول کرنا نہیں وہ دونوں فرقے اشقیاء کے ہیں جن کو اصحاب شمال کہا گیا ہے ان میں سے مطرود دون یعنی کفار کے دل تو کفر کے زنگ سے سیاہ ہو چکے ہیں ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ان کے دلوں میں ہدایت کو قبول کرنے کی استعداد ہی ختم ہو چکی ہے۔ دوسرا فرقہ منافقین کا ہے انہوں نے بھی اپنے فاسد اعتقاد کی وجہ سے اپنی استعداد کو زائل کر دیا ہے لہٰذا وہ بھی ہمیشہ جہنم میں رہنے والے ہیں وہ بھی ہدایت کو قبول کرنے والے نہیں۔ باقی پانچ فرقے ہدایت کو قبول کرنیوالے ہیں وہی ﴿ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ﴾ کا مصداق ہیں البتہ ان کو تقوی کے مختلف مدارج حاصل ہیں۔

مقربین ومحبوبین اگرچہ رب تعالیٰ کے پسندیدہ ہوتے ہیں لیکن وہ بھی کتاب اللہ کی ہدایت کے محتاج ہوتے ہیں اس لئے کہ اور ہی زیادہ رب تعالیٰ کے قرب کو حاصل کرنے کے محتاج ہوتے بلکہ فناء فی اللہ کے درجہ کے حصول کے محتاج ہوتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کا محبوب کون ہو سکتا ہے ان کے متعلق بھی رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿کَذٰلِکَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَکَ﴾ اسی طرح ہم آپ کے دل کو اس کے ذریعے ثابت کرتے ہیں اور ارشاد فرمایا:

﴿وَکُلًّا نَّقُصُّ عَلَیْکَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَکَ﴾

''ہم آپ پر رسولوں کی خبریں بیان کرتے ہیں اس کے ذریعے آپ کے دل کو ثابت رکھتے ہیں''

واضح ہوا کہ محبوبین بھی قرآن پاک اور رب تعالیٰ کی ہدایت کے ذریعے اور بلند درجات رکھتے ہیں۔ اب نتیجہ واضح ہو گیا کہ دو بد بخت گروہوں کے بغیر پانچ قسم کے لوگوں کے دلوں فطرت اصلیہ باقی رہتی ہے ان کو ہدایت قبول کرنے کی استعداد حاصل ہوتی ہے۔ وہ شرک کے زنگ سے محفوظ ہوتے ہیں شک وشبہ سے انکے دل پاک وصاف ہوتے ہیں ان کے نفوس پاکیزہ ہوتے ہیں ان کا نور فطری باقی ہوتا ہے انہوں نے یوم میثاق کا وعدہ توڑا نہیں ہوتا لہٰذا وہ ہدایت کو قبول کرتے ہیں۔ ان کو تقوی کے ان کے مراتب کے مطابق مدارج حاصل ہوتے ہیں بس یہی تقوی مقدمہ ایمان ہے کیونکہ اسی میں شرک سے بچنا بھی ہے شرک سے اجتناب کے بغیر ایمان کا حصول نہیں۔

(از ابن عربی)

﴿ اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰـھُمْ یُنْفِقُوْنَ ☆ وَالَّـذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ ج وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ ﴾

☆ وہ جو بے دیکھے ایمان لائیں، اور نماز قائم رکھیں، اور ہماری دی ہوئی روزی میں سے ہماری راہ میں اٹھائیں۔ اور وہ کہ ایمان لائیں اس پر جو اے محبوب تمہاری طرف اترا اور جو تم سے پہلے اترا، اور آخرت پر یقین رکھیں۔

☆ اور وہ غیب پر ایمان لائے ہیں۔ اور نماز قائم کرتے ہیں۔ اور جو رزق ہم نے ان کو دیا اس سے وہ خرچ کرتے ہیں۔ اور وہ جو ایمان لائے ہیں اس پر (اے محبوب) جو آپ پر نازل کیا گیا اور جو نازل کیا گیا، آپ سی پہلے، اور آخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں۔"

متقین کی صفات: یہاں سے متقین کی صفات بیان کی گئی ہیں کہ متقی وہ لوگ ہیں۔ جو غیب پر ایمان لا چکے ہوں ہمیشہ کے لئے نماز ادا کرنے کے پابند ہوں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو رزق دیا ہے اس سے وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ بھی کرتے ہیں اور جو نبی کریم ﷺ پر نازل ہوا اس پر بھی ان کا ایمان ہو اور آپ سے پہلے انبیاء کرام پر جو نازل ہوا اس پر بھی ان کا ایمان ہو اور آخرت پر بھی کامل یقین رکھتے ہوں۔ یہ تمام متقین کی صفات اس وقت معتبر ہوں گی جب کہ یہ کہا جائے کہ متقی وہ ہوتا ہے جو نیکیوں پر عمل کرنے والا ہو اور برائیوں کو چھوڑنے والا ہو۔ فعل یا تو دل سے متعلق ہوگا یا ظاہری اعضاء سے دل سے جس فعل کا تعلق ہے وہ ﴿ اَلَّـذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ ﴾ میں ذکر ہے اسی کے ضمن میں شرک کو چھوڑنا بھی ثابت ہوگا اور وہ فعل جن کا تعلق ظاہری اعضاء سے ہے ان کی بنیاد نماز، زکواۃ اور صدقہ ہیں۔

اس لئے کہ عبادات یا بدنیہ ہیں ان میں اعلیٰ نماز ہے اور عبادات یا تو مالیہ ہیں ان میں سے اعلیٰ

زکوٰۃ ہے اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "الصلوۃ عماد الدین" نماز دین کا ستون ہے اور ارشاد فرمایا "الزکوۃ قنطرۃ الاسلام" زکواۃ اسلام کا پل ہے۔ نماز کے ضمن میں بھی برائیوں کا چھوڑنا ثابت ہو جائے گا کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ﴾ بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے بچاتی ہے یہ قول اکثر حضرات کا ہے کہ اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ سے لے کر ھُمْ یُوْقِنُوْنَ تک متقین کی صفات ہیں اور متقین کی تفسیر ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ کا موقف:

" والاقرب ان لا تکون ھذہ الاشیاء تفسیرا لکونھم متقین " (ماخوذ از کبیر)

زیادہ قریب بات یہ ہے کہ ان اشیاء کو متقین کی تفسیر نہ بنایا جائے اس لئے کہ کمال سعادت اس وقت تک حاصل نہیں ہوگی جب تک برائیوں کو نہ چھوڑے اور نیکیوں پر عمل نہ کرے۔ برائیوں وغیرہ کو چھوڑنا تقوی ہے اور فعل کا تعلق دل سے ہوا تو ایمان اور ظاہری اعضاء سے ہوا تو نماز، زکواۃ، تقوی کو پہلے ذکر کرنے کی یہ وجہ ہے کہ انسان کا دل تختی کی مثال ہے جس پر عقائد صحیحہ کے نقش ثابت کرنے ہیں وہ اس وقت تک نہیں منقش نہیں ہوں گے جب تک فاسد الفاظ سے تختی صاف نہیں ہوگی اسلئے واضح ہوا کہ تقوی یعنی غیر مناسب چیزوں کو چھوڑنا پہلے ہے اور مناسب چیزوں کو حاصل کرنا بعد میں ہے۔

ایمان کی تعریف:

"الایمان فی الشرع ھو التصدیق بما جاء بہ الرسول ﷺ من عند اللہ تعالیٰ"

شرع میں ایمان اس چیز کا نام ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے لایا اس کی تصدیق کرنا یعنی ایمان کے لئے اتنا ہی ضروری ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے لایا ہے میں اسے دل سے تسلیم کرتا ہوں یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت انبیاء کرام کی نبوت ملائکہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق تمام آسمانی کتب، آخرت پر اجمالی طور پر ایمان کافی ہے۔

تفصیلی طور پر نماز، نماز کے اوقات، نماز کی رکعتیں وغیرہ کو جاننا ان پر عمل کرنا عملیات میں داخل ہو جائے گا۔

تصدیق کیا ہے؟ " التصديق اذعان حكم المخبر وقبوله وجعله صادقا "

تصدیق یہ ہے کہ خبر دینے والے کے حکم کو یقینی طور پر مان لینا جائے اور خبر دینے والے کو سچا ماننا۔ چونکہ ایمان تصدیق ہے ایمان کا لفظ امن سے ہے کہا جاتا ہے " امنت زیدا " میں نے زید کو امن دیا۔ تو گویا کہ ایمان کا مطلب ہوگا " آمن به آمنه التكذيب والمخالفة " فلاں پر ایمان لایا کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اسے تکذیب اور مخالفت سے امن دیا۔

لفظ ایمان کبھی بلا واسطہ متعدی ہوتا ہے جیسا کہ آمنہ لیکن اس میں معنی امن دینا ہے اور کبھی لام کے واسطہ سے متعدی ہوتا ہے جیسا کہ " وما انت بمؤمن لنا " اسی طرح کبھی باء کے واسطہ سے متعدی ہوتا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے " ان تؤمن بالله " ان دونوں صورتوں میں ایمان بمعنی تصدیق کے ہوتا ہے۔

حدیث جبریل میں ایمان کی تعریف سے بھی واضح ہوگا کہ مطلب وہی ہے جو بیان کیا گیا کہ ایمان " التصديق بما جاء به الرسول من عند الله تعالیٰ " ہے کیونکہ حدیث شریف میں ہے جب سائل نے کہا " اخبرني عن الايمان " مجھے ایمان کے متعلق خبر دو۔ تو اس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" ان تؤمن بالله وملائكته وكتبه ورسله واليوم الآخر وتؤمن بالقدر وشره " (بخاری ومسلم)

" کہ تم اللہ پر ایمان لاؤ اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر ایمان لاؤ اور تم ہر خیر و شر کی تقدیر پر ایمان لاؤ "

یہ بھی خیال رہے کہ صرف دل میں یہ آجانا کہ خبر سچی ہے خبر دینے والا سچا یہ اس وقت تک تصدیق نہیں جب تک کہ اسے تسلیم نہ کیا جائے تصدیق کا معنی فارسی میں ہے " گرویدن " یعنی بغیر تکبر، بغیر عناد بغیر انکار کے تسلیم کر لینا۔

ملک المدرسین کا ارشاد: استاذ استاذی حضرت علامہ حافظ عطا محمد بندیالوی رحمہ اللہ فرماتے تھے

کہ منطق کے بغیر ایمان ہی نہیں ابھی علامہ تفتازانی رحمہ اللہ کا قول دیکھ کر یہ یاد آیا:

"وهو ای المعنی الذی یعبر عنه بگر ویدن معنی التصدیق المقابل التصور حیث یقال فی اوائل علم المیزان العلم اما تصور و اما تصدیق"

"تصدیق کا معنی جو "گرویدن" کیا ہے یہ وہی معنی ہے جو اس تصدیق کا ہے جو تصور کے مقابل ہے جس کا منطق کے ابتداء میں ذکر کیا جاتا ہے کہ علم یا تصور ہے یا تصدیق"

ملک المدرسین رحمہ اللہ کا قول واضح سمجھ آ گیا کہ ایمان بغیر تصدیق کے نہیں اور تصدیق منطق کا مسئلہ ہے مؤمن ہونے کا دعویٰ بھی ہو منطق کی مخالفت بھی ہو عقل سے بعید ہے راقم نے تو یہی سمجھا جن کو منطق آتی نہیں وہی مخالفت کرتے ہیں۔ ورنہ استاذی المکرم حضرت مولانا محمد اشرف سیالوی فرماتے ہیں۔ منطق کے بغیر مولوی خشی ہوتا ہے یعنی ادھورا مولوی ہوتا ہے۔ اکثر کتابوں کو نہیں سمجھ سکتا۔

(ماخوذ از شرح عقائد مع نبراس)

تصدیق کی چھ قسموں میں سے ایک مقبول:

سید الاولیاء حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی رحمہ اللہ نے داں بھچراں میں مولوی حسین علی دیوبندی سے سوال کیا (جب وہ بڑے متکبرانہ انداز پر مناظرہ کا چیلنج کر رہا تھا) کہ مولوی صاحب آیت مبارکہ ﴿قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ پر آپ کا ایمان ہے؟ مولوی صاحب نے کہا جی ہاں آپ نے فرمایا ایمان نام ہے۔ "تصدیق بما جاء به النبی ﷺ" کا اور تصدیق کی چھ قسمیں ان میں سے ایک مقبول ہے اور پانچ مردود وہ کیا ہیں؟ پھر حضرت پیر صاحب نے تھوڑی سی وضاحت اور فرمائی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کے علم "ما کان و مایکون" کے قائلین (جن کو وہ مولوی صاحب کافر کہتے تھے) آپ کے نزدیک اگر بالفرض مسلمان ہیں تو نزاع ہی نہیں اور اگر (تمہارے عقیدہ کے مطابق) وہ کافر ہیں تو کفر ایمان کی ضد ہے اور ایمان تصدیق ہے اور تصدیق چھ قسم ہے جن میں سے ایمان شرعی میں صرف ایک معتبر اور باقی مردود ہیں۔ ان کی آپ تفصیل بیان کریں کہ جو لوگ نبی کریم ﷺ کے علم "ما کان و مایکون" کے قائل ہیں آپ ان کو کافر کس وجہ سے کہتے ہیں وہ کون سی تصدیق پائی گئی ہے جس کی وجہ سے تم ان کو کافر کہہ رہے ہو۔ مولوی صاحب

جواب نہ دے سکے وہاں سے چلتے بنے۔ استاذ الاساتذہ، رئیس المحققین، استاذی المکرم حضرت علامہ محب النبی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ حضرت پیر صاحب نے متوسلین کی درخواست پر چھ قسموں کا ذکر فرمایا جن کا ماخذ حضرت شیخ اکبر رحمہ اللہ کی تصنیفات فتوحات مکیہ وغیرہ ہیں۔

(۱) **تصدیق بذاتہ** یعنی کسی صفت یا کسی دلیل کے بغیر ہی تسلیم کر لینا اور اس پر یقین رکھنا۔

(۲) **تصدیق بنعت ذاتہ** کسی صفت کو دیکھ کر اقرار کرنا اور تصدیق کرنا جیسا کہ کافروں سے زمین و آسمان کے خالق کے متعلق پوچھا جاتا تو وہ کہتے ''خالق اللہ ہے'' رب تعالیٰ نے اسے ان الفاظ مبارکہ سے بیان فرمایا ﴿ وَلَـئِـنْ سَـاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴾ اگر آپ ان سے سوال کریں زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا؟ تو وہ ضرور کہیں گے ''اللہ'' (نے ہی پیدا کیا)۔

(۳) **تصدیق بحالہ** مثلاً ایک تکلیف پیش آئی جو خدا کا نام لینے سے ٹل گئی اس سے ایک حال پیدا ہو گیا جس کی وجہ سے دل خود بخود (اس حال کی وجہ سے) تصدیق کرنے لگا۔

(۴) **تصدیق بربہ** یہ دیکھ کر کہ اللہ تعالیٰ تمام جہانوں کا رب ہے اس کی ربوبیت عامہ کو دیکھ کر تصدیق کر لی۔

(۵) **تصدیق بنعت ربہ** رب تعالیٰ کی ربوبیت خاصہ کو دیکھ کر تصدیق یعنی یہ خیال کرنا کہ مجھ پر رب تعالیٰ کا کتنا احسان ہے اور فلاں شخص پر کتنا احسان اس خاص ربوبیت کو دیکھتے ہوئے تصدیق کر لینا۔

(۶) **تصدیق بامر ربہ** اللہ تعالیٰ کے حکم کو ماننا اور اسی حکم کی وجہ سے تصدیق پائی جائے اور یقین کر لے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے مصطفےٰ کریم ﷺ نے پیش فرمایا ہے اسے تسلیم کرنا ہے یہی آخری تصدیق معتبر ہے اسی کا نام ایمان ہے پہلی تمام تصدیقات کفار کو بھی حاصل رہیں لیکن وہ مومن نہ بن سکے۔ (ماخوذ از مهر منیر ص ۴۴۰)

تنبیہ: اگر فرض کیا کہ کوئی شخص تصدیق کرتا ہے ان تمام امور کی جو نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ کی طرف سے لائے اور زبان سے اقرار بھی کرتا ہے اور ان پر عمل بھی کرتا ہے لیکن کافروں کی خاص

کفریہ علامات کو اگر وہ بھی اپنے کام میں لاتا ہے تو اسے کافر کہا جائے گا جس طرح کوئی شخص اپنے اختیار سے بت کو سجدہ کرے اس میں کوئی جبر اکراہ نہیں پایا گیا تو اسے کافر ہی کہا جائے گا۔اسی طرح اگر کسی شخص نے اپنے اختیار سے ''زنار'' باندھا تو اسے بھی کافر ہی کہا جائے گا(زنار بالضم والتشدید) یہ ایک دھاگہ ہوتا جو کافرلوگ اپنے آپ کی پہچان کرانے کے لئے گردن میں ڈالتے ہیں۔

الاقرار باللسان کاحکم: زبان سے ایمان لانا اور اقرار کرنا ایمان کے لئے کیا حیثیت رکھتا ہے اس میں دو مذہب ہیں ایک یہ ہے کہ تصدیق بالقلب (دل سے تسلیم کرنا) کی طرح ہی اقرار باللسان بھی ایمان کا رکن ہے البتہ فرق یہ ہے کہ تصدیق ایسا رکن ہے جو کسی وقت بھی سقوط کا احتمال نہیں رکھتا لیکن اقرار اکراہ (جبر) کی صورت میں ساقط ہو جاتا ہے۔

یعنی جب کافر کو قتل کرنے یا کسی عضو کے کاٹنے کی دھمکی دے کر کلمہ کفر زبان پر جاری کرنے کا کہیں تو مؤمن اپنے آپ کو بچانے کی غرض سے کلمہ کفر زبان پر جاری کردے تو اس کے لئے جائز ہے تاہم اگر صبر کرے اور اسے قتل کر دیا جائے تو وہ شہید ہوگا اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ .... الخ ﴾

اس آیت کریمہ میں کفر کرنے پر عذاب عظیم کی وعید بیان کی گئی لیکن جبریہ طور پر کفر کو زبان پر لانے کو عذاب عظیم سے مستثنیٰ قرار دیا۔دوسرا مذہب یہ ہے کہ رکن تو صرف تصدیق ہی ہے۔البتہ اقرار کو دنیا میں احکام ایمان جاری کرنے کیلئے شرط قرار دیا گیا ہے کیونکہ تصدیق دل کا کام ہے اس پر اطلاع ممکن نہیں اسی لئے اگر کوئی ظاہری طور پر ایمان کا دعوی کرے تو اسے مؤمن کہا جائے گا خواہ اسکے دل میں ایمان نہ ہو۔اگر چہ دل میں ایمان نہ ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ہاں کافر ہوگا لیکن اس کے ظاہری ایمان کی وجہ سے مؤمن اسے صاحب ایمان ہی سمجھیں گے اسے کافر سمجھ کر قتل نہیں کریں گے۔ اسکے مال کے ایسے ہی محافظ ہوں گے جس طرح حقیقی مومن کے مال کے محافظ ہوں گے۔اس کی نماز جنازہ ادا کریں گے اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کریں گے اگر کسی شخص کے دل میں تصدیق پائی جائے۔لیکن زبان سے ایمان کا اقرار نہ کرے تو اس پر ایمان کے احکام دنیا میں جاری نہیں کیے جائیں

گے اگر چہ اللہ کے ہاں وہ مومن شمار ہوگا اعمال کے نہ کرنے کی اگر سزا دینا مشیت ایزدی میں ہوتو پھر بھی آخر کار اسے جنت میں داخل کردیا جائے گا یہی مذہب حضرت شیخ ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ کا ہے۔

ایمان اور اسلام ایک کیسے؟ جب یہ لحاظ کیا جائے کہ اسلام کا معنی خضوع اور تسلیم کرنا ہے اور احکام کو قبول کرنا ان پر یقین کرنا ہے۔ تصدیق کا بھی یہی مطلب ہوگا اس معنی کے لحاظ پر ایمان اور اسلام ایک ہی ہیں اس پر یہ آیت دلالت کررہی ہے:

﴿ فَاخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴾

کیونکہ اس آیت میں لوط علیہ السلام کے ساتھ ان کے اہل جو مؤمن تھے ان کا ذکر کیا گیا ہے ان کو ہی مومن بھی کہا گیا ہے اور ان کو مسلمان کہا گیا ہے یہ مذہب اشاعرہ کا ہے۔

ایمان اور اسلام میں فرق کیسے؟ جب اسلام کا معنی صرف زبان سے اقرار کیا جائے۔ اور ظاہری طور پر تسلیم کرنا مراد لیا جائے اور ایمان کا معنی دل سے ماننا کیا جائے تو اب اسلام اور ایمان میں فرق ہوگا اس پر یہ آیت دلالت کررہی ہے ﴿ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا ﴾ اعراب نے کہا ہم نے ایمان لایا اے محبوب تم فرماؤ تم نے ایمان نہیں لایا لیکن تم کہو ''ہم نے اسلام لایا'' اسی طرح ایمان اور اسلام کی بھی علیحدہ علیحدہ تشریح کی گئی ہے۔

حدیث عمر میں رسول اللہ ﷺ نے جبرائیل کو سوالوں کے جوابات دیتے ہوئے فرمایا جبریل نے کہا ''یامحمد اخبرنی عن الاسلام '' اے محمد ﷺ مجھے اسلام کے متعلق خبر دیں۔ تو آپ نے فرمایا:

'' اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ وَتُقِيْمَ الصَّلٰوةَ
وَتُؤْتِيَ الزَّكٰوةَ وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ وَتَحُجَّ الْبَيْتَ اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَيْهِ سَبِيْلاً''

''تم یہ شہادت دو کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر اور کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں اور تم نماز ادا کرو اور زکواۃ دو اور رمضان کے روزے رکھو اور اگر تمہیں طاقت حاصل ہو تو بیت اللہ شریف کا حج کرو''

جب جبرائیل نے کہا ''فاخبرنی عن الایمان '' آپ مجھے ایمان کے متعلق خبر دیں تو آپ نے ارشاد فرمایا:

'' اَنْ تُؤْمِنَ بِاللهِ وَمَلٰئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ

خَیْرِهٖ وَشَرِّهٖ"

"یہ کہ تم اللہ تعالیٰ پر اس کے فرشتوں پر اس کی کتابوں پر اس کے رسولوں پر قیامت کے دن پر اور خیر وشر کی تقدیر پر ایمان رکھو"

اس حدیث سے بھی پتہ چلا کہ ایمان تصدیق کا نام ہے اور اسلام ظاہری تسلیم اور اعمال کا نام ہے یہ مذہب ماتریدیہ کا ہے لیکن راقم کے نزدیک یہ اختلاف فقط معنی کے اعتبار کا ہے جب اسلام کا معنی انقیاد و اذعان (تسلیم کرنا، یقین کرنا) کیا جائے تو ایمان اور اسلام ایک ہوگا اور جب اسلام کا مطلب صرف تسلیم کرنا لیا جائے اور ایمان کا معنی یقین کرنا لیا جائے تو فرق ہوگا۔ اسلئے کبھی ایمان اور اسلام ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں اور کبھی علیحد علیحدہ معانی میں۔ (از شرح عقائد نبراس)

غیب کیا ہے: کلام عرب میں غیب کہتے ہیں "کل ماغاب عنک" (ہروہ چیز جو تم سے غائب ہو) کو۔ اسی طرح سورج کے غروب ہونے پر بولتے ہیں "غابت الشمس اور تغیب الشمس اسی طرح وہ عورت جس کا خاوند اس سے غائب ہو جائے اسے "مغیبہ" کہا جاتا ہے اسی طرح پست زمین کو "غیبہ او غیابہ" کہا جاتا ہے اور گھنے جنگل کو "غیابہ" کہا جاتا ہے کہ ان میں انسان یا حیوان گم ہو جاتا ہے۔ (قرطبی)

غیب سے مراد: جو چیز حواس اور عقل میں نہ آسکے اس میں کامل طور پر غیبت پائی جاتی ہے۔

غیب کی دو قسمیں:

(۱) غیب کی ایک قسم یہ ہے کہ اس پر کوئی دلیل قائم نہ ہوسکے اسے ہی اللہ تعالیٰ نے مفاتح الغیب سے تعبیر فرمایا ارشاد باری تعالیٰ ہے "وعنده مفاتيح الغيب لا يعلمها الا هو" غیب کی چابیاں اسی کے پاس ہیں۔ انہیں کوئی نہیں جانتا سوائے اس کے۔

(۲) اور دوسری قسم غیب کی وہ ہے جس پر دلیل قائم ہوسکے جس طرح اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات اور نبوت اور اس سے متعلق احکام، شرائع، یوم آخرت اور اس کے احوال یعنی بعث، نشور، حساب، جزاء وغیرہ یہاں غیب سے مراد یہی قسم ہے۔ (روح البیان)

غیب کی ایک اور تقسیم:"واعلم ان الغیب غیبان غیب غاب عنک وغیب غبت عنه"
جان لے کہ بیشک غیب کی دو قسمیں ہیں ایک یہ ہے کہ جو تجھ سے غیب ہو اور دوسری یہ ہے کہ تو اس سے غائب ہو۔ پہلی قسم کا غیب یعنی جو تجھ سے غائب ہے وہ ہے عالم ارواح اس لئے کہ تو اس میں بحثیت روح کے موجود تھا جب رب تعالیٰ نے ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ (کیا میں تمہارا رب نہیں) کہا اس وقت بھی تو موجود تھا رب تعالیٰ کے خطاب کو سن رہا تھا آثار ربوبیۃ کا مشاہدہ کر رہا تھا ملائکہ موجود تھے انبیاء واولیاء کی ارواح کا تجھے تعارف کرایا گیا لیکن یہ سب کچھ تجھ سے غائب ہیں کیونکہ تیرے سامنے ظاہر تو وہ چیزیں ہوتی ہیں جن کو تو عقل اور حواس سے پہچانے عقل اور حواس کا تعلق عالم اجسام سے ہے۔
دوسری قسم جس سے تو غیب ہے وہ رب تعالیٰ کی ذات ہے جو تیری شہ رگ سے بھی زیادہ تیرے قریب ہے رب تعالیٰ نے فرمایا "نحن اقرب الیه من حبل الورید" لیکن تو اس سے دور ہے یعنی وہ تجھے جانتا ہے کہ تو کہاں ہے لیکن تو نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے اس لئے کہ وہ مکان سے پاک ہے یہاں غیب کا یہی معنی ہے کہ تو رب تعالیٰ کو نہ جاننے کی وجہ سے اس سے دور ہے گویا کہ تو اس سے غیب ہے ورنہ رب تعالیٰ سے غیب ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ (تاویلات نجمیه حاشیه جلالین)
اسی مضمون کو شیخ سعدی رحمہ اللہ نے ان الفاظ میں ذکر فرمایا:

یار نزدیک تر از من بمن است ویں عجب تر که من از وے دورم (گلستان)
میرا یار مجھ سے بھی میرے زیادہ نزدیک ہے لیکن تعجب اس پر ہے کہ میں اس سے دور ہوں

تنبیہ: غیب کی پہلی تقسیم میں پہلی قسم جو بیان کی گئی کہ جس پر کوئی دلیل قائم نہ کی جا سکے۔ اسکے متعلق تفسیر صاوی میں ذکر ہے "وما لم یدل علیه دلیل کالساعة ووقت نزول المطر ومافی الارحام......الخ" غیب کی وہ قسم جس پر کوئی دلیل قائم نہ ہو سکے اس کی مثال قیامت، بارش کے نازل ہونے کا وقت، ماں کے پیٹ میں کیا ہے کسی کی موت کہاں آئے گی اور کل کیا ہوگا۔ یہ پانچ چیزیں ہیں جن کو رب تعالیٰ نے "مفاتیح الغیب" سے تعبیر فرمایا ہے لیکن انکا علم ذاتی طور پر تو کسی کو حاصل نہیں البتہ رب تعالیٰ کی عطاء سے نبی کریم ﷺ کو انکا بھی علم حاصل ہے مشکوۃ کی شرح اشعۃ اللمعات

میں دوسری ہی حدیث کی شرح کو دیکھیں۔ مزید وضاحت انشاء اللہ کسی اور جگہ پر ذکر ہوگی۔

ایمان بالغیب: غیب پر ایمان کا مطلب کیا ہے یہاں تین چیزیں معتبر ہیں یہ تینوں کا مجموعہ مراد لیا گیا ہے:

(۱) جب "بالغیب" کو بواسطہ حرف جر "یؤمنون" کا مفعول بنایا جائے اور "باء" کو تعدیت کے لئے مانا جائے تو اب معنی یہ ہوگا "یؤمنون بماھو غائب عنھم" اس چیز پر ایمان لاتے ہیں جو ان سے غائب ہے۔ یعنی اس صورت میں غیب صفت ہے "مؤمن به" (جس چیز پر ایمان لانا ہے) کی نہ کہ مؤمن (ایمان لانے والے) کی اسی طرح جب "باء" مصاحبۃ کی ہو تو اس صورت میں بھی غیب سے مراد "مؤمن به" ہوگا یعنی جس چیز پر ایمان ہے وہ غائب ہے۔ (بیضاوی، شیخ زادہ)

وہ کیا چیز غائب ہے جس پر ایمان لانا متقین کی صفت ہے؟ اس میں مختلف قول ہیں لیکن وہ تمام ہی مراد ہیں بعض نے کہا غیب سے مراد "قضاء وقدر" ہے یعنی تقدیر پر ایمان رکھنا ایمان بالغیب ہے۔ بعض نے کہا اس سے مراد قرآن پاک اور اس میں جو غیوب مذکور ہیں یعنی قرآن پاک اور اس میں غیبی علوم جن کا ذکر ہے ان پر ایمان رکھنا ایمان بالغیب ہے۔

بعض نے کہا ہر وہ چیز جس کی خبر رسول اللہ ﷺ نے دی ہے لیکن وہ لوگوں سے غیب ہیں ان تمام پر ایمان لانا، ایمان بالغیب ہے جیسا کہ علامات قیامت، عذاب قبر، حشر ونشر، صراط (پل صراط) میزان اور جنت ودوزخ پر ایمان لانا۔

"قال ابن عطية وهذه الاقوال لاتعارض بل يقع الغيب على جميعها" ابن عطیہ نے کہا کہ ان تمام اقوال میں کوئی تعارض (اختلاف) نہیں بلکہ تمام پر غیب کا بولا جانا صحیح ہے اور تمام ہی ایمان بالغیب میں داخل ہیں۔ (از قرطبی)

تنبیہ: اللہ تعالیٰ غیب ہے یا نہیں؟ بعض حضرات نے کہا کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا بھی ایمان بالغیب ہے بعض حضرات نے کہا کہ اللہ تعالیٰ پر غیب کا اطلاق صحیح نہیں۔ اصل میں یہ اختلاف اس پر مبنی ہے کہ غیب کیا ہے بعض نے کہا غیب اسے کہا جاتا ہے کہ جو وقتی طور پر تو سامنے نہ ہو لیکن سامنے ہو سکے اس لحاظ

پر تو اللہ تعالیٰ اور اسکی صفات غیب نہیں کیونکہ دنیا میں عام آدمیوں کے سامنے آنے کا تصور نہیں۔

لیکن صحیح قول یہ ہے کہ یہ قید لگانی ''کہ غیب کے لئے ضروری ہے کہ وہ سامنے بھی آ سکے'' درست نہیں کیونکہ متکلمین حضرات فرماتے تھے "**ھذا من باب الحاق الغائب بالشاھد**" اس غائب سے مراد وہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات لیتے ہیں لہذا صحیح قول یہی ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات پر ایمان لانا بھی ایمان بالغیب ہی ہے۔ (از کبیر)

اس اختلاف کی ایک اور وجہ بھی ہے کہ بعض حضرات نے غیب اور غائب میں فرق بیان کیا ہے کہ غیب وہ ہے "**مالاتراہ انت**" جسے تو نہ دیکھ سکے اور غائب وہ ہے "**مالایراک ولاتراہ**" جو تجھے نہ دیکھ سکے اور تو اسے نہ دیکھ سکے۔ اس معنی کے لحاظ پر اللہ تعالیٰ پر غیب کا اطلاق صحیح ہے لیکن غائب کا اطلاق صحیح نہیں۔ (از روح المعانی)

لیکن راقم کے نزدیک یہ فرق کرنا کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتا اس لئے کہ غیب مصدر کو معنی للفاعل ماننے سے خود بخود غیب بمعنی غائب ہی ہوگا صحیح وجہ وہ ہی جو کبیر سے بیان کر دی۔

(۲) اگر ''بالغیب'' کو ''ملتبسین'' مقدر کے متعلق کر کے حال بنایا جائے تو اس صورت میں معنی یہ ہوگا'' **انھم لیؤمنون غائبین عنکم لا کالمنافقین**'' یعنی متقین وہ لوگ ہیں جو بیشک ایمان لاتے ہیں تم سے غائب ہو کر بھی منافقوں کی طرح نہیں کہ "**واذا لقوا الذین آمنوا قالوا آمنا**" ایمان والوں سے ملیں تو کہیں کہ ہم ایمان لائے اور "**واذا خلوا الی شیاطینھم قالوا انامعکم**" کافروں سے ملیں تو کہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

(۳) بعض حضرات نے کہا کہ غیب سے مراد قلب (دل) ہے کیونکہ وہ بھی مستور ہوتا ہے اب معنی یہ ہوگا "**یؤمنون بقلوبھم لا کمن یقولون بافواھھم مالیس فی قلوبھم**" کہ وہ دل سے ایمان لاتے ہیں ان لوگوں (منافقین) کی طرح نہیں جو منہ سے کہتے ہیں اور دل سے نہیں مانتے۔

حاصل کلام: اب تک کی گئی بحث سے حاصل یہ ہوا کہ متقین کی علامتوں میں سے ایک علامت یہ ہے کہ وہ دل سے ظاہر طور پر یعنی لوگوں کی موجودگی میں اور غیب طور پر یعنی لوگوں کی غیر موجودگی میں

ہراس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جن کا نبی کریم علیہ السلام نے بیان فرمایا ہے بیشک انہیں وہ نظر آ رہیں۔

فائدہ: ایمان کی دو قسمیں ہیں تقلیدی اور تحقیقی پھر تحقیقی کی دو قسمیں ہیں استدلالی اور کشفی پھر یہ دونوں یعنی استدلالی اور کشفی علم کی کسی حد پر رکتے ہیں یا نہیں۔ استدلالی جو علم کی ایک حد تک رک جائے اسے علم الیقین کہتے ہیں کشفی جو علم کی ایک حد تک رک جائے اس کی پھر دو قسمیں ہیں عینی جو آنکھوں سے نظر آئے یعنی مشاہدہ کیا جائے پھر مانا جائے یہ عین الیقین ہے ایک اور قسم ہے حقی جسے شہود ذاتی کہا جاتا ہے وہ چیز بذاتہ خود حاضر ہو جائے اسے حق الیقین کہا جاتا ہے۔

یہ علوم غیبیہ نہیں کہلاتے بلکہ غیبیہ وہ ہیں جو کسی حد پر نہ رکیں ان کا تعلق دل سے ہے مشاہدہ سے نہیں پھر دل کو یہ علوم غیبیہ اس وقت حاصل ہوں گے جب وہ سعادات کی طرف میلان کرتے ہوئے صرف سعادات باقیہ کی طرف میلان کرے سعادات بدنیہ خارجیہ جو انسان کو دنیا کی طرف بھی مشغول کردیں ان سے احتراز حاصل ہو۔

(از ابن عربی)

ایمان بالغیب کی افضلیت پر احادیث:

"عن عبد الرحمن بن یزید قال کنا عند عبد اللہ بن مسعود جلوسا فذ کرنا اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم وماسبقونا به فقال عبد اللہ ان امر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کان بینا لمن راہ والذی لا الہ غیرہ ما آمن احد قط ایمان افضل من ایمان بغیب ثم قرأ الم ذلک الکتاب لاریب فیه هدی للمتقین الذین یؤمنون بالغیب الی قوله المفلحون ...... وهکذا رواہ ابن ابی حاتم وابن مردویه والحاکم فی مستدرکه من طرق عن الاعمش به وقال الحاکم صحیح علی شرط الشیخین ولم یخرجاہ" (ابن کثیر)

"عبدالرحمٰن ابن یزید نے کہا کہ ہم عبداللہ ابن مسعود کے پاس بیٹھے ہوئے تھے ہم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام اور اپنے سے پہلے گزرے ہوئے حضرات کا ذکر کیا تو عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جن لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے ان کے سامنے تو آپکا معاملہ بہت واضح تھا قسم ہے اس ذات کی جس کے بغیر اور کوئی معبود نہیں کسی شخص کا ایمان اسکے ایمان سے افضل نہیں جس کا ایمان بالغیب

ہو پھر آپ نے اس پر دلیل قائم کرتے ہوئے " الٓمّٓ ذٰلِکَ الْکِتَابُ " سے لے کر
" اُولٰئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ " تک آیات کو پڑھا"
کیونکہ ان آیات میں ایمان بالغیب کی فضیلت بیان کی گئی ہے:

☆ " عن بن محیریز قال قلت لابی جمعة حدثنا حدیثا سمعته من رسول الله ﷺ قال نعم احدثک حدیثا جیدا تغدینا مع رسول الله ﷺ ومعنا ابو عبیدة بن الجراح فقال یارسول الله هل احد خیر منا اسلمنا معک و جاهدنا معک قال نعم قوم من بعدکم یؤمنون بی ولم یرونی " (ابن کثیر)

ابن محیریز نے کہا میں نے ابو جمعہ کو کہا کہ ہمیں کوئی حدیث بیان کریں جو تم نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہو انہوں نے کہا ہاں میں تمہیں ایک عمدہ حدیث (جسے تم تابعین یقیناً زیادہ پسند کرو گے) بیان کرتا ہوں ہم نے رسول اللہ ﷺ کی معیت میں صبح کا کھانا کھایا ہمارے ساتھ ابوعبیدہ ابن جراح بھی تھے انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ کیا ہم سے بھی بہتر کوئی ہوگا کہ ہم نے آپ کی موجودگی میں اسلام قبول کیا آپ کی معیت میں جہاد کیا؟ آپ نے فرمایا ہاں (تم سے بہتر) وہ قوم ہے جو مجھ پر ایمان لائیں گے حالانکہ انہوں نے مجھے دیکھا نہیں ہوگا۔

" عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده قال قال رسول الله ﷺ ای الخلق اعجب الیکم ایمانا قالوا الملائکة قال ومالهم لایؤمنون وهم عند ربهم قالوا فالنبیون قال ومالهم لایؤمنون والوحی ینزل علیهم قالوا فنحن قال ومالکم لاتؤمنون وانا بین اظهر کم قال فقال رسول الله ﷺ الا ان اعجب الخلق الیّ ایمانا لقوم یکونون من بعدکم یجدون صحفافیها کتاب یؤمنون بما فیها " (ابن کثیر)

" عمرو ابن شعیب اپنے باپ، دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم مخلوق میں سے کس کے ایمان پر تعجب کرتے ہو صحابہ کرام نے عرض کیا فرشتوں کے ایمان پر آپ نے فرمایا کہ انہیں کیا تھا کہ وہ ایمان نہ لائے جب کہ وہ اپنے رب تعالیٰ کے حضور تھے پھر صحابہ کرام نے عرض کیا کہ انبیاء کرام کے ایمان پر آپ نے فرمایا کہ انہیں کیا تھا کہ وہ ایمان نہ لاتے جب ان کے پاس وحی نازل ہوتی پھر صحابہ کرام نے عرض کیا کہ ہم ہوں گے (یعنی ہمیں اپنے ایمان لانے پر تعجب ہے) آپ نے فرمایا

تمہیں کیا تھا کہ تم ایمان نہ لاتے جب کہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں راوی کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خبردار بیشک سب سے زیادہ تعجب ان لوگوں کے ایمان پر ہے جو میرے بعد ہوں گے صرف قرآن کو کتابی شکل میں دیکھ کر اس کے احکام پر ایمان لے آئیں گے"۔

تنبیہ: یہ خیال رہے کہ کسی غیر صحابی کو صحابی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں کیونکہ حالت ایمان میں ایک لحہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں گزارنا پھر اسی پر دنیا سے رخصت ہونا تمام عبادات سے عظیم تر ہے ہاں البتہ بعد میں آنے والوں کا ایمان لانا جب کہ نبی کریم ﷺ کو دیکھا نہیں آپ کے معجزات وکمالات کو نہیں دیکھا یہ باعث تعجب ہے درحقیقت یہ بھی کمال میرے پیارے مصطفی ﷺ کا ہی ہے کہ تاقیامت آپ سے محبت کرنے والے آپ کی ذات پر گرویدہ رہیں گے نہ دیکھنے کے باوجود ایمان لائیں گے ان کا اس طرح ایمان لانا یقیناً قابل تعریف ہے۔

نتیجہ یہ نکلا: نبی کریم ﷺ نے جو تعلیم فرمائی جو ہدایت دی اس کے مطابق ہی ایمان لانا ایمان بالغیب ہوا آپ کی تعلیمات سے ہٹ کر کسی چیز کو صرف عقل سے ماننے کا نام ایمان ہی نہیں۔ ایمان بالغیب تو بعد کی بات ہے۔

"**ویقیمون الصلوۃ**" یہاں سے متقین کی دوسری صفت بیان کی جارہی ہے کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں۔ پہلی صفت بیان کی وہ ایمان بالغیب رکھتے ہیں یعنی ایمان تمام اعمال کے لئے اصل ہے کیونکہ ایمان کے بعد ہی اعمال کی کوئی حیثیت ہوسکتی ہے:

"من اخل بالاعتقاد وحده فهو منافق ومن اخل بالاقرار فهو كافر ومن اخل بالعمل فهو فاسق"

جس شخص نے زبان سے تو اقرار کیا لیکن اعتقاد نہ رکھا وہ منافق ہے، جس نے اقرار ہی نہیں وہ کافر ہے خواہ دل میں اعتقاد بھی نہ ہو اور زبان سے اقرار بھی نہ ہو وہ عنداللہ بھی کافر ہے اور دنیاوی احکام کے لحاظ سے بھی کافر ہے خواہ دل میں اعتقاد ہو لیکن زبان سے اقرار نہ ہو وہ بھی دنیاوی احکام کے لحاظ سے تو کافر ہی ہے البتہ عنداللہ مؤمن ہوگا تاہم اقرار نہ کرنے کی وجہ سے اور اعمال کے نہ پائے جانے کی وجہ سے درجہ فسق میں ضرور ہوگا۔ اور اگر زبان سے اقرار بھی ہو دل میں اعتقاد بھی صرف اعمال میں کوتاہی کرتا ہو تو اسے فاسق کہا جائے گا۔

اقامۃ الصلوۃ کے چند معانی: (۱) اگر یہ لفظ مراد لیا جائے " اقام العود " سے (لکڑی کو درست کرنا) تو اس وقت معنی ہوگا نماز ادا کرتے وقت تعدیل ارکان سے صحیح طور پر ادا کرنا نماز کے فرائض، سنن، مستحباب میں خلل نہ واقع ہونے دینا۔

(۲) اگر یہ ماخوذ ہو " قامت السوق " سے تو اس صورت میں معنی مراد ہوگا ہمیشگی کرنا، یعنی متقین کی ایک علامت یہ ہے وہ نماز ہمیشہ پابندی سے ادا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلٰوتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ﴾ اور وہ لوگ اپنی نمازوں پر محافظت رکھتے ہیں اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿اَلَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ﴾ وہ لوگ اپنے نمازیں ہمیشہ ادا کرتے ہیں۔ اسی معنی پر دلالت کررہے ہیں۔

قامت السوق اسی وقت بولتے ہیں جب بازار جاری ہو کیونکہ قامت السوق کا عربی میں معنی " نفقت السوق " کرتے ہیں جو کاسد کا مد مقابل لفظ ہے یعنی نفق میں جاری ہونا جید ہونا اور کاسد کا معنی کھوٹا ہونا۔ گویا کہ جب نمازوں پر ہیشگی کرے گا تو اس کا عمل جاری رہے گا اور جب نمازوں کو ضائع کرے گا تو اس کا عمل کھوٹا ہوگا۔

(۳) کہا جاتا ہے " قامت الحرب علی ساقها " جنگ بھرپور جاری ہے اس کے مقابل لفظ استعمال ہوتا ہے " قعد عن الامر " اس نے اپنے معاملات میں سستی کردی۔ اس معنی کے لحاظ سے مطلب ہوگا کہ وہ نماز ادا کرنے مین چستی سے کام لیتے ہیں کوئی سستی نہیں کرتے۔ (از کبیر)

تمام معانی کو جامع عبارت:

" ویقیمون الصلوۃ ای یداومون علیها فی مواقیتها بحدودها واتمام ارکانها وحفظها من ان یقع فیها خلل فی فرائضها وسننها و آدابها " (خازن، وکذا فی معالم التنزیل)

وہ نماز قائم کرتے ہیں یعنی تمام نمازوں کو اپنے اپنے اوقات میں ہمیشہ ادا کرتے ہیں ان کی حدود کا لحاظ کرتے ہیں یعنی اس طرح نماز ادا کرتے ہیں جیسا کہ نماز ادا کرنے کا حق رکھتے ہیں نماز کے ارکان کو مکمل طور پر ادا کرتے ہیں اور نماز کے فرائض، سنن اور مستحبات میں کوئی خلل واقع نہیں ہونے دیتے۔

صلوۃ کے معانی: راقم کو خوب یاد ہے جب کہ راقم جامعہ نعیمیہ گڑھی شاہو لاہور میں زیر تعلیم تھا۔

ایک مرتبہ جامعہ میں حضرت قمر الاسلام خواجہ قمر الدین سیالوی رحمہ اللہ تشریف لائے۔ راقم کے استاذ مکرم حضرت مولانا محمد اشرف مدظلہ العالی آپکے مرید ہونے کی وجہ سے سیالوی کہلاتے ہیں۔ استاد محترم وہاں جامعہ میں اس وقت مدرس تھے۔ حضرت قمر الاسلام کی آمد پر استاذی المکرم حضرت مولانا مفتی محمد حسین رحمہ اللہ مہتمم جامعہ نعیمیہ نے تمام طلباء کو ایک جگہ جمع کر کے حضرت کی زیارت اور آپ کے ارشادات گرامی کو سننے کا اہتمام فرمایا۔ اس مختصر خطاب میں حضرت قمر الاسلام رحمہ اللہ نے فرمایا ''صلوۃ'' کے بیاسی معانی مجھے یاد ہیں۔ سبحان اللہ! کتنی عظیم علمی شخصیت تھی آپ بالواسطہ میرے استاذ مکرم بھی ہیں اور میرے مرشد بھی کیونکہ استاذی المکرم آپ کے شاگرد بھی ہیں اور مرید بھی راقم گولڑوی ہونے کی وجہ سے بالواسطہ سیالوی بھی ہے۔

یہاں راقم قرطبی سے چند معانی نقل کر رہا ہے:

(۱) صلوۃ بمعنی دعاء...... نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔ " **اذا دعی احدکم الی طعام فلیجب فان کان مفطرا فلیطعم وان کان صائما فلیصل** " جب کسی شخص کو طعام کی دعوت دی جائے تو وہ قبول کرے اگر روزہ دار نہیں تو کھانا کھالے اور اگر روزہ دار ہے تو (اس شخص کیلئے) دعاء کرے۔ بعض حضرات نے اس حدیث پاک میں "**فلیصل**" کا معنی یہ کیا ہے کہ اس کے گھر دو رکعت نفل ادا کر کے لوٹ آئے۔ اسی طرح قرآن پاک میں "**وصل علیهم**" بھی دعا کے معنی میں استعمال ہے۔

(۲) صلوۃ بمعنی نماز...... قرآن پاک میں اس معنی میں بہت جگہ استعمال ہے۔ ''**واقیموا الصلوۃ**'' نماز قائم کرو۔

(۳) صلوۃ بمعنی رحمت...... جیسا کہ حدیث شریف میں ہے "**اللهم صل علی محمد**...... الخ" اے اللہ محمد ﷺ پر رحمت بھیج۔

(۴) صلوۃ بمعنی عبادت...... جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔
﴿وَمَا كَانَ صَلٰوتُهُمْ عِندَ الْبَيْتِ﴾ یہاں صلوۃ بمعنی عبادت ہے۔

(۵) صلوۃ بمعنی نوافل...... "**وامر اهلک بالصلوۃ**" یہاں صلوۃ نوافل ادا کرنے کے معنی

میں استعمال ہے۔

(۶) صلوۃ بمعنی تسبیح ...... " فلولانہ کان من المسبحین " اس آیت میں اگرچہ تسبیح بمعنی صلوۃ کے استعمال ہے لیکن اسی طرح صلوۃ کا معنی بھی تسبیح آیا ہوا ہے۔

(۷) صلوۃ بمعنی قراءت ...... جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے "ولا تجھر بصلوتک" اس مقام پر صلوۃ قراءۃ کے معنی میں استعمال ہے۔

(۸) صلوۃ بمعنی تحریک الصلوین ...... نماز پڑھتے ہوئے رکوع وغیرہ میں جاتے ہوئے انسان چونکہ اپنی ٹانگوں وغیرہ کو ہلاتا ہے۔

کیونکہ تحریک الصلوین کا زیادہ مشہور معنی سرین کے دوطرفوں کو ہلانا لیکن صحیح یہ ہے کہ ران سے لے کر ٹخنے تک تمام ٹانگ کو شامل ہے۔ اسی معنی کے لحاظ سے گھوڑ دوڑ میں دوسرے نمبر پر آنے والے گھوڑے کو مصلی کہا جاتا ہے گویا کہ پہلے نمبر والے گھوڑے کے پچھلے حصہ پر دوسرے نمبر پر آنے والے گھوڑے کا سر ہوتا ہے۔

(۹) صلوۃ بمعنی دم کی اصل ...... جب صلوۃ کا لفظ "صلا" سے ماخوذ ہو تو معنی یہ ہوگا "مغرز الذنب من الفرس" گھوڑے کی دم جہاں سے شروع ہوئی، اسی معنی کے لحاظ پر بھی دوسرے نمبر پر آنے والے گھوڑے کو مصلّی کہا جائے گا کہ اس کا سر اگلے گھوڑے کی دم کی اصل پر ہوتا ہے۔

اسی معنی کے لحاظ سے صلوان کا معنی اثنان آتا ہے اسی معنی پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد بھی دلالت کررہا ہے "سبق رسول اللہ ﷺ وصلی ابوبکر وثلث عمر" رسول اللہ ﷺ سبقت لے گئے دوسرے مرتبہ پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رہے اور تیسرے مرتبہ پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ۔

اس ارشاد گرامی میں "صلی" دوسرے مرتبہ پر آنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے مراد یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ پہلے تشریف فرما تھے آپ کے تشریف لے جانے پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے آپ کے تشریف لے جانے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے۔

(۱۰) بمعنی لازم پکڑنا لفظ بولا جاتا ہے "صلی بالنار" اس نے آگ کی حرارت کو لازم پکڑا۔ چونکہ نمازی بھی عبادت کو اس طریقہ پر لازم پکڑتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے حکم دیا

اس لئے اسے مصلی کہا جاتا ہے۔

(۱۱) بعض حضرات نے کہا یہ ماخوذ ہے "صلیت العود بالنار" سے یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب لکڑی کو آگ سے نرم کیا جائے اور پھر اسے سیدھا کیا جائے۔ چونکہ نمازی بھی رب تعالیٰ کی محبت کی حرارت سے اپنے آپ کو گرم کرتا اور نرم کرتا ہے اس طرح وہ سیدھی راہ پر قائم رہتا ہے لہٰذا اسے مصلی کہا جاتا ہے۔

(از قرطبی)

(۱۲) ازالہ حرارت کہا جاتا ہے "صلی الرجل" یعنی اس شخص نے اپنے نفس سے "صلاء" کو اس عبادت کے ذریعے زائل کر دیا "صلاء" جہنم کی بھڑکائی ہوئی آگ کو بھی کہا گیا۔

(۱۳) صلوۃ بمعنی مقام عبادت جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ﴾

اس مقام صلوات عبادت کے مقامات پر بولا گیا ہے۔

فائدہ: مقام مدح میں صلوۃ کے ساتھ اقامت کا ذکر ہے "یقیمون الصلوۃ ...... واقیموا الصلوۃ ...... والمقیمین الصلوۃ" یہ مومنین کی شان میں الفاظ مبارکہ ہیں کہ وہ نماز کو ان کے حقوق کا لحاظ کرتے ہوئے ادا کرتے ہیں اور جہاں صرف صلوۃ کا ذکر ہے وہاں منافقین کا ذکر ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلٰوتِهِمْ سَاهُوْنَ﴾ اسی طرح فرمایا ﴿وَلَا يَأْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى﴾ یہی وجہ ہے کہ روایت میں آتا ہے "ان المصلین کثیر والمقیمین لھا قلیل" بیشک نمازی تو بہت ہیں لیکن نماز کے قائم کرنے والے کم ہیں۔

(مفردات راغب)

یہاں نماز سے کون سی نماز مراد ہے؟

" واختلف فی المراد بالصلوۃ ھنا فقیل الفرائض وقیل الفرائض والنوافل معا وھو الصحیح لان اللفظ عام والمتقی یاتی بھما " (قرطبی)

اگرچہ اختلاف تو ہے کہ بعض حضرات نے کہا اس نماز سے مراد فرض نماز ہے اور بعض نے کہا مراد عام ہے فرائض اور نوافل دونوں ہی مراد ہیں اور یہی صحیح قول ہے کیونکہ اس مقام پر متقین کی علامات کا ذکر

ہو رہا ہے کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں چونکہ متقین فرائض اور نوافل دونوں عبادات ہی کرتے ہیں بلکہ اعلیٰ تقوی ہے ہی یہ کہ فرائض کے ساتھ نوافل بھی ادا کئے جائیں۔

نماز کی افضلیت پر احادیث مبارکہ:

" عن ابی ھریرة قال قال رسول الله ﷺ الصلوات الخمس والجمعة الی الجمعة ورمضان الی رمضان مکفرات لما بینھن اذا اجتنبت الکبائر "

(مسلم، مشکوۃ کتاب الصلوۃ)

" حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پانچ نمازیں اور ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک اور ایک رمضان سے دوسرے رمضان تک درمیان والی خطاؤں کو مٹا دیا جاتا ہے بشرطیکہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرے "

وضاحت حدیث: نماز ادا کرنے سے اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے صغیرہ گناہوں کو معاف فرماتا ہے ایک جمعہ کی نماز ادا کرنے کے بعد دوسرے جمعہ کی نماز ادا کرنے پر درمیان والے دنوں کے صغیرہ گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں ایک رمضان کے روزے رکھنے کے بعد دوسرے رمضان کے روزے رکھنے سے درمیان والے وقت کے صغیرہ گناہ معاف ہوتے ہیں۔ لیکن کبیرہ گناہوں سے اجتناب ضروری ہے کبیرہ گناہ صرف توبہ سے معاف ہوتے ہیں عبادات سے نہیں۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ ﴿اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ﴾ اگر تم کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرو گے جن سے تمہیں روکا گیا ہے تو ہم تمہاری سیآت (صغیرہ گناہوں) کو معاف کر دیں گے۔ یعنی مراد یہ ہے:

" ان ما بینھن من الذنوب کلھا مغفور الا الکبائر لایکفرھا الا التوبة اوفضل الله تعالیٰ "

(مرقاۃ ج ۲ ص ۱۱۰)

یعنی ان عبادات سے درمیانی اوقات سے صغائر گناہ تو معاف ہوں گے لیکن کبیرہ گناہ صرف توبہ سے یا اللہ تعالیٰ کے فضل سے معاف ہو سکیں گے۔

☆ " عن ابی ھریرة قال رسول الله ﷺ ارأیتم لوان نھرا بباب احدکم یغتسل فیه کل یوم خمسا ھل یبقی من درنه شئی قالوا لایبقی من درنه شئی قال فذلک مثل الصلوات الخمس یمحو الله بھن الخطایا "

(بخاری، مسلم، مشکوۃ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم مجھے خبر دو بیشک کسی ایک شخص کے دروازہ پر نہر ہو وہ اس میں ہر روز پانچ مرتبہ غسل کرے کیا اس کی میل (اس کے جسم پر) باقی رہ جائے گی؟ صحابہ کرام نے کہا (اس کے جسم پر) کوئی میل باقی نہیں رہے گی آپ نے فرمایا پانچ نمازوں کی یہی مثال (ہر روز جو شخص پانچ نمازیں ادا کرتا ہے) اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے اس کے (صغیرہ) گناہ مٹا دیتا ہے۔

وضاحت حدیث: حدیث شریف میں لفظ استعمال ہوا ہے " ار أیتم " اس کا معنی ہے اخبرونی مجھے خبر دو اس طرح مشبہ بہ میں "کل یوم" (ہر دن) لفظ استعمال ہوا ہے لیکن مشبہ میں مراد "کل یوم ولیلة" ہے یعنی ہر دن رات میں پانچ نمازیں جو ادا کرے۔ اصل قانون ہی یہ ہے کہ جس کو تشبیہ دی جائے (مشبہ) اور جس سے تشبیہ دی جائے (مشبہ بہ) کا جمیع وجوہ میں برابر ہونا ضروری نہیں بلکہ بعض وجوہ سے تشبیہ کافی ہوتی ہے۔

حدیث شریف میں گناہوں کو میل سے تشبیہ دی گئی کیونکہ گناہ انسان کے ظاہر اور باطن کو مکدر کر دیتے ہیں گویا کہ گناہ میل سے بھی زیادہ گندے ہوتے ہیں اس لئے کہ میل تو صرف ظاہر کو آلودہ کرتی ہے لیکن گناہ ظاہر اور باطن دونوں کو ہی آلودہ کر دیتے ہیں۔

نماز کو نہر کے صاف اور شفاف پانی سے تشبیہ دی گئی۔ یعنی جس طرح جاری نہر کا صاف اور شفاف پانی میل کو دور کرتا ہے اسی طرح نماز انسان کے گناہوں کی گندگی کو دور کرتی ہے بلکہ نماز میں فوقیت (بلندی کمال) یہ پائی گئی کہ نماز ظاہر اور باطن کو صاف اور پاک کرتی ہے جب کہ پانی صرف ظاہر کو صاف اور پاک کرتا ہے۔

(از مرقاۃ)

سبحان اللہ اے مسلمان! تو کتنا خوش بخت ہے کہ نماز فرض ہونے کے باوجود صرف تیرے ذمہ قرض کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ تجھے بلند مرتبہ عطا کرتی ہے اور کمالات کی بلندی عطا کرتی ہے اور گناہوں سے پاک کرتی ہے۔

☆ " وعن انس قال جاء رجل فقال یارسول اللہ انی اصبت حدا فاقمه علی قال ولم یساله عنه وحضرت الصلوة فصلی مع رسول اللہ ﷺ فلماقضی النبی ﷺ الصلوة قام

الرجل فقال یارسول اللہ انی اصبت حدا فاقم فی کتاب اللہ قال الیس قد صلیت معنا قال نعم قال فان اللہ قد غفرلک ذنبک اوحدک " (بخاری، مسلم، مشکوۃ کتاب الصلوۃ)

" حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایک شخص آیا اس نے کہا یارسول اللہ میں نے حد کو پالیا ہے آپ مجھ پر حد قائم کردیں۔ آپ نے اس سے کچھ نہ پوچھا یہاں تک کہ نماز کا وقت ہوگیا اس شخص نے رسول اللہ ﷺ کی اقتداء میں نماز ادا کی جب رسول اللہ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو وہی آدمی پھر کھڑا ہوا عرض کیا یارسول اللہ میں نے حد کو پالیا آپ اللہ کی کتاب کے مطابق مجھے حد لگادیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز ادا نہیں کی؟ اس نے کہا ہاں (یارسول اللہ نماز تو آپ کے ساتھ ادا کی) آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے گناہ کی مغفرت کردی ہے راوی کو شک ہے کہ یا آپ نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری حد کو معاف کردیا۔

وضاحت حدیث: صحابی نے عرض کیا کہ یارسول اللہ میں نے وہ گناہ کرلیا ہے جس کی وجہ سے مجھ پر حد لگائی جاسکتی ہے لیکن یہ صحابی کی اپنی سوچ تھی کہ انہوں نے صغیرہ گناہ کو قابل حد سمجھ لیا تھا۔ "ولم یسأله" نبی کریم ﷺ نے اس صحابی سے سوال ہی نہیں کیا کہ تم نے جرم کیا کیا ہے آپ کے نہ پوچھنے کی یہ وجہ تھی "لانه علیه السلام عرف ذنبه وغفرانه بطریق الوحی" بیشک نبی کریم ﷺ نے اس کے گناہ اور مغفرت کو وحی کے ذریعے پہچان لیا تھا۔

یعنی بہت واضح بات ہے کہ صحابی نے اپنے کسی صغیرہ گناہ (بغیر شہوت بوسہ وغیرہ کو) کبیرہ سمجھا اور خیال کیا کہ شائد یہ حد لگانے کا سبب ہے لیکن نبی کریم ﷺ کے دل میں رب تعالیٰ کی طرف سے القاء کردیا گیا کہ اس کا گناہ صغیرہ ہے یہ تو آپ کے ساتھ نماز ادا کرنے سے معاف کردیا جائے گا۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور وجہ بیان کی ہے کہ صغائر جس طرح نیکیوں سے معاف کردیئے جاتے ہیں "وکذا ماخفی من الکبائر" اسی طرح جو مخفی کبائر ہیں ان کو بھی نیکیوں کے ذریعے مٹادیا جاتا ہے اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے اس شخص اس کے جرم کے متعلق وضاحت نہیں طلب کی ہوگی تاکہ یہ مخفی رہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم بھی عام ہے "ان الحسنات یذهبن السیآت" بیشک نیکیاں گناہوں کو مٹادیتی ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی عام ہے

"اتبع السئية الحسنة تمحها" کہ گناہ ہوجائے تو اس کے بعد نیک عمل کردتا کہ وہ گناہ مٹ جائے "واما ماظهر منها وتحقق عند الحاكم فليس يسقط حدها الاالتوبة" لیکن جو گناہ کبیرہ ظاہر ہوجائے یا حاکم کے پاس وہ ثابت ہوجائیں ان کی حد سوائے توبہ کے ساقط نہیں ہوسکتی۔

(مرقاۃ ج ۲ ص ۱۱۲)

راقم کے نزدیک قاضی عیاض رحمہ اللہ کے ان آخری الفاظ سے مطلب اخذ کرتے ہوئے اگر اس طرح بیان کیا جائے کہ پہلے قول کے مطابق ہی یہ بھی ہوجائے تو زیادہ مناسب ہے۔ گویا کہ قاضی عیاض رحمہ اللہ نے یہ بیان کیا کہ صغائر تو نیکیوں سے معاف ہوجاتے ہیں لیکن کبائر جو قابل حد ہیں جب وہ مخفی ہوں تو حاکم ان کو ظاہر کرنے اور کریدنے سے اجتناب کرے اور اس شخص کی نیکیوں کی وجہ سے اس سے حد ساقط رہے گی کیونکہ حد کے ثابت کرنے کے لئے جرم کا ثابت ہونا ضروری جرم مخفی رہا لہٰذا حد ساقط رہی۔ اگر کبیرہ ظاہر ہو یا وہ شخص خود یا گواہ اسے ظاہر کردیں اور اس پر حد بھی ثابت ہو رہی ہو تو حد کو نافذ کردیا جائے نبی کریم ﷺ کا نہ پوچھنا تعلیم امت کے لئے بھی ہو اور آپ کو مطلع بھی کردیا گیا ہو دونوں چیزوں کا ایک ہی وقت پایا جانا منع نہیں اس طرح بیان کرنے سے تقریباً حدیث پاک کی وضاحت میں مختلف قول نہیں ہوں گے بلکہ مطلب ایک ہی ہوگا۔ (والله اعلم بالصواب)

☆ "عن عبادة بن الصامت قال قال رسول الله ﷺ خمس صلوات افترضهن الله تعالىٰ من احسن وضوأهن وصلاهن لوقتهن واتم ركوعهن وخشوعهن كان له على الله عهد ان يغفر له ومن لم يفعل فليس له على الله عهد ان شاء غفر له وان شاء عذبه"

(رواه احمد وابوداود وروى مالك والنسائي نحوه مشكوة كتاب الصلوة)

عبادہ ابن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پانچ نمازوں کو اللہ تعالیٰ نے فرض کیا جس شخص نے ان کے لئے اچھی طرح وضو کیا اور ان کو وقت میں ادا کیا اور ان کا رکوع مکمل کیا اور خشوع کیا تو اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر عہد ہے کہ اس کی مغفرت فرمائے گا۔ اور جس نے ایسا نہ کیا تو اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر کوئی عہد نہیں ہاں رب تعالیٰ چاہے تو مغفرت فرمادے اور چاہے تو عذاب دے۔

وضاحت حدیث: جس آدمی نے اچھی طرح وضو کیا یعنی وضو کرتے وقت وضو کے فرائض اور وضو کی سنتوں کا لحاظ کرتے ہوئے وضو کیا۔ نمازوں کو ان کے اوقات میں ادا کیا یعنی مستحب اوقات میں ادا

کیا مکروہ اوقات میں نہ ادا کرے۔ رکوع کو مکمل کرنے کا یہ مطلب ہے کہ رکوع کی شرط اور سنت فعلیہ اور سنت قولیہ کو مکمل کیا رکوع کی شرط یہ ہے پیٹھ کو جھکایا جائے سنت فعلیہ یہ ہے کہ پیٹھ کو ہموار کرے پیٹھ بالکل سیدھی برابر ہو ٹیڑھی اور کبڑی نہ ہو۔ یہ سب بغیر عذر کے عذر ہو تو جس طرح رکوع کر سکے اسی طرح صحیح ہے۔ سنت قولیہ یہ ہے کہ کم از کم تین مرتبہ "سبحان ربی العظیم" کہے نمازوں کو خشوع سے ادا کرے خشوع کیا ہے؟ "الخشوع حضور القلب وطمانینة القلب" خشوع یہ ہے کہ دل حاضر رہے اور دل میں اطمینان پایا جائے اسی طرح ظاہری اعضاء میں بلاوجہ حرکت نہ پائی جائے جب یہ تمام چیزیں پائی جائیں گی تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اس کی مغفرت کرے گا لہٰذا اگرچہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز لازم تو نہیں لیکن اس نے خود مغفرت کا وعدہ کر رکھا ہے اور وہ مغفرت اپنے وعدہ کے مطابق اپنی مہربانی سے کرے گا۔ لیکن اگر کوئی شخص ان مذکورہ چیزوں پر عمل نہیں کرتا تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے مغفرت کا کوئی وعدہ نہیں کر رکھا ہے چاہے تو اسے معاف کر دے اور چاہے تو عذاب دے۔

(از مرقاۃ ج ۲ ص ۱۱۴)

☆ "عن ابن مسعود قال سالت النبی ﷺ ای الاعمال احب الی اللہ تعالیٰ قال الصلوۃ لوقتها قلت ثم ای قال بر الوالدین ثم ای قال الجهاد فی سبیل اللہ قال حدثنی بهن ولو استزدته لزادنی" (بخاری مسلم مشکوۃ کتاب الصلوۃ)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا تمام اعمال سے اللہ تعالیٰ کا کون سا عمل زیادہ محبوب ہے؟ آپ نے فرمایا نماز وقت میں ادا کرنا میں نے کہا پھر کون سا؟ آپ نے فرمایا والدین کی فرمانبرداری کرنا میں نے کہا پھر کونسا؟ آپ نے فرمایا اللہ کی راہ میں جہاد کرنا آپ نے ان کو مجھ پر بیان فرمایا اگر میں اس سے زیادہ طلب کرتا آپ زیادہ بتاتے۔

وضاحت حدیث: نماز کو وقت میں ادا کرنے کا وہی مطلب ہے جو پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ مستحب اوقات میں نمازوں کو ادا کیا جائے نہ کہ مکروہ اوقات میں۔ یہ حدیث ان علماء کی دلیل ہے جنہوں نے فرمایا "ان الصلوۃ افضل العبادات بعد الشهادتین" کہ بیشک نماز تمام عبادات سے شہادتین کے بعد افضل ہے اور اسی کے مطابق ایک اور صحیح حدیث ہے "الصلوۃ خیر موضوع ای خیر عمل وضعه اللہ لعباده لیتقربوا الیه به" نماز بہتر موضوع ہے بہتر موضوع کا کیا

مطلب؟ موضوع کا یہاں یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے جو عمل وضع کئے ہیں کہ ان کے ذریعے وہ میرے قریب ہو جائیں ان تمام اعمال سے نماز افضل ہے "قلت ثم ای" (میں نے کہا پھر کون سا) اس مقام پر "ثم" کا لفظ تراخی زمان کے لئے استعمال نہیں بلکہ تراخی رتبہ کے لئے استعمال ہے یعنی میں نے کہا نماز کے بعد کون سا عمل افضل ہے یوں نہیں ترجمہ کیا جائے گا کہ میں نے کہا نماز ادا کرنے کی کچھ دیر کے بعد کون سا عمل ادا کیا جائے یہ ترجمہ اس وقت کیا جاتا جب "ثم" تراخی زمان پر دلالت کرتا" قال برالوالدین ، الی او احدھما " آپ نے فرمایا والدین کی فرمانبرداری۔

خیال رہے کہ اکثر اوقات والدین زندہ ہوتے ہیں اس لئے دونوں کا ذکر کر دیا جاتا ہے ورنہ والدین میں سے کوئی ایک بھی زندہ ہو تو اس کا یہی حکم ہے اس حدیث پاک کا مفہوم رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کے مطابق ہے ﴿وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا﴾ آپ کے رب نے حکم دیا کہ نہ عبادت کرو کسی کی سوائے اس کے اور والدین سے احسان کرو:

"ولذا قیل من صلی الصلوات الخمس و دعا للوالدین بالمغفرة عقیب کل صلوة فقد ادی حق اللہ وحق والدیہ"

اسی وجہ سے کہا گیا ہے جس شخص نے پانچ نمازیں ادا کیں اور والدین کے لئے ہر نماز کے بعد مغفرت کی دعا کی تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ کا حق ادا کیا اور والدین کا بھی حق ادا کیا۔ یعنی اپنی طاقت کے مطابق اس نے رب تعالیٰ اور اپنے والدین کا حق ادا کیا ورنہ حقیقت میں نہ تو رب تعالیٰ کا حق ادا کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی والدین کا حق ادا کیا جا سکتا ہے۔

تنبیہ : احادیث میں اعمال کی افضلیت کو مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا اس حدیث میں نماز کو اولیت دی گئی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ذکر کیا گیا "ای العمل خیر" رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا یا رسول اللہ کون سا عمل بہتر ہے؟ تو آپ نے فرمایا " ایمان باللہ و جهاد فی سبیل اللہ " اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ جب آپ سے سوال کیا گیا "ای

النـــاس افضـل " لوگوں میں سے کون سا شخص افضل ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا " رجل مجاهد فی سبیل الله " وہ شخص تمام سے افضل ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والا ہے۔

بظاہر ان احادیث میں تعارض پایا گیا ہے لیکن ان تمام میں وجہ توفیق یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہر شخص کو جواب اس کے حال کے مطابق اور وقت کی ضرورت کے مطابق دیا یعنی جب دیکھا کہ یہ شخص جہاد میں جانے کی طاقت نہیں رکھتا تو آپ نے اس شخص کے لئے نماز کی افضلیت ذکر فرمائی اسی طرح جب دیکھا کہ اب وقتی طور پر جہاد کی ضرورت نہیں اور سائل کا مطلب یہ ہے کہ میرے لئے اب کون سا عمل افضل ہے تو اس وقت بھی نماز کو افضل بیان فرمایا لیکن جب دیکھا کہ سوال کرنے والا جہاد میں جانے کی طاقت رکھتا ہے اور جہاد کی اب ضرورت بھی ہے تو اس وقت آپ نے جہاد کا افضل ہونا ذکر فرمایا۔

یہ بالکل اسی طرح بامحاورہ وقتی ضرورت یا کسی شخص کے حال کو دیکھ کر آپ نے ارشادات فرمائے جیسا کہ کوئی شخص بہت باتیں کرنے کی عادت رکھتا ہو یا وہ وقت خاموشی سے عبادت کرنے کا ہو یا کوئی شخص ایسا کلام کر رہا ہو جو اس کی شان کے لائق نہیں یا اس بات کو ظاہر کرنا مناسب نہیں تو ان صورتوں میں کہا جاتا ہے "لاشئی افضل من السکوت " خاموشی سے افضل اور کوئی چیز نہیں۔ اور جب کوئی صاحب عالم شخص ہو ضرورت ہو کہ یہ کوئی بات کرے وہ خاموش ہو تو اس وقت کہا جاتا ہے "لاشئی افضل من الکلام " کلام سے افضل کوئی چیز نہیں۔ احادیث پر اعتراض کرتے رہنا کہ ان میں تعارض پایا گیا ہے یہ درست نہیں بلکہ احادیث کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ (از مرقاۃ ج ۲ ص ۱۱۲، ۱۱۳)

☆ " عن ابی ذر ان النبی ﷺ خرج زمن الشتاء و الورق یتهافت فاخذ بغصنین من شجرة قال فجعل ذلک الورق یتهافت قال فقال یا اباذر قلت لبیک یارسول الله قال ان العبد المسلم لیصلی الصلوة یرید بها وجه الله فتهافت عنه ذنوبه کما تهافت هذا الورق عن هذه الشجرة رواه احمد " (مشکوة کتاب الصلوة)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ سردی کے موسم میں نکلے پتے گر رہے تھے آپ نے درخت کی دو ٹہنیوں کو پکڑا پتے (اور زیادہ تیز رفتاری سے) گرنے شروع ہو گئے آپ نے فرمایا اے ابوذر میں نے عرض کیا "لبیک یـارسـول الله " آپ نے فرمایا بیشک مسلمان

بندہ جب نماز ادا کرتا ہے اور اس میں صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء کا ارادہ رکھتا ہو تو اس کے گناہ اس طرح گرتے ہیں جس طرح اس درخت کے پتے گر رہے ہیں۔

وضاحت حدیث: موسم خزاں جس میں درختوں کے پتے از خود گرنا شروع ہو جاتے ہیں اس موسم میں نبی کریم ﷺ گھر سے کہیں باہر تشریف لے گئے تو دیکھا کہ درخت کے پتے گر رہے ہیں آپ نے درخت کی دو ٹہنیوں کو پکڑ کر ذرا حرکت دی تو پتے خشک ہونے کی وجہ سے جلدی جلدی سے گرنا شروع ہو گئے تو آپ نے فرمایا کہ جس طرح یہ پتے بڑی تیزی سے گرنا شروع ہوئے اسی طرح مسلمان بندہ جب اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے نماز ادا کرتا ہے تو اس کے گناہ گرتے ہیں۔

یہاں بظاہر وہم ہوتا ہے کہ کسی کے درخت کو ہلانا اور پتے گرانا تو جائز نہیں نبی کریم ﷺ نے کیسے درخت کی ٹہنیوں کو پکڑ کر پتوں کو گرایا؟ تو اس کا جواب ذکر کرتے ہوئے علامہ علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" فاخذ بغصنين من شجرة اى مباحة او مملوكة له عليه الصلوة والسلام او لمن يظن رضاء بذلك "

آپ کے درخت کی دو ٹہنیوں کے پکڑنے میں جس درخت کا ذکر ہے وہ یا تو مباح تھا یعنی جنگلی درخت جس کا کوئی مالک نہ ہو اس میں ہر آدمی کو تصرف کا حق حاصل ہوتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ درخت نبی کریم ﷺ کی اپنی ملکیت میں ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کا ہو جس کے متعلق نبی کریم ﷺ کو معلوم ہو کہ یہ مجھے منع نہیں کرے گا۔

" لبیک " اصل میں " الب لک البابین " ہوتا ہے جو تکرار اور تکثر کو چاہتا ہے اس لئے اس کا معنی یہ ہوگا "اجابة لک بعد اجابة " آپ کی بات کو قبول کرنے کے بعد پھر قبول کرتا ہوں اور یا یہ معنی ہوگا "اقامة علی طاعتک بعد اقامة " آپ کی طاعت پر قائم ہونے کے بعد پھر قائم ہوں۔ مشہور معنی اس کا یہ ہے "حاضر جناب" اس کا مطلب بھی یہ ہوتا ہے کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے بعد پھر حاضر ہوں یعنی یوں سمجھیں کہ " لبیک " کہنے والا یوں کہتا ہے کہ آپ مجھے ایک مرتبہ بلا رہے ہیں لیکن میں آپ کے ارشاد پر عمل پیرا ہوں صرف ایک مرتبہ نہیں بلکہ بار بار حاضر

ہونے کے لئے تیار ہوں۔

نماز ادا کرنے سے مراد یہ ہے " لیصلی الصلوۃ بشرائطھا وار کانھا " کہ مسلمان بندہ نماز ادا کرے تو اس میں شرائط اور ارکان کا خصوصی طور پر لحاظ کرے ان میں کمی واقع نہ ہونے دے " یرید بھا وجہ اللہ " یعنی خالص طور پر اللہ تعالیٰ کی رضاء کی طلب پائی جائے چرچا کرنا مقصود نہ ہو دکھاوا، ریاکاری نہ ہو نماز ادا کرنے میں اپنے دنیاوی اور اخروی مقاصد نہ ہوں۔

(از مرقاۃ ج ۲ ص ۱۱۷، ۱۱۸)

" عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص عن النبی ﷺ انہ ذکر الصلوۃ یوما فقال من حافظ علیھا کانت لہ نورا وبرھانا ونجاۃ یوم القیامۃ ومن لم یحافظ علیھا لم تکن لہ نورا ولا برھانا ولا نجاۃ وکان یوم القیامۃ مع قارون وفرعون وھامان وابی بن خلف " (رواہ احمد والدارمی والبیھقی فی شعب الایمان، مشکوۃ کتاب الصلوۃ)

حضرت عبد اللہ ابن عمرو ابن عاص بیان کرتے ہیں نبی کریم ﷺ نے ایک دن نماز کا ذکر کیا آپ نے فرمایا جس شخص نے نماز کی حفاظت کی نماز اس کے لئے قیامت کے دن نور اور برہان اور نجات ہوگی جس نے نماز کی حفاظت نہ کی اس کے لئے نور، برہان اور نجات نہیں ہوگی قیامت کے دن وہ شخص قارون اور فرعون اور ہامان اور ابی ابن خلف کے ساتھ ہوگا۔

وضاحت حدیث: " انہ ذکر الصلوۃ یوما " یعنی نبی کریم ﷺ نے ایک دن نماز کی فضیلت اور شرافت کا ذکر کیا " کانت لہ نورا وبرھانا ونجاۃ " نماز اس کے لئے قیامت کے دن نور ہوگی یعنی اس انسان کے آگے آگے نور کی حیثیت سے ہوگی اس کے سامنے خود ہی مقامات روشن ہوں گے اسے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ نور سے مراد یہ ہے کہ اس کے ایمان میں نماز کی وجہ سے نورانیت زیادہ ہوگی "برھانا" برہان کا مطلب یہ ہے کہ نماز قیامت کے دن اس شخص کے لئے دلیل بنے گی کہ اس نے تمام طاعات پر عمل کیا۔ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ برہان کا یہ مطلب ہے کہ اس کے کمال عرفان پر واضح دلیل ہوگی۔

راقم کے نزدیک نور اور برہان کے دونوں معنی بیک وقت مراد لینا زیادہ بہتر ہے کیونکہ ان کے

اجتماع میں کوئی ممانعت نہیں "نجاۃ" نماز اس شخص کو قیامت کے دن عذاب سے نجات دے گی۔

فائدہ: "وکذلک نور وبرھان ونجاۃ لہ فی القبر کما ورد فی الاحادیث فان مات فقد قامت قیامتہ" نماز انسان کے لئے قبر میں بھی نور، برہان اور نجات ہوگی جیسا کہ احادیث میں وارد ہے کہ جو شخص فوت ہو جاتا ہے اس پر قیامت قائم ہو جاتی ہے۔ قیامت کے دن بھی پہلے تمام پر موت آئے گی پھر ان کو اٹھایا جائے گا اسی طرح موت کے بعد بھی قبر میں جسم سے روح کا تعلق قائم ہوتا ہے اور منکر ونکیر اس سے سوال کرتے ہیں۔ نماز نہ ادا کرنے والا نور، برھان اور نجات سے محروم ہوگا اسے قارون، فرعون، ہامان اور ابی ابن خلف کا ساتھ حاصل ہوگا۔ اس سے تعریض (اشارہ) کے طور پر یہ سمجھا دیا گیا کہ نماز پڑھنے والے حضرات صراط مستقیم پر ہوں گے ان کو انبیاء کرام، صدیقین، شہداء اور صالحین کا قرب حاصل ہوگا۔

یہی مطلب ہے کہ بے نماز لوگوں کو قارون، فرعون، ہامان اور ابی ابن خلف کا قرب حاصل ہوگا۔ تشبیہ صرف اس میں ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے معاف نہ کیا تو ان کو عذاب ہوگا ورنہ مؤمنین خواہ گنہگار بھی ہوئے ان کی آخر کار بخشش ہوگی کافر ہمیشہ کے لئے جہنم میں رہیں گے۔

فرعون خدائی کا دعویدار تھا، ہارون اس کا وزیر تھا۔ قارون وہ شخص تھا جس نے مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں دینے سے انکار کر دیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اسے بمع مال کے زمین میں دھنسا دیا۔ ابی ابن خلف یہ وہ بدبخت مشرک ہے جسے نبی کریم ﷺ نے اپنے ہاتھوں سے احد میں قتل کیا تھا۔ (از مرقاۃ ج ۲ ص ۱۱۸)

بچوں کی نماز کی رغبت دلائی جائے:

"عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ قال قال رسول اللہ ﷺ مروا اولادکم بالصلوۃ وھم ابناء سبع سنین واضربوھم علیھا وھم ابناء عشر سنین وفرقوا بینھم فی المضاجع"

(رواہ ابوداؤد۔ مشکوۃ کتاب الصلوۃ)

"عمرو ابن شعیب اپنے باپ دادا سے بیان کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو جب وہ سات سال کے ہو جائیں اور ان کو مارو جب وہ دس سال کے ہو جائیں اور ان کے لیٹنے کے مقامات علیحدہ علیحدہ کر دیں"

وضاحت حدیث: اولاد جمع ولد کی ہے ولد مشترک ہے مذکر اور مؤنث دونوں کو شامل ہے اس لئے حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ اپنے بچوں اور بچیوں کو نماز کا حکم دو جب وہ سات سال کے ہو جائیں "لتعادوا ویستأنسوا بھا" تا کہ ان کو نماز کی عادت پڑ جائے اور نماز سے محبت ہو جائے۔ دس سال کے ہو جائیں تو ان کو نماز نہ ادا کرنے پر سرزنش کی جائے یعنی ان کو نماز کا حکم دو ان سے نماز ادا کراؤ خواہ تمہیں سرزنش ہی کیوں نہ کرنی پڑے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بالغ ہو جاتے ہیں یا بالغ ہونے کے قریب ہوتے ہیں اگر ان کو نماز چھوڑنے پر نہ پوچھا گیا تو وہ اسی طرح بے نمازی ہی ہو جائیں گے۔ دس سال کی عمر میں بچوں اور بچیوں کو علیحدہ علیحدہ سلایا جائے ایک جگہ یعنی ایک ہی چارپائی ایک ہی بستر پر ان کو سونے کی اجازت نہ دی جائے یہ حکم عام ہے خواہ بچے بہن، بھائی ہوں یا اجنبی ہوں۔ (از مرقاۃ ج ۲ ص ۱۱۵)

ڈنڈے سے مارنا جائز نہیں: ادب سکھانے، نیک کاموں کی ترغیب کے لئے برے کاموں سے اجتناب کے لئے ماں، باپ کے لئے جائز ہے کہ وہ اولاد کو معمولی ماریں اور ان کی سرزنش کریں اور یہی صورت استاذ کے لئے بھی جائز ہے کہ وہ ادب سکھانے اور اچھی تربیت کے لئے شاگرد کو معمولی مارے اور سرزنش کرے شیخ سعدی رحمہ اللہ نے فرمایا:

"ضرب استاذ بہ از مہر ما دروپدر" استاذ کی مار، ماں، باپ کے پیار سے بہتر ہے لیکن یہ مار ہاتھ سے ہو تربیت کے لئے سرزنش کے طور پر ڈنڈے سے ظالمانہ انداز پر مارنا منع ہے۔

" وان وجب ضرب ابن عشر بید لا بخشبة ای عصا اوسوط او غیرہ لحدیث مروا اولادکم بالصلوۃ وھم ابناء سبع واضربوھم وھم ابناء عشر ولایجاوز الثلاث وکذا المعلم لیس لہ ان یجاوزھا قال علیہ الصلوۃ والسلام لمرداس المعلم ایاک ان تضرب فوق الثلاث فانک ان ضربت فوق الثلاث اقتص اللہ منک " (درمختار ، شامی ج ۱ ص ۲۵۸)

اگر چہ دس سال کے بچے ہو جائیں تو انکو نماز نہ ادا کرنے پر مارنا جائز ہے لیکن یہ مار ہاتھ سے ہو ڈنڈے کوڑے وغیرہ سے نہ ہو۔ مطلقاً مارنا تو حدیث پاک سے ثابت ہو گیا کہ بچوں کو نماز کا حکم دو جب وہ سات سال کے ہو جائیں اور نماز نہ ادا کرنے پر انکو مارو جب وہ دس سال کے ہو جائیں۔

حضرت علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ مارنا بھی ہاتھ سے ہے اور وہ بھی دو تین تھپڑ سے زیادہ نہ ہوں ماں باپ کیلئے بھی یہی حکم اور استاذ کیلئے بھی یہی حکم ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے بچوں کو پڑھانے والے ایک استاذ مرداس کو کہا کہ تم تین ضربوں (تھپڑ) سے زیادہ مارنے سے اپنے آپکو دور رکھو اگر تم نے تین مرتبہ سے زیادہ مارا تو اللہ تعالیٰ تم سے بدلہ لے گا۔ ان احادیث کو مدنظر رکھتے ہوئے شیخ سعدی رحمہ اللہ نے کتنا خوبصورت ضابطہ بیان کیا جو والدین اور اساتذہ کیلئے مشعل راہ ہے۔

درشتی و نرمی بہم دربہ است
چو فاصد کہ جراح و مرہم نہ است

درشتی نگیر خرد مند پیش
نہ سستی کہ نازل کند قدر خویش

نہ مرخویشتن را فزونی نہد
نہ یک بار تن در مذلت دہد

یعنی سختی اور نرمی دونوں کو ساتھ ساتھ رکھنا بہتر ہے
پچھوا لگانے والا زخم بھی کرتا ہے اور مرہم بھی لگاتا ہے
عقلمند آدمی بہت زیادہ سختی نہیں کرتا
اور اتنی زیادہ نرمی بھی نہیں کرتا کہ اس کی قدر و منزلت ہی کم ہو جائے

اپنے آپ کو بہت زیادہ آدم خور بھی نہ بناؤ
اور بہت زیادہ نرم ہو کر اپنے آپ کو ذلیل بھی نہ کرو

استاذ کے لئے یہی ایک اعلیٰ سبق ہے کہ ڈرائے، دھمکائے، سرزنش کرے، احساس دلائے اور شفقت بھی کرے اپنا رعب جمانے کے زعم باطل میں طلباء کی نظروں سے نہ گر جائے اور ان کی در پردہ گالیوں کا مستحق نہ بن جائے۔

نماز کی فضیلت میں اور احادیث مبارکہ:

"عن عمارة بن رويبة قال سمعت رسول الله ﷺ يقول لن يلج النار احد صلى قبل طلوع

شمس وقبل غروبها یعنی الفجر والعصر " (رواہ مسلم ۔ مشکوۃ باب فضائل الصلوۃ)

" عمارہ ابن رویبہ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے فرماتے ہوئے سنا کہ کوئی ایک آگ میں داخل نہیں ہوگا جس نے سورج کے طلوع ہونے سے پہلے نماز ادا کی اور سورج کے غروب ہونے سے پہلے نماز ادا کرے یعنی فجر اور عصر کی نماز ادا کرے "

وضاحت حدیث: دو وقتوں کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا کیونکہ ان دو وقتوں میں نماز ادا کرنا بہت مشکل ہے کہ صبح جاگنا خاص کر کے گرمیوں میں صبح نیند سے اٹھنا اور سردیوں میں صبح وضو کرنا بظاہر مشکل کام ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں پر یہ کوئی مشکل نہیں وہ بخوشی نماز ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح عصر کی نماز اس لئے مشکل ہے کہ دن ختم ہونے کے قریب ہوتا ہے ہر شخص اپنے کام کو ختم کرنے کی فکر میں ہوتا ہے لیکن یہ نماز بھی اللہ کے بندوں پر کوئی بھاری نہیں ۔ جب یہ دو نمازیں انسان ادا کرے گا تو یقیناً دوسری نمازیں بھی خوشی خوشی سے ادا کرے گا۔ ان دو نمازوں کو خصوصی طور پر ذکر کرنے کی ایک اور وجہ یہ ہے:

" هذان الوقتان مشهودان يشهدهما ملائكة الليل وملائكة النهار وير فعون فيهما اعمال العباد "

ان دونوں وقتوں میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں دن کے اعمال لکھنے والے فرشتے عصر کی نماز میں شریک ہوتے ہیں اور رات کے اعمال لکھنے والے بھی عصر کی نماز میں موجود ہوتے ہیں دن والے چلے جاتے ہیں رات والے رہ جاتے ہیں اسی طرح رات والے فرشتے صبح کی نماز ادا کر کے جاتے ہیں اور دن والے بھی اس میں آ جاتے ہیں اور بندوں کے اعمال رب کے حضور پہنچاتے ہیں اور وجہ یہ بھی ہے کہ ان دو وقتوں میں نماز پڑھنے والے کو اللہ تعالیٰ گناہوں سے بچنے اور نیکی کرنے کی توفیق عطا فرماتا ہے۔

تنبیہ: اگر کسی کے ذمہ حقوق العباد ہوئے تو وہ معاف نہیں ہوں گے کیونکہ صحیح حدیث میں مذکور ہے:

" ان من المسلمين من يأتي يوم القيامة وله صلوة وصيام وغيرهما وعليه ظلامات للناس فياخذون اعماله ماعدا الصوم لاختصاص عمله به تعالیٰ فاذا لم يبق له عمل وضع عليه من سياتهم ثم يلقى في النار " (مرقاۃ ج ۲ ص ۱۴۲)

''بیشک مسلمان قیامت کے دن حاضر ہوں گے ان کے پاس نمازیں، روزے اور عبادات ہوں گی ان میں سے اگر کسی کے ذمہ لوگوں کے حقوق ہوئے تو اس شخص کی عبادات ان لوگوں کو دے دی جائیں گی جن کے حقوق اسکے ذمہ ہیں البتہ روزے اس سے نہیں لئے جائیں گے کیونکہ وہ خالص اللہ تعالیٰ کیلئے ہوتے ہیں''

اگر اس کے نیک عمل باقی نہ رہے اور حقوق نہ ختم ہوئے تو ان حقوق والے لوگوں کے گناہ اس کے پلڑہ میں ڈال دیئے جائیں گے پھر اسے آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ جس حدیث سے وضاحت کی جارہی ہے اسی سے یہ بھی سمجھ آ گیا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا﴾ لیس بمعنی الدخول ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو یہ فرمایا کہ تم میں سے ہر ایک شخص کا جہنم کی آگ سے ورود ہوگا اس کا مطلب دخول نہیں بلکہ گزرنا ہے۔ یعنی پل صراط جہنم پر ہوگا اسی کے اوپر سے ہر شخص کو گزرنا ہوگا اس سے یہ لازم نہیں آئے گا کہ ہر شخص نے جہنم میں داخل ہونا ہے۔ (از مرقاۃ ج ۲ ص ۱۴۲)

☆ " عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ يتعاقبون فيكم ملائكة بالليل و ملائكة بالنهار ويجتمعون فی صلوة الفجر وصلوة العصر ثم يعرج الذين باتوا فيكم فيسالهم ربهم وهو اعلم بهم كيف تركتم عبادی فيقولون تركناهم وهم يصلون واتيناهم وهم يصلون "
(بخاری، مسلم، مشکوۃ باب فضائل الصلوۃ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے پاس رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے آگے پیچھے رہتے ہیں وہ فجر کی نماز میں اور عصر کی نماز میں جمع ہو جاتے ہیں پھر وہ جنہوں نے تمہارے پاس رات گزاری ہوتی ہے۔ جب وہ آسمان پر جاتے ہیں تو رب تعالیٰ ان سے پوچھتا ہے حالانکہ وہ خود بھی جانتا ہے کہ تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا ہے؟ تو وہ کہتا ہیں ہم نے ان کو نماز پڑھتے ہوئے چھوڑا جب ہم ان کے پاس پہنچے تھے وہ اس وقت بھی نماز ادا کر رہے تھے۔

وضاحت حدیث: "يتعاقبون فيكم" کا اگرچہ مطلب ہے آگے، پیچھے آنا لیکن یہاں مراد ہے آگے پیچھے رہنا کیونکہ رات والوں کی موجودگی میں صبح کی نماز میں دن والے آ جاتے ہیں لیکن چونکہ رات والے چلے جاتے ہیں اور دن والے موجود رہتے ہیں اس لئے وہ ان کے پیچھے رہتے ہیں اسی طرح دن والوں کی موجودگی میں رات والے عصر کی نماز میں آ جاتے ہیں لیکن دن والے چلے جاتے ہیں

رات والے ان کے پیچھے رہتے ہیں۔ یا تعاقب کا مطلب ہے نزول کے لحاظ سے آگے پیچھے ہوتے ہیں اگر چہ دونوں ہی صبح اور عصر کی نماز میں جمع ہو جاتے ہیں رات والے فرشتے رات بھر رہتے ہیں اور صبح کی نماز ادا کر کے جاتے ہیں دن والے فرشتے دن بھر رہتے ہیں اور عصر کی نماز ادا کر کے جاتے ہیں۔ جس طرح رب تعالیٰ رات والے فرشتوں سے پوچھتا ہے اسی طرح دن والوں سے بھی پوچھتا ہے۔ نمازی کتنا خوش قسمت ہے کہ اس کی نماز کی گواہی دونوں گروہ فرشتوں کے دے رہے ہیں خواہ وہ رات والے ہوں یا دن والے ہوں۔

☆ " عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ لو یعلم الناس ما فی النداء والصف الاول ثم لم یجدوا الا ان یستهموا علیه لا ستهموا ولو یعلمون ما فی التهجیر لا ستبقوا الیه ولو یعلمون ما فی العتمة والصبح لا توهما ولوحبوا " (بخاری، مسلم، مشکوۃ باب فضائل الصلوۃ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر لوگوں کو ندا اور صف اول کے متعلق معلوم ہو جائے تو کوئی بھی سوائے قرعہ اندازی کے نہ پا سکتا اگر ان کو نیکی کا کام جلدی کرنے کے متعلق معلوم ہو جاتا تو وہ اس کی طرف جلدی کرتے اگر ان کو عشاء اور صبح کی نماز کے متعلق معلوم ہو جاتا تو وہ اس کی طرف آتے خواہ ان کو گھسٹتے ہوئے کیوں نہ چلنا پڑتا۔

وضاحت حدیث: ندا سے مراد اذان دینا اور اقامت کہنا ہے یعنی اگر لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ اذان اور اقامت میں کتنا عظیم ثواب ہے تو ہر شخص کوشش کرتا کہ میں ہی اذان دوں اور میں ہی اقامت کہوں اس طرح ثواب کے حصول میں لوگ آگے آگے بڑھتے نوبت قرعہ اندازی کی درپیش آجاتی۔ اسی طرح صف اول کے ثواب کا کسی کو پتہ چلتا تو اس میں بھی لوگ بڑھ چڑھ کر پہنچنے کی کوشش کرتے کسی کو سوائے قرعہ اندازی کے جگہ نہ ملتی۔

لیکن یہ بھی خیال رہے کہ مقصد تو اذان سن کر جلدی مسجد میں آنا ہے۔ مسجد میں آنا اس وقت جب اقامت ہو رہی ہو صفوں کو چیرتے ہوئے جگہ ہو یا نہ آگے گھسنے کی کوشش کرنا اس میں کون سا ثواب ہے؟

" ولو یعلمون ما فی التهجیر، ای فی المسارعة الی الطاعة من الفضلیة والکرامة، لا ستبقوا ای لبادروا الیه "

اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتا کہ نیکی کے کاموں کی طرف جلدی کرنے میں کیا فضلیت اور کرامت ہے تو وہ جلدی جلدی سے اس کام کی طرف پہنچتے اور سرانجام دیتے۔ صبح اور عشاء کی نمازوں کا ذکر فرمایا کہ اگر ان دونوں نمازوں میں اجر وثواب کا لوگوں کو پتہ چلتا تو وہ ان نمازوں کے لئے آتے خواہ وہ بچوں کی طرح گھسٹ کر چلنے کی طاقت رکھتے ہوں۔ ان دو نمازوں کا ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں وقت نینداور غفلت کے ہوتے ہیں ان اوقات میں نماز ادا کرنا مشکل ہوتا ہے۔ (از مرقاۃ ج۲ص۱۴۴)

فائدہ: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے فرماتے ہوئے سنا "المؤذنون اطول الناس اعناقا یوم القیامۃ" قیامت کے دن اذان دینے والے لوگوں سے زیادہ مرتبہ والے ہوں گے۔

وضاحت حدیث: "اطول الناس اعناقا" کا ظاہر طور پر معنی یہ ہے کہ وہ لوگوں سے لمبی گردنوں والے ہوں گے لیکن اس کا ظاہری معنی مراد نہیں بلکہ مجازی معنی مراد ہے وہ کئی معنی ذکر کئے گئے تقریباً سب کا مطلب زیادہ مرتبہ لیا جاسکتا ہے۔ ایک معنی بیان کیا گیا ہے کہ ان کے اعمال زیادہ ہوں گے کیونکہ کہا جاتا ہے "لفلان عنق من الخیر" فلاں کو بھلائی کا حصہ حاصل ہے یا اس کا عمل خیر پر مبنی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ زیادہ امید رکھنے والے ہوں گے اس لئے کہ جو زیادہ امید رکھتا ہو وہ لوگوں کی طرف گردن اٹھا اٹھا کر دیکھتا ہے۔ اسی طرح قیامت کے دن جب لوگ مصیبت اور پریشانی میں ہوں گے اذان دینے والے گردن اٹھا اٹھا کر دیکھ رہے ہوں گے کہ ابھی ہمیں جنت میں داخل ہونے کی اجازت ملتی ہے۔ اور یہ معنی لیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہونا اس لئے کہ گردن اس وقت لمبی ہوتی ہے جب قد بھی لمبا ہو لمبے قد والا بلند چیز کے قریب ہوتا ہے اس طرح بلاتشبیہ وتمثیل اذان دینے والا اللہ تعالیٰ کے قریب ہوتا ہے جو بلند مرتبہ والا ہے اور معنی یہ مراد لیا گیا ہے کہ لمبی گردن سے مراد پریشان وشرمندہ نہ ہونا کیونکہ پست قد والا اور چھوٹی گردن والا شرمندہ رہتا ہے گویا کہ مطلب یہ ہوا کہ اذان دینے والا قیامت کے دن مطمئن ہوگا نادم نہیں ہوگا۔ اسی طرح لمبی گردن کا یہی معنی مراد لیتے ہوئے کہ اسے کوئی شرمندگی نہیں ہوگی اس سے مراد یہ بھی ہوسکتی ہے کہ قیامت کے دن جب لوگ پسینہ سے شرابور ہوں گے پسینہ ان کی گردنوں سے بہہ رہا ہوگا اس وقت اذان دینے

والے اس پسینہ سے محفوظ ہوں گے۔ اور معنی یہ مراد لیا گیا ہے کہ اذان دینے والے قیامت کے دن رئیس ہوں گے عرب عام طور پر سردار حضرات کی تعریف طول العنق (لمبی گردن والے) سے کرتے ہیں اور یہ بھی کہا جاتا ہے "جاء عنق من الناس" لوگوں کی ایک جماعت آ گئی یعنی عنق جماعت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس معنی کے لحاظ پر مطلب یہ ہوگا کہ اذان دینے والوں کی جماعتیں بڑی ہوں گی کیونکہ جن لوگوں نے ان کی اذان سن کر جماعت میں شرکت حاصل کی وہ بھی ان کے ساتھ ہوں گے۔ جتنے معانی بیان کئے ہیں ان تمام کا تقریباً مطلب یہی ہے کہ اذان دینے والے بلند مرتبہ والے ہوں گے۔

(از مرقاۃ ج ۲ ص ۱۵۸)

فائدہ: نماز کے بغیر چند اور مقامات میں بھی اذان کہنا مستحسن ہے:

" یسن لغیر الصلوۃ کالاذان فی آزان المولود الیمنی والاقامة فی الیسری ویسن ایضا عند الھم وسوء الخلق لخبر الدیلمی عن علی رضی اللہ عنہ رانی النبی صلی اللہ علیہ وسلم حزینا فقال یا ابن ابی طالب انی اراک حزینا فمر بعض اھلک یؤذن فی اذنک فانہ درأ الھم قال فجربتہ فوجدتہ کذلک "

''نماز کے بغیر بچے کے دائیں کان میں کہنا اور بائیں میں اقامت کہنا سنت ہے غم کے وقت یا بدخلق کے کان میں اذان کہنا سنت ہے۔ دیلمی نے بیان کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا مجھے نبی کریم ﷺ نے غم کی حالت میں دیکھا تو آپ نے فرمایا اے ابن ابی طالب میں تمہیں غمناک دیکھ رہا ہوں تم اپنے گھر والوں میں سے کسی کو کہو وہ تمہارے کان میں اذان کہے بیشک اس سے غم دور ہوتا ہے دیلمی نے فرمایا میں نے اس کا تجربہ کیا ایسے ہی پایا''

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جتنے بھی روایت کرنے والے ہیں سب نے اس کا تجربہ کیا ایسے ہی پایا:

" وروی الدیلمی عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ من ساء خلقہ من انسان او دابة فاذنوا فی اذنہ"

دیلمی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی آپ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کے اخلاق برے ہوں خواہ وہ انسان ہو یا کوئی اور جانور ہو اس کے کان میں اذان کہو۔

فائدہ عظیمہ: حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کے اذان کہنے سے آپ کو ایمان ملا محبت رسول اللہ ﷺ ملی۔ حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں چند آدمیوں کے ساتھ نکلا ہم کسی راستے پر تھے تو رسول اللہ ﷺ کے مؤذن نے نماز کے لئے اذان کہی ہم نے جب مؤذن کی اذان سنی ہم نے اس سے اعراض کیا پھر ہم نے بطور مزاح اذان کی نقل اتارنی شروع کر دی۔ نبی کریم ﷺ نے سنا تو آپ نے ہماری طرف چند صحابہ کو بھیجا (وہ ہمیں پکڑ کر لے گئے) نبی کریم ﷺ کے سامنے انہوں نے ہمیں بٹھا دیا آپ نے فرمایا تم میں سے میں نے کس کی آواز کو سنا جو اپنی آواز کو بلند کر رہا تھا ان لوگوں نے میری طرف اشارہ کیا وہ سچے بھی تھے آپ نے دوسرے میرے ساتھیوں کو چھوڑ دیا مجھے اپنے پاس رکھ لیا اور آپ نے مجھے کہا تم کھڑے ہو اور اذان کہو میں کھڑا ہوا مجھے رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر کوئی چیز ناپسند نہیں تھی اور جس چیز کا آپ مجھے حکم دے رہے تھے اس سے بڑھ کر بھی کوئی چیز ناپسند نہیں تھی۔ میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے کھڑا ہو گیا آپ نے خود مجھے اذان کہلانی شروع فرمائی آپ نے فرمایا تم کہو:

"اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر، اشهد ان لا اله الا اللہ، اشهد ان لا الـه الا اللہ، اشهد ان محمد رسول اللہ، اشهد ان محمد رسول اللہ"

(ابومحذورہ نے شہادتین کے الفاظ آہستہ کہے تھے) تو آپ نے فرمایا بلند آواز سے کہو

"اشهد ان لا الـه الا اللہ، اشهد ان لا الـه الا اللہ، اشهد ان محمد رسول اللہ، اشهد ان محمد رسول اللہ، حی على الصلوة، حی على الصلوة، حی على الفلاح، حی على الفلاح، اللہ اکبر، اللہ اکبر، لا اله الا اللہ"

جب میں نے اذان ختم کر لی آپ نے مجھے بلایا مجھے ایک تھیلی دی جس میں کچھ چاندی تھی پھر آپ نے اپنا ہاتھ ابومحذورہ (یعنی میرے) کی پیشانی پر رکھا پھر آپ نے اسکے چہرہ پر سینہ کے درمیان پھیرا

پھر جگر پر پھیرا پھر رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ ابو محذورہ کی ناف پر پہنچا پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" بارک الله لک وبارک علیک فقلت یا رسول الله امرتنی بالتاذین بمکة قال نعم قد امرتک فذهب کل شئی کان لرسول الله ﷺ من کراهیة وعاد ذلک کله محبة لرسول الله ﷺ "

اللہ تعالیٰ تمہیں برکت عطا فرمائے میں نے کہا یا رسول اللہ کیا آپ مجھے حکم دیتے ہیں کہ میں مکہ میں بھی اذان کہوں؟ آپ نے فرمایا ہاں میں تمہیں حکم دیتا ہوں (ابو محذور کہتے ہیں) نبی کریم ﷺ کی ناپسندیدگی جو بھی مجھے حاصل تھی وہ ختم ہوگئی اور مجھے رسول اللہ ﷺ سے محبت ہوگئی میں رسول اللہ ﷺ کے عامل عتاب ابن اسید کے پاس مکہ میں آ گیا وہاں ان کی معیت میں رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق نماز کی اذان کہی۔ (ابن ماجه ص ۵۲)

سبحان اللہ ابو محذورہ نے طنز کے طور پر صحابہ کرام کی نقل اتارتے ہوئے اذان کہی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو رسول اللہ ﷺ کی دعا اور ہاتھ پھیرنے کی برکت سے رسول اللہ ﷺ کی محبت عطا کردیا بغض دل سے نکال دی کفار کی محبت جاتی رہی مسلمانوں کی محبت حاصل ہوگئی۔

وضاحت حدیث: ''عبد'' سے مراد مسلمان ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والا مسلمان ہی ہوگا اس لئے کہ عبادت وہی معتبر ہے جو کامل ایمان کے بعد ہو یعنی ظاہری طور پر بھی ایمان ہو اور باطنی طور پر بھی پھر عبادت کرے " بین العبد وبین الکفر " کا یا تو یہ مطلب ہے "مقاربته " یعنی جو شخص نماز چھوڑنے کا عادی ہو جائے وہ کفر کے قریب ہوتا ہے اس لئے کہ ممکن ہے وہ کسی وقت نماز کی فرضیت کا ہی انکار کر کے کافر ہو جائے یا معنی یہ ہو جائے " ترکها وصلة بینه وبینه " نماز کا چھوڑنا مسلمان بندے کو کفر تک پہنچانے کا ذریعہ ہے وجہ وہی جو پہلے بیان ہوئی کہ نماز ہمیشہ چھوڑنے کی عادت انسان کو رب تعالیٰ سے بےخوف کر دیتی ہے جب رب تعالیٰ کا خوف ہی نہ رہا تو یقیناً اس کی زبان سے لغویات کا نکلنا جو کفر تک پہنچائیں عین ممکن ہے۔ یا یہ معنی ہو جائے کہ "فعل الصلوة حاجز بین العبد والکفر " نماز ادا کرنا مسلمان اور کفر کے درمیان رکاوٹ ہے کہ نماز ادا کرنے والا اللہ تعالیٰ کے فضل سے کفریات سے محفوظ رہتا ہے اب اسی سے واضح ہو جائے گا کہ نماز کو چھوڑنا اس رکاوٹ کو

توڑنا ہے۔یا یہ معنی ہو جائے:

"ترک الصلوة بالحد الواقع بینهما فمن ترکها دخل الحد وحام حول الکفر و دنامنه"

نماز اسلام اور کفر کے درمیان حد ہے جس نے نماز کو چھوڑنے کی عادت بنالی وہ اس حد تک پہنچ گیا کفر کے اردگرد پھرنے لگا اور کفر کے قریب ہو گیا۔ (از مرقاۃ ج ۲ ص ۱۱۳)

☆ "الصلوة عماد الدین فمن اقامها فقد اقام الدین ومن ترکها اوهدمها فقد هدم الدین"

نماز دین کا ستون ہے جس نے نماز کو قائم کیا اس نے دین کو قائم کیا جس نے نماز کو چھوڑا اس نے دین کو منہدم کر دیا۔واضح ہوا کہ نماز کو چھوڑنے سے دین کی بربادی ہے نماز ادا کرنے سے ہی دین کا قیام ہے قیامت کے دن حقوق العباد میں سے سب سے پہلے ناحق خون (قتل کرنے) کے متعلق سوال ہوگا اور حقوق اللہ میں سے سب سے پہلے نماز کے متعلق سوال ہوگا:

روز محشر که جان گداز بود اولین پرسش نماز بود

قیامت کے دن جب جان پگھلنے والی ہوگی سب سے پہلے نماز کے متعلق سوال ہوگا

نماز رحمت کی طلب، مصیبت کا حل:

بارش نہ ہو رہی ہو تو نماز استسقاء پڑھی جائے، تاریکی چھا جائے، آندھی، طوفان پر ہو تو نوافل ادا کئے جائیں، سورج کو گرہن لگ جائے تو نماز کسوف ادا کی جائے، چاند کے گرہن کے وقت نماز خسوف ادا کی جائے کسی کام میں تردد ہو کہ یہ کام کریں یا نہ کریں تو اسکے حل کیلئے نماز استخارہ ادا کی جائے

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ ہمیں نماز استخارہ تمام کاموں کے لئے سکھاتے تھے جیسا کہ قرآن پاک کی سورتیں ہمیں سکھاتے تھے اور فرماتے تھے جب بھی تم میں سے کسی ایک کو کوئی کام درپیش ہو تو وہ پہلے دو رکعت نفل ادا کرے پھر یہ دعاء پڑھے:

" اللهم انی استخیرک بعلمک واستقدرک بقدرتک واسالک من فضلک العظیم فانک تقدر ولا اقدر وتعلم ولا اعلم وانت علام الغیوب اللهم ان کنت تعلم ان هذا الامر خیر لی فی دینی ومعاشی وعاقبة امری اوقال عاجل امری وآجله فاقدره لی ویسره لی ثم

بارک لی فیہ وان کنت تعلم ان هذا الامر شرلی فی دینی ومعاشی وعاقبة امری اوقال عاجل امری وآجله فاصرفه عنه واصرفنی عنه واقدرلی الخیر حیث کان ثم رضنی به''

تنبیہ: دورکعت نفل جب ادا کرے تو پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد قل یاایھاالکفرون سورۃ پڑھے اور دوسری رکعت میں سورۃ قل ھو اللہ احد پڑھے جب دعا استخارہ پڑھے تو اس دعا کے شروع میں اور آخر میں پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد پڑھے پھر نبی کریم ﷺ پر درود پڑھے پھر دعا کرے آخر میں بھی ایسا ہی کرے پھر باوضو ہو کر قبلہ شریف کی طرف متوجہ ہو کر سو جائے اگر دل مطمئن ہو کہ یہ کام مجھے کرنا چاہیے تو سمجھ لے کہ وہ کام کرنا بہتر ہے اس لئے وہ کام کر لے اور اگر دل مطمئن نہیں ہو رہا تو سمجھے کہ یہ کام بہتر نہیں اس لئے اس کام سے اجتناب کر لے۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ دعا پڑھتے وقت خط کشیدہ الفاظ ''او قال'' دونوں جگہ نہ پڑھے باقی تمام دعاء پڑھ لے زیادہ تفصیل راقم کے نورالایضاح کے حاشیہ ذریعۃ النجاح میں طلباء کرام دیکھیں۔

امت مصطفیٰ ﷺ کی خوش بختی:

نبی کریم ﷺ کو معراج کی رات پچاس نمازوں کا حکم دیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کہنے پر نبی کریم ﷺ رب تعالیٰ کے حضور حاضر ہوتے رہے نمازیں معاف ہوتی رہیں۔ پانچ رہ گئیں لیکن تعداد کے لحاظ پر اگرچہ نمازیں کم ہو گئیں ثواب کے لحاظ پر رب تعالیٰ نے اپنی رحمت کاملہ سے نبی کریم ﷺ کی امت کے لئے کوئی کمی نہیں کی۔ بلکہ یہ فرمایا ''من جاء بالحسنة فله عشر امثالها'' جو شخص ایک نیکی کرے گا اس کو ثواب دس کا ہوگا۔ یعنی ایک نماز ادا کرنے سے ثواب دس کا اور پانچ ادا کرنے سے ثواب پچاس کا ہی عطا کروں گا پیارے نبی کے واسطہ سے پیارے نبی کی پیاری امت کا کتنا عظیم مرتبہ ہے اور کتنی خوش بختی ہے۔ مقام تعجب یا مقام افسوس یہ ہے کہ کچھ لوگ انبیاء کرام کو معاذ اللہ مردہ قرار دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ وہ کوئی نفع نہیں پہنچا سکتے لیکن نمازیں وہ بھی پانچ ہی ادا کرتے ہیں پچاس نہیں ادا کرتے پانچ نمازیں ادا کر کے کبھی ہوش و حواس کو قائم رکھتے ہوئے سوچ تو لیا کریں کہ پچاس سے پانچ تو موسیٰ علیہ السلام کی مہربانی سے ہوئیں موسیٰ علیہ السلام اگر نبی کریم ﷺ کو بار بار رب تعالیٰ

کے حضور نہ بھیجتے تو پانچ کیسے ہوتیں۔

☆ "الصلوۃ معراج المؤمنین "نماز مومنوں کی معراج ہے۔اس کا تفصیلی ذکر سورۃ فاتحہ کی تفسیر میں دیکھیں اتنی بات عرض کرنی مقصود ہے کہ اے امت مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء اپنی خوش بختی کو دیکھ کر تجھے نماز ادا کرتے ہوئے تجلیات باری تعالیٰ کا شرف حاصل ہوتا ہے اور تجھے اپنے محبوب ﷺ کا معراج یاد آتا ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر اور تجھے کیا قسمت حاصل ہوگی کہ تو رب تعالیٰ کی عبادت بھی کر رہا ہے اور اپنے یار (مصطفیٰ کریم ﷺ) کی اداؤں کو بھی اپنا رہا ہے۔نماز ادائے یار کی یاد کیسے؟ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "صلوا کما رأیتمونی اصلی" تم نماز ایسے ادا کرو جیسے مجھے نماز ادا کرتے ہوئے دیکھتے ہو۔

واضح ہوا کہ نماز اپنے محبوب ﷺ کے طور طریقہ کا نام ہے اور نماز میں وہی یاد تازہ ہوتی ہے۔

☆ نبی کریم ﷺ کی یہ خصوصیت ہے کہ انہیں پانچ نمازیں حاصل ہوئیں اور کسی امت کو پانچ نمازیں حاصل نہیں ہوئیں:

نماز فجر: حضرت آدم علیہ السلام نے صبح ہونے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ادا کی کیونکہ انہوں نے جنت میں رات نہیں دیکھی تھی۔ (شامی جلد اول)

نماز ظہر: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ادا کی جب کہ اسمٰعیل علیہ السلام کی جان محفوظ رہی اور قربانی کا ثواب بھی حاصل ہوگیا اور دنبہ بطور قربانی مل گیا اس کا شکریہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ظہر کی نماز ادا کر کے کیا۔

نماز عصر: حضرت عزیر علیہ السلام نے ادا کی جب کہ آپ کو سو برس کے بعد زندہ کیا گیا۔

نماز مغرب: حضرت داؤد علیہ السلام نے استغفار کی قبولیت کے شکر ادا کرتے ہوئے ادا کی اس لئے کہ آپ کی استغفار کی قبولیت کا وقت مغرب تھا۔

نماز عشاء: حضور ﷺ نے ادا کی یہ نماز حضور ﷺ کی خصوصیت ہے جس طرح پانچ نمازیں ادا کرنا آپ کی خصوصیت ہے۔

(از تفسیر الحسنات)

نماز فرشتوں کی عبادت کا مجموعہ:

فرشتوں میں سے بعض وہ ہیں جو قیام کی حالت میں ہی فقط رب تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں ان کو رکوع و سجود وغیرہ حاصل نہیں بعض فرشتے صرف رکوع کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہیں ان کو قیام اور سجدہ حاصل نہیں بعض فرشتے صرف سجدہ کی حالت میں رب تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں ان کو قیام اور رکوع حاصل نہیں۔ بعض فرشتے صرف تسبیح و تہلیل سے رب تعالیٰ کو یاد کر رہے ہیں۔

اے نبی کریم ﷺ کے امتی کبھی تو نے غور بھی کیا ہے کہ تجھے نماز جیسی عظیم عبادت حاصل ہے جس میں قراءت بھی ہے تسبیحات بھی ہیں رب تعالیٰ کی ثناء بھی ہے مصطفیٰ کریم ﷺ پر صلوۃ و سلام بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں پر سلام بھی ہے اس میں قیام بھی ہے رکوع بھی ہے سجود بھی ہے قعدہ بھی ہے۔

واضح ہوا کہ فرشتوں کی مجموعی عبادت یا اُن کی مجموعی عبادت سے بھی بڑھ کر تجھے عبادت حاصل ہے اسی کا نام نماز ہے۔ (از نعیمی)

نماز تمام مخلوق کی عبادت کا مجموعہ:

انسان چونکہ اشرف المخلوقات ہے اس لئے اسے تمام مخلوق کی عبادات حاصل ہیں کیونکہ درخت ہمیشہ قیام کر کے رب تعالیٰ کو یاد کر رہے ہیں اور چوپائے ہمیشہ رکوع کی حالت میں رب تعالیٰ کو یاد کر رہے ہیں اور سانپ، بچھو وغیرہ سجدہ کی حالت میں رب تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہیں اور مینڈک قعدہ کی حالت میں رب تعالیٰ کی یاد کر رہے ہیں۔ انسان جب نماز ادا کرتا ہے تو اسے تمام مخلوق کی مجموعی عبادات حاصل ہو جاتی ہیں۔ تمام مخلوق کا رب تعالیٰ کو یاد کرنا رب تعالیٰ نے خود ان الفاظ مبارکہ سے بیان فرمایا ﴿وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾ ہر چیز رب تعالیٰ کی تسبیح و حمد بیان کرتی ہیں۔ (از نعیمی)

حاتم زاہد رحمہ اللہ نے کیا خوب بیان فرمایا:

کسی شخص نے حاتم زاہد سے سوال کیا کہ تم نماز کس طرح ادا کرتے ہو؟ آپ نے فرمایا نماز کے وقت کے قریب آنے پر اچھی طرح وضو کرتا ہوں پھر نماز ادا کرنے کی جگہ آ کر کھڑا ہو جاتا ہوں اور دل

میں یہ تصور کرتا ہوں کہ کعبہ میری نظر کے سامنے ہے اور مقام ابراہیم کو میں دیکھ رہا ہوں ۔ اللہ تعالیٰ میرے پاس ہے جو میرے حال کو دیکھ رہا ہے اور میں یوں خیال کرتا ہوں کہ میرے قدم پل صراط پر ہیں جنت میری دائیں طرف ہے اور جہنم میری بائیں طرف ہے اور ملک الموت (عزرائیل) میرے پیچھے کھڑا ہے۔ اور جو نماز بھی ادا کرتا ہوں اسے آخری نماز سمجھتا ہوں پھر تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز شروع کرتا ہوں پھر قرآن پاک کے الفاظ کے معانی پر غور کرتے ہوئے قراءت کرتا ہوں بڑی عاجزی سے رکوع کرتا ہوں۔ عجز وانکساری سے سجدہ کرتا ہوں اور نماز کی قبولیت کی امید رکھتے ہوئے تشہد پڑھتا ہوں اور سنت کے مطابق سلام پھیرتا ہوں۔ پھر نماز سے فارغ ہونے پر نماز کی قبولیت کی امید کرتا ہوں لیکن مردود ہونے کا خوف بھی کرتا ہوں۔

(از روح البیان)

سبحان اللہ ایمان کامل ہے ہی یہی " الایمان بین الخوف والرجاء " ایمان امید اور خوف کے درمیان ہے۔ اللہ تعالیٰ کرے ہمیں بھی اسی طرح نماز ادا کرنے کی سعادت حاصل ہو جائے جیسا کہ حاتم زاہد رحمہ اللہ کو حاصل تھی۔

نماز ذریعہ ولایت:

" عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ ان الله تعالٰی قال من عادى لى وليا فقد آذنته بالحرب وماتقرب الى عبدى بشئى احب الى مما افترضت عليه ومايزال عبدى يتقرب الى بالنوافل حتى احبته فاذا احبته فكنت سمعه الذى يسمع به وبصره الذى يبصر به ويده التى يبطش بها ورجله التى يمشى بها ... رواه البخارى " (مشكوة باب ذكر الله عزوجل)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے فرمایا جس نے میرے ولی سے دشمنی کی میں اسے لڑائی کا یقین دلاتا ہوں اور جب میرا بندہ میرے قریب ہوتا ہے ان چیزوں سے جو میں نے اس پر فرض کیں وہ میرا محبوب ہوتا ہے اور نوافل کے ذریعے میرا بندہ میرے قریب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کی سماعت بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور میں اس کی بصر بن جاتا ہوں جس وہ دیکھتا ہے اور میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور میں اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔

وضاحت حدیث: "من عادی" سے مراد اذیت پہنچانا "ولیا" سے مراد اللہ تعالیٰ کی ولیوں میں سے کوئی ایک ولی یعنی جس شخص نے میرے ولیوں میں سے کسی ایک ولی کو ایذاء پہنچائی "فقد آذنته ای اعلمته" میں نے اسے بتادیا علم دے دیا یقین کرادیا یعنی "اعلمته بمحاربتی ایاہ لاجل ولی" میں نے اسے بتادیا ہے کہ میری لڑائی اس سے ہے کیونکہ اس کی لڑائی میرے ولی سے ہے یا یہ مطلب ہے "اعلمته بمحاربته ایای" کہ میں نے اسے یہ یقین کرادیا ہے بتادیا ہے کہ تیری لڑائی میرے ساتھ ہے کیونکہ اس کا میرے ولی کو ایذاء پہنچانا مجھے ایذا پہنچانا ہے میرے ولی سے دشمنی میرے ساتھ دشمنی ہے اور میرے ولی سے لڑنا میرے ساتھ لڑنا ہے" وما یتقرب عبدی" میں "عبدی" سے مراد مومن بندہ ہے جس طرح غلام اپنے آقا کی خدمت کرکے اس کا قرب حاصل کرتا ہے اسی طرح مومن اللہ تعالیٰ کے فرائض ادا کرکے اس کا قرب حاصل کرتا ہے اور پھر نوافل کے ذریعے اور زیادہ قرب حاصل کرنے کی کوشش میں رہتا ہے وہ شخص اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے تو دور دراز سے سن لیتا ہے کیونکہ اس کے کانوں میں طاقت ربی جلوہ گر ہوتی ہے یہی کیفیت اسے دیکھنے، پکڑنے اور چلنے میں بھی حاصل ہوجاتی ہے۔

نماز کے متعلق بحث پہلے ہی طویل ہوگئی اس لئے قرطبی میں جن مسائل کا ذکر کیا گیا ہے ان سے صرف نظر کررہا ہوں فقہی مسائل فقہ کی کتب میں دیکھے جائیں اور غیر مقلدین سے اختلافی مسائل راقم کی کتاب "نماز حبیب کبریا" میں دیکھے جائیں۔

﴿ وَمِمَّا رَزَقْنٰـهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴾

"اور جو ہم نے ان کو رزق دیا اس سے وہ خرچ کرتے ہیں"

"مِمَّا" اصل میں "من ما" ہے "من" اگر تبعیضیہ ہو تو ترجمہ وہی ہوگا جو ابھی نقل کیا جاچکا ہے یعنی وہ اپنے رزق سے بعض مال خرچ کرتے ہیں بہتر یہی ہے کہ تمام مال خرچ کرکے خود مانگنا نہ شروع کردے لیکن یہ حکم عام لوگوں کے لئے ہے۔ جو لوگ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرح کامل طور پر اللہ تعالیٰ پر توکل رکھنے والے ہوں وہ تمام کا تمام مال خرچ کردیں تو ان کے لئے یہی

بہتر ہوگا اس لئے کہ وہ بعد میں پشیمان نہیں ہوں گے کسی سے نہیں مانگیں گے۔ اس صورت میں "من" ابتدائیہ ہوگا مطلب یہ ہوگا کہ "جو ہم نے ان کو رزق دیا ہے وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں" "ما" میں تین احتمال ہیں:

(۱) موصولہ ہو (۲) موصوفہ ہو (۳) مصدریہ ہو۔ (از بیضاوی)

ر ز ق: جب راء پر فتحہ (زبر) ہو تو مصدر ہوگا اور راء کے نیچے کسرہ (زیر) ہو تو اسم ہوگا جس کا معنی ہوگا عطا کیونکہ مصدر کی صورت میں معنی ہوگا عطا کرنا ﴿مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ﴾ جو ہم نے ان کو عطا کیا یعنی رزق کا لغوی معنی ہے "حظ، نصیب" حصہ۔ یہ مال کو بھی شامل ہے اور غیر مال کو بھی جس طرح کہا جاتا ہے "اللهم ارزقني ولد اصالحا او زوجة صالحة" اے اللہ مجھے نیک اولاد عطا فرما اے اللہ مجھے نیک زوجہ عطا فرما۔ اسی طرح کہا جاتا ہے "اللهم ارزقني عقلا اعيش به" اے اللہ مجھے عقل عطا فرما جس کے ذریعے میں زندگی گزار سکوں۔

تنبیہ: ہر وہ مال جو انسان کو حاصل ہے وہ رزق ہے خواہ حلال ہو یا حرام ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا﴾ زمین میں ہر چلنے والی چیز کا رزق اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ کرم پر لیا۔ جب ہر ذی روح چیز کا رازق اللہ تعالیٰ ہے تو یقیناً حرام کو بھی رزق کہا جائے گا کیونکہ کئی لوگ زندگی بھر چوری، ڈاکہ وغیرہ حرام طریقہ سے مال حاصل کرتے ہیں۔

ہاں البتہ حرام کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف کرنا ادب کے خلاف ہے جس طرح کہ یہ تو کہا جا سکتا ہے "خالق المخلوقات" تمام مخلوق کو پیدا کرنے والا اس کے ضمن میں تو تمام مخلوق چھوٹی، بڑی عظمت والی یا رذیل آ گئی ہے۔ لیکن علیحدہ علیحدہ ذکر کرنا ہو تو عظمت والی چیزوں کا ذکر ہوگا یوں تو کہا جا سکے گا "خَالِقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" زمین و آسمان کا خالق اسی طرح یہ کہنا صحیح ہے "خالق المحدثات" تمام کائنات کا خالق" یہ کہا جائے تو درست ہے "خالق العرش والكرسي" عرش اور کرسی کا خالق۔ لیکن یہ کہنا درست نہیں "خالق الكلاب والخنازير" کتوں اور خنزیروں کا خالق حالانکہ رب تعالیٰ ان کا خالق تو ہے لیکن صرف گھٹیا چیزوں کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف کرنا اس کی عظمت شان کے خلاف ہے۔

اب اس بحث کے بعد ایک حدیث پاک کو سمجھنا آسان ہو جائے گا اور معتزلہ کی دلیل کا رد بھی ہو جائے گا۔ حضرت صفوان ابن امیہ کہتے ہیں ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس تھے آپ کے پاس عمرو ابن قرہ آیا اس نے کہا یا رسول اللہ:

" ان اللہ کتب علی الشقوة فلا ارانی ارزق الا من دفی بکفی فائذن لی فی الغناء من غیر فاحشة فقال علیه السلام لااذن لک ولا کرامة ولا نعمة کذبت۔ای عدو اللہ لقد رزقک اللہ رزقا طیبا فاخترت ما حرم اللہ علیک من رزقه مکان مااحل اللہ من حلاله اما انک لوقلت بعد هذه المقدمة شیا ضربتک ضربا وجیعا "

" بیشک اللہ تعالیٰ نے میرے لئے بدبختی کو لکھ دیا ہے میرا رزق صرف دف بجانے میں ہے اس لئے آپ مجھے گانا گانے کی اجازت فرمائیں فحش گانا نہیں ہوگا نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دیتا یہ کوئی عزت والا کام نہیں اور نہ ہی یہ نعمت ہے اے اللہ تعالیٰ کے دشمن تم نے جھوٹ بولا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہیں حلال رزق عطا فرمایا لیکن تم نے حلال رزق کے بدلے حرام کو پسند کرلیا ہے اگر تم نے اس بیان کے بعد پھر ایسا کہا تو تمہیں بہت شدید مارا جائے گا"

معتزلہ نے اسی حدیث کو دلیل بنایا تھا کہ حرام رزق نہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حرام کو رزق کہنے پر ناراضگی کا اظہار فرمایا لیکن ابھی تک جو بحث بیان کی اس سے واضح ہو گیا کہ حرام رزق کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف کرنا اس کی شان عظمت کے لائق نہیں اگر چہ ہے تو رزق۔

اسی حدیث سے ایک اور مسئلہ واضح ہو گیا کہ انسان فاعل مختار ہے اپنے اختیار سے اچھائی یا برائی کرتا ہے اسی پر جزاء خیر اور سزا کی دارومدار ہے۔ (از کبیر)

رزق حرام کے صدقہ کا کوئی ثواب نہیں:

حرام اگر چہ رزق ہے لیکن رزق حلال کے صدقہ کا ثواب ہے " لو عمل الخیر بمال مغصوب لا ثواب الغاصب فیه لانه آثم" (از روح المعانی) غصب کئے گئے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کا غاصب کو کوئی ثواب حاصل نہیں ہوگا اس لئے کہ اس کا غصب کرنا گناہ تھا۔ نبی کریم ﷺ نے

فرمایا " لایقبل الله صدقة من غلول " مال غنیمت میں خیانت کر کے صدقہ کیا جائے تو اللہ تعالیٰ اسے قبول نہیں فرماتا اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا "ان الله طیب لا یقبل الاطیبا " بیشک اللہ تعالیٰ طیب ہے طیب کے بغیر کسی اور چیز کو قبول نہیں فرماتا۔

معتزلہ نے ان احادیث کو دلیل بنایا ہے کہ حرام رزق نہیں لیکن جب یہ واضح ہو گیا کہ حرام رزق ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی راہ میں ثواب کی غرض سے صدقہ کرنا درست نہیں تو اسی سے معتزلہ کا رد بھی ہو گیا (از کبیر)

ینفقون: انفاق سے لیا ہوا ہے انفاق کا معنی ہے ''مال کا ہاتھ سے نکالنا'' " نفق المبیع نفاقا " اس وقت بولتے ہیں جب کسی چیز کے خریدار بہت ہو جائیں یعنی ایک دوسرے کے ہاتھ سے نکالنا چاہتے ہیں " نفقت الدابة " بولتے ہیں جب کہ جانور مر جائے اور اس کی روح نکل جائے۔ اسی سے لیا ہوا ہے "ان تبتغی نفقا فی الارض "تو زمین میں کوئی سرنگ تلاش کرلو۔ اس میں بھی ایک طرف سے داخل ہونا دوسری جانب سے نکلنا ہوتا ہے۔

عربی کا شاندار ضابطہ:

ہر وہ کلمہ جس کے فاء کلمہ میں نون ہو اور عین کلمہ میں فاء ہو اس کا معنی ہوتا ہے جانا، نکلنا، نفق الشی، کسی چیز کا ختم ہونا نفق البیع بیع کا رائج ہونا یعنی زیادہ خریداروں کا پایا جانا۔ انفق ،خرچ کرنا۔ نفل ،عطیہ دینا۔ نق، جھاڑنا یعنی تنکے وغیرہ ہٹانا۔ نفض القدر ہنڈیا کا زور سے ابلنا یعنی پانی وغیرہ کا باہر نکلنا۔ نفث منہ سے تھوک پھینکنا۔ نفج خرگوش یا جنگلی چوہے کا دوڑ کر نکل جانا۔ نفح، ہوا کا چلنا، رگ سے خون نکلنا۔ نفخ ، پھونکنا۔ نفد، ختم ہونا۔ نفذ، جاری کرنا تیر کو شکار سے پار کرنا۔ نفر ، بھاگنا۔ نفس ، سانس نکالنا۔ نفش ،روئی کا دھنا اور روئی کے ذرات کا اڑنا۔ نفص ، پیشاب کرنا۔ نفطت القدر ہنڈیا کا جوش مارنا۔

اتنے عظیم ضوابط کسی زبان میں نہیں ملیں گے جو عربی زبان میں پائے جاتے ہیں۔ (از بیضاوی ومنجد)

اصل مسئلہ کی طرف توجہ کریں:

قرآن پاک کا ہدایت ہونا متقین کے لئے ذکر فرمایا پھر متقین کی علامات کو ذکر فرمایا ان میں

سے دو کے متعلق کچھ وضاحت کر دی ایک ایمان بالغیب اور دوسری نماز قائم کرنا اب تیسری علامت متقین کی ذکر کی جا رہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے مال سے خرچ کرتے ہیں۔

یہاں کون سا خرچ کرنا مراد ہے:

بعض حضرات نے کہا کہ اس سے مراد زکوۃ ہے اس لئے کہ پہلے نماز قائم کرنے کا ذکر کیا اور اس کے بعد مال خرچ کرنے کا ذکر کیا قرآن پاک میں بہت سے مقامات ہیں جہاں نماز قائم کرنے اور زکواۃ ادا کرنے کو ایک جگہ ذکر کیا گیا ہے کہیں فرمایا "اقیموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ" کہیں فرمایا "واقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ کہیں فرمایا یقیمون الصلوۃ ویؤتون الزکوۃ ، "روی عن ابن عباس لمقارنتها" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنھما سے بھی یہی ذکر کیا گیا ہے اور آپ نے بھی یہاں سے مراد زکوۃ ہی لیا ہے دلیل ان کی بھی یہی ہے کہ نماز قائم کرنے کے ساتھ مال کا خرچ کرنا ذکر فرمایا ہے۔ بعض حضرات نے کہا کہ یہاں سے مراد مرد کا اہل وعیال پر خرچ کرنا ہے" روی عن ابن مسعود لان ذلک افضل النفقة" حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے افضل خرچ کرنا بیان فرمایا ہے۔

مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" دینار انفقته في سبيل الله و دينار انفقته في رقبة و دينار تصدقت به على مسكين و دينار انفقته على اهلک اعظمها اجرا الذی انفقته على اهلک "

ایک دینار تم نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا ایک دینار تم نے غلام آزاد کرانے میں خرچ کیا ایک دینار تم نے مسکین کو بطور صدقہ دیا اور ایک دینار تم نے اپنے اہل وعیال پر خرچ کیا تو اس پر تمہیں عظیم اجر حاصل ہوگا جو تم نے اپنے اہل وعیال پر خرچ کیا۔

یہ بھی خیال رہے کہ یہ اس وقت ہے جب اہل وعیال پر خرچ کرنا ضروری ہو وہ اس کے محتاج ہوں تو ان کا نفقہ اس پر فرض ہے فرض کی ادائیگی پہلے ہے نفل بعد میں اور اپنے ہی اہل وعیال پر خرچ کرنے میں صلہ رحمی بھی پائی گئی لیکن جب اہل وعیال محتاج نہیں ان کا مال ان کی کفایت کر رہا ہو تو اب

سے دو کے متعلق کچھ وضاحت کر دی ایک ایمان بالغیب اور دوسری نماز قائم کرنا اب تیسری علامت متقین کی ذکر کی جا رہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے مال سے خرچ کرتے ہیں۔

یہاں کون سا خرچ کرنا مراد ہے:

بعض حضرات نے کہا کہ اس سے مراد زکوۃ ہے اس لئے کہ پہلے نماز قائم کرنے کا ذکر کیا اور اس کے بعد مال خرچ کرنے کا ذکر کیا قرآن پاک میں بہت سے مقامات ہیں جہاں نماز قائم کرنے اور زکواۃ ادا کرنے کو ایک جگہ ذکر کیا گیا ہے کہیں فرمایا "اقیموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ" کہیں فرمایا "واقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ کہیں فرمایا یقیمون الصلوۃ ویؤتون الزکوۃ ، "روی عن ابن عباس لمقارنتها" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی ذکر کیا گیا ہے اور آپ نے بھی یہاں سے مراد زکوۃ ہی لیا ہے دلیل ان کی بھی یہی ہے کہ نماز قائم کرنے کے ساتھ مال کا خرچ کرنا ذکر فرمایا ہے۔ بعض حضرات نے کہا کہ یہاں سے مراد مرد کا اہل وعیال پر خرچ کرنا ہے" روی عن ابن مسعود لان ذلک افضل النفقة" حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے افضل خرچ کرنا بیان فرمایا ہے۔

مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" دینار انفقته فی سبیل الله و دینار انفقته فی رقبة و دینار تصدقت به علی مسکین و دینار انفقته علی اهلک اعظمها اجرا الذی انفقته علی اهلک "

ایک دینار تم نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا ایک دینار تم نے غلام آزاد کرانے میں خرچ کیا ایک دینار تم نے مسکین کو بطور صدقہ دیا اور ایک دینار تم نے اپنے اہل وعیال پر خرچ کیا تو اس پر تمہیں عظیم اجر حاصل ہوگا جو تم نے اپنے اہل وعیال پر خرچ کیا۔

یہ بھی خیال رہے کہ یہ اس وقت ہے جب اہل وعیال پر خرچ کرنا ضروری ہو وہ اس کے محتاج ہوں تو ان کا نفقہ اس پر فرض ہے فرض کی ادائیگی پہلے ہے نفل بعد میں اور اپنے ہی اہل وعیال پر خرچ کرنے میں صلہ رحمی بھی پائی گئی لیکن جب اہل وعیال محتاج نہیں ان کا مال ان کی کفایت کر رہا ہو تو اب

اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا نفلی طور پر بھی اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہونے کا ذریعہ ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ انسان فرائض ادا کرنے سے اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے اور فرائض ادا کرنے کے بعد نوافل ادا کر کے ہمیشہ عادت بنا کر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے والا اور ہی زیادہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نفلی صدقہ ادا کرنے کی طاقت نہ ہو تو پہلے فرض اور واجب ذمہ داریوں کو پورا کرے۔

☆ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" افضل دينار ينفقه الرجل دينار ينفقه على عياله و دينار ينفقه الرجل عي دابته في سبيل الله عزوجل و دينار ينفقه على اصحابه في سبيل الله "

" افضل وہ دینار ہے جو انسان نے اپنے اہل وعیال پر خرچ کیا بنسبت اس دینار کے جو اللہ تعالیٰ کی راہ کے لئے (جہاد کے لئے) سواری خریدنے پر خرچ کیا اور بنسبت اس دینار کے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے ساتھیوں پر خرچ کیا"

☆ ابو قلابہ نے کہا کہ ابتدا اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنے سے کی جائے پھر ابو قلابہ نے کہا "اى رجل اعظم اجرا من رجل ينفق على عيال صغار بعضهم او ينفعهم الله به ويغنيهم " وہ کون سا شخص ہوگا جس کا مرتبہ عظیم ہوگا اس شخص سے جو اپنے چھوٹے بچوں پر خرچ کرتا ہے کہ ان کو یہ مال کفایت کر جائے۔ وہ کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائیں اور ان کو اللہ تعالیٰ اس مال کے ذریعے نفع دے اور بے پرواہ کر دے "وقيل المراد صدقة التطوع "بعض حضرات نے کہا کہ یہاں صدقہ سے مراد نفلی صدقہ ہے۔ اس پر ضحاک کی یہ دلیل ہے کہ زکوۃ جہاں بھی مراد ہے وہاں لفظ زکوۃ ہی ذکر کیا گیا ہے۔ اور جہاں زکوۃ کا لفظ نہیں ذکر وہاں احتمال ہوگا کہ یہاں سے مراد فرض صدقہ ہے یا کہ نفلی لیکن جب " انفاق "ذکر ہوگا وہاں مراد نفلی صدقہ ہی ہوگا۔

بعض حضرات نے کہا یہاں خرچ کرنے سے مراد زکوۃ کے علاوہ حقوق واجبہ ہیں جن کا تعلق مال سے ہے۔ اس لئے کہ جب اللہ تعالیٰ نے نماز کے ساتھ ذکر فرمایا تو واجب ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کیا جائے لیکن لفظ زکوۃ ذکر نہیں فرمایا تو پتہ چل گیا کہ زکوۃ کے علاوہ دوسرے مالی حقوق واجبہ ہیں۔

صحیح قول یہ ہے: "هو عام وهو الصحيح " خرچ کرنے سے مراد عام ہے جو زکوۃ

اور دوسرے وجوبی صدقات اور نفلی صدقات کو شامل ہے یہی قول زیادہ صحیح ہے۔ (از قرطبی)

تمام اقوال کو جامع قول: یعنی جو ابھی بیان کیا کہ مراد عام ہے یہی قول تمام اقوال کو جامع ہے ان تمام اقوال کے لئے جامع عبارت ملاحظہ ہو:

" ینفقون ای یخرجون ویتصدقون فی طاعة الله تعالیٰ وسبیله ویدخل فیه انفاق الواجب کزکوة والنذر والانفاق علی النفس وعلی من تجب نفقته علیه والانفاق فی الجهاد اذا وجب علیه والانفاق فی المندوب وهو صدقة التطوع ومواساة الاخوان وهذه کلها مما یمدح بها " (خازن)

ینفقون کا معنی ہے نکالنا یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا اور اس کی طاعت کے لئے خرچ کرنا یہاں جو مراد ہے وہ عام ہے صدقات واجبہ اور مستحبہ دونوں کو شامل ہے واجب طور پر خرچ کرنا جیسے زکوۃ، نذر اپنی ذات پر خرچ کرنا اور جن لوگوں کا خرچ اس کے ذمہ ہے ان پر خرچ کرنا اور جب اس پر جہاد فرض ہو تو جہاد کے لئے خرچ کرنا۔ مستحب طور پر خرچ کرنا ہر قسم کے نفلی صدقات اور اپنے اقرباء اور اپنے مومن بھائیوں کی امداد کے لئے خرچ کرنا۔ ان تمام قسم کے خرچ کرنے کی تعریف قرآن وحدیث میں بیان کی گئی ہے یعنی ان پر انسان کو اجر عظیم حاصل ہوتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

سات قسم کا مال خرچ کرنا شریعت میں عبادت ہے:

(۱) فرض زکوٰۃ ادا کرنا نقد مال سے جب وہ نصاب کو پہنچ جائے اور سال اس پر گزر جائے مویشیوں اور مال تجارت سے زکوٰۃ ادا کرنا اور زمین کی پیداوار سے عشر ادا کرنا (تفصیل فقہی کتب میں دیکھی جائے)۔

(۲) صدقہ فطر، رمضان میں ادا کردے یا شوال کا چاند دیکھنے پر ادا کردے عید کی نماز سے پہلے ادا کرنا بہتر البتہ بعد میں ادا ہو سکے گا۔

(۳) خیرات یعنی سوال کرنے والوں کو دینا، مہمانوں کو کھانا کھلانا ضعیف اور یتیم لوگوں کی امداد

کرنااور قرض دینایہ تمام قسم کے نفلی صدقات ہیں جوزکوۃ کے علاوہ ہیں۔

(۴) مال کو اللہ کی راہ میں وقف کرنا مسجد بنانا، دینی مدارس بنانا، پل بنانا، کنواں بنانا، مہمانوں یعنی مسافروں کے لئے سرائے بنانا۔

(۵) حج کے لئے مال خرچ کرنا جب کہ اس کے پاس اتنا مال ہو جو اس کے آنے جانے اور وہاں رہنے کے اخراجات کے لئے کافی ہو اور جتنا وقت اس کا حج پر صرف ہو اتنے وقت کے لئے اس کے اہل وعیال کا خرچ بھی موجود ہو۔

(۶) جہاد کے لئے مال خرچ کرنا کیونکہ جہاد کے لئے ایک درھم خرچ کرنا سات سو درھم اور جگہ پر خرچ کرنے کے برابر ثواب حاصل کرتا ہے

(۷) نفقات واجبہ، یعنی زوجہ پر خرچ کرنا، چھوٹی اولاد پر خرچ کرنا اور اپنے محارم کی مجبوری اور معذوری کے وقت اپنی طاقت کے مطابق ان پر خرچ کرنا۔ (از عزیزی)

نتیجہ واضح ہوا اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے مال سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا قابل مدح اور علامت تقویٰ ہے اور بخل سے کام لینا اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں نہ خرچ کرنا قابل مذمت ہے۔

سخاوت کی تعریف اور بخل کی مذمت پر احادیث مبارکہ:

"عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ لو كان لی مثل احد ذهبا لسرنی ان لايمر علی ثلاث ليال وعندی منه شئی الا شئی ارصده لدين"

(رواه البخاری، مشكوة باب الانفاق وكراهية الامساس)

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر میرے پاس احد (پہاڑ) کے برابر سونا ہوتو مجھے یہ پسند ہے کہ اس پر تین راتیں نہ گزرنے پائیں کہ میرے پاس اس میں سے کچھ باقی رہے ہاں البتہ اتنا مال صرف باقی رہے جس سے میں قرض ادا کردوں"

جنت کے وسط میں پہنچنے سے پہلے ہی روزہ داروں کو شراب طہور پلا کر سیراب کردیا جائے گا ان کی پیاس کو ختم کردیا جائے گا۔ چونکہ انہوں نے دنیا میں پیاس کو برداشت کیا تھا جنت میں ان کو یہ انعام دیا جائیگا۔

(از مرقاۃ ج۴ص ۲۰۱، ۲۰۲)

وضاحت حدیث: نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی بہت واضح ہے سخاوت کی تعریف حدیث پاک سے عیاں ہو رہی ہے کہ نبی کریم ﷺ اسے پسند فرماتے تھے کہ اگر مجھے احد پہاڑ کے برابر سونا مل جائے تو وہ میرے پاس یوں ہی تین راتیں نہ رہے بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دیا جائے ہاں البتہ اتنا مال میرے پاس باقی رہ جائے جس سے میں اپنا قرض ادا کر سکوں۔

فائدہ: قرض کی ادائیگی کے لئے رسول اللہ ﷺ نے اپنے پاس رکھنے کی تمنا کر کے اس مسئلہ کی طرف اشارکر دیا:

" ان اداء الدین مقدم علی الصدقة و کثیر من جهلة العوام وظلمة الطغام یعملون الخیرات والمبرات والعمارات وعلیهم حقوق الخلق ولم یلتفقوا الیها "

بیشک قرض ادا کرنا صدقہ سے پہلے ہے عوام میں کثیر طور پر جہلاء اور بہت سے کمینے ظالم لوگ نیکی کے کاموں میں اور مساجد مدارس وغیرہ کی تعمیر میں خرچ کرتے رہتے ہیں حالانکہ ان پر لوگوں کے حقوق ہوتے ہیں جن کی وہ پرواہ نہیں کرتے فرائض کو پیچھے کر دینا اور نوافل کو مقدم کرنا سوائے جہالت کے اور کچھ نہیں:

" وهكذا كثير من المتصوفة غير العارفة يجتهدون فی الرياضات وتكثير الطاعات والعبادات وما يقومون بما يجب عليهم من الديانات "

اسی طرح بہت سے جاہل صوفیاء ریاضت میں کوشش کرتے ہیں بڑی طاعت کرتے ہیں اور عبادت کرتے ہیں لیکن یہ سب نفلی کام کرتے ہیں دین میں واجب کاموں کی کوئی پرواہ نہیں کرتے اور ان کو ادا نہیں کرتے۔ (از مرقاۃ ج ۴ ص ۱۸۴)

اس لئے علماء، طلباء، صوفیاء کے لئے ضروری ہے کہ وہ محافل کو قائم کریں تو نماز کے وقت نماز ادا کریں اتنی لمبی محافل نہ ہوں کہ لوگ نماز پڑھے بغیر چلے جائیں اکثر طور پر یہ خامی دیکھنے میں آتی ہے جس کی طرف توجہ کی بہت ضرورت ہے۔

☆ " عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ مامن يوم يصبح العباد فيه الاملكان ينزلان فيقول احدهما اللهم اعط منفقا خلفا ويقول الآخر اللهم اعط ممسكا تلفا "

(بخاری، مسلم، مشکوۃ باب الانفاق.....الخ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی ایسا دن نہیں جس کی صبح کو بندوں کے پاس دو فرشتے نہ نازل ہوتے ہوں ان میں سے ایک کہتا ہے اے اللہ خرچ کرنے والے کو اس کا بدلہ عطا فرما اور دوسرا کہتا ہے اے اللہ بخیل کے مال کو ہلاک کر۔

وضاحت حدیث: جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے اس کے لئے نازل ہونے والے دو فرشتوں میں سے ایک رب تعالیٰ کے حضور عرض کرتا ہے اے اللہ اسے اس کا عظیم بدلہ عطا فرما یعنی اسے اچھا بدلہ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی عطا فرما۔ یہ دعا اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مطابق ہے ﴿وَمَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ وَهُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ﴾ اور جو چیز تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو وہ اس کے بدلے اور دے گا اور وہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے لئے مال خرچ نہیں کرتا بخل سے کام لیتا ہے اس کے لئے دوسرا فرشتہ یہ دعا کرتا ہے اے اللہ اس کے مال کو برباد کر دے۔ اس دعا کا ایک مطلب تو یہ ہی ہو سکتا ہے کہ اس کا مال ظاہری طور پر برباد ہو جائے اور دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اس کے مال میں خیر و برکت ختم ہو جائے۔ (از مرقاۃ ج ۴ ص ۱۸۴)

☆ "عن اسماء قالت قال رسول الله ﷺ انفقی ولا تحصی فیحصی الله علیک ولا توعی فیوعی الله علیک ارضحی ما استطعت" (بخاری، مسلم، مشکوۃ باب انفاق الخ)

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کہتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم خرچ کرو شمار نہ کرو اللہ تعالیٰ تم پر شمار کرے گا روک کر نہ رکھو اللہ تعالیٰ تم پر روک کر رکھے گا عطا کرو جتنی تمہیں طاقت ہو۔

وضاحت حدیث: حضرت اسماء بنت صدیق رضی اللہ عنہما فرماتی ہیں مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرو۔

لا تحصی : تم شمار نہ کرو اس کے مختلف معانی معتبر ہیں ایک تو یہ کہ تم مال زیادہ سے زیادہ رب تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرو باقی جمع کر کے نہ رکھو اس لئے جو مال جمع ہوتا ہے انسان اسے گنتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم جو مال بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں دو اسے زیادہ سمجھو گن گن کر نہ دو کیونکہ جب تم یہ سمجھو گی کہ یہ مال تو تھوڑا ہے تو اس طرح تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کر سکو گی۔

راقم کے نزدیک تیسرا معنی یہ ہے کہ تم مال کو رب تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے وقت اس لئے نہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی ایسا دن نہیں جس کی صبح کو بندوں کے پاس دو فرشتے نہ نازل ہوتے ہوں ان میں سے ایک کہتا ہے اے اللہ خرچ کرنے والے کو اس کا بدلہ عطا فرما اور دوسرا کہتا ہے اے اللہ بخیل کے مال کو ہلاک کر۔

وضاحت حدیث: جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے اس کے لئے نازل ہونے والے دو فرشتوں میں سے ایک رب تعالیٰ کے حضور عرض کرتا ہے اے اللہ اسے اس کا عظیم بدلہ عطا فرما یعنی اسے اچھا بدلہ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی عطا فرما۔ یہ دعا اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مطابق ہے ﴿وَمَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُه' وَهُوَ خَيْرُ الرّٰازِقِيْنَ﴾ اور جو چیز تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو وہ اس کے بدلے اور دے گا اور وہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے لئے مال خرچ نہیں کرتا بخل سے کام لیتا ہے اس کے لئے دوسرا فرشتہ یہ دعا کرتا ہے اے اللہ اس کے مال کو برباد کر دے۔ اس دعا کا ایک مطلب تو یہی ہوسکتا ہے کہ اس کا مال ظاہری طور پر برباد ہو جائے اور دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ اس کے مال میں خیر و برکت ختم ہو جائے۔ (از مرقاۃ ج ۴ ص ۱۸۴)

☆ "عن اسماء قالت قال رسول اللہ ﷺ انفقی ولا تحصی فیحصی اللہ علیک ولا توعی فیوعی اللہ علیک ارضحی ما استعطت" (بخاری، مسلم، مشکوۃ باب انفاق ... الخ)

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کہتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم خرچ کرو شمار نہ کرو اللہ تعالیٰ تم پر شمار کرے گا روک کر نہ رکھو اللہ تعالیٰ تم پر روک کر رکھے گا عطا کرو جتنی تمہیں طاقت ہو۔

وضاحت حدیث: حضرت اسماء بنت صدیق رضی اللہ عنہما فرماتی ہیں مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرو۔

لا تحصی : تم شمار نہ کرو اس کے مختلف معانی معتبر ہیں ایک تو یہ کہ تم مال زیادہ سے زیادہ رب تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرو باقی جمع کر کے نہ رکھو اس لئے جو مال جمع ہوتا ہے انسان اسے گنتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم جو مال بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں دو اسے زیادہ سمجھو گن کر نہ دو کیونکہ جب تم یہ سمجھو گی کہ یہ مال تو تھوڑا ہے تو اس طرح تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کر سکو گی۔

راقم کے نزدیک تیسرا معنی یہ ہے کہ تم مال کو رب تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے وقت اس لئے نہ

گنو کہ اتنا مال رب تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا تو باقی تھوڑا رہ جائے گا اس طرح تم اللہ کی راہ میں مال تھوڑے سے تھوڑا خرچ کر سکو گی۔

فیحصی اللہ علیک: اللہ تعالیٰ تم پر شمار کرے گا اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ رب تعالیٰ تمہارے رزق میں کمی کر دے گا اس سے برکت اٹھ جائے گی یعنی تمہیں مال تھوڑا تھوڑا گن گن کر دے گا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ قیامت کے دن تم سے حساب لے گا تمہارے خرچ کیے ہوئے مال کو شمار کرے گا اور کہے گا کہ میں نے تمہیں کثیر مال عطا کیا تھا تم نے میری راہ میں قلیل مال کیوں خرچ کیا۔

ولا توعی فیوعی اللہ علیک: ایعاء کا معنی ہوتا ہے کسی چیز کو برتن یا تھیلے وغیرہ میں محفوظ کر لینا۔ مطلب یہ ہوا کہ جو مال اللہ تعالیٰ نے تمہیں دیا ہے اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضروریات میں خرچ کرنے کے بعد جو تم سے بچتا ہے اسے محفوظ ہی نہ کر لو فقراء کو اس سے نہ روکو بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی کے لئے فقراء کو مال دو اگر تم نے مال کو جمع کر کے رکھا فقراء کو نہ دیا تو اللہ تعالیٰ بھی تم پر اپنے فضل کو دروازے بند کر کے مال کو محفوظ کر لے گا۔

ارضحی ما استطعت: رضح کا معنی " قلیل عطیه " یعنی تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرو بیشک وہ قلیل ہی تمہاری استطاعت کے مطابق ہو " ولا تجعلیه حقیرا فانه ربما یکون عند اللہ کثیرا وفی میزان القبول کبیرا " تم تھوڑے مال کو حقیر نہ سمجھو (اس لئے کہ خلوص و محبت سے تھوڑا مال رب تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا ہوا) اللہ تعالیٰ کے ہاں کثیر ہوتا ہے اور قبولیت کا درجہ عطا کرتے ہوئے اسے میزان میں بھاری سمجھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ﴾ تو جو ایک ذرہ بھر بھلائی کرے اسے دیکھے گا یعنی ذرہ بھر نیکی کا کام بھی ضائع نہیں ہوگا بلکہ اس کا بھی عظیم اجر دیا جائے گا جو انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا وَكَفَى بِنَا حَاسِبِينَ﴾ اور اگر کوئی چیز رائی کے دانہ کے برابر ہو تو ہم اسے لے آئیں گے اور ہم کافی ہیں حساب کرنے والے۔ مطلب یہی ہے کے نیکی کا عمل تھوڑا سمجھ کر اس سے پیچھے نہ ہو بلکہ یہ سمجھا جائے کہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عظیم اجر حاصل ہوگا اور اس کے دربار میں شرف قبولیت اسے حاصل ہوگا۔ اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے

﴿وَاِنْ تَکُ حَسَنَةً یُّضَاعِفْهَا وَیُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِیْمًا﴾ اور اگر کوئی نیکی ہو تو اسے دونی کرتا ہے اور اپنے پاس سے بڑا ثواب دیتا ہے۔

تھوڑے سے تھوڑا مال خرچ کرنے کا حکم حضرت اسماء کو دے کر آپ نے ایک اور مسئلہ کو طرف اشارہ بھی فرمادیا کہ عورت اپنے خاوند کا مال اس کی اجازت کے بغیر صرف اتنا ہی دے سکتی ہے جتنا عام عادت کے مطابق ہوتا ہے کہ کسی فقیر کو معمولی چیز دے دی جاتی ہے کہ یہ دروازہ سے خالی نہ لوٹے لیکن زیادہ مال اگر خرچ کرنا ہے تو زوج کی اجازت لینی ضروری ہوتی ہے۔ ہاں اگر خاوند کی طرف سے زوجہ کو اپنے مال میں تصرف کرنے کی بلا روک ٹوک اجازت ہے تو وہ جتنا چاہے خرچ کرسکتی ہے۔ (از مرقاۃ ج ۴ ص ۱۸۵)

☆ " عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ السخی قریب من الله قریب من الجنة قریب من الناس بعید من النار والبخیل بعید من الله بعید من الجنة بعید من الناس قریب من النار ولجاهل سخی احب الی الله من عابد بخیل " (رواہ الترمذی، مشکوۃ باب الانفاق)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سخی اللہ تعالیٰ کے قریب ہوتا جنت کے قریب ہوتا ہے لوگوں کے قریب ہوتا ہے آگ سے دور ہوتا ہے اور بخیل اللہ تعالیٰ سے دور ہوتا ہے جنت سے دور ہوتا ہے آگ کے قریب ہوتا ہے اور البتہ جاہل سخی اللہ تعالیٰ کو عابد بخیل سے زیادہ محبوب ہوتا ہے۔

وضاحت حدیث: السخی : سخی سے مراد وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرے۔

قریب من الله: اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے کا یہ مطلب ہے کہ وہ اس کی رحمت کے قریب ہوگا اور یا یہ مطلب ہے کہ " قریب منه فی التخلق بصفة الکرم " وہ رب تعالیٰ کی صفت کرم کو حاصل کرنے کے قریب ہے۔ یعنی سخی کا کتنا عظیم مقام ہے کہ وہ رب تعالیٰ کی صفت کرم کا مظہر ہے رب تعالیٰ کریم ہے ذاتی طور پر اور اس نے اپنی عطاء اور اپنے فضل سے اپنے بندے کو بھی کریم بنا دیا ہے۔

قریب من الجنة : جنت کے قریب ہونے کا یہ مطلب ہے کہ سخی اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرکے اپنے ذمہ وجوب کو ادا کر رہا ہے لیکن "یوجب له حسن المال " اس کے لئے یہ اچھے

انجام کا سبب ہے۔

قریب من الناس : لوگوں کے قریب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ فقراء پر احسان کر کے ان کے وہ قریب ہوجاتا ہے"وفی الحقیقه هم الناس "حقیقت میں لوگ یعنی انسان فقراء ہی ہیں۔ اور ایک مطلب یہ بھی ہے کہ سخاوت کر کے انسان عوام اور خواص کے قریب ہوتا ہے اس لئے کہ سخی سے ہر شخص محبت کرتا ہے بیشک کسی کو اس کی سخاوت سے فائدہ نہ بھی حاصل ہو جس طرح عادل کی عدالت سے کوئی فائدہ حاصل کرے یا نہ کرے لیکن ہر شخص اس سے محبت کرتا ہے۔

بعید من النار : سخی آگ سے دور ہوتا ہے:

" لان السخی لم یرتض باخذ مال الحرام وصرفه فی غیر المقاصد العظام والا فیکون مسرفا ولذا قیل لاخیر فی سرف ولا سرف فی الخیر "

اس لئے کہ سخی حرام مال حاصل کرنے کو پسند نہیں کرتا اور مقصد کے بڑے کاموں کے بغیر خرچ نہیں کرتا ورنہ وہ اسراف کرنے والا ہوگا سخی نہیں ہوگا اسی وجہ سے بیان کیا گیا ہے کہ اسراف میں نیکی نہیں اور نیکی میں اسراف نہیں۔

ولجاهل سخی......الخ : البتہ جاہل سخی اللہ تعالیٰ کے عابد بخیل سے زیادہ محبوب ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سخی جو فرائض تو ادا کرتا ہے لیکن نوافل نہیں ادا کرتا البتہ وہ علم بھی نہیں رکھتا کہ اس کے ذمہ مالی وجوب کیا ہے اور مستحب کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ہر راہ میں مال خرچ کرتا رہتا ہے وہ اس عابد سے بہتر ہے جو فرائض ادا کرنے کے بعد نوافل بھی ادا کرتا ہے لیکن بخیل ہے حقوق مالیہ ادا نہیں کرتا خواہ وہ عابد عالم ہی کیوں نہ ہو۔

سخی افضل کیوں؟ " لان ترک الدنیا راس کل عبادة " اس لئے کہ دنیا کو چھوڑنا تمام عبادات کی سردار عبادت ہے چونکہ سخی اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے خود دنیا کے مال سے محبت نہیں کرتا۔ بخیل کی مذمت کیوں بیان ہوئی؟"لان حب الدنیا راس کل خطیئة " اس لئے کہ دنیا کی محبت تمام خطاؤں کی اصل ہے چونکہ بخیل رب تعالیٰ کے دیئے ہوئے مال سے رب تعالیٰ کی راہ میں ہی اس لئے نہیں خرچ کر رہا کہ اسے دنیا کے مال سے محبت ہے۔

تنبیہ: " من قام بالفرائض وترک النوافل افضل ممن قام بالنوافل وترک الفرائض واکثر الناس مبتلون بهذا البلاء "

جو شخص فرائض کو ادا کرے اور نوافل نہ ادا کرے وہ افضل ہے اس شخص سے جو نوافل ادا کرتا ہے لیکن فرائض کو چھوڑتا ہے اکثر لوگ اس میں مبتلاء ہیں کہ وہ فرائض ادا کرتے کا لحاظ نہیں کرتے نوافل ادا کرنے کے درپے ہوتے۔

ہاں البتہ یہ خیال رہے کہ جو لوگ فرائض ادا کر کے نوافل بھی ادا کرتے ہیں وہ خوش قسمت ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہوتے اور اللہ تعالیٰ کے مقرب بھی ہوتے ہیں ان کی عبادت " نور علٰی نور " ہوتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ شرعی قوانین کی پاسداری کرنا ان کے مطابق چلنا ہی کامیابی ہے اور وہی شخص "واصل الی اللہ " ہوتا ہے اپنی مرضی سے راہیں متعین کرنا باعث خسارہ ہے "ولـذا قال بعض العارفين انما حرموا الوصول بتضييع الاصول " اسی وجہ سے کسی عارف نے کیا خوب کہا کہ وہ لوگ جو اصولوں کو ضائع کر دیتے ہیں وہ رب تعالیٰ کے قرب تک پہنچنے سے بھی محروم رہتے ہیں۔

(از مرقاۃ ج ۴ ص ۱۸۹)

اتنی بات واضح ہے: کہ ﴿ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴾ سے مراد اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنا متقین کی علامت ہے مال خرچ کرنے کی کئی قسمیں ہیں لیکن ان پر صدقات واجبہ اور مستحبہ کے الفاظ بولے جاتے ہیں اس لئے ابھی زکوۃ کی تعریف اور احکام یا صدقہ فطر کی تعریف اور احکام کی بجائے صرف صدقہ کی فضیلت کے متعلق یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔ سلسلہ تحریر جاری رکھنے کی توفیق اللہ تعالیٰ نے عطاء فرمائی تو انشاء اللہ آگے مناسب مقامات پر ہر ایک کی تعریف بیان ہوتی رہے گی۔

صدقہ کی فضیلت میں احادیث مبارکہ سے:

" عن عبد الله بن عمرو قال قال رسول الله ﷺ اعبدوا الرحمن واطعموا الطعام وافشوا السلام تدخلوا الجنة بسلام "

(رواه الترمذی وابن ماجه، مشکوۃ باب فضل الصدقة)

"حضرت عبداللہ ابن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رحمٰن کی عبادت کرو اور طعام کھلاؤ اور سلام عام کرو سلامتی سے جنت میں داخل ہو جاؤ"

وضاحت حدیث: رحمٰن جس نے قرآن سکھایا صرف اسی ذات کی عبادت کرو اس کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ ٹھہراؤ اور عوام و خواص کو طعام کھلاؤ طعام کھلانے میں ریا کاری، نام و نمود اپنا چرچا کرنا مقصود نہ ہو بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مندی مقصود ہو اور مومنوں کو سلام کہو خواہ تمہاری ان سے جان پہچان ہو یا نہ ہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں جنت کے بہتر مقام میں داخل کرے گا جس کا نام دار السلام ہو گا وہاں جنتی ایک دوسرے کو سلام کا تحفہ پیش کریں گے۔

☆ ''عن انس قال رسول اللہ ﷺ ان الصدقة لتطفی غضب الرب وتدفع میتة السوء''
(رواہ الترمذی، مشکوۃ باب فضل الصدقة)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ صدقہ رب تعالیٰ کے غضب کو ختم کرتا ہے اور خاتمہ کی برائی کو مندفع کرتا ہے۔

وضاحت حدیث: میتة، میم کے نیچے کسرہ (زیر) ہے اصل میں'' موتة'' واؤ ساکن ما قبل میم مکسور، واؤ کو یا سے بدل دیا انسان پر موت کے وقت جو حالت ہوتی ہے اسے میتة کہا جاتا ہے۔ رب تعالیٰ کے غضب (کی آگ) کو بجھا دینے کا مطلب یہ ہے کہ صدقہ اس کے پاس مکروہ چیزوں کے نازل ہونے کو منع کرتا ہے اور مردہ ہونے کی حالت کی برائی کو مندفع کرتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے سوء خاتمہ سے محفوظ رکھتا ہے ''سوء'' کو سین کی زبر اور پیش دونوں سے پڑھا گیا ہے۔ مکروہ چیزوں سے مراد یہ ہے کہ ہر وہ چیز ہر وہ حالت جس کی وجہ سے انسان بے خوف نہ ہو سکے اور جس کی آخرت میں تعریف نہ کی جا سکے ان سے صدقہ انسان کو محفوظ رکھتا ہے۔ اسی طرح وہ فقر جو انسان کے صبر سے بالاتر ہو اور ایسی مصیبتیں جو انسان کی پریشان حالی کا سبب بنیں اور ایسے درد جو انسان کی بے قراری کا سبب بنیں اور ایسی تنگ حالی جو انسان کے لئے رب تعالیٰ کی نعمتوں کے کفران (ناشکری) کا سبب بنیں صدقہ ان سے انسان کو محفوظ رکھتا ہے سوء خاتمہ سے مراد عذاب قبر عذاب آخرت ہے یعنی صدقہ کرنے والا اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور صدقہ کی برکت سے قبر کے عذاب اور آخرت کے عذاب سے محفوظ رہتا ہے۔ (از مرقاۃ ج ۴ ص ۴۰۸)

☆ ''عن ابی ھریرة قال قال رسول اللہ ﷺ من تصدق بعدل تمرة من کسب طیب ولا یقبل اللہ الا الطیب فان اللہ یتقبلھا بیمینه ثم یربیھا لصاحبھا کما یربی احدکم

فلوہ حتی تکون مثل الجبل" (بخاری ، مسلم ، مشکوۃ باب فضل الصدقۃ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے کسب حلال سے ایک کھجور کی مقدار صدقہ کیا "اللہ تعالیٰ صرف حلال مال ہی قبول کرتا" تو بیشک اللہ تعالیٰ اس صدقہ کو اپنے دائیں ہاتھ (جو اس کی شان کے لائق ہے) سے قبول فرماتا ہے پھر اس صدقہ کو صدقہ کرنے والے کے لئے بڑھاتا ہے جیسا کہ تم میں سے کوئی ایک اپنے گھوڑے کے بچے کو پالتا ہے یہاں تک کہ وہ احد پہاڑ کی طرح ہو جاتا ہے۔

وضاحت حدیث: "عدل" عین پر فتح اور کسرہ دونوں سے آتا ہے معنی برابر ہونا یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدقہ کرے۔ خواہ کھجور ہو یا کھجور کے برابر مقدار میں کوئی اور چیز ہو یا کھجور کی قیمت کے برابر کوئی اور چیز ہو۔ البتہ وہ صدقہ کے طور پر دیا ہوا مال رزق حلال، کسب حلال ہو خواہ وہ اپنی صنعت سے حاصل ہو یا تجارت سے یا زراعت سے یا کسی نہ کسی طرح مزدوری وغیرہ سے کسب کیا ہوا ہو خواہ بطور وراثت ملا ہو خواہ بطور ہبہ ملا ہو۔ بیشک اللہ تعالیٰ اسے اپنے دائیں دست قدرت سے قبول کرتا ہے یعنی اسے حسن قبولیت عطا فرماتا ہے اور وہ صدقہ کامل طور پر رب تعالیٰ کی رضامندی پر دلالت کرتا ہے "لان الشئی المرضی یتلقی بالیمین فی العادۃ" اس لئے کہ جو چیز پسند ہو مرضی کے مطابق ہو اسے ہی دائیں ہاتھ سے قبول کرنے کی عادت پائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس صدقہ کو بڑھاتا ہے یعنی اس میں خیر و برکت عطا فرماتا ہے وہ صدقہ جو کھجور کی طرح تھا قیامت کے دن اس کا ثواب احد پہاڑ کی طرح میزان میں ہوگا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ صدقہ ہی پہاڑ کی طرح نظر آئے کہ اس نے پہاڑ کی طرح اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا ہے۔

" فلو، بفتح الفاء ویضم وبضم اللام وتشدید الواو ای المهر وهو ولد الفرس" فا پر فتح (زبر) ہے اور ضمہ (پیش) بھی آ جاتا ہے لام پر ضمہ ہے اور واؤ پر شد ہے اس کا معنی گھوڑے کا بچہ۔ نبی کریم ﷺ نے تھوڑے صدقہ کو رب تعالیٰ کی طرف سے بڑھانے کو تشبیہ سے سمجھایا کہ جس طرح تم گھوڑے کے چھوٹے سے بچے کو پالتے ہو تو وہ بڑا جسیم قد آور گھوڑا بن جاتا ہے اسی طرح رب تعالیٰ کے حضور تمہارا رزق حلال سے خلوص سے صرف رب تعالیٰ کی رضاء کی خاطر دیا ہوا

صدقہ عظیم ہو جائے گا۔

"ولا یقبل اللہ الا طیبا" یہ جملہ معترضہ ہے جو شرط اور جزا کے درمیان واقع ہے "وفیہ اشارۃ الی ان غیر الحلال غیر مقبول وان الحلال المکتسب یقع بمحل عظیم" اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو مال حلال نہیں ہو گا وہ رب تعالیٰ کے حضور قبول نہیں ہو گا اور جو حلال طریقہ سے حاصل کیا ہو گا اسی کا صدقہ کرنا عظیم درجہ رکھے گا۔

علامہ علی قاری رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں کہ ہمارے شیخ عارف باللہ ولی علی متقی رحمۃ اللہ علیہ بیان فرماتے کہ ایک بزرگ شخص اپنے کسب سے مال حلال حاصل کرتے تھے تہائی حصہ صدقہ کرتے تہائی حصہ اپنے آپ پر اور اہل وعیال پر خرچ کرتے اور تہائی حصہ اپنے ذریعہ کسب پر خرچ کرتے یعنی کسب کے آلات وغیرہ خریدنے اور ان کو درست کرنے پر خرچ کرتے ان کے پاس ایک دنیادار شخص آیا اس نے کہا اے شیخ میں صدقہ کرنا چاہتا ہوں مجھے کوئی مستحق شخص بتائیں۔ انہوں نے کہا۔ جو مال حلال طریقہ سے حاصل ہو وہ جب خرچ کیا جائے تو خود بخود وہ مستحق کے پاس ہی جاتا ہے اس غنی شخص نے پھر پوچھا کہ آپ مجھے کوئی مستحق بتائیں انہوں نے فرمایا تم جاؤ اور جس شخص سے بھی تمہاری ملاقات ہو اور تمہارا دل اس کی طرف میلان کرے کہ اس پر مہربانی کرنی چاہیے وہی مستحق ہو گا وہ شخص وہاں سے نکلا اس نے ایک فقیر کو دیکھا جو بہت بوڑھا اور نابینا تھا اس نے اسے مال دے دیا۔ دوسرے دن یہ شخص وہاں سے گزرا تو اس نے سنا کہ وہ نابینا کسی دوسرے کو بتا رہا ہے کہ کل ایک شخص نے مجھے پیسے دیئے تھے جس سے مجھے بڑی بساطت حاصل ہوئی میں نے ان پیسوں سے گذشتہ رات شراب پیا اور رات ایک گانا گانے والی عورت کے پاس گزاری۔ وہ غنی شخص اپنے شیخ کے پاس آیا ان کو واقعہ بتایا کہ میں نے جسے کل پیسے دیئے تھے وہ مستحق نہیں تھا۔ شیخ نے اپنے کسب سے حاصل کیے رزق حلال سے اس غنی کو ایک درہم دیا کہ تم جاؤ گھر سے باہر نکلنے کے بعد جو شخص تمہیں سب سے پہلے ملے یہ درہم اسے دے دینا وہ شخص شیخ کا درہم لے کر چلا سب سے پہلے جس پر اس کی نظر پڑی وہ بظاہر فقیر نظر نہیں آ رہا تھا بلکہ یوں سمجھ آ رہا تھا کہ اس کی حالت بہتر ہے۔ اس شخص نے اسی درہم دینے سے پہلے تو خوف کیا کہ یہ مستحق نہیں لیکن پھر شیخ کے کہنے کے مطابق اس غنی شخص نے اسے وہ درہم دے دیا۔

جب اس نے اس شخص کو درہم دیا تو وہ اپنے راستہ پر واپس لوٹ پڑا غنی بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا اس نے دیکھا کہ وہ شخص ایک بیابان خراب سی جگہ میں ایک دروازہ میں داخل ہوا اور دوسری طرف سے نکل کر شہر کی طرف چلا غنی نے اس خراب بیابان چار دیواری میں داخل ہو کر دیکھا کہ وہاں اور تو کچھ نہیں البتہ ایک کبوتر مردہ حالت میں پڑا ہے اس غنی نے اس شخص کو قسم دلا کر اس کا حال پوچھا جب میں نے تمہیں درہم دیا تو تم وہاں سے ہی کیوں لوٹ پڑے اور اس خراب جگہ میں داخل ہونے کا کیا مطلب ہے کبوتر مرا ہوا کیسے ہے وغیرہ؟ اس شخص نے بتایا کہ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں جو بہت زیادہ بھوک میں مبتلا تھے ہم حالت اضطراب میں تھے جس حال میں مردہ جانور کھانا بھی جائز ہے۔ میں گھر سے نکل کر ادھر ادھر چکر لگا رہا تھا مجھے ایک مردہ کبوتر مل گیا جو میں نے اس بیابان جگہ سے اٹھایا تھا وہ لے کر جا رہا تھا کہ اسی کو کھالیں گے جب اللہ تعالیٰ نے ایک درہم عطا فرما دیا تو میں اس کبوتر کو یہاں رکھنے کیلئے آ گیا جو اس نے پکڑ کر غالباً کسی کپڑے وغیرہ میں چھپا رکھا تھا۔ اب اس غنی پر شیخ کے کلام کی حقیقت واضح ہوگئی کہ حرام کی کمائی کمال جسے مستحق سمجھ کر دیا تھا وہ عیاش نکلا مستحق نہیں تھا اور حلال کی کمائی کا مال جسے غیر مستحق سمجھ کر دیا وہ ایسا مستحق تھا جیسا ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے۔ سبحان اللہ صاحب بصیرت حضرات کو اللہ تعالیٰ نے کیسا ہی بلند مقام دیا ان کی نظر ولایت کہاں تک کام کرتی ہے اور ان کی نصیحت کا انداز کیا ہی خوب ہوتا ہے۔

(از مرقاۃ ج ۴ ص ۱۹۹، ۲۰۰)

تنبیہ: جہاں بھی رب تعالیٰ کے لئے اعضاء کا ذکر ہے جس طرح یہاں ہے ﴿یَتَقَبَّلُهَا بِیَمِیْنِهٖ﴾ دائیں ہاتھ سے قبول کرتا ہے اور ﴿یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ﴾ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے ﴿فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ جس طرف منہ پھیرو اللہ تعالیٰ کا چہرہ اسی طرف ہے۔ اس قسم کے تمام الفاظ متشابہات سے ہیں حقیقی مراد ان کی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں ہاں البتہ یہ معنی کیا جائے دایاں ہاتھ جو اس کی شان کے لائق ہے یا یوں کہا جائے اس کا دایاں دست قدرت تو کسی حد تک درست ہے۔

فائدہ جلیلہ:

"وفی حدیث زھیر قال قال رسول اللہ ﷺ ان المقسطین عند اللہ علی

منابر من نور عن يمين الرحمن عزوجل و كلتا يديه يمين الذين يعدلون في حكمهم و اهليم وما ولوا" (مسلم ج ۲ ص ۱۲۹ باب فضیلة الامیر العادل)

''حضرت زہیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بیشک وہ لوگ جن کو ولایت حاصل ہے وہ اپنی رعایا وغیرہ اور اپنے اہل پر حکم اور فیصلہ کرنے میں انصاف کرتے ہیں وہ لوگ (قیامت کے دن) رحمٰن عزوجل کی دائیں جانب نورانی منبر پر ہوں گے اللہ تعالیٰ کی دونوں طرفیں یمین (دائیں) ہی ہیں''

وضاحت حدیث: "مـا ولـوا" واؤ پر فتحہ اور لام پر ضمہ اور لام مخففہ ہے یعنی جن لوگوں پر ان کو ولایت حاصل ہے "مقسطون" کا معنی ہے عدل کرنے والے لیکن یہ معنی اس وقت ہوگا جب کہ یہ لفظ قسط بکسر القاف سے لیا ہوا ہوگا اسی معنی پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے لیکن جب قسط بفتح القاف یا قسوط اصل ہو تو پھر معنی ہوتا ہے ظلم کرنا اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی اس معنی پر بھی دلالت کر رہا ہے "واما القاسطون فكانوا لجهنم حطبا" لیکن ظالم لوگ جہنم کا ایندھن ہوں گے "منابر" منبر کی جمع ہے بلند ہونے کی وجہ سے منبر کہا جاتا ہے نور کے منبر پر ہونے کا ایک مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو منازل رفیعہ عطا فرمائے گا اور دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ حقیقی منبروں پر ہوں گے۔

علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حقیقی منبر معنی لینا زیادہ مناسب ہے کیونکہ اس میں بلند مرتبہ والا معنی بھی پایا گیا ہے "یمین الرحمن" رب تعالیٰ کی دائیں طرف اس میں اختلاف ہے کہ اس کا معنی کیا کیا جائے اتنا اتفاق ہے کہ اس کا ظاہری معنی مراد نہیں:

" وان منهم من قال نؤمن بها ولا نتكلم في تاويله ولا نعرف معناها "

بیشک بعض حضرات نے کہا ہے کہ ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں ہم اس کی تاویل بیان نہیں کرتے اور اس کا معنی مرادی ہم نہیں جانتے البتہ اتنا ہمارا عقیدہ ہے کہ اس کا ظاہری معنی مراد نہیں وہی معنی مراد ہوسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے یہ مذہب جمہور سلف صالحین اور کچھ متکلمین کا ہے "والثانی انها تتاول علی ما یلیق" دوسرا مذہب یہ ہے کہ ایسی تاویل کر لی جائے جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے یہ مذہب اکثر متکلمین کا ہے اسی مذہب کے مطابق قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں

" ان المراد بکونهم عن الیمین الحالة الحسنة و المنزلة الرفیعة " بیشک ان کا رب تعالیٰ کے دائیں طرف ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ اچھی حالت اور بلند مراتب میں ہوں گے " قال ابن عرفة یقال اتاه عن یمینه اذا جاء من الجهة المحمودة " ابن عرفہ نے کہا ہے کہ عام طور پر کہا جاتا ہے وہ دائیں طرف سے آیا لیکن اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ قابل تعریف جہت سے آیا:

" والعرب تنسب الفعل المحمود الی الیمین وضده الی الیسار قالوا والیمین ماخوذة من الیمن "

عرب حضرات اچھے کام کو یمین (دائیاں) کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اس کی ضد کو یسار (بائیاں) کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ کہتے ہیں یمین ماخوذ ہے یمن سے جس کا معنی ہے برکت۔

اسی حدیث اور اس کی اس تشریح (یمین سے مراد فعل محمود اور اس کی ضد یسار ہے) کو مدنظر رکھتے ہوئے محب رسول صاحب حسنات رفیعہ، شفیق ومہربان، محسن عظیم، رئیس المحققین، عظیم المدققین، اشرف المدرسین، استاذی المکرم حضرت علامہ ابوالحسنات محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی فرماتے تھے کہ جب رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں کا ذکر ہو تو یوں کہو آپ کا دایاں ہاتھ اور آپ کا دوسرا ہاتھ بائیاں ہاتھ نہ کہو اس لئے کہ بائیں ہاتھ میں اکثر طور پر طاقت کی کمی ہوتی ہے اور شان کی کمی پر بھی دلالت کرتا ہے نبی کریم ﷺ کے دونوں ہاتھ ہی یمین ہیں۔

سبحان اللہ کیا ایمان ہے کیسا شاندار عقیدہ کیسی پختہ محبت حبیب کبریا علیہ التحیۃ والثناء کے ساتھ ہے کاش کہ میرے استاذ محتشم نے جب ہمیں پڑھاتے ہوئے یہ نصیحت فرمائی تھی ہمارے لئے دعا بھی فرمادیتے کہ یا اللہ ان میرے تلامذہ کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرما بہت کوشش کرتا ہوں کافی حد تک اس پر عمل بھی کرتا ہوں لیکن کبھی بھول کر بائیاں بھی کہہ دیتا ہوں اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔

☆ " عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ ما نقصت صدقة من مال و ما زاد الله عبدا بعفو الا عزا وما تواضع احمد الله الا رفعه الله " (رواه مسلم مشکوة باب فضل الصدقة)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی شخص کا مال صدقہ سے کم نہیں ہوتا اور کسی بندے کو اللہ تعالیٰ عفو سے زائد نہیں کرتا مگر یہ کہ اسے بڑھاتا ہے اور کوئی ایک اللہ تعالیٰ کے لئے عجز اختیار نہیں کرتا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کی عزت کو بڑھاتا ہے۔

وضاحت حدیث: انسان کا مال صدقہ ادا کرنے سے بظاہر جو کم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس میں برکت عطا فرما دیتا جس کی وجہ سے اس کا مال بڑھ جاتا ہے کبھی کبھی ظاہری طور پر مال کے بڑھنے اور عطیہ کے ملنے کو انسان خود دیکھ بھی لیتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اسے عظیم ثواب عطا فرما دیتا ہے۔ جب کوئی انسان کسی سے انتقام لینے کی قدرت رکھتا ہے پھر معاف کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اسے عزت عطا کرتا ہے۔ دلوں میں اس کی عظمت پیدا کر دیتا ہے۔ اسے عظیم ثواب عطا کر کے اسے بلند مرتبہ عطا کر دیتا ہے۔ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے عجز و انکساری سے کام لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا مرتبہ دنیا اور آخرت میں بلند کر دیتا ہے۔ (مرقاۃ ج ۴ ص ۲۰۰)

☆ " عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ من انفق زوجين من شئی من الاشياء فی سبيل الله دعی من ابواب الجنة وللجنة ابواب فمن كان من اهل الصلوة دعی من باب الصلوة ومن كان من اهل الجهاد دعی من باب الجهاد ومن كان من اهل الصدقة دعی من باب الصدقة ومن كان من اهل الصيام دعی من باب الريان فقال ابوبكر ماعلی من دعی من تلک الابواب من ضرورة فهل يدعی احد من تلک الابواب كلها قال نعم وارجو ان تكون منهم " (بخاری، مسلم مشكوة باب فضل الصدقة)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا زوجین (ایک دوسرے پر) جو مال اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے خرچ کرتے ہیں، ان کو جنت کے دروازوں سے بلایا جائے گا نمازی کو باب الصلوٰۃ سے بلایا جائے گا اور جہاد کرنے والے کو باب الجہاد سے بلایا جائے گا۔ صدقہ کرنے والے کو باب الصدقہ سے بلایا جائے گا اور روزہ داروں کو باب الریان سے بلایا جائے گا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا تمام دروازوں سے بلائے جانے کی ضرورت تو نہیں کیا کسی کو تمام دروازوں سے بھی بلایا جائے گا تو آپ نے فرمایا ہاں اور میں امید کرتا ہوں تم ان سے ہی ہو گے۔

وضاحت حدیث: زوجین (خاوند زوجہ) جب اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے لئے ایک دوسرے پر مال خرچ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اسے پسند فرماتا ہے جنت کے تمام دروازوں سے ان کو داخل ہونے کی اجازت ہو گی اور ہر دروازہ سے بلاوہ آئے گا۔ جنت کے آٹھ دروازے ہیں ہر دروازہ کا عبادت کی مناسبت سے نام رکھا گیا ہے چار کا ذکر اس مذکور حدیث میں ہے اور چار کا ذکر دوسری احادیث میں۔

باب الصلوۃ ، باب الجهاد ، باب الصدقة ، باب الريان ، باب التوبة ، باب الرياضين ، باب الكاظمين الغيظ و العافين عن الناس اور باب الضحى ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت میں ایک دروازہ ہے جس کا نام باب الضحیٰ ہے جب قیامت کا دن ہوگا تو پکارنے والا پکارے گا " این الذین کانوا یداومون علی صلوۃ الضحی هذا بابکم فادخلوه برحمة الله " کہاں ہیں وہ لوگ جو چاشت کی نماز ہمیشہ ادا کرتے تھے یہ تمہارا دروازہ ہے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اس میں داخل ہو جاؤ۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا سب دروازوں سے داخل ہونے کی ضرورت تو نہیں اس لئے کہ مقصد تو جنت میں داخل ہونا ہے خواہ ایک سے داخل ہو جائے یا سب سے داخل ہونے کی اسے اجازت ہو۔لیکن کوئی خوش قسمت ایسا بھی ہوگا جسے ہر دروازہ سے بلایا جائے وہ جس دروازہ سے داخل ہو جائے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہاں یعنی ایک جماعت کثیر نمازیں (نوافل) ادا کرنے کی وجہ سے اور زیادہ جہاد کرنے کی وجہ سے اور کثیر روزے (نفلی اور فرض) رکھنے کی وجہ سے اور ہر قسم کی نیکیاں کرنے والے حضرات کو تعظیم و تکریم کے طور پر ہر دروازہ سے داخل ہونے کی اجازت ہوگی اور ہر دروازہ سے ان کو بلایا جائے گا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں امید کرتا ہوں (اے ابوبکر) تم بھی ان میں سے ہی ہوگی " لانه رضی الله عنه كان جامعا لهذه الخيرات كلها " اسلئے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ تمام نیکیاں کرنے والے تھے اس لئے ان کو تمام دروازوں سے داخل ہونے کے لئے بلایا جائے گا۔ ویسے عام طور پر جو عبادت کوئی کرے گا اسی کے مناسب دروازہ کا جو نام ہوگا اسی سے اس شخص کو بلایا جائے گا ستر ہزار خوش قسمت وہ لوگ ہوں گے جو بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے۔ روزہ داروں کے جنت میں داخل ہونے والے دروازہ کو باب الریان کہنے کا کیا مطلب ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ریان ضد ہے عطشان کی عطشان معنی پیاسا اور ریان کا معنی سیراب۔

" عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ من اصبح منكم اليوم صائما قال ابوبكر انا قال فمن تبع منكم اليوم جنازة قال ابوبكر انا قال فمن اطعم منكم اليوم مسكينا قال ابو بكر انا قال فمن عاد منكم اليوم مريضا قال ابوبكر انا فقال رسول الله ﷺ ما اجتمعن فی امری الادخل الجنة "

(رواه مسلم مشكوة باب فضل الصدقة)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے آج صبح روزہ کس نے رکھا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے آپ نے فرمایا تم میں سے آج جنازہ کے ساتھ کون گیا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا میں۔ آپ نے فرمایا تم میں سے آج مسکین کو کھانا کس نے کھلایا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے آپ نے فرمایا تم میں سے آج مریض کی عیادت کس نے کی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی شخص میں یہ تمام (چار چیزیں) جمع نہیں ہوتیں مگر یہ کہ وہ جنت میں داخل ہوگا۔

اس حدیث شریف میں بھی صدقہ کی فضیلت واضح ہے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا تمام امت سے افضل ہونا بھی واضح ہے ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے دروازہ پر حاضر ہوئے دروازہ کھٹکایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''من'' کون انہوں نے عرض کیا ''انا'' آپ نے فرمایا ''انا انا'' میں میں یعنی آپ نے ناپسند فرمایا کہ ''انا'' کہا جائے بلکہ نام لیا جائے۔ یہ صورت اس وقت ہے جب آدمی سامنے نہ ہو جب سامنے ہو پھر پوچھا جائے یہ کام کس نے کیا ہے وہ کہے ''انا'' میں نے یہ جائز ہے کیونکہ اس میں کوئی اشتباہ نہیں۔ (از مرقاۃ ج ۴ ص ۲۰۲)

فائدہ عظیمہ: زیر بحث آیۃ کریمہ سے ہی یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ فوت شدہ حضرات کے لئے صدقہ کرنا اور ان کو ثواب پہنچانا بھی اس میں داخل ہے کیونکہ صدقہ مطلقاً ذکر ہے جو وجوبی اور نفلی کو شامل ہے۔ فوت شدہ حضرات کے لئے صدقہ کرنا مستحب ان کو ثواب پہنچانا مستحب ہے یہی تحقیق غزالی دوراں حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر التبیان مع البیان میں فرمائی ہے۔ راقم نے ایصال ثواب ''مستحب'' ہے ایک رسالہ آج سے تین سال پہلے لکھا تھا یہاں عوام الناس کے فائدہ کے لئے اس سے ایصال ثواب کی بحث کو شامل کیا جا رہا ہے۔

بحث ایصال ثواب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے!

﴿ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾

اور وہ لوگ جو ان کے بعد آئے، عرض کرتے ہیں۔ اے ہمارے رب ہمیں بخشش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لائے اور ہمارے دل میں والوں کی طرف سے کینہ نہ رکھ

اے رب ہمارے! بے شک تو نہایت مہربان رحم والا ہے۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر کبیر میں ذکر کیا ہے۔

" واعلم ان هذه الآيات قد استوعبت جميع المؤمنين لانهم اما المهاجرون او الانصار او الذين جاؤا من بعدهم و بين ان فى شان من جاء من بعد المهاجرين والانصار ان يذكر السابقين وهم المهاجرون والانصار بالدعاء والرحمة فمن لم يكن كذالك بل ذكرهم بسوء كان خارجا جملة اقسام المؤمنين بحسب نص هذه الآية "

بے شک یہ آیات (یعنی تین آیات ایک یہ اور دو اس سے پہلی آیتیں مسلمانوں کی تمام قسموں کو حاوی ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہ پہلے مسلمانوں یعنی مہاجرین وانصار (اور تمام پہلے گزرے ہوئے مسلمانوں) کیلئے دعا کریں ایصال ثواب کریں۔ ان کیلئے رحمت طلب کریں جو اس طرح نہیں کرتے بلکہ پہلے مسلمانوں کو برائی سے یاد کرتے ہیں، وہ مسلمانوں کی تمام قسموں سے خارج ہیں۔

اس حکم پر یہ آیت کریمہ صراحۃً دلالت کر رہی ہے، قرآن پاک کی اس آیت کریمہ سے واضح ہوا کہ مسلمانوں کو حقیقی معنی میں مسلمان بننے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے سے پہلے گزرے ہوئے تمام مسلمانوں کے لئے دعا کریں اور ان کے لئے دعا مغفرت طلب کریں۔

بے شمار احادیث سے بھی یہ واضح ہے کہ فوت شدہ بھائیوں کو ثواب پہنچایا جائے اور ان کیلئے دعا مغفرت کی جائے۔

" عن ابى هريرة قال اذا مات الانسان انقطع عنه عمله الامن ثلاثة الامن صدقة جارية او علم ينتفع به او ولد صالح يدعو له "

(مسلم ج ۲، باب ما يلحق من الثواب بعد وفات)

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے بے شک نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب انسان فوت ہو جاتا ہے اس کے اعمال منقطع ہو جاتے ہیں۔ سوائے تین چیزوں کے۔ یعنی سوائے صدقہ جاریہ یا علم جس سے لوگ نفع حاصل کر رہے ہوں۔ یا نیک اولاد جو اس کے حق میں دعا کر رہے ہوں۔

اس حدیث پاک سے یہ ثابت ہوگیا، کہ فوت شدہ انسان کے لئے دعا کرنا صرف جائز ہی نہیں بلکہ اس کے اعمال کی ترقی اور مغفرت اور بلندی درجات کا ذریعہ ہے۔

اسی حدیث کی شرح میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں!

" وفیه ان الدعاء یصل ثواب الی المیت و کذلک الصدقة وهما مجمع علیهما "

اس حدیث پاک سے یہ ثابت ہوا کہ بے شک دعا کا ثواب میت کو پہنچتا ہے۔ اسی طرح صدقہ کا ثواب بھی، ان دونوں کے ثواب کے پہنچنے پر اجماع امت ہے۔

" ان من البر بعد البر ان تصلی لأبویک مع صلاتک و تصوم لهما مع صومک " (مسلم ج اول باب بیان الاسناد من الدین)

بے شک نیکی کے بعد نیکی یہ ہے کہ تم اپنی نماز کے ساتھ والدین کے لئے بھی نماز (نوافل) پڑھو اور اپنے روزہ کے ساتھ اپنے والدین کے لئے (نفلی) روزے بھی رکھو (ان کا ثواب پہنچاؤ)۔

اس حدیث کی شرح میں نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

" عن بعض اصحاب الکلام من ان المیت لا یلحقه بعد موته ثواب فهو مذهب باطل قطعا و خطأ بین، مخالف النصوص الکتاب والسنة واجماع الامة فلا التفات الیه "

بعض اصحاب کلام نے کہا کہ میت کو اسکی موت کے بعد ثواب نہیں پہنچتا یہ مذہب یقیناً باطل ہے قرآن پاک، حدیث پاک اور اجماع امت کے خلاف ہے۔ اسکی طرف بالکل توجہ نہ کی جائے۔

نیز علامہ نووی اس کے بعد یہ تحریر فرماتے ہیں۔

" وذهب جماعات من العلماء الی انه یصل الی المیت ثواب جمیع العبادات من الصلوة والصوم والقراءة وغیره ذلک "

علماء کی کثیر جماعتوں کا موقف یہ ہے کہ میت کو تمام عبادات کا ثواب پہنچتا ہے۔ خواہ نماز ہو، یا روزہ ہو، تلاوت قرآن پاک ہو یا ان کے بغیر اور عبادات ہوں۔

گویا اس مسئلے میں کل دو مذہب ہو گئے ایک باطل مذہب کہ میت کو ثواب نہیں پہنچتا اور دوسرا علمائے حق کا مذہب کہ میت کو ثواب پہنچتا ہے۔

" قال النووی فی الاذکار قال محمد بن احمد المروزی سمعت احمد بن حنبل یقول اذا دخلتم المقابر فاقرءوا بفاتحة الکتاب والمعوذتین وقل هو الله احد واجعلوا ثواب ذالک لاهل المقابر فانه

یصل الیهم والمقصود من زیارة القبور للزائر الاعتبار وللمزور الانتفاع بدعائه "

محمد بن احمد مروزی فرماتے ہیں کہ میں نے احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو فرماتے سنا کہ جب تم قبرستان میں داخل ہو تو سورۂ فاتحہ، سورۃ اخلاص، سورۃ فلق اور سورۃ الناس پڑھ کر ثواب قبرستان والوں کو پہنچاؤ، کیونکہ ان کو ثواب پہنچتا ہے۔

قبروں کی زیارت میں مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ زیارت کرنے والا عبرت حاصل کرے اور جن کی زیارت کی جائے انہیں دعا سے نفع حاصل ہو۔

" واخرج الخلال فی الجامع عن الشعبی قال کانت الانصار اذا مات لھم المیت اختلفوا الی قبره یقرؤن القرآن " (مرقات ج ۴ ص ۱۸۱)

شعبی سے مروی ہے کہ انصار کا اگر کوئی شخص فوت ہو جاتا تو وہ اسکی قبر پر جا کر قرآن پاک پڑھتے تھے۔

" واخرج ابو محمد السمر قندی فی فضائل قل ھو اللہ احد عن علی مرفوعا من مر علی المقابر وقرء ﴿قل ھو اللہ احد الخ﴾ احدی عشرة مرة ثم وھب اجره للاموات اعطی من الاجر بعدد الاموات " (مرقات ج ۴ ص ۸۱)

حضرت علی رضی اللہ عنہ مرفوع حدیث مروی ہے کہ جو شخص قبرستان سے گزرے اور گیارہ مرتبہ ''قل ھو اللہ احد'' پڑھے پھر اس کا ثواب فوت شدہ حضرات کو پہنچائے تو فوت شدہ لوگوں کی تعداد کے مطابق اجر دیا جائے گا۔ (یعنی ہر شخص کو مکمل ثواب حاصل ہوگا۔ اور پڑھنے والے کو بھی جتنے زیادہ ہوں گے اتنا زیادہ اجر حاصل ہوگا)۔

" واخرج ابو القاسم سعد بن علی الزنجانی فی فوائده عن ابی ھریرة قال قال رسول اللہ ﷺ من دخل المقابر ثم قرأ فاتحة الکتاب وقل ھو اللہ احد والھکم التکاثر ثم قال انی جعلت ثواب ما قرأت من کلامک لاھل المقابر والمؤمنین والمؤمنات کانوا شفعاء له الی اللہ تعالیٰ "

(مرقات ج ۴ ص ۸۱،۲)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص قبرستان میں داخل ہوا پھر سورۃ فاتحہ پڑھی اور ''قل ھو اللہ احد'' اور ''الھکم التکاثر'' سورۃ پڑھی پھر کہا میں نے جو کلام پڑھی ہے۔ اس کا ثواب میں قبرستان کے مومن مرد اور عورتوں کو پہنچاتا ہوں۔ تو تمام لوگ (جن کو

یہ ثواب پہنچائے گا) اس کے شفیع ہوں گے۔

" عن ابی هريرة ان رجلا قال للنبی ﷺ ان ابی مات وترک مالا ولم یوص فهل یکفر عنه ان تصدق عنه (ان تصدق عنه) قال نعم "

(مسلم باب وصول ثواب الصدقة الی المیت)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ بے شک ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے عرض کیا یا رسول اللہ میری والدہ اچانک فوت ہوگئیں کوئی وصیت نہیں کر سکیں، میرا گمان یہ ہے کہ اگر وہ کلام کر سکتیں تو صدقہ کی وصیت ہی کرتیں۔ کیا انہیں اس کا ثواب ملے گا کہ میں ان کی طرف سے صدقہ کردوں؟ آپ نے فرمایا ہاں۔

ان دونوں حدیثوں کے ترجمہ سے ہی بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ صدقہ کا ثواب میت کو ملتا ہے اور حضرت محدث رحمۃ اللہ علیہ نے ''باب'' کا نام (عنوان) ہی ایسا رکھا ہے جس سے واضح ہو رہا ہے کہ اس باب میں وہ احادیث ذکر ہوں گی جن سے یہ ثابت ہوگا کہ میت کو صدقہ کا ثواب پہنچتا ہے

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی مقام پر فرمایا!

" وفی هذا الحديث جواز الصدقة عن الميت واستحبابها وان ثوابها يصله وينفعه وينفع المتصدق ايضا وهذا كله اجمع عليه المسلمون " (نووی شرح مسلم جلد ثانی ۲۹)

اس حدیث سے واضح ہوا کہ میت کی طرف سے صدقہ کرنا جائز اور مستحب ہے اور بے شک اس صدقہ کا ثواب اسے پہنچتا ہے اور میت کو اس کا نفع حاصل ہوتا ہے اور صدقہ کرنے والے کو بھی اس کا نفع حاصل ہوتا ہے۔ اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔

مباح بہ نیت تقرب مستحب ہو جاتا ہے:

وصیت کے متعلق نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"والثلث كثير انک ان تذر ورثتک اغنياء خير من ان تذرهم عالة يتكففون الناس ولست تنفق نفقة تبتغي بها وجه الله الا اجرت بها حتى اللقمة تجعلها فی فی امراتک" (مسلم ج۲، کتاب الوصية)

تہائی حصہ کی وصیت بہت ہے۔ بے شک اگر تم ورثاء کو غنی چھوڑ جاؤ، تو یہ بہتر ہے اس سے کہ تم

انہیں حاجتمند چھوڑ جاؤ کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہیں ۔تم اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے جو مال بھی خرچ کرو گے۔اس کا تمہیں ضرور اجر ملے گا۔ یہاں تک کہ جو لقمہ تم اپنی زوجہ کے منہ میں ڈالو گے۔اس کا ثواب بھی تمہیں ملے گا۔

یہ حدیث جس کا کچھ حصہ نقل کیا گیا ہے۔اس کی شرح میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے چند مسائل نقل کئے ہیں۔

☆ " وفی هذا الحدیث حث علی صلة الارحام والاحسان الی الاقارب والشفقة علی الورثة وان صلة القریب الاقرب والاحسان الیه افضل من الابعد "

اس حدیث پاک میں صلہ رحمی اور قریبی رشتہ داروں پر احسان کرنے اور ورثاء پر شفقت کرنے پر برانگیختہ کیا گیا ہے۔ اور اس بات پر برانگیختہ کیا گیا ہے۔ کہ قریبی رشتہ داروں پر صدقہ کر کے صلہ رحمی حاصل کرنا اور ان پر احسان کرنا زیادہ بہتر ہے بنسبت دور والوں کے۔

☆ " واستدل به بعضهم علی ترجیح الغنی علی الفقیر "

اسی سے بعض اہل علم نے یہ ثابت کیا ہے کہ اپنی قریبی رشتہ دار کو نفلی صدقہ دینا زیادہ بہتر ہے باوجود اس کے کہ وہ غنی ہو اور دوسرا شخص فقیر ہو۔

☆ " وفیه استحباب الانفاق فی وجوه الخیر "

اور یہ بات ثابت ہوئی کہ بھلائی کے ہر قسم کے مواقع پر مال خرچ کرنا مستحب ہے۔

☆ " وفیه ان الاعمال بالنیات وانه انما یثاب علی عمله بنیة "

اور یہ ثابت ہوا کہ اعمال کا دارومدار نیات پر ہے، بے شک انسان کو اس کے عمل پر اس کی نیت کے مطابق ہی ثواب دیا جاتا ہے۔

☆ " وفیه ان الانفاق علی العیال یثاب علیه اذا قصد به وجه اللہ تعالیٰ "

اور یہ ثابت ہوا کہ اہل وعیال پر مال خرچ کرنے پر بھی ثواب حاصل ہوا ہے۔ جب اس میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا لحاظ کیا جائے۔

☆ " وفیه المباح اذا قصد به وجه اللہ تعالیٰ یصیر طاعة ویثاب علیه "

اور یہ واضح ہوا کہ مباح کے کام میں جب اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا لحاظ کیا جائے تو وہ طاعت

بن جاتا ہے اور اس پر ثواب دیا جاتا ہے۔ کیونکہ اپنی زوجہ سے مہربانی اور تعلقات ازدواجی دنیاوی خواہشات اور لذات کی وجہ سے ہوتا ہے، ان لذات کے پیش نظر ہی اس کے منہ میں لقمہ ڈالا جاتا ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے یہی کام کئے جائیں تو ان میں ثواب حاصل ہوتا ہے۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے زوجہ کے منہ میں ڈالے جانے والے لقمہ کو باعث اجر و ثواب قرار دیا ہے۔

☆ " ان الانسان اذا فعل شياء اصله على الاباحة ذالك كالاكل بنية التقوى على طاعة الله تعالى والنوم للاستراحة ليقوم اى بنية العبادة نشيطا والاستمتاع بزوجة ليكف نفسه وبصره ونحوهما عن الحرام وليقضى حقها وليحصل ولد اصالحا "

(نووی شرح مسلم ج ۲، ص ۴۷)

انسان جب کوئی ایسا کام کرے جو اصل میں تو مباح ہو لیکن جب وہ اس میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی کو حاصل کرنے کے لئے کرے تو وہ مستحب ہو جائے گا۔ اس میں اسے ثواب حاصل ہوگا۔ جس طرح کھانا کھانا مباح ہے۔ لیکن جب اس لئے کھائے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کی قوت حاصل ہو جائے تو یہی مستحب ہو جائے گا۔ "سونا" (آرام کرنا) مباح ہے لیکن اس لئے سونا کہ آرام حاصل ہو جائے تو پھر عبادت کرنے میں چستی حاصل ہو ستی باقی نہ رہے تو یہ سونا بھی مستحب ہوگا، اس پر ثواب حاصل ہوگا۔

زوجہ سے منافع حاصل کرنا مباح ہیں لیکن اس غرض سے منافع حاصل کرے کہ حرام کاموں سے بچ جاؤں اور زوجہ کے حقوق پورے کرلوں اور نیک اولاد حاصل ہو تو یہ منافع حاصل کرنے مستحب ہو جائیں گے اور ان پر ثواب مرتب ہوگا۔

نتیجہ واضح ہوا: علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ کی بحث سے یہ واضح ہو گیا کہ میت کے گھر والے یا ان کے رشتہ دار اگر اس غرض سے کھانا پکائیں کہ دور دراز سے آئے ہوئے رشتہ داروں اور پڑوسیوں یا اہل محلہ یا احباب کو کھلائیں گے تا کہ ہمارے تعلقات اور زیادہ بڑھیں صلہ رحمی حاصل ہو تو یقیناً یہ باعث ثواب ہے۔

تنبیہ: اہل میت کھانے کا اہتمام ایسا نہ کریں جس سے یہ پتہ چلے کہ یہ خوشی کی محفل ہے۔ شرکاء بھی غمزدہ ہی نظر آئیں۔ مطلقاً ضیافت، اظہار خوشی یقیناً مکروہ ہے۔

" ویکرہ اتخاذ الضیافة من الطعام من اهل المیت لانه شرع فی السرور لا فی الشرور" (شامی ج ۱، ص ۶۶۴)

اس لئے غم اور خوشی کے کھانوں میں فرق ہونا چاہئے، کسی قسم کی ایسی حرکات نہ پائی جائیں، جو خوشی پر دلالت کریں۔

لیکن یہ بھی خیال رہے کہ اگر خوشی کی طرح ہی کھانے کی محفل سجائی جائیں، شرکاء بھی ہنستے رہیں ان محافل سے غمی کا کوئی تصور نہ ہو تو پھر بھی ''مکروہ'' ہی ثابت ہوگا۔ ''حرام'' ثابت کرنے کے لئے صرف زبان سے کہہ دینا کافی نہیں، بلکہ دلیل کی ضرورت ہے۔

اہل سنت و جماعت کا مذہب:

" وفی البحر من صام او صلی او تصدق وجعل ثوابه لغیره من الاموات والاحیاء جاز ویصل ثوابها الیهم عند اهل السنة والجماعة کذا فی البدائع ثم قال وبهذا علم انه لا فرق بین ان یکون المجعول له میتا او حیا والظاهر انه لا فرق بین ان ینوی به عند الفعل للغیر او یفعله لنفسه ثم بعد ذالک یجعل ثوابه لغیره لاطلاق کلامهم "

(شامی ج ۱، ص ۶۶۶)

البحر الرائق میں ذکر کیا گیا ہے کہ کوئی شخص روزہ رکھ کر یا نماز ادا کر کے یا صدقہ کر کے ثواب دوسرے شخص کو پہنچائے خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ یہ جائز ہے اور ان عبادات کا ثواب ان کو پہنچتا ہے۔ یہی اہل سنت و جماعت کا عقیدہ ہے، البدائع میں بھی یہی ذکر ہے، اس کے بعد بدائع میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ اس سے معلوم ہو گیا کہ جس کو ثواب پہنچایا گیا، وہ زندہ ہو یا مردہ، اسی طرح عام ہے کہ یہ عبادات غیر کو ثواب پہنچانے کی غرض سے کرے اور ثواب پہنچائے، یا اپنے لئے اور پھر ثواب دوسرے کو پہنچائے کیونکہ اہل علم نے مطلقاً ثواب پہنچنے کا ذکر کیا ہے۔

خیال رہے کہ نفلی نماز اور نفلی روزہ میں تو اتفاق ہے کہ ان کا ثواب غیر کو پہنچایا جا سکتا ہے۔ لیکن فرضی نماز روزہ میں اختلاف ہے۔

اعتراض: رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے!

﴿ وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی ﴾ اور یہ کہ آدمی نہیں پائے گا سوائے اپنی کوشش کے

اس آیت کریمہ سے تو پتہ چلا کہ انسان کو اپنے اعمال کا ہی فائدہ ہوگا، دوسرے کے اعمال کا اسے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

اس اعتراض کے علامہ علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے پانچ جواب ذکر کیے ہیں۔

پہلا جواب: "انها منسوخة بقوله تعالىٰ والذين آمنوا واتبعتهم ذريتهم بايمان الحقنابهم ذريتهم...... الاية

" ادخل الابناء الجنة بصلاح الاباء "

یہ آیت کریمہ دوسری آیت کریمہ ﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ...... الآیة ﴾ سے منسوخ ہے دوسری آیت کا ترجمہ یہ ہے، اور جو ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کی ہم نے ان کی اولاد ان سے ملادی اور ان کے عمل میں انہیں کچھ کمی نہ دی سب آدمی اپنے کیے میں گرفتار ہیں

اس آیت کریمہ سے واضح ہوا کہ آباء کی نیکیوں کی وجہ سے ان کی اولاد کو بھی جنت میں داخل کر دیا جائے گا، جبکہ ان کے اپنے اعمال میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

دوسرا جواب: " انها خاصة بقوم ابراهيم وموسى عليهما الصلوة والسلام فاما هذه الامة فلها ما سعت وما سعى لها قاله عكرمة "

اس آیت کریمہ کا حکم قوم ابراہیم علیہ السلام اور قوم موسیٰ علیہ السلام سے خاص ہے کہ انہیں صرف اپنے ہی اعمال کا فائدہ ہوتا تھا، اس آیت سے پہلے قوم ابراہیم علیہ السلام اور قوم موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے، لیکن امت مصطفیٰ ﷺ کو اپنے اعمال کا بھی فائدہ ہوتا ہے۔ دوسرے لوگ جو اپنی عبادات کا ثواب انہیں پہنچائیں اس کا فائدہ بھی انہیں حاصل ہوتا ہے۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کا اس آیت کریمہ کے متعلق یہی قول ہے۔

تیسرا جواب: " ان المراد بالانسان هنا الكافر فاما المؤمن ما سعى وسعى له قاله الربيع بن انس "

بے شک آیت کریمہ میں جو انسان کا ذکر ہے، اس سے مراد کافر ہے کہ کافر کو کسی دوسرے شخص کے عمل کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ لیکن مومن کو اپنے اعمال کا فائدہ بھی ہوگا، اور دوسروں کے اعمال کا بھی، جن کا ثواب اسے پہنچایا گیا ہو۔ اس آیت کریمہ کی وضاحت میں حضرت ربیع بن انس رضی اللہ عنہ کا یہی قول ہے۔

چوتھا جواب: " ليس للانسان الا ما سعى من طريق العدل فاما من باب الفضل فجائز ان يزيده الله ما شاء قاله الحسين بن فضل "

آیت کریمہ میں جو یہ ذکر کیا گیا ہے کہ انسان صرف وہی پائے گا جو اس نے خود کوشش کی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے نظام میں صرف عدل کی بات ہوتی تو یہ شخص کسی دوسرے کے عمل کا فائدہ حاصل نہ کر سکتا، لیکن نظام قدرت میں فضل کو بھی دخل عظیم ہے۔ اس لئے وہ اپنے فضل سے انسان کو اس کے اپنے اعمال کا فائدہ بھی دے گا۔ اور دوسروں سے پہنچائے گئے ثواب کا فائدہ بھی دے گا۔ وہ اپنے فضل سے جتنا چاہے انسان کے مراتب کو زیادہ کرے۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں یہی قول حضرت حسین بن فضل رضی اللہ عنہ کا ہے۔

پانچواں جواب: " ان اللام فى الانسان بمعنى علىٰ اى ليس على الانسان الا ما سعى "
(مرقاۃ ج۴، ص ۸۶)

للانسان میں لام بمعنی علی کے ہے، اب آیت کریمہ کا معنی یہ ہوگا کہ انسان کو نقصان صرف اپنے برے اعمال کا ہوگا۔ کسی دوسرے کی بداعمالیوں کا اسے نقصان نہیں ہوگا۔

مسلمان ہمیشہ ایصال ثواب کرتے رہے

" وان المسلمين ما زالوا فى كل مصر وعصر يجتمعون ويقرؤن لموتاهم من غير نكير فكان ذالك اجماعا " (مرقاۃ ج۴، ص ۸۲)

بے شک مسلمان ہر شہر میں اور ہر زمانہ میں ہمیشہ سے فوت شدہ آدمیوں کے لئے قرآن پاک

پڑھتے چلے آرہے ہیں۔ کسی نے اس کا انکار نہیں کیا۔ اس پر اجماع امت ہے۔

" قال السیوطی واما القراءة علی القبر فجزم بمشروعیتها اصحابنا وغیرھم " (مرقاۃ ج ۴، ص ۸۲)

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا قبر پر قرآن پاک پڑھنے کے جواز پر ہمارے اصحاب اور دوسرے حضرات نے یقین کیا ہے، یعنی اس کے جواز میں کوئی شک وشبہ نہیں۔

" قال النووی فی شرح المھذب یستحب لزائر القبور ان یقرأ ما تیسر من القرآن ویدعو لھم عقبھا نص علیه الشافعی واتفق علیه الاصحاب وزاد فی موضع آخر وان ختموا القرآن علی القبر کان افضل "

(مرقاۃ ج ۴، ص ۸۲)

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ شرح مھذب میں ذکر کیا ہے کہ قبروں کی زیارت کرنے والے کے لئے مستحب یہ ہے کہ جتنا ہو سکے قرآن پاک پڑھے، اور اس کے بعد قبرستان والوں کے لئے دعا کرے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر نص فرمائی ہے اس پر آپ کے اصحاب کا بھی اتفاق ہے۔ دوسرے مقام پر اور یہ زیادہ فرمایا کہ اگر قبر پر مکمل قرآن پاک پڑھ کر دعا کریں، تو اور زیادہ بہتر ہے

ایصالِ ثواب کا طریقہ: علامہ ابن عابدین شامی نقل فرماتے ہیں:

" وفی شرح اللباب ویقرأ من القرآن ما تیسر له من الفاتحة واول البقرة الی المفلحون وآیة الکرسی وآمن الرسول وسورة یسین وتبارک الملک وسورة التکاثر والاخلاص اثنی عشر مرة او احدی عشرة او سبعة او ثلاثا ثم یقول : " اللھم اوصل ثواب ما قرأناه الی فلان او الیھم " (شامی ج ۱، ص ۶۶۲)

شرح لباب میں ذکر کیا گیا ہے کہ قرآن پاک جہاں سے آسان ہو پڑھے یعنی ہو سکے تو سورة فاتحه اور سورة بقرة کی ابتداء سے "مفلحون" تک اور آیت الکرسی اور امن الرسول اور سورة تکاثر اور سورة اخلاص بارہ مرتبہ یا گیارہ مرتبہ یا سات مرتبہ یا تین مرتبہ پڑھے۔ پھر یہ کہے: اے اللہ جو میں نے پڑھا ہے اس کا ثواب فلاں شخص کو پہنچا۔

اگر زیادہ لوگوں کے لئے پڑھا ہو تو زیادہ کا ذکر کردے۔ اے اللہ فلاں، فلاں کو اس کا ثواب پہنچا

دعاء میں شامل سب کو مکمل ثواب پہنچے گا:

"فی زکوۃ التتارخانیة عن المحیط الافضل لمن یتصدق نفلا ان ینوی لجمیع المؤمنین والمؤمنات لانھا تصل الیھم ولا ینقص من اجرہ شیء" (شامی ج ۱، ص ٦٦٦)

بحر محیط کے حوالے سے تتار خانیہ کی کتاب الزکوۃ میں یہ مسئلہ ذکر کیا گیا ہے کہ جو شخص نفلی صدقہ کر رہا ہو، اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ تمام مومن مرد اور مومن عورتوں کی نیت کرے کیونکہ تمام کو ثواب پہنچے گا، اور اس کے اپنے اجر میں بھی کوئی کمی نہیں آئے گی۔

اس لئے ہر دعا میں تمام مومنین کا ذکر کیا جائے، یہ نہ خیال کیا جائے کہ شاید ثواب منقسم ہو جائے گا، ایسا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بہت وسیع ہے۔

بہتر یہ ہے کہ دعا کرتے وقت پہلے نبی کریم ﷺ کے حضور ایصال ثواب کا نذرانہ عقیدت پیش کرے پھر تمام انبیاء کرام اور سلف صالحین کے حضور پیش کرے۔ ان بزرگ ہستیوں کے وسیلہ جلیلہ سے جس شخص کے لئے اہتمام کیا گیا ہے، اسے ثواب پہنچائے پھر تمام مومنین ومومنات کو ثواب پہنچائے۔

فائدہ: مذکورہ بحث سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ دعا سے پہلے مروج چھوٹا ختم شریف یعنی چہار قل، فاتحہ، سورۃ بقرہ کی ابتدائی آیات اور پھر کچھ اور آیات مبارکہ جو مختلف جگہ سے پڑھی جاتی ہیں یہ جائز ہے، البتہ، لازم نہیں کوئی اور سورتیں پڑھ لی جائیں، پھر بھی جائز ہے۔ قرآن پاک مکمل پڑھ لیا، ویسے ہی دعا کر لی پھر کوئی اور سورتیں یا آیات نہیں پڑھیں تو یہ بھی جائز ہے۔

حاجی صاحب کے فتویٰ سے بخوبی واضح ہو جائے گا کہ سامنے کھانا رکھ کر اس پر کچھ مختصر سورتیں پڑھ کر دعا کرنا جائز ہے۔ قبولیت دعا اور حضور قلب کا ذریعہ ہے، البتہ اسے فرض اور واجب نہ سمجھے اور یہ بھی اعتقاد نہ رکھے کہ اس کے بغیر ثواب نہیں پہنچتا۔

میت کو ایصالِ ثواب کے لئے صدقہ:

"عن سعد بن عبادة قال یا رسول اللہ ام سعد ماتت فای الصدقة افضل قال الماء"

حضرت سعد بن عبادۃ رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ سعد کی (یعنی میری) ماں فوت ہوگئی اس کے لئے کون سا صدقہ افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: پانی۔ حضرت سعد نے کنواں کھدوایا (اور لوگوں کے لئے وقف کر دیا اور کہا یہ سعد کی ماں کے لئے ہے) یعنی اس کنویں کا نام ہی ایسا رکھا جس سے واضح ہو رہا ہے کہ یہ ام سعد کے ایصال ثواب کے لئے ہے۔

نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی اور صحابی کے عمل کے بعد بھی اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میت کو ثواب نہیں پہنچتا تو یہ اس کی قسمت کی بات ہے، ہمیں کسی کی بدقسمتی پر ماتم کرنے کی ضرورت نہیں معاملہ اپنی اپنی قسمت کا ہے۔

پانی کو زیادہ باعث ثواب کہنے کی وجہ:

" الا فضلية من الامور النسبية وكان هناك افضل لشدة الحر والحاجة وقلة الماء"

(مرقاۃ ج ۴ ص ۲۰۹)

کسی صدقہ کی افضلیت وقتی مناسبت سے تعلق رکھتی ہے۔ وہاں پانی کا صدقہ افضل تھا، کیوں کہ شدید گرمی پڑتی، پانی قلیل ہوتا تھا، لوگوں کو زیادہ اسی کی ضرورت تھی۔

اس سے پتہ چلا کہ اگر کہیں مسجد کی زیادہ ضرورت ہو تو مسجد بنوائی جائے، اگر کہیں دینی مدرسہ کی زیادہ ضرورت ہو تو دینی مدرسہ پر مال خرچ کیا جائے۔ اگر کہیں قبرستان کے لئے جگہ کی ضرورت زیادہ ہو تو قبرستان کے لئے جگہ لی جائے وغیرہ۔

میت کی جانب سے حج کرنا:

" حدثني موسى بن سلمة الهذلي ان ابن عباس قال امرت امرأة سنان بن سلمة الجهني ان يسال رسول الله ﷺ ان امها ماتت ولم تحج أفيجزى عن امها ان تحج عنها قال نعم ! لو كان على امها دين فقضته عنها ألم يكن يجزئي فتحج عن امها " (نسائی ج ۲، باب الحج عن الميت)

موسیٰ بن سلمہ ہذلی نے حدیث بیان کی کہ بیشک ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ سنان بن سلمہ جہنی کی زوجہ نے حکم دیا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ سے پوچھ کر بتایا جائے، کہ میری ماں فوت ہوگئیں

انہوں نے حج نہیں کیا تھا۔ کیا میں ان کی طرف سے حج کر دوں تو ان کی طرف سے جائز ہو جائے گا۔ آپ نے فرمایا: کیا ایسا نہیں کہ اگر اس کی ماں پر فرض ہوتا تو وہ ادا کرتی (قرض ادا ہو جاتا) تو اسے چاہئے کہ وہ اپنی ماں کی جانب سے حج کرے۔

"عن ابن عباس امرأة سالت النبی ﷺ عن ابیها مات ولم یحج قال حجی عن ابیک" (نسائی جلد ۲)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بیشک ایک عورت نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ میرے باپ فوت ہو گئے ہیں اور وہ حج نہیں کر سکے۔ (تو اب میں کیا کروں) آپ نے فرمایا کہ تم اپنے باپ کی جانب سے حج کرلو۔

ان احادیث سے واضح ہوا کہ میت کو عبادات کا ثواب پہنچتا ہے، اگر ثواب نہ پہنچتا تو نبی کریم ﷺ یہ نہ فرماتے کہ تم اپنی ماں کی جانب سے، یا تم اپنے باپ کی جانب سے حج کرلو۔ میت کو عبادات کا فائدہ ہوتا ہے۔ اسی لئے آپ نے میت کی طرف سے حج کرنے کی اجازت فرمائی۔

ذکر و تسبیحات سے میت کو فائدہ پہنچانا:

"وعن ابن عباس قال مر رسول اللہ ﷺ بقبرین فقال انہما یعذبان و ما یعذبان فی کبیر اما احدھما . فکان لا یستبری من بولہ ، واما الاخر فکان یمشی بالنمیمۃ ثم اخذ جریرۃ رطبۃ فشقھا نصفین ثم غرز فی کل قبر واحدۃ فقالوا یا رسول اللہ ﷺ لم صنعت ھذا ؟ فقال یخفف لعلھما عنھما"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ دو قبروں کے قریب سے گذرے تو آپ نے فرمایا کہ بیشک ان دونوں کو عذاب ہو رہا ہے، اور ان کو عذاب (بظاہر) کوئی بڑی چیز کی وجہ سے نہیں ہو رہا۔ ایک کو عذاب اس لئے ہو رہا ہے کہ وہ پیشاب کے چھینٹوں سے نہیں بچتا تھا، اور دوسرے کو عذاب اس لئے ہو رہا ہے کہ وہ چغلخوری کرتا تھا۔ پھر آپ نے ایک سبز شاخ کو لیا اور اس کے دو ٹکڑے کئے۔ پھر ہر ایک قبر پر ایک ایک کو گاڑ دیا۔ صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: جب تک یہ ٹہنیاں خشک نہیں ہوں گی۔ (انہیں فائدہ ہوگا) ان سے عذاب تخفیف

ہوگی۔ ''لعلّ '' کا لفظ کوئی شک پر دلالت نہیں کر رہا بلکہ تعلیل کے لئے ہے۔ یعنی جب تک یہ ٹہنیاں خشک نہیں ہوں گی ان کے عذاب میں تخفیف ہوگی۔ تو اس سے تخفیف کی علت ثابت ہوگی۔

باعث تخفیف عذاب کیوں ہوں گی ؟

" انه یسبح مادام رطبا فیحصل التخفیف ببرّکة التسبیح "

اس لئے کہ وہ جب تک سبز و تر رہیں گی۔ اللہ تعالیٰ کی تسبیحات پڑھیں گی۔ لہذا تسبیح کی برکت کی وجہ سے ان سے عذاب میں تخفیف ہوگی۔

" وعلی هذا فیطرد فی کل ما فیه رطوبة من الاشجار وغیرها
وکذٰلک فیما فیه برکة کالذکر وتلاوة القرآن "

اسی سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ ہر وہ چیز جس میں رطوبت (تراوت) پائی جائے خواہ درخت ہوں یا اور کوئی چیز ہو وہ باعث تخفیف عذاب ہے۔ اسی طرح ہر وہ چیز جس میں برکت پائی جاتی ہو جیسے ذکر اور تلاوت قرآن بطریق اولیٰ (یعنی سبز شاخوں سے بڑھ کر) فائدہ مند ہیں اور عذاب کی تخفیف کا سبب ہے۔ (از حاشیه نسائی)

قبر پر پانی چھڑکنا رحمت الٰہی کا سبب ہے:

" وعن جابر قال رش قبر النبی ﷺ وکان الذی رش الماء علی قبره بلال بن رباح بقربة بدأ من قبل راسه حتی انتهی الی رجلیه " (رواه البیهقی فی دلائل النبوة مشکوٰة باب دفن المیت)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ کہ رسول اللہ ﷺ کی قبر شریف پر چھڑکا گیا، بلال بن رباح نے مشکیزہ سے پانی چھڑکا، سر کی جانب سے شروع کیا گیا اور پاؤں کی انتہا تک چھڑکا گیا

" قال الطیبی لعل ذلک اشارة الی استنزال الرحمة الالٰهیة
والعواطف الربانیة کما ورد فی الدعاء اللهم اغسل خطایاه بالماء
والثلج والبرد وقالوا سقی الله ثراه وبرد مضجعه " (مرقاة ج ۴)

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ پانی چھڑکنے میں اس طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ یہ رحمۃ الٰہیہ کے نزول کا سبب ہے۔ اور رب تعالیٰ کی مہربانیوں کا ذریعہ ہے، جیسا کہ خود نبی کریم ﷺ نے

دعاء میں فرمایا، اے اللہ اس کے گناہوں کو پانی اور برف اور اولوں (ژالہ باری) سے دھو دے۔ صحابہ کرام نے دعا میں ذکر کیا، اے اللہ ان کی قبر کو سیراب کر دے اور ان کے ٹھکانہ کو ٹھنڈا کر۔

نبی کریم ﷺ کا حضرت سعدؓ کی قبر پر تسبیحات و تکبیرات پڑھنا!

" وعن جابر قال خرجنا مع رسول اللہ ﷺ الی سعد بن معاذ حین توفی فلما صلی علیہ ﷺ ووضع فی قبرہ وسوی علیہ سبح رسول اللہ ﷺ فسبحنا طویلا ثم کبر فکبرنا ۔ فقیل یا رسول اللہ ﷺ لم سبحت ثم کبرت ؟ قال لقد تضایق علی ھذا العبد الصالح قبرۃ حتی فرجہ اللہ عنہ "

(رواہ احمد مشکوۃ باب اثبات عذاب القبر)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلے جب سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ فوت ہوئے، رسول اللہ ﷺ نے ان پر نماز جنازہ پڑھی۔ اور ان کو قبر میں رکھا گیا، اور مٹی ڈال دی گئی، تو نبی کریم ﷺ تسبیحات پڑھیں۔ ہم نے طویل تسبیحات پڑھیں پھر حضور نے تکبیر پڑھی، ہم نے بھی تکبیر پڑھی۔ پھر رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا۔ کہ آپ نے تسبیح کیوں پڑھی؟ پھر تکبیر کیوں پڑھی ؟ آپ ﷺ نے جواب دیا کہ اس نیک بندے پر قبر تنگ ہوگئی تھی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی قبر کو کشادہ کر دیا۔

خیال رہے کہ قبر کی تنگی بکریوں یا اونٹوں کے پیشاب کے چھینٹوں سے نہ بچنے کی وجہ سے ہوئی تھی۔

حضرت سعد بن معاذ جلیل القدر صحابی تھے۔ جن کا لقب نبی کریم ﷺ نے سید الانصار رکھا، انہوں نے مدینہ طیبہ میں عقبہ اولیٰ اور عقبہ ثانیہ کی بیعت کے درمیانی عرصہ میں اسلام قبول کیا۔ ان کی وجہ سے بنو عبد الاشہل نے اسلام قبول کیا اور ان کے گھر کے تمام افراد نے اسلام قبول کر لیا، ان کی وفات پر خوشی سے عرش الٰہی جھوما۔ اور ستر ہزار فرشتے ان کے جنازہ میں شریک ہوئے۔

" وعن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ ھذا الذی تحرک لہ العرش وفتحت لہ ابواب السماء وشھدہ سبعون الفامن الملائکۃ لقد ضم ضمہ ثم فرج عنہ "

(مشکوۃ)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ (سعد بن معاذ) وہ شخص

ہے جس کے لئے عرش الٰہی نے حرکت کی اور ان کے لئے آسمان کے دروازے کھول دیئے گئے۔ اور ان کے پاس (ان کی نماز جنازہ ادا کرنے کے لئے) ستر ہزار فرشتے حاضر ہوئے۔ تحقیق ان کی قبر تنگ ہوگئی تھی۔ پھر اسے کشادہ کرلیا گیا۔

" الذی تحرک له العرش ای ارتاح بصعوده واستبشر لکرامته علی ربه"
(مرقاة ج ا، ص ۲۱۱)

آپ کے لئے عرش الٰہی نے حرکت کی، اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کی روح کے چڑھنے کی وجہ سے خوش ہوا، راحت محسوس کی، آپ کی روح کو خوشبو سے مہکتا ہوا پایا۔ اور آپ کو جو رب کے ہاں عزت و تکریم حاصل تھی۔ اس کی وجہ سے خوشی سے عرش جھوما۔

" وفتحت له ابواب السماء لإنزال الرحمة ونزول الملائكة اوتزيينا لقدومه وطلوع روحه لأن محل أرواح المؤمنين الجنة وهى فوق السماء السابعة عرضا للابواب بأن يدخل من أى باب شاء لعظم كما له كفتح ابواب الجنة الثمانية لبعض المؤمنين " (مرقاة ج ا. ص ۲۱۱)

آسمان کے دروازے کھول دیئے گئے، تا کہ رحمت کا نزول ہو، اور فرشتے نازل ہوں، یا اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی روح کے آنے کی وجہ سے آسمانوں کو مزین کرنے کے لئے دروازے کھول دیئے گئے تھے۔ اور وجہ یہ تھی کہ آپ کی روح کو جنت میں پہنچانے کے لئے دروازے کھول دیئے گئے تھے، کیونکہ جنت سات آسمانوں سے اوپر ہے اور جنت ہی مومنوں کی روحوں کے ٹھہرنے کا مقام ہے۔ اور وجہ یہ تھی کہ آپ کے عظیم کمال کی وجہ سے جنت کے تمام دروزے کھول دیئے گئے تھے، کہ آپ جس دروازے سے چاہیں داخل ہو جائیں، کیونکہ با کمال مومنوں کے لئے آٹھ جنتوں کے تمام دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، کہ جس میں چاہیں داخل ہو جائیں۔

" وشهد سبعون الفا من الملائكة ای حضر جنازة تعظيما له "(مرقاة ج ا ص ۲۱۱)

آپ کے جنازہ میں آپ کی تعظیم کے لئے ستر ہزار فرشتے حاضر ہوئے۔

اے غافل انسان ! کیا تو ایسے عظیم المرتبہ جلیل القدر صحابی سے بھی اپنے آپ کو بڑا سمجھ رہا ہے؟ اتنے عظیم مرتبہ والے صحابی پر قبر تنگ ہوسکتی ہے اور نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کی تسبیحات وتکبیرات

سے قبر کشادہ ہوئی۔ تو تجھے کیا ہوا کہ اپنی قبر کو کشادہ کرنے کے ذرائع سے یعنی تلاوت قرآن پاک اور صدقہ وخیرات سے روک رہا ہے۔ کیا تو اپنی قبر کے تنگ ہونے پر ہی خوش ہے۔ اگر تجھے قبر کی تنگی پسند ہے تو ہمیں تیری قبر کے کشادہ کرنے کی کوئی فکر نہیں۔

میت کے لئے استغفار کا حکم:

" عن عثمان قال كان النبی ﷺ اذا فرغ من دفن الميت وقف عليه فقال استغفروا لاخيكم ثم سلوا له بالتثبيت فانه الآن يسئل " (رواه ابو داؤد ، مشكوة اثبات القبر)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ میت کے دفن سے فراغت کے بعد اس پر ٹھہرے اور فرمایا اپنے بھائی کے لئے مغفرت طلب کرو! پھر اس کے لئے (کلمہ شہادت پر) ثابت رہنے کی دعا کرو، کیونکہ اب اس سے سوال کیا جائے گا۔

میت کے لئے ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا: مسلم شریف جلد اول کتاب الجنائز میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کردہ ایک طویل حدیث میں یہ ذکر کیا گیا ہے۔

" ...... حتى جاء البقيع فقام فاطال القيام ثم رفع يديه ثلاث مرات ثم انحرف "

یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ بقیع (قبرستان کا نام) میں تشریف لائے، وہاں بہت دیر کھڑے ہو کر ہاتھ اٹھا کر تین مرتبہ دعا فرمائی پھر واپس ہو گئے۔

یہاں ہاتھ اٹھانے سے مراد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا ہی مراد ہے۔ کیونکہ اس حدیث کے آخر میں آ رہا ہے۔

" فقال ان ربک يأمرک ان تاتی اهل البقيع فتستغفر لهم "

جبرائیل نے کہا بیشک تمہارا رب تمہیں حکم دیتا ہے، تم بقیع میں دفن شدہ حضرات کے پاس آ کر ان کے لئے دعا مغفرت کرو۔

" مالک عن يحی بن سعيد ان سعيد بن المسيب كان يقول ان الرجل ليرفع بدعاء ولده من بعد وقال يده نحو السماء فرفعهما "

(موطا امام مالک کتاب القرآن باب العمل فی الدعاء)

امام مالک یحی بن سعید سے روایت کرتے ہیں، بیشک سعید بن مسیب کہتے ہیں کہ تحقیق پیچھے رہ

جانے والی اولاد کی دعا سے انسان کے مدارج بلند ہوتے ہیں، انہوں نے اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا۔

اس حدیث کی شرح میں مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی تحریر فرماتے ہیں۔

"توضيح كلام الباجي ان قوله قال بيده (الخ) ويحتمل وجهين الاول ان يكون بيانا لقوله يد ويؤيده رواية بن عيسٰى بلفظ يرفعها ويدعو يعني اذا رفع الولد يديه نحو السماء للدعاء وصوره ابن المسيب بيديه فيرفع لأجله درجات الولد"

شارح حدیث علامہ باجی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کی وضاحت یہ ہے کہ حدیث شریف میں "بیدیہ" سے لے کر آخر تک جو الفاظ مذکور ہیں۔ اس کا مقصد بیان کرنے میں دو احتمال ہیں۔ ایک احتمال یہ ہے کہ یہ "یدعوا" کا بیان ہوا، مطلب یہ ہوگا کہ اولاد ہاتھ اٹھا کر دعا کرے۔

اس معنی کی ابن عیسی کی روایت تائید کرتی ہے، جس میں ذکر ہی "یرفعہماویدعوا" ہے جس کا معنی یہ ہے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر دعا کرے۔ یعنی اولاد جب دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر اپنے والدین کے لئے دعا کرے تو ان کے مدارج بلند ہوتے ہیں۔

اسی صورت کو ابن مسیب نے اپنے ہاتھ اٹھا کر بتایا ہے، کہ اس طرح دعا کرے۔

خیال رہے کہ حدیث پاک میں اولاد کی قید اتفاقی ہے، کیونکہ تمام زندہ لوگوں کی دعا فوت شدہ لوگوں کے مدارج کی بلندی کا سبب ہے۔ اس حدیث کی شرح میں بیان کیا گیا ہے۔

"بدعاء ولده اى بسبب دعاء اولاده ومن تبعه من بعد اى بعد موته"

یعنی جس طرح اولاد کی دعا کی وجہ سے مدارج بلند ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس کے پیچھے رہ جانے والوں میں سے کوئی بھی دعا کرے تو اس کے مدارج کی بلندی کا وہ دعا سبب ہوگی۔

ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے میں حکمت:

کچھ لوگ دعا کے تو قائل ہو جاتے ہیں مگر نامعلوم ہاتھ اٹھانے میں انہیں کیا قباحت محسوس ہوتی ہے؟ درج ذیل میں ہاتھ اٹھانے کی حکمت و برکت کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

"عن سلیمان قال قال رسول الله ﷺ ان ربكم حيي كريم يستحي من عبده اذا رفع يديه اليه ان يردهما صفرا "(رواه الترمذی و ابوداؤد والبیهقی مشکوة شریف کتاب الدعوات)

حضرت سلیمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک تمہارا رب بڑے حیاء والا ہے۔ (جو اس کی شان کے لائق ہے) اپنے بندے سے حیاء فرماتا ہے کہ اس کے ہاتھوں کو خالی لوٹائے۔

خیال رہے کہ یہاں حیاء کا حقیقی معنی اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو انکے نفع والی چیزیں عطا فرمایا ہے اور ضرر والی ان سے دور رکھتا ہے۔

علامہ علی قاری رحمۃ اللہ علیہ مرقاۃ المفاتیح میں اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

" حکمة الرفع الی السماء انها قبلة الدعاء ومهبط الرزق والوحی والرحمة والبرکة "

ہاتھ اٹھانے میں یہ حکمت ہے کہ آسمان دعا کا قبلہ ہے جیسے نماز کا قبلہ کعبہ شریف ہے، نماز میں جب کعبہ شریف کی طرف انسان متوجہ ہوتا ہے تو دعا میں آسمانوں کی طرف ہاتھ پھیلا کر دعا کرے۔ آسمانوں سے ہی رزق، وحی رحمت اور برکت نازل ہوتی ہے۔

قرآن پاک پڑھ کر دعا کرنے میں عظیم برکت:

" وعن حمید الاعرج قال من قرء القرآن وختمه ثم دعا أمّن علیٰ دعائه اربعة آلاف ملک ثم لایزالون یدعون له ویستغفرون ویصلون علیه الی السماء او الی الصباح " (روح البیان پ۹ زیر آیة وهذا کتاب انزلنه مبارک)

حمید اعرج سے مروی ہے کہ جس نے قرآن پاک پڑھ کر ختم کیا، پھر دعا کی تو اس کی دعا پر چار ہزار فرشتے آمین کہتے ہیں۔ پھر ہمیشہ اس کے لئے دعا کرتے رہتے ہیں اور اس کے لئے مغفرت طلب کرتے رہتے ہیں اور صبح و شام تک اس کے لئے رحمت کی دعا کرتے رہتے ہیں۔

سبحان اللّٰہ! پڑھنے والے کو کتنا عظیم ثواب ملتا ہے اور اس کے لئے فرشتے دعا کرتے ہیں، جب وہ دعا کرتا ہے تو چار ہزار فرشتے آمین کہتے ہیں۔ جب وہ میت کے لئے دعا کرے گا اور چار ہزار فرشتے آمین کہیں گے۔ تو میت کے کتنے مدارج بلند ہوں گے۔

قرآن پاک کے دَور کے وقت صدقہ کرنا:

" عن ابن عباس قال کان رسول اللہ ﷺ اجود الناس بالخیر وکان اجود ما

یکون فی شهر رمضان ان جبرئیل علیه السلام کان یلقاه فی کل سنة فی رمضان حتی ینسلخ فیعرض علیه رسول الله ﷺ القرآن فاذا لقیه جبرئیل کان اجود بالخیر من الریح المرسلة". (مسلم ج ۲، باب جوده ﷺ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ سب لوگوں سے زیادہ سخی تھے اور رمضان شریف میں زیادہ سخاوت فرماتے تھے، بیشک جبرائیل علیہ السلام ہر سال رمضان میں آپ سے ملاقات کرتے تھے، یہ سلسلہ ملاقات رمضان کے ختم ہونے تک جاری رہتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ جبرائیل علیہ السلام سے قرآن پاک کا دور کرتے تھے۔ جب آپ کی ملاقات جبریل سے ہوتی تو آپ تیز چلنے والی ہوا سے بھی زیادہ سخاوت فرماتے تھے۔

اس حدیث پاک کی تشریح میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

" وفی هذا الحدیث فوائد منها بیان عظم جوده ﷺ ومنها استحباب اکثار الجود فی رمضان ومنها زیادة الجود والخیر عند ملاقاة الصالحین وعقب فراقهم للتاثر بلقائهم ومنها استحباب مدارسة القرآن " (نووی شرح مسلم ج ۲، ص ۲۴۱)

اس حدیث پاک میں کئی فوائد حاصل ہو رہے ہیں۔

(۱) نبی کریم ﷺ کی بہت زیادہ جود و سخاوت کا اس میں بیان ہے۔

(۲) رمضان شریف میں زیادہ سخاوت کرنا مستحب ہے۔

(۳) نیک لوگوں سے ملاقات کے وقت زیادہ سخاوت کرنا۔

(۴) نیک لوگوں کی جدائی کے وقت زیادہ سخاوت کرنا۔ کیونکہ ان کی ملاقات نے اس پر نیکیوں کے اثرات چھوڑے ہیں۔

(۵) قرآن پاک کو دَور کرنا، یعنی ایک دوسرے کو سنانا مستحب ہے۔

اسی طرح چھٹا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ قرآن پاک پڑھنے پر صدقہ کرنا مستحب ہے۔

قرآن پاک پڑھ کر اجتماعی دعا کرنا:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ قرآن پاک کے ختم کے وقت اپنے گھر والے تمام حضرات کو جمع کرتے اور پھر سب مل کر دعا کرتے تھے۔ (نووی کتاب الاذکار باب تلاوت القرآن)

حکیم ابن عتبہ فرماتے ہیں کہ ایک مجمع کو مجاہدہ وعبدہ ابن ابی لبابہ نے بلایا اور فرمایا کہ ہم نے تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ آج ہم قرآن پاک ختم کر رہے ہیں۔ چونکہ قرآن پاک ختم کے وقت دعا قبول ہوتی ہے۔

حضرت مجاہدہ سے صحیح روایت منقول ہے کہ بزرگان دین قرآن پاک کے ختم کے وقت لوگوں کو جمع کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ اس وقت رحمت باری تعالیٰ کا نزول ہوتا ہے۔ (نووی کتاب الاذکار)

کھانا سامنے رکھ کر قرآنی آیات تلاوت کرنا:

عام طور پر مروج ہے کہ کھانا سامنے رکھ کر ''چھار قل'' یعنی سورۃ الکافرون، اخلاص، الفلق، الناس، فاتحہ، البقرۃ کی ابتدائی آیات پڑھ کر دعا کی جاتی ہے۔ بعض لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا ہے کہ یہ کھانا حرام ہو گیا ہے۔ سبحان اللہ کیسی جاہلانہ منطق ہے۔ قرآن پاک پڑھنے سے کھانا متبرک ہوتا ہے یا حرام؟

اللہ کا ذکر کرنے سے کھانا متبرک ہوتا ہے:

حضرت ابوطلحہ کے گھر تھوڑا سا طعام تھا۔ حضور ﷺ کے ساتھ ستر یا اسی صحابہ کرام آئے تو آپ نے فرمایا۔

" ھلمی یا ام سلیم ما عندک فاتت بذلک الخبیر فامر بہ رسول اللہ ﷺ ففت وعصرت ام سلیم عکۃ فادمتہ ثم قال رسول اللہ ﷺ فیہ ما شاء اللہ " (مسلم، بخاری مشکوۃ المعجزات)

اے ام سلیم جو تمہارے پاس طعام ہے وہ لے آؤ انہوں نے روٹی پیش کی۔ آپ نے روٹی کے ٹکڑے کرنے کا حکم دیا، ام سلیم نے ایک برتن سے گھی نچوڑ کر روٹی پر لگایا۔ پھر اس پر نبی کریم ﷺ نے

کچھ پڑھا جو اللہ تعالیٰ کی مشیت میں تھا۔ پھر دس دس آدمیوں کو بلاتے رہے جو سیر ہو کر چلے جاتے۔ وہ معمولی طعام آپکے پڑھنے کی برکت سے اسی آدمیوں نے سیر ہو کر کھا لیا۔ سبحان اللہ!

" ثم قال فیه رسول الله ﷺ ما شاء الله ان یقول "

اس کی تشریح علامہ قاری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں۔

" فیه ای فی ذلک الخبز مع الادام او فیما ذکر من الخبز والادام "

اس میں پڑھا۔ سوال ہوتا ہے کہ مفرد کی ضمیر دو چیزوں کی طرف روٹی اور گھی کیطرف کیسے لوٹ رہی ہے۔ تو اسکی وجہ بیان کی یا یہ تاویل "فی ذلک الخبز مع الادام" اس روٹی میں بمع گھی کے پڑھا۔ یا تاویل یہ کریں "فیما ذکر" جس چیز کا پہلے ذکر آ چکا یعنی روٹی اور گھی میں پڑھا۔

"ماشاء الله ان یقول" اللہ تعالیٰ نے جو چاہا وہ پڑھا۔ " ای من الدعا أو الاسماء " یعنی دعا کی اور اسما الٰہیہ پڑھے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں چند کھجوریں پیش کیں اور عرض کیا

" یا رسول الله ﷺ ادع الله فیهن البرکة فضمهن ثم دعا لی فیهم بالبرکة "

یا رسول اللہ ﷺ آپ ان میں اللہ تعالیٰ سے برکت کی دعا فرما دیں۔ آپ نے وہ ہاتھ میں لیں۔ پھر میرے لئے ان میں برکت کی دعا فرما دی۔ اور آپ نے فرمایا کہ یہ لے لو اور ان کو اپنے کسی توشہ دان میں ڈال لو۔ جب بھی تم کھجوریں لینا چاہو تو اس میں ہاتھ ڈال کر نکال لیا کرنا۔ لیکن ان کو نکال کر باہر نہیں پھینکنا۔

حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں میں وہ کھجوریں ہمیشہ اپنی کمر پر باندھ کر رکھتا تھا، ان میں سے ایک وسق یعنی ساٹھ صاع (ایک صاع تقریباً چار کلو کے برابر ہوتا ہے) تو میں نے اللہ کی راہ میں دیں۔ ہم خود بھی کھاتے رہے اور دوسرے لوگوں کو بھی کھلاتے رہے۔ لیکن (افسوس) کہ وہ توشہ دان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے دن میری کمر سے ٹوٹ کر گر گیا۔ کھجوریں بکھر گئیں۔ (پھر وہ ختم ہو گئیں)۔

(باب المعجزات، مشکوۃ)

وہ کھجوریں جب حضرت ابو ہریرہ نے آپ کی خدمت میں پیش کی تھی۔ان کی تعداد کل اکیس تھی نبی کریم ﷺ نے ہاتھ میں لے کر برکت کی دعا کی۔وہ بابرکت ہوگئیں۔

غور کیجئے! کھانے کی چیز پر پڑھنے اور دعا کرنے سے وہ کھانا حرام کیسے ہو جاتا ہے۔اہل علم کو تو اس کا پتہ نہیں۔البتہ جہلاء اس کے حرام ہونے کی رٹ لگاتے رہیں، تو ہم ان کو ان کی جہالت اور بے علمی کی وجہ سے معذور سمجھیں گے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔کہ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے شادی کی تو میری والدہ ام سلیم نے کھجوروں، گھی اور کھوئے سے حلوہ تیار کیا، اسے ایک برتن میں ڈالا، پھر کہا اے انس یہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے جاؤ، اور یہ عرض کرنا کہ یہ میری والدہ نے آپ کی طرف بھیجا ہے اور آپ کی خدمت میں سلام عرض کیا ہے۔اور یہ کہہ رہی تھیں یا رسول اللہ آپ کے لئے ہماری طرف سے یہ تھوڑا سا ہدیہ ہے۔

فرماتے ہیں: میں لے کر گیا، والدہ کا پیغام پہنچایا آپ نے فرمایا رکھ دو۔پھر آپ نے فرمایا جاؤ فلاں کو میرے پاس بلاؤ اور فلاں کو اور فلاں کو جن شخصوں کے آپ نے نام ذکر فرمائے۔(تین آدمیوں کے خصوصی نام ذکر فرمائے) پھر کہا جو بھی تمہیں ملے اسی کو میرے پاس آنے کی دعوت دے دو، میں نے ان آدمیوں کو دعوت دی جن کے آپ نے نام لئے تھے۔واپس آیا تو آپ کا گھر آپ کے صحابہ سے بھرا ہوا تھا۔حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا تمہاری تعداد کتنی تھی۔آپ نے فرمایا کہ تین سو کے قریب تھی، حضرت انس کہتے ہیں۔

" فرأیت النبی ﷺ وضع یدہ علی تلک الحسیة وتکلم بما شاء اللہ"

میں نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنا ہاتھ مبارک اسی حلوے پر رکھا ہوا ہے اور آپ نے اس پر پڑھا جو اللہ نے چاہا، پھر آپ نے دس دس آدمیوں کو بلایا اور وہ کھانا کھانے لگے۔تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ کا نام لے کر کھاؤ اور ہر شخص اپنے سامنے سے کھائے!''

سب لوگ سیر ہو کر کھا کر چلے گئے۔پھر اور دس کو بلایا۔اسی طرح سب (یعنی تین سو کے قریب لوگوں) نے کھانا سیر ہو کر کھالیا۔اور مجھے آپ نے فرمایا اے انس اب اٹھالو۔میں نے اٹھایا تو مجھے معلوم نہیں ہو

وہ کھجوریں جب حضرت ابو ہریرہ نے آپ کی خدمت میں پیش کی تھی۔ان کی تعداد کل اکیس تھی نبی کریم ﷺ نے ہاتھ میں لے کر برکت کی دعا کی۔وہ بابرکت ہوگئیں۔

غور کیجئے! کھانے کی چیز پر پڑھنے اور دعا کرنے سے وہ کھانا حرام کیسے ہو جاتا ہے۔اہل علم کو تو اس کا پتہ نہیں۔البتہ جہلاء اس کے حرام ہونے کی رٹ لگاتے رہیں، تو ہم ان کو ان کی جہالت اور بے علمی کی وجہ سے معذور سمجھیں گے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔کہ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے شادی کی تو میری والدہ ام سلیم نے کھجوروں، گھی اور کھوئے سے حلوہ تیار کیا، اسے ایک برتن میں ڈالا، پھر کہا اے انس یہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے جاؤ، اور یہ عرض کرنا کہ یہ میری والدہ نے آپ کی طرف بھیجا ہے اور آپ کی خدمت میں سلام عرض کیا ہے۔اور یہ کہہ رہی تھیں یا رسول اللہ آپ کے لئے ہماری طرف سے یہ تھوڑا سا ہدیہ ہے۔

فرماتے ہیں: میں لے کر گیا، والدہ کا پیغام پہنچایا آپ نے فرمایا رکھ دو۔پھر آپ نے فرمایا جاؤ فلاں کو میرے پاس بلاؤ اور فلاں کو اور فلاں کو جن شخصوں کے آپ نے نام ذکر فرمائے۔(تین آدمیوں کے خصوصی نام ذکر فرمائے) پھر کہا جو بھی تمہیں ملے اسی کو میرے پاس آنے کی دعوت دے دو، میں نے ان آدمیوں کو دعوت دی جن کے آپ نے نام لئے تھے۔واپس آیا تو آپ کا گھر آپ کے صحابہ سے بھرا ہوا تھا۔حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا تمہاری تعداد کتنی تھی۔آپ نے فرمایا کہ تین سو کے قریب تھی، حضرت انس کہتے ہیں۔

"فرأيت النبی ﷺ وضع يده على تلك الحسية وتكلم بما شاء الله"

میں نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنا ہاتھ مبارک اسی حلوے پر رکھا ہوا ہے اور آپ نے اس پر پڑھا جو اللہ نے چاہا، پھر آپ نے دس دس آدمیوں کو بلایا اور وہ کھانا کھانے لگے۔تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"اللہ کا نام لے کر کھاؤ اور ہر شخص اپنے سامنے سے کھائے!"

سب لوگ سیر ہو کر کھا کر چلے گئے۔پھر اور دس کو بلایا۔اسی طرح سب (یعنی تین سو کے قریب لوگوں) نے کھانا سیر ہو کر کھالیا۔اور مجھے آپ نے فرمایا اے انس اب اٹھالو۔میں نے اٹھایا تو مجھے معلوم نہیں ہو

رہا تھا، کہ جب کھانا رکھا تھا۔اس وقت زیادہ تھا یا جب واپس اٹھایا؟ (مشکوۃ باب المعجزات)

یعنی آپ نے تعجب کیا کہ تین سو لوگ کھانا کھا گئے لیکن کھانا پہلے سے زیادہ تھا۔اس حدیث پاک سے بھی یہی واضح ہوا کہ کھانا سامنے رکھ کر نبی کریم ﷺ نے اللہ کا ذکر کیا اور دعا کی، اس میں برکت ہوئی۔

پتہ چلا کہ کھانا سامنے رکھ کر پڑھنا، ذکر کرنا، دعا کرنا باعث برکت ہے نہ کہ باعث حرمت۔

شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کا فتویٰ:

" طعامیکه ثواب آن نیاز حضرت امامین نمایند بر آن قل وفاتحه ودرود خواندن متبرک ثواب می شود وخوردن حضرت بیسار خوب است " (فتاوی عزیزیه ص ۷۵)

وہ طعام جو حضرت امام حسن وامام حسین رضی اللہ عنہما کے ثواب کے لئے پکایا جائے اور اس پر قل (سورۃ الکافرون، فلق، الناس) پڑھنا باعث برکت ہے اور اس کا کھانا بہت ہی خوب ہے۔

" اگر مالیده وشیر برائے فاتحه بزرگے بقصد ایصال ثواب بروح ایشان پخته بخورانند جائز است مضائقه نیست " (فتاوی عزیزیه ص ۷۵)

کسی بزرگ کے فاتحہ کے لئے ان کے روحوں کو ثواب پہنچانے کے لئے دودھ اور مالیدہ پکایا جائے تو جائز ہے۔اس میں کوئی حرج نہیں۔

حاجی امداد اللہؒ کا فتویٰ: حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ (جو مولوی اشرف علی تھانوی صاحب کے مرشد ہیں) فرماتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ فاتحہ مروجہ کا: اس میں وہی گفتگو ہے جو "مسئلہ مولود" (محفل میلاد) میں مذکور ہوئی جس کا خلاصہ یہ ہے۔کہ نفس ایصال ثواب ارواح اموات میں کسی کو کلام نہیں، اس میں بھی تخصیص وتعین کو موقوف علیہ ثواب کا سمجھے (یعنی کھانا سامنے رکھنے سے ثواب ہوگا ورنہ نہیں ہوگا) یا واجب وفرض اعتقاد کرے تو ممنوع ہے۔ اور اگر یہ اعتقاد نہیں بلکہ کوئی مقصد باعث تقید ہیئت کذائیہ (عام رواج کے مطابق اہتمام کرنا) ہے تو کچھ حرج نہیں۔جیسا بمصلحت نماز میں سورہ اخلاص کو معین کرنے کو فقہاء

محققین نے جائز رکھا کہ سلف میں تو عادت تھی ۔ کہ مثلاً کھانا پکا کر مسکین کو کھلا دیا اور دل سے ایصال ثواب کی نیت کر لی ۔ متاخرین میں کسی کو خیال ہوا کہ جیسے نماز میں نیت ہر چند دل سے کافی ہے ۔ مگر موافقت قلب ولسان (دل اور زبان) کے لئے عوام کو زبان سے کہنا بھی مستحسن ہے ۔ اسی طرح اگر یہاں زبان سے کہہ لیا جائے ''یا اللہ اس کھانے کا ثواب فلاں شخص کو پہنچے'' تو بہتر ہے ۔ پھر کسی کو خیال ہوا کہ اس کے لفظ کا مشار الیہ اگر روبرو موجود ہو تو زیادہ استحضارِ قلب (دل کا حاضر ہونا) ہو ۔ کھانا روبرو لانے لگے ۔ کسی کو یہ خیال ہوا کہ یہ ایک دعا ہے ۔ اس کے ساتھ اگر کچھ کلام الٰہی بھی پڑھا جائے تو قبولیت دعا کی بھی امید ہے ۔ اور اس کلام کا ثواب بھی پہنچ جائے گا ۔ کہ

" جمع بین العباد میں ہے ۔

ع " چه خوش بود که بر آید بیک کرشمه دو کار "

قرآن شریف کی بعض سورتیں بھی لفظوں میں مختصر اور ثواب میں بہت زیادہ ہیں پڑھی جانے لگیں ۔ کسی نے خیال کیا، کھانا جو مسکین کو دیا جائے گا ۔ اس کے ساتھ پانی دینا بھی مستحسن ہے ۔ پانی پلانا بڑا ثواب ہے اس نے پانی کو بھی کھانے کے ساتھ رکھ لیا پس یہ ہیئت کذائیہ حاصل ہوگئی ۔

(یعنی ایک خاص طریقہ ختم اور دعا کا مروجہ ہو گیا ۔ لیکن ہر کام میں ثواب ہے نہ کہ گناہ ۔ بلکہ مستحب، کیونکہ حاجی صاحب جا بجا لفظ مستحسن استعمال فرما رہے ہیں ۔ جس کام کو علماء و صلحاء اچھا سمجھیں، وہ مستحب ہوتا ہے ۔

تعیین تاریخ کے متعلق فرماتے ہیں:

''یہ بات تجربہ سے معلوم ہوتی ہے ۔ کہ جو امر کسی خاص وقت میں معمول ہو اس وقت وہ یاد آجاتا ہے ۔ اور ضرور ہو رہتا ہے، اور نہیں تو سالہا سال گزر جاتے ہیں ۔ کبھی خیال بھی نہیں ہوتا اس قسم کی مصلحتیں ہر امر میں ہیں ۔ (فیصله هفت مسئله ، کلیات امدادیه صفحه ۸۱)

حاجی صاحبؒ نے مسئلہ کا مکمل حل پیش کر دیا کہ معین تاریخ کو ایصال ثواب کا اہتمام کرنا، قرآن پاک پڑھ کر، سامنے کھانا اور پانی رکھ کر اور چھوٹی چھوٹی سورتیں پڑھ کر دعا کرنا مستحب ہے ۔ ہاں البتہ ان چیزوں کو فرض اور واجب نہ سمجھے، اور یہ بھی نہ سمجھے کہ اس صورت کے بغیر ثواب نہیں پہنچے گا ۔ بفضلہ تعالیٰ

علمائے اہلسنت اور عوام اہل سنت کا یہی عقیدہ وطریقہ ہے۔

جمعرات کا ختم: اگر چہ ایصالِ ثواب کا کوئی دن مقرر نہیں، لیکن بعض دنوں کی بعض وجوہ سے افضلیت ثابت ہے اس لئے سلف صالحین نے ایصال ثواب کی محافل میں جن چیزوں کا لحاظ کیا ہے، وہ بلا دلیل نہیں بلکہ احادیث مبارکہ سے ہی وجوہ تلاش کی ہیں۔

" عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ يفتح ابواب الجنة يوم الاثنين و يوم الخميس فيغفر لكل عبد لا يشرک بالله شيئا الا رجل كانت بينه وبين اخيه شحناء وفيقال انظروا هذين حتى يصطلحا "

(رواه مسلم باب الحب فى الله ومن الله)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پیر کے دن اور جمعرات کے دن جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہ ٹھہرانے والے ہر شخص کی بخشش کی جاتی ہے سوائے اس شخص کے جس کے درمیان اور اس کے (دوسرے مسلمان) بھائی کے درمیان عداوت پائی جاتی ہو، پس (اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کو کہا جاتا ہے) ان کو مہلت دے دو یہاں تک کہ یہ صلح کرلیں۔

" وعن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ يعرض اعمال الناس فى كل جمعة مرتين يوم الاثنين ويوم الخميس فيغفر لكل عبد مومن الا عبد بينه وبين اخيه شحناء فيقال اتركوا هذين حتى يضيئا "

(رواه مسلم ومشكوة باب الحب فى الله ومن الله

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگوں کے اعمال ہر ہفتہ میں دو دن پیش کئے جاتے ہیں ۔ ہر مومن بندے کے مغفرت کی جاتی ہے۔ سوائے اس کے ایک شخص اور اس کے دوسرے مومن بھائی کے درمیان عداوت پائی جاتی ہو، پس کہا جاتا ہے۔ ان دونوں کو چھوڑ دو یہاں تک کہ یہ (عداوت سے) رجوع کرلیں۔

" قال القاضى قال الباجى معنى فتحها كثرة الصفح والغفران ورفع المنازل واعطاء الثواب الجزيل قال القاضى ويحتمل ان يكون على ظاهره وان فتح ابوابها علامة لذلك " (نووى شرح مسلم ج ۲، ص ۳۲۵)

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ باجی رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا کہ جنت کے دروازوں کے کھلنے کا یہ مطلب ہے کہ ان دو دنوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کثیر معافی عطا کی جاتی ہے۔ اور کثیر بخشش کی جاتی ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے مراتب بلند فرماتا ہے۔ اور کثیر ثواب عطا فرماتا ہے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ کہ اس کو ظاہر پر رکھنا بھی درست ہے۔ کہ جنت کے دروازے فی الواقع کھول دیئے جاتے ہیں، البتہ ان کو کھولنے کی وجہ یہی ہوتی ہے۔ کہ پتہ چل جائے کہ آج اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں ہے۔ اپنے بندوں کو عفو اور مغفرت کثیر طور پر عطا فرما رہا ہے۔ ان کے مراتب بلند کر رہا ہے۔ انہیں عظیم ثواب سے نواز رہا ہے۔

" وفی روایة الحکیم عن والد عبد العزیز ولفظه " تعرض الاعمال یوم الاثنین والخمیس علی الله تعالیٰ وتعرض علی الانبیاء وعلی الآباء والامهات یوم الجمعة فیفرحون بحسناتهم وتزداد وجوههم بیاضا واشراقا فاتقوا الله ولا توذوا موتاکم " (مرقاة ج ، ص ۲۶۵)

ایک روایت میں یہ ہے کہ بندوں کے اعمال پیر کے دن اور جمعرات کے دن اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش کیے جاتے، اور انبیاء کرام اور لوگوں کے آباؤ امہات، باپ، دادا، نانی، دادی وغیرہ اوپر تک آباؤ اجداد پر جمعہ کے دن پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ بزرگ ان کے اچھے اعمال سے خوش ہوتے ہیں ان کے چہرے خوشی کی وجہ سے زیادہ سفید اور روشن ہو جاتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور فوت شدہ اپنے آباؤ اجداد کو ایذاء نہ پہنچاؤ۔

ان احادیث سے واضح ہوا۔ کہ جمعرات کا دن اور پیر کا دن مبارک ہے، اس میں لوگوں کے اعمال اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرماتا ہے۔ اپنی رحمت کی وجہ سے جنت کے دروازے کھول دیتا ہے، اسی وجہ سے بزرگان دین نے جمعرات کو ایصال ثواب کا اہتمام کرنا خاص کیا ہے کہ قرآن پاک پڑھنے والوں کا عمل بھی مقام مقبولیت میں پہنچ جائے اور جس میت کیلئے دعا کی جارہی ہے۔ اس کے لئے دعا کی قبولیت کو بھی شرف حاصل ہو جائے۔

خاص کر کے جمعرات کو غروب آفتاب سے پہلے قرآن پاک پڑھنے کا اہتمام ہو اور غروب

آفتاب کے بعد دعا کی جائے تو جمعہ کی فضیلت بھی ساتھ ہی حاصل ہو جائے گی۔ اس طرح یہ دعا کا عمل انبیائے کرام کے حضور بھی پہنچے گا اور ان لوگوں کے آباؤاجداد کے پاس بھی۔ اب لوگوں کی مرضی کی بات ہے کہ وہ دعائے مغفرت کا اہتمام کر کے اپنے آباؤاجداد کو خوش کرنا چاہتے ہیں یا کہ ایصال ثواب کا کوئی فائدہ نہیں۔ کہہ کر انہیں مایوس کرنا چاہتے ہیں۔

" عن كعب ابن مالك ان النبی ﷺ خرج يوم الخميس فی غزوة تبوك وكان تحب ان يخرج يوم الخميس " (رواہ البخاری، مشکوۃ باب آداب السفر)

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ بیشک نبی کریم ﷺ غزوہ تبوک میں جمعرات کے دن (گھر سے) نکلے، آپ جمعرات کو ہی نکلنا پسند فرماتے تھے۔

نبی کریم ﷺ غزوات وغیرہ کی لئے جمعرات کو جانا کیوں پسند فرماتے تھے۔

اس کی چند وجوہ ہیں۔

" احدها انه يوم مبارك يرفع فيه اعمال العباد الى الله وقد كانت سفراته لله وفی الله والى الله فاحب ان يرفع له فيه عمل صالح "

(مرقاۃ ج۷، ص۳۲۶)

ایک وجہ یہ ہے کہ یہ برکت والا دن ہے، اس میں بندوں کے اعمال اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوتے ہیں، چونکہ نبی کریم ﷺ کے سفر بھی اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے کی وجہ سے اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی وجہ سے ہوتے تھے، اس لئے آپ پسند فرماتے تھے، کہ یہ میرا سفر جو اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر ہے، آج ہی اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہو جائے

" عن عائشة قالت كان رسول الله ﷺ يصوم الاثنين والخميس "

(رواہ الترمذی والنسائی، مشکوۃ باب صیام التطوع)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ پیر اور جمعرات کو روزہ رکھتے تھے۔

" وعن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ تعرض الاعمال يوم الاثنين والخميس فاحب ان يعرض عمل وانا صائم " (رواہ الترمذی، مشکوۃ باب صیام التطوع)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پیر اور جمعرات کو

(اللہ تعالیٰ کے حضور لوگوں کے) اعمال پیش ہوتے ہیں۔ پس میں پسند کرتا ہوں کہ میرے اعمال پیش
ون تو میں روزہ دار ہوں۔

ان احادیث سے واضح ہوا کہ جمعرات برکت والا دن ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس دن نیک اعمال کرنے کو پسند فرمایا ہے، اسلئے ایصال ثواب کی محافل اس دن قائم کرنا یقیناً فضیلت کا سبب ہیں

" عن عبد الله بن عمرو قال قال رسول الله ﷺ ما من مسلم يموت يوم الجمعة وليلة الجمعة الا وقاه الله فتنة القبر " (رواه احمد والترمذی، مشکوۃ باب الجمعه)

حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی مسلمان بھی جمعہ کے دن یا جمعہ کی رات کو فوت ہو جائے، تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور قبر کے فتنہ سے بچالیتا ہے۔ فتنہ قبر سے مراد عذاب قبر اور قبر میں ہونے والے سوالات ہیں۔ یعنی وہ قبر کے عذاب سے محفوظ ہو جاتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا مسلمانوں پر عظیم فضل ہوتا ہے۔

" وهذا يدل على ان شرف الزمان له تاثير عظيم كما ان فضل المكان له اثر جسيم " (مرقاۃ ج۳، ص ۲۴۲)

یہ حدیث پاک اس پر دلالت کر رہی ہے کہ زمانہ کی شرافت کی دعا کی قبولیت میں عظیم اثر حاصل ہے، جیسا کہ مکان کی فضیلت کو بہت زیادہ اثر حاصل ہے۔

تنبیہ :

" قال القرطبی هذه الاحاديث اى التى تدل على نفى سوال القبر لاتعارض احاديث السؤال السابقة اى لا تعارضها بل تخصها وتبين من لايسئل فى قبره ولا يفتنه فيه ما يجرى عليه السؤال . (مرقاۃ ج۳، ص ۲۴۲)

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ جو احادیث سوال قبر کی نفی پر دلالت کر رہی ہیں ان میں اور وہ احادیث جو پہلے مذکور ہو چکی ہیں۔ جن میں قبر کے سوال کا ذکر ہے ان میں کوئی تعارض نہیں، بلکہ پہلی احادیث میں یہ ذکر ہے کہ قبر میں سوال ہوں گے۔ ان میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے جمعہ کو فوت ہونے والے قبر کے سوال سے محفوظ ہوں گے اور اگر کسی سے سوال ہوا بھی تو وہ سختی اور عذاب سے محفوظ رہے گا۔

فائدہ: ابھی تک جن احادیث کوذکر کیا ہے ان سے واضح ہوا، کہ جمعرات، جمعہ اور پیر کو دوسرے دنوں میں سے خصوصی فضیلت حاصل ہے، ان میں کئے ہوئے عمل کواللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شرف قبولیت حاصل ہوتا ہے، اسی وجہ سے اہل علم بزرگان دین نے ان دنوں میں ایصال ثواب کی محافل کومنعقد کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

سوئم (تیجہ) تیسرے دن عام طور پر ایصال ثواب کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ جسے سوئم یا تیجہ یاقل کاختم کہہ لیا جاتا ہے۔ قرآن پاک پڑھا جاتا ہے۔ کلمہ شریف، درود شریف اور سورۃ اخلاص پڑھے جاتے ہیں۔ یہ تمام امور مستحسن ہیں۔ ایصال ثواب کے طریقوں میں سے یہ بھی ایک طریقہ ہے۔

مگر کچھ لوگ اپنی سرشت کے مطابق اسے بھی ناجائز کہتے ہیں۔ ان سے ہم یہ پوچھتے ہیں کہ کیا اللہ کا کلام پڑھنا ناجائز ہے؟ کیا اللہ کا نام لینا منع ہے؟ کیا اللہ کے حبیب پر درود پاک پڑھنا حرام ہے؟ جب سب میں ثواب ہے کوئی چیز ناجائز نہیں تو ناجائز کہنا کہاں تک انصاف ہے۔ کیا ایسا کہنے والے عالم ہیں، یا جاہل۔ خدارا انصاف کیجئے! حق وباطل میں فرق کو سمجھیں۔

"التعزیۃ لصاحب المیت حسن کذا فی الظھیریۃ"

مصیبت زدہ انسان کے پاس تعزیت کے لئے جانا مستحب ہے۔ خیال رہے کہ تعزیت کا معنی صبر دلانا ہے۔ پیٹنا نہیں، آج کل پیٹنے والے جلوسوں کا نام تعزیہ کے جلوس رکھ لیا گیا ہے، جنوں کا نام خرد اور خرد کا نام جنوں رکھ لیا۔ حقیقت میں صحابہ کرام کی شان میں گستاخی کی سزا رب تعالیٰ نے یہ دے رکھی ہے کہ اپنے آپ کو پیٹتے رہو۔ احمق سزا کو ثواب سمجھ بیٹھے۔

"ووقتھا من حین یموت الی ثلاثۃ ایام ویکرہ بعدھا الا یکون المعزی او المعزی الیہ غائبا فلا بأس بھا وھی بعد الدفن اولی منھا قبلہ وھذا اذا لم یر منھم جزع شدید فان رؤی ذلک قدمت التعزیۃ"

تعزیت کا وقت وفات سے لے کر تین دنوں تک ہے، اس کے بعد مکروہ ہے، ہاں البتہ تعزیت کرنے والا یا جس کے پاس تعزیت کرنی ہے وہ موجود نہ ہو تو جب بھی ملاقات ہو تعزیت کر لی جائے، اس میں کوئی حرج نہیں۔ دفن کے بعد تعزیت زیادہ بہتر ہے، ہاں اگر لوگ زیادہ جزع فزع کر رہے ہو، تو

دفن سے پہلے بھی تعزیت کی جا سکتی ہے۔

" ویستحب ان یعم بالتعزیة جمیع اقارب المیت الکبار والصغار والرجال والنساء الا ان یکون امرأة شابة فلا یعزیها الا محارمها "

مستحب یہ ہے کہ میت کے تمام اقارب کے پاس تعزیت کرے خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے، مرد ہوں یا عورتیں البتہ جوان عورت کے پاس صرف اس کے محرم مرد ہی تعزیت کریں۔

" ویستحب ان یقال مصاحب التعزیة غفر اللہ تعالٰی لمیتک وتجاوز عنه وتغمده برحمة ورزقک الصبر علی مصیبة وآجرک علی موته "

جو شخص تعزیت کے لئے جائے اس کے لئے مستحب یہ ہے۔ کہ وہ یہ کہے! اللہ تمہارے میت کی مغفرت کرے اور اس کے گناہ معاف فرمائے اور اس کو اپنی رحمت سے ڈھانپ لے اور جو تمہیں مصیبت پہنچی ہے۔ اس پر تمہیں صبر عطا فرمائے، اور اس کی موت پر صبر کرنے کی وجہ سے تمہیں اجر عطا فرمائے۔

" ولا بأس لاهل المصیبة ان یجلسوا فی البیت اوفی المسجد ثلاثة ایام والناس یأتونهم یعزیهم "

مصیبت زدہ لوگوں کے لئے کوئی حرج نہیں، کہ وہ گھر میں تین دنوں تک بیٹھیں یا مسجد میں بیٹھیں اور لوگ ان کے پاس آ کر تعزیت کریں۔

" واما لنوح العالی فلا یجوز والبکاء مع رقة القلب لا باس به "

بلند آواز سے رونا چلانا، واویلا کرنا جائز نہیں، البتہ رقت قلب (دل کی نرمی) کی وجہ سے آہستہ آواز میں رونا، آنسو بہانا جائز ہے۔

" واما تسوید الخدود والایدی وشق الجیوب وخدش الوجوه ونشر الشعور ونثر التراب علی الرؤس والضرب علی الفخذ والصدر وایقاد النار علی القبور فمن رسوم الجاهلیة "

رخساروں کو سیاہ کرنا، ہاتھوں کا سیاہ کرنا، گریبان پھاڑنا اور چہرہ نوچنا بال بکھیرنا۔ سر پر مٹی ڈالنا، رانا ور سینہ پر ہاتھ مارنا، قبروں پر آگ جلانا یہ سب جاہلانہ رسمیں ہیں۔ (از فتاوی عالمگیری ج ۱ ص ۱۶۷)

خیال رہے کہ بعض دیہاتوں میں موذی جانور (بجو) کے قبر کو کھودنے کے خوف کی وجہ سے

قبروں پر دھواں دُکھایا (سلگایا) جاتا ہے، وہ بوجہ عذر کے ہے۔ وہ جائز ہے۔

"عن عبد اللہ بن مسعود قال قال رسول اللہ ﷺ لیس منا من ضرب الخدود وشق الجیوب ودعا بدعوی الجاهلية" (بخاری، مسلم، مشکوۃ باب البکاء علی المیت)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ شخص ہم سے نہیں جس نے رخساروں پر مارا اور گریبان پھاڑا اور زمانہ جاہلیت کی طرح واویلا کیا۔

مذکورہ بالا بحث سے واضح ہوا:

☆ تین دن تک میت والے مسجد میں یا گھر جمع ہوں۔ لوگ ان کے پاس تعزیت کیلئے جائیں، ان کے لئے صبر کی دعا کریں۔ اور میت کے لئے مغفرت کی دعا کریں۔ واویلا نہ کریں، زور زور سے نہ چلائیں، پیٹیں نہیں، ورنہ نبی کریم ﷺ کی امت اور آپ کے دین سے نکل جائیں گے۔

سلف صالحین، بزرگان دین، علماء دین متین نے جب یہ دیکھا کہ تعزیت کے لئے لوگ تیسرے دن کو تعزیت کا آخری دن سمجھ کر جمع ہوتے ہیں، لیکن وہ میت کے اقرباء کو تسلی دینے اور صبر کی تلقین کرنے کے بجائے خود بھی رونے چلانے میں شریک ہو جاتے ہیں۔ یہ طریقہ درست نہیں، تو اس کی جگہ یہ بہتر ہے کہ لوگ قرآن پاک پڑھیں، اللہ کا ذکر کریں، کلمہ شریف پڑھیں؛ تاکہ پڑھنے والوں کو ثواب ہو اور میت کو بھی فائدہ ہو۔ لوگ رونے، پیٹنے سے بچ جائیں۔ لوگوں کی غیبت کرنے، جھوٹ بولنے سے بچ جائیں۔ لہٰذا ''سوم'' یعنی تیسرے دن نیک محافل کا انعقاد کیا گیا جو یقیناً باعث ثواب۔ باعث نزول رحمت اور سکون قلب کا ذریعہ ہے۔

فائدہ: اس بحث سے چہارم یعنی چوتھے دن کے ختم کا بھی پتہ چل گیا۔ کیونکہ میت والوں کے سوگ کے دن ختم ہو چکے ہوتے ہیں وہ قرآن خوانی کی محافل قائم کرتے ہیں، صدقہ وخیرات کرتے ہیں۔

کوئی مجھے سمجھائے تو سہی! کہ صدقہ وخیرات کرنا حرام ہے یا قرآن پاک پڑھنا حرام ہے کیا کلمہ شریف پڑھنا حرام ہے؟ یا اللہ کا نام لینا حرام ہے۔ کیا درود پاک پڑھنا حرام یا حضور ﷺ کی نعت خوانی حرام ہے ان کاموں سے جب کوئی ''مکروہ تنزیہی'' بھی نہیں۔ تو ''حرام'' کہنا کہاں درست ہو

گا۔ جب سب کام باعث ثواب ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے نزول کا سبب ہیں تو یقیناً جائز ہیں۔

شاہ ولی اللہ کا سوئم: ”روز سوئم کثرت ہجوم آں قدر بود کہ بیروں از حساب است ہشتاد ویک کلام اللہ بہ شمار آمدہ و زیادہ ہم شدہ باشد و کلمہ را حصر نیست“

(ملفوظات شاہ عبدالعزیز ۸۰)

تیسرے دن لوگوں کا اتنا ہجوم تھا جو شمار سے باہر تھا اکاسی قرآن پاک ختم ہونے کا حساب لگایا گیا تھا ہوسکتا ہے اس سے بھی زیادہ پڑھے گئے ہوں۔ کلمہ شریف کا تو حساب ہی نہیں کہ کتنا پڑھا گیا تھا۔

چہلم (چالیسواں): اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی: ﴿وَوَاعَدْنَا مُوْسٰی اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً﴾ ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا۔

موسیٰ علیہ السلام کو چالیس دنوں کے بعد تورات عطا کی گئی۔ کہ آپ چالیس دن دنیا والوں سے الگ تھلگ ہوکر اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول رہیں۔ تاکہ اس کے ذکر سے آپ کے قلب و روح کو ایک خاص قسم کی قوت حاصل ہو جائے جو اس عظیم بوجھ کو اٹھانے کے قابل ہو جائے۔

”ان للاربعین خصوصیة اختصاص الکلام للانبیاء کما ان لھا اختصاصا فی ظھور ینابیع الحکمة من قلوب الاولیاء کقولہ علیہ السلام من اخلص للہ اربعین صباحا ظھرت ینابیع الحکمة من قلبہ علی لسانہ“

(روح البیان)

بے شک چالیس کو ایک خصوصیت حاصل ہے، اسی وجہ سے انبیاء کرام کو چالیس سال کی عمر میں نبوت کے اعلان کا حکم دیا جاتا رہا، ان سے رب تعالیٰ کا کلام بذریعہ وحی اسی عمر میں ہوا۔

پھر اولیائے عظام کا بھی یہی معمول ہے کہ وہ چلہ کشی کرتے ہیں۔ یعنی چالیس روز تک دنیا سے علیحدہ ہوکر فقط رب تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہوتے ہیں تو ان کے دلوں پر حکمت کے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ”جو شخص چالیس صبح خلوص سے اللہ تعالیٰ کی یاد کرتا ہے اس کے دل سے اس کی زبان پر حکمت کے چشمے نمودار ہو جاتے ہیں۔“

اس سے واضح ہوا کہ عام معمول کے مطابق میت کے لئے چالیس دن تک قرآن خوانی، درود پاک اور کلمہ شریف پڑھنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے، پھر اجتماعی دعا ہوتی ہے۔ صدقہ وخیرات کیا جاتا ہے جو یقیناً دعا کی مقبولیت کا سبب بنتا ہے۔ پڑھنے والوں کے مدارج بھی بلند ہوتے ہیں اور میت کے اعمال میں بھی ترقی ہوتی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کردہ ایک طویل حدیث میں یہ ذکر ہے کہ نبی کریم ﷺ کو ابتدائی طور پر خواب کی صورت میں وحی فرمائی جاتی، اس کے بعد یہ ذکر ہے۔

"ثم حبب اليه الخلاء و كان يخلو بغار حرا فيتحنث فيه وهو التعبد الليالي ذوات العدد" (مشكوة باب المبعث و بدء الوحی)

پھر جب آپ کو علیحدہ رہنا پسند ہوا، آپ غار حرا میں جا کر الگ تھلگ ہو کر کئی راتیں عبادت کرتے۔

اس کے ماتحت علامہ قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

"وهي شهر في كل سنة و ذالك الشهر كان رمضان"

یعنی ہر سال میں ایک مہینہ رمضان کا آپ غار حرا میں علیحدہ ہو کر عبادت کرتے تھے۔

"اقول و يمكن ان تكون المدة اربعين قياسا على ميقات موسىٰ عليه السلام"

علامہ قاری رحمۃ اللہ علیہ اپنا مختار بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ آپ ﷺ نے چالیس دن علیحدہ ہو کر عبادت کی ہو۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے چالیس دن لوگوں سے علیحدہ ہو کر عبادت کی تھی تو آپ کو تورات عطا فرمائی گئی تھی۔

"ولما فيها من الخواص والاسرار التي تظهر آثارها وانوارها على الصوفية الابرار مع ما فيها من مطابقة الاربعينات في الاطوار وقد قال ﷺ من اخلص لله اربعين صباحا ظهرت ينابيع الحكمة من قلبه على لسانه هذا"

"چالیس" میں جو خصوصیات اور اسرار پائے جاتے ہیں ان کے آثار اور انوار اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں پر یعنی صوفیائے کرام پر ہی ظاہر ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ بعض اوقات چلہ کاٹتے ہیں یعنی چالیس دن عام لوگوں سے دور رہ کر الگ تھلگ ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص چالیس صبح خلوص سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے اس کے دل سے اس کی زبان پر حکمت کے چشمے نمودار ہو جاتے ہیں۔

(مرقاۃ ج ۱۰۷)

" ومن حفظ علی امتی اربعین حدیثا بعثه الله فقیها " (مرقاۃ ج ۷ ص ۱۹۳)

جو شخص میری امت پر چالیس حدیثیں یاد کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو فقیہ کے درجہ میں اٹھائے گا۔

اسی وجہ سے کئی بزرگ علمائے کرام نے چالیس چالیس حدیثوں پر مشتمل کتابیں تصنیف کی ہیں جن کے نام ہی اربعین رکھے گئے ہیں۔ جن میں اربعین نووی سب سے زیادہ مشہور ہے۔

" ان تعداد الاربعین تاثیرا بلیغا فی صرفها الی الطاعة او المعصبته "

(مرقاۃ ج ۷ ص ۱۹۳)

بے شک چالیس کو بہت زیادہ تاثیر حاصل ہے نیکیوں میں بھی اور گناہوں میں بھی۔

یعنی چالیس صبح خلوص سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے سے حکمت کے چشمے جاری ہوتے ہیں اور شراب پینے سے چالیس دنوں کی نمازیں اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے

" من شرب الخمر لم یقبل الله له صلوة اربعین صباحا "

جو شخص شراب پیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی چالیس دنوں کی نمازیں قبول نہیں فرماتا۔ اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ چالیس دنوں کو خصوصی تاثیر حاصل ہے۔ لہٰذا چالیس دن میت کے ایصال ثوب کا اہتمام کرتے رہنا اور چالیسویں دن اجتماعی دعا کرنے میں خصوصی قبولیت کے واضح آثار نظر آتے ہیں۔

ایصال ثواب کی محافل میں نیک لوگوں کی شرکت:

عام طور پر سوئم اور چہلم کی ایصال ثواب کی محافل میں دینی مدارس کے طلباء و مشائخ کو بلایا جاتا ہے؛ کیونکہ نیک لوگوں کی شرکت سے دعا میں قبولیت ہوتی ہے۔ اور دینی مدارس کے طلباء صدقہ و خیرات کے زیادہ مستحق ہوتے ہیں۔

بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی،

" واذا سمع صیاح الدیکة فلیسال الله من فضله فانها رات ملکا "

جب کوئی شخص مرغ کی آواز (آذان) سنے تو اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کا سوال کرے کیونکہ اس

نے فرشتہ کو دیکھا ہے۔

" قال القاضی عیاض سببه رجاء تامین الملائکة علی الدعا واستغفارهم و شهادتهم بالتضرع والإقبال علی الله والإ خلاص "

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مرغ کی اذان پر دعا کرنے کا حکم اس لئے فرمایا کہ وہ فرشتے کو دیکھ کر اذان کہتا ہے۔ تو جب اس کی آواز سن کر دعا کی جائے گی تو فرشتے اس دعا پر آمین کہیں گے اور دعا کرنے والوں کے لئے مغفرت طلب کریں گے اور ان کی عاجزی اور ان کے خلوص اور اللہ تعالیٰ کی طرف ان کے متوجہ ہونے کی گواہی دیں گے۔

" وفیه استحباب الدعاء عند حضور الصالحین والتبرک بهم "

نیک لوگوں کی موجودگی میں دعا کرنا مستحب ہے اور نیک لوگوں کے آنے اور ان کے موجود ہونے سے برکت حاصل کرنا مستحب ہے۔

یعنی نیک لوگوں کی موجودگی کو غنیمت سمجھا جائے اور اپنی دعاؤں کی قبولیت کا ذریعہ سمجھا جائے

(مرقاۃ ج۸، ص ۲۳۳)

گزشتہ سے پیوستہ: علامہ احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ نے اسی آیۃ کریمہ کی تفسیر میں دو حوالے وہ ذکر فرمائے جو میرے رسالہ ایصال ثواب میں نہیں تھے خیال ہوا کہ ان کو بھی شامل کرلیا جائے تا کہ مزید فائدہ بھی ہو جائے اور حصول برکت بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

" ان سعد بن عبارة توفیت امه وهو غائب عنها فقال یارسول الله ﷺ ان امی توفیت وانا غائب عنها اینفعها شئی ان تصدقت به عنها قال نعم قال فانی اشهدک ان حائطی المخراف صدقة علیها "

(بخاری ج ۱ ص ۳۸۶، ۳۸۷)

" سعد بن عبارۃ رضی اللہ عنہ کی والدہ ماجدہ کی جب وفات ہوئی تو وہ اپنی والدہ کے پاس نہ تھے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی یارسول اللہ میری ماں وفات پا گئی اور میں اس کے پاس موجود نہ تھا کیا میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو اسے وہ چیز نفع پہنچائے گی؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہاں حضرت سعد نے عرض کی تو یارسول اللہ میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میرا قطار در قطار لگایا ہوا باغ "مخراف" میری والدہ پر صدقہ ہے"

(التبیان مع البیان ص ۵۰ پارہ اول

خیال رہے حضرت سعد کو کنواں کھودنے کا حکم دینا اور آپ کنواں کھدوانا وہ حدیث پہلے مذکور ہو چکی ہے اگر چہ علامہ کاظمی رحمہ اللہ نے یہاں ذکر کی ان دونوں حدیثوں کا مجموعی مطلب یہ ہے کہ حضرت سعد نے اپنی والدہ کے لئے باغ صدقہ کیا اور رسول اللہ ﷺ کے مزید ارشاد پر کنواں بھی کھدوایا جس کا نام ہی "ھذہ لام سعد" (یہ سعد کی ماں کے لئے ہے) رکھا۔

فائدہ: ایصال ثواب صدقات مالیہ کے ساتھ مختص نہیں بلکہ عبادات بدنیہ کا ثواب بھی دوسرے کو پہنچایا جاسکتا ہے ابراہیم بن صالح سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں میں نے اپنے باپ سے سنا۔ کہ ہم حج کرنے جارہے تھے ایک شخص (ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ) نے ہم سے مخاطب ہو کر کہا تمہارے علاقے میں (بصرہ کے قریب ایک مشہور) شہر ابلہ ہے (جہاں نہر فرات کے کنارے مسجد عشار ہے)

"من یضمن لی منکم ان یصلی لی فی مسجد العشار رکعتین او اربعا ویقول ھذہ لابی ھریرۃ سمعت خلیلی ابا القاسم ﷺ یقول ان اللہ عزوجل یبعث من مسجد العشار یوم القیامۃ شھداء لایقوم مع شھداء بدر غیرھم"

(ابو داود کتاب الملاھم ص ۵۹۲ مشکوۃ ص ۴۶۸)

تم میں سے کون میرے لئے ذمہ داری اٹھاتا ہے کہ وہ مسجد عشار میں میرے لئے دو یا چار رکعتیں نماز پڑھے اور کہے کہ یہ نماز ابو ہریرہ کے لئے ہے میں نے اپنے محبوب ابوالقاسم (رسول اللہ) ﷺ سے سنا حضور فرماتے تھے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مسجد عشار سے (ایسے) شہداء کو اٹھائے گا کہ شہداء بدر کے ساتھ ان کے سوا کوئی کھڑا نہ ہو سکے گا۔

ملا علی قاری نے فرمایا یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ شہداء اس امت سے ہیں یا امم سابقہ سے مسجد عشار کے متعلق محدثین کا قول ہے کہ مسجد عشار ایک قدیم ترین مسجد ہے جہاں برکت حاصل کرنے کے لئے لوگ نمازیں پڑھتے ہیں حضرت ابو ہریرہ کی اس حدیث سے بھی اس قول کی تائید ہوتی ہے اس حدیث سے عبادت بدنیہ کا ثواب دوسرے کو پہنچانے کے علاوہ یہ بھی ثابت ہوا کہ زندہ کے لئے بھی ایصال ثواب جائز ہے نیز اس سے یہ امر بھی ثابت ہوا کہ مسجد سے شہداء اور صالحین کا قرب اس میں نماز پڑھنے کی فضیلت کا سبب ہے۔

﴿مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ﴾ کی تفسیر میں صاحب کتاب وجیز امام واحدی متوفی ۴۶۸ء نے فرمایا

﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ﴾ "اعطیناھم بما ینتفعون بہ ینفقون یخرجونہ فی طاعۃ اللہ"
(کتاب الوجیز ج اص ۴) (ہم نے ان کو نفع کے لئے جو کچھ بھی دیا ہے وہ اس سے اللہ کی طاعت میں
نکالتے ہیں) اس تفسیر کی روشنی میں آیۃ کریمہ کا مفہوم یہ قرار پائے گا کہ پرہیز گار وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ
کی ہر عطا اور اس کی ہر نعمت سے جس کا وہ فائدہ اٹھاتے ہیں اسی کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اپنی اولاد اور
مال کو جہاد فی سبیل اللہ میں قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتے وہ دل، کان، آنکھ، ہاتھ، پاؤں سے
لوگوں کو نفع پہنچاتے ہیں وہ اپنے علم و عمل سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے لوگوں کو نفع پہنچاتے ہیں اور
اللہ کی دی ہوئی کسی نعمت کو اس کی رضاء کے خلاف کام میں نہیں لاتے قیامت کے دن کی اس جواب طلبی
سے وہ ڈرتے ہیں جس کا ذکر قرآن مجید میں وارد ہے ﴿اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰئِکَ
کَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلاً﴾ بیشک کان، آنکھ اور دل سب کے متعلق سوال کیا جائے گا۔

نیز فرمایا ﴿ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْمِ﴾ پھر قیامت کے دن اللہ کی نعمتوں کے متعلق تم
سے ضرور پوچھا جائے گا۔

واضح ہوا کہ متقین ان تمام نعمتوں کو ضرورت کے وقت اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے کار خیر میں
ہی خرچ کرتے ہیں۔ (از التبیان مع البیان پارہ اول ص ۵۱ تا ۵۳)

﴿وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ﴾

"اور وہ کہ ایمان لائیں اس پر جو اے محبوب تمہاری طرف اترا اور جو تم سے پہلے اترا"

"اور (اے محبوب) جو آپ پر نازل کیا گیا اس پر وہ ایمان لاتے ہیں اور اس پر جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا"

متقین کی یہ چوتھی علامت بیان کی جا رہی ہے کہ ان کا ایمان اس چیز پر بھی ہے جو نبی کریم ﷺ
پر نازل ہوا اور پانچویں صفت کہ ان کا ایمان اس پر بھی ہے جو پہلے انبیاء کرام پر نازل ہوا:

"قال ابن عباس ای یصدقون بما جئت بہ من اللہ وما جاء بہ من قبلک
من المرسلین لا یفرقون بینھم ولا یجحدون ما جاء وھم بہ من ربھم"

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تصدیق کرتے ہیں اس چیز کی جو (اے محبوب ﷺ) آپ نے لایا اور تصدیق کرتے ہیں اس کی جو آپ سے پہلے رسولوں نے لایا وہ انبیاء کرام کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور جو انہوں نے اپنے رب کی طرف سے لایا ہے اس کا انکار نہیں کرتے''

وہ لوگ کون ہیں جن کا یہاں ذکر ہے؟ اس میں ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد تمام ایمان لانے والے خواہ وہ پہلے مشرک تھے یا کافر یا اہل کتاب یعنی مشرکین کفار اہل کتاب میں سے جو لوگ بھی پہلی تین صفات کے ساتھ یہ دو صفتیں بھی رکھتے ہیں کہ جو آپ نے لایا اور جو آپ سے پہلے انبیاء کرام نے لایا اس پر وہ ایمان رکھتے اور آنے والی صفت (کہ وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں) بھی وہ رکھتے ہیں وہی متقین ہیں وہی ہدایت پر ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہاں سے مراد اہل کتاب ہیں جب کہ پہلے کفار اور مشرکین کا ذکر ہے اب مطلب یہ ہوگا کہ کتاب ہدایت ہے ان لوگوں کے لئے جو کفار و مشرکین سے ایمان بالغیب لائے اور ہدایت ہے ان اہل کتاب کے لئے جو اس چیز پر بھی ایمان لائے جو آپ پر نازل ہوئی اور اس پر بھی جو پہلے انبیاء کرام پر نازل ہوئیں۔

تیسرا قول یہ ہے کہ پہلے موصوف عرب ہیں پھر دوسری مرتبہ اہل کتاب ہیں کیونکہ قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں اہل کتاب سے ایمان لانے والوں کی شان بیان کی گئی ہے رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ ﴾

بیشک اہل کتاب میں سے بعض وہ جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہیں اور اس چیز پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی اور اس پر جو ان کی طرف نازل کی گئی۔ اور ارشاد فرمایا:

﴿ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ﴾

وہ لوگ جن کو ہم نے آپ سے پہلے کتاب دی وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور جب ان پر (قرآن کی آیات) تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں ہم نے اس پر ایمان لایا بیشک یہ ہمارے رب کی طرف سے حق ہے بیشک ہم تو پہلے ہی مانتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:'' ثلاثة يؤتون اجرهم مرتين رجل من اهل الكتاب

آمن بنبیه و آمن بی و رجل مملوک ادی حق اللہ وحق موالیه او رجل ادب جاریته فاحسن تادیبها ثم اعتقها وتزوجها "

(رواہ الشیخان عن ابی موسی الاشعری)

" تین شخص وہ ہیں جن کو دو مرتبہ اجر دیا جاتا ہے ایک وہ شخص جو اہل کتاب سے ہو اور وہ اپنے نبی پر بھی ایمان لایا اور پھر مجھ پر بھی ایمان لایا اور دوسرا شخص غلام ہے جو اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی ادا کرے اور اپنے مولی (مالکوں) کے حقوق بھی ادا کرے اور تیسرا شخص وہ ہے جو اپنی مملوکہ غلامہ کو اچھی طرح ادب سکھائے پھر اسے آزاد کر دے اور پھر اس سے نکاح کر لے "

ظاہر یہ ہے کہ اس آیت کریمہ کو عام رکھا جائے جیسا کہ حضرت مجاہد کا قول ہے کہ سورۃ بقرہ میں چار آیتیں مؤمنین کی صفات میں ہیں اور دو آیتیں کفار کی صفات بیان کر رہی ہیں اور تیرہ (۱۳) آیات میں منافقین کا ذکر ہے:

" فھذہ الآیات الا ربع عامة فی کل مؤمن اتصف بھا من عربی وعجمی و کتابی من انس وجنی "

نتیجہ واضح ہوا کہ یہ چار آیات عام ہیں ہر مومن ان کے ساتھ متصف ہے خواہ عربی ہو یا عجمی، خواہ انسان ہو یا جن۔ اس لئے کہ ان تمام صفات میں تلازم ہے کوئی ایک صفت دوسری کے بغیر نہیں پائی جا سکتی۔ ایسا ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص ایمان بالغیب تو رکھے لیکن اس کا ایمان اس پر نہ ہو جو نبی کریم ﷺ نے لایا اور اس پر ایمان نہ ہو جو پہلے رسولوں نے لایا۔

واضح ہوا کہ مومن متقی بننے کے لئے ہر شخص کو " خواہ کفار سے ہو یا مشرکین سے یا اہل کتاب سے " چھ صفات کے ساتھ متصف ہونا ضروری ہے۔ (ماخوذ از خلاصہ ابن کثیر للصابونی)

دینی مدارس کے طلباء کی دلچسپی کے لئے:

ابھی جو اقوال ذکر کیے ہیں ان کی اصل وجہ عربی گرائمر کی وجوہ ہیں جو کہ قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے تفصیلاً ذکر فرمائی ہیں۔ جن کا خلاصہ و تفسیر آسان لفظوں میں ذکر کر رہا ہوں۔ " وماانزل......الخ" کے عطف میں اختلاف بیان کا خلاصہ یہ ہے۔ معطوف یا معطوف علیہ کا مقابل اور مباین ہوگا یا نہیں مباین ہو تو پھر دو احتمال ہیں کہ عطف الذین یؤمنون پر ہو یا کہ المتقین پر ہو مباین نہ ہونے کی صورت میں

بھی دوہی احتمال ہیں معطوف یا تو معطوف علیہ کے ساتھ متحد بالذات ہوگا یا کہ اس کا کچھ حصہ ہوگا۔

(۱) جب عطف ہو الذین یؤمنون بالغیب پر اور معطوف اور معطوف علیہ میں مباینت ہو تو الذین یؤمنون بالغیب سے مراد وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے ایمان لایا کفر و شرک سے اور وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ ...... الخ سے مراد ہوگا کہ وہ لوگ جو کفار و مشرکین تو نہیں تھے بلکہ اہل کتاب تھے اور ایک دین سے دوسرے دین کی طرف منتقل ہوئے۔

اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ کتاب ہدایت ہے متقین کے لئے جو ایمان لائے ہیں کفر و شرک سے اور اسی طرح ہدایت ہے متقین سے ان لوگوں کے لئے جو کفار و مشرکین تو نہیں تھے لیکن وہ پہلے دین سے نبی کریم علیہ ﷺ کے دین کی طرف منتقل ہوئے۔

(۲) جب عطف ہو متقین پر معطوف اور معطوف علیہ میں مغائرت و مباینت ہو تو اب معنی یہ ہوگا کہ کتاب ہدایت ہے متقین کے لئے جو کفر و شرک سے ایمان لائے اور کتاب ہدایت ہے ان لوگوں کے لئے جو اہل کتاب سے آپ پر ایمان لائے۔

خیال رہے کہ پہلی صورت متقین کی دو قسمیں ہیں کفر و شرک سے ایمان لانے والے اور اہل کتاب سے ایمان لانے والے اور دوسری صورت میں ایمان لانے والوں کی دو قسمیں بنی ہیں کفر و شرک سے ایمان بالغیب لانے والے جو متقین ہیں۔ اور دوسرے جو اہل کتاب سے ایمان لانے والے ہیں لیکن یہ متقین کی قسم نہیں بنی۔

(۳) وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ کا عطف ہو الذین یؤمنون بالغیب پر اور معطوف اور معطوف علیہ متحد بالذات ہو اور اعتباری فرق ہو صرف صفات کے لحاظ سے۔

(۴) چوتھی صورت یہ ہے کہ عطف ہو والذین یؤمنون بما انزل کا الذین یومنون بالغیب پر معطوف اور معطوف علیہ میں مغایرت بھی نہ ہو لیکن والذین یؤمنون بما انزل سے مراد تمام وہ لوگ نہ ہوں جو الذین یؤمنون بالغیب میں داخل ہوں بلکہ ان میں سے بعض ہو اس صورت میں بھی مراد اہل کتاب ہی ہوں گے۔ (از بیضاوی شیخ زادہ حاشیۃ الشہاب)

ان تمام اقوال سے صحیح قول وہی ہے جو علامہ محمد علی صابونی رحمہ اللہ نے بیان کیا کہ یہ عام ہے تمام کو شامل ہے "الانزال نقل الشئی من الاعلی الی الاسفل" کسی چیز کو بلندی سے پستی کی

طرف منتقل کرنا انزال ہے عام طور پر تو کسی ذات کو منتقل کیا جاتا ہے لیکن ذوات میں معانی کا اعتبار بھی ہوتا ہے یہاں یہی وجہ مراد ہے۔

رسولوں پر کتب الاھیہ کو نازل کرنے کا یہ مطلب ہے کہ جبرائیل اللہ تعالیٰ سے روحانی طور پر حاصل کر لیتے ہیں جو رسولوں تک پہنچا دیتے ہیں یا یہ مطلب ہے کہ لوح محفوظ پر رب تعالیٰ کی طرف سے خود ہی منتقل کر دیا جاتا ہے پھر وہاں سے جبرائیل یاد کر لیتا ہے اور رسولوں پر پیش کر دیتا ہے۔

قرآن وحدیث میں تلازم: ایسا ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص یہ کہے کہ میں قرآن کو مانتا ہوں لیکن حدیث کو نہیں مانتا۔ منکر حدیث دراصل منکر قرآن ہوتا ہے تفصیل مقدمہ میں دیکھیں یہاں رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ ﴾ یہ نہیں کہا **والذین یؤمنون بالقرآن**

مؤمن ہونے کے لئے صرف قرآن پاک پر ایمان لانا کافی نہیں ورنہ اللہ تعالیٰ یہی فرماتا کہ وہ لوگ جو قرآن پر ایمان لاتے ہیں لیکن رب تعالیٰ نے فرمایا ''وہ لوگ جو اس پر ایمان لاتے ہیں جو آپ پر نازل کیا گیا یہ حکم عام ہے:

" والمراد بما انزل الیک القرآن باسرہ والشریعة عن آخرھا فان الانزل یعم الوحی الظاھر والخفی'' (بیضاوی بمع بین السطور) **بما انزل الیک** سے تمام قرآن پاک پر ایمان لانا مراد اور آپ کی شریعت پر ایمان لانا مراد ہے کیونکہ انزال (اتارنا) عام ہے جو ظاہر وحی کو بھی شامل ہے اور خفی وحی کو بھی شامل ہے۔

''ایمان می آرند بآنچه نازل کرده شده است بسوئے تو از وحی متلوکه عبارت از کتاب است ووحی غیر متلوکه عبارت است سنت از'' (عزیزی)

''بما انزل الیک'' سے مراد یہ ہے کہ وہ ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو آپ پر نازل کی گئی خواہ وہ وحی متلو ہو یا وحی غیر متلو ہو۔

وحی متلو سے مراد قرآن پاک ہے اور غیر متلو سے مراد حدیث پاک یعنی قرآن اور حدیث دونوں پر ایمان لانے والے ہی مؤمن ہیں وہی متقی ہیں وہی ہدایت یافتہ ہیں کسی ایک کا بھی منکر مومن نہیں ہوسکتا متقی نہیں ہوسکتا ہدایت یافتہ نہیں ہوسکتا۔

مسئلہ: نبی کریم ﷺ پر جو اتارا گیا اس پر ایمان لانا واجب ہے کیونکہ آخر میں بیان فرمایا: "واولئک هم المفلحون" وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ جسے یہ ایمان حاصل نہیں ہو گا وہ فلاح بھی حاصل نہیں کر سکے گا جب یہ ثابت ہوا تو اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ پر جو اتارا گیا اس کا تفصیلی علم حاصل کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ جب تک علم ہی حاصل نہیں ہو گا تو اس پر عمل کیلئے ممکن ہو گا۔ ہاں البتہ یہ بات ذہن میں رہے کہ شریعت (قرآن وحدیث) کا تفصیلی علم حاصل کرنا فرض کفایہ ہے (از کبیر) مقدار سفر یعنی ساڑھے بانوے کلومیٹر کے اندر اندر کوئی ایک شخص تفصیلی علم رکھنے والا ہو تو کوئی گنہگار نہیں ہو گا اگر کوئی بھی نہ ہوا تو سب گنہگار رہوں گے۔

وماانزل من قبلک: یعنی ونیز ایمان مے آرند بآنچه نازل کرده شده است پیش از تو بر انبیائے سابقین که عبارتست از کتبِ الاهیه سابقه مثل توراة وانجیل وزبور وصحف انبیائے پیشین وازسنن انبیائے سابقین ومواعظ وارشادات (عزیزی) یعنی نیز ایمان وہ لاتے ہیں اس پر جو آپ سے پہلے انبیاء کرام پر نازل کیا گیا یعنی پہلی آسمانی کتابیں تورات، انجیل، زبور اور صحیفوں پر وہ ایمان رکھتے ہیں اسی طرح پہلے انبیاء کرام کی سنتوں مواعظ اور ارشادات پر ایمان رکھتے ہیں یعنی یہاں بھی آسمانی کتابوں کے نام ذکر نہ کر کے واضح کر دیا کہ پہلے انبیاء کرام پر نازل کی گئی آسمانی کتابوں پر جس طرح ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح ان کے ارشادات پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔

صحف کی تعداد: کل صحیفے ایک سو ہیں اور کتابیں چار ہیں صحیفوں کے مستقل نام نہیں اور کتابوں کے نام ہیں جو مشہور ہیں قرآن پاک جو ہمارے نبی کریم محمد مصطفٰے ﷺ پر نازل ہوا۔ تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام پر۔ انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اور زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر۔ پچاس صحیفے حضرت شیث علیہ السلام پر۔ حضرت ادریس علیہ السلام پر تیس۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر دس اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات کے نازل ہونے سے پہلے دس نازل ہوئے۔

اعتراض: پہلی کتابوں اور پہلے انبیاء کرام کے ارشادات پر ایمان لانا کیسے ممکن ہے جب کہ ان کے احکام اور ہماری شریعت کے احکام مختلف ہیں۔

جواب: ان پر اجمالی ایمان لانا ضروری ہے کہ جو پہلے انبیاء کرام پر رب تعالیٰ کی طرف سے

کتابیں صحیفے نازل ہوئے ہمارا ان پر ایمان ہے وہ حق تھے اور جو انبیاء کرام کے ارشادات تھے ان تمام پر بھی ہمارا ایمان ہے۔ ہاں البتہ پہلے انبیاء کرام کے احکام اگر ہماری شریعت میں آ گئے تو ان پر ایمان لانا بھی ضروری ہوگا اور عمل کرنا بھی ضروری لیکن یہ نہیں کہ ان پر اس لئے عمل ہوگا کہ وہ پہلی شریعتوں کے احکام ہیں بلکہ ان پر عمل اس لئے ضروری ہوگا کہ وہ ہماری شریعت کا حصہ بن چکے ہیں۔ (از قرطبی)

عقیدہ ختم نبوت کا ثبوت: جب مومن بننے کے لئے ضروری کہ وہ نبی کریم ﷺ پر جو نازل ہوا اس پر ایمان لائے اور آپ سے پہلے انبیاء کرام پر جو نازل ہوا اس پر ایمان لائے تو اسی سے واضح ہوگیا کہ حضور کے بعد کوئی اور نبی آ سکتا تو رب تعالیٰ ضرور حکم فرماتا کہ جو آپ کے بعد نبیوں پر نازل ہوگا اس پر بھی ایمان لائیں گے۔ جب ﴿وَمَا اُنْزِلَ مِنْ بَعْدِکَ﴾ نہیں کہا تو واضح ہوگیا کہ مومن وہی ہوسکتا ہے جو نبی کریم ﷺ کو آخری نبی مانے۔ ختم نبوت پر عقیدہ نہ رکھنے والا کبھی مومن نہیں ہوسکتا۔ ختم نبوت کی تفصیلی بحث کا تعلق تو ﴿وَلٰـكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾ سے ہے صرف ایک حدیث یہاں نقل کی جا رہی ہے تاکہ مسئلہ کو سمجھنا آسان ہو جائے:

" عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ مثل ومثل الانبياء كمثل قصر احسن بنيانه ترک منه موضع لبنة فطاف به النظار يتعجبون من حسن بنيانه الاموضع تلک اللبنة فكنت انا سددت موضع اللبنة ختم به البنيان وختم بی الرسل وفی رواية فانا اللبنة وانا خاتم النبيين "

(بخاری، مسلم، مشکوۃ باب فضائل سید المرسلین

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری مثال اور مجھ سے پہلے انبیاء کرام کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی محل بڑا حسین بنایا گیا ہو لیکن ایک اینٹ کی جگہ اس میں چھوڑ دی گئی دیکھنے والے اس میں گھوم پھر کر اسے دیکھیں تو اس کی حسین عمارت پر تعجب کریں لیکن ایک اینٹ کی جگہ (کو خالی چھوڑا ہوا انہیں پسند نہ آئے) تو میں نے اس اینٹ کی جگہ کو مکمل کر لیا مجھ سے ہی محل مکمل ہوگیا میں ہی رسولوں کا خاتم ہوں''

ایک روایت میں ہے کہ وہ اینٹ میں ہی ہوں خاتم النبیین میں ہی ہوں۔ حدیث کا مطلب واضح ہے کہ قصر نبوت میں ایک نبی کی جگہ خالی تھی جسے میں نے آ کر مکمل کر دیا اب کسی اور کے آنے کی کوئی گنجائش نہیں اس لئے خاتم المرسلین، خاتم النبیین میں ہی ہوں۔

﴿ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴾

(۱) ''اور آخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں (۲) اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں''

متقین کی یہ چھٹی علامت ذکر کی جا رہی ہے کہ وہ آخر پر کامل یقین رکھتے ہیں کامل یقین اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کا تفصیلی علم نہ ہو اور اس سے شک نہ اٹھ جائے۔ (عزیزی)

یعنی متقین کو قیامت کے احوال، حشر ونشر، جنت ودوزخ کا اتنا علم حاصل ہوتا ہے جو رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا اور ان کو اس میں کسی قسم کا کوئی شک وشبہ نہیں ہوتا۔

آخِرَةِ: صفت ہے دار کی جس طرح آتا ہے "الدار الآخرة" پھر اسمیت اس پر غالب آگئی یعنی اب قیامت اور اس کے بعد کے احوال کا نام " آخرة " ہوگیا نام کی وجہ یہ ہے کہ وہ دنیا سے بعد میں ہے یا ہم سے وہ دور ہے اور ہم اس سے دور ہیں دنیا کو دنیا کہنے کی وجہ یہ ہے وہ قریب ہے چونکہ دنیا دنو ماخوذ ہے جس کا معنی ہے قریب ہونا۔

يُوْقِنُوْنَ: ایقان سے لیا ہوا ہے جس کا اصل مادہ یقین ہے یقین کسے کہتے ہیں اس میں مختلف الفاظ مذکور ہیں لیکن آخر کار معنی دو ہی بنتے ہیں۔ بعض نے کہا یقین کا مطلب ہے کہ اسے وہم نہ ہو بعض نے کہا یقین علم کو کہا جاتا ہے جس سے شک کا زوال ہو۔ بعض نے کہا جو نظر واستدلال سے حاصل ہو وہ یقین ہے بعض نے کہا جو نقیض کا احتمال نہ رکھے وہ یقین ہے۔ بعض نے کہا یقین علم کی صفت ہے جو معرفت اور درایت سے اوپر ہے اسی لئے علم یقین کہا جاتا ہے معرفۃ یقین نہیں کہا جاتا لیکن یہ تمام معانی ان دو میں سمٹ کر آجاتے ہیں ایک معنی یہ ہے کہ اس میں شک نہ ہو خواہ وہ نظر سے حاصل ہو یا حس سے، یا عقل سے، یا خبر متواتر سے، یا دلیل سے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ جو عقل پر غالب ہو اس میں شک یا مجاز کا کوئی احتمال نہ ہو۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے بیان کیا کہ پہلے شک ہو پھر زائل ہو جائے تو وہ یقین ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے علم کو یقین نہیں کہا جاتا اس لئے کہ وہ شک کے بعد بھی حاصل نہیں ہوا اور کسی دلیل سے بھی

حاصل نہیں ہوا۔ اسی طرح بدیہات پر بھی یقین نہیں بولا جاتا کیونکہ بدیہات استدلالی کی ضد ہیں ان میں بھی دلائل نہیں پائے جاتے۔ (از کبیر وروح المعانی)

فائدہ: اللہ تعالیٰ نے آخرت پر یقین رکھنے والوں کی مدح کی اسی سے پتہ چل گیا کہ جن لوگوں کو آخرت پر یقین نہیں جس طرح مذاہب باطلہ رکھنے والے وہ کسی طرح بھی مدح کے مستحق نہیں ہو سکتے اسی طرح وہ لوگ بھی مدح کے مستحق نہیں جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں لیکن حساب، سؤال، مؤمنین کا جنت میں جانا، کافروں کا جہنم میں جانا اور جنت میں مختلف نعمتوں کا پایا جانا ان چیزوں پر ان کا یقین نہیں۔ اسی طرح یہود ونصاریٰ آخرت پر یقین رکھنے کے باوجود اپنی مرضی سے من گھڑت اقوال پیش کرتے ہیں ان کی اس حماقت کو رب تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا:

﴿ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْنَصَارٰى ﴾

''یعنی یہودی کہتے تھے جنت میں صرف یہود جائیں گے اور نصرانی کہتے تھے۔ جنت میں صرف نصاری جائیں گے''

اسی طرح یہودیوں نے کہا ﴿وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً﴾ ہمیں آگ صرف چند دن ہی مس کرے گی یعنی چالیس دن جو ہمارے آباؤاجداد نے بچھڑے کی پوجا کی تھی صرف اتنے دن ہمیں آگ کا عذاب ہوگا۔ یہ تمام مذاہب باطل ہیں ان کا آخرت پر یقین غیر معتبر ہے یہ نہ ہدایت پر ہیں اور نہ ہی ان کو فلاح حاصل ہوگی۔ (از کبیر)

اسی بحث سے ایک اور مسئلہ حل ہوگیا کہ "بالاخرة" اور "هم" کو پہلے ذکر کیا گیا ہے جو حصر پر دلالت کررہے ہیں کہ آخرت پر یقین صرف ایمان والوں کو ہی ہے کیونکہ دوسروں کا یقین معتبر ہی نہیں۔

لوگوں کی ناسمجھی پر تعجب: نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" یاعجبا کل العجب من الشاک فی الله وهو یری خلقه وعجبا ممن یعرف النشآة الاولی ثم ینکر النشاة الآخرة وعجبا ممن ینکر البعث والنشور وهو فی کل یوم ولیلة یموت ویحی (یعنی النوم الیقظة)

وعجبا ممن یؤمن بالجنة ومافیها من النعیم ثم یسعی لدار الغرور وعجبا من المتکبر الفخور وھو یعلم ان اولہ نطفة مذدة و آخرہ جیفة قذدة"

(کبیر)

''کتنا ہی تعجب ہے اس شخص پر جو اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو دیکھتے ہوئے بھی اللہ تعالیٰ کے متعلق شک کرتا ہے (کہ کوئی اللہ ہے بھی یا نہیں) اور کتنا ہی تعجب ہے اس پر جو پہلی پیدائش کو جانتا ہے لیکن آخرت کے اٹھنے کا انکار کرتا ہے اور کتنا ہی تعجب ہے اس پر کہ جو حشر و نشر کا انکار کرتا ہے حالانکہ وہ ہر دن اور رات کو مرتا اور زندہ ہوتا ہے (یعنی سوتا اور جاگتا ہے) اور کتنا ہی تعجب ہے اس پر جو جنت اور جنت میں پائی جانے والی نعمتوں پر ایمان رکھتا ہے پھر وہ اس گھر کی طرف دوڑ دوڑ کر جاتا ہے جس میں دھوکہ پایا جاتا ہے اور کتنا ہی تعجب ہے اس پر جو تکبر کرتا ہے اور فخر کرتا ہے جب کہ وہ جانتا بھی ہے کہ اس کا ابتدائی بیج نطفہ ہے اور آخر میں اس نے بدبودار مردار ہو جانا ہے''

﴿اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾

(۱) ''وہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی مراد کو پہنچنے والے''

(۲) ''وہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی کامیاب ہیں''

پہلے متقین کی صفات بیان ہوئیں اور اس آیۃ میں ان کے انجام اور ان پر فیضان کو ذکر کیا کہ یہ وہ بلند مرتبہ کتاب ہے جس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں متقین کے لئے ہدایت ہے متقین کی یہ علامت ہیں کہ وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور وہ نماز قائم کرتے ہیں اور اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کی راہ میں خرچ کرتے اور جو نبی کریم ﷺ پر اتارا گیا اس پر وہ ایمان رکھتے ہیں اور آپ سے پہلے انبیاء کرام پر جو اتارا گیا اس پر وہ ایمان رکھتے ہیں اور آخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں۔ اتنی صفات رکھنے والے متقین وہ خوش بخت لوگ ہیں کہ اپنے رب تعالیٰ کی طرف سے ان کو ہدایت پر متمکن کر دیا جاتا ہے اور دین و دنیا اور آخرت میں ان کو کامیابی سے سرفراز کیا جاتا ہے۔

ماقبل سے تعلق: (۱) جب یہ بیان کیا گیا کہ کتاب (قرآن پاک) ہدایت ہے متقین کے

لئے تو گویا کہ ضمناً سوال پایا گیا کہ کیا وجہ ہے کہ کتاب متقین کے لئے ہدایت ہے؟ تو اس کا جواب الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ سے لے کر اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ تک دیا گیا کہ وہ یہ صفات رکھتے ہیں لہٰذا وہی اپنے رب تعالیٰ کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔

(۲) جب متقین کی صفات کا ذکر کر دیا گیا اور اس کے بعد ہدایت کا ذکر ہوا تو ضمناً سوال یہ ہوا کہ ان صفات سے متصف لوگ ہی کیوں ہدایت سے مختص ہیں؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ ان کے غیر تو کفار اور فساق ہیں وہ تو رب تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہوں گے ان کو ہدایت یا کامیابی حاصل ہونا ممکن ہی نہیں وہ تو اپنے آپ کو کامیابی کی راہ سے ہی دور کر چکے ہیں۔

(۳) ایمان والے متقین کی صفات اور ان کی کامیابی کو ذکر کر کے اشارۃً یہ بتا دیا کہ وہ اہل کتاب جو نبی کریم ﷺ پر ایمان نہیں لائے وہ گمان کریں کہ ہم ہدایت پر ہیں اور ہم کامیاب ہوں گے تو ان کا یہ گمان باطل ہے کامیابی سے ہمکنار ہونے والے تو وہی ہوں گے جو نبی کریم ﷺ کے اعلان نبوت کے بعد ان مذکورہ چھ صفات سے متصف ہوں گے۔ (از کبیر)

اُولٰٓئِکَ: اشارہ متقین کی طرف ہے یہ قریب اور بعید مذکر اور مؤنث کے لئے مشترک ہے جب یہ لحاظ کیا جائے کہ متقین جو بہت عظیم صفات رکھنے والے ہیں وہ بڑی شان والے ہیں گویا کہ بلندی مرتبہ کی وجہ سے ان کو بعد مکانی (دوری) حاصل ہے تو بعید والا معنی کیا جائے گا جیسا کہ اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے کیا ہے ''وہی لوگ'' اور جب یہ خیال کیا جائے متقین کا ذکر تو ابھی قریب ہی ہوا ہے تو معنی قریب والا ہوگا جیسا کہ مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے کیا ہے ''یہی لوگ'' راقم نے اعلیٰ حضرت کی نقالی ہی کی ہے۔

خیال رہے کہ ''اولئک'' کا اشارہ غیر ذوی العقول کی طرف بھی ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''ان السمع والبصر والفواد کل اولئک کان عنه مسؤلا'' (بے شک کان اور آنکھ اور دل ان سب سے سوال ہونا ہے) یہاں اولئک کا اشارہ سمع، بصر، اور فواد کی طرف ہے جو غیر ذوی العقول ہیں۔ (از قرطبی)

عَلٰی: دینی مدارس کے طلباء کرام بخوبی واقف ہیں کہ ''علی، استعلا'' (بلندی کے معنی) کے

لئے آتا ہے یہاں بلندی کا معنی کیسے؟ علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "علی هدی ، بیان لتمکنهم من الهدی واستقرارهم علیه حیث شبهت حالهم بحال من اعتلی الشئی ورکبه" "علی هدی" میں لفظ "علی" سے یہ سمجھ آیا کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت پر متمکن کردے گا اوران کو ہدایت پر ثابت کردیا جائے گا یعنی ان کے حال کو اس شخص کو حال سے تشبیہ دی گئی جو کسی چیز کے اوپر ہو اور سوار ہو۔ یہی صورت پائی جاتی ہے۔ ان الفاظ میں "فلان علی الحق ، فلان علی الباطل" یعنی فلاں شخص اتنا حق پر قائم ہے کہ گویا کہ اسے حق پر تمکن حاصل ہو گیا اسی طرح فلاں شخص اتنا باطل راہ پر چل رہا ہے کہ گویا کہ باطل پر سوار ہے۔ ایسے ہی عام طور پر کہا جاتا ہے " فلان جعل الغوایة مرکبا" فلاں نے گمراہی کو سواری بنالیا اسی طرح یوں کہا جاتا ہے " فلان امتطی الجهل" فلان نے جہالت کو سواری بنالیا۔ جو شخص کسی سواری پر سوار ہوا سے یہ قدرت حاصل ہوتی ہے کہ جب تک چاہے سوار رہے وہ بغیر ضرورت کے سواری سے نہیں اترتا اسی طرح جس شخص نے دلائل سے اپنے لئے سیدھی راہ کو حاصل کرلیا اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ اس پر قائم رہے اور اپنا محاسبہ کرتا رہے تا کہ اس سے ہٹ نہ جائے۔ گویا کہ لفظ "علی" سے ہی یہ سمجھ آ گیا کہ وہ اللہ کے فضل وکرم سے ہمیشہ ہدایت پر قائم رہے گا۔ (از کبیر)

هدی کو نکرہ ذکر کرنے کی وجہ:

نکرہ اس لئے ذکر کیا گیا کہ اس کا ابہام اس چیز پر دلالت کرے کہ اس کی حقیقت تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ اور نہ ہی اس کا کوئی اندازہ کرسکتا ہے مطلب یہ ہے کہ متقین حضرات کو رب تعالیٰ کی طرف سے اتنی عظیم ہدایت حاصل ہوتی ہے جس کی حقیقت کو انسان نہیں سمجھ سکتا اس کی عظمت، اس کثرت بے انتہاء رب کی مہربانیوں کا انسان اندازہ نہیں کرسکتا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی کہے " لو ابصرت فل انا ابصرت رجلا" اگر تو فلاں کو دیکھے تو اسے تو مرد پائے۔ اس مثال میں نکرہ (رجلا) ذکر کیا اشارہ اس طرف کیا کہ اگر تو فلاں شخص کو صحیح نظر وبصیرت سے دیکھتا تو جوانمردی، بہادری مروت واحسان اس میں بہت ہی کامل درجہ کا پاتا۔

فائدہ: عون ابن عبداللہ نے فرمایا:" الهدی من الله کثیر ولا یبصر الابصیر ولا یعمل

به الایسیر الاتری ان نجوم السماء یبصر ها البصراء ولا یهتدی به الا العلماء" اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کے بہت راستے دکھائے جاتے ہیں لیکن ان کو صرف بصیرت والے حضرات ہی دیکھتے ہیں اوران پر عمل کرنے والے بہت تھوڑے ہی ہوتے ہیں کیا تم دیکھتے نہیں کہ بیشک آسمان کے ستاروں کوسب نظر والے دیکھتے تو ہیں لیکن ان سے ہدایت صرف علماء ہی حاصل کرتے ہیں۔ (از کبیر)

مِنْ رَّبِّهِمْ: ان کے رب کی طرف سے ان کو ہدایت حاصل ہوتی ہے یہ کہہ کر بیان یہ فرمایا کہ اگرچہ بظاہر اسباب اور وسائل صوریہ (صورت رکھنے والے واسطے) پائے جاتے ہیں لیکن حقیقت میں رب تعالیٰ کی مہربانی سے ہی ہدایت حاصل ہوتی ہے "انہ ھو الموفق لھم والمفیض علیھم من بحار لطفه و کرمه" اس لئے کہ ان کو توفیق دینے والا وہی ہے اوراپنے لطف وکرم کے سمندروں سے ان پر فیضان کرنے والا وہی ہے۔

"ان الوسائط قد ترتفع من البین فیبتلج صبح العیان لذی عینین" بیشک واسطے اوراسباب کبھی درمیان سے اٹھ بھی جاتے ہیں لیکن رب تعالیٰ کی مہربانیوں کی وجہ سے عطاء کو صبح کی طرح ظاہر، روشن، چمکتا دمکتا ہوا آنکھیں رکھنے والا انسان دیکھ لیتا ہے۔

آنکھ والا تیری عطاء کا تماشہ دیکھے ، دیدۂ کور کو کیا نظر آئے کیا دیکھے؟

(روح المعانی)

"مِنْ رَّبِّهِمْ" سے قدریہ فرقہ کا رد بھی ہو گیا کیونکہ وہ انسان کو ہی ایمان اور ہدایت کا خالق مانتے ہیں اگر مذہب صحیح ہوتا تو "من انفسھم" کہا جاتا "من ربھم" نہ کہا جاتا کیونکہ ان کے مذہب کے مطابق اسی وقت صحیح مطلب ہو سکتا ہے جب یہ کہا جائے کہ وہ ہدایت پر ہیں اپنے نفسوں کی طرف سے ہی (از قرطبی) سبحان اللہ رب تعالیٰ کا کلام کیسا ہی ذیشان ہے ایک ایک لفظ موجزن دریا کی حیثیت رکھتا ہے جس میں دریکتا پنہاں ہیں۔

یہاں ہدایت سے مراد کیا: "علی ھدی ای علی نور وبیان وبصیرة من اللہ تعالیٰ" وہ ہدایت پر ہوں گے اپنے رب کی طرف سے یعنی ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نور، بیان اور بصیرت حاصل ہوگی "وقال ابن عباس علی ھدی من ربھم ای علی نور من ربھم واستقامة علی

ماجاء هم بہ " حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ان کو ان کے رب تعالیٰ کی طرف سے نور حاصل ہوگا اور جو ان کو دین شریعت ، ایمان ، اقامت صلوۃ ، رب کی راہ میں خرچ کرنا قرآن وحدیث پر ایمان پہلی کتب الاھیہ اور ارشادات انبیاء پر ایمان اور آخرت پر یقین حاصل ہوئے ہیں۔ ان پر اللہ تعالیٰ ان کو استقامت نصیب فرماتا ہے یہی استقامت ان کے لئے رب تعالیٰ کی طرف سے ہدایت ہے۔

(صابونی)

وہ رب تعالیٰ جس نے تمام مخلوق کی تربیت کی وہ اپنی رحمت کاملہ سے ایمان کی دولت عطا کر کے اور قرآن میں جتنے بھی ہدایت کے طریقے ذکر ہیں ان پر چلا کر متقین کو عظیم ہدایت سے نوازتا ہے

(از تبصیر الرحمن)

اللہ تعالیٰ متقین کو ''رشاد'' (درست راہ پر چلنا) اور نور اور استقامت عطا فرماتا ہے۔

(خازن جواهر طنطاوی)

" علی هدی من ربهم ، اما الیه و اما الی داره ، دار السلامة ، والفضل والثواب واللطف "

رب تعالیٰ ان کو اپنی طرف ہدایت دیتا ہے یعنی ان کو اپنا قرب عطا فرماتا ہے اور اپنے دار یعنی دار السلامۃ کی طرف ہدایت دیتا ہے کہ ان کو جنت کے اعلیٰ مقام کا مستحق ٹھہراتا ہے ان پر فضل فرماتا ہے ان کو ثواب عطا کرتا ہے ان پر مہربانی فرماتا ہے۔

(ابن عربی)

مفلحون کے معانی: فلح کا معنی ، پھاڑنا ، توڑنا جیسا کہ کہا جاتا ہے۔

" ان الحدید بالحدید یفلح " لوہا لوہے سے کاٹا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے فلاحۃ الارض زمین کو ہل چلا کر پھاڑنا اسی وجہ سے "اکار " کو فلاح کہتے ہیں یعنی ہل چلانے والے کو اکار کہتے ہیں اور فلاح بھی اسی طرح جس شخص کا نیچے والا ہونٹ پھٹا ہوا ہو اسے "افلح " کہا جاتا ہے مفلح کو مفلح کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ مشکلات کو کاٹ کر مطلوب تک پہنچتا ہے۔ کبھی اس کا معنی ہوتا ہے'' کامیاب ہونا'' جیسا کہ کہا جاتا ہے استفلحی بامرک خاوند اپنی زوجہ کو کہتا ہے تو اپنے امر میں کامیاب ہوگئی کبھی اس کا معنی ہوتا باقی رہنا جیسا کہ کہا گیا ہے "افلح بما شئت فقد یدرک بالضعف وقد یخدع الاریب " تو باقی رہ جس طرح تو چاہے (خواہ عقل مندی سے یا حماقت سے) کبھی رزق دیا جاتا ہے احمق کو اور کبھی عاقل کو محروم کر دیا جاتا ہے۔

(از قرطبی)

یہاں مفلحون کا کون سا معنیٰ ہے؟

"واولئک هم المفلحون ، ای الفائزون بالجنة والباقون فیها" وہ لوگ جنت کے حصول سے کامیاب ہونے والے ہیں اور اس میں ان کو باقی رہنا ہے۔ ابن ابی اسحاق نے کہا "المفلحون هم الذین ادرکوا ما طلبوا ونجوا من شرما منه هربوا" مفلحون ان لوگوں کو کہا گیا ہے جو مطلوب کو حاصل کر لیں اور جس شر سے وہ بھاگنا چاہیں اس سے نجات حاصل کر لیں۔

''فلاح'' کا ایک معنیٰ حدیث شریف میں ''سحری کا کھانا'' بھی آیا ہوا ہے چونکہ سحری کا کھانا اس لئے کھایا جاتا ہے کہ انسان اپنے روزہ کو آسانی سے باقی رکھ سکے اس معنیٰ کے لحاظ پر بھی 'مفلحون " سے مراد جنت کی نعمتوں میں باقی رہنے والے لوگ ہیں۔ (از قرطبی)

''کامیاب ہونا'' ایسا معنیٰ ہے جو سب کو شامل ہے تمام معانی اس میں آجاتے ہیں وہ آگ سے نجات حاصل کر کے کامیاب ہیں وہ جنت کو پا کر کامیاب ہیں وہ عزت حاصل کر کے کامیاب ہیں وہ سعادت حاصل کر کے کامیاب ہیں وہ مطلوب کو حاصل کر کے کامیاب وہ شر سے بچ کر کامیاب ہیں (از خازن)

اسی وجہ سے تبصیر الرحمٰن میں یہ معنیٰ بیان کیا گیا ہے " واولئک هم المفلحون بالهدايات كلها " وہ ہر قسم کی ہدایت کو حاصل کر کے کامیاب ہیں۔ اسی سے یہ فائدہ حاصل ہو گیا کہ کفار کو کوئی ہدایت حاصل نہیں کیونکہ قرآن پاک سے کفر کرنا مستلزم ہے کہ وہ ہدایت کے ساتھ بھی کفر کرنے والے ہیں لہٰذا وہ گمراہ ہیں ہدایت پر نہیں۔ (تبصیر الرحمن)

لفظ فلاح میں عظمت:

" لیس فی کلام العرب کله اجمع من لفظة الفلاح لخیری الدنیا والآخرة کما قاله ائمة اللغة" (تاج العروس)

ائمہ لغت نے یہ واضح کیا ہے کہ کلام عرب میں لفظ فلاح سے بڑھ کر کوئی اور ایسا لفظ نہیں جو دنیا اور آخرت کی بھلائیوں کا جامع ہو یعنی اس میں ہر قسم کی نعمتوں کا ذکر آجاتا ہے۔

فائدہ: سورۃ بقرہ کی ابتداء سے یہاں تک آیات کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بیشک میں نے تمہاری طرف رسول بھیجا جسے حکمت عطا کی گئی وہ فصیح اللسان ہیں ان کو فصاحت

اسی کتاب حکیم کے ذریعے عطا کی گئی قرآن کی فصاحت کو ان آیات اور اس کے نتائج میں دیکھو قرآن پاک کے دلائل اور ان کی عمدگی ان آیات میں نظر آئے گی ان آیات اور ان سے حاصل ہونے والے شرعی احکامات کی طرف تو توجہ کر وان آیات سے بڑھ کر اور تمہیں کون سا کلام بلیغ نظر آئے گا یہ قرآن پاک مرکب تو ان حروف تہجی سے ہی ہے جن سے اور کتب بھی تصنیف کی گئی ہیں لیکن اس کا مقابلہ کرنے سے ساری دنیا کے سارے انسان فصحاء و بلغاء عاجز آ گئے۔

اس کتاب میں متقین کی جو صفات بیان کی گئی ہیں ان کے مطابق اپنے آپ کو بنالو اسی میں کامیابی ہے اسی میں نجات ہے۔ متقین کی تین قسم کی صفات کو بیان کیا گیا ہے ایک قسم میں متقین کے ''علم وحکمت کو بیان کیا گیا ہے ان دونوں کا ذکر ایمان بالغیب میں ہے متقین کی دوسری صفت تسخیر بدن بالعبادۃ (یعنی عبادت کے ذریعے اپنے آپ کو رب تعالیٰ کے تابع بنانا) جو نماز سے حاصل ہوتی ہے اور تیسری صفت جو رب تعالیٰ کے دیئے ہوئے مال سے رب کی راہ میں خرچ کرنے سے حاصل ہوتی ہے پھر ان کی بزرگی کو رب تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا کہ ان کا ایمان اپنے دین پر بھی ہے اور پہلے دینوں پر بھی اور آخرت پر بھی ان کا یقین ہے۔ اس پر ان کی کامیابی کا ذکر فرمایا گویا کہ ان کے ماضی، حال، استقبال کا ذکر فرما کر یہ سمجھا دیا گیا کہ اے انسان تو اگر کامیابی چاہتا ہے تو اپنے ماضی، حال، استقبال کی طرف نظر رکھ۔ ماضی کی غلطیوں سے تائب ہو جا حال کو درست رکھ پھر تیرا مستقبل روشن ہوگا سبحان اللہ قرآن پاک تیری فصاحت و بلاغت پر قربان، تیری عظمت کو سمجھنے والے علماء کو سلام۔ (ماخوذ از جواھر طنطاوی)

گزشتہ سے پیوستہ: واولـــئک دوبارہ ذکر کر کے یہ مسئلہ بتایا کہ متقین جو صفات مذکورہ سے متصف ہوں گے وہ ان دو انعاموں سے بھی متصف ہیں یعنی وہ صفات خود ہی تقاضا کریں گی کہ انکو دونوں انعام حاصل ہوں اگر اسم اشارہ میں تکرار نہ ہوتا تو یہ وہم بھی ہوسکتا تھا کہ شائد صفات صرف ایک ہی انعام کا تقاضا کرتی ہوں اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ دونوں انعاموں میں سے ہر ایک متقین کو دوسروں سے ممتاز کرنے کیلئے کافی ہے۔ کیونکہ ان کے غیر لوگوں کو نہ ہدایت حاصل ہے اور نہ ہی فلاح واؤ عاطفہ کے ذکر کی وجہ یہ ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ ہر ایک جملہ کا مفہوم مختلف ہے جیسا کہ پہلے ہدایت اور فلاح کی بحث میں دونوں کے مطالب تفصیلی طور پر بیان کئے جا چکے ہیں ان پر نظر کرنے سے فرق خود بخود واضح ہو جائے گا۔

"ھم "ضمیر درمیان میں ذکر کی گئی ہے کہ یہاں حصر ہے جس کا مطلب ہے کہ صرف وہی لوگ کامیاب ہیں جو متقی ہیں ان کے غیروں کوکوئی فلاح حاصل نہیں۔ (از بیضاوی)

عربی کا شاندار ضابطہ:

ہر وہ کلمہ جس کا فاء کلمہ فاء ہی ہو اور عین کلمہ لام ہو اس میں پھاڑنے ،فرق کرنے کا معنی ضرور پایا جائے گا۔جیسا کہ فلج ، پھٹنا،فلح ،کاٹنا،فلذ ،کاٹنا،فلی، بالوں کوادھرادھر کرنا کھجلانے کیلئے یا جوئیں نکالنے کے لئے فلف، پھٹنا۔ (از بیضاوی)

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴾

''بیشک وہ جن کی قسمت میں کفر ہے انہیں برابر ہے چاہے تم انہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ ایمان لانے کے نہیں''

''بیشک وہ جن کی قسمت میں کفر ہے انہیں آپ کا ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے''

اس سے پہلے اللہ تعالی نے اپنے خاص بندوں، خالص اولیاء کا ذکر کیا ان کی صفات کا ذکر کیا ان پر مرتب ہونے والے نتائج یعنی ان کو عطاء ہونے والے انعامات کا ذکر کیا۔اب اس آیۃ میں اور اس کے بعد آنے والی آیۃ میں سرکش، نافرمان کھلے کافروں کا ذکر کیا جارہا ہے کہ ان کو ہدایت نفع نہیں دیتی ان کو آیات سے کوئی فائدہ نہیں ان کو ڈرانے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ وہ ایمان نہیں لائیں گے کافروں سے مراد کون سے کافر ہیں؟ یا تو " الذین " (موصول) عہد پر دلالت کر رہا ہے اس سے مراد خاص معین کافر ہیں ابولہب، ابوجہل، ولید بن مغیرہ یہود کے پادری۔اور یا " الـذیـن " موصول جنس پر دلالت کر رہا ہے یعنی مراد تو جنس کفار ہیں لیکن وہ جو کفر پر قائم رہنے کا مصمم ارادہ کئے ہوئے ہیں کفر پر جمے ہوئے

ہیں ہر ایک ایک کافر مراد نہیں کہ کوئی کافر بھی ایمان نہیں لائے گا اس لئے کہ ہزاروں کافر مسلمان ہوئے رب تعالیٰ کا کلام سچا ہے صرف اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ (ماخوذ از بیضاوی)

علامہ قاضی بیضاوی رحمہ اللہ کے اس بیان کے بعد اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کے ترجمہ پر نظر کریں کہ ایک ہی لفظ سے دریا کو کوزے میں کیسا بند کر دیا۔ آپ فرماتے ہیں ''بیشک وہ جن کی قسمت میں کفر ہے'' یہ نہیں ترجمہ کیا ''بیشک وہ جو کافر ہیں'' یعنی ایک لفظ ''قسمت'' ذکر کر کے علامہ بیضاوی رحمہ اللہ کی ساری بحث کو اس میں سمیٹ دیا کہ ایمان جو نہیں لائیں گے اور جن کو نبی کریم ﷺ کا ڈرانا نفع نہیں دے یہ وہی کافر ہوں گے جن کی قسمت میں کفر پر ہی مرنا ہوگا سارے کافر اس سے مراد نہیں۔

دینی مدارس کے طلباء کے لئے:

''سواء'' پر رفع میں دو قول ہیں ایک یہ ہے کہ یہ ''ان'' کی خبر ہے اور ﴿وَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ﴾ مقام رفع میں ہے کیونکہ وہ فاعل ہے بتاویل مصدر سواء کا اور سواء بمعنی استواء ہے اور استواء بمعنی ''مستو'' کے ہے۔ دوسرا قول یہ ہے ﴿اَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ﴾ بتاویل مصدر اسم ہے اور مبتدا سواء خبر مقدم ہے۔ پورا جملہ خبر ہے ''ان'' کی اب معنی یہ ہوگا ''سواء علیهم انذارک وعدمه'' (آپ کا ڈرانا اور نہ ڈرانا ان پر برابر ہے) دوسری ترکیب زیادہ بہتر ہے کیونکہ سواء اسم ہے اس کو فعل کا قائم مقام ماننا خلاف اصل ہے۔ (از کبیر)

سواء مرفوع ہے بوجہ مبتداء ہونے کے اور ''وانذرتهم ام لم تنذرهم'' خبر ہے اور مکمل جملہ خبر ہے ''ان'' کی۔ (قرطبی)

لیکن خیال رہے کہ علامہ قرطبی کی ترکیب بغیر تاویل کے درست نہیں کیونکہ ''سواء'' نکرہ ہے اور نکرہ بغیر تخصیص کے مبتداء نہیں بن سکتا اس لئے تاویل کر کے کوئی تخصیص ثابت کرنی پڑے گی جو خلاف ظاہر ہے۔

کفر کا لغوی معنی: لغت میں کفر کا معنی ڈھانپنا ستر اسی معنی میں شاعر نے اس مصرع میں استعمال کیا ہے ''فی لیلة کفر النجوم غمامها'' رات میں ستاروں کو رات کے بادل نے ڈھانپ دیا۔

کفر بمعنی رات اصل معنی چھپانا ہی ہے اسی مناسبت سے رات پر بولا گیا ہے جیسا کہ ثعلبہ بن صعیرہ مازنی نے کہا "فتذکرا ثقلا رثیدا بعد ما ، القت ذکاء یمینها فی کافر" ان دونوں نے شتر مرغ طے بطے (تہ بتہ) رکھے ہوئے انڈوں کا ذکر کیا اسکے بعد جب کہ سورج نے چھپنا شروع کیا۔

" ذکاء بضم الذال والمد اسم الشمس الثقل بالتحریک هنا بیض النعام المصون الرشید المنضد القت یمینها فی کافر بدأت فی المغیب...... لسان العرب"

دریا اور بڑی نہر کو بھی کافر کہہ لیا جاتا ہے کہ ان زیادہ گہرے پانی کی وجہ سطح زمین چھپی ہوئی ہوتی ہے زمین میں کھیتی باڑی کرنے والے کسان (زراع) کو بھی کافر کہا جاتا ہے کہ وہ دانے کو چھپا دیتا ہے اسی معنی میں قرآن پاک میں بھی استعمال ہے " کمثل غیث اعجب الکفار نباته " اس بارش کی طرح جس کے اگائے ہوئے سبزہ نے کسانوں کو تعجب میں ڈالا جس خاکستر پر ہوا مٹی ڈال دے اسے بھی مکفور کہا جاتا ہے جو شخص لوگوں سے علیحدہ ہو کر دور چلا جائے کہ وہاں سے کسی کا گزر نہ ہو کوئی اسے ملنے نہ آئے اسے "الکافر من الارض "(دور زمین میں چھپ جانے والا) کہا جاتا ہے بستیوں کو بھی "الکفور "کہا جاتا ہے۔

کفر کا اصطلاحی معنی: کفر ایمان کی ضد ہے وہی یہاں مراد ہے جب واضح ہو چکا ہے کہ ایمان تصدیق کو کہا جاتا ہے تو سمجھ آ گیا کہ کفر انکار کو کہا جائے گا خواہ انکار ظاہری ہو یا باطنی یعنی تصدیق کا نہ پایا جانا کفر ہے خیال رہے کبھی نعمت و احسان کے انکار یعنی ناشکری کو بھی کفر کہا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِىْ لَشَدِيْدٌ﴾ اگر تم نے شکر کیا تو میں تمہیں اور دوں گا اگر تم نے ناشکری کی تو میرا عذاب سخت ہے۔ حدیث کسوف میں رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کے متعلق ارشاد فرمایا:

"ورایت النار فلم ار منظرا کالیوم قط افظع ورآیت اکثر اهلها النساء قیل بم یارسول الله ؟ قال بکفرهن قیل ایکفرن بالله ؟ قال یکفرن العشیر ویکفرن الاحسان لواحسنت الی احداهن الدهر کله ثم رات منک شیا قالت ما رأیت منک خیرا قط ، اخرجه البخاری وغیره "

اور میں نے آگ کو دیکھا آج جیسا کوئی پریشان کن گھبرا دینے والا منظر نہیں دیکھا میں

نے آگ والوں میں عورتوں کو زیادہ تعداد میں دیکھا پوچھا گیا اس کی وجہ کیا ہے یارسول اللہ؟ آپ نے فرمایا بوجہ ان کے کفر کے آپ سے پوچھا گیا کیا وہ اللہ تعالیٰ سے کفر کرتی ہیں؟ آپ نے فرمایا (یہ کفر بمعنی ناشکری ہے) وہ اپنے خاوند کی ناشکری کرتی ہیں اور احسان کو بھلا دیتی ہیں (ناشکری کرتی ہیں) اگر تم ان میں سے کسی ایک پر سارا زمانہ احسان کرتے رہو پھر وہ تم سے ذرا بھر کوئی چیز دیکھ لے (یعنی معمولی فرق آجائے) تو کہے گی میں نے تو تم سے کوئی اچھائی دیکھی ہی نہیں۔

انذار کا معنی: لغت میں انذار کا معنی "الانذار اعلام مع تخویف" خوف دلاتے ہوئے کسی کو تعلیم دینا بتانا "فکل منذر معلم ولیس کل معلم منذر" ہر منذر معلم ضرور ہوگا لیکن ہر معلم کا منذر ہونا ضروری نہیں۔ یعنی انذار صرف ڈرانا نہیں بلکہ کسی کو تعلیم دیتے ہوئے تبلیغ کرتے ہوئے ڈرانا مراد ہے (از خازن) اسی سے یہ واضح ہو گیا کہ ظالمانہ انداز کی دھمکیاں دینے والے مخوف تو ہو سکتے ہیں لیکن نذیر نہیں ہو سکتے حقیقی طور پر تو انبیاء کرام کی صفت ہے نذیر ہونا لیکن مجازی طور پر انبیاء کرام کے وارث ہونے کے لحاظ پر علماء کرام بھی نذیر ہیں کہ وہ بھی تبلیغ احکام میں رب تعالیٰ کے عذاب کا ذکر کرتے ہیں لیکن خیال رہے دونوں پہلو مدنظر رہیں۔ صرف عذاب کا ذکر کرنا رحمت کا نہ ذکر کرنا اور صرف رحمت کا ذکر کرنا عذاب کا ذکر نہ کرنا انبیاء کرام کی سنت کے خلاف ہے انبیاء کرام بشیر بھی ہیں اور نذیر بھی۔ البتہ یہاں معنی یہ مراد ہے "الانذار التخویف من عقاب اللہ بالزجر عن المعاصی" (مدارک) آپ ان کو گناہوں (کفر) سے روکتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرائیں یا نہ ڈرائیں ان پر کوئی اثر نہیں۔

"لایؤمنون ای لا یصدقون یعنی انهم ینکرون انکار شئی مما علم بالضروة کونه من دین محمد علیه السلام" (از خازن وتبصیر الرحمن)

وہ ایمان نہیں لائیں گے یعنی وہ تصدیق نہیں کریں گے کیونکہ نبی کریم ﷺ کے دین سے بدیہی طور پر سمجھ آنے والے احکام کا انکار کریں گے۔

آیۃ کریمہ کا شان نزول:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حریص تھے کہ تمام لوگ ایمان لے آئیں اور ہدایت پر آپ کی تابعداری کریں تو آپ کو اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ جن کی قسمت میں

ہمیشہ کیلئے کفر پر ہی رہنا ہے ان کو آپ کا ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہے (یہاں سے ہی سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے پھر تاکید کے طور پر لایؤمنون ذکر کیا کہ) وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ (از صابونی)

اعتراض: کفر کی جب یہ تعریف بیان کی گئی ہے کہ نبی کریم علیہ السلام کی شریعت کے بدیہی احکام کی تصدیق کرنا تو کفار کے شعار پر عمل کرنے والے کو کیسے کافر کہا جاتا ہے حالانکہ اسے تصدیق حاصل ہوتی ہے کہا جاتا ہے مثلاً کافروں کی خصوصی شعار والی لمبی ٹوپی پہننا اور جنجو باندھنا کفر ہے تصدیق کے ہوتے ہوئے ان کو کفر کہنا کیسے صحیح ہے۔

جواب: کفار کے شعار کو علامتِ کفر کہا جاتا ہے عین کفر نہیں صرف یہ ہے کہ شریعت مصطفوی کی تصدیق کرنے والا کافروں کے شعار پر عمل کرنے کی جرات نہیں کرسکتا اگر کوئی ایسا کرے گا تو وہ کافر نظر آئے گا بظاہر یہی سمجھ آئے گا کہ یہ کافر ہے کیونکہ اس نے کافروں کی خصوصی علامات کو اپنایا ہوا ہے۔
(از بیضاوی وشیخ زادہ)

اعتراض: جب ازلی کفار کو ڈرانے کا کوئی فائدہ نہیں تو نبی کریم علیہ السلام کو تبلیغ احکام کا حکم کیوں دیا گیا یا اس خبر کے بعد آپ کا تبلیغ کو جاری رکھنے کا کیا مقصد ہے۔

جواب: اس کے دو فائدے ہیں ایک تو یہ کہ کافروں کے منہ بند کرنے مقصود تھے کہ وہ قیامت کے دن یہ نہ کہہ سکیں "لو لا ارسلت الینا رسولا فنتبع آیاتک ونکون من المؤمنین" (اے اللہ) تو نے ہماری طرف رسول کیوں نہیں بھیجے کہ ہم تیری آیات کی تابعداری کرتے اور ہم مومن ہو جاتے۔ اور ساتھ ساتھ رب تعالیٰ کی مہربانی کا اظہار بھی ہو جائے اس لئے کہ رب تعالیٰ نے اپنی مہربانی کو ان الفاظ مبارکہ سے ذکر کیا ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا﴾ ہم اس وقت تک عذاب نہیں دیتے بیشک رسول نہ بھیج دیں۔ رسولوں کو تبلیغ جاری رکھنے کے حکم کا یہی فائدہ ہے کہ ان کو عذاب دینا بلاوجہ نہیں بلکہ رب تعالیٰ نے رسول بھیج دیئے انہوں نے تبلیغ کر دی پھر نہ ایمان لانے والوں کی حجت بازی ختم ہوگئی اب وہ عذاب کے مستحق ہوگئے تو عذاب ان کو دے دیا گیا۔

اسی فائدہ کو رب تعالیٰ نے یوں ذکر فرمایا:

﴿لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ ۢ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾

تاکہ رسولوں کے (آنے اور تبلیغ کرنے) کے بعد لوگوں کو اللہ تعالیٰ پر کوئی حجت باقی نہ رہے۔

یعنی یہ نہ کہہ سکیں کہ ﴿ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ﴾ ہم تو اس سے غافل تھے ہمیں کسی نے بتایا ہوتا تو ہم ایمان لاتے دوسرا فائدہ یہ ہے "ھی حیازتہ علیہ السلام فضل الا بلاغ " کہ نبی کریم ﷺ تبلیغ دین کا ثواب حاصل کرلیں:

" فان الا بلاغ والدعوة الی الحق والی طریق مستقیم اعظم الطاعات التی ینال المرء بھا من ربه اعظم المثوبات "

بیشک تبلیغ، حق کی دعوت، سیدھی راہ کی طرف ہدایت تمام طاعات سے عظیم طاعت ہے انسان کو اس عمل پر اپنے رب تعالیٰ کی طرف سے عظیم ثواب عطا کیا جاتا ہے۔ قرآن پاک کے انداز بیان کو تو دیکھئے ذرا غور کریں سمجھنے کی کوشش کریں یہ عقدہ خود ہی حل ہو جائے گا یہ نکتہ سمجھ آجائے گا "ولذلک سوا علیھم ولم یقل سواء علیک " رب تعالیٰ نے یہ فرمایا ان پر آپ کا ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے یہ نہیں فرمایا کہ ان کو ڈرانا یا نہ ڈرانا آپ پر برابر ہے۔

مطلب واضح ہے کہ ازلی کفار کو تو آپ کے ڈرانے کا یقیناً کوئی فائدہ نہیں ہوگا لیکن آپکو عظیم ثواب حاصل ہوگا آپکے مدارج میں بلندی ہوگی۔ ایک اور آیۃ کو سمجھنے سے یہ مسئلہ اور نکھر کر واضح ہو جائے گا رب تعالیٰ نے بت پرستوں کو ارشاد فرمایا ﴿سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ﴾ تم پر برابر ہے کہ تم ان (بتوں) کو بلاؤ یا خاموش رہو اس آیۃ میں بتوں کے پکارنے والوں کو کہا کہ تمہیں کوئی فائدہ نہیں بلاؤ یا نہ بلاؤ تمہارے لئے نقصان ہی نقصان ہے۔ (از بیضاوی وشیخ زادہ)

اعتراض : جب رب تعالیٰ نے بیان فرما دیا کہ ازلی کافر ایمان نہیں لائیں گے تو ان کے ایمان نہ لانے پر ان کو عذاب کیوں دیا جائے گا۔

خیال رہے کہ یہی اعتراض آج کل کے لوگ جو دین کے باغی ہیں وہ بھی کر رہے ہیں کہ جب رب تعالیٰ کو معلوم ہے کہ ہم نے گناہ کرنا ہی کرنا ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے ہم تو مجبور ہیں۔

جواب : اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل وشعور دیا اور اس کے اعضاء صحیح وسلامت بنائے پھر بندے کو مختار بنایا جب بندہ اپنے اختیار سے ہر کام کرتا ہے تو اسی پر سزا اور جزا خیر کا تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علم نے ان کو مجبور نہیں کیا وہ ایمان لائیں یا کفر کریں نیکی کریں یا گناہ کریں ہر فعل ان کا ان کے اختیار سے ہوتا ہے اس

کی ایک مثال پر ذرا توجہ کریں کہ ایک استاد نے اپنے شاگردوں کو کہا کل جو سبق یاد کر کے نہیں لائے گا اسے سزا ملے گی استاذ کو اپنے شاگردوں کے متعلق کافی حد تک علم اور تجربہ ہوتا ہے اسی علم اور تجربہ کے پیش نظر استاد نے کسی دوست کا بتا دیا کہ فلاں فلاں لڑکے یاد تو کر سکتے ہیں لیکن بے پرواہ ہیں مار کھا لیتے ہیں لیکن سبق یاد نہیں کرتے اس لئے کل انہوں نے مار کھانی ہے۔ اب اس کے بعد ہوا ایسے ہی جیسے استاذ نے بتایا تھا لیکن استاذ نے ان کو سبق یاد نہ کرنے پر مجبور نہیں کیا تھا استاذ کی خبر نے ان کے اختیارات اور صلاحیت کو نہیں چھین لیا تھا۔ اسی طرح رب تعالیٰ کا علم ماضی، حال، مستقبل کا ایک جیسا ہے رب تعالیٰ نے اپنے علم سے اگرچہ بتا دیا ہے کہ فلاں فلاں نے کافر ہونا ہے یا فاسق و گنہگار اور ساتھ یہ بھی بتا دیا ہے کہ ان کو یہ عذاب دیا جاتا ہے لیکن ان کو صلاحیت دی اختیار دیا صحیح وسلامت اعضاء دیئے انہوں نے عذاب میں مبتلا ہونا ہے تو اپنی بے پرواہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے علم نے انہیں کفر وفسق پر مجبور نہیں کیا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا جواب:

ایک شخص نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی محفل میں کھڑے ہو کر کہا اے ابو عبدالرحمٰن قوم زنا بھی کرتی ہے چوری بھی کرتے ہیں اور شراب بھی پیتے ہیں اور کہتے یہ ہیں " **كان ذلك في علم الله فلم نجد منه بدا** " کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہی تھا ہم اس سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ غصہ میں آ گئے اور فرمایا: " **سبحان الله العظيم قد كان في علم الله تعالىٰ انهم يفعلون ذلك فلم يحملهم علمه على فعلهم** "

اللہ تعالیٰ کی ذات پاک اور عظیم ہے اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ تھا کہ یہ ایسا کریں گے لیکن اللہ تعالیٰ کے علم نے ان کو ان افعال پر مجبور تو نہیں کیا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا علم اور کسی چیز کی خبر دینا اور ارادہ کرنا کہ یہ کام پایا جائے گا یا نہیں پایا جائے گا اس سے کسی انسان کی قدرت اور اس کے اختیار کو ضائع نہیں کیا جاتا کہ اس کے اختیار کو باطل کر کے اور اسے مجبور کر کے وہ کام کرایا جائے یا وہ کام جو کرنے تھے ان کو مجبور کر کے نہ کرنے دیئے جائیں۔

شاندار علمی ضابطہ:

" ان الاخبار عن الشئی حکم علیه بمضمون الخبر والحکم تابع لارادة الحاکم اياه وارادته تابعة لعلمه وعلمه تابع للمعلوم والمعلوم هو ذلک الفعل الصادر عن فاعله باختياره ففعله او ترکه باختياره اصل وجميع ذلک تابع له والتابع لايوجب المتبوعَ ايجابا يؤدی الی القسر والالجاء بل التابع علی حسب وقوع المتبوع "

کسی چیز کی خبر دینے پر مضمون خبر کا حکم ثابت ہوتا ہے حکم حاکم کے ارادہ کے تابع ہے اور حاکم کا ارادہ اس کے علم کے تابع ہے اور علم معلوم کے تابع ہے معلوم وہ فعل ہے جو فاعل کے اختیار سے صادر ہوتا ہے اس فعل کے کرنے اور نہ کرنے میں حاکم کو کامل اختیار حاصل ہے یہ سب چیزیں تابع ہیں تابع متبوع پر کسی کام کو واجب نہیں کرسکتا کہ اسے مجبور کردے بلکہ تابع تو متبوع سے کام کے واقع ہونے کے مطابق ہی تابع ہے (یہاں حاکم سے مراد حکم دینے والا)۔

آیئے ذرا اس ضابطہ کو آسان لفظوں میں سمجھئے وزیر اعظم کہیں جانا چاہے اس کا پروگرام طے ہوجائے کہ فلاں دن اس نے جانا ہے اور فلاں دن اس نے واپس آنا ہے اس کے خادموں اور چمچوں سے کسی نے اس کے پروگرام کی خبر دے دی اس کی خبر سے وزیر اعظم کے پروگرام کا تو پتہ چل گیا اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یہ حکم دراصل وزیر اعظم کا اپنا ہے۔ اس نے یہ حکم اپنے ارادہ سے دیا ہے اور اس کا یہ ارادہ اسکے اپنے علم کے مطابق ہے کہ مجھے فلاں وقت جانا چاہیے اور فلاں وقت آنا چاہیے اس کا علم اسی کام کے مطابق ہے جو اس کے پروگرام کے مطابق ہے۔ لیکن خدارا انصاف کیجئے کیا اس خادم کے خبر دینے سے حاکم مجبور ہوا یا اس کا سارا پروگرام اپنے ارادہ سے ہے یقینی بات ہے کہ خبر دینے والے علم رکھنے والے نے وزیر اعظم کو مجبور نہیں کیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے علم اور خبر دینے سے کوئی مجبور نہیں ہوتا ہر شخص کام اپنی مرضی اپنے اختیار سے کرتا ہے۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

خواص وعوام مسئلہ تقدیر میں نہ الجھیں:

" والقدر سر من اسرار اللہ تعالیٰ لم يطلع عليه ملکا مقربا ولا نبيا

مرسلا ولا یجوز الخوض والبحث عنه بطریق العقل"

مسئلہ تقدیر اللہ تعالیٰ کے رازوں میں ایک راز ہے اس کی تفصیل اور اس کی حقیقت سے کسی مقرب فرشتے اور کسی نبی مرسل کو مطلع نہیں کیا گیا لہذا اس مسئلہ میں عقل کے ذریعے غور و خوض اور بحث کسی طرح بھی جائز نہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کیا خوب فرمایا:

ایک شخص نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ آپ مجھے تقدیر کے متعلق بتائیں آپ نے فرمایا "طریق مظلم لا تسلکه" تاریک راستہ ہے اس پر نہ چلو۔ اس شخص نے پھر وہی سوال لوٹایا آپ نے فرمایا "بحر عمیق لا قلجه" گہرا سمندر ہے۔ اس شخص نے پھر وہی سوال کیا آپ نے فرمایا "سر اللہ قد خفی علیک فلا تفتشه" یہ اللہ تعالیٰ کا راز ہے جو تم پر مخفی ہے اس کی تفتیش نہ کرو۔

تقدیر پر ایمان ضروری ہے:

" الایمان بالقدر فرض لازم وهو ان یعتقد ان اللہ تعالیٰ خالق اعمال العباد خیرها وشرها وکتبها فی اللوح المحفوظ قبل ان خلقهم والکل بقضائه وقدره وارادته ومشیئته غیر انه یرضی الایمان والطاعة ووعد علیهما الثواب ولا یرضی الکفر والمعصیة واوعد علیهما العقاب "

"قدر پر ایمان لانا فرض لازم ہے اور وہ یہ کہ عقیدہ رکھے کہ بیشک اللہ تعالیٰ بندوں کے تمام اعمال کا خالق ہے خواہ خیر ہوں یا شر اور ان کو لوح محفوظ میں لکھ دیا مخلوق کی پیدائش سے پہلے سب اللہ تعالیٰ کی قضاء قدر ارادہ اور مشیت میں ہیں سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ ایمان اور طاعت کو پسند فرماتا ہے اور ان پر اس نے ثواب مقرر فرمایا ہے اور وہ کفر و معصیت پر راضی نہیں اور ان پر عذاب کی وعید فرمائی ہے"

(از مرقاۃ ج ۱ ص ۱)

﴿ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴾

۱) ''اللہ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر کردی اور ان کی آنکھوں پر گھٹا ٹوپ ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب''

۲) ''اللہ نے مہر لگا دی ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے''

ختم کا معنی: ختم اور کتم تقریباً ایک معنی میں استعمال ہوتے ہیں اگرچہ ان میں ترادف نہیں اس لئے کہ ختم کا مطلب ہے کسی چیز پر مہر لگا دینا بند کر دینا جس طرح خط وغیرہ پر مہر لگا کر بند کر دیا جائے یا دروازہ پر مہر لگا کر بند کر دیا جائے (سیل کر دیا جائے) چونکہ اس میں بھی معنی چھپانے والا آجاتا ہے لہذا کتم کو اس کے قریب سمجھ لیا گیا اس لئے کہ کتم کا معنی مطلقاً چھپانا ہے اس میں مہر لگانے والا معنی مراد لینا ضروری نہیں۔

(از بیضاوی وشیخ زادہ)

کفار کے دلوں کے رب تعالیٰ نے دس وصف بیان فرمائے:

(۱) **انکار:** ﴿ قُلُوْبُهُمْ مُنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُسْتَكْبِرُوْنَ ﴾ ان کے دل منکر ہیں اور وہ مغرور ہیں

(۲) **حمیة:** ﴿ اِذْ جَعَلَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِیَّةَ ﴾ جب کہ کافروں نے اپنی دلوں میں آڑ رکھی ہے۔

(۳) **انصراف:** ﴿ ثُمَّ انْصَرَفُوْا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ ﴾ پھر وہ پھر گئے اللہ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا بیشک وہ قوم سمجھنے والی نہیں۔

(۴) **قساوة:** ﴿ فَوَیْلٌ لِّلْقٰسِیَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ تو خرابی ہے ان کی جن کے دل یاد خدا کی طرف سے سخت ہو گئے۔

(۵)موت : ﴿ اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنَاهُ ﴾ اور کیا وہ کہ مردہ تھا تو ہم نے اسے زندہ کیا۔

(۶) رین : ﴿ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴾ کوئی نہیں بلکہ ان کے دلوں پر زنگ چڑھا دیا ہے ان کی کمائیوں نے۔

(۷)مرض : ﴿ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ﴾ ان کے دلوں میں مرض ہے۔

(۸)ضیق : ﴿ وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّضِلَّه، يَجْعَلْ صَدْرَه، ضَيِّقًا حَرَجًا ﴾ اور جسے گمراہ کرنا چاہے اس کا سینہ تنگ خوب رکا ہوا کر دیتا ہے۔

(۹)طبع : ﴿ فَطَبَعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴾ ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی تو وہ سمجھتے نہیں۔

(۱۰)ختم : ﴿ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ﴾ ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی۔

ختم کی دو قسمیں: ختم کبھی تو محسوس ہوتی ہے جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ خط پر مہر لگانا یا دروازہ پر مہر لگانا اور کبھی ختم کا اطلاق غیر محسوس درجہ کا ہوتا ہے جیسا کہ دلوں یا کانوں پر مہر لگانا کیونکہ یہاں ظاہری طور پر مہر لگانا مراد نہیں بلکہ دل میں حق بات کا نہ آنا حق خطابات کو نہ سمجھنا اور اللہ تعالیٰ کی آیات میں تفکر نہ کرنا مراد ہے۔ اسی طرح کانوں پر مہر لگانے کا یہ مطلب ہے کہ حق بات کو ان کے کان سن کر قبول نہیں کرتے گویا کہ نہ سننے کے مترادف ہے۔

فائدہ: قلوب کو پہلے ذکر کر کے اشارہ کر دیا گیا کہ قلب تمام اعضاء سے اشرف ہے اس لئے کہ قلب (دل) ہی مقام فکر ہے بلکہ اس کو قلب کہنے کی وجہ ہی یہ ہے کہ ایک چیز کو سوچ کر ادھر پھر گیا اور دوسری چیز کو سوچ کر ادھر پھر گیا۔ ابن ماجہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "مثل القلب مثل ريشة تقلبها الرياح بفلاة" دل کی مثال ایک پر کی طرح ہے جسے ہوائیں جنگل میں الٹ پلٹ کرتی رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ دعاء فرمایا کرتے "اللهم يا مثبت القلوب ثبت قلوبنا على طاعتك" اے اللہ دلوں کو ثابت رکھنے والے اپنی طاعت پر ہمارے دلوں کو ثابت رکھ۔

" فاذا کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقولہ مع عظیم قدرہ وجلال منصبہ فنحن اولی بذلک اقتداء بہ "

نبی کریم ﷺ عظیم قدر و منزلت رکھنے والے اعلیٰ منصب کے مالک جب یہ دعا کرتے تھے تو ہم زیادہ حق رکھتے ہیں کہ ہم بھی یہ دعا کریں کیونکہ نبی کریم ﷺ کی اقتداء میں ہی کمال ہے۔

سمع و بصر میں افضل کون؟ بعض حضرات نے بیان فرمایا کہ یہاں آیۃ کریمہ میں سمع کا ذکر پہلے ہے اور بصر کا بعد میں اس لئے سمع افضل ہے بصر سے۔ اس کی وجہ بھی واضح طور پر سمجھ آتی ہے کہ چھ جہتوں (دائیں، بائیں، آگے، پیچھے، اوپر، نیچے) سے آنے والی آواز کو سنا جاسکتا ہے لیکن دیکھنے کا تعلق صرف سامنے سے ہے۔ اور وجہ یہ بھی ہے کہ اندھیرے میں انسان سن سکتا ہے لیکن دیکھ نہیں سکتا۔ لیکن اکثر متکلمین حضرات نے بصر کو سمع پر افضل کہا ہے کیونکہ سمع کا تعلق صرف کلام اور آواز سے ہے اور بصر سے جسموں رنگوں اور شکلوں کا ادراک ہوتا ہے۔

راقم کے نزدیک آسان صورت یہ ہے کہ بعض لحاظ سے سمع افضل ہے اور بعض لحاظ سے بصر افضل ہے۔ بہر حال اس قسم کی بحثوں سے قرآن پاک کی عظمت ہی سمجھ میں آتی ہے کہ ایک ایک لفظ میں اہل علم نے کیا خوب تفکر کیا ہے۔ (از قرطبی)

غشاوۃ کا معنی: غشاوۃ اس چیز کو کہا جاتا ہے جو کسی چیز کو ڈھانپ دے مراد اس سے پردہ ہے۔

عربی کا شاندار ضابطہ: جب فعالۃ (فا کے نیچے کسرہ زیر) کا وزن ہو تو اس میں معنی یہ ہوتا ہے کہ یہ چیز کسی پر مشتمل ہے جیسا کہ غشاوۃ، آنکھ پر مشتمل ہونے والا پردہ، عصابۃ، لپیٹنے والی پٹی جو کسی عضو پر مشتمل ہوتی ہے۔ اور عمامہ، پگڑی جو سر پر مشتمل ہوتی ہے۔ جب فعالہ (فا پر ضمہ پیش) کا وزن ہو تو اس میں معنی یہ ہوگا کہ کسی چیز کسی سے گرنا جیسا کہ مشاطہ، کنگھی کرتے ہوئے گرنے والے بالوں کو کہا جاتا ہے برایہ لکڑی تراشتے ہوئے گرنے والا بورا اور قلم تراشتے ہوئے گرنے والے چھلکے۔ (شیخ زادہ)

دینی مدارس کے طلباء کے لئے: سمع کو واحد ذکر کیا گیا اور ابصار کو جمع اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ سمع مصدر ہے اور مصدر تثنیہ جمع نہیں ہوتا۔ اگر چہ بظاہر بصر بھی مصدر نظر آتا ہے اسے بھی جمع

نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن اس پر اسمیت غالب آ گئی وہ آنکھ کا نام بن جانے کی وجہ سے جمع ذکر کیا گیا ہے ۔سمع اور قلب چونکہ جمیع جوانب سے ادراک کی صلاحیت رکھتے ہیں اس لئے ان کے لئے ختم (مہر) کا ذکر کیا جو جمیع جوانب کو بند کر دیتی ہے لیکن بصر کا تعلق سامنے سے ہے اس لئے اس کے لئے پردہ کا ذکر کیا جو سامنے سے بند کر دیتا ہے۔

اور یہ بھی واضح ہے کہ دل اور کان پر پردہ ان کے ادراک یعنی دل کو سمجھنے اور کان کو سننے سے بند نہیں کر سکتا اس لئے ان کے مناسب مہر ہی ہے اور آنکھ کو پردہ دیکھنے سے روک دیتا ہے اس لئے بصر کے لئے غشاوۃ کا ذکر ہی مناسب ہے (از حاشیہ جلالین) یہ تو انسانی علم اور ادراک کی باتیں ہیں ورنہ رب تعالیٰ کے کلام میں کلام ہی کیا جس لفظ کو رب تعالیٰ نے جہاں ذکر کیا ہے وہ اس کا محل ہے دوسرا لفظ وہاں استعمال ہی کیسے ہو؟

اعتراض: جب رب تعالیٰ نے ہی انسانوں کے دلوں اور کانوں پر مہر لگادی اور ان کی آنکھوں پر پردہ کر دیا تو انسانوں کا ایمان نہ لانا نیکیاں نہ کرنا ضروری ہو گیا اس لئے اس میں انسان کا تو کوئی قصور نہیں پھر عذاب دینے کا کیا مقصد ہے۔

جواب: انسان خود اپنے اختیارات کو غلط استعمال کر کے ایمان سے دور رہ کر گناہوں میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو مہر اور پردے اور عذاب کا مستحق بنالیتا ہے رب تعالیٰ کی طرف نسبت اس وجہ سے کی گئی ہے کہ وہ تمام چیزوں کا خالق یعنی ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگائے جانے اور آنکھوں پر پردہ چھا جانے کی وجہ اصل میں ان کا کسب ہے البتہ ہر چیز کا خالق چونکہ رب تعالیٰ ہے لہذا بحیثیت خلق کے رب تعالیٰ کی طرف منسوب ہیں۔آیئے اس پر احادیث مبارکہ کو دیکھیں:

" قال رسول الله ﷺ ان الرجل لیصدق فتنکت فی قلبه نکتة بیضاء وان الرجل لیکذب الکذبة فیسود قلبه "

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک ایک شخص سچ بولتا ہے تو اس کے دل میں ایک سفید نکتہ پیدا ہو جاتا ہے اور بیشک انسان جب جھوٹ بولتا ہے تو اس کے دل میں سیاہ نکتہ پیدا ہو جاتا ہے۔''

ترمذی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح حدیث نقل کی ہے:

" ان الرجل لیصیب الذنب فیسود قلبه فان هو تاب صبقل قلبه قال هو الرین الذی ذکره الله فی القرآن فی قوله ﴿ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴾"

" بیشک انسان جب گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کا دل سیاہ ہوجاتا ہے اگر وہ توبہ کرے تو اس کا دل صاف ہوجاتا ہے وہ سیاہ نکتہ دراصل زنگ ہے جسے رین کہا جاتا ہے قرآن میں اسی کا ذکر کیا گیا ہے کہ ان کے دل اپنے کسب کی وجہ سے زنگ آلود ہیں"

(از قرطبی)

" قَالَ قَتَادَةَ فِيْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ اِذَا اَطَاعُوْهُ فَخَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ هُدًى وَّلَا يَسْمَعُوْنَ وَلَا يَفْقَهُوْنَ وَلَا يَعْقِلُوْنَ "

اسی آیۃ کی تفسیر میں حضرت قتادہ نے بیان کیا کہ جب ان (کفار) پر شیطان غالب آجاتا ہے وہ اس کی اطاعت کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دیتا ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ کر دیتا ہے تو وہ ہدایت کی راہ کو دیکھ نہیں سکتے اور حق بات سن نہیں سکتے اور حق بات کو سمجھنے اور عقل رکھنے کی ان میں صلاحیت نہیں رہتی ۔ اس قول سے بھی واضح ہوا کہ شیطان کے جال میں پھنس کر وہ اپنے آپ کو اس قابل کر لیتے ہیں کہ انکے دیکھنے، سننے، سمجھنے کی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے۔

ابن جریج نے کہا کہ مجاہد نے بیان کیا ہے کہ وہ لوگ جب کفر کرتے ہیں اور گناہ کرتے ہیں تو وہ گناہ انکے دلوں پر چھا جاتے ہیں گناہوں کا دلوں پر چھا جانا اور ان میں سمجھنے کی صلاحیت کا ختم ہوجانا ہی طبع اور ختم ہے۔ عبداللہ ابن کثیر کہتے ہیں کہ انہوں نے مجاہد کو کہتے سنا ران (زنگ) آسان ہے "طبع" سے اور "طبع " آسان ہے قفل (تالے) سے یہی کیفیت وہ ہے جسے ختم کہا گیا ہے۔

مجاہد نے اپنے ہاتھ سے اس طرح سمجھایا کہ پہلے چھوٹی انگلی بند کی پھر دوسری پھر تیسری پھر چوتھی پھر پانچویں کہ اسی طرح ایک گناہ دل پر چھا جاتا ہے پھر دوسرا تیسرا وغیرہ یہاں تک کہ وہ دل بالکل بند ہوجاتا ہے سمجھنے کی طاقت اس میں ختم ہوجاتی ہے۔

(از ابن کثیر)

ابھی تک جو مسئلہ بیان کیا گیا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا اپنا ارشاد گرامی بہت زیادہ واضح طور پر

دلالت کر رہا ہے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ ﴾ ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کی وجہ سے مہر لگادی ہے۔

"وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ": ان کے لئے بڑا عذاب ہے یعنی کافروں کو رب تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑا عذاب دیا جائے گا "عذاب" کا لغوی معنی ہے روکنا کہا جاتا ہے "اعذبه عن كذا" اسے اس طرح کے کاموں سے روکو "غدوبة الماء" میٹھے پانی کو "عذوب" کہا جاتا ہے کیونکہ اسے بھی پینے کے لئے برتنوں میں روک کر رکھا جاتا ہے یا یہ کہ وہ پیاس کو روکتا ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد بھی اسی معنی پر دلالت کر رہا ہے "اعذبوا نساء کم عن الخروج" اپنی عورتوں کو باہر نکلنے سے روکو اس طرح کہا جاتا ہے "لا لجمنک لجا ما معذبا" میں تمہیں روکنے والا لگام ڈالوں گا۔ اصطلاح میں عذاب کا معنی ہے "ما يؤلم الانسان" جو انسان کو درد پہنچائے جیسا کہ کوڑے سے مارنا آگ سے جلانا اور لوہے سے کاٹنا۔ اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے حد کو بھی عذاب کہا ہے کیونکہ اس میں بھی انسان کو درد پہنچانا اور گناہوں سے روکنا مقصود ہوتا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے "ويشهد عذابهما طائفة من المؤمنين" ان دونوں (زانی مرد اور عورت) کے عذاب کے وقت مومنوں کا ایک گروہ حاضر رہے۔ یہاں حد کو عذاب کہا گیا ہے یعنی جب ان پر حد جاری ہو دوسرے مومن لوگ حاضر رہیں تا کہ عبرت پکڑیں۔ (از قرطبی)

"عظیم" حقیر کی ضد ہے اور کبیر، صغیر کی ضد ہے جس طرح حقیر، صغیر سے کم کو کہا جاتا ہے اسی طرح عظیم کبیر سے فوق (اوپر) چیز کو کہا جاتا ہے۔ یعنی کافروں کو اتنا بڑا عذاب ہوگا جس کی حقیقت کو کوئی نہیں پا سکتا اگر چہ عظیم کا لفظ بھی عظمت پر دلالت کر رہا تھا لیکن اس پر تنوین بھی تعظیم کے لئے ہے لہذا معنی ہوگا بہت بڑا عذاب ان کو ہوگا۔

خیال رہے کہ "غشاوة" پر تنوین بھی تعظیم کی ہے کہ ان کی آنکھوں پر ایسا پردہ ہوگا جس کی حقیقت کو رب تعالیٰ ہی جانتا ہے انسان اس کی حقیقت کو جاننے سے قاصر ہے۔ یہاں علامہ بیضاوی اور علامہ رازی رحمہما اللہ نے دقیق اور طویل بحثیں کی ہیں اگر چہ ان کا ذکر کرنا بیضاوی پڑھنے والے طلباء کے لئے مفید بھی تھا لیکن ان سے صرف نظر کر رہا ہوں تا کہ بہت طوالت بھی نہ ہو۔

قلب کے متعلق شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

قلب لغت میں وہ گوشت صنوبری (الٹالٹکا ہو) ہے جو سینہ کے بائیں جانب ہے روح حیوانی اسی گوشت میں پیدا ہوتی ہے اور وہی روح حیوان کے لئے حس وحرکت کا منشا ہے اہل شرح کی اصطلاح قلب لطیفہ انسانی کو کہا جاتا ہے اسی سے انسان کو انسانیت حاصل ہے اور وہی اوامر ونواہی کو تسلیم کرنے کا سبب ہے قرآن پاک میں اسی معنی کو ان الفاظ مبارکہ سے بیان کیا گیا ﴿ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ ﴾ بیشک اس میں نصیحت ہے اس کے لئے جس کا دل ہے یعنی جسے سمجھنے کی صلاحیت سے نوازا گیا ہے کبھی قلب بمعنی نفس بھی آتا ہے اور کبھی قلب بمعنی روح بھی آتا ہے۔ (از عزیزی)

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴾

(۱) ''اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور وہ ایمان والے نہیں''

(۲) ''اور بعض لوگ کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخرت کے دن پر حالانکہ وہ ایمان والے نہیں''

پہلے مؤمنین کا ذکر کیا ان کی صفات کا ذکر کیا اور ان کا ہدایت پر ہونا اور ان کے کامیاب ہونے کا تذکرہ کیا پھر کھلے کفار کا ذکر کیا جو ظاہراً اور باطناً کافر تھے ان کا ذکر صرف دو آیتوں میں کر دیا اس لئے کے جس کے متعلق ظاہری طور پر معلوم ہو کہ یہ دشمن ہے اس سے انسان بچ کر رہتا ہے اور یہاں سے منافقین کا ذکر شروع ہو رہا ہے ان کا تیرہ آیات میں ذکر کیا ہے کیونکہ وہ اپنے آپ کو مومنین کے سامنے مومن ہونا ظاہر کرتے تھے حالانکہ وہ مومن تو نہیں تھے بلکہ کافر تھے ان سے مؤمنین کو زیادہ نقصان اٹھانا پڑا اس لئے کہ صحابہ کرام ان کو اپنا سمجھ کر ہر قسم کی بات کر لیتے تھے وہ کافروں کو بتا دیتے تھے رب تعالیٰ نے بھی اسی وجہ سے ان کے کردار کو کھول کر بیان کیا اور ان کی مذمت کی اور سب سے زیادہ سخت عذاب بھی منافقوں کو ہی ہونا ہے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اِنَّ الْمُنَافِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ﴾ بے شک منافقین آگ کے سب سے نیچے درجے میں ہوں گے۔

شانِ نزول: جب نبی کریم ﷺ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ میں تشریف لائے اس وقت وہاں انصار کے قبیلے اوس اور خزرج تھے زمانہ جاہلیت میں یہ لوگ مشرکین عرب کی طرح بت پرست تھے اور مدینہ طیبہ میں اہل کتاب سے یہود بھی تھے یہ اپنے آباؤ اجداد کے دین پر ہی قائم تھے ان کے تین قبیلے تھے ایک بنو قینقاع جو خزرج کے حلیف تھے دوسرا قبیلہ بنو نضیر، تیسرا قبیلہ بنو قریظہ یہ دونوں اوس کے حلیف تھے۔ جب نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ میں آئے تو اوس اور خزرج قبیلے کے زیادہ لوگ اسلام لے آئے یہی انصار کہلائے۔ یہود میں سے بہت کم تعداد میں لوگ اسلام لائے ان میں سے اسلام لانے والے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے کچھ ساتھی تھے۔ ابھی تک کوئی منافق نہیں تھا کیونکہ ابھی مسلمانوں کو زیادہ دبدبہ حاصل نہیں تھا نبی کریم ﷺ نے بھی یہود اور مدینہ طیبہ کے اطراف میں رہنے والے لوگوں سے زیادہ طور پر پہلوتہی ہی کی۔ جب بدر کا واقعہ درپیش آیا تو دین اسلام کا غلبہ ہوا اور خصوصی اعزاز حاصل ہوا مسلمانوں کا رعب قبائل کے دلوں پر چھا گیا اور مسلمانوں کو خاص طور پر دبدبہ حاصل ہو گیا بدر کے واقعہ کے بعد منافقت کا دور شروع ہوتا ہے اس کا پس منظر یہ تھا۔

عبداللہ ابن ابی ابن سلول خزرج قبیلہ سے تھا، جو مدینہ طیبہ میں سردار تھا۔ اوس اور خزرج اختلاف رکھنے کے باوجود، دونوں قبیلے ہی اسے اپنا سردار مانتے تھے، انہوں نے اسے مستقل طور پر اپنا بادشاہ بنانے اور اس کی تاج پوشی کی تیاری کر لی تھی۔

جب ان کو نبی کریم ﷺ کی نبوت کی خبر ملی، کچھ لوگ ہجرت سے پہلے ہی عقبہ اولی اور ثانیہ پر ایمان لا چکے تھے، اور آپ کی ہجرت کے بعد تو دونوں قبائل سے کثیر تعداد میں لوگ ایمان لائے۔

عبداللہ بن ابی کی بادشاہت کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا، اس کا اسے رنج تھا، ادھر بدر کا واقعہ درپیش آ گیا، مسلمانوں کی شوکت و دبدبہ کو دیکھ کر، عبداللہ ابن ابی اور اسی کے قبیلہ کے چند لوگ، اور یہود میں سے کچھ، اور اطراف مدینہ سے کچھ لوگوں نے منافقت کی راہ اختیار کر لی، کہ بظاہر مسلمان بن کر مسلمانوں کے ساتھی بن کر ان کو نقصان پہنچاؤ۔

ان لوگوں کی چالبازیوں کو بیان کرنے کے لئے یہ آیۃ کریمہ اور اس کے بعد والی نازل ہوئیں۔

خیال رہے مہاجرین میں سے کوئی بھی منافق نہیں تھا، اس لئے کہ انہوں نے اپنا وطن، گھر، اہل و عیال اور اقرباء کی صرف ایمان اور محبت رسول اللہ ﷺ کے لئے چھوڑا تھا، وہ خالص مومنین

تھے۔ان میں نفاق کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

(از ابن کثیر)

منافقت کو سمجھنے کے لئے تحقیقی بحث: دل کے احوال چار ہیں:

(۱) دلیل سے جو حاصل ہوا اعتقاد بھی اس کے مطابق ہوا سے علم کہا جاتا ہے۔

(۲) اعتقاد اس کے مطابق ہو جو دلیل سے تو نہیں حاصل لیکن مجتہد سے حاصل ہو یہ ہے اعتقاد مقلد۔

(۳) اعتقاد واقعہ کے مطابق نہ ہو یہ ہے جہل۔ (۴) دل ان تمام سے خالی ہو۔

پھر زبان کے احوال تین ہیں۔ (۱) اقرار۔ (۲) انکار۔ (۳) سکوت۔

یہ تمام بارہ قسمیں بن گئیں کیونکہ جب عرفان قلبی حاصل ہو یعنی دلیل سے حاصل ہو اور اعتقاد اس کے مطابق ہو تو اس کے ساتھ یا اقرار ہو گا یا انکار، یا سکوت۔

(۱) عرفان قلبی کے ساتھ جب اقرار پایا جائے تو یہ اقرار اگر اختیاری ہو تو وہ شخص سچا مومن ہو گا اس میں سب کا اتفاق ہے اور اگر اقرار اضطراری ہو کہ خوف نہ ہوا تو اقرار کرلیں گے ورنہ انکار کرلیں گے یہ ہے منافقت اسلئے کہ وہ دل سے حقانیت کو پہچانتا بھی ہے لیکن پھر تکذیب بھی کرتا ہے۔

(۲) عرفان قلبی کے ساتھ انکار ہو لیکن وہ انکار اضطراری ہو تو وہ شخص مومن ہو گا کیونکہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِیْمَانِ ﴾ یعنی جس سے جبراً کفریہ کلمہ کہلایا گیا اور دل اسکا ایمان پر مطمئن ہو تو وہ کفر اور اللہ تعالیٰ کے غضب اور عذاب عظیم سے مستثنیٰ ہے۔ اگر انکار اختیاری ہوا تو وہ پکا کافر ہے کیونکہ اختیاری طور پر ایمان سے انکار میں سوائے کفر کے اور کوئی صورت نہیں۔

(۳) عرفان قلبی ہو اور سکوت ہو یعنی نہ اقرار ہو اور نہ انکار پھر اگر یہ سکوت اضطراری ہے کہ اسے اقرار کرنے میں خوف ہے اس کا خیال ہے کہ جبھی خوف زائل ہو گا میں اقرار کرلوں گا یہ مؤمن ہے یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ ایک شخص نے دلیل سے اللہ تعالیٰ کو پہچانا اور دل سے تسلیم کرلیا لیکن زبان سے اقرار کی مہلت ہی نہ ملی وفات طاری ہوگئی تو وہ مومن ہے۔ اگر یہ سکوت اختیاری ہے تو یہ محل بحث ہے لیکن زیادہ بہتر قول امام غزالی رحمہ اللہ کا ہے کہ وہ مومن ہے اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے "یخرج من النار من کان فی قلبه مثقال ذرة من الایمان" جس آدمی کے دل میں ایک ذرہ بھر بھی

ایمان ہوا اللہ تعالیٰ اسے آگ سے نکال دے گا۔ اس شخص کا دل بھی نور ایمان سے بھرا ہوا ہے کیسے آگ سے نہیں نکلے گا۔

(۴) اعتقاد تقلیدی ہو اور اس کے ساتھ انکار ہو لیکن وہ انکار اختیاری ہو تو وہ شخص کافر ہے یعنی اس کا کفر یقینی ہے۔ اگر وہ انکار اضطراری ہو یعنی اسے اقرار میں خوف ہو تو اس شخص کو بھی مومن سمجھا جائے گا کیونکہ اس کے دل میں ایمان ہے۔

(۵) اعتقاد تقلیدی اور اسکے ساتھ اقرار ہو اور اقرار اختیاری ہو تو یہ مسئلہ اہل علم میں متنازع ہے تاہم صحیح یہ ہے کہ وہ مؤمن تو ہو گا لیکن اپنا اعتقاد بھی ضروری ہے فقط تقلید نہ ہو کیونکہ تقلید فروعی مسائل میں ہے اعتقادیات میں نہیں اگر اقرار اضطراری ہو تو یہ منافقت ہوگی۔

(۶) اعتقاد تقلیدی ہو اور سکوت اختیاری ہو اور ساتھ ساتھ اپنا اعتقاد بھی مل گیا تو وہ شخص مؤمن ہے جیسا کہ علامہ غزالی رحمہ اللہ کا قول پہلے بیان ہوا ہے اور اگر سکوت اضطراری ہوا تو وہ بھی مومن ہے کیونکہ اضطراری حالت ویسے ہی عذر ہے

(۷) انکار قلبی ہو اس کے ساتھ اقرار ہو زبان سے خواہ وہ اقرار اختیاری ہو یا اضطراری ہو یہ منافقت ہی ہے۔

(۸) انکار قلبی کے ساتھ زبانی انکار بھی پایا جائے تو وہ ہر حال میں کافر ہی ہے انکار کی کوئی صورت بھی ہو۔

(۹) انکار قلبی کے ساتھ سکوت پایا جائے وہ کافر ہے منافق نہیں کیونکہ منافق وہ ہوتا ہے جو اظہار بھی کرتا ہے۔

(۱۰) تمام اعتقادات سے اس کا دل خالی ہے زبان سے وہ ایمان کا اقرار کرتا ہو تو اسے کافر نہیں کہا جائے گا کیونکہ ایک تو اس کے ظاہر حال کا اعتبار ہوگا اور دوسرا ہو سکتا ہے وہ غور و فکر کر رہا ہو۔

(۱۱) قلب خالی ہوا انکار ہو تو اس پر حکم کفر ثابت ہو گا کیونکہ ظاہراً اس کا انکار پایا گیا ہے۔

(۱۲) قلب خالی ہو اور سکوت ہو تو اس کو بھی کافر ہی سمجھا جائے گا جب تک قلب میں اعتقاد نہیں آتا تو حقیقی ایمان نہیں اور جب تک زبان سے اقرار نہیں تو ظاہری ایمان نہیں۔ (ازنہ)

منافقت کی تین قسمیں:

(۱) خالص منافقت، یعنی منافقت میں اعلیٰ اور اکمل ہونا کہ ایمان کو ظاہر کرے اور باطن میں صاف منکر ہو یعنی دل میں کفر ہو اور زبان پر ایمان ہو اس آیۃ کریمہ میں اسی منافقت کا ذکر ہے۔

(۲) ظاہر اور باطن میں متذبذب اور متردد ہو یعنی نہ ایمان پر یقین ہو اور نہ ہی کفر پر اعتبار ہو اسی حالت کو رب تعالیٰ نے بیان فرمایا ﴿ مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ط ﴾ وہ اس کے درمیان متذبذب ہیں نہ ادھر کے ہیں نہ ادھر کے۔

(۳) اگرچہ وہ دل میں تصدیق تو رکھتے ہیں لیکن کثیر گناہوں اور دنیا کی بہت زیادہ محبت اور بے ایمان لوگوں کے برے اخلاق کے پائے جانے کی وجہ سے ان کا ایمان نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔

ایمان کا اصل مقصد یہ ہے کہ مؤمنین کو بلند ہمت حاصل ہو دنیا سے محبت کم ہو لذات نفسانیہ کو چھوڑ دے اور اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے اس کا ہر کام ہو قیامت کی فکر کرے اور ایسے عمل کرے کہ قیامت کے دن اسے بلند مرتبہ حاصل ہو جائے۔ لیکن جب کوئی شخص دنیا کو آخرت پر ترجیح دے آخرت کے عذاب کی اسے کوئی فکر نہ ہو دنیا کی تکالیف سے ہی بچنے کی کوشش میں رہے خواہ ان کے لئے ناجائز ذرائع استعمال کرنے پڑیں ایسے لوگ کوتاہ ہمت ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ لوگ ہوتے تو مومن ہیں لیکن ان میں علامات منافقت پائی جاتی ہیں۔

(از عزیزی)

علاماتِ نفاق حدیث مبارکہ سے:

" عن عبد الله بن عمرو قال قال رسول الله ﷺ اربع من كن فيه كان منافقا خالصا ومن كانت فيه خلة منهن كانت فيه خلة من نفاق حتى يدعها اذا حدث كذب واذا عاهد غدر واذا وعد اخلف واذا خاصم فجر "

" حضرت عبد اللہ بن عمرو کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص میں چار چیزیں پائی گئیں اسے منافقوں سے بہت زیادہ مشابہت حاصل ہوگی اور جس میں ان چار خصلتوں سے ایک خصلت بھی پائی گئی وہ منافقت کی خصلت ہوگی یہاں تک کہ ان کو چھوڑ دے (وہ چار یہ ہیں) جب بات کرے جھوٹ بولے جب معاہدہ کرے تو دھوکہ کرے اور جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور جب جھگڑا کرے تو گالی

نکالے'' (مسلم ج ا ص ۷۶ کتاب الایمان باب خصال المنافق)

وضاحت حدیث:

'' وقد اجمع العلماء علی من کان مصدقا بقلبه ولسانه وفعل هذه الخصال لایحکم علیه بکفر ولایکون هو منافق یخلد فی النار''

''علماء کا اس پر اجماع ہے کہ جس شخص کے دل میں تصدیق پائے جائے زبان سے بھی اقرار پایا جائے اور اس میں یہ چار کی چار عادات پائی جائیں وہ کافر نہیں اسے منافق نہیں کہا جاتا کہ وہ آگ میں ہمیشہ رہے''

پھر نبی کریم ﷺ کے ارشاد '' اربع من کن فیه کان منافقا خالصا '' کا کیا مطلب ہے حالانکہ اس کا ظاہری معنی تو یہی ہے کہ جس میں یہ چار خصلتیں پائی جائیں وہ خالص منافق ہے ''معناہ شدید الشبه بالمنافقین بسبب هذه الخصال '' اس کا مطلب یہ ہے کہ جس میں یہ چار خصلتیں پائی جائیں اسے منافقوں سے بہت زیادہ مشابہت حاصل ہوتی ہے (راقم نے یہی ترجمہ کیا ہے)۔

بعض علماء نے ایک اور شاندار جواب بھی دیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ کی یہ بات ہے کیونکہ اس وقت یہ چار خصلتیں صرف منافقوں میں پائی جاتی تھیں مومنوں میں چار کا اجتماع کبھی نہیں ہوا البتہ بعد میں مسلمانوں میں بھی چار جمع ہونی شروع ہوگئیں اس لئے بعد والے مسلمانوں کے لحاظ پر وہی جواب ہوگا جو پہلے بیان کیا ہے '' اذا عاهد غدر '' معاہدہ عام ہے امانت رکھنا بھی معاہدہ میں آتا ہے جنگ کے معاہدہ میں دھوکہ کرنا بھی اسی ضمن میں آتا ہے '' اذا خاصم فجر ''فجور کا اصلی معنی میانہ روی سے پھر جانا یہاں مراد حق سے پھر جانا باطل اور جھوٹ کہنا تقریباً مراد یہ ہے کہ جب جھگڑا کرے تو بیہودہ لغو کلام کرے گالی گلوچ سے کام لے۔ (از نووی)

آیۃ کریمہ میں دو باطل فرقوں کا واضح رد:

جو شخص اللہ تعالیٰ کو نہ پہچانے یعنی دل سے تصدیق نہ کرے اور اقرار کرے وہ مومن نہیں ہوسکتا اس پر ﴿وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ﴾ کی واضح دلالت پائی گئی ہے۔ اس سے کرامیہ فرقہ کا رد ہوگیا کیونکہ وہ اس قسم کے لوگوں کو مومن مانتے ہیں جو قرآن پاک کے سراسر مخالف ہے۔ ایک اور باطل فرقہ کا نظریہ یہ

ہے کہ ہر مکلف اللہ تعالیٰ کو پہچاننے والا ہوتا ہے۔اس لئے کہ انہوں نے جب اقرار کیا ہے تو ضروری ہے کہ ان کا اقرار ایمان ہو یہ نظریہ بھی باطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب فرمایا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخرت کے دن پر۔تو یہ واضح ہے کہ انہوں نے اقرار تو کیا ہے لیکن پھر رب تعالیٰ نے فرمایا''وہ مومن نہیں''اس سے واضح ہو گیا کہ یہ کہنا باطل ہے کہ ہر مکلف اور اقرار کرنے والا ضرور مومن ہوتا ہے۔

منافق میں قباحتیں ہیں جو کافروں میں نہیں:

(۱) منافق دھوکہ بازی کا ارادہ رکھتا ہے لیکن کافر میں دھوکہ بازی نہیں۔

(۲) کافر میں مردوں والی عادت ہوتی ہے کہ وہ کھلی دشمنی کرتا ہے اور منافق میں خنثی والی عادات ہوتی ہیں کہ وہ اوپر سے اور ہوتا ہے اور اندر سے اور۔

(۳) کافر کو جھوٹ بولنے سے شرم آتی ہے وہ جھوٹ نہیں بولتا بلکہ سچی بات کرتا ہے منافق کو جھوٹ بولنے سے شرم نہیں آتی بلکہ وہ جھوٹ بولنے کو پسند کرتا ہے۔

(۴) منافق کافر بھی ہوتا ہے اور مسلمانوں سے استھزاء (مزاح کرنا) بھی کرتا ہے لیکن خالص کافر دشمنی تو مسلمانوں سے کرتا ہے لیکن استھزاء جیسا بیہودہ فعل نہیں کرتا اسی وجہ سے منافق کی سزا بھی رب تعالیٰ نے سخت مقرر کی ہے اور فرمایا ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ بیشک منافقین آگ کے سب سے نیچے درجہ میں ہوں گے۔

(۵) کافروں کا ذکر صرف دو آیتوں میں کیا گیا لیکن منافقین کا ذکر تیرہ آیات میں کیا گیا واضح ہوا کہ وہ زیادہ مذمت کے قابل تھے کیونکہ ان کے جرائم زیادہ تھے۔ (از کبیر)

ایمان میں صرف دو چیزوں کا ذکر کیوں؟

صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے اور آخرت پر ایمان لانے کا ذکر کیا ہے کہ مقصود اعظم ایمان میں یہی چیزیں ہیں کیونکہ ایمان کی ابتداء اور انتہاء کا جب ذکر کر دیا گیا تو دوسری چیزیں خود بخود اس میں آ گئی ہیں ضمناً ایک اور بات یہ سمجھ آ گئی کہ جب یہ منافقین اپنے آپ کو مومن اور سچا سمجھتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے پھر بھی ان کو جھوٹا کہا ہے کہ وہ منافق ہیں تو یقیناً وہ لوگ جو اپنے آپ کو جھوٹا سمجھ کر

مسلمانوں سے استہزاء کریں گے اور منافقت سے کام لیں گے وہ ان سے بھی برے ہوں گے۔ (از بیضاوی)

نکتہ: انہوں نے کہا " آمنا " عقل کا تقاضا یہ تھا کہ کہا جاتا " وما آمنوا " (انہوں نے ایمان نہیں لایا) تا کہ دونوں جملوں میں ماضی کا ذکر ہوتا لیکن یہ کہا گیا ہے کہ ﴿ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴾ کیونکہ اس میں ان کا دعوی کامل طور پر رد کر دیا گیا ہے کہ وہ مومنوں کی گنتی سے ہی باہر ہیں صرف ماضی میں ان کے ایمان کی نفی میں اتنا مبالغہ نہیں جتنا " وما هم بمؤمنين " میں ہے۔ (از بیضاوی)

لفظی بحث: " من " تبعیضیہ ہے جس کا معنی " بعض " یا " کچھ "

الناس: (۱) یا مشتق ہے " ناس ،ینوس " سے جس کا معنی ہے حرکت کرنا اسی معنی میں حدیث ام زرع استعمال ہے " اناس من حلی اذنی (اذ نای " زیور سے میرے کانوں نے حرکت کی۔ اس معنی کے لحاظ پر انسان کو انسان کہنے کی یہ وجہ ہے کہ وہ حرکت کرتا ہے۔

(۲) بعض نے کہا یہ مشتق ہے " نسی " سے ناس اصل میں " نسی " ہے پھر اس میں قلب یا " نیس " ہو گیا یا متحرک ماقبل فتحہ الف سے بدل دیا گیا " ناس " ہو گیا پھر الف لام اس پر داخل کیا تو " الناس " ہو گیا قال ابن عباس " نسی آدم عهد الله فسمی انسان " حضرت آدم علیہ السلام بھول گئے اس لئے آپ کا نام انسان ہو گیا نبی کریم ﷺ نے فرمایا " نسی آدم فنسيت ذريته " آدم علیہ السلام بھولے اسی وجہ سے ان کی اولاد بھی بھولتی ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ وَلَقَدْ عَهِدْنَا اِلٰی آدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ ﴾ تحقیق ہم نے آدم علیہ السلام سے وعدہ لیا اس سے پہلے تو وہ بھول گئے۔ کسی شاعر نے کہا " سميت انسان لانک ناسی " تیرا نام انسان رکھا گیا کیونکہ تو بھولنے والا ہے۔ ابوالفتح نے کہا:

نسيت عهدک و النسيان مغتفر	فاغفر فاول ناس اول الناس
میں تمہارا وعدہ بھول گیا بھول معاف کردی جاتی ہے	معاف کردو سب سے پہلے انسان ہی سب سے پہلے بھولے
يا اكثر الناس احسانا الى الناس	و اكثر الناس افضالا على الناس
سب لوگوں سے زیادہ لوگوں پر احسان کرنے والے	اکثر لوگوں کی مہربانیاں بھولنے والوں پر ہوتی ہیں

(۳) بعض نے کہا انسان کو انسان اس لئے کہا جاتا ہے کہ " لانسه بحوا " حضرت آدم علیہ السلام نے سب سے پہلے حضرت حوا سے انس پکڑا۔ بعض نے کہا " لانسه بربه " اپنے رب تعالیٰ

سے محبت کرنے کی وجہ سے انسان کو انسان کہا گیا ہے۔ کسی شاعر نے کہا:

و ما سمي الانسان الا لانسه	ولا القلب الا انه يتقلب
انسان کو اسی لئے انسان کہا گیا ہے کہ یہ محبت کرتا ہے	اور قلب کو صرف اس لئے قلب کہا گیا ہے کہ یہ منقلب (پلٹتا) رہتا ہے

اس معنی کے لحاظ پر ہمزہ اصل ہوگا جب الف لام داخل ہوگا تو ہمزہ کو حذف کر دیا جائے گا ہمزہ اور الف لام دونوں کا اجتماع جائز نہیں یعنی "الا نـــاس" نہیں کہا جائے گا۔ البتہ قلیل طور پر آ جاتا ہے جیسا کہ اس مصرع میں ہے:

"انا المنايا يطلعن على الاناس الآمنينا".

(۴) انسان کو انسان اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ ظاہر ہوتے ہیں اور دیکھتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا﴾ (حضرت موسیٰ علیہ السلام نے) طور کی جانب آگ کو دیکھا یہ وجہ ایسی ہی ہے۔ جیسا کہ "جن" کو اسی لئے "جن" کہا جاتا ہے کہ وہ آنکھوں سے چھپا ہوتا ہے۔

(از قرطبی، کبیر، بیضاوی)

حقیقی منافقت اب نہیں:

"عن حذيفة قال انما النفاق كان على عهد رسول الله ﷺ فاما اليوم فانما هو الكفر او الايمان" رواه البخاری، مشكوة باب الكبائر وعلامات النفاق)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ منافقت نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں تھی اب یا کفر ہے یا ایمان اس منافقت سے مراد حقیقی منافقت ہے علامات نفاق اب بھی پائی جاتی ہیں جیسا کہ پہلے حدیث پاک سے واضح کیا جا چکا ہے:

"ان المصالح كانت مقتصرة على ذلك الزمان اما اليوم فلم تبق تلك المصالح فنحن ان علمنا انه كافر سرا قتلناه حتى يؤمن" (لمعات)

اس لئے کہ منافق جس مصلحت اور غرض کی وجہ سے منافقت کرتے تھے وہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے ساتھ ہی خاص تھی اب وہ مصلحت موجود نہیں اگر ہمیں معلوم ہو گیا کہ کوئی شخص باطنی طور پر کافر ہے تو ہم اس چھپے ہوئے کافر سے لڑائی کریں گے یا وہ ایمان لے آئے نہیں تو ہم اسے قتل کر دیں گے۔ واضح ہوا کہ اب حقیقی منافقت نہیں۔

﴿ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴾

فریب دیا چاہتے ہیں اللہ اور ایمان والوں کو، اور حقیقت میں فریب نہیں دیتے مگر وہ اپنی جانوں کو اور انہیں شعور نہیں۔

دھوکہ دینا چاہتے ہیں اللہ اور ایمان والوں کو، اور وہ دھوکہ نہیں دے رہے سوائے اپنی جانوں کے، اور انہیں محسوس نہیں ہو رہا۔

منافقین ظاہر طور پر ایمان والوں کے سامنے اپنے ایمان کا اظہار کرتے تھے اور اندرونی طور پر کافر تھے، وہ اپنی اس چالبازی سے یہ سمجھتے تھے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو دھوکہ، فریب دے رہے، اسے ہماری اس حرکت کا پتہ ہی نہیں، اسی طرح وہ اپنے گمان میں یہ خیال کر رہے تھے کہ ہماری چالبازیوں سے مومنین بے خبر ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ اپنے لئے سخت سے سخت عذاب کا سامان پیدا کر رہے تھے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ دھوکہ نہیں دے رہے تھے سوائے اپنی جانوں کے، یعنی ان کے دھوکہ کا کسی کو کوئی نقصان نہیں تھا، نقصان تو وہ اپنا ہی کر رہے تھے۔ وہ اپنے خیال میں بڑے سمجھدار بن رہے تھے، لیکن درحقیقت بے سمجھ تھے۔

يُخَادِعُوْنَ ، الخ : خدع بری چیز ہے، اسلئے ضروری تھا کہ منافقین کی اس حرکت کو ذکر کر کے بے نقاب کیا جائے تاکہ دوسرے ایسا نہ کریں، اور ان کو معلوم ہو جائے کہ خدع کیا ہے۔

''خدع '' کا اصلی معنی ہے مخفی رکھنا، اسی لئے خزانہ کو ''مخدع '' (مخفی رکھنے کی جگہ) کہا جاتا ہے۔ اسی طرح گردن میں دو مخفی رگوں کو ''اخدعان '' کہا جاتا ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے۔ '' خدع الضب '' جب کہ گوہ اپنے بل میں چھپ جائے، کبھی کبھی باہر نکلے، اسی طرح وہ راستہ جو مقصد کے خلاف ہو جسے عقلمند شخص بھی نہ سمجھ سکے، اسے طریق خادع، یا، طریق خیدع کہا جاتا ہے

اصطلاح میں '' خدع '' یہ ہے کہ ظاہر وہ چیز کرنا جس میں سلامتی ہو، اور وہی درست راہ ہو، لیکن

درپردہ غیر کونقصان پہنچانے کی راہ کو اختیار کیا جائے، ظاہر طور پراپنابن کر درپردہ دشمنی کی جائے۔

یہ حقیقی منافقت تونہیں، البتہ منافقوں کی مشابہت ہے، اس لئے کہ حقیقی منافقت میں ظاہر طور پر ایمان اور درپردہ کفر کا پایا جانا ضروری ہے۔ یعنی صرف ظاہری دوستی، باطنی دشمنی حقیقی منافقت نہیں۔

ایسے ہی ریاء کاری کے طور پر اچھے اعمال کرنا بھی علامت نفاق ہے، اگرچہ حقیقی منافقت کہنا ممکن نہیں۔

منافقت غیر حقیقی کیلئے ضابطہ:

جیسا کہ واضح ہو چکا ہے کہ منافقت حقیقی کی تو صرف ایک ہی صورت ہے، لیکن منافقت غیر حقیقی یعنی انداز منافقانہ کی کئی صورتیں ہیں۔ اس لئے اس کے لئے یہ ضابطہ **یاد کرلیا جائے** تو خود بخود انسان سمجھ لے گا کہ یہ منافقت ہے۔

وہ ضابطہ یہ ہے۔ ہر وہ چیز جو دین کے مخالف ہو، اسے چھپا کر رکھنا، اور اس کے مخالف چیز کو ظاہر کرنا نفاق ہے۔

اللہ تعالیٰ دین کی استقامت کو پسند کرتا ہے۔ اس میں استقامت نہ ہوتو نفاق ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ عبادت میں خلوص کو پسند کرتا ہے۔ خلوص نہ ہوتو منافقت ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ چاہتا ہے دھوکہ نہ دیا جائے، لہٰذا کسی کو دھوکہ دینا منافقت ہے۔

اسی لئے وہ حدیث مدلس کہلاتی ہے۔ جس کا راوی یہ ظاہر کرے کہ یہ حدیث اس نے فلاں سے سنی ہے۔ حالانکہ اس سے سنی نہیں ہوتی۔ ہاں اگر ظاہر طور پر کہہ دے میں فلاں کا نام تو لے رہا ہوں، لیکن میں نے اس سے یہ حدیث سنی نہیں، یہ تدلیس نہیں، البتہ اعلانیہ کذب ہے۔

اعتراض: "یخادعون" باب مفاعلہ سے ہے جو جانبین سے فعل کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کا ظاہری طور پر تو یہ معنی ہے۔ کہ وہ اللہ کو دھوکہ دیتے ہیں۔ اور اللہ ان کو دھوکہ دیتا ہے۔

یہ دونوں معنی مراد لینے درست نہیں، وہ رب تعالیٰ کو دھوکہ دے نہیں سکتے، اور اللہ تعالیٰ کی شان

کے لائق نہیں کہ وہ دھوکہ دے۔ رب تعالیٰ کو دھوکہ کیوں نہیں دیا جا سکتا؟ اس لئے کہ " انہ تعالیٰ یعلم الضمائر والسرائر " بیشک اللہ تعالیٰ چھپی ہوئی چیزوں کو جانتا ہے دل کے رازوں پر مطلع ہے اسے دھوکہ کیسے دیا جائے اس لئے کہ " خادع " (دھوکہ دینے والا) تو وہ ہوتا ہے جو ظاہر اور کرے اور باطن میں اور رکھے وہ کون سی چیز ہے جسے رب تعالیٰ سے چھپایا جا سکتا ہے:

" فاذا کان اللہ تعالیٰ لا یخفی علیہ البواطن لم یصح ان یخادع "

''جب اللہ تعالیٰ پر باطن کو مخفی نہیں تو اسے دھوکہ بھی نہیں دیا جا سکتا''

دوسری وجہ یہ تھی کہ منافقوں کا یہ عقیدہ ہی نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف رسول بھیجا ہے ان کا یہ عقیدہ ہوتا تو وہ دھوکہ دیتے اس لئے " فلم یکن قصدھم فی نفاقھم مخادعۃ اللہ تعالیٰ'' ان کا منافقت کرنے میں اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینا کسی طرح بھی مقصود نہیں ہو سکتا۔ "خدع " کا استعمال یہاں کس طرح درست ہے؟ جب کہ دونوں جانب سے "خدع " درست نہیں۔

جواب: " لا یمکن اجراء ھذا اللفظ علی ظاھرہ بل لا بدمن التاویل " اس لفظ کو ظاہر پر رکھنا تو ممکن نہیں اسلئے ضروری ہے کہ اس کی تاویل کی جائے یعنی جب حقیقی معنی کے لحاظ یہ لفظ استعمال نہیں تو اس کا کوئی نہ کوئی مجازی معنی ضروری طور پر لیا جائے گا اس کی دو صورتیں ہیں:

(۱) " صورۃ حالھم مع اللہ حیث یظھرون الایمان وھم کافرون صورۃ من یخادع" وہ چونکہ ایمان کو ظاہر کر رہے تھے حالانکہ واقع میں کافر تھے وہ اپنے خیال میں اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دے رہے تھے کیونکہ ان کا طریقہ دھوکہ دینے والوں کا تھا۔ یعنی اسی چیز کو آپ اس طرح بیان کر دیں جس طرح یہ عبارت کبیر کی واضح کر رہی ہے کہ ان کا ''خدع'' رب تعالیٰ سے حقیقی طور پر نہیں تھا بلکہ ان کا طریقہ "خادعین " (دھوکہ دینے والوں) کا تھا ''خدع'' کی صورت کو ''خدع'' کہہ دیا یا یوں بیان کیا جائے جیسا کہ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بیان کیا "یخادعونہ عند انفسھم وعلی ظنھم " وہ اپنی طرف سے اور اپنے خیال کی مطابق اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں۔

(۲) "انہ تعالیٰ ذکر نفسہ وارادبہ رسولہ علی عادتہ فی تفخیم وتعظیم شانہ " بیشک اللہ تعالیٰ نے ذکر اپنا فرمایا ہے لیکن مراد اس سے رسول ﷺ لئے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عادت شریفہ

(جو اس کی شان کے لائق ہے) یہ ہے کہ وہ اپنے رسول ﷺ کی طرف منسوب ہونے والی چیزوں کو اپنی طرف کرتا ہے تا کہ نبی کریم ﷺ کی شان کی بلندی اور عظمت واضح ہو جائے جیسا کہ فرمایا ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ ﴾ بیشک وہ لوگ جو آپ سے بیعت کر رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ سے بیعت کر رہے ہیں یعنی منافقوں کا اپنے خیال میں رسول اللہ ﷺ کو دھوکہ دینے کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرما دیا تا کہ آپ کی عظمت واضح ہو جائے۔ (از کبیر)

میری برادری کے لوگ اپنے ہی مفتی محمد شفیع دیوبندی صاحب کی اسی بحث میں اس عبارت کو ضرور پڑھیں۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کے رسول یا ولی کے ساتھ کوئی برا معاملہ کرتا ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ ایسا معاملہ کرنے کے حکم میں ہے دوسری طرف آنحضرت ﷺ کی رفعتِ شان کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا کہ آپ کی شان میں کوئی گستاخی کرنا ایسا ہی جرم ہے جیسا اللہ جل شانہ کی شان میں گستاخی جرم ہے۔ (معارف القرآن ج ۱ ص ۱۲۹)

اعتراض کی دوسری شق کا جواب:

جو یہ کہا گیا ہے کہ مخادعۃ جانبین سے ہوتی ہے تو معنی یہ کیسے صحیح ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان سے دھوکہ کرتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہی نہیں کہ وہ دھوکہ کرے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ باب مفاعلہ میں کبھی جانبین کا معنی نہیں پایا جاتا جیسا کوئی حاکم کہے "عاقبت اللص" میں نے چور کو سزا دی اس میں صرف اتنا ہی معنی ہے یہ معنی درست نہیں کہ "چور نے مجھے بھی سزا دی"۔ دوسرا جواب یہ ہے "صورة صنیع الله معهم حیث امر باجراء احکام المسلمین علیهم وهم عنده فی عداد الکفرة" منافقین اللہ تعالیٰ کے نزدیک کافروں میں شمار تھے لیکن کچھ دیر کے لئے ان پر مسلمانوں والے احکام جاری کرنے کا حکم دیا گیا اس ظاہری صورت کو مجازی طور پر مخادعت سے تعبیر کر دیا گیا۔ پہلا جواب ہی زیادہ قوی ہے کیونکہ اس کی ابو حیوۃ کی قراءت تائید کر رہی ہے کیونکہ اس قراءت میں "یخدعون" باب فتح سے ہے مفاعلہ سے نہیں۔ (از کبیر)

وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ :

''وہ دھوکہ کسی ایک کو بھی نہیں دے رہے سوائے اپنی جانوں کے''

" فانہ لا یخفی علی اللہ خافیۃ وھو یطلع نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم والمؤمنین فھم غروا انفسھم "

ان کا دھوکہ رب تعالیٰ کو دینا ممکن ہی نہیں تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز مخفی نہیں اور اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کو بھی وہ دھوکہ نہیں دے سکتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بذریعہ وحی مطلع فرما دیا۔ اس لئے وہ دھوکہ درحقیقت اپنے آپ کو دے رہے تھے وہ بظاہر طور پر مطمئن تھے کہ ہمیں عذاب نہیں ہوگا حالانکہ وہ عذاب الیم کے مستحق ہیں۔ اسی طرح جب ایک ایک منافق کا نام لے کر ان کو مسجد سے نکال دیا گیا رسوائی ان کو حاصل ہوئی تو ان کے دھوکہ دینے کا وبال جب ان کو ہی حاصل ہوا تو انہوں نے دھوکہ اپنے آپ کو ہی دیا۔ (از مظہری)

تنبیہ : اگرچہ بعض ایمان والوں کو دھوکہ دینا تو ممکن تھا لیکن تمام ایمان والوں کو دھوکہ دینا ممکن نہیں تھا بعض کو دھوکہ بھی ایک وقت کے لئے ممکن تھا۔

اسی طرح یہ بھی خیال رہے کہ ایمان والے کسی کو دھوکہ نہیں دیتے ان کی شان کے لائق ہی نہیں کہ وہ دھوکہ بازی کریں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عمر رضی اللہ کے متعلق فرمایا'' کان اعقل من ان یخدع وافضل من ان یخدع " اگر "یخدع " کو مجہول پڑھا جائے تو معنی یہ ہوگا کہ آپ عقل مند تھے آپ افضل تھے آپ کو دھوکہ دیا جانا ممکن نہیں تھا اگر معروف پڑھا جائے تو پھر معنی یہ ہوگا کہ آپ عقل مند اور افضل تھے کسی کو دھوکہ دینا آپ کی شان کے لائق نہیں تھا نبی کریم ﷺ نے فرمایا'' المؤمن غر کریم " مؤمن امتیازی شان رکھنے والا کریم ہے اس سے بھی واضح ہوا کہ مؤمن کسی سے دھوکہ نہیں کرتا اس لئے کہ " ان الا نخداع یدل علی البلہ " بیشک دھوکہ دینا بے وقوفی ہے مؤمن عقل مند ہے بے وقوف نہیں۔ (از روح المعانی)

وَمَا يَشْعُرُوْنَ : ''ان کو شعور ہی نہیں''

" انھم یخدعونھا او ان اللہ یعلم ما یسرون وما یعلنون او اطلاع اللہ تعالیٰ نبیہ ﷺ علی خداعھم وکذبھم "

ان کو یہ محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ ہم کسی اور کو دھوکہ نہیں دے رہے بلکہ اپنی ہی جانوں کو دھوکہ

دے رہے کیونکہ اللہ تعالیٰ تو ہر ظاہر اور باطن کو جانتا ہے اور اپنے نبی کریم علیہ ﷺ کو بھی ہمارے دھوکہ اور کذب بیانی سے مطلع کر رہا ہے۔ (از روح المعانی)

"ان وبال ذلک الخداع راجع الیھم لان اللہ تعالیٰ یطلع علی نبیہ ﷺ علی نفاقھم فیفتضحون فی الدنیا ویستوجبون العقاب فی العقبی" (خازن)

"ان کے دھوکہ کا وبال ان کی طرف ہی لوٹ رہا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کریم ﷺ کو ان کے نفاق سے مطلع فرما رہا تھا وہ دنیا میں بھی رسوا ہو رہے تھے اور آخرت میں بھی عذاب کے مستحق ہوں گے"

نکتہ : وما یشعرون اگر چہ مطلقاً لا یعقلون (وہ سمجھ نہیں رکھتے) کے معنی میں بھی استعمال ہوتا رہتا ہے لیکن حقیقی معنی شعور کا حواس سے محسوس کرنا اور جو چیز محسوس ہو وہ بدیہی کے درجہ میں ہوتی ہے " ومن لایشعر بالبدیھی المحسوس مرتبته ادنی مرتبة من البھائم " اس سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ منافقین کا مرتبہ چوپاؤں سے بھی کم ہے کہ انہیں محسوس بدیہی کا بھی شعور نہیں اور شعور کی نفی سے علم کی نفی بھی ہو جاتی ہے اس لئے " وما یشعرون " میں بنسبت " وما یعلمون " کے زیادہ مبالغہ ہے۔ (از بیضاوی و خفاجی)

تنبیہ : ابھی تک جو بحث کی اس سے یہ واضح ہوا کہ منافقین اپنے خیال اور گمان کے مطابق اللہ تعالیٰ اور ایمان والوں کو دھوکہ دینا چاہتے تھے یا نبی کریم ﷺ اور ایمان والوں کو دھوکہ دینا چاہتے تھے حقیقت میں وہ کسی ایک کو بھی دھوکہ نہیں دے سکتے تھے یہ بات سمجھنے کے بعد تراجم کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ بہت عظیم ہے۔

یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا :

"چال بازی کرتے ہیں اللہ سے اور ان لوگوں سے جو ایمان لا چکے ہیں" (اشرف علی صاحب)

"فریب دیتے ہیں اللہ کو اور ان لوگوں کو کہ ایمان لائے" (شاہ رفیع الدین صاحب)

"دغا بازی کرتے ہیں اللہ سے اور ایمان والوں سے" (شاہ عبدالقادر صاحب)

"وہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں" (مودودی صاحب)

"فریب دیا چاہتے ہیں اللہ اور ایمان والوں کو" (مولنا احمد رضا خان رحمہ اللہ)

﴿ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴾

☆ ان کے دلوں میں بیماری ہے تو اللہ نے ان کی بیماری اور بڑھائی اوران کے لئے دردناک عذاب ہے بدلہ ان کے جھوٹ کا

☆ ان کے دلوں میں فساد ہے تو اللہ نے ان کے فساد کو بڑھا دیا اوران کے لئے درد ناک عذاب ہے بوجہ ان کے جھوٹ کے

مرض کی دوقسمیں: مرض حقیقی اور مرض مجازی۔

مرض حقیقی: یہ ہے کہ وہ بدن کو عارض ہو خاص اعتدال سے نکال دے اور افعال میں خلل پیدا کرے

مرض مجازی: یہ ہے کہ اعراض نفسانیہ کے کمال میں خلل پیدا کرے جیسے جہالت، بدعقیدگی، حسد، کینہ وغیرہ یعنی ہر قسم کی بری صفات جو گناہوں کا سبب بنیں۔

مرض حقیقی اور مجازی میں مشابہت:

مرض حقیقی کی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ مرض بدن کو اعتدال سے نکال دے جو اس کے لائق ہے اور افعال میں خلل پیدا کرے یعنی ہر عضو جو اپنی درست حالت میں کام کرتا ہے اس میں خلل آجائے۔ دوسری قسم یہ ہے کہ مرض سے حیات جسمانیہ میں ہلاکت آجائے یعنی انسان پر مرض سے موت طاری ہو جائے اسی طرح مرض مجازی کی بھی دو ہی قسمیں ہیں ایک یہ کہ مرض انسان کو فضائل دینیہ کے حاصل کرنے کے کمال سے مانع ہو یعنی اللہ تعالیٰ کی معرفت اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول ﷺ کی طاعت اور دین کے ہر پسندیدہ راستہ سے دور کرنے کا ذریعہ بنے اور خلل پیدا کرے اور دوسری قسم یہ ہے کہ وہ مرض

مجازی انسان کی ابدی زندگی سے موت کی طرف لے جائے یعنی کفر تک پہنچا دے جس طرح رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ﴾ زندہ اور مردہ برابر نہیں یعنی مومن اور کافر برابر نہیں اس آیت میں زندہ سے مراد مومن اور مردہ سے مراد کافر ہے۔ (از بیضاوی وشیخ زادہ)

منافقین کی مرض میں اقوال:

منافقین کے دلوں میں مرض کو ذکر فرمایا اس مرض سے مراد کیا ہے؟ اس میں کئی اقوال ہیں "مرض ای شک ونفاق" مرض سے مراد شک اور نفاق ہے شک کا مطلب یہ ہے کہ دو چیزوں میں متردد ہونا جیسا کہ حدیث پاک میں ان کے تردد کو ذکر کیا گیا:

" عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ مثل المنافق کالشاة العائرة بین الغنمین تعیر الی هذه مرة والی هذه مرة " (رواه مسلم ، مشکوة باب الکبائر النفاق)

"حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا منافق کی مثال ایسے ہے جیسے بکری نر کی تلاش میں دو بکریوں کے درمیان متردد ہو کبھی اس کی طرف جائے اور کبھی اس کی طرف"

متردد کو مریض اس لئے کہا گیا ہے کہ مریض موت وحیات میں متردد ہوتا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ مرض ضد ہے صحت کی ۔ اسی طرح فساد کو بھی صحت کے مقابل استعمال کیا جاتا ہے لہٰذا ان کے دلوں میں مرض کہہ کر یہ ثابت کیا کہ ان کو صحت حاصل نہیں بلکہ ان کو فساد حاصل ہے۔ یعنی ہر قسم کے فساد کو مرض سے تعبیر کر دیا جاتا ہے اور جب مرض کا معنی نفاق لیا جائے تو اس کا بھی یہی مطلب ہوگا کہ ان کے دلوں میں فساد ہے ۔ (از مدارک للنسفی) مرض کو بعض حضرات نے انکار کے معنی میں لیا اور بعض نے تکذیب کے معنی میں لیا اور بعض نے رجس (ناپاکی) کے معنی میں لیا۔ (از قرطبی)

بعض حضرات نے مرض کو ریاء (دکھلاوا) کے معنی میں لیا ہے بعض نے کہا مرض سے مراد دین میں مرض کا لاحق ہونا بعض نے کہا مرض کا معنی شر ہے بعض نے کہا مرض کا معنی ضلالت ہے۔ (از ابن کثیر)

تمام اقوال کا مطلب ایک:

" والمرض عبارة مستعارة للفساد الذی فی عقائدهم " (قرطبی) مرض کا مجازی

معنی مراد ہے یعنی ان کے عقائد میں پایا جانے والا فساد ان کے دلوں میں مرض سے تعبیر کر دیا گیا وہ فساد نفاق کی وجہ سے تھا وہ فساد شک کی وجہ سے تھا۔ وہ فساد انکار کی وجہ سے تھا وہ فساد تکذیب کی وجہ سے تھا وہ فساد ریاء کاری کی وجہ سے تھا وہ فساد دین میں خرابیوں کی وجہ سے تھا وہ فساد ان کے شرک کی وجہ سے تھا وہ فساد ان کی ضلالت (گمراہی) کی وجہ سے تھا۔ یعنی تمام معنی اس معنی میں موجود ہیں کہ ان کے دلوں میں فساد تھا ان کا عقیدہ ظاہر کے خلاف تھا۔

جب واضح ہو گیا کہ مرض سے مراد عام ہے خواہ وہ بیماری کی وجہ سے صحت سے نکال دے یا نفاق کی وجہ سے صحت سے نکال دے یا امر دینیہ میں تقصیر (کوتاہی) کی وجہ سے حد اعتدال سے نکال دے

اعتراض: قرآن کے متعلق تو رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ﴾ یہ لوگوں کیلئے شفا ہے جب منافق قرآن پاک بھی پڑھتے تھے تو ان کے دلوں کو شفاء کیوں نہ حاصل ہوئی۔

جواب: " لانهم لما ابغضوه لم يستعملوا النظر فيه "اس لئے کہ انہوں نے جب قرآن پاک سے بغض رکھا تو اس میں نظر کو استعمال ہی نہیں کیا کہ قرآن پاک ان کو سمجھ آتا یعنی بغض، حسد، عناد نے ان کو سوچنے، سمجھنے کی طاقت سے دور کر دیا تھا لہذا واضح ہوا کہ قرآن پاک میں شفا تو ہے لیکن اس سے شفا حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ جس طرح کوئی دوا کسی مرض کے لئے مفید ہو تو دوا کو استعمال کرنا اور پرہیز کرنا اس سے نفع حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے۔ (از تبصیر الرحمن)

وجہ مرض کیا تھی؟ منافقین کے دلوں میں مرض کی وجہ یہ تھی:

" ان المنافقين مرضت قلوبهم لما راؤا ثبات امر النبی ﷺ واستعلاء شانه يوما فيوما وذلک كان يؤثر فی زوال رياستهم "

بیشک منافقین کے دلوں میں مرض اس لئے آ گئی تھی کہ جب انہوں نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ کا معاملہ روز بروز پختہ ہی ہو رہا ہے آپ کی شان تو دن بدن بڑھ رہی ہے اب ہمیں تو سرداری کے ملنے کا تصور بھی نہیں ہو سکتا تو انکے دلوں میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی ہر طرح کی چالبازیوں اور فساد سے وہ فتنے برپا کرنے لگے یعنی صرف ریاست کے زوال کی وجہ سے حسد تھا۔ اسی پر ایک روایت بھی شاہد ہے:

" روی انه عليه السلام مر بعبد الله بن ابی بن سلول علی حمار فقال

له نح حمارک یامحمد فقد آذنتی ریحه فقال له بعض الانصار اعذره یارسول الله فقد کنا عزمنا علی ان نتوجه الریاسة قبل ان تقدم علینا "

روایت بیان کی گئی کہ بیشک نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ عبداللہ بن ابی بن سلول کے قریب سے اپنے گدھے پرسوار ہوکر گزرے تو اس نے کہا اے محمد اپنے گدھے کو یہاں سے ہٹالو اس کی بو نے مجھے تکلیف پہنچادی بعض انصار نے کہا یارسول اللہ اسے معذور سمجھیں (یہ غم میں مبتلا ہے) کیونکہ آپ کے تشریف لانے سے پہلے ہم نے اسے اپنا سردار بنانے کا پختہ ارادہ کرلیا تھا

یعنی آپ کے آنے سے اس کی سرداری کا زوال ہوگیا تو یہ بیچارہ اس کے غم میں حسد کی آگ میں جل رہا ہے۔ لیکن خیال رہے کہ یہ مشورہ بعض حلیم حضرات کا تھا لیکن بعض جوشیلے صحابہ کرام نے اسے کہا خبردار منہ کو بند رکھو نبی کریم ﷺ کے گدھے کے پیشاب کی بو کستوری کی خوشبو سے اچھی ہے۔ اس طرح دونوں طرف سے تکرار پر لڑائی ہوگئی چھتر اور لاٹھیاں چل گئیں نبی کریم ﷺ نے اپنے اخلاق کریمانہ سے بچ بچاؤ کرادیا مکمل تفصیل مسلم شریف میں دیکھی جائے۔

فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا: "انکی مرض کو اللہ تعالیٰ نے اور زیادہ کردیا" اس کا مطلب بھی یہی ہے۔

" زادهم الله غما علی غمهم بما یزید فی اعلاء امر النبی ﷺ وتعظیم شانه "

کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو غموں پر غم پہنچادیئے کیونکہ ان کے غمناک ہونے کی وجہ نبی کریم ﷺ کی شان کی رفعت تھی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی رفعت کو روز بروز بڑھانے اور آپ کی تعظیم شان میں زیادتی فرمانے سے ان کے غم میں زیادتی ہونے لگی یہی وجہ تھی ان کی مرض کی زیادتی کی۔ (از کبیر)

ذرا غور کریں تو آج بھی عبداللہ بن ابی کی ذریت معنوی میں کوئی کمی نظر نہیں آئے گی نبی کریم ﷺ کی شان سے لوگ جل اٹھتے ہیں کہیں یارسول اللہ کہنے سے درد لاحق ہوتا کہیں آپ کو شفیع کہنے سے پریشان رب تعالیٰ جب مصطفےٰ کریم کی شان کو زیادہ فرمانے کا وعدہ ﴿ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ﴾ سے کرچکا ہے تو کسی کے جلنے سے کیا ہوگا

مٹ گئے مٹ جائیں گے سب اعداء تیرے — نہ مٹا ہے نہ مٹے گا کبھی چرچا تیرا

نکتہ : فی قلوبھم مرض کہا ہے یہ نہیں کہا " قلوبھم مرضی " (ان کے دل مریض ہیں)

جملہ ظرفیہ ذکر کر کے اشارہ کیا کہ ان کی مرض عارضی تھی دل اس کی جائے قرار تھا البتہ وہ دل میں راسخ ہوگئی تھی کیونکہ اس کے اسباب یعنی حسد، کینہ، کھوٹ کو وہ دل سے نہیں نکال رہے تھے۔ اسی جملہ سے اس مسئلہ کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ ازلی کافروں کی طرح نہیں تھے کہ جن کے متعلق فرمایا "لا یؤمنون" وہ ایمان نہیں لائیں گے بلکہ یہ اسباب کو زائل کر دیں تو مخلص ایمان والے ہو سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کئی منافقین نے نفاق کو چھوڑ دیا تھا اور مخلصین ہو گئے۔ (از ابن عربی)

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

"الیم" فعیل کے وزن پر ہے یہ کبھی فاعل کے معنی میں ہوتا ہے اور کبھی مفعول کے معنی میں زیادہ مفسرین نے اسے مفعول کے معنی میں لیا ہے درد پہنچایا ہوا لیکن یہ صفت عذاب کی نہیں بلکہ اس شخص کی ہے جسے عذاب دیا جانا ہے عذاب کی صفت یہاں کیسے ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مبالغہ ثابت کرنے کے لئے عذاب کے شدید دردناک ہونے کو بیان کرنے کے لئے الیم کو مفعول کے معنی میں لیتے ہوئے عذاب کی صفت بنا دیا گیا ہے "وجه المبالغة افادة ان الالم بلغ الغاية حتى سرى من المعذب الى العذاب المتعلق له" مبالغہ کی وجہ یہ ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ اس شخص کو عذاب اتنا شدید درد پہنچائے گا کہ وہ درد خود اس عذاب میں بھی پہنچ جائے گا۔ تاہم فاعل کے معنی میں بھی استعمال ہے خطیب میں یہی ذکر کیا گیا "ویجوز كسر لام مولم كسميع بمعنى مسمع" یعنی الیم بمعنی مولم ہے جس طرح مفسرین نے مولم کے لام پر فتحہ (زبر) پڑھ کے مفعول کا معنی لیا ہے اسی طرح مولم کے لام کے نیچے کسرہ (زیر) پڑھ کر فاعل کے معنی میں بھی لیا جا سکتا ہے اس وقت "الیم" کا لفظ صفت "عذاب" کی ہوگا یعنی لفظی اور معنوی دونوں صورتوں میں اب معنی ہوگا ان کو عذاب ہوگا جو درد پہنچانے والا ہوگا پہلی صورت میں معنی ہوگا ان کو عذاب ہوگا جس سے وہ درد پہنچائے جائیں گے۔

بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ:

باء میں دو احتمال ہیں کہ یہ مقابلہ کے لئے ہے یا سبب کیلئے ہے ان دونوں کو قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے یوں بیان فرمایا "والمعنى بسبب كذبهم او ببدله جزاء لهم" یعنی یا معنی یہ کیا جائے کہ

ان کو دردناک عذاب ہوگا بوجہ اس کے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے اور یا یہ معنی کیا جائے کہ ان کو دردناک ہوگا ان کے جھوٹ کے بدلے (از بیضاوی) " مـا " مصدریہ ہے اس طرح معنی مختصر ہوسکتا ہے ان کو دردناک عذاب ہوگا بوجہ جھوٹ کے۔

یَکْذِبُوْنَ: میں دو قراءتیں ہیں ثلاثی مجرد باب ضرب سے معنی ہوگا جھوٹ بولنا یعنی انہوں نے جو یہ کہا تھا ﴿اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ ﴿ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخرت کے دن پر﴾ یہ ان کا کہنا جھوٹ تھا۔ دوسری قرائت میں ثلاثی مزید فیہ باب تفعیل سے ہے اس کے لحاظ پر معنی یہ ہے کہ ان کو دردناک عذاب ہوگا بوجہ تکذیب کے (از مظہری) تاہم ان کے دونوں حال تھے جھوٹے بھی تھے اور نبی کریم ﷺ اور قرآن پاک کی تکذیب بھی کرتے تھے یہی قرآن پاک کی عظمت ہے کہ ایک ہی لفظ سے کئی مسائل بیان کر دیئے جاتے ہیں۔

اعتراض: " کـانـوا " سے زمانہ ماضی سمجھ آ رہا ہے اور یکذبون سے زمانہ حال یا استقبال سمجھ آ رہا ہے ایک ہی جگہ ان کو کیسے جمع کیا گیا۔

جواب: کان جمیع زمانوں کے استمرار پر دلالت کرتا ہے اور مضارع استمرار تجدد پر دلالت کرتا ہے اور "ما" کا مصدریہ ہونا بھی بیان کر دیا گیا ہے اب واضح ہے کہ ان کے جھوٹ کی وجہ سے ان کے لئے دردناک عذاب ہے خواہ وہ ماضی میں ہو یا مستقبل میں ہو۔ (از روح المعانی)

منافقین عذاب کے مستحق تھے:

" بِمَا کَانُوْا یَکْذِبُوْنَ " سے یہ واضح کر دیا کہ منافقین کو دردناک عذاب بلاوجہ نہیں ہوگا بلکہ جھوٹ بول کر انہوں نے اپنے آپ کو دردناک عذاب کا مستحق بنا لیا تھا۔ خاص کر جب وہ جھوٹ اس ذات کے سامنے بول رہے جو سید الانبیاء اور سید الکائنات ہیں تو یقیناً وہ شدید دردناک عذاب کے مستحق ہو گئے اور نبی کریم ﷺ کی تکذیب کرنے کی وجہ سے بھی وہ اس کے حقدار تھے کہ ان کو دردناک عذاب ہی دیا جائے۔

کذب کی مذمت احادیث مبارکہ سے:

" عن عبد اللہ قال قال رسول اللہ ﷺ ان الصدق یھدی الی البر وان

البر يهدى الى الجنة وان الرجل ليصدق حتى يكتب عند الله صديقا وان الكذب يهدى الى الفجور وان الفجور يهدى الى النار وان الرجل ليكذب حتى يكتب عند الله كذابا " (مسلم ج ۲ ص ۳۳۳)

'' حضرت عبد اللہ (ابن مسعود) رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک صدق نیکی کی راہنمائی کرتا ہے اور بیشک نیکی جنت کی ہدایت دیتی ہے اور بیشک ایک شخص سچ بولتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اسے صدیق لکھ دیا جاتا ہے اور بیشک کذب گناہوں کی راہنمائی کرتا ہے اور گناہ آگ (جہنم) میں پہنچانے کا ذریعہ ہیں اور بیشک انسان جھوٹ بولتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اسے کذاب لکھ دیا جاتا ہے''

'' البر جامع للخير كله '' ہر قسم کی بھلائی جس میں جمع ہو اس نیکی کا نام ''بر'' ہے مطلب واضح ہے کہ سچ سے نیک اعمال حاصل ہوتے ہیں اور نیک اعمال سے جنت حاصل ہوتی ہے سچا انسان اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہوتا ہے یہاں تک کہ اسے مقام صدیقیت حاصل ہو جاتا ہے ''الفجور هو الميل عن الاستقامة وقيل الانبعاث في المعاصي '' درست راہ سے ہٹ جانے کا نام فجور ہے اسی طرح گناہوں پر ابھارنے والے اسباب کو بھی فجور کہتے ہیں۔

جھوٹا شخص کتنا بد بخت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی اس کے جھوٹ کے چرچے ہوتے ہیں اور اسے رب تعالیٰ کے ہاں کذاب کا لقب دے دیا جاتا ہے:

'' وفى رواية عليكم بالصدق فان الصدق يهدى الى البر واياكم والكذب ''

''ایک روایت میں ہے کہ تم پر صدق لازم ہے بیشک سچ نیکیوں کی راہنمائی کرتا ہے اور تم جھوٹ سے بچ کر رہو''

'' وفى رواية يستحرى الصدق ويستحرى الكذب '' یعنی جو شخص سچ میں کوشش کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صدیق لکھ دیا جاتا ہے اور جو شخص کذب میں کوشش کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کذاب لکھ دیا جاتا ہے۔

ان روایات سے واضح ہوا کہ سچ میں انسان کوشش کرے سچ بولنا ہی اس کا مقصود ہو اور وہی معتبر ہو اور کذب سے بچنا ضروری ہے اور کذب سے بچنے میں تساہل (سستی) کرنا بھی برا ہے اس لئے کہ

اس سستی کی وجہ سے انسان کثیر جھوٹ بولنے کا عادی بن جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں عذاب کا مستحق ہو جاتا ہے اور کذاب کا لقب اسے مل جاتا ہے۔ یہاں صدیق اور کذاب میں لکھنے کا کیا مطلب ہے؟ اللہ تعالیٰ کے ہاں تو اس کا شقی ہونا یا سعید ہونا پہلے سے ہی لکھا ہوتا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی یہ صفت ملأ اعلیٰ میں مشہور ہو جاتی ہے۔ سچے شخص کا سچ اور جھوٹے شخص کا جھوٹ آسمانوں میں مشہور ہو جاتا ہے۔ اور وجہ یہ ہے کہ " **یلقی ذلک فی قلوب الناس والسنتھم کمایوضع له القبول والبغضاء** " کہ سچ کو جس طرح مقام قبولیت حاصل ہوتا ہے اسی طرح سچے انسان کی محبت لوگوں کے دلوں میں ڈال دی جاتی ہے اور لوگوں کی زبانوں پر اس کا چرچا ہوتا ہے یعنی سچے انسان کا لوگ ذکر خیر کرتے ہیں اور اس سے محبت کرتے ہیں اور جھوٹ سے جس طرح نفرت اور ناپسندیدگی رب تعالیٰ کو اور فرشتوں کو ہوتی ہے اسی طرح لوگوں کے دلوں میں بھی اسے ڈال دیا جاتا ہے لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں اور جب بھی کہیں اس کا ذکر کرتے ہیں تو جھوٹا کہہ کر ہی یاد کرتے ہیں۔ (از نووی)

☆ " **وقال ابو امامة قال رسول اللہ ﷺ ان الکذب باب من ابواب النفاق** "

(احیاء العلوم ج ۳ ص ۸۲)

ابوامامہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک جھوٹ منافقت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے جیسا کہ پہلے ایک حدیث کو بیان کیا جا چکا ہے کہ جھوٹ منافقت کی علامت ہے اور جھوٹ کی عادت (العیاذ باللہ) حقیقی منافقت کی طرف پہنچانے کا ذریعہ بھی ہے۔ اس لئے کہ جن کافروں نے جھوٹ کو برا سمجھا اور جھوٹ بولنا اپنے لئے عار سمجھا وہ کھلے کافر ہے لیکن جن کافروں نے جھوٹ کی کوئی پرواہ نہیں کی وہ ہی منافق ہوئے۔

☆ " **وقال علیه السلام الکذب ینقص الرزق** " (احیاء العلوم ج ۳ ص ۸۲)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جھوٹ رزق کو کم کرتا ہے۔ یعنی جھوٹ کی وجہ سے خیر و برکت میں کمی آ جاتی ہے رب تعالیٰ کی ناراضگی ہوتی ہے جس کی وجہ سے مخلوق بھی اس پر اعتبار نہیں کرتی اس کے لین دین کا تعلق لوگ ختم کر لیتے ہیں اس طرح اسے خسارہ ہوتا ہے اور رزق بھی یقیناً کم ہوگا۔

☆ " **وقال رسول اللہ ﷺ ان التجارھم الفجار فقیل یارسول اللہ الیس قد احل اللہ البیع قال نعم ولکنھم یحلفون فیاثمون ویحدثون فیکذبون** " (احیاء العلوم ج ۳ ص ۸۲)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تاجر فاجر (گنہگار) ہیں عرض کیا گیا یارسول اللہ کیا اللہ تعالیٰ نے

خرید وفروخت کوحلال نہیں کیا؟ آپ نے فرمایاہاں (حلال تو کیا ہے) لیکن (میری مراد) وہ ہیں جو قسمیں اٹھاتے ہیں گنہگار ہوتے ہیں بات کرتے ہیں تو جھوٹ بولتے ہیں یعنی جھوٹی قسمیں اٹھا اٹھا کر اپنے مال کی تعریف کرنا وغیرہ تاجروں کو گنہگار کرتا ہے ہاں البتہ سچے تاجروں کی رسول اللہ ﷺ نے تعریف بھی فرمائی ابوسعید کی روایت میں ہے:

" قال رسول الله ﷺ التجر الصدوق الامین مع النبیین والصدیقیین والشهداء "

(رواه الترمذی الدارمی والدار قطنی ورواه ابن ماجه عن ابن عمر مشكوة باب المساهلة فی المعاجلة)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سچے امین تاجر انبیاء کرام ،صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوں گے یعنی جو تاجر اپنی تجارت میں سچ بولتے ہیں امانت دار ہوتے ہیں قیامت کے دن ان کو انبیاء کرام اور صدیقین اور شہداء کا قرب حاصل ہوگا۔

تین جھوٹوں کا علیحدہ حکم: نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" لیس الکذب الذی یصلح بین الناس ویقول خیرا وینمی خیرا قال ابن شهاب ولم اسمع یرخص فی شئی مما یقول الناس کذب الا فی ثلاث الحرب والاصلاح بین الناس وحدیث الرجل امراته وحدیث المراة زوجها " (مسلم شریف ج ۲ باب تحریم الکذب ص ۳۳۳)

" وہ شخص کذاب نہیں جو لوگوں کے درمیان صلح کرائے اور بہتر بات کرے اور بہتری کی طرف نسبت کرے ابن شہاب نے بیان کیا کہ میں نے سوائے تین چیزوں کے کہ لوگ ان کو کذب کہتے ہیں رخصت نہیں سنی ایک جنگ میں دوسرا لوگوں کے درمیان صلح کرانا اور تیسرا خاوند زوجہ سے کوئی بات کرے یا زوجہ خاوند سے "

" قال القاضی لاخلاف فی جواز الکذب فی هذه الصور " قاضی عیاض رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ ان تین مقامات میں جھوٹ بولنا جائز ہے اس میں کسی کا اختلاف نہیں ۔لیکن اس میں اختلاف ہے کہ وہ جھوٹ کس طرح جائز ہے بعض حضرات نےکہا مطلقاً جائز ہے لیکن بعض حضرات نے کہا

" لایجوز الکذب فی شی اصلا قالوا وماجاء من الاباحة فی هذا المراد به التوریة واستعمال المعاریض لاصریح الکذب "

جھوٹ کسی چیز میں بالکل جائز نہیں جو مباح ہے وہ توریہ اور تعریض کے طور پر کلام کرنا مراد ہے صریح جھوٹ مراد نہیں۔

توریہ اور تعریض یہ ہے کہ اس انداز پر کلام کی جائے کہ سننے والا اور معنی سمجھے اور بولنے والا اور معنی مراد لے یہ حقیقت میں جھوٹ نہیں ہوتا البتہ سننے والا ہوسکتا ہے جھوٹ سمجھے۔ جیسا کہ اپنی زوجہ کو کہے میں تم پر احسان کر دوں گا اچھے کپڑے پہناؤں گا نیت کرے کہ اگر مجھے اللہ تعالیٰ نے طاقت دی تو ایسے کروں گا۔ اسی طرح دو آدمیوں کے درمیان مخالفت ہو تو ایک شخص ان کے درمیان صلح کرانا چاہتا ہے تو یہ کہتا ہے کہ وہ تو تمہارے حق میں بڑے اچھے الفاظ بول رہا تھا تمہیں کسی نے غلط خبر دی اسی طرح دوسرے کو کہے، مراد یہ ہو کہ تمہاری لڑائی سے پہلے تم دونوں ایک دوسرے کو اچھے الفاظ سے یاد کرتے تھے۔ اسی طرح جنگ کے دوران دشمن سے کہے "**مات امامکم الاعظم** "تمہارا بڑا بادشاہ مر گیا۔ مراد اس سے یہ لے کہ تمہارا پہلے بڑا بادشاہ مر گیا تھا مقصد اس میں یہ ہوتا ہے کہ ان کے حوصلے پست ہو جائیں۔ اسی طرح یہ کہے "**غدا یاتینا المدد**" ہمارے پاس مدد آ رہی ہے اس کی مراد یہ ہو کہ ہمارے پاس کھانا آ رہا ہے دشمن یہ سمجھے کہ ان کے پاس فوج کی امداد آ رہی ہے یہ توریہ یا تعریض کہلاتا ہے یہ جائز ہے لیکن کھلا اور واضح جھوٹ جائز نہیں۔

(ازنووی)

اسی توریہ کی ایک اور مشہور و معروف مثال حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کلام ہے ہجرت کی رات آپ نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے کسی شخص نے آپ کو پہچانا اور حضور کو نہ پہچانا اس نے پوچھا کہ اے ابوبکر تمہارے ساتھ کون ہے؟ اب آپ نے خیال کیا کہ اگر یہ بتاتا ہوں کہ میرے ساتھ نبی کریم ﷺ ہیں تو یہ لوگ آپ کو تکلیف پہنچائیں گے کیونکہ وہ دشمن تو صرف آپ کے ہیں ہمارے تو نہیں اور اگر یہ بتاتا ہوں کہ میرے ساتھ کوئی اور شخص ہے تو جھوٹ ہوگا آپ نے اس امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے کیا خوب جواب دیا کہ میرے ساتھ "ہادی" ہے۔ سننے والے نے سمجھا کہ آپ کہیں سفر پر جا رہے ہیں راستہ نہیں دیکھا ہوا تو اپنے ساتھ کوئی راہنما لیا ہے لیکن آپ کا مقصد تھا میرے ساتھ وہ ذات گرامی ہے جو میرے راہنما ہیں دنیاوی امور میں بھی اور دینی امور میں بھی جواب سچا تھا سننے والا نہ سمجھے تو اس کا اپنا قصور ہے۔

بغیر ضرورت کے تعریض بھی جائز نہیں:

" قال عمر رضی اللہ عنہ اما فی المعاریض مایکفی الرجل عن الکذب وروی ذلک عن ابن عباس وغیرہ وانما ارادوا بذلک اذا اضطر

الانسان الی الکذب فاما اذالم تکن حاجة وضرورة فلا یجوز التعریض ولا التصریح جمیعا ولکن التعریض اهون "(احیاء العلوم ج ۳ ص ۸۴)

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تعریض کا مطلب یہ ہے کہ انسان جھوٹ سے بچ جائے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا کہ تعریض کا یہ مطلب ہے کہ انسان جھوٹ اور گناہ سے بچ جائے لیکن یہ ضرورت کے وقت تعریض بھی جائز ہے بغیر ضرورت کے نہ تو صریح طور پر جھوٹ جائز ہے اور نہ ہی تعریض کے طور پر البتہ تعریض بغیر ضرورت کے کھلے جھوٹ سے ذرا کم درجہ جرم ہے''

نبی کریم ﷺ کا منافقین کو قتل نہ کرانے میں حکمت:

جب یہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو رب تعالیٰ نے منافقین کے متعلق مطلع فرمادیا تھا تو پھر کیا وجہ ہے کہ آپ نے منافقین کو قتل کیوں نہیں کرایا اس لئے کہ کافر تو واجب القتل تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ ظاہر طور پر ایمان لائے ہوئے تھے۔ نماز نبی کریم ﷺ کی اقتداء میں ادا کرتے تھے تمام کام مسلمانوں والے کرتے تھے اور تمام مسلمانوں کو ان کی منافقت کا پتہ نہیں تھا اگر آپ ان کو قتل کرادیتے تو نئے مسلمان ہونے والے ان کی منافقت کو نہ جاننے والے یہ کہتے کہ یہ کیسے نبی ہیں جو اپنے ہی مسلمانوں کو قتل کرارہے ہیں تو ان کے دلوں میں اسلام کی الفت ڈالنے اور اسلام پر قائم رہنے کی مصلحت کے پیش نظر آپ نے منافقوں کو قتل کرانے کا حکم نہیں دیا۔ اسی مقصد کو نبی کریم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان الفاظ مبارکہ سے بیان فرمایا:

" معاذ الله ان یتحدث الناس انی اقتل اصحابی "

''اللہ کی پناہ اس سے کہ لوگ یہ باتیں کریں کہ میں اپنے دوستوں کو قتل کرادیتا ہوں''

" وقد کان یعطی للمؤلفة قلوبهم مع علمه بسوء اعتقادهم تالفا "

''یہی وجہ تھی کہ کئی مؤلفۃ قلوب کو بداعتقاد ہونے کے باوجود آپ عطیات سے نوازتے تاکہ ان کے دلوں میں اسلام کی محبت راسخ ہوجائے'' ہاں یہ بھی خیال رہے کہ یہ اس وقت تک کی بات ہے جب تک مسلمانوں کو شوکت و دبدبہ حاصل نہیں ہوا جب اسلام کو مسلمانوں کی کثرت سے قوت حاصل ہوئی مسلمانوں کو دبدبہ حاصل ہوگیا تو منافقین کو بے نقاب کردیا گیا جس کا ذکر چوتھے پارہ میں اس آیۃ میں کردیا گیا

"ماکان اللہ لیذر المؤمنین علی ما انتم علیه حتی یمیز الخبیث من الطیب"

"قال الشافعی واصحابه وانما منع رسول اللہ ﷺ من قتل المنافقین ماکانوا یظھرونه من الاسلام مع العلم بنافقھم لان مایظھرونه یجب ماقبله"

"امام شافعی اور آپ کے اصحاب رحمہم اللہ نے کہا کہ نبی کریم ﷺ کو منافقوں کے نفاق کا علم تھا لیکن ان کو قتل اس لئے نہیں کرایا کہ وہ اس چیز (یعنی اسلام) کو ظاہر کر رہے تھے جو پہلے کی تمام برائیوں کو مٹا دیتی ہے"

اس طرح لوگوں کے دلوں سے اعتبار اٹھ جانے کا خطرہ تھا کہ ادھر آپ فرماتے ہیں اسلام کفر اور تمام برائیوں کو ختم کر دیتا ہے اسلام لانے کے بعد پہلے گناہوں کی باز پرس نہیں اور ادھر آپ مسلمانوں کو قتل کرا رہے ہیں۔

مسئلہ: طبری نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ظاہری احکام پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے کسی کے باطنی امور پر اپنی مخلوق کو ذاتی علم نہیں دیا گیا ہاں خود اللہ تعالیٰ نے اگر کسی کو مطلع فرما دیا تو یہ اس کی عطا سے علم حاصل ہوا تو اس سے یہ واضح ہو گیا کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ظاہری احکام پر ہی عمل کریں اگر کوئی کہتا ہے مسلمان ہوں تو اسے مسلمان سمجھ کر اس سے مسلمانوں والا سلوک کیا جائے اس کی موت پر نماز جنازہ پڑھی جائے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے اس کے اندرونی حالات کیا ہیں ان کو رب تعالیٰ کے سپرد کر دیا جائے۔ (از قرطبی)

﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴾

☆ اور جو ان سے کہا جائے زمین میں فساد نہ کرو تو کہتے ہیں ہم تو سنوارنے والے ہیں۔

☆ اور جب ان سے کہا جاتا زمین میں فساد نہ پھیلاؤ تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح کرنے والے ہی ہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ: "اذا" ظرف ہے زمانہ استقبال کیلئے استعمال ہوتا ہے شرط والا معنی زیادہ طور پر

پایا جاتا ہے یقینی امور پر استعمال ہوتا ہے یا جن کا وقوع راجح ہو ان پر استعمال ہوتا ہے۔ (ابو سعود)

"قیـــل" اصل میں "قول" ہے ماضی مجہول ہے اسکا فاعل "اللہ تعالیٰ" ہے یا "رسول اللہ ﷺ" ہیں یا "مومنین" ہیں یہ مختلف قول ہیں۔ تاہم علامہ رازی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ سب ہی احتمال درست ہیں مومن بھی ان کو کہتے تھے فساد نہ پھیلاؤ رسول اللہ ﷺ بھی ان کو یہی فرماتے کہ فساد نہ پھیلاؤ اور اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو یہی فرمایا۔ (از کبیر)

لَا تُفْسِدُوْا: فساد سے لیا ہوا "الفساد خروج الشئی عن الاعتدال والصلاح ضده" اور فساد کا معنی یہ ہے کہ کسی چیز کا اعتدال سے نکل جانا اور اسکی ضد کو صلاح کہا جاتا ہے یعنی کسی چیز کا اعتدال میں رہنا "صلاح" ہے "وکلهما یعمان کل ضار ونافع" پھر ان دونوں لفظوں کا استعمال عام ہوگیا ہے یعنی ہر نقصان دہ چیز کو "فساد" کہہ دیا جاتا ہے اور ہر نفع مند چیز کو صلاح کہا جاتا ہے۔ (از بیضاوی)

اِنَّمَا: حصر کے لئے آتا ہے یعنی یہ "ما، الا" کے معنی کو متضمن ہوتا ہے اس کا معنی کیا جاتا ہے سوائے اس کے کہ نہیں۔ (از بیضاوی)

منافقوں کا فساد: رب تعالیٰ کے کلام میں کیسی جامعیت ہے کیسا فصیح کلام ہے کہ ایک لفظ کتنے معانی کو شامل ہے صرف ایک لفظ ذکر کر کے کتنے معانی اس سے مراد لئے ہیں تفصیل ملاحظہ ہو:

(ا) "لا تفسدوا فی الارض من افراطكم فی الشهوية والغضبية وتفريطكم فی الحكمية بترك الانقياد للشرائع التی بها انتظام امرا لدارين وتحقق الانسانية" (تبصیر الرحمن)

زمین میں افراط وتفریط سے فساد نہ پھیلاؤ جانوروں کی طرح خواہشات نفسانیہ میں مبتلا ہونا اور درندوں کی طرح قوۃ غضبیہ میں مبتلا ہونا افراط ہے اور یہ ذریعہ فساد ہے تم انسان ہو کر حیوانوں اور درندوں کی طرح اپنے آپ کو کیوں بنا رہے ہو۔

حکمت والے کاموں میں کوتاہی کرنا تفریط ہے یہ بھی ذریعہ فساد ہے وہ حکمت والے کام کیا ہیں؟ وہ یہ ہیں کہ شرعی احکام یعنی اوامر ونواہی کی پابندی کی جائے جن پر دینا اور آخرت کے نظام کی دارومدار ہے اور ان پر چلنا ہی انسان کو انسانیت کا سبق دیتا ہے ان میں کوتاہی کرنا ان کو چھوڑنا تفریط ہے

گویاان کو کہا گیا ہے کہ تفریط کے ذریعے فساد نہ پھیلاؤ۔

(۲) " لا تفسدوا فی الارض بمخادعة المؤمنين " مسلمانوں کو دھوکہ دے کر زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔ چونکہ منافقین مسلمانوں کے خلاف کفار کی امداد کرتے تھے اور مسلمانوں کے راز ان پر افشاء (ظاہر) کرتے تھے جن کی وجہ سے لڑائیاں اور فتنے برپا ہوتے ان کی ان حرکات اور فتنوں، لڑائیوں کی وجہ سے لوگ، جانور، کھیتیاں سب ہی متاثر ہوتے تو ان کو کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کو دھوکہ دے کر فساد نہ پھیلاؤ۔ اس لئے کہ تمہارے اس عمل سے لوگ مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں جانور قتل ہوتے ہیں یا کھیتیوں کے برباد ہونے کی وجہ سے انسان اور جانور بھوک میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان کو کھانے کی اشیاء میسر نہیں ہوتیں۔

(از بیضاوی)

(۳) " لا تفسدوا فی الارض بمدارة الكافرين " کافروں سے محبت کر کے زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔ چونکہ منافقین کفار سے محبت کرتے تھے ان کی طرف ہی ان کا میلان تھا ان کے ساتھ ہی میل جول رکھتے قلبی طور پر یہ لوگ کفر کی طرف ہی مائل تھے اگر چہ بظاہر مسلمان تھے یہ خیال کرتے تھے کہ ہم اس طرح رسول اللہ ﷺ اور انصار کو نقصان پہنچا سکیں گے ان کے اس طریقہ سے کافروں کو جرات ملتی کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے عداوت کو ظاہر کرتے لڑائیاں قائم کرتے اپنے خیال میں نبی کریم ﷺ پر غلبہ حاصل کرنے کی طمع میں ہوتے۔ گویا کہ کفار سے منافقین کی محبت فساد عظیم تھا اس سے ان کو منع کیا گیا کہ کفار سے محبت کر کے فساد نہ پھیلاؤ۔ (از کبیر) رب تعالیٰ نے بیان فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِى الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ﴾

"اور کافر آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں ایسا نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد ہوگا"

یعنی مسلمانو! اگر تم نے آپس میں ایک دوسرے کی امداد نہ کی تو کافر سب ایک ہو کر تمہیں نقصان دینے کی کوشش کریں گے جو بہت بڑا فساد ہوگا جب کہ کفار سے محبت فساد ہے تو یہی وجہ ہے کہ رب تعالیٰ نے مومنوں کو کافروں سے محبت کرنے سے منع کیا اور ارشاد فرمایا:

﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴾

"اے ایمان والو کافروں کو دوست نہ بناؤ مسلمانوں کے سوا کیا یہ چاہتے ہو کہ اپنے

اوپر کے لئے صریح حجت کرلو یعنی کافروں سے محبت کر کے اپنے آپ کے لئے منافقت پر واضح دلیل نہ بنالو'' (از ابن کثیر وخزائن العرفان)

(۴) ''لا تفسدوا فی الارض بکتمان الکفر'' اپنے کفر کو چھپا کرزمین میں فساد نہ پھیلاؤ کیونکہ وہ چھپ چھپ کر نبی کریم ﷺ کی تکذیب کرتے اسلام کا انکار کرتے اور لوگوں کے دلوں میں اسلام کے خلاف شبہات ڈالتے لوگوں کو اسلام سے دور کرنے کے لئے ہی تو وہ نام کے مسلمان بنے بیٹھے تھے لیکن در پردہ اسلام کے خلاف کام کر کے فساد پھیلا رہے تھے رب تعالیٰ نے ان کو اس حرکت سے منع کیا۔ (از کبیر) آج بھی منافقین کی علامات رکھنے والوں کی کوئی کمی نہیں لیکن انشاءاللہ وہ اپنے مکر میں کامیاب نہیں ہوں گے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''الاسلام یعلو ولا یعلی'' اسلام بلند ہے پست نہیں یعنی اسلام کے خلاف یہودیت ونصرانیت کی پرچار کرنے والے کبھی اسلام پر غلبہ حاصل نہیں کرسکیں گے۔

(۵) ''ان المراد بالفساد فی الارض اظهار معصیة الله تعالیٰ'' فساد سے اللہ تعالیٰ کی معصیت کرنا یعنی منافقین کو کہا گیا ہے کہ تم گناہوں کے مرتکب ہو کر زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔ اس لئے کہ شرعی احکام پر عمل کرنے سے ہر شخص درست راہ پر چلتا ہے کسی پر کوئی ظلم نہیں کرتا ناحق خون نہیں بہایا جاتا فتنے نمودار نہیں ہوتے تو اس طرح زمین میں بہتری ہوتی ہے اس کے رہنے والے بہتر راہ پر چل رہے ہوتے ہیں ''لان اصلاح الارض والسماء بالطاعة'' اس لئے کہ زمین اور آسمان کی اصلاح رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طاعت سے حاصل ہوتی ہے:

''فان الاخلال بالشرائع والاعراض عنها ممایوجب الهرج والمرج ویخل بنظام العالم''

''لیکن شریعت کے احکام پر عمل نہ کرنا ان میں خلل پیدا کرنا اور ان سے اعراض کرنا نظام عالم میں خلل پیدا کرتا ہے اور اس سے قتل وغارت فتنہ وفساد برپا ہوتا ہے'' (از کبیر، ابن کثیر، بیضاوی)

''هرج ومرج'' کا معنی ''قتل وغارت، فتنہ وفساد ہے'' جیسا کہ علامات قیامت کا ذکر جس حدیث پاک میں ہے اس میں ذکر ہے ''ویکثر الهرج وهو القتل'' قیامت سے پہلے کثیر ہرج پایا جائے گا راوی نے خود ''هرج'' کا معنی بیان کردیا کہ اس سے مراد ''قتل'' ہے۔

گناہوں کی وجہ سے نظامِ عالم کی بربادی:

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْا اَرْحَامَكُمْ ﴾

تو کیا تمہارے یہ لچھن نظر آتے ہیں کہ اگر تمہیں حکومت ملے تو زمین میں فساد پھیلاؤ اور اپنے رشتے کاٹ دو یعنی رشوتیں لو، ظلم کرو، آپس میں لڑو، ایک دوسرے کو قتل کرو۔" (خزائن العرفان)

اس آیۂ کریمہ سے واضح ہوا کہ معاصی فتنہ وفساد کا سبب ہیں ان سے رشتوں کے تعلقات منقطع ہو جاتے ہیں نظامِ عالم برباد ہو کر رہ جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِى النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِىْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾

"ظاہر ہوئی خرابی خشکی اور تری میں ان برائیوں کی وجہ سے جو لوگوں نے کیں تاکہ ان کو بعض کرتوتوں کا مزہ چکھائے کہیں وہ باز آئیں"

لوگوں کے شرک اور گناہوں کی وجہ سے خشکی اور تری طوفان آتے ہیں زمین میں فصل نہیں اگتے دریاؤں کا پانی نمکین ہو جاتا ہے چشموں کا پانی خشک ہو جاتا ہے ہر قسم کا فساد برپا ہو جاتا ہے۔ (از کبیر)

رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ﴾

"اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں اس کے خوشحالوں پر احکام بھیجتے ہیں پھر وہ اس میں فسق کرتے ہیں تو اس پر بات پوری ہو جاتی ہے تو ہم اسے تباہ کر کے برباد کر دیتے ہیں"

مطلب آیۂ کریمہ کا واضح ہے کہ امیر لوگ، خوشحال جب اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے شہروں اور ملکوں کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔

قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ: "تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح کرنے والے ہی ہیں"

یعنی جب ان کو کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ پھیلاؤ تو وہ اس کے جواب میں کہتے ہیں ہم

تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں وہ اپنے فساد کو اپنے باطل گمان کے مطابق اصلاح سمجھتے ہیں وہ کافروں کی معاونت کرنے کے باوجود اور مسلمانوں کے راز افشا کرنے کے باوجود کہتے یہ ہیں کہ ہم مومنوں اور کافروں کے درمیان صلح کرانے والے ہیں۔ (از قرطبی)

انہوں نے فساد کو اصلاح سے اس لئے تعبیر کیا تھا کہ ان کے دلوں میں مرض تھی یوں سمجھیں جس طرح مریض کسی چیز کے ذائقہ کو الٹا سمجھ لیتا ہے اسی طرح وہ دل کے مریض ہونے کی وجہ سے فساد کو اصلاح کرر ہے تھے۔

جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ﴾ تو کیا وہ جسکی نگاہ میں اسکا برا کام آراستہ کیا گیا کہ اس نے اسے بھلا سمجھا (ہدایت والے کی طرح ہو جائے گا؟) "انما" سے انہوں نے اپنے دعویٰ کو بڑا زور دے کر صحیح کرنے کی کوشش کی کہ سوائے اصلاح کے ہمارا تو اور کوئی مقصد ہی نہیں۔

﴿ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴾

"سنتا ہے وہی فسادی ہیں مگر انہیں شعور نہیں"

"خبردار بیشک وہی فساد پھیلانے والے ہیں لیکن ان کو شعور نہیں"

منافقین نے جب اپنے آپ کو اصلاح کرنے والا بیان کرنے پر زور دیا تاکید سے بیان کیا تو رب تعالیٰ نے بھی ان کے دعویٰ کو بہت ہی تاکید سے رد کیا پہلے فرمایا "الا" اس میں بھی تاکید کا معنی پایا جاتا ہے کیونکہ اس میں ہمزہ استفہام انکاری کے لئے ہے حرف نفی پر داخل ہے جس طرح "اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقَادِرٍ" کیا اس پر قادر نہیں؟ یعنی یقیناً وہ قادر ہے اسی طرح "الا" کا معنی بھی اصل میں یہ ہے کیا نہیں اور مراد یہ ہے کہ ہاں یقیناً ہے۔ پھر "الا" کو تنبیہ کے لئے استعمال کرتے ہیں معنی کر لیا جاتا ہے "خبردار" اس میں اصل مراد یہ ہوتی ہے "خبردار غور سے سنو" اسی لئے اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا ہے "سنتا ہے" "الا" یا کوئی بھی حرف نفی ہو جس پر ہمزہ استفہام داخل ہو اس کے بعد آنے

والا جملہ یا تو قسم سے شروع ہوتا ہے یا اس میں قسم کی طرح پختگی پائی جاتی ہے۔

اسی وجہ سے جملہ کو "ان" سے شروع کیا گیا جو تحقیق کا معنی دیتا ہے اس کا ترجمہ ہی ''تحقیق'' یا ''بیشک'' ہوتا ہے پھر خبر کو معرفہ ذکر کر کے مبتدا (یعنی اسم ان) اور خبر کے درمیان "ھم" ضمیر فصل ذکر کے اور تاکید پیدا کر دی یعنی جب منافقین نے کہا ہم تو اصلاح کے بغیر کچھ کرتے ہی نہیں ہمارا مقصد تو صرف اصلاح ہی اصلاح ہے۔ تو رب تعالیٰ نے بھی ان کا رد ان کے کلام سے بھی زیادہ پختہ کیا اور گویا کہ یوں فرمایا خبردار غور سے سنو تحقیق اس میں کوئی شک نہیں وہی فساد پھیلانے والے ہیں۔ یعنی ان کا کوئی کام فساد کے بغیر ہے ہی نہیں ان کا اپنے آپ کو مصلح کہنا ایسا ہی ہے جیسا وہ اپنے آپ کو مومن کہتے ہیں حالانکہ حقیقت میں نہ ہی وہ مومن ہیں اور نہ ہی وہ مصلح ہیں۔

وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ : ''لیکن ان کو شعور ہی نہیں''

یہاں شعور کی نفی کر کے یہ بتایا کہ وہ امور محسوسہ میں فساد پھیلاتے ہیں لیکن انکی حس ہی نہیں کہ انہیں پتہ چل سکے کہ ہم تو فساد پھیلا رہے ہیں (ابو سعود) ان کے شعور کی نفی کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ:

" انهم لم يصلوا الى رتبة البهائم فان البهائم تمتنع من المضار فلا تقربها لشعورها بخلاف هؤلاء "

(صاوی)

بیشک وہ چوپاؤں کے مرتبہ کو بھی نہیں پہنچے ہوئے کیونکہ چوپائے نقصان دہ چیز سے رک جاتے ہیں اس کے قریب نہیں جاتے کیونکہ ان کو شعور ہوتا ہے بخلاف منافقین کے کہ ان کو شعور ہی نہیں وہ نقصان دہ چیز کو نفع مند سمجھتے ہیں۔

خیال رہے کہ ہمارے معاشرہ میں کسی کو بے وقوف کہنا ہو تو اسے گدھا کہہ دیا جاتا ہے کہ اس میں شرم وحیا نہیں یا اسے اونٹ کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ پیشاب اپنی ٹانگوں پر ہی کرتا رہتا ہے۔ لیکن منافقین یا ان کی علامات رکھنے والے ان کے ہمنوا لوگوں کو گدھا یا اونٹ کہنا بھی غلط ہوگا کیونکہ وہ تو جانوروں سے بھی گئے گزرے ہوئے ہیں جب ان میں حیوانیت ہی نہیں تو انسانیت کیا ہوگی۔

مطلب واضح ہوگیا: یعنی جب منافقین کو مومنوں نے اور رسول اللہ ﷺ نے اور اللہ تعالیٰ

نے فرمایا اے منافقو! کافروں سے محبت کر کے کافروں سے میل جول رکھ کر گناہوں میں مبتلا ہو کر اپنی خواہشات کے مطابق افراط و تفریط کر کے اوپر سے اور اندر سے اور بن کر لوگوں کے دلوں میں اشتباہ پیدا کر کے فساد نہ پھیلاؤ تو انہوں نے کہا ہمارے یہ طریقے صرف مومنین اور کفار یا مؤمنین اور اہل کتاب کے درمیان صلح کرانے کے لئے ہیں صلح کرانے کے بغیر ہمارا کوئی مقصد ہی نہیں۔ رب تعالیٰ نے ان کا رد اس انداز پر فرمایا کہ وہ تو حواس ہی نہیں رکھتے چوپاؤں سے بھی گئے گزرے ہوئے ان کو نفع نقصان کے درمیان فرق کرنے کا شعور ہی نہیں وہ فساد کو اصلاح سمجھ رہے ہیں حالانکہ حقیقت میں وہ ہی فساد پھیلانے والے ان کا فساد ہونا شک و شبہ سے بالاتر ہے۔

فائدہ: " وما روی عن سلمان ان اهل هذه الآية لم يأتوا بعد فلعله اراد به ان اهله ليس الذين كانوا فقط. بل وسيكون من بعد حاله حالهم " (بیضاوی)

" حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے جو روایت آتی ہے کہ اس آیۃ کے اہل ابھی نہیں آئے اس سے مراد یہ ہے کہ اس آیت کے اہل صرف یہی لوگ نہیں جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے ہیں بلکہ ابھی جو نہیں آئے بلکہ بعد میں آئے ہیں وہ بھی ان کی طرح ہی ہوں گے "

یعنی اگرچہ خالص منافقین تو صرف نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں ہی ہوتے ہیں لیکن ان کی طرح کام کرنے والے ہر زمانہ میں آتے رہیں گے جو فساد کو اصلاح کہیں گے لیکن وہ چوپاؤں سے بھی زیادہ گئے گزرے ہوں گے۔ قارئین کرام حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کی روایت کو دیکھ کر خود ہی انصاف کریں کیا ہمارے زمانہ میں ہمارے ملک میں وہ لوگ نہیں جو یہود، نصاریٰ اور ہنود کے ایجنٹ ہیں؟ یقیناً ایسے لوگوں کی کوئی کمی نہیں اوپر سے مسلمان ہیں لیکن وہ کام غیر مسلموں کا کرتے ہیں ملک کو اسلام کو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا کوئی وقت ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ان کی معاونت کافروں سے ہوتی ہے مسلمانوں کے راز ان پر افشاء کرتے ہیں کیا ہمارے ملک میں ایسے لوگ نہیں جو کافروں سے محبت رکھتے ہوں ان کے دین کو پسند کرتے ہوں ان کے اطوار (طور طریقہ) کے دلدادہ ہوں؟ یقیناً ایسے لوگوں کی بھی کوئی کمی نہیں۔ کیا ہمارے ملک میں ایسے لوگ نہیں جو بظاہر مسلمان بن کر اسلام کے احکام پر

اعتراض کرتے ہوں انگریز کے قوانین پر چلتے ہوں حاکم کے اشاروں پر ان کے فیصلے ہوتے ہوں؟ یقیناً ایسے لوگوں کی بھی کوئی کمی نہیں۔ کیا ہر طرح کی برائیوں کے مرتکب لوگ کچھ کم ہیں جن کی برائیوں کی وجہ سے ملک کا نظام تباہ و برباد ہو رہا ہے؟ یقیناً ایسے لوگوں کی بھی کوئی کمی نہیں۔ منافقین کی طرف پر کام کرنے والے ہمارے ملک میں کثیر تعداد میں ہیں جو فساد پھیلانے کو اصلاح کہتے ہیں۔

﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴾

''اور جب ان سے کہا جائے ایمان لاؤ جیسے اور لوگ ایمان لائے ہیں تو کہیں کیا ہم احمقوں کی طرح ایمان لے آئیں سنتا ہے وہی احمق ہیں مگر نہیں جانتے''

''جب ان سے کہا جاتا ہے ایمان لاؤ جیسا کہ ایمان لائے ہیں اور لوگ تو وہ کہتے ہیں کیا ہم ایمان لائیں ایسا جیسا کہ بے وقوفوں نے ایمان لایا ہے خبردار بیشک وہی بے وقوف ہیں لیکن وہ جانتے نہیں''

یعنی منافقین کو جب یہ کہا جاتا کہ تم بھی ایسا ایمان لاؤ جیسا کہ دوسرے مومن لوگوں نے ایمان لایا کہ وہ مخلص ایمان والے ہیں تو ان کی طرف سے جواب ہوتا کہ وہ تو صرف ایک طرف کے ہو کر بے وقوف ہیں رب تعالیٰ نے ان کا رد بڑی تاکید سے فرمایا خبردار غور سے سنو اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ بے وقوف صرف وہی لوگ ہیں۔ " الناس " پہ الف لام جب جنسی ہو تو معنی ہوگا:

" الكاملون في الانسانية العاملون بقضية العقل "

''وہ لوگ جو انسانیت میں کامل ہیں اور عقل کے تقاضا کے مطابق کام کرتے ہیں''

انسان کامل اس وقت ہوتا ہے جب رذیل کاموں کو چھوڑ دے اور اچھے کام کرے اس لئے پہلے حکم دیا گیا ﴿لَا تُفْسِدُوْا﴾ فساد نہ پھیلاؤ یعنی ہر قسم کے گھٹیا کام جو فساد کا ذریعہ ہیں ان کو چھوڑ دو پھر

حکم دیا " آمنو " ایمان لاؤ یعنی اچھے کام کر کے اور برے چھوڑ کر اپنے آپ کو کامل انسان بنالو الف لام جنسی اگر چہ مطلقاً جنس اور ذات کے لئے بھی بولا جاتا ہے لیکن کبھی معانی مخصوصہ اور مقصودہ پر بھی بولا جاتا ہے اسی وجہ سے غیر سے نفی بھی ہوتی ہے اب معنی یہ ہوگا کہ جب ان کو کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ جیسا کہ ان لوگوں نے ایمان لایا جو کامل انسان ہیں یعنی انسان کہلانے کے وہی حقدار ہیں ان کے بغیر دوسرے انسان کہلانے کے حقدار ہی نہیں ۔ اس سے واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں صرف صحابہ کرام جنہوں نے نبی کریم ﷺ پر خلوص سے ایمان لایا وہی انسانیت کے درجہ میں تھے آپ پر ایمان نہ لانے والے انسانیت سے ہی دور تھے۔

☆ " النـــاس " پر الف لام اگر عہد خارجی ہو تو خاص معین لوگ مراد ہوں گے یعنی نبی کریم ﷺ اور آپ کے ساتھ صحابہ کرام اب معنی یہ ہوگا کہ جب ان کو کہا جاتا ہے ایمان لاؤ جیسا کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر اور فرشتوں اور آسمانی کتابوں اور رسولوں اور قیامت اور جنت اور دوزخ پر ایمان لایا یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم ﴿وَاَطِیْعُوْا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ " (اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو) کو کامل طور پر تسلیم کیا اور اسے بجالایا۔

☆ " النـــاس " پر الف لام عہد خارجی ہی مان کر اس سے مراد حضرت عبداللہ ابن سلام اور ان کے دوسرے ساتھی ایمان لانے والے ہوں گے اب مطلب یہ ہوگا کہ جب ان کو کہا جاتا ہے تم ایمان لاؤ جیسا کہ تمہارے ساتھی یعنی اہل کتاب میں سے ہی حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی ایمان لائے۔

(از بیضاوی ،شیخ زادہ ، ابن کثیر)

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ :

"وہ کہتے ہیں ہم ایمان لائیں ایسا جیسا کہ ایمان لایا بے وقوف لوگوں نے"

یعنی جو لوگ انسانیت میں کامل تھے انسان کہلانے کے حقدار ہی صرف وہ تھے ان کو منافقوں نے بے وقوف کہا اس کی دو وجہ تھیں ایک یہ کہ وہ بہت زیادہ جاہل تھے ان کا کفر واضح تھا ان کی نظر سوچ میں خلل تھا ان کے اعتقادات باطل تھے انہوں نے یہ سمجھا حق پر صرف ہم ہی ہیں اس کے سوا سب کچھ باطل ہے جو ہمارے نظریات کے خلاف ہوگا وہ سفیہ (بے وقوف) ہوگا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ غنی

تھے مال و دولت کے مالک تھے اور صحابہ کرام میں سے اکثر غریب لوگ تھے کئی آزاد کردہ غلام تھے وہ ان کو (معاذ اللہ) حقیر سمجھ کر بے وقوف کہا کرتے تھے (از بیضاوی و شیخ زادہ) " السفاهة اى خفة العقل وقيل من تعمد الكذب " سفاہت کا معنی عقل کی کمی بعض نے کہا جان بوجھ کر جھوٹ بولنا بھی سفاہت ہے۔

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ : ''خبردار بیشک وہی بے وقوف ہیں''

اللہ تعالیٰ نے بہت تاکید سے ان کا رد کیا اور کہا کہ بے وقوف تو وہ خود ہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ کے معجزات کو دیکھ کر ان کا ایمان نہ لانا پھر اہل کتاب سے منافقین کا تورات کو پڑھنا نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو جاننے کے باوجود ایمان نہ لانا نبی کریم ﷺ کی نبوت کا انکار کرنا صرف اس وجہ سے تھا کہ ان کی عقلیں ان کو چھوڑ چکی تھیں " فما اصبرهم على النار " اس سے بڑھ کر ان کی بے وقوفی کیا ہوگی کہ وہ اپنے آپ کو آگ کا مستحق بنا رہے تھے۔

وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ :

" يعنى ومن تمام جهلهم انهم لا يعلمون بحالهم فى الضلالة والجهل وذلك اردى لهم وابلغ فى العمى والبعد عن الهدى "

''لیکن وہ جانتے نہیں'' یعنی وہ اتنا زیادہ جاہل ہیں ان کو کامل طور پر جہالت حاصل ہے کہ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ ہم گمراہ ہیں اور جاہل ہیں یہ ان کا گھٹیا حال ہے یہ ان کے اندھا ہونے میں کامل درجہ کا حال ہے یہ ان کے ہدایت سے دوا ہونے کے وجہ سے۔ یعنی قانون یہ ہے کہ جو جاہل ہو اور اپنے آپ کو عالم سمجھے اپنی جہالت کا علم نہ رکھے اس حال کا نام ''جہل مرکب'' ہے تو منافقین میں سے ہر شخص جاہل مرکب تھا۔ علامہ محقق جلال الدین دوانی رحمہ اللہ نے اخلاق جلالی میں جاہل کی تعریف ان الفاظ سے کی ''ہر کس کہ داند نہ داند'' جو شخص اپنے نہ جاننے کو جانے وہ تو جاہل ہے لیکن ''ہر کس کو نہ داند نہ داند'' ہر وہ شخص جو اپنے نہ جاننے کو نہ جانے وہ جاہل مرکب ہے۔ ایسے شخص کا کوئی علاج نہیں اس کو سمجھانا ممکن نہیں وہ ضال اور مضل تو ہو سکتا ہے لیکن اس کو ہادی ماننا حماقت ہے۔

تنبیہ : اس سے واضح ہوا کہ صحابہ کرام اور نبی کریم ﷺ کے گستاخ منافقین تھے جنہوں

نے ان پاک ہستیوں کو بے وقوف کہا تھا جو کامل انسان تھے بالکل اس وقت صرف وہی انسانیت کے درجہ کو حاصل کرنے والے تھے ان لوگوں نے خود تو صبر سے کام لیا جاہل، منافق، بے وقوف لوگوں کو کوئی جواب نہ دیا لیکن رب تعالیٰ نے ان کی طرف سے جواب دیا گویا یوں کہا خبر دار غور سے سنو بغیر کسی شک اور تردد کے اس بات پر یقین کرلو کہ بے وقوف تو وہ خود ہیں لیکن اپنی جہالت اپنی حماقت اپنی گمراہی اپنے اندھاپن اپنے ہدایت سے دور ہونے کو بھی نہیں جانتے۔

خدارا انصاف کیجئے حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت امیر معاویہ، حضرت عائشہ صدیقہ اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کا گستاخ کیا جاہل مرکب نہیں کیا بے وقوف نہیں جو گمراہ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو عالم سمجھے بیٹھا ہے کیا شور وغل کرنے کا نام علم ہے کیا جھوٹا شخص عالم ہوسکتا ہے کیا علامات منافقین رکھنے والا عالم ہوسکا ہے کیا دوسرے لوگوں کو گمراہ کرنے والا انسانیت کا درجہ حاصل کرسکتا ہے؟ نہیں نہیں یقیناً نہیں بلکہ وہ انسانیت سے دور ہے ایسے شخص کو مدتے سے بھی تشبیہ نہ دی جائے بلکہ گدھا اس سے اچھا ہے ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے ضمن میں آتا ہے۔ ﴿اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ﴾ وہ لوگ چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔ اسی طرح گستاخ انبیاء کرام گستاخ اہل بیت اطہار گستاخ اولیاء کرام شخص بھی وہی درجہ رکھتا ہے جو صحابہ کرام کے گستاخ کا حال ہے خدارا اپنی عاقبت کو برباد نہ کرو صحابہ کرام اور اہل بیت اطہار کے محب بن جاؤ انبیاء کرام اور اولیاء کرام کے محب بن جاؤ اسی میں دین و دنیا میں کامیابی ہے۔

علماء کرام متوجہ ہوں: جب منافقوں کو صحابہ کرام نے نصیحت کے طور پر کہا کہ تم لوگ راہ راست سے دور ہو کر غلط کاموں کا ارتکاب کر کے فساد پھیلا رہے ہو ایسا نہ کرو بلکہ اچھے کام کرو ظاہر و باطن میں مومن بنو کامل ایمان والے تب ہی ہو گے جب تم اچھے کام کرو گے "فکان من جوابهم ان سفهوهم لتمادی جهلهم" وہ لوگ اپنی کامل جہالت کی وجہ سے مخلص ایمان والے لوگوں کو یعنی صحابہ کرام کو بے وقوف کہنے لگے "وفيه تسلية للعالم مما يلقى من الجملة" اس میں علماء کے لئے تسلی ہے کہ اگر تمہیں جاہلوں کی طرف سے اس قسم کے الفاظ سننا پڑیں تمہیں لوگ بے وقوف کہیں تمہیں لوگ جاہل کہیں تو یہ خیال کرنا کہ تم صحابہ کرام سے تو بڑے نہیں ہو جب ان کو بے وقوف کہہ دیا

گیا تھا تمہیں جاہل بے وقوف کہنا کون سا عجیب کام ہے (از مدارک) ہاں اتنا سمجھ لینا کہ تمہیں بے وقوف کہنے والے درحقیقت خود ہی بے وقوف ہیں۔ ہیں تو احمق، ہیں تو سفیہ، ہیں تو جاہل مرکب لیکن اپنے آپ کو پڑھا لکھا سمجھتے ہیں کہ ہم تو ڈاکٹر ہیں۔ ہاں ہاں رئیس المنافقین عبداللہ ابن ابی بھی اسلام کے خلاف ڈاکٹریٹ کی اعلیٰ ڈگری رکھتا تھا علماء کرام کبھی اس کی طرف بھی آپ نے توجہ کی کہ انبیاء کرام کو تو ''مجنون'' پاگل تک کہہ لیا گیا تھا کیا تمہیں نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی یاد نہیں ''العلماء ورثۃ الانبیاء'' علماء انبیاء کرام کے وارث ہیں۔ جب تم انبیاء کرام کے وارث ہو تو تمہیں انبیاء کرام کی طرح جہلا کا سامنا بھی کرنا پڑے گا ان کے بیہودہ الفاظ بھی سننے پڑیں گے صرف اسی پر اکتفا نہیں ہو گا بلکہ تمہیں گھسیٹا بھی جائے گا تم پر پتھر بھی برسائے جائیں گے۔ تمہیں انبیاء کرام کی طرح صبر کرنا ہو گا رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے بیان کو جاری رکھنا پڑے گا۔

﴿ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴾

''اور جب ایمان والوں سے ملیں تو کہیں ہم ایمان لائے اور جب اپنے شیطانوں کے پاس اکیلے ہوں تو کہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو یوں ہی ہنسی کرتے ہیں''

''اور جب وہ ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب لوٹتے ہیں اپنے شیطانوں کی طرف تو کہتے ہیں بیشک ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو ان سے ٹھٹھہ ہی کرتے ہیں''

شانِ نزول: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ آیۃ کریمہ عبداللہ ابن ابی منافق اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ یہ ایک مرتبہ گھروں سے نکلے ان کا سامنا صحابہ کرام میں سے کچھ افراد سے ہو گیا عبداللہ ابن ابی نے اپنے ساتھیوں سے کہا ''دیکھو میں ان لوگوں کو کیسے بے وقوف بناتا ہوں'' یہ کہا اور اس نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کو پکڑا اور کہنے لگا مرحبا۔

صدیق بنو تیم کے سردار شیخ الاسلام غار میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہنے والے اپنی جان اور اپنا مال رسول اللہ ﷺ پر قربان کرنے والے پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کو پکڑ کر کہنے لگا مرحبا اے بنو عدی بن کعب کے سردار فاروق اللہ کے دین میں قوی، بہادر اور اپنے مال اور اپنی جان کو رسول اللہ ﷺ پر قربان کرنے والے۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کو پکڑ کر کہنے لگا، مرحبا اے رسول اللہ ﷺ کے چچا کے بیٹے اور آپ کے داماد اور رسول اللہ ﷺ کے ماسوا بنو ہاشم کے سردار حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے کہا " اتق اللہ یا عبد اللہ و لا تفافق " اے عبداللہ، اللہ سے ڈر اور منافقت نہ کر اس لئے کہ منافقین اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق سے شر (زیادہ برے اور شریر) ہیں یہ کہنے لگا اے ابوالحسن (حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کنیت) رک جائیں یعنی ہمیں منافق نہ کہیں میں منافقت سے یہ نہیں کہہ رہا بلکہ اللہ کی قسم ہمارا ایمان تمہارے ایمان جیسا ہے ہماری تصدیق تمہاری تصدیق جیسی ہے پھر یہ لوگ صحابہ کرام سے علیحدہ ہو گئے یہ اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا دیکھا ہے تم نے میں نے ان سے کیا کہا یعنی ان کو کیسے بے وقوف بنایا ان سب نے اس کی تعریف کی تم نے بہت کمال کیا ہے (خازن) لیکن تعجب ہے ان کی بے وقوفی پر کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب ان کو واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ تم منافق ہو تم اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے بدترین ہو تو پھر اس کا یہ کہنا کیسے کہ دیکھا تم نے میں نے کیا کیا اور ان لوگوں کا اس کی تعریف کرنا اور یہ کہنا کہ تم نے تو کمال ہی کر دی یہ سب ان کی بے وقوفی کی علامت تھی۔

" لَقُوْا ": اصل میں میں " لقیوا " ہے بعض قراءتوں میں " لا قوا " ہے معنی اس کا، ملاقات کرنا اور جب وہ ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں " آمنا " ہم ایمان لائے اس سے مراد ان کا صرف زبان سے ایمان لانا مراد نہیں بلکہ دل سے خلوص کے ساتھ ایمان لانا مراد ہے کیونکہ ان کا زبانی ایمان تو مؤمنین کو پہلے ہی معلوم تھا یہ بتانے کی انہیں ضرورت نہیں تھی اسی طرح کافروں سے جب وہ ملتے تو ان کے ساتھ ہونے کا ذکر کرنے سے ان کی مراد یہی ہوتی ہے کہ وہ دل سے کافر ہیں صرف ظاہری طور پر ایمان والوں سے ملتے جلتے ہیں جب ایمان والوں سے ملتے تھے تو یقیناً اس کی ضد ہی انہوں نے بیان کرنی تھی اب اس کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ ہم دل سے ایمان لائے ہیں ہم ایمان لانے میں مخلص ہیں۔ (از کبیر)

وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِہِمْ : " واذا خلوا الی رجعوا " (خازن) ایک معنی یہ ہے کہ جب وہ اپنے شیطانوں کیطرف لوٹتے ہیں دوسرا معنی ہے "مزاح اڑانا" جیسا کہ کہا جاتا ہے "خلوت بہ" میں نے اس سے مزاح اڑایا اب معنی یہ ہوگا کہ جب وہ اپنے شیطانوں کے پاس مسلمانوں کا مزاح اڑاتے ہیں تیسرا معنی صاحب کشاف نے کہا کہ کہا جاتا " خلوت بفلان " یا کہا جاتا ہے "خلوت الی فلان " اسکا معنی ہوتا ہے " انفردت معه " میں اس سے اکیلے میں ملا۔ (کبیر)

لیکن بعض حضرات نے کہا کہ یہ معنی لینے کے لئے " الی " کو باء کے معنی میں لینا پڑے گا جو ضعیف ہے (قرطبی) اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر چہ "علیحدگی میں ملنا" معنی لینا اسی وقت صحیح ہوسکتا ہے جب باء ذکر ہو لیکن " الی " کو "باء" کے معنی میں لے کر مبالغہ ثابت کیا گیا کہ وہ اپنے شیطانوں کے بہت ہی قریب ہو جاتے ہیں ایک قول یہ ہے کہ عبارت میں حذف پایا گیا ہے اصل عبارت اس طرح " واذا خلوا من المؤمنین الی شیاطینهم " اور جب وہ مومنوں سے لوٹ کر شیطانوں کی طرف جاتے ہیں۔

شیطانوں سے مراد کون لوگ ہیں؟

یا تو اس سے مراد کھلے کافر ہیں اور یا اس سے مراد منافقین کے سردار ہیں ان کو شیطان کہنے کی وجہ یہ ہے "شیطاطینهم الذین ماثلوا الشیاطین فی تمردهم " کہ وہ شیاطین کی طرح سرکش تھے اب مطلب یہ ہوگا کہ جب یہ اپنے شیطانوں سے علیحدگی میں ملتے ہیں یعنی منافقین جب کفار سے ملتے ہیں یا چھوٹے منافقین اپنے بڑے سرداروں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں بیشک ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ یعنی ہم تمہارے معاون ہیں ہم تمہارے دوست ہیں ہم تمہارے دین کے موافق ہیں ہماری تمام ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں۔

(از کبیر، مدارک)

علمی نکتہ : مسلمانوں سے مل کر کہتے ہیں " آمنا " یہ جملہ فعلیہ ہے جو تجدد پر دلالت کرتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اگر چہ پہلے مؤمن نہیں تھے لیکن اب خالص مومن ہیں اور کافروں سے جب علیحدگی میں ملاقات کرتے ہیں تو کہتے ہیں " انا معکم " یہ جملہ اسمیہ ہے جو دوام واستمرار پر دلالت کرتا

ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم پہلے بھی تمہارے ساتھ تھے اب بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ (مدارک)

اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُ وْنَ : مومنوں کے ساتھ مزاح اڑانے کے بغیر ہمارا کوئی کام ہی نہیں "انما" سے حصر کا فائدہ سمجھ میں آ رہا ہے۔ یعنی ہم محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں کے سامنے اسلام ظاہر کر کے ان کے شر سے بچ جاتے ہیں (معاذ اللہ) اور ان کے رازوں پر مطلع ہو جاتے ہیں ان سے مال غنیمت اور صدقات حاصل کر لیتے ہیں۔ (خازن)

" الاستهزاء السخرية و الاستخفاف" استھزاء کا معنی ہے مزاح اڑانا کسی کو گھٹیا سمجھنا

تنبیہ : کئی لفظ عربی میں استعمال ہوتے ہیں اور عربی میں بھی، لیکن ہر زبان کا استعمال اپنے اپنے انداز پر ہے:

" المزاح بضم میم ویکسر ثم المزاح انبساط مع الغیر من غیر ایذاء فان بلغ الا یذاء یکون سخرية " (مرقاة باب المزاح)

مزاح کی میم پر ضمہ (پیش) ہے یا کسرہ (زیر) ہے جب کوئی شخص دوسرے سے خوش طبعی کی کوئی بات کرے اسے گھٹیا نہ سمجھے ایذا (تکلیف) نہ پہنچائے اس میں کسی کی ذلت نہ ہو تو عربی میں اسے مزاح کہتے ہیں اور اگر کسی کو ایذا پہنچائی جائے تو اسے " سخرية " کہا جاتا ہے لیکن اردو میں مزاح میم کے فتحہ (زبر) سے استعمال ہے پھر جب کہا مزاح کرنا یہ عام ہے اچھے مزاح کو بھی کہا جاتا ہے اور برے کو بھی لیکن جب کہا جائے مزاح اڑانا تو یہ صرف گھٹیا پر بولا جاتا ہے استھزاء اور سخریہ تقریباً ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ خوش طبعی کے طور پر مزاح جائز ہے کسی کو ذلیل کرنے کے لئے مزاح یعنی استہزاء اور سخریہ (ٹھٹھہ کرنا) ناجائز ہے۔

☆☆☆

﴿برا مزاح گناہ ہے﴾

نبی کریم ﷺ نے فرمایا'' لا تمار اخاك ولا تمازحه '' اپنے بھائی کو حقیر نہ سمجھو جھگڑا نہ کرو اور مزاح نہ کرو 'لاتمار ، مماراۃ سے لیا ہوا جس کا مطلب ہے کسی کے کلام میں طعن پیش کرنا، کسی کے کلام میں خلل اور غلطیاں نکالنا اور اپنی برتری ظاہر کرنا اس میں اپنے دوسرے مسلمان بھائی کو تکلیف پہنچانا لازم آتا ہے اور ایسا شخص زیادہ طور پر جھوٹ بولتا ہے۔ دوسرے سے جھگڑا کرتا ہے جس سے منع کیا گیا۔

مزاح کی دو قسمیں ہیں: ایک یہ ہے کہ مزاح سے کسی کو ایذاء پہنچائی جائے اسے سخریۃ کہتے ہیں یہ ہر صورت میں ناجائز ہے۔

دوسری قسم مزاح کی یہ ہے کہ اس میں خوش طبعی پائی جائے کسی کو ایذاء نہ پہنچائی جائے۔ اس میں بھی زیادتی اور ہمیشگی منع ہے۔ کیونکہ کثرت مزاح سے کثیر ہنسی حاصل ہوگی اور کثیر ہنسنے سے دل میں سختی پیدا ہوتی ہے، دل کی سختی گویا کہ دل مردہ ہونے کے مترادف ہے، دل کے مردہ ہونے سے انسان اللہ تعالیٰ کے ذکر اور دینی معاملات میں تفکر سے دور ہو جاتا ہے۔

زیادہ مزاح کرنے سے انسان بعض اوقات تو دوسروں کو تکلیف دینے کا سبب بنتا ہے اور انسانوں کے درمیان کھوٹ، کینہ کا سبب بنتا ہے اس طرح زیادہ مزاح کرنے والے کا رعب و وقار ختم ہو جاتا ہے۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں'' من كثر ضحكه قل هيبته '' جو شخص زیادہ ہنسے اس کا رعب کم ہو جاتا ہے۔

'' من كثر كلامه كثر سقطه ومن كثر سقطه قل حياء ه ومن قل حياء ه قل ورعه ومن قل ورعه مات قلبه ''

جو شخص مزاحیہ کلام زیادہ کرنے کا عادی ہو جائے وہ زیادہ گھٹیا ہو جاتا ہے، جو شخص زیادہ گھٹیا ہو جائے اس کی حیاء میں کمی آ جاتی ہے، اور جس شخص کی حیاء میں کمی آ جائے اس کی نیکی اور تقویٰ میں کمی آ جاتی ہے، اور جس شخص کی نیکی اور تقویٰ میں کمی آ جائے، اس کا دل مردہ ہو جاتا ہے۔

حضرت وہیب بن ورد نے ایک قوم کو عید الفطر کے دن ہنستے ہوئے دیکھا تو آپ نے فرمایا اگر ان لوگوں کو اپنی مغفرت کا یقین ہو چکا ہے تو انہیں اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہونا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنے والے لوگ اس طرح نہیں ہنستے اور اگر ان لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ ہماری مغفرت نہیں ہوئی تو انہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنا چاہئے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنے والے لوگ بھی اس طرح نہیں ہنستے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کیا تمہیں معلوم ہے کہ مزاح کو مزاح کیوں کہتے ہیں؟ احباب نے جواب دیا ہم نہیں جانتے آپ نے فرمایا" لانّہ ازاح صاحبی عن الحق "آپ نے فرمایا کہ اسے مزاح اس لئے کہتے ہیں کہ یہ مزاح کرنے والے کو حق سے دور کر دیتا ہے۔ یعنی مزاح کا لفظ ازاحۃ سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے ہٹانا، دور کرنا۔

مزاح کی جگہ دینی محافل قائم کرے!

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے فرمایا کہ مزاح کی محافل قائم کرنے سے اجتناب کرو، اس سے دلوں میں کھوٹ، کینہ، کدورت پیدا ہوتی ہے جو انسان کو برائیوں کے ارتکاب کی طرف پہنچاتا ہے تم ذکر قرآن کی محافل قائم کیا کرو یعنی ایسی محفلیں قائم کرو جن میں قرآن و احادیث بیان کی جائیں اگر تمہیں اس قسم کی محفلیں قائم کرنے میں مشکل درپیش آئے تو نیک لوگوں کی نیک باتیں ہی بیان کرلیا کرو۔

کسی کی مصیبت پر ہنسنا ناجائز ہے:

ایک اعرابی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اپنے اونٹ پر سوار ہیں آپ کا اونٹ جوان، پھرتیلا، سرکش ہے، وہ جب نبی کریم ﷺ کے قریب آ کر سلام کہتے ہوئے کوئی بات پوچھنا چاہتے ہیں تو ان کا اونٹ منہ زور ہو کر انہیں دور لے جاتا ہے۔ صحابہ کرام اس منظر کو دیکھ کر ہنس رہے ہیں۔ یہ معاملہ کئی مرتبہ درپیش آیا۔ آخر کار اونٹ نے انہیں گرا دیا وہ شہید ہو گئے، صحابہ کرام نے عرض کیا۔

"یارسول اللہ ان الاعرابی قد صرعہ قلوصہ وقد ھلک فقال نعم وافواھکم ملائی من دمہ"

یارسول اللہ اعرابی کو اونٹ نے گرا دیا ہے وہ شہید ہو گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ہاں لیکن

تمہارے منہ اس کے خون سے بھرے ہوئے ہیں۔ مقصد یہی تھا کہ ان کا اونٹ سرکش تھا جو ان کے قابو میں نہیں تھا۔ وہ بے بس تھے۔ اونٹ کو قریب لانا چاہتے تھے وہ انہیں دور لے جاتا، تم ان کی بے بسی پر ہنس رہے تھے ان کا اس بے بسی کی حالت پر فوت ہونا اور تمہارا اس حالت پر ہنسنا گویا ان کے خون سے اپنے موٹھوں کو بھرنا تھا۔

اچھا مزاح سنت ومستحب ہے:

جب مزاح میں صرف خوش طبعی مقصود ہو، مزاح میں کثرت نہ ہو، ہمیشہ مزاح کرنے کی عادت نہ بنالی جائے، مزاح میں جھوٹ نہ ہو بلکہ حق بات ہو، مقصد مخاطب کو خوش کرنا ہو تو یہ جائز ومستحب ہے۔ ایسا مزاح انسان کے حسن اخلاق کو ظاہر کرتا ہے، ہنس مکھ چہرا سے کلام کرنا ہی اخلاق کریمانہ ہیں، کشادہ روئی جنت والوں کی علامت ہے اور مرجھایا ہوا چہرا، ماتھے پر بل، اکڑ کر رہنا جہنمیوں کی علامت ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ!

" انک تداعبنا قال انی لا اقول الاحقا "

بے شک آپ ہمارے ساتھ مزاح فرمالیتے ہیں آپ نے فرمایا کہ ہاں میں سوائے حق کے کچھ نہیں کہتا۔

صحابہ کرام کا تعجب کرنا اس وجہ سے تھا کہ نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا کہ اپنے بھائیوں سے مزاح نہ کرو اسی وجہ سے از روئے تعجب صحابہ کرام نے آپ کے مزاح کی وجہ پوچھی کہ آپ ہمارے ساتھ مزاح فرمالیتے ہیں اس میں حکمت کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں سوائے حق کے کچھ نہیں کہتا۔ میرے کلام میں عدل وانصاف اور حق وصداقت ہوتی ہے تم میں سے ہر آدمی اس طرح کی بات کرنے پر قادر نہیں اس وجہ سے تمہیں منع کیا ہے اگر تم بھی مزاح کا یہی حق ادا کرسکو تو تمہارے لئے بھی جائز ہے۔

نبی کریم ﷺ کے مزاح کی درخشاں مثالیں

(۱) "وعن انس ان رجلا من اهل البادية كان اسمه زاهر بن حرام و كان يهدى للنبى ﷺ من البادية فيجهزه رسول الله ﷺ اذا اراد ان يخرج فقال النبى ﷺ ان زاهرا باديتنا ونحن حاضروه و كان النبى ﷺ يحبه و كان دميما فاتى النبى ﷺ يوما وهو يبيع متاعه فاحتضنه من خلفه وهو لايبصره فقال ارسلنى من هذا ؟ فالتفت فعرف النبى ﷺ فجعل

لایألو ما الزق ظهره بصدر النبی ﷺ حین عرفه وجعل النبی ﷺ یقول من یشتری العبد فقال یارسول اللہ اذا واللہ تجدنی کاسدا فقال النبی ﷺ لکن عند اللہ لست بکاسد "

دیہات میں رہنے والے ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس دیہاتی تحفے پیش کرتے، جب وہ واپس جانے کا ارادہ فرماتے تو آپ ان کے لئے اسباب مہیا فرماتے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ زاہر ہمارا جنگل ہے ہم اس کے شہر ہیں۔ نبی کریم ﷺ اس شخص سے محبت کرتے تھے اگرچہ وہ زیادہ خوبصورت نہیں تھے ایک دن نبی کریم ﷺ تشریف لائے وہ اپنا سامان فروخت کرر ہے تھے، آپ نے آکران کو پیچھے سے اپنے بازوؤں میں لے لیا، انہیں نظر نہیں آرہا تھا، وہ کہہ رہے تھے کہ یہ کون ہے مجھے چھوڑ دے، پھر انہوں نے پہچان لیا کہ نبی کریم ﷺ ہیں پہچاننے پر اپنے پیٹھ کو نبی کریم ﷺ کے سینہ مبارک سے ملنے لگے، نبی کریم ﷺ فرمانے لگے یہ غلام کون خریدے گا، انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی، آپ اسے کھوٹا پائیں گے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو کھوٹا نہیں۔

وضاحت حدیث: یہ صحابی زاھر ابن حرام حجازی تھے باہر جنگل، دیہاتی، صحرائی تحفے پھل، نباتات خوشبوئیں اور دوائیں وغیرہ بطور ھدیہ لاتے اور نبی کریم ﷺ انہیں مدینہ طیبہ سے واپسی پر ان کی واپسی کے اسباب مہیا فرماتے اور دیہاتوں میں جن شہری چیزوں کی ضرورت واقع ہوسکتی وہ عطا فرماتے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا'' ان زاھرا بادیتنا ونحن حاضروہ ''جس کا مطلب ہے کہ بے شک زاہر ہمارا ہے جو صحرا میں رہتا ہے، کہ ہم اس سے صحرائی تحفے وصول کر کے فائدہ حاصل کرتے تھے۔ اگرچہ یہ معنی لینا بھی زیادہ قریب ہے کہ زاہر ہمارے صحراء میں رہتا ہے۔ لیکن پہلا معنی مراد لینے میں زیادہ حلاوت (مٹھاس) ہے۔ اور فرمایا کہ ہم اس کے ہیں، جو شہر میں رہتے ہیں یعنی وہ ہمارے شہری تحفوں سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کے اس طرز عمل سے اور آپ کے اقوال سے یہ واضح ہے کہ ایک دوسرے کو ھدیہ، تحفہ، دینا محبت کے بڑھنے کی علامت ہے۔ صرف ھدیہ وصول کرنے کی طرف ہی نظر نہ رکھے بلکہ ھدیہ دینے والے کو ھدیہ اور محبت وشفقت سے نوازے، یہ ہی نہ کہتا رہا کہ میں تمہارے پاس آؤں تو کیا دوگے ار جب تم میرے پاس آؤ تو کیا لاؤ گے۔

حدیث شریف میں جولفظ ''دمیما'' استعمال ہوا ہے اس کا معنی '' قبیح المنظر کریہ الصورۃ '' یعنی بدصورت ہے۔ نبی کریم ﷺ ان سے بہت ہی زیادہ محبت فرماتے تھے اگرچہ وہ بدصورت تھے لیکن ان سے محبت کی وجہ ان کا حسن سیرت تھا۔ ہر انسان کسی کو محبوب بنانے، شادی کرنے میں یہی نقطہ مدنظر رکھے کہ خوبصورت بدکردار کے بجائے، بدصورت لیکن دیندار کو پسند کرے۔ اسی میں دین ودنیا کی کامیابی ہے۔

ایک دن حضرت زاھر بازار میں یا کہیں کھلی فضاء میں اپنا سامان فروخت کررہے تھے کہ نبی کریم ﷺ تشریف لائے ''فاحتضنه'' ان کو بغل کے نیچے پہلوؤں میں لیا اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ نے اپنے ہاتھ مبارک ان کی بغل کے نیچے سے گذار کران کو پیچھے کی جانب سے گلے لگایا، ان کی آنکھوں پر بھی ہاتھ رکھے کہ وہ دیکھ نہیں سکتے تھے، یا آپ ﷺ کے پکڑنے کا انداز ایسا تھا کہ وہ پیچھے نہیں دیکھ سکتے تھے اور کہہ رہے کہ یہ کون ہے مجھے چھوڑ دے۔ جب حضرت زاہر نے آنکھ کے ایک کنارے سے دیکھا تو پہچان لیا کہ یہ تو میرے حبیب پاک علیہ التحیۃ والثناء ہیں تو پہچاننے پر اپنی پیٹھ کو آپ کے سینہ سے ملنے لگے۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ حضور میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''من یشتری العبد''؟ یہ غلام کون خریدے گا؟

یہی بات سمجھنے کی ہے کہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ میں جو مزاح کرتا ہوں وہ حق ہوتا ہے تو آپ کے ارشاد گرامی کا مطلب کیا ہوسکتا ہے کہ آپ نے آزاد شخص کو غلام کہا اور غلام بیچا نہیں جاسکتا تو آپ نے کیسے فرمایا اسے کون خریدے گا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے مزاح میں ظاہری مطلب اور ہوتا تھا لیکن درحقیقت اور مطلب مراد ہوتا تھا جو حق ہوتا تھا، یہاں بھی آپ نے لفظ عبد استعمال فرمایا اس کا ظاہری معنی غلام ہے لیکن اس سے آپ کی مراد عبداللہ (اللہ کا بندہ) ہے اس طرح یشتری لفظ اشتراء سے لیا ہوا ہے جس کا ظاہری معنی خریدنا لیکن یہ لفظ کبھی ''مقابلة الشئی بالشئی'' (ایک چیز کے مقابل دوسری کا ہونا) کے لئے استعمال ہوتا ہے اور کبھی اس کا معنی ''تبدیل کرنا'' ہوتا ہے اب پورے کلام کا معنی اس طرح ہوگا اس اللہ کے بندے کو میری محبت کے مقابل (اکرام وتعظیم) کون عطا کرے گا۔

دوسرا معنی یہ ہے کہ اس اللہ کے بندے جیسا میرے پاس کون لائے گا کوئی ایسا محبوب اور بھی ہو سکتا ہے۔اس کا تیسرا معنی یہ ہوگا۔اس اللہ کے بندے کو کون لے گا کوئی ہے جو اس سے ایسی ہی محبت کرے جیسے میں اس سے محبت کرتا ہوں۔حضرت زاہر نے نبی کریم ﷺ کے ظاہر الفاظ کو دیکھتے ہوئے عرض کیا یا رسول اللہ آپ اس غلام کو کھوٹا سکہ پائیں گے، یہ تو سستا بکے گا۔اسے کون خریدے گا۔اس بدصورت کو کون پسند کرے گا۔

قربان جاؤں! میرے پیارے مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء نے کیا خوبصورت جواب دیا! آپ فرماتے ہیں ''لکن عند اللہ لست بکاسد '' لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم تو کھوٹے نہیں۔یعنی جب تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرتے ہو تو وہ شخص کیسے کھوٹا سکہ، بے قدر و منزلت ہو سکتا ہے جو محب اللہ اور محب رسول اللہ ﷺ ہو بلکہ اس سے بڑھ کر محبوب رسول اللہ ﷺ بھی ہو۔

اصل محبت محبانِ مصطفیٰ ﷺ سے محبت ہے:

پیر طریقت راہبر شریعت ترجمان مسلک اہل سنت حضرت علامہ سید تراب الحق شاہ صاحب مدظلہ العالی سے صرف تین چار ملاقاتیں ہوئیں۔ایک یادگار ملاقات دوران حج مکہ مکرمہ میں ہوئی۔لیکن آپ سے اور آپ کے حلقہ ارادت کے دو ہیرے ﴿قادری برادارن﴾ یعنی حافظ قاری محمد آصف قادری صاحب اور حافظ قاری محمد عارف قادری صاحب مدظلہما العالی سے بہت ہی محبت صرف اسی واسطہ سے ہے کہ یہ سینے محبت مصطفیٰ ﷺ کے انوار سے منور ہیں۔

لپٹا جو دامن مصطفےٰ سے وہ یگانہ ہو گیا ☆ جس کے حضور ہو گئے اس کا زمانہ ہو گیا

جو محبت مصطفیٰ ﷺ سے دور ہیں ان بے نور روحوں سے ہم بھی دور ہیں، ان سے کبھی محبت نہیں ہو سکتی

جو تجھ سے یار پھرتے ہیں ☆ یونہی دربدر خوار پھرتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کے مزاح کی ایک اور مثال:

(۲) حضرت حسن بصریؒ سے مروی ہے کہ ایک بڑھیا حبیب پاک علیہ التحیۃ والثناء کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا یا رسول اللہ آپ میرے لئے دعا فرمائیں کہ میں جنت میں داخل ہو جاؤں آپ نے فرمایا اے ام فلاں ''ان الجنۃ لاتدخلہا عجوز '' بے شک جنت میں بوڑھی عورتیں

داخل نہیں ہوں گی، راوی کہتے ہیں وہ روتے ہوئے واپس ہو رہی تھیں تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اسے خبر دے دو کہ جنت میں بوڑھی عورتیں اس حال میں نہیں جائیں گی کہ وہ اس وقت بھی بوڑھی ہوں گی بلکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ اِنَّآ اَنۡشَاۡنٰهُنَّ اِنۡشَآءً فَجَعَلۡنٰهُنَّ اَبۡكَارًا ﴾

ہم نے پیدا کیا ان کی بیویوں کو حیرت انگیز طریقہ سے۔ پس ہم نے بنا دیا انہیں کنواریاں۔

یہاں اہل جنت کی نیک بیویوں کا ذکر فرمایا جا رہا ہے، یعنی جب وہ جنت میں داخل ہوں گی تو ان کی خلقت بالکل بدلی ہوئی ہوگی، اگرچہ دنیا میں وہ خوش شکل نہ تھیں مرتے وقت وہ بالکل بوڑھی ہوگئیں تھیں، لیکن جب جنت میں داخل ہوں گی تو بھرپور جوانی ہوگی، مجسم حسن و رعنائی ہوں گی، اور کنواری بنا کر انہیں جنت میں داخل کیا جائے گا۔

حدیث شریف میں اس آیت کی یہی تفسیر مذکور ہے، حضرت ام سلمہؓ کے عرض کرنے پر حضور نے فرمایا

"یا ام سلمة هن اللواتی قبضن فی الدنیا عجائز شمطا عمشا رمصا
جعلهن الله بعد الکبر اترا با علی میلاد واحد فی الاستواء"

اے ام سلمہ ان سے وہی بیویاں ہیں اگرچہ وفات کے وقت وہ بالکل بوڑھی تھیں ان کے بال سفید تھے، ان کی بینائی کمزور تھی، آنکھیں میلی کچیلی رہتی تھیں لیکن جب وہ جنت میں داخل ہوں گی تو ساری ہم عمر ہوں گی۔ (احیاء العلوم ج ۳، مرقاۃ، مشکوٰۃ باب المزاح، شمائل ترمذی، ضیاء القرآن)

نبی کریم ﷺ کے مزاح کی صرف دو مثالیں پیش کیں ہیں۔ مقصد صرف یہ سمجھانا ہے کہ مزاح خوش طبعی کے طور پر جب کہ اس میں صداقت ہو کذب بیانی نہ ہو۔ متکبرانہ انداز نہ ہو، اپنی برتری اور کسی کی حقارت بیان کرنا مقصود نہ ہو، تو جائز ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے مزاح فرمایا۔ لیکن بات حق اور سچ ہوتی صرف سننے والا ابتدائی طور پر دوسرا معنی سمجھ کر بعض اوقات غلطی میں واقع ہو جاتا ہے، اس طرح کے نبی کریم کے کئی اور مزاح بھی احیاء العلوم اور کتب احادیث میں ملتے ہیں، سب کی نوعیت ایک ہی ہے۔ کسی کو حقیر و ذلیل کرنے کی غرض سے مزاح ہو یا کسی قسم کا کوئی بھی کلام ہونا جائز ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ اپنے آپ کو عاجز، دوسروں سے کمتر سمجھنا اور دوسروں کو فوقیت دینا اور انہیں اپنے آپ سے برتر سمجھنا ہی "کمال" ہے۔

﴿ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِیْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴾

☆ اللہ ان سے استہزاء فرماتا ہے (جیسا اس کی شان کے لائق ہے) اور انہیں ڈھیل دیتا ہے کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔

☆ اللہ ان کو ٹھٹھہ کا بدلہ دے گا اور انکو مہلت دیتا ہے کہ وہ اپنی سرکشی میں سرگرداں رہیں۔

جب منافقین نے کہا ہم مسلمانوں سے استھزاء (ٹھٹھہ) کرتے ہیں تو رب تعالیٰ نے ان کے جواب میں کہا اللہ تعالیٰ ان سے استہزاء کرتا ہے (جو اس کی شان کے لائق ہے) اور ان کو مہلت دے رکھی ہے دنیا میں ان کو عذاب نہیں دیتا تا کہ وہ اور زیادہ سرکشی کرتے رہیں اسی طرح بھٹکتے رہیں تا کہ اور ہی زیادہ عذاب کے مستحق ہوسکیں۔

اعتراض: استہزاء میں تو مکاری پائی جاتی ہے کیونکہ بظاہر شان بیان کی جاتی ہے لیکن حقیقت میں ذلت بیان کی جاتی ہے جیسا کہ نالائق طالب علم کا کسی کو تعارف کراتے ہوئے کہا جائے کہ یہ ہمارے مدرسہ کا بڑا لائق طالب علم ہے یہ تو ابھی سے ہی بہت بڑا عالم فاضل ہے یہ بظاہر تعریف ہے لیکن حقیقت میں اس کی تذلیل ہے۔ اسی طرح استھزاء جاہلوں کا کام ہے جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک مقتول کو زندہ کرنے کے لئے گائے کو ذبح کرنے (اور اس کا گوشت اس کے جسم سے لگانے) کا حکم دیا تو ان لوگوں نے کہا " اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا " کیا تم ہمارے ساتھ مزاح اڑا رہے ہو؟ تو آپ نے ان کو جواب دیتے ہوئے فرمایا:

﴿ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ ﴾ ''اللہ کی پناہ کے میں جاہلوں سے ہو جاؤں''

مکاری اور جہالت دونوں ہی اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں تو اللہ تعالیٰ کا استہزاء کرنا کیسا درست ہے؟

جواب اول: " **ان ما يفعله الله بهم جزاء على استهزائهم سماه بالاستهزاء** " اللہ تعالیٰ نے ان کو استہزاء پر جو سزا دینی ہے اسے استھزاء کہہ دیا گیا ہے کیونکہ ایک چیز کی جزا کو اسی والا نام دے دیا جاتا ہے اسے علم بدیع میں " **مشاكلة** " کہا گیا جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا "**جزاء سيئة سيئة**"

برائی کی جزاء بری ہے۔ حالانکہ برائی کی جزاء تو حکمت کے مطابق ہوتی ہے بری نہیں لیکن مشاکلۃ کے طور پر اسے "سیئہ" کہہ لیا گیا ہے۔ اسی طرح فرمایا:

﴿ فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ ﴾

"جو شخص تم پر تجاوز (زیادتی) کرے تم اس پر تجاوز کرو ایسا ہی جیسا اس نے تم پر تجاوز کیا"

یہاں زیادتی کے بدلہ کو زیادتی کہا گیا ہے حالانکہ زیادتی کا بدلہ حق ہے لیکن یہاں بھی مشاکلۃ والا قانون جاری ہے خیال رہے راقم کا ترجمہ اسی جواب کے مطابق ہے۔

جواب دوم: منافقین جو مومنین سے استہزا کرتے ہیں اس کا وبال اور ضرر ان کی طرف ہی لوٹ کر آنا ہے مومنوں کو اس کا نقصان ہونا نہیں چونکہ ہر عمل ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہے رب تعالیٰ نے اسے اپنی طرف منسوب فرمایا اب ترجمہ یہ ہوگا ان کے استہزاء کو اللہ تعالیٰ ان پر ہی لوٹا دے گا کیونکہ نقصان ان کا ہی ہونا ہے۔

جواب سوم: استہزاء سبب ہے اور اس پر مرتب ہونے والے مسببات ذلت، حقارت، رسوائی ہیں یہاں مجاز مرسل کا ضابطہ استعمال ہے کہ ذکر سبب کا ہے اور مراد اس سے مسبب ہے اب معنی یہ ہوگا اللہ تعالیٰ ان کو ہی ذلیل، حقیر، رسوا کرے گا۔

جواب چہارم: کچھ دیر کے لئے منافقین سے مومنوں والا سلوک کیا گیا ان کے مال اور ان کی جانیں محفوظ رہیں اور مال غنیمت وغیرہ ان کو ملتا رہا لیکن پھر ان کو اعلانیہ طور پر علیحدہ کر دیا گیا ان کو رسوا کر دیا گیا اسے استہزاء سے تعبیر کر دیا گیا اس معنی کے لحاظ سے "ویمدھم" اس کی تفسیر ہوگا اب معنی یہ ہوگا اللہ تعالیٰ کچھ دیر کے لئے مہلت دے کر ختم کر دے گا۔

جواب پنجم: مطلب یہ ہوگا کہ "اللہ تعالیٰ ان سے دنیا اور آخرت میں استہزا والا معاملہ کرے گا"
اس ترجمہ کے مطابق دنیا میں استہزا کا معاملہ تو یہی ہے کہ ان کے راز نبی کریم ﷺ پر کھول دیئے گئے حالانکہ وہ اپنے شیطانوں سے چھپ چھپا کر باتیں کرتے تھے اور آخرت میں ان سے استہزاء والا معاملہ یہ ہوگا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب جنت والوں کو جنت میں داخل

کر دیا جائے گا اور جہنم والوں کو جہنم میں تو منافقین کے جہنم والے مقام کے سامنے جنت کا دروازہ کھولا جائے گا۔ یہ جنت کے دروازہ کو کھلا دیکھ کر اس کی طرف آئیں گے قریب پہنچنے پر دروازہ بند کر دیا جائے گا جنت والے یہ منظر دیکھ کر ہنسیں گے اسی کو رب تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا ﴿ فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ﴾ آج کے دن ایمان والے کافروں پر ہنسیں گے۔ (از کبیر)

ان پانچ جوابات کو دیکھ کر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو پھر سے دیکھیں تو عجیب سے عجیب خوب سے خوب تر، کامل ترین ترجمہ نظر آئے گا جس میں یہ پانچ جواب سمٹ کر آ گئے۔

نکتہ: منافقین کے قول ﴿ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ کے جواب میں "یستھزی" کہا ہے مستھزی نہیں کہا حالانکہ عقل کا تقاضا یہ تھا کہ جواب بھی ان کے قول کے مطابق ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "یستھزی" مضارع ہے جو وقتاً فوقتاً کام کے جاری رہنے پر دلالت کرتا ہے اس سے رب تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف اشارہ ہو رہا ہے:

﴿ اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ﴾ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ بیشک انہیں فتنہ میں مبتلا کیا جاتا سال میں ایک مرتبہ یا دو مرتبہ۔

يَمُدُّهُمْ: حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود اور کچھ دوسرے حضرات نے اس کا معنیٰ کیا ہے "ویملی لھم" ان کو دیر تک فائدہ اٹھانے دیتا ہے۔ مجاہد نے اس کا معنیٰ کیا ہے "ویزیدھم" ان کو زیادہ دیتا ہے یعنی جتنے ان کے گناہ زیادہ ہوتے ہیں اتنا ہی ان کو مال و دولت وغیرہ زیادہ دیا جاتا ہے وہ اسے نعمت سمجھتے ہیں حالانکہ واقع میں وہی ان کے لئے عذاب ہوتا ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ☆ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۭ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾

"پھر جب انہوں نے بھلا دیا جو نصیحتیں ان کو کی گئی تھیں ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ جب خوش ہوئے اس پر جو انہیں ملا تو ہم نے اچانک انہیں پکڑ لیا اب وہ آس ٹوٹے رہ گئے تو جڑ کاٹ دی گئی ظالموں کی سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کا مالک ہے"

تقریباً مطلب دونوں معنی کا ایک ہی ہے کیونکہ اصل مقصد بیان ہی یہ ہے جو ابن جریر نے بیان کیا ہے کہ مطلب اس کا یہ ہے " نزیدهم علی وجه الاملاء والترک لهم فی عتوهم وتمردهم " گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم کو زیادہ نعمتیں دیتے ہیں تا کہ وہ ان سے زیادہ دیر نفع حاصل کر لیں ہم ان کو اسی طرح چھوڑ دیتے ہیں یعنی جلدی سے ان کو عذاب نہیں دیتے کہ وہ حدود سے تجاوز کرتے رہیں سرکشی کرتے رہیں " الطغیان هو المجاوزة فی الشئی " کسی چیز میں جب تجاوز پایا جائے یعنی حد سے بڑھ جائے تو اسے طغیان کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّا لَمَّا طَغَى الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ﴾

بیشک ہم نے پانی کو جب حد سے بڑھا دیا تو تمہیں کشتی پر سوار کر دیا چونکہ کفر بھی حد سے بڑھ جانے کا نام ہے اسی لئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کا معنی کیا ہے " فی طغیانهم یعمهون ای فی کفرهم یترددون " وہ اپنے کفر میں سرگرداں ہوتے ہیں مجاہد اور کچھ دوسرے حضرات نے معنی کیا ہے " فی کفرهم وضلالتهم " وہ اپنے کفر اور گمراہی میں متردد رہتے ہیں مقصد یہاں بھی ایک ہی ہے کہ کفر ہے ہی ضلالت اس لئے گویا کہ ضلالت کفر کی ہی تفسیر ہے۔

يَعْمَهُوْنَ: عمه سے لیا ہوا ہے اس کے مختلف معانی مراد لئے گئے ہیں تاہم مقصد ان سب کا بھی ایک ہی ہے " العمه الضلال " عمه کا معنی بھٹک جانا " العمی فی العین والعمه فی القلب " آنکھ کے اندھے کو اعمی کہتے ہیں اور دل کے اندھے کو اعمه کہا جاتا ہے تاہم بھی عمی کا اطلاق دل کے اندھے پر بھی ہوتا ہے " ذهبت ابله العمهاء اذا لم یدر این ذهبت به " اندھا پن بے وقوف کو کہیں لے جائے اسے معلوم نہ ہو کہ اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ مطلب سب کا ایک ہی ہے کہ وہ بھٹکتے رہیں متردد رہیں سرگرداں رہیں۔ (از ابن کثیر)

فائدہ: ابھی جن دو آیتوں کی وضاحت بیان کی گئی ان سے یہ واضح ہوا کہ انسانوں میں بھی کئی شیاطین ہیں کیونکہ کفار اور منافقین کے سرداروں کو شیطان کہا گیا اس لئے کہ وہ سرکش اور حد سے تجاوز کرنے والے تھے اس لئے مسلمانوں میں بھی اگر ایسے لوگ ہوں جو سرکش، ظالم، حد سے تجاوز کرنے

والے، غاصب، لیٹرے، جھوٹے فراڈی ہوں تو وہ کافر یا منافق اگر چہ نہیں کافروں یا منافقوں کی طرح شیطان اگر چہ نہیں لیکن منافقوں اور شیطانوں والی صفات ان میں ضرور موجود ہوتی ہیں۔ انسانوں اور جنوں سے شیاطین کا واضح ذکر قرآن پاک کی اس آیۂ کریمہ میں پایا گیا ہے۔

﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِيْنَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ﴾

''اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن کئے ہیں آدمیوں اور جنوں میں سے شیطان کہ ان میں ایک دوسرے پر خفیہ ڈالتا ہے بناوٹ کی بات دھوکہ کے لئے''

مسند امام احمد میں ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

'' نعوذ باللہ من شیاطین الانس والجن '' ''اللہ کی پناہ انسانوں اور جنوں کے شیطانوں سے''

'' فقلت یا رسول اللہ او للانس شیاطین قال نعم'' میں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ کیا انسانوں میں بھی شیطان ہوتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا ہاں (ہوتے ہیں) (از ابن کثیر) دلیل اس پر قرآن پاک سے بیان کی جا چکی ہے ہمارے زمانہ میں '' نعوذ باللہ من شیاطین الانس والجن'' کی کثرت کی جائے۔

فائدہ: زیادہ مال و دولت، زیادہ اولاد، باغات، مکانات وغیرہ کو نعمت ہی نہ سمجھا جائے بلکہ اصل نعمت یہ ہے کہ خوف خدا حاصل ہو محبت مصطفیٰ کریم ﷺ حاصل ہوتا کہ وہ دین پر قائم رہے رب سے دوری، تکبر، سرکشی انسان کو تباہ و برباد کر دیتی ہے جب تباہی کا وقت آتا ہے تو مال و دولت، اولاد، محافظین، چمچے، کڑچھے کوئی بھی کام نہیں آتے۔ خدا سے ڈریں تباہی سے پہلے انسان بن جائیں تباہ ہونے والے ظالم بادشاہوں کے انجام سے سبق سیکھیں۔

تنبیہ: تفسیر کبیر سے جو وضاحت کی گئی اس سے واضح ہو چکا ہے کہ استہزا کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف بغیر تاویل کے درست نہیں اس لئے اعلیٰ حضرت نے بریکٹ میں یہ الفاظ بڑھائے ہیں اللہ ان سے استہزاء کرتا ہے (جیسا اس کی شان کے لائق ہے) اب تراجم کو دیکھ کر خود فیصلہ کیجئے کون سا ترجمہ رب تعالیٰ کی شان کی لائق ہے:

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ :

اللہ ہنسی کرتا ہے ان سے اور ترقی دیتا ہے ان کو ان کی سرکشی میں (اور) حالت یہ ہے کہ وہ عقل کے اندھے ہیں۔	(محمود الحسن صاحب)
اللہ ہنسی کرتا ہے ان سے اور بڑھاتا ہے ان کو ان کی شرارت میں بہکے ہوئے۔	(شاہ عبد القادر صاحب)
ان (منافقوں) سے خدا ہنسی کرتا ہے۔	(فتح محمد صاحب)
اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے اور ان کی رسی دراز کیے جاتا ہے اور یہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے جاتے ہیں۔	(مودودی صاحب)
اللہ ٹھٹھا کرتا ہے ان سے اور کھینچتا ہے ان کو بیچ سرکشی ان کے بہکتے ہیں۔	(شاہ رفیع الدین صاحب)
انہیں اللہ بنا رہا ہے۔	(عبد الماجد دریا آبادی صاحب)

اللہ ان سے استہزاء فرماتا ہے (جیسا اس کی شان کی لائق ہے) اور انہیں ڈھیل دیتا ہے کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں (اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان رحمہ اللہ) نیز یہ بھی خیال رہے کہ عبد الماجد صاحب نے "یستھزی" کا ترجمہ کیا ہے بنا رہا ہے یہ معنیٰ لغوی بھی نہیں اور مرادی بھی نہیں

﴿ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰی فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا کَانُوْا مُهْتَدِیْنَ ﴾

☆ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی تو ان کا سودا کچھ نفع نہ لایا اور وہ سودے کی راہ جانتے ہی نہ تھے۔

☆ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خریدا گمراہی کو ہدایت کے بدلے ان کو تجارت میں کچھ نفع نہ ہوا اور وہ (تجارت کا طریقہ) جانتے ہی نہ تھے۔

"اُولٰٓئِکَ" کا اشارہ ان منافقین کی طرف ہے جن کے پہلے دو وصف بیان کیے جا چکے ہیں

ایک تو ان کا فسادی ہونا اگر چہ وہ اپنے آپ کو مصلح سمجھتے تھے دوسرا ان کا وصف یہ تھا کہ وہ بے وقوف تھے لیکن اپنے آپ کو عقل مند سمجھتے تھے اب ان کی بے وقوفی کی وجہ بیان کی جارہی ہے کہ انہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کو خریدا کتنے وہ بے وقوف تھے کہ ایسی تجارت کر رہے تھے کہ ان کا اصل سرمایہ بھی تباہ ہو رہا تھا۔

اعتراض: اشتراء کا معنی خریدنا ہوتا ہے بیع کا معنی بیچنا یہ ان کا زیادہ استعمال ہے اگر چہ بیع کا معنی بیچنا اور خریدنا دونوں ہی آتے ہیں اور شراء کے بھی دونوں معنی آتے ہیں۔ اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ بیع کی تعریف فقہاء کرام یہ کرتے ہیں " البیع هو مبادلة المال بالمال بالتراضی بالایجاب و القبول او بالتعاطی " بیع کا مطلب یہ ہے کہ مال کو مال سے تبدیل کیا جائے فریقین کی رضامندی پائی جائے ایجاب وقبول پایا جائے یا بغیر کلام کے ثمن دے کر مبیع لے لیا جائے۔ یہاں تو ہدایت یا ضلالۃ دونوں میں سے کوئی ایک بھی مال نہیں تو " اشتروا " کا مطلب کیا ہوگا۔

جواب: یہاں اشتراء کا حقیقی معنی مراد نہیں بلکہ مجازی معنی مراد لیا گیا ہے یعنی گمراہی (ضلالت) کو بیع سے تشبیہ دی گئی اور " هدی "کو ثمن سے۔

اعتراض: منافقین کے پاس تو ہدایت تھی ہی نہیں وہ تو کافر تھے انہوں نے کسی طرح ہدایت کے بدلے ضلالت کو حاصل کیا؟

جواب: بعض حضرات کا یہاں قول یہ ہے کہ ان کے پاس ہدایت تھی اور بعض کا قول یہ ہے کہ ان کے پاس ہدایت نہیں تھی جن حضرات کا قول یہ ہے کہ ان کے پاس ہدایت نہیں تھی ان کے قول کو علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے یوں بیان کیا ہے کہ اس مقام میں شراء کا معنی ایک چیز دے کر دوسری اس کے بدلہ میں لینا مراد نہیں:

" لان المنافقین لم یکونوا مؤمنین فیبیعون ایمانهم " اس لئے کہ منافقین تو مؤمن تھے ہی نہیں کہ وہ اپنے ایمان کو بیچتے۔

اسی وجہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا:

" اخذوا الضلالة و ترکو الهدی "

انہوں نے گمراہی کو حاصل کیا اور ہدایت کو چھوڑا۔اسی قول کے مطابق " اشتروا " کا ایک معنی یہ ہے " استحبوا " ضلالت سے مراد کفر اور ہدایت سے مراد ایمان ہے اب معنی یہ ہوگا "استحبوا الکفر علی الایمان " انہوں نے کفر کو ایمان پر پسند کیا یعنی انہوں نے کفر سے محبت کی اسے حاصل کیا اور ایمان کو پسند نہیں کیا اس لئے اسے چھوڑ دیا۔

(از قرطبی)

اور جن حضرات نے کہا کہ ان کے پاس ہدایت تھی انہوں نے بھی شراء کا معنی تو مجازی ہی لیا ہے حقیقی معنی نہیں لیا اس قول کے مطابق معنی یہ ہوگا " استبدلوا الضلالة بالهدی " انہوں نے ہدایت دے کر اس کے بدلے میں گمراہی کو حاصل کر لیا ان کے پاس ہدایت کیا تھی اس میں پھر دو قول ہیں ایک یہ:

" ولا مرية فی ان ذلک کان حاصلا لاولئک المنافقين بما شاهدوه من الآيات الباهرة والمعجزات القاهرة والارشاد العظيم والنصح والتعليم لكنهم نبذوا ذلک فوقعوا فی مهاوی المهالک "

" اس میں کوئی شک نہیں کہ منافقین کو کچھ ظاہری طور پر ہدایت حاصل تھی کیونکہ وہ روشن آیات، قاہر معجزات، بہت بڑی راہنمائی یعنی رشد وہدایت، نصیحت، تعلیم کا مشاہدہ کر رہے تھے نبی کریم علیہ السلام سے براہ راست ان چیزوں کو حاصل کر رہے تھے یہ ظاہری طور پر ان کو ہدایت حاصل تھی لیکن وہ اسے چھوڑ کر پس پشت ڈال کر ہلاکت کے ہاویہ میں گر گئے "

لیکن اس قول کے مطابق ہدایت کا مجازی معنی مراد ہے حقیقی نہیں "اویقال المراد بالهدی الهدی الجبلی وقد كان حاصلا لهم حقيقة فان كل مولود يولد على الفطرة " یا یہ کہا جائے کہ ان کو حقیقی طور پر ہدایت حاصل تھی اس ہدایت سے مراد فطرتی، جبلی، پیدائشی ہدایت ہے کیونکہ ہر بچہ اپنی فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔یعنی اس میں اسلام قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔لیکن انہوں نے اسے ضائع کر کے گمراہی کو حاصل کر لیا اب بھی اشتروا کا معنی تبدیل کرنا ہی ہوگا۔ (از روح المعانی) راقم کے نزدیک یہی قول معتبر ہے جیسا کہ ﴿ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴾ کی وضاحت سے مسئلہ واضح ہو جائے گا۔

فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ: اللہ تعالیٰ نے نفع کو تجارت کی طرف منسوب کیا کیونکہ عربی

حضرات کا محاورہ یہ تھا کہ وہ اس طرح کہتے تھے " ربح بیعک " تیری بیع نے نفع دیا۔ حالانکہ اصل میں اس طرح ہونا چاہیے " ربحت فی بیعک " تجھے اپنی بیع میں نفع ہوا۔ اسی طرح کہا جاتا ہے "خسرت صفقتک " تیرے سودے نے نقصان پہنچایا حالانکہ اصل میں یوں ہونا چاہیے "خسرت فی صفقتک " تونے اپنے سودے میں نقصان اٹھایا (اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ظاہر محاورہ کے مطابق ہے)

" فما ربحت تجارتھم ای ما ربحوا فیھا اشار بذلک ان اسناد الربح للتجارة مجاز عقلی وحقه ان یسند للتجر " (جلالین، صاوی)

جلالین میں ﴿ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ ﴾ کا معنیٰ کیا گیا ہے ان کو تجارت میں کچھ نفع نہ ہوا اس پر صاوی نے ذکر کیا کہ یہاں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ آیۃ کریمہ میں مجاز عقلی پایا گیا ہے کیونکہ ربح کی نسبت تجارت کی طرف مجاز عقلی ہے حق یہ تھا کہ تاجروں کی طرف نسبت کی جاتی جلالین کے " ما ربحوا فیھا " کے الفاظ کو دیکھ کر شائد راقم کا ترجمہ بھی منصفین کو درست نظر آئے:

" الربح الفضل علی راس المال ولذلک سمی شفا بکسر الشین الفضل " (بیضاوی، شیخ زادہ)

اصل سرمایہ سے جو زیادہ مال حاصل ہو اس نفع کو " ربح " کہا جاتا ہے اسی کو شفا بھی کہہ دیا جاتا ہے۔

وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ : وہ سودے کی راہ جانتے ہی نہ تھے یعنی تجارت کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ نفع حاصل ہو جائے لیکن ایسا تاجر جو اپنا اصل سرمایہ ہی برباد کردے وہ تجارت کے طریقہ سے بے خبر ہوتا ہے ایسے ہی منافقین بھی تھے:

" وھم ضیعوا راس المال وھی الفطرة وما حصلوا الفضل با دراک الحق ونیل الکمال " (مظہری)

کیونکہ انہوں نے اپنا اصلی سرمایہ ہی ضائع کر دیا تھا وہ حق کو پالینے اور کمال کو حاصل کرلینے کا نفع کیا حاصل کرتے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے اسی آیۃ کی تفسیر میں کہا ہے:

" قد واللہ رائیتموھم خرجوا من الھدی الی الضلالة ومن الجماعة الی الفرقة ومن الامن الی الخوف ومن السنة الی البدعة " (ابن کثیر)

''قسم ہے اللہ تعالیٰ کی کہ تم ان کو دیکھتے ہو وہ ہدایت سے گمراہی کی طرف چلے گئے
جماعت (یعنی مومنوں کی جماعت) کو چھوڑ کر انہوں نے تفرقہ کی راہ کو اختیار کیا،
ایمان اور اسلام کی جو امن کی راہ ہے اسے چھوڑ کر انہوں نے کفر کی راہ کو اختیار کیا جو
خوف کی راہ ہے، سنت کو چھوڑ کر بدعت کو انہوں نے حاصل کر لیا''

فائدہ: یہ خیال رہے کہ ہر بدعت کو ضلالت اور گمراہی سے تعبیر کرنا جہالت ہے بلکہ بدعت کی پانچ قسمیں ہیں۔

﴿اقسام بدعات﴾

نمبر ۱ **واجب:** جس طرح قرآن پاک اور حدیث پاک کو سمجھنے کے لئے علم نحو کا پڑھنا۔

نمبر ۲ **حرام:** اللہ تعالیٰ کا بندوں کی طرح جسم ثابت کرنا بندے کو پتھر کی طرح غیر مختار سمجھنا وغیرہ۔

نمبر ۳ **مستحب:** دینی مدارس قائم کرنا سرائے بنانا اور ہر بہتر کام جو نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے زمانہ میں نہیں تھا۔

نمبر ۴ **مکروہ:** ہر ایسا کام جس کے کرنے سے سنت کی ترک لازم آئے تو اگر سنت غیر مؤکدہ کی ترک لازم آئے تو مکروہ تنزیہی اور اگر سنت مؤکدہ کی ترک لازم آئے تو مکروہ تحریمی۔ بعض کے نزدیک جس سے واجب کی ترک لازم آئے وہ مکروہ تحریمی ہے

نمبر ۵ **مباح:** جیسے صبح یا عصر کی نماز کے بعد مصافحہ کرنا لیکن بغیر سلام کے مصافحہ کرنے کا یہ حکم ہے اور اگر مصافحہ کے ساتھ سلام بھی ہو تو مستحب ہوگا۔ بیہقی نے مناقب امام شافعی رحمہ اللہ میں ان کا ہی قول نقل کیا:

" المحدثات من الامور ضربان احدهما ما احدث مما يخالف كتابا
او سنة او اثرا او اجماعا فهذه البدعة الضلالة والثانی ما احدث من
الخير لا خلاف فيه لواحد من هذا هذه محدثة غير مذمومة"

(الحاوی للفتاوی ج ۱ ص ۱۹۲)

''نئے امور یعنی بدعات کی دو قسمیں ہیں ایک ان میں سے یہ ہے کہ ایسا نیا کام جو

قرآن یا حدیث یا آثار صحابہ یا اجماع امت کے مخالف ہو یہ بدعت گمراہی ہے یعنی نا جائز ہے اس سے اجتناب ضروری ہے دوسری قسم ان میں سے یہ ہے کہ کوئی نیا کام ہو لیکن نیکی کا کام ہو اس کے جائز ہونے میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں بلکہ بالاتفاق جائز ہے اور مستحسن ہے اس پر عمل کرنا باعث ثواب ہے اور یہ بدعت کسی طرح بھی بری نہیں"

نئے کاموں کے ایجاد کے لئے نبی کریم ﷺ نے ضابطہ بیان فرمایا:

"قال رسول اللہ ﷺ من سن فی الاسلام سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها من بعده من غير ان ينقص من اجورهم شئی ومن سن فی الاسلام سنة سيئة كان عليه وزرها ووزر من عمل بها من بعده من غير ان ينقص من اوزارهم شئی"
(مشكوة كتاب العلم)

"نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص اسلام میں اچھا طریقہ ایجاد کرتا ہے اسے اس کا ثواب ملے گا اور اس کے بعد جتنے لوگ اس پر عمل کریں گے ان کے مطابق بھی اس کو ثواب ملے گا اور ان عمل کرنے والوں کے ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ اور جو شخص اسلام میں برا طریقہ رائج کرتا ہے اس کو برے طریقہ کے رواج دینے کا گناہ ہوگا اور جتنے آدمی اس پر عمل کریں گے ان کے عمل کے مطابق بھی اسے گناہ ہوگا اور ان عمل کرنے والوں کے گناہوں میں کوئی کمی نہیں ہوگی"

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ اسلام میں اچھا طریقہ رائج کرنا منع نہیں بلکہ نیکیوں کا سبب ہے اور برا طریقہ رائج کرنا گناہوں کا سبب ہے اس سے بچنا ضروری ہے۔ معلوم نہیں کہ لوگ کتنی ہی بدعات کے مرتکب ہونے کے باوجود جو بات پسند نہ آئے جس میں نبی کریم ﷺ کی شان پائی جائے اسے بدعت کہہ کر اور ضلالت کہہ کر کیوں گمراہ ہو رہے ہیں۔

ذرا انصاف تو کریں کبھی طالبان کے حق میں جلوس، کبھی واجپائی کے آنے کے خلاف جلوس، کبھی کارگل سے فوجیں ہٹانے کے خلاف جلوس، کبھی امریکہ کے خلاف جلوس، کبھی امام کعبہ کے استقبال کے لئے جلوس، کبھی مریدکے میں جلوس، کبھی لاہور میں جلوس، کبھی مظفر آباد میں جلوس، کبھی دھرنے مارنے کے لئے جلوس جائز ہوں۔

لیکن میلاد النبی ﷺ کا جلوس نا جائز ہے آخر اس کی وجہ کیا ہے وجہ صرف ایک نظر آتی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی شان پسند نہیں شانِ مصطفےٰ کریم ﷺ کی رفعت دیکھ کر یہ لوگ جل جاتے ہیں ورنہ سب جلوسوں میں لوگوں کا اجتماع، بینر، جھنڈے، ڈنڈے، گاڑیاں، لاؤڈ سپیکر، تقریریں مشترک ہیں ہاں فرق یہ ہے کہ میلاد النبی ﷺ کے جلوس میں نعت خوانی ہوتی ہے نبی کریم ﷺ کے اوصاف بیان کئے جاتے ہیں کسی کے خلاف تقریر نہیں ہوتی پولیس پر پتھراؤ نہیں ہوتا کسی کی غیبت نہیں ہوتی کسی کی برائی بیان نہیں ہوتی۔ لیکن باقی جلوسوں میں یہ سارے کام ہوتے ہیں۔ اب آپ سے صرف یہ سوال کرنا ہے کہ انصاف سے بتائیں کہ میلاد النبی ﷺ کے جلوس میں کون سی چیز ان لوگوں کو نا جائز نظر آتی ہے مجھے تو صرف یہی سمجھ آیا کہ نبی کریم ﷺ کی شان کا بیان کرنا ان کو پسند نہیں۔ ورنہ یہ کیسے درست ہو سکتا ہے کہ پاک جلوس نا جائز ہو ناپاک جلوس جائز ہو جائیں۔

ہدایت کے بدلے گمراہی حاصل کرنے کا ایک واقعہ:

ملک غسان کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ جبلہ ابن ایہم تھا جو کہ نصرانی تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور اسلام قبول کر لیا مکہ مکرمہ میں گیا دوران طواف اس کی چادر پر بنی فزارہ کے ایک شخص کا پاؤں آ گیا جبلہ نے اسے تھپڑ مار دیا جس کی وجہ سے اس کے ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی اور دانت بھی ٹوٹ گیا۔ وہ بنی فزارہ کا مظلوم شخص اپنی فریاد لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گیا شکایت کی آپ نے فیصلہ فرمایا کہ جبلہ کو یا معاف کرانا پڑے گا یا قصاص دینا پڑے گا اس نے بڑے تعجب سے یہ سوال کیا " اتقتص منی وانا ملک وھو سوقة " کیا مجھ سے قصاص لیا جائے گا جب کہ میں بادشاہ ہوں وہ ایک عام دہقانی شخص ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیا خوب جواب دیا " شملک وایاہ الاسلام فلا تفاضل بینکما الا فی العاقبة " اب وہ اور تم دونوں مسلمان ہو تمہیں ایک دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہاں جس کا انجام اچھا ہوا وہ افضل ہوگا جبلہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک دن کی مہلت طلب کی رات کو بھاگ کر ملک شام چلا گیا اور العیاذ باللہ مرتد ہو گیا اگر چہ ایمان تو اسے نصیب نہ ہو سکا تاہم وہ نادم ضرور ہوا اس نے اپنی ندامت کو یوں ذکر کیا:

تنصرت بعد الحق عارا للطمة
وما کان فیھا لو صبرت لھا ضرر

میں حق کے بعد ایک تھپڑ کی عار سے نصرانی ہو گیا۔ اگر میں صبر سے تھپڑ کھا لیتا تو اس میں کیا نقصان تھا

و ادرکنی فیها لجاج حمیة فبعت لها العین الصحیحة بالعور

مجھے حمیت کی گہرائی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا، میں نے صحیح آنکھ کو بیچ کر ضائع آنکھ کو حاصل کر لیا

فیا لیت امی لم تلدنی ولیتنی صبرت علی القول الذی قاله عمر

کاش میری ماں نے مجھے نہ جنا ہوتا کاش میں اس بات پر صبر کر لیتا جو عمر نے کہی

(شیخ زادہ علی البیضاوی)

اس واقعہ سے اسلام کا نظام انصاف سمجھ آیا کہ مجرم کو کلیسا میں تو پناہ مل سکتی ہے لیکن اسلام میں حاکم کسی مجرم کو پناہ دے یہ ممکن نہیں اور مساوات محمدی کی ایک جھلک نظر آئی کہ اسلام میں بادشاہ اور غریب کا کوئی فرق نہیں انصاف میں سب برابر ہیں۔

تراجم کا تقابلی جائزہ: میں نے کئی سال پہلے تراجم کا تقابلی جائزہ پیش کیا اس اپنی کاوش کا نام تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان رکھا۔ ذرا ایک نظر اس پر:

وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ :

☆ اور نہ ہوئے وہ راہ پانے والے۔	(محمود الحسن صاحب)
☆ اور نہ یہ ٹھیک طریقہ پر چلے۔	(اشرف علی صاحب)
☆ اور یہ ہرگز صحیح راستہ پر نہیں۔	(مودودی صاحب)
☆ اور نہ وہ ہدایت یاب ہی ہوئے۔	(فتح محمد صاحب)
☆ اور نہ راہ پائے۔	(شاہ عبد القادر صاحب)
☆ اور نہ ہوئے راہ پانے والے۔	(شاہ رفیع الدین صاحب)
☆ اور نہ وہ راہ یاب ہوئے۔	(عبد الماجد صاحب)
☆ اور وہ سودے کی راہ جانتے ہی نہ تھے۔	(اعلیٰ حضرت)

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو تفاسیر کے آئینہ میں دیکھیں بفضلہٖ تعالیٰ صاف وشفاف نظر آئے گا۔

مدارک میں ہے:

﴿ وما کانوا مھتدین لطریق التجارۃ ﴾ ''وہ طریقہ تجارت کی راہ نہیں جانتے تھے''

جلالین میں ہے " وما کانوا مھتدین فیما فعلوا " اس پر حاشیہ میں ہے " فیما فعلو ای الی طرق التجارۃ "، مقصد اس کا بھی یہی کہ وہ طریقہ تجارت کو نہیں جانتے تھے۔

بیضاوی شریف میں ہے:

" وما کانوا مھتدین لطرق التجارۃ فان المقصود عنھا سلامۃ رأس المال والربح وھؤلاء قد اضاعوا الطلبتین لان راس ما لھم کان الفطرۃ السلیمۃ والعقل الصرف فلما اعتقدوا ھذہ الضلالات بطل استعدادھم واختل عقلھم ولم یبق لھم راس مال یتوسلون بہ الی درک الحق ونیل الکمال فبقوا خاسرین آیسین من الربح فاقدین للاصل "

''یعنی وہ تجارت (سودے) کی راہ نہیں جانتے تھے کیونکہ تجارت میں مقصد یہ ہوتا ہے کہ اصلی سرمایہ محفوظ رہے اور نفع بھی حاصل ہو اور ان لوگوں نے دونوں کو ضائع کر دیا کیونکہ اصل ان کا سرمایہ فطرت سلیمہ اور عقل خالص تھا لیکن اعتقاد باطلہ کی وجہ سے ان کی استعداد باطل ہوگئی عقلوں میں فتور آ گیا اور ان کا اصل سرمایہ جو حق کو پانے اور حصول کی کمالات کا ذریعہ تھا وہ ضائع ہو گیا پس اس طرح وہ اصل مال کے ضائع کرنے کی وجہ سے خسارے میں ہوئے اور نفع سے محروم رہے''

تفسیر بیضاوی کی وضاحت سے بھی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی تائید حاصل ہوئی۔ اسی طرح بیضاوی پر شیخ زادہ میں یہ ہے " فظھر ان من اشتری الضلالۃ بالھدی کما یلزمہ ان یکون خاسرا فی التجارۃ " یعنی جو شخص ہدایت کے بدلے گمراہی کو حاصل کرتا ہے وہ اپنی تجارت میں خسارے میں رہتا ہے۔ ﴿ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴾ پر شیخ زادہ نے یہ تحریر کیا ہے " ان المرام بعدم الاعتداء عدم اھتدائھم لطریق التجارۃ " ان کے ہدایت نہ پانے سے یہ مراد ہے کہ وہ سودے کی راہ نہیں جانتے تھے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی خوبی واضح ہوگئی جو کہ معتبر تفاسیر کی بحثوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔

(تسکین الجنان ص ۳۱، ۳۲)

﴿ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا اَضَاۗءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴾

'' ان کی کہاوت اس کی طرح ہے جس نے آگ روشن کی تو جب اس سے آس پاس سب جگمگا اٹھا اللہ ان کا نور لے گیا اور انہیں اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ کچھ نہیں سوجھتا ''

'' ان کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے آگ جلائی جب اس کے اردگرد کو آگ نے بہت روشن کر دیا اللہ انکے نور کو لے گیا اور ان کو تاریکیوں میں چھوڑ دیا کہ وہ کچھ دیکھ نہیں سکتے''

فائدہ: ایمان کو نور سے اور کفر کو ظلمت سے تشبیہ قرآن پاک میں کئی مقامات پر دی گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ نور (روشنی) حیرانگی کو زائل کرتا ہے اور کامل طور پر راستہ کی ہدایت اس میں پائی جاتی ہے اسی طرح ایمان سے تحیر زائل ہوتا ہے اور دین میں کامل منفعت پائی جاتی ہے۔ کفر کو ظلمت سے تشبیہ دی گئی ہے اس لئے کہ تاریکی میں انسان راستہ سے بھٹک جاتا ہے اور متحیر ہوتا ہے ایسے ہی کفر کی وجہ سے صراط مستقیم سے بھٹک جاتا ہے اور تحیر میں مبتلا ہوتا ہے۔ (از کبیر)

منافقین کو آگ جلانے والے سے تشبیہ کیوں دی؟

منافقوں کے حال کو تاریکی میں آگ سے روشنی حاصل کرنے والے سے تشبیہ اس لئے دی کی اس میں غرابت پائی گئی ہے " کانه قیل قصتهم العجیبة کقصة الذی استو قد نارا " گویا کہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان منافقوں کا قصہ بھی عجیب ہے جیسا کہ تاریکی میں آگ جلانے اور روشنی کے ختم ہونے پر متحیر ہونے والوں کا قصہ عجیب ہے۔ (از کبیر)

اعتراض: جماعت کو واحد سے کیسے تشبیہ دی گئی مثلھم ، بنورھم ، ترکھم میں ضمائر جمع کی ہیں اسی طرح لا یبصرون جمع ہے اور "الذی استو قد" واحد ہے۔

جواب: الذی لغت میں جمع کی جگہ عام طور پر واقع ہوتا رہتا ہے جیسا کہ " وخضتم

کالذی خاضوا " میں "الذی "مقام جمع میں واقع ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ " الذی "جنس کے لئے استعمال ہو جنس میں کثرت کے پائے جانے کا بھی احتمال ہوسکتا ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ "الذی " واحد ہی ہے الذین کی جگہ تو استعمال نہیں البتہ مجازی طور پر اس کا معنی جمع والا سے لیا گیا ہو۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ " الذی استو قد " سے مراد فوج ہو کہ منافقوں کی مثال اس فوج کی طرح ہے جس نے آگ جلائی اس صورت میں جمع کو جمع سے تشبیہ دی گئی ہے اور یہ بھی احتمال ہوسکتا ہے کہ منافقین کی ذاتوں کو آگ جلانے والوں کی ذاتوں سے تشبیہ نہ دی گئی ہو بلکہ ایک قصہ کو قصہ سے تشبیہ دی گئی ہو اس صورت میں جماعت کو واحد سے تشبیہ دینے کی کوئی صورت نہیں۔ (از کبیر)

" استوقد ای اوقد " یہاں سین اور تا طلب کے لئے نہیں یعنی معنی آگ کا بھڑکانا اس میں طلب والا معنی نہیں (جلالین، صاوی) " وقود النار هو سطوعها وارتفاع لهبها " وقود النار کا مطلب آگ کو روشن کرنا اس کے شعلوں کو بلند کرنا " نـار "ایک جوہر لطیف ہے جس میں روشنی، حرارت اور جلانے کی تاثیر پائی جاتی ہے اصل میں یہ لفظ لیا ہوا ہے نـار ، ینور سے جب کہ کوئی بھاگ جائے نار میں بھی حرکت اور اضطراب پایا جاتا ہے اس لئے اسے " نار " کہا جاتا ہے نور بھی اسی سے مشتق ہے نار کی ضوء (روشنی) کو ہی نور بھی کہا جاتا ہے " ظـلـمة " کا معنی ہے نور کا نہ پایا جانا البتہ اس میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ اس میں نور کے پائے جانے کی وجہ سے ظلمت ختم ہو جائے یعنی نور اور ظلمۃ میں نسبت عدم وملکہ کی ہے۔

اَضَـآءَ تْ : اضاءۃ اور اظلام یہ دونوں لفظ لازم بھی استعمال ہوتے ہیں اور متعدی بھی یعنی ان کا معنی روشن ہونا اور تاریک ہو جانا بھی ہے اور روشن کرنا اور تاریک کرنا بھی ہے جیسا قرینہ ہوگا ویسا ہی معنی ہوگا اس مقام میں متعدی ہے یعنی جب آگ نے اس کے اردگرد کو روشن کر دیا اگر چہ متعدی والا معنی زیادہ مناسب ہے تاہم لازم والا معنی لینے کا احتمال بھی ہے کہ اضاءت میں ضمیر ماحولہ کی طرف لوٹے اس کے اردگرد مکانات اور اشیاء روشن ہوگئیں۔ اعلیٰ حضرت نے ترجمہ لازم والا کیا ہے راقم نے علامہ رازی رحمہ اللہ کے ان الفاظ " وهـنـا الاقـرب انها متعدية " کو دیکھ کر متعدی والا ترجمہ کر دیا تا کہ قارئین کو اس کی دونوں حالتوں کا پتہ چل جائے۔ حضور پر نور سید یوم النشور علیہ السلام کے زمانہ میں منافق دو

قسم کے تھے ایک تو اسلام کے سخت دشمن مگر بظاہر ہمدرد ہونے کا دعوی کرتے تھے ان کو ﴿اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ﴾ سے بیان کیا۔ دوسرے جو طبیعت کے کمزور تھے نہ حامی تھے نہ مخالف جدھر فائدہ نظر آتا ادھر ہو جاتے اس آیت میں اسی قسم کو بیان کیا گیا ہے۔ (از الحسنات)

اس مثال سے منافقوں کے حال کو بیان کیا گیا کہ جسطرح کوئی شخص اندھیری رات میں روشنی حاصل کرنے کیلئے آگ جلائے اور جب اس کا ارد گرد روشن ہو جائے تو وہ آگ کی روشنی جاتی رہی اب وہ آگ جلانے سے پہلے کی حالت سے بھی زیادہ تاریکی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہی کیفیت منافقوں کی تھی کہ وہ کفر کی تاریکی میں مبتلا تھے لیکن مومنوں سے ملنے جلنے کی وجہ سے اسلام سے بظاہر روشنی بھی حاصل کر لیتے تھے لیکن انکے مکر وفریب کی وجہ سے وہ ظاہری روشنی بھی رب تعالیٰ نے ضائع کر دی تو وہ تاریکیوں میں ڈوب گئے کہ انہیں کچھ بھی نہ دکھائی دیا۔ مثل (میم اور ثاء پر فتحہ) اور مثل (میم کے نیچے کسرہ) اور مثیل، شبہ، شبہ اور شبیہ کی طرح ہیں انکا معنی ہوتا ہے کسی کا ہم مثل ہونا مشابہ ہونا یعنی نظیر اور مثیل اور شبیہ تقریبا ایک معنی میں استعمال ہوتے رہتے ہیں۔ پھر "مثل" کا لفظ عجیب وغریب ضرب المثل پر بولا جاتا ہے پھر مجازی طور پر حالت، صفت اور قصہ کو "مثل" کہہ لیتے ہیں۔

مثال سے سمجھانے کا فائدہ: مثال سے کسی مسئلہ کو سمجھانا دلوں میں زیادہ تاثیر پیدا کرتا ہے کیونکہ اس چیز کے اوصاف کو بیان کرنا اتنا زیادہ مؤثر نہیں ہوتا۔ مثال سے بیان کرنے میں غرض یہ ہوتی ہے کہ جلی کے ذریعے خفی کو واضح کیا جائے اور شاہد کے ذریعے غائب کی وضاحت کی جائے اس طرح ماہیت پر زیادہ واقفی حاصل ہو جاتی ہے عقل میں آنے والی چیز محسوس کے درجہ میں آ جاتی ہے۔ صرف ایمان کا ذکر اتنا مؤثر نہیں جتنا اس کو نور سے تشبیہ دے کر سمجھانے سے اثر حاصل ہوتا ہے اسی طرح صرف کفر کے ذکر کرنے سے کفر کا قبیح (برا ہونا) ہونا اتنا سمجھ میں نہیں آ سکتا جتنا کہ کفر کو تاریکی سے تشبیہ دینے سے اس کا قبیح ہونا واضح ہوگا۔ اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے اس کے فائدہ کو ان الفاظ مبارکہ سے ذکر فرمایا:

﴿ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴾

"اور اللہ لوگوں کے لئے مثالیں بیان فرماتا ہے کہ کہیں وہ سمجھیں"

(ماخوذ از کبیر)

اعتراض: جس شخص کو نور دے کر سلب کر لیا جائے اس سے منافقوں کو تشبیہ کیسے دی گئی جب کہ ان کو نور حاصل ہی نہیں اور اس لحاظ پر بھی تشبیہ کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ آگ جلانے والا روشنی سے نفع کچھ دیر کے لئے تو حاصل کر لیتا ہے پھر محروم ہوتا ہے لیکن منافقوں کو تو نفع حاصل ہی نہیں ہوتا۔ پھر اس لحاظ پر تشبیہ درست نظر نہیں آتی کہ آگ جلا کر روشنی حاصل کرنے والا اس روشنی سے نفع حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ اس کی روشنی کو ضائع کر دیتا ہے لیکن منافق تو بھلائی کو حاصل ہی نہیں کرنا چاہتے۔

جواب: جن حضرات کے نزدیک منافقوں کو ہدایت حاصل تھی ان کی طرف سے تو جواب یہ ہوگا کہ انہوں نے جب اسلام کو ظاہر کیا تو وہ اپنے آپ کو قتل سے بچانے اور اپنے مالوں کی سلامتی اور مال غنیمت کے حصول اور اپنی اولاد کو قید سے بچانے میں کامیاب ہو گئے یہ گویا کہ انہیں نور حاصل ہوا لیکن مسلمانوں سے استہزاء اور دھوکہ بازی سے ان کا نور جاتا رہا۔ لیکن وہ لوگ جن کے نزدیک منافقوں کو ہدایت حاصل ہی نہیں تھی ان کی طرف سے جواب یہ ہے کہ یہاں تشبیہ جمیع وجوہ میں نہیں بلکہ صرف ایک وجہ میں ہے وہ یہ کہ جس طرح آگ جلانے والا روشنی کے ضائع ہونے میں متحیر (حیران) ہوتا ہے اسی طرح منافقین بھی متحیر تھے یعنی وجہ شبہ صرف ان کی حیرانگی ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

ظلمات کو جمع لانے کی وجہ: ظلمات کو جمع اس لئے لایا گیا کہ منافقوں کو موت کے بعد کئی تاریکیاں ان کا احاطہ کریں گی:

اول: ظلمت کفر۔

دوم: ظلمت مکر و فریب، جو انہوں نے مومنوں سے مکر و فریب کیا تھا۔

سوم: ظلمت دروغ و افتراء جو انہوں نے اپنے آپ کو جھوٹ کے طور پر مومن کہا تھا حالانکہ وہ مومن نہیں تھے۔

چہارم: ظلمت طعن و تشنیع، یعنی انہوں نے خالص مومنوں کو جو بے وقوف کہا اسکی تاریکی بھی ان پر چھائے ہوگی۔

پنجم: ظلمت جہل مرکب، یعنی جو انہوں نے فسادی ہونے کے باوجود اپنے آپ کو اصلاح کرنے والا کہا گویا کہ وہ اپنے حال کو جاننے سے بھی بے خبر رہے۔

ششم: ظلمات معاصی وشہوات، یعنی ان کے وہ گناہ اورنافرمانیاں جن میں وہ منافقت سے پہلے ہی مبتلا تھے لیکن منافقت سے انہوں نے ان معاصی اورشہوات کو برقرار رکھنے کی کوشش کی

ہفتم: ظلمت قبر، قبر میں ان کو شدید ہولنا کیوں کا سامنا کرنا پڑے گا قبر کے مختلف عذابوں میں مبتلا ہوں گے اور قبر کی شدید تاریکی ان کو حاصل ہوگی۔ (از عزیزی)

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ ظلمات کو جمع لانے کی وجہ بیان کرتے ہیں ان کو ظلمت کفر حاصل ہے کیونکہ کفر ہے ہی ظلمت کے مشابہ اسی طرح ان کو ظلمت نفاق حاصل ہے کیونکہ منافقت میں بھی باطنی طور پر کفر ہی ہے جو ظلمت ہے اور قیامت کے دن ان کو ظلمت حاصل ہوگی ﴿ يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ ﴾ جس دن تم ایمان والے مردوں اورایمان والی عورتوں کو دیکھو گے انکا نوران کے آگے اوران کے دہنے دوڑتا ہوگا یعنی جب مومنوں کو قیامت کے دن نور حاصل ہوگا منافقوں کو ظلمت حاصل ہوگی اور انکو ظلمت ضلال حاصل ہوگی اور ان کو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی ظلمت حاصل ہوگی اوران کو نہ ختم ہونے والے عذاب کی ظلمت حاصل ہوگی۔ اور انکو شدید ظلمت حاصل ہوگی ان تمام ظلمات کو ذکر کرنے کے بعد ذکر کیا " کانها ظلمات متراکمة " گویا کہ انکو کثیر ظلمتیں حاصل ہوں گی جو ایک دوسرے کے اوپر نیچے تہ بتہ حاصل ہوں گی۔

(از بیضاوی وشیخ زادہ)

تقریباً واضح یہ ہوا کہ عزیزی اور بیضاوی میں ذکر کی گئی تمام ہی ظلمتیں ان کو حاصل ہوں گی بلکہ ان سے بھی زائدہ ہوں گی اسی وجہ سے ظلمات کو جمع ذکر کیا گیا۔

خیال رہے راقم نے جو " فلما اضاءت " کے ترجمہ میں ''بہت روشن'' کے الفاظ ذکر کئے ہیں وہ تفسیر ابی السعود سے لئے ہیں " الا ضاءة فرط الانارة " اضاءة کا معنیٰ ہے ''بہت زیادہ روشن کرنا''۔

(ابو السعود)

﴿ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴾

''بہرے گونگے اندھے تو وہ پھر آنے والے نہیں''

''یہ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں تو وہ نہیں پھریں گے''

صم: حق بات کو سننے سے وہ بہرے ہیں اس لئے کہ وہ حق بات کو قبول نہیں کرتے جو حق بات کو قبول نہ کرے وہ ایسے ہی جیسا کہ اس نے سنا ہی نہیں۔

بکم: حق بات چونکہ وہ کہتے ہی نہیں تھے جب وہ حق کلام نہیں کرتے تھے تو گویا کہ وہ گونگے تھے ان میں بولنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی۔

عمی: ان کو بصیرت حاصل نہیں تھی کہ وہ حق اور باطل کے درمیان فرق کر سکیں جس کو بصیرت حاصل نہ ہو اسے بصارت بھی حاصل نہیں ہوتی یعنی جس شخص میں سمجھنے کی صلاحیت ہی نہ پائی جائے گویا کہ اسے دیکھنے کی صلاحیت بھی حاصل نہیں خیال رہے کہ ان کے حواس درست تھے سنتے تھے، دیکھتے تھے، بولتے تھے لیکن جب حق کو سننے سے ان کے کان بند تھے تو وہ اس لحاظ پر بہرے تھے اور جب حق بات ان کی زبان پر نہیں آتی تھی تو گویا کہ وہ گونگے تھے۔

ما حوله: ایک چیز کے اردگرد آس پاس جو چیزیں متصل (قریب) ہوں ان کو ماحول کہا جاتا ہے حال یحول کا لغوی معنی پھرنا متغیر ہونا ہے سال کو حول کہتے ہیں اس لئے کہ وہ بھی پھرتا رہتا ہے جب کسی کے قرض وغیرہ کو اس سے ہٹا کر کوئی شخص اپنے ذمہ لگالے تو اسے حوالہ کہا جاتا ہے اس میں بھی بدلنا پایا گیا جب کسی فعل کا کوئی طالب نہ ہو اس کے بعد فعل کی طلب کرنا محاولہ کہلاتا ہے آنکھ کے بدلنے کو حول کہتے ہیں اسی وجہ سے بھینگے کو احول کہا جاتا ہے

ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ: بظاہر عقل کا تقاضا یہ ہے کہ جب ﴿ فَلَمَّا اَضَآءَتْ ﴾ ذکر کیا گیا ہے تو اس کے جواب میں '' ذھب اللہ بضوئھم'' ہونا چاہئے تھا بنورھم کیوں کہا گیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی کامل تاریکی کا ذکر کرنا مقصود تھا وہ بنورھم سے ہی حاصل ہو سکتا تھا بضوئھم سے حاصل

نہیں ہوسکتا تھا۔اگر " ذهب الله بضوئهم " کہا جاتا تو اس میں وہم ہوسکتا تھا کہ شائد بہت زیادہ روشنی کو ماند کر کے تھوڑی روشنی رہنے دی گئی ہو کیونکہ " ضوء " زیادہ روشنی کو کہا جاتا ہےاور " نور " اصل روشنی کو کہا جاتا ہے جب کہا " ذهب الله بنورهم " تو اس سے واضح کر دیا کہ اللہ ان کی روشنی کو مکمل طور پر لے جائے " والغرض ازالة النور بالكلية " مقصد بیان ان کے نور کو کلی طور پر زائل کرنا ہے اسی وجہ سے اس کے بعد اس کمال زوال پر دلالت کرنے کے لئے ﴿ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمَاتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴾ ذکر فرمایا کیونکہ " ظلمة " کا معنی ہے "عدم النور " نور کا نہ پایا جانا پھر اسے جمع اور نکرہ ذکر کر کے کامل تاریکی کا ذکر فرما دیا۔ (از کبیر)

اس کے بعد "لا يبصرون " مزید اس پر دلالت کر رہا ہے کیونکہ " ومفعول لا يبصرون من قبيل المطروح المتروك ، لا يبصرون " کا مفعول مقدر نہیں بلکہ اسے گویا کہ ذکر ہی نہیں کیا گیا تا کہ اس میں عموم پیدا ہو جائے جیسا کہ " والله يدعو الى دار السلام " اور اللہ ہر ایک کو دار اسلام کی طرف بلاتا ہے یہاں مفعول کو مکمل طور پر چھوڑنے سے عموم سمجھ آیا کہ یہاں مفعول " كل احد " ہے۔اسی طرح یہاں معنی یہ ہے " لا يبصرون شيئا "وہ کسی چیز کو بھی نہیں دیکھتے (از بیضاوی) اسی مبالغہ والے معنی کو اعلیٰ حضرت نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے"میں کچھ نہیں سوجھتا"اور راقم نے یوں بیان کیا"وہ دیکھ نہیں سکتے" گویا کہ سخت تاریکی کی وجہ سے ان کے دیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔

ایک عجیب علمی نکتہ: " ذهب " لازم ہے اس کا معنی ہے"وہ گیا" جب اس کے بعد"با" آ جائے تو یہ متعدی ہو جاتا ہے۔اس وقت اس کا معنی ہوتا ہے"لے جانا" جیسا کہ یہاں استعمال ہوا ﴿ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ﴾ اللہ ان کے نور کو لے گیا اسی طرح باب افعال پر آ کر بھی متعدی ہوتا ہے اگر اس طرح ہوتا " اذهب الله نورهم " تو پھر بھی معنی یہی ہوتا اللہ ان کے نور کو لے گیا۔تو کیا وجہ ہے کہ ﴿ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ ﴾ کہا ہے " اذهب الله نورهم " ذکر نہیں کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ "اذهب" اور "ذهب به " میں فرق یہ ہے کہ اذھب کا معنی ہے ایک جگہ سے ہٹانا اور اس کو جانے والا بنانا۔لیکن جب یہ کہا جائے "ذهب به " تو اس کا معنی ہوتا ہے وہ ساتھ لے گیا یعنی بہ اس مقام

میں معہ کے معنی میں ہے۔ جس طرح رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهٖ " جب یوسف کے بھائی اس کو اپنے ساتھ لے گئے یہاں گویا کہ معنی یہ ہے " اخذ الله نورهم و امسكه " ان کے نور کو اللہ نے لے لیا ہے اور اپنے پاس روک لیا ہے لیکن یہ معنی " اذهب ' ' میں نہیں سمجھ آ سکتا۔ (از کبیر)

قربان جاؤں قرآن تیری عظمت پہ تیرے ایک ایک لفظ میں کتنے موجزن سمندر موجود ہیں۔

اور جب حق و باطل کے درمیان ان میں فرق کرنے کی صلاحیت نہیں تھی بلکہ اپنے عیوب کو بھی وہ سمجھنے سے قاصر تھے اس لحاظ پر وہ اندھے تھے یعنی تھے تو وہ دل کے اندھے لیکن ایسے ہی تھے جیسے کہ آنکھوں کے اندھے ہوتے ہیں۔

فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ: وہ اپنی گمراہی اور منافقت سے پھر کر حق کی طرف آنے والے نہیں تھے بلکہ وہ اپنی منافقت کو ہی اپنا کمال سمجھ رہے تھے وہ اپنے فساد کو اصلاح کہہ رہے تھے وہ اپنی بے وقوفی کو عقل مندی سمجھ رہے تھے تو اس حال سے پھرنا ان سے کیسے ہو سکتا تھا (از خازن) ان دونوں آیتوں کے متعلق صدر الافاضل مولنا نعیم الدین مراد آبادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ ان کی مثال ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے کچھ ہدایت دی یا اس پر قدرت بخشی پھر انہوں نے اس کو ضائع کر دیا اور ابدی دولت کو حاصل نہ کیا ان کا مال حسرت و افسوس اور حیرت و خوف ہے اس میں وہ منافق بھی داخل ہیں جنہوں نے اظہار ایمان کیا اور دل میں کفر رکھ کر اقرار کی روشنی کو ضائع کر دیا اور وہ بھی جو مومن ہونے کے مرتد ہو گئے اور وہ بھی جنہیں فطرت سلیمہ عطا ہوئی اور دلائل کی روشنی نے حق کو واضح کیا۔ مگر انہوں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا اور گمراہی اختیار کی اور جب حق سننے ماننے کہنے راہ حق دیکھنے سے محروم ہوئے تو کان زبان آنکھ سب بے کار ہیں۔

(خزائن العرفان)

☆☆☆

﴿ اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ج يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ط وَاللّٰهُ مُحِيْطٌ ۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴾

☆ ''یا جیسے آسمان سے اترتا پانی کہ اس میں اندھیریاں ہیں اور گرج اور چمک اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس رہے ہیں کڑک کے سبب موت کے ڈر سے اور اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے''

☆ ''یا پھر جیسے زور کی بارش برس رہی ہو بادل سے جس میں تاریکیاں ہوں اور گرج اور چمک ہو وہ اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں ٹھونس رہے ہوں کڑک کے سبب موت کے ڈر سے اور اللہ نے کافروں کا احاطہ کیا ہوا ہے''

منافقوں کی حالت کو ایک دوسری مثال سے بیان کیا جا رہا ہے یا تو اس مثال سے منافقوں کی دوسری قسم کے لوگوں کا حال بیان ہو رہا ہے جیسا کہ پہلے تفسیر الحسنات کے حوالہ سے ذکر کیا۔ یا یہ ہے کہ منافقوں کے حال کو دو مثالوں سے بیان کیا گیا ہے۔ تمام منافقوں کو ان دو مثالوں سے بیان کیا جا رہا ہے۔ یہی قول زیادہ مفسرین نے پسند کیا ہے۔ غزالی دوراں حضرت علامہ احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ نے بھی اسی قول کے مطابق تفسیر فرمائی ہے۔ یعنی جس طرح کثیر بارش ہو رہی ہو اور اس میں رات کی تاریکی بھی ہو بارش کی کثرت کی وجہ سے تاریکی بھی ہو اور بادلوں کے سایہ کی وجہ سے تاریکی بھی ہو اور اس میں کڑک بھی ہو اور بجلی کی چمک بھی ہو کڑک کی وجہ سے ایسے حال میں مبتلا ہونے والوں کو موت کا خطرہ لاحق ہو جائے وہ اپنے آپ کو اس ڈر سے بچانے کے لئے اپنی انگلیوں کو کانوں میں ٹھونس دیں۔

تنبیہ: اس آیۃ کریمہ میں جو مثال بیان کی گئی ہے اس کی وضاحت انشاءاللہ اس آیۃ اور آنے والی آیۃ کی لفظی بحث مکمل کرنے کے بعد کی جائے گی اس پر ''مقصد بیان'' کا عنوان قائم کر دیا جائیگا۔

دینی مدارس کے طلباء کے فائدہ کے لئے:

"او" یاتو"وائو" کے معنی میں ہے جیسا کہ اس شعر میں اسی معنی میں استعمال ہے "قال الخلافة او كانت له قدرا ، كما اتى ربه موسى على قدر" اور بعض حضرات نے کہا" او للتخيير اى مثلوهم بهذا او بهذا"، "او" تخبیر کے لئے ہے مطلب یہ ہے کہ منافقوں کی یہ مثال دیں یا پہلی مثال دیں۔

(از قرطبی)

خیال رہے کہ تفسیر الحسنات سے منافقوں کی دو قسمیں اور ہر قسم کے مطابق ایک مثال کا جو ذکر پہلے کیا ہے اس کے مطابق"او" تنویع کے لئے ہے۔

كَصَيِّبٍ: کاف کا معنی ہے مثل، صیب اصل میں صیوب ہے صوب سے لیا ہوا ہے جس کا معنی ہے اترنا اوپر سے نیچے پلٹنا پھر یہ بادل اور بارش پر بولا جاتا ہے آیۃ کریمہ میں جو لفظ "صیب" استعمال ہے اس میں دونوں احتمال پائے جاسکتے ہیں کہ بارش مراد ہو یا بادل لیکن بعد میں "من السماء" کے ذکر سے یہی معنی لینا زیادہ مناسب ہے "اريد به نوع من المطر شديد" کہ اس سے مراد شدید بارش ہے۔

(از بیضاوی)

مِنَ السَّمَآءِ: "السماء" مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے اس کی جمع اسمية (بروزن اعونۃ) اور سماوات اور سمی (بروزن مفعول) لیکن اب تعلیل کے بعد سین پر ضمہ اور میم کے نیچے کسرہ ہے "السماء كل ماعلاک فاظلک" ہر وہ چیز جو تم سے بلند ہو اور تمہیں سایہ کرے اسے "سماء" کہہ لیا جاتا ہے۔ "السماء" کے آسمان، کمرے کا چھت، بارش مشہور معانی ہیں اسی طرح "سماء" کا معنی بادل بھی عام طور پر استعمال ہوتا رہتا ہے۔ کیچڑ اور گھاس کو بھی "سماء" کہا جاتا ہے جیسا کہ کہا گیا ہے "ما زلنا نطأ السماء حتى اتيناكم" ہم کیچڑ اور گھاس کو روندتے ہوئے تمہارے پاس آ گئے گھوڑے کی پیٹھ کو بھی سماء کہہ لیا جاتا ہے کہ اس میں بھی بلندی پائی گئی ہے۔ ہر بلند چیز کو سماء کہا جاتا ہے اور ہر پست چیز کو ارض کہہ لیا جاتا ہے۔

(از قرطبی)

فِيهِ ظُلُمَاتٌ: بارش میں تاریکیاں ہوں یعنی رات کی بھی تاریکی ہو بارش کی کثرت کی وجہ سے بھی تاریکی ہو اور بادلوں کے سائے کی بھی تاریکی ہو۔

(از بیضاوی)

وَرَعْدٌ: رعد کیا ہے اس پر ترمذی کی ایک حدیث کی طرف توجہ کریں:

" عن ابن عباس قال سألت اليهود النبی عن الرعد ما هو؟ قال ملک من الملائکة معه مخاریق من نار یسوق بها السحاب حيث شاء الله فقالوا فما هذا الصوت الذی نسمع ؟ قال زجره بالسحاب اذا زجره حتی ينتهی الی حیث امر الله قالوا صدقت "

" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہود نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا رعد کیا ہے" آپ نے فرمایا وہ فرشتوں میں سے ایک فرشتہ (جو بادلوں پر مقرر کیا ہوا ہے) اس کے پاس آگ کی گرزیں ہوتی ہیں وہ ان سے بادلوں کو چلاتا ہے۔ انہوں نے کہا پھر یہ آواز کیا ہے جو ہم سنتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ یہ فرشتے کی گرجدار آواز ہے جب وہ بادلوں کو زجر کرتے ہوئے آواز نکالتا ہے اور بادلوں کو وہاں تک پہنچا دیتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہوتا ہے"

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ بارش میں کڑک فرشتہ کی گرجدار آواز ہوتی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کسی کی گرجدار آواز کو لغت عرب میں " **رعد اور صواعق** " کا استعمال معلوم (یقینی واضح) ہے جیسا کہ لبید نے زمانہ جاہلیت میں اپنے اس شعر میں دونوں لفظوں کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے:

فجعنی الرعد والصواعق بال فارس یوم الکریهة النجد

" مجھے نجد کی شدید لڑائی کے دن سواروں کی گرجدار کڑکتی ہوئی آواز نے گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا"

" وروی عن ابن عباس انه قال الرعد ریح تختفق بین السحاب فتصوت ذلک الصوت "

" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بادل کے درمیان پھنس جانے والی ہوا جب باہر نکلنے کی کوشش کرتی ہے تو آواز پیدا ہوتی ہے اس آواز کو رعد (کڑک) کہا جاتا ہے"

وَّبَرْقٌ: (چمک) اس پر حضرت علی ابن مسعود ابن عباس رضی اللہ عنہم کی روایت مشاہدہ ہو کہ برق کیا ہے " **البرق مخراق حدید بید الملک یسوق به السحاب** " فرشتے کے ہاتھ میں لوہے کی گرز ہوتی ہے جس سے وہ بادلوں کو چلاتا ہے اسے (اسی کی چمک کو) برق کہا جاتا ہے۔ " **وعن ابن**

عباس ایضا، هو سوط من نور بید الملک یزجر به السحاب " حضرت ابن عباس رضی اللہ
عنہ سے ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ فرشتے کے ہاتھ میں ایک روشن کوڑا ہوتا ہے جس سے وہ بادلوں کو
چلاتا ہے اسے برق کہا جاتا ہے " وعنه ایضا، البرق ملک یتراءی " حضرت ابن عباس رضی
اللہ عنہما سے ہی ایک اور روایت میں یہ بھی ہے کہ فرشتے کی چمک کو برق کہا جاتا ہے۔ (از قرطبی)

تمام روایات میں تطبیق: جتنی روایات بیان کی گئی ہیں سب کا مطلب ایک ہے ذرا اسکو یوں
بیان کر کے دیکھیں ایک نورانی فرشتہ بادلوں پر مقرر ہوتا ہے جوان کو رب تعالیٰ کے حکم سے چلاتا جہاں
رب تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے وہاں پہنچا دیتا ہے اس کے ہاتھ میں لوہے کی گرز (کوڑا) آگ میں گرم کیا ہوا
چمکدار ہوتا ہے وہ جب بادلوں کو چلاتا ہے تو اس سے پہلے بادلوں میں ہوا رکی ہوئی ہوتی ہے جیسا کہ کسی
کا گلا گھونٹا ہوا ہو۔ وہ نورانی فرشتہ اپنی زوردار آواز سے اپنے کوڑے کو حرکت دیتا ہے بادل پھٹ جاتے
ہیں۔ جب بادل پھٹتے ہیں تو ان سے بھی ایک زوردار آواز سے اپنے کوڑے کو حرکت دیتا ہے اس طرح
فرشتے کی گرجدار آواز اور بادلوں کے پھٹنے اور ہوا کے نکلنے سے زوردار آواز مجتمع ہو کر کڑک پیدا کرتی
ہیں۔ اور نورانی فرشتہ کی نورانیت اور اس کے ہاتھ میں لوہے کا آگ میں گرم کیا ہوا چمکدار کوڑا جو روشنی
پیدا کرتے ہیں۔ اسی فرشتے کی نورانیت اور کوڑے کی چمک کو مجتمع ہونے سے اس چمک میں شدت
آجاتی ہے اسی کو برق کہا جاتا ہے۔ (راقم)

رعد کا لغوی معنیٰ: رعد کا معنیٰ حرکت، اضطراب ہے بزدلی کی وجہ سے کانپنے والے ہاتھ کو رعد کہا جاتا
ہے۔ ارتعد کا معنیٰ ہے وہ مضطرب ہوا کندھوں کے کانپنے کے لئے حدیث شریف میں " ترعد
فرائصهما " استعمال ہوا ہے کڑک میں بھی اضطراب ہوتا ہے اس لئے اسے رعد کہا گیا ہے۔

برق کا لغوی معنیٰ: اصل اس کا بریق ہے جس کا معنیٰ چمکنا روشن ہونا۔ نبی کریم ﷺ جس سواری پر
معراج کی رات سوار ہوئے اسے براق کہا جاتا ہے کیونکہ وہ نورانی اور برق رفتار تھا۔ آسمانی بجلی اور اس
کی چمک کو برق کہا جاتا ہے۔ (از قرطبی)

فلاسفہ کا مذہب: فلاسفہ کہتے ہیں کہ گرمی سے پانی بخار بن جاتا ہے اور زمین کے اجزاء سے دھواں

جیسے لکڑی سے دھواں بنتا ہے اور دیگچی وغیرہ سے گرم پانی بھاپ بن کر اٹھتا ہے اسے بخار کہا جاتا ہے اور یہ زمین کا دھواں جب ہوا کی حرکت سے بڑھ کر کرۂ آگ تک پہنچتا ہے اور وہاں جا کر روشن ہو جاتا ہے تو کبھی تو چند روز تک روشن رہتا ہے تو دمدار ستارے اور نیزے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور کبھی روشن ہو کر جلد بجھ جاتا ہے جس کو شہاب کہتے ہیں (ستارہ ٹوٹنا) اور کبھی روشن نہیں ہوتا بلکہ جل جاتا ہے اور آسمان کی سرخی اور سیاہی بن کر نظر آنے لگتا ہے۔ اسی طرح بخار زمین سے اٹھ کر چند صورتیں اختیار کر لیتا ہے ایک یہ کہ زیادہ اونچا ہو کر جم جاتا ہے اور قطرہ قطرہ ہو کر زمین پر گر پڑتا ہے اس جمے ہوئے بخار کو بادل اور قطروں کو بارش کہتے ہیں۔ اور کبھی یہ بخار زیادہ اونچا نہیں جاتا بلکہ زمین کے قریب ہی سردی سے جم کر گر جاتا ہے اس کو شبنم یا اوس کہتے ہیں اور کبھی سخت سردی کی وجہ سے یہ بخار راستہ ہی سے جم کر زمین پر گر پڑتا ہے اس کو اولہ (ژالہ) کہتے ہیں یہ جو ابھی تک بیان کیا ہے اس میں بخار اور دھوئیں کے علیحدہ علیحدہ حالات بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آفتاب کی گرمی پا کر بخار دھواں اور غبار مخلوط ہو کر زمین سے اوپر اٹھتے ہیں اور وہاں پہنچ کر علیحدہ علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ غبار الٹا واپس آتا ہے اسی کا نام آندھی ہے اور بخار اور دھواں ٹھنڈک کی حد کو پہنچتے ہیں جہاں بخار ٹھنڈا ہو کر بادل بن جاتا ہے اور دھواں اس کو چیر کر اوپر جانا چاہتا ہے کہ جس سے سخت آواز پیدا ہوتی ہے۔ اسی آواز کا نام اردو میں گرج اور عربی رعد ہے اور کبھی یہ دھواں۔ تیز حرکت کی وجہ سے بھڑک کر روشن ہو جاتا ہے اسی کو اردو میں بجلی اور عربی میں برق کہتے ہیں۔ اور کبھی سخت سردی کی وجہ سے یہ دھواں بھی جم کر زمین کی طرف لوٹتا ہے یہ جما ہوا دھواں جب بادل کو چیرتا ہے تو اس سے سخت آواز پیدا ہوتی ہے اور زمین پر گر کر بہت سی چیزوں کو فنا کر دیتا ہے اسی کو عربی میں صاعقہ اور اردو میں بجلی گرنا کہتے ہیں۔ اس کی قوت اس قدر ہے کہ دریا میں گر کر مچھلیوں کو بھی جلا ڈالتا ہے بعض جگہ یہ بجھی ہوئی بجلی لوہے کی شکل میں ملی ہے یہ وہی پکا ہوا اور جما ہوا دھواں ہے۔

(از نعیمی)

میرے خیال میں مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے یہ بحث ھد یہ سعید یہ سے لی ہے چونکہ علامہ خیر آبادی رحمہ اللہ کی طرز پر ہی حضرت مفتی صاحب نے بعد میں یہ تحریر فرمایا ہے مگر دل کے بہلانے کو لیکن یہ خیال اچھا ہے: یہ سب عقلی ڈھکوسلے ہیں۔ مگر حقیقت میں یہ تمام قدرت کے کرشے ہیں۔

راقم کا خیال: راقم کے نزدیک صورت یہ ہے کہ فلاسفہ نے جن چیزوں کا ذکر کیا ہے وہ اسباب ہیں اور کسی سبب کا مؤثر ہونا اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہے اللہ تعالیٰ چاہے تو وہ سبب مؤثر ہو اور چاہے تو مؤثر نہ ہو حقیقت یہی ہے کہ یہ سب قدرت کے کرشمے ہیں لیکن ان کے اسباب بھی ہیں۔ خاص کر کے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں رعد کی جو تعریف بیان ہوئی کہ بادلوں میں ہوا محبوس ہو جاتی ہے اور بادل پھٹتے ہیں تو ہواز وردار آواز سے باہر آتی ہے تو ایک کڑک پیدا ہوتی ہے۔ اس روایت میں اور فلاسفہ کے قول میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ بعض فلاسفہ اپنی بدبختی کی وجہ سے مومن نہ بن سکے کیونکہ انہوں نے بہت سے باطل نظریات کو اپنے عقائد میں شامل کرلیا۔

اسباب کا مؤثر ہونا قدرت کے تابع ہے:

جیسا کہ پہلے ذکر کیا ہے کہ رب تعالیٰ چاہے تو کسی سبب کو موثر بنا دے اور چاہے تو سبب ہو لیکن مؤثر نہ بنائے۔ اس پر ایک شعر ہی پیش کرنا کافی ہے جو مستانہ گجراتی مرحوم اپنی نعت سے پہلے پڑھا کرتے تھے:

دو موتوں سے بوت بنایا نام رکھایا پوت   کرم کرے تے بھلا بھلا نہیں تے موت داموت

یعنی دو نطفوں کو ملا کر جسم بنایا جس کا نام بیٹا رکھا۔ مہربانی فرمادے تو اس کی طرف سے بھلائی نہ مہربانی فرمائے تو نطفہ ہی رہے گا۔ واضح ہوا کہ نطفہ اولاد کا سبب تو ہے لیکن اس کا مؤثر ہونا رب تعالیٰ کی مہربانی سے ہے رب کی مہربانی نہ ہو تو وہ نطفہ غیر موثر ہو جاتا ہے۔

فائدہ جلیلہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ کے ساتھ مدینہ اور شام کے درمیان ہم سفر میں تھے شدید آندھی چلنے لگی اور سخت بارش ہونے لگی جس میں کڑک بھی تھی اور بجلی کی چمک بھی۔ لوگ مختلف جگہ میں پناہ لینے کے لئے متفرق ہو گئے۔ مجھے کعب نے کہا جس آدمی نے کڑک کو سن کر یہ پڑھا " سبحان الله من يسبح الرعد بحمده و الملائكة من خيفته " وہ کڑک اور ژالہ باری سے محفوظ رہے گا میں نے اور کعب نے یہ الفاظ پڑھ لئے (تو ہم کڑک اور ژالہ باری سے بفضلہ تعالیٰ محفوظ رہے) جب صبح ہوئی لوگ جمع ہوئے تو میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کہا اے امیر المؤمنین لوگ جس مصیبت میں مبتلا ہوئے ہم تو اس سے محفوظ رہے۔ آپ

نے فرمایا'' وہ کیسے؟ تو میں نے ان کو بتایا جو عمل حضرت کعب نے بتایا تھا آپ نے کہا ''سبحان اللہ افلا قلتم لنا فنقول کما قلتم'' سبحان اللہ تم نے ہمیں کیوں نہیں بتایا ہم بھی پڑھ لیتے ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اسی موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ناک ژالہ لگنے سے متاثر ہوا۔

☆ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ جب کڑک اور گرج سنتے تو یہ پڑھتے:

'' اللھم لا تقتلنا بغضبک ولا تھلکنا بعذابک وعافنا قبل ذلک'' (قرطبی)

يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ :

وہ اپنی انگلیوں کو اپنے کانوں میں ٹھونستے ہیں اس لئے کہ قرآن پاک کو نہ سن سکیں ایسا نہ ہو کہ قرآن سن کر قرآن پر اور اللہ تعالیٰ پر اور نبی کریم ﷺ پر ایمان لے آئیں۔'' وذلک عندھم کفر والکفر موت'' کیونکہ ایمان لانے کو وہ کفر سمجھتے تھے اور کفر کو موت سمجھتے۔ (از قرطبی)

خیال رہے کہ وہ انگلیوں کے پورے کانوں میں داخل کرتے تھے پوری انگلیوں کو کانوں میں داخل کرنا ممکن ہی نہیں لیکن اس سے مبالغہ ثابت کیا گیا کہ وہ انگلیاں داخل کرنے میں گویا کہ اتنی کوشش کرتے کہ پوری انگلیاں کانوں میں گھس آئیں تا کہ وہ ذرا بھی قرآن نہ سن سکیں۔ (از بیضاوی)

مِنَ الصَّوَاعِقِ: من اجل الصواعق، کڑک کی وجہ سے۔ صواعق جمع ہے صاعقہ کی۔ حضرت ابن عباس، مجاہد وغیرہ نے بیان فرمایا ہے کہ بادلوں پر مقرر فرشتہ جب شدید غصہ سے منہ سے بات نکالتا ہے تو وہ آگ کے شعلہ کی حیثیت رکھتا ہے اسی کو صواعق کہا جاتا ہے۔ خلیل نے کہا ''رعد کی آواز سے شدت پیدا ہوتی ہے اس میں بعض اوقات جلا دینے والی آگ بھی ہوتی ہے وہی صاعقہ ہے ابو زید نے کہا سخت کڑک میں آسمانوں سے گرنے والی آگ صاعقہ ہے۔ گرجدار آواز جو عذاب بن کر آئے اسے بھی صاعقہ کہا جاتا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ ﴾ ان کو رسوا کن عذاب کی کڑک نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ کبھی ''صعق'' کا معنی بے ہوش ہونا آتا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿ وَخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ﴾ ''موسیٰ بے ہوش کر گر پڑے'' کبھی ''صعق'' کا معنی ''موت'' آتا ہے جیسا کہ ﴿ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ﴾ صور پھونکنے پر آسمانوں اور زمین والی تمام مخلوق مرجائے گی۔ (از قرطبی)

راقم کی وضاحت: فلاسفہ کے نزدیک صاعقہ کا جو معنی بیان کیا گیا ہے یا دوسرے اقوال جو بیان کئے گئے ہیں ان تمام کو جمع کر کے یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ بادلوں پر مقرر فرشتہ کی منہ سے شدت غضب کے وقت نکلنے والی آگ کی طرح بات اور زمین سے اٹھنے والے دھوئیں کا بادلوں کو چیرتے وقت آگ کا آسمانوں سے گر کر چیزوں کو فنا کر دینے کا نام صاعقہ ہے اس طرح یہاں واقع ہونے والے صواعق میں کوئی اختلاف نہ رہا بلکہ مطلب ایک ہوگا البتہ دوسرے مقامات پر صاعقہ اور معانی میں بھی استعمال ہے جیسا کہ قرآنی آیات سے واضح کر دیا گیا۔

حَذَرَ الْمَوْتِ: موت کے ڈر کی وجہ سے " والموت ضد الحياة " حیات کی ضد کو موت کہا جاتا ہے وہ زمین جس کا انسانوں میں سے کوئی مالک نہ ہو اور نہ ہی اس سے کوئی فائدہ اٹھاتا ہو اسے موات کہا جاتا ہے " والموتان (بالتحريک) خلاف الحيوان "حیوان کے خلاف موتان (میم اور واؤ پر فتحہ) کا استعمال ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے " اشتر الموتان ولا تشتر الحيوان " زمین اور مکان خرید، غلام اور چوپائے نہ خرید و اس مثال میں " موتان " سے مراد زمین اور مکان ہے "مؤتہ" اس زمین کا نام ہے جس میں حضرت جعفر رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ (از قرطبی)

وَاللهُ مُحِيْطٌ بِالْكٰفِرِيْنَ: اور اللہ تعالیٰ نے کافروں کا احاطہ کیا ہوا ہے " ای لا يفوتونه " کوئی کافر بھی رب تعالیٰ سے بھاگ کر نہیں جا سکے گا جیسا کہ کہا جاتا ہے " احاط السلطان بفلان " بادشاہ نے فلاں کا ہر طرف سے احاطہ کیا ہوا ہے یعنی اسے اپنی گرفت میں لے لیا ہے اسی طرح کہا جاتا ہے " فالله سبحانه محيط بجميع المخلوقات " یعنی تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے اور اس کے قہر کے نیچے ہے جس طرح رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ تمام زمین قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہوگی۔ احاطہ کا معنی علم بھی ہے اس معنی کے لحاظ پر ﴿وَاللهُ مُحِيْطٌ بِالْكٰفِرِيْنَ﴾ کا مطلب ہوگا اللہ تعالیٰ کافروں کو جاننے والا ہے یہ معنی رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی سے ثابت ہے۔ ﴿وَاَنَّ اللهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا﴾ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو علم کے ذریعے احاطہ کرنے والا ہے اور ایک معنی ہلاک کرنا جمع کرنا بھی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿اِلَّا اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ﴾ مگر یہ کہ تم تمام کو ہلاک کر دیا جائے۔ (قرطبی)

راقم کے نزدیک سب معانی جمع ہیں:

﴿ وَاللّٰہُ مُحِیۡطٌ بِالۡکٰافِرِیۡنَ ﴾ اللہ تعالیٰ تمام کافروں کو جانتا ہے کوئی اس سے بھاگ کر کہیں جا نہیں سکے گا وہ سب کو جمع کر کے عذاب میں مبتلا کر کے ہلاک کر دے گا۔

اعتراض: ذکر منافقوں کا ہو رہا ہے ان کو ہی مثالوں سے بیان کیا جا رہا ہے تو کافروں کا ذکر کیسے آ گیا۔

جواب: قرآن پاک کی یہی عظمت ہے کہ ایک لفظ سے کئی معانی سمجھا دیئے جاتے ہیں یعنی پہلے ان کافروں کا ذکر کیا جو بد بخت ہمیشہ کے لئے کفر پر رہ کر مرنے والے ہیں پھر منافقوں کا ذکر کیا باطنی طور پر وہ بھی کافر ہیں جن کے کفر کو ﴿ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ ﴾ سے ثابت کر دیا گیا کہ وہ ایمان والے نہیں ﴿ وَاللّٰہُ مُحِیۡطٌ بِالۡکٰفِرِیۡنَ ﴾ سے حکم عمومی ثابت کر دیا کہ ظاہری کافر، باطنی کافر یعنی کفر پر مرنے والے سارے ہی اس میں داخل ہیں۔

﴿ یَکَادُ الْبَرْقُ یَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَاۤ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِیْهِ ۙ وَاِذَاۤ اَظْلَمَ عَلَیْهِمْ قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴾

۱ ''بجلی یوں معلوم ہوتی ہے کہ ان کی نگاہیں اچک لے جائے گی جب کچھ چمک ہوئی اس میں چلنے لگے اور جب اندھیرا ہوا کھڑے رہ گئے اور اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کے کان اور آنکھیں لے جاتا بیشک اللہ سب کچھ کر سکتا ہے''

۲ ''قریب ہے کہ بجلی ان کی بینائی اچک لے جب بھی ان کے لئے روشنی ہوئی وہ اس میں چلنے لگے اور جب اندھیرا ہوا کھڑے رہ گئے اور اگر اللہ چاہتا تو ان کی بینائی اور شنوائی لے جاتا بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے''

یَکَادُ الْبَرْقُ: کاد افعال مقاربہ ہے اس لئے واضح کیا گیا ہے کہ اس سے یہ ثابت ہو کہ خبر کا پایا جانا قریب ہے لیکن پائی نہیں گئی یا کسی مانع کے عارض ہونے کی وجہ سے نہیں پائی گئی یا شرط ہی نہیں پائی گئی (بیضاوی) ہاں البتہ قرآن پاک کے بغیر عربی شعراء نے اس کی خبر کو وجود میں بھی استعمال کیا ہے جیسا کہ روبہ نے کہا "قد کاد من طول البلی ان یمصحا" زیادہ دیر گزر جانے کی وجہ سے نشانات تقریباً مٹ چکے ہیں۔ اس مصرع میں "کاد" کے بعد اس کی خبر کا تقریباً وقوع ثابت کیا گیا ہے (از قرطبی) اور یہ بھی خیال رہے کہ "عسی" کی خبر کے پائے جانے کی امید پائی جاتی ہے یعنی اس کا پایا جانا قریب ہوتا ہے۔

(بیضاوی)

یَخْطَفُ: "الخطف الاخذ بسرعة" جلدی سے کسی چیز کو لے لینا اسے عربی میں خطف کہا جاتا ہے اور اردو میں "اچک لینا" ایک پرندہ جو بہت تیزی سے اڑتا ہے اسے خطاف (خاء پر پیش) کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک نے خوف دلانے کے لئے اسے مثال کے طور پر پیش کیا ہے اب معنی یہ ہوگا "ان خوفھم مما ینزل بھم یکاد یذھب ابصارھم" بیشک ان کو خوف ہوتا ہے کہ ان پر بجلی گر کر ان کی بینائی کو ہی زائل نہ کر دے۔ خطف باب سمع پر بھی آتا ہے اور ضرب پر بھی اسی مقام میں ایک قراءت میں "یتخطف" بھی آیا ہوا ہے۔

اَبْصَارَهُمْ: ابصار جمع ہے بصر کی "وھی حاسة الردیة" یہ دیکھنے والی قوت کو کہا جاتا ہے جسے ہم اپنی زبان میں نظر، نگاہ، بینائی کہہ لیتے ہیں۔

(قرطبی)

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ کی بحث بعد میں آئے گی ابھی دونوں آیتوں سے حاصل ہونے والے مقصد کو بیان کیا جاتا ہے۔

مقصد بیان: جس کہاوت اور ضرب المثل سے منافقوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ کہاوت یہ ہے جب بادل ہو اس میں کڑک اور چمک ہو بادل کی تاریکی کے ساتھ رات کی تاریکی اور بارش کی کثرت کی تاریکی بھی جمع ہو جائیں اس میں بجلی بھی گر رہی ہو۔ ایسی حالت میں پھنس جانے والے لوگ موت سے ڈر کر اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس رہے ہوں انہیں یہ بھی خطرہ ہو کہ کہیں بجلی ہماری

نظروں کو ہی ضائع نہ کر دے۔ لیکن جب بجلی چمکتی ہے تو وہ اس روشنی میں کچھ چل بھی لیتے ہیں اور جب بجلی کی چمک ختم ہو جاتی ہے تو بہت زیادہ تاریکی چھا جاتی ہے وہ متحیر (بہت حیران) ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں کیونکہ تین تاریکیوں کے بعد اچانک روشنی ہو کر پھر جب ختم ہو جاتی ہے تو حیرت بڑھ جاتی ہے بلکہ وہ اندھیرا آنکھوں میں پہلے سے بھی بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔

منافقین کو اس کہاوت سے مشابہت کیسے؟

اس میں مشابہت کی چند وجوہ پائی گئی ہیں سب کو دیکھ کر سمجھنا کوئی مشکل نہیں:

(۱) منافقوں کی حیرت اور دین میں جہالت کو ان لوگوں سے مشابہت دی گئی کہ جس طرح بادل میں پھنس جانے والے تاریکیوں کی وجہ سے راہ نہیں دیکھ سکتے منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے اسی طرح منافقین بھی اپنے تحیر اور دین میں جاہل ہونے کی وجہ سے سیدھی راہ نہیں چل رہے اور نہ ہی کامیابی کو حاصل کرنے کی راہ انہوں نے اختیار کی۔

(۲) بارش اگرچہ نفع مند ہے لیکن جب اس میں کڑک ہو، چمک ہو اور بجلی کے گرنے کا خطرہ ہو بلکہ بجلی گر رہی ہو تو ایسی صورت میں بارش نقصان دہ ہوتی ہے نفع مند نہیں ہوتی۔ ایمان کو ظاہر کرنا بھی نفع مند ہوتا ہے لیکن جب کہ اسکے ساتھ باطنی ایمان بھی پایا جائے خلوص اعتقاد ہو دل میں بھی ایمان ہو اور زبان پر بھی ایمان ہو لیکن جب خلوص نہ ہو منافقت پائی جائے اب ایمان کا ظاہر کرنا نقصان دہ، نفع مند نہیں یعنی منافقت انسان کو جہنم کا ایندھن بنا دیتی ہے۔

(۳) جو لوگ خالص مومن ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہیں انہیں معلوم ہوتا ہے کڑک، گرج وغیرہ سے انگلیوں کو کانوں میں ٹھونسنا نفع نہیں دے سکتا جو بھی ہونا ہے وہی ہونا ہے جو اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا۔ لیکن جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کم ہوتا ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کانوں میں انگلیاں ٹھونسنا ان کے لئے نفع مند ہے حالانکہ ان کی یہ سوچ غلط ہے۔ ان لوگوں سے ہی منافقوں کی اس حالت کو تشبیہ دی گئی کہ منافق لوگ مومنوں کے سامنے ایمان کا اظہار کرتے اور کہتے ہم تمہارے ساتھ ہیں وہ یہ سمجھتے کہ ہمارے لئے ایسا کرنا نفع مند ہے حالانکہ یہ ان کی سوچ غلط تھی کیونکہ رب تعالیٰ نے ان کی چالبازوں کو بے نقاب کر کے ذلیل کر دیا۔

(۴) جس طرح بجلی کی کڑک سے موت کے ڈر کی وجہ سے وہ انگلیاں کانوں میں ٹھونستے تھے اسی

طرح منافقین جہاد میں شریک ہونے سے گھبراتے تھے اور اگر جاتے تو وہاں سے بھاگ آتے مختلف حیلے، بہانے بنا کر واپس لوٹ آتے کیونکہ یہ بھی ڈرتے تھے کہ مر جائیں گے اور قتل ہو جائیں گی۔

(۵) جس طرح کڑک، گرج میں مبتلا ہونے والے موت سے ڈر کر کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر یہ سمجھتے کہ ہم موت سے بچ جائیں گے ان کو یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا " **فان الموت والھلاک من ورائھم لا مخلص لھم** " کہ موت اور ہلاکت کو ان کا پیچھا کر رہی ہے اس سے ان کو چھٹکارا حاصل نہیں ہوتا۔ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی سے بھی یہی مضمون سمجھ میں آ رہا ہے " **قل ان الموت الذی تفرون منه فانه ملا قیکم** " اے محبوب آپ فرمادیں بیشک وہ موت جس سے تم بھاگ رہے ہو بیشک وہ تمہیں ملنے والی ہے۔ یہی حال تھا منافقین کا وہ یہ سمجھتے تھے کہ شائد مومنوں کے سامنے ایمان کا اظہار کر کے وہ رب تعالیٰ کے عذاب سے بچ جائیں گے لیکن انہیں یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا:

" **ان الذی یخوضون فیه لا مخلص من عذاب النار** "

"کہ وہ جو کوشش کر رہے ہیں یہ ان کو جہنم کے عذاب سے چھٹکارا نہیں دلا سکے گی"

(۶) جس طرح بادل کی وجہ سے کڑک اور بجلی کی چمک میں مبتلا ہونے والا شخص بہت زیادہ حیران و پریشان ہوتا ہے کیونکہ ہر طرف سے مختلف اندھیروں کا اسے سامنا کرنا پڑ رہا ہے بجلی گرنے کا اسے خوف ہے۔ ایسے ہی منافقین دین میں بہت زیادہ حیران تھے کسی راہ کو متعین کرنا ان سے نہیں ہو رہا تھا اور ہر وقت ان کو یہ خوف دامن گیر رہتا کہ اگر ہمارے باطنی کفر کا مومنوں کو پتہ چل گیا تو یہ ہمیں قتل کر دیں گے:

" **فلا یکاد الوجل والخوف یزول عن قلبه مع النفاق** "

"منافق جب تک منافق ہے اس کے دل سے ڈر اور خوف نہیں نکل سکتا"

(۷) ایمان اور قرآن پاک کو بارش سے تشبیہ دی گئی ہے اور تاریکیوں اور کڑک اور چمک سے منافقوں کو مشکل میں ڈالنے والی چیزوں کو تشبیہ دی گئی ہے۔ منافقوں کو مشکل چیزیں جو نظر آتی تھیں وہ یہ تھیں نماز ادا کرنا، روزہ رکھنا اپنی ریاست و سرداری کو چھوڑنا اور جہاد کرنا خصوصاً اپنے

ہی رشتہ داروں سے جہاد کرنا ان کے لئے اور ہی مشکل کا سبب تھا اور اپنے پرانے دین کو چھوڑنا اور نبی کریم ﷺ کی اطاعت کرنا یہ تمام چیزیں وہ اپنے لئے بہت شاق سمجھتے تھے۔ ان تمام چیزوں سے بچنے کے لئے وہ ایمان اور قرآن سے بھی بچتے تھے جیسا کہ اندھیرے، کڑک اور چمک سے بچنے کے لئے انسان بارش کو بھی ناپسند کرے۔

(۸) جس طرح اندھیرے میں اچانک بجلی کی چمک ہونے پر بادل میں گھرے ہوئے چلنا شروع کرلیں اسی طرح منافقین کے مال جب محفوظ رہتے اور ان کی جانیں محفوظ رہتیں اور مالِ غنیمت حاصل ہوتا تو دین کو پسند کرتے۔

(۹) جس طرح بجلی کی چمک کے ختم ہونے پر اندھیرا چھا جانے پر وہ کھڑے ہو جاتے اسی طرح منافقین کو بھی اگر مالِ غنیمت حاصل نہ ہوتا اور کسی قسم کا دنیاوی نفع نہ حاصل ہوتا تو وہ دین کو ناپسند کرنا شروع کردیتے۔ (از کبیر)

(۱۰) جب بھی ان کے احوال بہتر ہوتے کھیتی باڑی، مال مویشی میں ترقی ہوتی اور ان کو نعمتیں زیادہ حاصل ہوتیں تو کہتے:

" دین محمد دین مبارک " ، "محمد کا دین مبارک دین ہے"

گویا کہ وہ جب روشنی ہوتی تو چلتے اور جب ان پر کوئی مصیبت آتی اور قحط سالی میں مبتلا ہوتے " ثبتوا فی نفاقھم " اپنی منافقت میں قائم رہتے یعنی اندھیرا چھا جانے پر چلنے سے رک جاتے۔ (از قرطبی)

فائدہ: صوفیاء کرام نے بیان فرمایا کہ اسی مثال سے ایک اور مطلب بھی سمجھ میں آ گیا کہ اگر کسی شخص کے ابتدائی طور پر ہی احوال ارادہ صحیح نہ ہوں وہ اپنے باطل گمان اور جھوٹے دعوی سے اکابر کے درجہ میں ہونا ظاہر کرے تو گویا کہ اس نے اپنے آپ کو شیخ ظاہر کر کے بارش کو ظاہر کیا جھوٹے دعووں سے اپنے آپ کو بجلی اور کڑک کا مستحق ٹھہرایا۔ (از قرطبی)

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ :

" لو " حرف تمنی ہے شرط کے معنی میں استعمال ہے اس کی جزاء " لذھب " ہے یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو مومنوں کو ان پر ابتدائی طور پر ہی مطلع کر دیتا کہ وہ ان کو قتل کر دیتے اور اپنے آپ سے

ان کو دور کر دیتے۔ سمع اور بصر کا ذکر اس لئے کیا کہ ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے یا اس لئے کہ انسان کے یہ اشرف اعضاء ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ: " الشئی یختص بالموجود " موجود کے ساتھ شے خاص ہے اصل میں یہ مصدر ہے " شاء " کا جس کا معنی ہے اس نے موجود کیا معتزلہ نے " شئی " کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہا " الشئی ما یصح ان یوجد وھو یعم الواجب والممکن " شئی اسے کہا جاتا ہے جس کا پایا جانا صحیح ہو اس معنی کے لحاظ سے واجب اور ممکن کو بھی " شئی " کہہ لیا جائے گا " او ما یصح ان یعلم ویخبر عنه فیعم الممتنع ایضا " شئی کا معتزلہ بعض اوقات معنی بیان کرتے ہیں کہ شئی اسے کہا جاتا ہے کہ جس کا علم حاصل کرنا اور اس کی خبر دینا ممکن ہو اس لحاظ پر شئی عام ہے جو واجب ممکن اور ممتنع تمام کو ہی شامل ہے۔

قَدِيْرٌ: قدرۃ سے لیا ہوا ہے " القدرۃ ھو التمکن من ایجاد الشئی " کسی چیز کو موجود کر سکنا قدرۃ کہلاتا ہے۔

قادر اور قدیر میں فرق: اگرچہ دونوں لفظ ہی قدرۃ سے لئے ہوئے ہیں بظاہر دونوں کا معنی ایک ہے لیکن ان کا استعمال کے لحاظ پر فرق بھی ہے " القادر ھو الذی ان شاء فعل وان لم یشا لم یفعل " قادر وہ ہے کہ اگر کام کرنا چاہے تو کرے اور اگر نہ کرنا چاہے تو نہ کرے " القدیر الفعال لما یشا علی ما یشا " قدیر وہ ہے کہ جو چاہے وہ کرے اس طرح جس طرح چاہے۔ غیر اللہ پر اس کا استعمال بہت ہی کم ہوا۔

(از بیضاوی)

اعتراض: اہل سنت و جماعت کے نزدیک جب شئی کا معنی موجود ہے اور موجود تو رب تعالیٰ کی ذات اور صفات بھی ہیں اور رب تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ پر بھی شی کا اطلاق ہے۔

" قل ای شئی اکبر شهادة من الله ، قل الله شهید "

اس آیۃ کریمہ میں پہلے سوال ہے کہ " اے محبوب آپ فرما دو کون سی چیز بڑی ہے از روئے اللہ تعالیٰ کی شہادت کے " پھر اس کا جواب ہے فرما دو اللہ گواہ ہے یعنی سب چیزوں سے اللہ بڑا

گواہ ہے۔اس میں رب تعالیٰ پرشئ بولا گیااب خرابی یہ لازم آئے گی کہ آیۃ کریمہ سے یہ سمجھ آئے گا کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات اور صفات پر بھی قادر ہے حالانکہ واجبات قدرۃ میں داخل نہیں۔اسی طرح معتزلہ پر اعتراض میں اور زیادتی ہوگی کہ ان کی نزدیک شئ کا جو معنی ہے اس معنی کے لحاظ سے، واجبات اور ممتنعات تمام ہی قدرۃ میں داخل ہوں گے حالانکہ یہ بھی صحیح نہیں۔اور برے افعال رب تعالیٰ کی قدرت میں کیسے داخل ہوں گے حالانکہ بظاہر یہ معلوم ہورہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے تو ہر چیز میں جھوٹ، چوری وغیرہ تمام ہی برے اعمال داخل ہو گئے کس طرح کہنا صحیح ہوگا کہ اللہ تعالیٰ جھوٹ، چوری وغیرہ جیسے برے اعمال پر بھی قادر ہے''معاذ اللہ''

جواب: پہلے آسان لفظوں میں علامہ احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ کی تفسیر کو دیکھیں جواب خود سمجھ آجائے گا اس کے بعد انشاءاللہ تفصیلی جواب نقل کروں گا۔''ہم کتاب وسنت کے دلائل قطعیہ کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کے کمال قدرت پر ایمان رکھتے ہوئے اس کی سبوحیت وقدوسیت پر بھی ایمان رکھتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر ہم مومن نہیں ہوسکتے۔قاضی بیضاوی نے فرمایا لفظ''قدیر'' قدرت سے مشتق ہے اس کا استعمال مبالغہ کے معنی میں ہوا یہی وجہ ہے کہ غیر اللہ کے لئے اس کا استعمال بہت ہی کم ہوا ہے۔ قدرت کے معنی ہیں'' التمکن من ایجاد الشئی ''کسی شئ کے ایجاد پر قابو اور قوت رکھنا'' بندے کی قدرت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کسی فعل کی قوت رکھتا ہو قادر اور قدیر کے لئے ضروری نہیں کہ وہ جو کام کرسکتا ہو اسے ضرور کرے بلکہ اس کا کرنا نہ کرنا اس کے ارادے پر موقوف ہے چاہے کرے چاہے نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ کا کرنا نہ کرنا مشیت کے علاوہ حکمت سے بھی متعلق ہوتا ہے کیونکہ وہ قدیر ہی نہیں بلکہ حکیم بھی ہے لہٰذا اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ (التبیان مع البیان ص ۷۰)

علامہ کاظمی رحمہ اللہ کی اس تفسیر کے بعد عوام کے لئے تو کچھ بیان کرنا ضروری نہیں کیونکہ ان کے لئے تو اتنا بیان ہی کافی ہے اور علماء کرام کے لئے اس لئے ضروری نہیں کہ تفاسیر کو دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت وہ راقم سے زیادہ رکھتے ہیں۔دینی مدارس کے آخری کلاسوں کے طلباء کرام بھی یقیناً بہت بڑی صلاحیت کے مالک ہوتے ہیں وہ بھی اردو تفسیر کے محتاج کم ہی ہوتے ہیں تاہم چھوٹی کلاسوں کے طلباء کے فائدہ کے لئے کچھ مزید بحث پیش خدمت ہے۔

قاضی بیضاوی نے فرمایا: شی کا معنی " مشئی وجودہ "جس کے وجود کو رب تعالی چاہے۔ اور اس کا ارادہ کرے اس کی وضاحت کرتے ہوئے شیخ زادہ نے بیان کیا کہ واجبات یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کا وجود اور اس کی صفات قدرت سے باہر ہیں " **لانہ لا یصدق علیہ مفھوم مشئی وجودہ** " اس وجہ سے کہ شئی کا معنی جو قاضی بیضاوی نے " **مشئی وجودہ** " کیا ہے اس کا مفہوم واجب تعالیٰ اور اس کی صفات پر ثابت ہی نہیں۔ اس طرح معتزلہ کا مسلک بیان کرنے کے بعد فرمایا " **لزمھم التخصیص بالممکن فی الموضعین** " ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس آیۃ میں شئی کا معنی کرتے ہوئے "**ممکن**" کی قید لگائیں تاکہ واجب اور ممتنع اس سے خارج ہو جائے کیونکہ ہر ذی عقل کی عقل کا یہی تقاضا ہے کہ ممتنعات اور واجبات قدرت سے باہر ہیں۔ قدرت کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف کریں تو اس کا معنی ہوتا ہے " **نفی العجز** " وہ عاجز نہیں اور قدرت کی نسبت جب بندے کی طرف کریں تو پھر اس کا معنی ہوتا ہے " **یتمکن بھا من الفعل** " کہ اسے یہ طاقت وقدرت حاصل ہے کہ وہ یہ کام کر سکتا ہے اسی طرح قدرۃ کا معنی جب قدر سے لیا جائے تو معنی یہ ہوگا " **القادر یوقع الفعل علی مقدار قوتہ** " قادر وہ ہے جو اپنی قدرت کی مقدار کے مطابق کام کو واقع کرے "**اوعلی مقدار ما تقتضیہ المشیۃ** " رب تعالیٰ کو ہر چیز پر قدرت حاصل ہے جب وہ چیز اس کی مشیت میں بھی ہو۔

بیضاوی کا خلاصہ یہ ہے کہ بندہ جس چیز پر عمل کے لحاظ پر قادر ہے رب تعالیٰ اس پر خلق کے لحاظ پر قادر ہے اور وہ رب تعالیٰ کی تقدیر میں ہے اور رب تعالیٰ جس چیز کو چاہے اور اس کی شان کے لائق ہو وہ اس کی قدرت میں داخل ہے برے اعمال خود ہی اس قابل نہیں کہ رب تعالیٰ کی قدرت میں داخل ہونا ان کا ممکن ہو اور نہ ہی رب ان کو چاہتا ہے اور نہ ہی ان کا ارادہ کرتا ہے اس بحث سے برائیوں کا رب کی قدرت میں ممکن ہونے کا بیہودہ قول رد ہو جائے گا۔ اور علامہ بیضاوی کی اس عبارت میں مشکل میں کوئی نہیں پھنسے گا " **ان مقدور العبد مقدور اللہ** " مطلب اس کا یہی ہے کہ بندہ جس پر عمل کرنے پر قادر ہے وہ چیز رب کی قدرت تخلیق وایجاد میں داخل ہے۔

جلالین میں ذکر کیا گیا:

﴿ ان الله علی کل شاء ہ﴾ (قدیر)، ''بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز جسے چاہے اس پر قادر ہے''

اس پر صاوی میں بیان کیا گیا کہ مفسر نے ''شاء ہ'' سے ''شئی'' کی تفسیر اس لئے کی ہے کہ وہ اعتراض مندفع ہو جائے کہ کہا جاتا ہے شی تو موجود کو کہتے ہیں تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات بھی موجود ہیں لفظ ''کل'' استغراق کے لئے جس کا مطلب ہوگا ہر موجود پر اللہ تعالیٰ قادر ہے قدرت کا تعلق واجبات سے صحیح نہیں۔ کیونکہ موجود کو پھر موجود کرنے کی قدرت سے ایک حاصل چیز کو حاصل کرنا لازم آئے گا اور یا حقائق کا بدلنا لازم آئے گا۔ جب شیٔ کی تفسیر شاء ہ سے کی تو اس سے یہ واضح کر دیا:

''ان الله علی کل شی ای اراده والآرادة لا تتعلق الا بالممكنات''

''بیشک اللہ تعالیٰ جس چیز کا ارادہ کرے اس پر قادر ہے ارادہ کا تعلق صرف ممکنات سے ہے واجبات اور ممتنعات سے نہیں'' (از صاوی)

''والمتحيلات فلا تتعلق القدرة والاراده بشی من ذلک''

''محال چیزوں سے قدرت اور ارادہ کا کوئی تعلق نہیں'' (صاوی حاشیہ جلالین ص ۹۷)

یقینی بات ہے کہ تمام برائیاں رب تعالیٰ کے حق میں محال کے درجہ میں ہی ہیں ان کا پایا جانا ممکن بھی نہیں۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے کیا خوب بحث کی:

''والشئی لغة ما یصح ان یعلم ویخبر عنه كما نص علیه سیبویه'' شیٔ لغت میں اسے کہتے ہیں جس کا علم حاصل ہو سکے اور اس سے خبر دی جا سکے سیبویہ نے یہی بیان کیا ہے۔ علامہ آلوسی کے اس بیان سے پتہ چلا کہ یہ معنی صرف معتزلہ کے نزدیک نہیں ہے بلکہ نحو کے امام کے نزدیک لغوی معنی یہی ہے اس معنی کے لحاظ سے معدوم موجود واجب اور ممکن سب کو شیٔ کہا جاتا ہے لیکن اطلاق کے لحاظ پر مختلف ہیں قرائن سے پتہ چلے گا کہ یہاں کون کون سے افراد پائے گئے ہیں:

☆ کبھی جمیع افراد مراد ہوں گے جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴾ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے۔

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا علم واجب، ممکن معدوم، ممکن موجود محال سب کو محیط ہے۔

☆ اور کبھی شئی کا اطلاق صرف ممکن پر ہوگا واجب اور ممتنع پر اس کا اطلاق نہیں ہوگا جیسا کہ اسی آیۃ میں اس پر قرینہ قدرت ہے کیونکہ قدرت کا تعلق صرف ممکنات سے ہے لہٰذا واضح ہوا کہ ﴿ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴾ کا مطلب ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ممکنات پر قدرت رکھتا ہے

☆ اور کبھی شئی کا اطلاق ممکن خارجی پر ہوتا ہے لیکن ابھی تک وہ صرف ذہن میں موجود ہے جیسا کہ ارشاد ہوا ﴿ وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَیْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِکَ غَدًا اِلَّا اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ ﴾ تم ہرگز کسی شے کی متعلق یہ نہ کہو کہ میں کل کروں گا مگر یہ کہ اللہ چاہے یعنی جو کام ہوسکنا ممکن ہے اور ابھی تک تمہارے ذہن میں موجود ہے کہ کل کرنا ہے تو اس کے لئے " ان شاء اللہ " کا لفظ ذکر کر کے کہو کہ "کل میں کروں گا"۔

☆ اور کبھی شئی کا اطلاق ہوتا ہے ممکن معدوم پر جو نفس الامر میں ثابت ہوتی ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا:

﴿ اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَا اَرَدْنٰہُ اَنْ نَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ﴾

بیشک ہمارا قول کسی چیز کے بارے میں جب ہم اس کا ارادہ کرتے ہیں تو ہم کہتے ہیں ہوجا وہ ہو جاتی ہے۔ اس میں تکوین قرینہ ہے کیونکہ کسی چیز کی تکوین (معرض وجود میں لانا) کا تعلق ہی معدوم سے ہوتا ہے اگر پہلے سے ہی موجود ہو تو اسے پھر موجود کرنے کا کیا مطلب ہوگا۔

☆ اور کبھی شی کا اطلاق موجود خارجی پر ہوتا ہے یعنی جو چیز خارج میں موجود ہوتی ہے اسے شی کہا جاتا ہے جیسا کہ ارشاد گرامی ہے:

﴿ وَقَدْ خَلَقْتُکَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَکُ شَیْئًا ﴾

(اے زکریا) میں نے اس سے پہلے تمہیں پیدا کیا تو تم کچھ نہیں تھے یعنی تم خارج میں واقع میں موجود نہیں تھے جب میں نے تمہیں پیدا کیا۔

(از روح المعانی)

خیال رہے کہ علامہ آلوسی نے قاضی بیضاوی کے اس قول پر کہ شی موجود کو کہتے ہیں اور اس آیۃ میں " مشئی وجودہ " کے معنی میں ہے " فیہ ما فیہ " سے اعتراض کیا ہے۔ تاہم راقم کے نزدیک آسان بات یہ ہے کہ شئی کا معنی موجود کرنا بھی اہل علم کا قول ہے جب وہ قول لیا جائے تو اس وقت آیۃ کریمہ میں " شئی موجودہ " معنی ہوگا۔ اور جب یہ معنی مراد ہو جو سیبویہ نے کیا ہے اور علامہ آلوسی نے بیان کیا ہے پھر یہ بحث بھی خوب ہے جو علامہ آلوسی نے بیان کی ہے۔

﴿ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾

☆ اے لوگو اپنے رب کو پوجو جس نے تمہیں اور تم سے اگلوں کو پیدا کیا یہ امید کرتے ہوئے کہ تمہیں پرہیز گاری ملے۔

☆ اے لوگو اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے (لوگوں) کو پیدا کیا تا کہ تم پرہیز گار ہو جاؤ۔

جب اللہ تعالیٰ نے مکلفین کے تین فرقوں کا ذکر کیا مومنین، کفار اور منافقین جو کہ مذبذبین تھے۔ مومنین کا ذکر ﴿الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ﴾ سے کیا کامل مومنین متقین کی صفات کو ذکر کیا پھر ان پر مرتب ہونے والے انعامات کا ذکر ﴿اُولٰٓئِكَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ سے کیا، دوسرا فرقہ کفار کا ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ﴾ سے ان کا ذکر کیا پھر ان کی سزا کا ذکر کیا کہ ان کے دلوں اور کانوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اس کے بعد ﴿ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴾ سے ان کے لئے بڑے عذاب کا ذکر کیا، تیسرے فرقہ منافقین کا ذکر ﴿ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ ﴾ سے کیا پھر ان کی سزا کا ذکر ﴿ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴾ سے کیا اس کے بعد تینوں فرقوں کو حرف نداء سے اپنی طرف متوجہ کیا کیونکہ عبادت میں تکلیف اور مشقت پائی جاتی ہے جب کسی کو خطاب کیا جائے تو وہ لذت محسوس کرتا ہے۔ (از روح المعانی)

دینی مدارس کے طلباء کے لئے:

یا: صاحب کشاف نے کہا ''یا'' حرف نداء اس کی وضع بعید کے لئے ہے لیکن مجازی طور پر قریب کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے نداء بعید کو یہاں کیوں استعمال کیا گیا اصل وجہ یہ ہے کہ قریب کے مقام پر بعید کو استعمال اس لئے کیا جاتا ہے کہ یا نداء دینے والے کا مرتبہ بلند ہوتا یا منادی کا درجہ بلند ہوتا ہے۔ اس مقام پر منادی (اسم فاعل) کا مرتبہ بلند ہے کیونکہ وہ رب تعالیٰ ہے اور کبھی اس لئے بھی قریب کے مقام پر بعید کو لایا جاتا ہے کہ سامع کی غفلت کو دور کرنا بھی مقصود ہوتا ہے وہ صورت بھی یہاں موجود ہے کہ خطاب

کا مطلب ہو کہ اے لوگو غفلت کو دور کرتے ہوئے رب تعالیٰ کے ارشاد کو غور سے سنو پھر اس پر عمل کرو۔

(از روح المعانی)

تنبیہ: قاضی بیضاوی نے بھی صاحب کشاف کے قول کو پسند کیا کہ ''یا'' کی وضع نداء بعید کے لئے ہے قریب کے لئے مجازی طور پر استعمال ہوتا ہے لیکن شیخ زادہ نے اسے رد کرتے ہوئے کہا:

" قال ابن الحاجب فی الکافیة یا اعم حروف النداء ای ینادی بها القریب والبعید علی السواء ودعوی المجاز فی احدهما خلاف اصل "

''علامہ ابن حاجب نے کافیہ میں ذکر کیا ہے کہ یا حرف ندا قریب اور بعید کے لئے برابر ہے اس لئے قریب کے لئے مجاز کا قول کرنا خلاف اصل ہے''

راقم کا بھی خیال یہی ہے جو شیخ زادہ نے کہا ہے کہ قریب اور بعید کے لئے بطور مشترک ایک جیسا استعمال ہے اگر بعید کو قریب کے لئے استعمال ہونا تسلیم کیا جائے تو وہی صورت ہوگی جو بیان ہو چکی ہے۔ اور اگر قریب ہو اور استعمال بھی قریب کے لئے ہو تو پھر واضح ہے کہ مخلوق رب سے دور نہیں اس لئے کہ رب تعالیٰ خود قریب ہے البتہ یہ خیال رہے کہ یہ قرب وبعد مکان کے لحاظ سے نہیں رب تعالیٰ مکان سے پاک ہے اس قرب وبعد سے مراد رب تعالیٰ کی رحمت کا قریب ہونا مومنوں کے لئے اور رب تعالیٰ کے عذاب کا کفار ومنافقین کے قریب ہونا مراد ہے۔ اسی طرح تمام مخلوق کا اسے علم ہے اور تمام پر اس کی مہربانیاں ہیں اس لحاظ پر وہ سب کے قریب ہے۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

اَیُّھَا: قانون یہ ہے کہ معرف باللام (جس کلمہ پر الف لام ہو) پر جب حرف نداء آئے تو سوائے لفظ ''اللّٰہ'' کے باقی تمام کلمات پر حرف نداء اور معرف باللام کے درمیان ایھا اور ای ھذا وغیرہ کا فاصلہ لاتے ہیں۔

النَّاسُ: یہ خطاب کن لوگوں کو ہے؟ اس سے مراد مومنین ہیں یا کفار ہیں یا سب ہی مراد ہیں؟ بعض حضرات نے کہا کہ یہ خطاب کفار کو ہے کیونکہ اس آیۃ کی ابتدا ﴿ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ ﴾ سے ہے جو آیتیں ﴿ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ ﴾ سے شروع ہوتی ہیں وہ مکی ہوتی ہیں ان میں خطاب مشرکین مکہ کو ہوتا ہے اور جو آیتیں ﴿ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ﴾ سے شروع ہوتی ہیں وہ مدنی ہوتی ہیں۔

لیکن خیال رہے یہ دونوں قاعدے کلیہ نہیں بلکہ اکثریہ ہیں کیونکہ ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْا

انفسکم واھلیکم نارا ﴾ آیۃ کی ابتداء ﴿ یا یھا الذین امنوا ﴾ سے ہے لیکن آیۃ مکی ہے اور یہ آیۃ ﴿ یایھا الناس اعبدوا ﴾ بالاتفاق مدنی ہے (از عزیزی) اس لئے زیادہ بہتر یہی ہے کہ یہاں یہ تسلیم کیا جائے کہ یہ خطاب عام ہے مومنین کفار اور منافقین کو علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے ایک قول نقل کرتے ہوئے فرمایا:

"انہ عام فی جمیع الناس فیکون خطابہ للمؤمنین باستدامۃ العبادۃ وللکافرین بابتدائھا وھذا حسن"

یہ حکم عام ہے مومنوں کو بھی عبادت کرنے کا حکم دیا گیا لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ اے مومنو اگرچہ تم پہلے ہی عبادت کر رہے ہو۔ لیکن اپنی عبادت پر قائم و دائم رہو۔ یعنی ہمیشہ کے لئے اپنی عبادت کو جاری رکھو۔ کفار کو بھی خطاب ہے کہ اے کافرو تم بھی رب تعالیٰ کی عبادت کو جاری کرلو، اور یہ خطاب منافقین کو بھی اسی طرح ہی ہوگا، کیونکہ وہ بھی کفار ہی ہیں، یہی قول زیادہ بہتر ہے۔ (از قرطبی)

البتہ یہ خیال رہے کہ کفار کا کافرہ کرتو عبادت کرنا یعنی نماز ادا کرنا روزہ رکھنا وغیرہ کوئی مفید نہیں ان کو حکم دینے کا کیا مطلب؟ اس مسئلہ میں اتفاق ہے کہ دنیا کے لحاظ سے حکم کا مطلب یہ ہے کہ اے کافرو پہلے ایمان لے آؤ پھر عبادت کرو۔

اے منافقو! جس طرح تم ظاہری طور پر ایمان کا اقرار کرتے ہو اسی طرح باطنی طور پر بھی ایمان لے آؤ پھر عبادت کرو لیکن کافر اگر حالت کفر میں ہی مر گئے ایمان نہ لائے تو قیامت میں ان کو ایمان نہ لانے کا اور عبادات پر اعتقاد نہ رکھنے کا عذاب ہوگا۔ یہی مطلب ان آیات کا ﴿ وویل للمشرکین الذین لا یؤتون الزکوۃ ﴾ عذاب ہوگا مشرکین کو جو زکوۃ ادا کرنے کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے ﴿ ما سلککم فی سقر ☆ قالوا لم نک من المصلین ☆ ولم نک نطعم المسکین ﴾ (جب کافروں سے پوچھا جائے گا) تمہیں جہنم میں کس چیز نے داخل کیا ہے تو وہ کہیں گے ہم نماز کی فرضیت کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے اور مسکینوں کو طعام کھلانے (یعنی زکواۃ دینے) کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے۔

یہی قول معتبر ہے جو بیان کر دیا گیا ہے کہ آخرت میں ان کو عذاب ایمان نہ لانے اور عبادات پر

عقیدہ نہ رکھنے کی وجہ سے ہوگا تاہم بعض حضرات کا یہ بھی خیال ہے کہ بات صرف عقیدہ نہ رکھنے کی نہیں بلکہ کفار کو عذاب ایمان نہ لانے کی وجہ سے جس طرح ہوگا اسی طرح عبادات کے ادا نہ کرنے کی وجہ سے بھی ہوگا۔

(ماخوذ از روح المعانی)

خیال رہے کہ عبادت کی بحث تفصیلی طور پر ﴿ اِیَّاکَ نَعْبُدُ ﴾ کی وضاحت بیان کرتے ہوئے ذکر ہو چکی ہے۔

رَبَّکُمْ: اے لوگو عبادت کرو اپنے رب کی یہاں سے یہ واضح کیا گیا کہ اگر عبادات میں تمہیں مشکل درپیش آئے تو اس کے قریبی اور واضح سبب کو سامنے رکھنا کہ اس ذات کی تم عبادت کر رہے ہو جو تمہارا رب ہے مالک ہے ہر طرح کی تمہاری تربیت اسی کے قبضہ قدرت میں ہے لیکن یہ حکم عوام کے لئے ہے خواص تو بغیر واسطہ کے ہی عبادت کرتے ہیں وہ تو صرف اس کی ذات کبریائی کو دیکھتے ہیں۔

(از روح المعانی)

اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ: خلق کا لغوی معنی ہے " صحیح مستیقم "، خلق کا استعمال ان معانی میں ہے عدم سے وجود میں لانا اور بغیر نمونہ کے کسی چیز کو ایجاد کرنا۔

تنبیہ: کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے کسی انسان کو اس معنی کے لحاظ سے خلق حاصل نہیں البتہ مخلوق کے لئے جھوٹ بہتان گھڑنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ "وتخلقون افکا"

(از مفردات راغب)

وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ: اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت، صنعت کا ذکر فرمایا کہ تمہیں یہ معلوم ہے کہ خالق تو صرف میں ہی ہوں تو تمہیں چاہئے کہ تم اس ذات کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا یعنی تم کچھ نہ تھے تمہیں معرض وجود میں لایا اور تمہارے آباء واجداد کو بھی اسی ذات نے پیدا کیا۔

خیال رہے کہ کفار بھی رب تعالیٰ کے خالق ہونے کو مانتے تھے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴾

اگر آپ ان سے سوال کریں زمین وآسمان کا خالق کون ہے تو ضرور بر ضرور کہیں گے "اللہ"

انفسکم واھلیکم نارا ﴾ آیۃ کی ابتداء ﴿ یآ یھا الذین امنوا ﴾ سے ہے لیکن آیۃ مکی ہے اور یہ آیۃ ﴿ یآیھا الناس اعبدوا ﴾ بالاتفاق مدنی ہے (از عزیزی) اس لئے زیادہ بہتر یہی ہے کہ یہاں یہ تسلیم کیا جائے کہ یہ خطاب عام ہے مومنین کفار اور منافقین کو علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے ایک قول نقل کرتے ہوئے فرمایا:

" انہ عام فی جمیع الناس فیکون خطابہ للمؤمنین باستدامۃ العبادۃ وللکافرین بابتدائھا وھذا حسن"

یہ حکم عام ہے مومنوں کو بھی عبادت کرنے کا حکم دیا گیا لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ اے مومنو اگرچہ تم پہلے ہی عبادت کر رہے ہو۔ لیکن اپنی عبادت پر قائم ودائم رہو۔ یعنی ہمیشہ کے لئے اپنی عبادت کو جاری رکھو۔ کفار کو بھی خطاب ہے کہ اے کافرو تم بھی رب تعالیٰ کی عبادت کو جاری کرلو، اور یہ خطاب منافقین کو بھی اسی طرح ہی ہوگا، کیونکہ وہ بھی کفار ہی ہیں، یہی قول زیادہ بہتر ہے۔ (از قرطبی)

البتہ یہ خیال رہے کہ کفار کا کافر رہ کر تو عبادت کرنا یعنی نماز ادا کرنا روزہ رکھنا وغیرہ کوئی مفید نہیں ان کو حکم دینے کا کیا مطلب؟ اس مسئلہ میں اتفاق ہے کہ دنیا کے لحاظ سے حکم کا مطلب یہ ہے کہ اے کافرو پہلے ایمان لے آؤ پھر عبادت کرو۔

اے منافقو! جس طرح تم ظاہری طور پر ایمان کا اقرار کرتے ہو اسی طرح باطنی طور پر بھی ایمان لے آؤ پھر عبادت کرو لیکن کافر اگر حالت کفر میں ہی مر گئے ایمان نہ لائے تو قیامت میں ان کو ایمان نہ لانے کا اور عبادات پر اعتقاد نہ رکھنے کا عذاب ہوگا۔ یہی مطلب ان آیات کا ﴿ وویل للمشرکین الذین لا یؤتون الزکوۃ ﴾ عذاب ہوگا مشرکین کو جو زکوۃ ادا کرنے کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے ﴿ ما سلککم فی سقر ☆ قالوا لم نک من المصلین ☆ ولم نک نطعم المسکین ﴾ (جب کافروں سے پوچھا جائے گا) تمہیں جہنم میں کس چیز نے داخل کیا ہے تو وہ کہیں گے ہم نماز کی فرضیت کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے اور مسکینوں کو طعام کھلانے (یعنی زکواۃ دینے) کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے۔

یہی قول معتبر ہے جو بیان کر دیا گیا ہے کہ آخرت میں ان کو عذاب ایمان نہ لانے اور عبادات پر

عقیدہ نہ رکھنے کی وجہ سے ہوگا تاہم بعض حضرات کا یہ بھی خیال ہے کہ بات صرف عقیدہ نہ رکھنے کی نہیں بلکہ کفار کو عذاب ایمان نہ لانے کی وجہ سے جس طرح ہوگا اسی طرح عبادات کے ادا نہ کرنے کی وجہ سے بھی ہوگا۔ (ماخوذ از روح المعانی)

خیال رہے کہ عبادت کی بحث تفصیلی طور پر ﴿ اِیَّاکَ نَعْبُدُ ﴾ کی وضاحت بیان کرتے ہوئے ذکر ہو چکی ہے۔

رَبَّکُمْ: اے لوگو عبادت کرو اپنے رب کی یہاں سے یہ واضح کیا گیا کہ اگر عبادات میں تمہیں مشکل درپیش آئے تو اس کے قریبی اور واضح سبب کو سامنے رکھنا کہ اس ذات کی تم عبادت کر رہے ہو جو تمہارا رب ہے مالک ہے ہر طرح کی تمہاری تربیت اسی کے قبضہ قدرت میں ہے لیکن یہ حکم عوام کے لئے ہے خواص تو بغیر واسطہ کے ہی عبادت کرتے ہیں وہ تو صرف اس کی ذات کبریائی کو دیکھتے ہیں۔ (از روح المعانی)

اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ: خلق کا لغوی معنی ہے " صحیح مستقیم " خلق کا استعمال ان معانی میں ہے عدم سے وجود میں لانا اور بغیر نمونہ کے کسی چیز کو ایجاد کرنا۔

تنبیہ: کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے کسی انسان کو اس معنی کے لحاظ سے خلق حاصل نہیں البتہ مخلوق کے لئے جھوٹ بہتان گھڑنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ "وتخلقون افکا" ۔ (از مفردات راغب)

وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ: اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت، صنعت کا ذکر فرمایا کہ تمہیں یہ معلوم ہے کہ خالق تو صرف میں ہی ہوں تو تمہیں چاہئے کہ تم اس ذات کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا یعنی تم کچھ نہ تھے تمہیں معرض وجود میں لایا اور تمہارے آباء واجداد کو بھی اسی ذات نے پیدا کیا۔

خیال رہے کہ کفار بھی رب تعالیٰ کے خالق ہونے کو مانتے تھے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴾

اگر آپ ان سے سوال کریں زمین وآسمان کا خالق کون ہے تو ضرور بر ضرور کہیں گے "اللہ"

مقصد واضح ہوا کہ جب تم رب تعالیٰ کو خالق بھی مانتے ہو یہ بھی تسلیم کرتے ہو کہ تمہارے آباء واجداد کا خالق بھی وہی ہے گویا کہ تم اس کے احسان کو بھی مانتے ہو اس کی قدرت کو بھی مانتے ہو تو تمہیں خود ہی سمجھ آنا چاہئے کہ اس کا کوئی شریک نہیں اس کے بغیر کوئی عبادت کے لائق نہیں اس لئے اسی ذات کی عبادت کرو۔ پھر یہ بھی خیال کرو کہ تم اگر رب تعالیٰ کی عبادت کرو گے تو اس میں رب تعالیٰ کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ اس میں بھی تمہارا ہی فائدہ ہے کیونکہ تمہیں ہی پرہیزگاری حاصل ہونی ہے۔ (از کبیر)

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ: بظاہر اس میں وہم یہ ہوتا ہے کہ "لعل" ترجی کے لئے آتا ہے یعنی اس میں طمع اور امید کیسے؟ جب کہ یہ رب تعالیٰ کا کلام ہے اس کا ظاہری طور پر معنی یہ سمجھ میں آتا ہے "شائد کہ تم پرہیزگار ہو جاؤ" اس میں تو رب تعالیٰ کی طرف شک کی نسبت کیسے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ "لعل" کا استعمال تین طرح ہے:

(۱) "لعل" ترجی اور توقع کے معنی میں ہی استعمال ہے لیکن اس توقع کی نسبت بندوں کی طرف ہے رب تعالیٰ کی طرف نہیں گویا کہ یوں کہا گیا ہے "**افعلوا ذلک علی الرجاء منکم**" تم عبادت کرو اس میں امید یہ رکھو کہ تمہیں پرہیزگاری حاصل ہو جائے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے "یہ امید کرتے ہوئے کہ تمہیں پرہیزگاری ملے"

(۲) "**ان العرب استعملت لعل مجردة من الشک بمعنی لام کی**" بیشک عربی حضرات "لعل" کو شک کے معنی کے بغیر "لام" کے معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں جس کا معنی ہوتا ہے "تاکہ" راقم کا ترجمہ اور کئی مترجمین کے تراجم اسی جواب کے مطابق ہیں "تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ" "**وهذا القول عن قرطب والطبری**" "لعل" کو "لام کی" کے معنی میں لینا قطرب اور طبری کا قول ہے (قطرب بضم القاف)

(۳) "**ان تکون، لعل بمعنی التعرض للشی**" لعل کبھی کسی چیز کے درپے ہونے کے معنی میں آتا ہے یعنی یہ کام کرو فلاں چیز کے درپے ہونے کے لئے اس توجیہ کے لحاظ پر معنی یہ ہوگا۔

"**لعلکم ان تجعلوا بقبول ما امرکم اللہ به وقایة بینکم وبین النار**"

''اللہ تعالیٰ کا حکم مانتے ہوئے اس کی عبادت کرو اس چیز کو حاصل کرنے کے لئے کہ وہ تمہیں آگ سے بچالے''
(از قرطبی)

تنبیہ: " لعل وعسی حرفا ترج وهما ای کل منهما من الله واجب " (خازن)
لعل اور عسی دونوں ہی امید کے معنی میں آتے ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک جب رب تعالیٰ کی طرف منسوب ہو تو وجوب یعنی یقین کے لئے آئے گا وہاں شک یا صرف طمع کی بات نہیں ہوگی۔

فائدہ جلیلہ:

" ومعلوم ان الزيادة على العبادة عبادة فصح تفسيرة قوله اعبدوا بالزيادة فی العبادة "
(از کبیر)

''جب ایمان والے عبادت گزار حضرات کو حکم ہوگا کہ عبادت کرو تو اس کی تفسیر اس طرح بھی درست ہے کہ کہا جائے تم اور زیادہ عبادت کرو کیونکہ عبادت پر زیادتی بھی عبادت ہے''

اس سے بہت سے لغویات کا حل مل گیا کہ یہاں نوافل درست نہیں یہاں دعا درست نہیں یہ ثابت نہیں وہ ثابت نہیں یہ سب لغو باتیں ہیں عبادت عبادت ہی ہے عبادت سے روکنا منافقوں کا کام ہے

آیۂ کریمہ سے حاصل ہونے والے فوائد:

اللہ تعالیٰ نے جب اپنی ربوبیت اور خالقیت کا ذکر کیا تو اس سے چند فوائد حاصل ہوئے:

پہلا فائدہ: اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا علم اور اس میں نظر واستدلال تمام علوم سے اشرف ہے اس کی فضیلت پر بہت واضح اور روشن دلائل موجود ہیں:

(۱) علم کی شرافت معلوم کی شرافت کے مطابق ہوتی ہے جب اشرف المعلومات اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات ہیں تو یقیناً ان سے متعلق علم بھی اشرف العلوم ہوگا۔

(۲) علم یا دینی ہوگا یا غیر دینی یقینی بات ہے کہ علم دینی افضل ہے غیر دینی سے پھر علم دینی کی دو قسمیں ہیں یا وہ علم اصول کا ہوگا یا اصول کے ماسوا کا علم ہوگا لیکن ان دونوں سے افضل اصول کا علم ہے کیونکہ اصول کے ماسوا کی صحت اصول پر ہی موقوف ہے۔ اس لئے کہ مفسر اللہ تعالیٰ کے

کلام کے معانی کی بحث کرتا ہے اللہ کا کلام متفرع ہے اس کے متکلم ہونے پر اور اس کے صانع ہونے پر اور اس کے مختار ہونے پر۔

محدث بحث کرتا ہے رسول اللہ ﷺ کے کلام کی یہ فرع ہے آپ کی نبوت کے ثبوت کی اس طرح حدیث کی بحث فرع ہوئی رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی بحث اصل ہوئی۔ فقیہ بحث کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے احکام کی یہ بحث فرع ہے توحید و نبوت کی۔ اس سے یہ واضح ہو گیا کہ فروع سے متعلق تمام علوم موقوف ہیں اصول کے علوم پر لیکن اصول کے علوم فروع کے علوم پر موقوف نہیں۔ اور نہ ہی ان کے محتاج ہیں "فوجب ان یکون علم الاصول اشرف العلوم" تو ثابت ہوا کہ علم اصول اشرف العلوم ہے۔

(۳) کسی چیز کا کمال اور اس کا اشرف ہونا اس کی ضد کی خساست (گھٹیا پن) سے سمجھ آتا ہے ایک چیز جتنی زیادہ گھٹیا ہوگی اس کی ضد اتنی ہی زیادہ اشرف ہوگی۔ جب اصول یعنی توحید باری تعالیٰ نبی کریم ﷺ کی نبوت کو تسلیم کرنے کی ضد کفر ہے اسی طرح اصول کی ضد بدعات سیئہ ہیں اور وہ بہت زیادہ خسیس ہیں تو علم اصول اتنا ہی زیادہ اشرف ہے۔

(۴) کسی علم کے اشرف ہونے کی دارومدار تین چیزوں پر ہے ایک یہ کہ اس کا موضوع افضل ہو۔ دوسرا یہ کی اس کی حاجت بہت زیادہ ہو تیسرا یہ کہ اس کے دلائل قوی ہوں۔ علم اصول ان تینوں چیزوں پر مشتمل ہے موضوع اس کا اعلیٰ ضرورت اس کی زیادہ دلائل اس کے قوی۔

موضوع افضل کیسے؟ اسلئے کہ علم اصول سے اللہ تعالیٰ کی ذات صفات اور افعال کی معرفت مطلوب ہے اور اسی طرح معلومات خواہ موجود ہوں یا معدوم ان کی معرفت بھی علم اصول سے ہی ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تمام چیزیں افضل ہیں ان تمام کا علم بھی افضل ہے ان کے علم کا نام ہی علم اصول ہے۔

علم اصول کی ضرورت بہت زیادہ کیوں؟ اسلئے کہ ضرورت کا تعلق دین سے ہوگا اور یا دنیا سے دین میں علم اصول کی شدید ضرورت اس لئے ہے کہ جس شخص نے ان اشیاء کا علم حاصل کر لیا وہ ثواب عظیم کا مستحق ہوگا اور ملائکہ سے اسے قرب حاصل ہوگا اور جو شخص ان سے جاہل رہا وہ عذاب عظیم کا مستحق ہوگا اور شیطانوں سے ملے گا۔ اور دنیا کے لحاظ سے بھی علم اصول کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔

اس لئے کہ جہان میں بہتر کاموں کے منظم ہونے کی دارومدار ایمان پر ہے جس شخص کو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر ایمان حاصل ہوگا حشر ونشر پر ایمان حاصل ہوگا اس کے کام صحیح ہوں گے غلط راہ پر چلنے سے وہ اجتناب کرے گا اس لئے کہ اسے رب تعالیٰ کے عذاب اور جہنم کا خوف ہوگا جب ایمان ہی نہیں ہوگا تو قتل وغارت کا ہی ہر طرف بازار گرم ہوگا عبادت گاہوں میں بھی قتل کرنے سے ان کو حیا نہیں آئے گی۔ خیال رہے قتل کرانے والے بھی وہی ہیں جو حفاظت کا ڈھونگ رچانے والے ہیں جب ملک کے محافظ غاصب اور لیٹرے بن جائیں منصفین انصاف کا دامن چھوڑ دیں ایمان نام کی کوئی شے نہ رہے تو یہی حال ہوتا ہے جو ہماری آنکھوں دیکھا حال ہے۔

علم اصول کے دلائل قوی کیسے؟ اس علم کے دلائل قوی ہیں کیونکہ وہ مقدمات یقینیہ سے مرکب ہیں علم کی تمام قسموں سے اعلیٰ علم یقین ہی ہے تو پتہ چل گیا کہ علم اصول کے دلائل قوی ہیں۔ جب علم اصول کے موضوع کی افضلیت اور علم اصول کی شدید ضرورت اور علم اصول کے دلائل کا قوی اور قطعی ہونا دلائل سے ثابت ہوگیا تو ان دلائل سے ہی علم اصول کا اشرف العلوم ہونا بھی ثابت ہوگیا۔

(۵) اصول کسی شریعت میں منسوخ نہیں ہوئے کسی شریعت میں بھی ان میں تبدیلی نہیں آئی تو ان سے متعلق علم بھی نہ کبھی منسوخ ہوا اور نہ ہی تبدیل ہوا امتیں بدلتی رہیں زمانے بدلتے رہے زمین کے مختلف حصوں میں مختلف قومیں آباد رہیں لیکن علم اصول نہ بدلا نہ بدلنے والا اشرف ہی ہوا کرتا ہے۔

(۶) قرآن پاک کی جن آیات میں علم اصول پایا گیا ہے وہ درجہ کے لحاظ پر اشرف ہیں ان آیات سے جن میں فقہی احکام پائے گئے ہیں تو اس سے بھی واضح ہوا کہ یہ علم دوسرے علم سے اشرف ہے مثال کے طور پر دیکھیں ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا ذکر ہے ﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ ﴾ میں رسول اللہ ﷺ کے ایمان کا ذکر ہے اور آیۃ الکرسی میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور معبود نہ ہونے اور اللہ تعالیٰ کی صفات عظیمہ کا ذکر ہے یہ تمام آیات زیادہ درجہ رکھتی ہیں بنسبت ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ﴾ کے جس میں عورتوں کے حیض کا احکام کا ذکر ہے اسی طرح بنسبت ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ ﴾ کے کہ اس میں قرض کے لین دین پر لکھنے کا ذکر ہے۔

(۷) جن آیات میں احکام شرعیہ ذکر ہیں وہ چھ سو سے کم ہیں اور باقی تمام آیات اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلالت کر رہی ہیں کیونکہ بعض آیات میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا صراحۃً ذکر ہے بعض میں نبوت کا ذکر ہے نبوت خود بھی اصول میں داخل ہے اور نبوت کے علم سے بھی علم توحید حاصل ہوتا ہے اور بعض آیات میں کفار اور بت پرستوں کا رد ہے اس سے بھی توحید کا علم حاصل ہوتا ہے اور بعض آیات میں قصص کا ذکر ہے لیکن ان سے بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت اور قدرت کا ہی پتہ چلتا ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے خود فرمایا ﴿ لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ﴾ تحقیق قصص میں عقل والوں کے لئے عبرت ہے اس سے بھی واضح ہو گیا کہ علم اصول تمام علوم سے اشرف ہے۔

دوسرا فائدہ: آیۃ کریمہ سے حاصل ہونے والے فوائد سے اور یہ فائدہ حاصل ہوا کہ جب رب تعالیٰ نے اپنی عبادت کا حکم دیا تو اس کا موجود ہونا ضروری ہے۔

وجود باری تعالیٰ پر دلائل:

" اما الذی یدل علی وجود الصانع فالقرآن مملوء منه "

جن دلائل سے صانع کا موجود ہونا سمجھ آتا ہے قرآن پاک ان سے بھرا ہوا کسی آیۃ کو بھی دیکھیں وجود باری تعالیٰ کا پتہ چلے گا تاہم چند دلائل صرف سمجھانے کی حد تک ذکر کئے جا رہے ہیں کسی کو سمجھ آئے تو یہ بھی اس پر رب تعالیٰ کا ہی فیضان ہے۔

(۱) سب سے پہلے تو اس زیر بحث آیۃ کریمہ اور بعد میں آنے والی آیۃ کریمہ کو دیکھیں ان میں ہی کئی دلائل آپ کو مل جائیں گے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت ربوبیت کو " ربکم " سے ذکر کیا ہے مربی اور مالک وہی ہو سکتا ہے جو موجود ہو پھر رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اَلَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ ﴾ جس ذات نے تمہیں پیدا کیا اور تم سے پہلے لوگوں کو۔ ان الفاظ مبارکہ میں رب تعالیٰ نے مکلفین کو بتایا کہ تمہارا خالق بھی میں ہوں اور تم سے پہلے لوگوں کا خالق بھی میں ہی ہوں خالق وہی ہو سکتا ہے جو موجود ہو۔ آنے والی آیۃ سے سمجھ آ رہا ہے کہ زمین و آسمان کا خالق بھی رب تعالیٰ ہے اس کی صفت خالقیت کا تقاضا ہے کہ وہ موجود ہو پھر آسمان سے پانی کو نازل کرنا اور زمین میں اگانے کی تاثیر پیدا کرنا پھر زمین سے پھلوں کو پیدا کرنا یہ تمام چیزیں رب تعالیٰ کے خالق ہونے اور موجود ہونے

پر دلالت کر رہی ہیں:

" وکل ماور د فی القرآن من عجائب السموات والارض فالمقصود منه ذلک "

قرآن پاک میں جتنے بھی زمین وآسمان کے عجائب کا ذکر ہے سب کے بیان سے مقصد وجود باری تعالیٰ کو ہی ثابت کرنا اور اسی کو وحدہ لاشریک لہ ماننا اور اس کے بغیر کسی کی عبادت نہ کرنا ہے اور صرف اسی کی عبادت کرنا مقصد بیان ہے۔

وجود صفات باری تعالیٰ پر دلائل:

اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کا ذکر اس آیۃ کریمہ میں کیا ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَخْفٰی عَلَیْہِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز مخفی نہیں زمین میں اور نہ ہی آسمانوں میں۔ اس کے بعد ذکر فرمایا ﴿ ھُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ کَیْفَ یَشَآءُ ﴾ وہ ذات جو تمہیں صورتیں عطا فرماتا ہے بچہ دانیوں میں جس طرح چاہتا ہے۔

یہ متکلمین کی دلیل ہے کہ افعال کے احکام اور ان پر یقین ہونے کے لئے صانع کا علم ضروری ہے اس لئے کہ خود رب تعالیٰ نے بچہ دانیوں میں صورتیں عطا کرنے سے پہلے اپنے علم کا ذکر فرمایا۔ اسی سے یہ مسئلہ واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ اور اسکی صفات کا علم پہلے ہے اور اس کے احکام پر عمل بعد میں ہوگا۔

صفت قدرت: اللہ تعالیٰ کی قدرت کا تفصیلی ذکر ﴿ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴾ کی بحث میں ہو چکا ہے لیکن پھر بھی انسان جب یہ خیال کرے کہ رب تعالیٰ نے مختلف قسم کے پھل پیدا کئے اور مختلف قسم کے حیوانات پیدا کئے سب میں چار طبائع موجود ہیں حرارت (گرمی) برودت (ٹھنڈک) رطوبت (تری) یبوست (خشکی) لیکن تمام کا مختلف ہونا رب تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر دلیل ہے۔

صفت تنزیہ: رب تعالیٰ جسم سے پاک ہے مکان سے پاک ہے رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ﴾ فرما دیجئے وہ اللہ ایک ہے اس کا "احد" ہونا ہی دلالت کر رہا ہے کہ وہ مرکب نہیں کیونکہ مرکب محتاج ہوتا ہے اور محتاج حادث ہوتا ہے یعنی اس کی ابتداء بھی ہوتی ہے اور انتہاء بھی "احد" سے ہی یہ سمجھ میں آیا کہ وہ جسم نہیں جب جسم نہیں تو مکان سے بھی پاک ہے۔

صفت توحید: اللہ تعالیٰ کے ارشادات گرامیہ سے یہ ارشاد اس پر بہت واضح دلیل ہے:

﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا﴾

اگر زمین وآسمان میں متعدد الٰہ ہوتے تو یہ دونوں برباد ہو کر رہ جاتے۔

صفت نبوت: اصول میں سے ہی نبوت ہے نبوت کا علم بھی علم اصول میں ہی داخل ہے نبوت کے دلائل میں سے ایک آیۂ کریمہ کا ملاحظہ کریں ﴿وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَى عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ﴾ اور اگر تم شک میں ہو اس چیز سے جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی تو تم اس کی ایک چھوٹی سے سورت جیسی لے آؤ۔

اس آیۂ کریمہ سے واضح ہوا کہ اللہ کا کلام جس بندہ پر نازل ہوتا ہے وہ نبی ہی ہوتا ہے اور اسی سے یہ بھی سمجھ آ گیا کہ قرآن پاک نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے کیونکہ تمام فصحاء و بلغاء کو چیلنج کیا گیا جب اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز آ گئے تو اسی سے مصطفیٰ کریم ﷺ کا نبی ہونا اور قرآن پاک معجزہ ہونا واضح ہو گیا۔

صالحین کے وجود باری تعالیٰ پر عجیب استدلات:

ایک زندیق (بے دین) نے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے پاس رب تعالیٰ کا انکار کیا کہ کوئی بھی اس جہان کو معرض وجود میں لانے والا نہیں یہ خود ہی نظام چل رہا ہے اس کا کوئی صانع نہیں۔ حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے اس شخص سے پوچھا کیا تم دریا کو عبور کرنے کے لئے کشتی پر بھی کبھی سوار ہوئے؟ اس نے کہاں ہاں سوار ہوا ہوں پھر آپ نے پوچھا کیا اس کے ہولناک مناظر کو بھی کبھی دیکھا ہے؟ اس نے کہا ہاں دیکھا ہے۔ ایک دفعہ دریا کے سفر کے دوران شدید آندھی چلی کشتیاں ٹوٹ گئیں ملاح غرق ہو گئے میں کشتی کے ایک پھٹے سے چمٹ گیا کچھ دیر کے بعد مجھ سے وہ پھٹا بھی چھوٹ گیا مجھے دریا کی موجیں کنارے کی طرف دھکیل رہی تھیں یہاں تک کہ میں کنارے پر پہنچ گیا۔ حضرت امام جعفر رضی اللہ عنہ نے اسے کہا پہلے تمہارا اعتماد کشتی اور ملاح پر تھا پھر پھٹے پر اعتماد ہوا کہ یہ تمہیں نجات دیں گے لیکن جب تمام سہارے ختم ہو گئے کیا تم نے اپنے آپ کو ہلاکت کے سپرد کر دیا تھا؟ یا اس کے بعد بھی تمہیں امید تھی کہ میں بچ سکتا ہوں اور سلامت رہ سکتا ہوں۔ اس شخص نے کہا مجھے اس وقت بھی سلامتی

کی امید تھی۔ حضرت امام نے کہا اس وقت تمہیں امید کون دلا رہا تھا؟ وہ خاموش رہا کوئی جواب نہ دے سکا آپ نے فرمایا اس وقت تمہیں امید دلانے والا اللہ تعالیٰ ہی تھا جو صانع ہے اور اسی نے تمہیں غرق ہونے سے بچایا ہے۔ یہ سن کر اس شخص نے حضرت امام کے ہاتھ پر اسلام قبول کرلیا۔

" سبحان اللہ ما اعظم شانہ " .

☆ کتاب دیانات العرب میں مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عمران ابن حصین کو کہا:

" کم لک من الہ ؟ قال عشرۃ قال فمن لغمک و کربک و دفع الامر العظیم اذا نزل بک من جملتھم ؟ قال اللہ قال علیہ السلام مالک من الہ الا اللہ "

" تمہارے کتنے خدا ہیں؟ اس نے کہا دس آپ نے فرمایا جب تمہیں تمام کی طرف سے غم، مصیبت اور عظیم مصائب ہی حاصل ہوں تو اس وقت تمہارا خدا کون ہوتا ہے اس نے کہا "اللہ" آپ نے فرمایا تمہارا اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں"

☆ " کان ابو حنیفۃ سیفا علی الدھریۃ " امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ دہریوں کے لئے تلوار تھے وہ آپ کو شہید کرنے کے لئے موقع تلاش کرتے رہتے تھے۔ ایک دن آپ مسجد میں بیٹھے تھے کہ دہریوں کی ایک جماعت تلواریں سونت کر آپ کو قتل کرنے کی غرض سے اچانک آ گئے۔ آپ نے ان کو کہا مجھے ایک سوال کا جواب دو پھر جو چاہے کرنا انہوں نے کہا وہ کیا؟ آپ نے فرمایا تم مجھے یہ بتاؤ کہ ایک شخص کہتا ہے کہ میں نے ایک کشتی کو دیکھا جو بھری ہوئی تھی اس پر بہت بڑا بوجھ تھا دریا کہ موجیں طغیانی میں تھیں مختلف سمتوں سے تیز ہوائیں چل رہی تھیں کشتی بالکل سیدھی سمت پر چل رہی تھی لیکن اسے چلانے والا کوئی ملاح نہیں تھا۔ کیا اسے عقل تسلیم کرتی ہے؟ وہ کہنے لگے ایسا نہیں ہوسکتا اسے تو عقل نہیں مانتی۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا یا سبحان اللہ جب ایک کشتی کا بغیر ملاح کا چلنا عقل تسلیم نہیں کرتی تو یہ دنیا کا اتنا بڑا نظام جس میں حالات مختلف ہوتے رہتے ہیں اعمال بدلتے رہتے ہیں ہر طرف وسیع زمین اور دور دور تک مکانات پھیلے ہوئے ہیں یہ بغیر صانع کے بغیر حفاظت کرنے والے کے پایا جائے۔ وہ لوگ یہ سن کر رونے لگ گئے انہوں نے کہا آپ نے سچ فرمایا ہے انہوں نے اپنی تلواریں نیام میں کرلیں اور توبہ کرلی۔

☆ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کے پاس سترہ شخص آئے جو دہرئے تھے یعنی اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے یا اسی کے قبضہ قدرت میں تمام نظام کے ہونے کے وہ قائل نہیں تھے۔ انہوں نے سوال کیا کہ رب تعالیٰ کی ذات کے صانع ہونے اور اس کے موجود ہونے پر تمہارے پاس کیا دلیل ہے؟ آپ نے فرمایا تم مجھے یہ بتاؤ کہ توت درخت کے تمام پتے کیا ایک ہی ذائقہ نہیں رکھتے کیا ان کا رنگ ایک ہی نہیں کیا ان کی بو ایک جیسی نہیں کیا ان کی طبیعت ایک جیسی نہیں؟ ان تمام نے اسے تسلیم کیا کہ ہاں توت کے تمام پتوں کے یہ سارے اوصاف تو واقعی ایک جیسے ہیں۔ ان سے یہ اقرار کرانے کے بعد آپ نے ان کو دعوت فکر دیتے ہوئے کہا کہ اب ذرا غور کرو۔ آپ نے فرمایا توت کے تمام پتوں کے تم نے تمام اوصاف ایک جیسے تسلیم کر لئے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ وہی پتے ریشم کا کیڑا کھائے تو اس سے ریشم پیدا ہو اور ان پتوں سے ہی شہد کی مکھی رس حاصل کرے تو شہد بن جائے اور وہی پتے بکری کھائے تو مینگنیاں بن جائیں اور وہی پتے ہرن کھائے تو اس کی ناف میں کستوری بن جائے۔ وہ کون ہے جو ایک ہی طبیعت کے پتوں سے مختلف چیزوں کو معرض وجود میں لا رہا ہے؟ ان لوگوں نے آپ کے اس جواب کو اچھا سمجھا کہ واقعی جواب با کمال ہے تو ان تمام نے اسلام قبول کر لیا۔

☆ حضرت امام احمد حنبل رحمہ اللہ نے وجود باری تعالیٰ پر یوں دلیل پیش کی ایک مضبوط قلعہ ہو جو باہر سے صاف، شفاف ہو اس میں کوئی سوراخ نظر نہ آتا ہو اس کے اندر چاندی ہو اور پھر اس کے اندر خالص سونا ہو پھر دیواریں پھٹیں تو اس قلعہ کے اندر سے ایک حیوان نکلے جس کو سماعت بھی حاصل ہو اور بصر بھی۔ کیا یہ حیوان خود بخود اس قلعہ سے نکل آیا کیا اس سونے اور چاندی سے روح والا جانور خود بن گیا یا کسی نے بنایا؟ آپ کی اس دلیل کا بھی کوئی جواب نہ دے سکا بلکہ لوگ سمجھ ہی نہ پائے۔ آپ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا مضبوط صاف شفاف قلعہ جس کی دیواروں میں کوئی سوراخ نظر نہ آتا ہو اس سے میری مراد انڈہ ہے سفید چاندی سے مراد انڈے کے اندر سفیدی ہے اور پھر اس کے اندر خالص سونے سے مراد انڈے کی زردی ہے۔ اس قلعہ میں پہلے چاندی اور سونے کے بغیر اور کوئی ذی روح چیز نہیں تھی۔ اسی سونے اور چاندی یعنی اسی زردی اور سفیدی سے انڈے میں بچہ پیدا کر دیا۔ بغیر کسی قادر، فاعل مختار اور صانع کے ایسا کرنا ممکن نہیں آپ کی اس دلیل کو بھی مستحسن سمجھا گیا۔

☆ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کچھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے اور اس کے صانع پر اس طرح سمجھایا کہ بعض اوقات باپ چاہتا ہے مجھے بیٹا حاصل ہو لیکن اس کی بیٹی پیدا ہو جاتی ہے یہ تو بتاؤ وہ کون سی قوت ہے جس نے باپ کی مرضی کے بغیر بیٹی کو معرضِ وجود میں لایا؟ وہ ذات جس نے یہ کیا یقیناً وہی اللہ ہے ہارون الرشید نے ایک مرتبہ امام مالک رحمہ اللہ سے پوچھا کہ آپ کے پاس کیا دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ ہے اور وہی تمام نظام کو چلانے والا ہے، سارا جہان اسی کے قبضہ قدرت میں ہے؟ آپ نے فرمایا کیا ہر انسان نہیں چاہتا کہ میری آواز خوبصورت ہو کیا ہر انسان نہیں چاہتا کہ مجھے الفاظ کا ادا کرنا اچھی طرح آ جائے میری طرز خوبصورت ہو میرا اندازِ بیان اچھا ہو؟ ہارون الرشید نے کہا ہاں یہ تو ہر شخص کی یہی تمنا ہوتی ہے کہ میری آواز خوبصورت ہو میری طرز حسین ہو۔ آپ نے فرمایا کہ جب ہر شخص کی تمنا یہ ہے لیکن تمام کی یہ تمنا نہیں پوری ہوتی تو اس کی وجہ کیا ہے؟ یقیناً یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ نظام کسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔

☆ ابونواس نے رب قدوس کی قدرت اور اس کی صنعت پر کیا خوبصورت اشعار سے دلیل قائم کی:

تامل فی نبات الارض وانظر — الی آثار ماصنع الملیک
عیون من لجین شاخصات — وازهار کما الذهب الیک
علی قضب الزبرجد شاهدات — بان الله لیس له شریک

زمین کے پودوں میں غور کرو اور دیکھو
کہ مالک الملک کی صنعت کے کیا کیا آثار پائے گئے ہیں
سفید شفاف چاندی کی طرح چشموں کا ٹھہرا ہوا پانی
اور شگوفے کلیاں جیسا کہ سونا پگھلایا ہوا ہے
زمرد کی ٹہنیوں پر یہ تمام چیزیں شاہد ہیں
کہ بیشک اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں

☆ ایک اعرابی سے پوچھا گیا کہ تمہیں کیا معلوم ہے کہ اس نظام کائنات کو کوئی چلانے والا ہے یہ نظام خود بخود کیوں نہیں چل رہا تو اس نے کیا خوبصورت جواب دیا:

"البعرة تدل علی البعیر والروث علی الحمیر وآثار الاقدام علی المسیر فسماء ذات ابراج، وارض ذات فجاج وبحار ذات امواج

اما تدل علی الصانع الحلیم العلیم القدیر "

''اونٹ کی مینگنیاں اونٹ پر دلالت کرتی ہیں لید گدھے پر دلالت کرتی ہے قدموں کے نشان چلنے والے پر دلالت کرتے ہیں برجوں والا آسمان، وسیع راستوں والی زمین کیوں نہ دلالت کریں اس ذات پر جو صانع ہے، حلیم ہے، علیم ہے اور قدیر ہے''

کسی طبیب سے پوچھا گیا کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ کوئی رب تعالیٰ بھی ہے جو مؤثر حقیقی قادر مختار ہے اس نے کہا ''باھلیج مجفف اطلق ولعاب ملین امسک'' مجھے خشک ہریڑ سے پتہ چلا کیونکہ اس میں دو مختلف تاثیریں پائی جاتی ہیں قبض کشا ہے لیکن نرم لعاب کو روکتی ہے۔ اس کو مختلف قسم کی تاثیریں عطا کرنے والا یقیناً کوئی صانع موجود ہے ایک چیز کو کھولے بھی اور روکے بھی خود بخود تو اس میں یہ کوئی طاقت نہیں۔

☆ ایک اور شخص سے پوچھا گیا تمہیں کیسے پتہ چلا کہ کوئی رب تعالیٰ ہے اور تمام جہان کا نظام اسی کے قبضہ قدرت میں ہے؟ تو اس نے کہا " عرفته بنحلة باحد طرفیها تعسل والآخر تلسع " میں نے رب تعالیٰ کو شہد کی مکھی سے پہچانا اس لئے کہ وہ ایک طرف سے شہد بناتی ہے اور دوسری طرف سے ڈستی ہے اس کی ایک طرف میں شہد کو رکھنا دوسری طرف ڈنگ مارنے کی تاثیر کا رکھنا کسی قادر کا ہی کام ہے۔

عربی زبان کی چاشنی: " عسل " کا معنی ہے شہد اور اس لفظ کو الٹا کریں یعنی پہلے لام پھر سین اور پھر عین رکھیں تو " لسع " ہو جائے گا جس کا معنی ہے ڈنگ مارنا ذرا توجہ فرمائیں کہ شہد کی مکھی ایک طرف سے " عسل " (شہد) بناتی ہے اور دوسری طرف یعنی الٹ جانب عسل کا الٹ " لسع " ڈسنا پایا جاتا ہے (ماخوذ از کبیر) سبحان اللہ رب تعالیٰ نے اپنے محبوب علیہ السلام کی زبان کو کیا خوب بنایا کیا ہی اس میں ذوق پایا گیا ہے۔

تنبیہ: عبادت کی مکمل بحث ﴿ اِیَّاکَ نَعْبُدُ ﴾ کی بحث میں اور ''الناس ''کی بحث " ومن الناس من یقول " کی بحث میں اور تقوی (تتقون) کی بحث ﴿ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴾ کی بحث میں دیکھیں۔ خیال رہے علامہ رازی رحمہ اللہ نے اس آیۃ کریمہ کی بہت تفصیل سے تفسیر کی ہے لیکن بہت زیادہ طوالت سے بچتے ہوئے بحث کو کچھ مختصر کر دیا ہے۔

﴿ اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ ج فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾

"اور جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو عمارت بنایا اور آسمان سے پانی اتارا تو اس سے کچھ پھل نکالے تمہارے کھانے کو تو اللہ کیلئے جان بوجھ کر برابر والے نہ ٹھہراؤ"

"وہ جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت اور نازل کیا بلندی سے پانی تو نکالے اسکے ذریعے پھل جو تمہارے لئے رزق ہیں تو اللہ کے شریک نہ ٹھہراؤ حالانکہ تم جانتے ہو"

اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں رب تعالیٰ نے اپنی عبادت کا حکم دیا اور ساتھ ساتھ اپنے احسان کا بھی ذکر کیا کہ رب تعالیٰ نے تمہیں پیدا کیا اور تم سے پہلے لوگوں کو بھی پیدا کیا جن میں تمہارے آباءواجداد بھی تھے اور عبادت کرنے کا فائدہ بھی لوگوں کو ہی ہے اس کا ذکر کیا ﴿ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾ کہ تقوی تمہیں ہی حاصل ہونا ہے۔ اس آیۃ کریمہ میں مزید احسانات کا ذکر کیا کہ رب تعالیٰ نے تمہارے قرار کے لئے زمین کو بنایا اور آسمان کو تمہارے لئے چھت بنایا پھر بارشیں برسا کر زمین کو رب تعالیٰ ہی اس قابل بناتا ہے کہ زمین میں اگانے کی تاثیر پیدا ہوتی ہے اور تمہارے لئے پھلوں کو پیدا کیا۔ ان نعمتوں کے ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ رب تعالیٰ کے ساتھ کوئی شریک نہ ٹھہراؤ جب تمہیں معلوم بھی ہے کہ خالق صرف وہی ذات ہے ہر قسم کی نعمتیں اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں کسی ایک صفت میں بھی کوئی اس کا مثل نہیں ہوسکتا تو پھر اس ذات کے تم کیوں شریک ٹھہراتے ہو۔

دینی مدارس کے طلباء کے لئے:

اَلَّذِیْ جَعَلَ: (وہ جس نے بنایا) "جعل" کبھی بمعنی "صیر" کے آتا ہے جس کا معنی ہوتا ہے بنانا ایک حال سے دوسرے حال کی طرف پھیرنا اس وقت اس کے دو مفعول ہوتے ہیں جس طرح اس

آیۃ کریمہ میں استعمال ہوا ہے ﴿ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا ﴾ یہاں ''ارض'' اور ''فراشا'' دو مفعول ہیں۔

☆ اور ''جعل'' کبھی بمعنی ''خلق'' کے ہوتا ہے اس وقت اس کا ایک مفعول ہوتا ہے اس وقت معنی ہوتا ہے ''پیدا کرنا'' جس طرح رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرُ ﴾ اس نے تاریکیاں اور نور پیدا کئے۔

☆ اور جعل کبھی بمعنی ''اخذ'' کے ہوتا ہے اس وقت لازم ہوتا ہے اس وقت معنی اس کا شروع کرنا ہوتا ہے لیکن یہ خیال رہے کہ اس صورت میں یہ ایک اور فعل پر داخل ہوتا ہے جیسا کہ مفلس ابن لقیط اسدی نے دو آدمیوں کے ستانے پر کہا:

وقد جعلت نفسی تطیب لضغمہ　　　لضغمھما ھا یقرع العظم نابھا

میں اپنے نفس کو تسلی دینی شروع کی کہ میں بھی ان کو ایسا ہی ستاؤں گا جیسا انہوں نے مجھے ستایا ہڈیاں باری باری پر کھٹکتی ہیں۔

☆ اور کبھی ''جعل'' نام رکھنے کے معنی میں آتا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ''انا جعلنا قرآنا عربیا'' بیشک ہم نے اس (کتاب) کا نام قرآن عربی رکھا۔

خیال رہے اکثر مفسرین نے اس آیۃ میں ''جعل'' کا معنی بنایا کیا ہے اس لحاظ پر ''جعل'' بمعنی ''صیر'' ہے۔

☆ اور کبھی ''جعل'' زائد ہوتا ہے جس کا معنی نہیں ہوتا جیسا کہ کسی شاعر نے کہا:

وقد جعلت اری الاثنین اربعۃ　　　والواحد اثنین لما ھدنی الکبیر

''مجھے دو چار نظر آتے ہیں اور ایک دو دکھائی دیتے ہیں جب سے میں بوڑھا ہو گیا''

(از قرطبی)

لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا: یہاں ''لکم'' میں لام انتفاع کا ہے معنی یہ ہوا تمہارے نفع کے لئے زمین کو فراش بنایا'' الارض'' جس طرح ''السماء'' کا معنی آسمان بھی ہے اور بلند چیز بھی اسی طرح ''الارض'' کا معنی زمین بھی ہے اور پستی بھی ''فراشا'' بچھونا۔ ایک اور مقام پر ارشاد گرامی ہے

﴿اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا﴾ کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہیں بنایا "مھادا" کا معنی بچھونا بھی ہے اور ہموار ہونا بھی ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا ﴿جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا﴾ زمین کو قرار بنایا یعنی ٹھہرنے کی جگہ بنایا۔ تقریباً تینوں آیات کا مطلب یہی ہے کہ زمین کو تمہارے نفع کے لئے یعنی تمہارے ٹھہرنے کے لئے جائے قرار بنایا جیسا کہ بچھونا سونے اور آرام کرنے کے لئے ہوتا ہے ایسا ہی زمین کو بچھونے کی حیثیت دی۔

(از کبیر و قرطبی)

زمین کے بچھونا ہونے کی شرائط:

(۱) بچھونا بننے کی ایک شرط یہ ہے وہ زیادہ سخت بھی نہ ہو اور بہت زیادہ نرم بھی نہ ہو، یہی اوصاف زمین میں بھی موجود ہیں۔ اگر زمین بہت زیادہ سخت ہوتی تو اس پر سونا اور چلنا دشوار ہوتا اور اس سے تمام بدن کو درد ہوتا۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ اگر زمین سونے چاندی کی بنائی جاتی تو اس پر کھیتی باڑی ممکن نہ ہوتی اس پر مکان بنانے مشکل ہوتے اور اسے کھودنا اس میں کنویں بنانے ممکن نہ ہوتے اور زمین پانی کی طرح بہت زیادہ نرم نہیں اگر ایسے ہوتی تو لوگ اس میں غوطے کھاتے رہتے اور زمین کے اندر ہی دھنستے چلے جاتے۔ زمین کے بہت زیادہ سخت اور نرم ہونے کی صورت میں زمین سے نفع حاصل کرنا ممکن نہ ہوتا کیونکہ جب اس پر ٹھہرنا ہی ممکن نہ ہوتا تو اس سے نفع کیا ہوتا۔

(۲) بچھونا وہ چیز بن سکتی ہے جو بہت زیادہ لطیف اور شفاف نہ ہو کیونکہ شفاف چیز پر نور قرار نہیں پکڑ سکتا جو چیز اس طرح ہو وہ ہمیشہ ٹھنڈی ہی رہتی ہے اس میں ستاروں اور سورج کی حرارت (گرمی) نہیں پائی جاسکتی۔ رب تعالیٰ نے زمین کو مٹی والا اسی لئے بنایا کہ اس میں نور قرار پکڑ سکے اور ستاروں کی حرارت اس میں اثر انداز ہو سکے تاکہ انسان اور دوسرے حیوان اس پر رہ سکیں اور نفع حاصل کرسکیں۔

(۳) زمین کے فراش بننے کے لئے ضروری ہوا کہ زمین کو پانی سے باہر نکالا جائے زمین کی اپنی طبیعت یہ تھی کہ وہ پانی میں مستغرق رہے لیکن اگر ایسا ہوتا تو اس پر انسان سکونت اختیار نہ کرسکتے۔ تو اللہ تعالیٰ نے زمین کی طبیعت کو بدل دیا تھا جس طرح سمندر میں بعض جزیرے ظاہر ہو جاتے ہیں اسی طرح زمین کو پانی سے باہر نکال کر رہنے کے قابل بنا دیا۔

(۴) علامہ رازی رحمہ اللہ نے زمین کے فراش ہونے کے لئے زمین کا ساکن ہونا بھی شرط قرار دیا۔

اور اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے بھی زمین کے ساکن ہونے پر ایک رسالہ تحریر فرمایا علامہ رازی نے تفسیر کبیر میں زمین کے ساکن ہونے پر بہت دلائل قائم کیے ہیں آج کل کے سائنسدان زمین کے متحرک ہونے کے قائل ہیں۔ لیکن راقم کے خیال میں سائنسدانوں کا اختلاف قرآن پاک کی عظمت کو ہی ثابت کر رہا ہے کہ فلاسفہ کے قانون بدلتے رہتے ہیں لیکن قرآن پاک کے قوانین کبھی نہیں بدلے اور کبھی نہیں بدلیں گے۔ راقم ان فلاسفہ کے نظریات سے اتفاق رکھتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ زمین بھی ساکن ہے اور آسمان بھی ساکن ہے سیارے ہی چلتے ہیں۔ قرآن پاک کی یہ آیۃ کریمہ بھی بظاہر اسی کی تائید کرتی ہے ﴿ اِنَّ اللّٰہَ یُمۡسِکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ اَنۡ تَزُوۡلَا ﴾ تاہم یہ ایسا مسئلہ نہیں کہ ایک دوسرے کے خلاف لکھا جائے، قران پاک میں صراحۃً کسی ایک نظریہ کی بھی ترجمانی نہیں ملتی ہر طرف سے دلائل ملتے ہیں اور آیات مبارکہ کی تاویلات پائی جاتی ہیں۔

وَالسَّمَآءَ بِنَآءً: علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا:

" والبناء مصدر سمی به المبنی بیتا او کان قبة او خباء " "بناء" مصدر ہے معنی اس کا مفعول والا ہے گھر یا قبہ یا خیمہ کو کہا جاتا ہے۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے اور آسمان کو عمارت بنایا۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" والسماء بناء " السماء للارض كالسقف للبيت ولهذا قال وقوله الحق " " وجعلنا السماء سقفا محفوظا "

آسمان زمین کے لئے ایسے ہے جیسے مکان کا چھت اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے فرمایا اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا راقم کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے لیکن اگر یوں کہہ دیا جائے کہ آسمان کو چھت کی طرح عمارت بنایا تو اس میں دونوں معنی شامل ہو جائیں گے۔

زمین میں رب تعالیٰ کی صنعت کے عجائب:

(۱) قانون یہ ہے کہ ہر چیز جو وزنی ہوتی ہے وہ نیچے کی طرف آنے کا میلان رکھتی ہے جس چیز

میں وزن (بھار) نہیں ہوتا بلکہ ہلکی ہوتی ہے وہ اوپر جانے کی کوشش کرتی ہے۔ پانی کے نیچے زمین کا نہ جانا جب کہ تمام زمین کے نیچے پانی ہے اور زمین بھاری بھی ہے یقیناً یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ رب تعالیٰ کی قدرت کے بغیر ایسا ہونا ممکن ہی نہیں۔

(۲) زمین میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانیاں بطور ودیعت رکھی ہیں جن کا ذکر خود مالک الملک نے اس آیۃ کریمہ میں کیا ہے

﴿ وَفِيْ الْاَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ﴾ اور زمین میں یقین رکھنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں

(۳) ایک ہی زمین میں کچھ حصے نرم اور کچھ سخت اور کچھ خوبصورت اور کچھ خوبصورتی میں کم بنانا بھی صرف رب تعالیٰ کی قدرت سے ہی ہوسکتا ہے رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی اسی کی طرف اشارہ کر رہا ہے ﴿ وَفِيْ الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجَاوِرَاتٌ ﴾ اور زمین کے مختلف قطعے ہیں اور ہیں آس پاس۔ خزائن العرفان میں اس کی تفسیر ان الفاظ سے کی گئی ایک دوسرے سے ملے ہوئے ان میں کوئی قابل زراعت ہے کوئی نا قابل زراعت کوئی پتھریلا کوئی ریتلا۔

(۴) زمین میں مختلف رنگ رکھے گئے ہیں جن کا تذکرہ رب قدوس نے بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ﴾

''اور پہاڑوں میں راستے ہیں سفید اور سرخ رنگ رنگ کے اور کچھ بہت کالے''

(۵) زمین میں اگانے کی تاثیر رکھی گئی رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ﴾ اور زمین کی (قسم) جو اس سے کھلتی ہے یعنی زمین بارش سے اس قابل ہوتی ہے کہ وہ کھل جاتی ہے اور بیج سے پودے اگتے ہیں۔

(۶) زمین میں اسکی طبع میں خشکی کی وجہ سے بارش کے پانی کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھی گئی۔ اس کا ذکر رب تعالیٰ نے اس آیۃ میں کیا ﴿ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ ﴾ اور ہم نے آسمان سے پانی اتارا ایک اندازہ پر پھر اسے زمین میں ٹھہرایا۔

(۷) اللہ تعالیٰ نے زمین میں چشمے اور نہریں جاری فرمائیں۔

(۸) مختلف قسم کے گھاس اور نباتات پودجات، درخت زمین میں ہی اگائے گئے۔

خیال رہے کہ نباتات کا زمین میں پیدا ہونا بظاہر ایک نشانی نظر آتی ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ اس ایک نشانی میں کئی قدرت کی نشانیاں موجود ہیں۔ اس لئے کہ علیحدہ علیحدہ رنگ پائے جانے بہت بڑی نشانی ہے اور مختلف قسم کا ذائقہ ان میں پایا جانا اور علیحدہ نشانی ہے، پھر مختلف قسم کی بوئیں پائی جانی اور علیحدہ قسم کی نشانی ہے۔ پھر ان میں کوئی انسانوں کی خوراک بنتے ہیں، کوئی حیوانوں کی حیوانوں میں سے چرندوں کی علیحدہ خوراک، پرندوں کی علیحدہ یہ ایک اور عظیم نشانی ہے پھر ان میں سے بعض کو اسی طرح کھایا جاتا ہے بعض کو آگ پر پکا کر یہ ایک اور نشانی ہے پھر بعض کا بطور دوا استعمال کیا جانا اور بعض کا بطور تلذذ جس طرح پھل ہو گئے یہ اور علیحدہ نشانی ہے۔

پھر ذرا غور کریں تو لباس بھی نباتات سے ہی حاصل ہوتا ہے کیونکہ سوت کپاس سے حاصل ہوتا جو زمین کی پیداوار ہے اور جانوروں کے بالوں اور پشم اور جانوروں کے چمڑے سے بننے والا لباس بھی زمین کے نباتات سے ہی حاصل ہوا کیونکہ جانوروں کی خوراک نباتات سے ہی حاصل ہوتی ہے اور ریشم سے بننے والا لباس بظاہر کیڑے سے حاصل ہوا لیکن کیڑے کو خوراک درخت کے پتوں سے ملتی ہے تو یہ بھی زمین کی پیداوار ہی ہو گیا۔

راقم نے جن کو سات نمبر اور آٹھ نمبر میں شمار کیا ان دونوں رب تعالیٰ کی قدرت کی عجیب نشانیوں کو رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی میں دیکھیں ﴿ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰـهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ﴾ اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور اس میں لنگر ڈالے اور اس میں ہر بارونق جوڑا اگایا۔

(۹) زمین میں رب تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے یہ تاثیر رکھی ہے کہ ایک دانہ اس میں کاشت کیا جائے تو وہ اس سے سات سو دانے اگاتی ہے اسی کو رب تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا ﴿ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ﴾ جیسا کہ ایک دانہ ہو (اس سے زمین) سات بالیاں (خوشے، سٹے) اگائے اور ہر بالی میں سو دانہ ہو۔

(۱۰) زمین کو حشر ونشر کا نمونہ بنایا گیا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ اَحْيَيْنٰهَا ﴾ اور ان کے لئے نشانی ہے کہ مردہ زمین کو ہم نے زندہ کیا۔ یعنی جس طرح بارش نہ

ہوتو زمین میں اگانے کی تاثیر ختم ہو جاتی ہے وہ مردہ حیثیت رکھتی ہے اور جب بارش ہوتی ہے تو اس میں اگانے کی تاثیر پیدا ہو جاتی ہے وہ زندہ ہونے کی صورت میں ہوتی ہے۔ یہی صورت چونکہ انسان کی موت و حیات، حشر و نشر میں بھی ہونی ہے تو گویا کہ زمین حشر و نشر کی یاد دلاتی ہے۔

(۱۱) اسی زمین میں ہی اللہ تعالیٰ نے مختلف قسم کے جانور پیدا فرمائے جن کا ذکر اس آیۃ کریمہ میں فرمایا ﴿ وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ﴾ اور اس (زمین) میں (اللہ) نے ہر قسم کے جانوروں کو پھیلایا۔

(۱۲) اسی زمین میں اللہ تعالیٰ نے مختلف پتھر پیدا فرمائے بعض پتھر وہ ہیں جو صرف زینت کا کام دیتے ہیں جیسا کہ یاقوت، الماس، عقیق اور فیروزہ اور بعض پتھر وہ ہیں جو صرف تعمیر کے لئے کام آتے ہیں جس طرح عام سخت پتھر جو ہم عام دیکھتے ہیں لیکن تعمیر کے کام آنے والے پتھر بھی مختلف قسم کے ہیں کوئی بہت سخت نیلگوں کوئی ریتلے کوئی سچے ہیں۔ اور بعض پتھر وہ ہیں جو تعمیر اور زینت دونوں کا بیک وقت فائدہ دیتے ہیں جیسا کہ سنگ مرمر اور سرخ رنگ کا پتھر پھر ذرا اور غور کریں تو عجیب بات یہ نظر آئے گی کہ بعض پتھر وہ ہیں جن کی قیمت تھوڑی اور فائدہ زیادہ جیسا کہ تعمیر کے کام آنے والے اور چقماق جس سے آگ نکلتی ہے۔ اور بعض پتھر وہ ہیں جنکی قیمت زیادہ لیکن ان میں فائدہ تھوڑا ہے جیسا کہ یاقوت، عقیق وغیرہ۔ زمین میں پتھروں کا پایا جانا اور پھر مختلف قسم کا ہونا یہ رب تعالیٰ کی عظیم قدرت کی عظیم نشانیاں ہیں

(۱۳) معدنیات بھی زمین میں ہی پائی جاتی ہیں جن میں سونا اور چاندی کی کان زیادہ قیمت رکھتی ہے یہ بھی رب تعالیٰ کی قدرت کی ہی عجیب نشانیاں ہیں۔

(۱۴) زمین میں بسنے والے انسان کو رب تعالیٰ نے مختلف کسب، مختلف صنعتوں اور مختلف عادات کا مالک بنا دیا یہی زمین میں رہنے والا انسان کبھی دریا کی گہرائی سے مچھلیاں پکڑتا ہے اور کبھی فضاء سے پرندے پکڑتا ہے۔ اور اگر غور کیا جائے تو یہ منافع جو انسان کو حاصل ہوتے ہیں وہ بہت ہی عظیم ہیں اس لئے کہ خوراک میں حیات ہے جو بعض اوقات جنگل اور سفر میں یہ چیزیں وہ فائدہ دیتی ہیں جو سونا اور چاندی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔

(۱۵) زمین میں بڑے بڑے درخت لگائے گئے جنکے حسین مناظر کو دیکھ کر انسان بے ساختہ کہتا ہے ''سبحان اللہ کیا ہی رب کی قدرت ہے'' پھر ان درختوں کی لکڑی سے انسان اپنے مکانات کے چھت، دروازے وغیرہ بناتے ہیں۔ غرضیکہ زمین میں ربّ تعالیٰ کی قدرت کی بہت ہی زیادہ نشانیاں پائی گئی ہیں۔

مقام توجہ: اے انسان ذرا تو سوچ توجہ کر اپنے حال کو سمجھنے کی کوشش کر تو تجھے یقینی طور پر یہ سمجھ آئے گی کہ جہان ایک گھر کی مثال ہے گھر میں جن چیزوں کی ضرورت انسان کو ہوتی ہے وہ سب مہیا کر دی گئی ہیں۔ آسمان کو چھت بنایا، زمین کو فرش اور اس گھر میں ستاروں کے چراغ چاند، سورج کی قندیلیں اور زمین کے نباتات سے غذا، دوا، لباس، سواری، زیور عطا کئے گئے۔ حیوانات، معدنیات اسے عطا کئے گئے اسے گھر کا مالک بنایا گیا طرح طرح کے انعام اس پر کئے گئے اور رب تعالیٰ نے ان گنت احسانات اس پر فرمائے اب انسان کے لئے ضروری کہ وہ شکر گزار بندہ بنے اور رب تعالیٰ کی عبادت کرے اور اسی کی طاعت کرے اگر انسان رب تعالیٰ کا شکر گزار ہوا تو ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ﴾ کے وعدہ کے مطابق اور ہی رب تعالیٰ سے انعام حاصل کرے گا اور اگر ناشکری کی تو ﴿وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِيْدٌ﴾ کی وعید کے مطابق وہ شخص رب قدوس کے انعام واکرام سے محروم ہو جائے گا۔ (ماخوذ از عزیزی)

قارئین کرام کیا آپ اپنے ملک میں اور گرد نواح میں آئے دن مشاہدہ نہیں کر رہے کہ رب تعالیٰ کی ناشکری کرنے والے بڑے بڑے عظیم بڑے بڑے جابر، بادشاہ، حکمران ذلیل نہیں ہو رہے خدارا یہودیوں، عیسائیوں، ہندوؤں کا آلہ کار بن کر کام کرنا چھوڑ دو یہ مسلمان کا شیوہ نہیں رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام پر عمل پیرا ہو جاؤ۔

زمین کی فضیلت: اللہ تعالیٰ نے زمین کے مختلف حصوں کو برکت والا کہا ہے مکہ شریف کی زمین کو برکت والا اس آیۃ میں ذکر کیا گیا ہے ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا﴾ موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا کرنے اور سب سے پہلے رب تعالیٰ کے کلام کرنے والے مقام کو ان الفاظ مبارکہ سے بیان کیا گیا '' فی البقعة المباركة من الشجرة '' مسجد اقصیٰ کے اردگرد زمین کی برکت کا

ذکراس آیۃ میں کیا﴿ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ ﴾ ملک شام کی زمین کا برکت والی ہونا ذکر کرتے ہوئے فرمایا﴿ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْهَا ﴾ تمام زمین میں رب تعالیٰ نے برکت رکھی اس کا ذکر یوں کیا گیا﴿ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَکَ فِیْهَا ﴾ اگر کوئی یہ کہے کہ خالی جنگل ہولناک جنگل میں کون سی برکت ہے؟ تو اس کا جواب دیا جائے گا کہ جنگل میں جانور پائے جاتے ہیں جن سے انسان فائدہ حاصل کرتا ہے پھر بعض اوقات انسان اپنی ضرورت کے مطابق جنگل میں بسیرا اختیار کر لیتا ہے۔ زمین میں ان برکتوں کے پائے جانے کی وجہ سے رب تعالیٰ نے فرمایا﴿ وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ﴾ (یقین رکھنے والوں) کا ذکر کیا ہے جیسا کہ قرآن پاک اگرچہ تمام لوگوں کے لئے ہدایت ہے لیکن اس ہدایت سے نفع صرف متقین حضرات ہی حاصل کرتے ہیں اس لئے فرمایا﴿ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ﴾

زمین کی فضلیت پر واضح دلیل یہ بھی موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انبیاء کرام جو مقرب اور بلند درجات کے مالک ہیں وہ زمین میں ہی پیدا ہوئے اور زمین ہی ان کا اصل ہے یہ مسئلہ اس آیۃ کریمہ کو دیکھنے سے سمجھ آجائے گا ﴿ مِنْهَا خَلَقْنٰکُمْ وَفِیْهَا نُعِیْدُکُمْ ﴾ اسی (زمین) سے ہم نے تمہیں پیدا کیا۔ اور اسی میں تمہیں لوٹائیں گے۔ یہ خطاب تمام انسانوں کو ہے جس میں انبیاء کرام بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو خاص انعام سے مکرم فرمایا جو پہلے کسی نبی کو وہ انعام نہیں دیا گیا﴿ جعل الارض کلها مسجدا له وجعل ترابها طهورا ﴾ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے تمام زمین کو مسجد بنایا اور زمین کی مٹی کو پاک کرنے والا بنایا یعنی اس سے تیمم کیا جاتا ہے جس سے انسان کو طہارت حاصل ہوتی ہے۔ اس سے بھی زمین کی فضلیت سمجھ میں آئی واضح ہوا کہ زمین کو مختلف وجوہ سے کمال اور فضلیت حاصل ہے۔

(از کبیر)

آسمان کی فضلیت: آسمان ملائکہ کی عبادت گاہ ہے اس میں کوئی جگہ ایسی نہیں جسمیں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوتی ہو۔ آدم علیہ السلام جب جنت میں تھے بھول کر خطا کے واقع ہونے پر بھی آپ کو جنت سے نکل جانے کا حکم دیا۔ آسمان کو مضبوط چھت بنایا جس کا ذکر رب تعالیٰ نے ان الفاظ مبارکہ سے کیا ﴿ وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ﴾ اور آسمان میں برج بنائے مالک الملک نے ارشاد فرمایا

﴿تَبٰرَکَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجاً﴾

زمین وآسمان کی فضلیت کاذکر:

" انه تعالیٰ ذکر امر السموات والارض فی کتابه فی مواضع "

''بیشک اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کے متعلق اپنی کتاب میں کئی جگہ ذکر کیا''

اوراس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب زمین وآسمان کا بہت زیادہ ذکر کیا " فھو یدل علی عظم شانھما " تووہ ان کی عظمت شان پردلالت کرتا ہے " وعلی ان له سبحانه و تعالیٰ فیھما اسرارا عظیمة " بیشک اللہ تعالیٰ کے زمین وآسمان میں عظیم راز پائے جاتے ہیں اس سے بھی ان دنوں کی شان میں عظمت واضح طور پر سمجھ آرہی ہے:

" وحکما بالغة لا یصل الیھا افھام الخلق ولا عقولھم "

''اورزمین وآسمان میں اللہ تعالیٰ کی کامل حکمتیں اتنی پائی جاتی ہیں جن تک مخلوق کی سمجھ اورعقل نہیں پہنچ سکتی''

اس بھی پتہ چلا کہ زمین وآسمان کورب تعالیٰ نے بہت زیادہ عظمت عطافرمائی ہے۔

آسمانوں کوزمین پرفضلیت کے قائلین کے دلائل:

اول: اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کوسات چیزوں سے مزین فرمایاہے:

(۱) مصابیح (چراغوں) سے ﴿وَلَقَدْ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ﴾

(۲) چاند سے جس کاذکر یوں فرمایا ﴿وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِیْهِنَّ نُوْرًا﴾

(۳) سورج سے، جس کاذکرفرمایا ﴿وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجاً﴾

(۴) عرش سے، اسے یوں بیان کیا ﴿رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ﴾

(۵) کرسی سے، اس کاذکراس طرح کیا ﴿وَسِعَ کُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾

(۶) لوح سے، جسے ذکرکیا ﴿فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ﴾

(۷) قلم سے جس کاذکرفرمایا ﴿نٓ وَالْقَلَمِ﴾

دوم: سماء کامعنی ہی بلندی ہے جس کانام عظمت پردلالت کررہاہے کہ آسمانوں کورفعت شان حاصل ہے

سوم: " انه تعالیٰ جعل السماء قبلة الدعاء فالایدی ترفع الیها والوجوه تتوجه نحوها "
بیشک اللہ تعالیٰ نے آسمان کو دعاء کا قبلہ بنایا ہاتھ آسمان کی طرف اٹھتے ہیں انسان آسمان کی طرف ہی دعا میں متوجہ ہوتا ہے آسمان ہی انوار کی منزل ہے اور صفاء اور روشنی اور طہارت اور خلل وفساد سے پاک ہونے کا محل ہے۔

چہارم: آسمان مؤثر ہیں کہ بارش سورج کی شعاعیں زمین میں اثر انداز ہیں لیکن آسمان اثر قبول کرنے والے نہیں زمین اثر کو قبول کرتی ہے مؤثر نہیں " والمؤثر اشرف من القابل " مؤثر قبول کرنے والے سے اشرف ہوتا ہے۔

پنجم: آسمانوں کو سورج اور چاند سے جو زینت حاصل ہے اس سے بھی آسمانوں کو فضلیت حاصل ہے یہ دلائل دینے والے حضرات آسمانوں کو زمین پر افضل مانتے ہیں کہ زمین کو یہ کمالات حاصل نہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

راقم کا موقف: استاذی المکرم حضرت علامہ مفتی محمد حسین نعیمی رحمہ اللہ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ نبی کریم ﷺ ہیرے کی مثال ہیں ہیرا اگر رومال میں لپیٹ دیں تو رومال کی قیمت بڑھ گئی ہیرے کو ٹوپی میں رکھیں تو ٹوپی کی قیمت بڑھ گئی اور اگر ہیرے کو کسی برتن میں رکھیں تو وہ برتن قیمتی ہو جائے گا۔

بس یہی سمجھیں کہ جب نبی کریم ﷺ غار حرا میں ہوتے تو غار حرا کا مقام بلند ہوتا اور جب مکہ مکرمہ میں ہوتے تو مکہ مکرمہ کا مقام بلند ہوتا اور جب آپ غار ثور میں تشریف لائے تو غار ثور کا مقام بلند ہو گیا اور جب آپ آسمانوں پر تشریف لے گئے تو آسمانوں کا مقام بلند ہو گیا اور جب آپ مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو مدینہ طیبہ کا مقام بلند ہو گیا اور جب آپ مزار انور میں تشریف لے گئے تو آپ کے مزار انور کا مقام بلند ہو گیا۔

راقم کو یہی بات پسند آئی دل میں یوں راسخ ہو گئی کہ زمین کی افضلیت پر دلائل اور آسمان کی افضلیت پر دلائل کی قوی ہونے یا ضعیف ہونے سے قطع نظر دل یہ کہتا ہے میرا ایمان یہی ہے میرا دین یہی ہے میری محبت یہی ہے کہ رب تعالیٰ تو مکان سے پاک ہے رب تعالیٰ کے بعد اگر کوئی ذات سب کائنات سے بلند ہے تو میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ ہیں وہ چونکہ زمین میں ہیں لہذا زمین ہی افضل ہے کوئی

شخص دلائل کی قوت وضعف سے مجھ پر اعتراض نہ کرے میرا سرمایہ صرف محبت رسول اللہ ﷺ ہی ہے۔

مسئلہ: اگر چہ زمین کو فراش کہا گیا ہے اور سورج کو سراج کہا گیا ہے لیکن قسم کا تعلق عرف سے ہے اس لئے اگر کسی نے قسم اٹھائی کہ میں فراش پر نہیں سوؤں گا اگر وہ زمین پر سو گیا تو اس کی قسم نہیں ٹوٹی کیونکہ عرف عام میں زمین کو فراش نہیں کہتے بلکہ بستر کو فراش کہتے ہیں۔اسی طرح اگر قسم اٹھائی کہ میں سراج (چراغ) کی روشنی میں نہیں پڑھوں گا تو اس نے سورج کی روشنی میں پڑھ لیا تو اس کی قسم نہیں ٹوٹی کیونکہ عرف میں سورج کو چراغ نہیں کہا گیا۔ (از احکام القرآن للجصاص)

وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً:

(اور آسمان سے پانی نازل کیا) بظاہر اس پر وہم یہ پایا جاتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ پانی بادل سے نازل ہوتا ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ذکر ہے:

﴿ اَفَرَءَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ☆ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ﴾

''تو بھلا بتاؤ تو وہ پانی جو پیتے ہو کیا تم نے اسے بادل سے اتارا یا ہم ہیں اتارنے والے''

اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ﴾

کیا تو نے نہ دیکھا کہ اللہ نرم نرم چلاتا ہے بادل کو پھر انہیں آپس میں ملاتا ہے پھر انہیں تہہ بتہہ کر دیتا ہے تو تو دیکھے کہ اس میں سے بارش نکلتی ہے۔

جب ثابت ہوا کہ پانی بادل سے نازل ہوتا ہے تو یہاں آسمانوں سے پانی کے نازل ہونے کا کیا مطلب ہے؟

☆ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں یا تو مراد ہے ''انزل من جهتها'' آسمان کی جانب سے پانی نازل کرتا ہے۔

☆ اور یا اس کا مقصد یہ ہے ''منها الی السحاب و من السحاب الی الارض'' کہ رب تعالیٰ آسمان سے پانی بادل میں نازل کرتا ہے اور بادل سے زمین کی طرف نازل کرتا ہے

اس پر حدیث پاک شاہد ہے:

''عن ابن عباس رضی اللہ عنهما انه قال تحت العرش بحر ینزل منه

ارزاق الحیوانات یوحی اللہ تعالیٰ الیه فیمطر ماشاء من سماء الی سماء حتی ینتھی الی السماء الدنیا ویوحی الی الریح فتحمله فتلقیه فی السحاب والسحاب بمنزلة الغربال ویوحی الی السحاب ان یغربله فیغربله فلیس من قطرة الا ومعها ملیک یضعها موضعها ولا ینزل من السماء قطرة الا بکیل معلوم ووزن معلوم الا ما کان فی یوم الطوفان فانه کان منهمرا قد نزل بغیر کیل ولا وزن "

" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ عرش کے نیچے دریا ہے جس سے حیوانوں کا رزق نازل ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی طرف وحی کرتا ہے تو وہ بارش برساتا ہے جتنی رب چاہتا ہے وہ بارش ایک آسمان سے نیچے والے آسمان تک اس طرح یہ سلسلہ چلتے ہوئے آسمان دنیا تک پہنچ جاتا ہے پھر ہوا کی طرف وحی کی جاتی ہے جو اس بارش کو اٹھا کر بادلوں تک پہنچا دیتی ہے اور بادل چھلنی کی طرح ہوتے ہیں پھر بادلوں کی طرف وحی کی جاتی ہے تو ان سے چھلنی کی طرح بارش برسنی شروع ہو جاتی ہے ہر قطرہ کے ساتھ ایک فرشتہ ہوتا ہے جو اسے اپنی جگہ رکھ کر چلا جاتا ہے ہر قطرہ کی مقدار معلوم ہوتی ہے ہاں طوفان کے دن وہ بے تحاشا پانی ہوتا ہے جس کی مقدار معلوم نہیں ہوتی "

خیال رہے کہ علامہ طنطاوی نے "السماء" کا معنی ہی یہاں "السحاب" (بادل) کیا ہے۔

☆ اور یا اس کا جواب یہ ہے " او المراد بالسماء جهة العلو کما ینبئی عنه الاظهار فی موضع الاضمار" اور یا " السماء " سے مراد "بلندی کی جانب" ہے کیونکہ پہلے "والسماء بناء " میں " السماء " سے مراد آسمان ہے اگر یہاں بھی مراد آسمان ہوتا تو یوں کہہ دیا جاتا " وانزل منه ماء " جب ضمیر نہیں ذکر کی بلکہ اسم ظاہر لایا گیا تو اس سے بھی اشارہ مل رہا ہے کہ پہلے معنی سے مختلف معنی لینا زیادہ مناسب ہے۔ (از تفسیر ابی السعود ، شیخ زادہ)

☆ " او من اسباب سماویة تثیر الاجزاء الرطبة من اعماق الارض الی جوا لهواء فتنعقد سحابا ما طرا " یا اس آیۃ میں یہاں " السماء " سے مراد "اسباب سماویہ" ہو جائیں یعنی زمین کی گہرائی سے تر اجزاء فضاء کی طرف اٹھتے ہیں اور بادل بن کر برستے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اسباب سماویہ سے پانی نازل کیا خیال رہے کہ تر اجزاء سے مراد بخارات ہیں جو پانی اور ہوا سے ملے جلے ہوتے ہیں یعنی پانی سے بخارات اٹھ کر ہوا کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ پھر وہ

کرہ ہوائیہ جسے زمہریر یہ کہا جاتا ہے اس میں پہنچ جاتے ہیں اور پانی کی شکل اختیار کر کے زمین پر آجاتے ہیں۔ (از بیضاوی ، شیخ زادہ)

راقم کا موقف: راقم نے اس تمام بحث کے بعد یہ مناسب سمجھا کہ " السماء " کا معنی بلندی کر لیا جائے اور اس طرح بیان کیا جائے کہ تمام اقوال اس میں سمٹ کر آجائیں کسی کا اختلاف نظر نہ آئے وہ یوں سمجھ آتا ہے کہ زمین کے پانی سے اٹھنے والے بخارات فقط سبب ہیں بارش کا برسنا رب تعالیٰ کی قدرت سے ہے وہ چاہے تو کسی سبب کو مؤثر بنائے اور چاہے تو مؤثر نہ بنائے۔ بخارات سے بننے والے بادلوں کو عرش کے نیچے سے آنے والا پانی بھی فراہم ہوتا ہے وہ پانی چونکہ آسمانوں کی جانب سے ہی آتا ہے پھر برستا اس وقت ہی ہے جب رب تعالیٰ حکم دیتا ہے چونکہ " السماء " کا لغوی معنی بلندی بھی ہے اس لئے راقم نے ''بلندی'' معنی کر کے اپنے زعم ناقص کے مطابق تمام اقوال کو جمع کر لیا ہے۔ " واللہ اعلم بالصواب "

فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ:

جب ﴿ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ﴾ میں لفظ " ماء " کی تنوین کو تبعیض کے لئے بنایا جائے اور ''من الثمرات'' میں " من " کو بھی تبعیض کے لئے بنایا جائے تو معنی یوں ہوگا۔ ''اور اللہ نے بلندی سے کچھ پانی نازل کیا اور اس کے ذریعے تمہارے رزق کے لئے بعض پھل نکالے''۔ اس سے اس طرف اشارہ حاصل ہوگیا کہ جب بارش برستی ہے تو زمین میں یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس سے ہر قسم کے نباتات پیدا ہوتے ہیں جن میں سے بعض انسانوں کے کھانے کے لئے ہوتے ہیں اور بعض جانوروں کے کھانے کے لئے ہوتے ہیں جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۙ ☆ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۙ ☆ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۙ ☆ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ۙ ☆ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ۙ ☆ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ۙ ☆ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ۙ ☆ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴾

''بیشک ہم نے اچھی طرح پانی ڈالا پھر زمین کو خوب چیرا تو اس میں اگایا، اناج اور انگور اور چارہ اور زیتون اور کھجور اور گھنے باغیچے اور میوے اور نباتات تمہارے اور تمہارے چوپاؤں کے نفع کے لئے''

☆ اور اگر ﴿ مِنَ الثَّمَرٰتِ ﴾ میں ''من'' کو بیانیہ بنایا جائے تو معنی ہوگا۔ ''تو نکالے اس کے ذریعے پھل''۔ اب مقصد یہ ہوگا کہ تمام پھل ہی انسان کے نفع کے لئے ہیں کیونکہ جن نباتات کو حیوانوں نے کھانا ہے اور حیوانوں سے نفع انسان نے حاصل کرنا ہے وہ نباتات بھی درحقیقت انسان کے نفع کے لئے ہی ہیں۔

(ماخوذ از بیضاوی وقرطبی)

قرآن پاک کی یہ عظمت ہے کہ ایک ایک لفظ سے کتنے مطالب حاصل ہوتے ہیں بیان کرنے والے پھر بھی اپنے عجز کا ہی اعتراف کرتے ہیں کہ ہم قرآن پاک کو کما حقہ بیان کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔

شاندار علمی نکتہ: '' الثمرات '' جمع مؤنث سالم ہے جب اس پر الف لام نہ ہو تو یہ جمع قلت ہے اور جب اس پر الف لام ہو تو جمع کثرت ہے اس لفظ کو ذکر کرنے اور الثمر یا الثمار نہ ذکر کرنے کی یہ وجہ ہے '' **تنبیھا علی قلة ثمار الدنیا واشعار بتعظیم امر الآخرة** '' کہ اس سے متنبہ کیا گیا ہے کہ اگرچہ دنیا میں بظاہر پھل کثیر پائے جاتے ہیں لیکن وہ امر آخرت کی عظمت اور ان پھلوں کے مقابل قلیل ہی ہیں۔

(از کبیر)

فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا: (تو اللہ کے شریک نہ ٹھہراؤ) '' انداد '' جمع ہے '' ند '' کی جس کا معنی ہے مثل، نظیر، کفو جس طرح کسی شاعر نے کہا:

نحمد الله ولا ندله ، عنده الخیر وما شاء فعل

ہم اللہ کی حمد کرتے ہیں اور اس کی کوئی مثل نہیں ، اسی کے پاس سب بھلائیاں جو چاہے وہ کرتا ہے

(از قرطبی)

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی لغوی معنی کے مطابق ہے لیکن مرادی معنی یوں بیان کیا گیا ہے

'' **فلا تجعلوا لله اندادا ، شرکاء فی العبادة** ''

اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبادت میں شریک نہ ٹھہراؤ (جلالین) راقم کا ترجمہ جلالین کے مطابق ہے یہاں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہ ٹھہرانے کا حکم دیا گیا ہے ماقبل کے ساتھ اس کے تعلق میں تین احتمال ہیں۔

(۱) اس کا تعلق " اعبدوا " سے ہو اب مطلب یہ ہوگا کہ اے لوگو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ" فان اصل العبادة واساسها التوحید " بیشک عبادت کی اصل اور بنیاد توحید ہے۔

(۲) اس کا تعلق " لعل " سے ہو اب مطلب یہ ہوگا " اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا کیا تا کہ تم ڈرو اور اس کے عذاب کا خوف رکھو" فلا تثبتوا له ندا فانه من اعظم موجبات العقاب " اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ کیونکہ اسکے ساتھ شریک ٹھہرانا بہت بڑے عذاب کا سبب ہے

(۳) اس کا تعلق ﴿ اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا......الخ ﴾ سے ہو اب مطلب یہ ہوگا کہ وہ ذات جس نے تمہیں اتنی عظیم نعمتوں سے نوازا اور اپنے خالق ہونے پر اتنے روشن دلائل قائم کئے ہیں اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ۔ (از کبیر)

اندادا جمع لانے میں عجیب حکمت:

" وفی الاتیان بالجمع تشنیع علیهم حیث جعلوا ......انداد لمن یستحیل له ان یکون له ند واحد " " اندادا " جمع ذکر کر کے ان لوگوں کی حماقت کو واضح کیا گیا جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کئی شریک ٹھہراتے تھے کہ یہ لوگ کیسے ہی احمق ہیں کہ اس ذات کے ساتھ کئی شریک ٹھہرا رہے ہیں جس کا کوئی ایک شریک ٹھہرانا بھی محال ہے۔

کیا خوب کہا زید بن عمر بن نفیل رضی اللہ عنہ نے جو نبی کریم ﷺ کے اعلان نبوت سے پہلے زمانہ فترة میں بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان رکھتے تھے:

اربا واحدا ام الف رب ،	ادین اذا تقسمت الامور
ترکت اللات والعزی جمیعا ،	کذلک یفعل الرجل البصیر
کیا ایک رب ہے یا ہزار رب ہیں	کیا دین کے امور (کئی خداؤں میں) تقسیم ہو سکتے ہیں
میں نے لات اور عزی سب کو چھوڑ دیا	عقل آدمی ایسا ہی کرتا ہے

(از روح المعانی)

اعتراض: پہلے تمہید کو دیکھا جائے پھر اعتراض کو سمجھنا آسان ہوگا "ند" ایک چیز کی مثل کو

کہا جاتا ہے جو اس کے امور میں مخالف ہو منافر ہو اس سے بعید ہو "السند المشارک فی الجوهرية فقط" ایک چیز جو دوسری چیز کے ساتھ جوہر ہونے میں مشترک ہو اسے "ند" کہا جاتا ہے "الشکل المشارک فی القدر والمساحة" ایک چیز جب دوسری سے قدر اور پیمائش (ناپ، اندازہ) میں مشترک وہ "شکل" ہے "الشبة المشارک فی الكيفية فقط" ایک چیز دوسری کے ساتھ صرف کیفیت میں شریک ہو تو اسے "شبہ" کہتے ہیں "والمساوی فی الكمية فقط" جب ایک چیز دوسری کے ساتھ مقدار (لمبائی وغیرہ) میں مشترک ہو تو اسے "مساوی" کہا جاتا ہے "والمثل عام فی جمیع ذالک" ایک چیز دوسری کے ساتھ کسی طرح بھی مشترک ہو تو اسے "مثل" کہا جاتا ہے۔

اب اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ مشرکین میں سے کوئی بھی اپنے معبودوں کو اللہ تعالیٰ کی ذات میں صفات میں مماثل نہیں مانتے تھے اور نہ ہی وہ اپنے معبودوں کو اللہ تعالیٰ کے افعال کے مخالف کام کرنے والا مانتے تھے:

"وانما عبدوها لتقربهم اليه سبحانه زلفى"

"وہ تو بتوں کی عبادت صرف اس لئے کرتے تھے کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کرتے ہیں"

یہاں کیسے کہا گیا کہ "رب تعالیٰ کے "ند" نہ بناؤ وہ تو رب تعالیٰ کا کوئی "ند" (جوہر ہونے میں اس کا مماثل) مانتے ہی نہیں تھے۔

پہلا جواب: یہاں استعارہ تھکمیہ پایا گیا ہے جس طرح کہ کفار کو عذاب کی خبر ان الفاظ سے دی گئی ﴿ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ اے محبوب آپ ان کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔ حالانکہ عذاب کی خبر تو پریشان کن ہوتی ہے لیکن اس کو بشارت سے تعبیر کر دیا گیا کیونکہ اس میں تہکم پایا گیا ہے "تهكم" کا معنی تو مزاح اڑانا ہے لیکن یہاں مفہوم یہ ہے کہ ان سے اس انداز پر کلام کریں کہ تمہارے کلام سے ان کے بے وقوفی واضح ہو جائے۔ اس آیۃ میں بھی یہ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے غیر کی عبادت صرف اس غرض سے کرنا کہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے قریب کریں گے یہ حماقت ہے یہ تو ایسے ہی ہے جیسا کہ اس کا کوئی مماثل سمجھ لیا جائے۔

دوسرا جواب: ہوسکتا ہے کہ آیۃ مبارکہ میں "نـد" کا معنی مثل اور نظر لے لیا گیا ہو کہ غیر اللہ کی

عبادت کرنا اس کو معبود سمجھنے میں مثل ہی سمجھنا ہے۔ (از روح المعانی)

تیسرا جواب: علامہ کاظمی رحمہ اللہ نے آسان لفظوں میں یوں جواب ذکر فرمایا اس کا جواب یہ ہے کہ کسی ایک صفت میں غیر اللہ کو اسکے برابر مان لینا گویا اس کی ذات اور تمام صفات میں برابر ماننا ہے۔ (تبیان البیان)

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ: حال من ضمیر "لا تجعلوا" والمفعول مطروح" یہ جملہ حال واقع ہو رہا ہے یعنی معنی یہ ہے کہ تمہارا حال یہ ہے کہ بیشک تم علم، معرفت، نظر و فکر اور درست رائے رکھتے ہو جب تم معمولی بھی غور و فکر کرو تو تمہیں سمجھ آ جائے کہ صانع (خالق) موجود ہے وہ ذات وصفات میں واحد ہے اس کے بغیر کوئی معبود نہیں راقم کا ترجمہ اسی قول کے مطابق ہے" حالانکہ تم جانتے ہو" "او مقدر حسبما یقتضیه المقام ویسد مسد مفعولی العلم" یا مناسب الفاظ مقدر نکالے جائیں جو "علم" کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہوں۔ یعنی اب معنی اس طرح ہوگا "وانتم تعلمون انه سبحانه لا یماثله شئی" اللہ تعالیٰ کے برابر نہ ٹھہراؤ تم جانتے بھی ہو کہ اس پاک ذات کا کوئی مثل نہیں۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی قول کے مطابق ہے تو اللہ کیلئے جان بوجھ کر برابر والے نہ ٹھہراؤ۔

اعتراض: اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تو محاورہ کے خلاف ہے اس لئے کہ ہم جب کسی کو یہ کہیں کہ یہ کام جان بوجھ کر نہ کرو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ارادۃً قصداً یہ کام نہ کرو یہاں یہ مراد ہی نہیں۔

جواب: زبان کا تعلق علاقہ اور زمانہ سے ہوتا ہے بعض علاقوں میں اور محاورہ ہوتا ہے اور بعض میں اور اسی طرح بعض زمانوں میں اور محاورات ہوتے ہیں بعض میں اور اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو یوں پڑھ کر دیکھیں تو اللہ کے لئے جانتے ہوئے (کہ اس کا کوئی مثل نہیں) برابر والے نہ ٹھہراؤ۔ انشاء اللہ آپ کا ذہن اسے ضرور قبول کرے گا کہ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کا یہی مطلب ہے جو راقم نے آپ کے ترجمہ کی توجیہ بیان کی۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبادت میں شریک ٹھہرانے والوں کے عقائد:

ایک فرقہ جس کو ثنو یہ کہا جاتا ہے وہ دو خدا مانتے ہیں ایک حلیم جو بہتر کام کرتا ہے اور ایک سفیہ جو برے کام کرتا ہے اسی فرقہ کے قریب مجوس ہیں وہ بھی دو خالق مانتے ہیں ایک نیکیوں کو پیدا کرنے والا جس کا نام ان کے نزدیک یزادان ہے اور دوسرا برائیوں کو پیدا کرنے والا جسے وہ اھرمن کہتے ہیں۔

اسی طرح ایک فرقہ جن کو صابئین کہا جاتا ہے یہ ستاروں کو معبود مانتے ہیں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان ستاروں کو پیدا کیا ہے اور ان ستاروں کو تمام جہان کا مدبر بنایا ہے اس لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ان کی عبادت کریں اور ستارے اللہ کی عبادت کریں۔ ایک اور فرقہ جسے نصاری کہا جاتا ہے "الذین یعبدون المسیح علیہ السلام" یہ وہ لوگ ہیں جو عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت کرتے ہیں ایک اور فرقہ ہے جو بت پرست ہیں تمام فرقوں سے پہلا فرقہ بت پرستوں کا ہی ہے کیونکہ یہ نوح علیہ السلام کے زمانہ میں بھی پائے گئے ہیں جن کا ذکر رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَاتَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا یَغُوْثَ وَیَعُوْقَ وَنَسْرًا﴾ وہ کہنے لگے اپنے معبدوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور (اپنے بتوں) ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کو نہ چھوڑنا۔

بت پرست بتوں کی عبادت کیوں کرتے تھے؟

ابو معشر جعفر ابن محمد منجم بلخی نے ذکر کیا ہے کہ بہت سے چین اور ہند کے لوگ کہتے تھے "باللہ وملائکۃ" اللہ کی قسم اور اس کے فرشتوں کی قسم۔ ان لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ جسم ہے اور اس کی صورت ہے وہ سب صورتوں سے اچھی صورت رکھتا ہے اور اسی طرح فرشتے بھی جسم ہیں اور بہت خوبصورت ہیں۔ لیکن وہ تمام آسمانوں میں ہیں ان کی صورتیں ہم سے محجوب ہیں یعنی ہماری آنکھوں سے اوجھل ہیں اس لئے انہوں نے اپنے عقیدہ کے مطابق ضروری سمجھا کہ ان کی اچھی اچھی صورتیں بنا لیں لہٰذا انہوں نے خوبصورت خوبصورت مورتیاں بنالیں ان بتوں کی عبادت کرنی شروع کر دی کہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے قریب کرتے ہیں۔

ستارہ پرستوں کے نظریات:

جب لوگوں نے دیکھا کہ نظام عالم میں تغیر ستاروں کے احوال کے تغیر کے ساتھ منسلک ہے کہ سورج کا سرکی جانب سے قرب اور دوری سے مختلف حالات ہوتے ہیں اسی طرح باقی سیاروں کا بھی یہی حال ہے تو ان لوگوں نے یہ عقیدہ رکھ لیا کہ دنیا میں نحوست یا سعادت کی دار و مدار ستاروں پر ہی ہے تو انہوں نے ان کی تعظیم میں حد درجہ سے تجاوز کیا۔

اب ان میں سے بعض نے یہ عقیدہ رکھا کہ یہ تمام ستارے واجب الوجود (خود قائم ہیں کسی نے

ان کوموجود نہیں کیا) ہیں اور یہی اس جہان کی تمام مخلوق کے خالق ہیں۔
اور بعض ان میں سے اللہ تعالیٰ کو بھی مانتے تھے اسے " اللہ اکبر " کہتے تھے ان کا عقیدہ ستاروں کے متعلق یہ تھا کہ یہ اللہ اکبر کی مخلوق ہیں لیکن اس جہان کے یہ خالق ہیں۔
ان دونوں فرقوں میں یہ فرق تھا کہ پہلے فرقہ والے لوگ ستاروں کو مستقل خدا مانتے تھے ان کو ہی خالق مانتے تھے اور یہ کہتے کہ یہ جب خود خالق ہیں تو مخلوق نہیں۔ دوسرے فرقہ والے ان کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق مانتے تھے اور دوسری مخلوق کا خالق مانتے تھے اس طرح ان کے نزدیک ستارے اللہ تعالیٰ اور انسان کے درمیان واسطہ تھے " فلا جرم اشتغلوا بعبادتها والخضوع لها " یقیناً دونوں فرقے ہی ان کی عبادت میں مشغول ہو گئے اور ان کے سامنے انہوں نے عجز کا اظہار شروع کر دیا۔ پھر ان لوگوں نے بھی جب دیکھا کہ ہمارے معبود تو کبھی ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں تو انہوں نے بھی ان کی مورتیاں بنالیں اور ان بتوں کی عبادت شروع کر دی ان کی غرض یہ تھی کہ یہ بت ہمیں ہمارے معبودوں (ستاروں) کے قریب کرتے ہیں پھر ان میں کئی لوگوں نے زیادہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان بتوں کو ہی مستقل معبود سمجھ لیا ستاروں کو معبودیت سے معزول کر دیا۔

طلسم پرست: جادوگری کی لکیریں کھینچنے کو خوشحالی کے آنے اور مصائب کے مندفع کرنے کا مستقل ذریعہ سمجھ لیا اسی کی تعظیم شروع کر دی آہستہ آہستہ رب تعالیٰ کے مقابل مستقل کارساز ان کو ہی سمجھ لیا:
" ولما طاقت المدة ذلک الفعل نسوا مبدا الامر واشتغلوا بعبادتها علی الجهالة باصل الامر " جب وقت زیادہ گزر گیا تو یہ لوگ بھی اپنے ابتدائی عقیدہ سے اور تجاوز کر گئے انہوں نے بھی "طلسم پرستی" شروع کر دی۔

بت پرستی کی ایک اور وجہ: جب ان میں سے کوئی بڑا شخص فوت ہو جاتا تھا جسے وہ سمجھتے تھے کہ اس کی دعا قبول ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی شفاعت قبول ہوتی ہے " اتخذوا صنما علی صورته یعبدونه " اس کی شکل کا وہ بت بنالیتے تھے اور اس کی وہ عبادت کرتے ان کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ انسان جن کی مورتیوں کی ہم عبادت کر رہے وہ قیامت کے دن ہمارے شفیع ہوں گے اللہ تعالیٰ نے ان کے قول کو یوں بیان فرمایا ﴿ یَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ وہ کہتے یہ اللہ کے ہاں

ہمارے شفاعت کریں گے۔

بت پرستی کا ایک اور انداز: ابتدائی طور پر وہ بزرگوں کے بت بنا کر مسجد کے محراب میں رکھ لیتے تھے وہ اپنے خیال میں عبادت تو رب تعالیٰ کی ہی کرتے تھے لیکن بتوں کو اپنی توجہ کا مرکز سمجھتے تھے "ولما استمرت هذه الحالة ظن الجهال من القوم انه يجب عبادتها" جب وہ اسی حال میں رہے زیادہ وقت گزرنے پر ان کے جاہلوں نے محراب میں رکھے ہوئے بتوں کی عبادت کو واجب سمجھ لیا اور ان کو حقیقی معبود سمجھ لیا۔

بت پرستوں کا ایک اور عقیدہ:

"لعلهم كانوا من المجسمة فاعتقدوا جواز حلول الرب فيها فعبدوها على هذا التاويل" وہ جن بزرگوں کا مجسمہ بناتے تھے اس کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ رب تعالیٰ اس مجسمہ میں اتر آیا ہے لہذا یہ مجسمہ رب تعالیٰ کا قالب ہے ہم تو رب کی عبادت کر رہے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

تنبیہ: باطل فرقوں کی جتنی قسمیں بیان کی ہیں ان تمام کا عقیدہ یہ تھا کہ غیر اللہ معبود ہیں ان کے وہ مجسمے بنا کر ان کی عبادت کرتے تھے۔

مقام افسوس! کہ جہلاء مسلمانوں کو مشرک کہہ کر اپنے آپ کا جہنم کا ایندھن بناتے رہتے ہیں وہ کہتے یہی ہیں کہ انبیاء کرام اور اولیاء کرام کو اللہ تعالیٰ کا مقرب ماننے والے ان کو شفیع ماننے والے بت پرستوں کی طرح ہی ہیں۔ خدارا انصاف کیجئے کیا کوئی مسلمان کسی نبی کسی ولی کو معبود سمجھتا ہے کیا کوئی مسلمان ان کا مجسمہ بنا کر ان کو پوجتا ہے؟ جب ایسا نہیں تو مسلمانوں کو مشرک کہنے والے یقیناً انسانیت سے دور ہیں۔

فائده جليله:

" وكان قصي جد رسول الله ﷺ ينهاهم عن عبادتهم ويدعوهم الى عبادة الله تعالىٰ " (كبير)

"رسول اللہ ﷺ کے جد امجد حضرت قصی لوگوں کو بتوں کی عبادت سے منع کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف دعوت تھے"

نبی کریم ﷺ کے والدین کو کافر کہنے والے اپنی عاقبت کو برباد کر رہے ہیں ان شاء اللہ مستقل بحث مناسب مقام پر ذکر کی جائے گی۔

توحیدِ باری تعالیٰ: مسند احمد میں حارث اشعری سے روایت ذکر کی گئی بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا تحقیق اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کو پانچ کلمات (پانچ چیزوں) کا حکم دیا کہ خود بھی ان پر عمل کرو اور بنی اسرائیل کو بھی حکم دو وہ بھی ان پر عمل کریں بنی اسرائیل کو کہنے میں آپ سے کچھ دیر ہوگئی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کو کہا رب تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے پانچ چیزوں کا کہ تم خود بھی ان پر عمل کرو اور بنی اسرائیل کو بھی ان پر عمل کرنے کا حکم دو۔ بنی اسرائیل کو یہ حکم تم پہنچاؤ گے یا میں پہنچاؤں آپ نے کہا اے میرے بھائی (دینی بھائی) مجھے ڈر لگتا ہے کہ اگر تم نے مجھ سے پہلے بنی اسرائیل کو حکم پہنچا دیا:

"ان اعذب او یخسف بی" تو مجھے کہیں عذاب نہ دے دیا جائے یا میری صورت کو کہیں تبدیل نہ کر دیا جائے۔

حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام نے بیت المقدس میں بنی اسرائیل کو جمع کیا یہاں تک کہ مسجد بھر گئی آپ بلند جگہ پر بیٹھے اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی اور اسکی ثناء بیان کی پھر کہا بیشک اللہ تعالیٰ نے مجھے پانچ چیزوں کا حکم دیا ہے کہ میں ان پر خود بھی عمل کروں اور تمہیں بھی ان پر عمل کرنے کا حکم دوں۔

اَوَّلُهُنَّ اَنْ تَعْبُدُوْا اللهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْاً:

ان میں سے پہلی چیز یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ بیشک اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسا کہ کوئی شخص اپنے خالص مال یعنی سونے یا چاندی سے غلام خریدے پھر اسے کسی کام پر مقرر کرے (یعنی اس سے مزدوری کرائے) اور وہ اپنی آمدنی اپنے مالک کے غیر کو دے دے تم میں سے کون سا شخص ہے جو اپنے غلام کی اس طرح کی حرکت کو پسند کرے گا؟

"وان اللہ خلقکم ورزقکم فاعبدوہ ولا تشرکوا بہ شیا"

"بیشک اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا کیا اور تمہیں رزق عطا فرمایا تو اسی کی تم عبادت کرو اور اس کے

ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ''

وَاَمَرَکُمْ بِالصَّلٰوۃِ: اور (دوسری چیز یہ ہے) اللہ تعالیٰ نے تمہیں نماز کا حکم دیا ہے بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی طرف (اپنی رحمت کی) توجہ فرماتا ہے جب تک بندہ ادھر ادھر منہ نہ پھیرے نماز میں بندہ چونکہ ادھر ادھر منہ نہیں پھیرتا (لہذا وہ رب تعالیٰ کی رحمت کی توجہ کا مستحق رہتا ہے)

وامرکم بالصیام: ''اور تمہیں رب تعالیٰ روزں کا حکم دیتا ہے'' اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسا کہ ایک جماعت میں کسی کے پاس کستوری کی تھیلی ہو سب لوگ اس سے خوشبو حاصل کریں کیونکہ روزہ دار کی منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے ہاں کستوری کی بو سے بھی زیادہ پسندیدہ ہے۔

و امرکم بالصدقة: اور (چوتھی چیز) تمہیں صدقہ کرنے کا حکم دیا بیشک اسکی مثال ایسے ہی ہے کہ جیسے کسی شخص کو اس کا دشمن قید کرلے اس کے ہاتھ گردن سے باندھ لے اور اس کے گردن اڑانے کے لئے اسے میدان میں کھڑا کر دیا جائے وہ کہے تم مجھ سے فدیہ لے کر مجھے چھوڑ دو (چونکہ صدقہ بھی جہنم سے بچنے کا ایک ذریعہ ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا " ان الصدقة تطفی النار " بیشک صدقہ آگ کو بجھا دیتا ہے۔

وامرکم بذکر الله کثیرا: اور (پانچویں چیز) اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے کہ تم اللہ کا ذکر بہت کرو اس کی مثال ایسے ہے جیسا کہ ایک شخص کے پیچھے دشمن جلدی جلدی سے آرہا ہو یہ بھاگ کر ایک قلعہ میں داخل ہو کر قلعہ بند ہو جائے بیشک انسان جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو وہ شیطان سے قلعہ بند ہو کر محفوظ ہو جاتا ہے:

" قال قال رسول الله ﷺ وانا آمرکم بخمس الله امرنی بهن الجماعة والسمع والطاعة والهجرة والجهاد فی سبیل الله فانه من خرج من الجماعة قید شبر فقد قلع ربقة الاسلام من عنقه الا ان یراجع ومن دعا بدعوی جاهلیة فهو من جثی جهنم قالوا یا رسول الله وان صام وصلی فقال وان صلی وصام وزعم انه مسلم فادعوا المسلمین باسمائهم علی ما سماهم الله عزوجل المسلمین المؤمنین عباد الله ، هذا حدیث حسن "

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تمہیں پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں جو اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا جماعت کو لازم پکڑو (رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کو) دل کے کانوں سے سنو اور (اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی) طاعت کرو اور ہجرت اور جہاد اللہ تعالیٰ کی راہ میں۔

(جماعت کی ساتھ رہنے کا حکم کیوں دیا) بیشک وہ شخص جماعت سے ایک بالشت کی مقدار بھی ہٹ گیا اس نے اپنی گردن سے اسلام کا ڈورا نکال دیا ہاں مگر یہ کہ وہ (پھر جماعت کی طرف) لوٹ آئے اور جس نے زمانہ جاہلیت کے طور طریقے اختیار کئے وہ جہنم میں اوندھا ہو کر گرے گا صحابہ کرام نے کہا یا رسول اللہ اگرچہ اس نے نمازیں ادا کیں اور روزے رکھے آپ نے فرمایا ہاں اگرچہ وہ نمازیں بھی ادا کر رہا ہو روزے بھی رکھتا رہا ہو۔ اور اس نے اپنے آپ کو مسلمان بھی سمجھا ہو مسلمانوں کو ان کے ان ناموں سے ہی بلاؤ جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے نام مسلمان اور مومن رکھے ہیں'' (صابونی)

حدیث شریف سے واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ کو جوامع الکلم کا خصوصی اعجاز رب تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہوا تھا صرف ایک لفظ سے عظیم سے عظیم مسائل بیان کر دیئے۔ آپ نے ارشاد فرمایا ''الجماعۃ'' جماعت کو لازم پکڑو کیونکہ مسلمانوں کی جماعت کے عقیدہ سے نکل جانے والا زمانہ جاہلیت کے طریقوں پر عمل کرنے والا جہنمی ہوگا اس سے شرک کی نفی ہوگئی عبادت کرنے کا حکم پایا گیا چوری، ڈاکہ، غصب، بدکاری، سود خوری، شراب نوشی غرضیکہ ہر برائی سے اس ایک لفظ سے روک دیا گیا کیونکہ یہ تمام طریقے زمانہ جاہلیت کے ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی ثابت کر دیا کہ زمانہ جاہلیت کی طرح لوگوں کو برے القاب نہ دینا برے الفاظ سے نہ پکارنا اگر کوئی بظاہر مسلمان ہو تو اسے مسلمان ہی سمجھنا اس کے باطن کو رب تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

سبحان اللہ میرے پیارے مصطفےٰ کریم ﷺ نے کتنا شاندار عقیدہ توحید بیان فرما دیا کہ صرف زبان سے اپنے آپ کو توحیدی کہنے سے توحید نہیں ملتی توحیدی بننا ہے تو زمانہ جاہلیت کی تمام برائیوں کو یکسر ختم کرنا ہوگا لوگوں کے مال پر ناجائز قبضہ بھی اور نام کا توحیدی بھی ہوا ایسا توحیدی انشاء اللہ قیامت کے دن صاحب حق سے اپنے آپ کو چھڑا نہیں سکے گا۔

☆ اسی آیۃ کریمہ کے مطابق ہی دوسری آیۃ میں بھی رب تعالیٰ نے اپنے انعامات واحسانات

کا ذکر فرمایا:

﴿ اللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَکُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَکُمْ وَرَزَقَکُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ذٰلِکُمُ اللّٰهُ رَبُّکُمْ فَتَبٰرَکَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾

''اللہ تعالیٰ کی وہ ذات ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو قرار بنایا اور آسمان کو چھت اور تمہیں صورتیں عطا کیں تو تمہاری صورتوں کو حسین بنایا اور تمہیں حلال چیزوں سے رزق عطا فرمایا یہ اللہ تمہارا رب ہے اللہ برکت والا ہے وہ ہی سب جہانوں کا رب ہے''

ان دونوں آیتوں سے مضمون یہ ثابت کیا گیا ہے:

" انه الخالق الرازق مالک الدار وساکنیها ورازقهم فبهذا یستحق ان یعبد وحده ولا یشرک به غیره ولهذا قال فلا تجعلوا لله اندادا وانتم تعلمون "

''بیشک وہی خالق وہی رازق وہی سب جہانون کا مالک وہی جہان میں رہنے والوں کا مالک وہی ان کو رزق دینے والا ہے اسی وجہ سے وہی مستحق ہے کہ عبادت صرف اس ایک ذات کی کی جائے اس کے ساتھ کوئی اور شریک نہ ٹھہرایا جائے''

اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے خود فرمایا:

﴿ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ تو اللہ کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ حالانکہ تم جانتے ہو

☆ بخاری و مسلم میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں میں نے کہا " یا رسول الله ای الذنب اعظم عند الله قال ان تجعل لله ندا وهو خلقک " یارسول اللہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کون سا بہت بڑا گناہ ہے آپ نے فرمایا کہ تم اللہ کے شریک ٹھہراؤ وہ ذات جس نے تمہیں پیدا کیا (یعنی خالق کے ساتھ شریک ٹھہرانا بہت بڑا گناہ ہے)۔

☆ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے " اتدری ما حق الله علی عباده ان یعبدوه ولا یشرکوا به شیا " کیا تم جانتے ہو اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر کیا حق ہے؟ (اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر یہ حق ہے) کہ صرف اسی کی عبادت کی جائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔

☆ ایک اور حدیث میں ہے " لا یقولن احدکم ماشاء الله وشاء فلان ولکن لیقل

ماشاء الله ثم شاء فلان " تم میں سے کوئی شخص ہرگز یہ نہ کہے "جو اللہ نے چاہا اور فلاں شخص نے چاہا ہاں البتہ یہ کہہ سکتے ہو جو اللہ نے چاہا پھر فلاں نے چاہا۔

یعنی پہلی صورت میں شرک کا شبہ پڑتا ہے لیکن دوسری صورت میں " ثم " ذکر ہے جو تراخی پر دلالت کرتا ہے اس میں شرک کا شبہ للہ ﷺ نے فرمایا " فلا تقولوا ما شاء الله وشاء محمد ولكن قولوا ما شاء الله وحده " تم یہ نہ کہو جو اللہ نے چاہا اور محمد ﷺ نے چاہا لکن تم صرف اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو کہ نہیں پڑتا۔

☆ ایک اور حدیث میں ہے رسول اجو اللہ نے چاہا۔ (از ابن ...)

نام نہاد توحیدی توجہ فرمائیں:

ابھی ساتھ ہی متصل جس حدیث کو پیش کیا ہے اسے توحید کے علمبردار بہت پیش کرتے ہیں ہمیں تو بفضلہ تعالیٰ کوئی اعتراض ہی نہیں ہم نے کبھی " العیاذ باللہ " نبی کریم ﷺ کو معبود نہیں سمجھا کبھی رب تعالیٰ کا شریک نہیں سمجھا البتہ یہ ضرور سمجھا جائے کہ اس حدیث میں عین شرک کا ذکر نہیں بلکہ صرف شرک کی مشابہت اور شرک کے وہم سے بچنے کے لئے نبی کریم ﷺ نے ذکر فرمایا کہ رب تعالیٰ کی مشیت سے ملا کر میری مشیت کو نہ ذکر کیا جائے۔

شرک کی مشابہت اور تقویٰ:

" وعن ابن عباس رضی الله عنهما لا تقولوا لو لا فلان لا صا بنی كذا ولولا كلبنا يصيح على الباب لسرق متاعنا وعن النبی ﷺ انه قال اياكم ولو فانه من كلام المنافقين قالوا لو كانو عندنا لما ماتوا وما قتلوا "

" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہ نہ کہو اگر فلاں نہ ہوتا تو مجھے اسی طرح تکلیف پہنچتی اگر ہمارے دروازے پر ہمارا کتا نہ بھونکتا تو چور ہمارا سارا سامان لے جاتے اور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کلمہ " لو " کہنے سے اپنے آپ کو بچا کر رکھو کیونکہ یہ منافقوں نے کہا" لو كانوا عندنا لما ماتوا وماقتلوا " اگروہ (صحابہ کرام) ہمارے پاس ہوتے (جہاد میں نہ شریک ہوتے) تو نہ فوت ہوتے اور نہ ہی قتل کئے جاتے (یعنی شہید نہ ہوتے)" (روح البیان وحاشیہ جلالین)

یہ دراصل تقوی کی باتیں ہیں تقویٰ کا اعلیٰ معیار ان میں پایا گیا ہے ورنہ کون سا توحیدی نہیں کہتا کہ مجھے یہاں آنے میں دیر ہوگئی ایک مہمان آ گیا تھا اگر مہمان نہ آتا تو میں وقت پر پہنچ جاتا۔کون سا توحیدی یہ نہیں کہتا دوران سفر ٹھنڈی ہوا لگی تو نزلہ، بخار ہو گیا اگر ٹھنڈی ہوا نہ لگتی تو نزلہ، بخار بھی نہ ہوتا وہ کون سا توحیدی ہے جو یہ نہیں کہتا کہ چلنے میں کچھ دیر ہو گئی گاڑی نکل گئی اگر تھوڑا پہلے چلتا تو گاڑی کو پکڑ سکتا تھا، خدارا! انصاف کیجئے جب ہر مسلمان دن میں بیسیوں مرتبہ اگر ہوتا اگر یہ نہ ہوتا کی رٹ لگاتا رہتا ہے اسی کوئی مشرک نہیں کہتا توحیدی یہی الفاظ سینکڑوں مرتبہ بولنے پر اپنے آپ کو مشرک نہیں کہتا تو اس کی وجہ کیا ہے؟ ہاں ہاں یقیناً یہ الفاظ بولنے والا مشرک تو نہیں البتہ تقوی کا اسے اعلیٰ معیار حاصل نہ ہوا ہاں اگر کوئی خوش بخت بڑی احتیاط سے کام لیتا ہوا اس قسم کے الفاظ نہ ذکر کرے تو وہ تقوی کے بلند مقام پر فائز ہے۔

بس یہی مطلب ہے " **فلا تقولوا ما شاء الله شاء محمد** " کا اگر چہ ان الفاظ سے عین شرک حاصل نہیں ہوگا البتہ تقوی کا بلند مقام اسی وقت حاصل ہوگا جب فقط رب تعالیٰ کی مشیت کا ذکر کرتے ہوئے کہے گا " **ماشاء الله** ".

ذرا اور توجہ فرمائیں: علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ آیۃ اس پر دلالت کر رہی ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے انسان کو تمام مخلوق سے مستغنی (بے پرواہ) بنایا۔ اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

" والله لان یاخذ احدکم حبله فیحتطب علی ظهره خیر له من ان یسال احدا عطاه او منعه " (اخرجه مسلم)

قسم ہے اللہ تعالیٰ کی تم میں سے کوئی شخص رسی لے لے اور اپنی پیٹھ پر لکڑیاں (ایندھن) لائے (اور بیچ دے) تو اس کے لئے بہتر ہے بنسبت اس کے کہ کسی سے سوال کرے وہ دے یا نہ دے۔

" ویدخل فی معنی الاحتطاب جمیع الاشغال من الصنائع وغیرها فمن احوج نفسه الی بشر مثله بسبب الحرص والامل والرغبة فی زخرف الدنیا فقد اخذ بطرف من جعل الله ندا "

" نبی کریم ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ لکڑیاں جنگل سے لاکر بیچنا کسی سے مانگنے سے بہتر ہے آپ کے اسی ارشاد گرامی میں یہ تمام چیزیں داخل ہیں کہ کسی کارخانہ میں کام کرنا،

دوکان کرنا، کسی قسم کی تجارت کرنا، کسی قسم کی محنت ومزدوری کرنا اپنا کوئی بھی کام کرنا کسی سے مانگنے سے بہتر ہے"

جو شخص حرص، امید اور دنیا کی زیب وزینت میں رغبت کی وجہ سے اپنے آپ کو کسی انسان کا محتاج بنالیتا ہے تو اس نے بھی شرک کا کچھ نہ کچھ کنارہ حاصل کر ہی لیا (قرطبی)

ہاں ذرا غور کیا آپ نے کہ کوئی ایسا شخص بھی ڈھونڈنے سے ملے گا جس نے کسی دوسرے انسان سے لالچ نہ رکھی ہو۔

فائدہ جلیلہ: صوفیاء کرام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ میں انسان کو فقر کی راہ بتائی ہے وہ یہ ہے کہ اے انسان تو زمین کو اپنا بچھونا بنا اور آسمان کو اوڑھنی بنا پانی کو ذریعہ لذت بنا اور گھاس پتے اپنا طعام بنا اور دنیا کی طلب کی وجہ سے مخلوق میں سے کسی ایک کی بھی عبادت نہ کر:

" فان اللہ عزوجل قد اتاح لک مالا بدلک من غیر منۃ فیہ لاحد علیک "

" بیشک اللہ تعالیٰ نے تمہاری ضرورت کی ہر چیز تمہیں مہیا فرمائی ہے اور اس نے تم میں سے کسی شخص پر اپنا احسان نہیں جتلایا"

نوف بکالی کہتے ہیں ایک مرتبہ رات کو حضرت علی رضی اللہ عنہ باہر تشریف لائے آپ نے ستاروں کی طرف نگاہ کی تو آپ نے فرمایا اے نوف **" اراقد انت ام رامق "** کیا تم سوئے ہوئے یا کچھ جاگ رہے ہو میں نے کہا **" بل رامق یا امیر المؤمنین "** اے امیر المؤمنین میں جاگ رہا ہوں آپ نے فرمایا:

> **" طوبی للزاھدین فی الدنیا والراغبین فی الآخرۃ اولئک قوم اتخذوا الارض بساطا وترابھا فراشا وماء ھا طیبا والقرآن والدعاء دثارا وشعارا فرفضوا الدنیا علی منھاج المسیح علیہ السلام "**
>
> " کتنے اچھے وہ لوگ ہیں جو دنیا سے دور ہوتے ہیں اور آخرت کی طرف رغبت کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے زمین کو بچھونا بنایا اور اس کی مٹی کو اس کے اوپر فرش بنایا اور اسکے پانی کو باعث لذت سمجھا اور قرآن پاک اور دعاء کو اوڑھنا بنایا اور دنیا کو اس طرح چھوڑ دیا جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام دنیا سے دور رہے"۔

﴿ وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾

''اور اگر تمہیں کچھ شک ہو اس میں جو ہم نے اپنے (ان خاص) بندے پر اتارا تو اس جیسی ایک سورت تو لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے سب حمایتیوں کو بلالو اگر تم سچے ہو''

''اور اگر تمہیں کچھ شک ہے اس میں جو ہم نے اپنے بندہ خاص پر نازل کیا تو اس جیسی ایک چھوٹی سی سورت لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے تمام مددگاروں کو بلالو اگر تم سچے ہو''

ماقبل سے تعلق:

" لما تقرر اثبات الربوبية لله سبحانه وتعالىٰ وانه الواحد الخالق وانه لا ضد له ولا ند اتبعه باقامة الحجة على اثبات نبوة محمد ﷺ وما يدحض الشبهة فى كون القرآن معجزة وانه من عند الله تعالىٰ لا من عند نفسه كما تدعون فيه"
(خازن)

''پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت کا ذکر کیا کہ وہی رب ہے وہی خالق ہے وہی رازق ہے وہی بارش نازل کرنے والا ہے وہی زمین سے پھل نکالنے والا ہے زمین کو جائے قرار بنانے والا وہی ہے اور آسمان کو چھت بنانے والا وہی ہے لہٰذا اس ایک ذات کی ہی عبادت کرو وہی " وحده لاشريك له " (ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں)''

اس کے بعد واضح طور پر ﴿ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا ﴾ کا ارشاد فرمایا کہ تم اللہ کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ یہ تمام ذکر توحید باری تعالیٰ کا تھا۔ اب یہاں سے نبوت کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ قرآن ہم نے اپنے بندہ خاص پر نازل کیا ہے اور قرآن نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے آپ نے خود قرآن نہیں پیش کیا۔ علامہ محی الدین ابن عربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" ولما اثبت التوحيد استدل على اثبات النبوة ليصح بهما الاسلام

فانہ لا یصح الابشہادتین"

رب تعالیٰ نے جب اپنی توحید کا ذکر فرمادیا تو ساتھ نبوت کے ثبوت پر دلائل ذکر فرمادیئے تاکہ ان دونوں پر ایمان لاکر لوگ مسلمان بن سکیں کیونکہ رب تعالیٰ کی وحدانیت کی شہادت اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی شہادت کے بغیر ایمان حاصل نہیں ہوسکتا۔ توحید بغیر رسالت کے انسان کو زندیق بنادیتی ہے اور رسالت بغیر توحید کے انسان کو مجوسی اور قدری بنادیتی ہے واضح ہوا کہ توحید اور رسالت دونوں میں میں تلازم ہے ایک دوسری سے جدا نہیں ہوسکتیں۔ (ابن عربی)

شانِ نزول: کافروں نے کہا آپ جو کلام پیش کررہے ہیں ہمیں تو اس میں شک ہے ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کلام تم خود پیش کررہے ہو ان کے یہ کہنے کے بعد یہ آیت نازل ہوئی (قرطبی)۔ اہل کتاب نے قرآن پاک کے وحی باری تعالیٰ ہونے پر شک کیا۔ تو یہ آیۃ نازل ہوئی (کبیر) دونوں قول ایک ہی مطلب رکھتے ہیں کہ کفار اور اہل کتاب کے اعتراض اور شک وتردد کرنے پر ان کے رد میں یہ آیۃ نازل ہوئی۔ تو نہ فوت ہوئے اور نہ ہی قتل کیے جاتے (یعنی شہید نہ ہوئے)۔ (روح البیان و حاشیہ جلالین)

مختصر مطلب: جب کفار اور اہل کتاب نے قرآن پاک پر شک کیا کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان تمام کو کہا کہ اگر تمہیں اس چیز میں شک ہے جو ہم نے اپنے خاص بندے محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل فرمائی تو تم بھی اس جیسی ایک چھوٹی سی سورت لے آؤ۔ رب تعالیٰ کے بغیر جتنے بھی تم نے معبود بنا رکھے ہیں یا جن کو بھی تم رب تعالیٰ کے بغیر اس کے مدمقابل اپنا مددگار سمجھتے ہو۔ ان تمام کو بلالو سب مل کر ایک چھوٹی سی سورت بنالو اگر تم اپنے دعوی میں سچے ہو۔

خیال رہے کہ ابتداء میں ﴿لَا رَیْبَ فِیْهِ﴾ کی بحث میں ریب اور شک میں فرق بیان کردیا گیا ہے اور یہ بھی واضح کردیا گیا ہے کہ قرآن پاک اگرچہ شک سے پاک ہے اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں البتہ جن لوگوں نے اس کے کلام الٰہی ہونے میں شک کیا ہے وہ یا تو حاسد تھے اور یا سمجھنے کی اہلیت سے قاصر تھے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ: لفظ "ان" ذکر کیا ہے جس کا معنی "اگر" ہوتا ہے یہ مقام شک میں استعمال ہوتا ہے "اگر تم نے سبق یاد نہ کیا تو تمہیں سزا دی جائے گی" یہ کلام استاذ اسی وقت کرتا ہے جب

اسے یقین نہیں ہوتا کہ یہ لڑکا سبق یاد کرے گا یا نہیں کرے گا۔ یہاں رب تعالیٰ کے ارشاد میں "ان" کا استعمال کیسے ہے؟ تو اس کا مطلب یہ ہے " لـلـتـوبـيـخ علی الارتياب " کہ ان لوگوں کو شک کرنے پر ڈانٹنا مقصود تھا کہ قرآن پاک میں تو شک کی گنجائش نہیں البتہ اے حسد کرنے والو سوچنے، سمجھنے کہ اہلیت نہ رکھنے والو اگر بالفرض تمہیں کوئی شک ہو تو قرآن پاک کی ایک چھوٹی سی سورت جیسی سورت بنا کر تو دکھا دو جب تم اپنے تمام مددگار بلانے کے باوجود بھی ایسا نہیں کر سکو گے تو سمجھ لینا کہ کلام الٰہی میں شک کرنا تمہاری اپنی ہی غلطی ہے۔ اور مطلب یہ بھی ہے کہ کفار اور اہل کتاب میں سے قرآن پاک میں شک کرنے والے تو کچھ لوگ تھے تمام نہیں تھے لیکن ایمان نہ لانے کی وجہ سے سب ایک جیسے ہی تھے اس لئے شک نہ کرنے والوں کو بھی شک کرنے والوں کے ساتھ ملا کر ارشاد فرمایا کہ اگر تمہیں بھی اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح کبھی شک ہو جائے تو تم بھی یہی کوشش کر کے دیکھ لینا تمہیں سمجھ آ جائے گا کہ ہاں واقعی یہ اللہ کا کلام ہے ماننا تو اسی وقت ہوتا ہے جب قسمت ساتھ دے۔

رَیْبٍ: لفظ " ریب " کو نکرہ ذکر کر کے بھی یہ ارشاد فرمایا کہ اگر تم نے شک کیا بھی تو وہ کوئی حیثیت نہیں رکھے گا۔ کیونکہ قرآن پاک کی حقانیت پر بہت قوی اور روشن دلائل پائے گئے ہیں ان دلائل کے ہوتے ہوئے تمہارے شک کا کیا مقام رہ جائے گا (از روح المعانی)۔ بلکہ تمہارے نہ ماننے کے باوجود تمہارے اپنے دل اس پر گواہی دیں گے کہ قرآن پاک حق ہے اللہ کا کلام ہے اور تمہارے ساتھ بھی تمہیں یہی کہیں گے کہ اس کتاب جیسی اور کوئی کتاب نہیں۔

مِمَّانَزَّلْنَا: اصل میں " من مانزلنا " ہے لفظ " من " ابتدائیہ ہے اور بعض حضرات نے تبعیضیہ بھی بنایا ہے بعض نے "تبعیضیہ" ہونے پر کلام بھی فرمایا ہے "ما" موصولہ ہے اس سے مراد "کتاب" ہے مطلب یہ ہوگا کہ جو کتاب ہم نے اپنے بندہ خاص پر نازل فرمائی ہے اگر تمہیں اس کتاب پر شک ہو بلکہ اس کتاب کی کسی ایک سورت پر بھی شک ہو تو تم بھی اس جیسی کوئی سورت لے آؤ۔

خیال رہے کہ تنزیل کا معنی ہے آہستہ آہستہ اتارنا اور انزال کا معنی ہے ایک ہی بار اتارنا لیکن یہ کبھی ایک دوسرے کے معنی میں بھی استعمال ہوتے رہتے ہیں۔ اگرچہ یہاں آہستہ آہستہ اتارنے کا مفہوم مراد تو نہیں تاہم کفار کے اس قول کا بھی ضمنی طور پر رد ہو گیا " **لولا نزل علیه القرآن جملة واحدة** " یہ قرآن اس پر ایک بار ہی سارا کیوں نہیں نازل ہوا۔ ضمنی طور پر رد واضح ہے اگر تمہیں قرآن

پاک کے آہستہ آہستہ نازل ہونے پر کوئی شک ہو تو ہمارا یہ چیلنج بھی قبول کرلو کہ تم قرآن پاک کی سورت جیسی سورت آہستہ آہستہ تمام مل کر ہی لے آؤ۔

عَلٰی عَبْدِنَا: " وقوله علی عبدنا ، اضافة تشریف لمحمد ﷺ وان القرآن منزل علیه من عند الله تعالٰی " (خازن)

اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ عَلٰی عَبْدِنَا ﴾ میں اضافت تشریفی ہے جو مضاف کی عظمت وشرافت کو واضح کر رہی ہے کہ وہ ہمارا بندہ ہے اس لئے کہ قرآن اس ذات پر ہم نے ہی نازل کیا ہے سبحان اللہ جسے رب تعالیٰ نے خود اپنا بندہ کہا وہ رب تعالیٰ کا خاص ہی بندہ ہے وہ صرف " عبد " نہیں بلکہ رب تعالیٰ نے " عبدنا " کہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ حضرت نے اپنے ترجمہ میں بریکٹ میں لفظ "خاص" بڑھایا ہے راقم نے بھی اگرچہ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی ہی نقل کی ہے لیکن اضافت تشریفی علم معانی کا ضابطہ اہل علم سے مخفی نہیں اس لئے راقم نے بغیر بریکٹ کے بندہ خاص معنی کر دیا ہے جس پر تفسیر خازن کی تائید پیش کر دی ہے۔

فَاْتُوْا: فا علیحدہ ہے ائتوا علیحدہ امر کا صیغہ ہے "تو لے آؤ" اگرچہ وہ لا تو نہیں سکتے تھے لیکن ان کو یہ حکم اس لئے نہیں دیا گیا کہ وہ لا سکیں گے اور ان سے مطالبہ کیا گیا ہو کہ یہ کام تمہارے ذمہ ہے تم کر سکتے ہو لہٰذا ضرور کرنا بلکہ یہ امر "تعجیز" کیلئے ہے ان کو عاجز کرنا اور تمام کائنات پر ان کے عجز کو ظاہر کرنا مقصود تھا کہ تم یہ کام کبھی نہیں کر سکو گے جیسا کہ بعد والی آیت میں واضح ہو جائے گا۔

بِسُوْرَةٍ: "بـا" تعدیت کی ہے اسی وجہ سے " ائتـوا " کا معنی "لاؤ" کیا ہے ورنہ بغیر "بـا" کے اس کا معنی ہوتا ہے "آؤ، دو" "سورۃ" کا ایک معنی ہے قطعہ (ٹکڑا) چونکہ سورت بھی قرآن پاک کا ایک حصہ ہوتا ہے اس لئے اسے سورت کہا جاتا ہے۔

خیال رہے کہ سورت میں کم از کم تین آیتوں کا ہونا ضروری ہے اور ایک آیۃ میں کم از کم چھ حرفوں کا ہونا ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ علامہ شامی نے ثم نظر، ثم عبس، ثم بسر" چھ چھ حرفوں پر مشتمل آیات کو چھوٹی آیات کہا ہے اور اس کے مجموعہ یعنی اٹھارہ حرفوں پر مشتمل مقدار کی آیات کو بڑی آیات کہا ہے۔ "سُوْرَة" کا ایک اور معنی "بلند مرتبہ" اسی معنی کے لحاظ پر شہر کے ارد گرد دیوار کو "سور البلد" کہا جاتا ہے

کہ وہ دیوار بھی بلند ہوتی اس معنی کے لحاظ سے قرآن پاک کی ''سورۃ'' کو''سورۃ'' کہنے کی یہ وجہ ہے:

" سمیت سورة لان القاری ینال بھا منزلة رفیعة حتی یستکمل المنازل باستکمال سور القرآن "

سورۃ کا نام سورۃ اس لئے رکھا گیا ہے کہ اسے پڑھنے والا شخص بلند مرتبہ حاصل کر لیتا ہے یہاں تک جب قرآن پاک تمام سورتوں کی قراءت مکمل کر لیتا ہے تو مرتبہ کی بلندی میں کمال حاصل کر لیتا ہے۔(از خازن)

مِنْ مِّثْلِهٖ: اگر ضمیر " مثله " کی قرآن پاک کی طرف لوٹے جو "مما نزلنا" سے بیان کیا گیا ہے تو اب معنی یہ ہوگا کہ اگر تمہیں شک ہے اس پر جو ہم نے اپنے بندہ خاص پر نازل کیا ہے تو تم ایک چھوٹی سے سورت لے آؤ جو اس قرآن کی سورۃ جیسی فصاحت و بلاغت رکھتی ہو:

" ولو کان الضمیر مردودا الی محمد ﷺ (ای الی عبدنا) تعال و ان ارتبتم فی ان محمدا منزل علیه فھاتوا قرآنا مثل محمد ﷺ "
(خازن)

اور اگر ضمیر نبی کریم ﷺ کی طرف لوٹے (یعنی عبد کی طرف لوٹے) تو معنی یہ ہوگا کہ اگر تمہیں شک ہے اس میں جو محمد ﷺ پر ہم نے نازل کیا تو تم ایک چھوٹی سی سورۃ لے آؤ جو محمد ﷺ کی مثل ہو مفہوم یہاں بھی یہ ہوگا کہ جو محمد ﷺ پر نازل ہونے والے قرآن کی مثل ہو علامہ رازی رحمہ اللہ نے کبیر میں ذکر کیا کہ ایسا شخص ہو جو نبی کریم ﷺ کی طرح امی ہوتا ہم ضمیر کو قرآن کی طرف لوٹانا ہی بہتر ہے تاکہ دوسری آیات کے مطابق ہو جائے خصوصاً سورہ یونس میں ''عبد'' کا ذکر ہی نہیں صرف سورۃ کا ذکر ہے ﴿ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ﴾.

خیال رہے کہ مثل سے مراد یہ نہیں کہ عربی عبارت اتنی مقدار میں بناؤ جتنی مقدار ایک چھوٹی سی سورۃ ہے کیونکہ جو لوگ ایک ''طرح مصرع'' پر قصیدے لکھتے تھے ان کے سامنے سورۃ کوثر کی مقدار عربی زبان میں عبارت پیش کرنا کیا مشکل تھا بلکہ مراد یہ ہے کہ قرآن پاک کی طرح فصیح و بلیغ ایک چھوٹی سی سورۃ لے آؤ۔

تنبیہ: راقم نے جو ترجمہ میں ''چھوٹی سی سورت'' تحریر کی ہے یہ مدارک سے ترجمہ لیا ہے کیونکہ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اس کے ترجمہ میں یہ تحریر فرمایا ہے "سورة من اصغر السور " ایک

ایسی سورۃ لاؤ جو تمام سورتوں سے چھوٹی ہو کچھ مزید ذکر انشاء اللہ تفصیلی ذکر میں آجائے گا ابھی تک تو اختصار سے کام لیا جا رہا ہے۔

وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: " الدعاء النداء والاستعانة " دعاء کا معنی بلانا اور امداد طلب کرنا البتہ پہلا معنی حقیقی ہے اور دوسرا مجازی اور یہ بھی ممکن ہے کہ استعانت کنایہ کے طور پر نداء پر مبنی ہے اس لئے کہ جب کوئی شخص کسی کو بلاتا ہے تو اس سے امداد طلب کرتا ہے۔ " شهداء " شہید یا شاہد کی جمع ہے اور شہید جس طرح علامہ راغب اصفہانی نے بیان کیا اسے کہا جاتا ہے " كل من يعتد بحضوره ممن له الحل والعقدة ولذا سموا غيره مخلفا " ہر وہ شخص جس کی موجودگی کو معتبر سمجھا جائے یعنی جو شخص صاحب علم ہو اور ہر قسم کے علمی پیچ وخم کو جانتا ہو اس کا موجود ہونا اصل سمجھا جائے اس کے موجود ہوتے ہوئے جیسے دوسرے حاضر ہوں تو ان کو اس کا خلیفہ ہی سمجھا جائے اور دوسرے اس کے ہوتے ہوئے موجود نہ ہوں تو پھر بھی ان کو خلیفہ ہی سمجھا جائے۔ اور شہید کے اور معانی حاضر ہونا، گواہی دینا، امداد کرنا اور امام ہونا۔

"دون" کے معانی: قریب ہونا، اس کا استعمال "من" سے زیادہ ہوتا ہے جیسے یہاں استعمال ہے " من دون الله " اور کبھی باء سے بھی استعمال ہوتا ہے پھر مجازی طور پر " دون " کا استعمال تفاوت کیلئے بھی آتا ہے زیادہ طور پر حسی تفاوت کیلئے استعمال ہوتا ہے لیکن معنوی تفاوت کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جسطرح کہا جائے " دون زيد في القامة " فلاں شخص کا قد زید کے قد سے چھوٹا ہے یہ حسی تفاوت کی مثال ہے اور یہ کہا جائے "دون زيد شرفا " فلاں شخص زید سے شرافت کے لحاظ پر کم ہے تو تفاوت معنوی ہوگا پھر مجازی معنی میں اور زیادہ عموم پایا جاتا ہے یعنی ایک حد سے دوسری حد کی طرف تجاوز کرنے کیلئے بھی " دون " کا استعمال ہوتا ہے اگرچہ اس میں تفاوت اور پستی نہ بھی پائی جائے اسی معنی کے لحاظ پر " دون "،"غیر" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جو کلمہ استثناء کہلاتا ہے اس صورت میں اس کا معنی ہوتا ہے سوا۔ اور "دون "کا معنی "گھٹیا" اکثر طور پر آتا ہے۔ (از روح المعانی)

اب معنی کی طرف توجہ کریں:

" وادعوا شهداء كم من دون الله اى استعينوا بآلهتكم التي تعبدونها من دون الله "

یعنی اللہ تعالیٰ کے بغیر جن کی تم عبادت کرتے ہو اور ان کو اپنا معبود سمجھتے ہو ان کو اپنی امداد کے لئے بلالو کہ آؤ ہماری امداد کرو کہ ہم قرآن کی سورت جیسی کوئی سورت بنالیں۔ یعنی جب تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ ہم جن کی عبادت کررہے ہیں یہ عبادت کے مستحق ہیں تو ان کو اپنی امداد کے لئے بلالو اور قرآن کی سورت جیسی سورت بناکر نبی کریم ﷺ سے مقابلہ کرلو اگر تم ایسا نہیں کرسکتے وہ تمہارے معبود تمہاری امداد نہیں کرسکتے تو تم سمجھ لو کہ تم باطل راہ پر ہو۔

(از خازن)

خیال رہے کہ یہ جو معنی بیان کیا ہے اس میں " شہید " بمعنی ناصر لیا ہے کہ تم اپنے معبودوں کو اپنی مدد کے لئے بلالو کہ وہ تمہاری امداد کریں اور ''شہید'' بمعنی گواہ لے کر ایک معنی یہ ہوگا " **واستعینوا بآلھتکم التی تعبدونھا وتزعمون انھا تشھدلکم یوم القیامۃ** '' اور تم اپنے معبودوں کو اپنی امداد کے لئے بلالو جن کی تم عبادت کرتے ہو اور گمان یہ کرتے ہو کہ وہ قیامت کے دن تمہاری شہادت دیں گے۔ یعنی جن کو تم اپنے لئے قیامت کے دن کا گواہ سمجھ کر ان کی عبادت کرتے ہو ان اپنے قیامت کے گواہ معبودوں کو بلالو سب مل کر قرآن کی سورت جیسی سورت لے آؤ۔ (از مظہری) اور ''شہید'' بمعنی گواہ کے ہی لے کر ایک اور معنی یہ ہے:

''**وادعوا ان اتیتم بشئی وزعمتم انه من مثله شهداء کم ای من یشهد لکم فالعاقل لا یرضی لنفسه ان یشهد بما یظهر اختلاله** ''

اگر تم اپنے باطل خیال کے مطابق کوئی کلام پیش کرکے اسے قرآن پاک جیسا سمجھ بیٹھو تو اس اپنے کلام کے قرآن کی مثل ہونے پر کوئی گواہ لے آؤ جو یہ گواہی دے کہ ہاں یہ قرآن کی مثل ہے لیکن تم سے یہ بھی نہیں ہوسکے گا کیونکہ کوئی عقل مند شخص یہ پسند نہیں کرتا کہ جس میں خلل ظاہر ہو اس کی گواہی دے دے یعنی تمہارے اپنے ساتھی بھی کیوں نہ ہوں اگر ان میں معمولی بھی عقل ہوئی بالکل ہی پاگل نہ ہوئے تو وہ بھی آنکھیں بند کرکے یہ گواہی نہیں دے سکیں گے کہ تمہارا ناقص کلام قرآن پاک کی مثل ہوسکتا ہے۔

(از تبصیر الرحمن)

''شہید'' بمعنی حاضر لے کر یہ معنی ہوگا'' **ادعوا اناسا یحضرونکم** '' تم لوگوں کو بلالو جو تمہارے پاس حاضر ہوجائیں یعنی حاضر ہوکر تمہاری امداد کریں کہ تم سب

مل کر کوئی سورت قرآن پاک کی چھوٹی سی سورت جیسی لے آؤ۔ یا پہلے والا معنی ہی مراد ہو جائے کہ تم لوگوں کو بلا لو یعنی بڑے بڑے فصحاء کو بلا لو وہ گواہی دیں کہ تمہارا کلام رب کے کلام کے مثل ہو سکتا ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ: اگر تم سچے ہو کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں بلکہ نبی کریم ﷺ کا اپنا کلام ہے تو اپنی طرف سے پوری کوشش کر لو اور اپنے مددگار بھی بلا لو اور قرآن پاک کی چھوٹی سی سورت جیسی لے آؤ۔ اب اس وضاحت کے بعد امید ہے کہ قارئین کرام کو اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بخوبی سمجھ آ جائے گا کہ اپنے حمایتی بلا لو وہ تمہاری سورت بنانے میں حمایت کریں یا تمہارے کلام کو رب کے کلام جیسا اپنی گواہی سے ثابت کر کے حمایت کریں راقم۔ کا ترجمہ بھی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی نقل ہی ہے صرف الفاظ کا فرق ہے۔

کچھ مزید وضاحت: اللہ تعالیٰ نے جب اپنی خالقیت اور اپنے معبود ہونے پر بہت پختہ دلائل قائم فرما دیئے اور اس کے بعد یہ بھی واضح فرما دیا کہ اس کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ اس آیۃ میں نبوت پر دلائل قائم فرمائے ہیں اور ساتھ باطل فرقوں کا رد بھی فرمایا ہے اس لئے کہ رب تعالیٰ نے جب اپنی توحید کو پہلے ذکر کیا تو تعلیمیہ فرقہ کا رد ہو گیا۔

وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت رسول کی معرفت سے حاصل ہوتی ہے۔ رب تعالیٰ نے اپنی وحدانیت کو پہلے ذکر فرما کر واضح کر دیا کہ عقل والے ہر چیز سے میری الوہیت اور میری وحدانیت کو سمجھ سکتے ہیں اسی انداز بیان سے حشویہ فرقہ کا بھی رد ہو گیا کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت قرآن اور حدیث کے بغیر نہیں۔ نتیجہ واضح ہوا کہ پہلے توحید پھر رسالت۔

" ولما كانت نبوة محمد ﷺ مبينة على كون القرآن معجزا اقام الدلالة على كونه معجزا "

جب نبی کریم ﷺ کی نبوت کی بناء قرآن پاک کے معجزہ ہونے پر تھی تو اس آیۃ مبارکہ میں رب تعالیٰ نے قرآن پاک کے معجزہ ہونے پر دلائل قائم فرمائے ہیں۔

قرآن پاک معجزہ ہے: قرآن پاک معجزہ ہے اس لئے کہ کتنا ہی زمانہ گزر جائے قرآن کریم

تبدیل وتحریف سے محفوظ رہے گا رب تعالیٰ اس کا خود محافظ ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾

''بے شک قرآن ہم نے اتارا ہے اور بیشک ہم خود اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''

قرآن پاک ہر شے کا جامع ہے اس سے بھی قرآن پاک کا معجزہ ہونا واضح طور پر معلوم ہو رہا ہے رب تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ اور ہم نے آپ پر قرآن نازل کیا جس میں ہر چیز کا واضح بیان ہے۔قرآن اپنے غیر سے بے نیاز ہے جس سے قرآن کا معجزہ ہونا روز روشن کی طرح عیاں ہے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ﴾ اور بے شک وہ عزت والی کتاب ہے باطل کو اس کی طرف راہ نہیں نہ اس کے آگے سے اور نہ اس کے پیچھے سے۔اور قرآن پاک حفظ کرنے والوں کے لئے آسان کر دیا گیا جس سے قرآن پاک کا معجزہ ہونا ثابت ہے کہ پہلی آسمانی کتب کو یہ مقام حاصل نہیں تھا ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴾

''اور تحقیق ہم نے قرآن یاد کرنے کے لئے آسان فرما دیا ہے تو ہے کوئی یاد کرنے والا''

قرآن پاک کے معجزہ ہونے پر نبی کریم ﷺ کا فرمان ذیشان:

بخاری نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی نبی ایسا نہیں ہے مگر یہ کہ اس نبی کو اس کی مانند معجزہ دیا گیا جس پر بشر ایمان لائے بلاشبہ جو چیز مجھے عطا فرمائی گئی ہے وہ وحی ہے جو اللہ تعالیٰ نے میری طرف فرمائی اور میں امید رکھتا ہوں کہ میں متبعین کے اعتبار سے تمام نبیوں سے ممتاز ہوں گا یعنی میری امت سب سے زیادہ ہوگی۔

ایک شخص کا ایمان لانا کہ قرآن معجزہ ہے:

بیہقی نے یحیٰ بن اکثم سے روایت کی انہوں نے کہا کہ خلیفہ مامون کے پاس ایک یہودی آیا اور اس یہودی نے بہت اچھی گفتگو کی پھر مامون نے اس یہودی کو اسلام کی دعوت دی مگر اس نے انکار کیا جب ایک سال گزر گیا تو وہ یہودی ہمارے پاس مسلمان ہو کر آیا اور اس نے فقہ پر بہت اچھی گفتگو کی مامون نے اس سے پوچھا تیرے اسلام لانے کا واقعہ کیا ہے؟ اس یہودی نے کہا جب میں آپ کے

پاس سے گیا تو میں نے چاہا کہ میں تمام دینوں کا امتحان لوں چنانچہ میں نے پہلے تورات کو شروع کیا اور اس کے نسخے لکھے اور میں نے اس میں کمی زیادتی کی۔ پھر میں ان نسخوں کو لے کر کنیسہ میں گیا تو انہوں نے وہ نسخے مجھ سے خرید لئے۔ اس کے بعد میں نے انجیل کی طرف توجہ دی اسکے تین نسخے لکھے جس میں میں نے کمی زیادتی کی اور ان کو گرجا میں لے گیا تو انہوں نے وہ نسخے مجھ سے خرید لئے۔ پھر میں نے قرآن کی طرف قصد کیا اور میں نے اسکے تین نسخے لکھے اور میں نے اس میں بھی کمی، زیادتی کی اور ان اوراق کو لے کر مسلمانوں کے پاس گیا تو مسلمانوں نے ان کو بغور پڑھا جب انہوں نے ان میں کمی وزیادتی پائی تو انہوں نے ان ورقوں کو میرے منہ پر مار دیا اور نہیں خریدا۔ اس وقت میں نے جان لیا کہ یہ کتاب محفوظ ہے تو یہ واقعہ میرے اسلام لانے کا ہے۔

یحییٰ بن اکثم نے بیان کیا میں اسی سال حج کو گیا تو میں حضرت سفیان بن عیینہ کو ملا اور ان سے یہ واقعہ بیان کیا اس پر انہوں نے مجھ سے فرمایا اس واقعہ کی صداقت اللہ تعالیٰ کی کتاب میں موجود ہے میں نے پوچھا وہ کس جگہ ہے؟ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ ﴾ تو اللہ تعالیٰ نے تورات وانجیل کی حفاظت ان امتوں کے ذمہ رکھی مگر انہوں نے اسے ضائع کر دیا۔ لیکن قرآن کریم کے بارے میں فرمایا ﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾ تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت ہمارے ذمہ نہیں کی بلکہ اپنے ذمہ رکھی اس لئے وہ ضائع نہیں ہوا۔

قرآن پاک شیطان سے محفوظ:

بیہقی نے حسن سے آیۃ کریمہ ﴿ لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ ﴾ کی تفسیر میں روایت کی انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو شیطان کے دخل سے محفوظ رکھا ہے لہذا نہ کوئی اس میں باطل کا اضافہ کر سکتا ہے اور نہ کوئی اس میں سے حق کو نکال سکتا ہے۔ خیال رہے قرآن پاک میں کوئی اضافہ بھی کیا جائے وہ باطل ہی ہے اور قرآن پاک سے کچھ بھی نکالنے کی ناپاک جسارت کی جائے تو وہ حق کا ہی نکالنا ہی گا۔ واضح ہوا کہ قرآن پاک کمی اور زیادتی سے شیطان کی دخل اندازی سے محفوظ ہے۔

قرآن پاک تمام آسمانی کتب کے مضامین کو حاوی ہے:

بیہقی نے شعب الایمان میں حسن بصری سے روایت کی انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ نے ایک سو چار کتابیں

نازل فرمائیں اوران کتابوں کے علوم چار کتابوں میں جمع فرمائے وہ چار کتابیں تورات، انجیل، زبور اور فرقان حمید ہے۔اس کے بعد تورات، انجیل اور زبور کے علوم کو قرآن مجید فرقان حمید میں جمع فرما دیا۔

قرآن پاک قیامت تک باقی رہنے والا معجزہ ہے:

آپ کا وہ معجزہ جو قیامت تک باقی و مستمر رہے گا وہ قرآن کریم ہے اور تمام انبیاء علیھم السلام کے معجزات اپنے وقت کے ساتھ تھے۔ یہ خصوصیت شیخ عزالدین ابن عبدالسلام نے خصائص میں شمار کی ہے اور یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے معجزات تمام انبیاء کے معجزات سے زیادہ ہیں۔ چنانچہ ایک قول کے بموجب ایک ہزار معجزات اور ایک قول کے بموجب تین ہزار معجزات تک ان کی گنتی پہنچتی ہے اسے بیہقی نے ذکر کیا ہے۔تمام نبی جو جدا جدا معجزات رکھتے تھے وہ سب کے سب حضور ﷺ کو عطا ہوئے کسی اور نبی کو وہ تمام معجزات عطا نہیں ہوئے۔

(ماخوذ از خصائص کبری اردو حصہ دوم از ص ۳۹۱ تا ص ۴۰۳ مترجم مولنا معین الدین نعیمی رحمہ اللہ)

قرآن پاک کے معجزہ ہونے پر دلائل:

قرآن پاک کے معجزہ ہونے پر دلائل دو طریقوں سے بیان کیے جاسکتے ہیں پہلا طریقہ ان میں سے یہ ہے کہ قرآن پاک کے معجزہ ہونے میں عقلی احتمال تین ہیں۔ایک یہ کہ قرآن پاک تمام فصحاء کے کلام کے برابر ہو۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ قرآن پاک دوسرے فصحاء کے کلام سے زیادہ مرتبہ رکھتا ہو فصاحت میں لیکن اتنا ہی زائد ہو جتنا کہ عام فصحاء اپنے اپنے کلاموں میں ایک دوسرے پر برتری رکھتے ہیں یعنی یہ زیادتی عام عادت کے مطابق ہو۔

تیسرا احتمال یہ ہے کہ قرآن پاک میں فصاحت عام فصحاء کے کلاموں پر اتنی زیادہ ہو کہ کوئی انسان سر توڑ کوشش کرے کہ میں بھی ایسا کلام پیش کرسکوں لیکن وہ عاجز آجائے یعنی قرآن پاک کی فصاحت عام انسانوں کی طاقت سے بلند و بالا ہو۔عقلی احتمال تو یہ تین ہیں لیکن پہلے دونوں احتمال باطل ہیں اس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو لوگ انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر قرآن پاک کا مقابلہ کرسکتے لیکن جب تمام انسان مقابلہ کرنے سے عاجز آگئے تو قرآن کا معجزہ ہونا بھی واضح ہوگیا۔اس لئے کہ قانون یہ ہے کہ جب کسی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اس میں فیصلہ حکام اور گواہ کرتے ہیں تاکہ یہ اختلاف ختم

ہو سکے۔ وہ لوگ اس قسم کے تھے کہ خاندانی رقابت، نسلی برتری کو قائم رکھنے کے لئے کسی کی حق بات کو بھی ماننے کے لئے تیار نہ تھے باطل کو ماننا جوان کی مرضی کے خلاف ہو یہ تو ان کے تصور میں بھی نہ تھا۔ ان لوگوں نے اپنی خاندانی حمیت کے پیش نظر نبی کریم ﷺ سے مقابلہ کرنے کی سرتوڑ کوشش کی اپنے مال اور جانوں کو مقابلہ میں لگاتے رہے پوری کوشش کے باوجود وہ قرآن پاک جیسا کلام پیش کرنے سے جب عاجز آ گئے تو قرآن پاک کا معجزہ ہونا بھی واضح ہو گیا۔ اور خصوصاً جب ان کو یہ بھی کہہ دیا گیا کہ تم اپنے تمام معبودوں اور لوگوں میں سے اپنے فصحاء کو بھی مددگار بنالو۔ پھر قرآن پاک کی چھوٹی سی سورت جیسی سورت بنا کر پیش کرو۔ پھر اس کی فصاحت اور قرآن پاک کی فصاحت کے ایک جیسا ہونے پر اللہ کو گواہ نہ بناؤ مسلمانوں کو گواہ نہ بناؤ بلکہ اپنے ہمنوا ساتھیوں کو گواہ بنالو، ان سے فیصلہ کرالو، کہ کیا تمہارا کلام قرآن پاک جیسا ہو سکتا ہے؟ جب وہ لوگ ایسا نہ کر سکے تو پتہ چلا کہ قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت انسانی کلام کی فصاحت و بلاغت کی حدوں سے بہت ہی بلند و بالا ہے۔ انسان کی سمجھ سے ہی بالاتر ہے کہ وہ اس سے کیسے مقابلہ کرے اس سے مسئلہ بہت ہی واضح ہو گیا کہ قرآن پاک نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے معجزہ سے مقابلہ انسان کے لئے ممکن ہی نہیں:

"فظهر انه سبحانه كما لم يكتف فى معرفة التوحيد و التقليد فكذا فى معرفة النبوة لم يكتف بالتقليد"

''واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی توحید کی معرفت میں بھی تقلید نہیں اسی طرح نبوت کی معرفت میں بھی تقلید کافی نہیں''

اسی سے احناف کا مسلک بھی نکھر کر سامنے آ گیا کہ تقلید فروع میں ہے اصول میں نہیں کیونکہ اعتقادیات میں تقلید کی کوئی گنجائش نہیں اور نہ ہی ائمہ اربعہ یا علماء ربانیین نے یہ کہا ہے۔

قرآن پاک اور فصحاء کا کلام:

''قرآن پاک کے معجزہ ہونے کو دوسرے طریقہ سے بیان کرنا'' اگر عام فصحاء کے کلام کو دیکھا جائے اور ان کے کلاموں میں وجوہ فصاحت کو دیکھا جائے اور ادھر قرآن پاک کو دیکھا جائے تو انسانی عقل تو یہ کہتی ہے کہ قرآن پاک میں فصاحت کم ہونی چاہئے کہ وہ وجوہ فصاحت اس میں نہیں جو عام فصحاء کے کلاموں میں ہیں۔ لیکن پھر بھی قرآن پاک میں بہت زیادہ فصاحت کا پایا جانا اور تمام

انسانوں کا اس سے مقابلہ کرنے سے عاجز ہونا قرآن پاک کے معجزہ ہونے کو واضح کر رہا ہے:

(۱) عرب کی فصاحت اکثر طور پر مشاہدات کی تعریفوں میں ہے کبھی انہوں نے اونٹ کی تعریف کی اور کبھی گھوڑے کی اور کبھی لونڈیوں کی تعریف کی اور کبھی بادشاہوں کی۔ اور کبھی تلوار کی ضرب کی تعریف کی اور کبھی نیزہ بازی کی، اور کبھی لڑائیوں کی تعریف کی اور کبھی لوٹ مار کی۔

قرآن پاک میں اس قسم کی تعریفات میں سے کوئی بھی نہیں پائی گئی فصحاء کے کلام میں فصیح الفاظ ان چیزوں میں ہی پائے گئے ہیں عقل کا تقاضا یہ تھا کہ جب اور قسم کے مضامین کے لئے کوئی فصیح الفاظ ہی نہیں ملیں گے تو فصاحت کیسے ہوگی۔ لیکن قرآن پاک جب انسانوں کا کلام ہی نہیں تو یہ اپنا مقام فصاحت قائم رکھنے کے لئے انسانوں کے الفاظ کا محتاج ہی کیسے ہوتا؟ یہی وجہ ہے کہ تمام انسان اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز آ گئے۔

(۲) قرآن پاک رب تعالیٰ کا کلام ہے اس میں سچ کا ہی ذکر ہے جھوٹ کا وہم وگمان اس میں نہیں پایا جا سکتا لیکن عرب کے بڑے بڑے فصحاء شعراء کا کلام جھوٹ پر مبنی ہے جتنا زیادہ جھوٹ کو وہ اپنے کلام میں شامل کرتے تھے اتنا ہی زیادہ ان کا کلام حسین نظر آتا۔ اسی وجہ سے عارف گنجوی نے اپنے بیٹے کو شعر بنانے کا طریقہ سکھاتے ہوئے یہ نصیحت کی:

ہر گز مپیچ درفن او ، چوں اکذب است احسن است

شعر میں اس کے فن کی باریکیوں کو نہ دیکھیں بلکہ جتنا زیادہ جھوٹ اس میں ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ حسین ہوگا "وکل شاعر ترک الکذب والتزم الصدق نزل شعره ولم یکن جیدا" ہر شاعر جس نے جھوٹ کو چھوڑا اور سچائی کو لازم کیا اس کے شعر، شعراء کی نظر میں کم درجہ ہوئے انہوں نے ان اشعار کو عمدہ نہیں سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت لبید بن ربیعہ اور حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہما نے اسلام لانے کے بعد جو شعر کہے ہیں ان اشعار کو شعراء نے اتنا عمدہ اور حسین نہیں سمجھا جیسا کہ ان دونوں حضرات کے زمانہ جاہلیت کے اشعار کو حسین سمجھا وجہ اس کی یہی تھی کہ اسلام میں جھوٹ گناہ کبیرہ ہے:

"وان اللہ تعالیٰ مع ماتنزه عن الکذب والمجازفة جاء بالقرآن فصیحا کما تری"

"بیشک اللہ تعالیٰ کا کلام قرآن پاک جھوٹ اور اٹکل، اٹے سٹے سے پاک ہے لیکن فصاحت کا وہ معیار اس میں پایا گیا ہے کہ تمام بنی نوع انسان اس کے مقابلہ سے عاجز آ گئے"

قرآن پاک معجزہ ہے اس کو سمجھنا کوئی مشکل نہ رہا۔

(۳) فصحاء کے قصائد اور اشعار میں یقیناً کچھ ایسے شعر بھی ہوتے ہیں جن سے مقابلہ کرنا دوسرے شعراء کے لئے آسان ہوتا ہے بلکہ معمولی تغیر وتبدل سے ایک شاعر دوسرے شاعر کے شعروں کو اپنے قصیدہ میں داخل کر لیتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے کلام میں ایک چھوٹی سورت سے بھی مقابلہ کرنے کی تمام مخلوق میں کسی کو بھی طاقت نہ مل سکی اس سے بڑھ کر قرآن پاک کے معجزہ ہونے پر کس دلیل کی طلب ہوگی۔

(۴) جب بھی کسی فصیح شاعر نے اپنے کلام میں کسی چیز کے وصف کو دوبارہ ذکر کیا تو اس میں پہلے کی طرح فصاحت نہیں پائی گئی پہلے کی طرح ذوق اور چاشنی اس میں نہیں پائی گئی:

" وفی القرآن التکرار الکثیر ومع ذلک کل واحد منها فی نهایة الفصاحة ولم یظهر التفاوت اصلا"

لیکن قرآن پاک میں کثیر تکرار پایا گیا ہے باوجود کثیر تکرار اس میں بہت ہی زیادہ فصاحت پائی گئی ہے اس میں ذرا بھر بھی فرق نہیں پایا گیا۔

(۵) قرآن پاک میں جن چیزوں کا ذکر ہے ان کو اپنے کلام میں کوئی شاعر بھی لا کر فصاحت نہیں لا سکتا۔ قرآن پاک میں "عبادات کے وجوب، برائیوں سے اجتناب، اچھے اخلاق پر برانگیختہ کرنا، دنیا کو چھوڑنا، اور آخرت کو اختیار کرنا، اس قسم کی چیزوں کا ذکر ہے۔ جن کے ذکر سے کلام کو فصیح نہیں بنایا جا سکتا لیکن ان ہی چیزوں کو ذکر سے قرآن پاک میں فصاحت کا وہ بلند مقام قائم کیا گیا ہے کہ تمام مخلوق کو اس کا مقابلہ کرنے کے لئے کہہ دیا لیکن کسی کو جرات نہ ہو سکی اس سے قرآن پاک کا عظیم معجزہ ہونا ثابت ہو گیا۔

(۶) امراء القیس کے اشعار کو دیکھیں تو ان میں عورتوں کا ذکر، گھوڑوں کا ذکر، عورتوں وغیرہ کے ساتھ محافل قائم کرنے کا ذکر نظر آئے گا یعنی اس کے اشعار کا حسن ان چیزوں میں بند ہے۔ نابغہ کے اشعار خوف کے وقت کہے گئے ان میں حسن کی دار ومدار صرف خوف کے ذکر پر بند ہے۔ اعشی کے اشعار میں حسن اور فصاحت کو طلب اور شراب کی تعریف میں بند کر دیا گیا ہے۔ زھیر کے اشعار میں حسن کی دار ومدار رغبت اور امید کے تذکرہ پر اس کے بغیر اس میں اور کسی چیز کا ذکر نہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ہر شعر میں فصاحت اور حسن کا تعلق معین اشیاء کے ذکر سے ہے ان سے ہٹ کر اگر اسی شاعر نے کوئی شعر کہا تو وہ غیر معیاری ٹھہرا۔ " اما القرآن فانه جاء فصیحافی کل فنون علی غایة الفصاحة " لیکن قرآن پاک میں (اس قسم کے مضامین نہیں) حقائق ہیں سچائی ہے بے شمار مضامین ہیں لیکن فصاحت کا بلند سے بلند مقام اس میں پایا گیا ہے جس کے مقابلہ سے ساری مخلوق عاجز آ گئی۔

قرآن پاک کے مضامین اور فصاحت:

(۱) قرآن پاک میں ترغیب (رغبت دلانا) کو ذکر کیا گیا جب کہ فصیح شعراء ترغیب کو اپنے شعروں میں ذکر کر کے فصیح نہ بنا سکے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ جَزَآءً ۢ بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴾

"تو کسی نفس کو معلوم نہیں جو آنکھ کی ٹھنڈک ان کے لئے چھپا رکھی ہے جزاء ہے اس کی جو وہ عمل کرتے رہے"

(۲) قرآن پاک میں ترہیب (ڈرانا) کو ذکر کر کے فصاحت کا بے مثال انداز قائم کیا جبکہ فصیح شعراء سے یہ کام نہ ہو سکا یعنی سادہ مضامین اور فصاحت کا بلند معیار صرف قرآن پاک میں ہی ملے گا۔رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ یَّخْسِفَ بِکُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ یُرْسِلَ عَلَیْکُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَکُمْ وَکِیْلًا ﴾

"کیا تم اس سے نڈر ہو گئے کہ وہ خشکی ہی کا کوئی کنارہ تمہارے ساتھ دھنسا دے یا تم پر پتھراؤ (کا عذاب) بھیجے پھر تم اپنا کوئی حمایتی نہ پاؤ"

ترہیب کو ہی ذکر کرتے ہوئے اور ارشاد فرمایا:

﴿ ءَ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یَّخْسِفَ بِکُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِیَ تَمُوْرُ ☆ اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یُّرْسِلَ عَلَیْکُمْ حَاصِبًا فَسَتَعْلَمُوْنَ کَیْفَ نَذِیْرِ ﴾

"کیا تم اس سے نڈر ہو گئے ہو جس کی سلطنت آسمان میں ہے کہ تمہیں زمین میں دھنسا دے جبھی وہ کانپتی رہے یا تم نڈر ہو گئے ہو اس سے جس کی سلطنت آسمان میں ہے کہ تم پر پتھراؤ (کا عذاب) بھیجے تو اس وقت تمہیں پتہ چل جائے گا کہ کیسا تھا میرا ڈرانا"

ترھیب میں ہی اور ارشاد باری تعالیٰ دیکھئے:

" وخاب كل جبار عنيد ، من ورائه جهنم ويسقى من ماء صديد يتجرعه ولا يكاد يسيغه وياتيه الموت من كل مكان وما هو بميت ومن ورائه عذاب غليظ "

''اور رسوا ہوا ہر سرکش اور ہٹ دھرم جہنم اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے اور اسے پیپ کا پانی پلایا جائے گا بمشکل اس کا تھوڑا تھوڑا گھونٹ لے گا اور گلے سے نیچے اتارنے کی امید نہ ہوگی اور اسے ہر طرف سے موت آئے گی اور مرے گا نہیں اور اس کے پیچھے اسے سخت عذاب ہوگا''

(۳) اللہ تعالیٰ نے زجر کا ذکر جس انداز سے کیا کسی انسان کی طاقت میں ہی نہیں کہ وہ اسے بیان کر سکے یعنی قرآن پاک کے الفاظ مبارکہ کو دیکھ کر بھی انسان اس قسم کا کلام پیش کرنے سے عاجز ہے رب تعالیٰ کا فصیح کلام دیکھئے:

﴿ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴾

''تو ان میں سے ہر ایک کو ہم نے اس کے گناہ سے پکڑا تم ان میں سے کسی پر ہم نے پتھراؤ (کا عذاب) بھیجا اور ان میں سے کسی کو چنگھاڑ (زوردار آواز) نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اور ان میں سے کسی کو زمین میں دھنسا دیا اور ان میں سے کسی کو ڈبو دیا اور اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا ہاں وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے''

(۴) الھیات کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ۭ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ۭ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ﴾

''اللہ جانتا ہے جو کچھ کسی مادہ کے پیٹ میں ہے اور پیٹ جو کچھ گھٹتے اور بڑھتے ہیں اور ہر چیز اسکے پاس ایک اندازے سے ہے وہی ہر چھپے اور ظاہر کا جاننے والا ہے سب بڑی بلندی والا ہے''

تمام علوم قرآن پاک میں ہیں: قرآن پاک تمام علوم کا منبع اور اصل ہے علم کلام کو دیکھیں تو قرآن پاک میں نظر آئے گا۔ علم فقہ قرآن پاک سے ماخوذ ہے۔ اصول فقہ کو قرآن پاک سے حاصل کیا گیا ہے علم صرف، علم نحو، علم لغت تمام کا اصل قرآن پاک ہی ہے دنیا میں علم زہد اور آخرت کی خبریں

قرآن پاک سے ہی ملیں گی اور اچھے اخلاق کو حاصل کرنے کا سبق قرآن پاک سے ہی ملتا ہے

غرضیکہ کہ قرآن پاک میں ہر قسم کے مضامین ، تمام علوم ، سچی باتیں ، حقائق ذکر ہیں لیکن فصاحت و بلاغت اس مقام تک پہنچی ہوئی ہیں کہ انسان بلکہ تمام مخلوق اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہے۔ جبکہ انسانوں میں سے لوگ ان کو فصحاء سمجھتے ہیں جو زیادہ سے زیادہ جھوٹ اپنے کلام میں لائیں اور عورتوں کے حسن و جمال کے تذکرے کریں کہیں اپنی بہادری کے گن گائیں، کہیں اپنے گھوڑے کی تعریف کریں اور کہیں اونٹ کی، کہیں شراب کی تعریف اور کہیں ثقافت کے نام پر بے حیائی کے پروگرام کی محافل کا تذکرہ سبحان اللہ قرآن تیری عظمت پر قربان تو رب تعالیٰ کا ذیشان فرمان تیرا مقابلہ کیا کرے گا ملک و جن و انسان۔

قرآن پاک نے کئی مرتبہ مقابلہ کے لئے بلایا:

رب تعالیٰ اپنے محبوب کی زبان مبارک سے اعلان ان الفاظ مبارکہ سے کرایا ﴿ قُلْ فَاْتُوْا بِكِتَابٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَا ﴾ تم فرماؤ تو اللہ کے پاس سے کوئی کتاب لے آؤ جو ان دونوں کتابوں (قرآن پاک اور تورات) سے زیادہ ہدایت کی ہو۔

مقابلہ کے لئے لوگوں کو بلایا بھی لیکن ساتھ ہی واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ تمام جن اور انسان مل کر بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے ارشاد فرمایا:

﴿ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا "

"تم فرماؤ اگر آدمی اور جن سب اس پر متفق ہو جائیں کہ اس قرآن کی مانند لے آئیں تو اس کا مثل نہ لا سکیں گے اگر چہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہوں"

پھر ان کو قرآن پاک کی دس سورتوں جیسی سورتیں لانے کے لئے کہا اور ارشاد فرمایا:

﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾

"کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ انہوں (نبی کریم) نے یہ خود ہی بنا لیا ہے ان کو کہو اس جیسی دس سورتیں بنا لاؤ اور اللہ کے بغیر جن کو تم بلا سکتے ہو بلا لو اگر تم سچے ہو"

اس کا جواب بھی رب تعالیٰ نے خود ہی ارشاد فرما دیا کہ ان کو اس کا جواب دینے کی کوئی طاقت ہی حاصل نہیں:

﴿ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ﴾

''اگر وہ تمہیں (اے مسلمانو) اس بات کا جواب نہ دے سکیں تو سمجھ لو وہ اللہ کے علم سے ہی اترا ہے اور یہ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں''

پھر ان کو قرآن پاک کی سورتوں میں سے کوئی ایک سورت جیسی سورت بنا کر لانے کے لئے کہا۔

اور ارشاد فرمایا:

﴿ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴾

''کیا یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اسے بنا لیا ہے تم فرماؤ تو اس جیسی ایک سورت لے آؤ اور اللہ کو چھوڑ کر جو مل سکیں سب کو بلا لاؤ اگر تم سچے ہو''

اس کے بعد بھی رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا کہ وہ جاہل ہیں، جھوٹے ہیں، رب تعالیٰ کے عذاب میں مبتلا ہوں گے:

﴿ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ یُحِیْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا یَاْتِهِمْ تَاْوِیْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِیْنَ ﴾

''بلکہ انہوں نے قرآن کو سمجھنے کے بغیر ہی جھٹلایا اور ابھی انہوں نے اس کا انجام نہیں دیکھا ایسے ہی ان سے پہلے لوگوں نے (انبیاء اور اللہ کی کتب کو) جھٹلایا تھا تو دیکھو ظالموں کا کیسا انجام ہوا''

آخری چیلنج یہی ہے جس آیۃ کی تفسیر جاری ہے کہ ﴿ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ﴾ اس میں ''بسورۃ'' پر تنوین صغر پر دلالت کر رہی ہے جس کا معنی ہے قرآن پاک کی چھوٹی سے سورت (یعنی کوثر اور العصر) جیسی سورت لے آؤ۔ اس میں بھی ان کو کھلی اجازت دی کے اپنے تمام مددگار'' خواہ وہ تمہارے معبودان باطلہ ہوں، یا انسانوں سے بڑے بڑے فصحا ہوں بلا لو اگر تم اپنے اس گمان میں سچے ہو کہ یہ قرآن نبی کریم ﷺ نے خود پیش کیا ہے تو تم بھی بنا کر دکھاؤ۔

اسکے بعد بھی رب تعالیٰ نے ان کو واضح طور پر فرما دیا ہے کہ تم سے یہ کام کبھی نہیں ہو سکے گا۔ ابھی وہ ارشاد دیکھئے جسکی وضاحت کرنی بھی مقصود ہے اور زیر بحث آیت کے بعد آ رہی ہے وہ یہ ہے۔

(ماخوذ از کبیر)

﴿ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوْا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ ﴾

☆ ''پھر اگر نہ لاسکو اور ہم فرمائے دیتے ہیں کہ ہرگز نہ لاسکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں تیار رکھی ہے کافروں کے لئے''

☆ ''پھر اگر تم نہ کر سکے اور ہرگز تم نہیں کر سکو گے تو بچ جاؤ اس آگ سے جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں۔ وہ کافروں کے لئے تیار کر رکھی ہے''

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا: یہ پہلی آیۃ پر مرتب ہے اور اسی کا گویا کہ نتیجہ ہے اسی وجہ سے اسے ''فاء'' سے شروع کیا گیا ہے گویا کہ یہ کہا گیا ہے کہ جب تم اپنی پوری کوشش صرف کر لو فصاحت کے شاہسواروں اور اپنے معبودان باطلہ کے دامن کا بھی سہارا لے لو اور خود بھی بڑے مضبوط اور تیز چلنے والے گھوڑوں پر سوار ہو کر میدان فصاحت میں گھوڑے دوڑا چکو جب عاجز آ جاؤ قرآن پاک کا مقابلہ نہ کر سکو تو تصدیق لازم ہے ایمان لے آؤ۔ اور اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچا لو وہ آگ جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ (از روح المعانی)

علمی نکات: بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ یقین کے مقام پر '' اذا '' استعمال ہوتا ہے اور شک کے مقام پر '' ان '' کا استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جو لطیف وخبیر ہے اور علیم مافی الصدور (دلوں کی بھید جاننے والا) ہے۔ تو '' ان '' کا استعمال کس طرح درست ہوگا۔ یہ تو مقام یقین ہے اس مقام پر ''اذا'' آنا چاہئے تھا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں '' ان '' مخاطبین کے حال کے مطابق ہے کہ اگر تمہیں کوئی شک ہو کہ ہم کوشش کریں تو کامیاب ہو جائیں تو کوشش کر کے دیکھ لو اگر ایسا نہ کر سکو تو آگ سے بچ جاؤ۔ یا اس میں تحکم پایا گیا ہے کہ تم قرآن پاک کی ایک چھوٹی سورت جیسی بھی بنا تو نہیں سکتے۔ لیکن ذرا کوشش کر کے تو دیکھ لو اپنی فصاحت پر ناز کرنے والو تمہیں اپنے عجز کا پتہ چل جائے گا۔ ایک اور وہم یہ ہے کہ '' ان '' استقبال کے لئے آتا ہے اور '' لم '' جب مضارع پر داخل ہو تو اسے ماضی منفی بنا دیتا ہے۔ یہاں ایک ہی جگہ پر استقبال اور ماضی کا اجتماع کیسے درست ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ

''ان'' جب ماضی پر داخل ہوتو اسے مستقبل کے معنی میں کر دیتا ہے لہٰذا اب ﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا﴾ کا معنی یہی ہوگا اگر تم نہ لاسکو اگر تم نہ کرسکو۔ دوسرا جواب یہ ہے:

''فان ''ھنا داخلة علی المجموع عاملة فی محله کانه قال فان ترکتم الفعل فیفید الکلام استمرار عدم الاتیان المحقق فی الماضی''

اس مقام میں '' ان '' مجموعہ (یعنی لم اور تفعلوا) پر داخل ہے صرف ''لم'' پر داخل نہیں کہ ایک اور وہم پڑے کہ حرف کا حرف پر عمل نہیں ہوتا تو یہاں کس طرح '' ان '' کا '' لـــم '' پر داخل ہونا صحیح ہے۔ اس کا بھی ساتھ ہی جواب آ گیا کہ پورے ﴿لَمْ تَفْعَلُوْا﴾ کے مجموع پر '' ان '' داخل ہے اور اس کے محل پر عمل کر رہا ہے۔ اب معنی یہ ہوگا کہ ''اگر تم نے فعل ترک کر دیا''۔

اس سے واضح ہوا کہ ان کا نہ لاسکنا زمانہ ماضی میں بھی جاری رہا اب ﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا﴾ کا معنی یہ ہوگا۔ کہ اگر تم آج تک کر نہیں سکے اور ہرگز کر بھی نہیں سکو گے۔

خیال رہے کہ پہلے معنی سے ﴿وَلَنْ تَفْعَلُوْا﴾ جملہ معترضہ ہوگا۔ لیکن اب جو معنی کیا ہے اس کے لحاظ سے معطوفہ بنانا درست ہے معترضہ بنانے کی ضرورت نہیں۔

وَلَنْ تَفْعَلُوْا: اگرچہ ''لا'' بھی نفی کرتا ہے لیکن '' لا '' کی نفی مطلق ہوتی ہے اور اس میں تاکید بھی نہیں ہوتی اور '' لـــن '' مستقبل کی نفی کرتا ہے اور نفی میں تاکید ہوتی ہے (از روح المعانی) اس کا معنی یہ ہے ''اور ہرگز تم نہیں کرسکو گے'' البتہ مرادی معنی یہ ہے ''اور ہرگز تم نہیں لاسکو گے''

آیۃ کریمہ میں چار معجزے:

(۱) بڑی متواتر خبروں سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ کفار نبی کریم ﷺ کے اعلان نبوت کے بعد آپ کے شدید دشمن بن گئے بہت بڑی مخالفت کرنے لگ گئے اور ہر وقت یہی چاہتے تھے کہ آپ کے لائے ہوئے دین اسلام کو مٹا کر رہیں۔ نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کو ہر طرح کی تکالیف پہنچانے، اور ان کی ایذاء رسانیوں اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہجرت کرنے سے واضح ہے کہ انہوں نے عداوت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔

ان حالات میں جب قرآن نے یہ پیش کیا ﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا﴾ (پھر اگر تم نہ

کر سکے اور ہرگز نہیں کر سکو گے) اس کے بعد " فلو کان فی وسعھم وامکانھم الاتیان بمثل القرآن او بمثل سورۃ منہ لاتوا بہ فحیث ماتوا بہ ظھر المعجز " اگر ان کی وسعت میں ہوتا اور ان کے لئے ممکن ہوتا تو قرآن پاک جیسی کتاب بنا لیتے یا کم از کم کوئی سورت ضرور بنا لیتے۔ لیکن وہ شدید مخالفت کے باوجود کثیر کوشش کے بعد قرآن پاک جیسا کلام پیش کرنے کی شدید حرص اور تمنا رکھنے کے باوجود جب عاجز آ گئے کہ ایک چھوٹی سورت بھی نہ بنا سکے تو معجزہ ہونا ثابت ہو گیا

(۲) اگر چہ کفار نبی کریم ﷺ کی نبوت کے معاملہ میں شک کرتے تھے لیکن وہ بھی نبی کریم ﷺ کے کامل عاقل ہونے اور فضلیت رکھنے اور کسی کام کے انجام کو اچھی طرح جاننے میں کوئی شک نہیں کرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ کو اپنی نبوت میں بھی یقین کامل تھا ذرا بھر بھی شک نہیں تھا۔ ورنہ اتنا بڑا چیلنج کرنے میں آپ خوف کرتے لیکن آپ نے بلا خوف جب ساری مخلوق کو قرآن پاک کے ساتھ مقابلہ کرنے کی دعوت دے دی اور رب تعالیٰ کا پیغام ﴿وَلَنْ تَفْعَلُوْا﴾ (تم ہرگز نہیں کر سکو گے) سنا دیا اور وہ تمام لوگ عاجز آ گئے تو اس سے بھی معجزہ ہونا واضح ہو گیا۔

(۳) نبی کریم ﷺ کو اگر اپنی نبوت میں یقین نہ ہوتا تو آپ یہ قطعی خبر " لایاتون بمثلہ " (تمام جن اور انسان مل کر بھی قرآن جیسا نہیں لا سکیں گے) نہ دیتے۔ اس لئے کہ اگر آپ کی نبوت قطعی طور پر صحیح نہیں ہوتی تو آپ کی خبر کے خلاف وہ لوگ قرآن پاک جیسا کلام پیش کر لیتے اگر ایسا کر لیتے تو (معاذ اللہ) نبی کریم ﷺ کا جھوٹا ہونا ثابت ہو جاتا۔ باطل راہ پر چلنے والا جھوٹا شخص اپنا کلام یقینی طور پر پیش کرنے پر قادر نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ اپنے آپ پر یقین کر سکتا ہے:

" فلما جزم دل انہ علیہ الصلوۃ والسلام کان قاطعا فی امرہ "

" جب آپ نے اپنا کلام یقینی طور پر پیش فرما دیا تو اس سے واضح ہو گیا کہ آپ کو اپنی نبوت میں بھی یقین محکم حاصل تھا "

(۴) قرآن پاک نے جو خبر دی ہے نبی کریم ﷺ کے زمانہ سے لے کر آج تک اس کی صداقت جگمگا رہی ہے۔ اور انشاء اللہ قیامت تک کوئی اس سے مقابلہ کرنے کی جرات نہیں کر سکے گا۔ ان چار وجہ سے واضح ہو گیا کہ اس آیۃ کے چند الفاظ مبارکہ سے ثابت ہو گیا کہ قرآن پاک عظیم کتاب ہے

مختصر الفاظ سے عظیم مطالب اور کئی کئی معجزات بیان کردیئے گئے ہیں:

"وذلک یدل علی فساد الجهال الذین یقولون ان کتاب الله لا یشتمل علی الحجة والاستدال"

اسی سے جاہلوں کا وہ قول بھی مردود ہوگیا کہ قرآن پاک میں حجت اور دلائل مذکور نہیں ہاں اپنی جہالت کی وجہ سے کوئی قرآن پاک کو نہ سمجھ سکے تو وہ اپنی جہالت پر افسوس سے کف دست ملے۔ قرآن پاک کے تو ایک ایک لفظ سے کئی کئی مسائل کے دلائل حاصل ہورہے ہیں بات صرف ایمان، ایقان، عرفان حاصل ہونے کی ہے۔

وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ: اس (آگ) کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں "**وقود**" میں اگر واؤ پر فتحہ (زبر) ہو تو وہ اسم ہے تو اس کا معنی ہوتا ہے "ماتوقد به النار" جس چیز کے ذریعے آگ جلائی جائے یعنی ایندھن اور اگر واؤ پر ضمہ (پیش) ہو تو وہ مصدر ہوتا ہے جس کا معنی ہوتا ہے جلانا۔ لیکن یہ بھی خیال رہے کہ واؤ پر فتحہ کی صورت میں بھی مصدر آتا رہتا ہے اگر آیۃ کریمہ میں مصدری معنی لیا جائے تو مبالغہ ہوگا یا مضاف حذف ہوگا۔ تقدیر عبارت کی ہوگی "ذو وقودها" اس آگ کو جلانے والے۔

حِجَارَةُ: حجر بفتحتین (حا اور جیم پر زبر) کی جمع کثرت ہے۔ اور اس کی جمع قلت "احجار" ہے۔

حجارۃ سے مراد کون سے پتھر ہیں:

ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد عام پتھر ہیں کیونکہ پتھروں سے بھڑکائی ہوئی آگ بہت زیادہ گرم ہوتا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد گندھک ہے۔ کیونکہ اس میں حرارت بہت ہی زیادہ ہوتی ہے۔ اور اس سے اٹھنے والے شعلے آسمانوں سے باتیں کرتے ہیں اور وہ بہت جلدی بھڑک پڑتی ہے اور وہ بدن سے چمٹ جاتی ہے "واعداد اهل النار ان یکونوا حطامع نتن ریح وکثرة دخان وقود کثافة" جب وہ آگ کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے تو اس کا ایندھن بھی ایسا بنایا کہ اس میں بدبو پائی جاتی ہے اور بہت زیادہ دھواں اس میں پایا جاتا ہے اور بہت زیادہ سیاہی اس میں ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ لطیف نظر نہیں آتی بلکہ وہ آگ بہت زیادہ کثیف ہوتی ہے۔ آگ کا ایندھن پتھر کہہ کر گویا کہ آگ کی شدید ہولناکیاں ذکر فرمادیں تاکہ لوگ اس سے نفرت کریں۔

تیسرا قول یہ ہے کہ پتھروں سے مراد ان کے تراشے ہوئے بت ہیں۔ جن کو وہ پتھروں سے بناتے تھے یعنی کفار کے ساتھ ان کے بتوں کو بھی جلایا جائے گا تاکہ ان کی حسرت وندامت کو اور زیادہ کیا جاسکے کہ ہم تو امید کرتے تھے کہ یہ ہمیں رب تعالیٰ کے عذاب اور اس کی ناراضگی سے بچالیں گے لیکن افسوس کہ ہمارے معبود بھی ہمارے ساتھ ہی جل رہے ہیں:

" وھناک یتم لھم نوعان من العذاب روحانی وجسمانی "

''وہاں انہیں مکمل عذاب حاصل ہوگا جسمانی بھی اور روحانی بھی''

کیونکہ جب وہ خود آگ میں جل رہے ہوں گے تو یہ ان کا جسمانی عذاب ہوگا۔ اور جب ان کے معبودان باطلہ بھی ان کے ساتھ ہی جل رہے ہوں گے تو ان کی ناامیدی بڑھ جائے گی۔ شدید حسرت حاصل ہوگی اور شدید ندامت ہوگی تو یہ ان کا روحانی عذاب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی اس کی تائید کررہا ہے۔ ﴿ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ﴾ بیشک تم اور جن و ما اللہ سے سوا پوجتے ہو سب جہنم کا ایندھن ہو۔

چوتھا قول یہ ہے کہ حجارۃ سے مراد سونا اور چاندی ہے " لانھما یسمیان حجرا " کیونکہ ان کو بھی وہ پتھر ہی کہتے تھے اور دنیا میں ان کی حفاظت کرتے تھے اور دنیا میں سمجھتے تھے کہ سونا اور چاندی فدیہ دے کر انسان اپنے آپ کو بچا سکتا ہے لیکن جب ان کے ساتھ سونا اور چاندی بھی جل رہے ہوں گے تو ان کی ناامیدی بڑھ جائے گی اور کہیں گے ہائے افسوس آج تو بچنے کا کوئی ذریعہ بھی نظر نہیں آرہا۔

سب اقوال کا مطلب ایک: جہنم کی آگ کا ایندھن لوگ بھی ہوں گے اور پتھر بھی اور گندھک بھی اور ان کے بت بھی اور سونا چاندی بھی۔ یعنی پتھروں سے بھڑکائی ہوئی شدید گرم آگ میں گندھک بھی ہوگی جس کی بدبو اور دھواں اور سیاہ تاریکی سے اور ہی زیادہ عذاب ہوگا۔ اور ان لوگوں کے ساتھ ان کے معبودان باطلہ کو جلا کر ان کی اس امید کو ختم کردیا جائے گا کہ ہمارے یہ معبود ہمیں چھڑا لیں گے۔ اور ان کے ساتھ سونا اور چاندی بھی آگ میں جھونک دیا جائے گا تاکہ فدیہ دے کر اپنے آپ کو چھڑانے کا تصور بھی ان کے ذہنوں سے جاتا رہے۔

سبحان اللہ قرآن پاک کے ایک لفظ سے کتنے عظیم مطالب حاصل ہوگئے اگر یوں کہہ دیا جائے تو

شائد بے جا نہیں ہوگا کہ " الحجارۃ " میں جو اجمال تھا اس کی تفسیر ﴿ وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴾ (کسی نفس سے کوئی بدلہ (فدیہ) قبول نہیں کیا جائے گا اور کافروں کو کسی کی شفاعت سے کوئی نفع نہیں ہوگا اور ان کی امداد نہیں کی جائے گی) میں آ گئی۔

تنبیہ: جہنم میں جن اور شیاطین بھی ہوں گے، جن کا ذکر دوسرے مقامات پر موجود ہے۔ یہاں انسانوں اور پتھروں کا ذکر کر کے جہنم کے آگ کی شدت کا ذکر کیا جا رہا ہے، تا کہ لوگوں کے دلوں میں اس کا خوف پیدا ہو۔

" نعم قال سیدی الشیخ الاکبر قدس سرہ انھم لھبھا اولئک جمرھا "

'' ہاں البتہ شیخ اکبر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جن اور شیاطین آگ کے شعلے ہوں گے اور انسان اور پتھر چنگاریاں ہوں گے''

انسانوں کا ذکر پہلے کیوں؟ جہنم کے ایندھن ہونے میں لوگوں کا ذکر بھی کیا اور پتھروں کا بھی، لیکن لوگوں کا ذکر پہلے اس لئے کیا کہ ان کو درد ہوگا، شدید تکلیف ان کو ہی ہوگی۔ اور یہ بھی وجہ ہے کہ پتھروں کی بنسبت انسان جلدی جلیں گے، کیونکہ ان میں گوشت اور چربی پائی جاتی ہے۔ اور یہ چیزیں آگ کو جلدی قبول کرتی ہیں اور آگ کا بھی ان پر بہت زیادہ اثر ہوتا ہے۔

سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جہنم کی آگ کا خوف تو صرف انسانوں کو دلانا مقصود ہے۔ پتھروں کو جلانے کی وجہ پتھروں کو عذاب دینا مقصود نہیں ہوگا، بلکہ وہ بھی انسانوں کو عذاب ہوگا۔ کیونکہ یا تو پتھروں کی آگ کی شدت کی وجہ سے انسانوں کو شدید عذاب ہوگا۔ اور یا اپنے معبودانِ باطلہ کو جلتے دیکھ کر حسرت وندامت کا ان کو روحانی عذاب ہوگا یہی وجہ ہے کہ انسانوں کا ذکر پتھروں سے پہلے کیا گیا۔

تنبیہ: " النار " کو معرفہ ذکر کیا گیا معرفہ وہ ہوتا ہے جو معین ہو جس کے متعلق پہلے علم ہو۔ معرفہ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ سورۃ تحریم میں "نار" کو نکرہ ذکر کیا گیا ہے۔ جو نزول کے لحاظ پر پہلے ہے وہاں ذکر ہوا ﴿ قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ﴾ اپنے آپ کو اور اپنے اہل کو آگ سے بچا لو، جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں۔ لہذا جب ایک مرتبہ نکرہ ذکر ہو چکا تھا تو علم حاصل ہو گیا اب معرفہ ذکر کرنا درست ہو گیا۔

اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ: کافروں کے لئے تیار کی گئی یعنی آگ کو اصل میں تو کافروں کے لئے تیار کیا گیا ہے کیونکہ کفار کی آگ میں تذلیل بھی ہوگی لیکن اگر مومنین گنہگار جہنم میں ڈالے گئے تو ان کو آگ میں ڈالنے کی وجہ صرف یہ ہوگی کہ یہ گناہوں کی آلودگی سے پاک ہوجائیں، جیسا کہ سونے کو آگ کی بھٹی میں ڈالنے کا مقصد سونے کی بے قدری نہیں۔ بلکہ سونے کے کھوٹ سے پاک کرنا مقصد ہوتا ہے۔

اسی طرح یہ بھی خیال رہے کہ آگ کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔تو پہلے کافروں کو ہی آگ میں ڈالا جائے۔مومن گنہگار تو بعد میں کچھ دیر کے لئے آگ میں ڈالے جائیں گے (اللهم انا نعوذ بک من النار) اور آگ جب کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے تو وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔نہ اخروی زندگی نے ختم ہونا ہے اور نہ ہی ان کا عذاب ختم ہونا ہے کہ وہ آگ سے نکال دیئے جائیں۔لیکن مومن گنہگار تو صرف کچھ دیر کے لئے آگ میں ڈالے جائیں گے۔گناہوں کا عذاب ختم ہوتے ہی وہ جنت میں آجائیں گے۔

فائدہ: اسی بحث سے یہ فائدہ حاصل ہوگیا:

" کون الاعداد للکفرین لاینا فی دخول غیرھم فیھا علی جھة التطفل
فلا حاجة الی القول بان نار العصاة غیر نار الکفار "

آگ کا کافروں کیلئے تیار کیا جانا اسکے منافی نہیں کہ دوسرے نافرمان لوگوں کو انکے پیچھے داخل کیا جائے گا۔لہٰذا بعض لوگوں نے جو یہ کہا ہے کہ کافروں کی آگ اور ہوگی۔اور گنہگاروں کی آگ اور ہوگی یہ قول درست نہیں۔اور نہ ہی اسکی کوئی ضرورت ہے کہ دو قسم کی آگ ثابت کی جائے۔

" اعدت " ماضی کا صیغہ ہے، جس کا معنی تیار کردی گئی۔اسی سے معتزلہ کا بھی رد ہوگیا۔کہ وہ جنت اور دوزخ کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ ابھی پیدا نہیں ہوئیں، البتہ قیامت کے بعد پیدا ہوں گی۔ان کا یہ قول قرآن پاک اس آیت اور کئی دوسری آیات کے سراسر مخالف ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

جہنم کی آگ کا ہولناک منظر: بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" نارکم جزء من سبعین جزء من نار جھنم "

"تمہاری آگ (یعنی دنیا کی آگ) جہنم کی آگ کے ستر حصوں میں سے ایک ہے"

بخاری ومسلم کی ہی ایک اور روایت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" انه اهون اهل النار عذابا من له نعلان و شراكان من نار يغلى منهما دماغه كما يغلى المرجل مايرى ان احدا اشد منه عذابا و انه لاهونهم عذابا "

'' بیشک آگ والے لوگوں کا سب سے آسان عذاب یہ ہوگا کہ اسے دو جوتے پہنائے جائیں گے جو آگ کے ہوں گے۔ اوران کے تسمے بھی آگ کے ہوں گے، جن سے اس کا دماغ اس طرح کھولتا ہوگا، جس طرح آگ پر دیگ کھولتی ہے۔ وہ شخص سمجھے گا کہ سب سے زیادہ عذاب مجھے ہی دیا جارہا ہے۔ حالانکہ اس کا یہ عذاب جہنم والے تمام لوگوں سے کم ہوگا''

جب سب سے کم عذاب اتنا شدید ہولناک ہوگا، تو زیادہ عذاب کتنا ہولناک ہوگا؟ اے اللہ مومنین کوتو اس عذاب سے اپنی رحمت سے بچا۔ ہمارے عملوں کو نہ دیکھ، اپنے فضل کو دیکھ۔

ترمذی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" او قد على النار الف سنة حتى احمرت ثم اوقد عليها الف سنة حتى ابيضت ثم اوقد عليها الف سنة حتى اسودت فهي سوداء مظلمة "

'' جہنم کی آگ کو ایک ہزار سال تک بھڑکایا گیا یہاں تک کہ وہ سرخ ہوگئی۔ پھر ایک ہزار سال بھڑکایا گیا یہاں تک کہ وہ سفید ہوگئی پھر ایک ہزار سال بھڑکایا گیا یہاں تک کہ سیاہ ہوگئی۔ اب وہ بہت ہی سیاہ تاریک آگ ہے''

دارمی نے نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت کو ذکر کیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

" انذرتكم النار ، انذرتكم النار فما زال يقولها حتى لو كان في مقامي هذا سمعه اهل السوق وحتى سقطت خميصة كانت عليه عند رجليه "

'' میں تمہیں آگ سے ڈراتا ہوں، میں تمہیں آگ سے ڈراتا ہوں۔ آپ یہ فرماتے رہے، یہاں تک اگر میرے اس مقام میں بازار والوں سے کوئی شخص سنتا تو اپنا جبہ اتار دیتا جو اس کے پاؤں تک ہوتا ہے''

یعنی آپ نے آگ کا اتنا ہولناک منظر بار بار یہ کہہ کر کہ ''میں تمہیں آگ سے ڈراتا ہوں'' پیش کیا کہ اگر پاؤں تک جب پہنے لوگ اسے سنتے تو وہ خوف کے مارے اپنے جبے بے ساختہ اس طرح اتار دیتے کہ گویا ان کے جبے خود ہی گر رہے ہیں۔ (مظہری)

﴿وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙۗ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾

☆ اور خوشخبری دے انہیں جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے کہ ان کیلئے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں رواں جب انہیں ان باغوں سے کوئی پھل کھانے کو دیا جائے گا (صورت دیکھ کر) کہیں گے یہ تو وہی رزق ہے جو ہمیں پہلے ملا تھا اور وہ (صورت میں) ملتا جلتا انہیں دیا گیا، اور ان کیلئے ان باغوں میں ستھریاں بیبیاں ہیں، اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔

☆ اور خوشخبری دو ان لوگوں کو جنہوں نے ایمان لایا اور اچھے عمل کئے۔ بیشک ان کیلئے جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، اور ان کو جب بھی ان جنتوں سے پھلوں کا رزق دیا جائے گا، وہ کہیں گے یہ تو وہی رزق ہے جو ہمیں پہلے بھی دیا گیا۔ اور اسی کے مشابہ ان کو دیا گیا۔ اور ان کیلئے ان جنتوں میں پاکیزہ زوجہ ہوں گی۔ اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

جب اللہ تعالیٰ نے اشقیاء (بدبخت) کفار کا ذکر کیا اور ان کے عذاب کا ذکر کیا، تو اس کے بعد مومنین نیک بخت لوگوں کا ذکر فرمایا، جو اپنے ایمان میں مخلص اور نیک عمل کرنے والے ہوتے ہیں۔ قرآن پاک اسماء گرامیہ میں ایک اسم گرامی ''مثانی'' بھی ہے۔ جس کا ایک معنی یہ ہے کہ قرآن پاک میں جب ایک چیز کا ذکر ہوتا ہے، تو ساتھ ہی اس کے مقابل دوسری چیز کا ذکر بھی ہوتا ہے، اس لئے کہ قانون یہی ہے:

'' انما الاشیاء تعرف باضدادھا '' '' کہ بیشک چیزیں اپنی ضدوں سے پہچانی جاتی ہیں''

یہ وجہ ہے کہ پہلے کفار کا ذکر تو بعد میں ایمان والوں کا ذکر ہوگا۔اور اگر پہلے ایمان والوں کا ذکر ہو تو بعد میں کفار کا ذکر ہوگا۔اسی طرح پہلے نیک لوگوں کا ذکر ہو تو بعد میں گنہگاروں کا ذکر ہوتا ہے۔اور پہلے گنہگاروں کا ذکر ہو تو بعد میں نیک لوگوں کا ذکر ہوتا ہے۔ (از ابن کثیر)

وَبَشِّرِ : اور بشارت دو۔ یہ حکم نبی کریم ﷺ کو ہے کہ آپ بشارت دو، یا یہ حکم عام انسانوں کو ہے " وھذا حسن " عام لوگوں کو حکم دینا اچھا ہے کہ اس بشارت میں عظمت اور شان کی بلندی پائی گئی ہے۔کہ اے انسانو! جو بھی بشارت دینے کی طاقت رکھتے ہو ایمان والوں اور اچھے عمل والوں کو جنت کی بشارت دے دو " والبشارة الاخبار بما یظهر سرور المخبر به " بشارت اس خبر کو کہتے ہیں جسے سن کر وہ شخص ہو جائے، جسے خبر دی گئی ہو۔یعنی اس کے چہرے کے بشرہ (چمڑے) پر مسرت کے آثار ظاہر ہوں۔

اسی وجہ سے فقہاء کرام نے بیان کیا ہے کہ اگر کوئی شخص کہے کہ جس میرے غلام نے مجھے فلاں شخص کے آنے کی بشارت دی وہ آزاد ہے۔اس کے اس قول کے بعد ایک غلام آیا اس نے بتایا کہ فلاں آ گیا۔پھر دوسرے نے، پھر تیسرے نے بتایا۔تو صرف پہلا غلام آزاد ہوگا، کیونکہ بشارت اسی کی خبر کو کہا جائے گا، بعد والوں کی خبریں فقط خبریں ہی ہیں، کیونکہ مسرت صرف پہلی خبر سے حاصل ہوتی ہے۔

لیکن اگر کسی شخص نے کہا میرے جس غلام نے فلاں شخص کے آنے کی خبر دی وہ آزاد ہے۔اس طرح کئی غلاموں نے خبر دی، پہلے ایک، پھر دوسرے، پھر تیسرے نے تو تمام غلام آزاد ہو جائیں گے۔اس لئے کہ جتنے بھی بتائیں گے، ان تمام کے بتانے کو خبر کہا جائے گا۔ (از احکام القرآن للجصاص ومدارک)

فائدہ: نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" بشر المشائین الی المسجد فی ظلم اللیالی بالنور التام یوم القیامة "

''اندھیری راتوں میں مسجد کی طرف جانے والوں کو قیامت کے دن کامل نور حاصل ہونے کی بشارت دو'' (ابو السعود)

آپ کے اس ارشاد گرامی سے ایک تو یہ فائدہ حاصل ہوا کہ بشارت کا حکم یہاں عام ہے، کہ جس سے بھی بشارت ممکن ہو وہ ہی ایمان والوں اور نیک اعمال والوں کو بشارت دیں۔

اور دوسرا فائدہ حاصل ہوا کہ جماعت سے نماز ادا کرنے والے، مسجد میں جانے والے کتنے خوش قسمت ہیں کہ ان کا ذکر مصطفےٰ کریم ﷺ کی زبان ذیشان پر ہے۔ صرف ذکر ہی نہیں بلکہ بشارت دینے کا حکم دیا جا رہا ہے۔

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: وہ لوگ جنہوں نے ایمان لایا۔ یعنی بشارت دو ایمان والوں کو " الذین امنوا ، صدقوا باللہ " مراد اس سے یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی تصدیق کی وہی ایمان والے ہیں۔ ایمان والوں کی تفسیر صرف اس سے کر دینا کافی ہے " لانہ یلزم من التصدیق باللہ التصدیق بما اخبر بہ علی لسان رسلہ " کیونکہ اللہ تعالیٰ کی تصدیق اس کو ہی حاصل ہوگی جسے ان تمام خبروں کی تصدیق حاصل ہوگی جو اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے اپنی زبان مبارک سے بیان فرمائیں

(از جلالین و صاوی)

مقصد واضح ہے کہ ایمان وہی معتبر ہے کہ ان تمام چیزوں پر ایمان ہو جن کا ایمان میں اعتبار کیا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر، تمام انبیاء کرام ، ملائکہ، قیامت کے دن، تقدیر پر ایمان ہو۔ تاہم خیال رہے کہ تفسیر عزیزی اور تبصیر الرحمٰن " الذین امنوا " کی تفسیر میں کتاب یعنی قرآن پاک پر ایمان کا ذکر ہے۔ لیکن قرآن پاک پر بھی ایمان اسی وقت مکمل ہوگا جب کہ تمام ایمانیات کی تصدیق حاصل ہوگی۔

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: اور اچھے عمل کیے، یعنی ایمان والوں اور اچھے عمل کرنے والوں کو بشارت دو۔

اچھے عمل کون سے ہیں؟

" وعملوا الصالحات من الفرائض والنوافل " ''اچھے عمل یہ ہیں فرائض ادا ہوں اور نوافل بھی''

فرائض سے مراد جیسا کہ پانچ وقت نماز ادا کرنا، رمضان کے روزے رکھنا، عمر میں ایک مرتبہ طاقت حاصل ہونے پر حج کرنا۔ اپنے مال کی زکوۃ ادا کرنا اور جب دشمن اچانک حملہ کر دے تو جہاد کرنا۔ نوافل سے مراد نفلی نماز ادا کرنا۔ نفلی روزے رکھنا " ومو اساۃ الفقراء وغیر ذلک من انواع البر " اور فقراء کی امداد کرنا اور ہر قسم کے نیکی کے کام کرنا اسی میں شامل ہے:

"والمراد عملوا الصالحات علی حسب الطاقة قال تعالیٰ فاتقوا الله ما استعطتم"
"نیک عمل کرنے سے مراد" طاقت کے مطابق عمل کرنا" ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی کا بھی یہی مطلب ہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو جتنی تمہیں طاقت ہو" (جلالین صاوی)

نیک عمل کی پہچان:

"العمل الصالح ما کان فیه اربعة اشیاء العلم والنیة والصبر والاخلاص"
"نیک عمل وہ ہوگا جس میں چار چیزیں پائی جائیں گی، علم، نیت، صبر اور اخلاص" (خازن)
"وقال عثمان بن عفان وعملوا الصالحات ای اخلصوا الاعمال یعنی عن الریاء"
"حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نیک عمل وہ معتبر ہوں گے جو ریاء کاری (دکھلاوے) سے پاک ہوں گے"

علمی نکتہ: ﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ کے بعد واؤ عاطفہ کو ذکر کیا پھر ﴿عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ کو معطوف بنایا۔ چونکہ معطوف اور معطوف علیہ میں مغائرت ہوتی ہے۔ اسی سے پتہ چل گیا کہ اعمال ایمان میں داخل نہیں۔ البتہ مؤمن کی پہچان اعمال صالحہ سے ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر اعمال کو ایمان میں داخل مانا جائے "لزم التکرار وهو خلاف الاصل" تکرار لازم آئے گا وہ خلاف اصل ہے۔ (از کبیر)

تنبیہ: ایمان اور اعمال صالحہ پر ہی موت آئے اس کے ذمہ کوئی حقوق العباد اور حقوق نہ ہوئے تو اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے مطابق اپنے فضل سے جنت عطا فرمائے گا اگرچہ اس پر کوئی چیز لازم نہیں۔ اور بندہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے سے قاصر ہے۔

اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ: بیشک ان کے لئے جنتیں ہوں گی۔ یعنی بشارت دو ان لوگوں کو جنہوں نے ایمان لایا اور اچھے عمل کئے کہ بیشک ان کو جنات حاصل ہوں گی۔ جنت کا معنی باغ ہے۔ یعنی ان کو باغات حاصل ہوں گے۔ جنت کا کچھ مختصر ذکر احادیث مبارکہ سے انشاء اللہ بعنوان "جنت کا منظر" سے آیۃ کریمہ کی لفظی بحث کے بعد آئے گا۔

جنتوں کی تعداد: رب تعالیٰ نے "جنات" جمع ذکر کیا ہے۔ اس سے اتنا تو واضح ہے کہ

جنتوں کی تعداد زیادہ ہے۔ البتہ ان کی تعداد کتنی ہے۔ اس میں تین قول مشہور ہیں:

ایک قول یہ ہے جنتیں کل چار ہیں۔ کیونکہ سورۃ الرحمٰن میں چار جنتوں کا ذکر ہے ﴿ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ ﴾ میں دو جنتوں کا ذکر ہے پھر ﴿ وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتَانِ ﴾ میں دو اور کا ذکر ہے

دوسرا قول یہ ہے کہ جنتوں کی کل تعداد سات ہے، اس پر ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد مبارک شاہد ہے:

" وجمعها و تنكيرها لان الجنان على ماذكره ابن عباس سبع جنة الفردوس وجنة عدن وجنة النعيم ودار الخلد وجنة الماوى ودار السلام وعليون "

''جنات'' کو جمع اور نکرہ لانے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ذکر فرمایا کہ جنتیں سات ہیں:

(۱) جنت الفردوس (۲) جنت عدن (۳) جنت نعیم (۴) دارالخلد
(۵) جنت ماوی (۶) دارالسلام (۷) علیون۔

تیسرا قول یہ ہے جنتیں کل آٹھ ہیں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ نے سات نام یہی ذکر فرمائے جو بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول میں ذکر کئے ہیں اور آٹھواں نام آپ نے "دار المقامة" ذکر فرمایا ہے۔ (از بیضاوی وعزیزی)

راقم کا موقف اس پر یہ ہے کہ جب مشہور ضابطہ یہ ہے کہ ''ذکر قلیل کثیر سے مانع نہیں'' تو اس ضابطہ کے مطابق جنتوں کی تعداد آٹھ ذکر کرنی ہی صحیح ہے۔ کیونکہ جہاں چار کا ذکر ہے وہاں بھی آٹھ کی نفی نہیں۔ اور جہاں سات کا ذکر ہے وہاں بھی آٹھ کی نفی نہیں۔

زیادہ تعداد میں جنتوں کی حکمت:

" وفي كل واحدة منها مراتب ودرجات متفاوتة على حسب تفاوت الاعمال والعمال "

''ہر ایک جنت میں مختلف مراتب اور مختلف درجات ہیں کیونکہ عمل کرنے والے بھی مختلف درجات رکھتے ہیں اور ان کے اعمال بھی مختلف درجات کے ہوتے ہیں'' (بیضاوی)

یعنی جب انسان عمل کے لحاظ پر مختلف درجات رکھتے ہیں اور رب تعالیٰ کی طرف سے بھی

انبیاء کرام کو تمام مخلوق سے زیادہ مرتبہ حاصل ہے۔ اور تمام انبیاء کرام سے افضل ہمارے نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ تو یہ بالکل عقل کا تقاضا ہے کہ جنت کے بھی اسی طرح مدارج ہوں۔ تاکہ زیادہ مرتبہ والے حضرات کا جنت میں بھی مقام عظیم المرتبۃ ہو۔ اور جس جس طرح اعمال میں فرق ہوگا۔ اسی طرح ان لوگوں کے جنت میں مقامات میں بھی فرق ہوگا۔

تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ : ان کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ یعنی ایمان والوں اور اچھے عمل کرنے والوں کو جنتوں کی بشارت دو جن میں نہریں جاری ہوں گی۔

﴿مِنْ تَحْتِهَا﴾ سے مراد "من تحت اشجارها" ہے یعنی جنتوں (باغات) کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔

جنت کی نہریں دنیا کی نہروں سے مختلف ہوں گی:

"عن مسروق النار الجنة تجری فی غیر اخدود"

"حضرت مسروق رضی اللہ عنہ سے مروی کی جنت کی نہریں کے لئے کھائیاں نہیں ہوں گی"

یعنی دنیا میں نہر کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے اردگرد بند باندھا جائے۔ اور درمیان میں پانی والی جگہ بنسبت طرفوں کے گہری ہو۔ لیکن جنت کی نہریں ہموار زمین میں خود بخود قدرت باری تعالیٰ سے صحیح سمت میں چلتی ہوں گی دائیں بائیں پانی وغیرہ کا نکلنا ممکن ہی نہیں ہوگا۔ (از بیضاوی)

خیال رہے کہ نہر سے مراد دریا ہیں کیونکہ نیل اور فرات کو نہر کہا گیا ہے جو دریا ہیں۔

جنت کی نہریں: رب تعالیٰ نے خود ہی واضح طور پر جنت کی نہروں کا ذکر فرما دیا ہے۔ جن کو یوں بیان کیا گیا ہے:

﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ فِیْهَاۤ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَیْرِ اٰسِنٍ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ یَتَغَیَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِیْنَ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى﴾

"احوال اس جنت کا جس کا وعدہ پرہیزگاروں سے ہے، اس میں ایسے پانی کی نہریں ہیں جو کبھی خراب نہ ہوں، اور ایسے دودھ کی نہریں ہیں جس کا مزہ نہ بدلے اور ایسے

شراب کی نہریں ہیں جس کے پینے میں لذت ہے، اور ایسے شہد کی نہریں ہیں جو صاف کیا گیا ہے''

یعنی جنت میں پانی کی نہریں بھی ایسے ہوں گی کہ وہ پانی کبھی بدبودار نہیں ہوگا، سڑے گا نہیں۔ اس پانی کے ٹھہرنے کی وجہ سے اس میں کسی قسم کے کوئی اثرات نہیں ہوں گے۔

دودھ کی نہریں بھی دنیا کے دودھ سے مختلف ہوں گی۔ دنیا میں دودھ کا مزہ بدل جاتا ہے، ترش ہو جاتا ہے، بدبودار ہو جاتا ہے۔ لیکن جنت میں دودھ کی نہروں پر اس قسم کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔

جنت کی شراب پاکیزہ ہوگی، اس میں نشہ نہیں ہوگا، پینے میں لذت حاصل ہوگی، جنت کے شراب میں دنیا کے شراب کے عیوب اور خرابیاں نہیں پائی جائیں گی۔

جنت میں خالص، صاف، شفاف شہد کی نہریں ہوں گی۔ اگرچہ دنیا میں بھی شہد میں شفاء ہے لیکن جنت کا شہد اور ہی عظیم ہوگا۔

كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِىْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا:

''جب انہیں جنتوں سے کوئی پھل رزق کے طور پر دیا جائے گا تو وہ یہ کہیں گی کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے بھی دیا گیا اور اس کے مشابہ دیا گیا''

﴿ اَلَّذِىْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ﴾ کا کیا مطلب ہے؟ اس میں ایک قول یہ ہے کہ ان کو جنت میں جو پھل دیا جائے گا وہ دنیا والے پھلوں کی طرح ہی ہوگا شکل کے لحاظ پر سیب، انار، انگور، انجیر وغیرہ ہی ہوں گے لیکن ان کا ذائقہ مختلف ہوگا۔ یعنی جنت والے پھلوں کا نام اور شکل تو دنیا والے پھلوں کی طرح ہوں گے، لیکن ان کی شان بہت بلند ہوگی۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ان کو جنت میں ایک مرتبہ جو پھل دیئے جائیں گے وہ دوبارہ جب دیئے جائیں گے تو نام اور شکل تو پہلے پھلوں والی ہوگی لیکن ذائقہ ہر مرتبہ مختلف ہوگا۔ (از بیضاوی)

دونوں قولوں کا مجموعہ ہی مقصد ہے:

یعنی جنت والے حضرات کو جنت میں جو پھل دیئے جائیں گے وہ دنیا کے پھلوں کے مشابہ ہوں

گے تا کہ وہ مانوس پھلوں کو دیکھ کر ان سے نفع حاصل کر سکیں۔ لیکن وہ ذائقہ کے لحاظ پر مختلف ہوں گی اور ان میں عظمت پائی جائے گی جو دنیا کے پھلوں میں نہیں۔

پھر جنت میں جتنی مرتبہ بھی پھل ان کو دیئے جائیں گے وہ پہلے سے ذائقہ میں مختلف ہوں گے اگر چہ رنگ اور شکل میں پہلے کی طرح ہوں گے۔

جنت کے پھلوں کے متعلق ارشاد مصطفوی:

" روی انه علیه الصلوۃ والسلام قال والذی نفس محمد بیده ان الرجل من اهل الجنة یتناول الثمرة لیاکلها فما هی واصلة الی فیه حتی یبدل الله مکانها مثلها "

" نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے بیشک جنتی لوگ کھانے کے لئے جو پھل بھی حاصل کریں گے وہ ان کے منہ تک نہیں پہنچے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس پھل کی مثل اور اسی درخت سے قائم فرما دے گا "

یعنی وہاں پھلوں کے لئے پھول لگنا، پھر آہستہ آہستہ ان کا پھل بننا پھر پکنا اس پر زمانہ گزرنا نہیں پایا جائے گا بلکہ ادھر پھل توڑا ادھر اسی کی مثل دوسرا تیار ہو گیا۔

وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا: (ان کو اسی کے مشابہ دیا گیا) یہ جملہ معترضہ ہے اور ماقبل کلام کی تقریر (پختگی، تاکید) کے لئے لایا گیا ہے۔ کیونکہ " الذی رزقنا من قبل " سے سمجھ آ چکا ہے کہ وہ کہیں گے کہ یہ رزق تو وہی ہے جو ہمیں پہلے دیا گیا۔ اسی سے پتہ تو چل گیا تھا کہ ان کے کہنے کا مقصد یہ ہوگا کہ یہ پھل دنیا کے پھلوں کے مشابہ ہیں یا ان کا مقصد یہ ہوگا کہ یہ پھل تو جنت میں حاصل ہونے والے پھلوں کے مشابہ ہیں۔ لیکن پہلے ضمناً یہ مقصد حاصل ہوا تھا اب صراحتاً اسے بیان کیا جا رہا ہے۔

" بہ " میں ضمیر لوٹ رہی ہے " رزق " کی طرف جو " رزقنا " سے حاصل ہوا یعنی " مارزقوا فی الدارین " یہ اسی کے مشابہ دیا گیا جو ان کو دنیا اور جنت میں پہلے دیا گیا۔ اور یا ضمیر لوٹ رہی ہے " رزق " کی طرف جو " رزقنا " سے حاصل ہوا۔ کہ ان کو اسی رزق کے مشابہ دیا گیا جو پہلے دیا گیا۔

تنبیہ: یہ مشابہت صرف رنگ اور شکل میں ہوگی ورنہ جنتی پھل اتنے اعلیٰ ہوں گی کہ انکے ساتھ مماثلت اور مشابہت تامہ دنیا کے پھلوں کو حاصل نہیں ہو سکے گی۔ کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشادگرامی ہے " لیس فی الجنة من اطعمة الدنیا الا الاسماء " جنت میں کوئی طعام بھی دنیا کے طعاموں سے نہیں ہوگا۔ صرف ان طعاموں کے نام دنیا کے طعاموں والے نام ہوں گے

علمی نکتہ: ابھی ذکر کیا ہے کہ ﴿ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ﴾ جملہ معترضہ ہے۔ لیکن اس کے متعلق طلباء کرام اس بات کو نہ بھولیں۔ حواشی سعدیہ میں یہ ذکر کیا گیا ہے:

" جعله اعتراضا مبنی علی رائی من یجوز الاعتراض فی آخر الکلام ومن لا یجوزه فیه یجعله تذییلا وهو ان یعقب الکلام بما یشتمل علی معناه توکیدا "

" جملہ معترضہ ان حضرات کے مذہب کے مطابق بنانا صحیح ہے جو کلام کے آخر میں بھی جملہ معترضہ کو لانے کے قائل ہیں۔ لیکن جو کلام کے آخر میں جملہ معترضہ کو تسلیم نہیں کرتے ان کے نزدیک یہ جملہ " تذییل " ہے۔ " تذییل " کا معنی ہوتا ہے دامن میں لانا یعنی ایک جملہ کے بعد دوسرا اسی کے معنی کی وضاحت اور تاکید کے لئے لایا جائے "

(از بیضاوی وشیخ زادہ)

وَلَهُمْ فِيْهَا اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ : " اور ان جنتیوں کے لئے جنتوں میں پاکیزہ زوجہ ہوں گی "

اَزْوَاجٌ: جمع ہے زوج کی، زوج مذکر اور مؤنث دونوں پر بولا جاتا ہے۔ اس مقام پر مراد مؤنث ہے۔

لَهُمْ: میں ضمیر ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یعنی ایمان والے اور نیک عمل کرنے والے جن کے لئے بشارت دینے کا حکم دیا گیا ہے وہ جنتی لوگ مراد ہیں۔

فِيْهَا: میں ضمیر جنات کی طرف لوٹ رہی ہے۔ کہ ان کو جنتوں میں پاکیزہ زوجہ حاصل ہوں گی۔

مُطَهَّرَةٌ: پاکیزہ ہوں گی۔ یعنی " مطهرة مما یستقذر من النساء ویذم من احوالهن " ان کو ہر اس گندگی سے پاکیزگی حاصل ہوگی جو دنیا کی عورتوں میں پائی جاتی ہے۔ اور ان تمام حالات سے پاکیزہ ہوں گی جو دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ان کی مذمت کا سبب ہیں۔

طبعی قذر (گندگی) سے پاک ہوں گی:

" مطھرات الاجسام مما یستکرہ طبعا کالدن والبزاق والمخاط " ان کے جسم ہر اس چیز سے پاک ہوں گے جو طبعی طور پر ناپسند ہوں۔ یعنی میل کچیل سے وہ پاک ہوں گی۔ بار بار تھوکنا جسے لوگ ناپسند کرتے ہوں اس سے وہ پاک ہوں گی۔ اور ناک ان کا نہیں بہہ رہا ہوگا جسے دیکھ کر لوگ پسند نہ کریں بلکہ ایسی صاف ستھری ہوں گی کہ ان کے خاوندان کی طرف بہت زیادہ میلان کریں گے:

" ومما یستکرہ شرعا کالحیض والنفاس والبول والغائط والمذی "

" ان کے جسم ان چیزوں سے بھی پاک ہوں گے جو شرعاً ناپاک سمجھی گئی ہیں جیسے حیض، نفاس، پیشاب، پاخانہ اور مذی منی وغیرہ "

" ومطھرات الاخلاق لیس فیھن شئی من الاخلاق الذمیمۃ کالحسد والبخل والکبر والعجب ونحوھا "

" اور وہ پاکیزہ اخلاق والی ہوں گی ان کے اخلاق میں کسی قسم کی برائی نہیں ہوگی۔ جیسے حسد، بخل، تکبر اور اپنے آپ پر اترانا۔ یہ تمام برے اخلاق ہیں ان سے وہ پاک ہوں گی "

" ومطھرات الافعال لا یصدر عنھن فعل تسبیح " (بیضاوی وشیخ زادہ)

" اور ان کے افعال پاکیزہ ہوں گی ان سے کسی قسم کا کوئی برا فعل سرزد نہیں ہوگا "

فائدہ: جو عورت جس مسلمان کے نکاح میں مرے گی وہ جنت میں اسی کے ساتھ رہے گی۔ یعنی عورت اپنے آخری مسلمان خاوند کے ساتھ جنت میں رہے گی۔ اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد بھی آپ کی ازواج مطہرات سے نکاح کرنا حرام تھا تاکہ وہ آپ کے ساتھ ہی جنت میں رہیں۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ نبی کریم ﷺ کو شہداء سے بھی اعلیٰ حیات حاصل ہے۔ زندہ کی زوجہ بیوہ نہیں ہوتی کہ وہ کسی اور کے ساتھ نکاح کرے۔

خیال رہے کہ شہداء کو قبر میں زندگی حاصل ہے لیکن دنیاوی طور پر ان پر احکام فوت شدہ والے جاری ہوتے ہیں۔ اسی لئے ان کی بیوہ نکاح کر سکتی ہے شہید کی زندگی پر بحث ان شاء اللہ مناسب مقام پر آئے گی۔

جس مسلمان عورت کا خاوند (العیاذ باللہ) کافر ہو کر مر گیا۔ یا وہ عورت جو کنواری ہی فوت ہو گئی

ان کا نکاح جنتیوں میں سے کسی شخص سے کردیا جائے گا جو جنت کو بھرنے کے لئے اس وقت پیدا کئے جائیں گے۔ جس شخص کی بیوی (العیاذ باللہ) کافر ہو کر مرگئی یا وہ شخص کنوارا ہی فوت ہوگیا تو اس کو صرف جنت کی حوریں حاصل ہوں گی دنیاوی کوئی عورت اس کے نکاح میں نہیں ہوگی۔ جس شخص کی بیوی مسلمان ہونے کی حالت میں ہی فوت ہوئی اسے وہ اپنی بیوی بھی حاصل ہوگی اور جنتی حوریں بھی لیکن دنیاوی عورت جنتی حوروں سے حسن و جمال میں کسی طرح بھی کم نہیں ہوں گی۔

فائدہ جلیلہ: روایات میں آیا ہے کہ حضرت مریم عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ، اور حضرت آسیہ فرعون کی بیوی جنت میں نبی کریم ﷺ کے نکاح میں آئیں گی۔ (از نعیمی)

جنت میں ایک عورت کو کئی خاوند حاصل نہیں ہوں گے:

اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ فرماتے ہیں جنت میں ایک مرد کو کئی عورتیں دی جائیں گی، لیکن ایک عورت کو کئی مرد نہیں دیئے جائیں گے کیونکہ یہ بے حیائی ہے۔ ایک مخدوم کے چند خادم ٹھیک ہیں مگر ایک خادم کے چند مخدوم ٹھیک نہیں ہاتھ میں انگوٹھا جو نہر ہے ایک ہے انگلیاں جو مادہ ہیں وہ کئی ہیں۔ (نعیمی)

اسی مسئلہ کو غزالی دوران حضرت علامہ احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ نے بڑے خوبصورت انداز میں یوں بیان فرمایا:

اگر کہا جائے کہ ﴿وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ﴾ میں مرد و عورت دونوں شامل ہیں کیونکہ ہر ایک دوسرے کا زوج یعنی جوڑا ہے۔ جس طرح ایک مرد کو جنت میں بہت سی عورتیں ملیں گی اسی طرح ایک عورت کو بھی وہاں بہت سے مرد ملنے چاہئیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جنت میں جسے جو کچھ ملے گا وہ اس کی خواہش کے مطابق ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنفُسُكُمْ﴾ (حم سجدہ آیۃ نمبر ۳۱)

''یعنی جنت میں تمہارے لئے وہ سب کچھ ہوگا جس کی تم خواہش کروگے''

لیکن مخفی نہ رہے کہ جنت میں کسی اہل جنت کے دل میں کوئی ایسی خواہش پیدا نہ ہوگی جو اصل فطرت کے خلاف ہو کیونکہ وہ عیب ہے جس سے جنتی پاک ہوں گے۔ دنیا میں کوئی غیر فطری خواہش

لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو سکتی ہے لیکن جنت میں کسی اہل جنت کے دل میں خلاف فطرت خواہش کا پیدا ہونا ممکن ہی نہیں۔

مرد کی اصلِ فطرت ایک سے زیادہ عورتوں کی متقاضی (تقاضا کرنے والی) ہو سکتی ہے یہ تقاضا اس کے حق میں عیب نہیں۔ لیکن عورت کی اصلِ فطرت بیک وقت ایک سے زیادہ مردوں کی متقاضی نہیں ہو سکتی۔ اگر دنیا میں کوئی عورت اس قسم کی غیر فطری خواہش اپنے دل میں رکھتی ہے تو وہ یقیناً عیب ہے۔ جنت میں اس عیب کا تصور کسی بھی جنتی عورت کے حق میں نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا وہاں کوئی عورت ایک سے زائد کسی مرد کی خواہش مند نہ ہوگی۔ ایسی صورت میں کسی جنتی عورت کو بہت سے مرد ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جس طرح عورتیں مردوں کے لئے نعمت ہیں اسی طرح مرد بھی عورتوں کے لئے یقیناً نعمت ہیں اور زیادتی نعمت کا تقاضا فطری خواہش ہے۔ اس لئے اگر عورتوں کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو تو خلاف فطرت نہ ہوگی۔ میں عرض کروں گا کہ اگر یہی سوال کسی سلیمۃ الفطرت حیادار عفت مآب عورت کے سامنے رکھا جائے تو وہ شرم و حیا سے پسینہ پسینہ ہو جائے گی۔ اور اسی کی زبان حال جواب دے گی کہ سائل اپنے والد کو اپنے حق میں نعمت سمجھتا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں سمجھتا تو ناخلف ہے اور اگر وہ سمجھتا ہے کہ میرا والد میرے حق میں اللہ کی نعمت ہے تو کیا وہ اس نعمت کی زیادتی کا طلب گار ہوگا اور اس کی فطرت ایک سے زیادہ والد کی خواہش مند ہوگی؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو وہ سمجھ لے کہ ایک حیادار عورت ایک سے زیادہ خاوند کی خواہش مند نہیں ہو سکتی۔ (النبیان مع البیان)

وَهُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ: اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یعنی جنت والے حضرات جنتوں میں ہمیشہ رہیں گے اور ان کو جنتوں سے نکالا نہیں جائے گا، کیونکہ اخروی زندگی کا انقطاع نہیں ہونا۔ اور نہ ہی کسی کو انعام عطا کرنے کے بعد انعام کو چھینا جانا ہے۔

خیال رہے کہ اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں۔ لفظی بحث یہاں کی گئی ہے کہ صرف لفظ "خالدون" سے ہی یہ معنی حاصل ہو جاتا ہے یا کہ اس کے ساتھ "ابدا" لفظ بڑھائیں تو یہ معنی حاصل ہوتا ہے۔ اور صرف "خالدون" آئے تو اس کا معنی زیداہ دیر ٹھہرنا ہوتا ہے۔ تاہم اس بحث کو غیر ضروری سمجھ کر ترک کیا جا رہا ہے۔ مسئلہ وہی ہے جو ابتدائی سطروں میں تحریر کر دیا ہے۔

جنت کا منظر: اجمال کے بعد کچھ تفصیلی طور پر جنت کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ تاکہ قرآن پاک کی مختلف آیات مبارکہ اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں جنت کا منظر سامنے آ سکے۔ اور بدمذہب لوگوں کے شکوک وشبہات کا ازالہ بھی ہو سکے کہ جنت ایسی نہیں ہوگی، جیسے مولوی بیان کرتے ہیں، یہ انکی بیہودگی علماء کو نقصان تو نہیں پہنچا سکتی البتہ انہیں دین کا باغی بنا سکتی ہے۔ ہاں یہ کام صرف یہود ونصاریٰ اور ہنود کے ایجنٹ ہی کر سکتے ہیں۔ کوئی مسلمان قرآن وحدیث کی مخالفت کی جرات نہیں کر سکتا۔

جنت کی عظمت

اللہ کے انعام کی عظمت انسانوں کی سمجھ سے بالاتر ہے:

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی (حدیث قدسی) ہے:

"اعددت لعبادی الصالحین مالاعین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر، واقرؤا ان شئتم ﴿ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ ﴾"

(بخاری، مسلم، مشکوۃ باب صفۃ الجنۃ واھلھا)

میں نے اپنے بندوں کے لئے ایسا مقام تیار کر رکھا ہے جو کسی آنکھ نے دیکھا نہیں اور کسی کان نے سنا نہیں اور کسی دل پر کھٹکا نہیں، اگر تم چاہتے ہو تو (قرآن پاک کی یہ آیت) پڑھ لو۔ (جس کا مطلب ہے) کوئی نفس نہیں جانتا، جو ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک ان کے لئے مخفی کر کے رکھی ہوئی ہے۔

اس سے مراد خصوصی ثواب اور انعام واکرام ہے:

"ای نوع عظیم من الثواب ادخر اللہ لاولئک واخفاہ من جمیع خلائقہ لایعلمہ الا ھو مما تقربہ عیونھم"

یعنی ثواب کی عظیم قسم جو اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کے لئے تیار کر رکھی ہے اس کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے مخلوق میں سے کوئی ایک بھی نہیں جانتا، یہ وہ عظیم ثواب اور مرتبہ ہوگا جس سے نیک لوگوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔

"بلغک اللہ امنیتک حتی ترضی بہ نفسک وتقر عینک ولاتستشرف الی غیرہ"

یعنی اے نیک انسان اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری تمام خواہشوں پر کامیاب کر دے گا یہاں تک کہ تو راضی ہو جائے گا، اور تیری آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی تجھے غیر کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں رہے گی

جنت کا کم از کم مقام دنیا کی تمام نعمتوں سے اعلیٰ ہے:

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" موضع سوط فی الجنة خیر من الدنیا ومافیھا "

(بخاری ، مسلم ، مشکوٰۃ باب صفة واھلھا)

جنت میں کوڑا (چابک ، چھڑی) رکھنے کا مقام دنیا اور اس کی تمام نعمتوں سے بہتر ہے۔ چونکہ جنت کی نعمتیں باقی رہنے والی ہیں اور اس کی نعمتیں فنا ہونے والی ہیں۔ یہ یقینی بات ہے کہ باقی رہنے والی چیز فنا ہونے والی سے بہتر ہے۔

" قال ابن الملک سوی کلام اللہ وصفاته و جمیع انبیائه"

ابن الملکؒ نے کہا ہے کہ اگر چہ دنیا میں اللہ کے کلام کا نزول بھی ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ صفات کا ظہور بھی ہوا ہے اور انبیاء کرام بھی تشریف لائے لیکن یہ حکم ان کو شامل نہیں، ان کے سواء باقی دنیا کی تمام نعمتوں یعنی مال و دولت، عالیشان محلوں سے جنت کا ادنی درجہ بھی اعلیٰ ہوگا۔

کوڑے یعنی چابک یا چھڑی کو ذکر کرنے میں خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اسے حقیر سمجھا جاتا ہے جب کوئی سوار اترنا چاہتا ہے تو وہ پہلے اپنی چھڑی زمین پر پھینکتا ہے پھر خود اترتا ہے۔ پہلے اس کے چھڑی پھنکنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ دوسرے ساتھیوں کو معلوم ہو جائے کہ یہاں ہی اترنا ہے وہ آگے نہ چلے جائیں، لیکن چھڑی کو زمین پر پھینکنے سے اس کی اور اس کے رکھنے کی جگہ کی حقارت بھی معلوم ہوگئی اس لئے واضح فرمایا کہ جنت ایسا مقام بھی دنیا کی عظیم الشان نعمتوں سے ارفع و اعلیٰ ہوگا۔

جنت کے درخت کی عظمت:

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" ان فی الجنة شجرة یسیر الراکب فی ظلھا مائة عام لا یقطعھا "

بیشک جنت میں ایک درخت ہے جس کے سائے میں چلنے والا سوار اس کو ایک سو سال میں بھی قطع نہیں کر سکے گا اور جنت میں تمہارے ایک کمان کی مقدار کا مقام بھی سورج کے مقام طلوع اور غروب سے بہتر ہے۔

(بخاری ، مسلم ، مشکوٰۃ باب صفة الجنة واھلھا)

جنت کے درخت کا نام ”طُوبیٰ “ ہے جس طرح ابن جوزی نے فرمایا ”یقال انھا طوبیٰ “ کہا جاتا ہے بیشک وہ طوبیٰ ہے۔خیال رہے درخت کے سائے میں چلنے سے مراد اس کے نیچے کنارے پر چلنا ہے کیونکہ دنیا میں سایہ کا اعتبار سورج سے ہے، خصوصا درخت کے سایہ میں اس وقت انسان چلتا ہے جب دھوپ اور سورج کی تمازت (گرمی) سے بچنا چاہتا ہو، لیکن جنت کی تعریف میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ” لا یرون فیھا شمسا ولا زمھریرا “ جنتی لوگ جنت میں نہ دھوپ دیکھیں گے اور نہ سردی۔ اور ممکن ہے کہ درخت کے اوپر اوپر نورانیت کا ظہور ہو اور اس کے نیچے حجاب ہو جو سایہ نظر آ رہا ہو جس طرح ہمارے محاورہ میں رات کو چراغ، بجلی کے قمقموں کی روشنی میں نظر آنے والے عکس کو بھی سایہ کہہ دیا جاتا ہے اسی طرح صبح صادق سے لیکر طلوع شمس تک سورج کی شعاعوں کے مقابل اس وقت کو بھی ظل (سایہ) کہا گیا ہے، رب تعالیٰ نے فرمایا ” وظل ممدود “ پھیلایا ہوا ظل (سایہ) اس سے مراد یہی وقت ہے۔

جس طرح انسان شکار کرنے کے لئے جائیں تو وہ درخت کے سایہ میں یا اور کسی جگہ آرام کرنے کے لئے اپنا کمان رکھ کر اپنی اپنی جگہ مختص کرتے ہیں اسی طرح نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جنت میں اتنی جگہ جتنی جگہ تم کمان رکھتے ہو وہ طلوع شمس (سورج) اور غروب شمس کے درمیان مقام سے اعلیٰ ہے۔ یعنی تمام دنیا سے اعلیٰ ہے ”وفی الجامع ان فی الجنة لشجرة یسیر الراکب الجواد المضمر السریع “ یعنی بخاری میں مزید وضاحت موجود ہے کہ جنت میں درخت کے نیچے چلنے والے سوار سے مراد وہ سوار ہے جو ایسے گھوڑے پر سوار ہو جس کے جسم کو بہت پختہ کیا گیا ہو اور وہ بہت تیز چلتا ہو، عمدہ قسم کا گھوڑا ہو۔

☆☆☆

جنت کیسی ہے؟

جنت میں شیشے کے خیمے:

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" ان للمؤمن فی الجنة لخیمة من لؤلؤ واحدة مجوفة "

جس کا طول وعرض ساٹھ ذراع (نوے فٹ) ہوگا، (ایک روایت طول ساٹھ ذراع کا ذکر ہے اور دوسری راویت میں عرض ساٹھ ذراع کا ذکر ہے) اور ہر کونے میں اسکی اھل ہوں گی کوئی بعض دوسرے بعض کو نہیں دیکھ سکے گا، مومنین ان کے پاس جائیں گے دو جنتیں چاندی کی ہوں گی اور انکے برتن اور ہر چیز چاندی کی ہوگی، اور دو جنتیں سونے کی ہوں گی ان کے برتن اور انکی تمام اشیاء سونے کی ہوں گی، جنت عدن میں مومن قوم اور رب کو دیکھنے میں صرف رداء (چادر) کبریائی حائل ہوگی۔

(بخاری، مسلم، مشکوۃ باب صفة الجنة واهلها)

" وقد یکون لارباب الکمال جنتان من ذهب وجنتان من فضة " (مرقاۃ المفاتیح)

ارباب کمال کو دو جنتیں چاندی کی اور دو سونے کی حاصل ہوں گی۔

اس طرح چار جنتیں ہوں گی لیکن ان کے طبقات آٹھ ہیں جیسے شروع میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ انسان جب جنت میں ہوگا اسکی جسمانی کدورت اٹھالی جائے گا۔ حسی موانع ختم ہو جائیں گے لیکن پھر اللہ تعالیٰ کے جلال کا اتنا رعب ہوگا اور اسکی نورانیت کا اتنا غلبہ ہوگا کہ سوائے اسکی رحمت او مہربانی کے انسان رب تعالیٰ کو دیکھ نہیں سکے گا، یہی رداء کبریائی ہے۔ (مرقاۃ المفاتیح)

جنت الفردوس سب سے اعلیٰ جنت ہے:

حضرت عبادہ بن صامتؓ فرماتے ہیں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جنت میں ایک سو درجہ ہے اور ہر درجہ میں اتنی وسعت ہے جس طرح زمین وآسمان کے درمیان وسعت ہے۔

" والفردوس اعلاها درجة منها تفجر انهار الجنة الاربعة ومن فوقها یکون العرش فاذا سألتم الله فاسئلوا الفردوس "

(ترمذی، مشکوۃ باب صفة الجنة واهلها)

فردوس تمام سے اعلیٰ درجہ والی ہے، اس میں جنت کی چار نہریں جاری ہیں۔ ان تمام (جنتوں کے) اوپر عرش ہے۔ جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کرو تو ''فردوس'' کا سوال کیا کرو۔

وضاحت حدیث: حدیث شریف میں ''مائة درجة'' ایک سو درجہ کا ذکر ہے لیکن بیہقی میں حضرت عائشہؓ سے مرفوع حدیث مروی ہے:

"عدد درج الجنة عدد آی القرآن فمن دخل الجنة من اهل القرآن فليس فوقه درجة"

جنت میں قرآن پاک کی آیتوں کے مطابق درجات ہیں، قرآن پاک پڑھنے والے اور اس پر عمل کرنے والے جس درجہ میں داخل ہوں گے اس کے اوپر کوئی درجہ نہیں۔

ان حدیثوں میں تطبیق اس طرح ہے کہ جنت میں بہت سے مدارج ہوں گے۔ سو کا ذکر کثرت کے لئے ہے۔ تعداد کے لئے نہیں۔ اہل عرب ستر، سو وغیرہ الفاظ سے عام طور پر کثرت والا معنی لیتے تھے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ کثیر تعداد میں سے، سو درجے ایک ایک شخص کو حاصل ہوں۔

فردوس کا لغوی معنی ایسا باغ جس میں ہر قسم کے درخت اور انگور کی بیلیں ہوں۔ لیکن جنت کے طبقات میں فردوس کو وہ خصوصیت اور امتیاز حاصل ہوگا جو دوسرے کسی طبقہ کو حاصل نہیں ہوگا اسی وجہ سے امت سے مصطفیٰ ﷺ کو اس کی طلب کرنے کی تعلیم دی گئی ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کی امت تمام امتوں سے اعلیٰ تو اس کو تمام جنتوں سے اعلیٰ جنت طلب کرنی چاہئے۔

نبی کریم ﷺ کی امت کی برتری کا تذکرہ رب تعالیٰ نے اس طرح فرمایا:

ہ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ہ

(پ ۲ / ۱)

اور بات یوں ہی ہے کہ ہم نے کیا سب امتوں سے افضل کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ۔

جب پہلی امتیں تبلیغ انبیاء کا انکار کر دیں گی تو رب تعالیٰ باوجود علم کے منکرین پر حجت قائم کرنے

کیلئے تبلیغ پر انبیائے کرام سے گواہ طلب کرے گا۔ انبیائے کرام امت محمد ﷺ کو گواہ پیش کریں گے۔ پہلی امتیں کہیں گی۔ تم ہمیں کیسے پہچانتے ہو؟ تو یہ کہیں گے کہ ہمیں اپنے سچے نبی نے اللہ کا کلام اس کی کتاب کے ذریعے پہنچایا جس سے ہمیں علم حاصل ہوا۔ پھر ان پر نبی کریم ﷺ کو گواہی دینے کیلئے لایا جائے گا، آپ اپنی امت کے حق میں نگہبان کی حیثیت میں شہادت دیں گے

خیال رہے کہ '' نگہبان '' کا لفظ صرف اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلویؒ کے ترجمہ میں ہے باقی کسی ترجمے میں نہیں، یہ لفظ آپ نے کیوں زیادہ فرمایا؟ اور باقی مترجمین کس طرح علمی نقطہ سے غافل رہے؟ یہ وضاحت میں نے اپنی کتاب تسکین الجنان میں کی ہے وہاں دیکھیں۔

چار نہریں:

﴿ فِيهَا أَنْهَارٌ مِّن مَّآءٍ غَيْرِ ءَاسِنٍ وَأَنْهَارٌ مِّن لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُۥ وَأَنْهَارٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشَّٰرِبِينَ ۝ وَأَنْهَٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى " (پ۲۶/۶)

ان (جنتوں) میں ایسی پانی کی نہریں ہیں جو کبھی خراب نہ ہوں اور ایسی دودھ کی نہریں ہیں جس کا مزہ نہ بدلے اور ایسی شراب کی نہریں ہیں جس کے پینے میں لذت ہے۔ اور ایسی شہد کی نہریں ہیں جو صاف کیا گیا ہے۔

ایک نہر پانی کی ہے اور وہ پانی دنیا کے پانیوں سے مختلف ہے کیونکہ زیادہ دیر ٹھہرنے کی وجہ سے اس کا ذائقہ اور بو نہیں بدلیں گے حالانکہ دنیا کے پانیوں میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے گل سڑ جاتا ہے سب سے پہلے پانی کا اس لئے ذکر کیا کہ انسان دنیا میں بغیر پانی کے زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ سب سے زیادہ پانی کی ضرورت ہی در پیش آتی ہے۔

دوسری نہر دودھ کی ہوگی وہ دودھ بھی دنیا کے دودھ سے مختلف ہوگا، نہ کھٹا ہوگا اور نہ ہی اس میں بدبو پیدا ہوگی بلکہ وہ صرف قدرت سے ہی دودھ معرض وجود میں آئے گا، کیونکہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ دودھ کی نہر جانوروں سے دوہا ہوا دودھ نہیں ہوگا، اسی طرح حضرت سعید بن جبیرؒ نے فرمایا کہ جنت کا دودھ گوبر اور خون کے درمیان نالی سے پیدا ہونے والا نہیں ہوگا۔

دودھ کا ذکر دوسرے مرتبہ پر کیا کیونکہ دودھ کو کثیر اہل عرب طعام کی جگہ بھی استعمال کرتے تھے اس لئے پینے کے بعد گویا کہ کھانے کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

تیسری نہر شرابا طھورا کی ہوگی دنیا کے شراب نشہ والے ہوتے ہیں ان میں بدبو ہوتی ہے بنانے والے کی میل کچیل کی آمیزش کا بھی قوی گمان ہوتا ہے لیکن جنتی شراب ان تمام چیزوں سے پاک ہوگا۔

تیسرے مرتبہ پر اس کا ذکر بھی اس لئے کیا گیا ہے کہ عام طور پر کھانے کے بعد تلذذ والی چیز کا استعمال ہوتا ہے اس لئے جنت میں بھی دودھ کی غذایت کے بعد شراب سے لذت دی جائے گی لیکن وہ شراب پاکیزہ ہوگا، صاف ستھرا مشروب ہوگا، نشہ سے پاک ہوگا۔

چوتھی نہر شہد کی ہوگی لیکن وہ شہد خالص صاف شفاف ہوگا، دنیا کے شہد میں بعض اوقات لوگ شمع کی یا چینی کی آمیزش کر کے شہد کو خراب کر دیتے ہیں جو خالص نہیں رہتا، اسی طرح دنیا کے شہد میں شہد کی مکھیوں کے فضلات کی آمیزش بھی ہو جاتی ہے لیکن جنتی شہد ان تمام چیزوں سے پاک ہوگا کیونکہ وہ فقط قدرت سے معرض وجود میں آیا ہوا ہوگا، ظاہری اسباب کو اس میں دخل نہیں ہوگا۔

شہد کا ذکر چوتھے مرتبہ پر کیا کیونکہ اس میں شفاء ہے۔ مرض میں اس کو استعمال کیا جاتا ہے۔ عام طور پر کھانے پینے کی بے احتیاطی پر مرض لاحق ہوتی ہے اور دواء کی ضرورت درپیش آتی ہے، اس لئے اس کا ذکر سب کے بعد عام عادت کے مطابق ہے۔ (تفسیر روح المعانی)

ایک حدیث پاک میں نبی کریم ﷺ نے جنت کی چار نہروں کے نام دنیا کی نہروں کے مطابق بیان فرمائے ہیں کہ جنت میں ایک نہر کا نام نیل ہے دوسری کا دجلہ، تیسری کا فرات اور چوتھی کا سیحان بعض جگہ سیحون آیا ہوا ہے۔ یہ صرف ناموں کی مطابقت ہے اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ دنیا کے دریا شائد جنت کے ہی ہیں۔

بیہقی میں حضرت کعب سے مروی ہے:

" نهر النيل نهر العسل و نهر دجلة نهر اللبن و نهر الفرات نهر الخمر و نهر سيحان نهر الماء في الجنة " (تفسیر روح المعانی)

جنت میں نہر نیل شہد کی نہر ہے۔ نہر دجلہ دودھ کی نہر ہے، نہر فرات شراب کی نہر ہے اور نہر سیحان / سیحون پانی کی نہر ہے۔

جنت کا بازار: حضرت انسؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

" ان فی الجنة لسوقا یأتونها کل جمعة "

بیشک جنت میں ایک بازار ہے جس میں جنتی لوگ ہر جمعہ کو آئیں گے ان پر شمالی جانب سے ہوا چلے گی ان کے چہروں اور کپڑوں پر (کستوری اور ہر قسم کی خوشبوئیں) پھیلادے گی۔ "فیرجعون الی اهلهم وقد ازدادوا حسنا وجمالا " اپنے اھل کی طرف جب یہ لوٹ کر آئیں گے تو وہ کہیں گے " والله لقد ازددتم بعدنا حسنا وجمالا " قسم ہے اللہ تعالیٰ کی تمہارا حسن و جمال ہمارے بعد زیادہ ہوگیا ہے اور یہ انہیں کہیں گے۔

" وانتم والله تعالی زدتم بعدنا حسنا وجمالا . (مسلم، مشکوۃ باب صفة الجنة واهلها)

قسم ہے اللہ تعالیٰ کی تمہارا بھی حسن و جمال ہمارے بعد زیادہ ہوگیا ہے۔

وضاحتِ حدیث: قیامت میں بھی لوگ علماء کے محتاج ہوں گے، اگرچہ قیامت میں سورج اور رات، دن کا وجود نہیں ہوگا لیکن جمعہ اور عیدین کا اعتبار کرنا یا مبارک دنوں میں زیارت کرنا وغیرہ ان تمام چیزوں کی دارومدار اس پر ہوگی " وانما یعرف وقت اللیل والنهار بارخاء استار الانوار ورفعها " جنت میں رات اور دن کی پہچان نور سے ہوگی، جب نور پر پردے لٹکا دئے جائیں گے تو رات ہوگی اور جب پردے ہٹا دئے جائیں گے تو دن ہوگا۔

بیشک اہل جنت میں محتاج ہوں گے، اس وجہ سے کہ وہ ہر جمعہ اللہ تعالیٰ کی زیارت کریں گے فیقول لہم تمنوا علی ماشئتم، رب تعالیٰ انہیں کہے گا جو بھی چاہتے ہو اسی چیز کی تمنا کرو یعنی مجھ سے طلب کرو، اب جنت والوں کو معلوم نہیں ہوسکے گا کہ وہ کسی چیز کی طلب کریں " فیلتفتون الی العلماء فیقولون ماذا نتمنی فیقولون تمنوا علیه کذا و کذا " وہ علماء کی طرف توجہ کریں گے، ان سے پوچھیں گے کہ ہم رب تعالیٰ سے کیا مانگیں؟ علماء انہیں بتائیں گے کہ تم فلاں فلاں چیزوں کی طلب کرو " فهم یحتاجون الیهم فی الجنة کما یحتاجون الیهم فی الدنیا " وہ

جنتی لوگ جنت میں علماء کے اسی طرح محتاج ہوں گے جیسے وہ دنیا میں ان کے محتاج تھے۔

جنت میں جمعہ کا نام یوم المزید (زیادہ نعمتوں کے حاصل ہونے کا دن) بھی ہوگا، اس سے واضح ہوا کہ جمعہ کے دن کو دنیا کی طرح جنت میں بھی باقی دنوں پر سرداری حاصل ہوگی۔

اہل عرب شمالی جانب سے چلنے والی ہوا کو برکت والی اور بارش والی ہوا قرار دیتے ہیں اس لئے ذکر فرمایا کہ ان کے چہروں اور کپڑوں کی شمالی جانب سے چلنے والی ہوا کستوری اور طرح طرح کی خوشبوؤں سے معطر کردے گی جس سے ان کی شکل وصورت اور زیب وزینت میں حسن و جمال زیادہ ہو جائے گا، چونکہ تمام اہل جنت جمعہ کے دن بازار میں جائیں گے اس لئے جب لوٹیں گے تو قبیلہ کا سربراہ اپنی جنتی ازواج سے کلام کرے گا وہ اس سے کلام کریں گی کہ ان کا حسن و جمال زیادہ ہو چکا ہے، اپنے حسن و جمال کی زیادتی کا علم تو ہو نہیں سکے گا، دوسرے کو دیکھ کر کہیں گے تمہارا حسن و جمال زیادہ ہو گیا ہے حالانکہ ہر ایک کا حسن و جمال زیادہ ہوگا۔

اہل جنت کے فضائل

جنت میں اعمال کے مطابق نورانیت کا حصول ہوگا:

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جنت میں سب سے پہلے داخل ہونے والی جماعت کے لوگ چودھویں کے چاند کی طرح ہوں گے۔ پھر ان کے بعد بہت زیادہ چمکتے ہوئے ستارے کی طرح ہوں گے" **قلوبھم علی قلب رجل واحد لا اختلاف بینھم ولا تباغض** "ان کے دل ایک آدمی کے دل ہوں گے، ان میں کوئی اختلاف اور بغض نہیں ہوگا۔

(بخاری، مسلم، مشکوۃ باب صفة الجنة)

سب سے پہلی جماعت انبیاء کرام کی ہوگی جن کے چاند کی طرح چمکتے چہرے ہوں گے لیکن سب سے زیادہ نورانیت مصطفےٰ ﷺ کو حاصل ہوگی" **ولعل دخولھا علی صورۃ الشمس مختص بنبینا** ﷺ باقی انبیائے کرام چاند کی طرح ہوں گے لیکن سورج کی طرح آب وتاب سے جگمگاتے چہرے سے دخول ہمارے نبی کریم ﷺ سے ہی خاص ہے۔ (مرقاۃ المفاتیح)

جب مشہور بات یہ ہے کہ ''نور القمر مستفاد من نور الشمس '' چاند کی نورانیت سورج کی نورانیت سے حاصل ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب چاند اور سورج کے درمیان زمین حائل ہو جائے تو چاند کو گرہن لگ جاتا ہے یعنی وہ بے نور ہو جاتا ہے۔ اس ضابطہ کو سمجھنے کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ انبیاء کرام کو چاند کی صورت عطا کر کے اور نبی کریم ﷺ کو سورج کی صورت عطا کر کے یہ ظاہر کیا جائے گا کہ تمام انبیاء کرام کو نورانیت مصطفٰے کریم ﷺ کے واسطہ سے حاصل ہو رہی ہے۔

اس جماعت کے بعد آنے والے " یقربون تلک الزمرۃ فی قرب المرتبۃ من الاولیاء والعلماء والشھداء والصلحاء " (مرقاۃ المفاتیح)

وہ لوگ ہوں گے جو انبیائے کرام کے مرتبہ کے لحاظ پر قریب ہوں گے وہ اولیائے کرام اور علمائے عظام، شہدائے کرام اور نیک متقی پرہیزگار لوگ ہوں گے۔

جنتی لوگوں میں اتفاق واتحاد ہوگا، ایک دوسرے سے محبت ہوگی، تمام لوگوں کے دل ایک آدمی کے دل کی طرح ہوں گے یعنی جس طرح کسی آدمی کو اپنے آپ سے اختلاف نہیں ہوتا اس طرح وہاں ایک دوسرے سے کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔ اور نہ ہی دلوں میں کوئی کھوٹ، کینہ ہوگا یہی وجہ ہوگی کہ کوئی ایک دوسرے سے بغض وعناد نہیں رکھے گا۔

جنت کا حسن و جمال: حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں: میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ مخلوق کو کس چیز سے پیدا کیا گیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: '' من الماء '' پانی سے۔ ہم نے پوچھا جنت کو کس چیز تخلیق کیا گیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

" لبنۃ من ذھب ولبنۃ من فضۃ وملاطھا المسک الاذفر وحصباؤھا اللؤلؤ والیاقوت وتربتھا الزعفران " (مسند احمد، ترمذی، دارمی، مشکوٰۃ باب صفۃ الجنۃ واھلھا)

سونے اور چاندی کی اینٹوں سے اور اینٹوں میں چونہ، سیمنٹ کی جگہ بہت زیادہ خوشبودار کستوری کو استعمال کیا گیا ہے اور جنت کی نہروں میں موتیوں اور یاقوت کی طرح سنگریزے ہوں گے اور اس کی مٹی کی جگہ زعفران ہوگا، یعنی نرم، زرد اور خوشبودار مٹی ہوگی، سفید، زرد اور سرخ رنگ سے مزین کیا گیا ہے۔ اور سبز درختوں سے اس کے حسن و جمال کو اور زیادہ دوبالا کیا گیا ہے۔ (مرقاۃ المفاتیح)

جنتی لوگوں کی عمریں اور خوبصورتی:

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" اهل الجنة جرد مر د كحلٰى لايفنى شبابهم و لا يبلى ثيابهم . " (مشکوة باب صفة الجنة)

جنت والے لوگ " جُرد مُرد " ہوں گے سرمہ لگا ہوگا، ان کی جوانی ختم نہیں ہوگی اور ان کے کپڑے پرانے نہیں ہوں گے (دوسری روایت میں ہے) انکی عمریں تیس، تینتیس سال ہوں گی۔

جُرد: کا معنی جس کے جسم پر بال نہ ہوں اور " مُرد " کا معنی جس کی داڑھی نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ وہ خوبصورت اور نرم و نازک ہوں گے، اور قدرتی طور پر ان کی آنکھوں کی پلکوں میں سیاہی اس طرح رکھ دی جائے گی جیسے یہ معلوم ہوگا کہ سرمہ لگایا ہوا ہے۔

جوانی ختم نہیں ہوگی، اس کی تفصیل دوسری حدیث میں ہے " یعطی قوة مائة " ایک آدمی کو سو آدمی کے برابر طاقت دی جائے گی، دنیا میں ایک سو آدمی جنتی طاقت رکھتے ہیں، جنت میں اتنی طاقت ایک آدمی کو حاصل ہوگی یعنی اس طرح ازواج سے مجامعت کی قدرت ہوگی۔ جنتی ہمیشہ زندہ رہیں گے مریں گے نہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" من يدخلها ينعم ولايبأس ويخلد ولا يموت " (مشکوة باب صفة الجنة)

جو شخص جنت میں داخل ہوگا اس کو نعمتیں حاصل ہوں گی وہ کبھی فقیر محتاج نہیں ہوگا، وہ ہمیشہ باقی رہے گا اس پر کبھی موت نہیں آئے گی۔

جنت کی نہر کوثر: حضرت انسؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا یا رسول اللہ کوثر کیا ہے؟ آپ نے فرمایا:

" ذاک نهر اعطانيه الله يعنى فى الجنة اشد بياضا من اللبن و احلى من العسل "

یہ وہ نہر ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے جنت میں عطا کی ہے جس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے۔ (مشکوة باب صفة الجنة)

اس میں یہ اشارہ پایا گیا ہے کہ جنت میں نہر کوثر کے پانی میں دودھ کی طرح غذائیت اور شہد کی

طرح حلاوت (مٹھاس) پائی گئی ہے۔اگر چہ اس میں شہد کی طرح شفاء بھی ہوگی لیکن وہاں مرض نہیں لاحق ہوگی اس لئے بطور دواء استعمال کی ضرورت بھی درپیش نہیں آئے گی۔

اسی طرح اس پانی میں آنکھوں کی ٹھنڈک اور خواہش کی طلب پائی جاتی ہے یہی نہر کوثر محشر کے حوض کوثر کا منبع بھی ہے۔جس طرح پہلے تفصیل بیان کی جاچکی ہے۔

اس نہر پر ایسے پرندے ہوں گے جن کی گردنیں اونٹوں کی گردنوں کی طرح ہوں گی۔

نبی کریم ﷺ کی امت سب سے زیادہ جنت میں ہوگی:

حضرت بریدہؓ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" اهل الجنة عشرون ومائة صف ثمانون منها من هذه الامة واربعون من سائر الامم " (ترمذی ۔مشکوۃ باب صفة الجنة)

جنت والے لوگوں کی ایک سوبیس صفیں ہوں گی،ان میں اَسی (۸۰) اس امت کی ہوں گی اور باقی تمام امتوں کی چالیس صفیں ہوگی۔

اولیائے عظام کے منازلِ رفیعہ:

حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تحقیق اہل جنت اپنے اوپر بالا خانہ پر رہنے والوں کو ایسے دیکھیں گے جس طرح تم مشرق یا مغرب میں افق پر باقی رہنے والے بہت زیادہ چمکدار ستارے کو دیکھتے ہو،کیونکہ جنت والے لوگوں میں سے بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہوگی۔صحابہ کرام نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ یہ منازل تو صرف انبیائے کرام کو ہی حاصل ہوں گے، دوسرا تو کوئی وہاں نہیں پہنچ سکے گا،آپ نے فرمایا:

" بلٰی والذی نفسی بیده رجال امنوا بالله وصدقوا المرسلین "
(بخاری ، مسلم مشکوۃ باب صفة الجنة)

کیوں نہیں؟قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔یہ مرتبہ تو ان مردوں کو بھی حاصل ہوگا جنہوں نے اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا اور رسولوں کی تصدیق کی۔

جنت والے لوگ ایک دوسرے کو دیکھیں گے،اعمال کے مطابق انکے مراتب و مدارج ہوں

گے اولیائے عظام کو عالیشان، بلند محلات حاصل ہوں گے، ظاہری طور پر بھی ان کو بلند مقام حاصل ہوگا جسطرح شان کے لحاظ سے انہیں بلند مقام حاصل ہوگا۔ روشن ستارے کیطرح بلندی اور نورانیت حاصل ہوگی، جنت میں کچھ لوگ پست مقام میں ہوں گے، کچھ درمیانی مقام میں کچھ بلندی پر۔

حدیث میں لفظ رجال استعمال ہوا ہے جس کا مطلب کامل فی الرجولیة یعنی جو بہت کامل لوگ ہوں گے ذکر اگر چہ رجال کا ہے لیکن نساء (عورتوں) کو بھی شامل ہے۔ کامل لوگ کون ہیں۔ رب تعالیٰ نے بیان فرمایا" رجال لاتلھیھم تجارة ولابیع عن ذکراللہ" کامل لوگ وہ ہیں جن کو تجارت اور خرید وفروخت اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اعراض نہ کرائے، اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ انہیں کامل ایمان، پختہ یقین، اور عبادت میں کامل طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کا مقام حاصل رہے۔

رسولوں کی تصدیق کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کے لائے ہوئے تمام اوامر اور نواہی (جن کاموں کا حکم دیا گیا ہے یا ان سے روکا گیا ہے) کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ صابرین شاکرین کی صف میں قائم ہیں اور مقام رضاء کے درجہ پر فائز ہیں، جب انسان ان بلند منازل کو طے کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس کو انعامات سے نواز دیتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اولئک یجزون الغرفة بما صبروا" ان لوگوں کو صبر کی وجہ سے بطور جزاء بالاخانے عطا کئے جائیں گے۔

جنتی لوگوں کو نیند نہیں آئے گی:

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا:

" اینام اھل الجنة قال النوم اخوالموت ولا یموت اھل الجنة"

(بیھقی، مشکوٰة باب صفة الجنة)

کیا جنت والوں کو بھی نیند آئے گی؟ آپ نے فرمایا نیند موت کی مثل ہے، جنت والوں کو موت نہیں آئے گی۔ یعنی نبی کریم ﷺ نے مدلل جواب ارشاد فرمایا کہ جس طرح انسان موت کے ہوتا ہے

نیند میں بھی اسکی ایسی حالت ہی ہوتی ہے۔ جب موت نہیں آنی تو یقیناً نیند بھی نہیں آئے گی

دنیا میں نیند کی ضرورت انسان کو اس لئے ہوتی ہے کہ وہ تھکان محسوس کرتا ہے اسے راحت کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ نیند سے پوری کرتا ہے۔لیکن جنت میں ہر طرح کا آرام ہی آرام ہونا ہے کسی قسم کی تھکاوٹ ہونی ہی نہیں تو اس وجہ سے نیند کی ضرورت بھی درپیش نہیں آئے گی۔

جنت میں انسان کو اولاد کی خواہش نہیں ہوگی:

" اذا اشتهى المؤمن في الجنة الولد كان في ساعة ولكن لايشتهى " (مشكوة باب صفة الجنة)

مومن کو جنت میں اگر اولاد کی طلب ہو تو اسی وقت اس کو عطا کر دی جائے لیکن مومن کو جنت میں اولاد کی خواہش ہی نہیں ہوگی۔

جنتیوں کے خدام اور ان کی بیویاں:

حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت والے لوگوں کو کم از کم اسی ہزار خادم اور بہتر بیویاں حاصل ہوں گی۔

جنتی بیویوں کی شان: حدیث شریف میں ہے:

" يرىٰ فخ سوقهن من وراء العظم واللحم من الحسن " (مشكوة باب صفة الجنة)

ان کے حسن و جمال کی وجہ سے ان کی پنڈلیوں (کی ہڈی) کا مغز ہڈی اور گوشت کے پیچھے نمایاں نظر آئے گا۔یعنی جنتی حوروں کو اس طرح لطافت اور حسن و جمال کامل طور پر حاصل ہوگا کہ ان سے انسان کے نفرت کرنے کا تصور بھی نہیں پایا جائے گا۔حسن میں صفائی، چمڑا نرم و نازک، تمام اعضاء میں لطافت اس طرح ہوگی کہ انسان دنیا میں اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ پنڈلیوں کی ہڈی کے مغز کے سامنے ہڈی اور گوشت حجاب نہیں بن سکیں گے؛ کیونکہ ہڈی اور گوشت کو شیشے کی طرح صفائی اور چمک دمک حاصل ہوگی۔

جنتی حور کبھی ناراض نہیں ہوگی: حضرت علیؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک جنت

خوبصورت آنکھوں والی سفید رنگ والی بیویوں سے جمع ہونے کا مقام ہے۔

" یقلن نحن الخالدات فلا نبید و نحن الناعمات فلا نبأس و نحن الراضیات فلانسخط طوبیٰ لمن کان لنا و کنا له " (ترمذی، مشکوۃ باب صفة الجنة)

وہ اپنے نغموں کی آواز بلند کریں گی وہ ایسی آواز ہوگی کسی نے اس سے پہلے ایسی آواز نہیں سنی ہوگی۔ وہ کہیں گی ہم ہمیشہ (زندہ) رہنے والی ہیں ہم کبھی ہلاک نہیں ہوں گی، ہمیں نعمتوں سے نوازا گیا ہے ہم کبھی محتاج نہیں ہوں گی۔ ہم راضی رہنے والی ہیں کبھی ناراض نہیں ہوں گی، کتنی خوش بختی کا مقام ہے اس شخص کے لئے جو ہمارا اور جس کی ہم ہیں۔

جنتی بیویاں پاکیزہ ہوں گی:

﴿ وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَهُمْ فِيهَا خَالِدُوْنَ ﴾ (پ ۱/ ۳)

ان کے لئے ان باغوں میں صاف ستھری بیویاں ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

یعنی وہ عورتیں خواہ حوریں ہوں یا دنیا کی عورتیں ہوں وہ تمام ہی ہر قسم کے ظاہری اور باطنی عیبوں اور گندگیوں سے بالکل پاک ہوں گی۔ یعنی حیض، نفاس، پیشاب، پاخانہ، منی، تھوک، میل اور ہر قسم کی بیماری وغیرہ سے بھی پاک ہوں گی اور بد خلقی، سخت زبانی، نافرمانی وغیرہ سے بھی ایک دم دور ہوں گی۔ ان کے چہرے کا نور آفتاب کی روشنی کو شرما دے گا۔

اللہ تعالیٰ نے بیویوں کا نعمتوں میں ذکر کیا کیونکہ انسان اپنی زوجہ کا مالک ہوتا ہے اس لئے زوجہ بھی عظیم نعمت ہے خیال رہے کہ جو عورت جس مسلمان کے نکاح میں مرے گی وہ جنت میں اسی کے ساتھ رہے گی اس لئے نبی کریم ﷺ کی بیویوں سے نکاح کرنا حرام تھا کیونکہ وہ جنت میں حضور ﷺ کے ساتھ خاص ہیں۔

اور جس عورت کا شوہر کافر ہو کر مرا، یا جو کہ کنواری ہی مر گئی ان کا نکاح ان جنتیوں میں سے کسی سے کر دیا جائے گا، جو لوگ جنت کے بھرنے کے لئے اس وقت پیدا کئے جائیں گے۔ اور جس کی بیوی کافر ہو کر مری یا کنوارا ہی مر گیا اس کے نکاح میں صرف حوریں ہوگی۔

اور جس کی بیوی بھی مسلمان مرے وہ جنت میں اپنی اس بیوی کو بھی پائے گا اور حوروں کو بھی لیکن وہاں یہ دنیاوی بیویاں حسن و جمال میں حوروں سے کسی طرح کم نہیں ہوں گی۔

روایات میں آیا ہے کہ حضرت مریم (عیسیٰ کی والدہ) اور حضرت آسیہ (فرعون کی زوجہ) جنت میں نبی کریم ﷺ کے نکاح میں آئیں گی۔ (از تفسیر نعیمی)

جنتی بیویاں نگاہیں نیچے رکھیں گی:

﴿ فِيهِنَّ قَٰصِرَٰتُ ٱلطَّرْفِ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ☆ فَبِأَيِّ ءَالَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ☆ كَأَنَّهُنَّ ٱلْيَاقُوتُ وَٱلْمَرْجَانُ ☆ فَبِأَيِّ ءَالَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴾ (پ ۲۷ الرحمن)

ان (جنتیوں) میں نیچی نگاہوں والی ہوں گی، جن کو نہ کسی انسان نے چھوا ہوگا ان سے پہلے اور نہ کسی جن نے۔ پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ یہ تو گویا یاقوت اور مرجان ہیں۔ پس اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

ان باغات میں جو محلات اور مکانات ان جنتیوں کے لئے بنائے گئے ان میں ایسی عورتیں ہوں گی جو شرم و حیا کا پیکر ہوں گی۔ ان کی نگاہیں جھکی ہوں گی۔ وہ اپنے شوہروں کے بغیر کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی پسند نہیں کریں گی باشرم و باحیا ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اتنی پاکدامن اور عفت مآب ہوں گی کہ آج تک انہیں کسی جن و انس نے چھوا تک نہ ہوگا۔

ان کے چہرے یاقوت کی طرح سرخ اور ان کے بدن مرجان کی طرح سفید اور شفاف ہوں گے۔ آپ ذرا غور فرمائیں ان کے ظاہری حسن و جمال اور اس کی سچی دلربائی اس کی پاک دامنی اور اس کی آنکھوں کا شرمیلا پن ہے۔

ع گھر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں

یہ نہ ہو تو وہ حضرۃ الدمن ہے۔ یعنی کوڑے کے ڈھیر پر اُگا ہوا سبزہ۔ اس کی طرف گدھے تو لپک کر جا سکتے ہیں اور اس کو اپنا تر نوالہ بنا کر زور سے ہنگ سکتے ہیں۔ لیکن ایک شریف النفس اور باذوق آدمی کو تو اس سے بدبو آئے گی، اس کی سڑاند سے اس کا دماغ پھٹنے لگے گا۔

دنیا میں بھی امت مصطفویہ کی بہو بیٹیوں کو عفت وحیا کے زیور سے آراستہ ہونا چاہیے۔ (یہی ان کا حسن وجمال ہے) یہ قاصرات الطرف کون ہوں گی؟ وہ نیک بیویاں جو دنیا میں اللہ کے نیک بندوں کے نکاح میں تھیں، وہی جنت میں ان کے محلات کی زینت بنیں گی۔ ان کے علاوہ انہیں حوریں بھی دی جائیں گے۔ نیز وہ مسلمان عورتیں جو کسی کے نکاح میں نہ تھیں یا جن کے خاوند جھنم رسید کر دیئے گئے ان کو بھی جنتی مردوں...... جو مخلوق اس وقت تخلیق ہوگی...... کے ساتھ بیاہ دیا جائے گا۔ یہی حال مومن جنوں اور باایمان جنیوں کے ساتھ ہوگا۔

علامہ قرطبیؒ مختلف اقوال لکھنے کے بعد فرماتے ہیں۔

" والذی یغلب علی الظن ان الانسی یعطی من الانسیات والحور والجنی یعطی من الجنیات والحور " (تفسیر روح المعانی)

(غالب گمان یہی ہے کہ انسانوں کو انسان عورتیں اور حوریں دی جائیں گی اور جنوں کو جن عورتیں اور حوریں عطا ہوں گی)

حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں میں نے عرض کی یارسول اللہ دنیا کی بیویاں افضل ہوں گی یا جنت کی حوریں؟ حضور نے فرمایا ''نساء دنیا افضل من الحور العین کفضل الظھارۃ علی البطانۃ ''یعنی دنیا کی عورتیں جنتی حوروں سے افضل ہونگی جس طرح ابری استر سے۔ میں نے عرض کیا یارسول اللہ یہ کیسے؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بصلواتھن و صیامھن و عبادتھن '' اپنی نمازوں، اپنے روزوں اور اپنی عبادات کے باعث وہ افضل ہوں گی۔ پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ ان کے چہروں کو نورانی بنادے گا۔ ان کے جسم ریشم سے نرم۔ ان کے چہرے سفید۔ ان کے لباس سبز اور ان کے زیورات سونے کی طرح زرد۔ ان کی انگھوٹھیاں موتیوں کی اور ان کنگنیاں سونے کی ہوں گی۔

(تفسیر ضیاء القرآن)

جنتی بیویاں پردہ دار ہوں گی:

○ فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ ☆ فَبِاَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ☆ حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ ☆ فَبِاَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ○

(پ ۲۷ / الرحمن)

ان (جنتیوں) میں اچھی سیرت والیاں، اچھی صورت والیاں ہوں گی۔ پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ یہ حوریں پردہ دار خیموں میں ہوں گی۔ پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

﴿ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ☆ فَبِاَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾

ان کو اب تک نہ کسی انسان نے چھوا ہو اور نہ کسی جن نے۔ پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

یعنی ان سرسبز وشاداب باغوں میں ایسی عورتیں ہوں گی جو اخلاق کے اعتبار سے بھی بے مثال اور حسن و جمال میں بھی بے نظیر "خیرات الاخلاق حسان الوجوه" یعنی جن کے اخلاق بہترین اور چہرے خوبصورت ہوں گے۔

حور جمع ہے اسکا واحد حوراء ہے "هی الشديدة بياض العين والشديدة سوادها" یعنی جس کی آنکھ کا سیاہ حصہ بہت زیادہ سیاہ ہو اور سفید حصہ بہت ہی زیادہ سفید ہو۔ مقصورات فی الخیام فرما کران کے باحیاء اور باشرم ہونے کا ذکر فرمادیا کہ وہ آوارہ پھرنے والیاں نہیں بلکہ اپنے اپنے خیموں میں جلوہ افروز رہتی ہیں ان کے ظاہری اور باطنی حسن و جمال سے ان کے خیموں کا گوشہ گوشہ معطر اور منور ہے۔ ان کے گھر کی فضا خوشی اور مسرت سے معمور رہتی ہے۔

جنتی بیویاں موٹی آنکھوں والی ہوں گی:

﴿ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴾ (پ ۲۷ الطور) انہیں بیاہ دیا بڑی آنکھوں والی حوروں سے

خیال رہے کہ یہ دنیا کے نکاح کی طرح نکاح نہیں ہوگا۔ کیونکہ دار تکلیف دنیا ہی ہے۔

" بل بمعنی تصيير هم زوجين ای صيرناهم كذالک بسبب حوزعين " (روح المعانی)

بلکہ ان کو زوجہ عطا کر دی جائیں گی۔ ان کو جب عطا ہوں گی تو وہ جنتی بیویوں والے ہو جائیں گے۔ ان کو ازواج کا عطا کرنا گویا کہ ان کے ساتھ بیاہ ہوگا۔

ایمان والی اولاد کو جنت میں ماں باپ سے ملا دیا جائے گا:

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ ﴾ (پ ۲۷، الطور)

اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی پیروی کی ان کی اولاد نے ایمان کے ساتھ ہم ملادیں گے ان کے ساتھ ان کی اولاد کو۔

ایک مزید انعام کا ذکر ہو رہا ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنے مقبول بندوں کو سرفراز فرمائے گا۔ اگر ان کی اولاد باایمان اس دنیا سے رخصت ہوئی ہے تو جنت میں وہ اپنے والدین کے ساتھ ملا دیا جائے گی اگرچہ ان کے اعمال زیادہ اچھے نہ ہوں۔

یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ الرعد آیت نمبر۲۳ اور سورۃ نمبر ۸ میں بھی گذر چکا ہے کہ مقبولانِ بارگاہِ الٰہی کے والدین، ان کی بیویاں اور ان کی اولاد کو ان کے طفیل مقامات رفیعہ پر فائز کر دیا جائے گا لیکن وہاں ماں۔ باپ کے نیک اور صالح ہونے کی قید ہے اور یہاں صرف ایمان کی شرط ذکر کی گئی ہے نیز پہلی دو آیتوں میں جنت عدن میں داخل ہونے کا ذکر تھا، یہاں فرمایا کہ ہم ان کو ان کے متقی والدین کے ساتھ ملا دیں گے۔ وہ انہیں کے پاس ان کے مقامات رفیعہ میں ہمارے لطف واحسان سے محفوظ ہوتے رہیں گے۔ اپنے بچوں کو اپنے پاس یوں خوش وخرم دیکھ کر ہمارے پیارے بندوں کی آنکھیں ٹھنڈی اور دل مسرور ہوں گے۔

عن ابن عباس ان رسول الله ﷺ قال ان الله عزوجل ليرفع ذرية المؤمن معه في درجة في الجنة وان كان لم يبلغها لتقربهم عينه ثم قرء ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَابِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ الآية ﴾ (تفسير قرطبی)

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ عزوجل مومن کی اولاد کو بھی جنت میں اس کا درجہ عطا فرمائے گا۔ اگرچہ وہ اپنے عمل کے ذریعہ وہاں رہنے کا مستحق نہ ہو۔ یہ اس لئے تا کہ انہیں اس مقام پر فائز دیکھ کر اس نیک بندے کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ پھر حضور نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

علامہ زمخشری لکھتے ہیں:

" فيجمع الله بهم انواع السرور بسعادتهم في انفسهم و بمزاوجة الحور العين وبموانسة الاخوان المؤمنين وباجتماع اولادهم وسلهم بهم" (تفسير كشاف)

والدین کے مرتبہ کو کم کر کے اولاد کے ساتھ نہیں ملا دیا جائے گا اگرچہ اولاد کا مرتبہ کم ہی کیوں نہ

بلکہ اولاد کو والدین کے ساتھ ملا دیا جائے گا۔ کیونکہ عمل کم کرنا ظلم کے مترادف ہے جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں۔ لیکن کسی کے عملوں کی کمی کے باوجود اسے بلند عطا کرنا یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہوگا وہ اپنے فضل سے جسے چاہئے نواز دے یہ اس کی مرضی کی بات ہے۔ لیکن تمام لوگوں کو ان کے اعمال کے بغیر کسی کمی کے پوری پوری جزاء عطا فرمائے گا۔

جنتی بیویاں شتر مرغ کے انڈے کی طرح ہوں گی:

﴿ وَعِندَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِينٌ ☆ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُونٌ ﴾ (پ ۲۳/ ۲)

اور ان کے پاس ہیں جو شوہروں کے سوا دوسری طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے گی۔ بڑی آنکھوں والی گویا وہ انڈے ہیں پوشیدہ رکھے ہوئے۔

قصرات الطرف ،جھکی ہوئی نگاہوں والیاں جو اپنے شوہروں کے بغیر کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتی ہی نہیں باشرم و باحیاء۔ عین جمع عیناء کی۔ موٹی موٹی خوبصورت آنکھوں والیاں۔ جن کی آنکھوں کا سیاہ حصہ بہت سیاہ اور سفید حصہ نہایت سفید۔ بیض ،انڈا خصوصاً شتر مرغ کا انڈا اس میں سفید اور زرد رنگ کی آمیزش بڑی لطیف ہوتی ہے۔ عربی لوگ عورتوں کے اس رنگ کو بہت پسند کرتے تھے۔ (از ضیاء القرآن)

معلوم ہوا کہ جنت میں پردہ ہوگا۔ کوئی عورت اجنبی مرد کو نہیں دیکھے گی۔ متقی پرہیزگار سے بھی پردہ ہے کہ جنت میں سارے متقی ہوں گے۔ مگر جنتی عورتیں حوریں ان سے بھی پردہ کریں گی، جن گھروں میں آج پردہ ہے وہ جنتی گھر ہیں اور جہاں بے پردگی، بے حیائی ہے وہ دوزخی گھر ہیں۔
(تفسیر نور العرفان)

جنتی بیویاں موتیوں کی طرح ہوں گی:

﴿ وَحُورٌ عِينٌ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُوءِ الْمَكْنُونِ ﴾ (پ ۲۷/ ۱۴)

اور حوریں خوبصورت آنکھوں والیاں (ٍسچے) موتیوں کی مانند جو چھپا رکھے ہوں۔

حوروں کو موتیوں سے تشبیہ دی گئی ہے یعنی وہ موتی جو سیپ میں ہو یا ڈبیہ میں بند کر کے رکھا ہوا ہو

وہ ہاتھوں سے محفوظ رہتا ہے اور تغیر وتبدل سے بچا رہتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

" صفاؤ ھن کصفاء الدر الذی لاتمسه الایدی " (تفسیر روح المعانی)

ان (جنتی حوروں کے رنگ اور جسم) کی صفائی ایسے ہوگی جیسے اس موتی کی صفائی ہوتی ہے جس کو ہاتھوں نے نہ چھوا ہو۔ اہل عرب اکثر طور پر حسین چیز کو موتیوں سے تشبیہ دیتے ہیں

جنتی عورتیں جوان ہوں گی:

﴿ اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ☆ عُرُبًا اَتْرَابًا ﴾ (پ۲۷ / ۱۴)

ہم نے پیدا کیا ان کی بیویوں کو حیرت انگیز طریقہ سے، پس ہم نے بنا دیا انہیں کنواریاں (دل وجان سے) پیار کرنے والیاں ہم عمر۔

اہل جنت کی نیک بیویاں جب جنت میں داخل ہوں گی تو ان کی خلقت بالکل بدلی ہوئی ہوگی اگرچہ دنیا میں وہ خوش شکل نہ تھیں، مرتے وقت وہ بالکل بوڑھی تھیں، لیکن جنت میں داخل ہوں گی تو بھر پور جوانی ہوگی۔ مجسم حسن ورعنائی ہوں گی اور کنواری بنا کر انہیں جنت میں داخل کیا جائے گا حدیث شریف میں اس آیت کی یہی تفسیر مذکور ہے۔

حضرت ام سلمہؓ کے عرض کرنے پر حضور ﷺ نے فرمایا:

" یا ام سلمة ھن اللواتی قبضن فی الدنیا عجائز شمطا عمشا رمصا جعلھن الله بعد الکبر اترابا علی میلاد واحد فی الاستواء "

اے ام سلمہ ان سے مراد وہی بیویاں ہیں۔ اگرچہ وفات کے وقت بالکل بوڑھی تھیں، ان کے بال سفید تھے۔ ان کی بینائی کمزور تھی، آنکھیں میلی کچیلی رہتی تھیں لیکن جب وہ جنت میں داخل ہوں گی۔ تو ساری ہم عمر ہوں گی۔

عُرُب اس کا واحد عروب ہے، علامہ قرطبی کہتے ہیں "فالعروب تبین محبتھا لزوجھا بشکل و عنج و حسن کلام " یعنی وہ عورت جو ناز وادا اور خوش گفتاری سے اپنی محبت کا اظہار اپنے خاوند سے کرے۔

یہ عورت کی ایسی صفت ہے جس میں اس کو نسوانیت کی ساری خوبیاں سمٹ آتی ہیں، حسین وجمیل بھی ہو، ناز وادا والی بھی ہو، خوش گفتاری بھی ہو، ہنس مکھ بھی اور اپنے خاوند کو دل سے چاہنے والی بھی ہو اور اپنے چاہت کو چھپانے والی نہ ہو بلکہ اس کا اظہار کرنے والی ہو۔(تفسیر ضیاء القرآن)

اتـــرابـــا: ہم عمر ہوں گی یعنی تمام کی عمریں ایک جیسی تیس اور تینتیس سال کے درمیان ہوں گی کامل جوانی ہوگی۔ اپنے شوہروں سے کامل محبت کرنے والی ہوں گی۔

خدام اور چھلکتے جام:

﴿ وَيُطَافُ عَلَيْهِم بِآنِيَةٍ مِّن فِضَّةٍ ......تا ...... اِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنثُورًا﴾ (پ۲۹ / ۱۹)

اور گردش میں ہوں گے ان کے سامنے چاندی کے ظروف اور شیشہ کے چمکدار گلاس اور شیشے بھی وہ چاندی کی قسم سے ہوں گے۔ ساقیوں (پلانے والے) نے انہیں پورے اندازہ سے بھرا ہوگا۔ اور انہیں پلائے جائیں گے۔ وہاں (ایسی شراب کے) جام جس میں زنجبیل (سونٹھ) کی آمیزش ہوگی۔

...... یہ زنجبیل جنت میں ایک چشمہ ہے جس کو سلسبیل کہا جاتا ہے...... اور چکر لگاتے رہیں گے ان کی خدمت میں ایسے بچے جو ایک ہی حالت پر رہیں گے۔ جب تو انہیں دیکھے تو یوں سمجھے گویا یہ موتی ہیں جو بکھر گئے ہیں۔

آنیة: جمع ہے اناء کی ظرف، برتن۔ اکواب، کوب کی جمع ہے وہ پیالہ یا پیالی جس کے ساتھ کنڈا نہ ہو۔

کانت قواریرا، قواریرا من فضة:

حضرت ابن عباسؓ نے اس کا مفہوم ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

" آنية من فضة صفاء ها كصفاء القوارير."

یعنی یہ سارے برتن چاندی کے بنے ہوں گے لیکن ان میں چمک اتنی زیادہ ہوگی کہ خیال گزرے گا کہ شیشہ اور بلور ڈھال کر انہیں بنایا گیا ہے۔

ساقی گری کی خدمت پر جو خدام مقرر ہوں گے وہ بھی بڑے سلیقہ شعار اور ادا شناس ہوں گے۔

صراحی سے جام میں اتنی مقدار میں شراب انڈیلیں گے جتنی پینے والا چاہے گا، جتنی اس کی خواہش ہوگی اناڑی نہ ہوں گے۔ جس کو چند گھونٹ کی خواہش ہو اسے چھلکتا گلاس دے دیں اور جو زیادہ پینا چاہتا ہو اسے چند قطروں پر ٹرخا دیں۔ جن کی دلداری اور عزت افزائی مقصود ہے وہ ان کی خواہش کا پورا پورا احترام کریں گے۔

انہیں ایسی شراب دی جائے گی جس میں زنجبیل (سونٹھ) کی ملاوٹ ہوگی۔ ساتھ ہی بتا دیا کہ یہ بھی جنت کے ایک چشمہ کا نام ہے اور اسی کو سلسبیل بھی کہا جاتا ہے۔ اہل عرب شراب میں سونٹھ ملا کر پیتے تھے۔ انہی کا پسند خاطر نام ذکر فرما دیا اور بتا دیا کہ جنت میں ایک چشمہ اسی نام کا جاری ہے جس میں سونٹھ کی بو تو ہوگی لیکن اس کے ذائقہ کی تلخی نہ ہوگی۔

خدام لڑکے ہر وقت ان کی خدمت بجالانے کے لئے اور ان کے احکام کی تعمیل کے لئے ان کے آگے پیچھے پھرتی سے دوڑ رہے ہوں گے۔ وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شکل وصورت اور ان کے رنگ روپ میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی اور جب وہ جنت کے مرغزاروں اہل جنت کی خدمت کیلئے ادھر ادھر بھاگے پھر رہے ہوں گے تو یوں معلوم ہوگا کہ کوئی موتیوں کی لڑی ٹوٹ گئی ہے اور اس کے تابندہ اور رنگ رنگیلے موتی ادھر ادھر لڑھکتے چلے جا رہے ہیں۔ (از ضیاء القرآن)

جنتی شراب پاکیزہ، نشہ سے پاک:

﴿ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَأْسٍ مِّنْ مَّعِينٍ ☆ بَيْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ☆ لَا فِيْهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ ﴾ (پ ۲۳/ ۶)

ان پر (پاکیزہ شراب) کے چھلکتے جام کو پھرایا جائے گا۔ سفید رنگ، پینے والوں کو لذت حاصل ہوگی۔ نہ اس میں نشہ ہوگا اور نہ ہی سر کو چکر آئیں گے۔

کأس اس پیالہ کو کہتے ہیں جس میں شراب موجود ہو۔ خواہ دنیا کی شراب یا جنت کی۔ خالی پیالہ کو قدح کہتے ہیں۔ معین کا معنی ہے جاری ہونا جس طرح جاری پانی کو عان الماء کہہ لیا جاتا ہے۔ یعنی پیالے بھرے ہوں گے، چھلک رہے ہوں گے۔

حضرت حسنؓ فرماتے ہیں'' ان خمرا لجنة اشد بیاضا من اللبن '' بیشک جنت کا شراب دودھ سے بھی زیادہ سفید ہوگا ''لا تغول عقولھم من السکر '' جنتی شراب میں نشہ نہیں ہوگا کہ اس سے عقل زائل ہو جائے ''لیس فیھا نتن ولا کراھیة کخمر الدنیا '' دنیا کے شراب کی طرح نشہ اس میں بدبو اور کراہیت نہیں پائی جائے گی۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں'' فی الخمر اربع خصال السکر والصداع والقیء و البول فنزہ اللّٰہ تعالیٰ خمرالجنة عنھا '' دنیا کے شراب میں چار صفات ہیں۔ نشہ، سر کا چکرانا، قے آنا اور اس سے پیشاب آنا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے جنت کے شراب کو ان تمام سے محفوظ رکھا ہوا ہے۔ (تفسیر روح المعانی)

یاد رہے جنت میں پیشاب نہیں آئے گا۔ (تفصیل ان شاء اللہ عنقریب ذکر ہوگی)

جنتی شراب کافور کی طرح ہوگا:

﴿ اِنَّ الۡاَبۡرَارَ یَشۡرَبُوۡنَ مِنۡ کَاۡسٍ کَانَ مِزَاجُھَا کَافُوۡرًا ☆ عَیۡنًا یَّشۡرَبُ بِھَا عِبَادُ اللّٰہِ یُفَجِّرُوۡنَھَا تَفۡجِیۡرًا ﴾ (پ۲۹/ ۱۹)

بے شک نیک لوگ پئیں گے (شراب کے) ایسے جام جن میں آبِ کافور کی آمیزش ہوگی۔ (کافور) ایک چشمہ ہے جس سے اللہ کے (وہ) خاص بندے پئیں اور جہاں چاہیں گے اسے بہا کر لے جائیں گے۔

یعنی جب اللہ تعالیٰ کے نیک بندے جنت میں اپنے اپنے مقامات پر تشریف فرما ہوں گے تو ان کو پاکیزہ شراب کے پیالے بھر بھر کر پیش کیے جائیں گے جن میں چشمہ کافور کا پانی جب ٹھنڈک اور رنگ میں کافور کی طرح ہوگا۔ اسی طرح وہ شراب بھی کافور کی طرح سفید اور چمکدار اور نہایت لذیذ اور ٹھنڈی ہوگی۔

جنت والوں کو جب پانی کی ضرورت ہوگی تو ان کی خواہش کے مطابق پانی خود بخود ادھر بہنا شروع ہو جائے گا۔ جدھر وہ اشارہ کریں گے۔ یعنی انہیں پانی حاصل کرنے میں کوئی مشقت نہیں اٹھانی

پڑے گی۔

تنبیہ: سابقین اور مقربین کو اللہ تعالیٰ اپنے عرش کے نیچے سے شراب طہور کے بھرے ہوئے پیالے بلاواسطہ پلائے گا۔ درمیانی درجے والوں کو فرشتے پلائیں گے۔ اور عام لوگوں کے ساقی غلمان ہوں گے۔ جب وہ بہشت کے شراب کو پئیں گے تو اللہ تعالیٰ کی محبت میں مست ہو جائیں گے۔ پردوں کو الٹ دیں گے۔ بے چون و چگوں و بے جہت حق تعالیٰ کا دیدار کریں گے۔ الٰہی! ہمیں بھی یہ نعمتیں عطا فرما اور اپنے کرم سے مقربین میں داخل فرما۔ آمین (تفسیر جرخی، ضیاء القرآن سورہ الدھر)

جنتی حضرات پاکیزہ خوش طبعی کریں گے

﴿ يَتَنَازَعُونَ فِيهَا كَأْسًا لَّا لَغْوٌ فِيهَا وَلَا تَأْثِيمٌ ☆ وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَأَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُونٌ ﴾
(پ ۲۷/ ۳)

وہ چھینا جھپٹی کریں گے وہاں جام شراب پر (لیکن) اس میں نہ کوئی لغویت ہوگی اور نہ گناہ اور (خدمت بجالانے کے لئے) چکر لگاتے ہوں گے ان کے گرد۔ ان کے غلام (اپنے حسن کے باعث) یوں معلوم ہوں گے گویا وہ چھپے موتی ہیں۔

جنت میں منعقد ہونے والی مجلس نشاط و سرور کی کتنی عمدہ تصویر کشی کی گئی۔ اہل جنت جب اپنی مجلس نشاط سجائیں گے۔ مہوش ساقی بلوریں جاموں (چاند کی صورت والے پلانے والے شیشے کی طرح چمکتے ہوئے پیالوں) میں شراب طہور (پاکیزہ) ڈال کر پیش کریں گے اور چھلکتے ہوئے جام کب گردش میں آئیں گے تو اُنس و محبت اور بے تکلفی کے عالم میں وہ ایک دوسرے سے چھینا جھپٹی کریں گے۔ یہ اس کے ہاتھوں سے جام چھینے گا اور وہ اس سے اچکنے کی کوشش کرے گا یہ سب کچھ ازراہِ ملاعبت و ملاطفت ہوگا۔ لیکن کیف و سرور کے اس عالم میں بھی وہ بے ہودہ گوئی اور ہرزہ سرائی کے قریب تک نہیں جائیں گے۔ کوئی ناشائستہ حرکت اور گناہ اس وقت بھی ان سے صادر نہیں ہوگا۔

علامہ آلوسی نے بڑے پیارے انداز سے یتنازعون کی تفسیر لکھی ہے:

"ای یتجاذبونها فی الجنة هم و جلساء هم تجاذب ملاعبة کما یفعل ذالک الندامی بینهم فی الدنیا بشدة سرورهم"
(تفسیر روح المعانی)

یعنی وہ لوگ اپنے ندیموں (ہمنشینوں) سے ازراہ ملاعبت وملاطفت پیالے چھینیں گے۔ جس طرح اس دنیا میں مے خواری کے وقت مے خوار کرتے ہیں۔

دیگر آسائشوں کے علاوہ اہل جنت کو خدمت گار بھی مہیا کئے جائیں گے جو ہر وقت ان کے اردگرد گھومتے رہیں گے تاکہ ان کے ہر اشارہ ابرو کی فوراً تعمیل کر سکیں۔ وہ خدمت گزار دنیا کے خدام کی طرح بد وضع، غلیظ اور اکھڑ مزاج نہیں ہوں گے۔ بلکہ بہت خوبصورت اور صاف ستھرے ہوں گے۔ یوں محسوس ہوگا کہ وہ آبدار موتی ہیں جو اب تک آغوش صدف میں مستور ہے اور ابھی ابھی باہر نکلے ہیں۔

(از تفسیر ضیاء القرآن)

جنتی لوگوں کو پھل عطا کیے جانا:

﴿ كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوا هٰذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا ﴾

(پ ۱/ ۳)

جب انہیں ان باغوں سے کوئی پھل کھانے کو دیا جائے گا (صورت دیکھ کر) کہیں گے یہ تو وہی رزق ہے جو ہمیں پہلے ملا تھا۔ یعنی جنت میں جب لوگوں کو پھل دیئے جائیں گے تو وہ شکل میں اور نام میں دنیا کے پھلوں کی طرح ہوں گے تو جنتی لوگ بہت تعجب سے یہ کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ کی کتنی عظیم قدرت ہے کہ اس نے ہمیں یہاں بھی دنیا کے پھلوں کی طرح پھل عطا کر دیئے۔ لیکن جنتی لوگوں کے گمان میں یہ ہوگا کہ شائد ذائقہ اور لذت میں بھی ان پھلوں کی طرح ہی ہوں گے لیکن حقیقت میں وہ ان سے بہت ہی زیادہ لذیذ اور مزہ دار ہوں گے جس کی کیفیت کو بیان کرنا ممکن نہیں۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: ''**ليس في الجنة من اطعمة الدنيا الا الاسماء**''

(بیهقی، روح المعانی)

جنت میں دنیا کے کھانوں کا صرف نام ہی ہوگا۔ یعنی صرف شکل اور نام میں مشابہت ہوگی ورنہ وہ بہت ہی عمدہ ہوں گے۔ اسی طرح جب جنت میں دوبارہ ان کو پہلے کھائے ہوئے پھل کی خواہش ہوگی تو دوبارہ جب وہ حاصل کریں گے تو کہیں گے یہ وہ ہی پھل ہے جو ہم نے ابھی پہلے کھایا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت سے جتنی مرتبہ ان کو ایک ہی پھل ملے گا اتنی مرتبہ ہی اس کا ذائقہ پہلے سے مختلف ہوگا

اس طرح ان کے تعجب میں اور اضافہ ہوگا کہ ہم تو سمجھ رہے تھے یہ وہی پھل ہے لیکن اس کا ذائقہ تو اور ہی نرالا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی:

والذی نفس محمد بیدہ ان الرجل من اھل الجنۃ یتناول الثمرۃ لیأ کلھا فما ھی واصلۃ الیٰ فیہ حتی یبدل اللہ تعالیٰ مکانھا مثلھا" (تفسیر روح المعانی)

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے بیشک جنتی آدمی جب ایک مرتبہ کھانے کے لئے پھل حاصل کرے گا تو جب ایک مرتبہ وہ پھل اس کے منہ میں پہنچیں گے تو اللہ تعالیٰ (ان درختوں کے ساتھ ہی) ان کی جگہ اور پھل لگا دے گا۔ یعنی اگرچہ شکل تو پہلے والوں کی ہوگی لیکن ذائقہ اور ہی عجیب ہوگا۔

خیال رہے کہ دو قول بنانے کے بجائے یہ تفسیر زیادہ مناسب ہے کہ پہلی مرتبہ پھل دیکھ کر سمجھیں گے یہ دنیا کے پھلوں کی طرح ہیں اور پھر سمجھیں گے کہ یہ تو ابھی جنت میں پہلے حاصل ہو چکے ہیں۔

(تفسیر روح المعانی)

﴿ھذا الذی رزقنا من قبل﴾ کی تفسیر میں ایک جگہ تحریر ہے "وھو المرزوق فی الدارین" "یہ تو وہی رزق ہے جو ہمیں دنیا اور جنت میں دیا جا چکا ہے۔ دوسری جگہ اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ "ان المراد من المرزوق فی الدنیا والآخرۃ" بیشک ان کا یہ کہنا کہ یہ تو ہمیں پہلے بھی دیا گیا۔ اس سے مراد جو رزق دنیا میں اور پھر آخرت (جنت) میں ہمیں دیا گیا۔

پھل بہت ہوں گے ان میں کوئی کمی نہیں ہوگی:

﴿ یُطَافُ عَلَیۡھِمۡ بِصِحَافٍ ...... تا ...... مِنۡھَا تَاۡکُلُوۡنَ ﴾ (پ ۲۵ / ۱۳)

ان پر سونے کے پیالے اور جام پھرائے جائیں گے۔ اور اس میں جو جی چاہے اور جس سے آنکھ کو لذت پہنچے اور تم اس میں ہمیشہ رہو گے اور یہ ہے وہ جنت جس کے تم وارث کئے گئے (مالک بنائے گئے ہو) اپنے اعمال سے تمہارے لئے اس میں بہت میوے ہیں کہ ان میں سے کھاؤ۔

یعنی درخت ثمردار (پھل دار) سدا بہار ہیں ان کی زیب وزینت میں فرق نہیں آتا۔ حدیث

شریف میں ہے کہ اگر کوئی ان سے ایک پھل لے گا تو درخت میں اس کی جگہ دو پھل نمودار ہو جائیں گے

خالص لذیذ خواہش کے مطابق پھل دیئے جائیں گے:

﴿ اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ ظِلٰلٍ وَّعُیُوْنٍ ☆ وَفَوَاکِهَ مِمَّا یَشْتَهُوْنَ ☆ کُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِیْٓـًٔا بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ (پ۲۹ / ۲۲)

بیشک متقی لوگ سایوں اور چشموں میں ہیں۔ اور میووں میں جو ان کا جی چاہے۔ (حکم ہوگا) کھاؤ اور پیو دل بھاتا۔

هنیئا : لذیذ خالص جس میں ذرا بھی نقص کا شائبہ نہ ہو جو دل میں رچے دل کو بھائے۔

اہل جنت ہر قسم کی آسائش اور ناز نعمت میں آرام کریں گے۔ ان کو ان کی مرضی، خواہش کے مطابق نعمتیں عطا کی جائیں گی۔ دنیا کی طرح نہیں کہ کبھی کوئی نعمت حاصل ہونے کی تمنا ہو تو وہ میسر نہ ہو

خیال رہے کہ یہاں متقین سے مراد مومن لوگ ہیں۔ ان المتقین من الکفر والتکذیب لوقوعه فی مقابلة المکذبین بیوم الدین فیشمل عصاة المؤمنین . (روح المعانی)

یہ نعمتیں ان لوگوں کو حاصل ہوں گی جو کفر اور قیامت کو جھٹلانے سے ڈرتے رہے کیونکہ اس مقام پر قیامت کے جھٹلانے والوں کے عذاب کے مدمقابل ذکر کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ نعمتیں ان گناہگار مومنوں کو بھی حاصل رہیں گی جن کو پہلے ہی اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے یا انبیاء کرام کی شفاعت سے جنت میں داخل فرمادے گا اسی طرح صلحاء شہداء کی شفاعت سے کسی کو جنت میں داخل کر دیا جائے۔ وہ گناہگار جو جہنم میں اپنے گناہوں کی سزا کاٹ کر جنت میں داخل ہوں گے ان کو بھی جنت میں تمام نعمتیں حاصل ہوں گی۔

جنتی لوگوں کے قریب پھل خود ہی آئیں گے

﴿ وَدَانِیَةً عَلَیْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِیْلًا ﴾ (پ۲۹ / ۱۹)

اور اس (بہشتی درختوں) کے سائے ان پر جھکے ہوں گے اور اس کے گچھے جھکا کر نیچے کر دیئے ہوں گے۔ یعنی جنتی لوگ جب بھی کسی پھل کی خواہش کریں گے تو ان کو وہی پھل جس کی انہوں

نے خواہش کی ہو گی درخت خود ان کے قریب ہو کر ان کو عطا کرے گا۔ اگرچہ تمام پھل ہر وقت قریب ہوں گے۔ کسی کی طلب کے لئے ادھر ادھر بھاگ دوڑ، تلاش کرنے کی ضرورت نہیں آئے گی۔ کہ درختوں پر چڑھ کر ان کے پھل کو توڑا جائے۔

" ای سخرت ثمارها لمتنا ولها ان کان الانسان قائما تناول الثمر دون کلفة وان کان قاعدا او مضطجعا ولا یرد الید عنها بعد ولا شوک " (المختصر من روح المعانی)

یعنی ان کے پھلوں کو حاصل کرنے والوں کے تابع کر دیا جائے گا۔ کھڑے ہوں، بیٹھے ہوں یا لیٹے ہوں ہر حال میں بغیر کسی مشقت کے پھل حاصل کر لیں گے۔ ان کے ہاتھ پھلوں سے دور نہیں رہیں گے۔ اور درختوں میں کسی قسم کے کانٹے نہیں ہوں گے جو توڑنے والوں کے لئے رکاوٹ کا سبب بنیں۔

پھل اور پرندوں کا گوشت:

﴿ وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُونَ ☆ وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ ﴾ (پ۲۷/۱۴)

اور میوے جو پسند کریں۔ اور پرندوں کا گوشت جو چاہیں۔

یعنی ہر قسم کا پھل وہاں میسر ہو گا۔ انسان جو چاہے گا وہی اعلیٰ اور افضل حالت میں ان کو حاصل ہو جائے گا۔ اور پرندوں کا گوشت بھی حاصل ہو جائے گا۔

" ان الرجل من اهل الجنة یشتهی الطیر من طیور الجنة فیقع فی یده مقلیا نضجا " (روح المعانی)

بے شک جنتی انسان جب پرندوں کے گوشت کی خواہش کرے گا تو جنتی پرندے اس کے ہاتھ میں خود بخود بھونے ہوئے آ جائیں گے۔ لیکن خیال رہے جنت کا تمام نظام دنیا کے نظام سے علیحدہ اور عجیب تر ہے۔ پرندوں کا بھونا ہوا دنیا کے پرندوں کے بھونے کی طرح نہیں ہو گا اور وہ کھائے جانے سے ختم نہیں ہوں گے۔

حضرت میمونہؓ سے مروی ہے:

" ان الرجل یشتهی الطیر فی الجنة فیجیء مثل البختی حتی یقع علی خوانه لم یصبه دخان ولم تمسه نار فیاکل منه حتی یشبع ثم یطیر الی غیر ذالک " (تفسیر روح المعانی)

انسان جنت میں جب پرندوں کے گوشت کی خواہش کرے گا تو وہ خود بخود سفید بُختی اونٹوں

کی طرح اس کے دسترخوان پر آ جائیں گے۔ (اگرچہ بھونے ہوئے ہوں گے) لیکن ان کو دھوئیں اور آگ نے چھوا تک نہیں ہوگا۔ یہ اس سے سیر ہو کر کھالیں گے پھر وہ اڑ کر دوسرے آدمی کی طرف چلے جائیں جو ان کی خواہش رکھتا ہوگا۔

نیک لوگ باغات میں اور عذاب سے محفوظ:

﴿ اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ نَعِیْمٍ ☆ فٰكِهِیْنَ بِمَا اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ وَوَقٰهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ ﴾ (پ۲۷ / ۳)

بے شک پرہیز گار باغوں اور چین میں ہیں اور اپنے رب کی عطاء پر خوش ہوں گے۔ اور انہیں ان کے رب نے آگ کے عذاب سے بچالیا۔

یعنی نیک لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے عذاب سے نجات عطا فرمائے گا کیونکہ انسان کے اعمال میں اتنے عیوب اور کوتاہیاں پائی جاتی ہیں کہ (اگر عدل کی بات ہو تو کئی طریقے سے نیک لوگوں کا گرفت میں آنا بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن صرف اللہ تعالیٰ کے فضل سے عذاب سے محفوظ ہوں گے اور باغوں کی سیر کر کے اور نعمتوں کے حصول سے خوش ہوں گے۔

نیک لوگ باغات اور نہروں میں:

﴿ اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍ ☆ فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْكٍ مُّقْتَدِرٍ ﴾ (پ۲۷ / ۱۰)

بے شک پرہیز گار باغوں اور نہر میں۔ سچ کی مجلس میں عظیم قدرت والے بادشاہ کے حضور۔ یعنی اللہ کے مقبول بندے جنتوں میں ابدی نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے میٹھے پانی، شراب طہور، صاف مصفی شہد اور تازہ دودھ کی نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ اواخر آیات کی رعایت کرتے ہوئے لفظ واحد ذکر کیا گیا۔ (نہر) لیکن مراد انہار ہی ہے۔ (اعلیٰ حضرت نے ترجمہ میں نہر ذکر کیا ہے لیکن اس سے مراد بھی ہر نہر ہی ہے مقصد آپ کا بھی نہریں ہی ہے)

حضرت امام جعفر صادقؓ فرماتے ہیں:

" مدح المكان بالصدق فلا يقعد فيه الا اهل الصدق "

یعنی اللہ تعالیٰ نے اس جگہ کو صفت صدق سے موصوف فرمایا ہے اس لئے کہ وہاں اہل صدق کو ہی

بیٹھنے کی جگہ ملے گی۔

بانه یبیح عزوجل لهم النظر الی وجهه الکریم . (روح المعانی)

یہ وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کے ساتھ جو وعدے فرمائے ہیں وہ پورے فرمائے گا۔ اس وقت ان عاشقان دلفگار کو اذن عام ہوگا کہ اے آتش عشق میں جلنے والو، اے شوق دیدار میں ماہی بے آب کی طرح عمر بھر تڑپنے والو، محبوب ازل اپنے رخ زیبا سے پردہ اٹھا رہا ہے، آنکھیں اٹھاؤ اور سیر ہو کر شاہد رعنا کا دیدار کر لو۔ (از ضیاء القرآن)

جنتی لوگ بول و براز وغیرہ سے محفوظ:

حضرت جابرؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اہل جنت اس میں (جنت میں) کھائیں گے، پئیں گے" ولا یتفلون، ولا یبولون، ولا یتغوطون ولا یمتخطون" انہیں تھوک نہیں آئے گی، پیشاب نہیں آئے گا، پاخانہ نہیں آئے گا۔ ناک نہیں بہے گا، کھنکھار وغیرہ نہیں آئے گا، صحابہ کرام نے عرض کیا اس کے کھانے کا کیا حال ہوگا؟

آپ نے فرمایا:

" جشاء ورشح کرشح المسک یلهون التسبیح اولتحمید کما تلهون النفس "

(مسلم، مشکوٰۃ باب صفة الجنة)

وہ ڈکار سے ہضم ہوگا اور پسینہ سے وہ پسینہ کستوری کی طرح خوشبودار ہوگا۔ تسبیح وتحمید ان کو ایسے الہام کی جائے گی جس طرح سانس الہام کیا جاتا ہے۔

یعنی جنت میں انسان ہر اس چیز سے محفوظ رہے گا جو دنیا میں ناپسندیدہ ہے۔ جب نبی کریم ﷺ نے فرمایا انسان جنت میں بول و براز وغیرہ سے بچا ہوگا تو صحابہ کرام نے از روئے تعجب عرض کیا کہ وہ کھانا، پینا کہاں جائے گا۔ آپ نے فرمایا ڈکار اور پسینہ سے ختم ہو جائے گا۔ لیکن وہ ڈکار اور پسینہ دنیا سے مختلف ہوگا۔ "فجشاء الجنة لا یکون مکروها بخلاف جشاء الدنیا" دنیا کا ڈکار ناپسندیدہ ہے لیکن جنتی ڈکار میں بھی خوشبو اور حسن ہوگا۔ اور دنیا کا پسینہ بد بودار ہوتا ہے لیکن جنت کا پسینہ کستوری سے بھی زیادہ خوشبودار ہوگا۔" والاظهر ان الاکل یتقلب جشاء والشرب یعود رشحا" ظاہر یہی ہے کہ کھانے کی اشیاء ڈکار سے ہضم ہو جائیں گے اور پینے کی پسینہ کی شکل میں

مترشح ہوکر۔

الہام: القاء الشیء فی الروع ۔انسان کے نفس میں کسی چیز کا القاء کرنا۔یعنی مطلب یہ ہے کہ انسان کو جس طرح سانس لینے میں تھکاوٹ اور دشواری نہیں ہوتی اسی طرح تسبیح وتحمید بھی بغیر تھکاوٹ اور دشواری کے اسے حاصل رہیں گے بلکہ جس طرح سانس انسان سے کسی وقت مکمل رابطہ توڑتا نہیں اسی طرح جنت میں انسان سے تسبیح وتحمید کا ذکر کبھی ختم نہیں ہوگا۔ (مرقاۃ المفاتیح)

جنتی لوگوں کا لباس اور سونے کے کنگن

﴿ جَنّٰتُ عَدۡنٍ یَّدۡخُلُوۡنَهَا یُحَلَّوۡنَ ...... تا ...... وَلَا یَمَسُّنَا فِیۡهَا لُغُوۡبٌ ﴾ (پ۲۲/۱۶)

جنات عدن (بسنے کے باغوں) میں داخل ہوں گے ان میں سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور وہاں ان کا لباس ریشمی ہے۔اور کہیں گے سب خوبیاں اللہ کو جس نے ہمارا غم دور کیا، بیشک ہمارا رب بخشنے والا اقدر فرمانے والا ہے۔وہ جس نے ہمیں آرام کی جگہ اتارا اپنے فضل سے، ہمیں اس میں نہ کوئی تکلیف پہنچے نہ ہمیں اس میں کوئی تھکان لاحق ہو۔

حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کریم کی تلاوت کرنے کے بعد فرمایا:

'' ان علیهم الیتجان انی ادنی لؤلؤة منها لتضیٔ ما بین المشرق والمغرب ''

بیشک ان (جنتیوں) کو تاج پہنائے جائیں گے جن کا ادنی (سب سے کم درجہ) موتی اتنی چمک رکھتا ہوگا۔کہ وہ مشرق ومغرب کے درمیان تمام جگہ کو روشن کر دے اور اسی طرح کنگن سونے اور موتی سے بنائے جائیں گے " **یرصع الذهب باللؤلؤ کمایرصع ببعض الاحجار**" سونے کے کنگنوں پر موتیوں کا جڑاؤ ہوگا جیسے کئی پتھری ہیروں کے جڑاؤ سے سونے کو مزین کیا جاتا ہے۔جنتیوں کا لباس خالص ریشم کا ہوگا۔ (روح المعانی)

جنتی لوگوں کے سبز کپڑے

﴿ یُحَلَّوۡنَ فِیۡهَا مِنۡ اَسَاوِرَ مِنۡ ذَهَبٍ وَّ یَلۡبَسُوۡنَ ثِیَابًا خُضۡرًا مِّنۡ سُنۡدُسٍ وَّ اِسۡتَبۡرَقٍ ﴾ (پ۱۵/۱۶)

وہ اس میں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور سبز کپڑے کریب اور قنادیز پہنیں گے جنت

میں لوگ شان وشوکت سے ہوں گے۔ جنت کا ہر نظام دنیا کے نظام سے بلند تر ہوگا، اس لئے وہاں کا سونا، چاندی اور موتی صرف نام کے لحاظ پر دنیا کے سونے، چاندی اور موتیوں سے مشابہت ہوگی ورنہ ان کی حقیقت کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کیونکہ جب کم از کم درجہ کا موتی مشرق ومغرب کے درمیان کو روشن کرسکتا ہے تو اعلیٰ کا مقام کیا ہوگا۔

ہر جنتی کو تین تین کنگن پہنائے جائیں گے سونے اور چاندی اور موتیوں کے، حدیث صحیح میں ہے کہ وضوء کا پانی جہاں جہاں پہنچتا ہے وہ تمام اعضاء بہشتی زیوروں سے آراستہ کیے جائیں گے۔ (خزائن العرفان)

سندس: ھو رقیق الدیباج، باریک، نفیس ریشمی کپڑا، جس کو دیباج بھی کہا گیا گے۔ اطلس یا دلپاس بھی اس کے نام کسی وقت رہے ہیں۔ اور باریک ریشمی کپڑے پر قنادیز بھی استعمال ہوا ہے۔

استبرق: انہ غلیظ الدیباج۔ ریشمی کپڑا لیکن ذرا موٹا۔ اسی طرح سونے کے تاریں جس کپڑے میں استعمال ہوں اسے بھی استبرق کہا گیا ہے۔ ریشمی موٹے کپڑے کو کریب بھی کہا جاتا ہے

(از روح المعانی)

کپڑوں کا سبز رنگ اس طرح روشن چمکدار ہوگا جو نظر کو پسند آئے گا۔ بلکہ نظر کی روشنی کی زیادتی کا سبب ہوگا۔ ''ان الرجل یکسی فی الساعة الواحدة سبعین ثوبا''، جنتی شخص کو ایک ایک وقت میں ستر ستر کپڑے دیئے جائیں گے۔ ایک ایک گھڑی میں وہ لباس تبدیل کرتا رہے گا۔ جو اسے پسند ہوگا وہ پہنے گا۔

(روح المعانی)

جنتی لوگ تختوں پر تکیہ لگائے ہوں گے:

﴿ مُتَّكِئِيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ نِعْمَ الثَّوَابُ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ﴾ (پ ۱۵، ۱۶/)

وہاں تختوں پر تکیہ لگائے ہوں گے، کیا ہی اچھا ثواب اور جنت کیا ہی اچھی آرام کی جگہ۔

ارائک: جمع ہے اریکہ کی۔ یہ اس تخت کو کہتے ہیں جس کے ارد گرد پالکی بنائی گئی ہو یعنی جس طرح دلہن کی ڈولی ہوئی ہے یا دلہن کے لئے چارپائی پر پالکی بنا کر چارپائی کو سجایا جاتا تھا۔ اسی طرح کے وہ تخت خوبصورت سجائے ہوں گے۔

تخت اونچے ہوں گے: ﴿ وَفُرُشٍ مَّرْفُوعَةٍ ﴾ (پ۲۷/ ۱۴)

اور بستر بچھے ہوں گے اونچے اونچے پلنگوں پر۔ حضرت ابوسعید خدریؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا:

" ارتفاعها كما بين السماء والارض مسيرة ما بينما خمس مائة عام "

ان تختوں کی بلندی اتنی ہوگی جتنی زمین وآسمان کے درمیان بلندی ہے، ان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے۔

" ولا تستعبد ذالک فالعالم عالم آخر وراء طور عقلک "

یہ کوئی بعید بات نہیں ۔ اس جہان کا نظام نظام ہی اور ہے، جو عقل کے ادارک سے ماوراء ہے۔ یعنی سمجھ سے بالاتر ہے۔ (از روح المعانی)

جنت میں بستر ریشمی ہوں گے:

﴿ مُتَّكِئِينَ عَلَىٰ فُرُشٍ ۢ بَطَائِنُهَا مِنْ إِسْتَبْرَقٍ ﴾ (پ۲۷/ ۱۳)

وہ تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے بستروں پر جن جن کے استر موٹے ریشم کے ہوں گے۔

عام رواج یہی ہے کہ " استر" یعنی نیچے والا کپڑا بنسبت " ابری" یعنی اوپر والے کپڑے سے گھٹیا ہوتا ہے کوٹ، لحاف، رضائی وغیرہ میں اسی چیز کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ جب جنتی بستروں کا استر ریشمی استبرق کا ہوگا تو اوپر والے حصہ کا کیا مقام ہوگا؟

سبز خوبصورت آرام دہ مسند ہوگی:

﴿ مُتَّكِئِينَ عَلَىٰ رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ﴾ (پ۲۷/ ۱۳)

وہ تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے سبز مسند پر جواز حد نفیس بہت خوبصورت ہوگی۔

" رفرف " کے کئی معنی بیان کئے گئے ہیں۔ سبز رنگ کی ریشمی چادر جو بستر پر بچھائی جاتی ہے اور تکیہ جس پر ٹیک لگائی جاتی ہے " الرفرف ضرب من بسط و قبل الوسائد " (کشاف)

اور علامہ قرطبی نے رفرف کے بہت سے معانی بیان کئے ہیں ایک معنی یہ بھی لکھا ہے:-

" قد قيل ان الرفرف شیء اذ استوى عليه صاحبه رفرف به واهوى به كالمرجاح

یمینا و شمالا و رفعا خفضا یتلذذ مع انیسته "

رفرف ایک ایسی چیز کو کہتے ہیں جس پر جب انسان بیٹھتا ہے تو کبھی وہ اوپر جاتی ہے کبھی نیچے کبھی دائیں کبھی بائیں۔ وہ جنتی اپنی مونس و ہمدم کے ساتھ بیٹھا لطف اندوز ہو رہا ہوگا لطف و مسرت کے لحاظ سے یہ معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

عبقری: " ثیاب منقوشة تبسط " پھولدار نقش ونگار والا قالین۔ ایسا خود ہی خوبصورت ہوتا ہے لیکن اس کی خوبصورت اور نفاست کا اندازہ اس سے لگائے کہ اللہ تعالیٰ بھی اسے " حسان " بہت خوبصورت فرما رہا ہے۔ (ضیاء القرآن)

جنتی انعام پر خوش ہوں گے

﴿ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ...... تا ...... وَزَرَابِيُّ مَبْثُوثَةٌ ﴾ (پ ۳۰۔ الغاشیة)

کتنے ہی چہرے اس دن بارونق ہوں گے، اپنی کاوشوں پر خوش ہوں گے۔ عالی شان جنت میں نہ سنیں گے وہاں کوئی لغو بات۔ اس میں چشمہ جاری ہوگا۔ اس میں اونچے اونچے تخت (بچھے) ہوں گے۔ اور ساغر قرینے سے رکھے ہوں گے۔ اور گاؤ تکیے قطار در قطار لگے ہوں گے اور قیمتی قالین بچھے ہوں گے۔

ناعمة: تروتازہ جن پر نعمت وراحت کے آثار نمایاں ہوں گے۔ " لسعیها " جو کوشش وہ زندگی بھر کرتے رہے ہوں گے ان کی جگر سوزیوں، عرق ریزیوں اور جد جہد کے عوض جو انعامات انہیں ملیں گے۔ انہیں دیکھ کر ان کی خوشی کی کوئی حد نہ رہے گی۔ فردوس بریں میں یہ اقامت گزیں ہوں گے۔ کوئی ایسی بات یہ نہ سنیں گے جو انہیں ناگوار ہو۔ ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے چشمے ہر طرف بہہ رہے ہوں گے۔ جگہ جگہ ان کے لئے اونچے پلنگ بچھے ہوں گے بڑے قرینے (سلیقے) سے ساغر اور بلوریں جام رکھے ہوں گے۔

نمارق: جمع ہے اس کا واحد نمرقہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے تکیے اور وہ گدیلے جو کجاوے (پالان) کے اوپر ڈالے جاتے ہیں ان کو بھی نمارق کہتے ہیں۔ زرابی اس کا واحد زربیہ ہے قالین، چاندنی جو فرش پر بچھائی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ان مہمانوں کی جنت میں جو خاطر و مدارات ہوگی۔ان کے آرام وآسائش کے جو سامان مہیا کیے جائیں گے۔انہیں جو شرف پذیرائی بخشا جائے گا،ان کا دلنواز تذکرہ آپ نے سنا جو لوگ ان وعدوں کی سچائی پر ایمان رکھتے ہیں انہیں سب کچھ چھوڑ کر بلکہ جان دے کر بھی اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا پڑے تو انہیں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

نبی کریم ﷺ کا رو کر دعا کرنا:

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے حضرت ابراہیمؑ کے متعلق نازل شدہ اللہ تعالیٰ کے قول (آیۃ کریمہ) کو تلاوت کیا۔

﴿ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضۡلَلۡنَ کَثِیۡرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنۡ تَبِعَنِیۡ فَاِنَّهٗ مِنِّیۡ وَمَنۡ عَصَانِیۡ فَاِنَّکَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴾

اے میرے رب بیشک ان (بتوں) نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے۔پس جس شخص نے میری تابعداری کی بیشک وہ میرا ہے۔اور جس نے میری نافرمانی کی بیشک تو ہی بخشنے والا رحم کرنے والا ہے

اور حضرت عیسیٰؑ نے کہا ﴿اِنۡ تُعَذِّبۡهُمۡ فَاِنَّهُمۡ عِبَادُكَ﴾ اگر تو ان کو عذاب دے تو بیشک وہ تیرے بندے ہیں۔پھر نبی کریم ﷺ نے اپنے ہاتھوں کو اٹھایا اور روتے ہوئے عرض کیا ''اللھم امتی امتی'' اے اللہ میری امت، میری امت (اس کو بخش دے، میری امت کا مجھے غم نہ دینا) اللہ تعالیٰ نے کہا اے جبرائیل محمد ﷺ کے پاس جاؤ اور تمہارا رب جانتا ہے۔(وربک اعلم جملہ معترضہ ہے) ان سے پوچھو تمہیں کس چیز نے رلایا ہے۔جبرائیل آپ کے پاس حاضر ہوئے، آپ سے سوال کیا، رسول اللہ ﷺ نے جو عرض کیا تھا (اللھم امتی امتی) اس کے متعلق خبر دی۔رب تعالیٰ نے فرمایا اے جبرائیل محمد (ﷺ) کے جا کر کہو'' انا سنرضیک فی امتک ولا نسوء ك'' ہم تمہیں امت کے بارے میں راضی کریں گے کوئی غم نہیں پہنچائیں گے

(مسلم، مشکوٰۃ باب الحوض والشفاعۃ)

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں اس حدیث پاک سے یہ فوائد حاصل ہوئے۔نبی کریم ﷺ کو اپنی امت پر کامل شفقت حاصل ہے۔آپ اپنی امت کی بہتری اور ان کے تمام بھلائی کے امور کا اہتمام فرماتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے امت کو راضی کرنے اور امت کا غم نہ پہنچانے کا آپ سے وعدہ فرمانا یہ

آپ کی امت کے لئے بہت بڑی بشارت ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حضور بنسبت باقی انبیاء کرام حضور ﷺ کا عظیم مرتبہ ہے۔ جبرائیل امین کو آپ کے پاس بھیج کر سوال کرنے میں بھی یہی حکمت ہے کہ آپ کے مرتبہ کو واضح کرنا مقصود تھا کہ تمام کو آپ کی فضیلت، برتری کا علم ہو جائے۔

(مرقاۃ)

اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ باقی انبیاء کرام نے گناہگاروں کو رب کے سپرد کیا کہ اللہ وہ تیرے ہیں تو ہی ان سے اپنی مرضی کے مطابق سلوک فرما۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے عرض کیا:

اے اللہ! ہیں تو گناہگار! لیکن جب میرے امتی ہیں تو وہ میرے ہی ہیں، ان پر رحم فرما۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت کا عجیب انداز:

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (قیامت کے دن) جہنم پر پل بچھایا جائے گا۔ تمام رسولوں سے پہلے میں اپنی امت کو اس سے گذاروں گا۔ اس دن سوائے رسولوں کے کسی کو کلام کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اور اس دن رسولوں کا کلام ہوگا ''اللھم سلم سلم'' اے اللہ سلامتی سے (ہماری امتوں کو) گذا دے۔ اور جھنم میں آگے سے ٹیڑھی کی ہوئی لوہے کی سلاخیں اس طرح ہوں گی جس طرح سعدان پودے کے کانٹے ہوتے ہیں، وہ سلاخین کتنی بڑی ہوں گی ان کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی نہیں جانتا۔ ان سے لوگوں کو ان کے اعمال کے مطابق کھینچا جائے گا۔ بعض لوگ ھلاک ہو جائیں گے (کافر ھلاک ہو جائیں گے) اور بعض کو گرا دیا جائے گا اور بعد میں ان کو نجات دی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ جب اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ فرما کر فارغ ہو جائے گا تو کچھ لوگوں کو جہنم سے نکالنے کا ارادہ فرمائے گا، جب کو نکالنے کا ارادہ فرمائے گا یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے یہ شہادت دی ہوگی اللہ کے بغیر کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دے گا جن لوگوں نے اللہ کی عبادت کی تھی ان کو نکال لو۔ فرشتے ان کو نکال لیں گے۔ اور سجدہ کی علامات (چہرے پر نورانیت) سے انہیں پہچان لیں گے اللہ تعالیٰ آگ پر حرام کر دے گا کہ وہ جن (اعضاء) پر سجدہ کے اثرات ہیں ان کو کھائے۔ تمام انسانوں کو آگ کھا جائے گی سوائے ان کے جن پر سجدہ کے علامات ہوں گی۔ جب ان کو آگ سے نکالا جائے گا تو وہ آگ سے جل چکے ہوں گے۔ ان پر آب حیات ڈالا جائے گا وہ اسی

طرح صحیح وسلامت ہو جائیں گے جس طرح بہتے پانی پر دانہ کھل کھلا رہا ہوتا ہے۔

ایک آدمی جنت اور دوزخ کے درمیان باقی رہ جائے گا۔ یہ سب دوزخیوں میں سے آخر میں جنت میں داخل ہونے والا ہوگا۔ اس کا چہرا ابھی تک آگ کی طرف ہوگا۔ یہ عرض کرے گا اے میرے رب میرے چہرے کو آگ سے پھیر لے، مجھے اس کی گرم لو ھلاک کر رہی ہے۔ اور اس کے شعلوں نے مجھے جلا کر رکھ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میں ایسا کردوں تو ہوسکتا ہے تو اور سوال کرنا شروع کر دے تو وہ کہے گا اے اللہ تیری عزت کی قسم میں اور کچھ نہیں مانگوں گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ اور تقدیر کے مطابق اسے یہ عطا کر دے گا (اس کی دعاء قبول کر لے گا) اس کے چہرے کو آگ سے پھیر دے گا، تو اتنی دیر خاموش رہے گا جتنی دیر اللہ تعالیٰ اس کے خاموش رہنے کو چاہے گا۔

پھر کہے گا: اے اللہ! مجھے جنت کے دروازے کے پاس پہنچادے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تو نے وعدہ نہیں کیا تھا؟ کہ میرا یہ سوال پورا کردے تو میں اور کچھ نہیں مانگوں گا۔ وہ شخص عرض کرے گا اے میرے رب (تیری مہربانی) مجھے اپنی تمام مخلوق سے زیادہ بد بخت نہ بنا۔ رب تعالیٰ فرمائے گا کہ اگر میں تیرا یہ مطالبہ پورا کردوں تو ہوسکتا ہے تو اور کوئی سوال کرنا نہ شروع کر دے۔ وہ کہے گا اے اللہ! تیری عزت کی قسم اور تو کچھ نہیں مانگوں گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے مطابق جو اس نے خود ہی پسند فرمایا، اسے جنت کے دروازہ کے پاس جانے کی اجازت فرمادے گا۔ وہ شخص دروازہ پر پہنچ کر جنت کی عیش و عشرت رونق، حسن و جمال اور جنت کے محلات، حور و غلماں دیکھے گا۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق کچھ دیر خاموش رہے گا۔ پھر عرض کرے گا: اے اللہ! مجھے جنت میں داخل کردے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تجھ پر بہت تعجب ہے تو کتنا ہی وعدہ خلاف ہے۔ کیا میں نے تیرے سارے وعدے پورے نہیں کر دیئے، کیا میں نے تیرے سوالوں کے مطابق تجھے عطا نہ کر دیا۔ تیرا وعدہ بھی تھا کہ یہ مجھے دے دے میں اور کچھ نہیں مانگوں گا۔

وہ عرض کرے گا۔ اے میرے رب (میرے حال پر رحم فرما) مجھے اپنی تمام مخلوق سے زیادہ بدبخت (بدنصیب) نہ بنا۔ وہ اسی طرح سوال کرتا رہے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس پر راضی ہو جائے گا۔ جب راضی ہو جائے گا تو اسے جنت میں داخل ہونے کی اجازت فرمادے گا پھر وہ شخص اسی طرح تمنا کرتا رہے گا۔ اور نعمتوں کا سوال کرتا رہے گا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کی تمام خواہشات کو پورا

فرمادے گا۔ بلکہ اس کے سوالات کے مطابق اسے انعامات سے نواز کر پھر اپنی مہربانی اور فضل وکرم سے اسے اس کی تمنا کے مطابق اتنی مقدار میں اور مزید انعامات عطا فرمادیگا۔

(بخاری، مسلم، مشکوۃ باب الحوض والشفاعة)

جنت میں سب سے عظیم نعمت اللہ تعالیٰ کی رضامندی ہے

حضرت ابو سعید فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ جنت والوں کو کہے گا۔ اے جنت والو۔ وہ کہیں گے اے ہمارے رب! لبیک وسعدیک (ہم تیری خدمت میں بار بار حاضر ہیں) رب تعالیٰ فرمائے گا: کیا تم راضی ہو؟ وہ کہیں گے۔ اے ہمارے رب ہم کیوں نہ راضی ہوں۔ تحقیق تو نے ہمیں وہ (نعمتیں) عطا کی ہیں جو تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو نہیں دی ہیں۔ رب تعالیٰ فرمائے گا۔ ''الا اعطیکم افضل من ذالک'' کیا میں تمہیں اس سے افضل عطا نہ کروں وہ کہیں گے اے رب ''وای شئی افضل من ذالک'' اس سے افضل اور کیا چیز ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا ''احل علیکم رضوانی فلا اسخط علیکم بعده ابدا'' میں تمہیں اپنی رضامندی عطا کرتا ہوں، اس کے بعد میں تم پر کبھی بھی ناراض نہیں ہوں گا۔

(بخاری، مسلم مشکوۃ باب صفة الجنة)

یعنی تمہیں ہمیشہ میری رضامندی حاصل رہے گی۔ اس لئے کہ ضروری نہیں کہ کثرت عطاء سے رضاء بھی حاصل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی سے بھی یہی حاصل ہو رہا ہے کہ تمام نعمتوں سے اللہ تعالیٰ کی رضاء ''اعلیٰ نعمت'' ہے۔

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ﴾ (پ ۱۰/ ۱۵)

اللہ نے مسلمانوں مردوں اور مسلمان عورتوں کو باغوں کا وعدہ دیا ہے جن کے نیچے نہریں رواں (جاری ہیں) ان میں ہمیشہ رہیں گے اور پاکیزہ مکانوں کا بسنے کے باغوں میں (وعدہ فرمایا ہے) اور اللہ کی رضاء سب سے بڑی (نعمت ہے)۔

کیونکہ ہر کامیابی اور سعادت کا سبب اللہ تعالیٰ کے رضاء ہے۔ جنتی لوگ اللہ کی رضاء کی وجہ سے ہی اس کی تعظیم وکرامت کو حاصل کریں گے۔ اور ہر قسم کے ثواب سے بڑھ کر اللہ کی کرامت کا حصول ہے۔

''لان العبد اذا علم ان مولاہ راض عنه فهو اکبر فی نفسه مما ورائه من النعم''

اس لئے کہ انسان کو جب یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا مولیٰ اس سے راضی ہے وہ اپنے دل میں سب نعمتوں سے بڑھ کر یہی نعمت سمجھتا ہے۔ اپنے مولیٰ کی رضاءمندی پر انسان خوش ہوتا ہے جس طرح اس کی ناراضگی پر انسان ہر چیز کو گھٹیا سمجھتا ہے بڑی سے بڑی نعمتیں بھی انسان کو حاصل ہو جائیں لیکن مولیٰ راضی نہ ہو تو انسان کو لذت حاصل نہیں ہوتی۔ (مرقاۃ المفاتیح)

یہی وجہ ہے کہ محبّ رسول ﷺ اپنے لئے سب سے بڑی نعمت آقا و مولیٰ حبیب خدا کی رضاء اور نظر عنایت کو سمجھتا ہے۔ کیونکہ رضاء مصطفےٰ ﷺ ہی رضاء خدا کا ذریعہ ہے۔

محمد کی غلامی دین حق کی شرط اول ہے
اسی میں اگر ہو خامی تو سب کچھ نامکمل ہے

سب سے بڑی کرامت اللہ کا دیدار ہے:

"اکبر اصناف الکرامۃ رؤیۃ اللہ تعالیٰ" (مرقاۃ ج ۸ ص ۳۲۸)

اللہ تعالیٰ کے دیدار سے مشرف ہونا ہی حقیقت میں سب سے بڑی کرامت ہے۔ حضرت جریر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

انکم سترون ربکم عیانا. (مشکوٰۃ باب رؤیۃ اللہ تعالیٰ)

بے شک تم اپنے رب کو ظاہر ظاہر دیکھو گے۔

﴿ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴾ (پ۲۹، ۱۷)

کئی چہرے اس روز تر و تازہ ہوں گے اور اپنے رب کے (انوار جمال) کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔ سعادت مند لوگوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جو ساری عمر اپنے رب کریم کی محبت اور یاد میں سرشار رہے ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس کے محبوب کریم کے عشق سے رنگین رہا اور ان کا ایک ایک سانس اس کے لائے ہوئے دین حنیف کے سربلندی کے لئے وقف رہا۔ فرمایا کئی ایسے چہرے ہوں گے جن کے حسن و جمال۔ تر و تازگی و شیفتگی کو دیکھ کر آنکھیں روشن ہو جائیں گی۔ وہ اپنے رب کے مشاہدہ و دیدار میں مستغرق ہو جائیں گے۔

اہل سنت کا یہ مسلمہ عقیدہ ہے کہ دار آخرت میں اللہ تعالیٰ اپنے مقبول بندوں کو اپنے دیدار سے

مشرف فرمائیں گے۔ لیکن معتزلہ اور خوارج اور دیگر بدعتی فرقے اس بات کا انکار کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ رؤیت (دیکھنے) کیلئے جن شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ ذات باری تعالیٰ ان سے مبرّا (پاک) ہے۔ اس لئے رؤیت کا تحقق ناممکن ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ رؤیت کے لئے دیکھنے والے کا بینا ہونا، جس کو دیکھا جارہا ہے اس کا محسوس ہونا، کسی جہت میں پایا جانا، نہ زیادہ نزدیک اور نہ زیادہ دور ہونا ضروری ہے ...... اور جب اللہ تعالیٰ جہت سے، محسوس ہونے سے، دوری اور نزدیکی سے پاک ہے تو اس کی رؤیت کیسے متحقق ہوسکتی ہے؟

اہل سنت اس کا جواب دیتے ہیں کہ تم ''عالم آخرت'' کے حقائق کو ''عالم دینا'' پر قیاس کر رہے ہو جو سراسر نادانی ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ رؤیت متحقق ہوگی۔ اور ان شرائط کے پائے جانے کے بغیر متحقق ہوگی، کیف، جہت اور ثبوت مسافت کے تکلفات کے بغیر آنکھیں رب کریم کا دیدار کریں گے۔ نیز کثیر احادیث سے جو مجموعی طور پر حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں۔ رؤیت خداوندی کا ثبوت ملتا ہے۔ اتنی کثیر احادیث کا انکار کیونکر ممکن ہے؟

صحیحین (بخاری و مسلم) کی حدیث ہے جو جریرا البجیلی سے منقول ہے:

" قال كنا جلوسا عند النبی ﷺ اذا نظر الی القمر ليلة البدر فقال انكم سترون ربكم كما ترون هذا القمر ليلة البدر لا تضامون فی رؤية "

ترجمہ: ہم حضور کریم علیہ السلام کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے، اچانک حضور نے چودہویں کے چاند کیطرف دیکھا اور فرمایا تم اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جس طرح چودھویں کے چاند کو دیکھ رہے ہو۔

زید بن حارثہؓ کہتے ہیں حضور یہ دعاء مانگا کرتے تھے:

" اللهم انی اسألك برد العيش بعد الموت ولذة النظر علی وجهک والشوق الی لقاءک "

الٰہی میں تجھ سے موت کے بعد آرام دہ زندگی کا سوال کرتا ہوں مجھے اپنے رخ انور کو دیکھنے کی لذت عطا فرما اور اپنی ملاقات کا شوق بخش۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَیَقُوْلُوْنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا ۙ وَّیَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا ؕ وَمَا یُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ ☆ الَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ ۪ وَیَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ وَیُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴾

''بیشک اللہ اس سے حیا نہیں فرماتا کہ مثال سمجھانے کو کیسی ہی چیز کا ذکر فرمائے، مچھر ہو یا اس کے بڑھ کر تو وہ جو ایمان لائے وہ تو جانتے ہیں کہ یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے، رہے کافر وہ کہتے ہیں ایسی کہاوت میں اللہ کا کیا مقصود ہے۔ اللہ بہتروں 1 کو اس سے گمراہ کرتا ہے اور بہتروں ۲ کو ہدایت فرماتا ہے۔ اور اس سے انہیں گمراہ کرتا ہے جو بے حکم ہیں وہ جو اللہ کے عہد کو توڑ دیتے ہیں پکا ہونے کے بعد اور کاٹتے ہیں اس چیز کو جس کے جوڑنے کا خدا نے حکم دیا اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں وہی نقصان میں ہیں''

''بیشک اللہ ترک نہیں فرماتا کہ وہ بیان کرے مچھر کی مثال یا اس سے بڑھ کر کسی چیز کی، تو وہ جو ایمان والے ہیں وہ تو جانتے ہیں کہ یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے۔ لیکن وہ جو کافر ہیں وہ کہتے ہیں ایسی کہاوت میں اللہ کا کیا مقصد ہے۔ بہتوں کو اللہ اس سے گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت فرماتا ہے۔ اور اس سے سوائے نافرمانوں کے کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔ وہ جو اللہ کے عہد کو توڑ دیتے ہیں پکا ہونے کے بعد، اور کاٹتے ہیں اس چیز کو جس کے جوڑنے کا حکم اللہ نے دیا، اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں وہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔''

شان نزول: آیۃ کریمہ کے شان نزول میں مختلف قول ہیں۔لیکن ان تمام کے واقع ہونے کے بعد آیۃ کریمہ نازل ہوئی:

(۱) ﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ نَارًا﴾ جب یہ آیۃ کریمہ اور اس کے بعد والی آیات نازل ہوئیں۔جن میں منافقوں کے حال کو بیان کیا گیا،تو وہ کہنے لگے رب تعالیٰ کا ان مثالوں کو بیان کرنے کا کیا مقصد ہے؟یعنی انہوں نے یہ سمجھا کہ رب تعالیٰ کا مثالیں بیان کرنا اس کی شان کے لائق نہیں تو اس وقت یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

ابھی جس قول کا ذکر کیا ہی اسی سے آیۃ کریمہ کا پہلی آیات سے تعلق بھی واضح ہو گیا اور قریب ہی کافروں کے لئے جہنم اور مومنوں کے لئے جنت کا ذکر ہو چکا ہے۔یہاں بھی ایمان والوں کا مثالوں کو حق سمجھنا اور کافروں کا اعتراض کرنا ذکر کیا گیا۔جس سے ماقبل سے تعلق واضح ہو گیا۔

(۲) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بت پرستوں اور ان کے معبودان باطلہ کا ذکر ان الفاظ سے کیا:

" یا ایها الناس ضرب مثل فاستمعوا له ، ان الذین تدعون من دون الله لن یخلقوا ذبابا ولو اجتمعوا له وان یسلبهم الذباب شیا لا یستنقذوه منه ضعف الطالب والمطلوب "

''اے لوگو ایک مثال بیان کی جاتی ہے اسے کان لگا کر سنو،وہ جنہیں اللہ کے سوا تم پوجتے ہو،ایک مکھی نہ بنا سکیں گے اگرچہ سب اس پر اکٹھے ہو جائیں اور اگر مکھی ان سے کچھ چھین کر لے جائے تو اس سے چھڑا نہ سکیں کتنا عاجز ہے چاہنے والا اور جسے چاہا گیا''

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مشرکین کا ذکر یوں بیان کیا:

﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِیَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَیْتًا وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُیُوْتِ لَبَیْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ﴾

''ان کی مثال جنہوں نے اللہ کے بغیر اور مالک بنالئے ہیں مکڑی کی طرح ہے،اس نے جالے کا گھر بنایا اور بیشک سب گھروں میں کمزور گھر مکڑی کا گھر ہے کیا اچھا ہوتا اگر وہ جانتے''

ان آیات پر یہود نے طنز کیا:

" ای قدر الذباب والعنكبوت حتی یضرب الله المثل بهما فنزلت هذه الآیة "

'' مکھی اور مکڑی کی قدر ہی کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مثالیں بیان کرے، ان کے اس کہنے پر یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی''

(۳) مکھی اور مکڑی کی مثالوں پر مشرکین اور کفار نے طنز کیا انہوں نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ بڑی شان کا مالک ہے وہ ان حقیر چیزوں کی مثالیں کیوں بیان کرتا ہے، تو اس وقت یہ آیۃ نازل ہوئی۔

اعتراض: یہ آخری قول تو درست نہیں کیونکہ مظہری میں ذکر ہے " والآیة مدنیة ومعارضة المشرکین کانت بمکة " آیت مدنی ہے اور کفار سے مقابلہ مکہ میں تھا تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ کفار و مشرکین کے طنز کے بعد یہ آیت نازل ہوئی یہ قول تو بہت ہی کمزور نظر آتا ہے۔

جواب: سورۃ مدثر مکی ہے اس میں کفار اور منافقین کا ذکر آ چکا تھا تو یہود کے اعتراض اور طنز پر، اور مشرکین و کفار کو دوبارہ جھنجھوڑنے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی۔ سورۃ مدثر میں رب تعالیٰ نے اسی مضمون کو ان الفاظ مبارکہ سے ذکر فرمایا:

﴿ وَلِیَقُوْلَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْکٰفِرُوْنَ مَاذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ؕ کَذٰلِکَ یُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ یَّشَآءُ وَیَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ﴾

'' اور وہ لوگ جن کے دلوں میں مرض ہے اور کافر کہیں گے اللہ ان مثالوں سے کیا ارادہ کرتا ہے، اسی طرح اللہ جسے چاہے گمراہ کر دے اور جسے چاہے ہدایت دے''

اسی وجہ سے علامہ رازی رحمہ اللہ نے آیۃ کریمہ کے شان نزول میں تینوں اقوال نقل کرنے کے بعد فرمایا:

" اذا ثبت هذا فنقول احتمال الکل ههنا قائم لان الکافرین والمنافقین والیهود کانوا متوافقین فی ایذاء رسول اللہ ﷺ وقد مضی من اول السورة الی هذه الموضع ذکر الیهود وذکر المنافقین وکر المشرکین وکلهم من الذین کفروا "

'' جب یہ ثابت ہو گیا کہ آیۃ کریمہ کے شان نزول میں تین قول ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ یہاں سب قول پائے جانے کا احتمال ہے اس وجہ سے کہ کفار، منافقین، مشرکین تمام کے تمام ہی نبی کریم ﷺ وایذاء پہنچانے (تکلیف دینے) میں ایک دوسرے سے متفق تھے اس قسم کا طنز بھی دراصل ایذاء پہنچانے کا ہی ایک حصہ تھا''

سورۃ کی ابتداء سے یہاں تک یہود، منافقین اور مشرکین کا ذکر ہو چکا ہے، کیونکہ وہ سب ہی کافر تھے

تو اس آیۃ میں بھی ان سب کے لغویات کا ذکر ہے اور انکا رب تعالیٰ نے رد فرما دیا۔ (از کبیر)

کیا مچھر کی مثال بیان کی گئی:

آیۃ کریمہ میں یہ تو ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ مچھر کی مثال بیان کرنے سے حیا نہیں فرماتا لیکن قرآن پاک میں کہیں مچھر کی مثال بیان کی گئی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث پاک میں مچھر کی مثال بیان ہے جیسا کہ ابو جعفر رازی نے ربیع بن انس کے قول سے ذکر کیا کہ انہوں نے اس آیۃ کریمہ کی تفسیر میں بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی مثال مچھر سے بیان فرمائی:

" ان البعوضة تحیی ما جاعت فاذا سمعت ماتت "

"بیشک مچھر جب تک بھوکا رہتا ہے تو زندہ رہتا ہے جب زیادہ کھا کر موٹا ہو جاتا ہے تو مر جاتا ہے"

یہی حال ہے دنیا کے مال و دولت کی طرف ہی توجہ کرنے والے اور رب تعالیٰ کی یاد کو چھوڑ دینے والوں کا کہ جب دنیا کا مال و دولت ان کے پیٹوں کو بھی بھر دیتا ہے تو وہ رب تعالیٰ کے احکام سے عدولی کرنے کی وجہ سے باغی ہو جاتے ہیں۔ تو رب تعالیٰ ان کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے پھر انہوں نے اپنے اس قول پر بطور دلیل یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ☆ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾

"پھر جب انہوں نے بھلا دیا جو نصیحتیں ان کو کی گئی تھیں، ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیے یہاں تک کہ جب وہ خوش ہوئے اس پر جو انہیں ملا تو ہم نے اچانک انہیں پکڑ لیا اب وہ آس ٹوٹے رہ گئے تو جڑ کاٹ دی گئی ظالموں کی اور سب تعریفیں اللہ کی ہیں جو تمام جہانوں کا مالک ہے" (از کبیر)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖۤ : بیشک اللہ تعالیٰ حیا نہیں فرماتا۔ لا یستحی "حیاء" سے ماخوذ ہے:

" اعلم ان الحیاء تغیر وانکسار یعتری الانسان من خوف ما یعاب به ویذم "

حیاء کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان پر عیب اور مذمت کے خوف کی وجہ سے ایسی حالت کا طاری

ہونا جس کی وجہ سے اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو جائے اور چہرا مرجھا جائے۔

اس معنی کے لحاظ سے رب تعالیٰ کی طرف حیاء کی نسبت نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ تغیر اور اس قسم کی کیفیت کا تعلق بدن اور جسم سے ہوتا ہے۔ رب تعالیٰ جسم سے پاک ہے۔ اس قسم کا تغیر جسموں سے ہونے کی وجہ واضح ہے کہ کہا جاتا ہے " والتغیر منکسر القوة منغص الحیاة " کہ حیاء کی وجہ سے اس میں وہ تغیر پیدا ہو گیا جس کی وجہ سے اس کی قوت ختم ہوئی اس کی زندگی خاک آلود ہوگئی۔ اسی طرح کہا جاتا ہے " فلان هلک حیاء من کذا " فلاں شخص اس طرح حیاء سے ہلاک ہو گیا " ومات حیاء " حیاء سے مر گیا۔ " ورایت الهلاک فی وجهه من شدة الحیاء " میں نے دیکھا کہ اس کے چہرہ پر شدت حیاء کی وجہ سے ہلاکت دکھائی دے رہی تھی " وذاب حیاء " وہ شخص حیاء کی وجہ سے پگھل گیا۔

اس قسم کے تمام الفاظ کا تعلق اجسام سے ہے، رب تعالیٰ جسم سے پاک ہے۔ اس سے یہ پتہ چل رہا ہے کہ رب تعالیٰ حیاء سے پاک ہے۔ اور رب تعالیٰ کے لئے حیاء کا استعمال بھی ہے جیسا کہ اسی آیت میں استعمال ہوا ہے اور حدیث پاک میں بھی مذکور ہے۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" ان الله تعالیٰ حیی کریم یستحی اذا رفع العبد الیه یدیه ان یردهما صفرا حتی یضع فیهما خیرا "

" بیشک اللہ تعالیٰ حیاء فرمانے والا کریم ہے جب بندہ اس کی طرف ہاتھ اٹھاتا ہے تو اسے حیاء آتی ہے کہ وہ اس کے ہاتھوں کو خالی لوٹا دے یہاں تک کہ ان میں خیر رکھ دیتا ہے "

اسی طرح حدیث شریف میں ہے:

" ان الله یستحی من ذی الشیبة المسلم ان یعذبه "

" بیشک اللہ تعالیٰ حیاء فرماتا ہے کہ سفید بالوں والے مسلمان کو عذاب دے "

حیاء کا استعمال رب تعالیٰ کے لئے کیسے صحیح ہے؟ جب کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ رب تعالیٰ کے لئے حیاء کا استعمال درست نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر وہ صفت جس کا تعلق اجسام سے ہو جب وہ

رب تعالیٰ کی طرف منسوب ہوگی تو اس کی ابتداء والا معنی مراد نہیں ہوگا بلکہ انتہاء والا معنی مراد ہوگا کہ اس کی غایت اور اس کا مقصد کیا ہے۔

حیاء کا بھی ایک مبدا ہے اور ایک منتہیٰ ہے۔ مبدا یہ ہے کہ انسان پر برائیوں کی طرف منسوب کرنے کی وجہ سے خوف طاری ہونے پر تغیر پیدا ہوجائے چہرے کا رنگ بدل جائے چہرہ مرجھا جائے۔ منتہیٰ یہ ہے کہ انسان اس کام کو چھوڑ دے:

" فاذا ورد الحياء فی حق الله تعالىٰ فلسی المراد منه ذلک الخوف الذی هو مبدا الحياء ومقدمته بل ترک الفعل الذی هو منتهاه وغايته "

''جب اللہ تعالیٰ کے حق میں حیاء کا ذکر ہو اس وقت اس سے مراد حیاء کا مبدا اور مقدمہ نہیں ہوتا جس کا مطلب خوف طاری ہونا ہوتا ہے۔ بلکہ اس کے حق میں مقصد اور منتہی مراد ہوتا ہے جس کا معنی ہوتا ہے چھوڑ دینا''

اب ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ ﴾ کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ چھوڑتا نہیں مثال بیان کرنے کو ......الخ۔ راقم نے یہی معنی کیا ہے تاہم جب معنی یہ کیا جائے کہ ''بیشک اللہ تعالیٰ حیاء نہیں فرماتا'' تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جو ''حیاء'' اس کی شان کے لائق ہے اب بھی مطلب درست ہے۔

اسی طرح غضب کا مطلب ہوتا ہے دل میں خون کا جوش مارنا، انتقام کی خواہش پیدا ہونا اور کسی کو عذاب دینا۔ جب رب تعالیٰ کی طرف غضب کی نسبت ہوگی تو صرف عذاب دینا مقصود ہوگا دل میں خون کا جوش مارنا اور انتقام کی خواہش کا پیدا ہونا مقصود نہیں ہوگا۔ (از کبیر و مظہری)

اَنْ يَّضْرِبَ: بیان کرنا، ضرب کئی معنی میں استعمال ہے:

(۱) ضرب بمعنی مارنا، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا " فاضربوا فوق الاعناق واضربوا منهم كل بنان " اور اسی طرح فضرب الرقاب اور اضرب بعصاک البحر ان تمام مقامات میں ''ضرب'' کا معنی مارنا ہی ہے۔

(۲) چلنا، سیر کرنا، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ ﴾ جب تم زمین میں چلو۔ اسی طرح ﴿ وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ ﴾ اسی طرح ﴿ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ

ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ﴾ ان تمام مقامات میں "ضرب "کا معنی چلنا اور سیر کرنا ہے۔

(۳) بیان کرنا، جس طرح یہاں استعمال ہوا﴿ اِنَّ اللّٰہَ لَایَسْتَحْیٖٓ اَنْ یَّضْرِبَ ﴾اور ﴿ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلاً ﴾ اور ﴿ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ مَثَلًا ﴾ ان مقامات میں "ضرب" کا معنی بیان کرنا۔

(۴) چھا جانا، جیسا کہ کہا جاتا ہے " ضرب الخیمة " اس نے خیمہ لگایا یعنی خیمہ چھا گیا۔ اور رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ ﴾ ان پر ذلت مسلط کر دی گئی یعنی ان پر ذلت چھا گئی۔ (از مفردات راغب)

مَثَلاً مَّا: ایک احتمال اس میں یہ ہے کہ " ما " میں عموم ہے۔ اب معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ترک نہیں فرماتا مثال بیان کرنے کو خواہ چھوٹی چیز کی مثال ہو یا بڑی چیز کی مثال ہو۔

ایک اور احتمال یہ ہے " ما ھھنا للتقلیل وتکون بعوضة منصوبة علی البدل " کہ "ما " یہاں تقلیل کے لئے ہو اور " بعوضة " منصوب ہو اور بدل واقع ہو رہا ہو۔ جس طرح کہا جاتا ہے " لا ضربن ضربا ما " میں ضرور بضرور کوئی چھوٹی سے مثال بیان کروں گا۔

اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ "بیشک اللہ تعالیٰ چھوٹی سی چھوٹی مثال بیان کرنے کو ترک نہیں فرماتا

ایک اور احتمال یہ ہے کہ " ما " موصولہ ہو اور " بعوضة " پر وہی اعراب ہو جو " ما " کا اعراب ہو۔ کیونکہ " ما " اور " من " کے صلہ کا اعراب وہی ہوتا ہے جو ان کا اپنا اعراب ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت حسان ابن ثابت رضی اللہ عنہ کے اس شعر میں " ما " اور اسکے صلہ کا اعراب ایک ہی ہے:

یکفی بنا فضلا علی من غیرنا — حب النبی محمد ایانا

"ہمیں اوروں پر یہی فضیلت کافی ہے — کہ نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ کو ہم سے محبت ہے"

(از ابن کثیر)

بَعُوْضَةً: (مچھر) صاحب کشاف نے بیان کیا ہے کہ " بعوض "مشتق ہے بعض سے جس کا معنی ہے کاٹنا، اسی طرح "بضع " کا معنی بھی" کاٹنا" اور" عضب" کا معنی بھی کاٹنا۔ تینوں کلموں میں حرف ایک ہی ہیں ب ، ع ، ض ، اگرچہ ترتیب حروف علیحدہ علیحدہ ہے لیکن معنی ایک ہے۔

فَمَا فَوْقَهَا: (تواس سے بڑھ کر) یعنی اللہ تعالیٰ ترک نہیں فرماتا کہ مثال بیان کرے مچھر کی یا اس سے بڑھ کرکسی چیز کی " فوق " کا لفظ ''تحت'' کا مقابل ہے جس کا معنی ہے اوپر ہونا " ھا" ضمیر " بعوضة " کی طرف لوٹ رہی ہے۔اب یہاں " فوق " میں دو احتمال ہیں ایک یہ ہے۔

" فما فوقھا یعنی الذباب والعنکبوت وما ھو اعظم منھما فی الجنة "

''کہ مچھر سے بڑی چیز ہو جسم کے لحاظ پر جیسے مکھی اور مکڑی''

یعنی اللہ تعالیٰ ترک نہیں فرماتا کہ مثال بیان کرے مچھر کی یا مچھر سے وہ بڑی ہو جسامت میں خواہ مکھی ہو، یا مکڑی ہو۔

دوسرا احتمال اس میں یہ ہے " وقیل معناہ فما دونھا واصغر منھا وھذا القول اشبه " کہ اس کا معنی یہ ہے کہ مچھر سے وہ چھوٹی چیز ہو اور حقیر ہو۔ یہ قول زیادہ مناسب ہے اور آیۃ کریمہ کے شان نزول کے قریب ہے۔اس لئے کہ کفار نے جب اعتراض اس بات پر کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں کہ وہ مکھی اور مکڑی کی مثالیں بیان کرے یہ تو حقیر چیزیں ہیں۔

ان کے جواب میں جب ارشاد ہوا تو مقصد بیان اس سے زیادہ واضح ہوتا ہے کہ تمام مخلوق رب تعالیٰ کی قدرت پر دلالت کر رہی ہے چھوٹی چیزوں میں اس کی قدرت زیادہ پائی جاتی ہے اس لئے رب تعالیٰ چاہے تو مچھر کی مثال بیان کرے یا اس سے بھی چھوٹی چیز کی مثال بیان کرے یہ اس کی مرضی کی بات ہے۔اس کی شان کے لائق ہے۔اس کی عظمت، اس کی قدرت واضح ہوگی اور مقصد لوگوں کو سمجھانا ہے جو اس سے زیادہ حاصل ہوتا ہے۔

اعتراض: جب " فوق " کا معنی ''اوپر'' ہے تو اس کا معنی ''کم'' اور ''گھٹیا'' کرنا کیسے صحیح ہے؟

جواب: اس صورت میں بامحاورہ کلام ہے۔جیسا کہ کوئی شخص نالائق اور دوسرا اس سے بھی زیادہ نالائق ہو تو کہا جاتا ہے کہ فلاں نے تو اس سے بھی زیادہ نمبر لے لئے حالانکہ نمبر اس کے کم ہوتے ہیں۔

اب مقصد یہ ہوگا کہ مچھر کی مثال ہو یا مچھر سے بھی حقارت اور چھوٹا پن ہونے میں اسے فوقیت حاصل ہو۔(از خازن) یہی دوسرا احتمال زیادہ مناسب ہے کیونکہ کسائی، ابوعبید اور علامہ رازی اور کئی

محققین نے اس قول کو ہی ترجیح دی ہے اور اس پر ایک حدیث پاک سے تائید بھی حاصل ہو رہی ہے وہ ارشاد گرامی یہ ہے:

"لو ان الدنیا تزن عند اللہ جناح بعوضۃ لما سقی کافرا منہا شربۃ ماء"

"اگر اللہ تعالیٰ کے ہاں دنیا کی ایک مچھر کے پر کے برابر بھی قدر و منزلت ہوتی تو اللہ تعالیٰ کافر کو ایک گھونٹ پانی بھی نہ پلاتا" (از خازن وابن کثیر)

مچھر سے رب تعالیٰ کی قدرت کا عظیم اظہار:

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ مچھر اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے عجیب مخلوق ہے جس کا وجود بہت چھوٹا ہے (اعضاء تمام حاصل ہیں جو ہاتھی کو حاصل ہیں) اور اسے سونڈ بھی بہت چھوٹی سی حاصل ہے۔ جو اندر سے خالی ہے۔ یعنی ٹھوس مضبوط کیل کی طرح نہیں لیکن بڑے مضبوط چمڑے والے بڑے بڑے جسیم جانوروں اونٹ، ہاتھی، گائے، بھینس وغیرہ کے چمڑے میں بڑی آسانی سے گھسا دیتا ہے جس طرح انسان اپنی انگلی کو حلوہ نما نرم کھانے میں گھسا دیتا ہے اسی کی وجہ یہ ہے کہ اس کی سونڈ میں زہر رکھ دیا گیا ہے۔ خازن میں یہ بھی ذکر ہے " حتی ان الجمل یموت من قرصہ" یہاں تک کہ مچھر کے ڈنگ مارنے سے بعض اوقات اونٹ مرجاتا ہے نعیمی میں ذکر ہے کہ یہ ہاتھی کی سونڈ میں گھس جائے تو ہاتھی مرجاتا ہے۔ (کبیر، خازن، نعیمی)

بہت ہی نصیحت آموز ارشاد: سلطان مامون رشید خطبہ پڑھ رہا تھا کہ ایک مچھر اس کی آنکھ پر آ بیٹھا بار بار اڑایا مگر وہ دفع نہ ہوا آخر کار سلطان کو خطبہ چھوڑنا پڑا اور کہنے لگا کہ مچھر کو خدا نے کیوں پیدا کیا ہے؟

حضرت مولانا ابو ہذیل بصری نے فرمایا کہ مچھر اس لئے پیدا ہوا ہے کہ اس سے بڑے جابر بادشاہ مجبور ہو کر رب تعالیٰ کی قہاری معلوم کریں۔

مچھر نے ایک بادشاہ کا غرور خاک میں ملا دیا:

بڑے بڑے بادشاہ مچھر سے عاجز آ گئے اس سے بچنے کی کئی تدبیریں کیں لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے نہ انہیں مچھر سے امن مل سکا، نمرود جیسے جابر اور خدائی کے دعویدار بادشاہ کو ایک مچھر

نے اتنے جوتے لگوائے کہ اسکا خدائی کا نشہ دور ہوگیا۔اور آخر کار مچھر نے ہی اس کو ہلاک کیا۔

جس سے معلوم ہوا کہ بڑے سے بڑا انسان ایک مچھر کو برداشت نہیں کرسکتا تو قبر میں سانپ اور بچھوؤں کو کیسے برداشت کرے گا۔

" اللهم نعوذ بک من عذاب القبر " (از نعیمی)

شیعہ حضرات کے نزدیک شان نبی وشان علی:

" ان هذا المثل ضربه الله لا میر المؤمنین علیه السلام فالبعوضة امیر المؤمنین علیه السلام وما فوقها رسول الله ﷺ " (قمی)

'' بیشک یہ مثال اللہ تعالیٰ نے امیر المؤمنین (حضرت علی) علیہ السلام کی بیان کی ہے مچھر سے مراد حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام ہیں اور اس سے اوپر سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں''

جب یہ واضح ہے کہ مشبہ اور مشبہ بہ میں وجہ شبہ پائی جاتی ہے تو شیعہ حضرات کے نزدیک معاذ اللہ نبی کریم ﷺ کا مقام اللہ تعالیٰ کے ہاں مکھی اور مکڑی جیسا ہے۔اور حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ کا مقام مچھر جیسا ہے۔سبحان اللہ کیسی عقل، کیسی محبت،صرف دعوی کرنے سے بات نہیں بنتی کی ہم محبان علی ہیں۔کاش کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقام سمجھ بھی آئے آپ کی عظمت کا بھی پتہ چلے اور مقام مصطفٰے علیہ التحیۃ والثناء سمجھ آئے۔

یاروں میں مطابقت پھر لڑتے کیوں ہیں؟

دیوبندیوں کے مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اسی عقیدہ کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔'' اور یقین جان لینا چاہئے کہ ہر مخلوق بڑا ہو یا چھوٹا وہ اللہ کی شان کے آگے چمار سے بھی ذلیل ہے'' (تقویۃ الایمان ص ۱۰) نظریات دونوں فریقوں کے ایک جیسے ہی ہیں بظاہر لڑتے رہتے ہیں لیکن اندر سے ایک ہیں۔

فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ :

لیکن ایمان والے جانتے ہیں کہ بیشک یہ حق ہے ان کے رب کی طرف سے۔

فَا: برائے تفصیل ہے۔کیونکہ جب رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖٓ ﴾ تو تحقیق اور ارتیاب (شک کرنا) میں شک واقع ہوگیا۔اس کی تفصیل کو شروع فرمایا کہ بعض لوگ حق پر ہیں ایمان

والے ہیں ۔اور بعض کافر ہیں ۔رب تعالیٰ کے مثالیں بیان کرنے میں ان کے نظریات مختلف ہیں۔
"فا" یا تفریعیہ ہے یعنی جو بات پہلے اشارہ سے سمجھ آ رہی ہو اس کے اوپر ایک چیز کو مترتب کیا جائے اور متفرع کیا جائے۔" **وتقدیم بیان حال المؤمنین لشرفه** " اگر چہ رب تعالیٰ کے مثالیں بیان کرنے میں دو فریق مختلف اقوال کہتے ،اور ان دونوں کا یہاں ذکر بھی کیا جا رہا ہے لیکن مومنوں کے حال کو پہلے بیان کیا جا رہا ہے کیونکہ مومنوں کو شرافت حاصل ہے رب تعالیٰ کے ہاں ان کو خصوصی قرب حاصل ہے۔

اَمَّا: شرط کے معنی کو متضمن ہوتا ہے۔اسی وجہ سے اس کے بعد " فا " زیادہ طور پر لازم ہوتی ہے اور جس جملہ پر یہ داخل ہو اس جملہ میں حکم کی تاکید اس میں پائی جاتی ہے۔اور پہلے جو چیز اجمالی طور پر مذکور ہو یا اجمال طور پر ذہن میں پائی جاتی ہو اس کی تفصیل بھی اس میں پائی جاتی ہے۔جس طرح کوئی شخص کہے " **رایت حامدا وزاهدا فاما حامد فخاطب واما زاهد فجالس** "میں نے حامد اور زاہد کو دیکھا لیکن حامد کو تو خطاب کرتے ہوئے پایا اور زاہد کو بیٹھے ہوئے اس مثال میں توجہ فرمائیں تو تمام معانی بیک وقت موجود ہیں۔اجمال کے بعد تفصیل حکم میں تاکید اور معنی شرط۔

الَّذِیْنَ آمَنُوْا: اگر چہ آمنوا ماضی کا صیغہ ہے لیکن اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ جو ایمان لا چکے ہیں وہ ان مثالوں کو حق سمجھتے ہیں۔اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے علم میں ایمان لا چکے ہیں۔اس معنی کے لحاظ سے کہ رب تعالیٰ کے علم میں تو ایمان والے ازلی طور پر ہیں مطلب یہ ہوگا کہ تا قیامت ایمان لانے والے اور ایمان پر قائم رہنے والے اسے حق ہی سمجھتے رہیں گے۔

اَنَّهُ: "ان" تحقیق کے لئے ہے جس کا معنی ہے بیشک ،تحقیق اور ضمیر یا تو لوٹ رہی ہے "**مثلا**" کی طرف یا " **ضرب** " کی طرف جو " **ان یضرب** " سے سمجھ میں آ رہا ہے یا " **عدم ترک** " کی طرف جو " **لا یستحی** " سے سمجھ میں آ رہا ہے یا قرآن کی طرف لوٹ رہی ہے۔

راقم کے نزدیک تمام معانی بیک وقت مراد ہیں۔کہ ایمان والے جانتے ہیں کہ بیشک وہ مثالیں جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہیں وہ حق ہیں۔اور اللہ تعالیٰ کا مثالیں بیان کرنا حق ہے۔اور اللہ تعالیٰ کا ترک نہ کرنا بلکہ مثالیں بیان کرنا حق ہے۔اور قرآن جس میں مثالوں کا ذکر ہے وہ ان کے رب کی

طرف سے حق ہے۔

الْحَقُّ: حق، باطل کا مقابل ہے حق یحق حقا، باب ضرب اور نصر پر استعمال ہوتا ہے۔ اس کا معنی واجب ہونا ثابت ہونا، آتا رہتا ہے۔ علامہ راغب اصفہانی نے بیان فرمایا کہ حق میں مطابقة اور موافقة پائی جاتی ہے۔ اسی طرح حکمت کے مطابق اور حکمت کے موافق کسی چیز کے ایجاد کرنے کو حق کہا جاتا ہے۔ حکم جو واقع کے مطابق ہو اسے بھی حق کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اقوال، عقائد، ادیان، مذاہب صحیحہ تمام کو حق کہا جاتا ہے۔ یعنی جو بھی واقع کے مطابق ہوں وہ حق ہیں۔

ابھی تک جو ذکر کیا ہے اس سے پتہ چلا کہ حق اور صدق میں فرق نہیں دونوں کا مطلب ایک ہے ہاں کبھی فرق بھی کیا جاتا ہے۔ عقد واقع کے مطابق ہو تو حق اور قول واقع کے مطابق ہو تو صدق اور کبھی واقع قول کے مطابق ہو تو حق اور قول واقع کے مطابق ہو تو صدق۔

مِنْ رَّبِّهِمْ: ضمیر " الذین آمنوا " کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یعنی ایمان والے جانتے ہیں کہ یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے اس کی ربوبیت کا ذکر کیا کہ ایمان والے جانتے ہیں کہ قرآن حاصل ہونا اور بڑے بڑے انعامات کا حصول درحقیقت اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔ چونکہ وہ رب العلمین ہے اور اس کی ربوبیت کے خصوصی فیضان مومنوں کو ہی حاصل ہیں۔

اسی پر رب تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی بھی دلالت کر رہا ہے ﴿ نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا ﴾ ہم نے اپنے بندہ خاص پر نازل کیا۔ یعنی اپنے مقرب بندے پر قرآن پاک کا اتارنا اور ان کے ذریعے تمہیں قرآن عطا کرنا ہمارا خصوصی انعام ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ربویت کو ماننا بھی مومنوں کو ہی حاصل ہوا کافروں کو یہ حاصل نہ ہو سکا اسی لئے رب تعالیٰ نے ان کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ﴿ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ﴾ رب تعالیٰ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے۔ " فیعلمون " سے بھی پتہ چلتا ہے کہ مومن صرف جانتے ہی نہیں تھے کیونکہ یہاں ایمان والوں کو علم یقینی اور اسے تسلیم کرنا مراد ہے۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَا ذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا :

"اور لیکن کافر کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کا کیا ارادہ ہے اس مثال میں"

پہلے جب ایمان والوں کا ذکر کیا تو فرمایا " یعلمون " وہ جانتے ہیں۔ یہاں یہ نہیں فرمایا

"لایعلمون" کہ کافرنہیں جانتے اس لئے کہ کافروں کی زیادہ مذمت کرنی مقصودتھی کہ وہ بہت بڑے جاہل ہیں۔اس لئے کہ "ماذا" استفہامیہ ہے۔استفہام یاعلم نہ ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے۔یا انکار کی وجہ سے دونوں ہی اس شخص کی کامل جہالت پر دلالت کرتے ہیں۔

خیال رہے کہ "ماذا" میں چھ وجہ ہیں راقم نے ایک وجہ کوذکر کردیا ہے۔طلباء کرام روح المعانی کودیکھیں۔

اَرَادَ: علامہ راغب اصفہانی نے فرمایا" **راد یرود اذا سعی فی طلب شئی** "کسی چیز کی طلب میں کوشش کرنا ارادہے" **وھی فی الاصل قوۃ مرکبۃ من شھوۃ وخاطر واملٍ** " اصل میں ارادہ اس قوت کا نام ہے جس میں شہوت اوردل میں واقع ہونا اورامید پائی جائے۔اللہ تعالیٰ کیطرف جب ارادہ کی نسبت ہوتو صرف یہ معنی ہوگا۔کہ کسی کام کومصلحت کے پیش نظر کرنے کاارادہ کرنا۔

بِھٰذَا: اس مقام پر "ھذا" اشارہ قریب کاحقارت کے معنی پردلالت کررہاہے۔اگرچہ کبھی عظمت پر بھی دلالت کرتا ہے۔

مَثَلاً: " **نصب علی التمیز عن نسبۃ الاستغراب** "مثلاً پرنصب بوجہ تمیز کے ہے اورنسبت میں غرابت پائی گئی ہے۔اب پورے جملہ کامطلب اس طرح ہوگیا۔

لیکن کافراپنی شدید جہالت کی وجہ سے یہ کہتے ہیں کہ اللہ اس قسم کی گھٹیا مثالیں بیان کرنے میں کیاارادہ رکھتا ہے۔ہمیں تو عجیب ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس قسم کی مثالیں بیان کرنے میں ارادہ رکھے۔

لیکن ان عقل کے اندھوں کو یہ معلوم نہ ہوسکا کہ تمام چیزیں رب تعالیٰ کی مخلوق ہیں جواس کی قدرت عظیمہ پردلالت کررہی ہیں۔خصوصاً چھوٹی چیز میں وہ تمام اعضاء پائے جائیں جو بڑی چیز میں پائے جاتے ہیں تو اس میں اورہی قدرت باری تعالیٰ کے کرشمے نظرآئیں گے۔لہذا وہ اپنی مخلوق میں سے جس کی مثال دینا چاہے اسی میں کمال ہے۔

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا

(بہتوں کواس سے گمراہ کرتا ہے۔اور بہتوں کواس سے ہدایت دیتا ہے)۔

یعنی رب تعالیٰ مثالیں بیان فرماتا ہے بہت سے لوگ ان پر اعتراض کر کے کجروی اختیار کر کے راہ راست سے بھٹک جاتے ہیں۔اور بہت سے انہیں حق مان کر ہدایت پر قائم رہتے ہیں۔

اعتراض: اس آیۃ کریمہ میں ایمان والوں کو کثیر (بہت) کہنے کا کیا مطلب ہے۔جب کہ دوسرے مقامات پر ان کو قلیل کہا گیا ہے اور کفار کو کثیر۔جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ﴾ میرے بندوں میں سے شکر گزار کم ہی ہیں۔اور ارشاد فرمایا﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ﴾ یہاں بھی ایمان والے اور اچھے عمل کرنے والوں کو قلیل کہا ہے اور ارشاد فرمایا ﴿مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُوْنَ﴾ ان میں سے کچھ لوگ مومن ہیں اور ان میں سے زیادہ کافر ہیں (اس مقام پر فاسقون، کافرون کے معنی میں استعمال ہے)

جواب: قلت اور کثرت کی دو قسمیں ہیں۔ایک بذاتہ اور دوسری قسم بنسبت غیر کے۔مؤمنین پہلی قسم کے لحاظ سے بہت ہیں۔یعنی کافروں کے ساتھ مقابلہ نہ کیا جائے تو بہت ہیں۔اسی لحاظ سے اس آیت میں بہت کہا گیا ہے۔اور جب دوسری قسم کا لحاظ کیا جائے کہ کافروں کی تعداد کے مقابل مومنوں کی تعداد کم ہوگی۔اسی لحاظ سے دوسری آیات مبارکہ میں مومنوں کو کم اور کافروں کو زیادہ کہا گیا ہے۔

(از عزیزی)

تنبیہ: اس آیۃ کریمہ میں کافروں کے گمراہ ہونے کا ذکر پہلے کیا اور ایمان والوں کی ہدایت کا بعد میں اگر چہ بظاہر یہ سمجھ آتا ہے کہ ایمان والے اللہ تعالیٰ کے مقرب ہیں اور ان کو ایمان کی وجہ سے خصوصی شرافت حاصل ہے اس لحاظ سے ان کا ذکر پہلے ہونا چاہئے تھا لیکن اصل وجہ یہ ہے کہ جب کفار کا قرآن پاک پر اعتراض اور ان کی کج روی کا ذکر مقصود تھا تو ان کی گمراہی کو پہلے ذکر کرنا مقصود کے مطابق ہے۔

(از عزیزی)

اعتراض:

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا: (اس کے ذریعے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے) سے یہ سمجھ آرہا ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں مثالیں بیان کر کے بہت لوگوں کو گمراہ کر دیتا ہے جسے رب تعالیٰ خود ہی گمراہ کر دے اس کا ہدایت پر آنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ اور اسے گمراہی پر عذاب دینا کیسے ممکن ہے۔

جواب: اس مسئلہ کو زیادہ تفصیلی طور پر سمجھنے کیلئے ﴿خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ ......الخ﴾ میں کی گئی بحث کا پھر سے مطالعہ کریں تو انشاء اللہ امید ہے کہ آپ کی ذہنی الجھن ختم ہو جائے گی۔ تاہم کچھ بحث بفضلہٖ تعالیٰ یہاں بھی بیان کی جاتی ہے۔ تا کہ آئندہ کہیں بھی ''اضلال (گمراہ کرنے) کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف ہو تو اسی سے مسئلہ کا حل تلاش کیا جائے۔

غزالی دوراں حضرت علامہ احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ نے بہت خوب انداز پر تحریر فرمایا جو عوام وخواص کے لئے یکساں مفید ہے۔ آپ فرماتے ہیں کفار اور معاندین جو حق قبول کرنے کی صلاحیتیں ضائع کر چکے اور ضرب الامثال کی حکمتوں کے منکر ہیں۔ از راہ کفر وعناد کہتے ہیں کہ اس مثل (مثال، کہاوت) کے بیان کرنے سے اللہ کا کیا ارادہ ہے؟ ان کے جواب میں ارشاد ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس سے بہت سے لوگوں کو ہدایت فرماتا ہے اور بہتوں کو گمراہ کرتا ہے یعنی ان کی گمراہی میں انہیں چھوڑے رکھتا ہے اور یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ کی طاعت سے روگردانی کر کے سرکشی اور بغاوت اختیار کرتے ہیں جو اللہ کے عہد کو پختہ کرنے کے بعد اسے توڑ دیتے ہیں۔ اللہ کے کسی حکم پر وہ عمل نہیں کرتے اور فساد انگیزی پر کمربستہ رہتے ہیں۔ ہدایت کی راہیں ان کے لئے بھی کشادہ تھیں مگر انہوں نے جان بوجھ کر ضلالت کا راستہ اختیار کیا۔ سنت الٰہیہ یہی ہے کہ جس نے روشن دلیلوں کے باوجود حق سے انحراف کر کے باطل کی راہ اختیار کی اللہ تعالیٰ اسے اسی راہ پر چلاتا ہے:

﴿ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا ﴾ (نساء آیة ۱۱۵)

''جس نے مؤمنین کے خلاف کوئی راہ اختیار کی ہم اسے اسی طرف پھیر دیں گے جس طرف وہ پھرا اور اسے جہنم میں پہنچائیں گے جو بہت برا ٹھکانا ہے'' (التبیان مع البیان)

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"معناہ ما ذکرہ المفسرون اھل التاویل من الحق انه یخذل به کثیرا من الناس مجازاة للکفرھم"

''اہل حق مفسرین کرام نے اس کے جو مطالب بیان کئے ہیں ان کا خلاصہ اور نچوڑ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو کفر کا بدلہ دینے کے لئے رسوا اور ذلیل کرتا ہے'' (از قرطبی)

مطلب واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں مثالوں سے مسائل کو سمجھاتا ہے تو جو لوگ ان پر

اعتراض کرتے ہیں اور غلط راہ پر چل پڑتے ہیں وہ کافر ہو جاتے ہیں اور کافروں کو رب تعالیٰ ذلیل وخوار کرے گا۔ رب تعالیٰ کے گمراہ کرنے کا یہی مطلب ہے۔

مولانا عبداللہ بن احمد بن محمود ابوالبرکات نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" والاضلال خلق فعل الضلال فی العبد والهداية خلق فعل الاهتداء هذا هو الحقيقة عند اهل السنة "

(مدارک التنزیل)

رب تعالیٰ کی طرف اضلال (گمراہ کرنے) کی نسبت کا یہ مطلب ہے کہ (وہ تمام چیزوں کا خالق ہے۔

یعنی اعمال کا بھی وہی خالق ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے خود فرمایا ﴿ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ اللہ تعالیٰ تمہارا اور تمہارے اعمال کا خالق ہے۔ وہ گمراہی کو پیدا کرتا ہے اور بندے اپنی مرضی اور اپنے کسب سے اس گمراہی کو حاصل کرتے ہیں یعنی گمراہی کی راہ کو بندے خود اختیار کرتے ہیں۔ یہی مطلب ہے ہدایت دینے کا کہ اللہ تعالیٰ ہدایت حاصل کرنے کو پیدا فرماتا ہے اور بندے اپنے اختیار سے اسے حاصل کرتے ہیں۔ یہی جواب جو مدارک میں ذکر کیا گیا ہے تفسیر ابی السعود میں بھی ہے بلکہ اس میں زیادہ وضاحت ہے۔

قاضی ابوالسعود محمد بن محمد عمادی فرماتے ہیں:

" واسناد الاضلال ای خلق الضلال اليه سبحانه مبنی علی ان جميع الاشياء مخلوقة له تعالیٰ وان کان افعال العباد من حيث الکسب مستندة اليهم "

" اضلال کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف اس لئے ہے کہ وہ ضلالت کا بھی خالق ہے کیونکہ سب چیزیں اسی کی مخلوق ہیں اور گمراہی کی نسبت بندوں کی طرف اس لحاظ سے ہے کہ وہ کسب کرتے ہیں"

(ابو السعود)

نتیجہ واضح ہوا کہ بندے اپنے اختیار اور مرضی سے گمراہی والے کام کر کے گمراہ ہوتے ہیں اور اس گمراہی کو حاصل کر لیتے ہیں جس کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے یہاں بہت تفصیلی بحث کی ہے۔ جبریہ اور قدریہ فرقوں کے ایک دوسرے کے خلاف دلائل بیان کئے ہیں۔ آپ کی بحث کا خلاصہ آسان لفظوں میں پیش کر رہا ہوں۔ قطع نظر اس

کے کہ معتزلہ نے کیا کہا ہے یا جبریہ نے کیا کہا۔ گمراہی کی نسبت بندوں کی طرف بھی ہے کہ بندے گمراہ ہوتے ہیں۔ گمراہ کرنے کی نسبت کفار کی طرف شیطان کی طرف اور لوگوں کے نفسوں کی طرف بھی ہے۔ اور گمراہ کرنے کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف بھی لیکن ہر نسبت میں معنی علیحدہ علیحدہ معتبر ہے۔

گمراہی کی نسبت لوگوں کی طرف:

یعنی لوگ گمراہ ہوتے ہیں تو اس کا یہی مطلب ہے کہ لوگ ایسے اعمال کرتے ہیں۔ جن کی وجہ سے وہ گمراہ ہوتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن پاک میں بیان ہونے والی مثالوں پر انہوں نے اعتراض کیا اور حق راہ کو چھوڑا تو گمراہ ہو گئے ﴿ کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ ﴾ تم اللہ کے ساتھ کیسے کفر کرتے ہو " فانی تصرفون اور فانی تؤفکون " کہاں بھٹکے جا رہے ہیں ان آیات سے یہی واضح ہو رہا ہے کہ انسان اپنے اختیار سے حق باطل راہ کو اختیار کرتا ہے۔

شیطان وغیرہ کی طرف اضلال کی نسبت:

یعنی جب اضلال کی نسبت شیطان وغیرہ کی طرف ہوگی تو اس وقت اس کا معنی یہ ہوگا:

" ان معنی الاضلال عن الذین فی اللغۃ ھو الدعاء الی ترک الذین وتسبیحۃ فی عینہ "

'' دین سے ہٹانے اور گمراہ کرنے کا یہ مطلب ہے کہ دین کو چھوڑنے کی طرف بلانا اور دین کو برا اور گھٹیا کر کے دکھانا''

" وھذا ھو الاضلال الذی اضافہ اللہ تعالیٰ الی ابلیس "

'' یہی وہ اضلال ہے جس کی نسبت رب تعالیٰ نے ابلیس کی طرف کی''

اور ارشاد فرمایا ﴿ اِنَّہٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِیْنٌ ﴾ بیشک وہ (انسانوں کا) کھلا دشمن اور گمراہ کرنے والا ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿ وَلَاُضِلَّنَّھُمْ وَلَاُمَنِّیَنَّھُمْ ﴾ (شیطان نے کہا) قسم ہے میں ضرور بر ضرور ان کو بہکا دوں گا اور ضرور بر ضرور ان کو آرزوئیں دلاؤں گا۔ اسی طرح رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا رَبَّنَا اَرِنَا الَّذَیْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْھُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا ﴾

'' اور (جہنم میں) کافر کہیں گے اے ہمارے رب ہمیں وہ دونوں دکھا جن اور آدمی جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا کہ ہم انہیں اپنے پاؤں کے نیچے روند دیں''

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ ﴾ شیطان نے ان کے لئے (برے) اعمال کو مزین کیا اور ان کو سیدھی راہ سے روکا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَمَا كَانَ لِيْ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ﴾

''کہ شیطان قیامت کے دن لوگوں کو کہے گا مجھے تو تم پر کچھ غلبہ حاصل نہیں تھا ہاں مگر میں نے تمہیں بلایا تو تم نے اسے قبول کر لیا''

اسی طرح اضلال (گمراہ کرنے) کی نسبت فرعون کی طرف کرتے ہوئے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ ﴾ فرعون نے اپنی قوم کو بھٹکا دیا۔

ابھی جن آیات مبارکہ کو ذکر کیا گیا ہے ان میں اضلال کی نسبت شیطان کی طرف کی گئی ہے لیکن ان سب کا مطلب یہ ہے کہ شیطان لوگوں کو غلط راہ پر چلنے کی دعوت دیتا رہا اور ان کو دین قبیح (بری بدصورت) کرکے دکھاتا ہے اس معنی کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے اضلال کی نسبت شیطان اور فرعون کی طرف کر دی۔ کیونکہ فرعون بھی یہی کرتا رہا کہ وہ اپنی خدائی کا دعوی کرکے اللہ تعالیٰ کے دین اور اللہ کی وحدانیت کا انکار کرتا رہا۔ اور باطل راہ کو مزین کرکے دکھاتا رہا اور حق راہ کی معاذ اللہ برائیاں بیان کرتا رہا۔

یہی آج بھی ہو رہا ہے۔ دین اسلام اور دین اسلام کے متوالوں، دینداروں، اسلام کے پیروکاروں کو ہر طرف سے نصاریٰ اور یہود و ہنود کے ایجنٹوں کی طنزیہ جملے سننے پڑ رہے ہیں۔ ہر طرف سے سازشوں کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے لیکن اے دین کے متوالے صبر سے اپنا کام کیے جا اللہ تعالیٰ تیرا حامی و ناصر ہے۔ بادشاہوں کی تعریف چھوڑ کر مصطفےٰ کریم کی تعریف کر یہی سبق یاد کر:

کروں مدح اہل دول رضا پڑے اس بلا میں میری بلا
میں گدا ہوں اپنے کریم کا، میرا دین پارہ نان نہیں

اضلال کی نسبت بتوں کی طرف:

رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ﴾ (ابراہیم علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حضور یوں عرض کیا) اے میرے رب بیشک ان بتوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کر دیا۔

سی طرح رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا ﴾ نوح علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حضور یوں عرض کیا تحقیق ان بتوں نے بہتوں کو گمراہ کر دیا۔

یہاں یہ بات بھی واضح ہے کہ اس مقام پر اضلال کی نسبت بتوں کی طرف اس معنی کے لحاظ پر تو نہیں ہو سکتی کہ بتوں نے ان کی غلط راہنمائی کی اور حق راہ کو باطل کر کے دکھایا بلکہ یہ معنی مراد ہوگا کہ ان لوگوں نے اپنے اختیار سے بت پرستی کو اختیار کیا مجازی طور پر نسبت بتوں کی طرف کر دی کہ بتوں نے ان کو گمراہ کیا۔

نوح علیہ السلام نے کفار کے دین سے دور ہونے کو اپنی تبلیغ کی طرف منسوب کیا:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ دَعَوْتُ قَوْمِيْ لَيْلًا وَّنَهَارًا ، فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِيْٓ اِلَّا فِرَارًا ﴾

''نوح علیہ السلام نے عرض کی اے میرے رب میں نے اپنی قوم کو دن رات بلایا تو میرے بلانے سے ان کا بھاگنا ہی زیادہ ہوا''

یہاں بھی یہی مطلب ہے کہ اے اللہ میں تو اپنی قوم کو دن رات تبلیغ کرتا رہا تیری راہ کی طرف بلاتا رہا لیکن وہ بھاگ بھاگ کر اس راہ سے دور ہوتے رہے۔ جتنا زیادہ میں ان کو راہ حق پر بلاتا رہا وہ تو راہ حق سے ہٹ کر گمراہ ہوتے رہے۔ تو آپ نے بھی ان کے بھاگنے کو مجازی طور پر اپنے بلانے کی طرف منسوب کر دیا۔

قرآن کی طرف کفر اور سرکشی کی نسبت:

اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرمایا:

" ولیزیدن کثیرا منهم ما انزل الیک من ربک طغیانا و کفرا "

''اور اے محبوب یہ جو تمہاری طرف تمہارے رب کے پاس سے اترا اس سے ان میں بہتوں کو سرکشی اور کفر میں ترقی ہوگی''

مطلب یہ ہے کہ قرآن پاک جیسے جیسے نازل ہوتا رہے گا وہ انکار کر کے اور اپنی سرکشی اور شرارتوں کی وجہ سے دین کے باغی ہو کر گمراہ ہوتے رہیں گے۔ گمراہ تو وہ خود ہوں گے۔ غلط راہ پر تو وہ

اپنے اختیار سے چلیں گے۔ لیکن مجازی طور پر ان کے کفر اور سرکشی کو قرآن کی طرف منسوب کر دیا

رب تعالیٰ کی طرف اضلال کی نسبت کا کیا معنی:

(۱) اللہ تعالیٰ نے ضلالت کو پیدا کیا۔ اور بندوں نے اپنے اختیار سے اسے حاصل کیا۔

(۲) رب تعالیٰ نے بندوں کو مہلت دے رکھی ہے ان کو جلدی ہی گرفت نہیں کرتا وہ اپنی مرضی سے گمراہ ہو رہے ہیں۔ لیکن رب تعالیٰ کے مہلت دینے کی وجہ سے اضلال کو رب تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا گیا۔

(۳) " اضل " کا معنی " اھلک " بھی آتا رہتا ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ اس کے ذریعے یعنی قرآن پاک کے انکار کے ذریعے رب تعالیٰ ان کو ہلاک کر دے گا۔

(۴) ضلال کا معنی عذاب اور اضلال کا معنی عذاب دینا بھی آتا رہتا ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ إِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلَالٍ وَّسُعُرْ ﴾ اس آیۃ میں ایک معنی ضلال کا عذاب ہے۔ اب اس معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ رب تعالیٰ ان بہتوں کو عذاب دے گا جو قرآن پاک میں بیان کردہ مثالوں پر اعتراض کرتے ہیں۔

(۵) اگر "اضلال" میں ہمزہ وجدان کیلئے ہو، تو مطلب یہ ہوگا کہ رب تعالیٰ بہتوں کو گمراہ پاتا ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ رب تعالیٰ ان مثالوں کو بیان کرنے میں کیا ارادہ رکھتا ہے۔

ابھی تک جو بحث کی گئی ہے اس سے بہت واضح ہو چکا ہے کہ بندوں کی طرف نسبت گمراہی کی اس لئے ہے کہ وہ اپنے اختیار سے گمراہی کی راہ کو اختیار کرتے ہیں۔ شیطان، کفار اور گمراہ کرنے والے تمام انسانوں اور جنوں کی طرف نسبت اس لئے ہے کہ وہ باطل راہ کی دعوت دیتے ہیں اور حق راہ کو برا کر کے دکھاتے ہیں۔ قرآن پاک، بتوں اور انبیاء کرام کی تبلیغ کی طرف نسبت مجازی طور پر ہے حقیقی نہیں۔ اور رب تعالیٰ کی طرف اس لئے ہے کہ گمراہی کو پیدا کرنے والا وہی ہے۔ شیطان اور کافروں کو پیدا کرنے والا وہی ہے جو گمراہی کا سبب بنتے ہیں۔ رب تعالیٰ قہر و جبر سے ان کو گمراہی سے روکتا نہیں۔ ان کو عذاب دے گا اور تباہ و برباد کر دے گا۔ رب تعالیٰ کی طرف گمراہ کرنے کا یہی مطلب ہے امید ہے

کہ قارئین کرام بڑی آسانی سے سمجھ چکے ہوں گے:

"واعلم ان الامة مجتمعة علی ان الاضلال بھذا المعنی لایجوز علی اللہ تعالٰی لانہ تعالٰی ما دعا الی الکفر وما رغب فیہ بل نھی عنہ وزجر وتوعد بالعقاب علیہ"

علامہ رازی رحمہ اللہ نے پہلے "اضلال" کا معنی بیان کیا کہ کسی کو دین کے چھوڑنے کی دعوت دینا اور اسے دین قبیح کر کے دکھانا، اس کے بعد فرمایا کہ تم یقین کرلو کہ تمام امت مسلمہ کا اس پر اجماع ہے کہ اس معنی کے لحاظ سے اضلال اللہ تعالٰی پر سچا نہیں آ سکتا ہے یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ کفر کی طرف بلائے اور کفر کی راہ کو پسند کرے۔ یہ کبھی نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ تو کفر سے روکتا ہے اس پر زجر (ڈانٹ) فرماتا، اور کافروں کو عذاب سے ڈراتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

"وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِيْنَ" اور اس سے سوائے نافرمانوں کے کسی کو گمراہ نہیں کرتا:

"والفسق اصلہ فی کلام العرب الخروج عن الشئی"

"کلام عرب میں فسق کا معنی ایک چیز کا دوسری سے باہر نکلنا"

اسی طرح کہا جاتا "فسقت الرطبة" کہ تر پھل چھلکے سے باہر آ گیا۔ اسی طرح چوہا جب اپنی بل سے باہر آ جائے تو اسے "فویسقہ" کہا جاتا ہے۔ شرارت اور ایذاء دینے کے لئے حد اعتدال سے باہر آ جانا بھی فسق کہلاتا ہے مسلم شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ذکر کی گئی کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"خمس فواسق یقتلن فی الحل والحرم الحیة والغراب الابقع والفارة والکلب العقور والحدیا"

"پانچ جانور فاسق ہیں (یعنی ایذا دینے والے ہیں) ان کو حل اور حرم میں (کہیں بھی ہوں) قتل کر دیا جائے وہ پانچ یہ ہیں سانپ، سیاہ، سفید داغوں والا کوا، چوہا، کاٹنے والا کتا، چیل"

یہ بھی خیال رہے "حدیا" حداءۃ کی تصغیر ہے اس کے جھپٹنے اور رذالت کی وجہ سے تصغیر کو ذکر فرمایا اور ایک روایت میں سانپ کی جگہ بچھو کا ذکر ہے۔ یعنی ان پانچ کے ساتھ بچھو بھی مراد ہے۔ تعداد

حد بیان کرنے کے لئے نہیں بلکہ صرف وضاحت کے لئے ہے۔" فـاطـلـق صلی الله علیه وسلم
سـم الـفـسـق لا ذیتهـا " نبی کریم ﷺ نے ان جانوروں کو فاسق اس لئے فرمایا کہ یہ اذیت
(تکلیف) دیتے ہیں (از قرطبی) " والـفسیق " (فا مکسور، سین مکسور اور مشدد) دائم الفسق۔ ہمیشہ فسق
کرنے والے کو فسیق کہا جاتا ہے۔

اصطلاح شرح میں فسق:

" والفسق فی عرف الاستعمال الشرعی الخروج عن طاعة الله عزوجل " (قرطبی)
''اللہ تعالیٰ کی طاعت سے نکلنا اصطلاح شرع میں فسق کہلاتا ہے''
" والفاسق فی الشرع الخارج عن امر الله بارتکاب الکبیرة "
''شرع میں فاسق اسے کہا جاتا ہے جو گناہ کا مرتکب ہو کر اللہ تعالیٰ کے امر سے نکل جائے یعنی عمل نہ کرے''
(بیضاوی)

" امـر " سے مراد یا تو اشارہ ہے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کی طرف ﴿ اَطِیـعُـوا اللهَ وَاَطِیعُوا رَسُوْلَ ﴾ اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اور یا " ترک امر " سے مراد " ترک امتثال " ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق عمل نہ کرنا خواہ وہ امر ہو یا نہی ہو

گناہ کبیرہ کیا ہے؟ اس کے متعلق مختلف اقوال ہیں:

" قـال صـاحـب الـنـهـایـة والاصـح فـی تفسیر الکبیرة ان ما کان شنیعا بین المسلمین وفیه هتک حرمة الله تعالیٰ والدین فهو کبیرة والا فهو صغیرة "
''صاحب نہایہ نے بیان فرمایا کہ کبیرہ کی بہت صحیح تفسیر یہ ہے کہ جس کام کو مسلمان برا سمجھیں اور اس میں اللہ تعالیٰ کی حرمت اور دین کی حرمت کی ہتک لازم آئے وہ کبیرہ ہے اگر ایسا نہیں تو وہ صغیرہ ہے''
(شیخ زادہ)

فاسق تین قسم پر ہیں:

فسق کا پہلا درجہ : تغابی: گناہ کبیرہ کا ارتکاب پایا جائے لیکن انسان گناہ کبیرہ کبھی کبھی کرے اور اسی برا بھی سمجھے۔ اس قسم کے فسق کو تغابی کہا جاتا ہے۔ تغابی کا لفظ مشتق ہی غباوت سے ہے

جس کا معنی ہے کم سمجھ رکھنا، کند ذہن ہونا۔

فسق کا دوسرا درجہ : انہماک : وہ یہ ہے کہ انسان گناہ کبیرہ کو عادت ہی بنالے اور کوئی پرواہ نہ کرے کہ یہ برا کام ہے اس سے مجھے اجتناب کرنا چاہیے۔ انہماک کا مطلب ہی یہ ہے کہ کسی کام کو کوشش سے کرنا اور اس سے چمٹ جانا۔

فسق کا تیسرا درجہ: جحود: انکار کرنا، یعنی انسان گناہ کبیرہ کو اچھا کام سمجھ کر کرے اُس کے گناہ ہونے کا ہی انکار کرے۔

جحود کا معنی واضح ہے انکار کرنا، یعنی گناہ کا ارتکاب گناہ سمجھ کر گناہ ہے۔ گناہ کو گناہ نہ سمجھنا اور گناہ کا انکار کرنا کفر ہے۔ جب انسان فسق کے اس تیسرے درجہ پر پہنچ جاتا ہے تو کافر ہو جاتا ہے۔ اور گویا کہ گناہوں کی وجہ سے اس پر گناہگار ہونے اور درجہ کفر تک پہنچ جانے کی علامت کو نقش کر دیا جاتا ہے۔

تنبیہ : پہلی دونوں قسم کے فسق انسان کو اسلام سے خارج نہیں کرتے۔ اگر چہ وہ انسان گناہگار ہوتا ہے۔ اور فاسق بھی کہلاتا ہے۔ لیکن تیسری قسم کا فسق کفر ہے۔ انسان کو اسلام سے نکال دیتا ہے ہاں اگر توبہ کرے تو پھر اسلام میں داخل ہو جائے گا۔ اس آیۃ میں یہی آخری قسم کا سق پایا گیا ہے۔ کیونکہ فاسقین کی جن علامت کا آگے تذکرہ آرہا ہے وہ کافروں میں ہی پائی جاتی ہیں۔ یہ بھی خیال رہے کہ قرآن میں فاسق گناہگاروں کو بھی کہا گیا ہے اور کافروں کو بھی، ہر محل کے ماقبل اور مابعد کو دیکھا جائے کہ یہاں کون سا معنی مراد لیا جا سکتا ہے۔ (ماخوذ از بیضاوی وشیخ زادہ)

اَلَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ

''وہ جو اللہ کے عہد کو توڑ دیتے ہیں پکا ہونے کے بعد''

یہاں سے فاسقین کی علامات کو بیان کیا جارہا ہے جن فاسقین کا یہاں ذکر ہے یعنی قرآن پاک کی امثال پر اعتراض کرنے والے کفار، اور تمام کفار کی یہی علامات ہیں۔ ان میں سے پہلی علامت ان کی یہ بیان کی گئی کہ وہ اللہ کے عہد کو توڑ دیتے ہیں حالانکہ وہ پہلے پکا وعدہ کر چکے ہوتے ہیں۔

یَنْقُضُوْنَ : نقض اگر چہ ظاہری اجسام کی ترکیب کو توڑنے کا نام ہے۔ جس طرح رسی بٹی ہوئی

ہوتو اسے ادھیڑ دیا جائے ، یا کہ کوئی عمارت توڑ دی جائے لیکن مجازی طور پر عہد کے توڑنے کو بھی "ینقضون" سے تعبیر کر دیا گیا، گویا کہ وعدہ کرنے والے ایک دوسرے کے درمیان وعدہ سے اسے طرح تعلق جوڑتے ہیں جس طرح رسی دو چیزوں کو ایک دوسرے سے ملانے کا ذریعہ بنتی ہے۔

(از بیضاوی)

عَھْدَ: دو آدمیوں کے درمیان پختہ وعدہ جو طے ہو جائے، اور اس کی حفاظت کرنے کی ذمہ داری پائی جائے۔اور وعدہ مطلق وعدہ کرنے کو کہا جاتا ہے، خواہ خیر ہو یا شر ہو، پختہ ہو یا نہ ہو۔وعید کا استعمال صرف شر میں ہوتا ہے خیر میں نہیں، یعنی عذاب وغیرہ دینے کے وعدہ کو وعید عام طور پر کہا جاتا ہے۔ میثاق اس وعدہ کو کہا جاتا ہے جس میں قسم بھی پائی جائے۔لیکن یہاں صرف پختہ وعدہ مراد ہے اس کے ساتھ قسم کا پایا جانا مرادنہیں ہے۔ (از بیضاوی ، مفردات راغب ، المعجم الوسیط)

عہد اللہ سے مراد کون سا وعدہ ہے؟:

اس میں اگر چہ مختلف قول ہیں لیکن وہ تمام ہی مراد ہیں۔ کیونکہ فاسقین سے مراد جب تمام کافر ہیں۔تو یقیناً یہاں بھی وہی مراد ہیں اس لئے کہ فاسقین کی ہی صفات تو بیان ہو رہی ہیں۔

پہلا قول: جب کوئی شخص اسلام قبول کرے اللہ تعالیٰ کے نبی یا اللہ کے نبی کے کسی خلیفہ (علماء انبیاء کے وارث ہیں) کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔اللہ تعالیٰ کے نبی کو اسی کا بھیجا ہوا رسول اور اسی ذات باری تعالیٰ کا نائب تسلیم کرلیا اور اللہ تعالیٰ سے وعدہ کرلیا کہ جو تیری طرف سے احکام ہم تک تیرے نبی کے واسطہ سے پہنچے ہیں۔ہم انہیں تسلیم کرتے ہیں اور ان پر ہمیشہ کے لئے عمل جاری رکھیں گے۔ پھر وہ اللہ کے رسول کی صحبت میں آ گئے یا اللہ کے نبی کے خلیفہ کی صحبت میں آ کر سیرت کی کتب کا مطالعہ کیا قرآن وحدیث کے مسائل پر مطلع ہوئے۔انبیاء کرام کے معجزات اور اولیاء کرام کی کرامات پر مطلع ہوئے پھر اپنے وعدہ کو اور پختہ کیا دین اسلام پر قائم رہنے کا اور زیادہ پختہ وعدہ کرلیا۔

"بعد ازیں حالت اگر معاذ اللّٰہ شبہ در امر اسلام بخاطر خود جادہد وبسبب آں شبہ طعن دراحکام شرعیہ شروع نماید ، یقین است کہ ایں شخص از حد عقل وشرع خارج شد وبمرتبۃ اعلی از گمراہی ترقی نمود"

اس حالت کے بعد اگر اس شخص کے دل میں معاذ اللہ شریعت کے احکام میں شک پیدا ہو گیا اور اس نے احکام شرعیہ میں طعن و تشنیع شروع کر دی، تو یقینی بات ہے کہ وہ عقل اور شریعت سے دور ہو گیا۔ اور وہ گمراہی کے اعلیٰ درجہ پر پہنچ گیا یعنی پاگل اور کافر ہو گیا۔

دوسرا قول: اس عہد سے مراد ﴿ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى ﴾ (کیا میں تمہارا رب نہیں انہوں نے کہا کیوں نہیں) والا عہد ہے۔ مسند احمد میں ایک طویل حدیث ہے جو مشکوۃ باب الایمان بالقدر میں مذکور ہے۔ جس کا کچھ حصہ یہ ہے:

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے ﴿ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ ' بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ ﴾ آیۃ کریمہ کے متعلق ارشاد فرمایا رب نے سب کو جمع کیا اور ان کو جوڑے بنایا پھر ان کو صورتیں عطا کیں پھر ان کو بولنے کی طاقت دی اور ان سے کلام کرنے کے متعلق فرمایا انہوں نے کلام کیا پھر رب تعالیٰ نے ان سے عہد و میثاق لیا اور ان کو ہی ان کے نفسوں پر گواہ بنایا، اور فرمایا ﴿ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ﴾ کیا میں تمہارا رب نہیں؟ ﴿ قَالُوْا بَلٰى ﴾ انہوں نے کہا کیوں نہیں۔ رب نے کہا میں تم پر سات آسمانوں اور سات زمینوں کو گواہ بنا رہا ہوں اور میں تم پر تمہارے باپ آدم کو گواہ بنا رہو ہوں تم قیامت کے دن کہو گے کہ ہمیں تو اس عہد و میثاق کا علم ہی نہیں یقین کر لو، جان لو میرے بغیر کوئی معبود نہیں، میرے بغیر کوئی رب نہیں۔ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا بیشک میں تمہاری طرف اپنے رسول بھیج کر اور کتابیں نازل کر کے تمہیں میرے ساتھ کیئے ہوئے تمہارے عہد و میثاق کو یاد دلاتا رہوں گا۔

(تو اس وقت رب تعالیٰ سے وعدہ کرتے ہوئے) سب نے کہا:

"شهدنا بانک ربنا والهنا لارب لنا غیرک ولا اله لنا غیرک"

''ہم گواہی دیتے ہیں بیشک تو ہمارا رب ہے اور ہمارا اللہ ہے تیرے بغیر ہمارا کوئی رب نہیں، اور تیرے بغیر ہمارا کوئی اللہ نہیں'' (مشکوۃ)

اس وعدہ کو پختہ کرنے کا مطلب بھی حدیث پاک سے واضح ہو گیا کہ ان کو اپنے نفسوں پر گواہ بنا کر (اشهدهم علی انفسهم) ان سے وعدہ کو پختہ کرالیا گیا۔ اور ان کی طرف رسول بھیج اور کتابیں نازل کر کے اس میں اور پختگی پیدا کر دی، لیکن ان میں سے بعض نے اس وعدہ کو توڑ دیا اور کفر کی راہ اختیار کی۔ (ماخوذ از عزیزی)

تیسرا قول: " الذین ینقضون عهد الله فی التوراة ان یبینوا امر محمد ﷺ وینصروه " جس وعدہ کو توڑنے کا یہاں ذکر ہو رہا ہے۔ یہ وہ وعدہ ہے جو توراۃ میں اہل کتاب سے لیا گیا کہ جب آخری نبی محمد ﷺ آئیں تو ان کے وہ اوصاف بیان کرنا جن کا ذکر توراۃ میں ہے۔ اور ان کی امداد کرنا یعنی ان پر ایمان لاکر ان کی معاونت کرنا۔ اسی کو رب تعالیٰ نے اس طرح ذکر فرمایا:

﴿ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ ﴾

"اور یاد کرو جب اللہ نے عہد لیا ان سے جنہیں کا کتاب عطا ہوئی کہ تم ضرور اسے لوگوں سے بیان کر دینا اور نہ چھپانا، تو انہوں نے اسے پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا"

لیکن انہوں نے اس وعدہ کو توڑ دیا نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو چھپایا اور تبدیل کر دیا اور آپ پر ایمان نہ لایا نہ ہی آپ کی کوئی امداد کی بلکہ کفر اور نفاق اختیار کیا۔ (از تبصیر الرحمن)

چوتھا قول: " ان المراد بهذا المیثاق حججه القائمة علی عباده الدالة لهم علی صحة توحیده وصدق رسوله " اس میثاق سے مراد وہ دلائل ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر قائم فرمائے ہیں جو باری تعالیٰ کی توحید پر دلالت کر رہے ہیں کہ اس کو " وحده لا شریک له " (ایک مانا جائے اس کے ساتھ کوئی شریک نہ ٹھہرایا جائے) مانا جائے۔ وہ دلائل عطاء کر کے گویا کہ ان سے وعدہ لے لیا گیا کہ ان دلائل پر نظر و فکر کرتے ہوئے میری توحید پر ایمان لانا اور میرے رسولوں کو سچا ماننا۔ لیکن کفار نے اللہ تعالیٰ کی قدرت کے روشن دلائل کو اور انبیاء کرام کے معجزات کو دیکھنے کے باوجود ایمان نہ لاکر اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو توڑ دیا۔

پانچواں قول: اس سے مراد وہ لوگ بھی ہو سکتے ہیں، جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا

﴿ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ﴾

"اور انہوں نے اللہ کی قسم اٹھائی اپنی قسموں میں حد سے زیادہ کوشش کی کہ اگر ان کے پاس کوئی ڈر سنانے والا آیا تو وہ ضرور کسی نہ کسی گروہ سے زیادہ راہ پر ہوں گے۔ پھر جب ان کے پاس ڈر سنانے والا آیا تو اس سے نہ زیادہ ہوئی سوائے نفرت کے"

یعنی نبی کریم ﷺ کے بعثت سے پہلے قریش نے یہود ونصاریٰ کے اپنے رسولوں کو نہ ماننے اور ان کو جھٹلانے کی نسبت کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان پر لعنت کرے کہ ان کے پاس اللہ کی طرف سے رسول آئے اور انہوں نے انہیں جھٹلایا اور نہ مانا خدا کی قسم اگر ہمارے پاس کوئی رسول آئے تو ہم ان سے زیادہ راہ پر ہوں گے اور اس رسول کو ماننے میں ان کے بہتر گروہ پر سبقت لے جائیں گے۔ لیکن جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو انہوں نے ایمان نہ لایا۔ اور حق راہ پر نہ آ کر آپ کی نبوت کو تسلیم نہ کر کے وعدہ کو توڑ دیا۔ (از کبیر وخزائن العرفان)

چھٹا قول: جس عہد کا یہاں ذکر ہے اس سے مراد یہ ہے "ما رکز فی عقولهم من الحجة علی التوحید کان امرهم وصاهم به" کہ ان کو عقل عطا کی اور اس عقل میں یہ صلاحیت رکھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لائیں پھر ان کو حکم بھی دیا اور نصیحت بھی کی کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لا کر اپنے آپ کو خسارے سے بچالو۔ لیکن انہوں نے اپنی عقل سے کام نہ لیا رب تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لا کر اپنے آپ کو خسارے سے بچالو۔ لیکن انہوں نے اپنی عقل سے کام نہ لیا رب تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان نہ لا کر وعدہ کو توڑ دیا۔

ساتواں قول: اس آیۃ کریمہ میں جس عہد کا ذکر ہے، اس کا ذکر رب تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا

﴿ ولَمَّا جآءَهُمْ كِتَابٌ مِنْ عِنْدِ اللهِ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِنْ قَبْلِ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللهِ عَلَى الْكَافِرِيْنَ ۝

''اور جب ان کے پاس اللہ کی وہ کتاب (قرآن) آئی جو ان کے ساتھ والی کتاب (تورات) کی تصدیق فرماتی ہے اور اس سے پہلی وہ اسی نبی کے وسیلہ سے کافروں پر فتح مانگتے تھے تو جب تشریف لایا ان کے پاس وہ جانا پہچانا اس سے منکر ہو بیٹھے تو اللہ کی لعنت منکروں پر''

یعنی وہ لوگ جب نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے آپ کے وسیلہ سے دعاء مانگ کر فتح حاصل کرتے تھے۔ آپ کے آنے کی انتظار کر رہے تھے، یہ پختہ وعدہ کر رہے تھے کہ آپ کے آنے کے بعد آپ پر ایمان لائیں گے۔ لیکن آپ کے آنے کے بعد وہ حسد اور عناد کی وجہ سے آپ پر ایمان نہ لائے، آپ کی نبوت کا انکار کر کے، آپ پر ایمان نہ لا کر وعدہ کو توڑ دیا۔ (راقم)

جتنے اقوال ذکر کیے ہیں تمام ہی معتبر ہیں۔ کیونکہ فاسقین سے مراد کفار ہیں۔ اور کفار کی علامت بیان کی جارہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے پختہ وعدہ کرنے کے بعد وعدہ کو توڑ دیتے ہیں لہٰذا جس وعدہ کو بھی توڑنے سے کفر لازم آئے وہی مراد ہے۔ جتنی قسم کے وعدہ ذکر کیے سب کے توڑنے والے کافر تھے۔

فائدہ: اللہ تعالیٰ نے تین وعدے لئے:

(۱) "**عهد اخذه على جميع ذرية آدم بان يقروا بربوبيته**" ایک وعدہ آدم علیہ السلام کی تمام اولاد سے لیا جب ان کو چھوٹے چھوٹے ذرات کی شکل میں آدم علیہ السلام کے دائیں طرف اور دوسرے طرف بٹھایا اور ان سے اپنے رب ہونے کا اقرار کرایا۔ اور اس پر ان کو ہی گواہ بنایا کہ تم اس پر قائم رہنا۔ لیکن اولاد آدم میں کچھ اس وعدہ پر قائم رہ کر مؤمن رہے، اور کچھ وعدہ کو توڑ کر کافر ہوگئے کافر ہونے والے اس آیۃ کے حکم میں داخل ہیں جن کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے۔

(۲) "**وعهد اخذه على النبيين**" دوسرا وعدہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام سے لیا ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا:

﴿ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ﴾

"اور یاد کرو جب پیغمبروں سے اللہ نے ان کا عہد لیا جو میں تم کو کتاب اور حکمت دوں پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول کہ تمہاری کتابوں کی تصدیق فرمائے تو تم ضرور بر ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور بر ضرور اس کی مدد کرنا"

یہ عہد اس آیۃ کریمہ میں داخل نہیں، کیونکہ یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ انبیاء کرام (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو توڑ دیں۔

(۳) "**وعده اخذه على العلماء بان بينوا الحق ولا يكتموه**" تیسرا وعدہ علماء سے لیا گیا کہ حق بات کو واضح کر کے بیان کرنا اور حق کو نہ چھپانا۔ اس وعدہ کو توڑنا تو کسی حد تک پایا جاسکتا ہے۔ اور حق کو چھپانے اور نہ بیان کرنے والے علماء کے لئے احادیث مبارکہ میں وعید بھی پائی گئی ہے لیکن وہ اس آیت میں اس لئے نہیں آتے کہ حق کو چھپانا گناہ تو ہے، لیکن کفر نہیں۔ جس آیت کی وضاحت بیان کی جارہی ہے اس میں کفار کا ذکر ہے۔

خیال رہے کہ علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے ان تین وعدہ کا ذکر اسی آیت کی تفسیر میں کیا ہے بظاہر وہم ہوتا تھا کہ شائد یہ تینوں عہد اس آیۃ میں داخل ہیں۔تو اس وہم کا ازالہ حضرت علامہ شیخ زادہ محمد بن مصلح الدین رحمہ اللہ نے اس طرح کیا ہے "هـذا الكلام ذكر استطرادا " یہ تین وعدہ کا ذکر ضمنی طور پر کردیا گیا ہے، مقصودی نہیں۔آگے چل کر بیان فرماتے ہیں:

" وليس المقصود منه ان كل واحد من هذه والعهود الثلاثة من العهد المنقوض المذكور في هذه الآية"

''یہاں ان تین وعدوں کے ذکر کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ یہ تینوں اس آیت میں مذکور عہد میں آتے ہیں جس کو توڑنے کا ذکر کیا جارہا ہے'' (از بیضاوی، شیخ زادہ)

قارئین کرام مقصودی بحث اور ضمنی بحث میں فرق ضرور ذہن میں رکھا کریں تاکہ انسان غلطی کا شکار نہ ہو۔

﴿ وَيَقْطَعُوْنَ مَا اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ اَنْ يُّوْصَلَ ﴾

''اور کاٹتے ہیں اس چیز کو جس کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا''

اللہ تعالیٰ نے کس چیز کو جوڑنے کا حکم دیا:

اس کے لئے ضابطہ قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا اسی سے انسان کئی مثالیں خود سمجھ سکتا ہے۔تاہم چند مثالیں بھی بیان کی گئی ہیں ان کو بھی یہاں نقل کیا جارہا ہے اور یہ بھی خیال رہے کہ یہاں فاسقین سے مراد کفار ہیں۔اس لئے مثالوں میں جو گناہ کبیرہ ذکر ہوں گے ان سے مراد ان کو جائز سمجھ کر ان کا ارتکاب کرنا کیونکہ گناہ کو جائز سمجھنا کفر ہے۔

وہ ضابطہ یہ ہے:

" يحتمل كل قطيعة لا يرضاها الله تعالىٰ وسائر ما فيه رفض خير او تعاطي شر "

یہاں یہ ہی قوی احتمال ہے کہ ہر وہ چیز جو انسان کو اللہ تعالیٰ کے قریب کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے دور رہنے کو ناپسند فرماتا ہو اس سے دور رہنا ہی قطع کرنا ہے۔اور اس پر قائم رہنا ہی اسے جوڑنا ہے ہر وہ کام جس میں خیر ہو اسے چھوڑنا اور برائیوں کا حصول اور ان پر عمل کرنا درحقیقت جن چیزوں کو رب تعالیٰ نے جوڑنے کا حکم دیا ان کو توڑنا ہے۔

فائدہ جلیلہ:

" فانه يقطع الوصلة بين الله وبين العبد المقصودة بالذات من كل وصل وفصل "

''اصل میں سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ انسان رب تعالیٰ سے اپنا تعلق جوڑے، تمام قسم کے تعلقات جوڑنے سے یہی تعلق جوڑنا بہت عظیم''

نیکیوں کو چھوڑنا اور برائیوں کا ارتکاب کرنا اور نہیں جائز سمجھنا، انسان کو رب تعالیٰ سے دور کر دیتا ہے، کافر بنا دیتا ہے جو رب تعالیٰ سے تعلق توڑنے کے ذرائع ہیں۔ تمام قسم کے تعلقات کو توڑنے سے بہت عظیم جرم یہ ہے کہ انسان رب تعالیٰ سے اپنا تعلق توڑ دے۔

جوڑنے، توڑنے کی چند مثالیں:

کقطع الرحم: جیسا کہ رحم کو قطع کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ﴾ اور اللہ سے ڈرو جس کے نام پر مانگتے ہو اور رشتوں کا لحاظ رکھو۔ یعنی رشتوں کو قطع نہ کرو حدیث شریف میں جو رزق کی کشادگی چاہے اس کو چاہئے کہ صلہ رحمی کرے اور رشتہ داروں کے حقوق کا لحاظ کرے۔ یعنی قرابت کو قائم رکھنا صلہ رحمی ہے اور توڑنا قطع رحمی ہے۔ رب تعالیٰ نے صلہ رحمی کرے کا حکم دیا یعنی تعلق کے جوڑنے کا حکم دیا لیکن وہ قطع رحمی کرتے ہیں یعنی قرابت داروں سے تعلق کو توڑتے ہیں۔ اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ ☆ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ ﴾

'' تو کیا تمہارے یہ لچھن نظر آتے ہیں کہ اگر تمہیں حکومت ملے تو زمین میں فساد پھیلاؤ اور اپنے رشتے کاٹ دو، یہ ہیں وہ لوگ جن پر اللہ نے لعنت کی اور انہیں حق سے بہرا کر دیا اور ان کی آنکھیں پھوڑ دیں''

واضح ہوا کہ قطع رحمی کو جائز سمجھنا باعث کفر ہے اور اللہ تعالیٰ کی لعنت کا سبب ہے اور حق بات کے سننے سے دوری کا سبب ہے۔ اور حق راہ کو دیکھنے سے محروم کرنے کا ذریعہ ہے۔

صلہ رحمی کا ذکر احادیث مبارکہ سے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

"الرحم شجنة من الرحمن قال الله من وصلک وصلته ومن قطعک قطعته"
(رواہ البخاری، مشکوۃ باب البر والصلة)

رحم مشتق ہے رحمٰن سے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا جس نے تمہیں بلایا ملایا، میں اسے ملاؤں گا اور جس نے تمہیں قطع کیا میں اس سے قطع کروں گا۔

وضاحت حدیث:

الرحم: "قال سیوطی ای رحم الاقارب کیف کانوا" علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حدیث شریف میں جو لفظ "رحم" استعمال ہے، اس سے مراد قرابت داروں سے تعلق ہے۔ خواہ وہ کسی قسم کے بھی کیوں نہ ہوں۔

شجنة: شین (معجمة) کے نیچے کسرہ بھی پڑھا گیا ہے اور اس پر ضمہ بھی، جیم ساکن ہے اسکے بعد نون ہے "وهی فی الاصل عروق الشجرة المشتبكة" اس کا اصل لغوی معنی تو گنجان درختوں کے ٹہنیاں ہیں "والمراد منها هنا انها مشتقة" یہاں مراد یہ ہے کہ "رحم" کا لفظ "رحمن" سے مشتق ہے کیونکہ "رحم" میں بھی وہی لفظ ہیں جو رحمٰن میں ہیں یہاں مشتق کا مطلب یہ ہے کہ رحم کا معنی رحمٰن کے معنی سے ماخوذ ہے۔ یعنی رحم بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے آثار میں سے ایک اثر ہے۔ رب تعالیٰ نے رحم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ جس نے تمہیں جوڑا یعنی قرابت داروں سے تعلق کو جوڑا، میں اس کا تعلق اپنی رحمت سے جوڑ دوں گا اور جس نے تمہیں منقطع کیا۔ یعنی جس شخص نے قرابت داروں سے تعلق کو توڑا میں بھی اس کا تعلق اپنی رحمت سے توڑ دوں گا۔ (مرقاۃ ج۹ ص۱۹۶)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "الرحم معلقة بالعرش تقول من وصلنی وصله الله ومن قطعنی قطعه الله" (بخاری، مسلم، مشکوۃ باب البر والصلة)

رحم عرش سے معلق ہو کر کہتی ہے، جس نے مجھے ملایا اللہ نے اسے ملایا جس نے مجھے توڑا اللہ نے اسے قطع کیا۔

وضاحت حدیث: عرش سے معلق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ کے عرش سے وہ سہارا لے

رَ قطع کرنے سے پناہ پکڑتی ہے۔اور جوڑنے کی خبر دیتی ہے۔
تقول: وہ کہتی ہے اس میں کئی احتمال ہیں۔ایک یہ کہ وہ ابتدائی طور پر خبر دیتی ہے۔دوسرا یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ سے جو سنتی ہے اس کی حکایت بیان کرتی ہے۔تیسرا یہ کہ جو اللہ تعالیٰ سے اس نے سنا ہوتا ہے اسے ذکر کر کے لذت محسوس کرتی ہے چوتھا یہ کہ ہوسکتا ہے کہ یہ ماضی کا صیغہ امر کے معنی میں استعمال ہو، اور رحم کی طرف سے دعا ہو کہ اے اللہ جو صلہ رحمی کرے تو بھی اسے اپنی رحمت کے قریب کر، اور جو قطع رحمی کرے تو بھی اسے اپنی رحمت سے دور کر " فالوصل كناية عن الاقبال اليه و القبول منه " اللہ تعالیٰ کے وصل سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کاملہ سے اس کی طرف توجہ کرتا ہے، اور اس کے صلہ رحمی کے عمل کو قبول کرتا ہے " والقطع عبارة عن الغضب عليه و الاعراض عنه " اللہ تعالیٰ کی طرف سے قطع کا یہ مطلب ہے کہ رب تعالیٰ اس پر غضب فرماتا ہے اور اپنی خصوصی توجہ اس کی طرف نہیں فرماتا " قطعه الله عن عين غايته ومن كمال رحمته ورافته " اللہ تعالیٰ اسے اپنی خاص عنایت، کامل رحمت اور کامل مہربانی سے دور کر دیتا ہے۔

رحم میں کون سے رشتہ دار آتے ہیں؟:

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِىْ كِتَابِ اللّٰهِ

"اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ہے کہ اولوا الارحام بعض، بعض سے زیادہ حق دار ہیں"

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے " ثم ادناک ثم ادناک " پھر جو تمہارے قریبی ہیں پھر جو تمہارے قریبی ہیں۔اس سے واضح ہوا کہ " ذو رحم محرم " (یعنی دو رشتہ داروں میں سے ایک کو مذکر تصور کیا جائے اور دوسرے کو مؤنث ان کا آپس میں نکاح نہ ہو سکے) زیادہ قریبی رشتہ دار ہیں اسی طرح وراثت کی ترتیب کے لحاظ سے بھی قرب اور بعد کا لحاظ کیا جا سکتا ہے۔تمام ہی رشتہ داروں سے اچھا سلوک کیا جائے، مہربانی کی جائے۔مالی امداد کی کسی کو ضرورت ہو اور معاونت کی طاقت ہو تو اپنی وسعت کے مطابق معاونت کی جائے۔ (از مرقاۃ ج ۹ ص ۱۹۷)

☆ " عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ ليس الواصل بالمكافئ ولكن الواصل الذی اذا قطعت رحمه وصلها " (رواه البخاری، مشکوة باب البر والصلة)

حضرت ابن عمرو نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ شخص حقیقت میں صلہ رحمی کرنے والا نہیں، جو بدلے کے طور پر صلہ رحمی کرے، حقیقت میں صلہ رحمی کرنے والا وہ شخص ہے کہ جب اس سے قطع رحمی کی جائے وہ پھر بھی صلہ رحمی کرے۔

وضاحت حدیث: المکافئ، المجازی کسی کی صلہ رحمی کے بدلہ میں صلہ رحمی کرنا "**قطعت**" ماضی مجہول کا صیغہ ہے، یعنی جب اس سے قطع رحمی کی جائے۔ نبی کریم ﷺ نے اس ارشاد گرامی میں مکارم اخلاق کا درس دیا کہ انسان مکارم اخلاق سے ہی اعلیٰ منصب کو حاصل کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ ﴾ (المؤمنون آیة ۹۶)

''سب سے اچھی بھلائی سے برائی کو دفع کرو''

اسی جملہ جمیلہ کے معنی بہت وسیع ہیں، اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ توحید جو اعلیٰ بہتری ہے اس سے شرک کی برائی کو دور کرو، اور یہ معنی بھی ہے کہ طاعت اور تقوی کو رواج دے کر معصیت کو دور کرو، اور اس کا معنی یہ بھی ہے کہ اپنے مکارم اخلاق (اچھے اخلاق) سے خطا کاروں پر اس طرح عفو و رحمت کرو جس سے دین میں کوئی سستی نہ ہو۔ (از خزائن العرفان)

اس طرح اللہ تعالیٰ کا اور ارشاد گرامی یہ ہے:

﴿ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ﴾

''برائی کو بھلائی سے ٹال، جبھی وہ کہ تجھ میں اور اس میں دشمنی تھی ایسا ہو جائے گا جیسا کہ گہرا دوست''

یعنی مکارم اخلاق سے انسان جب کسی کی برائی کے بدلے میں اچھائی کرے گا۔ تو دشمن بھی گہرا دوست بن جائے گا۔ اسی طرح بخاری میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: " **صل من قطعک واحسن الی من اساء الیک وقل الحق ولو علی نفسک هذا** "

''جو شخص تمہارے ساتھ قطع رحمی کرے اس سے صلہ رحمی کرو، اور جو تمہارے ساتھ برائی کرے تم اس سے بھلائی کرو، اور حق بات کرو اگر چہ تمہیں اپنے نفس کے خلاف ہی کہنا پڑے'' (از مرقاة ج ۹ ص ۱۹۷)

☆ " **عن ابی هريرة ان رجلا قال يا رسول الله ان لی قرابة اصلهم ويقطعونی واحسن اليهم ويسيئون الی واحلمهم عنهم ويجهلون علی فقال لئن كنت كما قلت**

فکانما تسفهم الملّ ولا یزال معک من اللہ ظهیر علیهم ما دمت علی ذلک "

(رواہ مسلم مشکوۃ باب البر والصلة)

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ، بیشک میرے قریبی رشتہ دار ہیں میں ان سے صلہ رحمی کرتا ہوں وہ مجھ سے قطع تعلقی کرتے ہیں میں ان سے بھلائی کرتا ہوں وہ مجھ سے برائی کرتے ہیں میں ان سے برداشت کرتا ہوں۔ وہ میرے ساتھ جہالت سے درپیش آتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر ایسا ہی ہے جیسا کہ تم کہہ رہے ہو تو تم نے ان (کے چہروں) کو راکھ لگادی۔ جب تک تم اس حال پر رہو گے تو اللہ تعالیٰ کی امداد تمہیں حاصل رہے گی"

وضاحت حدیث: تسفهم باب افعال ہے سفوف سے ماخوذ ہو جس کا معنی سفوف بنانا، اور کہا جاتا ہے " اسفـفته غیری ، ای تلقی وجوههم "کسی کے منہ میں (مٹی، راکھ) ڈالنا " الملّ " (میم پر فتحہ لام مشدد) گرم راکھ کو کہا جاتا ہے جس میں روٹی کو دبا دیا جائے کہ پک جائے۔ اگرچہ اس جملہ کے مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں، لیکن تمام کا مفہوم یہ ہے کہ جب وہ تمہاری صلہ رحمی کا بدلہ قطع رحمی سے دے رہے ہیں، تمہارے احسانوں کے بدلہ تمہارے ساتھ برائی سے درپیش آرہے ہیں تو یہ ایسا ہی جیسے کہ کسی منہ پر راکھ ڈال دیا جائے تو یہ اس کی ذلت ہے۔ یعنی وہ اگرچہ ذلت آمیز کام کر رہے ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اس وقت تک تمہاری امداد فرماتا رہے گا جب تک تم اچھے اخلاق پر قائم رہو گے۔

تنبیہ: اگرچہ اللہ تعالیٰ نے قرابت داروں سے اچھا تعلق رکھنے کو پسند فرمایا اور رسول اللہ ﷺ نے صلہ رحمی پر برانگیختہ فرمایا اور قطع رحمی پر وعید بھی فرمائی لیکن نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد گرامی کو بھی نہ بھولئے "ان احب الاعمال الی اللہ تعالیٰ الحب فی اللہ والبغض فی اللہ "

(روی ابو داؤد عن ابی ذر ، مشکوۃ باب الحب فی اللہ ومن اللہ)

بیشک تمام اعمال سے اچھا عمل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے ہی کسی سے محبت کی جائے اور اسی کی رضاء کے لئے کسی سے ناراضگی رکھی جائے:

" من احب فی اللہ یحب انبیاء ہ واولیاء ومن شرط محبتهم ان یقفوا اثرهم "

"محبت فی اللہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انبیاء کرام اور اس کے اولیاء کرام سے محبت رکھے اور ان کے نقش قدم پر چلے"

" وکذالک من البغض فی اللہ ابغض اعداء ہ و بذل جهده فی

المجاھدۃ معھم بالسنان و اللسان "

"بغض فی اللہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دشمنوں سے بغض رکھا جائے۔ان کی مخالفت میں کوشش کی جائے ان سے زبان سے مقابلہ کیا جائے ضرورت پڑے تو نیزہ سے مقابلہ کرے"

واضح ہوا بے دین، رب تعالیٰ کے احکام سے دور، دین مصطفےٰ ﷺ کا باغی، گستاخ انبیاء کرام، گستاخ اولیاء کرام سے بغض رکھنا عین ایمان ہے۔کنجروں سے تعلق جوڑنا، یہود ونصاری سے تعلق جوڑنا کہ امریکہ راضی ہوگا، اور اقتدار ملے گا، اور دین اکبری کی طرح اس نعرہ پر عمل کرنا:

مسلم، ہندو اور عیسائی ، ہیں سب بھائی بھائی

درحقیقت دین اسلام سے دور ہونے کے مترادف ہے ایسے اسلام کے دعویداروں سے دور رہیں۔یہ اسلام کا لبادہ اوڑھ کر یہودیوں اور عیسائیوں کا کام کرنے والے ہوتے ہیں۔

قطع اور ایصال کی مثالیں: اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو جوڑنے کا حکم دیا فاسقین ان کو توڑتے ہیں اس کا پہلے ضابطہ بیان کر دیا گیا۔پھر اسی ضابطہ کے مطابق مثالوں کو شروع کیا تھا جس میں ایک مثال ذکر کی کہ رب تعالیٰ نے صلہ رحمی یعنی قرابتداروں سے تعلق جوڑنے کا حکم دیا لیکن فاسقین اسے توڑتے ہیں قطع رحمی سے کام لیتے ہیں۔اس کی اور مثالیں قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے یہ بیان فرمائیں:

"والاعراض عن موالاۃ المؤمنین" "مومنوں سے دوستی قائم کرنے اور محبت رکھنے سے اعراض کرنا"

یعنی اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ مومن حضرات مومنوں سے ہی محبت کریں ان سے ہی دوستی قائم کریں ان سے ہی اپنا تعلق جوڑیں کفار، یہود ونصاری سے دوستی نہ رکھیں ان سے محبت نہ کریں۔لیکن فاسقین مومنوں سے تعلق توڑتے ہیں مومنوں کو تکالیف پہنچاتے ہیں۔مومنوں کو پابند سلاسل کرتے ہیں، کہ یہود ونصاری خوش ہو جائیں، خواہ ملک تباہ ہی کیوں نہ ہوتا رہے اس طریقہ کو جائز سمجھنے والے، کفار سے دلی محبت کرنے والے یقیناً کافر ہیں، وہ اس آیت میں داخل ہیں۔خیال رہے کہ موالاۃ کفار (کافروں سے دوستی) کی ممانعت پر تفصیلی بحث ان شاء اللہ اور کسی مناسب مقام پر ذکر کی جائے گی۔

"والتفرقۃ بین الانبیاء علیھم السلام والکتب فی التصدیق"

"انبیاء کرام اور کتب کی تصدیق میں تفریق کرنے والے بھی اس آیت میں داخل ہیں کہ وہ بھی فساق وکفار ہیں"

یعنی اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ تمام انبیاء کرام پر ایمان لاؤ، تمام انبیاء کرام کی نبوت کو حق اور سچ مانو، اور

آسمانی تمام کتب پر ایمان لاؤ کہ جو کتابیں رب تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئیں ان کی حقانیت پر ہمارا ایمان ہے۔ البتہ تحریف کے بعد ہمارا ان پر ایمان نہیں اور عمل بھی ہمارا شریعت مصطفوی پر ہی ہے کیونکہ یہی شریعتیں منسوخ ہوچکی ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کرام پر ایمان لا کر اور آسمانی تمام کتابوں کی تصدیق کر کے تعلق جوڑنے کا حکم دیا، لیکن فساق و کفار بعض نبیوں پر ایمان لا کر اور بعض پر ایمان نہ لا کر اور بعض کتابوں کی تصدیق کر کے اور بعض کی تصدیق نہ کر کے اس تعلق کو توڑتے ہیں۔ خیال رہے کہ اس کی تفصیل بھی انشاء اللہ " لا نفرق بین احد من رسله " کے ضمن میں آئے گی۔

وترک الجماعات المفروضة:

" ای ترک الاجتماعات المفروضة ، یعنی فرض اجتماعات کو چھوڑنا "

اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا:

﴿ وتعاونو ر پرہیزگاری پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی پر باہم مدد نہ دو "

یعنی الله تعانوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان ﴾

" اور نیکی الٰی نے حکم کیا کہ تم ایک دوسرے کی نیکی اور تقوی پر امداد کر کے تعلق جوڑو کیونکہ نیکی اور تقوی پر امداد مومنوں کو مومنوں کے قریب کرے گی اور نیک لوگوں کو نیک لوگوں کے قریب کرے گی۔ اور گناہوں اور زیادتیوں پر دوسرے کا ساتھ نہ دو اس سے بظاہر انسان کو نفع نظر آتا ہے کہ ظالم سے مل کر حکومت میں حصہ دار بن جاؤں گا، بہت مال بٹور لوں گا۔ لیکن اس کا انجام دنیا اور اخرت میں خسارے کے بغیر کچھ نہیں۔ لیکن فساق نے رب تعالیٰ کے اس حکم کو بھی توڑ دیا۔ کہ وہ نیکی اور تقوی پر امداد کر کے تعلق جوڑنے کی بجائے گناہ اور ظلم پر امداد کر کے اس تعلق کو توڑ رہے ہیں۔

اور رب تعالیٰ نے حکم دیا: ﴿ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴾

" اور ایک دوسرے کو حق کی تاکید کی اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی "

یعنی اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی شان بیان فرمائی جو خسارے سے بچے ہوئے ہیں۔ وہ ایمان والے ہیں جن کے اعمال اچھے ہیں اور ایک دوسرے کو حق پر چلنے کی حق بات کہنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کو صبر کرنے کی وصیت کرتے ہیں۔ تو یوں سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کر کے اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کر کے تعلق جوڑو لیکن فاسقین نے اس

کے خلاف کام کر کے اس حکم کو توڑ دیا۔اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" کونوا عباد اللہ اخوانا ، اللہ کے بندے بھائی بھائی بن جاؤ"

یعنی اللہ کے رسول ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنی امت کو حکم دیا کہ تم اللہ کے بندے بن جاؤ ،ایمان پر قائم رہو اللہ کی عبادت کرو اور ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن جاؤ۔یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی زبان ذیشان سے کہلایا کہ مومن بن کر بھائی بھائی بن کر ایک دوسرے سے تعلق جوڑو لیکن فساق نے اس سے پھر کر کفر کی راہ کو اختیار کر کے اسے توڑ دیا۔اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

" وعلیکم بالسواد الاعظم تم پر لازم ہے کہ بڑی جماعت کو لازم پکڑو"

یعنی رب تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی زبان مبارک سے کہلایا کہ بڑی جماعت کے ساتھ تعلق جوڑو لیکن فاسقین نے اس حکم کو بھی توڑ دیا۔لیکن یہ خیال رہے کہ اس تعلق کا مطلب سیاسی جماعتوں یا چھوٹی چھوٹی تنظیموں سے وابستگی نہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے:

" ای بما اجمع علیہ الجماعۃ الکثیرۃ من الامۃ فانھم لا یجتمعون علی الضلالۃ" (شیخ زادہ)

"یعنی اس عقیدہ پر قائم رہو جس پر بڑی جماعت قائم ہے۔کیونکہ تمام لوگ گمراہی پر متفق نہیں ہو سکتے" (ماخوذ از بیضاوی وشیخ زادہ)

اس لئے چھوٹی چھوٹی تنظیموں والے جب " من شذ شذ فی النار" (جو جماعت سے بکھر گیا وہ آگ میں پڑا) حدیث پاک کو اپنے دستوری کتابچوں میں لکھتے ہیں تو دکھ ہوتا ہے کہ حدیث پاک کے مطلب کو بدلنے کی کیوں کوشش کی جاتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ قطعوہ بالتکذیب والعصیان:

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کرنے اور ان کے ارشادات پر عمل کرنے کا حکم دیا لیکن فاسقین یعنی کفار نے اس حکم کو توڑ دیا آپ کی تکذیب کی اور نافرمانی کی۔ (روح المعانی)

فانہ تعالیٰ امر ان یوصل بالعمل فلم یصلوہ ولم یعلموا:

وظاھر ھذا انھا نزلت فی المنافقین ، اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ خلوص قلب سے عمل کر کے رب سے تعلق جوڑو لیکن منافقین نے ظاہری طور پر عمل کر کے اور دل سے انکار کر کے اس حکم کو توڑ دیا۔ (روح المعانی)

تنبیہ: اس آیت کریمہ میں کفار، یہود، نصاریٰ، منافقین تمام ہی داخل ہیں۔تو اس سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ منافقین کی چھ علامتیں ہیں:

(۱) بات کریں تو جھوٹ بولیں (۲) ان کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کریں

(۳) کسی سے وعدہ کریں تو خلاف ورزی کریں (۴) اللہ تعالیٰ سے وعدہ کریں تو توڑ دیں

(۵) اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کے جوڑنے کا حکم دیا ان کو توڑ دیں۔

(۶) اور زمین میں فساد پھیلائیں۔

(از ابن کثیر)

وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ: (اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں) اس کریمہ میں جن فاسقین یعنی کفار کا ذکر ہے ان کی یہ تیسری صفت بیان کی گئی کہ وہ زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔

زمین میں فساد پھیلانے کا مطلب کیا ہے؟

ان کے زمین میں فساد پھیلانے کے لئے بھی ایک ضابطہ موجود ہے جس کے ضمن میں کئی مثالیں پائی جاتی ہیں۔

وہ ضابطہ یہ ہے: "بانهم يرتكبون كل معصية يتعدى ضررها ويطير في الآفاق شررها"

وہ ہر ایسی معصیت کا ارتکاب کرتے ہیں کہ جس کے نقصانات متعدی (آگے پھیلنے والے) ہیں۔اور ان کے فسادات کی بھڑکائی ہوئی آگ کے چنگاریاں دور دور تک پھیل جاتی ہیں۔ان کے شر اور فساد کی لپیٹ میں تمام ملک آ جاتا ہے جس سے کوئی مقام محفوظ نہیں رہتا۔ (از روح المعانی)

ان کے فساد کے متعدی ہونے پر دلیل:

"ذكر في الارض اشارة الى ان المراد فساد يتعدى دون ما يقف عليهم"

رب تعالیٰ نے ان کے فساد کو "یفسدون" سے ذکر کیا اسی پر اکتفا نہیں فرمایا کہ وہ فساد پھیلاتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ "فی الارض" ذکر فرما کر یہ اشارہ کر دیا کہ ان کا فساد صرف ان کو ہی نقصان نہیں دیتا بلکہ ان کے فساد کے برے اثرات تمام زمین پر پھیلتے ہیں ان کی نحوست کا اثر روئے زمین پر پڑتا ہے۔

ان کے فساد کی چند مثالیں:

(۱) " افسادهم باستدعائهم الى الكفر والترغيب فيه وحمل الناس عليه "

ان کے فساد پھیلانے کا یہ طریقہ تھا کہ وہ دوسرے لوگوں کو بھی کفر کی طرف بلاتے تھے کفریہ عقائد واعمال کو مزین کر کے دکھاتے اور اس کی رغبت دلاتے اور یہ کہتے کہ یہی راہ حق ہے کہ اس پر چلنے والے مالدار ہیں۔ دین اسلام پر چلنے والے غریب ہیں ان کی غربت سے ہی سمجھ آرہا ہے کہ ہمارا طریقہ درست ہے۔ اس طرح کی خوبصورت باتوں سے لوگوں کو کفر پر برانگیختہ کرتے تھے۔

آج تک یہی طریقہ چلا آرہا ہے دین اسلام کے خدمت گزاروں کو عیاش طبقہ، یہود ونصاری سے محبت کرنے والا گروہ ہر وقت طعن وتشنیع کا نشانہ بنا رہا ہے۔ یہی فسادی لوگ ہیں جن کے متعدی فساد کی لپیٹ میں اقوام عالم (جہان کی تمام قومیں) مبتلا ہیں ''لیکن الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے'' محاورہ کے مطابق علماء کو فسادی کہتے ہیں۔

(۲) " او باخافتهم السبل وقطعهم الطرق على من يريد الهجرة الى الله تعالىٰ ورسوله ﷺ "

اور ان کے فساد پھیلانے کا طریقہ یہ تھا کہ وہ راستہ میں خوف دلاتے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی رضاء کی خاطر ہجرت کرنے والوں پر لوٹ مار کرتے۔ آیئے سوچئے عبادت گاہوں پر حملہ کرنے، قتل وغارت کا بازار گرم کرنے والے نماز ادا کرنے کے لئے مساجد پر پولیس اور سیکورٹی گارڈ کا پہرہ لگوانے والے، اور خوف اور ڈر پیدا کر کے مساجد سے عبادت سے روکنے کی مذموم کوشش کرنے والے کہیں انہیں کی ذریت معنوی تو نہیں؟ (ماخوذ از روح المعانی)

(۳) " ويفسدون في الارض بتعويق الناس عن الايمان وحثهم على القتال حفظا على الرشا " (تبصیر الرحمن)

اور ان کے فساد پھیلانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگوں پر ایمان لانے کے راستے تنگ کر دیتے ہیں اور قتل وغارت پر لوگوں کو برانگیختہ کرتے ہیں اور رشوت کے کلچر اور زیادہ مضبوط بناتے ہیں اور رشوت کے بازار کی حفاظت کرتے ہیں۔ قارئین کرام خدرا انصاف سے کام لیتے ہوئے ذرا یہ تو بتائیں کیا اس قسم کے لوگوں کی ہمارے ہاں کوئی کمی ہے؟ نہیں نہیں بڑی تعداد میں موجود ہیں ہوسکتا ہے کافر تو نہیں ہوں گے لیکن کافروں کے یار ضرور ہیں۔

(۴) " ویفسدون فی الارض بالمعاصی والکفر بالقرآن وبمحمد ﷺ ویھلکون الحرث والنسل "

(مظھری)

ان کے زمین میں فساد پھیلانے کا یہ مطلب ہے کہ وہ گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں۔اور قرآن پاک کا انکار کر کے اور نبی کریم محمد مصطفےٰ ﷺ پر ایمان نہ لاکر کفر کی راہ کو اختیار کرتے ہیں اور مسلمانوں کی کھیتیاں برباد کرتے ہیں اور مسلمانوں کی نسل کو ختم کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔

مسلمانو! سوچنے، سمجھنے کی ضرورت ہے جن نصاریٰ، یہود، ہنود کو تم اپنا خیر خواہ سمجھ بیٹھے ہو، اپنا مددگار سمجھتے ہو انہوں نے تمہیں سود پر قرض دے کر کنگال کر دیا تخریب کار انہوں نے خرید رکھے ہیں وہ تمہارا مال برباد کر رہے ہیں۔قتل تمہیں کرا رہے ہیں تمہاری نسل کو دین سے دور کر کے قتل عام کرا رہے ہیں تمہیں کب سمجھ آئے گی۔تباہ ہو کر بھی نہیں سمجھ رہے کب سمجھو گے؟ کسی بڑی تباہی کا انتظار کر رہے ہو؟

(۵) " ویفسدون فی الارض بالمنع عن الایمان والاستھزاء بالحق وقطع الوصل التی علیھا یدور فلک نظام العالم وصلاحه "

(ابو السعود)

ان کا زمین میں فساد پھیلانے کا یہ مطلب ہے کہ وہ لوگوں کو ایمان سے روکتے تھے اور حق کا مزاح اڑاتے تھے اور جن اچھے کاموں اور اچھے عقائد پر جہان کا نظام قائم ہے اور جہان کی صلاحیت ان پر قائم ہے اسے وہ تباہ کرتے تھے۔آج بھی یہی طریقہ ان کا چلا آ رہا ہے کہ وہ نظام عالم کو برباد کر رہے ہیں۔اچھائیوں کو برائیوں سے بدلنے کی کوشش میں رہتے ہیں اور دین اسلام کے شعار سے مزاح اڑانے کا کوئی وقت ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

(۶) " والاظھر ان المراد منه الصد عن طاعة الرسول ﷺ لان تمام الصلاح فی الارض بالطاعة "

زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ انکے فساد پھیلانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی طاعت سے روکتے زمین میں امن وسکون، ہر قسم کی بھلائی نبی کریم ﷺ کی طاعت سے ہی حاصل ہوتی ہے۔آپ کی طاعت ہی شریعت ہے۔انسان جب شریعت پر چلے تو وہ ظلم نہیں کرتا، عدل کو نہیں چھوڑتا لیکن شریعت سے دور ہو کر انسان ظالم بن جاتا ہے وہ انسان کی شکل میں خونخوار درندہ نظر آتا ہے۔

قارئین کرام ذرا توجہ فرمائیں کیا حقیقت یہ نہیں کہ جب تک نبی کریم ﷺ کو اپنی اولاد اپنے والدین اور تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ مانے ایمان نہیں حاصل ہوتا؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ نبی کریم ﷺ کو اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب ماننا ضروری ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ نبی کریم ﷺ پر جان قربان کرنا شہادت کا اعلیٰ مرتبہ ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ نبی کریم ﷺ کا کوئی ثانی نہیں مخلوق میں آپ کی کوئی نظیر نہیں؟

ہاں ہاں یہی حقائق ہیں جن کو مٹانے میں انگریز کے آلہ کار نکھٹو، الو، گدھے مل کر ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں نبی کریم ﷺ کو ایک عام انسان کا درجہ دے رہے ہیں تا کہ ان نظریات کو لوگوں کے ذہنوں میں بٹھا کر اطاعت رسول اللہ ﷺ کو مٹا دیں، تا کہ نبی کریم ﷺ پر جان قربان کرنے والا کوئی نہ رہے۔ دین کے متوالے مٹ جائیں اور دین مٹ جائے۔ یہی کوشش ابتداء اسلام سے لے کر آج تک جاری ہے۔ لیکن انشاء اللہ یہ ذلیل وخوار ہوں گے:

﴿مٹ گئے، مٹ جائیں گے سب اعداء تیرے۔ نہ مٹا ہے، نہ مٹے گا کبھی چرچا تیرا﴾

اُولٰئِکَ هُمُ الْخَاسِرُوْنَ: ”وہی نقصان اٹھانے والے ہیں“

قرآن پاک میں رب تعالیٰ کی طرف سے بیان کردہ مثالوں پر اعتراض کرنے والوں کے گمراہ ہونے اور فاسق (کافر) ہونے کا ذکر کیا گیا پھر ان کی صفات کو بیان کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے پختہ وعدہ کرنے کے بعد وعدہ کو توڑ دیتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے جن کے جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے وہ توڑتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ اب اس کا نتیجہ اور انجام بیان کیا جا رہا ہے کہ وہی خسارے میں ہیں:

” ان الخاسر اسم عام يقع على كل من عمل عملا لا يجزى عليه فيقال له خاسر “

”ہر وہ شخص جسے اس کے اعمال پر کوئی اچھا بدلہ، نفع نہ مل سکے اسے خاسر (نقصان اٹھانے والا) کہا جاتا ہے“

کافروں کو بھی ان کے اعمال کا کوئی نفع نہیں ہوگا اس لئے وہ خسارے میں ہوں گے۔ ایمان والے اور نیک عمل کرنے والے خسارے سے محفوظ رہیں گے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ☆ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾

''بیشک تمام انسان خسارے میں ہیں سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے ایمان لایا اور اچھے عمل کیے''

ان کے خسارے کی وجوہ:

(۱) " انهم خسروا نعيم الجنة " بیشک وہ جنت کی نعمتوں سے محروم رہیں گے۔ ہر شخص کے لئے جنت میں مقام بنایا گیا ہے " فان اطاع الله وجده " اگر اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی تو اس مقام کو پالے گا " وان عاصه ورثه المؤمنون " اور اگر اس نے نافرمانی کی تو وہ اس مقام سے محروم ہو جائے گا وہی مقام مومنوں کو دے دیئے جائیں گے اسی کو رب تعالیٰ نے یوں ذکر فرمایا:

﴿ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ ☆ اَلَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾

''یہی لوگ وارث ہیں کہ جنت فردوس کی میراث پائیں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''

(۲) یہود و نصاریٰ نے جو اپنی شریعت میں نیک عمل کیے اور منافقین کی ظاہری طور پر کی ہوئی نیکیاں ضائع ہو جائیں گی کیونکہ انہوں نے نبی کریم ﷺ پر ایمان نہ لا کر کفر اختیار کر کے اپنے اعمال کو برباد کر دیا۔ جو ان کے لئے خسارا کا سبب بنا۔

(از کبیر)

(۳) " اذ خسروا ديارهم واموالهم والعقل " (تبصیر الرحمٰن) انہوں نے اپنے شہروں، مالوں اور اپنی عقلوں کو کفر کی وجہ سے برباد کر کے رکھ دیا جس کی وجہ سے وہ خسارے میں پڑ گئے

(۴) ان لوگوں نے اپنی اصل پونجی (راس المال) یعنی عقل کو بھی ضائع کر دیا تو یقیناً جب اصل مال ہی نہ رہے تو اس پر مرتب ہونے والے فوائد بھی ضائع ہو جاتے ہیں۔ لہذا انہوں نے کتاب اللہ پر ایمان لانے سے دنیا میں حاصل ہونے والے فوائد اور جنت میں حاصل ہونے والی نعمتوں کو کفر کی وجہ سے برباد کر دیا اور اس کے بدلے موت کے بعد قبر میں بچھوؤں اور سانپوں کے ڈسنے کا عذاب حاصل کر لیا اور آخرت میں جہنم کا عذاب حاصل کر لیا۔ یہی ان کے لئے خسارے کا سبب بنا۔

(ماخوذ از عزیزی)

دینی مدارس کے طلباء کے لئے:

".اولئک اشارة الى الفاسقين باعتبار ما فصل من صفاتهم القبيحة

وفیه رمز الی انهم فی المرتبة البعیدة من الذم "

" اولئک " بعید کا اشارہ ذکر کیا ہے۔ جس کا مشار الیہ " فاسقین " ہے حالانکہ وہ قریب ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی بری صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ بیشک وہ اپنی قباحتوں اور برائیوں کی وجہ سے رب تعالیٰ کی رحمت سے دور ہیں وہ اشارہ قریب کے قابل نہیں اگرچہ ان کا ذکر قریب ہی ہے۔

" وحصر الخاسرین علیهم باعتبار کما لهم فی الخسران حیث اهملوا العقل عن النظر ولم یقتنصوا المعرفة المفیدة للحیاة الابدیة والمسرة السرمدیة "

" اولئک " معرفہ ہے اور " الخاسرون " بھی معرفہ ہے۔ درمیان بھی " هم " ضمیر منفصل مذکور ہے جس سے حصر کا فائدہ حاصل ہو رہا ہے یعنی " وہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں " کیونکہ انہوں نے کفر کو اختیار کر کے باطل راہ پر چل کر اپنی عقلوں کو بھی ضائع کر دیا تھا جس کی وجہ سے وہ نظر وفکر سے خالی ہو گئے۔ حیات ابدیہ اور ہمیشہ کے لئے آخرت میں حاصل ہونے والی مسرت کو ضائع کر بیٹھے۔ لہٰذا کامل نقصان ان کا ہی ہوا اس لئے ان کو ان میں ہی منحصر کر دیا۔ ان کے کامل نقصان کی وجوہ بھی واضح ہیں " واشتروا النقض بالوفاء " انہوں نے وعدہ کی وفا کے بدلے وعدہ کو توڑنا حاصل کیا:

" الفساد بالصلاح " اور انہوں نے امن وسکون اور صلاح کے بدلے فساد کو حاصل کیا۔

" والقطیعة والصلة " رب تعالیٰ نے جن کو جوڑنے کا حکم دیا انہوں نے اس کے بدلہ ان کو توڑنا حاصل کیا۔

" والثواب بالعقاب " انہوں نے ثواب حاصل کرنے کے بجائے عذاب حاصل کیا۔

لہٰذا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ " فضاع منهم الطلبتان راس المال والربح " ان سے دونوں مقاصد ضائع ہو گئے اصل مال یعنی عقل ضائع ہوئی اور اس سے حاصل ہونے والا نفع بھی ضائع ہو گیا یعنی ایمان اور نیکیوں پر مرتب ہونے والے دنیوی اور اخروی فوائد سے وہ محروم ہو گئے۔ " وحصل لهم الضرر الجسیم وهذا هو الخسران العظیم " اور ان کو اسی وجہ سے بہت بڑا ضرر پہنچا یہی وہ ان کا کامل نقصان ہے جو ان میں ہی منحصر ہے۔ (از روح المعانی)

﴿ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾

1 ''بھلاتم کیونکر خدا کے منکر ہو گے حالانکہ تم مردہ تھے اس نے تمہیں جلایا پھر تمہیں مارے گا، پھر تمہیں جلائے گا، پھر اسی کی طرف پلٹ کر جاؤ گے''

2 ''تم اللہ سے کیسے کفر کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے اس نے تم میں جان ڈالی پھر تمہیں مارے گا، پھر تمہیں زندہ کرے گا پھر تمہیں اسی کی طرف لوٹایا جائے گا''

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید کا ذکر ﴿ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾ سے کیا پھر نبوت کا ذکر ﴿ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا ﴾ سے کیا پھر قیامت کا ذکر ﴿ فَاتَّقُوا النَّارَ ﴾ سے اور ﴿ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ سے کیا پھر جنت والوں کے لئے نعمتوں کا ذکر کیا۔ اس آیۃ کریمہ میں بھی نعمتوں کا ہی ذکر ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا زندگی عطا کرنا اور موت عطاء کرنا نعمتیں ہیں۔ زندگی کا نعمت ہونا تو واضح سمجھ آتا ہے۔ لیکن موت کا نعمت ہونا اگرچہ بظاہر نہیں سمجھ آتا، لیکن جب غور کیا جائے کہ موت کے بعد ہی حیاۃ ابدیۃ حاصل ہوتی ہے اور اسی حیاۃ ابدیۃ میں جنت حاصل ہوتی ہے اور جنت کی نعمتیں حاصل ہوتی ہیں۔ تو خود بخود سمجھ آ جائے گا کہ موت جب اتنی عظیم نعمتوں کا ذریعہ ہے، اور موت کے بغیر اتنی عظیم نعمتیں حاصل نہیں ہوتی تو موت بھی بہت بڑی نعمت ہے۔

اس آیۃ کریمہ میں رب تعالیٰ نے ان پر تعجب کرتے ہوئے انہیں زجر کرتے ہوئے اور کفر سے روکتے ہوئے ارشاد فرمایا ﴿ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ ﴾ تم اللہ سے کیسے کفر کرتے ہو۔ اگرچہ ''کیف'' استفہام (سوال) کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہاں استفہام (یعنی پوچھنا) مقصود نہیں۔ کیونکہ استفہام کبھی تعجب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی توبیخ (ڈانٹ ڈپٹ) کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اور کبھی انکار کے لئے جیسا کسی کو کہا جائے یہ کام تم نے کیا ہے یعنی تمہیں نہیں کرنا

چاہئے تھا۔اگر چہ مفسرین کرام نے ایک ایک معنی لیا کسی نے ایک کسی نے دوسرا یا تیسرا۔

لیکن راقم کے نزدیک تمام معنی ایک ساتھ مراد لئے جاتے ہیں۔جب یوں کہا جائے تم نے رب تعالیٰ کی طرف لوٹ کر جانا ہے اس کے عذاب سے ڈرو تم کیسے کفر کر رہے ہو(یہ توبیخ ہے) تمہیں رب تعالیٰ کی نعمتیں نظر نہیں آ رہیں ہیں تم کیسی کفر کر رہے ہو تمہیں کفر نہیں کرنا چاہئے (یہ انکار ہے) اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں کے باوجود تم اس سے کفر کیسے کر رہے ہو(یہ تعجب ہے)

وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا: حالانکہ تم بے جان تھے، اس مقام پر اموات سے مراد وہ موت اور مردہ ہونا نہیں جو ہم سمجھتے ہیں کہ فلاں شخص پہلے زندہ تھا اب مر گیا۔ بلکہ اس مقام پر یہ مراد ہے " وکنتم امواتا نطفا فی الاصلاب " تم اپنے آباء کی پشتوں میں نطفہ کی شکل میں تھے یعنی اس دنیا میں ظاہری طور پر موجود ہونے سے پہلے تم معدوم تھے بے جان تھے۔

فَاَحْيَاكُمْ : اس نے تم میں جان ڈالی ۔ یہاں بھی موت کے بعد زندہ کرنے کا وہ مقصد نہیں، جو ہمارے ذہنوں میں عام طور پر پایا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ بے حس وحرکت کر دیا اور پھر اسے حس وحرکت والا کر دیا۔ بلکہ یہاں یہ مراد ہے " فاحیاکم فی الارحام والدنیا بنفخ الروح فیکم "رب تعالیٰ نے تمہاری ماؤں کی رحموں (بچہ دانیوں) میں جان ڈال کر تمہیں دنیا میں موجود کیا۔

ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ : پھر تمہیں مارے گا، اس موت سے مراد وہی موت ہے جو ہمارے ذہنوں میں مراد ہے کہ ہم کہتے ہیں فلاں شخص فوت ہو گیا، اسی لئے مفسرین کرام نے بیان فرمایا" ثم یمیتکم عند انتہاء آجالکم " کہ تمہاری زندگی کے وقت کے ختم ہونے پر تمہیں مارے گا۔

ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ: پھر تمہیں زندہ کرے گا۔اس زندگی سے مراد کون سی زندگی ہے؟اس پر روح البیان نے جو بیان کیا حاشیہ جلالین میں اسے بالاختصار یوں بیان کیا گیا:

" اما المحققون فذهبوا الی ان المراد بقوله تعالیٰ ثم یحییکم حیاة القبر وقال فی روح البیان ودل ثم التی للتعقب علی سبیل التراخی علی انه لم یروبه حیاة البعث فان الحیاة یومئذ یقارنها الرجوع "

"محققین حضرات نے یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ﴾ (پھر تمہیں زندہ کرے گا) سے مراد" قبر کی زندگی" ہے روح البیان میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ اس پر

﴿ ثُمَّ اِلَیۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴾ میں لفظ " ثم " دلالت کررہا ہے کیونکہ لفظ " ثم " تراخی پر دلالت کرتا ہے جس کا مطلب ہے کہ یہ کام کچھ دیر کے بعد ہوگا، یعنی تمہیں زندہ کرے گا پھر کچھ دیر کے بعد تمہیں رب تعالیٰ کی طرف لوٹایا جائے گا"

اگراس سے مراد قیامت کی زندگی ہوتو اس میں " ثم " کا حقیقی معنی مراد نہیں لیا جاسکے گا کیونکہ قیامت کی زندگی کے ساتھ ہی رب تعالیٰ کی طرف رجوع ہوگا اس میں دیر نہیں ہوگی۔

(جلالین ، حاشیہ جلالین)

لیکن خیال رہے کہ ﴿ ثُمَّ یُحۡیِیۡکُمۡ ﴾ سے مراد عام مفسرین نے "قیامت کی زندگی" بھی مراد لی ہے اب اس قول کے بعد یہ کہنا پڑے گا کہ رب تعالیٰ کی طرف لوٹائے جانے کا مطلب یہ ہوگا کہ جب رب تعالیٰ مومنوں سے کلام رحیمانہ فرمائے گا اور کفار سے غیظ وغضب کا کلام فرمائے گا۔ اب اس کے درمیان حشر اور حساب وکتاب پایا جائے گا اس لئے لفظ " ثم " کا معنی بھی حقیقی مراد لے لیا جائے گا۔

(از حاشیہ جلالین)

اس سے قبر کی زندگی مراد لینا بہتر ہے:

علامہ رازی رحمہ اللہ نے بھی یہی فرمایا کہ جب "ثم" تراخی کے لئے آتا ہے۔ اور قیامت کی زندگی کے بعد تو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع بغیر دیر کے ہوگا لہذا اس یہ واضح ہورہا ہے کہ " **فلو جعلنا الآیة من هذا الوجه دلیلا علی حیاة القبر کان قریبا** " اگر ہم اس آیۃ کریمہ میں اس دلیل کے پیش نظر ﴿ ثُمَّ یُحۡیِیۡکُمۡ ﴾ سے مراد قبر کی زندگی لیں تو عقل وفہم کے زیادہ قریب ہے۔ (از کبیر)

اعتراض: اگر قبر کی زندگی مراد لی جائے تو زندگیاں دو سے زیادہ ہوجائیں گی حالانکہ قرآن پاک میں صرف دو زندگیوں کا ثبوت ملتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَکَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِیۡنَ ثُمَّ اِنَّکُمۡ بَعۡدَ ذٰلِکَ لَمَیِّتُوۡنَ ☆ ثُمَّ اِنَّکُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ تُبۡعَثُوۡنَ ﴾

" پھر اسے (انسان کو) اور صورت میں اٹھان دی تو بڑی برکت والا ہے اللہ سب سے بہتر بنانے والا ہے پھر اس کے بعد تم ضرور مرنے والے ہو پھر تم سب قیامت کو اٹھائے جاؤ گے"

اس آیت کریمہ میں صرف دو حیاتوں کا ذکر ہے تیسری حیات کا ثابت کرنا کیسے صحیح ہے؟ خیال

رہے بعض حضرات نے یہی اعتراض " قالوا ربنا امتنا اثنتین واحییتنا اثنتین " سے کیا ہے کہ اس میں دوموتوں اور حیاتوں کا ذکر ہے۔لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ نے اس آیت سے استدلال پسند نہیں فرمایا کہ یہ کفار کے کلام کی حکایت ہے۔جس کو دلیل بنانا درست نہیں البتہ پہلے جس آیۃ کریمہ کو اعتراض میں ذکر کیا گیا ہے اسی کو اعتراض میں دلیل بنانا کسی حد تک درست ہے۔

پہلا جواب: جس آیۃ کریمہ کو معترض نے پیش کیا ہے اس میں دوموتوں اور حیاتوں کا ذکر ضرور ہے لیکن یہ ذکر نہیں کہ دوموتوں اور دو حیاتوں سے زائد کا پایا جانا منع ہے۔تین موتیں اور تین حیاتیں ہوسکتی ہیں۔بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ انسان پہلے مردہ ہوتا ہے یعنی اپنے آباء کی پشتوں میں اور ماؤں کی رحموں میں نطفہ ہوتا ہے۔پھر رحموں سے منتقل کر کے یعنی پیدا کر کے اسے حیات عطا ہوتی ہے پھر اس حیات کے بعد موت آ جاتی ہے۔پھر قبر میں زندگی حاصل ہوتی ہے۔پھر قبر میں نفخہ اولی (پہلی مرتبہ صور پھونکنے) کے وقت موت آئے گی پھر حشر کی طرف نشر کے وقت زندگی عطاء ہوگی۔جس کے بعد کوئی موت نہیں آئے گی " **فعلی هذا التاويل هي ثلاث موتات وثلاث احياء ات** " اس تاویل کے مطابق تین موتیں اور تین حیاتیں ثابت ہوگئیں دو سے زائد کے نہ پائے جانے کی بات ختم ہوگئی۔چار موتیں اور چار حیاتیں بھی ہوسکتی ہیں۔کیونکہ جن تین موتوں اور تین حیاتوں سے پہلے اگر ایک اور موت وحیات کو تسلیم کیا جائے تو یہ بھی صحیح ہے، کیونکہ سب سے پہلے تمام انسان اپنے سب سے پہلے باپ حضرت آدم علیہ السلام کی پشت میں مردہ تھے پھر ان کی پشت سے تمام چھوٹے چھوٹے ذرات کی شکل میں نکال کر اپنی ربوبیت کا ذکر ﴿ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ﴾ (کیا میں تمہارا رب نہیں) سے کیا، جس کا جواب قیامت تک آنے والوں نے ان الفاظ سے دیا ﴿ قَالُوْا بَلٰى ﴾ انہوں نے کہا کیوں نہیں (یعنی ہاں اے اللہ تو ہمارا رب ہے) یہ ایک موت وحیات ہوگئی۔تین کا ذکر اسے پہلے کر دیا گیا جن سے پہلے یہ موت وحیات پائی گئے "**فعل هذا اربع موتات واربع احياء ات** '' اس سے پتہ چلا کہ چار موتیں پائی گئیں اور چار ہی مرتبہ زندہ کرنا پایا گیا۔پانچ موتوں اور پانچ حیاتوں کا پایا جانا بھی صحیح ہے۔جن چار موتوں اور چار مرتبہ زندہ کرنے کا ذکر کیا گیا ہے ان سے پہلے بھی ایک موت وحیات کا ذکر ملتا ہے:

" ان الله تعالىٰ اوجدهم قبل خلق آدم عليه السلام كا لهباء ثم اماتهم فيكون على هذا خمس موتات وخمس احياء ات "

بیشک اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے تمام انسانوں ایک مرتبہ ایسے موجود فرمایا جس طرح سورج کی کرنوں کے پڑنے سے روشن دان سے چھوٹے چھوٹے ذرات نظر آتے ہیں، یعنی اس طرح بہت ہی چھوٹے ذرات کی صورت میں موجود کر کے پھر معدوم کر دیا۔ اس صورت میں پانچ موتوں اور پانچ مرتبہ زندہ کرنے کا ذکر ملتا ہے۔ چھٹی موت وحیات کا ذکر بھی ملتا ہے جیسا کہ حدیث پاک سے واضح ہے کہ جہنم میں کافروں پر تو موت طاری نہیں ہوگی۔ لیکن مومن گنہگاروں کو جہنم میں مار دیا جائے گا پھر زندہ کیا جائے گا حدیث پاک ملاحظہ فرمائیں:

" عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ ﷺ اما اهل النار والذین هم اهلها فانهم لا یموتون فیها ولا یحیون ولکن ناس اصابتهم النار بذنوبهم اوقال بخطایا هم فاماتهم اللہ اماتة حتی اذا کانوا فحما اذن فی الشفاعة فجئی بهم ضبائر ضبائر فبثوا علی انهار الجنة ثم قیل یا اهل الجنة افیضوا علیهم فینبتون نبات الحبة تکون فی حمیل السیل " (اخرجه مسلم)

" حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جہنم والے لوگ جو اس کے اہل ہیں (یعنی کفار) بیشک ان کی اس میں موت نہیں آئے گا اور نہ ہی موت کے بعد پھر زندگی (یعنی ان کی زندگی برقرار رہے گی ہمیشہ عذاب میں رہیں گے) لیکن کچھ لوگوں (یعنی گنہگاروں) کو آگ پہنچے گی ان کے گناہوں کی وجہ سے ان پر اللہ تعالیٰ موت طاری کر دے گا یہاں تک کہ جب وہ کوئلہ بن جائیں گے تو ان کیلئے شفاعت کی اجازت دے دی جائے گی ان کو متفرق جماعتوں کی صورت میں وہاں سے نکالا جائے گی جنت کی نہروں پر پھیلا دیا جائے گا، پھر کہا جائے گا، اے جنت والوان پر پانی بہاؤ وہ ایسے ہو جائیں گے جیسے ندی کی جھاگ میں سبزی وغیرہ کے بیجوں سے پودے اگ پڑیں"

" ضبائر " جمع ہے ضبارۃ کی۔ جس کا معنی ہوتا ہے مجتمع ہونا یعنی متفرق متفرق جماعتیں۔

"حبة" جب حاء کے نیچے کسرہ ہو تو سبزیوں کا بیج اور جب حاء پر فتح ہو تو گندم جو وغیرہ کا دانہ مراد ہوتا ہے۔

" حمیل السیل " ندی کا کسی چیز کو اٹھا کر رکھنا مراد اس سے پانی پر تیرنے والی جھاگ ہے۔ (از قرطبی)

دوسرا جواب: " لم یلزم من عدم الذکر فی هذه الآیة ان لا تکون حاصلة " اس آیت میں نہ ذکر کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ حیات قبر حاصل بھی نہ ہو (از کبیر) یعنی اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے

کہ " ثم یحییکم " سے مراد قیامت کی زندگی ہے تو پھر بھی یہ ثابت نہیں ہو سکے گا، کہ قبر میں زندگی حاصل ہی نہ ہو اس لئے کہ رب تعالیٰ کے دوسرے ارشادات گرامیہ سے قبر کی زندگی واضح طور پر ثابت ہے۔ اور احادیث مبارکہ بھی واضح طور پر ثابت کر رہی ہیں۔ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

" وحاق بآل فرعون سوء العذاب ، النار يعرضون عليها غدوا وعشيا ويوم تقوم الساعة ادخلوا آل فرعون اشد العذاب "

'' فرعون اور اس کے متعبین کا سخت ترین عذاب نے احاطہ کر لیا وہ صبح و شام آگ پر پیش کیے جاتے ہیں۔ اور جس دن قیامت قائم ہوگی اللہ رب العزت ملائکہ کو حکم فرمائے گا کہ فرعونیوں کو شدید ترین عذاب میں داخل کر دو''

" قال القرطبي الجمهور على ان هذا العرض يكون في البرزخ وهذا حجة في تثبيت عذاب القبر وقال غيره وقع ذكر عذاب الدارين في هذه الآية مبينا ومفسرا " (فتح الباری ج ۵ ص ۷۰۳ مطبع انصاری دهلی)

'' علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ علامہ قرطبی نے کہا جمہور علماء کا مذہب یہ ہے کہ "النار يعرضون عليها" سے عالم برزخ میں آگ پر پیش کیا جانا مراد ہے اور یہ آیۃ کریمہ اثبات عذاب قبر میں حجت و دلیل ہے''

علامہ قرطبی کے علاوہ دوسرے علماء حضرات نے فرمایا کہ اس میں دار آخرت اور عالم برزخ دونوں کے عذاب کا واضح اور تفصیلی بیان ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے فرمایا " احتج اصحابنا بهذه الآية على اثبات عذاب القبر " (کبیر) اسی آیۃ سے ہمارے علماء متکلمین نے عذاب قبر کے اثبات پر استدلال کیا ہے۔ اگر کوئی شخص تفصیلی طور پر اس مسئلہ کو سمجھنا چاہے تو استاذی المکرّم حضرت مولانا محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی کی کتاب '' جلاء الصدور'' کا مطالعہ کرے۔

تنبیہ: اس آیۃ سے مجسمہ فرقہ غلطی کا شکار ہوا ہے۔ کہ انہوں نے کہا ہے کہ رب تعالیٰ کا مکان ہے۔ کیونکہ جب رب نے خود فرمایا ہے ﴿ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ تو اس سے ثابت ہوا کہ اس کا مکان ہے لیکن یہ ان کا کہنا غلط ہے اس لئے کہ کہا جاتا ہے "رجع الامر الی الامیر" امیر کی طرف حکم لوٹا لیکن اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے "رجع الامر الی حیث لا یحکم غیرہ " یہ معاملہ وہاں پہنچ چکا ہے کہ اس کا حکم امیر (حاکم) کے بغیر کوئی اور نہیں دے سکتا۔

آیۃ کریمہ سے حاصل ہونے والے فوائد:

(۱) صرف اللہ تعالیٰ ہی زندگی اور موت عطاء کرنے والا ہے۔ کیونکہ رب تعالیٰ نے زندگی عطاء کرنے اور موت عطاء کرنے کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ اس سے ان لوگوں (اھل الطبائع) کا رد ہو گیا، جو ستاروں کو، افلاک کو، مزاج وغیرہ کو موت اور زندگی کے مستقل اسباب سمجھتے ہیں۔ حالانکہ مؤثر حقیقی اللہ تعالیٰ ہے مزاج وغیرہ تو اس کی مخلوق ہے۔

(۲) اسی آیۃ کریمہ سے حشر و نشر پر دلیل واضح ہو جاتی ہے اور عقل سلیم بھی اسے مانتی ہے کہ جو رب تعالیٰ انسان کو عدم سے وجود میں لانے والا ہے وہی موت کے بعد بھی حیات عطاء کرنے پر قادر ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنی نعمتوں کا ذکر فرمایا کہ وہ زندگی عطاء کرنے والا ہے اور وہی موت عطاء کرنے والا ہے جو تمہارے لئے نعمتیں ہیں اس کے بعد ذکر فرمایا ﴿ ثُمَّ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴾ اس میں خوف بھی دلایا گیا ہے کہ جب تم نے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے تو اس کے عذاب سے بھی ڈرتے رہو۔ اسی سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ انسان کو مکلّف بنانے میں ترغیب اور ترھیب (رغبت دلانے اور خوف دلانے) دونوں سے ہی کام لیا گیا ہے۔ (از کبیر)

فائدہ عظیمہ: موت و حیات کے کئی معانی ہیں۔ جب تک ان کا علم نہ ہو تو انسان غلط معنیٰ کر کے خود بھی گمراہ ہوتا ہے۔ اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے۔ اس لئے ان معانی کی طرف توجہ فرمائیں:

پہلا معنیٰ: موت کا معنیٰ روح روح کا جسم سے تعلق ٹوٹنا، اور حیوۃ کا معنیٰ روح کا جسم سے تعلق برقرار رہنا، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ کُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَۃُ الۡمَوۡتِ ﴾ ہر جان چکھنے والی ہے موت کو۔ اگر "نفس" کا معنیٰ بدن ہو تو ذائقہ کا معنیٰ ہوگا نازل ہونا، واقع ہونا یعنی ہر بدن سے روح کا تعلق ٹوٹ جائے گا۔ اسی طرح ہر بدن پر موت واقع ہوگی۔ اگر نفس سے مراد روح لیا جائے تو ذائقہ کا معنیٰ چکھنا ہوگا جو سیر ہو کر کھانے کا مدمقابل ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ روح کے ساتھ موت کا اتنا ہی تعلق ہوگا کہ روح کا رابطہ بدن سے ٹوٹے گا لیکن روح میں زندگی برقرار رہے گی۔

دوسرا معنیٰ: زمین میں نباتات اگانے کی تاثیر کا پایا جانا "حیوۃ" اور نہ پایا جانا "موت" ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِہِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا ﴾

''اور وہ جو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی اتار کر مردہ زمین کو اس سے زندہ کر دیا''

اس مقام پر زمین کے مردہ ہونے سے مراد بارش کے نہ ہونے کی وجہ سے زمین کا نباتات کے اگانے سے غیر مؤثر ہو جانا ہے۔ اور زمین کے مردہ ہونے سے مراد بارشوں کی وجہ سے زمین میں نباتات اگانے کی تاثیر کا پایا جانا ہے۔

تیسرا معنی: ایمان وکفر یعنی "حیوۃ" سے مراد ''ایمان'' اور ''موت'' سے مراد ''کفر''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَآءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ ، إِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ وَمَآ أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴾

''اور برابر نہیں زندہ اور مردے بیشک اللہ سناتا ہے جسے چاہے اور تم نہیں سنانے والے انہیں جو قبروں میں پڑے ہیں''

اس آیۃ کریمہ میں " احیاء " سے مراد "مؤمنین" اور "اموات" سے مراد " کفار " ہیں کفار کو مردوں سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح مردے سنی ہوئی بات یعنی پند ونصائح سے نفع نہیں حاصل کر سکتے۔ کیونکہ عمل کا دارومدار دنیاوی زندگی سے تھا اسی طرح کفار کا بھی یہی حال ہے کہ جن کی موت کفر پر یقینی ہے وہ ہدایت ونصیحت سے کوئی نفع نہیں حاصل کر سکتے۔

خیال رہے کہ اس آیۃ کریمہ میں قبروں والوں سے مراد کفار ہیں فوت شدہ انسان نہیں روح المعانی، مدارک اور ان کے علاوہ معتبر تفاسیر کو دیکھیں یہاں سے یہ ثابت کرنا کہ قبر والے انسان نہیں سنتے یہ گمراہی ہے اور دوسروں کو گمراہ کرنا ہے۔

چوتھا معنی: توجہ کرنا حیات، اور توجہ نہ کرنا موت ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا " **ما من احد يسلم على الارد الله روحى حتى ارده عليه السلام** '' (مسند احمد ابوداؤد) جو شخص مجھ پر سلام پیش کرتا ہے اللہ تعالیٰ میری توجہ اس کی طرف مبذول کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔

اس کا مقصد یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ پہلے اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی تجلیات کے انوار کے مشاہدہ میں مستغرق ہوتے ہیں دنیا سے بے نیاز ہوتے ہیں جب درود شریف پڑھنے والا آپ پر درود

وسلام پیش کرتا ہے تو اس وقت آپ استغراقی حالت سے واپس لوٹ کر اس شخص کی طرف توجہ کرتے ہوئے اس کو سلام کا جواب دیتے ہیں۔ اس حالت کو "رد روح" (روح کا لوٹنا) یعنی حیوۃ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سبحان اللہ نبی کریم ﷺ پر سلام پیش کرنے والے کی کتنی شان ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ بنفس نفیس آپ اس کو سلام کا جواب دیتے ہیں۔

یہاں سے واضح طور پر سمجھ آیا کہ موت کا معنی ہمیشہ مردہ ہونا ہی نہیں بلکہ دنیا سے توجہ ہٹا کر اللہ تعالیٰ کی طرف اس طرح متوجہ کرنا کہ استغراقی حالت پیدا ہو جائے یہ بھی بنسبت دنیا کے موت ہے۔ اور دنیا کی طرف متوجہ ہونا اس معنی کے لحاظ سے حیوۃ ہے۔

پانچواں معنی: حیوۃ کا معنی بیداری اور موت کا معنی نیند ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

" وهو الذی یتوفاکم باللیل ویعلم ماجرحتم بالنهار ثم یبعثکم فیه لیقضی الی اجل مسمی "

''اور وہی ہے جو رات کو تمہاری روحیں قبض کرتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ دن میں کماؤ پھر تمہیں دن میں اٹھاتا ہے کہ ٹھہرائی میعاد پوری ہو''

اس آیۃ کریمہ میں اس مسئلہ پر دلیل قائم فرمائی ہے کہ آخرت میں زندگی عطا ہوگی۔ یعنی موت کے بعد پھر زندہ ہونا ہے جس طرح روزمرہ سونے کے وقت تم پر ایک قسم کی موت مسلط کی جاتی ہے یعنی تمہارے حواس معطل ہو جاتے ہیں چلنا پھرنا، کھانا پینا کسی چیز کو پکڑنا وغیرہ تمام افعال جو انسان بیداری میں کرتا ہے وہ معطل ہو جاتے ہیں اس کے بعد جو انسان جاگتا ہے تو بیداری کے تمام تصرفات پھر اللہ تعالیٰ اسے لوٹا دیتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نیند میں افعال کو سلب کر لیتا ہے اور جاگتے وقت پھر عطا کرتا ہے وہ اس پر بھی قادر ہے کہ موت عطا کر کے بظاہر تمام تصرفات کو معطل کر کے پھر قبر اور حشر میں زندگی عطا کر کے ان تصرفات کو لوٹا دے۔

چھٹا معنی: حیوۃ سے مراد دلوں کا زندہ ہونا اور موت سے مراد دلوں کا مردہ ہونا۔

ساتواں معنی: حیوۃ سے مراد عزت کی زندگی موت سے مراد ذلت کی زندگی جو مردہ ہونے کی طرح ہے۔

آٹھواں معنی: حیوۃ سے مراد شہادت جو دنیا کی زندگی سے اعلیٰ زندگی عطا کرتی ہے۔ اور موت سے مراد دنیاوی زندگی جو بنسبت شہادت کے گھٹیا ہوتی ہے۔ ان آخری تینوں معنوں پر اللہ تعالیٰ کا یہ

ارشادگرامی دلالت کررہا ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ﴾

''اے ایمان والو اللہ اوراس کے رسول کے بلانے پر حاضر ہو جاؤ جب رسول تمہیں اس چیز کے لیے بلائیں جو تمہیں زندگی بخشے گی''

وہ کیا چیز ہے جو زندگی بخشنے والی ہے اور زندگی سے مراد کیا ہے؟

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے وہ چیز قرآن ہے کیونکہ اس سے دلوں کو زندگی حاصل ہوتی ہے اوراس سے نجات حاصل ہوتی ہے اوراس میں عصمت دارین ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ حیوۃ کا معنی کبھی دل کی زندگی اور موت کا معنی دل کی مردگی ہوتا ہے۔اور اگر دل اللہ تعالیٰ کی یاد میں رہا اور غفلت میں مبتلا نہ ہوا تو وہ زندہ ہوگا۔اور اگر اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل رہا تو مردہ ہوگا۔محمد بن اسحق رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ وہ چیز جہاد ہے۔جس سے زندگی حاصل ہوتی ہے اس لئے کہ جہاد کے ذریعے اللہ تعالیٰ عزت فرماتا ہے:

اس سے یہ واضح ہوا کہ عزت کی زندگی ہی درحقیقت زندگی اور ذلت کی زندگی موت ہے۔بعض مفسرین نے فرمایا کہ وہ شہادت ہے جو زندگی بخشتی ہے اُس طرح شہادت سے حاصل ہونے والی زندگی اعلیٰ قسم کی زندگی ہونے کی وجہ سے درحقیقت زندگی کہلانے کی حقدار ہے اس کے مقابل دنیا کی زندگی اگرچہ بظاہر زندگی ہی ہے لیکن گھٹیا ہونے کی وجہ سے مردگی کی طرح ہی ہے۔ (قرطبی ، روح المعانی ، کبیر وغیرہ)

نواں معنی: موت کا معنی سکون اور حیات کا معنی حرکت جس طرح کہا جاتا ہے ماتت الریح ہوا رک گئی۔یعنی ہوا کے رکنے، ٹھہرنے کو موت کہا گیا ہے اور ہوا کے چلنے کو حیات

دسواں معنی: قوت عاقلہ کے زوال یعنی جہالت کو موت کہہ لیا جاتا ہے اور علم کو حیات۔

گیارھواں معنی: فقر کو کبھی موت کہہ لیا جاتا ہے اور غناء کو حیات۔

بارھواں معنی: معصیت کو موت کہا جاتا ہے اور نیکی کرنے کو حیات۔

تیرھواں معنی: بڑھاپے کو موت سے کبھی تعبیر کرلیا جاتا ہے اور جوانی کو حیات سے۔

(ماخوذ از حاشیہ مشکوۃ ص ۲۰۸

☆☆☆

﴿ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ق ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ط وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴾

''(رب) وہی ہے جس نے تمہارے لئے بنایا جو کچھ زمین میں ہے پھر آسمان کی طرف استواء (قصد) فرمایا تو ٹھیک سات آسمان بنائے اور وہ سب کچھ جانتا ہے''

''(اللہ) وہی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لئے زمین کی تمام چیزوں کو پھر متوجہ ہوا آسمان کی طرف تو ٹھیک سات آسمان بنائے وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے''

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت کا ذکر فرمایا کہ اس نے تمہیں زندگی عطا فرمائی اب ایک اور نعمت کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ اس نے تمہارے نفع کے لئے زمین میں تمام چیزوں کو پیدا فرمایا۔ اور ساتھ ہی آسمانوں کی تخلیق کا ذکر فرمایا گویا کہ انسانوں کو تدبر کرنے کا سبق دیا کہ وہ ذات جو زمین و آسمان کی تخلیق پر قادر ہے وہ تمہاری موت کے بعد زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے کوئی چیز اس کے احاطہ علم سے باہر نہیں۔

﴿ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ﴾ اس مقام پر ''خلق'' کا معنی ''اخترع واوجد بعدالعدم'' (یعنی عدم کے بعد معرض وجود میں لایا) ہے۔ ''لکم ای لانتفاعکم'' زمین میں تمام چیزیں تمہارے لئے پیدا کی ہیں یعنی رب تعالیٰ نے تم پر انعام فرمایا ہے اسی سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا بھی پتہ چل گیا کہ اس کے بغیر زمین میں تمام چیزوں کا کوئی خالق نہیں اور اسی سے سوچنے کا موقع بھی مل گیا کہ جو ذات تمام چیزوں کے پیدا کرنے پر قادر ہے وہ ہمیں بھی موت کے بعد زندہ کرنے پر قادر ہے۔

اعتراض: زمین کی چیزوں میں تو سانپ اور بچھو بھی ہیں جو انسان کے لئے ضرر انداز ہیں ان میں تو انسان کو کوئی نفع نہیں تو کس طرح تمام چیزیں نفع مند ہوئیں؟

جواب: انسان جب یہ سوچے کہ کافروں کے لئے سانپ اور بچھو عذاب ہوں گے تو اسے ایمان حاصل ہوگا اور وہ گناہوں کو چھوڑ دے گا اس سے بڑھ کر اور عظیم نفع انسان کو کیا حاصل ہوگا۔ (از قرطبی، مدارک)

فائدہ: ارباب معانی نے کہا ہے کہ ﴿ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ﴾ (زمین میں تمام چیزیں تمہارے لئے پیدا کیں) کا مطلب یہ ہے کہ " **لتتقووا به علی طاعته لا لتصرفوه فی وجوه معصیته** " تم ان چیزوں سے قوت حاصل کرو کہ اللہ تعالیٰ کی طاعت کرسکو اور ان چیزوں کو معصیت میں نہ لگاؤ۔

فائدہ جلیلہ: ابوعثمان رحمہ اللہ نے بیان فرمایا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کی تمام چیزیں انسانوں کو عطا فرمادی ہیں " **لتستدل به علی سعة جوده** " تاکہ انسان اسی سے سمجھ جائیں کہ اللہ تعالیٰ کے جود میں بہت وسعت ہے۔ اور اس کی عظیم نعمتیں آخرت میں بھی حاصل ہونی ہیں۔ اور انسان کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اس کی نعمتیں شمار میں نہیں آسکتیں۔ اور اس نے انسان کو عمل سے پہلے ہی بہت بڑی نعمتیں عطا فرمادیں۔ ان تمام چیزوں سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا پتہ چلتا ہے۔ اور انسان کو بھی سخاوت کرنے کا درس ملتا ہے۔ سخاوت کو ہی سرکار دوعالم ﷺ نے پسند فرمایا۔

☆ **"عن عمر بن خطاب رضی الله عنه ان رجلا اتی رسول الله ﷺ فساله ان یعطیه فقال رسول الله ﷺ ما عندی ولکن ابتع علی فاذا جاء شی قضیان فقال له عمر " هذا عطیت اذا کان عندک فما کلفک الله ما لا تقدر فکره رسول الله ﷺ قول عمر فقال رجل من الانصار یارسول الله" انفق ولا تخش من ذی العرش اقلالا فتبسم رسول الله ﷺ وعرف السرور فی وجهه لقول الانصاری ثم قال رسول الله ﷺ بذالک امرت "**

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے بیشک ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آیا آپ سے اس نے سوال کیا کہ آپ مجھے کچھ عطا کریں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے پاس اس وقت کوئی چیز نہیں۔ البتہ تم (ادھار) خرید لو اس کا قرض مجھ پر ہوگا جب کوئی چیز ملے گی تو ہم ادا کردیں گی۔ (حضرت) عمر نے عرض کیا جب آپ کے پاس کوئی چیز ہوئی تو آپ اسی کو دے دینا (ابھی سے قرض اپنے ذمہ لینے کی کیا ضرورت ہے) آپ کو اللہ تعالیٰ نے اس چیز کی تکلیف تو نہیں دی جس پر

آپ قادر ہی نہیں۔ تو نبی کریم ﷺ (حضرت) عمر کے اس قول کو ناپسند فرمایا۔ انصاری میں سے ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ خرچ کرتے رہے صاحب عرش (رب تعالیٰ) سے کمی کا خوف نہ کریں انصاری صحابی کی بات سن کر نبی کریم ﷺ مسکرائے اور خوشی کے آثار آپ کے چہرہ مبارک پر نظر آ رہے تھے آپ نے فرمایا ہاں مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے۔

اس حدیث پاک سے بھی یہ واضح ہوا کہ انسان سخاوت کرتا رہے مال کی کمی سے نہ ڈرے کیونکہ رب تعالیٰ اس میں برکت عطا فرمائے گا اور مال بڑھتا رہے گا۔ خصوصاً جب انسان اس آیۃ کریمہ میں تفکر کرے کہ ﴿ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا ﴾ رب تعالیٰ نے ہمیں خطاب فرماتے ہوئے جب ارشاد فرمادیا کہ ''زمین میں تمام چیزیں تمہارے لئے پیدا کیں'' تو پھر ہمیں کس چیز کی کمی ہے۔ اور جب اس آیۃ کریمہ ﴿ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ﴾ (اور تمہارے لئے مسخر فرمادیں زمین و آسمان کی تمام چیزیں) میں انسان غور وفکر کرے تو اس پر یہ واضح ہو جائے گا کہ جب زمین و آسمان کی تمام چیزیں ہمارے لئے مسخر فرمائی ہیں تو ہمیں بھی چاہئے کہ ہم اس کے احکام کو تسلیم کریں۔ انسان کو یہی چاہئے " لیکون له عبدا کما خلقه عبدا " کہ رب کا عبادت گزار بن جائے کیونکہ انسان کی تخلیق کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ رب تعالیٰ کی عبادت کرے۔ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی سے یہ مقصد روز روشن کی طرح واضح ہے:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ ﴾

''میں نے انسانوں اور جنوں کو اپنی عبادت کے لئے ہی پیدا کیا ہے''

انسان جب رب تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے مال کی کمی کا ڈر نہ رکھے اور یہ خیال کرے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور عطا کرے گا تو یقیناً اس کے مال میں برکت ہوتی رہے گی۔

☆ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴾ اور جو چیز تم (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو اللہ اس کے بدلے اور عطا کرے گا وہ بہتر رزق دینے والا ہے

☆ حضرت سلیمان علیہ السلام کے کلام کی رب تعالیٰ نے ان الفاظ سے حکایت بیان فرمائی ہے "فان ربی غنی کریم" بیشک میرا رب غنی اور کریم (صاحب جود وکرم) ہے۔

☆ نبی کریم ﷺ نے فرمایا رب تعالیٰ فرماتا ہے (یعنی حدیث قدسی ہے):

"سبقت رحمتی غضبی یا ابن آدم انفق انفق علیک یمین الله ملای سحا لایغیضها شئی اللیل والنهار"

"اے ابن آدم (انسان) میری رحمت کو میرے غضب پر سبقت حاصل ہے تو خرچ کر، تو خرچ کر، تجھ پر اللہ تعالیٰ کا ہمیشہ فیضان کرنے والا رحمت بھرا دست قدرت ہے رات اور دن میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی"

☆ "وقال رسول الله ﷺ ما من یوم یصبح العباد فیه الا وملکان ینزلان فیقول احدهما اللهم اعط منفقا خلفا ویقول الآخر اللهم اعط ممسکا تلفا، وکذا فی المساء عند الغروب ینادیان ایضا"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بندوں کے پاس ہر صبح دو فرشتے آتے ہیں ایک ان میں سے یہ کہتا ہے اے اللہ (اپنی راہ میں) خرچ کرنے والے کو اور عطا فرما اور دوسرا کہتا ہے اے اللہ جو تیری راہ میں نہ خرچ کرے اس کے مال کو برباد کر اور ہر شام غروب آفتاب کے وقت بھی وہ دونوں فرشتے ضرور ہی آتے ہیں اور یہی دعاء کرتے ہیں۔

مذکورہ احادیث کو بیان کرنے کے بعد علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا "وهذا کله صحیح رواه الائمة والحمد لله" الحمدللہ یہ تمام کی تمام روایات صحیح ہیں جن کو ائمہ احادیث نے بیان کیا ہے۔ نتیجہ واضح ہوا کہ جس شخص کا سینہ روشن ہوا اور یہ معلوم ہوا کہ میرا رب غنی اور کریم ہے وہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرے گا اسے کسی قسم کی کمی کا کوئی خوف نہیں ہوگا۔ اسی طرح جس شخص نے اپنی دنیاوی خواہشات کو ختم کر دیا اور تھوڑی روزی گزر اوقات پر صابر وشاکر رہا اپنی نفسانی خواہشات کو منقطع کر دیا تو وہ ہر مشکل اور آسانی میں اللہ کی راہ میں مال خرچ کرے گا اسے کسی قسم کی مال کی کمی کی کوئی فکر نہیں ہوگی۔ خوف وہی کرے گا جسے خود اپنی خواہشات کی زیادہ فکر ہوگی کہ میں نے آج مال خرچ کیا تو میں خود کل کیا کروں گا ایسا شخص دراصل رب تعالیٰ کی رحمت سے دور ہو جاتا ہے۔

☆ "روی مسلم عن اسماء بنت ابی بکر قالت قال لی رسول الله ﷺ انفحی او انضحی او انفقی ولا تحصی فیحصی الله علیک ولا توعی فیوعی علیک"

مسلم نے اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے روایت ذکر کی ہے وہ کہتی ہے رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا تم (اللہ کی راہ میں) مال دو اور زیادہ دو یہاں تک خرچ کرو کہ اسے گن گن کر (تھوڑی مقدار میں) خرچ نہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تمہیں تھوڑا مال ہی عطا کرے گا اور مال کو جمع کر کے نہ رکھو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی اپنے خزانہ رحمت کو تم پر جمع کر کے رکھے گا۔

وضاحت حدیث: نفح اور نضح کا معنی عطا کرنا اور نضح کا معنی پانی کا بہانا بھی آتا ہے۔ یہاں یہی معنی مناسب ہے یعنی زیادہ سے زیادہ عطا کرنا۔ اور انفقی میں او کا استعمال راوی کے شک کے پیش نظر بھی ہوسکتا ہے کہ پہلے الفاظ آپ نے ذکر فرمائے یا بعد والے۔

لیکن راقم نے " او "کو" الی ان " (یہاں تک) کے معنی میں لے کر ترجمہ کیا ہے جس میں عجیب ذوق محسوس ہوتا ہے (واللہ اعلم بالصواب) " ایعاء " کا معنی ہوتا ہے برتن وغیرہ میں کسی چیز کو جمع کر کے رکھنا لاتوعی (مؤنث) جمع کر کے نہ رکھو۔ باقی حدیث پاک کا مفہوم ترجمہ سے ہی بہت واضح ہو رہا ہے۔

☆ " روی النسائی عن عائشة قالت دخل علی سائل مرة وعندی رسول الله ﷺ فامرت له بشیء ثم دعوت به فنظرت الیه فقال رسول الله ﷺ اما تریدین الا یدخل بیتک شیء ولا یخرج الا بعلمک قلت نعم قال مهلا یا عائشة لا تحصی فیحصی الله عزوجل " .

نسائی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ذکر کی۔ آپ فرماتی ہیں ایک مرتبہ ایک سائل آیا میں نے (اپنی خادمہ کو) اسے کچھ عطا کرنے کا حکم دیا (جب وہ خادمہ اسے دینے لگی) تو میں نے وہ چیز واپس طلب کی پھر اسے دیکھنے لگی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے عائشہ کیا تم یہ نہیں چاہتی کہ تمہارے گھر کوئی چیز نہ داخل ہو اور (تمہارے گھر سے) سوائے تمہارے علم کے کوئی چیز نہ نکلے میں نے کہا (ہاں یارسول اللہ میں یہی چاہتا ہوں) آپ نے فرمایا اے عائشہ ٹھہر جاؤ، کوئی چیز گن کر نہ دو (یعنی تھوڑی چیز نہ دو) ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تمہیں گن کر (تھوڑی چیز ہی) عطاء کرے گا۔ (ماخوذ از قرطبی)

نکتہ عظیمہ: غزالی دوراں حضرت علامہ احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ کیا خوب فرماتے ہیں ذرا

توجہ سے پڑھیے۔

اس آیۃ کریمہ اور دیگر آیات قرآنیہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت کی دلیلوں اور نعمتوں کو بیان فرما کر اپنے بندوں کو اپنی طرف متوجہ فرمایا ہے اور " **ھوی الذی ارسل رسولہ بالھدی** "(فتح ۲۸) فرما کر رسول اللہ ﷺ کی ذات مقدسہ کو بھی اپنی معرفت کی روشن دلیل اور نعمت عظیمہ کی حیثیت سے پیش فرما کر اپنے بندوں کو اپنی طرف بلایا ہے گویا تمام دلائل معرفت کا مجموعہ رسول کریم ﷺ کی ذات مقدس ہے۔ اسی طرح تمام نعمتوں کا خزینہ بھی حضور ﷺ ہی کا وجود اقدس ہے بلکہ کوئی دلیل جب تک انوار رسالت کی روشنی میں نہ دیکھی جائے معرفت کا فائدہ نہیں دیتی۔

یہی وجہ ہے کہ علوم عقلیہ میں مہارت تامہ رکھنے والے مشہور اکابر عقلاء وحکماء نے ان دلائل سے معرفت حاصل نہیں کی کیونکہ نور نبوت سے انہوں نے روشنی حاصل نہیں کی تھی اسی طرح یہ سب نعمتیں صحیح معنی میں ہمارے لئے اسی وقت نعمت قرار پاسکتی ہیں جب ان کا حصول رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے ہو۔ اس کے بغیر کوئی نعمت حقیقی نہیں ہوسکتی بلکہ جس نعمت کا تعلق رسول اللہ ﷺ کی ذات مقدس سے نہ ہو وہ زحمت بن جاتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی پاک نعمتیں (مال ہو یا اولاد) حضور ﷺ سے الگ ہو کر مثلاً زنا، سود، رشوت، غصب اور سرقہ کے ذریعے حاصل کی جائیں تو وہ بظاہر نعمت ہونے کے باوجود حقیقتاً زحمت ہوں گی۔ پھر یہ کہ یہ سب دلیلیں معرفت الٰھیہ کی خاموش دلیلیں ہیں یہی وجہ ہے کہ لوگ ان کی عبادت کرتے رہے اور یہ سب دلیلیں خاموش رہیں۔ ناطق دلیل رسول اللہ ﷺ کی ذات مقدس ہے یا وہ دلیلیں جن کو حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنے روحانی فیض سے ناطق بنا دیا۔ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ تمام دلائل معرفت اور اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت کو حضور ﷺ کے واسطہ سے حاصل کیا جائے۔ (التبیان مع البیان)

مسئلہ:

" واستدل کثیر من اھل السنۃ الحنیفیۃ والشافعیۃ بالآیۃ علی اباحۃ الاشیاء النافعۃ قبل ورود الشرع وعلیہ اکثر المعتزلۃ واختارہ الامام فی المحصول والبیضاوی فی المنہاج "

کثیر اہل سنت نے خواہ حنفی ہوں یا شافعی ہوں اسی آیۃ سے دلیل پکڑی ہے کہ شرع کے وارد

ہونے سے پہلے تمام نفع دینے والی اشیاء مباح ہیں۔ اکثر معتزلہ کا بھی اہل سنت سے اس مسئلہ میں اتفاق ہے۔ علامہ رازی رحمہ اللہ نے بھی اپنی کتاب محصول میں اسی سے اتفاق کیا ہے۔ اور قاضی بیضاوی نے بھی اپنی کتاب منہاج میں اسی سے اتفاق کیا ہے۔ (روح المعانی)

کمال کی بات یہ ہے کہ صدیق بھوپالوی نے فتح البیان میں بھی یہی تحریر کیا ہے:

"وفيه دليل على ان الاصل فی الاشياء المخلوقة الاباحة حتى يقوم دليل يدل على النقل عن هذا الاصل" (فتح البيان)

اس میں دلیل ہے اس پر کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے جب تک اس کے خلاف کوئی دلیل نہ پائی جائے۔

ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ : پھر آسمان کی طرف استواء (قصد) فرمایا۔ استواء کا مشہور معنی جو اکثر مترجمین نے لیا ہے وہ یہ ہے:

"الاستواء هٰهنا مضمن معنى القصد والاقبال لانه عدى بالى"

اس مقام پر "استواء" قصد اور توجہ کے معانی کو متضمن ہے کیونکہ "الی" سے متعدی ہے یعنی جب "استواء" کے بعد "الی" آ جائے تو اس وقت اس کا معنی قصد کرنا اور توجہ کرنا ہوتا ہے (ابن کثیر)

اسی کے پیش نظر اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے "استواء (قصد) فرمایا" ترجمہ کیا ہے اور راقم نے "متوجہ ہوا" ترجمہ کیا ہے تقریباً مقصود ایک ہی ہے۔ یعنی آسمانوں کے بنانے کی طرف رب تعالیٰ نے توجہ فرمائی اور ارادہ کیا کسی چیز کو ذہن میں رکھ کر وہ کام کرنے کا جب کوئی انسان ارادہ کرتا ہے تو اس وقت ہمارے روزمرہ معمول کے مطابق بھی یہی کہا جاتا ہے کہ فلاں کی توجہ تو آج کل صرف اس کام کی طرف ہے۔

یہ بھی خیال رہے کہ سیدھا قصد ہو یعنی صرف ایک طرف توجہ ہو ادھر ادھر نظر نہ ہو تو "استواء" ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے "استوى اليه كالسهم المرسل" چھوڑے ہوئے تیر کی طرح سیدھا قصد کیا۔ فراء نے اس کا معنی غالب ہونا مالک ہونا لیا ہے اور "الی" کو "علی" کے معنی میں لیا ہے کہ پھر رب تعالیٰ نے آسمانوں پر غلبہ حاصل کیا۔ لیکن علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے فرمایا "وهو خلاف الظاهر" یہ معنی خلاف ظاہر ہے "السماء" سے مراد کیا ہے؟ "والمراد بالسماء الاجرام

العلوية وجهة العلو " السماء سے مراد یا تو آسمان ہیں اور یا بلندی مراد ہے۔(روح المعانی) اکثر مترجمین نے '' آسمان'' ہی معنی کیا ہے تاہم مفکر السلام مفسر قرآن حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ نے دوسرا معنی ذکر فرمایا ہے آپ کا ترجمہ یوں ہے ''پھر توجہ فرمائی اوپر کی طرف'' (ضیاء القرآن)

فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ: تو ٹھیک سات آسمان بنائے "هن" ضمیر " السماء " کی طرف لوٹ رہی ہے معنی اس کا یہ ہے:

''عدلهن وخلقهن مصونة من العوج والفطور ''

آسمانوں کو ٹیڑھاپن، سوراخوں دراڑوں اور عیب وخلل سے محفوظ بنایا۔

سات آسمان، سات زمینیں:

اس آیۃ کریمہ سے سات آسمانوں کا ثبوت تو واضح طور پر ہے۔البتہ سات زمینوں کا ذکر دوسری آیۃ کریمہ سے ہو رہا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ﴾(الطلاق آیۃ نمبر ۱۲)

''اللہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور انہیں کے برابر زمینیں''

اس آیۃ کریمہ سے واضح ہو رہا ہے کہ آسمان سات ہیں اور زمینیں بھی ان کی مثل سات ہی ہیں

اعتراض: اس آیۃ کریمہ سے سات زمینیں ثابت کرنا کوئی یقینی بات نہیں کیونکہ اس میں کئی اقوال ملتے ہیں۔اس میں ایک قول یہ ہے کہ "مثلهن" سے مراد کیفیت میں مثلیت ہے کہ آسمانوں کی طرح زمینوں میں بھی موٹائی پائی جاتی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مثل سے مراد یہ ہے کہ جس طرح آسمانوں کے درمیان فاصلہ ہے۔اسی طرح زمینوں کے درمیان بھی فاصلہ ہے تو کس طرح سات زمینیں ثابت ہو سکتی ہیں۔

جواب: معتبر قول یہ ہے:

" ومن الارض مثلهن ای فی العدد لان الكيفية والصفة مختلفة بالمشاهدة والاخبار فتعين العدد "

زمینوں کا آسمانوں کے مثل ہونے سے مراد تعداد میں مثل ہونا ہے۔ کیونکہ کیفیت اور صفات

میں آسمان اور زمین مختلف ہیں۔ یہ مشاہدہ سے بھی ثابت ہے اور اخبار سے بھی ثابت ہے۔ جب زمین و آسمان ایک دوسرے کے کیفیت وصفات میں ایک دوسرے کی مثل نہیں تو تعداد میں مثل ہونا معین ہو گیا اسی قول کو احادیث مبارکہ سے تائید حاصل ہے کیونکہ احادیث میں سات زمینوں کا واضح طور پر ذکر ہے

☆ "روی مسلم عن سعید بن زید قال سمعت رسول الله ﷺ یقول من اخذ شبرا من الارض ظلما طوقه الی سبع ارضین"

مسلم نے حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی وہ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص نے کسی کی زمین ایک بالشت برابر ظلم سے لے لی وہ زمین اس کے گلے میں (قیامت کے دن) سات زمینوں تک طوق بنا کر ڈال دی جائے گا۔

☆ "ومن حدیث ابی هریرة لا یاخذ احد شبرا من الارض بغیر حقه الا طوقه الله الی سبع ارضین"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کردہ حدیث میں ذکر ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی ایک شخص بھی کسی کی زمین ایک بالشت برابر ناحق (ظلم کے طور) پر نہیں لیتا مگر یہ کہ وہ زمین اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) اس کے گلے میں طوق بنا کر ڈال دے گا جو سات زمینوں تک ہوگا۔

☆ "وروی النسائی عن ابی سعید الخدری عن رسول الله ﷺ قال قال موسی علیه السلام یا رب علمنی شیا اذکرک وادعوک به قال یاموسی قل لا اله الا الله قال موسی یارب کل عبادک یقول هذا قال قل لا اله الا الله قال لا اله الا انت انما ارید شیا تخصنی به قال یاموسی لو ان السموات السبع وعامرهن غیری والارضین السبع فی کفة ولا اله الا الله فی کفة مالت بهن لا اله الا الله"

نسائی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے ایک مرتبہ رب کے حضور عرض کیا اے میرے رب مجھے ایسے الفاظ کی تعلیم عطا فرما جن سے میں تیرا ذکر کروں اور تجھ سے دعاء کروں۔ رب تعالیٰ نے کہا اے موسیٰ تم یہ کہا کرو " لا الـه الا الله " موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا اے میرے رب یہ تو تیرے سارے بندے ہی کہتے ہیں۔ رب تعالیٰ نے فرمایا تم کہا کرو " لا الـه الا الله " موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا " لا الـه الا انت" تیرے بغیر

اور کوئی معبود نہیں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ مجھے خصوصی طور پر کچھ عطا فرما (یعنی جو صرف مجھے ہی حاصل ہو میرے بغیر اور کسی کو حاصل نہ ہو اس میں تو میرا بھی ایمان ہے کہ تیرے بغیر اور کوئی معبود نہیں) رب تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ اگر سات آسمان اور ان میں میرے بغیر جو مخلوق ہے اور سات زمینیں ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ دیئے جائیں اور " لا الہ الا اللہ " کو دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے گا تو وہ پلڑا جھکے گا (یعنی وہی بھاری ہوگا) جس میں "لا الـــه الا اللہ " ہوگا۔ان احادیث سے سات زمینوں کا ثابت ہونا بہت واضح طور پر مذکور ہے۔ جو شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ (ماخوذ از قرطبی)

اعتراض: اس آیۃ کریمہ سے پتہ چلتا ہے کہ زمین کی تخلیق پہلے ہے اور آسمانوں کی بعد میں لیکن دوسری آیۃ میں ذکر ہے " والارض بعد ذلک دحاھا " اس سے پتہ چلتا ہے کہ زمین کی تخلیق بعد میں ہے دونوں آیتوں میں تطبیق کیسے۔

جواب: حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کا قول اس مسئلہ کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے وہ یہ ہے:

" ان اللہ تعالیٰ خلق اولاد خان السماء ثم خلق الارض ثم استوی الی السماء وھی دخان فسواھا ثم دحا الارض بعد ذلک "

"بیشک اللہ تعالیٰ نے پہلے آسمانوں کے دھواں کو پیدا فرمایا پھر زمین کو پیدا فرمایا۔ پھر آسمانوں کی طرف توجہ فرمائی ان کو دھوئیں سے ٹھیک ٹھیک بنایا پھر زمینوں کو پھیلایا" (قرطبی)

یعنی آسمانوں کا مادہ پہلے پیدا کیا۔ پھر اصل زمین کو پیدا کیا۔ پھر آسمانوں کے مادہ سے آسمانوں کو پیدا فرمایا پھر زمین کو پھیلایا۔" دحا الشئی بسطه "کسی چیز کو پھیلایا جائے تو"دحا الشئی " بولا جاتا ہے " والارض بعد ذلک دحاھا " کا معنی یہ ہے " ثم دحا الارض بعد ذلک وکانت اذ خلقھا غیر مدحوة " یعنی پہلے فقط اصل زمین کو پیدا کیا گیا اس وقت اسے پھیلایا نہیں گیا پھر اسے آسمانوں کی تخلیق کے بعد پھیلایا گیا۔

اعتراض: حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کے قول سے پتہ چلتا ہے کہ آسمان دھوئیں سے بنا ہے حالانکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے یہ سمجھ آ رہا ہے کہ ہر چیز کی پیدائش پانی سے ہوئی:

" عن ابی ھریرۃ قال قلت یا رسول اللہ اذا رایتک طابت نفسی

وقرت عینی انبئنی عن کل شئی قال کل شئی خلق من الماء ، فقلت اخبرنی عن شئی اذا عملت به دخلت الجنة قال اطعم الطعام وافش السلام وصل الارحام وقم اللیل والناس نیام تدخل الجنة (ابن ماجه ، مسند ابی حاتم بستی) قال ابو حاتم قول ابی هریرة ، انبئنی عن کل شئی ، اراد به عن کل شئی خلق من الماء "

" حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے کہا یا رسول اللہ جب میں آپ کو دیکھتا ہوں تو میرا نفس خوش ہوتا ہے (یعنی آپ کو دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہو جاتا ہے اور میرے دل کو قرار حاصل ہوتا ہے) اور میری آنکھوں کو ٹھنڈک حاصل ہوتی ہے مجھے ہر چیز (جو پانی سے پیدا ہوئی) کی خبر دیں آپ نے فرمایا ہر چیز ہی پانی سے پیدا ہوئی پھر میں نے کہا مجھے کسی ایسے عمل کی خبر دیں جس کے کرنے سے میں جنت میں داخل ہوں۔ آپ نے فرمائی (غرباء و مساکین کو) طعام کھلاؤ اور سلام عام کرو (یعنی ہر ملنے والے کو سلام دو) اور صلہ رحمی کرو اور رات کو قیام کرو ایسے حال میں کہ لوگ سوئے ہوئے ہوں تو جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ ابو حاتم کہتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا " مجھے ہر چیز کی خبر دو " اس کا مقصد ہی یہ تھا کہ آپ یہ پوچھ رہے تھے کہ مجھے ہر اس چیز کے متعلق خبر دیں جو پانی سے پیدا ہوئی "

نبی کریم ﷺ کا جواب اسی پر دلالت کر رہا ہے کہ آپ نے فرمایا ہر چیز کو ہی پانی سے ہی پیدا کیا گیا ہے۔

جواب: سدی نے ابو مالک سے اور ابو صالح نے حضرت ابن عباس سے اور مرہ ہمدانی نے ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے ایک روایت ذکر کی کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام سے بعض حضرات نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی:

" ھو الذی خلق لکم مافی الارض جمیعا ثم استوی الی السماء فسواھن سبع سماوات "

کی تفسیر میں بیان کیا ہے:

" ان اللہ تبارک وتعالی کان عرشه علی الماء ولم یخلق شیئا قبل الماء فلما اراد ان یخلق الخلق اخرج الماء دخانا فارتفع فوق الماء فسما علیه ، فسماہ سماء "

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلے پانی کو پیدا کیا گیا پانی کے اوپر دھوئیں کو پیدا کیا اس دھوئیں سے آسمان کو بنایا۔ (ماخوذ از قرطبی)

تنبیہ: یہ اولیت اضافیہ ہے۔ ورنہ تمام مخلوق سے پہلے نبی کریم ﷺ کے نور کو پیدا کیا جس کی تفصیل انشاء اللہ آیت کریمہ میں آرہی ہے۔

اعتراض: آیۃ کریمہ میں سات آسمانوں کا ذکر ہے اہل ہیئت نے تو آسمانوں کا ذکر کیا ہے، اور اہل شرع نے بھی کہیں کہیں نو کا ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ پند نامہ میں شیخ عطار رحمہ اللہ نے نو کا ہی ذکر کیا۔ سات آسمان کہنا کیسے صحیح ہے؟ یا نو آسمان کہنا کیسے صحیح ہے۔

جواب: اہل شرع نے سات آسمانوں کا ذکر کیا ہے البتہ "سماء" کا لغوی معنی بلند ہونا اور رفیع الشان ہونا ہے اس لحاظ پر عرش اور کرسی کو بھی سماء کہہ لیا جاتا ہے۔ اس لحاظ پر نو آسمانوں کو بھی ذکر کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح علم ہیئت والوں اور اہل شرع میں اتفاق ہوگا مقصد ایک ہی ہوگا۔ (شیخ زادہ)

وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ: وہ سب کچھ جانتا ہے۔ یعنی وہ تمام چیزوں کے حقائق کو جانتا ہے۔ اسی وجہ سے اس نے ہر چیز کو کامل بنایا اور ہر چیز کو نفع مند بنایا بلکہ ہر چیز کا عجیب طریقہ پر پایا جانا اور عمدہ ترتیب کا ہونا اس پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ علیم، حکیم اور رحیم ہے۔ تمام افعال کا پختہ ہونا نفع مند طریقہ پر پایا جانا سوائے علیم وحکیم ورحیم کے کسی اور سے ممکن نہیں۔ اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ جب لوگ مر جائیں گے ان کے بدن کے اجزاء بکھر جائیں گے تو ان کو جمع کرنا اور پھر زندہ کرنا کیسے ہو سکے گا اس لئے کہ جب وہ رب تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے ہر چیز کو جانتا ہے تو کوئی چیز نہ اس کی قدرت سے باہر ہے اور نہ ہی کوئی چیز اس کے علم سے باہر ہے وہ ہر چیز کو جانتا ہے اور ہر چیز قادر ہے "لهذا" فیعاد منها کما کان " ان بکھرے ہوئے اجزاء سے (کہیں بھی ہوئے، مکمل کر راکھ بن گئے خواہ ہوا میں اڑا دیئے گئے) دوبارہ جسموں کو موجود کر لیا جائے گا جیسا کہ وہ پہلے تھے۔

فائدہ: پہلی آیت میں ذکر کیا گیا ہے ﴿ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ پھر اس کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے یعنی اللہ تمہیں زندہ کرے گا، حشر قائم ہوگا۔ حشر کے قائم ہونے کی دارومدار تین مقدمات پر تھا جن کو ان دونوں آیتوں میں بیان کر دیا گیا ہے وہ تین مقدمات یہ ہیں:

(۱) بدن کے اجزاء جمع ہونے کے قابل ہیں اور ان میں حیات آسکتی ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ ہر بدن کے تمام اجزاء اور ان کی جگہ کو کہ وہ کہاں ہیں جانتا ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ ان تمام اجزاء کو جمع کرنے اور زندہ کرنے پر قادر ہے۔

پہلے مقدمہ پر دلیل یہ قائم کی ﴿وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ﴾ تم بے جان تھے تمہیں معرض وجود میں لایا۔ یعنی جس ذات نے تمہیں نہ ہونے کے باوجود موجود کیا ہے وہ تمہیں مار کر پھر زندہ بھی کرلے گا اس سے کوئی چیز بھی بعید نہیں اور کوئی چیز اس کی قدرت سے باہر نہیں۔

دوسرے اور تیسرے مقدمہ پر یہ دلیل قائم کی کہ وہ ہر چیز کو جانتا ہے اور ہر چیز کا خالق ہے۔ جب وہ ہر چیز کو جانتا ہے تو واضح ہوا کہ وہ بدن کے بکھرے ہوئے اجزاء کے مقامات کو جانتا ہے کوئی ذرا اس سے اوجھل نہیں اور کسی ذرہ کے مقام سے وہ بے خبر نہیں۔ اور وہ جب ہر چیز کا خالق ہے تو بکھرے ہوئے اجزاء کو جمع کر کے پھر زندہ بھی کردے گا۔

یہ بھی واضح بات ہے کہ جس ذات نے بغیر کسی نمونہ کے ابتدائی طور پر تمہیں موجود کیا ہے جو بظاہر انسانی عقل کے مطابق مشکل تھا وہ تمہیں پھر سے تمہاری عقل کے مطابق ہی آسانی سے لوٹا دے گا اس لئے کہ رب تعالیٰ کے لئے تو نہ ابتداء مشکل ہے اور نہ لوٹانا مشکل ہے البتہ انسان یہ سمجھتے ہیں کہ کسی چیز کو ابتدائی طور پر بغیر نمونہ کے بنانا مشکل ہے اور اس کا لوٹانا آسان ہے۔ جو انسان قیامت میں رب تعالیٰ کے زندہ کرنے کو نہیں تسلیم کرتے وہ عقل سے ہی خالی ہیں کیونکہ جس چیز کو عقل تسلیم کرے اس کے خلاف عقیدہ رکھنا بے عقلی نہیں تو اور کیا ہے۔

(از بیضاوی وشیخ زادہ)

قرآن اور سائنس: جب رب تعالیٰ نے یہ فرمایا ﴿هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ﴾ اللہ وہی ہے جس نے تمہارے نفع کے لئے زمین میں ہر چیز کو پیدا کیا۔ جب زمین میں ہی معدنیات ہیں اور زمین پر پہاڑ ہیں اور جنگل ہیں اور مختلف ممالک ہیں تو ان میں غور وفکر کرنا اور نفع مند چیزوں کو کام میں لینا تو خود منشا ایزدی ہے:

"کیف تکون الکھرباء شاملة لا جزائها والاضواء والحرارة والخواص الطبیعة الکامنة فی هذه المخلوقات"

جب یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے اور اس کا انکار ممکن نہیں کہ اجزاء برقیہ، روشنی اور حرارت اور خاص اثر رکھنے والی اشیاء زمین میں ہی پائے جاتی ہیں تو یقیناً ان میں غور وفکر کرنا اور ان کو

کام میں لانا اور ان سے نفع حاصل کرنا تو رب کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ اسلئے اے مسلمانو رب تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہوئے اسباب کو ظاہری اسباب سمجھتے ہوئے مؤثر حقیقی رب تعالیٰ کو سمجھتے ہوئے زمین کی مخلوقات سے نفع حاصل کرنے کیلئے سائنسی علوم ضرور حاصل کرو یہ میدان صرف غیر مسلموں کے لئے نہ چھوڑو، ورنہ وہ تم پر چھا جائیں گے تم مغلوب ہو کر ان کے سامنے عاجز ہو کر زندگی بسر کرو گے۔ قرآن پاک نے تو کسی علم کو حاصل کرنے سے منع نہیں کیا شریعت کے باغی نہ ہو جانا، خدا کا انکار نہ کر بیٹھنا، عظمت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو دل سے نہ نکال دینا، دینداروں کو مولوی کہہ کر ان کا تمسخر نہ اڑانا، پھر علوم کو حاصل کر کے اسلام اور مسلمانوں کو فائدہ پہنچانا۔ یہ کام اگر تم نے کیا تو راقم تمہیں سلام کرے گا۔ ورنہ تمہیں یہود ونصاریٰ کا ایجنٹ سمجھے گا۔ راقم تو طنطاوی کی طرح یہی نظریات رکھتا ہے:

"فهل ظننتم ايها الناس ان الموجه له كاف الخطاب هم امم الفرنجة فيقول هو الذى خلق لكم ما فى الارض جميعا يا امم الفرنجة، اولستم داخلين فى كاف الخطاب اليس من العار عليكم ان تجعلوا نعمة ربكم ولعمرى ان هذا الكفر النعمة وقلة عقل وغاية الجهل"

"اے مسلمانو لوگو رب تعالیٰ نے جو یہ فرمایا ہے "هو الذى خلق لكم" (اللہ نے تمہارے لئے نفع کے لئے زمین کی تمام چیزیں پیدا کیں) کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ یہ خطاب صرف فرنگیوں (عیسائیوں) کو ہے۔ کہ رب تعالیٰ نے صرف عیسائیوں کو کہا ہے کہ تمہارے نفع کے لئے ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔ نہیں نہیں ذرا غور کرو کیا یہ خطاب تمہیں نہیں۔ کیا تمہیں شرم نہیں آتی کہ تم رب کی نعمتوں سے جاہل ہو قسم ہے مجھے اپنی عمر کی کہ یہ خیال رکھنا رب تعالیٰ کی نعمت کا انکار کرنا ہے اور عقل کی کمی ہے اور بہت بڑی جہالت ہے۔ بلکہ انسان اس وقت تک رب تعالیٰ کا شکر گزار بن ہی نہیں سکتا جب تک کہ اس کی نعمتوں سے نفع نہ حاصل کرے اور اس کی نعمتوں سے کامل نفع اسی وقت حاصل کیا جا سکتا ہے جب کہ ان کو حاصل کرنے کا طریقہ بھی آتا ہے" (ماخوذ از طنطاوی)

انتباہ: سائنس جب مذہب کے تابع ہو، انسان کو اسلام سے دور نہ کرے انسان کو بے حیاء نہ بنائے صرف مسلمان کو ترقی کی راہ پر گامزن کرے تو کوئی عالم دین اس کا مخالف نظر نہیں آئے گا۔ مخالفت صرف غلط راہوں پر چلنے، مذہب سے دور ہونے، دین کی مخالفت، یہودیوں اور عیسائیوں کے نظریات کے پرچار کی وجہ سے ہے۔

﴿ وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِکُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ ﴾

☆ اور (یاد کرو) جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں، بولے کیا ایسے کو (نائب) کرے گا جو اس میں فساد پھیلائے اور خونریزیاں کرے اور ہم تجھے سراہتے ہوئے تیری تسبیح کرتے، اور تیری پاکی بولتے ہیں، فرمایا مجھے معلوم ہے جو تم نہیں جانتے۔

☆ اور (یاد کیجئے) جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا، بیشک میں بنانے والا ہوں زمین میں خلیفہ (اپنا نائب) انہوں نے کہا، کیا تو زمین میں اسے خلیفہ بنائے گا جو وہاں فساد پھیلائے اور خون بہائے؟ اور ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح کرتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں، فرمایا بیشک میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

اس آیۃ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کی کیفیت کو ذکر فرمایا، اور رب تعالیٰ نے آپ کو جو عظمت سے نوازا اس کا ذکر ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو وہ علوم عطاء کیے گئے ہیں جو فرشتوں کو بھی عطاء نہیں کیے گئے، اور فرشتوں نے آپ کو سجدہ کیا۔ یہ انعام آپ کے واسطہ سے آپ کی ساری اولاد کو حاصل ہوا۔ پہلی آیات میں بھی نعمتوں کا ذکر کیا جارہا تھا۔ اور اس آیت میں اور نعمت کا تذکرہ فرمادیا۔

آیۃ کریمہ کا مختصر مفہوم: اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو اپنے ارادہ کی خبر دی، یا ان سے بطور مشورہ کہا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے تعجب کے طور پر عرض کیا کہ اے اللہ! زمین میں تو ایسا نائب بنائے گا جو فساد پھیلائے گا، اور خون بہائے گا۔

اور ہم تیری تسبیح وتحمید بیان کر رہے ہیں ،اور تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں ۔مقصد یہ تھا کہ ہمارے ہوتے ہوئے اور خلیفہ بنانے کی کیا ضرورت ہے۔

اور خلیفہ بنانے میں ہمیں تو مفاسد نظر آ رہے ہیں ، کہ وہ زمین میں فساد پھیلائیں گے ،قتل وغارت کریں گے ،اس طرح کا خلیفہ بنانے میں کیا فائدہ ہوگا۔

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے ۔یعنی جن حکمتوں کو میں جانتا ہوں تم ان سے بے خبر ہو۔

آیۂ کریمہ کی تفصیلی وضاحت:

" واذ "(اور جب)"اذ"اور " اذا " دونوں ہی وقت کے معنی کے لئے آتے ہیں ۔ " اذ" ماضی کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔اور " اذا "مستقبل کے لئے ۔ اور کبھی ایک دوسرے کی جگہ بھی استعمال ہوتے رہتے ہیں۔ (از قرطبی)

البتہ مبرد نحوی نے کہا"اذ"مستقبل پر داخل ہوتو اسے ماضی کے معنی میں کر دیتا ہے۔اور"اذا" ماضی پر داخل ہوتو اسے مستقبل کے معنی میں کر دیتا ہے۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں (یادکرو) بریکٹ میں ہے۔اس کی وجہ تفسیر جلالین میں دیکھئے۔

﴿ واذکر یا محمد اذ قال ربک ﴾ "اور یاد کرو اے محمد جب آپ کے رب نے کہا"

اس پر محشی لکھتے ہیں:

"اشارہ بہ الی ان اذ فی محل النصب وان العامل فیھا اذکر مقدر قال ابو البقاء فی تفسیر اذ قال ھو مفعول بہ تقدیرہ اذکر اذ قال"

یعنی یہاں اشارہ ہے کہ " اذ" محل نصب میں ہے،اور اس کا عامل " اذکر " مقدر ہے۔ ابوالبقاء نے اذ قال کی تفسیر میں کہا ہے " اذ قال "،مفعول بہ ہے اور تقدیر عبارت کی یہ ہے "اذکر اذ قال " اسی کا لحاظ کرتے ہوئے اعلیٰ حضرت نے"یادکر" کے لفظ کو بریکٹ میں بڑھایا ہے۔

اسی طرح مدارک میں ہے " اذ نصب با ضمار اذکر " یعنی " اذ "، اذکر کے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

﴿وَاِذۡ قَالَ رَبُّکَ﴾: ''اور یاد کرو جب کہا تیرے رب نے'' اس مقام پر رب تعالیٰ نے ''ربک'' ذکر فرمایا، جس کا معنی ہے (تیرا رب) اس نسبت میں کیا عظمت، کیا شان ہے، آیئے علامہ آلوسی رحمہ اللہ کے الفاظ میں دیکھئے:

''ولا یخفی لطف الرب ھنا مضافا الی ضمیرہ صلی اللہ علیہ وسلم بطریق الخطاب وکان فی تنویعہ والخروج من عامہ الی خاصہ رمزا الی ان المقبل علیہ بالخطاب لہ الحظ الاعظم والقسم الاوفر من الجملۃ المخبر بھا فھو ﷺ علی الحقیقۃ الخلیفۃ الاعظم فی الخلیفۃ والامام المقدم فی الارض والسموٰت العلی ولو لاہ ما خلق آدم بل (ولا ولا)''

رب تعالیٰ نے اپنی نسبت ''ک'' ضمیر کی طرف کی، جو نبی کریم ﷺ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اس نسبت میں خصوصی کمال اور رب تعالیٰ کی مہربانی کا ذکر پایا گیا ہے۔ کہ عظمت شان کے پیش نظر گویا کہ خطاب کے قابل آپ ہی ہیں۔ گویا کہ پہلے عام لوگوں کا ذکر تھا، اب اخص الخواص کا ذکر کیا جارہا ہے۔

اور اسی سے اس طرف بھی اشارہ کردیا ہے کہ مخلوق میں حقیقت میں خلیفہ اعظم حضور ﷺ ہی ہیں۔ اور زمین وآسمان میں سب سے پہلے امام آپ ہی ہیں۔

اگر آپ نہ ہوتے تو نہ آدم علیہ السلام کو پیدا کیا جاتا، اور نہ ہی کسی اور کو پیدا کیا جاتا۔ یعنی اگر مصطفیٰ کریم ﷺ کو نہ پیدا کیا جاتا تو کائنات میں کوئی چیز بھی پیدا نہ کی جاتی۔

علامہ آلوسی فرماتے ہیں، میرے سردار ابن الفارض نے حقیقت محمدیہ کی زبان کی ترجمانی کرتے ہوئے کیا خوب فرمایا:

وانی ان کنت ابن آدم صورۃ . فلی فیہ معنی شاھد بابوتی

گویا کہ نبی کریم ﷺ نے یوں فرمایا:

بیشک میں اگرچہ ظاہری طور پر آدم علیہ السلام کی اولاد سے ہوں
لیکن میرے اندر وہ حقیقت موجود ہے جو میرے باپ ہونے کی شاہد ہے

یعنی ظاہر طور پر تو میں ابن آدم ہوں، لیکن حقیقت میں میں اصل ہوں اور آدم علیہ السلام فرع

ہیں۔اس لحاظ پر حقیقی ابوۃ مجھے ہی حاصل ہے۔
اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے اسی مضمون کو کیا ہی خوبصورت انداز میں پیش فرمایا:

مقصود یہ ہیں آدم و نوح و خلیل سے — تخم کرم میں ساری کرامت ثمر کی ہے
ان کی نبوت ان کی ابوت ہے سب کو عام — ام البشر عروس انہیں کے پسر کی ہے
ظاہر میں میرے پھول حقیقت میں میرے نخل — اس عمل کی یاد میں یہ صدا ابوالبشر کی ہے

یعنی نبی کریم ﷺ تمام عالم کے معنوی طور پر باپ ہیں، کہ سب کچھ انہیں کے نور سے پیدا ہوا، اسی لئے حضور کا نام ابوالارواح ہے، تو آدم علیہ السلام اگرچہ صورت میں حضور کے باپ ہیں مگر حقیقت میں وہ بھی حضور کے معنوی بیٹے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ام البشر تمام انسانوں کی ماں حضرت حوا نبی کریم ﷺ کے معنوی بیٹے حضرت آدم علیہ السلام کی زوجہ ہیں۔
آدم علیہ السلام جب حضور کو یاد کرتے تو یوں فرماتے " یا ابنی صورة وابی معنی " اے ظاہر میں میرے بیٹے اور حقیقت میں میرے باپ۔ (الا حدائق بخشش ص ۷۵)

☆ " وروی عبد الرزاق بسنده عن جابر بن عبد الله قال قلت یا رسول الله بابی انت وامی اخبرنی عن اول شئی خلقه الله تعالیٰ قبل الاشیاء قال یا جابر ان الله تعالیٰ قد خلق قبل الاشیاء نور نبیک من نوره فجعل ذلک النور یدور بالقدرة حیث شاء الله ولم یکن فی ذلک الوقت لوح ولا قلم ولا جنة ولا نار ولا ملک ولا سماء ولا ارض ولا شمس ولا قمر ولا جنی ولا انس " (زرقانی ج ۱ ص ۴۹، انوار محمدیه ص ۱۳، مواهب)

عبدالرزاق نے اپنی سند سے جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان مجھے یہ خبر دیجئے کہ تمام چیزوں سے پہلے اللہ تعالیٰ نے کسے پیدا کیا ہے؟ آپ نے فرمایا، اے جابر بیشک اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء سے پہلے اپنے نور سے تیرے نبی کے نور کو پیدا کیا۔پھر وہ نور اللہ تعالیٰ کی قدرت سے جہاں بھی اسے منظور تھا سیر کرتا رہا۔اس وقت نہ لوح تھی نہ قلم اور نہ جنت اور نہ دوزخ اور نہ فرشتے اور نہ آسمان اور نہ زمین اور نہ سورج اور نہ چاند اور نہ جن اور نہ انسان تھے۔

خیال رہے کہ یہ حدیث مولوی اشرف تھانوی صاحب دیوبندی نے اپنی کتاب نشر الطیب میں بھی نقل کی ہے۔

☆ "عن العرباض بن سارية عن رسول الله ﷺ انه قال انى عند الله مكتوب خاتم النبيين و ان آدم لمنجدل فى طينة"

(شرح السنة، مشکوۃ باب فضائل سید المرسلین ص ۵۱۳، مواهب مع زرقانی ص ...)

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، بیشک میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس وقت خاتم النبیین تھا جب کہ آدم علیہ السلام ابھی تک اپنے خمیر میں تھے۔

مولوی اشرف علی تھانوی صاحب دیوبندی اپنی کتاب نشر الطیب میں بیان کرتے ہیں کہ اسے احمد، بیہقی اور حاکم نے بھی روایت کیا ہے اور مشکوۃ میں یہ حدیث شرح السنۃ سے مذکور ہے۔

اس حدیث پاک کی وضاحت میں استاذی المکرم حضرت مولنا محمد اشرف سیالوی مدظلہ فرماتے ہیں

"اس حدیث پاک سے آنحضرت ﷺ کا تحقیقاً آدم علیہ السلام سے قبل نبی ہونا بھی ثابت اور خاتم النبیین کے منصب پر فائز ہونا بھی ثابت، موجود ہونا بھی ثابت اور آپ کی حقیقت کا نور ہونا بھی ثابت، کیونکہ بشروں کا باپ بعد میں پیدا کیا جارہا ہے اور آپ کی حقیقت پہلے ہی موجود متحقق تھی اور ان صفات کمال کے ساتھ متصف"

اس مقام پر مولوی اشرف علی تھانوی صاحب کے بیان کردہ نکتہ اور ایک توہم کا ازالہ بھی ملاحظہ فرماتے جائیں:

"اگر کسی کو شبہ ہو کہ شائد مراد یہ ہے کہ میرا خاتم النبیین ہونا مقدر ہو چکا تھا سو اس لئے آپ کے وجود کا تقدم آدم علیہ السلام پر ثابت نہ ہو"۔

جواب یہ ہے اگر یہ مراد ہوتی تو آپ کی کیا تخصیص، تقدیر تمام اشیاء مخلوقہ کی ان کے وجود سے مقدم ہے۔ پس یہ تخصیص خود دلیل ہے اس کی مقدر ہونا مراد نہیں بلکہ اس صفت کا ثبوت مراد ہے، اور ظاہر ہے کہ کسی صفت کا ثبوت فرع ہے مثبت لہ کے ثبوت کی۔ پس اس سے آپ کے وجود کا تقدم ثابت ہو گیا، اور چونکہ مرتبہ بدن متحقق نہیں تھا۔ اس لئے نور اور روح کا مرتبہ متعین ہو گیا۔

اس سوال وجواب نے واضح کر دیا کہ نبی کریم ﷺ کی نبوت محض علم الٰہی کے لحاظ سے نہیں تھی، بلکہ خارج اور واقع میں آپکا نور انور اور روح اقدس اور حقیقت محمدیہ اس صفت کمال کے ساتھ موصوف ومتصف تھی اور یہی ہمارا نظریہ وعقیدہ ہے کہ بشریت کے لحاظ سے اولاد آدم بھی ہیں مگر حقیقت کے لحاظ سے اصل موجودات ہیں، اور آدم علیہ السلام اور تمام انبیاء کرام کی اس لحاظ سے آپ بنیاد ہیں۔

یہی تھانوی صاحب ایک اور سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں، سوال یہ ہے جب انبیاء علیہم السلام موجود ہوتے تو ان کے خاتم کا موجود ہونا بھی متصور ہوسکتا تھا، جب ان کا بلکہ ان کے والد اور معدن واصل کا وجود نہیں تھا تو آپ خاتم النبین کس طرح ہو گئے؟

تھانوی صاحب کی زبانی سوال وجواب ملاحظہ فرمائیں:

اگر کسی کو شبہ ہو کہ اس وقت ختم نبوت کے ثبوت بلکہ خود نبوت ہی کے ثبوت کے کیا معنی؟ کیونکہ نبوت آپ کو چالیس برس کی عمر میں عطا ہوئی اور چونکہ آپ سب نبیوں کے بعد مبعوث ہوئے اس لئے ختم نبوت کا حکم دیا گیا یہ وصف تو خود تاخیر کو مقتضی ہے۔

جواب یہ ہے کہ یہ تاخیر مرتبہ ظہور میں ہے۔ مرتبہ نبوت میں نہیں جیسے کسی کو تحصیلداری کا عہدہ آج مل جائے، اور تنخواہ بھی آج ہی سے چڑھنے لگے، مگر ظہور ہوگا کسی تحصیل میں بھیجنے کے بعد یعنی جس طرح اس تحصیلدار کے منصب کا لوگوں کو علم اس وقت ہوگا جب وہ تحصیل میں جا کر چارج سنبھالے گا، وہ اس وقت معلوم کریں گے کہ یہ ہمارے تحصیلدار صاحب ہیں۔ حالانکہ سرکار کے نزدیک وہ اس وقت سے تحصیلدار ہے جب سے اسے نامزد کیا گیا ہے۔

تو نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کے نزدیک خاتم النبیین کے مرتبہ اس وقت فائز ہو چکے تھے، جب آدم علیہ السلام ہنوز عالم آب وگل میں تھے، اگرچہ لوگوں کو اس وقت پتہ چلا جب آپ کا ظہور ہوا۔

الغرض ظہور اگرچہ بعد میں ہوا لیکن وجود پہلے تھا، اور یہی ہمارا عقیدہ ہے کہ حقیقت نوریہ کے لحاظ سے آپ اصل موجودات اور بنیاد آدم علیہ السلام ہیں اگرچہ ظہور اور نشاۃ دنیویہ کے لحاظ سے اولاد آدم ہیں۔

(تنویر الابصار از ص ۱۹)

☆ "عن ابی ہریرہ قال قالوا یا رسول اللہ متی وجبت لک النبوۃ قال و آدم بین الروح والجسد"

(ترمذی، مشکوۃ باب فضائل سید المرسلین ص ۵۱۳ د زرقانی ج ۱ ص ۳۴)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا:

یارسول اللہ آپ کے لئے نبوت کس وقت ثابت ہو چکی تھی۔ آپ نے فرمایا، جس وقت آدم علیہ السلام ابھی روح اور جسم کے درمیان تھے، یعنی ان کے جسم میں جب جان بھی نہیں آئی تھی میں اس وقت سے نبی ہوں۔ اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے، اور اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ اور ایسے ہی الفاظ میسرہ ضبی کی روایت میں بھی آئے ہوئے ہیں۔ امام احمد نے اپنی مسند میں اور امام بخاری نے اپنی تاریخ میں اور ابونعیم نے حلیہ میں اسے روایت کیا ہے، اور حاکم نے اس کی تصریح کی ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے پوچھنے اور سوال کرنے سے کہ آپ کب سے نبی بنے ہو۔ پتہ چل گیا کہ جن کے گھر آپ پیدا ہوئے اور عمر شریف کے چالیس سال گزارے تھے اور اس قدر طویل عرصہ گزارنے کے بعد نبوت کا اعلان فرمایا، جب وہ اس طرح کا سوال کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ آپ کب سے نبی ہیں تو معلوم ہوا کہ ان کے ایمان نے گواہی دی کہ نبی اکرم ﷺ نے اگرچہ نبوت کا اعلان اور اظہار چالیس سال کے بعد کیا، لیکن آپ نبی بنے ہوئے پہلے کے تھے۔ انہوں نے یہ نہیں پوچھا کہ تم نے اعلان نبوت ورسالت کب فرمایا۔ بلکہ پوچھا ہے " متی وجبت لک النبوۃ یا رسول اللہ " آپ کے لئے یارسول اللہ نبوت کس وقت سے ثابت ہے؟

اور نبی کریم ﷺ کا یہ جواب کہ میں اس وقت سے نبی ہوں جب تمہارے باپ آدم علیہ السلام کی روح ابھی ان کے جسم میں پھونکی نہیں گئی تھی۔ صحابہ کرام کے اس نظریہ وعقیدہ پر مہر تصدیق ہے کہ تم نے درست سمجھا واقعی میں عمر شریف کے چالیس سال گزار کر نبی نہیں بنا بلکہ اس وقت سے یہ منصب اور اعزاز مجھے حاصل ہے جب کہ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کے تن بدن میں جان نہیں آئی تھی۔

اس روایت کو ترمذی شریف میں نقل کیا گیا ہے اور ترمذی شریف حدیث کی وہ کتاب ہے جس کے متعلق محدثین نے فرمایا جس کے گھر میں یہ کتاب موجود ہو وہ یوں سمجھے کہ رب تعالیٰ کا رسول میرے گھر میں موجود اور تشریف فرما ہے۔

امام ترمذی نے اس حدیث کو موضوع (من گھڑت) نہیں کہا، بلکہ انہوں نے اس کو حسن کہا ہے اصول حدیث میں یہ واضح ہے کہ حسن حدیث حجت اور دلیل وسند ہو سکتی ہے۔

اور پھر اشرف علی تھانوی صاحب نے تصریح کر دی ہے کہ میسرہ ضبی کی روایت میں بھی اسی طرح کے الفاظ آتے ہیں۔ گویا کہ یہ روایت دو صحابیوں سے مروی ہوئی۔ اس طرح کل چار صحابیوں (حضرت جابر بن عبداللہ انصاری، حضرت عرباض بن ساریہ، حضرت ابوہریرہ اور حضرت میسرہ ضبی رضی اللہ عنہم) کی شہادت اور گواہی اب تک آ چکی ہے کہ آنحضرت ﷺ نور ہیں اور حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق وایجاد سے پہلے نبوت ورسالت اور خاتم النبیین کے منصب پر فائز ہو چکے تھے۔

علاوہ ازیں اس کو امام احمد نے اپنی مسند میں ذکر کیا ہے جو اہل سنت کے چوتھے امام ہیں، اور امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ کے بعد ان کا درجہ ہے۔

پھر امام بخاری نے اس کو اپنی تاریخ اور امام بخاری کے استاذ ابونعیم نے اس کو حلیہ میں نقل کیا ہے، اور حاکم جیسے محدث نے اس کی تصحیح کی۔ حاکم وہ محدث ہے جس نے بخاری ومسلم سے رہ جانے والی صحیح احادیث کو جمع کیا ہے اور اس کتاب کا نام مستدرک رکھا ہے۔ (نور الابصار ازص ۲۲)

اولیت مصطفیٰ دلیل ہے امتناع نظیر پر:

امتناع نظیر کا یہ مطلب ہے کہ نبی کریم ﷺ کا مثل پیدا کرنا رب تعالیٰ کی قدرت سے خارج ہے یہ ضرور خیال میں رہے کہ جو چیزیں محال بالذات، ممتنع بالذات ہیں وہ اگر اللہ تعالیٰ کی قدرت سے خارج ہوں تو رب تعالیٰ کی شان اور قدرت میں کوئی نقص لازم نہیں آتا۔ کیونکہ وہ اشیاء اس قابل نہیں کہ رب تعالیٰ کی قدرت میں آ سکیں۔ اس مسئلہ کو سید الاولیاء حضرت پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی رحمہ اللہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

مقدمات:

1: ممتنعات ذاتیہ کا احاطہ قدرت سبحانہ وتعالیٰ سے خروج کمال ذاتی باری تعالیٰ پر دھبہ نہیں لگاتا، بلکہ یہ قصور راجع بجانب قابل ہے کہ ممتنع ذاتی قبولیت کا صالح نہیں۔

2: انقلاب حقائق واقعیہ کا خواہ معدودات سے مثل انسان ، فرس ، بقر ، غنم کے ، یا مراتب عددیہ سے ہوں مثل ایک دو تین چار کے ، یا مراتب مختلطہ یعنی معدود بحیثیت عروض مرتبہ عددی مثلاً زید جو اول مولد ہے بنسبت باقی اولاد عمرو کے ممتنع بالذات ہیں۔

3: کسی چیز کی نظیر اس چیز کو کہا جاتا ہے کہ علاوہ مشارکت نوعی کے اوصاف ممیزہ کاملہ میں اس چیز کی ہم پلہ ہو۔

4: آنحضرت ﷺ بحسب الحقیقۃ الروحانیۃ النوریۃ اول مخلوق ہیں۔

" اول ما خلق الله نوری ، اول ما خلق الله العقل "

تصریحات محققین از اہل کشف وشہود اس پر شاہد ہیں۔

" کما قال الشیخ الاکبر قدس سره الاطهر" فلم یکن اقرب الیه قبولا فی ذلک الهباء الاحقیقة محمد ﷺ المسماة بالعقل فکان مبدأ العالم باسره واول ظاهر فی الوجود فکان وجوده من ذلک النور الالهیٰ "

نبی کریم ﷺ کا ارشاد کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے میرے نور کو پیدا کیا ہے ، یا یہ ارشاد کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے عقل کو پیدا کیا ہے ، ان دونوں کا مطلب ایک ہے۔

شیخ قدس سرہ نے اس کی وضاحت فرمائی ہے کہ وہی نور جس کو سب سے پہلے پیدا کیا گیا اور حقیقت محمدیہ کہلایا اسی کا نام عقل بھی ہے ، جو تمام عالم کا مبدأ ہے ، تمام جہان سے پہلے اسی نور کا وجود ہے ، اور وہ نور الٰہی سے معرض وجود میں آیا ہے۔

جس طرح نبی کریم ﷺ اولیت کی صفت سے متصف ہیں ، اسی طرح آخریت کی صفت سے بھی متصف ہیں کہ آخر الانبیاء ہیں۔ قال اللہ تعالیٰ ﴿ ولکن رسول وخاتم النبیین ﴾ لیکن آپ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔

مقام توجہ : اہل بصیرت کو ان مقدمات پر گہری نظر ڈالنے سے ثابت ہو جاتا ہے کہ نظیر آنحضرت ﷺ کا وجود ممتنع بالذات بایں معنی ہے کہ خالق سبحانہ وتعالیٰ نے آپ کو ایسا بنایا ہے اور ایسی کاملہ ممیزہ مختصہ صفات کے ساتھ سنوارا ہے کہ جس سے یہ کہا جا سکتا ہے "کہ درصورت فرض وجود نظیر ، انقلاب حقیقت لازم آتا ہے" کیونکہ فرض نظیر کا وجود آپ کے بعد ہی ہوگا ، تو لامحالہ ایسا معدود ہوگا

جس کو مرتبہ ثانیہ عدد عارض ہو، اور نظیر کہلانے کا مستحق جب ہی ہوسکتا ہے کہ وصف ممیز کامل یعنی اول مخلوقیت وختم نبوت میں مشارک ہوتو معروض مرتبہ ثانیہ کا معروض مرتبہ اول کا ہو(یہ ممتنع بالذات ہے، ایسا ہو نہیں سکتا)۔

ایسا ہی بلحاظ خاتمیت ،فرض کیا کہ آپ مثلاً چھٹے مرتبہ میں ہیں تو نظیر آپ کی معروض ساتویں مرتبہ کو مثل ہو کر معروض مرتبہ سادسہ کی ہوگی" وهو خلف " (یعنی یہ حقیقت کے خلاف ہے)

ہاں اس میں شک نہیں کہ ممتنعات ذاتیہ میں سے دو قسم اولین اور قسم ثالث میں فرق ظاہر ہے کیونکہ قسم ثالث کا امتناع اوصاف عارضہ کے لحاظ سے ہے۔اس لئے کہ محل بحث امتناع یا امکان نظیر ہے نہ کہ امتناع یا امکان مثل۔

خلاصہ یہ ہے کہ آئینہ احمد ﷺ میں خالق عزمجدہ نے جداگانہ کمال دکھایا،یعنی ایسا بنایا کہ نظیرش امکان ندارد (جس کی نظیر ممکن نہیں)

" فهذا الكمال راجع اليه سبحانه كما ان الجمال مختص به من منع الله تعالىٰ سبحان من خلقه واحسنه واجمله واكمله "(فتاوى محمديه ص ۹)

نبی کریم ﷺ کو اس شان سے پیدا کرنا درحقیقت رب تعالیٰ کا ہی کمال ہے،جس طرح یہ شان اور جمال نبی کریم ﷺ سے مختص ہے، وہ بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی عطاء سے ہی ہے، وہ ذات پاک جس نے آپ کو اس جداگانہ شان سے بنایا اور آپ کو سب سے زیادہ حسین بنایا، اور سب سے زیادہ جمیل بنایا، اور سب سے زیادہ باکمال بنایا۔

خلاصہ کلام:۔ نبی کریم ﷺ کو رب تعالیٰ سب کائنات سے اول معرض وجود میں لایا۔ اور آپ کو خاتم الانبیاء بنایا اگر آپ کی نظیر کوئی اور بھی بن سکے تو اسے بھی یہ دونوں وصف حاصل ہوں گے، حالانکہ اول تو ایک ہی ہوتا ہے، اس کے بعد آنے والے تو دوسرے درجہ میں ہو جاتے ہیں۔اور اسی طرح خاتم بھی ایک ہی ہوتا ہے، اس کے بعد کسی کو اگر خاتم کہا جائے، تو پہلی ذات کا خاتم ہونا باطل ہوگا یہ دونوں صورتیں ممتنع بالذات ہیں۔

ممتنع بالذات قدرت باری تعالیٰ سے خارج ہیں، ان میں یہ صلاحیت نہیں کہ یہ رب تعالیٰ کی

قدرت میں آ سکیں، ان کا رب تعالیٰ کی قدرت سے باہر ہونا رب کی قدرت میں کوئی فرق نہیں پیدا کرتا

خلیفہ بنانے کے متعلق ملائکہ سے کلام کا کیا مقصد؟

ملائکہ سے رب تعالیٰ کا یہ کہنا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں اس کی چند وجوہ ہیں۔

پہلی وجہ: ملائکہ (فرشتوں) پر حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد کی عظمت کا اظہار تھا، اسی وجہ سے اس واقعہ کی خبر نبی کریم ﷺ اور آپ کی امت کو بھی دی۔

" یخبر تعالیٰ بامتنانه علی بنی آدم بتنویهه بذکرهم فی الملأ الأعلی قبل ایجادهم "

''رب تعالیٰ خبر دے رہا ہے کہ بنی آدم پر میرا عظیم احسان ہے کہ ان کی عظمت، بلندی شان کا تذکرہ ملااعلی میں ان کے ایجاد سے پہلے ہو رہا تھا''

اس سے بہت واضح ہو گیا کہ ملائکہ کے سامنے ذکر کرنے کی بھی ایک وجہ یہی تھی کہ ملائکہ کو بھی معلوم ہو جائے کہ جس کے پیدا کرنے سے پہلے اس کا ذکر نورانی مخلوق میں کیا جا رہا ہے وہ کتنا ہی عظیم منصب والا ہوگا۔ اسی وجہ سے ارشاد فرمایا:

﴿ وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ ﴾

" ای واذکر یا محمد اذ قال ربک للملائکة واقصص علی قومک ذلک "

اور اے محمد (ﷺ) یاد کرو جب آپ کے رب نے فرشتوں کو کہا، اور یہی آپ اپنی قوم کو بھی بتا دیں۔ (صابونی)

دوسری وجہ:

" وفائده قوله هذا للملائکة تعلیم المشاورة وتعظیم شان المجعول بانه بشر بوجوده سکان ملکوته " (بیضاوی)

''ملائکہ سے کہنے کا ایک مقصد مشورہ کرنا تھا۔ اور دوسرا جس ذات کو خلیفہ بنانا تھا اس کی عظمت کا اظہار مقصود تھا کہ وہ بشر ہونے کے باوجود ملکوت میں ٹھہرے گا''

خیال رہے کہ مشورہ کبھی تو اس لئے طلب کیا جاتا ہے کہ مشورہ کرنے والا خود نہیں جانتا، دوسرا شخص اس سے زیادہ علم رکھتا ہے اور زیادہ مہارت رکھتا ہے۔ تو اس کے علم اور اس کی مہارت سے فائدہ اٹھانا مقصود ہوتا ہے۔

لیکن کبھی مشورہ کرنے والا خود صاحب علم ہوتا ہے، وہ کسی سے مشورہ صرف اس لئے کرتا ہے کہ جس سے مشورہ کیا جارہا ہے اس کی عظمت ظاہر ہوجائے، کہ ایک عظیم ذات نے اس سے مشورہ کیا ہے

رب تعالیٰ کا ملائکہ سے مشورہ کرنے کا یہی مقصد تھا کہ ملائکہ کی عظمت واضح ہوجائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عظیم مخلوق ہے، اور رب تعالیٰ کے ہاں ان کا عظیم مقام ہے۔

اسی لئے رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا ﴿ وشاورهم في الامر ﴾ یعنی اپنے معاملات میں صحابہ سے مشورہ کریں کہ صحابہ کی عظمت واضح ہوجائے کہ وہ کتنے عظیم لوگ تھے جن سے سیدالانبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ مشورہ کیا کرتے تھے۔ (ص ۳۹۳)

حدیث مرفوع، نبی کریم ﷺ کا ارشاد یہ ہے:

"ان ربي تبارك و تعالىٰ استشارني في امتي" (مسند احمد ج ۵ ص ۳۹۳)

"بیشک میرے رب تعالیٰ نے مجھ سے میری امت کے بارے میں مشورہ کیا"

یہ مشورہ بھی (معاذ اللہ) رب تعالیٰ کی احتیاجی کی وجہ سے نہیں، بلکہ نبی کریم ﷺ اور آپ کی امت کی عظمت کو ثابت کرنے کیلئے ہے کہ وہ کیسے عظیم نبی ہیں جن سے رب تعالیٰ مشورہ کررہا ہے، اور وہ کتنی عظمت والی امت ہے، جس کے متعلق رب تعالیٰ اپنے برگزیدہ نبی سے مشورہ کررہا ہے۔

فائدہ: علامہ کاظمی رحمہ اللہ نے کیا خوب فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کو فرشتوں اور جنات سب پر خلیفہ مقرر کرنے والا تھا، مگر ان کی خلافت کے متعلق مشورہ صرف فرشتوں سے طلب کیا جنات سے کوئی رائے نہیں لی گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فرشتوں میں اس کی اہلیت پائی گئی تھی، اور جنات سرکش و نافرمان تھے، ان میں خیر کی کوئی صلاحیت نہیں تھی اس لئے ان میں رائے دینے کی اہلیت بھی نہیں تھی۔

معلوم ہوا کہ جو رائے دینے کا اہل نہ ہو اس سے رائے طلب کرنا سنت الٰہیہ کے خلاف ہے۔ (انتہی)

کاش کہ حکام اور بڑے بڑے ادارے قائم کرنے والے منتظمین کو بھی یہ بات سمجھ آئے، نا اہل مشیر ہی تباہی کا سبب بنتے ہیں، لیکن نا اہل خوشامدی، منافقانہ چال والے ہی مقبول نظر ہوتے ہیں کسی اہلیت رکھنے والے کو کھو جانے سے افسوس کرتے ہوئے کف دست ملنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ بروقت

مخلص اور خودغرض میں فرق کو سمجھنا ہی دانشمندی اور کامیابی ہے۔

خلیفہ کون ہے؟

الخلیفة من یخلف غیره وینوب منابه خلیفہ اسے کہا جاتا ہے جو کسی کے بعد اس کا جانشین بنے اور اسی طرح جو کسی کا نائب ہو کر اس کے امور کو بیان کرے اسے بھی خلیفہ کہا جاتا ہے "خلیفة" میں تا مبالغہ کے لئے ہے، تانیث کے لئے نہیں، جیسا کہ علامة میں تا مبالغہ کے لئے ہے یہاں مراد خلیفہ سے، حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ اس وجہ سے کہ زمین میں سب سے پہلے خلیفہ بنانے کے متعلق جو مشورہ کیا جا رہا تھا اس سے مراد آپ ہی ہیں۔

اسی طرح آپ کے بعد ہر نبی کو خلیفہ بنایا گیا، تا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام زمین میں نافذ کر کے زمین کو امن وسکون کا گہوارہ بنایا جائے، اور لوگوں میں سیاست کی جائے، اور لوگوں کے نفوس کی تکمیل کی جائے، اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو جاری کیا جائے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق فرمایا:

﴿ یَا دَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنَاکَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ ﴾

"اے داؤد بیشک ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا"

اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: من؟

﴿ وَاذْکُرُوْا اِذْ جَعَلَکُمْ خُلَفَاءَ فِی الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ ﴾

"اور یاد کرو جب تمہیں نوح کی قوم کے بعد زمین میں خلیفہ بنایا"

اس سے واضح ہوا کہ زمین میں سب سے پہلے خلیفہ آدم علیہ السلام ہیں، پھر تمام انبیاء کرام پھر نبی کریم ﷺ کی امت کے علماء ہیں۔ (از بیضاوی و شیخ زادہ)

مصطفیٰ کریم ﷺ کا فرمان ذیشان:

" عن ابی حازم قال قاعدت ابا هريرة خمس سنين فسمعته يحدث عن النبی ﷺ قال كانت بنو اسرائيل تسوسهم الانبياء كلما هلك

نبی خلفه و انه لا نبی بعدی و ستکون خلفاء "

(مسلم ج ۲ ص ۱۲۴ باب وجوب الوفاء ببعة الخليفة الاول)

'' ابوحازم کہتے ہیں، میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس پانچ سال بیٹھتا رہا، میں نے ان کو نبی کریم ﷺ کی حدیث بیان کرتے ہوئے سنا، کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا بنی اسرائیل کی سیاست ان کے انبیاء کرام کرتے تھے۔ جب کوئی نبی وصال فرما جاتے تو ان کی جگہ دوسرے نبی آ جاتے، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، اسلئے (میرے بعد میری امت سے ہی) خلفاء ہوں گے''

" والساسية القيام على الشئى بما يصلحه " سیاست کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی مصلحت کے کام کرنا اور خلفاء کا مطلب یہ ہے " يتولون امورهم "لوگوں کے امور کا ولی بننا، لوگوں کے معاملات طے کرنا، غرباء کی امداد کرنا، لوگوں کے درمیان نزاع کو دور کرنا، ہر بہتری کا کام کرنا۔ (از نووی)

مقام افسوس! آج کل سیاست جھوٹ فراڈ کا نام بن گیا۔ جتنا بڑا جھوٹا اتنا بڑا سیاسی۔ سچی سیاست کوئی کرے تو کیا کرے جب انگریز کے پٹھوؤں، غاصبوں، لیڑوں کا ڈنڈا اسکے سر پر سوار ہے ملک کے محافظ جب کفار کے آلہ کار بن جائیں تو یہی حال ہوتا ہے جو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

محبّ وطن کو پلک جھپکتے ہوئے مکار بنا دیا جاتا ہے۔ مکار اپنے آپ کو محبّ وطن بنا کر پیش کرتا ہے، تو اس کے ہمنوا بھی اسی قسم کے نظر آتے ہیں۔ " **الامان ، الحفیظ** "

اعتراض:

" ان الخلافة عن الغير توهم عجز الغير عن القيام بالامر بنفسه اما لغيبة او موته او مرضه او نحو ذلک وهو لا يتصور فی حقه تعالیٰ فما وجه الاستخلاف "

'' کسی کو خلیفہ اس وقت بنایا جاتا ہے جب وہ شخص خود عاجز آ جائے، خواہ اس نے کہیں جانا ہو، تو وہ اپنی غیر موجودگی میں خلیفہ بنا دے، جیسا کہ بادشاہ کسی دوسرے ملک میں جاتے ہوئے اپنا قائم مقام بنا جاتے ہیں، لیکن رب تعالیٰ سے یہ بھی متصور نہیں، کیونکہ وہ ہر جگہ ہر گھڑی موجود ہے''

خود رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ نَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ ﴾ جب رب تعالیٰ ہر شخص کی

شہ رگ سے قریب ہے، تو اس کے غائب ہونے کا تصور ہی ممکن نہیں ۔ بھی خلیفہ بنانے کی اس وقت ضرورت درپیش آتی ہے جب اصل فوت ہو جائے لیکن رب تعالیٰ جب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ، قائم ودائم ہے " حی لا یموت " صفت کا مالک ہے، تو اس لحاظ پر بھی اسے خلیفہ بنانے کی ضرورت نہیں ۔ اور کوئی محتاجی بھی نہیں کہ وہ سو جائے تو اپنے سونے کی حالت میں خلیفہ بنادے، جس ذات کی صفت خود اس کے اپنے ارشاد سے یہ سمجھ آ جائے:

﴿ لاَ تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلاَ نَوْمٌ ﴾ اسے اونگھ اور نیند نہیں آتی

تو اس ذات کو خلیفہ بنانے کی کیا ضرورت درپیش آئی ؟

جواب:

لا لحاجة له تعالیٰ الی من ینوبه بل لقصور المستخلف علیه عن قبول فیضه وتلقی امره بغیر وسط ولذلک لم یستنبیٔ ملکا کما قال الله تعالیٰ ﴿ لو جعلناه ملکا لجعلناه رجلا ﴾

" خلیفہ بنانے کی رب تعالیٰ کو کوئی محتاجی نہیں تھی، بلکہ جن کی طرف خلیفہ بنانے کا ارادہ ہو چکا تھا وہ محتاج تھے کیونکہ وہ رب تعالیٰ سے بغیر واسطہ کے فیض حاصل نہیں کر سکتے تھے، اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے کسی فرشتے کو نبی نہیں بنایا، خود رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اگر کسی فرشتے کو وہ نبی بناتا تو اسے بھی انسانی شکل میں بھیجتا ﴾

واضح ہوا کہ خلیفہ بنانے میں جب رب تعالیٰ کو احتیاج نہیں تھی تو اعتراض بھی خود بخود ختم ہو گیا۔

(از بیضاوی و شیخ زاده)

لوگ رب تعالیٰ سے براہ راست فیض کیوں حاصل نہیں کر سکتے ؟

" لما انه فی غایة الکدورة والظلمة الجسمانیة وذاته تعالیٰ فی غایة التقدس، والمناسبة شرط فی قبول الفیض علی ما جرت به العادة الالهیة فلا بد من متوسط ذی جهتی تجرد و تعلق یستفیض من جهة و یفیض باخری "

(روح المعانی)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہاں خلیفہ کا معنی پیچھے آنے والا نہیں بلکہ نائب ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا

نائب ہو کر زمین وآسمان کی اشیاء میں تصرف کرنے والا، نائب بنانے کی ضرورت بھی اللہ تعالیٰ کی نہیں تھی وہ محتاج نہیں بلکہ جن کی طرف خلیفہ بنانا تھا انہیں محتاجی تھی۔ اس لئے کہ انسان بہت زیادہ کدورت اور ظلمات جسمانیہ رکھتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ بہت ہی زیادہ متقدس ہے اور لطیف ہے فیض لینے والے اور دینے والے میں کوئی مناسبت ہونی چاہئے۔ جب مخلوق میں اور اللہ تعالیٰ میں کوئی مناسبت نہیں تھی: مخلوق کو وجود میں لانا بھی رب تعالیٰ کی مشیت تھی، تو اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے پیدا فرمانے سے پہلے ہی ان کے فیض لینے کا یہ اہتمام فرمایا کہ انبیاء کرام کو واسطہ بنایا جو اپنی نورانیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے فیض لے کر اپنی بشریت کے وصف کی وجہ سے انسانوں تک وہ فیض پہنچا دیں۔

جس طرح انسانوں اور حیوانوں کے جسموں میں ہڈیاں اور گوشت ہے، ہڈیاں سخت ہیں، گوشت نرم ہے، ہڈی اپنی سختی کی وجہ سے گوشت سے غذا حاصل نہیں کر سکتی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ سے ہڈیوں اور گوشت کے درمیان پٹھے بطور واسطہ رکھے۔ پٹھے اپنے نرم حصہ سے گوشت سے غذا حاصل کرتے ہیں۔ اور اپنے سخت حصہ سے ہڈی کو غذا پہنچاتے ہیں۔ (ماخوذ از بیضاوی، شیخ زادہ، روح المعانی، خفاجی)

نکتہ: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنانے کے متعلق جو مشورہ کیا۔ اس سے مراد صرف آدم علیہ السلام نہیں اور آپ کی تمام اولاد بھی مراد نہیں، بلکہ آدم علیہ السلام اور آپ کی اولاد سے بعض حضرات جو اس خلافت کے منصب کے اہل ہوں گے یہ سب مراد ہیں۔ اور وہ افراد آدم علیہ السلام کی اولاد میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تک پیدا ہونے والے تمام انبیاء کرام ورسل کرام علیہم السلام ہیں۔ انبیاء کرام تمام ہی فرداً فرداً معصوم ہیں۔ لیکن صدیقین، اولیاء، صالحین فرداً فرداً تو معصوم نہیں، البتہ اجتماعی طور پر معصوم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کا اجتماعی فیصلہ امت کو قبول کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ جب یہ ثابت ہوا کہ خلافت کا حقدار وہ ہے جس میں یہ استعداد پائی جائے تو خود واضح ہوا کہ عورت کی فطرت سلیمہ اور طبیعت مستقیمہ اس قابل نہیں کہ جمعہ یا باقی نمازوں کی امامت یا خلافت یعنی حاکمیت اس کے سپرد کر دی جائے، عورت اپنی فطرت اور طبعی کمزوری کی وجہ سے یہ کام سرانجام نہیں دے سکتی۔

مسلمانوں کی زبوں حالی کی وجہ:

خلافت راشدہ عادلہ کے بعد مسلمانوں پر دنیا کی محبت غالب آ گئی اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت ان کے دلوں میں راسخ نہ رہی۔ دنیا کی محبت کی وجہ سے موت سے ان کے دلوں

میں کراہت پیدا ہوگئی اور اللہ کی راہ میں جان دینے کا جذبہ کامل نہ رہا، جس کی وجہ سے امت مسلمہ بدحالی کا شکار ہوگئی۔ غیروں پر اس کو غالب رہنے کی نعمت سے محرومی حاصل ہوگئی۔

ابوداؤ اور بیہقی کی حدیث میں امت مسلمہ کی اس بدحالی کا ذکر نہایت ہی المناک صورت میں وارد ہے۔ حضرت ثوبان سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے مسلمانو! قریب ہے کہ کافروں کی جماعتیں تم پر حملہ آور ہونے کے لئے اس طرح ایک دوسرے کو بلائیں گی جیسے کسی پیالے میں کھانا رکھا ہو اور اسے کھانے کے لئے ہر طرف سے لوگوں کو بلایا جائے، صحابہ کرام نے عرض کیا کہ حضور کیا اس وقت ہم قلیل ہوں گے؟ فرمایا نہیں اس وقت بہت کثیر تعداد میں ہوگے لیکن اس وقت تم سیلاب کے جھاگ اور خس وخاشاک کی طرح ہوگے (یعنی ایمانی قوت وشجاعت تم میں باقی نہ رہے گی) اللہ تمہاری ہیبت اور تمہارا رعب دشمن کے دل سے نکال دے گا اور تمہارے دلوں میں بزدلی اور کمزوری پیدا کردے گی۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا حضور بزدلی اور کمزوری کا سبب کیا ہوگا؟ حضور ﷺ نے فرمایا:

"حب الدنیا و کراهیة الموت ، دنیا کی محبت اور موت کی کراھیت (مکروہ سمجھنا)"

ظاہر ہے کہ جو شخص دنیا سے محبت کرے گا موت اسے ناپسند ہی ہوگی۔ عرصہ دراز سے مسلمان اسی بدحالی میں مبتلاء ہیں اور موجودہ دور میں یہ بدحالی ایسی خوفناک صورت اختیار کرگئی ہے کہ اس کے نتائج کے تصور سے بھی دل لرز جاتا ہے۔

خیال رہے کہ ہر دور میں نیک لوگ، اصحاب علم وتقوی رہے ہیں، انہیں کے دم سے نظام دنیا چل رہا ہے، اور دنیا کی بقاء ہے لیکن اکثریت جب گناہوں میں مبتلاء ہوجاتی ہے تو کم تعداد میں نیک لوگ بھی ہلاکت کی زد میں آجاتے ہیں، اگرچہ وہ ہلاکت ان کے لئے عذاب نہ ہو، جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے۔

" اذا انزل الله بقوم عذابا اصاب العذاب من کان فیهم ثم بعثوا علی اعمالهم "

"یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر عذاب بھیجتا ہے تو نیک وبد سبھی اس میں ہلاک ہوجاتے (بخاری ج ۲ ص ۱۰۵۳)

ہیں، پھر جب وہ اٹھائے جائیں گے تو ہر ایک کا اٹھایا جانا اس کے اچھے یا برے اعمال کے مطابق ہوگا"

مسلمان اگر اپنے دور رفتہ کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور ان کی تمنا یہ ہے کہ وہ کافروں پر غالب آ جائیں تو اس کا واحد حل یہ ہے کہ تمام مسلمان مجموعی طور پر کامل ایمان رکھیں۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت پر کسی اور کو ترجیح نہ دیں۔ اسی محبت اور کامل ایمان کی وجہ سے جذبہ جہاد اور شوق شہادت پیدا کریں، تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان اپنے اس دور کو حاصل نہ کرلیں، جو صحابہ کرام کے دور میں کفار پر مسلمانوں کو غلبہ حاصل تھا۔ مسلمانوں کی ہیبت سے کفار کے اعضاء پر کپکپی طاری ہوتی۔
(از التبیان مع البیان للکاظمی)

انسان کو خلیفہ بنانے میں راز حقیقت:

مفکر اسلام، مفسر قرآن حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جملہ مخلوقات سے صرف یہی ایک مخلوق ہے جو منصب خلافت کی اہلیت رکھتی ہے، علماء ربانیین نے اس مشت خاک میں پنہاں توانائیوں سے جیسے پردہ اٹھایا ہے، اس کی گرد راہ کو نفسیات انسانی کے ماہرین نہیں پہنچ سکتے، عارف کامل اسمٰعیل حقی کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

" ان فی الانسان صورة من عالم الشهادة المحسوسة وروحا من عالم الغيب الملكوتي غير المحسوس وسرا مستعدا لقبول فيض الانوار الالهية فبا لتربية يترقى من عالم الشهادة الى عالم الغيب وبسر المتابعة يترقى من عالم الملكوت الى عالم الجبروت والعظموت ويشاهد بنور الله المستفاد من سر المتابعة انوار الجمال والجلال......الخ" (روح البیان)

"یعنی انسان مختلف عناصر سے مرکب ہے، اس کی صورت کا تعلق عالم محسوس سے ہے، اور اس کی روح کا تعلق عالم غیب ملکوتی سے ہے، صورت و روح کے علاوہ اس میں ایک پوشیدہ قوت ہے جو انوار ربانی کے فیض کو قبول کرنے کی استعداد رکھتی ہے، اچھی تربیت سے وہ عالم محسوس سے ترقی کر کے عالم غیب تک رسائی حاصل کرتا ہے اور رسالت مآب کی سچی پیروی سے اس پر عالم جبروت و عظموت کی راہیں کھلتی ہیں۔ وہ الٰہی نور جو اس اطاعت و پیروی کی برکت سے اسے حاصل ہوتا ہے اس سے وہ جمال و جلال کے انوار و تجلیات کا مشاہدہ کرتا ہے " فسبحانه الله احسن الخالقين "

انسان کو جو صرف خاک کا پتلا سمجھتے ہیں کاش اس کی حقیقت پر غور کریں تا کہ ان میں اپنے بلند مقام پر پہنچنے کی تڑپ پیدا ہو۔ یہ وہ ذرہ ہے جس کے سامنے آسمان کی رفعتیں سرنگوں ہیں، اور یہ وہ قطرہ ہے جس میں سمندروں کی گہرائیاں ہیں۔

(ضیاء القرآن)

زمین میں خلیفہ بنانے کی وجہ:

﴿ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ ﴾

" ای التی ھی محل الکون والفساد فھو محل التصرف عن عناصرھا ومن الروح السماوی "

(تبصیر الرحمن)

رب تعالیٰ نے فرمایا: ''میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں'' زمین کا ذکر اس لئے فرمایا کہ زمین ہی وہ مقام ہے جہاں فساد وغیرہ پائے جاتے ہیں، اور زمین میں ہی عناصر اربعہ، سماوی (آسمانی) روح سے مل کر تصرفات کرتے ہیں۔ اس لئے زمین میں ہی ان کی اصلاح کی ضرورت تھی لہٰذا زمین میں خلیفہ بنانے کی مشیت کا اظہار کیا۔

رب تعالیٰ سے ارشاد پر فرشتوں نے کہا:

﴿ قالوا اتجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفک الدماء و نحنْ نسبح بحمدک ونقدس لک ﴾

''انہوں نے کہا، ایسے کو (نائب) کرے گا جو اس میں فساد پھیلائے گا اور خونریزیاں کرے گا اور ہم تجھے سراہتے ہوئے تیری تسبیح کرتے ہیں اور تیری پاکی بولتے ہیں''

فرشتوں نے یہ سوال تعجب سے کیا:

فرشتوں نے رب تعالیٰ پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا، اور نہ ہی بنی آدم پر کوئی حسد تھا اسی مضمون کو ان الفاظ میں پیش کیا گیا:

" وقول الملائکة ھنا لیس علی وجه الاعتراض علی اللہ ولا علی وجه الحسد لبنی آدم "

(ابن کثیر)

فرشتوں کے سوال کی وجہ یہ تھی:

" استکشاف عن الحکمة الخفیة او تعجب من ان یستخلف لعمارة الارض واصلاحھا من یفسد فیھا"

مخفی حکمت کے پتہ چلانے کے لئے، یا اس پر تعجب کرنے کے لئے یہ سوال کر دیا کہ جو فساد پھیلانے والے ہوں گے، اور خون بہانے والے ہوں گے ان سے زمین کو کیسے آباد کیا جائے گا۔ (روح المعانی)

یا ان کے سوال کی وجہ یہ تھی: " فان کان المراد عبادتک فنحن نسبح بحمدک ونقدس لک " اے اللہ زمین میں خلیفہ بنانے کی کیا حکمت ہے؟ اگر اس میں یہ حکمت ہے کہ وہ تیری عبادت کریں گے تو ہم پہلے ہی تیری عبادت کر رہے ہیں، یعنی تیری تسبیح وتحمید کر رہے اور تیری تقدیس ہم بیان کر رہے ہیں، کیا وجہ ہے کہ ہماری عبادت پر اقتصار نہیں کیا گیا؟ (ابن کثیر)

رب تعالیٰ نے جواب دیا:

﴿ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾

"رب نے فرمایا بیشک میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے"

یعنی اے فرشتو جو تم نے اس مخلوق کے مفاسد ذکر کیے ہیں میں اسکی تخلیق میں جو مصلحت جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے وہی مصلحت ان مفاسد پر راجح ہے جو تم نے ذکر کیے ہیں۔ وہ مصلحت یہ ہے:

﴿ ساجعل فیھم الانبیاء وارسل فیھم الرسل ویوجد منھم الصدیقون والشھداء والصالحون والعباد والزھاد والاولیاء والابرار والمقربون والعلماء الصالحون والخاشعون والمحبون لہ تبارک و تعالیٰ المتبعون رسل صلوات اللہ وسلامہ علیھم ﴾

"کہ میں ان میں انبیاء کرام پیدا کروں گا اور ان میں رسول بھیجوں گا اور ان میں صدیقین، شہداء، صالحین، عبادت گزار، زاہدین، اولیاء، نیک لوگ، مقربین، علماء صالحین، خشوع کرنے والے، اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی تابعداری کرنے والے ہوں گے"

مقصد جواب یہ تھا کہ اے فرشتو تمہاری نظر فساد پھیلانے اور خون بہانے والوں پر ہے اس لئے زمین میں میرے خلیفہ بنانے کی حکمت تمہیں سمجھ نہیں آ رہی لیکن میری نظر رحمت ان مقربین پر ہے جن کو میرے قریب کا سزاوار (لائق) ٹھہرالیا گیا ہے۔

رب تعالیٰ دن رات اپنی حکمت کا فرشتوں کو مشاہدہ کرا رہا ہے:

صحیح حدیث میں یہ مذکور ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" ان الملائکۃ اذا صعدت الی الرب تعالیٰ باعمال عبادہ یسالھم وھو اعلم کیف ترکتم عبادی فیقولون اتیناھم وھم یصلون وترکناھم وھم یصلون "

''بیشک فرشتے جب رب تعالیٰ کے حضور بندوں کے اعمال لے کر حاضر ہوتے ہیں۔تو رب تعالیٰ ان سے اپنے بندوں کے اعمال کے بارے میں سوال کرتا ہے، حالانکہ وہ جانتا بھی ہے، کہ تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا وہ کہتے ہیں جب ہم ان کے پاس پہنچے تو وہ نماز پڑھ رہے تھے اور ہم نے جب ان کو چھوڑا تو وہ نماز پڑھ رہے تھے''

رات کے فرشتے عصر کی نماز میں آ کر شریک ہوتے ہیں اور صبح کی نماز جماعت سے پڑھ کر تے ہیں، اور دن کے فرشتے صبح کی نماز میں جماعت میں شریک ہوتے ہیں اور عصر کی نماز جماعت ہ کر جاتے ہیں۔

اسلئے خواہ وہ فرشتے رات کے اعمال لکھنے والے ہوں یا دن کے اعمال لکھنے والے ہوں انکے آتے ہوئے بھی اللہ کے بندے نماز ادا کر رہے ہوتے ہیں۔اور جب وہ واپس لوٹتے ہیں تو اس وقت بھی وہ اللہ کے بندوں کو نماز ادا کرتے ہوئے دیکھ کر جاتے ہیں۔اسی لئے وہ رب کے حضور عرض کرتے ہیں کہ اے اللہ ہم گئے تھے تو وہ نماز پڑھ رہے تھے ہم آئے تو وہ نماز پڑھ رہے تھے۔

اسی پر نبی کریم ﷺ کا ایک اور ارشاد گرامی بھی دلالت کر رہا ہے " یرفع الیہ عمل اللیل قبل النھار وعمل النھار قبل اللیل " اللہ تعالیٰ کے حضور لوگوں کے رات کے عمل دن سے پہلے پہنچائے جاتے ہیں اور دن کے عمل رات سے پہلے:

" فقولھم اتیناھم وھم یصلّونْ وترکناھم وھم یصلون منْ تفسیر قولہ لھم انی اعلم مالا تعلمون "

''فرشتوں کا یہ کہنا کہ جب ہم ان کے پاس پہنچے تھے تو وہ نماز پڑھ رہے تھے اور جب ہم ان کو چھوڑ کر آئے تو وہ نماز پڑھ رہے تھے''

رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ انی اعلم مالا تعلمون ﴾ بیشک جو میں جانتا ہوں تم نہیں

جانتے، کی تفسیر ہے۔ (ابن کثیر)

گویا کہ یوں کہا جائے کہ رب تعالیٰ نے اپنے بندوں کے اعمال کو لکھنے اور دیکھنے پر فرشتوں کو مقرر کر کے ان پر واضح کر دیا کہ اے فرشتو میرے مقربین کے اعمال دیکھو وہ میرے حکم کے مطابق کیسے سجدہ ریز ہیں؟

رب تعالیٰ اپنی حکمت کا مشاہدہ دن، رات فرشتوں کو کرا رہا ہے، اور ان پر یہ بات عیاں ہو چکی ہے کہ ہم نے جو یہ کہا تھا کہ ''وہ فساد پھیلائیں گے اور خون بہائیں گے'' اس کے برخلاف رب تعالیٰ کے مقرب بندے خواہشات نفسانیہ رکھنے کے باوجود رب تعالیٰ کے احکام فریضہ پر ہی صرف عمل نہیں کر رہے، بلکہ ساری ساری راتیں، سحری کے اوقات میں رب کو یاد کر رہے ہیں واقعی اس مخلوق کی شان کو رب تعالیٰ ہی جانتا تھا ہم بے خبر تھے۔

ہاں یقین کیجئے فرشتوں کی عبادت سے انسانوں کی عبادت فوقیت رکھتی ہے کیونکہ فرشتوں کو خواہشات نفسانیہ حاصل نہیں لیکن انسان کو خواہشات نفسانیہ حاصل ہیں، پھر اپنی خواہشات کو ترک کر کے راتیں جاگ کر گزار دینا، گرمیوں، سردیوں میں سحری کے وقت اٹھ کر رب کے حضور سجدہ ریز ہو جانا بہت بڑا کام ہے۔

اے انسان رب نے تجھے اپنا مقرب بنایا، تو رب تعالیٰ کی عبادت سے منہ موڑ کر کہیں اس سے دور نہ ہو جانا۔

فرشتوں کو کیسے پتہ چلا کہ انسان فساد پھیلائیں گے:

ان کو اس کا علم چند وجوہ سے حاصل تھا۔ جو تمام ہی مراد ہیں:

(۱) رب تعالیٰ نے فرشتوں کو بتایا کہ میں ایک مخلوق کو زمین میں پیدا کرنے والا ہوں تو اسی وقت ان کو یہ بھی بتا دیا تھا:

" قال قتادة وقد تقدم اليهم انهم يفسدون فيها فقالوا ''﴿ اتجعل فيها من يفسد فيها ويسفک الدماء﴾

''حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کا قول یہ ہے کہ فرشتوں کو پہلے ہی رب تعالیٰ نے بتا دیا تھا کہ وہ مخلوق جو میں پیدا کرنے والا ہوں ان میں سے کچھ فساد پھیلانے والے بھی ہوں گے''

اسی وجہ سے فرشتوں نے تعجب کرتے ہوئے حقیقت حال کو جاننے کے لئے عرض کیا (اے اللہ اس میں حکمت کیا ہے) کیا تو اس مخلوق کو خلیفہ بنائے گا جو فساد پھیلائیں گے اور خون بہائیں گے

(۲) "وقیل عرفوا ذلک من اللوح" بعض حضرات نے کہا کہ فرشتوں نے لوح محفوظ سے دیکھ کر یہ کہا تھا کیونکہ لوح محفوظ میں یہ محفوظ تھا کہ انسان فساد پھیلائیں گے اور خون بہائیں گے۔

اسی پر اگرچہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے یہ اعتراض کیا ہے "ویبعده عدم علم الجواب" یہ بعید ہے کہ لوح محفوظ سے فرشتوں نے یہ تو دیکھ لیا ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیئے جانے والے جواب کو نہ دیکھا ہو۔

(از روح المعانی)

لیکن راقم کے نزدیک کوئی بعید نہیں اس لئے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کا اظہار کرنا تھا، تو ان پر یہ واضح کر دیا کہ انسان فساد پھیلانے والے ہوں گے، اور خون بہائیں گے۔ لیکن رب تعالیٰ نے اپنی حکمت اور اپنے مقربین کو ان سے مخفی رکھا، تا کہ فرشتے بھی رب تعالیٰ کی قدرت کے سامنے اپنے عجز کا برملا اعلان کر دیں۔

(۳) فرشتوں کو "خلیفہ" نام رکھنے سے معلوم ہوا کہ خلافت اصلاح کا تقاضا کرتی ہے۔ اور جن پر خلیفہ بنایا گیا ان پر قہر کا تقاضا کرتی ہے۔ اسی سے انہوں نے سمجھ لیا کہ وہ لوگ جن پر خلیفہ مقرر ہوگا وہ اپنی خواہشات کے مطابق کسی چیز کو نہ پا کر فساد پھیلائیں گے خون بہائیں گے۔ اور خصوصاً جب خلیفہ میں جمال ہوگا اور جلال بھی تو یقیناً جلال کے مطابق لوگوں کی غلطیوں پر گرفت بھی ہوتی ہے، تو وہ اس کے خلاف فساد پھیلانے والے اور خون بہانے والے ہوں گے۔ (از روح المعانی)

(۴) "ویحتمل انهم عرفوا ذلک بقیاسهم حال المجعول خلیفة علی حال الجن الذین کانوا فی الارض قبل آدم فافسدوا فیها انواعا من الفساد"

اور وجہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے جنات کو انسانوں سے پہلے پیدا کیا تو انہوں نے زمین میں مختلف قسم کے فساد پھیلائے تھے تو اسی سے انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ اب آنے والی نئی مخلوق کا بھی وہی حال ہوگا، جو ان سے پہلے والی مخلوق یعنی جنوں کا تھا تو انہوں نے کہا وہ تو فساد پھیلائیں اور خون بہائیں۔ (شیخ زادہ)

(۵) حضرت ابن زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آگ کو پیدا کیا تو فرشتوں کو

بہت زیادہ خوف لاحق ہوا تو فرشتوں نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا ﴿ ربنا لم خلقت هذه النار قال لمن عصاني من خلقي ﴾ اے ہمارے رب تو نے آگ کو کیوں پیدا کیا؟ تو رب تعالیٰ نے فرمایا اس کے لئے جو میری مخلوق سے جو میری نافرمانی کرے گا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ جنات کو بھی رب تعالیٰ نے ابھی پیدا نہیں کیا تھا اور نہ ہی انسان پیدا ہوئے تھے اس وقت صرف فرشتے ہی تھے۔

فرشتوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ ہم سے تو گناہ سرزد ہونے نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو قوت شہویہ اور قوت سبعیہ (درندگی) سے پاک رکھا ہوا ہے۔

جب کسی چیز میں درندوں والی قوت ہو تو وہ خون بہاتا ہے اور چوپاؤں والی قوت (یعنی صرف خواہشات والی قوت ہو) پائی جائے تو وہ فساد پھیلاتا ہے۔

اس سے فرشتوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ ایسی مخلوق ہوگی جس میں چوپاؤں اور درندوں والی قوتیں بھی ہوں گی جن کی وجہ سے وہ فساد پھیلائیں گے اور خون بہائیں گے۔ (شیخ زادہ)

لیکن فرشتے اس سے بے خبر رہے کہ ان میں مقربین رب تعالیٰ کی صفات کا مظہر ہوں گے اسی کو رب تعالیٰ نے ﴿ انی اعلم ما لا تعلمون ﴾ بیشک میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے سے بیان فرمایا۔

(۲) " من یفسد فیها لکونها من العناصر المختلفة الداعية الى اللذات السفلية ويسفك الدماء اذ فيه قوة غضبية من النار "

فرشتوں کو اس لئے پتہ چل گیا تھا کہ رب تعالیٰ کی طرف سے ان کو پہلے اس کا علم دے دیا گیا تھا کہ وہ مخلوق مختلف عناصر (آگ، مٹی، پانی، ہوا) سے بنے گی، تو فرشتوں نے کہا کہ ان کی جب ایک حالت دوسرے پر غالب ہوگی تو انہوں نے فساد ہی پھیلانا ہے، اور خصوصاً جب ان کی آگ والی قوت غضبیہ غالب ہوگی تو وہ خون بہائیں گے۔ (از تبصیر الرحمن)

خلیفہ اعظم سید الانبیا علیہ وسلم صلی اللہ:

پہلے یہ ذکر کیا گیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تخلیق حضرت آدم علیہ السلام سے پہلی ہوئی۔ اب یہاں یہ ذکر کرنا مقصود ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرانے کی وجہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں اور خلیفہ اعظم بھی

آپ ہی ہیں علامہ کاظمی رحمہ اللہ کی تفسیر کا خلاصہ ملاحظہ فرمائیں۔

اگرچہ ظاہر طور پر سب سے پہلے خلیفہ حضرت آدم علیہ السلام ہیں لیکن حقیقت میں سب سے پہلے خلیفہ ہمارے نبی کریم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ کیونکہ آپ کا اپنا ارشاد گرامی یہ ہے:

"کنت نبیا و آدم بین الروح والجسد"

(ابو نعیم، ابن سعد، طبرانی، جامع صغیر ج ۲ ص ۹۲)

''میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدم علیہ السلام روح اور جسم کے درمیان تھے''

جبرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے نبی کریم ﷺ کی قبرانور کی جگہ سے مٹی لے گئے، آب تسنیم سے اسے گوندھا گیا، جنتوں کی نہروں میں غوطے دیئے گئے زمینوں، آسمانوں میں پھرایا گیا (اسی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے ہی فرشتوں نے نبی کریم ﷺ کو پہچان لیا تھا) پھر اس مٹی کو آدم علیہ السلام کے جسم سے ملا دیا گیا اور نور محمدی ﷺ سے آدم علیہ السلام کی پیشانی کو چمکایا گیا۔

(تفسیر ثعالبی ملخصا خلاصة التفاسیر ج ۱ ص ۲۵)

وہی نور محمدی دراصل فرشتوں سے سجدہ کرانے کا سبب بنا تھا، امام رازی رحمہ اللہ نے تفسیر کبیر میں فرمایا

"ان الملائکة امروا بالسجود لآدم لاجل ان نور محمد ﷺ کان فی جبهة آدم"

(کبیر ج ۲ ص ۴۵۵)

''بیشک فرشتوں کو آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ آپ کی پیشانی میں محمد ﷺ کا نور رکھا گیا تھا''

علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فهو ﷺ علی الحقیقة الخلیفة الاعظم فی الخلیقة والامام المقدم فی الارض والسموات العلی ولو لا ماخلق آدم بل ولا ولا"

(روح المعانی ج ص ۲۱۸)

''یعنی درحقیقت حضور ﷺ ہی اللہ کی مخلوق میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ اعظم ہیں اور زمینوں اور بلند آسمانوں میں سب سے مقدم امام حضور ہی ہیں اگر حضور ﷺ نہ ہوتے تو نہ آدم پیدا ہوتے نہ ان کے علاوہ کوئی اور چیز''

علامہ رازی اور علامہ آلوسی رحمہا اللہ کی ان عبارات سے واضح ہوا کہ خلیفہ اعظم حضور ﷺ ہی ہیں آدم علیہ السلام کی خلافت کا ظہور ہے۔ (از تسان مع البیان)

اسی مضمون کو سمجھنے کے لئے پھر سے اس عبارت کو دیکھیں جس سے اولیت مصطفیٰ کریم ﷺ کے ساتھ ساتھ آپ کا خلیفہ ہونے بھی سمجھ میں آئے گا۔ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ انی جاعل فی الارض خلیفة ﴾ میں خلیفہ سے کیا مراد ہے؟

" وهو آدم ای فهو ابو البشر والخليفة الاول باعتبار عالم الاجساد واما باعتبار عالم الارواح فهو سيدنا محمد ﷺ "

" وہ آدم علیہ السلام جو تمام بشروں (انسانوں) کے باپ ہیں لیکن آپ جسموں کے لحاظ سے خلیفہ اول ہیں۔ لیکن باعتبار عالم ارواح کے خلیفہ اول ہمارے سردار محمد ﷺ ہیں"

قال العارف فانی وان کنت ابن آدم صورة فلی فیه معنی شاهد بابوتی

یعنی نبی کریم ﷺ کے ارشادات سے یہ مطلب بیان کیا جاسکتا ہے کہ آپ نے گویا کہ یوں فرمایا:

بیشک میں اگرچہ بظاہر آدم علیہ السلام کی اولاد سے ہوں

لیکن مجھے وہ حقیقت حاصل ہے جو میرے باپ ہونے پر شاہد ہے (از صاوی)

شیخ سعدی رحمہ اللہ نے فرمایا:

تو اصل وجود آمدی از نخست — دگر ہرچہ موجود شد فرع تست

سب سے پہلے تم ہی اصل کائنات بن کے آئے — باقی ہر چیز جو بھی موجود ہے وہ آپ کی فرع ہے

(بوستان)

ملائکہ کیا ہیں؟ پہلے تو اس لفظ کے متعلق سمجھیں یہ لفظ " الــوکة " سے لیا ہوا ہے جس کا معنی ہے "رسالت" جیسے کہا جاتا ہے " الکنی الیه ای ارسلنی الیه " اسنے مجھے فلاں کی طرف بھیجا۔ اصل میں لفظ ہوتا ہے "ملئک" ہمزہ کو تخفیف کے لئے حذف کر دیا جاتا ہے اور اس کی حرکت ماقبل کو دے دی جاتی ہے۔ اس طرح " ملک " بن جاتا ہے۔

صاحب کشاف نے کہا:

" الملائک جمع ملئک علی الاصل کالشمائل جمع شمال والحاق التاء لتانیث الجمع "

ملائک جمع ملاک کی جیسے شمائل جمع ہے شمأل کی، پھر جمع کی وجہ سے تاء تانیث کو لاحق کر دیا گیا۔ (از کبیر)

" فذهب اکثر المسلمین الی انها اجسام نورانیة "اکثر مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ فرشتے نورانی مخلوق ہیں مختلف شکلیں بدل لیتے کی اللہ تعالیٰ نے ان کو اجازت دے رکھی ہے۔

لیکن یہ خیال رہے کہ فرشتے گھٹیا چیزوں کی صورت اختیار نہیں کرتے ، جیسے کتے ، خنزیر وغیرہ کی شکل نہیں بناتے ، استاذ المکرّم حضرت مولنا عبدالحکیم شرف قادری مدظلہ العالیٰ نے منطق کی کتاب مرقاۃ کے عربی حاشیہ میں اس کی وضاحت کی ہے۔

دیگر مذاہب بعضوں نے کہا کہ فرشتے اجسام ھوائیہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کی اجازت سے مختلف شکلیں بدل لیتے ہیں۔نصاریٰ کا مذہب یہ ہے کہ فرشتے نفوس ناطقہ ہیں صاف اور بہتر بدنوں سے جدا ہوتے ہیں۔اور ان کے نزدیک اجسام خبیثہ جن اور شیطان ہیں۔

بت پرستوں کا مذہب یہ ہے کہ فرشتے ستارے ہیں کبھی وہ نیک بختی کی علامت ہوتے ہیں ان کو ملائکہ رحمت کہا جاتا ہے۔اور کبھی وہ نحوست کی علامت ہوتے ہیں ان کو ملائکہ عذاب کہا جاتا ہے

فلاسفہ کا مذہب یہ ہے کہ فرشتے جواہر مجردہ ہیں جو حقیقت میں نفوس ناطقہ سے مختلف ہیں۔یعنی فرشتوں کی حقیقت اور ہے اور نفوس ناطقہ کی حقیقت اور ہے۔

بعض نے وضاحت کی ہے کہ فرشتے عقول عشرہ ہیں اور نفوس فلکیہ ہیں جو آسمانوں کو حرکت دیتے ہیں۔

(روح المعانی)

فرشتوں کی تعداد:

فرشتوں کی تعداد کو صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے یا اس کے رسول ﷺ جانتے ہیں ، جن کو تمام زمینوں ، آسمانوں کا علم دیا گیا۔لیکن نبی کریم ﷺ نے بھی فرشتوں کی معین تعداد کو نہیں بیان فرمایا۔ البتہ فرشتوں کی کثرت کو علامہ رازی رحمہ اللہ کی اس بحث سے سمجھنے کی کوشش فرمائیں۔تو اتنا پتہ چل جائے گا کہ فرشتوں کی تعداد کثیر ہے:

" قال علیہ الصلوۃ والسلام ، اطت السماء وحق لها ان تئط ما فیها موضع قدم الا وفیه ملک ساجد او راکع"

''نبی کریم ﷺ نے فرمایا، آسمانوں میں چرچراہٹ پیدا ہوئی اور حق بھی یہی ہے کہ ان میں چرچراہٹ پیدا ہو، کیونکہ آسمانوں میں ایک قدم کی بھی جگہ نہیں کہ وہاں کوئی فرشتہ سجدہ یا رکوع کرنے والا موجود نہ ہو''

روایت میں آیا ہے: تمام انسان جنوں کا دسواں حصہ ہیں، اور تمام انسان اور تمام جن خشکی کے جانوروں کا دسواں حصہ ہیں اور تمام انسان اور تمام جن اور خشکی کے تمام جانور، پرندوں کا دسواں حصہ ہیں، اور تمام انسان، تمام جن، خشکی کے تمام جانور اور تمام پرندے، پانی والے حیوانات کا دسواں حصہ ہیں۔

یہ تمام مخلوق زمین کے موکلین فرشتوں کا دسواں حصہ ہیں، پھر یہ ساری تعداد پہلے آسمان کے فرشتوں کا دسواں حصہ ہیں۔ پھر یہی ترتیب ساتوں آسمانوں تک، پھر یہی نسبت کرسی کے اردگرد فرشتوں سے، پھر یہی تناسب عرش کے پردوں میں پہلے پردے سے متعلق فرشتوں سے، بھی اسی تعداد کو دوسرے، تیسرے پردے سے آخر تک جب کہ پردوں کی کل تعداد چھ لاکھ ہے...... واللہ اعلم بالصواب

(از کبیر)

آسان لفظوں میں یہی عقیدہ رکھنا کافی ہے کہ فرشتوں کی تعداد کو صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ ہی جانتے ہیں۔ البتہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے ہمیں معلوم ہے کہ آسمانوں میں ایک قدم کی جگہ بھی نہیں جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ رکوع اور سجدہ کرنے والا موجود نہ ہو۔

ملائکہ کی دو قسمیں:

اگرچہ ملائکہ کی کئی قسمیں ہیں کوئی زمین پر موکل، کوئی حاملین عرش، کوئی جنت کے دروازے پر مقرر، کوئی جہنم کے دروازے پر مقرر اس طرح بہت سی قسمیں بن جاتی ہیں۔ لیکن سارے فرشتے دو قسموں میں آجاتے ہیں علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے دو قسمیں بیان کی ہیں، جب کہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے تفصیلی طور پر بہت سی قسمیں بیان کی ہیں اختصار کے پیش نظر دو قسموں کو بیان کیا جا رہا ہے:

(۱) بعض فرشتے وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی معرفت میں مستغرق رہتے ہیں۔ رب تعالیٰ کے بغیر کسی اور میں مشغولیت سے وہ پاک ہیں۔ دن رات رب کی تسبیحات بیان کرتے ہیں۔ وہ کبھی اس سے تھکتے نہیں یہی وہ ہیں جو بلند شان رکھنے والے ہیں اور رب تعالیٰ کے مقرب ہیں ان کے نام ہی '' ملائکہ

العلیون والمقربون " مشہور ہو گئے۔

(۲) **مدبرات امر**: ان میں سے کوئی سماوی ہیں اور کوئی ارضی ان کی تعداد کو صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ ہی جانتے ہیں جس طرح پہلے حدیث شریف بیان کی جاچکی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" اطت السماء وحق لها ان تئط ، ما فیها موضع قدم الا فیه ملک ساجد او راکع "

''آسمان میں چرچراہٹ پیدا ہوئی، کوئی اس میں قدم رکھنے کی جگہ نہیں جہاں کوئی فرشتہ رکوع کرنے والا اور سجدہ کرنے والا نہ ہو''

یہ فرشتے مختلف شکلیں رکھتے ہیں اور ان کے مختلف درجات ہیں یعنی عظمت کے لحاظ پر ان میں تفاوت (فرق) پایا جاتا ہے۔

فائدہ جلیلہ:

" لا یراهم علی ما هم علیه الا ارباب النفوس القدسیة وقد یظهرون با بدان یشترک فی رؤیتها الخاص والعام وهم علی هم علیه ، حتی قیل ان جبریل علیه السلام فی وقت ظهوره فی صورة دحیة الکلبی بین یدی المصطفیٰ صلی الله علیه وسلم لم یفارق سدرة المنتهی "

''فرشتوں کے منصب ومقام کو صرف ارباب نفوس قدسیہ (پاک نفوں والے) ہی جانتے ہیں۔ کبھی یہ فرشتے کئی بدنوں کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں، یعنی ان کے اجسام مختلف جگہ پائے جاتے ہیں۔ اس وقت ان کو خواص وعوام دیکھتے کہ وہ کسی شکل پر نمودار ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ بیان کیا گیا ہے کہ جبریل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے پاس اکثر اوقات حضرت دحیہ کلبی کی شکل میں حاضر ہوتے (جب آپ انسانی شکل میں آتے اس وقت ان کو صحابہ کرام بھی دیکھ لیتے تھے) لیکن آپ اس وقت سدرۃ المنتھیٰ سے بھی جدا نہیں ہوتے تھے''

اس کے بعد علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" ومثله یقع للکمل من الاولیاء وهذا ما وراء طور العقل ، وانا به من المومنین "

''یہی حالت اللہ تعالیٰ کے اولیاء کاملین کو بھی حاصل ہے کہ وہ مختلف بدنوں کے ساتھ ایک وقت میں کئی جگہ دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ مسئلہ عوام کی عقل سے بالاتر ہے لیکن علم والے اور پاک نفوس والے اس پر ایمان رکھتے ہیں، میں بھی اسی پر ایمان رکھتا ہوں'' (از روح المعانی)

فائدہ عظیمہ: صوفیاء کرام، اولیاء عظام کی نگاہ جہاں تک کام کرتی ہے۔ وہاں تک کسی اور کی نظر کی رسائی (پہنچ) نہیں۔ اس لئے صوفیاء کرام نے فرمایا کہ یہ ظاہری جہانوں کے بغیر اور جہان بھی ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کو ہی ودیعت (امانت) کے طور پر رکھا ہوا ہے۔ یعنی اسی کی ذات وصفات کی معرفت کے حصول میں مستغرق مخلوق رہتی ہے۔ جو اس ظاہری جہان کے احکام کے خطاب میں نہیں آتے۔ اور نہ ہی ان کو سجدہ کا حکم دیا گیا تھا۔ کیونکہ ان کو سوائے رب تعالیٰ کی ذات کی معرفت میں مستغرق ہونے کے اور کوئی شعور ہی نہیں تھا۔

اسی جہان میں ایک فرشتہ ہے۔ جس کا نام روح، قلم اعلیٰ اور عقل اول ہے:

'' وهو المرآة لذاته تعالیٰ فلا يظهر بذاته الا فی هذا الملک ''

''وہی فرشتہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی پہچان کے لئے آئینہ کی حیثیت رکھتا ہے، اسی میں اللہ تعالیٰ کا ظہور ہوتا ہے، یعنی وہ ذات باری تعالیٰ کا مظہر ہے''

اور وہی فرشتہ تمام مخلوق میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر ہے، وہی عالم دینوی اور عالم اخروی کا قطب، اور وہی جنت و دوزخ کا قطب ہے، اگر کوئی جنگل میں کسی ٹیلے پر رہنے والا ہے تو اس کا بھی وہی قلب ہے۔ اور اعراف والوں کا بھی وہ قطب ہے۔ اور اسی فرشتے نے لوح (محفوظ) پر ما کان و ما یکون کو لکھا۔ وہ آدم علیہ السلام کی تخلیق کو بھی جانتا تھا اور آپ کے مراتب کو بھی جانتا تھا۔ لوح کو قلم کے لکھتے وقت علم ذوق حاصل ہوا (کیونکہ اس میں وہ فرشتہ پہلے ہی لکھ چکا تھا):

'' وقد ظهر هذا الملک بكما له فی الحقيقة المحمدية كما يشير اليه قوله تعالیٰ، وكذالک اوحينا اليک روحا من امرنا، ولهذا كان ﷺ افضل خلق الله تعالیٰ على الاطلاق، بل هو الخليفة على الحقيقة فی السبع الطباق، وليس هذا بعيد فليفهم ''

''وہی فرشتہ کامل طور پر حقیقت محمدیہ میں ظاہر ہوا۔ جس کی طرف اللہ تعالیٰ کا ارشاد اشارہ کر رہا ہے اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف روح کو وحی کیا اپنے حکم سے (اس روح سے

مُراد اگرچہ قرآن پاک بھی لیا گیا ہے۔لیکن علامہ آلوسی نے یہاں وہی ملک مراد لیا ہے)
اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ مطلقاً تمام مخلوق سے افضل ہیں اور حقیقۃً سات طبقوں میں خلیفہ
آپ ہی ہیں۔اور یہ قول عقل سے بعید نہیں۔اسے سمجھنا چاہیے'' (از روح المعانی)

اسی سے یہ بھی سمجھ آ گیا کہ خلیفہ اعظم نبی کریم ﷺ ہی ہیں۔اور تمام جہانوں کے قطب آپ ہی ہیں۔یعنی تمام جہانوں کی مخلوق آپ کے اردگرد گھومتی ہے۔اور آپ ہی اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے مظہر ہیں۔اور آپ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اور مراتب کو جانتے تھے۔اور آپ کو یہ حکم نہیں دیا گیا تھا کہ آپ بھی حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو حالانکہ آپ کے نور کو پہلے پیدا کر دیا گیا تھا۔بلکہ آدم علیہ السلام کو ملائکہ نے آپ کی وجہ سے ہی سجدہ کیا تھا۔

تنبیہ: ابھی علامہ آلوسی رحمہ اللہ کی عبارت سے ''ملک'' کا معنی راقم نے فرشتہ کیا ہے۔یہ ظاہری معنی ہے،ورنہ حقیقی معنی ہی اس کا ''نور'' ہے وہ نور ہی سب سے پہلے تخلیق ہوا جو نور نبی کریم ﷺ کی اصلیت اور حقیقت ہے۔انشاء اللہ مزید بحث نبی کریم ﷺ کے نور کی آگے آئے گی۔

مصطفیٰ کریم ﷺ روحِ عالم ہیں:

" ولم تنزل تلک الخلافۃ فی الانسان الکامل الی قیام الساعۃ وساعۃ القیام ، بل متی فارق ھذا الانسان العالم مات العالم لانہ الروح الذی بہ قوامہ "
(روح المعانی)

''وہی خلافت عظمیٰ قیامت تک اور اٹھنے کی گھڑی تک کامل انسان (حضرت محمد ﷺ) کو حاصل رہے گی۔بلکہ یہ کامل انسان اگر جہان سے جدا ہو جائیں تو جہان ہی مر جائے۔کیونکہ وہی تو جہان کی روح ہیں۔اور ان ہی سے جہان قائم ہے واضح بات ہے کہ روح کی جسم سے جدائی باعث موت ہے''

فرشتوں کی صفات:

فرشتے نہ مذکر ہیں،نہ مونث۔نورانی مخلوق ہیں حقیقی علم ان کا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو ہی ہے کہ وہ کیسے ہیں۔کھانے پینے سے وہ بے نیاز ہیں،خواہشات نفسانیہ سے وہ پاک ہیں سونے کی ضرورت نہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

" فمنهم سجود لا يركعون ، وركوع لا ينتصبون ، وصافون لا يتزايلون ، ومسبحون لا يسأمون ، لا يغشاهم هم نوم العيون ، ولا سهو العقول ولا فترة الابدان ولا غفلة النسيان ومنهم امناء على وحيه والسنة الى رسله ومختلفون بقضائه وامره ومنهم الحفظة لعباده "

" بعض فرشتے سجدہ میں ہیں (ہمیشہ اسی سجدہ میں مشغول ہوتے ہیں) رکوع نہیں کرتے اور جو رکوع میں ہیں وہ اس سے اٹھتے نہیں جو صف بنا کر کھڑے ہیں وہ اس سے ہٹتے نہیں ۔ اور تسبیح پڑھنے والے اس سے تھکتے نہیں ۔ ان کی آنکھوں کو نیند ڈھانپتی نہیں ان کی عقلوں میں بھول نہیں ان کے بدن تھکتے نہیں وہ غافل نہیں ہوتے کہ بھول جائیں ۔ ان میں کئی وحی کے امین ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے رسولوں تک وحی پہنچاتے ہیں اور ان میں کئی مختلف قضاء وتدبیر پر مقرر ہیں اور ان میں سے کئی بندوں کے اعمال لکھنے پر مقرر ہیں یعنی کراما کاتبین ہیں" (کبیر)

فرشتے رب تعالیٰ کا خوف رکھتے ہیں:

فرشتے اگرچہ گناہوں سے پاک ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتحمید میں ہر وقت مشغول رہتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کا خوف وہ اپنے دلوں میں ایسا رکھتے ہیں جیسا کہ کوئی گنہگار دل میں خوف رکھے:

" يكونون خائفين وجلين حتى كان عبادتهم معاصى "

" وہ اس طرح خوف رکھتے ہیں کہ گویا اپنی عبادت کی کمی کو معصیت سمجھتے ہیں"

رب تعالیٰ نے ان کے خوف کو ذکر فرمایا ﴿ يَخَافُونَ رَبَّهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ ﴾ اور ارشاد فرمایا: ﴿ وَهُمْ مِنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴾

عقیدہ:

" رسل البشر افضل من رسل الملائكة ورسل الملائكة افضل من عامة البشر ، وعامة البشر افضل من عامة الملائكة " (شرح عقائد ص ۱۲۲)

" تمام انبیاء کرام مقربین فرشتوں سے افضل ہیں ۔ اور مقربین فرشتے عام انسانوں سے افضل ہیں ۔ عام انسان مومنین عام فرشتوں سے افضل ہیں"

خیال رہے کفار " اولئک کالانعام بل هم اضل " کا مصداق ہیں یعنی وہ تو جانوروں سے بھی گھٹیا ہیں کیونکہ جانوروں جتنا بھی انہیں شعور نہیں۔

فائدہ: ایک مرتبہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ صبح نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے یا نبی کریم ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے، تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں رب تعالیٰ کو کون سا کلام زیادہ پسند ہے؟ تو آپ نے فرمایا:

" ما اصطفاه الله لملائكته ، سبحان الله وبحمده"

وہی جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کے لئے پسند فرمایا (یعنی یہ پڑھایا جائے) سُبْحَانَ اللهِ وَ بِحَمْدِهِ

☆ جرائیل نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آکر عرض کیا جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرشتوں کی صلوۃ کے متعلق سوال کیا، آسمان دنیا کے فرشتے سجدہ میں ہیں، قیامت تک سجدہ میں ہی رہیں گے اور یہ تسبیح وہ پڑھ رہے ہیں: ﴿سُبْحَانَ ذِی الْمُلْکِ وَالْمَلَکُوْتِ﴾ اور دوسرے آسمان کے فرشتے قیامت تک یہ پڑھتے رہیں گے ﴿سُبْحَانَ ذِی الْعِزَّةِ وَالْجَبَرُوْتِ﴾ تیسرے آسمان کے فرشتے قیامت تک رکوع میں یہ پڑھتے رہیں گے ﴿سُبْحَانَ الْحَيِّ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ﴾ (از کبیر)

الفائدة الجليلة :

• اسی آیت کی تفسیر میں علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ یہ آیت دلیل ہے اس پر کہ امام اور خلیفہ مقرر کیا جائے تاکہ اس کی بات کو سنا جائے، یعنی جو وہ حکم دے اس کو سنا جائے اور اس کی اطاعت کی جائے تاکہ وہ لوگ ایک کلمہ پر جمع ہو جائیں اور اسی کے ذریعے احکام جاری ہوں۔

(از قرطبی)

خلیفہ بنانا واجب ہے:

" ولا خلاف فی وجوب ذلک بین الامۃ ولا بین الائمۃ "

''امام و خلیفہ بنانے کے واجب ہونے میں امت کا کوئی اختلاف نہیں۔ اور نہ ہی اس میں کسی امام کا اختلاف ہے بلکہ تمام اس پر متفق اور مجتمع ہیں کہ امام و خلیفہ مقرر کرنا واجب ہے''

ہاں اس میں اختلاف صرف معتزلہ کے رئیس ابوبکر اصم نے کیا ہے " حیث کان عن الشریعۃ اصم " اس کا لقب ''اصم'' اسی وجہ سے پڑھا تھا کہ وہ شریعت کو سمجھنے اور حق بات کو سننے سے بہرا تھا، گویا کہ پتھر کی طرح تھا۔ پھر اس کی راہ پر چلنے والے کئی اس کے ہمنوا بن گئے۔

صرف اس کا مذہب یہ تھا کہ شریعت میں خلیفہ مقرر کرنے کا کوئی حکم نہیں اور نہ ہی واجب ہے اس کا قول یہ تھا کہ خلیفہ مقرر کرنے کی کیا ضرورت ہے لوگ خود ہی حج کریں، جہاد کریں، آپس میں ایک دوسرے پر انصاف کریں، اپنی طرف سے خود ہی حق پر عمل کریں، خود ہی مال غنیمت تقسیم کریں مال کا انتظام خود ہی کریں، صدقات مستحقین میں خود ہی تقسیم کریں، جن پر حدود واجب ہوں ان پر لوگ خود ہی حدود قائم کریں۔

یہی وجوہ ہیں خلیفہ مقرر کرنے کی جب ان تمام وجوہ پر خود بخود عمل کر سکتے ہیں تو امام و خلیفہ مقرر کرنا ضروری نہ رہا۔ (از قرطبی)

لیکن یہ اس کے عقلی من گھڑت اقوال ہیں بغیر امام اور خلیفہ کے از خود لوگ عمل کریں۔ ایسا نہ کبھی ہوا اور نہ ہو سکے گا۔

خلیفہ بنانے کے وجوب پر دلائل:

(1) رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ انی جاعل فی الارض خلیفۃ ﴾ بیشک میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔

رب تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کرنے سے پہلے ان کے خلیفہ بنانے کا فیصلہ فرمایا اگر خلیفہ کی

ضرورت نہ ہوتی تو انسانوں کو پیدا کر دیا جاتا اور ان کو کھلی آزادی دے دی جاتی کہ تم اپنی مرضی سے سارے کام خود بخود کرتے رہنا۔ لیکن رب تعالیٰ نے انسانوں کو شتر بے مہار نہیں بنایا۔

(2) اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ یَادَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ ﴾

اے داؤد بیشک ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا۔

اگر زمین میں خلیفہ بنانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی تو داؤد علیہ السلام کو خلیفہ کیوں بنایا گیا۔

(3) اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ ﴾

''اور اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ایمان والوں اور اچھے عمل کرنے والوں سے کہ ان کو خلیفہ بنائے گا زمین میں''

اس سے بھی پتہ چلا کہ خلیفہ بنانا ضروری ہے از خود لوگوں کا اچھے کاموں پر اتفاق، برے کاموں سے اجتناب ممکن نہیں۔

(از قرطبی)

(4) نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''من مات ولم یعرف امام زمانه فقد مات میتة جاهلیة''

''جو شخص فوت ہو گیا اور اس نے اپنے زمانہ کے امام کو نہ پہچانا تو وہ جاہلیت کی موت مر گیا''

(5) ''ولانه الامة قد جعلوا اهم المهمات بعد وفات النبی صلی الله علیه وسلم نصب الامام حتی قدموا علی الدفن وکذا بعد موت کل امام''

''اور بیشک نبی کریم ﷺ کی امت (صحابہ کرام) نے نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد سب سے اہم کام امام کا مقرر کرنا ہی سمجھا، کیونکہ امام کا مقرر کرنا نبی کریم ﷺ کے دفن سے بھی پہلے ضروری سمجھا گیا''

اور یہی دستور ہی امام کی وفات پر چلا آ رہا ہے کہ امام کی وفات پر اس کے دفن سے پہلے دوسرا امام مقرر کیا جاتا ہے۔

(از شرح عقائد)

(6) صحابہ کرام کے اجماع سے بھی ثابت ہے کہ خلیفہ مقرر کرنا واجب ہے، اس لئے کہ سقیفہ بنی

ساعدہ میں جب صحابہ کرام خلیفہ مقرر کرنے کے لئے جمع ہوئے تو ابتدائی طور پر انصار اور مہاجرین میں کچھ اختلاف ہوا، یہاں تک کہ انصار نے کہا" منا امیر ومنکم امیر " ہمارا اپنا امیر ہوگا، اور تمہارا اپنا امیر ہوگا۔

لیکن جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کا ارشاد پیش فرمایا" الائمة من قریش " امام قریشی ہوں گے۔" اجمعت الصحابة علی تقدیم الصدیق " اب تمام صحابہ کرام کا اس پر اجماع ہوگیا کہ ابوبکر سب سے مقدم ہیں، ان کو ہی خلیفہ بنایا جائے " فرجعوا واطاعو القریش " انصار اپنے موقف سے ہٹ کر قریش کی اطاعت میں آ گئے۔ اس سے واضح ہوا کہ خلیفہ مقرر کرنا واجب تھا ورنہ اختلاف یا غور وخوض کرنے کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ (از قرطبی)

خلیفہ کون مقرر کرے؟

اس میں امامیہ (اہل تشیع) فرقہ کا مذہب یہ ہے کہ خلیفہ مقرر کرنے کا راستہ صرف " ھو النص من الرسول علیہ السلام ولا مدخل للاختیار فیہ " نبی کریم ﷺ کا فرمان ہوسکتا ہے یعنی آپ نے خود خلیفہ مقرر فرما دیا ہے اس میں اور کسی کو کوئی اختیار نہیں۔

اہل سنت وجماعت کا اس میں مذہب یہ ہے کہ خلیفہ مقرر کرنے میں اہل علم جو اجتہاد کا مقام رکھتے ہوں ان کو اختیار ہے کوئی نص کسی کے متعلق نہیں کہ نبی کریم ﷺ نے امام مقرر فرمایا ہو۔ البتہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اشارات ملتے ہیں۔ تاہم واضح ارشاد مصطفوی کسی کے متعلق بھی نہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بلافصل پر (اہل تشیع) کے دلائل:

(۱) نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" من کنت مولاہ فعلی مولاہ " جس کا میں مولی ہوں اس کے علی مولی ہیں

اس حدیث پاک سے اہل تشیع نے یہ دلیل پیش کی ہے:

" والمولی فی اللغة بمعنی اولی ، فلما قال فعلی مولاہ بفاء التعصیب

علم ان المراد بقوله مولی انه احق واولی ، فوجب ان یکون اراد بذلک الامامة وانه مفترض الطاعة" (قرطبی)

کہ مولی کا لغت میں معنی ہے " اولی " (بہتر، حقدار) اور " فعلی مولاہ " میں فاء ذکر ہے جو تعقیب کے لئے آتی ہے اب معنی یہ ہوگا۔ کہ جس کا میں مولی ہوں۔ میرے بعد متصل ہی علی اس منصب کے لئے اولیٰ اور حقدار ہوں گے۔ لہذا ضروری ہے کہ اس حدیث سے مراد امامت ہی ہو۔ لہذا فرض ہے کہ اس حدیث پر عمل کیا جائے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بلافصل مانا جائے۔

اسی حدیث کی آڑ میں حد سے تجاوز:

" عن ابی عبد الله علیه السلام فی قول الله عزوجل ان الذین آمنوا ثم کفروا ثم امنوا ثم کفروا ثم ازدادوا کفرا لن تقبل توبتهم ، قال نزلت فی فلان وفلان آمنوا بالنبی ﷺ وکفروا حیث عرضت علیهم الولایة حین قال النبی ﷺ " من کنت مولاه فهذا علی مولاه " ثم آمنوا بالبیعة لامیر المؤمنین علیه السلام ثم کفروا حیث مضی رسول الله ﷺ فلم یقروا بالبیعة ثم ازدادوا کفرا باخذهم من بایعه لهم فهؤلاء لم یبق فیهم من الایمان شئی "

(صافی شرح اصول کافی کتاب الحجة جزء سوم حصه ۲ ص ۹۸)

"(اہل تشیع نے بیان کیا) " ان الذین امنوا ثم کفروا " یہ آیت فلاں، فلاں کے حق میں نازل ہوئی کیونکہ انہوں نے نبی کریم اور ان کی آل پر ایمان لایا پھر جب نبی علیہ الصلوۃ وآلہ نے ان پر ان الفاظ سے " من کنت مولاہ فهذا علی مولاہ " (جس کا میں ولی ہوں، اس کے علی ولی ہیں) ولایت امیر المؤمنین کو پیش کیا تو کافر ہو گئے۔ پھر امیر المؤمنین کی بیعت کر کے ایمان لے آئے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد بیعت پر قائم نہ رہنے کی وجہ سے کافر ہو گئے۔ پھر ان کا کفر اور زیادہ ہو گیا، جب انہوں نے ان لوگوں سے اپنے لئے بیعت لے لی جنہوں نے امیر المؤمنین کی بیعت کر لی تھی، یہاں تک کہ ان کا ایمان ذرا بھی باقی نہ رہا"

اس عبارت کی شرح صافی میں دیکھیں کہ فلاں، فلاں سے مراد کون ہیں؟ صافی میں ہے "ایں آیت نازل شد در ابوبکر و عمر و عثمان " کہ یہ آیت ابوبکر اور عمر اور عثمان کے حق

میں نازل ہوئی یعنی تینوں حضرات معاذ اللہ مرتد ہو گئے ان کا ایمان ذرا بھی باقی نہ رہا۔

اس کے بعد صافی میں ہی اسی مقام پر ہے کہ کچھ صحابہ کرام معاذ اللہ مرتد ہو گئے اور کچھ گمراہ ہو گئے ۔یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بیعت کرنے والے تو تمام ہی صحابہ کرام تھے، اس لئے ان حضرات کے قول کے مطابق کوئی صحابی گمراہی سے نہ بچ سکا۔صافی کی عبارت یہ ہے:

" بعض تابعان ایشاں وہر کدام در باطن مومن بود مرتد شد مثل اکثر تابعان ائمه ضلالت "

''بعض ان کی (ابوبکر،عمر،عثمان کی) تابعداری کرنے والے جو باطن میں مومن تھے وہ مرتد ہو گئے اور اکثر ان گمراہ اماموں کی تابعداری کرنے کی وجہ سے گمراہ ہو گئے'' (معاذ اللہ)

اسی طرح اصول کافی کے اسی باب میں مندرجہ بالا مضمون سے آگے یہ ذکر ہے۔

" ان الذين ارتدوا على ادبارهم من بعد ما تبين لهم الهدى فلان و فلان ارتدوا عن الايمان فی ترک ولاية امير المؤمنين "

''اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی " ان الذين ارتدوا " سے مراد فلاں ،فلاں ،فلاں ہیں جو امیر المؤمنین کی ولایت کو چھوڑنے کی وجہ سے ایمان سے مرتد ہو گئے''

اس پر شرح صافی کی یہ عبارت دیکھیں:

امام گفت مراد عثمان و ابوسفیان ومعاویه است برگشتند از ایمان در مجلس منافقان بسبب ترك ولایت امیر المؤمنین علیه السلام۔

امام نے کہا اس سے مراد (یعنی فلان ،فلان ،فلان ہے مراد) عثمان ،ابوسفیان ،معاویہ ہیں جو امیر المؤمنین کی ولایت کو ترک کرنے کی وجہ سے ایمان سے دور ہو گئے اور منافقوں کی جماعت میں آ گئے۔

سوائے تین کے سب مہاجرین وانصار مرتد ہو گئے :(معاذ اللہ)

" المهاجرون والانصار ذهبوا الا واشار بيده ثلاثة "

(اصول کافی ، کتاب الایمان باب فی قلة عدد المؤمنین)

''سوائے تین کے تمام مہاجرین وانصار ایمان سے دور ہو گئے یہ ہاتھ کے اشارے سے حضرت جعفر نے بتایا''

" عن سديد عن ابی جعفر عليه السلام قال كان الناس اهل الردة بعد

النبی ﷺ الا ثلاثة فقلت من الثلاثة فقال المقداد بن الاسود وابو ذر الغفاری وسلمان الفارسی " (معرفت اخبار الرجال، بحوالہ تحفہ شیعہ ص ٦٥)

''سدید کہتے ہیں کہ میں نے ابوجعفر علیہ السلام سے سنا کہ آپ فرماتے ہیں کہ سب لوگ نبی کریم کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد سوائے تین کے مرتد ہوگئے۔ میں نے کہا وہ تین کون ہیں؟ تو انہوں نے کہا مقداد ابن اسود، ابوذر غفاری اور سلمان فارسی''

صحابہ کرام نے حضور ﷺ کا حکم دل سے نہیں مانا: (معاذ اللہ)

" فلما نزلت الولاية واخذ رسول الله ﷺ الميثاق عليهم لا مير المؤمنين عليه السلام آمنوا اقرار لا تصديقا فلما مضى رسول الله ﷺ و آله كفروا وازدادوا كفرا " (تفسیر قمی جلد اول ص ١٥٦)

''جب ولایت کا حکم آیا تو رسول اللہ نے ان (صحابہ) سے امیر المؤمنین علی علیہ السلام کے لئے وعدہ لیا۔ انہوں نے صرف زبانی اقرار کیا لیکن دل سے تسلیم نہیں کیا، پھر جب رسول اللہ اس دنیا سے تشریف لے گئے تو وہ کافر ہوگئے، اوران کا کفر زیادہ شدید ہوگیا''

صحابہ کرام وعدہ خلاف اور لعنت کے مستحق: (معاذ اللہ)

﴿ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ ﴾ اس آیۃ کی تفسیر میں اہل تشیع کی تفسیر قمی جلد اول ص ١٦٣ میں مذکور ''یعنی نقض عہد امیر المؤمنین علیہ السلام''یعنی اس آیت میں جن لوگوں کا ذکر ہے یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کے وعدہ کو توڑ دیا رب نے کہا ہماری ان پر لعنت ہے۔

اہل تشیع کی اس تفسیر کے مطابق واضح ہوگیا کہ صحابہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کر کے حضرت علی کی بیعت کا وعدہ توڑا اور وہ لعنت کے مستحق ہوئے۔

اس وعدہ سے مراد وہی وعدہ ہے جس کا ذکر ان حضرات کی کتب کے حوالہ سے ہو چکا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے متعلق صحابہ سے وعدہ لیا کہ تمہارے امام میرے بعد امیر المومنین علی علیہ السلام ہوں گے۔ صحابہ نے اس حکم کو مان کر پھر توڑ دیا۔ لہذا اس وعدہ کے توڑنے کی وجہ سے وہ تمام ہی لعنت کے مستحق ہوئے۔ (معاذ اللہ)

اہل تشیع کے دلائل کے جوابات:

جن آیات سے اہل تشیع نے صحابہ کرام کو مرتد، کافر، کفر میں زیادہ ہونا، ایمان سے مکمل خارج ہونا نبی کریم کا حکم دل سے نہ ماننا، وعدہ خلاف اور لعنت کا مستحق ہونا ثابت کیا ہے۔ وہ تمام آیات منافقین یا یہود یا نصاری یا کفار کے حق میں نازل ہوئیں جن کی غلط تفسیر بیان کر کے صحابہ کرام پر چسپاں کر دی گئیں ان آیات کی تفسیر انشاء اللہ اپنے اپنے محل میں ہوگی۔ یہاں اتنی وضاحت کافی ہے کہ وہ آیات جو کفار، منافقین، یہود اور نصاری کے حق میں نازل ہوئیں ان کو صحابہ کرام پر چسپاں کرنا۔ قرآن پاک کی تحریف معنوی نہیں تو اور کیا ہے؟ مقام افسوس یہ ہے کہ ایک اور فریق بتوں اور کفار کے حق میں نازل ہونے والی آیات کو انبیاء کرام اور اولیاء کرام پر چسپاں کر کے لوگوں کو گمراہ کر رہا ہے۔

اے اللہ تعالیٰ حق بات سمجھنے اور کہنے کی توفیق عطا فرما باطل فرقوں اور ان کے باطل نظریات سے مسلمانوں کو بچا۔

اہل تشیع کی پیش کردہ حدیث کا جواب:

پہلے ایک مرتبہ حدیث پاک کی طرف نظر کریں پھر جوابات کو دیکھیں مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ عوام کو بھی سمجھ آئے گا کہ حدیث پاک کا مطلب کیا ہے۔

حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی روایت کرتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ حجۃ الوداع سے واپسی پر مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام " غدیر خم " میں جلوہ افروز ہوئے تو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور اس وقت جتنے مسلمان حاضر تھے ان کی موجودگی میں یہ ارشاد فرمایا:

"یا معشر المسلمین الست اولی بکم من انفسکم قالوا بلی قال من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللھم وال من والاہ و عاد من عاداہ"

''اے مسلمانوں کی جماعت کیا میں تمہاری جانوں سے زیادہ تم پر حقدار نہیں ہوں؟ سب نے کہا ہاں یارسول اللہ آپ ہم تمام سے ہماری جانوں سے بھی اولیٰ (حقدار) ہیں آپ نے فرمایا جس کا میں مولیٰ ہوں اس کے علی مولیٰ ہیں''

اے اللہ جو علی سے محبت کرے تو اس سے محبت کر اور جو علی سے دشمنی کرے تو بھی اسے اسی کی

دشمنی کا بدلہ دے۔اس حدیث سے اہل تشیع نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بلافصل مانا جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔آیئے اسکے جوابات کو دیکھئے کہ اس حدیث کا اصل مقصد کیا ہے اور بیان کیا کہا جاتا ہے۔

پہلا جواب :

" انه ليس بمتواتر ، وقد اختلف في صحته ، وقد طعن فيه ابو داود السجستاني و ابو حاتم الرازي "

"یہ حدیث متواتر نہیں (اور اس میں صراحتہً خلافت کا ذکر ہی نہیں) اس حدیث کی سند پر ابوداؤد اور ابو حاتم رازی نے اعتراض کیا ہے"

ضعیف حدیث سے فرضیت ثابت کرنا اور اس پر عمل نہ کرنے والے صحابہ کرام کو کافر و مرتد کہنا کون سا انصاف ہے؟ اور یہ بھی خیال رہے کہ ابوداؤد اور ابو حاتم رازی نے اس حدیث پر یہ بحث کی ہے کہ اس حدیث سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بلافصل ثابت کی جائے تو دوسری حدیث اور اس میں تعارض لازم آئے گا۔دونوں میں سے ایک کا جھوٹا ہونا لازم آئے گا۔اس لئے دونوں حدیثوں کا مفہوم اس طرح بیان کیا جائے کہ دونوں کا سچا ہونا لازم آئے۔

دوسری حدیث یہ ہے:

"مزينة و جهينة و غفار و اسلم موالي دون الناس كلهم ليس لهم مولى دون الله ورسوله "

"مزینہ اور جہینہ اور غفار اور اسلم قبائل دوسرے لوگوں کے سوا میرے موالی ہیں۔اللہ اور اس کے رسول کے بغیر ان کا کوئی مولی نہیں"

اگر پہلی حدیث میں مولی کا معنی خلیفہ اور حاکم لیا جائے اور دوسری حدیث میں بھی یہی معنی لیا جائے۔تو مطلب یہ ہوگا کہ میرے بعد خلیفہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہوں گے،لیکن ان کی خلافت کے زیر اثر یہ قبائل نہیں ہوں گے جن کا ذکر دوسری حدیث میں ہے۔بلکہ یہ ثابت ہوگا کہ ان پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے سوا کوئی حاکم نہیں ہوگا۔

یہ معانی غلط ہوں گے دونوں حدیثوں میں تعارض لازم آئے گا۔ایک کا سچا ہونا،دوسری حدیث کے کذب کو مستلزم ہوگا اس لئے جب یہ معنی لیا جائے کہ جن کا میں مددگار ہوں اور جن کا میں محب و محبوب ہوں۔ان کے علی بھی مددگار ہوں گے اور ان کے محبوب و محب ہوں گے۔

دوسری حدیث کا بھی یہی مفہوم لیں کہ مزینہ، جہینہ، غفار اور اسلم قبائل میرے مددگار ہیں، میرے ساتھ محبت کرتے ہیں اللہ اور اس کا رسول ان کے مددگار ہیں اور ان سے محبت کرتے ہیں۔ اس عظیم نعمت کی وجہ سے وہ کسی اور کی مدد کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ اب دونوں حدیثوں کا مفہوم واضح اور درست سمجھ آئے گا۔

دوسرا جواب: اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حدیث ثقہ (باوثوق، قوی) روایوں سے ثابت ہے تو پھر بھی اس حدیث سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت ثابت نہیں ہو سکتی، بلکہ حدیث پاک سے آپ کی فضیلت ثابت ہو رہی ہے:

" وذلک ان المولیٰ بمعنی الولی فیکون معنی الخبر من کنت ولیه فعلي ولیه"

"یعنی مولی بمعنی ولی ہے۔ اب حدیث پاک کا معنی یہ ہوا کہ جس کا میں ولی ہوں علی اس کے ولی ہیں"

جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ فان اللہ ھو مولاہ ﴾ بیشک اللہ آپ کا مولی ہے یہاں بھی معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ کا ولی (دوست، محب، مددگار) ہے۔ حدیث پاک میں اصل مقصود یہ سمجھانا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ظاہر اور باطن ایک جیسا ہے، اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عظیم فضیلت کا ذکر کیا گیا ہے۔

تیسرا جواب: یہ حدیث پاک ایک خاص موقع پر وارد ہوئی۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ حضرت اسامہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کا کچھ جھگڑا ہو گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو کہا " انت مولای " تم تو میرے غلام ہو، اور میں تمہارا مولی ہوں۔ اس کے جواب میں حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے کہا " لست مولاک بل انا مولی رسول اللہ ﷺ" میں تمہارا غلام نہیں اور نہ ہی تم میرے مولی ہو بلکہ میں تو رسول اللہ ﷺ کا غلام ہوں اور وہی میرے مولی ہیں جب یہ معاملہ نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچا تو آپ نے فرمایا" من کنت مولاہ فعلی مولاہ " جس کا میں مولی ہوں علی اس کے مولی ہیں۔

اس سے واضح ہوا کہ اس حدیث میں مولی کا معنی آقا اور غلام کا مالک ہونا ہے۔ اس میں امامت و خلافت کا کوئی ذکر ہی نہیں۔

چوتھا جواب: جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہار گم ہوگیا۔ آپ قافلہ سے پیچھے رہ گئیں تو منافقین نے آپ پر تہمت لگادی، نبی کریم ﷺ منافقین کے بیہودہ بکواس سے بہت پریشان تھے۔ اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا "النساء سواها كثير" یارسول اللہ حضرت عائشہ کے بغیر اور بہت عورتیں ہیں۔ یہ بات حضرت عائشہ رضے اللہ عنہا کو بہت ناگوار گزری آپ کی پریشانی میں اور زیادہ اضافہ ہوگیا۔

"فوجد اهل النفاق مجالا فطعنوا عليه واظهروا البراءة منه"

"منافقوں کو موقع مل گیا انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر طعنہ زنی شروع کرلی اور اسی واقعہ کو آڑ بنا کر آپ سے بیزاری کا اعلان کردیا"

عجیب بات یہ ہے کہ وہی منافق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگانے والے بھی تھے اور وہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے طرف دار بن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مخالفت بھی کررہے تھے

اسی وجہ سے صحابہ کرام کی ایک جماعت سے مروی ہے:

"ما كنا نعرف المنافقين على عهد رسول الله ﷺ الا ببغضهم لعلى عليه السلام"

"رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہم منافقوں کو نہیں پہچانتے تھے سوائے اس کے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بغض کرتے تھے"

لہٰذا ان منافقوں کے باطل گمان اور ان کی چالبازیوں سے بچنے کے لئے صحابہ کرام کی راہنمائی کے لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "من كنت مولاه فعلى مولاه" جس کا میں مولی ہوں اس کے علی مولا ہیں۔ یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مخالفت کرکے میرے ہمدرد بننے والے جھوٹے ہیں وہ میری محبت سے دور ہیں۔

(ماخوذ از قرطبی)

پانچواں جواب: اہل عربیت نے "مولی" بمعنی "اولیٰ" لینا غلط قرار دیا ہے بلکہ یہاں تک کہا ہے کہ کسی مادے میں اور کسی جگہ بھی مفعل کا وزن "افعل" کے معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ البتہ ابوزید نے اسے جائز کہا ہے۔ اور اس نے جواز پر یہ دلیل پیش کی ہے کہ ابوعبیدہ نے "ھی

مولکم " کی تفسیر " اولی بکم " سے کی ہے۔لیکن جمہور اہل عربیت نے اس استدلال اور تمسک کو غلط قرار دیا ہے۔اس لئے کہ اگر کوئی شخص یہ کہنا چاہتا ہو کہ " فلان اولی منک " (فلاں آدمی تم سے بہتر ہے) تو چاہیے یہ کہ وہ یہ بھی کہہ سکے '' فلان مولی منک " حالانکہ یہ بالاتفاق باطل ہے

دوسری وجہ یہ ہے کہ ابوعبیدہ نے یہ نہیں بیان کیا کہ "مولی "،بمعنی " اولی " ہے بلکہ اس نے حاصل معنی بیان کیا ہے " ھی مولکم " سے پہلے والے الفاظ گرامی کو دیکھا جائے تو مفہوم بہت زیادہ واضح ہو جائے گا۔اصل مکمل مفہوم اس وقت سمجھ آئے گا جب اتنے الفاظ پر نظر ہو ﴿ماواکم النار ھی مولکم ﴾ آگ تمہارا ٹھکانا ہے اور تمہارے لوٹ کر جانے کا مقام ہے) یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔اگر یہاں مولیٰ بمعنی اولیٰ لیا جائے اور مولیٰ کا معنی خلیفہ، امام، صاحب ولایت کیا جائے تو آیت کریمہ کا مطلب ہی بدل جائے گا۔کیونکہ اس صورت میں معنی یہ ہوگا'' آگ تمہارا ٹھکانا ہے اور وہی تمہاری حاکمہ، صاحبہ ولایت اور خلیفہ ہے۔کیا کوئی شخص آیت کریمہ کا یہ معنی درست سمجھ سکتا ہے؟ جب یقیناً یہ معنی درست نہیں تو واضح ہو گیا کہ اس آیت میں مولیٰ کو اولیٰ کے معنی میں لے کر ولایت کسی نے ثابت نہیں کی۔

چھٹا جواب: اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ مولیٰ کا معنی اولیٰ ہے،تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا مطلب یہ ہو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اولیٰ بالتصرف ہوں گے،یعنی ان کو ولایت حاصل ہوگی،میرے بعد وہ خلیفہ بلافصل ہوں گے بلکہ اس کا یہ مطلب ہوگا کہ آپ محبت اور تعظیم کے لحاظ سے اولیٰ ہیں آپ اس کے حقدار ہیں کہ آپ سے محبت کی جائے اور آپ کی تعظیم کی جائے۔اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِاِبْرَاهِیْمَ لَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِیُّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ﴾

''بیشک سب لوگوں سے ابراہیم کے زیادہ حقدار وہ تھے جو ان کے پیرو ہوئے اور یہ نبی اور ایمان والے''

اس مقام پر لفظ ''اولیٰ'' صراحۃً ذکر ہونے کے باوجود ولایت کے معنی میں استعمال نہیں ہو سکتا،تو مولیٰ کو اولیٰ کے معنی میں لے کر کیسے ولایت اور خلافت کو ثابت کیا جا سکتا ہے۔

ساتواں جواب: لفظ مولیٰ سے جو ولایت سمجھ آ رہی ہے اس کا معنی محبت ہے، کیونکہ اس کے بعد آنے والے الفاظ مبارکہ اس پر دلالت کر رہے ہیں کہ مراد محبت ہی ہے۔ بعد میں آنے والے الفاظ مبارکہ یہ ہیں " اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ " اے اللہ جو شخص علی سے محبت کرے

تو اس سے محبت کر، اور جو ان سے عداوت رکھے تو بھی اسے عداوت کا بدلہ دے۔

اگر یہاں مراد " اولی بالتصرف " ہوتا تو اس طرح کہا جاتا " اللھم وال من کان فی تصرفہ وعاد من لم یکن کذالک " اے اللہ تو اس شخص سے محبت کر جو حضرت علی کی ولایت تصرف میں ہو، اور اس شخص کو سزا دے جو ان کی ولایت تصرف میں نہ ہو۔

حالانکہ ایسا نہیں فرمایا، بلکہ واضح طور پر محبت اور عداوت کا ذکر کیا، جس سے مقصد واضح ہے کہ مراد یہ ہے کہ آپ سے محبت کرنا ضروری ہے اور آپ کی عداوت سے بچنا ضروری ہے۔ جب ظاہر کلام سے مقصد یہی واضح ہے اگر اس کے بغیر اور کوئی مقصد نکالنے کی کوشش کی جائے تو نبی کریم ﷺ کی شان میں حرف آئے گا کیونکہ نبی کریم ﷺ نے واجبات بلکہ مستحسنات و مستحبات بھی لوگوں کو فصیح اور بلیغ زبان میں اس طرح سمجھا دیئے کہ حاضرین نے ان کو سمجھا، اور بعد میں آنے والے جو لغت عرب سے واقف ہوں وہ بھی سمجھ جاتے ہیں کہ اس کا کیا مطلب ہے۔

لیکن اگر یہ اتنا اہم مسئلہ ایسے الفاظ میں بیان کیا گیا ہو جو ظاہری الفاظ سے اس کا مقصود سمجھ نہ آ سکتا ہو تو لازم یہ آئے گا کہ معاذ اللہ نبی کریم ﷺ نے تبلیغ کرنے اور ہدایت دینے میں سستی اور لاپرواہی سے کام لیا اور فصیح و بلیغ زبان کو استعمال نہیں فرمایا۔

معلوم یہ ہوا کہ نبی کریم ﷺ کا مقصود یہی تھا جو کلام سے ظاہر طور پر سمجھ آ رہا ہے اور عربی زبان کے منشا کے مطابق ہے۔ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا یہ مطلب ہے کہ جس طرح میری محبت تم پر فرض ہے اسی طرح علی کی محبت تم پر فرض ہے اور جس طرح میرے ساتھ تمہیں عداوت رکھنا حرام ہے، اسی طرح علی سے عداوت رکھنا حرام ہے، یہی اہل سنت و جماعت کا عقیدہ ہے اور خود اہل بیت نے بھی اس حدیث کا یہی مقصد لیا ہے۔

ابو نعیم نے حسن مثنی ابن حسن السبط رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ حدیث " من کنت مولاہ فعلی مولاہ " کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر نص ہے؟ تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ اگر نبی کریم ﷺ اس سے خلافت کا ارادہ فرماتے تو یقیناً واضح طور پر ارشاد فرماتے جس سے تمام مسلمان سمجھ جائے اس لئے کہ نبی کریم ﷺ تمام لوگوں سے زیادہ فصیح کلام فرمانے والے تھے۔ اگر آپ کا مقصد خلافت کا حکم دینا ہوتا تو یقیناً اس طرح فرماتے:

" یا ایها الناس هذا ولی امری والقائم علیکم بعدی فاسمعوا له واطیعوا "

''اے لوگو یہ (علی) میرے تمام امور کے والی ہوں گے اور میرے بعد تمہارے حاکم ہوں گے۔ تم ان کی بات سننا اور اطاعت کرنا''

اس کے بعد آپ (حسن مثنی) نے فرمایا اگر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کام کے لئے اختیار کیا ہوتا، تو آپ پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت لازم ہوتی اور آپ کا اس امر سے پیچھے رہنا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے خلاف ورزی کا سبب بنتا جو بہت بڑا گناہ ہے، یعنی خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خاموش رہنا اور خلافت کے حصول کے لئے میدان عمل میں نہ نکلنا ان کے لئے گناہ کا سبب بنتا۔

اس کے بعد ایک شخص نے کہا کیا نبی کریم ﷺ نے یہ نہیں فرمایا " من کنت مولاہ فعلی مولاہ " حضرت حسن مثنی نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا: یاد رکھو خدا کی قسم اگر نبی کریم ﷺ خلافت کا ارادہ فرماتے تو آپ واضح طور پر اس طرح ارشاد فرماتے جس طرح نماز اور زکواۃ کو واضح بیان کیا۔ یعنی اس طرح ارشاد ہوتا:

" یا ایها الناس ان علیا والی امرکم من بعدی والقائم فی الناس بامری "

''اے لوگو علی میرے بعد تمہارے حاکم ہوں گے اور لوگوں میں میرے تمام امور کو قائم کریں گے، یعنی میرے جانشین ہوں گے''

آٹھواں جواب: حدیث پاک سے ظاہر طور پر یہ سمجھ میں آرہا ہے کہ یہاں دونوں ولایتیں یعنی نبی کریم ﷺ کی ولایت اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولایت ایک زمانہ میں مجتمع ہیں، کیونکہ حدیث شریف میں لفظ " بعدی " نہیں ہے جس سے پتہ چلے کہ حضرت علی نبی کریم ﷺ کے بعد ولایت و خلافت کے حقدار ہوں گے۔ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں حضرت علی کا والی ہونا یعنی مسلمانوں کا حاکم ہونا عقلاً منع ہے۔

البتہ اگر ولایت سے مراد محبت لی جائے تو دونوں ولایتوں کا ایک زمانہ میں جمع ہونا منع نہیں، کیونکہ دونوں سے ایک زمانہ میں محبت کرنا جائز ہے۔ لیکن دو کا ایک زمانہ میں حاکم ہونا اور امور میں تصرف کا والی ہونا، اس میں کئی خرابیاں ہیں جو محتاج بیان نہیں بلکہ روز روشن کی طرح واضح ہیں۔

ہاں اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا ثبوت فی الحال تو نہیں، بلکہ صرف اتنا ثابت ہو رہا ہے کہ آپ خلیفہ ہوں گے، تو اس بات کو تسلیم کرنا اتفاق واتحاد کی دعوت دینا ہے، کیونکہ اہل سنت وجماعت بھی اس کے قائل ہیں کہ آپ خلیفہ ہوئے ہیں لیکن اپنے وقت میں اس وقت آپ کی خلافت برحق ہے۔ لیکن اس سے خلافت بلافصل کا ثبوت نہیں۔ کاش اس ایک نکتہ کو تسلیم کر لیا جائے تو سب جھگڑے ہی ختم ہو جائیں۔

بظاہر اس پر وہم ہوتا ہے کہ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تخصیص کا کوئی مطلب نہیں نکلتا بلکہ اس طرح تو نبی کریم ﷺ کو خلفاء اربعہ (چار خلفاء راشدین) کا ذکر کرنا چاہئے تھا۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یقین کے درجہ تک یوں کہا جا سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی بذریعہ وحی خفی کے معلوم ہو چکا تھا کہ بعد میں اختلافات ہوں گے اور کئی لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا انکار کریں گے۔ اس لئے تاکید فرمائی کہ حضرت علی سے محبت کرنا، بغض وعناد نہ رکھنا، جب آپ کی خلافت کا وقت آئے تو آپ کی خلافت کو تسلیم کرنا، انکار نہ کرنا۔

اعتراض: حدیث شریف کی ابتداء میں لفظ ''اولیٰ'' موجود ہے۔ اس لئے '' مولیٰ '' کا معنی '' اولیٰ '' کر کے خلافت وامامت ثابت کرنا ہی صحیح ہے تم کیسے کہتے ہو کہ '' مولیٰ '' کا معنی '' اولی بالتصرف '' کرنا درست نہیں؟

جواب: یہ بات قابل تسلیم ہے کہ حدیث شریف کی ابتداء میں یہ الفاظ بھی پائے گئے ہیں '' الست اولی بالمومنین من انفسهم فی المحبة '' لیکن ان الفاظ مبارکہ کا صحیح معنی ہی یہ ہے ''کیا میں محبت میں مومنوں کی جانوں سے بھی زیادہ حقدار نہیں؟'' یعنی لوگ اپنی جانوں سے بھی زیادہ مجھ سے محبت کریں۔ اب اس معنی کے لحاظ سے یہ کہنا بھی ایمان کا حصہ ہے کہ لوگ اپنی جانوں سے زیادہ حضرت علی سے بھی محبت کریں۔

آیئے قرآن پاک میں دوسرے مقام پر دیکھئے جہاں لفظ '' اولیٰ ''استعمال ہے۔ وہاں بھی محبت اور شفقت کے معنی میں ہی آپ کو نظر آئے گا۔

زید بن حارثہ جن کو نبی کریم ﷺ نے متبنیٰ (منہ بولا بیٹا) بنایا ہوا تھا۔ لوگ ان کو زید بن محمد کہنے

لگے تو اس سے منع فرمایا گیا کہ متبنیٰ حقیقی بیٹا نہیں بن جاتا۔ اس لئے ''زید بن محمد'' نہ کہو۔ بلکہ نبی کریم ﷺ تمام مسلمانوں پر باپ کی طرح شفیق، بلکہ باپ سے بھی زیادہ شفیق ہیں۔ اور آپ کی ازواج مطہرات اہل اسلام کی مائیں ہیں۔

نسب کے لحاظ سے انسان اپنے آباء کے قریب ہوتا ہے لہذا ان کی طرف ہی منسوب ہوسکتا ہے۔ اور یہی حق ہے کہ اسے اپنے آباء واجداد کی طرف ہی منسوب کیا جائے۔ غیر کی طرف منسوب نہ کیا جائے، البتہ شفقت غیر سے زیادہ ہوسکتی ہے۔ اسی طرح تعظیم کے لحاظ سے کوئی شخص اپنے آباء سے زیادہ معظم ہوسکتا ہے۔

نبی کریم ﷺ تمام مسلمانوں کے نسبی باپ تو نہیں لیکن باپ سے زیادہ شفیق اور باپ سے زیادہ معظم ہیں۔ اسی طرح آپ کی ازواج مطہرات اپنی نسبی ماؤں سے زیادہ شفقت کرنی والی اور زیادہ تعظیم کے لائق ہیں۔ اسی مندرجہ بالا مضمون کو قرآن پاک میں ان الفاظ مبارکہ سے پیش کیا گیا:

﴿ اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهَاتُهُمْ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ کِتَابِ اللّٰهِ ﴾

''یہ نبی مسلمانوں پر ان کی جانوں سے بھی زیادہ شفیق و مہربان ہیں اور آپ کی ازواج مطہرات ان کی مائیں ہیں اور رشتہ والے اللہ کی کتاب میں (کتاب اللہ کے حکم کے مطابق) ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہیں''

اعتراض: اگر اس حدیث سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صرف محبت کرنے کا حکم ہو، تو حدیث کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ قرآن پاک میں تمام مومنوں سے محبت کرنے کا حکم تو آچکا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَاءُ بَعْضٍ ﴾

''مسلمان مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں یعنی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور مدد کرتے ہیں''

اس آیۃ کریمہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت بھی ثابت ہوگئی پھر حدیث سے محبت کرنے کے ذکر کا کیا فائدہ؟

جواب: آیۃ کریمہ سے اگرچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت ثابت ہو رہی ہے۔ لیکن وہ عام مسلمانوں کی محبت کے ضمن میں ہو رہی ہے اور حدیث پاک میں آپ کی محبت کا خصوصی حکم دیا جا رہا ہے عمومی ثبوت اور خصوصی حکم میں بہت بڑا فرق ہے۔ جیسے کوئی شخص کہے کہ میں تمام انبیاء کرام پر ایمان رکھتا ہوں۔ لیکن وہ خصوصی طور پر نبی کریم ﷺ کے اسم گرامی کو نہیں ذکر کرتا اور یہ نہیں کہتا کہ میرا ایمان نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر بھی ہے۔ تو اس شخص کا ایمان معتبر نہیں۔ حالانکہ وہ کہہ رہا ہے کہ میرا تمام انبیاء کرام پر ایمان ہے۔ انبیاء کرام کے ضمن میں نبی کریم ﷺ بھی آ گئے لیکن خصوصی ایمان نہ لانے کی وجہ سے اس شخص کا ایمان معتبر نہیں۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت کرنے کا خصوصی حکم اعلیٰ حیثیت رکھتا ہے۔

حضرات محترم خود غور فرمائیں کہ جو مضمون "اولیٰ" کا قرآن پاک کی آیۃ سے سمجھ آ رہا ہے۔ وہی حدیث پاک سے "مولیٰ" سے مراد لینا بہتر ہے یا کہ وہ معنی مراد لینا بہتر ہے، جس سے نبی کریم ﷺ پر نقص لازم آئے کہ آپ نے بہت اہم فریضہ کو بیان کرنے کا حق تبلیغ ادا نہیں کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ پر حرف آئے کہ آپ نے اپنا حق نہ لے کر نبی کریم ﷺ کی حکم عدولی کی۔

حدیث پاک کا مفہوم بہت واضح ہے، جسے بیان کر دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(از تحفہ اثنا عشریہ)

دوسری حدیث سے استدلال اور اس کے جوابات:

نبی کریم ﷺ نے غزوہ تبوک میں جاتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جب یہ حکم فرمایا کہ تم مدینہ طیبہ میں اہل بیت میں ہی رہو۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ عرض کیا **"یا رسول اللہ اتخلفنی فی النساء والصبیان"** یارسول اللہ کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑ کر جا رہے ہو؟
نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"اما ترضی ان تکون منی بمنزلۃ ھارون من موسی"

"کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ تمہارا میرے ساتھ اس طرح تعلق ہو جس طرح حضرت ہارون کا حضرت موسیٰ (علیہما السلام) سے"

''الا انه لا نبی بعدی ، ہاں البتہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوسکتا''

حضرت ہارون علیہ السلام کو موسی علیہ السلام کے کوہ طور پر جانے کے بعد ولایت حاصل ہوئی اگر آپ موسی علیہ السلام کے بعد بھی زندہ رہتے تو وہ ولایت ختم نہیں ہوسکتی تھی۔ ورنہ نبی کا کسی منصب سے معزول ہونا لازم آئے گا اور یہ ناجائز ہے کہ نبی کو معزول کیا جائے، کیونکہ نبی کو کسی منصب سے معزول کرنا اس کی توہین ہے۔ اسی طرح حضرت امیر (علی رضی اللہ عنہ) کو منصب ولایت وخلافت سے معزول کرنا ان کی توہین ہے۔

ثابت ہوا یہ منصب ولایت (حاکمیت وخلافت) حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی حاصل ہے تا کہ ان کی توہین لازم نہ آئے۔

پہلا جواب: یہ کہنا کہ ''اسم جنس کی اضافت جب علم کی طرف ہو تو وہ عموم کا فائدہ دیتی ہے'' یہ قول تمام اصولیین کے اقوال کے مخالف ہے بلکہ انہوں نے وضاحت کی ہے کہ یہ اضافت عہد پر دلالت کرتی ہے جیسے ''غلام زید'' میں غلام اسم جنس ہے، اور زید علم ہے، لیکن اضافت عموم پر دلالت نہیں کر رہی بلکہ اس میں خصوص پایا گیا ہے، جو عہد پر دلالت کر رہی ہے۔ چونکہ اضافت معنویہ میں تعریف باعتبار عہد کے اصل ہے۔

اور حدیث پاک میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول '' اتخلفنی والنساء والصبیان '' قرینہ ہے کہ اس خلافت سے مراد وقتی خلافت ہے، اس لئے کہ حضرت ہارون علیہ السلام فقط حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوہ طور پر جانے کے زمانہ میں خلیفہ تھے نہ کہ ہمیشہ کے لئے اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی نبی کریم ﷺ کے غزوہ تبوک میں جانے کے زمانہ میں خلیفہ تھے۔

اسی وجہ سے تو آپ یہ عرض کر رہے ہیں یا رسول اللہ آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑے جا رہے ہو اگر خلافت سے مراد نبی کریم ﷺ کی جانشینی ہوتی پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ نہ کہتے کیونکہ پھر تو آپ کو تمام مردوں اور عورتوں اور بچوں کی ولایت حاصل ہوتی۔

چونکہ آپ کو معلوم تھا کہ مجھے فقط حضور ﷺ کی غیر موجودگی میں یہ نیابت حاصل ہو رہی ہے اور

وہ عورتوں اور بچوں میں رہنا ہوگا کیونکہ مرد تو تمام غزوہ تبوک میں جار ہے ہیں۔ باقی معزولیت کا اعتراض اس لئے نہیں آتا کہ معزولیت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ عمل باقی ہو اور اس پر عمل کرنے والے کو معزول کر دیا جائے، جب عمل ہی ختم ہو جائے تو معزولیت لازم نہیں آتی۔

کیونکہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آ گئے تو ان کی غیر موجودگی ختم ہوگئی حضرت ہارون علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی غیر موجودگی میں ذمہ داری سونپی تھی۔ جب آپ واپس آ گئے تو ان کی ذمہ داری ختم ہوگئی معزول نہیں کیا گیا کہ توہین لازم آتی۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ طیبہ کی غیر موجودگی میں اپنا جانشین بنایا۔ جب آپ واپس تشریف لے آئے تو غیر موجودگی ختم ہوگئی۔ جو وجہ تھی خلیفہ بنانے کی جب وہ ہی ختم ہوگئی تو خلیفہ کی ضرورت از خود ہی ختم ہوگئی۔ معزولیت تو اسی وقت ہوتی کہ ضرورت خلیفہ موجود ہوتی اور خلیفہ کو معزول کر دیا گیا ہوتا۔ حالانکہ یہاں یہ صورت پائی ہی نہیں گئی۔ اور دلیل میں یہ پیش کیا جاتا ہے کہ صحت استثناء کے لئے مستثنیٰ منہ میں عموم ضروری ہے یہ اس وقت ہوتا ہے۔ جب مستثنیٰ متصل ہو، لیکن یہاں تو منقطع ہے اس لئے کہ آپ کا ارشاد " انه لا نبی بعدی " جملہ خبریہ ہے اور " ان " کے داخل ہونے کی وجہ سے تاویل مفرد میں ہے مفہوم اس طرح ہو جائے گا " الا عدم النبوة " ظاہر بات ہے کہ نبوت کا نہ پایا جانا حضرت ہارون علیہ السلام کے مراتب میں کوئی مرتبہ نہیں کہ مستثنیٰ متصل ہو۔ کیونکہ مستثنیٰ متصل ماقبل کے حکم میں پہلے داخل ہوتا ہے پھر خارج کیا جاتا ہے۔

نقیض نہ جنس نقیض ہوتی ہے اور نہ ہی ماقبل کے حکم میں داخل ہوتی ہے ثابت ہوا کہ یہ مستثنیٰ منقطع ہے متصل نہیں۔ عموم کی ضرورت متصل میں ہوتی ہے۔ اور اگر حدیث پاک سے یہ ثابت ہو جائے کہ حضرت ہارون علیہ السلام کی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تمام مراتب حاصل ہیں، تو اس سے کئی خرابیاں لازم آئیں گے اس لئے کہ حضرت ہارون علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام سے عمر میں بڑے تھے، اور موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ فصیح کلام فرماتے تھے اور موسیٰ علیہ السلام کی طرح نبی بھی تھے اور ان کے حقیقی بھائی بھی تھے۔

لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان مراتب میں سے کوئی بھی حاصل نہیں تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ عمر میں نبی کریم ﷺ سے چھوٹے تھے اور کلام میں فصاحت زیادہ تو دور کی بات ہے، نبی کریم ﷺ جیسی فصاحت بھی حاصل نہیں تھی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی نہیں تھے، اور نہ حضور کے حقیقی بھائی تھے۔

دوسرا جواب: یہ بات قابل تسلیم نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد حضرت ہارون علیہ السلام کو خلافت کا حاصل ہونا آپ کا منصب تھا، یہ کس طرح تسلیم کیا جائے حضرت ہارون علیہ السلام تو خود نبی تھے۔ تبلیغ کرنے میں خود مستقل تھے، اگر خود موسیٰ علیہ السلام کے بعد بھی آپ زندہ رہتے پھر بھی آپ کو نیابت کا مرتبہ حاصل نہیں ہوسکتا تھا اس لئے کہ جو خود نبی ہو اس کو نائب بنا کر اس کے مراتب کو کیسے کم کیا جا سکتا ہے جب یہ واضح ہے کہ اصالۃ نبوت میں شرف وقدر زیادہ ہے اور وہ قدر و منزلت نیابت میں نہیں۔ لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد ثابت کرنا بھی ممکن نہیں۔

تیسرا جواب: نبی کریم ﷺ نے حضرت ہارون علیہ السلام سے تشبیہ دے کر واضح کر دیا کہ حضرت ہارون علیہ السلام کو صرف اتنی دیر خلافت حاصل رہی جتنی دیر حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پر رہے اور اپنی قوم سے غائب رہے۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اتنی دیر خلافت حاصل رہی جتنی دیر نبی کریم ﷺ غزوہ تبوک میں رہے اور مدینہ سے غائب رہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد آپ کی خلافت حضرت یوشع اور حضرت کالب کو حاصل رہی۔

قربان جاؤں میں اپنے حبیب پاک علیہ السلام کے علم پر جنہوں نے ایسی کامل تشبیہ بیان فرمائی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں آپ کے موجود نہ ہونے کے زمانے میں خلافت حضرت ہارون علیہ السلام کو حاصل رہی اور آپ کی وفات کے بعد حضرت یوشع اور حضرت کالب کو حاصل رہی۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ کے موجود نہ ہونے کے زمانہ میں خلافت حضرت ﷺ کو حاصل رہی اور آپ کے وصال کے بعد دوسرے اصحابہ ثلاثہ (تینوں صحابہ کرام) کو پہلے خلافت حاصل ہوئی۔ حقیقت میں کامل تشبیہ ہی اس وقت حاصل ہو سکے گی جب اس طرح بیان کیا جائے جیسا کہ راقم نے بیان کیا ہے۔

اگر زیادہ سے زیادہ کوشش کر کے اس حدیث پاک سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو ثابت کیا ہی جائے اور ہم تسلیم بھی کر لیں تو پھر بھی خلافت بلافصل پر اس حدیث کو کسی طرح بھی دلیل نہیں بنایا جاسکتا، اتنا ہی ثابت ہوسکتا ہے کہ آپ اپنے وقت میں خلیفہ ہوں گے۔ یہی مذہب اہل سنت و جماعت کا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چوتھے مرتبہ پر خلافت کا حاصل ہونا برحق ہے۔ اس وقت مخالفت کی وجہ اجتہادی خطاء تھی حق حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب تھا۔ (از تحفہ اثنا عشریہ)

اگر نبی ﷺ کا مقصد یہ ہوتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ میرے بعد خلیفہ ہوں گے، تو آپ یہ فرماتے " **انت منی بمنزلة یوشع من موسی** " تمہیں میرے نزدیک وہ مرتبہ حاصل ہے جو یوشع کو موسیٰ علیہ السلام کے بعد حاصل ہوا تھا " **فلما لم یقل هذا دل علی انه لم یرد هذا** " جب آپ نے یہ نہیں فرمایا تو واضح ہوا کہ آپ کا مقصد ہی خلافت کو بیان کرنا نہیں تھا۔ بلکہ صرف بیان کرنا یہ مقصود تھا کہ تم میری غیر موجودگی میں اہل بیت کے خلیفہ ہو گے۔ جیسا کہ حضرت ہارون اپنے اہل بیت میں خلیفہ رہے۔ (از قرطبی)

چوتھا جواب: نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کا ایک خاص محل اور موقع ہے وہ یہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ غزوہ تبوک کی طرف تشریف لے جانے لگے تو آپ نے مدینہ طیبہ میں اپنی غیر موجودگی میں اپنے اہل اور پیچھے رہ جانے والے دوسرے حضرات پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا۔ منافق کہنے لگے " **انما خلفه بغضا وقلی له** " کہ محمد (ﷺ) علی (رضی اللہ عنہ) سے ناراض ہو گئے ہیں اس لئے ان کے پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب ان کے کلام کو سنا تو پیچھے جا کر نبی کریم ﷺ سے مل کر بتایا کہ منافق یہ کہتے ہیں تو اس وقت نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہ جھوٹے ہیں بلکہ میں نے تو تمہیں اس طرح پیچھے چھوڑا ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو چھوڑا تھا اور ساتھ ہی یہ فرمایا " **اما ترضی ان تکون منی بمنزلة هارون من موسی** " کیا تم یہ نہیں پسند کرتے کہ تمہیں میرے نزدیک وہ مرتبہ حاصل ہو جو حضرت ہارون علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاں حاصل تھا۔

اس سے واضح ہوا کہ یہ حدیث مطلق نہیں، بلکہ ایک خاص موقع اور محل پر یہ ارشاد فرمایا گیا اس سے خلافت ثابت کرنا درست نہیں۔

پانچواں جواب: نبی کریم ﷺ جب بھی کسی غزوہ پر تشریف لے جاتے تھے آپ کسی نہ کسی شخص کو مدینہ طیبہ میں خلیفہ بنا کر جاتے تھے۔ جیسا کہ آپ نے حضرت عبد اللہ ابن ام مکتوم کو بھی خلیفہ بنایا اور حضرت محمد بن مسلمہ (میم پر زبر) کو بھی خلیفہ بنایا۔ یقیناً یہ خلافت غیر موجودگی کی حالت میں ہوتی تھی۔ ورنہ ان دونوں صحابہ کے لئے بھی خلافت بلافصل ثابت کرنی پڑے گی۔

چھٹا جواب: جس روایت پر بحث جاری ہے وہ صرف حضرت سعد بن ابی وقاص سے مروی ہے جو خبر واحد ہے اس کے مقابل جو روایات حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے حق میں نازل ہیں وہ سند کے لحاظ سے قوی ہیں۔

روایت میں آتا ہے جب نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن میں (عامل بن کر) بھیجا۔ تو آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا آپ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کو کیوں نہیں بھیج رہے تو آپ نے فرمایا:

"انهما لا غنی بی عنهما ان منزلتهما منی بمنزلة السمع والبصر من الرآس"

"بیشک ان دونوں کی مجھے اپنے ساتھ بہت ضرورت ہے ان دونوں کو میرے ساتھ وہ مرتبہ حاصل ہے جو کانوں اور آنکھوں کو سر سے مرتبہ حاصل ہوتا ہے"

اور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "هما وزیر ای فی اهل الارض" وہ دونوں زمین میں میرے وزیر ہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ سے یہ روایت بھی ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا "ابوبکر وعمر بمنزلة هارون من موسی" ابوبکر اور عمر کو میرے ہاں وہ مرتبہ حاصل ہے جو حضرت ہارون علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاں حاصل تھا:

"وهذا الخبر ورد ابتداء و خبر علی ورد علی سبب ، فوجب ان یکون ابوبکر اولی منه بالامامة ......والله اعلم"

"جس روایت میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا ذکر ہے وہ مطلق ہے اس میں کوئی خاص وجہ اور کوئی خاص سبب نہیں، اور جس روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے اس میں منافقوں کا رد کیا گیا وہ خاص موقع اور محل کے مطابق ہے اسی سے سمجھ آ گیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلافت کے زیادہ حقدار تھے اسی لئے آپ کو خلیفہ بنانے میں صحابہ کرام کا اجماع حاصل ہوتا ہے" (از قرطبی)

حدیث قرطاس اور اہل تشیع:

حدیث قرطاس کی وجہ سے اہل تشیع نے کتنا حد سے تجاوز کیا ذرا توجہ فرمائیں:

ای عزیز آیا بعد ازیں حدیث که همه عامه روایت کرده اند هیچ عاقل رامجال آں هست که شک کند در کفر کسیکه عمر را مسلمان داند"

(جلاء العیون ص ۴۵)

''اے عزیز کیا اس حدیث (قرطاس) کے بعد جس کو عام راویوں نے بیان کیا ہے کیا کسی عقل مند شخص کے لئے یہ ممکن ہے ... عمر کے کفر میں یا جو شخص عمر کو مسلمان جانے اس کے کفر میں شک کرے'' (معاذاللہ)

اس عبارت سے یہ بھی پتہ چلا کہ اہل تشیع تمام اہل سنت و جماعت کو کافر مانتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مسلمان ماننے والے کافر ہیں۔ حالانکہ اہل سنت و جماعت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کا جلیل القدر صحابی اور دوسرا خلیفہ برحق مانتے ہیں۔

حدیث قرطاس کی وضاحت:

حدیث قرطاس سے مشہور روایات کو بیان کر کے اہل تشیع کے اعتراضات و جوابات کو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ کے تحفہ اثنا عشریہ، نووی رحمہ اللہ کی شرح مسلم، اور علامہ علی قاری رحمہ اللہ کی مرقاۃ شرح مشکوۃ کی روشنی میں بیان کیا جارہا ہے تاکہ اہل سنت و جماعت اور اہل تشیع کے عقائد کا واضح طور پر پتہ چل سکے۔ پہلے اصل روایات کو مدنظر رکھا جائے کہ اصل روایات کیا ہیں۔ پھر اہل تشیع کے اعتراضات اور ان کے جوابات اور اہل سنت و جماعت کا موقف سمجھنا آسان ہوگا۔

بخاری شریف سے دو حدیثیں اور ایک حدیث مسلم شریف سے پیش کی جارہی ہے:

(۱) حدثنا عبد الله بن محمد حدثنا عبد الرزاق اخبرنا معمر عن الزهری عن عبید الله بن عبد الله عن ابن عباس رضی الله عنهما قال لما حضر رسول الله ﷺ وفی البیت رجال فیهم عمر ابن الخطاب قال النبی ﷺ هلم اکتب لکم کتابا لا تضلوا بعده فقال عمر ان النبی ﷺ قد غلب علیه الوجع وعندکم القرآن حسبنا کتاب الله فاختلف اهل البیت فاختصموا منهم من یقول قربوا یکتب لکم النبی ﷺ کتابا لن تضلوا بعده ومنهم من

یقول ما قال عمر فلما اکثر واللغو والاختلاف عند النبی ﷺ قال رسول اللہ ﷺ قوموا قال عبید اللہ فکان ابن عباس یقول ان الرزیة کل الرزیة ما حال بین رسول اللہ ﷺ وبین ان یکتب لھم ذلک الکتاب من اختلافھم ولغطھم"
(صحیح بخاری جزء رابع کتاب الطب باب قول المریض قوموا عنی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جب نبی کریم ﷺ کے وصال شریف کا وقت قریب آ گیا۔آپ کے گھر کچھ حضرات موجود تھے اوران میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی تھے حضور نے ارشادفرمایا سامان کتابت لاؤ میں تمہیں ایک ایسی تحریر لکھ دوں کہ اس کے بعدتم گمراہ نہ ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی کریم ﷺ پر درد غالب ہوگیا تمہارے پاس قرآن پاک موجود ہے ہمیں کتاب اللہ کافی ہے۔جولوگ اس وقت نبی کریم ﷺ کے گھر موجود تھے ان میں اختلاف ہوگیا اور وہ آپس میں جھگڑا کرنے لگے۔بعض کہنے لگے (قلم ،دوات ،کاغذوغیرہ) قریب کروتا کہ آپ کوئی ایسی تحریر لکھ دیں جس کی وجہ سے تم گمراہ نہ ہو۔اور بعض حضرات نے اسی طرح کہا جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا۔ جب ان کا اختلاف اورشوروغل زیادہ ہوگیا تو نبی کریم ﷺ نے ارشادفرماؤ، اٹھ جاؤ ،عبیداللہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ مصیبت ،بہت بڑی مصیبت وہ تھی جو ان حضرات کا اختلاف اورشوروغل نبی کریم ﷺ اورآپ کی تحریر کے درمیان حائل ہوگیا۔

(۲) " حدثنا قتیبة حدثنا سفیان عن سلیمان الا حول عن سعید بن جبیر قال قال ابن عباس یوم الخمیس اشتد برسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم وجعه فقال ایتونی اکتب لکم کتابا لن تضلوا بعده ابدا فتنازعوا ولا ینبغی عند بنی تنازع فقالوا ما شانه اهجر استفهموه فذهبوا یردون علیه فقال دعونی فالذی انا فیه خیر مما تدعونی الیه واوصاهم بثلاث فقال اخرجوا الیهود والمشرکین من جزیرة العرب واجیزوا الوفد بنحو ما کنت اجیزهم وسکت عن الثالثة اوقال فنسیتها " (بخاری جزء ثالث باب عرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم ووفاتہ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا جمعرات کا دن، وہ جمعرات کا دن کتنا ہی سخت تھا، جس دن نبی کریم ﷺ کو درد شدید ہوگیا آپ نے فرمایا میرے پاس (لکھنے کا سامان) لاؤ میں تمہیں ایک ایسی تحریر لکھ دوں جس کے بعدتم گمراہ نہ ہو۔ حاضرین نے اس میں جھگڑا کیا کسی نبی کے سامنے جھگڑا

مناسب نہیں، بعض نے کہا نبی کریم ﷺ کی کیسی شان ہے کیا آپ کی زبان مبارک سے ہذیان اور مختلط کلام صادر ہوسکتا ہے؟ آپ سے سوال کرو تو پھر دوبارہ انہوں نے وہ معاملہ آپ پر پیش کیا، اس پر آپ نے فرمایا کہ مجھے چھوڑ دو کیونکہ میں جس حال میں ہوں وہ اس سے بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو، اور آپ نے تین باتوں کی ان کو وصیت کی، مشرکین اور یہود کو جزیرہ عرب سے نکال دینا اور (بیرون ممالک سے آنیوالے) قاصدوں کو اسی طرح انعام دینا (اچھا سلوک کرنا) جس طرح میں ان کو انعام دیتا تھا۔

سلیمان احول کہتے ہیں تیسری بات سے سعید بن جبیر خاموش رہے یا انہوں نے تو بیان فرمادیا لیکن مجھے یاد نہیں رہا۔

(۳) "حدثنا اسحق بن ابراهيم انا وكيع عن مالك بن مغول عن طلحة بن مصرف عن سعيد بن جبير عن ابن عباس انه قال يوم الخميس وما يوم الخميس ثم جعل تسيل دموعه حتى رايت على خديه كانها نظام اللؤلؤ قال قال رسول الله ﷺ ايتوني بالكتف والدواة او اللوح والدواة اكتب لكم كتابا لن تضلوا بعده فقالوا ان رسول الله ﷺ يهجر"

(مسلم جلد ثاني كتاب الوصية)

سعید بن جبیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جمعرات کا دن، وہ جمعرات کا دن کیسا شدید دن تھا پھر آپ کے آنسو جاری ہوگئے یہاں تک کہ میں نے آپ کے رخسار پر موتیوں کی طرح آنسو دیکھے، آپ نے کہا نبی کریم ﷺ نے فرمایا میرے پاس کاغذ اور دوات لاؤ یا آپ نے فرمایا "میرے پاس تختی اور دوات لاؤ (روای کو شک ہے) میں تمہیں ایک تحریر لکھ دوں کہ اس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہوگے انہوں نے کہا کیا نبی کریم ﷺ ہذیان اور مختلط کلام فرماسکتے ہیں؟

یہ وہ روایات جو حدیث قرطاس سے مشہور ہیں۔ ان روایات کو غلط بیان کر کے معاذ اللہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کافر کہا گیا۔

حدیث قرطاس کی وجہ سے اہل تشیع کے اعتراضات:

پہلا اعتراض: نبی کریم ﷺ کے ارشادات وحی ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴾

''نبی کریم ﷺ اپنی خواہشات نفسانیہ سے کوئی کلام نہیں فرماتے سوائے اس کے جو آپ کی طرف وحی نازل کی اس پر خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی شاہد ہے:

﴿ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون ﴾

جو اللہ کے اتارے پر حکم نہ کرے وہی لوگ کافر ہیں۔

جواب: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی کو رد نہیں فرمایا۔ بلکہ یہ کہنا کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی کو رد کیا ہے یہ کسی طرح بھی درست نہیں ہر شخص اپنے بزرگ یا عزیز بیمار کو راحت پہنچانے کا خیال کرتا ہے اگر کوئی بیمار شخص از خود حاضرین کی مصلحت اور فائدہ کے لئے کوئی مشقت برداشت کرنا بھی چاہے تو اس کے خدام، عزیز و اقارب اس کو منع کرتے ہیں کہ تم پہلے ہی شدت مرض میں مبتلا ہو اب مزید کوئی تکلیف نہ اٹھاؤ۔

اسی طرح جب نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کرام کی مصلحت کے پیش نظر شدت مرض کے دوران لکھنے کی تکلیف اٹھانے کا ارادہ فرمایا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے از روئے شفقت اور ادب واحترام کے پیش نظر نبی کریم ﷺ کو سنانے کی غرض سے عرض کیا کہ ہمیں کتاب اللہ کافی ہے۔ تاکہ نبی کریم ﷺ ہماری طرف سے مطمئن ہو جائیں کہ ہم انشاء اللہ کوئی کام کتاب اللہ کے خلاف نہیں کریں گے۔

اہل علم اور اہل عقل و دانش تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس شاندار عرض گزاشت اور دقیق نظر کو تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ سبحان اللہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نظر اس مسئلہ کی طرف بھی تھی کہ یہ تو یقینی بات ہے کہ نبی کریم ﷺ نے نیا کوئی ارشاد تو فرمانا ہی نہیں۔ کیونکہ اس واقعہ سے تین ماہ پہلے دین اسلام کی تکمیل اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی سے ہو چکی تھی:

﴿ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ﴾

''آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو دین پسند کیا''

گویا کہ اس آیت کریمہ سے نسخ، تبدیلی، زیادتی ونقصان کے احتمال کو ختم کر دیا گیا، اس کے بعد اگر کوئی نیا حکم نافذ کرنا مقصود ہوتا تو اللہ تعالیٰ کی اس آیت کریمہ کی تکذیب لازم آتی، حالانکہ نبی کریم ﷺ

سے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ آپ کوئی نیا حکم نافذ کر کے اللہ تعالیٰ کے حکم کو بدل دیتے۔

یقینی بات ہے کہ آپ سابقہ احکام کی توثیق ہی فرمانا چاہتے ہوں گے اور اسی کو سمجھتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو سنانے کے لئے عرض کیا کہ یارسول اللہ آپ ہمارے متعلق کوئی فکر نہ کریں ہم انشاءاللہ کتاب اللہ پر عمل کریں گے۔

حدیث پاک کے الفاظ پر توجہ کریں تو مندرجہ بالا تقریر کو ذہن قبول کرے گا۔ حدیث پاک کے ان الفاظ کو پھر دیکھیں اور غور وفکر کریں:

"ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قد غلبہ الوجع وعندنا کتاب اللہ حسبنا"

"بیشک نبی کریم ﷺ شدت درد و تکلیف میں ہیں ہمارے پاس کتاب اللہ ہے وہ ہمیں کافی ہے"

انکار بوجہ محبت مستحسن ہے:

اگر کوئی شخص اپنے کسی بزرگ مثلاً باپ، استاد، پیرومرشد کا کوئی کام کرنا چاہتا ہو وہ ازروئے شفقت اپنے عزیز کو کہے کہ تم یہ کام نہ کرو، چھوڑ دو، میں خود ہی کر لیتا ہوں۔

لیکن وہ عزیز اپنے بزرگ کی بات کو تسلیم نہ کرے بلکہ اصرار کرے کہ یہ کام مین نے کرنا ہی ہے تو اس کو نافرمان نہیں کہا جائے گا بلکہ اس کو باادب کہا جائے گا کہ اس نے باوجود اپنے بزرگ کے روکنے کے ادب کا بھی لحاظ کیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اسی طرح نبی کریم ﷺ کے آرام کی خاطر محبت سے انکار کیا جو یقیناً مقبول اور حسین ہے۔

حضرت علیؓ نے بوجہ محبت نبی کریمؐ کے ارشاد کا انکار کیا:

نبی کریم ﷺ نے جب مشرکین مکہ سے حدیبیہ کے مقام میں صلح کی اور اس میں چند شرائط پر صلح ہوئی اس صلح نامہ کی تحریر میں یہ واقع بھی درپیش آیا:

"فلما کتبوا الکتاب کتبوا ھذا ما قاضی علیہ محمد رسول اللہ قالوا لا نقر بھا فلو نعلم انک رسول اللہ ما منعناک ولکن انت محمد بن عبد اللہ فقال انا رسول اللہ وانا محمد بن عبد اللہ ثم قال لعلی بن ابی طالب امح رسول اللہ قال لا امحوک ابدا فاخذ رسول اللہ ﷺ

ولیس یحسن یکتب فکتب هذا ما قاضی علیه محمد بن عبد الله "

(متفق علیه، مشکوۃ باب الصلح)

"جب صلح نامہ تحریر کیا تو اس میں لکھا یہ ہے جس پر محمد رسول اللہ (ﷺ) نے فیصلہ کیا۔ انہوں (مشرکین) نے کہا ہم آپ کی رسالت کا اقرار ہی نہیں کرتے اگر ہمیں یہ معلوم ہوتا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں ہم آپ کو (عمرہ کرنے سے) نہ روکتے۔ لیکن تم محمد بن عبداللہ ہو۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں محمد رسول اللہ بھی ہوں اور محمد بن عبداللہ بھی ہوں۔ پھر آپ نے علی بن طالب (رضی اللہ عنہ) کو کہا اس سے لفظ رسول اللہ کو مٹا دو آپ نے کہا میں آپ سے کبھی نہیں مٹاؤں گا (یعنی لفظ رسول اللہ کو آپ کے اسم گرامی سے کبھی نہیں مٹاؤں گا) پھر نبی کریم ﷺ نے وہ صلح نامہ خود لیا اگرچہ آپ خود لکھنا زیادہ پسند نہیں فرماتے تھے پھر بھی آپ نے خود اس پر لکھا " هذا ما قاضی علیه محمد بن عبد الله " یہ وہ ہے جس پر محمد بن عبداللہ نے فیصلہ کیا ہے"

اس واقع سے بخوبی معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی کو تسلیم نہیں کیا بلکہ رد کیا اب اگر کوئی نامراد، بد بخت یہ کہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے (معاذ اللہ) رسول اللہ ﷺ کو رد کر کے وحی خدا کو رد کر دیا ہے یہ کہنا اپنی ہی بدبختی ہے ورنہ ہر ذی عقل وشعور سمجھتا ہے کہ آپ کا یہ انکار کمال محبت پر دلالت کر رہا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقصد یہ تھا کہ یا رسول اللہ جب آپ کو ہم دل و جان سے اللہ کا رسول مانتے ہیں تو پھر میں اپنے ہی ہاتھوں سے آپ کے اسم گرامی سے " رسول الله " کو مٹا دوں یہ ناممکن ہے۔ میرا ایمان یہ تسلیم ہی نہیں کرتا کہ یہ کام میں سرانجام دوں سبحان اللہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا انکار کیسی محبت پر مبنی تھا۔

خدارا ذرا عقل و ہوش سے کام لیتے ہوئے انصاف کریں کہ کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نبی کریم ﷺ کے ارشاد کو رد کرنے کے باوجود کمال ایمان اور عین محبت ہے یا نہیں؟ یقیناً آپ نے کامل ایمان اور کامل محبت سے ہی انکار کیا۔ یہ انکار ہی کیسا حسین ہے جو اپنے دامن میں محبت کے موجزن دریا کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کمال شفقت و رحمت کی وجہ سے انکار کیا جو عین ایمان اور حقیقی محبت ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بوجہ عذر انکار کیا:

" حدثنا قتیبة بن سعید قال نالیث عن عقیل عن الزهری عن علی بن حسین ان الحسبن بن علی بن ابی طالب ان النبی ﷺ طرقه وفاطمة فقال الا تصلون فقلت یا رسول الله انما انفسنا بید الله فاذا شاء ان یبعثنا بعثنا فتصرف رسول الله ﷺ حین قلت له ذلک ثم سمعته وهو مدبر یضرب فخذه ویقول وکان الانسان اکثر شئی جدلا "

(مسلم کتاب صلوة المسافرین باب الحث علی صلوة اللیل وان قلت)

'' حضرت امام حسین نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا نبی کریم ﷺ ایک رات میرے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے ،فرمایا تم نماز تہجد ادا نہیں کرتے ؟ میں نے کہا یا رسول اللہ ہماری جانیں اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں جب ہمیں وہ اٹھانا چاہتا ہے ہم اٹھتے ہیں ۔ (حضرت علی کہتے ہیں) جب میں نے یہ کہا تو نبی کریم ﷺ واپس لوٹ پڑے ، پھر میں نے سنا کہ آپ واپس ہونے کے دوران اپنی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے فرمارہے ہیں " وکان الانسان اکثر شئی جدلا " انسان سب چیزوں سے زیادہ جھگڑا کرنے والا ہے''

اسی حدیث کی شرح میں علامہ نووی ذکر کرتے ہیں :

" والمختار فی معناه انه تعجب من سرعة جوابه وعدم موافقته له علی الاعتذار بها ولهذا ضرب فخذه "

'' اس حدیث پاک کے معنی میں مختار قول یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جلد بازی سے جواب دینے اور نبی کریم ﷺ کے ارشاد پر بوجہ عذر جواب نہ دینے پر حضور کو تعجب ہوا ، اسی تعجب کی وجہ سے آپ نے اپنی ران پر ہاتھ مارا''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہاں یہ عرض نہیں کیا کہ یا رسول اللہ نہیں اٹھ سکے اب اٹھتے ہیں ۔ بلکہ عرض کیا ہمیں رب جب اٹھاتا ہے اس وقت اٹھتے ہیں ۔ بظاہر یہ جواب رد پر دلالت کرتا ہے ۔لیکن حقیقت میں عذر پیش کیا جارہا ہے ۔اگر چہ جواب میں جلد بازی سے معمولی کوتاہی ہوگئی ۔لیکن نبی کریم ﷺ نے بھی تعجب کیا ناراضگی کا اظہار نہیں فرمایا ۔اس لئے اس جواب سے معاذ اللہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان

میں کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

دوسرا اعتراض: حضرت عمر نے نبی کریم ﷺ سے کلام کو ہذیان سے تعبیر کیا حالانکہ ہذیان تو اس شخص سے سرزد ہوتا ہے جس کا عقل نہ ہو مجنون ہو۔ انبیاء کرام میں جنون کا پایا جانا محال ہے اور ان سے ایسے کلام کا واقع ہونا جو بے اعتبار رہو مختلط (غلط اور صحیح سے خلط ملط) ہونا ممکن ہے ورنہ انبیاء کرام کے اقوال اور افعال بے اعتبار ہو جائیں گی۔ حالانکہ انبیاء کرام کے افعال اور اقوال ہر وقت قابل اتباع ہوتے ہیں۔ ہاں البتہ وہ افعال انبیاء کرام کے ساتھ خاص نہ ہوں۔

لہذا حضرت عمر کا نبی کریم ﷺ کے کلام کو ہذیان سے تعبیر کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گستاخی ہے۔

جواب: یہ قول حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرنا ہی غلط ہے بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب یہ کہا ہمارے پاس قرآن پاک ہے ہمیں اللہ تعالیٰ کی کتاب کافی ہے۔ اس وقت صحابہ کرام دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ بعض حضرات کہہ رہے تھے کہ ہمارے پاس اللہ کی کتاب ہے وہ کافی ہے نبی کریم ﷺ شدید مریض ہیں ان کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں۔

یہ ہذیان والا کلام ان حضرات کا ہے جو لکھنے کو پسند فرما رہے تھے اور وہ استفہام انکاری کے طور پر کلام کر رہے تھے۔ استفہام انکاری کا یہ مطلب ہے کہ سوالیہ انداز پر کسی بات کو رد کر دیا جائے جیسے کوئی شخص کسی دوسرے کو کہے یہ کام تم نے کیا ہے اور وہ جواب میں یہ کہے کہ کیا میں نے کیا ہے؟ اس کا مقصد یہ ہے کہ ایسا کام میں نہیں کر سکتا:

"وقال القاضی عیاض وقوله اهجر رسول الله ﷺ، لکذا هو فی صحیح مسلم وغیره اهجر علی الاستفهام وهو اصح من روایة من روی هجر ویهجر لان هذا کله لا یصح منه صلی الله علیه وسلم لان معنی هجر هذی وانما جاء هذا من قائله استفهاما للانکار علی من قال لا تکتبوا ای لا تترکوا امر رسول الله ﷺ وتجعلوه کامر من هجر فی کلامه لانه صلی الله علیه وسلم لا یهجر"

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث میں قول " اهجر رسول الله ﷺ " مسلم

وغیرہ میں جو آیا ہوا ہے وہ استفہام کے طور رہے۔ یہ استفہام والی روایت " ھجر اور یھجر " والی روایتوں سے زیادہ صحیح ہے، کیونکہ " ھجر " کا معنی ہذیان ہے یعنی مختلط کلام کرنا۔ اور یہ کلام استفہام انکاری کے طور پر واقع ہے۔ یعنی وہ حضرات جو اس کے قائل تھے کہ امر کتابت کو نہ چھوڑا جائے بلکہ اس پر عمل کیا جائے وہ استفہام انکاری کے طور پر اس طرح کہہ رہے تھے کیا نبی کریم ﷺ کا کلام ہذیان ہوسکتا ہے؟ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔

اسلئے جب آپ سے ہذیان سرزد نہیں ہوسکتا تو آپ سے لکھانا چاہئے۔ کیونکہ آپ لکھنے کا حکم دے رہے ہیں وہ حق پر مبنی ہے یہ بھی خیال رہے کہ راقم کے نزدیک جن روایات میں " ھمزہ استفھام " ظاہر نہیں ان میں بھی یقیناً ہمزہ مقدر ہے۔ اس طرح تمام روایات میں مطابقت ہوگی۔ سب کا ترجمہ استفہام انکاری کے مطابق ہی صحیح ہے۔

اس طرح قرآن پاک میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ستاروں، چاند اور سورج کو خدا کہنا استفہامیہ انداز پر ہے لیکن اکثر مترجمین اس کو نہ سمجھ سکے ترجمہ اقرار اور خبر کے مطابق کر کے غلطی کے مرتکب ہوئے۔ راقم کی کتاب تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان میں وضاحت دیکھیں۔

تیسرا اعتراض: نبی کریم ﷺ کی محفل پاک میں حضرت عمر نے اپنی آواز کو بلند کیا حالانکہ نبی کریم ﷺ کی محفل میں آواز کو بلند کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ﴾

"اے ایمان والو اپنی آوازیں اونچی نہ کرو اس غیب بتانے والے (نبی) کی آواز سے اور ان کے حضور بات چلا کر نہ کرو جیسے آپس میں ایک دوسرے کے سامنے چلاتے ہو کہ کہیں تمہارے عمل برباد نہ ہوجائیں اور تمہیں خبر نہ ہو"

اس آیہ کریمہ سے واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ کے حضور چلانا عمل کے ضائع کرنے کا سبب ہے، تو حضرت عمر نے اپنی آواز کو کیوں بلند کیا؟

جواب: یہ اعتراض غلط فہمی پر مبنی ہے اور یا حق سے چشم پوشی کی گئی ہے۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کی

آواز مبارک پر کسی کی آواز بلند نہیں ہوئی نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اور نہ کسی اور صحابی کی۔ نبی کریم ﷺ کے حضور صحابہ کرام کا ایک دوسرے سے کلام کرنا ہمیشہ جاری رہا اس سے منع نہیں کیا گیا بلکہ قرآن پاک اس کے جواز کی طرف دو وجہ سے اشارہ کر رہا ہے۔

ایک وجہ یہ کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿ لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ﴾ تم اپنی آوازیں نبی کی آواز سے اونچی نہ کرو یہ نہیں فرمایا:

﴿ لا ترفعوا اصواتکم بینکم عند النبی ﴾

تم اپنی آوازیں نبی کریم کے حضور ایک دوسرے پر بلند نہ کرو۔

اس سے صاف سمجھ آتا ہے کہ اپنی آوازیں نبی کریم ﷺ کی آواز پر بلند کرنا اعمال کے ضائع کرنے کا سبب تھا نہ کہ ایک دوسرے سے اپنی آواز کو بلند کرنا اعمال کے ضائع کرنے کا سبب تھا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ کجھر بعضکم لبعض ﴾ جیسے آپس میں ایک دوسرے سے چلاتے ہو (ایسی چلا کر نبی کریم ﷺ سے باتیں نہ کرو)۔ قرآن پاک کے یہ الفاظ صاف صاف بتا رہے ہیں کہ آپس میں ایک دوسرے سے بلند آواز سے بات کرنا جائز تھا۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ یہ ثابت کرنا ممکن ہی نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی آواز کو بلند کیا بلکہ آپ نے تو صرف اتنا کہا " حسبنا کتاب الله " ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے۔

اس پر صحابہ کرام کے دو گروہ بن گئے کچھ کہہ رہے تھے کہ سامان کتابت لانا چاہئے کچھ کہہ رہے تھے ضرورت نہیں۔ چونکہ وہاں کئی صحابہ کرام کا آپس میں ایک دوسرے سے کلام کرنے کی وجہ سے آواز بلند ہوئی یہ قدرتی امر ہے کہ جب کئی آدمی آپس میں کلام کریں تو آواز بلند ہو ہی جاتی ہے اس آواز کے بلند ہونے میں سب ہی شریک تھے جو صحابہ کرام لکھانے کے حق میں تھے وہ بھی کلام کر رہے تھے اور جو صحابہ کرام کہہ رہے تھے ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے وہ بھی کلام کر رہے تھے۔ صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر اعتراض کرنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔

اور نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد گرامی " لا ینبغی عندی تنازع " (میرے پاس جھگڑا کرنا

مناسب نہیں) سے واضح ہو رہا ہے کہ کسی صحابی کی آواز نبی کریم ﷺ کی آواز پر بلند نہیں ہو رہی تھی ورنہ حضور ﷺ "لا ینبغی" کے الفاظ سے ذکر نہ فرماتے کیونکہ اس کا معنی ہے "مناسب نہیں"

اگر نبی کریم ﷺ کی آواز مبارک پر کسی کی آواز بلند ہو رہی ہوتی تو آپ واضح طور پر فرماتے کہ" میرے پاس جھگڑا کرنا حرام ہے" اور نبی کریم ﷺ نے جو ارشاد فرمایا " قوموا " (اٹھ جاؤ) اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ آپ شدید مریض تھے یہ ہر شخص سمجھتا ہے کہ مریض کا مزاج ہی ایسا ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے پاس باتوں کو پسند نہیں کرتا۔

اور یہ بھی واضح ہے کہ انبیاء کرام کا مریض ہونا بدن کا ضعیف ہونا جائز ہے یہ ان کی شان کے منافی نہیں اس لئے کہ مرض سے گنہگار مریض کے گناہ معاف ہوتے ہیں اور نیک لوگوں کے مدارج بلند ہوتے ہیں۔

چوتھا جواب: حضرت عمر نے ضروریاتِ دین کا انکار کیا اور حق تلفی کی ہے کیونکہ اگر نبی کریم ﷺ لکھ دیتے تو کوئی اختلاف نہ رہتا، آج اصول وفروع میں جو اختلاف ہیں وہ فقط حضرت عمر کے انکار کی وجہ سے ہیں۔ لہٰذا ان تمام اختلافات کا وبال حضرت عمر کی گردن پر ہے۔

جواب: یہ کہنا ہی غلط ہے کہ نبی کریم ﷺ جو لکھنا چاہتے تھے وہ ضروریات دین سے تھا اس لئے کہ نبی کریم ﷺ جو لکھنا چاہتے تھے اس میں تین احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ آپ جتنے احکام پہلے بیان کر چکے تھے ان میں زیادتی فرمانا چاہتے تھی۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ آپ پہلے احکام کو منسوخ فرمانا چاہتے تھے، اور تیسرا احتمال یہ ہے کہ آپ پہلے ہی احکام کی تاکید فرمانا چاہتے تھے۔ پہلے دونوں احتمال باطل ہیں۔ اس لئے کہ اس واقعہ سے تین ماہ پہلے یہ آیہ کریمہ نازل ہو چکی تھی:

﴿ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ﴾

"آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا اور میں نے اپنی نعمتیں تم پر مکمل کر دیں اور تمہارے لئے دین اسلام پسند کیا ہے"

تین ماہ پہلے دین مکمل ہو چکا ہے اب اس میں زیادتی یا نسخ کرنے سے اس آیہ کریمہ کی

تکذیب لازم آتی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے قرآن پاک کی آیت کی تکذیب ہو۔ اگر پہلے ہی احکام کی تاکید ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ پہلے یہ واضح طور پر بیان نہیں فرمایا کہ میرے جانشین حضرت علی رضی اللہ عنہ ہوں گے۔ اگر ایسا آپ نے فرمایا ہوتا تو اب امید کی جاسکتی تھی کہ آپ نے دوبارہ اسی امر کی تاکید فرمائی ہو اور لکھنا چاہتے ہوں لیکن یہ ثبوت پیش کرنا ممکن نہیں۔

جن دو حدیثوں سے خلافت بلا فصل کو پیش کیا جاتا ہے۔ ان کا رد پہلے ہی کر دیا گیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ جو وصیتیں لکھنا چاہتے تھے وہ آپ نے زبانی ہی ارشاد فرما دیں۔ وہ احادیث جو شروع بحث میں بیان کی جاچکی ہیں ان سے یہ واضح ہے کہ آپ نے یہ فرمایا:

(۱) مشرکین اور یہود کو جزیرہ عرب سے نکال دینا۔

(۲) دوسرے ممالک سے آنے والے قاصدوں سے میری طرح اچھا سلوک کرنا اور ان کو میری طرح انعامات دینا۔

(۳) تیسری وصیت راوی کو بھول گئی لیکن محدثین نے وضاحت کی کہ وہ تیسری وصیت یقیناً وہی ہوگی جو آپ نے دوسرے اوقات میں بیان فرما دی تھی وہ یہ ہے کہ آپ نے فرمایا "لشکر اسامہ کو غزوہ کے لئے بھیج دینا اسے روکنا نہیں اور اسی طرح یہ بھی فرمایا" میری قبر کو سجدہ گاہ نہ بنانا۔

اور یہ بات بھی واضح ہے کہ اگر نبی کریم ﷺ ضروریات دین سے کوئی مسئلہ لکھنا چاہتے ہوتے تو ضرور بر ضرور آپ واضح طور پر لکھتے اور اشارہ، کنایہ سے نہ ارشاد فرماتے کیونکہ آپ پر فرض تھا کہ آپ ضروریات دین کے تمام مسائل کو کھول کر بیان کریں۔

معاذ اللہ ایسے اہم مسائل میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کوئی پرواہ نہ ہوتی۔ اور یہ بھی خیال رکھا جائے کہ یہ واقعہ جمعرات کا ہے اور نبی کریم ﷺ کا وصال پیر کو ہوا۔ جب بعد میں اہل بیت اطہار کو آپ کے پاس علیحدہ بیٹھنے کے واقع بھی میسر آئے لیکن نبی کریم ﷺ نے اتنے دنوں میں پھر لکھنے کا ارادہ نہیں فرمایا تو اس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ آپ کو اطمینان حاصل ہو چکا تھا کہ صحابہ کرام قرآن پاک پر عمل کریں گے ان کو وصیت لکھ کر دینے کی ضرورت نہیں۔

اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ضرورتِ دین کا انکار کیا ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ ایک اہم مسئلہ بھی مسئلہ خلافت تحریر فرمانا چاہتے تھے تو اس میں نبی کریم ﷺ کی شان میں فرق آئے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ ﴾

''اے رسول پہنچا دو جو کچھ اترا تمہیں تمہارے رب کی طرف سے اور اگر ایسا نہ ہوا تو تم نے اس کا کوئی پیام نہ پہنچایا اور اللہ تعالیٰ تمہاری نگہبانی کرے گا لوگوں سے''

یعنی نبی کریم ﷺ پر ضروری تھا کہ آپ اللہ تعالیٰ کا پیغام بغیر خوف وخطر پہنچا دیں اس میں آپ سے معاذ اللہ کوئی کوتاہی لازم آئے یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ پھر نبی کریم ﷺ اپنی امت پر رحیم وشفیق بھی ہیں، رحیم وشفیق نبی اپنی امت کو ضروری مسئلہ سے آگاہ نہ کرے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بلکہ یہ مسئلہ ضروریات دین سے تھا ہی نہیں۔ اسی وجہ سے آپ نے بیان نہیں فرمایا۔ آپ کی رحمت وشفقت کا اندازہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ گرامی سے کریں کہ آپ کتنے ہی زیادہ رحیم وشفیق ہیں:

﴿ لَقَدْ جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُفٌ رَّحِیْمٌ ﴾

''بیشک تمہارے پاس تشریف لائے تم میں سے وہ رسول جن پر تمہارا مشقت میں پڑنا گراں ہو تمہاری بھلائی کے نہایت چاہنے والے مسلمان پر کمال مہربان ہیں''

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا موقف:

" حدثنا اسحق اخبرنا بشر بن شعیب حدثنی ابی عن الزھری قال اخبرنی عبد اللہ بن کعب ان عبد اللہ بن عباس اخبرہ ان علی بن ابی طالب خرج من عند النبی ﷺ فی وجعہ الذی توفی فیہ فقال الناس یا ابا حسن کیف اصبح رسول اللہ ﷺ قال اصبح بحمد اللہ بارئا فاخذ بیدہ العباس فقال الا تراہ انت واللہ بعد الثلاث عبد العصا واللہ انی لاری رسول اللہ ﷺ سیتوفی فی وجعہ وانی لاعرف فی وجوہ بنی عبد المطلب الموت فاذھب بنا الی رسول اللہ ﷺ فنسالہ فیمن یکون الامر فان کان فینا علمنا ذلک وان کان فی غیرنا امرناہ فاوصی بنا قال علی واللہ لئن

سالناها رسول الله ﷺ فیمنعنا لا یعطیناها الناس ابدا وانی لا اسالنا رسول الله ﷺ ابدا"

(بخاری حزء ۲۶ کتاب الاستیذان ، باب المعانقه وقول الرجل کیف اصبحت)

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ جب نبی کریم ﷺ مرض وصال میں تھے تو آپ کے پاس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نکلے آپ سے لوگوں نے پوچھا اے ابا حسن نبی کریم ﷺ نے کیسے صبح کی؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا بحمد اللہ آپ نے صبح حالت صحت میں کی یعنی آپ کو افاقہ ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور کہا کیا تم دیکھتے نہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وصال فرمانے والے ہیں۔ تم تین دنوں کے بعد غیروں کے تابع ہو گے، میں خاندان عبدالمطلب کے چہروں سے موت کو پہچان لیتا ہوں تم ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے چلو، ہم آپ سے پوچھیں کہ امر خلافت کن لوگوں میں ہوگا۔ (یعنی آپ کے بعد آپ کا جانشین اور خلیفہ کون ہوگا) اگر آپ نے ہمارے متعلق فرمایا تو ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ اور اگر آپ نے ہمارے بغیر کسی اور کے متعلق فرمایا تو ہم عرض کریں کہ آپ ہمارے لئے وصیت فرمائیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا خدا کی قسم اگر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے امر خلافت کے متعلق پوچھیں تو آپ ہمیں منع فرما دیں لوگ ہمیں کبھی امر خلافت کا حق نہیں دیں گے میں رسول اللہ ﷺ سے اس کا کبھی سوال نہیں کروں گا"

اس حدیث پاک سے مسئلہ نکھر کر سامنے آ گیا کہ جن حدیثوں سے دلائل پیش کئے جاتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بلا فصل بنا دیا تھا۔ لیکن معاذ اللہ صحابہ کرام نے انہیں اس حق سے محروم کر دیا۔ یہ بالکل بے سروپا دعوے ہیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا اور حدیث قرطاس سے مراد بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت ہوتی تو آپ یہ کبھی نہ فرماتے کہ اگر نبی کریم ﷺ نے ہمیں منع کر دیا تو ہم ہمیشہ کے لئے اس سے محروم رہیں گے۔

خلیفہ بلا فصل کہنے سے شانِ علی میں گستاخی:

اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نبی کریم ﷺ نے خلیفہ بلا فصل بنا دیا تھا۔ اور وہ احادیث جن سے آج دلائل پیش کئے جاتے ہیں، یقیناً ان احادیث کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بہتر سمجھا ہوگا۔ کیونکہ

آپ تو " باب مدینة العلم " (علم کے شہر کا دروازہ ہیں)۔
حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سمجھتے ہوئے کیوں خاموشی اختیار کی اپنے حق کا مطالبہ کیوں نہیں کیا۔ جب کہ آپ پر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو ماننا ضروری تھا۔ اگر آپ کو جان بھی قربان کرنی پڑتی تو آپ خاموش نہ رہتے۔ کیونکہ آپ خود فرماتے ہیں کہ میں اپنی جان سے زیادہ ارشاد مصطفیٰ ﷺ کو ترجیح دیتا ہوں۔
حقیقت یہ ہے: اگر آپ فرماتے کہ میں نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی کے مطابق اپنے حق کا مطالبہ کر رہا ہوں تو آپ کے ساتھ ہزاروں صحابہ کرام ہوتے۔ ہر صاحب دانش اس بات کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ خلافت بلافصل کے عقیدہ سے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا مقصد ہی رائیگاں چلا جاتا ہے۔ اس لئے کہ جب آپ نے دیکھا کہ ایسے شخص کو مسلمانوں کا خلیفہ، حکمران بنایا جا رہا ہے جو نا اہل ہے آپ نے اپنی جان اور اپنے تمام خاندان کو قربان کر دیا، شہادت عظمیٰ کے رفیع مرتبہ پر فائز ہو گئے۔ لیکن اس کے برخلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ خلافت ان حضرات کے پاس ہے جو اس کے حقدار ہیں۔ تو آپ نے خاموشی اختیار کی۔

مقام غور و فکر ہے ان حضرات کے لئے جو خلافت بلافصل کی رٹ لگائے رہتے ہیں ان کے اس قول سے نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں حرف لازم آتا ہے اور جو خارجی یا خارجیوں کے ہمنوا یزید کی مدح سرائی کرتے ہیں وہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شان میں گستاخی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اور ان کی شہادت کو فقط حکومت کی خاطر جنگ اور شہادت قرار دیتے ہیں۔ خارجیوں کی وجہ سے اہل تشیع صحابہ کرام کی شان میں گستاخی کر رہے ہیں۔ اور اہل تشیع کی وجہ سے خارجی اہل بیت کی شان میں گستاخی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔
سبحان اللہ شاندار عقیدہ حق اور سچ وہی ہے جس پر بفضلہ تعالیٰ اہل سنت و جماعت قائم ہیں۔ خدارا انصاف سے بتائیں کیا یہی کہنا حق نہیں خاندان اہل بیت حکومت کا چاہنے والا نہیں تھا بلکہ حق کا مطالبہ کرنے والا تھا، جب حق دیکھا خاموشی اختیار کی اور جب دیکھا کہ باطل کا ظہور ہو رہا ہے تو جان کی بازی لگا دی " اللھم نعوذ بک من المتعصبین "

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی خلیفہ نامزد نہیں فرمایا:

" عن ابن عمر قال حضرت ابی حین اصیب فاثنوا علیه وقالوا جزاک الله خیرا فقال راغب وراهب فقالوا استخلف فقال اتحمل امرکم حیا ومیتا لوددت ان حظی منها لکفاف لا علی ولالی فان استخلف فقد استخلف من هو خیر منی یعنی ابابکر وان اترککم فقد ترککم من هو خیر منی رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم قال عبد الله فعرفت انه حین ذکر رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم غیر مستخلف "

(مسلم ج ۲ کتاب الامارة باب الاستخلاف وترکه)

" حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں اپنے باپ کے پاس حاضر ہوا جب کہ ان کو زخمی کر دیا گیا (اور لوگ بھی آپ کے پاس حاضر ہوئے) انہوں نے آپ کی تعریف کی اور کہا "جزاک اللہ خیرا" (اللہ تعالیٰ تمہیں بہتر جزاء عطا فرمائے) آپ نے فرمایا امید و بیم پائی جاتی ہے سب نے عرض کیا آپ کوئی خلیفہ نامزد فرما دیں آپ نے فرمایا کیا میں نے ہی زندگی اور موت میں تمہارے معاملات کو اٹھانا ہے۔ میں تو یہی پسند کرتا ہوں کہ مجھے اس سے رک جانا چاہئے کہ اس میں میرا کوئی نفع و نقصان نہیں۔ اگر میں خلیفہ نامزد کر دوں (تو ٹھیک ہے) مجھ سے بہتر ذات نے خلیفہ نامزد کیا ہے اور اگر میں خلیفہ نامزد نہ کروں (تو پھر بھی ٹھیک ہے کیونکہ) مجھ سے بہتر ذات یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خلیفہ نامزد نہیں کیا۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں جب آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر فرمایا تو میں سمجھ گیا کہ آپ خلیفہ نامزد نہیں کریں گے"۔

وضاحت حدیث:

راغب: رغبت کرنا، امید کرنا راھب: ڈر رکھنا، خوف رکھنا۔

صحابہ کرام نے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں دعائیہ کلمات عرض کئے " جزاک اللہ خیرا " (اللہ تعالیٰ تمہیں بہتر جزا عطا فرمائے) تو اس کے جواب میں آپ نے فرمایا " راغب وراھب " (امید کرتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے) ان الفاظ کا مقصد کیا ہے؟ علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ آپ نے فرمایا لوگ دو قسم کے ہیں ایک قسم امید کرنے والوں کی ہے، اور دوسری قسم ڈرنے والوں کی۔

یعنی " راغب فی حصول شئی مما عندی اور راهب منی " جو چیز میرے پاس ہے اس کے حصول میں کئی لوگ رغبت رکھتے ہیں۔ اور کچھ لوگ اس کے حصول کی طلب میں ڈر رہے ہیں۔

راقم کے نزدیک یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی واضح کرامت ہے کہ آپ نے پہلے ہی اس بات کی طرف اشارہ فرمادیا جو صحابہ کرام نے بعد میں عرض کیا " استخلف " آپ خلیفہ نامزد کردیں۔ آپ کا اسی طرف اشارہ تھا کہ کئی لوگ چاہتے ہیں کہ میں ان کو خلیفہ بنادوں۔ اور کچھ لوگ یہ مطالبہ کرنے سے ڈر رہے ہیں۔

دوسرا معنی: علامہ نووی نے یوں بیان کیا" انی راغب فیما عند اللہ تعالیٰ وراهب من عذابه " کہ آپ پر چونکہ وہ دنیا سے رخصت ہونے کا وقت قریب آرہا تھا۔ جسے آپ بھی محسوس فرمارہے تھے۔ اور آپ اس وقت ایمان کے اعلیٰ درجہ کے مطابق کہہ رہے تھے۔ مجھے اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید بھی ہے اور اللہ کے عذاب کا خوف بھی ہے۔ کیونکہ "الایمان بین الخوف والرجاء " ایمان خوف اور امید کے درمیان ہے۔

مقصد آپ کا یہ تھا کہ اب تم میرے لئے یہی دعاء کرو کہ میں اپنے ایمان کی سلامتی سے دنیا سے رخصت ہوکر رب تعالیٰ کے حضور پہنچ جاؤں، اب تمہارا تعریف کرنا، یا مطالبات کرنا میرے نزدیک بے معنی ہے۔

تیسرا معنی:

> " المراد الخلافة ای الناس فیها ضربان راغب فیها فلا احب تقدیمه لرغبته و كاره لها فاخشى عجزه عنها "
>
> '' مقصد آپ کا خلافت ہی تھا کہ لوگ خلافت کے معاملہ میں دو قسم کے ہیں۔ بعض لوگ تو چاہتے ہیں کہ میں ان کو خلیفہ بنادوں لیکن جو خود چاہتے ہیں میں ان کو خلیفہ بنانا پسند نہیں کرتا''

اور بعض لوگ ناپسند کرتے ہیں میں بھی سمجھتا ہوں کہ ہوسکتا ہے وہ اتنا عظیم بوجھ نہ اٹھا سکیں تو کہیں اس شخص کو خلیفہ نہ مقرر کردوں جو اس کو نہ چلا سکے۔ اسلئے میں خلیفہ مقرر نہیں کرنا چاہتا جب

صحابہ کرام نے آپ سے صراحۃً مطالبہ کیا کہ آپ خلیفہ نامزد کردیں تو آپ نے فرمایا اگر میں خلیفہ نامزد کردوں تو یہ بھی شریعت کے مطابق ہی فیصلہ ہے کیونکہ مجھ سے بہتر ذات یعنی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے وصال کے قریب (مجھے) خلیفہ نامزد فرمادیا تھا۔

لیکن اگر میں خلیفہ نامزد نہ کروں تو یہ بھی شریعت کے عین مطابق ہے اس لئے کہ وہ عظیم ذات جو مجھ سے بہتر ہیں۔ یعنی رسول اللہ ﷺ نے خلیفہ نامزد نہیں فرمایا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ جب آپ نے یہ فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے خلیفہ نامزد نہیں فرمایا۔ تو مجھے یقین ہو گیا تھا کہ آپ خلیفہ نامزد نہیں کریں گے۔

ساتھ ہی آنے والی دوسری حدیث میں یہ الفاظ ہیں: "**فعلمت انه لم یکن لیعدل برسول الله ﷺ احدا و انه غیر مستخلف**" جب آپ نے ذکر فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے خلیفہ نامزد نہیں کیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کسی کو نہیں کریں گے لہٰذا اسی کو ترجیح دیں گے کہ کسی ایک کو خلیفہ نامزد نہ کریں۔

فائدہ عظیمہ: جس حدیث پاک کی وضاحت کی جارہی ہے اس میں "راغب" کا ایک معنی یہ کیا گیا ہے کہ کچھ لوگ رغبت تو کرتے ہیں کہ ان کو خلیفہ نامزد کر دیا جائے لیکن خود چاہنے والوں کو میں آگے لانا پسند نہیں کرتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد دراصل نبی کریم ﷺ کے ارشادات کے ہی تابع تھا جو آخری وقت بھی آپ کے پیش نظر تھے۔

" حدثنا عبد الرحمن بن سرة قال لی رسول الله صلی الله علیه و سلم یا عبد الرحمن لا تسال الامارة فانک ان اعطیتها عن مسالة وکلت الیها و ان اعطیتها عن غیر مسالة اعنت علیها "

(مسلم ج ۲ کتاب الامارة باب النهی عن طلب الامارة والحرص علیها)

"حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اے عبدالرحمٰن تم حکومت نہ طلب کرو، اگر تمہارے مطالبہ کے بعد تمہیں حکومت دے دی گئی تو تمہیں اس کے سپرد کر دیا جائے گا۔ اور اگر تمہیں حکومت بغیر مطالبہ کے دی دی گئی تو تمہاری امداد کی جائے گی"

☆ "عن ابی موسی قال دخلت علی النبی صلی الله علیه وسلم انا ورجلان عن بنی عمی فقال احد الرجلین یا رسول الله امرنا علی بعض ما ولاک الله عزوجل وقال الآخر مثل ذلک فقال انا والله لا نولی علی هذا العمل احدا ساله ولا احدا حرص علیه"

(مسلم ج ۲ حوالہ مذکور)

حضرت ابوموسیٰ (اشعری) رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ میں اور میرے دو چچازاد نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے ان دونوں میں سے ایک نے عرض کیا کہ یارسول اللہ مجھے کسی علاقہ کا حاکم بنادیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ علاقے دے رکھیں ہیں جن کے آپ والی ہیں۔

دوسرے نے بھی یہ عرض کیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قسم ہے اللہ تعالیٰ کی جو شخص خود سوال کریں ہم ان میں سے کسی ایک کو بھی حاکم نہیں بناتے اور نہ کسی ایسے شخص کو حاکم بناتے ہیں جو حاکمت کی حرص رکھنے والا ہو۔

حکومت طلب کرنے والے کو نبی کریم ﷺ نے حکومت کیوں نہ دی؟ بیان کردہ دونوں حدیثوں سے بہت واضح ہے تاہم مزید وضاحت علامہ نووی رحمہ اللہ ان الفاظ سے بیان کرتے ہیں:

"قال العلماء والحکمة فی انه لا یولی من سأل الولایة انه یوکل الیها ولا یکون معه اعانة کما صرح به فی حدیث عبد الرحمن بن سمرة السابق واذا لم یکن معه اعانة لم یکن کفوا ولا یولی غیر الکفو ولان فیه تهمة للطالب والحریص...... والله اعلم"

"اہل علم حضرات نے بیان فرمایا ہے کہ حکومت طلب کرنے والے کو حکومت عطا نہ کرنے کی واضح وجہ حدیث پاک میں آ چکی ہے کہ جو شخص خود حکومت کا مطالبہ کرتا ہے، اسے مطالبہ پر اگر حکومت دے دی گئی تو گویا کہ اسے حکومت کے سپرد کر دیا گیا اسے کوئی معاونت حاصل نہیں ہوگی۔ اس کی حکومت ایسے ہی ہوگی جیسا کہ وہ اجنبی لوگوں کا حاکم ہے۔ حالانکہ اجنبیوں کی حکومت کرنے والا کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا"

دوسری وجہ یہ ہے کہ خود مطالبہ کرنے والا حریص ہونے کی تہمت میں مبتلاء ہوگا۔ راقم کے نزدیک تو حقیقت یہ ہے کہ وہ شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت اور امداد سے محروم ہوجاتا ہے۔ ہم نے اپنی زندگی میں اسی کا مشاہدہ کیا ہے کہ بڑے بڑے نعرے لگانے والے ناکام ہوئے ہیں۔

مسلمانوں کا خلیفہ مقرر کرنے کا طریقہ:

یہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے کہ خلیفہ مقرر کرنا واجب ہے اسی لئے نبی کریم ﷺ کے دفن سے پہلے خلیفہ مقرر کیا گیا:

" واجمعوا على انه يجب على المسلمين نصب خليفة ووجوبه بالشرع لا بالعقل "
(نووی شرح مسلم ج۲ ص ۱۲۸)

''اس مسئلہ پر اجماع امت ہے کہ مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ خلیفہ مقرر کریں، خلیفہ کے مقرر کرنے کا وجوب شرع سے ثابت ہے نہ کہ فقط عقل سے اس کا ثبوت ہے''

اسی سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ خلیفہ یعنی مسلمانوں کا حاکم مقرر کرنے کا وہی طریقہ معتبر ہو گا جو شریعت کے مطابق ہو گا۔ اور شریعت کے مطابق خلفاء راشدین کی خلافت کے تقرر کو ہی معیار بنایا جا سکتا ہے۔ اس سے ہٹ کر کوئی طریقہ استعمال کرنا درست نہیں ہو گا۔

حدیث ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا تقرر:

نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد صحابہ کرام سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے، جن میں انصار کے سردار حضرت سعد بن عبادہ بھی موجود تھے، مہاجرین میں سے بھی جلیل القدر صحابہ کرام موجود تھے۔ (سقیفہ کا وزن سفینہ کا ہے، چھت ہو، دیواریں نہ ہوں اسے سقیفہ کہا جاتا، جسے ہم چھپر یا شلٹر کہہ لیتے ہیں)۔

اگرچہ ابتدائی طور پر انصار کی جانب سے یہ بھی کہا گیا کہ " منا امير ومنكم امير " ہمارا اپنا حاکم ہو اور تمہارا اپنا۔ لیکن جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا نبی کریم ﷺ نے فرمایا " الائمة من قریش " حکماء خلفاء قریش سے ہوں گے تو انصار نے اپنا مطالبہ ترک کر دیا۔ (یہ بھی خیال رہے کہ یہ حدیث صحیح ہے تقریباً چالیس صحابہ کرام سے روایت کی گئی ہے)۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ مشورہ پیش کیا کہ میں دو شخصوں کو تمہارے لئے پسند کرتا ہوں ان میں سے ایک کو منتخب کر لو اس پر ہر طرف سے اپنی اپنی باتیں پیش ہو رہی تھیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

" یا معشر الانصار الستم تعلمون ان رسول اللہ ﷺ امر بابی بکر یؤم الناس فی الصلوۃ فما لکم تؤخرونہ فقالوا معاذ اللہ ان تؤخرہ "

''اے قبیلہ انصار کیا تمہیں معلوم نہیں کہ بیشک رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر کو نماز کی امامت کا حکم فرمایا (جب رسول اللہ ﷺ نے ان کو آگے گیا) تو تمہیں کیا ہوا کہ تم انہیں مؤخر کر رہے ہو انصار نے کہا معاذ اللہ ہم ان کو مؤخر نہیں کر رہے''

بخاری میں ہے کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تم عمر یا ابوعبیدہ میں سے کسی ایک کی بیعت کرلو، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا " بل نبایعک انت فانت سیدنا وخیرنا واحبنا الی رسول اللہ ﷺ " نہیں بلکہ ہم آپ کی بیعت کریں گی کیونکہ آپ ہمارے سردار ہیں آپ ہم سے بہتر ہیں ہم سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آپ ہی محبوب ہیں:

" وقال سعد بن عبادۃ لابی بکر نحن الوزراء وانتم الامراء "

''حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہم آپ کے وزیر ہوں گے اور آپ حکام ہوں گے''

" فاخذ عمر بید ابی بکر فبایعہ ثم المهاجرون ثم الانصار "

''تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور آپ کی بیعت کی۔ پھر مہاجرین اور انصار نے بھی آپ کی بیعت کر لی''

"فاجمعوا علی ذلک" ''حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر صحابہ کرام کا اجماع ہے۔

" ولو لم تکن الخلافۃ حقا لما اتفق علیہ الصحابۃ "

''آپ کی خلافت پر صحابہ کرام کا متفق ہونا ہی آپ کی خلافت کی حقانیت پر بہت بڑی دلیل ہے''

" لان اجماع الامۃ علی الباطل ممنوع ولا سیما الصحابۃ ھم افضل البشر بعد الانبیاء "

''کیونکہ یہ کبھی نہ ہوا اور نہ ہو سکے گا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت باطل پر متفق و مجتمع ہو جائے یہ تو آپ کی عام امت کی بات ہے اور وہ حضرات جو انبیاء کرام کے بعد تمام انسانوں سے افضل ہیں''

یعنی صحابہ کرام ان کا باطل پر متفق ہونا تصور میں بھی نہیں آ سکتا۔ صحابہ کرام پر طنز کرنے والے اپنے آپ کو جہنمی بنا رہے ہیں۔ صحابہ کرام کی شان میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

" وبايعه على على رؤس الاشهاد اى بمحضر الشاهدين علانية لاسرا وخفية بعد توقف كان منه "

'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی کچھ توقف کے بعد صحابہ کرام کی موجودگی میں ظاہر طور پر آپ کی بیعت کرلی کوئی چھپ چھپا کر بیعت نہیں کی''

یہ بھی خیال رہے کہ مستدرک حاکم ،بیہقی صحیح ابن حبان میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سقیفہ بنی ساعدہ کے مقام پر لوگوں کے بیعت کرنے کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جب منبر پر خطبہ دینے کیلئے آئے تو اسی وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی آپ کی بیعت کرلی۔

بخاری و مسلم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چھ ماہ بعد بیعت کرنے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اس پر شاندار محاکمہ نبراس میں پیش کیا گیا:

" الصحيح الجامع بين القولين انه بايعه في اول الامر ثم تاخر عن صحبته حتى اعاد البيعة بعد ستة اشهر "

دونوں روایتوں میں تطبیق کے لئے یہ بہتر اور صحیح جامع بات ہے کہ آپ نے شروع میں ہی بیعت کرلی تھی۔ پھر نبی کریم ﷺ کے وصال کے غم اور حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی بیماری کی وجہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صحبت زیادہ نہ اختیار کر سکے۔ اور زیادہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی معاونت نہ کر سکے۔ لیکن چھ ماہ کے بعد پھر دوبارہ بیعت کی اور باقاعدگی سے آپ کی معاونت اور آپ کے پاس صحبت کو اختیار کیا۔ (از شرح عقائد مع نبراس ص ۴۹۳،۴۹۴)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اشارات:

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کوئی خلیفہ نامزد نہیں فرمایا یہی عقیدہ اہل سنت و جماعت کا ہے تاہم نبی کریم ﷺ کے ارشادات مبارکہ سے ایسے اشارات ملتے ہیں، جن سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کا پتہ چلتا ہے۔

☆ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے، جس میں یہ بھی مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: " لا تبقین فی المسجد خوخة الاخوخة ابی بکر " مسجد میں کھلنے والے چھوٹے دروازے تمام بند کر دیئے جائیں سوائے ابوبکر کے دروازے کے۔

" فيه خصيصة و فضيلة ظاهرة لابی بکر "

اس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور خصوصیت واضح ہے۔

اس سے واضح طور پر اشارہ مل رہا ہے کہ مسجد کی طرف صحابہ کرام کے دروازوں کو بند کرنے کا حکم دیا گیا کہ کوئی شخص دروازے سے گزر کر مسجد سے نہ گزرے، لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دروازے کو کھلا رکھنے کا حکم دے کر آپ کے مستقل کے خلیفہ ہونے کا اشارہ فرما دیا۔

☆ " عن محمد بن جبیر بن مطعم عن ابیه ان امرأة سالت رسول الله صلی الله علیه وسلم شیأ فامرها ان ترجع الیه فقالت یا رسول الله ارایت ان جئت فلم اجدک ، قال ابی کانها تعنی الموت قال فان لم تجدینی فاتی ابابکر "

محمد بن جبیر بن مطعم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں، بیشک ایک عورت نے رسول اللہ ﷺ سے کسی چیز کا سوال کیا تو آپ نے فرمایا بعد میں آنا، اس عورت نے کہا یا رسول اللہ آپ کا کیا خیال ہے کہ اگر میں آؤں اور آپ کو نہ پاؤں، محمد بن جبیر کہتے ہیں، میرے باپ نے کہا کہ وہ عورت حضور ﷺ کے وصال کو مراد لے رہی تھی آپ نے فرمایا اگر تم مجھے نہ پاؤ تو ابوبکر کے پاس آ جانا۔

" فلیس فیه نص علی خلافته و امر بها بل هو اخبار بالغیب الذی اعلمه الله تعالیٰ به...... والله اعلم "

''نبی کریم ﷺ کا یہ فرمانا کہ'' اگر مجھے نہ پاؤ تو ابوبکر کے پاس آنا'' آپ کی خلافت پر نص تو نہیں البتہ رب تعالیٰ نے آپ کو جو علم غیب عطا فرمایا ہے اس کے مطابق آپ نے خبر دی (جو ہو کر رہی)''

میری برادری کے حضرات علم غیب کے لفظ سے مجھ پر خفا نہ ہوں یہ علامہ نووی رحمہ اللہ کے الفاظ ہیں میں تو صرف ناقل ہوں۔

☆ " عن عائشه قالت قال لی رسول الله ﷺ فی مرضه ادعی لی ابابکر اباک

واخاک حتی اکتب کتابا فانی اخاف ان یتمنی متمن ویقول قائل انا اولی ویابی اللہ والمؤمنون الا ابا بکر"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں مجھے رسول اللہ ﷺ نے اپنی مرض (وصال) میں فرمایا کہ میرے پاس اپنے باپ ابوبکر اور اپنے بھائی (عبدالرحمٰن) کو بلاؤ تا کہ میں خط لکھ دوں بیشک میں خوف کرتا ہوں کہ تمنا کرنے والا تمنا کرے گا، اور کہنے والا کہے گا میں زیادہ حق دار ہوں حالانکہ اللہ تعالیٰ اور مومن سوائے ابوبکر کے انکار کرتے ہیں۔

اس حدیث پاک سے واضح طور پر یہ پتہ چل رہا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت بیان فرمائی اور خبر دی کہ آپ کے وصال کے بعد آپ کا خلیفہ ہونا واقع ہوگا۔ مسلمان اور کسی کو خلیفہ بنانے سے انکار کر دیں گے۔ اور اس طرف بھی اشارہ تھا کہ ابتدائی طور پر کچھ اختلاف بھی ہوگا۔ نبی کریم ﷺ نے جو خبر دی اسی کے مطابق ہوا۔

(مسلم ج ۲ نووی باب فضائل من ابی بکر الصدیق)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تقرر:

"ثم ان ابابکر لما ایس من حیوته دعا عثمان واملی علیه کتاب عهده لعمر"

''جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی زندگی سے مایوس ہو گئے تو آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بلا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق لکھوا دیا کہ میرے بعد یہ خلیفہ ہوں گے ان کی بیعت کرنا''

یقیناً آپ نے ایسے شخص کا انتخاب کیا۔ جن کے عدل وانصاف نے اور ان کی خلافت کے دوران اسلامی فتوحات اور کفار کے ڈر کر رہنے نے ثابت کر دیا کہ واقعی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا فیصلہ ایک عظیم مدبر کا فیصلہ تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ اپنے بیٹے کے متعلق نہیں تھا اپنے کسی رشتہ دار کے متعلق نہیں تھا۔ بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق فیصلہ تھا جس میں صرف دین کی بھلائی اور مسلمانوں کی بھلائی مد نظر تھی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق وصیت کو لکھوایا تو اس میں جو کچھ لکھا گیا اسے پڑھ کر صاحب ایمان خود ہی سمجھ جاتا ہے کہ مقصد عظیم کیا تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وصیت نامہ:

﴿ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ﴾

" ھذا ما عھد ابوبکر بن قحافة فی آخر عھد و فی الدنیا خارجا منھا و عند اول عھدہ بالآخرة داخلا فیھا حیث یؤمن الکافر ویوقن الفاجر ویصدق الکاذب ، انی استخلفت علیکم بعدی عمر بن الخطاب فاسمعوا له واطیعوه وانی لم آل اللہ ورسوله ودینه ونفسی وایاکم خیرا فان عدل فذالک ظنی فیه وعلمی به وان بدل فلکل امرئ ما اکتسب والخیر اردت ولا اعلم الغیب وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون والسلام علیکم ورحمة اللہ "

''اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے شروع جو بہت مہربان ہے''

''یہ وہ وصیت ہے جو ابوبکر بن قحافہ نے اپنی زندگی کے آخری وقت میں دنیا سے جاتے وقت لکھوائی ہے۔ اور یہ آخرت کی طرف جانے کا پہلا وقت ہے۔ یہ وہ وقت ہے جس میں کافر بھی ایمان لے آتے ہیں۔ اور فاسق و فاجر بھی راہ راست پر آنے کا یقین کر لیتے ہیں اور جھوٹے بھی سچ بولتے ہیں۔ بیشک میں اپنے بعد عمر بن خطاب کو تمہارا خلیفہ مقرر کر رہا، ان کے ارشادات کو سننا اور ان کی اطاعت کرنا بیشک میں نے اللہ تعالیٰ کے احکام کو تسلیم کرنے میں اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات کو ماننے میں اور دین اسلام کے مطابق چلنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اور میں نے اپنے لئے اور تمہارے لئے خیر خواہی میں بھی کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ اگر حضرت عمر بن خطاب نے عدل و انصاف سے کام لیا تو بہتر ہوگا میرا غالب گمان یہی ہے کہ وہ عدل و انصاف سے کام لیں گے۔ بلکہ مجھے تو ان کے عدل و انصاف پر یقین کا درجہ حاصل ہے۔ اگر میرے گمان کے خلاف انہوں نے کوئی کام کیا۔ میرے گمان کو انہوں نے تبدیل کر دیا تو ہر شخص کو اس کے اپنے اعمال کے مطابق جزا دی جاتی ہے۔ میں نے بھلائی کا ارادہ کیا ہے البتہ میں غیب نہیں جانتا۔ ظالموں کو خود ہی پتہ چل جائے گا کس کروٹ پر پلٹا کھائیں گے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ اور تم پر سلامتی اور اللہ کی رحمت ہو)''

آپ نے یہ وصیت نامہ لکھوا کر سربمہر کر دیا، اسی وصیت نامہ کے مطابق صحابہ کرام نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی:" وبالجملة وقع الاتفاق علی خلافته " حاصل کلام یہی ہے کہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنے اور آپ کو خلیفہ تسلیم کرنے میں صحابہ کرام متفق ہو گئے۔

(از شرح عقائد مع نبراس ص ۴۹۸، ۴۹۹)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا تقرر:

" ثم استشهد عمر وترک الخلافة شوری بین ستة عثمان وعلی وعبدالرحمن بن عوف وطلحة والزبیر وسعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم "

'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی شہادت کے وقت خلیفہ نامزد نہیں فرمایا، بلکہ چھ جلیل القدر صحابہ کرام کی مشاورتی کمیٹی بنادی کہ تم جسے چاہو خلیفہ مقرر کرلو، مشاورتی کمیٹی کے ارکان یہ حضرات تھے، حضرت عثمان، حضرت علی المرتضی، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم''

پھر ان چھ حضرات میں سے پانچ حضرات نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو اختیار دے دیا کہ تم جسے چاہو منتخب کرلو، ہم تمام حضرات اس پر اتفاق کرلیں گے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے علیحدہ علیحدہ ہر ایک سے مشورہ کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشاورت میں یہ عرض کیا کہ اگر میں تمہاری بیعت نہ کروں تو تم کس کے متعلق مشورہ دو گے؟ آپ نے فرمایا حضرت عثمان کے متعلق۔ پھر آپ نے حضرت زبیر سے مشورہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں تمہاری بیعت نہ کروں تو تم کس کے متعلق مشورہ دو گے؟ انہوں نے کہا حضرت علی یا حضرت عثمان کے متعلق میری رائے ہوگی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مشورہ کرتے ہوئے پوچھا کہ اگر میں تمہاری بیعت نہ کروں تو تم کس کے متعلق مشورہ دو گے؟ آپ نے فرمایا میری رائے کے مطابق حضرت علی کو مقرر کردیا جائے۔ پھر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا میں اور آپ تو خلافت کا بوجھ اٹھانا نہیں چاہتے اس لئے میری رائے کے مطابق حضرت عثمان کو منتخب کرلینا بہتر ہے پھر حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے مشاورتی کمیٹی سے باہر جلیل القدر صحابہ کرام سے مشورہ کیا تو اکثریت کی رائے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق ہی تھی:

" فاختار هو عثمان وبايعه بمحضر من الصحابة فبايعوه وانقادوا والاوامره وصلوا معه الجمع والاعياد "

''اس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے تین دن کے بعد حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے غور وفکر اور مشورہ کرنے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت صحابہ کرام کی موجودگی میں کی۔ پھر دوسرے صحابہ کرام نے بھی آپ کی بیعت کر لی۔ اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے احکام کو تمام صحابہ نے ماننا شروع کر لیا اور آپ کی اقتداء میں ہی جمعہ اور عید کی نمازیں ادا کرنے لگے''

اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت پر صحابہ کرام کا اتفاق ہو گیا۔

(از شرح عقائد مع نبراس و حاشیہ ص ۴۹۹، ۵۰۰)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تقرر:

"ثم استشهد عثمان وترک الامر مهملا فاجتمع کبار المهاجرین والانصار علی علی والتمسوا منه قبول الخلافة وبایعوه لما کان افضل اهل عصره واولاهم بالخلافة"

''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی شہادت کے وقت خلافت کے معاملہ کو اسی طرح رہنے دیا یعنی نہ ہی آپ نے خلیفہ نامزد فرمایا اور نہ ہی مشاورتی کمیٹی بنائی، آپ کی شہادت کے بعد مہاجرین اور انصار صحابہ کرام نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس اجتماعی طور پر عرض کی کہ اب آپ خلافت کے معاملہ کو قبول فرمائیں''

بیعت کر لی اور یہی فیصلہ درست بھی تھا کیونکہ اس وقت تمام صحابہ کرام میں افضل آپ ہی تھے اور خلافت کے حقدار بھی سب سے زیادہ آپ ہی تھے۔

اعتراض: حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں صحابہ کرام کا اجماع ثابت نہیں بلکہ بعض حضرات نے اختلاف بھی کیا تو آپ کی خلافت کو کیسے خلافت راشدہ سے تعبیر کیا جاتا ہے؟

پہلا جواب:

"وما وقع من المخالفات والمحاربات لم یکن عن نزاع فی خلافة بل کان المحاربون یسلمون خلافته بل عن خطا فی الاجتهاد والخطاء هو الاستعجال فی طلب قصاص عثمان زعما ان التاخیر یوجب جرءة العوام علی الاکابر"

''جو حضرات مخالفت کر رہے تھے۔ ان کی مخالفت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خلافت

کے مسئلہ پر نہیں تھی۔ بلکہ وہ آپ کی خلافت کے ماننے کے باوجود، اجتہادی خطا کی وجہ سے آپ سے مخالفت کر رہے تھے۔ وہ اجتہادی خطا ان کی یہ تھی کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کا جلدی مطالبہ کر رہے تھے کیونکہ تاخیر میں عوام کو حکام پر جرات کا موقع ملتا رہے گا''۔

دوسرا جواب:

" والحق ان صحة الخلافة غير محتاجة الى الاجماع بل يكفى بيعة بعض اهل الحل والعقد حتى قيل يكفى الواحد منهم وقد بايع عليا الوف المهاجرين والانصار "

''حق بات یہ ہے کہ کسی شخص کے حاکم ہونے کو صحیح کہنے کے لئے تمام لوگوں کو متفق ہونا ضروری نہیں۔ بلکہ بعض اہل حل وعقد بھی بیعت کرلیں تو وہ خلیفہ برحق ہے۔ اگرچہ بعض حضرات نے تو اہل حل وعقد میں سے کسی ایک کے بیعت کرلینے کو بھی خلافت کو صحیح قرار دیا ہے۔ تاہم معتبر قول یہی ہے کہ اکثر اہل حل وعقد جب کسی کو منتخب کریں تو وہی خلیفہ برحق ہوگا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت تو ہزاروں مہاجرین وانصار صحابہ کرام نے کی آپ کی خلافت کے حق ہونے پر میں شک کرنا دیوانگی ہے''

(شرح عقائد مع نبراس ص ۵۰۱)

اہل حل وعقد کون؟

" اهل الحل والعقد اى المجتهدون الحل كشادن والعقد بستن والمجتهد صاحب التجويز والمنع "

''حل'' کا معنی ہے ''کھولنا'' اور ''عقد'' کا معنی ہے ''باندھنا'' اہل حل وعقد مجتہد علماء کرام اور فقہاء عظام کو کہا جاتا ہے کیونکہ مجتہد کو تجویز دینے کا حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنے علم کے مطابق یہ کہے کہ ہاں اسے خلیفہ بنانا جائز ہے۔ اس وجہ سے وہ ''اہل حل'' ہے، اور مجتہد کو منع کرنے کا بھی حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ یہ کہے کہ اس شخص میں خلافت کی صلاحیت نہیں کہ شرعی شرائط میں یہ پورا نہیں اترتا۔ اس کے روکنے کی صلاحیت کی وجہ سے وہ ''اہل عقد'' ہوگیا'' (نبراس ص ۵۰۳)

خلاصہ کلام: اسلامی قوانین کے مطابق حاکم منتخب کرنے کے چار طریقے ہیں:

پہلا یہ کہ تمام لوگوں کا اس کی حکمرانی پر اتفاق ہوجائے۔ دوسرا یہ کہ پہلا خلیفہ کسی دوسرے

شخص کو نامزد کر دے بشرطیکہ اس میں خلیفہ بننے کی شرعی شرائط موجود ہو۔ اپنی ہی اولاد کا انتخاب بھی نہ کرے تاکہ ملوکیت قائم نہ ہو۔ تیسرا یہ کہ پہلا خلیفہ اپنی وفات کے قریب مشاورتی کمیٹی قائم کر کے خلافت کا معاملہ ان کے سپرد کر دے۔ لیکن اس میں بھی شرط یہی ہے کہ کمیٹی کے ارکان شرعی شرائط پر پورے اترتے ہوں۔ شرعی شرائط کا ذکر انشاء اللہ آگے آئے گا۔ چوتھا یہ کہ اکثر اہل حل وعقد مل کر کسی کو خلیفہ بنالیں۔

آج مسلمانوں کو اسی وجہ سے سکون حاصل نہیں کہ وہ غیر مسلموں کے تابع ہو کر جمہوریت، جمہوریت کی رٹ لگا کر، مرد، عورت، عالم، جاہل کے ووٹ کو برابر سمجھ کر کامیابی سمجھ رہے ہیں۔ جو دراصل اسلامی قوانین سے عدولی کی وجہ سے ان کے لئے باعث زوال ہے جس کا ہم آئے دن مشاہدہ کر رہے ہیں۔

دو حدیثوں میں تطبیق:

"عن سماک بن حرب قال سمعت جابر بن سمرة یقول سمعت رسول الله ﷺ یقول لا یزال الاسلام عزیزا الی اثنی عشر خلیفة ثم قال کلمة لم افهمها فقلت لابی ما قال فقال کلهم من قریش"

"سماک بن حرب کہتے ہیں میں نے حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کو کہتے ہوا سنا (وہ کہہ رہے تھے) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اسلام بارہ خلفاء تک غالب رہے گا۔ اس کے بعد آپ نے کچھ فرمایا جسے میں نہ سمجھ سکا تو میں نے اپنے باپ سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگے کیا فرمایا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ آپ نے فرمایا وہ تمام قریش سے ہوں گے"

☆ دوسری حدیث پاک میں ہے "الخلافة بعدی ثلاثون سنة ثم تکون ملکا" میرے بعد تیس سال تک خلافت رہے گی پھر ملوکیت ہو جائے گی۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ یہاں دو سوال وارد ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ تیس سال حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے خلافت کے خاتمہ پر مکمل ہوتے ہیں۔ اس وقت تک بارہ خلفاء مکمل نہیں ہوئے تو دونوں حدیثوں میں مطابقت کس طرح صحیح ہوگی؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس حدیث پاک میں تیس سال کا ذکر ہے اس میں مراد خلافت نبوت ہے یعنی آپ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ میرے بعد مسلسل تیس سال تک تو خلافت برقرار رہے گی۔ اس کے بعد اس کا برقرار رہنا ضروری نہیں۔

" وقد جاء مفسرا فی بعض الروایات خلافة النبوة بعدی ثلثون سنة ثم تکون ملکا ولم یشترط ھذا فی الاثنی عشر "

" کیونکہ بعض روایات میں واضح طور پر ذکر ہے کہ آپ نے فرمایا میرے بعد خلافت نبوت تیس سال تک رہے گی۔ لیکن جہاں آپ نے بارہ خلفاء کا ذکر فرمایا اس میں خلافت نبوت کا ذکر نہیں "

دوسرا سوال یہ لازم آتا ہے کہ اچھے خلفاء بنی عباسیہ میں گزرے ہیں جن کو اہل حل وعقد (مجتہدین فقہاء وعلماء) نے منتخب کیا ہے اور انہوں نے عدل وانصاف کو بھی قائم کیا تو بارہ خلفاء کا ذکر کیسے درست ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے:

" ویحتمل ان یکون المراد مستحقی الخلافة العادلین وقد مضی منھم من علم ولا بد من تمام ھذا لعدد قبل قیام الساعة "

" کہ خلفاء راشدین کی طرح کامل عدل وانصاف کرنے والے جن کی خلافت پر اتفاق ہوگا وہ قیامت تک کل بارہ خلفاء ہوں گے مطلقاً انصاف کرنے والوں کی نفی نہیں فرمائی "

مطلب واضح ہوا کہ اچھے برے خلفاء آتے رہیں گے کوئی ظالم ہوں گے، کوئی انصاف کرنے والے ہوں گے، ان میں سے پھر کوئی تھوڑا انصاف کریں گے کوئی زیادہ، لیکن کامل انصاف کرنے والے کل بارہ خلفاء ہوں گے ان کاملین میں سے میرے بعد مسلسل رہنے والے تیس سال تک رہیں گے۔

(مسلم ونووی ج ۲ کتاب الامارة ص ۱۲۷)

خلیفہ کا ظاہر ہونا ضروری ہے:

جب یہ واضح ہے کہ خلیفہ کے مقاصد میں عدل وانصاف کو قائم کرنا، مظلوموں کو ظالموں سے انصاف دلانا، شرعی احکام نافذ کرنا، حدود قائم کرنا، ملکی سرحدوں کی حفاظت کرنا وغیرہ شامل ہے تو یہ کام

وہی سرانجام دے سکتا ہے جو ظاہر موجود ہو۔ جو ہمیشہ کے لئے چھپا ہوا اس کی انتظار رہی رہے وہ امور خلافت سرانجام نہیں دے سکتا۔

لہٰذا اہل تشیع کا یہ نظریہ باطل ہے کہ سب سے پہلے نبی کریم ﷺ کے بعد امام وخلافت کے حقدار حضرت علی رضی اللہ عنہ۔ پھر آپ کے بیٹے حضرت امام حسن، پھر ان کے بھائی حضرت امام حسین پھر ان کے بیٹے حضرت علی زین العابدین۔ پھر ان کے بیٹے ابوجعفر محمد باقر، پھر ان کے بیٹے ابوعبداللہ جعفر صادق، پھر انکے بیٹے موسیٰ کاظم، پھر ان کے بیٹے ابوالحسن علی رضاء، پھر انکے بیٹے ابوجعفر محمد تقی، پھر انکے بیٹے ابوالحسن علی نقی، پھر ان کے بیٹے ابوالحسن حسن عسکری پھر انکے بیٹے محمد قاسم ہیں

ان کے آخری خلافت کے حقدار کے متعلق ان کا نظریہ یہ ہے کہ وہ ایک مکان میں چھپ گئے ہیں۔ ان کے چھپنے کی وجہ خلفاء عباسیہ سے مخالفت تھی۔ لیکن وہ قیامت سے پہلے ظاہر ہوں گے اور دنیا کے اندر عدل وانصاف قائم کریں گے۔

لیکن جیسا کہ پہلے واضح کیا گیا کہ ظاہر خلیفہ ہی خلافت کے مقاصد کو پورا کر سکتا ہے۔ اس لئے یہ نظریہ مقصد خلافت کے خلاف ہے۔ (شرح عقائد نبراس ص ۵۲۰ تا ۵۲۳)

تنبیہ: اختلاف صرف مستحق خلافت ہونے میں ہے ورنہ اہل بیت کے یہ حضرات اہل سنت وجماعت کے نزدیک نہایت افضلیت اور بزرگی کے مالک ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اہل سنت وجماعت کے دلوں میں جتنا ادب واحترام اہل بیت اور صحابہ کرام اور اولیاء کرام کا ہے اتنا کوئی اور فرقہ ثابت نہیں کر سکتا۔

اسلام میں حاکم کے لئے شرائط:

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اسی آیۃ کی تفسیر میں (جس کی وضاحت راقم کر رہا ہے) ان شرائط کا ذکر کیا ہے جو مسلمانوں کے حاکم کے لئے ضروری ہیں:

(۱) مسلمانوں کے حاکم کے لئے ضروری ہے کہ وہ قریش سے ہو، جیسا کہ پہلے احادیث سے وضاحت کردی گئی۔

(۲) "والثانی ان یکون ممن یصلح ان یکون قاضیا من قضاة المسلمین مجتهدا

لایحتاج الی غیرہ فی الاستفتاء فی الحوادث"

دوسری شرط یہ ہے کہ وہ صلاحیت رکھے کہ اسے مسلمانوں کا قاضی بنایا جا سکے یعنی وہ شرعی مسائل پر خود عبور رکھتا ہو، اتنا علم ہو کہ وہ شخص درجہ اجتہاد میں پہنچا ہوا ہو، تا کہ جب کبھی اسے مسائل کا سامنا ہو تو دوسرے حضرات سے فتویٰ طلب کرنے کا محتاج نہ ہو۔

(۳) وہ شخص اتنا صاحب عقل اور مدبر ہو کہ کفار کے ساتھ جہاد کرنے کی اس میں صلاحیت پائی جا سکے اپنے اسلامی لشکر کو ترتیب دے سکے، سرحدوں کی حفاظت کر سکے۔ اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کر سکے۔ مظلوموں کو ظالموں سے انصاف دلا سکے۔

(۴) حدود اور تعزیرات وغیرہ کو نافذ کرنے میں نرم دلی کا مظاہرہ نہ کرے، قصاص اور رجم وغیرہ میں کسی کو قتل کرانے میں نہ گھبرائے۔

صحابہ کرام کا اس پر اجماع ہے کہ حاکم وہی بن سکتا ہے جس میں یہ شرائط پائی جائیں جس میں یہ شرائط نہ پائی جائیں وہ مسلمانوں کا حاکم بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

"ولن یصلح لذلک کلہ الامن کان عالما یذلک کلہ قیما بہ"

"ان تمام صفات کی صلاحیت وہی شخص رکھتا ہے جو عالم ہو، اور ان تمام صفات کو جاری رکھنے اور قائم رکھنے کی صلاحیت اس میں پائی جائے"

(۵) وہ شخص آزاد ہو، غلام نہ ہو، کیونکہ غلام اپنے آپ پر ولایت نہیں رکھتا تو دوسروں پر کیسے ولایت رکھے گا۔ غلام اگرچہ آج کل بین الاقوامی قوانین کے مطابق نہیں پائے جاتے، لیکن راقم کے خیال کے مطابق یہود و نصاریٰ سے ہر معاملہ میں مشورہ لینے والے، ان کی خواہش کے مطابق مسلمانوں پر حکمرانی کرنے والے بھی یہود و نصاریٰ کے غلام ہی ہیں ایسے بکاؤ مال کسی صورت میں بھی مسلمانوں کے حاکم بننے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

(۶) حاکم بننے کے لئے بالغ ہونا ضروری ہے۔ نابالغ چونکہ مکلف نہیں اور نہ ہی اسے کسی پر ولایت حاصل ہے اس لئے وہ حکومت کرنے کا اہل نہیں۔ نابالغ چونکہ عقل بھی کامل نہیں رکھتا۔ اس لحاظ پر حکومت کرنے کی اہلیت سے خالی ہوتا ہے۔

(۷) حاکم بننے کے لئے عاقل ہونا ضروری ہے بے عقل، پاگل، دیوانہ حکومت نہیں کر سکتا۔ افسوس

کہ علم اور تقوی کے نابالغ اور بے عقل حکمران ہی ہماری قسمت میں لکھے ہوئے ہیں۔ کاش کہ کوئی عالم، زاہد، متقی حاکم ہمیں بھی اپنی زندگی میں دیکھنا نصیب ہو جائے۔

(۸) اعضاء اس کے سلامتی میں ہوں ہاتھ، پاؤں کٹے ہوں یا اس کے اعضاء بے کار اور شل ہوں تو اس کی عزت ملک میں بھی نہیں ہوگی اور کفار پر بھی اس کا رعب طاری نہیں ہوگا۔

(۹) مسلمان ہونا ضروری ہے کیونکہ کافروں کو مسلمانوں پر حکومت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ ولن يجعل الله للكافرين على المؤمنين سبيلا ﴾ کافروں کو مومنوں پر اللہ تعالیٰ کوئی راہ نہیں دے گا۔

(۱۰) مسلمانوں کے حاکم کیلئے مذکر ہونا ضروری ہے مؤنث کو حاکمیت کی شرعاً کوئی اجازت نہیں۔

☆ "عن ابی بکرة قال لما بلغ رسول الله ﷺ ان اهل فارس قد ملكوا عليكم بنت كسرى قال لن يفلح قوم ولوا امرهم امراة" (بخاری، مشکوة کتاب الامارة والقضاء)

ابو بکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب نبی کریم ﷺ کو یہ خبر ملی کہ بیشک فارس والوں نے کسریٰ (شاہ فارس) کی بیٹی کو اپنا حاکم بنالیا تو آپ نے فرمایا وہ قوم ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتی جس نے اپنا حاکم عورت کو بنالیا۔

حقیقت یہ ہے کہ عورت کی فطری کمزوریاں ایسی ہیں جن کی وجہ سے وہ حکمرانی کی اہل نہیں کیونکہ عورت کا مردوں سے اختلاط، اور مردوں کے جلسوں میں خطاب کرنا اور مردوں کے ہجوم میں پھنس جانا بلکہ پس جانا عورت کی عزت کے ہی خلاف ہے۔

☆ حضرت ابو اسید انصاری فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا، جب آپ مسجد سے باہر آرہے تھے آپ نے مردوں اور عورتوں کے اختلاط کو راستہ میں دیکھتے ہوئے عورتوں کو فرمایا:

"استاخرن فانه ليس لكن ان تحققن الطريق عليكن بحافات الطريق"
"تم پیچھے ہو جاؤ، تمہیں راستہ کے درمیان نہیں چلنا چاہئے بلکہ راستے کے کنارے کنارے پر چلو"۔

آپ کے اس ارشاد گرامی کے بعد عورتیں دیوار کے ساتھ ساتھ چلیں یہاں تک کہ عورتوں کے

کپڑے دیواروں کے ساتھ لگ رہے ہوتے تھے۔ (ابو داؤد باب فی مشی النساء مع الرجال فی الطریق)

☆ " عن ابن عمر ان النبی ﷺ نهی ان یمشی (یعنی الرجل) بین المراتین "

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے مرد کو دو عورتوں کے درمیان چلنے سے منع فرمایا۔ (ابو داؤد باب فی مشی النساء مع الرجال)

☆ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا " لو ترکنا هذا الباب للنساء " کاش کہ ہم (مسجد میں آنے جانے کے لئے) عورتوں کے لئے یہ دروازہ مختص کر دیں۔

حضرت ابن عمر سے روایت کرنے والے حضرت نافع فرماتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کے بعد حضرت ابن عمر زندگی بھر اس دروازے سے داخل نہیں ہوئے۔

(ابو داؤد باب اعتزال النساء فی المساجد من الرجال)

فائدہ: نبی کریم ﷺ کا کیسا حکیمانہ ارشاد گرامی ہے کہ آپ نے صحابہ کرام کو حکم نہیں فرمایا بلکہ تمنا کا اظہار فرمایا '' کاش ایسا ہو جائے '' اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کامل اتباع کو تو دیکھو کہ وہ حضور ﷺ کی فقط تمنا پر ہی سر جھکا دیتے تھے خصوصی حکم کے منتظر نہیں رہتے تھے۔

☆ " عن نافع قال ان عمر بن الخطاب کان ینهی ان یدخل من باب النساء "

حضرت نافع سے مروی ہے بیشک حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ عورتوں کے دروازے سے مسجد میں داخل ہونے سے (مردوں کو) منع فرماتے تھے۔

ابھی تک جن احادیث کو ذکر کیا ان سے یہ فوائد حاصل ہوئے کہ عورتیں مساجد میں مردوں کے ساتھ مل جل کر نماز ادا نہ کریں بلکہ مسجد کی ایک جانب علیحدہ پردہ میں نماز ادا کریں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی کامل اتباع کرتے تھے اسی لئے نبی کریم ﷺ کے اظہار تمنا پر زندگی بھر اس دروازے سے داخل نہیں ہوئے جس کو نبی کریم ﷺ نے عورتوں کے لئے خاص کرنے کے لئے خواہش کا اظہار فرمایا۔

جب یہ واضح ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام نے عورتوں اور مردوں کے اختلاط کو ناپسند فرمایا ہے تو عورت حکمران بن کر مردوں سے مل جل کر کام کرنے کی وجہ سے کیا نبی کریم ﷺ کے احکام کی مخالفت نہیں کر رہی ہوگی۔

☆ " عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ اذا کان امراؤکم خیارکم واغنیاء کم سمحاء کم

وامور کم شوری بینکم فظهر الارض خیر لکم من بطنها واذا کان امراؤکم شرارکم واغنیاء کم بخلاء کم وامور کم الی نساء کم فبطن الارض خیرلکم من ظهرها " (ترمذی، مشکوۃ باب تغیر الناس)

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تمہارے حکام تم سے بہتر ہوں (نیک، صالح، متقی) اور تمہارے غنی لوگ سخی ہوں اور تمہارے معاملات مشاورت سے طے ہوں تو تمہارے لئے زمین کے اوپر کا حصہ اندر کے حصہ سے بہتر ہے۔ اور جب تمہارے حکام برے ہوں (ظالم، فاسق وفاجر) اور تمہارے غنی لوگ کنجوس ہوں اور تمہارے معاملات تمہاری عورتوں کے سپرد ہوں تو تمہارے لئے زمین کے اندر کا حصہ اوپر کے حصہ سے بہتر ہے۔

وضاحت حدیث: یعنی جو معاملات مشاورت سے طے ہوں گے ان میں الفت ومحبت اتفاق واتحاد پیدا ہوگا اور اگر مشاورت نہ پائی جائے بلکہ ظالمانہ انداز پایا جائے تو اس میں اختلاف وافتراق ہوگا۔

حکام کون سے بہتر ہوں گے؟ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

" خیار ائمتکم الذین تحبونهم ویحبونکم وتصلون علیهم ویصلون علیکم "

" تمہارے بہتر حکام وہ ہوں گے جو تمہارے ساتھ محبت کرتے ہوں گے اور تم ان سے محبت کرتے ہوگے اور وہ تمہارے لئے دعا کرتے ہوں گے اور تم ان کیلئے دعا کرتے ہوگے"

برے حکام کون سے ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" شرار ائمتکم الذین تبغضونهم وبغضونکم وتلعنوهم وبلعنوکم "

(مسلم، مشکوۃ باب الامارۃ والقضاء)

" تمہارے برے حکام وہ ہوں گے جن کو تم ناپسند کرتے ہوگے اور وہ تمہیں ناپسند کریں گے اور تم ان پر لعنت بھیج رہے ہوگے اور وہ تم پر لعنت بھیج رہے ہوں گے"۔

حکام کی اطاعت کب لازم ہے؟

" قال العلماء تجب طاعة ولاة الامور فیما تشق وتکرهه النفوس وغیره مما لیس بمعصیة فان کانت معصیة فلا سمع ولا طاعة "

(نووی باب وجوب طاعة الامراء)

" علماء حق نے بیان فرمایا کہ امراء حکام کی ان معاملات میں اطاعت لازم ہوگی جو شریعت کے مطابق ہوں، خواہ انسان اپنے لئے ان میں مشقت سمجھے اور نفوس ان کو

ناپسند کریں۔ لیکن اگران میں گناہ پایا جاتا ہو شریعت کے مخالف ہوں تو ان میں حکام کی اطاعت لازم نہیں ہوگی"۔

جن احادیث میں مطلق امراء، حکام کی اطاعت لازم ہونے کا ذکر ہے ان کا یہی مطلب ہے کہ ان میں معصیت نہ پائی جائے کیونکہ دوسری حدیث میں صراحۃً ذکر کیا گیا ہے "**لا سمع ولاطاعة فی المعصیة**" معصیت کے کاموں میں ان کی بات کو سن کر قبول نہ کیا جائے ان کے احکام کی فرمانبرداری نہ کی جائے۔

اغنیاء کے سخی ہونے میں کیا فائدہ:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"**السخی قریب من الله قریب من الجنة قریب من الناس بعید من النار**"

"سخی کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے وہ جنت کے قریب ہوتا ہے اور لوگوں کے قریب ہوتا ہے اور آگ سے دور ہوتا ہے"

یعنی سخی اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے اور غرباء، محتاج لوگوں کی امداد کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا محبوب ہوگا اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کا قریب جنت میں جانے کا ذریعہ ہے اور سخی کی مہربانیوں اور اچھائیوں اور حسن اخلاق کی وجہ سے لوگ بھی اس سے محبت کریں گے۔

اغنیاء کے کنجوس ہونے میں نقصانات:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"**والبخیل بعید من الله بعید من الجنة بعید من الناس قریب من النار**"

"کنجوس اللہ تعالیٰ سے دور ہوتا ہے جنت سے دور ہوتا ہے، لوگوں سے دور ہوتا ہے آگ کے قریب ہوتا ہے"

چونکہ کنجوس اللہ تعالیٰ کے حقوق کو ادا نہیں کرتا۔ اسلئے رب تعالیٰ اس سے ناراض ہوتا اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اس کو جنت سے دور اور جہنم کے قریب کر دیتی ہے اور اس کی بے رخی اور فقراء و غرباء کو اس کا ڈانٹ ڈپٹ کرنا جب لوگ دیکھتے ہیں، تو وہ اس کو نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس سے دور ہو جاتے ہیں۔

"**ولجاھل سخی احب الی الله من عابد بخیل**" (ترمذی، مشکوۃ باب الانفاق)

"جاہل سخی، اللہ تعالیٰ کو، عبادت گزار کنجوس سے زیادہ محبوب ہے"

اپنے معاملات عورتوں کے سپرد نہ کیے جائیں:

جب عورت کو صرف گھریلو معاملات کا خودمختار سربراہ بنا دینا خسارہ کا سبب ہے تو یقیناً ملکی معاملات سپرد کرنے سے عظیم نقصان ہونا ہی ہونا ہے۔ یقیناً عورت عقل کی کمی، بے صبری اور انتقامی کاروائی کرنے کی حریص ہونے کی وجہ سے صحیح فیصلہ نہیں کر سکتی بلکہ اس کے اکثر و بیشتر فیصلے غلط ہی ہوتے ہیں۔

خیال رہے حدیث پاک میں استعمال کیے گئے الفاظ " ظهر الارض " کا مطلب زندگی اور "بطن الارض " کا مطلب موت ہے۔ یعنی جب معاملات عورتوں کے سپرد ہوں اور مجلس مشاورت ختم کردی جائے صرف ایک ڈکٹیٹر من مانیاں شروع کردے غرباء اور فقراء پر رحم کرنا چھوڑ دیا جائے تو یقیناً شرفاء لوگ ایسے حالات میں زندگی سے موت کو ترجیح دیتے ہیں۔

(۱۱) مسلمان حاکم کے لئے اور شرط یہ ہے:

" ان یکون عدلا ، لانه لا خلاف بین الامة انه لا یجوز ان تعقد الامامة لفاسق "

کہ وہ عادل ہو، اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کی امت کے مسلمان اہل علم کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ فاسق کو مسلمانوں کا حاکم بنانا جائز نہیں"

اور یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں کا حاکم علم میں افضلیت رکھنے والا ہو۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" انمتکم شفعاء کم فانظروا بمن تستشفعون "

"تمہارے حکام تمہارے شفیع ہوں گے تم دیکھو کس کو اپنا شفیع بنا رہے ہو"

قرآن پاک میں بھی حکام کے لئے علم میں افضل ہونا ذکر فرمایا، طالوت کے متعلق رب تعالیٰ نے بیان فرمایا:

" ان الله اصطفاه علیکم وزاده بسطة فی العلم والجسم "

بیشک اللہ تعالیٰ نے اسے تم پر چن لیا ہے اور اسے تم پر علم اور جسم میں کشادگی زیادہ دی"

علم کا ذکر پہلے فرمایا اور جسمانی قوت کا ذکر بعد میں فرمایا اور رب تعالیٰ نے " اصطفاه " ذکر

فرمایا جس کا معنی "اختـاره" یعنی طالوت کو تم پر اختیار کرنا، چن لینا اس وجہ سے ہے کہ وہ تم پر علم میں اور جسمانی قوت میں فوقیت رکھتا ہے۔

تنبیہ: " الامام اذا نصب ثم فسق بعد انبرام العقد فقال الجمهور انه تنفسخ امامته ويخلع بالفسق الظاهر المعلوم "

ابتدائی طور پر تو فاسق کو حاکم مقرر کرنا ہی ناجائز ہے لیکن کسی کو نیک سمجھ کر اگر حاکم مقرر کرلیا گیا بعد میں وہ فاسق ہوگیا تو جمہور حضرات اس طرف ہیں کہ حق یہ ہے کہ اب اس کی حکومت ختم ہوجائے گی اور جب اس کا فسق ظاہر طور پر معلوم ہو تو وہ خود بخود معزول ہونے کے قابل ہوجائے گا۔ حکومت کے ختم ہونے اور معزول ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ معزول ہونے کا مستحق ہوجائے گا۔ اس کے معزول ہونے کی وجہ واضح ہے کہ اسے حاکم اس لئے بنایا گیا تھا کہ وہ حدود قائم کرے اور حقوق شرع پر عمل کرائے اور یتیموں کے مال کی حفاظت کرے اور مجنونوں کے مال کی حفاظت کرے اور تمام امور شرعیہ میں نظر رکھے۔ جب وہ خود ہی فاسق ہوگیا تو وہ امور شرع کا پاس نہیں کرسکتا۔ اس لئے وہ حاکمیت کا اھل نہیں رہا۔

اعتراض: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ذکر ہے:

" ولا تنازع الامر اهله قال الا ان تروا كفرا بواحا عندكم من الله فيه برهان "

(مسلم ج ۲ کتاب الامارة ص ۱۳۳)

"کہ حاکم کی اس وقت تک مخالفت نہ کی جائے جب تک اس میں ظاہر کفر نہ دیکھ لیا جائے ہاں اگر وہ کافر ہوجائے تو خود ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مخالفت کی دلیل حاصل ہوگئی"

اس صریح حدیث کے ہوتے ہوئے صرف فسق سے حاکم کی معزولیت کو کیسے بیان کیا جاسکتا ہے؟

جواب: حدیث پاک میں " كفر بواحا " کا معنی اصطلاحی کفر نہیں بلکہ اس سے مراد گناہ ہے:

" ومعناهما (اى معنى كفر بواحا) كفرا ظاهرا والمراد بالكفر هنا المعاصى ، ومعنى عندكم من الله فيه برهان اى تعلمونه عن دين الله "

(نووی حوالہ مذکور)

"حدیث شریف میں " كفر بواحا " کا معنی " كفرا ظاهرا " ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جب حاکم میں ظاہری طور پر گناہ دیکھو یعنی وہ فاسق ہوجائے تو اس کی اطاعت

تم پر لازم نہیں کیونکہ تمہیں دین کے قوانین کا علم ہے کہ وہ مستحق خلافت نہیں رہا اس لئے تمہیں رب تعالیٰ کی طرف سے اجازت مل گئی کہ تم اس کی اطاعت کو چھوڑ دو''۔

حدیث پاک کا معنیٰ یہ ہوگیا:

" لا تنازعوا ولاة الامور فی ولایتهم ولا تعترضوا علیهم الا ان تروا منهم منکرا محققا تعلمونه من قواعد الاسلام فاذا رایتم ذلک فانکروه علیهم وقولوا بالحق حیث ما کنتم "

'' حاکموں کی ان کے دور حکومت میں مخالفت نہ کرو اور ان کے خلاف کسی قسم کا کوئی قدم نہ اٹھاؤ ہاں اگر ان میں تم واضح طور پر شریعت کے خلاف گناہوں کو دیکھو تو پھر ان پر انکار کرو، اور جہاں بھی تم ہو ان کے خلاف کلمہ حق کہو، اس لئے کہ تمہیں معلوم ہے کہ اسلامی قوانین کا تقاضا یہی ہے''۔

" واما الخروج علیهم وقتالهم فحرام باجماع المسلمین وان کانوا فسقة ظالمین "

'' البتہ یہ خیال رہے کہ حکام فاسق اور ظالم ہو جائیں تو ان کے خلاف بغاوت اور قتل وغارت حرام ہے اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے''۔

فاسق کو چاہئے: حق تو یہ ہے کہ مسلمانوں کا حکمران جب فاسق ہو جائے تو خود بخود حکومت کو چھوڑ دے اس لئے کہ وہ معزول ہونے کے قابل ہو چکا ہے اس کی حکومت کے خاتمہ کا استحقاق ثابت ہو چکا ہے۔ لیکن اگر وہ حکومت سے چمٹا ہی رہے، نہ چھوڑے تو اس کی حکومت قائم ہے، اس کے غیر شرعی امور کو نہ تسلیم کیا جائے، اور شریعت کے مطابق اس کے احکام کو تسلیم کیا جائے:

" واجمع علیه اهل السنة انه لا ینعزل السلطان بالفسق..... قال العلماء وسبب عدم انعزاله وتحریم الخروج علیه ما یترتب علی ذلک من الفتن واراقة الدم وفساد ذات البین فتکون المقسدة فی عزله اکثر منها فی بقائه "

'' مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ فاسق حاکم اگرچہ مستحق ہے کہ وہ معزول کر دیا جائے لیکن جب تک وہ حکومت سے چمٹا ہوا ہے وہ معزول نہیں ہوا اس کے خلاف بغاوت نہ کی جائے۔ اس لئے کہ اس کے خلاف بغاوت کرنے میں فتنے اٹھیں گے، قتل وغارت ہوگی، فسادات مرتب ہوں گے۔ اس لئے اس کے باقی رکھنے میں اتنے

نقصانات نہیں جتنے اس کے معزول کرنے اور اس کے خلاف بغاوت میں ہیں"۔

فائدہ: ابھی تک جو بحث کی ہے اس سے یہ بھی واضح ہو چکا ہے کہ فاسق حاکم مستحق معزولیت ہو چکا ہے۔ لیکن اس کے خلاف فساد اور قتل و غارت کی وجہ سے اس سے بغاوت کرنے کی ممانعت ہے۔

فاسق بادشاہ کے معاصی جب رعایا کو تباہ کر رہے ہوں تو کیا کیا جائے؟

" قال القاضي عياض اجمع العلماء على ان الامامة لا تنعقد لكافر وعلى انه لو طرا عليه الكفر انعزل قال و كذا لو ترك اقامة الصلوات والدعاء اليها و كذلك عند جمهورهم البدعة "

'' قاضی عیاض رحمہ اللہ نے بیان فرمایا مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ کافر کو ابتدائی طور پر مسلمانوں کا حاکم بنانا جائز نہیں۔ اگر مسلمانوں کا حاکم کسی مسلمان شخص کو بنالیا گیا العیاذ باللہ وہ کافر ہوگیا تو معزول ہو جائے گا۔ اسی طرح ایک عادل، نیک شخص کو حاکم بنایا تھا وہ فاسق ہو گیا اس نے نمازیں چھوڑ دیں، لوگوں کو بھی نماز کا حکم نہیں دیتا یعنی اس کی وجہ سے لوگ بھی بے نماز ہو رہے ہیں تو وہ بھی حکومت سے معزول ہو گیا''۔

اسی طرح جمہور علماء کے نزدیک خلاف شرع نئے نئے کام ایجاد کرنے کی وجہ سے بھی معزول ہو جائیگا:

" قال القاضي فلو طرأ عليه الكفر او تغيير للشرع او بدعة خرج عن حكم الولاية وسقطت طاعته وجب على المسلمين القيام عليه وخلعه ونصب امام عادل ان امكنهم ذلك فان لم يقع ذلك الا لطائفة وجبت عليهم القيام بخلع الكافر ولا يجب في المبتدع الا اذا ظنوا القدرة عليه فان تحققوا العجز لم يجب القيام وليها جر المسلم عن ارضه الى غيرها ويفر بدينه "

'' قاضی عیاض رحمہ نے فرمایا اگر مسلمانوں کا حاکم کافر ہو جائے، یا شرعی احکام تبدیل کرنے کا مرتکب ہو جائے یا شریعت کے خلاف نئے نئے احکام جاری کرنے شروع کر دے تو اس کی حکومت در حقیقت ختم ہو جاتی ہے اور اس کی طاعت ختم ہو جاتی ہے۔ یعنی ضروری ہو جاتا ہے کہ اس کے احکام کو نہ تسلیم کیا جائے۔ اگر چہ حقیقت میں وہ معزول تو ہو چکا ہے لیکن معزول ہونے کے باوجود لٹھ برداروں کے سہارے حکومت کر رہا ہو، تو مسلمانوں کے لئے ضروری ہو جاتا ہے اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور اسے ہٹا کر کسی عادل شخص کو اپنا حاکم مقرر کر لیں۔ لیکن یہ اس وقت ہوگا جب مسلمانوں

کے اس کو خلاف قدم اٹھانے کی طاقت بھی حاصل ہو“

اگر مسلمانوں کا ایک گروہ سمجھتا ہے کہ ہمیں بادشاہ کی مخالفت اور مقابلہ کی طاقت نہیں تو پھر بھی جب حاکم کافر ہو جائے تو وہ لوگ اس کے خلاف جان پر کھیل جائیں، خود شہادت کا اعلیٰ منصب حاصل کر کے اسکی حکومت کی جڑوں کو متزلزل کر دیں تا کہ جلدی ہی مسلمانوں کو اس سے نجات حاصل ہو جائے۔

اگر حاکم کافر تو نہیں ہوا لیکن وہ احکام شرع کو تبدیل کر رہا ہے شریعت کے خلاف نئے نئے احکام پر عمل کرنے پر مجبور کر رہا ہے تو اب دیکھا جائے اگر اس سے مقابلہ ممکن ہے تو اسے معزول کر دیا جائے اور اسکی جگہ کسی عادل اور نیک شخص کو مقرر کر دیا جائے۔ اگر اس سے مقابلہ ممکن نہیں اور وہ غیر شرعی کام کرنے پر مجبور بھی کر رہا ہے تو ہجرت کر کے اپنے دین کو بچا لیا جائے، اور اپنے آپ کو اسکے غیر شرعی امور سے الگ تھلگ کر لیا جائے۔ (از نووی کتاب الامارۃ) (بحث خلافت ماخوذ از قرطبی بزیادۃ)

مقام افسوس یہ ہے کہ آج کل یہ شرعی اصول چھوڑ کر لوگ مغربی جمہوریت میں کامیابی کا راز سمجھ بیٹھے۔ حالانکہ مسلمانون کے حکمران کو منتخب کرنا اہل علم مجتہدین فقہاء کرام، علماء عظام کا کام ہے مغربی جمہوریت میں عالم، جاہل، مرد اور عورت کا ووٹ برابر ہے جسے چاہیں منتخب کریں۔ اسلام میں حکمران کیلئے جو شرائط رکھی گئی ہیں مغربی جمہوریت میں ان کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ ہر فاسق و فاجر حاکم بن سکتا ہے۔ اسلام میں مجلس مشاورت کے لئے انتخاب نہیں بلکہ حاکم وقت جن لوگوں کو اھل سمجھے ان سے مشورہ لے لیکن مغربی جمہوریت میں بغیر کسی اھلیت کے مشاورت کے لئے اسمبلی کے ممبران کو منتخب کیا جاتا ہے۔

اسلام میں مشیر قومی خزانہ پر بوجھ نہیں ہوتے ان کی معین تعداد نہیں ہوتی، لیکن مغربی جمہوریت میں قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبران قومی خزانہ پر بلا وجہ بوجھ بنے ہوتے ہیں اور ان کی معین تعداد ہوتی ہے۔ اسلام میں مشیر قرآن وحدیث کے تابع ہوتے ہیں وہ کوئی قانون خود نہیں بنا سکتے بلکہ قرآن وحدیث کے قوانین کی تشریح کر سکتے ہیں لیکن مغربی جمہوریت میں قومی اسمبلی کے دو تہائی ممبران جو چاہیں قانون بنا دیں۔

اسلام میں یہ کوئی تصور نہیں کہ ووٹ قومی اسمبلی کے ممبران کو دیا جائے اور وہ وزیر اعظم کا انتخاب کریں۔ یہ تصور صرف مغربی جمہوریت میں ہے اور خصوصاً باعث نقصان اور قابل مذمت بات یہ ہے کہ

ووٹ دینے والے وزیراعظم کو مدنظر رکھ کر ووٹ دیتے ہیں۔ لیکن کئی بے ضمیر، بکاؤ مال ووٹ اور نام پر لیتے ہیں اور اسمبلی میں جا کر ساتھ اور کا دیتے ہیں اسلام میں حاکم جب تک انصاف سے کام کرتا ہے اس کی میعاد ختم نہیں ہوتی اور اگر انصاف کو چھوڑ دے تو اس کے رہنے کا حق ختم ہو جاتا ہے۔

لیکن مغربی جمہوریت میں حاکم خواہ نیک ہو، منصف ہو، وہ مقرر میعاد پر معزول ہو جائے گا اور خواہ کتنے مظالم ڈھائے وقت سے پہلے معزول نہیں ہوگا۔ اسلام میں حاکم کی غلطی پر عام شخص کو بھی حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ حاکم سے پوچھے کہ تم نے یہ غلط کام کیوں کیا ہے۔ مغربی جمہوریت میں حاکم سے پوچھنے والے پر جھوٹے ان گنت مقدمے بنا دیئے جاتے ہیں۔

اسلام میں حاکم بھی عام آدمی کی طرح عدالت میں اپنے خلاف مقدمات کا جواب دینے کا ذمہ دار ہے لیکن مغربی جمہوریت میں حاکم کو عدالت میں جواب دینے سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا ہے۔ اسلام میں قومی خزانہ لوٹنے پر، بیت المال کو نقصان پہنچانے پر ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ حاکم سے باز پرس کرے۔ مغربی جمہوریت میں یہ حق نہیں دیا گیا۔ صرف ذاتی نقصان پر کسی کو مقدمہ کرنے کا بظاہر حق حاصل ہے لیکن مقدمہ درج ہی کوئی نہیں کرتا۔ مقدمہ درج ہو جائے تو حاکم کے خلاف کوئی فیصلہ ہی نہیں کرتا۔

آیئے پاکستان میں حاکم کے مقرر کرنے کا طریقہ دیکھیں؟ یہ طریقہ تمام قوانین سے بالاتر ہے اسلامی قوانین پر عمل کا تو تصور ہی نہیں لیکن مغربی جمہوریت کا صرف نام ہے مغربی جمہوریت پر بھی کوئی عمل نہیں۔ لٹھ بردار جسے چاہیں الیکشن کا ڈھونگ رچا کر رات ہی رات میں اس کی صندوقچیاں پرچیوں سے بھر کر اسے محب وطن کا سرٹیفکیٹ دے دیں اور اسے حاکم بنا دیں۔ جب تک وہ لٹھ برداروں کے سامنے سر نہ اٹھائے۔ خوشامدی بن کر رہے جی حضوری بن کر رہے (تھلے لگ کے رہے) وہ محب وطن کہلاتا ہے وہ ملک کا خیر خواہ کہلاتا ہے وہ لائق اور ذہین کہلاتا ہے۔ لیکن جب وہ سر اٹھائے اپنے آپ کو حاکم سمجھے اپنی سمجھ کے مطابق کوئی فیصلہ کرے جی حضوری اسے کرنہ رہے اسے کرپٹ، غدار، لٹیرا کہا جاتا ہے لٹھ بردار اسے چلتا بناتے ہیں۔ کفار کے سامنے شرمناک طریقہ سے سرنگوں ہونے والے ملک کو دولخت کرنے والے، اپنے ہی ملک کو بار بار فتح کر کے اپنی فتح کے شادیانے بجا کر اپنے دل کو تسلیاں دیتے ہیں اور قوم کو الو بناتے ہیں۔

اب قوم بھی بے وقوف نہیں رہی قوم نے سمجھ لیا ہے کہ ملک کو برباد کرنے والے کون ہیں اصل غاصب اور لیٹرے کون ہیں ہاں البتہ قیام پاکستان کے وقت کانگرس کے پٹھو رہنے والے بھی ملک کے برباد میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہے۔ بین الاقوامی سازش، یہود و نصاریٰ کی سازش سے ملک عزیز کے باوقار، باعزت ادارہ کو لوگوں کی نظر میں بے عزت اور بے وقار کر دیا گیا نفرت کے بیج بو دیئے گئے۔

﴿ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ﴾:

''انہوں (فرشتوں) نے کہا کیا تو زمین میں اسے خلیفہ بنائے گا جو وہاں فساد پھیلائے اور خون بہائے''

ان الفاظ مبارکہ کی تفسیر بیان ہو چکی ہے کیونکہ اصل مقصودی بحث "للملئكة" کے متعلق تھی لیکن یہ بحث بھی اسی کے ضمن میں گزر چکی ہے۔ اب مختصر صرف دو لفظوں کو ذکر کیا جا رہا ہے "اتجعل" جعل سے ماخوذ ہے کبھی اس کا معنی ہوتا ہے پیدا کرنا اس وقت اس کا ایک مفعول ہوتا ہے اور کبھی اس کا معنی ہوتا ہے بنانا، پھیرنا، اس وقت اس کے دو مفعول ہوتے ہیں "ویسفک" سفک سے مضارع ہے جس کا معنی ہے بہانا کبھی کہا جاتا ہے "سفک الدم" خون بہانا، اور کبھی کہا جاتا ہے "سفک الدمع" آنسو بہانا۔ سفاک اور سفاح کا معنی ہوتا ہے خون بہانے والا اور کبھی ان کا معنی ہوتا ہے ''کلام پر قدرت رکھنے والا'' اسی طرح بولا جاتا ہے "سفک الکلام" اس نے نثر کلام کیا۔ تاہم زیادہ طور پر "سفک" کا استعمال خون بہانے کے معنی میں ہوتا ہے۔ دوسرے معانی میں کم استعمال ہے۔

(از قرطبی)

﴿ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ ﴾: ''اور ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح کرتے ہیں''

"وهو مشتق من السبح وهو الجری والذهاب" نسبح مشتق ہے "سبح" سے۔ جس کا معنی ہے جاری ہونا، تیرنا، جانا۔

ونحن نسبح بحمدک، ای ننزهک عما لا یلیق بصفاتک ونخلط التسبیح بالحمد ونصله به"

''فرشتوں کے کہنے کا یہ مطلب تھا کہ اے اللہ ہم تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں ان صفات سے جو تیری شان کے لائق نہیں، اور ساتھ ہی تیری حمد بیان کرتے ہیں''

اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ "بحمدک" جملہ معترضہ ہو اور "ونحن نسبح ونقدس"

کا ایک دوسرے پر عطف ہو۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ ہم تیری تسبیح بیان کرتے ہیں اور تیری تقدیس بیان کرتے ہیں۔

" ثم اعترضوا علی جهة التسليم ای وانت المحمود فی الهداية الي ذلك "

" پھر انہوں نے جملہ معترضہ کے طور پر ذکر کیا کہ اے اللہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ تسبیح و تقدیس کی ہدایت بھی ہمیں تو نے ہی عطا کر رکھی ہے اور تو ہی محمود ہے یعنی حمد کے لائق تو ہی ہے "

☆ " روی عن طلحة بن عبيد الله قال سالت رسول الله ﷺ عن تفسير سبحان الله فقال هو تنزيه الله عزوجل عن كل سوء "

حضرت طلحہ بن عبید اللہ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرنے کا کیا مطلب ہے؟ تو آپ نے جواب دیا کہ " اللہ تعالیٰ کی شان کے جو بھی لائق نہیں اس سے رب تعالیٰ کی پاکیزگی بیان کرنا "

ملائکہ کی تسبیح:

" فقال ابن مسعود وابن عباس تسبحهم صلاتهم " " ملائکہ کی تسبیح سے مراد ان کا نماز ادا کرنا ہے "

وقيل تسبيحهم رفع الصوت بالذكر "

" بعض حضرات نے کہا کہ ملائکہ کی تسبیح کا مطلب ہے بلند آواز سے ذکر کرنا یہ قول مفضل کا ہے "

" وقال قتادة تسبيحهم سبحان الله علی عرفه فی اللغة "

" حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، فرشتوں کی تسبیح " سبحان اللہ " کہنا ہے لغت کے مطابق یہی معنی مراد لیا جاتا ہے "

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اس آخری معنی کو صحیح قرار دیا ہے اور اسی کی تائید میں ایک حدیث پیش کی ہے۔ لیکن راقم کے نزدیک تمام معانی مراد لینے میں کوئی مشکل نہیں کیونکہ فرشتے اپنی عبادت کے ذریعے بھی رب تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور بلند ذکر سے بھی رب تعالیٰ کی پاکیزگی بیان کرتے ہیں اور زیادہ طور " سبحان اللہ " کہہ کر بھی رب تعالیٰ کی پاکیزگی بیان کرتے ہیں۔ اب حدیث پاک کا مفہوم بھی آسانی سے سمجھ آ جائے گا کہ زیادہ طور پر ان کی تسبیح یہ ہوتی تھی۔

☆ " عن ابی ذر ان رسول الله ﷺ سئل ای الكلام افضل ؟ قال ما اصطفی الله لملائكته (او لعباده) سبحان الله وبحمده " (مسلم)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کون سا کلام افضل ہے؟ آپ نے فرمایا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کے لئے پسند فرمایا یعنی " سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ "

☆ " عن عبد الرحمن بن قرط ان رسول الله صلى الله عليه وسلم ليلة اسرى به سمع تسبيحا فى السموات العلا سبحان الله العلى الا على سبحانه و تعالىٰ " (بيهقى)

عبدالرحمٰن بن قرط فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی رات کو آسمان بالا میں یہ تسبیح سنی:

﴿ سُبْحَانَ اللهِ الْعَلِيِّ الْاَعْلٰى سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى ﴾

﴿ وَنُقَدِّسُ لَكَ ﴾:

" اى نعظمک ونمجدک ونطهر ذكرک عما لا يليق بک مما نسبک اليه الملحدون "

"ہم تیری عظمت بیان کرتے ہیں اور تیری بزرگی بیان کرتے ہیں اور تیرے ذکر کو ہر اس چیز سے پاک رکھتے ہیں جو تیری شان کے لائق نہیں اور بے دینوں نے تیری طرف منسوب کیا ہے"

یہ قول حضرت مجاہد اور حضرت ابوصالح رحمہما اللہ اور ان کے بغیر کچھ دوسرے حضرات کا ہے۔ اور ضحاک وغیرہ نے یہ معنی بیان کیا ہے:" نطهر انفسنا لک ابتغاء مرضاتک " ہم اپنے نفسوں کو پاکیزہ رکھتے ہیں تیری رضامندی حاصل کرنے کے لئے۔ حضرت قتادہ اور کچھ دوسرے حضرات نے کہا "نقدس لک " ، معناه نصلى ، والتقديس ، الصلوة " کہ " نقدس لک " کا معنی یہ ہے کہ ہم نماز ادا کرتے ہیں۔ کیونکہ " التقديس "کا معنی "نماز" ہے اس معنی کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے تائید بھی حاصل ہے آپ فرماتی ہیں:

" كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول فى ركوعه وسجوده سبوح قدوس رب الملئكة والروح" (مسلم)

رسول اللہ ﷺ رکوع اور سجود میں یہ پڑھتے تھے ﴿ سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوْحِ ﴾ لیکن یہ خیال رہے کہ رکوع میں " سبحان ربى العظيم " پڑھنے کے بعد اور سجود میں

"سبحان ربی الاعلی" پڑھنے کے بعد یہ تسبیحات پڑھتے اور نماز بھی نفلی مراد ہے فرض نماز مراد نہیں
جیسا کہ شارحین نے وضاحت کی ہے: "تقدیس" کا معنی نماز لینا عقل کے بھی مطابق ہے:

"ان الصلوة تشتمل علی التعظیم والتقدیس والتسبیح"

"بیشک نماز تعظیم، تقدیس، تسبیح کو شامل ہے"

﴿ قَالَ اِنِّیٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ ﴾: "رب نے کہا بیشک میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے"
اس کی وضاحت بھی پہلے کافی حد تک ضمنی طور پر گزر چکی ہے البتہ مختصر طور پر یہاں بھی ذکر کیا جا رہا ہے۔ اس سے کیا مراد ہے "کہ میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے؟" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک مطلب یہ بھی ہے کہ فرشتے جب یہ کہہ رہے تھے کہ ہم تیری تسبیح وتحمید وتقدیس بیان کرتے ہیں تو رب تعالیٰ نے فرمایا کہ بیشک میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے کیونکہ تمہارے اندر ابلیس بھی ہے جس کے دل میں تکبر آ چکا ہے اس نے میرے حکم کا انکار کرنا ہے اور مردود ہو جانا ہے۔ اور ایک معنی یہ بھی ہے:

"انی اعلم مالا تعلمون مما کان ومما یکون ومما ھو کائن" (از قرطبی)

"بیشک جو ہو چکا ہے جو ہو رہا ہے، جو ہونا ہے وہ میں ہی جانتا ہوں تمہیں اس کا علم نہیں"

حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش:

رب تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی پیدائش کے مختلف مراحل کو ذکر فرمایا یعنی آپ کے جسم اطہر کیلئے پہلے خشک مٹی کو لایا گیا، پھر اسے گوندھ کر کیچڑ بنایا گیا پھر چپکنے والی مٹی بنایا گیا پھر اسے اسی طرح رہنے دیا گیا یہاں تک کہ وہ خشک ہو گئی اور بجنے لگی اور اس کی بو میں تغیر آ گیا پھر اور زیادہ رکھنے پر ٹھیکری کی طرح ہو گئی۔ ان تمام مراحل کا ذکر قرآن پاک کی مختلف آیات میں دیکھنے سے واضح ہو جائے گا:

﴿ فانا خلقنکم (ای اصلکم آدم) من تراب ﴾ (پ ۱۷ ۸ جلالین)

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا بیشک ہم نے تمہارے اصل (باپ) آدم کو مٹی سے پیدا کیا"

﴿ واذ قال ربک للملائکة انی خالق بشرا من طین (ھو آدم) ﴾ (پ ۲۳ ۱۲ جلالین)

"یاد کرو اس وقت کو جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا بیشک میں ایک بشر کیچڑ سے بنانے

والا ہوں اس سے مراد آدم علیہ السلام ہیں''

﴿ انا خلقناهم من طين لازب (انا خلقناهم اى اصلهم آدم) ﴾

''بیشک ہم نے انسانوں کو چپکتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا یہاں بھی انسانوں سے مراد ان کے اصل آدم علیہ السلام ہیں''

﴿ ولقد خلقنا الانسان (آدم) من صلصال (طين يابس تسمع له صلصلة اى صورت اذا نقر) من حمأ(طين اسود) مسنون (متغير) ﴾ (پ ۱۴ ۳ جلالین)

''بیشک ہم نے انسان یعنی آدم کو سیاہ خشک متغیر کیچڑ سے پیدا کیا''

''صلصال'' اس کیچڑ کو کہتے ہیں جو خشک ہو جائے کھٹکانے پر اس سے آواز آئے سیاہ کیچڑ کو ''حمأ'' کہتے ہیں جس کی بو میں تغیر آجائے اسے ''مسنون'' کہتے ہیں۔

﴿ خلق الانسان (آدم) من صلصال (طين يابس يسمع له صلصلة اى صوت اذا نقر) كالفخار (وهو ما طبخ من طين) ﴾ (پ ۲۷ ۱۲ جلالین)

''انسان یعنی آدم کو خشک بجنے والی ٹھیکری کی طرح کیچڑ سے پیدا کیا''

آدم علیہ السلام کے جسم کے لئے مٹی کیسے لی گئی؟

آدم علیہ السلام کے جسم اطہر کی تخلیق کے لئے مٹی لانے کے لئے حضرت جبرائیل کو زمین پر بھیجا گیا، آپ جب تشریف لائے تو زمین سے مٹی لینے کا ارادہ فرمایا، تو زمین نے بڑی عاجزی وانکساری اور گریہ وزاری سے عرض کیا کہ میرے مٹی سے بننے والے شخصوں نے اگر خونریزیاں کیں یا اور جرائم کی وجہ سے وہ جہنم میں گئے تو مجھے تکلیف ہوگی۔ اس لئے آپ میری مٹی نہ لے کر جائیں۔

حضرت جبرائیل زمین کی عاجزی کو دیکھ کر واپس چلے گئے اور اللہ تعالیٰ کے حضور ماجرا عرض کر دیا۔ اسی طرح اسرافیل بھی آئے وہ بھی زمین کی بات سن کر واپس چلے گئے اور میکائیل آئے وہ بھی اسی طرح واپس چلے گئے۔ ان تمام کے بعد عزرائیل آئے ان کی خدمت میں بھی زمین نے وہی عاجزانہ گفتگو کی۔ لیکن آپ نے کہا میں تیری بات تسلیم کروں یا اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کروں۔

مجھے اللہ تعالیٰ کا حکم اس لئے میں نے تو مٹی ضرور لے کر جانا ہے۔ آپ نے زمین کی انکساری کی طرف کوئی توجہ نہ دی بلکہ رب تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق زمین سے مٹی لے کر رب تعالیٰ کے حضور حاضر ہو گئے۔

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے روح قبض کرنا بھی ان کے سپرد کیا کہ ایسا نہ ہو کہ جبرائیل، میکائیل اور اسرافیل میں سے کسی کے ذمہ لگایا تو یہ روح قبض کرنے کے لئے جائیں تو اس کے اقرباء کو روتے ہوئے پا کر اسی طرح چھوڑ کر نہ آ جائیں۔ (از عزیزی)

سوال: زمین کو کیسے پتہ چلا کہ انسان خونریزیاں کریں گے اور فساد پھیلائیں گے اور کئی لوگ جہنم میں جائیں گے؟

جواب: ''جبریل گفت که حق تعالیٰ از تو مخلوق را خواهد آفرید که خلافت زمین باو خواهد بخشید و او چنیں و چناں خواهد کرد، و در ثواب و عذاب خواهد افتاد'' (از عزیزی)

جبرائیل نے خود ہی زمین کو اللہ تعالیٰ کا پیغام واضح طور پر دیا تھا کہ رب تعالیٰ تجھ سے ایک مخلوق کو پیدا کرنے والا ہے۔ جسے زمین میں ہی منصب خلافت عطا کرنا ہے۔ البتہ انکے اعمال مختلف ہوں گے کئی لوگ نیک ہوں گے، ان کو ثواب عطا کیا جائے گا۔ اور کئی لوگ گنہگار ہوں گے ان کو عذاب دیا جائے گا۔ زمین پر یہ حقائق خود رب تعالیٰ کی طرف سے جبرائیل نے واضح طور پر کھول کر رکھ دیئے تھے۔ اسی وجہ سے زمین نے عاجزانہ طور پر عرض کیا تھا کہ مجھ سے مٹی لے کر نہ جائیں۔

کسی طرح کی مٹی لی گئی؟

'' عن ابی موسی قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول ان اللہ خلق آدم من قبضة قبضها عن جمیع الارض فجاء بنو آدم علی قدر الارض منهم الاحمر والابیض والاسود وبین ذلک والسهل والحزن والخبیث والطیب '' (رواه احمد والترمذی وابو داؤد، مشکوة باب الایمان والقدر)

''حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو مٹھی بھر مٹی سے پیدا کیا، وہ مٹی تمام زمین سے (مختلف قسم کے ذرات کی صورت میں) حاصل کی گئی۔ اسی لئے آپ کی

اولادمٹی کے ان ہی ذرات کی شکل میں موجود ہے کوئی سرخ ہیں، کوئی سفید ہیں، کوئی
سیاہ ہیں کوئی ان کے درمیان ہیں (یعنی گندم گوں رنگ کے ہیں) کوئی نرم مزاج ہیں،
کوئی سخت مزاج ہیں کوئی ناپاک ہیں اور کوئی پاک ہیں"

یعنی آدم علیہ السلام کی تخلیق کے وقت آپ کے جسم میں جس قسم کے ذرات رکھے گئے آپ کی اولاد میں بھی اسی طرح کی صورتیں پیدا ہوئیں۔ جتنے رنگوں کے ذرات آپ کی مٹی میں تھے اتنے ہی آپ کی اولاد میں پائے جاتے ہیں۔آپ کی مٹی میں کوئی سخت ذرات اور کوئی نرم ذرات تھے۔اس لئے آپ کی اولاد میں بھی کوئی سخت دل اور کوئی نرم دل ہیں اور اسی طرح آپ کی اولاد میں کوئی نیک اور کوئی برے ہیں۔

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی مٹی میں ساٹھ قسم کے رنگ شامل تھے، وہ تمام آپ کی اولاد میں پائے جاتے ہیں۔ (صاوی)

زمین میں چشمے جاری ہونے کی وجہ:

اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو زمین کو بتایا کہ میں تجھ سے اپنی ایک مخلوق پیدا کرنے والا ہوں، جو میرے مطیع ہوں گے ان کو جنت میں داخل کروں گا اور جو میرے نافرمان ہوں گے ان کو میں جہنم کی آگ میں ڈال دوں گا۔ یہ سن کر زمین نے پھر پوچھا۔اے اللہ تعالیٰ مجھ سے پیدا ہونے والی مخلوق جہنم کی آگ میں جائے گی؟

رب تعالیٰ نے فرمایا ہاں زمین نے رب تعالیٰ کے ارشاد کو جب سنا:" **فبکت فانبعت العیون من بکائها وهی تجری الی یوم القیمة** " (صاوی) تو زمین اتنا روئی کہ اس کے رونے سے چشمے جاری ہو گئے وہ قیامت تک چشمے جاری رہیں گے۔

انسان کو خوشی کم اور غم زیادہ کیوں؟

حضرت عزرائیل جب مٹی کو لائے تو انہیں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اسے صفا و مروہ پہاڑیوں کے پاس رکھ دو یعنی وہاں رکھ دینے کا حکم دیا جہان آج کل کعبہ شریف ہے۔ پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ اسکا

مختلف پانیوں سے گارا بنائیں، پھر اس پر چالیس روز بارش ہوئی۔ انتالیس دن تو غم ورنج کا پانی برسا اور ایک دن خوش کا۔ اسی لئے انسان کو رنج زیادہ اور خوشی کم ہوتی ہے۔ پھر اس گوندھی ہوئی مٹی کو مختلف ہواؤں سے خشک کر کے کھنکنے والی مٹی بنا کر اللہ تعالیٰ نے خود اپنی قدرت کاملہ سے آپ کے قالب کو تیار کیا۔ (از عزیزی)

آدم علیہ السلام کی صورت جنت میں تیار ہوئی:

" قد ترک فی الارض حتی استعد للصورة الانسانية ثم نقل الى الجنة وصور هناک " (حاشیہ مشکوة ص ۵۰۶)

" آدم علیہ السلام کی مٹی کو زمین میں رکھا گیا جب وہ انسانی صورت بنانے کے قابل ہو گئی تو اسے جنت کی طرف منتقل کر دیا گیا پھر وہاں اسے صورت عطا کی گئی"

" عن انس ان رسول الله ﷺ قال لما صور الله آدم فی الجنة ترکه ماشاء الله ان یترکه فجعل ابلیس یطیف به ینظر ما هو فلما رآه اجوف عرف انه خلق خلقا لا یتمالک " (مشکوة باب بدا الخلق)

" حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو جنت میں صورت عطا کر دی (یعنی آپ کا جسم بنا دیا گیا) تو جنت میں کچھ دیر کے لئے چھوڑ دیا گیا، یعنی جتنی دیر رب تعالیٰ کی مشیت تھی اتنی دیر آپ کے جسم کو (بغیر روح کے) جنت میں رکھ دیا گیا ابلیس اسے پھیر کر دیکھتا، جب اس نے دیکھا کہ اس میں پیٹ ہے تو اس نے سمجھا کہ یہ وہ مخلوق ہے جو اپنے آپ پر قدرت نہیں رکھے گی"۔

آدم علیہ السلام کی صورت دیکھ کر فرشتے حیران ہو گئے:

فرشتوں نے کبھی ایسی صورت نہیں دیکھی تھی وہ حیران ہو کر اس کے ارد گرد پھرتے تھے، اور اس کی خوبصورتی پر تعجب کرتے تھے۔ ابلیس کو بھی اس کی خبر ہو چکی تھی۔ ابھی تک وہ مردود نہیں ہوا تھا، وہ بھی اس قالب کو دیکھنے آیا، اور اس کے ارد گرد پھر کر بولا تم اس پر تعجب کرتے ہو یہ تو اندر سے ایک خالی جسم ہے جس میں جگہ جگہ سوراخ ہیں اور اس کی کمزوری کا یہ حال ہے کہ اگر بھوکا ہو تو گر پڑے اور اگر خوب سیر ہو جائے تو چل پھر نہ سکے، اس خالی قالب سے کچھ نہ ہو سکے گا، پھر کہنے لگا ہاں اس کے سینے کے

بائیں طرف ایک بند کوٹھڑی (دل) ہے یہ خبر نہیں کہ اس میں کیا ہے۔ شائد یہی لطیفہ ربانی کی جگہ ہو، جس کی وجہ سے یہ خلافت کا حق دار ہوا ہو۔ (از عزیزی)

آدم علیہ السلام کے قالب میں روح کا دخول:

اللہ تعالیٰ نے روح کو حکم دیا کہ اس قالب میں داخل ہو جا اور تمام حصوں میں پھیل جا جب روح قالب کے پاس پہنچی تو جسم کو تنگ و تاریک پایا اندر جانے سے ٹھہر گئی۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ تب نور مصطفیٰ ﷺ سے وہ قالب جگمگا دیا گیا یعنی وہ نور آدم علیہ السلام کی پیشانی میں امانت رکھا گیا اب روح آہستہ آہستہ داخل ہونے لگی ابھی سر میں تھی کہ آپ کو چھینک آئی اور زبان میں پہنچی، تو آپ نے الحمد للہ پڑھا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں یرحمک اللہ کہا۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ابو محمد (ابو محمد اور ابو البشر آدم علیہ السلام کی کنیت ہے) میں نے تمہیں اپنی حمد کے لئے ہی پیدا کیا ہے۔ جب روح کمر تک پہنچی تو آپ نے اٹھنا چاہا لیکن آپ گر پڑے کیونکہ روح ابھی آپ کے نیچے والے حصہ میں نہیں پہنچی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ خلق الانسان من عجل ﴾ انسان جلد باز پیدا کیا گیا۔ پھر روح تمام جسم میں پھیل گئی تو آپ کو حکم ہوا کہ فرشتوں کو سلام کرو، آپ نے کہا" السلام علیکم "فرشتوں نے جواب دیا" وعلیکم السلام" اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ ہی آپ کیلئے اور آپ کی اولاد کے لئے سلام کا طریقہ ہوگا۔ آپ نے عرض کیا میری اولاد کون سی ہوگی؟ تو آپ کی تمام اولاد کو آپ کے سامنے کر دیا گیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا۔ پھر ان کی پیٹھ پر اپنا دست قدرت پھیرا اور آپ کی باقی اولاد کو ظاہر فرمایا اور رب تعالیٰ نے کہا کہ ان لوگوں کو میں نے جہنم کے لئے پیدا کیا ہے یہ جہنمیوں والے عمل کریں گے۔

(ماخوذ از خازن ج ۱ ص ۴۶، نعیمی ج ص ۲۵۰، ابو داؤد مشکوۃ باب الایمان بالقدر)

آدم علیہ السلام کی پیدائش جمعہ کے دن ہوئی:

"عن ابی هريرة قال اخذ رسول الله ﷺ بيدی فقال خلق الله التربة يوم

السبت وخلق فيها الجبال يوم الاحد وخلق الشجر يوم الاثنين وخلق المكروه يوم الثلثاء وخلق النور يوم الاربعاء وبث فيها الدواب يوم الخميس وخلق آدم بعد العصر من يوم الجمعة فى آخر الخلق وآخر ساعة من النهار فيما بين العصر الى الليل "(رواه مسلم مشكوة باب بدأ الخلق)

''حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ہاتھ کو پکڑ کر فرمایا اللہ تعالیٰ نے مٹی کو ہفتے کے دن پیدا فرمایا (مٹی سے مراد زمین ہے) اور اسمیں پہاڑوں کو اتوار کے دن پیدا فرمایا اور درختوں کو پیر کے دن پیدا فرمایا۔ اور مکروھات (مصائب وغیرہ) کو منگل کے دن پیدا فرمایا۔ اور نور کو بدھ کے دن پیدا فرمایا، اور چوپاؤں کو زمین میں جمعرات کے دن پھیلایا، اور آدم (علیہ السلام) کو جمعہ کے دن عصر کے بعد تمام مخلوق کے آخر میں دن کی آخری گھڑی عصر سے شام تک کے درمیان میں پیدا کیا؛

فائدہ: احادیث میں مروی ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ بہترین دنوں میں جمعہ کا دن ہے کیونکہ جمعہ کو ہی حضرت آدم علیہا السلام کی تخلیق ہوئی اور جمعہ کے دن ہی آپ کو جنت میں داخل کیا گیا۔ اور جمعہ کے دن ہی آپ جنت سے باہر تشریف لائے اور جمعہ کے دن ہی آپ کی وفات ہوئی اور جمعہ کے دن ہی قیامت قائم ہوگی۔ (از عزیزی)

سید الاولیاء کا کلام:

سید الاولیاء حضرت پیر مہر علی شاہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ حضرت الشیخ نے فتوحات کے متعدد مقامات میں اشعار تحریر فرمائے ہیں ان میں سے ایک مصرعہ یہ ہے " یا اخت عمتی المعقولة "اس مصرع کا لفظی معنی یہ ہے کہ اے میری بہن بلکہ میری پھوپھی کہ تو معقولہ ہے یہ اشارہ ہے اس حدیث شریف کی طرف جس میں ہے کہ آدم علیہ السلام کی خلقت سے کچھ مٹی باقی رہ گئی جس سے کھجور کا درخت بنایا گیا، لہذا کھجور کا درخت آدم کی بہن اور ہماری پھوپھی ٹھہرا۔

جب اس کی خلقت کے بعد کچھ مٹی بمقدار ایک دانہ تل باقی بچی تو اس سے اللہ تعالیٰ نے ایک زمین نہایت وسیع پیدا فرمائی کہ ساتوں آسمان اور زمینیں اس کے مقابلہ میں ایسے ہیں جیسے صحرا میں ایک حلقہ، اس کو ارض حقیقی بولتے ہیں:

ایں جھان را آں جھانے دیگر است　　　اس جہان کے مقابلہ میں وہ جہان ہی اور ہے

اس میں صرف اللہ تعالیٰ کے اولیاء ہی داخل ہوتے ہیں اور اس کا علم بھی ان کو ہی حاصل ہے

(از ملفوظات مہریہ ص ۱۷)

آدم علیہ السلام کا قد:

" عن ابی هريرة قال ان رسول الله ﷺ قال كان طول آدم ستين ذراعا فی سبع اذرع عرضا " (مشكوة باب بدأ الخلق)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آدم علیہ السلام کی لمبائی ساٹھ ذراع تھی (یعنی نوے فٹ) اور آپ کی چوڑائی سات ذراع تھی''۔

﴿ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ☆ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ☆ قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴾

(۱)　''اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام (اشیاء کے) نام سکھائے۔ پھر سب (اشیاء) کو ملائکہ پر پیش کر کے فرمایا سچے ہو تو ان کے نام تو بتاؤ ☆ بولے پاکی ہے تجھے ہمیں کچھ علم نہیں، مگر جتنا تو نے ہمیں سکھایا بیشک تو ہی علم و حکمت والا ہے ☆ فرمایا اے آدم بتا دے انہیں سب (اشیاء کے) نام، جب اس نے (یعنی آدم نے) انہیں سب کے نام بتا دیئے فرمایا میں نہ کہتا تھا کہ میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمین کی سب چھپی چیزیں اور میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو''۔

(۲)　''اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام چیزوں کے ناموں کا علم عطا کر دیا پھر تمام چیزوں کو فرشتوں پر پیش فرمایا پھر کہا ان چیزوں کے نام کی مجھے خبر دو اگر تم سچے ہو ☆ انہوں نے عرض کیا پاکی ہے تجھے ہمیں کچھ علم نہیں سوائے اس کے جو تو نے ہمیں علم عطاء کیا ہے، بیشک تو ہی علم و حکمت والا ہے ☆ (رب) نے کہا اے آدم تم ان کو ان چیزوں کے ناموں کی خبر دے دو جب اس نے (آدم نے) انہیں (فرشتوں کو) تمام چیزوں کے نام بتا دیئے (تو رب تعالیٰ نے) کہا کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ بیشک میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمین کی تمام چھپی ہوئی چیزیں اور میں جانتا

ہوں جو تم ظاہر کرتے اور جو تم چھپاتے تھے"

مختصر مطلب: جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے مشورہ کیا اور اپنے ارادہ سے مطلع کیا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں تو فرشتوں نے اس پر تعجب کرتے ہوئے کہا کہ اے اللہ تو ایسی مخلوق کو خلیفہ بنائے گا جو خونریزیاں کریں گے اور زمین میں فساد پھیلائیں گے۔ حالانکہ اے اللہ ہم تیری تسبیح وتحمید وتقدیس بیان کرتے ہیں تو رب تعالیٰ نے فرمایا جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔

ان آیات میں رب تعالیٰ نے فرشتوں پر اس حقیقت کو واضح کیا کہ زمین میں، میں جو خلیفہ بنانے والا ہوں اسی میں خلافت کی اہلیت پائی گئی ہے جو اہلیت تمہیں عطاء نہیں ہوئی اسلئے کہ رب تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے ناموں کا علم عطاء فرما دیا، فرشتوں میں اتنے علوم کو حاصل کرنے کی استعداد ہی حاصل نہ تھی۔ پھر وہ تمام چیزوں کو فرشتوں پر پیش کر کے کہا کہ تم ان چیزوں کے نام بتاؤ لیکن فرشتوں نے اپنے عجز کا اظہار کرتے ہوئے رب کے حضور عرض کیا کہ اے اللہ تو پاک ذات ہے ہمیں تو اتنا ہی علم حاصل ہے جو تو نے ہمیں عطا کر رکھا ہے اس سے زائد ہم کچھ بھی نہیں جانتے

وہی تمام چیزیں آدم علیہ السلام پر پیش کر کے رب تعالیٰ نے کہا اے آدم تم ان کو ان چیزوں کے نام بتلاؤ آدم علیہ السلام نے جب نام بتلا دیئے تو رب تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے تمہیں نہیں بتلا دیا تھا کہ جو کچھ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے اور میں ہی آسمانوں اور زمینوں کی چھپی ہوئی چیزوں کو جانتا ہوں۔ ساتھ ہی فرشتوں کو یہ بھی کہا کہ میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو یا چھپاتے ہو فرشتوں کو بھی واضح طور پر جب اللہ تعالیٰ کی حکمت سمجھ آئی تو برملا عرض کیا اے مولائے کائنات بیشک تو ہی علیم وحکیم ہے۔

تفصیلی وضاحت:

﴿وعلم ادم الاسماء كلها﴾ "اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام چیزوں کے نام سکھا دیئے"

" علم معناه عرف وتعليمه هنا الهام علمه ضرورة "

"یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے دل میں القاء کر کے تمام چیزوں کا علم اس طرح عطا کر دیا جس طرح بدیہات کا علم حاصل ہوتا ہے"

آدم علیہ السلام کی وجہ تسمیہ:

یعنی آدم علیہ السلام کا نام آدم رکھنے کی وجوہ کا تذکرہ:

(۱) "قیل سمی بذلک لکون جسده من ادیم الارض" اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ لفظ آدم کا معنی لیا گیا ہے "ادیـــم الارض" سے جس کا معنی ہے زمین سے اوپر کا حصہ۔ چونکہ آپ کے جسم اطہر کو زمین کی مختلف رنگوں اور مختلف صفات والی مٹی سے بنایا گیا ہے اس لئے آپ کا نام بھی ''آدم'' رکھ دیا

(۲) "وقیـل لسـمـرة فی لونه یقال رجل آدم نحو اسم" آدم کا معنی گندم گوں ہونا بھی لیا جاتا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے "رجـل آدم" فلاں شخص کا رنگ گندمی ہے۔ آدم علیہ السلام کا نام بھی اس لئے آدم رکھا گیا کہ آپ کا رنگ بھی گندمی تھا۔

(۳) "وقیـل سـمـی بذلک لکونه من عناصر مختلفة وقوی متفرقة کما قال اللہ تعالیٰ امشاج نبتلیه ویقال جعلت فلانا ادمة اهلی ای خلطته بهم"

اور وجہ یہ ہے کہ عام طور پر یہ الفاظ بولے جاتے ہیں "جعلت فلانا ادمة اهلی" میں نے فلاں شخص کو اپنے گھر کے افراد سے ملا لیا ہے۔ یعنی اسے اپنے گھر کا فرد سمجھتا ہوں۔

مطلب یہ ہوا کہ لفظ آدم لیا ہوا ہے "ادمة" سے جس کا معنی ہے ''خلط ملط کرنا'' اور ملانا۔ چونکہ آدم علیہ السلام میں بھی رب تعالیٰ نے مختلف عناصر (اصول) کو رکھا اور مختلف قوتیں آپ کو عطاء کیں اسی وجہ سے آپ کا نام ''آدم'' رکھ دیا۔ اس پر رب تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی بھی دلالت کر رہا ہے:

﴿ انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج ﴾ ''بیشک ہم نے آدمی کو پیدا کیا ملی ہوئی منی سے''

ملی ہوئی منی (نطفہ) سے مراد ''مرد اور عورت کے نطفہ کا ملنا'' ہے۔ یا نطفہ کا دوسرے عناصر سے ملنا مراد ہے۔

(۴) "وقیل سمی بذلک لما طیب به من الروح المنفوخ فیه المذکور فی قوله "ونفخت فیـه مـن روحی" وجعل به العقل والفهم والرؤیة التی فضل بها علی غیره، کما قال اللہ تعالیٰ "وفضلناهم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا" وذلک من قولهم الادام وهو ما یطیب به الطعام"

اور وجہ یہ ہے کہ لفظ ''آدم'' لیا ہوا ہے "ادام" سے "ادام" اسے کہا جاتا ہے جس چیز سے روٹی کو اچھی طرح کھایا جا سکے جیسا کہ سالن، سرکہ، چٹنی، اچار وغیرہ تمام چیزیوں پر ادام بولا جاتا ہے۔ چونکہ آدم علیہ السلام میں بھی رب تعالیٰ نے اپنی طرف سے خود روح کو پھونک کر آپ کو وہ کمال عطا فرما دیا کہ جس کے ذریعے آپ کو عقل کامل، فہم کامل اور بصارت وبصیرت عطا کر دی جس کی وجہ سے انسان کو

دوسری مخلوق پر فضیلت دے دی۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی بھی اسی پر دلالت کررہا ہے:

﴿وفضلناهم على كثير ممن خلقنا تفصيلا﴾

ہم نے اپنی بہت سی مخلوق پر ان کو فضیلت دی ہے (از مفردات راغب)

سبحان اللہ آدم علیہ السلام کا نام ہی کیسا باکمال ہے کہ صرف نام سے ہی یہ پتہ چل گیا کہ آپ کے جسم میں مختلف رنگوں کی مٹی رکھی گئی تھی اور اس مٹی کو مختلف صفات حاصل تھیں یہی وجہ ہے کہ آپ کی اولاد میں مختلف رنگ پائے جاتے ہیں اور ان کو مختلف صفات حاصل ہیں۔ آدم علیہ السلام کا رنگ گندمی تھا۔ اور آدم علیہ السلام کو مختلف عناصر سے بنایا گیا۔ اور آپ کو مختلف قوتیں عطا کی گئیں۔ اور آدم علیہ السلام کو عقل کامل فہم کامل اور بصارت و بصیرت عطا کر کے دوسری مخلوق پر فضیلت دی جیسا کہ ادام جس روٹی سے مل جائے اسے دوسری روٹی پر فوقیت دے دیتا ہے۔

آدم علیہ السلام کی کنیت:

"آدم عليه السلام يكنى ابو البشر وقيل ابا محمد، كنى بمحمد خاتم الانبياء صلوات الله عليهم قاله السهيلى وقيل كنيته فى الجنة ابو محمد وفى الارض ابو البشر" (قرطبی)

"آدم علیہ السلام کی کنیت ابوالبشر ہے کیونکہ آپ انسانوں کے باپ ہیں۔ اور آپ کی کنیت خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ کی نسبت سے ابومحمد بھی ہے"۔

جنت میں آپ کی کنیت ابومحمد ہے اور زمین میں ابوالبشر، یعنی جنتیوں کو آپ کی پہچان اس انداز پر کرائی گئی کہ یہ آدم! اگرچہ میرے خلیفہ ہیں میرے نبی ہیں میرے مقرب ہیں، لیکن سب سے بڑا کمال ان کو یہ حاصل ہے کہ سید الانبیاء اور خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ کا باپ ہونے کا بھی شرف رکھتے ہیں۔

آدم علیہ السلام کے علوم:

"وعلم آدم الاسماء اى اسماء المسميات كلها حتى القصعة والقصيعة" (جلالین)

"حضرت آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام سکھا دیئے یہاں تک کہ چھوٹے اور بڑے پیالے کے نام بھی بتا دیئے"

" ان اللہ تعالیٰ اطلع آدم علی المسمیات جمیعھا و علم اسماء ھا واطلع الملئکۃ علی المسمیات ولم یعلمھم اسماء ھا فاشترک آدم مع الملئکۃ فی معرفۃ المسمیات واختص آدم بمعرفۃ الاسماء بجمیع اللغات وتلک اللغات تفرقت فی اولادہ " (صاوی)

''بیشک اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں پر مطلع کیا۔ اوران تمام چیزوں کے ناموں کا علم بھی عطا کیا۔ اور فرشتوں کو تمام چیزوں کا علم دیا لیکن ان چیزوں کے ناموں کا علم نہیں دیا۔ تمام چیزوں کے علم میں آدم علیہ السلام فرشتوں کے ساتھ شریک ہیں۔ لیکن ان تمام چیزوں کے ناموں کا علم صرف آدم علیہ السلام کو دیا گیا ہے اس لحاظ پر آدم علیہ السلام کو خصوصیت حاصل ہے آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام ہر زبان میں بتا دیئے گئے تھے اور وہی زبانیں آپ کی اولاد میں بکھیر دی گئیں۔ یعنی دنیا میں جتنی زبانیں ہیں اتنی زبانیں ہی حضرت آدم علیہ السلام کو عطا کر دی گئی تھیں''۔

" ومعنی تعلیمہ اسماء المسمیات انہ تعالیٰ اراہ الاجناس التی خلقھا و علمہ ان ھذا اسمہ فرس وبعیر وھذا اسمہ کذا " (مدارک)

''آپ کو تمام چیزوں کا علم دیا گیا یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوقات میں سے ایک ایک جنس آپ کو دکھا دی اور اس کا نام ہر زبان میں آپ کو بتا دیا۔ مثلاً گھوڑا دکھایا پھر بتایا اسے گھوڑا، اسپ، فرس، ہارس وغیرہ کہتے ہیں''

اسی طرح آپ کو اونٹ دکھایا پھر بتایا اسے اونٹ، شتر، جمل، بعیر، کیمل وغیرہ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک ایک چیز کا نام ہر زبان میں آپ کو بتا دیا گیا۔ حضرت ابن عباس اور عکرمہ اور قتادہ اور مجاہد اور ابن جبر رضی اللہ عنہم کا قول یہ ہے:

" علمہ اسماء جمیع الاشیاء کلھا جلیلھا و حقیرھا "

''کہ آپ کو تمام چھوٹی اور بڑی چیزوں کے ناموں کا علم عطاء کر دیا گیا''

حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے غلام سعد کہتے ہیں۔ میں ایک مرتبہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس بیٹھا ہوا تھا، آپ کے سامنے کچھ برتنوں کے ناموں کا ذکر ہوا۔ کوڑے (درے) کے نام کا ذکر ہوا تو آپ نے فرمایا:

﴿ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ﴾ " آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے ناموں کا علم عطا کر دیا گیا"

" واللغات كلها اسماء فهي داخلة تحته "
" تمام زبانیں نام ہی ہیں اس لئے واضح بات ہے کہ آپ کو تمام زبانوں کا علم عطا کر دیا گیا تھا" (قرطبی)

" علمه اسماء جميع الاشياء حتى القصعة والقصيعة " (ابو سعود)
" اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام چیزوں کے ناموں کا علم عطا کیا یہاں تک کہ بڑے اور چھوٹے پیالے کے نام بھی بتائیے"

" وقيل المراد بها اسماء ما كان وما يكون الى يوم القيمة وعزى الى ابن عباس رضى الله عنهما " (روح المعانی)
" بعض حضرات نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف قول منسوب کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے " ماكان وما يكون " (جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ ہونا ہے) کا علم عطا فرمایا"۔

پہلے معانی جو ذکر کئے ہیں ان اور اس معنی کے لحاظ سے مقصد ایک ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام چیزوں اور ان کے ناموں کا علم عطا کر دیا، خواہ وہ پہلے پائی جا چکی ہیں یا بعد میں انہوں نے پایا جانا ہے " المراد بالاسماء صفات الاشياء ونعوتها وخواصها " (کبیر)
امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ کو تمام چیزوں کی صفات اور نعتیں اور خواص تک کا علم عطا فرما دیا گیا تھا۔

" وعلمه احوالها وما يتعلق بها من المنافع الدينية والدينوية " (البحر المحیط)
"اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام چیزوں کو احوال اور جو ان کے ساتھ دینی اور دنیاوی منافع متعلق ہیں ان تمام کا علم عطاء کر دیا"

اسی طرح ایک قول کے مطابق آپ کو تمام ملائکہ کے ناموں سے مطلع کر دیا گیا۔ اور ایک قول کے مطابق آپ کو تمام ستاروں کے ناموں پر مطلع کر دیا گیا۔ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد حکیم ترمذی کا قول نقل کیا "اسماوه تعالىٰ " کہ اس آیت کریمہ میں اسماء سے اسماء الٰھیہ ہیں۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا میرے نزدیک حق یہ ہے اور تمام اللہ والے بھی اسے حق مانتے ہیں اور منصب خلافت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ آپ کو تمام اشیاء کے اسماء کا علم عطا کیا گیا ہے۔

" وهوانها اسماء الاشياء علوية او سفلية جوهرية او عرضية ويقال

لها اسماء الله تعالیٰ عندهم باعتبار دلالتها علیه وظهوره فیها غیر متقیدبها "

(روح المعانی)

''وہ اشیاءخواہ علوی ہوں یا سفلی، جوہری ہوں یا عرضی ان تمام کے اسماء کو اللہ تعالیٰ کے اسماء ہی کہا جاتا ہے، کیونکہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی ذات پر دلالت کرتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے جلوے تمام اشیاء سے ظاہر ہوتے ہیں''۔

فائدہ: جب آدم علیہ السلام کو ماکان و ما یکون کا علم دیا گیا ہر چیز کے نام ہر زبان میں سکھائے گئے تو سید الانبیاء ﷺ کے علم کا مقام کیا ہوگا۔ اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے ﴿الرحمن علم القرآن خلق الانسان علمه البیان﴾ (پ۲۷) کا ترجمہ ان الفاظ میں تحریر فرمایا ہے: ''رحمٰن نے اپنے محبوب کو قرآن سکھایا، انسانیت کی جان محمد کو پیدا کیا ما کان و ما یکون کا بیان ا نہیں سکھایا'' (کنز الایمان) اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے نبی کریم ﷺ کو انسانیت کی جان کہا۔ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے " وما ارسلناک الا رحمة للعلمین " کی تفسیر میں تحریر فرمایا ہے " العالم جسد روحه النبوة ولا قیام للجسد بدون روحه " (روح المعانی) تمام جہان ایک جسم ہے اور نبی کریم ﷺ اس کی روح ہیں جسم کا قیام بغیر روح کے ممکن نہیں۔

اسی سے روز روشن کی طرح عیاں ہوگیا کہ نبی کریم ﷺ کائنات کی جان ہیں تو یقیناً انسانیت کی بھی جان ہیں اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ میں یہ واضح کیا ہے کہ " علمه البیان " کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو " ما کان و ما یکون " کا علم عطا کیا گیا اس پر علامہ قرطبی رحمہ اللہ کی الجامع لاحکام البیان کی تفسیر ملاحظہ ہو:

" (علمه البیان) وعن ابن عباس وایضا عن ابن کیسان الانسان ههنا یراد به محمد ﷺ "

یعنی " علمه البیان " میں ضمیر منصوب کا مرجع " الانسان " ہے اس سے مراد نبی کریم ﷺ ہیں

" والبیان بیان الحلال والحرام والهدی من الضلال وقیل ما کان وما یکون لانه بین عن الاولین والآخرین ویوم الدین "

''اور " علمه البیان " میں بیان سے مراد یا تو حلال وحرام کا علم اور گمراہی سے ہدایت دینا اور یا جس طرح بیان کیا گیا ہے کہ بیان سے مراد " ما کان وما یکون " (جو

ہو چکا ہے اور جو ہونا ہے) کا علم ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اولین و آخرین اور قیامت کا ذکر فرما دیا ہے''۔

یعنی آپ نے تمام گزرے ہوئے اور آنے والے واقعات اور قیامت کے احوال سے مطلع فرما دیا ہے۔ تو یقیناً آپ کو " ما کان و ما یکون " کا علم حاصل ہے۔ میں نے تراجم کا تقابلی جائزہ پیش کرتے ہوئے اپنی کتاب ''تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان'' میں بہت سی تفاسیر کی عبارات نقل کر کے واضح کیا کہ یہاں اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی باکمال ہے۔ ابھی منزل بہت دور ہے کہیں انشاء اللہ ستائیسویں پارہ میں پہنچ گیا تو مزید وضاحت کروں گا۔

﴿ ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾

" هم "، ضمیر کا مرجع مسمیات ہے جس پر اسماء دلالت کر رہا ہے " انبونی " اخبرونی (مجھے خبر دو)" هؤلاء " کا مشار الیہ مسمیات ہے۔ اب مطلب یہ ہوا پھر پیش کیا ان چیزوں کو فرشتوں پر پھر کہا ان چیزوں کے ناموں کی مجھے خبر دو اگر تم سچے ہو۔

اعتراض: هم، ضمیر تو ذوی العقول کی طرف لوٹتی ہے حالانکہ آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کا اور تمام چیزوں کے ناموں کا علم دیا گیا جن میں غیر ذوی العقول زیادہ ہیں یہاں " هم " ضمیر کا استعمال کیسے درست ہے؟

جواب: " وفیہ تغلیب العقلاء " اس میں عقلاء کو ان کی شرافت کے پیش نظر غالب سمجھتے ہوئے "هم " ضمیر کا استعمال کیا گیا ہے جو ذوی العقول کی طرف لوٹتی ہے (از جلالین) " ان کنتم صادقین " کا مطلب کیا؟ اس میں کئی وجوہ ہیں جو مفسرین کرام نے بیان کی ہیں۔

(۱) " ان کنتم صادقین فی انی لا اخلق اعلم منکم "

''فرشتوں کو اس پر تعجب آ رہا تھا کہ جو مخلوق فساد بھی پھیلائے گی اور خونریزیاں بھی کرے گی وہ ہم سے زیادہ کیسے علم والی ہوگی''۔ رب تعالیٰ نے تمام چیزوں کو فرشتوں کو پیش کر کے فرمایا کہ مجھے ان چیزوں کے ناموں کی خبر دو اگر تم اس چیز میں سچے ہو کہ میں تم سے زیادہ علم والی مخلوق نہیں پیدا کروں گا۔

خیال رہے کہ فرشتوں کی یہ سوچ بھی تعجب پر مبنی تھی۔ رب تعالیٰ کے ارشاد کا بھی یہی مطلب ہے کہ ان چیزوں کے ناموں کی خبر دو اگر تم اپنے تعجب میں سچے ہو فرشتوں کا رب تعالیٰ پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اور نہ ہی رب تعالیٰ کی قدرت میں شک تھا۔

(۲) "ان کنتم صادقین فی انکم احق بالخلافة"

تم مجھے ان چیزوں کے ناموں کی خبر دو اگر تم اپنے اس تعجب میں سچے ہو کہ ہمیں مستحق خلافت کیوں نہیں سمجھا گیا۔

یعنی فرشتے اس پر تعجب کر رہے تھے کہ ہم رب تعالیٰ کی تسبیح و تحمید و تقدیس بیان کرتے ہیں پھر رب تعالیٰ نے ہمیں خلافت کا مستحق کیوں نہیں سمجھا۔ تو رب تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے علم کو ظاہر فرما کر فرشتوں کے اس تعجب کا بھی ازالہ کر دیا ہے۔

(از جلالین)

(۳) "معناه اعلمونی اسماء هؤلاء ان علمتم انکم تکونون صادقین فی ذلک الاعلام"

تم مجھے ان چیزوں کے ناموں کی خبر دو اگر تم جانتے ہو اگر تم نے خبر دے دی تو یقیناً تم اس خبر دینے میں سچے ہو گے۔

(۴) "معناه اخبرونی ولا تقولوا الا حقا وصدقا"

مجھے ان چیزوں کے ناموں کی خبر دو لیکن وہ خبر حق اور سچ ہو۔ غرض اس میں یہ تھی کہ ان کے عجز کو تاکیدی طور پر بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ اگر وہ خبر دینے کی طاقت رکھتے تو یہ کہنے کا کوئی مقصد نہ رہتا (ان کنتم صادقین) اگر تم سچے ہو۔

(کبیر)

(۵) "معنی صادقین عالمین حکاہ النقاش" یعنی اس میں نقاش کا یہ قول ہے کہ اس مقام پر "صادقین" کا معنی ہی "عالمین" ہے اب مطلب یہ ہوا کہ ان چیزوں کے ناموں کی خبر دو اگر تم جانتے ہو۔

(قرطبی)

(۶) "ان کنتم صادقین انی لا اخلق خلقا الا و کنتم اکرم علی سنه وافضل واعلم"

تم مجھے ان چیزوں کے ناموں کی خبر دو اگر تم اپنے اس گمان میں سچے ہو کہ میں کوئی مخلوق بھی پیدا کروں تو تم اس سے میرے نزدیک مکرم ہو گے اور افضل ہو گے اور زیادہ علم رکھو گے۔

یعنی فرشتوں کا خیال تھا کہ وہ مخلوق جس میں فساد پھیلانے والے اور خونریزیاں کرنے والے ہوں گے ان سے یقیناً رب تعالیٰ کے ہاں مکرم ہم ہی ہوں گے۔ افضل ہم ہی ہوں گے علم ہمارا ہی زیادہ ہوگا پھر اس مخلوق کو خلیفہ بنانے کا کیا مقصد ہوگا۔

تمام معانی کا مقصد ایک ہے:

فرشتے تعجب اور حیرانگی سے یہ سوچ رہے تھے کہ ہم رب تعالیٰ کے ہاں مکرم بھی ہیں۔ ہمیں افضلیت بھی حاصل ہے ہمیں علم بھی عطاء کیا گیا ہے ہم رب تعالیٰ کی تسبیح وتحمید وتقدیس بھی بیان کرتے ہیں۔ رب تعالیٰ جس مخلوق کو پیدا کرنے والا ہے وہ تو فساد پھیلانے والے ہوں گے خونریزیاں کرنے والے ہوں گے وہ مستحق خلافت کیسے ہوں گے ہمیں مستحق خلافت کیوں نہیں سمجھا گیا۔

رب تعالیٰ نے ان کی حیرانگی کو دور کرنے کے لئے ان پر یہ واضح کیا کہ تم عام مخلوق کے فساد اور ان کی خونریزیاں کو دیکھ رہے ہو تمہیں یہ معلوم نہیں کہ ان میں میرے خلفاء یعنی انبیاء کرام کو کتنے علوم کی استعداد حاصل ہوگی۔ اور ان کو کتنے علوم حاصل ہوں گے یہی وجہ ہوگی ان کے خلیفہ بننے کی۔ تم بیشک مکرم ہو، فضیلت رکھنے والے ہو، علم والے ہو، لیکن انبیاء کرام سے تمہارا مقام پست ہوگا لہٰذا مستحق خلافت وہی ہوں گے۔

نتیجہ واضح ہوا:

"فمن لم يقدر على معرفة مراتب الاشياء لا يستحق ان يكون خليفة عليها"
(طنطاوی)

"جو ذاتیں اشیاء کی معرفت پر قادر نہیں وہ مستحق خلافت بھی نہیں" اس سے فرشتوں کا تعجب جاتا رہا حیرانگی ختم ہوگئی سمجھ گئے کہ ہاں آنے والے خلفاء کا علمی مقام کیا ہے۔

علم کی فضیلت: یہ آیت علم کی فضیلت پر دلالت کر رہی ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی تخلیق میں اپنی حکمت کا اظہار ان کے علم سے ہی کیا۔ اگر کوئی اور وجہ ہوتی تو اسے بھی ظاہر کیا جاتا علم کی فضیلت قرآن پاک سے، حدیث پاک سے اور سلف صالحین کے اقوال سے ثابت ہے۔

قرآن پاک سے علم کی فضیلت:

اللہ تعالیٰ نے علم کو حکمت کہا پھر حکمت کی عظمت شان کو بیان کیا حکمت کی عظمت شان سے خود بخود علم کی عظمت شان سمجھ آ جاتی ہے۔علم کو حکمت کہا گیا اور حکمت کو قرآن پاک میں چار معانی کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔مقاتل کا یہی قول ہے:

(۱) حکمت بمعنی مواعظ قرآن (قرآن پاک کے پندونصائح) سورۃ بقرۃ میں رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:﴿ وما انزل علیکم من الکتاب والحکمۃ ﴾ (یعنی مواعظ القرآن) اور جو تم پر نازل کیا کتاب اور حکمت اس مقام میں حکمت کا معنی قرآن پاک کی نصیحتیں ہیں۔یعنی اللہ تعالیٰ نے تم پر قرآن پاک کو نازل کیا اور اس میں پندونصائح کو ذکر کیا۔اسی طرح سورۃ نساء میں بھی ذکر کیا گیا ﴿ وانزل علیکم الکتاب والحکمۃ ﴾ یہاں بھی حکمت کا معنی ''نصیحتیں'' ہے اور اسی طرح سورۃ آل عمران میں بھی حکمت اسی معنی میں استعمال ہے۔

(۲) حکمت بمعنی فہم اور علم رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ واتیناہ الحکم صبیا ﴾ اور ہم نے اسے (حضرت یحیٰ کو) بچپن میں علم اور فہم عطاء کئے۔اور سورۃ لقمان میں ہے ﴿ ولقد آتینا لقمان الحکمۃ ﴾ اور تحقیق ہم نے لقمان کو علم اور فہم عطاء کئے۔

(۳) حکمت بمعنی نبوت،سورۃ نساء میں ذکر کیا گیا ہے ﴿ فقد آتینا آل ابراھیم الکتاب والحکمۃ ﴾ اور ہم نے اسے (حضرت داؤد علیہ السلام کو) نبوت عطا کی۔سورۃ ص میں بھی اسی معنی میں استعمال ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿ وآتیناہ الحکمۃ ﴾ اور ہم نے اسے (حضرت داؤد علیہ السلام کو) نبوت عطا کی۔

(۴) حکمت بمعنی قرآن پاک سورۃ نحل میں ہے ﴿ ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ ﴾ اپنے رب کی راہ کی طرف قرآن پاک کے ذریعے بلاؤ۔سورۃ بقرہ میں ہے ﴿ ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا ﴾ جسے قرآن پاک کا علم عطا کر دیا گیا اسے بہت بڑی بھلائی عطاء کر دی گئے۔

یہ جتنے معانی بیان کئے گئے ہیں۔ان میں علم کا اعتبار پایا جاتا ہے۔اس لئے کہ مواعظ قرآن ہو یا فہم وعلم ہو یا نبوت ہو یا قرآن ہو تمام معانی کی دارومدار علم پر ہی ہے۔گویا کہ حکمت میں علم کا

اعتبار کیا گیا ہے۔

مقام تفکر: اللہ تعالیٰ نے عام انسانوں کو قلیل علم عطاء کیا۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا ﴾ تمہیں علم نہیں عطا کیا گیا مگر تھوڑا

اسی طرح دنیا کے تمام مال و دولت کو قلیل کہا گیا" قل متاع الدنیا قلیل "اے محبوب فرمادو دنیا کا مال و متاع قلیل ہے:

" فما سماه قليلا لا يمكننا ان ندرك كميته فما ظنك بما سماه كثيرا "

''جن چیزوں کو رب نے قلیل کہا ہے ہم ان کی مقدار کو حاصل کرنے کی قدرت نہیں رکھتے تو تیرا کیا گمان ہے کہ جن کو رب تعالیٰ نے کثیر کہا ہے ان کی مقدار کیا ہوگی''

یعنی رب تعالیٰ نے انبیاء کرام کو کثیر علوم عطاء فرمائے ہیں اور انبیاء کرام کو حکمت عطا فرمائی ہے اور جن کو حکمت عطاء فرمائی گئی ان کو خیر کثیر عطا کیا گیا۔ اب خود ہی اندازہ کریں کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو جو علوم کثیرہ اور خیر کثیرہ عطا کیے ہیں کیا کوئی انسان ان کی حد معلوم کرسکتا ہے؟ نہیں نہیں کبھی نہیں ان کی حد کو صرف رب تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

برہان عقلی: عقل بھی اسے مانتا ہے کہ دنیا قلیل ہے کیونکہ اس کی انتہاء ہے اس کی تعداد، اس کی مقدار اور اس کی مدت سب متناہی ہیں یعنی تمام کے ختم ہونے کی ایک حد ہے۔ لیکن علم کی نہ کوئی مقدار مقرر ہے اور نہ ہی کوئی تعداد مقرر ہے اور نہ ہی کوئی مدت مقرر ہے۔ یعنی علم نہ ختم ہونے والی چیز ہے بلکہ علم سے حاصل والی سعادات (نیک بختیاں) بھی ختم ہونے والی نہیں ہیں۔ اسی سے واضح ہوگیا کہ علم کو وہ فضیلت حاصل ہے جو تمام دنیا کے مال و دولت کو وہ مقام حاصل نہیں۔

علم کی فضیلت پر قرآن پاک سے اور دلیل:

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ قل هل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون ﴾

''اے محبوب فرمادیں کیا علم والے اور بے علم برابر ہوسکتے ہیں''

خیال رہے کہ یہاں استفہام انکاری ہے جس کا مطلب ہی یہ ہے کہ علم والے اور بے علم برابر

نہیں ہو سکتے۔قرآن پاک میں سات چیزوں میں فرق بیان کیا گیا ہے کہ ان کی ضدیں ان کے برابر نہیں ایک یہی جس کا ابھی ذکر ہوا کہ جہالت، علم کے برابر نہیں ہو سکتی۔

دوسری چیز: ﴿قل هل يستوى الخبيث والطيب﴾

فرمادیجئے اے محبوب کیا خبیث اور طیب برابر ہو سکتے ہیں۔

خبیث سے مراد حرام اور طیب سے مراد حلال چیزیں ہیں یعنی حرام اشیاء کبھی حلال اشیاء کے برابر نہیں ہوسکتیں۔

تیسری چیز: ﴿قل هل يستوى الاعمى والبصير﴾

اے محبوب فرمادیجئے کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہو سکتے ہیں۔

یعنی تاریکیاں کبھی نور کے برابر نہیں ہوسکتیں۔

چوتھی چیز: ﴿ام هل تستوى الظلمات والنور﴾ کیا اندھیرے اور نور برابر ہو سکتے ہیں؟ یعنی تاریکیاں کبھی نور کے برابر نہیں ہوسکتیں۔

پانچویں چیز: ﴿ولا الظلمات ولا النور﴾ جنت اور نار میں فرق بیان کیا گیا کہ آگ یعنی جہنم کبھی جنت کے برابر نہیں ہوسکتی۔

چھٹی چیز: ﴿ولا الظل ولا الحرور﴾ سایہ اور حرارت برابر نہیں، یعنی حرارت سایہ کے برابر نہیں ہوسکتی۔

ساتویں چیز: ﴿وما يستوى الاحياء ولا الاموات﴾

زندہ اور مردہ برابر نہیں یعنی مردہ زندہ کے برابر نہیں ہو سکتے

ان تمام چیزوں میں بنیادی طور پر مراد علم ہی ہے کہ جہالت علم کے برابر نہیں ہوسکتی۔زیادہ تفصیل تو ہر آیت کی اس کے محل میں ہی انشاء اللہ بیان ہوگی یہاں تو اختصار سے ذکر کیا جارہا ہے۔

قرآن پاک سے اور دلیل:

اللہ تعالیٰ نے ارشادفرمایا: ﴿اطيعوا الله واطيعو الرسول واولى الامر منكم﴾

"اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو، اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرو اور تم میں سے جو اولوالامر ہیں ان کی اطاعت کرو" "والمراد من اولى الامر العلماء فى اصح الاقوال لان الملوك يجب

علیهم طاعة العلماء ولا ینعکس"

"اولی الامر" سے مراد علماء ہیں تمام اقوال سے یہی قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ بادشاہوں پر واجب ہے کہ وہ علماء کی اطاعت کریں لیکن علماء پر لازم نہیں کہ وہ بادشاہوں کی اطاعت کریں"

بادشاہوں کی اطاعت کب لازم ہے اور کب لازم نہیں اس کا ذکر تفصیلی طور پر خلیفہ کی بحث میں بیان کیا جا چکا ہے۔

قرآن پاک سے اور دلیل:

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿یایها الذین آمنوا اذا قیل لکم تفسحوا فی المجالس فافسحوا یفسح الله لکم واذا قیل انشزوا فانشزوا یرفع الله الذین آمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات والله بما تعملون خبیر﴾ (پ ۲۸)

"اے ایمان والو جب تم سے کہا جائے مجلسوں میں جگہ دو تو جگہ دو اللہ تمہیں جگہ دے گا اور جب کہا جائے اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہو اللہ تمہارے ایمان والوں کے اور ان کے جن کو علم دیا گیا اور درجے بلند فرمائے گا اور اللہ کو تمہارے کاموں کی خبر ہے"

اس آیۃ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے علم والوں کے درجات کی بلندی کا ذکر فرمایا جس سے علم کی فضیلت واضح ہو رہی ہے اللہ تعالیٰ نے چار قسم کے لوگوں کے درجات کا ذکر فرمایا:

(۱) غزوہ بدر میں شریک ہونے والے صحابہ کرام کا ذکر ان الفاظ مبارکہ سے فرمایا:

﴿انما المؤمنون الذین اذا ذکر الله وجلت قلوبهم واذا تلیت علیهم آیاته زادتهم ایمانا وعلی ربهم یتوکلون ☆ الذین یقیمون الصلوة ومما رزقنا هم ینفقون ☆ اولئک هم المؤمنون حقا لهم درجات عند ربهم ومغفرة ورزق کریم﴾ (پ ۹)

"ایمان والے وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے ان کے دل ڈر جائیں اور جب ان پر اس کی آیتیں پڑھی جائیں ان کا ایمان ترقی پائے اور وہ اپنے رب پر بھروسہ کریں وہ جو نماز قائم کریں اور ہمارے دیئے سے کچھ ہماری راہ میں خرچ کریں۔ یہی سچے مسلمان ہیں ان کے لئے درجے ہیں ان کے رب

کے پاس اور بخشش ہے اور عزت کی روزی''۔

(۲) مجاہدین کی شان بیان کرتے ہوئے رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فضل اللہ المجاهدین باموالهم وانفسهم علی القاعدین درجة ﴾ (پ ۵)

''اللہ تعالیٰ نے اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرنے والوں کا درجہ بیٹھنے والوں سے بڑا کیا''

(۳) صالحین کا رب تعالیٰ نے بیان فرمایا:

﴿ ومن یاته مومنا قد عمل الصالحات فاولئک لهم الدرجات العلی ﴾ (پ ۱۶)

''اور جو اس کے حضور ایمان کے ساتھ آئے کہ اچھے کام کیے ہوں تو ان کے درجے بلند ہوں گے''

(۴) علماء کے درجات بلند فرمائے، جو پہلے ذکر کیا جا چکا ہے:

﴿ یرفع اللہ الذین امنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات ﴾

''تمہارے ایمان والوں اور علم والوں کے اللہ تعالیٰ درجات بلند فرماتا ہے''

ان تمام پر اپنے اپنے زمانہ میں علماء کو ہی فضیلت رہی جیسا کہ بدر والوں میں خلفاء راشدین کا ہی مقام بلند تھا کیونکہ وہی تمام سے زیادہ علم والے تھے اسی طرح مجاہدین اور صالحین میں بھی علم والے ہی افضل ہوتے ہیں۔

قرآن پاک سے اور دلیل:

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے علماء کی شان کو ان الفاظ گرامیہ سے بیان کیا:

﴿ انما یخشی اللہ من عباده العلماء ﴾

''بیشک اللہ تعالیٰ سے اس کے بندوں میں سے علماء ہی ڈرتے ہیں''

خیال رہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں علماء کے پانچ وصف بیان کئے ہیں۔ کامل طور پر اور مجموعی طور پر وہ اوصاف علماء کو ہی حاصل ہیں۔ بلکہ یوں کہنا بھی بہتر ہوگا کہ جن علماء کو وہ پانچ اوصاف حاصل ہوں گے وہی کامل علماء ہوں گے وہ قابل تعریف ہوں گے ان کا ہی اللہ تعالیٰ کے ہاں خصوصی مرتبہ ہوگا۔

(۱) رب تعالیٰ نے علماء کے کامل وصف ایمان کو ان الفاظ مبارکہ سے بیان فرمایا:

﴿ هو الذی انزل علیک الکتاب منه آیات محکمات هن ام الکتاب واخر متشابهات

فاما الذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ما تشابه منه ابتغاء الفتنة و ابتغاء تاویله وما یعلم تاویله الا الله و الراسخون فی العلم یقولون امنا به کل من عند ربنا و ما یذکر الا اولوا الالباب ﴾
(پ ۳)

''وہی ہے جس نے تم پر یہ کتاب اتاری اس کی کچھ آیتیں صاف معنی رکھتیں ہیں وہ کتاب کی اصل ہیں اور دوسری وہ ہیں جن کے معنی میں اشتباہ ہے وہ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ اشتباہ والی کے پیچھے پڑتے ہیں گمراہ چاہنے اور اس کا پہلو ڈھونڈنے کو اور اس کا ٹھیک پہلو اللہ کو ہی معلوم ہے اور پختہ علم والے کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے سب ہمارے رب کے پاس سے ہے اور نصیحت نہیں مانتے مگر عقل والے''۔

اس آیت میں پختہ علم والوں کو کامل ایمان والا بیان کیا گیا ان کے مقابل کم علم یا جہلاء کو ٹیڑھی راہ پر چلنے والے اور گمراہی حاصل کرنے والے کہا گیا ہے۔

(۲) رب تعالیٰ نے علماء کی توحید اور اسکی وحدانیت پر ان کی شہادت کو ان الفاظ مبارکہ سے ذکر فرمایا:

﴿ شھد الله انه لا اله الا ھو و الملائکة و اولوا العلم قائما بالقسط لا اله الا ھو العزیز الحکیم ﴾
(پ ۳)

''اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں اور عالموں نے انصاف سے قائم ہو کر گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہی ہے عزت والا، حکمت والا''

(۳) اللہ تعالیٰ نے علماء کے رونے اور سجدہ کرنے کو ان الفاظ مبارکہ سے ذکر فرمایا:

﴿ ان الذین اوتوا العلم من قبله اذا یتلی علیھم یخرون للاذقان سجدا☆ ویقولون سبحن ربنا ان کان وعد ربنا لمفعولا ☆ ویخرون للاذقان یبکون ویزیدھم خشوعا ﴾ (پ ۱۵)

''بیشک وہ لوگ جن کو اس سے پہلے علم دیا گیا جب ان پر (قرآن) پڑھا جاتا ہے ٹھوڑی کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں۔ اور کہتے ہیں پاکی ہے ہمارے رب کو بیشک ہمارے رب کا وعدہ پورا ہونا تھا اور ٹھوڑی کے بل گرتے ہیں روتے ہوئے اور یہ قرآن ان کے دل کا جھکنا بڑھاتا ہے''

(۴) علماء کے خشوع کا ذکر بھی ان آیات میں ہی چکا ہے ﴿ ویزیدھم خشوعا ﴾ ''قرآن ان کے خشوع کو بڑھاتا ہے

(۵) علماء کرام کی خشیت (رب تعالیٰ سے ڈرنا) کو رب قدوسی نے ان الفاظ مبارکہ سے بیان کیا:

﴿ انما یخشی الله من عباده العلماء ﴾ ''بیشک اللہ تعالیٰ سے اس کے بندوں میں علماء ہی ڈرتے ہیں''
(از کبیر)

علم کی فضیلت احادیث مبارکہ سے:

" عن معاویة قال قال رسول اللہ ﷺ من یرد اللہ به خیرا یفقهه فی الدین وانما انا قاسم واللہ یعطی " (بخاری، مسلم مشکوۃ کتاب العلم)

''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ جسے خیر کثیر عطاء فرمانے کا ارادہ فرماتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا فرما دیتا ہے۔ بیشک میں ہی تقسیم کرنے والا ہوں اور اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے''

وضاحت حدیث:

لفظ خیر کو نکرہ ذکر کیا گیا جو تفخیم شان پر دلالت کر رہا ہے لہٰذا معنی ہوگا ''خیر کثیر'' (بہت بھلائی) ﴿ یفقهه فی الدین ﴾ کا معنی ہے کسی کو عالم دین بنا دینا، یعنی احکام شریعت، طریقت اور حقیقت کا علم عطا کر دینا۔

اسی سے واضح ہو گیا کہ فقہ صرف احکام شرعیہ عملیہ میں بند نہیں بلکہ اعتقادیات پر بھی فقہ کا اطلاق ہے البتہ زیادہ مشہور احکام شرعیہ عملیہ میں اس کا استعمال ہے۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" انما الفقیه الزاهد فی الدنیا الراغب فی الآخرة البصیر بامر دینه المداوم علی عبادة ربه "

''فقیہ وہ ہے جو دنیا میں زاہد ہو آخرت کی طرف رغبت کرنے والا ہو امور دینیہ میں نظر رکھنے والا ہو بلکہ اسے امور دینیہ میں بصارت تامہ حاصل ہو اور اپنے رب کی عبادت میں ہمیشگی کرنے والا ہو'' (از مرقاۃ)

وانما انا قاسم واللہ یعطی:

ونیستم من مگر قسمت کننده وخدا میدهد هر کرا وهرچه میخواهد از فقه وفهم در دین وغیر آن

''اور نہیں ہوں میں مگر تقسیم کرنے والا جسے خدا دیتا اور جو کچھ دیتا ہے خواہ دین میں علم وفہم ہو یا اس کے بغیر'' (اشعة اللمعات)

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اپنی رحمت کے خزانوں سے جو کچھ عطا فرماتا ہے وہ میں ہی تقسیم کرنے والا ہوں۔ رب تعالیٰ کسی کو علم دے تو میرے ذریعے ہی دیتا ہے کسی کو رزق حلال دے تو وہ میرے ذریعے ہی عطا کرتا ہے۔ علامہ علی قاری رحمہ اللہ نے بھی مختلف قول نقل فرمائے کہ نبی کریم صرف علم تقسیم فرمانے والے ہیں، یا رزق حالال بھی۔ اس کے بعد ذکر فرماتے ہیں " والاظھر ان لا منع من الجمع وان کان المقام یقتضی العلم " اگرچہ مقام چاہتا ہے کہ یہاں علم کی تقسیم ہی مراد ہو کیونکہ اس سے پہلے علم کا ہی ذکر کیا گیا ہے۔ رب تعالیٰ کے تمام خزانے مراد لینے میں کوئی مانع (منع کرنے والی چیز) نہیں۔ (از مرقاۃ)

☆ " عن ابن مسعود قال قال رسول اللہ ﷺ لاحسد الا فی اثنین رجل آتاہ اللہ مالا فسلطه علی ھلکته فی الحق ورجل آتاہ اللہ الحکمة فھو یقضی بھا ویعلمھا "
(بخاری، مسلم، مشکوۃ کتاب العلم)

" حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سوائے دو شخصوں کے کسی پر رشک نہیں کرنا چاہیے ایک وہ جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا کیا ہو پھر اسے اپنی راہ میں خرچ کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہو اور دوسرا وہ جسے اللہ تعالیٰ نے حکمت (علم) عطا کیا ہو وہ اس کے مطابق فیصلے کرے اور دوسروں کو تعلیم دے "

حدیث پاک کا جس انداز پر ترجمہ کیا ہے اس سے حدیث پاک کو سمجھنا آسان ہے، زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں۔

☆ " عن ابن مسعود قال قال رسول اللہ ﷺ...... ومن سلک طریقا یلتمس فیه علما سھل اللہ له به طریقا الی الجنة وما اجتمع قوم فی بیت من بیوت اللہ یتلون کتاب اللہ ویتدارسونه بینھم الا نزلت علیھم السکینة وغشیتھم الرحمة وحفتھم الملائکة وذکرھم اللہ فیمن عندہ " (مسلم، مشکوۃ کتاب العلم)

" حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص علم حاصل کرنے کے لئے راہ اختیار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے اس شخص کے لئے جنت کی راہ آسان فرما دیتا ہے۔ اور جب بھی کوئی قوم اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہوتی ہے اور اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں اور ایک

دوسرے کو پڑھاتے ہیں تو ان پر آرام وسکون نازل ہوتا ہے اور ان کو رحمت ڈھانپ لیتی ہے۔ اور ملائکہ ان کا احاطہ کر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا ذکر فرماتا ہے جو اس کے حضور ہوتے ہیں''

وضاحت حدیث:

''من سلک طریقا '' سے مراد عام ہے خواہ وہ اپنے گھر سے قریب ہی علم حاصل کرنے کے لئے جائے یا کہیں دور کا سفر اختیار کرے: '' یلتمس فیه علما '' میں علم سے مراد عام ہے خواہ وہ تھوڑا علم حاصل کرنے کی غرض سے گھر سے باہر جائے یا زیادہ علم حاصل کرنے کے لئے جائے۔ البتہ علم سے مراد دین کا علم ہے اور یہ شرط ہے کہ اس میں نیت اللہ کا قرب حاصل کرنا خود نفع حاصل کرنا اور غیروں کو نفع پہنچانا مقصود ہو۔ ضمناً یہ بھی سمجھ آ گیا کہ دینی علوم کے حاصل کرنے کے لئے گھر کو چھوڑ کر باہر جانا مستحب ہے اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کو پسند ہے:'' سھل الله بـه طـريقا الى الجنة ''علم کے حاصل کرنے کی وجہ سے راہ پر چلنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس شخص کے لئے جنت کی راہ آسان کر دیتا ہے:
'' ومـا اجتمع قوم فی بیت من بیوت الله ''اللہ کے گھر کہہ کر یہود اور انصاری کے عبادت خانوں کو نکال دیا، کیونکہ نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے کے بعد پہلے دین منسوخ ہو گئے ان کے عبادت خانوں کی حیثیت بھی ختم ہو گئی۔

'' والعـدول عن المساجد الى بيوت الله ليشمل كل ما يبنى تقربا الى الله تعالىٰ من المساجد والمدارس والربط ''

''مساجد نہیں ذکر فرمایا بلکہ اللہ تعالیٰ کے گھر کہا ہے تا کہ مراد ہر وہ مقام ہو جائے جو بھی اللہ تعالیٰ کے تقرب کے لئے بنایا گیا ہو خواہ مساجد ہوں، یا دینی مدارس ہوں، یا ایسی سرائے جس میں تعلیم وتعلم کا سلسلہ جاری ہو، یا اس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہو''۔

﴿يتـلـون كتاب الله﴾ اللہ تعالیٰ کی کتاب یعنی قرآن پاک کی وہ تلاوت کرتے ہیں۔ خیال رہے کہ اگر چہ قرآن پاک کا صرف پڑھنا بھی ثواب ہے جیسا کہ مقدمہ میں، میں نے ذکر کر دیا ہے لیکن اس مقام میں قرآن کو پڑھنا اور اس کے معانی کو سمجھنا بھی مراد ہے۔

﴿ويتـدارسونه بينهم﴾ تدارس کا مطلب ہے بعض کا بعض پر پڑھنا تا کہ الفاظ کی ادائیگی صحیح ہو اور معانی کی وضاحت حاصل ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد دینی مدارس کی پڑھائی مراد ہو۔

﴿نزلت علیهم السکینة﴾ ،سکینة کا معنی وقار اور خشیت جس سے سکون قلب، اطمینان اور وقار حاصل ہو جائے اور انوار کا دل پر نزول ہو، اور بعض حضرات نے کہا اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن پاک پڑھنے سے نورانیت حاصل ہو جس سے دل کی صفائی حاصل ہو اور ظلمات نفسانیہ دور ہوں اور ذوق وشوق حاصل ہو۔

اسی طرح " سکینة " کا ایک مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ مقرر فرما دیتا ہے جو قرآن پاک پڑھنے اور پڑھانے والے مؤمنین کے دلوں کو تسلی دیتا ہے اور ان کو امن دیتا ہے اور ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے۔

﴿وغشیتهم الرحمة﴾ ،رحمت ان پر بلند ہوتی ہے اور ان کے پاس رحمت آتی ہے اور ان پر چھا جاتی ہے۔

﴿و حفتهم الملائکة﴾ رحمت و برکت کے فرشتے ان کا احاطہ کرتے ہیں، اور ان کے اور ان کے گھروں کے اردگرد گھومتے ہیں۔ فرشتے آسمان دنیا تک ان کے اردگرد ہوتے ہیں ان کا قرآن پاک پڑھنا اور پڑھانا سنتے ہیں۔ اور آفات وبلیات سے ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ اور ان کی زیارت کرتے ہیں اور ان سے مصافحہ کرتے ہیں اور ان کی دعاء پر آمین کہتے ہیں۔

﴿وذکرهم الله فیمن عنده﴾ اللہ تعالیٰ ملأ اعلیٰ اور فرشتوں کے طبقہ اولیٰ میں ان لوگوں کی بلندی شان کا ذکر فرماتا ہے اور کہتا ہے " انظروا الی عبیدی یذکرونی ویقرؤن کتابی " میرے بندوں کو دیکھو جو میرا ذکر کر رہے ہیں اور میری کتاب پڑھ رہے ہیں۔ (از مرقاۃ)

☆ " عن کثیر بن قیس قال کنت جالسا مع ابی الدرداء فی مسجد دمشق فجاءه رجل فقال یا ابا الدرداء انی جئتک من مدینة الرسول ﷺ لحدیث بلغنی انک تحدثه عن رسول الله ﷺ ما جئت لحاجة قال فانی سمعت رسول الله ﷺ یقول من سلک طریقا یطلب فیه علما سلک الله به طریقا من طرق الجنة وان الملائکة لتضع اجنحتها رضا لطالب العلم وان العالم یستغفرله من فی السموات ومن فی الارض والحیتان فی جوف الماء وان فضل العالم علی العابد کفضل القمر لیلة البدر علی سائر الکواکب وان العلماء ورثة الانبیاء وان الانبیاء لم یورثوا دینارا ولا درهما وانما ورثوا العلم فمن اخذه اخذ بحظ وافر " (رواه احمد والترمذی، وابوداؤد وابن ماجه والدارمی مشکوة کتاب العلم)

''کثیر بن قیس (ترمذی نے قیس بن کثیر ذکر کیا ہے) کہتے ہیں میں حضرت ابوالدرداء کے پاس دمشق کی مسجد میں بیٹھا ہوا تھا ایک شخص ان کے پاس آیا اس نے کہا اے ابوالدرداء بیشک میں تمہارے پاس رسول اللہ ﷺ کے شہر (مدینہ طیبہ) سے آیا ہوں ایک حدیث (تم سے سننے) کے لئے مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تم رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث بیان کرتے ہو۔ میرے آنے کی اور کوئی وجہ نہیں۔ انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا جو شخص علم حاصل کرنے کے لئے کسی راستہ پر چلتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے اس شخص کو جنت کے راستوں میں سے ایک راستہ پر چلاتا ہے۔ اور بیشک ملائکہ طالب علم کی رضا کے لئے اپنے پر بچھاتے ہیں۔ اور بیشک عالم کے لئے زمین و آسمان کی تمام مخلوق مغفرت طلب کرتی ہے۔ اور پانی میں مچھلیاں اس کے لئے مغفرت طلب کرتی ہیں۔ اور بیشک عالم کو عابد پر ایسے فضیلت حاصل ہے جیسے چودویں کے چاند کو باقی ستاروں پر فضیلت حاصل ہے، اور بیشک علماء انبیاء کے وارث ہیں اور بیشک انبیاء دراھم و دنانیر وراثت کے طور پر نہیں چھوڑتے۔ وہ علم کو بطور وراثت چھوڑ کر جاتے ہیں۔ جس نے علم کو حاصل کیا اس نے بہت کامل حصہ حاصل کر لیا۔

وضاحت حدیث:

یہی حدیث جو حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے بیان کی اسے ہی سننے کیلئے وہ شخص حاضر ہوئے تھے۔ انہیں اس حدیث کے متعلق اجمالی پر علم حاصل ہوا تھا۔ تفصیلی طور پر سننا چاہتے تھے، یا ان کا خیال تھا کہ میں نے یہ حدیث واسطہ سے سنی تھی لیکن میں چاہتا ہوں آپ سے براہ راست سنوں۔

کیا خوب علم دین سے سلف صالحین کی محبت تھی کہ مدینہ طیبہ سے ملک شام میں ایک حدیث سننے کے لئے وہ شخص گئے جب کہ اس وقت اتنا سفر کرنا بہت مشکل کام تھا۔ اور کوئی مقصد بھی نہیں تھا کہ کسی کام کے لئے گئے ہوں اور حدیث سننے کا ارادہ بن گیا ہو۔ بلکہ صرف ایک حدیث سننے کے لئے گئے۔ شرح السنۃ میں امام ثوری رحمہ اللہ کا قول نقل کیا گیا ہے وہ فرماتے ہیں: '' **ما اعلم الیوم شیأ افضل من طلب العلم** '' علم کے طلب کرنے سے کسی چیز کو میں افضل نہیں سمجھتا۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: '' **طلب العلم افضل من صلوۃ النافلۃ** '' علم کا طلب کرنا نفل نماز سے افضل ہے۔ اس کی وجہ علامہ علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" لانه اما فرض عین او فرض کفایة وهما افضل من النافلة "
''اس لئے کہ علم حاصل کرنا یا فرض عین ہے یا فرض کفایہ ہے وہ دونوں ہی نفل نماز سے افضل ہیں۔ واضح ہوا کہ علم حاصل کرنا نفلی نماز سے افضل ہے''

فرشتوں کے پر بچھانے کا مطلب کیا ہے؟

" قیل معناه انها تتواضع لطالبه توقیرا لعلمه کقوله تعالیٰ واخفض لهما جناح الذل من الرحمة "
''بیان کیا گیا کہ فرشتوں کے پر بچھانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ طالب علم کے علم کی عزت کی خاطر عجز کا اظہار کرتے ہیں۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے والدین کے لئے پر بچھانے کا حکم دیا ہے مراد اس سے بھی یہی ہے کہ والدین کے سامنے تواضع (عجز) اختیار کرو''

" او المراد الکف عن الطیران والنزول للذکر " اور اس کا یہ مطلب ہے کہ فرشتے طالب علم کی علمی بحثوں کو سننے کے لئے اڑنے سے رک جاتے ہیں اپنے پر زمین پر بچھا دیتے ہیں "والمراد حقیقة وان لم تشاهد" اور یہ معنی مراد لینا بھی کوئی بعید نہیں کہ وہ حقیقۃً اپنے پر بچھا دیتے ہیں اگر چہ ہم اس کا مشاہدہ نہ کر سکیں۔ یعنی وہ حقیقی طور پر طالب علم کی عزت و توقیر کے لئے اپنے پر بچھا دیتے ہیں کہ طالب علم ان پر چلے۔

حدیث پاک سے مزاح اڑانے والوں کا انجام:

احمد بن شعیب کہتے ہیں ہم بصرہ میں بعض محدثین کے پاس تھے، ہم نے یہی حدیث بیان کی وہاں ایک معتزلی طالب علم بھی موجود تھا وہ مزاح اڑاتے ہوئے کہنے لگا اچھا کل میں راستہ میں چلتے ہوئے اپنے جوتے زور زور سے زمین پر ماروں گا تا کہ فرشتوں کے پروں کو اپنے پاؤں اور جوتوں سے روند ڈالوں، دوسرا دن ہوا اس نے ایسا ہی کیا " ومشی فی النعلین فجفت رجلاه ووقعت فیهما الاکلة " اور اپنے جوتے پہن کر تکبرانہ انداز پر فرشتوں کے پروں کو (معاذ اللہ) روندنے کی غرض سے چلا ہی تھا کہ اسکے دونوں پاؤں شل ہو گئے ان میں ایسی جلن پیدا ہوئی کہ وہ کھوکھلے ہو کر رہ گئے۔

طبرانی کہتے ہیں میں نے ابن یحی ساجی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ہم بصرہ کی گلی، کوچہ میں چل رہے تھے کیونکہ ہم ایک محدث کے پاس علم کے حصول کی غرض سے جا رہے تھے ہمارے ساتھ ایک شخص تھا جو

مفت کا دیندار بنا بیٹھا تھا، حقیقت میں اسے دین سے کوئی واسطہ نہ تھا، وہ طنز اڑاتے ہوئے کہنے لگا اپنے پاؤں کو فرشتوں کے پروں سے اٹھا اٹھا کر چلو کہیں ان کے پر توڑ نہ دینا، اس کا یہ کہنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پاک سے مزاح اڑانا تھا:

" فما زال عن موضعه حتی جفت رجلاه وسقط الی الارض "

''ابھی وہ اپنی جگہ سے ہٹا بھی نہیں تھا یہاں تک کہ اس کے پاؤں شل ہو گئے اور زمین پر گر گیا''

عالم کے لئے استغفار:

زیر بحث حدیث پاک میں مذکور ہے کہ عالم کے لئے زمین والے اور آسمان والے مغفرت طلب کرتے ہیں اور پانی میں مچھلیاں مغفرت طلب کرتی ہیں۔ آسمان والے عالم دین کی مغفرت کیسے طلب کرتے ہیں ان کو کیسے پتہ چلا کہ وہ شخص عالم دین تھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے " **لانهم عرفوا بتعريف العلماء وعظموا بقولهم** " آسمان والے علماء کی تعریف اور عظمت کے بیان سے ہی سمجھ جاتے ہیں کہ یہ لوگ عظیم مرتبہ کے مالک ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ ان کے لئے استغفار کرتے ہیں۔ زمین والے علماء کے لئے استغفار کیوں کرتے ہیں " **لان بقائهم وصلاحهم مربوط برائي العلماء وفتواهم** " اس لئے کہ زمین کی مخلوق کی بقاء اور ان کی بہتری کی دارومدار علماء کی رائے اور فتوی کے ساتھ ہی متعلق ہے:

" ولذلک قيل ما من شئي من الموجودات حيها وميتها الاوله مصلحة متعلقة بالعلم "

''اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ تمام موجودات خواہ زندہ ہوں یا مردہ ان میں سے کوئی چیز ایسی نہیں جس کی مصلحت علم سے متعلق نہیں''

مچھلیوں کی عالم کے لئے استغفار کی کیا وجہ ہے؟

" **وقال الطيبی تخصيص الحيتان للدلالة علی ان انزال المطر ببركتهم حتی ان الحيتان تعيش بسببهم وفی الحديث بهم تمطرون وبهم ترزقون** "

''مچھلیاں علماء کے لئے اس لئے مغفرت طلب کرتی ہیں کہ علماء کی برکت سے بارش برستی ہے گویا کہ مچھلیوں کی زندگی کی دارومدار بھی علماء پر ہے کیونکہ مچھلی کی زندگی پانی پر ہے پانی کا حصول بارش سے ہے اور بارش کا حصول علماء سے ہے۔ حدیث پاک میں

بھی ذکر ہے کہ تمہیں علماء کی برکت کی وجہ سے ہی بارش حاصل ہوتی ہے اور ان کی برکت کی وجہ سے ہی تمہیں رزق دیا جاتا ہے"

عالم اور عابد سے کیا مراد ہے؟ عالم سے مراد وہ عالم ہے جو فرائض اور سنت مؤکدہ کو ادا کرے لیکن زیادہ وقت تعلیم و تعلم میں مشغول رہے عالم سے مراد وہ عالم نہیں جو بے عمل ہو فرائض اور سنت مؤکدہ کا بھی تارک ہو۔ اسی طرح عابد سے مراد خالص جاہل مراد نہیں۔ بلکہ جو صاحب علم تو ہو۔ لیکن زیادہ وقت عبادات میں مشغول رہے اور تعلیم و تعلم سے دور رہے۔ یعنی عالم سے مراد جس کے علم کو عبادت پر غلبہ حاصل ہے اسی طرح عابد سے مراد جس کی عبادت اس کے علم پر غالب ہو۔ عالم کو عابد پر اس لئے فضیلت حاصل ہے کہ عالم سے اور لوگ بھی فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ اس کی طرف سے اور لوگوں کو بھی نفع حاصل ہوتا ہے لیکن عابد کی عبادت اس کی اپنی ذات تک موقوف رہتی ہے۔

ایک عظیم نکتہ: اس حدیث پاک میں نبی کریم ﷺ نے عالم کو چودھویں کے چاند سے اور عابد کو ستاروں سے تشبیہ دی ارشاد فرمایا:

"ان فضل العالم علی العابد کفضل القمر لیلۃ البدر علی سائر الکواکب"

"بے شک عالم کو عابد پر ایسے فضیلت حاصل ہے جیسے چودھویں کے چاند کو ستاروں پر فضیلت حاصل ہے"

دوسری حدیث شریف میں آپ کا ارشاد گرامی ہے:

"فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم"

"عالم کو عابد پر ایسے فضیلت حاصل ہے جیسے مجھے تم میں سے کسی ادنی پر فضیلت حاصل ہے"

دونوں حدیثوں کا ایک ہی مطلب ہے کیا خوب علامہ علی قاری رحمۃ اللہ نے بیان فرمایا ذرا سمجھنے کی کوشش فرمائیں۔

"کفضل القمر لیلۃ البدر ای لیلۃ الرابع عشر وبہ اول طہ علی حساب الجمل و ارید بہ النبی ﷺ یعنی المشبہ بہ فی نہایۃ النور وغایۃ الظہور فیکون فیہ تلمیح الی قولہ کفضلی علی ادنا کم کمافی قولہ (علی سائر الکواکب) ایماء الی قولہ اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم فان نور المؤمن ولو کان عابدا ضعیف اذا لم ی کن عالما" (مرقاۃ)

عابد کو نبی کریم ﷺ نے ستاروں سے تشبیہ دی اور عالم کو چودھویں کے چاند سے کیونکہ مومن جب تک عالم نہ ہو بیشک عبادت گزار ہی کیوں نہ ہو اس کا نور کم ہوتا ہے اور عالم کو نورانیت زیادہ حاصل ہوتی ہے "لیلۃ البدر" کا معنی چودھویں رات ہے جیسا کہ بعض حضرات نے "طٰہٰ" کا بحساب ابجد بھی معنی چودھویں کا چاند مراد لیا ہے یہاں چودھویں کے چاند سے مراد نبی کریم ﷺ ہیں جیسا کہ دوسری حدیث پاک میں واضح طور پر فرمایا کہ عالم کو عابد پر ایسے فضیلت حاصل ہے جیسے مجھے تم میں سے کسی ادنی پر فضیلت حاصل ہو۔

چاند سے تشبیہ دی کہ اس کی نورانیت اور اس کے ظاہر ہونے کو تو لوگ مانتے ہی ہیں ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں نبی کریم ﷺ کی نورانیت بھی آ جائے حدیث شریف میں ستاروں سے مراد صحابہ کرام ہیں کیونکہ دوسری حدیث میں صحابہ کرام کے متعلق نبی کریم ﷺ نے فرمایا میرے صحابہ ستاروں کی طرح ہیں ان میں جس کی اقتداء کرو گے ہدایت پا جاؤ گے۔ (از مرقاۃ)

علماء انبیاء کرام کے وارث:

انبیاء کرام کو یقین ہوتا ہے کہ دنیا فانی ہے وہ دنیا سے محبت نہیں کرتے مال و دولت جمع نہیں کرتے صرف گزر اوقات کے لئے ان کے پاس مال ہوتا ہے، وہ بھی بطور وراثت تقسیم نہیں ہوتا۔ تا کہ یہ کوئی نہ کہے کہ شائد انہوں نے ورثاء کے لئے یہ مال جمع کیا تھا۔ لیکن علم باقی رہنے والی چیز ہے وہی ان کی وراثت ہوتی ہے اس کے حقدار بھی خاص اپنے اہل و عیال ہی نہیں ہوتے بلکہ امت کا جو فرد بھی حاصل کرنا چاہے وہی حاصل کر لے۔

اسی مسئلہ کو ایک اور حدیث سے سمجھئے:

"ابوهريرة مر يوما في السوق بقوم مشتغلين بتجاراتهم فقال انتم ههنا وميراث رسول الله ﷺ يقسم في المسجد فقاموا سراعا اليه فلم يجدوا فيه الا القرآن والذكر ومجالس العلم فقالوا اين ما قلت يا ابا هريرة فقال هذا ميراث محمد ﷺ يقسم بين ورثته وليس بمواريثه دينا كم" (مرقاۃ ج ۱ ص ۲۸۱)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ایک دن بازار سے گزرے لوگ اپنی اپنی تجارت میں مشغول تھے تو آپ نے فرمایا تم یہاں ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت مسجد میں تقسیم ہو رہی ہے۔ لوگ جلدی جلدی مسجد میں آ گئے۔ وہاں سوائے قرآن پاک پڑھنے، ذکر کرنے اور علمی مجالس کے انہوں نے کچھ نہ پایا وہ کہنے لگے اے ابوہریرہ جو تم کہہ رہے تھے وہ کہاں ہے آپ نے فرمایا نبی کریم ﷺ کی وراثت یہی ہے (جو تم مسجد میں دیکھ رہے ہو) جو آپ کے ورثاء میں تقسیم کی جا رہی ہے آپ کی وراثت تمہاری دنیا کا مال و دولت نہیں''

فوائد:

" الصوفی لا یملک ولا یملک وفیه ایماء الی کمال توکلهم علی الله تعالیٰ فی انفسهم و اولادهم "

''صوفیاء کرام، اولیاء عظام کسی چیز کے نہ مالک ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی کو مالک بناتے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ پر ان کو اپنی جانوں اور اپنی اولاد کے متعلق کامل توکل ہوتی ہے۔

خیال رہے کہ رزق حلال، اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ ہونے والا مال قابل تعریف ہے اسی لئے بعض اولیاء کرام نے شاہی میں فقیری کی، یعنی مال و دولت حاصل ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے مقرب رہے۔ اور بعض اولیاء کرام نے فقیری میں شاہی کی یعنی ان کے پاس مال و دولت تو زیادہ نہیں تھا لیکن بے نیازی سے وہ وقت کے بادشاہوں سے زیادہ (تھوڑے مال پر صابر و شاکر رہنے کی وجہ سے) مطمئن رہے۔

☆ " وفیه اشعار بان طالب الدنیا لیس من العلماء الورثة "

اسی حدیث پاک سے یہ سمجھ میں آیا کہ دنیا کو طلب کرنے والے علماء نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث نہیں بن سکتے۔ مقصد صرف دین کی خدمت ہو رب تعالیٰ کی مہربانی سے اگر مال بھی حاصل ہو جائے تو اسے رب تعالیٰ کا فضل ہی سمجھے۔

☆ امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" اقل العلم بل اقل الایمان ان یعرف ان الدنیا فانیة وان العقبی باقیة "

''کم از کم علم کا درجہ بلکہ ایمان کا کم درجہ یہ ہے کہ آدمی کو یہ معلوم ہو کہ دنیا فانی اور آخرت باقی رہنے والی ہے''۔

اس علم کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ فانی چیز سے اعراض کرے گا اور باقی رہنے والی چیز کی طرف متوجہ ہوگا

(از مرقاۃ)

اعتراض: نبی کریم ﷺ کے وصال کے وقت آپ کے پاس فدک اور خیبر وغیرہ کی زمین تھی۔ اور حضرت شعیب علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت ایوب علیہ السلام کے وصال کے مطابق ان کے پاس بھی کثیر مال تھا۔ تو کس طرح درست ہوگا کہ انبیاء کی وراثت مال نہیں ہوتا۔

جواب:

" ان المراد انه ما ورثت اولادهم وازواجهم شيأ من ذلك بل بقى بعدهم معدا لنوائب المسلمين "

''بیشک مراد یہ ہے کہ انبیاء کرام کے پاس اگر کوئی مال دولت آیا بھی تو وہ ان کی اولاد اور ان کی بیویوں میں وہ بطور وراثت تقسیم نہیں ہوا بلکہ انکے بعد وہ مسلمانوں کی حاجات کیلئے وقف رہا''۔ (از مرقاۃ)

☆ " عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ تعلموا الفرائض والقرآن وعلموا الناس فانی مقبوض "

(رواہ الترمذی، مشکوۃ کتاب العلم)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا علم فرائض حاصل کرو، قرآن کا علم حاصل کرو اور لوگوں کو علم سکھاؤ، بیشک میں دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں''۔

وضاحت حدیث:

علم فرائض سے مراد ''علم میراث'' اور جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرض کیا ہے اس کا علم، اوامر و نواہی کا علم، حدیث پاک کا علم۔ آخری معنی مراد لینا زیادہ بہتر ہے (راقم) تاکہ اس کا مفہوم یوں واضح ہو جائے " تعلموا الكتاب والسنة " قرآن اور حدیث کا علم حاصل کرو، یہ معنی جب مراد ہوگا تو دوسرے معانی خود بخود اس میں داخل ہو جائیں گے۔

" وعلموا الناس فانی مقبوض ، ای ساقبض وينقطعان "

''لوگوں کو بھی علم فرائض اور قرآن کی تعلیم دوایسا نہ ہو کہ میں دنیا سے رخصت ہو جاؤں تو علوم ختم نہ ہو جائیں''

(از مرقاۃ)

موجودہ دور میں ایک حدیث پاک سے مغالطہ دینے کی کوشش:

" عن ابی ھریرۃ روایۃ یوشک ان یضرب الناس اکباد الابل یطلبون العلم فلا یجدون احدا اعلم من عالم المدینۃ " (ترمذی ، مشکوۃ ، کتاب العلم)

'' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوع روایت بیان کرتے ہیں کہ عنقریب لوگ علم کی طلب کے لئے سفر کریں گے لیکن مدینہ طیبہ کے عالم سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں پائیں گے''۔

اسی حدیث پاک سے لوگوں کو مغالطہ دینے کی یہ کوشش کی جاتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مدینہ میں علم والوں کی تعریف کی ہے لہٰذا آج کل مدینہ میں رہنے والے ہی بڑے عالم ہیں انکے اقوال کو ہی دین سمجھا جائے۔ یہ بالکل غلط ہے، حدیث پاک کا مفہوم غلط بیان کرنے کی ناپاک کوشش ہے۔ آیئے علامہ علی قاری رحمہ اللہ سے حدیث پاک کی وضاحت پوچھئے کہ اس کا مطلب کیا ہے۔

" (فلا یجدون احدا) ای فی العالم (اعلم من عالم المدینۃ) قیل ھذا فی زمان الصحابۃ والتابعین واما بعد ذلک فقد ظھرت العلماء الفحول فی کل بلدۃ من بلاد الاسلام اکثر ما کانوا بالمدینۃ فالا ضافۃ للجنس وقیل المراد بہ ذاتہ علیہ الصلوۃ والسلام فالاضافۃ للعھد " (مرقاۃ ج ۱ ص ۳۰۱)

" عالم المدینۃ " میں اضافت پائی گئی ہے اس اضافت میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ اضافت جنس کے لئے ہو اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ اضافت عہد کے لئے ہو۔ پھر اضافت جنس کے لئے ہو تو اس سے مراد صحابہ کرام اور تابعین کرام ہیں۔ اب معنی یہ ہوگا کہ لوگ علم حاصل کرنے کے لئے سفر کریں گے۔ ان کو جہان میں کہیں بھی میرے صحابہ اور ان کے بعد آنے والے تابعین جو زیادہ طور پر مدینہ طیبہ میں ہوں گے ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں ملے گا''۔

ورنہ بعد میں عالم اسلام کے شہروں میں سے ہر شہر میں بڑے بڑے جلیل القدر علماء کرام پائے گئے ہیں اور اگر اضافت عہد کے لئے ہو تو مراد خود نبی کریم ﷺ کی ذات ہوگی۔ اب معنی یہ ہوگا کہ عنقریب لوگ سفر کریں گے علم حاصل کرنے کے لئے لیکن جہان میں ان کو کہیں بھی مدینہ طیبہ میں رہنے والے عالم سے زیادہ کوئی عالم نہیں ملے گا وہ مدینہ طیبہ میں رہنے والا عالم تو میں خود ہی ہوں۔ دنیا کے لوگ تمام جہان میں پھر کر تو دیکھ لیں کیا مجھ سے بڑھ کر بھی کوئی عالم انہیں نظر آئے گا۔

راقم کے نزدیک اضافت عہد کے لئے ہی راجح قول ہے جسے دو وجہ سے تائید حاصل ہے۔ایک لفظ " یوشک " ذکر ہے۔ وافعال مقاربہ سے ہے۔ جس کا حقیقی معنی ہی ''قریب ہونا'' ہے حقیقی معنی کو چھوڑ کر مجازی معنی لینے کی کوئی ضرورت اور مجبوری نہیں۔ دوسری تائید لفظ " اعلم من عالم المدینة " سے مل رہی ہے۔ جس میں مفرد الفاظ کا استعال ہے۔ بلکہ تیسری وجہ ترجیح بھی ہے کہ صحابہ کرام اور تابعین کے زمانہ میں ہی مدینہ طیبہ کے باہر ہی بڑے بڑے علماء موجود تھے جو صحابہ کرام اور تابعین سے ہی تھے۔

☆ " **وعن انس قال قال رسول الله ﷺ طلب العلم فریضة علی کل مسلم وواضع العلم عند غیر اهله کمقلد الخنازیر الجوهر واللؤلؤ والذهب** "

(رواه ابن ماجه وروی البیهقی فی شعب الایمان الی قوله مسلم ، مشکوة کتاب العلم)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا علم کا طلب کرنا ہر مسلم پر فرض ہے۔ اور علم کو غیر اہل کے پاس رکھنے والا ایسا ہی ہے جیسا کہ خنزیروں کے گلے میں جواہر اور موتیوں اور سونے کے ہار ڈالنے والا ہو''۔

وضاحت حدیث:

" (طلب العلم) ای الشرعی (فریضة) ای مفروض فرض عین (علی کل مسلم) او کفایة "

''حدیث پاک میں جس علم کا ذکر ہے وہ علم شرعی مراد ہے یعنی شریعت کا علم حاصل کرنا ہر مسلمان کے لئے فرض عین ہے یا فرض کفایہ ہے''

خیال رہے کہ شرعی علم حاصل کرنا ہر مسلمان ''مرد ہو یا عورت'' کے لئے فرض ہے۔ قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں بہت جگہ مذکر کے صیغے استعال ہیں۔ جن سے مراد مؤنث بھی ہیں۔ اور علامہ علی قاری رحمہ اللہ نے تو یہ بھی بیان کیا ہے "ومسلمة کما فی روایة " کسی ایک روایت میں "مسلمة " کا ذکر بھی ہے ''علم فرض عین'' یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم ہو کہ رب تعالیٰ کی ذات موجود ہے اور وہ واحد لاشریک لہ ہے۔ اور نبوت کا علم اور نماز کی کیفیت کا علم ہو وغیرھا۔ ''علم فرض کفایہ'' تفصیلی طور پر شرعی علوم کو حاصل کرنا کہ درجہ افتاء واجتہاد حاصل کرنا۔

غیر اھل کون ہے؟

" وواضع العلم عند غیر اھله ، بان یحدثه من لا یفھمه او من یرید منه غرضا دنیویا اومن لا یتعلمه لله "

" جس شخص کو تعلیم دی جائے وہ اسے سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، یا اس کا علم حاصل کرنا دنیا کی غرض کے لئے ہو یا وہ اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی کے لئے علم حاصل نہ کرے وہ نااہل ہے "

اسی سے یہ واضح ہو گیا کہ اگر علم ایسے شخص کو پڑھایا گیا جس میں اس کی استعداد پائی گئی ہو تو وہ اس کا اہل ہے نااہل شخص کو علم عطاء کرنا ظلم ہے جس طرح اخس (بہت ہی گھٹیا) جانور کے گلے میں قیمتی جواہر، موتیوں اور سونے کا ہار ڈال کر مال ضائع کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا جائے۔

اسی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا:

" حدثوا الناس بما یفھمون او یعرفون اتحبون ان یکذب الله ورسوله "

" لوگوں سے بات کرو جسے وہ سمجھتے ہوں کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی تکذیب کی جائے "

یعنی ایسے نااہل سے کوئی علمی بات نہ کریں جو سوچنے سمجھنے کی کوشش ہی نہ کرے بلکہ انکار ہی کرتا چلا جائے " وعلی العالم ان یخص کل طالب بما ھو مستعد له " عالم کے لئے ضروری ہے کہ ہر طالب علم جتنی اہلیت رکھے اسی طرح کا اسے علم پڑھایا جائے (چھوٹی کلاسوں کو مشکل مسائل پڑھا کر اپنی علمت کو ظاہر کرنے والے دراصل جاہل ہوتے ہیں)۔

تنبیہ: اس حدیث کو بیھقی نے بیان کرنے کے بعد کہا ہے " واسناده ضعیف " اور اس کی سند ضعیف ہے:" وقال الجزری فی البدایة الا اصل له ای لیس له اصل صحیح " جزری نے بدایہ میں بیان کیا ہے کہ اس کی اصل صحیح نہیں " ولکن قال العراقی قد صحح بعض الائمة " لیکن عراقی نے کہا ہے کہ اس حدیث کو بعض ائمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔ علامہ علی قاری رحمہ اللہ نے کہا:

" ولکن کثرة الطرق تدل علی ثبوته ویقوی بعضه ببعض "

" اگرچہ بیہقی نے ضعیف کہا ہے لیکن کثرت طرق سے ثابت ہے، اس لئے بعض اسناد

کو بعض سے تقویت حاصل ہے"

" قال المزی تلمیذ النوی ان طرقه تبلیغ رتبة الحسن "

"مزی رحمہ اللہ جو علامہ نووی رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں وہ فرماتے ہیں کہ یہ متعدد طرق سے ثابت ہونے کی وجہ حسن کے مرتبہ تک پہنچی ہوئی ہے"۔

" وقال العلقمی فی شرح الجامع الصغیر رایت له خمسین طرق جمعتها فی جزء وحکمت بصحته لکن من القسم الثانی وهو الصحیح بغیره "

"علقمی نے جامع صغیر کی شرح میں بیان کیا ہے کہ میں نے اس حدیث کے پچاس سند کے طریقے دیکھے ہیں ان تمام کو میں نے "جزء" میں جمع کیا ہے۔ اور میں نے اس حدیث کے صحیح ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ البتہ یہ صحیح کی قسم ثانی ہے یعنی "صحیح لغیرہ" ہے۔ (از مرقاة ج ۱ ص ۲۸۵)

راقم نے یہ بحث اس لئے تحریر کردی کہ بعض بدطینت لوگ صرف جزری کا قول پیش کر کے راقم پر معترض نہ ہوں کہ یہ حدیث کیوں نقل کی کیا صرف جزری کے قول کو صحیفہ آسمانی سمجھ کر قبول کرلیا جائے اور باقی تمام بزرگوں کے اقوال کو رد کردیا جائے یہ کون سا انصاف ہے۔ ایک ایک قول کو لے کر جب بعض وہ جہلاء جو علامہ سیوطی رحمہ اللہ کی کتب کو سمجھنے کی صلاحیت سے بھی عاری ہیں علامہ سیوطی رحمہ اللہ کے متعلق یوں لکھتے ہیں کہ ان کی کتب میں موضوع حدیثوں کو درج کیا گیا ہے" تو مجھے بڑا ہی افسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ سنیت کا لبادہ اوڑھ کر منافقت کے طور پر اغیار کا کام کررہے ہیں " اللهم انا نعوذبک من الجاهلین الشیاطین المفسدین "

☆ " قال علیه السلام معلم الخیر اذا مات بکی علیه طیر السماء ودواب الارض وحیتان البحور "

(کبیر)

نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا دینی علم کی تعلیم دینے والا عالم جب فوت ہوتا ہے تو اس پر آسمانوں کے پرندے اور زمین کے جانور اور دریاؤں کی مچھلیاں روتی ہیں۔

☆ "حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے مرفوع حدیث روایت کی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" رحمة الله علی خلفائی فقیل من خلفاؤک یا رسول الله قال الذین یحیون سنتی ویعلمونها عباد الله "

(کبیر)

"اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو میرے خلفاء پر آپ سے پوچھا گیا یا رسول اللہ آپ کے خلفاء کون ہیں؟ آپ نے فرمایا وہ لوگ جو میری سنت کو زندہ کرتے ہیں اور اللہ کے بندوں

کواس کی تعلیم دیتے ہیں''۔

☆ '' قال علیه السلام لعلی حین بعثه الی الیمن لان یهدی الله بک رجلا واحدا خیر لک مما تطلع علیه الشمس او تغرب '' (کبیر)

نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جب یمن کی طرف بھیجا تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری وجہ سے کسی ایک شخص کو ہدایت دے دی تو تمہارے لئے بہتر ہوگا ہر اس چیز سے جس پر سورج طلوع ہوتا ہے یا غروب ہوتا ہے۔ یعنی تمام روئے زمین کے مال و دولت سے تمہارے لئے بہتر ہوگا۔

☆ '' ابو وافد اللیثی قال ، انه علیه السلام بینما هو جالس والناس معه اذا قبل ثلاثة نفر اما احدهم فرآی فرجة فی الحلقة فجلس الیها واما الآخر فجلس خلفهم واما الثالث فانه رجع وفر فلما فرغ علیه السلام من کلامه قال اخبرکم عن النفر الثلاثة اما الاول فآوی ای الله فآواه الله واما الثانی فاستحیا من الله فاستحیا الله منه واما الثالث فاعرض عن الله فاعرض الله عنه ''
(رواہ مسلم ،کبیر)

ابو وافد لیثی کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ ایک محفل میں تشریف فرما تھے لوگ بھی آپ کے پاس موجود تھے (آپ خطاب فرما رہے تھے) تین شخص آئے ان میں سے ایک نے حلقہ میں خالی جگہ دیکھی تو وہاں آ کر بیٹھ گئے۔ ان میں دوسرا شخص مجلس کے آخر میں بیٹھ گیا اور تیسرا شخص واپس لوٹ گیا۔ نبی کریم ﷺ جب اپنے کلام سے فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا کیا میں تمہیں تین شخصوں کے متعلق خبر نہ دوں؟ ان میں سے پہلے شخص نے اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لئے جگہ حاصل کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی اسے اپنا قرب عطاء کر دیا۔ لیکن دوسرے شخص نے رب تعالیٰ سے حیاء کی تو رب تعالیٰ نے بھی اس سے حیاء کی۔ لیکن تیسرے نے رب تعالیٰ سے اعراض کیا تو رب تعالیٰ نے بھی اس سے اعراض کیا۔

حدیث پاک کا تقریباً مفہوم واضح ہے کہ جو شخص محفل میں جگہ دیکھ کر نبی کریم ﷺ کے قریب پہنچ گئے اور آپ کے کلام کو سنا اور مسائل کا علم حاصل کیا انہیں رب تعالیٰ نے اپنا قرب عطا کیا، وجہ تقرب اس میں علم دین کو حاصل کرنا ہی ہے۔ دوسرے شخص بہت پیچھے ہی بیٹھ گئے انہوں نے نبی کریم ﷺ کے کلام کو سننے کی کامل توجہ نہ کی اور حیاء کی وجہ محفل میں کشادہ جگہ دیکھ کر قریب نہ ہوئے تو رب تعالیٰ نے بھی

ان کو اپنا تقرب عطاء نہ کیا، رب تعالیٰ کے حیاء کرنے کا یہی مطلب ہے کہ وہ رب تعالیٰ کے تقرب سے محروم رہے۔ تیسرا شخص محفل میں لوگوں کو دیکھ کر چلا گیا، گویا کہ تعلیم سے اعراض کیا تو رب تعالیٰ بھی اس سے ناراض ہو رب تعالیٰ کی ناراضگی کو ہی اعراض سے تعبیر کیا گیا۔

علم کی فضیلت آثار سے:

یعنی علم کی فضیلت میں سلف صالحین کے اقوال ذھبیہ (سنہری اقوال) بیشمار پائے گئے ہیں۔ چندان میں سے ذکر کیے جاتے ہیں:

(۱) "العالم ارأف بالتلميذ من الاب والام لان الاباء والامهات يحفظونه من نار الدنيا و آفاتها والعلماء يحفظونه من نار الآخرة و شدائدها"

"عالم اپنے شاگرد پر بنسبت اس کے ماں، باپ کے زیادہ مہربان ہے، اس لئے کہ اس کے ماں باپ اسے دنیا کی آگ اور دنیا کے مصائب سے بچاتے ہیں لیکن علماء ان کو آخرت کی آگ اور اس کی شدتوں سے بچاتے ہیں"۔

(۲) "حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا:" بم وجدت هذا العلم قال بلسان سؤول وقلب عقول" توانہوں نے فرمایا سوال کرنے والی زبان اور عقل رکھنے والے دل سے۔

علم حاصل کرنے کا راز اسی میں بند ہے کہ طالب علم کو جو بات نہ آئے وہ اپنے احباب سے پوچھے یا اساتذہ سے پوچھے اور پڑھتے وقت بڑی توجہ سے استاذ کی بات کو سنے۔ مطالعہ کرے سبق کا تکرار کرے، عقل رکھنے والے دل کا یہی مطلب ہے۔ استاذ کی بات کو کھیل میں مشغول رہتے ہوئے نہ سننا باعث محرومیت ہے۔

(۳) بعض حضرات نے کیا خوب کہا "سل مسألة الحمقى واحفظ حفظ الاكياس" سوال بے وقوفوں کی طرح کرو اور یاد عقلمندوں کی طرح کرو۔ بے وقوفوں کی طرح سوال کرنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ نہ آنے پر بار بار سوال کرتا رہے۔ ایک دوسرے سے پوچھتا رہے۔ جو طلباء اساتذہ سے اپنی برتری کا اظہار کرتے ہوئے سوال کرتے ہیں وہ راقم کے نزدیک حقیقی احمق ہوتے ہیں ان کو اساتذہ کی طرف سے "خسر الدنيا والآخرة" کا تمغہ ملتا ہے، جو زندگی بھر ان کا پیچھا کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنے

زعم باطل میں بڑے مجتہد ہوتے ہیں لیکن ہر طرف سے ان پر لعنت کے تیر برس رہے ہوتے ہیں۔

(۴) مصعب بن زبیر نے اپنے بیٹے کو کیا خوب نصیحت کی:

" یا بنی تعلم العلم فان کان لک مال کان العلم لک جمالا وان لم یکن لک مال کان العلم لک مالا "

'' اے میرے پیارے بیٹے علم حاصل کرو اگر تمہارے پاس مال بھی ہوا تو علم اس کیلئے جمال ہوگا، اگر تمہارے پاس مال نہ ہو تو علم خود ہی بہت عظیم مال و دولت ہے''۔

(۵) '' قال علی ابن ابی طالب لا خیر فی الصمت عن العلم کما لا خیر فی الکلام عن الجھل "

حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ نے فرمایا علم سے خاموش رہنے میں کوئی بھلائی نہیں جیسا کہ جہالت کے کلام میں کوئی اچھائی نہیں۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ جب مسئلہ بیان کرنے کی ضرورت ہو اس وقت خاموش رہنا نیکی کے کام سے دور ہونے کے مترادف ہے۔ اسی طرح جہالت کی باتیں کرنا بھی بھلائی سے دور ہونا ہے۔

راقم کے نزدیک قوم کی تباہی دو چیزوں سے ہو رہی ہے۔ ہر جاہل کہتا ہے میں بھی دین کو سمجھتا ہوں۔ اور دوسری چیز یہ ہے کہ جو چاہو کرتے رہو اور یہ کہہ دو کہ کچھ نہیں ہوتا جی دین میں تنگی نہیں، یہ جائز، ناجائز تو مولویوں نے بنا رکھا ہے۔

(۶) عالم تین قسم پر ہیں ایک ان میں سے وہ ہیں جو " عالم باللہ غیر عالم بامر اللہ " ہوں یہ وہ ہیں کہ ان کے دلوں پر معرفت الٰہیہ کا غلبہ ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالٰی کے نور جلال کے مشاہدہ میں مستغرق ہوتے ہیں۔ اور رب تعالٰی کی کبریائی کا ان پر غلبہ ہوتا ہے۔ علم احکام کو حاصل کرنے کا ان کو وقت ہی میسر نہیں ہوتا۔ ان میں سے بعض تو وہ ہوتے ہیں جو کچھ نہ کچھ احکام حاصل کر لیتے ہیں اور بعض وہ ہوتے ہیں جو مقام مجذوبیت تک پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن یہ مقام اتنا بلند نہیں جیسا کہ " اھدنا الصراط المستقیم " کی بحث میں بیان کیا جا چکا ہے۔

تین قسموں میں سے دوسری قسم کے عالم وہ جن کے متعلق یوں کہا گیا ہے " عالم بامر اللہ غیر عالم باللہ " یہ حضرات حلال و حرام کو پہچانتے ہیں احکام کے حقائق کو جانتے ہیں لیکن اللہ تعالٰی کے

جلال کو اسرار کو نہیں جانتے۔ تیسری قسم ان میں سے یہ ہے " عالم باللہ و بامر اللہ " یہ وہ حضرات ہیں جو اللہ تعالیٰ کو بھی جانتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو بھی جانتے ہیں۔ یہ عالم معقولات اور عالم محسوسات کے درمیان ایک حد مشترک پر تشریف فرما ہوتے ہیں۔

" فهو تارة مع الله بالحب له وتارة مع الخلق بالشفقة و الرحمة "

" وہ کبھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کرنے میں مشغول ہوتے ہیں اور کبھی مخلوق کے ساتھ شفقت و رحمت میں مشغول ہوتے ہیں"

کبھی ان کی توجہ مخلوق کی طرف ہوتی ہے اس وقت رب تعالیٰ کی طرف توجہ میں کچھ کمی ہوتی ہے۔ اور کبھی ان کی توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے اس وقت مخلوق کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ یہ مقام اللہ تعالیٰ کے انبیاء کرام، مرسلین اور صدیقین کو حاصل ہے جو " واصل باللہ و بالمخلوق " کے درجہ پر ہوتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے علم والوں کی ان تینوں قسموں کا پتہ چلتا ہے آپ نے فرمایا:

" سائل العلماء و خالط الحكماء و جالس الكبراء "

" علماء سے مسائل پوچھیں حکماء سے میل جول رکھیں اور بڑے حضرات کی مجالس میں بیٹھیں"

علماء سے مراد وہی لوگ ہیں جو " عالم بامر الله و غير عالم بالله " ہیں۔ اور حکماء سے مراد وہی ہیں جو " عالم بالله و غير عالم بامر الله " ہیں۔ اور کبراء سے مراد وہی ہیں جو " عالم بالله و بامر الله " ہیں۔ کبراء کی مجالس میں بیٹھنے سے دین و دنیا کی بھلائی حاصل ہوتی ہے۔

تنبیہ: اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اکثر علماء کو مقام صدیقین حاصل ہے وہ درجہ کبراء میں ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے جلال کے اسرار کو بھی جانتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو بھی جانتے ہیں۔ اگر کسی عقل کے اندھے کو یقین نہ آئے تو وہ نبی کریم کے اس ارشاد گرامی کو دیکھے اور سمجھنے کی کوشش کرے " العلماء ورثة الانبياء " علماء انبیاء کرام کے وارث ہیں۔ انبیاء کرام کے وہی وارث ہو سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے جلال کے اسرار کو بھی جانتے ہوں اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو بھی جانتے ہیں۔

اب دوسرے ارشاد گرامی کو سمجھنا واضح ہو جائے گا کہ " سائل العلماء " علماء سے صرف مسائل پوچھنے کا مطلب یہ ہے اگر بعض علم والے لوگ صرف مسائل کو جانتے ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دور

ہوں تو ان سے مسائل پوچھنے کا حکم آپ نے فرمایا لیکن وہ علماء جو " العلماء ورثة الانبیاء " کے درجہ پر ہیں ان سے مسائل بھی پوچھے جائیں ان کی محافل میں بیٹھا جائے انشاء اللہ ان کے قرب سے خدا کا قرب حاصل ہوگا۔

راقم اگرچہ بہت گنہگار ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے راقم کے قرب سے بھی کئی احباب کے عقائد درست ہوئے اور کئی احباب کو نیکی اور تقوی کا مقام حاصل ہوا۔ آیئے امام شقیق بلخی رحمہ اللہ کے قول کو دیکھیں تو یہ مسئلہ اور واضح ہو جائے گا اور سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ آپ فرماتے ہیں تینوں کی تین تین علامات ہیں:

" اما العالم بامر الله فله ثلاث علامات ان یکون ذاکرا باللسان دون القلب وان یکون خائفا من الخلق دون الرب وان یستحی من الناس فی الظاهر ولا یستحی من الله فی السر "

" وہ شخص جو صرف احکام کو جاننے والا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کو نہیں جانتا اس کی تین علامتیں یہ ہیں وہ زبان سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرے اور دل سے یاد نہ کرے۔ اور مخلوق سے ڈرے رب تعالیٰ سے نہ ڈرے، لوگوں سے ظاہری طور پر حیاء کرے اور اللہ تعالیٰ سے پوشیدگی میں حیاء نہ کرے "

" واما العالم بالله فانه یکون ذاکرا خائفا مستحییا اما الذکر فذکر القلب لا ذکر اللسان واما الخوف فخوف الریاء لا خوف المعصیة واما الحیاء فحیاء ما یخطر علی القلب لا حیاء الظاهر "

" وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کو جاننے والا ہے احکام کو کامل طریقہ سے نہیں جانتا یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں مستغرق ہے وہ ذکر کرنے والا ڈرنے والا، حیاء کرنے والا ہوتا ہے۔ لیکن اس کا ذکر دل کا ذکر ہوتا ہے، زبان کا ذکر نہیں ہوتا۔ اسے ڈر ریاء کاری سے ہوتا ہے معصیت کا خوف نہیں ہوتا۔ اور اسے دل پر کھٹکنے والے خطرات سے حیاء آتی ہے۔ ظاہر سے اسے حیاء محسوس نہیں ہوتی "۔

" واما العالم بالله وبامر الله فله ستة اشیاء الثلاثة التی ذکرناها للعالم بالله فقط مع ثلاثة اخری کونه جالسا علی الحد المشترک بین عالم الغیب والشهادة وکونه معلماللقسمین الاولین وکونه بحیث یحتاج الفریقان

الاولان الیه وھو یستغنی عنھا"

''وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کو جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو بھی جانتا ہے اس میں چھ چیزیں پائی جاتی ہیں۔ تین تو وہی جن کو اس شخص کے لئے بیان کیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کو جانتا ہے احکام کو نہیں جانتا، یعنی وہ ذکر کرنے والا ڈرنے والا اور حیاء کرنے والا ہو، اور مزید تین چیزیں یہ ہیں کہ وہ عالم غیب اور عالم شہادۃ کے درمیان حد مشترک پر بیٹھنے والا ہو۔ یعنی ظاہری احکام کو بھی جانتا ہو اور باطنی احکام کو بھی جانتا ہو۔ اور ظاہری احکام کی تعلیم دینے والا ہو اور باطنی احکام کی بھی تعلیم دینے والا ہو۔ یعنی جہاں احکام شرعی سکھائے وہاں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی معرفت بھی سکھائے۔ اور وہ اس درجہ پر ہو کہ پہلے دونوں فریق (یعنی فقط عالم باللہ اور فقط عالم بامر اللہ) اس کے محتاج ہوں لیکن وہ خود ان دونوں سے مستغنی ہو''

امام شفیق بلخی رحمہ اللہ نے مزید وضاحت کرتے ہوئے یوں بیان فرمایا:

" مثل العالم باللہ وبامر اللہ کمثل الشمس لایزید ولا ینقص ومثل العالم باللہ فقط کمثل القمر یکمل تارۃ وینقص تارۃ اخری ومثل العالم بامر اللہ فقط کمثل السراج یحرق نفسہ ویفتی لغیرہ "

''وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کی معرفت بھی رکھتا ہے اور اس کے احکام کو بھی جانتا ہے وہ سورج کی طرح ہے جو نہ کبھی گھٹتا ہے اور نہ ہی بڑھتا ہے ایک حال پر رہتا ہے۔ یہ وہ علماء جو بکتے نہیں ہر سورج کے پجاری نہیں صوفیوں والا لبادہ اوڑھ کر، یا علمیت کے دعویدار بن کر حاکموں کے سامنے کاسہ گدائی نہیں پھیلاتے فتوے بیچتے نہیں صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی رضاء کی خاطر حق اور سچ بیان کرتے ہیں اور اسی پر قائم رہتے ہیں''۔

اور وہ اشخاص جو صرف رب تعالیٰ کی معرفت رکھیں اور وہ احکام کی کامل معرفت نہ رکھیں وہ چاند کی طرح ہیں۔ جیسے چاند گھٹتا اور بڑھتا ہے اسی طرح وہ بھی گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں یعنی ان کے مدارج میں اتار، چڑھاؤ آتا رہتا ہے۔ اور وہ لوگ جو صرف احکام کی معرفت رکھیں اللہ تعالیٰ کی معرفت ان کو حاصل نہ ہو وہ چراغ کی طرح ہیں جو خود جلتا ہے اور دوسروں کو روشن کرتا ہے۔ گھٹیا قسم کے علماء بھی دوسروں کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ اعلیٰ قسم کے علماء کا کتنا ہی عظیم مقام ہوگا۔

(۷) " قال فتح الموصلی ، الیس المریض اذا امتنع عنہ الطعام والشراب والدواء

یموت ، فکذا القلب اذا امتنع عنه العلم والفکر والحکمة یموت "

''فتح موصلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کیا ایسا نہیں کہ مریض کا جب کھانا، پینا اور دواء رہ جائے تو وہ مر جاتا ہے؟ اسی طرح جب دل میں علم، فکر اور حکمت نہ آئے تو دل مرجاتا ہے''۔

(۸) " قال الشیخ البلخی ،الناس یقومون من مجلسی علی ثلاثة اصناف : کافر محض، ومنافق محض ، ومؤمن محض ، وذلک لانی افسر القرآن فاقول عن الله وعن الرسول فمن لا یصدقنی فهو کافر محض ، ومن ضاق قلبه منه فهو منافق محض ومن ندم علی ما صنع وعزم علی ان لا یذنب کان مؤمنا محضا "

''شیخ بلخی رحمہ اللہ فرماتے ہیں میری مجلس میں آ کر جانے والے تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں خالص کافر، خالص منافق، خالص مومن چونکہ میں قرآن پاک کی تفسیر بیان کرتا ہوں وہی کچھ بتاتا ہوں جو اللہ تعالیٰ کے ارشادات گرامیہ ہوتے ہیں یا نبی کریم ﷺ کے ارشادات گرامیہ ہوتے ہیں جو شخص میری تصدیق نہ کرے وہ خالص کافر ہوتا ہے۔ اور جو شخص اس سے دل تنگی محسوس کرے وہ خالص منافق ہے اور جو شخص اپنے کئے ہوئے پر نادم ہو جائے اور آئندہ کے لئے گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرلے وہ خالص مومن ہے''

(۹) " وقال ایضا ثلاثة من النوم یبغضها الله تعالیٰ وثلاثة من الضحک : النوم بعد صلوة الفجر وقیل صلوة العتمة والنوم فی الصلوة والنوم عند مجلس الذکر ، والضحک خلف الجنازة والضحک فی المقابر والضحک فی مجلس الذکر "

''شیخ بلخی رحمہ اللہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ تین وقت سونے کو اور تین وقت ہنسنے کو رب تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے۔ نماز فجر کے بعد اور عشاء کی نماز سے پہلے سونا، اور نماز میں سونا اور مجلس ذکر یعنی وعظ ونصیحت کی مجلس میں سونا رب تعالیٰ کو ناپسند ہے جنازہ کے ساتھ چلتے ہوئے ہنسنا، قبرستان میں ہنسنا اور مجلس ذکر میں ہنسنا رب تعالیٰ کو ناپسند ہے''۔

مطلب واضح ہے کہ دوران تعلیم سوئے رہنا اور ہنستے رہنا ہر وہ کام جو متعلم کی توجہ کو معلم سے ہٹا دے وہی رب تعالیٰ کو ناپسند ہوگا۔

(۱۰) " فاحتمل السیل زبدا رابیا " (تو پانی کی روانگی ابھرے ہوئے جھاگ اٹھالائی) اس

آیۂ کریمہ کی تفسیر میں ایک قول یہ بھی ہے کہ ''سیل'' سے مراد ''علم'' ہے۔

اگر مراد علم ہی لیا جائے تو علم کو پانی سے تشبیہ دینے کی پانچ وجہ ہوں گی ان میں ایک یہ ہے کہ پانی بھی آسمانوں سے نازل ہوتا ہے اور علم بھی آسمانوں سے نازل ہوا ہے اور دوسری یہ ہے کہ جس طرح زمین کی اصلاح پانی سے ہوتی ہے اسی طرح مخلوق کی اصلاح علم سے ہوتی ہے اور تیسری وجہ ان میں سے یہ ہے کہ جس طرح کھیتیاں اور نباتات پانی کے بغیر پیدا نہیں ہوتے۔ اسی طرح اعمال اور طاعات بغیر علم کے حاصل نہیں ہوتے۔ اور چوتھی وجہ ان میں سے یہ ہے کہ جس طرح بارش میں بجلی کی چمک اور کڑک پائی جاتی ہے، اسی طرح علم کے ساتھ وعد اور وعید پائے جاتے ہیں۔ اور پانچویں وجہ ان میں سے یہ ہے کہ جس طرح بارش میں نفع بھی ہے اور نقصان بھی۔ اسی طرح علم میں نفع بھی ہے اور نقصان بھی۔ کیونکہ علم کے مطابق عمل کیا جائے تو اس میں نفع ہے اور علم کے مطابق عمل نہ ہو تو اس میں نقصان ہے۔ اسی طرح علم حق ہو یعنی قرآن وحدیث کے مطالب صحیح بیان کرے تو علم نفع مند ہے اور اگر قرآن پاک اور احادیث کے مطالب غلط بیان کرے جیسا کہ بتوں کے حق میں نازل ہونے والی آیات کو انبیاء کرام اور اولیاء عظام پر چسپاں کرنا اور کافروں کے حق میں نازل ہونے والی آیات کو مسلمانوں پر چسپاں کرنا یہ علم نقصان دہ ہے اسے ہی علم سوء کہا جاتا ہے۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ حکام کی ہاں میں ہاں ملانے والے، ہر جائز اور ناجائز کو جائز کہنے والے جدھر پیسہ جائے ادھر فتوی جائے یہ بھی علم سوء (برا) رکھنے والے ہی ہیں۔

(۱۱) دنیا کا باغ پانچ چیزوں سے مزین ہے علماء کے علم سے امراء کے عدل سے، عبادت کرنے والون کی عبادت سے، تاجروں کی امانت سے، کسب کرنے والوں کے خلوص سے۔ لیکن ابلیس نے پانچ جھنڈے لا کر ہر ایک کے اردگرد ایک ایک جھنڈا اگاڑ دیا۔ جس کی وجہ سے ہر ایک کے کمال میں زوال آ گیا۔ ہاں صرف وہی با کمال رہے جن کو اللہ تعالیٰ نے شیطان سے محفوظ رکھا۔

☆ شیطان نے حسد کا جھنڈا علم کے پاس گاڑ دیا ہے۔ علماء حسد کی وجہ سے زوال میں آ رہے ہیں (الا ماشاء اللہ)۔

☆ شیطان نے ظلم کا جھنڈا عدل کے قریب گاڑ دیا ہے۔ حکام ظلم کی وجہ سے برباد ہوتے جا رہے

ہیں۔ جوان کی ہر ناجائز کام میں ہاں میں ہاں ملاتے چلے جائیں وہ مخلص، محب وطن، وفادار، نیک، متقی ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ ان کے ناجائز کاموں کو ناجائز کہیں ان کو للکاریں اور کہیں کہ ظلم بند کرو انہیں پابند سلاسل کر دیا جاتا ہے۔ ان کو غاصب اور لیٹرا کہا جاتا ہے۔ یوں سمجھیں کہ غاصب خود دوسرے کو غاصب کہتا ہے چور دوسرے کو چور کہہ کر شور کر رہا ہے، لیٹرا دوسرے کو لیٹرا کہہ کر قوم کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ یہ دراصل اسکے قریب شیطان نے ظلم کا جھنڈا جو گاڑ دیا ہے اسی کے سب کرشمے ہیں عادل ظالم بن گیا جس کے عدل سے زمین نے آباد ہونا تھا اس کے ظلم سے زمین برباد ہو کر رہ گئی۔

☆ شیطان نے ریاء (دکھلاوے) کا جھنڈا عبادت کے قریب گاڑ دیا ہے۔ جب عبادت کرنے والے اپنی عبادت پر ناز کرنا شروع کر دیں تو ان کے عبادت میں زوال آجاتا ہے۔

☆ شیطان نے خیانت کا جھنڈا امانت کے قریب گاڑ دیا ہے۔ تاجر جب تک امین اور صادق ہوتا ہے وہ اللہ کا حبیب ہوتا ہے لیکن جب وہ امانت کا دامن چھوڑ دے کھوٹ، ملاوٹ، کم تولنا، جھوٹ بولنا جب اس کا وطیرہ ہو جائے تو وہ شیطان کا دوست بن جاتا ہے رب سے دور ہو جاتا ہے۔

☆ شیطان نے کھوٹ کے جھنڈے کو خلوص کے قریب نصب کر دیا ہے۔ کسب کرنے والے، کسی پیشہ کو اختیار کرنے والے جب کسی چیز کے بنانے میں کھوٹ سے کام لیتے ہیں۔ تو ان کا خلوص ختم ہو جاتا ہے۔

(۱۲) حضرت حسن بصری رحمہ اللہ تابعین میں سے جلیل القدر تابعی ہیں۔ ان کو درجات کی بلندی، مقام میں افضلیت پانچ چیزوں سے حاصل ہوئی۔ ان میں سے ایک یہ ہے " لم یامرا حد بشئی حتی عمله " کہ آپ نے کسی ایک کو کسی کام کا حکم اس وقت تک نہیں دیا۔ یہاں تک کہ آپ نے پہلے خود اس پر عمل کیا۔ ان میں سے دوسری چیز یہ ہے " لم ینه احدا عن شئی حتی انتهی عنه " آپ نے کسی ایک کو کسی چیز سے اس وقت تک نہیں منع کیا یہاں تک خود اس سے آپ نے آپ کو روک لیا۔ ان میں سے تیسری چیز یہ ہے:

" کل من طلب منه شیا مما رزقه الله تعالیٰ لم یبخل به من العلم و المال "

" کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو علم اور مال کی دولت سے نوازا۔ اس میں سے کسی نے کچھ طلب کیا تو آپ نے اس میں بخل (کنجوس) نہیں کیا"۔

ان میں چوتھی چیز یہ ہے " کان یستغنی بعلمه عن الناس " آپ اپنے علم کی وجہ سے لوگوں سے مستغنی رہے۔ حقیقت یہی ہے کہ خودداری انسان کو باوقار بناتی ہے۔ اگر چہ بعض اوقات لوگ اسے متکبر بھی سمجھتے ہیں۔ لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے۔ اور ان میں سے پانچویں چیز یہ ہے ' کانت سریرته وعلانیته سواء " آپ کا ظاہر و باطن ایک جیسا تھا۔ علامات نفاق کو آپ سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔

(۱۳) جب تو یہ چاہے کہ تجھے معلوم ہو جائے کہ تیرا علم تجھے نفع پہنچا رہا ہے یا نہیں۔ تو تو پانچ چیزوں کو طلب کر، تیرا علم یقیناً تیرے لئے نفع مند ہوگا وہ پانچ چیزیں یہ ہیں " حب الفقر لقلة المؤنة " مشقت کم اٹھانے کے لئے فقر سے محبت کی جائے۔ یقینی بات ہے کہ فقیر کو تمام مصائب کے ہونے یا نہ ہونے کی کوئی فکر نہیں ہوتی وہ آزاد ہوتا ہے۔

" وحب الطاعة طلبا للثواب " "ثواب کے حاصل کرنے کیلئے طاعت سے محبت کیجائے"

" وحب الزهد فی الدنیا طلبا للفراغ " "فراغت حاصل کرنے کیلئے دنیا میں زہد سے محبت کیجائے"

" وحب الحکمة طلبا لصلاح القلب " "دل کی اصلاح کیلئے علم سے محبت کیجائے"

" وحب الخلوة طلبا لمناجاة الرب " "رب تعالیٰ سے مناجات کیلئے خلوت سے محبت کیجائے"

(۱۴) پانچ چیزوں کو پانچ میں تلاش کرو:" اطلب العز فی التواضع لا فی المال والعشیرة " عزت عاجزی میں طلب کرو، نہ کہ مال اور قبیلہ میں۔ یعنی انسان جتنا زیادہ عاجز ہوگا، اتنا ہی زیادہ عزت والا ہوگا، انسان کی یہ خام خیال ہے کہ وہ مال و دولت میں عزت سمجھتا ہے، یا وہ یہ سمجھے کہ میری برادری بڑی ہے، یا میرے ساتھ لٹھ بردار پشت پناہی کرنے والے ہیں:"اطلب الغنی فی القناعة لا فی الکثرة " غناء کو قناعت میں تلاش کرو، نہ کہ مال و دولت کے کثیر ہونے میں۔ تھوڑے مال پر اکتفاء کر لینا، جتنا مال رب تعالیٰ نے دیا اسی پر صابر رہنا قناعت ہے، اسی سے غناء حاصل ہوتی ہے۔ زیادہ مال ملے اور زیادہ ملنے کی خواہش پائی جائے، اس سے انسان غنی نہیں ہو سکتا۔ جو بے پرواہ نہیں وہ غنی کب ہے۔ غنی تو وہ ہے جو بے پرواہ ہے:" اطلب الأمن فی الجنة لا فی الدنیا " یہ خواہش رکھو کہ جنت میں امن حاصل ہو جائے۔ دنیا میں امن حاصل کرنا ضروری نہیں کیونکہ دنیا میں مصائب

وآلام گناہوں کا کفارہ بنتے ہیں درجات کی بلندی کا ذریعہ بنتے ہیں: "**اطلب الراحة فی القلة لا فی الکثرة**" قلیل مال میں ہی راحت طلب کرو، کثیر مال میں آرام نہیں بلکہ ذہنی طور پر ہر وقت بے چینی ہی رہتی ہے: "**اطلب منفعة العلم فی العمل لا فی کثرة الروایة**" علم کا نفع عمل میں حاصل کرو زیادہ تقریروں سے علم کا نفع حاصل نہیں ہوگا۔

(۱۵) ابن مبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس امت میں فساد صرف پانچ قسم کے خاص لوگوں سے ہوتا ہے وہ خواص یہ ہیں: علماء، غزاۃ (غازی لوگ) زھاد، تاجر اور حکام:

"**اما العلماء فھم ورثة الانبیاء فاذا کان العالم واضعا للدین وللمال رافعا فبمن یقتدی الجاھل**"

''علماء چونکہ انبیاء کرام کے وارث ہیں۔ جب عالم دین ہی دین کو پست کرے مال کو ترجیح دے تو کون سا جاہل اس کی اقتداء کرے گا''۔

یعنی دین کو چند ٹکوں پر بیچنے والے حاکموں کو خوش کرنے کے لئے مسائل کو بدل دینے والے حاکم بدلے تو ان کے مسائل بدل جائیں حاکم بدل جائے تو ان کی دعائیں بدل جائیں ان کو ہر شخص جانتا ہے کہ یہ بکے ہوئے ہیں یہ دین کو بیچنے والے ہیں۔ ان کی کوئی اقتداء نہیں کرتا۔

"**واما الزھاد فعماد اھل الارض فاذا کان الزاھد فی الدنیا راغبا فبمن یقتدی التائب**"

''زاہد لوگ زمین والوں کا ستون ہیں۔ جب زاہد ہی دنیا کی طرف راغب ہو جائیں تو کس وجہ سے ان کی اقتداء کر کے کوئی توجہ کرے گا''۔

"**واما الغزاة فجند اللہ فی الارض فاذا کان الغازی طامعا مرائیا فکیف یظفر بالعدو**"

''غازی حضرات زمین میں اللہ تعالیٰ کا لشکر ہیں لیکن جب غازی ہی طمع ولالچ کرنے والا بن جائے غازی ہی جب دکھلاوے کا کام کرے تو وہ دشمن پر کیسے کامیاب ہوسکتا ہے''۔

"**واما التجار فامناء اللہ فی ارضه فاذا کان التاجر خائنا فکیف تحصل الامانة**"

''لیکن تاجر اللہ تعالیٰ کی زمین میں اللہ تعالیٰ کے امین ہوتے ہیں۔ جب تاجر ہی خائن ہو جائے تو امانت کیسے حاصل ہوگی''

" واما الولاة فهم الرعاة فاذا كان الراعی ذئبا فكيف تحصل الرعاية "

" حکام اپنی رعیت کے محافظ ہوتے ہیں لیکن جب محافظ ہی بھیڑیا بن جائے تو حفاظت کیسے ہوگی"

(۱۶) حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں علم کو مال پر سات وجہ سے فضیلت حاصل ہے:

" اولها العلم ميراث الانبياء والمال ميراث الفراعنة "

" ان میں سے پہلی وجہ یہ ہے کہ علم انبیاء کرام کی وراثت ہے اور مال و دولت فرعونوں کی وراثت ہے"

" ثانيها العلم لا ينقص بالنفقة والمال ينقص "

" ان میں سے دوسری وجہ یہ ہے کہ علم خرچ کرنے سے کم نہیں ہوتا، لیکن مال خرچ کرنے سے کم ہوتا ہے"

" وثالثها يحتاج المال الى الحافظ والعلم يحفظ صاحبه "

" ان میں سے تیسری وجہ یہ ہے کہ مال کو محافظ کی ضرورت ہے لیکن علم خود صاحب علم کی حفاظت کرتا ہے"

" ورابعها اذا مات الرجل يبقى ماله والعلم يدخل مع صاحبه قبره "

" ان میں سے چوتھی چیز یہ ہے کہ انسان جب فوت ہو جاتا ہے اس کا مال پیچھے رہ جاتا ہے یعنی اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے لیکن علم انسان کے ساتھ قبر میں جاتا ہے"

سبحان اللہ علم کیسا ساتھی ہے جو ساتھ نہیں چھوڑتا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے مال بے وفاء ہے اس میں علامت نفاق پائی جاتی ہے اور علم باوفاء ہے اس میں خلوص پایا جاتا ہے۔

" وخامسها المال يحصل للمؤمن والكافر والعلم لا يحصل الا للمؤمن "

" ان میں سے پانچویں وجہ یہ ہے کہ مال مومنوں کو حاصل ہے اور کافروں کو بھی حاصل ہے لیکن علم (چونکہ علم سے مراد علم دین ہی ہے) صرف مومنوں کو حاصل ہے"

سبحان اللہ کیا خوب مسئلہ سمجھ آیا کہ مومنوں اور کفار کا اشتراک باعث زوال ہے اور صرف مومنوں کے ساتھ رہنے میں ہی حصول کمال ہے۔ کاش کسی کو سمجھ آئے کفار کی دوستی نے ہی مسلمانوں کو تباہ کر دیا ہے۔

" وسادسها جميع الناس يحتاجون الى صاحب العلم فى امر دينهم ولا يحتاجون الى صاحب المال"

''اوران میں سے چھٹی وجہ یہ ہے کہ تمام لوگ دینی معاملات میں عالم دین کے محتاج ہوتے ہیں لیکن مال دار کے تمام لوگ محتاج نہیں ہوتے''۔

بڑے بڑے خناس، بڑے بڑے منحوس دین اسلام کے باغی نام کے مسلمان بھی بچے کی پیدائش کے وقت اور کسی عزیز، بزرگ کی موت کے وقت اور نکاح کے وقت عالم دین کے محتاج ہوتے ہیں۔

" وسابعها العلم يقوى الرجل على المرور على الصراط والمال يمنعه "

''اوران میں سے ساتویں وجہ یہ ہے کہ علم انسان کو پل صراط سے گزرنے کی طاقت عطا فرمائے گا۔اور مال پل صراط سے گزرنے میں رکاوٹ بنے گا''

خیال رہے کہ مال سے مراد وہ مال ہے جو حلال طریقہ سے حاصل نہ کیا گیا۔ یا اسے ناجائز کاموں میں خرچ کیا گیا۔ یا اس حال سے زکواۃ نہ ادا کی گئی۔ یا اس مال نے انسان کو رب تعالیٰ سے دور رکھا کہ وہ فرائض کا تارک رہا۔

(۱۷) فقیہ ابو اللیث رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص عالم کے پاس بیٹھتا ہے اور علم سے کوئی چیز وہ یاد کرنے پر قادر نہ بھی ہو تو پھر بھی وہ سات قسم کی چیزیں حاصل کر لیتا ہے جو اس کے لئے باعث تکریم بنتی ہیں۔

" اولها ينال فضل المتعلمين "

''ان میں سی پہلی چیز یہ ہے کہ وہ متعلمین کا مقام فضیلت حاصل کر لیتا ہے''

" والثاني مادام جالسا عنده كان محبوسا عن الذنوب "

''اور دوسری چیز یہ ہے کہ وہ جتنی دیر ایک عالم دین کی محفل میں بیٹھا رہے گا۔اتنی دیر وہ گناہوں سے بچا رہے گا''

" والثالث اذا خرج من منزله طلبا للعلم نزلت الرحمة عليه "

''اور تیسری چیز یہ ہے کہ جب وہ اپنے گھر سے علم کی طلب کے لئے نکلتا ہے اس پر رحمت کا نزول ہوتا ہے''

" والرابع اذا جلس فی حلقة العلم فاذا نزلت الرحمة عليهم حصل له منها نصيب "

''اور چوتھی چیز یہ ہے کہ جب وہ شخص علم کی مجلس میں بیٹھے گا تو جب معلمین اور متعلمین پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا نزول ہوگا تو اللہ تعالیٰ اسے بھی اپنے رحمت سے نوازے گا کیونکہ اس

کی شان کریمی کے یہ لائق ہی نہیں کہ وہ ایک ہی محفل میں بیٹھے ہوئے بعض لوگوں پر رحم فرمائے اور بعض کو محروم کرے''۔

" والخامس ما دام یکون فی الاستماع تکتب له طاعة "

'' ان میں سے پانچویں چیز یہ ہے کہ جب تک وہ علمی مسائل سن رہا ہے اسی وقت تک اس کے نامہ اعمال میں طاعت کا درجہ لکھا جارہا ہے''

" والسادس اذا استمع ولم یفهم ضاق قلبه لحرمانه عن ادراک العلم فیصیر ذلک الغم وسیلة له الی حضرة الله تعالیٰ لقوله عزوجل ان عند المنکسرة قلوبهم لاجلی "

''اوران میں سے چھٹی چیز یہ ہے کہ جب انسان دینی مسائل سنے اور اسے وہ سمجھ نہ آئیں تو یقیناً وہ ان سے دل تنگ ہوگا کیونکہ وہ یہ سمجھے گا کہ میں علم کے حاصل کرنے سے محروم ہو رہا ہوں۔ یہ غم اور پریشانی اور دل تنگی اس کو رب تعالیٰ کے قریب پہنچانے کا ذریعہ بنے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد (غالباً حدیث یا کسی صاحب کشف کا قول) یہ ہے کہ جس کا دل میری وجہ سے ٹوٹے (یعنی جو پریشان رہے کہ مجھے رب تعالیٰ کا قرب حاصل کیوں نہیں ہو رہا) تو میں اس کے قریب ہوتا ہوں''

۔ یعنی اس شخص کو میرا ایسا قرب حاصل ہوتا ہے کہ میں خود اس کے قریب ہو کر اسے اپنا مقرب بنالیتا ہوں۔

" والسابع یری اعزاز المسلمین للعالم واذلالهم للفساق فیرد قلبه عن الفسق ویمیل طبعه الی العلم فلهذا امر علیه الصلوة والسلام بمجالسة الصالحین "

''اور ساتویں چیز ان میں سے یہ ہے کہ جب وہ شخص علماء کی عزت اور فاسق لوگوں کی ذلت کو دیکھے گا تو اس کی طبیعت خود بخود علم کی طرف میلان کرے گی (ہوسکتا ہے کچھ نہ کچھ علم بھی اسے حاصل ہو جائے) اسی لئے نبی کریم علیہ السلام نے نیک لوگوں کی محافل میں بیٹھنے کا حکم فرمایا''۔

(۱۸) فقیہ ابو اللیث رحمہ نے فرمایا جو شخص آٹھ قسم کے لوگوں کے ساتھ بیٹھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کیلئے آٹھ چیزوں کو زیادہ کرتا ہے :

" من جلس مع الاغنیاء زاده الله حب الدنیا والرغبة فیها "

جو شخص غنی لوگوں کے ساتھ بیٹھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی دنیا کے ساتھ محبت اور رغبت بڑھا دیتا ہے۔

" ومن جلس مع الفقراء جعل الله له الشكر و الرضا بقسمة الله "

''اور جو شخص فقیر لوگوں کے ساتھ بیٹھے گا اللہ تعالیٰ اس کو اپنی تقسیم پر راضی اور شاکر بنا دیتا ہے''

یعنی فقراء کی مجلس کو اختیار کرنے والے کی رضاء اور اسکا شکر گزار ہونا اللہ تعالیٰ بڑھا دیتا ہے۔

" ومن جلس مع السلطان زاده الله القسوة و الكبر "

''اور جو شخص بادشاہوں کے ساتھ بیٹھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی قساوت قلبی (دل کی سختی) اور تکبر کو بڑھا دیتا ہے''

" ومن جلس مع النساء زاده الله الجهل و الشهوة "

''اور جو شخص عورتوں کے ساتھ بیٹھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی جہالت اور شہوت کو زیادہ کر دیتا ہے''

" ومن جلس مع الصبيان از داد من اللهو و المزاح "

''اور جو شخص بچوں کے ساتھ بیٹھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے مزاح اور کھیل کود میں زیادتی کر دیتا ہے''

" ومن جلس مع الفساق از داد من الجرأة على الذنوب وتسويف التوبة "

''اور جو شخص فاسقوں کے ساتھ بیٹھتا ہے اس کا گناہوں پر دلیر ہونا اور توبہ میں ٹال مٹول کرنا زیادہ کر دیا جاتا ہے''

" ومن جلس مع الصالحين از داد رغبة في الطاعات "

''اور جو شخص نیک لوگوں کے ساتھ بیٹھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی طاعات میں رغبت کو زیادہ کر دیتا ہے''

" ومن جلس مع العلماء از داد العلم و الورع "

''اور جو شخص علماء کے ساتھ بیٹھتا ہے اللہ تعالیٰ اسکے علم اور ورع (تقوی، نیکیوں) کو بڑھا دیتا ہے''

فائدہ : اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے ناموں کا علم دیا رب تعالیٰ کے ارشاد ﴿وعلم آدم الاسماء كلها﴾ کا یہی مطلب ہے اور حضرت خضر علیہ السلام کو فراست کا علم دیا رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ وعلمناه من لدنا علما ﴾ اور ہم نے ان کو اپنی طرف سے علم دیا (یعنی علم لدنی سے ان کو نوازا)۔ اور یوسف علیہ السلام کو خواب کی تعبیر کا علم دیا ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ رب قد آتيتني من الملك وعلمتني من تاويل الاحاديث ﴾

''اے میرے رب تو نے مجھے بادشاہت عطاء کی اور خوابوں کی تعبیر کا علم تو نے مجھے عطاء فرمایا''

اور حضرت داؤد علیہ السلام کو زرع بنانے کا علم عطا فرمایا رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وعلمناه صنعة لبوس لكم ﴾ اور ہم نے اسے تمہارے لئے زرع بنانے کا علم عطا فرمایا۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو پرندوں کی بولیوں کا علم فرمایا یعنی آپ پرندے کے کلام کو سمجھتے تھے کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ یا ایها الناس علمنا منطق الطیر ﴾ اے لوگو ہمیں پرندوں کے کلام کا علم عطا کیا گیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو توراۃ اور انجیل کا علم دیا گیا جیسا کہ رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا:

﴿ ویعلمه الکتاب والحکمة والتوراة والانجیل ﴾

''اور اسے کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل سکھاتا ہے''

اور ہمارے نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو شرع اور توحید کا علم دیا گیا اور آپ پر مزید فیضان یہ فرمایا گیا ﴿ وعلمک ما لم تکن تعلم ﴾ سے آپ کو خطاب فرمایا جس میں " ما " عموم پر دلالت کر رہا ہے یعنی یوں فرمایا کہ آپ جو کچھ بھی نہیں جانتے تھے وہ سب کچھ آپ کو عطاء فرما دیا گیا اور ﴿ الرحمن علم القرآن ﴾ کہہ کر واضح کر دیا کہ آپ کو قرآن کا علم دیا گیا جو " علم الاولین والآخرین " تمام اگلوں اور پچھلوں کے علم پر مشتمل ہے اور " علمه البیان " کہہ کر واضح کر دیا کہ آپ کو "ماکان وما یکون " (جو ہو چکا ہے اور جو ہونا ہے) کا علم عطاء کر دیا گیا:

" فعلم آدم کان سببا له فی حصول السجدة والتحية "

''حضرت آدم علیہ السلام کا علم فرشتوں کا انہیں سجدہ کرنے اور سلام کرنے کا سبب بنا''

" وعلم الخضر کان سببا لان وجد تلمیذا مثل موسی ویوشع علیهما السلام "

''حضرت خضر علیہ السلام کے علم کی وجہ سے ہی ان کے شاگرد موسیٰ علیہ السلام اور یوشع علیہ السلام بنے''

" وعلم یوسف کان سببا لوجد ان الاهل والمملکة "

''حضرت یوسف علیہ السلام کے علم کے سبب سے ہی آپ کو اہل اور مملکت حاصل ہوئی''

" وعلم داؤد کان سببا لوجد ان الریاسة والدرجة "

''حضرت داؤد علیہ السلام کو علم کی وجہ سے ہی ریاست اور درجات حاصل ہوئے''

" وعلم سلیمان کان سببا لوجدان بلقیس والغلبة "

''حضرت سلیمان علیہ السلام نے علم کی وجہ سے بلقیس کو حاصل کیا اور اس پر غلبہ حاصل کیا''

" وعلم عیسی کان سببا لزوال التهمة عن امه "

''اور عیسیٰ علیہ السلام کا علم ان کی والدہ مکرمہ سے تہمت کے زوال کا سبب بنا''

'' وعلم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کان سببا لوجود الشفاعة ''

''اور ہمارے نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ کا علم آپ کو شفاعت کا حق حاصل ہونے کا سبب بنا''

(علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں) پھر ہم کہتے ہیں کہ جب مخلوق کے اسماء کے علم کی وجہ سے فرشتوں کا سلام حضرت آدم علیہ السلام کو حاصل ہوا۔ تو پتہ چلا کہ جسے خالق کائنات اور اس کی صفات کا علم حاصل ہوا یقیناً اسے بھی فرشتوں کا سلام حاصل ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اسے سلام حاصل ہوگا۔ جسے رب تعالیٰ نے ان الفاظ مبارکہ سے ذکر فرمایا:

﴿ سلام قولا من رب رحیم ﴾

اور خضر علیہ السلام کو جب علم فراست کی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام کی صحبت حاصل ہوئی " فیا امة الحبیب بعلم الحقیقة کیف لا تجدون صحبة محمد صلی اللہ علیہ وسلم " تو اے حبیب پاک ﷺ کی امت تمہیں علم حقیقت کی وجہ سے۔ مصطفیٰ کریم ﷺ کی صحبت کیوں حاصل نہیں ہوگی جب کہ رب تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا:

﴿ فاولئک مع الذین انعم اللہ علیهم من النبیین ﴾

''جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے ان کو انبیاء کرام کا ساتھ حاصل ہوگا''

اور جب یوسف علیہ السلام کو خوابوں کی تعبیر کی وجہ سے دنیا کے قید خانہ سے نجات حاصل ہوئی "فمن کان عالما بکتاب اللہ کیف لا ینجو من حبس الشهوات " جس شخص کو اللہ کی کتاب کا علم حاصل ہو وہ کیسے خواہشات کی قید سے نجات حاصل نہیں کرے گا جب کہ رب تعالیٰ نے خود ہی فرمایا:

﴿ ویهدی من یشاء الی صراط مستقیم ﴾

''اور اللہ تعالیٰ جسے چاہے سیدھی راہ کی ہدایت دیتا ہے''

اور حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی ذات پر رب تعالیٰ کے انعامات کا ذکر یوں فرمایا:

﴿ وعلمتنی من تاویل الاحادیث ، اے اللہ تو نے مجھے خوابوں کی تعبیر کا علم عطا فرمایا ﴾

تو اے شخص قرآن کا علم رکھنے والے ذرا غور کر اللہ تعالیٰ کا تجھ پر کتنا احسان عظیم ہے جس نے

تجھے اپنی کتاب کا علم عطا فرمایا اس سے بڑھ کر تیرے لئے اور کیا نعمت ہوسکتی ہے جس نے تجھے مفسر قرآن بنایا اور اپنا مقرب بنایا اور اپنے نبی کریم ﷺ کا وارث بنایا اور مخلوق کو دعوت حق دینے والا بنایا اور اپنے بندوں کو نصیحت کرنے والا بنایا اور اپنے شہروں کے باشندوں کے لئے تمہیں چراغ بنایا اور اپنی مخلوق کا جنت اور ثواب کے لئے تمہیں قائد بنایا اور جہنم کی آگ سے بچنے کے لئے لوگوں کو زجر کرنے والا تمہیں بنایا۔

حدیث پاک میں آتا ہے " العلماء سادة و الفقهاء قادة و مجالستهم زيادة " علماء کو سیادت (سرداری) حاصل ہے اور فقہاء کو قائد ہونے کی حیثیت حاصل ہے اور ان کی مجالس میں بیٹھنے میں زیادتی ثواب حاصل ہے۔

تنبیہ: راقم اللہ تعالیٰ کے ان گنت انعامات کا شکریہ ادا نہیں کرسکتا۔ ان انعامات میں سے اس کا عظیم انعام یہ بھی ہے کہ اس نے مجھے مفسرین کرام کے اقوال کے نقل کرنے کی توفیق عطا فرمائی میں "ناقلِ اقوالِ مفسرینِ کرام "تو ہوں لیکن مجھے کوئی مفسر قرآن نہ سمجھے اس عظیم منصب کا میں اہل نہیں۔ (راقم نجوم الفرقان)

(۱۹) مؤمن علم کی طرف اس وقت تک کامل رغبت نہیں کرسکتا جب تک اس میں چھ صفات نہ پائی جائیں: ایک یہ کہ کہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے فرائض کے ادا کرنے کا حکم دیا ہے میں ان کو اس وقت تک ادا نہیں کرسکوں گا جب تک کہ مجھے علم حاصل نہیں ہوگا اور دوسری صفت یہ ہے کہ مؤمن یہ سمجھے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے معاصی سے منع فرمایا ہے لیکن میں ان سے علم کے بغیر اجتناب نہیں کرسکتا اور تیسری صفت یہ ہے کہ مؤمن کو یہ معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر لازم کیا ہے کہ میں اسکی نعمتوں کا شکریہ ادا کروں اور بغیر علم کے میں اس کا شکرگزار نہیں ہوسکتا۔ اور چوتھی صفت یہ ہے کہ مؤمن یہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے مخلوق پر انصاف کرنے کا حکم دیا ہے بغیر علم کے انصاف کرنا ممکن نہیں۔ اور پانچویں صفت یہ ہے کہ یہ معلوم ہو کہ مجھے اللہ تعالیٰ مصیبتوں پر صبر کرنے کا حکم دیا ہے بغیر علم کے صابر بننا ممکن نہیں۔ اور چھٹی صفت یہ ہے کہ یہ معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے شیطان کے ساتھ عداوت کرنے والا بنایا ہے۔ جب تک مجھے شیطان کا علم حاصل نہیں ہوگا میں اس سے کس طرح عداوت کرسکوں گا۔

(۲۰) چار آدمیوں کے ہاتھوں میں جنت کی راہ ہے وہ یہ ہیں عالم، زاہد، عابد اور مجاہد۔

" فالزاهد اذا كان فی دعواه صادقا يرزقه الله الامن "

''زاہد جب اپنے دعویٰ میں سچا ہوتو اللہ تعالیٰ اسے امن عطا فرماتا ہے''

" والعابد اذا كان صادقا فی دعواه يرزقه الله الخوف "

''اور عبادت کرنے والا شخص جب اپنے دعوی میں سچا ہوتو اللہ تعالیٰ اسے خوف عطا فرماتا ہے''

" والمجاهد اذا كان فی دعواه صادقا يرزقه الله الثناء والحمد "

''اور مجاہد جب اپنے دعویٰ میں سچا ہوتو اللہ تعالیٰ اسے ثناء اور حمد کرنے کی توفیق عطا فرماتا ہے''

" والعالم اذا كان صادقا فی دعواه يرزقه الله الحكمة "

''اور عالم جب اپنے دعوی میں سچا ہوتو اللہ تعالیٰ اُسے حکمت عطا فرماتا ہے''

یہی جنت کے راستے ہیں جو ان حضرات سے حاصل ہوتے ہیں جن کا ذکر ابھی کیا گیا ہے۔

(۲۱) چار چیزوں میں چار چیزوں کو تلاش کرو ایسی جگہ رہو جس میں سلامتی پائی جائے " فاذا لم تجد من الموضع السلامة فالسجن خير منه " جب تمہیں رہنے کی جگہ میں سلامتی حاصل نہ ہو تو اس سے قید خانہ بہتر ہے۔ دوست سے عزت حاصل کرو " فاذا لم تجد من صاحب الكرامة فالكلب خير منه " جب تو اپنے دوست سے عزت حاصل نہ کر سکے تو اس سے کتا بہتر ہے۔ مال سے فراغت حاصل کرو یعنی مال تمہیں آرام پہنچائے " واذا لم تجد من مالك الفراغة فالمدر خير منه " جب تمہیں مال سے فراغت میسر نہ ہو تو اس مال سے مٹی کے ڈھیلے بہتر ہیں۔ علم سے نفع حاصل کرو یعنی علم تمہارے لئے نفع مند ہو " واذا لم تجد من العلم المنفعة فالموت خير منه " اور جب تم علم سے نفع حاصل نہ کر سکو تو اس سے موت بہتر ہے۔

(۲۲) چار چیزیں چار چیزوں کے بغیر مکمل نہیں ہوتیں " لا يتم الدين الا بالتقوی فالدين بلا تقوی علی خطر " دین تقوی کے بغیر مکمل نہیں ہوتا اس لئے کہ تقوی کے بغیر دین مقام پر خطر پر ہوتا ہے جو کسی وقت بھی نفس وشیطان کی زد میں آ کر برباد ہوسکتا ہے:

" ولا يتم القول الا بالفعل والقول بلا فعل كالهدر "

''قول کی تکمیل فعل کے بغیر نہیں فعل کے بغیر قول اسی طرح ہے جس طرح کسی بیکار چیز

کو پھینک دیا جائے“

” ولا تتم المروء ۃ الا بالتواضع والمروء ۃ بلا تواضع کشجر بلا ثمر “

”مروت بغیر عاجزی کے مکمل نہیں ہوسکتی عاجزی کے بغیر مروت ایسے ہی ہے جیسے درخت بغیر پھل کے ہو“

” ولا یتم العلم الا بالعمل والعلم بلا عمل کغیث بلا مطر “

”علم کی تکمیل عمل کے بغیر نہیں کیونکہ علم عمل کے بغیر ایسے ہی ہے جیسے بادل بغیر بارش کے ہوں“

(۲۳) لوگ چار قسم کے ہیں **ایک** شخص جو صاحب علم ہو اسے معلوم ہو کہ میں عالم ہوں یعنی وہ تبلیغ دین کر رہا ہو تو وہ حقیقۃً عالم ہے اس کی تابعداری کرو۔

دوسرا وہ شخص ہے جو عالم تو ہے لیکن اسے معلوم نہیں کہ میں عالم ہوں یعنی وہ اپنے علم کے مطابق دین کا کوئی کام نہیں کر رہا" **فھو نائم فایقظوہ** "وہ سویا ہوا ہے اسے بیدار کرو۔ یعنی اسی کہوائے شخص اللہ تعالیٰ نے تجھے علم دین عطا کیا ہے اس کے مطابق کوئی کام بھی کر۔ خود بھی اس عظیم نعمت سے فائدہ حاصل کر اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچا۔

تیسرا شخص وہ ہے جو صاحب علم نہیں لیکن اسے اپنے آپ کے متعلق معلوم ہے کہ میں عالم نہیں "**فھو مستر شد فارشدوہ** "وہ سیدھی راہ کو حاصل کرنے کی تمنا رکھتا ہے اس کی راہنمائی کرو۔

چوتھا وہ شخص ہے:

” ورجل لا یدری ولا یدری انہ لا یدری فھو شیطان فاجتنبوہ “

جو جانتا بھی نہیں یعنی عالم نہیں اور وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ میں نہیں جانتا، یعنی اسے اپنے آپ کا بھی علم نہیں وہ اپنے عالم نہ ہونے کو بھی نہیں جانتا وہ شیطان ہے اس سے بچ کر رہو۔

اسے ہی جاہل مرکب کہا جاتا ہے ایسا شخص خود تو گمراہ ہوتا ہی ہے لیکن دوسروں کو بھی گمراہ کرتا رہتا ہے۔ کیونکہ وہ تقریر کرتا ہی رہتا ہے اپنی جہالت کو علم بتاتا ہے لوگ اس جاہل کو عالم سمجھ کر اس کے جال میں پھنستے رہتے ہیں۔ اگر کوئی عالم اسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ کہتا ہے میں خود ہی عالم ہوں ایسے شخص کو سمجھانا ممکن نہیں۔

(۴۴) چار چیزوں سے کوئی شریف شخص عار (شرم) محسوس نہیں کرتا اگرچہ وہ حاکم وقت ہی کیوں نہ ہو "قیامه من مجلسه لابیه" اپنی مجلس سے اپنے باپ کے لئے کھڑا ہونے میں کسی شریف انسان کو کوئی عار نہیں۔ سبحان اللہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے کیا خوب ہی مسئلہ حل فرمادیا کہ باپ کی تعظیم کیلئے کھڑا ہونے میں کسی شریف انسان کو تو کوئی عار نہیں ہاں کوئی شریف ہی نہ ہو باپ کو باپ ہی نہ سمجھے تو وہ باپ کی تعظیم کے لئے کھڑے ہونے میں اپنے لئے عار سمجھ کر کہے کہ تعظیم کے لئے کھڑا ہونا منع ہے تو یہ اس کا حق ہے۔

آیئے حدیث پاک کی طرف توجہ فرمائیں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے جس میں یہ الفاظ مبارکہ ہیں:

"قال رسول الله ﷺ للانصار قوموا الی سیدکم"

"رسول اللہ ﷺ نے (حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے آنے پر) انصار کو فرمایا اپنے سردار کے لئے کھڑے ہوجاؤ" (مسلم باب جو از قتال من نقض العهد ج ۲ ص ۱۰۳)

اسی حدیث کے تحت علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فیه اکرام اهل الفضل وتلقیهم بالقیام لهم اذا اقبلو هکذا احتج به جماهیر العلماء لاستحباب القیام"

اس حدیث پاک سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ اہل فضل کی تعظیم کی جائے اور ان کے آنے پر دوسرے لوگوں کو کھڑا ہونے کا حکم دیا جائے جمہور علماء کرام نے اسی حدیث سے ثابت کیا ہے صالحین کی تعظیم کے لئے کھڑا ہونا مستحب ہے۔

"قال القاضی ولیس هذا من القیام المنهی عنه وانما ذاک فیمن یقومون علیه وهو جالس ویمثلون قیاما طول جلوسه"

"قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جن احادیث میں عجمیوں کی طرح کھڑا ہونے سے منع کیا گیا ہے ان سے مراد تعظیم کے لئے کھڑا ہونے سے منع کرنا نہیں بلکہ پہلے بڑے لوگ یعنی سردار اور چوہدری یہ چاہتے تھے بلکہ لزومی طور پر دوسرے غرباء کو حکم دیتے ہیں کہ جب تک ہم بیٹھے رہیں تم کھڑے رہو اس قیام سے منع کیا گیا ہے"۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے بھی اپنا مختار قول ان الفاظ سے ذکر فرمایا:

"قلت القیام للقادم من اهل الفضل مستحب وقدجاء فیه احادیث ولم

يصح في النهى عنه شئى صريح "

"میں کہتا ہوں اہل فضل کے آنے پر ان کی تعظیم کے لئے کھڑا ہونا مستحب ہے۔ یہ احادیث مبارکہ سے ثابت ہے لیکن کسی حدیث میں قیام تعظیمی سے منع نہیں کیا گیا"۔

اعتراض: مسلم کی اسی حدیث پر سندھی کے حاشیہ میں یہ تحریر ہے:

" (قوموا الى سيدلكم) لا دليل فيه على قيام التعظيم والتكريم اذ لو اريد ذاك لقيل قوموا لسيدكم "

اس حدیث میں تعظیم وتکریم کی وجہ سے قیام ثابت نہیں کیونکہ اس میں لفظ " الی " ذکر ہے۔ جو انتہاء غایۃ پر دلالت کر رہا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کھڑے ہو کر اپنے سردار کے پاس پہنچو، ان کی سواری سے اترنے میں امداد کرو کیونکہ وہ مریض ہیں۔ اگر تعظیم کے لئے قیام مراد ہوتا تو "لام" ذکر ہوتا یوں ارشاد ہوتا:" قوموا لسيدكم "اپنے سردار کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ کس طرح اس حدیث سے قیام تعظیم کو ثابت کیا جاتا ہے۔

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ کہاں علامہ نووی اور قاضی عیاض اور دوسرے جلیل القدر علماء جنہوں نے اسی حدیث پاک سے قیام تعظیمی ثابت کیا ہے اور کہاں سندھی صاحب۔ دوسری بات یہ ہے کہ " الی " ہمیشہ انتہاء مکان کے لئے تو نہیں آتا بلکہ تقرب کے لئے بھی آتا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے " اليه يصعد الكلم الطيب " اسی کی طرف پاکیزہ کلمات بلند ہوتے ہیں۔ رب تعالیٰ مکان سے پاک ہے اس لئے " الــــى " اس مقام پر تقرب کے لئے استعمال ہے مطلب یہ ہے کہ پاکیزہ کلمات رب تعالیٰ کے حضور تقرب اور بلندی درجات حاصل کرتے ہیں۔

اب حدیث پاک کا مفہوم یہ ہوگا کہ تمہارے سردار آرہے ہیں ان کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاؤ اور ان کا تقرب حاصل کرو۔

سید الاولیاء کی شاندار تشریح:

سید الاولیاء حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی رحمہ اللہ اسی حدیث پاک کی تشریح میں فرماتے ہیں قانون یہ ہے کہ مشتق کو ذکر کریں تو مبدأ اشتقاق علت ہوتا ہے اب حدیث پاک کا معنی یہ ہوگا:

" قوموا الی سید کم لسیادتہ تم اپنے سردار کے لئے ان کی سرداری کی وجہ سے کھڑے ہو جاؤ"
اگر صرف سواری سے اتارنے کی امداد کے لئے حکم ہوتا تو ایک یا دو آدمیوں کو کہا جاتا تمام انصار کو کہنے کا کیا مقصد تھا پھر " قوموا الی سعد " کہا جاتا کہ کھڑے ہو کر سعد کو اتارو " قوموا الی سید کم " کیوں کہا؟

دوسری چیز جس سے کوئی شریف انسان عار محسوس نہیں کرتا وہ یہ ہے " وخدمتہ لضیفہ" اپنے مہمان کی خدمت کرنے سے۔

تیسری چیز جس سے کوئی شریف انسان عار محسوس نہیں کرتا وہ یہ ہے " وخدمتہ للعالم الذی یتعلم منہ " اور عالم جس سے انسان تعلیم حاصل کرے اس کی خدمت سے۔ اکثر طور پر جلیل القدر علماء کرام کو دیکھا ہے جو اپنے استاذ کی نعلین مبارک کو اٹھانے اور خدمت گزاری کو اپنے لئے فخر اور باعث سعادت سمجھتے ہیں۔

چوتھی چیز جس سے کوئی شریف انسان عار محسوس نہیں کرتا وہ یہ ہے " والسؤال عمالا یعلم ممن ھو اعلم منہ " اپنے سے زیادہ علم والے سے سوال کرنے میں۔ وہی انسان کامیاب ہے جو اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھے بزرگوں سے علمی سوال کرتا رہے جو اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے وہ ذلیل ہوتا ہے۔

(۳۵) دل تمام اعضاء کا رئیس ہے یہ ریاست و سرداری اسے قوت کی وجہ سے حاصل نہیں " فان العظم اقوی منہ " کیونکہ ہڈیوں کو اس سے زیادہ قوت حاصل ہے۔ اور یہ سرداری اسے بڑا عضو ہونے کی وجہ سے بھی حاصل نہیں " فان الفخذ اعظم منہ " کیونکہ ران کو اس سے بڑائی حاصل ہے۔ اور دل کو یہ ریاست تیزی کی وجہ سے بھی حاصل نہیں " فان الظفر احد منہ " کیونکہ ناخن اس سے زیادہ تیز ہیں۔

" وانما تلک الریاسة بسبب العلم فدل علی ان العلم اشرف الصفات "
" بیشک یہ ریاست دل کو علم کی وجہ سے حاصل ہے اسی سے واضح ہوا کہ علم تمام صفات میں سے اعلیٰ و اشرف صفت ہے"

علم کی تین قسمیں ہیں:

(۱) ایسا علم جو مذموم (برا) ہو خواہ تھوڑا حاصل کریں یا زیادہ حاصل کریں۔

(۲) وہ علم جو محمود (اچھا قابل تعریف) ہو۔ خواہ تھوڑا حاصل کریں یا زیادہ حاصل کریں بلکہ جتنا زیادہ حاصل کریں اتنا ہی زیادہ افضل اور احسن ہو۔

(۳) بقدر ضرورت علم کا حاصل کرنا اچھا ہو، لیکن زیادہ وقت اس پر خرچ کرنا، اسی علم میں تمام اوقات کو صرف کرنا اچھا نہیں۔ اور نہ ہی اس کی تعریف کی جاسکتی ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھیں جیسا کہ بدن کے احوال بعض قلیل وکثیر قابل تعریف ہیں۔ جیسا کہ صحت اور حسن وجمال اور بعض احوال مذموم ہوتے ہیں خواہ قلیل ہوں یا کثیر جیسا کہ قبیح شکل اور بدخلقی اور بعض وہ ہیں جو کسی حد تک تو قابل تعریف ہیں۔ لیکن حد سے بڑھ جانے پر قابل مذمت ہیں۔ جیسا کہ مال خرچ کرنا جب وہ میانہ روی پر ہو تو اچھا، لیکن جب حد سے بڑھ جائے جسے تبذیر کہا جاتا ہے وہ مذموم ہے۔

علم مذموم: وہ علم جو قلیل وکثیر مذموم ہے جس میں دین ودنیا میں کوئی فائدہ نہیں بلکہ اس علم میں نفع سے نقصان زیادہ ہو جیسا کہ جادو کا علم اور اسی طرح علم نجوم۔ اس علم پر بہت ہی نفیس چیز کو خرچ کرنا یعنی عمر صرف کرنا درحقیقت عمر کو ضائع کرنا ہے اور نفیس چیز کو ضائع کرنا حماقت سے خالی نہیں۔ اور ان علوم میں دین ودنیا کے نقصانات سے غافل رہنا انسانیت نہیں۔

علم محمود: وہ علم جو قلیل وکثیر قابل تعریف ہے وہ علم دین ہے، جس سے رب تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کے امور کا علم حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ آخرت دنیا پر مترتب ہے۔ جیسے دنیا میں اعمال ہوں گے ایسے ہی آخرت میں مدارج ہوں گے یعنی آخرت کی سعادت اسی علم پر موقوف ہے۔ اس علم کی حد کو کوئی نہ پاسکا۔ یہ ایک ایسا سمندر ہے جس کا کنارہ کسی کو معلوم نہ ہوسکا۔ ہاں البتہ انبیاء کرام، اولیاء کرام، اور علم میں راسخ حضرات نے اپنے اپنے مدارج کے مطابق اس علم کو حاصل کیا۔ ان حضرات کے علوم کی حد کو بھی کتابوں میں لکھا نہیں جاسکتا۔ اسلئے کہ ان کے علوم کی دارومدار اللہ تعالیٰ کی عطاء پر ہے ان کی محنت کو اس میں دخل نہیں۔

ایک حد تک علم محمود: وہ علم جو بقدر ضرورت تو محمود ہے لیکن حد سے زیادہ اس پر عمر صرف کرنا قابل تعریف نہیں۔حساب، ریاضی، سائنس، انگلش وغیرہ کو ضرورت کے مطابق حاصل کرنا تو درست ہے۔لیکن دینی علوم سے غافل رہ کر صرف ان علوم میں عمر صرف کر دینا کسی طرح بھی قابل تعریف نہیں۔ان علوم سے آج کل کے نظام دنیا کے مطابق روٹی کمائی جاسکتی ہے۔لیکن ان علوم سے دین حاصل نہیں ہوسکتا، آخرت میں سعادت حاصل نہیں ہوسکتی۔ (از احیاء العلوم جلد اول)

راقم کے نزدیک اگر ایک شخص پاکستان کا حدود اربعہ نہیں جانتا بلکہ اپنے شہر یا اپنے مکان کا حدود اربعہ نہیں جانتا تو وہ جاہل نہیں لیکن اگر وہ نماز کے ارکان، شرائط، واجبات وسنن کو نہیں جانتا تو وہ بدترین جاہل ہے۔راقم مدارس ہے اور مصنف بھی ہے خطیب بھی ہے امام بھی لیکن اسلام آباد میں جس مکان میں بائیس سال سے رہ رہا ہے اس کے حدود ثلاثہ کا علم تو ہمیشہ سے حاصل رہا لیکن حدود اربعہ کے علم سے غافل رہا۔لوگ مجھے عالم کہتے ہیں کوئی حسن ظن رکھتے ہوئے استاذ العلماء بھی کہہ لیتے ہیں اگر کوئی سر پھرا اس وجہ سے مجھے جاہل کہے کہ اسے تو اپنے مکان کا حدود اربعہ معلوم نہیں تو میں اس بدترین جاہل کی زبان کو تو بند نہیں کرسکتا۔

علم کے حصول میں کمی کے اسباب:

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے یہ سمجھا جائے کہ علم کا محل دل ہے اور یہ آئینہ کی طرح ہے جس طرح آئینہ میں چیزوں کی صورتیں منقش ہوتی ہیں اسی طرح حقائق کی صورتوں کا دل میں منقش ہونا علم ہے یہاں تین چیزیں ہوں گی ایک آئینہ، دوسری اشیاء اور تیسری ان کی صورتیں۔

اسی طرح علم کے حصول کے لئے بھی تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے دل، حقائق اشیاء اور ان کی صورتیں۔آئینہ میں چیزوں کے منقش ہونے میں کمی کی پانچ وجہ ہیں:

(۱) آئینہ کا جوہر ہی درست نہ ہو یعنی اس میں صورتوں کے نقش کے قبول کرنے کی صلاحیت ہی نہ ہو یا اس کی بناوٹ میں کمی رہ جائے۔

(۲) آئینہ زنگ آلود ہو جائے میلا ہو جائے۔

(۳) آئینہ اس چیز کے سامنے نہ ہو جس کو آئینہ میں منقش کرنا مقصود ہو۔

(۴) آئینہ اور اس چیز کے درمیان پردہ حائل ہو جائے جس کی وجہ سے وہ چیز آئینہ میں منقش نہ ہو سکے

(۵) آدمی اتنا جاہل ہو کہ اسے یہ معلوم ہی نہ ہو کہ آئینہ کی کس جانب صورت منقش ہوتی ہے۔

☆ یہی پانچ وجوہ دل سے متعلق ہیں جن کی وجہ سے علم میں کمی رہ جاتی ہے۔ ان میں **پہلی** وجہ یہ ہے کہ دل میں کامل صلاحیت ہی نہ ہو کہ وہ تمام چیزوں کا علم حاصل کرے جیسا کہ بچے کے دل میں ابتدائی طور پر صلاحیت کم ہوتی ہے۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے۔ ایسے ہی صلاحیت بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ان میں **دوسری** وجہ یہ ہے کہ گناہوں کی کدورت اور خباثت دل پر چھا جائے جس کی وجہ سے علم حاصل کرنے کی صلاحیت میں کمی آ جائے۔ ہاں البتہ گناہوں سے اعراض کرنے پر اور رب تعالیٰ کی طاعت کی طرف کامل متوجہ ہونے سے دل کی کدورت ختم ہو جاتی ہے اور اس میں جلا پیدا ہو جاتی ہے اور اس میں علم حاصل کرنے کی اور صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ مسئلہ رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی سے واضح ہو رہا ہے:

﴿ والذین جاهدوا فینا لنهدینهم سبلنا ﴾

''اور جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں ہم ان کو اپنی راہوں کی ضرور بر ضرور ہدایت دیں گے''

اور نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی سے بھی واضح ہے:

" من عمل بما علم ورثه الله علم ما لم یعلم "

''جس شخص نے علم کے مطابق عمل کیا اللہ تعالیٰ اسے وہ علم عطاء کرے گا جو اسے پہلے حاصل نہیں تھا''

ان میں **تیسری** وجہ یہ ہے کہ انسان کو جب دنیا کے مصائب و آلام حاصل ہوں اسباب معیشت میں تفکرات حاصل ہوں تو اسکے دل میں صلاحیت ہونے کے باوجود کامل توجہ نہیں رہتی جس کی وجہ سے وہ کامل طور پر علم حاصل نہیں کر سکتا۔ ان میں **چوتھی** وجہ یہ ہے کہ خواہشات نفسانیہ وغیرہ دل کے سامنے حجاب کی حیثیت میں آ جائیں۔ جنکی وجہ سے علم کے حاصل کرنے میں کمی واقع ہو۔ ان میں **پانچویں** وجہ یہ ہے کہ طالب علم مقاصد اور غیر مقاصد کا فرق نہ کر سکے۔ یا استاذ صحیح راہنمائی نہ کرے تو وہ طالب علم اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ (ماخوذ از احیاء العلوم ج ۳ ص ۹)

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی علمی فراست کی ایک درخشاں مثال:

بیان کیا جاتا ہے کہ اہل مدینہ کی ایک جماعت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے پاس آئی تا کہ آپ سے امام کے پیچھے قراءت کے متعلق مناظرہ کریں اور ان کو اس مسئلہ میں خاموش کرادیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں تم تمام سے علیحدہ علیحدہ گفتگو نہیں کرتا۔ تم اپنے مناظرہ کا معاملہ کسی ایک بڑے عالم کے سپرد کردو جس سے میں کلام کر لیتا ہوں انہوں نے کہا ٹھیک ہے ان تمام حضرات نے اپنے میں ایک زیادہ علم رکھنے والے کو منتخب کر لیا کہ یہ صاحب تمہارے ساتھ مناظرہ کریں گے۔

آپ نے فرمایا " هذا اعلمكم " کیا یہ تم میں سے بڑے عالم ہیں؟ انہوں نے کہا جی ہاں یہ ہمارے بڑے عالم ہیں پھر آپ نے فرمایا " والمناظرة معه كالمناظرة معكم " کیا اس سے مناظرہ تم تمام سے مناظرہ متصور ہوگا؟ سب نے کہا جی ہاں ان سے مناظرہ ہم سب سے مناظرہ متصور ہوگا۔ پھر آپ نے فرمایا " والالزام عليه كا لزامكم عليه " ان کو اگر میں نے کوئی الزامی جواب دیا کیا تم تمام کو وہ الزامی جواب ہوگا؟ انہوں نے ہاں ایسا ہی ہوگا۔ پھر آپ نے فرمایا "وان ناظرته والزمته الحجة فقد لزمتكم الحجة " اگر میں نے ان سے مناظرہ کیا اور ان پر حجت قائم کردی کیا وہ حجت تم سب پر قائم ہو جائے گی؟ سب نے کہا جو حجت ان پر قائم ہوگی وہ ہم سب پر قائم ہوگی آپ نے ان لوگوں سے پوچھا یہ کیسے ہوگا؟ انہوں نے کہا" لانا رضينا به اماما فكان قوله قولنا" اس لئے کہ ہم اس کے امام بنانے پر راضی ہیں لہٰذا اس کی بات ہماری ہی بات ہوگی۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کہا کہ جو مناظرہ تم میرے ساتھ کرنے آئے ہو اس کا جواب تو تمہارے اپنے کلام سے ہی تمہیں مل گیا۔ اس لئے کہ تم اپنے امام کی بات کو اپنی بات کہہ رہے ہو:

" فنحن لما اخترنا الامام فى الصلوة كانت قراء ته قراة لنا "

"تو ہم نے جب ایک شخص کو نماز میں امام بنالیا ہے تو اس کی قراءت ہماری قراءت ہوگی"

جب کہ اس پر نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی بھی دلالت کر رہا ہے:

" من كان له امام فقراء ة الامام قراة له "

"جس شخص کا امام ہے تو امام کی قراءت اس شخص کی قراءت ہے"

امام اعظم رحمہ اللہ کے اس شاندار جواب کو سن کر وہ لوگ لاجواب ہوگئے۔ وہ اپنے دلائل پیش کرنے سے ہی عاجز آ گئے۔ اس طرح امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ کی علمی فراست واضح ہوگئی۔ (از کبیر)

﴿ قَالُوا سُبحٰنَکَ لاَ عِلمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمتَنَا اِنَّکَ اَنتَ العَلِیمُ الحَکِیمُ ﴾

''انہوں نے عرض کیا پاکی ہے تجھے ہمیں کچھ علم نہیں سوائے اس کے جو تو نے ہمیں سکھایا ہے بیشک تو ہی علم وحکمت والا ہے''

رب تعالیٰ نے اشیاء کوفرشتوں پر پیش کر کے جب ان کے ناموں کے متعلق سوال کیا تو فرشتوں نے رب تعالیٰ کے حضور اپنے عجز کا اقرار کرتے ہوئے اور یہ اعتراف کرتے ہوئے کہ انسان کو افضیلت حاصل ہے اور وہ مستحق خلافت ہے اور رب تعالیٰ نے جب ان پر انسان کی تخلیق کی حکمت کو واضح کیا تو اس عظیم نعمت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے عرض کیا:

'' سبحانک ای نسبحک سبحانا عن خلو افعالک عن الحکم و المصالح ''

''اے اللہ ہم تیرے افعال کو حکمتوں اور مصلحتوں سے خالی ہونے سے تجھے پاک سمجھتے ہیں''

یعنی اے اللہ تعالیٰ ہمیں معلوم ہو گیا کہ تیرے افعال میں طرح طرح کی حکمتیں اور مصلحتیں پائی جاتی ہیں۔ جن کو سمجھنے سے ہم قاصر تھے:'' ذاشعار بان سؤالھم کان استفسارا ولم یکن اعتراضا '' یہاں سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ ان کا رب تعالیٰ سے سوال کرنا (کیا بنائے گا اس میں (خلیفہ) جو اس میں فساد پھیلائے گا اور خونریزیاں کرے گا) صرف حقیقت کی وضاحت طلب کرنے کے لئے تھا رب تعالیٰ پر معاذ اللہ انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ (از مظھری وبیضاوی)

﴿ سُبحَانَ ﴾ : مصدر ہے غفران کی طرح، یہ بغیر اضافت کے بہت کم ہی کہیں استعمال ہوتا ہے۔ اور منصوب ہوتا ہے اس سے پہلے فعل محذوف ہوتا ہے جس طرح معاذ اللہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے اس کا فعل بھی محذوف ہوتا ہے۔

'' یؤدی عن معنی نسبحک تسبیحا معنی یہ ہوگا کہ ہم تیری پاکی بیان کرتے ہیں''

(بیضاوی، قرطبی)

علمی نکتہ: دینی طلباء کرام کے ذوق کے لئے یہ ذکر کیا جا رہا ہے '' انک انت ''میں ''انت ''

ضمیر میں تین احتمال ہیں۔ایک یہ کہ اسم ان اور خبر ان میں یہ فصل ہے کیونکہ مبتداء خبر کے درمیان اصل میں ضمیر فصل کو لایا جاتا ہے جو بعد میں ظاہر عامل کے آنے کے بعد بھی برقرار رہتی ہے۔جس طرح یہاں ہے اسی طرح " کنت انت الرقیب علیھم " میں بھی "انت "ضمیر فصل ہے اور اسی طرح " انہ ھوا لغفور الرحیم " میں بھی " ھو " ضمیر فصل ہے۔دوسرا احتمال یہ ہے کہ "انت "کاف خطاب کی تاکید ہو گویا کہ معنی کاف کا تکرار پایا گیا ہے۔کیونکہ دونوں خطاب کی ضمیریں ہیں اگرچہ کاف ضمیر منصوب متصل ہے اور انت ضمیر مرفوع منفصل۔اور تیسرا احتمال یہ ہے کہ " انت "ضمیر مبتداء ہو اور مابعد والے الفاظ "العلیم الحکیم "خبر ہو اور مبتداء خبر مل کر " ان " کی خبر بن جائے۔

(از بیضاوی و شیخ زادہ)

﴿ الْعَلِيمُ ﴾ : فعیل کا وزن ہے مبالغہ کے لئے استعمال ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے معلومات بے شمار ہیں

﴿ الْحَكِيمُ ﴾ : "معناہ ذوالحکمۃ " اس کا معنی ہے صاحب حکمت۔اب مفہوم یہ ہوا کہ اے اللہ بیشک تو ہی بہت جاننے والا ہے اور تمام حکمتوں کا مالک تو ہی ہے: " الحکیم معناہ الحاکم " حکیم کا معنی حاکم بھی آتا ہے۔اسی طرح علیم اور حکیم میں بہت زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے:" وقیل معناہ المحکم " بعض حضرات نے کہا حکیم کا معنی محکم (فاعل کا معنی) ہے۔جس طرح سمیع کا معنی مسمع اور علیم کا معنی معلم آتا رہتا ہے۔اور حضرات نے یہ کہا ہے " الحکیم المانع من الفساد "حکیم کا معنی فساد سے روکنے والا۔جیسا کہ کہا جاتا ہے " حکمۃ اللجام " چونکہ لگام بھی گھوڑے کو سوار کی مرضی کے بغیر چلنے اور ادھر ادھر ہونے سے روکتا ہے۔اسی معنی کے لحاظ سے کہا جاتا ہے " السورۃ المحکمۃ " کہ سورت تغیر وتبدل سے روکی گئی ہے۔بہر حال حکیم کا معنی جب صاحب حکمت کیا جائے تو تمام معانی اس میں آجائیں گے۔

فائدہ: اگر کسی شخص سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے۔اسے وہ معلوم نہ ہو تو اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ یہ کہے " اللہ اعلم و لا ادری " اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے میں نہیں جانتا۔ (از روح المعانی وقرطبی)

اسلئے کہ اسے ملائکہ اور انبیاء کرام اور نیک علماء کی اقتداء حاصل ہو جائے گی۔کیونکہ فرشتوں نے رب تعالیٰ کے حضور اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ ہم تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں۔ہمیں

کوئی علم حاصل نہیں سوائے اس کے جو تو نے ہمیں عطاء کیا ہے بیشک تو ہی علیم وحکیم ہے۔

☆ " قد اخبر الصادق ان یموت العلماء یقبض العلم فیبقی ناس جهال یستفتون فیفتون برایهم فیضلون ویضلون "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ علماء کے دنیا سے رخصت ہو جانے پر علم اٹھ جائے گا۔ جاہل لوگ رہ جائیں گے جن سے مسائل پوچھے جائیں گے وہ اپنی رائے سے بیان کریں گے خود بھی گمراہ ہوں گے دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

☆ بستی نے مسند صحیح میں ذکر کیا ہے:

" عن ابن عمر ان رجلا سال رسول ال صلی الله علیه وسلم ای البقاع شر ؟ قال لا ادری حتی اسأل جبریل ، فسأل جبریل ، فقال لا ادری حتی اسأل میکائیل ، فجاء فقال خیر البقاع المساجد وشرها الاسواق "

"حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے پوچھا (یارسول اللہ) تمام مقامات میں سے شر مقام کون سا ہے؟ آپ نے فرمایا میں نہیں جانتا۔ البتہ جبرائیل سے پوچھوں گا (ہوسکتا ہے اس نے رب تعالیٰ سے کہیں سوال کیا ہو) آپ نے جبرائیل سے پوچھا اس نے کہا میں نہیں جانتا البتہ میکائیل سے پوچھتا ہوں (ہوسکتا ہے اس نے رب تعالیٰ سے سوال کیا ہو) میکائیل آئے انہوں نے بتایا کہ تمام مقامات سے بہتر مقام مساجد ہیں اور تمام مقامات سے برا مقام بازار ہیں"۔

خیال رہے کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد " لا ادری " (میں نہیں جانتا) سے کوئی ذہنی مریض خوش نہ ہو۔ نبی کریم ﷺ کے علم کے متعلق اہل سنت وجماعت کا عقیدہ تفاسیر میں سنہری الفاظ سے لکھا ہوا ہے۔ آیئے اس کی ایک مثال سیکھئے:

" انه ﷺ لم یخرج من الدنیا حتی اعلمه الله بجمیع مغیبات الدنیا والاخرة ولکن امر بکتم شیأ منها (حاشیه جلالین از صاوی) ص ۴۹۰ زیر آیته یسلونک عن الساعة ایان مرسها "

"بیشک نبی کریم ﷺ اس وقت دنیا سے تشریف نہیں لے گئے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دنیا وآخرت کے تمام غیبی علوم عطا فرمادیئے البتہ بعض چیزوں کے چھپانے

کا آپ کو علم دیا گیا تھا (جیسا کہ قیامت کے متعلق علم)''

☆ '' وقال الصدیق للجدة ارجعی حتی اسأل الناس ''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس ایک عورت آئی جو اپنے پوتے کی وراثت سے اپنے حق کا مطالبہ کر رہی تھی تو آپ نے فرمایا ابھی تم لوٹ جاؤ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود تو سنا نہیں کہ دادی کا کیا حق ہے۔ البتہ دوسرے حضرات سے پوچھوں گا ہوسکتا ہے آپ سے کسی نے سنا ہو اگر کسی نے بتایا کہ دادی کا یہ حق ہے تو تمہیں دے دیا جائے گا۔

☆ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تین مرتبہ یہ فرمایا '' وابردها علی الکبد '' (اس کو جگہ پر ٹھنڈا رکھو) کچھ حضرات نے آپ سے پوچھا اے امیر المؤمنین اس کا مطلب کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: '' ان یسأل الرجل عما لا یعلم فیقول اللہ اعلم '' کہ جب کسی شخص سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے وہ نہ جانتا ہو تو وہ یہ کہے '' اللہ اعلم '' (اللہ ہی بہتر جانتا ہے)۔

☆ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کسی شخص نے کوئی مسئلہ پوچھا تو آپ نے فرمایا '' لا علم لی بها '' مجھے اس کا علم نہیں۔ جب وہ شخص چلا گیا۔ تو آپ نے فرمایا مجھ سے وہ مسئلہ پوچھا گیا تھا جس کا مجھے علم نہیں تو میں نے کتنا اچھا جواب دیا کہ میں نہیں جانتا۔ (رواہ الدارمی)

☆ حضرت قاسم بن عبید اللہ کا نسب باپ کی جانب سے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے اور ماں کی جانب سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ باپ کی جانب سے نسب اس طرح ہے قاسم بن عبید اللہ بن عبد اللہ بن عمر بن خطاب، اور ماں کی جانب سے نسب اسی طرح ہے قاسم کی والدہ ام عبد اللہ بنت قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ۔

ابو عقیل یحی بن متوکل کہتے ہیں میں قاسم بن عبید اللہ اور یحی بن سعید کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ یحی نے قاسم کو کہا اے ابو محمد آپ جیسے عظیم شخص سے اگر کسی امر دین کے متعلق سوال کیا جائے تو آپ کو اس کا علم نہ ہو تو یہ بہت قبیح ہے آپ نے فرمایا '' وعم ذاک ؟ اس کی کی وجہ ہے؟ یحی بن سعید نے کہا '' لانک ابن امامی هدی ابن ابی بکر وعمر '' اس لئے کہ تم بڑے جلیل القدر دو راہنما اماموں کی اولاد سے ہو۔ حضرت قاسم بن عبید اللہ نے کہا کہ بہت بری بات یہ ہے '' ان اقول بغیر علم ''

کہ میں بغیر علم کے کوئی بات کہوں۔ آپ کا یہ جواب سن کر یحیی بن سعید خاموش ہو گئے۔

☆ حضرت مالک بن انس سے مروی ہے میں نے ابن ہرمز کو کہتے ہوئے سنا کہ ہر عالم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے پاس بیٹھنے والوں کو " لا ادری " کہنا سکھائیں کہ ان کے ہاتھوں میں یہ قانون اور ضابطہ ہونا چاہیے کہ جب بھی کسی سے سوال کیا جائے اور وہ اس مسئلہ کو نہیں جانتا تو وہ کہے "لا ادری" میں نہیں جانتا۔

☆ ہثیم بن جمیل کہتے ہیں:

" شهدت مالک بن انس سئل عن ثمان و اربعین مسالة فقال فی اثنین و ثلاثین منها لا ادری "

" میں گواہی دیتا ہوں کہ مالک بن انس رضی اللہ عنہ سے اڑتالیس مسائل کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے بتیس مسائل کے متعلق فرمایا " لا ادری " میں نہیں جانتا۔

انصاف پسندی کی درخشاں مثالیں:

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارادہ فرمایا کہ عورتوں کا مہر چالیس اوقیہ (بارہ درھم ایک اوقیہ میں ہوتے ہیں) سے زیادہ مقرر نہ کیا جائے لیکن ایک عورت نے کہا یہ تمہیں کوئی حق حاصل نہیں۔ آپ نے فرمایا کیوں؟ اس نے کہا رب تعالیٰ نے یہ فرمایا:

﴿ و آتیتم احداهن قنطارا فلا تاخذوا منه شیا ﴾

"اگر تم ایک بیوی کے بدلے دوسری بدلنا چاہو) اور اسے ڈھیروں مال دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو"

اس آیۃ میں مہر کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی بلکہ ڈھیروں مال کہا گیا۔ اس عورت کی اس دلیل کو سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: " امرأة اصابت و رجل اخطأ " عورت نے درست کہا اور مرد نے غلط کہا۔ سبحان اللہ کتنا جلیل القدر حاکم جس کا نام سن کر قیصری و کسری کانپ جائیں۔ لیکن حق بات پر وہ ایک عورت کے سامنے سر جھکا دے کاش آج بھی کوئی ایسا حاکم ملے۔

☆ محمد بن کعب قرظی کہتے ہیں ایک شخص نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کوئی مسئلہ پوچھا آپ نے

بیان فرمایا اس شخص نے عرض کیا "یا امیر المؤمنین ولکن کذا و کذا" اے امیر المؤمنین یہ مسئلہ تو اس اس طرح ہے:" فقال علی اصبت و اخطأت وفوق کل ذی علم علیم" حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم نے درست کہا ہے اور میں نے خطا کی ہے۔ ہر صاحب علم کے اوپر کوئی علم والا ہوتا ہے۔ سبحان اللہ علم کے شہر کے دروازہ سے اگر غلطی ہوسکتی ہے۔ تو ہم کیا چیز ہیں کہ ہم سے غلطی نہ ہو۔ غلطی کو مان لینا اپنے سے بڑے عالم نے اگر دلائل سے ثابت کر دیا ہو کہ یہ مسئلہ تم نے درست بیان نہیں کیا تو اعتراف کر لینا اور رجوع کر لینا ہی انصاف پسندی ہے۔ غلطی کو نہ تسلیم کرنے سے ہی اختلافات بڑھتے ہیں۔ اور ہر شخص اپنی ضد پر قائم نظر آتا ہے اللہ تعالیٰ سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

﴿ قَالَ يٰاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَاتُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴾

"(رب) نے فرمایا اے آدم تم ان کو ان چیزوں کے ناموں کی خبر دے دو۔ جب اس نے (آدم) نے ان کو (فرشتوں کو) تمام چیزوں کے نام بتا دیئے۔ (تو رب تعالیٰ نے) کہا کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ بیشک میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمین کی تمام چھپی چیزیں اور میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے تھے"۔

اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو کہا کہ تم ان فرشتوں کو تمام چیزوں کے ناموں کی خبر دو "فسمی کل شئی باسمه وذکر حکمته التی خلق لها" تو آپ نے ہر چیز کا نام بتایا اور اس چیز کا فائدہ بیان کیا کہ اس کے پیدا کرنے میں حکمت کیا ہے۔ جب آدم علیہ السلام نے تمام چیزوں کے ناموں کی خبر فرشتوں کو دے دی تو رب تعالیٰ نے فرمایا کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ میں زمین و آسمان کی چھپی چیزوں کو جانتا ہوں اور میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور چھپاتے ہو۔

﴿ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ غَیۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ﴾:

" ھو ما قصرت عنه علوم الخلق وغاب علمه عن اھلھما لکونه بحیث لا دلیل علیه ولا طریق الیه "

'' زمین وآسمان کے غیب سے مراد یہ ہے کہ وہ علوم جن سے مخلوق کا علم قاصر ہو، اور زمین وآسمان میں رہنے والوں سے وہ علم غائب ہو اس لحاظ پر کہ اس پر کوئی دلیل نہ ہو اور نہ ہی اسے پہچاننے کا کوئی راستہ ہو''

" وفیه دلیل علی ان ما اطلع اللہ تعالیٰ علیه بعض عبادہ یسمی غیبا بالنسبة الی غیرہ لانه دخل فی ذلک ما علمه آدم علیه السلام "

'' اور اس میں یہ دلیل پائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے بعض خواص کو امور غیبیہ پر مطلع کر دیتا ہے ان کو غیب ہی کہا جاتا ہے کہ وہ بنسبت غیروں کے غیب ہے اس میں آدم علیہ السلام کا علم بھی داخل ہے کہ جن چیزوں کا علم فرشتوں کو نہیں تھا اس غیب پر آدم علیہ السلام کو مطلع کر دیا گیا''۔ (شیخ زادہ)

سبحان اللہ عوام کو بے وقوف بنانے والوں کے اعتراض کو مفسرین کرام نے کیا خوب رد فرما دیا، عوام کو کئی لوگ کہتے ہیں کہ جو چیز بتا دی جائے وہ غیب نہیں رہتی۔ کاش کہ وہ لوگ تفاسیر کا مطالعہ کریں اور مسائل کو سمجھیں جو مسائل کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے انہوں نے ضال اور مضل ہونا ہی ہے

" انی اعلم غیب السموات والارض ، دلیل علی ان احدا لا یعلم من الغیب الا ما اعلمه اللہ کالانبیاء او من اعلمه من اعلمه اللہ تعالیٰ فالمنجمون والکھان وغیرہ کذبة "

'' رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی میں (کہ میں زمین وآسمان کی چھپی ہوئی چیزوں کو جانتا ہوں) دلیل ہے کہ رب تعالیٰ کے بغیر کوئی غیب نہیں جانتا البتہ رب تعالیٰ اپنے انبیاء کرام کو خود غیب پر مطلع کرتا ہے اس لئے وہ غیب جانتے ہیں پھر انبیاء کرام جن لوگوں کو غیب پر مطلع کریں وہ بھی غیب جانتے ہیں''۔

البتہ نجومی اور کاہن وغیرہ جھوٹے ہیں۔ ان کا دعوی کرنا کہ ہم غیب جانتے ہیں سراسر جھوٹ ہے (قرطبی)

سبحان اللہ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے کیا خوب مسئلہ حل فرمایا لوگ تو آج تک انبیاء کرام کے علوم غیبیہ میں جھگڑا کر رہے ہیں۔ لیکن علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ غیب تو اولیاء کرام بھی جانتے ہیں۔

فائدہ:

" علوم آدم كائنة منه فاعجز بها الملائكة خاصة واما علوم رسول الله ﷺ فاعجز بها الخلائق جميعا "

" رب تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اتنے علوم عطا فرمائے جن سے فرشتے عاجز آ گئے یعنی وہ علوم فرشتوں کو حاصل نہیں تھے لیکن نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اتنے علوم عطا فرمائے جن سے تمام مخلوق عاجز آ گئی، یعنی اتنے علوم اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک ﷺ کو عطا فرمائے جو اپنی تمام مخلوق میں سے کسی کو بھی عطا نہیں فرمائے"۔ (از صاوی)

﴿ واعلم ما تبدون وما كنتم تكتمون ﴾

" اور میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے تھے "

" ما تبدون " سے مراد یہ ہے کہ جو انہوں نے ظاہر طور پر کہا تھا:

﴿ اتجعل فيها من يفسد فيها ويسفك الدماء ﴾

" کیا تو بنائے گا اس میں جو زمین میں فساد پھیلائے گے اور خون بہائیں گے "

" وما كنتم تكتمون " سے مراد یہ ہے کہ جب انہوں نے آدم علیہ السلام کو عجیب صورت دیکھی اس میں پیٹ دیکھا جو اندر سے خالی اس پر وہ تعجب کر رہے تھے کہ اس صورت میں خلافت کے مستحق ہونے کی کیا وجہ ہے وہ ظاہر نہیں کر رہے تھے اس باطن تعجب کے متعلق رب تعالیٰ نے فرمایا " جو تم چھپاتے تھے میں اسے جانتا ہوں"۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد ابلیس ہے جس نے اپنے نفس میں تکبر اور معصیت کو چھپا رکھا تھا۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ تم میں سے بعض جو اپنی بات کو واضح کر رہے تھے میں اسے بھی جانتا ہوں اور تم میں سے بعض نے اپنے نفس میں جو چھپا رکھا تھا میں اسی بھی جانتا ہوں۔ (از قرطبی)

حاصل کلام:

" معناه انا الذى اعرف الظاهر والباطن والواقع والمتوقع "

" اس کلام کا مفہوم یہ ہے کہ گویا رب تعالیٰ نے یوں فرمایا کہ میں ظاہر و باطن کو جانتا ہوں جو چیز واقع ہوتی ہے اسے جانتا ہوں جس کے واقع ہونے کی ابھی امید ہو میں اسے بھی جانتا ہوں"۔

" واعلم ان ما ترونه عابدا مطيعا سيكفر ويبعد من حضرتی ومن ترونه فاسقا بعيدا سيقرب من خدمتی "

" بیشک تم ایک شخص کو عبادت گزار اور مطیع دیکھتے ہو میں جانتا ہوں کہ وہ عنقریب کافر

ہو جائے گا اور میرے حضور سے دور ہو جائے گا اور تم ایک شخص کو فاسق سمجھتے ہو اور میری رحمت سے دور سمجھتے ہو میں جانتا ہوں کہ وہ میری خدمت اور میری طاعت کرنے والا ہے اور وہ میرے حضور قریب ہونے والا ہے"۔

اور رب تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ مخلوق اللہ تعالیٰ کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتی اور فرشتوں پر بھی واضح کر دیا کہ تم اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کو سمجھنے سے قاصر ہو اور انسان کی کامل عبودیت کی وجہ سے اس کے مرتبہ کو جب فرشتوں پر واضح کر دیا تو انہوں نے بھی اعتراف حقیقت کرتے ہوئے عرض کر دیا اے اللہ ہم تو صرف وہی جانتے ہیں جو تو نے ہمیں علم عطاء فرمایا۔ (ماخوذ از کبیر)

تنبیہ: "والمراد بالغیب المذکور ما اجمل سابقا بقوله انی اعلم مالا تعلمون"

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے استفسار پر جو فرمایا "انی اعلم مالا تعلمون" (بیشک میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے) اس میں اجمالی طور پر جو ذکر تھا اسی کو واضح طور پر "انی اعلم غیب السموات والارض" میں بیان کر دیا گیا۔

یعنی پہلے صرف یہ ذکر فرمایا کہ جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے پھر اسی کی وضاحت کر دی کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ میں زمین و آسمانوں کی چھپی ہوئی چیزوں کو جانتا ہوں اور جسے تم ظاہر کرتے ہو اسے بھی جانتا ہوں اور جسے تم چھپاتے تھے اسے بھی جانتا ہوں۔ (از شیخ زادہ)

آدم علیہ السلام کو نام سکھائے، فرشتوں کو نہیں کیا وجہ؟

الفاظ کے ذریعے معانی کا علم حاصل ہوتا ہے جس کے پڑھانے والے کو معلم کہتے ہیں اور پڑھنے والے کو متعلم صرف معلم کے پڑھانے سے متعلم کو علم حاصل ہونا ضروری نہیں بلکہ متعلم میں استعداد کا پایا جانا ضروری ہے۔ یعنی متعلم میں سمجھنے کی صلاحیت ہو تو معلم کی تعلیم کا اس پر اثر ہوگا۔ یہ روزمرہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں ایک ہی کلاس کے لڑکوں کو استاذ پڑھاتا ہے سب کو یکساں پڑھا رہا ہوتا ہے لیکن پھر کوئی لائق ہوتا ہے اور کوئی نالائق۔

اللہ تعالیٰ نے بھی جب آدم علیہ السلام کو منصب خلافت عطاء کرنا تھا تو آپ کو پہلے تمام اشیاء اور ان کی کیفیات اور انکے ناموں کو سمجھنے کی استعداد بھی عطاء فرمائی لیکن فرشتوں کو ہر ہر چیز کے حالات کی تفاصیل کو سمجھنے کی استعداد عطاء نہیں ہوئی تھی کیونکہ ان کو منصب خلافت پر فائز کرنا مقصود ہی نہیں تھا۔

مندرجہ بالا مضمون تفسیر ابی السعود سے لیا ہے طلباء کرام کی دل چسپی کے لئے عربی عبارت تحریر کر رہا ہوں تا کہ ان کا ذوق دوبالا ہو جائے:

" اذا العلم بالالفاظ من حيث الدلالة على المعانى مسبوق بالعلم بها والتعليم حقيقة عبارة عن فعل يترتب عليه العلم بلا تخلف عنه ولا يحصل ذلک بمجرد اضافة المعلم بل يتوقف على استعداد المتعلم لقبول الفيض ولقيه من جهته .... وهو السر فى ايثاره على الاعلام والابناء فانهما انما يتوقفان على سماع الخبر الذى يشترک فيه البشر والملک وبه يظهران جقيقته بالخلافة منهم عليهم السلام لما ان جبلتهم غير مستعدة للاحاطة بتفاصيل احوال الجزئيات الجسمانية خبرا " (تفسير ابى السعود)

اس کے بعد " انک انت العليم الحكيم " کی تفسیر میں ابوالسعود فرماتے ہیں گویا کہ فرشتوں نے کہا:

" انت العالم بكل المعلومات التى من جملتها استعداد آدم عليه السلام لما نحن بمعزل من الاستعداد له من العلوم الخفية المتعلقة بما فى الارض من انواع المخلوقات التى عليها يدور فلک خلافة الحكيم الذى لا يفعل الا ما تقتضيه الحكمة ومن جملته تعليم آدم عليه السلام ما هو قابل له من العلوم الكلية والمعارف الجزئية المتعلقة بالاحكام الواردة على ما فى الارض وبناء امرا الخلافة عليها "

اے اللہ تو ہی تمام معلومات کا علم رکھتا ہے۔ اور تو ہی جانتا ہے کہ آدم علیہ السلام کو استعداد حاصل ہے تمام خفی علوم کی جن کا تعلق زمین کی مختلف مخلوقات سے ہے ہمیں وہ استعداد حاصل نہیں۔ اے اللہ ساری مخلوقات کا نظام بڑی حکمت کے تقاضا کے مطابق ہے۔ آدم علیہ السلام کو تمام علوم کلیہ اور معارف جزئیہ کا علم تو نے دیا ہے جن کا تعلق زمین میں رہنے والی مخلوق کو احکام عطاء ہونے سے ہے آدم علیہ السلام کی خلافت کی دارومدار بھی اسی استعداد پر ہے۔ (از تفسير ابى السعود)

تنبیہ: جب یہ واضح ہو گیا کہ فرشتوں میں اتنے علوم حاصل کرنے کی استعداد ہی نہ تھی جتنے علوم حضرت آدم علیہ السلام کو عطا کئے گئے تو اسے سے یہ سمجھنا آسان ہو گیا کہ آدم علیہ السلام کے بتانے کے بعد فرشتوں کو وہ تمام علوم حاصل نہ ہو سکے جو آدم علیہ السلام کو حاصل تھے اس لئے کہ تمام علوم کو حاصل کرنے کی ان میں استعداد ہی نہ تھی۔ ہاں البتہ آدم علیہ السلام کی افضلیت آپ کے علم کی فوقیت اور رب تعالیٰ کی حکمت کے متعلق وہ جان گئے۔

﴿ وَاِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡٓا اِلَّآ اِبۡلِيۡسَ ، اَبٰى وَاسۡتَكۡبَرَ وَكَانَ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴾

☆ ''اور (یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو، تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے منکر ہوا اور غرور کیا اور کافر ہو گیا''

☆ ''اور (یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں کو کہا'' آدم کو سجدہ کرو'' تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور کافر ہو گیا''

مختصر مطلب: حضرت آدم علیہ السلام نے جب تمام چیزوں کے نام بتا دیئے جن کے بتانے سے فرشتے عاجز آ گئے تھے۔ اور فرشتوں کو آدم علیہ السلام کی برتری کا علم ہو گیا، اور خلیفہ بنانے کی رب تعالیٰ کی حکمت سمجھ آ گئی۔ تو رب تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ تم آدم علیہ السلام کو سجدو کرو، رب تعالیٰ کے اس حکم کو مانتے ہوئے تمام فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا، لیکن ابلیس نے سجدہ نہ کیا، بلکہ سجدہ کرنے سے صاف انکار کر دیا اور تکبر کیا جس کی وجہ سے وہ کافر ہو گیا۔

تفصیلی وضاحت:

﴿ وَاِذۡ قُلۡنَا ﴾: ای واذکر، یعنی'' اذ '' سے پہلے '' اذکر ''مقدر ہے، جس کا معنی ہے ''یاد کرو''

اگر چہ ابوعبیدہ نے '' اذ '' کو زائدہ کہا ہے، فلیس بجائز '' لان اذ ظرف '' اس کا یہ قول درست نہیں۔ کیونکہ ''اذ'' ظرف ہے جس سے پہلے اکثر طور پر '' اذکر ''مقدر ہوتا ہے:

'' وقال قلنا لم یقل قلت لان الجبار العظیم یخبر عن نفسه بفعل الجماعة تفخیما واشادة بذکرہ ''

''رب تعالیٰ نے اپنے قول کو '' قلنا '' (ہم نے کہا) سے تعبیر کیا ہے '' قلت '' (میں نے کہا) سے تعبیر نہیں کیا۔ اس لئے کہ رب تعالیٰ جبار ہے اور عظیم ہے وہ اپنے فعل کو ایک جماعت کے فعل سے تعبیر کرتا ہے تا کہ سننے والے اس قول کی بلندیٔ شان سمجھیں اور انہیں معلوم ہو جائے کہ یہ حکم بہت پختہ ہے''۔

تنبیہ: رب تعالیٰ خود اپنا ذکر جمع کے صیغوں سے کرتا ہے۔لیکن بندے اسے واحد کے صیغہ سے ذکر کریں،اس لئے کہ رب تعالیٰ کی سب سے بڑی شان ہی یہ ہے کہ اس کو ایک کر کے بلایا جائے،تا کہ سنتے ہی معلوم ہو جائے کہ وہ ایک ہی عبادت کے لائق ہے،اس کے ساتھ کوئی اور شریک نہیں۔

اذکر مقدر سے ماقبل سے تعلق واضح ہو گیا:

انسانوں پر رب تعالیٰ کے جو انعامات ہیں ان کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ اے انسان جب رب تعالیٰ نے تمہیں علم جیسی عظیم نعمت سے نوازا۔تو یہ بھی سمجھ کہ تیرے باپ آدم علیہ السلام کو مسجود ملائکہ بنایا۔جس کی عظمت تجھے بھی حاصل ہے اور یہ تیرے لئے بھی عظیم نعمت ہے۔

سجدہ کا لغوی معنی:

"السجود معناه فی کلام العرب التذلل والخضوع"

''سجدہ کا لغوی معنی جھکنا اور عجز کا اظہار کرنا اس معنی میں عرب حضرات نے اس کو عام طور پر استعمال کیا ہے''

جیسا کہ شاعر نے کہا:

بجمع تضل البلق فی حجراته ترى الاكم فيها سجدا للحوافر

شاعر نے بنی عامر سے کہا کہ میرا پتہ تمہیں اس وقت چلے گا جب میں بڑا لشکر لا کر تم پر حملہ کر دوں گا۔جس کا اطراف میں ابلق گھوڑوں کا پتہ نہیں چل سکے گا۔اور جس کے گھوڑوں کے ٹاپوں کے آگے ٹیلے سجدہ کریں گے،یعنی ان گھوڑوں کے ٹاپوں کے آگے ٹیلے بھی جھک جائیں گے۔

''وقلن له اسجد لليلى فأسجدا عورتوں نے ایک اونٹ کو کہا لیلیٰ کے سامنے جھک جا تو وہ جھک گیا''

اسی طرح جن دراہم پر تصویریں ہوں ان کے لئے " دراهم الاسجاد " بولتے ہیں کہ دراہم تصویروں کے سامنے جھکے ہوئے ہیں۔ (قرطبی)

اصلاح شرع میں سجدہ:

شرعی طور پر سجدہ کیا ہے؟ اس کی وضاحت خود نبی کریم ﷺ نے فرمادی:

" عن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم امرت ان السجد على سبعة اعظم على الجبهة واليدين والركبتين واطراف القدمين " (الكتب الستة)

" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سات ہڈیوں (اعضاء) پر سجدہ کروں، پیشانی، دونوں ہاتھوں، دونوں گھٹنے، اور قدموں کے اطراف (قدموں کی انگلیاں) "

فائدہ:

" ولابی حنیفة رحمه الله ان السجود يتحقق بوضع بعض الوجه وهو المامور به الا ان الخد والذقن خارج بالاجماع "

"امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ چہرے کا بعض حصہ زمین پر لگانے سے سجدہ ادا ہو جائے گا لیکن صرف رخسار لگانے سے یا صرف ٹھوڑی لگانے سے سجدہ ادا نہیں ہوگا۔ اس پر تمام اہل علم کا اجماع ہے"

واضح ہو گیا کہ سجدہ پیشانی لگانے سے ادا ہوگا، رخسار یا ٹھوڑی لگانے سے سجدہ ہوتا ہی نہیں، کوئی شخص کسی قبر پر رخسار رکھ دے تو جہلاء کی طرف سے شرک کی مشین چل جاتی ہے۔ جو چیز سجدہ ہی نہیں اسے سجدہ بنا کر مسلمانوں کو مشرک کہہ کر کذب بیانی اختیار کر کے اپنی عاقبت برباد کر رہے ہیں۔

تنبیہ:

" واما وضع القدمين فقد ذكر القدوری انه فرض فی السجود فاذا سجد ورفع اصابع رجليه عن الارض لا يجوز كذا ذكره الكرخی والجصاص ولو وضع احداهما جائز قال قاضيخان و يكره ". (عناية)

" سجدہ میں دونوں قدموں کا زمین پر رکھنا قدوری کے نزدیک فرض ہے۔ جب سجدہ کرے اور دونوں پاؤں کی انگلیوں کو زمین سے اٹھالے تو جائز نہیں۔ یہی قول علامہ کرخی اور جصاص کا ہے۔ تاہم اگر ایک پاؤں کو زمین پر رکھے تو قاضی خان رحمہ اللہ علیہ

نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ لیکن فرمایا کہ یہ مکروہ ہے۔ صاحب عنایہ نے اگرچہ اسی مقام پر تحریر فرمایا''۔

'' وذکر الامام التمرتاشی ان الیدین والقدمین سواء فی عدم الفرضیة وهو الذی یدل علیه کلام شیخ الاسلام فی مبسوطه وهو الحق ''

''امام تمرتاشی نے کہا ہے کہ دونوں ہاتھوں اور دونوں قدموں کا زمین پر لگنا فرض نہیں، اسی پر شیخ الاسلام کی کلام بھی مبسوط پر دلالت کر رہی ہے اور وہی حق ہے''

لیکن راقم کے نزدیک حق مذہب وہی ہے جو قاضی خان رحمہ اللہ کا ہے، اس مسئلہ کو مولنا محمود احمد رضوی نے بہت خوبصورت انداز میں لکھا ہے۔

'' واستقبل باطراف اصابع رجلیه القلبة '' (بخاری) ''اور پاؤں کی انگلیوں کو قبلہ رخ رکھنا''

فائدہ: اس حدیث سے فقہاء احناف نے یہ استدلال کیا کہ پاؤں کی انگلیاں قبلہ رخ اسی صورت میں ہو سکتی ہیں جب کہ پاؤں کی انگلیوں کے پیٹ زمین سے لگ جائیں، لہذا پاؤں کی ایک انگلی کے پیٹ کا زمین سے لگنا شرط ہے، تو اگر (دونوں) پاؤں زمین سے اٹھے رہے تو نماز نہ ہوئی۔ اسی طرح اگر صرف انگلی کی نوک زمین سے لگی جب بھی نماز نہ ہوگی۔ پاؤں کی دسوں (تمام) انگلیوں کے پیٹ زمین پر لگنا سنت ہے اور ہر پاؤں کی تین انگلیوں کے پیٹ زمین پر لگنا واجب ہے اور دسوں انگلیوں کا قبلہ رخ ہونا سنت ہے۔ (فیوض الباری شرح بخاری ج۲ پارہ سوم ص ۴۴۹)

<u>سجدہ کی دو قسمیں ہیں:</u> سجدہ کی ایک قسم سجدہ عبادت ہے اور دوسری قسم سجدہ تعظیمی

سجدہ عبادت اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی کو جائز نہیں:

'' ان السجود الشرعی عبادة وعبادة غیره سبحانه شرک محرم فی جمیع الادیان والازمان ولا ارها حلت فی عصر من الاعصار '' (روح المعانی)

'' عبادت کی غرض سے سجدہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی کے لئے شرک اور حرام ہے تمام دینوں اور تمام زمانوں میں شرک ہی رہا کسی زمانہ میں بھی اس کی حلت نظر نہیں آتی (ترجمہ میں راقم نے کچھ تغیر کیا ہے)''۔

سجدہ تعظیمی:

نبی کریم ﷺ سے پہلے سجدہ تعظیمی جائز تھا، لیکن آپ کی شریعت میں سجدہ تعظیمی بھی ناجائز قرار دے دیا گئی۔ پہلی شریعتوں میں سجدہ کے جواز پر خود قرآن پاک شاہد ہے " ورفع ابويه على العرش وخروا له سجدا " اور (یوسف نے) اپنے ماں باپ کو تخت پر بٹھایا اور سب اس کے لئے سجدہ میں گرے۔

علامہ نعیم الدین مرادآبادی اس کی تفسیر میں بیان فرماتے ہیں: یہ سجدہ تحیۃ وتواضع کا تھا۔ جو ان کی شریعت میں جائز تھا۔ جیسا کہ ہماری شریعت میں کسی معظم کی تعظیم کے لئے قیام اور مصافحہ اور دست بوسی جائز ہے۔ سجدہ عبادت اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کے لئے بھی جائز نہیں ہوا نہ ہو سکتا ہے، کیونکہ یہ شرک ہے اور سجدہ تحیۃ و تعظیم بھی ہماری شریعت میں جائز نہیں۔ (خزائن العرفان)

لطف کی بات یہ ہے کہ مفتی محمد شفیع دیوبندی لکھتے ہیں: یہ تو ظاہر ہے کہ یہ (آدم علیہ السلام کو) سجدہ عبادت کے لئے نہیں ہو سکتا کیونکہ غیر اللہ کی عبادت شرک وکفر ہے جس میں یہ احتمال ہی نہیں کہ کسی وقت کسی شریعت میں جائز ہو سکے۔ اس کے سوا کوئی احتمال نہیں کہ قدیم انبیاء کے زمانہ میں سجدے کا وہی درجہ ہوگا جو ہمارے زمانے میں سلام، مصافحہ، معانقہ اور دست بوسی یا تعظیم کے لئے کھڑے ہو جانے کا ہے۔

امام جصاص نے احکام القرآن میں یہی فرمایا ہے کہ انبیاء سابقین کی شریعت میں بڑوں کی تعظیم اور تحیۃ کیلئے سجدہ مباح تھا، شریعت محمدیہ میں منسوخ ہو گیا اور بڑوں کی تعظیم کیلئے صرف سلام مصافحہ کی اجازت دی گئی۔ رکوع اور سجدہ اور بہیئت نماز ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے کو ناجائز قرار دے دیا گیا۔

(معارف القرآن جلد اول ص ۱۸۸)

☆ " عن قيس بن سعد قال اتيت الحيرة فرأيتهم يسجدون لمر زبان لهم فقلت رسول الله ﷺ احق ان يسجد له فاتيت رسول الله ﷺ فقلت انى اتيت الحيرة فرأيتهم يسجدون لمر زبان لهم فانت احق بان يسجد لک فقال لى ارأيت لو مررت بقبرى اكنت تسجد له فقلت لا فقال لا تفعلوا لو كنت آمر احدا ان يسجد لاحد لامرت النساء ان يسجدن لازواجهن لما جعل الله لهم عليهن من حق "

(رواه ابو داؤد ورواه احمد عن معاذ بن جبل، مشکوٰۃ باب عشرة النساء)

حضرت قیس بن سعد فرماتے ہیں میں حیرہ میں آیا تو میں نے ان لوگوں کو دیکھا کہ وہ اپنے سردار کو سجدہ کر رہے ہیں۔ میں نے خیال کیا کہ رسول اللہ ﷺ زیادہ حق رکھتے ہیں کہ ان کو سجدہ کیا جائے میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے کہا بیشک میں حیرہ میں گیا تھا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ لوگ اپنے سردار کو سجدہ کر رہے ہیں آپ زیادہ حق رکھتے ہیں کہ آپ کو سجدہ کیا جائے آپ نے فرمایا تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر تم میری قبر سے گزرے تو کیا میری قبر کو سجدہ کرو گے میں نے کہا نہیں تو آپ نے فرمایا تم (مجھے سجدہ) نہ کرو۔ اگر میں کسی ایک کو کسی کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مردوں کے عورتوں پر حقوق رکھے ہیں۔

وضاحت حدیث:

حیرۃ: حاء کے نیچے کسرہ ہے کوفہ کے علاقہ میں ایک قدیمی شہر کا نام ہے۔

مرزبان: میم پر فتح ہے اور زاء پر ضمہ بادشاہ سے کم درجہ ہو لیکن قوم سے اوپر درجہ رکھتا ہو بہادر اور شاہ سوار ہو حضرت قیس بن سعد کو یہ کیوں خیال آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ حق رکھتے ہیں کہ ان کو سجدہ کیا جائے؟

" لانه اعظم المخلوقات واکرم الموجودات "

''اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوقات سے عظیم درجہ رکھتے ہیں اور تمام موجودات سے آپ مکرم ہیں''

" فرأيتهم يسجدون لمر زبان لهم ، تعظيما له و تکريما " حضرت قیس بن سعد نے کہا میں نے حیرہ میں لوگوں کو دیکھا کہ وہ اپنے سردار کو تعظیم وتکریم کے لئے سجدہ کر رہے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے جو جواب دیا اس میں " اظهار العظمة الربوبية واشعارا لمذلة العبودية " یہ بتایا گیا کہ رب تعالیٰ عظیم ذات ہے بندہ عاجز ہے اس لئے سجدہ خواہ عبادت کا ہو یا تعظیم کا ہو وہ صرف اسی ذات کے لائق ہے جو عظیم ہے۔

نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے ہی علامہ طیبی رحمہ اللہ نے یہ بیان فرمایا کہ آپ کے ارشاد کا گویا کہ یہ مطلب تھا "اسجدوا للحی الذی لا یموت " سجدہ صرف اسی ذات کو کرو جو ہمیشہ کے لئے

زندہ ہے اس پر موت واقع نہیں ہوگا۔

(خیال رہے یہ روایت جامع صغیر، مستدرک حاکم، ترمذی، ابن ماجہ میں بھی مختلف الفاظ سے مذکور ہے)

دست بوسی: ابھی ماقبل فاضل مرادآبادی صاحب کی تفسیر خزائن العرفان اور مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی کی تفسیر معارف القرآن سے ذکر کیا کہ دست بوسی جائز ہے۔ یعنی بزرگوں کے ہاتھ چومنے جائز ہیں۔ آیئے اسی مسئلہ کو احادیث کی روشنی میں دیکھئے:

☆ صفوان بن عسال کی حدیث میں مذکور ہے۔ دو یہودی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے "فقبلا یده و رجلیه" ان دونوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ اور پاؤں چومے۔

خیال رہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان کو منع نہیں فرمایا آپ کا نہ روکنا حدیث تقریری ہے۔ جس سے روز روشن کی طرح بزرگوں کی صرف دست بوسی ہی نہیں بلکہ قدم بوسی کا جواز بھی مل گیا۔

(مشکوۃ باب الکبائر و علامات نفاق)

☆ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ہمیں رسول اللہ ﷺ نے ایک سریہ میں بھیجا۔ ہم اس میں پسپا ہوگئے۔ ہم مدینہ طیبہ میں آئے تو (حیاء کی وجہ سے) چھپ رہے تھے۔ ہم نے کہا ہم تو ہلاک ہوگئے۔ پھر ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہم نے عرض کیا "نحن الفرارون" ہم تو بھاگنے والے ہیں۔ آپ نے فرمایا: "لا بل انتم العکارون قال فدنونا فقبلنا یده" (ابوداؤد، مشکوۃ باب القتال فی الجہاد) نہیں تم تو جنگ کی طرف لوٹنے والے ہو۔ حضرت ابن عمر کہتے ہیں ہم آپ کے قریب ہوئے ہم نے آپ کے ہاتھ کا بوسہ لیا۔

نبی کریم ﷺ کی شفقت و رحمت کا اندازہ کریں کہ صحابہ کرام کی دل جوئی کے لئے کیا خوب حکمت بھرا ارشاد فرمایا۔ کہ جنگ میں وقتی طور پر پسپا ہونے سے شرمندہ نہ ہوں تم نے تو پھر جنگ میں جانا ہے اور کفار کو شکست دینی ہے۔ اور حدیث پاک سے ہاتھوں کا چومنا بھی واضح طور پر سمجھ آ گیا۔

☆ "قال النووی تقبیل یدا لغیر ان کان لعلمه وصیانته وزهده ودیانته ونحو ذلک من الامور الدینیة لم یکره بل یستحب وان کان لغناه او جاهه فی دنیاه کره وقیل حرام"

(مرقاۃ ج ۹ ص ۷۲)

علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں غیر کے ہاتھوں کو چومنا اس شخص کے علم اور گناہوں سے بچنے اور اس کے زہد اور اس کے دین دار ہونے کی وجہ سے مکروہ نہیں بلکہ مستحب ہے۔ اسی طرح کوئی بھی اس کا دینی منصب دیکھ کر ہاتھوں کو چوما تو یہ مستحب ہے۔

اگر کسی کے ہاتھ اس لئے چومے کہ یہ غنی ہے یا یہ سردار ہے اور دنیاوی طور بڑے منصب کا مالک ہے تو یہ مکروہ ہے بلکہ بعض حضرات نے اسے حرام کہا ہے۔

آدم علیہ السلام کو فرشتوں نے کونسا سجدہ کیا؟

اگر چہ اس میں مختلف قول ہیں ایک یہ ہے کہ یہ سجدہ عبادت تھا حقیقت میں سجدہ رب تعالیٰ کو تھا آدم علیہ السلام قبلہ کی طرح تھے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ سجدہ حقیقی تھا ہی نہیں بلکہ صرف فرشتوں نے جھک کر سلام کیا اسی کو سجدہ کہا گیا۔ لیکن صحیح قول یہ ہے:

"ان السجدة كانت لآدم عليه السلام تعظيما له وتحية له كالسلام منهم عليه وقد كانت الامم السالفة تفعل ذلک كما يحى المسلمون بعضهم بعضا بالسلام وقال قتادہ فی قولہ (وخروا له سجدا) كانت تحية الناس يومئذ سجود بعضهم لبعض" (کبیر)

"حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں نے سجدہ کیا (یعنی پیشانی کو زمین یا آسمان پر رکھ کر) یہ سجدہ تعظیم کے لئے تھا جیسا فرشتوں نے آپ کو سلام بھی کہا تھا۔ پہلی امتوں میں ایک دوسرے کو سجدہ کر کے ہی تحیۃ و تعظیم کی جاتی جیسا کہ مسلمان صرف سلام سے تحیۃ پیش کرتے ہیں۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ وخروا له سجدا ﴾ کی تفسیر میں یہی بیان کیا ہے کہ اس وقت بعض لوگ دوسرے بعض کو سجدہ سے تحیۃ پیش کرتے تھے"۔

فائدہ جلیلہ:

جس طرح شروع میں ذکر کر دیا گیا کہ عالم اجسام میں حضرت آدم علیہ السلام ہی پہلے انسان

ہیں اور اللہ کے خلیفہ ہیں لیکن عالم حقائق میں سب سے اول اور خلیفہ اعظم نبی کریم ﷺ ہیں۔ آپ نے خود ارشاد فرمایا" کنت نبیا آدم بین الروح و الجسد " میں اس وقت نبی تھا جب آدم علیہ السلام روح اور جسم کے درمیان تھے۔

بعض مفسرین نے لکھا کہ جبرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت محمد ﷺ کی قبر انور کی جگہ سے حضور کے اجزاء جسمیہ مبارکہ کی مٹی لے گئے اور یہ آب تسنیم سے گوندھی گئی اور اسے جنت کی نہروں میں غوطے دلوائے گئے۔ پھر اسے زمینوں اور آسمانوں میں پھرایا گیا آپ کو فرشتوں نے آدم سے پہلے پہچان لیا۔ پھر جسدِ آدم کی مٹی کے ساتھ اسے ملا دیا گیا پھر آدم میں روح پھونکی گئی اور نور محمد ﷺ آدم کی پیشانی میں چمکایا گیا۔ (تفسیر ثعالبی ملخصا بحوالہ خلاصۃ التفاسیر ج ۱ ص ۲۵)

پیشانی آدم میں نور محمدی کا چمکنا ان کے مسجود ملائکہ ہونے کا سبب ہوا جیسا کہ امام رازی نے تفسیر کبیر میں ذکر فرمایا:

" ان الملئکة امروا بالسجود لآدم لاجل ان نور محمد ﷺ کان فی جبهة آدم " (کبیر ج ۲ ص ۴۵۵)

"یعنی فرشتوں کو آدم کے لئے سجدے کا حکم اس لئے ہوا کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا نور مبارک ان کی پیشانی میں تھا۔ اس عبارت سے اس حقیقت پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ اعظم حضور ﷺ ہی ہیں، آدم علیہ السلام کی خلافت حضور ﷺ کی خلافت کا ظہور ہے"۔ (از التبیان مع البیان للکاظمی ص ۱۳۱)

﴿ فَسَجَدُوْا ﴾: ۔ "تو سب نے سجدہ کیا" چونکہ اللہ تعالیٰ کا خطاب بھی عام تھا، یعنی سب فرشتوں کو ہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں۔ تو تمام فرشتوں نے رب تعالیٰ کے حکم کو تسلیم کرتے ہوئے سجدہ کیا۔ (سوائے ابلیس کے) اسی پر ارشاد باری تعالیٰ شاہد ہے:

﴿ فسجد الملئکة کلهم اجمعون ﴾ "تو سب فرشتوں نے سجدہ کیا" (خازن)

ملائکہ میں سب سے پہلے سجدہ کرنے والے حضرت جبریل ہیں۔ پھر میکائیل، پھر اسرافیل، پھر عزرائیل اور پھر تمام ملائکہ مقربین یہ سجدہ جمعہ کے روز زوال سے عصر تک ہوا۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ ملائکہ مقربین سو برس تک سجدہ میں رہے۔ اور ایک قول ہے کہ پانچ سو برس سجدہ میں رہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)(تفسیر الحسنات)

﴿ اِلَّآ اِبۡلِیۡسَ ﴾: "سوائے ابلیس کے" یعنی رب تعالیٰ کے حکم کو تسلیم کرتے ہوئے تمام فرشتوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔

﴿ اَبٰی و اسۡتَکۡبَرَ ﴾: "اس نے انکار کیا اور تکبر کیا"

﴿ وَکَانَ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴾: "اور کافروں سے ہو گیا"

" ابلیس " عجمی لفظ ہے، غیر منصرف ہے علیت اور عجمہ ہونے کی وجہ سے اس لفظ کا وزن فعلیل ہے۔ بعض حضرات نے کہا کہ یہ لفظ عربی ہے مشتق ہے " ابلاس " سے اس کا معنی ہے خیر سے دور ہونا اور رحمت سے ناامید ہونا۔ اب اس کا وزن ہوگا " افعیل " غیر منصرف اس لئے ہوگا کہ اس کی نظیر عربی میں نہیں پائی گئی گویا کہ لفظ عجمی ہے۔ (از روح المعانی)

تنبیہ: ابلیس کا نام ابلیس سجدہ سے انکار کرنے کے بعد رکھا گیا، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہو گیا:

" وکان اسمه عزازیل بالسریانية و بالعربية الحارث فلما عصی غیر اسمه فسمی ابلیس وغیرت صورته "

" پہلے اسم کا نام سریانی زبان کے مطابق عزازیل تھا اور عربی میں حارث تھا۔ جب اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کی تو اس کا نام تبدیل کر دیا گیا اور اس کی شکل بھی تبدیل کر دی گئی" (خازن)

﴿ اَبٰی وَاسۡتَکۡبَرَ ﴾: "(ابی) ای امتنع من السجود " یعنی وہ سجدہ کرنے سے رک گیا، مطلب یہ ہے کہ اس نے رب تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی رب تعالیٰ کے حکم کے ماننے سے انکار کیا۔

" (واستکبر) من عطف العلة علی المعلول ای ابی وامتنع لکبره والسین للتاکید " (صاوی)

شیطان نے سجدہ کرنے سے انکار کیوں کیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے تکبر کیا۔ یعنی سجدہ نہ کرنے کی علت اس کا تکبر ہے۔ یعنی یہاں علت کا معلول پر عطف ہے۔ کیونکہ اس کا تکبر کرنا علت ہے۔ اور

انکار کرنا معلول ہے اس کے تکبر کرنے کو رب تعالیٰ نے واضح طور پر بیان فرمایا کہ اس نے کہا:

﴿ خلقتنی من نار و خلقته من طین ﴾

''کہ اے اللہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے پیدا کیا''

ابلیس کی یہ سوچ بھی غلط تھی کیونکہ آدم علیہ السلام کی پیدائش عناصر اربعہ سے ہوئی۔ اگر چہ مٹی کا ذکر واضح تھا۔ اس لئے آدم علیہ السلام بحیثیت مادہ کے بھی افضل تھے۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ تمام مخلوق کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی بہتر جانتا ہے کہ کون افضل ہے اور اس کی افضلیت کی وجہ کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جسے چاہے اسے افضل بنادے۔ (از صاوی)

﴿ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴾: اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ "کان ھنا بمعنی صار" یہاں "کان" کا وہی معنی ہے جو "صار" کا ہے یعنی جب اس نے سجدہ کرنے سے انکار کیا تو کافر ہو گیا۔

جیسا کہ نوح علیہ السلام کے بیٹے نے جب کشتی میں بیٹھنے سے انکار کیا "فکان من المغرقین" تو غرق ہو گیا۔ اس مقام پر بھی "کان" "صار" کے معنی میں استعمال ہے۔

بعض حضرات نے کہا کہ "کان" اپنے معنی میں ہی استعمال ہے یعنی معنی یہ ہے "کان فی علم اللہ تعالیٰ انہ سیکفر" کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں کافر تھا۔ یعنی وہ عنقریب کافر ہو جائے گا۔

اس پر بخاری کی اس حدیث کو دلیل بنایا جا سکتا ہے "وانما الاعمال بالخواتیم" بیشک اعمال کی دارومدار فقط خاتمہ پر ہے۔ اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ "ان ابلیس عبد اللہ تعالیٰ ثمانین الف سنة" بیشک ابلیس نے اللہ تعالیٰ کی اسی ہزار سال عبادت کی۔

- "واعطی الریاسة والخزانة فی الجنة علی الاستدراج"

''ابلیس کو آہستہ آہستہ جنت کی سرداری عطا کر دی گئی اور اسے جنت کا خازن بنا دیا گیا''

"فکان فی ریاسته والکبر فی نفسه متمکن"

''ریاست اور تکبر اس کے نفس میں راسخ ہو گئے''

"قال ابن عباس کان یری لنفسه ان له فضیلة علی الملائکة بما عنده فلذلک قال انا خیر منه"

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ابلیس اپنے آپ کو فرشتوں سے

افضل سمجھنے لگ گیا تھا کیونکہ اسے سرداری اور خازن جنت ہونے کا مقام مل گیا تھا اسی وجہ سے اس نے کہا تھا میں آدم سے بہتر ہوں"۔

اعتراض: یہاں سے یہ سمجھ آ رہا ہے کہ آدم علیہ السلام نے جب فرشتوں کو تمام چیزوں کے نام بتا دیئے تو اس کے بعد رب تعالیٰ نے فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا۔

لیکن دوسری آیۃ سے سمجھ آ رہا ہے کہ آدم علیہ السلام میں روح پھونکتے ہی فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ نام بتانے والا مسئلہ بعد میں درپیش آیا۔

رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اذ قال ربک للملئکة انی خالق بشرا من طین ☆ فاذا سویته ونفخت فیه من روحی فقعوا له سجدین ﴾

"جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں مٹی سے انسان بناؤں گا پھر جب میں اسے ٹھیک بنا لوں اور اس میں اپنی طرف کی روح پھونکوں تو تم اس کے لئے سجدے میں گرنا"

اس آیۃ میں "فقعوا" میں فاء ہے جو تعقیب مع الوصل کا تقاضا کرتی ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ فرشتوں کو رب تعالیٰ نے حکم دیا کہ آدم میں نفخ روح کے ساتھ ہی تم نے سجدہ کرنا ہے۔ ان میں تطبیق کیسے پائی گئی؟

جواب:" الفاء للسببیة لا للتعقیب "، فقعوا، میں فاء سببیت کیلئے ہے۔ تعقیب کیلئے نہیں۔ (روح المعانی)

قرآن پاک میں چونکہ بعض آیات بعض کا بیان ہیں۔ اس لئے دونوں آیتوں کو جمع کرنے سے نتیجہ واضح ہو جاتا ہے کہ رب تعالیٰ کے ارشادات کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے خلیفہ بنانے کا مشورہ کیا۔ انہوں نے تعجب سے سوال کیا کہ وہ کیسے خلیفہ ہوں گے جو خونریزیاں کریں گے اور فساد پھیلائیں گے؟

تو رب تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام سکھا دیئے فرشتوں سے پوچھا وہ نہ بتا سکے آدم علیہ السلام نے جب فرشتوں کو بتا دیا۔ تو رب تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ میں تمہیں سجدہ کرنے کا حکم دے رہا ہوں لہٰذا میرے حکم کے بعد تم جلدی ہی سجدہ میں گر جاؤ۔

اگرچہ تفسیر عزیزی میں ایک اور جواب دیا گیا ہے۔لیکن راقم کو وہی جواب مناسب نظر آیا جو نقل کردیا گیا۔تاہم شاہ عبدالعزیز صاحب کا جواب بھی مدنظر رہے۔وہ یہ ہے:

"قبل از پیدائش حضرت آدم نیز حکم شدہ بود کہ
حضرت آدم را بعد از پیدائش سجدہ نمایند اما وجوب اد
ای سجدہ بایں امر دیگر ثابت شد"

حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے بھی فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دے دیا گیا تھا کہ آدم علیہ السلام کی پیدائش کے بعد تم نے سجدہ کرنا ہے لیکن سجدہ کرنے کا حکم یعنی اس پر عمل کرنے کا حکم اس آیۃ سے ہوا جس کی وضاحت جاری ہے۔

اس پر شاہ صاحب نے ایک مثال بھی دی ہے کہ جس طرح ایک بچے کو حکم دیا جائے کہ وقت نماز کا شروع ہونے پر تم نے وضوء کرنا اور نماز ادا کرنی ہے۔پھر دوبارہ اسے بطور تاکید کہا جائے کہ نماز کا وقت شروع ہوگیا، اٹھو وضوء کرو اور نماز ادا کرو۔

اور جواب یہ بھی دیا گیا کہ "مراد از نفخ روح ظہور آثار آں نفخ است" نفخ روح (روح پھونکنے) سے مراد یہ ہے کہ اس روح پھونکنے کے آثار جب ظاہر ہوں تو تم نے ان کو سجدہ کرنا ہے وہ آثار اسی وقت ظاہر ہوئے جب آپ نے فرشتوں کو تمام چیزوں کے نام بتادیئے۔(ماخوذ از عزیزی)

اعتراض: ابلیس جب فرشتہ نہیں تو اس کو سجدہ کا حکم کیسے؟ سجدہ کا حکم تو فرشتوں کو تھا۔

جواب: "وان ابلیس کان من الملائکۃ والا لم یتناولہ امرھم ولم یصح استثناؤہ منھم"

"یقینی بات ہے کہ ابلیس ملائکہ سے ہے۔اگر ملائکہ سے نہ ہوتا تو نہ اسے حکم ہوتا اور نہ ہی استثناء صحیح ہوتا" (بیضاوی)

اب البتہ دیکھنا یہ ہے کہ وہ ملائکہ سے کیسے ہے، اگرچہ اس میں کئی وجوہ کا ذکر کیا گیا ہے۔لیکن دو صورتیں زیادہ بہتر نظر آتی ہیں۔ان کو ہی ذکر کیا جارہا ہے۔

ایک وجہ تو اسی سے سمجھ آجاتی ہے۔جو قرطبی سے پہلے بیان کیا ہے:

"ان ابلیس عبد اللہ تعالیٰ ثمانین الف سنۃ واعطی الریاسۃ والخزانۃ فی الجنۃ علی الاستدراج" (قرطبی)

''بیشک ابلیس نے اللہ تعالیٰ کی عبادت اسی ہزار سال (۸۰۰۰۰) کی۔تو اللہ تعالیٰ نے اسے سرداری عطا کر دی اور جنت کا خازن بنا دیا''

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ابلیس اگر چہ حقیقی طور پر فرشتہ نہیں تھا، لیکن کثرت عبادت کی وجہ سے حکمی طور پر فرشتوں میں داخل تھا، کیونکہ کئی فرشتوں پر بھی اسے سرداری حاصل تھی۔

دوسری وجہ تحقیقی تھی کہ ابلیس حقیقی طور پر فرشتوں میں سے تھا۔اگر چہ اس پر دو وجہ سے اعتراض ہوتا ہے ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا'' کان من الجن '' (ابلیس جن تھا) اس سے پتہ چلتا ہے کہ ابلیس حقیقی طور پر فرشتہ نہیں تھا بلکہ جن تھا۔

دوسرا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ جب ابلیس نے یہ کہا'' خلقتنی من نار ''(اے اللہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا) تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ ابلیس فرشتوں سے نہیں، کیونکہ اگر فرشتوں سے ہوتا، تو اسے یوں کہنا چاہئے تھا'' خلقتنی من نور ''(اے اللہ تو نے مجھے نور سے پیدا کیا) کیونکہ فرشتے نورانی مخلوق ہیں۔تو اس کا جواب یہ ہے کہ ابلیس کے متعلق جو یہ کہا گیا ہے '' کان من الجن ''اس کی وجہ یہ تھی:

'' ان الجن ماخوذ من الاجتنان وھو الستر '' کہ جن ماخوذ ہے اجتنان سے جس کا معنی ہے پوشیدہ ہونا۔

اب جن کہنے کی وجہ واضح ہوگئی کہ وہ آنکھوں سے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے جن کہلایا۔(از کبیر)

علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' لامنا فاة کونہ جنا وکونہ ملکا فان الجن کما یطلق علی ما یقا بل الملک یقال علی نوع منہ ''

''ابلیس کو اگر چہ رب تعالیٰ نے جن کہا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں بھی اسے جن کہا گیا لیکن جن کہنے سے اس کے فرشتہ ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا، ان میں کوئی منافات نہیں اس لئے کہ جن کبھی تو فرشتوں کے مد مقابل علیحدہ مخلوق کو بھی کہتے ہیں اور کبھی فرشتوں کی ایک قسم کو بھی جن کہا جاتا ہے''۔

فرشتوں کو جن کیوں کہا گیا:

'' لاجتنانھم واستتارھم عن اعین الناس ''

اس لئے کہ وہ لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں چھپی ہوئی چیز کو جن کہا جاتا ہے''۔

جہاں تک یہ سوال تھا کہ ابلیس آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور فرشتے نور سے تو ابلیس کو فرشتہ کیسے کہا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے:

"وكونه مخلوقا من نار وهم مخلوقون من نور غير ضار ايضا ولا قادح في ملكية لان النار والنور متحدا المادة بالجنس واختلافهما بالعوارض" (روح المعانی)

''ابلیس کے آگ سے پیدا ہونے اور فرشتوں کے نور سے پیدا ہونے میں بھی کوئی ضرر نہیں اور اس کے فرشتہ ہونے میں اس سے کوئی عیب ثابت نہیں ہو سکتا، کیونکہ آگ اور نور کا مادہ ایک ہی ہے ایک ہی جنس سے ہیں، البتہ عوارض کے لحاظ پر مختلف ہیں''۔

یعنی جس کے ساتھ دھوئیں کی آمیزش ہے وہ آگ ہے اور جو صاف وشفاف ہے وہ نور ہے جس طرح مٹی، ریت، پتھر، سرمہ وغیرہ کا مادہ اور جنس ایک ہے عوارضات کے لحاظ سے مختلف ہیں۔

واضح ہوا کہ ابلیس اگرچہ نار سے پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن نار اور نور کا جوہر ایک ہے لہٰذا یہ فرشتہ تھا اگرچہ نار کے عوارضات علیحدہ تھے، اسی لئے اس کی ذریت (اولاد) بھی ہے اور یہ معصوم بھی نہیں۔

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ کی عبارت اور زیادہ واضح ہے:

"فان المراد بالنور الجوهر المضئ والنار كذلك غير ان ضوءها مكدر مغمور بالدخان محذور عنه بسبب ما يصحبه من فرط الحرارة والاحراق فاذا صارت مهذبة مصفاة كانت محض نور ومتى نكصت عادت الحالة الاولى جزعة ولا تزال تتزايد حتى ينطفي نورها ويبقى الدخان الصرف" (بیضاوی)

''نور سے مراد روشن جوہر ہے اور نار بھی اسی طرح (وہی جوہر) ہے۔ سوائے اس کے کہ اس کی روشنی مکدر ہوتی ہے اور دھوئیں نے اسے اپنی لپیٹ میں لیا ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس میں بہت زیادہ حرارت اور جلانے کی تاثیر پائی جاتی ہے۔ جب اسی جوہر کی کدورت اور دھواں داری ختم ہو جائے اور وہ خالص صاف شفاف ہو جائے تو وہی نور ہے، اسی طرح جب اس کی روشنی کم ہونی شروع ہو جائے اس میں کدورت آ جائے اور دھواں اس میں ہو تو وہ پھر پہلے حال کی طرف لوٹ آئے گا جسے نار کہا جائے گا''

فائدہ جلیلہ:

" ان جمیع المخلوقات علویها وسفلیها سعیدها وشقیها مخلوق من الحقیقة المحمدیة "

'' بیشک تمام مخلوق حقیقت محمدیہ سے پیدا کی گئی ہے خواہ وہ آسمانی مخلوق ہو یا زمینی ہو، خواہ وہ نیک بخت ہو یا بد بخت'' ،

" الا ان الملائکة العلویین خلقوا منه علیه الصلوة والسلام من حیث الجمال وابلیس من حیث الجلال "

'' ہاں فرشتے نبی کریم ﷺ کی حقیقت ونورانیت سے پیدا کئے گئے ہیں بحیثیت جمال کے اور ابلیس آپ کی جلالی حیثیت سے پیدا کیا گیا۔

چونکہ نبی کریم ﷺ رب تعالیٰ کے مظہر ہیں اس لئے بالواسطہ ابلیس رب تعالیٰ کی صفت جلالیہ کا مظہر ہوگا۔

" ولهذا کان منه ما کان ولم یجزع ولم یندم ولم یطلب المغفرة "

'' اسی وجہ سے ابلیس سے وہ ہوا جو ہوا، نہ اس نے کوئی جزع وفزع کی نہ اسے کوئی ندامت ہوئی اور نہ ہی اس نے مغفرت طلب کی''

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ کرتا ہے جو ارادہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے افعال میں تغیر وتبدل نہیں جب ابلیس بھی رب تعالیٰ کی صفت جلالیہ کا بالواسطہ مظہر بن گیا تو یقیناً اس نے بھی اپنے فعل میں کوئی تبدیلی نہیں کرنی تھی۔ (از روح المعانی)

ابلیس نے اپنی بخشش کا موقع ضائع کر دیا:

ابھی جو وجہ بیان کی کہ ابلیس نے نہ جزع وفزع کی اور نہ ہی اسے ندامت ہوئی اسی وجہ سے اس نے اپنی بخشش کا ایک موقع گنوا دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں شیطان نے موسیٰ علیہ السلام کو کہا کہ تم اللہ تعالیٰ سے کلام کرتے وقت میری سفارش بھی کر دینا۔ آپ نے رب تعالیٰ کے حضور ابلیس کی درخواست پیش کر دی کہ ابلیس نے یہ کہا رب تعالیٰ نے فرمایا:

اسجد لقبر آدم اقبل توبتک واغفر معصیتک فقال ما سجدت لقالبه و جسته فکیف

اسجد لقبرہ ومیتہ ﷺ

اے ابلیس آدم (علیہ السلام) کی قبر کو سجدہ کرلے تو تیری توبہ قبول کرلوں گا، اور تیرے گناہوں کو بخش دوں گا۔ ابلیس نے کہا جب آدم کے جسم کو (یعنی زندہ آدم کو) سجدہ نہیں کیا تو اب اس کی قبر کو اور مردہ آدم کو سجدہ کیسے کروں، اس طرح اس نے ایک مرتبہ پھر انکار کردیا۔

بعض روایات میں ہے کہ ایک لاکھ سال کے بعد ابلیس کو جہنم سے نکال کر اور آدم علیہ السلام کو جنت سے نکال کر پھر اسے کہا جائے گا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کر لیکن یہ پھر انکار کردے گا اسے پھر جہنم کی آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ (از روح البیان حاشیہ جلالین ص ۸) (عزیزی)

فائدہ: نبی کو اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد قبر کی زندگی میں سب سے پہلے مردہ کہنے والا شیطان لعین ہے اب اس کے چیلے، چمچے، انبیاء کرام کو مردہ کہہ رہے ہیں، لیکن جو کام باپ کرے اس کی اولاد وہی کرے تو کوئی خاص تعجب نہیں، خواہ حقیقی اولاد ہو یا معنوی اولاد ہو۔

تنبیہ: جس طرح آدم علیہ السلام کو تعظیمی سجدہ کرنے کا حکم فرشتوں کو تھا، اسی طرح ابلیس کو جو حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کی قبر کو سجدہ کرنے کا۔ جب یہ رب تعالیٰ کا حکم تھا تو اس میں کوئی کلام نہیں۔

البتہ ہمارے نبی کریم ﷺ کی شریعت میں رب تعالیٰ کے بغیر کسی کو سجدہ کرنا مطلقاً حرام ہے خواہ وہ سجدہ عبادت کا ہو یا تعظیم کا ہو۔ اسی طرح قبر کو سجدہ کرنا ناجائز ہے اگر صاحب قبر کو معبود سمجھ کر سجدہ کیا تو شرک ہے۔ اگر معبود نہیں سمجھا تو سجدہ کرنا حرام ہے۔

شیطان کا رونا:

" عن ابی هريرة عن النبی ﷺ اذا قرأ ابن آدم السجدة (فسجد) اعتزل الشيطن يبكی يقول يا ويله وفی رواية يا ويلی امر ابن آدم بالسجود فسجد فله الجنة وامرت بالسجود فابيت فلی النار "

(خرجه مسلم، الزيادة من صحيح مسلم) (قرطبی)

" حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جب ابن آدم نے سجدہ کی آیت تلاوت کی (اور سجدہ کیا) تو شیطان ایک طرف ہو کر رویا اور کہنے لگا ہائے افسوس انسان کو سجدہ کا حکم دیا گیا تو اس نے سجدہ کرلیا اس کیلئے جنت ہے اور مجھے سجدہ کا حکم ہوا تو میں نے انکار کیا اور میرے لئے آگ ہے۔"

حدیث پاک سے بہت واضح سمجھ آ رہا ہے کہ شیطان کا رونا ندامت کی وجہ سے نہیں تھا، اور نہ ہی توبہ کی غرض سے تھا۔ بلکہ اس کا رونا صرف اس لئے تھا کہ مجھے جنت سے نکال دیا گیا، اور میری سرداری میں زوال آ گیا۔

تکبر کی مذمت:

علامہ راغب اصفہانی بیان فرماتے ہیں کبر (تکبر) اس حالت کا نام ہے جس سے انسان اپنے آپ کو دوسرے سے بڑا سمجھتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو احکام ہوتے ہیں ان کو وہ تکبر اور اپنے آپ کو عظیم سمجھتے ہوئے انکار کر دیتا ہے اور عبادات پر اسے یقین نہیں رہتا۔

تکبر کرنے کی دو وجہ ہوتی ہیں ایک یہ کہ انسان بڑا بننے کی کوشش کرے۔ اگر اچھے کام میں بڑا بننے کی کوشش کی جائے تو یہ قابل تعریف ہے اور اگر بڑا بننے کی کوشش میں اللہ تعالیٰ کے احکام کو ہی تسلیم نہ کیا جائے تو یہ تکبر قابل مذمت ہے۔

تکبر کی دوسری قسم یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو سیر ہو کر دکھائے اور جو چیز اس کے پاس نہیں وہ اپنے آپ کو اس کا مالک بنائے یہ قابل مذمت ہے۔ ابلیس کا بھی یہی تکبر تھا کہ اس نے اپنے آپ کو آدم علیہ السلام سے اعلیٰ سمجھا حالانکہ وہ اعلیٰ نہیں تھا۔ یہی تکبر اس کے انکار کرنے کا ذریعہ بنا۔

علامہ غزالی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا اگر ظاہری طور پر تکبر پایا جائے تو اسے اصطلاح میں بھی تکبر ہی کہتے ہیں اور اگر باطن میں ہو یعنی اس کے دل پر تکبر کے اثرات پائے گئے ہوں تو اسے اصطلاح میں کبر کہا جاتا ہے۔ (از مرقاۃ ج ۹ ص ۳۰۴)

☆ "عن حارثة بن وهب قال قال رسول الله ﷺ الا اخبركم باهل الجنة كل ضعيف متضعف لو اقسم على الله لا بره الا اخبركم باهل النار كل عتل جواظ متكبر"

(بخاری، مسلم وفی روایة المسلم كل جواظ زنيم متكبر . مشكوة باب الغضب والكبر)

حضرت حارثہ بن وہب کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں جنت والوں کی خبر نہ دوں؟ (پھر آپ نے ان کی خبر دی) ہر وہ شخص جو بہت زیادہ عاجزی کرنے والا ہو (وہ جنتی ہے) اگر وہ اللہ تعالیٰ کی قسم اٹھا دے کہ رب یہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم کو پورا فرما دیتا ہے۔ کیا میں

تمہیں جہنم والوں کی خبر نہ دوں؟ (پھر آپ نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا) ہر وہ شخص جو باطل طریقہ سے جھگڑا کرنے والا ہو، انکار کرنے والا ہو، تکبر کرنے والا ہو۔

مسلم کی ایک روایت میں یہ ہے کہ ہر شخص انکار کرنے والا، غلط نسب بیان کرنے وال اور تکبر کرنے والا (جہنمی ہے)

وضاحت حدیث:

حدیث شریف میں جو لفظ " ضعیف " مذکور ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ متکبر اور جبار نہ ہو اور معانی بھی آتے رہتے ہیں وہ ماقبل اور مابعد کو دیکھ کر معانی بیان کئے جاتے ہیں۔

" متضعف " کا لفظ تاکید کے لئے آیا ہوا جیسے کہ کہا جاتا ہے " **جنود مجنده ، القناطير المقنطرة** " اور ظل ظليل یعنی " **ضعيف متضعف** " کا معنی ہے کامل عاجز۔

" **لو اقسم على الله لا بره** " اگر اللہ تعالیٰ پر وہ قسم اٹھادیں تو اللہ تعالیٰ اسے پورا فرمادے۔

یعنی یہ قسم اٹھادیں کہ اللہ تعالیٰ ایسا کرے گا۔ یا یہ قسم اٹھادیں کہ اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کرے گا، تو اللہ تعالیٰ بھی ان کی خواہش کے مطابق وہ ہی کام کر دیتا ہے۔ یا وہی کام چھوڑ دیتا ہے اس کے چھوڑنے کی اس عاجز شخص نے قسم اٹھائی تھی۔

جواظ: واؤ پر شد ہے اس کا معنی انکار کرنا، بہت خوشحالی کی وجہ سے موٹا ہو جانا، فاجر اور فخر کرنے والا۔

زنیم: کوئی شخص اپنے آپ کو کسی طرف منسوب کرے کہ میرا مرتبہ بڑا نظر آئے حالانکہ وہ اس قبیلہ سے نہیں۔ یہاں مطلقا یہ معنی کیا جائے کہ وہ ذلیل ہے تو زیادہ مناسب ہے۔ (مرقاة ج ۹ ص ۳۰۶)

☆ " **وعن ابن مسعود قال قال رسول الله ﷺ لا يدخل النار راحد في قلبه مثقال حبة من خردل من ايمان و لا يدخل الجنة احد في قلبه مثقال حبة من خردل من كبر** "

(رواه مسلم مشكوة باب الغضب و الكبر)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی ایک شخص بھی آگ میں داخل نہیں ہوگا، جس کے دل میں ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہوا۔ اور کوئی شخص جنت میں نہیں داخل ہوگا جس کے دل میں ایک رائی کے دانہ کے برابر تکبر پایا گیا۔

وضاحت حدیث:

" لا یدخل النار ای دخول خلود " جس شخص کے دل میں ذرا بھر بھی ایمان ہوا وہ آگ میں ہمیشہ نہیں رہے گا۔ اگر کچھ وقت کے لئے سزا دینے کی غرض سے آگ میں ڈال بھی دیا گیا تو سزا ختم ہونے پر آگ سے نکال دیا جائے گا۔

ذرا بھر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ ثمرات ایمان تھوڑے پائے گئے یعنی اخلاق جو ظاہر و باطن سے متعلق ہیں اور وہ نور ایمان اور ظہور ایقان سے صادر ہوتے ہیں ان میں کمی اور زیادتی ہوتی ہے۔ نفس ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے اس میں زیادتی اور کمی نہیں ہوتی۔ جس کے دل میں ذرا بھر تکبر ہوا وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا اس کا ایک مطلب یہ ہے " لا یدخل الجنة مع السابقین " یعنی وہ جنت میں ان لوگوں کے ساتھ داخل نہیں ہوگا جو سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے، بلکہ وہ اپنے تکبر کی سزا حاصل ہونے کے بعد جنت میں داخل کیا جائے گا کیونکہ صرف تکبر سے کوئی شخص کافر نہیں ہوتا۔

اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ " ان یراد بالکبر الکفر والشرک " تکبر سے مراد کفر و شرک ہو، یعنی اتنا متکبر ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو ہی تسلیم نہ کرے اور اس کے ساتھ شریک ٹھہرائے تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں رہے گا۔ کبھی جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ (از مرقاۃ ج۹ ص۳۰۷)

☆ " وعن ابن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یدخل الجنة من کان فی قلبه مثقال ذرة من کبر فقال رجل ان الرجل یحب ان یکون ثوبه حسنا ونعله حسنا قال ان اللہ تعالٰی جمیل یحب الجمال الکبر بطر الحق وغمط الناس "

(رواہ مسلم، مشکوۃ باب الغضب والکبر)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وہ شخص جنت میں نہیں داخل ہوگا، جس کے دل میں ذرا بھر بھی تکبر ہوا۔ تو ایک شخص نے عرض کیا کہ بیشک ہر شخص اچھے کپڑے اور اچھے جوتے پہننا پسند کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ جمیل ہے وہ جمال کو پسند فرماتا ہے۔ تکبر یہ ہے کہ حق پر اکڑ دکھائے اور لوگوں کو حقیر سمجھے۔

وضاحت حدیث:

وہ شخص جو عرض کرنے والے تھے وہ معاذ بن جبل، یا عبداللہ بن عمرو بن عاص، یا ربیعہ بن عامر تھے:

"لما رأى الرجل العادة فى المتكبرين لبس الثياب الفاخرة ونحوذلک سأل ما سأل"

''جب سوال کرنے والے شخص نے دیکھا کہ عام طور پر متکبر لوگ فاخرانہ لباس پہنتے ہیں اور فاخرانہ جوتے پہنتے ہیں تو یہ پوچھا کہ اچھے کپڑے پہننے والا اور اچھے جوتے پہننے والا شخص آپ کے نزدیک متکبر ہے یا تکبر کی کوئی اور علامت ہے''۔

تو حضور ﷺ نے جواب دیا:

"ان الله جميل اى فى ذاته وصفاته وفعاله وكل جمال صورى او جميل معنوى فهو اثر جماله فلا جمال ولا جلال ولا كمال الا له سبحانه"

''بیشک اللہ تعالیٰ جمیل ہے۔یعنی وہ اپنی ذات اور صفات اور افعال میں جمیل ہے بلکہ ہر قسم کا صوری اور معنوی جمال رب تعالیٰ کے جمال کا ہی اثر ہے۔کوئی جلال اور کوئی جمال اور کوئی کمال رب تعالیٰ کے بغیر کسی کو حاصل نہیں۔جو کسی کو حاصل ہے وہ اسی کے واسطہ سے''۔

يحب الجمال: رب تعالیٰ جمیل ہے وہ جمال کو پسند فرماتا ہے یعنی جمال اس کی مخلوق میں ظاہر ہو۔اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ انسان اپنے جمال ظاہر کرے اسی کو ایک حدیث پاک سے تائید بھی حاصل ہے:

"ان الله يحب ان يرى اثر نعمته على عبده"

''بیشک اللہ تعالیٰ کو پسند ہے کہ وہ اپنے بندے پر اپنی نعمت کا اثر دیکھے''

الكبر بطر الحق: تکبر حق سے روگردانی،نعمت کے حاصل ہونے پر سرکش ہونا،اللہ تعالیٰ کی توحید اور عبادت کو باطل سمجھنا حق کو ناحق سمجھنا۔

وغمط الناس: اور لوگوں کو حقیر سمجھنا اور بے وقوف سمجھنا۔یعنی فاخرانہ اور تکبرانہ طور پر نہ ہو بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی نعمت کے اظہار پر اچھا صاف ستھرا لباس پہننا علامت تکبر نہیں۔لیکن یہ بھی خیال رہے کہ اسراف نہ ہو۔

اکثر طور پر دیکھا گیا ہے جہلاء فاخرانہ لباس پہنتے ہیں علماء صاف ستھرا،اچھا لیکن عاجزانہ لباس پہنتے ہیں۔تکبر حق سے پھرنے باطل راہ پر چلنے،دوسروں کو حقیر سمجھنے کا نام ہے۔(از مرقاة ج ۹ ص ۳۰۸)

☆ " عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ یقول الله تعالیٰ الکبریاء ردائی والعظمة ازاری فمن نازعنی واحدا منهما ادخلته النار وفی روایة قذفته فی النار "

(رواہ مسلم ، مشکوۃ باب الغضب والکبر)

" حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کبریائی میری رداء ہے اور عظمت میری ازار ہے۔ جس شخص نے بھی ان دونوں میں کسی ایک کو بھی چھینا میں اسے جہنم میں داخل کر دوں گا۔ ایک روایت ہے کہ میں اسے جہنم میں پھینک دوں گا "۔

وضاحت حدیث:

" رداء " اوپر اوڑھنے والی چادر کو کہا جاتا ہے اور " ازار " کمر میں تنگیز کو ڈھانپنے والی چادر کو کہا جاتا ہے۔ "الکبریا" اور " العظمة " کا معنی بادشاہی۔ اور کبھی ان دونوں کا معنی کیا جاتا ہے کمال ذات اور کمال وجود جو صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے " الکبریاء ردائی " جب کبریائی کو رداء کہا ہے اور عظمت کو ازار کہا ہے تو اسی سے پتہ چل گیا کہ کبریائی میں بنسبت عظمت کے زیادہ درجہ پایا گیا ہے۔ کیونکہ رداء کو ازار پر فوقیت حاصل ہے۔

یعنی اپنی بڑائی بیان کرنا اور اپنی عظمت بیان کرنا اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ اس طرح اپنی بڑائی اور عظمت بیان کرے کہ جس سے یہ سمجھ آئے کہ یہ حق سے روگردانی کر رہا ہے اور لوگوں کو حقیر سمجھ رہا ہے۔ اسی سے تواضع کا معنی سمجھ آگیا وہ یہ ہے " التواضع هو الاذعان للحق وتوقير الناس " تواضع یہ ہے کہ حق پر یقین رکھے اور لوگوں کی عزت کرے۔ اسی کو دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا گیا " التعظيم لامر الله والشفقة على خلق الله " اللہ تعالیٰ کے امر کی تعظیم اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر شفقت کرنا تواضع ہے۔

نتیجہ واضح ہوا:

" من تكبر على الله وعلى الخلق ابتلاه الله تعالىٰ فی الدنیا بالذل والهوان وفی الآخرة یقذفه فی اقصی درکات النیران ومن تواضع ﷲ

مع الخلق رفع اللہ درجتہ فی الدنیا و الآخرۃ "

''جس نے اللہ تعالیٰ پر اور مخلوق پر تکبر کیا اللہ تعالیٰ اسے دنیا میں ذلت اور رسوائی میں مبتلاء کرتا ہے اور آخرت میں اسے جہنم کی آگ میں پھینک دے گا اور جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے لئے مخلوق سے تواضع کی اللہ تعالیٰ اس کے درجات دنیا اور آخرت میں بلند کرے گا''

(از مرقاۃ ج ۹ ص ۳۰۹)

☆ " وعن عمر قال وهو على المنبر يا ايها الناس تواضعوا فانی سمعت رسول الله ﷺ يقول من تواضع لله رفعه الله فهو فی نفسه صغیر و فی اعین الناس عظیم و من تکبر وضعه الله فهو فی اعین الناس صغیر و فی نفسه کبیر حتی لهو اهون علیهم من کلب او خنزیر "

(مشکوۃ باب الغضب والکبر)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منبر پر فرمایا اے لوگو تواضع اختیار کرو بیشک میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی رضاء کیلئے تواضع کی اللہ تعالیٰ اس کے درجات کو بلند کرے گا اگرچہ اس شخص نے اپنے آپ کو چھوٹا سمجھا لیکن لوگوں کی نظر میں وہ عظیم ہے۔ اور جس شخص نے تکبر کیا اللہ تعالیٰ اسے پست کر دیتا ہے اور لوگوں کی نظر میں بھی وہ حقیر ہوتا ہے اگرچہ وہ خود اپنے آپ کو بڑا ہی سمجھے یہاں تک کہ وہ لوگوں کے نزدیک کتے اور خنزیر سے بھی گھٹیا نظر آتا ہے۔

وضاحت حدیث:

جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے لئے تواضع کی اپنا حق اس نے خود پست بیان کیا یعنی حقیقت میں جو اس کا مرتبہ تھا "فجعل نفسه دون مرتبته" اس نے اپنے آپ کو اس کم مرتبہ سمجھا۔

'' ثم ان الله يرفعه من تلك المنزلة التي هي حقه الى ما هي ارفع منها و يعظمه عند الناس ''

''پھر اللہ تعالیٰ بیشک اس کے مرتبہ کو اس کے حقیقی مرتبہ سے بھی بلند کر دیتا ہے، اور لوگوں کے نزدیک بھی اسے عظیم مرتبہ عطا فرما دیتا ہے۔ تکبر کرنے میں اسی کو الٹ کریں نتیجہ واضح ہو جائے گا''۔

(مرقاۃ ج ۹ ص ۳۱۷)

یعنی جو شخص اپنے حقیقی مرتبہ سے اپنے آپ کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے۔ رب تعالیٰ اسے اس کے حقیقی مرتبہ سے بھی پست کر دیتا ہے اور لوگوں کی نظروں میں بھی اسے حقیر بنا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ لوگ اسے کتوں اور خنزیروں سے بھی حقیر سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔

﴿ وَقُلْنَا يٰآدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾

☆ اور ہم نے فرمایا اے آدم تو اور تیری بی بی اس جنت میں رہو اور کھاؤ اس سے بے روک ٹوک جہاں تمہارا جی چاہے مگر اس پیڑ کے پاس نہ جانا کہ حد سے بڑھنے والوں میں ہو جاؤ گے

☆ اور ہم نے کہا اے آدم تم اور تمہاری زوجہ جنت میں رہو، اور دونوں اس سے کھاؤ جو چاہو بغیر رکاوٹ کے (ہاں البتہ) اور دونوں اس درخت کے قریب نہ جانا کہ حد سے دونوں بڑھنے والے ہو جاؤ گے۔

مختصر مطلب:

اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد ان کی زوجہ حضرت حوا کو ان کی بائیں پسلی سے پیدا کیا اور انہیں حضرت آدم علیہ السلام کی زوجہ ہونے کا شرف بخشا پھر ان دونوں کو جنت میں رہنے کا حکم دیا۔ اور ان کو ارشاد فرمایا کہ تم جنت کے پھل جو چاہو کھاؤ کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں، البتہ ایک درخت کے قریب جانے سے دونوں کو روک دیا کہ اس کے قریب نہ جانا۔ ورنہ تم حد سے تجاوز کرنے والے ہو جاؤ گے۔

تفصیلی وضاحت:

حضرت حوا کی پیدائش: جب حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں نے سجدہ کر لیا اور ابلیس انکار تکبر کی وجہ سے مردود ہو گیا، تو آدم علیہ السلام جو خاک سے پیدا ہوئے تھے آپ کا جنت میں کوئی ہم جنس نہ تھا، کیونکہ فرشتے علیحدہ جنس تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ پر نیند کو مسلط کیا، پھر آپ کی بائیں پسلی سے حضرت حوا کو پیدا کیا، اور اس کی جگہ گوشت رکھ دیا۔ جب آپ بیدار ہوئے تو آپ نے اپنے پاس حضرت حوا کو بیٹھے ہوئے پایا پوچھا تم کون ہو؟ انہوں نے کہا میں عورت ہوں پھر آپ نے کہا تمہیں کیوں پیدا کیا گیا؟ تو انہوں نے عرض کیا تا کہ تم مجھ سے سکون حاصل کرو۔

فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کے علم کا امتحان لینے کے لئے پوچھا یہ کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا" ھذہ امرأۃ" یہ عورت ہے پھر انہوں نے پوچھا اسے " امرأۃ " (عورت) کیوں کہا گیا

ہے؟ آپ نے فرمایا چونکہ یہ " امـرأ " (مرد) سے بنی ہے پھرانہوں نے سوال کیا اس کا نام کیا ہے؟ آپ نے فرمایا " حوا " پھرانہوں نے کہا اس کا نام حوا کیوں رکھا گیا؟ " قـال لانهـا خـلقت من شـئ حیّ " آپ نے فرمایا کہ یہ زندہ چیز سے پیدا کی گئی ہے۔ یعنی زندہ چیز کو چونکہ "حی" کہا جاتا ہے اس لئے اس کا نام بھی حوار کھ لیا گیا۔

تنبیہ: ایک روایت کے مطابق حضرت حوا کی پیدائش فرشتوں کے سجدہ کے بعد جنت میں ہوئی۔ اور دوسری روایت کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام کا جسم زمین میں تیار کیا گیا اور اس میں روح کو داخل بھی زمین میں ہی کیا گیا اور حضرت حوا کی پیدائش بھی زمین پر ہی ہوئی پھر دونوں کو جنت میں لے جایا گیا۔ (روح المعانی)

عورت کے بائیں پسلی سے پیدا ہونے پر حدیث نبوی:

آج کل آزادیٔ نسواں کے دعویدار اور مادر، پدر آزاد شتر بے مہار عورتیں سب مل کر یہ کہہ رہے ہیں۔ کہ عورت کا مرد کی بائیں پسلی سے پیدا ہونے کا کوئی ثبوت نہیں۔ جہلاء کو تو الو بنایا جا سکتا ہے، لیکن اہل علم ان کے جال میں کیسے آئیں؟ آیئے اسی پر حدیث نبوی کو دیکھیں اور یہودیوں کے آلہ کار لوگوں کے چکر میں نہ آئیں۔

☆ " عن ابی هـريـرة قال قال رسول الله ﷺ استوصوا بالنساء خيرا فانهن خلقن من ضـلـع اعـوج وان اعـوج شئى فى الضلع اعلاه فان ذهبت تقيمه كسرته وان تركته لم يزل اعوج فاستوصوا بالنساء " (بخاری، مسلم مشکوۃ باب عشرۃ النساء)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا عورتوں کے متعلق میں تمہیں بہتر حکم دیتا ہوں، جسے قبول کرو، بیشک وہ ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہیں، بیشک پسلی کا ٹیڑھا پن اوپر کی جانب ہوتا ہے اگر تم اسے سیدھا کرنا شروع کرو گے تو اسے توڑ دو گے اور اگر اسے اسی حال پر چھوڑو گے تو وہ ٹیڑھی ہی رہے گی عورتوں کے متعلق میرا حکم قبول کرو۔

وضاحت حدیث: " استـوصـوا " کے دو معنی بیان کئے گئے ہیں ایک یہ کہ لفظ ''سین'' طلب کے لئے ہو تو اب معنی یہ ہو گا

" اطلبوا الوصية من انفسكم فى حقهن بخير "

اپنے نفسوں سے عورتوں کے حق میں بہتر نصیحت طلب کرو۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے " وکانوا من قبل یستفتحون علی الذین کفروا " وہ (اہل کتاب) نبی کریم ﷺ کے آنے سے پہلے کافروں پر (آپ کے وسیلہ سے) فتح طلب کرتے تھے یعنی جس طرح "یستفتحون" میں سین طلب کے معنی میں ہے، اسی طرح "استوصوا" میں بھی سین طلب کے لئے ہے پھر "بخیر" پر جو باء ہے اس کو النساء پر داخل کیا تو "استوصوا بالنساء خیرا" ہو گیا۔

دوسرا معنی قاضی عیاض رحمہ اللہ نے بیان کیا" الاستیصاء " کا معنی وصیت قبول کرنا اب معنی یہ ہوگا:

" اوصیکم بھن خیرا فاقبلوا وصیتی فیھن "

"میں تمہیں عورتوں کے حق میں بہت نصیحت کرتا ہوں وہ میری نصیحت قبول کرلو"

مقصد اس سے یہ ہے کہ ان سے نرم سلوک کیا جائے، نرمی کی جائے ان کے ٹیڑھا رہتے ہوئے کچھ ان کی خامیاں برداشت کی جائیں ان پر احسان کیا جائے ان کی غلطیوں کو برداشت کیا جائے۔ جس طرح کہا گیا ہے:

" الصبر عنھن ایسر من الصبر علیھن والصبر علیھن اھون من الصبر علی النار "

"ان کی خامیوں کو برداشت کرنا بنسبت ان کو روکنے سے آسان ہے اور ان کو غلطیوں سے روکنا آگ میں جلنے سے آسان ہے"

یعنی اگر ان میں کوئی خامی اور غلطی ایسی ہو جو خلاف شرع نہ ہو تو اس پر صبر کرنا آسان ہے کیونکہ اگر عورت کو روکا گیا تو وہ اپنے ٹیڑھے پن اور عقل کی کمی کی وجہ سے گھر کو برباد کر دے گی سکون برباد ہو جائے گا۔

لیکن اگر اس کی غلطیاں شریعت کے خلاف ہوں تو پھر روکا جائے اگر نہ روکا گیا تو مرد کو خلاف شرع کاموں سے نہ روکنے کی وجہ سے جہنم کی آگ میں جلنا پڑے گا اور عورت کو گناہ کرنے کی وجہ سے آگ میں جلنا پڑے گا۔ عورت کا ٹیڑھا ہونا، کسی بات کو نہ ماننا اور اپنی بات منوانے پر زور دینا اس کی پیدائشی عادت وفطرت میں داخل ہے۔ کیونکہ حضرت حوا کو آدم علیہ السلام کی بائیں جانب اوپر کی پسلی سے پیدا کیا گیا ہے۔ پیدائشی عادت کا بدلنا ممکن نہیں۔ خود ارشاد مصطفوی کے مطابق پہاڑ کا اپنی جگہ سے ہٹنا ممکن ہے لیکن پیدائشی عادت کا بدلنا ممکن نہیں۔ (از مرقاۃ و نووی)

نکتہ : عورت کو مٹی سے نہیں پیدا کیا گیا بلکہ مرد کی بائیں پسلی سے پیدا کیا گیا ہے تا کہ عورت کبھی بھی مرد کی برابری کا دعویٰ نہ کر سکے، کیونکہ اس کو پیدائش کے وقت سے ہی مرد کے تابع بنا دیا گیا ہے۔ پھر بائیں پسلی سے پیدا کرنا دائیں سے نہ پیدا کرنا بھی اس کے مرتبہ کی کمی پر دلالت کر رہا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کی شادی اور مہر:

جب حضرت حوا کو پیدا کیا گیا تو حضرت آدم علیہ السلام نے ان کی طرف میلان کرنا چاہا اور ارادہ فرمایا کہ دست محبت بڑھائیں تو فرشتوں نے کہا اے آدم ٹھہر جاؤ پہلے مہر ادا کر دو۔ آپ نے فرمایا:

" فما مهرها قالوا حتى تصلى على النبى صلى الله عليه وسلم "

''وہ مہر کیا ہے؟ فرشتوں نے کہا مہر یہ ہے کہ تم نبی کریم ﷺ پر درود پڑھو''

ایک روایت میں تین دفعہ اور ایک میں سترہ مرتبہ درود پاک پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ یعنی اس مسئلہ میں اتفاق ہے کہ آدم علیہ السلام کا مہر یہی تھا کہ وہ نبی کریم ﷺ پر درود پاک پڑھیں۔ آپ نے درود پڑھا، اور فرشتوں کو گواہی سے نکاح ہوا۔

" وفى ذلك اشارة الى انه عليه الصلوة والسلام الواسطة لكل موجود حتى ابيه آدم " (صاوی زیر آیتہ خلقکم من نفس واحدۃ پ ۲)

''اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ بیشک نبی کریم ﷺ ہر موجود چیز کے لئے وسیلہ ہیں یہاں تک کہ آپ اپنے باپ حضرت آدم علیہ السلام کا بھی وسیلہ ہیں''

دوسری روایت کے مطابق آپ کو اور حضرت حوا کو شادی کے بعد فرشتے سونے کے تخت پر بٹھا کر اس طرح اٹھا کر جنت میں لے گئے جس طرح بادشاہوں کو عزت کی خاطر اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ (روح المعانی)

گویا کہ بارات کی واپسی پر فرشتے سنہری ڈولی میں دونوں میاں بیوں کو اٹھا کر لا رہے ہیں۔

قانون قدرت اور قانون عادت میں فرق:

اللہ تعالیٰ کی عادت شریفہ یہ ہے کہ عام طور پر کاموں کے اسباب بنا دیئے ہیں۔ اسی طرح انسانوں کی پیدائش میں بھی قانون عادت اسباب کے تحت کر دیا گیا ہے۔ کہ ماں اور باپ سے اولاد کی پیدائش ہوتی ہے۔ لیکن یہ قانون قدرت نہیں۔

قانون قدرت کی اللہ تعالیٰ نے ایک ایک مثال قائم کر دی کہ میں اس طرح بھی کر سکتا ہوں اسباب کی مجھے کوئی محتاجی نہیں۔ مرد اور عورت کے بغیر اپنے دست قدرت سے مٹی کا قالب بنا کر اس میں روح پھونک کر حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا۔ اور عورت کے بغیر مرد کی پسلی چاک کر کے عام عادت کے خلاف حضرت حوا کو پیدا فرما کر یہ واضح کر دیا کہ میں بغیر عورتوں کے مردوں سے اولاد پیدا کرنے پر بھی قادر ہوں۔

اور عورت سے بغیر اس کے خاوند کے بیٹا پیدا کر کے بھی واضح کر دیا کہ میری قدرت سے یہ بھی کوئی بعید بات نہیں۔ یعنی حضرت مریم سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش تو ایک عام طریقہ کے مطابق ہی ہوئی۔ لیکن اس میں مرد کا کوئی واسطہ نہیں، صرف جبرائیل امین کی پھونک کا اثر ہے ورنہ عیسیٰ علیہ السلام کا کوئی باپ نہیں۔

﴿ یآدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ﴾ ''اے آدم تم اور تمہاری زوجہ جنت میں رہو''

'' (اسکن) تنبیه علی الخروج لان السکنی لا تکون ملکا '' رب تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جنت میں رہنے کا جو حکم دیا۔ اس میں لفظ '' اسکن '' استعمال فرمایا۔ اس لفظ سے ہی اشارہ کر دیا گیا تھا کہ پھر آپ کو اس مقام سے نکلنا بھی ہو گا کیونکہ سکونت عارضی طور پر ٹھہرنے کو کہا جاتا ہے اس میں ملکیت نہیں پائی جاتی۔

اسی وجہ سے بعض عارفین نے کہا کہ سکونت ایک مدت تک ہوتی ہے پھر ختم ہو جاتی ہے ان دونوں کا جنت میں دخول ٹھہرنے کے لئے تھا، مستقل طور پر مقیم ہونے کے لئے نہیں تھا۔ ہاں البتہ کوئی قرائن پائے جائیں تو اپنے مملوکہ دار (مکان) میں ٹھہرنے کو بھی سکونت سے تعبیر کر دیا جاتا ہے اور کوئی شخص مکان دے دے عمر بھر ٹھہرنے کے لئے تو عمر بھر ٹھہرنے کی اجازت ہو گی۔ اور کوئی یہ کہے کہ تم اس مکان میں اپنی تمام عمر رہو بلکہ بعد میں بھی تمہارے ورثاء کا یہ مکان ہو گا تو اس سے ملکیت حاصل ہو جائے گی۔ لیکن ان تمام صورتوں کی دارومدار قرائن پر ہے۔

کسی کو کوئی چیز دی جائے اس میں کئی لفظ استعمال ہوتے ہیں جو کچھ قریب قریب ہیں۔

دینی مدارس کے طلباء کے لئے: **العمری**: (عین پر ضمہ اور آخر میں الف مکسورہ، فعلی کے وزن پر) کوئی شخص اپنا مکان کسی کو دے کہ تم عمر بھر اس میں آباد رہو یا یہ کہے جب تک میری عمر ہے تو اس میں آباد رہو اسے عمری کہا جاتا ہے۔ یہ موت کے بعد اصل مالک کے ورثاء کی طرف لوٹ آئے گا (جس کی عمر کا ذکر تھا اس کی موت کے بعد)۔

الرقبی: (راء پر ضمہ اور آخر میں الف مکسورہ فعل کا وزن) اگر کوئی شخص دوسرے کو مکان دیتا ہے اور یہ کہتا ہے اگر تمہاری موت مجھ سے پہلے آ گئی تو یہ مکان میری طرف لوٹ آئے گا۔ اور اگر میری موت تمہاری موت سے پہلے آ جائے تو تم اس کے مالک ہو گے اسے رقبی کہا جاتا ہے۔

خیال رہے کہ رقبی بہتر نہیں اس لئے کہ ہر شخص دوسرے کی موت کا منتظر رہتا ہے۔

رقبی کی ممانعت پر بھی حدیث پاک موجود ہے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "**لا رقبی فمن ارقب شیاء فهو له حیاته و مماته**" تقریبا اس حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ رقبی اس طرح مناسب نہیں کہ ایک دوسرے کی موت کے منتظر ہوں ہاں رقبی ایسا ہو جو مطلق ہو زندگی اور موت میں اس کو مطلق مالک بنا دیا جائے رقبی کے جواز پر حدیث پاک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے موقوف طور پر ثابت ہے "**العمری والرقبی سواء**" عمریٰ اور رقبی برابر ہیں۔

الافقار: یہ لفظ ماخوذ ہے "**فقار الظهر**" سے کوئی شخص دوسرے کو کہے "**فقرتک ناقتی**" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنی اونٹنی کی پیٹھ تم کو اعارہ کے طور پر دے دی تم اس پر سوار ہو کر فلاں جگہ تک جا سکتے ہو۔ یا اس سواری پر سوار ہو کر شکار کیلئے تیر اندازی کر سکتے ہو تو تمہیں اجازت ہے۔

الاخبال: عام طور پر کہا جاتا ہے "**اخبلت فلانا**" فلاں شخص کو میں نے اونٹ یا گھوڑا جہاد کیلئے اعارہ کے طور پر دے دیا ہے۔

المنحة: (میم کے نیچے کسرہ) یہ لفظ اس طرح ذکر کیا جاتا ہے "**منحت الناقة او الشاة فلانا**" میں نے فلاں شخص کو اونٹنی یا بکری دودھ دوہنے اور استعمال کرنے کے لئے دے دی۔ یعنی وہ اس کا دودھ استعمال کرتا رہے لیکن پھر میری اونٹنی یا بکری واپس کر دے۔

العارية: عاریہ عام ہے کسی کو کوئی چیز نفع حاصل کرنے کے لئے دے اور پھر وہ نفع حاصل کر کے واپس کر دے۔

الھبة: مطلقاً کسی کو کوئی چیز بغیر کسی معاوضہ کے بطور ملکیت کے دے جب وہ اس چیز پر قبضہ کر لے تو وہ اس کا مالک بن جاتا ہے۔

الصدقة: کسی کو کوئی چیز مستقل طور پر دے دی جائے لیکن اس میں غرض اور نیت ثواب کی ہو۔

الاطراق: اعارۃ الفحل کوئی نر جانور کسی کو بطور اعارہ دینا جس طرح دیہاتوں میں عام رواج ہے۔ موسم بہار میں ریوڑ والے بعض اوقات دوسرے ریوڑ والے سے بکریوں کے لئے بکرا مانگ کر لے آتے ہیں۔
(ماخوذ از قرطبی)

﴿ اَنْتَ ﴾: یہ ضمیر تاکید ہے اس ضمیر کی جو " اسکن " میں مستتر ہے، کیونکہ ضمیر متصل پر منفصل کی تاکید کے واسطہ کے بغیر عطف درست نہیں۔ اس لئے " اسکن وزوجک " نہیں کہا جا سکتا۔

﴿ وَزَوْجُکَ ﴾: لفظ زوج مذکر اور مؤنث کے درمیان مشترک ہے یعنی خاوند کو بھی زوج کہہ لیا جاتا ہے۔ اور بیوی کو بھی زوج کہہ لیا جاتا ہے۔ یہاں " زوجک " (تمہاری زوجہ) سے مراد حضرت حوا ہیں۔ جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

تاہم یہ بھی خیال رہے کہ مؤنث کے لئے لفظ " زوجة " بھی استعمال ہے۔ جیسا کہ حدیث پاک میں وارد ہے:

" عن انس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان مع احدی نسائه فمربه رجل فدعاه فجاء فقال یا فلان ھذه زوجتی فلانة فقال یا رسول اللہ من کنت اظن به فلم اکن اظن بک، فقال رسول اللہ ﷺ ان الشیطن یجری من الانسان مجری الدم " (از قرطبی)

" حضرت انس فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ اپنی ازواج میں سے ایک کے ساتھ تھے یک شخص وہاں سے گزرا تو آپ نے اسے بلایا وہ حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا اے فلاں شخص یہ میری فلاں زوجہ ہے۔ اس نے کہا یا رسول اللہ میں کون ہوتا ہوں آپ پر کوئی گمان کروں، میں نے آپ پر کوئی گمان نہیں کیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک شیطان انسان میں اس طرح سرایت کر جاتا ہے جیسا کہ خون سرایت کرتا ہے" (از قرطبی)

مقصد یہ ہے کہ اس حدیث پاک میں " زوجتی " استعمال ہے۔ لہٰذا واضح ہوا کہ مؤنث کے لئے دونوں لفظ استعمال ہیں " زوج " بھی اور " زوجة " بھی۔

﴿ الْجَنَّةَ ﴾: جنت کا ذکر پہلے تفصیلی طور پر ہو چکا ہے۔ جس کا لغوی معنی ہے باغ یہاں جس جنت کا ذکر ہے وہ وہی جنت ہے جو دار جزاء ہے:

" ولا التفات لما ذهبت اليه المعتزلة و القدرية من انه لم يكن في جنة الخلد وانما كان في جنة بارض عدن "

" معتزلہ اور قدریہ کے قول کی طرف کوئی توجہ نہ کی جائے کیونکہ ان کا کہنا باطل ہے کہ یہاں جس جنت کا ذکر ہے وہ جنۃ الخلد نہیں۔ بلکہ یہ عدن میں ایک باغ تھا جس میں حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو ٹھہرایا گیا تھا"

ان کا قول " اهبطوا " سے ہی مردود ہو جاتا ہے، کیونکہ جنت سے اتر آنے کا حکم آپ کو دیا گیا تھا معتزلہ جب ابتدائی طور پر بھٹکے تو بھٹکتے ہی رہے، کیونکہ وہ کہتے ہیں " اهبطوا " کا معنی ہے منتقل ہو جاؤ، لیکن ان کا یہ معنی کرنا بھی لغت کے خلاف ہے۔ (از قرطبی)

خیال رہے کہ آج کل معتزلہ کی ذریت معنوی بھی وہی ڈھنڈورا پیٹ رہی ہے جو انہوں نے پیٹا تھا

﴿ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ﴾: " رغدا " غین پر فتحہ ہے تاہم علامہ نخعی رحمہ اللہ نے غین کے سکون سے بھی پڑھا ہے اس کا معنی ہے "بغیر کسی مشقت کے کام کرنا، کسی کام میں وسعت کا پایا جانا، کوئی کام بغیر رکاوٹ کے کرنا۔ (از روح المعانی)

" الا كل الرغد ان ياكل ما شاء اذا شاء حيث شاء "

" رغدا " کے مفہوم میں وسعت پائی گئی ہے یعنی معنی یہ ہو گیا تم دونوں کھاؤ جو چاہو جب چاہو، جہاں سے چاہو۔ اس معنی کے لحاظ پر " حيث شئتما " تخصیص بعد از تعمیم ہو گی۔ پہلے عمومی معنی ذکر کیا پھر مکان کی وسعت بیان کی " حيث شئتما اى مكان من الجنة شئتما " جنت کے جس مقام سے جو پھل کھانا چاہو کھاؤ۔

﴿ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ ﴾: "اور تم دونوں اس درخت کے قریب نہ جانا"

﴿ فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِينَ ﴾: "مگر اس درخت کے قریب نہ جانا" کہ حد سے بڑھنے والوں میں ہو جاؤ گے۔

آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو اس خاص درخت (جس کی طرف اشارہ تھا) کے پھل کھانے

سے روکا گیا لیکن پھر بھی آپ نے پھل کھا لیا۔ جس سے بظاہر یہ سمجھ آتا ہے کہ شائد وہ دونوں (معاذ اللہ) ظالم ہو گئے۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ آدم علیہ السلام کو پہلے منصب خلافت عطاء کر دیا گیا، یعنی آپ کو نبی بنا دیا گیا تھا۔ یہ پھل کھانے کا واقع بعد میں درپیش آیا۔

انبیاء کرام صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے پاک ہیں اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی بھی یہ ہے:

﴿ لا ینال عھدی الظالمین ﴾ ''میرا وعدہ (نبوت عطاء کرنے کا) ظالموں کو نہیں پہنچے گا''

اس سے واضح ہوا کہ ظلم انبیاء کرام میں نہیں پایا جا سکتا کیونکہ ظلم انبیاء کرام کے منصب نبوت کے ہی خلاف ہے۔

" ومن نسب التعمعد والعصیان له بمعنی فعل الکبیرة او الصغیرة فقد کفر "

(صاوی ج اول ص ۴۳)

''جس شخص نے انبیاء کرام کی طرف یہ منسوب کیا کہ وہ جان بوجھ کر صغیرہ یا کبیرہ گناہ کر لیتے تھے وہ شخص کافر ہو جائے گا''

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس آیۃ کریمہ سے بھی بظاہر یہ سمجھ آ رہا ہے کہ پھل کھا کر حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا (معاذ اللہ) ظالم ہو گئے۔ اور ان کا اقرار بھی یہ ہے " ربنا ظلمنا انفسنا " اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔

اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ (معاذ اللہ) انہوں نے ظلم کیا تو کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ظلم نہیں کیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ظلم مختلف چیزوں پر بولا گیا ہے، ظلم انبیاء کرام کی طرف منسوب نہیں ہو سکتا اس کی اور وجوہ ہیں۔ اور ظلم کی نسبت ان کی طرف ہو سکتی ہے اس کی اور وجہ ہے۔ ظلم کا لغوی معنی یہ ہے " وضع الشئی فی غیر موضعه " کسی چیز کو اس کی اصل جگہ میں رکھنے کی بجائے دوسری جگہ رکھ دینا۔

ظلم چونکہ شرک پر بھی بولا گیا ہے ظلم سے مراد گناہ بھی ہے۔ ظلم سے مراد اللہ تعالیٰ کی نافرمانی قصداً کرنا بھی ہے ان معانی کے لحاظ پر ظلم کا اطلاق انبیاء کرام پر نہیں ہو سکتا۔ ان معانی کے لحاظ پر اگر کوئی شخص انبیاء کرام کی طرف ظلم کو منسوب کرے گا تو یقیناً وہ کافر ہو جائے گا۔ ہاں اگر کوئی خلاف اولیٰ (یعنی جو کام کرنا بہتر تھا اس کے خلاف) کام کر دیا تو اسے بھی ظلم کہہ لیا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک کام کرنا تھا اس کے خلاف کر دیا لیکن بھول کر کر دیا اسے بھی ظلم کہہ لیا جاتا ہے، کیونکہ وہ کام مقصد کے خلاف ہو

گیا۔ اس لئے اس پر ظلم کی تعریف " وضع الشئی فی غیر موضعه " سچی آ ئی۔ ان معانی کا لحاظ کرتے ہوئے انبیاء کرام پر ظلم کا اطلاق اگر چہ ہوسکتا ہے لیکن مطلقاً انبیاء کرام کو ظالم کہنا ظلم ہوگا اس لئے کہ صرف ظلم کے لفظ بولنے سے دھیان شرک اور گناہ اور کسی پر بے جا زیادتی کی طرف ہی جاتا ہے جس سے انبیاء کرام پاک ہیں۔

یہ بھی واضح ہے کہ آدم علیہ السلام نے اس درخت کا پھل کھایا جس سے روکا گیا تھا لیکن وہ قصداً نہیں بلکہ بھول کر وہ پھل کھایا تھا۔ آپ کی بھول پر قرآن پاک شاہد ہے:

﴿ ولقد عهدنا الى آدم من قبل فنسى ولم نجد له عزما ﴾ (پ ١٦ سورة طه آیت ١١٥)

"اور بیشک ہم نے اس سے پہلے آدم سے درخت کے قریب نہ جانے کا وعدہ لیا تو وہ بھول گئے اور ہم نے ان کا کوئی قصد نہ پایا" عصمت انبیاء کی تفصیلی بحث انشاء اللہ اگلی آیۃ کریمہ میں آ رہی ہے۔

یہاں یہ نہیں فرمایا کہ اس درخت کا پھل نہ کھانا، بلکہ یہ فرمایا کہ اس درخت کے قریب بھی نہ جانا اس کی وجہ یہ ہے کہ نہی (روکنے) کو قرب سے معلق کر کے، بہت زیادہ تاکید کر دی گئی ہے اور مبالغہ ثابت کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ قریب جانا ذریعہ ہے کھانے کا، جب قریب جانے سے منع کیا گیا ہے تو اس سے واضح ہوگیا کہ پھل کھانے سے اجتناب لازم قرار دیا گیا۔ اور اس کی ممانعت میں مبالغہ ثابت کیا گیا ہے اور اس بات پر متنبہ کیا گیا ہے کہ:

" ان القرب من الشئی یورث داعیة ومیلا یاخذ بمجامع القلب ویلهیه عما هو مقتضی العقل والشرع "

"کسی چیز کا قرب اسے حاصل کرنے کی تمنا پیدا کرتا ہے۔ اور دلی میلان اس کی طرف ہو جاتا ہے۔ اور کثرت محبت اس سے عقل و شرع کے خلاف کام کرا دیتی ہے"۔

اس پر یہ روایت بھی شاہد ہے " حبک الشئی یعمی ویصم " کسی چیز کی محبت تمہیں اندھا اور بہرا کر دیتی ہے۔ یہاں سے ہی ایک اور مسئلہ سمجھ آ گیا:

" فینبغی ان لا یحوما ما حول ما حرم الله علیها مخافة ان یقعا فیه "

"کہ مناسب یہی ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے اس کے اردگرد بھی نہ پھرو کہ کہیں اس حرام کے مرتکب نہ ہو جاؤ" (از بیضاوی)

فائدہ: جس طرح حرام چیزوں کے اسباب و ذرائع سے بھی بچنا ضروری ہے۔ تاکہ وہ حرام تک نہ

پہنچائیں۔ جیسا کہ کسی کی زمین میں کھیتی کو بچانا ضروری ہے اور کھیتی کو بچانے کیلئے اسکے اردگرد لگی ہوئی باڑ کے قریب جانے سے بھی جانوروں کو روکنا ضروری ہے۔ اسی طرح واجب چیزوں کے اسباب پر عمل کرنا بھی ضروری ہوتا ہے تاکہ واجب پر عمل کیا جا سکے، نماز فرض ہے نماز کی شرط وضو ہے وضو کرنے کیلئے پاک پانی کا حاصل کرنا حتی الوسع بھی ضروری ہے۔ نبی کریم علیہ السلام ﷺ کی تعظیم واجب ہے تو یقیناً تعظیم کے ذرائع واسباب یعنی نعت خوانی اور نبی کریم علیہ السلام ﷺ کے ذکر کی محافل، میلاد کی محافل کا انعقاد بھی ضروری ہے تاکہ ان محافل میں نبی کریم علیہ السلام ﷺ کی عظمت اور آپ کے اوصاف جمیلہ اور آپ کے معجزات وکمالات کو بیان کیا جائے جس سے لوگوں کے ایمان کی حفاظت ہو سکے۔

جس درخت سے روکا گیا وہ کون سا تھا؟

اگرچہ اس میں مختلف قول ہیں بعض حضرات نے کہا اس سے مراد انگور کی بیل ہے بعض نے کہا گندم کا پودا ہے بعض نے کہا سنبلہ (خوشبودار پودہ) ہے بعض نے کہا زیتون کا درخت مراد ہے بعض نے کہا کھجور کا درخت مراد ہے بعض نے کہا انجیر کا درخت مراد ہے۔

خیال رہے " شجرة " کا اطلاق عام ہے درختوں، بیلوں اور پودہ جات تمام پر بولا جاتا ہے:

" قال الامام ابو جعفر بن جرير رحمه الله والصواب في ذلك ان يقال ان الله عزوجل ثناؤه نهى آدم وزوجته عن اكل شجرة بعينها من اشجار الجنة دون سائر اشجارها فاكلامنها ولا علم عندي باى شجرة على التعيين لان الله لم يضع لعباده دليلا على ذلك في القرآن ولا من السنة الصحيحة " (صابونی)

"امام ابو جعفر بن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ درست یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام اور آپ کی زوجہ کو جنت کے تمام درختوں سے نہیں روکا بلکہ ایک معین درخت سے روکا، جس کا پھل آپ نے کھالیا وہ درخت کون سا تھا؟ اس کا ذکر قرآن پاک میں نہیں اور احادیث صحیحہ میں بھی نہیں البتہ ضعیف حدیثوں میں مختلف قول ملتے ہیں۔ جن کا ذکر اوپر بیان کیا جا چکا ہے"۔

اس لئے مناسب یہی کہ درخت کو معین کر کے بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور نہ ہی درخت کے معین کرنے پر مسائل موقوف ہیں اس لئے اس بحث پر پڑنے کے کوئی مقاصد نہیں۔

﴿ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴾

☆ شیطان نے جنت سے انہیں لغزش دی اور جہاں رہتے تھے وہاں سے انہیں الگ کر دیا، اور ہم نے فرمایا نیچے اترو آپس میں ایک تمہارا دوسرے کا دشمن اور تمہیں ایک وقت تک زمین میں ٹھہرنا اور برتنا ہے۔

☆ تو شیطان نے انہیں (اس درخت کے ذریعے) پھسلایا، پس ان دونوں کو وہاں سے الگ کر دیا جہاں وہ رہتے تھے، اور ہم نے کہا تم تمام اتر جاؤ، بعض تمہارے بعض کے دشمن ہوں گے اور تمہارے لئے زمین میں ٹھہرنا اور نفع حاصل کرنا ہے ایک خاص وقت تک۔

مختصر مطلب: شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو پھسلا دیا انہوں نے اس درخت کا پھل کھالیا، جس کی وجہ سے انہیں جنت سے زمین میں آنا پڑا۔

رب تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ تم تمام یہاں سے نیچے زمین پر اتر جاؤ۔ اور یہ بھی خیال رکھنا کہ بعض تمہارے بعض کے دشمن ہوں گے، یعنی دشمن سے محتاط رہنے کا حکم زمین پر اتارتے وقت ہی دے دیا گیا، اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ زمین میں ایک وقت تک تمہارا قرار ہوگا اور تمہیں نفع حاصل کرنے کا موقع ملے گا۔

اسی سے یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ جو انسان بھی روئے زمین پر آئے گا ایک وقت کے بعد اس نے جانا بھی ہے۔

تفصیلی وضاحت:

﴿ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا ﴾: تو شیطان نے جنت سے ان کو لغزش دی۔

" عنھا " میں ضمیر یا تو " شجرة " کی طرف لوٹ رہی ہے، اب معنی یہ ہوگا " حملھما علی الزلة " ان دونوں یعنی حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو وہ پھل کھانے پر برانگیختہ کیا جو ان کی لغزش کا سبب بنا۔ غزالی دوران علامہ احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ نے بھی یہی معنی کیا اور راقم نے بھی وہی نقل کیا۔

اور ایک احتمال یہ ہے کہ " عنھا " میں ضمیر، سابقہ آیۃ میں مذکور " الجنة " کی طرف لوٹ رہی ہو، تو اب معنی یہ ہوگا " تو شیطان نے جنت سے انہیں لغزش دی " اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا یہی ترجمہ ہے۔
(ماخوذ از روح المعانی)

" فازلھما " ماخوذ ہے " زلة " سے اس کے لغوی معنی سے ہی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آدم علیہ السلام کی یہ لغزش بلا ارادہ تھی۔ اسے گناہ یا ظلم سے تعبیر کرنا خود اپنی جان پر ظلم کرنا ہے۔

" الزلة فی الاصل استرسال الرجل من غیر قصد "

" بغیر ارادہ کے پاؤں کا پھسل جانا اصل میں زلة ہے "

" والمزلة مکان الزلق " " پھسلنے والی جگہ کو مزلة کہا جاتا ہے " (مفردات راغب)

پھسلنے کی وجہ واضح ہوگئی:

جب کہ زلة کا معنی ہی بلا ارادہ پھسل جانا ہے تو واضح ہو گیا کہ آدم علیہ السلام کا پھسلنا بھول کی وجہ سے تھا، جو کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا " فنسی ولم نجد له عزما " آدم بھول گئے ہم نے ان کا کوئی ارادہ نہ پایا۔

" وقاسمھما انی لکما لمن الناصحین " اور ان سے قسم کھائی کہ میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں معنی یہ ہیں کہ ابلیس ملعون نے جھوٹی قسم کھا کر حضرت آدم علیہ السلام کو دھوکا دیا اور پہلا جھوٹی قسم کھانے والا ابلیس ہی ہے حضرت آدم علیہ السلام کو گمان بھی نہ تھا کہ کوئی اللہ کی قسم کھا کر جھوٹ بول سکتا ہے اس لئے آپ نے اس کی بات کا اعتبار کیا۔ (خزائن العرفان)

شیطان اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا:

حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو جب یہ حکم دیا گیا کہ اس درخت کے قریب نہ جانا۔ شیطان

نے ان سے اس فرمان الٰہی کی نافرمانی کرانی چاہی۔ اسلئے وسوسے کی زبان میں دونوں کو کہا:

" فوسوس اليه الشيطن قال يا آدم هل ادلك على شجرة الخلد وملك لا يبلى "

''شیطان نے انہیں وسوسہ ڈالا، کہا اے آدم کیا میں تمہیں ایسا درخت نہ دکھاؤں، جس کے کھانے سے تم ہمیشہ جنت میں رہو اور تمہیں ایسی بادشاہی نصیب ہو جائے جس میں کبھی کسی قسم کی کمزوری پیدا نہ ہو''

شیطان نے ان کے دلوں میں بار بار وسوسہ پیدا کیا اور وسوسہ کی زبان میں قسم کھا کر ان کو کہا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ اس درخت کے (پھل) کھانے سے تمہارے رب نے صرف اس لئے تمہیں روکا ہے کہ تم فرشتہ نہ ہو جاؤ، یا ہمیشہ تمہیں جنت میں رہنا نصیب نہ ہو جائے۔

بالآخر دھوکہ سے انہیں اس درخت کے کھانے پر آمادہ کر لیا اور آدم وحوا نے درخت سے کھا لیا، اور کھاتے ہی ان کا جنتی لباس ان سے اتر گیا اور جنتی درختوں کے پتوں سے اپنے اپنے جسموں کو ڈھانپ لیا۔

﴿فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ﴾: ''جہاں وہ رہتے تھے وہاں سے انہیں الگ کر دیا گیا''

یعنی وہ جنت سے زمین کی طرف اتار دیئے گئے۔ یہاں تک تو شیطان کی خواہش پوری ہوگئی، لیکن اس مقصد میں وہ کامیاب نہ ہوا اس کی اصل خواہش یہ تھی کہ آدم علیہ السلام کو جو روکا گیا ہے، اس نہی کو یاد رکھتے ہوئے قصدا اس درخت سے کھائیں اور اس طرح عاصی اور نافرمان ہو کر جنت سے نکالے جائیں، اسلئے اس نے وسوسہ کی زبان میں "مانها كما ربكما عن هذه الشجرة " کہہ کر اللہ کی نہی بھی انہیں یاد دلا دی۔

لیکن عصمت الٰہیہ نے انہیں معصیت سے بچا لیا اور اس درخت کے کھانے سے پہلے نہی الٰہی کا انہیں نسیان ہو گیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا " فنسى ولم نجد له عزما " آدم بھول گئے ہم نے ان کا قصد نہ پایا۔

واضح ہوا کہ آدم علیہ السلام قصدا فرمان الٰہی کی خلاف ورزی سے بچ گئے اور شیطان اپنے اصل

مقصد میں ناکام ہوگیا، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے " ازلھما " ذکر فرمایا کہ ان کو پھسلایا، یہ نہیں فرمایا" اضلھما " ان کو بھٹکایا۔ ان کو گمراہ کر دیا۔ (از تبیان للکاظمی)

شیطان نے وسوسہ کیوں ڈالا؟

آدم علیہ السلام کو جب فرشتوں نے سجدہ کر لیا تو آپ کو اور آپ کی زوجہ کو جنت میں رہنے کا حکم ہوا اور ارشاد ہوا کہ آپ یہاں جو چاہیں بافراغت کھائیں یعنی تمہیں کسی چیز کے کھانے سے یہاں کوئی رکاوٹ نہیں۔ ہاں البتہ ایک درخت کے قریب جانے سے روک دیا گیا۔ تو اس منع کیے ہوئے درخت کی وجہ سے شیطان نے دونوں کو پھسلا دیا اور انہیں خوشحالی، بے فکری اور عیش وعشرت کے ماحول یعنی جنت سے دور کر دیا۔

وجہ اس کی یہ تھی کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے شیطان نے انکار کر دیا اور تکبر کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا " فاخرج منها فانک رجیم " تو مردود ہے یہاں سے نکل جا۔

تو شیطان کے دل میں بغض وحسد کی آگ بھڑکنے لگی اور کہنے لگا کہ جس طرح میں ذلیل وخوار کر کے نکالا گیا ہوں آدم اور حوا اور ان کی نسل کو اسی طرح جنت سے نکالوں گا، اور انہیں اس طرح گمراہ کروں گا جس طرح مجھے گمراہ کیا گیا، یعنی میں ان سے پورا بدلہ لوں گا۔

شیطان پھسلانے پر کیسے قادر ہوا:

شیطان نے جب سجدہ سے انکار کیا اسے جنت سے نکل جانے کا حکم دیا گیا۔ اسی وقت اس نے اللہ تعالیٰ سے مہلت لے لی، اگرچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ تیرا داؤ میرے مخلص بندوں پر نہیں چلے گا، اس لئے شیطان آپ سے قصداً گناہ نہ کرا سکا بلکہ صرف اس مہلت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ کے دل میں وسوسہ ڈال کر آپ کو بھلا دیا۔

شیطان انسانوں کو کیسے وسوسہ ڈالتا ہے:

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿ انه یراکم هو وقبیله من حیث لا ترونهم ﴾

''بیشک وہ (شیطان) اور اس کا قبیلہ تمہیں دیکھتا ہے جہاں سے تم اس کو نہیں دیکھ سکتے''

یعنی شیطان اوراس کے زیر اثر دوسرے چھوٹے چھوٹے شیطان جہاں کہیں بھی ہوں انسانوں کو دیکھ سکتے ہیں، اورانہیں وسوسہ میں ڈال سکتے ہیں حالانکہ انسان انہیں نہیں دیکھ رہے ہوتے

" ان الشیطان یجری من الانسان مجری الدم " (بخاری ، ابوداؤد ، ابن ماجہ ، مسند احمد)

''بیشک شیطان انسان کے اندر اپنے اثرات اس طرح جاری وساری کرسکتا ہے، جیسے آدمی کی رگوں میں خون جاری ہوتا ہے'' (از تبیان للکاظمی)

شیطانی وسوسہ کے اثر ہونے یا نہ ہونے کے لحاظ سے لوگوں کی پانچ قسمیں:

انسان جسم اور روح کا مجموعہ ہے، روح عالم قدس کی ایک لطیف مخلوق ہے، جس میں عالم بالا کے حقائق وکمالات اور تمام منافع پائے جاتے ہیں، اور جسم کی تخلیق مٹی سے ہوئی اس لئے اس میں مادی اثرات اور خصوصیات اور زمین کی مخلوقات والے کمالات پائے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا خلیفہ بننے کی استعداد ہر انسان کو جسم اور روح کے ضمن میں عطاء ہوئی، لیکن شیطان نے انسان کو جواس نعمت سے محروم کرنے کی کوشش کی ہے اس کے نتیجہ میں انسانوں کے پانچ گروہ بن گئے۔

پہلا گروہ: وہ ہے جو پوری طرح شیطان کے قبضہ میں آکر خلافت الٰہیہ سے بغاوت کر بیٹھا اس نے خلافت الٰہیہ کی استعداد بالکل ضائع کردی۔ اللہ تعالیٰ کی توحید اور اسکی معرفت سے اس کا کوئی تعلق نہ رہا۔ دونوں جہانوں کی نیک نیتی اور ہمیشہ کی نجات کی راہوں سے دور جا پڑا۔ کوئی روحانی کمال حاصل کرنے کی اس میں طاقت نہ رہی۔ یہاں تک کہ مادی فوائد جاننے اور انہیں حاصل کرنے سے بھی وہ محروم رہا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو عقل وخرد سے خالی ہیں۔ جاہل، کافر اور مشرک ہیں۔

دوسرا گروہ: وہ ہے جس میں استعداد تو باقی رہی مگر شیطان کے بھٹکانے سے بھٹک گیا اور روحانی استعداد کو ضائع کردیا۔ اس لئے روحانی تقاضوں کو بروئے کار لانے سے وہ محروم ہوگیا، معرفت الٰہیہ تو درکنار اللہ تعالیٰ کی ہستی سے بھی منکر ہوگیا۔ اس نے صرف جسم اور مادہ کو اپنا مقصد بنالیا اور اپنی بقیہ استعداد کا رخ مادیات ہی کی طرف موڑ دیا، وہ عقل کی پیچیدگیوں میں گم ہوکر رہ گئے۔

بعض نے جدید انکشافات اور مادی ایجادات میں بہت بڑی کامیابی حاصل کرلی، بیشمار مفید چیزیں ایجاد کیں۔ فضاء میں اڑنے والے طیارے، خلانورد سیارے کے ذریعے زمین وآسمان تک رابطہ

قائم کرلیا، حیرت انگیز آلات ایجاد کرلئے اب ان کی ترقی کا آخری مرحلہ یہ ہے کہ انہوں نے بنی نوع انسان کی ہلاکت کے لئے ہزاروں میل تک مار کرنے والے میزائل تیار کرلئے، ایٹم بم، نیپام بم بنانے، آواز سے زیادہ تیز رفتار ہوائی جہاز تیار کئے جن کے ذریعے چند سکینڈ میں روئے زمین کو ہلاکت خیز منظر میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اور ایٹم بموں کے ذریعے کرۂ ارض (زمینی کرہ) کو آنکھ جھپکنے کی مقدار میں اڑا کر تباہ و برباد کردینا آسان ہے، خلافت الٰہیہ کی وہ استعداد جو بنی نوع انسان کی جسمانی، روحانی، دینوی اخروی فوائد کے لئے تھی، اسے انسانوں کے ہلاک کردینے والے آلات کے لئے وقف کردیا گیا۔

اب معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ ان ہتھیاروں کو ایجاد کرنے والے خود اپنے آپ کو ان کی زد میں محسوس کررہے ہیں۔ انہیں ہر وقت یہ خطرہ لاحق ہے کہ ہمارے ہی ایجاد کئے ہوئے آلات نہ معلوم کس وقت ہم پر پھٹ پڑیں اور کرۂ ارض کے ساتھ ہم بھی لقمہ اجل بن کر نہ رہ جائیں۔

تیسرا گروہ: وہ ہے جن میں استعداد تو موجود تھی مگر شیطان کے ورغلانے کا اتنا اثر ان پر ضرور ہوا کہ وہ غفلت اور سستی کا شکار ہوگئے کہ اپنی استعداد کو پوری طرح بروئے کار نہ لائے، یہ وہ عام مسلمان لوگ ہیں جنہوں نے قدرے قلیل جسمانی اور روحانی منافع حاصل کئے مگر اپنی صلاحیتوں کو پوری طرح کام میں نہ لانے کی وجہ سے روحانیات یا مادیات پر کامل تصرف حاصل نہ کرسکے۔ بیشک وہ منصب خلافت پر فائز نہیں ہوئے مگر انہوں نے خلافت الٰہیہ سے بغاوت بھی نہیں کی۔ یعنی ایمان سے ہاتھ نہیں دھوئے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ اس گروہ میں پھر دو قسمیں ہیں ایک وہ جن پر شیطان کا اثر کم ہے اور دوسرے وہ جن پر شیطان کا بہت زیادہ اثر ہوتا ہے اگرچہ ایمان سے دور تو نہیں ہوتے لیکن بہت زیادہ گناہوں میں مبتلاء ہوجاتے ہیں۔

چوتھا گروہ: اللہ کے ان خاص بندوں کا ہے جن میں اللہ تعالیٰ کی عطا فرمائی ہوئی جسمانی، روحانی، علمی، عملی پوری استعداد موجود تھی، اور شیطان کے بھٹکانے کا ان کو کوئی نقصان نہ پہنچ سکا۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو مخاطب فرما کر پہلے ہی فرمادیا تھا " **ان عبادی لیس لک علیهم سلطن** " بیشک میرے خاص بندوں پر تجھے کوئی غلبہ حاصل نہ ہوگا۔

یہ مقدس گروہ انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام اور ان کے متبعین کاملین پر مشتمل ہے جنہوں نے

اللہ تعالیٰ کی عطاء فرمائی ہوئی استعداد کو پوری طرح کام میں لا کر خلافت الٰہیہ کے منصب کو پایا۔ حکمت و مصلحت کے مطابق روحانیات و مادیات پر متصرف ہوئے اور خلافت الٰہیہ کے تقاضوں کو انہوں نے صحیح معنوں میں پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

<u>پانچواں گروہ:</u> وہ ہے جس نے اپنے خیال میں صرف روح اور اس کے تقاضوں کو پیش نظر رکھا اور جسمانیات اور مادیات کو نظر انداز کر دیا یہ وہ تارک الدنیا لوگ ہیں جو اپنے اپنے خیال کے مطابق ریاضت و مجاہدہ میں مشغول رہے۔ ان میں کچھ وہ ہوتے ہیں جن کا اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان ہوتا ہے وہ شیطان کی بھٹکانے سے محفوظ رہتے ہیں۔ اور کچھ وہ ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان نہیں رکھتے ان کو شیطان نجات کی راہ سے مکمل طور پر ہٹا دیتا ہے اپنی ریاضت اور مجاہدہ سے کسی نے فائدہ اٹھا کر روحانیت کو حاصل کر لیا، البتہ دنیاوی اور مادی منافع سے محروم رہے اور کسی کو اپنے خیال کے مطابق اپنی کی ہوئی ریاضت و مجاہدہ سے نہ روحانیت ملی اور نہ ہی دنیاوی اور مادی منافع حاصل ہوئے۔

(ماخوذ از تبیان للکاظمی)

شیطان نے کہاں سے وسوسہ والی گفتگو کی:

شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا سے جو کلام کیا وہ صرف وسوسہ ڈالا، جس وسوسہ میں بہت زیادہ قوت پائی گئی تھی کیونکہ اس نے قسم اٹھا کر آپ کو وسوسہ ڈالا:

" وقیل خاطبه من الارض ولم يصعد الى السماء بعد الطرد واللعن وكان خطابه وسوسة "

(تفسیر بحر محیط ج ١ ص ١٦)

''اس نے زمین سے ہی آپ سے خطاب کیا یعنی زمین سے ہی وسوسہ والی گفتگو کی۔ کیونکہ جب سے اسے جنت سے نکال دیا گیا اور ملعون قرار دے دیا گیا پھر وہ آسمانوں پر نہ چڑھ سکا، کیونکہ اسے آسمان پر جانے کی اجازت ہی نہیں تھی''۔

قرآن پاک اور حدیث پاک میں کہیں بھی ذکر نہیں کہ شیطان حضرت آدم علیہ السلام کے پاس جنت میں پہنچا ہو۔ کیونکہ قرآن پاک میں صرف اسکے وسوسہ ڈالنے کا ذکر ہے " فوسوس لهما الشيطن " ان دونوں کو شیطان نے وسوسہ میں ڈال دیا۔ شیطان کو وسوسہ ڈالنے کیلئے جنت میں جانا ضروری ہی نہیں تھا۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ شیطان جسے وسوسہ ڈالے وہ شیطان کو دیکھے بھی۔

" ان الشیطن یجری من الانسان مجری الدم "

''بیشک شیطان انسان میں ایسے سرایت کر جاتا ہے جیسے خون سرایت کئے ہوئے ہے''

تنبیہ: جن اقوال میں شیطان کا سانپ کے ذریعے یا مور کے ذریعے جنت میں جانے کا ذکر ہے وہ اقوال درست نہیں بلکہ اسرائیلی روایت ہیں۔

ابن کثیر میں ہے: " قد ذکر المفسرون ھھنا اخبار الا سرائیلیة "

یہاں مفسرین نے کئی اسرائیلی روایات کو ذکر کر دیا ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے بھی یہی بیان کیا ہے:

" اعلم ان ھذا وامثاله مما یجب ان لا یلتفت الیه " (کبیر)

''ضروری ہے کہ اس قسم کی روایات کی طرف بالکل توجہ نہ کی جائے''

اس بحث کو مد نظر رکھتے ہوئے آنے والے (اسی آیۃ مبارکہ کے) الفاظ مبارکہ کو سمجھنا آسان ہوگا۔

﴿ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ﴾:

" (وقلنا اهبطوا) الی الارض ای انتما بما اشتملتما علیه من ذریتکما (بعضکم) بعض الذریة (لبعض عدو) من ظلم بعضهم بعضا " (جلالین)

'' یہ حکم حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو ہے کہ تم دونوں زمین پر اتر جاؤ۔ البتہ " اھبطوا " جمع کا صیغہ اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ ان کو مع ان کی ذریت، (جو ابھی تک آدم علیہ السلام کی صلب میں تھی) کے زمین پر اترنے کا حکم دیا۔ "بعضکم لبعض عدو" کا مطلب بھی یہی ہے کہ تمہاری اولاد میں سے بعض لوگ بعض کے دشمن ہوں گے''۔

تنبیہ: تفسیر خازن میں ہے (اور دیگر کئی تفاسیر میں بھی ہے)" (وقلنا اھبطوا) ای انزلوا الی الارض یعنی آدم وحوا وابلیس والحیة " اور ہم کہا نے اتر جاؤ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا اور ابلیس اور سانپ کو حکم دیا کہ تم زمین پر اتر جاؤ۔

اسی طرح ﴿ بعضکم لبعض عدو ﴾ کا مطلب تفسیر خازن میں یوں ذکر کیا گیا ہے:

" (بعضکم لبعض عدو) یعنی العداوة التی بین المؤمنین من ذریة آدم و بین ابلیس والیه الاشارة بقوله عزوجل ان الشیطان لکم عدو

فاتخذوہ عدوا "

"اس آیۃ میں جس عدوات کا ذکر ہے اس سے مراد یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو کہا گیا ہے کہ تمہاری اولاد میں سے مومن حضرات اور ابلیس کے درمیان عدوات ہوگی۔ اسی لئے رب تعالیٰ نے دوسرے مقام پر فرمایا"۔

ترجمہ: بیشک شیطان تمہارا دشمن ہے اس کو دشمن پکڑو، یعنی شیطان کو دشمن سمجھو تا کہ اس سے اپنے آپ کو بچا سکو۔

" والعداوة التی بین ذریة آدم والحیة " اسی طرح آیۃ کریمہ میں جس عداوت کا ذکر ہے اس سے مراد وہ عداوت ہے جو آدم علیہ السلام کی اولاد اور سانپ کے درمیان ہے جس عداوت کا ذکر احادیث مبارکہ میں پایا گیا ہے۔

☆ " عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من ترک الحیة مخافة طلبھن فلیس منا ما سالمنا ھن منذحا ربنا ھن " (ابو داؤد)

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے سانپ کو چھوڑ دیا اس خوف سے کہ وہ اسے طلب کریں گے تو وہ ہم سے نہیں کیونکہ ہم نے ان سے صلح نہیں کی جب سے ان سے لڑائی کی"۔

حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ سانپ کو دیکھو تو اسے قتل کر دو، یہ خوف نہ کرو کہ وہ تم پر حملہ کرے گا، اگر تم نے ایسا کیا تو تمہارا قرب ہم سے نہیں ہوگا، کیونکہ سانپ انسان کا دشمن ہے، ہم نے اسے ہمیشہ اپنا دشمن ہی سمجھا ہے کبھی اسے اپنا دوست نہیں سمجھا۔

☆ " عن ابن مسعود ان رسول اللہ ﷺ قال اقتلوا الحیات کلھن فمن خاف من ثارھن فلیس منی " .... وفی روایة اقتلوا الکبار کلھا الا الجان الابیض الذی کانه قضیب فضة " (مسلم)

"حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمام سانپوں کو قتل کرو جو ان کے انتقام (حملہ کرنے، ڈسنے) سے خوف رکھے وہ ہم سے نہیں"

ایک روایت میں ہے تمام بڑے سانپوں کو قتل کرو سوائے چھوٹے سفید سانپوں کو جو چاندی کی چھڑی کی طرح ہوں۔

☆ " عن ابی سعید الخدری ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ان بالمدینۃ جنا قد اسلموا فاذا رأیتم منھم شیأ فآذنوہ ثلاثۃ ایام فانہ بدا لکم بعد ذلک فاقتلوہ فانما ھو شیطان ....وفی روایۃ ان بھذہ البیوت عوامر فاذا راأیتم عنھا شیأ فحرجوا علیہ ثلاثا فان ذھب والا فاقتلوہ فانہ کافر " (مسلم)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مدینہ طیبہ میں جن رہتے ہیں جنہوں نے اسلام قبول کرلیا، اگران میں سے کوئی تمہارے سامنے ظاہر ہوتو اسے تین دن رہنے کی اجازت دو (اگروہ چلا جائے تو درست ہے) ورنہ اسے قتل کردو کیونکہ وہ شیطان ہے.........ایک روایت میں ہے ان گھروں میں رہنے والے ہیں، جب تم ان میں سے کسی کو دیکھوتو اس پر حرج پیش کرو (اسے ڈراؤ) تین دن تک، (اگر چلا جائے تو ٹھیک) ورنہ اسے قتل کردووہ کافر ہے۔ (خازن)

" قال العلماء معناہ واذا لم یذھب بالانذار علمتم انہ لیس من عوامر البیوت ولا ممن اسلم من الجن بل ھو شیطان فلاحرمۃ لکم فاقتلوہ ولن یجعل اللہ لہ سبیلا للانتصار علیکم بثارہ بخلاف العوامر ومن اسلم واللہ اعلم " (نووی علی المسلم ج ۲ ص ۲۱۳)

''علماء نے بیان کیا ہے کہ جب وہ تمہارے ڈرانے سے بھی نہ جائیں توتم جان لوکہ وہ گھروں میں رہنے والے نہیں اور نہ ہی ان سے ہیں جوجنوں میں سے اسلام لائے ہیں۔ بلکہ وہ شیطان ہے۔لہٰذا اس کو (نہ قتل کرنے کی) کوئی حرمت حاصل نہیں بلکہ اس کوقتل کردو، کیونکہ اس کے ڈسنے اور حملہ کرنے کے پیش نظر اسے قتل کردیا جائے، البتہ جوگھروں میں رہنے والے (سانپ) اور جنوں میں سے اسلام لانے والے (سانپ) ان کوتین دنوں کی مہلت دی جائے اور ڈرایا جائے وہ چلے جائیں توٹھیک ورنہ ان کوبھی قتل کردیا جائے''

ڈرانے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کوکہا جائے:

" انشدکن بالعھد الذی اخذ علیکن سلیمان بن داؤد ان لا تؤذونا ولا تظھرن لنا "

''میں تمہیں وہ وعدہ یاد دلاتا ہوں جوتم سے سلیمان علیہ السلام نے لیا تھا کہ تم ہمیں کوئی ایذاء (تکالیف) نہیں پہنچاؤ گے اورنہ ہی ہم پر ظاہر ہوگے'' (نووی ج ۲ ص ۲۴۲)

خازن کی اس بحث کے متعلق عرض یہ ہے کہ یہ ساری بحث اس وقت صحیح ہو سکتی ہے جب یہ صحیح روایت سے ثابت ہو کہ ابلیس سانپ کے منہ میں داخل ہو کر جنت میں گیا اور حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو پھسلایا۔

لیکن جیسا کہ پہلے البحر المحیط کے حوالہ سے ثابت کیا جا چکا ہے کہ ابلیس نے زمین سے ہی وسوسہ ڈالا۔ اور ابن کثیر اور تفسیر کبیر سے ثابت کیا جا چکا ہے کہ یہ روایات غیر معتبر ہیں تو واضح ہوا کہ اترنے کا حکم حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو بمع ان کی ذریت کے دیا گیا، اسی لئے صیغہ جمع کا استعمال ہوا اور اس آیت میں جو یہ بیان کیا گیا ہے کہ بعض تمہارے بعض کے دشمن ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ تمہاری اولاد بعض، بعض کے دشمن ہو گی۔

یہ بھی خیال رہے کہ مسئلہ اس آیت کے متعلق بیان ہو رہا ہے کہ اس آیت میں دشمنی سے مراد ابلیس یا سانپ کی دشمنی نہیں، یہ نہیں بیان کیا جا رہا کہ ابلیس مؤمنین کا دشمن نہیں، ابلیس کی دشمنی قرآن پاک کی آیت سے واضح طور پر ثابت ہے جو خازن کے حوالہ سے ذکر ہو چکی ہے۔ اسی طرح یہ بھی بیان نہیں کیا جا رہا کہ سانپ انسانوں کا دشمن نہیں وہ تو احادیث سے ثابت ہے۔

تفسیر مدارک میں بہت خوب بیان کیا گیا:

" (وقلنا اهبطوا) الهبوط النزول الى الارض والخطاب لآدم وحوا وابليس والحية والصحيح لآدم وحوا والمراد هما وذريتها لما كانا اصل الانس ومنشعبهم جعلا كانها الانس كلهم ويدل عليه قوله تعالى قال اهبطا منها جميعا (بعضكم لبعض عدو) المراد به ما عليه الناس من التباغي والتعادي وتضليل بعضهم لبعض "

" قلنا اهبطوا " میں اترنے کا حکم آدم علیہ السلام اور حضرت حوا اور ابلیس کو ہے۔ بعض نے کہا سانپ کو بھی حکم دیا گیا کہ زمین پر اتر جاؤ۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ حکم حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو ہے۔ اس سے مراد وہ دونوں اور ان کی اولاد ہے، کیونکہ یہ دونوں تمام انسانوں کے اصل ہیں۔ اور باقی تمام انسان ان کی ہی اولاد ہیں، اس لئے ان دونوں کو ہی تمام انسانوں کا اصل ہونے کی وجہ سے تمام

انسان ہی سمجھ لیا گیا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا دوسرا ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے ﴿ قال اهبطا منها جميعا ﴾ رب تعالیٰ نے فرمایا تم دونوں ایک ساتھ ہی اتر جاؤ۔ چونکہ واقع ایک ہی ہے اس لئے ایک جگہ جب تثنیہ کا صیغہ ہے دو کو حکم ہے تو یقیناً دوسری جگہ جو جمع کا صیغہ ہے وہ بھی حکم دو ہی کو ہے البتہ ان کی تمام ذریت کو ساتھ ملا کر جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے " بعضكم لبعض عدو " سے مراد یہ ہے کہ بعض لوگ بعض پر بغاوت کریں گے، دشمنی کریں گے اور بعض لوگ دوسرے بعض کو راہ راست سے بھٹکائیں گے۔

﴿ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلَى حِينٍ ﴾ :

"مستقر کا معنی" موضع استقرار" قرار کی جگہ" ومتاع ...... المتاع ما يستمتع به من اكل ولبس وحياة وحديث وانس وغير ذلك " متاع کا معنی یہ ہے کہ نفع حاصل کرنا کھانے، پینے، لباس، زندگی، کلام کرنے اور انس پکڑنے وغیرہ سے " الی حین " ایک وقت تک، اس سے مراد موت ہے۔

اب مطلب یہ ہو گیا کہ تم نے زمین میں رہنا ہے اور نفع حاصل کرنا ہے موت تک، اسی سے واضح ہو کر دیا گیا تھا کہ تمہاری زندگی دائمی نہیں ہو گی بلکہ اس نے ختم ہونا ہی ہے۔

" وقال السدی " مستقر " یعنی القبور، علامہ سدی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ مستقر کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں قبروں میں جائے قرار حاصل ہو گی۔ اس معنی کے لحاظ سے "الی حین" کا معنی ہو گا قیامت تک یعنی تمہیں قبروں میں قیامت تک رہنا ہو گا۔ (از قرطبی)

اس معنی کے لحاظ سے "متاع" کا معنی بھی واضح ہو گا کہ تمہیں قبروں میں نفع حاصل ہو گا، رزق، جنت کی ہوا، جنت کی خوشبو وغیرہ لیکن اس میں مؤمنین کی تخصیص ہو گی۔

فائدہ عظیمہ:

" وانما كان اخراجهما من الجنة الى الارض لانهما خلقا منها لآدم وليكون آدم خليفة في الارض ولم يقصد ابليس لعنه الله اخراجه منها وانما قصد اسقاطه من مرتبته وابعاده كما ابعد هو فلم يبلغ مقصده ولا ادرك مراده بل ازداد سخنة عين وغيظ نفس وخيبة ظن " (قرطبی)

حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو جنت سے نکالنے کی دراصل وجہ ہی یہ تھی کہ بیشک وہ دونوں زمین سے ہی پیدا کئے گئے تھے یعنی آدم علیہ السلام کو زمین سے اور حضرت حوا کو آپ کی پسلی سے پیدا کیا گیا۔ اور آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا ﴿ انی جاعل فی الارض خلیفه ﴾ بیشک میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔ تو یقیناً آپ کو زمین میں بھیجنا ہی تھا تاکہ آپ کو زمین میں منصب خلافت حاصل ہو سکے۔

شیطان لعین کا مقصد بھی آپ کو صرف جنت سے نکالنا نہیں تھا بلکہ وہ تو چاہتا تھا کہ آپ کے مرتبہ کو کم کر دیا جائے اور ان کو بھی اللہ تعالیٰ اپنے قرب سے اسی طرح دور کر دے جس طرح مجھے دور کر دیا گیا لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ بلکہ اس کی آنکھ کو گرمی حاصل ہوئی اس کے نفس میں غصہ بڑھا، اس کا گمان فاسد ہو گیا کہ آدم علیہ السلام کی توبہ کو قبول کر کے ان کو منصب خلافت پر فائز کر دیا گیا۔

قرطبی کے اسی قول پر حاشیہ جلالین میں بیان کیا گیا آپ کو جنت سے اتارنے اور زمین پر ٹھہرانے کی وجہ ہی یہ تھی کہ حکمت ازلیہ ظاہر ہو اور آپ کی نسل پھیلے ان کے اعمال پر اخروی ثواب وعذاب مرتب ہو، کیونکہ جنت اور جہنم دار تکلیف نہیں۔

ابو مدینہ قدس سرہ سے پوچھا گیا کہ آدم علیہ السلام نے کس طرح وہ پھل کھا لیا تھا جس سے رب تعالیٰ نے منع فرمایا تھا؟ تو آپ نے بھی یہی جواب دیا کہ منشا ایزدی یہی تھا کہ رب تعالیٰ نے آپ کو زمین پر اتار کر ہی مخلوق کا نظام قائم کرنا تھا، یہی وجہ آپ کے بھولنے کی اور درخت کے پھل کو کھانے کی ہوئی۔

اس تمام واقعہ کی جو ان کے کلام سے سمجھ آ رہا ہے کیا خوب حکمت کیا ایمان افروز کلام فرمایا آپ فرماتے ہیں:

" لو کان ابونا یعلم انه یخرج من صلبه مثل محمد ﷺ لصاریا کل عرق الشجرة فکیف ثمرها یسارع فی الخروج علی وجه الارض لیظهر الکمال المحمدی و الجمال الاحمدی "

(روح البیان)

" اگر ہمارے باپ آدم علیہ السلام کو اس وقت یہ معلوم ہوتا کہ درخت کے پھل کھانے سے مجھے زمین میں جانا پڑے گا اور میرے زمین پر جانے سے ہی محمد ﷺ میری اولاد میں سے زمین پر ظاہر ہوں گے، تو صرف پھل ہی کیا آپ درخت کی ٹہنیاں بھی کھا جاتے تاکہ جنت سے

نکل کر جلدی زمین پر پہنچ جائیں کہ آپ کی ذریت میں کمال محمدی اور جمال احمدی کا ظہور ہو"
(از حاشیہ جلالین)

حضرت آدم وحوا علیہما السلام کا زمین پر تشریف لانا:

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ فاخرجهما مما كان فيه ﴾ اور جہاں رہتے تھے وہاں سے انہیں الگ کر دیا گیا۔

یعنی جنت میں حضرت آدم وحوا علیہما السلام دونوں کو رہنے کی اجازت دی گئی اور ہر قسم کے جنت کے پھل اور نعمتیں کھانے کی اجازت دی گئی، البتہ ایک درخت سے منع کیا گیا، جب شیطان خیر خواہ بن کر، قسمیں اٹھا کر نصیحت دینے والے کی شکل میں آپ کو وسوسہ ڈالنے میں کامیاب ہو گیا تو آپ کو جنت اور جنت کی نعمتوں سے الگ ہونا پڑا۔ اور اللہ تعالیٰ نے حکم دے دیا ﴿ وقلنا اهبطوا بعضكم لبعض عدو ﴾ اور ہم نے کہا تم تمام اتر جاؤ بعض تمہارے بعض کے دشمن ہیں اور دوسرے مقام پر فرمایا ﴿ وقال اهبطا منها جميعا ﴾ اور رب نے فرمایا تم دونوں مل کر جنت سے اتر جاؤ۔

دونوں آیتوں کا مقصد یہ ہے کہ حضرت آدم وحوا کو مع ان کی اولاد کے جو قیامت تک معرض وجود میں آنی تھی زمین پر ان کو اترنے کا حکم دے دیا گیا اور فرمایا تمہاری اولاد بعض دوسرے بعض کی دشمن ہوگی۔

خیال رہے کہ شیطان ان دونوں کے اتارنے سے پہلے ہی مردود کر کے روئے زمین پر بھیج دیا گیا تھا، یہاں اس کے اترنے کا ذکر نہیں، آدم علیہ السلام جب زمین پر تشریف لائے، آپ کا جنتی لباس اتار لیا گیا تھا اور جنت کے درختوں کے پتے اپنے جسم پر ڈھانپ کر تشریف لائے۔

آدم علیہ السلام کو سراندیپ (ہندوستان میں ایک جگہ کا نام) میں اتارا گیا اور حضرت حوا کو جدہ میں اور شیطان کو پہلے ہی ایلہ میں اتار دیا گیا تھا۔ (از روح المعانی)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہندوستان کی زمین اس لئے عمدہ اور ہری بھری ہے اور عود قرنفل وغیرہ خوشبوئیں اس لئے وہاں پر پیدا ہوتی ہیں کہ آدم علیہ السلام جب اس زمین پر آئے تو ان کے جسم پر جنتی درخت کے پتے تھے، وہ پتے ہوا سے اڑ کر جس درخت پر پہنچے وہ ہمیشہ کے لئے خوشبودار ہو گیا۔
(حاکم و بیہقی بروایت ابن عباس بحوالہ عزیزی)

آدم علیہ السلام زمین پر اپنے ساتھ کیا لائے:

حضرت آدم علیہ السلام جنت سے مختلف قسم کے بیج اور تین قسم کے پھل، اور حجر اسود (سیاہ پتھر جو خانہ کعبہ میں لگا ہوا ہے) اور وہ عصا جو بعد میں موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا، جس کی لمبائی دس ذراع تھی، اپنے ساتھ لے کر آئے تھے اور کچھ سونا، چاندی اور کچھ کھیتی باڑی وغیرہ کے اوزار بھی ساتھ لائے آدم علیہ السلام اس قدر گریہ وزاری میں مشغول ہوئے کہ ان تخموں سے بے خبر ہو گئے، شیطان نے موقع پا کر ان کو اپنا ہاتھ لگایا وہ زہریلا ہو گیا اور جو اس کے ہاتھ سے محفوظ رہا اُن کا نفع برقرار رہا۔

سیدنا آدم علیہ السلام کے ساتھ تیس قسم کے پھل آئے جو پہلے زمین میں نہیں تھے۔ ان کی تین قسمیں ہیں ایک وہ ہیں جو سارے کھالئے جاتے ہیں جیسا کہ انگور وغیرہ اور ایک وہ ہیں جن کا اوپر کا حصہ کھالیا جاتا ہے اور گٹھلی کو پھینک دیا جاتا ہے جیسے آدم، خوبانی وغیرہ اور بعض وہ ہیں جن کے اوپر حصہ کو پھینک دیا جاتا ہے اور اندرونی حصہ کھالیا جاتا ہے جیسا کہ کیلا، مالٹا وغیرہ۔ اور آدم علیہ السلام جب جنت سے زمین پر آئے تو آپ ساتھ ہی کچھ لوہے کے اوزار بھی لائے، یعنی ان کے ساتھ سنڈاسی جس سے لوہا پکڑتے ہیں ہتھوڑا، ارن تھے۔

یہ بھی خیال رہے کہ جب حجر اسود جنت سے آیا اس کی بہت روشنی تھی ان شعاؤں کی روشنی جہاں تک پہنچی وہاں تک حرم کی حدود کو قائم کر دیا گیا۔

(از عزیزی)

نام محمد ﷺ سے دل کو تسلی:

حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا میں آ کر بہت وحشت اور گھبراہٹ ہوئی، حضرت جبرائیل علیہ السلام بحکم الٰہی زمین پر آئے اور آپ نے بلند آواز سے اذان کہی۔ حضرت آدم علیہ السلام نے جب اذان میں نبی کریم ﷺ کا اسم گرامی سنا تو ان کی وہ وحشت اور گھبراہٹ جاتی رہی۔ (از عزیزی)

حضرت آدم علیہ السلام کا ذریعہ معاش:

آدم علیہ السلام نے سب سے پہلے کپڑا بننے کا کام کیا۔ اور بعد میں آپ کھیتی باڑی کے کام میں مشغول ہو گئے۔ نوح علیہ السلام کا ذریعہ معاش لکڑی کا کام تھا، یعنی آپ نے بڑھئی کا پیشہ اختیار فرمایا۔

حضرت ادریس علیہ السلام درزی کا کام کرتے تھے۔ حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام تجارت کرتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کھیتی باڑی کرتے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کچھ مدت بکریاں چرائیں۔ داؤد علیہ السلام زرہ بناتے تھے۔ سلیمان علیہ السلام اتنے بڑے عظیم بادشاہ ہونے کے باوجود درختوں کے پتوں سے پنکھے اور زنبیلیں وغیرہ بنا کر گزر کرتے تھے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے کوئی پیشہ اختیار نہ فرمایا، بلکہ ہمیشہ سیر کرتے رہتے تھے اور فرماتے تھے کہ جس نے مجھے صبح کا کھانا دیا ہے وہی شام کا کھانا بھی دے گا۔ (از عزیزی)

فائدہ: حضرت آدم علیہ السلام نے کنوئیں کا پانی کبھی نہیں پیا بلکہ آپ ہمیشہ بارش کا پانی پیا کرتے تھے۔ سب سے پہلے آدم علیہ السلام نے چاندی سے روپے اور سونے سے اشرفیاں بنائیں۔ (از عزیزی)

اعتراض: ابھی تک جو تم نے بیان کیا ہے اس سے یہ ثابت کیا ہے کہ آدم علیہ السلام بھول گئے آپ سے کوئی خطا نہیں ہوئی حالانکہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ وعصی آدم ربہ فغوی ﴾ کا کئی مترجمین نے ترجمہ کرتے ہوئے "عصی" کا معنی حکم ٹالا۔ نافرمانی کی آپ سے قصور ہوا کیا ہے اور "غوی" کا معنی "راہ سے بہکا" گمراہ ہوئے غلطی میں پڑ گئے راہ راست سے بھٹک گیا کیا ہے، تو کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ آدم علیہ السلام سے صرف بھول واقع ہوئی، آپ نے کوئی جرم اور گناہ نہیں کیا؟

جواب: عام مترجمین نے یہاں معنی صحیح نہیں بیان کیا دیکھئے اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے یہ ترجمہ کیا ہے۔ "آدم سے اپنے رب کے حکم میں لغزش واقع ہوئی جو مطلب چاہا تھا اس کی راہ نہ پائی" اس ترجمہ سے واضح ہو رہا ہے کہ یہ لغزش بھول کر تھی اس میں کوئی گناہ یا بھٹکنے والی بات نہیں تھی۔ معترض نے جو آیت پ ۱۶ سے پیش کی اسی کی تفسیر میں علامہ رازی رحمہ اللہ نے کبیر میں یہ ذکر فرمایا:

"ان ظاهر القرآن وان دل على ان آدم عصى و غوى لكن ليس لاحد ان يقول ان آدم كان عاصيا غاويا"۔

"یعنی بے شک ظاہر قرآن پاک اگرچہ دلالت کرتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے عصیان وغوایت واقع ہوئے، لیکن کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ وہ یہ کہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے حکم ٹالا، وہ گمراہ ہوئے، بھٹک گئے"۔

مقصد یہ ہے کہ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ نے استعمال فرمائے ہیں۔ جس کو حق پہنچتا ہے وہ اپنے بندے کے حق میں جو الفاظ استعمال کرے، لیکن وہی حقیقۃً ان کے معانی سے بھی آگاہ ہے۔

اسی مقام پر علامہ آلوسی رحمہ اللہ روح المعانی میں تحریر فرماتے ہیں:

"وقد صرح القاضی ابوبکر بن العربی بعدم جواز نسبة العصیان للآباء الادنین الینا المماثلین لنا فیکیف یجوز نسبة للانبیاء الاقدام والنبی المقدم المکرم وارتضی ذلک القرطبی"

"قاضی ابوبکر بن العربی نے واضح طور پر بیان کیا ہے کہ عصیان یعنی نافرمانی، بھٹک جانا، بہک جانا، گمراہ ہو جانا، اس قسم کے الفاظ کی نسبت جب ہم اپنے والدین، آباء واجداد کی طرف نہیں کر سکتے جو انسانیت میں ہمارے مماثل ہیں اور انبیاء کرام سے گھٹیا ہیں تو ایسے الفاظ کی نسبت انبیاء کرام اور خصوصاً حضرت آدم علیہ السلام کی طرف کیسے ہو سکتی ہے۔ جو برگزیدہ مکرم اور ہر طرح تعظیم وتکریم کے لحاظ سے مقدم ہیں"۔

معالم التنزیل میں ہیں: "واعلم انه لا یجوز اطلاق العاصی وغیرہ علی آدم علیه السلام" یہ یقینی بات ہے کہ آدم علیہ السلام پر عاصی وغیرہ (نافرمان ہوا، بہک گیا، گمراہ ہوا) کے الفاظ کا اطلاق جائز نہیں۔

لفظ نبی انبیاء کرام کی رفعت شان پر دلیل ہے:

"النبی وهو لفظ منقول فی العرف عن مسماه اللغوی الی معنی عرفی اما المعنی اللغوی فقیل هو المنبئ واشتقاقه من النبافهو النبأ فهو حینئذ مهموز لکنه یخفف ویدغم وهذا المعنی حاصل لمن اشتهر بهذا الاسم لانبائه عن الله تعالیٰ وقیل مشتق من النبوة وهو الارتفاع یقال ینبی فلان اذا ارتفع وعلا والرسول عن الله موصوف بذالک لعلو شانه وسطوع برهانه وقیل من النبی وهو الطریق لانه وسیلة الی الله واما مسماه فی العرف فهو عند اهل الحق من قال له الله تعالیٰ ممن اصطفاه من عباده"

(از شرح مواقف المرصد الاول فی النبوات المقصد الاول ص ۶۲۳ مطبوعه نو لکشور)

"لفظ نبی منقول عرفی ہے یعنی لغوی معنی سے عرف شرع کی طرف منقول ہے۔ لغوی

معنی خبر دینے والا کیونکہ یہ نباء سے مشتق ہے پس وہ اس وقت مہموز ہوگا۔ مخفف اور مشدد دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اس لغوی معنی کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے نبی کو اس لئے نبی کہا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کو خبریں پہنچاتا ہے۔ نبی کا اور معنی یہ ہے کہ نبی لفظ نبوۃ سے مشتق ہے جس کا معنی ہے بلند ہونا، مرتفع ہونا۔ جب کوئی شخص رفعت و بلندی کو حاصل کرتا ہے تو کہا جاتا ہے "ینبئی فلان" اس معنی کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے انبیاء کرام کو نبی اس لئے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں رفعت شان اور روشن دلائل و معجزات سے نوازا ہوتا ہے۔ اور نبی کو نبی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ نبی سے مشتق ہے جس کا معنی ہے راستہ۔ جس طرح راستہ منزل مقصود تک پہنچنے کا ذریعہ ہے اسی طرح انبیاء کرام لوگوں کے اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے کا ذریعہ ہیں۔ عرف شرع میں نبی اسے کہتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے برگزیدہ بنایا ہو"۔

نبی کی عام لوگوں سے امتیازی شان:

" النبی من اجتمع فیه خواص ثلث یمتاز بها عن غیره احدها ان یکون له اطلاع علی المغیبات الکائنة والماضیة والاتیة وثانیهما ان یظهر منه الافعال الخارقة للعادة وثالثها ان یری الملائکة مصورة بصور محسوسة ویسمع کلامهم وحیا من الله تعالیٰ الیه "

(از شرح مواقف المرصد الاول فی النبوات المقصد الاول ص ۲۶۳ مطبوعه نو لکشور)

"نبی وہ ہے جس میں تین ایسے خصوصی اوصاف پائی جائیں جن کی وجہ سے باقی لوگوں سے ممتاز ہو۔ ان میں سے ایک وصف یہ ہے کہ نبی وہ ہوگا جو موجودہ اور گزرے ہوئے زمانہ اور آنے والے زمانہ پر مطلع ہو۔ دوسرا وصف یہ ہے کہ خرق عادات افعال یعنی معجزات اس سے ظاہر ہوں۔ تیسرا وصف یہ ہے کہ وہ ملائکہ کو ظاہری صورتوں میں دیکھ سکے اور ان کے کلام سے اللہ تعالیٰ کی وحی کو سن سکے"۔

انبیاء کرام معصوم ہیں:

عصمت کیا ہے؟ " العصمة ملکة اجتناب المعاصی مع التمکن منها "

(کتاب التعریفات ص ۶۵ مطبوعه تهران)

عصمت اس ملکہ کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے گناہوں سے بچا جاسکے باوجود اس کے کہ قدرت حاصل ہو۔

خیال رہے کہ ملکہ اس کیفیت کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے انسان سے بآسانی افعال سرزد ہوں۔ وہ کیفیت ایسی پختہ ہو کہ اسکا زوال نہ ہو۔ کیونکہ کسی وقت وہ کیفیت حاصل ہو اور کسی وقت حاصل نہ ہو وہ ملکہ نہیں بلکہ اس کیفیت کو "حال" کہتے ہیں۔ یعنی کیفیت راسخہ ملکہ ہے اور کیفیت غیر راسخہ حال ہے:

" وحقیقة العصمة ای ماهیتها ان لا یخلق الله تعالیٰ فی العبد الذنب مع بقاء قدرته واختیاره واختار الشارح فی شرح المقاصد التعریف بالملکة ولیس هذا تناقضا لعدم التفاوت فی المقصود من التعریفین " (شرح عقائد مع النبراس ص ۵۳۲)

" حقیقت یعنی ماہیت عصمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بندے میں گناہ نہ پیدا کرنا باوجود اس کے کہ اس کو قدرت واختیار حاصل رہے۔ شارح نے یہاں حقیقت عصمت کا ذکر کیا ہے اور شرح مقاصد میں ملکہ ذکر کیا ہے مقصد دونوں تعریفوں کا ایک ہی ہے کوئی ان میں تناقض نہیں خیال رہے کہ صاحب نبراس نے بھی عصمت کی تعریف میں ملکہ ذکر کیا ہے"۔

" العصمة ملکة نفسانیة یخلقها الله سبحانه فی العبد فیکون سببا عادیا لعدم خلق الذنب فیه " (النبراس ص ۵۳۲ مطبوعه شاه عبد الحق محدث اکیڈمی)

عصمت ملکہ نفسانیہ کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ بندے میں پیدا فرماتا ہے جو انسان میں گناہ کرنے کا سبب ہوتا ہے۔ اسی طرح عصمت کی تعریف ان الفاظ میں بھی کی گئی ہے جو اگرچہ معتزلہ نے تعریف کی لیکن اشاعرہ کی تعریف کے مخالف نہیں اس لئے شارح نے تعریف کے تکملہ کے طور پر ذکر کی ہے۔

" هی ای العصمة لطف من الله تعالیٰ یحمله ای العبد علی فعل الخیر ویز جره عن الشر مع بقاء الاختیار " (شرح عقائد مع النبراس صفحه ۵۳۴)

عصمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے لطف ومہربانی انسان کو حاصل ہوتی ہے جو انسان کو نیکی کے کاموں کی طرف برانگیختہ کرتی ہے اور شر سے روکتی ہے باوجود اس کے کہ انسان کا اختیار باقی رہتا ہے"۔

قدرت واختیار کی بقاء عصمت کے لئے کیوں:

" ان بقاء الاختیار للابتلاء وان الا بتلاء هو الامتحان بالتکلیف ولا شک ان عدم القدرة علی الذنب ینافی التکلیف باجتنابه " (از النبراس ص ۵۳۴)

" اختیار وقدرت کو اس لئے باقی رکھا گیا ہے تاکہ امتحان لیا جاسکے، کیونکہ انسان کو مکلف بنایا گیا ہے اگر گناہوں کی طاقت ہی حاصل نہ ہو تو گناہوں سے بچنے کی تکلیف

دے کر امتحان نہیں لیا جا سکتا تھا''

یہ بھی حقیقت ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے امتحان تمام انسانوں سے عظیم تر امتحانات تھے، خصوصا سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم پر تمام انبیاء کرام سے بڑے امتحانات آئے۔

انبیاء کرام صغائر و کبائر سے پاک ہیں:

" الانبیاء معصومون قبل النبوة وبعدها عن کبائر الذنوب وصغائرها ولو سهوا علی ما هو الحق عند المحققین " (مرقاة شرح مشکوة باب الکبائر ج ۱ ص ۱۲۷)

''محققین کا مذہب یہی ہے کہ انبیاء کرام قبل از نبوت اور بعد از نبوت تمام صغائر اور کبائر گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں۔ ان سے کوئی گناہ بھول کر بھی سرزد نہیں ہوتا''۔

" فالحق انه لا خلاف لاحد فی ان نبینا علیه السلام لم یرتکب صغیرة ولا کبیرة طرفة عین قبل الوحی وبعده کما ذکره ابو حنیفة رحمه الله فی الفقه الاکبر "

(تفسیرات احمدیه زیر آیت لاینال عهدی الظالمین ص ۳۱ مطبع فتح الکریم بمبئی)

''حق مذہب یہی ہے کہ کسی ایک کا اس میں اختلاف نہیں کہ ہمارے نبی کریم ﷺ نے وحی سے پہلے اور بعد ایک لحہ بھر بھی کسی صغیرہ اور کبیرہ گناہ کا ارتکاب نہیں کیا جیسا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ اکبر میں ذکر کیا ہے''۔

" والانبیاء علیهم السلام کلهم منزهون ای معصومون عن الصغائر والکبائر ای من جمیع المعاصی والکفر والقبائح والفواحش وفی شرح العقائد ان الانبیاء علیهم السلام معصومون عن الکذب "

(از شرح فقه اکبر ملا علی قاری ص ۸ مطبوعه مجتبائی)

''تمام انبیاء کرام علیہم السلام ہر قسم کے گناہوں سے کفر، برائی کے کاموں، بے حیائی کے کاموں یہاں تک کہ ہر قسم کے صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے معصوم ہیں۔ شرح عقائد میں ہے کہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام جھوٹ سے پاک ہیں''۔

انبیاء کرام کو جھوٹا کہنے سے راویوں کو جھوٹا کہہ دینا بہتر ہے:

علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

" اضافة الکذب الی رواته اولی من ان یضاف الی الانبیاء علیهم السلام "

(تفسیر کبیر پ ۱۷ زیر آیت بل فعله کبیرهم

بالفرض اگر ایسی کوئی روایت ہو جس میں انبیاء کرام علیھم السلام کا جھوٹا ہونا ثابت ہو رہا ہو اور اس روایت کی کوئی تاویل نہ ہو سکے یعنی کوئی ایسی وجہ نہ بیان ہو سکے جس سے انبیاء کرام کی صداقت ثابت ہو سکے تو ایسی صورت میں راویوں کو جھوٹا کہا جا سکتا ہے لیکن انبیاء کرام کو جھوٹا کہنا محال ہو گا یعنی روایت کو رد کر دیا جائے لیکن انبیاء کرام کی شان میں کوئی فرق نہیں آنے دیا جائے گا۔

انبیاء کرام سے بھول کر بھی کوئی گناہ صغیرہ سرزد نہیں ہوا:

اجماع امت سے ثابت ہے کہ انبیاء کرام سے بھول کر بھی کوئی گناہ صغیرہ سرزد نہیں ہوا:

" لا تجوزا الصغيرة التي تخرج صاحبها عن الشرافة الى الخساسة و الر ذالة لاعمدا و لا سهوا لانها توجب نفرة الناس عنه " (النبراس ص ۴۵۳)

''ایسے صغیرہ گناہ جو انسان کو شرافت سے نکالنے کا سبب بنیں اور ان کی وجہ سے انسان رذیل و خسیس نظر آئے ایسی گناہ باوجود اس کے کہ صغیرہ ہی کیوں نہ ہوں انبیاء کرام سے سرزد نہیں ہوتی کیونکہ یہ لوگوں کی نفرت کا سبب بنتے ہیں''۔

" قال القاضي عياض ذهب طائفة من محققي الفقهاء و المتكلمين الى العصمة عن الصغائر كالعصمة عن الكبائر للاختلاف في الصغائر " (النبراس ص ۴۵۳)

''قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ محققین فقہاء کرام اور متکلمین کا حق مذہب یہ ہی ہے کہ انبیاء کرام اسی طرح صغائر سے معصوم ہیں جس طرح کبائر سے معصوم ہیں اگرچہ صغائر میں اختلاف ہے لیکن محققین حضرات کا وہی مذہب ہے جو مذکور ہو چکا ہے''۔

مقام توجہ: شرح عقائد میں سہو کتابت یا سہو مصنف ہے جو یہ ذکر کیا گیا ہے "و اما الصغائر فتجوز عمدا عند الجمهور" انبیاء کرام سے صغائر کا عمداً سرزد ہونا جمہور کے نزدیک جائز ہے۔ لیکن اسی عبارت کی شرح میں اس طرح مذکور ہے:

" وفيه قصور لان منع الصغيرة عمدا مختار مذاهب الا شاعرة كما في شرح المواقف وهو مختار الشارح في التهذيب وشرح المقاصد " (نبراس ص ۴۵۲)

''اس عبارت میں قصور پایا گیا ہے کیونکہ عمداً انبیاء کرام سے صغیرہ گناہ سرزد نہیں ہوتے یہی اشاعرہ کا مختار مذہب ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ خود شارح علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب بھی یہی ہے کہ انبیاء کرام سے عمداً کوئی صغیرہ سرزد نہیں ہوتا۔ مصنف کی

دوسری تصانیف تہذیب اور شرح مقاصد میں اسی طرح مذکور ہے''۔

اسی طرح شرح عقائد کی اس پہلی عبارت کے متصل عبارت میں بھی سہو پایا گیا ہے:'' **وتجوز سهوا بالاتفاق** '' سہواصغائر بالاتفاق جائز ہیں یہ بھی درست نہیں جیسا کہ محققین فقہاء کرام اور متکلمین کا مذہب اس کے خلاف ذکر کیا جاچکا ہے وہ بحث بھی النبر اس کی اسی عبارت پر ہے خیال رہے کہ صغائر کا جواز ہے یا نہیں؟ یہ اختلاف اس میں نہیں کہ سہواً انبیاء کرام علیھم السلام سے فی الواقع صغائر گناہ سرزد ہوتے ہیں بلکہ یہ اختلاف اس میں ہے کہ عقلا جواز ممکن ہے یا نہیں۔

'' **وعلم ایضا ان هذا الاختلافات المارة انما هی فی جواز الوقوع وعدمه لا فی الوقوع نفسه فتامل** '' (رسائل ابن عابدین ج ۱ ص ۳۱۳)

اس سے پہلے کی گئی بحث سے واضح ہوا کہ یہ اختلافات جو بیان ہوئے ہیں وہ اختلافات صرف اس میں ہیں کہ صغائر گناہوں کا سہواً وقوع ممکن ہے یا نہیں۔ یہاں کسی کا قول نہیں کہ انبیاء کرام علیھم السلام سے بھول کر بھی صغائر گناہ سرزد ہوتے ہیں۔ انبیاء کرام کا بھولنا اور چیز ہے اور بھول کر گناہ کرنا اور چیز ہے۔ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ بھول انبیاء کرام سے واقع ہوئی لیکن بھول کر گناہ نہیں واقع ہوا۔

'' **ان الانبیاء کلهم علیهم الصلوة والسلام لم تقع منهم معصیة قط لاقبل النبوة ولا بعدها** '' (رسائل ابن عابدین ج ۱ ص ۳۱۲)

'' بیشک تمام انبیاء کرام علیہم السلام سے ہرگز کوئی گناہ سرزد نہیں نہ نبوت سے پہلے اور نہ ہی نبوت کے بعد''

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

'' **عفا الله عنک لم اذنت لهم فان ظاهره ایضامو هم ولیس بمراد بل هو استفسار عن العلة وقدم قوله عفا الله عنک لئلا یتوهم التوبیخ** ''

(رسائل بن عابدین ج ۱ ص ۳۱۲)

اس عبارت کے مفہوم کو سمجھنے سے پہلے یہ سمجھ لیا جائے کہ غزوہ تبوک میں منافقین کے عذر پیش کرنے اور غزوہ میں شریک نہ ہونے کی اجازت طلب کرنے کی خبر اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو پہلے ہی دے دی تھی کہ وہ جھوٹی قسمیں اٹھائیں گے اور معذرت پیش کریں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو

منع نہیں فرمایا کہ ان کو اجازت نہ دینا۔ نبی کریم ﷺ نے انہیں اجازت دے دی اس کے بعد رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ عفا الله عنک لم اذنت لھم ﴾ ''اللہ تمہیں معاف کرے تم نے انہیں کیوں اذن دے دیا'' اب رسائل ابن عابدین کی مذکورہ عبارت کو سمجھیں۔

قرآن پاک کے الفاظ مبارکہ سے بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ شائد ان الفاظ سے نبی کریم ﷺ کو کسی غلطی پر ڈانٹا گیا ہو حالانکہ ایسا ہرگز نہیں بلکہ یہ تو پیار و محبت سے اس وجہ کے متعلق سوال کیا جا رہا ہے کہ اے حبیب وہ کیا وجہ ہے کہ آپ نے ان کو اجازت دے دی تھی۔ ﴿ عفا الله عنک ﴾ کے الفاظ پہلے ذکر کر کے اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ آپ ﷺ پر کوئی توبیخ تو نہیں۔ البتہ آپ ﷺ سے وجہ کا سوال کیا جا رہا ہے تاکہ آپ کی امت اس پر مطلع ہو جائے۔ علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

" لا نسلم ان قولہ عفا الله عنک یوجب الذنب ولم لا یجوز ان یقال ان ذالک یدل علی مبالغة الله فی تعظیمہ وتوقیرہ کما یقول الرجل لغیرہ اذا کان معظما عندہ عفا الله عنک ما صنعت فی امری فلا یکون من ھذا الا مزید التبجیل والتعظیم " (کبیر)

ہم ہرگز یہ تسلیم نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ عفا الله عنک ﴾ سے نبی کریم ﷺ کا کوئی گناہ ثابت ہو رہا ہے۔ کیوں جائز نہیں کہ یہ کہا جائے کہ یہ الفاظ مبارکہ تو اس پر دلالت کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی بہت بڑی تعظیم و توقیر کا ذکر فرمایا ہے۔ جس طرح ایک شخص اس آدمی سے کلام کرے جو اسکے نزدیک بہت بڑا صاحب عظمت انسان ہے اور اسے کہے ''اللہ آپ کو معاف کرے آپ نے میرے معاملہ میں کیا کیا ہے؟'' اس میں تو زیادہ اس کی عظمت اور بزرگی کا ذکر ہے۔ یہ تو نہیں کہ تم بہت بڑے قصوروار ہو اللہ تمہیں معاف کرے تم نے میرے معاملہ میں کیا کیا ہے؟

تنبیہ: اسی آیۃ کریمہ کے ماتحت علامہ رازی رحمہ اللہ کی بحث کو دیکھیں۔

انبیاء کرام کے صغائر و کبائر سے پاک ہونے پر علامہ رازی کے دلائل:

" والمختار عندنا انہ لم یصدر عنھم الذنب حال النبوة البتة لا الکبیرة ولا الصغیرة "

ہمارا مختار مذہب یہی ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام سے کوئی صغیرہ گناہ اور کبیرہ گناہ حالت نبوت

٨١

میں ہرگز ہرگز صادر نہیں ہوا۔اس پر چند دلائل موجود ہیں۔

(۱) "لو صدر عنهم لكانوا اقل درجة من عصاة الامت وذلک غير جائز"

اگر انبیاء کرام علیہم السلام سے گناہ سرزد ہوں تو وہ امت کے نافرمان لوگوں سے بھی کم درجہ ہوں گے۔اس لئے کہ انبیاء کرام علیہم السلام جلیل القدر ہیں اور شرافت ان کو عظیم درجہ کو حاصل ہے۔جتنی شان زیادہ ہو اسی کے مطابق معمولی جرم بہت عظیم جرم سمجھا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات جب شان کے لحاظ پر دوسری عورتوں سے عظیم مرتبہ رکھتی ہیں تو ان کو اللہ تعالیٰ اسطرح خطاب فرماتا ہے:

﴿ يا نساء النبى من يات منكن بفاحشة مبينه يضاعف لها العذاب ضعفين ﴾(پ ۲۱)

"اے نبی ﷺ کی بیبیو جو تم میں صریح حیا کے خلاف کوئی جرات کرے اس پر اوروں سے دونا عذاب ہوگا"

اسی طرح محصن بنسبت غیر محصن کے بلند شان رکھتا ہے تو محصن کی بدکاری پر اسے رجم کردیا جائے گا لیکن غیر محصن کو کوڑے لگائے جاتے ہیں۔اسی طرح غلام پر نصف حد بوجہ کم درجہ ہونے کے اور آزاد (حر) پر مکمل حد۔

"واما انه لا يجوز ان يكون النبى اقل حالا من الامة فذاک بالاجماع"

جب نبی امت کے کسی فرد سے بھی کم درجہ نہیں ہوتا اس پر اجماع امت ہے لہذا نبی سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوتا تاکہ نبی امت کے کسی فرد سے بھی کم درجہ نہ ہو۔

(۲) نبی اگر گناہ کرے تو فسق لازم آئے گا فاسق کی شہادت قبول نہیں، حالانکہ نبی کا مقبول الشہادۃ ہونا ضروری ہے۔ورنہ وہ امت کے عادل آدمیوں سے کم درجہ ہوگا کیونکہ امت کے عادل آدمیوں کا مقبول الشہادۃ ہونا ثابت ہے تو اس سے سمجھ میں آ گیا کہ نبی کا گناہ گار ہونا جائز نہیں، کیونکہ انبیاء کرام کا شاہد ہونا ضروری ہے۔

"وانه لا معنى للنبوة والرسالة الا انه يشهد على الله تعالىٰ بانه شرع هذا الحكم"

یعنی نبوت اور رسالت کی اس وقت تک تکمیل نہیں ہوسکتی جب تک وہ اللہ تعالیٰ پر اس کے نافذ کردہ احکام شرع کی شہادت نہ دیں۔

نیز یہ بھی ثابت ہے کہ قیامت کے دن آپ ﷺ تمام پر شاہد ہوں گے۔ جس طرح رب قدوس نے ارشاد فرمایا:

﴿ لتكونوا شهدا على الناس ويكون الرسول عليكم شهيدا ﴾ (پ ۲ ع ۱)

''اور بات یوں ہی ہے کہ ہم نے تمھیں کیا سب امتوں میں افضل کہ) تم لوگوں پر گواہ ہو اور یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ'' (کنز الایمان)

خیال رہے کہ ''یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ'' یہ ترجمہ صرف اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا ہی ہے جس کی فوقیت میں نے تسکین الجنان میں واضح کی ہے۔

(۳) اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ (معاذ اللہ) نبی کریم ﷺ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرتے ہیں تو یہ کام یعنی کبیرہ کا ارتکاب تو حرام ہے حرام کام کرنے والے کی کوئی عزت نہیں ایسے شخص کو ایذاء پہنچانا حرام نہیں۔ حالانکہ نبی کریم ﷺ کو ایذاء پہنچانا حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ ان الذين يوذون الله ورسوله لعنهم الله في الدنيا والاخرة ﴾ (پ ۲۲ ع ۴ کنز الایمان)

''بیشک جو ایذا دیتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کو ان پر اللہ کی لعنت ہے دنیا اور آخرت میں'' (کنز الایمان)

وہ ایذا دینے والے کفار ہیں جو شان الٰہی میں ایسی باتیں کہتے ہیں جن سے وہ منزہ اور پاک ہے اور رسول کریم ﷺ کی تکذیب کرتے ہیں ان پر دارین میں لعنت۔ (خزائن العرفان)

خیال رہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ایذاء دینا (یہ حقیقی معنی ہے) اور اللہ تعالیٰ کو ایذاء دینا (یہ مجازی معنی ہے) عموم الفاظ سے مطلقاً واضح ہے کہ ہر قسم کی ایذاء رسول اللہ ﷺ کو دینا حرام اور باعث عذاب ہے۔

(۴) بیشک محمد ﷺ سے اگر کسی قسم کا کوئی صغیرہ اور کبیرہ گناہ ہوتا تو ہم پر واجب ہوتا کہ ہم ان گناہوں میں آپ کی اقتداء کرتے کیونکہ آپ ﷺ کی اقتداء و اتباع کا اللہ تعالیٰ نے مطلقاً حکم دیا ہے ارشاد فرمایا ﴿ فاتبعونی ﴾ میری تابعداری کرو۔ تو اس طرح ایک کام حرام بھی ہوتا اور واجب بھی ہوتا یہ محال ہے کہ حرام اور واجب ایک ہی جگہ جمع ہو جائیں۔ جب نبی کریم ﷺ کے حق میں ثابت ہو گیا تو تمام انبیاء کرام کے متعلق بھی ثابت ہو گیا کہ وہ بھی معصیت کے کاموں سے پاک ہیں کیونکہ کسی کا قول ایسا نہیں پایا گیا جس میں نبی کریم ﷺ اور باقی انبیاء کرام علیہم السلام کے درمیان گناہ کے ہونے یا نہ ہونے کا فرق بیان کیا گیا ہو۔

اس مذکورہ بالا مضمون پر دلالت کرنے والی تفسیر کبیر کی عبارت ملاحظہ ہو:

" ورابعها ان محمدا ﷺ لو اتی بالمعصیة لوجب علینا الاقتداء به فیها قوله تعالیٰ فاتبعونی فیفضی الی الجمع بین الحرمة والوجوب وهو محال واذا ثبت ذالک فی حق محمد ﷺ ثبت ایضا فی سائر الانبیاء ضرورة انه لا قائل بالفرق "

خیال رہے کہ گناہ صغیرہ کی اقتداء اور اتباع کا حکم بھی نہیں دیا جاسکتا۔ یہاں سے ثابت ہوا کہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام ہر قسم کی معصیت یعنی صغائر اور کبائر سے پاک ہیں۔

(۵) اس سے بڑھ کر اور کوئی چیز بری نہیں ہوسکتی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو بلند مراتب عطا فرمائے ہوں اور اپنی وحی کا امین بنایا ہو اور اپنے بندوں اور اپنی سلطنت میں اسے اپنا خلیفہ بنایا ہو وہ اپنے رب کا پیغام سن رہا ہو کہ اسے رب قدوس کہہ رہا ہے:

" لا تفعل کذا فیقدم علیه ترجیحا للذته غیر ملتفت الی نهی به ولا منزجر بوعیده "

کہ یہ کام نہ کرو پھر بھی وہ اپنی نفسانی خواہشات ولذات کو ترجیح دے اور اپنے رب کی نہی کی طرف توجہ نہ دے اور اپنے رب کی وعید کے پائے جانے کے باوجود برائیوں سے نہ رکے یہ کبھی نہیں ہوسکتا ایسے شخص اور اس کے ایسے اعمال کی قباحت بہت واضح اور روشن ہے۔ اتنا قبیح انسان نبی نہیں ہوسکتا۔

(۶) بے شک اگر انبیاء کرام سے گناہ صادر ہوں تو وہ مستحق عذاب ہوں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ ومن یعص الله ورسوله ویتعد حدوده یدخله نارا خالدا فیها ﴾ (پ۴ ع۱۳)

جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اور اس کی کل حدوں سے بڑھ جائے بیشک اس کے لئے جہنم کی آگ ہے جس میں ہمیشہ رہے گا۔ اسی طرح اور یہ ہے کہ اگر انبیاء کرام علیہم السلام گناہگار ہوں تو وہ ظالم ہوں گے اور ظالم لعنت کا مستحق ہوتا ہے گویا کہ انبیاء کرام کا (معاذ اللہ) لعنت کا مستحق ہونا لازم آئے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ الا لعنة الله علی الظالمین ﴾ (پ۱۲ ع۲)

"خبردار ظالموں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے"۔

" واجمعت الامة علی ان احدا من الانبیاء لم یکن مستحقا للعن ولا

للعذاب فثبت انه ما صدرت المعصية عنه "

''اجماع امت سے ثابت ہے کہ کوئی ایک نبی بھی لعنت اور عذاب کا مستحق نہیں تو اسی سے یہ ثابت ہو گیا کہ کوئی نبی بھی گناہ گار نہیں ہو سکتا''

(۷) بے شک انبیاء کرام لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا حکم دیتے ہیں اگر وہ خود اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری نہ کریں تو اللہ تعالیٰ کی اس ارشاد گرامی میں داخل ہوں گے۔

﴿ اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسكم وانتم تتلون الكتاب افلا تعقلون ﴾ (پ ۱ کنز الایمان)

''کیا لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتے اور اپنی جانوں کو بھولتے ہو حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو تو کیا تمھیں عقل نہیں''

اسی طرح رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿ وما اريد ان اخالفكم الى ما انهاكم عنه ﴾ (پ ۱۲ ع ۸)

(حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو کہا) اور میں نہیں چاہتا ہوں کہ جس بات سے تمھیں منع کرتا ہوں آپ اس کے خلاف کرنے لگوں۔ (کنز الایمان)

" فما لا يليق بواحد من وعاظ الامة كيف يجوز ان ينسب الى الانبياء عليهم السلام "

جو کام کسی امت کے ایک واعظ کی شان کے لائق نہیں وہ انبیاء کرام علیہم السلام کی طرف کیسے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ یعنی اوروں کو برائیوں سے روکنا اور خود برائی کا ارتکاب کرنا انبیاء کرام سے اس طرح دور ہے کہ اس کا تصور کرنا بھی محال ہے۔

(۸) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿ انهم كانوا يسارعون فى الخيرات ﴾ (۱۷ع۷) بیشک وہ بھلے کاموں میں جلدی کرتے تھے۔ (کنز الایمان)

اس سے قبل کئی انبیاء کرام کا ذکر کیا گیا اس کے بعد فرمایا یعنی انبیاء کرام مذکورین کی یہ شان ہے کہ وہ اچھے کاموں میں جلدی کرتے ہیں:

" ولفظ الخيرات للعموم فيتناول الكل ويدخل فيه ما ينبغى وترك
مالا ينبغى فثبت ان الانبياء كانوا فاعلين لكل ما ينبغى فعله وتاركين
كل ما ينبغى تركه و ذلك ينافى صدور الذنب عنهم "

آیت کریمہ میں لفظ خیرات استعمال ہوا ہے جو عموم کے لئے اور کل کو شامل ہے ہر اچھے کام کا کرنا اور ہر برے نامناسب کام کا چھوڑنا اسی میں داخل ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے خود انبیاء کرام علیہم السلام کے

متعلق فرمایا کہ وہ بھلے کاموں میں جلدی کرتے ہیں اور نامناسب کاموں کو چھوڑتے ہیں۔ اگر انبیاء کرام علیہم السلام سے کوئی گناہ صغیرہ یا کبیرہ صادر ہو تو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کے منافی ہوگا۔

(۹) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وانهم عندنا لمن المصطفين الاخيار ﴾ (پ ۲۳ ص ۱۴)

اور بیشک وہ ہمارے نزدیک چنے ہوئے پسندیدہ ہیں۔ (کنز الایمان)

" وهذا يتناول جميع الافعال والتروك " اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی جمیع اچھے کاموں کے کرنے اور جمیع نامناسب کاموں کے چھوڑنے کو شامل ہی۔ یعنی وہ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو پسندیدہ ہیں کہ وہ ہر اچھا کام کرتے ہیں۔ اور ہر برے کام سے اجتناب کرتے ہیں۔ یہاں سے مراد تمام افعال ہیں اس پر دلیل یہ ہے کہ اس سے استثناء صحیح ہوسکتا ہے جیسے یہ کہا جائے " فلان من المصطفين الاخيار الا فی الفعلة الفلانية " فلاں شخص برگزیدہ پسندیدہ لوگوں سے ہے لیکن فلاں کام میں یعنی فلاں کلام اس کا اچھا نہیں۔ چونکہ استثناء کی وجہ سے مستثنیٰ ماقبل کے حکم سے خارج ہوتا ہے۔ یہاں استثناء کا نہ پایا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حکم عام ہے:

" فثبت انهم كانوا اخيار فی كل الامور و ذلك ينافی صدور الذنب عنهم "

اس سے ثابت ہوا کہ تمام انبیاء کرام جمیع امور میں برگزیدہ اور اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ تھے۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ جو اللہ تعالیٰ کے تمام کاموں میں پسندیدہ ہوں ان سے گناہ سرزد ہوں ورنہ بعض کاموں میں پسندیدہ ہونا لازم آئے گا جو عموم کے منافی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ الله يصطفی من الملئكة رسلا و من الناس ﴾ (پ ۱۷ ع ۱۷)

''اللہ چن لیتا ہے فرشتوں میں سے رسول اور آدمیوں میں سے'' (کنز الایمان)

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی یہ ہے:

﴿ ان الله اصطفی آدم و نوحا و آل ابراهيم و آل عمران علی العالمين ﴾ (پ ۳ ع ۱۲)

''بے شک اللہ (عزوجل) نے چن لیا آدم اور نوح اور ابراہیم علیہم السلام کی آل اور عمران کی آل کو سارے جہاں سے'' (کنز الایمان)

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿انی اصطفیتک علی الناس برسلتی وبکلامی﴾ (پ ۹ ع ۷)

"(فرمایا اے موسیٰ) میں نے تجھے لوگوں سے چن لیا اور اپنی رسالتوں اور اپنے کلام سے" (کنز الایمان)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی یہ ہے:

﴿واذکرنا عبادنا ابراھیم واسحاق ویعقوب اولی الایدی والابصار انا اخلصناھم بخالصة ذکری الدار وانھم عندنا لمن المصطفین الاخیار﴾ (پ ۲۳ ع ۱۳)

اور یاد کرو ہمارے بندوں ابراھیم اور اسحاق اور یعقوب قدرت اور علم والوں کو بے شک ہم نے انہیں ایک کھری بات سے امتیاز بخشا کہ وہ اس گھر کی یاد ہے اور بیشک وہ ہمارے نزدیک چنے ہوئے پسندیدہ ہیں۔ (کنز الایمان)

"فکل ھذہ الایات دالة علی کونھم موصوفین بالاصطفاء والخیریة وذالک ینافی صدور الذنب عنھم"

"یہ تمام آیات اس پر دلالت کر رہی ہیں کہ انبیاء کرام کو رب تعالیٰ کا پسندیدہ ہونا اور تمام لوگوں سے بہتر ہونے کا خصوصی وصف حاصل ہے لہٰذا ایسی برگزیدہ ہستیوں سے گناہ کا سرزد ہونا ان کی شان کی منافی ہے"

(۱۰) بے شک اللہ تعالیٰ نے ابلیس کے قول کی حکایت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿فبعزتک لا غوینھم اجمعین الا عبادک منھم المخلصین﴾ (پ ۲۳ ع ۱۴)

"بولا تیری عزت کی قسم ضرور میں ان سب کو گمراہ کر دوں گا مگر جو ان میں تیرے چنے ہوئے بندے ہیں۔ (کنز الایمان)"

"فاستثنی من جملة من یغویھم المخلصین وھم الانبیاء علیھم السلام"

تمام لوگوں کو شیطان نے راہ راست سے بھٹکانے کی کوشش کرنی ہے (کسی پر کامیاب ہوگا، کسی پر نہیں) لیکن انبیاء کرام جو اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے ہیں ان پر یقیناً اس کا داؤ نہیں چلے گا جس کا اقرار خود شیطان نے بھی کر لیا ہے۔ یعنی اس کی گرفت میں آنے سے انبیاء کرام کو مستثنیٰ کر دیا جب شیطان کی گرفت میں اللہ تعالیٰ کے مخلصین بندے نہیں آئیں گے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ انبیاء کرام کو اب رب قدوس نے اپنا مخلص بندہ کہا ہے یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ابراھیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کے متعلق ارشاد فرمایا: ﴿انا اخلصناھم بخالصة ذکری الدار﴾ (پ ۲۳ ع ۱۳)

''بے شک ہم نے ان کو اپنا مخلص بنایا کہ وہ اس گھر کی یاد ہے''

یعنی دار آخرت کی وہ لوگوں کو اسی کی یاد دلاتے ہیں اور کثرت سے اس کا ذکر کرتے ہیں محبت دنیا نے ان کے قلوب میں جگہ نہیں پائی (خزائن العرفان) اور حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق مالک الملک نے فرمایا:

﴿ انه من عبادنا المخلصین ﴾ (پ ۱۲ ع ۱۳) ''بے شک وہ ہمارے مخلص بندوں سے ہیں''

'' واذا ثبت وجوب العصمة فی حق البعض ثبت وجوبها فی حق الکل لانه لا قائل بالفرق ''

جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ بعض انبیاء کرام (علیہم السلام) معصوم ہیں تو اسی سے تمام انبیاء کرام کا معصوم ہونا ثابت ہو گیا کیونکہ کوئی قائل بالفصل نہیں۔ یعنی یہ کسی کا عقیدہ نہیں کہ بعض انبیاء کرام ہی صرف معصوم ہیں اور بعض معصوم نہیں۔

(۱۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی یہ ہے:

﴿ ولقد صدق علیهم ابلیس ظنه فاتبعوہ الا فریقا من المؤمنین ﴾ (پ ۲۲ ع ۸)

''اور بے شک ابلیس نے انہیں اپنا گمان سچ کر دکھایا تو وہ اسکے پیچھے ہوئے مگر ایک گروہ کہ مسلمان تھا'' (کنزالایمان)

'' فاولئک الذین ما اتبعوہ وجب ان یقال انه ما صدر الذنب عنهم والا فقد کانوا متبعین له ''

پس وہ لوگ جنہوں نے ابلیس کی تابعداری نہیں کی یقیناً ان کے متعلق یہی کہا جائے گا کہ ان سے کوئی گناہ صادر نہیں ہوا اور نہ وہ اس کے متبع ہوتے۔ جب یہ ثابت ہو گیا تو اب دیکھتے ہیں کہ وہ گناہ نہ کرنے والا فریق کون سا ہے۔ انبیاء کرام ہیں یا دوسرا کوئی فریق ہے۔ اگر انبیاء کرام (علیہم السلام) ہیں تو مدعیٰ ثابت ہو گیا کہ کوئی نبی کوئی گناہ نہیں کرتا اور اگر وہ فریق انبیاء کرام کے ماسوا کوئی اور فریق ہے جو گناہگار نہیں اور انبیاء کرام کا گناہگار ہونا ثابت ہو تو انبیاء کرام کا درجہ غیر انبیاء سے کم ہو جائے گا اور وہ غیر لوگ انبیاء کرام علیہم السلام سے زیادہ مرتبہ رکھنے والے ہو جائیں گے۔

'' وذلک باطل بالاتفاق فثبت ان الذنب ما صدر عنهم ''

''اور یہ (نبی کا دوسرے لوگوں سے کم درجہ ہونا اور دوسروں کا افضل ہونا) بالاتفاق

باطل ہے لہٰذا ثابت یہ ہوا کہ بے شک کسی نبی سے کوئی گناہ نہیں صادر ہوا۔

(۱۲) اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی دو قسمیں بنائی ہیں۔ ایک قسم کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ اولئک حزب الشیطن الا ان حزب الشیطن هم الخاسرون ﴾ (پ ۲۸ ع ۳)

''وہ شیطان کے گروہ ہیں سنتا ہے (خبردار) بے شک شیطان ہی کا گروہ ہار (خسارہ) میں ہے''۔ (کنز الایمان)

اور مخلوق کی دوسری قسم کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ اولئک حزب الله الا ان حزب الله هم المفلحون ﴾ (پ ۲۸ ع ۳)

''یہ اللہ کی جماعت ہے، سنتا ہے (خبردار) اللہ ہی کی جماعت کامیاب ہے''۔ (کنز الایمان)

کوئی شک نہیں یقیناً شیطان کا گروہ وہ ہے جو ایسے کام کرے جنہیں شیطان پسند کرے "والذی یرتضیه الشیطان هو المعصیة" جن کاموں کو شیطان پسند کرتا ہے انہیں معصیت کہا جاتا ہے۔ پس ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہوگا یعنی معصیت کا مرتکب ہوگا وہی شیطان کے گروہ کا ہوگا:

" فلو صدرت المعصية من الرسول لصدق عليه انه من حزب الشيطن ولصدق عليه انه من الخاسرين "

اگر کسی نبی اور رسول سے معصیت صادر ہو تو یہ صادق آئے گا کہ بے شک وہ شیطان کا گروہ ہے اور یہ صادق آئے گا کہ وہ خسارے میں ہے۔ اور امت کے زاہد لوگوں پر صادق آئے گا کہ یہ اللہ (عزوجل) کی جماعت ہیں۔ اور بیشک یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

" فحينئذ يكون ذالك الواحد من الامة افضل بكثير عند الله من ذالك الرسول وهذا لا يقوله مسلم "

تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ امت کا ایک فرد اللہ (عزوجل) کے نزدیک رسول سے بہت ہی زیادہ فضیلت رکھنے والا ہو جائے، کوئی مسلمان اس کا قائل نہیں ہو سکتا کہ نبی سے امتی افضل ہو جائے

(۱۳) " ان الرسول افضل من الملک فوجب ان لا یصدر الذنب من الرسول "

''بیشک رسول فرشتوں سے افضل ہیں۔ پس ضروری ہے کہ کسی نبی اور رسول سے کوئی گناہ نہ صادر ہو''

﴿ وانما قلنا انه افضل لقوله تعالیٰ ان الله اصطفیٰ آدم و نوحا و آل ابراهيم و آل عمران على العالمين ﴾ (پ ۳ ع ۱۲)

''ہم نے کہا کہ نبی فرشتوں سے افضل ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا بے شک اللہ نے چن لیا آدم اور نوح اور ابراہیم کی آل اور عمران کی آل کو سارے جہان سے''۔

اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء کرام تمام مخلوقات سے (یعنی بمع ملائکہ کے) افضل ہیں۔ اس مسئلہ پر امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے ﴿ واذ قلنا للملئکۃ اسجدوا ﴾ (پ۱) میں طویل بحث کی ہے۔ یہاں اس کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ انبیاء کرام ملائکہ سے افضل ہیں تو

''فوجب ان لا یصدر الذنب عن الرسول لانہ تعالیٰ وصف الملائکۃ بترک الذنب''

تو ضروری ہے کہ انبیاء کرام سے کوئی گناہ نہ سرزد ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کا وصف بیان کیا کہ وہ گناہ نہیں کرتے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لا یسبقونہ بالقول وھم بامرہ یعملون ﴾ (پ ۱۷ ع ۲)

بات میں اس سے سبقت نہیں کرتے اور وہ اسی کے حکم پر کاربند ہوتے ہیں۔ (کنز الایمان)

اسی طرح رب قدوس کا ایک اور ارشاد گرامی یہ ہے:

﴿ لا یعصون اللہ ما امرھم ویفعلون ما یومرون ﴾ (پ ۲۸ ع ۱۹)

''وہ اللہ کا حکم نہیں ٹالتے اور جو انہیں حکم ہو وہی کرتے ہیں'' (کنز الایمان)

''فلو صدرت المعصیۃ عن الرسول لا متنع کونہ افضل من الملک''

اگر رسولوں سے گناہ سرزد ہوں تو وہ فرشتوں سے افضل نہیں ہو سکتے، اس لئے کہ ان کے متعلق ثابت کیا جا چکا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کرتے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق کام کرتے ہیں۔ گناہگار نیکوں کے برابر نہیں ہو سکتے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ ام نجعل الذین آمنوا وعملوا الصالحات کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجار ﴾ (پ ۲۳ ع ۱۲)

''کیا ہم انہیں جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے ان جیسا کر دیں جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں یا ہم پرہیزگاروں کو شریر بے حکموں کے برابر ٹھہرا دیں'' (کنز الایمان)

(۱۴) حضرت خزیمہ ابن ثابت رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے دعوی کے مطابق شہادت دی (حالانکہ آپ واقعہ کے گواہ نہیں تھے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم نے کیسے شہادت دے دی (تمہیں

تو اس واقعہ کا علم ہی نہیں تھا) تو عرض کیا یا رسول اللہ آپ پر سات آسمانوں سے اوپر سے نازل ہونے والی وحی کی میں تصدیق کرتا ہوں تو اتنی مقدار کی تصدیق نہ کرتا (یہ کیسے ہوسکتا ہے) رسول اللہ ﷺ نے ان کی تصدیق فرمائی اور ان کا نام ذوشہادتین رکھا:

" ولو كانت المعصية جائزة على الانبياء لما جازت تلك الشهادة "

''اگر انبیاء کرام سے معصیت کا سرزد ہونا جائز ہوتا تو یہ شہادت جائز نہ ہوتی۔ پتہ چلا کہ تمام انبیاء کرام ہر قسم کے گناہ سے پاک ہوتے ہیں''۔

حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کی گواہی دینے کا واقعہ:

عمارہ بن خزیمہ سے مروی ہے کہ ان کے چچا جو رسول اللہ ﷺ کے صحابہ سے ہیں فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے ایک اعرابی سے گھوڑا خریدا۔ آپ نے اس اعرابی کو کہا میرے پیچھے چلو تا کہ میں تمہیں گھوڑے کا ثمن ادا کر دوں۔ نبی کریم ﷺ جلدی جلدی چلے اعرابی آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ کئی اور لوگ اعرابی کے درپے ہوئے اس سے گھوڑے کا سودا کرنے لگے۔ ان کو معلوم نہیں تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے گھوڑا خرید لیا ہے۔ وہ اعرابی رسول اللہ ﷺ کو ندا دینے لگا اگر تم نے یہ گھوڑا خرید لیا ہے (تو ٹھیک) ورنہ میں یہ گھوڑا بیچنے لگا ہوں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا میں نے تم سے یہ خرید نہیں لیا؟ اعرابی کہنے لگا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں نے تم پر یہ نہیں بیچا۔ (اس کو خیال ہوا کہ شائد دوسرے لوگوں سے قیمت زیادہ مل جائے) نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں میں تو تم سے یہ خرید چکا ہوں اعرابی کہنے لگا گواہ پیش کرو۔ خزیمہ بن ثابت نے کہا میں گواہی دیتا ہوں۔ بیشک آپ نے اس سے خرید لیا ہے نبی کریم ﷺ حضرت خزیمہ کی طرف متوجہ ہوئے آپ نے فرمایا" بتصديقك يا رسول الله " آپ کی تصدیق کرتے ہوئے یا رسول اللہ گواہی دے رہا ہوں طبقات سعد میں یہ الفاظ زائد ہیں "انا اصدقك بخبر السماء ولا اصدقك بما تقول " میں آپ کی آسمانوں کی خبروں کی تصدیق کرتا ہوں تو یہ تصدیق کیوں نہ کروں جو آپ فرما رہے ہیں تو نبی کریم ﷺ نے ان کی شہادت کو دو شخصوں کی شہادت کے برابر قرار دے دیا۔ (ابو داؤد)

تنبیہ: یہی واقعہ نور الانوار میں کچھ مختلف ہے جو میں تذکرۃ الانبیاء میں نقل کیا۔

(۱۵) اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں یہ فرمایا:

﴿ انی جاعلک للناس اماما ﴾ (پ ۱ ع ۱۵)

''میں تمہیں لوگوں کا پیشوا (امام) بنانے والا ہوں'' (کنز الایمان)

'' والامام من یوتم به فاوجب علی کل الناس ان یاتموا به فلو صدر الذنب عنہ لوجب علیھم ان یاتموا به فی ذالک الذنب یفضی الی التناقض ''

امام وہ ہوتا ہے جس کی اقتداء کی جائے تمام لوگوں پر واجب ہوتا ہے کہ امام کی اقتداء کریں اگر انبیاء کرام سے گناہ سرزد ہوں جن کو اللہ تعالیٰ نے امتوں کا امام بنایا ہوتا ہے تو امتوں پر واجب ہو جائے گا کہ ان گناہوں میں بھی اپنے ائمہ انبیاء کرام کی اقتداء کریں۔ اس میں تناقض لازم آئے گا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ انبیاء کرام خود گناہ کریں اور لوگوں کو روکیں، اسی طرح رب تعالیٰ گناہوں سے منع بھی کرے اور انبیاء کرام معاذ (اللہ) اگر گناہگار ہوں تو انکی اقتداء کا حکم بھی دے یہ ناممکن ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ انبیاء کرام گناہوں سے پاک ہوتے ہیں اس لئے ان کی اقتداء کا حکم دیا گیا ہے۔ خیال رہے کہ صغیرہ گناہوں کی اقتداء بھی منع ہے یہ نہیں ہوسکتا کہ امام کے صغیرہ گناہوں کو دیکھ کر ان کی اقتداء شروع کر لی جائے۔ جب صغائر کی اقتداء بھی نہیں ہوسکتی تو اس سے واضح ہوا کہ انبیاء کرام صغائر سے بھی پاک ہیں۔

(۱۲) اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ لا ینال عھدی الظالمین ﴾ (پ ۱ ع ۱۵)

''میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا'' (کنز الایمان)

اس عہد سے مراد یا عہد نبوت ہے یا عہد امامت '' فان کان المراد عھد النبوۃ وجب ان لا تثبت النبوۃ للظالمین '' اگر اس عہد سے مراد عہد نبوت ہو تو ضروری ہے کہ نبوت ظالموں کو نہ ملے کیونکہ ظالم گناہگار ہے اور نبی گناہوں سے پاک ہے۔ اور اگر اس عہد سے مراد عہد امامت ہو تو ضروری ہے کہ امامت ظالموں کو نہ ملے اور جب امامت ظالموں کو نہیں مل سکتی:

'' وجب ان لا تثبت النبوۃ للظالمین لان کل نبی لابد وان یکون امام یوتم ویقتدی به ''

تو ضروری ہے کہ نبوت بھی ظالموں کو نہ مل سکے اس لئے کہ ہر نبی امام بھی ضرور ہوتا ہے تاکہ اس کی اقتداء کی جائے۔ جب ظالم یعنی گناہگار کی اقتداء سے ممانعت ہے تو نبی کا گناہوں سے پاک ہونا بھی ضروری ہے۔

﴿ فَتَلَقّٰی اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیۡهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ﴾

☆ ''پھر سیکھ لئے آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمے تو اللہ نے اس کی توبہ قبول کی بیشک وہی بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان''

☆ ''پھر آدم نے اپنے رب کے کلمات کا استقبال کیا۔ تو اللہ نے ان کی توبہ کو قبول کیا بیشک وہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا، رحم کرنے والا''

مختصر وضاحت: آدم علیہ السلام کو جنت سے زمین پر اتار دیا۔ تو آدم علیہ السلام کے پاس رب تعالیٰ کی طرف سے کچھ کلمات آ گئے، جن میں آپ کو توبہ کرنے کا طریقہ سکھایا گیا۔ آپ نے ان کلمات کو دل و جان سے قبول کیا، گویا کہ آپ نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا، اور رب تعالیٰ کے حضور توبہ کی، رب تعالیٰ نے آپ کی توبہ کو قبول فرما لیا، بیشک وہی بہت زیادہ توبہ کرنے والا (اور) رحم کرنے والا ہے۔

تفصیلی وضاحت:

﴿ فَتَلَقّٰی ﴾: " قیل معناه فهم وفطن وقیل معنی تلقی ، تلقن ، وهذا فی المعنی صحیح "

" تلقی " کا معنی بعض حضرات نے بیان کیا ہے سمجھنا اور فطانت (زیرکی)۔ بعض حضرات نے کہا ہے " تلقی " کا معنی ہے سیکھ لینا، یہی معنی صحیح ہے اعلیٰ حضرت کا یہی ترجمہ ہے: " وقیل قبل واخذ " بعض حضرات نے کہا ہے " فتلقی " کا معنی یہ ہے متوجہ ہوئے، استقبال کیا اور قبول کیا جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے:

" وکان علیه السلام یتلقی الوحی ، ای یستقبله ویاخذه "

''نبی کریم ﷺ وحی کا استقبال کرتے اور اسے قبول فرماتے''

اسی طرح کہا جاتا ہے " خرجنا فتلقی الجمیع " ہم گھروں سے باہر نکلے تاکہ حاجیوں کا استقبال کریں۔

(قرطبی)

"(فتلقی آدم من ربه کلمات) استقبلها بالآخذ والقبول والعمل بها

حین علمها" (بیضاوی)

''آدم علیہ السلام نے اپنے رب کے کلمات کو حاصل کرنے اور قبول کرنے میں ان کا استقبال کیا اور جب آپ کو وہ حاصل ہوئے جب آپ نے وہ کلمات سیکھ لئے تو ان پر عمل کیا''۔

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ کے اس معنی میں بھی عجیب ذوق پایا جاتا ہے، اسی لئے راقم نے یہی معنی ذکر کر دیا۔

خیال رہے کہ ابن کثیر کی قراءت میں ''آدم'' پر نصب اور ''کلمات'' پر رفع پڑھا گیا ہے۔ اس قراءت کے لحاظ پر معنی یہ ہوگا۔ رب کے کلمات نے آدم علیہ السلام کا استقبال کیا۔ (از قرطبی)

یعنی آدم علیہ السلام کی عاجزی، گریہ وزاری کی وجہ سے رب تعالیٰ نے آپ کو جو کلمات سکھائے، وہ کلمات بے تابی سے آپ کے پاس آئے کہ آپ اپنی آہ و بکا کو ختم کر دیں۔

آدم علیہ السلام کو کون سے کلمات سکھائے گئے:

وہ کلمات یہ ہیں:

﴿ ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین ﴾

طبرانی نے معجم اوسط میں ایک روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ کی قبولیت کا وقت قریب آ گیا تو آپ نے کعبہ کے قریب کھڑے ہو کر دو رکعت ادا کر کے یہ دعاء پڑھی:

" اللھم انک تعلم سری وعلانیتی فاقبل معذرتی وتعلم حاجتی فاعطنی سوالی وتعلم ما فی نفسی فاغفرلی ذنبی اللھم انی اسئلک ایمانا یباشر قلبی ویقینا صادقا حتی اعلم انه لا یصیبنی الا ما کتبت لی وارضنی بما قسمت لی"

اسی طرح اور ان کلمات کا ذکر کیا گیا ہے:

" لا اله الا انت سبحانک وبحمدک عملت سوء وظلمت نفسی، فارحمنی فتب علی انک انت التواب الرحیم"

☆ طبرانی نے معجم صغیر میں اور حاکم نے مستدرک میں، اور بیہقی نے حضرت امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام جب بھول گئے لغزش واقع ہوگئی۔ اور رب تعالیٰ کے عتاب میں آگئے اپنی توبہ کے قبول ہونے میں حیران تھے ،تو آپ کو یاد آ گیا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے جب پیدا کیا اور اپنی طرف سے خاص روح مجھ میں پھونکی تو اس وقت میں نے عرش کی جانب سر اٹھایا تھا۔ وہاں میں نے لکھا ہوا دیکھا تھا:

﴿ لا اله الا الله محمد رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) ﴾ مستدرک جلد دوم

اسی سے پتہ چلتا ہے کہ کوئی ذات رب تعالیٰ کے ہاں اس ذات سے برگزیدہ نہیں جس کے نام کو اس نے اپنے نام کے ساتھ ملا کر ذکر کیا ہے۔ آپ نے سوچا کہ اسی ذات کے وسیلہ سے دعاء کروں تو مغفرت ہو جائے گی۔ آپ نے کہا "اسئلک بحق محمد ان غفرت لی" میں تجھ سے محمد ﷺ کا واسطہ دے کر مغفرت چاہتا ہوں۔

☆ ابن منذر نے حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی کہ آدم علیہ السلام نے یہ الفاظ پڑھے:

"اللهم اسالک بجاه محمد عبدک و کرامته علیک ان تغفرلی خطیئتی"

''اے اللہ میں تجھ سے اس ذات کے مرتبہ کے واسطہ سے سوال کرتا ہوں جن کا اسم گرامی محمد ﷺ ہے جو تیرے خاص بندے ہیں اور تیرے ہاں مکرم ہیں کہ تو مجھے معاف فرما دے''

(از عزیزی)

☆ " وقیل رأی مکتوبا علی ساق العرش محمد رسول الله فتشفع به و اذا اطلقت الکلمة علی عیسی علیه السلام فلتطلق الکلمات علی الروح الاعظم والحبیب الاکرم ﷺ فما عیسی بل وما موسی بل وما وما الا بعض من ظهور انواره وزهرة من ریاض انواره ﷺ "

(روح المعانی)

اور بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ آپ نے ساق عرش پر " محمد رسول الله ﷺ "لکھا ہوا دیکھا تھا (تو یاد آنے پر) حضور کو ہی شفاعت کا ذریعہ بنایا یعنی وہ کلمات " محمد رسول الله " ہیں۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب عیسیٰ علیہ السلام پر " کلمة الله "کا اطلاق پایا گیا ہے، تو نبی کریم ﷺ جو روح اعظم اور حبیب اکرم ہیں ان پر " کلمات الله " کا اطلاق تو بطریق اولیٰ صحیح ہونا ہی ہے۔ نہ عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور نہ موسیٰ علیہ السلام ہیں بلکہ کائنات میں کوئی بھی نہیں جو نبی کریم ﷺ کے نور سے ظاہر نہ ہوا ہو۔ اور کوئی بھی ایسا نہیں جو نبی کریم ﷺ کے انوار کے باغ کا مہکتا ہوا پھول نہ ہو۔

☆ " وقالت طائفة ، رآى مكتوبا على ساق العرش " محمد رسول الله " فتشفع بذلك فهي الكلمات " (قرطبی)

بہت سے علماء نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام نے ساق عرش پر " محمد رسول الله " لکھا ہوا دیکھا تھا، اسی کے شفاعت حاصل کی، یہی اللہ تعالیٰ کے کلمات ہیں۔

راقم کا موقف: کون سے کلمات آپ کو سکھائے اور آپ نے وہ ادا فرمائے تو آپ کی مغفرت فرما دی گئی۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ بلکہ سب کا مقصد ایک ہی ہے۔ سب سے پہلے آپ نے عرض کیا۔ جسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا ہے:

" قال يا رب الم تخلقني بيدك قال بلى قال يا رب الم تنفع في الروح من روحك قال بلى قال يا رب انى تبت واصلحت اراجعى انت الى الجنة قال نعم " (بیضاوی)

(آپ نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا) اے میرے رب کیا تو نے مجھے اپنے دست قدرت سے پیدا نہیں کیا؟ رب تعالیٰ نے فرمایا ہاں میں نے اپنے دست قدرت سے تمہیں پیدا کیا ہے، پھر آپ نے کہا اے میرے رب کیا تو نے خود اپنی طرف سے مجھ میں خاص روح نہیں پھونکی، رب تعالیٰ نے کہا ہاں میں نے ہی یہ کیا ہے۔ پھر آپ نے کہا اے میری رب اگر میں توبہ کروں اور کوشش کروں کہ مجھ سے کوئی لغزش واقع نہ ہو گیا تو مجھے جنت میں لوٹا دے گا۔ رب تعالیٰ نے فرمایا: ہاں توبہ کرنے پر (بالآخر) جنت میں لوٹا دوں گا۔

اس کے بعد آپ کے دل میں مختلف دعائیں ڈال دی گئیں آپ وہ دعائیں پڑھتے رہے۔ پھر

آپ کے دل میں ﴿ربنا ظلمنا انفسنا و ان لم تغفرلنا و ترحمنا لنکونن من الخاسرین﴾ کوڈال دیا گیا۔ جس کی برکت سے آپ کو یاد آیا کہ عرش پر ایک جلیل القدر ہستی کا نام لکھا ہوا دیکھا تھا۔ تو آپ نے اسی نام کے وسیلہ جلیلہ سے دعا کی تو آپ کی توبہ کو قبول کرلیا گیا۔

اگر نام محمد را بیاو ردے شفیع آدم نہ آدم یافت توبہ نہ نوح از غرق نجینا

اگر آدم علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے اسم گرامی کو بطور وسیلہ نہ پیش کرتے اور اسی طرح نوح علیہ السلام آپ کے اسم گرامی کا وسیلہ نہ لاتے تو نہ آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوتی اور نہ نوح علیہ السلام غرق سے نجات حاصل کرتے۔

فائدہ: اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے دل پر کلمات القاء کیے تو آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے وہ کلمات سیکھ لئے اور ان کو پڑھنے سے اللہ تعالیٰ نے آپ کی توبہ کو قبول فرمالیا اسی سے یہ فائدہ حاصل ہوا:

" ان الذاکر لا ینتفع بالذکر ولا بنور باطنه الا اذا کان الشیخ عارفا واذنه فی ذلک والذاکر مشتاقا کتلقی آدم الکلمات "

اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا اس وقت تک ذکر سے کامل نفع نہیں حاصل کرسکتا اور نہ ہی اپنے باطن کو منور کرسکتا ہے جب تک کہ اس کا شیخ کامل نہ ہو اور یہاں تک کہ شیخ اس کو اجازت دے اور ذکر کرنے والا مشتاق ہو جس طرح کہ کلمات سکھانے والا رب تعالیٰ ہے، سیکھنے والے آدم علیہ السلام جو ان کلمات کے مشتاق تھے اور منتظر تھے۔ (از صاوی)

﴿ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴾: "تو اللہ نے ان کی توبہ کو قبول کیا، بیشک وہی بہت توبہ قبول کرنیوالا، رحم کرنیوالا ہے"

"تاب" کا مصدر "توبة" ہے۔ جس کا معنی ہے رجوع کرنا، جب اس کی نسبت بندے کی طرف ہو یوں کہا جائے "تاب العبد" تو اس کا معنی ہوتا ہے "رجع الی طاعة ربه" بندے نے اپنے رب کی طرف رجوع کیا۔ اور جب رب تعالیٰ کی طرف نسبت کی جائے، جس طرح یہاں ہے "فتاب علیه" تو اس کا معنی یہ ہوگا "قبل توبته او وفقه للتوبة" کہ رب تعالیٰ نے ان کی توبہ کو

قبول کیا۔ یا یہ معنی ہوگا کہ رب تعالیٰ نے ان کو توبہ کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔

"تواب" خواہ بندے کی طرف منسوب ہو یا رب تعالیٰ کی طرف اس کے معنی میں مبالغہ پایا جاتا ہے جو کثرت پر دلالت کرتا ہے:

"عبد تواب" رب تعالیٰ کی طرف بندے کا زیادہ رجوع کرنا:

"انه هو التواب" اسم ان معرفہ ہے اور خبر بھی معرفہ ہے درمیان میں ضمیر فصل کو لایا گیا جو حصر پر دلالت کر رہی ہے اور

"تواب" میں کثرت کا معنی پایا گیا ہے (بہت توبہ قبول کرنے والا)۔

"رحیم" رحم کرنے والا، زیادہ وضاحت اس لفظ مبارک کی سورۃ فاتحہ میں بیان ہو چکی ہے۔

اعتراض: جب حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا دونوں کو ہی درخت کے قریب جانے سے منع کیا گیا ہے " **ولا تقربا** " فرمایا جو کہ تثنیہ کا صغیہ ہے۔ اور دعاء میں بھی جمع کے صیغے ہیں " **ربنا ظلمنا ..... الخ** " جس سے واضح ہے کہ دونوں نے ہی دعاء کی۔ تو کیا وجہ ہے کہ " **فتاب علیه** " کہا ہے " **فتاب علیهما** " نہیں کہا کہ دونوں کی توبہ کی قبولیت کا ذکر ہو جاتا۔

جواب: " **لما كانت المرأة تابعة للرجل فى غالب الامر لم تذكر** " (از قرطبی)

''عورت اکثر طور پر تمام امور میں مرد کے تابع ہوتی ہے اس لئے اس کا علیحدہ ذکر نہیں کیا''

تنبیہ: " تاب يتوب توبة " سے اسم فاعل " تائب " ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو تائب نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ رب تعالیٰ نے اور نبی کریم ﷺ نے اور مؤمنین نے اللہ تعالیٰ کے لئے لفظ "تائب" استعمال نہیں کیا۔ اس لئے اگرچہ لغوی معنی کے لحاظ پر جائز تھا لیکن پھر بھی استعمال کرنا درست نہیں۔ رب تعالیٰ نے جب خود اپنے لئے " تواب " کا ذکر فرمایا تو یہی لفظ رب تعالیٰ کے لئے استعمال ہوگا اور اس کے معنی میں کثرت بھی ہے جو "تائب" میں نہیں۔ (از قرطبی)

حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ کس دن قبول ہوئی:

حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ جمعہ کو قبول ہوئی۔ آپ کی پیدائش اور جنت سے باہر تشریف لانا

بھی جمعہ کے دن ہی تھا اور وہ عاشورہ یعنی دس محرم کا دن تھا۔

خیال رہے کہ عاشورہ جمعہ کو بڑے اہم واقعات ہوئے۔ آدم علیہ السلام کی توبہ، نوح علیہ السلام کی کشتی کا زمین پر آنا، یونس علیہ السلام کا مچھلی کے پیٹ سے باہر آنا، ایوب علیہ السلام کی شفاء، موسیٰ علیہ السلام کا فرعون سے نجات پانا، اور فرعون کا غرق ہونا، یعقوب علیہ السلام کا یوسف علیہ السلام سے ملنا، حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا کربلا میں شہید ہونا سب دسویں محرم کو واقع ہوئے۔ ان بزرگوں نے گیارھویں شب راحت کی گزاری۔

اہل سنت و جماعت گیارھویں رات کو حضرت غوث پاک کے ایصال ثواب کا اہتمام کرتے ہیں وہ درحقیقت ان تمام بزرگوں کو حاصل ہونے والے انعامات پر اظہار خوشی بھی ہوتا ہے۔ (از نعیمی)

آدم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے مکالمہ پر حدیث نبوی:

"عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ احتج آدم و موسی عند ربهما فحج آدم موسی قال موسیٰ انت آدم الذی خلقک الله بیده و نفخ فیک من روحه واسجدلک ملائکته واسکنک فی جنته ثم اهبطت الناس بخطیئتک الی الارض ، قال آدم موسی الذی اصطفاک الله برسالته وبکلامه اعطاک الالواح فیها تبیان کل شئی وقربک نجیا فبکم وجدت الله کتب التوراة قبل ان اخلق قال موسی باربعین عاما قال آدم فهل وجدت فیها فعصی آدم ربه فغوی قال نعم قال افتلومنی علی ان عملت عملا کتبه الله علی ان اعمله قبل ان یخلقنی باربعین سنة قال رسول الله ﷺ فحج آدم موسی "

(رواہ مسلم، مشکوۃ کتاب الوسوسة)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آدم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب کے ہاں ایک دوسرے سے دلائل طلب کئے۔ آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا تم وہی آدم ہو جن کو رب تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا اور اپنی طرف سے خاص روح تم میں پھونکی۔ اور اپنے فرشتوں سے تمہیں سجدہ کرایا۔ اور تمہیں جنت میں ٹھہرایا، پھر تم نے اپنی لغزش سے لوگوں کو زمین پر اتار دیا؟

آدم علیہ السلام نے فرمایا تم وہی موسیٰ ہو کہ رب تعالیٰ نے تمہیں اپنی طرف سے رسالت عطاء کر کے اور تم سے کلام کر کے تمہیں برگزیدہ بنایا، اور تمہیں توراۃ کی تختیاں عطاء کیں جن میں ہر چیز کو بیان فرمایا، اور تمہیں اپنا خاص راز دان بنایا، میری پیدائش سے پہلے کتنے سال توراۃ کو لکھا گیا؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا چالیس سال۔

آدم علیہ السلام نے فرمایا کیا تم نے اس میں یہ لکھا ہوا پایا "**فعصی آدم ربه فغوی**" (آدم سے اپنے رب کے حکم میں لغزش واقع ہوئی جو مطلب چاہا تھا اس کی راہ نہ پائی) موسیٰ علیہ السلام نے کہاں ہاں (یعنی یہ تو لکھا ہوا میں نے توراۃ میں پایا ہے) آدم علیہ السلام نے کہا کیا تم مجھے ملامت کرتے ہو میرے اس عمل پر جو اللہ تعالیٰ نے میری پیدائش سے چالیس سال پہلے لکھ دیا کہ میں نے یہ عمل کرنا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے۔

وضاحت حدیث:

"**احتج ای تحاج** (جھگڑا کیا) **ای طلب کل منهما الحجة من صاحبه علی ما یقول**"

"یعنی ہر ایک نے ایک دوسرے سے حجت (دلیل) طلب کی کہ وہ اپنے قول پر دلائل پیش کرے"

یہ مکالمہ کس حال میں ہوا:

یا تو یہ مکالمہ عالم غیب میں روحانی طور پر ہوا "**عند ربهما**" کے الفاظ اس کی تائید کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی طرف سے تجلیات کے ذریعے ایک دوسرے پر کلام کرنا اور ایک دوسرے کو دیکھنا منکشف کر دیا۔

ہو سکتا ہے کہ یہ مکالمہ ان کا جسمانی طور پر ہو، کہ ان کو ظاہری حیات عطاء کر کے، یا موسیٰ علیہ السلام کی ظاہری حیات میں آدم علیہ السلام کو بھی ظاہری طور پر حیات کر کے اپنی رحمت خاصہ کے سایہ میں جمع کر کے، ان کو اپنا قرب عطاء کر کے ایک دوسرے سے کلام کرنے کا شرف عطاء کیا ہو۔

یا یہ ہو کہ مکالمہ تو جسمانی طور پر تھا لیکن ظاہری زمین پر نہیں، بلکہ اپنی اپنی قبور میں دونوں تھے، درمیان سے حجاب اٹھا دیئے گئے اور ان کو شرف کلام عطاء کر دیا گیا۔ جیسا کہ واضح طور پر ثابت ہے اور اس پر علماء ربانین کا اجماع ہے:

" ان الانبیاء احیاء فی قبورهم یصلون "

''بیشک انبیاء کرام اپنی قبروں میں زندہ ہیں وہ نماز پڑھتے ہیں''

" بیده " اور " من روحه " اور " فی جنته " میں اضافت تشریفی ہے۔ یعنی بغیر ماں باپ کے واسطہ کے اور بغیر کسی نمونہ کے رب تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی قدرت کاملہ سے پیدا فرمایا اسے ہی دست قدرت سے تعبیر کر دیا گیا۔ اور اپنی طرف سے خاص روح آدم علیہ السلام میں پھونکی اسی طرح خصوصی جنت میں آپ کو ٹھہرایا۔

" ثم اهبطت الناس بخطیئتک " ''پھر تم نے اپنی خطاء سے لوگوں کو زمین پر اتار دیا''

اکثر طور پر لوگ اس قسم کے الفاظ کو نہ سمجھ کر غلط معانی بیان کر کے ضال و مضل (گمراہ اور گمراہ کرنے والے) بن جاتے ہیں۔ آیئے دیکھئے ملا علی قاری رحمہ اللہ کیا خوب بیان فرماتے ہیں:

" (بخطیئتک) ای التی صدرت منک غیر لائقة بعلو مقامک وهی الکلک من الشجرة وان کان نسیانا "

''آدم علیہ السلام نے بھول کر درخت سے جو کھالیا تھا اسے بھی خطاء سے تعبیر کر دیا گیا کیونکہ آپ کا مقام بہت بلند تھا اور آپ کا بھولنا اور کامل توجہ نہ کرنا آپ کے لئے گرفت کا سبب بن گیا''۔

" او خطأ فی الاجتهاد لان الکمل یعاتبون ویؤاخذون بما لا یؤ اخذ به غیرهم فان حسنات الابرار سیآت المقربین "

یا آپ کی اجتہادی غلطی تھی۔ لیکن خیال رہے کہ اجتہادی غلطی اس وقت ہو سکتی ہے جب ان مفسرین کے قول کو تسلیم کیا جائے جنہوں نے یہ کہا کہ حضرت آدم علیہ السلام نے یہ سمجھا تھا کہ مجھے خاص معین درخت سے منع کیا گیا ہے، حالانکہ آپ کو اس درخت کی پوری جنس سے روکا گیا تھا۔ آپ نے معین درخت سے نہیں کھایا تھا۔ بلکہ اسی جنس کے دوسرے درخت سے کھایا تھا جو گرفت کا ذریعہ بنا۔

وجہ دونوں صورتوں میں کوئی بھی ہو، حقیقت یہی ہے کہ جو لوگ کامل درجہ رکھتے ہیں یعنی انبیاء کرام ان کو معمولی سی لغزش پر بھی عتاب ہوتا ہے اور گرفت ہوتی ہے جب کہ دوسرے لوگوں کو اس پر گرفت نہیں ہوتی۔ اس لئے عام نیک لوگوں کی نیکیاں بھی بعض اوقات مقرب لوگوں کے لئے لغزش اور غلطی سمجھی جاتی ہیں۔ (از مرقاۃ)

آیئے ایک درخشاں مثال آپ کے سامنے پیش کروں شائد کہ آپ کو سمجھ آ جائے اور آپ کا ذہن قبول کر لے، سید الاولیاء حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی رحمہ اللہ کا قافلہ ایک مرتبہ مدینہ شریف کے سفر کے دوران وادئ حمرا میں شب باش (رات گزارنے کے لئے قیام کرنا) ہوا۔ بدوؤں کے حملے اور قافلے والوں کے خوف و ہراس اور اضطراب کی وجہ سے حضرت قبلہ عالم نماز عشاء کی ابتدائی سنتیں ادا نہ کر سکے تو خواب میں آنحضرت ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی۔ حضور نے ارشاد فرمایا کہ آل رسول کو سنت ترک نہیں کرنا چاہئے۔ (از مہر منیر ص ۱۰۵)

واضح ہوا کہ سنت غیر مؤکدہ کے ترک پر کسی کو گرفت نہیں، لیکن نبی کریم ﷺ نے اپنے مقرب اور اپنی آل سے برگزیدہ شخص پر صرف سنت غیر مؤکدہ کی ترک پر ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور نبی کریم ﷺ کی زیارت کے دوبارہ شوق کا ذکر کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں:

لا ہو مکھ تھیں مخطط بردیمن　　　من بھانوری جھلک دکھاؤ سجن

او ہو مٹھیاں گالی الاؤ مٹھن　　　جو حمراء وادی سن کریاں

یعنی اے نبی کریم ﷺ آپ نے جو دھاری دار چادر یمنی اوڑھ رکھی ہے (مراد کفن ہے) وہ ذرا اتار کر اپنے محب کو اس کے دل کو بھانے والی اپنے چہرا مبارک کی جھلک دکھا دو (یعنی ایک مرتبہ پھر زیارت کرا دو) وہی میٹھی میٹھی باتیں جو آپ نے میرے ساتھ حمرا وادی میں کی تھیں وہی باتیں ذرا اب بھی فرما دیں۔ ہو سکتا ہے اس مثال پر کوئی اعتراض کرے کہ سنت مؤکدہ چھوڑنا مباح ہے، نیکی نہیں۔ اس لئے یہ مثال بیان کرنا درست نہیں کہ بعض اوقات نیک لوگوں کی نیکیاں بھی مقرب لوگوں کے لئے

باعث مؤاخذہ ہوتی ہیں۔ آیئے احادیث کی روشنی میں اور مثالیں دیکھئے جس سے اس اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔

☆ "عن انس قال کنا مع النبی ﷺ فی السفر فمنا الصائم ومنا المفطر فنزلنا منزلا فی یوم حار فسقط الصوامون وقام المفطرون فضربوا الابنیة وسقوا الرکاب فقال رسول اللہ ﷺ ذھب المفطرون الیوم بالاجر" (بخاری، مسلم، مشکوۃ باب صوم المسافر)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ہم نبی کریم ﷺ کی معیت میں (ساتھ) ایک سفر میں تھے کچھ ہم میں سے روزہ دار تھے اور کچھ لوگ افطار کر رہے تھے، ہم ایک سخت گرم مقام میں اترے روزہ دار لوگ گر گئے (یعنی نڈھال ہو کر لوٹ گئے) اور جن لوگوں نے روزہ نہیں رکھا ہوا تھا افطار کرنے والے تھے وہ کھڑے رہے (یعنی صحیح سلامت حالت میں رہے) انہوں نے خیمے لگائے اور سواریوں کو پانی پلایا نبی کریم ﷺ نے فرمایا آج افطار کرنے والے اجر لے گئے۔

اس حدیث پاک سے واضح ہو گیا کہ یہ بدر کا واقعہ ہے، وہاں روزہ افطار کرنا افضل تھا، اور روزہ رکھنا افضل نہیں تھا۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ نے افطار کرنے والوں کی فوقیت بیان کی۔

☆ "عن جابر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرج عام الفتح ای مکۃ فی رمضان فصام حتی بلغ کراع الغیم فصام الناس ثم دعا بقدح من ماء فرفعه حتی نظر الناس الیه ثم شرب فقیل له بعد ذلک ان بعض الناس قد صام فقال اولئک العصاۃ اولئک العصاۃ" (رواہ مسلم، مشکوۃ باب صوم المسافر)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے سال رمضان میں تشریف لے گئے۔ آپ نے روزہ رکھا ہوا تھا یہاں تک کہ آپ جب کراع غیم مقام پر پہنچے تو لوگوں نے بھی روزہ رکھا ہوا تھا آپ نے پانی کا ایک پیالہ منگوایا اسی اٹھا کر بلند کیا، لوگ دیکھ رہے تھے آپ نے پانی پی لیا، آپ کو اس کے بعد بتایا گیا کہ کچھ لوگوں نے روزہ رکھا ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا وہ نافرمان ہیں وہ نافرمان ہیں۔ حدیث پاک کی طرف ذرا غور تو فرمائیں کہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام کی روزہ کی حالت میں مشقت کو دیکھ کر روزہ افطار کر دیا اب کامل اتباع اسی میں تھی کہ صحابہ کرام صرف دیکھ کر ہی روزہ افطار کر لیں۔ جن لوگوں نے روزہ اس کے بعد بھی رکھا، ان کے روزہ رکھنے کو نافرمانی

سے تعبیر کیا۔ حالانکہ وہ مقرب نہ ہوتے تو روزہ رکھنا نیکی ہوتا۔ لیکن مقربین کے لئے حکم ہی یہ ہے کہ وہ دیکھ کر ہی اتباع کریں۔

شرعی ضابطہ ہی جب یہ ہے کہ جب تک منع نہ کیا جائے وہ کام مباح رہتا ہے تو صحابہ کرام نے کون سا جرم کیا تھا؟ بات صرف یہ ہے کہ عام نیک لوگوں کی نیکی بھی مقربین کے لئے بعض اوقات قابل گرفت ہوتی ہے اسے بھی خطاء کہہ لیا جاتا ہے۔

آدم علیہ السلام کے موسیٰ علیہ السلام پر غالب آنے کی وجہ:

آدم علیہ السلام کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اے موسیٰ جب اللہ تعالیٰ نے میری پیدائش سے پہلے چالیس سال لکھ دیا تھا کہ مجھ سے بھول ہوئی ہے اور لغزش ہوئی ہے تو وہ مجھ سے واقع تو ضرور ہونی تھی خواہ میں اس سے بچنے کی کوشش بھی کرتا۔ لیکن تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تم ایسا کلام کرو:

" فلم تلومنی علی ذلک و لان اللوم علی الذنب شرعی لاعقلی و اذا تاب الله تعالیٰ علی آدم وغفرله زال عنه اللوم فمن لامه کان محجوجا بالشرع "

تم مجھے کیسے ملامت کر رہے ہو۔ شرعی گناہ پر تو ملامت ہو سکتی ہے جو گناہ ہی نہ ہو صرف عقل کہے یہ خطاء ہے اس پر ملامت کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں اور خصوصا جب میں نے توبہ بھی کر لی رب تعالیٰ نے میری بھول اور لغزش کو بھی معاف کر دیا تو اب ملامت نہیں ہو سکتی۔ ورنہ شرعی طور پر حجت اس کے خلاف قائم ہوگی۔ پس یہی وجہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام پر غلبہ حاصل ہو گیا۔

(از نووی ج ۲ ص ۳۴۳)

" ومن هذا المقام قول الجیلی " اسی مقام پر جیلی رحمہ اللہ نے کیا خوبصورت اشعار بیان فرمائے:

ولی نکتة غراهنا ساقولها — وحق لها ان ترعوبها المسامع
هی الفرق ما بین الولی وفاسق — تنبه لها فالا مر فیه بدائع
وما هو الا انه قبل وقعة — یخبر قلبی بالذی هو واقع
فاجنی الذی یقضیه فی مرادها — وعینی لها قبل الفعال تطالع
فکنت اری منها الارادة قبل ما — اری الفعل منی والاسیر مطاوع
اذا کنت فی امر الشریعة عاصیا — فانی فی حکم الحقیقة طائع

مجھے خوب چمکدار نکتہ سمجھ آیا ہے جسے میں بیان کرتا ہوں

اور حق یہی ہے کہ کانوں پر اسے کھٹکا یا

ولی اور فاسق میں یہی فرق ہے

اس (نکتہ) پر متنبہ ہو جائے وہ عجیب بات پر مشتمل ہے

اور وہ نہیں ہے مگر یہی کہ واقعہ سے پہلے

میرا دل اسی چیز کی خبر دیتا ہے جو واقع ہونے والا ہوتا ہے

اسی آنے والے واقعہ کی مراد کے تقاضا پر بظاہر جنایت ہو جاتی ہے

میری آنکھیں فعل سے پہلے ہی اسکا مطالعہ کر لیتی ہیں

میں اسی ارادہ کے مطابق دیکھ لیتا ہوں اس سے پہلے

کہ وہ فعل مجھے نظر آئے قیدی شخص نے مطیع ہونا ہی ہے

امر شریعت میں ہو سکتا ہے مجھے کوئی عاصی سمجھے

بیشک حقیقت میں، میں اللہ تعالیٰ کا مطیع ہوتا ہوں

مقصد اس کا بھی یہی ہے کہ فاسق اپنی مرضی سے گناہ کرتا ہے توبہ نہیں کرتا پھر کہتا ہے تقدیر میں یہی تھا، اسے یہ نہیں سمجھ آتا کہ مجھے رب تعالیٰ نے فاعل مختار بنایا ہے۔

لیکن اللہ کے ولی کی نظر کام سے پہلے بھی تقدیر پر ہوتی ہے کام وہ بھی اپنے اختیار سے کرتا ہے لیکن اگر لغزش واقع ہو جائے تو وہ صرف یہ کہہ کر ٹال نہیں دیتا کہ تقدیر میں یہی تھا بلکہ وہ رو رو کر اپنی معمولی لغزش کی بھی معافی چاہتا ہے۔ اس کا بھول کر معاف کرا لینا حقیقت میں رب تعالیٰ کی فرمانبرداری ہوتا ہے۔ اگر چہ بظاہر اس کا بھول جانا شریعت کے مخالف نظر آتا ہے۔

☆☆☆

﴿توبہ کا بیان﴾

یہی آیۃ جس کی بحث کی جارہی ہے ﴿ فتاب علیه انه هو التواب الرحیم ﴾ اسی کی تفسیر میں علامہ رازی رحمہ اللہ نے تفسیر کبیر میں ذکر کیا۔ اور اسی طرح شیخ زادہ میں بھی اسی مقام پر توبہ کی بحث کا ذکر کیا گیا ہے۔

راقم نے اپنی کتاب ''موت کا منظر مع احوال حشر ونشر'' میں توبہ نصوح کے متعلق تفصیلی مضمون لکھا تھا، اسی کو یہاں شامل کیا جا رہا ہے جو کہ تقریباً تفسیر کبیر اور شیخ زادہ سے کچھ نہ کچھ ملتی جلتی بحث ہے۔ اور خاص کر کے وجہ یہ بھی ہے کہ کام بہت دیر سے شروع کیا۔ کہاں پہلا پارہ اور کہاں اٹھائیسواں پارہ وہاں تک پہنچنے کی کوئی خاص امید نظر نہیں آتی اللہ تعالیٰ مہربانی فرمادے تو کوئی بعید بھی نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ☆ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ یُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَیُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾

اے ایمان والو اللہ کی طرف ایسی توبہ کرو جو آگے کو نصیحت ہو جائے (سچی توبہ کرو) قریب ہے کہ تمہارا رب تمہاری برائیاں تم سے اتار دے اور تمہیں باغوں (جنات) میں لے جائے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں۔

''نصوحا'' مبالغہ کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے زیادہ نصیحت کرنا، یہ توبة کی صفت ہے یعنی بہت نصیحت کرنے والی توبہ، یعنی ایسی توبہ ہو جو توبہ کرنے والے شخص کو جن گناہوں سے وہ توبہ کر رہا ہے ان کی طرف آئندہ نہ لوٹنے کی نصیحت کرنے والی ہو۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مقصد یہ ہوگا، کہ اتنی خالص سچی توبہ ہو کہ جس سے توبہ کرنے والے حضرات خود ہی اپنے نفسوں کو نصیحت کرسکیں۔ (تفسیر کبیر)

حضرت معاذ بن جبلؓ نے عرض کیا:

''یا رسول الله ما التوبة النصوح ؟'' یارسول اللہ! ''توبہ نصوح'' کیا چیز ہے؟

نبی کریم ﷺ نے جواب ارشاد فرمایا: ''ان یندم العبد علی الذنب الذی اصاب فیعتذر الی

اللہ تعالیٰ ثم لایعود الیہ کما لا یعود اللبن الی الضرع ''

انسان اپنے گناہوں پر نادم ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے حضور عذر پیش کرے (یعنی گناہوں کی معافی طلب کرے) پھر کبھی ان گناہوں کی طرف نہ لوٹے (یعنی پختہ ارادہ کرے کہ آئندہ یہ گناہ کبھی نہیں کروں گا۔) جیسے (دوہا ہوا) دودھ تھنوں کی طرف نہیں لوٹتا۔

اہل عرب نصاحۃ الثوب کا لفظ بولتے ہیں جس کا معنی لیتے ہیں'' کپڑے کو سینا اور رفو کرنا'' اس طرح التوبۃ النصوح کا معنی ہوگا کہ انسان کے گناہوں کی وجہ سے اس کے دین میں جو خلل واقع ہوا ہے، اس شخص کی توبہ سے اللہ تعالیٰ اسے پر کردے گا، گویا، توبہ سے اس کے دین کی چادر کے سوراخ رفو ہو جاتے ہیں۔ عربی زبان میں عسل ناصح بولتے ہیں جس کا معنی ہوتا ہے خالص شہد یعنی ملاوٹ سے پاک وصاف، اب توبہ نصوح کا معنی ہوگا خالص توبہ، سچے دل سے توبہ ہو جس پر انسان قائم رہنے کا عزم صمیم (پختہ ارادہ) کرے اور پہلے نصیحت گناہوں پر نادم ہو، آئندہ گناہوں کی طرف نہ لوٹنے کا وعدہ کرے۔

النصوح: بہت نصیحت کرنا، اس معنی کے لحاظ پر ایک معنی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایسی توبہ ہو جو دوسرے لوگوں کو نصیحت کرنے والی ہو، یعنی لوگ جب توبہ کرنے والے کو دیکھیں کہ یہ شخص کتنا ہی گنہگار تھا، اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے فضل وکرم سے کیسے توبہ کی توفیق عطا فرمائی۔ کہ اب یہ نیک، متقی، صالح ہو گیا، ہمیں بھی چاہئے کہ ہم بھی گناہوں سے توبہ کریں، نیک متقی بن جائیں تا کہ اللہ تعالیٰ کے عفو و مغفرت اور اس کے فضل وکرم سے ہم بھی بہرہ ور ہو جائیں۔

امور اسلامیہ میں سب سے اہم چیز توبہ، مقامات ایمانیہ میں سب سے اول توبہ، سالکین کے راستہ کا مبدأ توبہ، واصل باللہ ہونے والے حضرات کے دروازہ کی چابی توبہ ہے۔

توبہ اس وقت حقیقت میں توبہ ہوگی جب گناہ کو گناہ سمجھ کر توبہ کرے اور صرف اللہ تعالیٰ کا خوف مدنظر ہو۔ اگر کسی آدمی کو کسی گناہ سے بدن میں کوئی ضرر پہنچے یا مال متاع میں کوئی نقصان ہو وہ ان نقصانات کی وجہ سے گناہ چھوڑنے کا ارادہ کرتا ہے اور توبہ کرتا ہے کہ میں گناہ کو چھوڑ رہا ہوں تا کہ ان

نقصانات سے بچ سکوں ایسی توبہ درحقیقت توبہ نہیں، اس کی قبولیت کی کوئی امید نہیں۔ (تفسیر روح المعانی)

صوفیائے کرام کا تقویٰ تو یہاں تک ہے کہ توبہ کرتے وقت جنت میں داخل ہونے کا طمع اور جہنم سے بچنے کا خوف بھی مدنظر نہ ہو بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا خوف ہو، جب اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے حاصل ہو جائیں گے۔

حضرت علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں:

" التوبة مااستجمعت ثلاثه امور ، ان يقلع عن المعصية ، وان يندم علىٰ فعلها وان يعزم عزما جاريا على ان لا يعود الىٰ مثلها ابدا فان كانت تتعلق بآدمى لزم رد الظلامة الى صاحبها او وارثه اوتحصيل البرائة منه ، وركنها الاعظم الندم " (تفسیر روح المعانی)

علامہ آلوسیؒ نے فرمایا کہ حقیقی توبہ یہ ہے کہ اس میں تین چیزیں پائی جائیں۔

(۱) گناہ کو چھوڑ دے (۲) پہلے جو گناہ کر چکا ہے اس پر نادم ہو۔

(۳) آئندہ کے لئے پختہ ارادہ کہ میں گناہ کبھی نہیں کروں گا۔

حقوق اللہ میں یہ تین چیزیں ہیں۔ لیکن حقوق العباد میں ان تین کے علاوہ ایک چوتھی چیز بھی ہے، وہ یہ ہے کہ جس کسی کا حق دبایا ہوا ہے وہ اسے لوٹا دے۔ وہ فوت ہو چکا ہو تو اس کے وارثوں کو لوٹا دے۔ یا اس شخص سے برائت حاصل کر لے، یعنی وہ اسے معاف کر کے بری الذمہ قرار دے دے توبہ کا سب سے بڑا رکن کئے ہوئے گناہوں پر نادم ہونا ہے۔

" وعلامة الندم طول الحسرة والخوف وانسكاب الدمع " (روح المعانی)

نادم ہونے کی تین علامتیں ہیں۔

(۱) لمبی حسرت یعنی بہت پشیمان رہنا، ہر وقت پشیمان رہنا۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا خوف طاری ہونا۔

(۳) آنسو بہانا یعنی گناہوں کو یاد کر کے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا خیال کر کے رونا۔

ضابطہ قبولیت جس گناہ کا وہ ارتکاب کر رہا ہے، اس کو توبہ کے لئے چھوڑنا ضروری ہے، کافر کی توبہ کفر سے باز آنا۔ مشرک کی توبہ شرک کو ترک کرنا اور منافق کی توبہ منافقت کو چھوڑنا ہے۔

قاعدہ: صرف توبہ سے ہی گناہ کبیرہ معاف ہوتے ہیں، باقی عبادات سے صغائر تو معاف ہوتے ہیں کبائر معاف نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے صغائر یا کبائر معاف فرمادے تو اس کی مہربانی ہوگی البتہ شرک کو اللہ تعالیٰ کبھی معاف نہیں فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی یہ ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ ﴾ (پ ۵ ۱۵)

بے شک اللہ اسے نہیں بخشتا کہ اس کا کوئی شریک ٹھہرایا جائے اور اس سے نیچے جو کچھ ہے جسے چاہے معاف فرمادیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ﴾

(اے محبوب) آپ فرمادیجئے! اے میرے بندو جنہوں نے اپنے نفسوں پر زیادتیاں کی ہیں اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔

جب نفسانی جذبات مشتعل ہوجاتے ہیں تو بڑے بڑے دانشمندوں سے انتہائی قبیح حرکتیں سرزد ہوجاتی ہیں، جب انتقام کے شعلے بھڑکتے ہیں تو بڑے بڑے حلیم الطبع لوگوں کے ہاتھ سے بھی عدل وانصاف کا دامن چھوٹ جاتا ہے، غلط ماحول کے باعث غلط نظریات دل میں جم جاتے ہیں، ان حالات میں اگر کوئی شخص گناہوں اور بدکرداریوں سے اپنا دامن آلودہ کرلے اور اس کے لئے توبہ کا دروازہ بند کردیا جائے، تو وہ اپنی اصلاح کی طرف متوجہ نہیں ہوگا اور گناہ وعصیاں کی دلدل میں بڑی بے باکی سے بڑھتا چلا جائے گا، اس طرح خود بھی برباد ہوگا اور کئی معصوم زندگیوں کو بھی دفن کرکے رکھ دے گا۔

اسی طرح اگر یہ بات کسی کے ذہن نشین ہوجائے کہ گناہ کرنے سے کوئی مضرت نہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت واسعہ کے سامنے ہمارے ان گناہوں کی کیا حقیقت ہے ہم کچھ بھی کرتے رہیں وہ بخش دے گا اور جنت کے دروازے ہمارے لئے کھول دیئے جائیں گے، ایسا انسان بھی عمر بھر اپنی نفسانی خواہشات کے ہاتھوں کھلونا بنا رہتا ہے۔ خونریزی، بدکاری، راہزنی، حق تلفی سے اسے کوئی نفرت نہیں رہتی لوگوں کے حقوق پامال کرنے کے باوجود اور ملک میں فتنہ وفساد کی آگ بھڑکانے کے باوجود اس

کے دل میں خلش بھی پیدا ہوتی جو اس کو بے چین کر دے۔ یہ دونوں کیفیتیں انسان کے لئے سمِ قاتل (قتل کرنے والا زہر) ہیں اس طرح وہ نہ فقط دوسروں کے لئے وبالِ جان بن جاتا ہے، بلکہ اپنی ذات پر بھی ظلم عظیم کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس کو جو تعمیری صلاحیتیں اور نیکی کی قوتیں بخشی گئی تھیں ان سے اگر وہ صحیح کام لیتا تو آسمان شہرت پر مہر و ماہ (سورج و چاند) بن کر چمکتا اور قیامت تک دنیا اس کی نیکیوں کو یاد کرتی اسے دعائیں دیتی، اب وہ بیکار پڑی رہیں۔ اور برگ و بار (بارش اور ہوا سے جھڑے ہوئے پتے) لائے بغیر ختم ہو گئیں۔

اسلام جو دین فطرت ہے جس کا مقصد اولین فرد کی صحیح نشو و نما اور راہنمائی کرنا ہے تاکہ سلجھے اور اصلاح یافتہ افراد سے ایک ایسی قوم معرض وجود میں آئے جو قیادت امم (امتوں) کی ذمہ داری سنبھال سکے اور ساری انسانیت کی راہنمائی کا فریضہ ادا کر سکے، اس لئے اسلام نے انسان کو نہ تو بالکل بے لگام چھوڑ دیا ہے کہ وہ خرمستیاں (گدھے کی طرح مستیاں) کرتا رہے، چمن حیات کی نازک اور معصوم کلیوں کو مسلتا رہے۔ اور ان کی رنگ و نکہت کو لوٹتا رہے اور اس کے باوجود دل میں اپنی بخشش کا بھی یقین رکھے اور نہ ہی اسلام نے انسان کو مایوسیوں اور نا امیدیوں کے گہرے گڑھے میں دھکیل دیا بلکہ صحیح خطوط پر اس کی تربیت کا پروگرام پیش کیا۔

ایک طرف اسے اپنے اعمال نیک و بد کا ذمہ ٹھہرایا اور اسے ان نتائج سے آگاہ کیا جو اس کے اچھے یا برے اعمال پر سنت الٰہی کے مطابق مرتب ہو کر رہیں گے۔ تاکہ قبول کرنے کے لئے تیار ہے اس کے ساتھ اس کو مایوس بھی نہیں ہونے دیا۔ اسے بتا دیا کہ گناہوں اور بدکاریوں سے تائب ہو کر جب اور جہاں سے وہ نئی پاکیزہ زندگی شروع کرنے کا عزم کر چکے ہو تو تمہارے گناہ بے شمار اور نہایت سنگین کیوں نہ ہوں معاف کر دئے جائیں گے تمہیں یہاں سے مایوس نہیں لوٹایا جائے گا۔

(تفسیر ضیاء القرآن)

اس آیت کریمہ میں انسان کو کئی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کی امید دلائی ہے تاکہ انسان اللہ کی رحمت سے مایوس ہو کر گناہ گار ہی اس دنیا سے رخصت نہ ہو جائے، بلکہ سچے دل سے توبہ کر کے اپنے گناہوں کی مغفرت حاصل کرے۔

(۱) گناہگار انسان کو عبد کہا، عبد کا مطلب ہے محتاج، مسکین، اپنے آپ کو حقیر سمجھنے والا، کریم ورحیم ذات کے لائق ہی یہ ہے کہ وہ رحمت وخیر کا فیضان محتاج ومسکین کو پہچائے۔

(۲) رب تعالیٰ نے گناہگار بندوں کو اپنی طرف منسوب کیا اور فرمایا ''یا عبادی'' اے میرے بندو گویا اس سے یہ بتایا گیا کہ ایمان والے انسان اگر تو اپنے نفس پر زیادتیاں کر بھی لے تو میں تجھے پھر بھی اپنا بندہ سمجھ کر توبہ کی مہلت دیتا ہوں کیونکہ کوئی اپنے بندے کو بلا وجہ عذاب نہیں دیتا بلکہ مولیٰ تو اپنے بندے کو جہاں تک ممکن ہو کوشش کرتا ہے عذاب سے بچانے کی۔

(۳) ''اسرفوا علٰی انفسھم'' (جنہوں نے اپنے نفسوں پر زیادتیاں کی ہیں) کہہ کر اشارہ فرمایا کہ گناہوں کا نقصان تمہیں ہے تمہارے گناہوں سے مجھے کوئی نقصان نہیں اگر تم گناہوں سے توبہ کر کے اپنے آپ سے ضرر مٹالو تو مجھے معاف کرنے میں کیا نقصان ہے۔ اگر تم گناہوں سے زنگ آلودہ ہو کر مرتے تو تمہیں جہنم کی آگ کی بھٹی میں صاف کرنا پڑتا لیکن اگر توبہ سے تم نے اپنے گناہوں کے زنگ کو مٹا دیا تو اب میں اپنے وسیع فضل وکرم سے تمہیں معاف کردوں گا۔

(۴) اور فرمایا ''لا تقنطوا من رحمة اللّٰہ'' اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو گویا کہ اپنے کرم کے متعلق فرمایا کہ میں کریم ہوں، لہٰذا تمہیں چاہیے کہ کریم کے کرم سے ناامید نہ ہو وہ اپنے دربار میں آئے ہوئے، معافی کی طلب کا دامن پھیلائے ہوئے، اپنے جرموں پر نادم ہونے والے اور آئندہ نہ جرم کرنے کا عزم صمیم (پختہ ارادہ) رکھنے والے اپنے عاجز بندوں کو اپنے کرم سے کبھی مایوس نہیں فرمائے گا۔

(۵) پہلے فرمایا ''یا عبادی'' اے میرے بندو، اس کے بعد عربی محاورہ اور انسانی عقل کے تقاضا کے پیش نظر ''لا تقنطوا من رحمتی'' (میری رحمت سے ناامید نہ ہو) ہونا چاہیے تھا لیکن اسے چھوڑ کر جب رب کائنات نے اپنی حکمت کے مطابق اس طرح ارشاد فرمایا ''لا تقنطوا من رحمة اللّٰہ'' اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، تو اس سے یہ واضح کیا کہ میرا اسم گرامی اللّٰہ ہے جو تمام کامل صفات کا جامع ہے۔ یعنی تمام کامل صفات اس لفظ اللّٰہ میں جمع ہیں جو اللّٰہ ہو وہ رحمٰن، رحیم، کریم، غفور، اور رحیم بھی ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ جبار وقہار بھی ہوتا ہے۔

اگر تم جرائم کے مرتکب ہوئے، میرے احکام کے باغی ہوئے تو مجھے اللہ سمجھتے ہوئے میری صفات قہر و جبر کو مدنظر رکھنا اور اگر تم عاجز بندے بن کر گناہوں کی معافی طلب کرنے کی غرض سے میرے دربار میں آ گئے تو مجھے رحمٰن و رحیم سمجھنا کیونکہ میں اللہ ہوں۔ جو اللہ ہوتا وہ رحمٰن و رحیم بھی ہوتا ہے۔

(۶) ''لا تقنطوا من رحمة اللّٰه'' کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا'' ان اللّٰه یغفر الذنوب جمیعا'' اگر تم نے سچے دل سے توبہ کی تو اللہ تعالیٰ بھی تمام گناہوں کو معاف فرما دے گا، یہ نہیں کہ بعض گناہ معاف کرے اور بعض نہ معاف کرے دوبارہ اپنا اسم گرامی ذکر کیا اور کہا'' ان اللّٰه'' اور ''انہ'' نہیں کہا۔ تو اس سے بھی یہ واضح کیا کہ میں تمہیں بار بار بتا رہا ہوں کہ میں اللہ ہوں میرے رحمت کے دامن میں آ کر تو دیکھو کہ میں کیسی طرح بخشش کرتا ہوں۔

(۷) ''ان اللّٰه یغفر الذنوب'' (بے شک اللہ گناہوں کو بخشے گا) سے مقصد تقریبا حاصل تھا لیکن پھر بطور تاکید لفظ جمیعا کو ذکر کر کے اپنی وسعت رحمت کا اعلان فرمایا، کہ میں تمام گناہوں کو بخشنے والا ہوں۔

(۸) اپنی صفت غفور ذکر فرمائی جس کے معنی میں مبالغہ ہے یعنی بہت بخشنے والا۔ اس طرح جب انسان توجہ کرے گا کہ میرا رب کریم ہے۔ بہت بخشنے والا ہے تو مجھے بھی چاہئے کہ میں اپنے گناہوں کی معافی طلب کر کے اس کی مغفرت سے فائدہ حاصل کر لوں، تاکہ روز قیامت عذاب میں مبتلاء نہ ہونا پڑے۔

(۹) رب تعالیٰ نے اپنے غفور ہونے کے بعد رحیم ہونے کا ذکر فرمایا کہ مغفرت کے بعد میری رحمت بھی ہوگی۔ میں اپنے انعامات سے بھی نوازوں گا، اس طرح انسان کو متوجہ کیا کہ اے انسان میری مغفرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر اپنے آپ کو پاک صاف کرنے کے ساتھ ساتھ میری رحمت کے ہیرے اور موتی بھی حاصل کر لے۔

(۱۰) ''انہ هو الغفور الرحیم'' میں لفظ'' انہ'' کے بعد ''هو'' کو ذکر کیا، جو عربی گرائمر کے مطابق اس میں حصر کا فائدہ حاصل ہو رہا ہے جس کا مطلب ہے کہ غفور اور رحیم صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اس کے بغیر کوئی غفور و رحیم نہیں، لہٰذا اپنے گناہوں کی معافی اسی سے مانگو وہی تمہیں معاف فرمائے گا۔

سچی توبہ سے ڈاکوؤں کا سردار زمانہ کا ولی بن گیا:

حضرت فضیل ابن عیاضؒ اپنی زندگی میں چوروں کے سردار تھے۔ بیابان میں خیمہ لگایا ہوا تھا، خوبصورت موٹا لباس اور صوف کی کلاہ پہنے ہوئے اپنے خیمہ میں بیٹھے رہتے تھے آپ کے احباب و آشنا تمام چور اور ڈاکو تھے، چرایا ہوا مال اور ڈاکہ سے لوٹا ہوا مال ان کے پاس لاتے تھے۔ یہ ہی ان میں تقسیم کرتے تھے ایک رات کو ایک قافلہ کہیں جا رہا تھا اس میں ایک شخص یہ آیۃ کریمہ پڑھ رہا تھا۔

﴿ اَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ﴾

کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا؟ اہل ایمان کے لئے کہ جھک جائیں۔ ان کے دل یاد الٰہی کے لئے اور اس سچے کلام کے لئے جو اترا ہے۔

یہ آیہ مبارکہ سن کر آپ کے دل پر رقت طاری ہوگئی۔ اور آپ کو راہ ہدایت دکھائی گئی۔ آپ نے اپنے دل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ کب تک تو رہزنی کرتا رہے گا؟ کیا تو نے خدا کے حکم کو نہیں سنا؟ یہ کہتے ہی آپ نے ایک چیخ ماری اور روتے ہوئے عرض کرنے لگے: اے مولائے کائنات! اب وہ وقت آ گیا ہے کہ میں توبہ کر رہا ہوں، تیرے دربار کی طرف رجوع کر رہا ہوں، اس طرح روتے ہوئے خیمہ سے نکل کر جنگل کی راہ لی۔ وہاں پر ایک قافلہ اترا ہوا تھا جو آپ کے متعلق ہی باتیں کر رہے تھے کہ فضیل ڈاکوؤں کا سردار ہے، اس کے ساتھی لوگوں کا مال لوٹ لیتے ہیں۔ ڈاکو ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک عورت پر بھی عاشق ہونے کی وجہ سے راہ راست سے بھٹکا ہوا انسان ہے وہ کب سیدھی راہ پر آ سکتا ہے؟ آپ نے ان کی باتوں کو سن کر اپنا تعارف کرایا کہ فضیل میں ہی ہوں میں اللہ کے فضل و کرم سے آج سے توبہ کر چکا ہوں، آئندہ مجھے اس جنگل میں کبھی ڈاکہ مارتے ہوئے نہیں دیکھو گے۔ فضیل نے سچے دل سے توبہ کر لی۔

حضرت فضیل کا مقام ولایت:

ایک رات ہارون الرشید نے اپنے وزیر فضل برمکی سے کہا کہ مجھے آج کی شب کسی ایسے بزرگ کے پاس لے چلو جس سے میرے قلب کو سکون و راحت ہو۔ وزیر، ہارون الرشید کو سفیان کے پاس لے

گیا، جب ان کا دروازہ کھٹکھٹایا تو سفیان نے پوچھا کون ہے؟ کہا امیر المومنین۔ سفیان نے کہا مجھے پہلے کیوں نہیں خبر دی تا کہ میں خود ہی حاضر ہو جاتا۔ یہ سن کر ہارون الرشید نے اپنے وزیر کو کہا کہ یہ وہ شخص نہیں جس سے میرا دل مطمئن ہو سکے۔ تو وزیر نے کہا، جس شخص کی آپ کو تلاش ہے وہ فضیل ابن عیاضؒ ہو سکتے ہیں۔ ہارون الرشید اور اس کے وزیر جب حضرت فضیل کے گھر پہنچے تو آپ یہ آیۃ کریم تلاوت کر رہے تھے:

﴿ اَمۡ حَسِبَ الَّذِيۡنَ اجۡتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنۡ نَّجۡعَلَهُمۡ كَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ﴾

یعنی بد اعمال لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو نیک اعمال اشخاص کے برابر مرتبہ دیں گے۔ یہ سن کر ہارون الرشید نے کہا کہ اگر چہ میرے لئے یہی کافی ہے، لیکن پھر بھی دروازہ کھٹکھٹاؤ، وزیر نے دستک دی آپ نے پوچھا کون؟ وزیر نے کہا، امیر المومنین۔ آپ نے فرمایا امیر المومنین کو مجھ سے کیا کام اور مجھے اس سے کیا واسطہ؟ جاؤ اپنا کام کرو میرا وقت ضائع نہ کرو۔ وزیر نے کہا بادشاہ کی اطاعت لازم ہے آپ نے پھر فرمایا مجھے پریشان نہ کرو۔

وزیر نے کہا ہم حکماً داخل ہونا چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں اجازت تو نہیں دیتا البتہ اگر تم شاہانہ حکم سے آنا چاہتے ہو تو میں رد نہیں کر سکتا، اس طرح ہارون الرشید اور اس کا وزیر آپ کے پاس پہنچے تو آپ نے اپنا چراغ گل کر دیا تا کہ بادشاہ مجھے دیکھ نہ سکے، اسی دوران ہارون کا ہاتھ کہیں آپ کے ساتھ چھو گیا آپ نے فرمایا کتنا نرم ہاتھ ہے۔ کاش کہ دوزخ کی آگ سے بچ جائے، یہ کہہ کر آپ پھر اپنی نماز میں مشغول ہو گئے بادشاہ آپ کی اس بے توجہی کو دیکھ کر رونے لگا۔ اور عرض کیا کچھ فرمایئے!

آپ نے فرمایا تمہارا باپ نبی کریم ﷺ کا چچا تھا (یعنی تم عباسیہ خاندان کے ہو) انہوں نے ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ سے کسی صوبہ کی امارت (گورنری) طلب کی تو آپ نے فرمایا اے چچا تمہیں تمہارے نفس کا امیر بنایا جاتا ہے۔ یعنی مخلوق کی ہزار سال طاعت کرنے سے نفس کا خالق کی طاعت میں رہنا بہتر ہے۔

ہارون الرشید نے کہا اور کچھ نصیحت فرمائیں:

''آپ نے کہا حضرت عمرو بن عبد العزیزؒ جب خلیفہ بنائے گئے تو آپ نے چند بزرگوں کو بلا کر

پوچھا کہ میں اس بارگراں (بھاری بوجھ) کو کیسے اٹھا سکوں گا'' انہوں نے مشورہ دیا کہ اگر تم قیامت کے عذاب سے بچنا چاہتے ہو تو ضعیف مسلمانوں کو باپ کی طرح، نوجوانوں کو بھائیوں کی طرح، چھوٹوں کو بچوں کی طرح اور عورتوں کو بہنوں کی طرح سمجھو!

ہارون الرشید نے عرض کیا کچھ اور ارشاد فرمایئے!

آپ نے فرمایا: اسلامی ملک ریاست کو گھر کے برابر سمجھو، تمام مخلوق کو ماں، باپ، بہن بھائی اور بچوں کے برابر سمجھو، ان سے اچھا سلوک رکھو۔ یہ خوف ذہن میں ہمہ وقت رکھو کہ کتنے ہی خوبصورت چہرے آگ میں پڑ کر بدصورت ہو جائیں گے اور کتنے ہی سردار وہاں قید ہو جائیں گے۔ ہر غریب کے حقوق اس تک پہنچاؤ۔ ورنہ قیامت کے دن وہ غریب بڑھیا عورت بھی تمہارے دامن کو پکڑنے والی ہوگی جو یہاں بھوکی سوگئی۔

آپ کی یہ نصیحتیں سن کر ہارون الرشید پر گریہ وزاری طاری ہوگیا۔ روتے روتے بے ہوش ہوگیا پھر ہارون نے آپ سے پوچھا کہ تم نے کسی کا قرض تو نہیں دینا، آپ نے فرمایا ہاں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا قرض میرے ذمہ ہے اگر اس میں کوتاہی ہوگئی، ادا نہ کرسکا تو میری حالت افسوسناک ہوگی۔

ہارون نے کہا میرے پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ آپ نے دنیا میں کسی انسان کا قرض تو نہیں دینا، آپ نے فرمایا نہیں اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بہت نعمتیں حاصل ہیں۔

ہارون نے آپ کی خدمت میں ایک ہزار دیناروں کی تھیلی پیش کی، آپ نے کہا افسوس میری نصیحتوں کا تم پر کوئی اثر نہیں۔ غصہ سے دیناروں کی تھیلی واپس کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے بادشاہ اور اس کا وزیر بھی مجبوراً اٹھے، آپ نے دروازہ بند کر دیا۔ ہارون نے وزیر سے کہا کہ واقعی فضیل بن عیاض اللہ تعالیٰ کے بہت بڑے ولی ہیں۔ (ماخوذ از تذکرۃ الاولیاء)

سبحان اللہ! یہ فضیل بن عیاض ایک عورت کا عاشق، تمام مال و دولت اور راتیں اس پر قربان کرنے والا، ڈاکو، راہزن، چور، لٹیرہ، ڈاکوؤں کا سردار۔ لیکن توبہ کرنے سے، اپنے گناہوں پر نادم ہونے گناہوں کو چھوڑنے اور آئندہ گناہ نہ کرنے کے عزم صمیم سے ولایت کے بہت بلند مقام پر فائز ہوگیا۔

گناہگار بندے کی توبہ سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" للہ اشد فرحا بتوبة احدکم من احدکم بضالته اذا وجدها "

(مسلم شریف ج ۲ کتاب التوبة)

اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ سے اس شخص سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جو اپنی گم شدہ چیز کو پا کر خوش ہوتا ہے

دوسری حدیث شریف میں زیادہ وضاحت ہے۔

حضرت حارث بن سویدؒ فرماتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہؓ کے پاس ان کی حالت مرض میں عیادت کے لئے حاضر ہوا، آپ نے مجھے دو حدیثیں بیان فرمائیں ایک حدیث اپنی طرف سے اور ایک حدیث رسول اللہ ﷺ کی طرف سے، آپ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرما رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندہ کی توبہ سے اس شخص سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جو خوفناک بے آب وگیاہ جنگل میں ہو اس کے ساتھ ایک سواری ہو جس پر اس کا کھانے، پینے کا سامان لدا ہوا ہو تو یہ شخص سو جائے جب بیدار ہو تو دیکھے کہ میری سواری غائب ہے اس کی تلاش میں نکلے، پیاس غالب آجائے (عاجز آکر) کہے۔ کہ جہاں سے آیا تھا وہاں ہی واپس جا کر سو جاتا ہوں تا کہ موت ہی آجائے۔ واپس آکر اپنا سر کلائی کے اوپر رکھ کر سو جاتا ہے تا کہ موت آجائے۔ لیکن کچھ دیر بعد جاگتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کی سواری بمع کھانے پینے کے سامان کے اس کے پاس کھڑی ہے، اس وقت اس شخص کو اپنی سواری اور کھانے، پینے کی اشیاء دیکھ کر جتنی خوشی ہوگی، اللہ تعالیٰ کو اپنے مومن بندے کی توبہ سے اس سے بھی زیادہ خوشی ہوگی۔

کتنی ہی مرتبہ غلطی سرزد ہو پھر بھی توبہ کرتا ہی رہے:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" ما اصر من استغفر وان عاد فی الیوم سبعین مرة "

(ترمذی، ابو داؤد، مشکوٰۃ باب الاستغفار التوبہ)

جو شخص استغفار کرتا ہے وہ اپنے گناہوں پر مصر (قائم رہنا) نہیں رہتا، اگرچہ ایک دن میں ستر مرتبہ بھی اس سے غلطی کیوں نہ سرزد ہو۔

حدیث پاک سے واضح ہوا کہ انسان کو چاہیئے کہ وہ گناہوں سے توبہ کرتا رہے، غلطی سے کئی مرتبہ بھی اس کے گناہ سرزد ہو جائیں تو توبہ کرنے سے شرم محسوس نہ کرے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ توبہ نہ کرنا، گناہ پر نادم نہ ہونا، یہ گناہ پر اصرار ہے اور گناہ پر اصرار سے گناہوں میں زیادتی ہوتی ہے۔

حدیث پاک میں ہے "لا صغیرة مع الاصرار ولا کبیرة مع الاستغفار" اصرار سے صغیرہ نہیں اور استغفار سے کبیرہ نہیں رہتا۔ یعنی گناہ پر اصرار (بار بار کرنے) سے وہ صغیرہ اپنی پہلی حیثیت پر صغیرہ نہیں رہتا بلکہ کبیرہ بن جاتا ہے۔ اور اگر کبیرہ بھی سرزد ہو جائے تو توبہ و استغفار کرنے سے وہ کبیرہ نہیں رہتا بلکہ اللہ تعالےٰ اپنے فضل سے معاف فرما دیتا ہے۔

انسان تو گناہگار ہی ہے لیکن رب تعالیٰ "غفار" ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" والذی نفسی بیده لولم تذنبوا لذهب الله بکم ولجاء یقوم یذنبون فیستغفرون الله فیغفرلهم "

(مسلم ، مشکواة باب التوبة)

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر تم سے کوئی گناہ سرزد نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ تمہیں لے جاتا، ایک اور قوم کو لے آتا جو گناہ کرتے اور اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کی بخشش فرماتا۔

حدیث پاک سے واضح ہوا کہ انسان کا گناہوں سے معصوم ہونا فرشتوں کی طرح ہمہ وقت نیکیوں میں مشغول ہونا اس نظام دنیا کے ہی مخالف ہے، کیونکہ دنیا کو امتحان گاہ بنایا کہ کون ایمان لاتا ہے اسی طرح کون نیکیاں کرتا ہے اور کون برائیاں پھر برائیوں سے کون توبہ کرتا ہے اور کون برائیوں پر قائم رہتا ہے توبہ کرنے والوں کو رب تعالیٰ معاف فرماتا ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کو نیک لوگوں کو انعامات دینا پسند ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کو یہ بھی پسند ہے کہ گناہ گار اس سے معافی طلب کریں تو وہ انہیں معاف فرمائے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" کل بنی آدم خطاء وخیر الخطائین التوابون "

(ترمذی ، ابن ماجه ، دارمی ، مشکواة باب الاستغفار والتوبة)

ہر انسان خطاء کار ہے لیکن اچھے لوگ وہ ہیں جو غلطی کے ارتکاب کے بعد توبہ کر لیتے ہیں یعنی انسان ہے ہی بھولنے والا کثیر غلطیاں کرتا رہتا ہے لیکن رب تعالیٰ مغفرت فرمانے والا ہے انسان کا کام ہے غلطیاں کرنا لیکن رب کی طرف رجوع کرنے توبہ کرنے سے اللہ تعالیٰ کا کام ہے اپنے رحمت سے مغفرت فرمانا۔

لیکن انبیائے کرام گناہوں سے پاک ہیں۔ اسی لئے اس حدیث کی شرح میں ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں:

" واما الانبیاء صلوات اللہ علیھم فاما مخصوصون عن ذالک واما انھم اصحاب صغائر والاول اولیٰ"

جو حکم عمومی ذکر کیا ہے کہ ہر انسان خطاء کار ہے اس سے انبیائے کرام خاص ہیں۔ یا بعض لوگوں کا قول ہے کہ انبیاء کرام سے صغائر سرزد ہوتے ہیں۔ لیکن پہلا قول ہی معتبر ہے کیونکہ صحیح محققین کا مسلک یہی ہے کہ انبیاء کرام صغائر سے بھی پاک ہوتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" ان المؤمن اذا اذنب کانت نکتۃ سوداء فی قلبہ فان تاب واستغفر صقل قلبہ وان زاد زادت حتی تعلو قلبہ فذلکم الران الذی ذکر اللہ تعالیٰ ﴿ کلا بل ران علیٰ قلوبھم ما کانوا یکسبون﴾ " (مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ، مشکواۃ باب الاستغفار والتوبۃ)

بے شک مومن جب گناہ کرتا ہے اس کے دل میں سیاہ نکتہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرتا ہے اس کا دل صاف ہو جاتا ہے۔ اگر وہ گناہ زیادہ کرنے شروع کر دے تو اس کے دل کی سیاہی زیادہ ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ تمام دل پر چھا جاتی ہے۔ یہ ان کے دلوں پر زنگ ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴾ (پ ۳۰)

نہیں نہیں درحقیقت زنگ چڑھ گیا ہے ان کے دلوں پر ان کے کرتوتوں کے باعث جو وہ کیا کرتے تھے۔

حدیث شریف سے واضح ہو رہا ہے کہ جس طرح نیک اعمال سے دلوں میں نورانیت پیدا ہوتی

ہے۔ان کے دل کا آئینہ صاف وشفاف ہوتا ہے اسی طرح گناہوں سے دل سیاہ ہو جاتا ہے نورانیت و چمک، دمک ختم ہو جاتی ہے۔دل زنگ آلود ہو جاتا ہے۔جس طرح لوہے کے زنگ صقل (نکل) سے دور کیا جاتا ہے اسی طرح دل کے زنگ کو توبہ سے دور کیا جاتا ہے۔

ایک شخص کی توبہ کا عجیب واقعہ:

حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم سے پہلی امتوں میں سے ایک شخص نے ننانوے قتل کئے، پھر علاقہ میں جو شخص بڑا عالم تھا اس سے سوال کیا (کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے) اس نے ایک راہب کی راہنمائی کی، وہ شخص اس کے پاس آیا، اسے بتایا کہ میں نے ننانوے قتل کئے ہیں کیا میری توبہ بھی قبول ہوسکتی ہے۔راہب نے کہا نہیں۔اس نے راہب کو بھی قتل کر دیا۔ اسی طرح اس نے سو قتل مکمل کر لئے۔پھر علاقہ کے کسی بڑے عالم سے سوال کیا۔اس نے اس کی ایک اور عالم کی راہنمائی کی کہ اس سے سوال کرو، اس عالم کے پاس آ کر اس شخص نے بتایا کہ میں نے سو قتل کئے کیا میری توبہ بھی قبول ہوسکتی ہے؟ اس نے کہا ہاں...... یقیناً توبہ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے گا...... کون سی چیز ہے جو تمہارے اور توبہ کے درمیان حائل ہے؟...... جو توبہ قبول نہ ہونے دے......تم فلاں جگہ چلے جاؤ وہاں کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہیں۔تم بھی ان کے ساتھ مل کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ اپنی زمین (اپنے علاقہ) کی طرف لوٹ کر نہ آنا۔کیونکہ یہ برائیوں والی زمین ہے۔

وہ شخص چل پڑا...... جہاں عبادت گذار لوگوں کے پاس جانا تھا اس کا...... ابھی نصف راستہ ہی طے کیا تھا کہ وہ فوت ہو گیا۔تو اب رحمت کے فرشتے اور عذاب کے فرشتے اس شخص کے بارے میں جھگڑا کرنے لگے۔رحمت کے فرشتے کہنے لگے...... اس کی روح ہم لے کر جائیں گے...... کیونکہ یہ سچے دل سے توبہ کی غرض سے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ تھا...... اس لئے اتنے دور سے نیک لوگوں کے پاس جا رہا تھا...... عذاب کے فرشتے کہنے لگے...... اس کی روح ہم لے کر جائیں...... اس نے کوئی نیک کام آج تک کیا ہی نہیں۔اتنے میں ایک اور فرشتہ انسانی شکل میں آ گیا۔ان فرشتوں نے یہ معاملہ اپنے جھگڑے کا اس کے سامنے پیش کیا۔اس نے کہا کہ دونوں طرف کی زمین کو ناپ لو جس طرف کی زمین تھوڑی ہے یہ شخص ان کے لئے ہی ہوگا۔یعنی اگر وہ زمین قریب ہے جس میں نیک لوگ عبادت کر

رہے ہیں تو یہ نیک لوگوں کا ساتھی متصور ہوگا؛ کیونکہ یہ زیادہ فاصلہ طے کر چکا تھا تھوڑا باقی رہ گیا تھا۔ اور اگر وہ زمین جو گناہوں والی ہے جہاں سے یہ آ رہا تھا تو ابھی گناہگار ہی متصور ہوگا کیونکہ ابھی اس نے تھوڑا فاصلہ طے کیا تھا اور زیادہ باقی رہتا تھا) جب انہوں نے زمین کو ناپا تو وہ زمین قریب تھی جہاں جا رہا تھا۔ تو اس طرح اس کی روح کو ملائکہ رحمت نے لے لیا۔

حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں کہ حضرت حسنؒ نے ہمیں بتایا کہ جب اس شخص پر موت کا وقت آیا تو اس نے اپنے سینہ کو اٹھایا۔ (یعنی صرف سینہ کا اس سرزمین کی طرف ہونا ہی اس کی بخشش کا سبب بنا)۔

حدیث پاک سے حاصل ہونیوالے فوائد:

اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وسعت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ رب کتنا ہی رحیم ہے انسان جب اپنے جرائم پر نادم ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے دامن میں لے کر اسے معاف فرما دیتا ہے۔ یہ نہیں دیکھتا یہ کتنا بڑا مجرم ہے۔

☆ یہ واقع پہلی امتوں کا ہے۔ ہماری شریعت میں ارادۂ قتل کرنے سے توبہ کے ساتھ ساتھ مقتول کے ورثاء کا معاف کرنا بھی ضروری ہے۔ قتل کے اقسام و احکام کی تفصیلی بحث گذر چکی ہے

☆ عابد سے عالم بہتر ہے، کیونکہ پہلے وہ شخص راہب کے پاس گیا جو عبادت گذار تو تھا لیکن صاحب علم نہیں تھا اس لئے وہ اسکی صحیح راہنمائی نہ کر سکا اور خود بھی قتل ہو گیا۔ پھر وہ شخص دوسری مرتبہ ایک عالم کے پاس گیا جس نے اس کی بہتر طریقہ سے راہنمائی کی تو وہ توبہ کی غرض سے جا رہا تھا، باوجود منزل مقصود تک نہ پہنچنے کے وہ بخشا گیا۔ یہ عالم باعمل کی نیک اور درست راہنمائی کا ہی نتیجہ تھا

حضرت ابن عباد رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" فقيه واحد اشد على الشيطان من الف عابد " (ترمذی، ابن ماجه، مشکواۃ کتاب العلم)

ایک عالم فقیہ بنسبت ہزار عابد کے شیطان پر غالب ہے۔ اس کی وجہ واضح ہے کہ عابد فقط اپنے آپ کو بچانے کی فکر میں ہوتا ہے اور عالم باعمل اپنے آپ کو بچانے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی بچانے کی سعی کرتا ہے۔

☆ انسان جب نیکی کا پختہ ارادہ کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس پر بھی ثواب مرتب کرتا ہے، جس طرح یہ

شخص اپنی منزل مقصود تک نہ پہنچ سکا، لیکن نیکی کے ارادہ اور توبہ کی غرض سے جا رہا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسے بخش دیا، نیکی کے پختہ ارادہ پر ثواب مرتب فرما دیا۔

☆ جس سرزمین پر برائیاں ہو رہی ہوں، اسے چھوڑ دینا چاہئے، کسی دوسری جگہ انسان کو چلا جانا چاہئے تاکہ برائیوں کی نحوست سے بچ سکے۔

☆ نیک لوگوں کی محفل میں بیٹھنے سے ان کی نیکیوں کے اثرات حاصل ہوتے ہیں انسان دیکھ کر ان کی نیکیوں جیسی نیکیاں حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نیک لوگوں کے قرب کی وجہ سے اس کو بھی نیک بنا دیتا ہے اور توبہ کی توفیق فرما دیتا ہے۔

فائدہ: سوال کرنے سے کسی کے علم کی نفی نہیں ہوتی۔ سوال کرنے میں کئی حکمتیں ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ نے سوال کیا: تونے ایسا کیوں کیا؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشہادۃ ہے۔ اس طرح نبی کریم ﷺ نے کئی مواقع پر جاننے کے باوجود سوال فرمائے۔ اس سے آپ کے علم کی نفی نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کی بخشش اس لئے فرمادی کہ وہ حقیقتاً سچا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا خوف اسے دامن گیر تھا۔ لیکن ساتھ ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات سے جاہل تھا۔ جو عیب تو ہے مگر جرم نہیں۔ اور اگر کسی شخص کو اللہ تعالیٰ کی صفات کا علم ہو اور یہ بھی معلوم ہو کہ مسلمان کو جلانا حرام ہے۔ تو پھر اسے جائز سمجھ کر اس قسم کی وصیت کرے (مجھے جلا دینا وغیرہ) تو کافر ہو جائے گا۔

موت کے یقین ہونے سے پہلے توبہ کرے:

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"ان اللہ یقبل توبۃ العبد مالم یغرر"

(ترمذی، ابن ماجہ، مشکوٰۃ، باب الاستغفار والتوبۃ)

بے شک اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ قبول کرتا ہے جب تک اس کی جان حلقوم میں نہ آجائے یعنی جب موت کا یقین نہ ہو تو توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ قبول فرمائے گا۔ اگر موت کا یقین آجائے تو توبہ قبول نہیں ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے اس کی متعلق اس طرح ارشاد فرمایا:

﴿ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ

تُبْتُ الْئٰنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ﴾

اور وہ توبہ ان کی نہیں جو گناہوں میں لگے رہتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان میں کسی کو موت آئے تو کہے اب میں نے توبہ کی اور نہ ان کی (توبہ) جو کافر مرے۔ یعنی جو لوگ ساری زندگی گناہوں میں گذار دیتے ہیں، اپنی نادانی، بے وقوفی کی وجہ سے توبہ نہیں کرتے، زندگی میں تو عیش وعشرت، طرب و نشاط نے انہیں گناہ میں مبتلاء رکھا، ہر قسم کے فسق و فجور میں ملوث رہے، لیکن جب موت کا وقت آ گیا پھر کہنے لگے ہائے میری توبہ، اللہ مجھے معاف فرما۔ ایسے لوگوں کی توبہ قبول کرنے کا اللہ تعالیٰ کا وعدہ نہیں، البتہ اس کی مرضی ہو تو معاف فرما دے تو اس کی مہربانی۔

موت کا یقین ہونے پر جان کا حلقوم میں آ جانے پر کافر کی توبہ تو قبول نہیں، اللہ تعالیٰ نے فرعون کے متعلق ذکر فرمایا:

﴿ وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ☆ آلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ☆ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴾ (پ ۱۱ ع ۱۴)

اور ہم بنی اسرائیل کو دریا پار لے گئے تو فرعون اور اس کے لشکروں نے ان کا پیچھا کیا سرکشی اور ظلم سے یہاں تک کہ جب اسے ڈوبنے نے آ لیا بولا میں ایمان لایا کہ کوئی سچا معبود نہیں سوا اس کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں مسلمان ہوں۔ کیا اب (تو ایمان لاتا ہے، توبہ کرتا ہے) اور پہلے سے نافرمان رہا اور تو فسادی تھا، آج ہم تیری لاش کو اتار دیں گے کہ تو اپنے پچھلوں کے لئے نشانی ہو اور بے شک لوگ ہماری آیتوں سے غافل ہیں۔

یہاں سے واضح ہوا کہ موت کے یقین آنے پر فرعون کو ایمان لانا فائدہ نہ پہنچا سکا۔ اس کی توبہ اس حال میں قبول نہیں ہوئی، حلقوم میں جان آنے پر کافر کی توبہ کا قبول نہ ہونا واضح ہوا۔

مومن اس وقت توبہ کرے جب اسے موت کا یقین ہو جائے تو اس کی توبہ کو ضرور قبول کرنے کا اللہ تعالیٰ نے کوئی وعدہ نہیں فرمایا، البتہ اس کی مرضی پر موقوف ہے، چاہے تو قبول فرمائے چاہے تو نہ قبول فرمائے۔

اہل علم نے یہ قید اس لئے لگائی ہے کہ ابھی جس آیۃ کریمہ اور حدیث شریف کو ذکر کیا اس سے پتہ چلتا ہے کہ موت کے وقت بالکل توبہ قبول ہی نہیں لیکن دوسری حدیث سے روح المعانی نے نقل فرمائی اس سے پتہ چلتا ہے کہ جان حلقوم میں بھی ہو تو پھر بھی توبہ کا وقت ہے۔تو اس طرح ان میں تطبیق ہو جائے گی کہ قبول کرنے کا تو اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمالیا، ارشاد فرمایا:

﴿ اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴾

اور توبہ جس کا قبول کرنا اللہ نے اپنے فضل سے لازم کرلیا ہے وہ انہیں کی ہے جو نادانی سے برائی کر بیٹھیں پھر تھوڑی دیر میں توبہ کرلیں۔ ایسوں پر اللہ اپنی رحمت سے رجوع کرتا ہے اور اللہ علم وحکمت والا ہے۔

وہ حدیث جو روح المعانی نے نقل فرمائی جس سے پتہ چلتا ہے کہ حلقوم میں جان آنے پر توبہ کی جائے، اس کا ترجمہ یہ ہے۔

"رسول اللہ ﷺ نے ایک اپنے خطبہ کے آخر میں ارشاد فرمایا جو شخص اپنی موت سے پہلے ایک سال توبہ کرلے اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے گا، پھر فرمایا جس شخص نے موت سے ایک مہینہ پہلے توبہ کرلی اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے گا، پھر ارشاد فرمایا جس شخص نے اپنی موت سے ایک دن پہلے توبہ کی، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے گا، پھر فرمایا دن بھی بہت ہے جو موت سے ایک گھڑی پہلے توبہ کرے، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے گا، پھر فرمایا، گھڑی بھی بہت ہے۔ یہ فرما کر اپنے حلق مبارک کی طرف اپنے ہاتھ مبارک سے اشارہ فرمایا کہ اگر کوئی شخص جان کے یہاں تک آنے پر بھی توبہ کرے تو قبول ہے"

ان آیات اور احادیث میں تطبیق اسی طرح ممکن ہے جیسے ذکر کیا جاچکا ہے کہ مومن موت کے یقین سے پہلے توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ نے قبولیت کا وعدہ فرمالیا، اس کی قبولیت کا یقین ہے، اور اگر موت کے وقت توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے۔ چاہے تو قبول فرمائے اور چاہے تو نہ قبول فرمائے، لہٰذا انسان کو چاہئے کہ اپنے جرائم پر قائم رہنے کے بجائے معافی طلب کرے، تاخیر نہ کرے بلکہ جلدی کرے دیر سے یعنی موت کے وقت پر توبہ کی قبولیت پر یقین نہ رکھے۔

نیک انسان بھی توبہ واستغفار کرتا رہے:

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" واللہ انی لاستغفر اللہ واتوب الیہ فی الیوم اکثر من سبعین مرۃ

(بخاری ، مشکوۃ باب الاستغفار و التوبۃ)

قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں ہر دن ستر مرتبہ سے زیادہ توبہ واستغفار کرتا ہوں۔

حدیث شریف میں جو ستر مرتبہ ذکر ہے اس سے مراد کثرت ہے کہ میں بہت ہی زیادہ توبہ و استغفار کرتا ہوں۔ کیونکہ دوسری حدیث میں سو مرتبہ استغفار کا ذکر ہے۔

حضرت ابن الملکؒ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کی توبہ واستغفار" لیس لذنب لانہ معصوم "کسی گناہ کی وجہ سے نہیں ہوتی تھی کیونکہ آپ تو معصوم ہیں۔ آپ یہ خیال کر کے توبہ کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ذوالجلال والاکرام ہے اس کے حضور کھڑے ہو کر میں اس کی عبادت اور عجز و انکساری میں کہیں کوتاہی نہ کر دیتا ہوں یہ خیال کر کے اپنے عجز کا اظہار کرنے کے لئے توبہ فرماتے تھے سبحان اللّٰہ ! کیا ہی شان ہے رب تعالیٰ کی بلند شانوں والے بھی کہتے ہیں "ماعرفناك حق معرفتك وما عبدناك حق عبادتك "ہم نے تجھے ایسے نہیں پہچانا جیسے پہچاننے کا حق ہے اور ہم نے تیری ایسی عبادت نہیں کی جیسے عبادت کرنے کا حق ہے۔

نبی کریم ﷺ کے توبہ کرنے کی دوسری وجہ یہ تھی:

" وحث لامته علی التوبة والاستغفار فانه ﷺ مع کونه معصوما و کونه خیر المخلوقات اذا استغفر و تاب الی ربه فی کل یوم اکثر من سبعین مرة فکیف بالمذنبین "

اور آپ نے تعلیم امت کے لئے توبہ فرمائی ، امت کو اس پر برانگیختہ کرنا تھا کہ جب آپ ﷺ باوجود معصوم ہونے اور تمام مخلوقات سے اعلیٰ ہونے کے باوجود ہر دن میں ستر مرتبہ سے زائد توبہ واستغفار فرماتے ہیں تو گناہگاروں کا کیا حال ہوگا؟ کہ وہ توبہ واستغفار نہ کریں۔ (ماخوذ از مرقاۃ المفاتیح)

جب نبی کریم ﷺ سے شان کے لحاظ پر کوئی بلند و بالا نہیں ہو سکتا تو کوئی شخص اپنی نمازوں صدقات و خیرات اور نیکیوں پر ناز نہ کرے بلکہ ہر حال میں اپنے آپ کو عاجز سمجھ کر اللہ تعالیٰ سے اپنی کوتاہیوں کی معافی طلب کرتا رہے، اس سے مدارج بلند ہوں گے۔

کسی مسلمان کے متعلق نہ کہو کہ اس کی بخشش نہیں ہوگی:

حضرت جندبؓ سے مروی ہے کہ بے شک رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا:

" ان رجلا قال واللہ لایغفر اللہ لفلان وان اللہ تعالیٰ قال من ذا الذی یتألی علی انی لا اغفر لفلان فانی غفرت لفلان واحبطت عملک " (او کما قال)

(مسلم، مشکوۃ باب الاستغفار والتوبۃ)

ایک شخص نے کہا کہ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی فلاں شخص کو اللہ تعالیٰ نہیں بخشے گا۔ (اللہ تعالیٰ کے دربار میں جب پہنچے) تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تجھے کس نے کہا تھا؟ کہ تم قسم اٹھاؤ کہ میں فلاں کی مغفرت نہیں کروں گا۔ بے شک میں نے فلاں کی مغفرت کردی اور تمہارے عمل کو ضائع کردیا، (او کما قال ﷺ).

حدیث پاک سے معلوم ہوا:

(۱) رسول اللہ ﷺ نے آنے والے حالات کو اپنی زندگی مطہرہ میں دیکھ کر بیان فرمادیا۔ یہ مکالمہ قیامت کو ہوگا لیکن نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ رب تعالیٰ اور اس کے بندے میں گویا کہ یہ بات چیت ہوچکی ہے۔

(۲) انسان کسی کی برائیوں کو زیادہ سمجھ کر اور اپنی نیکیوں پر ناز کرتے ہوئے تکبرانہ انداز سے یہ نہ کہے کہ فلاں کو اللہ تعالیٰ نہیں بخشے گا۔

(۳) اللہ تعالیٰ اس شخص کو جھوٹی قسم کی سزا دینے کے لئے اور اسے ذلیل کرنے کے لئے اس دوسرے شخص کو بخش دے گا اور اس کے اعمال کو ضائع کردے گا، اعمال کے ضائع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ سزا ان پر غالب آجائے گی جب عذاب میں مبتلاء ہوگا [تو گویا کہ اس کے نیک اعمال نہ ہونے کے برابر ہوں گے۔

یہ خیال رہے کہ اگر کوئی شخص کہے کہ گستاخ رسول ﷺ کو اللہ تعالیٰ نہیں بخشے گا۔ صحابہ کرام، اہل بیت اطہار کی شان میں گستاخیاں کرنے والوں کو کبھی بھی اللہ تعالیٰ نہیں بخشے گا، شرک کرنے والوں کو، کفر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرمائے گا۔ اس طرح کہنا جائز ہوگا؛ کیونکہ یہ سب کافر ہیں، یہ یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں کو نہیں بخشے گا۔

﴿ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ☆ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾

(۱) ''ہم نے فرمایا تم سب جنت سے اتر جاؤ، پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کا پیرو ہوا اسے نہ کوئی اندیشہ نہ کچھ غم، اور وہ جو کفر کریں اور میری آیتیں جھٹلائیں گے وہ دوزخ والے ان کو ہمیشہ اس میں رہنا''

(۲) ''ہم نے کہا اترنے کے بعد جو تم سب زمین میں ہی رہو پھر اگر آ جائے تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت تو جس نے میری ہدایت کی تابعداری کی اسے نہ کوئی خوف ہے اور نہ ہی ان کو کوئی غم ہوگا ☆ اور جنہوں نے کفر کیا اور جھٹلایا ہماری آیتوں کو وہ لوگ آگ والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے''۔

تفصیلی وضاحت :

پہلے بیان کئے ہوئے مضامین جب ذہن میں ہوں گے تو مختصر وضاحت تو صرف ترجمہ سے ہی حاصل ہو جائے گی اس لئے تفصیلی وضاحت کو ذکر کیا جا رہا ہے ﴿ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا ﴾ کہنے کا مطلب کیا ہے جب کہ یہی حکم پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں مفسرین کرام کے کئی اقوال ہیں۔ جن کو ذکر کیا جاتا ہے تا کہ سمجھنے میں کوئی مشکل درپیش نہ آئے:

'' كرر الامر بالهبوط ايذانا بتحتم مقتضاه وتحققه لا محالة ''

''دو مرتبہ جنت سے اترنے کا حکم دیا گیا تا کہ آدم علیہ السلام کو معلوم ہو جائے کہ یہ حکم یقینی ہے اور اس نے واقع ہونا ہی ہے'' (ابو سعود)

کیونکہ ممکن تھا کہ آدم علیہ السلام کے دل میں خیال آتا کہ ہو سکتا ہے کہ جنت سے اتر جانے سے پہلے ہی توبہ قبول ہو جائے اور اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی فرما دے۔ البتہ پھر یہ خیال کیا جائے کہ یہ تکرار کیوں

پایا گیا ہے۔ اس میں ایک قول یہ ہے کہ یہ تاکید کیلئے ہے " کما تقول لرجل قم قم " جیسا کہ تو کسی کو کہے اٹھ جا، اٹھ جا۔ اس صورت میں صرف لفظی تکرار ہوگا معنی میں تکرار نہیں ہوگا۔ (قرطبی)

دوسرا قول یہ ہے کہ لفظی اور معنوی لحاظ پر تکرار ہے کیونکہ پہلا حکم علیحدہ قیود سے مقید ہے اور دوسرا حکم علیحدہ قیود سے مقید ہے:

" فان الاول دل علی ان هبوطهم الی دار بلیة یتعادون فیها و لا یخلدون و الثانی اشعر بانهم للتکلیف فمن اهتدی الهدی نجا و من ضله هلک " (بیضاوی)

دونوں حکم ہی جنت سے اترنے سے پہلے آگے پیچھے دیئے گئے پہلے حکم میں یہ بتایا گیا کہ تم سب جنت سے اتر جاؤ اس مقام کی طرف جو آزمائش کا مقام ہے (یعنی زمین پر چلے جاؤ) وہاں تم ایک دوسرے سے دشمنی کرو گے یعنی آدم علیہ السلام کو کہا تمہاری اولاد بعض بعض کی دشمن ہوگی۔ اور تم نے وہاں بھی ہمیشہ نہیں رہنا بلکہ ایک وقت مقررہ تک تم نے زمین میں نفع حاصل کرنا ہے پھر تم پر موت نے آجانا ہے۔

اور دوسرا حکم دیتے وقت یہ بتا دیا گیا کہ زمین میں جو تمہیں اترنے کا حکم دیا گیا ہے تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ زمین ہی دار تکلیف ہے۔ جب تمہارے پاس ہدایت آجائے جو اسے قبول کرے اور اس پر قائم رہے وہ نجات پا جائے گا۔ اور جس نے اس ہدایت پر عمل نہ کیا اور بھٹک گیا وہ ہلاک ہو جائے گا۔

خیال رہے کہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ان اقوال کے مطابق ہی ہے کہ دونوں حکم جنت سے اتر جانے کے متعلق ہیں (دونوں حکموں میں تاکید ہو، یا علیحدہ علیحدہ قیود کا اعتبار ہو)

تنبیہ: اگرچہ قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے یہ تحریر فرمایا ہے:

" والتنبیه علی ان مخافة الاهباط و المقترن باحدهذین الامرین کافیة للحازم ان تعوقه عن مخالفة حکم اللہ تعالیٰ فکیف بالمقترن بهما و لکنه نسی و لم تجد له عزما "

اللہ تعالیٰ نے آپ کو اتر جانے کا جو حکم دیا اسے دو قسم کے امور سے ملایا ایک یہ کہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور تم نے زمین میں ہمیشہ نہیں رہنا اور دوسرا حکم یہ ہے کہ زمین ہی دار تکلیف ہے اس پر جزاء مرتب ہونی ہے۔ ان دونوں قسم کے امور میں سے ایک ہی یقین کر لینے کے لئے کافی ہے کہ

اللہ تعالیٰ کے حکم سے لغزش نہ واقع ہو،لیکن جب اترنے کے حکم کو دونوں قسم کے امور سے ملا کر ذکر کر دیا گیا تو پھر آپ سے لغزش کیسے واقع ہوئی۔تو اس کا جواب قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے دیا کہ آپ بھول گئے۔

لیکن راقم کے خیال میں اس تنبیہ کو ذکر کرنے کی اس لئے ضرورت نہیں کہ بھول پہلے واقع ہوئی اور جنت سے اترنے کا حکم دو قسم کے امور سے ملا کر بعد میں دیا۔ہاں البتہ بعد میں جو قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے اسے اس حکم پر مرتب کرنا صحیح ہے:

" وان کل واحد منهما کفی به نکالا لمن اراد ان یذکر "

آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے جو نصیحت حاصل کرنا چاہے اس کے لئے ایک حکم کے ساتھ ذکر ہونیوالی قیود ہی نصیحت دینے کے لئے کافی ہیں۔لیکن جو دونوں حکم علیحدہ علیحدہ قیود سے مقید ہیں تو یقیناً یہ ارشادات الاھیہ بہت عظیم نصیحت آموز ہیں۔

☆ اور قول یہ ہے " الاول من الجنة الی سماء الدنیا والثانی منها الی الارض " کہ یہ دونوں حکم ہی علیحدہ علیحدہ ہیں۔پہلا حکم جنت سے آسمان دنیا کی طرف اتر جانے کا ہے اور دوسرا حکم آسمان دنیا سے زمین پر اترنے کا ہے۔ (بیضاوی)

لیکن اس معنی کے متعلق خازن میں یہ ذکر کیا گیا ہے " وفیه ضعف " اس معنی میں ضعف پایا گیا ہے۔

☆ علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دوسری مرتبہ جو " اهبطوا " فرمایا گیا اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو لغزش کی وجہ سے جنت سے اترنے کا حکم دے دیا گیا آپ نے رب تعالیٰ کی طرف سے کلمات سیکھ لئے۔آپ کی توبہ کو قبول کر لیا گیا:

" ووقع فی قلبهما ان الامر بالهبوط لما کان بسبب الزلة فبعد التوبة وجب ان لا یبقی الامر بالهبوط فاعاد الله تعالیٰ الامر بالهبوط مرة ثانیة لعلما ان الامر بالهبوط ما کان جزاء علی ارتکاب الزلة حتی یزول بزوالها بل الامر بالهبوط باق بعد التوبة لان الامر به کان تحقیقا للوعد المتقدم فی قوله (انی جاعل فی الارض خلیفة)" (کبیر)

تو ان دونوں کے دل میں یہ بات آئی کہ ہمیں جنت سے اترنے کا حکم ہماری لغزش کی وجہ سے دیا

گیا تھا توبہ کے بعد ضروری ہو گیا کہ ہمیں "ہبوط" کا حکم نہیں دیا جائے گا۔ رب تعالیٰ نے "ہبوط" کے حکم کو دوبارہ لوٹایا۔ تا کہ ان کو معلوم ہو جائے گا جنت سے اترنے کا حکم در حقیقت لغزش کی وجہ سے نہیں تھا (یہ تو ظاہر طور پر تھا) کہ توبہ قبول کرنے کے بعد یہ حکم ختم ہو گیا بلکہ توبہ کے بعد بھی یہ حکم برقرار رہے گا، کیونکہ میں نے تمہاری پیدائش سے پہلے ہی کہہ دیا تھا:

﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ ''میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں''

میری مشیت کا تقاضا ہی تمہیں زمین میں آباد کرنا اور تم سے جمال محمدی کو ظاہر کرنا ہے۔ لیکن خیال رہے کہ اس قول کے مطابق "ہبوط" کا معنی اترنا نہیں۔ بلکہ تبصیر الرحمٰن سے اس معنی کو دیکھئے

" (قُلْنَا اهْبِطُوْا) ای استقروا بمکان الهبوط (منها) ای من اثر تلک المعصیة " (تبصیر الرحمن)

ہم نے کہا جہاں تمہیں اتارا وہیں قائم رہو اب "منها" کا مطلب یہ ہو گا کہ لغزش کے اثر سے جہاں تمہیں اتارا وہیں قرار پکڑو۔

راقم نے یہی معنی تحریر کیا ہے تا کہ یہ بحث بھی طلباء کرام کو ذہن نشین ہو جائے۔

مقام توجه: ابھی جو بحث کی اس سے یہ پتہ چلا کہ آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارنا تقاضا و حکمت کے مطابق تھا تو اسی سے معارف القرآن میں مفتی محمد شفیع صاحب کے ان الفاظ (اس جگہ پھر اس کو مکرر لانے میں غالباً حکمت یہ ہے کہ پہلی آیت میں زمین پر اتارنے کا ذکر بطور عتاب اور سزا کے آیا تھا) پر علامہ کاظمی رحمہ اللہ نے گرفت کی ہے کہ سزا کے طور پر اتارنے کا مقصد ہی نہیں لہٰذا یہ جملے غلط ہیں

﴿جَمِیْعًا﴾: " حال من فاعل اهبطوا الی مجتمعین " (شیخ زادہ) پہلے معانی کے لحاظ پر معنی یہ ہو گا تم سب مجتمع ہو کر اتر جاؤ کیونکہ " جمیعا " اهبطوا " کے فاعل سے حال واقع ہے جو "مجتمعین" کے معنی میں ہے۔ یہ حکم بھی آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو ہے کہ تم دونوں اپنی اولاد کے ساتھ (جس نے زمین میں پیدا ہونا ہے) زمین پر اتر جاؤ۔ اور اگر "ہبوط" کا معنی تفسیر تبصیر الرحمٰن کے مطابق کیا جائے تو معنی ہو گا، اس سے اترنے کے بعد زمین میں ہی سب مجتمع ہو کر قرار پکڑے رہو۔

﴿فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی﴾: یعنی جب ہدایت کا آنا تمہارے لئے متحقق ہو جائے۔

تو دلائل عقلیہ اور معجزات قولیہ اور فعلیہ کے ذریعے معلوم ہو جائے کہ یہ ہدایت میری طرف سے ہی ہے

﴿ فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ ﴾: جس شخص نے میری ہدایت کی تابعداری کی کہ یہ ہدایت تو رب تعالیٰ سے ہی حاصل ہے یہ ہدایت کسی گمراہ کرنے والے کی طرف سے تو کبھی نہیں آ سکتی۔ (از تبصیر الرحمن)

﴿ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾: " تو ان کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ ہی ان کو غم حاصل ہوگا"۔

خوف وحزن میں فرق:

" زوال الخوف يتضمن السلامة من جميع الآفات وزوال الحزن يقتضى الوصول الى كل اللذات والمرادات "۔ (کبیر)

خوف کہتے ہیں آفات و بلیات کے آنے کا جو ڈر لاحق ہو جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ ﴾ ان پر کوئی خوف نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام آفات و بلیات سے محفوظ رہیں گے۔ اور حزن اس غم کو کہا جاتا ہے جو لذت و ذوق والی چیز کے زوال کی فکر سے ہو۔ اور جب رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾ اور ان کو کوئی حزن نہیں ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو کسی قسم کی لذت والی چیز اور ان کی مراد کے زوال کا غم نہیں ہوگا۔

" فلا خوف عليهم فضلا عن ان يحل بهم مكروه ولا هم ممن يفوت عنهم محبوب فيحزنوا عليه " (بیضاوی)

ان کی شان کے یہ لائق ہی نہیں کہ وہ کسی مکروہ چیز کے لاحق ہونے کا خوف کریں۔ کوئی مکروہ چیز ان پر واقع ہو جائے یہ تو دور کی بات ہے۔

خیال رہے کہ اس مکروہ سے مراد عذاب ہے۔ دنیاوی تکالیف نہیں، دنیاوی تکالیف اللہ تعالیٰ کے محبوب کو زیادہ حاصل ہوتی ہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" خص البلاء بالانبياء ثم الاولياء ثم الامثل ثم الامثل "

"مصیبتیں انبیاء کرام پر زیادہ آتی ہیں پھر اولیاء کرام پھر اسی طرح درجہ بدرجہ"

حزن یہ ہے کہ ان کو کسی محبوب چیز کے فوت ہونے (ضائع ہونے) کا غم ہوتا ہے۔ یعنی ہدایت

کے آنے پر وہ اس کی تابعداری کرتے ہیں۔ طاعات اور عبادات واجبہ اور مستحبہ جوان کو محبوب ہوتی ہیں۔ ان کے چھوٹ جانے کا ان کو حزن نہیں ہوتا۔ (از شیخ زادہ)

فائدہ: حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رب تعالیٰ نے جب عصا زمین پر ڈال دینے کا حکم دیا تو آپ نے عصا کو ڈالا وہ سانپ بن گیا۔ تو رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ﴾ اس کو پکڑ لیں اور خوف نہ کریں (یہ تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکے گا بلکہ پکڑنے پر پھر پہلی حالت میں عصا بن جائے گا) اور جب نبی کریم ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ غار ثور میں تھے۔ تو مشرکین آپ کی تلاش میں وہاں پہنچ گئے۔ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا یا رسول اللہ مشرکین تو غار کے منہ پر پہنچ گئے ہیں اگر وہ اپنے قدموں کی طرف بھی دیکھیں تو ہمیں دیکھ لیں گے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو چونکہ خوف یہ لاحق ہو رہا تھا کہ کہیں یہ لوگ میرے محبوب ﷺ کو شہید نہ کر دیں۔ آپ کے اسی غم کو دور کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ نے جو ارشاد فرمایا رب تعالیٰ نے اس کی حکایت بیان فرماتے ہوئے ذکر کیا:

﴿ وَلَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ﴾ اور تم غم نہ کرو بیشک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے

اگر آپ کو اپنی فکر ہوتی تو "ولا تخف" کہا جاتا۔ (راقم)

خوف وحزن میں اور فرق یہ ہے:

"فالخوف على المتوقع والحزن على الواقع" (بیضاوی)

خوف کا تعلق مستقبل سے ہے۔ اور حزن کا تعلق حال سے ہے۔ اگر چہ معانی وہی ہیں جو بیان کئے جا چکے ہیں۔ خوف اور حزن کی نفی کر کے کامل طور پر مؤکد طریقہ سے ان سے عذاب کی نفی کی گئی اور ثواب ان کے لئے ثابت کیا گیا۔

فائدہ: رب تعالیٰ نے جو ارشاد فرمایا ﴿ فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ ﴾ اس سے مراد ہر دلالت اور ہر بیان جسے عقل کہے کہ یہی راستہ سیدھا ہے۔ اور اسی طرح نبی پر نازل ہونے والا کلام جس میں ہدایت پائی جائے۔ جو شخص ہدایت کی تابعداری کرے گا یعنی اسی قبول کرے اور اس پر قائم رہے گا اس پر کوئی خوف اور حزن نہیں ہوگا۔ یعنی اسے جہنم کے عذاب سے بچایا جائے گا، اور جنت کی نعمتیں عطاء کی جائیں گی۔

" وفیہ تنبیہ علی عظم نعمة اللہ تعالیٰ علی آدم و حواء فکانہ قال وان احبتکم من الجنة الی الارض فقد انعمت علیکم بما یؤدیکم مرة اخری الی الجنة مع الدوام الذی لا ینقطع "

رب تعالیٰ نے اپنے اسی کلام سے اس پر متنبہ کیا کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواء پر اللہ تعالیٰ کا عظیم انعام ہے۔ گویا کہ رب تعالیٰ نے یوں فرمایا اگرچہ میں نے تمہیں جنت سے زمین پر اتارا ہے تحقیق میں نے تم پر یہ انعام کیا ہے کہ تمہیں یہ حکم دیا ہے جب میری طرف سے ہدایت آجائے تو اس کی تابعداری کرنا تاکہ تمہیں دوبارہ پھر جنت میں پہنچا دیا جائے، اب جب جنت میں آؤ گے تو ہمیشہ کے لئے رہو گے۔ (از کبیر)

عدم خوف کو عدم حزن پر مقدم کرنے کی وجہ:

ان پر خوف نہیں ہوگا اسے پہلے ذکر کیا اور ان کو غم نہیں ہوگا اسے بعد میں ذکر کیا اس کی وجہ یہ ہے " لان زوال ما لا ینبغی مقدم علی طلب ما ینبغی " کہ غیر مناسب چیزوں کا زوال پہلے پایا جاتا ہے پھر مناسب چیزوں کی طلب پائی جاتی ہے۔

﴿ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ ﴾ ان مختصر الفاظ مبارکہ سے یہ مطلب حاصل ہوا:

" ان المکلف الذی اطاع اللہ تعالیٰ لا یلحقہ خوف فی القبر ولا عند البعث ولا عند حضور الموقف ولا عند تطایر الکتب ولا عند نصب الموازین ولا عند الصراط کما قال اللہ تعالیٰ لا یحزنھم الفزع الاکبر وتتلقاھم الملئکة ھذا یومکم الذی کنتم توعدون "

بیشک مکلف جب اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے تو اسے قبر کا خوف نہیں ہوگا، قیامت میں اٹھنے وقت خوف نہیں ہوگا۔ حساب وکتاب کی انتظار میں کھڑے ہوتے وقت خوف نہیں ہوگا، نامہ اعمال کھولتے وقت اسے خوف نہیں ہوگا اور میزان قائم کرتے وقت اسے خوف نہیں ہوگا صراط کے وقت اسے کوئی خوف نہیں ہوگا۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا " انہیں غم میں نہیں ڈالے گی وہ بڑی گھبراہٹ اور فرشتے ان کی

پیشوائی کو آئیں گے کہ یہ ہے تمہارا وہ دن جس کا تم سے وعدہ تھا''

(از کبیر)

فائدہ: ﴿ فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ ﴾ سے یہ فائدہ حاصل ہوا:

" ان الهدى قد ثبت ولا اهتداء "

کہ بعض اوقات ہدایت پائی جاتی لیکن اسے قبول نہیں کیا جاتا جس کی وجہ سے وہ انسان اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہوتے ہیں۔ اسی لئے فرمایا ''جس نے میری ہدایت کی تابعداری کی'' اسے ہی خوف اور غم نہیں۔ اور فائدہ یہ حاصل ہوا:

" ان باتباع الهدى تستحق الجنة "

کہ بیشک انسان ہدایت کی تابعداری کر کے جنت کا مستحق بن جاتا ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

اہل سنت و جماعت حنفی مسلک کا عقیدہ یہ ہے کہ اصول میں تقلید نہیں بلکہ فروع میں تقلید ہے علامہ رازی رحمہ اللہ نے بھی کئی مقامات میں اصول میں تقلید کی نفی کی لیکن غیر مقلدین جہلاء کو کبیر کی عبارت دکھا کر گمراہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اسی مقام پر علامہ رازی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

" ابطال التقليد لان المقلد لا يكون متبعا للهدى "

آپ کے بیان کا مقصد یہ ہے کہ ﴿ فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ ﴾ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تقلید باطل ہے کیونکہ ہدایت میں تقلید کرنے والا ہدایت کی تابعداری کرنے والا نہیں۔

مسئلہ واضح ہے کہ ہدایت کی تابعداری عقائد سے تعلق رکھتی ہے اور عقائد میں تقلید نہیں۔ اس عبارت سے کوئی شخص مغالطہ ڈالنے کی کوشش کرے تو اس سے ہوشیار رہیں۔ (از کبیر)

☆☆☆☆☆

﴿ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾

☆ ”جب اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی تابعداری کرنے والوں سے وعدہ فرمایا کہ وہ عذاب اور حزن سے امن میں رہیں گے“۔

☆ ”تو اسکے بعد ذکر فرمایا جو لوگ کفر کریں گی اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ جہنم کی آگ میں جھونک دیئے جائیں گے اور وہ اسمیں ہمیشہ رہیں“۔

یہ عذاب کافروں کے لئے ہے خواہ وہ انسانوں میں سے کافر ہوں یا جنوں میں سے، ان کو عذاب ہمیشہ کے لئے دیا جاتا ہے اس عذاب میں کسی وقت بھی انقطاع لازم نہیں آتا۔ (از کبیر)

نصیحت آموز کلام: حضرت احمد بن حارث فرماتے ہیں:

” یا صاحب الذنوب الم یان لک ان تتوب یا صاحب الذنوب ان الذنب فی الدیوان مکتوب یا صاحب الذنوب انت بها فی القبر مکروب یا صاحب الذنوب انت غدا بالذنوب مطلوب “

”اے گنہگار شخص کیا تیری توبہ کا وقت نہیں آیا، اے گنہگار شخص بیشک تیرے گناہ تیرے نامہ اعمال میں لکھے ہوں گے، اے گنہگار انسان گناہوں کی وجہ سے تجھے قبر میں مصیبت اٹھانی ہے، اے گنہگار انسان کل تجھے گناہوں کی وجہ سے طلب کیا جائے گا“ (کبیر)

انتباہ: ” ان آدم علیه السلام لما لم یستغن عن التوبة مع علو شانه فالواحد اولی بذالک “

بیشک آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی اور برگزیدہ شان والے ہونے کے باوجود اپنی بھول اور لغزش سے جب توبہ کر رہے ہیں۔ تو اے عام انسان تیرا تو زیادہ حق بنتا ہے کہ تو اللہ تعالیٰ سے توبہ کرتا رہے۔ (از کبیر)

آدم علیہ السلام کی توبہ کب قبول ہوئی:

یہ مسئلہ تو اتفاقی ہے کہ آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے کلمات سکھائے آپ نے ان کے ذریعے توبہ کی جو قبول کر لی گئی۔ لیکن اس میں اختلاف ہے کہ توبہ کب قبول ہوئی تفسیر عزیزی میں یہ ہے کہ آدم

علیہ السلام زمین پر تشریف لا کر دوسو سال تک روتے رہے پھر آپ کی توبہ قبول ہوئی۔ اسی قول کو مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے ترجیح دی ہے۔

لیکن روح البیان میں یہ ہے کہ جنت سے باہر آتے ہی آپ کو اللہ تعالیٰ نے کلمات سکھا دیئے اور آپ کی توبہ کو قبول فرمالیا۔ تاہم آپ کا رونا، گریہ زاری ثابت ہے ہوسکتا ہے وہ توبہ کے قبول کرنے کے بعد ہو کہ آپ لغزش کو یاد کر کے روتے ہوئے ہوں علامہ کاظمی رحمہ اللہ نے اسی قول کو پسند کیا ہے

(واللہ اعلم بالصواب)

حضرت آدم علیہ السلام کا رونا:

حضرت آدم علیہ السلام جب اپنی لغزش کو یاد کر کے روتے رہے تو اس میں ہمارے لئے تنبیہ ہے کہ ہم زیادہ حق رکھتے ہیں بنسبت حضرت آدم علیہ السلام کے کہ ہم روئیں۔ اس لئے کہ وہ تو اللہ کے نبی ہیں اور ہم گنہگار ہیں۔ جب نیکوکار روتا رہا تو گنہگار کیوں نہ روئے۔

"روی عن رسول الله ﷺ انه قال لو جمع بكاء اهل الدنيا الى بكاء داؤد لكان بكاء داؤد اكثر ولو جمع بكاء اهل الدنيا وبكاء داؤد الى بكاء نوح لكان بكاء نوح اكثر ولو جمع بكاء اهل الدنيا وبكاء داؤد وبكاء نوح عليهما السلام الى بكاء آدم على خطيئته لكان بكاء آدم اكثر"

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تمام دنیا والوں کے رونے کا تقابل داؤد علیہ السلام کے رونے سے کیا جائے تو داؤد علیہ السلام کا رونا زیادہ ہوگا۔ اور اگر تمام دنیا والوں کے رونے اور داؤد علیہ السلام کے رونے کو نوح علیہ السلام کے رونے سے تقابل کیا جائے تو نوح علیہ السلام کا رونا زیادہ ثابت ہوگا، اور اگر تمام دنیا والوں کے رونے اور داؤد علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے رونے کو آدم علیہ السلام کے رونے سے مقابلہ کیا جائے تو آدم علیہ السلام کا رونا زیادہ ثابت ہوگا۔

(کبیر)

حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کی ملاقات:

جب دونوں زمین پر تشریف لائے تو حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان کے علاقہ سراندیپ کے پہاڑ پر اترے اور حضرت حوا جدہ میں اتریں۔ توبہ قبول ہونے کے بعد دونوں کی ملاقات عرفات کے

مقام پر ہوئی دونوں نے ایک دوسرے کو پہچانا اسی لئے اس میدان کو عرفات کہتے ہیں یعنی پہچاننے کی جگہ۔

جب حضرت آدم علیہ السلام جنت سے آئے تھے تو ان سے عربی زبان بھی لے لی گئی تھی یعنی بھلا دی گئی تھی۔ اتنے روز تک سریانی زبان میں کلام فرمایا توبہ قبول ہونے کے بعد عربی زبان پھر عطا ہوئی۔ پھر حضرت جبرائیل نے تمام عالم کے جانوروں کو آواز دی کہ اے جانورو حق تعالیٰ نے تم پر اپنا خلیفہ بھیجا ہے۔ اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کرو، دریائی جانوروں نے سر اٹھا کر اطاعت ظاہر کی اور خشکی کے جانور آپ کے آس پاس جمع ہو گئے آدم علیہ السلام ان پر ہاتھ پھیرنے لگے جس پر ان کا ہاتھ پہنچ گیا وہ اہل اور خانگی بن گئے۔ جیسے گھوڑا، اونٹ، بکری، کتا، بلی وغیرہ اور جس پر آپ کا ہاتھ نہ پہنچا وہ جنگلی وحشی رہا جیسے ہرن وغیرہ۔

حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کے حق میں دعاء:

اس واقعہ کے بعد حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کیا اے اللہ میری اولاد بہت کمزور ہے اور ابلیس کا فریب بہت سخت ہے۔ اے اللہ اگر تو ان کی امداد نہیں کرے گا تو وہ شیطان کے فریب سے بچ نہیں سکیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا حکم آپکے پاس آیا اے آدم تمہارے اور احکام تھے اور آپ کی اولاد کے احکام اور ہوں گے ہم ہر انسان کے ساتھ ایک فرشتہ رکھیں گے۔ آپ نے یہ سن کر خوش ہو کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ (از عزیزی)

آدم علیہ السلام کی اولاد:

حضرت حوا بیس یا چالیس مرتبہ حاملہ ہوئیں ہر حمل میں دو دو بچے پیدا ہوئے ایک مذکر اور ایک مؤنث ایک حمل کے بچوں کا دوسرے حمل کے بچوں کا ایسا حکم تھا جیسا کہ مختلف ماں باپ کے بچوں کا ہوتا ہے یعنی پہلے حمل کے بچے کا دوسرے حمل کی بچی سے نکاح ہوتا، اسی طرح دوسرے حمل کے لڑکے کا پہلے حمل کی لڑکی سے نکاح ہوتا۔ (صاوی زیر آیۃ، وبث منھما رجالا کثیرا ونساء پ۴ ع۱۲)

تنبیہ: حضرت آدم علیہ السلام کے دو دو بچے ہر حمل سے ہوئے سوائے حضرت شیث علیہ السلام کے

"وضعت شیثا وحدہ کرامۃ سیدنا محمد ﷺ فان نورہ انتقل من آدم الی شیث"

(مواہب لدنیہ، مرقاۃ باب فضائل سید المرسلین، انوار محمدیہ ص ۱۵)

حضرت حوا نے حضرت شیث کوصرف اکیلا ہی جنا۔ ان کے ساتھ جڑواں کوئی بچی نہیں تھی۔ یہ صرف نبی کریم ﷺ کی عزت وتکریم کے لئے مالک الملک نے ایک بچے سے حاملہ کیا کیونکہ نبی کریم ﷺ کا نور آدم علیہ السلام سے منتقل ہو کر حضرت شیث کے پاس آ گیا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے انہیں وصیت کی کہ یہ نور پاک عورت کی طرف منتقل کرنا ہے۔ یہی وصیت کا سلسلہ چلتا رہا۔ نبی کریم ﷺ کا نور پاک پشتوں سے منتقل ہوتا رہا۔

حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد اور اولاد کی اولاد وغیرہ آپ کی وفات کے وقت تک چالیس ہزار سے زائد ہوگئی تھی بلکہ صاوی وجمل وغیرہ میں ایک لاکھ تک پہنچ جانے کا ذکر ملتا ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

حضرت آدم علیہ السلام کی وفات:

جب حضرت آدم علیہ السلام کے وصال کا وقت آ گیا تو آپ کو جنتی میوے کھانے کی تمنا ہوئی، اپنے بیٹوں کو کہا تم کعبہ شریف کے پاس جا کر دعاء کرو کہ اللہ تعالیٰ میری یہ تمنا پوری کر دے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے اپنے باپ کے حکم سے جب وہاں پہنچے تو ان کی ملاقات حضرت جبرائیل اور کچھ اور دوسرے فرشتوں سے ہوئی۔

آپ کے بیٹوں نے ان سے آدم علیہ السلام کی فرمائش کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا تم ہمارے ساتھ چلو ہم جنت کے میوے تمہارے باپ کے حضور پیش کر دیں گے۔ جب یہ سب حضرت آدم علیہ السلام کے پاس پہنچے تو حضرت حوا فرشتوں کو دیکھ کر ڈرنے لگیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کے دامن میں چھپنا چاہا لیکن آپ نے فرمایا اے حوا اب تم مجھ سے جدا ہی رہو۔ میرے اور میرے رب کے قاصدوں کے درمیان رکاوٹ نہ بنو۔ اس طرح فرشتوں نے آدم علیہ السلام کی روح قبض کر لی۔

حضرت آدم علیہ السلام کی تجہیز وتکفین فرشتوں نے کی:

فرشتوں نے آدم علیہ السلام کے بیٹوں کو کہا کہ تم دیکھو جس طرح ہم تمہارے باپ کو کفن دیں گے اور دفن کریں گے اسی طرح تم نے فوت ہونے والے لوگوں کے کفن ودفن کا انتظام کرنا ہے۔ جبرائیل علیہ السلام جنت کی مرکب خوشبو اور جنتی جوڑے کا کفن اور جنتی بیری کے کچھ پتے ساتھ لائے تھی

انہوں نے غسل دیا اور کفن پہنایا اور خوشبو ملی۔اور ملائکہ آپ کے جسم مبارکہ کو کعبہ میں لائے اور ان پر فرشتوں نے نماز جنازہ ادا کی۔جس میں حضرت جبرائیل امام تھے اور دوسرے فرشتے مقتدی۔

اس نماز میں چار تکبیریں کہی گئیں جیسے آج بھی چار تکبیریں ہی ادا کی جاتی ہیں۔پھر مکہ مکرمہ سے مقام منیٰ میں لے گئے جہاں کہ حاجی قربانی کرتے ہیں اور اسی جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کی۔وہاں مسجد خیف کے قریب بغل قبر (لحد) کھود کر ان کو دفن کیا اور ان کی قبر کو اونٹ کی کوہان کی طرح ڈھلوان بنایا اور حضرت حوا کی قبر جدہ میں ہے۔

بعض روایات کے مطابق دونوں کی قبریں حرم میں طواف کی جگہ میں ہیں۔

(واللہ اعلم بالصواب، از عزیزی)

راقم کی نظر میں زیادہ کتب میں طواف کی جگہ ہی دونوں کی قبروں کا ذکر گزرا ہے۔قارئین کرام حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر بالترتیب اور ایک ہی جگہ راقم کی کتاب تذکرۃ الانبیاء میں دیکھئے

تفہیم القرآن کے اغلوطے:

ابھی تک حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر معتبر تفاسیر سے جو بیان کیا ہے اور انبیاء کرام کا گناہوں سے پاک ہونا دلائل سے بیان کیا ہے۔اسے مدنظر رکھتے ہوئے تفہیم القرآن میں مودودی صاحب کے سنگین الفاظ کو دیکھئے کہ اللہ کے نبی کی شان کا وہ پاس نہ کر سکے:

(۱) یعنی آدم کو جب اپنے قصور کا احساس ہوا اور انہوں نے نافرمانی سے پھر فرمانبرداری کی طرف رجوع کرنا چاہا۔ (تفہیم القرآن ج اص ۶۷ حاشیہ ۵۱)

آدم علیہ السلام کی طرف قصور یا نافرمانی کے الفاظ کی نسبت غلط ہے رب تعالیٰ کے ارشاد "فنسی" (وہ بھول گئے) کے سراسر منافی ہے۔

(۲) اس کا معنی یہ ہوئے کہ آدم اپنی نافرمانی پر عذاب کے مستحق نہ رہے۔گناہ گاری کا جو داغ ان کے دامن پر لگ گیا تھا وہ دھوڈالا گیا۔ (تفہیم ج اص ۶۸ حاشیہ ۵۳)

یہاں بھی نافرمانی اور گناہ گاری جیسے الفاظ آدم علیہ السلام کی طرف منسوب کرنا شدید غلطی ہے

(۳) ﴿ فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِينَ ﴾ (ورنہ ظالموں میں شمار ہو گے) یہ ترجمہ کرنے کے بعد تفسیر یوں لکھتے ہیں۔ ظالم کا لفظ نہایت معنی خیز ہے ''ظلم'' دراصل حق تلفی کو کہتے ہیں ظالم وہ ہے جو کسی کا حق تلف کرے، جو شخص خدا کی نافرمانی کرتا ہے وہ درحقیقت تین بڑے بنیادی حقوق تلف کرتا ہے اولاً خدا کے حقوق ثانیاً ان تم چیزوں کے حقوق جن کو اس نے نافرمانی کے ارتکاب میں استعمال کیا اعضاء جسمانی وغیرہ۔ ثالثاً خود اپنا حق، کیونکہ اس پر اس کی ذات کا یہ حق ہے کہ وہ اسے تباہی سے بچائے مگر نافرمانی کر کے جب وہ اپنے آپ کو اللہ کی سزا کا مستحق بناتا ہے تو دراصل اپنی ذات پر ظلم کرتا ہے۔

(تفہیم ج ۱ ص ۶۶ حاشیہ ۴۹ بالاختصار)

یہاں ترجمہ میں ظلم کی نسبت آدم علیہ السلام کی طرف کر دی گئی۔ پھر تین قسمیں ظلم کی بیان کیں جن کا تعلق عام انسان سے تو ہو سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے نبی سے ان کا تعلق نہیں ہو سکتا۔ سی مقام پر مودودی صاحب نے اس کی وضاحت نہیں کی۔ لہٰذا تفہیم سمجھانے سے تو قاصر رہی البتہ عام انسان کو الجھانے میں موزوں ثابت ہوئی کہ عام انسان یہ سمجھے کہ شائد یہ تینوں ظلم اللہ کے نبی میں بھی پائے گئے ہیں

(۴) ﴿ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ﴾

''پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے جھک جاؤ تو سب جھک گئے''

اگرچہ کئی مفسرین نے سجدہ کا معنی انحناء کیا ہے جس کا معنی جھکنا ہے لیکن یہ معنی معتبر نہیں جیسا کہ راقم نے بیان کر دیا ہے۔ اس آیت کی مکمل تفسیر علامہ کاظمی رحمہ اللہ نے تفہیم سے لے کر اس پر گرفت فرمائی آیئے آپ بھی دیکھئے:

اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین اور اس سے تعلق رکھنے والے طبقہ کائنات میں جس قدر فرشتے مامور ہیں ان سب کو انسان کے لئے مطیع و مسخر ہو جانے کا حکم دیا گیا۔ چونکہ اس علاقے میں اللہ کے حکم سے انسان کو خلیفہ بنایا جا رہا تھا، اس لئے فرمان جاری ہوا کہ صحیح یا غلط، جس کام میں بھی انسان اپنے ان اختیارات کو جو ہم اسے عطاء کر رہے ہیں استعمال کرنا چاہے اور ہم اپنی مشیت کے تحت اسے ایسا کر لینے کا موقع دے دیں، تو تمہارا فرض ہے کہ تم میں سے جس جس کے دائرہ عمل سے وہ کام متعلق ہو وہ اپنے دائرے کی حد تک اس کا ساتھ دے وہ چوری کرنا چاہے یا نماز پڑھنے کا ارادہ کرے، نیکی کرنا چاہے یا

بدی کے ارتکاب کے لئے جائے ۔ دونوں صورتوں میں جب تک ہم اسے اس کی پسند کے مطابق عمل کرنے کا اذن دے رہے ہیں تمہیں اس کے لئے سازگاری کرنی ہوگی مثال کے طور پر اس کو یوں سمجھئے کہ ایک فرمان روا جب کسی شخص کو اپنے ملک کے کسی صوبے یا ضلع کا حاکم مقرر کرتا ہے تو اس علاقے میں حکومت کے جس قدر کارندے ہوتے ہیں ان سب کا فرض ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت کریں۔ اور جب تک فرمانروا کا منشا یہ ہے کہ اسے اپنے اختیارات کے استعمال کا موقع دے اس وقت تک اس کا ساتھ دیتے رہیں قطع نظر اس سے کہ وہ صحیح کام میں ان اختیارات کو استعمال کر رہا ہے یا غلط کام میں۔ البتہ جب جس کام کے بارے میں بھی فرمانروا کا اشارہ ہو جائے کہ اسے نہ کرنے دیا جائے تو وہیں ان حاکم صاحب کا اقتدار ختم ہو جاتا ہے اور انہیں ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ سارے علاقے کے اہل کاروں نے ہڑتال کر دی ہے۔ حتی کہ جس وقت فرمانروا کی طرف سے ان حاکم صاحب کی معزولی اور گرفتاری کا حکم ہوتا ہے تو وہی ماتحت و خدام جو کل تک ان کے اشاروں پر حرکت کر رہے تھے ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر انہیں کشاں کشاں دار الفاسقین کی طرف لے جاتے ہیں فرشتوں کو آدم کے لئے سربسجود ہونے کا جو حکم دیا گیا تھا اس کی نوعیت کچھ اسی قسم کی تھی۔ (تفہیم ج ۱ ص ۶۴ حاشیہ ۴۵)

علامہ کاظمی رحمہ اللہ نے یوں گرفت فرمائی:

مترجم مذکور نے ترجمہ اور تشریح میں عامہ مترجمین ومفسرین کے خلاف اپنا الگ راستہ اختیار کیا مترجمین نے " اسجدوا " کا ترجمہ سجدہ کنید، سجدہ کرو، اور سجدے میں گر جاؤ" کیا اور مفسرین کے نزدیک سجدہ کے معنی صرف جھکنا جسے عربی میں "انحناء" کہتے ہیں قوی نہیں بلکہ ضعیف ہے۔ نص قرآنی " فقعوا له ساجدين " جمہور کے اس قول کی قوی دلیل ہے۔

پھر مترجم مذکور کے کلام میں زمین سے تعلق رکھنے والے (گویا علاقائی اور طبقاتی) فرشتوں کی تقسیم اور تخصیص بھی مفسرین کے خلاف ہے جمہور کا قول یہی ہے کہ بلا تخصیص سب فرشتوں کو حضرت آدم علیہ السلام کے لئے سجدہ کا حکم ہوا۔ بغیر کسی استثناء کے سب فرشتے آدم کے لئے سجدہ میں گر پڑے ظاہر نص قرآنی " فسجد الملائكة كلهم اجمعون " مفسرین کے قول کی روشن دلیل ہے۔ اس

طویل اقتباس کی رو سے مترجم کے نزدیک ہر انسان خلیفۃ اللہ ہے خواہ مومن ہو یا کافر، ظالم ہو یا مظلوم اور وہ ہر ایک کے لئے فرشتوں کو مطیع و مسخر مانتا ہے۔

ایسی صورت میں سوچنا پڑے گا کہ اگر ظالم و مظلوم، مؤمن و کافر آپس میں آمادہ قتال ہو جائیں تو فرشتے کس کا ساتھ دیں گے؟ یا وہ بھی آپس میں قتال کریں گے؟ فکر صحیح یہی جواب دے گی کہ ہر مومن و کافر اور ظالم و مظلوم کا خلیفہ ہونا درست نہیں۔ اس کے بعد یہ امر بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ مترجم مذکور نے دنیاوی فرمانرواؤں اور ان کے مقرر کردہ حاکموں کو اللہ تعالیٰ اور اس کے مقرر کردہ خلفاء کی مثال قرار دیا۔

حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی اور اللہ تعالیٰ کے خلفاء کے حق میں سخت بے ادبی ہے اور یہ کتنی بڑی جسارت ہے کہ خلفاء اللہ کے بارے میں یہ کہا جائے کہ ان کی معصیت و نافرمانی کی بنا پر ان کے مطیع فرمان فرشتے انہیں گرفتار کر کے دار الفاسقین تک پہنچاتے ہیں۔ (التبیان مع البیان پارہ اول ص ۱۲۹)

راقم کی مزید وضاحت:

تفہیم میں مثال بیان کرنے کے بعد بہت واضح طور پر یہ بیان کیا گیا ہے "فرشتوں کو آدم کے لئے سربسجود ہونے کا جو حکم دیا گیا تھا اس کی نوعیت کچھ اسی قسم کی تھی"۔

اب ذرا مثال کو واضح الفاظ میں سمجھئے، مثال کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی بادشاہ یا صدر یا وزیر اعظم کسی شخص کو صوبے کا گورنر بنا دے یا ضلع کا حاکم بنا دے جب تک وہ اس منصب پر قائم ہے پولیس والے اسکا احترام کرتے ہیں۔ خواہ وہ اچھے کام کرے یا برے لیکن جب اسے معزول کر دیا جائے تو وہی پولیس والے اسے ہتھکڑیاں لگا کر دار الفاسقین میں پہنچا دیتے ہیں یعنی اسے جیل میں پہنچا دیتے ہیں جہاں اور مجرم بھی رہتے ہیں یعنی اب گورنر صاحب اور ڈی سی صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔

اس مثال کے بعد جب یہ کہا گیا ہے کہ فرشتوں کو آدم کے سامنے سربسجود ہونے کا جو حکم دیا گیا ہے اس کی بھی یہی نوعیت ہے اب ذرا مثال کو اور آدم علیہ السلام اور فرشتوں کو سامنے رکھ کر مثال کو ممثل لہ (جس

کی مثال دی گئی) پر منطبق کریں تو سمجھ آئے گا کہ کتنی بڑی جسارت کی گئی، کتنا ظلم عظیم کیا گیا

کیونکہ مثال سے یوں سمجھ آیا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنایا اور فرشتوں کو آپ کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا لیکن فرشتے اسی وقت تک احترام کریں گے جب تک خلیفہ اپنے منصب پر قائم رہے گا خواہ اچھے کام کرے یا برے (معاذ اللہ نبی سے برے کام کرنا متصور نہیں) پھر جب خلیفہ کو معزول کر دیا جائے (نبی معزول نہیں ہوتا معاذ اللہ) تو وہی فرشتے اس خلیفہ کو پکڑ کر دار الفاسقین تک لے جائیں گے۔ (معاذ اللہ)

فرشتے لوگوں کو جس دار الفاسقین تک پہنچاتے ہیں اسے جہنم کہا جاتا ہے۔ فرشتون کی کیا مجال کی نبی کو پکڑ کر معاذ اللہ جہنم میں لے جائیں۔ خدرا انصاف کیجئے کہ اس مثال میں زہر کو نہیں ملایا گیا تو اور کیا ہے۔ رب تعالیٰ اور انبیاء کرام اور فرشتوں کی شان میں گستاخی نہیں پائی گئی تو اور کیا ہے۔

طویل اقتباس میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ انسان نماز ادا کرے یا چوری کرے رب تعالیٰ کا اس میں اذن پایا جاتا ہے حالانکہ یہ بھی سراسر غلط ہے رب برے کاموں کی اجازت نہیں دیتا البتہ بندے کو مختار بناتا ہے وہ بندہ اپنے اختیار سے برے کام کرتا ہے۔

ضیاء القرآن کی خوبی:

تفہیم القرآن کے مقابل حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ کی تفسیر ضیاء القرآن کا اس مقام پر مطالعہ کریں تو ایمان افروز تفسیر نظر آئے گی۔ نبی کی شان سمجھ آئے گی کہ نبی گناہوں سے پاک ہیں۔ لمبی عبارت کو نقل کرنا تو ممکن نہیں البتہ قارئین کو دعوت دیتا ہوں کہ اسی مقام پر ضیاء القرآن کا مطالعہ کر کے خود ہی اس کی خوبیوں کا اندازہ کریں۔

☆☆☆☆☆

﴿ يٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِکُمۡ ۚ وَاِیَّایَ فَارۡهَبُوۡنِ ﴾

(۱) ''اے یعقوب کی اولاد یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا اور میرا عہد پورا کرو میں تمہارا عہد پورا کروں گا اور خاص میرا ہی ڈر رکھو''

(۲) ''اے اولادِ یعقوب یاد کرو میری نعمتوں کو جو میں نے انعام کی ہیں تم پر اور پورا کرو میرا وعدہ میں پورا کروں گا تمہارا وعدہ اور مجھ سے ہی تم ڈرو''

ما قبل سے تعلق: جب اللہ تعالیٰ نے توحید اور نبوت اور قیامت پر دلائل قائم فرمائے اس کے بعد عام نعمتوں کا ذکر فرمایا جن کا تعلق عام انسانوں سے ہے یعنی انسانوں کو پیدا کرنا، ان کو موت دینا اور پھر زندہ کرنا، زمین کی تمام چیزوں کو انسان کے لئے نفع مند بنانا آدم علیہ السلام کو تمام علوم عطاء فرمانا یہ بھی تمام اولاد پر نعمت ہے۔ اسی طرح آدم علیہ السلام کو فرشتوں سے سجدہ کرانا وغیرہ

اب ان خاص نعمتوں کی یاد حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کو دلائی جا رہی ہے جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں پائے جانے والے یہود کے آباء واجداد پر تھیں۔

مختصر وضاحت:

آدم علیہ السلام کا ذکر کرنے کے بعد اور اولادِ آدم علیہ السلام کو اپنی نعمتیں یاد دلانے کے بعد بنی اسرائیل یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں موجود تھی، انھیں رب تعالیٰ نے اپنی وہ نعمتیں یاد دلائیں جو ان کے آباء واجداد پر تھیں کہ ان کو یاد کرتے ہوئے اور ان کا شکر ادا کرو اور میرے وعدہ کو پورا کرو، یعنی توراۃ میں جو وعدہ لیا گیا تھا کہ آخر الزمان نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ جب آئیں تو ان پر ایمان لانا، اسی وعدہ کو پورا کرو، میں تمہیں جزاء عطاء کر کے اپنا وعدہ پورا کروں گا، تم میرا وعدہ توڑنے اور میرے احکام کی خلاف ورزی کرنے میں مجھ سے ہی ڈرو۔

تفصیلی وضاحت:

یا: حرف نداء ہے، جو قریب وبعید کے لیے استعمال ہوتا ہے، اس کا معنی ہے ''اے''۔

بنی: جمع ہے'' ابن'' کی اصل میں'' بنین '' ہے، نون اضافت کی وجہ سے حذف ہوگیا (گرگیا) ابن کی جمع ابناء بھی آتی ہے۔ (از قرطبی)

اسرا: عجمی لفظ ہے یعنی عبرانی زبان کا لفظ ہے اس کے چار معانی ہیں بندہ، انسان، مہاجر (چھوڑنے والا) اور برگزیدہ۔

ایل: عبرانی زبان میں اس کا معنی ہے''اللہ'' اب یہاں 'اسرا' کے دو معنی معتبر ہیں، یعنی اسرائیل کا معنی'' اللہ کا بندہ' اور یا معنی یہ ہے، اللہ تعالی کا پسندیدہ اور برگزیدہ،، (از روح المعانی)

تاہم تفسیر کبیر میں ان معانی کے علاوہ'' رجل اللہ (اللہ کا مرد) بھی معنی مراد لیا گیا ہے۔ اسرائیل سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں، یعنی یہ آپ کا عبرانی زبان میں نام ہے۔ (عجمہ اور علم کی وجہ سے غیر منصرف ہے)

" عن ابن مسعود قال اسرائیل هو یعقوب"اخرجه عبد بن حمید وابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم"............(درمنثور)

حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ اسرائیل سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں۔

" واخرج ابن جریر عن ابن عباس ان اسرائیل ومیکائیل وجبریل واسرافیل کفولک عبد الله " (در منثور)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اسرائیل اور میکائیل اور جبرئیل اور اسرافیل (ان تمام) کا معنی'' اللہ کا بندہ' ہے۔

ابوالفرج جوزی نے اپنی کتاب " فهوم الآثار " میں بیان کیا ہے:

" لیس فی الانبیاء من له اسمان غیره الانبینا محمد ﷺ فان له اسماء کثیرة " ...... (قرطبی)

انبیاء کرام میں دو نام صرف حضرت یعقوب علیہ السلام کے ہیں۔ ہاں البتہ ہمارے نبی کریم محمد مصطفی ﷺ کے بہت نام ہے۔

تاہم علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا یہ درست نہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے علاوہ کسی اور نبی کے دو نام نہیں۔ کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کے چار نام ہے۔ عیسیٰ...... مسیح...... کلمۃ اللہ...... روح اللہ

اسی طرح حضرت یونس علیہ السلام کا دوسرا نام ''ذوالنون'' ہے۔ اور حضرت الیاس علیہ السلام کا دوسرا نام ''ذوالکفل'' ہے۔

یبنی اسرائیل کہنے کی وجہ:

یا بنی یعقوب نہیں کہا، بلکہ یا بنی اسرائیل کہا۔ اس لئے کہ ان کو اسلام میں داخل ہونے، اور نبی کریم ﷺ کی تابعداری کا حکم دیا گیا۔ ان کے باپ کے کمالات کو ذکر کر کے ان کو اس پر برانگیختہ کیا گیا۔ یہ مقصد لفظ ''یعقوب'' سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا جیسا کہ ''اسرائیل'' سے حاصل ہوا۔ اس لئے کہ حاصل کلام یہ ہوا۔

" یا بنی العبد الصالح المطیع للہ و کونوا مثل ابیکم فی متابعۃ الحق "

اے نیک اور اللہ تعالیٰ کے مطیع بندے کی اولاد اللہ تعالیٰ کی تابعداری میں اپنے باپ کی طرح ہو جاؤ۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے:

" یا ابن الکریم افعل کذا " اے کریم کے بیٹے تو بھی اپنے باپ کی طرح کرم کر۔

" یا ابن الشجاع بارز الابطال " اے بہادر شخص کے بیٹے تو میدان جنگ میں بہادر لوگوں کا مقابلہ کر۔

" یا ابن العالم اطلب العلم " اے عالم کے بیٹے تو بھی اپنے باپ کی طرح علم طلب کر۔

مقصد یہ ہے کہ باپ کے کمالات سے اولاد کو خوشی ہوتی ہے۔ اسی لئے باپ کا نام ہی وہ ذکر کیا جو کمالات پر دلالت کر رہا ہے...... (از ابن کثیر)، یعنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے۔ ان کی اولاد اور خاندان کو بنی اسرائیل کہا جاتا ہے، اگرچہ آپ کی اولاد میں خواہ یہودی ہوں یا عیسائی ہوں سب بنی اسرائیل ہیں۔ تاہم آج کل صرف یہودیوں کو بنی اسرائیل کہا جاتا ہے۔

بنی اسرائیل:

اصل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام جن کی اولاد سے

نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں ۔اور دوسرے بیٹے ان کے حضرت اسحٰق علیہ السلام اور ان کے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں ۔حضرت یعقوب علیہ السلام کے ایک اور بھائی تھے جن کا نام عیص تھا۔ یہ دونوں بھائی جوڑا تھے ،یعنی ایک ہی حمل سے دونوں جڑواں پیدا ہوئے ،لیکن حضرت یعقوب علیہ السلام کی پیدائش بعد میں ہوئی اسی لئے آپ کا نام ہی یعقوب رکھ لیا گیا، کیونکہ عقب کا معنی ہے پیچھے۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ حضرت یعقوب اور عیص کے نانا حضرت لوط علیہ السلام ہیں ،کیونکہ اسحٰق علیہ السلام کی زوجہ حضرت لوط علیہ السلام کی بیٹی ہے جس کے یہ دونوں بیٹے ہیں۔

اور یہ بھی واضح رہے کہ حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھائی کے بیٹے تھے۔
حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے اسحٰق علیہ السلام حضرت سارہ کے بطن سے پیدا ہوئے ،اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام حضرت ہاجرہ کے بطن سے پیدا ہوئے ۔ یہ دونوں بیٹے زیادہ مشہور ہیں کیونکہ ان کو نبوت حاصل ہوئی ورنہ حضرت ہاجرہ کے چھ بیٹے اور بھی تھے جن کے نام یہ ہے ، زمران...... یسقان...... مدان...... مدیان...... اسیاق...... سوج...... واللہ اعلم بالصواب۔ (از حقانی)

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے ان کے ناموں سے ہی بارہ قبیلے بنے ہر قبیلے کو سبط کہا گیا، جس کی اسباط ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں بھی ہے۔

ان قبائل کو بنی اسرائیل کہا گیا ، یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ، ان میں ہی جلیل القدر انبیاء کرام حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے۔ (از عزیزی)

۞ **اذْكُـــرُوْا** ۞: "یاد کرو" یہ ماخوذ ہے "ذکر" سے خواہ دال کے کسرہ سے ہو یا ضمہ سے، دونوں صورتوں میں اس کے دونوں معانی استعمال ہیں ، زبان سے یاد کرنا اور دل سے یاد کرنا۔

" الذکر بالقلب ضد النسیان و الذکر باللسان ضد الانصات "

دل سے یاد کرنا بھولنے کی ضد ہے ، اور زبان سے یاد کرنا خاموش رہنے کی ضد ہے۔

" وقال الکسائی ما کان بالضمیر فھو مضموم الذال وما کان باللسان فھو مکسور الذال "

تاہم کسائی رحمہ اللہ نے فرق بیان کیا ہے کہ جولفظ ذال کے ضمہ سے ہوگا اس کا معنی ہے دل سے یاد کرنا اور جو ذال کے کسرہ سے ہے اس کا معنی ہے زبان سے یاد کرنا۔

آیۃ کریمہ میں بنی اسرائیل کو نعمتوں کے یاد کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ تم میری نعمتوں کو یاد کر کے ان کا شکریہ ادا کرو۔ نعمت کے ذکر کرنے سے شکر خود سمجھ آ رہا تھا اسلئے اسے حذف کر دیا گیا۔ بعض حضرات نے کہا یہاں مقصود یہ ہے کہ "میری نعمتوں کو دل سے یاد کرو"۔

﴿ اِیْ لَا تَغْفِلُوْا عَنْ نِعْمَتِیَ الَّتِیْ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَلَا تَنَاسُوْھَا وَھُوَ حُسْنٌ ﴾

یعنی میری نعمتوں سے غافل نہ ہو جو میں نے تم پر انعام کی ہیں اور ان کو بھلاؤ نہیں۔

یہ معنی مراد لینا اچھا ہے۔ نعمۃ اسم جنس ہے مراد اس سے جمع ہے اگر چہ صیغہ مفرد کا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا ﴾ یہاں بھی نعمۃ کا معنی جمع والا ہے۔ یعنی "اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرو تو شمار نہیں کر سکو گے"۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں تو ہر انسان پر ان گنت ہیں اور ہر قبیلے پر بے شمار نعمتیں ہیں تاہم بنی اسرائیل کو کچھ خصوصی نعمتوں کی یاد دلائی گئی ہے آل فرعون سے نجات دینا ان میں انبیاء کرام کو مبعوث کرنا، ان پر کتب (توراۃ، انجیل، زبور) کو نازل کرنا، من اور سلوی نازل کرنا، پتھر سے بارہ چشمے جاری کرنا، توراۃ میں نبی کریم ﷺ کی نبوت ورسالت کا ذکر آنا، اور آپ کے اوصاف کو ذکر کرنا وغیرہ۔

فائدہ جلیلہ: اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو کہا ﴿ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ ﴾ میری نعمتوں کو یاد کرو۔ لیکن نبی کریم ﷺ کو فرمایا ﴿ فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ ﴾ تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا نبی کریم ﷺ کی امت کو نعمتوں کی یاد نہیں دلائی، اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے۔

" لیکون نظر الامم من النعمة الی المنعم ونظر امة محمد ﷺ من المنعم الی النعمة "

کہ واضح ہو جائے کہ باقی امتوں کی نظر نعمتوں کے واسطے سے منعم (ذات باری تعالیٰ) کی طرف ہے، لیکن نبی کریم ﷺ کی امت کی نظر منعم سے نعمت کی طرف ہے۔

کیا خوب مقام ہے امت مصطفیٰ ﷺ کہ ان کی نظر رب تعالیٰ پر ہوتی ہے کہ اے اللہ تو راضی

ہو جا۔ جب رب تعالیٰ راضی ہوگا تو نعمتیں بھی حاصل ہوں گی۔ لیکن باقی امتیں نعمتوں کے حصول کی دعائیں کرتی رہیں۔ نعمتیں ملیں تو رب تعالیٰ کو بھی یاد کیا اگر کہیں آزمائش میں آ گئے تو رب تعالیٰ کو بھی بھول گئے۔ (از قرطبی)

نعمت کی تعریف:

" النعمة الی المنفعة المفعولة علی جهة الاحسان الی الغیر "

نعمت اسے کہا جاتا ہے کہ غیر کو نفع پہنچانے کی غرض سے اس پر احسان کرنا۔

اگر غیر کو نقصان پہنچایا جائے تو اسے نعمت نہیں کہا جائے گا۔ کیونکہ نعمت منفعت کا نام ہے مضرت کا نہیں۔ اسی طرح نعمت کا مطلب ہے کہ کسی غیر پر احسان کر کے اسے نفع پہنچایا جائے۔ اگر وہ نفع اپنی ذات کی طرف ہی لوٹے تو اسے نعمت نہیں کہتے، جس طرح اپنے ہی غلام یا غلامہ پر اس طرح کا احسان کریں جس کا نفع اپنی طرف لوٹ آئے اسے نعمت نہیں کہا جائے گا۔ جو کچھ بھی ہمیں حاصل ہے خواہ وہ نفع مند ہو یا ضرر کو دور کرے دن کو حاصل ہو یا رات کو حاصل ہو، دنیا میں اس کا حصول ہو یا آخرت میں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی حاصل ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ﴾ "جو بھی نعمت تمہیں حاصل ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے"

تین طرح کی نعمتیں:

(1) وہ نعمت جس میں اللہ تعالیٰ منفرد (اکیلا) ہے جس میں کوئی واسطہ نہیں پایا گیا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا بندوں کو پیدا کرنا، ان کو حیات عطا کرنا، ان کو موت عطا کرنا وغیرہ۔

(2) وہ نعمت جو ہمیں بظاہر غیر کی طرف سے حاصل ہو وہ بھی درحقیقت رب تعالیٰ کی طرف سے ہی حاصل ہے، اس لئے کہ نعمت کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے، منعم کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے، منعم کو نعمت عطاء کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ اور منعم کو دوسرے پر مہربانی کرنے کی توفیق بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی حاصل ہے۔

اگرچہ انعام عطاء کرنے والے بندے کا شکریہ بھی ادا کرنا ہوگا لیکن حقیقت میں اللہ تعالیٰ کا ہی

شکریہ ادا کرنا لازم ہوگا رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اَنِ اشْکُرْلِیْ وَلِوَالِدَیْکَ ﴾ میرا شکریہ ادا کرو، اور اپنے والدین کا شکریہ ادا کرو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا ذکر پہلے فرمایا اور والدین کا بعد میں۔ نبی کریم ﷺ کا بھی ارشاد ہے:

﴿ لَا یَشْکُرِ اللّٰہَ مَنْ لَّا یَشْکُرِ النَّاسَ ﴾ اللہ تعالیٰ کا وہ شکر گزار نہیں جو لوگوں کا شکر گزار نہیں نبی کریم ﷺ نے بھی اس مقام پر اللہ تعالیٰ کے شکر کو پہلے ذکر فرمایا، اور بندوں کے شکر کو بعد میں اور یہ ارشاد فرمایا کہ بندوں کا شکریہ ادا کرنا درحقیقت اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنا ہی ہے۔

(3) بعض اوقات ہماری طاعت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ہمیں نعمتیں عطاء کرتا ہے۔ ان نعمتوں میں اگرچہ طاعات وسیلہ ہیں لیکن درحقیقت وہ نعمتیں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہیں۔ اس لئے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں طاعت کی توفیق عطا نہ کرتا اور ہماری امداد نہ فرماتا طاعت کرنے پر، اور ہمیں طاعت کی ہدایت نہ دیتا اور عذر زائل نہ کرتا تو ہم کبھی طاعت نہ کر سکتے، معلوم ہوا کہ طاعت کہ وجہ سے حاصل ہونے والی نعمتیں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی حاصل ہیں۔

اس تقریر کے بعد رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی:

﴿ وَمَا بِکُمْ مِنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰہِ ﴾ (جو نعمتیں بھی تمہیں حاصل ہیں وہ اللہ کی طرف سے ہیں) کو سمجھنا آسان ہوگیا۔

<u>اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ان گنت ہیں</u>: اس لئے کہ ہر وہ چیز جو ہمارے نفع کے لئے، اور اس سے لذت حاصل ہوتی ہے اور اعضاء کو جو ہم نفع حاصل کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں اور نقصان دہ چیزوں کے دفاع کے لئے استعمال کرتے ہیں یہ سب نعمتیں ہیں۔ جب نفع مند اشیاء اور نقصان دہ چیزوں کو جن کا اندفاع نعمت ہے ان کا شمار کرنا ممکن نہیں، تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی واضح طور پر سمجھ آ گیا:

﴿ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا ﴾

اور اگر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرو تو شمار نہیں کر سکو گے۔

اعتراض: جب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں شمار میں نہیں آ سکتیں تو بنی اسرائیل کو ان نعمتوں کے یاد کرنے کا حکم کیسے دیا گیا؟

جواب: اللہ تعالیٰ کی نعمتیں شخصی یا نوعی طور پر تو شمار سے باہر آئیں، البتہ جنس کے اعتبار سے کسی حد تک انکو ذہن میں لانا، یاد کرنا اور ان کا شکریہ ادا کرنا ممکن ہے۔

فائدہ: جب یہ واضح ہو گیا کہ سب نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی حاصل ہیں اور یہ بھی واضح ہے کہ منعم ذات کا شکریہ ادا کرنا اور اس کی حمد ثناء ضروری ہے " ثبت انه سبحانه و تعالیٰ وهو المستحق محمد الحامدين "

اسی سے ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ ہی تمام حمد کرنے والوں کی حمد کا مستحق ہے کیونکہ جس کی حمد کریں گے وہی آخر کار رب تعالیٰ کی حمد ہی ہونی ہے، کیونکہ تمام چیزوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔

عقیدہ:

" وقال اهل السنة انه سبحانه كما خلق المنافع خلق المضار ولا اعتراض لاحد عليه ولهذا سمى نفسه النافع والضار ، ولا يسأل عما يفعل "

اہل سنت و جماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس طرح نفع مند چیزوں کا خالق ہے اسی طرح ضرر انداز چیزوں کا بھی وہی خالق ہے، اس ذات پر کسی کو اعتراض کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء گرامی " النافع " اور " الضار " دونوں ہی ہیں۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی پوچھ نہیں سکتا کہ وہ کیا کرتا ہے (اور کیوں کرتا ہے) لیکن اس کے خلاف معتزلہ کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف نفع مند چیزوں کا خالق ہے، ضرر انداز چیزوں کا وہ خالق نہیں، بلکہ مقصد تخلیق ہی یہ ہے نفع پہنچایا جائے۔

عقیدہ: معتزلہ کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مکلفین پر دینی اور دنیاوی انعامات عطا کئے ہیں لہٰذا اس میں سب برابر ہیں یعنی خواہ مومن ہوں یا کافر ہوں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ان پر دینی اور دنیاوی پائی گئی ہیں۔

اہل سنت و جماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ کافروں کے لئے اللہ تعالیٰ نے عذاب تیار کر رکھا ہے اور ان کو جہنم کی آگ میں ڈال دیا جائے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، ان کا عذاب کبھی منقطع نہیں ہوگا اس لئے کافروں پر اللہ تعالیٰ کی دنیاوی نعمتیں تو ہیں لیکن دینی نعمتیں نہیں۔ دنیاوی نعمتوں کے پائے جانے پر نقل وعقل شاہد ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کو بھی کان، آنکھیں، عقل وغیرہ عطا

کئے دنیاوی مال و دولت عطا کیا تو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

قرآن پاک میں جو ذکر ہے:

﴿ جعل لکم الارض فراشا والسماء بناء ﴾

''تمہارے لئے زمین کو بچھونا بنایا اور آسمان کو چھت''

یہ حکم عام ہے مومنوں اور کافروں سب کو شامل ہے۔ اس طرح ﴿ کیف تکفرون باللہ کنتم امواتا فاحیاکم ﴾ میں موت وحیات کو نعمت قرار دیا گیا جو مومنوں اور کافروں سب کو یہ نعمتیں عطا ہیں اسی طرح یہی آیۃ جس کی وضاحت بیان ہو رہی ہے اسی میں مدینہ طیبہ کے غیر مسلم یہود کو کہا گیا ہے۔

﴿ یبنی اسرآئیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم ﴾ اس میں واضح طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ یہود پر بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں۔ اگرچہ ان کے آباؤ اجداد کی نعمتوں کا ذکر بھی تو پھر ان میں سے بھی بہت کافر ہوئے ہیں۔

لیکن یہ بھی خیال رہے کہ دنیاوی نعمتیں ان کے لئے درحقیقت نقصان دہ ہی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کو مہلت دیتا ہے اور مال و دولت دیتا ہے وہ اور زیادہ کفر میں سرکش ہوتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ ویمدھم فی طغیانھم یعمھون ﴾ اور اسی طرح رب تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی اور وضاحت کر رہا ہے:

﴿ ولا یحسبن الذین کفروا انما نملی لھم خیرا لانفسھم انما نملی لھم لیزدادوا اثما ﴾

ہرگز کافر گمان نہ کریں کہ ہمارا ان کو مہلت دینا ان کے لئے بہتر ہے ہم تو مہلت ان کو صرف اس لئے دیتے ہیں کہ وہ اور زیادہ گناہ کر لیں۔

واضح ہوا کہ ان کو دنیاوی نعمتیں کتنی زیادہ سے زیادہ کیوں نہ دے دی جائیں وہ درحقیقت ان کیلئے نقصان دہ ہی ہیں کیونکہ جب ان کو آخرت میں دائمی عذاب دیا جانا ہے تو ان کی نعمتوں کی یہی حیثیت ہوگئی کہ ان کو زہر ملا کر مٹھائی دے دی گئی۔ جس طرح زہر آلود مٹھائی بظاہر میٹھی لیکن حقیقت میں ہلاک کرنے والی ہے، یہی حال انکی دنیاوی نعمتوں کا ہے جنکے بعد ان کو ہمیشہ عذاب میں مبتلا کرنا ہے۔

(ماخوذ از کبیر)

فائدہ: اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو نعمتوں کی یاد دلائی کہ تم ان کو یاد کر کے میرا شکریہ ادا کرو، اس

کی وجہ کیا ہے؟ اس کی چند وجوہ ہیں:

(1) ایک یہ ہے کہ ان پر جو اللہ تعالیٰ کی نعمتیں تھیں ان میں سے تو راۃ، انجیل اور زبور بھی تھیں جو نبی کریم ﷺ کی صداقت و نبوت پر شہادت دے رہی تھیں تو اس نعمت کی یاد دلانے کا مطلب یہ تھا کہ تم نبی کریم ﷺ پر ایمان لے آؤ۔

(2) جب اللہ تعالیٰ نے ان کو کثیر نعمتیں عطاء کی تھیں تو ان کا انکار عظیم معصیت تھا، ان کو نعمتیں یاد دلا کر یہ بتایا گیا کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور قرآن پاک پر ایمان لانے کی جو تمہیں دعوت دی گئی اس کی مخالفت بہت بڑے دائمی عذاب کا سبب ہے لہٰذا ایمان قبول کر کے اپنے آپ کو عذاب سے بچالو۔

(3) اللہ تعالیٰ کی جب کثیر نعمتیں ان پر تھیں، لیکن وہ پھر بھی رب تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کر رہے تھے، نبی کریم ﷺ پر ایمان نہیں لا رہے تھے تو ان کی نعمتیں یاد دلا کر اظہارِ مخالفت پر حیاء دلانی مقصود تھی۔

(4) کثیر نعمتوں کی یاد دلانے کا یہ بھی مقصد تھا کہ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر بنسبت باقی لوگوں کے خصوصی فیضان کیا ہے، جب اس نے تمہیں ابتدائی طور پر نعمتیں عطاء کی ہیں تو وہی ان نعمتوں کو باقی رکھنے والا بھی ہے، لہٰذا تمہیں بھی چاہئے کہ اس کے احکام پر عمل کرو اور اس کی مخالفت نہ کرو۔

اعتراض: خطاب نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود کو ہے۔ اور جن نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ ان لوگوں پر نہیں تھیں، بلکہ ان کے آباؤ اجداد پر تھیں ان کو یاد دلانے کا کیا مقصد ہے۔

جواب: اگر یہ نعمتیں ان کے آباؤ اجداد پر نہ ہوتیں تو وہ باقی ہی نہ رہتے اور نہ ہی ان کی نسل ہوتی، لہٰذا ان لوگوں کے آباء پر نعمتیں گویا کہ ان کی اولاد پر بھی تھیں۔ اور وہ یہ تھی کہ یہ بتانا مقصود تھا کہ تمہارے آباء و اجداد پر اللہ تعالیٰ کی دینی اور دنیاوی عظیم نعمتیں تھیں لہٰذا وہ نعمتیں اولاد کے حق میں بھی پائی گئی ہیں۔

اور وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کو ایمان لانے کی رغبت دلانی اور کفر سے روکنا مقصود تھا کیونکہ یہ بتایا گیا کہ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تمہارے آباء کو یہ نعمتیں ان کی طاعت کی وجہ سے ہی دی گئی تھیں چونکہ اولاد کی عادت یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے آباء کے طریقہ پر چلتے ہیں۔ (از کبیر)

﴿ وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِكُمۡ ﴾: "اور تم پورا کرو میرا وعدہ میں پورا کروں گا تمہارا وعدہ" بندوں کا رب تعالیٰ سے وعدہ کیا ہے اور رب تعالیٰ کا بندوں سے وعدہ کیا ہے اس میں مفسرین کے اقوال

دیکھئے سے قرآن پاک کی عظمت واضح ہوتی ہے کہ مختصر الفاظ میں کتنے مطالب پائے جاتے ہیں۔

"﴿ وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡ﴾ فی اداء الفرائض علی السنة والاخلاص ﴿ اُوۡفِ﴾ بقبولها منکم ومجازاتکم علیها"

تم فرائض کو سنت کے مطابق اور اخلاص سے ادا کر کے میرا وعدہ پورا کرو، میں تم سے اس عبادت کو قبول کر کے اور اس پر جزاء عطا کر کے اپنا وعدہ پورا کروں گا۔

"﴿اَوۡفُوۡا بعَهۡدِیۡ ﴾ (فی العبادات ﴿ اُوۡفِ بعَهۡدِکُمۡ ﴾ ای اوصلکم الی منازل الرعایات "

تم عبادات میں میرے وعدہ کو پورا کرو، میں تمہیں رعایت (مہربانی) کے مقام پر پہنچا کر اپنا وعدہ پورا کروں گا۔

(از قرطبی)

﴿ اَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡ ﴾ فی حفظ آداب الظواهر ﴿ اُوۡفِ بِعَهۡدِکُمۡ﴾ بتزیین سرائرکم "

تم ظاہری آداب کی حفاظت کر کے میرا وعدہ پورا کرو، میں تمہارے باطن کو مزین کر کے وعدہ کو پورا کروں گا۔

(از قرطبی)

﴿ اَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡ ﴾ باداء الفرائض وترک الکبائر ﴿اُوۡفِ﴾ بالمغفرة والثواب "

تم فرائض کو ادا کر کے اور کبائر (کبیرہ گناہوں) کو چھوڑ کر میرا وعدہ پورا کرو، میں مغفرت وثواب عطا کر کے اپنا وعدہ پورا کروں گا۔

﴿ اَوۡفُوۡا ﴾ بالاستقامة علی الطریق المستقیم ﴿ اُوۡفِ ﴾ بالکرامة والنعیم المقیم "

تم سیدھی راہ پر قائم رہ کر میرا وعدہ پورا کرو، میں تمہیں عزت عطاء کر کے اور ہمیشہ قائم رہنے والی نعمتیں (یعنی جنت کی نعمتیں) عطا کر کے اپنا وعدہ پورا کروں گا۔ (از بیضاوی)

تمام معانی ان دو معنوں میں سمٹ کر آجائیں گے:

(۱)...... وماروی عن ابن عباس رضی الله عنهما ﴿ اَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡ ﴾ فی اتباع محمد ﷺ (اوف بعهدکم) فی رفع الآصار والاغلال "

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی کا یہ مطلب ہے تم محمد ﷺ کی اتباع کر کے (جس کا وعدہ تم سے توراۃ میں لیا گیا) اپنا وعدہ پورا کرو میں تم سے ثقل ومشقت اٹھا کر اپنا وعدہ پورا کروں گا۔

(۲)...... اوفوا ٭ بما عاھدتمونی من الایمان والتزام الطاعة ٭ اوف ٭ بما عاھدتکم من حسن الاثابة "

تم ایمان قبول کر کے اور طاعت کو لازم پکڑ کر میرا وعدہ پورا کرو، میں تمہیں بہتر ثواب عطا کر کے اپنا وعدہ پورا کروں گا۔ (از بیضاوی)

ان دو معانی کو ایک جگہ جمع کر لیا گیا:

" (وافوا بعهدی) بالایمان بکل هدی تحقق مجیئه منی سیما هدی محمد ﷺ المأخوذ فیه میثاق الانبیاء علیهم السلام (اوف بعهدکم) بازالة الخوف والحزن وتکفیر السیآت وتضعیف الحسنات ورفع الآصار والاغلال "۔

جو ہدایت میں نے تمہیں دی ہے اس پر ایمان لا کر خصوصاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق انبیاء کرام جو بتاتے رہے کہ وہ آخری نبی ہوں گے ان پر ایمان لانا اس ہدایت پر تم ایمان لا کر میرا وعدہ پورا کرو، میں خوف اور حزن کو زائل کر کے، گناہوں کو مٹا کر، نیکیوں کو بڑھا کر، ثقل و مشقت کو اٹھا کر اپنا وعدہ پورا کروں گا۔

دونوں معاہدوں کی دو طرفیں: بندے اپنا وعدہ پورا کریں رب تعالیٰ اپنا وعدہ پورا کرے گا، اس میں بہت بڑی وسعت ہے بہت چیزوں کو یہ شامل ہے تاہم اس وعدہ کی ابتداء اور انتہاء بیان کی جارہی ہے جس سے درمیان والی صورتوں کی وسعت کا اندازہ خود ہو جائے گا۔

" فاول مراتب الوفاء منا هو الاتیان بکلمتی الشهادة ومن الله تعالیٰ حقن الدم والمال "

وعدہ کی وفاء کا پہلا مرتبہ بندوں کی جانب سے یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی رسالت کی شہادت دیں، اور رب تعالیٰ کی طرف سے وعدہ کو پورا کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ایمان لانے والوں کے مال اور جان کی حفاظت فرمائے گا۔

مطلب واضح ہے کہ جب کوئی شخص ایمان لے آئے تو اس کی جان محفوظ ہو جاتی ہے کہ مومن اسے کافر سمجھ کر قتل نہیں کریں گے اور اس کا مال بھی محفوظ ہو جاتا ہے کہ مومن اس کے مال کو بطور مال غنیمت حاصل نہیں کرتے۔

" وآخرها منا الاستغراق فی بحر التوحید بحیث یغفل عن نفسه

فضلا عن غیرہ ومن اللہ تعالیٰ الفوز باللقاء الدائم "

ایفاء عہد کی آخری حد بندوں کی طرف سے یہ ہے کہ وہ بحر توحید میں مستغرق ہو جائیں یہاں تک کہ اوروں کا خیال آنا تو دور کی بات ہے بلکہ وہ اپنے آپ سے بھی غافل ہو جائیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایفاء عہد کا مطلب اس صورت میں یہ ہوگا کہ وہ بندوں کو اپنی دائمی ملاقات یعنی تجلیات سے منور کرنے کا شرف عطا کرے گا۔ (از بیضاوی)

عہد کی تعریف:

" العهد حفظ الشئی ومراعته حالا بعد حال وسمی الموثق الذی یلزم مراعاته عهدا "

عہد کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کہ حفاظت کرنا اور وقتاً فوقتاً اس کی رعایت کرنا پختہ کلام جس کی رعایت لازم ہو جائے اسے عہد کہا جاتا ہے۔ (عہد کی نسبت وعدہ کرنے والے کی طرف بھی ہوتی ہے جیسے کہا جائے " **عهد فلان الی فلان** " فلاں نے فلاں سے وعدہ کیا۔ اور جس نے عہد کیا جائے اس کی طرف نسبت بھی ہوتی ہے " **عهد فلان من فلان** " فلاں نے فلاں سے وعدہ لیا۔

معاهد اور ذوعہد:

" والمعاهد فی عرف الشرع یختص بمن یدخل من الکفار فی عهد المسلمین وکذالک ذوالعهد قال صلی اللہ علیه وسلم لا یقتل مؤمن بکافر ولا ذوعهد فی عهده "

شرعی اصطلاح میں کفار سے کوئی شخص مسلمانوں کے عہد میں داخل ہو جائے یعنی مسلمانوں سے کوئی عہد لے لے تو اسے معاہد اور ذوعہد کہا جاتا ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کوئی مؤمن کافر کو اور ذوعہد اپنے عہد میں قتل کرے۔

وباعتبار الحفظ قبل الوثقیة بین المتعاقدین عهدة (بضم العین)

متعاقدین (ایک دوسرے سے عقد کرنے والے) کے درمیان وثقیہ سے پہلے حفاظت کا اعتبار کرنا عہدہ کہلاتا ہے۔ (مفردات غالب)

وعدو وعید: نبی کریم ﷺ نے منافقین کی علامات کو بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا " واذا

وعد اخلف '' جب وعدہ کرے خلاف ورزی کرے۔اور دوسری حدیث میں ارشاد نبوی ہے " اذا عاھد غدر '' جب معاہدہ کرے تو اس میں دھوکہ بازی کرے۔

علامہ علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں ﴿ وَاِذَا وَعَدَ ﴾ اخبر بخیر فی المستقبل ، اذ وعد یغلب فی الخیر واوعد فی الشر '' جب مستقبل کی بہتر خبر دی جائے کہ ایسا کروں گا تو اسے وعد کہتے ہیں۔اور جب شر خبر دی جائے تو اسے وعید کہا جاتا ہے یعنی انعام وغیرہ کا وعدہ ''وعد'' کہلاتا ہے اور سزا وغیرہ کی دھمکی ''وعید'' کہلاتی ہے۔

وایضا الخلف فی الوعید من مکارم الاخلاق ......قال الشاعر

" وانی اذا وعدته او وعدته لمختلف ایعادی ومنجز وعدی "

'' بیشک میں وعید بھی کرتا ہوں اور وعد بھی کرتا ہوں......البتہ وعید کو معاف کر کے اس کے خلاف کرتا ہوں اور وعد کو پورا کرتا ہوں......یعنی خلف فی الوعید (وعید کے خلاف کام کرنا) مکارم اخلاق میں سے ہے۔ (مرقاۃ ج ۱ ص ۱۲٦)

فائدہ عظیمہ : جب پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ ﴿ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْ ﴾ کا ایک مطلب یہ ہے کہ جو پہلی کتاب میں نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا تم سے وعدہ لیا گیا ہے اسے پورا کرو۔اس کی وجہ بہت واضح ہے کہ نبی کریم علیہ السلام کی آمد کی بشارت پہلی کتب میں مختلف طریقوں سے دی گئی۔

☆ توراۃ میں ذکر ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ہاجرہ حضرت سارہ سے ناراض ہوگئیں۔ان کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک فرشتہ ملا۔اس نے پوچھا اے ہاجرہ کہاں کا ارادہ رکھتی ہو کس طرف متوجہ ہو؟ انہوں نے کہا میں اپنی سیدہ سارہ سے بھاگ کر جارہی ہوں فرشتے نے کہا تم اپنی سیدہ کے پاس لوٹ جاؤ اچھے طریقہ سے ان کے ساتھ رہو۔اللہ تعالیٰ تمہیں بہت کھیتی باڑی عطا کرے گا ،اور اولاد تمہیں عطا کرے گا اور تمہارے ہاں بیٹا ہوگا اس کا نام اسمعیل رکھنا۔اور اللہ تعالیٰ نے تمہاری ابتلاء اور خشوع کو سنا ہے (تمہاری اولاد سے ایک شخص ہوگا)۔

" وھو یکون عین الناس وتکون یدہ فوق الجمیع وید الجمیع مبسوطة الیه بالخضوع "

وہ تمام لوگوں کا سردار ہوگا، اس کا ہاتھ تمام پر ہوگا اور تمام لوگ ہاتھ عاجزی سے اس کی طرف پھیلائے ہوں گے۔ یہ صفات یقینی طور پر حضرت اسمعیل علیہ السلام میں نہیں تھیں فرشتہ جھوٹ سے پاک ہونے کی وجہ سے بات سچ اور حق کہہ رہا تھا لہذا یہ بشارت نبی کریم صلی اللہ علیہ کے آنے کے متعلق ہی تھی۔ توراۃ میں ہے۔

" ان الرب الھکم یقیم لکم نبیا مثلی من بینکم ومن اخوانکم "
(موسیٰ علیہ السلام نے کہا) بیشک رب تعالیٰ تمہارا الہ ہے وہ میری مثل تمہارے درمیان نبی کو قائم کرے گا جو تمہارے بھائیوں سے ہوگا۔

توراۃ کی اسی فصل میں مذکور ہے کہ رب تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا:

" انی مقیم لھم نبیا مثلک من بین اخوانھم وایما رجل لم یسمع کلماتی التی یؤدیھا عنی ذلک الرجل باسمی انا انتقم منہ "
بیشک میں ان میں آپ کی طرح ان کے بھائیوں سے ایک نبی مبعوث کروں گا وہ نبی میرے کلام کو جب ان لوگوں پر میرا نام لے کر پیش کرے گا تو جو شخص اس کی بات کو نہیں سنے گا (سن کر قبول نہیں کرے گا) تو میں اس سے انتقام لوں گا۔

ان دونوں اقوال سے بہت واضح ہے کہ وہ بنی اسرائیل سے نہیں ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب بنی ہاشم کو یہ کہا جائے " انہ سیکون من اخوانکم اماما " بے شک وہ تمہارے بھائیوں سے امام ہوگا۔ تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ بنی ہاشم سے نہیں ہوگا، بلکہ ان کے ساتھ متعلق دوسرے قبیلہ سے ہوگا۔

اب مسئلہ کو سمجھنا آسان ہوگیا کہ موسیٰ علیہ السلام جس نبی کی بشارت دے رہے ہیں اور " من اخوانکم " کہہ رہے ہیں اس نے بنی اسرائیل سے نہیں ہونا، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام خود بنی اسرائیل سے ہیں۔ جب یہ بھی واضح کیا جاچکا ہے کہ ''اسرائیل'' حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام ہے ان سے تعلق رکھنے والا قبیلہ یا تو ان کے بھائی عیص کا خاندان ہے۔ آپ کا ایک بھائی عیص تھا، عیص کی اولاد میں صرف ایک نبی ہوئے حضرت ایوب علیہ السلام جو کہ موسیٰ علیہ السلام سے پہلے دنیا سے تشریف لے جاچکے تھے یقینی بات ہے کہ یہ بشارت حضرت ایوب علیہ السلام کے متعلق تو نہیں ہوسکتی تھی۔

دوسرا خاندان جو یعقوب علیہ السلام سے متعلق تھا وہ آپ کے باپ حضرت اسحٰق علیہ السلام کے بھائی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا تھا۔ یہ بھی واضح ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمام انبیاء کرام حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد سے تھے، یعنی بنی اسرائیل سے تھے۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد سے صرف نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہی تھے، لہذا یقینی طور پر یہی کہا جائے گا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بشارت نبی کریم ﷺ کے متعلق ہی تھی۔

اعتراض: ابھی جو تم نے توراۃ سے روایات ذکر کی ہیں ان میں "من بینکم" کے الفاظ بھی موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو جس نبی کے آنے کی بشارت دی وہ بنی اسرائیل سے آنے کی خبر دی کیونکہ "من بینکم" کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ تمہارے خاندان سے ہوگا۔ کس طرح یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ بشارت نبی کریم ﷺ کے متعلق دی گئی؟

جواب: ابھی ہم نے پہلے واضح کر دیا ہے کہ اس میں "من اخوانکم" سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے بنی اسرائیل کو یہ بتایا کہ وہ نبی تمہارے خاندان سے تو نہیں ہوں گے، البتہ تمہارے خاندان کے قریبی خاندان سے ہوں گے "من بینکم" کا مطلب یہ ہے "قام من بینکم" وہ تمہارے درمیان قائم رہیں گے۔ چونکہ مدینہ طیبہ اور اس کے اردگرد یہود محصور تھے جیسا کہ خیبر کے یہود، بنی نضیر، بنی قینقاع وغیرہ اسی طرح "من بینکم" کا مفہوم واضح ہوگیا۔

☆ توراۃ میں ذکر ہے:

"ان الرب تعالی جاء فی طور سیناء وطلع لنا من ساعیر وظهر من جبال فاران"

بے شک رب تعالیٰ کا نور طور سیناء میں آیا اور ہمارے پاس روشنی میں نمودار ہوا اور فاران کے پہاڑوں میں ظاہر ہوا۔

اور کتاب حقوق میں مذکور ہے:

"وهو جاء الله من طور سینا والقدس من جبل فاران وانکشفت السماء من بهاء محمد وامتلأت الارض من حمده یکون شعاع منظره مثل النور"

وہ اللہ تعالیٰ (کانور) طور سیناء سے آ گیا اور ذات قدس فاران کے پہاڑ سے ظاہر ہوئی اور محمد ﷺ کے حسن و جمال سے آسمان منکشف ہو گئے اور زمین آپ کی حمد سے بھر گئی۔ اور آپ کے منظر کی شعائیں نور کی طرح ہیں۔

ابوالحسین رحمہ اللہ نے کتاب الغرر میں نقل کیا ہے کہ مجھے نصاری کی نقول میں ملا:

" وظهر من جبال فاران لقد تقطعت السماء من بهاء محمد المحمود "

اس تمام کلام سے یہ واضح ہو گیا کہ توراۃ میں جو الفاظ " الرب تعالیٰ جاء " ہیں یا" ظهر الرب من جبل فاران " کے الفاظ ہیں۔ ان سے مراد خود رب تعالیٰ کا آنا نہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے

" معناه ظهور شخص موصوف بهذه الصفات وما ذاک الا رسولنا محمد ﷺ "

معنی اس کا یہ ہے کہ ایسا شخص ظاہر ہوگا جو ان صفات سے متصف ہوگا۔ وہ تمام صفات صرف ہمارے رسول محمد ﷺ میں پائی گئی ہیں۔ کیونکہ ان صفات میں یہ بھی ہے کہ اس کے دائیں طرف قدسی ہوں گے " فمنحهم العز " ان کو عزت عطاء فرمائے گا، یہ صفت صرف نبی کریم ﷺ کو ہی حاصل ہے۔

اعتراض: کتاب الغرر سے جو عبارت نقل کی گئی ہے اس کے آخر میں تو یہ بھی ہے " وانقاذ مسيحک " اور اس سے تمہارے مسیح کا چھڑانا ثابت ہوگا۔ اس سے تو یہ ہی پتہ چلتا ہے کہ " الرب تعالیٰ جاء " کا ظاہری معنی ہی درست ہے کہ رب تعالیٰ ظاہر ہوگا اور مسیح کو چھڑائے گا اس سے مراد نبی کریم ﷺ کیسے ہو سکتے ہیں۔

جواب: " (وانقاذ مسيحک) فان محمدا عليه السلام انقذ المسيح من كذب اليهود والنصارى "

مسیح کو چھڑانے سے مراد یہ ہے کہ بیشک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صحیح شان بیان کر کے (کہ آپ اللہ تعالیٰ کے بندے اللہ کے نبی ہیں آپ کی والدہ مکرمہ پاک دامن ہیں) ان کو یہود اور نصاری کے جھوٹ سے چھڑایا کیونکہ یہود آپ کو نبی نہیں مانتے تھے بلکہ معاذ اللہ آپ کی پیدائش کو پاکیزہ نہیں مانتے تھے یہ سراسر کذب بیانی تھی اسی طرح نصاری آپکو خدا یا دوسرا فرقہ آپ کو خدا کا بیٹا کہتا تھا، یہ بھی جھوٹ تھا۔

کتاب اشعیاء کی بائیسویں فصل میں ہے:

" قومی فازهری مصباحک (یرید مکة) فقدد ناوقتک و کرامة الله طالعة علیک فقد تجلل الارض الظلام وغطی علی الامم الضباب والرب یشرق علیک اشراقا ویظهر کرامته علیک تسیر الامم الی نورک والمملوک الی ضوء طلوعک وارفعی بصرکت الی ما حولک وتأملی فانهم مستجمعون عندک ویحجونک ویأتیک ولدک من بعید لأنک ام القری فأولاد سائرا البلاد کانهم اولاد مکة وتتزین ثیابک علی الارائک والسرور حین ترین ذلک تسرین وتبتهجین من اجل انه یمیل الیک ذخائر البحار ویحج الیک عساکر الامم ویساق الیک کباش مدینه ویاتیک اهل سبا ویتحدثون بنغم الله ویتمجدونه وتسیر الیک اغنام فاران ویرفع الی مذبحی ما یرضینی واحدث حینئذ لبیت محمدتی حمدا "

گویا مکہ مکرمہ کو رب تعالیٰ کی طرف سے خطاب کیا گیا (تمام صیغے اور ضمائر مؤنث کی ہیں) اے مکہ اٹھ کھڑا ہو اپنے چراغ روشن کر دے تیرا وقت قریب آ چکا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تجھ پر تکریم کا ستارہ طلوع ہونے والا ہے تاریک زمین روشن ہو جائے گی قوموں پر سفید نورانی چادر چھا جائے گی۔ رب تعالیٰ کی تجلیات تجھ پر روشن ہو جائیں گی۔ اور ان تجلیات کی کرامات تجھ پر ظاہر ہوں گی۔ قومیں تیری نورانیت کی طرف کھچا کھچ چلی آئیں گی۔ بادشاہ تجھ پر طلوع ہونے والی روشنی کی طرف آئیں گے۔ (اے مکہ) تو اپنی نظر اٹھا کر اپنے ارد گرد کو دیکھ اور تامل کر (سوچ) کہ سب لوگ تیرے پاس ہی جمع ہوں گے۔ اور تیرے پاس آ کر ہی حج کریں گے۔ اور سارے شہر تیری اولاد کی حیثیت ہیں کیونکہ تو "ام القریٰ" ہے اور سارے شہروں کے باشندے گویا کہ مکہ کے ہی باشندے ہیں۔ (اے مکہ) اپنے تختوں کو خوبصورت کپڑوں سے مزین کرے اور جب تو اس (طلوع ہونے والے ستارے) کو تو دیکھے خوش ہونا اور اس لئے بھی خوش ہو جانا کہ تمام دریاؤں، سمندروں کے ذخیرے تری طرف ہی میلان کریں گے اور سب امتوں کے لشکر تیری طرف ہی حج کرنے آئیں گے۔ اور مدین سے دنبے تیری طرف ہی چلائے جائیں گے اہل سبا تیرے پاس آئیں گے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے متعلق کلام کریں گے۔ اور رب تعالیٰ کی بزرگی بیان کریں گے اور فاران سے بھیڑ، بکریاں تیری طرف ہی چلائی جائیں گی۔ ان کو میری رضاء کے لئے ہی ذبح کی جگہ لایا جائے گا۔ اور اس وقت میری تعریف کا گھر نیا تعمیر کیا جائے گا۔

اس سے واضح ہوا کہ یہ تمام صفات مکہ مکرمہ کو ہی حاصل ہیں اور مکہ مکرمہ میں ظاہر ہونے والی روشنی اور طلوع ہونے والا ستارہ اور مکہ کو مکرمہ بنانے والی ہستی ہمارے نبی کریم محمد مصطفی ﷺ کی ذات ہی تھی۔" واحدث لبیت محمدتی حمدا " کا مطلب یہ ہے کہ اسلام سے پہلے عرب لوگ حج میں یہ تلبیہ پڑھتے تھے:

" لبیک لا شریک لک لبیک اللہ شریک ھو لک تملکه وما ملک "

اس تلبیہ میں اللہ تعالیٰ کا شریک ثابت کیا گیا اور یہ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے شرکاء کو خود ہی مالک بنایا ہے لیکن اسلام کے آنے کے بعد یہ تلبیہ پڑھا گیا " لبیک اللھم لبیک لا شریک لک لبیک " اس تلبیہ میں میں مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے شریکوں کی نفی کی گئی۔ گویا کہ رب تعالیٰ کی تعریف میں غلط الفاظ کو نکال کر صحیح تعریف کر کے حمد کی تجدید کی گئی۔

☆ توراۃ میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ میں نے اسمٰعیل کے متعلق تمہاری دعا کو قبول کر لیا ہے اور ان کو برکت وعظمت سے سرفراز کر دیا ہے اور ان کی اولاد میں وہ عظیم شخص ہوں گے " واجعله لامة عظیمة " میں ان کو عظیم امت کا نبی بناؤں گا۔

یہ بشارت بھی نبی کریم ﷺ کے متعلق ہی ہے کیونکہ اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے عظیم امت کا عظیم نبی ہمارے نبی کریم ﷺ کے بغیر کوئی تھا ہی نہیں۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام جب کعبہ کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو انہوں نے ہمارے نبی کریم ﷺ کے لئے ہی مکہ مکرمہ میں مبعوث ہونے کے لئے ان الفاظ میں دعا کی۔

﴿ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَیُزَکِّیْهِمْ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ﴾

اور اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا " انا دعوۃ ابی ابرھیم وبشارۃ عیسٰی " میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا ہوں اور عیسیٰ کی بشارت ہوں۔ عیسیٰ علیہ السلام نے بشارت دی جس کا ذکر قرآن پاک میں ان الفاظ مبارکہ سے کیا گیا ہے:

﴿ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُهٗ اَحْمَدُ ﴾

آپ نے اپنے بعد آنے والے رسول کی بشارت دی کہ ان کا نام (احمد ہوگا)

" فانه مشتق من الحمد والاسم المشتق من الحمد لیس الانبینا فان اسمه محمد واحمد ومحمود "

حمد سے مشتق ہوگا حمد سے مشتق صرف ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہے کیونکہ آپ کا نام محمد اور احمد اور محمود ہے۔

☆ توراۃ میں نبی کریم ﷺ کی بشارت یوں دی گئی:

" ان مولده بمكة ومسكنه بطيبة وملكه بالشام وامته الحمادون "

بیشک ان کا مقام پیدائش مکہ ہوگا، وہ مدینہ طیبہ میں رہیں گے، ان کی بادشاہت شام میں ہوگی، ان کی امت حمد کرنے والی ہوگی۔

☆ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریین کو کہا:

" انا اذهب وسيأتكم الفار قليط روح الحق الذى لا يتكلم من قبل نفسه انما يقول كما يقول له "

میں جارہا ہوں اور عنقریب تمہارے پاس "فارقلیط" آئیں گے جو اللہ تعالیٰ کے مظہر ہوں گے یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے خصوصی روح ان کو عطاء کر رکھی ہوگی۔ وہ اپنی طرف سے کلام نہیں کریں گے بلکہ وہی کہیں جو ان کو ارشاد ہوگا۔

یعنی آسان لفظوں میں یوں کہہ دیا جائے ان کو دیکھنا خدا کو دیکھنا ہوگا ان کا بولنا خدا کا بولنا ہوگا۔ اس کی تائید قرآن پاک کے ان الفاظ مبارکہ سے ہورہی:

﴿ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَيَّ ﴾ میں نہیں تابعداری کرتا مگر اسی چیز کی جو میری طرف وحی کی جاتی ہے

"الفارقلیط" کے دو معنی بیان کئے گئے ہیں ایک یہ ہے کہ وہ میرے بعد آنے والے نبی شافع ومشفع ہوں گے یعنی شفاعت کرنے والے ہوں گے اور ان کی شفاعت کو قبول کیا جائے گا۔ اور دوسرا معنی یہ ہے " هو الذى يفرق بين الحق والباطل " وہ حق اور باطل میں فرق کرنے والے ہوں گے۔

فائدہ: عیسیٰ علیہ السلام کے کلام میں ہے " انا اذهب " میں جارہا ہوں۔ کیا خوب الفاظ ذکر فرمائے جو واضح طور پر اس پر دلالت کر رہے ہیں کہ آپ زندہ ہی آسمانوں پر جارہے ہیں کیونکہ آپ نے یہ نہیں فرمایا " انا اموت " میں فوت ہو رہا ہوں میری وفات کے بعد "فارقلیط" آئیں گے۔ بلکہ فرمایا میں جارہا ہوں میرے جانے کے بعد آئیں گے۔

سبحان اللہ، اللہ کے نبی کا کیا مقام ہے کہ آپ نے صدیوں پہلے اشارہ فرما دیا کہ لوگ میری

وفات کو ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گے اور اپنے جھوٹے نبی کو مسیح موعود ثابت کرنے کی ناپاک کوشش کریں گے لیکن ناکام ہی رہیں گے۔

" فهذه هي البشارات الواردة في الكتب المقدمة بمبعث رسولنا محمد ﷺ "

یہ وہ بشارتیں ہیں جن کا ذکر پہلی کتب میں موجود ہے ، یہ بشارتیں ہمارے رسول محمد مصطفیٰ ﷺ کے مبعوث ہونے کے متعلق ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿ وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ ﴾ : دینی مدارس کے چھوٹی کلاسوں کے طلباء یہ خیال رکھیں کہ " ایای " ضمیر منصوب منفصل ہے جس کو فعل سے پہلے ذکر کیا گیا ہے جو حصر کا فائدہ دے رہی ہے۔

" ارهبوا " جمع مذکر حاضر امر حاضر معلوم کا صیغہ ہے اس کے بعد نون مکسور ہے بظاہر چھوٹی کلاسوں کے طلباء غلطی میں پڑ جاتے ہیں کہ واؤ جمع کے بعد نون مفتوح ہوتا ہے یہاں نون مکسور کیوں ہے؟ تو اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ یہ نون وقایہ ہے (نون جمع اور نون اعرابی نہیں) اس کے بعد یاء متکلم محذوف ہے اصل عبارت یہ ہے ﴿ وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِي ﴾ اور مجھ سے ہی ڈرو۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ " فَارْهَبُونِ " میں فاء جزائیہ ہے تقدیر عبارت کی یہ ہے " ان كنتم راهبين فاياى ارهبوا " اگر تم ڈر رکھتے ہو تو مجھ سے ہی ڈرو۔ (از قرطبی)

" ارهبوا " ماخوذ ہے " رهبة " سے " رهبة " کا معنی ہے خوف۔ متکلمین حضرات نے بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خوف رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے عذاب سے ڈرتا رہے۔ مکلّف کے خوف کی دو وجہ ہیں " احدهما مع العلم والآخر مع الظن " ان میں سے ایک وہ ہے جو یقین سے حاصل ہوتا ہے۔ اور دوسری قسم خوف کی وہ ہے جو ظن (گمان) سے حاصل ہوتا ہے۔ یقین کے ساتھ حاصل ہونے والے خوف کا یہ مطلب ہے کہ انسان کو یہ یقین ہو کہ میں نے تمام اوامر پر عمل کر لیا ہے اور تمام نواہی سے میں محفوظ رہا ہوں۔

" فان خوفه انما يكون عن المستقبل " بیشک اسے مستقبل کا خوف ہو کہ ابھی تک تو اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی ہے کہ میں اوامر پر عمل کرتا رہا اور نواہی سے بچتا رہا ، کہیں آگے جا کر شیطان اور نفس کے جال میں پھنس کر غلطی کا شکار نہ ہو جاؤں۔

وہ خوف جس کا تعلق ظن سے ہے وہ یہ ہے کہ اسے یہ یقین نہ ہو کہ اس نے تمام اوامر پر عمل کر لیا ہے اور تمام نواہی سے بچتا رہا" فحینئذ یخاف ان لا یکون من اهل الثواب " تو ایسی صورت میں وہ خوف رکھے گا کہ مجھے کامل ثواب تو حاصل نہیں ہوگا کہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔

تنبیہ: " واعلم ان کل من کان خوفه فی الدنیا اشد کان خوفة فی الدنیا اشد کان امنه یوم القیامة اکثر وبالعکس "

جان لیں بیشک ہر وہ شخص جسے دنیا میں زیادہ خوف حاصل ہوگا اسے قیامت کے دن بہت ہی زیادہ امن حاصل ہوگا۔ اس کے عکس میں عکس ہوگا یعنی جس شخص کو دنیا میں امن حاصل ہوا اللہ تعالیٰ کا خوف اس نے دل میں نہ رکھا وہ قیامت کے دن خوف میں مبتلا ہوگا۔

> " روی انه ینادی مناد یوم القیامة وعزتی وجلالی انی لا اجمع علی عبدی خوفین ولا امنین من امننی فی الدنیا خوفته یوم القیامة ومن خافنی فی الدنیا امنته یوم القیامة "
>
> قیامت کے دن رب تعالیٰ کی طرف سے نداء دی جائے گی مجھے اپنی عزت وجلال کی قسم بیشک میں اپنے بندے کو دو خوف اور دو امن نہیں دیتا۔ جو شخص دنیا میں مجھ سے بے خوف رہا آج قیامت کے دن میں اسے خوف دوں گا اور جو شخص دنیا میں مجھ سے خوف رکھتا رہا آج قیامت کے دن میں اسے امن میں رکھوں گا۔

عارفین کا ارشاد گرامی:

> " الخوف خوفان خوف العقاب وخوف الجلال والاول نصیب اهل الظاهر والثانی نصیب اهل القلب والاول یزول والثانی لا یزول "

خوف کی دو قسمیں ہیں ایک وہ خوف ہے جو عذاب کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے اور دوسرا وہ خوف ہے جو اللہ تعالیٰ کے جلال کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ پہلا خوف اہل ظاہر کا حصہ ہے اور دوسرا خوف اہل قلب (یعنی صوفیاء کرام، اولیاء عظام) کا حصہ ہے جو عام لوگوں کو خوف حاصل ہے اس کی دارومدار چونکہ عذاب پر ہے جب عذاب کا خطرہ ٹل گیا تو خوف بھی جاتا رہے گا، لیکن وہ خوف جو اولیاء کرام کو حاصل ہے اس کی دارومدار اللہ تعالیٰ کے جلال پر ہے نہ اللہ تعالیٰ کے جلال میں زوال ہے اور نہ ہی اولیاء کرام کے خوف میں زوال ہوتا ہے۔

آیۃ کریمہ سے حاصل ہونے والے فوائد:

" واعلم ان فی الآیة دلالة علی ان کثرة النعم تعظم المعصیة و دلالة علی ان تقدم العهد بعظم المخالفة و دلالة علی ان الرسول کما کان مبعوثا الی العرب کان مبعوثا الی بنی اسرائیل "

اس آیۃ کریمہ سے یہ واضح ہورہا ہے کہ کثیر نعمتیں عظیم معصیت کا سبب ہیں کیونکہ جب عظیم منعم کا انسان شکرگزار نہیں ہوگا تو اس کے لئے یہ بہت بڑی معصیت ہوگی۔ اور یہ بھی واضح ہورہا ہے کہ وعدہ جب پرانا ہو جائے اس کی خلاف ورزی زیادہ ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھی واضح ہورہا ہے کہ نبی کریم ﷺ جس طرح عرب کی طرف مبعوث ہوئے اسی طرح بنی اسرائیل کی طرف بھی مبعوث ہوئے بلکہ آپ ساری کائنات کے نبی ہیں۔

انتباہ: " وایای فارھبون " اس پر دلالت کر رہا ہے کہ انسان کیلئے ضروری ہے کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کا خوف رکھے کسی اور کا خوف نہ رکھے اور اسی طرح امید بھی صرف اللہ تعالیٰ پر رکھے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر چیز رب تعالیٰ کی قضاء وقدر میں ہے اگر بندہ بھی مستقل بالفعل ہوتو بندے سے خوف رکھنا بھی ضروری ہو جائے گا اس صورت میں حصر فوت ہو جائے گی کیونکہ رب تعالیٰ نے فرمایا "صرف مجھ سے ہی ڈرو"۔

" بل کان یجب ان لا یرهب الانفسه لان مفاتیح الثواب و العقاب بیده لابید الله تعالیٰ فوجب ان لا یخاف الا نفسه و ان لا یخاف الله البتة "

بلکہ انسان کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ صرف اپنے نفس سے ڈرے کیونکہ ثواب اور عذاب کی چابیاں رب تعالیٰ نے اسے ہی دے دی ہیں اپنے دست قدرت میں ان کو رکھا ہی نہیں کہ انسان پر جبر نہ ہو۔ اسلئے ضروری ہے کہ انسان صرف اپنے آپ سے ڈرے، اپنے آپ سے ڈرنا ہی درحقیقت رب تعالیٰ سے ڈرنا ہے اسی سے یہ واضح ہوا کہ انسان کا طاعت کرنا ہی اصل میں خوف اور امید ہے۔ (از کبیر)

<u>صوفیا حضرات نے فرمایا:</u> خوف ہوتا ہے عذاب سے، یعنی عذاب سے ڈرا کر خوف دلایا جائے اور رھبۃ وہ خوف ہے جو ناراضگی، قہر، اعراض اور پردہ کر لینے کے ڈر کی وجہ سے ہوتا ہے اور خشیۃ اخص ہے رھبۃ سے کیونکہ اس کا تعلق صرف احتجاب ذات سے ہے اور رھبۃ کا تعلق عظمت ذات کی وجہ سے خوف سے ہے۔ (ابن عربی)

﴿ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا وَّاِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ ﴾

☆ ''اور ایمان لاؤ اس پر جو میں نے اتارا اس کی تصدیق کرتا ہوا جو تمہارے ساتھ ہے اور سب سے پہلے اس کے منکر نہ بنو اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑے دام نہ لو اور مجھی سے ڈرو''۔

☆ ''اور ایمان لاؤ اس پر جو میں نے نازل کیا ہے تصدیق کرنے والا ہے اس کی جو تمہارے پاس ہے اور نہ ہو جاؤ تم پہلے اس کے انکار کرنے والے اور نہ حاصل کرو میری آیتوں کے بدلے تھوڑے دام، اور مجھ سے ہی ڈرو''۔

آیۂ کریمہ کا ماقبل سے تعلق:

اس آیۂ کریمہ میں بھی خطاب بنی اسرائیل کو ہی ہے، کیونکہ پہلے رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ﴾ ''میری نعمتیں یاد کرو''۔ پھر فرمایا ﴿وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْ﴾ میرا وعدہ پورا کرو اب فرمایا: ﴿وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ﴾ جو میں نے نازل کیا اس پر ایمان لاؤ۔ اسی طرح ﴿مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ﴾ بھی اسی کی تصدیق کر رہا ہے کہ یہ خطاب بنی اسرائیل کو ہی ہے کیونکہ قرآن پاک ان کے پاس جو آسمانی کتب تھیں ان کی تصدیق کر رہا ہے۔

شانِ نزول:

'' عن ابن عباس رضي الله عنهما ان رؤساء اليهود مثل كعب بن الاشرف وحيي بن اخطب امثالهما كانوا يأخذون من فقراء اليهود الهدايا وعلموا انهم لو اتبعوا محمد الا نقطعت عنهم تلك الهدايا يا فاصروا علي الكفر لئلا ينقطع عنهم ذلك القدر المحضر ''(از کبیر)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہود کے سردار کعب بن اشرف اور حی بن اخطب جیسے اور دوسرے سردار لوگ بھی یہود کے فقراء سے ہدیئے قبول کرتے تھے۔ انہیں

یہ معلوم ہو رہا تھا کہ اگر انہوں نے نبی کریم ﷺ پر ایمان لایا تو ان کے یہ حقیر ہدیے ختم ہو جائیں گے۔ اس لئے وہ کفر پر ہی قائم رہے تا کہ ان کے ہدیے بھی قائم رہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں ہی اس آیۂ کریمہ کو نازل کیا کہ تم علم والے ہو کر رب کے کلام کا سب سے پہلے انکار کر کے کافر نہ بنو، بلکہ رب تعالیٰ کے نازل کردہ کلام پر ایمان لاؤ، یہ تو وہ کلام جو تمہارے پاس آسمانی کتب کی تصدیق کرتا ہے۔

تفصیلی وضاحت:

﴿ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ ﴾: "اور ایمان لاؤ اس پر جو میں نے نازل کیا" ﴿ مَا اَنْزَلْتُ ﴾ سے مراد قرآن پاک ہے اس پر دو دلیلیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ رب تعالیٰ نے اس کی صفت بیان کی نازل کرنے سے، اور دوسری دلیل یہ ہے کہ اس کی دوسری صفت بیان کی ﴿ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ ﴾ (تصدیق کرنے والا ہے اس کی جو تمہارے پاس ہے) سے۔

ان دونوں چیزوں پر دوسری آیۃ واضح طور پر دلالت کر رہی، جس میں یہ دونوں صفتیں قرآن پاک کی بیان کی گئی ہیں:

﴿ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ مِنْ قَبْلِ ﴾ (آل عمران آیۃ ۳)

اس نے تم پر سچی کتاب اتاری، اگلی کتابوں کی تصدیق فرمائی اور اس نے اس سے پہلے توراۃ اور انجیل اتاری

" وقال قتادہ المراد ﴿ آمِنُوْا بِمَا اَنْزَلْتَ ﴾ من کتاب ورسول تجدونہ مکتوبا فی التوراۃ والانجیل "

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ﴿ آمِنُوْا بِمَا اَنْزَلْتَ ﴾ سے مراد قرآن پاک اور رسول اللہ ﷺ ہیں یعنی ان کو یہ حکم دیا کہ تم توراۃ اور انجیل میں جس نبی کے آنے اور اس پر اترنے والے کلام یعنی قرآن پاک کا تذکرہ پاتے ہو وہ آ چکے ہیں ان پر ایمان لاؤ

﴿ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ ﴾: کی دو تفسیریں ہیں ایک یہ کہ قرآن پاک میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام حق ہیں اور بیشک توراۃ و انجیل حق ہیں، اور بیشک توراۃ موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی اور انجیل عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ قرآن پاک پر ایمان لانا درحقیقت توراۃ اور انجیل پر

ایمان لانے کی تاکید ہے۔گویا کہ ان کو یوں کہا گیا:

"ان کنتم تریدون المبالغة فی الایمان بالتوراة والانجیل فآمنوا بالقرآن فان الایمان به یؤکد الایمان بالتوراة والانجیل"

اگر تم توراۃ اور انجیل پر ایمان میں اور زیادہ کمال پیدا کرنا چاہتے ہو تو قرآن پاک پر ایمان لے آؤ اس لئے کہ قرآن پاک پر ایمان لانے سے ہی توراۃ وانجیل پر ایمان میں پختگی ہوگی۔اور دوسری تفسیر،توراۃ وانجیل میں نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے کی بشارت دی گئی اور قرآن پاک کے نازل ہونے کی بشارت دی گئی۔اب اس سے واضح ہوا:

"الایمان ب محمد وبالقرآن تصدیق للتوراة والانجیل وتکذیب محمد والقرآن تکذیب للتوراة والانجیل"

کہ نبی کریم ﷺ اور قرآن پاک پر ایمان لانا توراۃ وانجیل کی تصدیق ہے اور نبی کریم ﷺ اور قرآن پاک کی تکذیب توراۃ وانجیل کی تکذیب ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ دوسری تفسیر زیادہ بہتر ہے کیونکہ پہلی تفسیر سے اتنا تو واضح ہے کہ قرآن پاک توراۃ وانجیل کی تصدیق کرتا ہے لیکن یہ ثابت نہیں کہ ﴿ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ ﴾ سے ہی نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے یہ دوسری تفسیر سے ہی واضح ہو رہا ہے۔

فائدہ: دوسری تفسیر نبی کریم ﷺ کی نبوت پر بھی دو وجہ سے دلالت کر رہی ہے:

"الاول ان شهادة کتب الانبیاء علیهم السلام لا تکون الا حقا"

پہلی وجہ یہ ہے کہ جب انبیاء کرام پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی کتابوں نے نبی کریم ﷺ کی نبوت کی خبر دی تو یقیناً انبیاء کرام پر نازل ہونے والی کتابوں کی خبر حق ہے۔

"والثانی انه علیه السلام اخبر عن کتبهم ولم یکن له معرفة الا من قبل الوحی"

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے آسمانی کتابوں کی خبر دی ان کی حقانیت کی تصدیق فرمائی تو آپ کو یہ معرفت یقیناً صرف وحی کے ذریعے حاصل ہوئی۔اور جس ذات پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئے وہ نبی ہی تو ہوتا ہے۔ (از کبیر)

قرآن پاک نے کتب سماویہ کی کن امور میں تصدیق کی؟

قرآن پاک توراۃ (وانجیل) کے ساتھ توحید اور نبوت اور اخبار اور نبی کریم ﷺ کے اوصاف بیان کرنے میں موافق ہے۔ اسی طرح قصص اور مواعید اور توحید کی دعوت دینے اور عبادت کا حکم دینے اور لوگوں کے درمیان عدل کرنے کا حکم دینے میں اور گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے روکنے میں قرآن پاک پہلی آسمانی کتابوں کے موافق ہے۔ تمام انبیاء کرام توحید کی دعوت دینے میں اور پانچ عبادات کا حکم دینے میں اور حلال وحرام کے احکام بیان کرنے میں اور زجر کرنے میں متفق رہے۔

اس سے واضح ہوا کہ دینوں اور ملتوں کے اختلاف اور زمانے کے اختلاف سے اصول اور کلیات شرعیہ میں اتفاق رہا جزئیات اور فروع میں اختلاف رہا۔ (از بیضاوی)

اعتراض: نبی کریم ﷺ کی شریعت تو پہلی شریعتوں کی ناسخ ہے تصدیق کرنے والی کیسے ہے؟

جواب: "والنسخ ليس بتكذيب بل بيان لانتهاء الحكم بانتهاء مصلحته التي شرع لها" (تبصير الرحمن)

نسخ تکذیب نہیں بلکہ حکم کی انتہاء کا بیان ہے۔ کیونکہ جو احکام منسوخ ہوتے ہیں وہ مختلف زمانوں اور قوموں کی مصلحت کے لئے نافذ ہوتے ہیں۔ جب تک ان کا قائم رہنا بہتر ہوتا ہے ان کو ثابت رکھا جاتا ہے اور جب ان احکام کے ختم کرنے میں مصلحت ہوتی ہے ان کو منسوخ کر دیا جاتا ہے۔ یعنی جس طرح مرض کی دوا مختلف زمانوں، مختلف اشخاص کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہیں اس طرح اللہ تعالیٰ جو حکیم ہے اس نے اپنی حکمت کے پیش نظر مختلف قوموں کے مزاج کے مطابق احکام نافذ فرمائے۔ جیسا کہ مسند احمد میں ہے:

"عن جابر انه ﷺ قال حين قرأ بين يديه عمر رضي الله عنه شيئا من التوراة لو كان موسى حيا لما وسعه الا اتباعي"

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ ﷺ نے جب اپنے سامنے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو توراۃ کا کچھ حصہ پڑھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری اتباع کے بغیر کوئی چارہ نہ ہوتا۔

اور دارمی کی روایت میں ہے:

" والذی نفس محمد بیده لو بدالکم موسی فاتبعتموه و ترکتمونی لضللتم عن سواء السبیل و لو کان حیاء ادرک نبوتی لا تبعنی "

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد کی جان ہے اگر تمہارے پاس موسیٰ آ جائیں تم ان کی تابعداری کرو اور مجھے چھوڑ دو تو تم سیدھی راہ سے بھٹک جاؤ گے اور اگر موسیٰ زندہ ہوتے اور میری نبوت کو پا لیتے تو وہ ضروری میری تابعداری کرتے۔ (از روح المعانی)

﴿وَلَا تَكُونُوٓا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ﴾: "اور نہ ہو تم پہلے پہلے کفر کرنے والے اس کے ساتھ"

اعتراض: جب یہ خطاب نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود کو ہے۔ جو مدینہ طیبہ میں تھے تو یہ کہنا کس طرح صحیح ہے کہ تم سب سے پہلے قرآن پاک کا انکار کرنے والے نہ بنو۔ حالانکہ ان سے پہلے مکہ کے مشرکین قرآن پاک اور نبی کریم ﷺ کا انکار کر چکے تھے۔

جواب نمبر ۱: یہ کلام بطور تعریض کی گئی یعنی ظاہری طور پر اور مطلب لیا گیا اور درحقیت اور ہے گویا کہ ان کو یہ کہا گیا ہے کہ تم پر واجب ہے کہ نبی کریم ﷺ پر سب سے پہلے ایمان لاؤ کیونکہ تم تو علم رکھتے ہو اور نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے کی تم دوسرے لوگوں کو بھی بشارت دیتے رہے اور آپ کے تشریف لانے سے پہلے تم ان کے وسیلہ سے کافروں پر فتح بھی طلب کرتے رہے۔ لیکن جب آپ تشریف لائے تو تم نے الٹا عمل شروع کر دیا کہ انکار کرنے لگے۔

جواب نمبر ۲: ہوسکتا ہے کہ یہاں حذف مضاف ہو۔ اصل مقصد یوں ہو:

﴿ وَلَا تَكُونُوٓا مِثْلَ اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ ﴾

تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے قرآن پاک سے پہلے پہلے کفر کیا۔

وہ مشرکین تو آپ کی شان کو جانتے ہی نہیں تھے لیکن اے بنی اسرائیل تم تو توراۃ و انجیل میں آپ کے اوصاف اور آپ کی تشریف آوری کو پڑھ چکے ہو۔ تمہارا انکار کرنا اور ہی باعث تعجب ہے۔

جواب نمبر ۳: خطاب جب یہود کو ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اے اہل علم تم تمام یہودیوں سے پہلے کفر کرنے والے نہ بنو کیونکہ باقی یہودی تو علم نہیں رکھتے، تمہارا سب سے پہلے انکار کرنا اور ہی باعث تعجب ہے۔

جواب نمبر ۴: اس کا مطلب یہ ہے کہ سب سے پہلے تم اپنی کتاب سے کفر نہ کرو کیونکہ نبی کریم ﷺ کی تکذیب درحقیقت ان کی اپنی کتب کی تکذیب تھی، کیونکہ ان میں نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا تھا۔ (از کبیر)

زیادہ بہتر جواب یہ ہے: کہ تجارتی طور پر مشرکین مکہ کا مدینہ میں آنا جانا تھا۔ مشرکین جاہل تھے وہ بعض اوقات یہود کے علماء سے کئی مسائل پوچھتے رہتے تھے، نبی کریم ﷺ کے اعلان نبوت کے بعد بھی مشرکین نے ممکن ہے یہود سے مشورہ لیا ہو، انہوں نے نبی کریم ﷺ کی تکذیب کی ہو، اس لحاظ پر سب سے پہلے کفر کرنے والے حقیقت میں وہی تھے۔

اعتراض و جواب کے بغیر ترجمہ:

﴿ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ﴾ ای لا تسارعو الی الکفر به "

تم کفر کی طرف جلدی نہ کرو یہ ترجمہ کرنے سے اعتراض وارد ہی نہیں ہوتا نہ جواب دینے کی ضرورت ہے۔ (از روح المعانی)

﴿ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ﴾ : اشتراء کا معنی خریدنا۔ اور بیچنے والے اور خریدنے والے کے درمیان جو رقم طے ہو جائے اسے ثمن کہا جاتا ہے۔ دو شخص مہارت رکھنے والے جو رقم طے کریں کہ یہ چیز اتنے کی ہوگی، اسے قیمت کہا جاتا ہے۔ آیۃ کریمہ میں اشتراء اور " ثمن " کا معنی حقیقی مراد نہیں لیا جا سکتا۔ بلکہ مجازی معنی مراد ہوگا۔ اس لئے " اشتراء " کا معنی ہے " استبدال " (تبدیل کرنا) اور ثمن کا معنی دنیاوی مال بطور رشوت لے لینا جیسا کہ شان نزول سے واضح ہے۔

یہ بھی خیال رہے کہ رب تعالیٰ کی طرف سے مومنوں کے لئے جو نعمتیں تیار کی گئی ہیں وہ عظیم ہیں اور ہمیشہ رہنے والی ہیں اسی مسئلہ کو ان الفاظ میں دیکھئے:

" وما اعد الله تعالیٰ للمؤمنین من النعیم العظیم الابدی "

لیکن دنیاوی مال کی یہ حیثیت ہے " حظوظ الدنیا الفانیة القلیلة المسترذلة " دنیاوی مال فانی اور قلیل اور گھٹیا ہے۔

اب مفہوم واضح ہوگیا کہ رب تعالیٰ کے ارشادگرامی کا مطلب یہ ہے ''میری آیتوں پر ایمان لانا جو اخروی عظیم نعمتوں کا ذریعہ ہے جو نعمتیں ہمیشہ رہنی ہیں فنا نہیں ہونی ان کے بدلے (یعنی ایمان نہ لا کر ان کے بدلے) دنیا کا فانی اور گھٹیا مال حاصل نہ کرو جو اخروی نعمتوں کے مقابل قلیل ہے۔ (از روح المعانی)

اس تفسیر سے یہ اعتراض خود بخود اٹھ گیا کہ رب تعالیٰ نے تھوڑے دام حاصل کرنے سے منع فرمایا ہے کیا زیادہ دام لے کر اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو بدلا جاسکتا ہے؟

تو اس کا جواب واضح ہے کہ ساری دنیا کے خزانے اخروی نعمتوں کے مقابل قلیل ہیں۔لہذا ساری دنیا حاصل کر کے بھی رب تعالیٰ کی آیات کو بدلنا کفر ہوگا۔اللہ تعالیٰ کے اس ارشادگرامی کو مدنظر رکھنے سے یہ مسئلہ بہت واضح ہو جاتا ہے ﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ﴾ اے محبوب فرمادیں دنیا کا مال قلیل ہے۔

اعتراض: آیات پر ایمان نہ لانے کے بدلے دنیا کا مال حاصل کرنے سے منع کرنا تو اس وقت درست ہوسکتا ہے جب کہ انہوں نے پہلے ایمان لایا ہوا ہو۔ پھر کہا جائے کہ میری آیات کے بدلے تھوڑا مال حاصل نہ کرو، ان کا تو ایمان تھا ہی نہیں۔ان کو آیات کے بدلے تھوڑا مال لینے سے منع کرنے کا کیا مقصد ہے۔

جواب: اس کا مقصد یہ ہے کہ انہوں نے توراۃ پر ایمان لایا ہوا تھا۔اسی توراۃ کی آیات کے بدلے وہ دنیا کا مال حاصل کرتے تھے جو گھٹیا اور فانی اور قلیل تھا۔اس سے ان کو منع کیا گیا کہ اے توراۃ پر ایمان لانے والو نبی کریم ﷺ پر ایمان نہ لا کر توراۃ کی آیات کو نہ بدلو۔ (از روح المعانی)

﴿وَاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ﴾: (اور مجھ سے ہی ڈرو) (ترکیب یہاں بھی ﴿وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ﴾ کی طرح ہی ہے)۔

یعنی تم تقوی اختیار کرو، میرا خوف اپنے دل میں رکھو تا کہ تم ایمان لاؤ، اور حق کی تابعداری کر سکو، اور میری آیات کے بدلے دنیا کا گھٹیا مال حاصل کرنے سے بچ سکو۔

نکتہ: پہلی آیت میں خطاب ہے بنی اسرائیل کے عوام کو اس لئے اس میں ﴿وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ﴾ کہا کیونکہ رھبۃ تقوی کا مقدمہ ہے لیکن اس آیۃ میں خطاب ہے بنی اسرائیل کے علماء کو، اس لئے یہاں تقوی ذکر کیا گیا ہے کہ یہ اس کی انتہاء ہے۔ (از مظہری)

یعنی رھبۃ کا مقام تقوی سے کم ہے، اس لئے کہ پہلے رھبۃ دل میں آئے پھر تقوی حاصل ہوتا ہے، اسی لئے خوف کا اعلیٰ مقام تقوی میں ہی پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء کو خطاب کرتے ہوئے تقوی کا ذکر کیا۔

(از روح المعانی)

دنیا کے گھٹیا ہونے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان ذیشان:

" قد اربع الناس فی الدنیا باربعة ...... اکل وشرب وملبوس ومکنوح ......
ومرجع الکل ان فکرت فیه الی ...... روث وبول ومطروح ومفضوح "

لوگ دنیا میں چار چیزوں کے بدلے چار چیزیں حاصل کرتے ہیں...... کھانا اور پینا اور لباس اور شادی ...... اگر تو ان سب میں فکر کرے تو ان سے حاصل ہونے والی چیزیں...... پیشاب، پاخانہ اور پھٹے ہوئے لباس کو پھینک دینا اور شادی کے بعد پریشانی۔

(از عزیزی)

بنی اسرائیل کے طور طریقے مسلمانوں میں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل چلے گئے لیکن وہ اپنے طور طریقے غیروں میں چھوڑ گئے۔

☆ بنی اسرائیل کا طریقہ رکھنے والا پہلا فرقہ بدقماش علماء کا ہے جو دنیا داروں اور ظالموں سے تعلقات رکھتے ہیں۔ اپنی لذات اور خواہشات کو پورا کرنے کیلئے ان کے مظالم اور ان کے گھٹیا اور ناجائز کاموں کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اور ان کے ناجائز کاموں کو جائز کرنے کیلئے حیلے تلاش کرتے رہتے ہیں۔

☆ بنی اسرائیل کے نقش قدم پر چلنے والا (دوسرا فرقہ رشوت خور قاضیوں (ججوں) اور بے باک مفتیوں کا ہے جو رشوت حاصل کرنے کے لئے شریعت کے حکم کو تبدیل کر دیتے ہیں، مدعی کو مدعا علیہ بنا دیتے ہیں اور مدعا علیہ کو مدعی بنا دیتے ہیں یوں سمجھیں آئین کے پاسبان آئین کی دھجیاں بکھیر دیتے ہیں۔

چور اور ڈاکو ان سے اس لئے اچھے ہوئے ہیں کہ وہ ظاہر طور پر آئین کی مخالفت کر رہے ہوتے ہیں لیکن یہ بظاہر آئین کے محافظ بنے بیٹھے ہوتے ہیں۔ درحقیقت آئین کا مزاح اڑانے والے یہی ہوتے ہیں۔ جدھر پیسہ گیا ادھر فیصلہ گیا۔ جدھر ڈنڈے والوں نے فیصلہ کرنے کا اشارہ دیا وہی فیصلہ کر دیا۔ لیٹروں اور غاصبوں کا ساتھ دینا کون سا انصاف ہے۔ آئین کی رو سے معطل شدہ کو نہ صرف بحال کرنا بلکہ اس کو مراعات دینا، اسے محافظ بنا دینا، اسے سیاہ وسفید کا مالک بنا دینا کون سا انصاف ہے؟

☆ بنی اسرائیل کے طرز عمل پر چلنے والا تیسرا فرقہ ظالم بادشاہوں اور بے انصاف حاکموں کا ہے جو مظلوموں کو انصاف نہیں دلاتے اور نہ ہی اپنے کارندوں کے غلط فیصلوں سے انہیں پوچھتے ہیں، ان کے ہر سیاہ وسفید کام پر آنکھیں بند کیے رہتے ہیں، ملک وملت کے سب سے بڑے دشمن یہی ہیں۔

☆ چوتھا طبقہ جو بنی اسرائیل کا طریقہ رکھتا ہے وہ معلمین اور واعظین کا ہے جو بغیر دنیاوی مال حاصل کرنے کے کسی کو کوئی مسئلہ نہ بتائیں۔ اگر کوئی علم دین کی بات پوچھے تو انہوں نے اس کی قیمت مقرر رکھی ہو کہ ایک مسئلہ پوچھنے پر اتنی رقم دینی ہوگی اور دو پر اتنی رقم ہوگی۔

خیال رہے کہ کسی مدرسہ وغیرہ میں تعلیم دینا اور تنخواہ حاصل کرنا اس حکم میں نہیں، اس کا ذکر انشاء اللہ تفصیلی طور پر آگے آئے گا۔

☆ پانچواں طبقہ بنی اسرائیل کا طریقہ رکھنے والا وزراء اور دفاتر کے آفیسران کا ہے جو رعایا کا مال ناجائز طریقہ سے حاصل کرنے میں اللہ تعالیٰ کا خوف نہیں رکھتے۔

حقیقت یہی ہے کہ ہم اپنے ملک "پاکستان" کو دیکھتے ہیں قرضے لے لے کر ملک کو برباد کر دیا۔ قرض کو با مقصد کم اور بے مقصد زیادہ خرچ کرنے والے اور خود ذاتی طور پر ملک وملت کے پیسے کو ہڑپ کرنے والے ہی اس ملک کو دولخت کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ وہی لوگ دوسرے لوگوں کو پیسے دے کر اپنا آلہ کار بنانے والے اور دوسروں سے لڑانے والے، ملک میں افراتفری پیدا کرنے والے ہیں۔

تعلیم وتدریس، امامت وخطابت پر اجرت لینے کا مسئلہ:

خیال رہے کہ اس مسئلہ میں دو رخ ہیں۔ ایک جائز ہے اور دوسرا ناجائز ہے۔

پہلا رخ جو جائز ہے۔ وہ یہ ہے کہ کسی کو تعلیم وتدریس کیلئے ایک جگہ مقرر کر دیا جائے کہ تم نے یہاں اتنے وقت کے لئے پڑھانا ہے اس پر اجرت مقرر کرنا یعنی تنخواہ لینا جائز ہے، یہ درحقیقت نیکی کے کام کی اجرت نہیں بلکہ اپنا وقت صرف کرنا اور اپنے آپ کو ایک جگہ پابند کرنے کی وجہ سے تنخواہ لینا ہے۔

یہی صورت امامت وخطابت کی ہے جب کسی کو ایک مسجد میں نماز پڑھانے اور جمعہ کا خطبہ دینے کے لئے مقرر کر دیا جائے تو وہ اپنے وقت کی پابندی اور ایک جگہ اپنے آپ کو پابند رکھنے کی تنخواہ لے سکتا ہے۔ بلکہ آج کل کے دور میں اس قسم کا نظام قائم کرنا بہت بہتر ہے تاکہ علم دین میں

کمی واقع نہ ہو۔

" قال فی الهداية وبعض مشائخنا رحمهم الله تعالیٰ استحسنوا الاستئجار علی تعليم القرآن اليوم لظهور التوانی فی الامور الدينية ففی الامتناع تضييع حفظ القرآن وعليه الفتوی "(شافی ج ۵ ص ۳۸)

علماء ومشائخ کا فتویٰ اسی پر ہے کہ ایک جگہ مقرر کر کے قرآن پاک کی تعلیم پر اجرت لینا جائز ہے خصوصاً ہمارے دور میں جبکہ امور دینیہ میں سستی ہوگئی ہے اگر اس طرح انتظام نہ کیا جائے تو قرآن پاک کی تعلیم کا سلسلہ ختم ہو جائے۔

دوسرا رخ جو ناجائز ہے، وہ یہ ہے کسی سے مسئلہ پوچھا اس نے کہا مجھے اتنی اجرت دو تو میں مسئلہ بتاؤں گا کسی کو کہا مجھے قرآن پاک کا یہ سبق بتا دو اس نے کہا مجھے اتنی رقم دو میں تمہیں قرآن پاک کے یہ الفاظ پڑھاؤں گا، کہیں نماز کا وقت ہوگیا کسی کو کہا آپ امامت کرا دیں وہ صاحب کہیں مجھے اتنے پیسے دو تو میں نماز پڑھاؤں گا۔ ان تمام صورتوں میں وقت مقرر نہیں جگہ مقرر نہیں کسی کو پابند نہیں کیا گیا یہ خالص نیکی کے کام کی اجرت لی جا رہی ہے جو ناجائز ہے۔

یہ بات نہ بھولئے:

" درزمان سابق ائمه وخطباء ومؤذنين " حسبة لله "، بايں اعمال مشغول ميشدند چنانچه قاضيان ومفتيان ومحتسبان وتحصيل کنندگان خراج وعشر وزکوة نيز بهميں نيت خالصه بايں مشغول ميگشتند وچوں خلفای راشدين وسلاطين عادلين ديدند که ايں جماعت خودرا مشغول باقامت ايں عبادات ساخته اند برای معاش آنها ازمال مسلمين امدادی مقرر کردندنه باجرت بلکه بنا براعانت "

(عزیزی)

نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے زمانہ میں لوگ صرف اللہ تعالیٰ کے رضاء کے لئے امامت وخطابت کے فرائض سرانجام دیتے تھے اسی طرح قاضی، مفتی، محتسب حضرات بھی اپنے منصب پر صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے قائم رہتے لیکن ان کی معاونت عشر، خراج اور زکواۃ کے مال سے کی جاتی تھی، تا کہ یہ لوگ دل جمعی سے یہ کام کر سکیں کہیں معاش کی تنگی کی وجہ سے یہ نیکی کے کام نہ چھوڑ دیں، بلکہ خلفاء راشدین کے زمانہ میں ان کی معاونت کے لئے خصوصی فنڈ مقرر کیا جاتا تھا وجہ وہی تھی کہ یہ لوگ مطمئن ہو کر نیکی کے کاموں میں مشغول رہیں۔

اسی سے یہ واضح ہوا کہ کسی شخص کو کسی جگہ وقت کا پابند کر کے اس سے امامت وخطابت، تعلیم تدریس کا کام لیا جائے اور اسے تنخواہ دی جائے تو " این اجرت برنفس ایں عبادات نیست بلکه برادای آں عبادات درمکانی خاص یا درزمانی خاص این خصوصیت داخل عبادت نیست جائز داشته اند " یہ اجرت عبادات کی نہیں بلکہ ان عبادات کو مخصوص مکان میں ادا کرنا، یا مخصوص زمانہ میں ادا کرنا اور ان کی اجرت مقرر کرنا یہ جائز ہے کیونکہ وقت اور جگہ کا خاص کر کے پابند کرنا عبادت کا حصہ نہیں۔ (از عزیزی)

ھدیہ اور رشوت میں فرق:

ھدیہ جائز ہے اور رشوت حرام ہے لہٰذا ان میں فرق کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے:

" الصدقة ما ينفق على الفقراء ويراد به ثواب الآخرة ولا يكافى وفيه ذل للمعطى له والهدية يراد بها الاكرام للمهدى او ينفق على الاغنياء "

جو مال فقراء پر خرچ کیا جائے اس میں آخرت کے ثواب کی نیت پائی جائے اور اس کے بدلے میں کوئی چیز حاصل نہ کی جائے اسے صدقہ کہا جاتا ہے اس میں جسے صدقہ دیا جاتا ہے اس کی حقارت ہوتی ہے۔ (لمعات حاشیہ مشکوۃ ص ۱۶۱)

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی اہل پر صدقہ حرام قرار دیا، لیکن وہ مال جو کسی کو دیا جائے اس کی عزت افزائی کے لئے خواہ فقیر کو دیں یا غنی کو اسے ہدیہ کہا جائے گا۔ یہ بھی خیال رہے کہ ہدیہ میں ثواب کی نیت نہیں ہوتی لیکن ثواب از خود حاصل ضرور ہوتا ہے کیونکہ فقیر کو مال صرف اس کی عزت افزائی کے لئے دیا جائے، صرف تعلقات کے قائم کرنے کی غرض سے دیا جائے تو پھر بھی اس میں فقیر کی معاونت پائی گئی جو باعث ثواب ہے۔

اگر غنی کو ہدیہ دیں، ثواب کی نیت نہیں لیکن ثواب اس لئے خود حاصل ہوگا کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی " تهادوا تحابوا " (او كما قال صلى الله عليه وسلم) (ایک دوسرے کو ہدیہ دو جو باہمی محبت کا ذریعہ) پر عمل ہوگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی پر عمل یقیناً باعث ثواب ہے۔

رشوة: "الرشوة بتثليت الراء ما يعطيه الشخص الحاكم وغيره ليحكم له او يحمله علي ما يريد"

جب کوئی شخص حاکم وغیرہ کو مال دے تا کہ یہ میرے حق میں فیصلہ کریں یا میرے ارادہ کے مطابق میری امداد کرنے پر یہ مال ان کے دل میں نرم گوشہ پیدا کردے اسے رشوۃ کہا جاتا ہے۔

رشوت کی چار قسمیں ہیں:

نمبر ۱: "ما هو حرام علي الآخذ والمعطي وهو الرشوة علي تقليد القضاء والامارة"

یعنی ان میں سے پہلی قسم یہ ہے جو لینے والے اور دینے والے کے لئے حرام ہے یہ وہ رشوت ہے جس سے کوئی منصب حاصل کیا مثلاً جج بنا تو رشوت دے کر، حاکم بنا تو رشوت دے کر، اسی طرح حقدار نہ ہونے کے باوجود بغیر میرٹ کے دوسروں کی حق تلفی کر کے کوئی منصب حاصل کرے رشوت دے کر یہ حرام ہے اور اس کی حرمت لینے اور دینے والے کے لئے ایک طرح ہی ہے۔

نمبر ۲: "ارتشاء القاضي ليحكم وهو كذالك ولو القضاء بحق لانه واجب عليه"

جج اس لئے پیسے لے کر یہ رقم مجھے دو تو میں فیصلہ دوں گا ورنہ میں اس میں تاخیر کرتا رہوں گا، قاضی کا یہ رقم لینا اور مقدمہ والے شخصوں کا مال دینا دونوں کے لئے حرام ہے کیونکہ قاضی (جج) پر مقدمہ کا فیصلہ کرنا شرعاً واجب ہے اگر ایک رقم دے کر فیصلہ کرائے تو قاضی کو ہمیشہ کے لئے حرام خور بنا دیا گیا یہی وجہ ہے کہ قاضی کا حرام خور ہونا اور قاضی کو حرام خور بنانا دونوں ناجائز ہیں۔

نمبر۳: بادشاہ سے مال لینا تا کہ بادشاہ کے پاس میرا مرتبہ بلند ہو اور بادشاہ کی طرف سے مجھے کوئی نقصان نہ ہو یہ مال لینا حرام ہے۔

"الثالث اخذ المال ليسوي امره عند السلطان دفعا للضرر او جلبا للنفع وهو حرام علي الاخذ فقط"

لیکن یہ بھی خیال رہے کہ بادشاہ کو کسی کو مال دینا اس وقت حرام نہیں ہوگا جب وہ اپنا حلال طریقہ سے کمایا ہوا مال دے حرام طریقہ سے کسب کیا ہوا مال بادشاہ کا دینا بھی حرام ہوگا۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ قومی خزانہ ایسے بکاؤ لوگوں پر لٹانا بھی حرام ہے۔

کئی مولویوں اور پیروں کی شکل والے لیٹروں کو دیکھتا ہوں کہ ہر حکومت کی تعریف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔حق و باطل میں وہ فرق کر ہی نہیں سکتے ورنہ ان کو دیا جانے والا ان کا مال بند ہو جائے گا۔ایسے لوگوں کی داڑھیوں کو نہ دیکھیں، ان کے میک اپ کو نہ دیکھیں، ان کے جبہ ودستار کو نہ دیکھیں، ان کی شیروانی وقراقلی ٹوپی کو نہ دیکھیں، عورتوں کی طرح نکالے ہوئے ان کے گھونگٹ کو نہ دیکھیں، اخبارات میں ان کی تصاویر کو نہ دیکھیں اخبارات میں ان کے بیانات کو نہ دیکھیں صرف یہ دیکھیں کہ یہ ہر حکومت کی تعریف کرنے والے، ہر ظالم وفاسق کو ولی اور شریعت کا پاسبان کہنے والے اپنے ہی ملک کو فتح کرنے والے بزدل کو بہادر کہنے والے ہیں۔ہاں یہ بھی بنی اسرائیل کی طرح رب تعالیٰ کی آیات کے بدلے دنیا کا حقیر مال بٹور کر ملک وملت اور دین کے دشمن ہیں۔

نمبر ۴: " الرابع ما يدفع لدفع الخوف من المدفوع اليه على نفسه او ماله حلال للدافع حرام على الآخذ لان دفع الضرر عن المسلم واجب ولا يجوز ليفعل الواجب "

رشوت کی چوتھی قسم یہ ہے کہ کسی شخص کو ڈرایا دھمکایا جائے اسے قتل کرنے، قید کرنے وغیرہ کی دھمکیاں دی جائیں، اس کا مال چھین لینے کے اسے دھمکیاں دی جائیں۔جب کہ وہ مجرم بھی نہیں، تو وہ مال دے کر اپنی جان بچاتا ہے اور اپنا مال بچاتا ہے تو اس صورت میں مال دینا تو جائز ہے وہ شخص تو گنہگار نہیں ہوگا، لیکن لینے والا حرام مال لے رہا ہے اس لئے کہ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اپنے دوسرے مسلمان بھائی کو جانی اور مالی نقصان نہ پہنچائے۔

خصوصاً ارباب اختیار اور حکام کی ذمہ داری ہی یہی ہے۔اگر وہ لوگ جو محافظ ہیں ظالم بن کر لوگوں سے مال ان ناجائز ہتھکنڈوں سے حاصل کریں تو یقیناً وہ حرام کا ارتکاب کر رہے ہیں۔
(از شامی ج ۴ ص ۳۳۷)

قاضی کے لئے ہدیہ قبول کرنے کا حکم:

قاضی کو جو شخص ہدیہ دے رہا ہے اسے دیکھا جائے کہ اس کا مقدمہ قاضی کے پاس ہے یا نہیں اگر اس کا مقدمہ قاضی کے پاس ہے یعنی وہ اپنے جھگڑے کا فیصلہ اسی شخص سے کرانا چاہتا ہے جسے ہدیہ دے رہا ہے تو قاضی کا یہ ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں۔یہ حکم عام ہے خواہ ہدیہ دینے والا اس کا قریبی رشتہ دار

ہو یا وہ قاضی کو پہلے بھی ہدیہ دیتا رہتا ہو۔ کیونکہ اب اس کا مقدمہ قاضی کے پاس ہے لہٰذا قاضی اگر اس سے ہدیہ قبول کرے گا تو اس کے لئے اس میں تہمت پائی جائے گی۔

اگر اس شخص کا مقدمہ قاضی کے پاس نہیں لیکن وہ قاضی کا قریبی ذی رحم رشتہ دار بھی نہیں اور اس کی قاضی کو قاضی بننے سے پہلے ہدیہ دینے کی عادت بھی جاری نہیں تو اس شخص سے بھی قاضی کا ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں کیونکہ ہوسکتا ہے وہ قاضی سے حمایت حاصل کرنا چاہتا ہو۔

ہاں اگر ایک شخص کا مقدمہ قاضی کے پاس نہیں اور وہ قاضی کا ذی رحم رشتہ دار ہے تو اس سے ہدیہ قبول کرنا جائز ہے کیونکہ ہدیہ قبول کرنے میں صلہ رحمی ہے اور ہدیہ نہ قبول کرنے میں قطع رحمی ہے اور قطع رحمی ناجائز ہے۔ اسی طرح ایک شخص کا مقدمہ قاضی کے پاس نہیں، لیکن وہ قاضی سے تعلقات رکھتا ہے، قاضی کو قاضی بننے سے پہلے بھی وہ ہدیہ دیتا رہتا تھا، اس شخص سے قاضی کا ہدیہ قبول کرنا جائز ہے کیونکہ یہ پرانی عادت کے مطابق ہے، یہ ہدیہ قاضی کو اس کے منصب قضاء کی وجہ سے نہیں دیا گیا۔

اصل میں بخاری و مسلم کی روایت ہے جو ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں:

" استعمل النبی صلی اللہ علیہ وسلم رجلا من الازد یقال لہ ابن اللتبیۃ علی الصدقۃ فلما قدم قال ھذا لکم وھذا لی قال علیہ الصلوۃ والسلام ھلا جلس فی بیت ابیہ اوبیت امہ فینظر ا یھدی لہ ام لا "

نبی کریم ﷺ نے ازد قبیلہ کے ایک شخص کو عامل بنا کر بھیجا، اس شخص کو ابن اللتبیہ کہا جاتا تھا۔ جب وہ صدقات کا مال لائے تو کہنے لگے یہ مال تمہارا ہے اور یہ میرا ہے (مجھے ہدیہ دیا گیا) نبی کریم ﷺ نے فرمایا وہ شخص اپنے باپ یا اپنی ماں کے گھر کیوں نہیں بیٹھ رہا۔ پھر وہ دیکھتا کہ اسے ہدیہ دیا جاتا یا نہ دیا جاتا۔

فرمان عمر بن عبدالعزیز:

" قال عمر بن عبد العزیز کانت الھدیۃ علی عھد رسول اللہ ﷺ ھدیۃ والیوم رشوۃ "

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ھدیہ واقعی ھدیہ ہوتا تھا لیکن آج کے دور میں ہدیہ رشوت کے درجہ میں آ گیا۔

یعنی نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں ہدیہ دینے والا اس ہدیہ کی وجہ سے کوئی غلط فیصلہ کرانے کا تصور بھی نہیں کرتا تھا لیکن آج لوگ قاضیوں کو ہدیہ دے کر غلط فیصلے کرانا چاہتے ہیں۔

(ماخوذ از هدایه ، عنایه ، فتح القدیر ۳۷۱ ، کتاب القاضی ج ۲)

قاضی کا دعوت کو قبول کرنا:

" ولا یحضر دعوة الا اذا کانت عامة ولا خصومة لصاحب الولیمة العامة ویدخل فی هذا الجواب قریبه فلا یجیب دعوته الا اذا کانت عامة ولا خصومة له " (فتح القدیر ج ۶ ص ۳۷۲)

قاضی عام دعوت ولیمہ میں جا سکتا ہے وہ بھی اس وقت جب دعوت ولیمہ کرنے والا کا مقدمہ قاضی کے پاس نہ ہو۔ دعوت عامہ کا یہ مطلب ہے کہ قاضی کے جانے یا نہ جانے میں اس دعوت میں کوئی فرق نہ پڑے اور قاضی کے کہنے پر وہ تاریخ مقرر نہ کی گئی ہو۔

قاضی اپنے رشتہ داروں کی دعوت ولیمہ میں اسی وقت شریک ہوسکتا ہے جب ان کا مقدمہ قاضی کے پاس نہ ہو۔ اگر ان کا مقدمہ قاضی کے پاس ہوتو پھر اپنے رشتہ داروں کی دعوت ولیمہ میں بھی اسے شریک ہونا جائز نہیں۔

حرام کاموں کی اجرت لینا بھی حرام ہے:

" ولا تصح الاجارة لاجل المعاصی مثل الغناء والنوح والملاهی "

(در مختار باب الاجارة)

گناہوں کے کاموں پر اجرت لینا ناجائز ہے جیسا کہ گانا گانے کی اجرت لینا اور میت پر نوحہ کرنے کی اجرت لینا، اسی طرح ڈھول باجا وغیرہ پر اجرت لینا ناجائز ہے۔ ہاں البتہ نکاح کا اعلان کرنے کے لئے دف بجانا، یا جہاد کا اعلان کرنے کے لئے دف بجانا بھی جائز ہے، اور اس پر اجرت لینا بھی جائز ہے۔

دم اور تعویذ اور ان پر ھدیہ لینے کا حکم:

اصل بات یہ ہے کہ مسئلہ کو جب واضح طور پر بیان کردیا جائے کہ کون سی صورتیں ناجائز ہیں اور کون سی جائز ہیں تو مسئلہ میں نہ کوئی اختلاف رہے گا اور نہ کوئی جھگڑا، جب مسئلہ کی ایک صورت کو بیان

کر دیا جائے اور دوسری کو چھوڑ دیا تو یقیناً وہ جھگڑے کا سبب بنے گا۔

آیئے اس پر احادیث کو دیکھئے دونوں رخ واضح ہو جائیں گے کہ کون سے تعویذات یا دم ناجائز ہیں اور کون سے جائز ہیں۔

☆ "عن زینب امرأة عبد الله بن مسعود ان عبد الله رأى فى عنقى خيطا فقال ما هذا فقلت خيط رقى لى فيه قالت فاخذه فقطعه ثم قال انتم آل عبد الله لاغنياء عن الشرک سمعت رسول الله ﷺ يقول ان الرقى والتمائم والتولة شرک فقلت لم تقول هكذا لقد كانت عينى تقذف و كنت اختلف الى فلان اليهودى فاذا رقاها سكنت فقال عبد الله انما ذلک عمل الشيطان كان ينخسها بيده فاذا رقى كف عنها انما كان يكفيک ان تقولى كما كان رسول الله ﷺ يقول اذهب البأس رب الناس واشف انت الشافى لا شفاء الا شفاؤک شفاء لا يغادر سقما رواه ابو داؤد" (مشکوۃ کتاب الطب والرقی)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زوجہ زینب کہتی ہیں کہ بیشک (ان کے خاوند) عبداللہ نے میری گردن میں ایک دھاگہ دیکھا جس میں منتر پڑھا گیا تھا۔ وہ کہتی ہیں انہوں نے اسے پکڑ کر کاٹ دیا، پھر کہا تم کو اے آل عبداللہ شرک سے دور رہنا ضروری ہے۔ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا بیشک منتر، تعویذات اور جادو شرک ہیں (ان کی زوجہ کہتی ہیں) میں نے کہا یہ تم کیسے کہہ رہے ہو حالانکہ مجھے ایک مرتبہ نظر لگی ہوئی تھی تو میں نے ایک یہودی سے منتر پڑھوایا تو ٹھیک ہو گئی۔ انہوں نے کہا یہ شیطان کا عمل ہے وہی اپنا ہاتھ وہاں لگاتا ہے جب وہ منتر پڑھتا ہے تو وہ تکلیف رک جاتی ہے۔ (ہاں اگر تم دم کرنا ہی چاہتی ہو) تو تمہارے لئے وہ الفاظ کافی ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے (دم کرتے ہوئے) کہے (وہ الفاظ یہ ہیں):

"اذهب البأس رب الناس واشف انت الشافى لا شفاء الا شفاؤک شفاء لا يغادر سقما"

وضاحت حدیث:

یہ ایک حدیث ہی مکمل سمجھ آ جائے تو سارا مسئلہ نکھر کر سامنے آ جائے گا۔ "انتم آل عبد الله" لفظ آل پر نصب ہے، حرف نداء محذوف ہے اصل میں "یا آل عبد الله" ہے "لاغنياء" میں لام تاکید کے لئے ہے اب معنی واضح سمجھ آ گیا کہ اے آلِ عبداللہ تم شرک سے دور رہو۔

حدیث پاک سے بہت عظیم فائدہ یہ حاصل ہوا کہ صحابی رسول اللہ ﷺ نے اپنی زوجہ کو اپنی اہل میں شامل کیا تو پتہ چلا کہ زوجہ اہل میں داخل ہے۔ ازواج مطہرات کو اہل میں داخل نہ کرنا اور آیہ تطہیر سے خارج کرنا بہت بڑی بے انصافی ہے۔

" (ان الرقی) ای رقیة فیها اسم صنم او شیطان او کلمة کفر او غیرها مما لا یجوز شرعا ومنها ما لم یعرف معناها "

وہ کون سا دم اور کون سا منتر شرک ہے وہ یہ ہے کہ جس میں بتوں کا نام ہو اور شیطان کا نام ہو، اور کفریہ کلمات ہوں، یا ان کے علاوہ ایسے الفاظ ہوں جو شرعا جائز نہیں، یا ان الفاظ کے معانی کا ہی پتہ نہ ہو کہ یہ شریعت میں جائز ہیں یا نہیں۔

" التمائم جمع تمیمة وهی التعویذة التی تعلق علی الصبی لا یکون فیها اسماء اللہ تعالیٰ وآیاته المتلوة والدعوات الماثورة "

تعویذات سے مراد وہ تعویذ ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے اسماء گرامی نہ ہوں قرآن پاک کی آیات نہ ہوں، احادیث مبارکہ میں پائی جانے والی دعائیں نہ ہو۔ ایسے تعویذ بچے کے گلے میں لٹکانا شرک کا ذریعہ ہیں۔

" وقیل هی خزرات کانت للعرب تعلق علی الصبی لدفع العین بزعمهم "

اسی طرح عرب لوگ زمانہ جاہلیت میں نظر بد سے بچنے کے لئے گلے میں منکے ڈالتے تھے اور ان کو مؤثر حقیقی مانتے تھے۔ ان کو شرک کا ذریعہ قرار دیا گیا۔ (والتولة) تاء پر ضمہ بھی ہے اور کسرہ بھی اور واؤ پر فتحہ ہے یہ جادو کی ایک قسم ہے جس کو شرک کا ذریعہ قرار دیا گیا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہودی کے دم کرنے کو شیطان کا عمل قرار دیا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ اس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا ہوسکتا ہے وہ ایسے الفاظ استعمال کرے جو ہماری شریعت میں جائز نہ ہوں۔ لیکن انہوں نے وہ دم پڑھنے کی اجازت فرمائی جو نبی کریم ﷺ پڑھا کرتے تھے۔

اس لئے واضح ہوا کہ آیات قرآنیہ اور ادعیہ ماثورہ سے دم کرنا یا ان کو لکھ کر گلے میں ڈال لینا جائز ہے۔ البتہ عقیدہ یہی رکھے کہ اس میں تاثیر اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے مؤثر حقیقی وہی ہے۔

(از مرقاۃ ج۸ ص ۳۵۹)

☆ عن جابر قال سئل النبی ﷺ عن النشرة فقال هو من عمل الشیطان رواه ابوداؤد . (مشکوة کتاب الطب والرقی)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ سے نشرہ کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا یہ شیطانی عمل ہی۔ نشرہ (بضم النون وسکون الشین المعجمة) زمانہ جاہلیت میں کوئی منتر پڑھا جاتا تھا خیال یہ کیا جاتا تھا کہ اس سے شیطان وجن منتشر ہو جاتے ہیں۔

اس سے تو نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا " ثم نشره بقل اعوذ برب الناس " لیکن اس کے بعد سورۃ الناس کے ذریعے جنوں کو دور کرنے کی اجازت عطاء فرمائی۔

" (فقال) ای النبی صلی الله علیه وسلم (هو من عمل الشیطان) النوع الذی کان اهل الجاهلیة یعالجون به ویعتقدون فیه واما ما کان من الآیات القرآنیة والاسماء والصفات الربانیة والدعوات الماثورة النبویة فلا بأس بل یستحب سواء کان تعویذا اور رقیة او نشرة "

نبی کریم ﷺ نے جس منتر اور جھاڑن سے منع فرمایا وہ زمانہ جاہلیت والا تھا جادو کی ایک قسم تھی، جس کو وہ کامل مؤثر سمجھتے تھے۔ لیکن قرآنی آیات اور اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات اور احادیث میں مذکور دعاؤں سے علاج کرنا جائز ہے بلکہ مستحب ہے خواہ ان سے دم کریں یا ان کو لکھ کر گلے میں ڈال لیں یا ان کے ذریعے آسیب زدہ کا علاج کریں۔ (از مرقاۃ ج ۸ ص ۳۶۰)

☆ " عن عائشة قالت امر النبی ﷺ ان یسترقی من العین ...... بخاری ومسلم " (مشکوة کتاب الطب والرقی)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ ہمیں نظر کا دم کرانے کے متعلق حکم فرماتے تھے۔ نظر کے دم سے مراد وہ ہے جو بخاری اور مسلم اور ابوداؤد اور نسائی اور ابن ماجہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔

" انه صلی الله علیه وسلم کان یقرأ علی نفسه بالمعو ذات وینفث "

نبی کریم ﷺ معوذات کو پڑھ کر اپنے آپ پر پھونکتے یعنی اپنے آپ کو دم کرتے تھے۔ اپنے آپ پر کیسے پھونکتے تھے " ینفث علی یدیه ثم یمسح بهما وجهه وجسده " آپ پڑھ کر

اپنے ہاتھوں پر پھونکتے پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے چہرے اور جسم پر پھیرتے۔

معوذات سے مراد یا تو صرف سورۃ الفلق اور الناس ہے دو کیلئے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے ہوسکتا ہے آپ سورۃ اخلاص بھی ساتھ پڑھتے ہوں البتہ تغلیب کے طور پر ذکر معوذات کا کر دیا گیا ہو۔

" ویمکن ان یضم معها قل یا ایها الکافرون علی ما هو المتعارف فی بعض البلاد قراءة و کتابة وتعلیقا وشربا "

اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ ان کے ساتھ قل یا ایها الکفرون سورۃ بھی ملا لیتے ہوں جیسا کہ ہمارے شہروں میں متعارف ہے کہ اس سورۃ کو بھی پڑھ کر دم کیا جاتا ہے اس کو لکھ کر گلے میں تعویذ ڈال کر اس سے نفع حاصل کیا جاتا ہے اور اسے لکھ کر پانی میں گھول کر پیا جاتا ہے یعنی چار قل پڑھ کر دم کیا جاتا ہے۔ (از مرقاۃ ج ۸ ص ۳۴۹)

☆ عن عوف بن مالک الاشجعی قال کنا نرقی فی الجاهلیة فقلنا یا رسول الله کیف تری فی ذلک فقال اعرضوا علی رقاکم لا بأس بالرقی ما لم یکن فیه شرک ...... روہ مسلم" (مشکوۃ کتاب الطب والرقی)

حضرت عوف بن مالک اشجعی کہتے ہیں ہم زمانہ جاہلیت میں دم کرتے تھے ہم نے کہا یا رسول اللہ آپ اس میں کیسے دیکھتے ہیں آپ نے فرمایا اپنے دم مجھ پر پیش کرو (یعنی مجھے پڑھ کر سناؤ) وہ دم کرنے جائز ہیں جن میں شرک کے الفاظ نہیں۔

اب اس سے بہت واضح ہوا کہ صرف وہ دم اور تعویذات منع ہوں گے جن میں کلمات شرکیہ اور کفریہ پائے جائیں گے لہذا اس مسئلہ میں فیصلہ کن بات یہی ہے کہ قرآن پاک کی آیات احادیث مبارکہ میں پائی جانے والی دعائیں۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء صفات نبی کریم ﷺ کے اسماء گرامی غرضیکہ ہر وہ الفاظ جن کے معانی معلوم ہوں اور ان میں شرک وکفر نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کی حمد اور نبی کریم ﷺ کی تعریف پائی گئی ہو وہ جائز ہے۔ مرقاۃ کے حوالہ سے جو عبارات ذکر کی ہیں ان کے قریب ہی نووی علی المسلم جلد ثانی ص ۲۲۷ میں بھی دیکھیں۔

☆ عن ابی سعید الخدری ان ناسا من اصحاب رسول الله ﷺ کانوا فی سفر فمروا بحی من احیاء العرب فاستضافوهم فلم یضیفوهم فقالوا لهم هل فیکم راق فان سید الحی لدیغ او مصاب فقال رجل منهم نعم فاتاه فرقاة بفاتحة الکتاب فبرأ الرجل فاعطی قطیعا

من غنم فابی ان یقبلها وقال حتی اذکر ذلک للنبی ﷺ فاتی النبی ﷺ فذکر ذلک له فقال یا رسول الله والله ما رقیت الا بفاتحة الکتاب فتبسم وقال وما ادراک ثم قال خذوا منهم واضربوالی بسهم معکم ۔

(مسلم جلد ثانی باب جواز اخذ الاجرة علی الرقیة بالقرآن والاذکار)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ میں سے کچھ لوگ سفر میں تھے۔عرب کے قبائل میں سے ایک قبیلہ پران کا گزرہوا۔ان سے انہوں نے مہمانی طلب کی (یعنی کھانا طلب کیا) انہوں نے ان کی مہمانی نہ کی پھر وہ صحابہ کو کہنے لگے کیا تم میں سے کوئی دم کرنے والا بھی ہے؟ بیشک ہمارے قبیلہ کے سردار کو (سانپ نے) ڈس لیا ہے۔صحابہ کرام میں سے ایک شخص نے کہاہاں (یعنی ہم میں دم کرنے والا موجود ہے) وہ شخص آیا اس نے اس ڈسے ہوئے شخص پر سورۃ فاتحہ کی تلاوت کی وہ ٹھیک ہوگیا۔اس شخص نے بھیڑ بکریوں کا ریوڑ دم کرنے والے کو دیا۔لیکن اس نے قبول کرنے سے انکار کردیا اور کہا کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کروں گا۔(اگر آپ نے اجازت دی تو قبول کرلوں گا)۔

وہ صحابی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اپنے اس واقعہ کا ذکر کیا تو یہ بھی عرض کیا کہ یارسول اللہ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں نے اور کوئی دم تو نہیں پڑھا صرف سورۃ فاتحہ ہی پڑھی رسول اللہ ﷺ مسکرائے اور آپ نے فرمایا کہ تمہیں معلوم نہیں کہ یہ بھی دم ہے۔پھر آپ نے فرمایا ان لوگوں سے بکریاں لے لو اور اپنے ساتھ میرا حصہ بھی مقرر کرلینا۔

وضاحت حدیث:

مسلم کی اس حدیث میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے دم کرنے والے شخص کا ذکر صیغہ غائب سے ذکر فرمایا لیکن وہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہی تھے " هذا الراقی هو ابو سعید الخدری الراوی کذا جاء مبینا فی روایة اخری غیر مسلم " مسلم کے بغیر دوسری ایک روایت میں واضح طور پر ذکر ہے کہ وہ دم کرنے والے حضرت ابوسعید خدری تھے جو حدیث کے راوی ہیں۔" فاعطی قطیعا من الغنم " قطیع کا معنی ریوڑ، گلہ دس سے لے کر

چالیس تک جس میں تعداد ہو اسے بھی قطیع کہا جاتا ہے اور پندرہ سے پچیس تک جس میں تعداد ہو وہ بھی قطیع ہے۔

" والمراد بالقطیع المذکور فی هذا الحدیث ثلاثون شاة كذا جاء مبینا "

حدیث شریف میں جس قطیع کا ذکر ہے اس سے مراد تیس بکریاں ہیں کیونکہ دوسری حدیث میں واضح طور پر تیس بکریوں کا ذکر پایا گیا ہے۔

" (ما ادراک انها رقیة) فیه التصریح بانها رقیة فیستحب ان یقرأ بها علی اللدیغ والمریض وسائر اصحابه الاسقام والعاهات "

" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کیا تمہیں معلوم نہیں یہ دم ہے اس سے واضح ہو گیا کہ سورۃ فاتحہ دم ہے ڈسے ہوئے شخص پر اور مریض پر، اور ہر قسم کی بیماری والے پر، اور ہر قسم کے مصیبت زدہ پر سورۃ فاتحہ پڑھنا مستحب ہے "۔

ہاں البتہ یہ خیال کیا جائے کہ پڑھنے والا جتنا زیادہ نیک ہوگا، جتنا زیادہ کسی ولی اللہ کا مقرب ہوگا جسے کسی نیک شخص نے پڑھنے کی اجازت دے رکھی ہوگی یقیناً زیادہ اثر ہوگا۔

" (قوله صلی الله علیه وسلم خذوا منهم واضربوا لی بسهم معکم) هذا تصریح بجواز اخذ الاجرة علی الرقیة بالفاتحة والذکر وانها حلال لاکراهیة فیها وکذا الاجرة علی تعلیم القرآن "

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ وہ بکریاں ان سے لے لو اور اپنے ساتھ ان میں میرا حصہ بھی مقرر کر دینا اس پر دلالت کر رہا ہے کہ سورۃ فاتحہ پڑھ کر دم کیا جائے یا کوئی اور ذکر ہو جس کے ذریعے دم کیا جائے اس پر ہدیہ لینا جائز ہے اور اسی طرح قرآن پاک کی تعلیم پر ہدیہ لینا بھی جائز ہے۔

اور خاص کر کے اگر یہ خیال کریں کہ محدث رحمہ اللہ نے اس مسئلہ کا عنوان کیا مقرر کیا ہے تو مسئلہ ہی واضح ہو جاتا ہے کیونکہ عنوان کا نام ہی یہ ہے " قرآن پاک اور دوسرے اذکار کے ذریعے دم پر اجرت (ہدیہ) لینے کے بیان میں۔

" (قوله صلی الله علیه وسلم واضربوا لی بسهم معکم) فانما قاله تطییبا لقلوبهم ومبالغة فی تعریفهم انه حلال لا شبهة فیه "

نبی کریم ﷺ کا یہ فرمانا کہ اپنے ساتھ میرا حصہ بھی مقرر کرلینا اس کا مطلب یہ تھا کہ اس سے صحابہ کرام کے دلوں کو خوش کرنا مقصود تھا کیونکہ وہ نبی کریم ﷺ کو ہدیہ دے کر خوشی محسوس کرتے تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ان کو کامل طرح پہچان کرانی مقصود تھی کہ یہ حلال ہے اس کے حلال ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ۔ سبحان اللہ جس چیز کو نبی کریم ﷺ نے بغیر شک وشبہ کے حلال قرار دیا ہو اس کے حلال میں کوئی شک کرے یا حرام ہونے کا فتوی لگاتا پھرے تو وہ اپنی جہالت پر روئے ۔

ایک یہ بھی خیال رہے کہ اصل میں اس ہدیہ کے مالک تو صرف حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ تھے لیکن ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے وہ بکریاں تمام ساتھیوں میں تقسیم کرنے کا حکم دیا جو اس قافلہ میں شریک تھے اور اپنا حصہ بھی مقرر کرنے کا حکم دیا اس کی وجہ صرف یہ تھی:

" فهذه القسمة من باب المروات والتبرعات ومواسات الاصحاب والرفاق "

تا کہ ان کے درمیان بھائی چارہ قائم ہو ایک دوسرے پر مہربانی کرنے کا طریقہ آئے اپنی خوشی سے ایک دوسرے پر مہربانی کریں۔ (ماخوذ از نووی)

قرآن خوانی اور ہدیہ:

اس مسئلہ میں بھی نزاع صرف اسی وجہ سے پایا جاتا ہے کہ ہر فریق ایک شق کو ذکر کرتا ہے دوسری کو چھوڑ دیتا ہے اگر مسئلہ واضح طور پر بیان کیا جائے تو کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔ اس لئے کہ اگر اجرت مقرر کر کے قرآن خوانی کرائی جائے کہ ایک پارہ پڑھنے کی اتنی رقم دی جائے گی تو یہ ناجائز ہے اور ایسے طریقہ سے قرآن پڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں ۔ شامی نے اس مسئلہ کو بہت واضح بیان کیا ہے۔ لیکن قرآن پڑھنے والے اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی کے لئے پڑھیں اور پڑھانے والے میت کو ثواب پہنچانے کی غرض سے بطور صدقہ ان کو کھانا کھلائیں یا نقد ہدیہ دیں تو جائز ہے۔

بلکہ یہ بھی خیال میں رہے کہ عبادات کو مخصوص وقت اور مخصوص جگہ میں ادا کرنے کا پابند کیا جائے تو وقت کی اجرت مقرر کرنا بھی جائز ہے یہ مسئلہ پہلے واضح کر دیا گیا ہے، اگر کوئی شخص کسی طالب علم یا حافظ قرآن کو کہتا ہے تم نے اتنے دن اتنے وقت کے لئے میرے فلاں رشتہ دار کی قبر پر قرآن

پاک پڑھنا ہے تو وہ اجرت مقرر کر بھی لے تو جائز ہے۔

لیکن راقم کے خیال کے مطابق اس گئے گزرے ہوئے دور میں بھی ایسا کرتے ہوئے کسی کو دیکھا نہیں گیا۔ کچہریوں میں جا کر کوئی کاغذ لکھوا کر بھی دیکھ لیں اور علماء سے فتاوی لکھا کر بھی دیکھ لیں آپ کو خود بخود سمجھ آ جائے گا کہ بفضلہٖ تعالیٰ علماء اور عوامی لوگوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

راقم جامعہ رضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی میں آنے والے سوالات کے جوابات تحریر کرتا ہے۔ کبھی کبھی میرے چھٹی کر کے آ جانے کے بعد فتوی لکھانے والے میرے مسکن پر بھی آ جاتے ہیں۔ کئی لوگ از خود ہدیہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ کئی لوگ پوچھتے ہیں کہ کتنا ہدیہ پیش کیا جائے لیکن میں نے بفضلہٖ تعالیٰ کبھی کسی سے کوئی ہدیہ قبول نہیں کیا خواہ کوئی اپنی خوشی سے ہی دینے کی کوشش کیوں نہ کرے

سب سے بڑی وجہ اس کی یہ بھی ہوتی ہے کہ کوئی یہ نہ کہے کہ میں نے پیسے دے کر اپنی مرضی کا فتویٰ حاصل کر لیا ہے اللہ کے فضل و کرم سے کبھی کوئی مسئلہ راقم نے کسی سے مرعوب ہو کر یا مرغوب ہو کر نہیں لکھا۔ جنڈ کے علاقہ کے کسی ابو جہل کو غلط فہمی ہوئی جیسا کہ اس نے میرے ایک فتوی کے متعلق تحریر کیا ہے کہ یہ فتوی مرعوب ہو کر یا مرغوب ہو کر لکھا گیا:

" اللهم انا نعوذبک من الجاهلين المتعصبين "

☆☆☆☆☆

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ

☆ اور حق سے باطل کو نہ ملاؤ اور دیدہ دانستہ حق نہ چھپاؤ۔

☆ اور نہ ملاؤ حق سے باطل کو اور حق کو نہ چھپاؤ جان بوجھ کر۔

﴿ وَلَا تَلْبِسُوا ﴾: ''خلط ملط نہ کرو'' بعض حضرات نے فرق بیان کیا ہے کہ ''لبس'' کے لام پر جب زبر ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے خلط ملط کرنا، ملا جلا دینا اور لام پر پیش ہو تو اس کا معنی لباس پہننا، تاہم مفردات راغب میں لام کی زبر سے معنی لباس پہننا کیا گیا ہے چونکہ لباس کا مطلب ہے ڈھانپنا اور جب ایک چیز کا دوسری سے التباس لازم آئے تو وہاں بھی ستر کا معنی پایا جاتا ہے۔ گویا کہ لباس پہننا اور خلط ملط کرنا دونوں کا ایک مادہ لیا گیا ہے ''لبس'' لام کے فتحہ سے۔

﴿ الْحَقَّ ﴾: حق کا اصل معنی مطابقۃ اور موافقۃ۔

☆ پھر حکمت کے تقاضا کے مطابق کسی سبب کی وجہ سے کسی چیز کے ایجاد کرنے والے کو بھی حق کہا جاتا ہے اسی وجہ سے رب تعالیٰ کے متعلق بھی کہا گیا'' وھو الحق '' یعنی اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی بھی حق ہے۔

☆ اسی طرح سبب کے لحاظ کے بغیر حکمت کے تقاضا کے مطابق ایجاد کرنیوالے کو بھی حق کہا جاتا ہے

☆ اور کوئی چیز بذاتہ جیسی ہو اس کے مطابق اس کا اعتقاد رکھنا بھی حق کہلاتا ہے جیسا کہ کہا جائے

'' اعتقاد فلان فی البعث والثواب والعقاب والجنة والنار حق ''

فلاں کا اعتقاد قیامت اور ثواب اور عذاب اور جنت اور دوزخ کے متعلق حق ہے۔

☆ اس قول اور فعل کو بھی حق کہا جاتا ہے جو اسی طرح واقع ہو جس طرح واجب ہے اور اسی قدر کے مطابق جتنی مقدار میں واجب ہے۔ اور اسی وقت میں ہو جس میں واجب ہو۔ جیسے کہا جائے ''فعلک حق وقولک حق '' تمہارا فعل حق ہے اور تمہارا قول حق ہے۔ (از مفردات راغب)

﴿ بِالْبَاطِلِ ﴾: '' الباطل نقیض الحق وھو مالا ثبات لہ ''

باطل حق کی نقیض ہے یعنی جس چیز میں ثبات نہ پایا جائے اسے باطل کہا جاتا ہے۔

(مفردات راغب)

" والباطل هو الزائل کما فی قول لبید "

باطل زائل ہونے والی چیز کو بھی کہا جاتا ہے جیسا کہ لبید کے اس شعر میں یہی معنی ہے۔

الا کل شئی ما خلا اللہ الباطل	و کل نعیم لا محالة زائل
خبردار اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز زائل ہونے والی ہے	اور ہر نعمت عطا کرنے والے نے یقیناً زائل ہونا ہی ہے

مقام توجہ: ﴿وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾ کے دو معنی بیان کئے گئے ہیں۔ایک معنی یہ ہے

" لا تخلطوا الحق المنزل فی التوراة بالباطل الذی اخترعتموه وکتبتموه "

توراۃ میں جو حق نازل ہے اسے اس باطل سے نہ ملاؤ جو تم نے خود اختراع کیا ہے (گھڑا ہے) اور تم نے وہ خود ہی لکھا ہے

دوسرا معنی یہ ہے:"لا تجعلوا ذلک ملتبسا مشتبها غیر واضح لا یدرکه الناس بسبب الباطل وذکره"

باطل کو حق کے ساتھ ملا کر حق میں التباس اور اشتباہ نہ ثابت کرو کہ جس سے وہ واضح ہی نہ رہے اور لوگ اسے سمجھ ہی نہ سکیں۔اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے یہ دوسرا معنی ہی ذکر فرمایا"اور حق سے باطل کو نہ ملاؤ" راقم نے بھی اعلیٰ حضرت کے معنی کو ہی نقل کیا ہے اور اسی معنی کو علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے راجح قرار دیا

دو معنی جو ذکر کئے گئے ہیں علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ان کو ذکر کرنے کے بعد یہ ارشاد فرمایا:

" ولعل الاول ارجح لانه اظهر واکثر لا ، لان جعل وجود الباطل سببا لالتباس الحق لیس اولی من العکس لما انه لما کان المذموم هو التباس الحق بالباطل وان لزمه العکس وکان هذا طارئا علی ذلک استحق الاولویة التی نفیت "

شائد پہلا معنی راجح ہو کیونکہ وہ ظاہر ہے اور اکثر حضرات نے اسے استعمال کیا ہے لیکن ایسا ہے نہیں اس لئے کہ حق کو باطل سے ملایا جائے اور باطل حق میں التباس پیدا کرے یہ معنی بہتر نہیں۔بلکہ بہتر معنی یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ باطل کو حق سے ملا کر التباس واشتباہ پیدا نہ کرو کیونکہ حقیقت میں یہی فعل قابل مذمت ہے۔اگر یہ کہنا زیادہ بہتر ہوتا کہ حق کو باطل سے ملا کر حق میں التباس پیدا نہ کرو تو اسے اولی اور راجح قرار دیا جاتا لیکن میں نے اس کی

اولویت (بہتر ہونے) کی نفی کر دی ہے۔ (از روح المعانی)

حق و باطل سے مراد یہاں کیا ہے؟

اس میں مختلف اقوال ہیں:

(۱) "ولا تکتبوا فی التورة ما لیس فیها فیختلط الحق المنزل بالباطل الذی کتبتم"

توراۃ میں وہ نہ لکھو جو اس میں نہیں کیونکہ اگر تم ایسا کرو گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جو باطل تم نے اپنے ہاتھوں سے خود لکھا اسے حق سے ملا دیا گیا اور حق کو باطل سے خلط ملط کر دیا گیا۔

(۲) ولا تخلطوا الحق الذی انزل علیکم من صفة محمد صلی اللہ علیہ وسلم فی التوراة بالباطل الذی تکتبونه بایدیکم من تغییر صفته"

اور وہ حق جو توراۃ میں اللہ تعالیٰ نے نازل کیا یعنی محمد مصطفیٰ ﷺ کی صفات کو ذکر کیا اس کے ساتھ اس باطل کو نہ ملاؤ جو تم اپنے ہاتھوں سے لکھ کر نبی کریم ﷺ کی صفات کو بدل رہے ہو

(۳) ولا تخلطوا صفة محمد ﷺ هی الحق بالباطل ای بصفة الدجال وذلک انه لما بعث رسول اللہ ﷺ حسده الیهود وقالوا لیس هو الذی تنتظره وانما هو المسیح بن داؤد یعنی الدجال وکذبوا فیما قالوا"

نبی کریم ﷺ کی صفات حق ہیں ان کے ساتھ باطل کو نہ ملاؤ جو تم (معاذ اللہ) ان میں دجال کی صفات کو بیان کرتے ہو اس کی وجہ یہ تھی کہ جب نبی کریم ﷺ مبعوث ہوئے تو یہود آپ سے حسد کرنے لگے اور انہوں نے کہا کہ یہ وہ نبی نہیں جن کی تم انتظار کر رہے تھے، یہ تو داؤد علیہ السلام کی اولاد سے آنے والا شخص مسیح دجال ہے (معاذ اللہ) یہ ان کا قول سراسر جھوٹ پر مبنی تھا۔ (خازن)

(۴) ولا تلبسوا الیهودیة والنصرانیة بالاسلام وانتم تعلمون ان دین اللہ الاسلام وان الیهودیة والنصرانیة بدعة لیست من اللہ"

اسلام کے ساتھ یہودیت اور نصرانیت کو نہ ملاؤ۔ اس لئے کہ تمہیں معلوم ہے کہ اسلام حق ہے اور یہودیت و نصرانیت جو تمہاری ایجاد کردہ ہیں وہ باطل ہیں۔ (ابن کثیر)

تمام معانی کا جامع معنی: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے:

" لا تخلطوا ما عندکم من الحق فی الکتاب بالباطل " (قرطبی)

تمہارے پاس کتاب میں جو بھی مذکور ہے وہ حق ہے اس کے ساتھ باطل کو نہ ملاؤ۔

البتہ یہ خیال رہے کہ وہ زیادہ نبی کریم ﷺ کے اوصاف وکمالات کو ہی چھپاتے تھے تاکہ لوگ آپ پر ایمان نہ لے آئیں، کیونکہ وہ نبی کریم ﷺ سے حسد کرتے تھے وہ چاہتے یہ تھے کہ آپ کو ماننے والے کم ہوں لیکن ایمان والوں کی تعداد بڑھتی رہی آج بھی یہودی اور نصرانی علماء کو ختم کرنے کے درپے ہیں لیکن انشاءاللہ وہ ذلیل ہوتے رہیں گے، علماء کی تعداد بڑھتی رہے گی۔

﴿ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ ﴾: ''اور نہ چھپاؤ حق کو'' ''تکتموا'' کا عطف ہے ''تلبسوا'' پر اسلئے ''لا'' اس کے ساتھ بھی ملے گا، کیونکہ معطوف علیہ سے پہلے جو عبارت ہوتی ہے وہ معطوف سے پہلے بھی ہوتی ہے۔ اسلئے اب عبارت یہ ہوگی ﴿ولا تكتموا الحق﴾ اور حق کو نہ چھپاؤ۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ '' تکتموا '' منصوب ہو اور '' ان '' اس میں مقدر ہو۔ اب اس کا معنی یہاں ہوگا:

'' لا يكن منكم لبس الحق و كتمانه ''

تم سے حق چھپانے اور اس کے ساتھ باطل کو خلط ملط کرنے کا طریقہ واقع نہیں ہونا چاہیے۔ (قرطبی)

﴿ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾: یہ جملہ حالیہ ہے اور '' تعلمون '' کا مفعول محذوف ہے تاکہ اختصار ہو سکے یعنی اب معنوی لحاظ پر عبارت کا مطلب یہ ہو گیا:

'' وانتم من ذوى العلم ولا يناسب من كان عالما ان يتصف بالحال الذى انتم عليه ''

اور تم علم والے ہو، جو شخص عالم ہو اس کے مناسب نہیں کہ وہ اس حال سے متصف ہو جس سے تم ہو۔

یا معنوی طور پر اصل عبارت اس طرح ہو جائے '' وانتم تعلمون انكم لا بسون كاتمون '' حالانکہ تم اپنے متعلق جانتے بھی ہو کہ تم حق چھپانے والے ہو اور حق کے ساتھ باطل کو ملانے والے ہو۔ یا مقصد یہ ہو '' وانتم تعلمون صفة محمد ﷺ او البعث والجزاء '' حالانکہ تم نبی کریم ﷺ کی صفات کو جانتے ہو قیامت کے آنے کو جانتے ہو، جزاء دیئے جانے کا تمہیں پتہ ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ '' وانتم تعلمون '' جملہ حالیہ ہے جس کا معنی ہے'' حالانکہ تم جانتے ہو'' لیکن اس

کے ساتھ جب تک محذوف الفاظ نہ ملائے جائیں اس وقت تک معنی مکمل نہیں ہوسکتا تھا۔ (از روح المعانی)
لمبی عبارات کا مفہوم پھر خصوصا محذوف عبارتیں مختلف قسم کی تھیں ان کے معانی بہت مختصر عبارت میں اعلیٰ حضرت نے شامل کر لئے ہیں، راقم نے بھی وہی معنی ذکر کیا صرف الفاظ مختلف ہیں۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ دیکھیں کیا خوب کیا مختصر ''وتکتموا الحق وانتم تعلمون'' اور دیدہ دانستہ حق نہ چھپاؤ۔

حاصل کلام: پہلی آیۃ کریمہ '' وآمنوا بما انزلت ''......الخ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو کفر اور گمراہی کے چھوڑنے کا حکم دیا اور اس آیۃ کریمہ میں ان کو ''لوگوں کو گمراہ کرنے اور بھٹکانے'' سے منع کیا
کسی دوسرے کو گمراہ کرنے کے دو طریقے ہیں۔ اس لئے حق کے دلائل سننے اور نہ سننے کے لحاظ پر لوگ دو قسم پر ہیں۔ اس لئے کہ بعض لوگ وہ ہوتے ہیں جنہوں نے حق کے دلائل کو سنا ہوا ہوتا ہے۔ ان کو گمراہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان دلائل کے ساتھ باطل کو ملا دو۔ ایسا ان کا حلیہ بگاڑ دو کہ جس نے وہ دلائل سنے ہوئے تھے اس کا ذہن منتشر ہو جائے وہ ان گمراہ کرنے والوں کے جال میں پھنس جائے کہ یہی سچے ہیں۔ اس قسم کے گمراہ کرنے والے گروہ کو رب تعالیٰ نے ﴿ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ ﴾ کہہ کر باطل کو حق سے ملا کر لوگوں کو گمراہ کرنے سے منع فرمایا۔
دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جنہوں نے حق کے دلائل سنے ہی نہیں ہوتے ان کو گمراہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان تک حق کے دلائل پہنچنے ہی نہ دیئے جائیں اور ان دلائل کو چھپا کر رکھا جائے۔ ایسے گمراہ کرنے والے لوگوں کو رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ اور حق نہ چھپاؤ جان بوجھ کر اب ﴿ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ کا ایک مطلب یہ بھی ہو گیا کہ تم جانتے ہو کہ مخلوق کو گمراہ کرنا بہت بڑے نقصان کا سبب ہے جو قیامت میں وہ ضرر عظیم تمہاری طرف ہی لوٹتا ہے۔ اور یہ تمہارا ''باطل کو حق سے ملانا'' مخلوق کو قیامت تک حق سے پھیرنے اور گمراہ کرنے کا ذریعہ ہے۔ اور یہ تمہارا طریقہ لوگوں کو ہمیشہ گمراہی پر قائم رکھنے کا ذریعہ ہے، لہٰذا تمہارے اس عظیم جرم کی وجہ سے تمہیں عذاب بھی عظیم ہوگا۔
(از کبیر)

تنبیہ: '' وهذا الخطاب وان وردفيهم فهو تنبيه لسائر الخلق وتحذير من مثله

فصار الخطاب وان كان خاصا فی الصورة لكنه عام فی المعنی"

اگر چہ بظاہر یہ خطاب بنی اسرائیل کو ہے لیکن اس میں تمام مخلوق کو متنبہ کیا گیا ہے اور اگر چہ یہ خطاب ظاہر کے لحاظ سے خاص ہے لیکن حقیقت کے لحاظ سے عام ہے۔ (از کبیر)

واضح ہوا کہ کوئی شخص بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف کے دلائل اور ان کو بیان کرنے والی احادیث کو ضعیف کہہ کر یا دلائل کو مخفی رکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے دور رکھنے والا ہو۔ اسے یہی خطاب ہے۔ اسی طرح صحابہ کرام، اہل بیت، اولیاء کرام کی شان میں دلائل کو رد کرنا اور دلائل کو چھپانا بھی یہی حکم رکھتا ہے۔ اگر میں یوں کہہ دوں کہ وہ بھی یہودیوں اور نصرانیوں کا لبادہ اوڑھنے والا ہے تو کہنا حق ہے بے جا نہیں۔

اعتراض: رب تعالیٰ نے تو فرمایا کہ حق نہ چھپاؤ جان بوجھ کر۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ صرف علماء کیلئے حق چھپانا جائز نہیں۔ لیکن جہلاء حق چھپالیں تو کوئی حرج نہیں یہ کس طرح صحیح ہے؟

جواب: اصل مسئلہ اس طرح ہے کہ جب کسی کو علم ہی نہ ہو کہ یہ حق ہے یا باطل ہے اور اسے یہ بھی علم نہ ہو کہ میرے اس قول سے باطل کا حق سے ملانا لازم آ رہا ہے تو اسے توقف کرنا چاہئے بغیر علم کے نفی یا اثبات کا کوئی حکم لگانا اس کے لئے ناجائز ہے۔

ہاں البتہ آیۃ کریمہ میں علم سے مقید کرنا یعنی یہ فرمانا کہ "علم رکھنے کے باوجود حق نہ چھپاؤ" اس سے یہ واضح ہوا کہ علماء کے لئے حق چھپانا بہت ہی برا ہے اگر چہ جہلاء کے لئے بھی بے علم بات کرنا، حق کو نہ جاننے کے باوجود حق بنا کر پیش کرنا برا ہے۔ لیکن بنسبت علماء کے اس میں کم غلطی ہے۔ (از کبیر)

فائدہ: "والآية دالة على ان العالم بالحق يجب عليه اظهاره ويحرم عليه كتمانه والله اعلم"

آیۃ کریمہ اس پر دلالت کر رہی ہے کہ بیشک حق کے عالم کے لئے واجب ہے کہ وہ حق کو ظاہر کرے اور اس پر حق کو چھپانا حرام ہے۔ (از کبیر)

حق کہنے کا ایک عظیم واقعہ:

دارمی نے روایت ذکر کی ہے کہ ضحاک بن موسی کہتے ہیں ایک مرتبہ (وقت کا حاکم)

سلیمان بن عبدالملک مکہ شریف میں جاتے ہوئے مدینہ طیبہ سے گزرا۔ وہاں اس نے چند دن قیام کیا۔ اس نے پوچھا کیا مدینہ طیبہ میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جس نے نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام میں سے کسی ایک کو پایا ہو؟ لوگوں نے بتایا کہ ہاں ابوحازم ہیں۔

سلیمان بن عبدالملک نے ابوحازم کی طرف پیغام بھیجا (کہ مجھے ملنے کیلئے آؤ) وہ جب آئے تو سلیمان نے انہیں کہا اے ابوحازم یہ کیا جفاء ہے؟ ابوحازم نے کہا اے امیر المؤمنین تم نے مجھ میں کیا جفاء دیکھی ہے؟ اس نے کہا مجھے مدینہ طیبہ کے سب لوگ ملنے کیلئے آئے تم نہیں آئے۔ ابوحازم نے کہا اے امیر المؤمنین میں تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتا ہوں کہ تم کوئی ایسی بات کہو جو درست نہ ہو اس سے پہلے جب تم مجھے نہیں پہچانتے تھے اور میں نے تمہیں نہیں دیکھا تھا (تو میں تمہیں کیسے ملتا؟) سلیمان نے محمد بن شہاب زہری کی طرف توجہ کی تو اس نے کہا شیخ نے درست کہا اور تم نے خطا کی ہے۔ سلیمان نے کہا اے ابوحازم کیا وجہ ہے ہم موت کو ناپسند کرتے ہیں۔ ابوحازم نے کہا:

" لانکم اخربتم الآخرۃ وعمرتم الدنیا فکرھتم ان تنتقلوا من العمران الی الخراب "

اس لئے کہ تم نے آخرت کو (اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے) برباد کر دیا اور دنیا کو آباد کر لیا ہے اب تمہیں یہ پسند نہیں کہ تم آباد جگہ سے برباد جگہ کی طرف منتقل ہو جاؤ۔

سلیمان نے کہا اے ابوحازم تم نے درست کہا ہے اور یہ بتاؤ کہ کل اللہ تعالیٰ کے پاس کیسے جانا ہوگا؟ ابوحازم نے کہا کہ نیکیاں کرنے والے تو رب تعالیٰ کے حضور اس طرح خوشی خوشی حاضر ہوں گے جس طرح کوئی شخص سفر سے اپنے گھر اہل وعیال کے پاس خوشی سے لوٹ کر آتا ہے۔ لیکن برائیاں کرنے والے رب تعالیٰ کے حضور بڑی ندامت سے حاضر ہوں گے، جیسا کہ بھاگے ہوئے غلام کو مالک کے پاس لوٹ کر آنے میں ندامت ہوتی ہے۔

ابوحازم کی یہ بات سن کر سلیمان رونے لگ گیا، کہنے لگا کاش مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ میرا مقام رب تعالیٰ کے ہاں کیسا ہے اور میری حاضری اس کے ہاں کیسے ہوگی۔ ابوحازم نے کہا اپنے اعمال کو اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن پاک پر پیش کر کے اندازہ کر لو، خود سمجھ آ جائے گا۔ سلیمان نے کہا قرآن پاک کی کن آیات سے مجھے یہ پتہ چلے گا؟

ابو حازم نے کہا ان آیات کو پڑھو:

﴿ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ، وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ ﴾

''بیشک نیک لوگ نعمتوں (جنت) میں ہوں گے اور بیشک گنہگار جہنم میں ہوں گے''

پھر سلیمان نے پوچھا اے ابو حازم اللہ تعالیٰ کی رحمت کہاں ہے نزدیک ہے یا دور؟ ابو حازم نے کہا ﴿ اِنَّ رَحْمَةَ اللهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ کی رحمت احسان کرنے (نیکی کرنے) والوں کے قریب ہے۔ سلیمان نے ابو حازم سے پوچھا اے ابو حازم '' **فای عباد الله اکرم** '' اللہ کے بندوں میں سے کون سے مکرم ہیں؟ ابو حازم نے کہا '' **اولوا المروءة والنهى** '' مروت اور عقل رکھنے والے لوگ مکرم ہیں۔ سلیمان نے ان سے پوچھا '' **ای الاعمال افضل** '' کون سے اعمال افضل ہیں؟ ابو حازم نے کہا '' **اداء الفرائض مع اجتناب المحارم** '' فرائض کا ادا کرنا اور ساتھ ہی حرام کاموں سے اجتناب کرنا۔ سلیمان نے کہا '' **فای الدعاء اسمع** '' کون سی دعاء مقام قبولیت میں زیادہ آتی ہے۔ ابو حازم نے کہا '' **دعاء المحسن اليه للمحسن** '' جس پر احسان کیا جائے وہ دعاء کرے احسان کرنے والے کے لئے۔

سلیمان نے کہا '' **ای الصدقة افضل** '' کون سا صدقہ افضل ہے؟ ابو حازم نے کہا '' **للسائل البائس وجهد المقل ، ليس فيها من ولا اذى** '' زیادہ حاجت مند فقیر کو صدقہ دینا ، اور کم مال کی وجہ سے جو شخص پریشان حال ہو اسے صدقہ دینا افضل ہے بشرطیکہ اس میں احسان نہ جتالیا جائے اور جسے مال بطور صدقہ دیا جائے اسے اذیت نہ پہنچائی جائی۔ سلیمان نے پوچھا '' **فای القول اعدل** '' کون سی بات عدل وانصاف پر مبنی ہے۔ ابو حازم نے کہا '' **قول الحق عند من تخافه او ترجوه** '' حق بات کہنا خواہ تم اس سے خوف رکھتے ہو یا اس سے امید کرتے ہو۔ سلیمان نے پوچھا ''فای المؤمنین اکیس ''. مومنوں میں سے عقلمند کون ہے؟

ابو حازم نے کہا '' **رجل عمل بطاعة الله ودل الناس عليها** '' جو شخص اللہ تعالیٰ کی طاعت کے مطابق عمل کرے اور لوگوں کو بھی اسی پر عمل کرنے کی تلقین کرے۔ سلیمان نے پوچھا '' **فای المؤمنین احمق** '' مومنوں میں سے بے وقوف کون ہے؟ ابو حازم نے کہا:

" رجل انحط فی ھوی اخیه وھو ظالم فباع آخرته بدنیا غیرہ "
وہ شخص جس نے ظالمانہ طریقہ سے اپنے بھائی کی ظلم میں امداد کی وہ سب سے زیادہ
بے وقوف ہے کیونکہ اس نے غیر کی دنیا کے بدلے اپنی آخرت کو بیچ دیا ہے

یعنی کسی مومن بھائی کو دنیاوی نقصان پہنچانا ظلم ہے اور اس سے اپنی آخرت کو برباد کر دینا لازم آئے گا کیونکہ ظالم کی امداد کرنا دراصل مظلوم کو نقصان پہنچانا ہے۔سلیمان نے ابو حازم سے کہا "اصبت" تم نے درست کہا ہے۔پھر سلیمان نے کہا " فما تقول فیما نحن فیه " ہمارے متعلق تم کیا کہتے ہو یعنی ہماری بادشاہت وحاکمیت کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ ابو حازم نے کہا یہ سوال نہ پوچھئے بلکہ مجھے معاف رکھئے۔لیکن سلیمان نے کہا نہیں مجھے ضرور نصیحت کریں اور بتائیں کہ ہماری حاکمیت کیسی ہے؟ ابو حازم نے کہا اے امیر المؤمنین:

" ان آباءک قھروا الناس بالسیف واخذوا ھذا الملک عنوۃ علی
غیر مشورۃ من المسلمین ورضاھم "
بیشک تمہارے آباء نے لوگوں پر تلوار سے قہر وجبر کیا اور یہ ملک مسلمانوں کے مشورہ اور
ان کی رضامندی کے بغیر طاقت سے حاصل کیا۔

یہاں تک کہ بہت سے مسلمانوں کو انہوں نے قتل کیا لیکن وہ بھی اس دنیا سے کوچ کر گئے کاش کہ تمہیں معلوم ہو کہ اب وہ کیا کہہ رہے ان کو کیا کہا جا رہا ہے (یعنی قبر میں ان کے متعلق تمہیں معلوم ہو کہ ان سے کیا سلوک کیا جا رہا ہے تو تم پر دہشت طاری ہو جائے)۔

بادشاہ کے پاس بیٹھے ہوئے ایک شخص نے کہا اے ابو حازم تم نے بہت برا کیا ہے۔ابو حازم نے کہا جھوٹے تم ہو "ان اللہ اخذ میثاق العلماء لیبیننه للناس ولا یکتمونه " بیشک اللہ تعالیٰ نے علماء سے وعدہ لیا ہے کہ لوگوں کے سامنے حق بیان کرنا اور حق کو چھپانا نہیں۔سلیمان نے ابو حازم سے پوچھا " فکیف لنا ان نصلح " ہم اپنی اصلاح کیسے کر سکتے ہیں؟ ابو حازم نے کہا:

" تدعون الصلف وتمسکون بالمروۃ وتقسمون بالسویة "
تم تکبر چھوڑ دو اور مروت سے کام لو، اور لوگوں میں برابر برابر تقسیم کرو۔

سلیمان نے پوچھا ہم اسے کیسے حاصل کر سکتے ہیں ابو حازم نے کہا " تاخذہ من حله وتضعه

فی اهله " تم حلال مال حاصل کرواوراس کے حقدارلوگوں میں وہ تقسیم کردو۔سلیمان نے ابوحازم سے کہا کیا یہ ہوسکتا ہے کہ تم ہمارے ساتھ رہو۔تمہیں ہم سے نفع ہو،ہمیں تم سے نفع ہو۔ابوحازم نے کہا "اعوذ باللہ "اللہ کی پناہ۔سلیمان نے کہاتم نے یہ کیوں کہا؟ابوحازم نے کہا:

" اخشی ان ارکن الیکم شیأ قلیلا فیذ یقنی اللہ ضعف الحیوة وضعف المماة "

میں اس سے ڈرتا ہوں کہ کہیں تمہارے مال کی وجہ سے جوگھٹیا اور حقیر ہے تمہاری طرف میلان کر کے زندگی اور موت میں اللہ تعالیٰ کی شدید گرفت میں نہ آ جاؤں۔

سلیمان نے کہا اگر تمہیں ہم سے کوئی حاجت ہو تو بتاؤ تا کہ ہم اسے پورا کردیں۔ابوحازم نے کہا ہاں ہمیں تم سے یہ حاجت ہے " تنجینی من النار وتدخلنی الجنة " مجھے آگ سے نجات دواور جنت میں داخل کردو۔سلیمان نے ابوحازم کی خدمت میں عرض کیا " لیس ذاک الی " یہ کام تو میری طاقت میں نہیں۔ابوحازم نے کہا " فما لی الیک حاجة غیرها " پھر مجھے بھی اس کے علاوہ تم سے اورکوئی حاجت نہیں۔سلیمان نے کہا " فادع لی " تو میرے لئے دعاء ہی کردو۔ابوحازم نے ایک حاکم وقت کے لئے یہ دعا کی:

" اللهم ان کان سلیمان ولیک فیسره لخیر الدنیا والآخرة وان کان عدوک فخذ بناصیته الی ما تحب وترضی "

اے اللہ اگر سلیمان تیرادوست ہے تو اس کے لئے دنیااور آخرت آسان کردے اور اگر وہ تیرادشمن ہے تو اس کی پیشانی سے اس کے بالوں کو پکڑ کر اس طرف لے آ جو تجھے محبوب ہے اور تجھے پسند ہے۔

سلیمان نے کہاہاں ایسا ہی ہو جائے ابوحازم نے کہامختصراور زیادہ بات یہی ہے کہ اگر تم اس کے اہل ہوئے تو بہتر اور اگر تم اس کے اہل نہ ہوئے تو یہ مناسب نہیں کہ میں ایسا تیر چلاؤں جس میں وتر ہی نہ ہو۔سلیمان نے کہا مجھے کچھ وصیت فرمادیں،ابوحازم نے کہاہاں میں تمہیں وصیت کرتا ہوں وہ وصیت مختصر طور پر یہ ہے:

" عظم ربک ونزهه ان یراک حیث نهاک او یفقدک حیث امرک "

اپنے رب کی عظمت بیان کرواوراس کی تنزیہ (پاکیزگی) بیان کرو(اس کا خیال یہاں تک رکھو

کہ ایسا نہ ہو) کہ وہ تمہیں وہاں دیکھے جہاں سے اس نے تمہیں روکا ہے یا تمہیں وہاں نہ پائے جہاں اس نے تمہیں حکم دیا ہے۔

جب بادشاہ ابو حازم کی محفل سے اٹھ کر باہر گیا تو اس نے ابو حازم کے پاس ایک سو دینار بھیجے کہ ان کو خرچ کرلو، اور ساتھ ہی یہ پیغام بھیجا کہ تمہارے لئے میرے پاس اس قسم کے کثیر عطیات کیلئے ہر وقت دروازے کھلے ہیں۔ ابو حازم نے وہ رقم واپس لوٹادی اور اسکی طرف لکھا اے امیر المؤمنین:

"فان کانت هذه المائة دینار عوضا لما حدثت فالمیتة والدم ولحم الخنزیر فی حال الاضطرار احل من هذه، وان کان لحق فی بیت المال فلی فیها نظراء فان ساویت بیننا والا فلیس لی فیها حاجة"

اگر یہ سو دینار میری باتوں، نصیحتوں کا عوض ہے تو میرے نزدیک یہ مردہ جانور، اور خون اور خنزیر کے گوشت کی طرح ہیں، جو صرف حالت اضطرار میں جائز ہیں۔ اور اگر یہ مجھے اس لئے دیئے گئے ہیں کہ میرا بیت المال میں حق ہے تو میرے جیسے اور بھی بہت ہیں۔ اگر سب کو برابر طور پر اتنا ہی مال دیا گیا ہے تو میں بھی یہ مال لینے کا حقدار ہوں۔ اگر سب کو اتنا مال نہیں دیا گیا تو مجھے اس مال کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ بیت المال کے مال میں ناجائز تصرف کا حق حاکم کو حاصل نہیں۔ (از قرطبی ج اول از ص ۳۳۷)

اس واقعہ سے حاصل ہونے والے فوائد:

حضرت ابو حازم سو دینار پر بکے نہیں بلکہ آپ نے وہ واپس کر کے خودداری کا عملی نمونہ پیش فرمادیا۔ حق بیان کرنے میں آپ کو بادشاہ کا خوف اور بادشاہ کا رعب کوئی نقصان نہ پہنچا سکا بلکہ آپ نے بلا خطر حق بیان فرما کر آنے والے علماء کو سبق دے دیا کہ بادشاہوں کے ٹکڑوں پر بک کر دین کے مسائل کو بدل کر ان میں لچک پیدا کر کے دین کا ستیاناس نہ کر دینا۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"لا یمنعن احدکم هیبة احد ان یقول او یقوم بالحق حیث کان"

تم میں سے کسی ایک کو بھی کسی کا رعب حق بات کہنے سے اور حق پر قائم رہنے سے ہرگز نہ روکے۔

رب تعالیٰ نے نیک بندوں کی شان بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

﴿ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ﴾

وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں (یعنی حق بات کہنے میں کوشش کرتے ہیں) اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہیں رکھتے۔ (از قرطبی حوالہ مذکور)

راقم کے نزدیک اس واقعہ سے اور عظیم فائدہ یہ حاصل ہوا کہ مسلمانوں کے مشورہ اور مرضی کے بغیر طاقت سے مسلط ہونے والا لیٹرا اور غاصب تو ہوسکتا ہے اسے حاکم نہیں کہا جا سکتا۔ اور یہ فائدہ حاصل ہوا کہ بادشاہ کے سامنے حق بیان کرنا سلف صالحین کا طریقہ رہا، لیکن ساتھ ہی بادشاہوں کے چمچے حق کو باطل کہنے والے بھی رہے۔ یہی طریقہ آج تک چلا آرہا ہے۔ مولوی ٹکٹوں پر نہ بکیں تو دین میں بگاڑ نہ واقع ہو۔ لیکن افسوس کہ بکاؤ مال دین کا حلیہ بگاڑ رہے ہیں ہر چڑھتے سورج کی پوجا کرنے والے سیاہ سفید کو صحیح قرار دیتے ہیں۔

حق چھپانے پر وعید:

" عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ من سئل عن علم علمه ثم كتمه الجم يوم القيامة بلجام من نار "

(رواه احمد و ابو داؤد و الترمذی ورواه ابن ماجه عن انس، مشکوة کتاب العلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک شخص سے علم کے متعلق پوچھا جائے وہ چھپائے تو قیامت کے دن اسے آگ کا لگام ڈالا جائے گا۔

یعنی مسائل امور دینیہ میں علم کا محتاج ہو تو اسے مسئلہ نہ بتایا جائے اور اسے کتاب نہ دیکھنے دی جائے تو قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کا لگام ڈالا جائے گا، کیونکہ منہ ہی کلام کرنے اور جواب دینے کا محل تھا لہٰذا اسی میں آگ کا لگام ڈالا جائے گا۔ ایسے عالم کو حیوان سے تشبیہ دی گئی، کیونکہ علم پڑھنے کا مقصد تو یہ تھا کہ اسے آگے پھیلایا جائے اور لوگوں کو اس کے ذریعے نفع پہنچایا جائے، لیکن جب اس نے علم کو چھپا دیا تو علم پڑھنے کی کامل غرض کو زائل کر دیا، اس لئے وہ علماء اور حکماء کے درجہ سے دور ہو کر حیوانوں کے درجہ میں پہنچ گیا۔ (از مرقاۃ)

اسی سے واضح ہوا کہ جب علم کا مسئلہ پوچھنے پر نہ بتانا اتنا عظیم جرم ہے تو باطل کو حق سے ملا کر حق کو چھپانا کتنا ہی زیادہ عظیم جرم ہوگا۔

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰاکِعِیْنَ

☆ ''اور صحیح ادا کرو نماز اور زکوۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو''۔

☆ ''اور نماز قائم رکھو، اور زکوۃ دو، اور رکوع کرو ساتھ رکوع کرنے والوں کے''۔

رب تعالیٰ نے پہلے ان (بنی اسرائیل) کو ایمان لانے کا حکم دیا ﴿ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمْ ﴾ سے پھر ان کو کفر کرنے سے منع کیا، پھر ان کو حق کے ساتھ باطل کو ملانے سے منع فرمایا پھر ان کو نبی کریم ﷺ کی نبوت کے دلائل چھپانے سے منع فرمایا۔ اب ان کو شرعی احکام پر عمل کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے کیونکہ ایمان اصل العبادات ہے، ایمان کے بغیر کوئی عبادت معتبر نہیں۔

پھر احکام شرائع میں پہلے نماز کا حکم دیا کیونکہ '' ھی اعظم العبادات البدنیة '' یہ بدنی عبادات میں سے عظیم عبادت ہے اس کے بعد زکواۃ ادا کرنے کا حکم دیا کیونکہ '' ھی اعظم العبادات المالیة '' یہ مالی عبادات میں عظیم عبادت ہے۔ (از کبیر)

﴿ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ ﴾: '' یامرکم اللہ الیھود بالدخول فی الاسلام واقامة الصلوة علی ما بینه محمد ﷺ وفصله وسنه '' (زبدة التفسیر من فتح القدیر)

اے یہود یو اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ اسلام میں داخل ہو جاؤ اسلام میں داخل ہونے کے بعد نماز اس طرح قائم کرو جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اسے بیان فرمایا اور اس کی تفصیل بیان فرمائی اور اس کا طریقہ بیان فرمایا۔

مقاتل نے کہا کہ ﴿ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ ﴾ کا مطلب یہ ہے '' امرھم ان یصلوا مع النبی ﷺ '' کہ ان کو رب تعالیٰ نے حکم دیا کہ نبی کریم ﷺ کی معیت میں نماز ادا کرو۔ (صابونی)

'' (وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ) یعنی صلوة المسلمین وزکاتھم فان غیرھما کلاصلوة ولا زکوة '' (بیضاوی)

مسلمانوں کی نماز کی طرح نماز ادا کرو اور ان کی زکوۃ کی طرح زکوۃ ادا کرو، بیشک ان کے طریقہ سے ہٹ کر نماز ادا کرنا یا زکوۃ ادا کرنا درحقیقت نماز ادا کرنا اور زکوۃ ادا کرنا نہیں ثابت ہو سکتا۔

یعنی اگر چہ یہ خطاب بنی اسرائیل کو ہے جو نماز ادا کرتے تھے اور زکوۃ بھی ادا کرتے تھے لیکن وہ اپنے طریقہ کے مطابق اس پر عمل کرتے تھے اس لئے ان کے عمل کو غیر معتبر سمجھ کر ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں کے طریقہ پر عمل کرو گے تو وہی معتبر ہوگا۔ اس تفصیل کے بعد " واقیموا الصلوۃ " کا ترجمہ حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ کا ضیاء القرآن میں عظیم تر نظر آئے گا ''اور صحیح ادا کرو نماز'' تاہم مسلمانوں کو ہمیشہ نماز ادا کرنے کا حکم دیا گیا اس لئے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بھی باکمال ہے ''اور نماز قائم رکھو'' علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے معنی بیان کیا ہے:

(وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ) بمراقبة القلوب " (روح المعانی) دل کو حاضر کر کے نماز ادا کرو۔

اس معنی سے بھی پیر صاحب کے ترجمہ کو تائید ملتی ہے کہ ''صحیح ادا کرو نماز'' یعنی اس میں خلوص پایا جائے حضور قلب سے نماز ادا ہو اس میں ریاء کاری نہ پائی جائے۔

﴿ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ﴾: " ایتـاء " اور " اعـطـاء " کا ایک ہی معنی ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے "آتیتـه ، اعطیتـه " دونوں کا ایک ہی معنی ہے ''میں نے اسے دیا'' اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿ لئن آتانا من فضله لنصدقن ﴾ اسی معنی میں استعمال ہے۔ اتیته بالقصر بغیر مد کے جب استعمال ہو تو پھر اس کا معنی ہوتا ہے ''آنا'' یعنی ''میں اس کے پاس آیا'' ہاں البتہ مستقبل کے صیغوں میں مد کے ساتھ بھی آنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں:

" ولآتین رسول الله صلى الله عليه وسلم فلأ خبرنه "

میں ضرور بر ضرور رسول اللہ ﷺ کے پاس آ کر ان کو خبر دوں گا

ایتان کا معنی جب آنا ہو تو اس کے ساتھ " بـــاء " لگا دیں تو متعدی ہو جائے گا جیسا کہ کہا جائے "ایت بالماء " پانی لاؤ۔

﴿ وَاَقِیْمُوا ﴾ امر معناه الوجوب (وآتوا) امر ایضا یقتضی الوجوب "

" اقیـمـوا " اور " آتـوا " دونوں ہی امر کے صیغے ہیں اور ان دونوں مقاموں میں امر وجوب کے لئے آیا ہوا ہے۔ یعنی نماز قائم کرنا، اور زکواۃ ادا کرنا فرض ہیں۔

''زکوۃ'' ماخوذ ہے " زکی الشی " سے۔ یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی چیز بڑھ جائے اور زیادہ ہو جائے اسی طرح کہا جاتا ہے " زکا الزرع " کھیتی بڑھ گئی اور کہا جاتا " والمال یزکو " مال زیادہ ہو جائے گا اور کہا جاتا ہے " رجل زکی " مرد زیادہ خیرات دینے والا ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے مال کی زکواۃ ادا کرنے کو زکوۃ کہنے کی بظاہر وجہ نظر نہیں آتی کیونکہ ظاہر طور پر تو مال کم ہو رہا ہے لیکن اس کو اس لئے زکواۃ کہا جاتا ہے " یتمو بالبرکة او بالاجر الذی یثاب به المزکی " کہ مال میں زکواۃ ادا کرنے سے برکت ہوتی ہے جس سے وہ مال بڑھتا ہے اور زکواۃ دینے والے کے ثواب میں زیادتی ہوتی ہے اس لئے بھی اسے زکواۃ کہا جاتا ہے۔

اسی معنی کے لحاظ سے کہا جاتا ہے " زکات الناقة بولدها " اونٹنی نے بچہ جنا یعنی بچہ اس کے پاؤں میں ہے بچے کی وجہ سے اونٹنی ایک سے دو بن گئی۔ اسی معنی لحاظ پر کہا جاتا ہے " زکا الفرد " متفرد شخص زوج بن گیا۔ یعنی شادی کر کے ایک سے دو بن گیا۔ ''زکوۃ'' کا اور معنی یہ ہے " وقیل اصلها الثناء الجمیل " اور بعض حضرات نے کہا اصل اس کا معنی اچھی تعریف ہے اسی معنی کے لحاظ پر کہا جاتا ہے " زکی القاضی الشاهد " قاضی نے گواہ کی اچھی تعریف کی۔

زکواۃ ادا کرنے والا جب بھی زکواۃ ادا کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو قابل تعریف بنالیتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس کی تعریف فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے بندے بھی اس کی تعریف کرتے ہیں۔ ''زکوۃ'' کا اور معنی یہ ہے " وقیل الزکاة ماخوذ من التطهیر " بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ زکواۃ کا معنی ہے پاکیزہ کرنا۔

چونکہ زکواۃ دینے والا جب اپنے مال سے زکواۃ ادا کرتا ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور اس نے میرے مال میں مسکینوں کا حق رکھا ہے۔ لہذا مسکینوں کو مال دینا اسی کے حکم کی تابعداری ہے، تو اس سے وہ اپنے مال کو پاکیزہ کر لیتا ہے، کیونکہ جب تک زکواۃ کا مال اس کے مال میں رہے گا تو اس کا مال میل کچیل سے پاک نہیں ہوگا۔

" الا تری ان النبی ﷺ سمی ما یخرج من الزکوة او ساخ الناس "
کیا تم دیکھتے نہیں کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے زکواۃ والے مال کو لوگوں کی میل قرار دیا ہے

اور رب تعالیٰ نے بھی فرمایا:

﴿ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا ﴾

اے محبوب ان کے مال میں سے زکواۃ حاصل کرو جس سے تم ان کو ستھرا اور پاکیزہ کر دو۔

یہاں زکواۃ سے مراد کیا ہے؟ آیۃ کریمہ میں بنی اسرائیل کو جو خطاب ہے " وآتوا الزکوۃ " زکواۃ ادا کرو اس سے مراد کیا ہے؟ اس میں مختلف اقوال ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ زکواۃ سے مراد وہی ہے جو مشہور ہے یعنی فرض زکواۃ یہی معنی مراد لینا بہتر ہے اور اسی پر اکثر علماء ہیں اس کی وجہ اس لئے بھی واضح ہے کہ " واقیموا الصلوۃ " کے ساتھ " وآتوا الزکوۃ " کو ذکر کیا ہے۔ بعض حضرات نے ذکر کیا ہے کہ اس مقام میں زکواۃ سے مراد صدقہ فطر ہے یہ قول ابن قاسم کا ہے جو امام مالک رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ قرآن پاک میں صدقہ فطر کا ذکر نہیں۔ البتہ امام مالک رحمہ اللہ نے ﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴾ میں تاویل بیان کی ہے کہ اس سے مراد صدقہ فطر ہے۔ (ماخوذ از قرطبی)

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے کیا خوب بیان فرمایا:

" (وآتوا الزکوۃ) ای بالغوا فی تزکیۃ النفس عن الصفات الزمیمۃ لتحصل لکم التحلیۃ بعد التخلیۃ ادوا زکوۃ الهھم فان لها زکوۃ کزکوۃ النعم بل ان لکل شئی زکوۃ کما قیل "

کل شی له زکوۃ تؤدی وزکوۃ الجمال رحمۃ مثلی

" وآتوا الزکوۃ " کا مطلب ہے کہ بری صفات سے نفس کو پاک کرنے میں مبالغہ کرو، تاکہ بری صفات کے زوال کے بعد اچھی صفات سے تم مزین ہو جاؤ۔ یا مراد یہ ہے کہ اپنی ہمتوں (اپنی ہمت کے مطابق ہر کام) کی زکواۃ ادا کرو کیونکہ ہمتوں کی زکواۃ ادا کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ نعمتوں کی زکواۃ کو ادا کرنا ہے بلکہ ہر چیز کی زکواۃ ہے جیسا کہ کسی شاعر نے کہا:

ہر چیز کی زکواۃ ادا کی جاتی ہے اور خوبصورتی کی زکواۃ میرے جیسوں پر رحم کرنا ہے

(از روح المعانی)

مختصر مسئلہ: زکواۃ اور عشر کے مسائل اور ان کے مصارف کا ذکر تو اپنی اپنی جگہ آئیگا۔

البتہ مختصر طور پر یہ سمجھا جائے کہ رب تعالیٰ نے زکوٰۃ کو مجمل طور پر ذکر فرمایا اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی تفصیل بیان فرمائی:

" عن ابی سعید الخدری ان النبی ﷺ قال لیس فی حب ولا تمر صدقة حتی یبلغ خمسة اوسق ولا فیما دون خمسة ذود صدقة ولا فیما دون خمسة اواق صدقة وقال البخاری خمس اواق من الورق "

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا دانوں اور کھجوروں میں صدقہ اس وقت تک نہیں جب تک وہ پانچ وسق کو نہ پہنچ جائیں اور پانچ اونٹوں سے کم میں صدقہ نہیں، اور پانچ اوقیہ چاندی سے کم میں صدقہ نہیں۔ (از قرطبی)

خیال رہے وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے صاع تقریبا چار کلو کا ہے۔ اور اوقیہ چالیس درھم کا وزن ہے یعنی دو سو درھم چاندی کا نصاب ہے جس کا وزن ساڑھے باون تولے بنتا ہے۔ سونے کا نصاب بیس مثقال ہے۔ جس کا وزن ساڑھے سات تولے بنتا ہے۔ روپوں کا حساب چاندی کے نصاب سے کیا جاتا ہے کیونکہ اس میں فقیر کا بھلا ہے۔ یعنی فقیر کے لئے بہتر یہی ہے کہ نصاب چاندی کا ہی حساب میں لایا جائے، اس سے نصاب جلدی مکمل ہو جاتا ہے:

" وروی البخاری عن ابن عمر عن النبی ﷺ قال فیما سقت السماء والعیون او کان عشریا (بفتح المهملة والثاء المثلثة وکسر الراء وتشد الیاء النخیل الذی یشرب بعزوقة من ماء المطر یجتمع فی حفیرة) وما سقی بالنضح (بفتح النون وسکون المعجمة بعدها مهملة ، ما سقی من آلابار) نصف العشر " (قرطبی بمع حاشیه)

بخاری میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس زمین کو بارش سے، چشموں سے اور زمین میں گڑھا کھود کر بارش کا پانی جمع کر کے اس سے سیراب کیا جائے اس میں دسواں حصہ پیداوار کا اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا جائے اور جس زمین کو کنوئیں کے پانی سے سیراب کیا جائے اس میں بیسواں حصہ دیا جائے۔

فائدہ: رب تعالیٰ کی راہ میں صدقہ کرنے سے چھ فائدے حاصل ہوتے ہیں تین دنیا میں

اور تین آخرت میں:

" فاما التی فی الدنیا فتزید فی الرزق وتکثر المال وتعمر الدیار "

دنیا میں جو فائدے حاصل ہوتے ہیں وہ یہ ہیں رزق میں زیادتی ہوتی ہے، اور مال میں کثرت ہوتی ہے، اور گھر اور شہر آباد ہوتے ہیں۔

" واما التی فی الآخرة فتستر العورة وتصیر ظلا فوق الرأس وتکون سترا من النار "

لیکن آخرت میں حاصل ہونے والے فوائد یہ ہیں کہ صدقہ انسان کی پردہ پوشی کرے گا، اور اس کے سر پر سایہ کرے گا اور اسے جہنم کی آگ سے بچائے گا۔ (کبیر)

تاریخ فرضیت زکواۃ: بعض حضرات نے کہا زکواۃ روزہ، صدقہ فطر کا حکم دو ھجری میں دیا گیا۔

" والمعتمد ان الزکوة فرضت بمکة اجمالا ویثبت بالمدینة تفصیلا جمعابین الآیات تدل علی فرضیتها بمکة وغیرها من الآیات والادلة والله اعلم " (مرقاة ج ۴ ص ۱۱۸)

زیادہ اعتماد اس بات پر ہے کہ بیشک زکواۃ مکہ میں فرض ہوگئی تھی لیکن وہ مجمل ہی رہی، اس کی تفصیل مدینہ طیبہ میں بیان کی گئی اس بیان سے آیات اور احادیث میں تطبیق ثابت ہو جائے گی، کیونکہ کچھ آیات واحادیث مکہ میں فرضیت پر دلالت کرتی ہیں اور کچھ مدینہ طیبہ میں فرضیت پر دلالت کرتی ہیں۔

﴿ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ ﴾: " اور رکوع کرو، رکوع کرنے والوں کے ساتھ، یعنی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرو"۔

ذکر جزء مراد کل: رکوع کا ذکر کر کے مراد نماز لی گئی ہے۔ یعنی جزء کا ذکر کر کے مراد کل لیا گیا ہے۔ یہ ضابطہ کئی جگہ پر جاری ہے جیسا کہ ذکر قراءۃ کا اور مراد نماز ہے رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا:

﴿ (وَقُرْآنَ الْفَجْرِ) ای صَلٰوةَ الْفَجْرِ ﴾

یعنی قرآن پاک میں جو قرآن الفجر ذکر ہے اس سے مراد صلوۃ فجر ہے۔

اور اہل حجاز ذکر سجدہ کا کرتے ہیں اور اس سے مراد رکعت لیتے ہیں اسی محاورہ کے مطابق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد بھی ہے " من ادرک سجدة من الصلوة فقد ادرک الصلوة " جس

شخص نے نماز کی ایک رکعت (امام کے ساتھ پالی) تحقیق اس نے نماز پالی۔اس حدیث پاک میں بھی ذکر سجدہ کا ہے لیکن مراد رکعت ہے۔

رکوع کے ذکر کی خصوصیت کیوں؟

یہ قانون تو سمجھ آ گیا کہ بعض اوقات ذکر جزء کا ہوتا اور مراد اس سے کل لیا جاتا ہے یہاں بھی ذکر رکوع کا ہے اور مراد نماز ہے۔لیکن دیکھنا یہ ہے کہ رکوع کا ہی ذکر کیوں کیا، سجدہ کا ذکر کیوں نہیں کیا، قراء ت کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ اس کی وجہ یہ ہے:

" انما خص الرکوع بالذکر لان بنی اسرائیل لم یکن فی صلوتھم رکوع "

رکوع کا ذکر خصوصی طور پر اس لئے کیا گیا کہ بنی اسرائیل کی نماز میں رکوع نہیں تھا

گویا کہ ان کو کہا گیا ہے کہ اب پہلی شریعتیں منسوخ ہو چکی ہیں لہذا تم اپنی نماز ادا نہ کرو، بلکہ مسلمانوں والی نماز ادا کرو، یعنی نماز جماعت سے ادا کرو اور اس نماز میں رکوع بھی کرو جیسا کہ مسلمان اپنی نماز میں رکوع کرتے ہیں۔

(قرطبی)

تنبیہ: یہ وجہ اگرچہ مفسرین کرام نے بیان تو کی ہے لیکن اس وجہ کو بیان کرتے ہوئے " یا مریم اقنتی لربک واسجدی وارکعی مع الراکعین " میں تعارض آئے گا اس میں پھر توجیہات کی ضرورت در پیش آئے گی۔اس لئے بہتر یہ ہے کہ رکوع کے تخصیص کی وجہ یہ بیان کی جائے

" لانہ کان اثقل علی القوم فی الجاھلیۃ "

رکوع کا خصوصی طور پر اس لئے حکم دیا گیا کہ زمانہ جاہلیت میں رکوع کرنا ان کو بھاری محسوس ہوتا تھا۔

(قرطبی)

یعنی رکوع تو اگرچہ یہود کی نماز میں بھی تھا لیکن وہ اس پر عمل کرنے میں پہلو تہی کرتے تھے واللہ اعلم۔اس قول پر تقریبا اس مسئلہ سے تائید حاصل ہوتی ہے۔شیخ ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ نے "شرح التاویلات" میں ذکر فرمایا ہے کہ جماعت سے نماز ادا کرنا واجب ہے کیونکہ رب تعالیٰ نے رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرنے کا حکم دیا۔اس سے واضح ہے کہ رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع میں شریک ہونے کا حکم دیا گیا ہے لہذا جماعت سے نماز ادا کرنا۔''مامور بھا'' (جس کا حکم دیا

جائے)ہوگیا۔" والامر المطلق الوجوب " مطلق امر وجوب کے لئے آتا ہے۔لیکن علامہ سعدالدین تفتازانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" بانهم كانوا يصلون وحدانا فامروا بان يصلوا مع النبی ﷺ واصحابه بالجماعة للمنع مما كانوا عليه من عادة الانفراد فيكفی فی ذلک كونها سنة مؤكدة "

وہ اکیلے اکیلے نماز ادا کرتے تھے ان کو حکم دیا گیا کہ نبی کریم ﷺ اور ان کے صحابہ کے ساتھ مل کر جماعت سے نماز ادا کرو ان کی جو عادت تھی اکیلے نماز ادا کرنے کی اس سے ان کو منع کیا گیا لہٰذا جماعت سے نماز ادا کرنا سنت مؤکدہ ہے بس اتنا ذکر کرنا کافی ہے۔ (از شیخ زادہ)

راقم کے نزدیک رکوع بھی حکماً سجدہ کے قریب ہے اسی وجہ سے رکوع میں سجدہ تلاوت کی نیت کرنے سے سجدہ تلاوت ادا ہو جاتا ہے صرف رکوع کے اہم ہونے کی وجہ سے اسے ذکر کر کے مراد کل لیا گیا ہے۔

رکوع کا لغوی معنی: " الركوع هو الانحناء " رکوع کا معنی ہے جھکنا۔ (مفردات راغب)

رکوع کا شرعی معنی: " الركوع هو الخضوع والانقياد " رکوع کا معنی خضوع کرنا یعنی تکبر کو چھوڑنا، عجز اختیار کرنا، رکوع بمعنی خضوع کے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی میں استعمال ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ ﴾

اور رکوع کا معنی پست ہونا یعنی انحطاط، جیسا کہ اضبط سعدی نے بیان کیا:

لا تذلک الضعيف علک ان تر — كع يوما والدهر قدر فعه

کسی کمزور کو ذلیل نہ کر، ہوسکتا ہے تو پست ہو جائے ایک دن اور زمانہ اسے بلند کر دے۔

(از بیضاوی وشیخ زادہ)

رکوع کیسے کیا جائے؟ اپنی پیٹھ، گردن، سرین کو برابر رکھے، اپنی انگلیوں کو کھلا رکھے، ان سے گھٹنوں کو پکڑے، پھر مطمئن ہو کر رکوع کرے اور کم از کم رکوع میں تین مرتبہ "سبحان ربی العظیم" پڑھے۔

☆ مسلم شریف میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت مذکور ہے:

" كان رسول الله ﷺ يستفتح الصلوة بالتكبير والقراء بالحمد لله

رب العلمین ، و کان اذا رکع لم یشخص راسه ولم یصوبه ولکن بین ذلک "
نبی کریم ﷺ نماز کو تکبیر سے شروع فرماتے اور قراءت کو " الحمد للہ رب العلمین " سے شروع فرماتے اور جو رکوع کرتے تو سر کو نہ اوپر کرتے اور نہ نیچے کرتے بلکہ ان کے درمیان رکھتے۔

☆ بخاری شریف میں حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

" قال رأیت رسول اللہ ﷺ اذا کبر جعل یدیه حذو منکبیه واذا رکع امکن یدیه من رکبتیه ثم هصر ظهره ......الخ "

وہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا آپ نے جب تکبیر کہی تو ہاتھوں (کی ہتھیلیوں) کو کندھے کے برابر کیا اور جب رکوع کیا تو اپنے ہاتھوں سے گھٹنوں کو پکڑا پھر پیٹھ کو جھکایا۔ (از قرطبی)

نماز میں رکوع فرض ہے اسی طرح سجدہ بھی نماز میں فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی سورۃ حج کے آخر میں ہے:

﴿ یا اَیُّهَا الَّذِینَ اٰمَنُوا ارْکَعُوا وَاسْجُدُوا ﴾ اے ایمان والو رکوع کرو، اور سجدہ کرو۔

حدیث پاک میں رکوع اور سجود کو اطمینان سے ادا کرنے کا حکم ہے کہ کم از کم تین تین مرتبہ تسبیحات دونوں میں پڑھی جائیں۔ سجدہ کرنے کا طریقہ حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی روایت میں مذکور ہے۔

" ان النبی ﷺ کان اذا سجد مکن جبهته وانفه من الارض ونحی یدیه عن جنبیه ووضع کفیه حذو منکبیه ...... خرجه الترمذی وقال حدیث حسن صحیح "

بیشک نبی کریم ﷺ جب سجدہ کرتے تو اپنی پیشانی اور ناک کو زمین پر لگاتے اور اپنے بازوؤں کو اپنے پہلوؤں سے دور رکھتے اور اپنی ہتھیلیوں کو اپنے کندھوں کے برابر رکھتے.... یہ حدیث ترمذی نے ذکر فرمائی اور اسے حسن صحیح قرار دیا"

مسلم شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے آپ فرماتے ہیں:

" قال رسول اللہ ﷺ اعتدلوا فی السجود ولا یبسط احدکم ذراعیه انبساط الکلب "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا سجدہ میں اعتدال سے کام لو، تم میں سے کوئی ایک آدمی اپنی کلائیوں کو اس طرح نہ بچھائے جس طرح کتا بچھاتا ہے۔

" وعن البراء قال قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم اذا سجدت فضع کفیک وارفع مرفقیک "

حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم سجدہ کرو اپنی ہتھیلیوں کو (زمین پر) رکھو اور اپنی کہنیوں کو اٹھا کر رکھو۔

" وعن میمونة زوج النبی ﷺ قالت کان رسول الله ﷺ اذا سجد خوی بیدیه یعنی جنح حتی یری وضح ابطیه من ورائه واذا قعد اطمان علی فخذه الیسری "

نبی کریم ﷺ کی زوجہ مطہرہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ جب سجدہ فرماتے تو اپنے بازوؤں کو پہلوؤں سے ہٹا کر رکھتے، یہاں تک آپ کی بغلوں کو پیچھے کی جانب سے واضح طور پر دیکھا جا سکتا تھا اور جب آپ بیٹھتے تو اپنی بائیں ران پر اطمینان سے بیٹھتے۔ (قرطبی)

" عن وائل بن حجر قال رأیت رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم اذا سجد وضع رکبتیه قبل یدیه واذا نهض رفع یدیه قبل رکبتیه "

(رواہ ابو داؤد والترمذی والنسائی وابن ماجہ والدارمی، (مشکوۃ باب السجود)

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا جب آپ سجدہ فرماتے تو اپنے گھٹنے اپنے ہاتھوں سے پہلے زمین پر رکھتے اور جب اٹھتے تو اپنے ہاتھوں کو اپنے گھٹنوں سے پہلے اٹھاتے۔

جماعت سے نماز ادا کرنا اور اس کی فضیلت:

" عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ صلوة الجماعة تفضل صلوة الفذ بسبع وعشرین درجة " (بخاری، مسلم) (مشکوۃ باب الجماعۃ وفضلها)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جماعت سے نماز ادا کرنا ستائیس درجہ افضل ہے بنسبت اکیلے نماز ادا کرنے سے۔

وضاحت حدیث:

" الفذ بتشدید الذال المعجمة ای الفرد بمعنی المنفرد ای علی صلوة الواحد الذی ترک الجماعة "

حدیث پاک میں جو لفظ ''الفذ'' استعمال ہے اس کا معنی ہے اکیلا ہونا یعنی جو شخص اکیلے نماز ادا کرے اور جماعت کو چھوڑ دے اس کی نماز پر جماعت سے نماز ادا کرنے والے کی نماز ستائیس درجہ افضل ہے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ یہ حکم اس وقت ہے جب کوئی شخص بغیر عذر کے جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا ترک کر دے:

" ان الواحد اذا صلى منفردا بعذر يحصل له ثواب الجماعة "

بیشک جب بھی کوئی شخص اکیلے نماز ادا کرے لیکن کسی عذر کی وجہ سے حالانکہ اس کی خواہش تھی کہ جماعت سے نماز ادا کروں تو اسے جماعت کا ثواب حاصل ہو جاتا ہے

اسی سے اور مسئلہ یہ سمجھ آیا کہ اکیلے نماز ادا کرنے سے نماز ہو تو جائے گی لیکن ثواب میں کمی واقع ہو گی

" وفيه دلالة على ان الجماعة ليست شرطا لصحة الصلوة ولا فرض عين "

اور اس حدیث میں اس مسئلہ پر دلیل موجود ہے کہ جماعت سے نماز ادا کرنا نماز کی صحت کے لئے شرط نہیں اور نہ ہی فرض عین ہے۔

استفسار: اس حدیث شریف میں جماعت سے نماز ادا کرنا ستائیس درجہ افضل قرار دیا گیا اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں پچیس درجہ افضل قرار دیا گیا ہے ان میں وجہ توفیق کی ہے۔

وضاحتی بیان: اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے عرف میں یہ واضح طور پر پایا جاتا ہے " ان الزائد متأخر عن الناقص " بیشک زائد متأخر ہوتا ہے ناقص سے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اپنے بندوں کو زیادہ اجر و ثواب تو عطا فرماتا ہے لیکن جو وعدہ فرمادے اس میں کمی نہیں کرتا۔ بیشک نبی کریم ﷺ نے پہلے ایک مقدار کی مومنوں کو بشارت دی۔ پھر جب اپنے آپ پر اور اپنی امت پر اللہ تعالیٰ کے مزید احسان کو دیکھا تو اس کی بشارت دے دی۔ اور جماعت سے نماز ادا کرنے پر ان کو ابھارا۔ ہاں البتہ کبھی پچیس درجہ افضل ہونا اور کبھی ستائیس درجہ افضل ہونا" فمرجعه الى العلوم النبوية التى لا يدركه العقلاء اجمالا فضلا عن التفصيل " اس کا علم نبی کریم ﷺ کو ہی حاصل تھا عقلاء اسے اجمالی طور پر بھی نہیں سمجھ سکتے تفصیلی طور پر سمجھنا تو دور کی بات ہے۔

علامہ نووی رحمہ اللہ نے ان دونوں حدیثوں میں تطبیق دیتے ہوئے تین وجہ ذکر فرمائی ہیں:

(۱) " ان ذكر القليل لا ينفى الكثير " بیشک قلیل کا ذکر کثیر کو باطل نہیں کرتا۔ یعنی پچیس کے

ذکر سے ستائیس کی نفی نہیں ہوتی ۔طلباء کرام یہ ضابطہ اچھی طرح یاد کرلیں انشاء اللہ بہت مسائل میں ان کو فائدہ دے گا۔

(۲) " ومفهوم اللقب باطل " مفہوم لقب باطل ہے یعنی ایک کے ذکر سے دوسرے کی نفی نہیں ہوتی ، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کو ذکر کرنے میں خصوصیت آ گئی ہے ستائیس خصوصی لقب ہے جو پچیس کی نفی کرتا ہے اور پچیس ایک خاص لقب ہے جو ستائیس کی نفی کرتا ہے ، یہ کہنا باطل ہے۔

(۳) " انه يختلف باختلاف حال المصلی " یہ فرق نمازیوں کے مختلف احوال سے ہے کوئی نماز ادا کرے گا جس میں زیادہ خشوع پایا جائے اسے زیادہ ثواب حاصل ہوگا ، اور کسی نمازی کی نماز میں کم خشوع پایا جائے اسے ثواب بھی کم حاصل ہوگا۔

رب تعالیٰ کی رحمت ہی رحمت: جماعت سے نماز ادا کرنے پر ستائیس درجہ فضیلت حاصل ہو گئی ۔ پھر جہاں نماز ادا کر رہا ہے اگر وہ مقام متبرک ہے تو اور زیادہ ثواب حاصل ہوگا ۔ اسی طرح جس امام کی اقتداء میں نماز ادا کر رہا ہے اگر وہ نیک ہے تو اس کی نیکیوں اور تقوی کی وجہ سے مقتدی کو بھی زیادہ ثواب حاصل ہوگا۔ (از مرقاة ج ۳ ص ۵۱)

فائدہ : حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں یہ حصہ بھی مذکور ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" وصلوته (صلوة الرجل) فی مسجدی بخمسين الف صلوة وصلوته فی المسجد الحرام بمائة الف صلوة "

(ابن ماجه باب ماجاء فی الصلوة فی المسجد الجامع)

کہ جو شخص میری مسجد (مسجد نبوی) میں نماز ادا کرے گا اسے پچاس ہزار نمازوں کا ثواب حاصل ہوگا اور جو شخص مسجد حرام میں نماز ادا کرے گا اسے ایک لاکھ نمازوں کا ثواب حاصل ہوگا۔

" ان السبعة والعشرين تحصل فی جماعة المسجد الحرام مضاعفة فی مائة الف صلوة الحاصلة للمصلی منفردا " (مرقاة ج ۳ ص ۵۱)

جب یہ واضح ہے کہ اکیلے مسجد حرام میں ایک نماز ادا کرنے سے ایک لاکھ نماز کا ثواب حاصل ہوتا ہے تو اسی سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مسجد حرام میں جماعت سے نماز ادا کرنا ستائیس لاکھ نماز کا درجہ رکھتا ہے۔

اسی سے یہ مسئلہ بھی خود بخود سمجھ آ گیا کہ مسجد نبوی میں ایک نماز با جماعت ادا کرنے سے پچاس ہزار پر ستائیس گنا زائد ثواب رکھتا ہے۔ (یعنی تیرہ لاکھ پچاس ہزار نمازوں کا ثواب حاصل ہوگا)۔

فائدہ جلیلہ: اگر چہ مسجد حرام میں تعداد کے لحاظ پر زیادہ ثواب ہے اور مسجد نبوی میں کم ہے۔ لیکن مسجد نبوی میں ثواب کیفیت کے لحاظ پر افضلیت رکھتا ہے جیسا کہ حج کے دنوں میں جو نمازیں منیٰ میں ادا کرنی ہیں، وہاں ایک نماز ادا کرنے کا ثواب ایک کا ہی ہے اور وہ نماز مسجد حرام میں ادا کریں تو ثواب ایک لاکھ کا ہوگا لیکن منی میں ادا کی ہوئی نماز باوجود ایک کا ثواب رکھنے کے بھاری ہے اس نماز پر جو اسی دن سنت کے خلاف کوئی شخص مسجد حرام میں آ کر ادا کرے۔ اسی طرح مسجد نبوی میں ادا کی ہوئی نماز پچاس ہزار کا ثواب رکھنے کے باوجود بھاری ہے مسجد حرام کی نماز پر حالانکہ ثواب مسجد حرام میں ایک لاکھ کا ہے۔ اصل وجہ اس میں یہ ہے:

" نقل عياض وقبله ابو الوليد الباجي وغيرهما الاجماع على تفضيل ما ضم الاعضاء الشريفة حتى على الكعبة كما قال ابن عساكر في تحفته وغيره بل نقل التاج السبكي عن ابن عقيل انها افضل من العرش وصرح التاج الفاكهي بتفضيلها على السموات قال بل الظاهر المتعين تفضيل جميع الارض على السماء لحلوله ﷺ "

(جواهر البحار ج ۳ ص ۷)

قاضی عیاض اور ابوالولید باجی رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ اس پر اجماع امت ہے کہ زمین کے جس ٹکڑے سے نبی کریم ﷺ کے جسم اطہر کے اعضاء شریفہ متصل ہیں (یعنی قبر شریف کا اندرونی حصہ) وہ کعبہ شریف سے بھی افضل ہے۔ ابن عساکر نے ذکر فرمایا اور تاج الدین سبکی رحمہ اللہ نے ابن عقیل حنبلی رحمہ اللہ سے نقل فرمایا کہ وہ مقام عرش سے بھی افضل ہے۔ تاج الدین فاکہی رحمہما اللہ نے بیان فرمایا کہ وہ مقام تمام آسمانوں سے افضل ہے۔ بلکہ ظاہر یہ ہے کہ تمام زمینوں کو تمام آسمانوں پر اسی لئے فضیلت حاصل ہے کہ زمین میں نبی کریم ﷺ حلول (زمین کے اندر حصے میں تشریف فرما ہیں) کئے ہوئے ہیں۔

علامہ نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں اور علامہ علی قاری رحمہ اللہ نے مرقاۃ شرح مشکوۃ میں تقریباً یہی مضمون تحریر فرمایا ہے۔

جماعت کی ترک پر رحمۃ للعلمین کا غصہ:

وہ ذات جو سراپا رحمت ہے وہ ذات جو رحمت کی جان ہے وہ ذات جسے زخمی کیا جاتا ہے، دانت کو شہید کیا جاتا ہے لیکن قوم کے لئے یوں دعا کی جاتی ہے:

" اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون " اے اللہ میری قوم کو ہدایت دے بیشک وہ بے علم ہیں۔

اس ذات پاک کو بھی اگر غصہ آتا ہے تو جماعت سے نماز نہ ادا کرنے والوں پر، ان پر ناراضگی کا اظہار اس طرح کیا جاتا ہے:

" عن ابی ھریرۃ عن النبی ﷺ قال لو لا ما فی البیوت من النساء والذریۃ اقمت صلوۃ العشاء وامرت فتیانی یحرقون ما فی البیوت بالنار "

(مسند احمد مشکوۃ باب الجماعۃ وفضلھا)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر گھروں میں عورتیں اور بچے نہ ہوتے تو میں عشاء کی نماز قائم کرنے کا حکم دیتا اور نوجوانوں کو حکم دیتا کہ وہ آگ سے ان کو جلادیں جو گھروں میں ہیں۔

وضاحت حدیث:

نبی کریم ﷺ نے نماز کی جماعت کے وقت فارغ بیٹھ کر جماعت کی ترک کرنے والوں کی مذمت بیان کی۔ اور نبی کریم ﷺ نے " ما فی البیوت " فرما کر ایک عجیب لطیف اشارہ فرمادیا کہ " ما " غیر ذوی العقول کے لئے استعمال ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جماعت ہو رہی ہو اور لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے رہیں تو وہ حیوانوں کی طرح ہیں۔

تاہم یہ خیال رہے کہ یہ راقم کی سوچ ہے اگر چہ علامہ علی قاری رحمہ اللہ نے یہ بیان فرمایا کہ پہلا " ما " جو کہ " لو لا ما فی البیوت " میں ہے وہ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ عورتیں اور چھوٹے بچے غیر ذوی العقول کی طرح ہیں۔ لیکن دوسرا " ما " جو کہ " یحرقون ما فی البیوت " میں ہے وہ بمعنی " من " کے ہے جو ذوی العقول کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ (از مرقاۃ)

لیکن امید ہے کہ اہل علم راقم کی سوچ سے اتفاق کرتے ہوئے فرمان مصطفوی کا ذیشان مطلب

حاصل کریں گے۔

حدیث پاک سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ عورتوں کا جماعت میں حاضر ہونا ضروری نہیں ورنہ نبی کریم ﷺ یہ ارشاد نہ فرماتے " لو لا ما فی البیوت من النساء " (اگر گھروں میں عورتیں نہ ہوتیں) اسی مسئلہ پر (کہ عورتوں کا جماعت میں شریک ہونا لازم نہیں) ایک حدیث پاک کا مشاہدہ فرمائیں۔

" عن ابن مسعود قال قال رسول الله ﷺ صلوة المرأة فی بیتها افضل من صلوتها فی حجرتها و صلاتها فی مخدعها افضل من صلوتها فی بیتها "

(رواہ ابو داود، مشکوۃ باب الجماعۃ وفضلہا)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورت کا نماز کمرے میں ادا کرنا افضل ہے بنسبت صحن میں ادا کرنے سے، اور کمرے کے اندر کمرے میں نماز ادا کرنا زیادہ بہتر ہے بنسبت کمرے میں ادا کرنے کے۔

وضاحت حدیث:

فی بیتها ، سے مراد کمرے کا اندرونی حصہ ہے اس میں نماز ادا کرنا افضل ہے تاکہ اس کے کامل پردہ کا لحاظ کیا جا سکے " فی حجرتها ای صحن الدار " نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی میں " فی حجرتها " سے مراد گھر کا صحن ہے۔ تاہم ایک قول یہ بھی ہے کہ گھروں کے دروازے کے باہر بالکونی جو برآمدہ نما ہوتی ہے اسے حجرۃ کہا گیا ہے۔

" مخدع " میم پر تینوں حرکتوں کو پڑھا گیا ہے دال پر فتحہ ہے مراد "کمرے میں کمرہ" ہے اس تمام ترتیب کی دارومدار اس پر ہے " لان مبنی امرها علی التستر " کہ عورت کے پردے کا لحاظ کیا گیا ہے عورت حقیقت میں اسی وقت عورت ہے جب وہ باپردہ اور باحیاء ہو۔ انسان اور حیوان میں فرق ہی حیاء سے سمجھ میں آتا ہے جب حیاء ہی نہ ہو تو انسان کو حیوان سے اشرف سمجھنا حماقت سے خالی نہیں

اعتراض: نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے تو پتہ چلتا ہے کہ عورتوں کو مسجد میں جانے سے منع نہ کیا جائے تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ عورتوں کا گھر میں نماز پڑھنا افضل ہے احادیث میں تطبیق کیسے ہوگی۔ حدیث پاک کو دیکھیں۔

" عن ابن عمر قال قال رسول النبی ﷺ اذا استأذنت امرأة احدکم

الی المسجد فلا یمنعنها "(بخاری، مسلم، مشکوۃ باب الجماعۃ وفضلها)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کسی ایک سے عورت مسجد میں جانے کی اجازت طلب کرے تو اسے ہرگز منع نہ کرو۔

جواب: اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اس حدیث میں مسجد میں نماز ادا کرنا بہتر نہیں فرمایا بلکہ صرف یہ فرمایا کہ عورت اگر مسجد میں جانے کی اجازت طلب کرے تو اسے روکو نہیں۔ اس کی تائید میں ایک اور حدیث پاک کو دیکھیں جس سے واضح ہو جائے گا کہ ہر حال میں عورت کا گھر میں نماز پڑھنا ہی بہتر ہے

" عن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ لا تمنعوا نساء کم المساجد وبیوتھن خیر لھن " (رواہ ابوداؤد مشکوۃ باب الجماعۃ)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی عورتوں کو مساجد سے نہ روکو اور ان کے گھر ان کے لئے بہتر ہیں۔ حدیث شریف کی شرح علامہ علی قاری رحمہ اللہ بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

" (لا تمنعوا نساء کم المساجد) ای للصلوۃ والطواف (**وبیوتھن**) ای عبادتھن فیھا (خیر لھن) مطلقا ویستثنی طواف الحج والعمرۃ او من الصلوۃ فی المسجد " (مرقاۃ)

عورتوں کو مساجد سے نہ روکنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو نماز اور طواف سے نہ روکو اور ان کا اپنے گھروں میں عبادت کرنا ان کے لئے مطلقا بہتر ہے۔ البتہ حج اور عمرہ کا طواف یا مسجد میں نماز ادا کرنا اس سے مستثنی ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ عورت کا نماز اپنے گھر میں ادا کرنا ہر حال میں اس کے لئے بہتر ہے۔ البتہ حج اور عمرہ کا طواف کرنا اور ایام حج

اور عمرہ کے دوران مسجد میں نماز ادا کرنے سے منع کرنا جائز نہیں۔ ہمارے زمانہ میں عورتوں کا مساجد میں نماز ادا کرنا مطلقا مکروہ ہے۔ کیونکہ اب فتنہ کا دور ہے فتنہ سے بچنا ممکن نہیں۔

" قال المظھر فیہ دلیل علی جواز خروجھن الی المسجد للصلوۃ لکن فی زماننا مکروہ قال ابن الملک لفتنۃ قلت ویؤیدہ خبر الشیخین عن عائشۃ لو ان رسول اللہ ﷺ رای ما احدث النساء

لمنعهن المسجد کما منعت نساء بني اسرائيل "(مرقاة ج ۳ ص ۵۶)

نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں عورتوں کا مساجد میں جانا جائز تھا۔ لیکن ہمارے زمانہ میں مکروہ ہے کیونکہ یہ فتنہ کا دور ہے اور اسی مسئلہ کو بخاری و مسلم کی حدیث سے تائید حاصل ہوتی ہے۔ وہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ یقینی بات ہے اگر رسول اللہ ﷺ اس حال کو دیکھتے جو آج عورتوں میں پایا جاتا ہے تو آپ عورتوں کو مساجد سے آنے سے منع فرماتے جیسا کہ بنی اسرائیل کی عورتوں کو منع کیا گیا تھا۔

سبحان اللہ یہ تو صحابہ کرام کے زمانہ اور سلف صالحین کے زمانہ کی بات ہے۔ اب جب ہم نے یہود و ہنود کو خوش کرنے کے لئے ترقی پذیر ہونے اور آزادی نسواں کا نعرہ بلند کیا۔ تو آج مسلمانوں کی عورتیں عریانی میں ان کی عورتوں سے پیچھے نہیں بلکہ دو قدم آگے ہیں۔ اس لئے اگر ان کو مساجد میں آنے کی کھلی چھٹی دے دی جائے تو مساجد کا تقدس پائمال ہو کر رہ جائے، رحمٰن کے خوش ہونے کے بجائے شیطان خوش ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن ام مکتوم نابینا صحابی کی حدیث کی وضاحت:

" عن ابی هريرة قال اتى النبی ﷺ رجل اعمى فقال يا رسول الله انه ليس لي قائد يقودني الى المسجد فسأل رسول الله ﷺ ان يرخص له فيصلي في بيته فرخص له فلما ولى دعاه فقال هل تسمع النداء بالصلوة قال نعم قال فاجب " (رواه مسلم، مشکوة باب الجماعة وفضلها)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک نابینا صحابی حاضر ہوئے، انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرا کوئی قائد نہیں جو مجھے مسجد میں لائے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے رخصت طلب کی کہ وہ گھر ہی نماز ادا کرلیا کریں۔ آپ نے ان کو رخصت دے دی۔ جب وہ واپس لوٹنے لگے تو آپ نے ان سے پوچھا کیا تم نماز کے لئے اذان سنتے ہو انہوں نے عرض کیا ہاں، آپ نے فرمایا پھر قبول کرو (یعنی پھر تم مسجد میں آ کر ہی نماز جماعت سے ادا کیا کرو)۔

اس حدیث سے بعض حضرات نے جماعت سے نماز ادا کرنا فرض عین قرار دیا۔ اور بعض حضرات نے فرض کفایہ کہا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ واجب ہے۔ (مرقاة)

لیکن صحیح یہ ہے " الجماعة سنة مؤكدة اى قوية يشبه الواجب فى القوة " (ھدایہ مع حاشیہ) جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا سنت مؤکدہ ہے البتہ اس میں بہت قوی تاکید پائی گئی لہٰذا واجب کے قریب ہے۔ اصل میں حدیث پاک کا مطلب یہ ہے " لا اجد لک رخصة تحصل لک فضيلة الجماعة من غير حضورها " کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہیں اس طرح رخصت نہیں دیتا کہ تمہیں جماعت میں حاضر ہونے کے بغیر ہی جماعت کا ثواب حاصل ہو جائے۔ نبی کریم ﷺ کو یہ علم عطا کر دیا گیا تھا کہ ان کے سوال کا مطلب یہ ہے کہ میں جماعت میں نہ حاضر ہوں لیکن مجھے ثواب جماعت کامل جائے۔

امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ کا مذہب یہ ہے کہ نابینا کو جماعت میں حاضر ہونا ضروری نہیں۔ اس کا مطلب واضح ہے کہ نابینا شخص یا کوئی اور معذور جماعت میں حاضر نہ ہو تو اس پر ترک جماعت کی وعید نہیں۔ البتہ جماعت کا ثواب جماعت سے نماز ادا کرنے سے ہی حاصل ہوگا۔

" ولحديث الصحيحين انه عليه السلام رخص لعتبان حيث شكا بصره ان يصلى فى بيته "
(مرقاۃ ج ۳ ص ۵۴)

امام صاحب رحمہ اللہ کے مذہب کو بخاری اور مسلم کی حدیث سے تائید حاصل ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عتبان بن مالک کو گھر نماز ادا کرنے کی اجازت فرمائی جب انہوں نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں اپنی نظر (کی خرابی) کے متعلق عرض کیا۔

فائدہ: " والجماعة من خصائص الدين فانها لم تكن مشروعة فى دين من الاديان " (عنایہ)

یعنی جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا اس دین یعنی شریعت محمدیہ کی خصوصیات میں سے ہے کیونکہ پہلے کسی دین میں جماعت نہیں تھی۔ اور ﴿ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴾ سے ایک اور مسئلہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص جماعت میں رکوع میں امام کے ساتھ مل گیا تو اس نے رکعت کو پالیا۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

" من ادرک الامام راکعا فرکع قبل ان يرفع الامام رأسه فقد ادرک تلک الرکعة " (بیہقی ج ۲ ص ۹۰)

یعنی جس شخص نے امام کے سر اٹھانے سے پہلے اس کے ساتھ رکوع کو پالیا اس نے اس

رکعت کو پالیا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"من لم یدرک الامام راکعا لم یدرک تلک الرکعة" (بیهقی ج ۲ ص ۹۰)

جس نے امام کے ساتھ رکوع کو نہ پایا اس نے اس رکعت کو نہیں پایا۔

دونوں حدیثوں سے مسئلہ مکمل طور پر سمجھ میں آ گیا کہ امام کے ساتھ رکوع کو پالینا رکعت کو پالینا ہے اور امام کے ساتھ رکوع کو نہ پانا رکعت کو نہ پانا ہے۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ موقوف حدیث جو عقل سے ثابت نہ ہو سکے وہ مرفوع حدیث کے حکم میں ہوتی ہے۔ مرفوع احادیث سے بھی یہی مسئلہ ثابت ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"من ادرک رکعة من الصلوة مع الامام فقد ادرک الصلوة" (مسلم ج ۱ ص ۲۲۱)

جس شخص نے امام کے ساتھ نماز کی ایک رکعت پالی اس نے نماز کو پالیا۔

"ان رسول اللہ ﷺ قال من ادرک رکعة من صلوة من الصلوات فقد ادرکها الا انه یقضی مافاته" (نسائی ج ۱ ص ۹۵)

بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے نمازوں میں سے کسی نماز کی رکعت کو پالیا اس نے نماز کو پالیا۔ ہاں مگر جو اس سے رکعتیں رہ گئیں ان کو مکمل کر لے۔

(ماخوذ از التبیان مع البیان للکاظمی)

ایک حدیث پاک سے لوگ غلط فہمی کا شکار ہیں:

"عن ابی موسی الاشعری قال قال رسول اللہ ﷺ اثنان فما فوقهما جماعة" (ابن ماجه، مشکوة باب الجماعة وفضلها)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو اور دو سے زیادہ شخص جماعت ہیں۔

بخاری شریف کی ایک حدیث پاک بھی اس کی تائید کرتی ہے:

"اذا حضرت الصلوة فاذ ناثم اقیما فلیؤمکما اکبر کما"

جب نماز کا وقت ہو جائے تو اذان کہو پھر اقامت کہو پھر تم دونوں میں سے جو بڑا ہو وہ امامت کرائے

ان احادیث سے واضح ہے کہ جب نماز کا وقت ہو جائے تو دو آدمی ہوں یا دو سے زیادہ ہوں وہ

اذان کہہ کر اقامت کہہ کر جماعت کرالیں۔لیکن یہ ایک مرتبہ کی بات ہے۔یا دوران سفر کی بات ہے یار لوگوں نے سمجھا کہ گھر بیٹھ کر گپ شپ لگاتے رہو۔گلی کوچے میں بیٹھ کر راہ گزرنے والوں کو تنگ کرتے رہو، کرکٹ کھیلتے رہو پھر مسجد میں خواہ جماعت ہو چکی ہو۔پھر دو ہو جاؤ تو اور ایک مرتبہ جماعت کرالو، پھر دو اور جا کر نماز پڑھالو۔اس طرح دو دو مسجد میں آتے رہو جماعتیں کراتے رہو، امام اور مقتدی سر سے ننگے۔امام صاحب سنت رسول اللہ ﷺ کے تارک داڑھی چٹ۔

اگر اس حدیث کا یہی مقصد ہے جو ایک خاص نظریئے والوں نے سمجھ رکھا ہے تو مساجد بنانے اور جماعت کرانے کے مقاصد ہی فوت ہو جائیں گے۔جماعت کے مقاصد میں تو اجتماعیت ہے۔دو دو کے گروہوں میں آ کر بار بار جماعت کرانے میں تو انفرادیت ہے۔

مسجد میں دوسری جماعت کا حکم:

"ویکرہ تکرار الجماعة باذان واقامة فی مسجد محلة لا فی مسجد طریق او مسجد لا امام ولا مؤذن" (در مختاب باب الامامة)

محلّہ کی مسجد اذان واقامت کے ساتھ دوسری جماعت کرانا مکروہ ہے البتہ راستہ کی مسجد ہو، یا ایسی مسجد ہو جہاں کوئی امام اور مؤذن نہ ہو وہاں دوسری جماعت جائز ہے۔

اس کی وجہ کیا ہے؟ " ولان فی الاطلاق ھکذا تقلیل الجماعة معنی فانھم لا یجتمعون اذا علموا انھم لا تفوتھم " (شامی) اس لئے کہ اگر مطلقاً دوسری جماعت کو جائز قرار دے دیا جائے تو اس سے جماعت میں کمی واقع ہوگی۔جماعت کی وجہ درحقیقت لوگوں کا مجتمع ہونا ہے وہ اجتماعیت ختم ہو جائے گی، اس لئے کہ جب ہر شخص کو پتہ ہوگا کہ دو مل کر جائیں گے تو پھر جماعت کرالیں گے، ہماری جماعت تو نہیں رہ سکتی، تو یقیناً جماعت میں ملنے کی کوئی کوشش نہیں کرے گا۔

بوقت عذر جماعت کو ترک کرنا جائز ہے:

" عن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ اذا وضع عشاء احدکم واقیمت الصلوة فابدؤا بالعشاء ولا یعجل حتی یفرغ منه وکان ابن عمر یوضع له الطعام و یقام الصلوة فلا یاتیھا حتی یفرغ منه واله لیسمع قراء ة الامام " (بخاری، مسلم، مشکوة باب الجماعة وفضلھا)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب شام کا کھانا تم میں سے کسی ایک کے پاس رکھ دیا جائے اور جماعت کھڑی ہو جائے تو (نماز کی طرف آنے کی) جلدی نہ کرو۔ پہلے کھانا کھالو، یہاں تک کہ کھانے سے فارغ ہو جاؤ (تو نماز ادا کرو) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے سامنے جب طعام رکھ دیا جاتا اور جماعت کھڑی ہو جاتی تو آپ جماعت میں شریک نہیں ہوتے تھے یہاں تک کہ کھانے سے فارغ ہو جاتے حالانکہ آپ امام کی قراءت سن رہے ہوتے۔

☆ **" وعن عائشة رضی الله عنهما انها قالت سمعت رسول الله ﷺ لا صلوة بحضرة طعام ولا هو يدافعه الاخبثان "** (رواه مسلم، مشكوة باب الجماعة وفضلها)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، طعام کے حاضر ہونے پر نماز ادا نہ کی جائے اور پیشاب، پاخانہ کی حاجت کے وقت نماز ادا نہ کی جائے۔

وضاحت: ان دونوں احادیث کا مطلب علامہ نووی رحمہ اللہ کی اس عبارت سے واضح ہو جاتا ہے۔

" قال النووی كراهة الصلوة بحضرة الطعام الذی یرید اكله لما فيه من اشتغال القلب وذهاب كمال الخشوع وكذالک كراهتها مع مدافعة الاخبثين ويلحق ما في مغاه وهذا اذا كان في الوقت سعة فلو تضيق الوقت اشتغل بالصلوة على حالة حرمة للوقت " (مرقاة ج ۳ ص ۵۵)

علامہ نووی رحمہ اللہ نے فرمایا طعام کے حاضر ہوتے وقت نماز تب مکروہ ہوگی جب کہ آدمی کو کھانے کی بہت زیادہ خواہش ہو کہ نماز وہ حضور قلب (دل کے حاضر ہونے کے ساتھ) سے ادا نہ کر سکے، اگر کھانے کی اتنی خواہش نہیں تو نماز پہلے ادا کرنی ضروری ہے یہی حال پیشاب، پاخانہ کی حاجت کا ہے۔ اگر حاجت اس طرح ہے کہ نماز ادا کرنی مشکل ہو تو نماز ادا کرنا مکروہ ہے اور اگر حاجت اس طرح نہیں تو مکروہ نہیں۔

اسی طرح ہر عذر جو ان عذروں کی طرح ہو اس کا یہی حکم ہے کہ شدید عذر کے وقت جماعت کے ترک کرنے میں کوئی حرج نہیں یہ تمام صورتیں اس وقت ہیں جب وقت میں وسعت پائی جائے اگر وقت میں گنجائش نہیں، وقت کے فوت ہونے کا خطرہ ہے تو وقت کا احترام کرتے ہوئے جہاں تک ممکن ہو سکے نماز پہلے ادا کرے۔ "جہاں تک ممکن ہو سکے" کی قید راقم نے اس لئے لگائی ہے کہ پیشاب پاخانہ کی شدید حاجت میں نماز ادا کرنا ممکن ہی نہیں۔

عالم شخص کو امام مقرر کیا جائے:

" عن ابن مسعود قال قال رسول الله ﷺ یؤم القوم اقرؤهم لکتاب الله فان کانوا فی القراءة سواء فاعلمهم بالسنة فان کانوا فی السنة سواء فاقدمهم هجرة فان کانوا فی الهجرة سواء فاقدمهم سنا "

(مسلم مشکوۃ باب الامامة)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قوم کی امامت کرائے جو کتاب اللہ کا ان سے زیادہ قاری ہو اگر قراءت میں برابر ہوں تو عالم بالسنۃ امامت کرائے۔ اگر علم میں برابر ہوں تو ان میں سے جو پہلے ہجرت کرنے والا ہو وہ امامت کرائے۔ اگر ہجرت میں برابر ہوں یعنی ایک ساتھ ہجرت کرنے والے ہوں تو وہ شخص امامت کرائے جو ان میں سے زیادہ عمر والا ہو۔

اعتراض: تم نے عنوان میں یہ ذکر کیا ہے کہ عالم شخص کو امام مقرر کیا جائے، حالانکہ نبی کریم ﷺ نے پہلے قاری کا ذکر فرمائے، اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ قاری کا حق پہلے ہے۔

جواب: نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد اپنے زمانہ کے صحابہ کرام کو فرمایا صحابہ کرام کے منصب کو دیکھ کر ہی حدیث پاک کو سمجھا جا سکتا ہے۔

" انما قدم النبی ﷺ الا قرأ لان الأ قرأفی زمانه کان افقه اذلو تعارض فضل القراءة فضل الفقه قدم الافقه اذا کان یحسن من القراءة ما تصح به الصلوة وعلیه اکثر العلماء "

اکثر علماء سلف صالحین نے حدیث پاک کی وضاحت میں یہی بیان فرمایا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قراءت میں فضیلت رکھنے والے کو پہلے ذکر کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے زمانہ میں تمام قاری حضرات عالم ہوا کرتے تھے۔ لیکن اب تمام قراء عالم نہیں ہوتے اس لئے اگر قاری بھی ہوں اور علماء بھی ہوں تو علماء کو امامت کے لئے منتخب کیا جائے جب کہ عالم اس طرح قرآن پاک پڑھ سکتا ہو جس سے نماز درست ہو جائے۔

مقام افسوس: آج کل امامت کے انتخاب کیلئے جہلاء کی کمیٹیاں ہوتی ہیں، جو دین سے بے خبر ہوتے ہیں فقہی مسائل سے نا آشنا ہوتے ہیں۔ جب ایسے جہلاء نے امام کو منتخب کرنا ہے تو

یقیناً وہ جاہل کا ہی انتخاب کریں گے صرف آواز دیکھیں گے، اسکے شعر پڑھنے کو دیکھیں گے، یہ معلوم نہیں کہ وہ کیا کر رہا ہے کہیں اسکے لغویات کفر تک پہنچانے والے تو نہیں ۔سینکڑوں مثالوں میں سے ذرا دو مثالیں دیکھئے ہاں جی ہمارے مولوی صاحب نے غوث پاک کی بڑی خوب شان بیان کی ۔

آپ نے بتایا ہے کہ نبی ﷺ جب معراج کو گئے تو ایک مشکل مقام پر غوث پاک نے آپ کو کندھا دیا، ایک اور مثال دیکھئے، ہاں جی ہمارے مولوی صاحب نے بتایا کہ غوث پاک حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی بلند شان رکھتے ہیں، وہ کیسے؟ جی آپ نے بڑی دلیل سے بیان کیا ہے، دلیل آپ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ غوث پاک نے بیان فرمایا ہے:

" قدمی هذه علی رقبة کل ولی الله " میرا یہ قدم ہر ولی کی گردن پر ہے۔

ظاہر بات یہ ہے کہ آپ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی امت کے تمام ولیوں کی گردنوں پر میرا یہ قدم ہے ۔عیسیٰ علیہ السلام نے بھی نبی کریم ﷺ کے امتی ہونے کی حیثیت میں تشریف لانا ہے ۔لہٰذا ان کی گردن پر بھی غوث پاک کا قدم ہے۔ (معاذ اللہ)

معاذ اللہ ثم معاذ اللہ کیسے لغویات ہیں یہ جو کفر تک پہنچا رہے ہیں لیکن ہمارے عوام کالانعام ایک جاہل کالحمار سے سن کر سر دھن رہے ہیں، عش عش کر رہے ہیں کہ جاہل مطلق نے ان کو سریلی آواز سے بیان کیا ہے، عوام نے کہا واہ کیا خوب۔

راقم نے یہ مثالیں دے کر حق بیان کر دیا ہے ۔ بات واضح ہے کہ حضرت غوث اعظم شاہ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کا مقام اولیاء کرام میں بہت ہی بلند ہے لیکن آپ کسی صحابی کے مقام کو نہ پا سکے۔ اور کوئی صحابی کسی نبی کے مقام کو نہیں پہنچ سکا۔ تو یہ کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ نبی کریم ﷺ بھی غوث پاک کے محتاج ہوئے اور یہ کیسے تسلیم کیا جائے کہ غوث پاک کو عیسیٰ علیہ السلام پر معاذ اللہ برتری حاصل ہے۔

ائمہ حضرات اور مقتدی یہ ضرور یاد کریں:

" وعن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ ثلاثة لا تقبل منهم صلوتهم من تقدم قوما وهم له کارهون ورجل اتی الصلوة دبارا والدبار ان یاتیها بعد ان تفوته ورجل اعتبد محررة "

(رواه ابو داؤد و ابن ماجه ، مشکوة باب الامامة)

حضرت عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین شخصوں کی نماز قبول نہیں ہوتی:

(۱) جو شخص قوم کی امامت کرائے اور وہ اسے ناپسند کرتے ہوں۔

(۲) جو شخص وقت کے نکل جانے پر نماز ادا کرے۔

(۳) اور وہ شخص جو غلام ہو اور اپنے آپ کو آزاد سمجھے۔

وضاحت حدیث: وہ امام جس کو لوگ ناپسند سمجھیں اس امام کا ان لوگوں کو نماز پڑھانا مذموم ہے اور اس امام کی نماز قبول نہیں ہوگی۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سا امام اس حدیث پاک کی زد میں آتا ہے

" (وامام قوم) ای الامامة الکبری او امامة الصلوة (وهم له) وفی نسخة لها ای الامامة (کارهون) ای لمعنی مذموم فی الشرع وان کرهوا لخلاف ذلک فالعیب علیهم ولا کراهة قال ابن الملک ای کارهون لبدعته او فسقه او جهله اما اذا کان بینه وبینهم کراهة وعداوة بسبب امر دنیوی فلا یکون له هذا الحکم فی شرح السنة قیل المراد امام ظالم واما من اقام السنة فاللوم علی من کرهه وقیل هو امام الصلوة ولیس من اهلها فیتغلب فان کان مستحقا لها فاللوم علی من کرهه قال احمد اذا کرهه واحد او اثنان او ثلاثة فله ان یصلی بهم حتی یکرهه اکثر الجماعة "

(مرقاة ج ۳ ص ۷۳)

نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی " امام قوم " سے مراد عام ہے خواہ وہ امامت کبری کا امام ہے یعنی ملک کا حاکم ہے، یا مسجد کا امام ہو، لوگ اسے ناپسند سمجھیں لیکن ان کی ناپسندیدگی امام کی شرعی برائی کی وجہ سے ہو اگر وہ شرعی برائی کے بغیر ہی کسی اور وجہ سے امام کو برا سمجھیں تو عیب ان لوگوں پر ہوگا، امام کا نماز پڑھانا بغیر کسی کراہت کے صحیح ہے، ابن الملک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ لوگ امام کو اس کی بدعات اور اس کے فسق اور اس کی جہالت کی وجہ سے ناپسند کریں تو امام کا امامت کرانا مکروہ ہے لیکن اگر لوگ امام کو صرف دنیاوی ناراضگی کی وجہ سے ناپسند کریں تو امام کی امامت شرعی طور پر درست ہے شرعاً اسے مکروہ کہنا جرم ہوگا، اسی طرح حاکم اگر لوگوں پر ظلم کرے اور لوگ اسے برا سمجھیں تو اس حاکم کو حکومت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ لیکن حاکم اگر سنت کے مطابق عمل کر رہا ہو شرعی حدود کو نافذ کر رہا ہو۔ لوگوں کو قومی خزانہ لوٹنے سے منع کرتا ہو خود بھی قومی خزانہ کو نہ لوٹ رہا ہو تو اسے لوگ ناپسند سمجھیں تو

وہ لوگ برے ہیں لیکن حاکم اچھا ہے۔ اسی طرح مسجد کا امام اگر امامت کا شرعی طور پر مستحق نہیں اور وہ لوگوں پر غالب ہے اور امامت سے چمٹا ہوا ہے تو لوگوں کا ناپسند کرنا صحیح ہے اور اس کا امامت کرانا مکروہ ہے۔ لیکن اگر امام شرعی طور پر امامت کا مستحق ہے لوگ اس کی مخالفت دنیاداری طور پر کر رہے ہیں تو ملامت کے مستحق وہ لوگ ہیں جو امام پر اعتراض کر رہے ہیں۔ حضرت امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں ایک، دو، تین یعنی چند آدمیوں کو امام کا ناپسند کرنا امام کو امامت کے استحقاق سے زائل نہیں کرتا۔ ہاں جب اکثر لوگ امام کو ناپسند سمجھیں تو پھر امام خود ہی ہٹ جائے تو یہی امام کے لئے بہتر ہے۔

راقم کو اکثر طور پر اصلاحی کمیٹیوں میں شرکت سے یہ معلوم ہوا کہ زیادہ طور پر سیاسی اختلافات، دنیاوی اختلافات اور ذاتی اختلافات کی وجہ سے کمینے لوگوں نے ائمہ کرام پر بدکاری جیسے الزامات لگائے ہیں۔ ایسے کمینے لوگوں سے بچنے کے لئے ائمہ کرام خود ہی معزول ہو جائیں تو ان کے لئے یہی بہتر ہوتا ہے۔

دبار کی وضاحت خود ہی حدیث پاک میں موجود ہے کہ وقت کے نکل جانے پر نماز ادا کرے، یا وقت کے نکلنے کے قریب مکروہ وقت میں نماز ادا کرنا کامل مقبولیت کا سبب نہیں ہے۔

رجل اعتبد محررۃ کے دو معانی بیان کئے گئے ہیں ایک یہ ہے کہ انسان غلام ہو یا لونڈی وہ مالک کی خدمت نہ کریں اس کے حکم کی پرواہ نہ کریں تو ان کی نماز کی قبولیت میں کمال نہیں ہوا۔ اس معنی کو دوسری حدیث سے تائید بھی حاصل ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ جو غلام بھاگ جائے اس کی نماز کامل طور پر قبول نہیں ہوتی۔ اور دوسرا معنی یہ ہے کہ آزاد شخص ہر وقت حکام وغیرہ کی خدمت میں غلاموں کی طرح مصروف رہے اور نماز جلدی جلدی آ کر ادا کرے اس کی نماز بھی کامل طور پر قبول نہیں ہوتی۔

تنبیہ: دوسری احادیث میں یہ بھی ذکر ہے جس عورت کا خاوند اس پر رات ناراضگی میں گزارے اس عورت کی نماز بھی کامل طور پر قبول نہیں ہوتی۔ دو مسلمان آپس میں ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہیں، فتنہ و فساد برپا رکھیں تو ان کی نماز بھی کامل طور پر قبول نہیں ہوتی۔

مفتیانِ کرام یہ مسئلہ یاد رکھیں:

" ولا بأس بامامة الاعمى والاعرج والاشل والاقطع والخصي والعبد اذا كان كل واحد منهم عالما بالصلوة وقال ابن وهب لا ارى ان يؤم الا قطع والاشل لانه منتقص عن درجة الكمال وكرهت امامته لاجل النقص وخالفه جمهور اصحابه وهو الصحيح لانه عضوا لا يمنع فقده فرضا من فروض الصلوة فجازت الامامة الراتبة مع فقده كالعين وقدروى انس ان النبي ﷺ استخلف ابن ام مكتوم يؤم الناس وهو اعمى وكذا الاعرج والاقطع والاشل والخصي قياسا ونظرا ...... والله اعلم...... وقدروى عن انس بن مالك انه قال في الاعمى وما حاجتهم اليه وكان ابن عباس وعتبان بن مالك يؤمان وكلاهما اعمى وعليه عامة العلماء "

(قرطبی ج ۱ ص ۳۵۴)

امام اگر عالم ہو خواہ نابینا ہو، یا لنگڑا ہو اس کے ہاتھ پاؤں شل ہوں یا کٹے ہوئے ہوں، خصی ہو یا غلام ہو ہر حال میں اس کی امامت صحیح ہے۔ اس میں کوئی کراہت نہیں۔ فقہاء کرام بھی نابینا یا غلام کی امامت کو اسی لئے مکروہ قرار دیتے ہیں کہ وہ اکثر الاوقات جاہل ہوتے ہیں۔ لیکن جب عالم ہوں تو ان کی امامت صحیح ہے۔ صرف ابن وہب کا قول ہے کہ جس شخص کے ہاتھ پاؤں شل ہوں یا کٹے ہوئے ہوں وہ درجہ کمال سے ناقص ہے لہذا اس کی امامت اس نقص کی وجہ سے مکروہ ہے۔ لیکن ابن وہب کا قول جمہور کے مذہب کے مخالف ہے۔ صحیح وہی ہے جو جمہور نے کہا ہے کہ کسی عضو کا ناقص ہونا نماز کے ارکان میں خلل انداز نہیں جس طرح ایک آنکھ کے ضائع ہونے سے امامت میں کوئی نقص نہیں۔ اسی طرح کسی عضو سے معذور ہونے سے بھی اس کی امامت میں کوئی فرق نہیں پڑتا...... حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ (جب غزوہ میں تشریف لے گئے) نے اپنا خلیفہ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کو مدینہ طیبہ میں خلیفہ بنایا وہ لوگوں کی امامت بھی کراتے رہے حالانکہ وہ نابینا تھے۔

اسی طرح حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے کہ نابینا شخص کی امامت پر لوگوں کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے جب کہ حضرت ابن عباس اور عتبان بن مالک رضی اللہ عنہما امامت کراتے رہے حالانکہ وہ دونوں نابینا تھے۔

صفوں کو سیدھا رکھنا:

" وعن انس قال اقیمت الصلوۃ فاقبل علینا رسول اللہ ﷺ بوجهه فقال اقیموا صفوفکم وتراصوا فانی اراکم من وراء ظهری "

(رواہ البخاری ، مشکوۃ باب تسویة الصفوف)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نماز کے لئے اقامت کی گئی تو رسول اللہ ﷺ نے ہماری طرف توجہ فرمائی اور ارشاد فرمایا اپنی صفوں کو سیدھا برابر رکھو اور ایک دوسرے سے مل کر کھڑے ہو، بیشک میں تمہیں پیچھے سے بھی دیکھتا ہوں۔

وضاحت حدیث:

اقیمت الصلوۃ: " ای فعلت اقامة الصلوۃ " یعنی نماز کے لئے اقامت کہی گئی، یا یوں کہیں جب نماز کو قائم کرنے کی تیاری کی گئی۔ (اقیموا صفوفکم) ای عدلوا واتموا " حدیث شریف میں جو لفظ " اقیموا صفوفکم " کے استعمال ہیں ان کا معنی یہ ہے صفوں کو سیدھا برابر رکھو اور صفوں کو مکمل کرو۔

(از مرقاة)

☆ " عن انس قال قال رسول اللہ ﷺ رصوا صفوفکم وقاربوا بینها وحاذوا بالاعناق فوالذی نفسی بیده انی لاری الشیطان یدخل من خل الصف کانها الخذف "

(رواہ ابو داؤد ، مشکوۃ باب تسویة الصفوف)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا صفوں کو درست رکھو ایک دوسرے سے مل کر کھڑے ہو صفوں میں ایک دوسرے کے قریب ہو جاؤ اور گردنوں کو برابر کرو، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے بیشک میں شیطان کو صف کی خالی جگہ میں ایسے گھستے ہوئے دیکھ رہا ہوں جیسے بھیڑ بکری کا چھوٹا بچہ خالی جگہ میں گھس جاتا ہے۔

وضاحت حدیث:

" رصفوا صفوفکم " کا معنی یہ کہ صفوں کو سیدھا رکھو اور ایک دوسرے سے مل کر کھڑے ہوں درمیان میں خالی جگہ نہ رہے، خیال رہے " رصوا " اور " تراصوا " کے معانی " بنیان مرصوص " سے لئے ہوئے ہیں۔ (وقاربوا بینها) یعنی صفوں کے درمیان قرب رکھو ایسا نہ ہو کہ دو صفوں کے درمیان اتنی کشادگی رکھو کی ان کے درمیان ایک اور صف سما سکے۔ تمہارا صفوں میں جسمانی

طور پر ایک دوسرے مل کر کھڑا ہونا تمہاری روحوں کے درمیان اتصال کا ذریعہ ہوگا۔ یعنی تمہارے دل ایک دوسرے کے قریب ہوں گے ۔ اور شیطان تمہارے درمیان گھس کر تمہارے درمیان نفاق (منافقت) پیدا نہیں کرے گا۔

" والظاهر ان محله حيث لا عذر كحر او برد شديد " اگر کسی عذر کی وجہ سے صف میں اس طرح کھڑے ہوں کہ ایک دوسرے سے معمولی فاصلہ رہے تو کوئی حرج نہیں جیسا کہ شدید گرمی اور شدید سردی میں ضرورت ہوتی ہے کہ کچھ فاصلہ رہے۔ گرمی میں تو واضح ہے اور سردیوں میں اس لئے ضرورت ہوتی ہے کہ لوگوں نے چادریں اوڑھ رکھی ہوتی ہیں بہت قرب اور بہت زیادہ مل کر کھڑا ہونا رکوع اور سجدہ کرنے میں دشواری کا سبب بنتا ہے۔

﴿وَحَاذُوا بِالْاَعْنَاقِ﴾: اس کا ظاہری معنی یہ ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ گردنیں برابر رکھو احادیث کا ظاہری ترجمہ دیکھنے والے مطالب کو نہ سمجھنے والے یار لوگ ایک جیسے قد والے لوگ تلاش کر کے ایک دوسرے کے ساتھ کھڑا کریں تب اس پر عمل ہو سکے گا۔ نہیں نہیں اس کا یہ مطلب ہی نہیں اسی لئے علامہ طیبی رحمہ اللہ نے واضح طور پر بیان فرمایا:

" ولا عبرة بالاعناق اذ ليس على الطويل ان يجعل عنقه محاذ يا للقصير "

حدیث شریف کا ظاہری معنی معتبر ہی نہیں اس لئے کہ لمبے قد والے شخص کی گردن چھوٹے قد والے کی گردن کے برابر نہیں ہو سکتی۔

ہاں ذرا غور کیجیے حدیث پاک کا مطلب کیا ہے؟

" (وحاذوا بالاعناق) اى بان لا يترفع بعضكم على بعض بان يقف في مكان ارفع من مكان الآخر "

یعنی بعض کو بعض سے اوپر، نیچے کھڑا ہونے سے منع کیا گیا ہے۔ (از مرقاة ج ۳ ص ۷۱)

یہ بھی خیال رہے کہ امام کے ساتھ کچھ صفیں برابر جگہ پر ہوں، پھر اور صفیں کچھ اوپر دوسری منزل میں ہوں اور کچھ نیچے تہہ خانہ وغیرہ میں ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

اس حدیث کی وضاحت سے ایک اور مسئلہ حل ہو گیا:

ایک اور حدیث پاک کی طرف توجہ کیجئے۔

" عن انس عن النبى ﷺ قال اقيموا صفوفكم فانى اراكم من وراء

ظهری و کان احدنا یلزق منکبه بمنکب صاحبه و قدمه بقدمه "
(بخاری باب الزاق المنکب بالمکب و القدم بالقدم فی الصف)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا اپنی صفوں کو درست رکھو بیشک میں تمہیں پیٹھ کے پیچھے دیکھتا ہوں اور ہم سے کوئی ایک اپنے کندھے کو دوسرے کے کندھے سے ملاتا اور قدم کو قدم سے ملاتا۔

☆ " وقال النعام بن بشر رأیت الرجل منا یلزق کعبه بکعب صاحب "

نعمان بن بشیر کہتے ہیں میں نے دیکھا کہ ہم میں سے ایک شخص اپنے کعب کو دوسرے کے کعب سے ملاتا

جب پہلی حدیث سے واضح کیا جاچکا ہے کہ گردنوں کا برابر کرنے کا حکم اپنے ظاہر پر نہیں بلکہ اس سے مراد ہے کہ ایک دوسرے سے ایک ہی صف میں اوپر نیچے نہ کھڑے ہو۔اسی طرح ان دونوں حدیث کا بھی مقصد یہ ہے " المراد بذلک المبالغة فی تعدیل الصف و سد خلله " کہ صفوں کو درست کرنے اور ان میں کشادگی کو بند کرنے کو بہت مبالغہ سے ثابت کیا گیا ہے۔

کئی احادیث میں صفوں میں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کھڑا ہونے کا حکم دیا گیا ہے کہ درمیان میں خالی جگہ نہ چھوڑ و مختلف احادیث میں مختلف الفاظ مذکور ہیں تاہم ابوداؤد اور صحیح ابن خزیمہ اور مستدرک حاکم میں ایک حدیث مذکور ہے جس کے الفاظ تمام احادیثوں کے الفاظ کو جامع ہیں۔

" ان رسول الله ﷺ قال اقیموا الصفوف وحاذوا بین المناکب وسدو الخلل ولا تذروا فرجات للشیطان ومن وصل صفا وصله الله ومن قطع صفا قطع الله "
(فتح الباری ج ۲ ص ۲۴۷)

بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا صفوں کو سیدھا رکھو اور کندھوں کو برابر رکھو اور درمیان میں کشادگی کو بند کرو اور درمیان میں شیطان کے لئے خالی جگہ نہ چھوڑو جس نے صف کو ملایا اللہ تعالیٰ اسے ملائے گا (یعنی ان کے دل ایک دوسرے سے مل جائیں گے) اور جس نے صف کو منقطع کیا اللہ تعالیٰ اسے منقطع کرے گا۔

جن دو حدیثوں کا ذکر کیا جارہا ہے ان سے یہ ثابت کرنا کہ صف میں کندھے سے کندھا ملانا اور ٹخنے سے ٹخنہ ملانا ضروری ہے یہ ناکام کوشش ہے اس کی وجوہ دیکھیں مسئلہ خود واضح ہو جائے۔ایک وجہ تو یہ ہے " وکان احدنا " کا مفہوم یہ ثابت کرنا یقینی نہیں کہ اس کا یہی ترجمہ کیا جائے کہ ہم میں سے

ہر ایک (کندھے سے کندھا ملاتا) بلکہ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ ہم میں سے کوئی ایک کندھے کو کندھے سے ملاتا۔

پھر " یلزق " کا معنیٰ ملانا اور چمٹانا کرنا بھی ضروری نہیں۔ اس لئے کہ " ملزق " منہ بولے بیٹے کو بھی کہا جاتا ہے۔ اسے اپنی طرف منسوب تو کیا جا سکتا ہے لیکن متصل ہونا اور چمٹنا معنیٰ مراد لینا درست ہی نہیں پھر کعب کا معنیٰ ٹخنہ کرنا ضروری نہیں اس لئے کہ وضوء کے مسائل میں " کعب " کا معنیٰ ٹخنہ ہے حج کے مسائل میں " کعب " کا معنیٰ " معقد الشراک " لیا گیا ہے یعنی پاؤں کا اوپر ہڈی والا حصہ جہاں تسمہ ہوتا ہے اور " کعب " کا معنیٰ ایڑی بھی لیا گیا۔

تمام احادیث کا مجموعی مفہوم یہ ہے کہ کندھے کو کندھے کے برابر رکھو، قدم کو قدم کے برابر رکھو، صف کو درست رکھو درمیان میں جگہ خالی نہ چھوڑو۔ اس لئے کندھے چڑھا کر، یا کندھے نیچے کر کے دوسرے کے کندھے سے ملانا اور پاؤں پھیلا کر ایک دوسرے کے ٹخنوں سے ٹخنے ملانا احادیث کا مطلب نہیں۔ اور بہت واضح بات ہے کہ رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے تکلف کا حکم نہیں دیا گیا۔ کندھوں کو کندھوں سے ملانا اور ٹخنوں کو ٹخنوں سے ملانا، اور کھڑے ہونا اور اسی حال میں رکوع اور سجدہ کرنا کسی طرح بھی ممکن نہیں اس پر عمل کرنے کی ناکام جسارت ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کا کوئی عمل ایسا نہیں جسے لوگ عیب سمجھیں۔

سب حضرات کو دعوت فکر دیتا ہوں اور انصاف کی توقع رکھتا ہوں کہ ذرا غور کریں اور انصاف کی آنکھ سے غیر مقلدوں کو بھی نماز جماعت سے ادا کرتے ہوئے دیکھو اور حنفیوں کو بھی دیکھو تو خود بخود سمجھ آ جائے گا کہ اونٹ کی طرح پاؤں پھیلا کر کھڑا ہونا اور طبعی طور پر پاؤں جتنے کھلے ہوتے ہیں اسی مقدار میں کھلے رکھ کر کھڑا ہونا ان میں سے مہذب طریقہ کون سا ہے اور عیب دار کون سا ہے۔ اور لطف کی بات ہے کہ حدیث میں صف کو درست کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس کے ظاہری الفاظ سے غلطی کھانا اور حقیقی مطلب کو نہ سمجھنا تو غیر مقلدوں کا طریقہ چلا آ رہا ہے لیکن ان احادیث سے اکیلے نماز پڑھتے ہوئے پاؤں کو پھیلا کر کھڑا ہونا کہاں سے ثابت ہے۔

دینی مدارس کے طلباء اس مسئلہ کو بھی بخوبی سمجھتے ہیں کہ " با " الصاق کے لئے آتی ہے اور الصاق کا معنیٰ ہے "اتصال الشئی بالشئی "ایک چیز کا دوسری چیز سے متصل ہونا پھر اتصال کی دو قسمیں ہیں۔

اتصال حقیقی اور اتصال مجازی۔ اتصال حقیقی کی مثال " بـــه داء " ہے جس کا معنی ہے اس کے ساتھ بیماری حقیقی طور پر متصل ہے۔ اور اتصال مجازی کی مثال ہے " مررت بزید " جس کا معنی میں زید کے قریب سے گزرا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں زید سے چمٹ کر، اپنے جسم کو اس کے جسم سے ملا کر گزرا۔ جب " الصاق " اور " الـزاق " کا تقریبا ایک معنی ہے تو کیا وجہ ہے کہ الصاق کا مجازی معنی لے لیا جائے اور الزاق کا مجازی معنی نہ لیا جائے؟ وجہ صرف یہی ہے کہ علمی کمزوری ہے ظاہری معنی کو دیکھنا اور کسی عبارت کی اصل روح کو نہ سمجھنا ہے ورنہ اور کوئی وجہ ہی نہیں۔

﴿ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾

۱) '' کیا لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتے اور اپنی جانوں کو بھولتے ہو حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو تو کیا تمہیں عقل نہیں''

۲) '' کیا حکم دیتے ہو تم لوگوں کو بھلائی کا، اور چھوڑتے ہو اپنے نفسوں کو، حالانکہ تم پڑھتے ہو کتاب کیا تم عقل نہیں رکھتے''

شان نزول:

(۱) یہود کے علماء کو یہ خطاب ہے کیونکہ ان کے کئی رشتہ دار اسلام لے آئے تھے جب وہ ان کو ملتے تو یہ ان کو نصیحت کرتے تھے کہ تم نے جو اسلام قبول کیا ہے اس پر قائم رہو وہ سچا دین ہے اور محمد ﷺ تمہیں جس چیز کا حکم دیں اسے تسلیم کرو، اس لئے کہ وہ سچے نبی ہیں، لیکن وہ خود اسلام نہیں لا رہے تھے، اور نہ ہی نبی کریم ﷺ کو سچا نبی تسلیم کیا، تو رب تعالیٰ نے ان کی مذمت میں آیۃ کریمہ کو نازل کیا۔

(۲) یہود کی ایک جماعت نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے مشرکین عرب کو خبر دیتے تھے کہ بیشک آخری رسول تم میں سے ہی ظاہر ہوں گے اور حق کی دعوت دیں گے ہم بھی تمنا رکھتے ہیں کہ وہ تشریف لے آئیں تو ہم ان کی تابعداری کریں۔ لیکن جب نبی کریم ﷺ تشریف لائے تو انہوں نے حسد کیا اور ان سے کفر کیا، تو رب تعالیٰ نے ان کی مذمت میں اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا کہ تمہیں کیا ہوا کہ تم تو مشرکین عرب کو آخری نبی پر ایمان لانے کی ترغیب دے رہے تھے لیکن ان کے آنے پر تم خود ہی پھر گئے۔

(۳) یہود کے علماء لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طاعت کا حکم دیتے تھے اور کہتے تھے کہ تم گناہوں سے دور رہو، لیکن وہ خود اس کے الٹ کام کرتے تھے، یعنی برائیوں کا ارتکاب کرتے اور نیکیوں پر عمل کرنے کو چھوڑ دیتے تھے۔

(۴) یہود کے علماء لوگوں کو نماز پڑھنے اور زکواۃ دینے کا حکم دیتے تھے، لیکن خود نہ نماز ادا کرتے اور نہ زکواۃ دیتے تھے تو ان کی مذمت میں یہ آیۃ نازل ہوئی۔

(۵) لوگوں کو رب تعالیٰ کی راہ میں بطور صدقہ مال خرچ کرنے کا حکم دیتے تھے لیکن خود بخل کرتے تھے رب تعالیٰ کی راہ میں مال نہیں خرچ کرتے تھے، رب تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ ان کے دل سخت تھے وہ سود کھاتے تھے، اور حرام مال حاصل کرتے تھے تو ان کی مذمت میں یہ آیۃ نازل ہوئی۔

(۶) یہود میں سے منافقین لوگوں کو ظاہر طور پر ایمان لانے کا حکم دیتے تھے اور دل سے انکار کرتے تھے اور مخالفت کرتے تھے تو رب تعالیٰ نے ان کی مذمت میں آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا۔

(۷) یہود لوگوں کو توراۃ کی تابعداری کرنے اور اس پر ایمان لانے کا حکم دیتے تھے، لیکن نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری کے بعد خود انہوں نے توراۃ کی تابعداری کرنی چھوڑ دی اس لئے کہ توراۃ میں تو ذکر تھا کہ محمد مصطفیٰ ﷺ سچے نبی ہیں جب تشریف لائیں تو ان پر ایمان لانا۔ آپ کے آنے پر ایمان نہ لانا درحقیقت توراۃ کی تابعداری سے منہ موڑنا تھا۔

تنبیہ: مختلف جو شان نزول بیان کئے گئے ہیں ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ اس لئے کہ یہ تمام واقعات پہلے پیش آئے تو بعد میں آیۃ کریمہ کا نزول ہوا لہذا یہ تمام وجوہ ہی شان نزول ہیں۔ (از کبیر)

﴿ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ ﴾: ہمزہ استفہام کیلئے ہے جس میں تقریر مع توبیخ پائی گئی ہے یا تقریر مع تعجیب پائی گئی ہے تقریر مع توبیخ کا مطلب یہ ہے کہ ان کو ڈانٹتے ہوئے کہا گیا ہے کہ تم لوگوں کو نیکی کا حکم دے رہے۔ خود اس پر عمل چھوڑ رہے ہو تم ایسا کر تو رہے ہو لیکن تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے۔

تقریر مع تعجیب کا یہ مطلب ہے کہ تعجب ہے تم پر کہ لوگوں کو تم نیکی کا حکم دیتے ہو لیکن خود اس پر عمل نہیں کرتے "البر" جب باء کے نیچے زیر ہو تو اس کا معنی ہے "نیکی" اور جب "باء" پر زبر ہو تو اس کا معنی وسیع فضاء اس لئے البر بالکسر ماخوذ ہے البر بالفتح سے لہذا نیکی میں بھی وسعت معتبر ہے۔ (از بیضاوی)

'' البـــرا '' بالفتح کا معنی ''اجلال اور تعظیم'' بھی ہے اسی معنی کے لحاظ سے کہا جاتا ہے
''ولد بر وبار '' یعنی اولاد اپنے والدین کی تعظیم اور تکریم کرتی ہے۔ (از قرطبی)

" البر " کے معنی میں وسعت کیسے ہے، علامہ رازی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا:
" واما البر فھو اسم جامع لاعمال الخیر " یعنی ہر قسم کے نیکی کے کام کو " البر " کہا جاتا ہے۔
اسی معنی کے لحاظ سے کہا جاتا" بـــر الـــوالـــدین " والدین کی فرمانبرداری کرنا اور کہا جاتا ہے
"عـمـل مبـرور ای قد رضیه الله تعالیٰ "یعنی جس کام میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی پائی جائے اسے
''عمل مبرور'' کہا جاتا ہے۔اور " بر " بمعنی صدق بھی استعمال ہے جیسا کہا جاتا ہے " بـر فی یمینه "
وہ اپنی قسم میں سچا رہا، اس نے قسم کو توڑا نہیں اور اسی طرح کہا جاتا ہے " صدقت و بررت " تم نے سچ
اور حق کہا ہے۔اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ (وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى) فَاَخْبَرَ اَنِ الْبِرَّ جَامِعٌ لِّلتَّقْوٰی ﴾
یعنی یہ بتایا گیا ہے کہ نیکی وہی ہو سکتی ہے جس میں تقوی پایا جائے۔

''بر'' کی تین قسمیں:

(۱) " بـر فـی مـعـاملة الله تعالیٰ وعبادته " ان میں سے ایک قسم یہ ہے کہ انسان کا اللہ تعالیٰ سے جو معاملہ ہے اس میں نیکی کا کام کرے اور رب تعالیٰ کی عبادت کرے۔

(۲) " وبـر فـی معاملة الاقارب ومراعات حقوقھم " اور دوسری قسم یہ ہے کہ قریبی رشتہ داروں سے نیکی اور بھلائی سے درپیش آئے اور ان کے حقوق کی رعایت کرے۔

(۳) " وبـر فـی مـعـاملة الاجانب وانصافھم" اور تیسری قسم یہ ہے کہ اجنبی لوگوں سے اچھا سلوک رکھنا اور ان سے انصاف سے درپیش آنا۔ (از بیضاوی و شیخ زادہ)

﴿ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ ﴾ : " ای تـتـرکـون انـفـسـکـم والنسیان (بکسر النون) یکون بمعنی الترک وھو المراد ھنا وفی قوله تعالیٰ (نسوا الله فنسیھم) "

یعنی مطلب ان الفاظ کا یہ ہے کہ تم اپنی جانوں کو چھوڑتے ہو، نسیان (نون کی زیر سے) کا معنی ترک کرنا بھی آتا ہے اور وہی مرد ہے یہاں جیسا کہ " نسـوا الله فـنـسیـھـم " میں یہی معنی معتبر ہے کہ

انہوں نے اللہ کو چھوڑ دیا اور اللہ نے ان کو چھوڑ دیا۔ (قرطبی)

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے اس سے بھی زیادہ واضح تحریر فرمایا ہے:

"والمراد به هنا الترک لان احدا لا ينسى نفسه بل يحرمها ويتركها"

یہاں نسیان کا معنی ترک کرنا ہے کیونکہ کوئی شخص اپنے آپ کو بھولتا نہیں البتہ اپنے آپ کو محروم کر دیتا ہے اور چھوڑ دیتا ہے۔

گویا کہ ان کی غفلت کو مبالغہ سے ثابت کیا گیا کہ وہ خود نیکیوں کو چھوڑ کر اتنے غافل ہو گئے جیسا کہ جو چیز بھول جائے تو انسان اس سے غافل ہو جاتا ہے۔ (از روح المعانی)

نسیان اور سہو میں فرق: لغوی معنی کے لحاظ پر تو نسیان اور سہو کا فرق نہیں۔ دونوں کا معنی یہ ہے "عدم الاستحضار فی وقت الحاجة" ضرورت کے وقت کسی چیز کا یاد نہ آنا۔ البتہ اصطلاح فقہاء میں یہ فرق بیان کیا گیا ہے کہ ایک چیز کا نفس میں حاضر ہونے کے بعد غائب ہو جانا نسیان کہلاتا ہے اور سہو عام ہے کیونکہ کبھی علم کے بعد بھولنے کو سہو کہا جاتا ہے۔ اور کبھی علم حاصل ہونے کے بغیر ہی کسی چیز کا ذہن میں موجود نہ ہونے کو سہو کہا جاتا ہے۔ (البحر الرائق)

نسیان کی دو قسمیں: نسیان کی ایک قسم یہ ہے کہ انسان کے ذہن سے کوئی چیز نکل جائے اسے یاد نہ رہے لیکن اس کے ارادہ کو اس میں دخل نہ ہو اس کی طرف سے اس بھول میں کوئی اسباب نہ پائے جائیں۔ یہ بھول معاف ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا "رفع عن امتی الخطا والنسیان" میری امت سے خطا اور نسیان کو اٹھا لیا گیا ہے۔ یعنی میری امت کو خطا اور نسیان پر کوئی گرفت (پکڑ) نہیں۔

نسیان کی دوسری قسم یہ ہے کہ انسان خود اپنے ارادہ سے غافل ہو جائے، اس کے بھولنے میں اس کے اپنے اسباب کو دخل ہو کہ وہ یاد رکھنے کے اسباب کا لحاظ نہ رکھے۔ اس بھولنے پر گرفت ہوگی۔ اسی نسیان کے متعلق رب تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ:

﴿ فَكَذٰلِكَ اَتَتْكَ آيَاتُنَا فَنَسِيْتَهَا ﴾

اس طرح تمہارے پاس ہمارے آیات آئیں تم نے ان کو بھلا دیا۔

اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا:

"من حفظ القرآن ثم نسيه لقى الله تعالى هو اجذم"

جس نے قرآن یاد کیا پھر اسے بھلا دیا تو وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے گا جب کہ یہ شخص اجذم ہوگا۔

اجذم کا معنی کسی عضو کا کٹ جانا بے برکت ہونا، گویا کہ یوں کہہ دیا جائے کہ اس کی اللہ تعالیٰ سے ملاقات ہوگی تو اس شخص کی اللہ تعالیٰ کے تقرب کی ناک کٹی ہوگی یعنی اسے رب تعالیٰ کا قرب حاصل نہیں ہوگا۔

﴿ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ﴾ حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو۔ ان الفاظ مبارکہ سے ان کی اور زیادہ مذمت بیان کی گئی ہے کہ تم توراۃ پڑھتے ہو تمہیں معلوم ہے کہ عناد کرنے پر رب تعالیٰ کا عذاب ہوتا ہے اور نیکی کے چھوڑنے پر رب تعالیٰ کا مؤاخذہ ہوتا ہے اور عمل کا قول کے مخالف ہونا اور ہی مذموم ہے۔ تو تم بھی سمجھ لو کہ اگر تم نے نبی کریم علیہ السلام کی مخالفت کی تو اللہ تعالیٰ کے عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

﴿ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾: عقل کا معنی ہے روکنا اس لئے معنی یہ ہوگا " افلا تمنعون انفسکم من مواقعة هذه الحال المردية لكم " تم اپنے آپ کو اس ہلاکت والے مقام میں واقع ہونے سے روکتے کیوں نہیں۔ عقل کا معنی جب روکنا ہے تو اس کے مناسب چند الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے طلباء کرام ان الفاظ اور ان کے معانی کو مدنظر رکھیں تا کہ انہیں سمجھنے میں دشواری درپیش نہ آئے:

"عقال البعير " اونٹ کو باندھنے والی رسی کو کہا جاتا ہے کہ وہ اونٹ کو چلنے، پھرنے سے روکتی ہے۔

" العقل " کا ایک معنی دیت بھی ہے کیونکہ قاتل جب مقتول کے ورثاء کو دیت ادا کر دیتا ہے تو گویا کہ ان کو روک دیتا ہے کہ اب تم مجھے قتل نہیں کر سکتے کیونکہ میں نے دیت ادا کر دی۔ پیٹ کے بند ہونے کو اعتقال البطن اور زبان کے بند ہونے کو اعتقال اللسان اور قلعہ کو معقل کہا جاتا ہے اور عقل جہالت کی نقیض کو بھی کہا جاتا ہے یعنی کبھی علم اور عقل کا ایک ہی معنی لیا جاتا ہے۔ سرخ رنگ کا کپڑا جو عرب عورتیں اپنے ہودج پر ڈالتی تھیں کہ اس سے پردہ ہو جائے اسے بھی عقل کہا جاتا تھا۔

علم کے مطابق عمل نہ ہونے پر وعید:

"عن انس قال قال رسول الله ﷺ ليلة اسرى بى مررت على ناس تقرض شفاههم بمقاريض من نار فقلت يا جبريل من هؤلاء قال هؤلاء الخطباء من اهل الدنيا يا مرون الناس بالبر وينسون انفسهم وهم

یتلون الکتاب افلا یعقلون" (کذا فی مسند احمد قرطبی و کبیر)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا معراج کی رات کو میرا گزر کچھ لوگوں پر ہوا جن کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جا رہے تھے میں نے کہا اے جبرائیل یہ کون لوگ ہیں تو جبرائیل نے کہا یہ لوگ دنیا والوں میں خطباء ہیں جو لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے تھے اور خود ان پر عمل چھوڑ دیتے تھے حالانکہ وہ کتاب پڑھتے تھے یہ عقل کیوں نہیں رکھتے تھے۔

☆ عن اسامة بن زید قال سمعت رسول الله ﷺ یقول یؤتی بالرجل یوم القیامة فیلقی فی النار فتندلق اقتاب بطنه فیدوربها کما یدور الحمار (بالرحی) فیجتمع الیه اهل النار فیقولون یا فلان مالک الم (تکن) تامر بالمعروف وتنهی عن المنکر فیقول بلی قد کنت آمر بالمعروف ولا آتیه وانهی عن المنکر وآتیه"

(مسلم ، قرطبی ، کبیر ، مسند ، بخاری ، صابونی)

حضرت اسامہ بن زید کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ ایک شخص کو قیامت کے دن لایا جائے گا اسے آگ میں ڈالا جائے گا، اس کے پیٹ کی انتڑیاں باہر نکل آئیں گی وہ ان کو لے کر چکر کاٹ رہا ہوگا جیسا گدھا (چکی کے اردگرد) چکر کاٹ رہا ہوتا ہے۔ جہنم والے لوگ جمع ہو جائیں گے وہ کہیں گے اے فلاں شخص تجھے کیا ہو گیا۔ کیا تو اچھے کاموں کا حکم نہیں دیتا تھا کیا تو برے کاموں سے روکتا نہیں تھا۔ وہ کہے گا کیوں نہیں، تحقیق میں اچھے کاموں کا حکم دیتا تھا لیکن خود ان پر عمل نہیں کرتا تھا اور برے کاموں سے روکتا تھا لیکن خود وہی کام کرتا تھا۔

(الاقتاب : الامعاء : انتڑیاں فتندلق : فتخرج بسرعة : جلدی سے نکلنا)

☆ "وقال علیه الصلوٰة والسلام ان فی النار رجلا یتاذی اهل النار بریحه فقیل من هو یا رسول الله ؟ قال عالم لا ینتفع به"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ بیشک آگ میں ایک شخص ہوگا جس کی (آگ میں جلنے سے) بو سے لوگوں کو بڑی تکلیف ہو رہی ہوگی۔ آپ سے پوچھا گیا یا رسول اللہ وہ کون ہوگا؟ آپ نے فرمایا وہ عالم جس نے اپنے علم سے نفع حاصل نہیں کیا ہوگا۔

☆ "وقال علیه الصلوٰة والسلام مثل الذی یعلم الناس الخیر و لا یعمل به کالسراج یضئی للناس ویحرق نفسه"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص لوگوں کو نیکی کا حکم دے اور خود اس پر عمل نہ کرے اس کی مثال ایسے ہے جیسے کہ چراغ کی بتی لوگوں کو روشنی مہیا کرتی ہے۔ اور خود جلتی ہے۔

☆ " وعن الشعبی یطلع قوم من اهل الجنة الی قوم من اهل النار فیقولون لم دخلتم النار ونحن انما دخلنا الجنة بفضل تعلیمکم فقالوا انا کنا نأمر بالخیر ولا نفعله "

(من ابن عساکر فی ترجمة الولید بن عقبه ، کبیر ، صابونی)

شعبی کہتے ہیں جنت کے کچھ لوگ جہنم میں کچھ لوگوں کو دیکھیں گے تو کہیں گے تم آگ میں کیوں داخل ہوئے ہو؟ حالانکہ ہم تمہاری تعلیم کی برکت وفضیلت کی وجہ سے جنت میں داخل ہو گئے ہیں۔ وہ کہیں گے بیشک ہم نیکی کا حکم دیتے تھے اور خود اس پر عمل نہیں کرتے تھے۔

☆ " من وعظ بقوله ضاع کلامه " ومن وعظ بفعله نفذت سهامه "

جس شخص نے صرف زبانی زبانی وعظ کیا عمل نہ کیا اس نے اپنے کلام کو ضائع کر دیا اور جس نے اپنے اچھے اعمال سے وعظ کیا اس کا تیر لوگوں کے دلوں کے نشانہ پر لگا:

یعنی عامل کی سادہ گفتگو دلوں پر اثر کرتی ہے اور بے عمل کی خوبصورت تقریر بھی رائیگاں چلی جاتی ہے

☆ کسی شاعر نے کیا خوبصورت شعر نصیحت آموز کہے۔

یا ایها الرجل المعلم غیره هلا لنفسک کان ذا التعلیم

اے شخص غیر کو تعلیم دینے والے وہی تعلیم تو اپنے آپ کو کیوں نہیں دیتا

تو اور بیماروں اور کینہ رکھنے والوں کے لئے دواء کا انتخاب کرتا ہے کہ وہ صحیح ہو جائیں تو خود بیمار ہی ہے

ابدأ بنفسک فانهما عن غیها فاذ انتهت عنه فانت حکیم

اپنے نفس سے ابتداء کرو اسے بھٹکنے سے روکو جب وہ بھٹکنے سے رک گیا تو تم حکیم ہو گے۔

فهناک یقبل ان وعظت ویقتدی بالرای منک وینفع التعلیم

پس اس وقت تیرے وعظ کو قبول کیا جائے گا اور اقتداء کی جائے گی تیری رائے کی اور تعلیم نفع دے گی۔

بیان کیا گیا ہے کہ یزید بن ہارون بہت نیک، زاہد وعظ کرنے والے شخص تھے، جب وہ فوت ہو گئے تو ان سے خواب میں کسی شخص نے پوچھا، آپ سے رب تعالیٰ نے کیا سلوک کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے میری مغفرت فرما دی۔ میرے پاس قبر میں سوال کرنے دو فرشتے "منکر ونکیر"

آئے انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ " من ربک " تیرا رب کون ہے؟ میں نے ان سے کہا:

" اما تستحیان من شیخ دعا الناس الی اللہ تعالیٰ کذا و کذا سنة فتقولان له من ربک "

کیا تمہیں یہ خیال نہیں آتا کہ یہ شیخ تو کئی سال لوگوں کو اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے اور اس کی عبادت کی طرف بلاتا رہا تم اس سے پوچھ رہے ہو تیرا رب کون ہے۔

☆ پہلے بزرگوں میں سے ایک بزرگ حضرت شبلی رحمہ اللہ ہوئے ہیں (سیرت کے نام پر کتاب لکھ کر زہرا گلنے والے شبلی مراد نہیں) ان پر وفات کا وقت قریب آ گیا تو کسی شخص نے تلقین کرتے ہوئے کہا " لا الہ الا اللہ " کہو۔ آپ نے رب تعالیٰ کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ عرض کیا

ان بیتا انت ساکنه غیر محتاج الی السرج

بیشک وہ گھر جس میں تو رہتا ہو اس میں چراغ جلانے کی ضرورت نہیں

مطلب یہ تھا کہ اے اللہ تعالیٰ میرا دل تو تیری تجلیات کا مرکز ہے وہ تیری تجلیات میرے دل میں ضوء فگن (روشنی ڈالنے والی) ہیں ان میرے دل میں لوگ ظاہری " لا الـــہ الا اللہ " کا چراغ جلانے کی تلقین کر رہے ہیں۔ ان کو یہ معلوم ہی نہیں کہ اس دل سے کبھی " لا الـہ الا اللہ " کی صدائیں غائب ہوئی ہی نہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

تنبیہ: واعظ با عمل کی شان ﴿ قَالُوا سُبۡحَانَکَ لَا عِلۡمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ﴾ (ای آخر آلایتین) میں بیان ہو چکی ہے علماء اور علم کی فضیلت کا وہاں مطالعہ کریں۔

بے عمل واعظ اپنے وعظ کو نہ چھوڑے:

اس آیۃ کریمہ سے اور دوسری آیۃ:

﴿ کَبُرَ مَقۡتًا عِنۡدَ اللّٰہِ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴾

کیسی سخت ناپسند ہے اللہ کو وہ بات کہ وہ کہو جو نہ کرو۔

بظاہر طور پر یہ سمجھ آ رہا ہے کہ کسی کو اچھے کام کرنے کا حکم دینا اور برائی سے روکنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود نیک ہو اچھے کام کرتا ہو اور برے کاموں سے روکتا ہو اگر گنہگار ہو تو وہ دوسرے کو وعظ و نصیحت نہیں کر سکتا۔ علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے اس کی بہت خوب وضاحت کی ہے کہ اس کا یہ

مطلب نہیں جو معتزلہ یاان کے ہمنوالوگوں نے سمجھا:

" والمراد بها حث الواعظ على تزكية النفس والاقبال عليها بالتكميل ليقوم فيقيم غيره لا منع الفاسق عن الوعظ فان الاخلال باحد الامرين المامور بهما لا يوجب الاخلال بالآخر " (بیضاوی)

بلکہ اس آیۃ کریمہ سے مراد یہ ہے کہ وعظ کرنے والے کواس پر برانگیختہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو پاکیزہ کرے اوراس کو پاکیزہ کرنے سے کامل بنانے کی طرف مکمل توجہ کرے تاکہ دوسروں کو بھی پاکیزہ کرسکے،اوران کے نفوس کو بھی کامل بنا سکے۔فاسق کو وعظ کرنے سے منع کرنا مقصود نہیں۔اس لئے کہ جب دو چیزوں کا حکم دیا جائے توان میں سے ایک میں خلل واقع ہونے سے دوسری سے نہیں روکا جاسکتا۔یعنی رب تعالیٰ اوراس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دو چیزوں کا علیحدہ علیحدہ حکم دیا گیا ہے۔ایک یہ کہ اچھے کاموں کالوگوں کو حکم دو۔اور برے کاموں سے روکواور دوسرا اس چیز کا حکم دیا گیا ہے کہ وعظ کرنے والاخود بھی نیکی کے کام کرے اور برے کاموں سے اجتناب کرے۔اس لئے اگر وہ خود نیک نہیں تواس کو جودو حکم دیئے گئے تھےان میں سے ایک میں خلل واقع ہوا ہے لہٰذا دوسرے حکم سے (یعنی اچھے کاموں کا حکم دینے اور برے کاموں سے روکنے سے) اسے منع نہیں کیا جاسکتا۔

☆ " قال الحسن لمطرف بن عبد الله " عظ اصحابك " فقال انى اخاف ان اقول مالا افعل قال يرحمك الله واينا يفعل ما يقول ويود الشيطان انه قد ظفر بهذا فلم يا مر احد بالمعروف ولم ينه عن المنكر "

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے مطرف بن عبد اللہ کو کہا اپنے اصحاب کو وعظ کرو (نصیحت دو) وہ کہنے لگے مجھے اس سے خوف آتا ہے کہ کہیں میں وہ نہ کہوں جوخود نہیں کرتا۔حضرت حسن نے فرمایا۔اللہ تم پر رحم کرے ہم میں سے وہ کون شخص ہے جو اپنے کہنے کے مطابق کامل طور پر عمل کرسکتا ہے شیطان کو تو یہی پسند ہے اوروہ اسی میں اپنی کامیابی سمجھتا ہے کہ کوئی دوسرے کو اچھے کام کا حکم دینے والا اور برائی سے روکنے والا نہ ہو۔ (از قرطبی)

منطقی کتب کے رؤس ثمانیہ مین حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بہت ہی خوبصورت قول نقل کیا گیا ہے آپ فرماتے ہیں "لا تنظر الى من قال وانظر الى ما قال " کہنے والے کو نہ دیکھ کہ وہ کیسا ہے

بلکہ یہ دیکھ کہ اس نے کہا کیا ہے۔

راقم کا تو یہی خیال ہے کہ جن واعظین کا عمل قول کے مطابق نہیں ہوتا ان کے وعظ کرنے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات ذکر کرنے کی برکت سے اللہ تعالیٰ ان کو نیک بنا دیتا ہے اکثر طلباء، علماء، واعظین کو اسی طرح دیکھا گیا کہ کئی حضرات جن میں کچھ خامیاں پائی گئیں، ان کو زہد وتقوی کے اعلیٰ مقام پر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مقام حاصل ہو گیا۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ☆ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ

☆ ''اور صبر اور نماز سے مدد چاہو اور بیشک نماز ضرور بھاری ہے مگر ان پر جو دل سے میری طرف جھکتے ہیں جنہیں یقین ہے کہ انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور اسی کی طرف پھرنا''

☆ ''اور امداد طلب کرو صبر اور نماز سے اور بیشک یہ ضرور بھاری ہے سوائے خشوع کرنے والوں کے (خشوع کرنے والے) وہ لوگ ہیں جو یقین رکھتے ہیں کہ بیشک ان کو ملنا ہے اپنے رب سے اور بیشک انہوں نے اسی کی طرف لوٹنا ہے''

انسانی عادات اور ان کے خلاف حکم:

انسان کی عادت یہ ہے کہ وہ مال ودولت سے محبت کرتا ہے، مال ودولت کی محبت کی وجہ سے بخل اور کنجوسی سے کام لیتا ہے جس کی وجہ سے زکواۃ ادا نہیں کرے گا اور صدقات واجبہ ادا کرنے سے پہلو تہی کرے گا۔ پھر مال زیادہ سے زیادہ جمع کرنے میں ہر قسم کے ناجائز ہتھکنڈے استعمال کرنے میں دریغ نہیں کرتا، رشوت، کم تولنا، کم ناپنا، ملاوٹ غرضیکہ اس کی صرف تمنا یہ ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ مال حاصل ہو سکے اس نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ میں اپنے مومن بھائیوں کو کتنا نقصان پہنچا رہا ہوں۔

اسے مال جمع کرنے کی اتنی زیادہ ہوس رہتی ہے کہ اسے جتنا بھی مال مل جائے اس کی آنکھ سیر نہیں ہوتی، مال اسے ملتا رہے اس سے غلط فتوے حاصل کرتے رہو اس سے ملک کے خلاف کام کراتے رہو ایسے یہودیوں کے ایجنٹ جو مال اور حاکمت کے حصول کے لئے اور بظاہر اپنی شان بلند کرنے کے لئے اور وہ جو حقیقت ملک وملت کے محافظ تھے، قومی خزانہ کو چاٹ چکے تھے انہوں نے ملک کے دو ٹکڑے کر دیئے۔

غرضیکہ مال و دولت اور حکمرانی کو چاہنے والوں نے اپنے مسلمان بھائیوں اور ملک کو نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ان لوگوں کو نماز اور صبر سے امداد طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ وہ ان پر عمل کر کے اپنی عادات کو چھوڑ دیں۔

﴿ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ﴾: اور امداد طلب کرو صبر اور نماز سے۔ الصبر: الحبس فی اللغة، جس کا لغوی معنی روکنا جس طرح کہا جاتا ہے " قتل فلان صبرا " فلاں شخص کو محبوس رکھ کر ہلاک کر دیا گیا اور کہا جاتا ہے "صبرت نفسی علی شئی " میں نے اپنے نفس کو فلاں چیز پر روک کر رکھا۔ (قرطبی)

صبر کی تین قسمیں: (۱) طاعت پر صبر۔ (۲) لذات گناہ سے صبر۔ (۳) مصائب پر صبر۔

پہلی دو قسمیں تقریبا ایک ساتھ ہی پائی جاتی ہیں کیونکہ طاعت پر صبر اسی وقت ہو سکے گا جب وہ شخص معصیت سے رکے گا۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ " الصبر من المعاصی " اور چیز ہے اور "الصبر علی المعاصی " اور چیز ہے۔ پہلے کا مطلب ہے گناہوں سے رکنا اور دوسرے کا مطلب ہے گناہوں پر رکنا یعنی گناہ کرنا۔ اس لئے صابر اسے ہی کہا جائے گا جو گناہوں سے رکے گا۔ اس شخص کو صابر نہیں کہا جائے گا جو گناہوں پر قائم رہے۔ جب مطلق صبر ذکر کیا جائے تو اس وقت یہی معنی مراد ہوتا ہے رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی: ﴿ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ (بیشک صبر کرنے والوں کو پورا اجر بغیر حساب کے دیا جائے گا) کا یہی مطلب ہے۔

تیسری قسم مصیبت پر صبر کرنا یعنی جزع وفزع نہ کرنا، کوئی شکایت زبان پر نہ لانا، اور رضا مندی کے خلاف کوئی حرکات اس سے سرزد نہ ہوں۔ یہ تینوں قسم کے صبر جس شخص کو حاصل ہوں۔ یعنی وہ طاعت پر صبر کرے، معاصی سے صبر کرے اور مصیبت پر صبر کرے اسے نفس پر غلبہ حاصل ہوتا ہے یعنی اس کا نفس مغلوب ہو جاتا ہے اور عقل و علم اس کا غالب ہو جاتا ہے۔ اسے انبیاء کرام اور صالحین کے اخلاق حاصل ہو جاتے ہیں۔

یحییٰ بن یمان کہتے ہیں " الصبر الا تتنمی حالة سوی ما رزقک الله " صبر یہ ہے کہ خبردار اللہ تعالیٰ نے جو تمہیں رزق عطا کیا ہے اس کے بغیر تم کسی چیز کی تمنا نہ کرو۔

" والرضاء بما قضی الله من امر دیناک وآخرتک "

اور صبر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا اور آخرت کے امور میں جو تمہارے حق میں فیصلہ کر دیا ہے اس پر راضی رہنا۔

حدیث شریف میں ہے:

" الایمان نصفان نصف فی الصبر ونصف فی الشکور "

(رواه البیهقی فی شعب الایمان مرفوعا)

ایمان کے دو حصے ہیں آدھا حصہ صبر میں ہے اور آدھا شکر میں ہے۔

گویا کہ حدیث پاک سے اس طرف اشارہ ملتا ہے کہ ایمان صحت کی طرح ہے صحت کی دارومدار دو چیزوں پر ہے ایک پرہیز اور دوسری دوا۔ اگر دوا ہو پرہیز نہ ہو تو پھر بھی کوئی فائدہ نہیں اور پرہیز ہو دوا نہ ہو تو پھر بھی صحت کا حصول نہیں۔ اسی طرح ایمان کیلئے صبر پرہیز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور شکر دوا کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

" الصبر من الایمان بمنزلة الرأس من الجسد "

صبر ایمان کا اس طرح حصہ ہے جیسا کہ سر جسم کا حصہ ہے۔

یقینی بات ہے کہ سر ہے تو اسی وقت جسم کی بھی کوئی حیثیت ہے اور سر نہیں تو جسم بھی بے حقیقت ہے اسی طرح صبر ہے تو ایمان میں بھی کمال ہے اور صبر نہیں تو ایمان میں بھی کمال نہیں۔ عبید بن عمیر یثی سے مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا " ما الایمان " ایمان کیا چیز ہے؟ تو آپ نے فرمایا" الصبر والسماحة " صبر اور سخاوت۔ صحاح ستہ میں یہ حدیث مروی ہے "ما اعطی احد عطاء خیرا اوسع من الصبر " کسی ایک کو صبر سے بہتر کوئی چیز نہیں عطا کی گئی۔

حکیم ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نوادر الوصول میں نقل کی ہے آپ فرماتے ہیں میں ایک دن رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آپ کی سواری پر سوار تھا، آپ نے فرمایا کیا میں تمہیں چند نفع مند چیزوں کی تعلیم نہ دوں؟ میں نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ آپ فرمائیں۔ آپ نے فرمایا:

"علیک بالعلم فان العلم خلیل المؤمن والحلم وزیرة والعقل دلیلة والرفق اخوہ والصبر امیر جنودہ"

علم حاصل کرو کیونکہ علم مومن کا خیر خواہ دوست ہے حلم یعنی بردباری کو اختیار کرو کیونکہ حلم وزیر ہے۔ اور عقل سے کام لو عقل اس کی راہنماء ہے اور نرمی اختیار کرو کیونکہ نرمی کو بھائی کی حیثیت حاصل ہے اور صبر اختیار کرو کیونکہ صبر اس کے تمام لشکر کا امیر ہے۔

بیہقی نے اشعث بن سلامہ سے روایت ذکر کی ہے کہ ابو حاصرہ اسدی سے انہوں نے سنا، وہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہو کر آپ کی مجلس اختیار کرتے، اس شخص کو آپ نے چند دن نہ دیکھا، ان کے متعلق دوستوں سے پوچھا وہ کہاں گئے ہیں۔ اصحاب نے بتایا کہ فلاں جنگل میں علیحدہ ہو کر گوشہ نشین ہو گئے اور وہاں عبادت میں مشغول ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس شخص کو میرے پاس بلاؤ، وہ جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے پوچھا تمہیں کیا ہو گیا کہ پہاڑوں میں تم نے لوگوں سے علیحدگی اختیار کر لی؟ وہ کہنے لگے کہ لوگوں کے ساتھ رہ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں خلل پڑتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا انسان کو دوسروں سے مل کر رہنے میں جو تکالیف پہنچیں ان پر صبر کرنا علیحدہ جنگل میں ساٹھ سال اکیلے عبادت کرنے سے بہتر ہے۔ (ماخوذ از عزیزی وقرطبی)

فائدہ: اللہ تعالیٰ نے اعمال کی جزاء کی ایک حد اور نہایت بیان فرمائی ﴿ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ﴾ جو ایک نیکی لائے تو اس کے لئے اس جیسی دس ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں دیا جانے والا صدقہ کی جزاء اس سے زیادہ بیان فرمائی ﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ ﴾ اس آیت میں صدقہ کی جزاء سات سو گنا، بلکہ اس سے زائد کا بھی ذکر فرمایا گیا۔ اور صبر کرنے والوں کا اجر بغیر حساب کے بیان فرمایا صبر والوں کی مدح میں رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾

بیشک صابروں کو ہی پورا پورا اجر دیا جائے گا بغیر حساب کے۔

اور رب تعالیٰ نے صبر کی مدح میں ارشاد فرمایا:

﴿ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴾

اور جس نے صبر کیا اور بخش دیا تو یہ ضرور ہمت کے کام ہیں۔ (قرطبی)

صبر بمعنی روزہ:

" وقد قیل ان المراد بالصابرین فی قوله " انما یوفی الصابرون " ای الصائمون "

آیۂ کریمہ ﴿ اِنَّمَا یُوَفَّی الصَّابِرُوْنَ اَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴾ میں کئی مفسرین کرام نے " صابرون " کا معنی " صائمون " روزہ رکھنے والے بھی کیا ہے اسی وجہ سے رمضان کا نام شہرالصبر بھی ہے حدیث شریف میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " **الصوم نصف الصبر** " روزہ نصف صبر ہے۔ ایک حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِهٖ ﴾ "روزہ میرے لئے ہے اور میں خود ہی اس کی جزا دیتا ہوں"۔

اس حدیث شریف میں روزہ کی جزاء کی کوئی حد نہیں بیان کی گئی جیسا کہ صبر کی جزاء کی کوئی حد بیان نہیں ہوئی۔

فائدہ: اللہ تعالیٰ نے صبر کو اپنی طرف منسوب فرمایا حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" لیس احد او لیس شئی اصبر علی اذی سمعه من الله تعالیٰ انهم لیدعون ولدا وانه لیعافیهم ویرزقهم " (بخاری)

اذیت ناک کلام سن کر کوئی بھی اتنا صبر نہیں کرتا جتنا رب تعالیٰ صبر کرتا ہے کہ بیشک لوگ اس کی اولاد مانتے ہیں وہ ان کو معاف کر دیتا ہے اور رزق دیتا ہے۔

" قال علماؤنا وصف الله تعالیٰ بالصبر انما هو بمعنی الحلم ومعنی وصفه تعالیٰ بالحلم هو تاخیر العقوبة عن المستحقین لها "

اللہ تعالیٰ کی صفت حلم ہے کیونکہ وہ حلیم ہے حلیم وہی ہے جو مستحقین عذاب کو عذاب دینے میں تاخیر کرے یہی صبر ہے اور اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی صبور بھی ہے۔ (قرطبی)

نماز سے امداد طلب کرنا: خیال رہے کہ مشہور معنی اس مقام پر " صلوۃ " کا نماز ہی ہے تاہم بعض حضرات نے " صلوۃ " کا معنی اس مقام پر "دعاء" بھی کیا ہے اگر معنی دعاء کیا جائے تو اس آیۂ کریمہ

اور ﴿ اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ ﴾ (جب تم کسی جماعت سے ملو تو ثابت قدم (صابر) رہو اور اللہ کا ذکر کرو) کا مفہوم تقریباً مشابہ ہوگا۔
(از قرطبی)

☆ " ان الصلوة من اکبر العون علی الثبات فی الامر "

بیشک نماز کسی امر پر ثابت کرنے کے لئے بہت بڑی مددگار ہے

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ اُتْلُ مَا اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ﴾

اے محبوب پڑھو جو کتاب تمہاری طرف وحی کی گئی اور نماز قائم فرماؤ، بیشک نماز منع کرتی ہے بے حیائی اور بری بات سے اور بیشک اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے۔
(ابن کثیر)

☆ " قال الامام احمد...... قال حذیفة یعنی ابن الیمان رضی اللہ عنه کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا حزبه امر صلی "

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی پریشانی لاحق ہوتی تو آپ نماز ادا کرتے۔
(ابن کثیر)

" (اذا حزبه امر) حز بالحاء والزاء الی اذا صابه ونزل به هم وغم فزع الی الصلوة ای التجاء الیها والمفزع ای الملجاء " (شیخ زادہ)

☆ بیضاوی میں حدیث پاک کے الفاظ مبارکہ یہ ہیں:

" انه علیه الصلوة والسلام کان اذا حزبه امر فزع الی الصلوة "

بیشک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی کوئی غم لاحق ہوتا تو آپ نماز کے ذریعے اس سے پناہ حاصل کرتے۔

☆ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پیٹ میں درد تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کیا تمہارے پیٹ میں درد ہے؟ انہوں نے عرض کیا ہاں تو آپ نے فرمایا: " قم فصل فان الصلوة شفاء " اٹھو نماز ادا کرو بیشک نماز شفاء ہے۔

☆ عیینہ بن عبدالرحمٰن اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس کو ان کے

بھائی قثم کی وفات کی خبر ملی آپ اس وقت سفر میں تھے آپ نے " انا للہ و انا الیہ راجعون " پڑھا۔ پھر راستہ سے ہٹ کر ایک طرف اونٹنی کو بٹھایا:

" فصلی رکعتین اطال فیھما الجلوس ثم قام یمشی الی راحلتہ وھو یقول واستعینوا بالصبر والصلوۃ "

پھر آپ نے دو رکعت پڑھیں ان میں بہت دیر بیٹھے، پھر اپنی سواری کی طرف آئے اور آپ یہی آیۃ پڑھ رہے تھے "واستعینوا بالصبر والصلوۃ" صبر اور نماز سے امداد طلب کرو۔ (ابن کثیر)

☆ نسائی اور ابن حبان نے صہیب رومی سے روایت ذکر کی کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" کان الانبیاء یفزعون اذا فزعوا الی الصلوۃ "

تمام انبیاء کرام پریشانی کے وقت نماز سے امداد طلب کرتے تھے۔

☆ ابن عساکر اور ابن ابی الدنیا نے ابو الدرداء سے روایت کی کہ:

" کان رسول اللہ ﷺ اذا کانت لیلۃ ریح کان مغزعہ الی المسجد حتی تسکن واذا حدث فی السماء حدث من کسوف الشمس او قمر کان مفزعہ الی الصلوۃ حتی ینجلی "

جب کبھی رات کو آندھی چلتی تو رسول اللہ ﷺ نماز ادا فرماتے یہاں تک کہ آندھی رک جاتی اور سورج کے گرہن پر اور چاند کے گرہن پر نماز ادا فرماتے یہاں تک کہ وہ روشن ہو جاتے۔ (عزیزی)

مطلب واضح ہے کہ ہر مصیبت پر انسان نماز سے امداد طلب کرے اللہ تعالیٰ نماز کی برکت سے اسے دور فرمادے گا۔

عبادات میں سے نماز کی تخصیص کیوں؟

تمام عبادات میں سے نماز سے امداد طلب کرنے کا اس لئے حکم دیا کہ نماز تمام عبادات بدنیہ اور نفسانیہ کو شامل ہے۔ نماز میں طہارت اور ستر عورت (یعنی شرمگاہ کو ڈھانپنا) ضروری ہے۔ پھر طہارت کے لئے پانی کی اور ستر عورت کے لئے کپڑے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اوران پر مال بھی خرچ ہوتا ہے۔ تو

گویا کہ ان دو چیزوں کی وجہ سے نماز عبادات مالیہ کو بھی شامل ہے۔ پھر نماز میں خشوع پایا جانا چاہئے۔ اور نیت میں خلوص پایا جائے اور دل کو ایک طرف متوجہ کیا جائے اور اپنے فکروں کو رب تعالیٰ کی مناجات کی طرف مختص کیا جائے اور شیطان کی مدافعت کے لئے مجاہدہ پایا جائے ان سب چیزوں کا تعلق قلب (دل) سے ہے۔ اس لئے نماز عبادات قلبیہ پر بھی مشتمل ہے۔ پھر نماز میں کعبہ شریف کا استقبال ایک جگہ قائم ہونا یعنی حرکت نہ کرنا چلنا پھرنا نہیں، اور قرآن پڑھنا، اور شہادتین کو زبان پر لانا یعنی " اشھد ان لا الہ الااللہ واشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ " پڑھنا اور اپنے نفس کو دو پاکیزہ چیزوں سے روکنا یعنی اپنے آپ کو کھانے پینے، اور جماع کرنے سے روکنا یہ سب چیزیں بدن سے تعلق رکھتی ہیں لہٰذا نماز عبادات بدنیہ پر بھی مشتمل ہے۔

نتیجہ واضح ہوا کہ نماز سے امداد طلب کرنے کا حکم دے کہ گویا کہ عبادات مالیہ، عبادات قلبیہ اور عبادات بدنیہ سے امداد طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ (از بیضاوی وشیخ زادہ)

﴿ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴾: ''اور بیشک یہ ضرور بھاری ہے سوائے خشوع کرنے والوں کے''۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں: " وانھا " کی ضمیر میں تین احتمال ہیں ایک یہ ہے کہ یہ ضمیر استعانۃ کی طرف لوٹے جو " واستعینوا " کے ضمن میں ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ ''بیشک استعانت ضرور بھاری ہے سوائے خشوع والوں کے'' اس معنی کے لحاظ پر ''نماز اور صبر'' دونوں مراد ہوں گے کیونکہ دونوں سے امداد طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے، تو اب مطلب یہ ہوگا کہ جن چیزوں سے تمہیں امداد طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے بیشک ان سے امداد طلب کرنا ضرور ضرور بھاری ہے سوائے خشوع والوں کے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ ضمیر کا مرجع " جملة ما امر وابه ونهوا عنه " بنی اسرائیل کو جن چیزوں کا حکم دیا گیا ہے اور جن سے روکا گیا ہے وہ تمام ہی مراد ہوں کہ وہ تمام کام ضرور بھاری ہیں سوائے خشوع والوں کے۔

تیسرا احتمال یہ ہے کہ ضمیر کا مرجع " صلوۃ " ہو بیشک نماز ضرور بھاری ہے سوائے خشوع والوں

کے۔ ''وتخصیصها بردا لضمیر الیها لعظم شانها واستجماعها ضروبا من الصبر''
البتہ ضمیر کا ''صلوۃ'' (نماز) کی طرف خصوصی طور پر لوٹانا نماز کی عظمت شان کے پیش نظر ہے اور اس میں تمام عبادات جب آ گئیں تو ان میں صبر بھی آ گیا جیسا کہ ایک جگہ قیام چلنے پھرنے سے رکنا، اور کھانے پینے سے رکنا یہ صبر ہی تو ہے۔ (از بیضاوی وشیخ زادہ)

خشوع: پست زمین جس میں ریت پائی گئی ہو اسے خبت کہتے ہیں۔ اور پست زمین کی طرف جھکنا، اسے اخبات کہتے ہیں اور اسے ہی خشوع کہا جاتا ہے یعنی ظاہری اعضاء کو نماز میں بلاوجہ حرکت نہ دینا، اطمینان سے کھڑا ہونا خشوع کہلاتا ہے۔

دل میں نرمی پائی جائے اور دل رب تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جائے اسے خضوع کہا جاتا ہے اور اسے ہی کبھی خشوع بھی کہا جاتا ہے یہاں خشوع بمعنی خضوع ہے اب مطلب یہ ہوا کہ نماز اور صبر سے امداد طلب کرنا اگرچہ عام لوگوں پر بھاری ہے لیکن جن کے دل رب تعالیٰ کی طرف جھکنے والے ہیں ان پر نماز بھاری نہیں۔ (از بیضاوی)

تنبیہ: اگر دل میں خشوع نہ ہو تو صرف سر جھکانے کا کوئی مقصد نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک جوان کو دیکھا جس نے اپنا سر جھکایا ہوا ہے آپ نے فرمایا:

''یا هذا ارفع رأسک فان الخشوع لا یزید علی ما فی قلبک''

اے شخص اپنا سر اٹھا لے، خشوع وہی ہے جو دل میں ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''الخشوع فی القلب'' خشوع دل میں ہے۔ نماز میں جس خشوع کی تعریف کی گئی ہے وہ بھی دل کا خشوع ہی ہے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلٰوتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ﴾

''تحقیق کامیاب ہوئے وہ مومن جو اپنی نمازوں میں خشوع کرتے ہیں''

''فمن اظهر للناس خشوعا فوق ما فی قلبه فانما اظهر نفاقا علی نفاق''

جس شخص نے دل کے خشوع سے زیادہ ظاہری طور پر خشوع کیا وہ خشوع نہیں بلکہ منافقت بر منافقت ہے۔

☆ " قال سهل بن عبد الله لا يكون خاشعا حتى تخشع كل شعرة على جسده ،لقول الله تعالیٰ (تقشعر منه جلود الذين يخشون ربهم)

حضرت سہل بن عبداللہ نے فرماتے ہیں کہ اس وقت تک خشوع کامل نہیں ہوتا جب تک جسم کا ہر بال خشوع نہ کرے اس لئے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا، اس سے (اللہ کی کتاب سے) بال کھڑے ہوتے ہیں ان کے بدن پر جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔

" قلت هذا هو الخشوع المحمود ، لان الخوف اذا سكن القلب
اوجب خشوع الظاهر فلا يملك صاحبه دفعه فتراه متطرقا متأدبا ،
متزللا وقد كان السلف يجتهدون في ستر ما يظهر من ذلك "

میں کہتا ہوں یہی خشوع قابل تعریف ہے اس لئے کہ جب دل میں خشوع پیدا ہوگا تو دل کو سکون حاصل ہوگا، اسی سے ظاہری طور پر بھی خشوع کے اثرات نمایاں نظر آئیں گے۔ وہ شخص اس خشوع کو مندفع نہیں کرسکتا (ہٹا نہیں سکتا) تم اسے دیکھو گے کہ بغیر اختیار کے اس کا سر جھکا ہوگا وہ ادب کرتے ہوئے نظر آئے گا اس کی عاجزی اس سے واضح ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ خشوع جو بغیر اختیار کے حاصل ہوتا ہے، سلف صالحین اسے چھپانے کی کوشش کرتے رہے۔

" واما المذموم فتكلفه والتباكي ومطأ طأة الرأس كما يفعله الجهال ليروا
بعين البر والاجلال وذلك خدع من الشيطان وتسويل من نفس الانسان "

ظاہری خشوع وہ برا ہے جس میں تکلف پایا جائے، اور بناوٹی طور پر رونے کی شکل بنائی جائے اور سر کو جھکایا جائے جیسا کہ جاہل لوگ کرتے ہیں کہ لوگ ہمیں نیک اور بزرگ سمجھیں، تو یہ شیطان کی طرف سے دھوکا ہے اور نفس کی جانب سے بناوٹ ہے۔(قرطبی

راقم کے نزدیک جب تک ریاء کاری نہ ہو، بلکہ ظاہری خشوع کرنے والے کی یہ نیت ہو کہ اے اللہ نیک لوگوں کو جو دل اور ظاہری جسم سے خشوع حاصل ہے وہ تو ہمیں حاصل نہیں، البتہ ہم بزرگوں کی طرح ظاہری طور پر خشوع کر رہے ہیں، کسی کو دھوکا دینا مقصود نہیں، بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ اے اللہ ہوسکتا ہے تیری مہربانی سے ہمارا ظاہر حقیقت بن جائے تو اس کی مذمت نہیں کی جاسکتی۔

﴿ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ ﴾ : " الذین فی موضع خفض علی النعت للخاشعین " یہ جملہ محل جر میں ہے خاشعین کی صفت ہے۔ " والظن ھنا فی قول الجمھور بمعنی الیقین " جمہور مفسرین کرام کا یہ قول ہے کہ اس آیۂ کریمہ میں "ظن" یقین کے معنی میں ہے۔ (قرطبی)

" (الذین یظنون انھم ملاقوا ربھم) ای یعلمون انھم محشورون الیہ یوم القیامۃ معروضون علیہ (وانھم الیہ راجعون) ای امورھم راجعۃ الی مشیئتہ یحکم فیھا ما یشاء بعد لہ فلھذا لما ایقنوا بالمعاد والجزاء سھل علیھم فعل الطاعات وترک المنکرات " (ابن کثیر)

یعنی خشوع کرنے والے وہ لوگ ہیں جو یقین رکھتے ہیں کہ بیشک ان کو قیامت کے دن ایک جگہ جمع کیا جانا ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ پر پیش کیا جانا ہے اور ان کے تمام امور اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹتے ہیں اور اس نے اپنی مشیت سے عدل وانصاف سے فیصلہ کرنا ہے جب انسان کو یہ یقین ہوگیا کہ قیامت بھی آنی ہے ہمیں رب تعالیٰ کے حضور پیش ہونا ہے، ہمارے اعمال کا بدلہ بھی ہمیں دیا جانا ہے تو اس پر نیکی کے کام کرنے اور برے کام چھوڑنے آسان ہو جائیں گے۔

تنبیہ : علامہ رازی اور علامہ بیضاوی رحمہما اللہ نے بیان کیا ہے کہ ﴿ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ ﴾ میں "ظن" بمعنی یقین کے بھی ہوسکتا ہے اور ظن بمعنی توقع اور گمان کے بھی ہوسکتا ہے۔ جب توقع کا معنی کیا جائیگا تو یوں کہا جائے گا " یتوقعون لقاء اللہ تعالیٰ ونیل ما عندہ " وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات اور اس کے پاس جو نعمتیں ہیں ان کو حاصل کرنے کی توقع رکھتے ہیں۔ اور جب ظن کا معنی یقین کیا جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا " یتیقنون انھم یحشرون الی اللہ فیجازبھم " وہ یقین رکھتے ہیں کہ بیشک ان کو رب تعالیٰ کے حضور جمع کیا جانا ہے اور اس نے ہمیں ہمارے اعمال کی جزا دینی ہے۔ لیکن زیادہ مفسرین کرام نے یہی بیان کیا ہے کہ اس مقام میں ظن کا معنی یقین کرنا ہی بہتر ہے، اعلیٰ حضرت نے بھی یہی معنی ذکر کیا راقم نے بھی وہی نقل کیا ہے۔

تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان کا ایک ورق:

اسی مسئلہ کو سمجھنے کے لئے راقم کی کتاب تسکین الجنان سے ایک ورق دیکھئے تو انشاء اللہ مسئلہ

آسانی سے سمجھ آئے گا۔

﴿ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ ﴾ (پ ۱ ع ۵)

مگرانہی پر جن کے دل پگھلے ہیں جن کو خیال ہے۔ (شاہ عبدالقادر صاحب)

مگران فرماں بردار بندوں کے لئے مشکل نہیں جو سمجھتے۔ (مودودی صاحب)

مگرانہی عاجزوں پر جن کو خیال ہے۔ (محمودالحسن صاحب)

وہ خاشعین وہ لوگ ہیں جو خیال کرتے ہیں۔ (اشرف علی صاحب)

مگر خشوع رکھنے والوں پر (نہیں) جنہیں اس کا خیال رہتا ہے کہ انہیں پروردگار سے ملنا (بھی) ہے (عبدالماجد)

مگران پر جو دل سے میری طرف جھکتے ہیں جنہیں یقین ہے۔ (اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلویؒ)

اس مقام پر اعلیٰ حضرت نے "یظنون" کا معنی یقین کیا ہے اور دیگر حضرات نے خیال اور سمجھا۔لیکن اعلیٰ حضرت کا ترجمہ زیادہ تفاسیر کے مطابق ہے۔اکثر مفسرین کرام نے بھی بمعنی یقین کے لیا ہے۔مدارک میں ذکر کیا گیا ہے:

"وفسر یظنون بتیقنون لقراءة عبد الله یعلمون ای یعلمون انه لابد من لقاء الجزاء فیعلمون علی حسب ذلک واما من لم یوقن بالجزاء ولم یرج الثواب کانت علیه مشقة خالصة"

چونکہ یہاں مقصد بیان یہ ہے کہ نماز لوگوں پر مشقت ہے وہ اسے گراں (بھاری) سمجھتے ہیں لیکن جن لوگوں کو یقین ہے کہ وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں ان پر گراں نہیں۔

علامہ نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "یظنون" کی تفسیر "تیقنون" سے کی گئی ہے اس لئے کہ حضرت عبداللہ کی قرأت میں "یعلمون" آیا ہے۔معنی یہ ہے کہ وہ یقین کرتے ہیں کہ بیشک ضرور اللہ سے ملاقات ہونی ہے اور ضرور جزاء حاصل ہونی ہے اور جس کو یہ یقین ہو اس کو یہ یقین کافی ہے وہ نماز کو گراں نہیں جانے گا۔لیکن جس کو جزاء کا یقین نہیں ہوگا اس کو ثواب کی امید نہیں ہوگی۔اس پر نماز خالص مشقت ہوگی۔

اس طرح شیخ زادہ علی البیضاوی میں بیان کیا گیا ہے:

" بیان لوجه استعمال الظن بمعنى اليقين مع ان الظن هو الاعتقاد الراجح الذى يحتمل النقض ، واليقين هو الاعتقاد الراجح الذى لا يحتمل النقض فانهما لما تشابها من حيث ان كل واحد منها اعتقاد راجح صح ان يستعار كل واحد منها للآخر بحسب اقتضاء المقام فاستعير لفظ الظن ههنا بمعنى اليقين "

یہاں یہ وجہ بیان کی جا رہی ہے کہ ظن بمعنی یقین ہے اس لئے کہ ظن کہتے ہیں اعتقاد راجح کو جو نقض کا احتمال رکھے۔ یقین کہتے ہیں اعتقاد راجح کو جو نقض کا احتمال نہ رکھے اس لئے دونوں میں اعتقاد راجح پایا گیا ہے لہٰذا یہ دونوں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں اس لئے ہر دو کو ایک دوسرے کو جگہ مجازاً استعمال کیا جاتا ہے لہٰذا اسی مشابہت کی وجہ سے اس مقام میں ظن بمعنی یقین ہے۔

اسی طرح جلالین میں بھی یظنون کی تفسیر یوقنون سے کی گئی ہے اور پھر اس پر حاشیہ میں یہ ذکر کیا گیا ہے " اشارة الى ان الظن ههنا بمعنى اليقين " یعنی یہاں یہ اشارہ ہے کہ ظن بمعنی یقین ہے۔
اب تفاسیر کی عبارات دیکھنے سے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت مخفی نہ رہی بلکہ خوبی واضح ہوگئی
(تسکین الجنان ص ۳۳، ۳۴)

☆☆☆☆☆

نجوم الفرقان

من تفسیر آیات القرآن

از رشحات قلم

حضرت علامہ مولانا

عبدالرزاق بھترالوی حطاروی

ناشر

ضیاء العلوم پبلی کیشنز راولپنڈی پاکستان

کتاب لاریب کی توضیحات وتشریحات،علوم عقلیہ ونقلیہ کی روشنی میں
علمی وتحقیقی ذوق رکھنے والوں کے لئے قدیم وجدید احکامات ومسائل پر ابحاث کا حسین مرقع
تفسیر القرآن بالقرآن،ارشادات نبویہ،اقوال صحابہ،تحقیقات اسلاف اور روایات صحیحہ پر مشتمل تفسیر

مسمّٰی بہ

نجوم الفرقان

من تفسیر آیات القرآن

جلد سوم

سورۃ البقرہ آیات 47 تا 141

از رشحات قلم

محقق اہلسنت
استاذ العلماء حضرت علامہ مولانا
عبد الرزاق بھترالوی ہزاروی
مدظلہ العالی

ناشر ضیاء العلوم پبلی کیشنز راولپنڈی پاکستان

اشاعتی ضابطہ

نام کتاب: نجوم الفرقان من تفسیر آیات القرآن

تصنیف: علامہ مولانا عبد الرزاق چشتی بھتر الوی

کمپوزنگ: ضیاء العلوم کمپوزنگ سنٹر سیٹلائیٹ ٹاؤن راولپنڈی

کمپیوٹر گرافکس: قاضی محمد یعقوب چشتی، اظہر اقبال اعوان

ضخامت: $\frac{20 \times 30}{8}$ 936 صفحات

بار طبع: اوّل دسمبر 2004ء

قیمت: ...... روپے

ناشر: سید شہاب الدین شاہ
ضیاء العلوم پبلی کیشنز راولپنڈی پاکستان

رابطہ: 0333- 5166587 - Fax 051-4580404
Email:ziauloom@isb.paknet.com.pk

﴿ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَاَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴾

☆ ''اے اولاد یعقوب یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا اور یہ کہ اس سارے زمانہ پر تمہیں بڑائی دی''۔

☆ ''اے اولاد یعقوب یاد کرو میری نعمتوں کو جو میں نے انعام کی ہیں تم پر۔ اور بیشک میں نے تمہیں فضیلت دی اس زمانے والوں پر''۔

یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ:

اس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ پھر دوبارہ ذکر کیا گیا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی ایک وجہ یہ ہے:

" انما اعاد هذا الكلام مرة اخرى توكيدا للحجة عليهم وتحذيرا من ترك اتباع محمد ﷺ" (خازن)

اس کلام کو دوبارہ اس لئے ذکر کیا گیا تا کہ ان پر حجت قائم کرنے میں دوبارہ تاکید قائم کی جا سکے اور ان کو نبی کریم ﷺ کی اتباع کے چھوڑنے سے ڈرایا جا سکے۔

اور وجہ یہ تھی کہ بنی اسرائیل کو دوبارہ نعمتیں یاد دلانے میں جہاں ایک حکم کو زیادہ تاکید سے ذکر کرنا مقصود تھا۔ وہاں یہ بتانا بھی ضروری سمجھا گیا کہ یہ لوگ اتنے غافل ہیں کہ ایک مرتبہ ان کو یاد دلایا جائے تو یہ یاد نہیں کر سکتے اس لئے ان کو بار بار یاد دلا کر ان کی غفلت کو واضح کر دیا گیا۔

پہلے صرف نعمتوں کا ذکر کیا گیا۔ اب نعمتوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ رب تعالیٰ کے عذاب اور اس کی گرفت کا ذکر بھی کیا جا رہا ہے تا کہ ترغیب اور ترہیب دونوں کا ذکر ہو جائے، گویا کہ ان کو یوں کہا گیا ہے۔

اے بنی اسرائیل " **ان لم تطيعو فى لاجل سوابق نعمتى فاطيعونى للخوف من لواحق عقابى**" اگر تم میری اطاعت میری نعمتوں کی وجہ سے نہیں کرتے جن نعمتوں کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے تو میرا عذاب جو تمہیں لاحق ہونے والا ہے اس کے خوف سے میری اطاعت کرو۔ (روح المعانی)

یا یوں کہا جائے کہ گویا رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ **ان لم تطيعونى لاجل سوالف نعمتى**

علیکم فاطیعونی للخوف من عقابی فی المستقبل ﴾

اگر تم ماضی کی میری نعمتوں کو یاد کر کے میری اطاعت نہیں کرتے تو مستقبل کے میرے عذاب سے ڈر کر میری اطاعت کرو۔ (کبیر)

﴿ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ ﴾ : ''اور بیشک میں نے تمہیں فضیلت دی'' فضیلت بھی نعمت ہے جب پہلے تمام نعمتوں کا ذکر کر دیا گیا تو فضیلت کو علیحدہ ذکر کیوں کیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں قاعدہ "**تخصیص بعد از تعمیم**" پایا گیا ہے کیونکہ "**التفضیل هو اجل النعم**" بنی اسرائیل کو فضیلت دیا جانا تمام نعمتوں سے عظیم نعمت تھی، اس لئے عام نعمتوں کے بعد اس کی خصوصیت کے پیش نظر اسے علیحدہ ذکر کر دیا گیا۔ (از روح المعانی)

بنی اسرائیل کو فضیلت کیا دی گئی؟

یہاں بھی خطاب اگر چہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے بنی اسرائیل کو ہے، لیکن انہیں وہ نعمتیں اور وہ فضیلت یاد دلائی جا رہی جو ان کے آباؤ اجداد کو حاصل تھیں۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ اس فضیلت سے مراد ان اسلاف یعنی آباؤ اجداد کی وہ فضیلت معتبر ہے جو موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بعد انہوں نے جب تک دین کو نہیں بدلا تھا۔ جب انہوں نے دین کو بدل دیا تو وہ رب تعالیٰ کی رحمت سے دور ہو گئے، اور اس کے غضب کے مستحق ہو گئے۔ ان کی فضیلت کو علامہ مظہری رحمہ اللہ نے ان الفاظ سے ذکر فرمایا:

> "**فضلهم الله بما منح عليهم من النبوة والكتاب والايمان والعلم والاعمال الصالحة والملك والعدالة ومناصرة الانبياء**" (مظهری)
>
> اللہ تعالیٰ نے ان کو نبوت عطا کر کے فضیلت دی۔ یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک آنے والے تمام انبیاء کرام بنی اسرائیل سے ہی ہوئے اور کتاب (توراۃ، زبور، انجیل) ان کو عطاء ہوئی، ایمان ان کو نصیب ہوا، علم ان کو دیا گیا۔ نیک اعمال کی توفیق ان کو بخشی گئی، بادشاہت ان کو حاصل رہی، عدالت ان کو حاصل ہوئی، اور انبیاء کرام کی امداد کی توفیق انہیں عطاء ہوئی۔

جب ان کے آباؤ اجداد کو ان چیزوں سے فضیلت دی گئی تو یقیناً ان کے لئے بھی وہ نعمت اور فضیلت پائی گئی، اس لئے کہ " فضل الآباء یوجب شرفا فی الابناء " آباء کی فضیلت کا شرف ان کی اولاد کو بھی حاصل ہوتا ہے۔ مقصد نعمتوں اور فضیلت کے ذکر کا یہ تھا کہ جب تمہیں معلوم ہے کہ انبیاء کرام کو وحی اور کتاب کے ذریعے رب تعالیٰ نے فضیلت سے نوازا اور تمہارے آباء پر نازل ہونے والی الہامی کتب میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف کا ذکر ہے تو جب تک تم نبی کریم ﷺ پر ایمان نہیں لاؤ گے تمہارا اپنی کتابوں پر ایمان ہو ہی نہیں سکتا۔ (از مظہری)

وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ : یہاں بظاہر یہ سمجھ آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو تمام جہان والوں پر فضیلت دی۔ اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے:

" وهو انه یلزم ان یکونوا افضل من محمد ﷺ وذلک باطل بالاتفاق "

کہ اس سے تو یہ لازم آئے گا کہ وہ نبی کریم ﷺ سے بھی افضل ہوں، حالانکہ یہ تو بالاتفاق باطل ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ تمام مخلوق سے افضل ہیں۔

بلکہ بنی اسرائیل تو نبی کریم ﷺ کی امت سے بھی افضل نہیں ہو سکتے۔ اسلئے کہ نبی کریم ﷺ کی امت کا تمام امتوں سے افضل ہونا رب تعالیٰ نے بیان فرمایا ﴿ کنتم خیر امة اخرجت للناس ﴾ اس کا جواب یہ دیا گیا " (علی العالمین) ای عالمی زمانهم " بنی اسرائیل کو انکے زمانے میں دوسرے لوگوں پر فضیلت دی گئی اس سے مراد ان کے آباء ہیں جب تک انہوں نے دین کو نہیں بدلا تھا۔
(از کبیر ، بیضاوی ، شیخ زادہ)

جلالین اور مظہری میں بھی یہی الفاظ ہیں " ای عالم زمانهم " ان کو اپنے زمانہ کے لوگوں پر فضیلت دی گئی تھی۔ صاوی میں " عالمی زمانهم " سے تفسیر جلالین میں مذکور ہونے کی وجہ بیان کی گئی ہے:

" (عالمی زمانهم) دفع بذلک ما یقال ان المراد بالعالمین ما سوی الله فیقتضی ان بنی اسرائیل افضل مما سواهم من الاولین والآخرین فاجاب بان المراد بالعالمین عالمو زمانهم " (صاوی)

" علی العالمین " سے بظاہر یہ پتہ چلتا تھا کہ "عالم" تو اللہ تعالیٰ کے ماسوا تمام مخلوق کو کہا جاتا ہے۔ اس سے تو یہ لازم آئے گا کہ بنی اسرائیل کو تمام پہلے اور بعد میں آنے والے لوگوں پر فضیلت دی

گئی تھی حالانکہ یہ تو درست نہیں کہ ان کو نبی کریم ﷺ اور آپ کی امت پر فضیلت حاصل ہو۔ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ "علی العلمین" سے مراد "علی عالمی زمانهم" ہے یعنی ان کو اپنے زمانہ میں دوسرے لوگوں پر فضیلت حاصل تھی۔ کمالین میں اس طرح ذکر کیا گیا:

"یعنی لیس المراد بالعالم جمیع ما سوی اللہ لیلزم تفضیلهم علی هذه الامة امة محمد ﷺ بل المراد بالعالم کل موجود سواه فی ذلک الوقت"

یعنی عالم سے مراد اللہ تعالیٰ کے بغیر جمیع اشیاء نہیں تاکہ بنی اسرائیل کی فضیلت نبی کریم ﷺ کی امت پر لازم نہ آئے، بلکہ عالم سے مراد اس وقت ان کے بغیر جو بھی تھے ان پر انہیں فضیلت دی گئی۔

تفاسیر سے جو وضاحت ذکر کی گئی ہے اس کو بھی سامنے رکھیں اور تراجم کو بھی دیکھیں تو انشاء اللہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بہت ہی خوب نظر آئے گا:

﴿ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ﴾

''اور اس کو کہ میں نے تم کو بڑائی دی تمام عالم پر''	(محمود الحسن صاحب)
''تمہیں دنیا کی ساری قوموں پر فضیلت دی تھی''	(مودودی صاحب)
''اور یہ کہ میں نے تم کو جہان کے لوگوں پر فضیلت بخشی تھی''	(فتح محمد صاحب)
''اور وہ جو میں نے تم کو بڑا کیا جہان کے لوگوں سے''	(شاہ عبدالقادر صاحب)
''اور تحقیق میں نے بزرگی دی تم کو اوپر عالموں کے''	(شاہ رفیع الدین صاحب)
''کہ میں نے تم کو تمام دنیا جہان والوں پر فوقیت دی تھی''	(اشرف علی صاحب)
''اور یہ کہ اس سارے زمانہ میں تمہیں بڑائی دی''	(اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلویؒ)

تنبیہ: اسی آیۃ سے بعض لوگوں نے مطلقاً فرشتوں پر انسانوں کی فضیلت ثابت کی کہ ﴿عَلَی الْعٰلَمِیْنَ﴾ میں فرشتے بھی آتے ہیں۔ جب بنی اسرائیل کو تمام جہان والوں پر فضیلت حاصل ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کو ہر فرشتے پر فضیلت حاصل ہے۔ یہ قول ان لوگوں کا باطل ہے اس لئے کہ ﴿ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ﴾ سے مراد تمام جہان والے ہیں ہی نہیں، بلکہ صرف

بنی اسرئیل کے زمانہ کے لوگ ہیں اسی لئے علامہ بیضاوی نے فرمایا "واستدل بہ علی تفضیل البشر علی الملک وھو ضعیف" اس آیۃ سے یہ دلیل پکڑنا کہ ہرانسان ہرفرشتے سے افضل ہے درست نہیں۔ یہ دلیل کمزور ہے وجہ وہی ہے جس کا تفصیلی طور پر بیان کیا جاچکا ہے۔

﴿ وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴾

۱) "اور ڈرو اس دن سے جس دن کوئی جان دوسرے کا بدلہ نہ ہوسکے گی، اور نہ کافر کے لئے کوئی سفارش مانی جائے اور نہ کچھ لے کر اس کی جان چھوڑی جائے اور نہ ان کی مدد ہو۔

۲) "اور ڈرو اس دن سے جس دن نہیں بدلہ دے گا کوئی نفس کسی نفس کی طرف سے کچھ (بھی)۔ اور نہیں قبول کی جائے کسی کافر کے لئے کوئی شفاعت۔ اور نہیں لیا جائے گا اس سے کوئی فدیہ اور نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی"

بنی اسرائیل کو نعمتیں یاد دلانے کا اصل مقصد یہی تھا کہ وہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لائیں پہلے نعمتوں کا ذکر کر کے ان کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا۔ اب وعید ذکر کر کے یعنی ڈرا کر ان کو ایمان لانے کے متعلق کہا جارہا ہے کہ اگر تم نے نبی کریم ﷺ پر ایمان نہ لایا تو رب تعالیٰ کی گرفت میں آجاؤ گے، پھر تمہیں اس سے چھڑانے والا کوئی نہیں ہوگا۔

سزا سے چھڑانے کے چار طریقوں کی نفی:

کوئی شخص کسی دوسرے کو عذاب سے یا تو قہر ودبدبہ سے چھڑاتا ہے یا اس کے بغیر۔ پہلی صورت یعنی کسی کو زبردستی چھڑالینا نصرت ہے، اس کی نفی بھی کردی۔ دوسری صورت یعنی زبردستی کسی کو نہ چھڑایا جائے بلکہ سفارش کے ذریعے مفت ہی چھڑالیا جائے اس کی نفی بھی کردی۔ دوسری صورت یعنی زبردستی کسی کو نہ چھڑایا جائے۔ بلکہ سفارش کے ذریعے مفت ہی چھڑالیا جائے اس کی نفی بھی کردی۔ تیسری صورت یہ ہے کہ کسی کو چھڑایا جائے لیکن اس کے ذمہ جو حقوق ہیں وہ ادا کردیئے جائیں اس کی بھی نفی کر

دی چوتھی صورت یہ ہے کہ مال بطور فدیہ دے کر کسی کو چھڑا لیا جائے، اس کی بھی نفی کر دی۔ (بیضاوی)

﴿ وَاتَّقُوْا ﴾: وقـی سے ماخوذ ہے جس کا معنی بچنا۔ اصل مطلب ہے بچ جاؤ پھر تقریباً مراد یہی ہے کہ ڈر جاؤ۔

﴿ یَوْمًا ﴾: "ای ما فیہ من الحساب و العذاب" یعنی اس دن سے ڈرو جس دن حساب و کتاب ہونا ہے۔ اور اس دن سے ڈرو جس دن کفار کے لئے عذاب ہوتا ہے۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

"یوما" کو "اتقوا" کی طرف ظرف نہیں بنایا جا سکتا۔ کیونکہ ڈرنا تو دنیا میں ہے قیامت میں ڈرنا کوئی نفع نہیں دے گا۔ اور "یوما" کو مفعول بہ بھی نہیں بنایا جا سکتا کیونکہ دن سے ڈرنا مقصود نہیں، بلکہ مقصود اس دن کے عذاب اور حساب سے ہے۔ اس لئے حذف مضاف ہے یعنی مقصد اس طرح مکمل ہوگا جب کہ عبارت یوں ہوگی:

﴿ وَاتَّقُوْا عَذَابَ یَوْمَ وَحِسَابِ یَوْمَ ﴾ اس دن کے حساب اور عذاب سے ڈرو۔

(از شیخ زادہ)

لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْأً:

"ای لا تقضی عن غیرھا ولا تؤدی شیأ من الحقوق الفائتة علی ذلک الغیر"

کوئی نفس کسی دوسرے نفس کے فوت ہونے والے حقوق کو اس کی طرف سے ادا نہیں کر سکے گا۔

فائدہ: جزی عنہ کا معنی ہے "قضی عنہ" اس کی طرف سے ادا کر دیا۔ جیسا کہ حضرت ابو بردہ بن نیار کی حدیث میں مذکور ہے "تجزی عنک ولا تجزی عن احد بعدک" یہ چھ ماہ کا بکری کا بچہ تمہاری قربانی کو ادا کر دے گا، لیکن تمہارے بعد کسی اور کی قربانی کو ادا نہیں کرے گا۔ بخاری میں حدیث مذکور ہے:

"ان ابا بردة قال یا رسول اللہ انی نسکت شاتی قبل الصلوة وعرفت

ان الیوم یوم اکل وشرب واحببت ان تکون شاتی اول ما یذبح فی بیتی فذبحتها وتغذیت بها قبل ان آتی الصلوٰۃ فقال رسول اللہ ﷺ "شاتک شاۃ لحم ، قال یا رسول اللہ فان عندنا عناقا جزعۃ ھی احب الی من شاتین افتجزی عنی قال نعم ولا تجزی عن احد بعدک "

حضرت ابو بردہ نے کہا یا رسول اللہ بیشک میں نے نماز سے پہلے اپنی بکری کو بطور قربانی ذبح کر دیا، کیونکہ میں نے یہی سمجھا کہ یہ کھانے پینے کا دن ہے، اس لئے میں نے یہ پسند کیا کہ میرے گھر میں سب سے پہلے بکری ذبح ہو۔ میں نے بکری کو ذبح کر لیا اور نماز میں آنے سے پہلے صبح کھانا بھی کھا آیا، نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمہاری یہ بکری تو گوشت ہی بنی (قربانی تو نماز سے پہلے ادا نہیں ہوتی) انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے پاس چھ ماہ کا ایک بکری کا بچہ ہے جو مجھے دو بکریوں سے بھی زیادہ پسند ہے، کیا وہ میری قربانی ادا کر دے گا۔ آپ نے فرمایا ہاں (تمہاری قربانی تو ادا کر دے گا) لیکن تمہارے بعد کسی ایک کی قربانی ادا نہیں کرے گا۔

اس حدیث پاک کو بیان کرنے سے صرف لفظی تحقیق مراد ہے کہ " لا تجزی " کا معنی "لاتقضی " ہے۔ (از شیخ زادہ)

ہاں البتہ یہ خیال رہے کہ نبی کریم ﷺ کو رب تعالیٰ نے امور شرعیہ میں مختار بنایا۔ اسی لئے ایک حکم کو ایک صحابی کے لئے جائز رکھا، لیکن دوسروں کے لئے جائز نہیں۔ " لا تجزی " اگر جزاء سے ہو" یا" صرف رسم الخط کے طور پر ہو اصل میں ہمزہ ہو (چونکہ بعض قراءتوں میں ہمزہ سے بھی استعمال ہے) تو معنی یہ ہو گا:

" لو تؤاخذ نفس بذنب اخری ولا تدفع عنها شیأ "

" کسی نفس کو دوسرے نفس کے بدلے میں پکڑا نہیں جائے گا کہ ایک نفس دوسرے نفس کی جگہ عذاب میں مبتلاء ہو کر اسے عذاب سے چھڑا لے ایسا نہیں ہو سکے گا۔

تنبیہ: ایسا تو نہیں ہو سکے گا کہ بندہ خود کہے کہ میں کسی کے حقوق ادا کر دیتا ہوں یا یہ کہے کہ مجھے اس کی جگہ پکڑ لیا جائے اور اسے چھوڑ دیا جائے۔ لیکن یہ ہو سکے گا کہ اللہ تعالیٰ خود کسی کی گرفت کرے اور بطور سزا اس کے اعمال لے کر دوسرے کے دے دیئے جائیں جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

☆ " عن ابی هریرة ان رسول الله ﷺ قال من کانت عنده مظلمة لأخیه من عرضه اوشئی فلیتحلله منه الیوم قبل الا یکون دینار ولادرهم ان کان له عمل صالح اخذ منه بقدر مظلمته وان لم یکن له حسنات اخذ من سیات صاحبه فحمل علیه "......خرجه البخاری .

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی شخص پر اپنے دوسرے (مومن) بھائی کے حقوق ہوں۔ اس نے کچھ مظالم کیے ہوئے ہوں تو ان حقوق کو ادا کردے ان مظالم کو معاف کرالے اس دن سے پہلے جس دن کوئی دینار اور کوئی درہم اس کے پاس نہیں ہوں گے، اس لئے جتنے حقوق اس کے ذمہ ہوں گے ان کے بدلے اس کے نیک اعمال لے کر اس دوسرے شخص کو دے دیئے جائیں گے۔ اگر اس کے نیک اعمال نہ ہوئے تو دوسرے شخص کے گناہ اس کے کھاتہ میں ڈال دیئے جائیں گے۔ (از قرطبی)

☆ " عن ابی هریرة ان رسول الله ﷺ قال اتدرون ما المفلس قالوا المفلس فینا من لادرهم له ولا متاع فقال ان المفلس من امتی من یاتی یوم القیامة بصلوة وصیام وزکوة ویاتی قد شتم هذا وقذف هذا واکل مال هذا وسفک دم هذا وضرب هذا فیعطی هذا من حسناته وهذا من حسناته فان فنیت حسناته قبل ان یقضی ما علیه اخذ من خطایا هم فطرحت علیه ثم طرح فی النار " (مسلم ج ۲ باب تحریم الظلم ص ۳۲۸)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو غریب کون ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کیا ہم میں غریب وہ ہوتا ہے جس کے پاس مال و متاع نہ ہو، تو آپ نے فرمایا میری امت میں سے غریب وہ ہوگا جس شخص کے پاس قیامت کے دن نمازیں، روزے اور زکوٰۃ (جیسے نیک اعمال) ہوں گے، لیکن اس نے کسی کو گالی دی ہوں گی، کسی کو تہمت لگائی ہوگی کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا، کسی کو مارا ہوگا، تو اس کی نیکیاں ایک کو دی جائیں گی اور دوسرے کو دی جائیں گی اگر اس کے ذمہ جو حقوق تھے وہ ان نیکیوں سے ادا نہ ہوئے تو ان لوگوں کے گناہ اس پر ڈال دیئے جائیں گے اور اسے آگ میں ڈال دیا جائے گا۔

مقام توجہ: علامہ نووی رحمہ اللہ نے اسی حدیث کی شرح میں بیان فرمایا ہے کہ بعض مبتدعہ فرقہ نے یہ کہا ہے کہ یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی:

﴿ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ اُخْرٰی ﴾ ''کوئی نفس کسی نفس کا بوجھ نہیں اٹھائے گا'' کے منافی ہے لیکن ان کا یہ کہنا غلط اور باطل ہے کیونکہ آیۃ کریمہ اور حدیث پاک میں وجوہ مختلف ہیں۔

حدیث شریف میں ذکر ہے کہ لوگوں کے حقوق اپنے ذمہ لے کر مرنے والے کو اس کے فعل، اس کے اپنے بوجھ، اس کے ظلم کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا، اسی عذاب کا یہ حصہ بھی ہوگا کہ لوگوں کے حقوق اس کی طرف متوجہ ہوں گے، اس کی نیکیاں ان کو دے دی جائیں گی۔ جب اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی اور ابھی لوگوں کے حقوق ختم نہیں ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے حکمت کے تقاضا کے پیش نظر اور اپنی مخلوق میں عدل کرنے کی وجہ سے ان کے گناہ اس کے ذمہ لگا دے گا، اور اسے آگ کا عذاب دیا جائیگا۔

" فحقيقة العقوبة انما هي بسبب ظلمه ولم يعاقب بغير جناية وظلم منه وهذا كله مذهب اهل السنة "

اس کو عذاب اس کے ظلم کی وجہ سے ہوگا ایسا نہیں کہ اس کو بغیر کسی جرم اور بغیر کسی ظلم کے عذاب دے دیا جائے یہ سب اہل سنت و جماعت کا مذہب ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اب واضح ہو گیا کہ آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ بغیر جنابت اور بغیر ظلم کے کسی کا بوجھ کسی دوسرے کے سر نہیں ڈالا جائے گا، اور نہ ہی اپنی خوشی سے کسی کا بوجھ کوئی دوسرا اٹھائے گا۔

﴿ وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ ﴾: ''اور کسی کافر کی شفارش قبول نہیں کی جائے گی''۔

"الشفاعة ماخوذة من الشفع وهما الاثنان " شفاعت ماخوذ ہے شفع سے جس کا معنی ہے دو اس کا مقابل لفظ وتر ہے جب کسی کی سفارش کی جاتی ہے تو یقینی بات ہے کہ وہ پہلے ایک ہوتا ہے، اور پھر وہ دو ہو جاتے ہیں۔

زمین پر شفعہ کرنے کا بھی یہی مطلب ہے کہ وہ شفعہ کے ذریعے اپنی زمین سے دوسرے کی زمین کو ملا لیتا ہے یہاں مطلقاً شفاعت کے نہ قبول کا ذکر نہیں بلکہ اس سے مراد کفار ہیں کہ ان کے لئے شفاعت قبول نہیں۔ (از قرطبی)

شفاعت کا تفصیلی ذکر انشاء اللہ آیۃ کریمہ کی لفظی بحث کے بعد کیا جا رہا ہے۔

﴿ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ ﴾: اور کسی نفس کا فدیہ نہیں لیا جائے گا۔ العدل (بفتح العين)

فداء ، وبکسرھا المثل ۔عدل کو جب عین کے فتحہ سے پڑھا جائے تو اس کا معنی فدیہ،اور جب عین کے کسرہ سے پڑھا جائے تو اس کا معنی ہے مثل ، یہاں پہلا معنی ہی معتبر ہے۔

﴿وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ﴾: ای یعانون ، والنصر ، العون ، والانصار ، الاعوان

اوران کی مدد نہیں کی جائے گی ،نصر کا معنی ہے مدد کرنا،اور انصار کا معنی مددگار۔ (از قرطبی)

نصرت اور معونت میں فرق:

" والنصر اخص من المعونة لا ختصاصه بدفع الضر والشدائد بخلاف المعونة فانها قد تکون لاقامة الصنائع والاعمال "

(بیضاوی مع شیخ زادہ)

نصرت بنسبت معونت کے خاص ہے کیونکہ نصرت اسی امداد سے خاص ہے جس کی وجہ سے مشکلات کو دور کیا جائے ۔لیکن معونت عام ہے اس لئے کہ معونت میں وہ معنی بھی پایا جاتا ہے جو نصرت میں پایا جاتا ہے لیکن اس میں یہ معنی بھی پایا جاتا ہے کہ کسی کی صنعت اور عمل میں امداد کی جائے۔

لیکن یہ بھی خیال رہے کہ یہ فرق تو حقیقی معنی کے لحاظ پر ہے مجازی معنی کے لحاظ پر نصرت بھی عام معنی میں استعمال ہوتا رہتا ہے، یعنی مطلقاً امداد کرنا نصرت کہلاتا ہے خواہ مشکلات کے دور کرنے میں امداد کی جائے ،خواہ کسی کے کام میں اس کی امداد کی جائے۔

شفاعت کی بحث: شفاعت کا لغوی معنی پہلے عرض کردیا گیا ہے شفاعت کا اصطلاحی معنی یہ ہے:

" الشفاعة ان یستوھب احد لا حد شیأ ویطلب له حاجة "

شفاعت کا مطلب یہ ہے کوئی شخص دوسرے کے لئے بخشش کا مطالبہ کرے اور اس کے لئے حاجت طلب کرے۔

اس آیۃ کریمہ میں شفاعت کی نفی کفار کے لئے ہے:

﴿وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ﴾ ای النفس المؤمنة لا تقبل شفاعتها فی النفس الکافرة "

یعنی کسی مومن کی طرف سے کافر کے حق میں کوئی شفاعت قبول نہیں کی جائے گی۔

اسی سے یہ واضح ہوگیا کہ کافر کے لئے جب مومن شفاعت نہیں کرسکے گا تو کافر کے لئے کافر کی

شفاعت کرنا تو عقلاً محال ہے۔

تنبیہ: " لم یؤذن لها فی اصل الشفاعة حتی یتسبب عنها القبول ولیس المرادانها تشفع ولکن لا یقبل منها تلک الشفاعة لقوله تعالیٰ فما لنا من شافعین "

مومنوں کو یہ حق ہی نہیں دیا جائے گا کہ وہ کافروں کے لئے شفاعت کریں۔ جب ان کو یہ حق ہی حاصل نہیں ہوگا تو یقیناً قبول کرنے کی کوئی صورت ہی نہیں ہوگی۔ آیۃ کریمہ کا یہ مطلب نہیں کہ مومن حضرات کافروں کے لئے شفاعت کریں گے اور ان کی شفاعت کو قبول نہیں کیا جائے گا، بلکہ انہوں نے شفاعت کرنی ہی نہیں۔ (از صاوی)

﴿ وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ ﴾ یعنی من الکافرین کما قال فما تنفعهم شفاعة الشافعین "

اس آیۃ کریمہ اور دوسری آیۃ کریمہ ﴿ فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ ﴾ کا مفہوم ایک ہی ہے کہ کافروں کے لئے کوئی شفاعت نفع مند نہیں ہوگی۔ (از ابن کثیر)

" ارید بالآیة نفی ان یدفع العذاب عن احد من الکفار احد بوجه من الوجوه فانه اما ان یکون قهرا فهو النصرة اوبلاقهر مجانا وهو الشفاعة او باداء ما کان علیه وهو ان یجزی عنه او بغیره وهو ان یعطی عنه عدلا " (مظهری)

آیۃ کریمہ میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کافروں سے عذاب کو کسی طرح بھی دور نہیں کیا جاسکے گا، نہ قہر سے کسی کی نصرت (امداد) ہوگی۔ اور نہ ہی بغیر قہر کے مفت کسی کی شفاعت کو قبول کیا جاسکے گا اور نہ ہی کوئی کسی کے حقوق ادا کر سکے گا اور نہ ہی کوئی کسی کے بدلے میں اپنے آپ کو عذاب میں گرفتار کرے گا اور نہ ہی کوئی کسی کا فدیہ دے سکے گا۔

اس سے واضح ہوا کہ اس آیۃ میں ذکر ہی کفار کا ہے اور کفار کے لئے ہی شفاعت کے نہ قبول کرنے کا ذکر ہے:

" والمعنی لا تقبل الشفاعة اذا کانت النفس کافرة "

مطلب یہی ہے کہ کافر کے لئے شفاعت قبول نہیں کی جائیگی۔ (خازن)

" ای لا تقبل الشفاعة اذا کانت النفس کافرة "

مطلب یہی ہے کہ کافر کے لئے شفاعت قبول نہیں کی جائیگی۔ (مدارک)

تقریباً جمیع مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ آیۂ کریمہ میں شفاعت کی نفی کافروں کے لئے یہ مطلب ہی نہیں کہ کسی کی شفاعت کسی کے لئے بھی قبول نہیں۔

تراجم کو دیکھئے: ابھی تک جو مختصر بحث کی ہے اسی سے تراجم میں فرق سمجھنا آسان ہو گیا، اگرچہ تفصیلی بحث ابھی ان شاء اللہ متصل ہی بیان ہو رہی ہے۔

﴿وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ﴾

''اور قبول نہ اس کی طرف سے سفارش'' (محمود الحسن صاحب، شاہ عبدالقادر صاحب)

''نہ کسی کی طرف سے سفارش قبول ہو گی'' (مودودی صاحب)

''اور نہ کسی کی سفارش منظور کی جائے گی'' (فتح محمد صاحب)

''اور ان قبول کی جائے اس سے سفارش'' (شاہ رفیع الدین صاحب)

''اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی سفارش قبول ہو سکتی ہے'' (اشرف علی صاحب)

''اور نہ کسی کے حق میں سفارش قبول ہو گی'' (عبدالماجد صاحب)

''اور نہ کافر کے لئے کوئی سفارش مانی جائے'' (اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلویؒ)

تراجم سے دیکھنے سے واضح ہوا کہ اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ مفسرین کرام کی طویل بحثوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ اور دوسرے تراجم شکوک وشبہات تو پیدا کر رہے ہیں لیکن اصل مسئلہ سمجھانے سے قاصر ہیں کیونکہ دوسرے تراجم سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کسی کی سفارش کسی کے لئے قبول نہیں۔ حالانکہ یہ غلط ہے کیونکہ انبیاء کرام اور صلحاء کی شفاعت قبول ہو گی۔ لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے واضح ہو رہا ہے کہ یہاں شفاعت کی نفی کافروں کے حق میں ہے کہ کافر کے لئے سفارش قبول نہیں ہو گی۔

شفاعت کا ثبوت قرآن پاک سے:

﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا﴾ (پ ۵ ع ۶)

''اور اگر وہ اپنی جانوں پر ظلم کریں تو اے محبوب تمہارے حضور حاضر ہوں اور پھر اللہ سے معافی چاہیں

اور رسول ان کی شفاعت فرمائے تو ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں"

اس آیۂ کریمہ میں رسول اللہ ﷺ کو گناہگار لوگوں کی شفاعت کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ آپ کی شفاعت کو رب تعالیٰ قبول فرما کر ان کی توبہ قبول کرے گا اور ان پر رحم فرمائے گا۔

﴿ عَسٰی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴾ (پ ۱۵)

"قریب ہے کہ تمہیں تمہارا رب ایسی جگہ کھڑا کرے جہاں سب تمہاری حمد کریں"

مقام محمود مقام شفاعت ہے کہ اس میں اولین و آخرین حضور کی حمد کریں گے، اسی پر جمہور ہیں۔ (خزائن العرفان)

﴿ وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی ﴾ (پ ۳۰)

"اور بیشک قریب ہے کہ تمہارا رب تمہیں اتنا دے گا کہ تم راضی ہو جاؤ گے"

اور یہ آیت آخرت کی عزت و تکریم کو بھی شامل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو شفاعت عامہ وخاصہ اور مقام محمود وغیرہ جلیل نعمتیں عطا فرمائیں۔ مسلم شریف کی حدیث شریف میں ہے نبی کریم ﷺ نے دونوں ہاتھ مبارک اٹھا کر امت کے حق میں رو کر دعا فرمائی اور عرض کیا "اللھم امتی امتی" اللہ تعالیٰ نے جبرائیل کو حکم دیا کہ محمد مصطفیٰ ﷺ کی خدمت میں جا کر دریافت کرو رونے کا کیا سبب ہے باوجودیکہ اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے، جبرائیل نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق آ کر دریافت کیا، نبی کریم ﷺ نے انہیں تمام حال بیان کیا اور امت کے غم کے متعلق بیان فرمایا، جبرائیل امین نے رب کے حضور عرض کیا کہ تیرے محبوب یہ بتاتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل کو حکم دیا کہ جاؤ اور میرے حبیب ﷺ سے کہو کہ ہم آپ کو آپ کی امت کے بارے میں عنقریب راضی کریں گے۔ اور آپ کو گراں خاطر (بوجھل دل) نہ ہونے دیں گے۔

حدیث شریف میں ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب تک میرا ایک امتی بھی دوزخ میں رہے میں راضی نہیں ہوں گا۔ آیت کریمہ کی وضاحت حدیث پاک سے جو بیان کی گئی اس سے واضح ہو گیا کہ حضور ﷺ کو اپنی امت کی شفاعت کا حق دیا گیا۔ (از خزائن)

﴿ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِکَ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَلِلْمُؤْمِنَاتِ ﴾ (پ ۲۶)

"اور اے محبوب اپنے خاصوں اور عام مسلمانوں مردوں اور عورتوں کے گناہوں کی معافی ما-

اس آیۃ کریمہ میں بھی واضح طور پر رب تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک علیہ الصلوۃ والسلام کو اپنی امت کے خاص اور عام مردوں اور عورتوں کے لئے شفاعت کا حکم دیا۔

﴿ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ﴾ (پ ۳)

''وہ کون ہے جو اس کے ہاں سفارش کرے بغیر اس کی اجازت کے''

اس آیۃ میں کفار کا رد ہے کیونکہ وہ کہتے تھے کہ ہمارے بت ہماری شفاعت کریں گے لیکن رب تعالیٰ نے ان کا رد فرماتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا ﴿ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ﴾ جس سے واضح ہو رہا ہے کہ رب تعالیٰ کے ہاں اس کی اجازت کے بغیر کسی کو شفاعت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہوگا ہاں البتہ انبیاء کرام، ملائکہ، شہداء، علماء کو رب تعالیٰ کی طرف سے شفاعت کرنے کا اذن حاصل ہوگا۔

﴿ لَا یَمْلِکُوْنَ الشَّفَاعَۃَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَھْدًا ﴾ (پ ۱۶)

''لوگ شفاعت کے مالک نہیں مگر وہی جنھوں نے رحمٰن کے پاس قرار رکھا ہے

یعنی رب تعالیٰ کے ہاں شفاعت کرنے کا کسی کو حق حاصل نہیں ہوگا، سوائے ان کے جن کا رب کے پاس عہد ہے مراد یہی ہے کہ جن کو رب تعالیٰ کی طرف سے اجازت ہوگی وہی شفاعت کے مالک ہوں گے۔

﴿ یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ☆ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ﴾

''جس دن نہ مال کام آئے گا نہ بیٹے مگر وہ جو اللہ کے حضور حاضر ہوا سلامت دل لے کر''

سلامت دل لے کر کا یہ مطلب ہے کہ شرک اور کفر سے پاک ہو کر رب تعالیٰ کے ہاں جو حاضر ہوں گے ان کو مال بھی نفع دے گا جو راہ خدا میں خرچ کیا ہو، اور اولاد بھی صالح ہو جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ جب آدمی مرتا ہے اس کے عمل منقطع ہو جاتے ہیں سوا تین کے ایک صدقہ جاریہ، دوسرا وہ مال جس سے وہ لوگ نفع اٹھائیں تیسری نیک اولاد جو اس کے لئے دعاء کرے۔

﴿ خُذْ مِنْ اَمْوَالِھِمْ صَدَقَۃً تُطَھِّرُھُمْ وَتُزَکِّیْھِمْ بِھَا وَصَلِّ عَلَیْھِمْ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّھُمْ وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴾ (پ ۱۱)

''اے محبوب ان کے مال میں سے زکوٰۃ حاصل کرو، جس سے تم انہیں ستھرا اور پاکیزہ کر دو اور ان کے حق

میں دعاءِ خیر کرو، بیشک تمہاری دعا ان کے دلوں کا چین ہے اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے''۔

اس آیۂ کریمہ میں بھی رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو ان لوگوں کے لئے دعاء کرنے کا حکم دیا جن سے آپ زکواۃ حاصل کریں اور ساتھ یہ بھی بتادیا کہ آپ کی دعاء ان کے دلوں کا چین ہے۔ سبحان اللہ اگر شفاعت قبول ہی نہ ہو تو آپ کو دعاء کرنے اور شفاعت کرنے کا حکم دینے کا کیا فائدہ ہے۔

جن آیات کریمہ کا ذکر کیا گیا ہے ان تمام سے واضح طور پر سمجھ آرہا ہے کہ شفاعت کرنے کا ان بزرگ ہستیوں کو حق حاصل ہے جن کو رب تعالیٰ نے اجازت دے رکھی ہے۔

شفاعت کا ثبوت احادیث مبارکہ سے:

" عن ابی هریرة عن النبی ﷺ قال اسعد الناس بشفاعتی یوم القیامة من قال لا اله الا الله خالصا من قلبه او نفسه " (رواه البخاری ، مشکوة باب الشفاعة)

حضرت ابو ہریرہ ؓ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن لوگوں میں سے وہ شخص نیک بخت ہوگا جس کو میری شفاعت حاصل ہوگی، میری شفاعت اسے ہی حاصل ہوگی جس نے خلوص قلب رخلوص نفس سے لا الہ الا اللہ کہا۔

اس حدیث پاک سے پتہ چلا کہ جو شخص مومن ہوا یعنی اس نے " لا الــه الا الله " پڑھا لیکن اس میں کوئی منافقت نہیں تھی اور شرک اور شک اور ریاء اور لوگوں کو سنانا، اپنا چرچا کرنا مقصود نہیں تھا تو اسے نبی کریم ﷺ کی شفاعت حاصل ہوگی۔ اور آپ کی شفاعت سے اسے سعادت حاصل ہوگی۔

☆ " وعن عبد الله بن عمرو بن العاص ان النبی ﷺ تلا قول الله تعالیٰ فی ابراهیم رب انهن اضللن کثیرا من الناس فمن تبعنی فانه منی وقال عیسی ان تعذبهم فانهم عبادک فرفع یدیه فقال اللهم امتی امتی وبکی فقال الله تعالیٰ یا جبریل اذهب الی محمد وربک اعلم فسله ما یبکیک فاتاه جبریل فسأله فاخبره رسول الله ﷺ بما قال فقال الله تعالیٰ لجبریل اذهب الی محمد فقل انا سنرضیک فی امتک ولا نسؤک "

(رواه مسلم مشکوة باب الشفاعة)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا ارشاد جو ابراہیم علیہ السلام کے حق میں نازل ہوا ﴿ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ﴾

تلاوت فرمایا۔

اور عیسیٰ علیہ السلام کے قول کی جو رب تعالیٰ نے حکایت بیان فرمائی ﴿اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ﴾ اسے تلاوت فرمایا پھر آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھایا تو کہا" اللھم امتی امتی" اور آپ رونے لگ گئے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا اے جبریل جاؤ محمد ﷺ کے پاس حالانکہ آپ کا رب خوب جانتا ہے پھر بھی ان سے سوال کرو تمہیں کس چیز نے رلایا۔ آپ کے پاس جبریل آئے انہوں نے آپ سے پوچھا رسول اللہ ﷺ نے اسے خبر دی۔ جبریل نے رب تعالیٰ کو بتایا جو نبی کریم ﷺ نے بتایا رب تعالیٰ نے جبریل کو کہا جاؤ محمد (ﷺ) کے پاس ان کو کہو ہم تمہیں تمہاری امت کے بارے میں راضی کریں گے پریشان نہیں کریں گے۔

وضاحت حدیث:

رسول اللہ ﷺ نے جب اس آیۃ کریمہ کا یہ حصہ تلاوت فرمایا ﴿رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ﴾ جس کا بعد والا حصہ یہ ہے ﴿وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ مکمل آیۃ کا ترجمہ اور مقصد یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا اے میرے رب بیشک ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا۔ یعنی یہ لوگوں کی گمراہی کا سبب ہیں۔ پس جس شخص نے میری تابعداری کی توحید اور اخلاص اور توکل میں بیشک وہ میرے متبعین ہیں اور میرا گروہ ہیں اور جس نے میری نافرمانی کی بیشک تو بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام نے رب کے حضور جو عرض کیا اسے قرآن پاک نے پیش کیا۔ نبی کریم ﷺ نے اس کی تلاوت فرمائی ﴿اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ﴾ اور اس سے آگے ہے ﴿وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ ان تمام الفاظ مبارکہ کا ترجمہ اور مطلب یہ ہے کہ اے اللہ تو ان کو عذاب دے تو بیشک وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان کی مغفرت کر دے تو بیشک تو غالب اور حکمت والا ہے یعنی تجھ پر کوئی غالب نہیں آ سکتا بیشک تو قوی اور قادر ہے اور تو جو چاہے حکم فرمائے، تو ایسا حاکم ہے کہ تیرے حکم کی مخالفت کی کسی کو طاقت نہیں تیرا ہر کام حکمت کے مطابق ہے۔

☆ وعن عمران بن حصین قال قال رسول اللہ ﷺ یخرج قوم من النار بشفاعة

محمد یدخلون الجنة یسمون الجهمیین ..... رواه البخاری ، وفی روایة یخرج قوم من امتی من النار بشفاعتی یسمون الجهنمیین "

عمران بن حصین کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا محمد کی شفاعت سے ایک قوم کو آگ سے نکالا جائے گا اور جنت میں داخل کر دیا جائے گا، ان کا نام ہی جہنمی لوگ ہوگا۔

خیال رہے ایک روایت میں "یخرج اقوم" کئی قوموں کو جہنم کی آگ سے نکال کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ حضور نے فرمایا میری امت میں سے ایک قوم کو میری شفاعت کی وجہ سے جہنم کی آگ سے نکالا جائے گا اور ان کا نام ہی جہنمی ہوگا۔

" قال الطیبی رحمه الله لیست التسمیة بها تنقیصا لهم بل استذکارا لیزدادوا فرحا الی فرح وابتهاجا الی ابتهاج ولیکون ذلک علما لکونهم عتقاء الله تعالیٰ " (مرقاۃ ج ١٠ ص ٣٠١)

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا ان کا نام جہنمی ان کی توہین، ان کی حقارت کیلئے نہیں رکھا جائے گا بلکہ ان کو یہ یاد دلانے کیلئے کہ وہ جہنم سے نکالے گئے ہیں تاکہ وہ اسے یاد کر کے زیادہ سے زیادہ خوش ہوں، اور زیادہ سے زیادہ ان کے چہروں پر مسرت کے آثار ظاہر ہوں۔ اور سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کو یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی اور نبی کریم ﷺ کی شفاعت سے ان کو جہنم سے نکالا ہے۔

☆ " وعن انس قال سألت النبی ﷺ ان یشفع لی یوم القیامة فقال انا فاعل قلت یا رسول الله فاین اطلبک قال اطلبنی اول ما تطلبنی علی الصراط قلت فان لم القک علی الصراط قال فاطلبنی عند المیزان قلت فان لم القک عند المیزان قال فاطلبنی عند الحوض فانی لا اخطئ هذه الثلاث المواطن رواه الترمذی وقال هذا حدیث غریب "
(مشکوۃ [illegible])

حضرت انس کہتے ہیں میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کیا آپ قیامت کے دن میری شفاعت فرمائیں گے؟ آپ نے فرمایا ہاں میں شفاعت کروں گا یہ کہتے ہیں میں نے پوچھا یا رسول اللہ میں آپ کو کہاں تلاش کروں؟ آپ نے فرمایا مجھے سب سے پہلے پل صراط پر تلاش کرنا۔ میں نے کہا یا رسول اللہ اگر میں پل صراط پر آپ کو نہ پاسکوں تو؟ آپ نے فرمایا پھر مجھے میزان پر تلاش کرنا۔ میں نے کہا یا رسول اللہ

اگر میری ملاقات میزان پر آپ سے نہ ہو سکے تو؟ آپ نے فرمایا پھر مجھے حوض کے پاس تلاش کرنا، میں ان تین جگہ سے ہٹ کر کہیں اور نہیں ہوں گا۔

خیال رہے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے جس شفاعت کے متعلق سوال کیا تھا وہ " الشفاعة الخاصة من بين هذه الامة دون الشفاعة العامة " شفاعت خاصہ مراد ہے جو نبی کریم ﷺ کی امت کو حاصل ہوگی۔ اس سے مراد شفاعت عامہ نہیں جو تمام امتوں کو حساب کے شروع کرنے کے لئے حاصل ہوگی ہے۔

اعتراض : اس حدیث سے سمجھ آ رہا ہے کہ نبی کریم ﷺ ان تینوں مقامات میں شفاعت کریں گے، کیونکہ نبی کریم ﷺ سے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے پوچھا ہی اس لئے تھا کہ میں آپ کو کہاں تلاش کروں تا کہ آپ کی خدمت میں شفاعت کرنے کی درخواست کروں۔ لیکن مشکوۃ باب الحساب فصل ثانی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" تین مقامات میں کوئی ایک دوسرے کو یاد نہیں کرے گا" وہ تین مقام آپ نے میزان، کتاب اور صراط ذکر فرمائے ہیں۔

اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ان مقامات میں کسی کو یاد نہیں فرمائیں گے اور نہ ہی کسی کی شفاعت فرمائیں گے ان دونوں احادیث میں کس طرح تطبیق دی جا سکتی ہے؟

جواب اول:

" جوابه لعائشة بذلك لئلا تتكل على كونها حرم رسول الله ﷺ
وجوابه لانس كيلا ييأس " (مرقاة ج ١٠ ص ٣٠٦)

نبی کریم ﷺ ہر شخص سے اس کے حال کے مطابق کلام فرماتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا تین وقتوں میں کوئی کسی کو یاد نہیں کرے گا اس کا مطلب یہ تھا کہ صرف یہ ہی خیال نہ کرنا کہ میں اللہ کے رسول ﷺ کی زوجہ ہوں آپ میری شفاعت کریں گے۔ اسی پر توکل نہ کر لینا بلکہ عمل بھی کرنا۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کو جواب دیا (کہ آپ مجھے تین مقامات میں تلاش کرنا، میں ان مقامات میں سے ہی کسی ایک مقام میں ہوں گا اور تمہاری شفاعت کروں گا) تا کہ آپ مایوس نہ ہوں۔

جواب دوم:

"ان الحديث الاول (حديث عائشة) محمول على الغائبين فلا احد يذكر احدا من اهله الغيب والحديث الثانی (حديث انس) محمول على من حضره من امته" (مرقاة ج ۱۰ ص ۳۰۶)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کا تعلق ان مقامات میں موجود نہ ہونے والے لوگوں سے ہے یعنی آپ نے فرمایا جب کسی کے اہل وعیال ان مقامات میں موجود نہیں ہوں گے ان کو کوئی یاد نہیں کرے گا۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ان تین مقامات میں آ جائیں گے ان کی میں شفاعت کروں گا۔ گویا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ فرمایا کہ صرف یہ ہی خیال نہ کرتے رہنا کہ میں نبی کریم ﷺ کی زوجہ ہوں آپ خود ہی میری شفاعت فرمائیں گے نہیں ایسا نہیں ہوگا بلکہ مجھے تلاش کرنا، مجھے ان مقامات میں طلب کرنا، پھر میری شفاعت حاصل ہوگی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کا یہ مطلب واضح ہے پتہ چلا دونوں حدیثوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔

☆ "عن انس ان النبی ﷺ قال شفاعتی لاهل الكبائر من امتی"

(رواه الترمذی وابوداؤد رواه ابن ماجه عن جابر مشكوة باب الشفاعة)

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا بیشک نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی یہ ہے کہ میری امت کے کبیرہ گناہ کرنے والوں کو میری شفاعت حاصل ہوگی۔

وضاحت حدیث:

"يعنی شفاعی فی العفو عن الكبائر من امتی خاصة دون غيرهم من الامم"

یعنی کبیرہ گناہوں کی معافی کا فائدہ میری شفاعت سے میری امت کو ہی خاص کر کے ہوگا دوسری امتوں کو فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔

"وقال الطيبی رحمه الله ای شفاعتی التی تنجی الهالكين مختصه باهل الكبائر"

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ میری وہ شفاعت جو ہلاک ہونے والوں کو ہلاکت سے نجات دے گی وہ کبیرہ گناہوں والوں کے ساتھ خاص ہوگی۔

شرح مسلم علامہ نووی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ شفاعت کا جواز عقلاً بھی ثابت ہے اور قرآن واحادیث سے بھی اس کا ثبوت بہت واضح ہے۔ قرآن پاک کی یہ آیۃ اس مضمون کو بہت واضح طور پر ثابت کر رہی ہے:

﴿ یَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا ﴾

یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر تو کسی کو شفاعت نفع نہیں دے گی۔ لیکن رب تعالیٰ جسے شفاعت کی اجازت دے گا اور اس کی بات کو پسند کرے گا یقینی طور پر اس کی شفاعت نفع مند ہوگی۔

" وقد جاء ت الآثار الذی بلغت بمجموعها التواتر لصحة الشفاعة فی الآخرة واجمع السلف الصالحون ومن بعدھم من اھل السنة علیھا "

شفاعت کے موضوع پر احادیث مجموعی طور پر تواتر کے درجہ تک پہنچی ہوئی ہیں۔ جن سے انکار ممکن نہیں۔ اسی مسئلہ میں اہل سنت کے تمام علماء کا اجماع ہے خواہ وہ پہلے گزرے ہوئے نیک حضرات ہوں، یا ان کے بعد والے ارباب علم ہوں۔

اسی مسئلہ میں اختلاف معتزلہ اور خوارج کا ہے جس کا انشاءاللہ تفصیلی طور پر ذکر کیا جائے گا۔

(مرقاۃ ج ۱۰ ص ۳۰۹)

شفاعت کی پانچ قسمیں:

(۱) " اولھا مختصة بنبینا ﷺ وھی الا راحة من ھول الموقف وتعجیل الحساب "

ان میں پہلی قسم وہ ہے جسے شفاعت عامہ کہا جاتا ہے وہ ہمارے نبی کریم ﷺ کے ساتھ ہی خاص ہے وہ شفاعت ہولناک مقام میں ٹھہرنے سے آرام پہنچانے اور جلدی حساب شروع کرنے کیلئے ہوگی۔

(۲) " الثانیة فی ادخال قوم الجنة بغیر حساب وھذہ ایضا وردت فی نبینا ﷺ "

شفاعت کی دوسری قسم یہ ہے کہ شفاعت کے ذریعے کئی لوگ بغیر حساب کے جنت میں چلے جائیں گے یہ شفاعت بھی صرف ہمارے نبی کریم ﷺ ہی فرمائیں گے۔

(۳) " الثالثة الشفاعة لقوم استوجبوا النار فیشفع فیھم نبینا ﷺ ومن شاء اللہ تعالیٰ "

شفاعت کی تیسری قسم ان لوگوں کے لئے ہوگی جو جہنم کی آگ میں داخل ہونے کے مستحق تو ہوجائیں گے لیکن شفاعت کی وجہ سے ان کو جہنم میں داخل ہونے سے بچالیا جائے گا۔ یہ شفاعت بھی نبی کریم ﷺ بھی فرمائیں گے اور بھی وہ لوگ یہ شفاعت فرمائیں گے جن کو رب تعالیٰ کی طرف سے اجازت دی جائے گی۔

(۴) "الرابعة فيمن دخل النار من المذنبين فقد جاء ت الاحاديث باخراجهم من النار بشفاعة نبينا والملائكة واخوانهم من المؤمنين ثم يخرج الله تعالى كل من قال لا اله الا الله"

شفاعت کی چوتھی قسم یہ ہے کہ جب گنہگار لوگوں کو جہنم کی آگ میں داخل کردیا جائے گا۔ تو ان کو شفاعت کی وجہ سے آگ سے نکال لیا جائے گا۔ اس مسئلہ میں کئی احادیث وارد ہیں۔ یہ شفاعت نبی کریم ﷺ کریں گے اور فرشتے اور ان گنہگار لوگوں کے دوسرے نیک مومن بھائی ان کے لئے شفاعت کریں گی آخر میں ان لوگوں کو آگ سے نکال لیا جائے گا جنہوں نے "لا الٰہ الا اللہ" پڑھا۔

(۵) "الخامسة الشفاعة في زيادة الدرجات في الجنة لاهلها وهذه لا ينكرها ايضا"

پانچویں قسم شفاعت کی یہ ہے کہ جنت میں جولوگ ہوں گے شفاعت کے ذریعے ان کے درجات کو بلند کردیا جائے گا اس شفاعت کا انکار کسی نے بھی نہیں کیا۔ یعنی اس شفاعت کو معتزلہ بھی جانتے ہیں۔ (مرقاۃ ج ۱۰ ص ۳۰۹)

☆ "عن عثمان بن عفان قال قال رسول الله ﷺ يشفع يوم القيامة ثلاثة الانبياء ثم العلماء ثم الشهداء" (رواہ ابن ماجه، مشکوۃ باب الشفاعة)

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے فرمایا قیامت کے دن تین قسم کے حضرات شفاعت فرمائیں گے۔ پہلے انبیاء کرام پھر علماء، پھر شہداء۔

فائدہ: علماء سے مراد عاملین ہیں یعنی جو علم کے مطابق عمل بھی کرتے ہیں۔ اور شہداء سے مراد مخلصین ہیں " وفي العطف بثم دلالة صريحة على تفضيل العلماء على الشهداء " نبی کریم ﷺ نے انبیاء کرام کے بعد علماء کا ذکر کیا پھر لفظ " ثم " ذکر فرمایا جو تراخی پر دلالت کرتا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ علماء عاملین کو شہداء مخلصین پر فضیلت حاصل ہے۔

اس مسئلہ پر ایک حدیث شریف واضح طور پر دلالت کر رہی ہے جو شیرازی نے حضرت انس سے اور ابن عبدالبر نے ابوالدرداء سے اور ابن جوزی نے علل میں نعمان بن بشیر سے مرفوع حدیث بیان کی ہے:

" یوزن یوم القیامة مداد العلماء ودم الشهید فیرجح مداد العلماء علی دم الشهید "

قیامت کے دن علماء کی سیاہی اور شہید کے خون کا وزن کیا جائے گا تو علماء کی سیاہی کو شہید کے خون پر ترجیح حاصل ہوگی۔ (مرقاة ج ١٠ ص ٣١١)

تنبیہ: حدیث شریف میں تین قسم کے حضرات کا ذکر کیا تو ان کے درمیان ترتیب کو ذکر کرنا مقصود ہے یا یہ قید اتفاقی ہے ورنہ ملائکہ، صلحاء چھوٹے بچوں کی شفاعت کا واضح طور پر ذکر موجود ہے۔

☆ " وعن انس قال قال رسول الله ﷺ یصف اهل النار فیمربهم الرجل من اهل الجنة فیقول الرجل منهم یا فلان اما تعرفنی انا الذی سقیتک شربة وقال بعضهم انا الذی وهبت لک وضوأ فیشفع له فیدخله الجنة " (رواه ابن ماجه مشکوة باب الشفاعة)

حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جہنم والے لوگ صف بنائے ہوں گے ان کے قریب سے جنت والے شخص کا گزر ہوگا، ایک شخص اس سے کہے گا کیا تو مجھے پہچانتا نہیں میں نے تمہیں پلایا تھا، دوسرا کہے گا کیا تمہیں معلوم نہیں میں نے تمہیں وضوء کے لئے پانی دیا تھا، وہ ان کے لئے شفاعت کرے گا تو اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں داخل کر دے گا۔

وضاحت حدیث:

یصف (بضم وفتح وتشدید) صف بنانا۔

" (یصف اهل النار) من عصاة المؤمنین والفجار فی طریق اهل الجنة من العلماء الاخیار والصلحاء الابرار علی هیئة المساکین السائلین فی طریق الاغنیاء فی هذه الدار "

یعنی گنہگار مومنین، فساق وفجار جنت والے نیک علماء اور دوسرے نیک صالحین حضرات کے راستے میں اس طرح کھڑے ہوں گے جس طرح دنیا میں غنی لوگوں کے راستہ میں سوال کرنے والے فقیر لوگ کھڑے ہوتے ہیں۔

جب کسی نیک شخص کا وہاں سے گزر ہوگا تو گنہگاروں میں سے کوئی کہے گا۔ اے شخص کیا تو مجھے

نہیں پہچانتا میں نے تمہیں فلاں وقت میں پینے کے لئے پانی یا دودھ وغیرہ دیا تھا، آج تم میری شفاعت ہی کر دو کہ اللہ تعالیٰ مجھے بخش دے۔ اسی طرح ایک اور شخص شفاعت کی درخواست کرتے ہوئے کہے گا اے فلاں شخص کیا تم مجھے نہیں پہچانتے میں نے فلاں وقت تمہیں وضوء کے لئے پانی عطاء کیا تھا، وہ نیک بزرگ عالم شخص ان کے حق میں شفاعت کریں گے تو ان گنہگاروں کو جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

فائدہ: "قال المظهر فيه تحريض على الاحسان الى المسلمين لاسيما مع الصلحاء والمجالسة معهم ومحبتهم فان محبتهم زين فى الدنيا ونور فى العقبى"
(مرقاة ج ١٠ ص ٣١٢)

اس حدیث پاک سے یہ واضح ہوا کہ مسلمانوں کو اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں پر رحم کرنے پر برانگیختہ کیا گیا ہے خصوصا نیک لوگوں پر احسان کرنا، ان کی محافل میں بیٹھنا اور ان سے محبت کرنے کی رغبت دلائی گئی ہے کیونکہ نیک لوگوں سے محبت دنیا میں زینت اور آخر میں نور ہوگا۔

☆ "وعن عوف بن مالک قال قال رسول الله ﷺ اتانى آت من عند ربى فخيرنى بين ان يدخل نصف امتى الجنة وبين الشفاعة واخترت الشفاعة وهى لمن مات لا يشرک بالله شيأ"
(رواه الترمذى وابن ماجه مشكوة باب الشفاعة)

عوف بن مالک کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے رب کی طرف سے آنے والا میرے پاس آیا مجھے اختیار دیا کہ میں نصف امت کو جنت میں داخل کیا جانا پسند کرلوں یا شفاعت کو پسند کرلوں۔ میں نے شفاعت کو اختیار کیا ہے۔ اور یہ شفاعت ہر اس شخص کیلئے ہوگی جسکی موت حالت شرک پر نہ آئے

حدیث کا مطلب بہت واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ نے شفاعت کو ترجیح دی کیونکہ آپ یہی چاہتے تھے کہ شفاعت کے ذریعے میری امت کے ایماندار لوگ تمام ہی نفع حاصل کریں۔ اس میں گنہگار بھی آ گئے اور نیک کار بھی البتہ مشرک نہ ہوں کیونکہ مشرکوں کو شفاعتِ خاصہ سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

☆ "وعن عبد الله بن ابى الجدعاء قال سمعت رسول الله ﷺ يقول يدخل الجنة بشفاعة رجل من امتى اكثر من بنى تميم" (رواه الترمذى والدارمى وابن ماجه، مشكوة باب الشفاعة)

عبداللہ بن ابی جدعاء فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ میری امت کے ایک عظیم شخص کی شفاعت سے بنو تمیم سے بھی زیادہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔

" رجل " پر تنوین تعظیم کی ہے مراد اس سے " رجل جلیل " ہے یعنی عظیم کی شفاعت سے۔ وہ عظیم اور جلیل القدر شخص کون ہوگا بعض حضرات نے کہا حضرت عثمان بن عفان ﷺ ہوں گے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ وہ حضرت اویس قرنی ہوں گے وغیرہ۔

" وعن ابی سعید ان رسول اللہ ﷺ قال ان من امتی من یشفع للفئام ومنهم من یشفع للقبیلة ومنهم من یشفع للعصبة ومنهم من یشفع للرجل حتی یدخلوا الجنة "
(رواه الترمذی مشکوة باب الجماعة)

حضرت ابو سعید خدری ﷺ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بیشک میری امت سے بعض لوگ ایک جماعت کی شفاعت کریں گے۔ اور بعض لوگ ایک قبیلہ کی شفاعت کریں گے اور بعض لوگ ایک خاندان (دس سے لے کر چالیس تک تعداد) کی شفاعت کریں گے۔ اور بعض ایک شخص کی شفاعت کریں گے وہ اس شفاعت کی وجہ سے جنت میں داخل ہوں گے۔

اس حدیث پاک سے بھی نبی کریم ﷺ کی امت کے نیک لوگوں کا شفاعت کرنا ثابت ہے۔

☆ " عن عبد اللہ بن مسعود قال قال رسول اللہ ﷺ من قدم ثلاثة لم یبلغوا الحنث کانوا له حصنا حصینا قال ابو ذر قدمت اثنین قال واثنین فقال ابی بن کعب سید القراء قدمت واحدا قال واحدا ولکن انما ذلک عند الصدمة الاولی " (ترمذی ابواب الجنائز)

حضرت عبد اللہ بن مسعود ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے تین نابالغ بچے آگے بھیجے (یعنی جس شخص کی اولاد سے تین نابالغ بچے فوت ہو گئے) تو وہ اس کو آگ سے بچانے کے لئے مضبوط قلعہ ہوں گے۔ حضرت ابو ذر نے کہا میں نے دو آگے بھیجے، آپ نے فرمایا دو ہی (قلعہ کی حیثیت ہوں گے) سید القراء حضرت ابی بن کعب نے عرض کیا میں نے ایک آگے بھیجا ہے آپ نے فرمایا ایک ہی (کافی ہوگا) البتہ جب اس شخص نے ابتدائی صدمہ کے وقت صبر کیا ہوگا۔

☆ " عن ابن عباس انه سمع رسول اللہ ﷺ یقول من کان له فرطان من امتی ادخله اللہ بهما الجنة فقالت له عائشة فمن کان له فرط من امتک قال ومن کان له فرط یا موفقة قالت فمن لم یکن له فرط من امتک قال فانا فرط من امتی لن یصابوا بمثلی "
(ترمذی ابواب الجنائز)

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص کے میری امت میں سے دو بچے فوت ہوگئے اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کریگا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا آپ کی امت میں سے جس کا ایک بچہ فوت ہوا؟ آپ نے فرمایا جس کا ایک بچہ فوت ہوا وہ بھی جنت میں داخل ہوگا اے توفیق دی ہوئی، پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا جس کا ایک بچہ بھی نہ فوت ہوا؟ آپ نے فرمایا ان کا میں آگے جا کر انتظام کروں، میرا جیسا کسی کو نہیں ملے گا۔

خیال رہے حدیث شریف میں استعمال ہے ''یا موفقۃ'' اس کا یہ معنی بیان کیا گیا ہے:

" یا موفقة بالخیرات والا سوة الواقعة موقعها شفقة علی الامة " (مرقاۃ)

اے بھلائی کی توفیق دی گئے کیونکہ تمہارے سوالات موقع کے مطابق ہوتے ہیں جن سوالات اور جوابات سے امت کے لئے شفقت کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

﴿فَرَط﴾: (بالتحریک) قافلے سے آگے جا کر قافلہ والوں کی ضروریات کا انتظام کرنے والوں کو ''فرط'' کہا جاتا ہے چھوٹا نابالغ بچہ جو فوت ہو جائے وہ بھی آگی جا کر والدین کے لئے جنت میں مکان تیار کرتا ہے۔ یعنی اس کی وفات پر والدین کو صبر کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ جنت میں داخل کرتا ہے اس لئے اسے بھی فرط کہا گیا ہے۔

حدیث پاک سے اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ جس کا اور کوئی نہیں، اس کے میرے پیارے مصطفی ﷺ ہیں۔ مسئلہ بہت واضح ہوگیا کہ نبی کریم ﷺ کی امت کے مومن لوگوں کے بچے فوت ہونے والے بھی اپنے والدین کے لئے شفاعت کریں گے۔

شفاعت عامہ: جب تک حساب وکتاب شروع نہیں ہوگا، لوگ بہت پریشان ہوں گے کیونکہ حبس شدید ہوگا، سخت گرمی کی وجہ سے لوگ کسی شفیع کو تلاش کریں گے کہ کسی کی شفاعت سے اس حال سے نجات مل جائے اسی حال میں حضرت آدم علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس شفاعت کی درخواست کریں گے، سب کی طرف سے یہ جواب حاصل ہوگا " لست لها " میں شفاعت نہیں کرسکتا۔ لیکن جب مصطفی کریم ﷺ کے پاس آئیں گے تو آپ " انا لها " فرمائیں گے ہاں شفاعت کا حق مجھے ہی دیا گیا ہے۔ آپ

شفاعت فرمائیں گے تو آپ کی شفاعت کو شرف قبولیت عطاء کیا جائے گا۔

نکتہ : شیخ محی الدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں ڈالے گا کہ پہلے آدم علیہ السلام کے پاس جاؤ وہاں سے مایوس ہونے پر ان کے دل میں یہ آئے گا کہ اب نوح علیہ السلام کے پاس جانا چاہئے۔اس طرح دوسرے انبیاء کرام کے پاس جائیں گے سب سے پہلے ان کے دل میں یہ کیوں نہیں ڈال دیا جائے گا کہ نبی کریم ﷺ کے پاس چلے جاؤ اس کی وجہ یہ ہے " **فانهم لو سألوا ابتداء لكان يحتمل ان غيره يقدر** " کہ اگر وہ پہلے نبی کریم ﷺ کے پاس آ جائیں تو ان کے دل میں یہ خیال آئے گا کہ اگر کسی اور کے پاس جاتے تو وہ بھی شفاعت فرماتے۔لیکن جب سب سے مایوس ہوں گے تو پتہ چلے گا کہ یہ منصب کسی اور کو حاصل نہیں۔

اعلیٰ حضرت بریلوی فرماتے ہیں۔

خلیل ونجی کلیم ومسیح سبھی سے کہی کہیں نہ بنی
یہ بے خبری کہ خلق پھری کہاں سے کہاں تمہارے لئے

مولنا حسن رضا بریلوی فرماتے ہیں:

فقط اتنا سبب ہے انعقاد بزم محشر میں
کہ ان کی شان محبوبی دکھائی جانے والی ہے

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی فرماتے ہیں:

جہاز امت کا حق نے کر دیا ہے آپ کے ہاتھوں
تم اب چاہو ڈباؤ یا تراؤ یا رسول اللہ
شفیع عاصیاں ہو تم ، وسیلہ بیکساں ہو تم
تمہیں چھوڑ اب کہاں جاؤں بتاؤ یا رسول اللہ

شفاعت سے کسی کو کم اور کسی کو زیادہ فائدہ کیوں؟

اس پر ایک حدیث پاک کو دیکھئے اسی سے مسئلہ شفاعت کو بھی سمجھنے کی کوشش کریں تو سمجھنا کوئی مشکل نہیں رہے گا:

" عن ابی موسی عبد الله بن قیس الاشعری ﷺ قال قال رسول الله ﷺ ان مثل ما بعثنی الله به من الهدی والعلم کمثل غیث اصاب ارضا فکانت منها طائفة طیبة قبلت الماء فانبتت الکلاء والعشب الکثیر ، وکان منها اجادب امسکت الماء فنفع الله تعالی بها الناس فشربوا منها وسقوا وزرعوا واصاب طائفة منها اخری انما هی قیعان لا تمسک ماء ولا تنبت کلأ فذلک مثل من فقه فی دین الله ونفعه ما بعثنی الله تعالی به فعلم وعلم ومثل من لم یرفع بذلک رأسا ولم یقبل هدی الله الذی ارسلت به "

(جواهر طنطاوی ج ۱ ص ۶۵)(مسلم ج ۲ ص ۲۵۵)

حضرت ابو موسی اشعری ﷺ فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بیشک مجھے اللہ تعالیٰ نے ہدایت اور علم عطا کر کے مبعوث فرمایا اس کی مثال بارش کی ہے۔ جب بارش اچھی زرخیز زمین پر برستی ہے تو اس زمین میں گھاس اور کثیر مقدار نباتات پیدا ہوتے ہیں۔ وہی بارش جب خشک قدرے سخت زمین پر برستی ہے جو پانی کو روک لیتی ہے (یعنی وہ پانی جلدی اس میں جذب نہیں ہو جاتا) اور وہ زمین حوض نما ہوتی ہے تو اس سے بھی لوگوں کو نفع حاصل ہوتا ہے کہ وہ پانی پیتے ہیں، اور اسی پانی سے اپنی کھیتی باڑی کو سیراب بھی کر لیتے ہیں، اور وہی بارش کبھی چٹیل میدان اور لڑھکنے والے مقام پر برستی ہے تو وہ نہ ہی پانی کو اپنے اوپر روک کر رکھتی ہے (کہ لوگ اس سے فائدہ حاصل کریں) اور نہ ہی اس میں گھاس وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔ یہی مثال جو شخص دین کا علم حاصل کرتا ہے اسے میرے مبعوث ہونے کا نفع حاصل ہوتا ہے وہ علم حاصل کرتا ہے اور پڑھاتا بھی ہے اور جو شخص اس کی طرف (جو مجھے دے کر مبعوث کیا گیا ہے) سر نہیں اٹھاتا وہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت قبول نہیں کرتا جو ہدایت دے کر مجھے بھیجا گیا ہے۔

تنبیہ : خط کشیدہ لفظ جواہر طنطاوی اور بخاری میں " وزرعوا " ہے جس کا معنی ہے کھیتی

باڑی کرنا۔اور مسلم شریف میں " ورعوا " جو " الرعی " سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے چرانا۔تقریبا مفہوم ایک ہی ہے کہ اس پانی کے ذریعے اگنے والا گھاس وغیرہ جانوروں کو چراتے ہیں۔ (از نووی)

اب اسی حدیث سے مسئلہ شفاعت کو سمجھئے کہ بارش کا نفع ایک جیسا ہے لیکن زمین کے مختلف حصے علیحدہ علیحدہ حیثیت رکھتے ہیں انکے مطابق ہی زمین میں مختلف قسم کے منافع ہیں۔اسی طرح نبی کریم ﷺ کی شفاعت تو نفع مند ہی نفع مند ہے لیکن لوگ مختلف قسم کے ہوں گے۔کسی کو نفع صرف یہ ہوگا کہ حساب وکتاب شروع ہو جائے گا۔اور کوئی جہنم کا مستحق ہونے کے باوجود جہنم سے بچ جائے گا اور کوئی جہنم میں داخل ہو چکا ہوگا اسے جہنم سے نکال لیا جائے گا اور کوئی پہلے سے جنت میں ہوگا لیکن اس کے مدارج کو بلند کر دیا جائے گا۔

شفاعت میں معتزلہ کا مذہب:

" فذهبت المعتزلة على انها للمستحقين للثواب وتاثير الشفاعة فى ان تحصل زيادة من المنافع على قدر ما استحقوه "

معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ شفاعت صرف ان لوگوں کو فائدہ دے گی جو ثواب کے مستحق ہوں گے، جنت میں داخل ہونے کے قابل ہوں گے اور شفاعت کا ان کو فائدہ ہوگا کہ وہ جس ثواب کے مستحق تھے اس سے بڑھ کر ان کو ثواب دے دیا جائے گا اور جنت میں بلند درجہ دے دیا جائے حالانکہ وہ اپنے اعمال کے لحاظ پر اس کے مستحق نہیں تھے۔

" وقال اصحابنا تاثيرها فى اسقاط العذاب عن المستحقين للعقاب اما بان يشفع لهم فى عرصة القيامة حتى لا يدخلوا النار وان دخلوا النار فيشفع لهم حتى يخرجوا منها ويدخلوا الجنة واتفقوا على انها ليست لكفار "

اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ شفاعت کا فائدہ ان لوگوں کو بھی ہوگا جو عذاب کے مستحق ہوں گے شفاعت کے ذریعے ان سے عذاب ساقط ہوگا۔نبی کریم ﷺ میدان قیامت میں شفاعت فرمائیں گے تو وہ مستحقین عذاب جہنم میں داخل ہونے سے بچ جائیں گے۔کئی لوگ جہنم میں داخل ہو چکے ہوں گے ان کو آپ کی شفاعت سے جہنم سے نکال کر داخل کر دیا جائے گا۔ہاں البتہ اس پر اہل سنت کا اتفاق ہے کہ نبی کریم ﷺ کافر کے عذاب کی تخفیف کے لئے شفاعت نہیں فرمائیں گے۔

معتزلہ کی دلیل نمبر 1: آیۃ کریمہ میں ﴿ وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ ﴾ کہا گیا ہے شفاعۃ نکرہ ہے قانون یہ ہے کہ نکرہ جب نفی کے تحت آجائے تو عموم کا فائدہ دیتا ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ شفاعت کی مطلقاً نفی کردی گئی ہے، کہ کسی کو کسی شخص کی شفاعت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہوگا۔ تو کبیرہ گناہوں والوں کے لئے شفاعت ثابت کرنا اس آیۃ کے مخالف ہے۔

الزامی جواب: یہ تمہارا اعتراض تو تمہارے مذہب کے مخالف ہے۔ کیونکہ اعتراض میں تم یہ ثابت کر رہے ہو کہ ہر قسم کی کوئی شفاعت بھی قبول نہیں ہوگی۔ اور تمہارا مذہب یہ ہے کہ شفاعت عظمیٰ (شفاعت عامہ) ہوگی۔ اور جو لوگ ثواب کے مستحق ہوں گے ان کیلئے بھی شفاعت ہوگی کہ ان کا ثواب بڑھادیا جائے گا۔ اس شفاعت کو ثابت کرنے کے لئے اپنے ہی اعتراض سے جو جواب تم دو گے وہی جواب ہماری طرف سے بھی سمجھ لینا۔

تحقیقی جواب: شفاعت کی دو قسمیں ہیں ایک یہ ہے کہ جس کی وجہ سے زیادہ منافع حاصل ہوتے ہیں۔ اور دوسری قسم یہ ہے جو لوگ ہمیشہ کے لئے عذاب سے مستحق ہیں۔ ان سے عذاب کو ہٹا دیا جائے۔ آیۃ کریمہ میں نفی دوسری قسم کی شفاعت کی ہے جس میں ہمیشہ کے لئے عذاب کے مستحق کافر لوگوں سے شفاعت کی نفی کی گئی۔

مسلمانوں کے لئے جو بھی شفاعت ہوگی وہ درحقیقت ان کو نفع پہنچانے کے لئے ہوگی۔ جب تک یہ فرق نہ کیا جائے اس وقت تک ان آیات اور احادیث کا کوئی مطلب نہیں ثابت کیا جا سکتا جن کو بیان کیا جاچکا ہے۔

نتیجہ یہی نکلا:

"ان المقصود من الآية نفی تاثير الشفاعة فی اسقاط العقاب لانفی تاثيرها فی زيادة المنافع"

کہ مقصد آیۃ کریمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کافروں سے عذاب کو ختم کرنے کے لئے کوئی شفاعت کام نہیں آئے گی لیکن منافع کی زیادتی کے لئے شفاعت کام آئے گی۔

خیال رہے کہ عقاب کہتے ہی اسے ہیں جو کافروں کو عذاب ہوگا اسی لئے راقم نے " اسقاط العقاب " کا ترجمہ کیا ہے" کافروں سے عذاب کو ساقط کرنا"

معتزلہ کی دلیل نمبر 2: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ مَا لِلظَّالِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ﴾

''اور ظالموں کا نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی سفارشی جس کا کہا مانا جائیگا''

اس آیۃ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ظالموں کا ذکر فرمایا ہے ظالم عام ہیں خواہ کافر ہوں یا مسلمان ہوں لہٰذا معلوم ہوا کہ کسی ظالم کے لئے کسی کی شفاعت قبول نہیں کی جائے گی۔ ظالم وہی ہوگا جو گنہگار ہوگا۔

جواب نمبر 1: اس آیۃ کریمہ میں نفی شفاعت کی نہیں بلکہ " یطاع "کی ہے:

" لانه لا يكون في الآخرة شفيع يطاع لان المطاع يكون فوق المطيع وليس فوقه تعالى احد يطيعه الله تعالى "

یعنی کوئی یہ سمجھے کہ رب تعالیٰ میری اطاعت کرے گا تو اس کا یہ خیال باطل ہے کیونکہ جس کی اطاعت کی جائے وہ بلند شان والا ہوتا ہے، اور جو اطاعت کرے وہ اس سے کم شان رکھتا ہے، جب اللہ تعالیٰ سے کوئی بلند شان والا نہیں تو یہ گمان بھی باطل ہوگا کہ میری بات کو ضرور مانا جائے گا کیونکہ رب تعالیٰ مطیع ہے اور میں مطاع ہوں۔ (معاذ اللہ)

دوسرا جواب: جب یہ تسلیم کرلیا جائے کہ یہاں نفی شفاعت کی ہے تو پھر بھی مطلقاً شفاعت کی نفی نہیں بلکہ اس شفاعت کی نفی ہے جو اطاعت سے مقید ہے۔

" انه تعالىٰ نفى شفيعا يطاع والشفيع لا يكون الا دون المشفوع اليه لان من فوقه يكون آمراله وحاكما عليه ومثله لا يسمى شفيعا "

بیشک اللہ تعالیٰ نے اس سفارشی کی نفی کی جس کی اطاعت کی جائے، اصل میں حقیقت یہ ہے کہ سفارش کرنے والا کم درجہ رکھتا ہے اس سے جس سے سفارش کر رہا ہے، کیونکہ اگر اوپر درجہ رکھے تو آمر اور حاکم کہلائے گا اس قسم کے شخص کو شفاعت کرنے والا نہیں کہا جاتا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اگر شفاعت کرنے والا یہ سمجھے کہ میری اطاعت کی جائے گی میری شفاعت

ضرور تسلیم ہوگی تو وہ اپنے آپ کو حاکم سمجھ رہا ہے اس کی شفاعت قبول نہیں ہوگی۔

اگر شفاعت کرنے والا اس خیال سے شفاعت کرے کہ وہ اللہ تعالیٰ حاکم مطلق، بے نیاز ہے میں اس کے حضور شفاعت کر دیتا ہوں آگے قبول کرنا اس کی مرضی ہے، اس عاجزی کی وجہ سے رب تعالیٰ اپنے وعدہ کے مطابق شفاعت کو قبول فرمائے گا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ کو بندے کا عجز پسند ہے تکبر اور بڑائی پسند نہیں۔

تیسرا جواب: دوسری آیات اور احادیث جن میں شفاعت کے قبول ہونے کا ذکر ہے ان میں اور اس میں تطبیق دینے کے لئے کئی مفسرین کرام نے ''ظالمین'' کا معنیٰ ''کافرین'' کیا ہے کیونکہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾ ''بیشک شرک ظلم عظیم ہے''

واضح ہوا کہ اس آیۃ کا معنیٰ بھی یہ ثابت ہے کہ کافروں کے لئے شفاعت نہیں مانی جائے گی۔

معتزلہ کی دلیل نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی:

﴿ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِىَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ﴾

اس آیۃ کریمہ میں شفاعت کی مطلقاً نفی ہو رہی ہے:

﴿ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴾ ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا

اس آیۃ سے بھی شفاعت کی نفی ہو رہی ہے:

﴿ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ﴾ شفاعت کرنے والوں کی شفاعت ان کو نفع نہیں دے گی۔
اس آیۃ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ شفاعت کا نفع نہیں ہوگا۔

جواب: ان تمام آیات میں کافروں کے لئے شفاعت کی نفی ہو رہی ہے اور اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر شفاعت کی نفی ہو رہی ہے، کیونکہ دوسری آیات سے واضح ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت سے شفاعت نفع مند ہوگی۔ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْ بَعْدِ اِذْنِهٖ ﴾ اس کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت نہیں کر سکے گا۔

﴿ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَه' اِلَّا بِاِذْنِه ﴾

اس کی اجازت کے بغیر اس کے پاس کون شفاعت کرے گا

﴿ لَا یَتَکَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴾

کوئی اس سے کلام نہیں کر سکیں گے سوائے ان کے جن کو رحمٰن نے اجازت دی اور درست بات کہی۔

ان تمام آیات سے واضح ہوا کہ رب تعالیٰ کی اجازت کے بغیر شفاعت نہیں ہوگی رب تعالیٰ کی اجازت سے شفاعت ہو سکے گی۔ اور نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد اس مسئلہ کو اور زیادہ واضح کر دیتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

" (عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ) لكل نبی دعوة مستجابة فتعجل كل نبی دعوته وانی اختبأت دعوتی شفاعة لامتی یوم القیامة فهی نائلة ان شاء الله من مات من امتی لا یشرك بالله شیئا "

(رواه مسلم ، کبیر ج ۲ ص ۲۳)

ہر نبی کو ایک دعاء حاصل ہوئی جس کی قبولیت یقینی تھی۔ لیکن ہر نبی نے وہ دعاء (دنیا میں ہی) جلدی استعمال کر لی۔ میں نے اپنی دعاء کو محفوظ کر کے رکھ لیا ہے وہ قیامت کے دن میری ہر امت کو انشاء اللہ پہنچے گی جس کو موت شرک کے بغیر آئی۔

دینی طلباء کی دلچسپی کے لئے:

" (ولا یقبل منها شفاعة) ان تخصیص مثل هذا العام بذلك السبب المخصوص یکفی فیه ادنی دلیل ، فاذا قامت الدلائل الدالة علی وجود الشفاعة وجب المصیر الی تخصیصها "

" ولا یقبل منها شفاعة " میں نکرہ تحت النفی ہونے کی وجہ سے عموم پایا گیا ہے لیکن عام کو مخصوص البعض بنانے کے لئے ادنیٰ دلیل کافی ہے جب شفاعت کے ثبوت پر کثیر دلائل موجود ہیں تو خود بخود سمجھ آ گیا کہ یہاں عام مخصوص البعض ہے کہ کفار کے لئے شفاعت قبول نہیں ہوگی۔

☆ ﴿ مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ حَمِیْمٍ وَّلَا شَفِیْعٍ یُّطَاعُ ﴾ یہ الفاظ گرامیہ نقیض ہیں " للظالمین حمیم وشفیع " اور یہ الفاظ قضیہ موجبہ کلیہ ہیں۔ اور قانون یہ ہے کہ موجبہ کلیہ کی نقیض سالبہ جزیہ ہوتی ہے

سالبہ جزیہ کے سچے آنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ بعض افراد سے نفی پائے جائے۔جمیع افراد کی نفی سالبہ جزیہ میں نہیں ہوتی۔اب واضح ہوا کہ اگر ''ظالمین'' سے مراد عام ظالم لوگ لئے جائیں جو مومنوں اور کافروں کو شامل ہوتو پھر بھی جب نفی کا معنی بحثیت سالبہ جزیہ کیا جائے گا تو اس وقت معنی یہ ہوگا ''کہ بعض ظالم کا کوئی دوست نہیں ہوگا اور نہ کسی کی سفارش مانی جائے گی''

اس معنی کے لحاظ پر خود واضح ہوجاتا ہے کہ بعض ظالموں سے مراد ہیں ہی کفار،مومن اس نفی کے معنی میں آتے ہی نہیں۔

☆ ﴿ وَمَا لِلظَّالِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴾ یہ نقیض ہے '' للظالمین انصار '' کی یہ موجبہ کلیہ ہے۔اس کی نقیض سالبہ جزیہ ہے اور سالبہ جزیہ کا مدلول سلب العموم ہے اور سلب العموم سے عموم السلب حاصل نہیں۔سلب العموم یعنی مجموع من حیث المجموع کی نفی جو بعض کی نفی کو مستلزم ہوتا ہے اور عموم السلب کا مطلب ہے ہر ہر فرد کی نفی کرنا،وہ اس میں پایا نہیں گیا۔

ان دونوں آیتوں پر علامہ رازی رحمہ اللہ کی عبارات کو بھی طلباء نگاہ میں رکھیں وہ عبارات یہ ہیں:

" ان قوله (ما للظالمین من حمیم ولا شفیع) نقیض لقولنا للظالمین حمیم وشفیع ، لکن قولنا للظالمین حمیم وشفیع موجبة کلیة ونقیض الموجبة الکلیة سالبة جزئیة والسالبه الجزئیة یکفی فی صدقها تحقق ذلک السلب فی بعض الصور ، ولا یحتاج فیه الی تحقق ذلک السلب فی جمیع الصور وعلی هذا فنحن نقول بموجبه لان عندنا انه لیس بعض الظالمین حمیم ولا شفیع یجاب وهم الکفار فاما ان یحکم علی کل واحد منهم بسلب الحیم والشفیع فلا "

" وقوله (وما للظالمین من انصار) فالجواب عنه انه نقیض لقولنا " للظالمین انصار " وهذه موجبة کلیة فقوله " وما للظالمین من انصار " سالبة جزئیة فیکون مدلوله سلب العموم وسلب العموم لا یفید عموم السلب " (کبیر ج ۲ ص ٦٥)

معتزلہ کا استدلال احادیث سے:

"عن ابی هریرة انه علیها لصلوة والسلام دخل المقبرة فقال السلام علیکم دار قوم مؤمنین وانا ان شاء الله بکم لا حقون ، وددت انی قد رأیت اخواننا ، قالوا یا رسول الله السنا اخوانک قال بل انتم اصحابی ، واخواننا الذین لم یأتوا بعد قالوا یا رسول الله کیف تعرف من یاتی بعدک من امتک ؟ قال ارأیت ان کان لرجل خیل غرمحجلة فی خیل دهم فهل لا یعرف خیله ؟ قالوا بلی یا رسول الله قال فانهم یأتون یوم القیامة غرا محجلین من الوضوء وانا فرطهم علی الحوض ، الا فلیذادن رجال عن حوضی کما یزاد البعیر الضال انادیهم الاهلم الاهلم فیقال انهم قد بدلوا بعدک فاقول فسحقا فسحقا"

حضرت ابو ہریرہ ﷛ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ قبرستان میں داخل ہوئے تو آپ نے کہا" السلام علیکم قوم مؤمنین وانا ان شاء الله بکم لا حقون " میں پسند کرتا ہوں کہ بیشک میں اپنے بھائیوں کو دیکھ لوں۔ صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا ہم آپ کے بھائی نہیں، کہا بلکہ تم تو میرے صحابہ ہو ہمارے بھائی تو ابھی نہیں آئے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کی امت کے جو لوگ ابھی تک نہیں آئے آپ ان کو کیسے پہچانیں گے؟ آپ نے فرمایا تمہارا اس میں کیا خیال ہے کہ اگر کسی شخص کا سفید پیشانی والا گھوڑا سیاہ گھوڑوں میں ہو تو کیا وہ شخص اسے نہیں پہچانے گا؟ صحابہ کرام نے عرض کیا کیوں نہیں (یعنی وہ یقینا پہچان لے گا) آپ نے فرمایا وہ لوگ وضوء کرنے کی وجہ سے چمکدار چہروں والے ہوں گے۔ اور میں حوض پر آگے جا کر ان کا منتظم ہوں گا۔ خبر دار کچھ لوگوں کو میرے حوض سے اس طرح ہٹا دیا جائے گا جس طرح اجنبی اونٹ کو ہٹا دیا جاتا ہے، میں ان کو ندا دوں گا خبر دار ادھر آ جاؤ خبر دار ادھر آ جاؤ۔ تو کہا جائے گا انہوں نے تمہارے بعد (دین کو) تبدیل کر دیا تھا۔ تو اس وقت میں کہوں گا پھر تو ٹھیک ہے انہوں نے رب کی رحمت سے دور ہونا ہی ہے ہاں انہوں نے دور ہی ہونا ہے۔

اس حدیث پاک سے معتزلہ نے دلیل یہ پکڑی کی جب نبی کریم ﷺ ان کو حوض سے نہیں پلا سکیں

گے تو ان کی شفاعت کر کے عذاب سے کیسے بچا سکیں گے۔

جواب نمبر 1: اگر ان کی دین میں تبدیلی حالت ارتداد تک پہنچی ہوئی ہو۔ تو واضح بات ہے کہ مرتد کافر ہوتا ہے کافر کو نہ حوض سے پانی پلایا جائیگا اور نہ ہی اسکی شفاعت کی جائیگی کہ وہ عذاب سے بچ جائیگا۔

" لان ظاهر هذا الحديث ان جميع الامة يشرب الا من ارتد وصار كافرا "

(نووی شرح مسلم ج ۲ ص ۲۵۷)

تحقیقی جواب نمبر 2: دین میں ان کی تبدیلیاں حالت ارتداد تک تو نہیں پہنچی ہوں گی لیکن ان کی رخنہ اندازی کی وجہ سے رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے ناراض ہوں گے جب حضور ناراض ہوئے تو حوض سے پانی پلانے کا مقصد ہی ختم ہو جائے گا۔ علامہ نووی رحمہ اللہ کے ان الفاظ کو پڑھ کر سمجھئے:

" وقيل لا يشرب منه الا من قد له السلامة من النار " (نووی شرح مسلم ج ۲ ص ۲۵۷)

بیان کیا گیا ہے کہ حوض سے پانی ان کو ہی پینا نصیب ہوگا جن کی قسمت میں آگ سے سلامتی مقدر ہوگی۔

اب مسئلہ کو سمجھئے کہ ان لوگوں کو حوض کا پانی نہیں پلایا جائے گا کیونکہ انہوں نے آگ میں داخل ہونا ہے۔ لیکن یہ کیسے ثابت ہو سکتا ہے کہ جو آگ میں داخل ہوں گے ان کی شفاعت نہیں ہوگی۔ جبکہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ شفاعت کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ جو لوگ جہنم کی آگ میں گناہوں کی وجہ سے داخل کر دیئے جائیں گے ان کو شفاعت کی وجہ سے آگ سے نکال دیا جائے گا۔ یعنی حوض کا پانی تو نہیں پلایا جائے گا لیکن جہنم میں داخل کرنے کے بعد شفاعت کی وجہ سے ان کو جہنم سے نکال دیا جائیگا۔

معتزلہ کا یہ کہنا کہ "جسے حوض سے پانی نہیں پلایا جائے گا اس کی شفاعت بھی نہیں ہوگی" باطل اور لغو قول ہے۔

☆ " عن جابر بن عبد الله ان النبی ﷺ قال لكعب بن عجرة يا كعب بن عجرة اعيذك بالله من امارة السفهاء انه سيكون امراء من دخل عليهم فاعانهم على ظلمهم وصدقهم بكذبهم فليس منی ولست منه ولن يرد على الحوض ومن لم يدخل عليهم ولا يعنهم على ظلمهم ولم يصدقهم بكذبهم فهو منی وانا منه وسيرد على الحوض يا كعب بن عجرة لا يدخل الجنة لحم نبت من سحت "

حضرت جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے کعب بن عجرۃ کو کہا اے کعب میں تمہارے لئے بے وقوفوں کے حاکمیت سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں بیشک ایسے امراء ہوں گے کہ جوان کے پاس گیا اوران کے ظلم پر ان کی امداد کی اوران کے جھوٹ کو سچا کہا اس شخص کا تعلق مجھ سے نہیں اور میر تعلق اس سے نہیں اور جو ان کے پاس نہ گیا اور کے ظلم پر ان کی امداد نہ کی، اوران کے جھوٹ کو سچ نہ کہا اس کا تعلق مجھ سے ہوگا اور میرا تعلق اس سے ہوگا۔اوروہ حوض پر وارد ہوگا (اسے حوض کوثر کا پانی ملے گا) اے کعب بن عجرہ نماز رب تعالیٰ کی قربت کا ذریعہ ہے، روزہ (گناہوں اورشہوات سے بچانے کے لئے) ڈھال ہے اور صدقہ گناہوں کو ایسے مٹا دیتا ہے جیسے پانی آگ کو، اے کعب بن عجرہ وہ شخص جنت میں نہیں داخل ہوگا جس کی پرورش حرام مال سے ہوگی۔

اس حدیث پر معتزلہ نے کہا:

"ان قولہ لا یدخل الجنۃ لحم نبت سحت ، صریح فی انہ لا اثر الشفاعۃ فی حق صاحب الکبیرۃ"

بیشک نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد کہ جس شخص کی پرورش حرام مال سے ہوئی وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا واضح طور پر دلالت کر رہا ہے کہ گناہ کبیرہ کے حق میں شفاعت کا اثر نہیں ہوگا۔

الزامی جواب: "لا یدخل الجنۃ" میں کسی زمانہ کی کوئی قید نہیں اگر اس کو مطلق رکھا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ کبھی بھی جنت میں داخل نہیں ہوگا حالانکہ ہمیشہ جہنم میں رہنا اور جنت میں کبھی نہ داخل ہونا صرف کافر کے لئے ہوگا۔مومن نے آخر کار جنت میں داخل ہونا ہی ہے۔

تحقیقی جواب: حدیث شریف میں "لا یدخل الجنۃ" کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس شخص پر اللہ تعالیٰ نے مہربانی نہ فرمائی تو وہ ابتدائی طور پر جنت میں نہیں داخل ہوگا، بلکہ اس کو ابتدائی طور پر جہنم میں بھیج دیا جائیگا۔اسکے بعد وہ سزا ختم کر لے تو اسے جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کر دیا جائے۔یا اسکے حق میں شفاعت کر دی جائے اور اسکے حق میں شفاعت کو قبول کر کے اسے جنت میں داخل کر دیا جائے۔

خیال رہے کہ "اول مرتبہ جنت میں داخل نہ ہونے کی قید بہت جگہ پر لگانے کی ضرورت درپیش آتی ہے" جیسا کہ:"من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ" (جس نے لا الہ الا اللہ کہا وہ جنت میں

داخل ہوگا) میں یہ قید لگانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ آخرکار وہ جنت میں داخل ہوگا۔

☆ "عن ابی هریرة قال قام فینا رسول الله ﷺ ذات یوم فذکر الغلول فعظمه وعظم امره ثم قال لا الفین احدکم یجئی یوم القیامة علی رقبته بعیرله رغاء یقول یا رسول الله اغثنی فاقول لا املک لک شیأ قد ابلغتک لا الفین احدکم یجئی یوم القیامة علی رقبته فرس له حمحمة فیقول یا رسول الله اغثنی فاقول لا املک لک شیأ قد ابلغتک، لا الفین احدکم یجئی یوم القیامة علی رقبته شاة لها ثغاء یقول یا رسول الله اغثنی فاقول لااملک لک شیأ قد ابلغتک، لا الفین احدکم یجئی یوم القیامة علی رقبته نفس لها صیاح فیقول یا رسول اغثنی فاقول لا املک لک شیأ قد ابلغتک لا الفین احدکم یجئی یوم القیامة علی رقبته رقاع تخفق فیقول یا رسول الله اغثنی فاقول لا ملک لک شیأ قد ابلغتک، لا الفین احدکم یجئی یوم القیامة علی رقبته صامت فیقول یا رسول الله اغثنی فاقول لا املک لک شیأ قد ابلغتک" (رواه مسلم باب غلظ تحریم الغلول)

مشکل الفاظ کے معانی: غلول، امانت میں خیانت کرنا۔ الفین، ہمزہ پر ضمہ، فاء کے نیچے کسرہ لا الفین ای لا اجدن احدکم علی هذه الصفة، میں نہ پاؤں تم میں سے کسی ایک کو اس صفت پر رغاء، اونٹ کی آواز۔ حمحمة، گھوڑے کی آواز۔ ثغاء، بکری کی آواز۔ صیاح، چلانا، زور زور سے آواز دینا۔ رقاع، کپڑوں کے ٹکڑے۔ تخفق، حرکت کرنا۔ صامت، خاموش رہنا، لیکن یہاں مراد سونا اور چاندی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان تشریف فرما تھے آپ نے مال غنیمت میں خیانت کا ذکر فرمایا اس کے عظیم جرم ہونے اور اس پر عظیم سزا کے مستحق ہونے کا ذکر فرمایا پھر آپ نے فرمایا میں تم میں سے کسی ایک کو ہرگز نہ پاؤں ایسے حال میں کہ وہ قیامت کے دن آئے اس کی گردن پر (غنیمت میں خیانت کردہ) اونٹ ہو جو آواز دے رہا ہو۔ وہ شخص کہے گا یا رسول اللہ میری فریاد کو پہنچیں میں کہوں گا میں تمہارے لئے کسی چیز کی ملکیت نہیں رکھتا، میں نے تمہیں (اللہ کے احکام) پہنچا دیئے تھے۔

میں تم میں سے کسی ایک کو ایسے حال میں ہرگز نہ پاؤں کہ وہ قیامت کے دن آئے اس کی گردن پر گھوڑا ہو جو اپنی آواز دے رہا ہو، وہ شخص کہے گا یا رسول اللہ میری فریاد کو پہنچو میں کہوں گا میں تمہارے

لئے کسی چیز کا مالک نہیں میں نے تمہیں احکام پہنچا دیئے تھے۔

میں تم میں سے کسی ایک کو ایسے حال میں ہرگز نہ پاؤں کہ وہ قیامت کے دن آئے اس کی گردن پر بکری ہو جو آواز دے رہی ہو، وہ شخص کہے گا یارسول اللہ میری فریاد کو پہنچو، میں کہوں گا میں تمہارے لئے کسی چیز کا مالک نہیں میں نے احکام پہنچا دیئے تھے۔

میں تم میں سے کسی ایک کو ایسے حال میں ہرگز نہ پاؤں کہ وہ قیامت کے دن آئے اس کی گردن پر کوئی انسان چلا رہا ہو (یعنی جس انسان کا حق اس نے دبایا ہوا تھا) وہ کہے گا یارسول اللہ میری فریاد کو پہنچو میں کہوں گا میں تمہارے لئے کسی چیز کا مالک نہیں میں نے تمہیں احکام پہنچا دیئے تھے۔

میں تم میں سے کسی شخص کو ہرگز ایسے حال میں نہ پاؤں کہ وہ قیامت کے دن آئے اس کی گردن پر کپڑے حرکت کر رہے ہوں، وہ کہے گا یارسول اللہ میری فریاد کو پہنچو میں کہوں گا میں تمہارے لئے کسی چیز کا مالک نہیں میں نے تمہیں احکام پہنچا دیئے تھے۔

میں تم میں سے کسی کو ہرگز اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ قیامت کے دن آئے تو اس کی گردن پر سونا اور چاندی ہو وہ کہے گا یارسول اللہ میری فریاد کو پہنچو میں کہوں گا میں تمہارے لئے کسی چیز کا مالک نہیں میں نے تمہیں احکام پہنچا دیئے تھے۔

نبی کریم ﷺ کی اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ خیانت کرنا عظیم جرم ہے۔ جس چیز کی خیانت کرے گا اسی کا بوجھ قیامت کے دن اس کی گردن پر ہوگا۔ جس سے نجات حاصل کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ سے فریاد طلب کر رہا ہوگا لیکن آپ امداد کرنے سے انکار فرما دیں گے۔

اس حدیث سے معتزلہ کا استدلال:

" ھذا صریح فی المطلوب لانه اذا لم یملک له من الله شیأ فلیس له فی الشفاعة نصیب "

معتزلہ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے ہمارا موقف بہت واضح طور پر ثابت ہے کہ جب نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی چیز کے مالک نہیں ہوں گے تو آپ کو شفاعت کا بھی کوئی حق حاصل نہیں ہوگا۔

جواب: " قال القاضی معناه من المغفرة والشفاعة الا باذن الله تعالیٰ قال ویکون ذلک اولا غضبا علیه لمخالفته ثم یشفع فی جمیع الموحدین بعد ذلک " (نووی شرح مسلم ج ۲ ص ۱۳۱)

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا مطلب (کہ میں تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی چیز کا مالک نہیں) یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی اجازت سے شفاعت کرتا ہوں ابھی تمہارے لئے مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت حاصل نہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ ان لوگوں پر ناراضگی کا اظہار فرمائیں گے جنہوں نے مال غنیمت میں خیانت کی ہوگی کیونکہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچا دیئے تھے تو ان پر عمل کرنا چاہئے تھا ان پر عمل کو چھوڑ کر انہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو ناراض کیا۔

ہاں البتہ پھر جب آپ تمام کلمہ توحید پر ایمان لانے والوں کی شفاعت کریں گے تو ان کی بھی شفاعت کریں گے۔ گویا کہ یہاں بھی ان کے جہنم میں داخل ہونے کے بعد ان کو شفاعت کے ذریعے نکال کر جنت میں داخل کیا جائے گا۔

راقم کے خیال میں یہاں ایک اور بھی احتمال ہے کہ اگر مال غنیمت کی تقسیم کے بعد کسی کا حق دبا لیا، تو اس صورت میں نبی کریم ﷺ نے شفاعت کرنی ہی نہیں کیونکہ حقوق العباد ادائیگی حقوق کے بغیر معاف نہیں ہوں گے۔ ان کی ادائیگی کا ذکر پچھلے اوراق میں کیا جا چکا ہے۔

☆ " قال علیہ الصلوۃ والسلام ثلاثۃ انا خصیمھم یوم القیامۃ ومن کنت خصیمہ خصمتہ ، رجل اعطی بی ثم غدر ، ورجل باع حرا فاکل ثمنہ ، ورجل استأجر اجیرا فاستوفی منہ ولم یوفہ اجرتہ "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا تین شخصوں سے قیامت کے دن میرا جھگڑا ہوگا ، جس سے میرا جھگڑا ہوگا اسی سے میری ناراضگی ہوگی۔ ایک وہ شخص ہے، جس نے میرے ساتھ معاہدہ کیا پھر اس میں دھوکہ بازی کی، دوسرا وہ شخص ہے، جس نے آزاد شخص کو بیچ کر اس کا بدل مال کھالیا۔ تیسرا وہ شخص ہے، جس نے کسی شخص کو اجرت پر کام میں لگایا، اس سے کام پورا لیا، لیکن اسے اجرت مکمل نہ دی۔

اس حدیث سے معتزلہ کا استدلال:

" انہ علیہ الصلوۃ والسلام لما کان خصیما لھؤلاء فاستحال ان یکون شفیعالھم "

بیشک نبی کریم ﷺ جب ان لوگوں سے جھگڑا کرنے والے ہوں گے کہ تم نے یہ جرم کیوں کئے تو محال ہے کہ آپ ان کی شفاعت فرمائیں۔ اس سے واضح ہوا کہ آپ کبیرہ گناہ کرنے والوں کی

شفاعت نہیں فرمائیں گے۔

جواب: اس حدیث پاک کا بھی وہی مطلب ہے جو پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ پہلے آپ ناراضگی کا اظہار فرمائیں گے یعنی ان کو ڈانٹ دیں گے۔اس طرح ان لوگوں کو جہنم میں داخل کر دیا جائے گا۔ پھر آپ شفاعت فرمائیں گے تو آپ کی شفاعت سے ان کو جہنم میں نکال کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

معتزلہ کی اور دلیل: اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی ﴾ فاسق تو مرتضی (پسندیدہ) نہیں لہٰذا فاسق کی جب فرشتے شفاعت نہیں کریں گے تو یقیناً نبی کریم ﷺ بھی شفاعت نہیں فرمائیں گے۔

جواب: آیۃ کریمہ کا مطلب یہ نہیں جو تم نے بیان کیا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ شفاعت کرنے کا حق ان کو ہوگا جن کو اللہ تعالیٰ نے پسند کیا ہوگا، یعنی جن کو اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہوگی اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے:

﴿ وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰاہُ اللّٰہُ ﴾

کہ شفاعت نہیں کریں گے سوائے اس شخص کے جس کے لئے شفاعت کو رب تعالیٰ نے پسند کیا ہوگا۔

تو اس سے بھی اتنا ہی ثابت ہوگا کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف اجازت نہیں دی جائے گی تو اس شخص کے لئے کوئی شفاعت نہیں کرے گا اور اگر اجازت ہوئی تو شفاعت کی جائے گی۔

معتزلہ اصل میں شفاعت کی پانچ قسموں کو سمجھنے سے قاصر رہے، انہیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ابتدائی طور پر شفاعت نہ کرنا اور جہنم میں جانے کے بعد شفاعت کرنا بھی شفاعت ہی ہے۔ بلکہ ساتھ تنبیہ بھی ہوگی اور ان پر مہربانی بھی ہوگی۔ پھر شفاعت نہ کرنا اور چیز ہے، شفاعت کا مستحق نہ ہونا اور چیز ہے معتزلہ یہ فرق نہ سمجھ سکے۔

(شفاعت میں معتزلہ کے دلائل کی بحث ماخوذ از کبیر بتصرف)

☆☆☆☆☆

﴿ وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴾

۱) ''(اور یاد کرو) جب ہم نے تم کو فرعون والوں سے نجات بخشی کہ تم پر برا عذاب کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ رکھتے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی بلا تھی یا بڑا انعام''۔

۲) ''اور یاد کرو جب ہم نے نجات دی تمہیں فرعون والوں سے، پہنچاتے تھے تمہیں بدترین تکلیفیں، ذبح کرتے تمہارے بیٹوں کو، اور زندہ چھوڑتے تمہاری بیٹیوں کو، اور اس میں تمہارے لئے آزمائش تھی تمہارے رب کی طرف سے بہت بڑی''۔

بنی اسرائیل کو رب تعالیٰ نے پہلے حکم دیا کہ میری نعمتوں کو یاد کرو، اب انہیں اپنی نعمتوں کی تفصیل بتائی جارہی ہے۔ کہ تم یاد کرو اس نعمت کو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں فرعون والوں سے نجات دی کیونکہ وہ تمہیں طرح طرح کی شدید تکلیفیں پہنچاتے تھے اور سب سے بہت بڑا اور بہت برا عذاب انہوں نے تمہیں یہ دیا کہ تمہارے بیٹوں کو قتل کرا دیا اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ چھوڑا، یہ تمہارے لئے بہت بڑی آزمائش تھی۔

خیال رہے کہ یہ خطاب بھی نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود کو ہے لیکن چونکہ یہ انعام ان کے آباؤ اجداد پر تھا اس لئے گویا کہ ان پر بھی یہ انعام تھا۔

﴿ وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ ﴾ : ''اور جب ہم نے تمہیں نجات دی فرعون والوں سے''

" اذ فی موضع النصب عطف علی (اذکروا نعمتی) وھذا وما بعدہ تذکیر ببعض التی کانت علیھم "

لفظ '' اذ '' محل نصب میں ہے اس کا عطف '' اذکروا '' پر ہے اس آیۃ کریمہ اور بعد میں آنے والی آیات میں بعض نعمتوں کی یاد دلائی جارہی ہے۔ جو نعمتیں ان پر تھیں ان میں سے ہی یہ نعمت بھی

ہے کہ ان کو فرعون والوں سے نجات دی۔

✽ الٍ ✽ : اصل میں اھل ہے کیونکہ اس کی تصغیر " اھیــل " آتی ہے بعض حضرات نے کہا یہ اصل میں ''اول'' (واؤ کے سکون سے) ہے۔

قاعدہ اکثریہ: آل اور اھل کا اگر چہ ایک معنی ہے لیکن ان کے استعمال میں فرق کیا جاتا ہے آل اور اھل میں دلالت کرنے والا قاعدہ اکثریہ یہ پایا گیا ہے کہ ''آل'' کا مصاف الیہ ذوخطر (سردار شخص) ہو۔ چاہئے خواہ اسے وہ منصب دینی طور پر حاصل ہو یا دنیاوی طور۔ آل رسول اور آل فرعون تو کہا جا سکتا ہے کیونکہ اللہ کے رسول کو ایک دینی منصب یعنی منصب نبوت حاصل ہے۔ اور فرعون کو دنیاوی طور پر باشاہت کی وجہ سے ایک منصب حاصل تھا۔

اسی وجہ سے ''آل حجام'' نہیں کہہ سکتے کیونکہ حجام (خون نکالنے والے) کا پیشہ گھٹیا سمجھا جاتا ہے اور " اھل حجام " کہا جا سکتا ہے۔ اور فرق یہ ہے کہ آل کا مضاف الیہ ذوی العقول سے ہونا چاہئے لہٰذا آل کوفہ نہیں کہا جا سکتا البتہ اھل کوفہ کہا جا سکتا ہے۔ اور فرق یہ کہ آل کا مضاف الیہ مذکر ہونا چاہئے اسی لئے آل فاطمہ نہیں کہا جاتا بلکہ اھل فاطمہ کہا جاتا ہے۔

لیکن یہ خیال رہے کہ یہ قاعدہ اکثریہ ہے کلیہ نہیں یہی وجہ ہے کہ اس قاعدہ کے خلاف بھی استعمال ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے، آل عوج (عوج گھوڑے کا نام) اور کہا جاتا ہے، آل مدینہ، اور کہا جاتا ہے، آل نعم اور کہا جاتا ہے، آل صلیب، اور کہا جاتا ہے، آلک، اور کبھی آل بغیر مصاف الیہ کے بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے " ھم خیر آل " (روح المعانی)

آل فرعون سے مراد:

" آل فرعون ای قومه واتباعه واھل دینه "

آل فرعون سے مراد فرعون کی قوم اور اس کی تابعداری کرنے والے، اور اس کے دین پر چلنے والے۔

" اذلم یکن له ابن ولا بنت ولا اب ولا عم ولا اخ ولا عصبة "

فرعون کی آل سے مراد اس کے دین کے پیروکار ہی لینا بہتر ہے کیونکہ " اغــرقــنــا آل فرعون" میں آل سے مراد فرعون کی قوم بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ اس وقت فرعون کا نہ کوئی بیٹا تھا اور نہ بیٹی،

اورنہ باپ تھااورنہ چچا،اورنہ بھائی تھااورنہ ہی خاندان کا کوئی اورفرد تھا۔ (از قرطبی)

" والآل خاصة الرحل من جهة قرابة او صحبة وحكي عن ابي عبيدة انه سمع فصيحا يقول اهل مكة آل الله "

کسی شخص کے قرابت یاصحبت کےلحاظ پرخاص حضرات کوآل کہاجاتا ہےابوعبیدہ نے فصیح شخص کوکہتے ہوئے سنا " اهل مكة آل الله " مکہ والے اللہ تعالیٰ کی آل ہیں،یعنی اللہ تعالیٰ سے مکہ والے قرب رکھنے والے ہیں اس لحاظ سے "آل اللہ" کہنا صحیح ہوا (از کبیر)

فائدہ: نبی کریم ﷺ کی آل سے مراد کون حضرات ہیں ؟ علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" واختلف العلماء فی آل النبی ﷺ علی اقوال اظهرها وهو اختيار الازهری وغيره من المحققين انهم جميع الامة والثانی بنو هاشم وبنو المطلب والثالث اهل بيته ﷺ وذريته والله اعلم "

(مسلم باب الصلوة علی النبی ج ا ص ۱۹۱)

نبی کریم ﷺ کی آل میں علماء کا اختلاف ہےاس میں مختلف قول ہیں ان میں ظاہر قول یہ ہے جو علامہ ازہری رحمہ اللہ اور دوسرے محققین حضرات کا ہے کہ بیشک اس سے مراد آپ کی تمام امت ہے لیکن خیال رہے کہ امت میں نیک اور متقی حضرات مراد ہیں فساق وفجار مراد نہیں،اس لئے کئی مصنفین حضرات نے اس مسئلہ کے اوپر بطور دلیل ایک حدیث پیش فرمائی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا" كل نقی تقی فهو آلی (او كما قال ﷺ) " کہ ہرپاک وصاف میری امت کا شخص میری آل ہے۔دوسرا قول یہ ہے کہ آپ کی آل سے مراد بنی ہاشم اور بنی مطلب میں سے ایمان لانے والے حضرات ہیں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی آل کا اطلاق آپ کی ازواج مطہرات پراورآپ کی اولاد پر ہوتا ہے۔

قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا:

" آل الرسول من هو علی دينه وملته فی عصره وسائر الاعصار سواء كان نسبيا له او لم يكن "

رسول اللہ ﷺ کے آل وہ ہے جوآپ کے دین اورآپ کی ملت پر ہےخواہ وہ آپ کے زمانہ میں تھے یابعد میں کسی زمانہ میں بھی ہوں خواہ آپ کےنسب سے ہوں یانہ ہوں۔

" ومن لم یکن علی دینه وملته فلیس من آله ولا اهله وان کان نسبه او قریبه "

جو شخص نبی کریم ﷺ کے دین اور ملت پر نہیں وہ آپ کی اہل سے نہیں اگرچہ آپ کے نسب سے اس کا تعلق ہو، یا آپ کا قریبی رشتہ دار ہو۔

یہی وجہ ہے کہ ابولہب اور ابوجہل آپ کے خاندان سے متعلق ہونے کے باوجود آپ کی اہل سے نہیں۔ اسی سے پتہ چل گیا کہ صرف یہ کہنا کہ ہم سادات ہیں کافی نہیں ایمان پہلے ہے سید ہونے کا نفع بعد میں ہے نبی کریم ﷺ کا گستاخ یا صحابہ کرام سے بغض رکھنے والا اپنے آپ کو حضور کی آل کہے یہ اس کی جہالت ہے۔

بعض حضرات نے کہا کہ آل نبی صرف آپ کی ازواج اور آپ کی اولاد ہے کیونکہ حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم آپ پر کیسے درود بھیجیں تو آپ نے فرمایا تم کہو۔

" اللهم صل علی محمد وعلی ازواجه وذریته کما صلیت علی آل ابراهیم وبارک علی محمد وعلی ازواجه وذریته کما بارکت علی آل ابراهیم انک حمید مجید "

(رواہ مسلم)

یعنی اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم یہ کہو' اے اللہ تو درود بھیج محمد (ﷺ) پر، اور آپ کی ازواج پر اور آپ کی اولاد پر۔

اس سے واضح ہوا کہ آپ کی آل آپ کی ازواج مطہرات ہیں اور آپ کی اولاد ہے۔

تمام اقوال میں حقیقتاً کوئی اختلاف نہیں:

راقم کے نزدیک تین اقوال جو ذکر کیے ہیں اور چوتھا قول جو درسیات کے حواشی پر ملتا ہے کہ آپ کی آل کا اطلاق آپ کے صحابہ کرام پر ہے سب ہی درست ہیں عبارت کے ماقبل اور مابعد کو دیکھا جائے کہ یہاں آل کا معنی ازواج مطہرات لینا صحیح ہے تو اس وقت اس سے مراد ازواج مطہرات ہی ہوں گی۔ اسی طرح اگر اولاد مراد لینا مناسب تو وہ معنی مراد لیا جائے، اگر صحابہ کرام معنی لینا زیادہ مناسب نظر آئے تو وہ معنی کیا جائے۔ اگر بنو ہاشم یا بنو عبد المطلب مراد لینا بہتر ہو تو وہی مراد لی جائے،

اور اگر آپ کی امت کے تمام نیک متقی حضرات مراد لینا بہتر سمجھ آئے تو وہی مراد ہوگا۔

فرعون: مصر کے بادشاہوں کا لقب فرعون ہوا کرتا تھا۔ روم کے بادشاہوں کا قیصر، فارس کے بادشاہوں کا کسری، یمن کے بادشاہوں کا تبع، ترک بادشاہوں کا خاقان، اور حبشہ کے بادشاہوں کا لقب نجاشی تھا۔

" ولم یکن من الفراعنة احد اشد غلظة و لا اقسی قلبا منه "

مصر کے جتنے بادشاہ بھی گزرے ہیں کوئی بھی موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے فرعون سے زیادہ بد خلق، سخت دل اور ظالم نہیں تھا۔

یوسف علیہ السلام کے زمانے کا فرعون کا نام ریان بن ولید تھا جس نے ایمان قبول کر لیا تھا موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں پائے جانے والے فرعون کا نام "ولید ابن مصعب" یا مصعب ریان تھا بعض نے اس کا نام قابوس بھی تحریر کیا ہے، قبیلہ قبط سے تھا۔ یوسف علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں پائے جانے والے فرعونوں کے درمیان چار سو سال سے زائد عرصہ تھا۔

دینی طلباء کرام کے لئے: فرعون غیر منصرف ہے کیونکہ اس میں ایک سبب علمیت ہے اور دوسرا سبب عجمہ ہے اگر چہ فرعون عجمی لفظ ہے عربی نہیں، لیکن فرعون کے ظالمانہ طریقہ کو دیکھ کر اور اس کی سرکشی کو دیکھ کر اس کو عربی حضرات نے استعمال کیا ہے:

" فقیل تفرعن الرجل اذا تجبر وعتا " جب کوئی شخص ظلم اور سرکشی کرے تو کہا جاتا ہے " تفرعن الرجل "

(ماخوذ از کبیر)

فرعون کا غربت سے بادشاہت تک پہنچنا:

فرعون بہت غریب شخص تھا اس پر بہت زیادہ قرض ہو گیا تھا یہ مصر میں آیا اس نے دیکھا کہ دیہات سے خربوزوں کی گٹھڑی ایک درھم کی ملتی ہے اور شہر میں ایک خربوزہ ایک درھم کا فروخت ہوتا ہے اس نے سوچا یہ بڑی کامیاب تجارت ہے اس سے قرضہ اتارنا آسان ہوگا۔ اس نے ایک درھم سے خربوزوں کی ایک گٹھڑی خرید لی، شہر میں لایا تو اس سے ٹیکس وصول کرنے والے بدمعاشوں نے مختلف جگہ پر بطور ٹیکس خربوزے بٹورنے شروع کر دیئے۔ سب خربوزے جگا ٹیکس کی نظر ہو گئے صرف ایک خربوزہ باقی بچا جو اس نے شہر میں ایک درھم سے بیچ کر اپنا مول کھڑا کیا۔

اس نے سوچا اس ملک میں کوئی قانون نہیں جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا ضابطہ ہے یہاں بدمعاش ہوکر مال بٹورنا آسان ہے قانون پر عمل کرنا جرم ہے۔

شہر میں وباء پڑ گئی لوگ بہت تعداد میں مرنے لگے، یہ قبرستان میں جا کر بیٹھ گیا کہ جو پانچ درھم دے گا اس کے مردہ کو یہاں دفن کرنے دیا جائے گا میں یہاں کا منتظم ہوں جو بھی آتے اسے پانچ درھم دیئے جاتے کسی نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ البتہ ایک خاندان والوں نے اسے پانچ درھم دینے سے انکار کر دیا اسے پکڑ کر حاکم وقت کے پاس لے گئے۔

اس نے پوچھا تمہیں کس نے قبرستان میں منتظم بنایا، تم کیوں ٹیکس لے رہے ہو اس نے بتایا مجھے کسی نے مقرر تو نہیں کیا تھا البتہ میں نے یہ حیلہ اس لئے کیا تھا کہ تمہارے پاس کسی طرح پہنچا دیا جاؤں میں نے تمہیں بتانا یہ تھا کہ تمہارے ملک میں کوئی قانون نہیں ہر شخص ٹیکس وصول کر رہا ہے ان کو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اسلئے کچھ کام میرے سپرد کرو تاکہ میں درست انتظام کرلوں بادشاہ نے اسے اپنی حکومت میں انتظامی امور سپرد کر دیئے اس نے مناسب تدبیر سے لوگوں میں اپنا مقام بنا لیا آخر کار بادشاہ بن گیا۔ (ابوالسعود)

﴿ يَسُوْمُوْنَكُمْ ﴾: "یذیقونکم ویلزمونکم ایاہ" وہ تمہیں چکھاتے تھے، تم پر لازم کرتے، "وقیل یدیمون تعذیبکم" بعض حضرات نے کہا اس کا معنی ہے ہمیشہ تمہیں عذاب پہنچاتے تھے۔

﴿ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ﴾: "معناہ اشد العذاب" اس کا معنی ہے سخت عذاب، یعنی وہ فرعون والے تمہیں سخت عذاب پہنچاتے، تاہم اگر ظاہری معنی مراد لیا جائے کہ وہ "برا عذاب تمہیں پہنچاتے تھے" تو پھر بھی ٹھیک ہے۔ (از قرطبی)

کیسا بنی اسرائیل کو سخت عذاب دیا گیا؟

بنی اسرائیل کی حالت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے یہ تھی کہ فرعونیوں کے یہ لوگ خادم تھے ان کو مختلف قسم کے کاموں پر مقرر کیا ہوا تھا۔ کچھ لوگوں کو تعمیر کے کاموں پر لگایا ہوا تھا، اور کچھ لوگوں سے

ہل چلانے کا کام لیا جاتا، اور کچھ لوگوں سے کھیتی باڑی کے مختلف کام لئے جاتے، فصل کی کاشت اور کٹائی وغیرہ کے کاموں پر مقرر تھے، گندے کاموں پر بھی انہیں ہی لگایا جاتا، بیت الخلاء کی صفائی ان لوگوں کے ذمہ ہی تھی، کیچڑ وغیرہ کے کاموں پر ان کو ہی مقرر کیا جاتا۔ پتھر تراشنا اور پتھروں کو اٹھا کر لانا ان کے ذمہ ہی تھا۔ اینٹیں بنانا اور پھر ان کو پکوانے کا کام ان سے ہی لیا جاتا تھا۔ جولوگ یہ کام نہیں کر سکتے تھے ان پر ٹیکس مقرر کر دیا جاتا تھا۔ اور جو شخص سورج کے غروب ہونے سے پہلے ٹیکس ادا نہ کرتا اس کے ہاتھ اس کی گردن سے باندھ دیئے جاتے اور ایک مہینہ تک اس کے ہاتھ اسی طرح بندھے رہتے۔

اور بنی اسرائیل کی عورتوں سے بھی اسی طرح کام لئے جاتے جیسے لونڈیوں سے کام لئے جاتے یعنی گھریلو تمام کام ان کے سپرد ہوتے، اور سوت کاتنا اور سلائی، بنائی وغیرہ کے کام ان کی عورتوں سے ہی لئے جاتے تھے۔ (ماخوذ از کبیر، روح المعانی، خازن)

﴿ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَ كُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَ كُمْ ﴾:

ابناء کم، تمہارے بیٹے۔ نساء کم، تمہاری بیٹیاں۔ یذبحون، تشدید سے مبالغہ کے معنی میں استعمال ہے، یعنی تمہارے بیٹوں کو کثیر تعداد میں انہوں نے ذبح کیا تھا۔ یہ معنی اس وقت ہوگا جب کہ کمیت (تعداد) میں مبالغہ ثابت کیا جائے، لیکن مبالغہ اگر کیفیت میں ثابت کیا جائے تو معنی یہ ہوگا کہ وہ تمہارے بیٹوں کو بے دردی سے ذبح کرتے تھے۔

نکتہ: اس آیۃ میں یذبحون بغیر واؤ کے استعمال ہے، اور سورۃ ابراہیم میں " ویذبحون " واؤ کے ساتھ استعمال ہوا ہے وجہ فرق کیا ہے؟ وجہ فرق یہ ہے کہ یہاں بغیر واؤ کے استعمال ہوا ہے، اس لئے کہ یہ ﴿يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ﴾ کا بیان ہے کہ وہ تمہیں برا عذاب پہنچاتے، وہ برا عذاب کیا تھا؟ وہ برا عذاب یہ بھی تھا کہ فرعون والے بنی اسرائیل کے بیٹوں کو ذبح کرتے اور بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتے۔

اور سورۃ ابراہیم میں ''واؤ'' سے ذکر کر کے مغائرت ثابت کی گئی کہ وہ برا عذاب پہنچاتے تھے اور اس سے بڑھ کر ان کے بیٹوں کو ذبح کرتے اور ان کی بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتے۔ سبحان اللہ قرآن پاک کی کیا عظمت ہے کہ ایک ہی مسئلہ کو دو مختلف انداز سے بیان کر کے اس طرح ثابت کر دیا کہ فرعونیوں کا بنی اسرائیل کو برا عذاب پہنچانا یہ بھی تھا کہ ان کے بیٹوں کو ذبح کرتے اور بیٹیوں کو

زندہ چھوڑتے۔ اور وہ مختلف طریقوں سے بنی اسرائیل کو برا عذاب پہنچاتے اور صرف اسی پر اکتفاء نہیں کرتے تھے بلکہ اس سے بڑھ کر ان کے بیٹوں کو ذبح کرتے اور ان کی بیٹیوں کو زندہ چھوڑتے۔ یہ عظمت صرف قرآن پاک کو ہی حاصل ہے۔

بنی اسرائیل کے بیٹوں کو ذبح کیوں کرایا گیا؟

فرعون نے ایک خواب دیکھا کہ بیت المقدس کی جانب سے ایک آگ نکلی ہے جس نے مصر کا احاطہ کرلیا اور تمام قبطیوں کو جلا دیا، لیکن بنی اسرائیل کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا اس خواب سے فرعون بہت پریشان تھا، اس نے خواب کی تعبیر بیان کرنے کے ماہرین سے پوچھا کہ اس خواب کی تعبیر کیا ہوسکتی ہے؟ انہوں نے بتایا کہ اس خواب سے تو یہی سمجھ آتا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک بچہ پیدا ہوگا جو تمہاری بادشاہی کے زوال کا سبب بنے گا۔ یہ سن کر فرعون نے حکم دیا کہ بنی اسرائیل میں جو بچہ بھی پیدا ہوا سے ذبح کردیا جائے اس طرح اس کے حکم سے ہزاروں کی تعداد میں ان کے بچے ذبح کردیئے گئے، وہ جو ذبح کیے گئے ان کی تعداد بارہ ہزار تھی یا ستر ہزار تھی، اتنی بات واضح ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔

(جلالین، جمل)

فرعون کے اسی خواب کو مختصر الفاظ میں پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ نے ذکر کرنے کے بعد فرمایا اس وقت کی توہم پرست مصری ذہنیت سے یہ کچھ بعید بھی نہ تھا۔ لیکن شیخ محمد عبدہ نے ایک اور وجہ بیان کی ہے وہ کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کی نسل اس تیزی اور کثرت سے بڑھنے لگی تھی کہ فرعون کو یہ اندیشہ لاحق ہوگیا کہ اگر ان کی پیدائش کی رفتار یہی رہی تو بنی اسرائیل کی اقلیت اکثریت میں تبدیل ہو جائے گی اور اپنی غالب اکثریت کی بناء پر یہ کوئی انقلاب برپا کردیں گے، اس خدشہ کے پیش نظر اس نے بنی اسرائیل کی نسل کشی کا یہ ظالمانہ حکم دیا۔ (ضیاء القرآن)

علامہ رازی رحمہ اللہ نے فرعون کے خواب دیکھنے کا واقعہ بھی بیان کیا لیکن اس سے پہلے ایک اور وجہ کو ذکر کیا وہ یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ فرعون اور اس کے متبعین (تابعداری کرنے والوں) کو جب یہ علم حاصل ہوا: "کان اللہ وعد ابراھیم ان یجعل فی ذریتہ انبیاء وملوکا فخافوا ذلک" کہ اللہ تعالیٰ کا ابراہیم علیہ السلام سے وعدہ ہے کہ تمہاری اولاد سے انبیاء

اور بادشاہ بناؤں گا تو اس سے فرعون اور فرعون والے لوگ ڈرے کہ یہ کہیں بادشاہ بن کر ہماری بادشاہت کو ختم نہ کردیں تو انہوں نے سوچا کہ بڑی عمر کے لوگ خود مر جائیں گے، بچوں کو قتل کرانا شروع کردو تاکہ بنی اسرائیل نہ بڑھیں اور نہ ہی ہمارے ساتھ مقابلہ کرنے کی ان کو طاقت ہو۔

ایک اور وجہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ ہوسکتا ہے کہ فرعون کو خواب تو نہ آیا ہو البتہ نجومیوں نے اسے بتایا ہو کہ بنی اسرائیل میں ایک بچہ پیدا ہوگا جو تمہاری بادشاہت کے زوال کا سبب بنے گا، تو اس نے بچوں کو ذبح کرانا شروع کردیا ہو۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کو ترجیح دیتے ہوئے کہا:

" والاقرب هو الاول لان الذی یستفاد من علم التعبیر وعلم النجوم لا یکون امرا مفصلا "

زیادہ مناسب پہلا قول ہی ہے کیونکہ خواب کی تعبیر یا نجومیوں کی بات پر اعتبار کرلینا غیر یقینی ہے اس پر علامہ رازی اعتراض کرتے ہیں کہ اگر کوئی یہ کہے کہ فرعون تو اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء کرام پر ایمان ہی نہیں رکھتا تھا تو اس نے کیسے اعتبار کرلیا کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے یہ وعدہ کیا ہے۔

اس کا جواب دیتے ہوئے بیان فرماتے ہیں:

" قلنا لعل فرعون کان عارفا باللہ ویصدق الانبیاء الا انه کان کافرا کفر الجحود والعناد "

کہ ہوسکتا ہے فرعون رب تعالیٰ کو پہچانتا ہو، اور انبیاء کرام کی صداقت کا بھی اسے پتہ ہو لیکن ضد اور سرکشی کی وجہ سے انکار کرتا ہو، تقریباً تمام مشرکین کا یہی حال تھا وہ رب تعالیٰ اور اس کے انبیاء کو جانتے تھے مانتے نہیں تھے۔ (از کبیر)

بیٹوں کو ذبح کرنے اور بیٹیوں کو زندہ چھوڑنے کی وجہ کیا تھی؟

اس میں چند وجوہ بہت واضح طور پر نظر آتی ہیں:

(۱) بیٹوں کو ذبح کرنے سے مردوں کو فنا کرنا مقصود تھا، تاکہ اس کے ذریعے نسل ختم ہو جائے، کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ جب عورتیں اکیلی رہ جائیں گے تو ان سے نسل کا سلسلہ آگے نہیں چلے گا، اس طرح خود ہی مرد اور عورتیں سب تباہ ہو جائیں گے۔

(۲) مردوں کو ختم ہو جانے سے عورتوں کی زندگی برباد ہو کر رہ جاتی ہے ان کو ذریعہ معاش کا حصول اور معیشت کو سہارا دینا مشکل ہوتا ہے۔ اس طرح کی زندگی عورت کے لئے بہت بڑی محنت اور مشقت کا ذریعہ ہوتی ہے اس سے نجات دینا بھی اسی طرح عظیم نعمت ہوگی۔

(۳) بیٹوں کو قتل کرنے میں ان کے والدین پر کتنا غم آتا ہے یہ ان کو ہی پتہ ہوتا ہے خصوصا والدہ جب ایک طویل وقت تک حمل کی مشکلات کو برداشت کرتی ہے، اور بچے کی پیدائش پر عظیم مسرت اور عظیم نفع کی انتظار میں ہوتی ہے، جب پیدائش کے ساتھ ہی بچے کو بے دردی سے قتل کر دیا جائے اور وہ بھی ماں کے سامنے تو اس کی حالت زار اس سے پوچھیے کہ اس کے لئے یہ کتنا عظیم عذاب ہے۔

اور یہ بھی واضح ہے کہ اگر بچہ بڑا ہو جائے، طبعی زندگی گزار کر فوت ہو تو اس پر اتنا افسوس نہیں ہوتا جتنا کہ پیدا ہوتے ہی اسے قتل کر دیا جائے پھر موت پر بھی افسوس اتنا نہیں جتنا قتل پر ہوتا ہے۔

(۴) بیٹوں کو والدین پسند کرتے تھے بنسبت بیٹیوں کے۔ اسی وجہ سے اکثر لوگ بیٹیوں کو بوجھ سمجھتے تھے اور ان کو ناپسند کرتے تھے خواہ ان کے بیٹے زیادہ تعداد میں بھی ہوتے، اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق یہ ارشاد فرمایا:

﴿ واذا بُشِّرَ احدُهُم بالاُنثٰی ظَلَّ وَجهُه، مُسوَدا وَهو کَظِیمٌ ☆
یتَوارٰی مِنَ القَومِ مِن سُوءِ مَابُشِّرَ بِه ﴾ (پ ۱۴)

اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو دن بھر اس کا منہ کالا رہتا ہے اور وہ غصہ میں ہو جاتا ہے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے اس بشارت کی برائی کی وجہ سے۔

اسی وجہ سے کئی لوگ اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے رب تعالیٰ نے ان کو اس سے منع فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ وَلَا تَقتُلُوا اَولَادَکُم خَشیَةَ اِملَاقٍ ﴾ اور تم اپنی اولاد کو بھوک کے ڈر کی وجہ سے قتل نہ کرو۔

اولاد سے مراد بیٹیاں ہی ہیں کیونکہ یہ بات واضح ہے کہ وہ بیٹیوں کو ہی زندہ دفن کرتے تھے بیٹوں کو نہیں۔

(۵) مرد جب نہ رہیں صرف عورتیں رہ جائیں تو بعض اوقات وہ دشمنوں کے قبضہ میں آ جاتی ہیں اور وہ ان کو اپنے نکاح میں لے آتے جو بہت زیادہ ذلت کا سبب بنتا ہے۔

یہی وجوہ تھیں جن کو مد نظر رکھتے ہوئے ان لوگوں نے بنی اسرائیل کے بیٹوں کو ذبح کرنے کا

پروگرام بنایا۔ (از کبیر)

تنبیہ : بعض حضرات نے " ویستحیون نساء کم " کا معنی یہ بیان کیا ہے:

" یفتشون فی حیائھن ینظرون ھل بھن حمل و الحیاء فرج "

کہ وہ عورتوں کی فرجوں کو دیکھتے اور تفتیش کرتے تھے کہ یہ حاملہ ہیں یا نہیں۔

لیکن اس معنی کو علامہ رازی رحمہ اللہ نے رد کیا ہے۔ (از روح المعانی و کبیر)

﴿ وَفِیْ ذٰلِکُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ ﴾

"اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے آزمائش تھی بہت بڑی"

" بلاء " کا معنی ہے اختبار، آزمائش کرنا۔ پھر اس کی تین قسمیں ہیں " وھو تارۃ یکون بالمسار لیشکروا " ایک قسم یہ ہے کہ نعمتیں عطا کر کے آزمایا جائے کہ یہ اس آزمائش میں پورے اتر کر شکر یہ ادا کریں۔" وتارۃ بالمضار لیصبروا " اور آزمائش کبھی تکلیف پہنچا کر کی جاتی ہے کہ یہ صبر کرتے ہیں یا نہیں یعنی مقصد یہ ہوتا ہے کہ آزمائش میں پورے اتر کر صبر کریں " وتارۃ بھما لیرغبوا ویرھبوا " اور کبھی دونوں چیزوں سے آزمایا جاتا ہے، یعنی نعمت عطاء کر کے اور ساتھ ہی مصیبت بھی پہنچا کر آزمایا جاتا ہے تاکہ یہ آزمائش میں پورے اتر کے رب تعالیٰ کی طرف رغبت بھی کریں اور رب تعالیٰ سے ڈریں بھی۔

اگر " ذلکم " کا اشارہ فرعون والے لوگوں کے عذاب پہنچانے اور انکے بیٹوں کو ذبح کرنے، اور ان کی بیٹیوں کو زندہ چھوڑنے کی طرف ہو تو " بلاء " کا معنی ہوگا کہ یہ مصیبتیں تمہارے لئے بہت بڑی آزمائش تھیں۔

اور اگر " ذلکم " کا اشارہ " انجاء " (اللہ تعالیٰ کے نجات دینے) کی طرف ہو تو " بلاء " کا معنی نعمت سے آزمانا ہوگا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں فرعونیوں کے طرح طرح کے عذاب سے نجات دے کر آزمایا، یہ آزمائش تمہارے لئے بہت بڑی تھی، کہ تم شکر کرتے ہو یا نہیں۔

اور اگر " ذلکم " کا اشارہ تمام چیزوں کی طرف بیک وقت کیا جائے تو اب " بلاء " کا معنی

یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں مصیبتیں پہنچا کر اور نعمتیں عطاء کر کے آزمایا یہ آزمائش تمہارے لئے بہت بڑی آزمائش تھی " ویرجح الاول التبادر " پہلا معنیٰ فوراً ذہن میں آنے کی وجہ سے راجح نظر آتا ہے کہ مصائب کے ذریعے آزمایا گیا۔

" والثانی انه فی معرض الامتنان " اور دوسرا معنیٰ اس لئے زیادہ راجح نظر آتا ہے کہ یہاں نعمتوں کا ذکر ہو رہا ہے اور ان نعمتوں کی یاد ہی دلائی جا رہی ہے۔ اس لئے یہ معنیٰ کرنا کہ رب تعالیٰ نے تمہیں نعمتوں سے آزمایا موقع و محل کے زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

" والثالث لطف جمع الترغیب والترهیب " تیسرا معنیٰ مراد لینا زیادہ پر لطف ہے کیونکہ اس میں مصائب کا ذکر بھی آ جاتا ہے اور نعمتوں کا ذکر بھی اور اس پر رب تعالیٰ کی رغبت کا ذکر بھی آ گیا اور رب تعالیٰ سے ڈرنے کا ذکر بھی آ گیا۔ (از روح المعانی)

روح المعانی کی اس باکمال بحث کے بعد اعلیٰ حضرت کا باکمال ترجمہ دیکھیں " اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی بلا تھی یا بڑا انعام "

تاہم راقم نے بھی ترجمہ وہی کیا ہے جو ان سب صورتوں کو شامل ہو جائے، لیکن اہل علم حضرات کو اس پر خود بھی سوچنا پڑے گا اور اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بہت بڑی تفسیر کو دو لفظوں سے حاوی ہو گیا۔

رب تعالیٰ کی عظمت:

" والعظم بالنسبة للمخاطب والسامع لا بالنسبة الیه تعالیٰ لانه العظیم الذی لا یستعظم شیأ "

یہاں آزمائش کو جو عظیم کہا گیا ہے وہ بنسبت مخاطبین کے اور سننے والے حضرات کے، یعنی اے بنی اسرائیل تم اس آزمائش کو عظیم سمجھتے ہو اور سننے والو تم بھی عظیم سمجھتے ہو۔

لیکن اللہ تعالیٰ خود بھی عظیم ہے اس لئے وہ کسی اور چیز کو عظیم نہیں سمجھتا۔ لہٰذا رب تعالیٰ کی بنسبت عظیم کا ذکر نہیں کیا گیا۔

تنبیہ : " عظیم صفة بلاء وتنکیر هما للتفخیم " عظیم بلاء کی صفت ہے دونوں کو نکرہ ذکر کیا گیا ہے جن کی تنوین عظمت پر دلالت کر رہی ہے اسی لئے ترجمہ میں " بہت بڑی آزمائش " ذکر کیا گیا ہے۔ (از روح المعانی)

﴿وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ﴾

۱) '' اور جب ہم نے تمہارے لئے دریا پھاڑ دیا تو تمہیں بچالیا اور فرعون والوں کو تمہاری آنکھوں کے سامنے ڈبو دیا۔''

۲) ''اور یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے پھاڑ دیا تمہارے لئے دریا کو تو ہم نے نجات دی تمہیں، اور غرق کیا ہم نے فرعون والوں کو، ایسے حال میں کہ تم دیکھ رہے تھے۔''

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ایک اور نعمت یاد دلائی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں نجات دی، اور فرعون کو تمہارے سامنے غرق کیا موسیٰ علیہ السلام کو رب تعالیٰ نے حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو رات میں مصر سے نکال کر لے جاؤ۔ یعنی اب بنی اسرائیل کی نجات اور فرعون اور اس کی قوم کی تباہی کا وقت آچکا ہے۔

رات کو نکالنے کا حکم دیا تا کہ بنی اسرائیل کا اجتماع دشمن کے سامنے نہ ہو اور وہ ان کی مراد کی تکمیل میں مانع نہ بنے اور رات کو نکالنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ فرعون اور اس کا لشکر ان کا پیچھا کر کے ان کو روک نہ سکے اور فرعون کے عظیم لشکر کو دیکھ کر بنی اسرائیل خوف نہ کریں۔

چاندنی رات میں موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو ساتھ لے کر چلے، بنی اسرائیل کے پاس کافی مقدار میں سونے اور چاندی کے زیورات بھی تھے، جو انہوں نے قبطیوں (فرعونیوں) سے مانگ کر لئے ہوئے تھے کہ ہم انہیں اپنی عید میں استعمال کریں گی وہ پہلے بھی ان سے زیورات لیتے رہتے تھے۔

یوسف علیہ السلام نے وصیت فرمائی تھی کہ جب تم مصر سے نکلو تو میرا تابوت بھی ساتھ لے کر جانا تو موسیٰ علیہ السلام نے آپ کی وصیت کے مطابق ایک بوڑھی عورت کی نشاندہی پر وہ تابوت نکال کر خود بنفس نفیس اٹھایا۔

ابن ابی حاتم حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں نقل فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک

دیہاتی کے پاس ایک مرتبہ ٹھہرے۔ اس نے حضور کی مہمان نوازی کی اور بہت تعظیم و تکریم کی۔

آپ نے فرمایا کہ تم کبھی ہمارے پاس بھی آنا، تو وہ دیہاتی ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا: بتاؤ تمہیں کس چیز کی ضرورت ہے کہ میں تمہیں عطا کروں اس نے کہا ایک اونٹنی جس پر کجاوہ پڑا ہوا ہو، اور ایک دودھ دینے والی بکری جس کا دودھ میرے گھر والے پئیں۔

حضور ﷺ نے فرمایا تو تو بنی اسرائیل کی بوڑھی عورت سے بھی گیا گزرا ہوا ہے (اس نے تو جنت طلب کی تھی) صحابہ کرام نے پوچھا یارسول اللہ بنی اسرئیل کی بوڑھی عورت کا کیا واقعہ ہے؟

آپ نے فرمایا جب موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو ساتھ لے کر چلے تو راستہ بھول گئے اس پر حیرانگی سے ایک دوسرے سے پوچھنے لگے یہ کیا ہوا؟ کچھ لوگوں کو حضرت یوسف علیہ السلام کی وصیت کا علم تھا تو انہوں نے کہا کہ یوسف علیہ السلام نے اپنی وفات کے وقت ہمارے آباءواجداد سے پختہ وعدہ لیا تھا کہ مصر سے نکلتے وقت میرا تابوت ضرور ساتھ لے جانا، ہمارے بھولنے کی یہی وجہ ہوسکتی ہے۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تم میں سے کون ہے جو یوسف علیہ السلام کی قبر کو جانتا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ ہم میں سے ایک بوڑھی عورت کے بغیر کوئی بھی نہیں جانتا کہ یوسف علیہ السلام کی قبر کس جگہ واقع ہے، تو موسیٰ علیہ السلام نے اس عورت کو بلا کر کہا کہ تم بتاؤ کہ یوسف علیہ السلام کی قبر کہاں ہے؟ اس نے کہا میں اس وقت تک نہیں بتاؤں گی جب تک تم میری ایک شرط پوری نہ کرو آپ نے پوچھا وہ کیا ہے؟ اس نے کہا میری صرف یہ خواہش ہے کہ میں جنت میں آپ کے ساتھ رہوں۔

موسیٰ علیہ السلام کچھ سوچ میں پڑ گئے، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی نازل کی کہ اے موسیٰ اس سے وعدہ کرلو آپ نے کہا ٹھیک ہے تمہاری درخواست منظور ہے موسیٰ علیہ السلام جب اس عورت کے ساتھ چلے تو اس نے قبر کی نشاندہی کی۔ جب یوسف علیہ السلام کے تابوت کو نکالا گیا تو اندھیری رات روشن ہوگئی، اس طرح انہیں راستہ مل گیا، (یہ حدیث غریب ہے، قریب ہے کہ صحابی تک موقوف ہو) راقم کے نزدیک ظاہر طور پر مرفوع ہے، اگر موقوف بھی ہو تو قیاس کے مخالف ہے اس لئے حکم مرفوع میں ہے۔

(ماخوذ از کثیر وابن کثیر زیر آیۃ ولقد اوحینا موسی الخ پ ۱۲ ع ۱۳

فرعون اور اس کی قوم کی ہلاکت کی طرف روانگی:

فرعون نے جب صبح دیکھا کہ بنی اسرائیل موجود نہیں ہیں تو بہت غصہ میں ہوا۔ اس نے ہر طرف کارندے دوڑا کر اپنی فوجوں، لشکروں اور اپنے تمام حامیوں کو جمع کر لیا اور کہنے لگا کہ بنی اسرائیل ہمارے مقابلہ میں ایک چھوٹی سی جماعت ہے وہ ہمیشہ ہمارے غیظ وغضب کو بھڑکاتے رہتے ہیں میں چاہتا ہوں ان کو مکمل تباہ و برباد کر دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کو برباد کرنے کے لئے ان کے دلوں میں یہ بات ثابت کر دی کہ سب لوگ بنی اسرائیل کا پیچھا کر کے ان کا مکمل صفایا کر دو، اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ سے ان تمام فرعونیوں کو برباد کر کے اپنا وعدہ پورا فرما دیا۔

فرعون کو ماننے والے تمام اس کے کہنے پر اپنی نعمتوں، اپنے اعلیٰ قسم کے مکانات اور پھلدار درختوں کے باغات اور اپنے سامان تعیش یعنی اپنی عیش و عشرت کے سامان کو چھوڑ کر بظاہر بنی اسرائیل کو تباہ کرنے کے لئے چلے جو درحقیقت اپنی ہی بربادی کی طرف چل رہے تھے، فرعون کے کہنے پر سب لوگ جمع ہو کر بنی اسرائیل کے تعاقب میں چل پڑے، دریا کے کنارے پر ان کے سامنے پہنچ گئے۔

بنی اسرائیل نے جب دیکھا تو کہنے لگے کہ اب تو ہم پکڑ لئے جائیں گے، ان کے دلوں میں پہلے ہی فرعون کا رعب چھایا ہوا تھا اور وہ تعداد میں بھی فرعونیوں سے بہت کم تھے، اور کسی قسم کا ان کے پاس کوئی اسلحہ بھی نہیں تھا اس لئے ان پر بہت زیادہ خوف طاری ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میرا رب میرے ساتھ ہے وہ ابھی میری راہنمائی فرمائے گا۔ (ماخوذ از کبیر پ ۱۹ ع ۸)

موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں عصا مارنے کا حکم:

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ آپ اپنا عصا دریا پر مارو، آپ نے جب اپنا عصا دریا پر مارا تو دریا پھٹ گیا، اس نے راستہ چھوڑ دیا، درمیان میں خشک راستہ اور ادھر ادھر پانی کی بلندی اتنی عظیم جیسے بڑے بڑے پہاڑ ہوں۔

بنی اسرائیل چونکہ بارہ قبائل تھے ایک ہی راستہ میں ایک دوسرے کے ساتھ چلنا مناسب نہیں سمجھتے تھے اس لئے ہر قبیلہ کے لئے علیحدہ علیحدہ راستہ بنایا گیا یعنی دریا میں بارہ راستے بنائے گئے ، ہر راستہ کے دائیں بائیں پانی کی بلندی عظیم پہاڑوں جیسی تھی وہ کہنے لگے کہ ہمیں کیا معلوم ہے کہ ہمارے دوسرے بھائی زندہ ہیں یا پانی کی طغیانی میں غرق ہو چکے ہیں تو درمیان سے روشن دانوں کی طرح پانی کو ہٹا دیا گیا، وہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے دریا عبور کر گئے۔

فرعون اور اس کے لشکر نے بھی دریا میں راستہ دیکھ کر اپنے گھوڑے دوڑا دیئے، لیکن وہ بنی اسرائیل کو نہ پا سکے۔ حضرت سائب سے مروی ہے کہ فرعونیوں اور بنی اسرائیل کے درمیان جبرائیل تھے بنی اسرائیل کے پیچھے لوگوں کے دلوں میں یہ بات ڈال رہے تھے کہ جلدی چلو اگلے لوگوں سے مل جاؤ، اور فرعونیوں کے دلوں میں یہ بات ڈال رہے تھے کہ آہستہ چلو پچھلے لوگوں کو ساتھ ملنے دو، بنی اسرائیل جب دریا عبور کر چکے اور فرعونی ابھی درمیان میں ہی پہنچے تھے تو پانی آپس میں مل گیا اس طرح فرعون اور اس کی قوم کے تمام لوگ ایک روایت کے مطابق یہ چھ لاکھ کی تعداد میں تھے سب غرق ہو گئے بنی اسرائیل یہ تمام ماجرا آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ (ماخوذ از کبیر پ ۱۹ ع ۸)

﴿ وَاِذْ فَرَقْنَا ﴾ : "اذ فی موضع النصب ، وفرقنا ، فلقنا"

یعنی اذ مقام نصب میں ہے، اذکر و مقدر ہے مطلب یہ ہوا کہ یاد کرو اس وقت کو۔

" فرق " کا لغوی معنی ہے جدا کرنا۔ اسی لئے بالوں میں مانگ نکالنے کو بھی فرق کہا گیا ہے کہ بال ایک حصہ کے ایک طرف اور دوسرے حصہ کے دوسری طرف ایک دوسرے سے جدا ہیں۔

" فرقان " جو حق و باطل کے درمیان فرق کرے " فالفارقات فرقا " قسم ہے فرق کرنے والی جماعتوں کی، اس سے مراد فرشتے ہیں جو حق و باطل کے درمیان فرق کرنے کے لئے نازل ہوتے ہیں۔

"یوم الفرقان " بدر کے دن کو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی حق و باطل کے درمیان فرق کرنے کا دن تھا۔

﴿ بِكُمْ ﴾ : " ای بکم ، فالباء بمعنی اللام ۔ یعنی " بکم " میں باء بمعنی لام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے دریا تمہارے لئے پھاڑا۔ بعض حضرات نے کہا باء بمعنی سببیت کے ہے۔ تمہاری وجہ سے

دریا کو پھاڑا، یعنی اصل سبب تم ہی تھے کیونکہ تمہیں نجات دینا مقصود تھا اگرچہ ظاہری سبب موسیٰ علیہ السلام کا عصا مارنا تھا۔

﴿ **اَلْبَحْرَ** ﴾: اصل معنی اس کا ہے ''وسعت رکھنا'' دریا میں بھی چونکہ وسعت ہوتی ہے اس لئے اس کو بحر کہتے ہیں کہا جاتا ہے ''فرس بحر'' تیز چلنے والا گھوڑا یعنی تیز چلنے والے گھوڑے کی چال میں بھی وسعت پائی جاتی ہے لہٰذا اسے بھی بحر کہہ لیا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں بھی حضرت ابوطلحہ کے گھوڑے کے لئے الفاظ استعمال ہیں " وان وجدناه البحر " (از قرطبی)

فائدے کے لئے حدیث پاک کو بھی دیکھتے چلیں تاکہ ذوق ایمان میں اضافہ ہو اور مقام مصطفیٰ ﷺ کی ایک جھلک نظر آئے:

" عن انس بن مالک قال کان رسول الله ﷺ احسن الناس و کان اجود الناس و کان اشجع الناس ولقد فزع اهل المدينة ذات ليلة فانطلق ناس قبل الصوت فتلقاهم رسول الله ﷺ راجعا وقد سبقهم الى الصوت وهو على فرس لابى طلحة عرى فى عنقه السيف وهو يقول لم تراعوا لم تراعوا قال وجدناه بحرا او انه لبحر قال وكان فرسا يبطأ "

(مسلم ج ثانی ص ۲۲۰ باب شجاعته صلی اللہ علیہ وسلم)

حضرت انس بن مالک فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ تمام لوگوں سے زیادہ حسین تھے تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے تمام لوگوں سے زیادہ بہادر تھے، ایک رات مدینہ طیبہ کے لوگ (کسی ہیبتناک آواز سے) گھبراہٹ میں مبتلا ہو گئے لوگ اس آواز کی طرف چلے، نبی کریم ﷺ ان کو ملے آپ لوٹ کر آرہے تھے، آپ ان لوگوں سے پہلے اس آواز کی طرف تشریف لے گئے تھے، آپ ابوطلحہ کے گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار تھے آپ کے گلے میں تلوار تھی، آپ فرما رہے تھے کوئی ڈر فکر کی ضرورت نہیں کوئی ڈر فکر کی ضرورت نہیں، حضرت انس فرماتے ہیں ہم نے اس گھوڑے کو تیز رفتار پایا حالانکہ وہی پہلے بہت سست رفتار تھا۔

" وفيه بيان عظيم بركته ومعجزته فى انقلاب الفرس سريعا بعد ان كان يبطأ "

اس حدیث پاک سے نبی کریم ﷺ کی عظیم شان سمجھ آئی کہ آپ کی برکت اور آپ کے

معجزہ کی وجہ سے ست رفتار گھوڑا تیز رفتار ہو گیا۔

اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ تمام سے زیادہ بہادر تھے سب سے پہلے اور اکیلے ہی رات کو دشمن کا پتہ چلانے تشریف لے گئے۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ حضرت ابوطلحہ کے اس گھوڑے کا نام مندوب تھا۔ (نووی)

﴿ فَاَنۡجَیۡنٰکُمۡ ﴾: ای من الغرق او من ادراک فرعون و آله لکم او مما تکرهو ن .

(تو ہم نے تمہیں نجات دی) قرآن پاک میں تھوڑے الفاظ کثیر معانی پر مشتمل ہیں، کیونکہ اس میں کئی احتمال ہیں بلکہ وہ تمام احوال مجموعی طور پر ان الفاظ مبارکہ سے سمجھ آ رہے ہیں۔ مطلب یوں ہوا۔ ہم نے تمہیں نجات دی غرق سے، یعنی فرعون اور اس کے لشکر کو غرق کر دیا تمہیں غرق سے بچالیا۔

اور یہ بھی مطلب حاصل ہو سکتا ہے کہ ہم نے تمہیں فرعون اور اس کے لشکر کو پالینے سے نجات دی حالانکہ انہوں نے تمہیں ہلاک کر دینے کی غرض سے تمہارا پیچھا کیا تھا لیکن رب تعالیٰ نے انہیں ہلاک کر دیا اور تمہیں ان لوگوں سے بچالیا کہ وہ تمہیں پا ہی نہ سکے ہلاک کیسے کرتے۔

اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں فرعون اور اس کے متعلقین و متبعین کی طرف سے جو شدید تکالیف پہنچائی جاتی تھیں ان سے بچالیا۔ بلکہ یہ تینوں معانی ایک ساتھ ہی لینے میں کمال ہے اور عظمت قرآن اس سے واضح ہے، یعنی مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں غرق ہونے، فرعون کو پالینے اور فرعونیوں کی شدید تکالیف سے نجات دی۔ (از روح المعانی)

تنبیہ: اب اس تفصیل کے بعد دیکھیں تو مودودی صاحب کا ان الفاظ مبارکہ کا ترجمہ ادھورا نظر آئیگا: مودودی صاحب کا ترجمہ یہ ہے:

''پھر اس میں سے تمہیں بخیریت گزروادیا''

پھر اس ترجمہ پر اور تعجب یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے کسی کی مدد سے ان کو گزروایا، خود گزارا یا کسی اور نے؟ مودودی صاحب نے اس سے پہلے (رکوع کی پہلی آیت میں) ﴿ ولا هم ينصرون ﴾ کا ترجمہ کیا ہے'' اور نہ مجرموں کو کہیں سے مدد مل سکے گی'' ذکر کافروں کا ہے نہ کہ صرف مجرموں

(گنہگاروں) کا۔ پھر اس کی تفسیر میں بھی کافروں کا ذکر نہ کر کے انبیاء، صلحاء، زھاد، اولیاء کی شفاعت کو قبول نہ کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے، جناب کے تفسیری الفاظ کو دیکھئے اور راقم کی شفاعت کی بحث کو بھی دیکھئے تو فرق خود سمجھ آ جائے گا۔

مودودی صاحب کی تفسیر یہ ہے۔ بنی اسرائیل کی بگاڑ کی ایک بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ آخرت کے متعلق ان کے عقیدے میں خرابی آ گئی تھی وہ اس قسم کی خیالات خام میں مبتلاء ہو گئے تھے کہ ہم جلیل القدر انبیاء کی اولاد ہیں بڑی بڑے اولیاء، صلحاء، اور زہاد سے نسبت رکھتے ہیں، ہماری بخشش تو انہیں بزرگوں کے صدقے میں ہو جائے گی، ان کا دامن گرفتہ ہو کر بھلا کوئی سزا کیسے پا سکتا ہے۔ انہیں جھوٹے بھروسوں نے ان کو دین سے غافل اور گناہوں کے چکر میں مبتلا کر دیا تھا، اس لئے نعمت یاد دلانے کے بعد فوراً ہی ان کی ان غلط فہمیوں کو دور کیا گیا ہے۔ (تفہیم القرآن)

﴿وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ﴾: اس مقام میں اگرچہ فرعون کا بظاہر ذکر نہیں لیکن اصل میں قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت کا عظیم مقام ہے جو دوسری کسی کتاب کو حاصل نہیں۔ علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے کیا خوب بیان فرمایا:

"(واغرقنا آل فرعون) اراد به فرعون وقومه واقتصر على ذكرهم بانه كان اولى به، وقيل شخصه كماروى ان الحسن ﷺ كان يقول اللهم صل على آل محمد اى شخصه واستغنى بذكره عن ذكر اتباعه" (بیضاوی)

یہاں سے مراد فرعون اور اس کے متعلقین تمام ہی ہیں۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ "ہم نے غرق کیا فرعون اور فرعون والوں کو" کیونکہ جب اس کی قوم کا ذکر کر دیا گیا تو خود بخود معلوم ہو گیا کہ وہ بھی ساتھ تھا اس کا غرق ہونا تو بطریق اولی (بہتر طریقہ سے) ثابت ہو جائے گا (پھر یہ بھی خیال رہے کہ فرعون کا واضح طور پر غرق ہونے کا ذکر نویں پارہ میں موجود ہے) اور یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ "آل فرعون" سے مراد خود فرعون کی ذات ہو اور اس کی قوم اس کے تابع ہونے کی وجہ سے مراد ہو، اس پر دلیل یہ ہے کہ روایت ہے حضرت حسن بصری ﷺ درود پاک پڑھتے ہوئے یہ کہتے "اللهم صل آل محمد" وہ

آل محمد سے مراد نبی کریم ﷺ کی ذات لیتے۔

﴿ وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ﴾: یہ جملہ حالیہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ "ایسے حال میں کہ تم دیکھ رہے تھے" یعنی پہلے تم نے دریا کو چلتے ہوئے دیکھا، پھر دریا کو پھٹتے ہوئے، کشک راستے بنے ہوئے بھی تم دیکھ رہے تھے۔ پھر فرعونیوں کو آتے ہوئے، دریا میں گھستے ہوئے، پھر ان پر دریا کو ملتے ہوئے، پھر ان کو غرق ہوتے ہوئے بھی تم دیکھ رہے تھے، پھر دریا نے ان کی لاشوں کو باہر پھینک دیا تو تم ان کو مردہ حال میں بھی دیکھ رہے تھے یہ سارا منظر تمہاری آنکھوں کے سامنے تھا۔ (از بیضاوی)

بنی اسرائیل اور فرعونیوں کی تعداد برابر تھی: عجیب اتفاق یہ تھا کہ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے ہر قبیلہ میں پچاس، پچاس ہزار آدمی تھے اس طرح کل تعداد چھ لاکھ تھی، فرعون کی قوم کے لوگ بھی چھ لاکھ کی تعداد میں تھے۔ (از خازن)

یہ دریا کون سا تھا؟ اس دریا کو "بحر قلزم" کہا جاتا ہے جس کی چوڑائی چار فرسخ تھی، یہ بحر فارس کے ایک طرف واقع ہے، اور بعض حضرات نے کہا مصر کے پیچھے ایک دریا ہے جسے "اساف" کہا جاتا ہے یہ وہی ہے۔ (از خازن)

مفتی احمد یار خان اور حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہما اللہ نے بحر قلزم کا ذکر کیا ہے۔ تاہم روح المعانی میں علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ایک قول بحر قلزم کے متعلق ذکر کیا اور دوسرا دریائے نیل کے متعلق:

"واختلفوا فی هذا البحر فقیل القلزم و کان بین طرفیه اربعة فراسخ وقیل النیل" (روح المعانی)

یہ واقعہ دینی اور دنیاوی نعمتوں کا پتہ دیتا ہے:

اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو دنیاوی اور دینی کثیر نعمتیں حاصل ہوئیں۔ دنیاوی نعمتیں حاصل ہونے کی چند وجوہ:

(۱) جب موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں آگے دریا اور پیچھے دشمن ہر قسم کے ہتھیار لے کر پہنچ گیا ہے، ذرا رکتے ہیں تو دشمن آکر تباہ و برباد کردے اور آگے چلتے ہیں تو دریا میں غرق

ہوتے ہیں یہ کتنا پرخوف اور ہولناک منظر ہے۔ جب دریا پھٹ گیا، دریا نے راستہ دے دیا اور ان کو نجات حاصل ہوگئی تو یہ کتنی بڑی خوشی کا مقام ہوگا، اس سے بڑھ کر دنیا میں اور کون سی عظیم نعمت ہو سکتی ہے۔

(۲) اس واقعہ سے موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ظاہر ہوا کہ آپ کے عصا مارنے کی وجہ سے دریا کو اللہ تعالیٰ نے پھاڑ دیا۔ اور اس سے بنی اسرائیل کا اس وقت رب تعالیٰ کا مکرم ہونا بھی ثابت ہوتا ہے اور ان پر عظیم نعمت بھی ثابت ہو رہی ہے۔ خیال رہے بنی اسرائیل جب تک ایماندار اور اللہ تعالیٰ کے نبی سے محبت کرنے والے، احکام شرع پر پابندی کرنے والے تھے مکرم تھے جب نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے سے منہ موڑ دیا تو ذلیل و خوار ہوگئے۔ اب یہودیوں اور نصرانیوں سے محبت کرنے والے شریعت مصطفیٰ ﷺ کے باغی ہیں اور دین اسلام کے دشمن ہیں۔

(۳) جب انہوں نے مشاہدہ کرلیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمن کو ہلاک کر دیا ہے تو انہیں معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں عظیم نعمت سے نوازا ہے کہ ہمیں بہت بڑی مصیبت سے نجات حاصل ہوگئی۔ خاص کر کے ان کو تکریم بھی حاصل ہوگئی اور دشمن کے ہلاک ہونے کا مشاہدہ بھی کرلیا۔ (یہ کبیر سے نقل کیا جا رہا ہے)

اس پر علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے کیا خوب الفاظ تحریر فرمائے:

"ان هلاک العد ونعمة و مشاهدته نعمة اخری"

بیشک دشمن کا ہلاک ہو جانا ایک نعمت ہے اور اس کی ہلاکت کا مشاہدہ کرنا دوسری نعمت ہے۔

خیال رہے کہ دین اسلام کے باغی دشمن خدا کی موت پر خوشی منانا سنت حبیب کبریا علیہ التحیۃ والثناء ہے:

"عن سعد ان النبی ﷺ جمع له ابویه یوم احد قال کان رجل من المشرکین قد احرق المسلمین فقاله له النبی ﷺ ارم فداک ابی و امی قال فنزعت له بسهم لیس فیه نصل فاصبت جنبه فسقط و انکشفت عورته فضحک رسول الله ﷺ حتی نظرت الی نواجذه"

(مسلم ج ۲ ص ۔ فضل سعد بن ابی وقاص)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے میرے لئے احد کے دن اپنے ماں باپ کو جمع کیا آپ فرماتے ہیں مشرکوں میں سے ایک شخص تھا جس نے

مسلمانوں کو بہت تنگ کیا ہوا تھا۔ مجھے نبی کریم ﷺ نے فرمایا میرے ماں باپ تم پر قربان اس کو تیر مارو، آپ فرماتے ہیں میں نے اسے تیر مار دیا حالانکہ اس میں لوہے کی نوک نہیں تھی وہ تیر میں نے اس کے پہلو پر گاڑ دیا، وہ گر گیا، اس کا ننگیز کھل گیا (ننگا ہو گیا) نبی کریم ﷺ ہنسے یہاں تک کہ میں نے آپ کی داڑھوں کو دیکھ لیا۔

اس حدیث کی شرح میں علامہ نووی رحمہ اللہ نے فرمایا" **فضحک فرحا بقتله عدوه لانکشافه** " کہ کوئی شخص یہ گمان نہ کرے کہ نبی کریم ﷺ اس کے ننگے ہونے پر ہنسے، نہیں نہیں نبی کی شان کے یہ لائق ہی نہیں کہ کسی کے ننگیز کے کھل جانے پر ہنسیں۔ آپ کی ہنسنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ حضرت سعد نے ایک دشمن کو قتل کر دیا تھا اس پر نبی کریم ﷺ نے خوشی کا اظہار فرمایا۔

حدیث شریف میں " **قد احرق المسلمین** " (تحقیق اس نے مسلمانوں کو جلایا ہوا تھا، یعنی مسلمانوں کو تنگ کر رکھا تھا) کے الفاظ واضح طور پر دلالت کر رہے ہیں کہ وہ مسلمانوں کا دشمن تھا، جس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا دشمن تھا۔ اس کی موت پر نبی کریم ﷺ نے خوشی کا اظہار فرما کر اس فعل کو سنت بنا دیا۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں کو غرق کر کے ان کی زمین، ان کے شہر اور گھر، اور ان کی نعمتیں اور ان کے مال بنی اسرائیل کو دے دیئے واضح ہوا کہ یہ واقعہ بنی اسرائیل کے لئے بہت بڑی نعمت کا سبب بنا۔

(۵) اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں کو غرق کر کے بنی اسرائیل کو ان سے نجات دے کر انہیں عظیم نعمت سے نوازا، اور ان کے دلوں سے مکمل طور پر فرعون اور اس کی قوم کا خوف زائل کر دیا۔ اگر بنی اسرائیل کو دریا سے پار کر دیا جاتا لیکن فرعون اور اس کی قوم کو غرق نہ کیا جاتا تو بنی اسرائیل ان سے ڈرتے ہی رہتے کہ اگر انہوں نے ہم کو پکڑ لیا، یا کہیں ہمیں ایک جگہ جمع ہونا پڑا تو وہ ہمیں شدید عذاب دیں گے۔ فرعونیوں کا صفایا کر کے بنی اسرائیل کو اس شدید خوف سے نجات دے دی جو یقیناً ان کے لئے بہت بڑی نعمت تھی۔

(۶) بنی اسرائیل کے سامنے فرعون اور اس کی قوم کا ہلاک ہو جانا بھی عظیم نعمت تھا اس لئے کہ اگر ان کو ہلاک کر دیا جاتا لیکن ان کی ہلاکت کو بنی اسرائیل نے نہ دیکھا ہوتا تو ان پر ان کا خوف جاری رہتا، کیونکہ یہ

فرعون کی چاکری میں ایک عرصہ گزار چکے تھے، اس لیے ان کے دلوں پران کا رعب چھایا ہوا تھا۔

اس واقعہ سے موسیٰ علیہ السلام کو دینی فوائد حاصل میں چند وجوہ پائی جاتی ہیں:

(۱) جب موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے آپ کے معجزہ کو واضح طور پر دیکھ لیا تو ان کے شکوک وشبہات زائل ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ جو صانع وحکیم ہے اس پران کا ایمان پختہ ہو گیا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کی نبی ہونے کی تصدیق بھی ان کی زیادہ پختہ ہو گئی، اس طرح ان کو بدیہی علم حاصل ہو گیا، نظر دقیق کے بوجھ اٹھانے اور مشقت آمیز دلائل کے حصول کی محتاجی نہ رہی۔

(۲) جب ان لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام کے اس معجزہ کو ظاہر طور پر دیکھ لیا تو جس طرح ان کے لئے سبب بنا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کریں اسی طرح قبطی لوگ جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کا پیچھا نہیں کیا تھا ان کے لئے بھی سبب بنا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کو سچا نبی مانیں اور فرعون کو جھوٹا خدا سمجھیں۔

(۳) نبی اسرائیل کو یہ معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر نہ کوئی عزیز ہے اور نہ ہی کوئی طاقت ور ہے:

"ثم ان الله تعالیٰ فی لحظة واحدة جعل العزیز ذلیلا الذلیل عزیزا"

پھر انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بیشک اللہ تعالیٰ ایک لحظہ میں عزیز کو ذلیل بنا دیتا ہے اور ذلیل کو عزیز بنا دیتا ہے۔

فرعون جو اپنے آپ کو عزیز سمجھتا تھا اسے غرق کر کے ذلیل کر دیا۔ بنی اسرائیل کو فرعونیوں نے اپنا غلام بنا کر ذلیل سمجھا ہوا تھا رب تعالیٰ نے ان کو نجات دے کر عزت عطا فرما دی۔ اور اسی چیز کو سمجھتے ہوئے ان کا دل دنیا کی مشکلات سے چھٹکارا پا گیا اور رب تعالیٰ پر اس وقت ان کو توکل کا حصول ہوا۔

امت مصطفیٰ ﷺ کو حاصل ہونے والے فوائد:

اسی واقعہ سے نبی کریم ﷺ کی امت کو کثیر فوائد حاصل ہوئے:

(۱) اہل کتاب کو یہ معلوم تھا کہ نبی کریم ﷺ نے کسی استاذ سے پڑھا نہیں۔ کسی استاذ سے لکھنا نہیں سیکھا اور نہ ہی آپ کبھی اہل کتاب کی محفلوں میں بیٹھے۔ جب آپ نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کے واقعات کو تفصیلی طور پر بیان فرمایا۔ اتنا علم تو خود اہل کتاب کو بھی حاصل نہیں تھا، ہاں البتہ ان کے علماء اپنی

رب کا علم رکھتے تھے۔ تو اس سے نبی کریم ﷺ کی صداقت اور آپ پر وحی کا آنا ان لوگوں پر واضح ہو گیا یہ

علیحدہ بات ہے کہ سوائے چند حضرات کے ان کو ایمان لانا نصیب نہ ہوا۔

اس طرح یہ واقعہ نبی کریم ﷺ کا ان پر بیان کرنا ان کے خلاف دلیل بن گیا اور مومنوں کے حق

میں حجت بن گیا کہ وہ نبی کریم ﷺ کی تصدیق میں اور زیادہ ایمان کی پختگی ثابت کریں۔

(۲) نبی کریم ﷺ کی امت کے لوگ جب یہ تصور کریں کہ فرعون اور اس کی قوم غرق ہوئی، اور بنی اسرائیل نجات حاصل کر گئے، یعنی رب تعالیٰ کے منکر غرق ہو گئے اور رب کو ماننے والوں کو نجات حاصل ہوگئی، تو ان کو یہ پتہ چل جائے گا۔

" من خالف الله شقى فى الدنيا والاخرة ومن اطاعه فقد سعد فى الدنيا والآخرة "

جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی مخالفت کی وہ دنیا اور آخرت میں بد بخت ہوا، اور جس نے اطاعت کی وہ دنیا اور آخرت میں نیک بخت ہوا۔

(۳) موسیٰ علیہ السلام کی امت ظاہر معجزات کو دیکھنے کے باوجود بچھڑے کی پجاری بن گئی۔ لیکن نبی کریم ﷺ کی امت نے ان کی طرح اس طرح کے ظاہر معجزات نہیں دیکھے لیکن پھر بھی نبی کریم ﷺ کے مطیع رہے اور آپ کی مخالفت نہیں کی اور نہ ہی معاذ اللہ گمراہ ہوئے۔

" وهذا يدل على ان امة محمد ﷺ افضل من امة موسى عليه السلام "

اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ کی امت موسیٰ علیہ السلام کی امت سے افضل ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

مومن کی کیا خوب شان:

دریا میں غرق ہونا فرعونیوں کے لئے عذاب ہے لیکن مومن کا غرق ہونا شہادت کا سبب ہے یعنی شہادت کا درجہ اور ثواب حاصل ہوتا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کی نجات کا دن:

" روى مسلم عن ابن عباس ان رسول الله ﷺ قدم المدينة فوجد اليهود صياما يوم عاشوراء فقال لهم رسول الله ﷺ ما هذا اليوم الذى

تصومونه فقالوا هذا یوم عظیم انجی اللہ فیه موسی وقومه وغرق فرعون وقومه فصامه موسی شکرا فنحن نصومه فقال رسول اللہ ﷺ "فنحن احق واولی بموسی منکم" فصامه رسول اللہ ﷺ وامر بصیامه واخرجه البخاری ایضا عن ابن عباس وان النبی ﷺ قال لاصحابه انتم احق بموسی منهم فصوموا" (قرطبی)

مسلم شریف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت مذکور ہے بیشک رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو آپ نے یہود کو عاشوراء کے دن روزہ رکھتے ہوئے پایا تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں کہا تم اس دن روزہ کیوں رکھتے ہو انہوں نے کہا یہ بڑا عظیم دن ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو اس دن نجات دی اور فرعون اور اس کی قوم کو غرق کیا۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے اس دن رب تعالیٰ کا شکر یہ ادا کرنے کے لئے روزہ رکھا اس لئے ہم بھی روزہ رکھتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہم بنسبت تمہارے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ زیادہ حق رکھتے ہیں اور ہمیں زیادہ قرب حاصل ہے۔ تو نبی کریم ﷺ نے روزہ رکھا اور (اپنی امت کو بھی) روزہ رکھنے کا حکم فرمایا۔ بخاری نے بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس روایت کو نقل فرمایا کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کو فرمایا تم یہودیوں سے زیادہ موسیٰ علیہ السلام سے حق رکھتے ہو، اس لئے تم روزہ رکھا کرو۔

اعتراض: اس روایت سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عاشورا کے دن روزہ رکھا اور روزہ رکھنے کا حکم دیا جب کہ یہود نے آپ کو خبر دی۔

حالانکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ قریش زمانہ جاہلیت میں عاشورہ کے دن روزہ رکھتے تھے اور نبی کریم ﷺ بھی اعلان نبوت سے پہلے روزہ رکھتے تھے۔ آپ جب مدینہ طیبہ میں آئے تو آپ نے عاشورہ کا روزہ رکھا اور روزہ رکھنے کا حکم دیا (یہ حکم بطور فرض تھا) جب رمضان شریف کے روزے فرض ہوئے تو عاشورہ کے دن روزہ رکھنے کا اختیار دے دیا گیا جو چاہے روزہ رکھے اور جو چاہے روزہ نہ رکھے۔ (بخاری ومسلم)

ان دونوں حدیثوں میں کیسے تطبیق دی جائے کہ ان میں تعارض نہ آئے۔

جواب: قریش اس لئے روزہ رکھتے تھے کہ وہ یہود کو روزہ رکھتے ہوئے دیکھتے تھے چونکہ قریش کے نزدیک یہود اہل علم سمجھے جاتے تھے نبی کریم ﷺ بھی قریش کے ساتھ ہی روزہ رکھتے تھے۔ لیکن مدینہ طیبہ میں آ کر دوبارہ تاکیدی طور پر حکم دیا اور اپنے صحابہ کو کہا تم یہود کی بنسبت موسیٰ علیہ السلام کے زیادہ قریب ہو اس لئے تم بھی روزہ رکھو۔

ایک غلطی فہمی کا ازالہ: حکم بن اعرج کہتے ہیں میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس پہنچا آپ زمزم کے پاس اپنی چادر کو تکیہ بنا کر تشریف فرما تھے میں نے ان کو کہا:

" اخبرنی عن صوم عاشوراء فقال اذا رأیت هلال المحرم فاعدد واصبح یوم التاسع صائما ، قلت هکذا کان محمد ﷺ یصومه قال نعم اخرجه مسلم "

مجھے یہ بتاؤ کہ عاشوراء کا روزہ کس دن رکھا جاتا ہے آپ نے فرمایا جب محرم کا چاند دیکھو تو شمار کرو جب نو تاریخ ہو تو روزہ رکھو میں نے کہا کیا اسی طرح (یعنی اسی دن) نبی کریم ﷺ روزہ رکھا کرتے تھے انہوں نے کہا ہاں۔

دوسری روایت میں حضرت حسن بصری حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا:

" امر رسول الله ﷺ بصوم یوم عاشوراء یوم العاشر "

نبی کریم ﷺ نے عاشوراء کا روزہ دس محرم کو رکھنے کا حکم فرمایا:

اس حدیث کو ترمذی نے حسن صحیح کہا، ان دونوں حدیثوں میں تعارض نظر آتا ہے اور غلط فہمی ہوتی ہے کہ روزہ نو محرم کو رکھا جائے یا دس محرم کو۔

صحیح یہ ہے کہ دونوں دن روزہ رکھا جائے تیسری حدیث سے دونوں دن روزہ رکھنے کا واضح ثبوت موجود ہے:

" قال الترمذی وروی عن ابن عباس انه قال صوموا التاسع والعاشر وخالفوا الیهود "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نو محرم اور دس محرم (دونوں دن) روزہ رکھو

یہود کی مخالفت کرو۔ کیونکہ یہود صرف دس محرم کو روزہ رکھتے تھے۔(از قرطبی)

فائدہ: موسیٰ علیہ السلام نے عاشوراء کا روزہ رکھا اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکریہ ادا کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ نے بھی اس نعمت کی یاد روزہ رکھ کر کی، بلکہ صحابہ کرام نے دو روزے رکھ کر موسیٰ علیہ السلام کی بنسبت عبادت میں زیادتی کی۔ اسی سے ایک تو واضح ہو گیا کہ عبادت میں زیادتی جائز ہے جب کہ نفلی درجہ کی ہو، البتہ فرائض میں زیادتی جائز نہیں۔

اور یہ واضح ہوا کہ نعمت کے حصول پر ہر سال اسے یاد کرنا اور اس پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا سنت انبیاء ہے یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ کے انعام واکرام کو لوگوں کے سامنے ذکر فرمایا:

"عن ابی سعید قال قال رسول اللہ ﷺ انا سید ولد آدم یوم القیامۃ ولا فخر وبیدی لواء الحمد ولا فخر وما من نبی یومئذ آدم فمن سواہ الا تحت لوائی" (مشکوۃ باب فضائل سید المرسلین)

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں تمام انسانوں کا قیامت کے دن سردار ہوں گا اس پر کوئی فخر نہیں میرے ہاتھ میں لواء الحمد ہو گا اس پر کوئی فخر نہیں اس دن تمام بنی آدم علیہ السلام اور ان کے سوا میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔

"ولا فخر" کی وضاحت بیان کرتے ہوئے علامہ علی قاری رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں کہ آپ کا مقصد یہ تھا:

"ای ولا اقولہ تفاخرا بل اعتدادا بفضلہ وتحدثا بنعمتہ وتبلیغا لما امرت بہ"

یعنی میں یہ فخر کے طور پر نہیں بیان کر رہا بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور نعمت کو بیان کرنے کے لئے ذکر کر رہا ہوں اور جس چیز کا مجھے حکم دیا گیا ہے میں وہ امت کو پہنچانے کے لئے ذکر کر رہا ہوں۔

یعنی نبی کریم ﷺ نے اپنی سیادت کو دو وجہ کے پیش نظر بیان کیا ان میں سے پہلی وجہ یہ ہے کہ آپ پر اپنے مراتب بیان کرنے ضروری ہوتے ہیں تاکہ آپ کی امت آپ کو پہچان لے اور آپ پر اعتقاد رکھے اور آپ کی عزت وتکریم کرنے کا جس طرح اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا اسی طرح اس پر عمل کر سکے

اور دوسری وجہ بیان کرتے ہوئے علامہ نووی رحمہ اللہ نے فرمایا" امتثا لا لامر اللہ تعالیٰ واما بنعمة ربک فحدث " آپ نے اپنے مراتب اللہ تعالیٰ کے حکم کی تابعداری کرتے ہوئے بیان فرمائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ واما بنعمة ربک فحدث ﴾ اپنے رب کی نعمتوں کو خوب بیان کرو۔

نبی کریم ﷺ کا اپنی ولادت کے دن اظہار تشکر:

" وان کان النبی ﷺ لم یزد فیہ علی غیرہ من الشھور شیأ من العبادات وما ذاک الا لرحمتہ ﷺ بامتہ ورفقہ بھم لانہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کان یترک العمل خشیۃ ان یفرض علی امتہ رحمۃ منہ بھم لکن اشار علیہ السلام الی فضیلۃ ھذا الشھر العظیم بقولہ للسائل الذی " (الحاوی للفتاوی ج ۱ ص ۱۹۴)

اگرچہ نبی کریم ﷺ نے اس ماہ میں نسبت اور مہینوں کے زیادہ عبادات نہیں کیں صرف اپنی امت پر رحمت اور مہربانی کرتے ہوئے کیونکہ نبی کریم ﷺ امت پر رحمت فرماتے ہوئے ان پر فرض ہو جانے کے ڈر سے کئی اعمال ترک فرما دیتے تھے لیکن آپ نے اس ماہ کی فضیلت کی طرف اشارہ فرمادیا جب آپ سے ایک شخص نے سوال کیا کہ آپ پیر کو روزہ کیوں رکھتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ یہ میری پیدائش کا دن ہے، یعنی آپ نے پیر کو اپنی پیدائش کا شکریہ ادا کرنے کے لئے روزہ رکھا اور اس طرح اظہار مسرت کیا۔

نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت پر خوشی منانے کی تفصیلی بحث اگر کوئی دیکھنا چاہے تو راقم کی کتاب ''شمع ہدایت'' کا مطالعہ کرے۔

☆☆☆☆☆

﴿ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴾

۱) ''اور جب ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا وعدہ فرمایا پھر اس کے پیچھے تم نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی اور تم ظالم تھے''

۲) ''اور یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے وعدہ کیا موسیٰ سے چالیس راتوں کا پھر تم نے بنا لیا بچھڑے کو معبود اس کے بعد، اور تم ظلم کرنے والے ہوئے''

ابوبکر بن ابی شیبہ نے قیس بن عباد سے روایت کیا کہ فرعون کے غرق ہو جانے کے باوجود بنی اسرائیل کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ مر چکا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اسے اور اس کی قوم کو باہر کنارے پر پھینک دیا تو ان کو یقین ہوا۔

بنی اسرائیل جب دریا سے نکل گئے، حق تو یہ تھا کہ ان کا ایمان اور پختہ ہوتا کیونکہ وہ اپنی آنکھوں سے دریا کو پھٹتے ہوئے دیکھ چکے تھے اور خود نجات حاصل کر چکے تھے، اور فرعون اور اس کی قوم کو غرق ہوتے ہوئے اور پھر دریا کا ان کو مردہ حالت میں کنارے پر پھینکنا دیکھ چکے تھے۔ لیکن بنی اسرائیل نے راستے میں جب بت پرست قوم کو دیکھا تو کہنے لگے:

﴿ یا مُوْسَى اجْعَل لَّنا اِلٰهًا كَما لَهُمْ آلِهَةٌ ﴾

اے موسیٰ ہمارے لئے ایسا خدا بنا دو جیسے ان لوگوں کے خدا ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام نے ان کو زجر کرتے ہوئے کہا:

﴿ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴾

کیا اللہ تعالیٰ کے بغیر تمہارے لئے میں اور خدا تلاش کروں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں فضیلت دی ہے اپنے زمانے میں جہان والوں پر۔

پھر موسیٰ علیہ السلام نے ان کو ارض مقدسہ میں جانے کا حکم دیا کیونکہ وہ ان کے آباء واجداد کا مقام

تھا، مقصد یہ تھا کہ یہ لوگ فرعون کی زمین سے بھی نجات حاصل کرلیں۔ اس ارض مقدسہ میں جابر لوگوں کا قبضہ تھا، موسیٰ علیہ السلام نے ان کو کہا کہ تم ان سے جہاد کر کے اپنے آباء واجداد کی زمین کو ان سے آزاد کراؤ لیکن یہ کہنے لگے کہ اے موسیٰ تم چاہتے ہو کہ ہم کافروں کے لئے گوشت کا ٹکڑا بن جائیں اس سے تو بہتر تھا کہ تم ہمیں فرعون کے، پاس ہی رہنے دیتے۔

اس طرح یہ چالیس سال تک میدان تیہ میں رہے۔ وہاں ان پر منّ وسلوی نازل ہوا (جس کا ذکر انشاء اللہ آگے آرہا ہے) پھر موسیٰ علیہ السلام طور سیناء پر تشریف لے گئے تاکہ تورات لائیں۔ لیکن انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے طور پر جانے کے بعد گائے کے بچھڑے کو اپنا معبود بنالیا۔ (از قرطبی)

موسیٰ علیہ السلام جب اپنی قوم کے ستر سرکردہ افراد کو ساتھ لے کر طور پر کتاب لینے کے لئے گئے قوم سے چالیس دنوں کا وعدہ کر کے گئے۔ آپ اپنی قوم کے ان افراد سے ذرا جلدی ہی آگے طور پر پہنچ گئے، رب تعالیٰ نے پوچھا تم اپنی قوم کے افراد سے پہلے کیوں آگئے ہو، تو آپ نے عرض کیا اے مولائے کائنات وہ بھی میرے پیچھے آ ہی رہے ہیں، میں صرف تیری خوشنودی حاصل کرنے کے لئے جلدی آ گیا طور پر ہی اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ خبر دے دی تھی کہ تمہاری قوم گمراہ ہو چکی ہے۔

آپ کو گئے ہوئے جب بیس دن مکمل ہو گئے تو سامری نے کہا موسیٰ علیہ السلام کو گئے بیس دن اور بیس راتیں ہو چکی ہیں چالیس کی تکمیل ہوگئی ہے۔ آپ واپس نہیں لوٹے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تمہارے پاس فرعونیوں کے زیورات ہیں وہ تم پر حرام ہیں، اس لئے وہ زیورات تم لوگ مجھے دے دو کہ میں ایک خدا بنا دوں۔ کیونکہ یہ پہلے دیکھ چکا تھا کہ قوم ایسا خدا چاہتی ہے جو انہیں نظر آئے یہ خود بھی گائے کی پرستش کرتا تھا، اس لئے اس نے تمام زیورات جمع کر کے انہیں ایک بچھڑا بنا دیا۔

بچھڑے کے ڈکارنے کی وجہ:

چونکہ فرعون کے لشکر نے اپنے گھوڑوں کو دریا میں ڈالنے سے سوچ وبچار شروع کر دی تھی تو جبرائیل ایک گھوڑی پر سوار ہو کر آئے وہ جہاں قدم رکھتی تھی وہاں سبز گھاس پیدا ہو جاتی۔ سامری نے یہ ماجرا دیکھ لیا تھا اس لئے اس نے گھوڑی کے پاؤں کے نیچے سے مٹی اٹھا کر محفوظ کر لی تھی، وہی مٹی

بچھڑے کے ڈھانچے میں ڈال دی تھی جس کی وجہ سے اس میں اثر حیات پیدا ہو گیا اور وہ گائے کی طرح ڈکارنے لگا۔

سامری سے جب موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا" فما خطبک یا سامری "

﴿ قَالَ بَصُرۡتُ بِمَا لَمۡ يَبۡصُرُوۡا بِهٖ فَقَبَضۡتُ قَبۡضَةً مِّنۡ اَثَرِ الرَّسُوۡلِ فَنَبَذۡتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتۡ لِىۡ نَفۡسِىۡ ﴾ (پ ١٦ ع ١٤)

سامری تونے ایسا کیوں کیا؟ اس نے کہا میں نے وہ دیکھا جو لوگوں نے نہ دیکھا۔ تو ایک مٹھی بھر لی فرشتے کے نشان سے پھر اسے ڈال دیا اور میرے جی کو یہی بھلا لگا۔

یہی آیت جس کا ابھی ترجمہ نقل کیا ہے اسی کی تفسیر میں علامہ قرطبی نے بھی یہی بیان کیا کہ سامری نے جبرائیل کی گھوڑی کے قدموں کے نشان کی جگہ سے ایک مٹھی بھر مٹی لے کر بچھڑے کے ڈھانچے میں ڈالی۔ (قرطبی)

جس آیت کی وضاحت کی جاری ہے اس کے تحت ہی مفتی محمد شفیع صاحب نے معارف القرآن میں بھی ذکر کیا۔ معتبر تفاسیر خازن وغیرہ میں بھی یہی ہے۔ غرضیکہ سلف صالحین کی تفاسیر میں بچھڑے کے ڈکارنے کی وجہ یہی تحریر ہے کہ جبرائیل کے گھوڑی کے پاؤں کے نیچے سے لی ہوئی مٹی کا اثر تھا۔

خیال رہے کہ سب سے پہلے اس قول (گھوڑی کے قدموں کے نشان سے مٹی لینا) کو ابو مسلم اصفہانی نے تسلیم نہیں کیا جو بہت بڑا معتزلی تھا، پھر اسی قول کا سہارا لیتے ہوئے مودودی صاحب نے تفہیم القرآن میں بھی یہی تحریر کر دیا کہ سامری نے موسیٰ علیہ السلام سے جھوٹ موٹ کہہ دیا تھا مودودی صاحب کی یہ سوچ غلط ہے قرآن پاک نے اگر چہ واضح طور پر اس قول کو نقل بھی نہیں کیا لیکن رد بھی نہیں کیا اسی لئے متقدمین حضرات کی تفاسیر کو چھوڑ کر ایک معتزلی کی بات کو تسلیم کرنا بھی کوئی عقل و دانش کا کام نہیں۔

﴿ وَاِذۡ وٰعَدۡنَا مُوۡسٰٓى اَرۡبَعِيۡنَ لَيۡلَةً ﴾: بعض قراءتوں میں " وعدنا " ہے۔ جب ہم نے وعدہ کیا، لیکن "واعدنا" باب مفاعلہ ہے جو شرکت جانبین کو چاہتا ہے۔ تو اس صورت میں یا تو یہ جواب دیا جائے گا کہ باب مفاعلہ میں بھی کبھی شرکت نہیں پائی جاتی لہٰذا اس مقام میں "وعدنا" اور " واعدنا " کا ایک ہی معنی ہے۔ اور یا یہ مراد ہے کہ رب تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے

توراۃ دینے کا وعدہ کیا اور موسیٰ علیہ السلام نے میقات پر آنے کا وعدہ کیا۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ جانبین سے یہ معنی مراد لیا جائے کہ رب تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے وعدہ کیا اور آپ نے وعدہ کو قبول کیا۔ چالیس راتوں سے مراد، ذی قعد کے تیس دن اور دس دن ذی الحج کے۔

اعتراض : سورۃ اعراف میں ذکر ہے ﴿ وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ ﴾ اس آیۃ سے پتہ چلتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سے تیس راتوں کا وعدہ کیا گیا۔ ان دونوں آیتوں میں تطبیق کیسے؟

جواب : بعض حضرات نے تو سورۃ اعراف کے ظاہر کو دیکھ کر یہ جواب دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے موسیٰ علیہ السلام سے تیس راتوں کا وعدہ کیا پھر اسے بڑھا کر چالیس کر دیا۔ لیکن حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا:

"لیس المراد ان وعدہ کان ثلاثین لیلۃ ثم بعد ذلک وعدہ بعشر لکنہ وعدہ اربعین لیلۃ جمیعا وھو کقولہ تعالیٰ ثلاثۃ ایام فی الحج وسبعۃ اذا رجعتم تلک عشرۃ کاملۃ"

کہ اس سے یہ مراد نہیں کہ پہلے تیس راتوں کا وعدہ کیا گیا پھر اس کے بعد آپ سے دس اور راتوں کا وعدہ کر کے چالیس کو مکمل کیا گیا بلکہ ابتدائی طور پر ہی چالیس کا وعدہ کیا گیا البتہ یہ با محاورہ کلام ہے کہ ذی القعدہ کی تیس راتوں اور ذی الحج کی دس راتوں کا وعدہ کیا گیا۔ اسے تعبیر تیس اور دس سے کیا گیا۔ جس طرح قران یا تمتع کرنے والا اگر ھدی نہ دے سکے تو اسے دس روزے رکھنے کا حکم دیا گیا، لیکن تین دن ایام حج میں مکمل کرنے ہیں اور سات دن ان سے فارغ ہونے کے بعد، ان کو بھی تین اور سات سے تعبیر کیا گیا۔ (از کبیر)

اگر چہ راقم نے تذکرۃ الانبیاء میں پہلی وجہ کو مختصر طور پر ذکر کیا تھا لیکن حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کی طرف سے دیا ہوا جواب بہت خوب نظر آیا۔

راتوں کا ذکر کیوں؟

"قرن التاریخ باللیل دون النھار لان الاشھر العربیۃ وضعت علی سیر

القمر وقیل لان الظلمة اقدم من الضوء " (خازن)

یہاں تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے راتوں کا اس لئے ذکر کیا ہے کہ عربی مہینوں کا حساب چاند کے لحاظ پر ہوتا ہے اور چاند کی تاریخوں کی ابتداء رات سے ہوتی ہے۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ تاریکی نورانیت سے پہلے ہوتی ہے یعنی کفر سے ایمان کی راہنمائی کی جاتی ہے۔ جب ایمان نصیب ہوا تو تاریکی ختم ہوگئی اور ایمان کی وجہ سے نورانیت حاصل ہوگئی۔

فائدہ: موسیٰ علیہ السلام کو چالیس دن، رات کے بعد توراۃ عطا کی گئی کہ آپ چالیس دن دنیا والوں سے الگ تھلگ ہو کر اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول رہیں، اس طرح اس کے ذکر وفکر سے آپ کے قلب وروح کو ایک خاص قسم کی قوت حاصل ہو جائے جو اس عظیم بوجھ کو اٹھانے کے قابل ہو جائے۔

" ان للاربعین خصوصیة فی اختصاص الکلام للانبیاء کما ان لھا اختصاصافی ظھور ینابیع الحکمة من قلوب الاولیاء کقوله علیه السلام من اخلص لله اربعین صباحا ظھرت ینابیع الحکمة من قلبه من لسانه " (روح البیان)

بیشک چالیس کو ایک خصوصیت حاصل ہے اسی وجہ سے انبیاء کرام کو چالیس سال کی عمر میں نبوت کے اعلان کا حکم دیا جاتا رہا۔ ان سے رب تعالیٰ کا کلام بذریعہ وحی اسی عمر میں ہوا۔ پھر اولیاء عظام کا بھی یہی معمول ہے کہ وہ چلہ کشی کرتے ہیں۔ یعنی چالیس روز تک دنیا سے علیحدہ ہو کر فقط رب تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہوتے ہیں تو ان کے دلوں پر حکمت کے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے جو شخص چالیس صبح خلوص سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے اس کے دل سے اس کی زبان پر حکمت کے چشمے نمودار ہو جاتے ہیں۔

کاش کہ لوگوں کو یہ سمجھ آ جائے کہ چالیس دن تک فوت شدہ کے لئے قرآن خوانی کا اہتمام کرتے رہنا پھر چالیس پر اس کے لئے اجتماعی دعاء کتنی مقبولیت کا سبب ہوگی۔ خیر معاملہ قسمت کا ہے جس کی قسمت میں ہوا اس کے لئے قرآن پاک پڑھا جائے گا۔

دینی طلباء کے لئے: " اربعین لیلة " میں " اربعین " کی نصبی حالت ہے۔ جو مفعول واقع ہو رہا ہے اور اس میں " واسأل القریة " کی طرح حذف مضاف ہے۔ لہذا عبارت کا مطلب یہ ہے۔

﴿ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰی تَمَامَ اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً ﴾

اور جب ہم نے موسیٰ کے ساتھ چالیس راتیں مکمل کرنے کا وعدہ کیا۔

" والاربعون کلها داخلة فی المیعاد " اور چالیس تمام کے تمام ہی وعدہ میں داخل ہیں۔

﴿ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ ﴾: الھا (خازن) پھر تم نے بچھڑے کو معبود بنالیا۔ لفظ " الھا "

مقدر نکال کر اشارہ دیا گیا کہ یہاں ایک مفعول حذف ہے۔ آیئے اسی سے تراجم میں تقابلی جائزہ دیکھیں۔

﴿ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ ﴾

''پھر پکڑا تم نے گائے کا بچہ''	(شاہ رفیع الدین صاحب)
''پھر تم نے ان کو پیچھے گوسالہ کو اختیار کرلیا''	(عبدالماجد صاحب)
''پھر تم لوگوں نے تجویز کرلیا گوسالہ کو موسیٰ کے بعد''	(اشرف علی صاحب)
''پھر تم نے بنالیا بچھڑا اس کے پیچھے''	(شاہ عبدالقادر صاحب)
''پھر تم نے بنالیا بچھڑا موسیٰ کے بعد''	(محمود الحسن صاحب)
''پھر اس کے پیچھے تم نے بچھڑے کی پوجا شروع کردی''	(اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خانؒ)

اس مقام پر بعض تراجم میں ایک تو ''موسیٰ'' کسی لفظ کا ترجمہ نہیں بلکہ ضمیر کے مرجع سے سمجھ میں آتا ہے۔ مخالفین کو یہ اعتراض تو کرنا آتا ہے کہ ضمیر کا مرجع، نبی کریم ﷺ ہوں تو ''محبوب'' ترجمہ میں کیوں آتا ہے تو ان کے اپنے ہی بعض تراجم میں ''موسیٰ'' کیوں آیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ دیگر تراجم سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے طور پر جانے کے بعد ایک بچھڑا بنالیا، یا تجویز کرلیا۔ کیا ان پر ایک دوسرے کو قتل کرنا فقط اس لئے واجب تھا کہ انہوں نے بچھڑا کیوں بنایا۔ یا بچھڑے کو خدا کیوں مانا؟ اور اس کی پوجا کیوں کی؟ اگر صرف بنانا مقصود تھا تو یہ فعل صرف سامری کا تھا تمام کا نہیں پھر دوسروں کا مواخذہ کیسے؟ یہاں تو یہ ذکر ہے انہوں نے بچھڑے کو خدا مان کر اس کی پوجا شروع کردی تھی۔

اس پر اعلیٰ حضرت کا ترجمہ زیادہ واضح ہے باقی تراجم سے مقصد واضح نہیں، اس پر زیادہ تفاسیر کی عبارات نقل کرنے کی ضرورت اس لئے نہیں خود قرآن پاک کے دوسرے مقام پر واضح کیا گیا کہ

انہوں نے بچھڑے کو خدا مانا تھا۔ اس کی عبادت کرتے رہے

﴿فَقَالُوا هٰذَا اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى﴾ ب ۲

''سامری اور اس کے متبعین نے دوسروں کو کہا یہ ہے تمہارا اور موسیٰ کا خدا''

اس سے آگے ان کا جواب حضرت ہارون علیہ السلام سے منع کرنے پر یہ تھا:

﴿قَالُوا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى﴾ ب ۲

انہوں نے کہا ہم تو موسیٰ (علیہ السلام) کے لوٹنے پر اسی پر (بچھڑے کی پوجا پر) قائم رہیں گے۔

تاہم صرف بیضاوی کی عبارت پر اکتفا کیا جاتا ہے: '' (ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ) الها ومعبودا '' یعنی تم نے بچھڑے کو خدا، معبود بنالیا۔ (تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان ص ۴۳)

﴿مِنْ بَعْدِهٖ﴾: (اس کے بعد) اس میں کئی احتمال ہیں جو تقریبا تمام کے تمام مجتمع ہیں۔

(۱) موسیٰ علیہ السلام کے طور پر جانے کے بعد تم نے بچھڑے کو معبود بنالیا۔

(۲) موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مواعدت کے بعد۔

(۳) جب تم نے دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جو واحد ہے اس کا کوئی شریک نہیں، وہ شرک سے پاک ہے رب نے اپنی توحید پر قائم رہنے کا حکم دیا اور شرک سے روکا ان تمام چیزوں کے بعد تم نے بچھڑے کو معبود بنالیا۔

﴿وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ﴾ ''اور تم ظلم کرنے والے ہوئے'' ظلم کا معنی شرک بھی ہے اس معنی کے لحاظ پر مطلب یہ ہوگا کہ تم مشرک ہوگئے۔ اور ظلم کا معنی یہاں یہ بھی ہے " وضع العبادة فی غیر موضعها" عبادت کو غیر محل میں رکھنا، یعنی تم نے اللہ تعالیٰ کی عبادت چھوڑ کر بچھڑے کی عبادت شروع کردی۔

(روح المعانی)

اور ﴿وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ﴾ کا یہ مطلب بھی ہے:

" وانتم ضارون لانفسكم بالمعصية حيث وضعتم العبادة فی غیر موضعها "

تم نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کو چھوڑ کر بچھڑے کی عبادت کر کے عظیم گناہ میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو نقصان پہنچایا۔ (خازن)

اس آیۃ سے بھی امت مصطفیٰ ﷺ کو یہ فائدے حاصل ہوئے:

(۱) یہود نے واضح معجزات اور دلائل کو دیکھا لیکن معمولی شبہات ڈالنے سے وہ بھٹک گئے، لیکن نبی کریم ﷺ کی امت کو یہ سمجھنے کے لئے کہ قرآن پاک معجزہ ہے دقیق دلائل سے پتہ چلا لیکن پھر بھی وہ بڑے قوی شبہات سے ڈگمگائے نہیں دین حق سے بھٹکے نہیں۔

(۲) نبی کریم ﷺ نے یہ واقعہ ذکر کیا حالانکہ آپ نے کسی سے پڑھا نہیں " وذلک یدل علی انه علیه الصلوة والسلام استفادها من الوحی " اس سے پتہ چلا کہ آپ کو یہ وحی کے ذریعہ حاصل ہوا۔

(۳) عقائد میں تقلید نہیں ان لوگوں نے فقط سامری کی بات کو مان کر بچھڑے کی پوجا کر کے اپنا ایمان ضائع کر دیا:

" لو انهم عرفوا الله بالدلیل معرفة تامة لما وقعوا فی شبهة السامری "

اگر وہ اللہ تعالیٰ کو دلائل کے ذریعے پہچانتے تو ان کو معرفت تامہ حاصل ہوتی وہ سامری کے شبہ میں نہ پڑتے۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے یہ واقعہ نبی کریم ﷺ پر بیان کر کے گویا کہ آپ کو صبر کرنے کا حکم دیا کیونکہ آپ کافروں کے شرک سے بہت پریشان ہوتے تھے، تو آپ کو گویا کہ اس واقعہ سے تسلی دی گئی کہ موسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کے شرک سے صبر کیا آپ بھی صبر کریں ان کا حساب رب کے پاس ہوگا۔

(۵) " ان اشد الناس مجادلة مع الرسول ﷺ وعداوة له هم الیهود فکانه تعالیٰ قال ان هؤلاء انما یفتخرون باسلافهم ثم ان اسلافهم کانوا فی البلادة والجهالة والعناد الی هذا الحد فیکف هؤلاء الاخلاف "

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سب لوگوں سے زیادہ جھگڑا کرنے والے اور سب سے زیادہ دشمنی کرنے والے یہود ہی تھے۔ گویا کہ رب تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ یہ لوگ اپنے اسلاف یعنی اپنے آباء واجداد پر فخر کرتے ہیں لیکن ان کے آباء واجداد بہت ہی زیادہ بے وقوف اور جاہل اور عناد کرنے والے تھے اس سے بڑھ کر ان کی جہالت کیا ہوسکتی ہے کہ ایک بچھڑا جو ان سے ہی زیور لے کر بنایا گیا اس کی انہوں نے پوجا شروع کر دی اور وہ نبی جس نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان کو فرعون اور اس کی قوم کے ظلم سے نجات دی اسی کے شریعت کے باغی ہو کر اس سے عناد کیا۔ جب ان کے اسلاف ایسے تھے تو

پیچھے آنیوالے اسی طرح کے ہی ہو سکتے تھے۔ (از کبیر)

﴿ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾

۱) ''پھر اس کے بعد ہم نے تمہیں معافی دی کہ کہیں تم احسان مانو''

۲) ''پھر ہم نے معاف کر دیا تمہیں اس کے بعد، تا کہ تم شکریہ ادا کرو''

مختصر مطلب: اللہ تعالیٰ نے اور نعمت کی یاد دلائی کی حق تو یہ تھا کہ تم موسیٰ علیہ السلام کے معجزات اور رب تعالیٰ کی مہربانیوں کو دیکھ کر ایمان میں اور زیادہ پختگی اختیار کرتے لیکن تم نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی تم بہت بڑے عذاب کے مستحق ہو چکے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہیں تو یہ توفیق عطاء کر کے اس عظیم جرم کے بعد بھی معاف فرما دیا تا کہ تم شکر کرو۔

تفصیلی وضاحت:

﴿ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ ﴾ ''عفو'' کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کا مخلوق کو معاف کرنا '' وقد یکون بعد العقوبة وقبلها '' ''عفو'' عام ہے عذاب کے بعد معاف کرنے کو بھی کہا جاتا ہے اور عذاب کے مستحق کو عذاب سے پہلے معاف کر دینے کو بھی عفو کہا جاتا ہے۔

'' بخلاف الغفران فانه لا یکون معه عقوبة البتة ''

لیکن مغفرت کا تعلق عذاب سے ہی ہوتا ہے کہ عذاب دینے کے بعد معاف کر دیا جائے لیکن یہ خیال رہے کہ کبھی مغفرت بھی عفو کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ دعاؤں میں مغفرت عفو کے معنی میں ہی استعمال ہے۔ اس کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ اللہ ہمیں عذاب سے پہلے ہی تو معاف فرما دے '' کل من استحق عقوبة فترکت له فقد عفی عنه '' ہر وہ شخص جو عقوبت کا مستحق ہوا سے سزا نہ دینے کو بھی '' عفی عنه '' سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ اسے معاف کر دیا گیا۔

عفو کا معنی گناہ مٹا دینا یعنی '' محونا ذنوبکم وتجاوزنا عنکم '' اب مطلب واضح ہوا کہ ﴿ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ پھر ہم نے تمہارے گناہوں کو مٹا دیا، اور تم سے درگزر کیا

''پھر ہم نے معاف کیا تمہیں'' ذرا مختصر الفاظ ہیں جو مکمل معنی کو حاوی ہیں اس لئے مترجمین نے یہی الفاظ اختیار کئے ہیں۔

''عفو'' کا لفظ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہے کہا جاتا ہے ''**عفت الدار**'' گھر مٹ گیا (برباد ہو گیا) اور کہا جاتا ہے ''**عفت الريح الاثر**'' ہوا نے نشان مٹا دیا ہے ''**عفا الشئ كثر فهو من الاضداد**'' کبھی عفو کا لفظ کثرت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جب کوئی چیز کثیر مقدار میں ہو جائے تو کہا جاتا ''**عفا الشئ**'' یعنی مٹا دینا اور بڑھا دینا یہ دونوں معانی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ لیکن عفو میں دونوں پائے جاتے ہیں۔ ماقبل اور مابعد (آگے پیچھے) کو دیکھ کر سمجھ لیا جائے گا کہ یہاں کون سا معنی معتبر ہے۔ قرآن پاک میں ''**حتى عفوا**'' میں کثرت والا معنی ہی مراد ہے۔

(از قرطبی ہوبا...)

﴿ **مِّنۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ** ﴾ ''**اى من بعد عبادتكم العجل**'' یعنی ہم نے تمہیں معاف کیا تمہارے بچھڑے کی پوجا کرنے کے بعد۔ (خازن)

اعتراض: ''**ثم**'' تراخی پر دلالت کرتا ہے اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اس کے بعد اور ''**من بعد ذلك**'' کا مطلب بھی یہی ہے اس طرح تکرار لازم آئے گا جو فصاحت کے خلاف ہے۔

جواب: ''(ثم) لتفاوت ما بين فعلهم القبيح والنعمة تعالىٰ فی شانهم فلا يكون (من بعد ذلك) تكرارا''

اس مقام میں لفظ (ثم) تراخی رتبی کے لئے ہے۔ تراخی زمانی کے لئے نہیں۔ یعنی (ثم) کے ذریعے یہ بیان کیا گیا ہے کہ اے بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو، ذرا ادھر توجہ کرو کہ کہاں تمہارا بچھڑے کی پوجا کرنے کا برا عمل اور کہاں رب تعالیٰ کا معاف کرنے کا عظیم کرم، ان کے مراتب میں کتنا عظیم تفاوت ہے۔

اب واضح ہو گا کہ ''**من بعد ذلك**'' میں تکرار نہیں بلکہ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ تم نے بچھڑے کی پوجا کی رب تعالیٰ نے تمہیں توبہ کرنے کا حکم دیا اور توجہ کرنے کی توفیق عطاء کی اس کے بعد تمہیں معاف کر دیا۔

﴿ **لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ** ﴾ ''**اى لكى تشكروا عفوى عنكم وحسن صنيعى اليكم**''

تا کہ تم شکر کرو، یعنی اللہ تعالیٰ نے معاف کر کے ان پر احسان کیا۔ اس نعمت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے تمہیں اس کے بعد معاف کیا تا کہ میرے معاف کرنے اور میرے تم پر احسان کرنے کے برتاؤ کا تم شکر کرو۔ (خازن)

فائدہ : " فسر لعل بکی اخذا مما قیل ان لعل فی القرآن بمعنی کی غیر قولہ تعالیٰ فی الشعراء لعلکم تخلدون بمعنی کان (مشبہ بالفعل) ای کانکم تخلدون "

خازن کی طرح علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے بھی "لعل" کی تفسیر " کی " سے کی ہے جس کا معنی ہے تا کہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے شیخ زادہ رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ قرآن پاک میں جہاں بھی "لعل" استعمال ہے اس کا معنی یہی ہے "تا کہ" البتہ سورۃ شعراء میں " لعلکم تخلدون " میں "لعل" کان حرف مشبہ بالفعل کے معنی میں استعمال ہے جس کا معنی ہوتا ہے "گویا کہ" (شیخ زادہ)

شکر کیا ہے؟ شکر کی مشہور تعریف یہ ہے کہ نعمت کے مقابل منعم کی تعریف کی جائے وہ تعریف عام ہے خواہ زبان سے ہو یا دل سے ہو یا ارکان سے ہو۔

تاہم شکر کی تعریف میں اور بھی مختلف اقوال ہیں۔ تمام کو جمع کر کے واضح ہوتا ہے کہ شکر ایک عظیم چیز کا نام ہے شکر کا جو مشہور معنی بیان کیا ہے اسی کے لحاظ سے شکر کی تین قسمیں بیان کی جاتی ہیں۔ شکر اور اس کی قسمیں خازن نے بیان کرتے ہوئے کہا:

" واصل الشکر ھو تصور النعمة واظهارها ویضادہ الکفر وهو نسیان النعمة وسترها "

شکر در حقیقت نعمت کا تصور کرنا اور اسے بیان کرنا، اور اس کی ضد کفران ہے یعنی نعمت کو بھول جانا اور اسے چھپانا۔

لیکن یہ خیال رہے کہ نعمت کو صرف اسلئے بیان کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا ظہیر یہ انعام ہے تکبر کے طور پر اور ریاء کاری کے طور پر چرچا کرنا رب تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہے اس سے اجتناب ضروری ہے۔

" والشکر علی ثلاثة اضرب شکر القلب وهو تصور النعمة وشکر اللسان وهو الثناء علی النعمة وشکر سائر الجوارح وهو مکافاة النعمة بقدر استحقاقها " (خازن)

شکر کی تین قسمیں ہیں:

(۱) دل سے شکر کرنا یعنی نعمت کا دل میں تصور کرنا۔

(۲) زبان سے شکر کرنا یعنی نعمت پر زبان سے تعریف کرنا۔

(۳) ارکان سے شکر ادا کرنا یعنی ظاہری اعضاء کے ذریعے نعمت کے مقابل منعم کی تعریف کرنا۔ (خازن)

" وقال ذوالنون (الشکر) لمن فوقک بالطاعة ولنظیرک بالمکافات ولمن دونک بالاحسان " (روح المعانی)

ذوالنون مصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اپنے سے بلند مرتبہ کا شکریہ ادا کرنے کا یہ مطلب ہے کہ اس کی طاعت کی جائے اور اپنے برابر کو اس کے احسان کا اسی طرح کا بدلہ دے کر شکریہ ادا کیا جائے۔ اور اپنے سے کم درجہ کے احسان کا بدلہ زیادہ احسان کر کے شکریہ ادا کیا جائے۔

" قال سهل بن عبد الله الشکر الاجتهاد فی بذل الطاعة مع الاجتناب للمعصية فی السرو العلانية "

حضرت سہل بن عبداللہ رحمہ نے فرمایا کہ شکر یہ ہے کہ انسان طاعت کرنے میں بہت زیادہ کوشش کرے اور ظاہری طور پر اور باطنی طور پر معصیت سے اجتناب کرے۔

" وقالت فرقة اخری الشکر هو الاعتراف فی تقصیر الشکر للمنعم "

بعض اور حضرات نے بیان کیا کہ شکر حقیقت میں اسے کہا جاتا ہے کہ انسان منعم (انعام کرنے والے) کا شکر ادا کرنے میں اپنی کوتاہی کا اعتراف کرے کہ میں نے شکر اس طرح نہیں کیا جیسا شکر کرنے کا حق تھا۔

جب رب تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو شکر کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا ﴿ اِعۡمَلُوۡۤا آلَ داوٗدَ شُکۡرًا ﴾ تو حضرت داؤد علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا اے میرے رب میں تیرا شکر کس طرح کروں " والشکر نعمة منک " جب کہ شکر بھی تیری طرف سے ایک نعمت ہے پھر اس کا شکر ادا کروں گا تو وہ بھی تیری نعمت ہو گی یہ سلسلہ تو ختم ہونے میں نہیں آئے گا تو رب تعالیٰ نے فرمایا:

" الآن قد عرفتنی وشکرتنی اذ قد عرفت ان الشکر منی نعمة "

" اب تم نے مجھے پہچان لیا اور میرا شکریہ ادا کر دیا کیونکہ تمہارا یہ پہچان لینا کہ شکر بھی

میری نعمت ہے یہ تمہاری طرف سے شکر ہی ہے“

حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا اے میرے رب جو تیرے انعامات مجھ پر مخفی ہیں ان میں سے کسی ایک کا مجھے علم عطاء فرما۔ تو رب تعالیٰ نے کہا ”سانس لیں“ جب آپ نے سانس لیا تو رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ مَنْ يَّحْصِيْ هٰذِهِ النِّعْمَةَ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ ﴾

کون شخص اس نعمت کو شمار کر سکتا ہے جو اسے رات اور دن کو ہر لحظہ میں حاصل ہے۔

موسیٰ علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا اے میرے رب میں تیرا شکر کیسے ادا کروں جب کہ اے اللہ تو کسی نعمت کو چھوٹا سمجھ کر مجھے عطاء کرے گا ” لا يجازى بها عملى كله “ تو میری زندگی کے تمام اعمال بھی اس نعمت کا بدل نہیں بن سکتے۔ تو رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يَا مُوْسٰى الْآنَ شَكَرْتَنِيْ ﴾ اے موسیٰ تم نے رب تیرا شکریہ ادا کر دیا۔

مطلب واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کو نعمت سمجھنا اور اسے عظیم نعمت سمجھنا ہی درحقیقت شکر ہے۔ (از قرطبی)

” وقال الفضيل شكر كل نعمة ان لا يعصى الله بعدها بتلك النعمة “

فضیل رحمہ اللہ کہتے ہیں ہر نعمت کا شکریہ ہے کہ اس نعمت کے حاصل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کی جائے۔

” قل شكر النعمة ان لا يراها البتة ويرى المنعم “ شکر کا علی درجہ یہ ہے کہ نعمت کو نہ دیکھے بلکہ منعم کو دیکھے اس لئے کہ بعض اوقات صرف نعمتوں کی طرف ہی توجہ کرتے رہنے سے انسان باغی ہو جاتا ہے، لیکن جب اسے یہ معلوم ہوگا کہ یہ نعمتیں اللہ تعالیٰ نے مجھے عطاء کی ہیں تو وہ سراپا عجز بن کر رہے گا۔ (از خازن)

” وقال الشبلى الشكر التواضع والمحافظة على الحسنات الشهوات وبذل الطاعات “

شبلی رحمہ اللہ نے فرمایا شکر یہ ہے کہ عجز اختیار کیا جائے اور نیکی کے کام پابندی سے کئے جائیں اور خواہشات کی مخالفت کی جائے اور طاعات پر وقت صرف کیا جائے۔ (از قرطبی)

﴿وَاِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾

۱) ''اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور حق و باطل میں تمیز کر دینا، کہ کہیں تم راہ پر آ ؤ''

۲) ''اور یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے عطا کی موسیٰ کو کتاب (اور عطا کیا) حق و باطل میں تمیز کرنا، تا کہ تم ہدایت حاصل کرو''

یہاں سے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اور نعمت یاد دلائی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہدایت کیلئے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطاء کی اور حق و باطل میں فرق کرنے والی چیز عطا کی یہ درحقیقت تم پر بہت بڑا انعام تھا۔

﴿وَاِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ﴾: "اذ اسم للوقت الماضی، واذا اسم للوقت المستقبل و آتینا، اعطینا" (قرطبی)

"اذ" ماضی کے لئے استعمال ہوتا ہے جبکہ "اذا" مستقبل کے لئے اور آتینا کا معنی ہے اعطینا ہم نے عطا کیا۔ (موسیٰ) عجمی نام ہے علمیت اور عجمہ کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ بعض حضرات نے کہا یہ مرکب ہے (مو) اور (شی) سے (مو) کا معنی پانی اور (شی) کا معنی ہے درخت۔ پھر (شی معجمہ) کو (سی مہملہ) سے بدلا گیا ہے۔ چونکہ آپ کا تابوت بھی پانی اور درختوں سے ملا تھا اس لئے آپ کو موسیٰ کہا گیا۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ " ماس یمیس " سے لیا ہوا ہے طوبیٰ کا وزن ہے یا کو واؤ سے تبدیل کیا گیا۔ (از روح المعانی ج اول ص ۲۵۷)

موسیٰ علیہ السلام: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد کا نام عمران ہے جو اپنے قبیلہ کے سردار تھے لاوی بن یعقوب علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے نام میں اختلاف ہے یارخا، ایارخت، نوحانذ، یوحانذ، لوحا، مریم، یہ تمام نام ذکر کرنے کے بعد حاشیہ جلالین میں ذکر کیا گیا ہے "والاصح هو الاول کما فی روح البیان" صحیح پہلا قول ہی ہے یعنی 'یارخا' جیسے روح البیان میں ہے۔

(حاشیہ جلالین ص ۳۲۹)

مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے تفسیر نعیمی میں عائذ لکھا ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

سامری کا نام بھی موسیٰ تھا بظاہر ایمان لایا ہوا تھا لیکن حقیقت میں منافق تھا۔ سامری کا تفصیلی ذکر ان شاء اللہ پارہ سولہ میں آئے گا۔

﴿ **الْكِتٰبَ** ﴾ سے مراد توراۃ ہے۔ اس میں تمام مفسرین کا اتفاق ہے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب توراۃ ہی ہے۔

﴿ **وَالْفُرْقَانَ** ﴾ کا معنی یہ ہے " الفارق بين الحق والباطل " حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی چیز۔

اس آیۃ کریمہ میں فرقان سے مراد کیا ہے اس میں تین احتمال پائے گئے ہیں جو تمام کے تمام جمع ہیں ان میں کوئی تعارض نہیں۔ وہ تین احتمال یہ ہیں کہ فرقان سے مراد توراۃ ہو، یا توراۃ کے اندر داخل چیز ہو، یا توراۃ سے خارج ہو۔

پہلا احتمال: فرقان سے مراد توراۃ ہو تو اس صورت میں عطف تفسیری ہوگا، یعنی مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی جو حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی ہے۔ تاکہ تم اس کتاب کے ذریعے ہدایت حاصل کرسکو۔ فرقان سے مراد توراۃ ہو تو اسے یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے۔

" ان التوراة لها صفتان كونها كتابا منزلا و كونها فرقانا تفرق بين الحق والباطل "

بیشک توراۃ کے دو وصف ہیں ایک یہ کہ وہ کتاب ہے جو اللہ کی طرف سے نازل کی گئی ہے اور دوسرا وصف اس کا یہ ہے کہ وہ فرقان ہے یعنی حق و باطل میں فرق کرنے والی ہے۔

یہاں دونوں وصفوں کو اس طرح ذکر کیا گیا جیسا کسی شخص کی شجاعت اور سخاوت کو ذکر کرنا مقصود ہو تو یوں کہا جائے "رأيت الغيث والليث " (میں نے بارش اور شیر کو دیکھا) یعنی میں نے ایسے شخص کو دیکھا جو سخاوت میں بارش کی طرح ہے اور بہادری میں شیر کی طرح ہے۔

دوسرا احتمال: فرقان سے مراد وہ مسائل جو توراۃ میں بیان کئے گئے ہیں یعنی موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے کتاب دی اور اس میں اصول دین اور فروع دین کو ذکر کیا اور موسیٰ علیہ السلام کو ان کے بیان کرنے اور ظاہر کرنے کا حکم دیا تاکہ تم ان اصول دین اور فروع دین پر عمل کر کے ہدایت حاصل کرسکو۔

تیسرا احتمال: توراۃ سے خارج چیزیں مراد ہوں۔ یعنی فرقان سے مراد موسیٰ علیہ السلام کے معجزات ہوں کہ آپ کو ید بیضاء اور عصاء عطا فرمایا اور بھی نشانیاں عطا فرمائیں (جن کا ذکر ہو چکا ہے اور آئندہ آئے گا ان شاء اللہ) وہ حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی ہیں۔ توراۃ سے خارج ہی فرقان سے مراد نصرت ہے اور کشادگی جو بنی اسرائیل کو عطا کی گئی اسی نصرت والے معنی کے لحاظ سے یوم بدر کو یوم الفرقان کہا گیا ہے جیسے رب تعالیٰ نے ان الفاظ مبارکہ سے بیان فرمایا ہے:

﴿ وَمَا اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ ﴾

تنبیہ: بعض حضرات نے یہ بھی بیان فرمایا کہ فرقان سے مراد قرآن پاک ہے اور مفعول حذف ہے یعنی اصل عبارت یہ ہے "واذ آتینا موسی الکتاب ومحمدا فرقانا" لیکن اس قول کو تقریباً تمام مفسرین نے ضعیف قرار دیا۔ اس لئے پہلے ہی تمام احتمالات قویٰ ہیں اور راقم کے نزدیک تمام ہی بیک وقت مراد ہیں۔ جس کا مجموعی مفہوم یہ ہے کہ یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور وہی کتاب کو حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی بنا کر عطا کی اور اصول دین اور فروع دین کو بیان کرنے کا حکم دیا تاکہ حق و باطل میں فرق ہو سکے اور آپ کو معجزات عطاء فرمائے تاکہ معجزات کو دیکھ کر حق و باطل میں فرق کیا جا سکے۔ اور آپ کی امداد فرما کر حق و باطل میں فرق کیا گیا ان تمام چیزوں کے عطاء کرنے کی وجہ یہ ہے تاکہ تم ہدایت حاصل کرلو۔ (از کبیر بزیادۃ)

﴿ لَعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴾ "لکی تهتدوا بالتدبر فیه والعمل بما یحویه" (تفسیر ابی السعود)

تاکہ تم کتاب میں تدبر کر کے اور جن مسائل پر وہ مشتمل ہے ان پر عمل کر کے ہدایت حاصل کرلو۔

"لکی تهتدوا بتدبر الکتاب وتفکر الآیات" (بیضاوی)

تاکہ تم کتاب میں تدبر کر کے اور آیات میں تفکر کر کے ہدایت حاصل کرلو۔

"(لعلکم تهتدون) لما هو شکر المحق والمبطل" (تبصیر الرحمن)

تاکہ تمہیں اس ذات کا شکریہ ادا کرنے کی ہدایت حاصل ہو جو حق راہ اور باطل راہ کا پیدا کرنے والا ہے اور حق و باطل میں تمیز کرنے والا ہے۔

☆☆☆

﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْۤا اِلٰی بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ فَتَابَ عَلَیْكُمْ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ﴾

۱) ''اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم تم نے بچھڑا بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا تو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع لاؤ تو آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک تمہارے لئے بہتر ہے اس نے تمہاری توبہ قبول کی بیشک وہی ہے توبہ قبول کرنے والا مہربان''۔

۲) ''اور یاد کرو اس وقت کو جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو، اے میری قوم بیشک تم نے ظلم کیا ہے اپنی جانوں پر بوجہ بنانے تمہارے بچھڑے کو معبود، تو توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف، تو ایک دوسرے کو تم قتل کرو، یہ بہتر ہے تمہارے پیدا کرنے والے کے ہاں، تو اس نے توبہ قبول کی تمہاری بیشک وہ توبہ قبول کرنے والا، رحم کرنیوالا ہے''۔

یعنی موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو حکم دیا کہ تم نے بچھڑے کی پوجا کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا اب تم اپنے رب کی طرف توبہ کرو اور تمہاری توبہ کی صورت یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو، چنانچہ توبہ کرنے والوں نے اس طرح توبہ کی کہ ہر ایک کے ہاتھ میں ایک تلوار تھی بلا امتیاز ہر ایک نے دوسرے کو قتل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی ہر قتل ہونے والے نے درجہ شہادت پایا۔

﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ﴾ ''اور یاد کرو جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو'' یہاں سے بنی اسرائیل کو ایک اور نعمت یاد دلائی جا رہی ہے۔ بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا کہ ایک دوسرے کو قتل کریں تو اسے نعمت کیسے کہا جائے؟ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے وضاحت فرمائی کہ یہ نعمت کیسے ہے۔

"نعمة اخروية فی حق المقتولين من بنی اسرائيل حيث نالوا درجة الشهداء كما ان العفو نعمة دنيوية فی حق الباقين"

وہ بنی اسرائیل جن کو توبہ کرتے ہوئے قتل کیا گیا ان کے لئے یہ اخروی نعمت ہے کیونکہ انہوں نے شہداء کا درجہ حاصل کرلیا۔ جو باقی بچ گئے جن کو موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کی دعاء سے معاف کردیا گیا ان کے حق میں یہ دنیاوی نعمت تھی۔ کیونکہ اتنے عظیم جرم کو معاف کرنا عظیم نعمت ہے۔ (از روح المعانی)

اور اللہ تعالیٰ نے جب ان کو ان کے عظیم گناہ کی خبر دی کہ تمہارا بچھڑے کی عبادت کرنا بہت بڑا جرم ہے اور پھر ان کو اس جرم سے نکلنے کی راہ بتا کر ان پر بہت بڑا دینی انعام کیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان پر دنیاوی نعمتوں کا ذکر کیا تو اس دینی نعمت کا ذکر کرنا بھی بہتر ہے۔ (از کبیر)

عجیب نکتہ:

"ثم ان هذه النعمة وهی كيفية هذه التوبة لما لم يكن وصفها الا بمقدمة ذكر المعصية كان ذكرها ايضا من تمام النعمة"

جب توبہ کو قبول کرنا نعمت ہوا تو معصیت کا ذکر بھی نعمت میں داخل ہے کیونکہ معصیت کے بعد ہی تو توبہ کرنے کی ضرورت درپیش آئی معصیت نہیں ہوتی تو توبہ کی ضرورت نہ ہوتی۔ (از کبیر)

جب اللہ تعالیٰ نے ان کو توبہ کرنے کے لئے قتل کرنے کا حکم دیا لیکن تمام کے فنا ہو جانے سے پہلے حکم کو اٹھا لیا تو یہ باقی بچ جانے والوں کے لئے بہت بڑی نعمت تھی۔ اور خصوصاً نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے بنی اسرائیل کے حق میں نعمت تھی کیونکہ ان کے آباء کو معاف کر بچا نہ لیا جاتا بلکہ سب کو تباہ کردیا جاتا تو یہ لوگ کس طرح موجود ہوتے۔ گویا کہ حاضرین کے لئے براہ راست بھی نعمت تھی صرف ان کے آباء پر نعمت کا ذکر نہیں۔ (از کبیر)

نبی کریم ﷺ کی امت پر عظیم احسان:

بنی اسرائیل کی توبہ کو قتل سے مکمل کیا گیا۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو بتایا کہ تمہیں توبہ کرنے کے لئے ایک دوسرے کو قتل کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ گناہوں سے باز آنے کا عزم کرلو، اسی طرح کافرو تمہاری توبہ یہ ہے کہ تم کفر کو چھوڑ دو، ایمان لے آؤ تو اللہ تعالیٰ تم پر انعام عظیم فرماتے ہوئے

تمہاری توبہ کو قبول کرے گا۔ (از کبیر)

اس واقعہ سے نبی کریم ﷺ کی امت کو توبہ کی رغبت دلائی گئی:

" ان فیه ترغیبا شدیدا لامة محمد صلوات الله وسلامه علیه فی التوبة "

اس واقعہ سے بہت ہی زیادہ رغبت دلائی گئی ہے امت مصطفیٰ ﷺ کو، اس لئے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کی امت نے اتنے مشکل طریقہ سے توبہ کی تو نبی کریم ﷺ کی امت میں ہر شخص کو چاہیے کہ وہ توبہ کرنے میں دیر نہ کرے کیونکہ کتنی آسان راہ ان کو بتائی، کہ گناہوں پر نادم ہو جاؤ، آئندہ گناہ نہ کرنے کا مصمم ارادہ کرلو، گناہ کو چھوڑ دو، نیکی کے کام کرو بس یہی تو کامل ترین توبہ ہے۔ اسی سے ایک اور بہت بڑا فائدہ حاصل ہوا:

" ان ترغیب الانسان فیما هو المصلحة المهمة من اعظم النعم "

کسی انسان کو اہم مصلحت کی رغبت دلانا بھی اس پر بہت بڑا انعام ہے۔ (از کبیر)

﴿ یٰقَوْمِ اِنَّکُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَکُمْ بِاتِّخَاذِکُمُ الْعِجْلَ ﴾ یاقوم میں میم کا کسرہ اس پر دلالت کر رہا ہے اس سے یائے متکلم محذوف ہے اصل میں " یا قومی " ہے (اے میری قوم) بیشک تم نے ظلم کیا اپنے نفسوں پر۔

﴿ بِاتِّخَاذِکُمُ الْعِجْلَ ﴾ سے اس ظلم کی وجہ بیان کی یہاں پر بھی ایک مفعول محذوف ہے "الھا"، یعنی تم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا بسبب اس کے کہ تم نے بچھڑے کو معبود بنالیا۔

﴿ فَتُوْبُوْٓا اِلٰی بَارِئِکُمْ ﴾ "تو تم توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف" توبہ کا معنی ہے رجوع کرنا، یعنی تم اپنے باری تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا پختہ ارادہ کرلو، اس لئے کہ توبہ کی تکمیل تو ان کی قتل سے ہوتی ہے، صرف رجوع کرنے سے نہیں " باریٔ " کا معنی بری کرنے والے جس طرح کہا جاتا ہے " بریٔ المریض من مرضه " مریض اپنی مرض سے بری ہوگیا۔ اور کہا جاتا ہے " بریٔ المدیون من دینه " مقروض قرضے سے بری ہوگیا۔

اور " باریٔ " کا معنی پیدا کرنے والا جیسا کہ کہا جاتا ہے " برأ الله آدم من الطین " اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو کیچڑ سے پیدا کیا۔ اس مقام پر معنی یہ ہوگا۔

" فاعزموا علی التوبة والرجوع الی من خلقکم بریئا من التفاوت

وممیزا بعضکم عن بعض بصور وھیئات مختلفہ "

تم توبہ کرنے کا پختہ ارادہ کرلو، اور رجوع کرو اس ذات کی طرف جس نے تمہیں تفاوت (ایک دوسرے سے مختلف نمونہ ہونا) سے بری پیدا فرمایا، اور جس نے تمہیں بعض کو بعض سے صورتوں اور مختلف شکلوں سے تمیز دی۔

یعنی وہ ذات باری ہے جس نے تمام انسانوں کو ایک نمونہ بنایا، البتہ مختلف نقوش وغیرہ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے پہچاننے کے لحاظ پر ممتاز کردیا۔

﴿ فَتُوبُوٓا اِلٰی بَارِئِكُمْ ﴾ کہہ کر گویا کہ بنی اسرائیل کو یہ کہا گیا ہے کہ وہ ذات جو عالم وحکیم ہے جس نے اپنی مہربانی اور حکمت سے تمہیں پیدا فرمایا تم میں کوئی تفاوت نہیں رکھا کہ ایک ہاتھ لمبا بنایا ہو تو دوسرا چھوٹا، اس قسم کے تفاوت سے تمہیں بری بنایا حق تو یہ تھا کہ تمہیں یہ تصور بھی نہ آتا کہ اس ذات کو بھی ناراض کرنا ہے لیکن افسوس کہ تم نے بچھڑے کی پوجا کر کے اسے ناراض کردیا۔

پھر وہ ذات جس نے تمہیں مختلف شکلیں عطاء کر کے ایک دوسرے سے ممتاز کیا، حق تو یہ تھا کہ تم اس کے شکر گزار ہوتے لیکن تم نے رب تعالیٰ کی عظیم نعمتوں کی ناشکری کی اور رب تعالیٰ سے شریک ٹھہرا کر کفر کیا لیکن رب تعالیٰ پھر بھی تمہیں موقع عطاء کر رہا ہے کہ تم اس کے حضور جھک جاؤ، رجوع کرو، اس کے حکم کے مطابق توبہ کرو تو وہ تمہاری توبہ قبول فرمائے گا۔ (از بیضاوی وشیخ زادہ)

اعتراض: توبہ جب ہوتی ہی رب تعالیٰ کی طرف ہے تو صرف " فتوبوا " کیوں نہیں کہہ دیا گیا " الی بارئکم " کیوں کہا گیا ہے۔

جواب: " المراد عنہ النھی عن الریاء فی التوبۃ کأنہ قال لھم لو اظھر تم التوبۃ لاعن القلب فانتم ماتبتم "

مراد یہ ہے کہ ان کو توبہ میں ریاء سے منع کیا گیا ہے گویا کہ ان کو کہا گیا ہے کہ اگر تم نے دل سے توبہ نہ کی تو تمہاری توبہ حقیقت میں توبہ نہیں ہوگی۔

یعنی تم نے اس ذات کی طرف رجوع نہیں کیا جو تمہارے دلوں میں مخفی رازوں کو جانتا ہے، بلکہ تم نے لوگوں کے لئے توبہ کی جس کا کوئی فائدہ نہیں:

" فانکم اذا اذنبتم الی اللہ وجب ان تتوبوا الی اللہ "

" بیشک جب تم نے رب تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گناہ کیا تو توبہ بھی اسی ذات کی طرف کرو "

(از کبیر)

﴿ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ﴾ ان الفاظ مبارکہ کا اگرچہ ظاہری معنی تو یہ ہے "پس قتل کروا پنی جانوں کو" لیکن یہ معنی بالاتفاق مراد نہیں کیونکہ ان کو یہ حکم نہیں دیا گیا کہ تم میں سے ہر شخص اپنے آپ کو قتل کر کے توبہ کرے، بلکہ اس کا معنی یہ معتبر ہے کہ تم میں سے بعض بعض کو قتل کریں، یعنی آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو۔

ایک دوسرے کو قتل کرنے سے کیا مراد ہے؟

" وقیل امروا ان یقتل بعضهم بعضا " اور بیان کیا گیا ہے کہ اس سے مراد مطلق ہے یعنی تمام ہی بچھڑے کی پوجا کرنے والے تھے، ان کو حکم دیا گیا کہ تم ایک جگہ جمع ہو کر ایک دوسرے کو قتل کرو جب تم نے ایسا کر لیا تو تمہاری توبہ قبول کر لی جائے گی۔ " وقیل امر من لم یعبد العجل ان یقتل العبدة " اور بعض حضرات نے کہا کہ جن لوگوں نے بچھڑے کی پوجا نہیں کی تھی ان کو حکم دیا گیا کہ تم ان لوگوں کو قتل کرو جنہوں نے بچھڑے کی پوجا کی۔

ان کے لئے قتل کرنا کیسے ممکن ہوا؟

بنی اسرائیل جب سب ہی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد تھے ایک دوسرے کے قریبی رشتہ دار تھے تو ان کے لئے یہ بہت مشکل کام تھا کہ ایک دوسرے کو قتل کریں، وہ توبہ کرنے پر آمادہ بھی ہو گئے لیکن ان سے یہ کام کرنا جب مشکل ہوا تو ان کے لئے یہ آسانی پیدا کی گئی:

" فارسل الله ضبابة وسحابة سوداء لایتباصرون فاخذوا یقتلون من الغداة الی العشی حتی دعا موسی وهارون فکشفت السحابة ونزلت التوبة وکانت القتلی سبعین الفا "

کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے دھند اور سیاہ بادل چھا دیئے جن سے اندھیرا چھا گیا وہ ایک دوسرے کو نہیں پہچان سکے تھے اور نہ دیکھ سکتے تھے، انہوں نے صبح سے لے کر شام تک ایک دوسرے کو قتل کیا، موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام نے دعا کی اے اللہ اب ان کو معاف کر دے دعاء کرنے کی وجہ یہی تھی کہ اگر ان پر یہی سلسلہ جاری رہا تو بنی اسرائیل کا نام و نشان ہی دنیا سے ختم ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ نے ان کی دعاء کو قبول کیا اور معاف فرما دیا لیکن اس وقت تک ستر ہزار کی تعداد میں یہ لوگ قتل ہو چکے تھے۔ (بیضاوی رشیخ زادہ)

﴿ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ﴾ : یہاں سے بیان کرنا یہ مقصود ہے کہ اگر تم نے توبہ کر لی اور ایک دوسرے کو قتل کر دیا تو تمہارے گناہ کو معاف کر دیا جائے اخروی ضرر سے تم بچ جاؤ گے اگرچہ دنیاوی ضرر قتل کی وجہ سے تمہیں حاصل ہونا ہے۔ لیکن اگر تم نے توبہ نہ کی تو دنیاوی ضرر تمہیں نہیں پہنچے گا، لیکن اخروی ضرر میں تم نے مبتلاء ہونا ہے، اس لئے تمہارا توبہ کرنا تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک تمہارے لئے بہتر ہے۔

" واما الخلاص من العقاب والفوز بالثواب فذاك هو الغرض الاعظم "

یعنی عذاب اخروی سے نجات حاصل کرنا اور ثواب میں کامیابی حاصل کرنا ہی بہت بڑا مقصد ہے۔ (از کبیر)

﴿ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ﴾ : یہاں دو احتمال ہیں ایک یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے کلام کی حکایت رب تعالیٰ نے بیان فرمائی اس صورت میں مطلب یہ ہوگا " فان فعلتم فقد تاب عليكم " اگر تم نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق توبہ کر لی یعنی ایک دوسرے کو قتل کر دیا تو اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ یقیناً قبول فرمائے گا۔

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی بنی اسرئیل کو التفات کے طور پر فرمایا ہو جس کا مطلب یہ ہو: ﴿ فَفَعَلْتُمْ مَا اَمَرَكُمْ بِهٖ مُوْسٰى فَتَابَ عَلَيْكُمْ بَارِئُكُمْ ﴾

''موسیٰ علیہ السلام نے تمہیں جو حکم دیا اس پر تم نے عمل کر لیا اس لئے اللہ تعالیٰ نے تمہاری توبہ کو قبول کر لیا''۔

اعلیٰ حضرت نے یہی ترجمہ کیا ہے اور راقم نے بھی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو ہی نقل کیا ہے۔ تاہم یہ ترجمہ بھی کیا جا سکتا ہے ''وہ تمہاری توبہ قبول کرے گا''۔

تنبیہ : یہ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کا قانون تھا کہ ایک دوسرے کو قتل کرنے سے توبہ قبول ہوتی تھی صرف زبان سے توبہ نہیں کی جا سکتی تھی۔ اسلئے یہ اعتراض نہیں کیا جا سکے گا کہ مرتد کو توبہ کے بعد قتل کرنے کا کیا مطلب؟ مسئلہ یہ واضح ہے کہ ایک شریعت کے احکام کو دوسری شریعت پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ (ماخوذ از خازن)

﴿ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴾ : "ای الرجاع بالمغفرة القابل للتوبة الرحيم بخلقه"

یعنی بیشک وہ مغفرت سے رجوع کرنیوالا اور توبہ قبول کرنیوالا ہے اور اپنی مخلوق پر رحم کرنیوالا ہے۔ (خازن)

﴿ وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَھْرَۃً فَاَخَذَتْکُمُ الصّٰعِقَۃُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ☆ ثُمَّ بَعَثْنٰکُمْ مِّنْ بَعْدِ مَوْتِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ﴾

۱) ''اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز تمہارا یقین نہیں لائیں گے جب تک علانیہ خدا کو نہ دیکھ لیں تو تمہیں کڑک نے آ لیا اور تم دیکھ رہے تھے، پھر مرے پیچھے ہم نے تمہیں زندہ کیا کہ کہیں تم احسان مانو''

۲) ''اور یاد کرو اس وقت کو جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز یقین نہیں کریں گے تم پر یہاں تک کہ ہم دیکھ لیں اللہ کو ظاہر طور پر، تو پا لیا تمہیں کڑک نے ایسے حال میں کہ تم دیکھ رہے تھے، پھر زندہ کیا ہم نے تمہیں تمہاری موت کے بعد تا کہ تم شکر کرو''

اس آیۃ کریمہ میں بنی اسرائیل کی پشیمانی کے بعد کج روی کا ذکر کیا گیا ہے کہ بچھڑے کی پوجا کرنے اور موسیٰ علیہ السلام کی سرزنش کے بعد وہ لوگ بہت پشیمان ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ آپ اپنی قوم کے بہترین ستر افراد کو ساتھ لے کر طور پر آ جائیں تا کہ وہ تمام قوم کی طرف سے بچھڑے کی پوجا کے جرم کی معافی طلب کریں، آپ ان کو جب ساتھ لے کر گئے تو انہوں نے کہا اے موسیٰ اپنے رب سے سوال کرو یہاں تک کہ ہم اس کے کلام کو سنیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے رب کے حضور عرض کیا تو اسے قبول کر لیا گیا۔

جب آپ کے قریب پہنچے تو ستون کی شکل میں بادل نمودار ہوا جس نے تمام پہاڑ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام اس بادل کے قریب ہوئے یہاں تک کہ اس میں داخل ہو گئے موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنے رب تعالیٰ سے کلام فرمایا تو آپ کی پیشانی سے ایک نور چمکنے لگا، انسانوں میں سے کوئی اسے دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔

قوم نے اللہ تعالیٰ کے کلام کو سنا جو اس نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا، جب کلام کا سلسلہ ختم ہوا تو بادل کو اٹھالیا گیا، قوم نے کہا:

﴿لن نؤمن لک حتی نری اللہ جھرۃ﴾

ہم ہرگز تم پر ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ ہم اللہ کو ظاہر دیکھ لیں۔ تو ان کو بجلی کی کڑک نے اپنی گرفت میں لے لیا اور سب مر گئے۔

موسیٰ علیہ السلام کھڑے ہوئے اور آسمانوں کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعاء کرنے لگے اور عرض کیا اے اللہ میں بنی اسرائیل کے ستر آدمیوں کو منتخب کر کے لایا تھا تا کہ ان کی توبہ کے قبول ہونے میں میرے گواہ بنیں۔ اب میں ان کی طرف واپس جاؤں گا تو میرے ساتھ جب کوئی ایک بھی نہیں ہوگا تو وہ میرے متعلق کیا خیال کریں گے۔ موسیٰ علیہ السلام دعاء فرماتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی روحوں کو لوٹا دیا۔

خیال رہے کہ موسیٰ علیہ السلام جب توراۃ لینے کے لئے طور پر گئے تو اس وقت ستر آدمیوں کو ساتھ لے کر گئے پھر واپس لوٹنے پر قوم کے بچھڑے کی پوجا کرنے کے بعد لے کر گئے۔

(از کبیر ب ا ج ۳ ص ۸۴)

رہا یہ امر کہ بعض آیات قرآنیہ کے ظاہر الفاظ سے مفہوم ہوتا ہے کہ موت کے بعد دنیوی حیات حاصل نہیں ہوتی، ان آیات میں اسی قانون عام اور قدرت الٰہیہ کا بیان ہے۔ لیکن خرق عادت بھی کتاب وسنت سے ثابت ہے اور بعض امور کا قانون خاص کے تحت ہونا قرآن وحدیث سے واضح ہے اس لئے یہاں کوئی اشکال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جن لوگوں کی دنیوی مدت عمر، علم الٰہی میں باقی تھی اور بطور سزائے معصیت یا کسی دوسری حکمت کی وجہ سے ان پر موت طاری کی گئی، ان لوگوں کو مرنے کے بعد دنیا میں دوبارہ زندگی عطا کی جاتی ہے اور جن لوگوں کی دنیوی مدت عمر علم الٰہی میں پوری ہو چکی ان کو دنیا میں دوبارہ زندگی دی جاتی ہے۔ (از تبیان للکاظمیؒ)

قدرے مزید تفصیل: یہاں سے مراد اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک اور نعمت کی یاد دلائی کہ اے بنی اسرائیل تم رب تعالیٰ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم نے موسیٰ علیہ السلام کو یہ کہا کہ ہم ہرگز تمہاری بات پر یقین نہیں کریں گے جب تک اللہ تعالیٰ کو ظاہر نہ دیکھ لیں تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایک کڑک کے ذریعے مار کر پھر زندہ کیا:

" لتتوبوا عن بغیکم وتتخلصوا عن العقاب وتفوزوا بالثواب "

تاکہ تم اپنی سرکشی سے توبہ کرلو اور عذاب سے نجات حاصل کرلو، اور ثواب حاصل کر کے رب تعالیٰ کے حضور کامیابی حاصل کرلو۔

☆ اور ان دونوں آیتوں سے نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے بنی اسرئیل کو ڈرایا بھی گیا کہ تمہارے آباء واجداد جس قسم کی کج رویوں (ٹیڑھی چالوں) کی وجہ سے ایک مرتبہ ترک کی وجہ سے مارے گئے اگر تم نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا تو رب تعالیٰ کی قدرت سے بعید نہیں کہ تمہیں بھی ذلیل کردے۔

☆ نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود آپ کی نبوت کا انکار کرتے تھے تو ان کی آباؤاجداد کا ذکر کر کے بتایا کہ جب ان کے آباء واجداد موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو ظاہر طور پر دیکھ کر نہ مانے تو ان کی اولاد نے وہی کچھ کرنا ہے جو ان کے اسلاف نے کیا ہے جیسے وہ ذلیل ہوتے رہے ایسے ہی یہ بھی ذلیل ہوتے رہیں گے۔

☆ نبی کریم ﷺ پر یہ واقعہ بیان کر کے آپ کو تسلی دی گئی کہ آپ سے پہلے بھی انبیاء کرام کے معجزات کا انکار کر کے اور ان پر ایمان نہ لاکر ان کو اسی طرح ذہنی تکلیف دیتے رہے جیسے آپ کو دے رہے ہیں لیکن اس کے لئے یہی ضروری ہے:

﴿ فاصبر کما صبر اولو العزم من الرسل ﴾

کہ اے محبوب آپ صبر کریں جیسا کہ دوسرے اصحاب عزم رسولوں نے صبر کیا۔

☆ اس واقعہ سے کفار کے اس اعتراض کو رد کیا جو وہ کرتے تھے کہ اگر محمد ﷺ کی نبوت سچی ہوتی تو اہل کتاب ایمان لے آتے کیونکہ وہ علم والے ہیں۔ ان کو یہ بتایا گیا کہ یہ لوگ نبی کریم ﷺ کی حقانیت کو جاننے کے باوجود انکار کر رہے کیونکہ ان کا خاندانی طریقہ ہی یہی ہے ان کے اسلاف بھی ایسا ہی کرتے رہے جیسا یہ کر رہے ہیں۔

☆ " لما اخبر محمد علیه الصلوة والسلام عن هذه القصص مع انه کان امیا لم یشتغل بالتعلم البتتة وجب ان یکون ذلک عن الوحی "

جب نبی کریم ﷺ نے یہ واقعات بیان فرمائے باوجود اس کے کہ آپ نے کسی مدرسہ میں کی

استاذ سے نہیں پڑھا تو اسی سے واضح ہو گیا کہ یہ وحی کے ذریعے ہی آپ کو علم حاصل ہوا ہے۔ (… سیر)

﴿وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ﴾ " فمعناه لا نصدقک و لا نعترف بنبوتک "

اس کا معنی یہ ہوا " اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز تمہاری تصدیق نہیں کریں گے۔ اور یا "لن نؤمن لک" کا یہ معنی ہو ہم ہرگز تمہاری نبوت کا اعتراف نہیں کریں گے۔ (… کبیر)

اعتراض : یہ کہنا کیسے صحیح ہے کہ انہوں نے کہا "ہم ہرگز تم پر ایمان نہیں لائیں گے"

" وقد کان هؤلاء مؤمنين من قبل بموسیٰ عليه السلام "

حالانکہ وہ تو موسیٰ علیہ السلام پر پہلے ہی ایمان رکھتے تھے۔

جواب : " الا انهم نفوا هذا الايمان المعين والاقرار الخاص ، وقيل اراد نفي الكمال ای لايكمل ايماننا لک ، كما قيل في قوله ﷺ ، لا يؤمن احدكم حتى يحب لاخيه المؤمن ما يحب لنفسه "

انہوں نے … ایمان کی نفی نہیں کی تھی، بلکہ طور پر موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے جو کلام فرمایا تھا جسے یہ سن رہے تھے اس کی انہوں نے نفی کی تھی کہ ہم اس پر ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ اللہ کو ظاہر دیکھ لیں۔

اسی جواب کے مطابق اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بہت خوب ہے جس پر اعتراض وارد ہی نہیں ہوتا "ہرگز تمہارا یقین نہیں لائیں گے" یعنی ہم تمہاری بات پر یقین نہیں کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ کہا ہے۔ بلکہ ہم تو تمہاری بات پر اس وقت یقین کریں گے جب ہم اللہ تعالیٰ کو ظاہر دیکھ لیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ انہوں نے مطلقاً ایمان کی نفی نہیں کی تھی بلکہ کمال ایمان کی نفی کی تھی۔ یعنی ہم تم پر کامل طور پر ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کو ظاہر دیکھ لیں۔

کبھی بظاہر ایک چیز کی نفی ہوتی ہے لیکن حقیقت میں اس کے کمال کی نفی ہوتی ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی "لا یؤمن" کے الفاظ استعمال ہیں، لیکن اس میں بھی کمال کی نفی پائی گئی ہے حدیث کا مطلب یہ ہے "تم میں سے کوئی ایک کامل مومن نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ اپنے مومن بھائی کے لئے وہی چیز پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے" (از روح المعانی)

﴿ حَتّٰی نَرَی اللّٰهَ جَهْرَةً ﴾: اصل میں " جهرة " کا معنی ہے بلند آواز سے پڑھنا جیسا کہ کہا جاتا ہے "جهرت بالقراءة" میں نے بلند آواز سے قراءت کی۔ جس چیز کا ظاہر طور پر کامل طریقہ سے معاینہ پایا جائے اس پر مجازی طور پر " جهر " کا لفظ بولتے ہیں۔

" قال الراغب " الجهر " يقال لظهور الشئی بافراط حاسة البصر او حاسة السمع "

" علامہ راغب اصفہانی فرماتے ہیں " جہر " کا لفظ مشترک ہے یعنی دونوں معنی ہی اس کے حقیقی ہیں۔ خواہ واضح طور پر کسی چیز کو دیکھا جائے، یا واضح طور پر کسی کلام کو سنا جائے "

ان لوگوں نے " نری " کے ساتھ " جهرة " ذکر کر کے اپنی بات کو پختہ طور پر پیش کیا کیونکہ صرف رؤیۃ کا تعلق دل سے بھی ہے اور خواب سے بھی ہے ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کو ظاہر آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں جب ظاہر آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو تمہاری بات پر بھی یقین کر لیں گے۔ ہم دل سے دیکھنے یا خواب سے دیکھنے کا مطالبہ نہیں کر رہے۔ (از روح المعانی)

﴿ فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ ﴾: " تو پالیا تمہیں کڑک نے " اخذ کا اصل معنی ہے ہاتھ سے پکڑنا "یہاں معنی ہے "استولت عليكم واحاطت بكم" تم پر کڑک غالب آ گئی کڑک نے تمہارا احاطہ کر لیا " صاعقه " کے تین معنی کئے گئے ہیں۔

(۱) آسمانوں سے آگ آئی جس نے ان کو جلا دیا۔ (۲) آسمانی لشکر آیا جس کی حرکت کو سن کر ہی یہ مر گئے۔ (۳) آسمانوں سے ایک کڑک آئی جس سے یہ مر گئے، اور ایک دن اور ایک رات تک مرے رہے۔ (از روح المعانی)

﴿ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴾: ایسے حال میں کہ تم دیکھ رہے تھے یا تو اس سے مراد یہ ہے کہ ان پر صاعقہ کی وجہ سے جو حالت واقع ہوئی اسے وہ دیکھ رہے تھے۔ اور یا یہ مراد ہے کہ وہ زندہ ہونے کے بعد اپنے جسموں پر آثار موت دیکھ رہے تھے، اور یا یہ مراد ہے کہ ان کو زندہ کرتے وقت ان کے اعضاء کو علیحدہ علیحدہ حیات عطاء کی تو وہ اپنے زندہ ہونے کو دیکھ رہے تھے۔ (از روح المعانی)

اسی سے یہ واضح ہو گیا کہ " صعق " کا معنی موت بھی آتا ہے لیکن یہاں یہ معنی نہیں بن سکتا کہ

تم کو موت نے گرفت میں لے لیا ایسے حال میں کہ تم دیکھ رہے تھے۔ (از کبیر)

﴿ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ ﴾ : "پھر ہم نے تمہیں زندہ کیا تمہاری موت کے بعد" یعنی اللہ تعالیٰ کو ظاہر دیکھنے کے تمہارے سوال پر اللہ تعالیٰ نے جو کڑک بھیجی اس کی وجہ سے تم پر موت واقع ہوئی اس موت کے بعد موسیٰ علیہ السلام کی دعاء سے تمہیں زندگی عطاء کی۔

خیال رہے " بعث " جب موت کے بعد ہو تو اس وقت اس کا معنی ہوتا ہے زندہ کرنا جیسا کہ یہاں واقع ہے اور اگر نیند کے ساتھ متعلق ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے بیدار کرنا جیسا کہ اصحاب کہف کے واقعہ میں " ثم بعثناهم " مذکور ہے وہاں نیند سے بیدار کرنا معنی مراد لیا گیا ہے۔ اور 'بعث' کا زیادہ استعمال بھیجنے کے معنی میں ہے جیسا کہ ﴿ ربنا وابعث فیهم رسولا ﴾ میں اسی معنی میں استعمال ہے۔
(از روح المعانی)

﴿ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ : " تاکہ تم شکر کرو" یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں موت کے بعد زندگی عطاء کی تاکہ تم اس نعمت کا شکر کرو۔ اسی طرح کفر کے بعد تمہیں صرف کڑک کی وجہ سے موت عطا کی گئی، اخروی عذاب سے تمہیں نجات دی گئی، یہ اللہ تعالیٰ کا تم پر عظیم انعام ہے، یہ عظیم انعام اسی لئے کیا تاکہ تم اللہ تعالیٰ کا شکر و کرو۔ (از روح المعانی)

تنبیہ: اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی تفصیلی بحث تو انشاء اللہ سورۃ انعام میں آنی ہے تاہم مختصر مسئلہ سمجھ لیا جائے اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھنا جائز ہے یا نہیں، اکثر مبتدعہ اور معتزلہ اس کے جواز کے قائل نہیں ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کو دنیا میں دیکھنا ناجائز ہے اور آخرت میں بھی اسے نہیں دیکھا جا سکے گا۔

" واهل السنة والسلف علی جوازها فیهما ووقوعها فی الآخرة "

اہل سنت و جماعت اور سلف صالحین کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو دنیا میں اور آخرت میں دیکھنا جائز ہے۔ البتہ دنیا میں صرف ممکن کی حد تک ہے اور آخرت میں اس کا وقوع ہوگا یعنی حقیقت میں مومنوں کو رب تعالیٰ کا دیدار حاصل ہوگا۔ (از قرطبی)

قابل توجہ: نبی کریم ﷺ معراج کی رات اللہ تعالیٰ کے دیدار سے مشرف ہوئے اس کی تفصیلی

بحث روح المعانی میں سورۃ" والنجم " میں دیکھی جائے، راقم نے تو ہنوز آغاز سفر کیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعاء کا اثر: اس سے واضح ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کی دعاء سے بنی اسرائیل کو حیات مل گئی۔ جب موسیٰ علیہ السلام کی دعاء سے مردوں کو زندگی مل گئی، تو یہ کیوں نہ ہوتا کہ نبی کریم ﷺ کی دعا اور نگاہ سے مردہ دلوں کو حیات جاودانی نہ ملتی کفر وشرک سے نجات دے کرامت مصطفیٰ ﷺ کو حیات ابدیہ اور سرور سرمدیہ سے سرفراز کیا۔

﴿ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ ۖ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴾

۱) ''اور ہم نے ابر کو تمہارا سائبان کیا اور تم پر من اور سلویٰ اتارا، کھاؤ ہماری دی ہوئی ستھری چیزیں اور انہوں نے کچھ ہمارا نہ بگاڑا، ہاں اپنی جانوں کا بگاڑ کرتے تھے''۔

۲) ''اور ہم نے سایہ کیا تم پر بادلوں کا اور نازل کیا ہم نے تم پر من اور سلویٰ، کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تمہیں عطا کیں اور انہوں نے نہیں ظلم کیا ہم پر اور لیکن وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے''۔

بنی اسرائیل کا اصل وطن ملک شام تھا، یوسف علیہ السلام کے دور میں یہ لوگ مصر آ کر آباد ہو گئے وہاں ان پر مختلف حالات گزرے، فرعون کی غلامی میں رہنا اور اس کے مظالم کو برداشت کرنے کا دور بھی مصر میں ہی ان پر آیا۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے ان کو نجات دی اور فرعون کو غرق کر دیا، اب بظاہر یہ لوگ پریشانیوں سے نکل کر اطمینان میں آ گئے۔ اس دوران ملک شام پر قوم عمالقہ قابض ہو چکی تھی اور انہوں نے وہاں اپنا تسلط قائم کر لیا تھا۔

فرعون کے غرق ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ تم اپنا وطن بنی عمالقہ سے آزاد کراؤ، اور وہاں جا کر مقیم ہو جاؤ، لیکن جب ان کو پتہ چلا کہ بنی عمالقہ تو بہت بڑے جسیم اور طاقتور لوگ ہیں تو انہوں نے ان سے جنگ کرنے اور اپنے وطن کو آزاد کرانے سے انکار کر دیا بلکہ موسیٰ علیہ السلام کو یہ لوگ کہنے لگے۔

﴿ فاذھب انت وربک فقاتلا انا ھھنا قاعدون ﴾

تم جاؤ اور تمہارا خدا جائے تم ان سے قتال کرو ہم تو یہاں ہی بیٹھتے ہیں۔

جب وہ عمالقہ قوم کی طاقت کا حال سن کر ڈر گئے اور جہاد سے منہ موڑ کر واپس لوٹ آئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس جرم کی سزا یوں دی کہ وہ اپنے گھروں تک واپس نہ پہنچ سکے اور چالیس برس تک وادی تیہ میں حیران و پریشان گھومتے رہے۔

تیہ مصر اور شام کے درمیان ایک وسیع اور کھلا میدان تھا تیہ کے معنی ہیں حیرانی و پریشانی کے ہیں بنی اسرائیل اس میدان میں چالیس سال تک انتہائی حیرانی اور پریشانی کے عالم میں سرگرداں رہے اسی لئے اسے وادیٔ تیہ کہا جاتا ہے۔ بنی اسرائیل اپنے گھروں تک جانے کی فکر میں دن بھر سفر کرتے رات بسر کرنے کے بعد صبح اپنے آپ کو وہیں پاتے جہاں سے گزشتہ صبح انہوں نے سفر کو شروع کیا ہوتا۔

(از شیخ زادہ و قرطبی)

بنی اسرائیل سرکشی کے باوجود انعامات:

یہی آیت کریمہ جس کی وضاحت کی جارہی ہے اس میں ان نعمتوں کا ذکر ہے جن کا تعلق میدان تیہ سے ہے۔ حالانکہ میدان تیہ میں ان کو حیران و پریشان کرنے کی وجہ ان کی سرکشی تھی۔ اس وادی میں نہ کوئی سایہ دار درخت تھا اور نہ ہی کوئی مکان، نہ پینے کے لئے پانی تھا اور نہ کھانے کے لئے کوئی چیز وہاں موجود تھی، روشنی وہاں نہیں تھی، اور ضروریات زندگی وہاں حاصل نہیں تھے۔

اس بے سروسامانی اور غریب الوطنی کے حال میں موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے ان کو سب سامان مہیا کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے دھوپ سے بچاؤ اور سایہ کے حصول کیلئے بادل بطور سائبان نازل فرما دیا۔ کھانے کیلئے من اور سلوی بھیج دیا، تاریکی دور کرنے کے لئے عمودی شکل میں ایک روشنی ظاہر ہو جاتی تھی۔ لباس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی اعجازی شان اس طرح ظاہر فرمائی کہ نہ ان لوگوں کے کپڑے میلے ہوتے اور نہ ہی پھٹتے اور انکے بچوں کے جسم کے ساتھ بچوں کا لباس بھی بڑھتا رہتا۔ موسیٰ علیہ السلام کا پتھر سے پانی نکالنے والا معجزہ بھی اسی میدان میں ظاہر ہوا۔ جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

(از شیخ زادہ و قرطبی)

﴿ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ ﴾ : " سخر الله لهم السحاب يظلهم من الشمس حين كانوا في التية " (بیضاوی)

اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے بادل کو مسخر فرمایا جو ان کو سورج کی دھوپ سے بچانے کیلئے سایہ کرتا تھا۔ جب کہ وہ تیہ میں تھے راقم نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے" اور ہم نے سایہ کیا تم پر بادلوں کا" "ای جعلناه علیکم کالظلة " (قرطبی) اعلیٰ حضرت کا ترجمہ قرطبی کے ان الفاظ کا ہی بعینہ ہے" اور ہم نے ابر (بادل) کو تمہارا سائبان کیا"

(الغمام) جمع ہے غمامۃ کی۔ جس طرح سحابۃ کی جمع سحاب ہے ہر چیز جو ڈھانپ دینے والی ہو اس پر "غم" کا اطلاق ہوتا ہے بادلوں کو غمام کہا گیا ہے کہ وہ آسمانوں کو ڈھانپ لیتے ہیں۔ " کل مغطی فھو مغموم " ہر ڈھانپی ہوئی چیز کو "مغموم" کہا جاتا ہے پھر جو شخص غم اور پریشانی میں ہو اسے بھی مغموم کہا جاتا ہے کیونکہ اس کی عقل پر پردہ چھا جاتا ہے۔ "غم الھلال" کہا جاتا ہے کہ چاند کو بادل نے ڈھانپ لیا، خیال رہے کہ غین اور غیم دونوں کا معنی بادل اور گرد و غبار آتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے " انہ لیغان قلبی " میرے دل پر جب دنیاوی مشاغل کی وجہ سے رب تعالیٰ کی طرف اتنے لحات کے لئے توجہ میں کمی کی وجہ سے پردہ آجاتا ہے تو میں رب تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

علامہ سعدی رحمہ اللہ نے بیان کیا کہ ان پر دن کو سفید ہلکے بادل چھا جاتے جو دھوپ سے ان کو بچاتے، لیکن رات کو بادل چھٹ جاتے، چاندنی روشنی سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی تھی۔ (از قرطبی)

﴿ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ﴾ : "اور نازل کیا (اتارا) ہم نے تم پر من اور سلویٰ"

من کیا چیز ہے؟ اگرچہ اس میں مختلف قول ہیں صحیح قول یہی ہے کہ من سے مراد ترنجبین ہے جو ایک نفیس شیریں ذائقہ دار مادہ تھا جو شبنم کی طرح صبح کے وقت آسمان سے اترتا اور کتے مقدار میں چھوٹے درختوں پر منجمد ہو جاتا تھا:

"فلما اکثروا اکله سمنوا من اکله فقالوا لموسی علیه السلام قتلنا هذا المن بحلاوته"

جب وہ کثیر مقدار میں من کھا کھا کر موٹے ہو گئے تو کہنے لگے اے موسی اس من کی مٹھاس نے تو ہمیں مار کر رکھا دیا ہے موسی علیہ السلام نے رب کے حضور دعاء کی تو رب تعالیٰ نے ان پر سلوی نازل فرمایا۔

سلوی کیا ہے: سلوی کے بارے میں بھی متعدد اقوال ہیں۔ صحیح یہی ہے کہ وہ بٹیر تھا، بعض نے کہا وہ بھنا ہوا اترتا تھا اور بعض کا قول ہے کہ بکثرت زندہ پرندے ان کے پاس جمع ہو جاتے تھے وہ انہیں زندہ پکڑ لیتے اور ذبح کرتے تھے۔ الغرض من اور سلوی ان کی میٹھی اور نمکین غذائیں تھیں جنہیں وہ پیٹ بھر کر کھاتے تھے۔ من کو روٹی کے طور پر کھاتے تھے اور سلوی کو سالن کے طور پر کھاتے تھے یہ ان پر کتنا بڑا انعام تھا کہ بغیر مشقت انہیں یہ انعامات میسر تھے۔

ایک حدیث کا مطلب: سعید بن زید بن عمرو بن فضیل فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الکمأة من المن الذی انزل اللہ علی بنی اسرائیل وماؤھا شفاء للعین ، وفی روایة من المن الذی انزل اللہ علی موسی .... رواہ مسلم "

کمأة اس من سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر نازل فرمایا اس کا پانی آنکھوں کے لئے شفا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ اس من سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمایا (مطلب دونوں روایات کا ایک ہی ہے)

کمأة کیا ہے؟ یہ پودا بہار کے موسم میں زمین کے نیچے پایا جاتا ہے یہ اروی کی طرح گول جڑ ہوتی ہے جس کا نہ تنا ہوتا ہے نہ ریں اس کا رنگ مٹیالا ہوتا ہے (المنجد) تاہم بعض مترجمین نے اس کا معنی کھمبی بھی کیا ہے۔

کمأة کو من کہنے کی وجہ: اس میں دو قول پائے جاتے ہیں ایک ان میں سے یہ ہے:

" الکمأة مما انزل اللہ علی بنی اسرائیل ای مما خلقه اللہ لھم فی التیه "

کمأة کو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے تیہ کے میدان میں پیدا کیا۔

دوسرا قول زیادہ معتبر ہے وہ یہ ہے:

" قال ابو عبید انما شبھھا بالمن لانه لا مؤنة فیھا ببذر ولا سقی ولا علاج "

ابوعبید رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ کمأۃ کو من سے تشبیہ دی گئی ہے یعنی حقیقی طور پر اس کا من ہونا معتبر نہیں بلکہ مجازی طور پر من کے اس طرح مشابہ ہے کہ من بھی قدرتی طور پر بغیر محنت اور مشقت کے حاصل ہوا، اور کمأۃ بھی بغیر بیج اور بغیر پانی لگانے اور بغیر کاشت کرنے وغیرہ کی مشقت کے حاصل ہوتی ہے۔

کمأۃ کا پانی آنکھوں کے لئے شفاء ہے بعض اہل علم نے بیان فرمایا کہ اس کے پانی میں برودت (ٹھنڈک) کی تاثیر ہے۔ اس لئے اگر اسے استعمال کیا جائے جب کہ آنکھوں، حرارت (گرمی) کی وجہ سے خراب ہوں تو آنکھوں کو شفا حاصل ہو گی۔ البتہ مختلف اوقات میں دواؤں کے ساتھ استعمال آنکھوں کے لئے نفع مند ہے۔

"وذهب ابو هريرة ﷺ الى استعمالها بحتا فی جميع مرض العين"

اور حضرت ابو ہریرہ ﷺ کا یہ موقف تھا کہ کمأۃ کا پانی ہر حال میں بغیر کسی دواء کے ملانے کے آنکھ کی تمام مرضوں سے شفا دیتا ہے۔ (از قرطبی)

اصل میں یہ عشق و محبت کی بات ہے کیونکہ حضرت ابو ہریرہ ﷺ نے سوچا کہ نبی کریم ﷺ نے تو مطلقاً "ماءها" (اس کا پانی) فرمایا ہے کہ اس کا پانی آنکھوں کے لئے شفاء ہے آپ نے تو یہ نہیں بیان فرمایا کہ اس کے پانی کے ساتھ دواء بھی ملانا آپ نے تو یہ نہیں بیان فرمایا کہ اس کا پانی بعض مرضوں کیلئے شفا ہے تو ہم کون ہوتے ہیں کہ اس کی قسمیں بناتے پھریں۔ راقم کا موقف بھی یہی ہے۔

بنی اسرائیل کی ذخیرہ اندوزی:

"روى انه كان ينزل عليهم من طلوع الفجر الى طلوع الشمس كالثلج، فيأخذ الرجل ما يكفيه ليومه، فان ادخر منه شيأ فسد عليه الا فی يوم الجمعة فانهم كانوا يدخرون ليوم السبت فلا يفسد عليهم لان يوم السبت يوم عبادة وما كان ينزل عليهم يوم السبت شئ"

روایت کیا گیا ہے کہ ان پر من طلوع فجر (صبح صادق) سے لے کر طلوع شمس (سورج نکلنے) تک برف کی طرح نازل ہوتا، ہر شخص کو اتنا حاصل ہو جاتا جو تمام دن کے لئے کافی ہوتا، ان کو جمع کرنے کی اجازت نہیں تھی، اگر کوئی جمع کر لیتا تو وہ من بدبودار ہو جاتا، ہاں البتہ ہفتہ کا دن ان کی عبادت کا دن تھا، اس دن من نہیں نازل ہوتا تھا البتہ

جمعہ کے دن زیادہ نازل ہوجاتا تھا، اوران کو اجازت تھی کہ وہ جمعہ کے دن اتنا جمع
کرلیں جوان کو ہفتہ کے دن بھی کافی ہوسکے۔ (از قرطبی)

رب تعالیٰ کی طرف سے گویا کہ ان کو حکم تھا:

" ولا تدخروا الغد فخالفوا وادخروا فدود وفسد فقطع الله عنهم " (حازن)

کل کے لئے ذخیرہ بنا کر نہ رکھو، لیکن انہوں نے رب تعالیٰ کے اس حکم کی مخالفت کی اور دوسرے دن کے لئے ذخیرہ بنایا تو اس کھانے میں کیڑے پڑ گئے اور بدبودار ہوگیا اور ذخیرہ اندوزی کرنیوالوں سے وہ کھانا روک لیا گیا۔

☆ " عن ابی ہریرة ﷺ قال قال رسول الله ﷺ لو لا بنی اسرائیل لم یخنت الطعام اللحم ولو لا حواء لم تخن انثی زوجھا الدھر ...... روای البخاری ومسلم ... قوله لم نخنز اللحم ینتن ولم یتغیر " (خازن)

حضرت ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر بنی اسرائیل طعام میں خیانت نہ کرتے تو گوشت کبھی بھی بدبودار نہ ہوتا، اور حضرت حواء اگر خیانت (حضرت آدم علیہ السلام کو دانہ کھلانے کی) نہ کرتیں تو کبھی بھی کوئی عورت اپنے خاوند کی خیانت نہ کرتی۔ بنی اسرائیل نے من اور سلویٰ کو جب سے جمع کرنا شروع کیا اور اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی کی اس وقت سے گوشت خراب ہونا اور بدبودار ہونا شروع ہوا ورنہ پہلے گوشت کتنے دن بھی پڑا رہے کبھی خراب نہیں ہوتا تھا۔ (از خازن)

ذخیرہ اندوزی کی مذمت احادیث سے:

" عن معمر قال قال رسول الله ﷺ من احتکر فھو خاطی "

(رواہ مسلم، مشکوۃ باب الاحتکار)

حضرت معمر ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے ذخیرہ اندوزی کی وہ گنہگار ہوا۔

تنبیہ: یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ذخیرہ اندوزی کیا ہے اور کس چیز میں ہے اور کس حال میں منع ہے۔

" الاحتکار المحرم ھو فی الاقوات خاصة بان یشتری الطعام فی

وقت الغلاء ولا یبیعه فی الحال بل یدخره لیغلوا فاما اذا جاء قریة او اشتراه فی وقت الرخص واذخره وباعه فی وقت الغلاء فلیس باحتکار ولا تحریم فیه واما غیر الاقوات فلا یحرم الاحتکار فیه بکل حال طیبی " (حاشیه مشکوة)

ذخیرہ اندوزی کا تعلق صرف انسانوں کی روزی (اور جانوروں کے چارہ وغیرہ سے ہے) جب انسانوں کو طعام وغیرہ کی ضرورت ہو اور جانوروں کے چارہ کی ضرورت ہو طعام اور چارہ وغیرہ کم ہونے کی وجہ سے مہنگے ہو رہے ہوں اس وقت ان چیزوں کو خرید کر جمع کر لینا اور مہنگا ہونے کی انتظار کرنا، لوگ مصیبت میں اپنا وقت گزار رہے ہوں، یہ ذخیرہ اندوزی حرام ہے۔

اگر کسی آدمی نے دیہات سے سستا غلہ خرید لیا یا شہر سے ہی خرید لیا اس وقت اس کی قیمت کم تھی۔ اس نے وہ غلہ رکھ لیا کہ ابھی کچھ دنوں کے بعد ان چیزوں کی قیمتیں بڑھیں گی، لوگوں کو ان چیزوں کی کمی نہیں وافر مقدار میں مل رہی ہیں، یہ ذخیرہ اندوزی جائز ہے اس میں لوگوں کو مصیبت میں نہیں ڈالا گیا انسانوں یا جانوروں کی روزی کے بغیر باقی چیزوں کی ذخیرہ اندوزی ہر حال میں جائز ہے چونکہ ان چیزوں کے بغیر بھی انسان یا جانور زندہ رہ سکتے ہیں۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ اپنی زمین کی پیداوار خواہ اپنی ضرورت سے وافر مقدار میں ہی کیوں نہ ہو اسے جمع کر کے رکھ لینا نہ بیچنا کوئی گناہ نہیں۔ ہاں ضرورت مندوں پر بیچنا، مہنگے ہونے کی انتظار نہ کرنا ثواب ہے لوگوں پر مہربانی ہے اصل میں کسی پر مہربانی کرنا ہی رب تعالیٰ کی مہربانی کا ذریعہ ہے۔

☆ " عن عمر النبی ﷺ قال الجالب مرزوق والمحتکر ملعون "

(رواه ابن ماجه والدارمی مشکوة باب الاحتکار)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا طعام وغیرہ باہر سے لے کر مناسب قیمت سے بیچنے والے کو رزق دیا جاتا ہے اور ذخیرہ اندوز لعنت کا مستحق ہوتا ہے۔

جالب ضد ہے محتکر کی، یعنی لوگوں کو جب ضرورت ہو غلہ کی اور جانوروں کے چارہ کی تو وہ تاجر جو حاجت مندوں کی ضرورت کو دیکھ کر دیہاتوں اور دوسرے شہروں سے یہ اشیاء خرید کر لائے بہت مناسب نفع لے، لوگوں کی ضرورت سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائے بہت مہنگا سودا نہ بیچے بلکہ مناسب قیمت

لے تو اسکے رزق میں برکت ہوگی رب تعالیٰ کی اس پر رحمت ہوگی لوگوں کی دعائیں اسکے ساتھ ہوں گی۔
ذخیرہ اندوز لوگوں کو تکلیف پہنچانے والا ، اپنے مال سے ناجائز فائدہ اٹھانے والا ، لوگوں کی ضرورت کو دیکھ کر ان کو اور زیادہ ستانے والا لوگوں کو دعاء سے محروم ہو جاتا ہے رب کی رحمت سے دور ہوتا ہے اس کے رزق میں بے برکتی آ جاتی ہے۔

☆ "وعن انس قال غلا السعر علی عھد النبی ﷺ فقالوا یا رسول اللہ سعر لنا فقال النبی ﷺ ان اللہ ھو المسعر القابض الباسط الرزاق وانی لارجو ان القی زبی ولیس احد منکم یطلبنی بمظلمة بدم ولا مال" (رواہ الترمذی وابن ماجہ وابو داؤد والدارمی ، مشکوۃ باب الاحتکا)

حضرت انس ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایک مرتبہ چیزیں مہنگی ہوگئیں صحابہ کرام نے عرض کیا یارسول اللہ ہمارے لئے چیزوں کا بھاؤ مقرر فرما دیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے بھاؤ مقرر کرنا۔ رزق کو تنگ کرنے والا اور رزق کو کشادہ کرنے والا وہی ہے، رزق دینے والا وہی ہے، بیشک میں امید کرتا ہوں کہ میری ملاقات جب میرے رب سے ہو گی تو تم میں سے کوئی ایک بھی مجھ سے ظلم کا مطالبہ نہیں کرے گا کہ میں نے کسی کا ناحق خون بہا کر ظلم کیا ہو یا کسی کے مال کو نقصان پہنچا کر ظلم کیا ہو، کہ قیامت کے دن لوگ رب تعالیٰ کو یہ کہہ رہے ہوں کہ ہمیں اس ظلم کا بدلہ دلایا جائے۔

"وجه النھی بالتسعیر لان التصرف فی اموال الناس بغیر اذنھم فیکون ظلما وربما یؤدی الی القحط والمراد انه لا یکلف الناس بالتسعیر ولکن یؤمرون بالانصاف والشفقة علی الخلق والنصیحة لھم" (لمعات)

گویا کہ بھاؤ مقرر کرنے سے نبی کریم ﷺ نے لوگوں کو منع کیا ہے خود بھی بھاؤ مقرر نہیں کیا۔ اسلئے کہ لوگوں کے مالوں میں ان کی اجازت کے بغیر تصرف کرنا ظلم ہے بسا اوقات یہ قحط تک پہنچاتا ہے۔ مراد اس سے یہی ہے کہ خود (حاکم) بھاؤ مقرر کر کے لوگوں پر ظلم نہ کریں کیونکہ ان کو بھاؤ مقرر کرنے کا مکلّف ہی نہیں بنایا گیا ہاں البتہ لوگوں کو انصاف کرنے کا حکم دیا جائے اور مخلوق پر شفقت کی جائے اور ان کو نصیحت کی جائے

"(قوله انی لارجو) فیه اشارة الی المانع من التسعیر مخافة ان یظلم فی اموالھم"

نبی کریم ﷺ نے خود بھاؤ اسی لئے مقرر نہیں فرمایا کہ کہیں لوگوں کے مالوں میں ناجائز

ظلم نہ ہوجائے۔

تنبیہ : پہلے یہ بحث تفصیلی طور پر بیان ہوچکی ہے کہ انبیاء کرام صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے پاک ہیں اسلئے نبی کریم ﷺ کا بھاؤ مقرر نہ کرنا تعلیم امت کے لئے تھا ورنہ آپ سے ظلم ہونا یہ ممکن ہی نہیں۔ بلکہ یوں سمجھیں کہ آپ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ میں بھاؤ اس لئے مقرر نہیں کرتا کہ آج اگر میں نے بھاؤ مقرر کردیا تو میری امت کے حکام بھی بھاؤ مقرر کریں گے، ان پر مجھے یہ خوف ہے کہ کہیں وہ لوگوں کے مالوں پر ظلم کر کے اپنی عاقبت برباد نہ کردیں۔

ضمناً یہ بھی سمجھا دیا کہ اے میری امت لوگوں کے ناحق خون بہا کر اپنے آپ کو جہنم کے عذاب کا مستحق نہ بنانا۔

☆ " عن عمر بن الخطاب قال سمعت رسول الله ﷺ یقول من احتکر علی المسلمین طعامهم ضربه الله بالجذام والافلاس "

(رواہ ابن ماجہ والبیهقی فی شعب الایمان ورزین فی کتابه مشکوۃ باب الاحتکار)

حضرت عمر ابن خطاب ؓ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا "جو شخص مسلمانوں کے طعام کو ذخیرہ اندوزی کرے گا، اللہ تعالیٰ اس پر کوڑھ اور غربت کو مسلط کرے گا۔

یعنی مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو بدن اور مال کو آزمائش میں مبتلاء کرے گا برکت اور خیران سے اٹھ جائیگی۔

☆ " وعن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ من احتکر طعاما اربعین یوما یرید به الغلاء فقد بری من الله وبری الله منه " (رواہ رزین، مشکوۃ باب الاحتکار)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ جس شخص نے چالیس دن تک طعام کو روکے رکھا اور مہنگا ہونے کا ارادہ کرتا رہا تو وہ اللہ تعالیٰ سے دور ہوگیا۔ اور اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے لحاظ سے اس سے دور ہوگیا۔ یعنی اس شخص نے رب تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کر کے اس کے وعدہ کو توڑ دیا رب تعالیٰ نے بھی اسے جو اپنی امان اور حفاظت کا وعدہ کر رکھا تھا وہ بھی اس شخص نے ختم کرنے کا خود ہی سبب بنالیا۔

☆ "وعن ابی امامة ان رسول الله ﷺ قال من احتکر طعاما اربعین یوما " ثم تصدق به لم یکن له کفارة " (رواہ رزین، مشکوۃ کتاب الاحتکار)

حضرت ابوامامہ ﷜ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے چالیس دنوں تک طعام کو روک کر رکھا پھر صدقہ (بھی) کرے تو اس کا کفارہ نہیں بن سکتا۔

☆ "وعن معاذ قال سمعت رسول الله ﷺ يقول بئس العبد المحتكر ان ارخص الله الاسعار حزن وان اغلاها فرح"

(رواه البيهقى فى شعب الايمان ورزين فى كتابه، مشكوة باب الاحتكار)

حضرت معاذ ﷜ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ وہ شخص بہت برا ہے جو شخص طعام کو روک کر رکھے جب اللہ تعالیٰ بھاؤ سستے کر دے تو وہ غمناک ہو جائے اور اگر مہنگا کر دے تو وہ خوش ہو جائے۔

﴿كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ﴾ : ''کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تمہیں عطا کیں'' یعنی پاکیزہ اور لذت دار من اور سلوی کھاؤ، لیکن ذخیرہ نہ بنانا، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی تبدیلی نہ طلب کرنا، کیونکہ یہ شکر کے مخالف ہے۔

﴿وَمَا ظَلَمُوْنَا﴾ : انہوں نے ناشکری کی، ذخیرہ اندوزی کی، اور من وسلوی کے تبدیل کرنے کا مطالبہ کیا ان نافرمانیوں کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے انعام سے محروم ہو گئے، حالانکہ ان پر جو فیضان تھا اس میں ان کو کوئی مشقت نہیں اٹھانی پڑتی تھی اور نہ ہی اس کھانے کا ان سے کوئی حساب لیا جاتا لیکن انہوں نے ناشکری سے اپنے آپ کو اس نعمت سے محروم کر دیا تو رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾

اور انہوں نے نہیں ظلم کیا ہم پر، لیکن وہ اپنی جانوں پر ہی ظلم کرتے تھے۔ (از تبصیر الرحمن)

نبی کریم ﷺ کے معجزات کی ایک جھلک:

"عن جابر ان ام مالك كانت تهدى للنبى ﷺ فى عكة لها سمنا فياتيها بنوها فيسالون الادم وليس عندهم شئى فتعمد الى الذى كانت تهدى فيه للنبى ﷺ فتجد فيه سمنا فما زال يقيم لها ادم بيتها حتى عصرته فاتت النبى ﷺ فقال عصرتيها فقالت نعم قال لو تركتيها ما زال قائما"

(مسلم ج ۲ ص ۲۵۴ باب فى معجزات النبى ﷺ)

حضرت جابر ﷺ فرماتے ہیں کہ ام مالک رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کو چمڑے کے ایک برتن (کپے) میں گھی بطور ہدیہ دیا کرتی تھیں ان کے بیٹے جب ان کے پاس آ کر مطالبہ کرتے کہ کوئی چیز دیں جس سے روٹی کھائیں اور کوئی چیز نہیں ہوتی تھی تو وہ اس برتن کے پاس آتیں جس میں نبی کریم ﷺ کو گھی ہدیہ دیتی تھیں، اس برتن میں ان کو گھی میسر ہوتا تھا۔ وہی اپنے بچوں کو دیتی تھیں جس سے ملا کر وہ روٹی کھا لیتے تھے یہ سلسلہ کافی دیر تک رہا، ایک مرتبہ انہوں نے برتن کو نچوڑ لیا تو وہ گھی حاصل ہونا بھی ختم ہو گیا۔ وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو آپ نے فرمایا کیا تم نے اس برتن کو نچوڑ لیا تھا انہوں نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ تو آپ نے فرمایا اگر تم اسے اسی طرح چھوڑتی (یعنی نہ نچوڑتی) تو ہمیشہ (تمہیں گھی میسر ہونے کا سلسلہ) قائم رہتا۔

☆ "عن جابر ان رجلا اتی النبی ﷺ یستطعمه فاطعمه شطر وسق شعیر فما زال الرجل یاکل منه وامرأته وضیفهما حتی کاله فاتی النبی ﷺ فقال لو لم تکله لاکلتم منه ولقام لکم" (مسلم شریف ج ۲ ص ۲۴۵ باب المعجزات)

حضرت جابر ﷺ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے طعام طلب کیا تو نبی کریم ﷺ نے انہیں نصف وسق (ایک سو بیس کلو تقریباً) جو دیئے۔ وہ شخص اور ان کی زوجہ اور ان دونوں کے مہمان کھاتے رہے، یہاں تک کہ ایک دن انہوں نے ان کو کیل کر لیا (ماپ لیا) وہ صحابی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا اگر تم ان کا (جو کے دانوں کا) کیل نہ کرتے تو وہ ہمیشہ کے لئے قائم رہتے تم کھاتے رہتے (وہ کبھی ختم نہ ہوتے)۔

ان دونوں حدیثوں کے متعلق علامہ نووی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں:

"ان عصرها وکیله مضاد للتسلیم والتوکل علی رزق الله تعالیٰ ویتضمن التدبیر والاخذ بالحول والقوة وتکلف الا حاطة باسرار حکم الله تعالیٰ وفضله فعوقب فاعله بزواله" (نووی)

اس عورت کے برتن کو نچوڑنے اور اس شخص کے کیل کرنے سے رب تعالیٰ کے رزق عطا کرنے پر توکل اور تسلیم اٹھ گئے، اپنی تدبیر کو درمیان میں دخل انداز کر دیا گیا تمام امور کو رب تعالیٰ کی طرف سپرد کرنا تھا کہ اسی کی عطا کردہ قوت سے کسی چیز کا حصول ہوتا ہے اور وہی کسی چیز کو دور کرے تو وہ چیز دور ہوتی ہے، لیکن انسان جب اپنے آپ

پر بھروسہ کرے اور یہ کوشش کرے کہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کے علم کے اسرار کا احاطہ کرسکتا ہوں تو اس شخص کو بطور سزا اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے محروم کردیتا ہے۔

☆ ”عن جابر قال انا یوم الخندق نحضر فعرضت کدیة شدیدة فجاؤا النبی ﷺ فقالوا هذه کدیة عرضت فی الخندق فقال انا نازل ثم قام وبطنه معصوب بحجر ولبثنا ثلاثة ایام لا نذوق ذواقا فاخذ النبی ﷺ المعول فضرب کثیبا اهیل فانکفأت الی امرأتی فقلت هل عندک شئی فانی رأیت بالنبی ﷺ خمصا شدیدا فاخرجت جرابا فیه صاع من شعیر ولنا بهمة داجن فذبحتها وطحنت الشعیر حتی جعلنا اللحم فی البرمة ثم جئت النبی ﷺ فساررته فقلت یا رسول الله ذبحنا بهیمة لنا وطحنت صاعا من شعیر فتعال انت ونفر معک فصاح النبی ﷺ یا اهل الخندق ان جابرا صنع سورا فحی هلابکم فقال رسول الله ﷺ لا تنزلن برمتک ولا تخبزن عجینکم حتی اجئی وجاء فاخرجت له عجینا فبصق فیه وبارک ثم عمد الی برمتنا فبصق وبارک ثم قال ادعی خابزة فلتخبز معک واقدحی من برمتکم ولا تنزلوها وهم الف فاقسم بالله لا کلوا حتی ترکوه وانحرفوا وان برمتنا لتغلط کما هی وان عجیننا لیخبز کما هو“ (بخاری، مسلم مشکوۃ باب فی المعجزات)

حضرت جابر ﷺ فرماتے ہیں ہم غزوہ خندق کی کھدائی کر رہے تھے ایک شدید چٹان آ گئی (جس میں کوئی کدال وغیرہ اثر نہیں کر رہی تھیں) صحابہ کرام نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو خندق میں آنے والی چٹان کا ذکر فرمایا آپ نے فرمایا میں خود اس خندق میں اترتا ہوں۔ آپ جب خندق میں اتر کر کھڑے ہوئے تو آپ کے پیٹ پر پتھر باندھا ہوا تھا، (حضرت جابر کہتے ہیں) ہم نے بھی تین دنوں سے کچھ نہیں کھایا تھا، نبی کریم ﷺ نے کدال کو لیا اور اس چٹان پر مارا، ایک ہی ضرب سے وہ چٹان (سخت پتھر) ریت کی طرح ریزہ ریزہ ہو کر ٹوٹ گیا۔ میں اپنے گھر اپنی زوجہ کے پاس آیا، میں نے کہا تمہارے پاس کوئی چیز ہے؟ میں نے نبی کریم ﷺ کو بہت بھوک میں مبتلاء دیکھا۔ تو میری زوجہ نے ایک تھیلا نکالا جس میں ایک صاع (چار کلو) جو کے دانے تھے۔ اور ہمارا ایک بکری کا بچہ تھا (جو چھ ماہ سے کم عمر کا تھا) میں نے بکری کے بچے کو ذبح کیا اور میری زوجہ نے جو کا آٹا بنایا۔ یہاں تک کہ ہم نے گوشت کو ہنڈیا میں ڈالا، پھر میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا میں نے آپ سے آہستہ کان میں عرض کیا یا رسول اللہ ہم نے بکری کا ایک بچہ ذبح کیا اور ایک صاع جو کا آٹا تیار کیا آپ بھی آ جائیں اور آپ کے ساتھ کچھ اور حضرات بھی (جن کو یہ کھانا پورا ہو سکے) نبی کریم ﷺ نے بلند آواز سے اعلان

فرمایا، اے اہل خندق بیشک جابر نے دعوت کی ہے سب جلدی چلو۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اپنی ہنڈیا کو چولہے سے نہ اتارنا اور اپنے آٹے سے روٹیاں نہ پکانا یہاں تک کہ میں آ جاؤں نبی کریم ﷺ تشریف لے آئے میں نے آپ کے پاس آٹا پیش کیا آپ نے اس میں لعاب ڈالا اور برکت کی دعا کی۔ پھر آپ ہنڈیا کے پاس آئے اس میں لعاب ڈالا اور برکت کی دعا کی۔ پھر آپ نے حضرت جابر کی زوجہ کو فرمایا روٹی پکانے والی کوئی اور بھی بلالو جو تمہارے ساتھ مل کر روٹی پکائے اور ہنڈیا سے گوشت پیالوں میں ڈالو، لیکن ہنڈیا کو نہ اتارو۔ صحابہ کرام ایک ہزار کی تعداد میں تھے، قسم ہے اللہ تعالیٰ کی تمام سیر ہو کر کھا کر چلے گئے کھانا بقیہ چھوڑ کر چلے گئے بیشک ہماری ہنڈیا اسی طرح جوش مار رہی تھی بیشک ہمارے آٹے سے روٹیاں پک رہی تھیں آٹا اسی طرح موجود تھا۔

حدیث پاک کی وضاحت:

نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام نے بہت مشکلات برداشت کیں تین تین دن تک سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا بلکہ مدینہ طیبہ میں تین دن تک دو وقت سیر ہو کر گندم کی روٹی کھانا نبی کریم ﷺ سے ثابت نہیں۔

آج بات بات پر جہلاء جب یہ پوچھتے ہیں کہ یہاں دعاء نبی کریم ﷺ نے کی تھی۔ یہ کام نبی کریم ﷺ نے کیا تھا؟ تو مجھے ان جہلا کی قسمت پر افسوس ہوتا ہے کہ کتنے بدقسمت ہیں کہ ان کو علم کی ہوا بھی نہیں لگی۔ یہ تو پوچھتے ہیں کہ جنازہ کے بعد نبی کریم ﷺ نے دعاء کی تھی؟ فرض نماز کے بعد دعاء کی تھی؟ تمام نماز کے مکمل ہونے کے بعد اجتماعی دعا کی تھی، لیکن یہ نہیں پوچھتے کہ نبی کریم نے ﷺ ایک دن میں تین تین وقت کھانا کھایا تھا؟ کیا آپ نے فاخرانہ لباس پہنا تھا، کیا آپ نے گاڑیوں پر سفر کیا تھا کیا آپ نے ہوائی جہاز پر سفر کیا تھا۔ اگر یہ کام نہیں کیے تھے تو نا جائز ہیں۔

یہ سوال نہیں کرتے، یہ کریں بھی تو کیوں کریں ان چیزوں کو تو وہ ختم نہیں کر سکتے، ان کو ختم کرنے سے ان کے نخرے ختم ہو جاتے ہیں، وہ اپنا فاخرانہ انداز ختم کر دیں یہ تو نہیں ہو سکتا۔ بھوکے رہ کر کمزور ہو جائیں، یہ تو نہیں ہو سکتا، سبحان اللہ صرف نیکی کے کاموں سے روکنا ان کا کام ہے سیدھے سادھے عوام کو دھوکا دینا ان کا وطیرہ ہے۔

☆ نبی کریم ﷺ کا عظیم معجزہ ظاہر ہوا کہ تمام صحابہ کرام جس پتھر کو توڑنے سے عاجز آ گئے جس پتھر کو

توڑنے میں کوئی آلہ کام نہیں کر رہا تھا، اس پتھر کو کدال کی ایک ضرب سے ریت کی طرح ریزہ ریزہ کر دینا نبی کریم ﷺ کا عظیم معجزہ ہی تو تھا۔

☆ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو کہتے ہیں " فساررتہ " میں نے آپ سے سرگوشی کی اس سے پتہ چلا کہ بوقت ضرورت جماعت میں سے کسی ایک سے علیحدگی میں گفتگو کرنا جائز ہے۔

☆ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو بتایا کہ ہم نے ایک صاع جو کا آٹا تیار کیا ہے۔ مقصد اس بتانے میں یہ تھا " ان هذا قدر يسير واصحابک کسير " بیشک یہ تھوڑی مقدار میں کھانا ہے آپ کے اصحاب بہت تعداد میں ہیں۔ اس لئے آپ اتنے صحابہ کو ساتھ لے کر آئیں جن کو یہ کھانا کفایت کر جائے۔

☆ نبی کریم ﷺ نے جب ایک ہزار کی تعداد صحابہ کرام کو دعوت دے دی تو آپ کو یہ علم حاصل تھا کہ چار کلو جو کا آٹا اور ایک بکری کے بچے کا گوشت ان تمام کو کفایت کر جائے گا۔ کیونکہ اس میں برکت آجائے گی جو قلیل ہونے کے باوجود کثیر کو کفایت کرے گا۔

☆ نبی کریم ﷺ کے لعاب مبارک میں اتنی عظیم برکت تھی کہ تھوڑا آٹا بڑھ گیا اور تھوڑا گوشت بڑھ گیا۔ آج کل کے یہودیوں کے ایجنٹ جوایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ اور یہ ثابت کرنے کی بھر پور کوشش کر رہے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایک عام انسان ہی تو تھے...... معاذ اللہ۔

ان بیہودہ لوگوں سے میں پوچھتا ہوں تمہارے تھوک میں بھی یہ کمال ہے؟ ذرا کھانے میں تھوک کر تو دیکھو، اس کھانے کو کھانے والے تمہارے منہ پر تھپڑ لگائیں گے کہ تم نے سارا کھانا ہی برباد کر دیا ہے۔ حدیث شریف میں ذکر ہے "وبارک " اس کا معنی بیان کرتے ہوئے ملا علی قاری رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں:

" ای ودعا بالبركة فيه " آپ نے آٹے اور گوشت میں برکت کی دعا فرمائی۔

سبحان اللہ اسی سے ایک اور مسئلہ حل ہو گیا آج کل ایصال ثواب کے لئے کھانا سامنے رکھ کر دعاء کی جائے تو جہلاء کو یہی کہتے ہوئے سنتے ہیں نبی کریم ﷺ نے یہ نہیں کیا۔ کاش کہ وہ احادیث کا مطالعہ

کریں تو انہیں سمجھ آ جائے کہ نبی کریم ﷺ نے کھانا سامنے رکھ کر اس میں برکت کی دعاء کی اب آپ ہی بتائیں وہ کھانا حرام ہوا تھا یا کہ برکت والا ہوا تھا۔

اس پر جہلاء کی جانب سے ایک اور عجیب سوال ہوتا ہے جو ان کی حماقت پر دلالت کرنے کے ساتھ ساتھ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کی گستاخی پر دلالت کرتا ہے وہ سوال یہ کیا جاتا ہے کہ جس کھانے کو سامنے رکھ کر قرآن پاک پڑھا گیا اس کی ہڈیاں اور چھلکے بھی بابرکت ہو جائیں گے ان کو تم کھاتے کیوں نہیں، ان کو پھینکتے کیوں ہو؟

سبحان اللہ کیسا سوال؟ نبی کریم ﷺ نے کھانے کے پاس آ کر برکت کی دعا بھی کی لیکن ہڈیوں کو پھینکا بھی گیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام بمع ہڈیوں کے کھا گئے تھے تو یہ ان محترم حضرات کی شان میں درحقیقت گستاخی ہوگی۔

☆ صرف کھانے میں برکت نہیں ہوئی بلکہ پکانے والی دونوں عورتوں کو بھی برکت حاصل ہوئی کہ پکانے والی دو عورتیں، ادھر روٹی پکا رہی ہیں ادھر سالن برتنوں میں ڈال رہی ہیں، تھوڑے وقت میں ہزار آدمیوں کی روٹی تیار ہو جائے یہ معمولی کام نہیں۔ یہ صرف نبی کریم ﷺ کی دعاء کی برکت تھی۔

''لتغط'' کا معنیٰ جو پیش کیا گیا ہے اس پر مرقاۃ کی عبادت مدنظر رہے:

(لتغط) بکسر الغین المعجمة وتشدید الطاء المهملة ای لتفور وتغلي ویسمع غلیانها'' (ماخوذ از مرقاۃ ج ۱۱ ص ۱۶۹ بزیادۃ)

تنبیہ: نبی کریم ﷺ کے کثیر معجزات میں سے دو تین مثالیں اس لئے پیش کیں تاکہ دینی مدارس کی چھوٹی کلاسوں کے طلباء کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کے ساتھ ساتھ نبی کریم ﷺ کے معجزات بھی ذہن نشین ہوتے چلے جائیں تاکہ عظمت مصطفیٰ ﷺ دلوں میں جاگزین ہو جائے۔

☆☆☆

﴿وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ﴾

۱) ''اور جب ہم نے فرمایا اس بستی میں جاؤ پھر اس میں جہاں چاہو بے روک ٹوک کھاؤ، اور دروازے میں سجدہ کرتے داخل ہو اور کہو ہمارے گناہ معاف ہوں، ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے اور قریب ہے کی نیکی والوں کو اور زیادہ دیں''۔

۲) ''اور جب ہم نے کہا داخل ہو جاؤ اس بستی میں، تو کھاؤ اس سے جہاں سے تم چاہو'' بغیر کسی رکاوٹ کے، اور داخل ہو تم دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے، اور کہو ہمارے گناہ معاف فرما ہم بخش دیں گے تمہارے گناہ اور قریب ہے کہ ہم اور زیادہ دیں گے نیکی کرنے والوں کو''۔

اس آیۃ کریمہ اور آنے والی آیت کریمہ کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں میدان تیہ سے نکل کر ایک بستی میں داخل ہونے کا حکم دیا، اور ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ جب تم اس میں داخل ہو تو عجز وانکساری سے سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا اور زبان سے '' حطة '' (ہمارے گناہ معاف ہوں) کہنا لیکن قوم نے اپنی سابقہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے سرکشی سے سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونے کے بجائے اپنی سرینوں کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہونا اختیار کیا اور '' حطة '' کہنے کی جگہ ''حنطة'' (ہمیں گندم چاہئے) کہا۔ ان کی سرکشی اور حدود سے تجاوز کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے طاعون کا عذاب بھیجا جس سے وہ چوبیس ہزار کی تعداد میں مر گئے۔ (از کبیر)

وہ بستی کون سی تھی؟ بعض حضرات نے کہا کہ وہ بستی بیت المقدس تھی۔ لیکن قاضی بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بیت المقدس نہیں:

'' فانهم لم يدخلوا بيت المقدس فى حياة موسى عليه السلام ''

کیونکہ بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں بیت المقدس میں داخل نہیں ہوئے۔

اس لئے کہ میدان تیہ میں ہی حضرت ہارون علیہ السلام فوت ہوئے۔ اور ایک سال بعد میدان

تیہ میں ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام فوت ہوئے۔ (بیضاوی ، شیخ زادہ)

بیت المقدس کا قول کرنے والوں کو غلط فہمی اس لئے ہوئی کہ وہاں ایک دروازہ ہے جس میں سے لوگ داخل ہو کر اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتے ہیں اس کا نام "حطة" ہے اسی وجہ سے یہ سمجھ لیا گیا کہ شائد بنی اسرائیل کو اسی دروازہ سے داخل ہونے کا حکم دیا گیا ہے، حالانکہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بیت المقدس کی تعمیر یا دروازہ کا نام "حطة" تھا ہی نہیں۔ (از عزیزی)

راقم نے تذکرۃ الانبیاء میں تحریر کیا ہے جب موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کا واقعہ مراد لیا جائے تو بستی سے مراد "اریحا" ہوگی کیونکہ موسیٰ علیہ السلام بیت المقدس میں داخل نہیں ہوئے اگر بیت المقدس مراد لیا جائے تو یہ واقعہ حضرت ہارون علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے بعد حضرت یوشع کے زمانہ سے متعلق ہوگا۔

مختلف کتب کے مطالعہ سے خصوصاً شیخ زادہ سے شاندار محاکمہ سمجھ میں آتا ہے کہ "اریحا" بیت المقدس کے مضافات سے ہے لہٰذا یہاں جس بستی کا ذکر ہے وہ اور جس کا "یقوم ادخلوا الارض المقدسة" میں ذکر ہے ایک ہی ہے۔ اسی طرح اور بات یہ سمجھ آتی ہے کہ انہوں نے مطالبہ تو موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں کیا تھا کہ ہمیں اس میدان تیہ سے نکال کر ایسی بستی میں داخل کر دیا جائے جہاں ہم کھیتی باڑی کریں، ان سے وعدہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں کر دیا گیا تاہم ان کو اس بستی میں داخل ہونے کا حکم حضرت یوشع علیہ السلام کے زمانہ میں دیا گیا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ نے بہت خوب بیان کیا کہ اس تاریخی پہلو میں الجھنے کی ضرورت ہی نہیں بلکہ قرآن پاک کے اصل مقصود کو دیکھا جائے آپ فرماتے ہیں:

> "ایک چیز قرآن کا مطالعہ کرتے وقت ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیے وہ یہ ہے کہ قرآن جن واقعات کا ذکر کرتا ہے اس سے مقصود صرف عبرت وموعظت ہوتی ہے، اس سے واقعہ کی تاریخی حیثیت کا بیان مطلوب نہیں ہوتا، اس لئے قرآن ان واقعات کے صرف ان پہلوؤں کو بیان کرتا ہے جن میں درس عبرت ہو۔ عموماً غیر ضروری تفصیلات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، جو لوگ قرآن حکیم کی اس خصوصیت کو ملحوظ نہیں رکھتے وہ قصص قرآنی میں تاریخی کتب کی طرح تفصیلات کا تسلسل اور زمان ومکان کا تعین نہیں پاتے تو وہ طرح طرح کے شکوک وشبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں" (ضیاء القرآن)

﴿ سُجَّدًا ﴾: بعض مفسرین نے یہاں لغوی معنی مراد لیا ہے کہ شہر میں داخل ہونا، جھکتے ہوئے، عاجزی کرتے ہوئے جس طرح رکوع کرنے والے جھکتے ہیں۔اور بعض حضرات نے سجدہ کا شرعی معنی مراد لیا ہے کہ تم شہر میں داخل ہوتے وقت (پہلے میدان تیہ سے نکلنے کی وجہ سے اور تمہاری دعا کے قبول ہونے کی وجہ سے (کہ ہمیں یہاں سے نکال) تمہیں چاہئے کہ) پہلے سجدہ شکر بجالاؤ پھر اس بستی میں داخل ہو۔

خیال رہے قریہ کو قریہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کے جمع ہونے کہ جگہ ہے جس طرح کہا جاتا " قریت الماء " میں نے پانی جمع کیا۔اس لئے قریہ زیادہ طور پر بستی، دیہات پر بولا جاتا ہے، لیکن کبھی صرف لغوی معنی کا اعتبار کرتے ہوئے شہر کو بھی قریہ کہہ لیا جاتا ہے۔

﴿ وَّقُوۡلُوۡا حِطَّةٌ ﴾: " ای حط عنا خطایانا ، امروا بالاستغفار ، وقال ابن عباس قولوا لا اله الا الله لانها تحط الذنوب "

یعنی " حطة " کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ ہمارے گناہ معاف فرما، ان کو استغفار کا حکم دیا گیا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ان کو حکم دیا گیا کہ تم " لا الـه الا الله " کہتے ہوئے اس بستی میں داخل ہونا کیونکہ اس کلمہ کے پڑھنے سے گناہ معاف ہوتے ہیں ۔ بظاہر وہم ہوتا ہے کہ "حطة " کا مطلب تو صرف معاف کرنا ہے۔گناہوں کا ذکر کیسے ہے تو اس کا جواب دیا گیا کہ ایک وجہ تو یہ ہے کہ جب ان کو حکم دیا گیا تم یہ کہو تو اس سے مطلب ان کی خطائیں اور گناہ ہی ہو سکتے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ آگے آنے والے الفاظ گرامی اس پر قرینہ ہیں کہ مراد گناہ ہی ہیں کیونکہ اس کے بعد فرمایا:

" (نـغـفـرلكم خطايا كم) ای نسترها عليكم من الغفر وهو الستر لان المغفرة تستر الذنوب "

ہم تمہارے گناہوں کی مغفرت کریں گے، یعنی ان کو چھپا کر ان پر قلم عفو پھیر دیں گے کیونکہ غفر کا معنی ہے ڈھانپنا۔

(وسنـزيـد المحسنين) نیکی کرنے والوں کو عنقریب اور زیادہ دیں گے اس سے مراد ثواب ہے۔ عنقریب سے مراد قیامت ہے، کیونکہ بنسبت اخروی زندگی کے قیامت قریب ہی ہے۔(از خازن بتغير)

﴿فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَنزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ﴾

۱) ''تو ظالموں نے اور بات بدل دی جو فرمائی گئی تھی اس کے سوا تو ہم نے آسمان سے ان پر عذاب اتارا بدلہ ان کے بے حکمی''

۲) ''تو تبدیل کر دیا ان لوگوں نے جنہوں نے ظلم کیا قول (بات) کو اس کے غیر سے جو ان کو کہا گیا تھا۔ تو نازل کیا ہم نے ان لوگوں پر جنہوں نے ظلم کیا عذاب آسمانوں سے۔ بوجہ اس کے کہ وہ فسق کرتے تھے''۔

یعنی بنی اسرائیل کو جب یہ کہا گیا کہ تم اس بستی میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ اور حطة (گناہ معاف فرما) کہو لیکن انہوں نے رب تعالیٰ کے ارشاد کو بدل دیا '' حبة من شعيرة '' کہا یا کہ '' حنطة '' یعنی انہوں نے گناہوں کی معافی طلب کرنے کے بجائے، گندم کا مطالبہ کیا کہ ہمیں تو دانے چاہیں۔ رب تعالیٰ نے انہیں سجدہ کرتے ہوئے بستی کے دروازے میں داخل ہونے کا حکم دیا، لیکن وہ سرین کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے۔

تو ان کے فسق کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان ظالموں پر عذاب بھیج کر ان کو تباہ و برباد کر دیا۔

﴿فَأَنزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا﴾: اس مقام پر ﴿فَأَنزَلْنَا عَلَيْهِمْ﴾ نہیں کہا (کہ ان پر نازل کیا بلکہ ﴿فَأَنزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا﴾ کہا اس لئے کہ ان کے معاملات کی زیادہ قباحت بیان کرنا مقصود تھا۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے '' ان انزال الرجز عليهم لظلمهم '' کہ بیشک ان پر عذاب کا نازل ہونا ان کے ظلم کی وجہ سے تھا۔

رجز سے مراد کیا ہے؟ '' ان الرجز هو العذاب '' رجز سے مراد عذاب ہے، اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ﴾ ای العقوبة '' جب ان پر عذاب واقع ہوا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ ﴾ میں بھی ''رجز'' عذاب کے معنی میں استعمال ہے:

'' وذكر الزجاج ان الرجز والرجس معناهما واحد وهو العذاب ''

زجاج نے یہ بیان کیا ہے کہ '' رجز'' اور '' رجس'' دونوں کا معنی ایک ہے اور وہ ہے ''عذاب'' اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ ﴾ میں ''رجز'' کا معنی شیطان کا وسوسہ اور کفر کی طرف بلانا، وہ بھی عذاب کا ہی سبب ہے۔

رجز سے مراد کون سا عذاب ہے؟ '' لا دلالة فی الآیة علیه '' آیت کریمہ میں تو یہ ذکر نہیں کیا گیا کہ وہ کون سا عذاب ہے البتہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد یہ ہے۔

'' مات منهم بالفجأة اربعة وعشرون الفافى ساعة واحدة ''

ان میں ایک ہی گھڑی میں اچانک چوبیس ہزار لوگ مر گئے۔

'' وقال ابن زيع بعث الله عليهم الطاعون حتى مات من الغداة الى العشى خمس وعشرون الفاو لم يبق منهم احد ''

ابن زید رحمہ اللہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان پر طاعون کی مرض کو بھیجا، یہاں تک کہ صبح سے شام تک پچیس ہزار کی تعداد میں مر گئے، اور ان میں سے کوئی ایک بھی نہ بچ سکا۔

ابن زید رحمہ اللہ کے قول کے مطابق یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ '' فبدل الذين ظلموا منهم '' میں '' مــن '' تبعیضیہ ہے یعنی جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد کو بدلا وہ سب عذاب میں گرفتار ہو کر تباہ و برباد ہو گئے۔ البتہ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو نہیں بدلا وہ عذاب سے محفوظ رہے۔

﴿ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴾ ''بوجہ اس کے کہ وہ فسق کرتے تھے'' '' فالفسق هو الخروج المضمر '' پوشیدہ چیز کو نکالنا فسق ہے۔ اسی طرح پھل کے چھلکے سے نکلنے کیلئے بھی فسق کا لفظ استعمال کرتے ہیں جیسے کہا جاتا ہے ''فسقت الرطبة '' اور شرع میں فسق کا یہ معنی ہے

'' الخروج من طاعة الله الى معصيته '' اللہ تعالیٰ کی طاعت سے معصیت کی طرف نکلنا۔

اس آیہ کریمہ میں فسق سے مراد ان کا اپنی جانوں پر ظلم کرنا ہی مراد ہے۔

فائدہ : ابھی جن دو آیتوں کا ذکر ہوا۔ اسی مفہوم کو سورۃ اعراف میں بھی ذکر کیا گیا ہے کچھ

الفاظ میں فرق ہے۔سورۃ اعراف میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے:

﴿ وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓـٰٔتِكُمْ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾

سوال اول: سورۃ بقرۃ میں ذکر ہوا " واذ قلنا " اور سورۃ اعراف میں ذکر ہوا " واذ قیل لھم" وجہ فرق کیا ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کے اول میں صراحۃً ذکر کیا کہ اس قول کا کہنے والا اللہ تعالیٰ ہے اب بات واضح ہوگئی اس میں کوئی ابہام (پوشیدگی) باقی نہ رہی۔ چونکہ اس سے پہلے رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا:

﴿ اُذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ ﴾

جب رب تعالیٰ نعمتوں کو واضح طور پر اپنی طرف منسوب فرمایا کہ ''یاد کرو میری نعمتوں کو جو میں نے تم پر انعام فرمائی ہیں''تو ان نعمتوں کی تفصیل ذکر کرتے ہوئے بھی اپنی طرف ہی مناسب تھا لیکن سورۃ اعراف میں کوئی ابہام باقی نہ رہا تھا اس لئے فرمایا " واذاقیل " (اور جب ان کو کہا گیا)۔

سوال دوم: سورۃ بقرہ میں ذکر ہوا " واذ قلنا ادخلوا " (اور جب ہم نے کہا داخل ہو جاؤ) اور سورہ اعراف میں ذکر ہوا " واذاقیل لھم اسکنوا " اور جب ان کو کہا گیا ٹھہرو، سکونت اختیار کرو۔ایک جگہ داخل ہونے کا حکم دیا۔اور دوسری جگہ رہنے کا حکم دیا ان دونوں میں وجہ فرق کیا ہے؟

جواب: مقصد دونوں چیزیوں کا حکم دینا تھا کیونکہ ان کے مطالبہ کو پورا کیا جارہا تھا اس لئے حکم دیا گیا کہ اس بستی کے دروزہ سے سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ اور اسی میں سکونت اختیار کرلو۔دخول چونکہ سکونت سے پہلے ہوتا ہے اس لئے پہلی سورۃ میں دخول کا حکم دیا، اور بعد میں آنے والی سورۃ میں سکونت کا حکم دیا گیا۔

سوال سوم: سورۃ بقرہ میں ذکر کیا گیا " فکلوا " اس میں " فاء " ہے اور سورۃ اعراف میں ذکر کیا گیا" وکلوا " اس میں " واؤ " ہے یہ فرق کیوں کیا گیا؟

جواب: ہر وہ فعل جس کا عطف کسی چیز پر ہو، وہ فعل شرط کے درجہ میں ہو اور وہ چیز جزاء کے درجہ میں ہو وہاں فاء کا ذکر ہوتا ہے لیکن معطوف اور معطوف علیہ میں اگر شرط اور جزا کا درجہ نہ پایا

جائے تو وہاں فاء کوذکر نہیں کیا جاتا بلکہ واؤ کوذکر کیا جاتا ہے۔

سورۃ بقرہ میں ہے: ﴿ وَاذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا﴾ اس کوشرط وجزاء کادرجہ حاصل ہے۔اصل مفہوم یہ ہوگیا " ان دخلتموها اکلتم منها " اگرتم اس بستی میں داخل ہو گئے تو اس سے کھانا جوتم چاہو بلا روک ٹوک کے۔

لیکن سورۃ اعراف میں ذکر کیا گیا: ﴿ وَاذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ ﴾ اس میں شرط وجزاء کی حیثیت نہیں۔ یہ نہیں کہا گیا کہ تم اس بستی میں رہتے ہوئے ہی اس کے پھل کھا سکتے ہو۔ بلکہ حکم یہ تھا کہ اس بستی میں رہو، چاہو تو باغات میں جا کر وہاں ہی پھل کر پھر واپس بستی میں لوٹ آؤ، اور چاہو تو باغات سے پھل توڑ کر بستی میں لے آؤ اور بستی میں رہ کر کھاؤ۔اس لئے سورۃ اعراف میں " واؤ " سے عطف کیا گیا اور " فاء " سے عطف نہیں کیا گیا۔

سوال چہارم: سورۃ بقرۃ میں کہا گیا ﴿ نَغْفِرْلَكُمْ خَطَايَاكُمْ ﴾ اور سورۃ اعراف میں ذکر ہے ﴿ نَغْفِرْلَكُمْ خَطِيْئَاتِكُمْ ﴾ اگر چہ دونوں جمع کے صیغے ہیں لیکن علیحدہ علیحدہ جمع کے صیغے ذکر کرنے کا کیا مطلب؟

جواب: خطایا جمع کثرت ہے اور خطیئات جمع سالم ہے جو بغیر الف لام کے جمع قلت ہے۔سورۃ بقرہ میں جب رب تعالیٰ نے صراحۃ اپنی طرف نسبت کی " واذ قلنا ادخلو " کہا تو یقیناً اپنے جود وکرم کے لائق لفظ کو ذکر کیا کہ تم کتنے بھی کثیر گناہ کرو مجھ سے معافی طلب کرو تو میں کثیر گناہوں کو بھی معاف کر دیتا ہوں اس لئے یہاں جمع کثرت کا صیغہ ذکر کیا گیا۔اور سورۃ اعراف میں صراحۃ اپنی طرف نسبت نہیں کی بلکہ کہا ﴿ وَاذْ قِيْلَ لَهُمْ ﴾ (اور جب ان کو کہا گیا) اس لئے جمع قلت کو ذکر کر دیا گیا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جب فاعل کا صراحۃ ذکر کیا گیا تو اس کے کرم کے مناسب کثیر خطاؤں کی مغفرت کا ذکر کر دیا گیا۔اور جب فاعل کا صراحۃ ذکر نہیں کیا گیا تو جمع قلت کو ذکر کر دیا گیا۔یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ دیا جائے کہ ایک جگہ جمع کثرت ذکر کر کے، دوسری جگہ جمع قلت ذکر کر کے یہ بتا دیا گیا کہ خواہ کثیر گناہوں یا قلیل ہوں سب رب تعالیٰ ہی معاف کرتا ہے اسی کی طرف ہر حال میں رجوع کیا جائے۔

سوال پنجم: سورۃ بقرہ میں " رغدا " ذکر کیا اور سورۃ اعراف میں " رغدا " مذکور نہیں فرق کی وجہ کیا ہے؟

جواب: اس کا جواب بھی وہی ہے جو ابھی سوال چہارم کا ذکر کیا کہ رب تعالیٰ نے سورۃ بقرہ اپنی طرف صراحۃً نسبت کی تو عظیم انعام کا ذکر کیا۔ یعنی " رغدا " ذکر کر دیا گیا۔ اور سورۃ اعراف میں اپنی طرف صراحۃً نسبت نہیں کی تو " رغدا " ذکر نہیں کیا۔

" رغدا " کا معنی ہے بلا روک ٹوک، بافراغت، عیش وعشرت وغیرہ، یہ انعام کی عظمت پر دلالت کر رہا ہے۔

سوال ششم: سورۃ بقرہ میں ذکر کیا گیا ﴿ وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ ﴾ اور سورۃ اعراف میں ذکر کیا گیا ﴿ وَقُولُوا حِطَّةٌ وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا ﴾ اس تقدیم وتاخیر کی وجہ کیا ہے؟

جواب: واؤ مطلقاً جمع کے لئے آتی ہے ترتیب پر دلالت نہیں کرتی، اس لئے دونوں کا مطلب ایک ہی ہے تاہم حکمت یہ ہوسکتی ہے کہ بنی اسرائیل میں بعض لوگ گنہگار تھے اور بعض لوگ گنہگار نہیں تھے۔ جو لوگ گنہگار نہیں تھے ان کو عبادت کرنے کا پہلے حکم دیا گیا اور فرمایا گیا:

﴿ وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا ﴾ "دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو"۔

پھر ان کو کہا گیا:

﴿ وَقُولُوا حِطَّةٌ ﴾ "اور تم کہو ہمارے گناہ معاف کر"۔

یہ توبہ کرنے کا ان کو حکم اس لئے دیا گیا کہ ان میں عجز پایا جائے اور اپنے عبادت پر ناز نہ کریں۔ اور جو لوگ گہنگار تھے ان کو توبہ کرنے کا پہلے حکم دیا گیا۔ اور کہا گیا ﴿ وَقُولُوا حِطَّةٌ ﴾ اور پھر ان کو عبادت کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا:

﴿ وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا ﴾

سوال ہفتم: سورۃ بقرۃ میں ﴿ وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ﴾ ذکر کیا گیا جس میں "واؤ" ہے اور سورۃ اعراف میں ﴿ سَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ﴾ مذکور ہے جس میں "واؤ" نہیں وجہ فرق کیا ہے؟

جواب: دونوں سورتوں میں علیحدہ علیحدہ طریقہ اختیار کر کے دو ضابطوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا کہ کبھی

دو یا دو سے زیادہ چیزوں کو ذکر کر کے ان کے اوپر اسی طرح دو یا دو سے زیادہ احکام مرتب کر کے مجموع پر مجموع حکم مرتب ہوتا ہے۔ اور کبھی علیحدہ علیحدہ اعتبار کر کے علیحدہ علیحدہ احکام کو مرتب کیا جاتا ہے سورۃ بقرہ میں دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے، دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونے کا حکم، اور گناہوں کی معافی طلب کرنا، ان دونوں چیزوں کے مجموعہ پر دو چیزوں کا مجموعی حکم مرتب کیا، یعنی ہم تمہارے گناہ معاف کریں گے اور نیکی کرنے والوں پر زیادہ احسان کریں گے۔

سورۃ اعراف میں دوسرے ضابطہ کی طرف اشارہ فرمایا، کہ جو توبہ کرے گا، گناہوں کی معافی طلب کرے گا، ہم اس کے گناہ معاف کر دیں گے اور جو سجدہ کرتے ہوئے دروازہ میں داخل ہوں گے ہم ان نیکی کا کام کرنے والوں پر زیادہ احسان کریں گے۔ یعنی سورۃ اعراف میں علیحدہ علیحدہ چیزوں پر علیحدہ علیحدہ احکام مرتب فرمائے حقیقت بات ہی یہ ہے کہ عربی کے تمام قواعد ہی قرآن پاک کو دیکھ کر مرتب ہوئے۔

سوال ہشتم: سورۃ بقرۃ میں ذکر کیا گیا ﴿ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا ﴾ اور سورۃ اعراف میں ذکر فرمایا ﴿ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا ﴾ یعنی سورۃ بقرۃ میں " منهم " نہیں اور سورۃ اعراف میں " منهم " ہے وجہ فرق کیا ہے؟

جواب: سورۃ اعراف میں اس واقعہ کی ابتداء لفظ " من " سے ہے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴾

اور موسیٰ کی قوم سے ایک گروہ ہے کہ حق کی راہ بتاتا ہے اور اسی سے انصاف کرتا ہے۔

یعنی اس آیۃ میں ذکر کیا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام کی امت میں سے بعض لوگ یہ کرتے ہیں۔ پھر ان پر انعامات کی مختلف قسموں کا ذکر فرمایا، پھر ان کو جو اوامر دیئے گئے ان کا ذکر کیا گیا۔ اس واقعہ کے آخر میں پھر " من " ذکر فرمایا اور ارشاد ہوا: ﴿ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا ﴾ اسی طرح ابتداء اور انتہاء میں مناسبت پائی گئی۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ رب تعالیٰ کے قول کو تبدیل کرنے والے بعض تھے تمام کے تمام بدلنے والے نہیں تھے۔

سورۃ بقرۃ میں پہلے بعض کا ذکر نہیں کیا گیا تو ﴿ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ﴾ میں بھی " منهم " کو

ذکر نہیں کیا گیا۔اب وجہ فرق واضح ہوگئی۔

سوال نہم: سورۃ بقرہ میں ذکر کیا گیا ﴿ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا ﴾ اور سورۃ اعراف میں ذکر فرمایا گیا: " فارسلنا " یعنی سورۃ بقرۃ میں " فانزلنا " اور سورۃ اعراف میں " فارسلنا " ذکر کیا گیا وجہ فرق کیا ہے؟

جواب: انزال کا مطلب ہے ابتدائی طور پر نازل کرنا، اور ارسال کا مطلب ہے مسلط کرنا یہاں تک کہ ان کو مکمل طور پر تباہ کر دینا۔ گویا کہ دونوں آیتوں سے مسئلہ کو واضح طور پر بیان کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ورزی کرنے والے اور اس کے قول کو بدلنے والے بنی اسرائیل پر رب تعالیٰ نے عذاب نازل کیا۔ اور اس عذاب کو ان پر مسلط کر کے ان کو مکمل طور پر تباہ و برباد کر دیا گیا۔

سوال دہم: سورۃ بقرۃ میں ذکر فرمایا ﴿ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴾ اور سورۃ اعراف میں ذکر کیا گیا ﴿ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴾ ان میں وجہ فرق کیا ہے؟

جواب: سورۃ بقرۃ میں ﴿ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ﴾ سے ان لوگوں کا ظالم ہونا ذکر کیا گیا پھر ان کے متعلق ہی کہا ﴿ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴾ یعنی ان کا ظلم فسق تھا۔ جب سورۃ بقرہ میں ان کا ظالم ہونا اور فاسق ہونا ذکر کر دیا گیا، تو سورۃ اعراف میں صرف ان کے ظلم کے ذکر پر اکتفاء کر دیا گیا۔

(ماخوذ از کبیر)

الفاظ کے تبدیل کرنے کے متعلق مسئلہ عظیمہ:

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اسی آیۃ کریمہ کی تفسیر میں اس عظیم بحث کو ذکر فرمایا ہے جس کا ذکر کرنا طلباء اور عوام کے لئے یکساں مفید ہے۔ علماء کرام یقیناً پہلے سے ہی جانتے ہیں۔

" فان كان التعبد وقع بلفظها فلا يجوز تبديلها "

اگر ایسے کلمات ہوں جن کے معانی اور الفاظ دونوں مقصود ہوں یعنی الفاظ کا ادا کرنا عبادت ہو تو ان کو تبدیل کرنا جائز نہیں، کیونکہ رب تعالیٰ کے ارشادات کو تبدیل کرنے کی مذمت بیان کی گئی ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک کے الفاظ کو تبدیل کرنا جائز نہیں باوجود اس کے کہ قرآن پاک کے الفاظ کا مفہوم ادا ہو رہا ہو۔ ہاں البتہ اگر وہ قرآن پاک کا صرف ترجمہ پیش کر رہا ہو۔ تو اس کے متعلق بھی احتیاط یہ ہے کہ یوں

نہ کہے "اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا" بلکہ یہ کہے اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی کا ترجمہ یہ ہے۔

اسی طرح اذان کے الفاظ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے بواسطہ فرشتہ خواب میں صحابہ کرام کو القاء کیے گئے ان میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

ایسے ہی نماز میں ثناء کا ادا کرنا، تشہد کا پڑھنا، دعاء قنوت کا پڑھنا بھی صرف ان الفاظ سے ہی ہوسکتا ہے جن کا ذکر احادیث میں ہے، ان کو تبدیل کرنا جائز نہیں۔ تاہم یہ خیال رہے کہ تشہد میں حدیث پاک میں مختلف الفاظ ملتے ہیں جو بھی پڑھے جائز ہے۔ البتہ بہتر وہی ہے جو ہم پڑھتے ہیں۔ یہی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"وان وقع بمعناها جاز تبديلها بما يؤدي الى ذلك المعنى، ولا يجوز تبديلها بما يخرج عنه"

اگر ایسے کلمات ہوں جن میں مقصد معانی ہوں، ان کو ایسے الفاظ سے تبدیل کرنا جائز ہے جن سے معانی مکمل طور پر حاصل ہوں، معانی نہ بدلیں، اگر معنی بدل رہا ہو تو ان الفاظ سے تبدیل کرنا جائز نہیں۔

البتہ امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ اور ان کے متبعین تمام حضرات نے یہ شرط لگائی ہے کہ تبدیلی کا حق صرف ایسے عالم کو ہوسکتا ہے جو عربی زبان اور اس کے قواعد سے اچھی طرح باخبر ہو۔ ہاں البتہ یہ بھی ذہن میں رہے کہ بعینہ وہی الفاظ ادا کرنا جو احادیث میں وارد ہوں، بہتر ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"من سمع حديثا فحدث به كما سمع فقد سلم"

جس شخص نے حدیث کو سنا اور اسی طرح بیان کیا جیسا سنا تو وہ یقیناً سلامتی میں رہا۔

"والقول بالجواز هو الصحيح ان شاء الله تعالیٰ"

تبدیل کرنے کے جواز کا قول ہی صحیح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

کیونکہ صحابہ کرام سے ایک ہی واقعہ کو مختلف الفاظ سے بیان کرنا عام طور پر ثابت ہے۔

واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ کا قول اس پر شاہد ہے آپ فرماتے ہیں:

"ليس كل ما اخبرنا به رسول الله ﷺ نقلناه اليكم حسبكم المعنى"

نبی کریم ﷺ کے ارشادات کو ہم نے تمہاری طرف اس طرح نقل نہیں کیا کہ وہ الفاظ مبارکہ آپ کے ہی ہیں البتہ تمہیں معنیٰ کافی ہے۔

یعنی ہم نے بہت جگہ نبی کریم ﷺ کے ارشادات کے مطالب کو بیان کیا۔ الفاظ ہمارے اپنے بھی ہوسکتے ہیں۔ حضرت زرارہ بن اوفی کہتے ہیں:

" لقیت بعدة من اصحابه النبی ﷺ فاختلفوا علی فی اللفظ واجتمعو فی المعنی "

میں کئی صحابہ کرام کو ملا انہوں نے نبی کریم ﷺ کے ارشادات جو بیان فرمائے ان میں الفاظ اگرچہ مختلف تھے لیکن معانی سب کے ایک تھے۔

" وکان النخعی والحسن رحمهم الله یأتون بالحدیث علی المعانی "

حضرت نخعی حسن بصری اور شعبی رحمہم اللہ حدیث بالمعنی ذکر فرماتے تھے یعنی الفاظ مختلف ہوتے لیکن معانی میں اتفاق ہوتا۔

"وقال الحسن اذ اصبت المعنی اجزاک " حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب تمہیں معنی صحیح نظر آئے تو تمہارے لئے کافی ہے۔ یعنی حدیث پاک کے معنی کو مدنظر رکھا جائے، الفاظ بدل جائیں تو کوئی حرج نہیں:

" وقال وکیع رحمه الله ان لم یکن المعنی واسعا فقد هلک الناس "

حضرت وکیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں اگر معنی میں وسعت نہ دی جاتی یعنی حدیث بالمعنی کے جواز کا قول اگر نہ پایا جاتا تو لوگ ہلاک ہوجاتے۔

اس لئے کہ بعینہ الفاظ کا یاد رکھنا تو بہت مشکل کام ہے البتہ مفہوم کو نہ بدلنے دیا جائے یہی روایت میں کافی ہے:

" واتفق العلماء علی جواز نقل الشرع للعجم بلسانهم وترجمته لهم وذالک هو النقل بالمعنی "

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ شرع کو لوگ اپنی اپنی عجمی زبانوں میں بیان کرسکتے ہیں، اور عربی کا ترجمہ کر کے لوگوں کو بیان کرسکتے ہیں۔ جب عربی زبان میں الفاظ ادا کرنے کے بغیر عجمی میں ترجمہ جائز ہے تو یہ نقل بالمعنی ہی تو ہے۔

قرآن پاک میں پہلے لوگوں کے واقعات مختلف الفاظ سے بیان ہیں مفہوم سب کا ایک ہے:

☆ کچھ حضرات نے بیان کیا ہے کہ حدیث کے لفظ کو بدلنا درست نہیں۔ ان حضرات نے اپنے موقف پر یہ دلائل قائم کیے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی یہ ہے:

" نضر الله امرأ سمع مقالتی فبلغها کما سمعها "

اللہ تعالیٰ اسے خوش رکھے جس نے میرا کلام سنا اور اسی طرح آگے پہنچایا جیسا سنا۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ جو الفاظ حضور ﷺ سے سنے ان کو اسی طرح آگے دوسروں تک پہنچائے۔ الفاظ کو تبدیل کرنا جائز نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد " فادا ها کما سمعها " کا مطلب یہ ہے "حکمها لا لفظها" کہ جو بات مجھ سے سنے اس کے حکم کو ایسے ہی ادا کرے جیسا کہ مجھ سے سنے۔ اس میں یہ ذکر ہی نہیں کہ الفاظ کو جیسا سنا بعینہٖ ایسے ہی ادا کرے۔

☆ ان حضرات کی دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرات براء بن عازب کہتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" جب تم سونے لگو تو وضو کر لو، جس طرح نماز میں وضو کیا جاتا ہے پھر دائیں کروٹ پر لیٹ جاؤ، پھر یہ پڑھو"

" اللهم انی سلمت وجهی الیک وفوضت امری الیک ولجأت ظهری الیک رغبة ورهبة الیک لا ملجأ ولا منجا منک الا الیک امنت بکتابک الذی انزلت ونبیک الذی ارسلت "

تمہارے کلام کے سب سے آخر میں یہی دعا ہو (یعنی دعا کے بعد پھر کوئی اور کلام نہ کرنا) پھر اگر تمہاری موت اسی رات کو آ گئی تو تمہاری موت فطرت (اسلامیہ) پر آئے گی۔

راوی کہتے ہیں میں نے آپ کے دعائیہ کلمات کو لوٹایا تا کہ مجھے یاد ہو جائیں، تو میں نے دعاء میں یہ پڑھا:

" امنت برسولک الذی ارسلت "

تو آپ نے فرمایا یہ پڑھو " آمنت بنبیک الذی ارسلت " (مسلم ج ۲ ص ۳۵۶ باب الدعاء عند النوم)

اس حدیث پاک سے دلیل یہ پیش کی گئی کہ حدیث پاک کے الفاظ کو بدلنا جائز ہوتا تو نبی کریم ﷺ اپنے صحابی کو منع نہ فرماتے۔ جب آپ نے وہی الفاظ پڑھنے کا حکم دیا جو آپ نے پڑھائے تھے تو پتہ چلا کہ الفاظ کو تبدیل کرنا مطلقاً جائز نہیں۔

اس کا جواب علامہ نووی رحمہ اللہ کے قول سے ہی دینا زیادہ مناسب رہے گا، آپ فرماتے ہیں: کہ اس میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، علامہ مازری وغیرہ نے یہ قول پسند فرمایا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے انکار کا یہ مطلب تھا کہ یہ ذکر اور دعا ہے اسلئے دعائیہ کلمات اور اذکار میں ان الفاظ کو ہی ذکر کیا جائے جو حقیقت میں مذکور ہیں اور خصوصاً دعا پر یا ذکر پر اگر خاص ثواب وغیرہ کا ذکر ہو تو اسکا تعلق ان خاص الفاظ سے ہی ہوتا ہے جن کو ذکر کیا گیا ہو، اگر وہ الفاظ بدل جائیں تو وہ خصوصی حکم انکے ساتھ متعلق نہیں رہتا۔ (نووی)

☆ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی:

" فرب حامل فقه غير فقيه ورب حامل فقه الى من هو افقه منه "

کتنے ہی فقہی مسائل کو دوسروں تک پہنچانے والے خود فقیہ نہیں ہوتے۔ اور کتنے ہی فقہی مسائل کو ان تک پہنچاتے ہیں جو ان سے بھی زیادہ فقیہ ہوتے ہیں۔

" ثم ان هذا الحديث بعينه قد نقل بالفاظ مختلفة والمعنى واحد "

اس حدیث پاک کو مختلف الفاظ سے بیان کیا گیا ہے لیکن معنی سب کا ایک ہے " **وذلک ادل دليل على الجواز** " یہ بہت بڑی دلیل ہے جس سے واضح ہو رہا ہے کہ معنی نہ بدلنے پائے تو الفاظ مختلف پیش کئے جا سکتے ہیں۔

اعتراض: اگر ایک راوی کو الفاظ بدلنے کی اجازت ہو، تو دوسرے اور تیسرے کو بھی اجازت ہوگی اس طرح تو حدیث کا مفہوم ہی بدل جائے گی کیونکہ دقیق اور مخفی فرق کو سمجھنا دشوار ہوتا ہے۔

جواب: " الجواز مشروط بالمطابقة والمساواة " الفاظ کو تبدیل کرنے کا جواز اس بات سے مشروط ہے کہ اصل الفاظ اور ان کی جگہ استعمال ہونے والے الفاظ میں مطابقت اور

مساوات پائی جائے۔اس طرح اگر ایک راوی اور دوسرا اور تیسرا بھی الفاظ بدل دیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔اگر فرق کر دیا گیا تو یہ جائز ہی نہیں۔

حضرت محی الدین ابن عربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" الخلاف فی هذه المسئلة انما يتصور بالنظر الی عصر الصحابة والتابعين للتساويهم فی معرفة اللغة الجبلية الذوقية ، واما من بعدهم فلا نشک فی ان ذلک لا يجوز "

اس مسئلہ میں کہ الفاظ کو بدلنا جائز ہے یا جائز نہیں یہ اختلاف صحابہ کرام اور تابعین کے زمانہ تک محدود ہے، کیونکہ وہ لغت جبلیہ (پیدائشی طور پر اپنی عربی زبان میں مہارت) اور ذوقیہ میں سب برابر تھے۔لیکن بعد کے لوگوں کے لئے جائز نہیں کیونکہ ان کی طبائع مختلف ہیں اور سمجھیں ایک دوسرے سے جداگانہ ہیں۔

اس قول کے متعلق علامہ قرطبی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں: " وهذا هو الحق " یہی حق ہے۔

تاہم بعض علماء نے ہر زمانے میں جواز کا قول کیا ہے کہ جب شرط پائی جائے کہ مفہوم نہ بدلنے پائے تو الفاظ کا بدلنا ہر زمانہ میں جائز ہے۔ہاں البتہ یہ بھی خیال رہے کہ بہتر یہی ہے کہ اصلی الفاظ ہی بیان کئے جائیں۔بعض روایات میں صحابہ کرام اسی احتیاط کے پیش نظر دو دو لفظ ذکر کئے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے یہ فرمایا یا دوسرے الفاظ ذکر فرمائے۔

(ماخوذ از قرطبی بزیادة)

☆☆☆☆☆

﴿ وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴾

۱) ''اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی طلب کیا تو ہم نے فرمایا اس پتھر پر اپنا عصا مارو، فوراً اس میں سے بارہ چشمے نکلے، ہر گروہ نے اپنا گھاٹ پہچان لیا، کھاؤ اور پیو خدا کا دیا اور زمین میں فساد اٹھاتے نہ پھرو''

۲) ''اور جب پانی طلب کیا موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے، تو ہم نے کہا مارو اپنا عصا پتھر پر، تو جاری ہو گئے اس سے بارہ چشمے، تحقیق جان لیا ہر قبیلہ نے اپنے پینے کی جگہ کو، کھاؤ اور پیو اللہ کے رزق سے اور نہ حد سے بڑھو زمین میں فساد پھیلاتے ہوئے''

مختصر وضاحت:

میدان تیہ میں چھ لاکھ کی تعداد میں بارہ میل پر پھیلے ہوئے لشکر کو جب پیاس کی شدت محسوس ہوئی تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے اپنی بے بسی کا ذکر کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رب تعالیٰ سے دعاء کی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعاء کو قبول کیا اور حکم دیا کہ اے موسی اپنا عصا پتھر پر مارو، پانی جاری ہو جائے گا۔

آپ نے اپنا عصا پتھر پر مارا تو بارہ چشمے جاری ہو گئے، ہر قبیلے نے ایک ایک چشمہ اپنے لئے مختص کر لیا، پتھر سے جاری ہونے والا پانی اتنی بڑی تعداد کے لوگوں کے لئے کافی تھا، پتھر مکعب شکل کا تھا، اور ہر طرف سے تین تین چشمے جاری ہوئے یہ پتھر کوئی خاص معین تھا، یا کہ عام پتھر تھا اگر چہ اس میں مختلف اقوال تو ہیں لیکن صحیح یہی ہے کہ قرآن پاک میں کسی پتھر کو مختص جب نہیں کیا گیا تو وہ پتھر عام ہی تھا۔ (ابو سعود)

قدرے تفصیل:

یہاں سے مراد بنی اسرائیل پر ایک اور نعمت کا ذکر کیا جا رہا ہے یہ دین اور دنیا کی نعمتوں کی جامع نعمت ہے۔لیکن دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ان کی پانی کی شدید حاجت کو دور فرما کر ان پر انعام کیا " ولو لا لھلکوا فی التیہ " اور اگر ان کو پانی نہ دیا جاتا تو وہ میدان تیہ میں ہلاک ہو جاتے، جیسا کہ ان کو "من اور سلویٰ" عطا کر کے ہلاکت سے بچایا گیا۔کیونکہ انسان کھانے پینے سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی اس کی وضاحت کر رہا ہے:

﴿ وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا لَّا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ ﴾

"اور ہم نے انہیں خالی بدن نہ بنایا کہ کھانا نہ کھائیں"

اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ﴾ "اور ہم نے ہر چیز کو پانی سے زندگی عطا فرمائی"

بلکہ میدان تیہ میں ان کو پانی عطاء کرنا، عام عادت کے مطابق پانی عطا کرنے سے عظیم نعمت تھی، اس لئے کہ جب انسان جنگل میں ہو اور اسے پانی کی شدید حاجت ہو اس پر امید کے دروازے بظاہر بند ہوں، کہ وہ ایسی جگہ ہے جہاں پانی اور نباتات جیسی کوئی چیز نہیں، ایسے لوگوں کو جب عصا کے ذریعے پتھر سے پانی عطاء کر دیا گیا:

" فعلم ان ھذہ النعمة لا یکاد بعدلھا شئی من النعم "

تو معلوم ہوا کہ ان کو تمام نعمتوں سے بڑی نعمت یہی نظر آئے گی۔اور میدان تیہ میں ان کو پانی حاصل ہونا دینی نعمت بھی ہے۔

" فلانہ من اظھر الدلائل علی وجود الصانع وقدرتہ وعلمہ ومن اصدق الدلائل علی صدق موسی علیہ السلام "

اس لئے کہ موسیٰ علیہ السلام کے اس معجزہ سے اللہ تعالیٰ جو صانع ذات ہے اس کی قدرت اور عظم پر ظاہر دلائل پائے گئے ہیں اور موسی علیہ السلام کی صداقت پر بہت بڑے سچے دلائل پائے گئے ہیں۔ (از کبیر)

خاص کر کے ایک پتھر کی طرف سے نکلنے والا پانی پچاس ہزار افراد پر مشتمل آدمیوں کو پورا ہو

جائے، اور بارہ طرفوں سے نکلنے والے بارہ چشمے چھ لاکھ لوگوں کو پورے ہو جائیں۔ اس سے بڑھ کر رب تعالیٰ کی قدرت اور نبی کی صداقت پر کوئی اور دلیل طلب کرے تو اس کی حماقت ہوگی۔

﴿ وَاِذِ اسْتَسْقٰی مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ ﴾: استسقاء کا معنیٰ ہے:

" طلب السقیا من المطر علی عادۃ الناس اذا اقحطوا "

بارش سے پانی طلب کرنا جب لوگ قحط سالی میں مبتلا ہوں۔

البتہ یہاں مطلقاً پانی طلب کرنے کی دعاء اور التجاء مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو نادر طریقہ سے پانی عطاء کر کے اپنی قدرت کاملہ کا اظہار فرمایا، اور اپنے نبی کے معجزہ کو ظاہر کیا۔

﴿ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ﴾: " تو ہم نے کہا مارو اپنا عصا پتھر پر"

موسیٰ علیہ السلام کا عصا کیسا تھا؟ اس میں حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا قول یہ ہے:

" کانت عصا اخذھا من بعض الاشجار " آپ کا عصا کسی عام درخت کا تھا۔

وقیل کانت من آس الجنۃ طولھا عشرۃ اذرع علی طول موسٰی ولھا شعبتان تتقدان فی الظلمۃ "

اور بعض حضرات نے کہا آپ کا عصا جنت کے ساگوان کے درخت کا تھا، اس کی لمبائی دس ذراع (پندرہ فٹ) تھی جو موسیٰ علیہ السلام کے قد کے برابر تھی۔ اور اس عصا کے آگے سے دو حصے تھے جو اندھیرے میں روشن ہو جاتے تھے۔

علامہ رازی رحمہ نے یہ ذکر کرنے کے بعد فرمایا، کہ قرآن پاک سے اتنا ثابت ہے کہ وہ عصا بڑا تھا، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے اس عصاء کے متعلق رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا" اتوکا علیھا " میں اس پر ٹیک لگا لیتا ہوں۔ اور موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ سے وہ عصا بہت بڑا اژدہا بن گیا۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ وہ عصا لمبا ہو اور اس میں موٹائی پائی گئی ہو۔

" وما زاد علی ذلک فلا دلالۃ "

اور اس سے زیادہ کسی چیز کے ثبوت پر قرآن پاک نہیں دلالت کر رہا ...... واللہ اعلم بالصواب۔ (از کبیر)

وہ پتھر جس سے پانی موسیٰ علیہ السلام کے عصا مارنے سے نکلا، وہ پتھر معین تھا یا کہ کوئی عام پتھر تھا،

صحیح قول وہی ہے جو تفسیر ابی السعود سے پہلے نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ عام پتھر تھا، معین نہیں تھا۔

جو حضرات معین پتھر مانتے ہیں وہ کہتے ہیں یہ وہ پتھر تھا جو موسیٰ علیہ السلام کے کپڑے لے کر بھاگا تھا جب آپ نے غسل کرتے وقت اس پر رکھے تھے، یہ وہاں آکر رکا تھا جہاں بنی اسرائیل کے کئی لوگ موجود تھے، دراصل موسیٰ علیہ السلام سے اس عیب کو دور کرنا مقصود تھا جو آپ کے علیحدہ غسل کرنے پر بنی اسرائیل آپ پر لگاتے تھے کہ ان کے خصیتین میں ہوا بھری ہوئی ہے اس لئے یہ علیحدہ نہاتے ہیں بنی اسرائیل خود ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نہاتے تھے۔

جو لوگ معین پتھر کا قول کرتے ہیں ان کی اور دلیل یہ ہے کہ " الحجر " ذکر ہے جس پر الف لام عہد خارجی ہے جو تعیین پر دلالت کرتا ہے، لیکن یہ دلیل قوی نہیں کیونکہ " الف لام " جنسی بھی ہو سکتا ہے، جو تعیین پر دلالت نہیں کرتا۔ علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے فرمایا: " او للجنس وهذا اظهر فی الحجة " الف لام کا جنسی بنانا دلائل میں زیادہ ظاہر ہے۔

" وكان من الجنة حملهما آدم فتوار ثهما الانبياء عليهم السلام حتى وصلا الى شعيب فاعطاهما موسى عليه السلام " (تبصیر الرحمن)

موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور پتھر دونوں ہی حضرت آدم علیہ السلام نے جنت سے لائے تھے اور انبیاء کرام کی طرف منتقل ہوتے رہے، یہاں تک کہ حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس آگئے اور آپ نے وہ دونوں چیزیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دے دیں ....واللہ اعلم بالصواب۔

ایسے مسائل کی تحقیق اتنی ضروری نہیں اور قرآن پاک کا مقصود بھی نہیں، تاہم اقوال اس لئے نقل کر دیئے ہیں کہ اگر کوئی خطیب کسی ایک قول کو بیان کرے تو دوسرا شخص صرف دوسرے قول کو دیکھ کر اعتراض نہ کرے۔

﴿ فَانفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ﴾: "عطف على مقدر اى فضرب فانفلق "

فانفجرت کا عطف مقدر الفاظ پر ہے، حاصل کلام یہ ہے کہ آپ نے عصا کو پتھر پر مارا اور پتھر

پھٹا اور اس سے بارہ چشمے جاری ہوگئی۔ بارہ چشمے جاری کرنے کی وجہ یہ تھی:

" وکان ھذا العدد دون غیرہ لکونھم کانوا اثنی عشر سبطا وکان بینھم تضاغن وتنافس فاجری اللہ تعالیٰ لکل سبط عینا یردھا لایشرکہ فیھا احد من السبط الآخر دفعا لا تارۃ الشحناء ویشیر ای حکمۃ الانقسام" (روح المعانی)

کہ وہ بارہ قبیلے تھے، ایک دوسرے سے عداوت رکھتے تھے، ایک ہی جگہ سے ان کا پانی پینا دشوار تھا، اس لئے رب تعالیٰ نے ان کو میدان تیہ میں پانی دے کر جو عظیم انعام فرمایا، اس سے بڑھ کر اور یہ انعام فرمایا، کہ ان کی عداوت کے پیش نظر ان کو لڑائی جھگڑے سے بچانے کے لئے ان کی تعداد کے مطابق چشمے جاری کر دیئے۔ اور اشارۃً یہ مسئلہ بھی سمجھا دیا کہ جب مشترک چیز میں فساد کا خطرہ ہو تو اسے تقسیم کر لینا، اور فساد سے بچ جانا حکمت کا تقاضا ہے۔

﴿ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ ﴾: کل سبط (مشربھم) عینھم التی یشربون منھا، یہاں " اناس " کا معنی قبیلہ ہے اور " مشربھم " کا معنی وہ چشمہ جس سے وہ پانی پینے لگے، یعنی مطلب یہ ہوا کہ ہر قبیلہ نے اپنے پانی کے پینے کی جگہ کو پہچان لیا کہ یہ ہمارا چشمہ ہے۔

﴿ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ ﴾: ''کھاؤ اور پیو اللہ کے رزق سے'' یہاں ''قلنا'' مقدر ہے یعنی مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ہم نے کہا، جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں رزق عطا فرمایا یعنی من اور سلوی اور چشموں کا پانی، ان کو کھاؤ اور پیو۔ بعض حضرات نے کہا یہاں مراد تو صرف پانی ہے، لیکن کھاؤ اور پیو کا مطلب یہ ہے کہ پانی پیو اور پانی سے پیدا ہونے والے پھل وغیرہ کھاؤ۔

لیکن پہلا قول زیادہ معتبر ہے کیونکہ یہ ارشاد ان کو میدان تیہ میں فرمایا وہاں نباتات، پھل وغیرہ نہیں تھے۔ (از بیضاوی وشیخ زادہ)

﴿ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴾:

" ولا تعتدوا حال افسادکم" اور تم زمین میں تجاوز نہ کرو فساد پھیلاتے ہوئے۔

بظاہر اس پر یہ وہی ہوتا ہے کہ تجاوز کرنا تو ہے ہی فساد، پھر دوبارہ فساد کے ذکر کرنے کا کیا فائدہ

ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ کبھی تجاوز کرنا فساد نہیں ہوتا۔ جیسا کہ کوئی دوسرا شخص زیادتی کرے، حد سے تجاوز کرے تو اس کے بدلہ میں اس طرح تجاوز کرنا جائز ہے یہ فساد نہیں بلکہ " ولمن انتصر بعد ظلمہ فاولئک ما علیھم من سبیل " (اور بیشک جس نے اپنی مظلومی پر بدلہ لیا اون پر کچھ مواخذہ کی راہ نہیں) کا مصداق ہے۔

اسی طرح حضرت خضر علیہ السلام کا کشتی کو توڑنا، اور ایک بچے کو قتل کرنا بظاہر حد سے تجاوز تھا، لیکن یہ فساد نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اصلاح کی غرض تھی۔ (انشاء اللہ اپنے مقام پر اس کی تفصیل آئے گی)۔

﴿ وَلَا تَعْثَوْا ﴾ : میں دو لغتیں ہیں ایک باب علم سے ناقص یائی ، عثی یعثی عثیا ، اور دوسری لغت باب نصر سے ہے۔ ناقص واوی عثا یعثو عثوا۔ معنٰی دونوں کا ایک ہی ہے فساد پھیلانا، فساد کی غرض سے حد سے تجاوز کرنا۔ (از بیضاوی وشیخ زادہ)

معجزات کا انکار جہالت ہے:

" ومن انکر امثال ھذہ المعجزات فلغایۃ جھلہ باللہ تعالیٰ وقلۃ تدبرہ فی عجائب صنعہ "

اس قسم کے (پتھر سے پانی کا نکلنا وغیرہ) معجزات کا انکار کرنا، اللہ تعالیٰ سے بہت ہی زیادہ جاہل ہونے کی وجہ سے ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی صنعت کے عجائب میں تدبر کم کرنے کی وجہ سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بعض پتھروں میں یہ طاقت رکھ دی ہے کہ ان سے بال مونڈے جاسکتے ہیں۔ اور بعض وہ پتھر ہیں جن سے سرکہ کو متنفر بنا دیا، جب وہ پتھر سرکہ میں ڈالو تو سرکہ ٹپک کر برتن سے باہر آجائے گا۔

اور بعض پتھروں کو مقناطیس بنایا جو لوہے کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں، جب اللہ تعالیٰ کی قدرت کے یہ ادنی کرشموں کی مثالیں ہم نے پیش کر دی ہیں، تو اسی سے واضح ہو گیا کہ موسیٰ علیہ السلام کے عصا مارنے سے پتھر سے پانی کا جاری ہونا اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے اور موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ہے۔ (ماخوذ از بیضاوی)

تنبیہ : معجزات کا انکار کرنے والے وہ لوگ تھے جو خود یہ بحثیں کرنے والے تھے کہ پانی ہوا بن جاتا ہے ہوا پانی بن جاتی ہے، وغیرہ، یعنی فلاسفہ نے معجزات کا انکار کیا۔ البتہ یہ خیال رہے کہ فلاسفہ

کے زیادہ اختلافات کے قطع نظر فلاسفہ کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) دھریون (۲) طبعیون (۳) الاھیون۔

دھریون: وہ لوگ تھے جن کا عقیدہ یہ تھا کہ کوئی ذات صانع اور مدبر اور عالم اور قادر نہیں۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ اور اس کی قدرت کو نہیں مانتے تھے بلکہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ جہان ہمیشہ سے موجود ہے کسی صانع اور پیدا کرنے والے کا کوئی دخل نہیں۔ بلکہ ایک حیوان کے نطفہ سے دوسرا اور دوسرے کے نطفہ سے تیسرا پیدا ہوا۔ ان کے نزدیک نہ کوئی زندہ کرنے والا ہے اور نہ کوئی مارنے والا یہ نظام عالم اسی طرح چل رہا ہے یہ لوگ زندیق ہیں، یعنی بے دین اور کافر ہیں۔

طبیعون: یہ وہ لوگ ہیں جو اکثر طور پر عالم طبیعیہ اور عجائب حیوانات اور نباتات سے بحث کرتے ہیں، حیوانات کے اعضاء کی تشریح میں زیادہ غور وخوض کرتے ہیں، جب یہ اللہ تعالیٰ کی صنعت کے عجائبات اور اس کی حکمت کے انوکھے انوکھے آثار دیکھتے ہیں تو مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ تسلیم کریں کہ حیوانات کا کوئی خالق ہے اور وہ حکیم ہے تمام امور اور مقاصد پر وہ مطلع ہے اس کی تخلیق عجیب نظام حکمت سے مربوط ہے۔

لیکن یہ تسلیم کرنے کے باوجود حیوانات کے اعضاء میں غور وخوض کرنے کے بعد وہ یہ کہتے ہیں کہ انسان کی قوت عاقلہ اس کے مزاج کے تابع ہے جب مزاج باطل ہو تو قوت عاقلہ بھی باطل ہو جاتی ہے۔ اور جب مزاج معدوم ہو تو قوت عاقلہ بھی معدوم ہو جاتی ہے۔

ان کی سوچ اور تفکر کی آخری حد یہ ہے کہ کوئی نفس جب مر جائے تو پھر وہ زندہ نہیں ہوگا آخرت کا یہ لوگ انکار کرتے ہیں۔ جنت و دوزخ اور قیامت و حساب کو یہ نہیں مانتے، ان کے نزدیک کسی نیکی پر کوئی ثواب مرتب نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی کسی برائی پر کوئی عذاب ہوتا ہے۔

ان کے عقیدہ میں نہ کسی کام کا کرنا واجب ہے اور نہ کسی کام سے رکنا ضروری ہے۔ یہ لوگ بھی صرف خواہشات ہی رکھتے ہیں جیسے جانور خواہشات رکھتے ہیں یہ لوگ بھی زندیق یعنی بے دین اور کافر ہیں کیونکہ مومن تو وہ ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اور اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات پر ایمان رکھتا ہو جب وہ اس ایمان سے خالی ہیں تو یقیناً زندیق ہیں۔

الاھیون : یہ متاخرین فلاسفہ ہیں جیسے ارسطو اور اس کا استاد افلاطون اور اس کا استاد سقراط ان لوگوں نے اگر چہ دھریوں اور طبیعوں کا رد بھی کیا ہے لیکن یہ خود بھی کفریات سے نہیں نکل سکے اسی وجہ سے اسلامی فلاسفہ نے ان کا بھی رد کیا ہے اور ان کو کافر کہا ہے جیسا کہ ابن سینا اور فارابی نے اس تیسرے فرقہ کا بھی رد کیا ہے۔

واضح ہوا کہ فلاسفہ کے یہ تینوں فرقے کافر ہیں اور متاخرین حضرات ابن سینا اور فارابی وغیرہ مسلمان ہیں۔ پہلے تینوں قسم کے فلاسفہ نے معجزات کا انکار کر کے بزعم خویش علم کے دعویدار ہونے کے باوجود (بقول علامہ بیضاوی) اپنی جہالت کا ثبوت پیش کیا۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

سید الانبیاء کی انگلیوں سے نکلا ہوا پانی زمزم اور کوثر سے افضل ہے:

" عن جابر قال عطش الناس یوم الحدیبیة ورسول الله ﷺ بین یدیه رکوة فتوضأ منها ثم اقبل الناس نحوه قالوا لیس عندنا ماء نتوضأ به ونشرب الا ما فی رکوتک فوضع النبی ﷺ یده فی الرکوة فجعل الماء یفور من بین اصابعه کامثال العیون فشربنا وتوضأنا قیل لجابر کم کنتم قال لو کنا مائة الف لکفانا کنا خمس عشرة مائة "

(بخاری، مسلم، مشکوة باب المعجزات)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حدیبیہ کے دن لوگ پیاسے ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک برتن میں پانی تھا۔ جس سے آپ نے وضوء فرمایا، پھر لوگوں نے آپ کی طرف توجہ کی اور عرض کیا کہ ہمارے پاس پانی نہیں کہ ہم اس سے وضوء کریں یا پیئں، سوائے اس کے جو آپ کے برتن میں پانی ہے، نبی کریم ﷺ نے اپنا ہاتھ مبارک اپنے برتن میں رکھا تو آپ کی انگلیوں سے پانی کے فوارے چل پڑے جس طرح چشموں سے پانی نکلتا ہے راوی کہتے ہیں اس سے پیا اور وضوء کیا حضرت جابر سے پوچھا گیا کہ اس وقت تمہاری تعداد کتنی تھی؟ آپ نے فرمایا اگر ہم ایک لاکھ کی تعداد میں ہوتے تو پھر بھی ہمیں کفایت کر جاتا البتہ ہم اس وقت پندرہ سو کی تعداد میں تھے۔

ایک دوسری حدیث دیکھیں جس کے وضاحت میں عنوان کے مطابق بحث کی گئی ہے۔

☆ " عن انس ان رسول الله ﷺ اتاه جبریل وهو یلعب مع الغلمان فاخذ فصرعه فشق

عن قلبه فاستخرج منه علقة فقال هذا حظ الشيطان منک ثم غسله فی طشت من ذهب بماء زمزم ثم لامه واعاده فی مكانه وجاء الغلمان يسعون الی امه يعنی ظئره فقالوا ان محمدا قد قتل فاستقبلوه وهو منتقع اللون قال انس فكنت اری اثر المخيط فی صدره "

(مسلم، مشکوۃ باب علامات النبوۃ)

حضرت انس ﷺ سے مروی ہے بے شک رسول اللہ ﷺ کے پاس جبریل آئے جب کہ آپ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے انہوں نے آپ کو پکڑ کر لٹایا پھر آپ کے دل کی جگہ (سے سینہ) کو چاک کیا اور اس سے ایک منجمد خون کا لوتھڑا نکلا اور کہا کہ یہ آپ کے جسم میں شیطان کا حصہ تھا پھر ایک سونے کے طشت میں دل کو رکھ کر زمزم کے پانی سے دھویا پھر سینے کو درست کیا (یعنی اسے ٹانکے لگائے) دل کو پانی جگہ پر لوٹا دیا (ساتھ کھیلنے والے) بچے دوڑتے ہوئے آپ کی رضاعی ماں (حلیمہ سعدیہ) کے پاس آئے تو کہنے لگے کہ محمد کو قتل کر دیا گیا۔ جب حلیمہ کے گھر کے افراد آئے تو دیکھا کہ حضور کا رنگ متغیر ہے۔ حضرت انس کہتے ہیں میں حضور کے سینہ مبارک پر سوئی سے لگے ہوئے ٹانکوں کے نشان دیکھتا تھا۔

وضاحت حدیث: سونے کے برتن استعمال کرنا نبی کریم ﷺ کی شریعت میں حرام ہے۔ لیکن جبریل نے سونے کے طشت کو استعمال کیا اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ابھی آپ کو اعلان نبوت کا حکم نہیں دیا گیا تھا اور نہ ہی آپ کو شریعت عطاء ہوئی تھی۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ یہ استعمال کرنے والے جبریل تھے اور فرشتے ہمارے افعال کے مکلف نہیں۔

آب زمزم سے دھونے کی وجہ: نبی کریم ﷺ کے دل مبارک کو آب زمزم سے دھویا گیا۔

" استدل به علی انه افضل مياه العالم حتی ماء الكوثر "

اس کو اس مسئلہ پر دلیل بنایا گیا ہے کہ آب زمزم جہان کے تمام پانیوں سے افضل ہے یہاں تک کہ حوض کوثر اور نہر کوثر کے پانی سے بھی افضل ہے کیونکہ آپ کے دل کو دھونے کے لئے جس پانی کا انتخاب کیا گیا وہ یقیناً تمام پانیوں سے افضل ہی ہونا چاہئے۔

زمزم سے بھی افضل پانی:

" لكن الماء الذی نبع من بين اصابعه ﷺ فلا شک انه افضل المياه

علی الاطلاق "

لیکن وہ پانی جو حضور ﷺ کی انگلویں سے جاری ہوا تھا وہ بلا شک تمام پانیوں سے مطلقا افضل ہے۔

یعنی آب کوثر سے بھی اور آب زمزم سے بھی، چونکہ آب کوثر سے تو آب زمزم بھی اعلیٰ ہے اور آب زمزم سے وہ پانی افضل ہے جو میرے حبیب علیہ السلام کی انگلیوں سے جاری ہوا وہ کیوں افضل ہے؟

" لکونه من اثر یده الشریفة وماء زمزم من اثر قدم اسمعیل المنیفة وبون بین بینهما ولان الاعجاز الکائن فی یده ﷺ ابلغ "

اس لئے کہ اس پانی کو تعلق ہے سید الانبیاء کے ہاتھ مبارک سے کہ آپ کی انگلیوں سے جاری ہوا۔ اور آب زمزم کو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے قدموں سے تعلق ہے کہ وہ آپ کی ایڑی کی حرکت سے نکلا ہے، تو ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے کیونکہ جب نبی کریم ﷺ تمام نبیوں سے افضل ہیں تو آپ کے ہاتھ مبارک سے ظاہر ہونے والا معجزہ بھی افضل ہے اس کمال سے جو اسمٰعیل علیہ السلام کی ایڑی کی رگڑ سے ظاہر ہوا۔

نبی کریم ﷺ کے اس معجزہ کو اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے کیا خوبصورت انداز میں بیان کیا۔

انگلیاں ہیں فیض پر ٹوٹے ہیں پیاسے جھوم کر ندیاں پنجاب رحمت کی ہیں جاری واہ واہ

تنبیہ :

" وهذا الحدیث وامثاله مما یجب فیه التسلیم ولا یتعرض له بتاویل من طریق المجاز اذلا ضرورة فی ذلک "

یہ شق صدر (سینہ چاک کرنے) والی حدیث ہو یا اس قسم کی اور احادیث ہوں ان کو تسلیم کرنا واجب ہے۔ اور تاویل کر کے مجازی معنی نہ لیا جائے کیونکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں، اس لئے کہ خبر دینے والے خود نبی کریم ﷺ ہیں، جن سے بڑھ کر کوئی سچا نہیں ہوسکتا، اس لئے خبر سچی ہے اور رب تعالیٰ کی قدرت سے بھی یہ کوئی بعید نہیں۔

فائدہ : نبی کریم ﷺ کے جسم اطہر سے وہ خون کا منجمد ٹکڑا کیوں نکالا گیا؟ اس لئے کہ اگر میں

یہ تاثیر رکھی ہوئی ہے کہ وہ شیطان کے اثر کو قبول کر لیتا ہے، اس کو نکال دیا گیا تا کہ اس کی وجہ سے دل مقدس اور منور ہو جائے اور وحی کو قبول کرنے کی کامل صلاحیت اس میں پیدا ہو جائے، اور نبی کریم ﷺ کو غافل کرنے کی تمام امیدیں منقطع ہو جائیں۔ وہ ٹکڑا آپ کے جسم میں رکھا ہی کیوں تھا، اس کے بغیر ہی آپ کو پیدا فرما لیا جاتا اس کی کیا وجہ ہے؟

اصل وجہ یہ ہے کہ ہر انسان کے جسم میں وہ ٹکڑا ہوتا ہے اگر آپ کے جسم میں وہ حصہ شروع ہی میں نہ رکھا جاتا تو جسم میں ایک حصہ کے نہ ہونے کی وجہ سے نقص پیدا ہوتا، آپ کو چونکہ ہر عیب سے پاک پیدا فرمانا تھا، اس لئے پہلے اس حصہ کو جسم میں رکھا گیا تا کہ جسمانی کوئی نقص نہ ہو، پھر اسے نکال دیا گیا، کیونکہ اب آپ کے جسم مبارک میں وہ رہنے کے قابل نہ تھا۔

میرے استاذ مکرم حضرت علامہ ابوالحسنات محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی نے یہی تقریر فرمائی تھی جب آپ یہ حدیث مبارک پڑھا رہے تھے، اس وقت میرے ساتھ پڑھنے والے اور حضرات کے علاوہ یہ چار حضرات قابل ذکر تھے، مولنا شاہ محمد قصوری، مولنا قاری محمد یوسف جہلمی، مولنا عبداللطیف صاحب سرگودھوی اور مولنا ابوالفضل اللہ دتہ صاحب (بھابڑہ ضلع سرگودھا) جن کا ابھی تین ماہ پہلے وصال ہوا اللہ تعالیٰ آپ کے مدارج کو بلند فرمائے، جنت الفردوس عطا فرمائے۔

خیال رہے کہ نبی کریم ﷺ کا شق صدر (سینہ چاک کرنا) کئی مرتبہ ہوا۔ ایک مرتبہ بچپن میں جب آپ حضرت حلیمہ سعدیہ کے پاس تھے اور دوسری مرتبہ جب آپ سے جبریل امین کی غار حرا میں ملاقات ہوئی۔ اور تیسری مرتبہ معراج کی رات کو۔ (از مرقاۃ ج ۱۱ ص ۱۲۳)

مسئلہ استسقاء: اسی آیہ کریمہ کی تفسیر میں علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ جب پانی میسر نہ ہو اور بارش نہ ہو رہی ہو تو انسانوں کو چاہئے کہ وہ اپنی عبودیت کا اظہار کریں، اپنے فقر، مسکینی اور عجز کے ساتھ خلوص دل سے توبہ کرے اور رحمت کی بارش کی دعاء کرے۔

"وقد استسقی نبینا محمد ﷺ فخرج الی المصلی متواضعا متذللا متخشعا مترسلا متضرعا"

ہمارے نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ نے عیدگاہ کی طرف نکل کر (نماز استسقاء) ادا کر کے اپنے

رب تعالیٰ سے بڑی عاجزی اور انکساری سے دعاء فرمائی۔

" فکیف بنا ولا توبة معنا الا العناد ومخالفة رب العباد فانی نسقی "

جب ہمارے نبی کریم ﷺ نے عاجزی سے دعاء فرمائی تو ہم کیوں نہ دعاء کریں، اور ہم توبہ کیوں نہ کریں جب ہم میں عناد بھی پایا جاتا ہے اور رب تعالیٰ کے احکام کی مخالفت بھی، اگر ہم خلوص دل سے توبہ نہیں کریں گے تو ہمیں رب تعالیٰ کی طرف سے رحمت کی بارش کیسے حاصل ہوگی؟

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

" ولم یمنعوا زکوة اموالهم الا منعوا القطر من السماء ولو لا البهائم لم یمطروا "

جب لوگ اپنے مال کی زکواۃ ادا کرنا چھوڑ دیتے ہیں تو رب تعالیٰ کی طرف سے بارشوں کو روک لیا جاتا ہے اگر حیوانات نہ ہوتے تو بارش کبھی نہ ہوتی۔

یعنی اللہ تعالیٰ جانوروں پر رحم فرماتا ہے تو اس رحمت سے انسان بھی فائدہ حاصل کر لیتے ہیں۔ ورنہ انسانوں کی بداعمالیوں سے رحمت کے نزول کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ (ماخوذ از قرطبی)

استسقاء کے تین طریقے:

☆ " الاستسقاء ثلاثة انواع، احدها الاستسقاء بالدعاء من غیر صلوة "

بارش طلب کرنے کے تین طریقے ہیں۔

(۱) ایک ان میں سے یہ ہے کہ بارش کے لئے بغیر نماز ادا کرنے کے دعاء کرے، یعنی عام اوقات میں دعاء کرتا رہے یہ انتظار نہ کرے کہ جب نماز ادا کروں گا تو اس کے بعد دعا کروں گا۔

(۲) " الثانی الاستسقاء فی خطبة الجمعة او فی اثر صلوة مفروضة وهو افضل من النوع الذی قبله "

(۳) دوسرا طریقہ بارش طلب کرنے کا یہ ہے کہ جمعہ کے خطبہ کے دوران بارش کی دعاء کی جائے، یا فرض نماز کے ادا کرنے کے بعد دعا کی جائے، یہ طریقہ پہلے طریقہ سے افضل ہے۔

دوران خطبہ نبی کریم ﷺ کا دعاء کرنا:

" عن انس بن مالک ان رجلا دخل المسجد یوم جمعة من باب کان نحو دار القضاء ورسول الله ﷺ قائم یخطب فاستقبل رسول الله ﷺ قائما ثم قال یا رسول الله هلکت الاموال وانقطعت السبل فادع الله یغثنا قال فرفع رسول الله ﷺ یدیه ثم قال اللهم اغثنا اللهم اغثنا اللهم اغثنا قال انس ولا والله ما نری فی السماء من سحاب ولا قزعة وما بیننا وبین سلع من بیت ولا دار قال فطلعت من وراءہ سحابة مثل الترس فلما توسطت السماء انتشرت ثم امطرت قال فلا والله ما راینا الشمس سبتا قال ثم دخل رجل من ذلک الباب فی الجمعة المقبلة ورسول الله ﷺ قائم یخطب فاستقبله قائما فقال یا رسول الله هلکت الاموال وانقطعت السبل فادع الله یمسکها عنا قال فرفع رسول الله ﷺ یدیه ثم قال اللهم حولنا ولا علینا اللهم علی الآکام والظراب وبطون الاودیة ومنابت الشجر فانقلعت وخرجنا نمشی فی الشمس ، قال شریک فسألت انس بن مالک اهو الرجل قال لا ادری "

حضرت انس بن مالک ﷺ فرماتے ہیں بیشک جمعہ کے دن ایک شخص دار القضاء کے دروازہ کے جانب سے مسجد میں داخل ہوئے رسول اللہ ﷺ کھڑے ہو کر خطبہ دے رہے تھے وہ صحابی کھڑے ہو کر رسول اللہ ﷺ کی طرف توجہ کرتے ہوئے عرض کرنے لگے یا رسول اللہ مال ہلاک ہو رہے ہیں۔ راستے منقطع ہو چکے ہیں آپ اللہ تعالیٰ سے دعاء فرمائیں کہ ہمیں بارش عطا فرمائے۔ حضرت انس کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھوں کو اٹھایا پھر تین مرتبہ کہا اے اللہ ہمیں بارش عطا فرما، حضرت انس کہتے ہیں قسم ہے اللہ تعالیٰ کی ہم آسمانوں میں کوئی بادل نہیں دیکھ رہے تھے، اور نہ ہی کوئی بادل کا ٹکڑا نظر آ رہا تھا۔ اور نہ ہی ہمارے درمیان اور سلع پہاڑ کے درمیان کوئی گھر ایسا تھا کہ وہاں بادل کے آثار نظر آ رہے ہوں۔ حضرت انس کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے پیچھے کی جانب سے بادل نمودار ہوا جو ڈھال کی طرح تھا۔ جب آسمانوں کے درمیان پہنچا تو پھیل گیا، پھر بارش شروع ہو گئی۔ حضرت انس کہتے ہیں قسم ہے اللہ تعالیٰ کی ہمیں سورج کا ذرا بھر بھی کوئی حصہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ آنے والے جمعہ میں پھر ایک شخص

اسی دروازہ سے داخل ہوئے جب کہ رسول اللہ ﷺ کھڑے خطبہ دے رہے تھے وہ شخص کھڑے ہوکر رسول اللہ ﷺ کی طرف متوجہ ہوکر عرض کرنے لگے یا رسول اللہ مال ہلاک ہو رہے ہیں اور راستے منقطع ہو گئے۔ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ ہم سے بارش کو روک لے۔ حضرت انس کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھوں کو اٹھایا، پھر عرض کیا، اے اللہ ہمارے اردگرد بارش ہو، ہم پر نہ ہو، چھوٹے، بڑے ٹیلوں پر، وادیوں میں، درختوں کے پیدا ہونے کے مقامات پر بارش ہوتی رہے۔ حضرت انس کہتے ہیں (نبی کریم ﷺ کی دعا سے) بادل چھٹ گئے ہم دھوپ میں باہر نکلے۔ شریک کہتے ہیں میں نے حضرت انس سے پوچھا کیا دوسرے جمعہ پر عرض کرنے والے وہ پہلے شخص ہی تھے آپ نے فرمایا یہ مجھے معلوم نہیں۔

توضیح : دار القضاء سے مراد وہ دار ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دار تھا قرض کی ادائیگی میں بیچا گیا تھا۔ دونوں دفعہ دعاء میں "**ھلکت الاموال وانقطعت السبل**" کے الفاظ استعمال ہیں۔ پہلی مرتبہ عرض کرنے پر مقصد یہ تھا کہ قحط سالی کی وجہ سے مال ہلاک ہو رہے، پیداوار کے راستے بند ہو گئے ہیں۔

دوسری مرتبہ عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ بارش بہت زیادہ ہوگئی، جس کی وجہ سے مال ہلاک ہو رہے ہیں اور ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا ہے جس کی وجہ سے آمدورفت کے راستے بند ہو گئے ہیں: "**اللھم اغثنا**" اگر لفظ "**اغثنا**" **غیث** سے لیا ہوا ہو تو معنی یہ ہوگا کہ اے اللہ ہمیں بارش عطا فرما، اور اگر "غوث" سے لیا ہوا ہو تو معنی یہ ہوگا "اے اللہ ہماری فریاد رسی فرما۔

اسی وجہ سے پہلے لفظ میں دو نسخے ہیں ایک میں ہے "**یغثنا**" اور دوسرے میں ہے "**یغیثنا**" نبی کریم ﷺ نے تین مرتبہ رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا "**اللھم اغثنا**" **ففیه استحباب تکرار الدعاء ثلاثا** ،اس سے واضح یہ ہوا کہ دعاء میں تین مرتبہ تکرار مستحب ہے۔ "**واللہ ما رأینا الشمس سبتا**" میں سبتا کا معنی ہے ٹکڑا "**اصل السبت القطع**"

"**وبھذا الاخبار عن معجزۃ رسول اللہ ﷺ وعظیم کرامته علی ربه سبحانه وتعالٰی بانزال المطر سبعة ایام متوالیة متصلا بسواله من غیر تقدیم سحاب ولا قزع ولا سبب آخر لا ظاهر ولا باطن**"

اس حدیث پاک سے رسول اللہ ﷺ کا معجزہ اور آپ کا رب تعالیٰ کے ہاں عظیم مکرم ہونا

واضح ہورہا ہے کہ آپ کی دعاء سے سات دن لگاتار بارش جاری رہی جب کہ اس سے
پہلے نہ کوئی بادل تھے اور نہ ہی بارش کے کسی قسم کے کوئی آثار تھے۔

"اکام" بڑے ٹیلے، **"ظراب"** چھوٹے ٹیلے۔

حدیث پاک سے اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ بارش جب مقدار سے زیادہ نقصان دہ ہو جائے تو یہ دعا کرنا جائز ہے کہ اے اللہ تعالیٰ ہمیں اس بارش کے نقصان سے بچا۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے بھی ان مقامات سے بارش کو روک دینے کی درخواست کی جہاں بارش کی وجہ سے نقصان ہورہا تھا۔ البتہ بارش کے رکنے کی دعاء کے لے میدان میں جمع ہونا اور نماز ادا کر کے دعاء کرنے کا کوئی ثبوت نہیں۔

حضرت انس ﷺ سے جب یہ پوچھا گیا کہ دوسرے جمعہ دعا کرنے کی عرض کرنے والے پہلے جمعہ والے ہی صحابی تھے یا کوئی اور، تو آپ نے کہا" **لا ادری** "مجھے معلوم نہیں: " **وقد جاء فی البخاری وغیرہ انه الاول** " لیکن بخاری اور دوسری احادیث کی کتب میں یہ مذکور ہے کہ دوسرے جمعہ میں عرض کرنے والے وہی صحابی تھے جنہوں نے پہلے جمعہ میں عرض کیا تھا۔

اس حدیث پاک سے یہ واضح ہوا کہ بارش طلب کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ نے بغیر نماز استسقاء ادا کرنے کے دوران خطبہ دعاء فرمائی:

☆ **" والثالث وهو اكملها ان يكون بصلوة ركعتين وخطبتين ويتاهب قبله بصدقة وصيام وتوبة واقبال على الخير ومجانبة الشر ونحوذلك من طاعة الله تعالىٰ "**

☆ بارش طلب کرنے کا تیسرا طریقہ جو کہ زیادہ کامل ہے وہ یہ کہ نماز استسقاء ادا کرے اور نماز سے پہلے رب تعالیٰ کی راہ میں صدقہ کیا جائے روزے رکھے جائیں، توبہ کی جائے نیکیوں کی طرف توجہ کی جائے اور شر سے اجتناب کیا (بچا) جائے، اور ہر قسم کی اللہ تعالیٰ کی طاعت کی جائے (نماز کا طریقہ انشاءاللہ بعد میں بیان ہوگا۔ اسی میں خطبہ دینے کا حکم بیان ہو جائیگا)۔

☆ **" عن عباد بن تميم عن عمة قال خرج النبی ﷺ الى المصلى فاستسقى واستقبل القلبة وقلب رداءه وصلى ركعتين "**

حضرت عباد بن تمیم اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ عیدگاہ کے میدان کی طرف

تشریف لے گئے بارش طلب کرنے کی دعاء کی، قبلہ کی طرف متوجہ رہے، اور اپنی چادر کو پھیرا اور دو رکعتیں پڑھیں۔ (مسلم بمع نووی ج اول کتاب صلوۃ الاستسقاء)

نماز استسقاء: دو رکعت بنیت استسقاء جماعت سے ادا کی جائیں۔ امام ان میں قراءت بلند آواز سے کرے۔ اور بعد میں عید کی طرح دو خطبے دیئے جائیں۔ ایک خطبہ بھی ہو تو کافی ہے کیونکہ عید کے خطبہ کا یہی حکم ہے۔ (راقم کے اس بیان سے خطبہ کا مسئلہ اتفاقی ہو جائے گا)

نماز استسقاء کے بعد امام چادر پھیرے، لوگ اپنی چادروں کو نہ پھیریں، چادر پھیرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس انداز پر چادر کو الٹا کرے کہ نیچے والے کونے اوپر چلے جائیں اور اوپر والے نیچے ہو جائیں۔ دائیاں کونہ بائیں طرف ہو جائے، اور بائیاں کونہ دائیں ہو جائے۔ اسی طرح کپڑے کی اوپر والی سطح نیچے ہو جائے اور نیچے والی سطح اوپر ہو جائے۔

چادر پھیرنے میں نیک تفاؤل (نیک شگونی) مقصود ہوتی ہے کہ اے اللہ تعالیٰ جس طرح میں چادر پھیرنے کی طاقت رکھتا ہوں تو چادر کو الٹا پھیر رہا ہوں۔ تو ہی قدرت وطاقت کا مالک ہے اس لئے تو ہمارے حالات پھیر دے، یعنی قحط سالی کو ختم کر کے بارش عطاء فرما کر خوشحالی پیدا فرما دے۔ (از ھدایۃ)

ایک غلط فہمی کا ازالہ: امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا:

"لیس فی الاستسقاء صلوۃ مسنونۃ فی جماعۃ"

بارش طلب کرنے کے لئے جماعت سے نماز ادا کرنا سنت نہیں۔

اسی طرح فقہاء کرام نے یہ بیان کیا: "ولا خطبۃ عند ابی حنیفۃ لانہا تبع للجماعۃ ولا جماعۃ عندہ" اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک استسقاء کے لئے خطبہ بھی نہیں کیونکہ خطبہ جماعت کے تابع ہے جب ان کے نزدیک جماعت مسنون نہیں تو خطبہ بھی نہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اس قول پر عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جب حدیث پاک سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے استسقاء کی نماز جماعت سے پڑھائی اور خطبہ بھی دیا تو امام صاحب نے اس کا انکار کیوں کیا۔

اس پر فقہاء کرام نے مختلف بحثیں کی ہیں۔ فتح القدیر میں بسیط بحث ہے، لیکن راقم کا موقف اس میں بہت آسان ہے، حقیقت میں ہے بھی یہی، وہ یہ ہے کہ ہدایہ کی اس عبارت کو بڑے غور سے پڑھا جائے اور سمجھا جائے " قلنا فعله مرة وترکه اخری فلم یکن سنة " امام صاحب نے کہا کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی بارش طلب کرنے کے لئے نماز پڑھائی اور کبھی نہیں پڑھائی، لہذا نماز باجماعت ادا کرنا سنت نہیں۔

اب ذرا بات کو سمجھیں کہ جب علامہ نووی رحمہ اللہ کی بحث سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ بارش طلب کرنے کے تین طریقے ہیں ان میں ایک نماز استسقاء ہے تو اس سے واضح ہو گیا کہ امام صاحب نے نفی مطلقا سنت ہونے کی نہیں کی، بلکہ سنت مؤکدہ ہونے کی کی ہے، آپ کا یہ کہنا ہی واضح کر رہا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی نماز جماعت سے پڑھائی اور کبھی نماز نہیں پڑھائی۔ کہ آپ سنت غیر مؤکدہ ہونے کے قائل ہیں۔ جب نماز باجماعت ہوگی خطبہ ہوگا اور جب جماعت نہیں ہوگی تو خطبہ بھی نہیں ہو گا، لہذا خطبہ کی نفی بھی سنت مؤکدہ کی نفی ہے۔

نماز استسقاء کے بعد دعا:

" عن انس قال رأیت رسول ﷺ یرفع یدیه فی الدعاء حتی یری بیاض ابطیه "

(مسلم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے (بارش طلب کرنے کے لئے) دعا میں اتنے بلند ہاتھ اٹھائے کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی کو دیکھا جا سکتا۔

☆ " عن انس ان نبی اللہ ﷺ کان لا یرفع یدیه فی شئی من دعائه الا فی الاستسقاء حتی یری بیاض ابطیه " (مسلم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ اپنی کسی دعا میں اتنے بلند ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے جتنے بارش طلب کرنے کی دعا میں اٹھاتے یہاں تک کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی کو دیکھا جا سکتا تھا۔

غلط فہمی کا ازالہ: عام لوگ جو علم سے کورے ہیں، اور ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کے قائل نہیں، وہ کہتے

ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے سوائے استقاء کے ہاتھ اٹھائے ہی نہیں ۔ یہ ان کی غلط فہمی ہے ۔ اس پر علامہ نووی رحمہ اللہ کی بحث کو دیکھیں ، اور خاص کر کے یہ سمجھیں کہ علامہ نووی رحمہ اللہ نے آجکل کے اختلافات کو پہلے سے ہی کیسے دور فرما دیا۔

" هذا الحديث يوهم ظاهره انه لم يرفع ﷺ الا في الاستسقاء وليس الامر كذلك بل قد ثبت رفع يديه ﷺ في الدعاء في مواطن غير الاستسقاء وهي اكثر من ان تحصر وقد جمعت منها نحوا من ثلاثين حديثا من الصحيحين او احدهما "

اس حدیث سے بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سوائے استقاء کے ہاتھ اٹھائے ہی نہیں ، حالانکہ اس طرح نہیں ۔ بلکہ نبی کریم ﷺ کا استقاء کے بغیر بیشمار مقامات میں ہاتھ اٹھانا ثابت ہے۔

میں نے صحیحین سے متفق علیہ احادیث یا ان دونوں میں سے کسی ایک یعنی بخاری یا مسلم سے تقریباً تیس احادیث کو جمع کیا ہے جن میں استقاء کے بغیر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا ثابت ہے۔ یہ احادیث میں نے شرح مہذب کے باب صفۃ الصوۃ میں جمع کی ہیں۔

" ويتأول هذا الحديث على انه لم يرفع الرفع البليغ بحيث يرى بياض ابطيه الا في الاستسقاء "

اس حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کسی دعا میں بھی ہاتھ بہت زیادہ بلند کر کے نہیں اٹھائے کہ جس سے بغلوں کی سفیدی نظر آ جائے سوائے استقاء کی دعا کے۔

☆ " عن انس بن مالک ان النبی ﷺ استسقى فاشار بظهر كفيه الى السماء " (مسلم)

حضرت انس بن مالک ؓ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے بارش طلب کرنے کے لئے دعا فرمائی اپنی ہتھیلیوں کی پیٹھ کو آسمانوں کی طرف کیا۔

" قال جماعة من اصحابنا وغيرهم السنة في كل دعاء لرفع بلاء كا لقحط ونحوه ان يرفع يديه ويجعل ظهر كفيه الى السماء واذا دعا لسوال شئى وتحصيله جعل بطن كفيه الى السماء واحتجوا بهذا

الحديث " (نووی)

اہل علم حضرات نے اسی حدیث سے یہ دلیل قائم کی ہے کہ ہر وہ دعاء جو مصیبتوں کے رد کرنے کیلئے ہو جیسے قحط سالی کو دور کرنے کیلئے وغیرہ تو اس دعاء میں الٹے ہاتھوں سے دعاء کرے اور ہر وہ دعا جو کسی چیز کی طلب کی جائے وہ دعا سیدھے ہاتھوں سے کرے۔

(مسلم ج اول کتاب صلوۃ الاستسقاء مع نووی)

بادلوں کو دیکھ کر دعا کرنا:

" عن عائشة زوج النبی ﷺ انها قالت کان النبی ﷺ اذا عصفت الریح قال اللهم انی اسألک خیرها و خیر مافیها و خیر ما ارسلت به واعوذ بک من شرها و شرما فیها و شرما ارسلت به قالت و اذا تخلیت السماء تغیر لونه و خرج و دخل و اقبل و ادبر فاذا مطرت سری عنه فعرفت ذلک عائشة فسالته فقال لعله یا عائشة کما قال قوم عاد فلما رأه عارضا مستقبل او دیتهم قالوا هذا عارض ممطرنا "

(مسلم ج اول کتاب صلوۃ الاستسقاء)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں جب تیز ہوا چلتی تو نبی کریم ﷺ کہتے اے اللہ میں تجھ سے اس کے خیر ہونے اور جو اس میں ہے اس کے خیر ہونے، اور اسے جو عطا کر کے بھیجا گیا ہے اس کے خیر ہونے کا تجھ سے سوال کرتا ہوں۔ اور اے اللہ تیری پناہ اس کے شر سے، اور جو اس میں ہے اس کے شر سے، اور جو اس میں بھیجا گیا ہے اس کے شر سے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، جب حضور (کڑک، چمک والے) بادل دیکھتے تو آپ (کے چہرے) کا رنگ بدل جاتا، آپ کبھی داخل ہوتے کبھی آگے کی طرف متوجہ ہوتے اور کبھی پیچھے مڑتے (یعنی آپ پر بے قراری طاری رہتی) اور جب بارش ہو جاتی تو آپ کی وہ کیفیت جاتی رہتی (یعنی آپ کو خوشی ہوتی) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ کی یہ کیفیت جب محسوس کی تو آپ سے اس کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا قوم عاد نے جب عذاب کو دیکھا بادل کی طرح آسمان کے کنارے میں پھیلا ہوا ان کی وادیوں کی طرف آتا بولے یہ بادل ہے کہ ہم پر برسے گا۔

﴿ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُم بِهِ رِيحٌ فِيهَا عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴾

بلکہ یہ تو وہ ہے جس کی تم جلدی مچاتے تھے ایک آندھی ہے جس میں [illegible] عذاب ہے۔ مسلم شریف

اسی باب میں دوسری حدیث میں یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یارسول اللہ:

" اری الناس اذا رأوا الغیم فرحوا رجاء ان یکون فیه المطر واراک اذا رأیته عرفت فی وجهک الکراهیة قالت فقال یا عائشة ما یؤمننی ان یکون فیه عذاب قد عذب قوم بالریح وقد رأی قوم العذاب فقالوا هذا عارض ممطرنا "

میں لوگوں کو دیکھتی ہوں کہ وہ بادلوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اس امید سے کہ بارش ہوگی، اور میں آپ کو دیکھتی ہوں کہ آپ بادل کو دیکھ کر پریشان ہوتے ہیں آپ نے فرمایا اے عائشہ میں عذاب سے بے خوف نہیں ہوتا ایک قوم کو ہوا کی وجہ سے عذاب دیا گیا (اوران کو تباہ وبرباد کر دیا گیا) وہ قوم عذاب کو دیکھ کر یہی کہہ رہی تھی یہ بادل ہے ہم پر برسے گا۔

ان احادیث سے واضح ہوا کہ بارش اور ہوا اعتدال پر رہیں تو رحمت ہیں، خوشحالی کا ذریعہ ہیں اور اگر حد سے تجاوز کر جائیں تباہی کا سبب بن جائیں تو وہی رب تعالیٰ کا عذاب ہے اسلئے بادل کو دیکھ کر اس کے خیر کی دعاء کرے۔

☆☆☆☆☆

﴿ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ ، اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ، وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴾

۱) ''اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم سے تو ایک کھانے پر ہرگز صبر نہ ہوگا، تو آپ اپنے رب سے دعاء کیجئے کہ زمین کی اگائی ہوئی چیزیں ہمارے لئے نکالے، کچھ ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز فرمایا کیا ادنیٰ چیز کو بہتر کے بدلے مانگتے ہو۔ اچھا مصر یا کسی شہر میں اترو وہاں تمہیں ملے گا جو تم نے مانگا، اور ان پر مقرر کر دی گئی خواری اور ناداری اور خدا کے غضب میں لوٹے یہ بدلا تھا اس کا کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے اور انبیاء کو ناحق شہید کرتے یہ بدلا تھا ان کی نافرمانیوں اور حد سے بڑھنے کا''۔

۲) ''اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز صبر نہیں کریں گے ایک کھانے پر، تو دعاء کریں ہمارے لئے اپنے رب سے وہ پیدا کرے ہمارے لئے وہ چیزیں جو زمین اگاتی ہے۔ یعنی سبزی اور ککڑی (تر، کھیرا) اور گندم اور مسور اور پیاز، فرمایا کیا تم تبدیل کرنا چاہتے ہو وہ چیز جو گھٹیا ہے اس کے بدلے جو بہتر ہے اتر جاؤ شہر میں، تو بیشک تمہارے لئے وہ ہے جو تم نے مانگا۔ اور ڈال دی گئی ان پر ذلت اور محتاجی، اور وہ لوٹے اللہ کے غضب سے، یہ اس وجہ سے کہ بیشک وہ کفر کرتے تھے اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے، اور شہید کرتے تھے انبیاء کو ناحق (اور) یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے تجاوز کرتے تھے''۔

مختصر مطلب:

بنی اسرائیل میدان تیہ میں من اور سلوی ہر روز کھانے سے اکتا گئے، تو موسیٰ علیہ السلام کو کہنے لگے کہ ایک ہی قسم کے کھانے پر اب ہم سے صبر نہیں ہوسکتا، آپ رب تعالیٰ سے ہمارے لئے دعاء کرو کہ وہ ہمیں زمین کی پیداوار چیزیں یعنی سبزیاں اور ککڑی، گیہوں، مسور اور پیاز عطا کرے۔

موسیٰ علیہ السلام نے انہیں سمجھایا کہ جو چیزیں تم طلب کر رہے ہو وہ گھٹیا ہیں۔ رب تعالیٰ نے جو کھانا تمہیں عطا کر رکھا ہے وہ بہتر ہے، تمہیں بغیر مشقت کے حاصل ہو رہا ہے، لیکن ان کو جب بات نہ سمجھ آئی، وہ زمین کی پیداوار کے حاصل کرنے پر اصرار کرتے رہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو قریبی شہر میں جانے کی اجازت دے دی کہ وہاں تمہیں تمہاری خواہش کے مطابق اشیاء حاصل ہوں گی۔

ان پر ذلت اور محتاجی کو مسلط کر دیا گیا اور وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہو گئے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرتے تھے اور انبیاء کرام کو ناحق شہید کرتے، اور اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہونے کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی موسیٰ علیہ السلام کے نافرمان تھے اور حد سے تجاوز کرنے والے تھے۔

تفصیلی وضاحت:

﴿ وَاِذۡ قُلۡتُمۡ یٰمُوۡسٰی لَنۡ نَّصۡبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ ﴾ : ''اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز صبر نہیں کریں گے ایک کھانے پر'' ''نادوہ باسمه من قلة ادبهم'' (تیسیر الرحمٰن)

بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام لے کر پکارا جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے دلوں میں موسیٰ علیہ السلام کا ادب واحترام کم تھا، شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس سے زیادہ واضح تحریر فرمایا:

''ودریں ندا کمال بے ادبی کردید که همچو پیغمبر اولو العزم را بنام او خواندید ویا رسول الله ویا نبی الله وامثال ذلک نگفتید''

یاد کرو تم اس وقت کو کہ تم نے کہا ''اے موسیٰ'' اور تم نے موسیٰ علیہ السلام کا نام لے کر جو

پکارا اس میں بہت بڑی بے ادبی تم نے کی، کیونکہ تم نے اللہ تعالیٰ کے ایک عظیم مرتبہ والے نبی کو نام لے کر پکارا، حق یہ تھا کہ تم "یارسول اللہ" "یا نبی اللہ" یا اور اس قسم کے ادب والے الفاظ سے پکارتے"

"ومضمون کلام شما نیز کمال بے ادبی بود زیرا که گفتید "لن نصبر" یعنی ماہرگز صبر نخواہیم کرد، وایں نوع کلام دلالت میکند برآنکه صبر متیوانم کرد ولیکن باختیار خود نمیکنیم"

"اور تمہارے کلام کا مضمون بھی کامل بے ادبی پر دلالت کر رہا ہے کہ تم نے کہا "لن نصبر" (ہم ہرگز صبر نہیں کریں گے) ان کے اس کلام سے یہ سمجھ آ رہا ہے کہ وہ صبر کر سکتے تھے لیکن انہوں نے اپنے اختیار سے صبر نہ کرنے کے متعلق کہا کہ ہم گز صبر نہیں کریں گے۔ (عزیزی)

ان کے "لن نصبر" کہنے سے یہ بھی سمجھ آیا کہ وہ میدان تیہ میں اترنے والے من اور سلویٰ کو ناپسند کرتے تھے "اذ الصبر حبس النفس فی المضیق" جب کہ صبر کا مطلب ہے مشکل اور تنگی میں اپنے آپ کو اس میں روکنا ان کا مطلب یہ تھا کہ اس مشکل میں ہم اپنے آپکو کبھی نہیں روکیں گے۔
(از روح المعانی)

﴿ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ ﴾: بظاہر وہم یہ ہے کہ میدان تیہ میں ان کو دو کھانے حاصل تھے، ایک طعام کا ذکر کیسے کیا گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا مطلب یہ تھا" انه لا یختلف ولا یتبدل " کہ یہ کھانا جو ہمیں عطا کیا جاتا ہے یہ کبھی مختلف نہیں ہوتا، اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی، یعنی ایک حال پر رہنے کی وجہ سے انہوں نے ایک ہی طعام کہہ دیا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے:

" طعام مائدة الا میر واحد یریدون انه لا تتغیر الوانه "

امیر کے دستر خوان پر ہمیشہ ایک جیسا کھانا ہی رہتا ہے یعنی اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی، حالانکہ دستر خوان پر کھانے کئی ہوتے ہیں، لیکن ہر روز وہی ہوتے ہیں ان کو ایک طعام کہہ لیا جاتا ہے۔ (از بیضاوی)

فائدہ: طعم (بالفتح) کا معنی ہے "چکھنا" کہا جاتا ہے " طعمه مر " اس کا ذائقہ کڑوا ہے الطعم (بالضم) کا معنی ہے "طعام"

''طعام'' کھانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَـاِذَا طَعِمْتُمْ فَـانْتَشِرُوْا ﴾ اس مقام پر طعام کا معنی ہے ''کھانا'' اور کبھی طعام ''پینے'' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے ''ومن لم یطعمه فانه منی'' (جس نے اس نہر سے نہ پیا وہ میرے ساتھ متعلق ہوگا) یہاں پانی کے معنی میں استعمال ہے۔

اور کبھی ''طعام'' بمعنی غذائیت کے استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ زمزم کے پانی کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

''انها طعام طعم وشفاء سقم''

زمزم کے پانی میں پینے والے کے لئے غذائیت ہے اور بیمار کے لئے شفا ہے۔

(از قرطبی)

﴿ فَادْعُ لَنَا رَبَّکَ ﴾ : ''دعاء کرو ہمارے لئے اپنے رب سے''

''وانما سألوا من موسٰی ان یدعولهم لان دعاء الانبیاء علیهم الصلوة والسلام اقرب للاجابة من دعاء غیرهم''

ان لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہا کہ تم ہمارے لئے دعاء کرو خود انہوں نے دعاء نہیں کی اس کی وجہ کیا تھی؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ انبیاء کرام کو رب تعالیٰ کے حضور درجہ قبولیت حاصل ہوتا ہے اس لئے ان کی دعاء کو جو قبولیت کا مقام حاصل ہوتا ہے وہ دوسرے لوگوں کی دعائوں کو حاصل نہیں ہوتا۔

''علی ان دعاء الغیر للغیر مطلقا اقرب الیها فما ظنک بدعاء الانبیاء لاممهم''

عام طور پر جب کوئی انسان کسی دوسرے انسان کے لئے دعاء کرے تو رب تعالیٰ اسے شرف قبولیت عطا فرماتا ہے تو تمہارا کیا خیال ہے کہ انبیاء کرام جب اپنی امتوں کے حق میں دعاء کریں تو ان دعائوں کو کیا مقام حاصل ہوگا یقیناً ان میں عظیم درجہ کی قبولیت حاصل ہوگی۔ اس لئے کہ پاک ہستیوں کی پاک زبانوں سے نکلنے والے الفاظ کبھی رد نہیں ہوسکتے۔

''عن ام الدرداء قالت حدثنی سیدی انه سمع رسول اللہ ﷺ یقول من دعاء لاخیه بظهر الغیب قال الملک الموکل به آمین ولک بمثل''

(مسلم ج ۲ ص ۳۶۰)

حضرت ام الدرداء رضی اللہ عنہا سے مروی ہے میرے خاوند نے مجھے بتایا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ نے فرماتے ہوئے سنا جو شخص اپنے (مومن) بھائی کی غیر موجودگی میں اس کے لئے دعاء کرتا ہے اس پر ایک فرشتہ آمین کہنے کے لئے مقرر ہوتا ہے وہ دعاء قبول ہوتی ہے۔ دعاء کرنے والے کو ایسا ہی اجر ملتا ہے۔

عظیم ہستی کا دعاء کی درخواست کرنا:

جب یہ واضح ہوا کہ کوئی دوسرا شخص کسی اور کے لئے دعاء کرے تو اس میں قبولیت پائی جاتی ہے اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فرمایا "**اشرکنا فی دعائک**" اپنی دعاء میں ہمیں بھی شریک کرنا، نبی کریم ﷺ نے اپنے اس ارشاد سے اپنی امت کو تعلیم دی، کہ اے میری امت کے علماء اور صوفیاء حضرات تم اپنے آپ کو بے نیاز نہ سمجھنا، کسی کو اپنے سے کم سمجھ کر دعاء کی درخواست سے اجتناب نہ کرنا، بلکہ دعاء کی درخواست ہر شخص کو کرتے رہنے چاہئے۔

وفی الاثر "ادعونی بالسنة لم تعصونی فیها" رب تعالیٰ کی طرف سے یوں کہا جاتا ہے کہ مجھ سے ان زبانوں سے دعاء کرنا جن زبانوں سے تم نے میری نافرمانی نہیں کی۔

یعنی کوئی شخص بھی رب تعالیٰ کی اپنی زبان سے نافرمانی کرتا ہے۔ تو وہ اپنے حق میں جب دعاء کرے گا تو وہ نافرمان زبان سے دعاء کر رہا ہے۔ لیکن جب دوسرے کے حق میں دعاء کرے گا تو اس کے حق میں اس کی زبان پاک ہوگی، پاک زبان سے جب یہ دعاء کرے گا تو اسے شرف قبولیت حاصل ہوگا۔

لہٰذا واضح ہوا کہ بنسبت اپنے لئے دعاء کرنے کے دوسروں کے لئے دعاء کرنا زیادہ قبولیت کا سبب ہے۔ لہٰذا دعاء کرتے وقت اپنی دعاء میں اور مومنوں کے لئے بھی دعاء کرے تا کہ ان کے طفیل اس کے اپنے حق میں بھی دعاء قبول ہو۔ (از روح المعانی)

ایک عجیب حکمت: انہوں نے کہا "**ربک**" یہ نہیں کہا "**ربنا**" یعنی انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو کہا تم اپنے رب سے ہمارے لئے دعاء کرو یہ نہیں کہا کہ "تم ہمارے رب سے ہمارے لئے دعاء کرو"۔

اس میں حکمت یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو رب تعالیٰ نے خصوصی تقرب عطا فرمایا کہ آپ سے بلا

واسطہ جبرائیل کلام فرمایا، اور آپ کو توراۃ عطا فرمائی، بنی اسرائیل کو معلوم تھا کہ یہ منصب تو ہمیں حاصل نہیں۔ تو گویا کہ انہوں نے کہا:

" ادع لنا المحسن الیک بما لم یحسن به الینا فکما احسن الیک من قبل نرجو ان یحسن الیکم فی اجاجة دعائک "

کہ آپ ہمارے لئے اس ذات سے دعاء کریں جس کا آپ پر بہت احسان ہے اس کے جتنے احسان آپ پر ہیں اتنے ہم پر نہیں۔ اس لئے جب آپ اپنے رب سے ہمارے لئے دعاء کریں گے تو وہ آپ کی دعاء کو قبول کر کے آپ پر اور احسان فرمائے گا، کیونکہ اس کے احسان آپ پر پہلے ہی بہت عظیم ہیں۔ (روح المعانی)

گذشتہ سے پیوستہ:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا نبی کریم ﷺ کی خدمت میں دعاء کی درخواست کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آپ کا بھی عقیدہ یہی تھا کہ بزرگ ہستیوں سے دعاء کرانا باعث قبولیت ہے۔

☆ " عن ابی هریرة قال اتیت النبی ﷺ بتمرات فقلت یا رسول الله ادع الله فیهن بالبركة فضمهن ثم دعاء لی فیهن بالبركة قال خذهن فاجعلهن فی مزودک كلما اردت ان تاخذ منه شیأ فادخل فیه یدک فخذه ولا تنثره نثرا فقد حملت من ذلک التمر كذا وكذا من وسق فی سبیل الله فكنا ناكل منه ونطعم وكان لا یفارق حقوی حتی كان یوم قتل عثمان فانه انقطع " (رواه الترمذی ، مشکوة باب المعجزات)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں چند کھجوریں لایا تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ اللہ تعالیٰ سے ان میں برکت کی دعاء فرما دو، آپ نے وہ کھجوریں لیں پھر ان میں برکت کی دعاء کی آپ نے فرمایا یہ لے لو، ان کو اپنے توشہ دان میں ڈال لو، جب ان میں کھجوریں لینا چاہو، تو اپنا ہاتھ اس میں ڈال کر نکال لیا کرو، لیکن کھجوروں کو باہر نکال کر پھیلانا نہیں، حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں ان کھجوروں میں سے ایک وسق تو میں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیں۔ ہم خود کھاتے بھی رہے، کھلاتے بھی رہے، وہ کھجوریں میری کمر سے کبھی جدا نہیں ہوئیں (یعنی میں ان کو اپنی کمر سے باندھ کر رکھتا تھا) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جس دن شہید ہوئے اس دن وہ کمر سے کھل کر بکھر گئیں۔

وضاحت حدیث:

حضرت ابو ہریرہ ﷛ نے جو کھجوریں لائیں وہ کتنی مقدار میں تھیں؟

" قال الشیخ ابو نصر کانت التمرات احدی وعشرین "

شیخ ابونصر رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ وہ کھجوریں صرف اکیس دانے تھے۔

نبی کریم ﷺ کی دعاء سے ان میں کتنی عظیم برکت ہوئی، کہ صرف اکیس کھجوریں اتنی زیادہ مقدار میں بڑھتی رہیں کہ ایک وسق تو حضرت ابو ہریرہ ﷛ نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیں۔ وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے، اور صاع تقریباً چار کلو کا ہوتا ہے۔ پھر وہ کھجوریں حضرت ابو ہریرہ ﷛ اور ان کے گھر والے خود بھی کھاتے رہے، اور دوسرے لوگوں کو بھی یعنی آنے والے مہمانوں کو بھی کھلاتے رہے۔

اگر حضرت ابو ہریرہ ﷛ سے وہ کھجوریں گر کر بکھر نہ جاتیں تو عمر بھر وہ ان سے نفع حاصل کرتے رہتے، بلکہ نسل بنسل وہ کھجوریں چلتی رہتیں۔ حضرت ابو ہریرہ ﷛ کا ایک قول یہ بھی ہے:

" وسقط منی وضاع فحزنت علیه حزنا شدیدا "

اور مجھ سے وہ کھجوریں گر گئیں اور ضائع ہو گئیں تو میں بہت زیادہ غمناک ہو گیا۔

" وفیه ایماء الی ان الفساد اذا شاع ارتفعت البرکة " یہاں سے ہی ایک اور بات واضح ہو گئی کہ فساد جب پھیل جاتا ہے تو اس کی نحوست سے برکت اٹھ جاتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ ﷛ افسردہ حال میں دکھ بھرے لہجہ میں فرماتے تھے۔

للناس هم ولی همان بینهم هم الجراب وهم الشیخ عثمانا

لوگوں کا ایک غم حاصل تھا مجھے ان کے درمیان دو غم حاصل تھے ایک توشہ دان کا غم اور ایک بزرگ شخصیت حضرت عثمان کا یعنی باقی صحابہ کرام کو ایک عظیم غم حاصل تھا، وہ حضرت عثمان ﷛ کا شہید کیا جانا، فتنہ وفساد کا نمودار ہونا، لیکن حضرت ابو ہریرہ ﷛ فرماتے ہیں مجھے دو غم لاحق تھے، ایک تو میرے توشہ دان کا میری کمر سے کھل جانا، اور کھجوروں کا بکھر جانا، کیونکہ وہی ان کھجوروں کی برکت کا آخری دن تھا۔ اور دوسرا حضرت عثمان ﷛ کی شہادت اور یہودیوں کی سازش اور باغیوں کی یلغار کی وجہ سے غم میں مبتلاء تھا۔

(از مرقاۃ ج ۱۱ ص ۳۱۷)

☆ "عن عمر بن الخطاب قال انی سمعت رسول الله ﷺ یقول ان خیر التابعین رجل یقال له اویس وله والدة وکان به بیاض فمروہ فلیستغفرلکم"

(مسلم ج ۲ باب من فضائل اویس القرنی)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا، بیشک تابعین میں سے بہتر وہ شخص ہے جسے اویس کہا جاتا اس کی والدہ ہے (جس کی تیمارداری کی وجہ سے وہ میرے پاس نہ آسکا) اسے برص کی مرض تھی، جب اس پر تمہارا گزر ہو تو اپنے لئے اس سے مغفرت کی دعاء کرانا۔

"فیہ استحباب طلب الدعاء والاستغفار من اهل الصلاح وان کان الطالب افضل منهم" (نووی)

اس حدیث سے یہ واضح ہوا کہ نیک لوگوں سے دعاء کرائی جائے، ان سے مغفرت طلب کرنے کی درخواست کی جائے، خواہ دعاء کرانے والا افضل ہی کیوں نہ ہو کیونکہ صحابہ کرام کو حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ سے دعاء کرانے کو حکم دیا، جبکہ اویس تابعی تھے، صحابی تابعی سے افضل ہے۔

﴿یُخرِجُ لَنَا مِمَّا تُنبِتُ الاَرضُ﴾: "پیدا کرے ہمارے لئے وہ چیز جو زمین اگاتی ہے" طلباء حضرات خیال فرمائیں کہ اس مقام پر "یخرج" مجزوم ہے کہ "ادع" امر کے جواب میں واقع ہے۔

اگرچہ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے دو قول اور بھی نقل کئے ہیں لیکن ان میں تکلفات ہیں آسان صورت یہی ہے جو بیان کر دی گئی۔ ﴿یُخرِجُ لَنَا﴾ کا اگرچہ حقیقی معنی ہے اظہار، یعنی ظاہر کرنا۔ لیکن یہاں مجازی معنی مراد ہے جو حقیقی معنی کو مستلزم ہے: "وهو الاظهار بطریق الایجاد" وہ ظاہر کرنا بطریق ایجاد، یعنی پیدا کرے ہمارے لئے وہ چیزیں جو زمین اگاتی ہے۔ (روح المعانی)

زمین کی طرف اگانے کی نسبت مجازی طور پر ہے، ظاہری طور پر سبب زمین ہے ورنہ حقیقت میں رب تعالیٰ کا فعل ہے۔ (بیضاوی)

بنی اسرائیل نے زمین کی پیداوار کا سوال کیوں کیا تھا؟ اسی کی وجہ یہ تھی "وهم کانوا فلاحة

فنزعوا الی عکرهم واشتھوا ما الفوہ " (بیضاوی) اس لئے کہ وہ کسان تھے، کھیتی باڑی کا کام کرنے والے تھے، لہذا وہ اپنے اصل کی طرف لوٹے، اور جس چیز کی خواہش رکھتے تھے اسی کی انہوں نے تمنا کی ۔ کیونکہ انسان کی اصل تربیت میں جس کی طرف رغبت ہو، عادت کے مطابق اسی کی وہ خواہش رکھتا ہے، خواہ وہ گھٹیا ہی کیوں نہ ہو، اور اس کے مقابل دوسری چیز اعلی ہی کیوں نہ ہو۔

اور وجہ یہ تھی کہ وہ میدان تیہ میں چالیس سال سے من اور سلوی کھا رہے تھے، جس سے وہ اکتا گئے انہوں نے مطالبہ کیا کہ اب ہمارا کھانا بدل دیا جائے ۔ اور وجہ یہ تھی کہ انہیں یہ معلوم تھا کہ زمین کی پیداوار میدان تیہ جیسے چٹیل مقام میں تو حاصل ہو نہیں سکتی، یقیناً کہیں زرخیز زمین سے حاصل ہوگی لہذا ان کی تمنا یہ تھی کہ ہمیں میدان تیہ سے نکال کر کسی شہر میں بھیج دیا جائے جہاں ہم آباد بھی ہو جائیں اور ہماری خواہش کے مطابق ہمیں غذا بھی حاصل ہو جائے ۔

اور وجہ یہ تھی کہ انہوں نے طبیب حضرات کے اس قول کا خیال کیا کہ ایک ہی کھانا ہمیشہ کھانے سے شہوت میں نقصان ہوتا ہے، ہضم میں کمی ہو جاتی ہے، رغبت کم ہو جاتی ہے، لیکن مختلف قسم کے کھانے تناول کرنے سے شہوت میں قوت آ جاتی ہے، اور لذت بڑھ جاتی ہے تو انہوں نے اطباء کے ان اقوال کو دیکھتے ہوئے تمنا کی کہ ہمارا کھانا بدل جائے ہمیں زمین کی پیداوار حاصل ہو۔ (از کبیر)

﴿ مِنۡ بَقۡلِهَا ﴾ : من بیان کے لئے ہے جس کا معنی ہوتا ہے یعنی اور " بقل " سے مراد علامہ بیضاوی بیان کرتے ہیں:

" والبقل ما انبته الارض من الخضر والمراد به اطایبه التی توکل "
حقیقت میں بقل کا معنی زمین کے اگانے والی ہر قسم کی سبزی، جو گھاس وغیرہ کو بھی شامل ہے لیکن یہاں مراد سبزی سے وہ ترکاری جو کھائی جاتی ہے ۔

﴿ وَقِثَّآئِهَا ﴾ : فارسی زبان میں " قثاء " کا معنی خیار ہے ۔ پھر اس کی دو قسمیں ہیں، ایک " خیار دراز " جسے ککڑی کہا جاتا ہے ہماری زبان میں "تر" کہتے ہیں اور دوسری قسم " خیار خرد " یعنی کھیرا ۔ آیۃ کریمہ میں مراد عام ہے انہوں نے ککڑی اور کھیرے دونوں کا ہی مطالبہ کیا تھا۔

(از عزیزی)

﴿ وفومها ﴾ : " اختلف فی الفوم فقیل هو الثوم لانه المشاکل للبصل ، وقیل الفوم الخنطة روی عن ابن عباس ایضا واکثر المفسرین " (از قرطبی)

" فوم " کے معنی میں اختلاف ہے بعض نے کہا کہ یوں " فوم " سے مراد تھوم (لہسن) ہے کیونکہ یہ پیاز کا ہم شکل ہے اور احکام بھی دنوں کے ایک ہی ہیں، اور بعض حضرات نے کہا آیۃ کریمہ میں " فوم " سے مراد گندم ہے یہی قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔اور یہی قول اکثر مفسرین کرام کا ہے۔اسی لئے مترجمین نے گندم ہی معنی کیا ہے۔

﴿ وَعَدَسِهَا ﴾ : عدس کا معنی مشہور ہے "مسور" یعنی عدس سے مراد جب زمین کی پیداوار مراد لیں تو اس وقت معنی فقط "مسور" ہی ہوگا۔تاہم " عدس " کے اور معانی بھی آتے ہیں۔ خچر کو زجر کنا، مشقت اٹھانا، شدید پائمال کرنا، چلنا۔انسان کے جسم پر آبلے بن جائیں تو ان کو " عدسة " کہا جاتا ہے۔ (از قرطبی)

﴿ وَبَصَلِهَا ﴾ : " بصل " کا معنی پیاز، ان چیزوں کا ذکر صرف مثال کے طور پر تھا، کہ ہمیں زمین کی پیداوار عطا ہو۔یعنی مثال کے طور پر سبزی اور ککڑی اور گندم اور مسور اور پیاز۔صرف ان چیزوں کا مطالبہ کرنا ان میں انحصار (بند) کرنا مقصود نہیں تھا۔اگرچہ تفسیر عزیزی، روح المعانی اور شیخ زادہ نے ان چیزوں کے مطالبہ کی حکمتیں بھی بیان کی ہیں۔لیکن راقم نے ان بحثوں کو غیر ضروری سمجھ کر صرف نظر کرلیا۔

فوائد: البتہ یہاں ایسی بحثوں کا ذکر کیا جارہا ہے جو قارئین کے لئے زیادہ مفید ہیں۔

☆ " عن عائشة قالت كانت امی تعالجنی للسمنة ، ترید ان تدخلنی علی رسول الله ﷺ فما استقام لها ذلک حتی اکلت القثاء بالرطب فسمنت کا حسن سمنة "

(رواه ابن ماجه وسناده صحیح ، قرطبی)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میری والدہ میرے موٹا ہونے کیلئے علاج کررہی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجیں، لیکن ان کو اس پر کامیابی حاصل نہیں ہورہی تھی۔ یہاں تک کہ میں ککڑی یا کھیرا کھجور سے ملا کر کھانے لگی تو مجھ پر موٹاپا آ گیا۔

مسئلہ : پیاز اور لہسن پکا کر کھائے جائیں جب ان کی بو زائل ہو جائے تو جائز ہے اس میں کوئی کراہیت نہیں خواہ وہ نماز سے پہلے ہی کیوں نہ کھالے۔ کچے پیاز اور لہسن کو کھانا جب کہ ان میں بو پائی جائے عام اوقات میں جائز ہے البتہ نماز سے پہلے کھانا مکروہ ہے کیونکہ ان کی بو سے دوسرے نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ اور نماز میں شریک فرشتوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔

اعتراض : نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے تو کچے پیاز اور لہسن کو کھانا مطلقاً منع نظر آتا ہے صرف نماز کے وقت کی قید لگانا تو درست نہیں: " واحتجوا بان رسول الله ﷺ سماها خبيثة " ان معترضین کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان کو خبیث کہا۔ اور اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کا وصف بیان فرمایا:

" ويحرم عليهم الخبائث " کہ آپ خبیث چیزوں کو حرام کرنیوالے ہیں۔

تو اس سے پتہ چلا کہ جس چیز کو رسول اللہ ﷺ نے خبیث کہا ہے وہ مطلقاً حرام ہے۔

جواب : دوسری احادیث میں واضح طور پر ذکر ہے کہ ان کو پکا کر ان کی بو کو زائل کر دیا جائے تو ان کا کھانا جائز ہے۔ ان کو نہ پکایا جائے تو کھا کر مسجد میں آنا منع ہے۔ نبی کریم ﷺ نے خود صحابہ کرام کو کچے پیاز کھانے کے لئے دیئے۔ اگر مطلقاً حرام ہوتے تو آپ ان کو نہ دیتے۔ آپ کا ان کو خبیث کہنا بدبودار کے معنی میں ہے۔

یہ بھی خیال رہے کہ خود نبی کریم ﷺ نے احتیاط اور تقوی کے طور پر لہسن والا پکا ہوا سالن بھی استعمال نہیں فرمایا لیکن صحابہ کرام کو اس کی اجازت دی۔ آیئے ان مسائل پر احادیث مبارکہ کو دیکھیں۔

☆ " عن جابر ان النبی ﷺ اتی ببدر فيه خضرات من بقول فوجد لها ريحا ، قال فاخبر بما فيها من البقول قال قربوها ، الى بعض اصحابه كان معه فلما رآه كره اكلها ، قال كل فاني انا جي من لا تناجي " (اخرجه مسلم وابوداؤد)

حضرت جابر ؓ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک طشت میں کچھ سبزیاں پیش کی گئیں۔ لیکن ان میں بو پائی گئی (جیسا کہ پیاز وغیرہ میں ہوتی ہے) جب آپ کو بتایا گیا تو آپ نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے صحابی کے متعلق فرمایا کہ یہ ان کو دے دو، جب نبی کریم ﷺ نے ان کو دیکھا کہ وہ کھانے میں کراہیت محسوس کر رہے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا تم کھالو، بیشک میں اس ذات سے مناجات

کرتا ہوں جس سے تم نہیں کرتے۔

" فهذا بين في الخصوص له والاباحة لغيره " اس سے واضح طور پر معلوم ہوگیا کہ تمام اوقات میں کچے پیاز اور لہسن کو نبی کریم ﷺ کا استعمال نہ کرنا آپ کی تخصیص تھی دوسرے لوگوں کے لئے جائز ہے۔

پیاز لہسن کھا کر مسجد میں آنے کی ممانعت:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں آتا ہے:

" من الكل البصل والثوم والكراث فلا يقربن مسجدنا فان الملائكة تتاذى مما يتأذى مه بنو آدم "

جس شخص نے پیاز اور لہسن اور کراث (ایک قسم کا ساگ جس میں پیاز اور لہسن کی طرح بو آتی ہے) کھایا وہ ہماری مسجدوں میں نہ آئے کیونکہ فرشتوں کو اس چیز سے تکلیف ہوتی ہے جس سے انسانوں کو تکلیف ہوتی ہے۔

☆ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث میں ذکر ہے:

" انكم ايها الناس تأكلون شجرتين لا اراهما لا خبيثتين هذا البصل والثوم ولقد رأيت رسول الله ﷺ اذا وجد ريحهما من الرجل في المسجد امر به فاخرج الى البقيع فمن اكلهما فليمتهما طبخا .... خرجه مسلم .

بیشک تم اے لوگو یہ دو سبزیاں کھاتے ہو، لیکن میں ان کو خبیث (ناپسند، بدبودار) سمجھتا ہوں۔ وہ پیاز اور لہسن ہیں۔ اور تحقیق میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا جب آپ ان دونوں میں سے کسی کی بو کسی شخص میں مسجد میں پاتے تو آپ اس کو بقیع کی طرف چلے جانے کا حکم عطا فرماتے، (اور فرماتے) جو شخص ان دونوں کو کھانا چاہے تو ان کو پکا کر ان کی بو کو زائل کر دے۔

اس حدیث سے یہ بھی واضح طور پر معلوم ہوگیا کہ پیاز اور لہسن پکا کر کھانا، اور کھا کر مسجد میں آنا جائز ہے اور کچے پیاز اور لہسن کھا کر مسجد میں آنا منع ہے۔

نبی کریم ﷺ کا کچے لہسن سے پرہیز کرنا:

" عن ابی ایوب ان النبی ﷺ نزل علیه فنزل النبی ﷺ فی السفل وابو ایوب فی العلو فانتبه ابو ایوب لیلة فقال نمشی فوق رأس رسول الله ﷺ فتنحوا فباتوا فی جانب ثم قال للنبی ﷺ فقال النبی ﷺ السفل ارفق فقال لا اعلو سقیفة انت تحتها فتحول النبی ﷺ فی العلو وابو ایوب فی السفل فکان یصنع للنبی ﷺ طعاما فاذا جی به الیه سأل عن موضع اصابعه فیتتبع موضع اصابعه فصنع له طعاما فیه ثوم فلمارد الیه سأل عن موضع اصابع النبی ﷺ فقیل له لم یاکل ففزع وصعد الیه فقال احرام هو قال النبی ﷺ لا ، ولکن اکرهه قال فانی اکره ماتکره اوما کرهت قال وکان النبی ﷺ یؤتی بالوحی."

(مسلم ج ۲ ص ۱۹۱ باب اباحة اکل الثوم)

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ (جب ہجرت کر کے مدینہ طیبہ میں آئے) میرے گھر اترے، آپ نے مکان کے نیچے حصہ میں قیام کیا اور ابو ایوب نے اوپر والے حصہ میں۔ ایک رات حضرت ابوایوب (اچانک) جاگ پڑے (خیال آگیا) کہا ہم رسول اللہ ﷺ کے سر کے اوپر چل رہے ہیں۔ تمام گھر والوں نے رات مکان کے ایک کونہ میں گزار دی۔ پھر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا (کہ آپ اوپر تشریف لے آئیں) آپ نے فرمایا میرے لئے نیچے والا حصے میں رہنا آسان ہے حضرت ابوایوب نے عرض کیا، یارسول اللہ میں بھی اس چھت پر نہیں رہ سکتا جس کے نیچے آپ تشریف فرما ہوں۔ نبی کریم ﷺ اوپر تشریف لے گئے اور حضرت ابو ایوب نیچے آگئے۔ وہ نبی کریم ﷺ کے لئے کھانا تیار کرتے تھے۔ جب بچا ہوا کھانا واپس آتا، تو پوچھتے رسول اللہ ﷺ کی انگلیاں کہاں لگی ہیں۔ آپ کی انگلیوں والی جگہ سے حضرت ابوایوب تناول فرماتے۔ ایک دن انہوں نے کھانا تیار کیا اس میں لہسن ڈالا جب کھانا واپس آیا تو انہوں نے پوچھا رسول اللہ ﷺ کی انگلیاں کہاں لگی ہیں تو ان کو بتایا گیا کہ حضور نے کھانا تناول نہیں فرمایا۔ یہ گھبرا گئے، او[illegible] گئے، اور آپ سے پو[illegible] یا رسول اللہ کیا یہ حرام ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا نہیں۔ لیکن میں اسے ناپسند سمجھتا ہوں حضرت ابوایوب نے عرض کیا میں بھی اسے ناپسند [illegible] ہوں جسے آپ ناپسند سمجھتے ہیں۔

حضرت ابوایوب کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس وحی آتی تھی۔

وضاحت حدیث:

نبی کریم ﷺ سے جب حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ نے پوچھا" احرام ھو "کیا یہ حرام ہے؟ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا" لا "نہیں (حرام تو نہیں)" ھذا تصریح باباحة الثوم وھو مجمع علیه" یہ تصریح ہے کہ لہسن مباح ہے اسی پر امت کا اجماع ہے۔

"وکان ﷺ یترک الثوم دائما لانه یتوقع مجئی الملائکة والوحی کل ساعة"

نبی کریم ﷺ ہمیشہ لہسن کے استعمال کو ترک فرماتے تھے کیونکہ آپ کو ہروقت فرشتے کے آنے کی توقع رہتی کیونکہ آپ کے پاس وحی ہروقت آتی رہتی تھی۔ یعنی وحی کا وقت مقرر نہیں تھا۔

حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے جو کھانا بچ کر آتا وہ تناول فرماتے، اس سے یہ پتہ چلا۔

"قال العلماء فی ھذا انه یستحب للآکل والشارب ان یفضل مما یاکل ویشرب فضله لیواسی بها من بعده لا سیما ان کان ممن یتربک بفضلته"

علماء کرام نے فرمایا کہ کھانا کھانے والے شخص کو چاہئے کہ وہ اپنے کھانے اور پینے سے کچھ بچادے تا کہ اس کے کھانے اور پینے سے جو بچ رہے وہ بعد میں دوسروں کے بھی کام آسکے۔ خصوصاً وہ شخص جس کے بچے ہوئے کھانے پینے سے دوسرے حضرات تبرک حاصل کرتے ہوں۔ اسے اپنے طعام اور مشروب سے ضرور بچانا چاہئے۔

"وکذا اذا کان فی الطعام قلة ولھم الیه حاجة"

جب کھانا کم ہو گھر والے لوگوں کو اس کی ضرورت ہو تو ایسی صورت میں کھانے کا بچانا ضروری ہے۔

"ویتاکد ھذا فی حق الضیف لاسیما ان کانت عادة اھل الطعام ان یخرجوا کل ما عندھم وتنظر عیالھم الفضلة کما یفعله کثیر من الناس"

مہمان کے لئے تو بہت ضروری ہے کہ وہ کھانا تھوڑا مناسب مقدار میں کھائے اور بچا کر

واپس دے کیونکہ اکثر لوگوں کی عادت یہ ہے کہ وہ طعام مہمانوں کے آگے رکھ دیتے ہیں، ان کے اہل وعیال اس انتظار میں ہوتے ہیں کہ کھانا بچ کر آئے گا تو کھائیں گے۔ اکثر لوگوں کی یہی عادت، اس لئے ایسے حال میں مہمانوں کا تمام کھانا ہڑپ کر جانا حماقت سے خالی نہیں۔

" ونقلوا ان السلف کانوا یستحبون افضال هذه الفضلة المذکورة وهذا الحدیث اصل ذلک کله "

سلف صالحین سے یہی منقول ہے کہ وہ نیک لوگوں کے بچے ہوئے کھانے، پینے کا استعمال مستحب سمجھتے، یہی حدیث ان کی دلیل ہے نبی کریم ﷺ کا پہلے نیچے والے حصہ میں قیام کرنا اپنی اور ملاقات کے لئے آنے والے صحابہ کرام کی آسانی کے لئے تھا۔

" واما کراهة ابی ایوب فمن الادب المحبوب الجمیل وفیه اجلال اهل الفضل والمبالغة فی الادب معهم "

حضرت ابوایوب ﷛ کا اوپر رہنے کو ناپسند کرنا، بہت ہی ادب کی وجہ سے تھا، اور اس میں اہل فضل کی بزرگی کا پاس کرنا، اور ان کے ساتھ بہت زیادہ ادب میں مبالغہ کرنے کا ثبوت ملتا ہے۔

اس حدیث پاک سے حضرت ابوایوب انصاری ﷛ کی فضیلت کئی وجہ سے ثابت ہو رہی ہے:

(۱) " نزوله ﷺ " نبی کریم ﷺ کا ان کے گھر قیام کرنا وہ بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے۔

(۲) " ادبه معه " حضرت ابوایوب ﷛ کے دل میں نبی کریم ﷺ کا بہت زیادہ ادب واحترام پایا جانا۔

(۳) " موافقته فی ترک الثوم " نبی کریم ﷺ کے بتانے کے باوجود کولہسن (پکے ہوئے طعام میں کسی حال میں بھی) حرام نہیں، لیکن میں ناپسند کرتا ہوں، جیسا کہ دوسری روایت میں ہے کہ میں اس سے کلام کرتا ہوں جس سے تم کلام نہیں کرتے۔ لیکن حضرت ابوایوب ﷛ کا یہ کہنا " انی اکره ما ترکه " میں بھی اس چیز کو ناپسند کرتا ہوں جسے آپ ناپسند کرتے ہیں۔ یہ دلالت کرتا ہے کہ آپ کو نبی کریم ﷺ کے افعال کی تابعداری کامل طور پر حاصل تھی، اور آپ کو حضور سے بہت زیادہ محبت تھی۔

" ومن اوصاف المحب الصادق ان یحب ما احب محبوبه ویکره ما کره "

سچے محبت کے اوصاف ہی یہ ہیں کہ وہ محبوب کی پسندیدہ چیزوں سے محبت کرے اور جن چیزوں کو محبوب ناپسند سمجھے ان کو ناپسند سمجھے۔ (نووی) (ماخوذ از قرطبی)

مسور کا ذکر: حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ذیشان بیان فرماتے ہیں:

" علیکم بالعدس فانه مبارک مقدس وانه یرق القلب ویکثر الدمعة فانه بارک فیه سبعون نبیا آخرهم عیسی بن مریم "

تم مسور کا استعمال کرو، بیشک یہ مبارک اور مقدس ہے، اس سے دل میں نرمی آتی ہے، اور آنسو زیادہ آتے ہیں، اس میں ستر انبیاء کرام نے برکت بیان کی ہے، آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس میں برکت کا ذکر فرمایا۔ (قاله الجوهری)

" وکان عمر بن عبد العزیز یاکل یوما خبزا بزیت ویوما بلحم ویوما بعدس "

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ ایک دن روٹی زیتون سے کھاتے، اور ایک دن گوشت سے اور ایک دن مسور سے۔ (ذکره الثعلبی وغیره)

" والعدس والزیت طعام الصالحین " مسور اور زیتون نیک لوگوں کا طعام ہے۔ (قاله الحلیمی)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دستر خوان پر مسور ضرور ہوتے جب آپ کسی کی مہمان نوازی کرتے، مسور سے بدن میں خفت (ہلکا پن) آتی ہے، جس کی وجہ سے انسان عبادت میں سستی نہیں کرتا اور مسور سے شہوات میں زیادتی نہیں ہوتی جیسا کہ گوشت سے شہوات کی زیادتی ہوتی ہے، اور یہ بھی واضح ہے کہ شہوات کی زیادتی سے گناہوں میں مبتلاء ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ (ماخوذ از قرطبی)

﴿ وَفُومِهَا ﴾: " فوم " کا اگرچہ معنی لہسن بھی لیا گیا ہے، لیکن آیۃ کریمہ میں زیادہ مفسرین کرام نے گندم ہی معنی مراد لیا ہے:

" والشعیر قریب منها وکان طعام اهل المدینة "

اور جو بھی گندم کے کچھ قریب ہیں، اور مدینہ طیبہ والے حضرات کا زیادہ طور پر طعام جو کی روٹی ہی ہوا کرتی تھی۔

" کما کان العدس من طعام قریة ابراهیم علیه السلام فصار لکل واحد من الحبتین باحد النبیین علیهما السلام فضیلة "

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شہر میں مسور کے زیادہ پائے جانے کی وجہ سے، اور آپ کے دستر خوان میں مسور کے استعمال سے مسور کو فضیلت حاصل ہوگئی۔

اور نبی کریم ﷺ کے شہر میں جو کے زیادہ استعمال کی وجہ سے، اور خود نبی کریم ﷺ کے جو کی روٹی کے استعمال سے جو کو فضیلت حاصل ہوگئی۔

" وقدوری ان النبی ﷺ لم یشبع هو واهله من خبز بر ثلاثة ایام متتابعة منذ قدم المدینة الی ان توفاه الله عزوجل "

(حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے) روایت بیان کی گئی ہے کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے اور آپ کے گھر والوں نے تین دن لگا تار سیر ہوکر گندم کی روٹی نہیں کھائی، جب سے آپ مدینہ طیبہ میں تشریف لائے یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ سنا سے تشریف لے گئے۔

یعنی نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ میں زندگی بھر جو کی روٹی کھاتے رہے وہ بھی پیٹ بھر کر میسر نہیں تھی۔

(از قرطبی)

افسوس صد افسوس جہلاء کی عقل پر ہے جو بات بات پر یہ پوچھتے ہیں، نبی کریم ﷺ نے یہاں دعاء کی تھی یا نہیں۔ کیا یہاں ہاتھ اٹھا کر دعاء کی تھی؟ جن چیزوں کی نفی یا ثبوت کا ظاہر طور پر ذکر نہیں وہ پوچھا جاتا ہے اور جس کا واضح ذکر ہے اس کی طرف توجہ نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے تین دن مسلسل گندم کی روٹی سیر ہوکر نہیں کھائی، لیکن لوگ ہر دن تین وقت گندم کی روٹی سیر ہوکر بھی کھا رہے ہیں، پھر دلیلیں بھی یہ دے رہے ہیں یہ کام نبی کریم ﷺ نے نہیں کیا۔

افسوس صرف اس پر ہے کہ پڑھے لکھے ہوئے لوگوں کی عقلوں پر پردہ چھا گیا۔ جس کی وجہ سے وہ احمق ہوگئے۔

﴿ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ﴾ : " کہا کیا تم تبدیلی چاہتے ہو اس کی جو گھٹیا ہے اس کے بدلے جو بہتر ہے" "بنی اسرائیل کے اس مطالبہ پر کہ ہمیں زمین کی پیداوار حاصل ہو" کے جواب میں یہ کہا گیا کیا تم اعلیٰ چیز کے بدلے گھٹیا چیز حاصل کرنا چاہتے ہو؟ " الاستبدال وضع الشئی موضع آخر "ایک چیز کی جگہ دوسری کو رکھنا" "استبدال" کہلاتا ہے اسی سے "بدل" کا بھی استعمال ہے۔

﴿ اَدْنٰى ﴾ : زجاج کے نزدیک " دنــو " سے ماخوذ ہے، یعنی قیمت میں قرب۔ اسی معنی کے اعتبار سے جس کپڑے کی قیمت کم ہو اسے " ثوب مقارب " کہا جاتا ہے۔

علی بن سلیمان کا قول یہ ہے کہ "ادنی" ماخوذ ہے "دنئی" سے جس کا معنی ہے "گھٹیا ہونا" بلکہ "ادنی" اسے کہا جائے گا جس کا گھٹیا ہونا بہت زیادہ واضح ہو۔ اس قول کے مطابق ہمزہ میں تخفیف کی گئی ہے۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ ماخوذ ہے "دون" سے جس کا معنی ہوتا "احط" پست ہونا۔ اصل میں یہ "ادون" بروزن افعل ہوتا ہے۔ پھر قلب کیا گیا، افلع کا وزن بنایا گیا یعنی "ادنو" ہوا پھر واؤ بر طرف ماقبل فتح الف سے بدلا تو "ادنی" ہو گیا۔

خیال رہے کہ اصل میں کیا ہے؟ اس میں اگرچہ تین قول ہیں، جن کو نقل کیا گیا ہے، لیکن تینوں کا معنی یہاں ایک ہی ہے یعنی "گھٹیا" چیز۔

ومعنی الآیة: "اتستبدلون البقل والقثاء والفوم والعدس والبصل الذی هو ادنی بالمن والسلوی هو خیر"

من اور سلوی کی فوقیت:

من اور سلوی کے بدلے ان کا زمین کی پیداوار طلب کرنا، اعلی کے بدلے گھٹیا چیز کی طلب تھی، وہ اعلی من اور سلوی تھے، وہ اعلی کیوں تھے؟ اس کی چند وجہ ہیں:

۱) سبزیوں وغیرہ کو من اور سلوی سے کوئی نسبت ہی حاصل نہیں تھی تو یقیناً من اور سلوی افضل تھے، کہاں ان کی لذت، کہاں ان کے کمالات اور کہاں سبزیوں کی لذت اور ان کے مقابل نہ رکھنا۔

۲) من اور سلوی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر خصوصی انعام تھا، اور رب تعالیٰ کی طرف سے ہی ان کو کھانے کا حکم ہی تھا، یہ واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر قائم رہنا، اور اس کی نعمت کا شکر ادا کرنا ہی باعث اجر ہے اور یہی اجر وثواب آخرت کا ذخیرہ اور توشہ ہونا ہے۔ اور جو چیزیں وہ طلب کر رہے تھے وہ اس عظمت سے خالی تھیں، اس لئے ان کو بنسبت من اور سلوی کے گھٹیا قرار دیا۔

(۳) جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے ان کو بطور احسان عطا فرمائی تھیں، ان میں لذت اور غذائیت بھی زیادہ تھیں، کیونکہ وہ لوگ جن چیزوں کا مطالبہ کر رہے تھے وہ ان کی بنسبت کم درجہ تھیں۔

(۴) رب تعالیٰ کی طرف سے جو نعمت ان کو میسر تھی اس میں انہیں کوئی تکلیف نہیں اٹھانی پڑتی تھی۔ اور نہ ہی اس میں کوئی محنت، مشقت اور تھکاوٹ لازم آتی۔ اسی وجہ سے وہ نعمت فضیلت رکھتی تھی بنسبت اس کے جس کا وہ مطالبہ کر رہے تھے، کیونکہ اس میں ہل چلانا، فصل کاشت کرنا، فصل کاٹنا وغیرہ ہر طرح کی محنت ہی محنت تھی۔

(۵) جو نعمت ان کو رب تعالیٰ سے مل رہی تھی اس میں یہ کوئی شک نہیں پایا جاتا تھا کہ وہ نعمت حاصل ہوگی یا نہیں۔ کوئی چھین تو نہیں لے گا، اس پر کوئی زوال تو نہیں آئے گا۔

لیکن جو نعمت وہ حاصل کرنا چاہتے تھے اس پر ہر طرح کے خطرات تھے، کیونکہ کبھی زمین فروخت ہوگئی کبھی بیج میسر نہ ہوا، کبھی زمین پر غاصبانہ قبضہ ہوگیا۔ کبھی فصل کاشت کر دیا لیکن بارش نہ ہوئی، کبھی ژالہ باری سے تباہ ہوگیا وغیرہ، یقیناً اس طرح کے خطرات میں مبتلاء ہونے والی اشیاء گھٹیا تھیں۔

(ماخوذ از قرطبی)

مسئلہ: فی هذه الآية دليل على جواز اكل الطيبات والمطاعم المستلذات، وكان النبی ﷺ يحب الحلوى والعسل ويشرب الماء البارد العذب "

اس آیۂ کریمہ سے یہ مسئلہ سمجھ آیا کہ پاکیزہ، حلال اور لذت والے طعام کھانے جائز ہیں۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ حلوا اور شہد پسند فرماتے تھے (حلوا سے مراد ہر میٹھی چیز) اور آپ ٹھنڈا، میٹھا پانی پیتے تھے۔

(قرطبی)

﴿ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ﴾ :

''اتر جاؤ شہر میں بیشک تمہارے لئے وہ ہے جو تم نے سوال کیا''

میدان تیہ بلندی پر تھا اور جس شہر میں ان کو اترنے کا حکم دیا وہ پستی پر تھا۔ اس معنی کے لحاظ سے " ہبوط " کا معنی حقیقی ہوگا جو " صعود " کی ضد ہے، یعنی اترنا۔ لیکن کبھی " ہبوط " کا مجازی معنی مراد لیا جاتا ہے، جس کا مطلب ہوتا ہے، آنا، یعنی شہر میں آجاؤ۔

﴿ مِصۡرًا ﴾ : سے مراد خاص مشہور شہر مصر ہے، یا کہ مطلقاً اس کا معنی شہر ہے۔ اور پھر یہ منصرف ہے یا غیر منصرف ہے۔ اس میں مختلف قول ہیں۔ کسی ایک کو راجح نہ سمجھتے ہوئے اعلیٰ حضرت نے اپنے ترجمہ میں لکھا ''اچھا مصر میں یا کسی شہر میں اترو''

راقم نے مطلقاً ''شہر'' معنی کیا ہے چونکہ کئی مفسرین کرام نے اس معنی کو ترجیح دی ہے۔

''واللہ اعلم بالصواب''

﴿ وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ وَالۡمَسۡكَنَةُ ﴾ : ''اور ڈال دی گئی ان پر ذلت اور محتاجی''

" احيطت بهم احاطة القبة بمن ضربت عليه "خیمہ لگانے کے لئے " ضرب " لفظ استعمال ہوتا ہے، مطلب یہ ہوا کہ جس طرح خیمہ احاطہ کرتا ہے، اسی طرح ذلت اور محتاجی نے ان کا احاطہ کرلیا: " او الصقت بهم من ضرب الطين على الحائط " یا معنی یہ ہے کہ ذلت اور محتاجی ان کے ساتھ متصل ہوگئی (چمٹ گئی) جس طرح کہا جاتا ہے " ضرب الطين على الحائط " کیچڑ سے دیوار پر لپائی کردی گئی۔ (بیضاوی)

اور کہا جاتا ہے " ضرب الحاكم على اليد ، اى حمل والزم " حاکم نے یہ کام لازم کردیا ہے اور اس کو سرانجام دینے کے لئے رعایا کو اس پر برانگیختہ کیا ہے۔

اب مطلب یہ ہوگا " الزموهما وقضى عليهم بهما " کہ یہود نے ذلت اور محتاجی کو لازم پکڑا، تو رب تعالیٰ نے بھی ان کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

ذلت سے مراد:

" قال الحسن اذلهم الله فلا منعة لهم وجعلهم تحت اقدام المسلمين ولقد ادركتهم هذه الامة "

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ذلت سے یہی مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ذلیل کردیا، ان کو شوکت اور دبدبہ نہیں دیا، اور ان کو مسلمانوں کے قدموں کے نیچے کردیا، اور ان کو نبی کریم ﷺ اور آپ کی امت نے ذلیل کر کے جلاوطن کردیا۔

ایک قول یہ ہے کہ ''ذلت'' سے مراد جزیہ ہے ﴿ يُعۡطُوۡنَ الۡجِزۡيَةَ عَنۡ يَّدٍ وَّهُمۡ صَاغِرُوۡنَ ﴾

میں ان کی ذلت جزیہ کو قرار دیا گیا۔ (از ابن کثیر)

لیکن اس قول کو علامہ رازی رحمہ اللہ نے رد کرتے ہوئے فرمایا:

" قول الجزية بعيد لان الجزية ما كانت مضروبة عليهم من اول الامر "

جزیہ والا قول درست نہیں کیونکہ ابتدائی طور پر ہی ان پر جزیہ مقرر نہیں کیا گیا۔

علامہ رازی رحمہ اللہ کا مختار ہی عظیم ترین قول ہے آپ فرماتے ہیں:

" والاقرب في الذلة ان يكون المراد منها ما يجري مجرى الاستحقاق كقوله تعالىٰ فيمن يحارب ويفسد ﴿ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنيَا ﴾

ذلت سے مراد، فہم کے زیادہ قریب معنی یہ ہے کہ ہر وہ کام جو ذلت کا سبب بنے، یعنی ان کو مستحق ذلت بنا دیا گیا ہے کہ وہ کام ہی ایسے کرتے رہیں گے کہ ان کی وجہ سے ذلیل ہوتے رہیں گے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے لڑائی اور فساد بھڑکانے والوں کے متعلق فرمایا "یہ ان کے لئے رسوائی ہے دنیا میں" یعنی ان کے کام ہی ان کے لئے دنیا میں رسوائی کا ذریعہ بن گئے۔ (از کبیر)

مسکنت سے مراد:

" فالمراد به الفقر والفاقة وتشديد المحنة فهذ الجنس يجوز ان يكون كالعقوبة "

اس سے مراد فقر، فاقہ، شدید محنت ہے، ہوسکتا ہے یہ جنس بھی عقوبت کی طرح ہی ہو، یعنی ہر قسم کی محتاجی اور سزا کے مستحق ہونے کے ذرائع ان پر مسلط کر دیئے گئے۔

فائدہ جلیلہ:

" ومن العلماء من عد هذا من باب المعجزات لانه عليه السلام اخبر عن ضرب الذلة والمسكنة عليهم ووقع الامر كذلك فكان هذا اخبارا عن الغيب فيكون معجزا " (كبير)

نبی کریم ﷺ کا یہود کے متعلق خبر دینا کہ ان پر ذلت اور محتاجی ڈال دی گئی، یعنی ذلت محتاجی ان پر

چھا گئی، پھر جیسے نبی کریم ﷺ نے خبر دی، اس طرح واقع ہو جانا، یہ نبی کریم ﷺ کی غیب کی خبر ہے، اور آپ کا معجزہ ہے، سبحان اللہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے کیا خوب بیان فرمایا کہ حضور کا علم غیب در حقیقت آپ کا معجزہ ہے، کسی کو سمجھ آ جائے تو بہتر، نہ سمجھ آئے تو اس کی قسمت۔

یہود کی ذلت پر علامہ کاظمی رحمہ اللہ کا شاندار بیان:

قوم یہود پر ذلت و مسکنت کا مسلط ہونا ایسی حقیقت ثابتہ ہے، جس کا انکار واقعات کی روشنی میں کوئی اہل انصاف نہیں کر سکتا۔ قرآن مجید بھی " علی روس الاشهاد " (واضح شہادت سے) فرما رہا ہے کہ ذلت و مسکنت اور دنیا و آخرت میں اللہ کا غضب ان کے حق میں مقدر ہو چکا ہے، دنیا جانتی ہے کہ یہود کی تاریخ مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں سے بہت پرانی اور قدیم ہے، ابتداء سے لے کر آج تک ان کی تاریخ کو سامنے رکھ لیجئے کوئی دور ان کا ذلت و مسکنت سے آپ کو خالی نظر نہیں آئے گا۔ حالانکہ ایک طبقہ ان کا بہت بڑا سرمایہ دار ہے، لیکن انتہائی بخیل (کنجوس) اور حریص۔

بخیل کتنا ہی مالدار ہو مگر بخل کی وجہ سے وہ ہمیشہ مسکینی کی ہیئت (شکل) پر رہتا ہے، اور حریص کمال حرص کے سبب ہر جائز و ناجائز طریقہ سے مال جمع کرنے کی فکر میں رنج و تعقب (مصیبت اور مشقت) میں مبتلاء رہتا ہے، پھر یہ کہ سب یہودی مال دار نہیں بلکہ بہت سے یہود فقر و مسکنت کا شکار ہیں۔

حیوانیت و بربریت، ظلم و جور، دکھی انسانیت پر لرزہ خیز مظالم ان کی طبائع میں مرکوز (پختہ موجود) ہیں۔ عہد شکنی، وعدہ خلافی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کے ظلم و ستم کے باعث اقوام عالم کی نظروں میں وہ لائق گردن زنی (گردن اڑا دینے کے قابل) رہے ہیں۔ اسی لئے ان کی پوری تاریخ میں ایسا کوئی وقت نہیں آیا کہ ان کے جرائم کی پاداش میں لوگ انہیں قتل کرنے اور سخت تکلیفیں پہنچانے کے درپے نہ رہے ہوں۔ قرآن کے اعلان کے مطابق یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

جیسا کہ سورۃ الاعراف میں فرمایا:

﴿ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّکَ لَیَبْعَثَنَّ عَلَیْهِمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَنْ یَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ﴾

"یعنی آپ کے رب نے بتا دیا تھا کہ وہ ان یہود پر قیامت تک ایسے لوگوں کو بھیجتا رہے گا، جو

انہیں بدترین عذاب دیں گے"

☆ اس زمانہ میں بھی جب کہ یہود کی نام نہاد حکومت فلسطین میں قائم ہے، مظلوم فلسطینی ہر وقت ان کی تاک میں رہتے ہیں۔ گویا کہ وہ یہودیوں پر مسلط رہتے ہیں۔ جب بھی انہیں موقع ملتا ہے وہ یہود کو تکلیفیں پہنچانے، قتل کرنے اور قیدی بنانے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، اور یقیناً یہ صورت حال قیامت تک جاری رہے گی۔

البتہ ان کے لئے جان و مال کی بے حرمتی سے بچنا اللہ کی رسی کے سہارے ہوسکتا ہے، یا اس کے علاوہ ذلت وخواری سے محض (فقط) بظاہر محفوظ رہنا لوگوں کی رسی کے ذریعے ممکن ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَمَا ثُقِفُوْا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ ﴾

"یعنی وہ جہاں بھی پائے جائیں ذلت ان پر مسلط کردی گئی بجز اللہ کی رسی اور لوگوں کی رس کے"

اللہ کی رسی سے مراد قرآن اور اسلام ہے (قرآنی اور اسلامی حکم ایک ہے):

﴿وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ ﴾

یعنی اگر کوئی مشرک تم سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دے دو۔

اور ارشاد فرمایا ﴿ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴾ یعنی (اگر وہ پناہ طلب نہ کریں تو) ان کا مال و جان محفوظ نہیں، یہاں تک کہ وہ ذلیل ہوکر اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں، اگرچہ پناہ مانگنا اور جزیہ ادا کرنا دونوں باتیں موجب ذلت ہیں، مگر اللہ کے دین میں مستامن (جس نے امن طلب کیا) اور ذمی کا جان و مال بے حرمتی سے محفوظ رہتا ہے۔ اور لوگوں کی رسی سے مراد یہ ہے کہ غیر مسلم لوگ ان سے معاہدہ کر کے ان کی حفاظت کا ذمہ اٹھالیں۔

جیسا کہ آج کل بعض غیر مسلم بڑی طاقتوں نے یہود سے معاہدہ کر کے ان کی حفاظت کا ذمہ اٹھایا ہوا ہے، جس کے بل بوتے پر فلسطین میں یہود کی بے بنیاد حکومت کا ڈھانچہ کھڑا ہے، اگر وہ لوگ آج اپنا معاہدہ ختم کردیں تو یہ نام نہاد حکومت باقی نہ رہے۔ بعض مفسرین نے لوگوں کی رسی کا مفہوم جزیہ بیان کیا ہے۔ اس صورت میں اللہ کی رسی اور لوگوں کی رسی ایک ہی قرار پائے گی۔ حالانکہ انسب یہ ہے

کہ یہ دونوں علیحدہ ہوں۔ (ملخصا البحر المحیط ج ۳ ص ۳۲ ، ابن کثیر ج ۱ ص ۳۹۶)

غالبًا اسی لئے قرآن مجید میں ''وحبل من المسلمین'' کی بجائے ﴿ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ ﴾ فرمایا گیا ہے ایسی حکومت کا قیام قرآن کی پیشگوئی کے خلاف ہرگز نہیں ۔ بلکہ ''حبل من الناس'' کے الفاظ اس مسئلہ میں قرآنی صداقت کا اعلان کر رہے ہیں اور دنیا دیکھ رہی ہے کہ قرآن کے مطابق محض لوگوں کے سہارے فلسطین میں بے بنیاد اسرائیلی حکومت قائم ہے، جو آج بھی حقیقی ذلت ومسکنت اور اللہ کے غضب میں مبتلاء ہیں اور یقیناً آخرت میں بھی اللہ کے غضب میں یہ لوگ مبتلاء ہوں گے۔

(تبیان للکاظمی)

﴿ وَبَاءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ﴾ : ''اور وہ لوٹے اللہ کے غضب سے'' ''وباءوا ای انقلبوا ورجعوا الی الزامھم ذلک'' اور وہ لوٹے اللہ کے غضب سے یعنی انہوں نے اپنے کرتوتوں سے اللہ کے غضب کو اپنے آپ پر لازم قرار دے دیا۔ نبی کریم ﷺ کی ایک دعاء میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہے:

''ابوء بنعمتک علی ، ای اقربھا والزمھا نفسی''

اے اللہ تیری نعمتیں جو مجھ پر ہیں میں ان کا اقرار کرتا ہوں، اور اپنے نفس پر ان کو لازم پکڑتا ہوں یعنی تو نے اپنے فضل وکرم سے مجھے ان کا مستحق ہونے کا شرف عطاء فرمادیا ہے۔

اصل لغت میں رجوع (لوٹنے) کے معنی میں ہی استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے ''باء بکذا ، ای رجع بہ'' ''فلاں شخص اس طرح کے حالات سے لوٹا'' اور کہا جاتا ہے ''وباء الی المباءة'' وہ اپنی منزل میں لوٹا ''مباءة'' کا معنی ہے لوٹنے کی جگہ۔ (قرطبی)

تنبیہ : ''ولا یقال باء الا بشر'' اگرچہ ''باء'' کا معنی مطلقا لوٹنا بھی آتا ہے، لیکن استعمال میں زیادہ اس کا تعلق شر سے ہوگیا۔ یعنی خیر سے لوٹنے کے لئے ''باء'' کو استعمال نہیں کیا جاتا۔ بلکہ شر سے لوٹنے کے لئے ''باء'' کو استعمال کیا جاتا ہے۔ (کبیر) ''ولا یقال باء الا موصولا اما بخیر واما بشر'' (ابن کثیر) باء مطلقا استعمال نہیں ہوتا بلکہ خیر یا شر کے ساتھ متصل استعمال ہوتا ہے کبیر اور ابن کثیر کے مجموعہ کلام سے یہ مطلب حاصل ہوا کہ ''باء'' کا استعمال شر میں زیادہ

ہے اور خیر میں کم ہے۔

" البوء التسوية ، باء یبوء بوء " برابری کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔اس معنی کے لحاظ سے آیۂ کریمہ میں معنی ہوگا " استوی علیهم غضب الله " ان پر اللہ کا غضب برابر ہو گیا (یہ قول زجاج کا ہے)" وباء وا ای استحقوا " اور " باء وا " کا معنی ہے مستحق ہونا۔یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہو گئے جیسا کہ اسی معنی میں اس آیۂ کریمہ میں استعمال " انی ارید ان تبوء باثمی واثمک " (ہابیل نے قابیل کو کہا)۔بیشک میں چاہتا ہوں کہ تو مستحق ہو جائے میرے گناہ کا اور اپنے گناہ کا یعنی دونوں گناہوں کا مستحق تو ہی ہو۔

﴿ بِغَضَبٍ ﴾ : " واما غضب الله فهو ارادة الانتقام " (کبیر)

اللہ کے غضب سے مراد انتقام کا ارادہ رکھنا۔

خیال رہے ﴿ غیر المغضوب علیهم ﴾ میں تفصیلی طور پر "غضب " کے متعلق بحث گزر چکی ہے۔غضب سے مراد اس طرح بیان کی جائے، کہ وہ دنیا میں عذاب اور انتقام کے مستحق ہوئے، اور آخرت میں جس عذاب کے حقدار تھے اسکے مستحق ہوئے۔اسی طرح دنیاوی اور اخروی طور پر ہر ذلت اور غیظ و غضب کے مستحق ہوئے یہاں یہ معنی کرنا زیادہ بہتر ہے " صاروا احقاء به " وہ غضب کے مستحق ہو گئے۔کیونکہ رب تعالیٰ نے صراحۃً یہ نہیں ذکر فرمایا، وہ کہاں سے لوٹے اور کس طرف لوٹے۔

(از روح المعانی)

﴿ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ﴾ :

"یہ اس وجہ سے کہ بیشک وہ کفر کرتے تھے اللہ کی آیتوں سے"

یہاں سے ان لوگوں پر ذلت و مسکنت کے مسلط ہونے اور غضب کے مستحق ہونے کی وجہ بیان کی جارہی ہے کہ وہ اس کے مستحق کیوں ہوئے۔

﴿ ذٰلِکَ ﴾ کا مشار الیہ " ضرب الذلة والمسكنة والبوء بالغضب " ذلت و مسکنت کا مسلط ہونا اور غضب کا مستحق ہونا۔﴿ بِاَنَّهُمْ ﴾ میں "با" سببیت کے لئے ہے۔اور اللہ تعالیٰ کی آیات سے مراد یا تو موسیٰ علیہ السلام کے معجزات ہیں۔اور یا توراۃ کی بعض آیات ہیں۔

اب مطلب یہ ہوگا کہ ان پر ذلت ومحتاجی کا مسلط ہونا اور ان کا غضب کا مستحق ہونا اس وجہ سے تھا کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے معجزات ظاہر دیکھ کر بھی کفر کیا۔ بنی اسرائیل کے لئے دریا کا پھٹ جانا اور فرعون کا غرق ہونا، میدان تیہ میں ان پر بادل کا سایہ کرنا، من اور سلویٰ کا ان پر اترنا، اور پتھر سے چشموں کا جاری ہونا۔ یہ تمام معجزات ان کے سامنے ثابت ہوئے لیکن انہوں نے کفر کیا۔

اور پہلی آسمانی کتابوں یعنی توراۃ، انجیل پر انہوں نے کما حقہ (جیسا کہ حق تھا) ایمان نہ لایا، بلکہ کفر کیا۔ آیۃ رجم کا انہوں نے انکار کیا۔ اور توراۃ میں نبی کریم ﷺ کے جو اوصاف تھے ان کو چھپانے کی مذموم کوشش انہوں نے کی اور ان سے کفر کیا۔ یہی کفر ان کی ذلت و رسوائی، ان کی محتاجی اور ان کے غضب کے مستحق ہونے کا سبب بنا۔ (بیضاوی)

﴿ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيِّيْنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ﴾ : ''اور شہید کرتے تھے انبیاء کو ناحق'' ان پر ذلت اور محتاجی کے مسلط ہونے اور اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہونے کی اور وجہ یہ بیان کی گئی کہ وہ انبیاء کرام کو ناحق شہید کرتے تھے۔

انبیاء کرام کو شہید کرنے کی وجہ:

" واھانتم حملة الشرع وھم الانبیاء واتباعھم فانتقصوھم الی ان افضی بھم الحال الی ان قتلوھم "

ان کی ذلت کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے حاملین شرع یعنی انبیاء کرام اور ان کے متبعین کی توہین کی اور ان کے نقص بیان کئے، اسی کی وجہ سے ان کو یہ نحوست حاصل ہوئی کہ وہ اس حال پر پہنچ گئے کہ انہوں نے انبیاء کرام کو شہید کر ڈالا۔

اس سے بڑھ کر اور عظیم کفر کیا ہوسکتا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کیا اور انبیاء کرام کو ناحق شہید کیا۔ (واضح ہوا کہ انبیاء کرام کی توہین کرنا اور نقص بیان کرنا طریقہ یہود ہے)۔

☆ حدیث شریف جس کی صحت پر اتفاق ہے " ان رسول اللہ ﷺ قال الکبر بطر الحق وغمط الناس " بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا، تکبر یہ ہے کہ حق سے اکڑ کر پھر جانا اور لوگوں کو گھٹیا سمجھنا۔

بنی اسرائیل کی گمراہی کا سبب بھی اسی قسم کا تکبر تھا۔

☆ حضرت ابن مسعود ﷺ فرماتے ہیں میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ کے پاس مالک بن مرارہ رہاوی تھے، میں نے ان کو یہ کہتے ہوئے پایا:

" یا رسول اللہ قد قسم لی من الجمال ما تری فما احب ان احدا من الناس فضلنی بشراکین فما فوقهما الیس ذلک هو البغی فقال لا لیس ذلک من البغی ولکن البغی من بطر اوقال سفه الحق وغمط الناس (یعنی رد الحق وانتقاص الناس والاز دراء بهم والتعاظم علیهم "

یا رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ نے مجھے جمال (خوبصورتی) کا وہ حصہ عطا فرمایا جو آپ دیکھ رہے ہیں مجھے یہ پسند نہیں کہ لوگوں میں سے کوئی شخص مجھ پر (خوبصورتی میں) دو تسموں کے برابر یا ان سے کچھ زائد فضیلت رکھے۔ کیا یہ سرکشی تو نہیں؟ آپ نے فرمایا نہیں، یہ سرکشی نہیں۔ بلکہ سرکشی یہ ہے کہ حق کو رد کر دیا جائے، لوگوں کو گھٹیا سمجھا جائے (یعنی لوگوں پر عیب لگایا جائے اپنے آپ کو بڑا سمجھا جائے)۔ (ابن کثیر)

اعتراض : رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا ﴿ بِغَيْرِ الْحَقِّ ﴾ "ناحق" انبیاء کرام کو شہید کرنا جب ہمیشہ ناحق ہی ہوتا ہے تو " بغیر الحق " کہنے کا کیا فائدہ ہے۔

جواب : بعض اوقات کام باطل ہوتا ہے، ناحق ہوتا ہے لیکن وہ کام کرنے والا شخص اس کام کو حق سمجھتا ہے، لیکن انبیاء کرام کو شہید کرنے والے خود بھی اپنے آپ کو باطل راہ پر سمجھتے تھے، اور اپنے اس فعل کو قبیح (برا) سمجھتے تھے۔ (از کبیر)

اعتراض : " کیف جاز ان یخلی بین الکافرین وقتل الانبیاء " کافروں کو انبیاء کرام کے شہید کرنے کی اجازت دینا کس طرح جائز ہے؟ (یہ تو انبیاء کرام کی توہین ہے)۔

جواب :

" ذلک کرامة لهم وزیادة فی منازلهم ، کمثل من یقتل فی سبیل الله من المؤمنین ولیس ذلک بخذ لان لهم "

انبیاء کرام کی شہادت ان کی کرامت کی زیادتی کا سبب تھی، اور ان کے مدارج اس سے بلند

ہوئے، جیسا کہ مومنین اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہونے والے شہادت سے بلند رتبہ حاصل کر لیتے ہیں یہ ان کی رسوائی نہیں ہوتی۔

" قال ابن عباس والحسن ، لم یقتل بنی قط من الانبیاء الا من لم یؤمر بقتال و کل من امر بقتال نصر "

حضرت ابن عباس اور حسن بصری رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے انبیاء کرام میں کسی نبی کو شہید نہیں کیا گیا، سوائے اس کے کہ جن انبیاء کرام کو جہاد کی اجازت نہیں دی گئی، یعنی صرف وہی شہید ہوئے جن کو جہاد کی اجازت نہیں دی گئی۔ البتہ جن کو جہاد کی اجازت دی گئی وہ کامیاب ہوئے کیونکہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کافروں کے خلاف امداد دی گئی۔

یہود نے ایک دن میں ستر انبیاء کرام کو شہید کیا۔ جس پر ان کو کوئی غم لاحق نہ ہوا، نہ کوئی پریشانی ہوئی۔ (جمل) .... یہود نے جن انبیاء کرام کو شہید کیا ان میں جلیل القدر انبیاء کرام حضرت زکریا، حضرت یحیٰ، حضرت شعیب علیہم السلام تھے۔ (بیضاوی)

انبیاء کرام کو شہید کرنا یہود کی زبانی: تب خدا کی روح .... زکریا پر نازل ہوئی سو وہ لوگوں سے بلند جگہ پر کھڑا ہو کر کہنے لگا .... چونکہ تم نے خدا کو چھوڑا ہے اس نے بھی تم کو چھوڑ دیا۔ تب انہوں نے اس کے خلاف سازش کی اور بادشاہ کے حکم سے خداوند کے گھر کے صحن میں اسے سنگسار کر دیا۔

(۲ تواریخ ۲۴، ۲۰، ۲۱)

☆ اسی طرح مرقس کے باب ۶ کی آیات ۱۷ تا ۲۹ میں حضرت یوحنا (یحیٰ علیہم السلام) کے متعلق مذکور ہے۔ کہ جب آپ نے ہیرودیس بادشاہ کو اس پر ٹوکا کہ اس نے اپنے بھائی فلپس کی بیوی ہیرودیاس کو اپنے پاس کیوں رکھا ہوا ہے تو بادشاہ نے پہلے انہیں قید کر دیا، بعد میں اپنی داشتہ کی فرمائش پر آپ کا سر کاٹا اور ایک تھال میں رکھ کر اس کی خدمت میں پیش کیا۔ (ضیاء القرآن)

☆ پھر جب یہودیہ کی ریاست میں علانیہ بت پرستی اور بدکاری ہونے لگی اور زکریا نبی نے اس کے خلاف آواز بلند کی تو شاہ یہوداہ اس کے حکم سے انہیں عین ہیکل سلیمانی میں مقدس اور قربان گاہ کے درمیان سنگسار کر دیا۔

(۲ تورایخ باب ۲۴ آیت ۲۱)

انبیاءِ کرام کو جیل میں بھیجنا یہود کی زبانی:

ایک اور نبی حضرت میکایاہ کو اسی اخی اب نے حق گوئی کے جرم میں جیل بھیجا اور حکم دیا کہ اس شخص کو مصیبت کی روٹی کھلانا اور مصیبت کا پانی پلانا۔ (سلاطین باب ۲۲ آیت ۲۶، ۲۷)

☆ حضرت سلیمان کے بعد جب بنی اسرائیل کی سلطنت تقسیم ہو کر دو ریاستوں میں یعنی یروشلم کی دولت یہودیہ اور سامریہ کی دولت اسرائیل میں بٹ گئی تو ان میں باہم لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا اور نوبت یہاں تک آئی کہ یہودیہ کی ریاست نے اپنے ہی بھائیوں کے خلاف دمشق کی ارامی سلطنت سے مدد مانگی۔ اس پر خدا کے حکم سے حنانی نبی نے یہودیہ کے فرمانروا آسا کو سخت تنبیہ کی۔ مگر آسا نے اس تنبیہ کو قبول کرنے کے بجائے خدا کے پیغمبر کو جیل بھیج دیا۔ (۲۔ تورایخ باب ۱۷۔ آیت ۷، ۱۰)

لفظ نبی کے متعلق: اگرچہ چوتھے رکوع میں عصمت انبیاء کے ذکر میں لفظ نبی کی کافی حد تک بحث ہو چکی ہے۔ تاہم اس مقام پر علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے مزید بحث فرمائی، اس کا خلاصہ یہ ہے۔

"نبی" مشتق ہے "نبأ" سے جس کا معنی ہے خبر دینا۔ نافع رحمہ اللہ نے تمام قرآن پاک میں جہاں بھی ذکر ہے ہمزہ سے پڑھا ہے یعنی "نبیئین" پڑھا ہے۔ صرف دو مقام پر "باء" سے پڑھا ہے۔ ایک "ان وھبت نفسھا للنبی ان اراد" میں اور دوسرا "ولا تدخلوا بیوت النبی" میں۔ اور "نبی" ہمزہ کے بغیر "نبا ینبو نبوا" سے بھی لیا جاتا ہے جس کا معنی ظاہر ہونا۔ اور "نبوۃ" سے مشتق کرتے ہیں جبکہ معنی ہوتا ہے "ارتفاع" بلند ہونا۔ اس معنی کے لحاظ سے نبی کو نبی کہنے کی وجہ یہ ہوگی کہ وہ رفیع الشان، بلند مرتبہ ہوتے ہیں۔ اور کبھی "نبی" کا معنی راستہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کو نبی اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ مخلوق کو ہدایت کرتے ہیں، جیسا کہ راستہ ہدایت کرتا ہے۔

اعتراض: تم نے بیان کیا ہے کہ "نبی" مشتق ہے "نبأ" سے، جس میں ہمزہ آتا ہے اور معنی ہوتا ہے "خبر دینا" حالانکہ ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا "السلام علیک یا نبیء اللہ" یعنی ہمزہ سے "نبیء" ذکر کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "لست بنبیء اللہ" وھمز، ولکنی نبی اللہ" ولم یھمز۔ میں نبیء اللہ (ہمزہ سے) نہیں۔ لیکن میں تو "نبی اللہ"

(بغیر ہمزہ کے) ہوں۔تو کس طرح یہ ثابت کرنا درست ہے کہ ''نبی'' مشتق ہے '' نبأ '' سے۔

جواب : '' قال ابو علی ضعف سند هذا الحديث '' ابوعلی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ اس حدیث کی سند کو ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ اس سے قوی سند والی حدیث سے ثابت ہے '' قد انشده المادح ، يا خاتم النباء '' کہ نبی کریم ﷺ کی مدح کرنے والے نے آپکے سامنے شعر پڑھا، جس میں ''يا خاتم النبأ '' ذکر فرمایا۔ '' ولم يؤثر في ذلك انكار ''لیکن آپ نے اس میں انکار نہیں فرمایا۔گویا کہ حدیث تقریری جس کی سند قوی ہے اس پر دلالت کر رہی ہے کہ ''نبی'' مشتق ہے' نبأ '' سے

(از قرطبی)

﴿ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴾: ''(اور) یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے تجاوز کرتے تھے''۔یعنی بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے، اور حد سے تجاوز کر کے اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کیا اور انبیاء کرام کو شہید کیا، دراصل وجہ یہ ہے کہ:

'' ان صغار الذنوب سبب يؤدی الى ارتكاب كبارها كما ان صغار الطاعات اسباب مؤدية الى تحرى كبارها ''

''بیشک چھوٹے چھوٹے گناہ انسان کو بڑے گناہوں کا مرتکب بنا دیتے ہیں۔جیسا کہ چھوٹی چھوٹی نیکیاں کرنے والا انسان بڑے بڑے نیکی کے کام شروع کر دیتا ہے۔

اسی طرح بنی اسرائیل بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی کے احکام کے نافرمانی کرتے کرتے اتنے بڑے جرائم کے مرتکب ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرنے لگے اور انبیاء کرام کو شہید کرنے لگے۔

(از بیضاوی)

☆☆☆

﴿ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِیۡنَ هَادُوۡا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیۡنَ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴾

۱) ''بے شک ایمان والے نیز یہودیوں اور نصرانیوں اور ستارہ پرستوں میں سے وہ کہ سچے دل سے اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائیں اور نیک کام کریں۔ ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے، اور نہ انہیں کچھ اندیشہ ہو اور نہ کچھ غم''

۲) ''بیشک وہ لوگ جنہوں نے ایمان لایا، اور وہ لوگ جو یہودی ہوئے، اور نصرانی اور صابی (ان میں سے) جو شخص ایمان لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور نیک عمل کئے۔ تو ان کے لئے ان کا اجر ان کے رب کے ہاں ہے، اور ان پر کوئی خوف نہیں ہوگا اور نہ ان پر کوئی غم''

شانِ نزول:

۱) جب یہود اور نصاریٰ نے اپنے اپنے دعوے کئے کہ جنت میں صرف ہم ہی داخل ہوں گے، ہمارے بغیر جنت میں کوئی اور نہیں جائے گا، ان کے اس دعویٰ کو قرآن پاک میں ان الفاظ مبارکہ سے پیش کیا گیا:

﴿ وَقَالُوۡا لَنۡ یَّدۡخُلَ الۡجَنَّةَ اِلَّا مَنۡ كَانَ هُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰی ﴾

''اور انہوں نے کہا جنت میں ہرگز کوئی نہیں داخل ہوگا، سوائے ان کے جو یہودی ہوئے یا نصرانی''

یعنی یہودیوں نے کہا جنت میں صرف یہودی جائیں گے، اور نصاریٰ نے کہا جنت میں صرف نصاریٰ جائیں گے۔ تو ان کے اس کہنے پر اس آیۃ کریمہ کا نزول ہوا کہ خواہ ایمان والے ہوں یا یہودی ہوں یا نصرانی ہوں یا ستارہ پرست ہوں جنت میں وہی جائیں گے۔ اچھے اجر کے مستحق وہی ہوں گے جن کا اللہ تعالیٰ پر اور آخرت پر ایمان ہوگا۔

یعنی جو لوگ نبی کریم ﷺ اور آپ کی شریعت پر ایمان لائیں گے۔ان کا ایمان ہی معتبر ہوگا۔ جن لوگوں کا ایمان معتبر ہوگا، جنت کے وہی مستحق ہوں گے، جن کا ایمان ہی معتبر نہ ہوا وہ جنت کے حقدار کیسے بن بیٹھے۔ (ماخوذ از ضیاء القرآن وتبیان للکاظمی)

(۲) "نزلت فی اصحاب سلمان الفارسی بینا ھو یحدث النبی ﷺ اذ ذکر اصحابه فاخبرہ خبرھم فقال کانوا یصلون ویصومون ویؤمنون بک ویشھدون انک ستبعث نبیا فلنا فرغ سلمان من ثنائه علیھم قال له نبی الله ﷺ یا سلمان ھم من اھل النار فاشتد ذلک علی سلمان فانزل الله تعالیٰ ھذہ الایة" (ابن کثیر)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت مین اپنے یہودی ساتھیوں کی تعریف کرنے لگے، اوران لوگوں کی خبر بیان کرتے ہوئے عرض کیا کہ وہ لوگ نماز پڑھتے تھے، روزے رکھتے تھے اور آپ پر ایمان رکھتے تھے اور یہ گواہی دیتے تھے کہ آپ ہی آخری نبی مبعوث ہوں گے۔ جب حضرت سلمان ان لوگوں کی تعریف کرکے فارغ ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے سلمان وہ جہنمی ہیں۔حضرت سلمان پر یہ ارشاد شاق (تکلیف دہ) گزرا، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیہ کریمہ کو نازل کیا۔

یعنی مقصد بیان واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے ان لوگوں کا ایمان لانا کافی نہیں، بلکہ آپ کے تشریف لانے کے بعد جن لوگوں نے آپ پر ایمان لایا اور خلوص دل سے ایمان قبول کیا اور اس پر قائم رہے ان کا ہی ایمان معتبر ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے فرمایا "ھم اصحاب النار" وہ لوگ جہنمی ہیں۔تو حضرت سلمان کہتے ہیں:

"فاظلمت علی الارض فنزلت ان الذین آمنوا والذین ھادوا ......الخ
فکانما کشف عنی الجبل"

کہ مجھ پر زمین تاریک ہوگئی (اور آپ کا ارشاد پہاڑ بن کرگرا) جب یہ آیت نازل ہوئی تو گویا کہ وہ پہاڑ مجھ سے ہٹ گیا۔ (درمنثور)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ: اسی مقام پر علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نیشا پور کے علاقہ کے رہنے والے تھے۔آپ اس علاقہ کے اشراف سے تھے۔بادشاہ کا بیٹا آپ کا

دوست تھا، یہ اکثر اوقات ایک ساتھ ہی رہتے تھے، ایک دن یہ دونوں شکار کرنے کے لئے گئے تو ان کو ایک خیمہ نظر آیا۔ وہاں یہ گئے تو دیکھا کہ ایک شخص خیمہ کے اندر ایک کتاب پڑھ رہا ہے۔ اور ساتھ ساتھ رو رہا ہے۔ انہوں نے اس سے پوچھا یہ کیسی کتاب ہے۔ اس شخص نے کہا خیمہ سے باہر کھڑے کھڑے سوال کا کیا مطلب ہے، اگر تم کچھ علم حاصل کرنا چاہتے ہو تو اندر آ جاؤ، یہ دونوں اندر چلے گئے۔

اس شخص نے ان کو بتایا یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اس میں رب تعالیٰ کی طاعت کا حکم دیا گیا ہے، اور اس کی معصیت سے منع کیا گیا ہے۔ یعنی چوری کرنے، زنا کرنے، لوگوں کا مال ناحق طور پر لینے سے منع کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے اور بھی کئی احکام اس نے ان کو بتائے۔ وہ کتاب انجیل تھی جو اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمائی تھی (خیال رہے آج کل انجیل اصلی حال میں نہیں ملتی، بلکہ عیسائیوں کی من گھڑت کتاب کا نام آج کل انجیل ہے) ان کے دلوں پر بہت اثر ہوا، انہوں نے توبہ کی، اور انجیل پر ایمان لایا۔ اس شخص (راہب) نے ان دونوں کو بتایا کہ تمہاری قوم کافر ہے ان کے ذبح کئے ہوئے جانوروں کا گوشت نہ کھانا۔

یہ دونوں حضرات اس راہب کے پاس زیادہ وقت گزارتے، اور اس سے انجیل کا علم حاصل کرتے، عید کے دن بادشاہ نے اپنے دسترخوان پر مختلف قسم کے کھانے تیار کرنے کا حکم دیا، اور بڑے بڑے سرکردہ لوگوں کو دعوت دی۔ اپنے بیٹے کو بھی اس دعوت میں شرکت کے لئے بلایا، لیکن اس نے انکار کر دیا کہ میں تمہاری دعوت میں شریک نہیں ہو سکتا، تم اور تمہارے احباب ہی وہ کھانا کھالو۔

کئی آدمی بلانے کے لئے گئے، وہ ناکام ہو کر لوٹ آئے، آخر کار بادشاہ نے زبردستی اپنے بیٹے کو اپنے دربار میں حاضر کرا دیا۔ اور پوچھا کہ تم ہماری دعوت میں کیوں شریک نہیں ہو رہے؟ اس لڑکے نے بتایا کہ تم لوگ کافر ہو، تمہارے ہاتھوں سے ذبح کئے ہوئے جانور حرام ہیں۔ میں حرام گوشت نہیں کھاتا۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا تمہیں کس نے بتایا ہے؟ لڑکے نے جواب دیا مجھے راہب نے بتایا ہے۔ راہب کو بلایا گیا اور بادشاہ نے پوچھا میرا بیٹا کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا تمہارا بیٹا ٹھیک کہتا ہے۔ یعنی میں نے ہی اسے یہ تعلیم دی ہے۔ بادشاہ نے کہا اگر قتل کرنا ہمارے نزدیک عظیم جرم نہ ہوتا، تو میں تمہیں قتل کرا دیتا لیکن تم ہماری زمین سے نکل جاؤ تمہیں جلاوطن کیا جاتا ہے۔

سلمان کہتے ہیں ہم نے راہب کے اس حال پر رونا شروع کیا، اس نے کہا اگر تم سچے ہو تو موصل کے عبادت خانہ میں آ جانا وہاں ساٹھ حضرات ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہیں۔ راہب چلا گیا سلمان اور بادشاہ کا بیٹا وہیں رہ گئے۔ سلمان بادشاہ کے بیٹے کو کہتے "چلو" ہمیں چلنا چاہئے وہ بھی کہتا ٹھیک ہے۔ لیکن اس کے سامان وغیرہ بیچنے اور تیاری کرنے میں دیر ہو گئی۔ سلمان اکیلے ہی چلے گئے، عبادت خانہ میں ان لوگوں کے پاس پہنچ گئے، اس عبادت خانہ کا منتظم راہب حضرات سے بھی بلند مرتبہ رکھتا تھا۔ سلمان بھی عبادت کرنے میں مکمل ریاضت اور مشقت اٹھاتے رہے۔

ایک دن سلمان نے اس شخص کو کہا تم مجھے کیا حکم کرتے ہو کہ میں کوئی افضل کام کروں، یعنی مجھے اس میں تم کوئی مشورہ دو۔ اس شخص نے کہا کہ میں اس عبادت خانہ کا منتظم ہوں۔ کسی کو نکالنا چاہوں تو نکال بھی سکتا ہوں، لیکن میں اپنی عبادت کو کم سمجھتے ہوئے یہاں سے ایک اور عبادت خانہ میں جا رہا ہوں۔ تم یہاں رہنا چاہو تو یہاں ہی رہو، اور میرے ساتھ دوسرے عبادت خانہ میں منتقل ہونا چاہو تو منتقل ہو جاؤ سلمان نے اس سے پوچھا کہ کس عبادت خانہ میں عبادت کرنے والے افضلیت رکھتے ہیں۔ اس نے کہا یہاں کے لوگ افضل ہیں۔ سلمان نے کہا میں پھر یہیں رہوں گا۔ سلمان وہاں ہی رہے، اسی عبادت خانہ میں لوگوں سے مل کر عبادت میں مشغول رہے۔

پھر وہ شیخ عالم بیت المقدس میں جانے لگے، تو انہوں نے سلمان کو کہا اگر تم میرے ساتھ بیت المقدس چلنا چاہتے ہو تو چلو، اور اگر تم یہاں رہنا چاہتے ہو تو یہاں ہی رہو۔

سلمانؓ نے ان سے پوچھا افضل کیا ہے، یہاں رہنا، یا بیت المقدس میں جانا؟ انہوں نے کہا بیت المقدس میں جانا بہتر ہے۔ پھر دونوں بیت المقدس آ گئے، ایک دن شیخ نے سلمان کو کہا اس مسجد میں بہت علماء حضرات تشریف لاتے ہیں تم ان کے پاس جا کر علم حاصل کرو۔ سلمان جاتے ان سے علم حاصل کرتے۔

ایک دن سلمان بڑے غمناک حال میں واپس لوٹے، شیخ نے پوچھا، غمزدہ ہونے کی کیا وجہ ہے؟ انہوں نے کہا خیر کا زمانہ تو ہم سے پہلے گزر گیا، کیونکہ انبیاء کرام اور ان کی زیارت کرنے والے ہم سے پہلے گزر گئے۔ شیخ نے کہا:

"لا تحزن فانه بقی نبی لیس من نبی بافضل منه"

غم نہ کرو ابھی ایک نبی تشریف لانے والے ہیں جن سے کوئی نبی افضل نہیں۔

یہی وہ زمانہ ہے جسمیں آپ نے تشریف لانا ہے میں تو ہوسکتا ہے ان کو نہ پاسکوں، لیکن تم جوان ہو، تم ان کو پالو گے، وہ عرب کی زمین میں تشریف لائیں گے " فان ادرکته فآمن به واتبعه" اگر تم ان کو پالو تو ان پر ایمان لانا اور ان کی تابعداری کرنا، سلمان نے کہا مجھے ان کی علامات بتائیں۔ انہوں نے فرمایا ان کی علامات یہ ہوں گی:

" وهو مختوم فی ظهره بخاتم النبوة وهو یاکل الهدیة ولا یاکل الصدقة "

ان کی پیٹھ پر مہر نبوت ہوگی وہ ہدیہ کھائیں گے، لیکن صدقہ نہیں کھائیں گے۔

سلمان کو بنی کلب کے دو آدمی ملے، انہوں نے ان سے پوچھا، انہوں نے بتایا کہ ہمارے علاقہ میں ایک شخص ہے جو نبوت کا دعوی کرتا ہے۔ سلمان آئے ان کی نبی کریم ﷺ سے ملاقات ہوئی انہوں نے آپ کی مہر نبوت دیکھ کر اور یہ دیکھ کر کہ واقعی آپ صدقہ نہیں کھاتے، بلکہ صرف ہدیہ کے طور پر دیا ہوا مال کھا لیتے ہیں تو انہوں نے ایمان قبول کر لیا۔ اسی دوران اپنے یہود ساتھیوں کی تعریف کی جس پر نبی کریم ﷺ نے ان کو جہنمی کہا، جوان پر شاق گزرا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (مختصر از در منشور)

قرآن تیری عظمت پر قربان:

بظاہر تو یہ وہم ہوتا ہے کہ ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا ﴾ کے بعد ﴿ مَنْ آمَنَ مِنْھُمْ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ ﴾ کا کیا مطلب ہے؟ بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے (ان میں سے) جنہوں نے اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا، اس کا کیا مطلب ہوسکتا ہے، بظاہر تو تکرار نظر آتا ہے۔

لیکن مفسرین کرام کے وضاحتی بیان سے پتہ چلا کہ ایک چھوٹے سے جملہ میں کتنے معانی رکھ دیئے گئے، تو بے ساختہ ذہن وضمیر نے کہا "قرآن تیری عظمت پر قربان" آیئے اس کے مطالب دیکھئے:

(۱) ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ آمَنُوْ ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جو نبی کریم ﷺ کی بعثت (اعلان نبوت) سے پہلے یہود کے باطل نظریات وعقائد کو چھوڑ کر عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے تھے، جیسے قیس بن ساعدہ اور بحیری راہب اور حبیب نجار اور زید بن عمرو بن نفیل اور ورقہ ابن نوفل اور سلمان فارسی اور ابوذر غفاری اور وفد نجاشی۔

گویا کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی کا یہ مطلب ہوا:

" ان الذین آمنوا قبل مبعث محمد والذین کانوا علی الدین الباطل الذی للیھود والذین کانوا علی الدین الباطل الذی للنصاری کل من آمن منھم بعد مبعث محمد ﷺ باللہ والیوم الآخر وبمحمد فلھم اجرھم عند ربھم "

بیشک وہ لوگ جنہوں نے نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے ایمان لایا، خواہ وہ یہودیت کے باطل عقائد کو چھوڑ کر ایمان لائے تھے، یا نصرانیت کے باطل عقائد کو چھوڑ کر نصرانیت کے صحیح عقائد پر ایمان لائے تھے، اب نبی کریم ﷺ کی بعثت کے بعد اسی کا ایمان معتبر ہوگا جس نے اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر اور نبی کریم ﷺ پر ایمان لایا ان لوگوں کے لئے ہی ان کے رب کے ہاں اجر ہے۔

۲) رب تعالیٰ نے اس سورۃ کی ابتداء میں منافقین کا ذکر فرمایا پھر یہود کا ذکر کیا، اب اس آیت کریمہ میں ﴿ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ﴾ سے مراد منافقین بھی ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ بیشک وہ لوگ جو زبان سے ایمان لائے اور یہودی اور نصرانی اور صابی جو اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان لائے ان کا ہی ایمان معتبر ہے:

" فکانہ تعالیٰ قال ھؤلاء المبطلون کل من اتی منھم بالایمان الحقیقی صار من المؤمنین عند اللہ تعالیٰ "

گویا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا اے باطل راہ پر چلنے والے منافقو، یہودیو، نصرانیو، صابیو، اگر تم رب تعالیٰ کے ہاں اجر چاہتے ہو تو دل سے اور حقیقی طور پر نبی کریم ﷺ پر ایمان لے آؤ۔

۳) ﴿ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے ماضی میں نبی کریم ﷺ پر ایمان لایا اور " من آمن باللہ " کا تعلق مستقبل سے ہے۔

" فالمراد الذین آمنوا فی الماضی وثبتوا علی ذلک واستمروا علیہ فی المستقبل "

اس صورت میں مطلب یہ ہوا کہ بیشک وہ لوگ جو نبی کریم ﷺ پر حقیقی طور پر اور خلوص قلب سے ماضی میں ایمان لا چکے ہیں۔ ان کا ایمان اسی وقت معتبر ہوگا، اور وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر کے مستحق اسی وقت ہونگے جب اس ایمان پر ثابت قدم رہے اور مستقبل میں بھی اس ایمان پر قائم رہے۔ (ماخوذ از کبیر)

یہ تینوں معانی بیک وقت مراد لیں تو واضح ہو جائے گا کہ قرآن پاک کے مختصر الفاظ مبارکہ کتنے بڑے معانی پر مشتمل ہیں۔ خود بخود عظمت قرآن سمجھ آئے گی۔

﴿وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی﴾: (اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصرانی ہوئے) جن لوگوں نے توراۃ پر عمل کیا موسیٰ علیہ السلام کی سنت پر عمل کیا۔ لیکن جب عیسیٰ علیہ السلام تشریف لے آئے۔ اس کے بعد بھی جو لوگ توراۃ پر عمل کرتے رہے اور موسیٰ علیہ السلام کی سنت پر عمل کرتے رہے انہوں نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا، برباد کر دیا، کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کے آنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کی شریعت منسوخ ہو چکی تھی۔

اسی طرح جن لوگوں نے عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا، انجیل پر عمل کرتے رہے، نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری کے بعد بھی وہ اس پر قائم رہے تو انہوں نے بھی اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا۔ نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے پر یعنی جب سے آپ نے اعلان نبوت فرمایا۔ اسی وقت سے پہلے تمام دین منسوخ ہو گئے، اس کے بعد پہلے کسی دین پر قائم رہنا ایمان نہیں تھا۔

اب آیۃ کریمہ کا مفہوم واضح ہو گیا کی بیشک وہ لوگ جو یہودی ہیں یا نصرانی ان کا اپنے اپنے دینوں پر قائم رہنا ایمان نہیں۔ بلکہ ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر اور آخرت پر ایمان لائیں اور نبی کریم ﷺ کے دین پر ایمان لائیں تو ان کا ایمان معتبر ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کیلئے اجر ہوگا۔

فائدہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس آیۃ کریمہ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ...... الخ﴾ کے بعد یہ آیۃ نازل ہوئی:

﴿ وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴾

''اور جس نے اسلام کے بغیر اور دین تلاش کیا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں سے ہوگا''۔

اس سے یہ مسئلہ واضح ہو گیا:

" لا یقبل من احد طریقة ولا عملا الا ما کان موافقا لشریعة محمد ﷺ بعد ان بعثه بما بعثه به فاما قبل ذلک فکل من اتبع الرسول فی زمانه فهو علی هدی وسبیل ونجاة " (صابونی)

کسی ایک کا کوئی طریقہ اور کوئی عمل قابل قبول نہیں ہوگا جب تک کہ اس کا ایمان نبی کریم ﷺ اور آپ کی شریعت پر نہ ہوا، لیکن یہ آپ کی بعثت کے بعد کا مسئلہ ہے۔ البتہ آپ کی بعثت سے پہلے جن لوگوں نے اپنے اپنے رسولوں پر ان کے زمانہ میں ایمان لایا، اور ان کی تابعداری کی وہ ہدایت پر تھے، اور وہی راہ ان کیلئے نجات کا ذریعہ تھی۔

یہود کو یہود کہنے کی وجہ:

(۱) ایک وجہ یہ ہے کہ انہوں نے بچھڑے کی عبادت کرنے کے بعد توبہ کر لی تھی اس لئے ان کو یہود کہا گیا جیسا کہ رب تعالیٰ نے ان کے قبول کو ذکر فرمایا ﴿ اِنَّا هُدْنَا اِلَيْكَ ﴾ ای تبنا ورجعنا "بیشک ہم نے (اے اللہ) تیری طرف توبہ کی۔

(۲) حضرت یعقوب علیہ السلام کے بڑے بیٹے کا نام "یہوذا" (ذال معجمہ کے ساتھ) تھا، پھر جب عربی میں اس کا استعمال ہوا تو دال مہملہ کے ساتھ استعمال ہوا یعنی یہودا کہا گیا، اسی کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے اس کی اولاد کو بھی یہود کہا گیا۔

(۳) ان کو یہود اس لئے کہا گیا" لانهم يتهودون ای يتحركون عند قراءة التوراة " کہ وہ توراۃ پڑھتے ہوئے حرکت کرتے تھے، کیونکہ ایک معنی یہود کا حرکت کرنا ہے۔ (از کبیر)

(۴) " وقرئ (هادوا) بفتح الدال ای مال بعضهم الى بعض " ایک قراءت میں "هادوا" دال کے فتحہ (زبر) سے بھی پڑھا گیا ہے۔ اس معنی کے لحاظ پر ان کو "هادوا" اس لئے کہا گیا ہے کہ ان میں سے بعض بعض کی طرف مائل ہوئے۔ (روح المعانی)

(۵) " واليهود من الهوادة وهى المودة فكانهم سموا بذلك لمودتهم " یہود مشتق ہے " هوادة " سے جس کا معنی محبت کرنا، وہ آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اسلئے ان کو یہود کہا گیا۔ (از صابونی)

نصاریٰ کو نصاریٰ کہنے کی وجہ:

(۱) ایک بستی تھی جس کا نام ناصرہ تھا، اس میں عیسیٰ علیہ السلام تشریف لے جاتے تھے، وہاں کے لوگ اس بستی کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے "نصاریٰ" کہلائے۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین ایک دوسرے کی امداد کرتے تھے، اسی وجہ سے ان کا نام نصاری رکھ لیا گیا۔

(۳) عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں کو کہا " من انصاری الی اللہ " اللہ کے دین میں میرا مددگار کون ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا ﴿نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ﴾ اللہ کے دین کے ہم مددگار ہیں تو اسی وجہ سے ان کو نصاری کہا گیا۔

یہاں یہ بھی خیال رہے کہ صاحب کشاف نے کہا ہے '' نصاری '' جمع ہے ''نصران'' کی کہا جاتا ہے " رجل نصران "(مددگار) اور کہا جاتا ہے " امرأۃ نصرانۃ " (عورت مددگار) نصرانی میں یاء مبالغہ کے لئے ہے جیسا کہ " احمری " میں۔ ان کو عیسیٰ علیہ السلام کے مددگار ہونے کی وجہ سے نصاری کہا گیا۔ (از کبیر)

تنبیہ : کبیر سے جو وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے پہلی وجہ کی علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے مزید وضاحت کی کہ عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت قدس کے مقام پر بیت اللحم میں ہوئی، پھر آپ کی والدہ آپ کو مصر میں لے آئیں۔ پھر آپ جب بارہ سال کے ہوئے تو آپ کی والدہ آپ کو ملک شام میں لے آئیں اور ناصرہ بستی میں مقیم ہوئیں۔ اس وجہ سے ان لوگوں کو نصاری کہا گیا۔ (روح المعانی)

تاہم علامہ رازی رحمہ اللہ نے ناصرہ بستی کے متعلق عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے '' وکان ینزلھا " کے الفاظ ذکر فرمائے، میں نے اس کا ترجمہ آسان بامحاورہ لکھا تشریف لے جاتے تھے۔

﴿ وَالصَّابِئِيْنَ ﴾ : بعض حضرات کے قول کے مطابق یہ لفظ عجمی ہے۔ اور بعض حضرات نے کہا یہ عربی لفظ ہے زیادہ معتبر یہی قول ہے۔ جب لفظ عربی ہو تو اس کا اصل کیا ہے، ایک قول یہ ہے کہ یہ مہموز اللام ہے " صبأ بالھمز اذا خرج" صبأ کے آخر میں ہمزہ ہے، اس کا معنی ہے نکل جانا، اس معنی کے لحاظ پر ان کو صابئ کہنے کی وجہ یہ ہے " لخروجھم عن الدین الحق " وہ دین حق سے نکلے ہوئے تھے۔

ایک اور قول یہ ہے کہ یہ ناقص (معتل اللام) ہے یعنی " صبا یصبوا صبوا " سے لیا ہوا ہے ''صبا بمعنی مال'' صبا کا معنی ہے میلان کرنا۔ اس معنی کے لحاظ پر ''صابی'' یاء سے پڑھا جائے گا۔ اور انکو صابی کہنے کی وجہ یہ ہوگی " لمیلھم الی الباطل " ان کا میلان باطل عقیدہ کی طرف تھا، اس

لئے ان کو صابی کہا گیا۔ (روح المعانی)

صابئین کی قسمیں:

مختلف فرقوں کو صابئ کہا گیا وجہ سب کی یہی تھی کہ وہ دین حق سے نکل کر باطل دین کی طرف مائل ہوئے لہٰذا ان کو صابی کہا گیا۔

(۱) صابی کی ایک قسم یہ ہے " قوم بین النصاری والمجوس " صابی وہ قوم تھی جو نصاری اور مجوس کے درمیان تھی، یعنی ان کے عقائد ان دونوں سے ملتے جلتے تھے۔ (بیضاوی)

(۲) "والصابئین ای ان عبدوا الکواکب"

صابئین سے مراد ستاروں کی عبادت کرنے والے ہیں۔ (تبصیر الرحمن)

علامہ رازی رحمہ اللہ کا مختار مذہب بھی یہی ہے:

" ان الصابئین قوم یعبدون الکواکب بمعنی ان اللہ جعلها قبلة للعباد والدعاء او بمعنی ان اللہ فوض تدبیر امر هذا العالم" (صابونی)

کہ بیشک صابئین وہ لوگ ہیں جو ستاروں کی عبادت کرتے تھے، اس لحاظ پر کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دعاء کا قبلہ بنایا ہے، اور بندوں کی عبادت کا بھی یہی قبلہ ہیں۔ اور وہ ستاروں کی عبادت اس لئے بھی کرتے تھے کہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ستاروں کو اللہ تعالیٰ نے تمام جہان کی تدبیر سپرد کر دی۔

تقریبا یہ وہی عقیدہ ہے جو فلاسفہ میں ان لوگوں کا ہے جو عقول عشرہ کے قائل ہیں۔ علامہ صابونی نے صابئین کا معنی ستارہ پرست کرنے کے متعلق فرمایا " واختار الرازی...... واظهر الاقوال"

(۳) " قوم بین المجوس والیهود والنصاری لیس لهم دین " صابی وہ لوگ تھے جن کا کوئی دین نہیں تھا بلکہ وہ یہود اور نصاری اور مجوسیوں کے درمیان درمیان تھے، یہ ان کا اپنا کوئی مستقل دین نہیں تھا جس کی وہ تابعداری کرتے بلکہ اپنی مرضی کے مطابق جو پسند آیا اسی پر عمل کر لیا، کوئی عقائد یہودیوں کے حاصل کر لئے اور کوئی نصرانیوں کے اور کوئی مجوسیوں کے۔ (از صابونی)

آجکل ہمارے ملک میں بھی نکھٹو، الو اور گدھوں کی جماعت ان ہی نظریات کی مالک ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کے شر سے ملک کو محفوظ رکھے، یہ لوگ علماء کو فرقہ واریت کا ذمہ دار ٹھہرا کر خود ہی قتل کرا رہے ہیں حالانکہ بعض کمینے لوگوں کو پیسے دے کر لڑانے والے بھی یہی ہیں انہوں نے ''مولوی مکاؤ'' پروگرام شروع کیا ہوا ہے۔

(۴) " قال قتادة هم قوم يعبدون الملائكة ويصلون الى الشمس كل يوم خمس صلوات"

قتادہ کہتے ہیں، صابئین وہ لوگ تھے جو فرشتوں کی عبادت کرتے تھے، البتہ سورج کی طرف منہ کر کے ہر روز پانچ نمازیں ادا کرتے تھے۔

" وقال ايضا الاديان خمسة منها للشيطان اربعة و واحد للرحمن ،
الصابئون وهم يعبدون الملائكة والمجوس وهم يعبدون النار ،
والذين اشركوا يعبدون الاوثان ، واليهود ، والنصارى "

اور قتادہ نے وضاحت کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ دین پانچ قسم ہیں۔ چار شیطانی ہیں، اور ایک رحمانی ہے نبی کریم ﷺ کی بعثت کے بعد رحمانی دین صرف ایک ہی ہے کہ نبی کریم ﷺ شریعت پر ایمان لائے۔ شیطانی دینوں میں ہی، صابی ہونا بھی ہے، صابی وہ ہیں جو فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں۔ اور شیطانی دین والے مجوسی ہیں جو آگ کی پوجا کرتے ہیں، اور شیطانی دین والے مشرک ہیں جو بتوں کی عبادت کرتے ہیں، اور شیطانی دین والے یہود و نصاریٰ بھی ہیں کیونکہ انہوں نے آسمانی کتب میں تحریف کر دی تھی، باطل نظریات اور باطل عقائد کو حاصل کر لیا، اور نبی کریم ﷺ پر ایمان بھی نہیں لائے۔
(از کبیر)

(۵) " هم قوم يشبه دينهم دين النصارى الا ان قبلتهم نحو مهب الجنوب يزعمون انهم على دين نوح عليه السلام " (صابونی)

صابئین وہ لوگ تھے جن کا دین نصاریٰ کے دین کے مشابہ تھا، لیکن ان کا قبلہ جنوبی جانب سے چلنے والی ہوا کے رخ پر تھا، اور یہ اپنے گمان کے مطابق اپنے آپ کو نوح علیہ السلام کے دین پر سمجھتے تھے۔

(۶) " ان الصابئين قوم يعبدون الملائكة ويقرء ون الزبور ويصلون للقبلة " (صابونی)

بیشک صابئین اس قوم کو کہا جاتا ہے جو فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں، اور زبور پڑھتے ہیں اور قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔

اس قول کے مطابق ان کا زبور پر ایمان ثابت نہیں۔ اگر ان کا زبور پر ایمان ہوتا تو وہ فرشتوں کی عبادت نہ کرتے۔

(۷) " سئل وهب بن منبه عن الصابئين فقال الذی يعرف الله وحده ليستله شريعة يعمل بها ، ولم يحدث كفرا " (صابونی)

وہب بن منبہ سے سوال کیا گیا صابئین کے متعلق کہ وہ کون لوگ ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا، یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ وحدہ کو پہچانتے ہیں، اور ان کی کوئی شریعت نہیں جس پر وہ عمل کریں اور کفر کو وہ اختیار نہیں کرتے۔

(۸) " قال عبد الرحمن بن زيد الصابئون اهل دين من الأديان كانوا بجزيرة الموصل يقولون لااله الا الله وليس لهم عمل ولا كتاب ولا نبی الا قول لا اله الا الله" (صابونی)

عبد الرحمٰن بن زید نے بیان کیا ہے کہ صابئون اپنے آپ کو دیندار کہتے ہیں، موصل کے علاقہ کے ایک جزیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ وہ لا اله الا الله کہتے ہیں۔ لیکن نہ ہی ان کا کوئی عمل ہے اور نہ کتاب، اور نہ ہی کسی نبی پر وہ ایمان رکھتے ہیں سوائے "لا الـه الا الله" کے ان کے پاس کوئی عمل نہیں، جس کی وجہ سے ان کو مومن کہا جا سکے۔

(۹) " قال ابو العاليه والضحاک الصابئون فرقة من اهل الكتاب يقرأون الزبور ولهذا قال ابو حنيفة واسحاق لاباس بذبائحهم ومناكحتهم " (الصابونی)

ابو العالیہ اور ضحاک نے کہا صابئین اہل کتاب میں سے ایک فرقہ کو کہا جاتا ہے وہ زبور پڑھتے ہیں ان کا حکم وہی ہے جو اہل کتاب کا ہے۔ صابئین کی تمام قسموں میں سے صرف یہ قسم ہے جن سے نکاح کرنا جائز ہے اور ان کا ذبیحہ جائز ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ اور اسحاق رحمہما اللہ نے ان کے ساتھ ہی نکاح کرنا اور ان کے ذبیحہ کے جائز ہونے کا قول کیا ہے۔

آیۃ کریمہ میں صابئین کی کون سی قسم معتبر ہے؟

اگرچہ پہلے بیان کر دیا گیا ہے کہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے ستارہ پرست ہونے کے قول کو ہی مختار کہا ہے اور یہ کہا ہے کہ یہ ظاہر قول ہے۔ اور بھی کئی مفسرین کرام نے اسی قول کو راجح قرار دیا، اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان رحمہ اللہ نے بھی اپنے ترجمہ میں "ستارہ پرست" ذکر فرمایا۔

راقم کا موقف: اس مقام پر راقم کا موقف وہی ہے جو تدریس کے بادشاہ راقم کے استاذ محترم نے جلالین پڑھاتے ہوئے بیان فرمایا تھا کہ یہاں صابئین کی تمام قسمیں ہی معتبر ہیں۔ اس طرح قرآن پاک کا وسیع بیان واضح ہوگا، اور عظمت قرآن کا پتہ چلے گا۔

یعنی مطلب یہ ہوا کہ صابئین کے تمام گروہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس وقت تک اجر حاصل نہیں کر سکیں گے جب تک ان کا اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان نہ ہوا۔

آیئے اسی موقف کو علامہ رازی رحمہ اللہ کی اس عبارت سے سمجھیں، پھر اندازہ کریں کہ راقم کے استاذ محترم کا علمی کمال کیا ہے یقیناً آپ عمدۃ الازکیاء اور رازی دوران ہیں۔ اس سے میری مراد حضرت علامہ مولنا محمد اشرف سیالوی ہیں۔

"ثم انه سبحانه بين فى هذه الفرق الاربعة انهم اذا آمنوا بالله فلهم الثواب فى الآخرة ليعرف ان جميع ارباب الضلال اذا رجعوا عن ضلالهم و آمنوا بالدين الحق فان الله سبحانه وتعالىٰ يقبل ايمانهم طاعتهم ولا يردهم عن حضرته البتة" (كبير)

اللہ تعالیٰ نے اگرچہ بظاہر چار فرقوں کا ذکر فرمایا کہ وہ جب اللہ تعالیٰ پر ایمان لائیں تو ان کو ثواب حاصل ہوگا آخرت میں، لیکن اس سے یہ معلوم ہوگیا کہ بیشک تمام گمراہ لوگ جب اپنی گمراہی کو چھوڑ کر، دین حق پر ایمان لے آئیں تو اللہ تعالیٰ ان کے ایمان کو قبول کرتا ہے، اور ان کی طاعت کو قبول فرماتا، اور ان کو یقیناً اپنے حضور سے دور نہیں فرماتا۔

واضح ہوا کہ تمام باطل فرقے مراد ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ اور آخرت اور نبی کریم ﷺ پر ایمان لائیں تو ان کا اجر ان کے رب کے ہاں ہوگا۔

﴿مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾: "جو شخص ایمان لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر"

اعتراض: آیۂ کریمہ میں صرف اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لانے کا ذکر ہے حالانکہ آسمانی کتب اور اللہ تعالیٰ کے تمام انبیاء کرام اور فرشتوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ انکا ذکر کیوں نہیں کیا؟

جواب : " (من آمن) منهم مخلصا (باللہ والیوم الآخر) الذی لایتم الایمان باللہ بدونه اذبه الایمان بدوام ربوبیته لهم وعموم قدرته وحکمته وعدله واما الایمان بالکتب والرسل والملائکة فلازم للایمانین اذ لا یعرفان الا بهذه الامور فلم یصرح به لقوة دلالة الایمانین علیه " (تبصیر الرحمن)

جس نے ان میں سے اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر خلوص سے ایمان لایا۔ آخرت کے دن پر ایمان لانے کا ذکر فرما کر واضح کر دیا کہ جب تک انسان کا آخرت پر ایمان نہیں ہوگا اس وقت تک اللہ تعالیٰ پر بھی ایمان نہیں ہوگا۔ کیونکہ آخرت کے دن پر ایمان کے بغیر اللہ تعالیٰ کی دائمی ربوبیت اور اس کی قدرت کے عموم، اور اسکی حکمت اور اس کے عدل پر ایمان نہیں ہوسکتا۔

آسمانی کتب اور رسولوں اور فرشتوں پر ایمان لانے کا اگرچہ بظاہر ذکر نہیں لیکن اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان ان تمام پر ایمان لانے کے بغیر ممکن نہیں۔ لہٰذا واضح ہوا کہ دو ایمانوں کا ذکر تمام ایمانوں کو مستلزم ہے۔

" (من آمن) منهم (باللہ والیوم الآخر) مع محمد ﷺ بالقلب واللسان " (مظهری)

جو شخص ان میں سے اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا، ساتھ ساتھ اور دل اور زبان سے محمد ﷺ پر بھی ایمان لایا۔ یعنی اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان اسی وقت معتبر ہوگا، جب کہ نبی کریم ﷺ پر زبان اور دل سے خلوص کے ساتھ ایمان لائے گا۔

تنبیہ : ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا ﴾ سے مراد جب حقیقی طور پر نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے والے مراد ہوں تو " مَنْ آمَنَ " سے مراد یہ بھی ہوسکتا ہے:

" ویمکن ان یکون من آمن اشارة الی الذین کمل ایمانهم بتصفیة القلب وتزکیة النفس والقالب "

کہ جو کامل طور پر صفائی قلب (خالص دل) اور پاکیزگی نفس اور پاکیزگی بدن سے ایمان لائیں، یعنی ظاہر و باطن سے کامل اور خالص ایمان لانیوالے ہی اللہ کے ہاں اجر پائیں گے۔

کمال ایمان کا ذکر نبی کریم ا کے اس ارشاد میں پایا گیا ہے:

" لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیه من والده وولد والناس

اجمعین " (بخاری ، مسلم ، مسند احمد ، نسائی ، ابن ماجه انس مرفوعا)

تم میں سے کوئی ایک کامل مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اسے اس کے والد (والدین) اور اولاد اور تمام لوگوں سے محبوب نہ ہوں۔

☆ اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی:

" لا یؤمن احدکم حتی یحب لاخیه ما یحب لنفسه "

(بخاری ، مسلم ، مسند احمد ، ترمذی ، نسائی ، ابن ماجه عن انس مرفوعا)

تم میں سے کوئی ایک کامل مومن نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ اپنے بھائی کے لئے وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

☆ اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی:

" لا یبلغ العبدحقیقة الایمان حتی یحزن من لسانه " (رواه الطبرانی و اصححه)

بندہ اس وقت تک کامل ایمان نہیں حاصل کرسکتا جب تک اپنی زبان سے نہ غم کھائے۔ (ازمظہری)

یعنی ڈرتا رہے کہ زبان کہیں لغزش نہ کرلے، زبان کی لغزش پر بہت ہی فساد مرتب ہوتے ہیں۔

﴿ وَعَمِلَ صَالِحًا ﴾ (اور اچھے عمل کئے) (وعمل صالحا)علی حسب امر الله تعالیٰ (مظهری)

وہی اعمال صالحہ ہوسکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے امر کے مطابق ہوں۔ اگر کوئی شخص اپنے خیال کے مطابق اچھے عمل کررہا ہے لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق نہیں، تو وہ حقیقت میں اچھے عمل نہیں۔

" (وعمل صالحا)ولا بدفیه من الاخذ بالناسخ وترک المنسوخ " (تبصیر الرحمن)

جب تک انسان منسوخ کو چھوڑ کر ناسخ پر عمل نہیں کرے گا اسوقت تک اعمال صالحہ نہیں بن سکتے۔

اسی سے واضح ہوگیا کہ نبی کریم ﷺ کی بعثت کے بعد یہود و نصاری کے اعمال اسی وقت اچھے اور صالح ہوسکتے تھے جب وہ نبی کریم ﷺ کی شریعت پر عمل کرتے۔ واضح ہوا کہ یہود و نصاری کا اپنے اپنے حق دینوں میں قائم رہنا بھی باطل تھا، ان کا کوئی عمل بھی صالح نہیں کہلاسکتا تھا۔ باطل دینوں پر قائم رہ کر وہ کیسے اعمال صالحہ کرسکتے تھے۔

﴿ فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾: " تو ان کے لئے ان کا اجران کے رب کے ہاں ہے" یعنی

اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ فرمایا ہے مومنوں کے لئے جنت کا، وہ تمام مومنوں کو حاصل ہوگی، البتہ قرب کے مراتب اور ستھری شراب جس پر کستوری کی مہر لگی ہوگی اور خاص چشمے صرف مقربین کو حاصل ہوں گے، رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ﴾ وہ ایسے چشمے ہوں گے جن سے مقربین پیئں گے۔

(از مظہری)

﴿ فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ ﴾ کا اور مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ایمان پر ہمیشہ کے لئے قائم رہے اور نیک عمل کرتے رہے تو ان کے لئے کامل اجر ہے ﴿ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾ کہہ کر اشارہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مربی ہے اس لئے یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوئی بعید نہیں کہ ان کے ایمان اور اعمال کو تھوڑے دنوں میں اتنا مال عطاء فرمادے جو ان کو مکمل عمر میں حاصل ہوتا۔ (از تبصیر الرحمن)

تنبیہ : ﴿ فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾ کی تفسیر میں علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا: "الذی وعدلهم علی ایمانهم وعملهم" ان کے لئے وہ اجران کے رب کے ہاں ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے ان سے ان کے ایمان لانے اور نیک عمل کرنے پر کیا ہوا ہے۔

علامہ بیضاوی کی اس عبارت سے شیخ زادہ نے یہ مسئلہ بیان فرمایا ہے:

" الذی وعدلهم الخ اشارة الی ان استحقاقهم للاجر بسبب الایمان والعمل انما هو بحسب التفضل والاحسان علی طریق وفاء الکریم بما وعده لاعلی طریق الوجوب العقلی کما زعمه المعتزلة فلذلک عدل من تعبیر صاحب الکشاف وهو قوله فلهم اجرهم الذی یستوجبونه بایمانهم وعملهم فانه مبنی علی مذهبه "

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے " الذی وعدلهم " سے تفسیر فرما کر یہ مسئلہ واضح کیا ہے کہ ان کو اجران کے ایمان اور نیک اعمال کی وجہ سے صرف اس لئے حاصل ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فضل واحسان ہے اور اس نے وعدہ فرمایا ہے کریم جب وعدہ فرماتا ہے اسے پورا کرتا ہے ان کو یہ اجر حاصل ہونا عقلا واجب نہیں۔ کہ انہوں نے ایمان لایا اور نیک عمل کئے تو رب تعالیٰ پر واجب ہو جائے کہ ان کو اچھا اجر عطا فرمائے۔ اس نے تو پہلے ہی ان گنت نعمتیں عطا کر رکھی ہیں، انسان ان کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکتا، تو اور اجر

کالزوی طور پر حقدار ہونے کا دعوی کیسے کر سکتا ہے۔

اسی سے یہ واضح ہوگیا کہ صاحب کشاف کی تفسیر اس کے مذہب کے مطابق ہے کیونکہ زمخشری معتزلی ہے لہذا اس کا یہ ذکر کرنا" الذی یستوجبونہ بایمانھم وعملھم" (وہ اجر جس کے وہ جوبی طور پر اپنے ایمان اور نیک اعمال کی وجہ سے مستحق ہیں) باطل ہے۔ (از بیضاوی وشیخ زادہ)

﴿ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴾ : ''اور ان پر کوئی خوف نہیں ہوگا اور نہ ان پر کوئی غم'' یعنی جب کفار عذاب سے ڈر رہے ہوں گے تو ایمان والے اور نیک اعمال والے لوگوں کو کوئی خوف اور ڈر نہیں ہوگا۔ اسی طرح جب اپنے اعمال میں کوتاہی کرنے والے اپنی عمر کے ضائع ہونے اور ثواب کے فوت ہونے پر غم کر رہے ہوں گے، تو ایمان والے اور نیک اعمال والے لوگوں کو کوئی غم نہیں ہوگا۔

مقام توجه : ﴿ عِندَ رَبِّهِمْ ﴾ کا یہ مفہوم نہیں کہ ان لوگوں کا اجر رب کے پاس کسی مکان میں ہے رب تعالیٰ مکان سے پاک ہے، اسلئے مکانیت کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف محال ہے، اور یہ معنی لینا بھی ممکن نہیں کہ رب تعالیٰ انکے اجر کی ایسے حفاظت کر رہا ہے جیسے امانت کی حفاظت کی جاتی ہے۔ بلکہ یہاں یہ مطلب ہے کہ ان لوگوں کو اجر یقینی طور پر حاصل ہونا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرمایا رکھا ہے اس نے اپنے فضل وکرم سے اپنے وعدہ کو پورا کرنا ہی ہے، اور اجر عطا کرنا ہے تو گویا کہ اس اجر کو اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل ہوگا، اور جسے وہ اجر حاصل ہوگا وہ بھی اللہ تعالیٰ کا مقرب ہوگا۔ (از کبیر)

گزشته سے پیوسته : صابی کا معنی بیان کیا جا چکا ہے کہ ایک دین سے دوسرے دین کی طرف میلان کرنا اور ایک دین کو چھوڑ کر دوسرے دین کو اختیار کر لینا:

"ولذلک کانت العرب یسمون رسول اللہ ﷺ صابیا لانہ علیہ السلام اظھر دینا خلاف ادیانھم ومال الیہ" (شیخ زادہ)

یہی وجہ ہے کہ مشرکین نبی کریم ﷺ کو صابی کہتے تھے کیونکہ آپ نے ان کے دینوں کے خلاف دین حق پیش فرمایا اور اسی کی طرف آپ کا میلان تھا۔

مسلم شریف جزء ثانی میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کے متعلق ایک طویل حدیث میں یہ ذکر ہے کہ حضرت ابوذر جب مکہ مکرمہ میں پہنچے تو آپ نے نبی کریم ﷺ کے متعلق یہی پوچھا کہ صابی کہاں ہے۔ مقصد یہ تھا کہ وہ شخص جن کو تم صابی کہتے ہو وہ کہاں ہیں؟ اور ان لوگوں کو جب

یہ پتہ چلا کہ ابوذر ایمان لا چکے ہیں تو انہوں نے حضرت ابوذر کو بھی صابی کہا۔

حکمت : ابھی جس آیۃ کریمہ کی وضاحت کی جا رہی ہے وہ یوں ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصَارٰى وَالصَّابِئِيْنَ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾

سورۃ مائدہ میں ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصَّابِئُوْنَ وَالنَّصَارٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾

اور سورۃ حج میں ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصَّابِئِيْنَ وَالنَّصَارٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴾

سورۃ بقرہ میں نصاریٰ کا ذکر پہلے ہے اور سورۃ مائدہ میں اور سورۃ حج میں صابئین کا ذکر پہلے کیا گیا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ اور سورۃ مائدہ میں الصابئون مرفوع ہے۔ باقی دونوں جگہ میں منصوب اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب : علامہ رازی رحمہ اللہ نے دونوں مسئلوں پر سورۃ مائدہ اور حج میں فرق کی وجوہ کو ذکر کیا ہے یہاں مختصر اور عجیب حکمت پر مبنی ارشاد فرمایا:

" والجواب لما كان المتكلم احكم الحاكمين فلابد لهذه التغيرات من حكم وفوائد ، فان ادركنا تلك الحكم فقد فزنا بالكمال وان عجزنا احلنا القصور على عقولنا لا على كلام الحكيم والله اعلم " (کبیر)

جواب یہ ہے کہ جب کلام کرنے والا اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین ہے تو ضروری طور پر ان تبدیلیوں میں حکمتیں اور فوائد پائے گئے ہیں۔ اگر ہم ان حکمتوں کو سمجھ سکیں تو ہماری بہت بڑی کامیابی ہے اور اگر ہم عاجز آ جائیں تو یہ ہماری عقلوں کا قصور ہوگا، اللہ تعالیٰ کے کلام میں کوئی کمی نہیں ہو سکتی۔ (واللہ اعلم)

تاہم تفصیلی جواب انشاء اللہ سورۃ مائدہ میں ہی آئے گا۔

﴿ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾

۱) ''اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تم پر طور کو اونچا کیا تو جو کچھ ہم تم کو دیتے ہیں زور سے، اور اس کے مضمون یاد کرو اس امید پر کہ تمہیں پرہیزگاری ملے''۔

۲) ''اور جب ہم نے لیا عہد تم سے اور اٹھایا اوپر تمہارے طور کو لے لو جو دیا ہم نے تمہیں، (وہ) مضبوطی سے، اور یاد کرو جو اس میں ہے، تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ''

''اعلم ان هذا هو الانعام العاشر وذلک لانه تعالیٰ انما اخذ میثاقهم لمصلحتهم فصار ذلک من انعامه''

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اپنی نعمتوں کی یاد دلائی وہ نعمتیں جن کا اس مقام پر ذکر کیا جارہا ہے ان میں یہ دسویں نعمت ہے۔ کیونکہ ان سے وعدہ لینا کہ تورات پر عمل کرو گے یہ ان کی مصلحت کے لئے تھا یقینی بات ہے جو کام مصلحت کے لئے ہو وہ نعمت ہی ہوا کرتا ہے۔ (از کبیر)

تاہم بنی اسرائیل کی کجروی کا ذکر بھی واضح ہے جیسا کہ پہلی نعمتوں میں بھی ان کی کجرویوں کا (ٹیڑھی چال) ذکر کردیا گیا ہے یہاں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔

مختصر وضاحت:

موسیٰ علیہ السلام پر جب تورات کا نزول ہوا تو آپ نے بنی اسرائیل کو تورات کے احکام بتائے لیکن انہوں نے احکام کو مشکل سمجھ کر ماننے سے انکار کردیا، تو اللہ تعالیٰ نے جبرائیل کو حکم دیا کہ انہوں نے طور پہاڑ کو اٹھا کر ان کے سروں پر کردیا، انہوں نے اسے تسلیم کرلیا۔

رب تعالیٰ نے ان کو توراۃ کے مضامین یاد کرنے اور ان پر عمل کرنے کا حکم جو دیا اسمیں ان کا ہی فائدہ تھا رب تعالیٰ غنی ہے، اسے کوئی پرواہ نہیں، ان کا فائدہ یہی تھا کہ وہ نیک، پرہیزگار بن جائیں۔

قدرے تفصیلی وضاحت:

﴿ وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ ﴾: "اور جب لیا ہم نے وعدہ تم سے"

" (مِیْثَاقَ کُمْ) ای عهد کم الوثیق " یعنی میثاق سے مراد پختہ وعدہ ہے مطلب یہ ہوا کہ ہم نے تم سے توراۃ کے مشکل احکام پر عمل کرنے اور ان کو تسلیم کرنے کا تم سے پختہ وعدہ لیا۔ (تبصیر الرحمن) ایسے امور جن کی اطاعت اور فرمانبرداری واجب ہوتی ہے ان کے کرنے کا حکم دینا اور ان کا وعدہ لینا میثاق کہلاتا ہے۔

وعدہ لینے سے مراد کیا ہے؟ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عقلیں عطاء کیں، جن سے ان دلائل کو حاصل کیا جاتا جو صانع کے وجود اور اس کی حکمت پر دلالت کرتے، اور پھر ان کو وہ دلائل بھی عطاء کیے جو اللہ تعالیٰ کے انبیاء کرام اور اس کے رسولوں کی صداقت پر دلالت کرتے۔

یہ مواثیق (وعدوں) کی قسموں میں سے بہت قوی میثاق ہے اس میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جب اللہ تعالیٰ سے توراۃ کی الواح (تختیاں) لے کر آئے تو قوم کو بتایا کہ اسمیں توراۃ اللہ کی کتاب ہے۔ انہوں نے کہا ہم تمہارے قول کو اس وقت تک ہرگز تسلیم نہیں کریں گے جب تک کہ اللہ تعالیٰ کو ظاہر طور پر نہ دیکھ لیں۔

آپ ان کو فرما رہے تھے " هذا کتابی فخذوه " یہ میری کتاب ہے اس پر عمل کرو، لیکن وہ مسلسل انکار کیے جا رہے تھے " فاخذتهم الصاعقة فماتوا ثم احیاهم " تو ان کو بجلی کی کڑک نے اپنی گرفت میں لے لیا تو وہ مر گئے پھر ان کو زندہ کیا۔ پھر ان کو کہا اللہ کی کتاب کو تسلیم کرو، انہوں نے پھر انکار کیا۔

" فرفع فوقهم الطور " تو طور کو اٹھا کر ان کے سروں پر بلند کر دیا، پھر ان کو کہا گیا کتاب کو تسلیم کرو ورنہ طور کو تمہارے اوپر پھینک دیا جائے گا " فاخذوه فرفع الطور هو المیثاق " تو انہوں نے اسے تسلیم کر لیا طور کو ان کے سروں سے ہٹا لیا گیا یہی وہ میثاق ہے۔

تنبیہ : بظاہر عقل کا تقاضا یہ تھا کہ " مواثیقکم " کہا جاتا کہ تم میں سے ہر ایک سے وعدہ

لیا گیا تمام سے ایک میثاق لینے کا کیا مطلب۔ اس کی دو وجہ ہیں۔ ایک یہ ہے کہ اگرچہ ذکر واحد کا ہے لیکن مراد ہر ہر فرد سے وعدہ لینا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿ ثُمَّ یُخرِجُکُم طِفلًا ﴾ پھر تم میں سے ہر ایک کو طفولیت کی حالت میں نکالا۔ دوسری وجہ یہ ہے " انہ کان شیًا واحدا اخذ من کل واحد منھم "ہر ایک سے ایک قسم کا ہی وعدہ لیا گیا" فلا جرم کان کلہ میثاقا واحدا " تو یقیناً ایک ہی میثاق مراد ہوا۔ اگر "مواثیق" کہا جاتا تو وہم ہوتا کہ شائد ان لوگوں سے علیحدہ علیحدہ وعدے لئے گئے۔ (از کبیر)

﴿ وَرَفَعنَا فَوقَکُمُ الطُّورَ ﴾ : "اور اٹھایا ہم نے تمہارے اوپر طور"

" عن ابی حاتم عن ابن عباس ان موسیٰ علیہ السلام لما جاء ھم بالتوراۃ وما فیھا من التکالیف الشاقۃ کبرت علیھم وابوا قبولھا فامر جبریل بقلع الطور فظلہ فوقھم حتی قبلوا " (روح المعانی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بیشک موسیٰ علیہ السلام جب ان کے پاس توراۃ کو لائے تو اس میں مشکل احکام تھے، انہوں نے ان کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، تو اللہ تعالیٰ نے جبرائیل کو حکم دیا، انہوں طور کو اٹھا کر ان کے سروں پر سائبان کی طرح کر دیا، تو انہوں نے توراۃ کے احکام شاقہ کو قبول کر لیا۔

سورۃ اعراف میں فرمایا:

﴿ وَاِذ نَتَقنَا الجَبَلَ فَوقَھُم کَاَنَّہٗ ظُلَّۃٌ وَّظَنُّوا اَنَّہٗ وَاقِعٌ بِھِم خُذُوا مَا اٰتَینٰکُم بِقُوَّۃٍ وَّاذکُرُوا مَا فِیہِ لَعَلَّکُم تَتَّقُونَ ﴾

اور جب ہم نے پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹا کر ان کے سروں پر سائبان کی طرح کر دیا۔ انہوں نے گمان کیا بیشک وہ ان پر گرنے والا ہے (ہم نے ان کو کہا) پکڑو (عمل کرو اس پر) جو ہم نے تمہیں عطا کیا مضبوطی سے (اس پر عمل کرو) اور یاد کرو اس میں جو ہے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔

"﴿ وَاِذ نَتَقنَا ﴾، قلع من اصلہ " یعنی ﴿ نَتَقنَا ﴾ کا معنی یہ ہے کہ ہم نے پہاڑ کو جڑوں سے اکھیڑ کر ان کے سروں پر سائبان کی طرح کر دیا" قال ابو عبیدہ، زعزعناہ فاستخرجنا من مکانہ" ابو عبیدہ نے کہا ﴿ نَتَقنَا ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اسے حرکت دی، جھنجوڑا اور اپنی جگہ سے ہٹا دیا۔

ہر وہ چیز جس کو اکھیڑ کر پھینک دیا جائے اس کے لئے لفظ ''نتق'' بولتے ہیں۔

''قال ابن الاعرابی ، الناتق الرافع'' ابن اعرابی نے کہا ناتق کا معنی اٹھا کر بلند کرنا۔

(از قرطبی)

علامہ رازی رحمہ اللہ نے کیا خوب بیان کیا:

'' ان رفع الطور آیة باهرة عجیبة تبهر العقول وترد المکذب الی التصدیق والشاک الی الیقین فلما رأو ذلک وعرفوا انه من قبله تعالیٰ علما لموسی علیه السلام علمامضافا الی سائر الآیات اقر واله بالصدق فیما جاء به واظهروا التوبة واعطوا العهد والمیثاق ان لا یعودوا الی ما کان منهم من عبادة العجل وان یقوموا بالتوراة فکان هذا عهدا موثقا جعلوه لله علی انفسهم''

پہاڑ کو اٹھا کر ان کے سروں پر کرنے میں بہت روشن دلیل ہے، اور عقلوں کو حیران کرنے والی ہے جھٹلانے والے کو تصدیق کی طرف لانے والی دلیل ہے، اور شک کرنے والے کو یقین دلانے والی ہے جب بنی اسرائیل نے طور کو اپنے سروں پر دیکھا تو وہ سمجھ گئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور ان کو موسیٰ علیہ السلام کے سچے نبی ہونے کا علم حاصل ہو گیا بلکہ تمام معجزات تمام نشانیوں اور تمام دلائل پر وہ یقین کرنے لگے اور انہوں نے توبہ کی اور پختہ وعدہ کیا کہ آئندہ بچھڑے کی پوجا کرنے جیسے عمل کو نہیں دھرائیں گے۔ اور تورات پر عمل کریں گے گویا کہ یہ ان کی طرف سے جو پختہ وعدہ کیا گیا اسی کو اللہ تعالیٰ نے ان سے طلب کیا تھا۔ (کبیر)

تنبیہ: اللہ تعالیٰ کے حکم سے جبرائیل نے طور کو اٹھا کر بنی اسرائیل کے سروں پر سائبان کی طرح کیا اس میں تقریباً تمام سلف صالحین کا اتفاق ہے متقدمین کی تمام تفاسیر اس پر شاہد ہیں۔ لہٰذا مودودی صاحب کی یہ تفسیر بے حقیقت ہو کر رہ گئی اس کی تفصیلی کیفیت معلوم کرنا مشکل ہے، بس مجملاً یوں سمجھنا چاہئے کہ پہاڑ کے دامن میں میثاق لیتے وقت ایسی خوفناک صورت حال پیدا کر دی گئی تھی کہ ان کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پہاڑ ان پر آپڑے گا، ایسا ہی کچھ نقشہ سورۃ اعراف آیۃ ۱۷۱ میں کھینچا گیا ہے۔

(تفہیم القرآن)

سورۂ اعراف کی وضاحت قرطبی کے حوالہ سے بیان کردی گئی، جس میں مطلب ہی یہ ہے کہ پہاڑ کو اٹھا کر بلند کیا۔

طور کو اٹھانے کا انکار کرنے والے کون؟

" من الملاحدة من انكر امكان وقوف الثقيل فی الهواء بلاعماد واما الارض فقالوا انماوقفت لانها بطبعها طالبة للمركز فلاجرم وقفت فی المركز ودليلنا علی فساد قولهم انه سبحانه قادر علی كل الممكنات ووقوف الثقيل فی الهواء من الممكنات فوجب ان يكون الله قادرا عليه "

(كبير)

بعض ملحدین (بے دینوں) نے انکار کیا ہے کہ طور کو اٹھا کر فضا میں روکے رکھنا ممکن نہیں۔ کیونکہ ثقیل (بھاری) چیز کا ہوا (فضاء) میں بغیر کسی ستون کے ٹھہرنا ممکن نہیں۔ لیکن زمین کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ وہ طبعی طور پر مرکز کو طلب کرتی ہے اس لئے اس کا مرکز میں کھڑا ہونا ممکن ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ان کا مذہب باطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام ممکنات پر قادر ہے، اس لئے ثقیل چیز کو فضاء میں معلق رکھنا اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوئی بعید نہیں۔

اعتراض: " اظلال الجبل غير جائز لان ذلك لو وقع لكان يجری مجری الا لجاء الی الايمان وهو ينافی التكليف"

طور کو اٹھا کر ان کے سروں پر سائبان کی طرح معلق رکھنا شرعاً بھی ناجائز ہے کیونکہ اس سے تو ایمان پر جبر (زبردستی حکم منوانا) ثابت ہوگا، یہ انسان کو مکلّف بنانے کے منافی ہے کیونکہ کسی کو حکم اسی وقت دیا جاسکتا ہے جب کہ اس کا اختیار باقی ہو، خصوصاً رب تعالیٰ کا ارشاد اس پر دلالت کر رہا ہے:

﴿ لَا اِكْرَاهَ فِی الدِّيْنِ ﴾ دین میں جبر نہیں۔

جواب: اجاب القاضی بانه لا يلجئ لان اكثر ما فيه خوف السقوط عليهم فاذا استمرفی مكانه مدة وقد شاهدوا السموات مرفوعة فوقهم بلا عماد جاز ههنا ان يزول عنهم الخوف فيزول الا لجاء ويبقی التكليف "

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے اس کا جواب یہ دیا کہ ان سے جبراً ایمان لانے کا مطالبہ نہیں تھا۔ جب

ان پر پہاڑ کو اٹھا کر بلند کیا تو ابتدائی طور پر انکو خوف ہوا، لیکن جب پہاڑ زیادہ دیر فضاء میں معلق رہا تو ان کو سمجھ آ گیا کہ پہاڑ ہم پر نہیں گرے گا، کیونکہ یہ تو آسمانوں کی طرح ہم پر بلند ہوا ہے جس طرح آسمان ہم پر نہیں گرتے ایسے ہی طور بھی نہیں گرے گا، البتہ ان کو اللہ تعالیٰ کی قدرت اور موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کا علم حاصل ہو گیا۔ ان سے خوف جاتا رہا انہوں نے ایمان اپنے اختیار سے قبول کیا۔ (از کبیر)

﴿ خُذُوا مَا اٰتَیْنٰکُمْ بِقُوَّةٍ ﴾: ''جو ہم نے تمہیں دیا اسے مضبوطی سے پکڑو''

﴿ بِقُوَّةٍ ﴾ ای بجد وعزیمة کاملة وعدول عن التغافل والتکاسل''
یعنی بڑی کوشش اور پختہ اور کامل ارادہ سے اس پر عمل کرو اسے تسلیم کرو جو ہم نے تمہیں عطا کیا ہے اس میں کسی قسم کی غفلت اور سستی کا مظاہرہ نہ کرو۔ (کبیر)

﴿ بِقُوَّةٍ ﴾ وقیل بنیة واخلاص '' جو ہم نے تمہیں عطا کیا ہے وہ خالص نیت سے حاصل کرلو۔

﴿ بِقُوَّةٍ ﴾ القوة العمل بما فیه '' جو ہم نے تمہیں عطا کیا ہے اس پر مضبوطی سے عمل کرو۔

'' وقیل بقوة بکثرة درس '' جو ہم نے تمہیں (کتاب) عطا کی ہے اسے زیادہ سے زیادہ پڑھو تا کہ زیادہ پڑھنے سے تمہارے دلوں پر زیادہ اثر انداز ہو۔ (از قرطبی)

﴿ وَاذْکُرُوْا مَا فِیْهِ ﴾: (اور یاد کرو جو اس میں ہے) ای تدبروه واحفظوا اوامره ووعیده ولا تنسوه ولا تضیعوه'' یعنی یاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو کتاب میں ہے اس میں تدبر کرو اس کے اوامر (احکام) اور وعید (یعنی عذاب کا خوف دلانا) کو یاد کرو، ان کو نہ بھولو، اور ان پر عمل کرو ان کو ضائع نہ کرو۔ (از قرطبی)

'' قلت هذا هو المقصود من الکتب العمل بمقتضاها لا تلاوتها باللسان وترتیلها''

کتب پر عمل کرنا ہی مقصد عظیم، صرف تلاوت کرنا، خوبصورت انداز پر ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا مقصود نہیں۔ اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے یہود کی مذمت فرمائی جب انہوں نے کتب پر عمل چھوڑ دیا، رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ ﴾

اہل کتاب میں سے ایک فریق نے کتاب کو پس پشت ڈال دیا۔

☆ نسائی نے حضرت ابوسعید خدری ﷛ سے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" ان من شر الناس رجلا فاسقا یقرأ القرآن لا یرعوی الی شئی منه "

بیشک لوگوں میں سے شر وہ فاسق شخص ہے جو قرآن پڑھتا ہو لیکن اس پر عمل نہ کرتا ہو

﴿لغوی ترجمه﴾ اس کی کسی چیز کی حفاظت نہ کرتا ہو)

" فبین ان المقصود العمل کما بینا " واضح ہوا کہ بیشک مقصد عمل کرنا ہی جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے۔

☆ " وقال مالک قد یقرء القرآن من لا خیر فیه " امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں بعض اوقات قرآن وہ شخص بھی پڑھتا ہے جس میں کوئی بھلائی کا کام نہیں ہوتا۔

عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جب ہم سے پہلے لوگوں یعنی یہود و نصاری کو حکم دیا گیا ہے کہ تم قرآن پاک پر عمل کرو تمہارے دین اب منسوخ ہو چکے ہیں لہذا اپنے اپنے دین چھوڑ دو تو یقیناً ہمارے لئے بھی ضروری ہے کہ ہم قرآن پاک کے مطابق عمل کریں۔

" قال اللہ تعالیٰ ﴿ وَاتَّبِعُوْا اَحْسَنَ مَا اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ ﴾ فامرنا باتباع کتابه ولاعمل بمقتضاه لکن ترکنا ذلک کما ترکت الیهود والنصاری "

رب تعالیٰ نے قرآن پاک کی تابعداری کا حکم دیا اور قرآن پاک کے تقاضا کے مطابق عمل کرنے کا حکم دیا۔ لیکن ہم نے اسے اس طرح چھوڑ دیا جیسا کہ یہود و نصاری نے چھوڑ دیا۔

اب کتب پڑھنے والے، قرآن پڑھنے والے بہت افراد ملیں گے لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ ان پر جہالت کا غلبہ ہے وہ ریاست کے طلبگار ہیں اور خواہشات کو چاہنے والے ہیں۔

☆ ترمذی نے جبیر بن نفیر سے روایت کیا اور انہوں نے ابوالدرداء ﷛ سے وہ فرماتے ہیں:

" کنا مع النبی ﷺ فشخص ببصره الی السماء ثم قال هذا اوان یختلس فیه العلم من الناس حتی لا یقدر وامنه علی شئی ، فقال زیاد بن لبید الانصاری ، کیف یختلس منا وقد قرأنا القرآن ، فواللہ لنقرأنه ولنقرأنه نساء نا وابناء نا فقال ثقلتک امک یازیاد ان کنت لا

عدک من فقهاء المدینة هذه التوراة والانجیل عند الیهود والنصاری فما ذا تغنی عنهم"

ایک مرتبہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے، آپ نے اپنی نظر کو آسمانوں پر ٹکایا، پھر فرمایا یہ وقت (جو میں دیکھ رہا ہوں، ایسا وقت ہوگا) جس میں لوگوں سے علم چھین لیا جائے گا یہاں تک کہ وہ اس پر قادر نہیں ہوں گے، تو زیاد بن لبید انصاری نے کہا، ہم سے کیسے علم کو چھین لیا جائے گا، حالانکہ ہم نے قرآن پڑھا ہے، قسم ہے اللہ تعالٰی کی ہم ضرور بضرور قرآن پڑھتے رہیں گے۔ اور ضرور بضرور اپنی بیبیوں اور اپنی اولاد کو قرآن پڑھاتے رہیں گے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے زیاد تمہاری ماں تمہیں پیٹے میں تو تمہیں مدینہ طیبہ کے فقہاء میں سے سمجھتا تھا، (کیا تمہیں معلوم نہیں) یہ توراۃ اور انجیل یہود و نصاری کے پاس ہیں (وہ پڑھ بھی رہے ہیں) لیکن انہیں ان سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو رہا۔

حدیث پاک کا مطلب واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ قرآن پاک پڑھنے والے لوگ تو ہوں گے اس پر عمل کرنے والے کم ہوں گے، گویا کہ علم اٹھ جائے گا، جس طرح یہود و نصاری میں توراۃ و انجیل پڑھنے والے تو بہت ہیں، لیکن اس پر عمل کرنے والے نہیں، تو وہ جاہل ہی ہیں ان کو اصحاب علم نہیں کہا جا سکتا، یقینی بات ہے کہ اگر وہ اپنی کتب پر عمل کرتے تو نبی کریم ﷺ پر ایمان بھی لاتے۔

☆ "وفی الموطأ عن عبد الله بن مسعود قال لانسان انک فی زمان کثیر فقهاؤه، قلیل قراؤه، تحفظ فیه حدود القرآن وتضیع حروفه، قلیل من یسأل، کثیر من یعطی، یطیلون الصلوة ویقصرون فیه الخطبة، یبدء ون فیه اعمالهم قبل اهوائهم، وسیأتی علی الناس زمان قلیل فقهاؤه، کثیر قراؤه، تحفظ فیه القرآن، وتضیع حدوده، کثیر من یسأل، قلیل من یعطی، یطیلون فیه الخطبة، ویقصرون الصلوة، یبدء ون فیه اهوائهم قبل اعمالهم"

مؤطا میں حضرت عبداللہ بن مسعود ﷜ سے روایت مذکور ہے، آپ نے ایک شخص کو فرمایا بیشک تم ایسے زمانہ میں موجود ہو جس میں فقہاء کثیر تعداد میں ہیں۔ قراء (قرآن کو سنوار سنوار کر پڑھنے والے)

قلیل تعداد میں ہیں۔اس دور میں قرآن پاک کی حدود کی حفاظت کی جاتی ہے (یعنی قرآن پاک کے مطابق عمل ہو رہا ہے) اور حروف ضائع ہو رہے ہیں۔ (یعنی قرآن پاک کم پڑھا جاتا ہے، اور تجوید کا لحاظ بھی کم کیا جاتا ہے) سوال کرنے والے قلیل ہیں اور دینے والے کثیر ہیں۔نمازیں لمبی پڑھنے والے موجود ہیں، اور تقریریں چھوٹی کرتے ہیں۔وہ اعمال کا لحاظ پہلے کرتے ہیں، خواہشات کا لحاظ بعد میں۔ لوگوں پر ایک زمانہ آنے والا ہے، جس میں فقہاء (دین کو سمجھنے والے) کم ہو جائیں گے، اور قراء کثیر ہو جائیں گے (یعنی خوش آوازی سے طرز لگا کر قرآن پڑھنے والے بہت مل جائیں گے) قرآن کی حفاظت کی جائے گی (یعنی پڑھنے کی کثرت اور لفاظی کی طرف توجہ زیادہ ہوگی) لیکن قرآن پاک کی حدود کو ضائع کر دیا جائے گا (یعنی عمل اٹھ جائے گا) سوال کرنے والے کثیر ہوں گے، دینے والے کم ہونگے، تقریریں لمبی ہوں گی، نمازیں چھوٹی ہوں گے۔اپنی خواہشات کو وہ اپنے اعمال پر مقدم کریں گے۔

ایک روایت میں ہے:

" یبتغون اهوائهم ویتركون العمل بالذی افترض علیهم "

وہ اپنی خواہشات کی تابعداری کریں گے اور فرض اعمال کو چھوڑ دیں گے۔ (قرطبی)

﴿ **لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ** ﴾ : (تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ) تقریباً مفہوم واضح ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو ہم نے تمہیں عطا کیا اسے مضبوطی سے پکڑو، یعنی اس پر کامل طور پر عمل کرو، اور جو اس میں ہے اسے یاد کرو، یعنی اسے پڑھو، اس میں تدبر کرو اور اس پر عمل کرو، ان تمام ہدایات کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس میں تمہارا ہی بھلا ہے، یعنی وجہ یہ ہے کہ تم پرہیزگار ہو جاؤ۔

☆☆☆☆☆

﴿ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾

۱) ''پھر اس کے بعد تم پھر گئے، تو اگر اللہ کا فضل اور اسکی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم ٹوٹے والوں میں ہو جاتے''

۲) ''پھر تم پھر گئے اس کے بعد، تو اگر نہ ہوتا اللہ تعالیٰ کا فضل تم پر، اور اسی کی رحمت، تم ہو جاتے خسارہ پانے والوں میں سے''

مختصر وضاحت: بنی اسرائیل نے اس وعدہ کو بھی توڑ دیا تھا اسی لئے رب تعالیٰ نے فرمایا تم اسکے بعد پھر گئے لیکن اللہ تعالیٰ نے پھر ان کو اپنے فضل و کرم اور اپنی رحمت سے توبہ کی توفیق دی، اسی لئے رب تعالیٰ نے فرمایا، اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحمت نہ ہوتی تو تم نقصان اٹھانے والوں میں ہوتے۔

قدرے وضاحت:

﴿ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ ﴾ : اعرضتم عن الوفاء بالميثاق بعد اخذه "(بیضاوی)

یعنی وعدہ کرنے کے بعد تم اس کی وفا نہ کر سکے، بلکہ تم نے اس سے اعراض کیا۔

﴿ تَوَلَّيْتُمْ ﴾ ماخوذ ہے " التولی " سے جس کا معنی ہے اجسام کا کسی چیز سے پیٹھ پھیرنا، پھر مجازی طور پر افعال اور اعتقادات سے اعراض کرنے پر بھی " التولی " کا اطلاق پایا جاتا ہے۔ بیشک ہم اجمالی طور پر جانتے ہیں کہ بنی اسرائیل نے توراۃ کو طور کے اٹھائے جانے کے بعد قبول کر کے اس پر عمل کرنے سے اعراض کر لیا۔ بلکہ توراۃ میں تحریف کر دی، انبیاء کرام کو شہید کیا، اور انبیاء کرام کا انکار کر کے کفر کیا، اور میدان تیہ میں موسیٰ علیہ السلام کے عجیب معجزات دیکھنے کے باوجود انکی مخالفت کرتے رہے۔ اور ہر اذیت والا کام کرتے رہے، اپنے لشکر میں کھلے اور واضح گناہ کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ:

" حتی خسف ببعضهم واحرقت النار بعضهم وعوقبوا بالطاعون "

بعض لوگوں کو ان میں سے زمین پر دھنسا دیا گیا اور بعض کو آگ نے جلا دیا، اور بعض کو

طاعون کی مرض سے عذاب دیا گیا۔

قرآن پاک میں ان کے اعراض کرنے کی اگرچہ تفصیل مذکور نہیں ، لیکن جو وجوہ ہم نے ذکر کی ہیں وہ تواریخ میں موجود ہیں۔ (بلکہ زیادہ ان میں سے قرآن پاک میں مذکور ہیں اگرچہ واضح طور پر یہ نہیں بیان کیا گیا کہ یہ وجوہ ہیں ان کے اعراض کرنے کے)۔ (از شیخ زادہ)

﴿ فَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۞ ﴾:

" الفضل التوفيق للتوبة والرحمة قبولها "

فضل کا مطلب ہے توبہ کی توفیق دینا ، اور رحمت کا مطلب ہے اس کی عطا کردہ توبہ کی توفیق کو قبول کرنا ، اسی معنی کے لحاظ پر مطلب یہ ہو گیا کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہیں توبہ کی توفیق نہ عطا کرتا اور اس توبہ کے قبول کرنے کی رحمت تم پر نہ فرماتا تو نقصان اٹھانے والوں میں ہوتے ۔ لیکن اس نے اپنے فضل اور رحمت کے ذریعے تمہیں اس نقصان سے بچا لیا۔

" او الفضل والرحمة بعثة رسول الله ﷺ وادراكهم لمدته "

یا فضل اور رحمت سے مراد نبی کریم ﷺ کی بعثت اور بنی اسرائیل کا آپ کے زمانہ کو پالینا۔

یعنی خطاب نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے لوگوں کو ہے اب مطلب یہ ہو گا کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے محبوب ﷺ کو نہ مبعوث کرتا اور تمہیں ان کا زمانہ عطا نہ فرماتا تو تم خسارہ اٹھانے والوں میں ہوتے ۔ لیکن اس نے اپنے محبوب ﷺ کو تم میں مبعوث کر کے اور تمہیں ان کا زمانہ عطا کر کے نقصان سے بچا لیا۔

(روح المعانی)

نبی کریم ﷺ کی وجہ سے ان کو نقصان سے کیسے بچا لیا گیا؟

" ويمكن ان يراد ﴿ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ﴾ بعثة محمد ﷺ حيث جعله رحمة للعالمين فبوجوده ﷺ امهل الكفار واخر عنهم العذاب ورفع عنهم الخسف والمسخ "

یعنی اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو مبعوث فرمایا ، آپ کو رحمۃ للعالمین بنایا ، اور آپ کے وجود مسعود سے کفار کو مہلت دی ، اور ان سے عذاب کو مؤخر کر دیا ، اور ان کو زمین میں دھنسا دینے والے عذاب اور ان کی شکلیں بگاڑ دینے والے عذاب سے بچا لیا۔

اب مفہوم واضح ہو گیا کہ اگر اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ کو سب جہانوں کے لئے رحمت بنا کر مبعوث نہ فرماتا، اور کفار میں ان کو موجود نہ فرماتا تو وہ بہت سخت عذاب میں مبتلا ہو کر تباہ و برباد ہو جاتے۔

(از مظہری)

﴿ خُسْرَانٌ ﴾ کا معنی رأس المال (اصل سرمایہ پونجی) کا ضائع ہو جانا یا اس میں کمی آ جانا۔

" والمراد لكنتم مغبونين هالكين بالانهماك في المعاصي "

مراد اس سے یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم گناہوں میں مکمل طور پر پھنس کر برباد ہو جاتے۔

" او بالخبط في مهاوي الضلال عند الفترة " یا مراد یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل تم پر نہ ہوتا اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم ابتدائی فترت میں ہی گمراہی کے گڑھے میں گر کر تباہ و برباد ہو جاتے۔

(از روح المعانی)

﴿ لَكُنْتُمْ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ المغبونين المعذبين في الحال كما كنتم معذبين الهالكين بوقوع الطور لو لم تقبلوا حكم الله حينئذ "

اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحمت نہ ہوتی تو تم عذاب میں ایسے مبتلاء ہوتے اور عذاب کی وجہ سے برباد ہو جاتے جیسا کہ تم طور پر جا کر ہلاک ہو گئے تھے، اگر اللہ تعالیٰ اس وقت تم پر رحم نہ فرماتا تو تم برباد ہی رہتے۔

(از مظہری)

☆☆☆☆☆

﴿ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ﴾

۱) ''اور بے شک ضرور تمہیں معلوم ہے تم میں کے جنہوں نے ہفتہ میں سرکشی کی، تو ہم نے ان سے فرمایا ہو جاؤ بندر دھتکارے ہوئے''

۲) ''اور تحقیق تم جانتے ہو ان لوگوں کو جنہوں نے تجاوز کیا ہے تم میں سے ہفتہ کے دن میں تو ہم نے کہا انہیں ہو جاؤ بندر ذلیل وخوار''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی کہ یہ واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں در پیش ہوا۔ یہ لوگ مدینہ طیبہ اور شام کے درمیان دریا کے کنارے پر واقع بستی ایلہ میں مقیم تھے۔ یہود کو ہفتہ کے دن شکار سے منع کیا گیا تھا، کیونکہ ہفتہ کا دن ان کے لئے معظم تھا۔ جیسا کہ عیسائیوں کے لئے اتوار کا دن اور مسلمانوں کے لئے جمعہ کا دن معظم ہے۔

سال کے ایک مہینہ میں اس دریا میں اتنی مچھلیاں ہوتیں کہ پانی کی اوپر کی سطح مچھلیوں سے ڈھانپ دی جاتی یہود کی آزمائش کے لئے ہفتہ کے دن بھی اتنی مچھلیاں ہی دریا میں جمع ہو جاتیں۔ لیکن آگے پیچھے اور دنوں میں مچھلیاں بہت ہی کم مقدار میں ہوتیں۔ زیادہ پانی کی گہرائی میں چلی جاتیں۔ سورۃ اعراف میں اسی واقعہ کو ان الفاظ مبارکہ سے ذکر فرمایا:

﴿ وَاسْأَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ إِذْ يَعْدُونَ فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِيتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَيَوْمَ لَا يَسْبِتُونَ لَا تَأْتِيهِمْ كَذَٰلِكَ نَبْلُوهُم بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴾

''اور ان سے حال پوچھو اس بستی کا کہ دریا کے کنارے تھے جب وہ ہفتہ کے دن کے بارے میں حد سے تجاوز کرنے لگے جب ہفتہ کے دن ان کے سامنے مچھلیاں پانی پر تیرتیں ان کے سامنے آتیں اور جو دن ہفتے کا نہ ہوتا نہ آتیں اس طرح ہم انہیں آزماتے تھے اس وجہ سے کہ وہ فسق کرتے تھے''

جب ہفتہ کے دن ان کے سامنے مچھلیاں آتیں اور اپنی اپنی دم کو پانی سے باہر نکالتیں تو ان کے دل للچانے لگے کہ ہم کس طرح شکار کریں ادھر ہفتہ کا دن، رب تعالیٰ کی طرف سے شکار کی ممانعت اور

ادھر صرف ہفتہ کے دن ہی مچھلیوں کی کثرت اور ان کا پانی کی سطح پر آنا۔ ابھی یہ لوگ شکار کرنے کو للچا رہے تھے کہ شیطان نے ان کی راہنمائی کی:

" ثم ان الشیطان وسوس الیھم وقال انما نھیتم عن اخذھا یوم السبت ولم تنھوا عن اخذھا فی غیرہ "

یعنی شیطان نے ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا، اور کہا بیشک تمہیں مچھلیوں کے پکڑنے سے منع کیا گیا ہے، لیکن ان کو کسی حیلہ سے پھنسانے سے تو منع نہیں کیا گیا، تو انہوں نے دریا کے کنارے اردگرد بڑے بڑے حوض بنالئے اور نالیوں کے ذریعے ان میں ہفتہ کے دن مچھلیوں کو حوضوں میں بند کر لیتے اور اتوار کو اور اسی طرح بعد کے دنوں میں ضرورت کے مطابق پکڑتے رہتے۔

" وقیل انھم کانوا ینصبون الشخوص والحبائل یوم الجمعۃ ویخرجونھا یوم الاحد "

اور ایک قول یہ ہے (راقم کے نزدیک بعض لوگ یہ حیلہ کرتے تھے اور بعض پہلے والا) کہ وہ لوگ جمعہ کے دن اپنی کنڈیاں اور جال دریا میں ڈال دیتے اور ان کو باہر رسیوں، دھاگوں سے باندھ دیتے، ہفتہ کے دن مچھلیاں ان میں پھنس جاتیں اور اتوار کو وہ نکال لیتے۔

کچھ وقت تک تو یہی طریقہ اختیار کئے رہے، اور عذاب ان پر نازل نہ ہوا تو ان کو جرأت حاصل ہوگئی کہ وہ ہفتہ کے دن بھی شکار کرنے لگ گئے۔ مچھلیاں پکڑنا، اور بھوننا اور خرید و فروخت کرنا ان کا مشغلہ بن گیا۔ اب ان میں تین گروہ بن گئے اس بستی میں رہنے والے ستر ہزار کی تعداد میں تھے۔

" صنف امسک عن الصید ونھی عن الاصطیاد " ایک قسم کے وہ لوگ تھے جو خود بھی شکار نہیں کرتے تھے اور شکار کرنے والوں کو بھی منع کرتے تھے ان کی تعداد بارہ ہزار تھی۔

" وصنف امسک ولم ینہ " اور ایک قسم کے وہ لوگ تھے جو خود تو شکار نہیں کرتے تھے لیکن شکار کرنے والوں کو روکتے نہیں تھے کہ تمام شکار نہ کرو۔

" وصنف انھمکوا فی الذنب وھتکوا الحرمۃ " اور قسم کے لوگ وہ تھے جو گناہوں میں منہمک تھے اور انہوں نے حرمت کے قانون کو توڑ دیا تھا۔

نیک لوگوں نے مجرمین سے کنارہ کشی کر لی:

جو لوگ خود شکار نہیں کر رہے تھے اور شکار کرنے والوں کو منع کر رہے تھے مجرمین نے جب ان نیک لوگوں کی نصیحت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، تو انہوں نے کہا " واللہ لا نساکنکم فی قریة واحدة فقسموا القریة بینهم بجدار " قسم ہے اللہ تعالیٰ کی ہم تمہارے ساتھ ایک بستی میں نہیں ٹھہریں گے انہوں نے اپنے گھروں کو درمیان میں ایک دیوار بنا کر علیحدہ کر لیا۔

اس طرح گویا کہ دو بستیاں بن گئیں ایک مجرمین کی اور ایک نیک لوگوں کی اسی حال میں کچھ عرصہ گزر گیا:" ثم لعنهم داؤد وغضب الله علیهم لا صرارهم علی المعصیة " پھر ان پر داؤد علیہ السلام نے بھی لعنت بھیجی اور اللہ تعالیٰ کا بھی غضب ان پر آ گیا کیونکہ وہ اپنی معصیت پر مصر رہے یعنی اپنے گناہوں پر ڈٹے رہے۔ تو رب تعالیٰ کا عذاب ان پر مسلط ہو گیا۔

جو لوگ ان کو شکار کرنے سے منع کرتے تھے ایک دن جب انہوں نے دیکھا کہ شکار کرنے والے گھروں سے نہیں نکل رہے، اپنی بستی کی دیوار کا انہوں نے دروازہ نہیں کھولا۔ تو ان لوگوں نے دیوار کو پھاند کر جب دیکھا تو یہ بندر بنے ہوئے تھے اپنے دم ہلا رہے تھے۔ (از خازن)

" وقیل صار الشباب قردة والشیوخ خنازیر فمکثوا ثلاثة ایام ثم هلکوا "
بعض حضرات نے کہا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے رب تعالیٰ کے حکم کے خلاف ورزی کی ان میں جوانوں کو بندر بنا دیا گیا۔ اور بوڑھوں کو خنزیر، وہ تین دن تک اسی حال میں رہے پھر ہلاک ہو گئے۔ (خازن)

مختصر لفظی بحث: ﴿ اَلسَّبْتُ ﴾ معروف دن یعنی ہفتہ کا دن۔

" وهو ماخوذ من السبت الذی هو القطع لانه سبت فیه خلق کل شئی وعمله "

یہ ماخوذ ہے اس " سبت " سے جس کا معنی ہے قطع کرنا، چونکہ اس دن میں ہر چیز اور اس کے عمل کو پیدا کرنے سے منقطع کیا گیا ہے اس لئے اسے " اَلسَّبْتُ " کہا گیا ہے۔

" وقیل من السبوت وهو الراحة والدعة " اور بعض حضرات نے کہا کہ یہ سبوت سے

ماخوذ ہے جس کا معنی ہے آرام وسکون۔ جب " السبت " سے مراد ہفتہ کا دن ہو تو حذف مضاف ہوگا ،تقدیر عبارت کی یہ ہوگی " اعتدوا منکم فی حکم السبت " یعنی مراد ہفتہ کے دن کے حکم میں تجاوز کرنا ہے " لان الاعتداء والتجاوزلم یقع فی الیوم بل وقع فی حکمه " اس لئے کہ تجاوز دن میں ،زمان میں نہیں ہوتا بلکہ تجاوز دن کے احکام میں ہوتا۔ (از روح المعانی)

" والسبت مصدرقولک سبتت الیهود اذا عظمت یوم السبت "

ایک مطلب یہ ہے کہ " السبت " مصدر ہے اس میں مراد وہ معنی ہے جو " سبتت الیهود " سے لیا ہوا ہے یہ جملہ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب یہود ہفتہ کے دن کی تعظیم کریں۔ اب اسی معنی کے لحاظ پر معنی یہ ہوگا اور تحقیق تمہیں علم ہے ان لوگوں کا جنہوں نے ہفتہ کے دن کی تعظیم کرنے میں تجاوز کیا۔ اس معنی کے لحاظ پر کوئی حذف مضاف نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ ان پر ہفتہ کے دن کی تعظیم کو واجب قرار دیا گیا تھا کہ وہ اس دن میں اپنی عادات کو چھوڑ دیں۔ اور عبادت میں مشغول رہیں، اور اس دن کی عظمت کا لحاظ رکھیں، جب اس دن کی تعظیم ان پر واجب ہے تو یقیناً اس دن میں تجاوز کرنا اور جرائم ان پر حرام ہیں۔ (از بیضاوی وشیخ زادہ)

یہود نے ہر موقع پر نبی کی مخالفت کی: موسیٰ علیہ السلام کے دل میں خواہش تھی کہ عبادت کا دن جمعہ کا منتخب ہو لیکن یہود نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کی وہ کہنے لگے کہ نہیں ہفتہ کا دن ہونا چاہئے۔ انہوں نے کہا:

" فانه تعالیٰ ابتدا خلق العالم فی یوم الاحد واتمه یوم الجمعة فلم یکن یوم السبت یوم العمل فتمحض فیه العبادة " (شیخ زادہ)

کہ اللہ تعالیٰ نے جہان کے پیدا کرنے کی ابتداء اتوار کے دن کی اور جمعہ کے دن اسے مکمل کر دیا ہفتہ کے دن کوئی عمل نہیں پایا گیا (عمل اور تخلیق سے منقطع ہونے کی وجہ سے ہی وہ سبت بنا) اسلئے وہ ہی عبادت کا دن ہونا چاہئے۔

موسیٰ علیہ السلام نے ان کی خواہش کے مطابق ہی دعا کر دی رب تعالیٰ نے ان کے لئے ہفتہ کا دن ہی معظم قرار دے دیا۔

راقم کے نزدیک ان کو اللہ کے نبی کی مخالفت کی وجہ سے شیطان کے جال میں پھنسنا پڑا، اسی کے وسوسہ سے انہوں نے شکار کرنے کے لئے مکروفریب کے حیلے تراشے، آخرکار بندر بنا دیئے گئے۔ سبحان اللہ نبی کی تعظیم کرنے والے بھی معظم بن گئے، قوم کے امام بن گئے، حیات جاوادنی حاصل کر گئے لیکن نبی کے گستاخ بندر اور خنزیر بنا دیئے گئے۔

﴿ قِرَدَةً ﴾ : جمع قرد، جس کا معنی مشہور و معروف ہے یعنی "بندر"، خاسئین، الخسو، الصغار والذلة " یعنی خاسئین کا معنی ذلیل وحقیر ہونا یہ لازم بھی استعمال ہوتا ہے اور متعدی بھی "وبعضهم ذكر الطرد عند تفسير الخسو كالابعاد " اور بعض حضرات نے اس کا معنی ہانکنا، دھتکارنا کیا ہے یعنی جس طرح کسی کو اپنے آپ سے دور کر دیا جائے۔

خیال رہے کہ " خاسئی " کا ظاہر طور پر معنی فاعل والا ہے، لیکن یہاں مراد مفعول والا معنی ہے، " الخاسئی الصاغر المبعد المطرود " اس لئے خاسئی کا معنی ذلیل، دور کیا ہوا اور دھتکارا ہوا۔ اعلیٰ حضرت اور علامہ کاظمی رحمہ اللہ نے "دھتکارے ہوئے" ترجمہ کیا ہے اور حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ نے پھٹکارے ہوئے ترجمہ کیا ہے۔ راقم نے طلباء کے فائدہ کے لئے کہ ان کو دوسرا معنی بھی ذہن نشین ہو جائے ترجمہ کیا ہے "ذلیل وخوار"

ہفتہ کے دن مچھلیوں کے زیادہ آنے کی وجہ:

یعنی اللہ تعالیٰ نے جب ان کو ہفتہ کی تعظیم کرنے کا حکم دیا اور شکار کرنے سے منع کیا تو ہفتہ کے دن مچھلیوں کے دریا میں زیادہ بھیجنے میں حکمت کیا تھی " وهل هذا الا اثارة الفتنة وارادة الاضلال " اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان کو آزمانا مقصود تھی کیونکہ سورۃ اعراف میں رب تعالیٰ نے واضح طور پر بیان فرمایا: ﴿ كَذٰلِكَ نَبْلُوْهُمْ ﴾ ہم اسی طرح ان کو آزماتے ہیں، جب وہ آزمائش میں ناکام ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو فتنہ میں مبتلا کر دیا اور گمراہ کر دیا۔

فائدہ عظیمہ : یہود امتحان میں ناکام ہو کر ذلیل وخوار ہوئے لیکن مصطفیٰ کریم ﷺ کے صحابہ کرام کی عظمت تو دیکھو کہ وہ آزمائش میں کس طرح کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

☆ "عن ابی قتادة انه خرج مع رسول الله ﷺ فتخلف مع بعض اصحابه وهم محرمون وهو غير محرم فرأوا حمارا وحشيا قبل ان يراه فلما رأوه تركوه حتى رآه ابوقتادة فركب فرساله فسألهم ان يناولوه سوطه فابوا فتناوله فحمل عليه فعقره ثم اكل فاكلوا فندموا فلما ادركو رسول الله ﷺ سألوه قال هل معكم منه شئی قالوا معنا رجله فاخذها النبی ﷺ فاكلها (متفق عليه) وفی رواية لهما فلما اتوا رسول الله ﷺ قال امنكم احد امره ان يحمل عليها او اشار اليها قالوا لا قال فكلوا ما بقى من لحمها "

(مشكوة باب المحرم يجتنب الصيد

حضرت ابوقتادہ ﷺ فرماتے ہیں وہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ (سفر میں) نکلے کچھ ساتھیوں کے ساتھ آپ سے پیچھے رہ گئے دوسرے ساتھی ان کے محرم (احرام میں) تھے اوران کا احرام نہیں تھا۔ ان کے دیکھنے سے پہلے دوسرے احرام والے ساتھیوں نے حمار وحشی کو دیکھا۔ (لیکن وہ احرام میں تھے، ان پر خشکی کے جانوروں کا شکار منع قرار دیا گیا تھا اس لئے) انہوں نے شکار کو دیکھا (اس کے درپے نہ ہوئے) اسے چھوڑ دیا۔ ابوقتادہ (چونکہ احرام میں نہیں تھے) نے جب اسے دیکھا تو وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے دوسرے صحابہ کرام کو کہا کہ مجھے کوڑا پکڑا دیں لیکن انہوں نے ان کو کوڑا دینے سے انکار کردیا۔ انہوں نے خود ہی کوڑا پکڑا اور حمار وحشی پر حملہ کیا اس کی کوچیں کاٹ دیں پھر انہوں نے (اس کا گوشت) کھایا اور دوسرے صحابہ کرام نے بھی کھایا (وہ کھانے پر) نادم ہوگئے۔ جب وہ نبی کریم ﷺ کو ملے، تو آپ سے صحابہ کرام نے پوچھا، آپ نے فرمایا کیا تمہارے پاس اس گوشت میں سے کچھ ہے؟ انہوں نے عرض کیا ہاں ٹانگ کا کچھ حصہ ہے نبی کریم ﷺ نے وہ گوشت لیا اور کھایا۔ (بخاری ومسلم)

بخاری اور مسلم کی ہی ایک روایت یہ ہے کہ جب صحابہ کرام نبی کریم ﷺ کے پاس آئے (ان کے پوچھنے پر) آپ نے فرمایا کیا تم میں سے کسی ایک نے ابوقتادہ کو حمار وحشی پر حملہ کرنے کا حکم دیا تھا یا اس کی طرف اشارہ کیا تھا؟ انہوں نے عرض کیا نہیں، تو آپ نے فرمایا جو گوشت تمہارے پاس بچا ہوا وہ بھی کھالو۔

حدیث پاک سے حاصل ہوا: صحابہ کرام کو احرام کی حالت میں خشکی کے جانوروں کو شکار کرنے سے منع کیا گیا تھا، یہ منع کرنا ان کی آزمائش تھی، لیکن وہ اس میں پورے اترے، شکار ان کے

سامنے تھا، وہ شکار کر سکتے تھے، لیکن انہوں نے نہ شکار کیا، نہ ہی ان کا دل للچایا، نہ ہی انہوں نے شکار کرنے کے لئے کوئی فریب اور دھوکا کا حیلہ کیا۔ بلکہ ابوقتادہ جو احرام میں نہیں تھے ان کو شکار کرنے کے لئے کوڑا بھی نہیں پکڑایا۔ وہ خود ہی سواری سے اترے اور انہوں نے کوڑا پکڑا اور شکار کیا۔

صحابہ کرام نے اپنے ذہنوں سے سوچتے ہوئے کہ یہ شکار اس شخص نے کیا ہے جس کا احرام نہیں۔ لہٰذا ہمیں گوشت کھا لینا جائز ہے۔ لیکن گوشت کھانے کے بعد پھر پشیمانی ہوئی کہ ہمیں پہلے نبی کریم ﷺ سے پوچھنا چاہئے تھا۔ نبی کریم ﷺ نے بھی ان سے پوچھ لیا کیا تم نے شکار کرنے کو کہا تو نہیں تھا، کیا تم نے شکار کی طرف اشارہ تو نہیں کیا تھا؟ جب صحابہ کرام نے عرض کیا نہیں یا رسول اللہ، تو آپ نے ان کو بقیہ گوشت بھی کھانے کی اجازت دی، اور ساتھ ہی ان سے گوشت لے کر خود بھی کھایا۔ تاکہ صحابہ کرام کامل طور پر مطمئن ہو جائیں کہ انہوں نے گوشت کھا کر کوئی غلطی نہیں کی۔

سبحان اللہ کیا ہی خوب شان ہے نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام کی جو آزمائش میں پورے اترے، اور اپنے عمل سے امت مصطفیٰ ﷺ کی برتری پر روز روشن کی طرح دلیل قائم کر دی۔

اس واقعہ کے ذکر کرنے کا مقصد: بنی اسرائیل کا اللہ تعالیٰ کے حکم سے عدول کرنا اور بندر بننے کے واقعہ کو ذکر کرنے میں دو مقصد ہیں۔ ایک یہ کہ نبی کریم ﷺ کے معجزہ کو ظاہر کرنا مقصود تھا، کیونکہ جب آپ نے اپنے زمانہ کے یہود کو خطاب کرتے ہوئے رب تعالیٰ کا ارشاد سنایا:

﴿ وَلَقَدۡ عَلِمۡتُمُ ﴾ "تحقیق تمہیں علم ہے"

اسی سے آپ کے سچے نبی ہونے کا پتہ چل گیا، کہ وحی کے بغیر آپ کو یہ کہنا ممکن ہی نہیں تھا کیونکہ اس وقت کے تمام یہود و نصاریٰ اور مشرکین جانتے تھے کہ آپ نے کسی استاذ سے کچھ نہیں پڑھا، آپ نے کبھی لکھنا سیکھا نہیں۔ آپ کبھی لوگوں کی مجلسوں میں شریک نہیں ہوئے، پھر بنی اسرائیل کے واقعات کو تفصیل سے بیان کرنا صرف اسی وقت ممکن تھا جب آپ کو نبوت حاصل ہو اور آپ کی طرف وحی آتی ہو۔

اس واقعہ کو بیان کرنے میں دوسرا مقصد یہ تھا کہ آپ نے اپنے زمانہ کے یہود کو اس پر متنبہ کیا کہ جب تمہارے آباء واجداد کو ہفتہ کے دن کی بے حرمتی اور رب تعالیٰ کی حکم سے عدولی کی وجہ سے بندر

بنا کر ذلیل وخوار کر دیا گیا:

" اما تخافون ان ینزل علیکم بسبب تمردکم مانزل علیهم من العذاب فلا تغتروا بالامهال المدودلکم "

تو تم کیوں نہیں ڈرتے کہ تمہاری سرکشی کی وجہ سے تم پر بھی عذاب نازل ہو جائے، تمہیں جو زیادہ دیر کیلئے مہلت دی جاتی ہے اس سے تم اس دھوکہ میں مبتلاء نہ ہو کہ تمہیں عذاب دیا ہی نہیں جاتا۔

اسی پر رب تعالیٰ کا ایک اور ارشاد گرامی واضح طور پر دلالت کر رہا ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴾

اے کتاب والو! ایمان لاؤ اس پر جو ہم نے اتارا تمہارے ساتھ والی کتاب کی تصدیق فرماتا قبل اس کے کہ ہم بگاڑیں کچھ چہروں کو تو انہیں پھیر دیں ان کی پیٹھ کی طرف یا انہیں لعنت کریں جیسی لعنت کی ہفتہ والوں پر، اور خدا کا حکم ہو کر رہے گا۔ (ماخوذ از کبیر)

اعتراض : ان کو بندر بن جانے کا حکم کیسے دیا گیا ﴿ كُوْنُوْا قِرَدَةً ﴾ "تم بندر بن جاؤ"، فانهم ما کانوا قادرین علی ان یقبلوا انفسهم علی صورة القردة " وہ تو اس پر قادر ہی نہیں تھے کہ اپنے آپکو بندر بنالیں۔

جواب : " ان المراد منه سرعة التکوین کقوله تعالیٰ (انماامرنالشئی اذا اردناه ان نقول له کن فیکون).

اس سے مراد امر دینا مقصود نہیں بلکہ ان کا جلدی ہی بندر بنا دینے کا ذکر ہے۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں کہتے ہیں ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کو عذاب دینا چاہے تو کوئی اس کے عذاب کو روک نہیں سکتا۔ اور نہ ہی اسے کوئی عاجز کر سکتا ہے بلکہ جسے عذاب دینا مقصود ہوتا ہے وہ خود ہی عذاب کو قبول کر لیتا ہے۔ (از کبیر)

کیا وہ حقیقی بندر بن گئے تھے یا تشبیہ ہے؟ اگر چہ بعض حضرات نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ وہ حقیقی بندر نہیں بنائے گئے تھے بلکہ ان کے دلوں پر مہر لگا کر ان کو بندروں کی طرح کر دیا گیا تھا لیکن یہ

قول صحیح نہیں کیونکہ صرف مجاہد کی تفسیر ہے:

" مسخت قلوبهم فقط وردت افهامهم كافهام القردة ولم يقله غيره من المفسرين فيما اعلم والله اعلم " (قرطبی)

کہ ان کے دل مسخ کیے فقط اور ان کی سمجھیں بندروں کی سمجھوں کی طرح ہوگئیں۔ میرے علم کے مطابق اور کسی مفسر نے یہ نہیں کہا۔

" وظاهر القرآن انهم مسخوا قردة على الحقيقة وعلى ذلك جمهور المفسرين وهو الصحيح "

قرآن پاک سے ظاہر طور پر یہی ثابت ہے کہ وہ حقیقی طور پر بندر بنادیئے گئے تھے اسی پر جمہور مفسرین کرام ہیں اور یہی صحیح قول ہے اور یہی معتبر ہے۔ (از روح المعانی)

جن کو بندر بنایا گیا کیا ان کی نسل چلی؟ اس میں ایک قول یہ ہے کہ ان کی نسل چلی، لہٰذا یہ بندر ان کی نسل سے ہی ہیں۔ اسی طرح مسخ ہونے والی قوموں نسل میں خنازیر، گوہ، چوہے وغیرہ آرہے ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ان کی نسل نہیں چلی بلکہ وہ تین دنوں کے بعد مر گئے یہی قول صحیح ہے۔

مسئلہ کی تفصیل ملاحظہ ہو: جن حضرات نے یہ کہا کہ یہ بندر ان کی نسل سے ہیں، وہ دلیل کے طور پر تین حدیثوں کو پیش کرتے ہیں۔

(۱) " عن ابی هريرة قال النبی ﷺ فقدت امة من بنی اسرائيل لا يدری ما فعلت ولا اراها الا الفار الا ترونها اذا وضع لها البان الابل لم تشربه واذا وضع لها البان الشاء شربته "......اخرجه مسلم.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بنی اسرائیل کی ایک جماعت گم ہوگئی ان کے متعلق معلوم نہیں کہ ان سے کیا کیا گیا میں نہیں خیال کرتا سوائے اس کے کہ چوہے وہی ہیں کیا تم دیکھتے نہیں کہ جب ان کے سامنے اونٹوں کا دودھ رکھا جائے تو وہ نہیں پیتے، اور جب ان کے سامنے بکریوں کا دودھ رکھا جائے تو وہ پی لیتے ہیں۔

(۲) " عن ابی سعيد وجابر قال جابر اتی النبی ﷺ بضب فابی ان ياكل منه وقال لا ادری لعله من القرون التی مسخت......اخرجه مسلم."

حضرت ابوسعید اور حضرت جابر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے حضرت جابر کہتے ہیں (الفاظ آپ کی روایت کے ہیں) نبی کریم ﷺ کے پاس گوہ لائے گئی، آپ نے اس کے کھانے سے انکار کر دیا اور فرمایا میں نہیں جانتا شائد یہ ان قوموں سے ہو جن کو مسخ کر دیا گیا۔

(۳) "قال عمرو بن میمون الاودی رأیت فی الجاھلیة قردة قدزنت فرجموھا فرجمتھا معھم" (رواہ البخاری)

حضرت عمرو بن میمون اودی رحمہ اللہ نے فرمایا، میں نے زمانہ جاہلیت میں دیکھا کہ ایک بندر اور بندریا نے زنا کیا تو دوسرے بندروں نے انہیں سنگسار کیا تو میں نے بھی ان کو سنگسار کیا۔

ان احادیث سے ان حضرات نے یہ دلیل پیش کی کہ جن قوموں کو مسخ کیا گیا ان کی نسل سے ہی چوہے اور گوہ اور بندر پائے جاتے ہیں۔

جمہور کے نزدیک نسل نہیں چلی:

"وقال الجمھور الممسوخ لا ینسل وان القردة والخنازیر وغیرھما کانت قبل ذلک والذین مسخھم اللہ قد ھلکوا ولم یبق لھم نسل لانہ قد اصابھم السخط والعذاب فلم یکن لھم قرار فی الدنیا بعد ثلاثة ایام"

جمہور حضرات کا یہی قول ہے کہ جن قوموں کو مسخ کیا گیا ان کی نسل نہیں چلی، بیشک بندر اور خنزیر اور ان کے علاوہ دوسرے جانور پہلے سے چلے آ رہے ہیں، جن کو مسخ کیا گیا وہ ہلاک کئے ان کی کوئی نسل باقی نہیں رہی، بیشک ان کو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور عذاب حاصل ہوا ان کو تین دنوں سے زیادہ دنیا میں قرار حاصل نہیں ہوا۔

یہی قول معتبر اور صحیح ہے معتبر تفاسیر میں جمہور مفسرین کرام نے یہی قول کیا ہے اور اسی کو صحیح قرار دیا گیا ہے۔

پہلے قول والوں کے دلائل کے جوابات:

پہلی جو دو حدیثیں بیان کی گئی ہیں (کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت گم ہو گئی ان کے متعلق معلوم نہیں وہ کہاں ہیں میرا خیال ہے کہ یہ چوہے وہی ہیں۔ اور آپ نے فرمایا مجھے معلوم نہیں ہو سکتا ہے یہ

(گوہ) ان قوموں سے ہو جن کو مسخ کر دیا گیا)۔

" فانما کان ظنا وخوفا لان یکون الضب والفار وغیرهما مما مسخ وکان هذا حد سامنه قبل ان یوحی الیه ان الله لم یجعل للمسخ نسلا "

ان میں نبی کریم ﷺ نے خوف اور اندیشہ سے کلام فرمایا یعنی وہ کلام اس وحی سے پہلے فرمایا جس میں آپ کو اللہ تعالیٰ نے مطلع فرمادیا مسخ ہونے والے جانوروں کی نسل نہیں چلی۔

بات بہت واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ نے شدید خوف الٰہی کے وقت اچانک کلام فرمایا جس میں توجہ صرف رب تعالیٰ کی طرف تھی، اسی لئے رب تعالیٰ نے آپ کو اس حقیقت حال کی طرف متوجہ فرمایا جس کا ذکر آپ نے فرمایا۔

☆ " قال رجل یا رسول الله القردة والخنازیر هی مما مسخ فقال النبی ﷺ ان الله عزوجل لم یهلک قوما او یعذب قوما فیجعل لهم نسلا وان القردة والخنازیر کانوا قبل ذلک...... رواه مسلم کتاب القدر "

ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا یا رسول اللہ کیا یہ بندر اور خنزیر وہی ہیں جن قوموں کو مسخ کر کے بندر اور خنزیر بنائے گئے تھے؟ آپ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کو اس لئے ہلاک نہیں کیا یا اس لئے عذاب نہیں دیا کہ ان کی نسل چلائی جائے بندر اور خنزیر پہلے بھی موجود تھے۔

☆ " قال ابن عباس لم یعش مسخ قط فوق ثلاثة ایام ولم یاکل ولم یشرب ولم ینسل "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جن قوموں کو مسخ کیا وہ تین دنوں سے زیادہ بالکل زندہ نہیں رہے اور نہ ہی انہوں نے کھایا اور نہ ہی پیا اور نہ ہی ان کی نسل چلی۔

☆ " قال ابن عطیة وروی عن النبی ﷺ وثبت ان الممسوخ لا ینسل ولا یاکل ولا یشرب ولا یعیش اکثر من ثلاثة ایام "

ابن عطیہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی یہ ہے کہ یہ ثابت شدہ بات ہے کہ جن قوموں کو مسخ کیا گیا ان کی نسل نہیں چلی، اور نہ انہوں نے کچھ کھایا اور نہ پیا اور نہ ہی تینوں دنوں سے وہ زیادہ زندہ رہے۔

تیسری حدیث کا جواب:

" کذا حکی ابو مسعود ولم یذکر فی ای موضع اخرجه البخاری من کتابه فبحثنا عن ذلک فوجدنا فی بعض النسخ لا فی کلها "

اسی طرح ابو مسعود نے حکایت بیان کی لیکن یہ نہیں ذکر کیا کہ بخاری نے کس مقام میں اپنی کتاب میں اس حدیث کو بیان کیا ہے جب ہم چھانٹ بینٹ کی تو بخاری کے بعض نسخوں میں یہ حدیث ملی، تمام نسخوں میں یہ حدیث نہ مل سکی۔

واضح ہوا کہ یہ حدیث قابل حجت نہیں، اس لئے کہ جب بخاری کے تمام نسخوں میں اتفاقی طور پر حدیث نہیں تو جن نسخوں میں ہے ان میں غلطی کا بھی احتمال ہو سکتا ہے۔

دوسرا جواب:

" فذکر فی کتاب ایام الجاهلیة یعنی ان عمرو بن میمون قد ادرک الجاهلیة ولم یبالی بظنه الذی ظنه فی الجاهلیة "

عمرو بن میمون نے زمانہ جاہلیت کا ذکر کیا اور انہوں نے زمانہ جاہلیت میں اپنے گمان کا ذکر کیا زمانہ جاہلیت میں گمان کا کوئی اعتبار نہیں کہ اس سے احکام ثابت کیے جائیں۔

بخاری کے بعض نسخوں میں بھی اسے نقل کیا گیا ہے اس سے احکام ثابت نہیں کیے۔ خیال رہے کہ زمانہ جاہلیت سے مراد نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے کا زمانہ اس حدیث میں مراد نہیں کیونکہ عمرو بن میمون تابعی ہیں اس سے مراد ان کے ایمان لانے سے پہلے کا وقت ہے۔

تیسرا جواب:

" والذی قال البخاری فی التاریخ الکبیر .... عن عمرو بن میمون قال رأیت فی الجاهلیة قردة اجتمع علیها قرود فرجموها فرجمتها معهم ولیس فیه ، قدزنت "

بخاری نے تاریخ کبیر میں عمرو بن میمون کی حدیث میں " قدزنت " (زنا کرنے کا) ذکر نہیں کیا بلکہ صرف اتنا ہی ذکر ہے عمرو بن میمون کہتے ہیں میں نے جاہلیت میں دیکھا کہ

ایک بندر کو دوسرے بندر پتھر مار رہے ہیں میں نے بھی اسے پتھر مارے۔

چوتھا جواب:

" وجماعة اهل العلم منكر اضافة الزنى الى غير مكلف واقامة الحدود فی البهائم "

اہل علم حضرات نے انکار کیا ہے کہ زنا کی نسبت غیر مکلّف جانوروں کی طرف کی جائے اور ان پر حد قائم کی جائے۔

پانچواں جواب:

" ولو صح لكانوا من الجن لان العبادات فی الانس والجن دون غيرهما "

اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حدیث میں " قد زنت " کے الفاظ بھی ہیں۔ اور حدیث بخاری کے صحیح نسخوں میں ہے اور بندر کو زنا کی وجہ سے ہی دوسرے بندر سنگسار کر رہے تھے، تو یہ کہنا پڑے گا کہ وہ جن تھے جو بندروں کی شکل میں تھے کیونکہ مختلف شکلیں بنا لیتے ہیں۔ چونکہ عبادت صرف انسانوں اور جنوں پر لازم ہے تو یقیناً حدود بھی انسانوں اور جنوں پر ہی نافذ ہو سکتی ہیں۔ (از قرطبی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی گریہ وزاری اور حضرت عکرمہ کا استدلال:

ایک دن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سورۃ اعراف میں اس واقعہ کو پڑھ کر رو رہے تھے لوگ آپ کے سامنے حیران ہو کر بیٹھے تھے، اور آپ کے رونے پر تعجب کر رہے تھے (آپ سے وجہ پوچھنے کی کوئی جرات نہیں کر رہا تھا) اتنے میں حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ آ گئے جو آپ کے خاص مقربین شاگردوں میں سے تھے۔ انہوں نے عرض کیا حضرت آپ کے رونے کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جن لوگوں کو بندر بنا دیا گیا ان کے واقعہ میں غور و فکر کر رہا تھا کہ وہ لوگ جنہوں نے شکار کیا تھا وہ عذاب الٰہی میں مبتلاء ہوئے اور بندر بن گئے۔ اور جن لوگوں نے شکار نہیں کیا اور ان کو منع کیا تھا کہ تم شکار نہ کرو وہ نجات حاصل کر گئے۔

لیکن تیسرا فرقہ جنہوں نے شکار تو اگرچہ نہیں کیا تھا لیکن شکار کرنے والوں کو منع نہیں کیا تھا، ان کا

حال معلوم نہیں ہو رہا، جب میں نے یہ خیال کیا کہ ہوسکتا ہے ان کو بھی ﴿ امر بالمعروف نهی عن المنکر ﴾ ''اچھے کام کا حکم دینا اور برے کام سے روکنا'' نہ کرنے کی وجہ سے عذاب میں مبتلاء کر دیا گیا ہو۔ یہ خیال کر کے مجھے شدید خوف لاحق ہوا کہ ﴿ امر بالمعروف نهی عن المنکر ﴾ کے معاملہ میں ہم میں سے بھی کئی لوگوں سے کوتاہی ہوتی رہتی ہے کہیں وہ بھی رب تعالیٰ کی گرفت میں نہ آ جائیں۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، خاموش رہنے والے، ان کو منع کرنے والے نجات حاصل کر گئے اور ان کو روکنے والوں کے ساتھ ان کو کر دیا گیا۔ حضرت ابن عباس رضے اللہ عنہما نے فرمایا تم اپنے دعوی پر دلیل پیش کرو۔ انہوں نے عرض کیا ہم نے آپ سے ہی کئی بار سنا اور حقیقت میں مسئلہ بھی یہی ہے " امر بمعروف ونهی از منکر فرض کفایة است " کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض کفایہ ہے۔

فرض کفایہ کا حکم واضح ہے کہ اگر بعض لوگ اس پر عمل کر لیں تو گنہگار کوئی بھی نہیں ہوتا۔ اگر چہ ثواب عمل کرنے والوں کو ہی ملتا ہے۔ اسلئے ثواب اور بلند درجہ تو شکار کرنے والوں کو روکنے والوں کو ہی حاصل ہوا لیکن خاموش رہنے والے بھی رب تعالیٰ کے عذاب سے بچ گئے۔

" حضرت ابن عباس رابشنیدن این کلام نهایت بهجت وسرور ود واو برخاستند وپیشانی عکرمه رابوسه دادندواورا دربر گرفتند "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کی دلیل کو سن کر بہت ہی زیادہ خوشی حاصل ہوئی اور آپ اٹھے حضرت عکرمہ کی پیشانی پر بوسہ دیا اور ان سے بغل گیر ہو گئے۔

(از عزیزی)

تنبیہ : جب لوگ بہت زیادہ جرائم میں مبتلاء ہو جائیں تو نیک لوگوں کو چاہئے کہ ان سے دور چلے جائیں جیسا کہ بنی اسرائیل کے نیک لوگ ان سے جدا ہو گئے تھے، ان کے درمیان اور اپنے درمیان دیوار حائل کر دی تھی جب مجرمین کے جرائم حد سے بڑھ جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَاِذَا اَرَدْنَا اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ﴾

''اور جب ہم ارادہ کرتے ہیں کسی بستی کو ہلاک کرنے کا تو اس کے رئیسوں کو حکم کرتے ہیں وہ اس میں فسق کرتے ہیں اس پر قول (عذاب کا) ثابت ہو جاتا ہے ہم اس بستی کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں''

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کرام کے ذریعے اپنے احکام لوگوں تک پہنچاتا ہے جب خوشحال اور رئیس لوگ اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے مطابق اس تمام بستی کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ خیال رہے غریب لوگ اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی بہت کم ہی کرتے ہیں۔ زیادہ طور پر امیر لوگ رب تعالیٰ کے نافرمان ہوتے ہیں۔

گنہگاروں کے ساتھ نیک لوگ بھی تباہ ہو جاتے ہیں:

" عن عبد الله بن عمر قال سمعت رسول الله ﷺ يقول اذا اراد الله بقوم عذابا اصاب العذاب من كان فيهم ثم بعثوا على اعمالهم "

(مسلم ج ۲ ص ۳۹۵ باب اثبات العذاب)

حضرت عبداللہ بن عمر ؓ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ و فرماتے ہوئے سنا کہ رب تعالیٰ جب کسی قوم کو عذاب دینا چاہے تو جتنے لوگ وہاں ہوتے ہیں سب کو عذاب پہنچتا ہے پھر اپنے اپنے اعمال کے مطابق اٹھائے جائیں گے۔

ایک روایت میں آتا ہے " يبعثهم الله على نياتهم " اللہ تعالیٰ ان کو انکی نیتوں کے مطابق اٹھائے گا۔ یعنی دنیا میں عذاب اگرچہ آنا تو مجرمین کی وجہ سے ہے لیکن اس تباہی میں نیک لوگ بھی مبتلاء ہو جاتے ہیں، البتہ جب ان کو قیامت میں اٹھایا جائے گا تو اپنے اپنے اعمال کے مطابق سب کو اٹھایا جائے گا مجرمین اللہ تعالیٰ کے احکام کے نافرمان اور باغی قیامت کے دن بھی عذاب کے مستحق ہوں گے۔ اور نیک لوگ اس آرام اور چین میں ہوں گے بلکہ دنیا میں ہلاکت کے باعث ان کے درجات اور زیادہ بلند ہوں گے۔

ناجائز کاموں کے لئے حیلہ کرنا حرام ہے:

﴿ واسْتُدِلَّ بِهٰذِهِ الْاٰيَةِ عَلٰى تَحْرِيْمِ الْحِيَلِ فِى الْاُمُوْرِ الَّتِى لَمْ تُشْرَعْ كَالرِّبَا ﴾

اسی آیۃ سے اس مسئلہ پر دلیل حاصل کی گئی کہ جو کام ناجائز ہیں ان کو جائز کرنے کے لئے حیلہ کرنا حرام ہے جیسا کہ سود حرام ہے اسے جائز کرنے کے لئے حیلہ کیا جائے۔ (روح المعانی)

ہاں البتہ سود سے بچنے کے لئے حیلہ خود نبی کریم ﷺ نے بیان فرمایا کہ ردی کھجوریں دو صاع فروخت کر کے ایک صاع عمدہ کھجوریں خرید لو۔ ایسے ہی ایک شخص صاحب نصاب ہو، سال مکمل ہونے کے قریب ہو، تو یہ اس مال سے گائے وغیرہ خرید لے جو نصاب تک نہ پہنچیں تو یہ زکواۃ دینے سے تو بچ گیا لیکن اس نے نیک کام سے دور رہنے کے لئے حیلہ کیا ہے جو ناپسندیدہ فعل ہے ایسے حیلے شریعت میں پسند نہیں کیے گئے۔

ایک شخص صاحب نصاب ہو قربانی اس پر واجب ہو وہ قربانی کے دنوں میں اپنے گھر سے ساڑھے بانوے کلومیٹر ارادۃً دور چلا جائے مسافر ہو گیا، قربانی واجب نہیں رہی، حیلہ تو کر لیا لیکن یہ حیلہ ایک نیک کام سے بچنے کے لئے کیا گیا ہے جو شریعت میں پسند نہیں۔

جائز کاموں کے لئے حیلہ جائز:

" قال الكواشي وجوزها اكثرهم مالم يكن فيها ابطال حق او احقاق باطل "

کواشی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ اکثر اہل علم نے فرمایا ہے کہ جس کام میں حق کو باطل کرنا لازم نہ آئے اور باطل کو حق کرنا لازم نہ آئے اس میں حیلہ کرنا جائز ہے۔

تنبیہ: حیلہ کی مکمل بحث اور حیلہ اسقاط پر بحث ان شاء اللہ ﴿ وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا ﴾ کے ضمن میں آئے گی۔

☆☆☆

﴿فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ﴾ (آیت ٦٦)

۱) ''تو ہم نے (اس بستی کا) یہ واقعہ اس کے آگے اور پیچھے والوں کے لئے عبرت کر دیا اور پرہیز گاروں کے لئے نصیحت بنا دیا''۔

۲) ''بنا دیا ہم نے اسے عبرت ان کے لئے جو اس وقت موجود تھے اور جو پیچھے آنیوالے تھے اور نصیحت بنا دیا پرہیز گاروں کے لئے''

﴿فَجَعَلْنَاهَا﴾ : '' ھا '' ضمیر جو مفعول واقع ہو رہی ہے اس کا مرجع یا تو '' عقوبۃ '' ہے یعنی مطلب یہ ہوا کہ گویا رب تعالیٰ نے فرمایا:

'' عاقبناھم بتحویل صورتھم الی صورۃ القردۃ ''

ہم نے ان کو سزا دی کہ ان کی صورتیں بدل کر بندر کی شکل میں بنا دیئے گئے۔

'' فانہ عقوبۃ لھم علی اصرارھم علی المخالفۃ والعصیان '' یہ سزا ان کو اس لئے دی گئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی مخالفت اور نافرمانی میں لگا تار عمل کرتے رہے۔ اب مطلب یہ ہوا کہ ہم نے سزا کو عبرت بنایا۔ اور یا '' ھا '' کا ضمیر کا مرجع '' مسخۃ '' ہے:

'' قولہ فقلنا لھم کونوا قردۃ خاسئین فی معنا مسخناھم ''

اب اس صورت میں مطلب یہ ہوگا گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم نے ان کی شکلیں بدل کر بندر بنایا، اور ان کی شکلوں کو بدل کر عبرت کا ذریعہ بنایا۔

﴿نَكَالًا﴾ : اصل میں '' نکال '' اس سزا کو کہتے ہیں جو مجرم کو دی جائے کہ اسے دیکھ کر دوسرے لوگ ان جرائم سے باز آ جائیں کہ کہیں ہمیں بھی وہی سزا نہ دی جائے جو فلاں مجرم کو دی گئی۔ علامہ راغب اصفہانی بیان کرتے ہیں:

'' النکال العقوبۃ الرادعۃ للجانی عن المعاودۃ الی الجنایۃ ولغیر الجانی

عن اتیان مثلها"

نکال اس سزا کو کہتے ہیں جو مجرم کو آئندہ جرم سے روک دے اور جو مجرم نہیں اس کو ایسے جرم سے منع رکھے جو مجرمین کے جرائم ہیں۔

کہا جاتا ہے "نکل فلان عن العدد" فلاں شخص دشمن سے بزدلی کی وجہ سے رک گیا اسی طرح کہا جاتا ہے "نکل فلان عن الیمین" فلاں شخص قسم اٹھانے سے رک گیا۔ لباب (لغت کی کتاب) میں ذکر کیا گیا ہے "نکال" کا معنی منع کرنا۔ اور عذاب کو نکال اس لئے کہا جاتا ہے کہ جسے عذاب نہیں دیا جا رہا اس کو منع کرنے کا ذریعہ بنتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ مجھے وہ کام نہیں کرنا چاہئے جو دوسرے کے لئے عذاب کا ذریعہ بنا ہے۔

"تنکیل" کا معنی ہے غیر کو عذاب دینا دوسروں کو روکنے کے لئے اسی طرح بیڑی لگانے کو "نکل" کہا جاتا ہے کیونکہ وہ چلنے سے روکتی ہے۔ (نکالا) عبرة تنکل المعتبر بها ای تمنعه" نکال کا مجازی طور پر معنی عبرت ہے، کیونکہ جو شخص عبرت حاصل کرنے کی کوشش کرے عذاب اسے برائیوں سے منع کر کے عبرت سکھاتا ہے، جب عذاب سبب ہے عبرت کا۔ تو ذکر سبب کا اور مراد مسبب ہے۔
(از بیضاوی و شیخ زاده)

تنبیه: کوئی شخص علامہ آلوسی رحمہ اللہ کی اس عبارت سے غلط فہمی میں مبتلاء نہ ہو "النکال بمعنی العقوبة لا العبرة" (روح المعانی) نکال کا معنی عقوبت ہے عبرت نہیں۔ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے حقیقی معنی کے لحاظ پر کہا ہے کہ "نکال" کا معنی عبرت نہیں بلکہ عقوبت ہے۔ اور علامہ بیضاوی نے مجازی طور پر عبرت معنی بیان کیا ہے۔

﴿ لِمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا ﴾:

"لما قبلها وما بعدها من الامم اذ ذکرت حالهم فی زبر الاولین واشتهرت قصتهم فی الآخرین"

یعنی ایک مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے نافرمان لوگوں کو سزا دینے اور ان کو مسخ کرنے میں پہلی اور بعد میں آنے والی امتوں کے لئے عبرت ہے کیونکہ ان کا حال پہلے صحیفوں میں ذکر ہو چکا تھا، اس لئے پہلی امتوں کو صحیفے پڑھنے سے عبرت حاصل ہوئی۔ اور ان کا واقعہ بعد میں آنیوالے پر مشہور

ہو گیا۔اس وجہ سے بعد میں آنیوالے لوگوں کے لئے عبرت کا ذریعہ بن گیا۔

" او لمعاصر بھم وما بعدھم " اوراس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو عقوبت دے کر اور ان کی شکلوں کو بدل کر ان کے زمانے کے لوگوں اور بعد میں آنے والے کے لئے عبرت بنایا۔

" اولما بحضرتھا من القری وما تباعد عنھا " اوراس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو عقوبت دے کر اور مسخ کر کے اس بستی کے قریب دوسرے لوگوں کے لئے اور دور والی بستیوں کے لوگوں کے لئے عبرت بنایا۔

" اولا ھل تلک القریة وما حوالیھا " اوراس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی عقوبت اور مسخ کو اس بستی والوں اوراس کے اردگرد لوگوں کے لئے عبرت بنایا۔

" اولا جل ما تقدم علیھا من ذنوبھم وما تأخر منھا " اب مطلب یہ ہوگا کہ ان کو مسخ کر کے ان کو عذاب ان کے اگلے اور پچھلے گناہوں کی وجہ سے دے کر ان کے لئے عبرت بنایا۔

(از بیضاوی)

دینی مدارس کے طلباء کے لئے:

﴿وَمَا یَدَیْھَا وَمَا خَلْفَھَا﴾ میں " من " نہیں ذکر کیا جو ذوی العقول کے لئے آتا ہے "ما" کو ذکر کرنے کی کیا وجہ جو غیر ذوی العقول کے لئے آتا ہے۔اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اس سے پہلے اس کی مراد میں کئی وجہ ذکر کی جا چکی ہیں آخری وجہ " ما تقدم من ذنوبھم وما تأخر " کے لحاظ سے تو ہونا ہی " ما " چاہئے۔

تاہم پہلی وجوہ کے لحاظ سے جب مراد لوگ لئے جائیں تو مجازی طور پر "مـــا" کو ذکر کیا گیا ہے۔کیونکہ مجازاً " من " غیر ذوی العقول کے لئے اور " ما " ذوی العقول کے لئے استعمال ہوتا رہتا ہے۔اور وجہ یہ بیان کی گئی:

" تحقیرا لشانھم فکانھم غیر عقلاء بالنسبة الی المتکلم العلی شانه الباھر سلطانه " (شیخ زادہ)

کہ رب تعالیٰ جس طرح چاہے اپنی مخلوق کا ذکر اسی طرح فرما دے وہ قادر مختار ہے۔ چونکہ یہاں بنی اسرائیل کے مجرمین کا بھی ذکر ہے اور غیر مجرمین کا بھی، اس لئے رب تعالیٰ جو بلند شان کا مالک ہے، جسے غالب سلطنت حاصل ہے اس نے وہ لوگ جو عاصی تھے ان کی حقارت شان کے لحاظ سے "ما" ذکر کیا کہ یہ لوگ جانوروں سے بھی گھٹیا ہیں۔

☆ ﴿ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ﴾ میں بھی بظاہر اعتراض ہوتا ہے کہ "قردة" غیر ذوی العقول کی جمع ہے اسکی صفت "خاسئین" کیسے آ گئی؟ جمع مذکر سالم تو ذوی العقول کے لئے آتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس مقام میں "خاسئین" صفت نہیں بلکہ حال ہے معنوی لحاظ پر تقدیر عبارت کی یوں ہوگی۔

" کونوا قردة حال کونکم خاسئین فی هذا المسخ والتبديل " (از عزیزی)

﴿ وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴾: اور نصیحت بنایا پرہیزگاروں کے لئے، یعنی بنی اسرائیل کے نافرمان لوگوں کو عذاب دے کر اور ان کی شکلوں کو مسخ کر کے پرہیزگاروں کے لئے نصیحت بنایا کہ وہ اپنے نیک اعمال پر ثابت رہیں۔ اور ہمیشہ نیک عمل کرتے رہیں۔

(موعظة) وزنها مفعلة من الاتعاظ والانزجار والوعظ والتخويف " موعظة کا وزن مفعلة ہے اس کا معنیٰ نصیحت قبول کرنا اور زجر حاصل ہونا اور نصیحت دینا اور خوف دلانا۔

" قال الخليل الوعظ التذكير بالخير فيما يرق له القلب " خلیل نے کہا "وعظ" کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو اچھے کاموں کی نصیحت کرنا جس سے اس کا دل نرم ہو جائے اور اچھے کام کرنا شروع کر دے۔

نکال اور موعظة میں فرق: نکال اصل میں عذاب ہے یعنی عذاب دے کر نصیحت کرنا اور باعث عبرت بنانا، یعنی عملی طور پر ڈنڈے سے نصیحت کرنا نکال ہے۔ جب نافرمان لوگوں کے عذاب اور ان کو نصیحت کرنے کا ذکر کیا تو "نکال" کہا کہ وہ اسی نصیحت کے قابل تھے۔ اور جب متقین کو نصیحت کرنے کا ذکر کیا تو "موعظة" ذکر فرمایا کیونکہ زبان سے نصیحت کرنا پیار و محبت سے نصیحت کرنا اور اچھے اعمال

کی نصیحت کرنا کہ ان کے دل نرم ہوں موعظۃ کہلاتا ہے۔

مومن اور پرہیزگاروں کی بلند شان کی طرف واضح طور پر اشارہ فرمادیا کہ وہ پیار سے نصیحت کرنے کے قابل ہیں۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے " العبد یقرع بالعصا والحر تکفیه الملامة " غلام پر ڈنڈا چلایا جاتا ہے اور آزاد کو ملامت کافی ہے یا یوں کہیں ذلیل کو ڈنڈے سے سمجھایا شریف کو زبان سے۔

(از عزیزی)

☆ متقین کا ذکر کیا حالانکہ نصیحت تو سب لوگوں کے لئے تھی اس کی وجہ یہ تھی " لتفردهم بها عن الكافرين المعاندين " کہ نیک لوگوں کی بلندیٔ شان کو ظاہر کرنے کے لئے متقین کی نصیحت کو علیحدہ ذکر کیا تاکہ ان کا ذکر بھی سرکش کفار سے علیحدہ ہو جائے۔

" قال ابن عطية واللفظ يعم كل متق من كل امة "

ابن عطیہ نے کہا کہ یوں جن متقین کا ذکر کیا گیا ہے وہ عام ہیں۔ ہر امت کے متقین مراد ہیں یعنی تمام متقین کے لئے نصیحت ہے۔

" وقال الزجاج ﴿ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ﴾ لامة محمد ﷺ ان ينتكهوا من حرم الله عزوجل ما نهاهم عنه "

زجاج نے بیان کیا ہے کہ اس آیۃ میں متقین سے مراد نبی کریم ﷺ کی امت مراد ہے کہ ان کو نصیحت دی گئی کہ وہ ان کاموں سے دور رہیں باز رہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔

ایسا نہ ہو کہ اے میرے محبوب کی امت تم بھی نافرمانیوں کی وجہ سے ہفتہ کے دن والے لوگوں کی طرح رب تعالیٰ کی گرفت میں نہ آ جاؤ۔

(از قرطبی)

فائدہ عظیمہ : اسی واقعہ سے یہ فائدہ بھی حاصل ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عبادت کے لئے پیدا کیا ہے اگر ان کو کھلی آزادی دے جاتی کہ وہ اپنی طبیعتوں کے مطابق جو چاہیں عمل کرتے رہیں تو یقیناً وہ لذات جسمانیہ میں مبتلا ہو جاتے۔ اور تاریکیوں کے پردے ان پر چھا جاتے ان کی عادات بچوں والی ہو جاتیں۔

والنفس كالطفل ان تهمله شب على — حب الرضاع وان تفطمه ينفطم

نفس بچے کی طرح ہے اگر تم اس کو کھلی چھٹی دے دو تو وہ بڑھاپے تک ماں کے دودھ سے محبت رکھے اگر دودھ چھڑا دیں تو چھوڑ دیتا ہے۔

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بندوں پر عبادات کو مقرر فرمایا اور مقررہ اوقات میں عبادات کا تکرار ان پر مقرر فرمایا تا کہ ان کی طبیعتوں سے ان اوقات میں غفلت دور ہو سکے اور خواہشات میں مبتلاء ہونے کی وجہ سے ان کے دلوں پر جو تاریکیاں چھا جاتی ہیں ان سے انہیں نجات حاصل ہو سکے۔

اسی وجہ سے ہفتہ میں ایک دن کو اجتماعی عبادت کے لئے خاص کر دیا گیا اور اسے دوسرے دنوں پر فوقیت دے دی گئی تا کہ ان سے علیحدہ علیحدہ رہنے کی وجہ سے جو وحشت طاری ہوتی ہے اسے دور کیا جا سکے، اور امور دنیاویہ میں مشغولیت کی وجہ سے چھا جانے والی تاریکی کو دور کیا جا سکے، اور اس دن کی برکتوں کی وجہ سے ان کی دعائوں میں خصوصی قبولیت آ سکے۔

جن لوگوں نے اپنی ذاتی طبیعت کے مطابق، اپنی عادت کے مطابق کام کیے رب تعالیٰ کے احکام کی پرواہ نہ کی وہ برباد ہو گئے یوں سمجھیں کہ وہ ایسی مرض میں مبتلا ہو گئے جو متعدی تھی لیکن وہ اس کا علاج نہ کر سکے مرض بڑھتے بڑھتے لاعلاج ہو گئی اور تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔

اور جن لوگوں نے اپنی انسانیت کو بچانے کی کوشش کی شریعت کے مطابق چلنے میں اپنی پوری طاقت کو صرف کیا یوں سمجھیں شرعی دواؤں سے اپنی صحت کی حفاظت کی تدبیر کی اور حکمت بھرے کلمات سے اپنا علاج کیا ایک دوسرے کو وعدو وعید سے نصیحت کی وہی کامیاب ہوئے۔

هي النفس ان تهمل تلازم خساسة — وان تنبعث نحوا لفضائل تلهج

اس نفس کو اگر ہر کام کی کھلی اجازت دے دو تو یہ خسیس ہو جائیگا — اور اگر اس کو فضائل پر لگاؤ تو اس میں کوشش کرے گا

☆☆☆☆☆

﴿ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً قَالُوْۤا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ﴾

۱) ''اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو بولے کہ آپ ہمیں مسخرہ بناتے ہیں فرمایا خدا کی پناہ میں جاہلوں سے ہوں'' (آیت نمبر ۶۷)

۲) ''اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو بیشک اللہ حکم دیتا تمہیں کہ ذبح کرو ایک گائے، انہوں نے کہا کیا تم اڑاتے ہو ہمارا مزاح، آپ نے کہا اللہ کی پناہ کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں''

یہاں سے ایک اور نعمت کا ذکر ہے اور ساتھ ساتھ بنی اسرائیل کی کجروی (ٹیڑھی چال کا بھی ذکر ہے) ان کو گائے کے ذبح کرنے کا حکم دینا ان کے لئے دنیاوی نعمت بھی تھا کیونکہ اس سے ان کے درمیان واقع ہونے والے اختلاف کو اٹھانا مقصود تھا۔ اور اخروی نعمت بھی تھا کیونکہ اس میں موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ پایا گیا اور بنی اسرائیل کا بار بار سوال کرنا (جس کا ذکر انشاء اللہ قریب ہی آ رہا ہے) ان کی پرانی روش (چال) پر دلالت کر رہا ہے۔ (روح المعانی)

بنی اسرائیل میں سے ایک شخص نے اپنے ایک رشتہ دار کو قتل کر دیا تا کہ اس کا وارث بن جائے قتل کر کے اس کی لاش کو چوراہے میں پھینک دیا پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس شکایت لے کر آ گیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کوشش کی قاتل کا پتہ لگانے کی لیکن پتہ نہ چل سکا۔ وہ لوگ کہنے لگے اپنے رب سے دعاء کیجئے تا کہ وہ بتائے کہ اس کا قاتل کون ہے؟ آپ نے اپنے رب سے دعاء کی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو وحی کی۔

آپ نے اپنی قوم کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ گائے ذبح کر کے اس کا گوشت مردہ کو مارو وہ زندہ ہو کر بتائے گا کہ میرا قاتل کون ہے؟ انہوں نے تعجب کیا کہ ذبح شدہ جانور کا گوشت مردہ کو کیسے زندہ کرے گا یہ تو ایک مزاح نظر آ رہا ہے۔ آپ نے فرمایا اللہ کی پناہ میں جاہلوں سے ہو جاؤں۔

''ان الاشتغال بالاستهزاء لا یكون الا بسبب الجهل ومنصب النبوة لا یحتمل الاقدام علی الاستهزاء''

یعنی کسی سے مزاح اڑانا کسی کو حقیر اور گھٹیا سمجھنا صرف جہالت کی وجہ سے ہوتا ہے منصب

نبوت کے یہ لائق ہی نہیں وہ حقارت آمیز توہین آمیز مزاح کسی سے اڑائے۔

خیال رہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے مزاح اڑانے سے پناہ نہیں مانگی بلکہ جہالت سے پناہ مانگی اس لئے کہ مزاح اڑانا جہالت کا سبب ہے، اور سبب کا ذکر کر کے مراد مسبب لینا مجاز میں زیادہ قوی ہے۔ اور موسیٰ علیہ السلام کا پناہ پکڑنا اس وجہ سے تھا کہ وہ لوگ آپ سے دین کے معاملہ میں راہنمائی حاصل کر رہے تھے اور دعاء کرا رہے تھے:

" والاستهزاء في امر الدين من العقاب الشديد والوعيد العظيم "

اور دین کے معاملہ میں مزاح اڑانا شدید عذاب کا ذریعہ ہے اور عظیم وعید کا ذریعہ ہے۔

" وقال بعضهم ان النفس الهزء قد يسمى جهلا وجهالة "

بعض لوگوں نے کہا کہ بیشک استہزاء یعنی مزاح اڑانا ہی جہالت ہے یعنی جہالت کا سبب نہیں بلکہ عین جہالت ہے۔ (از کبیر)

مزاح اور استہزاء میں فرق: استہزاء اللہ تعالیٰ کے دین سے مزاح اڑانا مسلمانوں سے حقارت آمیز مزاح اڑانا اور جن چیزوں کی تعظیم ضروری ہے ان کی توہین کرتے ہوئے مزاح اڑانا ہے یہ ناجائز اور حرام اور باعث کفر ہے۔ لیکن مزاح کرنا یعنی خوش طبعی کرنا اور کسی سے حقارت آمیز اور توہین آمیز سلوک نہ کرنا جائز ہے نبی کریم ﷺ اور ائمہ کرام نے مزاح کیا ہے جو یقیناً جائز ہے۔

ابن خویز منداد کہتے ہیں ہمیں یہ خبر ملی ہے کہ ایک شخص کوفہ کے قاضی عبید اللہ بن حسن کے پاس آیا انہوں نے مزاح کے طور پر اس شخص سے سوال کیا " **جبتك هذه من صوف نعجة او صوف كبش** " یہ تمہارا جبہ بھیڑ کی اون کا ہے یا کہ دنبے کی اون کا۔ وہ شخص کہنے لگا " **لا تجهل ايها القاضي** " اے قاضی جاہل نہ بنو۔ قاضی نے اس شخص سے سوال کیا کہ مزاح کرنا جہالت کیسے ہے تو اس نے یہی آیت بطور دلیل پیش کی۔ عبید اللہ نے اس سے اعراض کیا " **لانه رآه جاهلا لا يعرف المزاح من الاستهزاء** " کہ یہ شخص جاہل ہے اسے استہزاء اور مزاح میں فرق کا ہی پتہ نہیں حالانکہ استہزاء اور چیز ہے اور مزاح اور چیز ہے۔ (قرطبی)

کیا بنی اسرائیل کافر ہوئے: جن لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام کو کہا ﴿ اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ﴾ ''کیا تم ہمارے ساتھ مزاح اڑا رہے ہو'' کیا یہ کہنے سے وہ کافر ہو گئے تھے یا نہیں؟

اگر چہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ وہ کافر ہو گئے تھے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ کہا کہ بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے گائے ذبح کرنے کا، پھر ان کا یہ کہنا ﴿ اتتخذنا هزوا ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک کرنا لازم آیا۔ اور اگر انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہ سوچا کہ پتہ نہیں یہ سچ ہے یا نہیں اس سے یہ لازم آیا کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے احکام بیان کرنے میں خیانت کرنے والا سمجھا یہ دونوں صورتیں کفر ہیں۔ اور جن اہل علم نے ان کو کافر نہیں کہا، انہوں نے یہ دلیلیں قائم کی ہیں۔

" (الاول) ان الملاعبة علی الانبیاء جائزة فلعلهم ظنوا به علیهم السلام انه یلاعب ملاعبة حقة وذلک لا یوجب الکفر"

ان میں سے پہلی دلیل یہ ہے کہ خوش طبعی کا کلام انبیاء کرام بھی فرماتے رہے اور ان کی امت کے لوگ بھی، یہ مزاح جائز ہے ان لوگوں نے بھی یہ سمجھا کہ موسیٰ علیہ السلام شائد ہمارے ساتھ خوش طبعی کر رہے ہیں۔ اس سے کفر لازم نہیں آتا۔ ہاں اس دلیل پر اس طرح اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے'' مزاح'' کیوں نہیں ذکر کیا'' هــزوا '' کیوں کہا؟ اس کا جواب واضح ہے کہ بعض اوقات مجازی طور پر ایک لفظ دوسرے کی جگہ استعمال ہوتا رہتا ہے مناسبت بھی دونوں میں موجود ہے۔

" (الثانی) ان معنی قوله تعالیٰ ﴿ اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ﴾ ای ما اعجب هذا الجواب کانک تستهزئ بنا انهم حققوا علی موسی الاستهزاء"

دوسری دلیل یہ ہے کہ ان کا ﴿ اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ﴾ کہنا تعجب کے طور پر تھا کہ یہ کیسے ہوگا کہ مردہ کو مردہ کا گوشت زندہ کر دے یہ تو گویا کہ موسیٰ علیہ السلام ہمارے ساتھ مزاح اڑا رہے ہیں۔ انہوں نے حقیقی طور پر موسیٰ علیہ السلام کو مزاح اڑانے والا نہیں کہا کہ کفر لازم آتا۔

(از کبیر)

راقم کو یہی دلائل قوی نظر آئے کیونکہ ان کا بار بار سوال کرنا کہ'' اللہ تعالیٰ سے دعاء کرو'' پھر ان کا

''ان شاء اللہ'' کہنا پھران کا اس پر عمل کرنا یہ تمام ان کے ایمان پر دلالت کرنے والی اشیاء ہیں۔

(واللہ اعلم بالصواب)

دینی طلباء کرام کے لئے:

" قوله تعالیٰ ﴿ هُزُوًا ﴾ مفعول ثان ويجوز تخفيف الهمزة تجعلها بين الواو والهمزة "

(تخذ) کا پہلا مفعول ضمیر منصوب متصل ہے اور دوسرا " ھزوا " اور اس میں ہمزہ کی تخفیف یعنی واؤ اور ہمزہ کے درمیان پڑھنا بھی جائز ہے جسے علم صرف میں ''بین بین'' اور یا ''تخفیف'' کہتے ہیں۔

" وجعلها حفص واوا مفتوحة لانها همزة مفتوحة قبلها ضمة "

اور حفص نے ہمزہ مفتوحہ اور اس سے پہلے ضمہ ہونے کی وجہ سے واؤ مفتوحہ سے بدل کر پڑھا ہے۔

" ھزوا " کی زاء کو ساکن پڑھنا بھی جائز ہے جیسا کہ ''عضد'' کے ضاد مضموم کو ساکن پڑھنا جائز ہے۔ یعنی اصل میں " ھزوا " ہمزہ سے ہے جیسا کہ ﴿ ولم يكن له كفوا احد ﴾ میں ''کفوا'' اصل میں ہمزہ سے ہے پھر اسے واؤ مفتوحہ سے بدلا گیا۔ (از قرطبی)

(ھزوا) مهزوابنا حيث تجيبنا بمثل ذلك "(جلالین) " ھزوا " مصدر ہے مفعول والا معنی ہے اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت نے اس کا ترجمہ ''مسخرہ'' کیا ہے یعنی مزاح اڑایا ہوا۔ مصدر کو مبالغہ کے طور پر اپنے معنی میں رکھنا بھی جائز ہے اور حذف مضاف ہو " ذوی ھزء " ہو پھر بھی درست ہے۔

(حاشیہ جلالین)

☆☆☆☆☆

﴿ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا هِیَ قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِکْرٌ عَوَانٌ بَیْنَ ذٰلِکَ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴾

۱) ''بولے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں بتا دے گائے کیسی کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے نہ بوڑھی اور نہ اوسر بلکہ ان دونوں کے بیچ میں تو کرو جس کا تمہیں حکم ہوتا ہے''

۲) ''انہوں نے کہا دعاء کرو ہمارے لئے اپنے رب سے بیان کرے ہمارے لئے وہ گائے کیسی ہو کہا بیشک وہ فرماتا ہے کہ تحقیق وہ ایسی گائے ہو کہ نہ بوڑھی ہو اور نہ بچھڑی اس کے درمیان ہو تو کرو تم جس کا تمہیں حکم دیا جاتا ہے'' (آیت نمبر ۶۸)

﴿ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّن لَّنَا مَا هِیَ ﴾: ''انہوں نے کہا دعا کرو ہمارے لئے اپنے رب سے، بیان کرے ہمارے لئے وہ گائے کیسی ہو'' (ماھی) ای ماسنھا (خازن) ''ما ھی'' سے ان کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ اس گائے کی عمر کیا ہو۔

سوال: ''ما'' استفہامیہ جو سوال کے لئے آتا ہے اور ''ھی'' اشارہ ہے حقیقت کی طرف لہٰذا ''ما ھی'' سے سوال حقیقت کے متعلق ہے یعنی ان کے پوچھنے کا مطلب یہ تھا کہ گائے کی حقیقت کیا ہے اس کی جنس کیا ہے یعنی گائے کسے کہا جاتا ہے۔

ان کے سوال کا جواب گائے کی عمر بیان کر کے کیسے دیا گیا حقیقت کے متعلق جب سوال کیا جائے تو اس کا جواب اس کے اجزاء اور مقدمات بیان کرنے سے آتا ہے نہ کہ صفات خارجیہ کو بیان کرنے سے، عمر کا بیان اسی کی صفات خارجیہ سے ہے۔

پہلا جواب: اگرچہ ہے تو اسی طرح جیسا کہ معترض نے اپنے اعتراض میں ذکر کیا ہے لیکن یہاں قرینہ حالیہ دلالت کر رہا ہے کہ ان کا مقصد حقیقت اور ماہیت کے متعلق پوچھنا نہیں تھا، کیونکہ یہ تو وہ جانتے ہی تھے۔

'' بل کان مقصودھم طلب الصفات التی بسببھا یتمیز بعض البقر عن

بعض فلهذا حسن ذکر الصفات الخارجیة جوابا عن هذا السوال "

بلکہ ان کا مقصد ہی صفات کا سوال تھا کہ ایسی صفات کو بیان کیا جائے جن سے یہ گائے جس کے ذبح کا حکم دیا جا رہا ہے وہ دوسری گائیوں سے ممتاز ہو جائے۔ اسلئے صفات خارجیہ کو بیان کر کے جواب دینا ہی اچھا تھا تا کہ جواب سوال کے مطابق ہو جائے۔ (از کبیر)

دوسرا جواب : ان کا سوال گائے کی حقیقت اور ماہیت کے متعلق ہی تھا، البتہ ان کو صفات بیان کر کے جواب دیا گیا کہ تمہیں یہ سوال کرنا چاہئے تھا۔ ان کے سوال کرنے کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے دیکھا کہ ایک گائے تو عام ہے جو پائی جاتی ہے۔ اور دوسری وحشی گائے ہے جسے نیل گائے کہا جاتا ہے اور تیسری پہاڑی گائے ہے جسے سور گائے کہا جاتا ہے اور چوتھی دریائی گائے ہے ان میں تو یہ تاثیر نہیں پائی جاتی کہ ان کے گوشت سے مردہ شخص زندہ ہو جائے۔ لہذا وہ گائے یقیناً کسی اور نسل سے ہوگی اس لئے ان کا سوال گائے کی حقیقت کے متعلق تھا۔ البتہ جواب ان کو گائے کی عمر بیان کر کے دیا گیا کہ گائے تو وہی ہے البتہ تمہارے سوال پر جواب صفات بیان کر کے دے دیا جاتا ہے۔ (از عزیزی)

تیسرا جواب اجمالی: "لما رأوا ظهور القتل بذبح اى فرد من جنس البقرة مستبعدا وزعموا انها بائنة عن سائر البقرات بونا بعيدا حتى يكون كانه جنس آخر اجروه مجرى لا يعرفون حقيقته" (مظهری)

جن لوگوں نے دیکھا کہ گائے کے گوشت سے کسی مردہ شخص کو زندہ کرنا بہت بعید ہے تو انہوں نے گمان کیا گویا کہ وہ گائے دوسری عام گائے سے علیحدہ ہوگی ان کی ذاتیں مختلف ہوں گی اس لحاظ پر انہوں نے سوال کیا گویا کہ وہ حقیقت کو ہی نہیں جانتے۔

تنبیہ : دوسرے جواب میں یہ بتایا گیا کہ ان کا سوال واقعی گائے کی حقیقت کی متعلق تھا، اور تیسرے جواب میں ذکر کیا گیا ہے کہ گویا کہ ان کا سوال حقیقت کے متعلق تھا۔

تیسرا جواب تفصیلی (دینی طلباء کے لئے): اگرچہ مشہور قاعدہ یہ ہے کہ "**ما استفهاميه**" کے ذریعے جب سوال کسی چیز کی ماہت اور جنس کے لئے ہو اور وہ افراد خارجیہ پر منطبق ہو تو اس وقت "**مااستفهاميه**" کو "**ما حقيقيه**" کہا جاتا ہے اور اس کا درجہ "**هل بسيطه**" سے بعد ہوگا۔

" وهی التی یطلب بها وجود الشئی فی نفسه " کیونکہ جب کسی چیز کے "موجود فی نفسه " کے متعلق سوال کرنا مقصود ہوتو " هل بسیطه " کے ذریعے سوال کیا جاتا ہے۔

ماحقیقیہ کی مثال: ما الانسان ؟ اس مثال میں حقیقت انسان کے متعلق سوال کیا گیا جواب وہی دیا جائے گا جو انسان کے افراد خارجیہ پر منطبق ہوگا یعنی حیوان ناطق سے جواب دیا جائے گا اسی طرح "ما الحرکة " (حرکت کیا ہے؟) میں بھی ماحقیقیہ ہے۔اور " ما استفهامیه " کے ذریعے جب سوال کرنے کا مقصد یہ ہو کہ جواب میں اس چیز کی وضاحت اس طرح ہو کہ یہ پتہ چل جائے کہ اس کا نام کس پر دلالت کر رہا ہے۔یعنی اجمالی طور پر یہ ذکر ہوگا اسے " ما شارحة " کہا جاتا ہے۔

یہ ھل بسیطہ سے مقدم ہوتا ہے۔کیونکہ " هل بسیطه " کے ذریعے ایک چیز کے وجود فی نفسہ کے متعلق سوال ہوتا ہے اور " ما شارحة " کے ذریعے اس کے نام کی دلالت کی وضاحت طلب ہوتی ہے جس میں افراد خارجیہ پر منطبق ہونا ضروری نہیں ہوتا لہٰذا " ما شارحة " کے ذریعے موجود اور معدوم دونوں کے متعلق سوال ہوسکتا ہے۔جیسا کہ کہا جائے " ما العنقاء " تو اس سوال کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ماہیت موجودہ کے متعلق سوال کر رہا ہے،لیکن اسے اس کے وجود کا علم نہیں۔

اور یہی سوال "ما هیت معدومه " کے متعلق بھی ہوسکتا ہے۔اسی وجہ سے " هل بسیطه " مقدم ہوتا ہے " وکونها للسوال عن وصف المسمی نادر قلیل " " مااستفهامیه " کے ذریعے کسی چیز کے وصف کے متعلق سوال قلیل ہی پایا جاتا ہے لہٰذا " ما زید " کہہ کر زید کی صحت اور حالت کے متعلق سوال نہیں ہوتا۔ہاں اگر یہی سوال کرنا مقصود ہو تو " کیف زید " کہا جائے گا۔

اگرچہ بظاہر عقل کا تقاضا یہاں بھی یہ ہی تھا کہ " کیف هی " کہا جاتا ، یا اور کوئی لفظ ذکر کیا جاتا جو کیفیت اور حالت پر دلالت کرتا: "الا انه قیمت کلمة ما مقام ما یسأل به عن تعیین الشخص " لیکن انہوں نے " مااستفهامیه " کے ذریعے سوال کیا جو شخص اور جنس کی تعیین پر دلالت کرتا ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ ذبح کی ہوئی گائے کے گوشت سے مردہ کو زندہ کرنا عقل سے دور ہے:

" فسالوا عنه بما یسأل به عن الحقیقة مع ان الظاهر ان یسألوا بما یسأل به عن الوصف فسالوا اولا عن سنها ثم لونها فاجیبو ببیانهما ثم طلبوا

تمام الکشف ببیان اوصافها الزائدة علی ما ذکر"

توانہوں نے "ما" سے سوال کیا جس سے حقیقت کے متعلق سوال کیا جاتا ہے یہ سوال صرف عقل سے بعید سمجھنے کی وجہ سے "ما" کے ذریعے کر دیا گیا ورنہ حقیقت میں ان کا پہلا سوال ہی عمر کے متعلق تھا اور جواب بھی عمر کے متعلق ہی دیا گیا اور دوسرا سوال ہی رنگ کے متعلق جواب رنگ کے متعلق ہے اور تیسرا سوال ہی اس کے اور مزید اوصاف کے متعلق تھا جس سے زیادہ وضاحت ہو جائے اور جواب بھی اسی سوال کے مطابق ہی دیا گیا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ انہوں نے جب تعجب کیا کہ ذبح کی ہوئی گائے سے مردہ کیسے زندہ ہوگا تو انہوں نے یہ سمجھا کہ گویا کہ وہ گائے کوئی خاص صفات ہی رکھتی ہوگی سوال صفات کے متعلق ہی تھا لیکن خصوصی صفات رکھنے کی وجہ سے گویا کہ انہوں نے اس کی حقیقت کو ہی مختلف سمجھ لیا اور سوال "ماهی" کیا سے جو جنس اور حقیقت و ماہیت کے متعلق سوال کے لئے آتا ہے۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

چوتھا جواب: یہ قاعدہ اکثریہ ہے کلیہ نہیں کہ "ما" سے سوال حقیقت و جنس کے متعلق ہوتا ہے لیکن صفات کے متعلق سوال نہیں ہوتا۔ ان لوگوں نے سوال ہی صفات کے متعلق کیا تھا کیونکہ وہ حقیقت کو تو جانتے تھے کہ گائے کون سی جنس ہے۔

" لان ما وان کانت سؤ الاعن الجنس و کیف عن الوصف ولکن قد تقع ما موقع کیف "

"ما" سے انہوں نے صفات کا سوال کیا کیونکہ "ما" اگرچہ جنس کے متعلق سوال کے لئے آتا ہے اور "کیف" صفات کے متعلق آتا ہے لیکن "ما" کبھی "کیف" کی جگہ بھی استعمال ہوتا رہتا ہے۔ البتہ صفات کے متعلق ان کا سوال تعجب کی وجہ سے ہی تھا کہ وہ گائے خاص صفات والی ہی ہونی چاہئے جس کے گوشت سے مردہ زندہ ہوگا۔ (از مدارک)

﴿ قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ عَوَانٌۢ بَیْنَ ذٰلِكَ ﴾

"موسیٰ علیہ السلام نے کہا بیشک وہ رب تعالیٰ کہتا ہے کہ تحقیق وہ گائے نہ بوڑھی ہو نہ بچھڑی، اس کے درمیان ہو"

﴿ لا فارض ﴾ اسم للمسنة التی انقطعت ولادتها من الکبر "

وہ مؤنث جس کی ولادت بڑی عمر ہو جانے کی وجہ سے منقطع ہو جائے اسے فارض کہتے ہیں۔

وكأن المسنة سميت فارضا لانها فرضت سنها او قطعتها وبلغت آخرها"

بوڑھی گائے وغیرہ کو اس لئے بھی فارض کہا جاتا ہے کہ اس کے دانت قطع ہو جاتے (گر جاتے ہیں) یعنی فرض کا معنی منقطع ہونا، گرنا۔

﴿ وَالْبِكْرُ ﴾ اسم للصغيرة، چھوٹی عمر ہو تو اسے بکر (باء کے کسرہ سے) کہا جاتا ہے۔ گائے کی چھوٹی بچھڑی کو بکر کہا جاتا ہے۔ (یہاں یہی معنی مراد ہے) اگرچہ صغر کی وجہ سے جس کی اولاد نہ ہو اسے بھی بکر کہا جاتا ہے یہ معنی پہلے معنی کے قریب ہی ہے۔ اور اولاد میں سے پہلے ولد کو بھی بکر کہا جاتا ہے۔ (یہاں یہ مراد نہیں) خیال رہے پہلی حاجت کو بھی بکر کہا جاتا ہے۔

جوان اونٹ کو بکر (باء کے فتحہ سے) کہا جاتا ہے اور جوان اونٹنی کو بکرۃ کہا جاتا ہے صبح کے وقت کو بکرۃ (باء کے ضمہ سے) کہا جاتا ہے اور پہلے پہلے پھل کو باکورہ کہا جاتا ہے۔

﴿ عَوَانٌ ﴾ متوسط السن، درمیانی عمر والی گائے ہو نہ بوڑھی اور نہ بچھڑی۔ (از روح المعانی)

﴿ بَيْنَ ذٰلِكَ ﴾ پر بظاہر دو وجہ سے اعتراض ہوتا ہے کہ "بین" کی اضافت متعدد کی طرف ہوتی ہے یہاں "ذلک" کی طرف کیسے درست ہے؟ پھر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ "ذلک" کا اشارہ "فارض" اور "بکر" کی طرف ہے وہ دونوں مؤنث ہیں تو "ذلک" مذکر واحد کا اشارہ کیسے صحیح ہے؟

ان دونوں کا جواب یہ ہے کہ یہ "ما ذکر" کی تاویل میں ہے مذکور دو چیزیں ہیں فارض اور بکر۔ پہلے سوال کا جواب آ گیا اور مذکور مذکر ہے اس لئے دوسرے سوال کا جواب آ گیا۔ (از کبیر)

﴿ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴾ : "تو کرو جس چیز کا تمہیں حکم دیا جاتا ہے"۔

"اى من ذبح البقرة ولا تكرروا السوال ولا تغتوا"

یعنی گائے ذبح کرنے کا تمہیں حکم دیا گیا ہے تم اس پر عمل کرو بار بار سوال نہ کرو اور سرکشی نہ کرو۔

اس جملہ میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہو اور موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے اعلان کرایا ہو۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو نصیحت کے طور پر فرمایا ہو۔ اور رب تعالیٰ نے ان کے کلام کی حکایت بیان فرمائی ہو۔

سوال ان کے لئے مشکل کا سبب بن گئے: ابن جریری نے صحیح سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے موقوف روایت بیان کی:

" لو ذبحوا ای بقرة اراد والأ جزأتهم ولكن شد دوا على انفسهم فشدد الله تعالیٰ عليهم "

وہ کوئی گائے بھی ذبح کر لیتے جو چاہتے، توان کو کفایت کر جاتی، لیکن انہوں نے اپنے نفسوں پر شدت کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر شدت کر دی۔

☆ سعید ابن منصور نے اپنی سنن میں حضرت عکرمہ سے مرفوع اور مرسل یہی حدیث بیان کی ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ابن جریر نے بیان کی ہے۔

" وبانه لو كانت معينة لما عنفهم على التمادی وزجرهم عن المراجعة الى السؤال "

اور عقل سے بھی یہ بات واضح طور پر ثابت ہے کہ اگر گائے معین ہوتی جس کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا ہے توان کو دیر کرنے پر اور بار بار سوال کرنے پر زجر (ڈانٹ ڈپٹ) نہ کی جاتی۔

(از روح المعانی)

مسئلہ: بعض محققین نے اس مقام پر ایک مسئلہ کی تحقیق کی ہے کہ جب ان کو مطلق گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا لیکن انہوں نے خود اپنے آپ پر سوال کر کے حکم کو سخت کر دیا وہی حکم جو پہلے مطلق تھا اب مقید ہو گیا۔ اسی سے یہ مسئلہ ثابت ہو گیا۔

" النسخ جائز قبل وقت الفعل لانه لما امر ببقرة اقتضى اى بقرة كانت فلما زاد فى الصفة نسخ الحكم الاول بغيره لان شرط النسخ التمكن من الاعتقاد وهو حاصل بلاريب " (قرطبی، روح المعانی)

فعل کے وقت سے پہلے نسخ جائز ہے اس لئے کہ جب ان کو حکم دیا گیا کہ کوئی گائے ذبح کر دو انہوں نے جب بار بار سوال کئے تو صفات زائد کر کے حکم کو مقید کر کے پہلے مطلق حکم کو منسوخ کر دیا گیا نسخ کے لئے اعتقاد رکھنا ضروری ہے وہ ان کو حاصل تھا نسخ کے لئے یہ ضروری ہی نہیں کہ ایک مرتبہ عمل کر لیا جائے تو پھر منسوخ ہو۔ اس پر واضح دلیل یہ ہے کہ معراج کی رات کو پچاس نمازیں فرض کر دی گئیں لیکن ان پر عمل سے پہلے ہی ان کو منسوخ کر دیا گیا۔

﴿ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَالَوْنُهَا قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴾ (آیت ۶۹)

۱) ''بولے اپنے رب سے دعا کیجئے ہمیں بتا دے اس کا رنگ کیا ہے کہا وہ فرماتا ہے وہ ایک پیلی گائے ہے جس کی رنگت ڈہڈہاتی دیکھنے والوں کو خوشی دیتی''۔

۲) ''انہوں نے کہا دعاء کرو ہمارے لئے اپنے رب سے بیان کرے ہمارے لئے اس کا رنگ کیسا ہو، کہا بیشک وہ کہتا ہے تحقیق وہ گائے زرد (رنگ کی) ہو خالص شوخ زرد رنگ ہو اس کا خوش کرے دیکھنے والوں کو''۔

﴿ مَالَوْنُهَا ﴾ ما استفہامیہ ہے مبتداء واقع ہے اور لونھا خبر ہے (رنگ کیسا ہو) '' لون '' واحد ہے اور جمع اس کی '' الوان '' ہے '' اللون '' ، وھو ھیئة کالسواد والبیاض والحمرة '' سیاہ ہونا، سفید ہونا اور سرخ ہونا وغیرہ سے جو کیفیت، ھیئت حاصل ہوتی ہے اسے '' لون '' کہا جاتا ہے۔ یعنی '' لون '' نوع ہے اور سواد و بیاض وغیرہ اس کے افراد ہیں۔ اور کہا جاتا ہے '' فلان متلون '' (فلاں رنگ بدلتا رہتا ہے) اس کا مطلب یہ ہوتا '' لا یثبت علی خلق واحد وحال واحد '' کہ وہ ایک عادت اور ایک حال پر قائم نہیں رہتا۔

﴿ صَفْرَاءُ ﴾: زرد رنگ کی ہو۔ صفراء مؤنث ہے اور اصفر مذکر ہے اور جمع دونوں کی صفر (صاد کے ضمہ سے) ہے '' قال مکی عن بعضھم حتی القرن والظلف '' مکی نے بعض حضرات سے نقل کیا ہے کہ زرد رنگ کا جو حکم دیا گیا تھا اس سے مراد یہ تھا کہ اس گائے کے سینگ اور پاؤں کی ہڈی (کھر) بھی زرد رنگ کے ہوں۔ (قرطبی)

﴿ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا ﴾ الفقوع اشد ما یکون من لاصفرة وانصعه '' زرد رنگ جب بہت شدید زرد رنگ ہو اور اس میں چمک پائی جائے تو اس وقت فاقع کہا جاتا ہے۔

'' یرید خالصا لونھا لالونھا فیھا سوی لون جلدھا '' اس وقت '' فاقع لونھا '' کہا

جاتا ہے جب کہ اس کا زرد رنگ خالص ہو اور دوسرا رنگ اس میں نہ ہو صرف اس کے چمڑے کا ایک ہی رنگ زرد ہو۔

تنبیہ : مجازی طور پر اصفر کا معنی سیاہ بھی آتا رہتا ہے، جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: ﴿کَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ﴾ اس مقام پر بعض مفسرین کرام نے بیان فرمایا کہ جہنم کی چنگاریوں کو سیاہ اونٹوں سے تشبیہ دی گئی ہے یعنی ''صفر'' کا معنی مجازی طور پر ''سیاہ'' لیا گیا ہے۔ لیکن جب '' فاقع '' ساتھ ذکر ہو تو حقیقی معنی ''زرد'' لینا ضروری ہو جاتا ہے مجازی معنی لینا درست نہیں ہوتا۔

مقام توجہ: جب بہت سیاہ، خالص سیاہ کہنا مقصود ہو تو کہا جائے گا'' اسود حالک وحلکوک '' (حاء اور لام پر فتحہ) وحلکوک (حاء پر ضمہ اور لام ساکن) ودجوجی وغربیب (نین کے نیچے کسرہ) سخت سرخ، خالص سرخ کو '' احمر قانی '' اور خالص سفید کو کہا جاتا ہے '' ابیض ناصع ، ولھق (لام پر فتحہ اور ہاء کے نیچے کسرہ) ولھاق (لام کے نیچے کسرہ) ویقق (یاء پر فتحہ اور قاف کے نیچے کسرہ) اور خالص سبز کہنا ہو تو کہا جائے گا'' اخضر ناضر '' اور خالص زرد کہنا ہو تو کہا جائے گا'' اصفر فاقع ''

خیال رہے: چند اور معانی کی طرف بھی توجہ کی ضرورت ہے، الافقاع ، سوء الحال ، یعنی افقاع بدحالی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ فواقع الدھر ، بوائقه، زمانے کے مصائب کو فواقع الدھر کہتے ہیں۔ فقع باصابعه ، اذا صوت ، انگلیوں سے پٹاخے نکالنے کے لئے '' فقع باصابعه '' بولتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں آتا ہے '' نھی عن التفقیع فی الصلوۃ '' نماز میں انگلیوں سے پٹاخے نکالنے سے منع کیا گیا ہے۔ (از قرطبی)

﴿تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ﴾ : تسر مؤنث کا صیغہ ہے ضمیر بقرۃ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یعنی وہ گائے خوش کرے دیکھنے والوں کو:

'' السرور اصله لذۃ فی القلب عند حصول نفع او توقعه او رؤیة امر معجب رائق ''

سرور کا معنی یہ ہے کہ دل کو لذت حاصل ہو نفع کے حاصل ہونے کی وجہ سے یا نفع کی توقع کی وجہ سے یا عجیب اور عمدہ چیز کو دیکھنے کی وجہ سے۔ اسی طرح باطنی طور پر انشراح صدر (خوشی سے سینہ کا کھل

جانا) کو بھی سرور کہا جاتا ہے۔

خیال رہے " سرور " اور " حبور " اور " فرح " معنوی لحاظ پر قریب قریب ہیں:
"سرور" خالص پوشیدہ طور پر حاصل ہونے والی خوشی کو کہا جاتا ہے اس کا نام اسرار کی مناسبت سے رکھا گیا ہے اور " حبور " اس خوشی کو کہتے ہیں جس کے اثرات چمڑے وغیرہ پر ظاہر ہوں سرور اور حبور دونوں مقام مدح میں استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن ''فرح'' کا استعمال اس خوشی کے لئے ہوتا ہے جس پر اترایا جائے اکثر پائی جائے اسی وجہ سے اس کا استعمال اکثر طور پر مقام مذمت میں ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ﴾

بیشک اللہ تعالیٰ خوش ہونیوالوں (خوشی پر اترانے والوں) کو پسند نہیں فرماتا۔

(از روح المعانی)

﴿ تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴾ قال وهب كأن شعاع الشمس يخرج من جلدها "
وہب نے بیان کیا ہے کہ اس گائے کا رنگ گویا کہ یہ بتایا گیا ہے کہ وہ خالص شوخ زرد رنگ ایسے جیسے کہ سورج کی شعائیں اس کے چمڑے سے نکل رہی ہوں یعنی بہت چمکدار ہو، ایسے رنگ والی گائے دیکھنے والوں کو خوش کرے۔ (قرطبی)

فائدہ عظیمہ: " قال ابن عباس الصفرة تسر النفس وحض على لباس النعال الصفر "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ زرد رنگ سے نفس کو سرور حاصل ہوتا ہے اسی لئے آپ زرد رنگ کے جوتے پہننا پسند فرماتے ہوئے دوسروں کو بھی اسی پر برانگیختہ فرماتے تھے یہ نقاش نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔

" وقال علی بن ابی طالب ﷺ من لبس نعلی جلد اصفر قل همه لان الله تعالىٰ يقول ﴿ صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴾
ثعلبی نے حضرت علی ﷺ سے نقل کیا کہ آپ فرماتے ہیں جس شخص نے زرد رنگ کے چمڑے کے جوتے پہنے اسے غم کم لاحق ہوں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے گائے کا زرد رنگ ذکر فرمایا کہ وہ دیکھنے وال کو خوش کرے۔

☆ " ونهى ابن الزبير ومحمد ابن كثير عن عباس النعال السود لانها تهم "
ابن زبیر اور محمد بن کثیر سیاہ جوتے پہننے سے منع فرماتے تھے کہ سیاہ جوتے پہننے سے غم لاحق ہوتا ہے۔

(قرطبی وهكذا فی روح المعانی)

﴿ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ اِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴾ (آیت ۷۰)

۱) "بولے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ ہمارے لئے صاف بیان کردے وہ گائے کیسی ہے بیشک گائیوں میں ہم کو شبہ پڑ گیا اور اللہ چاہے تو ہم راہ پاجائیں گے"۔

۲) انہوں نے کہا دعا کریں ہمارے لئے اپنے رب سے کہ واضح طور پر بیان کرے ہمارے لئے کیسی ہو وہ گائے؟ بیشک گائے مشتبہ ہوگئی ہم پر، اور بیشک ہم "اگر اللہ نے چاہا" تو ہدایت پاجائیں گے"

سب سے پہلا سوال بھی ان کا " ما ھی " سے جس سے مراد ان کی گائے کے حال اور وصف کے متعلق سوال تھا اب پھر " ما ھی " سے سوال کیا جارہا ہے کیا انہوں نے پہلے جواب کو رد کر دیا اور دوبارہ سوال کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے سوال کو لوٹایا حال اور وصف کے متعلق سوال کیا پہلے جواب کو رد نہیں کیا۔

" بل لطلب الكشف الزائد على ما حصل واظهار انه لم يحصل البيان التام "

بلکہ انہوں نے پہلے جواب سے جو مطلب حاصل ہوا تھا اس کی مزید وضاحت طلب کی اور ظاہر کیا کہ ابھی تک ہمیں ہماری منشاء کے مطابق کامل جواب حاصل نہیں ہوا۔ (روح المعانی)

علامہ آلوسی کی وضاحت کے بعد اعلیٰ حضرت کا ترجمہ خوب سمجھ آیا "ہمارے لئے صاف بیان کردے" " قال قطرب جمع البقرة باقر وباقور وبقر " قطرب نے بیان کیا ہے کہ بقرۃ کی جمع باقر اور باقور اور بقر ہے یعنی " ان البقر " میں بقر جمع ہے۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی قول کے مطابق ہے "بیشک گائیوں میں ہم کو شبہ پڑ گیا"۔ " قال الزجاج ، المعنى ان جنس البقر " زجاج نے کہا ہے یہ جنس ہے، اس قول کے مطابق یہ ترجمہ بھی درست ہے "بیشک گائے ہم پر مشتبہ ہوگئی"۔ (از قرطبی)

﴿ اِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا ﴾: اعتذار عنه اى ان البقر الموصوف بالتعوين والصفرة كثير فاشتبه علينا " (بیضاوی)

انہوں نے عذر پیش کرتے ہوئے سوال کیا کہ بیشک گائے جس کے اوصاف بیان کر دیئے گئے کہ وہ ادھیڑ عمر ہو اور زرد رنگ کی ہو، اس قسم کی گائے بھی کثیر ہیں، اس لئے گائے ہم پر مشتبہ ہوگئی۔

﴿ وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰہُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴾ : جب انہوں نے " ان شاء الله " کہا تو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ان کو توفیق حاصل ہوگئی کہ انہوں نے عمل کرلیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" لو لم يستثنوا لما تبينت لهم آخر الابد "

اگر وہ ان شاء اللہ نہ کہتے تو ہمیشہ کے لئے ان پر واضح نہ ہوتا۔ (از روح المعانی)

یعنی وہ سوال کرتے رہتے ان کو جواب دیئے جاتے رہتے، مسئلہ نہ ان پر واضح ہوتا اور نہ ہی وہ عمل کرتے۔

" وفيه استعانة بالله وتفويض الأمر اليه والاعتراف بقدرته ونفاذ مشيئته "

ان شاء اللہ کہنے میں اللہ تعالیٰ کی امداد حاصل ہوتی ہے، اور تمام امور اللہ تعالیٰ کی طرف سپرد کر دیئے جاتے ہیں۔

اور رب تعالیٰ کی قدرت کا اعتراف پایا جاتا ہے اور اس کی مشیت کو جاری کیا جاتا ہے۔ (کبیر)

﴿ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴾ میں چند احتمال ہیں:

(۱) بیشک ہم اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہدایت پا جائیں گے یعنی ہمیں تمام اوصاف والی گائے مل جائے گی جو دوسری گائیوں سے ممتاز ہے تو ہم ذبح کرلیں گے۔

(۲) ہم بار بار جو سوال کر رہے ہیں ان شاء اللہ ہم اس پر ہدایت حاصل کریں گے ہمارا بار بار سوال کرنا کوئی گمراہی کے لئے نہیں۔

(۳) ان شاء اللہ گائے کے اوصاف بیان کرنے سے ہمیں قاتل کی راہنمائی مل جائے گی کیونکہ وہ گائے حاصل کر کے ذبح کرلیں گے۔

(اس تمام وضاحت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایمان پر قائم تھے کافر نہیں ہوئے تھے)۔

(ماخوذ از کبیر)

☆☆☆☆☆

﴿ قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِیْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِی الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِیَةَ فِیْهَا قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا یَفْعَلُوْنَ ﴾ (آیت ۷۱)

۱) ''کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے جس سے خدمت نہیں لی جاتی کہ زمین جوتے اور نہ کھیتی کو پانی دے بے عیب ہے جس میں کوئی داغ نہیں۔ بولے اب آپ ٹھیک بات لائے تو اسے ذبح کیا اور ذبح کرتے معلوم نہ ہوتے تھے''۔

۲) ''کہا بیشک وہ فرماتا ہے تحقیق وہ گائے ہے، نہیں اس سے کام لیا گیا کہ وہ ہل چلاتی ہے زمین میں۔ اور نہ ہی سیراب کرتی ہے کھیتی کو، سلامتی میں ہے۔ نہیں کوئی داغ اس میں انہوں نے کہا اب لائے ہو تم واضح بیان۔ تو ذبح کیا انہوں نے اسے اور وہ قریب نہیں تھے کرنے کے''۔

﴿ لَا ذَلُوْلٌ ﴾: '' ومعنى لا ذلول لم يذللها العمل '' مطلب یہ ہے کہ وہ گائے ایسی ہو کہ اس سے کام لے کر اسے ذلیل نہ کیا گیا ہو مختصر مفہوم یہ ہے کہ اس سے کام نہ لیا گیا ہو۔ (قرطبی)

﴿ تُثِیْرُ الْاَرْضَ ﴾: یہ جملہ صفت ہے '' ذلول '' کی '' تثير الارض اى تقلبها للزراعة '' زمین میں ہل چلانے کے لئے گائے کو جوتنا زمین کی مٹی کو ہل چلا کر الٹ پلٹ کرنا '' اثارة الارض '' کہا جاتا ہے۔ جب '' لا ذلــول '' کی صفت ہوا تو معنی ہو گیا۔ اس گائے سے کوئی کام بھی نہ لیا گیا اور نہ ہی اسے ہل جوتا گیا ہو۔

﴿ وَلَا تَسْقِی الْحَرْثَ ﴾: اور کھیتی کو پانی نہ دیا ہوا، مطلب یہ ہے کہ وہ گائے کنواں نہ چلی ہو۔

﴿ مُسَلَّمَةٌ ﴾: '' سلمها الله تعالىٰ من العيوب او اهلها من العمل او اخلص لونها من سلم له كذا اذا خلص ''

اللہ تعالیٰ نے اسے عیوب سے سلامتی میں رکھا ہو۔ اور اسی طرح اس کے مالکوں نے اسے کام

سے سلامتی میں رکھا ہو، یعنی اس سے کام نہ لیا ہو۔ اور اس کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ اس کا رنگ خالص ہو وہ رنگ عیب سے سلامتی ہو۔ اس لئے کہ ''مسلم لہ کذا، خلص لہ'' (خالص ہونے) کے معنی میں بھی استعمال ہوتا رہتا ہے۔ (از بیضاوی)

﴿ لَا شِيَةَ فِيهَا ﴾: یہ مصدر ہے یعنی " وشی یشی وشیا شیة " استعمال ہوتا ہے۔ اس کا اصل لغوی معنی " اذا خلط بلونه لونا آخر " جب ایک رنگ سے دوسرا رنگ ملا دیا جائے۔ اس لحاظ پر لغوی معنی یہ ہوگا کہ اس کے زرد رنگ میں کوئی اور رنگ نہ ملا ہوا ہو۔ مراد یہی ہے کہ اس میں کوئی داغ دھبہ نہ ہو۔

﴿ قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ﴾: انہوں نے کہا اب تم لائے ہو واضح بیان (بالحق) ای بالبیان التام الذی لا اشکال (خازن) یعنی اب تم نے بہت مکمل اور واضح بیان لایا ہے جس کی وجہ سے ہمیں سمجھنا مشکل نہیں رہا۔ خیال رہے حق یہاں باطل کا مقابل نہیں ورنہ ان کا یہ کہنا کفر ہوتا کہ پہلے تم باطل لاتے رہے اب حق لائے۔

﴿ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴾: تو انہوں نے اسے ذبح کیا وہ قریب نہیں تھے کرنے کے

خیال رہے کہ نحویوں کا لفظ " کاد " میں کلام ہے لیکن مشہور قول یہ ہے کہ یہ عام فعلوں کی طرح ہی مثبت ہوتا ہے جب اس پر حرف نفی نہ ہو۔ اور اگر اس پر حرف نفی ہو تو منفی ہوگا خواہ ماضی ہو یا مضارع۔ اسی مشہور قول کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہے اور یہی صحیح بھی ہے۔

وہ ذبح کیوں نہیں کرنا چاہتے تھے؟

اس کی چند وجوہ تھیں جن کے پیش نظر وہ ذبح کرنا تو نہیں چاہتے تھے لیکن اب ان کو اس کام کے نہ کرنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا لہٰذا انہیں ذبح کرنا پڑا۔

(۱) " لخوف الفضیحة " ایک وجہ یہ تھی کہ ان کو خوف لاحق تھا کہ اگر ہم نے ذبح کر دیا اور اس کا گوشت مقتول شخص کو مار دیا تو وہ زندہ ہو جائے گا اور پتہ چل جائے گا کہ قاتل کون ہے قاتل تو وہ خود ہی تھے اس لئے وہ رسوائی کے ڈر سے ذبح نہیں کرنا چاہتے تھے۔

(۲) "لعزة وجودها بهذه الاوصاف جميعا" اور وجہ یہ تھی کہ وہ اس لئے ذبح نہیں کرنا چاہتے تھے کہ وہ سمجھ رہے تھے کہ ان تمام اوصاف والی گائے کا ملنا تو مشکل ہے۔

(۳) "لغلاء ثمنها" اور وجہ یہ تھی کہ وہ اس لئے ذبح نہیں کرنا چاہتے تھے کہ وہ کہہ رہے تھے کہ اس کی بہت قیمت ہے کیونکہ اس وقت عام گائے کی قیمت تین دینار تھی لیکن یہ گائے ان کو گائے کا چمڑا بھر کر اس کے برابر سونا وغیرہ ادا کرنے کی قیمت سے مل رہی تھی۔ (از خازن)

بہت بھاری قیمت سے گائے حاصل کرنے کی وجہ:

اس وقت عام طور پر گائے کی قیمت تین دینار تک ہوتی تھی لیکن انہوں نے سوال کر کے اپنے لئے مشکل پیدا کر لی۔ تمام اوصاف کسی گائے میں بیک وقت پائے جانے دشوار نظر آئے۔ آخر کار تلاش کرتے کرتے انہیں ایک بیوہ اور اس کے یتیم بچے کے پاس ایسی گائے نظر آئی جس میں بیان کردہ جمیع اوصاف موجود تھے بوڑھی نہیں تھی اور بچھڑی نہیں تھی بلکہ درمیانی عمر کی تھی۔ زرد تیز رنگ تھا دیکھنے والوں کو خوش کرتا تھا۔ زمین میں اس نے ہل نہیں چلایا تھا اور نہ ہی کھیتی کو سیراب کیا تھا اور اس میں کوئی عیب اور داغ دھبہ نہیں تھا کیونکہ اس یتیم کے بوڑھے نیک پرہیز گار باپ نے اپنی ایک بچھڑی کو جنگل میں چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں دے دیا تھا کہ میرا بچہ کچھ بڑا اور سمجھدار ہو کر اسے لے جائے گا وہ بچہ بھی والدین کا فرمانبردار تھا اپنے باپ کی وفات کے کچھ عرصہ بعد وہ اپنی گائے جنگل سے لے آیا تھا، اسی گائے میں تمام اوصاف موجود تھے موٹی تازی تھی خوبصورت تھی۔

بنی اسرائیل کو اس کے چمڑے میں جتنی مقدار میں سونا آسکے اتنی مقدار سونا بطور قیمت ادا کرنا پڑا سبحان اللہ مالک الملک نے اپنے نیک بندے کی گائے کی جنگل میں حفاظت کی۔ اور اس نیک بندے کی بیوہ اور اس کے یتیم بچے کو کثیر مقدار میں مال و دولت عطا فرمایا۔

بنی اسرائیل اگرچہ گائے کی بھاری قیمت ادا کرنے پر بخوشی رضامند نہیں تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ اگر ہمارا مقتول زندہ ہو گیا تو ہمارا اپنا ہی عیب ظاہر ہو گا لیکن انہیں پھر بھی گائے مجبوراً ذبح کرنی پڑی کیونکہ اب ان کے پاس کوئی عذر باقی نہیں رہ گیا تھا اگرچہ وہ ذبح کرنا نہیں چاہتے تھے۔ (ماخوذ از کبیر)

گائے ذبح کرنے میں حکمت:

ایک وجہ تو یہی تھی کہ نیک آدمی کے یتیم بچے اور اس شخص کی بیوہ کو کثیر مال عطا کرنا تھا اس لئے گائے ذبح کرنے کا حکم دیا اور بنی اسرائیل کے ذہنوں میں یہ بات ڈال دی کہ وہ سوال کرتے رہیں اس طرح وہ گائے کہیں اور نہ مل سکی۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ گائے کی قربانی کا طریقہ پہلے سے چلا آرہا تھا اور وہ لوگ گائے کی قربانی کو عظیم سمجھتے تھے اس لئے انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تاکہ ان کے ذہن اسے قبول کرلیں کہ گائے کی قربانی میں یہ اثر ہوگا۔

تیسری وجہ یہ تھی کہ مقتول کو اس عجیب انداز سے زندہ کرکے بتادیا کہ اللہ تعالیٰ جس طرح چاہے اسی طرح مردوں کو زندہ فرمالیتا ہے۔

چوتھی وجہ یہ تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کی برتری ان پر واضح ہوجائے اور آپ کا معجزہ ظاہر ہوجائے۔

پانچویں وجہ یہ تھی کہ گاؤ پرستی ان کے آباء واجداد نے دیکھ کر بچھڑے کی پوجا شروع کرلی تھی ان کو گائے کے ذبح کرنے کا حکم دے کر تنبیہ کی کہ گائے خدا نہیں ہوسکتی۔ جو خود ذبح ہوجائے وہ خدا کیسے۔

فائدہ : اس واقعہ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ کسی چیز کے جب اوصاف بیان کردیئے جائیں تو ایسے پتہ چلتا ہے گویا کہ وہ چیز سامنے آگئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" لا تصف المرأة المرأة لزوجها حتى كانه ينظر اليها " (رواه مسلم)

کوئی عورت اپنے خاوند کے سامنے دوسری عورت کے اوصاف نہ بیان کرے یہ ایسا ہی جیسا کہ وہ شخص اس عورت کو دیکھ رہا ہے۔

" فجعل النبى ﷺ الصفة تقوم مقام الرؤية "

نبی کریم ﷺ نے اوصاف بیان کرنے کو دیکھنے کے قائم مقام قرار دیا۔

(از قرطبی)

جب صرف اوصاف بیان کرنے سے منع کیا تو عورتوں کا بے حجاب ہوکر، سر سے ننگے، اور بازو ننگے، گریبان کھول کر سڑکوں اور بازاروں میں گھومنا کہاں جائز ہوگیا۔

﴿ وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴾ (آیت ۷۲)

۱) ''اور جب تم نے ایک خون کیا تو ایک دوسرے پر اس کی تہمت ڈالنے لگے اور اللہ کو ظاہر کرنا جو تم چھپاتے تھے''

۲) ''اور جب تم نے قتل کیا ایک شخص کو، تو تم نے جھگڑا کیا اس میں، اور اللہ ظاہر کرنے والا ہے جو تم چھپاتے تھے۔

اس آیہ کریمہ میں واقعہ کی ابتداء ہے قرآن پاک میں درحقیقت واقعات کو صرف بطور واقعات بیان کرنا مقصود نہیں ہوتا، بلکہ ان واقعات سے تدبر حاصل کرنا، نصیحت پکڑنا، اور قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت میں غور وفکر مقصود ہوتا ہے۔ معنوی طور پر یہ آیت ﴿ وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ ﴾ ......الخ پہلے ہے اور ﴿ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ ﴾ بعد میں ہے۔

اسی طرح ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا قَيِّمًا ﴾ میں معنوی لحاظ پر " الکتاب " کے بعد " قیما " کا درجہ ہے اور ﴿ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ﴾ کا بعد میں۔ قرآن پاک میں کئی مقامات میں یہی صورت ہے وجہ یہی ہے کہ لوگ قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت میں غور وفکر کریں۔ (از قرطبی)

﴿ وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا ﴾ : لفظ " نفس " مؤنث سماعی ہے۔ اسی وجہ سے " فیھا " میں ضمیر مؤنث ہے جو لفظ نفس کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اگر چہ معنی یہاں مذکر والا لیا ہوا ہے، یعنی جب تم نے قتل کیا ایک شخص کو۔ خیال رہے معنوی طور پر " نفس " مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

﴿ فَادّٰرَءْتُمْ ﴾ : اصل میں " تدارأتم " ہے باب تفاعل کے فاء کلمہ میں دال واقع ہوا، تاء کا دال سے تبدیل کرنا جائز ہے۔ پھر واجب ہے کہ دال کو دال میں ادغام کیا جائے۔ ادغام کرنے کی صورت میں ابتداء ساکن لفظ سے لازم آرہی تھی۔ اس لئے ہمزہ کو شروع میں بڑھا دیا " ادارأتم " ہوگیا۔

(فادارأتم فیها) اختصتم فی شانها اذ المتخاصان یدفع بعضها بعضا "
تم نے اس میں جھگڑا کیا جھگڑا کرنے والے بعض بعض سے مدافعت کرتے ہیں۔

یعنی اصل میں " تدارئی " کا معنی ہے " تدافع " ہے۔تدافع کا کنایۃ کے طور پر معنی "اختصام " (جھگڑا کرنا) ہے اختصام ملزوم ہے تدافع کا یعنی ذکر لازم مراد ملزوم ہے۔یا حقیقی معنی ہی مراد لے لیا جائے:

" فادارأتم فیها ای تدافعتم بان طرح قتلها کل من نفسه الی صاحبه "
جب تم نے ایک شخص کو قتل کیا تو ہر ایک تم میں سے ایک دوسرے پر قتل کی تہمت لگا رہا تھا۔

اعلیٰ حضرت نے حقیقی معنی کے مطابق ہی ترجمہ کیا (تو ایک دوسرے پر اس کی تہمت ڈالنے لگے) لیکن راقم نے مجازی معنی کے مطابق ترجمہ کیا (تو تم نے جھگڑا کیا اس میں)۔اگر چہ قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے پہلے مجازی معنی بیان کیا پھر حقیقی معنی بیان کیا۔اس پر شیخ زادہ رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا:

" وقدم الوجه الاول لان الكناية ابلغ "
(وجہ اول کو مقدم ذکر کیا کہ کنایہ ابلغ ہے)

لیکن راقم نے مجازی معنی صرف اس لئے تحریر کیا ہے کہ طلباء کرام کے ذہنوں میں مختلف بحثیں آتی ہیں۔

﴿ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴾ : مظهره لا محاله ، اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا ہے یقیناً۔ " اخراج " کا حقیقی معنی ہے "نکالنا" لیکن یہاں معنی ہے "ظاہر کرنا" کیونکہ یہ "کتمان" (چھپانے) کے مقابل ذکر ہے البتہ علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے " لا محاله " سے تفسیر کی۔جس کا معنی ہے "یقیناً"۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسم فاعل جب ضمیر سے خالی نہ ہو اور مبتداء کی خبر واقع ہو تو اس میں تقویت کا معنی پایا جاتا ہے۔ ﴿ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴾ "جو تم چھپاتے تھے" یعنی قاتل اپنے آپ کو ظاہر نہیں کر رہا تھا اور ایک دوسرے پر الزام لگا رہے تھے۔

خیال رہے " مخرج " مستقبل کی حکایت ہے (اللہ ظاہر کرنے والا ہے) یعنی اگر چہ نبی کریم ﷺ پر جب آیۃ کریمہ کا نزول ہوا تو اس لحاظ پر واقعہ ماضی کا ہے۔ جب بنی اسرائیل سے ارشاد فرمایا گیا اس

وقت کے لحاظ پر مستقبل کر ذکر تھا، اس لئے ترجمہ بھی مستقبل کا کرلیا جاتا ہے۔ (از بیضاوی و شیخ زادہ)

فائدہ : "تدل الآیة علی ان ما یسره العبد من خیر او شر دام ذلک منه فان الله سیظهره قال علیه الصلوة والسلام ان عبدا لو اطاع الله من وراء سبعین حجابا لأظهر ذلک علی السنة الناس وکذلک المعصیة وروی ان الله تعالیٰ اوحی الی موسیٰ علیه السلام قل لنبی اسرائیل یخفون لی اعمالهم وعلی ان اظهرها لهم" (کبیر)

آیۂ کریمہ سے یہ مسئلہ ثابت ہو رہا ہے کہ جب کوئی انسان بھی نیکی یا برائی چھپ کر کرے اسی طریقہ پر ہمیشہ سے اس کا عمل ہو، تو اللہ تعالیٰ اسے ظاہر فرما دیتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: بیشک بندہ اگر اللہ تعالیٰ کی اطاعت ستر پردوں کے پیچھے سے کرے اللہ تعالیٰ اسے لوگوں کی زبانوں پر ظاہر فرما دیتا ہے۔ (یعنی لوگ اس نیک آدمی کی نیکیوں کا چرچا کرتے رہتے ہیں کہ فلاں جگہ ایک بزرگ ہستی ہے جو بہت نیک کار ہیں)

اور اسی طرح معصیت کو بھی ظاہر فرماتا ہے روایت میں آتا ہے "بیشک اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی" اے موسیٰ بنی اسرائیل کو کہہ دو وہ جو عمل (معصیت کے) مخفی طور پر کرتے ہیں میں ان کو ظاہر کر دیتا ہوں۔

قابل توجہ: قرآن پاک کے اکثر مقامات پر ذکر خاص اور مراد عام ہوتا ہے۔ لیکن اس مقام پر ذکر عام ہے جو عام کو بھی اگرچہ شامل ہے ﴿مَا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ﴾ **یتناول کل المکتومات ثم ان الله تعالیٰ اراد هذه الواقعة**" یعنی ﴿مَا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ﴾ میں ہر چھپی ہوئی چیز کا ذکر ہے کہ "اللہ تعالیٰ ظاہر فرمانے والا جو کچھ بھی تم چھپاتے ہو۔ لیکن پھر اس سے مراد خاص ان کے قتل کا واقعہ لے لیا۔

(از کبیر)

☆☆☆☆☆

﴿ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا كَذَالِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيْكُمْ آيَاتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴾ (آیت ۷۳)

۱) ''تو ہم نے فرمایا اس مقتول کو اس گائے کا ایک ٹکڑا مارو اللہ یوں ہی مردے جلائے گا اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے کہ کہیں تمہیں عقل ہو''

۲) ''تو ہم نے کہا مارو اس کو (مقتول کو) اس کا (گائے کا) بعض حصہ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرے گا اور دکھاتا ہے تمہیں اپنی نشانیاں تا کہ تمہیں عقل آ جائے۔

﴿ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ ﴾ : کا عطف ہے '' واذ قتلتم نفسا فادارأتم '' پر اور درمیان میں جملہ معترضہ ہے۔

﴿ بِبَعْضِهَا ﴾ : سے مراد گائے کا کون سا حصہ ہے؟ اگرچہ اس میں کئی اقوال ہیں لیکن صحیح یہی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مطلق ذکر کیا ہے تو اس کو اپنے اطلاق پر رہنے دیا جائے۔

مطلب یہ ہوا کہ جب تم نے ایک مقتول کے متعلق جھگڑا کیا کہ اس کا قاتل کون ہے اور ہر ایک دوسرے پر الزام لگانے لگا تو ہم نے کہا اس مقتول کو گائے ذبح کر کے اس کے گوشت کا کوئی ٹکڑا لے کر مقتول کے جسم کے کسی حصہ پر مار دو تو وہ زندہ ہو جائے گا۔

﴿ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ﴾ : ''اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کرے گا'' رب تعالیٰ کے حکم کے مطابق جب انہوں نے عمل کر لیا '' فضربوه فحيي '' کہ انہوں نے گائے ذبح کر کے اس کا گوشت مقتول کو مارا تو وہ زندہ ہو گیا اس نے بتایا مجھے کس نے قتل کیا ہے پھر وہ مردہ حالت میں ہو گیا۔ اس عجیب اور انوکھے انداز سے رب تعالیٰ نے ان کے سامنے اور ان کے فعل سے مردہ کو زندہ کیا جس میں ان کو یہ کہنے کی جرات بھی نہ ہو سکی کہ یہ موسیٰ علیہ السلام کا جادو ہے۔

تو رب تعالیٰ نے اس واقعہ سے ان لوگوں کو اور قیامت تک آنیوالے لوگوں کو اپنی قدرت اور قیامت قائم ہونے کے متعلق بتا دیا ﴿ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ﴾ ای جميعا يوم القيامة '' کہ

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمام مردوں کو اسی طرح زندہ فرمادے گا جس طرح اس مردہ کو تمہارے سامنے (اے بنی اسرائیل) زندہ کر دیا، اور بعد میں آنے والو جب تمہیں قطعی اور یقینی خبروں سے معلوم ہوجائے گا تو تم بھی سمجھ لو کہ قیامت ضرور آنی ہے۔ اور رب تعالیٰ کی قدرت سے بعید نہیں کہ وہ تمام مردوں کو زندہ کردے۔ (از شیخ زادہ)

﴿لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾: لکی یکمل عقلکم ، تاکہ تمہیں کامل عقل حاصل ہوجائے اس واقعہ کا بھی تمہیں یقین ہوجائے اور قیامت کے قائم ہونے اور تمام مردوں کے زندہ ہونے کا بھی تمہیں پتہ چل جائے۔ (از بیضاوی)

فائدہ جلیلہ : اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے دلوں میں ڈال دیا کہ وہ سوال کرتے رہیں اور ان کو جواب دیئے جاتے رہیں اس طرح ان کے لئے اس قسم کی گائے عام لوگوں سے حاصل ہونی اور عام قیمت پر مشکل ہوگئی۔

- ☆ اللہ تعالیٰ نے ابتدائی طور پر ہی اسے زندہ نہیں فرمایا تاکہ بہت سے فوائد حاصل ہوجائیں۔
- ☆ اس واقعہ سے ایک تو یہ حاصل ہوا کہ رب تعالیٰ کی راہ میں قربانی کرنا اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ذریعہ ہے اور اس کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔
- ☆ اور واجب کے ادا کرنے کی ترغیب دلائی گئی کہ ان لوگوں کو جو حکم دیا گیا تھا وہ اس پر عمل کریں۔ اگر چہ انہوں نے عمل کرنے میں کچھ دیر کی لیکن آخر کار عمل کر لیا۔
- ☆ اور اس میں یتیم کا نفع بھی تھا کہ ان لوگوں نے سوال کر کے اپنے لئے مشکل پیدا کر لی۔ بہت بھاری قیمت ادا کر کے وہ گائے حاصل کی، کیونکہ وہ گائے نیک شخص کے یتیم بچے سے ملی اور وہ سارا مالی فائدہ اسے حاصل ہوا۔
- ☆ اور اس واقعہ سے یہ فائدہ بھی حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ پر توکل رکھنے میں برکت ہوتی ہے لوگ عام طور پر جانوروں کو اکیلے جنگل میں نہیں چھوڑتے کیونکہ درندوں کا خطرہ ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے نیک بندے نے اسی کی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنی بچھڑی کو جنگل میں چھوڑ دیا رب تعالیٰ نے بھی اسے اپنی حفاظت میں رکھا۔

☆ اور پتہ چلا کہ بزرگوں کا طریقہ چلا آ رہا ہے کہ وہ اپنی اولاد سے شفقت کرتے تھے اپنے بچے پر شفقت کرتے ہوئے تو اس نیک بندے نے اپنی بچھڑی کو رب تعالیٰ کی حفاظت میں دے دیا تھا۔

☆ جو شخص اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کو طلب کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ اس واقعہ سے سبق حاصل کرتے ہوئے پہلے قربانی کرے، اور جس جانور کو قربانی کرے وہ اچھا خوبصورت اور قیمتی ہو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بہت خوبصورت، موٹی تازی اونٹنی تین سو دینار سے خریدی اور قربانی کی۔

☆ اسی واقعہ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ مؤثر حقیقی ممکنات میں صرف اللہ تعالیٰ ہے ظاہری اسباب صرف علامات ہیں ان میں ذاتی طور پر کوئی اثر نہیں۔ ہاں رب تعالیٰ جس چیز میں جو تاثیر رکھ دے وہی اس میں پائی جائے گی۔ بھلا یہ بات کس کے عقل میں آ سکتی ہے کہ مردہ جانور کے گوشت سے مردہ زندہ ہو جائے؟ صرف اور صرف رب تعالیٰ کی قدرت سے اس میں یہ تاثیر پیدا ہوئی۔

☆ اس واقعہ سے اس بات پر متنبہ کیا گیا ہے کہ جو شخص یہ چاہے کہ اسے اپنے سب سے بڑے دشمن یعنی اس کو حقیقی موت دینے والے کا پتہ چل جائے، وہ اس کا دشمن جو اس کے دل کو مردہ کر کے ایمان سے دور کرنے والا اور حق اعتقاد سے دور کرنے والا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ اپنے حیوانی نفس جو گائے کی طرح ہے جس کی زندگی خواہشات پر مبنی ہے اسے ریاضت کی چھری سے ذبح کرے۔

وہ نفس حیوانی بچپن کی حرص وخواہشات نہ رکھتا ہو، کیونکہ ان پر مؤاخذہ نہیں اور اس نفس حیوانی میں بڑھاپا بھی نہ ہو کیونکہ بڑھاپے میں خود بخود سستی آ جاتی ہے خواہشات کی شدت ختم ہو جاتی ہے۔ اسے ذبح کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہتی، اس لئے ضروری ہے کہ نفس حیوانی کی جوان گائے جس میں ہر طرح کی شوخی پائی جاتی ہے ہر طرح کی خواہشات پائی جاتی ہیں اسے ریاضت کی چھری سے ذبح کر دے۔ اور اس کا اثر جب دل کو پہنچے گا تو وہ زندہ ہو جائے گا خود بتا دے گا میرا قاتل شیطان ہے۔ میرا قاتل اسلام سے دور ہے۔ میرا قاتل محبت مصطفیٰ کریم ﷺ سے دور ہوتا ہے۔

(ماخوذ از بیضاوی وشیخ زادہ بتصرف)

تنبیہ: ایک روایت میں ذکر ہے کہ اس آدمی کے قتل اور گائے کے ملنے اور ذبح کرنے اور مردہ کو زندہ کرنے میں چالیس سال گزر گئے لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ نے اسے رد فرمایا:

" ان هذه الرواية على خلاف ظاهر القرآن ، لان الفاء في قوله تعالى ﴿ فقلنا اضربوه ببعضها ﴾ للتعقيب "

کہ یہ روایت قرآن پاک کے ظاہر کے خلاف ہے کیونکہ اس میں " فاء " جو " فقلنا " میں آ رہی ہے وہ تعقیب کے لئے جو زیادہ وقفہ کا تقاضا نہیں کرتی۔ اس لئے ان کے سوالات اور رب تعالیٰ کی طرف سے جوابات اور گائے کو حاصل کر لینے میں زیادہ وقت نہیں گزرا۔ البتہ تین دونوں کا ذکر خازن وغیرہ میں ملتا ہے کہ بچہ گائے کو جنگل سے لا رہا تھا تو راستے میں ایک فرشتہ انسانی شکل میں خریدار کی حیثیت سے ملا تو بچے نے کہا میں والدہ کی اجازت کے بغیر نہیں فروخت کر سکتا۔ تین دن تک جنگل میں چرانے کے لئے لے جانے اور واپس لانے کے دوران وہ ملتا رہا، اسی نے بچے کو بتایا کہ اس کی اتنی قیمت وصول کرنا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

طلباء کرام کی توجہ کے لئے: " اضربوه " میں منصوب متصل کی ضمیر نفس کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اگر چہ وہ مؤنث ہے لیکن وہ " شخص " کا معنی دے رہا ہے جو مذکر ہے لہذا مذکر کی ضمیر کا لوٹانا درست ہے۔ ہر وہ لفظ جس میں دو حیثیتیں ہوں اس کا یہی قانون ہے کہ اس پر تذکیر والے احکام جاری کریں یا تانیث والے دونوں ہی جائز ہیں۔ (از کبیر)

نیک باپ کا بچہ بھی نیک تھا: وہ بچہ اپنی ماں کا بڑا فرمانبردار تھا، جب اسے گائے کے بدلہ میں بہت مال و دولت حاصل ہوا تو اس کے باوجود اس کے نیک ہونے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ رات کا تہائی حصہ نماز اور عبادت میں گزارتا اور رات کا تہائی حصہ سونے میں گزارتا، اور رات کا تہائی حصہ اپنی والدہ کی خدمت گزاری میں رہتا۔

گائے کے فروخت کرنے سے پہلے وہ چھوٹا بچہ ہونے کے باوجود جنگل سے لکڑیاں لا کر بازار میں بیچتا جس کی آمدنی کا تہائی حصہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا۔ اور تہائی حصہ اپنی والدہ کو عطا کرتا اور

تہائی حصہ اپنے خرچ کے لئے رکھ لیتا۔

ایک دن اس کی والدہ نے اسے بتایا کہ تمہارا باپ جنگل میں ایک بچھڑی چھوڑ آیا تھا اب تو وہ گائے بنی ہوگی اسے تلاش کرو اگر مل جائے تو لے آؤ (باقی واقعہ پہلے گزر گیا)۔ (از شیخ زادہ)

اعتراض : اس واقعہ میں ایک نشانی پائی گئی ہے کہ مردہ کو زندہ کر دیا گیا۔ لیکن ﴿ ویریکم آیاتہ ﴾ میں "آیات" کو جمع ذکر کیا گیا ہے یہ کیسے درست ہے؟

جواب : بظاہر یہ ایک نشانی ہے لیکن حقیقت میں کئی نشانیوں کو مستلزم ہے اس لئے کہ اس واقعہ سے یہ سمجھ آیا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں تمام چیزیں ہیں۔ جس نے اپنی قدرت کاملہ سے مردہ جانور کے گوشت سے مقتول کو زندہ کیا۔ اور یہ ثابت ہوا کہ تمام معلومات اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں، کہ اس نے گائے میں جتنی علامات بیان فرمائیں ان علامات والی گائے مل گئی اور جیسا بتایا کہ اس کے گوشت سے مقتول زندہ ہوگا ایسا ہی ہوا۔ اور پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز کو موجود کرنے اور پیدا کرنے میں مختار ہے۔

اور اسی واقعہ سے موسیٰ علیہ السلام کی صداقت کا پتہ چلا کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے احکام جو پہنچائے وہ اسی طرح ثابت ہوئے ان میں ذرا بھر بھی فرق نہیں آیا۔ اور جو لوگ قاتل نہیں تھے لیکن ان پر قتل کی تہمت لگائی جارہی تھی اللہ تعالیٰ نے ان کو بری الذمہ قرار دیا۔ (از کبیر)

اعتراض : وہ لوگ تو پہلے سے ہی عقل مند تھے اسی لئے تو بار بار سوال کر رہے تھے ان کے سوالات ان کی عقل مندی پر دلالت کر رہے ہیں وہ دیوانے پاگل نہیں تھے کسی عاقل کو تو یہ نہیں کہا جا سکتا:

"انی عرضت علیک الآیۃ الفلانیۃ لکی تصیر عاقلا"

بیشک میں تم پر یہ نشانی پیش کر رہا ہوں تاکہ تم عاقل ہو جاؤ۔

﴿ وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾

"وہ تمہیں دکھاتا ہے اپنی نشانیاں تاکہ تم عقل حاصل کرو" کا کیا مطلب ہے؟

جواب: یہ الفاظ ظاہر پر مبنی نہیں بلکہ ان کی تاویل کی گئی ہے ایک یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے

" لعلکم تعملون علی قضیة عقولکم " تا کہ تمہیں تمہاری عقلوں کے فیصلہ کے مطابق علم حاصل ہو جائے کہ وہ ذات جسے ایک مردہ کو زندہ کرنے کی قدرت حاصل ہے اسے تمام مردوں کو زندہ کرنے کی قدرت حاصل ہے جب تمہیں یہ علم حاصل ہوگا تو تمہیں قیامت کا یقین بھی حاصل ہوگا۔ (کبیر)

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے کمال عقل سے تفسیر کی۔ اسکی وجہ بھی اس اعتراض کو دور کرنا مقصود تھا کہ ان کو اگرچہ عقل حاصل تھی لیکن کامل عقل حاصل نہیں تھی۔ راقم کے نزدیک یہ الفاظ اپنے ظاہر پر ہیں گویا کہ بنی اسرائیل کو ان کی کجرویوں (ٹیڑھی چالوں) کی وجہ سے جانوروں کی طرح بے عقل کہا گیا کہ تم ہو تو بے عقل لیکن اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تا کہ تمہیں عقل آ جائے۔

مسئلہ: ہماری شریعت میں جب کوئی شخص اپنے موروث لہ (جس کا اس نے وارث بننا ہے) کو قتل کر دے تو وہ اس کا وارث نہیں بن سکتا۔ بنی اسرائیل میں جس شخص نے قتل کیا تھا کیا وہ وراثت کا حقدار تھا یا نہیں؟ اور اس قاتل کو وراثت دی گئی یا نہیں۔

صحیح یہ ہے کہ وہ وراثت کا حقدار تو تھا اسی لئے اس نے اپنے موروث لہ کو قتل کیا تھا۔ لیکن اس کا وراثت سے محروم ہونا صراحۃً کہیں ذکر نہیں۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ ایک شریعت کا مسئلہ دوسری شریعت میں ثابت کرنا مشکل کام ہے۔ (از کبیر)

مسئلہ قسامت: ہماری شریعت میں قانون یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مقتول کسی محلہ کی گلی وغیرہ مین پایا جائے لاش اس کی کسی گھر میں نہ ہو اس کے قاتل کا پتہ نہ چل رہا ہو۔ تو محلہ کے پچاس آدمیوں سے قسم لی جائے۔ ان پچاس آدمیوں سے قسم لی جائے گی جن کو مقتول کا ولی منتخب کرے گا۔ وہ قسم اٹھائیں:

" باللہ ما قتلناہ و لا علمنالہ قاتلا "

قسم ہے اللہ تعالیٰ کی نہ ہم نے اس شخص کو قتل کیا اور نہ ہی ہمیں علم ہے کہ ا۔ کا قاتل کون ہے

جب پچاس آدمی قسم اٹھالیں تو تمام اہل محلہ کے عاقلہ (ان کے پدری رشتہ دار اور ان کے ہر شعبہ کے ساتھی) پر دیت لازم آ جائے گی۔

سعید ابن مسیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے یہود کے پچاس آدمیوں سے قسم لی تھی جب

مقتول ان کے محلہ میں پایا گیا تھا ان کے قسم اٹھا لینے کے بعد ان تمام پر دیت مقرر فرما دی۔

(روہ مسند بزار)

خیال رہے کہ مقتول کے ولی سے قسم طلب نہیں کی جائے گی، کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے جو آپ نے دوران خطبہ فرمایا:

" البينة على المدعى واليمين على المدعى عليه " (رواه الترمذی)

مدعی پر گواہ لازم ہیں اور مدعی علیہ پر قسم۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ جن پچاس آدمیوں کو قسم کے لئے ولی نے منتخب کیا تھا۔ اگر ان میں سے کوئی ایک قسم اٹھانے سے انکار کر دے تو اسے قید کر لیا جائے جب تک وہ قسم نہ اٹھائے اسے نہ چھوڑا جائے۔ اور یہ بھی خیال رکھیں کہ اگر محلہ کی آبادی کم ہو۔ پچاس مرد پورے نہیں ہو رہے، بلکہ تھوڑے ہیں تو ان سے قسم اتنی مرتبہ لیں کہ اس سے قسم کی تعداد پچاس مرتبہ مکمل کر لی جائے۔ کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ قسم لی لیکن آدمی انچاس تھے، تو آپ نے ایک شخص سے دو مرتبہ قسم لے لی تھی، اس طرح تعداد پچاس ہو گئی تھی۔

اور یہ بھی خیال رہے قسم صرف عقل مند مردوں سے لی جائے گی، مجنونوں (پاگلوں) سے نہیں لی جائے گی اور عورتوں اور بچوں سے بھی قسم نہیں لی جائے گی۔ (از هداية)

مختصر اور ضرورت کے مطابق مسئلہ بیان کر دیا ہے زیادہ تفصیل فقہ کی کتب میں دیکھی جائے۔

☆☆☆☆☆

﴿ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْاَشَدُّ قَسْوَةً وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾ (آیت ۷۴)

۱) ''پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے تو وہ پتھروں کی مثل ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ کرے۔ اور پتھروں میں تو کچھ وہ ہیں جن سے ندیاں بہہ نکلتی ہیں۔ اور کچھ وہ ہیں جو پھٹ جاتے ہیں تو ان سے پانی نکلتا ہے اور کچھ وہ ہیں جو اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں اور اللہ تمہارے کوتکوں سے بے خبر نہیں''۔

۲) ''پھر سخت ہو گئے دل تمہارے، اس کے بعد، تو وہ پتھروں کی طرح ہیں بلکہ (ان سے) زیادہ سخت۔ اور بیشک بعض پتھر وہ ہیں کہ جاری ہوتی ہیں ان سی نہریں۔ اور بیشک ان سے بعض وہ ہیں جو پھٹ پڑتے ہیں تو نکلتا ہے ان سے پانی۔ اور بیشک بعض ان سے وہ ہیں جو گر پڑتے ہیں اللہ کے ڈر سے، اور نہیں ہے اللہ غافل اس سے جو تم عمل کرتے ہو''۔

﴿ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ ﴾ : القسوۃ کا معنی صلابت (سختی) شدت، خشک ہونا۔ یہاں مراد یہ ہے کہ تمہارے دل اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے اور اللہ تعالیٰ کی آیات پر یقین رکھنے سے خالی ہو گئے۔ ﴿ قُلُوْبُكُمْ ﴾ میں خطاب کسے ہے؟ ابوالعالیہ اور قتادہ وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ یہ خطاب تمام بنی اسرائیل کو ہے کیونکہ سب کا طریقہ یہی تھا آج توبہ کرنا، کل پھر جانا۔

" وقال ابن عباس المراد قلوب ورثة القتيل لانهم حين حيى واخبر بقاتله وعاد الى موته انكروا قتله وقالوا كذب "

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ خطاب مقتول کے ورثاء کو ہے۔ کیونکہ جب وہ زندہ ہوا اور اس نے اپنے قاتل بتائے، پھر وہ فوت ہو گیا، تو وہ کہنے

لئے کہ ہم نے قتل نہیں کیا ہے اس نے جھوٹ بولا ہے۔

﴿مِنۢ بَعۡدِ ذَٰلِكَ﴾ : یہ واقعہ دیکھنے کے بعد جو اللہ تعالیٰ کی قدرت کی عظیم نشانی تھی پھر ان کا انکار کرنا یقیناً سخت دلی کی وجہ سے تھا، رب تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہارے دل تو پتھر کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت ہو گئے۔ یقیناً ان سے بڑھ کر کوئی دل کا اندھا نہیں ہو سکتا۔ ان سے بڑھ کر اپنے برے اعمال کی وجہ نبی کی تکذیب کرنے والا کوئی نہیں ہو سکتا۔

فائدہ:

☆ "عن عبد اللہ بن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ لا تکثروا الکلام بغیر ذکر اللہ فان کثرۃ الکلام بغیر ذکر اللہ قسوۃ للقلب وان ابعد الناس من اللہ القلب القاسی"

(رواہ الترمذی)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کے ذکر کے بغیر زیادہ کلام نہ کرو، کیونکہ اللہ کے ذکر کے بغیر زیادہ کلام کرنا دل کو سخت کرتا ہے اور سب لوگوں سے اللہ تعالیٰ سے دور ہونے والا وہی شخص ہے جس کا دل سخت ہو۔

☆ "عن انس قال قال رسول اللہ ﷺ اربعۃ من الشقاء جمود العین وقساء القلب وطول الأمل والحرص علی الدنیا"

(مسند بزار)

حضرت انس ﷺ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چار چیزیں بدبختی کا ذریعہ ہیں آنکھوں کا خشک ہو جانا (اللہ کے ڈر سے کبھی آنسو نہ آئیں) اور دل کا سخت ہونا اور لمبی امیدیں رکھنا، اور دنیا پر حرص رکھنا۔

(از قرطبی)

﴿فَهِيَ كَٱلۡحِجَارَةِ﴾ : "تو وہ پتھروں کی طرح ہیں" ان کے دلوں کو پتھروں سے تشبیہ دی گئی ہے لوہے سے تشبیہ نہیں دی اس لئے کہ لوہا پگھل جاتا ہے اس میں کچھ نرمی ہوتی ہے۔ لیکن ان کے دل تو مکمل طور پر نرمی سے خالی تھے۔

(تیسیر الرحمن)

قساوۃ کا ذکر کب ہوتا ہے؟ ہر وہ چیز جو اصل کے لحاظ سے کسی چیز کے اثر کو قبول کرے اسے "قابل" کہا جاتا ہے کہ یہ اثر کو قبول کرنے والی چیز ہے۔ جب کوئی چیز اسے عارض ہو جائے، جس

کی وجہ سے اس میں اثر کے قبول کرنے کی صلاحیت ختم ہو جائے تو اس کو ''قاسی'' کہا جاتا ہے: ''انــه صــار صـلبـا غليظا قاسيا'' کہ بیشک یہ بہت سخت ہو گیا، اب یہ ''قابل'' نہیں رہا بلکہ اس میں صلابت اور غلظة اور قساوة آ گئی۔

جسم بحیثیت جسم غیر کے اثر کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن جب اس کو صفت حجریۃ (پتھر ہونے کی صفت) عارض آ جائے۔ تو حجر کا جسم قابل نہیں رہتا قاسی (سخت) ہو جاتا ہے۔

اسی طرح دل کی شان یہ ہے کہ وہ دلائل اور آیات اور عبرت آموز نصائح کے اثر کو قبول کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ سرکشی، نافرمانی، تکبر کو چھوڑ دیتا ہے اور طاعت کو ظاہر کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے حضور جھک جاتا ہے اور اللہ کا خوف اسے لاحق ہوتا ہے۔

'' فاذا عرض للقلب عارض اخرجه عن هذه الصفة صارفى عدم التاثر شبيها بالحجر فيقال قسا القلب و غلظ ''

لیکن دل کو بھی جو عوارضات لاحق ہو جاتے ہیں تو اسے اپنی اصلی صفات سے نکال دیتے ہیں تو وہ دل تاثیر کو نہ قبول کرنے کی وجہ سے ''قساوۃ اور غلظۃ'' سے متصف ہو جاتا ہے یعنی اس وقت کہا جاتا ہے کہ فلاں کا دل بہت سخت ہو گیا۔

'' قساوة '' کا مقابل ''رقة ''(نرم ہونا) ہے۔ اسی لئے رب تعالیٰ نے مومنوں کی شان بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ (پ ۲۳ ع ۱۶)

''اللہ نے اتاری سب سے اچھی کتاب کہ اول سے آخر تک ایک سی ہے دوہرے بیان والی اس سے بال کھڑے ہوتے ہیں ان کے بدن پر جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں پھر ان کی کھالیں اور دل نرم پڑتے ہیں یاد خدا کی طرف رغبت کرتے ہیں''۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ﴾: ''بلکہ ان سے زیادہ سخت) یعنی تمہارے دل پتھروں کی طرح سخت ہو گئے بلکہ پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہو گئے کیونکہ پتھروں سے تو نہریں جاری ہوتی ہیں پتھروں سے تو چشمے جاری

ہوتی ہیں۔ پھر تو اللہ تعالیٰ کی خشیت سے نیچے گر پڑتے ہیں لیکن تمہارے دلوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

﴿اَوْ﴾: عام طور پر شک کے لئے آتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا کلام شک سے پاک ہے اس لئے یہاں شک کا معنی نہیں۔ اس لئے یہاں کئی احتمال ہیں کہ ''او'' کا معنی کون سا لیا جائے۔

(۱) اس میں ایک وجہ یہ ہے کہ (او) بمعنی (واو) کے عام طور پر آتا رہتا ہے۔ قرآن پاک میں کئی جگہ یہی معنی مراد لیا گیا ہے: ﴿ الی مِائَةَ اَلْفٍ اَوْ یَزِیْدُوْنَ ﴾ میں اور ﴿ وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ آبَائِهِنَّ ﴾ میں اور ﴿ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْ بُیُوْتِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ آبَائِكُمْ ﴾ میں اور ﴿لَعَلَّهُ یَتَذَكَّرُ اَوْ یَخْشٰی ﴾ میں اور ﴿ فَالْمُلْقِیَاتِ ذِكْرًا عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ﴾ میں " او "واو' کے معنی میں استعمال ہے۔ اس لحاظ پر معنی یہ ہوگا پھر سخت ہو گئے تمہارے دل اس کے بعد، تو وہ پتھر کی طرح ہیں اور اس سے بھی سخت۔

احمقوں کی جنت میں بسنے والے: راقم نے اپنے ایک رسالہ (ایصال ثواب مستحب ہے) میں مستحب کی تعریف میں ایک جگہ درمختار اور شامی کی عبارت میں ''او'' کا معنی اور کیا ہے، تو ایک سر پھرا شخص مجھے کہنا لگا تم نے ''او'' کا معنی ''یا'' نہیں کیا ''اور'' کیا ہے جو غلط ہے غلط معنی کر کے تم نے اپنا مطلب نکال لیا ہے۔ میں نے کہا جس کو پتہ ہی نہ ہو ''واو'' کے کون کون سے معانی ہیں اور اسے یہ پتہ نہ ہو کہ ''او'' کے کون کون سے معانی ہیں اسے دین کا کیا پتہ ''واو'' کا معنی صرف ''اور'' اور ''او'' کا معنی صرف ''یا'' یاد کرنے سے علامہ بن بیٹھے۔

(۲) کبھی کسی چیز کو معین کرنا مقصود نہ ہو بلکہ مقصد فعل کا بیان ہو تو وہاں ''او'' ذکر کرتے ہیں۔ جیسے کوئی کہے " اکلت خبزا او تمرا " میں نے روٹی کھائی یا کھجور۔ مقصد یہ ہے کہ میں نے کچھ نہ کچھ کھایا ہوا ہے مجھے کھانے کی حاجت نہیں یہ بیان کرنا مقصود نہیں کہ میں نے کیا کھایا ہے۔ اس صورت میں ''او'' کا معنی ''یا'' ہوگا لیکن وہ شک پر دلالت نہیں کرے گا۔

(۳) تیسرا احتمال یہ ہے کہ ''او'' تنویع پر دلالت کر رہا ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے تمہارے دل پتھر کی طرح ہیں بعض ان میں سے اور ہی زیادہ سخت ہیں۔ یہاں ''او'' کا معنی ''یا'' نہیں کیا جائے گا بلکہ معنی

ہوگا اور ''ان سے بعض''۔

(۴) اس کلام کی نسبت بندوں کی طرف ہے یعنی جب وہ ان کے دلوں کے حال کی طرف توجہ کریں گے اور اس پر مطلع ہوں گے تو کہیں گے ''تمہارے دل تو پتھروں کی طرح ہیں یا اس سے بھی سخت'' یہاں ''او'' کا معنی ''یا'' ہوگا شک والا معنی بھی ممکن ہوگا۔ کیونکہ لوگوں کا شک کرنا منع نہیں۔

(۵) جس طرح کہا جاتا ہے '' لا آکل الا حلوا او حامضا '' میں نہیں کھاتا سوائے میٹھے یا ترش کے مطلب اس کا یہ ہوتا ہے کہ میرا طعام صرف دو ہی قسم کا ہے میٹھا یا ترش۔ اسی طرح یہاں مطلب یہ ہوگا کہ تمہارے دل کی قساوت (سختی) ان دو قسموں سے باہر نہیں وہ یہ کہ تمہارے دلوں کی سختی پتھروں کی طرح ہے یا اس سے بھی زیادہ۔ اگرچہ یہاں ''او'' کا معنی ''یا'' کرنا صحیح ہے لیکن شک والا معنی نہیں۔

(۶) کبھی ''او'' اباحت کے لئے آتا ہے جیسا کہ کہا جائے '' جالس الحسن او ابن سیرین '' حسن کے ساتھ بیٹھو یا ابن سیرین کے ساتھ بیٹھو۔ یا دونوں کے ساتھ بیٹھو درست ہے تمہیں اجازت ہے۔ اس صورت کے لحاظ پر مطلب یہ ہوگا کہ تمہارے دل پتھروں کی طرح سخت ہیں۔ یا ان سے بھی زیادہ سخت مطلب یہ ہے کہ تشبیہ دینے والے کو اختیار ہے چاہے تو تمہارے دلوں کو پتھروں سے تشبیہ دے چاہے تو اس سے زیادہ سخت چیز سے تشبیہ دے چاہے تو دونوں سے تشبیہ دے۔

(۷) ان کلمة '' او '' بمعنی بل۔ اور اس میں یہ صورت پائی جاتی ہے کہ ''او'' بل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس کا معنی ہوتا ہے ''بلکہ'' (ماخوذ از کبیر)

اعلیٰ حضرت نے یہی معنی کیا ہے یہی سب سے زیادہ آسان اور معتبر ہے راقم نے بھی وہی نقل کیا ہے۔

﴿ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهَارُ ﴾: اور بیشک بعض پتھر وہ ہیں جن سے نہریں جاری ہوتی ہیں '' التفجر التفتح بالسعة والكثرة '' کسی چیز کا وسعت اور کثرت سے کھل جانا '' تفجر '' کہلاتا ہے۔ یعنی بعض پتھر کثیر مقدار میں پھٹ جاتے ہیں ان سے کثیر پانی نہروں کی صورت میں نکلتا ہے۔

﴿ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ﴾ : ''اور بیشک بعض ان سے پھٹ

جاتے ہیں تو ان سے پانی نکلتا ہے''۔ مراد اس سے یہ ہے '' فیخرج منه الماء فیکون عینا لانهرا جاریا '' کہ بعض پتھر پھٹ جاتے ہیں ان سے پانی اگر چہ نہر کی صورت میں تو نہیں نکلتا لیکن چشمہ کی صورت میں نکلتا ہے۔

﴿ وَاِنَّ مِنۡهَا لَمَا يَهۡبِطُ مِنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ ﴾ : ''اور بیشک بعض ان سے وہ ہیں جو گر پڑتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ڈر کی وجہ سے''۔

پتھر کیسے ڈرتے ہیں؟ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پتھروں میں نہ حیات ہے نہ ادراک ہے اور نہ ہی عقل ہے تو ان کا ڈرنا کیسے ثابت ہے معتزلہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے۔

'' ان الله تعالیٰ خلق فیه الحیاة و العقل و الادراک وهذا غیر مستبعد فی قدرة الله ''

بیشک پتھروں میں، اسی طرح اور کئی چیزوں میں حیات اور عقل بظاہر نہیں ہوتی ,لیکن اللہ تعالیٰ ان میں حیات اور ادراک اور عقل پیدا کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوئی چیز بعید نہیں۔

آیئے چند مثالوں کی طرف توجہ فرمائیں: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَقَالُوۡا لِجُلُوۡدِهِمۡ لِمَ شَهِدۡتُّمۡ عَلَيۡنَا قَالُوۡۤا اَنۡطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِىۡۤ اَنۡطَقَ كُلَّ شَىۡءٍ ﴾

''اور وہ اپنے چمڑوں سے کہیں گے تم نے ہم پر کیوں گواہی دی وہ کہیں گے ہمیں اللہ نے بلوایا جس نے ہر چیز کو بولنے کی قوت عطاء کی''۔

قیامت کے دن انسانوں کے چمڑے ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ گواہی تب ہی دیں گے جب ان کو عقل اور بولنے کی طاقت حاصل ہوگی۔ اور وہ کلام کو سن کر جواب دیں گے۔ یہ سب طاقتیں ان کو رب تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہوں گی۔

☆ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَوۡ اَنۡزَلۡنَا هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيۡتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ ﴾

''اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر اتارتے تو ضرور اسے جھکا ہوا دیکھتا، پاش پاش ہوتا اللہ کے خوف سے''۔

مراد یہ ہے کہ اگر قرآن پاک پہاڑ پر اتارا جاتا تو اسے عقل، فہم اور شعور بھی دیا جاتا وہ عظمت قران کے سامنے جھک جاتا، خشوع کرتا اور خوف الٰہی سے پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔

☆ " وروی عن النبی ﷺ انه لما اتاه الوحی فی اول المبعث وانصرف النبی ﷺ الی منزله سلمت علیه الاحجار والاشجار فکلها کانت تقول ...... السلام علیک یا رسول الله "

نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ جب سب سے پہلے بعثت (نبوت کے اعلان کے ارشاد) کے وقت وحی آئی تو آپ جب اپنے گھر تشریف لا رہے تھے تو آپ کو پتھر اور درخت سلام کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے " السلام علیک یا رسول الله "

اے انسان ذرا غور تو کر، کیا تجھے پتھروں جیسا عقل وشعور بھی حاصل نہیں، وہ تو اپنے پیارے نبی کریم ﷺ پر سلام بھیجیں اور " السلام علیک یا رسول الله " کہیں اور تو محروم ہی رہے تو بدقسمت ہی رہے اور دوسروں کو بدقسمت بنانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگائے۔

" قالوا فغیر ممتنع ان یخلق فی بعض الاحجار عقل وفهم حتی تحصل الخشیة فیه وانکرت المعتزلة "

جو علماء اہل سنت جو محققین اور راسخین فی العلم (علم میں پختگی رکھنے والے) ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی ممانعت نہیں کہ اللہ تعالیٰ بعض پتھروں میں عقل اور فہم پیدا فرما دے اور ان کو رب تعالیٰ کی خشیت حاصل ہو جائے البتہ معتزلہ کا انکار کرتے ہیں۔

(ماخوذ از کبیر)

خیال رہے بدیہی اور قطعی چیزوں کا انکار کرنا معتزلہ اور ان کے یاروں کا کام ہے بہت سے مسائل میں معتزلہ کے ساتھ ملنے والے آج کل بھی ان کے یار موجود ہیں۔

☆ "وفی صحیح مسلم انی لا عرف حجرا بمکة یسلم علی قبل ان ابعث انی لاعرفه الآن "

مسلم شریف میں ہے بیشک میں پہچانتا ہوں اس پتھر کو جو مکہ میں مجھے سلام کرتا تھا میری بعثت سے پہلے بیشک میں اب بھی اسے پہچانتا ہوں۔ (ابن کثیر)

☆ " قال البغوی روی ان النبی ﷺ کان علی ثبیر والکفار یطلبونه فقال الجبل انزل عنی فانی اخاف ان تؤخذ علی فیعاقبنی الله تعالیٰ بذلک وقال له جبل حراء الی الی یارسول الله "

علامہ بغوی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا بیشک نبی کریم ﷺ شبیر پہاڑ پر تھے، کافر آپ کو تلاش کر رہے تھے، تو پہاڑ نے عرض کیا آپ مجھ سے اتر جائیں، بیشک میں ڈرتا ہوں کہیں میرا مواخذہ (پکڑ) نہ ہو جائے مجھے اللہ تعالیٰ اس کی سزا نہ دے حراء پہاڑ نے عرض کیا یا رسول اللہ میری طرف تشریف لے آئیں یا رسول اللہ میری طرف تشریف لے آئیں۔

☆ "وصح عن انس ان رسول الله ﷺ طلع لـه احد فقال هذا جبل يحبنا ونحبه"

حضرت انس ﷺ سے صحیح حدیث مروی ہے بیشک رسول اللہ ﷺ نے احد پہاڑ کو دیکھ کر فرمایا یہ پہاڑ ہمارے ساتھ محبت کرتا ہے ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔

☆ "وصح عن ابی هريرة قال كان رسول الله ﷺ على حراء وابوبكر وعمر وعثمان وعلى وطلحة والزبير فتحركت الصخرة فقال النبی ﷺ اهدأ فما عليك الا نبی او صديق او شهيد ...... اخرجه مسلم"

حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے صحیح حدیث مروی ہے بیشک رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر اور عمر اور عثمان اور علی اور طلحہ اور زبیر حراء پہاڑ پر تھے پہاڑ نے (خوشی سے) حرکت کی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا ٹھہر جا تجھ پر نہیں سوائے نبی اور صدیق اور شہید کے۔

سبحان اللہ اس حدیث پاک سے جہاں یہ ثابت ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حراء پہاڑ کو عقل وشعور عطا کیا وہاں یہ ثابت ہو رہا ہے کہ علم غیب نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے کیونکہ آپ نے حضرت عمر، اور حضرت عثمان اور حضرت علی اور حضرت طلحہ اور حضرت زبیر ﷺ کے متعلق فرمایا کہ یہ شہید ہیں تو جیسا آپ نے فرمایا ایسا ہی سب کو شہادت نصیب ہوئی۔

معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ کو اپنی امت کی وفات کا علم دیا گیا اور آپ کو ان کے اس دنیا سے رخصت ہونے کی وجوہ کا علم بھی دیا گیا کہ کسی نے دنیا سے کیسے جانا ہے۔

☆ "وروی بسنده عن علی قال كنا مع رسول الله ﷺ بمكة فرحنا فی نواحيها خارجا من مكة بين الجبال والشجر فلم نمر بشجرة ولا جبل الا قال السلام عليك يارسول الله"

حضرت علی ﷛ سے سند صحیح سے مروی ہے کہ ہم ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مکہ شریف کے اطراف میں درختوں اور پہاڑوں میں سیر کی غرض سے نکلے، ہم کسی درخت اور پہاڑ سے بھی نہیں گزرتے تھے مگر یہ کہ وہ درخت اور پہاڑ حضور کی خدمت میں عرض کرتے...... السلام علیک یارسول"

انسان کو جھنجوڑتے ہوئے اگر یوں کہا جائے کہ "پتھروں نے تو رسول اللہ ﷺ کو کہا "السلام علیک یا رسول اللہ" اے پتھرا تو بھی عرض کر "السلام علیک یارسول اللہ" "اے پتھرا" کو ذرا سمجھنا) تو راقم کے خیال میں یہ جملہ بہت خوب رہے گا اگر پتھر سے گھٹیا انسان نہ سمجھے تو اس کی اپنی بدقسمتی۔

☆ "روی بسنده عن جابر بن عبد الله يقول كان النبی ﷺ استند الی جذع نخلة من سواری المسجد فلما صنع له المنبر فاستوی عليه اضطربت تلك السارية تحن كحنين الناقة حتی سمعها اهل المسجد حتی نزل رسول الله ﷺ فاعتنقها فسكنت"

حضرت جابر بن عبد اللہ ﷛ سے مروی ہے نبی کریم ﷺ مسجد کے ستونوں میں سے ایک ستون سے سہارا لگاتے تھے (جب آپ خطبہ دیتے) جو کہ کھجور کے تنے کا تھا۔ جب نبی کریم ﷺ نے منبر بنوالیا اور آپ نے اس پر (خطبہ کے لئے) بیٹھنا شروع فرمالیا تو وہ ستون بہت پریشان ہو گیا تو اس نے ایسا رونا شروع کر دیا جیسا کہ اونٹنی کی آواز ہوتی ہے۔ تمام مسجد والوں نے اس کی آواز کو سنا۔ نبی کریم ﷺ نے منبر سے اتر کر اسے گلے لگایا تو اسے سکون حاصل ہوا۔

☆ "عن ابی هريرة قال صلی بنا رسول الله ﷺ الصبح ثم اقبل علی الناس بوجهه فقال بينا رجل يسوق بقرة اذ عيی فركبها فضربها فقالت انا لم نخلق لهذا انما خلقنا لحراثة الارض فقال الناس سبحان الله بقرة تتكلم فقال رسول الله ﷺ فانی او من به وابوبكر وعمر وما هما ثم"

حضرت ابوہریرہ ﷛ فرماتے ہیں ہمیں رسول اللہ ﷺ نے صبح کی نماز پڑھائی۔ پھر آپ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے آپ نے فرمایا ایک وقت میں ایک شخص گائے کو چلا رہا تھا جب وہ شخص تھک گیا تو گائے پر سوار ہو گیا جب اس نے گائے کو (چلانے کے لئے) مارا تو گائے نے کہا ہمیں اس کے لئے نہیں پیدا کیا گیا ہمیں تو ہل چلانے کے لئے پیدا کیا گیا ہے لوگوں نے (تعجب کرتے ہوئے) کہا "سبحان اللہ" گائے بھی کلام کرتی ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بیشک میں اور ابوبکر اور عمر اس پر

ایمان رکھتے ہیں حالانکہ وہ دونوں حضرات وہاں موجود نہیں تھے۔ (ماخوذ از مظہری)

اس حدیث پاک سے جہاں گائے کا کلام کرنا، شعور رکھنا ثابت رہو رہا ہے وہاں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی فضیلت بھی ثابت ہو رہی ہے کہ ان کی غیر موجودگی میں نبی کریم ﷺ نے ان پر کامل اعتماد کرتے ہوئے فرمایا کہ میں اس پر ایمان رکھتا ہوں تو یہ ہو نہیں سکتا جس کو میں تسلیم کروں اس کو میرے دونوں یار تسلیم نہ کریں "سبحان اللہ" کیا ہی دونوں کا عظیم مقام ہے۔

"قال مجاهد لا ينزل الحجر من اعلى الى اسفل الا من خشية الله تعالىٰ" (مظہری)

حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ جو پتھر بھی اوپر سے نیچے گرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے ہی نیچے گرتا ہے۔

راقم کو بھی یہی قول پسند ہے کہ جو پتھر بھی اوپر سے نیچے گرے اس میں ظاہری سبب کوئی بھی ہو لیکن حقیقی سبب اس میں اللہ تعالیٰ کے خشیت ہی پائی جاتی ہے۔ اسلئے موجودہ زمانہ کے بعض مفسرین کے اس قول سے اتفاق نہیں کہ بعض پتھر تو رب تعالیٰ کی خشیت سے گرتے ہیں۔ اور بعض کے گرنے کی اور وجوہ ہوتی ہیں۔

فائدہ : آیۃ کریمہ میں پتھر کی چار قسموں کا ذکر کیا ایک وہ جو سخت ہوتے ہیں جو بظاہر کوئی اثر قبول نہیں کرتے۔ دوسرے وہ جن سے نہریں جاری ہوتی ہیں۔ تیسرے وہ جن سے چشمے جاری ہوتے ہیں۔ اور چوتھے وہ جو اللہ تعالیٰ کی خشیت سے گر پڑتے ہیں۔

انسانوں کے دل کی بھی چار قسمیں ہیں۔ ایک قسم کے وہ دل ہیں جو نور الٰہی میں مستغرق ہو کر فنا کے درجہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ وہ علم کے سمندر میں غرق ہو جاتے ہیں اور فانی ہو جاتے ہیں۔ جب وہ نور الٰہی اور علم میں مستغرق ہو کر فنا ہوتے ہیں تو ان سے معرفت کی نہریں جاری ہوتی ہیں اور سیدھی راہ کے طلب کرنے والے اور فیضان حاصل کرنے کی تمنا کرنے والوں کے قلوب کے لئے حیات کا ذریعہ بنتے ہیں۔ یہ قلوب اہل اللہ اور سابقین کے ہوتے ہیں۔ ان کے مناسب یہ ارشاد ہے ﴿ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ﴾ تقریباً ان میں مشابہت آ گئی۔

دوسرا درجہ قلوب کا یہ ہے کہ وہ علم کے دریا سے سیر ہوتے ہیں اور مخلوق کے نفع کا سبب بنتے ہیں یہ علماء راسخین کے قلوب ہیں۔ ان کو وہ درجہ حاصل ہے کہ ان کے قلوب سے پانی کے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔ ان کے قلوب کے مناسب رب تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے ﴿ وَاِنَّ مِنۡهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخۡرُجُ مِنۡهُ الۡمَآءُ ﴾.

تیسرا درجہ قلوب کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں اس کے احکام کو تسلیم کریں اور رب تعالیٰ کا خوف ان میں پایا جائے اس خوف سے رب کے حضور وہ سجدہ ریز ہو جائیں۔ اس کے مناسب رب تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے ﴿ وَاِنَّ مِنۡهَا لَمَا يَهۡبِطُ مِنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ ﴾.

چوتھا درجہ قلوب کا یہ ہے کہ سرکش اور متکبر لوگوں کے قلوب پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ منکر ہی رہتے ہیں ان میں کسی قسم کا خوف نہیں پایا جاتا۔ ان کے قلوب کے مناسب رب تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی ہے: ﴿ ثُمَّ قَسَتۡ قُلُوۡبُكُمۡ مِّنۡ بَعۡدِ ذٰلِكَ فَهِىَ كَالۡحِجَارَةِ ﴾ بہت ہی خوب مناسبت اور مشابہت پائی گئی۔

(ماخوذ از عزیزی)

قرآن پاک کی فصاحت کیا خوب ہے: اقسی ''(اسم تفضیل) کا معنی بہت سخت ہے اور ﴿اَشَدُّ قَسۡوَةً ﴾. کا معنی بھی بہت سخت ہے لیکن ان میں فرق یہ ہے کہ ﴿ اَقۡسیٰ ﴾ عام ہے مقدار اور کیفیت کے لحاظ پر سختی پر بولا جاتا ہے لیکن ﴿ اَشَدُّ قَسۡوَةً ﴾ کیفیت کے لحاظ پر سختی پر بولا جاتا ہے یہاں یہ ہی مراد ہے اسی لئے اسے ذکر کیا۔

(از عزیزی)

﴿ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴾ : ''اور نہ ہی اللہ غافل ہے اس چیز سے جو تم عمل کرتے ہو'' یہاں سے ان لوگوں کو ہی خطاب ہے جن کا پہلے ذکر آ رہا ہے اور ان کو ہی دھمکی دی جا رہی ہے کہ تمہارے دل پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہو گئے رب تعالیٰ کے احکام سے عدولی کئے جا رہے ہو یہ جان لو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں سے غافل نہیں۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ان الفاظ سے تفسیر فرمائی:

" وعید علی ما ذکر کانہ قیل ان اللّٰہ تعالیٰ لبالمرصاد ھؤلاء القاسیۃ قلوبھم حافظ لا عمالھم محص لھا ، فھو مجازیھم فی الدنیا و الآخرۃ "

ان کی بداعمالیوں کا جو ذکر کیا گیا اسی پر یہ ان کو وعید کی جا رہی ہے ان کو بتایا گیا کہ

بیشک اللہ تعالیٰ سے یہ سخت دل والے لوگ چھپ کر نہیں رہ سکتے، اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو نگاہ میں رکھے ہوئے ہے اور ان کے اعمال اس کے شمار میں ہیں وہ ان کو دنیا اور آخرت میں اس کا بدلہ دے گا۔

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی یہی مضمون وضاحت سے ثابت کر رہا ہے:

﴿ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴾ اور آپ کا رب بھولنے والا نہیں۔ (روح المعانی و کبیر)

تعظیم باری تعالیٰ کا پاس: قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں ﴿ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾ میں تاویل کی ضرورت ہے " لا يصح لانه يوهم جواز الغفلة عليه " اس لئے کہ بغیر تاویل کے اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ کہنا کہ وہ غافل نہیں۔ اس سے وہم پڑتا ہے کہ شائد اس میں غفلت آ سکتی ہے اور اس کی نفی کی گئی ہے۔ اگرچہ اس قول کو علامہ رازی رحمہ اللہ نے رد کیا ہے۔ تاہم اس قول سے اتنی بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ علماء صالحین نے رب تعالیٰ کی تعظیم کا کتنا لحاظ کیا ہے کہ جہاں ذرا بھر بھی اشتباہ ہوا وہاں کچھ نہ کچھ سوچنے کی کوشش کی کہ رب تعالیٰ کی شان کے لائق یہ الفاظ ظاہری طور پر مراد لئے جا سکتے ہیں یا ان کی تاویل کر کے وہ معنی مراد لیا جائے جو اس کی عظمت کے لائق ہو۔

تاہم علامہ رازی رحمہ اللہ نے بہت خوب بیان فرمایا:

" وليس الامر كذلك لان نفي الصفة عن الشئي لايستلزم ثبوت صحتها عليه، بدليل قوله تعالىٰ ﴿ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ، وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ﴾ والله اعلم "

اس طرح مسئلہ نہیں جس طرح قاضی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کیونکہ کسی چیز کی نفی سے یہ لازم نہیں آتا کہ پہلے اس کا ثبوت ہو۔ اس پر واضح دلیل ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ﴾ یہاں اونگھ اور نیند کی نفی کی گئی ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پہلے اس کے لئے اونگھ اور نیند کا ثبوت بھی ہو۔ اسی طرح رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ﴾ وہ کھلاتا ہے اسے کھلایا نہیں جاتا۔ اسی میں نفی تو پائی گئی ہے کہ وہ کھانے سے بے نیاز ہے اسے کوئی کھلاتا نہیں۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کے لئے کھلانے کے ثبوت کا وہم آ سکے۔ (از کبیر)

﴿ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ یَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴾

۱) ''تو اے مسلمانو کیا تمہیں یہ طمع ہے کہ یہودی تمہارا یقین لائیں گے اور ان میں کا تو ایک گروہ وہ تھا کہ اللہ کا کلام سنتے پھر سمجھنے کے بعد اسے دانستہ بدل دیتے''۔

۲) ''کیا تم طمع رکھتے ہو (اے مسلمانو) کہ وہ ایمان لے آئیں گے تمہاری وجہ سے۔ حالانکہ ان میں سے تو ایک گروہ وہ ہے جو سنتے ہیں اللہ کے کلام کو پھر اسمیں تبدیلی کر دیتے ہیں سمجھنے کے بعد، حالانکہ وہ جانتے ہیں (کہ ہم غلط کر رہے ہیں)''۔ (آیت نمبر ۷۵)

مختصر مطلب: اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو خطاب کیا کہ تم تو طمع رکھتے ہو کہ یہود ایمان لے آئیں۔ لیکن تمہیں ان کے ایمان پر طمع نہیں رکھنا چاہیے کیونکہ ان میں سے ایک فریق وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے کلام کو سنتا ہے اسمیں نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو جاننے اور سمجھنے کے باوجود پھر اس میں تحریف کر دیتے ہیں، حالانکہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہم باطل کر رہے ہیں لیکن حق سے پھر بھی روگردانی کرتے ہیں۔

اس آیۃ کریمہ کا ماقبل سے تعلق واضح ہے کہ پہلی آیات میں گزرے ہوئے یہود کے قبیح افعال کا ذکر کیا گیا۔ اور اس آیۃ کریمہ میں نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود کے قبیح افعال کا ذکر کیا جارہا ہے جو توراۃ کی تحریف کر کے نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو چھپاتے تھے۔ (از کبیر)

اس مقام پر پیر صاحب نے کیا خوب بیان فرمایا:

> ''اس سے معلوم ہوا کہ حق پوشی اور سید عالم ﷺ کے اوصاف کو چھپانا اور آپ کے کلمات کا انکار کرنا یہود کا شیوہ تھا۔ اسلام کا دعوی کرنے والوں کو زیب نہیں دیتا کہ اپنے محبوب اور کریم رسول کے کمالات کو بیان کرنے سے ان کی زبان میں لکنت ہو اور فضائل سننے سے دل میں گھٹن ہو۔ رفعتِ شان مصطفیٰ حبیب خدا علیہ وعلیٰ آلہ اطیب التحیۃ واحسن الثناء کسی کے گھٹانے سے نہ گھٹے گی''۔ (ضیاء القرآن)

شانِ نزول: انصار صحابہ کرام کے یہود حلیف بھی تھے اور پڑوسی بھی اس لئے ان کی بہت تمنا ہوتی

کہ یہود اسلام لے آئیں تو گویا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا تم تو تمنا کرتے ہو لیکن وہ ایمان لانے والے نہیں۔ اس لحاظ پر واضح ہوا کہ ﴿ اَفَتَطۡمَعُوۡنَ ﴾ میں خطاب صحابہ کرام کو ہے۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ خطاب نبی کریم ﷺ کو ہو البتہ جمع کا صیغہ تعظیم کے لئے ذکر کیا گیا ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے:

" لا تحزن علی تکذیبهم ایاک واخبر انهم من اهل السوء الذین آمنو"

کہ نبی کریم ﷺ کو فرمایا "یہود جو آپ کی تکذیب کرتے ہیں اس پر غم نہ کریں۔ اور ساتھ ہی خبر دے دی گئی کہ یہ لوگ اپنے آباء واجداد سے ہی بدعقیدہ اور بداعمال چلے آرہے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے بھی ایسا ہی ہونا ہے۔ (از قرطبی بتصرف، روح المعانی)

﴿ اَفَتَطۡمَعُوۡنَ ﴾ : طمع (سمع پر زیادہ آتا ہے، البتہ فتح پر بھی آتا رہتا ہے) یہ تعجب کے وقت استعمال ہوتا ہے اور اس کا معنی تمنا کرنا، حرص کرنا، طمع کرنا۔ اور باب کرم پر جب آئے تو مبالغہ کا معنی پایا جاتا ہے یعنی بہت زیادہ طمع کرنے والا۔ اور طمع لشکر کے رزق کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے " امر لهم الأمیر باطماعهم "امیر نے لشکر والوں کے لئے رزق دینے کا حکم دیا۔

خیال رہے کہ ﴿ اَفَتَطۡمَعُوۡنَ ﴾ میں ہمزہ استفہام انکاری کے لئے ہے:

"کانه ایاسهم من ایمان هذه الفرقة من الیهود "

گویا کہ یہود کے اس فرقہ سے ایمان کے طمع کرنے سے مکمل طور پر ناامید کیا گیا ہے

کہ ان کے ایمان کے لئے رزق کی طمع نہ کی جائے۔ (از قرطبی)

﴿ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا لَکُمۡ ﴾ : " ای یصدقوا مستجیبین لکم فالایمان بالمعنی اللغوی والتعدیة باللام للتضمین کما فی قوله تعالیٰ فآمن له لوط "

﴿ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا لَکُمۡ ﴾ کا ایک معنی یہ ہے (کیا تم طمع کرتے ہو) کہ وہ تمہاری بات کو قبول کرتے ہوئے اس کی تصدیق کریں گے اس صورت میں ایمان کا لغوی معنی ہوگا "مان لینا" اور لام سے متعدی کیا گیا ہے اس میں تضمین کا قاعدہ جاری ہے ﴿ فَاٰمَنَ لَهٗ لُوۡطٌ ﴾ میں بھی ایمان کا لغوی معنی ہی معتبر ہے۔ خیال رہے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی تفسیر کے مطابق ہے (تو اے مسلمانو کیا تمہیں یہ

طمع ہے کہ یہودی تمہارا یقین لائیں گے۔اور دوسرا معنی یہ کیا گیا ہے۔

" ﴿ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَکُمْ ﴾ ای ان یؤمنوا لا جل دعوتکم لھم ، فالفعل منزل منزلة اللازم والمراد بالایمان المعنی الشرعی واللام لام الاجل "

یعنی لام سببیہ ہے۔اور فعل بمنزل لازم کے ہے، اور ایمان کا معنی شرعی ہے اور معنی یہ ہوگا (کیا تم طمع کرتے ہو) کہ وہ تمہاری دعوت پر ایمان لے آئیں گے۔

راقم نے اس تفسیر کے مطابق ترجمہ کیا ہے "کیا تم طمع رکھتے ہو (اے مسلمانو) کہ وہ ایمان لے آئیں گے تمہاری وجہ سے۔ (از روح المعانی)

﴿ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ ﴾

"فریق سے مراد ان یہود کے گزرے ہوئے علماء اور پادریوں کی ایک جماعت ہے"

﴿ یَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہ توراۃ کو سنتے اور اس میں اپنی اغراض (غرضوں) کے مطابق تبدیلی کر لیتے تھے یہی قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔

اور جمہور کا قول بھی اسی کے قریب ہے کہ وہ اپنی طرف سے اللہ کی کتاب توراۃ میں تبدیلی کر لیتے تھے نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو انہوں نے تبدیل کر کے پیش کیا آپ کے درمیانہ قد کو لمبے قد سے تبدیل کر دیا۔اور آپ کے رنگ سفید گندم گوں کو کہیں خالص سفید، کہیں سیاہی مائل کہہ دیا۔اور آیۃ رجم کو (یعنی جس میں زنا کی سزا سنگسار کرنے کا ذکر تھا) انہوں نے تبدیل کر دیا۔اور اس میں تحریر کر دیا کہ اس کے چہرہ پر خاکستر لگا کر سیاہ کر دیا جائے۔

اسی طرح موسیٰ علیہ السلام ستر آدمیوں کو کوہ طور پر لے گئے تھے وہ کہنے لگے ہم بھی اللہ تعالیٰ کا کلام سنیں گے آپ نے ان کو فرمایا کہ غسل کر لو صاف لباس پہن لو ۔ جب انہوں نے ایسا کر لیا ۔ ﴿فَاَسْمَعَهُمُ اللّٰهُ كَلَامَهٗ ﴾ تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنا کلام سنایا ﴿ ثُمَّ قَالُوْا سَمِعْنَا ﴾ پھر انہوں نے کہا ہم نے سنا پہلے یہ کہا لیکن پھر اسے بدل کر کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ حکم دیا ہے۔

﴿ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَفْعَلُوْا هٰذِهِ الْاَشْيَاءَ فَافْعَلُوْ وَاِنْ شِئْتُمْ فَلَا تَفْعَلُوْا ﴾

کہ توراۃ میں جتنے بھی احکام ہیں ان پر اگر تم عمل کر سکتے ہو تو کر لو اگر تم ان پر عمل نہیں کرنا چاہتے تو نہ کرو۔

فائدہ: ان سے ایمان لانا بعید قرار دیا ان کے ایمان پر طمع کرنے سے نفی کر دی گئی تو اسی سے پتہ چلا:

" افتطمعون ان یؤمنوا لکم ویظھروا التصدیق ومن علم منھم الحق لم یعترف بذلک بل غیرہ وبدلہ "

کیا تم ان پر طمع رکھتے ہو کہ وہ تمہاری دعوت پر تمہاری وجہ سے ایمان لے آئیں گے تمہاری تصدیق کریں گے ایسا نہیں ہوسکتا، ان پر طمع کا کیا فائدہ جنہوں نے حق کو پہچان کر، جاننے کے باوجود اس پر ایمان نہیں لایا بلکہ اس میں تغیر وتبدل کر دیا۔

ان کے ایمان پر طمع نہ کرنے کی ایک اور عجیب وجہ بھی علامہ رازی رحمہ اللہ نے بیان فرمائی:

" افتطمعون ان یؤمنوا لکم مع انھم ما آمنوا بموسیٰ علیہ السلام وکان ھو السبب فی ان اللہ خلصھم من الذل وفضلھم علی الکل ومع ظھور المعجزات المتوالیۃ علی یدہ وظھور انواع العذاب علی المتمردین "

کیا تم طمع رکھتے ہو کہ وہ تمہاری وجہ سے ایمان لے آئیں گے یہ تو اس نسل سے ہیں ان لوگوں کی اولاد ہیں جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے ارشادات کو تسلیم نہیں کیا حالانکہ انہوں نے ان کو ذلت سے نکالا یعنی فرعون اور اس کی قوم سے تمہیں چھڑایا جو تم سے ذلت آمیز کام لیتے تھے اور تمہیں ان کے دردناک عذاب سے نجات دلائی جو تمہیں طرح طرح کی تکالیف پہنچاتے تھے۔ وہ موسیٰ علیہ السلام جنہوں نے ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے اس وقت کے تمام لوگوں پر فضیلت دلائی ان کے فرمان کو یہ لوگ ٹھکراتے رہے۔

پھر عجیب بات یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے کثیر معجزات کو انہوں نے دیکھا اور موسیٰ علیہ السلام کا ہی یہ معجزہ تھا کہ فرعون اور اس کی قوم کے لوگ جو بہت بڑے سرکش تھے ان کو بنی اسرائیل کے سامنے ہلاک کیا اور ان کو نجات دی لیکن یہ پھر بھی بار بار موسیٰ علیہ السلام کے حکم کو ٹالتے رہے تو ان سے ایمان کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے لہٰذا ان سے ایمان کی طمع کا کوئی فائدہ نہیں۔

اور اے مومنو تم تو ان کو عقل مند سمجھ رہے ہو لیکن یہ تو عقل سے بہت دور ہیں۔

" افتطمعون ان یؤمنوا لکم ھؤلاء من طریق النظر والاستدلال وکیف وقد کان فریق من اسلافھم یسمعون کلام اللہ ویعلمون انہ حق ثم یعاندوہ "

کیا تم توقع رکھتے ہو کہ یہ لوگ نظر و فکر کریں گے دلائل کے ذریعے تمہاری باتوں کو سمجھ لیں گے ایمان لے آئیں گے حالانکہ ان کے آباء و اجداد میں سے ایک فریق ایسا تھا جو اللہ کا کلام سنتے اور جانتے کہ یہ حق ہے لیکن پھر بھی اس سے عناد کرتے اور ایمان نہ لاتے۔ (از کبیر)

اعتراض: جب تحریف کرنے والا ایک فریق تھا تو یہ کیسے لازم آیا کہ تمام لوگ ہی ایمان نہیں لائیں گے:" فان عناد البعض لا ینافی اقرار الباقین " بیشک بعض لوگوں کا عناد باقی لوگوں کے اقرار کے مخالف نہیں۔

جواب: تحریف کرنے والے وہ لوگ تھے جن پر یہود کے علم کی دارومدار تھی وہ ان کے علماء تھے جو کتاب کا علم رکھتے تھے عوام تو علم سے ہی خالی تھے " العوام کالانعام " (عوام چوپایوں کی طرح ہیں) جملہ شائدان کے لئے ہی وضع کیا گیا تھا۔

اسلئے تمام یہود ہی اپنے راہنماؤں کے جال میں پھنسے ہوئے تھے جو حسد اور عناد کی وجہ سے تحریف کر رہے تھے یا اپنے تحائف وغیرہ آمدنی کے ذرائع کے بند ہونے کے خطرہ سے تحریف کر رہے تھے اور ان کے متبعین ان کی تحریف شدہ عبارات کو صحیح تسلیم کر رہے تھے اس پر ان کا ایمان تھا اور اسی پر ان کا عمل تھا۔ اس لئے گویا کہ ان میں سے اکثر ہی تحریف کے مرتکب ہو رہے تھے۔ تو ذکر مطلق فرمادیا آیۃ کریمہ کے شان نزول سے بھی واضح ہو رہا ہے کہ مراد وہ لوگ ہیں جو انصار صحابہ کرام کے حلیف اور ان کے قرب و جوار میں رہنے والے تھے۔ یہاں ان لوگوں سے ایمان لانے کے طمع کی نفی کی گئی۔ ورنہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے ایمان قبول کیا۔ (ماخوذ از کبیر بتصرف)

تنبیہ: اللہ تعالیٰ کے کلام کو سننے کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ پر جو وحی نازل ہوتی تھی وہ جب ان تک پہنچتی اور وہ سنتے تو اس میں تحریف کر دیتے تھے۔ علامہ آلوسی رحمہ اللہ کا مختار تو یہ ہے کہ ستر آدمی جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہ طور پر گئے تھے انہوں نے بھی رب تعالیٰ کا کلام براہ راست نہیں سنا، بلکہ موسیٰ علیہ السلام کے واسطہ سے سنا...... واللہ اعلم" (روح المعانی)

﴿مِنۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوۡهُ﴾ : " ای فهموه بعقولهم ولم یبق لهم فیه ریبة " یعنی انہوں نے تحریف کی جب کہ انہوں نے اپنی عقلوں سے بھی سمجھ لیا تھا کہ یہ اللہ کا کلام ہے کسی بندے کا کلام نہیں

انکواس میں ذرا بھی شک نہیں تھا۔

﴿ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴾ : ''انهم مفترون مبطلون '' وہ یہ جانتے ہوئے تحریف کرتے تھے کہ ہمارا تحریف کرنا باطل ہے۔ اور رب تعالیٰ پر افتراء ہے کہ ہم اپنے کلام کو رب تعالیٰ کی طرف منسوب کرر ہے ہیں۔ (از بیضاوی)

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ کی تفسیر کے بعد اعلیٰ حضرت کا ترجمہ مختصر اور تمام تفسیر کو حاوی نظر آئے گا۔

''اللہ کا کلام سنتے پھر سمجھنے کے بعد اسے دانستہ بدل دیتے''

البتہ راقم نے لفظی ترجمہ پیش کرنے کی کوشش کی تا کہ دونوں ترجمے ملا کر طلباء کرام زیادہ فائدہ حاصل کرلیں۔

جو سنتے ہیں اللہ کے کلام کو پھر اس میں تبدیلی کر دیتے ہیں سمجھے کے بعد، حالانکہ وہ جانتے ہیں (کہ ہم غلط کرر ہے ہیں)۔

﴿ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ آمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾ (آیت ۷۶)

۱) ''اور جب مسلمانوں سے ملیں تو کہیں گے ہم ایمان لائے اور جب آپس میں اکیلے ہوں تو کہیں وہ علم جو اللہ نے تم پر کھول رکھا مسلمانوں سے بیان کئے دیتے ہو کہ اس سے تمہارے رب کے یہاں تمہیں پر حجت لائیں گے تمہیں عقل نہیں''۔

۲) ''اور جب وہ ملتے ہیں ایمان والوں سے کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب آپس میں اکیلے ہوں تو کہیں وہ علم جو اللہ نے تم پر کھول رکھا مسلمانوں سے بیان کئے دیتے ہو کہ اس سے تمہارے رب کے یہاں تمہیں پر حجت لائیں گے کیا تمہیں عقل نہیں''۔

مختصر مطلب: منافقین جب ایمان والوں سے ملتے تھے تو ان کو یہ کہتے تھے کہ ہم ایمان لائے ہیں

اور تمہیں حق سمجھتے ہیں اور جب علیحدگی میں وہ اپنے ہی دوسرے لوگوں کو ملتے تھے تو وہ ان کو کہتے کہ توراۃ میں جو اس نبی کے اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔تم وہ اوصاف مومنوں کو کیوں بتاتے ہو وہ تو اللہ کے ہاں وہی حجت تم پر پیش کریں گے کہ یہ لوگ تو خود ہمیں ہمارے نبی کریم ﷺ کے اوصاف بتاتے تھے لیکن انہوں نے خلوص سے ایمان نہیں لایا۔اس طرح تو تمہیں رب کے ہاں بہت بڑی ناکامی کا سامنا کرنا پڑے،تم عقل کیوں نہیں رکھتے،ایسا کیوں کرتے ہو،عقل مندی تو یہ ہے کہ ان کے اوصاف کو چھپا کر رکھو۔

نبی کریم ﷺ کے یہود کی ایک قباحت کو پہلے ذکر کیا کہ ان پر ایمان لانے کی طمع نہ کرو وہ ایمان لانے والے نہیں اب ان کی دوسری قباحت کو ذکر کیا جا رہا ہے کہ وہ منافق ہیں۔

۱) شان نزول: چند واقعات کے درپیش آنے کے بعد اس آیۃ کریمہ کا نزول ہوا۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بیشک اہل کتاب میں سے منافقین جب نبی کریم ﷺ کے اصحاب کو ملتے تھے:

﴿ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِیْ اٰمَنْتُمْ بِهٖ وَنَشْهَدُ اَنَّ صَاحِبَكُمْ صَادِقٌ وَاَنَّ قَوْلَهٗ حَقٌّ وَنَجِدُهٗ وَصِفَتَهٗ فِیْ كِتَابِنَا ﴾

''تو کہتے تھے کہ ہم بھی اس ذات پر ایمان لائے ہیں جس پر تم نے ایمان لایا ہے۔اور ہم گواہی دیتے ہیں کہ تمہارے صاحب (تمہارے نبی) سچے ہیں۔اور بیشک ان کے ارشادات حق ہیں اور ہم ان کی نعتوں اور صفات کو اپنی کتاب میں پاتے ہیں''۔

اور وہ جب اپنے رئیسوں اور اپنے علماء کو علیحدگی میں ملتے تھے تو وہ ان کو نصیحت کرتے تھے کہ رب تعالیٰ نے توراۃ میں محمد (ﷺ) کی جو صفات واضح طور پر بیان کردی ہیں تم ان صفات کا ذکر مومنوں سے کیوں کرتے ہو وہ تمہاری گواہی کو تمہارے ہی خلاف بطور حجت پیش کریں گے۔تو ان کو بتا کر بے عقلی کا کام کر رہے ہو۔

" فان المخالف اذا اعترف بصحة التوراة واعترف بشهادة التوراة على نبوة محمد ﷺ فلا حجة اقوى من ذلك "

اس لئے کہ جب مخالفین نے یہ اعتراف کیا کہ توراۃ اللہ کی سچی کتاب ہے اور انہوں نے یہ بھی اعتراف کیا کہ توراۃ محمد ﷺ کی نبوت کی شہادت دے رہی ہے تو اس سے بڑھ کر نبی کریم ﷺ کی حقانیت پر کیا دلیل ہو سکتی۔

یہ دیکھ کر ان کو ان کے رئیسوں نے منع کیا، تو اس آیۃ کریمہ کا نزول ہوا۔ (از کبیر)

۲) اور شان نزول کی یہ وجہ ذکر کی گئی ہے: ابن جریج مجاہد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی ؓ کو بنی قریظہ کی طرف بھیجا انہوں نے نبی کریم ﷺ کو گالیاں دیں۔ آپ کی شان میں اذیت پہنچانے والے نازیبا الفاظ استعمال کئے۔ حالانکہ ان لوگوں کا نبی کریم ﷺ سے معاہدہ بھی تھا، حضرت علی ؓ نے جب نبی کریم ﷺ کو بتایا تو آپ نے فرمایا اگر میں ان کی طرف گیا تو وہ خاموش ہو جائیں گے آپ ان کی طرف گئے اور ارشاد فرمایا:

" انقضّم العهد يا اخوان القردة والخنازير يا عبد الطاغوت اخزاكم الله وانزل بكم نقمته "

اے بندرو اور خنزیر کے بھائیو! اے شیطان کے عبادت گزارو کیا تم نے وعدہ توڑ دیا اللہ تعالیٰ تمہیں رسوا کرے گا اور تمہیں عذاب دے گا۔

چونکہ وہ جانتے تھے کہ نبی کریم ﷺ نے کسی مدرسہ میں نہیں پڑھا پھر ان کے آباء واجداد کا بندر اور خنزیر بن جانا انہیں کیسے پتہ چلا۔

" فقالوا من اخبر بهذا الامر محمدا ما خرج بهذا القول الامنكم "

وہ کہنے لگے محمد کو یہ کس نے بتایا؟ پھر خود ہی اپنے منافق ساتھیوں کو کہنے لگے یہ تم نے ہی بتایا ہے تم کیوں بتاتے ہو وہ مسلمان تمہاری شہادت اور تمہارے بتانے کو ہی تمہارے خلاف بطور حجت پیش کریں گے۔ (ماخوذ از قرطبی وابن کثیر)

﴿ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ آمَنُوْا قَالُوْا آمَنَّا ﴾: ﴿ لَقُوْا ﴾ اصل میں " لقيوا " ہے اس میں ضمیر یہود کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی یہود جب ایمان والوں سے ملتے تھے تو کہتے ہم ایمان لائے ہیں اس پر کہ بیشک تم حق پر ہو بیشک تمہارے رسول (ﷺ) کی بشارت توراۃ میں دی گئی ہے۔ (بیضاوی)

﴿ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ﴾: " اى اذا انفرد بعض المذكورين " یعنی

جب بعض خلوت (علیحدگی) میں اپنے بعض رئیسوں کو ملتے یعنی کعب بن اشرف اور وہب بن یہوداو اور دوسرے سرکردہ رئیس علم والوں کو ملتے۔ (روح المعانی ، مظہری)

﴿ قَالُوْا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ ﴾ : ﴿ قَالُوْا ﴾ کی ضمیر ان یہود کی طرف لوٹ رہی ہے جو منافق نہیں تھے بلکہ خالص یہود تھے منافقین جب ان کے پاس جاتے تھے اور اپنے کارنامے بتاتے تو وہ ان کو بڑے پیارے اور میٹھے انداز پر ڈانٹتے تھے۔

﴿ فَتَحَ ﴾ کا معنی ہے " ایذان بانه سرمکتوم وباب مغلق " پوشیدہ راز کو ظاہر کرنا اور بند دروازہ کو کھولنا "فتح" کا معنی ہے یہاں مراد ہے واضح طور پر کھول کر بیان کرنا۔

﴿ اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ ﴾ کا مطلب علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ان لفاظ سے بیان کیا:

" تخبرون المؤمنين بما بينه الله تعالىٰ لكم خاصة من نعت نبيه محمد ﷺ او من اخذ العهود على انبياء كم بتصديقه ﷺ ونصرته "

کیا تم مومنوں کو خبر دیتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے خاص کر کے تمہیں بتایا کہ یہ اوصاف ہیں اس کے نبی محمد ﷺ کے اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ بتایا کہ انبیاء کرام سے اس نے وعدہ لیا ہے کہ جب میرے آخر الزمان نبی محمد ﷺ تشریف لائیں تو تم ان پر ایمان لان اور ان کی امداد کرنا۔

" والاستفهام انكار " ہمزہ برائے استفہام انکاری کے استعمال ہے یعنی تمہیں نہیں بتانا چاہیے۔

﴿ لِيُحَاجُّوْكُمْ بِهٖ ﴾ : " والمراد ليحتجوا به عليكم " مراد اس کی یہ ہے کہ وہ تم پر تمہاری شہادت اور تمہارے اقوال کو حجت کے طور پر پیش کریں گے یعنی ان کے لئے یہ پختہ دلیل ہوگی۔ (از روح المعانی)

﴿ عِنْدَ رَبِّكُمْ ﴾ : "تمہارے رب کے ہاں" یہ مختصر الفاظ گرامی کثیر معانی پر مشتمل ہیں:

ا) " انهم جعلوا محاجتهم به وقوله هو فی کتابکم " وہ تمہارے اقوال کو حجت بنائیں گے کہ یہ ارشادات تو تمہاری کتاب میں موجود ہیں۔

یعنی یہ کہنا " هو فی کتاب الله هکذا " یہ مسئلہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں اس طرح ہے یا یوں

کہا جائے " وهو عند الله كذا بمعنى واحد " یہ مسئلہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس طرح ہے ان دونوں قولوں کا مطلب ایک ہی ہے۔ لہٰذا ﴿ عِنْدَ رَبِّكُمْ ﴾ کہنے کا ان کا مطلب بھی یہی ہے کہ مسلمان حجت پیش کریں گے کہ یہ تو تمہاری کتاب میں موجود ہے جو اللہ کی کتاب ہے۔

(۲) رب تعالیٰ نے جن چیزوں کو لازم کیا کہ تم رسولوں کی اتباع کرو، ان میں حجت پیش کرنے کے متعلق " تصح ان توصف بانها محاجة فيه لانها محاجة في دينه " یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ رب تعالیٰ میں حجت پیش کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہ حجت رب تعالیٰ کے دین میں ہے۔ اب ﴿ عِنْدَ رَبِّكُمْ ﴾ کا مطلب " في ربكم " ہو گیا کہ وہ تمہارے رب کے بارے میں یعنی اس کے دین میں حجت پیش کریں گے۔

(۳) " المراد يحاجوكم يوم القيامة " یعنی اور مطلب ﴿ عِنْدَ رَبِّكُمْ ﴾ کا یہ ہے کہ وہ قیامت کے دن تم پر رب تعالیٰ کے ہاں حجت پیش کریں گے اس لئے کہ جب سوال کیا جائے گا کہ تم ایمان کیوں نہیں لائے تو تم نے اگر یہ کہا کہ ہمیں تو علم نہیں تھا تو یہ مسلمان کہیں گے کہ یہ تو ہمیں بھی بتاتے تھے کہ وہ سچے نبی ہیں۔ تو اس پر تمہیں زیادہ توبیخ (ڈانٹ ڈپٹ) کی جائے گی اور مخلوق کے سامنے تمہاری بہت زیادہ رسوائی ہو گی۔ حق کا اعتراف کر کے اسے چھپانا تو ایسا ہی ہے جیسا کہ انکار پر قائم رہنا ہے اس طرح تمام لوگ تمہاری منافقت کو اس وقت جان لیں گے جو تمہاری ذلت کا سبب بنے گا۔

اس تیسری صورت کے متعلق اگرچہ علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے یہ بیان کیا " وفيه نظر اذ الاخفاء لا يدفعها " شیخ زادہ نے اس کی وضاحت کی ہے۔ جس کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ منافقین کو ان کے رئیس لوگ منع کرتے تھے کہ تم مسلمانوں کو اپنی کتاب کے بیانات سے مطلع نہ کیا کرو کہ وہ تم پر حجت پیش کریں گے اس حجت سے مراد دنیا کی حجت ہی ہو سکتی ہے کیونکہ وہ نصیحت کرنے والے علم والے حضرات تھے۔ ان کو یہ معلوم تھا کہ قیامت کے دن تو مسلمانوں نے ہمارے خلاف حجت پیش کرنی ہی کرنی ہے اس لئے مسائل کو چھپانے کا قیامت میں فائدہ نہیں ہو گا۔ لہٰذا اس سے مراد دنیا میں فائدہ ہی لیا جا سکتا ہے، اس لئے یہ وجہ ضعیف ہے۔

لیکن اس پر قاضی مظہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بات قابل تسلیم ہے کہ وہ علم والے لوگ تھے

وہ یہ کیسے ان کو نصیحت کر سکتے تھے کہ مسلمانوں سے مخفی رکھو تا کہ قیامت کے دن رب کے حضور وہ تم پر حجت نہ پیش کریں جب ان کا مخفی رکھنا قیامت میں نفع مند نہیں ہوسکتا تھا تو ان کے رئیسوں نے ان کو یہ نصیحت بھی نہیں دی۔

اگر چہ بظاہر تو یہ سمجھ میں آتا ہے لیکن جب ان کی حماقت کو دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ضد اور حسد ان کو جہالت کے درجہ میں پہنچا دیتے تھے۔

" قالوا ما انزل الله علی بشر من شئی "

انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ نے بشر پر کسی چیز کو نازل نہیں کیا۔

" مع ادعائهم بانزال التوراة علی موسی "

باوجود اس کے کہ ان کا یہ بھی دعویٰ تھا تورات موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔

اس سے ہر شخص خود اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ کتنے احمق تھے۔ اور غور کیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے واضح معجزات کو دیکھنے کے بعد ایسے کام کیے اور ایسی باتیں کیں " ما لا یقولها الا مجنون " جو سوائے پاگل کے کوئی نہیں کر سکتا۔

اسلئے واضح ہوا کہ وہ اگر چہ اصحاب علم تھے لیکن نبی کریم ﷺ کی مخالفت ضد اور آپ کے ساتھ حسد کرنے میں درجہ حماقت میں پہنچے ہوئے تھے یہی وجہ تھی کہ ان کا کلام ان کی جہالت پر دلالت کر رہا تھا۔
(از مظهری)

۴) حجت پیش کرنے والے مختلف قسم کے ہوتے ہیں، بعض لوگوں کی غرض حجت پیش کرنے سے یہ ہوتی ہے کہ وہ مقابل شخص پر غلبہ حاصل کریں اور اس سے انہیں سرور حاصل ہو۔ اور بعض لوگوں کا حجت پیش کرنے کا مقصد دینی خدمت اور اچھی نصیحت کرنا ہوتا ہے۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہوتا ہے کہ مقابل شخص کا عذر ختم ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کی حجت (دلیل) کو ہی وہ غالب سمجھے۔

یہود کے منافقین کو ان کے اصحاب علم علیحدگی میں کہتے کہ تم تورات کے مسائل مسلمانوں کو بتا دیتے ہو تو مسلمان ان کو ہی بطور دلیل تم پر پیش کریں گے اور تمہیں نصیحت کریں گے کہ تم تو ہمیں خود بتاتے تھے لہذا تمہیں ایمان لانا چاہیے۔ نصیحت کے طور پر حجت پیش کرنے والا یہ کہتا ہے۔

" قد اوجبت علیک عند الله و اقمت علیک الحجة بین و بین ربی

فان قبلت احسنت الی نفسک و ان جحدت کنت الخاسر الخائب "
تحقیق میں نے تم پر اللہ کے ہاں حکم ثابت کر دیا ہے۔ میں نے اپنے اور اپنے رب کے
درمیان (جو معاہدہ تھا نصیحت کرنے اور حجت پیش کرنے کا وہ) حجت تم پر پیش کر دی
اگر تم نے قبول کر لیا تو تمہارا اپنا بھلا اور اگر تم نے انکار دیا تو تمہارا اپنا نقصان۔

۵) ﴿عِنْدَ رَبِّکُمْ﴾ کا مطلب ہے " عند حکم ربکم و قضائکم " وہ تم پر رب تعالیٰ کے حکم اور قضاء (فیصلہ) کے مطابق حجت پیش کریں گے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَاِذْ لَمْ یَاْتُوْا بِالشُّھَدَاءِ فَاُولٰئِکَ عِنْدَ اللّٰہِ ھُمُ الْکَاذِبُوْنَ ﴾

"(اس پر چار گواہ کیوں نہیں لائے) تو جب گواہ نہ لائے تو وہی اللہ کے نزدیک جھوٹے ہیں"

یہاں بھی یہ بیان کیا گیا ہے:

" فی حکم اللہ و قضائہ لان القاذف اذا لم یات بالشھود لزمہ حکم الکاذبین و ان کان فی نفسہ صادقا "

یعنی " عند اللہ " کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کے فیصلہ کے مطابق جھوٹے ہیں کیونکہ تہمت لگانے والا شخص جب چار گواہ نہ پیش کر سکے تو اس پر جھوٹا ہونے کا حکم لگا دیا جاتا ہے ہوسکتا ہے واقع میں وہ سچا ہی ہو۔ (ماخوذ از کبیر بزیادۃ)

﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾: "تم عقل کیوں نہیں رکھتے) یہ خطاب منافقین یہود کو ان کے رئیس علماء کی طرف سے ہی ہے کہ وہ تم پر تمہارے رب کے ہاں حجت پیش کریں گے " افلا تعقلون ان ذلک لا یلیق بما انتم علیہ " تم عقل کیوں نہیں رکھتے، بیشک تم جو طریقہ اختیار کیے ہو وہ تمہارے لائق نہیں۔

اسی معنیٰ کو علامہ رازی رحمہ اللہ نے بہتر قرار دیتے ہوئے یوں ذکر فرمایا:

" وھذا الوجہ اظھر لانہ من تمام الحکایۃ عنھم فلا وجہ لصرفہ عنھم الی غیرھم "

یہی معنیٰ مراد لینا زیادہ واضح ہے کیونکہ اس سے پہلے ذکر کیے گئے واقعہ کی تکمیل ہو رہی ہے لہٰذا جن لوگوں کا پہلے ذکر آ رہا ہے ان سے ہٹا کر اور طرف پھیرنا صحیح نہیں۔

واضح ہوا کہ ﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ سے مراد مومن لینا اور یہ معنیٰ کرنا کہ تم ان یہود کے ایمان پر طمع کیوں کرتے ہو کیا تم عقل نہیں رکھتے واضح نہیں بلکہ سیاق و سباق سے ہٹ جاتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿ اَوَلَا یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ ﴾(۷۷)

۱) ''کیا نہیں جانتے کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں''۔

۲) ''کیا وہ نہیں جانتے کہ بیشک اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں''۔

بیان قرآن کیا ہی ذیشان ہے: مختصر ذکر میں کتنی وسعت ایک ہی مضمون مختلف معانی پر مشتمل ہے اس آیۃ کریمہ میں علماء یہود کا اس طرح ذکر ہے:

" ان الیھود کانوا یعرفون اللہ ویعرفون انه تعالیٰ یعلم السرو العلانیة فخوفھم اللہ به "

کہ وہ تو اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھتے تھے انہیں یہ معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ ہر ظاہر و باطن کو جانتا ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے خوف دلایا کہ تم جانتے ہوئے پھر یہ کیوں کہتے ہو کہ مسلمانوں کے سامنے نبی کریم ﷺ کی جو شان بیان ہے اسے نہ بیان کرو تا کہ وہ تم پر رب کے ہاں حجت پیش نہ کریں۔ کیا رب خود نہیں جانتا تم نبی کریم ﷺ کی شان میں صفات کو چھپانے کا مشورہ دے کر اپنی حماقت کا ثبوت پیش کر رہے ہو۔

اور اگر اس آیۃ کریمہ میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو رب تعالیٰ کی معرفت نہیں رکھتے تھے عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانتے تھے تو اب مطلب یہ ہوگا:

" فرغبھم بھذا القول فی ان یتفکروا فیعرفوا ان لھم ربا یعلم سرھم وعلانیتھم وانھم لا یامنون حلول العقاب بسبب نفاقھم "

کہ ان کو رغبت دلائی گئی کیا وہ نہیں جانتے ؟ انہیں جاننا چاہئے ان کو چاہئے کہ وہ تفکر کریں اور پہچانیں کہ رب تعالیٰ ہر ظاہر اور باطن کو جانتا ہے۔ وہ منافقت کر کے رب تعالیٰ کے عذاب سے اگر بچنا چاہیں تو بچ نہیں سکیں گے ان پر عذاب آ کر رہے گا۔ (از کبیر)

﴿ اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ ﴾

" یعنی ما اسروا من کفرھم بمحمد ﷺ وتکذیبھم به وھم یجدونه مکتوبا عندھم "

یعنی وہ جو نبی کریم ﷺ سے کفر کرنے کو چھپا کر رکھتے ہیں اور نبی کریم ﷺ کی تکذیب کو

چھپا کر رکھتے ہیں حالانکہ وہ توراۃ میں پائے گئی ہیں ان کو چھپانے کا کیا فائدہ جب رب تعالیٰ جانتا ہے۔ (ابن کثیر)

یعنی اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو وہ بعض کفریات کو پوشیدہ رکھتے، اور بعض کو ظاہر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو وہ نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو چھپاتے ہیں اور کلمات کی تحریف کو ظاہر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے غضب اور عذاب کے جتنے اسباب ان کی طرف سے پائے جاتے ہیں خواہ وہ پوشیدہ رکھیں یا ظاہر کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کو جانتا ہے۔ (از مظہری)

مقصد واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ ان کے ظاہر اقوال وافعال کو جانتا ہے ان کے باطنی اقوال وافعال کو جانتا ہے تو ان کا چھپانا ان کو رب تعالیٰ کے عذاب سے نہیں بچا سکے گا۔

﴿ وَمِنۡهُمۡ اُمِّيُّوۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ الۡكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِىَّ وَاِنۡ هُمۡ اِلَّا يَظُنُّوۡنَ ﴾ (آیت نمبر ۷۸)

۱) ''اور ان میں کچھ ان پڑھ ہیں کہ جو کتاب کو نہیں جانتے مگر زبانی پڑھ لینا یا کچھ اپنی من گھڑت اور وہ نرے گمان میں ہیں''۔

۲) ''اور ان میں سے کچھ ان پڑھ ہیں جو نہیں جانتے کتاب کو مگر زبانی پڑھ لینا یا اپنی آرزوئیں نہیں ہیں وہ مگر گمان میں''۔

اللہ تعالیٰ نے یہود کے عناد کا ذکر فرمایا اور ان کے ایمان لانے کی طمع نہ کرنے کو بیان فرمایا اور یہود کے چار فرقوں کا ذکر فرمایا:

'' الفرقة الاولى هى الفرقة الضالة المضلة وهم الذين يحرفون الكلم عن مواضعه ''

پہلا فرقہ جس کا ذکر فرمایا وہ ہے جو خود بھی گمراہ تھے دوسروں کو بھی گمراہ کرتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کی کتاب توراۃ میں اپنی مرضی سے تبدیلی کر لیتے تھے۔

'' والفرقة الثانية المنافقون '' دوسرا فرقہ منافقین کا تھا جو ایمان والوں سے مل کر کہتے ہم ایمان لے آئے ہیں۔ اور کافروں سے مل کر کہتے ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

" والفرقة الثالثة الذین یجادلون المنافقین " اور تیسرا فرقہ ان میں سے وہ تھا جو منافقین کو یہ کہتے کہ تم توراۃ کے بیانات مسلمانوں پر کیوں واضح کرتے ہو۔

" والفرقة الرابعة هم المذکورون فی هذه الآیة " اور چوتھا فرقہ وہ ہے جن کا ذکر اس آیۃ کریمہ میں ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو جاہل تھے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے کتاب یعنی توراۃ کو سمجھنے کی ان میں صلاحیت نہیں تھی وہ صرف کتاب کے الفاظ کو پڑھنا جانتے تھے معانی نہیں سمجھ سکتے تھے اور اپنی من گھڑت آرزوئیں رکھتے تھے وہ یقینی علم تو رکھتے نہیں تھے البتہ وہ صرف اپنا گمان رکھتے تھے جو غلط ہی ہوتا تھا۔ (از کبیر)

لیکن یہ بھی خیال رہے کہ یہود کا ایک فرقہ خوش قسمت لوگوں کا بھی تھا جو علم والے لوگ تھے کتاب کو پڑھنا بھی جانتے تھے اور سمجھتے بھی تھے، یہ حضرت عبداللہ بن سلام ﷺ جو یہود کے بہت بڑے عالم تھے یہ اور ان کے ساتھی دولت ایمان سے مالا مال ہو گئے۔علامہ رازی رحمہ اللہ نے چار باطل فرقوں کا ذکر فرمایا۔

تنبیہ : جو شخص اس آیۃ اور پہلی آیات میں غور و فکر کرے اور اسے پتہ چل جائے کہ یہود کے اتنے فرقے ہیں اور ان کی یہ یہ صفات ہیں پھر اس امت کی طرف توجہ کرے تو اسے وہی صفات ان میں بھی نظر آئیں گی۔

" فان فیهم من یعاند الحق ویسعی فی اضلال الغیر "
بیشک ان میں بھی کئی لوگ وہ ہیں جو خود بھی دین حق سے عناد رکھتے ہیں اور غیروں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

" وفیهم من یکون متوسطا " کئی لوگ وہ ہیں جو متوسط ہوتے ہیں یعنی دین حق کے باغیوں سے جب ملتے ہیں تو ان کے ساتھ ہوتے ہیں اور کبھی علم والے اور حق والوں کے ساتھ ہوتے ہیں یہی سب سے زیادہ ملک وملت کے لئے نقصان دہ ہوتے ہیں کیونکہ یہ نظر تو "علم والے" آتے ہیں لیکن ہوتے بکاؤ مال ہیں اور جی حضوری ہوتے ہیں۔ان کا کام حاکموں کی خوشامد کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ جو بھی حاکم آئے خواہ کتنا بڑا ظالم ہو خواہ بہت بڑا بے دین ہو۔ خواہ دین اسلام کو مٹانے کے درپے ہو خواہ

علماء کو دہشت گرد کہنے والا ہو، خواہ علماء کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی تمنا رکھنے والا ہو، خواہ وہ یہودیوں اور عیسائیوں کا یار ہو یہ گروہ جی حضوریوں کا اسی کی تعریف کرے گا۔ یہ سب لوگ مل کر ''ہندو، مسلمان اور عیسائی'' ہیں سب بھائی بھائی، کے مصداق یک جہتی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

'' **وفيهم من يكون عاميا محضا مقلدا** '' اور اس امت میں کئی لوگ عوام ہوتے ہیں جو مسائل سے مکمل طور پر بے خبر ہوتے ہیں وہ سنی سنائی باتوں پر کان دھرتے ہیں جیسا کسی نے کہا وہی مان لیا۔ کوئی اللہ والا مل گیا تو یہ بھی نیک ہو گیا اور کوئی گمراہ کرنے والا مل گیا تو یہ بھی گمراہ ہو گیا۔

اور اس امت میں جھوٹ بولنے والے، وعدہ کی مخالفت کرنے والے، امانت میں خیانت کرنے والے، اور غدر کرنے والے منافقوں کی علامت رکھنے والوں کی بھی کوئی کمی نہیں۔ (از کبیر بزیادہ)

﴿ **وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ** ﴾: **من تبعيضيه** ہے ان میں سے بعض ان پڑھ ہیں چونکہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ یہود کے کئی فرقے تھے ان میں سے ایک فرقہ یہ تھا یہ مسئلہ '' **من** '' سے واضح ہوا۔

﴿ **اُمِّيُّوْنَ** ﴾ جمع ہے '' **امی** '' کی۔ '' **امی** '' کا ایک معنی یہ ہے '' **هو من لا يقر بكتاب ولا رسول** '' '' **امی** '' اسے کہتے ہیں جو کتاب اور رسول کا اقرار نہ کرے۔ دوسرا معنی یہ ہے ''**من لا يحسن الكتابة والقراءة** '' جو اچھے طریقہ سے لکھنا، پڑھنا نہ جانے۔

آیۂ کریمہ میں یہی معنی معتبر ہے کہ وہ ''ان پڑھ'' تھے کیونکہ وہ اپنی کتاب اور اپنے رسول کا اقرار کرتے تھے اگرچہ ان کا اپنی کتاب پر ایمان نہیں، ایمان ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لاتے۔ اسی دوسرے معنی پر ﴿ **لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتَابَ** ﴾ ''وہ کتاب کا علم نہیں رکھتے'' بھی دلالت کر رہا ہے۔

﴿ **لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتَابَ اِلَّا اَمَانِيَّ** ﴾: '' **امانی** '' جمع ہے '' **امنية** '' کی جو اصل میں ''**امنونة** '' (**افعولة**) تھا۔ اصل میں اس کا ایک ہی معنی ہے اسے سے آگے کئی معانی لئے گئے۔ وہ اصل واحد یہ ہے '' **ما تخيله الانسان فيقدر فى نفسه وقوعه** '' انسان کسی چیز کے واقع ہونے کا خیال کرے کہ ایسا ہوگا تو اسے '' **امنيه** '' کہا جاتا ہے۔

پھر اس کی دو صورتیں ہیں کبھی مطلب آرزو دلانا، یعنی دوسرے کو بتانا کو میں اس کام کی توقع رکھتا ہوں۔ وہ آرزو رکھے کہ فلاں شخص نے یہ کام کرنا ہے۔ اسی معنی میں ''**يعدهم ويمنيهم** ''استعمال

ہے۔اور کبھی اس کا معنی ہوتا ہے آرزو رکھنا جیسا کہ ﴿ تِلْکَ اَمَانِیُّھُمْ﴾ (یہ ان کی آرزوئیں ہیں) میں یہی معنی لیا گیا ہے۔اسی اصل معنی کا اعتبار کرتے ہوئے " امنیة " کا معنی ''جھوٹ'' بھی لیا جاتا ہے کہ وہ بھی انسان اپنے نفس میں رکھتا ہے کہ میں یہ کہوں گا پھر وہ جھوٹ بولتا ہے۔

" والمروی عن ابن عباس ومجاهد ؓ ان الامانی هنا الا کاذیب ای الا اکاذیب اخذوها تقلیدا من شیاطین المحرفین "

حضرت ابن عباس اور حضرت مجاہد ؓ سے مروی ہے کہ اس آیۃ کریمہ میں جو " امانی " کا ذکر ہے اس کا معنی ہے ''ان کے جھوٹ'' اب مکمل مفہوم یہ ہو گیا کہ وہ کتاب کو نہیں جانتے سوائے جھوٹی باتوں کے جو انہوں نے اپنے تحریف کرنے والے شیطانوں سے حاصل کی ہیں۔

اور اسی اصل معنی کا اعتبار کرتے ہوئے یہ معنی لیا گیا ہے " الا ما یقرء ون قراء ة عارية عن معرفة المعنی وتدبره " یعنی وہ کتاب کو نہیں جانتے سوائے پڑھنے کے جو معنی سمجھنے اور اس میں تدبر سے خالی ہونے کے۔آسان مطلب یہ تھا کہ وہ پڑھنا جانتے تھے لیکن سمجھنا نہیں جانتے تھے۔

صاحب کشاف نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ معنی بھی اصل معنی سے ہی ماخوذ ہے کہ جس طرح کوئی شخص کسی چیز کو دل میں رکھے اور تمنا کرے کہ یہ اس طرح حاصل ہو جائے " وکذالک القارئی یقدر ان کلمة کذا بعد کذا " اسی طرح قاری جو کتاب کو سمجھنے سے قاصر ہو وہ بھی صاف یہی سوچتا رہتا ہے کہ یہ کلمہ ایسا ادا کرنا ہے اور اس کے بعد کلمہ ایسے ادا کرنا ہے۔

آجکل کے بیکار قاری صرف اچھی آواز سے قرآن پاک کے الفاظ کو سریلی آواز اور طرز و ادا سے پڑھنے والے جو معانی سے بے خبر ہوتے ہیں وقف کرنے کا پتہ نہیں ہوتا کہ کہاں مضمون ختم ہو رہا ہے وقف کرنا چاہئے اور کہاں وقف نہیں کرنا چاہئے ان کے لئے یہ لمحہ فکر ہے جو چیز قابل تعریف نہیں وہ اس پر ناز کر کے علماء کرام پر اعتراض کرتے رہتے ہیں یہ تو قرآن پڑھنا نہیں جانتے کاش ان جاہلوں کو کچھ سمجھ آئے۔

تنبیہ: جب " امانی " کا معنی آرزوئیں کیا جائے، تو مطلب یہ ہو گا کہ ''وہ کتاب کا علم نہیں رکھتے سوائے اپنی من گھڑت آرزؤں کے'' اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کے من گھڑت اقوال کیا تھے۔

(۱) وہ یہ کہتے تھے کہ باقی انسانوں سے رب تعالیٰ کا تعلق یہ ہے کہ وہ اس کی مخلوق ہیں ۔ اور اس کے عبادت گزار ہیں ۔ رب تعالیٰ ان کا خالق اور معبود ہے :

"ما محبوب وپسر خوانده ایم پس ہر گنا ہے که از ما سرزد شود حق تعالی بسبب فرط محبت از ما درگزر فرماید"

لیکن ہم تو اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں اور ہم اس کی اولاد سمجھے جاتے ہیں ۔ لہذا ہم سے کوئی گناہ بھی سرزد ہوا تو اللہ تعالیٰ ہمیں بے پناہ محبت کی وجہ سے معاف کر دے گا ۔

(۲) ہمارے آباء واجداد عالی قدر انبیاء کرام تھے، ان کا رب تعالیٰ کے ہاں خصوصی مرتبہ ہے وہ اس کی مرضی کو تبدیل کر سکتے ہیں اگر بالفرض اللہ تعالیٰ نے ہمیں عذاب دینے کا ارادہ فرمایا:

"پدران ما را بجدوکد خلاص خواہند کنانید"

تو ہمارے آباء واجداد اپنی کوشش اور محنت سے ہمیں چھڑا لیں گے ۔

تنبیہ : اہل سنت مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ انبیاء کرام شفاعت فرمائیں گے رب تعالیٰ کے ہاں اپنے عجز کا اظہار کریں گے اور رب تعالیٰ ان پر اپنی خصوصی مہربانی فرماتے ہوئے ان کی سفارش کو قبول فرمائے گا ۔ اور یہود کا عقیدہ یہ ہے کہ انبیاء کرام اپنی وجاہت سے رب تعالیٰ کو مرضی تبدیل کرنے پر مجبور کر دیں گے، یہ فرق واضح رہے کہ کوئی گستاخِ انبیاء کرام ان کی شفاعت کو اور اہل سنت کے عقیدہ کو یہود کے عقیدہ سے تشبیہ نہ دے ۔

(۳) وہ کہتے تھے بیشک یہود کافر بھی کیوں نہ ہو جائیں رب تعالیٰ ان کو چالیس دنوں سے زیادہ عذاب نہیں دے گا وہ چالیس دن بھی اس لئے کہ ہمارے آباؤ اجداد نے چالیس دن بچھڑے کی پوجا کی تھی ۔

(۴) یہود کی شریعت قیامت تک واجب العمل ہے یہ کبھی منسوخ نہیں ہو سکتی ۔ یہ ان کا صریح جھوٹ تھا کہ ان کی اپنی کتاب نبی کریم ﷺ کی شریعت کو ناسخ کہتی تھی ۔

(۵) اور وہ یہ کہتے تھے کہ نبوت کی استعداد بنی اسرائیل میں سے صرف حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں پائی جاتی ہے ۔ کسی اور خاندان میں نبوت کی استعداد ہی نہیں ۔

یہ ان کی من گھڑت آرزوئیں اور خیالات باطلہ، اور جھوٹے اقوال تھے، بس یہی ان کے علم کے

محور تھا توراۃ کے حقیقی علم سے خالی تھے البتہ پڑھنا جانتے سمجھتے نہیں تھے اور من گھڑت اقوال کو جانتے۔
(ماخوذ از کبیر، عزیزی، روح المعانی، کشاف)

اس وضاحت کے بعد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی طرف غور کریں آپ نے دونوں معنی تحریر کر کے تفاسیر کا نچوڑ پیش کر دیا (جو کتاب کو نہیں جانتے مگر زبانی پڑھ لینا یا کچھ اپنی من گھڑت) راقم نے بھی اسی معنی کو نقل کیا ہے۔

﴿وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ﴾ : ''نہیں ہیں وہ مگر گمان میں'' یعنی ان کو یقینی علم حاصل نہیں تھا بلکہ ان کا علم ظنی تھا جن کا علم قطعی اور یقینی نہ ہو ان کو ایمان کیسے حاصل ہوتا ایمان کی دار و مدار تو علم یقینی پر ہے۔ (روح المعانی)

فائدہ : آیۃ کریمہ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ معارف (علمی مسائل) تمام کسبی ہیں۔ ضروری (بدیہی) نہیں۔ اسی لئے علم نہ حاصل کرنے والے صرف گمان سے بیان کرنے والے کی مذمت کی گئی۔

☆ اور یہ فائدہ حاصل ہوا " **بطلان التقليد مطلقا وهو مشكل لان التقليد في الفروع جائز عندنا** " اگر چہ بظاہر مطلقاً تقلید کا باطل ہونا سمجھ میں آ رہا ہے حالانکہ یہ کہنا خود باطل ہے کیونکہ تقلید اصول میں (یعنی اعتقادیات میں) منع ہے فروع میں جائز ہے یہی ہمارا مذہب ہے۔

خیال رہے یہود جو کہ جاہل تھے اور علماء کی تقلید کرتے تھے ان کی مذمت صرف اسی وجہ سے کی گئی کہ وہ باطل عقائد ان سے حاصل کر کے گمراہ ہو گئے۔

☆ اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ گمراہ کرنے والا اگر چہ برا انسان ہے۔ لیکن گمراہ کرنے والے کے جال میں پھنس کر گمراہ ہونے والا، صحیح عقائد بیان کرنے والے کی بات کو نہ تسلیم کرنے والا بھی برا انسان ہے۔ اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے گمراہ کرنے والے اور گمراہ ہونے والے دونوں کی ہی مذمت بیان کی۔

☆ اور فائدہ یہ حاصل ہوا " **ان الاكتفاء بالظن في اصول الدين غير جائز** " اصول دین میں یعنی اعتقادیات میں صرف ظن (گمان) پر اکتفاء کرنا جائز نہیں بلکہ یقینی علم حاصل ہونا چاہئے۔ (از کبیر)

﴿ فَوَيۡلٌ لِّلَّذِينَ يَكۡتُبُونَ الۡكِتَابَ بِاَيۡدِيهِمۡ ثُمَّ يَقُولُونَ هٰذَا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ لِيَشۡتَرُوۡا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيۡلًا فَوَيۡلٌ لَّهُمۡ مِّمَّا كَتَبَتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ وَوَيۡلٌ لَّهُمۡ مِّمَّا يَكۡسِبُوۡنَ ﴾ (آیت ۷۹)

۱) ''تو خرابی ہے ان کے لئے جو کتاب اپنے ہاتھ سے لکھیں پھر کہہ دیں یہ خدا کے پاس سے ہے کہ اس کے عوض تھوڑے دام حاصل کریں تو خرابی ہے ان کے لئے ان کے ہاتھوں کے لکھے سے اور خرابی ان کے لئے اس کمائی سے''۔

۲) ''تو ہلاکت ہے ان لوگوں کے لئے جو لکھتے ہیں کتاب اپنے ہاتھوں سے، پھر کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ حاصل کریں اس کے بدلے تھوڑا مال تو ہلاکت ہے ان کے لئے اس سے جو ان کے ہاتھوں نے لکھا، اور ہلاکت ہے ان کے لئے اس سے جو وہ کسب کرتے ہیں''۔

اس آیۃ کریمہ میں یہود کی ایک اور قسم کا ذکر کیا جا رہا ہے جو دوسرے لوگوں کو گمراہی کی دعوت دیتے تھے، اور جھوٹ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے، اور لوگوں کا مال باطل طریقہ سے کھاتے ہیں۔ (ابن کثیر)

یہ لوگ توراۃ کی تحریف کر کے نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو بدل کر اور توراۃ کے احکام کو بدل کر اپنی طرف سے اپنے ہی ہاتھوں سے لکھ کر یہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہی ارشاد فرمایا ہے ان کی تحریف کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس کے بدلے دنیاوی نفع کچھ حاصل کر لیتے تھے تو رب تعالیٰ نے ان کے اس فعل اور ان کی لکھی ہوئی کتاب اور ان کی کمائی کے لئے لفظ ویل ذکر کیا جس کی تفصیل تو ان شاء اللہ قریب ہی آ رہی ہے مختصر مطلب یہ ہے کہ ان کے لئے خرابی ان کے لئے بربادی ہے ان کے لئے ہلاکت ہے۔

﴿ فَوَيۡلٌ لِّلَّذِيۡنَ يَكۡتُبُوۡنَ الۡكِتٰبَ بِاَيۡدِيۡهِمۡ ﴾:

" والویل الھلاک والدمار وھی کلمۃ مشھورۃ فی اللغۃ "

''ویل'' کا لغت میں مشہور معنی ''ہلاک ہو جانا، برباد ہو جانا۔

ایک لفظ کثیر معانی پر مشتمل ہے:

☆ " عن ابی عیاض ویل صدید فی اصل جھنم " ابوعیاض فرماتے ہیں جہنم کی گہرائی اوراس کی تہ میں پیپ کی ایک وادی ہے جسے ویل کہا جاتا ہے۔ (ابن کثیر)

☆ " وقال عطاء بن یسار الویل واد فی جھنم لو ارسلت فیه الجبال لذابت من حرة " (شیخ زادہ)

عطاء بن یسار کہتے ہیں ویل جہنم میں ایک وادی کا نام ہے اگراس میں پہاڑوں کو ڈال دیا جائے تو وہ بھی اس کی گرمی کی وجہ سے پگھل جائیں۔

☆ " وروی عن ابی سعید الخدری ان النبی ﷺ قال ویل واد فی جھنم یھوی فیه الکافر اربعین خریفا قبل ان یبلغ قعره "

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا ویل جہنم میں ایک وادی کا نام ہے (وہ اتنی زیادہ گہری ہے کہ) اس میں کافر کو جب پھینکا جائے گا تو وہ اس کی تہ میں چالیس سال تک پہنچے گا۔ (از شیخ زادہ)

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے ان معانی کے بغیر اور مزید معانی بیان کئے ہیں۔

☆ " وعن ابن عباس الویل المشقة من العذاب "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عذاب سے جو مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے اسے ویل کہا جاتا ہے۔

☆ " وقال الخلیل الویل شدة الشر " خیل کہتے ہیں شر کی شدت کو بھی ویل کہا جاتا ہے۔

☆ " قال الاصمعی الویل تفجع " اصمعی نے کہا جزع فزع کو ویل کہا جاتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ نے کچھ اور معانی بھی تحریر فرمائے ہیں۔

☆ ابن جریر نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے نقل فرمایا کہ جہنم میں آگ کا ایک پہاڑ ہے اسے "ویل" کہا جاتا ہے۔ یہ وہی پہاڑ ہے جس پران یہود کو رکھا جائے گا جنہوں نے اللہ تعالیٰ

کی کتاب میں تحریف کی۔

☆ بزار وابن مردویہ نے سعد بن ابی وقاص سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جہنم میں آگ کا ایک بہت بڑا پتھر ہے جس کو ''ویل'' کہا گیا ہے اس پر بے دین چوہدریوں اور بے ایمان جماعت کے لیڈروں کو کبھی اوپر چڑھایا جائے گا اور کبھی نیچے اتارا جائے گا۔ (از عزیزی)

تمام معانی کا مطلب ایک ہے: ''ویل'' جہنم میں ایک وادی کا بھی نام ہے جس کی گہرائی تک پہنچنے میں چالیس سال درکار ہوں گے۔ اس وادی میں جہنم والے لوگوں کی پیپ ہوگی، اس وادی میں اتنی شدید حرارت ہوگی کہ اس میں پہاڑ بھی پگھل جائیں گے۔

اور جہنم کے شعلے مارنے والی آگ کی بلندی ایک پہاڑ اور ایک بڑے پتھر یعنی چٹان کی طرح نظر آئے گی۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں تحریف کرنے والوں کو کبھی بلندی تک پہنچایا جائے گا اور کبھی نیچے پھینکا جائے گا اس عذاب کی وجہ سے انہیں شدید مشقت اٹھانی پڑے گی۔ یہ عذاب ان کے لئے شدید شر کا سبب ہوگا۔ یہ ان کے لئے غم بڑھانے والا ہوگا، جس میں وہ جزع وفزع کریں گے۔ یہ شدید عذاب ان کے لئے خرابی اور بربادی کا سبب ہوگا۔

راقم کی اس توجیہ میں تمام معانی سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو گئے کسی غیر مسلم، بے دین کو یہ کہنے کی جرات نہیں ہو سکے گی کہ تمہارے قرآن اور تمہاری احادیث میں تعارض پایا جاتا ہے۔ تعارض نہیں صرف جہالت سمجھنے میں رکاوٹ کا سبب ہے۔

﴿ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ﴾: ''پھر کہتے یہ اللہ کی طرف سے ہے'' وہ لوگ دو وجہ سے گناہ کے مرتکب ہو رہے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اپنی طرف سے اس طرح کی عبارت اس کتاب کی عبارت سے ملا کر لکھنا کہ جس کو عام انسان اللہ تعالیٰ کی کتاب کا حصہ ہی سمجھے یہ بھی حرام اور گناہ کبیرہ کا سبب ہے۔ پھر دوسرا ان کا جھوٹ اور افتراء کہ یہ کلام رب تعالیٰ کا ہے یہ پہلے جرم سے بھی عظیم جرم تھا۔

انہوں نے تبدیل کیا: اگرچہ وہ توراۃ کے کئی احکام کو بھی اپنے مرضی کے مطابق تبدیل کرنے کے مجرم ہوئے تھے لیکن سب سے بڑا ظلم انہوں نے یہ کیا تھا کہ نبی کریم ﷺ کے جو اوصاف توراۃ میں ذکر تھے ان کو انہوں نے تبدیل کر دیا تھا، ان کا خیال تھا کہ ہمارے اس طریقہ سے لوگ کم تعداد میں اسلام قبول کریں گے۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ جسے رب تعالیٰ بڑھانا چاہے اسے دنیا کی کوئی طاقت گھٹا نہیں سکتی۔

آج کل یہ سازش زور و شور سے چل رہی ہے کہ نبی کریم ﷺ کو ایک عام انسان کی حیثیت میں پیش کرو کہ محبت مصطفیٰ ﷺ کی وجہ سے لوگ جو تن، من، دھن کی بازی لگا دیتے ہیں اس میں کمی آ جائے یہ غیر مسلموں کو معلوم ہے کہ سچا اور حقیقی مسلمان محبت مصطفیٰ ﷺ کا متوالا ہوتا ہے، وہ آپ کے نام پر جان قربان کرنا ایمان کا حصہ سمجھتا ہے۔

یہود و نصاریٰ اور ان کے ایجنٹ آج کل اس کوشش میں ہیں کہ اس میں کمی ہو جائے وہ بدبخت نہیں سمجھتے کہ رب تعالیٰ نے فرمادیا ہے:

﴿ وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ ﴾:

"اے محبوب آپ کی ہر آنے والی گھڑی پہلی سے بہتر ہے"

جسے رب تعالیٰ نے بڑھانے کا وعدہ فرمادیا اسے یہ گھٹانے کی فکر میں ہیں۔ ان کم بختوں کو یہ بھی معلوم نہیں ہو رہا کہ ہمارا باپ جب پہلے حاکم تھا اس وقت سے وہ کوشش کر رہا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی شان کو نام نہاد مسلمانوں کے ذریعے ہی کم کیا جائے۔ لیکن ایک دفعہ تو وہ دفعہ ہو گیا شان مصطفیٰ ﷺ بڑھتی چلی گئی، لیکن آجکل اس نے اپنے چیلے اور اپنی ذریت معنوی ماڈرن لوگوں کو بنایا ہوا ہے جن میں زیادہ زندیق، دہریئے اور قادیانی ہیں۔ لیکن ایک مرتبہ خود ان بکاؤ مال لوگوں کا باپ اپنی تباہی کا شکار ہو چکا ہے۔ لیکن اس کی ذریت معنوی اس کی پشت پناہی کر رہی ہے۔

مقام افسوس یہ ہے کہ کافر سارے کے سارے ایک ہیں " الکفر ملة واحدة " کا کامل مصداق ہیں، لیکن مسلمان بھی کافروں کا ساتھ دے رہے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم عالمی برادری

کے ساتھ ہیں ہم یک جہتی کا مظاہرہ کر رہے ہیں خیر اس میں زیادہ تعجب اس لئے نہیں کہ قانون یہ ہے ”کل شئی یرجع الی اصلہ“ ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ اس لئے ذریت معنوی اپنے محسن باپ کی رقوم کا حق ادا نہ کرے تو اور کون کرے گا۔

﴿ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ﴾ : ”تاکہ وہ حاصل اس کے بدلے تھوڑا ثمن“ اشتراء کا معنی خریدنا ہے لیکن یہاں اس کا معنی ہے تبدیل کرنا، حاصل کرنا اور ”ثمن“ کسی چیز کی قیمت جو بیچنے اور خریدنے والے کے درمیان طے ہو جائے یہاں مطلقاً اس سے مراد مال ہے۔ یعنی وہ دنیاوی مقاصد کے پیش نظر دنیا کا گھٹیا مال لے کر کتاب کی تحریف کرتے تھے۔

” وھو ان جل اقل قلیل بالنسبة الی ما استوجبوہ من العذاب الدائم وحرموہ من الثواب المقیم “
ذکر کیا گیا ہے کہ وہ قلیل مال لیتے تھے۔ دنیا کے لحاظ پر اگر چہ زیادہ مال بھی لے لیا جائے، لیکن وہ بنسبت دائمی عذاب کے مستحق ہونے اور ہمیشہ کے ثواب سے محروم ہونے کے گھٹیا ہی متصور ہوگا۔ (از روح المعانی)

﴿ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ ﴾ : ”تو خرابی ہے ان کے ہاتھوں کے لکھے سے“

﴿ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴾ : ”اور خرابی ان کے لئے اس کمائی سے“

” واما معنی فلان العبد انما یستحق الویل والعقاب لا جل فعلہ وکسبہ وھو الکتب والکسب ھھنا لا لاجل ذات المکتوب والمسکوب “
یعنی وہ خرابی اور ہلاکت کے مستحق اپنے فعل یعنی اللہ کی کتاب میں اپنی طرف سے عبارات کو لکھنے کی وجہ سے ہوئے اور اسی طرح اپنی طرف سے تحریف کر کے اس پر مال لینے کی وجہ سے خرابی کے مستحق ہوئے۔

نکتہ: ایک دفعہ ویل ذکر کے صرف معطوف اور معطوف علیہ کی صورت میں باقی جملے ذکر نہیں فرمائے بلکہ تین مرتبہ علیحدہ علیحدہ ”ویل“ ذکر کر کے اشارہ کیا کہ ان کے تین جرم علیحدہ علیحدہ تھے ہر جرم بذاتہ خود ہی بہت بڑا جرم تھا تین نے مل کر ان کو ایمان سے کتنا ہی دور کر دیا۔

اللہ تعالیٰ کی کتاب میں اپنی طرف سے ان کا عبارات کو شامل کرنا ایک جرم تھا۔ پھر اس کو رب تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا دوسرا جرم تھا کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اور پھر اس کے ذریعے رشوت لینا حرام طریقہ سے مال جمع کرنا اور ہی جرم تھا۔

فلذلک ذکر اللہ تعالیٰ لھم ثلاثة ویلات کل ویل بمقالة ذنب "

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تین مرتبہ "ویل" ذکر فرمایا یعنی ہر گناہ کے مقابلہ میں "ویل" ذکر کیا تین گناہ اور تین "ویل"۔ (از شیخ زادہ)

اب اس شیخ زادہ رحمہ اللہ کی تفسیر کے بعد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر ایک نظر پھر کریں۔ تینوں کا علیحدہ علیحدہ نمایاں طور پر فرق ترجمہ سے انشاء اللہ نظر آئے گا۔

مسئلہ : قرآن پاک میں بطور تفسیر عربی الفاظ، یا احادیث مبارکہ کو اس طرح لکھنا کہ قرآن پاک اور غیر قرآن کا فرق نظر نہ آئے ناجائز ہے۔ اسی لئے عربی تفاسیر میں قرآن پاک کے الفاظ مبارکہ پر لکیر کھینچ دی جاتی ہے۔ یا ان کو بریکٹ میں لکھ دیا جاتا ہے۔ یا ان کی لکھائی کا رنگ مختلف کر دیا جاتا ہے۔

فائدہ جلیلہ : عبدالرزاق اور ابن ابی داؤد نے عبداللہ بن شقیق عقیلی سے روایت بیان کی:

" کان اصحاب رسول اللہ ﷺ یشددون فی بیع المصاحف ویرونه عظیما "

رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام قرآن پاک کے نسخوں کو بیچنے سے ممانعت میں شدت اختیار فرماتے تھے اور اسکے بیچنے میں بہت ناپسندیدگی کا اظہار کرتے تھے۔

حضرت امام زین العابدین رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ صحابہ کرام کے زمانہ میں قرآن پاک کے نسخوں کو بیچنے کا رواج نہیں تھا۔ بلکہ طریقہ یہ رائج تھا کہ اگر کسی کو قرآن پاک کے نسخے کی ضرورت در پیش آتی تو وہ لکھنے کا تمام سامان مہیا کر کے مسجد کے منبر کے پاس آ کر بیٹھ جاتا۔ اور دوسرے احباب کو کہتا کہ آپ قرآن پاک کے لکھنے میں میری امداد کریں۔ جو شخص بھی لکھنا جانتا ہوتا وہ اس کے لکھنے میں امداد کرتا

اس طرح بہت سے آدمیوں کے مل کر لکھنے کی وجہ سے قرآن پاک کا نسخہ چند دنوں میں تیار ہو جاتا۔

اول ایں بدعت در آخر زمان معاویہ بن ابی سفیان رائج شدہ "

قرآن پاک کے نسخے لکھ کر بیچنے کی بدعت سب سے پہلے حضرت امیر معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں جاری ہوئی۔

"لیکن ایں بدعت حسنہ است بدعة سیئہ نیست "

لیکن یہ اچھی بدعت ہے جو جائز ہے بلکہ مستحسن اور مستحب ہے اس بدعت کو ناجائز کہنا جہالت ہوگا۔

بات بات پر بدعت بدعت کہنے والوں کو چاہئے کہ وہ قرآن پاک کے طبع شدہ نسخے خرید کر بدعت کے مرتکب نہ ہوں بلکہ اپنے ہاتھوں سے قرآن پاک لکھ کر پڑھا کریں۔ یہ کون سا طریقہ ہے جو جی میں آئے وہ جائز ہو جائے اور جی میں نہ آئے وہ ناجائز ہے۔

قرآن پاک کا نسخہ بیچنے کے جواز پر اجماع امت ہے:

جب علماء نے غور کیا، تحقیق کی کہ اگر کوئی شخص قرآن پاک لکھ کر وہ نسخہ بیچ دیتا ہے تو اس میں حرام ہونے کی تو کوئی وجہ نہیں۔ " واجماع برجواز آں متحقق گشت " تو اس کے جواز پر اجماع متحقق ہو گیا۔

تنبیہ : زیر بحث آیۃ کریمہ سے یہ ثابت کرنا ممکن نہیں کہ قرآن پاک کے نسخے تیار کر کے بیچنا یہود کی مشابہت ہے کیونکہ یہود تو اللہ کی کتاب میں اپنی طرف سے عبارات کو شامل کر کے کہتے تھے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے ان کا یہ فعل تو کفر تھا۔

لیکن کوئی مومن نہ اس طرح کی جرات کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کے متعلق سوچ سکتا ہے حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی حفاظت خود اپنے ذمہ کرم پر کی ہے اس لئے یہود و نصاریٰ کی کوئی کوشش بھی قرآن پاک کو تبدیل کرنے کی تا قیامت کامیاب نہیں ہو سکے گی۔

☆ قرآن پاک کے نسخے تیار کر کے بیچنے کے متعلق ابن ابی داؤد نے روایت کی کہ حضرت ابن عباس

اور محمد بن حنفیہ سے سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا " **لا باس انما یاخذون اجور ایدیھم** " کوئی حرج نہیں وہ اپنے ہاتھوں کی کمائی کی اجرت حاصل کر رہے ہیں۔

☆ ایک اور قول محمد بن حنفیہ نے بیان کیا ہے کہ علماء نے کہا ہے " **لا باس انما بیع الورق وعمل یدیه** " کہ کوئی حرج نہیں بیشک یہ اوراق کی بیع ہے اور ہاتھوں کی کمائی ہے۔

☆ حضرت امام محمد باقر سے روایت ہے " **لا بأس بشراء المصاحف وان یعطی الاجر علی کتابتھا** " کہ قرآن پاک کے نسخے خریدنے اور ان کی کتابت پر اجرت دینے میں کوئی حرج نہیں۔

(از عزیزی)

راقم کا موقف اس میں یہ ہے کہ ابتدائی طور پر نبی کریم ﷺ کے زمانہ اور صحابہ کرام کے دور میں تقوی کے طور پر قرآن پاک کے نسخے تیار کر کے نہیں بیچے جاتے تھے اسی تقوی کے پیش نظر متقدمین میں سے بعض حضرات نے پسند نہیں کیا تھا، لیکن جب یہ دیکھا گیا کہ لوگ اب سست ہوتے جا رہے ہیں قرآن پاک کے نسخے تیار کرنے میں ایک دوسرے کی معاونت نہیں ہو رہی تو بطور محنت و مزدوری کے تیار کرنے میں کوئی وجہ ناجائز نہ ہونے کی پا کر جواز کا قول کیا گیا۔

اس لئے یہ کہنا کہ پہلے بلا تحقیق اور مسئلہ کی طرف توجہ کرنے کے بغیر عدم جواز کا فتوی دیا گیا پھر تحقیق کر کے جواز کا فتوی دیا گیا یہ کوئی مناسب قول نہیں اور سلف صالحین متقدمین صحابہ کرام اور تابعین کے متعلق یہ کہنا کسی حد تک مناسب نظر نہیں آتا۔

☆☆☆☆☆

﴿ وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ (آیت ۸۰)

۱) ''اور بولے ہمیں تو آگ نہ چھوئے گی مگر گنتی کے دن تم فرمادو کیا خدا سے تم نے کوئی عہد لے رکھا ہے جب تو اللہ ہرگز اپنا عہد کا خلاف نہ کرے گا یا خدا پر وہ بات کہتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں''۔

۲) اور انہوں نے کہا ہرگز ہمیں نہیں چھوئے گی آگ مگر چند دن فرما دیجئے کیا تم نے لیا ہے اللہ سے عہد پھر تو ہرگز نہیں کرے گا اللہ اپنے عہد کا بلکہ تم کہتے ہو اللہ پر وہ بات جو تم نہیں جانتے''۔

شان نزول: نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود کے مختلف اقوال کے بعد یہ آیت نازل ہوئی ان کے اقوال تمام باطل تھے۔

(۱) " قال ابن عباس قالت اليهود مدة الدنيا سبعة آلاف سنة وانا نعذب بكل الف سنة يوما ثم ينقطع عنا العذاب بعد سبعة ايام " (خازن)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہود (کبھی تو یہ) کہتے تھے کہ دنیا کی کل مدت سات ہزار سال ہے اور ہمیں ہر ہزار سال کے بدلے ایک دن عذاب دیا جائے گا۔ یعنی ہمیں کل سات دن عذاب دیا جائے گا پھر ہم سے عذاب کو اٹھا لیا جائے گا۔

(۲) "روى الضحاك عن ابن عباس رضى الله عنهما ان اليهود زعمت انهم وجدوا فى التوراة ان ما بين طرفى جهنم سيرة اربعين سنة الى ان ينتهوا الى شجرة الزقوم وانهم يقطعون فى كل سيرة سنة فيكملونها " (ابو السعود)

ضحاک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ بیشک یہود (کبھی یہ) گمان کرتے تھے کہ انہوں نے توراۃ میں یہ پایا ہے کہ جہنم کی دونوں طرفوں میں چالیس سال کی راہ ہے چالیس سال کی مسافت کے بعد جہنم والے تھوہر کے درخت کے پاس پہنچیں گے۔ لیکن ہم وہ چالیس دنوں میں مسافت طے کر لیں گے۔

(۳) " وقال قتادہ وعطاء یعنون اربعین یوما التی عبد فیھا آباؤھم العجل "

قتادہ اور عطاء فرماتے ہیں کہ یہود (کبھی تو یہ کہتے تھے) کہ ہم تو سمجھتے ہیں کہ ہمیں صرف چالیس دن عذاب ہوگا وہ بھی اس لئے کہ ہمارے آباء واجداد نے چالیس دن بچھڑے کی پوجا کی تھی۔

(۴) " وقال الحسن وابو العالیۃ قالوا ان ربنا عقب علینا فی امر فاقسم لیعذبنا اربعین یوما فلن تمسنا النار الا اربعین یوما تحلۃ القسم "

حضرت حسن اور ابوالعالیہ کہتے ہیں بیشک ہمارے رب نے ہم پر کسی معاملہ میں عتاب فرمایا پھر قسم اٹھادی کہ وہ ہمیں چالیس دن عذاب دے گا۔ بس وہی چالیس دن تک رب تعالیٰ ہمیں عذاب صرف اس لئے دی گا تا کہ اس کی قسم پوری ہوجائے۔ (مظہری)

(۵) " قیل ان النبی ﷺ قال للیھود من اھل النار ، قالوا نحن ثم تخلفونا انتم فقال کذبتم لقد علمتم انا لا نخلفکم "

ایک قول یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ یہود کو کہا کہ جہنم میں کون جائے گا تو انہوں نے کہا کہ ہم جائیں گے (لیکن ہم تو بہت تھوڑے دن رہیں گے) پھر ہمارے پیچھے تم جہنم میں جاؤ گے (معاذ اللہ) (اور پھر تم جہنم میں ہمیشہ رہو گے) تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم جھوٹے ہو، تمہیں علم حاصل ہے کہ ہم تمہارے بعد جہنم میں نہیں جائیں گے۔ (قرطبی)

یہی قول ان کا تفسیر ابن کثیر میں وضاحت سے مذکور ہے:

" عن ابی ھریرۃ قال لما فتحت خیبر اھدیت لرسول ﷺ شاۃ فیھا سم فقال رسول اللہ ﷺ اجمعوا لی من کان من الیھود ھھنا فقال لھم رسول اللہ ﷺ من ابوکم قالوا فلان قال کذبتم بل ابوکم فلان فقالوا صدقت وبررت ثم قال لھم ھل انتم صادقی عن شئی ان سالتکم عنہ قالوا نعم یا ابا القاسم قالوا نعم یا ابا القاسم وان کذبناک عرفت کذبنا کما عرفتہ فی ابینا فقال لھم رسول اللہ ﷺ من اھل النار فقالوا نکون فیھا یسیرا ثم تخلفونا فیھا فقال لھم رسول اللہ ﷺ اخسئوا واللہ لا نخلفکم فیھا ابدا ثم قال لھم رسول اللہ ﷺ ھل انتم صادقی

عن شئی ان سألتکم عنه قالوا نعم یا ابا القاسم قال هل جعلتم فی هذه الشاة سما فقالوا نعم قال فما حملکم علی ذلک فقالوا اردنا ان کنت کاذبا ان نستریح منک وان کنت نبیا لم یضرک"

(رواه الامام احمد والبخاری والنسائی من حدیث اللیث بن سعد بحوه) (ابن کثیر)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جب خیبر فتح ہوا تو رسول اللہ ﷺ کو ایک بکری (کا گوشت) ہدیہ کے طور پر دی گئی جس میں زہر ملا دیا گیا تھا۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہود کو میرے پاس جمع کرو (جب وہ جمع ہو گئے) تو نبی کریم ﷺ نے ان سے پوچھا تمہارا باپ کون ہے؟ انہوں نے کہا فلاں آپ نے فرمایا تم نے جھوٹ بولا ہے تمہارا باپ فلاں ہے انہوں نے کہا تم نے سچ کہا ہے تم نے درست کہا ہے پھر آپ نے ان کو کہا کہ اگر میں تم سے ایک سوال کروں تو کیا تم مجھے سچ بتاؤ گے، انہوں نے کہا اگر ہم نے جھوٹ بولا تو اے ابوالقاسم آپ کو ہمارے جھوٹ کا پتہ چل جائے گا جیسا کہ تمہیں ہمارے باپ کے متعلق پتہ چل گیا ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا (جہنم کی) آگ میں کون جائیں گے وہ کہنے لگے ہم تھوڑی دیر کے لئے جائیں گے پھر تم ہماری جگہ جاؤ گے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا دفعہ ہو جاؤ، قسم ہے اللہ تعالیٰ کی ہم تمہاری جگہ کبھی نہیں جائیں گے پھر آپ نے ان سے پوچھا کہ میں تم سے سوال کروں تو تم کیا اس کا سچا جواب دو گے؟ انہوں نے کہا ہاں اے ابوالقاسم، آپ نے فرمایا کیا تم نے اس بکری (کے گوشت) کو زہر آلود کیا؟ انہوں نے کہا ہاں آپ نے فرمایا ایسا کرنے پر تمہیں کس چیز نے برانگیختہ کیا؟ وہ کہنے لگے ہم نے ارادہ کیا کہ اگر تم جھوٹے ہوئے تو ہمیں تم سے راحت حاصل ہو جائے گی اور اگر تم سچے نبی ہوئے تو تمہیں یہ زہر کوئی نقصان نہیں دے گا۔

یہود کے ان تمام لغو، بیہودہ، جھوٹے، باطل اقوال کے بعد اس آیۃ کریمہ کا نزول ہوا۔ یہاں سے یہود کی ایک اور قباحت کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی طرف سے یقینی دعویٰ کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں عذاب نہیں دے گا سوائے چند دنوں کے، تو رب تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرمایا کہ آپ ان کو کہہ دیجئے کیا تم نے اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد لے رکھا ہے ہاں اگر اس کا تمہارے ساتھ کوئی عہد ہے

کہ وہ تمہیں سوائے چند دنوں کے عذاب نہیں دے گا تو یقیناً ایسا ہی ہونا چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا لیکن یہ تمہارا دعوی ہی دعوی ہے اس پر تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں۔ صرف زبانی طور پر بغیر کسی دلیل کے تمہارے قول کا کوئی اعتبار نہیں وہ تو سراسر جھوٹ ہے۔

بلکہ تم اللہ تعالیٰ کی طرف جھوٹ کی نسبت کر رہے ہو یعنی یہ قول بھی تمہارا من گھڑت اور جھوٹا ہے اور کہتے یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ ہمیں سوائے چند دنوں کے عذاب نہیں دے گا سوائے چند دنوں کے۔ تم صرف اپنے عقل سے یہ کہہ رہے ہو اور منسوب رب تعالیٰ کی طرف کر رہے ہو حقیقت میں تم ایک اور عظیم جرم کے مرتکب ہو رہے ہو۔

﴿وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً﴾:

" المس ایصال الشئی بالبشرة بحیث تتأثر الحاسة به واللمس کالطلب له ولذلک یقال المسه فلا اجده " (بیضاوی)

" مس " کا معنی یہ ہے کسی چیز کو چمڑے تک پہنچانا اس لحاظ پر کہ وہ حس کو قبول کرے اور اسی حس کی طلب کو " لمس " کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے " المسه فلا اجده " میں اسے تلاش کر رہا ہوں لیکن پا نہیں رہا۔ اسی وجہ سے کہیں " مـــــس " (چھونا) کے پائے جانے کے باوجود "لمس " (طلب کرنا) نہیں پایا جاتا۔ ﴿اِلَّا اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً﴾ محصورة، یعنی معدودہ کا معنی ہے گنتی کے چند دن۔

طلباء کرام مستثنیٰ مفرغ کو جانتے ہیں یہاں بھی استثناء مفرغ پایا گیا ہے اصل معنوی لحاظ پر عبارت یوں ہوگی:

" ﴿لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ﴾ ابدا ﴿اِلَّا اَیَّامًا﴾ قلائل "

" ہرگز ہمیں آگ مس نہیں کرے گی کبھی بھی سوائے چند دنوں کے"۔

اسلئے کہ ﴿مَعْدُوْدَةً﴾ کا لفظ جب مطلق ذکر کیا جائے تو اس سے مراد "قلیل" ہی لیا جاتا ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿دراهم معدودة﴾ میں بھی قلیل دراھم ہی مراد ہیں۔

(از بیضاوی وشیخ زادہ)

تنبیہ : ﴿ مَعْدُوْدَةً ﴾ کا معنی قلیل جوذکر کیا ہے اس سے مراد جمع قلت والا معنی نہیں جودس سے زیادہ پر نہ بولا جا سکے۔ بلکہ یہاں با محاورہ معنی مراد لیا گیا ہے، چند دن۔ رمضان کے تیس روزوں کے لئے بھی ﴿ ایاً ما مَّعْدُوْدَا تٍ ﴾ ذکر کیا گیا ہے جو سال کی بنسبت چند دن ہی ہیں۔

طلباء کرام کی توجہ کے لئے: اس مقام پر ﴿ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً ﴾ ذکر کیا گیا ہے اور سورۃ آل عمران میں ﴿ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ ﴾ ذکر کیا ہے وجہ فرق کیا ہے؟ جبکہ موصوف دونوں میں ایک ﴿ایاما﴾ ہے۔ تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اسم اگر مذکر ہو (غیر ذوی العقول سے ہو) تو اس کی صفت کی جمع ''تا'' سے آتی ہے۔ یعنی واحد مؤنث ہوگی۔ جیسے کوز کی جمع کیزان اور اس کی صفت ''مکسورۃ'' آتی ہے اور اسی طرح ''ثوب'' کی جمع ''ثیاب'' اور اسکی صفت ''مقطوعۃ'' آتی ہے۔

اور جب اسم غیر ذوالعقول واحد مؤنث ہو تو اس کی جمع کی صفت ''الف، تا'' سے آئے گی جیسا کہ ''جرۃ'' کی جمع ''جرار'' آتی ہے اس کی صفت کی جمع ''مکسورات'' الف تا سے آتی ہے۔ لیکن مذکر غیر ذوی العقول جمع کی صفت ''الف تا'' سے آسکتی ہے جیسے ﴿ اَیَّـامًـا مَّـعْـدُوْدَاتٍ ﴾ الشھور الماضیات ، لہٰذا سورۃ بقرہ میں اصل مذکور ہے ﴿ اَیَّـامًـا مَّعْدُوْدَةً ﴾ اور سورۃ آل عمران میں فرع ذکر ہے ﴿ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ ﴾

﴿ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗ ﴾ :

''فرما دیجئے کیا تم نے اللہ سے عہد لیا ہے پھر تو ہرگز اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرے گا''

﴿ اَتَّـخَـذْتُـمْ ﴾ باب افتعال ہے اس میں اصل میں دو ہمزے تھے ایک استفہام کا اور ایک باب افتعال کے باب کا ہمزہ تخفیف کے طور پر حذف کر دیا اور استفہام کا ہمزہ انکار کے لئے ہے۔ یعنی مفہوم یہ ہو گیا کہ آپ فرما دیجئے تم نے اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد نہیں لیا کہ وہ وعدہ کے خلاف نہ کرے۔

﴿ فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗ ﴾ یدل علی انه سبحانه وتعالیٰ منزه عن الکذب وعده ووعیده قال اصحابنا لان الکذب صفة نقص والنقص علی الله محال ''

اللہ تعالیٰ وعدہ کی خلاف ورزی نہیں فرماتا کیونکہ وعدہ کی خلاف ورزی جھوٹ ہے
اللہ تعالیٰ اپنے وعد اور وعید میں جھوٹ سے پاک ہے اور یہی وجہ ہے کہ اہل سنت
وجماعت کا مذہب یہ ہے کہ جھوٹ ایک ایسی صفت ہے کہ جس سے نقص لازم آتا ہے
اللہ تعالیٰ کی طرف نقص کی نسبت محال ہے۔ (از کبیر)

یہاں یہ بھی خیال رہے کہ عہد لینے کا مطلب خبر دینا وعدہ کرنا ہے اصل مطلب یہ ہے کہ کیا تمہیں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے یا اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ وعدہ کیا ہے؟

﴿ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ ''بلکہ تم کہتے ہو اللہ پر جو تم نہیں جانتے''

دینی طلباء کرام کے لئے: (ام) کی دو قسمیں ہیں: متصله اور منقطعة '' یہاں آیۃ کریمہ میں ایک احتمال یہ ہے (ام) متصلہ ہو یہ دو چیزوں کے درمیان برابری کے لئے آتا ہے اور دونوں میں ایک چیز کی تعیین چاہتا ہے بظاہر مطلب تو یہ ہے کیا تم نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ لیا ہے .... یا تم اللہ تعالیٰ پر وہ کہتے ہو جو تم نہیں جانتے یعنی سوال کرنے والا دو چیزوں میں سے ایک کی تعیین کا سوال کر رہا ہوتا ہے۔ اسے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں سے ایک کا وقوع ہوا ہے۔ لیکن (ام) متصلہ لینے کی صورت میں ایک بات یہ ذہن میں رہے " فلا یکون الاستفهام علی حقیقته " کہ استفہام حقیقی معنی میں نہیں۔ سوال کرنا مقصود نہیں۔ اور دوسری یہ بات ذہن میں رہے:

" وخرج ذلک مخرج المتردد فی تعیینه علی سبیل التقریر
لاولئک المخاطبین لعلم المستفهم وهو النبی ﷺ بوقوع احدهما "

کہ یہاں سوال کرنے والے نبی کریم ﷺ ہیں کیونکہ " قل " سے خطاب آپ کو ہی ہے اور آپ کو کوئی تردد نہیں تھا آپ کو تو یقینی طور پر معلوم تھا کہ "یہ لوگ وہ چیز اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر رہے جس کا انہیں علم نہیں" البتہ ان لوگوں کو تردد تھا کہ وہ کیا جواب دیں۔ اور یہاں سے ایک اور مسئلہ سمجھ آ گیا کہ (ام) متصلہ کے بعد کبھی جملہ بھی آ جاتا ہے کیونکہ کبھی دو حکموں کے درمیان برابری کرنی مقصود ہوتی ہے " وبهذا صرح ابن الحاجب فی الایضاح " علامہ ابن حاجب نے ایضاح میں اس کی

وضاحت کی ہے۔

☆ " ویحتمل ان تکون منقطعة بمعنی بل ، والتقدیر بل تقولون "

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ (ام) منقطعہ ہو بل (بلکہ) کے معنی میں ہو تقدیر عبارت کی یہ ہو ''بلکہ تم کہتے ہو'' (بل) اضراب کے لئے آتا ہے۔

خیال رہے کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ " ام متصلہ " کے مطابق ہے اور راقم کا ترجمہ " ام منقطعہ " کے برابر ہے تاہم جب مفسرین کرام کی تفاسیر کو مدنظر رکھ کر وضاحت کی جائے تو دونوں میں نمایاں فرق نظر نہیں آئے گا بلکہ بہت قریب قریب ہوں گے۔ کیا تم نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ لے رکھا ہے کہ وہ تمہیں عذاب سوائے چند دنوں کے نہیں دے گا پھر تو وہ یقینی طور پر اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا، لیکن یہ غلط ہے کہ تم نے وعدہ لے رکھا ہو۔ یا تم اللہ تعالیٰ پر وہ بات کہتے ہو جو تم نہیں جانتے، ہاں ایسا ہی ہے یقیناً تم اللہ تعالیٰ پر وہ بات کہہ رہے ہو جو تم نہیں جانتے۔

دوسرا مطلب کیا تم نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ لے رکھا ہے کہ وہ تمہیں عذاب نہیں دے گا پھر تو تمہیں عذاب نہیں دے گا کیونکہ وہ وعدہ کی خلاف ورزی نہیں فرماتا، خبردار تمہیں یہ نہیں کہنا چاہئے کیونکہ تم نے کوئی وعدہ نہیں لے رکھا۔ بلکہ تم تو اللہ تعالیٰ پر وہ بات کہہ رہے جو تم نہیں جانتے۔

تنبیہ : یہاں علامہ رازی رحمہ اللہ نے ایک اعتراض و جواب ذکر فرمایا کہ یہود نے جب اپنے گمان سے بیان کیا کہ ہمیں زیادہ دیر عذاب نہیں ہوگا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت کی تو قیاس کیسے صحیح ہے؟ لیکن وہ اعتراض اور اس کے کئی جواب بہت واضح طور پر حکیم الامت علامہ مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے بیان فرمائے ان کو ذکر کرنا یقیناً بہت ہی مفید ہے۔

اعتراض : اس آیۃ سے معلوم ہوا کہ قیاس کرنا سخت گناہ بلکہ کفر ہے کیونکہ یہود نے قیاس سے اپنا چند روزہ عذاب مانا اور آیت نے ان کی سخت تردید کی اور حنفی، شافعی وغیرہ تمام مقلدین قیاس کرتے ہیں لہٰذا وہ سب گمراہ ہیں (معاذ اللہ) (غیر مقلد)۔

جواب اول: یہودیوں نے عقائد میں قیاس کیا تھا یہ واقعی ناجائز ہے مقلدین فروعی اعمال میں

قیاس کرتے ہیں نہ کہ عقائد میں۔

جواب دوم: یہود نے خبر میں قیاس کیا کہ قیامت میں ہماری بخشش ہوگی اور خبر میں قیاس نہیں ہوسکتا۔اس کے لئے نقل دلیل ضروری ہے ہم لوگ احکام شرعیہ میں قیاس کرتے ہیں۔

جواب سوم: انہوں نے نص کے مقابل قیاس کیا، کیونکہ توراۃ نے کفار کی بخشش کا انکار کیا انہوں نے قیاس سے اس کو ثابت کیا اور نص کے مقابل قیاس کرنا حرام ہے۔ان کا حال شیطان کے حال کی طرح ہوا، ہم ایسا قیاس نہیں کرتے۔ جہاں نص نہ ہو وہاں قیاس کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

جواب چہارم: ان کا قیاس فلسفی قیاس آرائی تھی یعنی ان کا قیاس من گھڑت بلا دلیل تھا کیونکہ ان کے قیاس میں کسی آیۃ کی تائید نہیں تھی۔ ہمارا قیاس شرعی ہوتا ہے جس کی آیۃ یا حدیث سے تائید ہوتی ہے۔

جواب پنجم: ان کا قیاس بلاضرورت تھا۔اور ہمارا قیاس شرعی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ہوتا ہے تو یقیناً قیاس بھی شرعی کہلاتا ہے لہٰذا ان کا قیاس بے دینی تھا اور ہمارا قیاس دینی ہے۔یعنی نبی کریم ﷺ کی شریعت کی چار دلیلیں ہیں: قرآن، حدیث، اجماع اور چوتھی دلیل ہے ہی قیاس۔کوئی غیر مقلد بغیر قیاس کے زندہ رہ نہیں سکتا فرق اتنا ہے کہ ہم مجتہدین کے قیاس پر عمل کرتے ہیں اور وہ جہلاء اور گمراہوں کے قیاس پر عمل کرتے ہیں گویا ہم اماموں کے مقلد ہیں اور وہ نفس اور شیطان کے۔ (از نعیمی)

☆☆☆

﴿بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْئَتُه فَاُولٰئِکَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خَالِدُوْنَ﴾

۱) ''ہاں کیوں نہیں جو گناہ کمائے اور اس کی خطا اسے گھیر لے وہ دوزخ والوں میں ہے انہیں ہمیشہ اس میں رہنا''۔

۲) ''ہاں کیوں نہیں جس نے کسب کیا برائی کا اور احاطہ کر لیں اس کا اس کی خطائیں تو وہ لوگ جہنم والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''۔

یہود کے دعوی کو رد کیا جا رہا ہے جو انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں زیادہ دیر عذاب نہیں ہوگا، بلکہ صرف چند دن عذاب ہوگا تو رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ میں ان کا رد فرمایا کہ تمہارا دعوی باطل ہے۔ عذاب کیوں نہیں ہوگا جب کہ قانون باری تعالیٰ یہ ہے کہ جب کوئی گناہوں کا عمل کرے اور وہ اس کی غلطیاں اس کا ایسا احاطہ کرلیں کہ اسے ایمان کی دولت سے بھی محروم کر دیں تو وہ لوگ جہنمی ہیں اور جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔

﴿بَلٰی﴾ : نفی کے بعد ثبوت کے لئے آتا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ﴾ کیا میں تمہارا رب نہیں؟ ﴿قَالُوْا بَلٰی﴾ انہوں نے کہا ہاں کیوں نہیں یعنی تو ہمارا رب ہے۔ اسی طرح جب انہوں نے کہا ﴿لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ﴾ ''ہمیں ہرگز آگ نہیں چھوئے گی'' تو رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿بَلٰی﴾ کیوں نہیں یعنی تمہیں آگ ضرور چھوئے گی کیونکہ تم نے تحریف کی وجہ سے کفر اختیار کرلیا۔

﴿مَنْ کَسَبَ سَیِّئَةً﴾ : والکسب جلب النفع کسب کا اصل میں معنی یہ ہے ''نفع حاصل کرنا'' والسیئة، الفاحشة الموجبة للنار '' وہ گناہ جو جہنم میں جانے کا ذریعہ ہو اسے ''سیئة'' کہا جاتا ہے اسی وجہ سے کبیرہ گناہوں پر ''سیئة'' کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ وہ بھی آگ میں جانے کا ذریعہ ہیں۔ '' ای یستحق فاعلها النار ان لم یغفرله '' یعنی اگر گناہ کبیرہ کرنے والے شخص نے توبہ نہ کی یا رب تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے اس کی مغفرت نہ کی تو وہ جہنم کا مستحق ہوگا۔

فصاحت قرآن: "کسب" کا معنی ہے "نفع حاصل کرنا" اس کے بعد "سیئۃ" کا ذکر کیا جو جہنم میں جانے کا ذریعہ ہے اس سے یہ واضح کیا کہ وہ اپنے کفر یعنی اللہ کی کتاب کی تحریف سے بظاہر دنیا کا گھٹیا مال حاصل کرتے اور وہ سمجھتے کہ ہم نفع حاصل کر رہے ہیں لیکن درحقیقت ان کے لئے خسارا کا ہی سبب تھا کیونکہ ان کے اس فعل نے ان کو جہنمی بنا دیا۔

﴿وَاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓـئَتُهٗ﴾ احاطہ کا معنی واضح ہے گھیر لینا، غالب آجانا، ہر طرف سے شامل ہو جانا: ﴿خَطِیْٓـئَتُهٗ﴾ اصل میں اس غلطی کو کہتے ہیں جو بلا ارادہ سرزد ہو۔ جیسا کہ کسی شکار کی طرف تیر پھینکا لیکن غلطی سے اس کی زد میں کوئی انسان آجائے، اسی طرح نشہ کی حالت میں کسی کا نقصان کر دیا یہ سب خطیات کہلائیں گی۔

تاہم خطائیں باوجود احاطہ کر لینے کے قابل توبہ ہیں۔ خواہ کفر اور شرک کی حد تک بھی ہوں۔ کیونکہ کفر اور شرک کو چھوڑ کر تائب ہو کر انسان جب مسلمان ہو جائے تو وہ قابل بخشش ہے، خواہ اس کے بعد وہ کئی گناہوں میں مبتلا ہو۔ ہاں البتہ جب کفر اور شرک پر اس کی موت آگئی توبہ نہ کر سکا تو وہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں رہے گا۔

﴿فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾

یہاں اصحاب کی نار کی طرف اضافت تلازم پر دلالت کر رہی ہے کہ جن کا گناہوں نے احاطہ کر لیا اور اسی پر ان کی موت آگئی آگ ان کو لازم رہے گی۔ وہ آگ میں ہمیشہ رہیں گے یعنی کافر کو کبھی بھی جہنم سے نکال کر جنت میں نہیں پہنچایا جائے گا۔ (ماخوذ از روح المعانی)

یہود دو وجہ سے مذمت کے مستحق ہوئے:

یہود کی تحریف اور غلطی کی وجوہ کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ سمجھا جائے کہ ہر شریعت میں معاصی کے دو مرتبے رہے۔ ایک یہ کہ اعتقاد تو ملت حقہ کے مطابق ہو لیکن عمل مخالفت ہو مثال کے طور پر شراب پینے، زنا کرنے، چوری کرنے، لواطت کرنے، غیر کے مال کو غصب کرنے کو حرام سمجھے، اور ان پر عذاب کے

لاحق ہونے کا خوف بھی رکھے، لیکن بوجہ حجاب طبعی اور غلبہ شہوت کے اس سے یہ افعال سرزد ہوں تو اسے فاسق وفاجر کہا جائے گا۔ فاسق وفاجر کو اگر عذاب دیا گیا تو وہ عذاب ختم بھی ہوگا اور وہ عذاب کے ختم ہونے کے بعد جنت میں آ جائیں گے۔

معاصی کا دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ اعتقاد ہی باطل ہو یعنی اللہ تعالیٰ اور انبیاء کرام اور ملائکہ اور آخرت اور آسمانی کتب پر اس کا ایمان نہ ہو۔ اور اسی طرح حرام چیزوں کو حرام ہی نہ سمجھے تو وہ شخص کافر زندیق اور ملحد کہلاتا ہے وہ جہنم میں دائمی عذاب میں ہوگا اس کا عذاب کبھی ختم نہیں ہوگا۔ اس مسئلہ کو مسلمان اہل علم نے اس طرح بیان کیا۔

" الفاسق لا يخلد في النار والكافر مخلد في النار "

فاسق آگ میں ہمیشہ نہیں رہے گا اور کافر آگ میں ہمیشہ رہے گا۔

لیکن یہود نے ان دونوں وجہ کی مخالفت کی اور من گھڑت اقوال پیش کیے کیونکہ یہود نے کہا:

﴿ لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا ﴾ یہود کے بغیر ہرگز کوئی جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

یعنی یہود نے مسلمانوں کے جنت میں جانے کی نفی کی، خواہ نیک ہوں یا گنہگار ان کا یہ قول جھوٹ پر مبنی تھا انہوں نے اپنے من گھڑت قول کو رب تعالیٰ کی طرف منسوب کیا۔ اسی طرح دوسرا مرتبہ معاصی کا کفر ہے۔ کافر جہنم سے کبھی باہر نہیں آئے گا۔ ہمیشہ جہنم میں رہے گا یہود اللہ کی کتاب میں تحریف کر کے کافر ہونے کے باوجود کہتے تھے کہ ہم جہنم میں ہمیشہ نہیں رہیں گے بلکہ ہمیں اگر عذاب ہوا تو صرف چند دن ہوگا ان کا یہ قول بھی جھوٹ پر مبنی تھا۔ لہٰذا ان دو جھوٹے اقوال اور قانون قدرت میں تحریف کی وجہ سے ان کی مذمت کی گئی۔ (از عزیزی)

☆☆☆

﴿ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾ (آیت ۸۲)

۱) ''اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے وہ جنت والے ہیں انہیں ہمیشہ اس میں رہنا''۔

۲) ''اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے عمل کئے اچھے وہ لوگ جنت والے ہیں انہیں اس میں ہمیشہ رہنا ہے''۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جب آیۃ وعید (عذاب والی آیۃ) کو ذکر کیا، تو ساتھ ہی آیۃ وعد کو ذکر فرمایا اس میں چند فوائد پائے جاتے ہیں۔

ایک فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نظام عدل واضح ہوتا ہے اس لئے کہ جو لوگ ہمیشہ کفر پر قائم رہنے والے ہیں ان کے لئے جب دائمی عذاب ہے تو یقیناً عدل و انصاف کا تقاضا یہی تھا کہ جو لوگ ہمیشہ ایمان پر ثابت رہنے والے ہیں ان کو قائم و دائم رہنے والی نعمتوں سے نوازا جائے۔

دوسرا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ مومن کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ سے خوف بھی رکھے اور اس کی رحمت کی امید بھی رکھے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا" **لو وزن خوف المؤمن ورجاؤہ لا عتدلا** " اگر مومن کے خوف اور امید کا وزن کیا جائے تو دونوں برابر ہوں۔ یعنی دونوں چیزیں ایک جیسی سمجھے تاہم رب تعالیٰ کی رحمت وسیع ہے اس کی وسعت پر امید رکھنا بھی اس کی شان کریمی کے مطابق ہے۔ مومن کو یہ اعتدال اسی وقت سمجھ آ سکتا ہے جب آیات وعید کے ساتھ آیات وعد کو بھی ذکر کیا جائے۔

تیسرا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے وعد سے اس کی کامل رحمت کا ظہور ہوتا ہے اور اس کی وعید سے اس کی کامل حکمت کا ظہور ہوتا ہے جس سے انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی صفات کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ (از کبیر)

تنبیہ : ایمان پر قائم رہنا، اور ایمان پر ہی موت کا آنا جنت میں جانے کا ذریعہ ہے اگر العیاذ باللہ مرتد ہو جائے اور اس کی موت حالت ارتداد پر ہی آ جائے تو وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

☆ حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفی نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا:

" یا رسول اللہ قل لی فی الاسلام قولا لا اسأل عنہ احدا بعدک قال قل آمنت باللہ ثم استقم " (رواہ مسلم)

یا رسول اللہ ﷺ آپ مجھے اسلام کے متعلق ارشاد فرمائیں کہ مجھے آپ کے بعد کسی سے سوال کرنے کی ضرورت درپیش نہ آئے آپ نے فرمایا تم یہ کہو میں نے اللہ پر ایمان لایا پھر اس پر قائم رہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی بھی اسی پر دلالت کر رہا ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴾

''بیشک وہ لوگ جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ اس پر قائم رہے تو انہیں کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمناک ہوں گے''۔ (از قرطبی)

فائدہ : ایمان کے بعد اعمال صالحہ کا ذکر فرمایا جس سے پتہ چلا کہ ایمان اصل میں تصدیق قلبی کا نام ہے اعمال صالحہ اس کا جزء نہیں کیونکہ جزء کا عطف کل پر نہیں ہوتا۔ اسی سے یہ مسئلہ بھی واضح ہو گیا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب فاسق وفاجر تو ہوتا ہے لیکن ایمان سے خارج نہیں ہوتا بلکہ مؤمن ہی رہتا ہے:

" لان الایمان اشرف من العمل لکونہ اساس جمیع الحسنات اذ الاعمال ساقطۃ عن درجۃ الاعتبار عند عدمہ "

کیونکہ ایمان تمام اعمال سے اشرف ہے اور تمام نیکیوں کی بنیاد ہے کیونکہ ایمان کے علاوہ نیک اعمال کبھی انسان سے ساقط بھی ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ حالت حیض میں عورت سے نماز ساقط ہو جاتی ہے اور مرد یا عورت ایک دن ایک رات سے زیادہ بیہوش ہو جائیں تو نماز ساقط ہو جاتی ہے لیکن ایمان کسی حال میں بھی ساقط نہیں ہوتا۔

نکتہ : ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ کے ذکر میں یہ نکتہ پایا گیا ہے:

" وھو ان یکون الایمان فی مقابلۃ السیئۃ المفسرۃ بالکفر عند البعض والعمل الصالح فی مقابلۃ الخطیئۃ المفسرۃ بما عداہ "

وہ یہ ہے کہ پہلی آیت مبارکہ میں ''سیئۃ'' کا ذکر ہی جس سے مراد کفر لیا گیا ہے۔ اس کے مقابل

اس آیۃ میں ایمان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور اسی طرح پہلی آیۃ میں ﴿خَطِیْٓئَةُ﴾ کا ذکر ہے جس سے مراد کفر کے علاوہ اور گناہ مراد ہیں اس آیۃ میں اس کے مقابل اعمال صالحہ کا ذکر ہے۔

﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ سے مراد عام حکم:

"والمراد من ﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ امة محمد ﷺ ومؤمنوا الأمم قبلهم"

اس آیۃ کریمہ میں ایمان کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ عام ہے نبی کریم ﷺ کی امت کو بھی شامل ہے اور پہلی امتوں کے مؤمنین کو بھی شامل ہے۔

فائدہ جلیلہ :

"ان خلودهم فی النار بسبب افعالهم السيئة وعصيانهم وخلودهم فی الجنة بمحض لطفه تعالى وكرمه والا فالايمان والعمل الصالح لا يفی بشكر ما حصل للعبد من النعم العاجلة"

بیشک لوگوں کا آگ میں داخل ہونا ان کے برے افعال اور نافرمانی کی وجہ سے ہوگا اور ان کا کفر جہنم میں ہمیشہ رہنے کا ذریعہ ہوگا۔ لیکن جنت میں ہمیشہ رہنے کا انعام صرف اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم سے حاصل ہوگا ورنہ بندے پر اللہ تعالیٰ کے اتنے انعام ہیں جو بندہ حاصل کر چکا ہوتا ہے کہ ان انعامات کو شمار کرنا چاہے تو شمار نہیں کر سکتا تو انسان کا ایمان اور نیک عمل تو ان انعامات کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکتے تو یوں سمجھیں کہ انسان اس مزدور کی طرح ہے جو مزدوری پہلے لے لے کام بعد میں کرے وہ کام ختم کرنے پر مزدوری کا حقدار تو نہیں ہوتا کیونکہ وہ پہلے مزدوری کا حقدار تو نہیں ہوتا کیونکہ وہ پہلے مزدوری حاصل کر چکا ہوتا ہے لیکن مالک اس پر پھر رحم کرے اور انعام سے نواز دے تو اسکی کرم نوازی۔

اسی طرح انسان اللہ تعالیٰ کے عظیم اور ان گنت انعامات پہلے حاصل کر چکا ہے لیکن ایمان اور نیک اعمال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اپنے لطف وکرم سے مزید انعام سے نوازے گا کہ جنت میں ہمیشہ رہنے اور جنت کی عظیم نعمتوں سے انسان کی پھر تکریم ہوگی۔

اسی سے ایک اور مسئلہ واضح ہوگیا کہ "ان الوعيد من الكريم مظنة الخلف دون الوعد" رب تعالیٰ جو کریم ذات ہے اس کی طرف سے وعید اس کی مشیت پر موقوف ہے اگر کفر کی حد تک گناہ نہ

ہوئے تو رب تعالیٰ نے چاہا تو گرفت فرمائے گا، اور اگر معاف کردے تو اسکی مرضی اور اس کا کرم ہوگا۔

لیکن رب تعالیٰ نے اپنے بندوں سے جو وعدہ فرمایا ہے اگر چہ اس پر کوئی چیز لازم تو نہیں ہوتی لیکن اس نے اپنے کرم سے اپنے آپ پر لازم قرار دے دیا ہے لہذا وعد میں ایسا نہیں ہوگا کہ وہ چاہے تو وہ نعمتیں عطا کرے اور چاہے تو نہ عطا کرے۔ (از روح المعانی)

راقم نے جس انداز پر اردو میں مسئلہ سمجھایا ہے اس میں خلف فی الوعید کی کوئی بات نہیں۔

تنبیہ: کوئی شخص اپنی نیکیوں کو عظیم اور کثیر نہ سمجھے اور ان پر اترائے نہیں اور تکبر نہ کرے اور ریاء کاری نہ کرے ورنہ اس کی نیکیاں ضائع ہو جائیں گی۔ یہ بھی خیال رہے کہ رب تعالیٰ کسی کی نیکیوں کو ضائع نہیں کرتا لیکن بندہ خود نیک عمل ریاء کاری کے طور پر کرے تو وہ نیک عمل ضائع ہو جاتا ہے کیونکہ وہ نیک عمل بنتا ہی نہیں اس نیک عمل کو بندے نے خود ہی ضائع کیا ہے۔

اور اسی طرح کوئی شخص اپنے گناہوں کو حقیر اور قلیل نہ سمجھے کیونکہ تھوڑے تھوڑے جمع ہو کر اس کی ہلاکت کا سبب بن جائیں گے

☆ "وعن عبد الله بن مسعود ﷺ ان رسول الله ﷺ قال ایاکم و محقرات الذنوب، فانهم یجتمعن علی الرجل حتی یهلکنه" (مسند احمد)

حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ نے فرمایا بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا گناہوں کو حقیر سمجھنے سے اپنے آپ کو بچا کر رکھو، بیشک وہ گناہ جمع ہو کر انسان کی ہلاکت کا سبب بن جاتے ہیں۔ پھر نبی کریم ﷺ نے ایک مثال سے مسئلہ کو سمجھایا کہ جس طرح کوئی قوم جنگل میں اترے قوم کا سردار ان کو لکڑیاں جمع کرنے کا حکم دے تو ایک شخص لکڑیاں لائے پھر دوسرا شخص لائے اس طرح جب کئی آدمی لکڑیاں جمع کریں اور آگ جلائی جائے اب آگ میں جو چیز بھی ڈالو وہ جل جائے گی۔

(از صابونی)

☆☆☆☆☆

﴿ وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْکُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ (آیت ۸۳)

۱) ''اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کو نہ پوجو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں سے اور لوگوں سے اچھی بات کہو اور نماز قائم رکھو اور زکوۃ دو پھر تم پھر گئے مگر تم میں کے تھوڑے اور تم روگرداں ہو''۔

۲) ''اور جب لیا ہم نے وعدہ بنی اسرائیل سے کہ عبادت نہ کرنا سوائے اللہ تعالیٰ کے اور والدین سے احسان کرنا اور رشتہ داروں سے اور یتیموں سے اور مسکینوں سے (احسان کرنا) اور کہو لوگوں سے اچھی بات، اور قائم کرو نماز، اور دو زکواۃ پھر تم پھر گئے سوائے تھوڑے تم میں سے اور تم ہی اعراض کرنے والے ہو''۔

☆ یہاں سے مراد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا ذکر فرمایا کہ ان کو اپنے اوامر میں سے کچھ امر (حکم) دیئے گئے اور ان سے ان پر عمل کرنے کا عہد لیا گیا لیکن وہ تمام سے پھر گئے اور قصداً انہوں نے اعراض کیا حالانکہ وہ جانتے بھی تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں۔ اور وہ کام انہوں نے بغیر کسی بھول کے کئے یعنی عمداً ان کا اعراض تھا علم نہ ہو، یا بھول ہو جائے تو کسی حد تک وہ قابل معافی جرم ہوتا ہے۔ (از ابن کثیر)

☆ رب تعالیٰ نے جس طرح گزشتہ آیات میں بنی اسرائیل پر اپنی نعمتوں کا ذکر کیا لیکن ساتھ ساتھ بنی اسرائیل کا ان نعمتوں کی قدر نہ کرنا اور اس پر مختلف نافرمانیوں کا ذکر کیا اسی طرح اس آیۃ میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت کا ذکر فرمایا اور ساتھ ہی یہ ذکر فرما دیا کہ اے بنی اسرائیل تم نے اس سے اعراض کیا یعنی تم اس سے پھر گئے یہ پھر جانا اور اعراض کرنا تمہاری عادت ہے۔

اس آیۃ میں کیسے نعمت کا ذکر کیا گیا؟ وہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے ان کو چند چیزوں کا مکلف بنایا یعنی

ان پر عمل کرنے کا حکم دیا کہ تم صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا۔ اور والدین سے اچھا سلوک کرنا اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں سے بھلائی سے درپیش آنا اور لوگوں سے اچھا کلام کرنا اور نماز قائم کرنا اور زکواۃ دینا۔

" وذلک لان التکلیف بھذہ الاشیاء موصول الی اعظم النعم وھو الجنۃ والموصل الی النعمۃ نعمۃ فھذہ التکلیف لا محالۃ من النعم "

یہ اس وجہ سے نعمت ہے کہ ان چیزوں کی تکلیف دینا بہت بڑی نعمت کے حاصل کرنے اور اس تک پہنچنے کا ذریعہ ہے وہ بہت بڑی نعمت جنت ہے جو چیز نعمت تک پہنچائے وہ نعمت ہے تو یقیناً یہ تمام احکام عظیم نعمتیں ہیں۔ (از کبیر)

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ﴾:

''اور جب لیا ہم نے عہد بنی اسرائیل کے عبادت نہ کرنا سوائے اللہ کے''۔

﴿لَا تَعْبُدُوْنَ﴾ میں ایک احتمال یہ ہے کہ یہ خبر ہے لیکن اس میں معنی نہی والا ہے (تم عبادت نہ کرو سوائے اللہ کے) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا " لا یضار کاتب ولا شھید " یہ صیغے بھی خبر ہیں۔ لیکن ان میں بھی معنی نہی والا ہے صریح نہی سے زیادہ بلاغت اس میں پائی جاتی ہے۔

" ویعضدہ قراءۃ لا تعبدوا " ایک قراءت میں ذکر ہی نہی ہے ﴿لَا تَعْبُدُوْا﴾ اس سے اس معنی کو تائید ملتی ہے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی قول کے مطابق ''اللہ کے سوا کسی کو نہ پوجو''

وقیل تقدیرہ ان لا تعبدوا فلا حذف ان رفع " اور اس میں ایک قول یہ ہے کہ یہ اصل میں ﴿اَنْ لَّا تَعْبُدُوْا﴾ تھا لیکن " ان " کو حذف کر دیا گیا اور نون اعرابی جو " ان " کی وجہ سے محذوف ہوا تھا وہ " ان " کے حذف ہونے کی وجہ سے واپس لوٹ آیا اب ﴿لَا تَعْبُدُوْنَ﴾ حالت رفعی میں ہے۔

راقم کا ترجمہ اسی تفسیر کے مطابق ہے ''عبادت نہ کرنا سوائے اللہ تعالیٰ کے''۔

" ویدل علیہ قراءۃ ان لا تعبدوا " اور اس پر وہ قراءت دلالت کر رہی ہے جس میں

○ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْا ○ ہے۔ (از بیضاوی)

خیال رہے کہ میثاق کا معنی یہ ہے " المیثاق اسم لما تقع به الوثاقة " جس چیز کے ذریعے کسی کو مضبوط بنایا جائے اسے میثاق کہا جاتا ہے گویا کہ مطلب یہ ہوا کہ رب تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے بہت پختہ وعدہ لیا ان احکام پر عمل کرنے کا لیکن وہ اس سے پھر گئے۔ (از شیخ زادہ بتغیر)

❁ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ❁: اس میں بھی دو ہی احتمال ہیں ایک احتمال یہ ہے کہ اس میں ○ اَحْسِنُوْا ○ (امر کا صیغہ) مقدر ہو معنی یہ ہو "اور ماں باپ سے بھلائی کرو" اعلیٰ حضرت کا یہی ترجمہ ہے۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے " وتحسنون " مقدر ہو۔ اصل میں " ان تحسنوا " ہو لفظ "ان" کو مقدر کر کے " تحسنون " رفعی حالت میں کر دیا گیا ہو۔ اس لحاظ پر معنی یہ ہوگا "اور والدین سے احسان کرنا" راقم کا یہی ترجمہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بعد والدین سے بھلائی کے ذکر کی وجوہ:

(۱) اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بندے پر سب نعمتوں سے عظیم نعمتیں ہیں۔ اسی وجہ سے سب نعمتوں کے شکر پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر بھی مقدم (پہلے) ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے بعد والدین کی اولاد پر عظیم نعمتیں ہیں، کیونکہ والدین اولاد کے لئے اصل ہیں۔ اور اولاد کے موجود ہونے کا سبب اور ذریعہ ہیں اور والدین اپنی اولاد کی تربیت کرتے ہیں یہ بھی والدین کا اولاد پر احسان عظیم ہے۔

لیکن والدین کے بغیر باقی رشتہ دار اگرچہ بعض اوقات تربیت تو کرتے ہیں لیکن وہ اصل نہیں یعنی وجود کا ذریعہ نہیں لہذا واضح ہوا " ان انعامهما اعظم وجوه الانعام بعد انعام الله تعالیٰ " بیشک والدین کا انعام اللہ تعالیٰ کے انعام کے بعد عظیم ہے کیونکہ اس کی وجوہ عظیم ہیں۔

(۲) اللہ تعالیٰ انسان کے موجود کرنے میں مؤثر حقیقی ہے، اور والدین مجازی طور پر اور ظاہر عرف کے مطابق مؤثر ہیں " فلما ذكر المؤثر الحقيقي اردفه بالمؤثر بحسب العرف الظاهر " جب اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کا ذکر فرمایا جو مؤثر حقیقی ذات ہے تو اس کے بعد والدین سے بھلائی کرنے کا حکم دیا کہ وہ ظاہر عرف کے مطابق مجازی طور پر مؤثر ہیں۔

(۳) اللہ تعالیٰ بندوں پر جو انعام کرتا ہے وہ اس کے بدلہ میں کسی چیز کی طلب نہیں کرتا بلکہ مقصد صرف لوگوں پر بھلائی کرنا، ان کو نعمتیں عطاء کرنا۔ رب تعالیٰ دنیاوی نعمتیں ہر نیک اور گنہگار کو عطا کرتا ہے اسی طرح وہ ہر مومن اور کافر کو عطا کرتا ہے۔

اسی طرح والدین بھی اپنی اولاد پر انعام بغیر کسی عوض (بدلہ) کے کرتے ہیں، نہ اس میں کوئی مالی بدلہ ان کے پیش نظر ہوتا ہے، اور نہ ہی وہ ثواب کی غرض سے انعام عطا کرتے ہیں۔ بلکہ فقط ان کا مقصد اولاد پر مہربانی کرنا ہوتا ہے۔ اولاد نیک ہو یا بد مومن ہو یا کافر والدین اس کی تربیت کرتے ہیں، اسے اپنے انعام سے نوازتے ہیں۔

"فمن هذا الوجه اشبه انعامهما انعام الله تعالیٰ" اسی وجہ سے والدین کا انعام اللہ تعالیٰ کے انعام کے مشابہ ہو گیا لیکن رب تعالیٰ کا انعام حقیقی اور والدین کا رب تعالیٰ کی عطاء ہے۔

(۴) اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر انعام کرتا ہے وہ اس سے ملال میں نہیں آتا، بندے عظیم جرم بھی کریں وہ ان سے اپنی نعمتیں چھینتا نہیں، بلکہ اس کی نعمتیں لگا تار جاری رہتی ہیں۔ اسی طرح والدین کو بھی اپنی اولاد پر انعام کرنے سے ملال نہیں ہوتا اور وہ اولاد کی نافرمانی سے اپنی نعمتیں بھی نہیں چھینتے بلکہ ان پر اپنی نعمتوں کو جاری رکھتے ہیں۔

(۵) والدین اپنی اولاد پر مشقت کرتے ہیں وہ اپنی اولاد کے مال میں نفع طلب کرتے ہیں اور اس کے مال کی زیادتی کے طلب گار ہوتے ہیں۔ اور ان کے مال کو نقصان اور خسارے سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ بندے کو طاعت کا حکم دیتا ہے تا کہ وہ رب کا مطیع بن کر اپنے آپ کو خسارے سے بچالے پھر اللہ تعالیٰ ان کے اعمال جو بظاہر ختم ہو چکے ہوتے ہیں ان کو ہمیشہ کے لئے باقی رکھتا ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ

"ان کی مثال جو اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں اس دانہ کی طرح ہے جس نے اگائیں سات بالیاں ہر بالی میں سو دانے ہوں"۔

یعنی بظاہر انہوں نے مال خرچ کر دیا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے ثواب کو ہمیشہ کے لئے باقی رکھ دیا۔

(۲) اللہ تعالیٰ کی نعمتیں عظیم ہونے کے باوجود ''نظری اور استدلالی ہیں'' یعنی دلائل سے ان کا کامل علم حاصل ہوتا ہے اور والدین کی نعمتیں بدیہی ہیں ان میں نظر و استدلال کی ضرورت نہیں۔ لیکن والدین کی نعمتیں بدیہی ہونے کی باوجود قلیل ہیں۔

'' والرجحان لنعم اللہ فلا جرم جعلنا نعم الوالدین کالتالیۃ لنعم اللہ تعالیٰ ''

جب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں عظیم ہیں اور کثیر ہیں اور والدین کی نعمتیں حقیر اور قلیل ہیں تو یقیناً والدین کی نعمتوں کا درجہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے بعد میں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رب تعالیٰ نے اپنی عبادت کا ذکر پہلے کیا اور والدین سے بھلائی کا ذکر بعد میں کیا۔ (از کبیر)

مسئلہ: اکثر علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ والدین کی تعظیم واجب ہے، اگر چہ اس کے والدین کافر ہی کیوں نہ ہوں اس پر چند دلائل واضح طور پر موجود ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ﴾ اس میں کوئی قید نہیں کہ والدین مومن ہوں یا کافر ہوں اس لئے کہ اصول فقہ میں یہ ضابطہ مذکور ہے '' **ان الحکم المرتب علی الوصف مشعر بعلیۃ الوصف** '' جب حکم کسی وصف پر مرتب ہو تو وہ وصف اس کے لئے علت کی حیثیت ہوتا ہے۔

اس لئے آیت کریمہ سے یہ حکم واضح ہوگا'' **ان الامر بتعظیم الوالدین لمحض کونھما والدین وذلک یقتضی العموم** '' کہ اللہ تعالیٰ نے والدین کی تعظیم کا جو حکم دیا ہے اس کا تعلق ان کے والدین ہونے سے ہے لہٰذا یہ حکم عام ہے جو والدین مومن ہوں یا کافر ہوں سب کو شامل ہے۔

(۲) رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا ﴾ ماں باپ کو اف نہ کہو اور ان کو جھڑکو نہیں۔ اس آیۃ کریمہ میں بھی مطلقاً والدین کی تعظیم کے خلاف کام کرنے سے منع کیا گیا۔

(۳) ابراہیم علیہ السلام نے اپنے چچا آزر (جو آپ کی والدہ کا دوسرا خاوند تھا، اور آپ کے باپ کی طرح تھا) کو کفر سے ایمان لانے کی دعوت بڑی مہربانی اور لطافت سے دی اس میں کوئی سخت کلامی اور درشتی (سخت انداز سے بولنا) نہیں تھی رب تعالیٰ نے آپ کی دعوت ایمان کا ذکر یوں فرمایا:

﴿ يَا اَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِىْ عَنْكَ شَيْئًا ﴾

اے میرے باپ تو کیوں عبادت کرتا ہے ان کی جو سنتے نہیں اور دیکھتے نہیں اور نہ کچھ تیرے کام آئیں

" ثم ان كان اباه كان يؤذيه ويذكر الجواب الغليظ وهو عليه السلام كان يتحمل ذلك "

پھر اگر آپ کا باپ آپ کو تکلیف دیتا اور سخت کلامی سے جواب دیتا تو ابراہیم علیہ السلام اسے برداشت فرماتے آپ اس قسم کا سخت کلام نہیں فرماتے تھے۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ (چچا) سے درپیش آنے کا طریقہ کیا تھا تو ہمیں بھی چاہئے کہ ہم بھی وہی طریقہ اختیار کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ﴿ ثُمَّ اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرَاهِیْمَ حَنِیْفًا ﴾ ارشاد فرما کر ہمیں ان کے طریقہ کے مطابق چلنے کا حکم فرمایا۔ (از کبیر)

تنبیہ : حضرت حنظلہ ﷛ کا باپ ابو عامر سخت کافر تھا انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اسے قتل کرنے کی اجازت طلب کی آپ نے منع فرمایا۔ ہاں اگر ماں باپ یا کوئی رشتہ دار اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے مقابلہ میں آ جائیں یعنی بیٹا مسلمانوں کی جانب ہو اور باپ کافروں کی جانب سے میدان جنگ میں آمنے سامنے آ جائیں تو باپ کا لحاظ نہیں کیا جائے گا حضرت ابو عبیدہ بن جراح نے اپنے باپ جراح کو احد میں قتل کیا۔ اور حضرت علی اور حضرت حمزہ اور حضرت ابو عبیدہ ﷛ نے بدر میں اپنے قریبی رشتہ داروں عتبہ، شیبہ اور ولید کو قتل کیا۔

اور حضرت ابو بکر صدیق ﷛ نے اپنے بیٹے عبدالرحمٰن (انہوں نے بعد میں اسلام قبول کیا) سے مقابلہ کرنے کی اجازت حضور ﷺ سے طلب کی لیکن آپ نے انہیں اپنے پاس ہی رکھنے کی وجہ سے اجازت عطا نہ فرمائی۔ (از تفسیر عزیزی ، و از حاشیہ جلالین پ ۲۸ زیر آیۃان لذین یحادون اللہ)

والدین سے احسان کا مطلب:

" والاحسان الى الوالدين معاشرتهما بالمعروف والتواضع لهما وامتثال امرهما والدعاء بالمغفرة بعد مماتهما وصلة اهل ودهما "

(قرطبی)

والدین سے احسان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی ضروریات کا دنیا کی زندگی میں اچھی طرح خیال رکھے، اور ان کے سامنے عاجز ہو کر رہے، ان کے حکم کو مانے، اور ان

کی وفات کے بعد ان کے لئے مغفرت کی دعاء کرے اور ان کے ساتھ محبت کرنے والے احباب سے اچھا تعلق رکھے۔

ماں باپ کی فرمانبرداری: حضرت بہز بن حکیم اپنے باپ اور وہ ان کے دادا (یعنی اپنے باپ) سے روایت کرتے ہیں انہوں نے کہا میں نے عرض کیا:

" یا رسول اللہ من ابر قال امک قلت ثم من قال امک قلت ثم من قال امک ، قلت ثم من ، قال اباک ثم الاقرب فالاقرب "

(ترمذی، ابوداؤد، مشکوۃ باب البر والصلۃ)

یارسول اللہ میں کس سے زیادہ احسان کروں اور کس کے ساتھ زیادہ صلہ رحمی کروں؟ تو آپ نے فرمایا "اپنی ماں سے" میں نے عرض کیا پھر کس سے؟ آپ نے فرمایا اپنی ماں سے۔ میں نے عرض کیا پھر کس سے؟ آپ نے فرمایا "اپنی ماں سے" میں نے پھر کہا اور کس سے تو آپ نے ارشاد فرمایا اپنے باپ سے اس کے بعد اپنے قریبی رشتہ داروں سے اور پھر جو ان کے بعد قریبی ہوں۔

اس حدیث پاک میں قریبی رشتہ داروں پر احسان کرنے اور صلہ رحمی سے درپیش آنے پر برانگیختہ کیا گیا، لیکن ماں کا حق سب سے زیادہ بیان کیا گیا اسکے بعد باپ کا اور اس کے بعد باقی رشتہ داروں کا جو زیادہ قریبی ہوں گے ان کا حق پہلے، پھر ان کے بعد والوں کا حق ہے۔

ماں کا حق سب سے زیادہ کیوں؟

" سبب تقدیم الام کثرۃ تعبھا علیہ وشفقتھا وخدمتھا " (نووی)

ماں کا حق سب سے مقدم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ماں بچے پر سب سے زیادہ شفقت برداشت کرتی ہے اور اس پر سب سے زیادہ شفقت کرتی ہے اور بچے کی خدمت سب سے زیادہ ماں ہی کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّ وَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا (پ ۲۶)

"اسکی ماں نے اسے پیٹ میں رکھا تکلیف سے اور جنا اس کو تکلیف سے اور اسے اٹھائے پھرنا اور اس کا دودھ چھڑانا تیس مہینہ میں ہے (یعنی کم از کم مدت حمل چھ ماہ اور زیادہ سے زیادہ دودھ پلانے

کی مدت دو سال ہے) اس آیہ کریمہ میں رب تعالی نے تین چیزوں سے ماں کا حق مقدم ہونا واضح فرمایا ہے:

(۱) ماں حمل کی مشقت برداشت کرتی ہے (۲) بچے کو جننے کی تکالیف برداشت کرتی ہے

(۳) بچے کو دودھ پلانے کی محنت اور رنج اٹھاتی ہے۔ (مرقاۃ)

ماں، باپ سے محبت خیر و برکت کا ذریعہ ہے:

حضرت انس ﷺ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

" من احب ان يبسط له في رزقه وينساله في اثره فليصل رحمه "

(بخاری، مسلم، مشکوۃ باب البر والصلة)

جو شخص پسند کرتا ہو کہ اس کا رزق کشادہ کر دیا جائے اور اس کی عمر میں برکت ہو تو وہ صلہ رحمی کرے۔

یعنی پہلے ماں، باپ پھر اور رشتہ داروں سے اچھا سلوک رکھے احسان کرے ان پر مہربانی کرے نرم طریقے سے درپیش آئے ان کے احوال کی رعایت رکھے یعنی مرض، صحت، خوشحالی اور تنگدستی وغیرہ کے مطابق ان کی حاجت کو پورا کرے۔

سوال: " ان الآجال والارزاق مقدرة ولا تزيد ولا تنقص "

موت کا وقت مقرر ہے اور رزق کی مقدار بھی مقرر ہے ان میں نہ کمی ہوتی ہے نہ زیادتی۔ حدیث پاک میں رزق کی کشادگی اور عمر کی زیادتی کا کیا مطلب ہے؟

پہلا جواب: " ان الزيادة بالبركة في البر " بیشک عمر کی زیادتی سے مراد عمر میں برکت کا آنا ہے۔ کہ اللہ تعالی اس انسان کو نیکیوں کی توفیق عطا فرما دیتا ہے اور اسے توفیق دیتا ہے کہ وہ ایسے اعمال کرے جو اسے آخرت میں نفع پہنچائیں۔ اپنے اوقات کو نفع میں مصروف رکھے ضائع ہونے سے بچائے، اسی طرح اس کے رزق میں بھی برکت آجاتی ہے حلال طور پر رزق حاصل کرنے اور حرام سے بچنے کی اسے توفیق دے دی جاتی ہے اور تھوڑے رزق پر بھی اس کے دل کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ ایسا اطمینان حرام رزق سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہ تمام اوقات ڈر اور خوف طرح طرح کی تکالیف اور اولاد کے بے راہ روی سے غیر مطمئن ہوتا ہے۔

دوسرا جواب: " **انه بالنسبة الی مایظهر للملائكة فی اللوح المحفوظ** " یہ عمر اور رزق کی زیادتی بنسبت ملائکہ کے لوح محفوظ میں نظر کرنے کے ہے۔

یعنی لوح محفوظ میں مثلاً لکھا ہوا ہی یہ ہوتا ہے کہ اس کی عمر ساٹھ سال ہونی تھی۔ لیکن والدین اور اقرباء کی صلہ رحمی کی وجہ سے اس کی عمر چالیس سال اور کر دی گئی یہی حال رزق کا بھی ہوگا۔ یعنی اگر یہ شخص صلہ رحمی نہ کرتا تو اس کی عمر کم ہوتی اور رزق بھی کم ہوتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی توفیق اور مہربانی سے اس نے صلہ رحمی کرنی ہے تو اس کی عمر اور رزق میں بھی زیادتی یقیناً ہونی ہے۔

تیسرا جواب: " **ان المراد بقاء ذکرہ الجمیل بعدہ فکانه لم یمت** " بیشک عمر اور رزق کی زیادتی سے مراد یہ ہے کہ اس کا اچھا ذکر اس کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی باقی رہے گا گویا کہ وہ فوت نہیں ہوا، جب اس کا نام زندہ ہے تو وہ بھی زندہ ہی ہے۔ (ماخوذ از مرقاۃ ونووی)

یہ تینوں جواب دراصل مجتمع ہو کر ایک جواب ہیں کیونکہ ان کے اجتماع میں کوئی تعارض نہیں قبلہ استاذی المکرم حضرت مولنا محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی سے یہی سنا۔

ماں باپ انسان کے لئے جنت و دوزخ ہیں: حضرت ابوامامہ ﷺ فرماتے ہیں، ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ والدین کے ان کی اولاد پر کیا حقوق ہیں؟ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا" **هما جنتک ونارک** " وہ دونوں (ماں باپ) تمہارے لئے جنت اور دوزخ ہیں۔ (ابن ماجہ، مشکوۃ باب البر والصلۃ)

سبحان اللہ میرے پیارے مصطفیٰ محمد ﷺ کا کیسا مختصر اور حکمت بھرا جواب ہے (یہ نبی کریم ﷺ کا خصوصی کمال ہے کہ آپ کو جوامع الکلم سے نوازا گیا یعنی بات مختصر اور مطالب بہت) کہ ماں باپ کی فرمانبرداری ان پر احسان کرنا، ان سے حسن سلوک سے درپیش آنا جنت میں جانے کا سبب ہے۔ اور ان کی نافرمانی، سخت کلامی، ان کے حکم کو تسلیم نہ کرنا، ان کی دیکھ بھال نہ کرنا، یعنی ان کو ناراض کرنا جہنم میں جانے کا ذریعہ ہے۔

ماں باپ کو رحمت سے دیکھنا حج کا ثواب ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" ما من ولد بار ینظر الی والدیه نظرة رحمة الا کتب الله له بکل نظرة حجة مبرورة قالوا ان نظر کل یوم مائة مرة قال نعم الله اکبر و اطیب "

(بیهقی ، مشکوة باب البر و الصلة)

کوئی ایسی فرمانبردار اولاد نہیں جو اپنے والدین کو رحمت کی نظر سے دیکھے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے ہر نظر کے بدلے ایک مقبول حج کا ثواب لکھ دیتا ہے صحابہ کرام نے عرض کیا اگر چہ ہر روز سو مرتبہ بھی دیکھے؟ آپ نے فرمایا ہاں (اگر چہ ہر روز سو مرتبہ بھی دیکھے) اللہ سب سے بڑا اور سب سے پاکیزہ ہے۔

وضاحت حدیث: ماں باپ دونوں زندہ ہوں یا ایک ہو اور اس ایک کو نظر رحمت سے دیکھنے پر بھی یہی ثواب ہے " نظرة رحمة " سے مراد شفقت کرنا، مہربانی کرنا، ان کی جائز بات تسلیم کرنا، ان کی ضروریات کا لحاظ کرنا " حجة مبرورة " سے مراد نفلی مقبول حج ہے۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ یہ ثواب کا حاصل فرضی حج کا بدل نہیں بن سکتا۔

" الله اکبر و اطیب " سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت بڑا ہے، اس کی عظمت انسان کے تصور سے بالاتر ہے اور اس کے انعامات اور اس کی مہربانیاں اتنی کثیر ہیں جو انسان کے شمار میں نہیں آسکتیں۔ اور اللہ تعالیٰ بہت پاکیزہ ہے یعنی اس کی قدرت میں کمی کا عیب نہیں لگایا جا سکتا وہ اپنے ارادہ اور مشیت میں نقصان سے پاک ہے۔ (از مرقاة)

نتیجہ واضح ہوا کہ اگر کوئی شخص یہ کہے یہ کیسے ہو سکتا ہے ایک سو حج کا ثواب مل جائے تو وہ شخص در حقیقت اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی قدرت سے غافل ہے اسے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بے حساب ہونے کا علم نہیں۔

ماں باپ کی نافرمانی ناقابل معافی جرم ہے:

حضرت ابو بکرة سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" کل الذنوب یغفر الله منها ما شاء الا عقوق الوالدین فانه یعجل لصاحبه فی الحیاة قبل الممات " (بیهقی ، مشکوة)

تمام گناہوں کو اللہ تعالیٰ جتنا چاہے معاف فرما دیتا ہے سوائے ماں باپ کی نافرمانی کے

، بیشک اللہ تعالیٰ ماں باپ کے نافرمان کو جلدی ہی اس کی زندگی میں موت سے پہلے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

یعنی ماں باپ کی نافرمانی کے جرم کو معاف نہیں کیا جائے گا اخروی عذاب کے علاوہ اسے دنیا میں بھی پکڑ ہو سکتی ہے یعنی رب تعالیٰ چاہے تو دنیا میں ہی اسے ذلیل و خوار کر دے۔

ماں باپ کی خدمت جہاد اور ہجرت سے پہلے: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص فرماتے ہیں ایک شخص نبی کریم ﷺ کی طرف متوجہ ہوا اور عرض کیا میں آپ سے جہاد اور ہجرت پر بیعت کرنا چاہتا ہوں تا کہ میں اللہ تعالیٰ سے اس کا اجر حاصل کرسکوں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا تمہارے ماں باپ سے کوئی ایک زندہ ہے؟ ہاں، بلکہ دونوں ہی زندہ ہیں تو آپ نے فرمایا:

" فتبتغی الاجر من اللہ قال نعم قال فارجع الی والدیک فاحسن صحبتھما " (مسلم ج ۲ کتاب البر والصلۃ والادب)

کیا واقعی تم اللہ تعالیٰ سے اجر حاصل کرنا چاہتے ہو؟ صحابی نے عرض کیا ہاں (یا رسول اللہ) آپ نے فرمایا اپنے والدین کے پاس لوٹ کر چلے جاؤ ان کے پاس رہ کر ان کی خدمت کے آداب اچھے طریقہ سے بجا لاؤ۔

اس حدیث پاک سے ماں باپ کی فرمانبرداری کی فضیلت واضح ہوئی۔ ماں باپ کی خدمت کا جہاد سے بھی زیادہ اہم ہونا سمجھ آیا۔ جب تک جہاد ہر شخص پر فرض عین نہ ہو جائے اس وقت تک ماں باپ کی اجازت کے بغیر جہاد میں شریک ہونا جائز نہیں۔ بشرطیکہ ماں باپ دونوں مسلمان ہوں۔ اگر ایک مسلمان ہو تو اسی سے اجازت طلب کرنا ضروری ہے۔ ہاں اگر ماں باپ کافر و مشرک ہیں تو ان سے جہاد میں شریک ہونے کے لئے اجازت طلب کرنا ضروری نہیں۔

ماں باپ سے احسان کی تین قسمیں:

(۱) اپنے قول و فعل سے ان کو ایذا نہ پہنچائے۔ (۲) اپنے بدن اور مال سے ان کی خدمت کرے

(۳) جب وہ بلائیں تو فوراً حاضر ہو جائے۔

پہلی قسم کی اطاعت ہر حال میں واجب ہے کیونکہ ماں باپ کو ایذاء دینے والا عاق اور نافرمان

کہلاتا ہے۔دوسری اطاعت جب واجب ہے کہ ماں باپ حاجت مند ہوں اور اولاد میں اس خدمت کی قدرت ہو اگر انہیں حاجت نہیں یا اولاد میں طاقت نہیں تو اس قسم کی اطاعت واجب نہیں۔تیسری قسم کی خدمت کی یہ شرط ہے کہ ان کی خدمت میں حاضر ہونے سے کوئی شرعی خرابی پیدا نہ ہو۔اگر نماز کا وقت جارہا ہو ادھر ماں باپ بلا رہے ہوں تو ان کے پاس نہ جائے بلکہ پہلے نماز پڑھے۔ (از نعیمی)

نفلی نماز اور والدین: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص جریج اپنے عبادت خانہ میں عبادت میں مشغول تھا۔حمید بن ھلال کہتے ہیں حضرت ابو ہریرہ نے ہمیں اس کی ماں کے اسے بلانے کی کیفیت بھی بیان کی، یعنی اس کی ماں نے اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو اپنے ابروؤں پر رکھ کر اوپر اس کے عبادت خانہ کی طرف دیکھ کر اسے بلایا اور کہا" یا جریج ان امک فتکلمنی " اے جریج میں تیری ماں ہوں میرے ساتھ کلام کر۔

لیکن اس نے اسے نماز نوافل جاری رکھے ہوئے پایا۔جریج نے کہا اے اللہ یہ میری ماں ہے اور یہ میری نماز (یعنی اس نے سوچا میں کیا کروں ماں سے کلام کروں یا نوافل ادا کرتا رہوں، آخر کار اس کے دل نے نوافل نماز کو ترجیح دی اور ماں سے کلام نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا) اس نے نماز کو اختیار کیا۔ماں واپس چلی گئی، پھر دوسرے دن لوٹ کر آئی، پھر اس نے کہا اے جریج میں تمہاری ماں ہوں، میرے ساتھ کلام کرو جریج نے پھر کہا اے اللہ یہ میری ماں ہے اور یہ میری نماز۔اس نے نماز کو ترجیح دی۔اس کی ماں نے کہا:

> " اللهم ان هذا جريج وهو ابنى وانى كلمته فابى ان يكلمنى اللهم فلا تمته حتى تريه الموسات "
>
> اے اللہ بیشک یہ جریج ہے اور وہ میرا بیٹا ہے بیشک میں نے اس سے کلام کیا اس نے میرے ساتھ کلام کرنے سے انکار کردیا، اے اللہ اس وقت تک موت نہ عطا کر یہاں تک کہ اسے فاحشہ عورتیں دکھادے۔

راوی کہتے ہیں اگر اس کی ماں اس کے لئے کسی بڑے فتنہ میں مبتلاء ہونے کی بددعاء کرتی تو وہ

بھی قبول ہو جاتی۔(ماں کی دعاء کی قبولیت کا اندازہ کریں) ایک شخص بھیڑ بکریاں کا چرواہا اس کے عبادت خانہ میں آ کر پناہ پکڑتا تھا ایک دن ایک عورت دیہات سے باہر آئی اس سے چرواہے نے بدفعلی کی وہ حاملہ ہوگئی، یہاں تک کہ اس نے ایک بچہ جنم دیا۔لوگوں نے اس عورت سے پوچھا یہ بچہ کس کا ہے؟ اس نے کہا اس عبادت خانہ میں ایک شخص ہے اس کا ہے۔لوگ اپنے زمین کھودنے کے آلات لے کر آ گئے۔انہوں نے باہر سے (جریج کو) پکارا لیکن اسے نماز پڑھتے ہوئے پایا۔اس نے لوگوں سے کوئی بات نہ کی۔ان لوگوں نے اس کے عبادت خانہ کو گرانا شروع کر دیا۔جب اس نے یہ ماجرا دیکھا تو وہ اپنے عبادت خانہ سے نیچے اترا۔ان لوگوں نے کہا اس عورت سے پوچھ۔

حضور ﷺ نے فرمایا وہ مسکرایا اس نے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا تمہارا باپ کون ہے؟ اس نے کہا میرا باپ بھیڑ بکریوں کا چرواہا ہے۔جب لوگوں نے اس (ننھے معصوم بچے) سے یہ سنا تو (معذرت کے طور) پر کہا کہ ہم نے تمہارا عبادت خانہ جو گرایا ہے اسے سونے اور چاندی سے تعمیر کر دیتے ہیں۔اس نے کہا نہیں تم مٹی کا ہی بنا دو جیسا وہ پہلے تھا۔اتنا کہہ کر وہ پھر اپنے عبادت خانہ پر چڑھ گیا۔

(مسلم ج ثانی کتاب البر والصلۃ والادب)

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ ماں کو راضی رکھنا نفلی عبادت سے مقدم ہے ماں کی ناراضگی اور بددعاء دنیا اور آخرت میں عذاب کا سبب ہے۔ماں باپ کا حکم پہلے مانے اور نفلی نماز بعد میں ادا کرے۔

مسئلہ: اگر نماز نفل جاری ہو تو ماں باپ کے بلانے پر نماز کو مکمل کر کے جائے نماز توڑے نہیں، جریج نے نماز کو نہ توڑنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا بلکہ اس نے فیصلہ یہ کیا تھا کہ دو رکعت نفل مکمل کر کے پھر دو رکعت اور کی نیت کر لو، نوافل جاری رکھو، ماں سے بات کر کے وقت ضائع نہ کرو۔اس کا یہ فیصلہ رب تعالیٰ کو بھی پسند نہ آیا اور ماں کی ناراضگی کا بھی ذریعہ بنا۔

مسئلہ: ماں باپ اگر گنہگار یا بدمذہب ہوں تو ان کی نرمی سے راہ راست پر لانے کی کوشش کرے اور اگر منافق یا کافر ہوں تو ان سے بھی ماں باپ کے ناطے نرم سلوک رکھے۔(اس مسئلہ کی تفصیل پہلے بیان ہو چکی ہے)۔

ماں باپ کے ساتھ احسان کرنے کے آداب:

(۱) ماں باپ سے دلی محبت رکھے۔

(۲) بات چیت اور اٹھنے بیٹھنے میں ان کے ادب کا لحاظ رکھے راستے میں ان کے آگے نہ چلے اور ان کے نام سے انکو نہ بلائے بلکہ ادب واحترام سے ان کو بلائے۔

(۳) جتنا ممکن ہوسکے اتنا اپنا مال اور اپنی جان ان پر قربان کرے۔

(۴) ہر کام اور ہر بات میں ان کی رضامندی کا خیال رکھے۔

(۵) ان کی وفات کے بعد ان کی وصیت کو پورا کرے۔

(۶) ان کے لئے مغفرت کی دعا کرتا رہے۔

(۷) ان کے لئے جتنا ہوسکے کبھی کبھی صدقہ وخیرات کرتا رہے۔

(۸) ہر ہفتہ میں ایک مرتبہ قبرستان میں ان کی قبر کی زیارت کے لئے جائے اور اگر ہوسکے تو سورۃ یٰسین پڑھ کر ان کو ثواب پہنچائے۔

(۹) ماں باپ کے دوستوں اور قرابت داروں سے محبت رکھے۔ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے نیک بخت اولاد اپنے والدین کے دوستوں کو اپنے والدین کی طرح سمجھتی ہے۔

(۱۰) جتنا ہوسکے اپنے والدین کے متعلقین کو تحائف، ھدایا وغیرہ دے یہ علامات محبت ہیں۔

(تفسیر عزیزی)

ایک مرتبہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما مکہ مکرمہ آرہے تھے دوران سفر آپ نے اپنے ساتھ ایک گدھا بھی رکھا ہوا تھا کہ جب اونٹ کی سواری سے تھکان محسوس ہو تو گدھے پر سوار ہوکر کچھ راحت حاصل کرلیں گے۔ اور ایک پگڑی آپ نے اپنے سر سے باندھ رکھی تھی۔

اسی سفر کے دوران ایک دن آپ اپنے گدھے پر سوار تھے، آپ کے قریب سے ایک اعرابی (دیہاتی) کا گزر ہوا آپ نے اس سے پوچھا کیا تم فلاں ابن فلاں نہیں ہو (یعنی اس کے باپ دادا کا نام لے کر اس سے پوچھا) اس نے کہا میں اسی شخص کا بیٹا ہوں۔

آپ نے اپنا گدھا اسے دے دیا کہ تم اس پر سواری کرو اور پگڑی بھی دے دی کہ یہ تم اپنے سر سے باندھ لو، آپ کے بعض ساتھیوں نے آپ کو (بطور تعجب) کہا کہ اس شخص کو آپ نے اپنے آرام کے لئے لیا ہوا گدھا دے دیا اور پگڑی بھی دے دی جو آپ اپنے سر سے باندھتے تھے۔

دوسری روایت میں ہے کہ یہ اعرابی تو تھوڑے مال پر بھی خوش ہو جاتے ہیں آپ نے فرمایا:

" انی سمعت رسول الله ﷺ یقول ان من ابر البر صلة الرجل اهل ودابیه بعد ان یولی وان اباه کان صدیقا لعمر "

(مسلم ج ۲ باب فضل صلة اصدقاء الاب والام ونحوهما)

بیشک میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ بیشک سب احسانوں سے اچھا احسان (یعنی سب فرمانبرداریوں سے اچھی فرمانبرداری) یہ ہے کہ انسان اپنے ماں باپ کا جانشین بننے کے بعد اپنے (ماں) باپ کے ساتھ تعلق رکھنے والے احباب کے ساتھ احسان سے پیش آئے، بیشک اس کا باپ (میرے باپ حضرت) عمر کا دوست تھا۔

بڑھاپے میں ماں باپ سے زیادہ شفقت ومحبت کا حکم دیا گیا:

حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے مروی ہے آپ نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" رغم انفه رغم انفه رغم انفه قیل من یا رسول الله ﷺ قال من ادرک والدیه عند الکبر احدهما او کلاهما ثم لم یدخل الجنة "

(مسلم مشکوۃ باب البر والصلة)

وضاحت حدیث: رغم انفه کے دو معنی لئے گئے ہیں ایک یہ کہ خبر ہو۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ اس شخص کا ناک خاک آلود ہو گیا یعنی ذلیل وخوار ہو گیا اور دوسرا معنی یہ ہے (کہ شائد آپ نے ایسی شخص کے خلاف دعا فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا) کہ وہ شخص ذلیل وخوار ہو جائے۔ اس معنی کے لحاظ سے سخت الفاظ سے ڈرایا گیا ہے جس کے خلاف نبی کریم ﷺ دعاء فرما دیں وہ کتنا ہی بدبخت ہوگا۔ (مرقاۃ)

اس حدیث پاک سے یہ نتیجہ حاصل ہوا

" ان برهما عند کبرهما وضعفها بالخدمة والنفقة وغیر ذلک سبب لدخول الجنة فمن قصر فی ذلک فاته دخول الجنة " (نووی)

بیشک ماں باپ سے احسان کرنا ان کے بڑھاپے اور کمزور حال ہوتے وقت جنت میں داخل ہونے کا ذریعہ ہے وہ احسان یہ ہے ان کی خدمت کرنا، انہیں خرچ دینا اور ہر طرح کی ان کی ضروریات کا خیال رکھنا اور جس شخص نے اس حال میں ان پر احسان کرنے میں کوتاہی کی وہ جنت میں داخل ہونے سے محروم ہوگیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَا اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ☆ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴾ (پ ۱۵ سورۃ اسراء)

''اور تمہارے رب نے حکم دیا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو اگر تیرے سامنے ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان سے اف (ہوں) نہ کہنا اور نہ جھڑکنا اور ان سے تعظیم کی بات کہنا۔ اور ان کے لئے عاجزی کا بازو بچھا نرم دلی سے اور عرض کر اے میرے رب تو ان دونوں پر رحم کر جیسا کہ ان دونوں نے بچپن میں مجھے پالا''

اس آیۃ کریمہ کے ترجمہ سے اتنا واضح ہوگیا کہ والدین سے بڑھاپے میں زیادہ شفقت اور محبت کرنے کا حکم دیا گیا آیۃ کریمہ کی مکمل وضاحت اپنے محل پر ہی انشاء اللہ آئے گی۔

ماں باپ کی وفات کے بعد ان سے حسن سلوک کا حکم:

حضرت ابو ربیعہ ساعدی فرماتے ہیں کہ میں بارگاہ رسالت میں حاضر تھا اسی اثناء میں ایک انصاری حضور اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں آیا اور عرض کی یارسول اللہ میرے والدین کی وفات کے بعد کیا مجھ پر ان سے حسن سلوک کرنا ضروری ہے؟

" قال نعم خصال اربع الصلوة عليهما والاستغفار وانجاز عهدهما واكرام صديقهما وصلة الرحم التی لارحم لک الا من قبلهما فهو الذی بقی عليک من برهما بعد موتهما "

(ابن ماجہ، صحیح ابن حبان، روح المعانی)

''حضور نے فرمایا چار باتیں تجھ پر ضروری ہیں ان کی نماز جنازہ ادا کرنا، ان کے لئے

دعاء مغفرت کرتے رہنا جو وعدہ انہوں نے کیا تھا اسے پورا کرنا۔ اور ان کے دوستوں کا احترام کرنا اور ان کے رشتہ داروں سے صلہ رحمی کرنا جن سے ان کی وجہ سے رشتہ داری ہو۔ یہ نیکی ایسی ہے جو ان کی وفات کے بعد بھی تم پر لازمی ہے"۔ (ضیاء القرآن)

ابن ابی الدنیا نے محمد بن نعمان سے مرفوع حدیث بیان کی کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

" من زار قبر ابویه او احدهما فی کل جمعة غفرله و کتب براه "

(بیهقی، روح المعانی)

جس شخص نے ہر جمعہ میں (ہفتہ میں ایک دن) اپنے والدین کی قبر کی زیارت کی یا ان میں ایک کی قبر کی زیارت کی (یعنی ایک کا ہی ابھی انتقال ہوا) اس کی مغفرت کر دی جاتی ہے اور اس کا (گناہوں اور عذاب سے) بری ہونا لکھ دیا جاتا ہے۔

خدارا انصاف کریں: آیئے بد مذہبوں کے نقش قدم پر چلنے والو، یہود و نصاری کے پیروکارو، ذرا ضد اور ہٹ دھرمی کو چھوڑ کر انصاف کا فیصلہ کریں۔ ایسا مقام جو اسلام نے عورت کو بحیثیت ماں ہونے کے اور مرد کو بحیثیت باپ ہونے کے دیا وہ کسی اور مذہب میں ہے؟ انسانی حقوق کے دعویدارو، اسلام کے مخالفین ایسی کوئی مثال نہیں پیش کر سکتے۔

کیا خوب مفکر اسلام مفسر قرآن حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ نے بیان فرمایا "ان واضح تعلیمات اور روشن ارشادات کے بعد آپ یورپ و امریکہ وغیرہا متمدن ممالک کے حالات کا جائزہ لیجئے وہاں آپ کو ایسی اولاد شاذ و نادر ہی ملے گی جو بوڑھے والدین کی خدمت اپنے لئے سرمایہ سعادت یقین کرتی ہو۔ شادی کے بعد لڑکا اپنے والدین سے الگ ہو جاتا ہے اور اپنے والدین کی خدمت کے لئے اخلاقی یا قانونی ذمہ داری قبول نہیں کرتا۔ اسی لئے تو ان ممالک کی حکومتوں کو ایسی پناہ گاہیں بنانا پڑتی ہیں جہاں بوڑھے اور والدین کو رکھا جائے تاکہ وہ زندگی کے آخری ایام وہاں بسر کر سکیں۔

(ضیاء القرآن)

افسوس صد افسوس یہ ہے کہ آج کل پاکستان میں بھی اسلامی تعلیمات سے ہٹ کر بوڑھوں کے لئے پناہ گاہیں بنانے کی سوچ تیز ہوتی جا رہی ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیں یہودیت و نصرانیت کی تہذیب و تمدن کو حاصل کرنے کی بے چینی لاحق ہو رہی ہے۔

نبی کریم ﷺ کا دودھ پلانے والی ماؤں کا احترام:

حضرت ابوالطفیل غنوی فرماتے ہیں میں نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا:

"اذ اقبلت امرأة فبسط النبی ﷺ رداء ہ حتی قعدت علیه فلما ذهبت قیل هذه ارضعت النبی ﷺ" (ابو داود، مشکوۃ باب المحرمات)

ایک عورت آئی جس کے لئے نبی کریم ﷺ نے اپنی چادر بچھائی وہ اس پر بیٹھی پھر چلی گئی۔ تو (لوگوں کو) بتایا گیا کہ اس نے نبی کریم ﷺ کو دودھ پلایا ہے۔

یہ حضرت حلیمہ سعدیہ تھیں جو حنین کے دن نبی کریم ﷺ کے پاس آئی تھیں: "فقام الیها وبسط رداء ہ لها وجلست" اور آپ ان کے لئے کھڑے ہوئے اور ان کی تعظیم کی اور ان کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آنے کے لئے آپ نے چادر بچھائی جس پر وہ بیٹھیں۔ جن لوگوں کو علم نہیں تھا وہ تعجب کر رہے تھے کہ عظیم المرتبت عورت کون ہے۔ لیکن جب علم ہوا تو پتہ چلا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی دودھ پلانے والی ماں کا کتنا عظیم احترام کیا۔ (مرقاۃ، مواهب اللدنیه)

نبی کریم ﷺ کا اپنی پرورش کرنے والی کی زیارت کرنا:

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کہا چلو ہم حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا کی زیارت کریں "کما کان رسول الله ﷺ یزورها" جس طرح رسول اللہ ﷺ ان کی زیارت کیا کرتے تھے۔ جب ہم ان کے پاس پہنچے تو وہ روئیں۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے انہیں کہا تو کیوں رو رہی ہو حالانکہ نبی کریم ﷺ کا مقام اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بہتر ہے۔ انہوں نے فرمایا میں اس لئے نہیں رو رہی کہ مجھے یہ علم نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا مقام اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بلند و بالا ہے۔ میرے رونے کی وجہ یہ ہے کہ آسمانوں سے وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے۔ انہوں نے ان دونوں کو بھی رونے پر برانگیختہ کر دیا۔ ان دونوں حضرات نے بھی رونا شروع کر دیا۔

(مسلم ج ۲ باب فضائل ام ایمن)

ام ایمن نبی کریم ﷺ کو اپنی گود میں لے کر پرورش کرنے والی ہیں۔ حضور ﷺ ان کی زیارت کے لئے جاتے تھے۔ اس حدیث پاک سے یہ واضح ہوا کہ نیک لوگوں کی زیارت کرنا مستحب ہے خواہ زیارت کرنے والا خود بھی اس سے زیادہ افضل کیوں نہ ہو۔ اپنے متعلقین کے احباب کی زیارت کرنا بھی مستحب ہے۔

کسی کے ماں باپ کو گالیاں دینے سے منع کرنے میں حکمت:

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ بہت بڑا گناہ ہے کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ کو گالیاں دے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ کوئی ایسا شخص بھی ہوگا جو اپنے ماں باپ کو گالیاں دیتا ہوگا۔

" قال نعم یسب ابا الرجل فیسب اباہ ویسب امہ فیسب امہ "

(بخاری، مسلم، مشکوۃ باب البر والصلۃ)

آپ نے فرمایا ہاں جو شخص کسی کے باپ کو گالیاں دیتا ہو وہ اس کے باپ کو گالیاں دے اور یہ کسی کی ماں کو گالیاں دے وہ اس کی ماں کو گالیاں دے۔

یعنی کسی کے ماں باپ کو گالیاں نہ دو ورنہ وہ تمہارے ماں باپ کو گالیاں دے گا۔ اس پر تم خود اپنے ماں باپ کو گالیاں دینے کا سبب بنو گے۔

فائدہ عظیمہ : اسکندر سے کسی نے پوچھا کہ تمہارے والدین کا تم پر احسان زیادہ ہے یا استاذ کا۔ اس نے کہا مجھ پر میرے استاذ کا احسان زیادہ ہے۔

" لانہ تحمل انواع الشدائد والمحسن علیہ عند تعلیمی ارتعنی فی نور العلم "

اس لئے کہ استاذ نے میری تعلیم میں طرح طرح کی مشکلات و تکالیف کو برداشت کر کے مجھے نور علم سے خوشحال کیا۔

لیکن اس کے برخلاف والدین کی اپنی خواہشات کا بھی کچھ دخل تھا جنہوں نے مجھے عالم عدم سے نکال کر عالم کون و فساد کی آفات و بلیات کے حوالے کر دیا۔

کلمات ماثورہ میں ایک مشہور قول یہ ہے " **خیر الآباء من علمک** " بہتر آباء وہ ہیں

جنہوں نے تمہیں علم سکھایا"۔ فتاوی عالمگیری میں ہے:

" حق العالم على الجاهل وحق الاستاذ على التلميذ واحد على السواء وهو ان لا يفتح بالكلام قبله ولا يجلس مكانه وان غاب ولا يرد على كلامه ولا يتقدم على مشيه "

عالم کا حق جاہل پر اور استاذ کا حق شاگرد پر ایک جیسا ہی ہے وہ یہ کہ ان کے کلام سے پہلے یہ کلام شروع نہ کرے ان کی جگہ نہ بیٹھے بیشک وہ غائب ہی کیوں نہ ہو ان کے کلام کو رد نہ کرے ان کے آگے آگے نہ چلے، استاذ اور عالم کی مسند پر ان کی عدم موجودگی میں بھی نہ بیٹھے اور ان سے اگر اختلاف بھی ہو تو ان کے کلام کو رد کرنے کے بجائے مستحسن انداز پر اس پر دلائل پیش کرے۔

عالمگیری میں ہے:

" ينبغي للرجل ان يراعي حقوق استاذه و آدابه ولا يضن بشئى من ماله "

انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے استاذ کے حقوق وآداب کی رعایت کرے اور اس پر اپنا مال خرچ کرنے میں بخل سے کام نہ لے یعنی استاذ اگر مالی طور پر پریشان حالی کا شکار ہو جائے تو شاگردوں کو چاہیے کہ اپنے مال سے استاذ سے تعاون کریں۔

عالمگیری میں تاتارخانیہ کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے:

" يقدم حق معلمه على حق ابويه وسائر المسلمين ويتواضع لمن علمه خيرا ولو حرفا ولا ينبغي ان يخذله ولا يستاثر عليه احدا فان فعل ذلك فقد قصم عروة من عرى الاسلام ومن اجلاله ان لا يقرع بابه بل ينتظر خروجه "

استاذ کا حق والدین کے حق اور تمام مسلمانوں کے حق سے مقدم ہے جس شخص نے اسے اچھا علم سکھایا ہو خواہ ایک حرف ہی ہو اس سے عاجزی کے ساتھ درپیش آئے۔ استاذ پر کسی اور کو ترجیح نہ دے اگر اس نے ایسا کیا تو اسلام کی رسیوں میں سے ایک رسی کو توڑ دیا استاذ کی بزرگی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے دروازے کو نہ کھٹکھٹائے بلکہ اس کے باہر آنے کا انتظار کرے۔

طبرانی نے حضرت ابوامامہ سے روایت کی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" من علم عبدا آیة من کتاب اللہ تعالیٰ فھو مولاہ "

"جس شخص نے کسی کوقرآن پاک کی ایک آیۃ بھی سکھادی تو وہ اس کا مولی ہوگیا"۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

" من علمنی حرفا فقد صیرنی لہ عبدا ان شاء باع وان شاء اعتق "

جس شخص نے مجھے ایک حرف بھی سکھادیا بیشک اس نے مجھے اپنا غلام بنالیا، اگر چاہے تو فروخت کردے اور اگر چاہے تو آزاد کردے۔

یعنی اسے مجھ پر اتنا حق حاصل ہوگیا جتنا مالک کو اپنے غلام پر حق حاصل ہوتا ہے۔ یہاں تشبیہ ہے حقیقی غلامیت مراد نہیں۔ (از شرح الحقوق لطرح العقوق للامام احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ)

نکتہ عظیمہ ، فائدہ جلیلہ : استاذی المکرم حضرت مولنا اشرف سیالوی مدظلہ العالی جامعہ جماعتیہ مہر العلوم رحیم ٹاؤن شکریال راولپنڈی (جو راقم کے زیر اہتمام چل رہا ہے) کے جلسہ دستار فضیلت پر تشریف لائے۔ دوران تقریر آپ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کو بھائی کہنا جائز نہیں۔ اس لئے کہ بھائی تو وہ ہوسکتا ہے کہ جن کا باپ ایک ہو۔ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی:

﴿ اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ﴾

" یہ نبی مومنوں کا ان کی جان سے زیادہ مالک ہے اور اس کی بیبیاں ان کی مائیں ہیں" سے واضح ہورہا ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی امت کے تمام مومنین کے روحانی باپ ہیں اور آپ کی بیبیاں روحانی مائیں ہیں اور اس رشتہ سے " کل مومن اخوۃ " تمام مومنین آپس میں ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے۔ اگر نبی کریم ﷺ کو بھی اپنا بھائی مان لیا جائے تو اپنا روحانی باپ کسے مانا جائے گا۔ جس کی بنسبت آپ کو اپنا بھائی کہا جائے۔

اور اگر کوئی یہ کہے کہ سب ہی آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اس لئے آپ ہمارے بھائی ہیں۔ تو اس میں مومنین کی تخصیص کیا۔ آدم علیہ السلام کی اولاد میں تو کفار بھی داخل ہیں۔ اس طرح رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی " کل مؤمن اخوۃ " میں مؤمن کی قید کا کوئی فائدہ ہی باقی نہیں رہتا۔

﴿ وَذِی الْقُرْبٰی ﴾: عطف ہے " ذی القربی " کا " بالوالدین " پر۔ چونکہ رشتہ داروں کا حق والدین کے حق کے تابع ہے۔ اور رشتہ داروں پر احسان والدین کے احسان کے واسطہ سے ہے

اسی وجہ سے والدین کا ذکر پہلے کیا گیا اور قرابت داروں کا بعد میں " فلھذا حسن عطف القرابة علی الوالدین " اسی وجہ سے " ذی القربی " کا عطف " بالوالدین " پر بہتر ہے۔ (خازن)

﴿اَلْقُرْبٰی﴾ قرابت کے معنی میں ہے اور وہ مصدر ہے جیسا کہ "رجعی" اور "عقبی" مصدر ہیں۔

" ای امرنا ھم بالاحسان الی القرابات بصلة ارحامھم "

یعنی ہم نے ان کو حکم دیا کہ وہ صلہ رحمی کر کے اپنے رشتہ داروں پر احسان کریں۔ (قرطبی)

ایک احتمال اس میں یہ بھی ہے کہ "قربی" میں الف تانیث کا ہو اور معنی "رحم اور صلب" کی قرابت ہو۔

(روح المعانی)

حدیث شریف میں ہے " الرحم شجنة من الرحمن " یعنی قرابت شعبه ایست از شعبھای ظھور اسم رحمن گویا رحمت الھی دریں پرده ظھور میکند۔ یعنی حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ "رحم" رحمٰن رب تعالیٰ کے اسم گرامی کے ظہور کے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے گویا کہ رحمت الٰہی اس پردہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے رب تعالیٰ کی طرف سے رحم کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا " من وصلک وصلته ومن قطعک قطعته " یعنی جس نے صلہ رحمی کی میں اس سے قرب رکھوں گا۔ اور جس نے قطع رحمی کی میں اس سے مقاطعت کروں گا۔

عقلی مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے قریبی رشتہ داروں سے اچھا سلوک رکھے کیونکہ انسان کو شادی وفات اور مشکلات میں بغیر کسی کی مالی معاونت، اور بدنی معاونت وغیرہ کے تمام کام سرانجام دینے ممکن نہیں اور یہ بھی واضح ہے کہ ہر انسان سے اس قسم کے کاموں میں امداد طلب کرنا ممکن نہیں۔

اس لئے ضروری ہے کہ ایسے لوگوں سے امداد طلب کی جائے جن سے طبعی طور پر محبت پائی جاتی ہو۔ اور قریبی رشتہ داری ہو جو اس کے حالات سے باخبر ہوں۔ اس کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتے ہوں۔ اس طرح رشتہ داروں کا ایک دوسرے سے تعاون کرنا ان کے لئے نفع مند ہوگا اس کے بغیر ان کی زندگی میں دشواریاں ہی دشواریاں ہوں گی۔

اہل قرابت کی دو قسمیں:

(۱) یعنی ان میں سے ایک قسم یہ ہے کہ رشتہ داری کے ساتھ ساتھ محرمیت (محرم ہونا) بھی حاصل ہو جیسا کہ چچا، ماموں، پھوپھی، خالہ، بھائی، بہن، بھائی اور بہن کی اولاد ان لوگوں سے احسان کرنا

فرض ہے اور اس کا تارک گنہگار ہے۔

(۲) دوسری قسم یہ ہے کہ رشتہ داری تو ہو لیکن محرمیت نہ ہو جیسے چچا کی اولاد، ماموں کی اولاد، پھوپھی کی اولاد، خالہ کی اولاد وغیرھا۔ ان کی امداد کرنا سنت مؤکدہ ہے۔ اس امداد سے مراد ہے ان کی مالی طور پر بدنی طور پر معاونت کرنا ان کی تکالیف میں ہاتھ بٹانا۔

" اما احسان بمعنی ترک ایذء پس نسبت بھمه اینھا فرض است بلکه نسبت بسائر مسلمین "

لیکن احسان کا معنی یہ لینا کہ ان کو ایذاء نہ پہنچائی جائے۔ یہ احسان تمام رشتہ داروں پر کرنا فرض ہے بلکہ تمام مسلمانوں سے یہ احسان کرنا فرض ہے۔ اس لئے کہ کسی مسلمان کو بھی ایذاء پہنچانا، نقصان دینا ناجائز ہے حرام ہے بچنا مسلمان کے لئے فرض ہے۔

نکتہ : ﴿ ذِی الْقُرْبٰی ﴾ کو واحد ذکر کیا گیا ہے۔ اور یتامی اور مساکین کو جمع ذکر کیا گیا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس سے یہ سمجھایا گیا ہے کہ تمام رشتہ داروں سے ایک جیسا سلوک رکھے اگر محرم رشتہ دار ہیں تو ان تمام سے ایک جیسا تعلق رکھے تا کہ بعض کی دل شکنی کا سبب نہ بنے اگر رشتہ دار محرم نہیں تو ان تمام سے بھی ایک ہی قسم کا تعلق رکھے۔ لیکن یتیموں اور مسکینوں میں سے ہر ایک سے ایک جیسا سلوک کرنا ضروری نہیں۔

نکتہ ، دیگر : یہاں ﴿ وَذِی الْقُرْبٰی ﴾ میں باء کو نہیں ذکر کیا اور سورۃ نساء میں ﴿ وَبِذِی الْقُرْبٰی ﴾ ذکر کیا جس میں " باء " بھی پائی گئی ہے وجہ فرق کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں بنی اسرائیل سے وعدہ لینے کا ذکر ہے جو والدین کے بغیر اور رشتہ داروں کے حقوق کو کوئی حیثیت نہیں دیتے تھے اس لئے ﴿ وَبِالْوَالِدَیْنِ ﴾ کے تابع رشتہ داروں کا ذکر کیا گیا۔

اور سورۃ نساء میں نبی کریم ﷺ کی امت کو حکم دیا گیا ہے وہ رشتہ داروں کے حقوق کو فطری اور عقلی طور پر سمجھتے تھے ان کو تاکید کے طور پر شرعی حیثیت سے بھی حکم دے دیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے سورۃ نساء میں "بـــا" کا اعادہ کر کے قرابت داروں کے حقوق کو مستقل حیثیت دے دی گئی اور یتامی اور مساکین کے

حقوق کوان تابع کر کے فرمایا:

﴿ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسَاکِیْنَ ﴾

﴿ وَالْیَتٰمٰی ﴾ : "یتیموں کے ساتھ بھلائی کرو" یتامی جمع ہے یتیم کی۔ جیسے ندیم کی جمع ندامی آتی ہے۔اور کبھی یتیم کی جمع ایتام بھی آتی ہے " والیتیم اصل معناه الانفراد " اور یتیم کا اصل معنی ہے منفرد ہونا۔اسی لئے کہا جاتا ہے " درة یتیمة " یکتا موتی، اور وہ گھر جو دوسرے گھروں سے جدا بنا ہوا ہو اسے " بیت یتیم " کہا جاتا ہے۔

آزاد کشمیر اور مری اور ایبٹ آباد وغیرہ کے پہاڑی علاقوں میں اکثر گھر بیوت یتامی (مرکب توصیفی) ہی ہیں۔اسی معنی کے لحاظ پر " یقال صبی یتیم ای منفرد من ابیه " بچے کو یتیم کہا جاتا ہے کہ یہ اپنے باپ سے منفرد ہے۔

"وقال ثعلب الغفلة " یتیم کا ایک معنی غفلت بھی ہے۔یتیم بچہ بھی چونکہ اپنے باپ کی فرمانبرداری سے غافل ہوتا ہے اس لئے اسے یتیم کہا جاتا ہے۔

" وقال ابو عمرو الابطاء " یتیم کا ایک معنی دیر کرنا بھی آتا ہے چونکہ یتیم بچے کا باپ نہیں ہوتا اس لئے گویا کہ اس سے باپ کی فرمانبرداری میں تاخیر ہوتی ہے لہٰذا اسے یتیم کہہ لیا جاتا ہے۔

" وهو فی الآدمیین من قبل الآباء ولا یتیم بعد بلوغ وفی البهائم من قبل الامهات من قبل الامهات وفی الطیور من جهتهما "

انسان وہ یتیم ہے جس کا باپ نہ ہو اور اس وقت تک یتیم ہے جب تک بالغ نہیں ہوتا، بالغ ہونے کے بعد یتیم نہیں رہتا اور چوپاؤں میں سے وہ یتیم ہے جس کی ماں نہ ہو، اور پرندوں میں سے وہ یتیم ہے جس کے ماں باپ دونوں ہی نہ ہوں۔ (از روح المعانی)

مسئلہ: انسان کا نسب باپ کی طرف منسوب ہوتا ہے: " وانما اضیف الآدمی الی ابیه تشریفا له وصیانة له عن الضیاع " انسان کی نسبت اس کے باپ کی طرف ہوتی ہے اس کی بزرگی کے پیش نظر اور اس کو ضائع ہونے سے بچانے کی غرض سے۔کیونکہ وراثت وغیرہ کی دارومدار اسی

پر ہے کہ اولاد کو باپ کی طرف منسوب کیا جائے۔

"ان الاصل فی الحیوانات الالحاق بالام" اصل یہ ہے کہ جانوروں کو ان کی ماؤں کی طرف منسوب کیا جائے اسی قانون کے پیش نظر اگر کوئی وحشی جانور باپ ہو اور گھریلو جانور ماں ہو تو ان کی اولاد کو گھریلو سمجھ کر قربانی کے جائز ہونے کا حکم ثابت ہے۔

"ان نزا الذئب علی الشاۃ یضحی بالولد" اگر بھیڑیے اور بکری کے ملاپ سے کوئی بچہ پیدا ہو جائے تو اس کی قربانی جائز ہے اسے کھانا جائز ہے۔ اس لئے کہ اس کی ماں بکری ہے جو حلال جانور ہے۔ (شامی ج اول ص ۱۶۵)

یتیم کی پرورش مستحسن کام:

"قال رسول اللہ ﷺ، کافل الیتیم لہ او لغیرہ انا وھو کھاتین فی الجنۃ واشار مالک بالسبابۃ والوسطی"

حدیث پاک کے راویوں میں سے ایک راوی مالک نے اپنی شہادت کی انگلی اور درمیان والی انگلی سے اشارہ کر کے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یتیم وغیرہ کی کفالت کرنے والا اور میں جنت میں اس طرح ہوں گے یعنی آپ نے اپنی انگلیوں سے اشارہ کر کے فرمایا جسے مالک نے اسی طرح بیان فرمایا "یعنی اسے میرا قرب حاصل ہوگا"۔

☆ "عن ابن عباس قال قال رسول اللہ ﷺ من ضم یتیما من بین مسلمین الی طعامہ وشرابہ حتی یغنیہ اللہ عزوجل غفرت لہ ذنوبہ البتۃ الا ان یعمل عملا لا یغفر ومن اذھب اللہ کریمتیہ فصبر واحتسب غفرت لہ ذنوبہ قال وما کریمتاہ ؟ قال عیناہ، ومن کان لہ ثلاث بنات اوثلاث اخوات فانفق علیھن واحسن الیھن حتی یبن اویمتن غفرت لہ ذنوبہ البتۃ الا ان یعمل عملا لا یغفر، فناداہ رجل من الاعراب ممن ھاجر فقال یا رسول اللہ او اثنتین ؟ فقال رسول اللہ ﷺ او اثنتین"

جس شخص نے مسلمانوں میں سے یتیم کو اپنے ساتھ کھانے، پینے میں شریک کیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بے پرواہ کر دیا (یعنی وہ بالغ ہو گیا) اللہ تعالیٰ (یتیم کو اپنے ساتھ کھانے پینے میں

شریک کرنے والے) اس شخص کے گناہ یقیناً معاف فرمادے گا ہاں البتہ اس نے کوئی ایسا عمل نہ کیا ہو جو قابل مغفرت نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے جس شخص کی دو کریم چیزوں کو لے لیا اور اس نے صبر سے کام لیا اور دین پر قائم رہا تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کی مغفرت فرمادے گا۔

صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ ''وہ دو کریم چیزیں کیا ہیں''؟ آپ نے فرمایا اس کی دونوں آنکھیں۔ اور آپ نے فرمایا جس شخص نے اپنی تین بیٹیوں یا تین بہنوں (جو بیوہ ہوں یا مطلقہ) پر اپنا مال خرچ کیا اور ان پر احسان کیا یہاں تک کہ انہوں نے اور نکاح کر لیا یا وہ فوت ہو گئیں۔ تو اس شخص کی رب تعالیٰ یقیناً مغفرت فرمائے گا ہاں البتہ اس کا کوئی ایسا جرم نہ ہو جو قابل معافی جرم نہیں۔

ایک مہاجر اعرابی شخص نے آپ سے سوال کیا، یا رسول اللہ یا دو ہوں (یعنی دو بیٹیوں اور دو بہنوں پر مال خرچ کرنے والے کا کیا حکم ہے؟) نبی کریم ﷺ نے فرمایا خواہ دو ہی ہوں یعنی دو کی ذمہ داری اٹھانے والا بھی قابل مغفرت ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس حدیث کو عجیب حوصلہ افزاء مغفرت کا ذریعہ فرماتے تھے۔ حدیث پاک سے یتیم پر احسان کرنا باعث مغفرت ہونا واضح ہو گیا۔

﴿ وَالْمَسَاكِينَ ﴾: ''اور مسکینوں سے بھلائی کرو'' مسکین ماخوذ ہے سکون سے، چونکہ فقر نے اسے روک رکھا ہوتا ہے اس لئے اسے مسکین کہا جاتا ہے اور یا اسے مسکنۃ سے لیا ہوا ہے۔ جس کا معنی ہے حقیر اور ذلیل ہونا، یعنی وہ اپنے مال کے کم ہونے کی وجہ سے لوگوں کی نظر میں حقیر اور ذلیل ہوتے ہیں۔ مسکین کا سکون یا مسکنۃ سے ماخوذ ہونے کا فرق طلباء کرام راقم کے حاشیہ میزان الصرف میں دیکھیں۔

یتامیٰ کے بعد مساکین کا ذکر کیا گیا اس لئے کہ انسان کبھی مساکین پر اس لئے رحم کرتا ہے کہ وہ میری خدمت کریں گے اس طرح انسان کی اپنی ذہنی کیفیت مساکین پر رحم کرنے کی زیادہ ہوتی ہے۔ لہٰذا رب تعالیٰ نے یتامیٰ کا پہلے ذکر کر کے واضح کر دیا کہ رحم کرنے کے لحاظ پر ان کا حق پہلے ہے۔ اس وجہ سے بھی ان کا حق پہلے ہے کہ وہ نابالغ ہونے کی وجہ سے کوئی ذریعہ معاش حاصل نہیں کر سکتے۔ لیکن مساکین کچھ نہ کچھ محنت و مزدوری کر کے مال حاصل کر سکتے ہیں۔ (از کبیر)

مساکین پر رحم کرنا:

" وھذا یتضمن الحض علی الصدقة والمؤ اساة وتفقد احوال المساکین والضعفاء "

مسکینوں پر بھلائی کرنے کا حکم عطا فرما کر مسکین اور ضعیف لوگ جو کمزور حال ہیں ان پر صدقہ کرنے اور ان پر غم کھانے کا حکم دیا گیا۔

☆ " روی مسلم عن ابی ھریرة عن النبی ﷺ قال الساعی علی الارملة والمسکین کالمجاھد فی سبیل اللہ واحسبه قال وکالقائم لا یفتر وکالصائم لا یفطر "

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیوہ عورت اور مسکین شخص کی امداد کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والا ہے۔ حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں میرا گمان یہ ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ وہ اس شخص کی طرح ہے جو بغیر سستی کے قیام کرنے والا ہے (یعنی رات کو بغیر سستی کے نوافل ادا کرنے والے کی طرح ہے) اور اس روزہ دار کی طرح ہے جو افطار نہ کرتا ہو۔ یعنی سوائے ایام ممینہ (روزہ رکھنا جن دنوں میں منع ہے) کے ہر دن روزہ رکھے۔

☆ " قال ابن المنذر وکان طاؤس یری السعی علی الاخوات افضل من الجھاد فی سبیل اللہ " (از قرطبی)

ابن منذر نے کہا طاؤس بہنوں کی امداد کرنے کو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے افضل سمجھتے تھے۔

لیکن یہ خیال رہے کہ یہ اس وقت ہے جب جہاد فرض نہ ہو جائے فرض عین کے مقابل مستحبات افضل نہیں ہو سکتے۔

﴿وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾: "اور کہو لوگوں سے اچھی بات" ای قولا حسنا سماہ به لمبالغة " "حسن" مصدر ہے مبالغہ کے طور پر ذکر ہے کہ تم لوگوں سے بہت ہی اچھی بات کرو۔

مختصر الفاظ لیکن معانی کثیر: یعنی اچھی بات کرنے کے کئی مطالب ہیں۔ بظاہر الفاظ مختصر ہیں لیکن مطالب کثیر ہیں۔

(۱) " والمراد قولوا لھم القول الطیب وجاوبوھم باحسن ما یحبون "

مراد یہ ہے کہ تم لوگوں سے اچھی بات کرو اور تم ان کو ایسا جواب دو جو وہ پسند کرتے ہوں۔

(۲) " مروهم بالمعروف وانهوهم عن المنكر "

اور اس سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کو اچھے کاموں کا حکم دو اور برے کاموں سے منع کرو۔

(۳) " قولوا لهم لا اله الا الله مروهم بها "

لوگوں کے سامنے تم خود بھی " لا اله الا الله " کہو اور ان کو بھی حکم دو کہ تم بھی " لا اله الا الله " کہو۔

(۴) " اعلموهم بما فی كتابكم من صفة رسول الله ﷺ "

جو تمہاری کتاب میں نبی کریم ﷺ کی صفات مذکور ہیں وہ اور لوگوں کو بھی بتاؤ یعنی تمہارا دوسرے لوگوں کو صاف صاف بتانا اچھی بات ہے۔ (روح المعانی)

(۵) " قولوا للناس صدقا فی امر محمد ﷺ ولا تغيروا نعته "

نبی کریم ﷺ کی صفات کو تبدیل نہ کرو اور آپ کے متعلق لوگوں سے سچ سچ بیان کرو۔

(قرطبی)

یہاں سے پتہ چلا کہ نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو چھپانا یہودیوں کا طریقہ تھا آج کل بھی جھگڑا صرف نبی کریم ﷺ کے اوصاف پر ہے آپ کے فضائل والی احادیث کو ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ضعیف کہا جاتا ہے۔ گستاخانِ رسول اللہ ﷺ کی تو بات ہی کیا ہے لیکن افسوس کہ سنیت کے لبادہ میں گستاخوں کے ایجنٹ بھی وہی کام کر رہے ہیں جو ان کے آقاؤں نے کیا۔

مٹ گئے، مٹ جائیں گے سب اعداء تیرے ۔۔۔ نہ مٹا ہے نہ مٹے کا کبھی چرچا تیرا

تنبیہ: " والظاهر ان هذا الامر من جملة الميثاق الماخوذ على بنی اسرائيل "
اس آیۂ کریمہ سے ظاہر طور پر یہی واضح ہو رہا ہے کہ ﴿ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا ﴾ بھی اسی میثاق کا حصہ ہے جو بنی اسرائیل سے لیا گیا۔ یعنی جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا......... اور ان کو یہ کہہ کر ''کہ لوگوں سے اچھی بات کرو'' بھی عہد لیا۔ (روح المعانی)

اسی قول پر تقریباً قرطبی رحمہ اللہ کی یہ تفسیر بھی دلالت کر رہی ہے:

" وقال طلحة بن عمر قلت لعطاء انك رجل يجتمع عندك ناس ذو

اهـواء مـخـتـلفة وانا رجل فی حدة فاقول لهم بعض القول الغليظ فقال لا تفعل يقول الله تعالىٰ ﴿ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا ﴾ فدخل فی هذه الآية اليهود والنصاری فکيف بالحنيفی وفی بعض نسخ الاصل " وفی غيرهما ".

طلحہ بن عمر نے کہا، میں نے عطا کو کہا بیشک تو وہ شخص ہے جس کے پاس لوگ جمع ہوتے ہیں جو مختلف خواہشات اور مختلف طبیعتیں رکھنے والے ہوتے ہیں۔ (لیکن تم ان سے اچھا کلام کرتے ہو) لیکن میری طبیعت میں تیزی ہے کہ میں بعض لوگوں سے سخت کلام بھی کر لیتا ہوں۔ انہوں نے کہا ایسا نہ کیا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا ﴾ لوگوں سے اچھی بات کہو۔ جب اس آیۃ میں یہود اور نصاریٰ داخل ہیں تو ان کے غیر کیوں داخل نہیں ہوں گے۔ یعنی اگرچہ یہ بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا تھا لیکن حکم عام ہے۔ جو نبی کریم ﷺ کی امت کو بھی شامل ہے۔

☆ " وروی عن النبی ﷺ انه قال لعائشة لا تكونی فاحشة فان الفحش لو كان رجلا لكان رجل سوء "

نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا فحش کلام والی کبھی نہ بننا، اس لئے کہ فحش کلام کرنے والا شخص برا شخص ہوتا ہے۔

ایک اور قول: ابھی تک جو ذکر کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ ﴿ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا ﴾ بھی بنی اسرائیل سے لئے ہوئے میثاق کا حصہ ہے کہ یہ خطاب بھی بنی اسرائیل کو ہے۔ لیکن ایک قول یہ ہے "ان المخاطب به الامة" کہ بیشک اس میں خطاب ہے نبی کریم ﷺ کی امت کو پھر اس میں کلام ہے کہ یہ منسوخ آیات قتال سے یا محکم ہے (یعنی منسوخ نہیں) اسی طرح اسمیں مختلف اقوال ہیں۔ کہ "للناس" سے مراد نیک مؤمن لوگ ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ نیک مومن لوگوں سے اچھی بات کرو، اس قول کے مطابق کفار اور فساق سے اچھی بات کرنے کا حکم ہمیں نہیں دیا گیا، بلکہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم ان پر لعنت کریں ان کی مذمت بیان کریں اور ان سے جنگ کریں۔ اسی طرح رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ﴾

"اللہ پسند نہیں کرتا بری بات کا اعلان مگر مظلوم سے"۔

یعنی مظلوم شخص ظالم کے برے اقوال وافعال کو لوگوں اور حکام سے واضح طور پر بیان کرے۔
لیکن ایک اور قول یہ ہے:

" فینبغی للانسان ان یکون قوله للناس لینا ووجهه منبسطا طلقا مع البر والفاجر والسنی والمبتدع من غیر مداهنة ومن غیر ان یتکلم معه بکلام یظن انه یرضی مذهبه"

کہ انسان کو چاہئے کہ وہ لوگوں سے نرم کلام کرے اور کشادہ روئی (ہنس مکھ ہوکر) سے کلام کرے، خواہ نیک لوگوں سے بات کرے یا برے لوگوں سے، سنت کے مطابق چلنے والوں سے کلام کرے یا بدعت پر عمل کرنے والوں سے کلام کرے، البتہ اس میں چاپلوسی نہ پائی جائے اور یہ محسوس نہ ہو کہ یہ اس کے دین اور اس کے طریقہ کو پسند کرتا ہے۔

ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرمایا: ﴿ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا ﴾ ''تم دونوں اس سے نرم بات کرو'' مراد اس سے فرعون ہے یعنی فرعون سے نرم کلام کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کرام کو دیا ہے۔

" فالقائل لیس بافضل من موسی وهارون والفاجر لیس باخبث من فرعون "

اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو حکم دیا کہ فرعون کے پاس جا کر اسے تبلیغ کرو لیکن اس سے بات نرم کرو، تو یہی حکم سب کے لئے ہوگا، کیونکہ کوئی اور شخص بات کرنے والا ان دونوں نبیوں سے افضل نہیں ہوسکتا اور جس سے بات ہوگی وہ فرعون سے زیادہ خبیث نہیں ہوسکتا۔ اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ﴾

''اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت سے بلاؤ''

اور رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾

''اور انہیں گالی نہ دو جن کو وہ اللہ کی سوا پوجتے ہیں کہ وہ اللہ کی شان میں بے ادبی کریں گے

زیادتی اور جہالت سے"۔

اس آیۃ میں کفار کے باطل معبودوں کو گالی دینے سے منع کیا گیا ہے تا کہ وہ اپنی جہالت اور ضد اور عناد کی وجہ سے بے جا زیادتی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی نہ کریں۔

محاکمہ : جب سخت کلام کرنے اور نرم کلام کرنے کے احکام پائے جاتے ہیں۔تو یقیناً ان کے علیحدہ علیحدہ مطالب بھی ہیں۔اس لئے ان کو اسطرح بیان کیا جائے کہ کوئی تعارض نظر نہ آئے اور نہ ہی بیان کرنے والوں کے درمیان کوئی اختلاف نظر آئے اس کی وضاحت یہ ہے:

لوگوں سے کلام یا دینی امور کے متعلق ہوگی یا دنیاوی امور کے متعلق ہوگی۔اگر دینی امور کے متعلق ہو تو کفار کو دعوت ایمان دینی مقصود ہو، یا فساق کو طاعت کی دعوت دینی مقصود ہو " فلا بد وان تکون بالقول الحسن " تو ضروری ہے کہ اچھی بات کے ذریعے ان کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرے۔اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرمایا:

﴿ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴾

"اس سے نرم بات کرو شائد وہ نصیحت حاصل کرلے یا ڈر جائے"۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے جلیل القدر انبیاء کرام کو جب فرعون سرکش، کافر، خدائی کے دعویدار سے نرم بات کرنے کا حکم دیا تو پتہ چلا کہ کسی کو بھی دعوت ایمان دینی ہو تو نرم گفتگو کی جائے۔نبی کریم ﷺ کو بھی خطاب کرتے ہوئے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

" ولو کنت فظا غلیظ القلب لا نفضوا من حولک "

اگر آپ تندمزاج اور سخت دل ہوتے تو وہ ضرور آپ کے گرد سے ہٹ جاتے۔

" واما دعوۃ الفساق فالقول الحسن فیہ معتبر '

فاسق لوگوں کو جب دعوت دی جائے تو اس وقت بھی نرم اور اچھی بات کی جائے۔

اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ﴾

"یعنی حکمت اور اچھے وعظ سے حق راہ کی دعوت کا حکم فرمایا گیا ہے"۔

" واما الامور الدنیویة فمن المعلوم بالضرورة انه اذا امکن التوصل الی الغرض بالتلطف من القول لم یحسن سواہ "

دیناوی معاملات بھی اگر نرم گفتگو سے حاصل ہو جائیں تو نرم گفتگو ہی کرے کسی قسم کی سخت کلامی کرنا منع ہے ہاں اگر بغیر ڈانٹ کے دنیاوی معاملہ کا کوئی حل نہ نکلے تو بارعب بات کرنا گرجدار آواز میں بات کرنا جائز ہے تاکہ وہ معاملہ حل ہو جائے۔

کفار اگر ایمان نہ لائیں، اپنے کفر پر قائم رہیں تو ان سے جنگ کرنا ان پر لعنت بھیجنا ان پر سختی کرنا ہی رب تعالیٰ کو پسند ہے اسی لئے نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کی شان میں فرمایا:

" محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم "

محمد رسول اللہ اور ان کے ساتھ والے کافروں پر سخت ہیں اور آپس میں نرم دل۔

صحابہ کرام کفار پر اس طرح سخت حملہ آور ہوتے جیسے شیر شکار پر حملہ کرتا ہے۔ اور صحابہ کرام کا تشدد کفار کے ساتھ اس حد پر تھا کہ وہ لحاظ رکھتے تھے کہ ان کا بدن کسی کافر کے بدن سے نہ چھو جائے اور ان کے کپڑے سے کسی کافر کا کپڑا نہ لگنے پائے۔ اور آپس میں نرمی کا یہ مقام تھا کہ ایک دوسرے پر اس طرح مہربانی کرتے اور اس طرح محبت سے درپیش آتے جیسے باپ بیٹے میں محبت ہوتی ہے۔ یہ محبت اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ جب ایک دوسرے کو دیکھتے تو شدید محبت کی وجہ سے ایک دوسرے کو گلے لگا لیتے اور مصافحہ کرتے۔ اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ يَآ اَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ﴾

''اے نبی کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان پر سختی فرماؤ''۔

اس آیۃ کریمہ میں بھی کفار اور منافقین سے رعب دار کلام کرنے اور جہاد کرنے کا حکم دیا کہ کافروں سے اس طرح کلام نہ کرو کہ تمہاری بزدلی نظر آئے، کفار کی خوشامد نہ کرو ان کے سامنے جی حضوری نہ بن جاؤ۔

یہاں یہ بھی خیال رہے کہ آیۃ کریمہ میں بظاہر خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے لیکن مراد آپ کی امت ہے۔ اسی لئے راقم نے وضاحت کرتے ہوئے ایسے الفاظ ذکر کئے ہیں جو امت کی طرف منسوب ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی طرف ''بزدلی، خوشامد'' جیسے الفاظ استعمال نہیں کئے جا سکتے۔

تنبیہ : کسی کو راہ راست پر لانے کے لئے نرم کلام کرنے کا اور مقصد ہے اور کسی سے ڈر کر، یا کسی کے سامنے خوشامد کے طور پر نرم کلام کرنے کا اور مقصد ہے۔ پہلا انداز قابل تعریف ہے اور دوسرا انداز قابل مذمت ہے اسی طرح سخت کلامی کی بھی دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ بارعب، بلند آواز سے کلام کی جائے کسی کے سامنے سر نہ جھکایا جائے۔ اس انداز سے کفار سے کلام کرنا قابل تعریف ہے تا کہ کفار کو معلوم ہو جائے کہ مسلمان جرأت اور بہادری کا مالک ہے۔

دوسرا انداز یہ ہے بیہودہ کلام کرے، گالیاں نکالے، ایسا انداز اختیار کرنا مسلمان کی شان کے لائق نہیں۔ وہ مومن سے کلام کرے یا کافر سے کلام سنجیدہ بیہودہ، بکواس بازی نہ ہو۔ انسانیت کا بھی تقاضا ہے۔ (ماخوذ از قرطبی، روح المعانی، کبیر، خزائن العرفان بزیادۃ)

﴿ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ﴾ : ''اور نماز قائم کرو اور زکواۃ دو'' یہ خطاب بھی بنی اسرائیل کو ہی ہے نماز اور زکواۃ ان پر بھی فرض تھی۔ اگر چہ مقدار وغیرہ میں بھی فرق تھا۔ یہود پر زکواۃ مال کا چوتھا حصہ فرض تھی۔ پھر وہ لوگ زکواۃ اپنے غریب لوگوں کو دیتے تھے یا کہ ان کی قربانی کی طرح زکواۃ کی قبولیت کی بھی علامت یہ تھی کہ آگ آتی اور اس مال کو کھا جاتی۔

علامہ آلوسی نے اس قول کو مطلقاً ذکر کیا۔ لیکن علامہ قرطبی نے ذکر کیا کہ قول یہ نقل کا محتاج ہے نقلی دلیل کا ملنا ضروری ہے جس سے پتہ چل جائے کہ واقعی قدرتی طور پر آگ آتی تھی جو ان کی زکواۃ کو کھا جاتی تھی۔ نماز اور زکواۃ کا مختصر ذکر رکوع نمبر ۵ میں گزر چکا ہے۔ دوبارہ اعادہ کی ضرورت نہیں۔

تنبیہ : پہلے والدین اور رشتہ داروں پر احسان کرنے کا حکم دیا۔ پھر زکواۃ ادا کرنے کا حکم دیا جس سے واضح ہوا کہ پہلا حکم صدقات مستحبہ سے ہے۔ اور زکواۃ ادا کرنا فرض ہے اسے سے یہ واضح ہو گیا کہ زکواۃ والدین یا اولاد کو نہیں دی جائے گی کیونکہ زکواۃ اصول (باپ داد، پردادا، دادی، پردادی وغیرھا، ماں، نانی، نانا، پرنانا وغیرہ) اور فروع (اولاد اور اولاد کی اولاد نیچے تک) کو نہیں دی جا سکتی۔ اور زوجین بھی ایک دوسرے کو زکواۃ نہیں دے سکتے۔ اصول و فروع کی مالی معاونت زکواۃ کے مال کے غیر مال سے کی جائے گی زکواۃ مستحقین کو ہی دی جائے گی۔

﴿ ثُمَّ تَوَلَّیۡتُمۡ اِلَّا قَلِیۡلًا مِّنۡکُمۡ وَ اَنۡتُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴾:

''پھرتم پھر گئے سوائے تھوڑے تم میں سے اورتم ہو ہی اعراض کرنے والے''۔

یہ خطاب نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود کو ہے کہ تم نے نبی کریم ﷺ کے معجزات کو دیکھ کر اعراض کرلیا۔ ہاں البتہ تم میں سے تھوڑے ایمان لائے۔ انہوں نے اعراض نہیں کیا وہ حضرت عبداللہ بن سلام اور کعب بن احبار اوران کے ساتھی ہیں ﷺ۔

اور ضمناً اس میں ان کے آباؤ اجداد کا بھی ذکر ہے کہ تمہارے آباؤ اجداد کا بھی یہی طریقہ چلا آ رہا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے وعدہ کر لیتے تھے پھر اعراض کر لیتے تھے۔

اعتراض: ﴿ تَوَلَّیۡتُمۡ ﴾ اور ﴿ وَ اَنۡتُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴾ کا ایک ہی مطلب ہے پھر جانا، اعراض کرنا، ایک ہی معنی پر دلالت کرنے والے دولفظوں کو ایک ہی جگہ ذکر کرنے کا کیا مطلب؟

جواب نمبرا: " التولی بالجسم والاعراض بالقلب " ﴿ ثُمَّ تَوَلَّیۡتُمۡ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم جسمانی طور پر پھر گئے کہ نبی کریم ﷺ سے دور ہو گئے۔ آپ کے قریب تم نے بیٹھنے سے اعراض کیا۔ اور ﴿ وَ اَنۡتُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴾ سے مراد دل سے پھرنا ہے۔ یعنی تم نبی کریم ﷺ سے حسد اور عناد کرنے لگے جس کی وجہ سے تم نے دل سے ان کو نبی نہیں مانا اور ایمان قبول نہیں کیا۔

جواب نمبر۲: ﴿ وَ اَنۡتُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴾ حال لان التولی فیه دلالة علی الاعراض " یعنی ﴿ وَ اَنۡتُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴾ جملہ حالیہ ہے کیونکہ ﴿ تَوَلَّیۡتُمۡ ﴾ اعراض پر دلالت کر رہا ہے اب مفہوم اس طرح ہوگا پھر تم پھر گئے ایسے حال میں کہ تم اعراض کرنے والے ہو۔ اس جواب کو پنجابی کے اس جملہ سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے ''منہ ادھر چا کے دفعہ ہو گیا'' یعنی منہ پھیر کر تم ادھر چلے گئے۔ (از قرطبی)

جواب نمبر۳: ﴿ وَ اَنۡتُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴾ ای وانتم قوم عادتکم الاعراض والتولی عن المیثاق " ﴿ ثُمَّ تَوَلَّیۡتُمۡ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم میثاق سے پھر گئے اور ﴿ وَ اَنۡتُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری عادت ہی یہ ہے کہ اعراض کرنا۔ (روح المعانی)

روح المعانی کے جواب کے مطابق اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہے ''اور تم روگرداں ہو'' راقم نے عوام کے سمجھنے کے لئے ذرا زیادہ واضح کر دیا ''تم ہو ہی اعراض کرنے والے''۔

گذشتہ سے پیوستہ : قول حسن (اچھی بات) کے متعلق علامہ رازی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا:

'' ان القول الحسن لیس عبارة عن القول الذی یشتھونه ویحبونه ، بل القول الحسن ھو الذی یحصل انتفاعھم به ونحن اذا لعناھم وذممناھم لیر تدعوا به عن الفعل القبیح کان ذلک المعنی نافعافی حقھم فکان ذلک اللعن قولا حسنا ونافعا کما ان تغلیظ الوالد فی القول قد یکون حسنا ونافعا من حیث انه یرتدع به عن الفعل القبیح ''

(کبیر)

اچھی بات کا صرف یہ ہی مطلب نہیں کہ مخاطب اسے سن کر خوش ہو اور پسند کرے بلکہ اچھی بات وہ ہے جس سے مخاطب کو نفع ہو، لہٰذا کافروں پر لعنت کرنا، ان کی مذمت بیان کرنا درحقیقت ان کے لئے نفع مند ہے تا کہ وہ کفر سے باز آ جائیں اس لحاظ پر ان پر لعنت کرنا اور ان کی مذمت بیان کرنا ان سے اچھی گفتگو ہوگی نہ کہ بری۔ انسان کبھی اپنی اولاد سے بظاہر سخت لہجہ میں بات کرتا ہے لیکن اولاد کی اچھی تربیت کی لئے اور غلط کاموں سے روکنے کے لئے یہ طریقہ استعمال کیا جاتا ہے جو اولاد کے حق میں سخت بات ہونے کے باوجود اچھی بات ہوگی۔

فائدہ: اسی سے یہ فائدہ حاصل ہو گیا کہ استاذ اگر شاگرد کو سبق یاد کرنے کیلئے اس کی اچھی تربیت کیلئے بطور سرزنش کے سخت کلام کرے تو اسے اچھا کہا جائے گا۔ اس بات کو برا نہیں کہا جا سکتا، ہاں البتہ گالیاں دینا، بیہودہ بکواس کرنا، بلاوجہ سرزنش کرنا استاذ کی شان کے لائق نہیں۔ اس سے استاذ کا وقار کم ہوتا ہے، بڑھتا نہیں۔ بعض استاذ اپنا رعب جمانے کی سوچ میں اپنے آپ کو بے وقار بنا لیتے ہیں۔

☆☆☆

﴿ وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ لَا تَسْفِکُوْنَ دِمَآءَ کُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴾ (آیت ۸۴)

۱) ''اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ اپنوں کا خون نہ کرنا اور اپنوں کو اپنی بستیوں سے نہ نکالنا پھر تم نے اس کا اقرار کیا اور تم گواہ ہو''۔

۲) اور جب لیا ہم نے تم سے عہد کہ تم نہ بہانا اپنوں کا خون، اور نہ نکالنا تم اپنوں کو اپنی بستیوں سے پھر تم نے اقرار کرلیا ایسے حال میں کہ تم گواہ تھے''۔

اس آیۃ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے یہود پر اپنے ایک اور انعام کا ذکر فرمایا لیکن انہوں نے اپنی عادت کے مطابق اس انعام کی قدر بھی نہ کی اور وعدہ کو توڑ دیا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے ایک دوسرے کا خون نہ بہانے اور ایک دوسرے کو اپنی بستیوں سے نہ نکالنے کا وعدہ لیا جو یقیناً ان کے لئے عذاب سے بچنے اور جنت میں جانے کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے عظیم انعام تھا لیکن انہوں نے اس وعدہ کو بھی توڑ دیا، عمل نہ کیا، جو ان کے لئے ذلت و رسوائی کا سبب بنا، جس کا ذکر اگلی آیۃ میں آ رہا ہے۔

شان نزول: اس آیۃ کریمہ اور آنے والی آیۃ کریمہ کا ایک ہی مضمون ہے اور ایک ہی شان نزول ہے۔ یہ آیۃ کریمہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے مدینہ طیبہ میں رہنے والے یہود کے حق میں نازل ہوئی۔ جو اوس اور خزرج کی لڑائیوں میں معاونت کرتے تھے۔

اوس اور خزرج انصار تھے جو زمانہ جاہلیت میں بت پرست تھے، اور ان کے درمیان کثیر لڑائیاں واقع ہوئیں مدینہ طیبہ میں یہود کے تین قبیلے تھے۔ ایک بنو قینقاع اور دوسرا بنو النضیر۔ یہ دونوں خزرج قبیلہ کے حلیف تھے۔ اور تیسرا قبیلہ بنو قریظہ تھا جو اوس کے حلیف تھے۔ جب اوس اور خزرج کی آپس میں لڑائی ہوتی تو خزرج کے حلیف بنو قینقاع اور بنو النضیر ان سے مل جاتے اور بنو قریظہ اپنے حلیف اوس سے مل جاتے۔

جب ان کے درمیان لڑائی ہوتی تو یہودیوں کے ہاتھوں دوسرے یہودی بھی مارے جاتے، اور

لڑائی میں جو قبیلہ غالب آ جاتا وہ دوسرے قبیلہ کو اپنی بستی سے نکال دیتا اور ان کا مال چھین لیتے۔ یہودیوں کے جو لوگ قیدی ہو چکے ہوتے تھے جب لڑائی ختم ہو جاتی تو دوسرا گروہ ان کا فدیہ دے کر چھڑا لیتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں آیتوں میں اس کا ذکر کیا جس کی تفصیل ان شاء اللہ آ رہی ہے۔

(از صابونی)

﴿ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَ كُمْ ﴾:

''اور جب لیا ہم نے تم سے عہد کہ نہ بہانا اپنوں کا خون''۔

﴿ تَسْفِكُوْنَ ﴾ السفک سے لیا ہوا ہے۔ جس کا معنی ہے:

" السفک فی الدم صبه و كذا فی الجوهر المذاب وفی الدمع "

خون بہانا، آنسو بہانا، کسی دھات یعنی سونے، چاندی وغیرہ کو پگھلانا۔

اعتراض : ﴿ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَ كُمْ ﴾ کا ظاہر طور پر معنی یہ ہے کہ ''تم اپنے خون نہ بہاؤ'' انسان کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ موت سے ڈرتا ہے مرنے کو اس کا جی نہیں چاہتا۔ جب کوئی انسان اپنے آپ کو قتل نہیں کرتا، اپنے آپ کو قتل کرنے سے گھبراتا ہے تو نہی (روکنے) کا کیا فائدہ ہے۔

پہلا جواب: کبھی کبھی لوگ موت سے ڈرنے کی باوجود اپنے آپ کو قتل کر لیتے ہیں، اس کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے:

" كثير ممن صعب عليه الزمان وثقل عليه امر من الامور فيقتل نفسه "

کہ انسان کثیر مشکلات میں مبتلاء ہو جاتا ہے جو اس کی قوت برداشت سے باہر ہو جاتا ہے تو وہ اپنے آپ کو قتل کر کے ان مصائب سے اپنے آپ کو آزاد کر لیتا ہے۔ (از کبیر)

لیکن اس کا یہ فعل حرام ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کیا کہ تم اپنے آپ کو مشکلات کی وجہ سے قتل نہ کرنا مصائب کی وجہ سے صرف موت کی تمنا بھی منع ہے اپنے آپ کو قتل کر دینا تو شدید جرم ہے۔

☆ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" لا يتمنين احدكم الموت من ضر اصابه "

تم میں سے کوئی شخص بھی مصیبت وضرر میں موت کی ہرگز تمنا نہ کرے۔

اگر اس کو بہت مجبوری ہو موت کی تمنا وہ ضرور ہی کرنا چاہتا ہے تو اس طرح دعا کرے۔

" اللهم احینی ما کانت الحیاة خیرا لی وتوفنی اذا کانت الوفاة خیرا لی "
(بخاری ، مسلم ، مشکوۃ باب تمنی الموت وذکرہ)

یعنی انسان کو کسی قسم کا ضرر بھی پہنچے خواہ مالی ضرر ہو، یا بدنی، اگر وہ اس ضرر ونقصان، مصیبت والم اور دکھ، درد پر موت کی تمنا کرتا ہے اور یہ کہتا ہے اے اللہ مجھے موت دے دے۔ تو یہ اس کے جزع وفزع پر دلالت کرے گا، اور بے صبری اور بے ثباتی پائے جائے گی لہذا یہ جائز نہیں۔ ہاں اگر انسان موت کی تمنا ضروری ہی کرنا چاہتا ہے صبر کا دامن لبریز ہو چکا ہے مصائب وآلام پر قائم رہنا ناممکن ہو چکا ہے تو پھر بھی یہ نہ کہے کہ اے اللہ مجھے موت عطا کر۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف اپنا معاملہ سپرد کرتے ہوئے یوں عرض کرے اے اللہ اس وقت تک مجھے زندہ رکھ جب تک میرے لئے زندگی بہتر ہے اور اے اللہ مجھے وفات عطا کر دے جب میرے لئے وفات بہتر ہو۔

اس طرح انسان نے گویا کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر رضامندی کا اظہار کر دیا ہے اور کامل بے صبری کا مظاہرہ نہیں کیا۔

☆ " عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ لا یتمنی احدکم الموت اما محسنا فلعله ان یزدا دخیرا واما مسینا فلعله ان یستعتب " (بخاری مشکوۃ باب تمنی الموت وذکرہ)

حضرت ابوھریرہ ﷛ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی ایک آدمی بھی موت کی تمنا نہ کرے اگر وہ نیک ہوا تو ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی نیکیوں میں اور زیادتی کرے اور اگر وہ گناہگار ہوا تو ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ اسے توبہ کی توفیق عطا فرمادے۔

یعنی اگر انسان کو اللہ تعالیٰ عمر زیادہ عطا فرمائے اور ساتھ ساتھ نیکیوں کی توفیق بھی عطا فرمادے تو یہ انسان کے مراتب ومدارج میں بلندی کا ذریعہ ہوگا۔ لیکن اگر کوئی شخص گناہ کی زندگی گزار رہا ہے تو انسان کو بھی موت کی طلب کرنا درست نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے موت سے پہلے کسی وقت توبہ کی توفیق عطا فرمادے۔ جس سے اس کے گناہ بخش دیئے جائیں تو اس طرح عمر کی زیادتی اس انسان کے لئے بھی مفید ہوگی۔

فائدہ : چند مقامات وہ ہیں جہاں موت کی تمنا جائز ہے۔

" وقد افتی النووی انه لا یکره تمنی الموت لخوف فتنة دینیة بل قال مندوب " (مرقاۃ حوالہ مذکور)

علامہ نووی رحمہ اللہ نے اس پر فتوی دیا ہے کہ اگر ایسے فتنے نمودار ہو جائیں جن سے دین میں خلل آ رہا ہو تو ایسی صورت میں موت کی تمنا کرنا مکروہ نہیں۔ بلکہ مستحب ہے کہ وہ موت کی طلب کرے۔ کیونکہ اسے دین میں واقع ہونے والے فتنوں کی پریشانی سے راحت حاصل ہونے کا ذریعہ موت کی تمنا ہے جو یقیناً مستحسن تمنا ہے۔

" و کذا یندب تمنی الشهادة فی سبیل الله لانه صح عن عمر ﷺ وغیره " (مرقاۃ)

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہادت حاصل ہونے کی تمنا کرنا مستحب ہے جیسے حضرت عمر ﷺ اور دوسرے صحابہ کرام سے ثابت ہے کہ وہ حصول شہادت کی دعائیں کرتے رہے۔

خود نبی کریم ﷺ دعا فرماتے رہے کہ اے اللہ مجھے شہید کر دیا جائے پھر زندہ کر دیا جائے پھر شہید کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے جسم اطہر کو ظاہر طور پر تو کافروں سے محفوظ رکھا تا کہ آپ کے جسم اطہر سے توہین آمیز سلوک نہ کر سکیں اور یہ بھی نہ کہہ سکیں کہ ہم نے مسلمانوں کے نبی کو قتل کر دیا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو اس طرح قبول کیا کہ خیبر میں ایک یہودیہ نے آپ کو زہر آلود بکری کا گوشت کھلایا۔ اس وقت گوشت نے خود نبی کریم ﷺ کو بتایا کہ میں زہر آلود ہوں، لیکن آپ جو ایک دو لقمے لے چکے تھے اس زہر کا اثر آپ کے جسم اطہر میں محفوظ رکھا گیا، پھر زہر کے اثر کو لوٹایا گیا تو آپ کو شہادت کا درجہ بھی عطا کر دیا گیا۔

دوسری وجہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ نے اپنی معروف تصنیف " سر الشهادتین " میں بیان کی کہ آپ کی دعا قبول کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو دونوں شہادتوں (ظاہری اور سری) کا درجہ نصیب فرمایا ہے وہ اس طرح کہ حضرت امام حسن ﷺ جو نبی کریم ﷺ کے سر مبارک سے لے کر ناف تک آپکے مشابہ ہیں آپ کو زہر کی وجہ سے شہادت نصیب ہوئی اور حضرت امام حسین ﷺ جو ناف

سے لے کر پاؤں تک نبی کریم ﷺ کے مشابہ ہیں آپ کو ظاہری شہادت میدان جنگ میں نصیب ہوئی۔ اس طرح ان دونوں حضرات کی شہادت سے نبی کریم ﷺ کو بھی شہادت کا مرتبہ نصیب فرمادیا۔

مسلم شریف میں " **من طلب الشهادة صادقا اعطيها ولو لم تصبه** " جس شخص نے صدق دل سے شہادت طلب کی اللہ تعالیٰ اسے شہادت کا مرتبہ عطا فرماتا ہے خواہ وہ بظاہر شہید نہ بھی ہو۔

" ويندب ايضا تمنى الموت ببلد شريف لما فى البخارى ان عمر رضی اللہ عنہ قال اللهم ارزقنى شهادة فى سبيلك واجعل موتى ببلد رسولك فقالت بنته حفصة انى يكون هذا فقال ياتى به الله اذا شاء اى وقد فعل فان قاتله كافر مجوسى "

مدینہ طیبہ میں موت کی تمنا کرنا بھی مستحب ہے بخاری شریف میں ہے بے شک حضرت عمر رضی اللہ عنہ دعا کرتے تھے " اے اللہ مجھے اپنے راستہ میں شہادت نصیب فرما، اور میری موت اپنے رسول کے شہر میں مجھے نصیب فرما۔ آپ کی بیٹی (ام المؤمنین) حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یہ کیسے ہوگا (کہ شہادت بھی ملے اور موت بھی مدینہ طیبہ میں آئے) مدینہ طیبہ میں کس سے جنگ ہوگی اور کیسے شہادت آئے گی؟ آپ نے بطور تعجب یہ عرض کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ چاہے گا تو ایسے ہی ہوگا آپ کی دعا کو اللہ تعالیٰ نے اسی طرح قبول فرمایا جیسے آپ نے عرض کیا کہ مدینہ طیبہ میں ہی آپ کو شہادت نصیب ہوئی کیونکہ آپ کا قاتل کافر، مجوسی تھا۔

سبحان اللہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جس خواہش کا اظہار کیا اور کامل توقع کی اللہ تعالیٰ نے اسے پورا فرمایا ہے۔ (ماخوذ از مرقاۃ وسر الشہادتین)

دوسری وجہ اپنے آپ کو قتل کرنے کی یہ ہوتی ہے:

" كما ثبت فى اهل الهند انهم يقدرون فى قتل النفس التخلص من عالم الفساد واللحوق بعالم النور "

جیسا کہ اہل ہند کے متعلق ثابت ہے وہ اپنے آپ کو اس لئے ماردیتے تھے کہ وہ عالم فساد سے چھٹکارا حاصل کر کے عالم نور سے مل جائیں۔

یعنی ان کا عقیدہ ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو رب تعالیٰ کی رضاء کیلئے بھوکا رکھ کر مار دینا رب تعالیٰ کے قریب کر دیتا ہے اور ظلمت ۔سے نکال کر نورانیت تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ ان کا عقیدہ باطل تھا۔اس لئے کہ رب تعالیٰ کا قرب نبی کریم ﷺ کی شریعت کے مطابق چلنے سے حاصل ہوتا ہے نہ کہ آپ کی شریعت کی مخالفت سے۔لہٰذا واضح ہوا کہ خودکشی اور بھوک ہڑتال حرام فعل ہیں۔

☆ "عن انس قال جاء ثلاثة رهط الى ازواج النبى ﷺ يسألون عن عبادة النبى ﷺ فلما اخبروا بها كانهم تقالوها فقالوا اين نحن من النبى ﷺ وقد غفر الله ما تقدم من ذنبه وما تاخر فقال احدهم اما انا فاصلى الليل ابدا وقال الآخر انا اصوم النهار ابدا ولا افطر وقال الآخر انا اعتزل النساء فلا اتزوج ابدا فجاء النبى ﷺ فقال انتم الذين قلتم كذا وكذا اما والله انى لاخشاكم لله واتقاكم له لكنى اصوم وافطر واصلى وارقد واتزوج النساء فمن رغب عن سنتى فليس منى" (بخاری ، مسلم ، مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں ایک قبیلہ کے تین شخص آئے نبی کریم ﷺ کی ازواج سے آپ کی عبادت کے متعلق سوال کرنے لگے جب ان کو آپ کی عبادت کے متعلق خبر دی گئی تو انہوں نے اسے کم سمجھا، وہ کہنے لگے ہمیں نبی کریم ﷺ سے کیا نسبت (یعنی کہاں ہم اور کہاں آپ) یقیناً آپ کا مرتبہ بلند ہے آپ کو تھوڑی عبادت کافی ہے ہمیں زیادہ عبادت کرنی چاہئے) اللہ تعالیٰ نے آپ کو تو پہلے اور پچھلے گناہوں سے محفوظ رکھا ہوا ہے تو ان میں سے ایک نے کہا میں ہمیشہ ساری رات نماز پڑھا کروں گا۔اور دوسری نے کہا میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا، کبھی افطار نہیں کروں گا، ایک اور نے کہا میں ہمیشہ عورتوں سے دور رہوں گا کبھی شادی نہیں کروں گا۔

اتنی دیر میں نبی کریم ﷺ تشریف لے آئے۔آپ نے فرمایا تم نے اس اس طرح کہا ہے؟ خبر دار قسم ہے اللہ تعالیٰ کی بیشک میں بنسبت تمہارے اللہ تعالیٰ سے زیادہ ڈرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے بنسبت تمہارے تقوی بھی زیادہ رکھتا ہوں لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں۔اور نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، جس شخص نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں۔

خیال رہے کہ تمام رات عبادت کرنا یا ہمیشہ روزہ رکھنا منع تو نہیں ، لیکن جب نبی کریم ﷺ کی عبادت کو کم سمجھ کر اس طرح کی عبادت کو اپنے آپ پر لازم کر دیا جائے تو وہ سنت سے اعراض ہے۔ جس کو نبی کریم ﷺ نے پسند نہیں فرمایا۔

تنبیہ : نکاح کے خطبہ میں علماء کرام سے سنتے ہیں کہ وہ اس طرح ایک حدیث پڑھتے ہیں :

" قال رسول اللہ ﷺ النکاح من سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی "

یہ مکمل الفاظ راقم کو کہیں نظر نہیں آئے۔ اگر کسی مہربان کی نظر سے یہ مکمل حدیث گزری ہو تو مجھے ضرور مطلع کرے۔ البتہ راقم یوں پڑھ لیتا ہے۔

" النکاح من سنۃ رسول اللہ ﷺ قال رسول اللہ ﷺ فمن رغب عن سنتی فلیس منی "

☆ " وقدروی ان عثمان بن مظعون بایع فی عشرۃ من اصحاب رسول اللہ ﷺ فعزموا ان یلبسوا المسوح وان یھیموا فی الصحراء ولایأ ووا البیوت ولا یاکلوا اللحم ولا یغشوا النساء فبلغ ذلک النبی ﷺ فجاء الی دار عثمان بن مظعون فلم یجدہ فقال لا مرأتہ ما حدیث بلغنی عن عثمان ؟ وکرھت ان تفشی سر زوجھا وان تکذیب رسول اللہ ﷺ فقالت یا رسول اللہ ان کان قد بلغک شئی فھو کما بلغک فقال قولی لعثمان اخلاف لسنتی ام علی غیر ملتی انی اصلی وانام واصوم وافطر واغشی النساء وآوی البیوت وآکل اللحم فمن رغب عن سنتی فلیس منی ، فرجع عثمان واصحابہ عما کانوا علیہ "

روایت کیا گیا ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے دس صحابہ کرام کے ساتھ مل کر ایک معاہدہ کیا اور سب نے پختہ ارادہ کیا کہ وہ پھٹے پرانے کپڑے پہنیں گے۔ اور جنگل میں پھریں گے (یعنی جنگل میں ہی رہیں گے) گھروں میں کبھی نہیں رہیں گے ، اور گوشت نہیں کھائیں گے ، اور عورتوں سے جماع نہیں کریں گے۔ نبی کریم ﷺ کو جب یہ خبر ملی تو آپ حضرت عثمان بن مظعون کے گھر تشریف لائے وہ گھر موجود نہیں تھے۔ آپ نے ان کی عورت سے پوچھا ، وہ کیا بات ہے جو مجھے عثمان کی جانب سے پہنچی ہے ؟ تو اس عورت نے ناپسند سمجھا کہ وہ اپنے خاوند کا راز افشاء (ظاہر) کرے۔ اور یہ بھی ناپسند کیا کہ وہ نبی کریم ﷺ سے جھوٹا کلام کرے (اس نے نہایت حکمت بھرا جواب دیا) اس نے کہا

یارسول اللہ اگر آپ تک ان کی کوئی بات پہنچی ہے تو اسی طرح ہوگی جس طرح آپ تک پہنچی ہے۔

آپ نے فرمایا عثمان کو کہہ دینا کیا تم میری سنت کا خلاف کر رہے ہو۔ یا میرے دین کو چھوڑ رہے ہو۔ بیشک میں نماز پڑھتا ہوں اور سوتا ہوں، اور روزہ رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، اور اپنی ازواج سے تعلق ازدواجی بھی رکھتا ہوں۔ اور گھروں میں رہتا ہوں اور گوشت بھی کھاتا ہوں۔ جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں (یعنی اس کا میرے ساتھ تعلق نہیں)۔ حضرت عثمان اور ان کے ساتھ مل کر معاہدہ کرنے والوں نے نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی کے بعد اپنے اپنے ارادہ سے رجوع کر لیا۔

(قرطبی)

دوسرا جواب: اپنے آپ کو قتل کرنے سے منع کرنے کا یہ مطلب ہے:

"المراد لا یقتل بعضکم بعضا وجعل غیر الرجل نفسه اذا اتصل به نسبا ودینا"

مراد اس سے یہ ہے کہ تم میں سے کوئی ایک دوسرے کو قتل نہ کرے۔ جب کوئی شخص نسبی یا دینی لحاظ سے تعلق رکھنے والا ہو، اسے قتل کرنا اپنے آپ کو ہی قتل کرنا ہے۔

جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ بچھڑے کی پوجا کے بعد بنی اسرائیل کو توبہ کا حکم دیا گیا۔ وہاں بھی رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ فَاقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ ﴾ "تم ایک دوسرے کو قتل کرو"۔ (از کبیر)

"وذلک ان اهل الملة الواحدة بمنزلة النفس الواحدة"

ایک ہی دین پر چلنے والے لوگ تمام ایک ہی نفس شمار ہوتے ہیں کسی کو نقصان پہنچانا اپنے آپ کو نقصان پہنچانا ہے۔

☆ "کما قال علیه الصلوة والسلام مثل المؤمنین فی توادهم وتراحمهم وتواصلهم بمنزلة الجسد الواحد اذا اشتکی منه عضو تداعی له سائر الجسد بالحمی والسهر"

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی اس پر دلالت کر رہا ہے مومن لوگ ایک دوسرے کے ساتھ محبت کرنے اور ایک دوسرے پر رحم کرنے اور ایک دوسرے سے تعلق جوڑنے کے لحاظ پر ایسے ہی ہیں، جس طرح ایک

جسم ہوتا ہے جب ایک عضو کو تکلیف ہو تو تمام جسم کو بخار ہوتا ہے اور تمام جسم بے قرار ہوتا ہے۔ (ابن کثیر)

تیسرا جواب: " انه اذا قتل غیره فکانما قتل نفسه لانه یقتص منه "

یعنی مراد یہ ہے کہ تم دوسروں کو نہ قتل کرو کیونکہ تمہارا دوسروں کو قتل کرنا اپنے آپ کو قتل کرنا لازم آئے گا۔ اس لئے کہ تمہیں قصاص کے طور پر قتل کر دیا جائے گا۔

چوتھا جواب: لا تتعرضوا لمقاتلة من یقتلکم فتکونوا قد قتلتم انفسکم "

تم ایسے لوگوں کے ساتھ قتال کے در پے نہ ہو کہ وہ تمہیں قتل کر دیں۔ اس طرح گویا کہ تم نے خود ہی اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالا حالانکہ تمہیں منع بھی کیا گیا تھا کہ تم اپنے ہی بھائیوں کو نہ قتل کرو، لیکن تم ان کے ساتھ قتال میں مشغول ہو کر اپنے ہی بعض آدمیوں کے ہلاکت کا سبب بنتے ہو۔

پانچواں جواب: " لا تسفکون دماء کم من قوامکم فی مصالح الدنیا بهم فتکونون مهلکین لانفسکم "

تم صرف دنیاوی مقاصد کے لئے اپنے خون نہ بہاؤ، اس میں تو صرف اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ یعنی مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے کافروں کو قتل کرنا اور اپنی جانوں کو قربان کرنا تو ثواب کا ذریعہ ہے لیکن صرف دنیاوی مقاصد کے لئے قتال میں شریک ہونا سوائے اپنے آپ کو ہلاک کرنے کے اور کچھ بھی نہیں۔ (از کبیر)

﴿ وَلَا تُخۡرِجُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ مِّنۡ دِيَارِكُمۡ ﴾: "اور نہ نکالنا اپنوں کو اپنی بستیوں سے"

اس میں دو احتمال پائے گئے ہیں ایک یہ " لا تفعلوا ما تستحقون بسببه ان تخرجوا من دیارکم " تم ایسا کوئی کام نہ کرو جس کی وجہ سے تمہیں تمہاری بستیوں سے ہی نکال دیا جائے۔

دوسرا احتمال یہ ہے:

" المراد لانهی عن اخراج بعضهم بعضا من دیارهم لان ذلک یعظم فیه المحنة والشدة حتی یقرب من الهلاک "

کہ روکنے کا مطلب یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو ان کے گھروں سے نہ نکالو
اس میں تمہارے لئے عظیم محنت اور شدت پائی جائی گی یہاں تک کہ ہلاکت کے
قریب پہنچ جاؤ گے۔ (از کبیر)

تنبیہ: ﴿ لَا تَسۡفِكُوۡنَ دِمَآءَكُمۡ وَلَا تُخۡرِجُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ مِّنۡ دِيَارِكُمۡ ﴾ میں جتنے احتمالات ذکر کیے گئے ہیں وہ تمام کے تمام ہی مراد ہیں یعنی مختصر الفاظ مبارکہ کثیر معانی پر مشتمل ہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ یوں کہا جائے یا یہ مطلب ہے یا یہ مطلب ہے۔ نہیں اس طرح نہیں بلکہ تمام معانی مجتمع ہیں ان کے اجتماع میں کوئی تعارض نہیں پایا گیا۔

﴿ ثُمَّ اَقۡرَرۡتُمۡ ﴾: "ای ثم اقررتم بالمیثاق واعترفتم علی انفسکم بلزومه"
یعنی پھر تم نے میثاق کا اقرار کرلیا اور اپنے نفسوں پر اس کا لازم ہونے کا اعتراف کرلیا۔ (کبیر)

﴿ وَاَنۡتُمۡ تَشۡهَدُوۡنَ ﴾: حال مؤکدہ یعنی جملہ حالیہ ہے اور حال مؤکدہ ہے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا۔ پھر تم نے میثاق کا اقرار کرلیا۔ ایسے حال میں کہ تم گواہ تھے۔
(روح المعانی)

☆☆☆☆☆

﴿ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾ (آیت ۸۵)

۱) ''پھر یہ جو تم ہو اپنوں کو قتل کرنے لگے، اور اپنے میں سے ایک گروہ کو ان کے وطن سے نکالتے ہو۔ ان پر مدد دیتے ہو (ان کے مخالف کو) گناہ اور زیادتی میں، اگر وہ قیدی ہو کر تمہارے پاس آئیں تو بدلا دے کر چھڑا لیتے ہو، اور ان کا نکالنا تم پر حرام ہے، تو کیا خدا کے کچھ حکموں پر ایمان لاتے ہو، اور کچھ سے انکار کرتے ہو۔ تو جو تم میں سے ایسا کرے تو اس کا بدلہ کیا ہے مگر یہ کہ دنیا میں رسوا ہو اور قیامت میں سخت تر عذاب کی طرف پھیرے جائیں گے اور اللہ تمہارے کوتکوں سے بے خبر نہیں''۔

۲) ''پھر تم یہ ہو کہ قتل کرتے ہو اپنوں کو، اور نکالتے ہو تم اپنے ایک فریق کو ان کے گھروں سے امداد کرتے ہو ان کے خلاف گناہ اور ظلم سے، اور اگر آئیں تمہارے پاس قیدی ہو کر تم ان کا فدیہ دیتے ہو، حالانکہ حرام تھا تم پر ان کا نکالنا، کیا تم ایمان رکھتے ہو بعض کتاب سے اور کفر کرتے ہو بعض سے، تو نہیں جزاء جو شخص کرے یہ، تم میں سے، سوائے رسوائی کے دنیا کی زندگی میں۔ اور قیامت کے دن پھیریں جائیں گے سخت عذاب کی طرف اور نہیں اللہ غافل اس سے جو تم عمل کرتے ہو''۔

توراۃ میں اللہ تعالیٰ نے یہود کو ارشاد فرمایا تم آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کرنا۔ اور تم ایک دوسرے پر ظلم کر کے ان کو ان کے گھروں اور بستیوں سے نہ نکالنا۔ اور اپنے ہی یہود کے خلاف کسی

دوسرے کی امداد نہ کرنا۔ اور اگر تمہارے یہود کسی کے قیدی ہو جائیں تو فدیہ دے کر ان کو چھڑا لینا۔ یہود نے رب تعالیٰ کے تین احکام کو پشت ڈال دیا، ان سے روگردانی کی۔

ایک دوسرے کو اپنے حلیفوں سے مل کر قتل بھی کرتے۔ اور ظلم کر کے ان کو گھروں سے نکال بھی دیتے۔ اپنے ہی یہود کے خلاف اپنے حلیفوں کی امداد کرتے۔ البتہ ایک کام کرتے کہ یہود میں سے کوئی قیدی ہو جاتا تو یہ فدیہ دے کر اسے چھڑا لیتے تھے۔

جب ان سے پوچھا جاتا تم ایسا کیوں کرتے ہو تو یہ کہتے کہ ہمیں توراۃ میں یہ حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ احکام تو دوسرے بھی توراۃ میں ہیں لیکن تم ان پر عمل نہیں کرتے، اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ تم بعض کتاب پر ایمان رکھتے ہو اور بعض کا انکار، تمہارا یہ فعل دنیا میں رسوائی کا سبب ہے اور قیامت کے دن تمہیں سخت عذاب کی طرف لوٹایا جائے گا۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ اللہ تعالیٰ تمہارا عملوں سے بے خبر ہے وہ کسی طرح بھی تمہارے عملوں سے غافل نہیں۔ (از خازن)

﴿ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰۤؤُلَاۤءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ ﴾: ''پھر تم یہ قتل کرتے ہو اپنوں کو'' تم تراخی کے لئے آتا ہے۔ ﴿ هٰۤؤُلَاۤءِ ﴾ کا اشارہ ذات کی طرف ہوتا ہے۔ ان کا وعدہ سے پھر جانا اگرچہ اس سے ان کی صفت بدلی لیکن اسے ذات کے بدلنے سے تعبیر فرمادیا۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے وعدہ کرنے کے بعد پھر جانے کو اس طرح ذکر فرمایا کہ تم تو یہ ہو جنھوں نے وعدہ کیا تھا کہ ہم اپنوں کا خون نہیں بہائیں گے اور اپنوں کو گھروں سے نہیں نکالیں گے اور اپنوں کے خلاف دوسروں کی امداد نہیں کریں گے جب تم وعدہ سے پھر گئے تو گویا کہ تم وہ رہے ہی نہیں جو وعدہ کرتے وقت تھے۔ (از بیضاوی)

خیال رہے ﴿ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ ﴾ میں وہ تمام احتمال پائے جاتی ہیں جو ﴿ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَاۤءَكُمْ ﴾ میں ذکر کئے گئے ہیں۔

اعتراض : انتم حاضرین کے لئے اور ﴿ هٰۤؤُلَاۤءِ ﴾ غائبین کے لئے ہے ایک ہی جملہ میں مخاطبین اور غائبین کا اجتماع کیسے صحیح ہے؟

جواب : ﴿ هٰۤؤُلَاۤءِ ﴾ سے ﴿ اَنْتُمْ ﴾ کی تاکید کی گئی اور خبر ﴿ تَقْتُلُوْنَ ﴾ ہے یہ جواب

زیادہ قوی ہے تاہم اس کے اور جواب بھی دیئے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ تقدیر عبارت کی اس طرح ہو ﴿ ثُمَّ اَنْتُمْ یا هٰؤُلَاءِ ﴾ اے لوگو پھر تم یہ ہو۔ اس طرح دونوں لفظ خطاب کے لئے ہو گئے۔ ان جوابات میں سے ایک اور جواب یہ ہے کہ تقدیر عبارت کی یہ ہے " ثم انتم اعنی هؤلاء الحاضرين " پھر تم میری مراد یہ حاضرین ہیں۔ ان جوابات میں سے ایک یہ بھی ہے " انه بمعنى الذين وصلته " کہ ﴿ هٰؤُلَاءِ ﴾ ﴿ اَلَّذِيْنَ ﴾ کے معنی میں ہو یعنی اشارہ موصول کے معنی میں استعمال ہو۔ اور اس کا صلہ ﴿ تَقْتُلُوْنَ ﴾ ہو۔

خیال رہے کہ اگرچہ آخری تین جوابات کو علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ضعیف قرار دیا ہے لیکن راقم کے قول کو اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے تائید حاصل ہوگئی کہ صرف ایک ہی کتاب کو ذہن میں نہ بٹھایا جائے، کیونکہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ﴿ هٰؤُلَاءِ ﴾ کو موصول کے معنی میں لینا کوفی نحویوں کا ضعیف مذہب قرار دیا ہے لیکن اعلیٰ حضرت نے اسے ضعیف نہیں تسلیم کیا اسی لئے ترجمہ موصول والا کیا ہے "پھر یہ جو تم ہو"۔

﴿ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ﴾ :

"اور تم نکالتے ہو اپنے ہی ایک فریق کو ان کے گھروں سے"

یعنی تم اپنے حلیفوں سے مل کر اپنے ہی خاندان کے یہودیوں کو گھروں سے نکال دیتے ہو۔

نکتہ: پہلی آیۃ میں ذکر کیا گیا ﴿ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ﴾ اور اس آیۃ میں ذکر کیا گیا ﴿ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ﴾ چونکہ پہلی آیۃ میں ﴿ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ ﴾ ذکر فرمایا جس سے یہ مسئلہ بیان کیا گیا کہ تم اپنے ہی رشتہ داروں کو جو ان کے گھروں سے نکالتے ہو وہ درحقیقت تم اپنے آپ کو ہی نکال رہے ہو، کیونکہ اپنے خاندانی اور اپنے دینی بھائیوں کو تکلیف دینا اپنے آپ کو تکلیف دینا ہے۔ اس کے بعد ﴿ مِنْ دِيَارِكُمْ ﴾ ذکر کیا۔ جس کا معنی "اپنے گھروں سے" اب مکمل مطلب یہ ہو گیا۔ تم اپنے آپ کو اپنے گھروں سے نہ نکالو اگرچہ مراد یہ ہے کہ تم اپنے بھائیوں کو ان کے گھروں سے نہ نکالو۔

دوسری آیۃ میں چونکہ ﴿ فَرِيْقَ ﴾ ذکر کیا ہے جو اسم ظاہر ہے درجہ غائب میں ہے تو اس لئے

﴿ مِنْ دِيَارِهِمْ ﴾ میں بھی ضمیر غائب کی ذکر کردی گئی، کہ تم اپنے ہی ایک فریق کو ان کے گھروں سے نکالتے ہو۔ (ماخوذ از روح المعانی)

﴿ تَظَاهَرُونَ عَلَيْهِمْ بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ﴾:

''تم امداد کرتے ہو ان کے خلاف گناہ اور ظلم سے''

﴿ تَظَاهَرُونَ ﴾ کا معنی ہے '' نتعاونون '' تم امداد کرتے ہو۔ یہ لفظ '' ظهر '' سے لیا ہوا ہے جس کا معنی ''پیٹھ'' چونکہ کسی کی امداد کرنے سے اس کی پشت پناہی ہوتی ہے اس لئے ﴿ تَظَاهَرُونَ ﴾ کا معنی ہوا تعاون کرنا۔

﴿ عَلَيْهِمْ ﴾ لفظ '' علی '' سے بعض اوقات ضرر کا معنی لیا جاتا ہے اس لئے یہاں مطلب ہو گیا ان کے خلاف یعنی تم اپنے خاندانی اور مذہبی بھائیوں کے خلاف اپنے حلیفوں کی امداد کرتے ہو۔ (از قرطبی)

﴿ بِالْإِثْمِ ﴾ اس کے معانی یہ ہیں '' الاثم الفعل الذی یستحق علیه صاحبه الذم واللوم '' وہ فعل جس کی وجہ سے فاعل (کام کرنے والے) کی مذمت کی جائے اور اسے ملامت کا مستحق سمجھا جائے اسے '' اثم '' کہا جاتا ہے۔

'' وقیل ما تنفر منه النفس ولا یطمئن الیه القلب ''

اور جس کام سے نفس نفرت کرے اور دل اس سے مطمئن نہ ہو اسے ''اثم'' کہا جاتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے '' الاثم ما حاک فی صدرک '' جو تمہارے دل میں کھٹکے (جس کے کرنے سے ملامت کا خطرہ ہو) وہ اثم ہے۔ شراب کو بھی اثم کہا جاتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

شربت الاثم حتی ضل عقلی کذلک الاثم تذهب بالعقول

میں نے شراب پیا جس سے میری عقل زائل ہوگئی اسی طرح گناہوں سے بھی عقل زائل ہوتی ہے

﴿ وَالْعُدْوَانِ ﴾ تجاوز الحد فی الظلم '' ظلم میں حد سے تجاوز کرنا ''عدوان'' کہلاتا ہے۔ (از روح المعانی)

تنبیہ: '' الآية تدل علی ان الظلم کما هو محرم فکذا اعانة الظالم علی ظلمة محرمة '' (کبیر)

اس آیۃ کریمہ سے یہ واضح ہوا کہ جس طرح ظلم کرنا حرام ہے اسی طرح ظالموں کی امداد کرنا بھی حرام ہے۔ واضح ہوا کہ مسلمانوں کے خلاف یہود ونصاری کی امداد کرنا حرام ہے۔

اعتراض : اللہ تعالیٰ ظالم کو ظلم کی قدرت عطا فرماتا ہے اور ہر قسم کی رکاوٹ اور موانع کو زائل کرتا ہے۔ اور اس پر خواہشات کو مسلط کر دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ ظلم کرتا ہے۔

" فلو کانت اعانة الظالم علی ظلمه قبیحة لوجب ان لا یوجد ذلک من الله تعالیٰ "

اگر ظالم کی ظلم پر معاونت برا کام ہوتا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظالم کی معاونت نہ پائی جاتی۔

جواب : " انه وان مکن الظالم من ذلک فقد زجره عن الظلم بالتهدید و الزجر "

اللہ تعالیٰ نے بیشک انسان کو قدرت دے رکھی ہے اسے مختار بنایا ہے چاہے تو وہ اپنے اختیار سے ظلم ہی کیوں نہ کرتا رہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ظلم پر اپنی گرفت اور عذاب کا ذکر بھی کیا ہے تو واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظلم پر معاونت نہیں پائی جاتی۔ کسی کو مختار بنانا اور کام کی قدرت دینا اور چیز ہے، اور کسی کی معاونت کرنا اور چیز ہے معاونت میں خوشی اور رغبت پائی جاتی ہے۔

" بخلاف المعین للظالم علی ظلمه فانه یرغبه فیه ویحسنه فی عینه ویدعوه الیه فظهر الفرق "

ظالم کے ظلم پر معاونت کرنے والا اس کے ظلم کو پسند کرتا ہے۔ اور اس کی آنکھ میں اسکا ظلم حسین نظر آتا ہے اور وہ اسے ظلم کرنے کی دعوت دیتا ہے کہ تم ظلم کو جاری رکھو۔

اب بہت واضح طور پر فرق کا پتہ چل گیا کہ معاونت کیا ہے اور قدرت واختیار دینا کیا ہے۔ (از کبیر)

تنبیہ : اگر چہ ظلم کرنا بھی حرام ہے اور ظلم کی معاونت بھی حرام ہے لیکن ظلم کرنا عظیم جرم ہے اور ظلم کی معاونت اس سے کچھ کم ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کو ظلم کرنے پر آمادہ کرتا رہے اور اسے امداد کرنے کی پیشکش کرے لیکن وہ ظلم نہ کرے تو اس کی معاونت کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ لیکن ظلم کرنے والا کبھی بغیر کسی معاونت کے ظلم کر لیتا ہے۔

تو اسی سے واضح ہو گیا کہ ظلم بنسبت معاونت ظلم کے عظیم جرم ہے۔ اگرچہ دونوں فعل ہی حرام ہیں۔
(از کبیر)

اللہ تعالیٰ ظالموں کے ظلم سے بچائے اے مولائے کائنات ظلم اور ظلم کی معاونت سے دور رکھ۔

﴿ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ ﴾:

''اور اگر وہ تمہارے پاس قیدی ہو کر آئیں تو تم ان کا فدیہ دے دیتے ہو''۔

یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کرتے کہ یہود اپنے دوسرے یہود بھائیوں کو فدیہ دے کر قید سے چھڑا لیتے ''اساری'' جمع ہے اسیر کی۔ اسیر کا لفظ ماخوذ ہے '' اسارۃ '' (بکسر الھمزۃ) سے '' اسارۃ '' اس رسی کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعے اونٹ کی پیٹھ پر پالان باندھتے ہیں۔

چونکہ اس زمانہ میں قیدی کو بھی رسی سے باندھا جاتا تھا اس لئے اسے اسیر کہہ لیا جاتا تھا، بعد میں مطلقاً محبوس کو اسیر کہا جانے لگا خواہ اسے رسی سے باندھا گیا ہو یا نہ باندھا گیا ہو۔ (از شیخ زادہ)

فائدہ : اسی آیۃ سے ایک اور فائدہ بھی حاصل ہو گیا:

'' وقیل معناه ان یاتوکم اساری فی ایدی الشیاطین تتصدون لا نقاذھم بالارشاد والوعظ مع تضییعکم کقوله تعالیٰ اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم ''

کہ ان کے ایک اور طریقہ کی مذمت کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ اگر ان کے پاس شیطانوں کے ہاتھوں میں کوئی قیدی بن کر آتے یعنی گناہوں میں مبتلاء ہوتے تو یہود کے علماء ان کو وعظ ونصیحت کرتے اور ان کی رہنمائی کرتے لیکن خود اس پر عمل نہیں کرتے تھے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا (ترجمہ) ''کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنی جانوں کو بھولتے ہو''۔ (بیضاوی)

حضرت عبداللہ بن سلام کا قول:

عبد خیر سے مروی ہے کہ ہم نے سلمان بن ربیعہ باہلی کی معیت میں ایک شہر کا محاصرہ کیا ہم نے اس شہر کو فتح کر لیا اور وہاں کے کئی لوگوں کو قید کر لیا۔

حضرت عبداللہ بن سلام نے ایک یہودیہ کو سات سو درہم سے خرید لیا، جب آپ جالوت کی قوم کے ایک سردار کے قریب سے گزرے اس کے پاس سواری سے اتر کر اسے کہا کیا تم اپنے دین پر قائم رہنے والی اس عورت کو خریدنا چاہتے ہو؟ اس نے کہا ہاں میں خرید لیتا ہوں۔ آپ نے اسے بتایا کہ میں نے سات سو درہم سے خریدا ہے اس نے کہا تم مجھ سے سات سو درہم مزید نفع لے لو۔ آپ نے فرمایا میں نے قسم اٹھا رکھی ہے کہ چار ہزار درھم سے کم پر نہیں بیچنا۔ اس نے کہا میں اس قیمت پر نہیں خریدتا۔ آپ نے فرمایا تم ضرور خریدو گے یا اپنے دین کا انکار کرو گے۔

آپ نے اسے کہا ذرا میرے قریب ہو جاؤ، وہ قریب ہوا آپ نے اس کے کان میں کہا تورات میں یہ ہے:

" انک لا تجد مملوک من بنی اسرائیل الا اشتریته فاعتقته وان یاتوکم اساری تفادوهم وهو محرم علیکم اخراجهم "

بیشک تم بنی اسرائیل سے کوئی مملوک نہ پاؤ مگر یہ کہ اسے خرید کر آزاد کر دو اگر تمہارے پاس قیدی آئیں تو ان کا فدیہ دو اور تم پر حرام ہے کہ اپنے ہی یہودیوں کو ان کے گھروں سے نکالو۔

اس نے کہا کیا تم عبداللہ بن سلام ہو؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ وہ چار ہزار درھم لے آیا۔ لیکن آپ نے اس سے دو ہزار درھم لئے اور دو ہزار واپس کر دیئے۔ (ابن کثیر)

☆ " اخبرنا ابو العالیة ان عبد الله بن سلام مر علی رأس الجالوت بالکوفة وهو یفادی من النساء من لم یقع علیه العرب ولا یفادی من وقع علیه العرب فقال عبد الله اما انه مکتوب عندک فی کتابک ان تفادیهن کلهن " (ابن کثیر)

ابوالعالیہ نے بیان کیا بیشک عبداللہ بن سلام جالوت قوم کے ایک سردار کے قریب سے کوفہ میں گزرے وہ ان عورتوں کا فدیہ دے کر چھڑاتا جن سے عرب لوگوں نے جماع نہ کیا ہوتا اور جن سے انہوں نے جماع کر لیا ہوتا ان کا فدیہ نہیں دیتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے فرمایا تمہاری کتاب میں یہ ہے کہ تمام کا فدیہ دے کر ان چھڑاؤ۔

قیدیوں کو چھڑانے کا حکم شریعت مصطفوی میں:

"عن الحکم عن جده ان رسول الله ﷺ کتب کتابا بین المهاجرین والانصار ان یعقلوا معاقلهم ویفدوا عانیهم بالمعروف والاصلاح بین المسلیمن"

حکم اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان ایک معاہدہ تحریر فرمایا کہ ایک دوسرے کی دیت ادا کرنا، اور قیدیوں کو اچھی طرح قانون کے مطابق فدیہ دے کر چھڑانا اور مسلمانوں کے درمیان اصلاح کرنا۔

☆ "عن ابی موسی الاشعری قال قال رسول الله ﷺ اطعموا الطعام وافشوا السلام وعودوا المریض وفکوا العانی"

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا طعام کھلاؤ، سلام عام کرو، مریض کی عیادت کرو، اور قیدیوں کو چھڑاؤ۔

"فهذان الخبران یدلان علی فکاک الاسیر لان العانی هو الاسیر"

یہ دونوں حدیثیں قیدیوں کو چھڑانے پر دلالت کرتی ہیں احادیث میں جو لفظ "العانی" استعمال ہوا ہے اس کا معنی قیدی ہے۔

☆ "وقدروی عمران بن حصین وسلمة بن الاکوع ان النبی علیه السلام فدی اساری من المسلمین بالمشرکین"

حضرت عمران بن حصین اور سلمۃ اکوع رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے مسلمان قیدیوں کا فدیہ مشرک قیدی دیئے۔

واضح ہوا کہ قیدیوں کا بدلہ قیدی دے کر اپنے قیدی چھڑانا بھی شریعت مصطفوی کا قانون ہے۔

☆ "سئل الحسین بن علی علیهما السلام علی من فدی الاسیر قال علی الارض التی یقاتل عنها"

بشر بن غالب کہتے ہیں حضرت امام حسین بن علی رضی اللہ عنہما سے سوال کیا گیا کہ قیدی کا فدیہ کون ادا کرے؟ تو آپ نے فرمایا جن لوگوں سے مل کر اس نے قتال کیا ہے وہی فدیہ بھی ادا کریں۔ یعنی

جس زمین اور شہر کے دفاع کے لئے وہ جنگ میں شریک ہونے کی وجہ سے قیدی ہوا ہے ان لوگوں پر ہی فدیہ لازم ہے۔ (احکام القرآن لجصاص)

یادرفتگان: جصاص کا حوالہ تحریر کرنے پر اپنے مہربان، مخلص دوست مولنا ابو الفضل اللہ دتہ سیالوی رحمہ اللہ آف بھابڑا ضلع سرگودھا کی یاد آئی۔ جنھوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام علالت میں مجھے جصاص کا مطالعہ کرنے کا مشورہ دیا۔ جب آپ کمپلیس اسلام آباد میں زیر علاج تھے۔ چند ہی روز کے بعد آپ کا وصال ہو گیا اللہ تعالیٰ آپ کی قبر کو کشادہ فرمائے جنت الفردوس عطا فرمائے۔

(آمین ثم آمین)

﴿ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ﴾ اس جملہ کا تعلق ماقبل جملہ ﴿وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْ دِيَارِهِمْ﴾ سے ہے۔ اور درمیان میں جملہ معترضہ ہے اب معنی یوں ہو گیا ''اور نکالتے ہو تم اپنے ایک فریق کو ان کو بستیوں سے حالانکہ ان کا نکالنا تم پر حرام قرار دیا گیا۔

دینی طلباء کرام کے لئے: ھو ضمیر کا مرجع " اخراج " ہے جس پر ﴿ وَتُخْرِجُوْنَ ﴾ دلالت کر رہا ہے۔ اور بعد میں آنے والا ﴿ اِخْرَاجُهُمْ ﴾ تاکید ہے ضمیر کے مرجع کی۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ " ھو "اور آنے والا جملہ اس کی تفسیر بیان کر رہا ہے۔

تیسرا احتمال یہ کہ " ھو " ضمیر مبھم ہو اور آنے والا جملہ اس کی تفسیر ہو۔

ضمیر شان اور ضمیر مبھم میں فرق: اگرچہ دونوں ہی اس کی محتاج ہوتی ہیں کہ آنے والا جملہ ان کی تفسیر بیان کرے، لیکن ان میں فرق یہ ہے۔ کہ ضمیر شان میں مسؤل عنہ (جس کے متعلق سوال ہو) کا اجمالی طور پر لحاظ کیا جاتا ہے۔ پھر آنے والے جملہ سے اس کے تعین کو بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی شان یہ ہے جس کے متعلق سوال کیا گیا ہے۔

یعنی پہلا جملہ ذکر کیا گیا ﴿ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ﴾ ''نکالتے ہو تم اپنے ایک فریق کو ان کے گھروں سے'' تو ضمناً سوال ہوا کہ ان کو گھروں سے نکالنے کا حکم کیا ہے؟ تو جواب دیا گیا کہ ہاں اس کی شان یہ ہے یعنی ہاں اس کا حکم یہ ہے ''کہ تم پر ان کا نکالنا حرام کیا گیا''۔

ضمیر مبہم میں ضمناً سوال نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی کسی چیز کی تعیین ہوتی ہے۔ بلکہ بیان کرنے والا خود ہی ابھام کو دور کرنے کے لئے ایک جملہ ذکر کر دیتا ہے جس میں تفسیر پائی جاتی ہے۔

(از بیضاوی و شیخ زادہ)

﴿ اَفَتُؤمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ﴾:

''کیا تم ایمان لاتے ہو بعض کتاب پر اور انکار کرتے ہو بعض کا''۔

یعنی توراۃ میں تمہیں قیدیوں کا فدیہ دے کر چھڑانے کا جو حکم دیا گیا ہے اس پر تو تم عمل کرتے ہو گویا کہ اس پر تمہارا ایمان ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے لیکن اسی کتاب میں رب تعالیٰ نے تمہیں یہ حکم بھی دیا ہے کہ اپنے ہی نسبی اور دینی بھائیوں کو قتل نہ کرو، ان کو گھروں سے نہ نکالو، اور ان کے خلاف دوسرے کافروں کی امداد نہ کرو۔ ان تمام احکام پر تمہارا عمل نہیں، گویا کہ تم نے ان احکام کو اللہ تعالیٰ کے احکام ہی تسلیم نہیں کیا۔

رب تعالیٰ کے اس ارشاد سے واضح ہو گیا:

- ''اگر بیک حکم کتاب خود نگردید کافر مطلق شدید''

اگر اللہ تعالیٰ کی کتاب کا ایک حکم بھی تسلیم نہ کیا تو مطلقاً کافر ہو جائے گا۔ (از عزیزی)

کیونکہ یہ مسئلہ بھی روز روشن کی طرح واضح ہے کہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں شخص آدھا کافر ہے اور فلاں چوتھائی حصہ کافر ہے یقیناً جب کافر ہو گا تو پکا اور مکمل کافر ہو گا۔

﴿ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾:

''جو شخص تم میں سے یہ کرے اس کی نہیں جزاء سوائے دنیا کی زندگی میں رسوائی کے''۔

﴿ خِزْيٌ ﴾ کا معنی ہے ذلت جس سے انسان کو حیاء محسوس ہو۔ اسی وجہ سے ﴿ خِزْيٌ ﴾ دونوں معنوں میں بیک وقت بھی استعمال ہوتا ہے اور علیحدہ علیحدہ بھی۔ تاہم ذلت کو حیاء لازم ہے۔

''یقال اخزاہ اللہ ای اذلہ ومقتہ وابعدہ''

جس طرح کہا جاتا ہے ''اخزاہ اللہ'' اللہ تعالیٰ اسے ذلیل کرے اور اس سے ناراض ہو اور

حالات سے تمام انبیاء کرام کو خبر دی گئی تھی۔ یہود نے نبی کریم ﷺ کی تکذیب کی۔ اور مصطفیٰ کریم ﷺ کی صفات کو چھپایا تو رب تعالیٰ نے ان کو لعنت کا مستحق قرار دیا۔

(از صابونی)

نکتہ: ﴿ خِزْیٌ ﴾ کو نکرہ ذکر کر کے اس طرف اشارہ کیا کہ رب تعالیٰ نے ان کو دنیا میں بہت زیادہ ذلت اور رسوائی عطا کی۔ (از روح المعانی)

﴿ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ ﴾:

''اور قیامت کے دن پھیریں جائیں گے سخت عذاب کی طرف''

" یردون ای یصیرون الیہ فلا یلزم کینونتھم قبل ذلک فی اشد العذاب "

بظاہر ایک وہم پیدا ہوتا تھا کہ ﴿ یُرَدُّوْنَ ﴾ کا معنی ہے ''لوٹایا جانا'' یہ اس وقت صادق آتا ہے۔ جب وہ پہلے بھی شدید عذاب میں ہوں اور قیامت کے دن پھر ان کو شدید عذاب کی طرف لوٹایا جائے۔ حالانکہ آیۃ کا یہ مفہوم نہیں۔ تو اس کے جواب کی طرف اشارہ ہے کہ ﴿ یُرَدُّوْنَ ﴾ کا یہاں معنی ''پھیرا جانا'' ہے۔

قیامت کا عذاب زیادہ شدید ہوگا کیونکہ دنیا کی رسوائی ختم ہونے والی ہے لیکن قیامت کا عذاب ختم ہونے والا نہیں، پھر قیامت میں بھی کافروں کو ان کے کفر کے مطابق مختلف درجوں کے عذاب دیئے جائیں گے اگرچہ وہ عذاب ہمیشہ رہنے کے لحاظ پر سب کے لئے برابر ہوگا۔ (از روح المعانی)

ایک غلط فہمی کا ازالہ: علامہ رازی رحمہ اللہ نے ایک سوال وجواب کو بیان فرمایا جس سے غلط فہمی ہوتی ہے لیکن غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ آپ نے درست تحریر فرمایا:

" ففیہ سوال وھو ان عذاب الدھریۃ الذین ینکرون الصانع یجب ان یکون اشد من عذاب الیھود فکیف قال فی حق الیھود ﴿ یُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ ﴾ والجواب المراد منہ انہ اشد من الخزی الحاصل فی الدنیا فلفظ الاشد وان کان مطلقا الا ان المراد اشد من ھذہ الجھۃ " (کبیر)

اس میں سوال یہ ہوتا ہے کہ دھریہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کا ہی انکار کرتے ہیں کوئی خالق، محی

اسے (اپنی رحمت سے) دور کرے۔ (ماضی کے مطابق خبر والا معنی بھی کیا جا سکتا ہے)۔اور کبھی "اخزاه الله" کا معنی اس طرح کرلیا جاتا ہے " اوقعة موقعا یستحی منه "اللہ تعالیٰ اسے ایسی جگہ پر واقع کرے جس سے اسے حیاء آئے۔

دنیا میں ان کی ذلت ایسے کو تیسا: دنیا میں ان کو فضیحت (رسوائی) اور سزا دے کر اور جزیہ مقرر کر کے اور ان کے دشمنوں کو ان کے خلاف غلبہ عطاء کر کے ذلیل کیا گیا تاہم بنی قریظہ اور بنی نضیر کو اسی طرح کی سزا دے کر رسوا کیا گیا جیسا کہ وہ خود کرتے تھے۔

" وقدروی عن ابن عباس رضی الله عنهما انه قال کان عادة بنی قریظة القتل وعادة بنی النضیر الاخراج فلما غلب رسول الله ﷺ اجلی بنی النضیر وقتل رجال قریظة واسر نساء هم واطفالهم "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بیشک بنی قریظہ کی عادت تھی کہ وہ دوسروں کو قتل کرتے تھے اور بنی نضیر کی عادت تھی کہ وہ دوسروں کو جلاوطن کرتے تھے جب نبی کریم ﷺ یہود پر غالب ہوئے تو آپ نے بنی نضیر کو جلاوطن کر دیا اور بنی قریظہ کے مردوں کو قتل کرا دیا۔اور ان کی عورتوں اور بچوں کو قید کرلیا۔ (از روح المعانی)

یہود کی اور رسوائی: یہود یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ جو کچھ توراۃ میں ہے وہ حق ہے لیکن جاننے، پہچاننے اور اس کے صحیح ہونے کی شہادت دینے کے باوجود اس کی مخالفت کرتے تھے " فلهذا لایؤتمنون علی ما فیها ولا علی نقلها" وہ اللہ کی کتاب میں جو کچھ مذکور تھا اس کی مخالفت کر کے امانت میں خیانت کے مرتکب ہوئے۔اور اسی طرح اس کے مسائل جو دوسروں پر بیان کرتے تھے ان میں بھی حق بیان نہیں کرتے تھے، لہٰذا کتاب میں خلل واقع کرنے کی وجہ سے گویا کہ امانت میں خیانت کے مرتکب ہو رہے تھے۔

" ولا یصدقون فیما کتموه من صفة رسول الله ﷺ ونعته ومبعثه ومخرجه ومهاجره وغیر ذلک من شؤنه التی اخبرت بها الانبیاء قبله علیهم الصلوة والسلام والیهود علیهم لعائن الله یتکاتمونه بینهم "

نبی کریم ﷺ کی صفات اور آپ کی بعثت (اعلان نبوت) آپ کا مکہ سے نکلنا یعنی ہجرت کرنا اور آپ کے حالات جو توراۃ میں مذکور تھے یہود نے ان کو چھپایا۔ حالانکہ ان تمام

اور میت نہیں مانتے ان کا عذاب یہود سے شدید ہوگا تو یہود کے متعلق ﴿ یُـرَدُّوْنَ الـی اَشَدِّ الْعَذَاب ﴾ کہنے کا کیا مطلب ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا میں ان کو جو رسوائی حاصل ہوئی ہے اس کی بنسبت قیامت کے دن ان کو عذاب اشد ہوگا مراد اشد اسم تفضیل سے یہی نسبت ہے اگر چہ ذکر مطلق ہے۔

علامہ رازی کے اس قول سے غلط فہمی اس لئے ہوئی کہ ایک تو ﴿ یُـــــــرَدُّوْنَ ﴾ کا معنی ﴿یُـصِـیْـرُوْنَ ﴾ پھیرا جانا ہے دوسرا یہ کہ جہنم میں مختلف درجات کے کفار کو عذاب ہوں گے۔ اس لئے اس سوال و جواب کی کوئی حیثیت ہی نہیں، لہٰذا اسے ذکر کرنے کی کوئی خاص وجہ نہیں۔

لیکن راقم کے نزدیک سوال حقیقت پر مبنی ہے کہ جب جہنم میں کفار کو عذاب مختلف درجات کے ہوں گے تو یہود کے عذاب کو دھریہ لوگوں کو عذاب سے اشد کہنا کیسے صحیح؟ اس کے جواب کی ضرورت تھی جو آپ نے ذکر فرمایا کہ یہاں یہود کے اپنے دنیا کے عذاب کی بنسبت اخروی عذاب کو اشد کہا گیا ہے۔

(واللہ اعلم بالصواب)

﴿ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾ : "اور نہیں اللہ تعالیٰ غافل اس سے جو تم عمل کرتے ہو"

" اعتراض وتذییل لتاکید الوعید المستفاد مما قبله ای انه بالمرصاد لا یغفل عما تعملون من القبائح "

یہ جملہ معترضہ ہے (ان کے نزدیک جو آخر میں جملہ معترضہ کے قائل ہیں) اور پہلے جملہ کے ساتھ ہی اسے بطور تاکید ذکر کیا کیونکہ پہلے جملہ سے ان کا وعید کا مستحق ہونا سمجھ میں آ رہا تھا اور اس جملہ میں بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں سب کچھ ہے وہ تمہارے برے اعمال سے غافل نہیں۔ (روح المعانی)

خیال رہے کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے (اور اللہ تمہارے کوتکوں سے بے خبر نہیں) برے اعمال کو آپ "کوتکوں" سے تعبیر فرماتے ہیں۔ لیکن ہمارے آج کل کے محاورہ میں "کوتکوں" کا استعمال نہیں۔ اس لئے راقم نے ترجمہ یہ لکھا "اور نہیں اللہ غافل اس سے جو تم عمل کرتے ہو۔

تنبیہ : راقم نے شروع شروع تو ترجمہ سلیس اردو میں آسان کرنے کی کوشش کی۔ لفظوں کے مطابق ترجمہ نہیں لیا۔ لیکن اب کوشش یہ کر رہا ہوں۔ کہ پہلے لفظ کا ترجمہ پہلے، دوسرے کا بعد میں ہو سوائے مرکب اضافی کے اس میں جب تک مضاف الیہ کا ترجمہ پہلے نہ ہو تو بات بنتی نہیں کوشش پھر بھی ہے کہ

ترجمہ آسان رہے لیکن لفظوں کی ترتیب کے مطابق ترجمہ سے سلیس اردو نہیں بنتی۔

فائدہ: علامہ رازی رحمہ اللہ نے اس جملہ میں ایک عجیب وسعت کا ذکر کیا۔

﴿ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾ تهديد شديد وزجر عظيم عن المعصية وبشارة عظيمة على الطاعة لان الغفلة اذا كانت ممتنعة عليه سبحانه مع انه اقدر القادرين وصلت الحقوق لا محالة الى مستحقيها"

اس جملہ میں معصیت سے شدید طور پر ڈرایا گیا ہے اور عظیم زجر کی گئی۔ اور طاعت میں بشارت عظیمہ بھی پائی گئی۔ اس لئے کہ جب یہ معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ غافل نہیں ہو سکتا اور یہ بھی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ عظیم قدرت کا مالک ہے تو یقیناً مستحقین کو اللہ تعالیٰ نے ان کے حقوق عطا فرمانے ہیں معصیت کا عمل کرنے والوں کو ان کے عمل کے مطابق اور طاعت کا عمل کرنے والوں کو ان کے عمل کے مطابق رب تعالیٰ جزاء دے گا۔ (از کبیر)

☆ " روى عن عمر ﷺ انه قال ان بنى اسرائيل قد مضوا وانتم تعنون بهذا يا امة محمد وبما يجرى مجراه "

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا بنی اسرائیل تو گزر چکے ہیں اب اے امت مصطفیٰ ﷺ اس آیۃ کریمہ سے تم عبرت حاصل کرو کہ اگر تم نے اللہ تعالیٰ کے احکام سے روگردانی کی تو تم رب تعالیٰ کی گرفت میں ہو گے کیونکہ رب تعالیٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں۔

(از روح المعانی)

☆☆☆

﴿ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَۃِ فَلَا یُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ وَلَا ھُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴾ (آیت ۸٦)

۱) ''یہ ہیں وہ لوگ جنھوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی مول لی تو ان پر سے عذاب ہلکا ہوگا اور نہ ان کی مدد کی جائے''

۲) ''یہ لوگ ہیں جنھوں نے حاصل کی دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے تو نہیں تخفیف کی جائے گی ان سے عذاب کی اور نہ ان کی مدد کی جائے گی''۔

﴿ اِشْتَرَاءَ ﴾ کا معنی خریدنا، یہاں مجازی معنی مراد ہے اختیار کرنا، تبدیل کرنا، پسند کرنا، حاصل کرنا وغیرہ۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کر کے آخرت کا اجر و ثواب حاصل کر سکتے تھے لیکن انہوں نے دنیا کی زندگی اور دنیاوی منافع کو ترجیح دے کر رب تعالیٰ کے احکام سے روگردانی کر لی:

﴿ فَلَا یُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابَ ﴾ ''تو نہیں تخفیف کی جائے ان سے عذاب کی''

عذاب کی تخفیف کبھی عذاب کو ختم کرنے سے کی جاتی ہے اور کبھی عذاب کو کل وقت یا بعض وقت میں کم کر کے تخفیف کی جاتی ہے۔ جب رب تعالیٰ نے فرمایا کہ ان سے عذاب میں تخفیف نہیں ہوگی، تو واضح ہوا کہ ان کا عذاب نہ ختم ہوگا، نہ کم ہوگا۔

﴿ وَلَا ھُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴾ ''اور ان کی امداد نہیں کی جائے گی'' یعنی دنیا میں ان سے رسوائی ختم کر کے ان کی امداد نہیں کی جائے گی اور ان سے دنیا میں جزیہ ختم کر کے ان کی امداد نہیں کی جائے گی۔ اور آخرت میں ان سے عذاب ختم کر کے ان کو امداد نہیں کی جائے گی۔ اور نہ ہی کوئی شخص ان کی طرف سے فدیہ لے کر ان کو اخروی عذاب سے چھڑا سکے گا۔ اور نہ ہی کوئی ان کو جبراً چھڑا سکے گا۔ طلباء کرام خصوصی طور پر یہ یاد رکھیں کہ یہاں '' ھم '' کو مقدم ''تقوی'' کے لئے کیا گیا ہے۔ حصر کے لئے مقدم نہیں ذکر کیا گیا۔ اس لئے ایسا نہیں کہا جا سکتا کہ یہ معنی کیا جائے کہ صرف یہود کی امداد نہیں کی جائے گی اور کافروں کی امداد کی جائے گی۔ نہیں نہیں ایسا نہیں بلکہ مطلب صرف اتنا ہے کہ یہود کی امداد نہیں کی جائے گی۔ (ماخوذ از کبیر، روح المعانی، وتفسیر ابی السعود)

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتَابَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ﴾ (آیت ۸۷)

۱) ''اور بیشک ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے۔ اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو کھلی نشانیاں عطاء کیں اور پاک روح سے اس کی مدد کی تو کیا تمہارے پاس کوئی رسول وہ لے کر آئے جو تمہارے نفس کی خواہش نہیں تکبر کرتے ہو تو ان (انبیاء) میں ایک گروہ کو تم جھٹلاتے ہو اور ایک گروہ کو شہید کرتے ہو''۔

۲) ''اور البتہ تحقیق ہم نے عطاء کو موسیٰ کو کتاب اور لگا تار بھیجے ہم نے ان کے پیچھے کئی رسول اور عطاء کیں ہم نے عیسیٰ بن مریم کو واضح نشانیاں، اور قوت دی ہم نے اس کو روح قدس سے کیا جب بھی لایا تمہارے پاس کوئی رسول وہ چیز جسے تمہیں پسند کیا تمہارے نفسوں نے (تو) تم نے تکبر کیا تو ایک فریق کو تم جھٹلاتے ہو اور ایک فریق کو تم شہید کرتے ہو''۔

اللہ تعالیٰ نے یہود کو جو نعمتیں عطا کیں ان میں سے اور نعمت کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی راہنمائی کے لئے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب یعنی توراۃ عطا کی۔ اور اس کے بعد بھی پے در پے (لگا تار) انبیاء کرام ان کی ہدایت کے لئے رب تعالیٰ بھیجتا ہی رہا، پھر عیسیٰ علیہ السلام کو واضح نشانیاں دے کر بھیجا عیسیٰ علیہ السلام کی روح قدس سے امداد کی۔

لیکن بنی اسرائیل نے اپنی روش (اپنے طریقہ) کو نہ بدلا۔ بلکہ انبیاء کرام نے اگر رب تعالیٰ کی طرف سے ایسے احکام لائے جو ان کی خواہشات کے مطابق نہیں ہوتے تھے تو وہ تکبر، غرور کی وجہ سے ان کا انکار کر دیتے یہاں تک کہ بعض انبیاء کرام کو انہوں نے جھوٹا کہا اور بعض کو شہید کر دیا۔

(از کبیر)

﴿ وَلَقَدْ آتَینَا مُوسَی الْکِتَابَ ﴾:

''اور البتہ تحقیق عطا کی ہم نے موسیٰ کو کتاب'' یہاں کتاب سے مراد توراۃ ہے۔

☆ " عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنهما ان التوراۃ نزلت جملة واحدة فامر اللہ تعالیٰ موسیٰ علیه السلام بحملها فلم یطق فبعث بکل حرف منها ملکا فلم یطیقوا حملها فخففها اللہ تعالیٰ لموسی علیه السلام فحملها "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک توراۃ تمام ایک مرتبہ ہی نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو اس کے اٹھانے کا حکم دیا آپ نہ اٹھا سکے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ہر حرف کے بدلے ایک فرشتہ اٹھانے کے لئے بھیجا۔ وہ بھی نہ اٹھا سکے تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے لئے اس کا اٹھانا آسان کر دیا۔ تو آپ نے اسے اٹھالیا۔ (از روح المعانی)

یعنی نہ تو الفاظ میں کمی ہوئی اور نہ ہی اس کی برکت اور عظمت میں کوئی کمی ہوئی بلکہ رب تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے موسیٰ علیہ السلام کے لئے اس کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ جیسا کہ قرآن پاک نبی کریم ﷺ کی امت کے سینوں میں محفوظ ہونا آسان کر دیا۔ حالانکہ یہی قرآن اگر پہاڑ پر نازل ہوتا تو وہ بھی قرآن پاک کی عظمت کی وجہ سے طاری ہونے والی خشیت سے پھٹ جاتا۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَه' خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ ﴾

''اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر اتارتے تو ضرور تو اسے دیکھتا جھکا ہوا پاش پاش ہوتا اللہ کے خوف سے''

﴿ وَقَفَّیْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ﴾: ''اور لگاتار بھیجے ہم نے اس کے پیچھے کئی رسول''

" وقفینا ای واتبعنا " ہم نے پیچھے بھیجا" التقفیة الاتباع والارداف " کہ یہ لفظ "تقفیه" سے ماخوذ ہے جس کا معنیٰ ہے پیچھے ہونا، کسی کے ساتھ سواری پر اس کے پیچھے سوار ہونا "قفاء" گردن کے پچھلے حصہ کو کہتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ'' ہم نے موسیٰ کے بعد کئی رسول پے در پے بھیجے'' دوسرے مقام پر رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ﴾ پھر ہم نے اپنے رسول لگاتار بھیجے " (تترا) ای واحدا

بعد واحد "یعنی تترا کا معنی ہے ایک دوسرے کے بعد بھیجنا۔

موسیٰ علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک ہزاروں کی تعداد میں انبیاء کرام تشریف لائے سب کا عمل توراۃ پر ہی رہا۔ شریعت ایک ہی رہی البتہ بعض اوقات شریعت پر عمل چھوڑ دیا گیا شریعت گویا کہ درجہ معدومیت میں پہنچ گئی تو اور رسول مبعوث ہوگئے۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد آنے والے جلیل القدر انبیاء کرام یہ تھے: حضرت یوشع بن نون، حضرت اشمویل، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت ارمیاء، حضرت حزقیل، حضرت الیاس، حضرت یونس، حضرت زکریا، حضرت یحیٰی علیہم السلام۔ (از خازن)

یہ بھی خیال رہے کہ زبور میں احکام نہیں تھے صرف اذکار و اوراد تھے۔

﴿ وَآتَيْنَا عِيسَى بْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ ﴾:

"اور ہم نے عطا کیں عیسیٰ بن مریم کو واضح نشانیاں"

﴿ اَلْبَيِّنَاتِ ﴾ سے مراد عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات بھی ہیں، مردہ کو زندہ کرنا مادر زاد اندھے کو نظر عطا کرنا، اور برص کی مرض والے کو صحیح کرنا۔ ﴿ اَلْبَيِّنَاتِ ﴾ سے مراد انجیل بھی جو واضح احکام دلائل پر مشتمل تھی۔ ﴿ عِيسَى ﴾ عبرانی لفظ ہے جس کا معنی ہے "سردار" اور "مبارک"۔ (از روح المعانی)

" ومریم در لغت عبرانی بمعنی خادم است چوما در ایشان را برای خدمت بیت المقدس نذر کرده بود ایشان را مریم نام گزاشت "

(عزیزی)

مریم کا معنی عبرانی زبان میں "خادم" ہے چونکہ آپ کی والدہ نے بیت المقدس کی خدمت کیلئے نذر مانی تھی اس لئے آپ کا نام بھی مریم رکھا۔

﴿ وَاَيَّدْنَاهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ﴾ : "اور امداد کی ہم نے اس کی روح قدس سے"

﴿ اَيَّدْنَاهُ ﴾ قویناه، ہم نے اس کو طاقت دی مراد امداد کی ہاتھ کو "ید" کہا جاتا ہے اور اس کی جمع "ایدی" آتی ہے چونکہ ہاتھ میں بھی پکڑنے کی قوت پائی جاتی ہے اسے اس لئے "ید" کہہ لیا جاتا ہے۔

﴿ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ﴾ روح سے مراد وہی روح ہو جس پر حیات کی دارومدار ہے اور "قدس"

سے مراد اللہ تعالیٰ ہو اضافۃ تشریفیہ ہے جس طرح عبد اللہ، امۃ اللہ، بیت اللہ، ناقۃ اللہ'' میں اضافۃ تشریفیہ پائی گئی ہے۔ تقریباً اسے یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم نے عیسیٰ کو اپنی طرف سے خصوصی روح عطاء فرمائی وہ روح ہمارے تقرب کی وجہ سے عیسیٰ علیہ السلام کی تقویت کا سبب بنی۔

" وقال ابن عباس هو اسم الله الاعظم الذى كان عيسى يحيى به الموتى "

اسی طرح روح قدس کا اور یہ بھی معنی ہے'' اللہ کا اسم اعظم'' جس کی وجہ سے آپ مردوں کو زندہ فرماتے تھے۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے گویا کہ یہ فرمایا ہم نے عیسیٰ کی اپنے اسم اعظم سے امداد فرمائی جس سے آپ کے معجزات کا ظہور ہوتا تھا۔

"وقيل هو الانجيل لانه حياة القلوب سماه روحا كما سمى القرآن روحا "

اسی طرح روح القدس سے مراد'' انجیل'' بھی ہے کیونکہ وہ دلوں کو زندہ کرتی جب تک (اصلی حال میں تھی اور منسوخ نہیں ہوئی تھی) جس طرح قرآن پاک کو روح کہا گیا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿اِنَّا اَنزَلْنَا اِلَیْکَ رُوْحاً﴾ بیشک ہم نے آپ کی طرف روح (قرآن پاک) کو نازل فرمایا۔

" وقيل هو جبريل ووصف بالقدس وهو الطهارة لانه لم يقترف ذنبا قط "

اور مطلب یہ ہے کہ روح سے مراد جبریل ہے اور قدس سے مراد پاک ہونا ہے یعنی جبریل نے کبھی گناہ کا ارتکاب نہیں کیا اب مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے جبریل پاک کے ذریعہ آپ کی امداد کی۔

" وقيل القدس هو الله تعالىٰ والروح جبريل كما تقول عبد الله سمى جبريل روحا للطافته لانه روحانى خلق من النور "

اور مطلب یہ ہے کہ قدس سے مراد اللہ تعالیٰ اور روح سے مراد جبریل، اضافۃ تشریفیہ ہے جیسے کہ عبد اللہ میں ہے، جبریل کو روح اس لئے کہا گیا ہے کہ اس میں لطافت پائی گئی ہے وہ روحانی ہے نور سے پیدا کیا گیا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا'' ہم نے اپنی نورانی مخلوق جبریل کے ذریعے ان کو طاقت دی (امداد کی)۔

" وقيل سمى روحا لمكانه من الوحى الذى هو سبب حياة القلوب "

اور وجہ جبریل کو روح کہنے کی یہ ہے کہ جبریل وحی لانے کی وجہ سے دلوں کی زندگی کا سبب ہے جس طرح روح سے ظاہری طور پر حیات حاصل ہوتی ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا ہم نے ان کی امداد کی وحی لانے والے جبریل کے ذریعے۔

تنبیہ: اگرچہ یہ تمام معانی اجتماعی طور پر مراد لئے جاسکتے ہیں لیکن " **وحمل روح القدس هنا علی جبریل اولی** " یہاں روح القدس مراد جبریل لینا زیادہ بہتر ہے۔ (از خازن)

عیسیٰ علیہ السلام کو جبریل کی تائید اس طرح حاصل تھی کہ آپ جہاں چلتے تھے جہاں جاتے تھے جبریل آپ کے ساتھ ہوتے اور آپ کی معاونت کرتے۔ (از خازن)

فائدہ: نبی کریم ﷺ نے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کو فرمایا " **اهجهم وروح القدس معک** " ان کافروں کو ھجو بیان کر و روح قدس تمہارے ساتھ ہیں۔ اور ایک مقام پر فرمایا " **اهجهم وجبریل معک** " ان کفار کی ھجو بیان کریں جبریل تمہارے ساتھ ہیں۔

اگرچہ نبی کریم ﷺ کے ارشادات گرامیہ سے بظاہر طور پر یہ معنی سمجھ آ رہا ہے کہ تم کفارہ کی ھجو بیان کرو تمہارے ساتھ روح قدس جبریل ہیں۔ یعنی ان کی تائید تمہیں حاصل ہے۔ چونکہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے لئے حضور ﷺ نے دعاء فرمائی " **اللهم ایده بروح القدس** " اے اللہ انہیں روح قدس کی تائید عطا فرما۔ (از روح المعانی وقرطبی)

لیکن حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے کمال عقیدت سے یہ بیان کیا کہ میرے امداد کرنے والے جبریل بھی نبی کریم ﷺ ہیں اور روح القدس بھی آپ ہی ہیں۔ سبحان اللہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کو یقین تھا کہ نبی کریم ﷺ کو رب تعالیٰ نے گناہوں سے معصوم پیدا کیا اس لئے آپ روح قدس ہیں۔

لیکن افسوس صد افسوس سنیت کے لبادہ میں اغیار آج کل نبی کریم ﷺ کی طرف ذنب بمعنی گناہ لے کر ذنب در ذنب میں مبتلاء ہو رہے ہیں " **اللهم انا نعوذ بک من الجاهلین** " اور حضرت حسان رضی اللہ عنہ کو یہ بھی یقین تھا کہ نبی کریم ﷺ نورانی مخلوق تھے کہاں جبریل کی نورانیت جو فرع ہے اور کہاں آپ کی نورانیت جو اصل ہے۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے کیا خوب بیان فرمایا:

وجبریل رسول اللہ فینا وروح القدس لیس لہ کفاء

(مسلم ج ۲ باب فضائل حسان بن ثابت ﷺ)

اللہ کے رسول جبریل ہم میں ہیں اور روح قدس ہیں جن کا کوئی مثل نہیں

خیال رہے کہ بعض شارحین نے اس شعر میں جبریل سے مراد جبریل ہی لیا لیکن راقم کے نزدیک سیاق وسباق کے لحاظ پر یہی معنی زیادہ قریب ہے جوذکر کردیا ہے۔

فائدہ جلیلہ : "عن عائشة قالت کان رسول اللہ ﷺ یضع لحسان منبرا فی المسجد یقوم علیه قائما یفاخر عن رسول اللہ ﷺ او ینافح ویقول رسول اللہ ﷺ ان اللہ یؤید حسان بروح القدس ما نافح او فاخر عن رسول اللہ ﷺ" (رواہ البخاری، مشکوۃ باب البیان والشعر)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ حضرت حسان ﷺ کے لئے مسجد میں منبر رکھتے اوراس پر حضرت حسان کھڑے ہوکر نبی کریم ﷺ کی مدح کرتے اور کفار کی ھجو کی مدافعت کرتے۔ یعنی ان کی ھجو کا آپ جواب دیتے رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے۔ بیشک اللہ تعالیٰ حسان کی روح قدس سے تائید عطا فرمائے جب تک یہ اللہ کے رسول (ﷺ) کی طرف سے کفار کی ھجو کی مدافعت کرتے رہیں۔

﴿ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ﴾:

''کیا جب بھی لایا جائے تمہارے پاس کوئی رسول وہ چیز جس کونہیں پسند کیا تمہارے نفسوں نے (تو) تم نے تکبر کیا''۔

یعنی رب تعالیٰ نے انبیاء کرام کو بنی اسرائیل کی راہنمائی کے لئے بھیجا لیکن جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام پیش فرمائے تو ان کو پسند نہ آئے تو انہوں نے تکبر کر کے ان سے روگردانی کرلی۔

ان کے تکبر کرنے کی وجہ کیا تھی: یہود کا انبیاء کرام کی تکذیب کرنا اوران کوشہید کرنا اوران کے بتائے ہوئے حق راستہ سے روگردانی کرنا اس وجہ سے تھا:

" وانما کانوا کذلک لارادتهم الرفعة فی الدنیا وطلبهم لذاتها والترؤس علی عامتهم واخذ اموالهم بغیر حق وکانت الرسل تبطل علیهم ذلک فیکذبونهم لاجل ذلک "

کہ یہود کی نظر میں دنیاوی رفعت کی قدر ومنزلت تھی دین کے معاملہ میں انہیں کوئی

پرواہ نہیں تھی وہ صرف دنیا کی لذات کو حاصل کرنے کے درپے تھے، وہ عام لوگوں کو ڈراتے رہتے تھے ان کو دھمکیاں دیتے رہتے تھے لوگوں کا مال ناحق جابرانہ اور غاصبانہ طور پر لے لیتے تھے۔

ان کے ان غلط کاموں پر انبیاء کرام انہیں متنبہ کرتے، ان کو بتاتے کہ تم باطل کام کر رہے ہو، انبیاء کرام کے حق راہ بتانے پر اور ان کو غلط کاموں سے روکنے کی وجہ سے انہوں نے انبیاء کرام کی تکذیب شروع کر دی۔

﴿ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ ﴾: ایک فریق کی تم تکذیب کرتے ہو یعنی موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام وغیرہما کی انہوں نے تکذیب کی۔ اور ایک فریق کو تم شہید کرتے ہو۔ یعنی حضرت یحی، حضرت زکریا، حضرت شعیاء وغیرھم علیھم السلام کو انہوں نے شہید کیا۔

" ویوھمون عوامھم کونھم کاذبین ویحتبون فی ذلک بالتحریف وسوء التاویل "

اور ان کے علماء عوام کے دلوں میں یہ وہم ڈالتے کہ یہ انبیاء (معاذ اللہ) جھوٹے ہیں اور کتب میں تحریف کر کے اور غلط تاویلیں کر کے عوام کو حق سے برگشتہ کرتے۔

" ومنھم من کان یستکبر علی الانبیاء استکبار ابلیس علی آدم "

ان یہود میں سے کئی لوگ اپنے آپ کو انبیاء کرام سے اعلیٰ سمجھتے ان کا تکبر ایسا تھا جیسا کہ شیطان نے آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنے سے تکبر کیا اور رب تعالیٰ کے حکم کا انکار کیا۔ نبی کریم ﷺ کو شہید کرنے میں بھی یہود نے بہت کوشش کی۔ آپ کو زہر آلود بکری کا گوشت کھلا کر شہید کرنے کی کوشش کی۔ پھر آپ پر جادو کر کے آپ کو شہید کرنے کی کوشش کی لیکن اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو بتا دیا کہ کس نے جادو کیا اور کیسے کیا۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کو ظاہری شہادت سے تو محفوظ رکھا البتہ اس زہر کا اثر لوٹ آیا تھا جب آپ کا وصال ہوا تو گویا کہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی شہادت باطنیہ بھی یہود کے ہاتھوں سے ہوئی۔

یہود و ہنود کا اشتراک: کفار مکہ کو بھی نبی کریم ﷺ سے اسی قسم کی مخالفت تھی جیسے بنی اسرائیل کو انبیاء کرام سے مخالفت رہی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا؛

﴿ وَاِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡهِمۡ آیَاتُنَا بَیِّنَاتٍ قَالَ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَاءَنَا ائۡتِ بِقُرۡآنٍ غَیۡرِ هٰذَآ اَوۡ بَدِّلۡهُ قُلۡ مَا یَکُوۡنُ لِیۡۤ اَنۡ اُبَدِّلَهٗ مِنۡ تِلۡقَآئِ نَفۡسِیۡ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ ﴾ (سورة یونس آیة ۱۵)

''اور جب تلاوت کی جاتی ہیں ان پر ہماری آیات جو واضح ہیں کہتے ہیں وہ لوگ جو نہیں امید کرتے ہماری ملاقات کی کہ لے آؤ قرآن اس کے سوا، یا اسے بدل دو، آپ فرما دیں نہیں ہے (یہ حق) میرے لئے کہ میں اسے تبدیل کر دوں اپنی طرف سے میں نہیں تابعداری کرتا سوائے اس کے جو میری طرف وحی کی جاتی ہے''۔

کفار کا مطالبہ: کفار کی ایک جماعت نبی کریم ﷺ کے پاس آئی وہ کہنے لگے کہ اس قرآن میں ہمارے معبودوں کے خلاف بیان کیا گیا ہے۔ اور ہر قسم کی ہماری عیاشی کے ذرائع شراب نوشی، جوا بازی لوٹ کھسوٹ، رشوت، سود خوری کو حرام قرار دے دیا گیا ہے۔ اس لئے ہمارا مطالبہ صرف یہ ہے کہ اس قرآن کے علاوہ کوئی اور قرآن لے آؤ، یا اسی قرآن کو بدل کر اس میں ترمیم کر دو، تا کہ ہم اپنے معبودوں کی عبادت بھی کرتے رہیں۔ اور عیاشی کے تمام ذرائع پر عمل کرتے رہیں اور تمہارا قرآن بھی ان کو جائز قرار دے تو ہمارا اور تمہارا جھگڑا ختم ہو جاتا ہے ہم تم پر ایمان لے آئیں گے۔

نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ کے حکم سے ان کو دوٹوک جواب دیا کہ قرآن رب کا کلام ہے رب تعالیٰ کی طرف سے جو وحی آتی ہے میں وہی بیان کرتا ہوں۔ قرآن کو میں بدل دوں یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد پر کفار بت پرست آپ کے مخالف ہو گئے بتوں کا مخالف سمجھنے لگے اپنے باطل دین کا مخالف سمجھنے لگے بلکہ یہوں کہیں کہ غنڈے اور بدمعاش نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کو (معاذ اللہ) دہشت گرد سمجھنے لگے جھوٹے لوگ معاذ اللہ آپ کی تکذیب کرنے لگے۔

آپ کو راستے سے ہٹانے کے مختلف حربے استعمال کرنے لگے لیکن کفار ذلیل ہوئے مصطفیٰ کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کو رب تعالیٰ نے رفعت و بلندی سے نوازا۔ ایک وقت وہ بھی آیا جب فتح مکہ کے وقت بڑے بڑے جابر کفار حضور ﷺ کے سامنے سر جھکانے لگے۔

تاریخ واقعات کو دہرا رہی ہے: آجکل کفار کے یار، یہود ونصاریٰ کے مددگار، بدکردار لوگ علماء کو دہشت گرد کہہ رہے ہیں وہ بھی چاہتے ہیں کہ جو ہم کہیں علماء اسے جائز قرار دے دیں جب علماء کہتے ہیں کہ حرام کو حلال کہنا ہم سے ممکن نہیں تو وہ کہتے ہیں کہ یہ پاگل ہیں، یہ دہشت گرد ہیں ان کو مٹا دو دینی مدارس کو ختم کر کے ایسے مدارس بناؤ جس سے فارغ ہونے والے نام نہاد مولوی ہماری ہاں میں ہاں ملا دیں۔

یہی ہنود کی پرانی تاریخ آج پھر دوہرائی جا رہی ہے لیکن اپنے آباؤ اجداد، اپنے پیشواؤں کی طرح انشاءاللہ یہ بھی ذلیل ہوں گے۔ اور علماء کرام انشاءاللہ زندہ رہیں گے، ان کے مٹانے سے نہیں مٹیں گے۔ ؏ یہ چراغ پھونکو سے نہ بجھایا جائے گا۔

تنبیہ: ﴿لَا تَهْوٰی﴾ ماخوذ "هوی" (بالکسر) سے اس کا معنی ہے محبت کرنا "**لا تهوی انفسکم ای لا تحب انفسکم**" جس چیز کو تمہارے نفس پسند نہیں کرتے، اور جب "هوی" (بالفتح) ہو تو اس کا معنی گرنا ہوتا ہے ﴿اَفَكُلَّمَا﴾ میں استفہام توبیخ کے لئے ہے:

"وقال توبیخا اکفرتم بهم فکلماجاءکم"

یعنی ان کو ڈانٹتے ہوئے، زجر کرتے ہوئے فرمایا کیا تم ان سے کفر کرتے ہو جب وہ احکام لاتے ہیں جو تمہیں پسند نہیں آتے۔ یعنی ان کا انبیاء کرام کے خلاف تکبر کرنا اور انکار کرنا کفر ہے۔
(از مظہری)

☆☆☆☆☆

﴿ وَقَالُوۡا قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ بَلۡ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفۡرِهِمۡ فَقَلِيۡلًا مَّا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴾ (آیت ۸۸)

۱) ''اور یہودی بولے ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہیں بلکہ اللہ نے ان پر لعنت کی ان کے کفر کے سبب تو ان میں تھوڑے ایمان لاتے ہیں''۔

۲) ''اور انہوں نے کہا ہمارے دلوں پر پردے ہیں بلکہ لعنت ہے ان پر اللہ کی بوجہ ان کے کفر کے تو تھوڑے ہیں جو ایمان لاتے ہیں''۔

اس آیۃ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ان پر نعمت عظمی کا ذکر فرمایا اور ساتھ ہی ان کی عادت جو کجروی (ٹیڑھی چال) کی تھی اسے بھی ذکر کر دیا۔ نبی کریم ﷺ کا تشریف لانا اور ان کو دعوت اسلام دینا بہت بڑی نعمت تھی، لیکن انہوں نے یہ کہا کہ ہمارے دلوں پر تو پردے چھائے جاتے ہیں جو تم ہمیں دعوت اسلام دیتے ہو وہ ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتی تو رب تعالیٰ نے ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ غلط کہتے ہیں ان کے دلوں میں تو سمجھنے کی صلاحیت موجود ہے البتہ ان کے کفر کی وجہ سے ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے اسی لئے وہ ایمان سے دور ہیں تھوڑے ہی ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔

﴿ وَقَالُوۡا قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ ﴾: ''اور انہوں نے کہا ہمارے دلوں پر پردے ہیں'' یہ مختصر سے الفاظ مبارکہ ہیں لیکن کثیر معانی پر مشتمل ہیں:

﴿ وَقَالُوۡا ﴾ میں ضمیر یہود کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی یہود نے کہا۔

﴿ غُلۡفٌ ﴾ جب لام کے سکون سے ہو تو یہ " اغلف " کی جمع ہے جس کا معنی ہوتا ہے پیدائشی پردہ جس کی وجہ سے کوئی چیز دل میں محفوظ نہ رہ سکے اور سمجھ میں کچھ نہ آئے۔ اور ﴿ غُلُفٌ ﴾ جب لام کے ضمہ سے ہو تو یہ جمع ہوتی ہے ''غلاف'' کی یہ کسی چیز کو ڈھانپ دینے کو کہا جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ جو چیز دل میں ہے پردہ نے اسے محفوظ کر دیا ہے۔

(مختصر از مظہری)

قدرے تفصیل:

" عن ابن عباس وقالوا قلوبنا غلف ای فی اکنة "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ یہودیوں نے کہا" ہمارے دل پردہ میں ہیں۔

" وعن ابن عباس وقالو قلوبنا غلف ای لا تفقه "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ایک اس کا معنی یہ ہے کہ یہودیوں نے کہا" ہمارے دل سمجھتے نہیں"۔

" وعن ابن عباس وقالوا قلوبنا غلف هی القلوب المطبوع علیها "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اس کا ایک معنی یہ ہے یہودیوں نے کہا ہمارے دلوں پر مہر لگادی گئی ہے۔

اور یہی قول حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کا بھی ہے کیونکہ انہوں نے فرمایا اس کا معنی یہ " علیها طابع " ہمارے دلوں پر مہر ہے۔

" وقال مجاهد وقالوا قلوبنا غلف علیها غشاوة ، وقال السدی یقولون علیها غلاف وهو الغطاء "

مجاہد اور سدی دونوں حضرات کے اقوال کا مطلب تقریباً ایک ہی ہے کہ ان یہودیوں نے کہا ہمارے دلوں پر پردہ چھا گیا۔

قال مجاهد وقتاده وقرأ ابن عباس غلف بضم اللام وهو جمع غلاف ای قلوبنا اوعیة لکل علم فلانحتاج الی علمک "

مجاہد اور قتادہ نے کہا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرأت میں "غلف" لام کی پیش سے بھی پڑھا گیا ہے جو غلاف کی جمع ہے۔ اس لحاظ سے ان کا کہنا یہ تھا کہ ہمارے دلوں میں جو علم پہلے سے موجود ہے اس پر غلاف چڑھا کر اسے محفوظ کر دیا گیا ہے لہٰذا ہم تمہارے علم کے محتاج نہیں۔ (از ابن کثیر)

تین معانی واضح ہیں:

" احدها انه جمع اغلف والا غلف هو ما فی غلاف ای قلوبنا مغشاة باغطیة مانعة من وصول اثر دعوتک الیها "

ان میں سے ایک معنی یہ ہے کہ غلف جمع ہے اغلف کی اور اغلف اسے کہتے ہیں جو غلاف میں ہو یعنی ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے دلوں پر پردے چھائے ہوئے ہیں جو تمہاری دعوت کو ہمارے دلوں تک پہنچنے سے مانع ہیں۔

وثانیھا روی الاصم عن بعضم ان قلوبھم غلف بالعلم ومملؤة بالحکمة فلا حاجة معھا بھم الی شرع محمد علیه السلام"

ان معانی میں دوسرا یہ ہے کہ ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ان کے دل علم اور حکمت سے بھرے ہوئے ہیں یعنی ان کے دلوں پر غلاف چڑھا کر علم وحکمت کو محفوظ کر دیا گیا ہے لہٰذا اس کے ہوتے ہوئے محمد (ﷺ) کی شریعت کی ضرورت نہیں۔

" وثالثھا غلف ای کالغلاف الخالی لا شئی فیه مما یدل علی صحة قولک"

ان معانی میں تیسرا یہ ہے کہ ہمارے دلوں پر تو خالی غلاف ہے ان میں کوئی چیز نہیں جس سے سمجھ آئے کہ تمہاری بات صحیح ہے یعنی ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے دل تو سمجھنے سے خالی ہیں لہٰذا تمہارا ہمیں تبلیغ کرنا اس لئے مفید نہیں ہوسکتا کہ ہم میں سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ (از کبیر)

خیال رہے کہ وہ اپنے آپ کو بڑا عقل مند بھی سمجھتے تھے لیکن یہ ان کا کہنا صرف ان کی کجروی کی وجہ سے تھا۔

﴿ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ ﴾: "بلکہ لعنت ہے ان پر اللہ کی بوجہ ان کے کفر کے"

اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کیا کہ ان کا یہ کہنا غلط ہے کہ ہمارے دلوں میں تمہاری بات آ نہیں سکتی اللہ تعالیٰ تو ہر شخص کو سمجھنے کی صلاحیت عطا کر کے پیدا فرماتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" ما من مولود الا یولد علی الفطرة فابواه یھود انه وینصرانه ویمجسانه" (رواہ البخاری ومسلم من حدیث ابی ھریرة)

کسی بچے کو نہیں پیدا کیا جاتا سوائے فطرۃ کے البتہ اس کے ماں باپ اسی یہودی بنا دیتے ہیں یا نصرانی بنادیتے ہیں یا مجوسی بنادیتے ہیں۔

مطلب واضح ہے کہ ہر بچہ پیدائش کے وقت فطرۃ اسلامیہ پر پیدا ہوتا ہے اس میں اسلام کے سمجھنے کی صلاحیت ہوتی ہے لیکن وہ اپنے والدین کو دیکھ کران کا مذہب ہی اختیار کرتا ہے اگراس کے ماں باپ یہودی ہوئے تو انہوں نے اسے اپنی یہودیہ طرز سے اس سے یہودی بنا دیا۔اور اگراس کے ماں باپ نصرانی ہوئے تو وہ اسے اپنی نصرانی روش سے نصرانی بنا دیتے ہیں۔اور اگراس کے والدین مجوسی ہوئے تو وہ اسے اپنے دین کی تربیت کرنے سے اپنے جیسا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

" رد لما قالو والمعنی انها خلقت علی الفطرة والتمكن من قبول الحق ولكن الله خذلهم بكفرهم "

یعنی ان کے اقوال کا رد اس طرح کیا گیا کہ وہ فطرۃ اسلامیہ پر پیدا کئے گئے حق کے قبول کرنے کی انکو طاقت دی گئی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کوان کے کفر کی وجہ سے رسوا اور ذلیل کیا۔اور ان کی استعداد کو ان کے کفر نے باطل کیا ان کے کفر نے ان کو توبہ کرنے سے ہی دور کر دیا تو بہ کرتے اسلام قبول کرتے تو یقیناً رب تعالیٰ اسے شرف قبولیت عطا فرماتا۔رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰی اَبْصَارَهُمْ ﴾ "(ان کوان کے کفر نے) بہرا اور اندھا کر دیا ہے"۔

(از مظهری وبیضاوری)

لعنت کیا ہے؟ " **واصل اللعن الطرد والابعاد** " عرب کی کلام میں لعنت کا معنی دور کرنا، ہانکنا چلانا ہے۔اسی لئے بھیڑیئے کو بھی "ذئب لعین" کہا جاتا ہے کہ اسے بھی دور بھگایا جاتا ہے۔

" **فالمعنی ابعدهم الله من رحمته** " یہاں مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی رحمت سے دور کیا۔

" **وقيل من توفيقه وهدايته** " یہاں لعنت کا معنی یہ لیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی توفیق اور ہدایت سے دور کیا۔

" **وقيل من كل خير** " اور یہ مطلب بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر بھلائی سے دور کر دیا۔

(قرطبی)

مسئلہ : جب لعنت کا معنی یہ لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ہر قسم کی رحمت سے دور کرے تو یہ لعنت صرف

کافر کے لئے ہے مومن فاسق کے لئے نہیں۔اور اس کافر پر شخصی طور پر لعنت بھیجی جاسکتی ہے جس کی کفر پر موت یقینی ہے جیسے ابوجہل، ابولہب، فرعون، نمرود وغیرھا۔جس شخص کی موت کفر پر یقینی طور پر ثابت نہ ہو اس پر شخصی طور پر لعنت نہیں بھیجی جاسکتی البتہ صرف اتنا کہنا کافی ہے:

• ﴿ لَعْنَةُ اللهِ عَلَى الْكَافِرِيْنَ ﴾ ''اللہ کی لعنت ہو کافروں پر''

اگر وہ شخص کافر ہوا تو اس لعنت میں خود شامل ہو جائے گا اور اگر کافر نہ ہوا تو لعنت بھیجنے والا گنہگار نہیں ہوگا۔لعنت کا جب یہ معنی لیا جائے کہ رب تعالیٰ کی رحمت خاصہ (جو مقربین مومنین کو حاصل ہوتی ہے) سے دور ہو تو اس معنی کے لحاظ سے فاسق و فاجر پر لعنت بھیجی جاسکتی ہے لیکن یہ بھی شخصی نہ ہو، اجتماعی ہو اس طرح کہنا جائز ہوگا۔

" لعنة الله على الفاسقين ، لعنة الله على الظالمين ، لعنة الله على الكاذبين "

اسی معنی کے لحاظ پر نبی کریم ﷺ نے بعض عورتوں پر لعنت فرمائی۔

حضرت اسماء بنت ابی بکر نے کہا کہ ایک عورت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اس نے عرض کیا کہ میری بیٹی کے بال بیماری کی وجہ سے گر گئے ہیں میں نے اس کی شادی کرنی ہے کیا میں اسے دوسری عورتوں کے بال لگا دوں؟ تو آپ نے فرمایا" لعن الله الواصلة والمستوصلة "دوسروں کے بال ملانے والیوں اور ملوانے والیوں پر اللہ کی لعنت۔

وضاحت حدیث: انسانی بالوں کی وگ لگانی حرام ہے کیونکہ انسان کے بالوں یا دوسرے اجزاء سے نفع حاصل کرنا حرام ہے ہاں اگر کسی جانور کے بال ہوں ان میں نجاست نہ ہو وہ خاوند کی اجازت سے لگا سکتی ہے۔ (نووی ج ۲ ص ۲۱۲)

اسی طرح پلاسٹک کی وگ جو آج کل استعمال ہوتی ہے وہ بھی جائز ہے۔البتہ عام طور پر سر کے بالوں کا جوڑا بنا کر سر پر بال فیشن کے طور پر لپیٹے جاتے ہیں جو اونٹ کی کوہان کی طرح نظر آتے ہیں یہ ممنوع ہے تاہم غسل کے بعد بال خشک کرنے کے لئے عارضی طور پر بالوں کا جوڑا بنانا راقم کو ممنوع نظر نہیں آتا۔

" واما تحمير الوجه والخضاب بالسواد فان فعلته بغير اذن الزوج

فحرام وان اذن جاز علی الصحیح "(نووی شرح مسلم ج ۲ ص ۲۱۲)

لیکن چہرے کا سرخ کرنا یا بالوں کا سیاہ کرنا اگر خاوند کی اجازت کے بغیر ہو تو حرام ہوگا اگر خاوند کی اجازت سے ہو تو صحیح یہ ہی ہے کہ جائز ہے تاہم اس حال میں بے حجاب ہو کر دوسرے نامحرم لوگوں کے سامنے آنا منع ہے۔

فائدہ : حرام کی معاونت بھی حرام ہے انسانی بال دوسری عورت یا مرد کے بالوں سے ملانے والی عورت پر مرد پر بھی اسی طرح لعنت ہوگی۔ جس طرح اس کو کہہ کر اپنے بالوں سے ملوانے والی پر لعنت ہے۔

☆ " عن عبد اللہ قال لعن اللہ الواشمات والمستوشمات والنامصات والمتنصمات والمتفلجات للحسن المغیرات خلق اللہ " (مسلم ج ۲ ص ۲۱۳)

حضرت عبداللہ (بن مسعود) رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کی لعنت ہو رنگ بھرنے والی اور بھروانے والی پر، اور بال نوچنے والی اور نچوانے والی پر اور دانتوں کے درمیان حسن کے لئے کشادگی (جھری) بنانے والی پر کیونکہ وہ اللہ کی تخلیق کو بدلنے والی ہیں۔

وضاحت حدیث: " واشمات " وہ عورتیں ہیں جو دوسری عورتوں کے جسم میں سوئی چبھو کر خون نکال کر اس میں رنگ بھر دیتی تھیں جس طرح اب بھی لوگ اپنے جسم پر نام لکھواتے ہیں یا پھول بنواتے ہیں یا جانوروں کی تصاویر بنواتے ہیں۔

" مستوشمات " یہ وہ عورتیں ہیں جو اس طرح اپنے جسم میں رنگ بھرواتی ہیں۔

خیال رہے کہ یہ فعل مردوں اور عورتوں کے لئے ایک جیسا ہی حرام ہے لیکن اس وقت عام طور پر یہ فعل صرف عورتوں میں پایا جاتا تھا اس لئے ان کا ہی تذکرہ کیا گیا ہے۔

"نامصات " چہرے کے بال نوچنے والی عورتوں کو کہا جاتا ہے۔

" متنمصات " نوچوانے والی عورتوں کو کہا جاتا ہے لیکن یہ ابروں کے بال یا چہرے پر کہیں بال ہوں تو ان کا یہ حکم ہے۔ البتہ داڑھی یا مونچھوں پر عورت کے بال آ جائیں تو اس کے لئے نوچنا مستحب ہے۔

" متفلجات " ان عورتوں کو کہتے ہیں جو اپنے سامنے والے دانتوں کو ریتی سے رگڑ کر ان کے

درمیان فرجہ (کشادگی ، جھری) بناتی تھیں تاکہ ان کے دانت حسین وجمیل نظر آئیں ۔اس غرض سے ایسا کرنے والی چونکہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کو بدلنے کی کوشش کرتی ہیں لہٰذا لعنت کی مستحق ہوتی ہیں ہاں اگر علاج کرنے کی غرض سے یا کسی عیب کو زائل کرنا مقصود ہو تو جائز ہے۔ (نووی شرح مسلم ج ۲ ص ۲۱۳)

یزید پر لعنت کا حکم: اگرچہ علامہ تفتازانی رحمہ اللہ نے شرح عقائد میں بہت سختی کی ہے اور کہا ہے۔

" لعنة الله عليه وعلى انصاره واعوانه "

یزید اور اس کے تمام مددگاروں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔

" قال السيوطى لعن الله قاتل الحسين وابن زياد ومعه ويزيد "

(حاشیہ نبراس ص ۵۵۴)

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو امام حسین ﷛ کے قاتل اور ابن زیاد اور اس کا ساتھ دینے والے قاتلوں اور یزید پر۔

لیکن کچھ حضرات نے یزید پر شخصی لعنت سے اجتناب بھی کیا ہے۔

" وبهذا ظهر ان استدلالهم على لعن يزيد بالنصوص العامة غير صحيح " (نبراس ص ۵۵۵)

صاحب نبراس نے اپنے دلائل ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یزید پر لعنت کرنے والے حضرات کے عام نصوص سے استدلات درست نہیں۔

قول فیصل: سب سے بہتر ارشاد سید الاولیاء حضرت پیر مہر علی شاہ رحمہ اللہ کا ہے۔ایک شخص نے عرض کیا کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی لعن یزید کے جواز کا فتوی دیتے ہیں۔فرمایا کہ " شیخ موبموسفتہ محبت بنو فاطمہ ہیں" پس ان کو ایذاء پہنچانے والے کو حق میں پورے طور پر مجوز لعنت ہیں۔لیکن بعض اہل علم نے اس میں تامل کیا ہے اور کہا ہے کہ آخرت کا حال معلوم نہیں ممکن ہے یزید نے توبہ کی ہو علامہ تفتازانی نے اس کے رد میں خوب فرمایا ہے کہ قتل ذریت طیبہ اور ان کی اہانت بطور یقین اور امر مشہور ہے اور توبہ امر محتمل پس احتمال وظن یقین سے کیا نسبت رکھتے ہیں اور بہت سے دیگر محققین بھی لعن کا جواز ثابت کرتے ہیں۔

ہمارے مخلصوں میں سے ایک شخص کو دمشق کی سیر وسیاحت کا اتفاق ہوا ہے اس نے بیان کیا ہے

کہ سارے شہر کی آلودگیاں اور خاکروبہ یزید کے قبر کے پاس ڈالتے ہیں وہ جگہ آبادی سے بہت دور ہے ہاں جواز اور لزوم میں فرق ہے لعن کو عادت بنانا ضروری اور لازم نہیں۔ بہتر ہے کہ بحکم فرمودہ حق تعالیٰ ﴿ فَلَعْنَةُ اللهِ عَلَى الظَّالِمِينَ ﴾ پر کفایت کی جائے۔ بجائے لعن کے اللہ اللہ کرنا اولین وآخرین کے حق میں بہتر کام ہے۔ (ملفوظات مہریہ ملفوظ نمبر ۱۶۴، ۱۲۴)

﴿فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ ﴾: ''تو تھوڑے ہیں جو ایمان لاتے ہیں'' اس کی تفسیر میں تین احتمال ہیں

" احدها ان القليل صفة المؤمن ای لا يؤمن منهم الا القليل "

ایک احتمال یہ ہے کہ قلیل صفت ہے مومن کی معنی یہ ہے کہ ان میں ایمان لانے والے نہیں ہیں سوائے تھوڑوں کے۔

" وثانيها انه صفة الايمان ای لا يؤمنون الا بقليل مما كلفوا به "

دوسرا معنی یہ ہے کہ قلیل صفت ہو ایمان کی۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ وہ نہیں ایمان لاتے سوائے تھوڑی چیزوں کے یعنی ان کو جن احکام کا مکلف بنایا ہے بعض پر وہ ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر رب تعالیٰ کو مان لیا انبیاء کرام کا انکار کر دیا۔

" وثالثها معناه لا يؤمنون اصلا لا قليلا ولا كثيرا ، كما يقال قليلا ما يفعل بمعنى لا يفعل البتة "

اور تیسرا معنی یہ ہے کہ وہ بالکل ایمان نہیں لاتے نہ قلیل پر نہ کثیر پر، جیسا کہ کہا جاتا ہے ''قلیلا ما فعل'' لیکن اس کا معنی یہ مراد لیا جاتا ہے ''وہ بالکل کام کرتا ہی نہیں''۔

علامہ کسائی رحمہ اللہ نے بھی بیان فرمایا ہے کہ عرب لوگ جب کسی زمین سے گزرتے ہیں تو کہتے ہیں " قليلا ما تنبت " لیکن معنی وہ یہ مراد لیتے ہیں کہ یہ زمین تو کچھ اگاتی ہی نہیں۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے پہلا معنی ہی مراد لیا ہے راقم نے بھی وہی نقل کیا ہے علامہ رازی رحمہ اللہ نے بھی اسے ہی ترجیح دی اور فرمایا " والوجه الاول اولى " پہلا معنی ہی زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ اسے رب تعالیٰ کے دوسرے ارشاد گرامی سے تائید حاصل ہے۔

﴿ بَلْ طَبَعَ اللهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴾

''بلکہ اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی ان (کے دلوں) پر تو نہیں ایمان لاتے مگر تھوڑے''

کیونکہ اس آیۃ کریمہ میں تھوڑے ایمان لانے والوں کا ہی ذکر ہے۔ (از کبیر)

اور پہلے معنی کو ہی تفسیر کواشی میں بھی ترجیح دی گئی۔

" وفی الکواشی ما زائدة ای وقلیلا یؤمنون لا ن مؤمنی المشرکین اکثر من مؤمنی الیهود " (شیخ زادہ)

تفسیر کواشی میں ذکر کیا گیا ہے " ما " زائد ہے یعنی تھوڑے ہی ایمان لاتے ہیں کیونکہ مشرکین سے زیادہ لوگوں نے ایمان قبول کیا اور یہود سے تھوڑے لوگوں نے ایمان قبول کیا۔

﴿ وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴾

۱) "اور جب ان کے پاس اللہ کی وہ کتاب (قرآن) آئی جو ان کے ساتھ والی کتاب (توراۃ) کی تصدیق فرماتی ہے اور اس سے پہلے وہ اس نبی کے وسیلہ سے کافروں پر فتح مانگتے تھے تو جب تشریف لایا ان کے پاس وہ جانا پہچانا اس سے منکر ہو بیٹھے تو اللہ کی لعنت منکروں پر"۔

۲) "اور جب آئی ان کے پاس کتاب اللہ کی طرف سے جو تصدیق کرتی ہے اس کی جو ان کے پاس ہے اور وہ تھے اس سے پہلے فتح طلب کرتے ان لوگوں پر جو کافر ہوئے۔ تو جب آئے ان کے پاس وہ جن کو پہچانتے تھے کفر کیا انہوں نے ان سے تو لعنت ہے اللہ کی کافروں پر"۔

یہاں سے ایک اور نعمت اور بنی اسرائیل کا اپنی عادت کے مطابق انکار کرنے کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

بنی اسرائیل نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے آپ کے وسیلہ سے جنگ میں دعا کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کو فتح عطا فرماتا یہ ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عظیم نعمت تھی۔ لیکن جب آپ تشریف لائے تو بنی اسرائیل نے اپنی کتاب میں آپ کے بیان کئے ہوئے اوصاف سے آپ کو پہچان بھی لیا، لیکن پھر بھی آپ کی نبوت کو تسلیم نہ کیا انکار کیا، جس کی وجہ سے وہ کافر ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی لعنت کا مستحق قرار دیا۔

﴿ وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ﴾: ''اور جب آئی ان کے پاس کتاب اللہ کی طرف سے'' اس آیۃ کا عطف ہے ﴿ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ﴾ پر۔ ''کتاب'' سے مراد قرآن پاک ہے اس کی تنکیر یعنی تنوین تعظیم پر دلالت کر رہی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جب آئی ان کے پاس عظیم کتاب یقیناً سب سے عظیم کتاب قرآن پاک ہی ہے۔

'' ووصفه بما عنده للتشريف والايذان بانه جدير بان يقبل ما فيه ويتبع لانه من خالقهم والههم الناظر فى مصالحهم ''

پھر کتاب کا وصف یہ ذکر فرمایا کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے، اس سے کتاب اور بزرگی، برتری کا ذکر فرمایا اور اسی سے واضح طور پر یہ پتہ چل گیا کہ یہ کتاب جب عظیم کتاب ہے اور رب تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے جو ان کا خالق ہے اور ان کا معبود ہے وہ اپنے بندوں کی مصلحتوں کو نظر میں رکھتا ہے تو انہیں بھی چاہئے کہ وہ کتاب کے احکام پر عمل کریں اور اس کے تمام احکام کی حقانیت کو تسلیم کریں۔

﴿ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ﴾ ''تصدیق کرنے والی ہے اس کی جو ان کے پاس ہے'' یہ کتاب کی دوسری صفت ہے۔ البتہ پہلی صفت ﴿ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ﴾ کو پہلے ذکر فرمایا اس لئے کہ کتاب کا اللہ کی طرف سے ہونا اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ صفت پہلے درجہ کی ہے۔ اور دوسری صفت کا درجہ بھی بعد میں ہے کہ رب تعالیٰ نے اس کتاب کو اپنی طرف سے نازل فرمایا اور پہلی کتب کی تصدیق کرنے والی بنایا۔

(از روح المعانی)

﴿ لِمَا مَعَهُمْ ﴾ يعنى التوراة والانجيل يخبرهم بما فيها '' قرآن پاک تصدیق کرنے والا ہے جو ان کے پاس توراۃ اور انجیل ہیں ان کی۔ یعنی ان کو خبر دیتا ہے کہ جو تمہارے پاس اللہ کی کتابیں ہیں ان میں کیا ہے۔ اس طرح تمہیں قرآن پاک کے ہونے میں بلاشبہ ایمان لانا چاہئے۔

(از قرطبی)

'' مصدق لما معهم فى امر يتعلق بتكليفهم بتصديق محمد ﷺ فى النبوة ''

نبی کریم ﷺ کے اوصاف اور آپ کی نبوت اور آپ پر ایمان لانے کا ذکر توراۃ وانجیل میں تھا قرآن پاک نے بھی اس کی تصدیق فرمائی گویا کہ قرآن پاک دلائل نبوت میں ان کی کتب کے موافق

ہے۔ ہاں البتہ خیال یہ رہے " انہ لیس بموافق لما معھم فی سائر الشرائع " کہ قرآن پاک پہلی کتب کے تمام احکام شرائع میں ان کے موافق نہیں، بلکہ پہلی کتب کے کئی احکام کو قرآن پاک نے منسوخ فرمایا۔

" والمراد ان موافقته لكتبهم فيما يختص بالنبوة وما يدل عليها من العلامات والنعوت والصفات "

قران پاک پہلی کتب کے ان چیزوں میں موافق ہے جو نبوت کے ساتھ خاص ہیں اور نبوت پر دلالت کرنے والی علامت اور صفات ہیں۔ (از کبیر)

﴿ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ ان الفاظ مبارکہ کے نزول میں چند وجہ بیان کی گئی ہیں۔ راقم کے نزدیک وہ تمام ہی معتبر ہیں، ان میں کوئی تعارض نہیں کسی کے انکار کی ضرورت نہیں۔

" احدها ان اليهود من قبل مبعث محمد عليه السلام ونزول القرآن كانوا يستفتحون اى يسألون الفتح والنصرة وكانوا يقولون ، اللهم افتح علينا وانصرنا بالنبى الامى "

ایک وجہ سے شان نزول یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی بعثت (اعلان نبوت) سے پہلے اور قرآن پاک کے نازل ہونے سے پہلے یہود فتح ونصرت نبی کریم ﷺ کے وسیلہ سے طلب کرتے تھے اور یہ دعا کرتے تھے" اے اللہ ہمیں امی نبی کے وسیلہ سے فتح ونصرت عطا فرما۔ (از کبیر)

جب یہود اور مشرکین کے درمیان سخت لڑائی ہوتی تو یہود توراۃ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر رب تعالیٰ کے حضور عرض کرتے:

" اللهم انا نسألک بحق نبيک الذى وعدتنا ان تبعثه فى آخر الزمان ان تنصرنا اليوم على عدونا فينصرون "

اے اللہ بیشک ہم تجھ سے سوال کرتے ہیں تیرے نبی کے واسطے جس کا تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ تو ان کو آخر زمانہ میں مبعوث فرمائے گا کہ تو آج ہماری امداد فرما کہ ہم دشمن پر غالب آجائیں تو اللہ ان کی امداد فرماتا۔ (از روح المعانی)

" یعنی طلب فتح ونصرت میکر دند از جناب الهیٰ بنام ایں پیغمبر
ومیدانستند کہ نام او ایں قدرٰ برکت دارد کہ بسبب ذکر آں
وتوسلی باں فتح ونصرت حاصل میشود "
یعنی یہود نبی کریم ﷺ کا نام رب تعالیٰ کے حضور پیش کرنے فتح ونصرت طلب کرتے تھے
اور وہ جانتے تھے کہ اس نام میں بڑی برکت ہے کہ اس کے ذکر کی وجہ فتح ونصرت حاصل
ہوتی ہے۔

ابونعیم، بیہقی اور حاکم نے روایت بیان کی کہ وہ یہ دعا کرتے تھے۔

" اللھم ربنا انا نسألک بحق احمد النبی الامی الذی وعدتنا ان
تخرجہ لنا فی آخر الزمان وبکتابک الذی تنزل علیہ آخر ما ینزل ان
تنصرنا علی اعدائنا "
اے اللہ اے ہمارے بیشک ہم تجھ سے نبی امی حضرت محمد ﷺ کے وسیلہ سے سوال
کرتے ہیں جن کو تو نے آخر زمانہ میں مبعوث کرنا ہے اور تیری اس کتاب کے وسیلہ
سے تجھ سے دعا کرتے ہیں جس کتاب کو تو نے آخری نبی پر نازل کرنا ہے کہ تو ہمارے
دشمنوں کے مقابل ہماری امداد فرما۔ (از عزیزی)

" یستفتحون ای یستنصرون ، والاستفتاح الاستنصار " وہ لوگ امداد طلب کرتے
تھے استفتاح کا معنی استنصار (یعنی امداد طلب کرنا) آتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی
ہے کہ یہود کو جب کبھی شکست ہوئی تو انہوں نے رب تعالیٰ کے حضور یہ دعا فرمائی:

" انا نسئلک بحق النبی الامی الذی وعدتنا ان تخرجہ لنا فی آخر
الزمان الا تنصرنا علیھم "
بیشک ہم تجھ سے سوال کرتے ہیں نبی امی کے واسطہ سے جن کو آخر زمانہ میں مبعوث
کرنے کا تو نے ہمارے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ تو ہماری امداد فرما۔ (از قرطبی)

علامہ بیضاوی اور مظہری وغیرہما نے بھی یہی معنی درج کیا ہے لیکن افسوس کہ آج کل کے
مفسرین جو رسول اللہ ﷺ کی محبت سے دور ہیں انہوں نے اپنی اردو تفاسیر میں اس معنی کو نقل نہیں کیا۔
اصل ان کو اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی کا پتہ تو نہیں ہے نبی کریم ﷺ کے وسیلہ سے دعا کرنا ان کو پسند
نہیں لیکن نبی کریم ﷺ کی شان چھپانے سے چھپ نہیں سکتی۔

وسیلہ کے متعلق ارشادات مصطفوی:

" کان النبی ﷺ یستفتح بصعالیک المهاجرین ای یستنصر بدعائهم وصلوتهم"

نبی کریم ﷺ غریب مہاجرین سے امداد طلب کرتے تھے یعنی ان کی دعاؤں اور ان کو نمازوں کے وسیلہ سے رب تعالیٰ کے حضور دعا فرماتے وہ فتح سے نواز دیتا۔

☆ " روی النسائی عن ابی سعید الخدری ان النبی ﷺ قال انما نصر الله هذه الامة بضعفائها بدعوتهم و صلاتهم و اخلاصهم"

حضرت ابو سعید خدری ﷺ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس امت پر اس کے ضعیف لوگوں کی دعاؤں اور نمازوں اور خلوص سے امداد فرماتا ہے۔

☆ " وروی النسائی ایضا عن ابی الدرداء قال سمعت رسول الله ﷺ یقول ابغونی الضعیف فانکم انما ترزقون وتنصرون بضعفائکم"

حضرت ابو الدرداء ﷺ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا مجھے غریب لوگوں میں تلاش کرو، بیشک تمہیں رزق دیا جاتا ہے اور تمہاری امداد کی جاتی ہے تمہارے غریب لوگوں کے وسیلہ سے ہی۔

☆ عن ابی سعید الخدری عن النبی ﷺ قال یأتی علی الناس زمان یغز وفنام من الناس فیقال لهم فیکم من رأی رسول الله ﷺ فیقولون نعم فیفتح لهم ثم یغزو فنام من الناس فیقال لهم هل فیکم من رأی من صحب رسول الله ﷺ فیقولون نعم فیفتح لهم ثم یغزو فنام من الناس فیقال لهم فیکم من رأی من صحب من صحب رسول الله ﷺ فیقولون نعم فیفتح لهم"

(مسلم ج ۲ ص ۳۱۶ باب فضل الصحابة ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم)

حضرت ابو سعید خدری ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ (مسلمانوں کا) لشکر جہاد کرے گا تو ان سے پوچھا جائے گا کیا تم میں کوئی صحابی بھی ہے؟ وہ کہیں گے ہاں ہم میں صحابی ہیں تو صحابی کی برکت سے ان کو فتح حاصل ہو جائے گی۔ پھر ایک لشکر جہاد کرے گا تو

ان سے پوچھا جائے گا کیا تم میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کے صحابی کو (حالت ایمان میں) دیکھا ہو؟ وہ کہیں گے ہاں ہم میں ایسا شخص ہے تو ان کو اس تابعی کی برکت سے فتح حاصل ہوگی۔ پھر ایک لشکر جہاد کرے گا ان سے پوچھا جائے گا کیا تم میں سے ایسا شخص ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کے صحابی کے صاحب (تابعی) کو دیکھا ہو؟ تو وہ کہیں گے ہاں ہم میں ایسا شخص (تبع تابعی) موجود ہے تو ان کو اس تبع تابعی کے وسیلہ سے فتح حاصل ہوگی۔

دوسری وجہ شان نزول کی:

" نزلت فی بنی قریظة والنضیر کانوا یستفتحون علی الاوس والخزرج برسول اللہ ﷺ قبل المبعث "

یہ آیت بنی قریظہ اور بنی نضیر کے متعلق نازل ہوئی کہ وہ اوس اور خزرج پر رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے آپ کے وسیلہ سے فتح طلب کرتے تھے۔

تیسری وجہ:

" کانوا یقولون لمخالفیهم عند القتال هذا نبی قد اظل زمانه ینصرنا علیکم "

بنی اسرائیل اپنے مخالفین کو لڑائی کے وقت بتاتے تھے کہ اب آخرالزمان نبی کا زمانہ قریب آچکا ہے وہ جب تشریف لے آئیں گے تو تمہارے خلاف ہماری امداد کریں گے۔

چوتھی وجہ:

" کانوا یسالون العرب عن مولده ویصفونه بانه نبی من صفته کذا وکذا ویتفصحون عنه علی الذین کفروا ای علی مشرکی العرب "

بنی اسرائیل مشرکین عرب سے نبی کریم ﷺ کی ولادت کے متعلق سوال کرتے رہتے تھے کہ وہ آخرالزمان نبی ان ان صفات والے ہیں کیا وہ پیدا ہو چکے ہیں؟ (از کبیر بتغییر الترتیب)

تنبیہ: ان میں پہلی دو وجہ میں امداد طلب کرنا، فتح طلب کرنے کا معنی پایا گیا ہے جو زیادہ واضح معنی وہی ہے اور چوتھی وجہ میں " یستفتحون " کا معنی پوچھنا، وضاحت طلب کرنا ہے۔

لیکن دوسری وجہ میں معنی بیان کرنا لیا گیا ہے کہ وہ اپنے مخالفین سے بیان کرتے تھے کہ جب نبی کریم ﷺ تشریف لائیں گے تو وہ تمہارے خلاف ہماری امداد فرمائیں گے۔

﴿ یَسْتَفْتِحُوْنَ ﴾ کا یہ معنی کیسے لیا گیا ہے؟ جس میں طلب والا معنی نہیں۔ اس کے متعلق مظہری، روح المعانی، بیضاوی وغیرہ میں بیان کیا گیا ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ کیا مطلب ہے عبارت بیضاوی کی ملاحظہ ہو۔

"او یفتحون علیھم ویعرفونھم ان نبیا یبعث فیھم وقد قرب زمانه والسین للمبالغة"

﴿ یَسْتَفْتِحُوْنَ ﴾ کا معنی یا تو یہ ہے کہ وہ ان پر واضح طور پر کھول کر بیان کرتے اور ان کی پہچان کراتے کہ بیشک آخر الزمان نبی مبعوث ہونے ہی والے ہیں ان کا زمانہ قریب آ چکا ہے۔

بظاہر وہم تھا کہ باب استفعال میں "سین" طلب کے لئے آتا ہے۔ تو یہاں "سین" کا کوئی معنی نہیں تو اس کا جواب دیا گیا کہ اس معنی کے لحاظ سے "سین" مبالغہ کے لئے ہے۔ یعنی معنی یہ ہوا کہ وہ بہت واضح طور پر بیان کرتے ہیں اور بہت واضح پہچان کراتے ہیں۔

تمام معانی یک جا جمع کریں: اگر غور وفکر کیا جائے۔ اور تمام معانی کو جمع کر لیا جائے تو قرآن پاک کی عظمت سمجھ میں آئے گی کہ کیسی عظمت والی یہ کتاب ہے جس کے ایک ایک لفظ میں معانی ومطالب کے دریا موجزن ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے بنی اسرائیل کفار کے مقابل جنگ میں آپ کے وسیلہ سے فتح طلب کرتے تو ان کو فتح دی جاتی اور یہود کے خاص قبائل بنوقریظہ اور بنونضیر جب اوس اور خزرج کے مقابلہ میں آپ کے وسیلہ سے فتح طلب کرتے تو ان کو فتح دی جاتی۔ آپ کی تشریف آوری سے پہلے وہ آپ کے منتظر رہتے تھے مکہ کے مشرکین سے طلب کرتے رہتے تھے کیا ان صفات کا کوئی بچہ تو پیدا نہیں ہوا۔ اور وہ کفار کو بتاتے رہتے تھے کہ آخر الزمان نبی تشریف لانے والے ہی ہیں جب وہ تشریف لائیں گے تو وہ بھی ہماری امداد فرمائیں گے۔ جب وہ نبی تشریف لائے تو انہوں نے پہچاننے کے باوجود ان کا اقرار کر دیا۔

راقم کی اس وضاحت کے بعد اگر آپ انصاف کی نظر سے دیکھیں گے تو واضح ہو جائے گا کہ نبی کریم ﷺ کے وسیلہ سے فتح طلب کرنے کو نہ ذکر کرنا اور چھپانا بھی بے انصافی ہے۔ اور

"یستفتحون" کو یفتحون (بیان کرنا) کے معنی میں لینے کو رد کرنا بھی زیادتی ہے۔

﴿ فَلَمَّا جَاءَ هُمْ مَّا عَرَفُوْا ﴾ : "ما" موصولہ ہے جاء کا فاعل ہے اور عائد محذوف ہے:

"ای ما عرفوه یعنی محمدا ﷺ عرفوه بنعته فی التوراة"

یعنی انہوں نے اس ذات یعنی محمد ﷺ کو پہچان لیا کیونکہ ان کی صفات توراۃ میں موجود تھیں جو ان لوگوں نے پڑھی ہوئی تھیں اور جانتے تھے۔ (مظہری)

﴿ كَفَرُوْا بِهٖ ﴾ : "انہوں نے کفر کیا آپ سے" یعنی ان کے کفر کی وجہ ان کا حسد اور اپنے مال کی آمد اور ریاست کے زوال کا خطرہ ان کے کفر کا سبب تھا۔ پہچاننے کی باوجود انہوں نے انکار کر دیا۔

﴿ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكَافِرِيْنَ ﴾ "تو اللہ کی لعنت ہے کافروں پر" یعنی ان کا نبی کریم ﷺ کا انکار کرنا ایمان نہ لانا صریح کفر تھا اور کافر لعنت کے مستحق ہوتے ہیں۔

تنبیہ : "فالمراد الابعاد من خیرات الآخرة لان البعد من خیرات الدنیا لا یکون ملعونا"

کافروں پر لعنت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو آخرت کی مہربانیوں اور بھلائیوں سے دور کر دیا اس لئے کہ دنیا کی بھلائی سے دور رہنے والے کو ملعون نہیں کہتے۔ (از کبیر)

بلکہ فقیر و غریب اللہ تعالیٰ کی کامل رحمت کے مستحق ہوتے ہیں اور ان کی برکت سے دوسروں کو بھی رزق ملتا ہے۔

اعتراض : رب تعالیٰ نے جب یہ فرمایا ﴿ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا ﴾ اور کہو لوگوں سے اچھی بات اور یہاں فرمایا ﴿ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكَافِرِيْنَ ﴾ اللہ کی لعنت ہو کافروں پر۔ ان دونوں میں تطبیق کیسے ممکن ہے کہ اچھی بات بھی کرو اور ان پر لعنت بھی بھیجو لعنت کیسے اچھی بات ہے؟

جواب : "ان لعن من یستحق اللعن من القول الحسن" بیشک وہ شخص جو لعنت کا مستحق ہے اس پر لعنت بھیجنا اس کے حق میں اچھی بات ہی ہے۔ (از کبیر)

اعتراض : آیۃ کریمہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہود نبی کریم ﷺ کی نبوت کو پہچانتے تھے کیونکہ توراۃ میں اس کا ذکر تھا۔ اب اس میں دیکھنا یہ ہے کہ توراۃ میں نبی کریم ﷺ کی نبوت کا تفصیلی ذکر تھا۔ یا اجمالی۔

اگر تفصیلی ذکر تھا کہ فلاں شخص فلاں صورت سے متصف ہوں گے ان کی سیرت یہ ہوگی فلاں سال میں تشریف لائیں گے فلاں جگہ پر تشریف لائیں گے تو انکار کی گنجائش باقی نہیں رہتی کیونکہ توراۃ تو اتر سے منقول ہو رہی تھی۔ تو کس طرح ان تمام نے انکار کیا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ توراۃ میں نبی کریم ﷺ کا اجمالی طور پر ذکر تھا تو یہ کہنا کیسے صحیح ہے کہ انہوں نے آپ کو پہچان لیا۔

جواب: توراۃ میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف اجمالی طور پر ذکر تھے اس طرح ان میں تفصیل نہیں تھی کہ آپ کی تعیین ہو جاتی۔ البتہ نبی کریم ﷺ کے معجزات کے ذریعے ان صفات کو تاکید حاصل ہوگئی۔ اب ان کا انکار کرنا گویا کہ کامل پہچاننے کے بعد انکار تھا۔ (از کبیر)

ضیاء النبی سے اقتباسات: مفسر قرآن مفکر اسلام حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

علامہ ابن جوازی رقم طراز ہیں:

"وقال لهم معاذ بن جبل ولبشر بن البراء اتقوا الله واسلموا قد كنتم تستفتحون علينا بمحمد ﷺ وانا اهل شرك تخبرونا انه مبعوث وتصفونه لنا بصفته فقال سلام بن مشكم ما هو بالذى كنا نذكر لكم ماجاء نا بشئى نعرفه" (الوفاء ج اول ص ۴۴)

معاذ بن جبل اور بشر بن براء رضی اللہ عنہما نے فرمایا اے گروہ یہود اللہ سے ڈرو اور اسلام قبول کرو۔ تمہیں وہ بات بھول گئی جب ہم مشرک تھے تو تم حضور ﷺ کے وسیلہ سے ہم پر فتح حاصل کرتے تھے اور ہمیں بتاتے تھے کہ وہ مبعوث ہونے والے ہیں اور ان کی صفات کے بارے میں بھی ہمیں بتایا کرتے تھے سلام بن مشکم نے کہا نہیں یہ وہ نہیں ہیں جن کا ہم ذکر کرتے تھے یہ کوئی ایسی چیز لے کر نہیں آئے جسے ہم جانتے ہوں۔

حقیقت کے اس کھلے انکار کو بجز حسد اور بغض باطنی کے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ (ضیاء النبی ج اول ص ۴۹۵)

حضور ﷺ کا ذکر خیر توراۃ وانجیل میں:

عطاء بن یسار سے مروی ہے آپ کہتے ہیں میری ملاقات حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے ہوئی میں نے کہا حضور کی جن صفات کا ذکر خیر توراۃ میں آیا ہے ان سے مجھے آگاہ فرمایئے۔ آپ نے کہا بیشک توراۃ میں حضور کی وہی صفات بیان کی گئی ہیں جو قرآن میں بیان ہیں۔ پھر آپ نے

توراۃ کی مندرجہ ذیل آیۃ تلاوت کی۔

﴿ يا ايها النبي انا ارسلناك شاهدا ومبشرا ونذيرا ﴾ وحرزا للاميين انت عبدی ورسولی سميتک المتوكل لست بفظ ولا غليظ ولا صخاب فی الاسواق ولا تجزی بالسيئة السيئة ولكن تعفو وتغفر ولن يقبضه الله حتى يقيم به الملة العوجاء بان يقولوا لا اله الا الله فيفتح به اعيان عميا و آذنا صما وقلوبا غلفا (انفرد باخراجه البخاری)

توراۃ کی آیۃ کا ترجمہ: اے نبی ہم نے بھیجا ہے آپ کو گواہ بنا کر، خوشخبری دینے والا، بروقت ڈرانے والا امیوں کے لئے جائے پناہ، تو میرا بندہ ہے اور میرا رسول ہے میں نے تیرا نام المتوکل رکھا ہے نہ تو درشت خو ہے نہ سخت دل اور نہ بازاروں میں شور مچانے والا ہے تو برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتا بلکہ معاف کر دیتا ہے اور بخش دیتا ہے اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی طرف نہیں بلائے گا یہاں تک ایک ٹیڑھی ملت کو آپ کو ذریعے درست کر دے اور وہ سب کہنے لگیں " لا اله الا الله " اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعہ سے اندھی آنکھوں کو بینا بہرے کانوں کو شنوا (سننے والا) غلافوں میں لپٹے ہوئے دلوں کو نور ہدایت سے منور کر دے۔

(الوفا لابن الجوزی جلد اول ص ۳۷، ضیاء النبی جلد اول ص ۲۹۲)

نبی کریم ﷺ کو پہچاننے کے باوجود انکار کے ایک مثال:

علامہ ابن قیم لکھتے ہیں حضرت صفیہ (جن کو بعد میں ام المؤمنین بننے کا شرف حاصل ہوا) یہ حیی بن اخطب رئیس یہود کی بیٹی تھیں ان کے چچا کا نام ابو یاسر بن اخطب تھا، آپ کہتی ہیں کہ میرے والد اور میرے چچا تمام بچوں سے زیادہ میرے ساتھ محبت کرتے تھے جب بھی میں ان سے ملاقات کرتی تو مجھے اٹھا کر سینے سے لگا لیتے۔ جب اللہ کے پیارے رسول قبا میں تشریف لائے اور بنی عمرو بن عوف کے محلّہ میں قیام فرمایا تو میرا والد اور میرا چچا صبح اندھیرے منہ حضور کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے گئے اور سورج غروب ہونے کے بعد واپس لوٹے جب وہ واپس آئے میں نے محسوس کیا وہ تھکے ہوئے ہیں۔ افسردہ خاطر (پریشان دل) ہیں اور بڑی مشکل سے ہولے ہولے چل رہے ہیں میں نے حسب معمول ان کو محبت بھرے کلمات سے مرحبا کہا لیکن ان دونوں میں سے کسی نے میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا میں نے اپنے چچا ابو یاسر کو اپنے باپ سے یہ کہتے ہوئے سنا کیا یہ وہی ہیں؟

اس نے کہا بیشک خدا کی قسم، پھر چچا نے پوچھا کیا تم نے ان کو توراۃ میں بیان کردہ نشانیوں اور

صفات سے پہچان لیا ہے؟ اس نے جواب دیا بیشک خدا کی قسم پھر چچا نے پوچھا بتاؤ اب کیا خیال ہے؟

میرے باپ نے جواب دیا:

" عداوته و الله ما بقیت " خدا کی قسم جب تک زندہ رہوں گا ان سے عداوت کرتا رہوں گا۔

(هداة الحیاری ابن قیم ص ۴۰ ضیاء النبی جلد اول ص ۴۹۷ سیرت ابن هشام ج ۲)

﴿بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴾

۱) "کس برے مولوں انہوں نے اپنی جانوں کو خریدا کہ اللہ کے اتارے سے منکر ہوں اس کی جلن سے کہ اللہ اپنے فضل سے اپنے جس بندے پر چاہے وحی اتارے تو غضب پر غضب کے سزاوار ہوئے اور کافروں کے لئے ذلت کا عذاب ہے"۔

۲) "کتنی ہی بری چیز ہے کہ بیچا انہوں نے اس کے بدلے اپنی جانوں کو کہ وہ ان کا کفر کرنا ہے اس چیز کے ساتھ جو نازل فرمائی اللہ نے اس حسد سے کہ نازل کرتا ہے اللہ اپنے فضل سے جس پر چاہے اپنے بندوں سے تو وہ مستحق ہوئے غضب کے ساتھ غضب پر۔ اور کافروں کے لئے عذاب ہے ذلت کا"۔ (آیت ۹۰)

نبی کریم ﷺ پر اللہ تعالیٰ کے فضل سے وحی کا نازل ہونا حقیقت میں تمام انسانوں کے لئے نعمت تھی کہ وہ آپ پر ایمان لاکر " خیر الامة " (بہتر امت) بن جائیں۔ یہود کے لئے خصوصا نعمت تھی کہ وہ تو آپ کی انتظار کر رہے تھے لیکن وہ حسد اور سرکشی کی وجہ سے اس کو برداشت نہ کر سکے، انہوں نے کفر اختیار کیا اپنی جانوں پر عذاب کی پرواہ نہ کی تو گویا کہ انہوں نے کفر کو حاصل کیا اور اس کے بدلہ میں اپنی جانوں کو عذاب کے حوالے کر دیا۔

اس طرح انہوں نے پہلے بھی عیسیٰ علیہ السلام سے کفر کیا اب پھر نبی کریم ﷺ سے کفر کیا تو وہ غضب

پرغضب کے مستحق ہوئے۔اورانہوں نے اپنے آپ کوکفر کی وجہ غضب کا مستحق ٹھہرایااور پھرنبی کریم ﷺ کے ساتھ حسد کر کے اپنے آپ کواورزیادہ غضب کا مستحق بنالیا۔اس طرح وہ غضب پرغضب کے مستحق ہوئے جس کی وجہ سے وہ ذلت وخواری کے عذاب میں مبتلاء ہونے کے لائق ہوگئے۔

﴿ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ ﴾: ''کتنی ہی بری چیز ہے کہ بیچا انہوں نے اس کے بدلے اپنی جانوں کو'' ''بئس'' فعل ذم ہےاس میں ضمیر مستتراس کا فاعل ہے مانکرہ ہے شئی کے معنی میں ہے جوتمیز ہےاور ﴿ اِشْتَرَوْا ﴾اس کی صفت ہے۔ ﴿ اِشْتَرَوْا ﴾ کے دونوں معنی آتے ہیں بیچنا اورخریدنا زیادہ مفسرین کرام نے بیچنے والا معنی پسند کیا ہے تاہم علامہ رازی رحمہ اللہ نے خریدنے والا معنی راجح قراردیا۔

﴿ اَنْ یَّکْفُرُوْا بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾: ''وہ ان کا کفر کرنا ہےاس چیز کے ساتھ جو نازل فرمائی اللہ نے'' یہ جملہ مخصوص بالذم ہے جومبتداء محذوف کی خبر ہے وہ ہے ''ھو''

اب توجہ فرمائیں کہ یہاں تک جوذکر کیے گئے الفاظ مبارکہ کا مطلب کیا ہے کچھ وضاحت کی جاتی ہے۔جب ﴿ اِشْتَرَوْا ﴾ کو''بیع''(بیچنے) کے معنی میں لیا جائے تواس کا مطلب سمجھنے کے لئے پہلے یہ سمجھا جائے کہ مکلّف کوایمان لانے کا حکم دیا گیا تا کہ ایمان اسے جنت میں پہنچانے کا ذریعہ بن جائے۔تو یقیناً کفراسے آگ تک پہنچائے گا۔

جب انسان کسی ایک کواختیار کرے گا تواس کی حیثیت یہ ہوگی ''اختیار تملک سلعة علی سلعة'' سامان کے بدلے سامان کی ملکیت کواختیار کرنے کی جوحیثیت ہے۔جب کوئی شخص ایمان حاصل کر کے نجات اورکامیابی حاصل کرلے تواس وقت کہاجاتا ''نعم ما اشتری'' (اچھی چیز اس نے خریدی) یعنی اچھی چیز کو حاصل کیا۔اوراگرکوئی شخص کفرکواختیار کر کے اپنی عاقبت برباد کردے اورعذاب کا مستحق ہوجائے تو کہاجاتا ہے ﴿ بِئْسَمَا اشْتَرٰی ﴾ اس نے بری چیز خریدی۔

اب واضح ہوا کہ ﴿ اِشْتَرَوْا ﴾ کامعنی جب بیچنے والا لیا جائے تو ﴿ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ ﴾ کامعنی یہ ہوگا ''باعوا نفسھم بکفرھم'' بری ہے وہ چیز کہ انہوں نے اپنی جانوں کوکفر

کے بدلے بیچ دیا۔ان کے اس سودے کو بری چیز کہا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے:

" لان الذی حصلوہ علی منافع انفسھم لما کان الکفر صاروا بائعین انفسھم بذلک "

کہ انہوں نے اپنے نفسوں کے منافع کے خلاف کفر کو اختیار کیا تو گویا کہ وہ اپنے نفسوں کو کفر کے بدلے بیچنے والے ہوئے۔ یہ سودا ان کا یقیناً نقصان والا سودا تھا کہ منافع کے بدلے عذاب حاصل کیا تو یہ کتنی ہی بری چیز ہے۔ (از کبیر)

اس معنی کو راجح سمجھتے ہوئے علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا:

" ای باعوا فالانفس بمنزلۃ المثمن والکفر بمنزلۃ الثمن لان انفسھم الخبیثۃ لاتشتری بل تباع "

﴿اِشْتَرَوْا﴾ کا معنی یہ ہے انہوں نے بیچا ان کی جانیں مبیع (جس چیز کو بیچا جائے) کے درجہ میں ہیں۔اور کفر ثمن (یعنی بطور قیمت طے شدہ مال) کے درجہ میں ہے۔انہوں نے اپنی جانوں کو کفر کے بدلے بیچ دیا۔ یہ معنی کرنا بہتر کیوں ہے اس لئے کہ خبیث نفوس کو خرید اتو نہیں جاسکتا البتہ ان کو بیچا جاسکتا ہے۔ (روح المعانی)

لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ خریدنے والے معنی کو راجح سمجھ کر بیان کرتے ہیں کہ اشتراء کا معنی اس مقام پر ''خریدنا'' " ھو الاصح عندی " وہ میرے نزدیک زیادہ صحیح ہے اس لئے کہ مکلّف جب اللہ تعالیٰ کے عذاب کا اپنے نفس پر خوف رکھتا ہے تو وہ ایسے کام کرتا ہے جو اس کے گمان کے مطابق اسے عذاب سے بچانے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔اس صورت میں یہ کہا جائے گا " فکانہ اشتری نفسہ بتلک الاعمال " گویا کہ اس نے اپنی جان کو ان اعمال کے ذریعے خرید لیا۔

" فھولاء الیھود لما اعتقدوا فیما اتوا بہ انھا تخلصھم من العقاب وتوصلھم الی الثواب فقد ظنوا انھم قد اشتروا انفسھم بھا فذمھم اللہ تعالیٰ "

ان یہود کا بھی جب یہ اعتقاد تھا کہ ہم جو کام کر رہے ہیں اس کے ذریعے اپنے آپ کو عذاب سے چھڑا رہے ہیں اور ثواب حاصل کر رہے ہیں۔تو انہوں نے اپنے گمان کے مطابق اپنے نفسوں کو اپنے اعمال کے بدلے خرید ا چونکہ ان کا گمان باطل تھا۔جس کام کو وہ ثواب کا ذریعہ اور عذاب سے بچنے

کا ذریعہ سمجھ رہے تھے وہ حقیقت میں ان کے لئے عذاب کا ذریعہ تھا۔ اسی لئے رب تعالیٰ نے ان کی مذمت بیان فرمائی۔ (از کبیر)

﴿ اَنْ یَّکْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ ﴾ سے ماقبل کی وضاحت فرمادی کہ وہ بری چیز کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ نے جو نازل فرمایا اس سے کفر کرنا ہے۔

" ولا شبھة ان المراد بذلک کفرھم بالقرآن لان الخطاب فی الیھود و کانوا مؤمنین بغیرہ "

یہود چونکہ اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن اور فرشتوں وغیرہ پر ایمان رکھتے تھے صرف وہ قرآن پاک پر ایمان نہیں رکھتے تھے، اسی لئے یہاں ﴿ اَنْ یَّکْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ ﴾ ذکر کیا کہ ان کا کفر اس چیز سے تھا جس کو رب تعالیٰ نے اتارا۔ مراد اس سے قرآن پاک ہی ہے۔ (از کبیر)

﴿ بَغْیًا اَنْ یُّنَزِّلَ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ ﴾:

''اس حسد سے کہ نازل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے''۔

یہاں سے ان کے کفر کی وجہ بیان کی جارہی ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والے کلام (قرآن) سے کفر کیوں کرتے تھے؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس پر حسد کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے فضل کرکے اس پر وحی نازل کردیتا ہے۔

" انھم ظنوا ان ھذا الفضل العظیم بالنبوۃ المنتظرۃ یحصل فی قومھم فلما وجدوہ فی العرب حملھم ذلک علی البغی والحسد "

اصل وجہ ان کے حسد کی یہ تھی کہ وہ اس کے منتظر تھے کہ آخر الزمان نبی ہماری قوم میں آئیں گے۔ جن کی وجہ سے ہمیں رب تعالیٰ کا عظیم فضل حاصل ہوگا۔ لیکن جب نبی کریم ﷺ عرب میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں تشریف لے آئے تو وہ آپ سے حسد کرنے لگے اور حد سے تجاوز کرنے لگے۔

(از کبیر)

﴿ اَلْبَغْیَ ﴾ کا معنیٰ ظلم اور فساد ہے عرب کہتے ہیں " بغی الجرح " زخم فاسد ہوگیا (یعنی زیادہ خراب ہوگیا) " وقیل اصلہ الطلب " ، البغی '' کا حقیقی معنیٰ ''طلب کرنا'' ہے پھر طلب کی

مختلف قسمیں ہیں۔اگر کسی کی نعمت کے زوال کی طلب پائی جائے تو" بغی " کا معنی" حسد کرنا" اور اگر کسی پر تجاوز کرنا مطلوب ہو تو" بغی " کا معنی "ظلم کرنا" اور اگر بدکاری کی طلب ہو تو" بغی" کا معنی " فجور " ہوگا۔

" والمراد به هنا بمعونة المقام طلب ما ليس لهم فيؤل الى الحسد "

یہاں آیۃ کریمہ میں" بغی " کا مطلب یہ ہے طلب کرنا اس چیز کا جس کے وہ حقدار نہیں تھے وہ ساتھ ساتھ یہ بھی تمنا کر رہے تھے کہ نبی کریم ﷺ پر اللہ تعالیٰ کا جو فیضان ہے وہ زائل ہو جائے۔اس لئے بغی کا معنی یہاں "حسد" لیا گیا ہے۔

﴿ وَقِيلَ ﴾ ، الظلم " یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ "بغی" کا یہاں معنی "ظلم" ہے۔(از روح المعانی)

لیکن راقم کے نزدیک دونوں معانی بیک وقت پائے جاتے ہیں کیونکہ حسد مستلزم ہے ظلم کو۔

تنبیہ :اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے " بغیا " کا ترجمہ "جلن" کیا ہے۔جب کہ مفسرین کرام نے "حسد" معنی بیان کیا ہے درحقیقت "حسد" بھی مجازی معنی ہے اور جلن بھی مجازی معنی ہے راقم کے خیال میں اعلیٰ حضرت نے اس حدیث کو مدنظر رکھتے ہوئے ترجمہ کیا ہے۔

☆ " عن ابی هريرة عن النبی ﷺ قال اياكم الحسد فان الحسد ياكل الحسنات كما تاكل النار الحطب " (رواه ابو داؤد ، مشكوة باب ما ينهى عنه من التهاجر)

حضرت ابو ہریرہ ﷺ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے تم اپنے آپ کو حسد سے بچا کر رکھو بیشک حسد نیکیوں کو ایسے کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔

اس حدیث شریف میں حسد کو آگ سے تشبیہ دی گئی یعنی کسی کی نعمت کو دیکھ کر دل میں اس طرح جلن پیدا ہوتی ہے جس طرح آگ سے جلن پیدا ہوتی ہے جب وہ دوسرے کی نعمتوں کا زوال طلب کرتا ہے تو وہی جلن اس کی نیکیوں کو جلا کر خاکستر بنا دیتی ہے۔

"واعلم ان هذه الآية تدل على ان الحسد حرام "

"بیشک یہ آیۃ اس پر دلالت کر رہی ہے کہ حسد حرام ہے"۔ (کبیر)

﴿ فَبَآءُوا بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ﴾ : "تو وہ مستحق ہوئے غضب کے ساتھ غضب پر"

"باء وا" کا حقیقی معنی ہے " رجعوا " وہ لوٹے۔ یہی معنی خازن نے بیان کیا ہے۔ لیکن ابن کثیر نے بیان کیا:

" ومعنى باء وا استوجبوا واستحقوا واستقروا بغضب على غضب "

" بــاء وا " کا معنی یہ ہے وہ لائق ہوئے، وہ مستحق ہوئے، انہوں نے حاصل کیا۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے ''وہ سزاوار ہوئے'' راقم نے بھی اسی کے مطابق تحریر کیا ''وہ مستحق ہوئے''۔

بغضب علی غضب کے معانی میں وسعت: پہلے ''غضب'' اور دوسرے ''غضب'' کے مختلف مطالب ہیں ان میں کئی وجوہ ہیں یعنی ایک جملہ کے کئی مطالب ہیں۔

" وقال ابو العالية غضب الله عليهم بكفرهم بالانجيل وعيسى ثم غضب الله عليهم بكفرهم بمحمد ﷺ وبالقرآن "

(۱) یعنی انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام سے کفر کیا تو وہ غضب کے مستحق ہوئے پھر انہوں نے نبی کریم ﷺ سے کفر کیا تو پھر غضب کے مستحق ہوئے۔

(۲) پہلے انجیل سے کفر کرنے کی وجہ سے غضب کے مستحق ہوئے۔ پھر قرآن پاک سے کفر کی وجہ سے غضب کے مستحق ہوئے۔

(۳) " قال السدى اما الغضب الاول فهو حين غضب عليهم فى العجل واما الغضب الثانى فغضب عليهم حين كفروا بمحمد ﷺ "

جب انہوں نے بچھڑے کی پوجا کی تو اس وقت وہ غضب کے مستحق ہوئے۔ اور پھر جب انہوں نے نبی کریم ﷺ سے کفر کیا تو غضب کے مستحق ہوئے۔ (ابن کثیر)

زیادہ بہتر یہ ہے:

" ليس المراد اثبات غضبين فقط بل المراد اثبات انواع من الغضب مترادفه لاجل امور مترادفه صدرت عنهم نحو قولهم (عزير ابن الله ، يد الله مغلولة ، ان الله فقير ونحن اغنياء) وغير ذلک من انواع كفرهم "

یعنی غضب پر غضب سے مراد صرف دو غضب نہیں۔ بلکہ ان کے کفریات بہت تھے، ہر کفر کی وجہ سے وہ غضب کے مستحق ہوئے، لہٰذا کئی قسم کے کفریات کے وجہ سے کئی قسم کے غضب کے مستحق ٹھہرے۔ ان کے ان گنت کفریات سے تین مثالیں علامہ رازی رحمہ اللہ نے پیش فرمائی ہیں۔

انہوں نے کہا" عزیر ابن الله " حضرت عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ رب کی اولاد ماننا کفر ہے۔ اور انہوں نے کہا" ید الله مغلولة " اللہ کے ہاتھ تنگ ہیں۔ معاذ اللہ رب تعالیٰ کو تنگدست کہہ کر وہ کفر کے مرتکب ہوئے۔ اور انہوں نے کہا ﴿ اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَاءُ ﴾ "بیشک اللہ تعالیٰ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ اس طرح کے ان کے کثیر کفریات پائے جاتے ہیں یقیناً کثیر غضبوں کے بھی مستحق ہیں۔ (از کبیر)

ایک معنی یہ بھی ہے:

" ان المراد به تاكيد الغضب وتكثيره لاجل ان هذا الكفر وان كان واحدا الا انه عظيم "

بیشک دوسرا غضب پہلے غضب کی تاکید ہے، کثرت اس لحاظ سے ہے کہ اگرچہ ان کا کفر قرآن پاک سے ایک کفر ہے، مگر عظیم کفر ہے، اس لئے وہ بہت بڑے غضب کے مستحق ہوئے۔ (از کبیر)

﴿ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴾ : "اور کافروں کے لئے عذاب ہے ذلت کا" جب ان کے کفر کا سبب حسد اور ظلم تھا جس کی اصل وجہ ان کا تکبر تھا۔ تکبر ذلت کا ذریعہ ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ﴾

بیشک وہ لوگ جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں وہ جہنم میں داخل ہوں گے ذلیل ہو کر۔

خیال رہے کہ حدیث شریف میں " عبادتی " دعا کے معنی میں بھی استعمال ہے۔ اس آیۃ کریمہ سے واضح ہوا کہ تکبر باعث عذاب اور باعث ذلت ہے خواہ وہ تکبر عبادت سے ہو خواہ دعا سے ہو خواہ ایمان نہ لانے سے ہو۔

☆ " عن عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده عن النبى ﷺ قال يحشر لمتكبرون يوم القيامة امثال الذر فى صور الناس يعلوهم كل شئى من الصغار حتى يدخلوا سبحنا فى جهنم يقال له بولس تعلوهم نار الانيار يسقون من طينة الخبال عصارة اهل النار "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن متکبر لوگ چھوٹی چھوٹی چیونٹیوں کی طرح ہوں گے اگرچہ شکلیں ان کی انسانوں والی ہی ہوں گی۔ ان کی ذلت اور حقارت کی وجہ سے ان پر تمام چیزوں کو بلندی حاصل ہوگی یہاں تک کہ ان کو جہنم کے قید خانہ میں داخل کر دیا جائے گا جس کو "بولس" کہا جاتا ہے ان پر

بہت شدید آگ چھا جائے گی ان کو جہنمیوں کا خون اور پیپ پلائے جائیں گے۔ (ابن کثیر)

فائدہ : "مھین" ماخوذ ہے "ھوان" سے

"وھو ما اقتضی الخلود فی النار دائما بخلاف خلود العصاۃ من المسلمین فان ذلک تمحیص لھم وتطھیر"

جو تقاضا کرتا ہے جہنم میں ہمیشہ رہنے کا، بخلاف نافرمان مسلمانوں کے ان کو عذاب زیادہ دیر تک تو ہوسکتا ہے جس طرح قاتل کو ہونا ہے لیکن ہمیشہ عذاب ہو جہنم سے نہ نکالا جائے ایسا نہیں ہوگا اور مومنین کو عذاب بھی صرف پاک وصاف کرنے کے لئے ہوگا۔ (از قرطبی)

﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ (۹۱)

۱) "اور جب ان سے کہا جائے کہ اللہ کے اتارے پر ایمان لاؤ تو کہتے ہیں وہ جو ہم پر اترا اس پر ایمان لاتے ہیں اور باقی سے منکر ہوتے ہیں۔ حالانکہ وہ حق ہے ان کے پاس والے کی تصدیق فرماتا ہوا تم فرماؤ کہ پھر اگلے انبیاء کو کیوں شہید کیا اگر تمہیں اپنی کتاب پر ایمان تھا"۔

۲) "اور جب ان کو کہا جاتا ایمان لاؤ اس پر جو اللہ نے نازل فرمایا۔ تو وہ کہتے ہیں ہم لاتے ہیں اس پر جو ہم پر اتارا گیا، اور کفر کرتے ہیں اس سے جو اس کے ماسواء ہے حالانکہ وہ حق ہے تصدیق کرنے والا ہے اس کی جو ان کے پاس ہے۔ فرمادیجئے تو کیوں تم شہید کرتے رہے اللہ کے نبیوں کو اس سے پہلے، اگر تم ایمان والے تھے"۔

یہاں سے یہود کی ایک اور قباحت کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ جب ان کو کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ نازل کیا یعنی قرآن پاک، توراۃ اور انجیل ان تمام پر ایمان لاؤ، تو وہ رب تعالیٰ کے اس ارشاد پر جواب یہ دیتے ہیں کہ ہم تو ایمان صرف اس پر لاتے ہیں جو ہماری طرف نازل ہوا یعنی ہمارا ایمان تو صرف توراۃ پر ہے اور وہ اس کے ماسوا سے کفر کرتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے کہا کہ وہ توراۃ کے بغیر باقی کتب قرآن اور انجیل کو تسلیم نہیں کرتے حالانکہ وہ حق ہے جس کی حقانیت حقیقت میں بھی ہے۔ اور اس کی حقانیت کو یہ لوگ بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے اس جھوٹے دعوی کو کہ ہمارا ایمان توراۃ پر ہے رب تعالیٰ نے رد کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ کو فرمایا اے محبوب تم فرما دو کہ اگر تم اپنے اس دعوی میں سچے ہو کہ تمہارا ایمان توراۃ پر ہے تو انبیاء کرام کو شہید کیوں کرتے رہے کیا توراۃ میں ناحق قتل کرنے سے منع کیا گیا؟

واضح ہوا کہ تمہارا دعوی جھوٹا ہے حقیقت یہ ہے کہ تمہارا ایمان توراۃ پر بھی نہیں۔

﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾:

''اور جب ان کو کہا جاتا ایمان لاؤ جو اللہ نے نازل فرمایا'' ﴿ لَهُمْ ﴾ میں ضمیر یہود کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یعنی جب یہود کو کہا جاتا ایمان لے آؤ۔

﴿ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾ سے مراد بعض حضرات نے فقط قرآن پاک لیا ہے کہ یہود کو جب کہا جاتا کہ تم قرآن پر ایمان لاؤ لیکن بعض حضرات نے بیان فرمایا " ای بکل بما انزل اللہ " کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا اس پر ایمان لاؤ۔ عموم والا معنی لینا اس لئے زیادہ بہتر ہے کہ " ما " ، " الذی " کے معنی میں ہے جس میں عموم پایا گیا۔ ان کو جب تمام آسمانی کتب پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا تو انہوں نے بعض پر ایمان کا دعوی کیا اور بعض سے کفر کا اقرار کیا تو رب تعالیٰ نے ان کی مذمت بیان کی۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ یہود انجیل کو اللہ تعالیٰ کی کتاب نہیں مانتے تھے اور عیسیٰ علیہ السلام کو

اللہ تعالیٰ کا نبی نہیں تسلیم کرتے تھے۔ یہ خطاب چونکہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ کو ہے تو ان کو گویا کہ کہا گیا تم قرآن پاک پر ایمان لاؤ کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اور محمد ﷺ آخری نبی ہیں۔ اور اب عمل صرف قرآن پاک پر ہی ہوسکتا ہے باقی کتب منسوخ ہوچکی ہیں۔

اور انجیل پر تمہارا یہ ایمان ہونا ضروری ہے کہ وہ اللہ کی کتاب ہے عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی اور وہ اللہ کے نبی ہیں۔ لیکن اب وہ منسوخ ہوگئی اب اس کے احکام پر عمل نہیں ہوسکتا۔

اور توراۃ پر تمہارا ایمان اس طرح ہو کہ توراۃ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور اللہ کے نبی موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی اس کے جمیع احکام سچے ہیں۔ یہ نہیں کہ جو دل نے مان لیا اسے سچا کہہ لیا اور جو دل نے نہ مانا اسے بدل ڈالا اور توراۃ کے متعلق بھی تمہارا ایمان یہ ہو کہ یہ منسوخ ہوچکی ہے۔ (از کبیر)

﴿ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا ﴾ :

''انہوں نے کہا ہم ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو ہم پر نازل فرمائی''۔ یعنی ان کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا ایمان توراۃ پر ہے۔ اور اُن صحیفوں پر بھی ہمارا ایمان ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی تائید کرتے ہیں۔ (کبیر)

﴿ وَیَکْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ﴾ : ''اور کفر کرتے ہیں اس کے ماسواء سے''

" ثم اخبر الله تعالیٰ عنهم انهم یکفرون بما وراءه وهو الانجیل والقرآن واورد هذه الحکایة عنهم علی سبیل الذم لهم "

یہود چونکہ خود بھی کہتے تھے کہ ہم تو توراۃ کے بغیر قرآن اور انجیل کو تسلیم نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت بیان کرتے ہوئے اور ان کے اقوال کے حکایت بیان کرتے ہوئے بیان فرمایا کہ وہ اس کے ماسواء سے کفر کرتے ہیں۔ (از کبیر)

فائدہ : جب دلائل سے واضح ہوچکا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی تمام کتابیں حق ہیں اور ان کا رب تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونا بھی دلائل سے ثابت ہوچکا تھا تو ان پر ایمان لانا واجب ہوگیا۔

" فثبت ان الایمان ببعض ما انزل الله دون البعض تناقض "

اسی سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کی بعض کتب پر ایمان رکھنا اور بعض کے ساتھ نہ رکھنا معتبر ہی نہیں۔ یعنی یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ قرآن پاک اور انجیل پر وہ ایمان نہ رکھیں اور توراۃ پر ان کا ایمان صحیح ہو کیونکہ توراۃ تو خود حکم دیتی ہے کہ ان کتب کو اللہ تعالیٰ کا کلام سمجھ کر ایمان لاؤ۔ (از کبیر)

﴿ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ﴾:

''اور وہ حق ہے تصدیق کرنے والا ہے اس کو جو ان کے پاس ہے'' '' ھو '' ضمیر ماوراء کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی توراۃ کے ماسوا جس کو وہ تسلیم نہیں کرتے حقیقت میں وہ حق ہے تصدیق کرنے والی ہیں جو ان کے پاس ہے یعنی قرآن پاک اور انجیل توراۃ کی تصدیق کرنے والی کتابیں ہیں۔

طلباء کرام توجہ فرمائیں: ﴿ وَهُوَ الْحَقُّ ﴾ میں حصر حقیقی نہیں، کہ توراۃ کے ماسواء یعنی قرآن اور انجیل ہی فقط حق ہیں۔

" لانہ جمیع کتب اللہ حق لا سیما التوراۃ لان کون القرآن مصدقالها یدل علی حقیتها ایضا "

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام کتب ہی حق ہیں۔ خاص کر کے توراۃ بھی حق ہے کیونکہ قرآن پاک جب توراۃ کی تصدیق کرنے والا ہے تو یقینی طور پر توراۃ کا حق ہونا ثابت ہو گیا۔

لہٰذا ﴿ وَهُوَ الْحَقُّ ﴾ میں حصر ادعائی ہے کیونکہ وہ " ماوراءہ " کو ہی فقط ناحق سمجھ رہے تھے تو ان کا رد کرتے ہوئے۔ ادعائی طور پر اسی " ماوراءہ " کے حق ہونے کو بطور حصر بیان کر دیا گیا۔ (از شیخ زادہ)

اور یہ بھی خیال رہے '' وراء '' اصل میں مصدر ہے وراہ یریہ، قضی یقض کی طرح آتا ہے جس کا معنی ہوتا ہے ''مخفی کرنا''۔ پھر یہ ظرف کے معنی میں غالب استعمال ہوتا ہے۔ اور اکثر طور پر '' خلف '' (پیچھے آنا) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن بعض اوقات '' قدام '' کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ " من ورائهم جهنم " اور " وكان ورائهم ملك " میں " وراء " سامنے، آگے کے معنی میں استعمال ہے۔ (از شیخ زادہ)

" خلف " کے معنیٰ کا اعتبار کرتے ہوئے " وراء " کا معنیٰ " سواء " بھی کرلیا جاتا ہے۔

" اما قوله تعالیٰ ﴿ وهو الحق مصدقا لما معهم ﴾ فهو كالاشارة الى ما يدل على وجوب الايمان بمحمد ﷺ "

اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ﴾ سے واضح ہوجاتا ہے کہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لانا ضروری ہے اس پر دو دلیلیں ہیں۔

پہلی دلیل ﴿ وَهُوَ الْحَقُّ ﴾ ہے اس لئے کہ جب نبی کریم ﷺ پر معجزات کا ظہور ہوا اور ان کی وجہ سے آپ کی نبوت واضح طور پر ثابت ہوگئی۔ پھر آپ نے خبر دی کہ بیشک یہ قرآن اللہ کی طرف سے نازل ہوا اور مکلفین کو قرآن پر ایمان لانے کا حکم دیا" وكان الايمان به واجبالا محالة " تو یقیناً آپ کے ساتھ ایمان لانا واجب ہوگیا کیونکہ قرآن پاک تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لانے کا حکم دیتا ہے۔

" وعند هذا يظهر ان الايمان ببعض الانبياء وبعض الكتب مع الكفر ببعض الانبياء وبعض الكتب محال "

یہاں سے ہی یہ بھی واضح ہوگیا کہ بعض انبیاء کرام اور بعض آسمانی کتب پر ایمان لانا، اور بعض انبیاء کرام اور بعض کتب سے کفر کرنا محال ہے۔

دوسری دلیل ﴿ مُصَدِّقاً لِّمَا مَعَهُمْ ﴾ ہے اس کی تقریر دو وجہ سے ہے۔ ایک یہ کہ نبی کریم ﷺ نے کسی سے علم حاصل نہیں کیا آپ نے کسی استاذ سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا۔ لیکن آپ نے واقعات جو بیان فرمائے وہ توراۃ کے موافق تھے ان میں کوئی فرق نہیں تھا۔

" علمنا انه عليه الصلوة والسلام انما استفادها من الوحی والتنزيل "

اسی سے واضح طور پر علم حاصل ہوگیا کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے وحی اور قرآن پاک سے فائدہ حاصل کیا۔ اس دلیل کا بیان دوسری وجہ سے اس طرح ہے۔ بیشک قرآن پاک نبی کریم ﷺ کی نبوت پر دلالت کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بیان فرمایا کہ قرآن پاک توراۃ کی تصدیق کرتا ہے۔

تو اسی سے واضح ہو جاتا ہے کہ توراۃ کا نبی کریم ﷺ کی نبوت کی خبر پر مشتمل ہونا ضروری ہے۔ ورنہ قرآن پاک توراۃ کی تصدیق کرنے والا نہیں بن سکتا بلکہ تکذیب کرنے والا ہوگا۔

" واذا كانت التوراة مشتملة على نبوة محمد عليه الصلوة والسلام وهم قد اعترفوا بوجوب الايمان بالتوراة لزمهم من هذه الجهة وجوب الايمان بالقرآن وبنبوة محمد عليه الصلوة والسلام "

جب توراۃ نبی کریم ﷺ کی نبوت پر مشتمل ہے تو انہوں نے جب جب اعتراف کر لیا توراۃ پر تو ہمارا ایمان لانا ضروری ہے تو اسی سے ثابت ہو گیا کہ قرآن پاک پر ایمان لانا ضروری ہے اور حضرت محمد ﷺ کی نبوت پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ (از کبیر)

﴿ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾:

''فرمادیجئے تو کیوں تم شہید کرتے رہے اللہ کے نبیوں کو اس سے پہلے اگر تم ایمان والے تھے''

یہاں سے اللہ تعالیٰ نے ان کے اس دعویٰ کو کہ ہمارا ایمان توراۃ پر ہے رد کیا کہ تمہارا دعویٰ غلط اور باطل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ توراۃ میں مذکور ہے کہ معجزہ نبی کی صداقت پر دلالت کرتا ہے۔ اور توراۃ اس پر دلالت کرتی ہے:

" من كان صادقا فى ادعاء النبوة فان قتله كفر "

''جو شخص نبوۃ کے دعویٰ میں سچا ہو اسے شہید کرنا کفر ہے''

" واذا كان الامر كذلك كان السعى فى قتل يحيى وزكريا وعيسى عليه السلام كفرا فلم سعيتم فى ذلك ان صدقتم فى ادعائكم كونكم مؤمنين بالتوراة "

''جب یہ ثابت ہو گیا کہ توراۃ میں انبیاء کرام کو شہید کرنا کفر بیان کیا گیا ہے تو یقیناً حضرت یحیٰ، حضرت زکریا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو شہید کرنے کی کوشش کفر تھی۔ جب تمہارا دعویٰ بھی یہ ہے کہ ہمارا ایمان توراۃ پر ہے تو پھر تم نے کیوں کوشش کی انبیاء کرام کو شہید کرنے کی''۔ (از کبیر)

خیال رہے رازی رحمہ اللہ نے " فلم سعتیم " ذکرفرمایا" فلم قتلتم " نہیں کہا۔ کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کواگر چہ انہوں نے شہید کرنے کی کوشش کی لیکن شہید کرنہیں سکے۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ کوشہید کرنے کی بھی انہوں نے کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔

نکتہ : " وفی اضافة (انبياء) الى الاسم الكريم تشريف عظيم وايذان بانه كان ينبغی لمن جاء من عند الله تعالیٰ ان يعظم وينصر لا ان يقتل " (روح المعانی)

لفظ انبیاء کی اضافت لفظ اللہ کی طرف اضافت تشریفیہ ہے جس سے یہ واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی عظیم ہستیاں قابل تعظیم ہیں۔ ان کی امداد کی جائے نہ کہ ان کوشہید کیا جائے۔

تنبیہ : خطاب اگر چہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود کو ہے لیکن مراد ان کے اسلاف ہیں جنہوں نے انبیاء کرام کوشہید کیا تھا، البتہ ان کو خطاب کرنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ اپنے آباء اجداد کے اس فعل پر رضامند تھے اسی لئے انہوں نے بھی نبی کریم ﷺ کوشہید کرنے کی کوشش کی۔

خیال رہے کہ بظاہر وہم یہ ہوتا ہے کہ مراد جب ان کے آباء اجداد ہیں تو ﴿ تَقْتُلُوْنَ ﴾ مضارع کا صیغہ حال پر دلالت کرنے والا کیوں ذکر کیا، ماضی کا صیغہ ذکر کیوں نہیں کیا؟ تو اس کا جواب واضح ہے کہ ان کی رضامندی کی وجہ سے مخاطبین یہی تھے کہ تم کیوں قتل کرتے ہو۔ (از کبیر)

☆☆☆☆☆

﴿ وَلَقَدْ جَآءَ كُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴾ (آیت ۹۲)

۱) ''اور بے شک تمہارے پاس موسیٰ کھلی نشانیاں لے کر تشریف لایا پھر تم نے اس کے بعد بچھڑے کو معبود بنالیا اور تم ظالم تھے''۔

۲) ''اور البتہ تحقیق لائے تمہارے پاس موسیٰ کھلی نشانیاں، پھر بنالیا تم نے بچھڑے کو معبود ان کے بعد، اور تم ظلم کرنے والے ہوئے''۔

یہ آیۃ کریمہ پہلے گزر چکی ہے، اس کی وضاحت کچھ ضرورت کے مطابق ذکر کر دی گئی۔ اب دوبارہ زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں رہے گی۔ البتہ مختصر وضاحت انشاء اللہ ذکر ہوگی۔

آیۃ کریمہ کے تکرار (دوبارہ ذکر کرنے) کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود کے طریقہ کے حکایت بیان فرمائی، اور ان کے عناد اور تکذیب کا ذکر فرمایا، تو ان کے آباؤ اجداد کا بھی ذکر فرمایا کہ وہ انبیاء کرام کو شہید کرتے رہے۔ اسلئے ان کی تکذیب کا ذکر موجود یہود سے زیادہ ضروری تھا۔ اس لئے موسیٰ علیہ السلام اور ان کی نشانیوں کا ذکر لوٹایا گیا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے واضح معجزات کو دیکھنے کے باوجود بچھڑے کی پوجا کرنے لگ گئے۔

" وهو مع ذلک صابر ثابت علی الدعاء الی ربه والتمسک بدینه وشرعه فکذلک القول فی حالی معکم وان بالغتم فی الکتذیب والانکار "

لیکن موسیٰ علیہ السلام صبر و استقلال سے ان کو رب تعالیٰ کی طرف بلاتے ہی رہے۔ اور فرماتے رہے کہ تم شریعت اور دین پر عمل کرو۔ گویا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہی میرا حال ہے تمہارے ساتھ اگرچہ تم میری تکذیب میں مبالغہ کر رہے ہو اور واضح طور پر انکار کر رہے ہو، لیکن میں بھی صبر استقلال سے تمہیں دعوت ایمان دے رہا ہوں۔ (از کبیر)

﴿ وَلَقَدْ جَآءَ كُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ﴾: ''اور البتہ تحقیق لائے تمہارے پاس موسیٰ کھلی

نشانیاں''۔ جب ان کو ایمان لانے کا حکم دیا تو انہوں نے کہا ہم تو توراۃ کے بغیر کسی چیز کو نہیں مانتے تو اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کرنا شروع کیا، اسی زجر وتوبیخ کا یہ حصہ ہے کہ تمہارے آباؤ اجداد کے پاس موسیٰ علیہ السلام معجزات لائے قطعی دلائل لائے لیکن وہ لوگ پھر بچھڑے کی پوجا کر کے ظالم ہوئے۔

تو گویا کہ ﴿ امنو ﴾ کے تحت داخل کر کے توبیخ کے لئے اس آیہ کریمہ کو ذکر کیا۔ اس لحاظ پر صرف لفظی تکرار رہے گا مقاصد علیحدہ علیحدہ ہوں گے۔ (از روح المعانی)

﴿ بالبینت ﴾ کا معنی واضح کھلی چیز ہے، یہاں کیا مراد ہے؟ یہاں اس کے مقصد میں وسعت پائی جاتی ہے:

(۱) " الدلائل الدالة علی صدقة علیه السلام فی دعوته "، بینات " کا ایک مطلب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایسے دلائل عطاء فرمائے جو آپ کی دعوت الی الحق (حق راہ کی تبلیغ) کی صداقت پر دلالت کرنے والے تھے۔

(۲) " المعجزات المؤیدة لنبوته کالعصا و لاید و انفلاق البحر " دوسرا معنی یہ ہے کہ آپ کو معجزات عطاء کئے گئے جو آپ کی نبوت کے لئے تائید تھے جس طرح عصا کا اژدہا بن جانا، ہاتھ کا سفید ہو کر چمکنا، اور دریا کا پھٹنا وغیرھا۔

(۳) " وقیل الاظهر ان یراد بها الدلائل الدالة علی الوحدانیة " بعض حضرات نے کہا زیادہ ظاہر یہ ہے کہ مراد اس سے وہ دلائل ہیں جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلالت کرتے ہیں۔ (روح المعانی)

" ﴿ بالبینت ﴾ ای بالآیات الواضحات و الدلائل القاطعات علی انه رسول الله و انه لا اله الا الله "

بینات کا معنی واضح نشانیاں اور قطعی دلائل جو اس پر دلالت کرتے ہیں کہ بیشک آپ اللہ کے رسول ہیں اور بیشک اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں۔ (ابن کثیر)

(۴) " والآیات البینات هی الطوفان و الجراد و القمل و الضفادع و الدم و العصاء و الید وفرق البحر وتظلیلهم بالغمام و المن و السلوی و الحجر وغیر ذلک من الآیات شاهدوها " (ابن کثیر)

واضح نشانیاں جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائیں وہ یہ تھیں طوفان، مکڑی، کیڑے،

مینڈک اور خون یہ چیزیں فرعون اور اس کے ساتھ ایمان رکھنے والے لوگوں کے لئے عذاب بنے جن کی تفصیل انشاء اللہ سورۃ اعراف میں آئے گی۔ تفسیر خزائن العرفان کے حوالہ سے راقم نے اپنی تصنیف تذکرۃ الانبیاء میں ان کا ذکر کیا ہے۔

اور واضح نشانیاں، عصا کا اژدہا بننا، ید بیضاء، اور دریا کا پھٹنا اور بادل کا سایہ کرنا اور من وسلوی کا نازل ہونا اور پتھر سے پانی کے چشموں کا جاری ہونا، اور ان کے بغیر بھی کئی واضح نشانیاں آپ کو عطا ہوئیں جو تمہارے پاس لائے اور تم ان کا مشاہدہ کررہے تھے۔

راقم کے نزدیک تمام معانی بیک وقت مراد ہیں علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے بھی اسے ہی اولی (بہتر) قرار دیا: " وعندی الحمل علی العموم بحیث یشمل ذلک ایضا اولی واظهر "

(روح المعانی)

اور میرے نزدیک عموم پر محمول کرنا ہی زیادہ ظاہر اور زیادہ بہتر ہے تاکہ تمام معانی کو شامل ہو جائے یعنی آپ کو ہر طرح کی واضح نشانیاں عطاء ہوئیں، معجزات عطاء ہوئے، آپ کی نبوت وصداقت پر دلالت کرنے والے دلائل حاصل ہوئے، اور آپ کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلالت کرنے والے دلائل قاطعہ (قطعی دلیلیں) عطاء کی گئیں۔

﴿ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ ﴾: ''پھر تم نے بنالیا بچھڑے کو معبود'' اگرچہ ظاہری طور پر صرف اتنا ہی معنی ہے کہ ''پھر تم نے بچھڑا بنالیا'' لیکن بچھڑا بنانا صرف سامری کا فعل تھا تمام کا نہیں۔ لہٰذا یہاں ایک مفعول محذوف ہے علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے کیا خوب تفسیر کی۔

﴿ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ ﴾ ای الذی صنعه لکم السامری من حلیکم الٰها "

پھر تم نے اس بچھڑے کو معبود بنالیا جو سامری نے تمہارے زیورات سے بنالیا۔

﴿ مِنْ بَعْدِهٖ ﴾: ''ان کے بعد'' یعنی موسیٰ علیہ السلام کے طور پر جانے کے بعد، جب آپ توراۃ لینے کے لئے اللہ تعالیٰ کے حکم سے طور پر گئے تو آپ کی غیر موجودگی میں سامری نے بنی اسرائیل سے زیورات لے کر ایک بچھڑا بنادیا جس کی ان لوگوں نے پوجا شروع کردی (زیادہ وضاحت چھٹے رکوع میں گزر چکی ہے)۔

عجیب نکتہ : " ثم " تراخی پر دلالت کرتا ہے یعنی یہ کام کچھ دیر کے بعد ہوا۔

" یشیر ھذا العطف علی انھم فعلوا ذلک بعد مھلة من النظر فی الآیات و ذلک اعظم ذنبا و اکثر شفاعة لحالھم "

لفظ " ثم " سے جو عطف کیا گیا ہے اس سے اس مسئلہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ انہوں نے بچھڑے کی پوجا واضح آیات کو دیکھنے کے بعد کی۔ جو ان کا عظیم گناہ تھا۔ اور بہت ہی زیادہ ان کے حال کے لئے برائی کا سبب تھا۔

﴿ وَ اَنۡتُمۡ ظٰلِمُوۡنَ ﴾ : " اور تم ظلم کرنے والے ہو" ظلم کا معنی یہ ہے " وضع الشئی فی غیر محله " ایک چیز کو جہاں رکھنا تھا اس سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھ دینا۔ اسی لئے علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ﴿ وَ اَنۡتُمۡ ظٰلِمُوۡنَ ﴾ کی تفسیر ان الفاظ سے کی " ای واضعون الشئی فی غیر محله اللائق به او مخلون بآیات اللہ تعالیٰ " تم ظلم کرنے والے ہو یعنی ایک چیز جہاں رکھنے کے قابل تھی وہاں سے ہٹا کر تم دوسری جگہ رکھنے والے ہو اور اللہ تعالیٰ کی آیات میں خلل ڈالنے والے ہو۔

" وفیھا التعریض بانھم صرفوا العبادة عن موضعھا الاصلی الی غیر موضعھا "

اور اس میں یہ اشارہ موجود ہے کہ بیشک انہوں نے عبادت کو اپنی اصلی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھ دیا کیونکہ عبادت تو صرف رب تعالیٰ کی ہو سکتی ہے لیکن انہوں نے بچھڑے کی عبادت شروع کر دی۔ اور مطلق ظلم کر کے یہ واضح کیا کہ انہوں نے بچھڑے کی عبادت کر کے عظیم ظلم کیا۔

" ان عبادة العجل کل الظلم و ان من ارتکبھا لم یترک شیأ من الظلم "

اس لئے کہ بچھڑے کی عبادت کرنا تمام کے تمام مظالم کو حاصل کرنا ہے اس لئے جس نے بچھڑے کی عبادت کا ارتکاب کیا اس نے ظلم کی آخری حد کو بھی عبور کر لیا، ظلم کا کوئی حصہ باقی رہنے نہیں دیا۔

نکتہ : جملہ اسمیہ دوام و استمرار پر دلالت کرتا ہے جس سے یہ مسئلہ واضح ہو گیا کہ گویا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کہا : " وانتم قوم عادتکم الظلم و استمر منکم و منه عبادة العجل " ظلم کرنا تمہاری عادت ہے اور تم ہمیشہ ظلم کرتے ہی رہتے ہو، تمہارے مظالم میں سے عظیم ظلم بچھڑے کی عبادت کرنا ہے۔

(ماخوذ از روح المعانی)

﴿ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاُشْرِبُوْا فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ (آیت ۹۳)

۱) ''اور یاد کرو جب ہم نے تم سے پیمان لیا اور کوہ طور کو تمہارے سروں پر بلند کیا لو جو ہم تمہیں دیتے ہیں زور سے اور سنو، بولے ہم نے سنا اور نہ مانا اور ان کے دلوں میں بچھڑا رچ رہا تھا ان کے کفر کے سبب تم فرمادو کیا برا حکم دیتا ہے تم کو تمہارا ایمان اگر ایمان رکھتے ہو''۔

۲) ''اور یاد کرو جب لیا ہم نے تم سے عہد اور بلند کیا ہم نے تمہارے (سروں) اوپر طور لے لو وہ چیز جو دی ہم نے تمہیں، مضبوطی سے، اور سنو، انہوں نے کہا ہم نے سنا، اور نافرمانی کی، اور پلادی گئی ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت بوجہ ان کے کفر کے۔ آپ فرمادیں بری ہے وہ چیز حکم دیتا ہے تمہیں جس کا تمہارا ایمان اگر ہو تم ایمان والے''۔

یہاں سے یہود کی اور قباحت کا ذکر کیا جارہا ہے رب تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے ان سے عہد لیا کہ جب ہم تمہیں کتاب عطاء کردیں تو اس کے احکام پر سختی سے عمل کرنا لیکن کتاب کے ملنے پر اس کے احکام کو سخت سمجھ کر انہوں نے انکار کردیا، تو ہم نے جبریل کو حکم دیا جس نے ان کے سروں پر طور پہاڑ کو اٹھا کر لا یا، پھر ہم نے ان کو کہا ہمارے حکم کو سنو، یعنی اسے سن کر قبول کرو، انہوں نے کہا ہم نے سنا لیکن وہ دل میں کہنے لگے ہم نے نافرمانی کی دراصل اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کافر ہو چکے تھے کیونکہ بچھڑے کو انہوں نے معبود مان لیا تھا اور بچھڑے کی محبت ان کے دلوں میں پلادی گئی جس کی وجہ سے ان کے دلوں میں بچھڑا رچ گیا تھا۔

رب تعالیٰ نے اپنے محبوب کریم ﷺ کو ارشاد فرمایا کہ آپ ہی ان کو فرمادیں وہ چیز بری ہے جس کا تمہیں تمہارا ایمان حکم دے رہا ہے یعنی بچھڑے کی محبت پر جو تمہارا ایمان ہے (اگر چہ حقیقت میں وہ کفر

ہے)وہ تمہارا ایمان جو تمہیں رب تعالیٰ کے حکم سے پھیر رہا ہے وہ تمہیں بری چیز کا حکم دے رہا ہے یعنی تمہیں جہنم کا ایندھن بنا رہا ہے اگر تم مومن ہو یعنی ادھر تمہارا ایمان کا دعوی اور ادھر بچھڑے کی پوجا اور رب کے احکام کی نافرمانی یہ تمہارے ایمان میں شک پیدا کرنے کے ذریعے ہیں۔

تنبیہ : ﴿ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ ﴾ تک الفاظ مبارکہ پہلے بھی گزر چکے ہیں تکرار اپایا گیا ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ عرب حضرات کا یہ طریقہ ہے کہ وہ جب کسی کلام میں زور دینا چاہیں ۔اس میں تاکید ثابت کرنا چاہیں تو وہ الفاظ کو مکرر (دوبارہ) ذکر کرتے ہیں۔اس لئے یہاں بھی تاکید کے لئے دوبارہ ذکر کر دیا گیا۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں ﴿ وَاسْمَعُوْا ﴾ سے لے کر آخر آیۃ تک زیادتی بھی ہے اس لئے کامل تکرار بھی نہیں۔(از کبیر) ان کے سروں پر پہاڑ کو اٹھا کر لانا اور ان کا یہ گمان کرنا کہ یہ ہم پر گرنے والا ہے اس کا سورۃ اعراف میں تفصیلی طور پر ذکر ہے۔ انشاء اللہ وہاں ہی ﴿ واذ نتقنا الجبل فوقهم كانه ظلة وظنوا انه واقع بهم ﴾ کے مطابق وضاحت کی جائے گی۔

شاہ عبدالعزیز صاحب نے ایک اور وجہ بیان کی کہ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ کے ان کے سروں پر اٹھانے کو دوبارہ ذکر کیا تو یہ تکرار ہے لیکن حقیقت میں تکرار نہیں، کیونکہ یہاں بعد میں ﴿وَاسْمَعُوْا﴾ ہے جس کا معنی ہے "سنو" اور پہلے جو ذکر ہے اس میں بعد میں ہے ﴿ واذكرو ﴾ یاد رکھو۔

گویا کہ یہ آیۃ واقعہ کی ابتداء ہے اور جو آیۃ پہلے گزر گئی وہ واقعہ کی انتہاء ہے کیونکہ سننا پہلے ہے اور یاد رکھنا بعد میں ہے۔ (عزیزی)

راقم کو علامہ رازی رحمہ اللہ کا قول ہی تحقیقی نظر آیا کیونکہ ﴿ وَاسْمَعُوْا ﴾ کا مطلب صرف سننا نہیں بلکہ سن کر قبول کرنا مراد ہے اسی لئے تو ان کے قول ﴿ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ﴾ کی مذمت بیان کی گئی۔لہٰذا ﴿ وَاسْمَعُوْا ﴾ اور ﴿ واذكروا ﴾ کا مفہوم تقریباً ایک ہی ہے کہ رب تعالیٰ کے احکام کو سن کر ہمیشہ کے لئے قبول کرلو یہ مفہوم ہے ﴿ وَاسْمَعُوْا ﴾ کا اور ان کو یاد رکھو یعنی ان پر ہمیشہ عمل کرو یہ مفہوم ہے ﴿ واذكروا ﴾ کا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

﴿ وَاسْمَعُوْا ﴾ ای استجيبوا واطيعوا ای فيما امرتم به" (خازن)

یعنی ﴿ وَاسْمَعُوْا ﴾ کا مطلب یہ ہے ان احکام کو قبول کرو اور فرمانبرداری کرو یعنی جن چیزوں

کا تمہیں حکم دیا جارہا ہے ان کو سن کر قبول کرو اور ان پر ہمیشہ کے لئے عمل جاری رکھو۔

﴿ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ﴾: ''انہوں نے کہا ہم نے سنا اور نافرمانی کی''

﴿ قَالُوْا سَمِعْنَا ﴾ قولک . ﴿ وَعَصَيْنَا ﴾ امرک . (ابو السعود)

انہوں نے کہا ہم نے تمہارے قول کو سنا اور اور تمہارے احکام کی نافرمانی کی۔ اسی طرح ان کے اس قول کا یہ مطلب بھی تھا:

" قالوا بلسان القال سمعنا وبلسان الحال وعصينا "

انہوں نے زبان سے کہا ہم نے سنا، اور دل میں کہا ہم نے نافرمانی کی۔

ایک قول یہ ہے کہ انہوں نے زبان سے تو کہا تھا ﴿ سَمِعْنَا ﴾ ہم نے سنا۔ لیکن ﴿وَعَصَيْنَا﴾ کے الفاظ انہوں نے اگر چہ زبان سے یا دل سے ادا تو نہیں کئے تھے لیکن اللہ تعالیٰ کے احکام پر دیدہ دانستہ عمل نہ کر کے انہوں نے ﴿ وَعَصَيْنَا ﴾ کا مظاہرہ کیا۔

لیکن اس قول کو علامہ رازی رحمہ اللہ نے رد کیا کہ بلا وجہ ظاہری معنی سے پھیرنا درست نہیں کیونکہ رب تعالیٰ نے ﴿ قَالُوْا ﴾ کے بعد ﴿ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ﴾ کا ذکر فرمایا جو ان کا مقولہ ہی ہو سکتے ہیں اسلئے زبان حال اور زبان مقال کا فرق ہو تو سکتا ہے لیکن مطلقاً قول کی نفی کسی حد تک بھی درست نہیں۔
(ماخوذ از کبیر، روح المعانی، قرطبی)

فائدہ عظیمہ: ان لوگوں کے سروں پر پہاڑ کا اٹھا کر لانا " انه من اعظم المخوفات " بیشک بہت بڑا ڈرانے کا ذریعہ تھا۔ لیکن وہ پھر اپنے کفر پر قائم رہے اور واضح طور پر یہ کہا ﴿ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ﴾ ہم نے سنا اور نافرمانی کی۔

" وهذا يدل على ان التخويف وان عظم لايوجب الانقياد "

یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اگر چہ بہت عظیم خوف بھی کیوں نہ دلا دیا جائے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ دل سے مطیع بھی ہو جائے۔ (از کبیر)

اسی سے اساتذہ کو بھی سبق حاصل کرنا چاہئے کہ وہ گالیاں دے کر، ظالمانہ مار سے اپنا رعب جمانے اور طلباء کو اپنا مطیع بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ محنت کر کے اسباق پڑھانے سے ہی، شفقت ومحبت سے ہی کسی کے دل میں کوئی آ سکتا ہے۔ بیہودہ گالیاں دینے والے استاذ کو ظاہری طور پر ان کے

شاگرد گالیاں دیں یا نہ دیں، دل میں گالیاں ضرور دیتے ہیں ۔ میرا اسکول کا ایک کلاس فیلو کہتا تھا میرا استاذ جب مجھے ایک مرتبہ گدھا کہتا ہے تو میں دل میں اسے دس مرتبہ گدھا کہتا ہوں تو گدھا، تو گدھا کی دل میں رٹ لگا دیتا ہوں۔

﴿ وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ ﴾ : ''ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت پلا دی گئی''

اگر چہ بظاہر معنی یہ ہے کہ ان کے دلوں میں بچھڑا پلا دیا گیا۔ لیکن یہاں مجاز کا استعمال ہے جس میں دو وجہ ہیں اس کی ایک وجہ یہ کہ حذف مضاف پایا گیا ہے یعنی معنی یہ ہے " واشربوا فی قلوبهم حب العجل " اور ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت پلا دی گئی۔

" معناه تداخلهم حبه والحرص علی عبادته کما یتداخل الصبغ الثواب "

اب اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت اور بچھڑے کی عبادت پر حرص ایسے داخل ہو چکی ہے جیسے کہ رنگ کپڑے میں سرایت کر جاتا ہے۔ اسی صورت کے مطابق اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہے ''ان کے دلوں میں بچھڑا رچ رہا تھا''۔

راقم کا ترجمہ بھی اسی صورت کے لحاظ پر ہے۔ البتہ راقم نے ابتدائی حذف مضاف کا لحاظ کرتے ہوئے ظاہری الفاظ کے مطابق ترجمہ کیا ہے اور اعلیٰ حضرت نے حاصل ہونے والے نتیجہ کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی:

" کما ان الشرب مادة لحیاة ما تخرجه الارض فکذا تلک المحبة
کانت مادة الجمیع ما صدر عنهم من الافعال "

کہ جس طرح پانی زمین کو پلایا جائے تو اس کے ذریعے زمین سے پودے اگتے ہیں۔ اسی طرح ان لوگوں کے دلوں میں بچھڑے کی جو محبت تھی وہ ان سے افعال کے صادر ہونے کا ذریعہ بنی۔ اس مناسبت کی وجہ سے ان کے دلوں کی محبت کو پانی کے پلائے جانے سے تشبیہ دی گئی۔ (از کبیر)

تنبیہ : بعض حضرات نے ذکر فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے بچھڑے کا برادہ بنایا اور اس کو پانی میں بہا دیا۔ پھر بنی اسرائیل کو کہا یہ پانی پیو، تو سب نے پانی پیا۔ جن کے دلوں میں بچھڑے کی محبت تھی ان کے ہونٹ زرد ہو گئے جیسے کہ سونے کا رنگ ہوتا ہے۔

اور ایک قول یہ بھی ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں بچھڑے کی محبت تھی وہ پانی پینے سے مجنوں

ہو گئے۔ یہ ذکر کرنے کے بعد علامہ قرطبی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں:

" اما تذریتہ فی البحر فقد دل علیہ قولہ تعالیٰ ثم لننسفنہ فی الیم نسفا ، واما شرب الماء وظهور البرادة علی الشفاه فیرده قولہ تعالیٰ ﴿ واشربوا فی قلوبهم العجل ﴾ ...... واللہ اعلم بالصوب." (قرطبی)

جہاں تک تعلق ہے بچھڑے کے برادہ کو دریا میں بہانے کا وہ تو درست ہے کیونکہ اس پر تو قرآن پاک کے یہ الفاظ مبارکہ دلالت کر رہے ہیں ﴿ ثم لننسفنہ فی الیم نسفا ﴾ پھر ہم ریزہ ریزہ کر کے دریا میں بہائیں گے۔ لیکن پانی کا پینا اور ان کے ہونٹوں پر برادہ کا زرد رنگ کا ظاہر ہونا درست نظر نہیں آتا کیونکہ بچھڑے کا پانی پینا قرآن پاک میں مذکور نہیں، بلکہ ان کے دلوں میں بچھڑے کا پلایا جانا مذکور ہے۔

﴿ بِكُفْرِهِمْ ﴾ : "بوجہ ان کے کفر کے"

" بسبب کفرهم وذلک لانهم کانوا مجسمة او حلولية ولم يروا جسما اعجب منه فتمکن فی قلوبهم ما سول لهم السامری "

بنی اسرائیل نے بچھڑے کا جسم عجیب وغریب دیکھ کر اس کی عبادت شروع کر دی اور ان کے دلوں میں وہ جا گزیں ہو گیا (جگہ پکڑ گیا) جیسا کہ مجسمہ فرقہ کا طریقہ ہے کہ جو پتھر خوبصورت دیکھا اسی کو خدا مان لیا اگر کوئی دوسرا پتھر خوبصورت نظر آ گیا تو اسے خدا بنا لیا پہلے خدا صاحب کو پھینک دیا۔ اسی وجہ سے وہ خدا تعالیٰ کا بھی جسم مانتے ہیں۔ یا حلولیہ فرقہ کی طرح انہوں نے بچھڑے کی پوجا اس لئے شروع کر دی تھی کہ اس میں خدا حلول کر گیا یہی ان کے کفر کی وجہ تھیں۔ (از بیضاوی)

﴿ قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهٖٓ إِيْمَانُكُمْ ﴾ : "فرما دیجئے بری ہے وہ چیز حکم دیتا ہے تمہیں جس کا تمہارا ایمان" بظاہر یہاں وہم ہوتا ہے کہ ابھی پہلے ذکر کیا کہ ان کا کفر سبب ہے ان کے بچھڑے سے محبت کرنے کا۔ اب یہ فرمایا گیا کہ بچھڑے کی عبادت بری چیز ہے تمہارے ایمان نے تمہیں بچھڑے کی عبادت کا حکم دے کر بری چیز کا حکم دیا۔ ان دونوں میں مطابقت کیسے کہ ایک ہی چیز کا سبب ایمان بھی ہو اور کفر بھی ہو۔ تو اس کا جواب یہ دیا گیا۔

﴿ اِيْمَانُكُمْ ﴾ ای ایمانکم الذی زعمتم فی قولکم " نؤمن بما انزل علینا "

کہ یہاں ایمان سے مراد وہ ایمان ہے جس کا یہود دعویٰ کرتے تھے کہ ہمارا ایمان توراۃ پر ہے۔ ان کا یہ دعویٰ باطل تھا کیونکہ ان کا انجیل اور قرآن پاک اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور نبی کریم ﷺ سے

ایمان نہ لانا کفر ہی تھا۔
اب واضح ہوا کہ حقیقی سبب کفر ہی تھا ان کا ایمان کا دعویٰ بھی درحقیقت کفر ہی تھا۔
(از قرطبی)

اعتراض: ایمان تو عرض ہے اس سے امر اور نہی متصور ہی نہیں تو کس طرح یہ کہا گیا ''کہ وہ چیز بری ہے جس کا تمہارا ایمان تمہیں حکم دیتا ہے۔

جواب: '' الداعی الی الفعل قد یشبہ بالامر '' کام کا سبب کبھی امر کے مشابہ ہوتا ہے۔ جس طرح رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿ اصلوتک تأمرک ﴾ کیا تمہاری نماز تمہیں حکم دیتی ہے۔ اور ارشاد گرامی ہے:

﴿ ان الصلوة تنهی عن الفحشاء والمنکر ﴾

بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔

﴿ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾: ''اگر تم ہو ایمان والے'' ان الفاظ مبارکہ سے ان کے دعویٰ ایمان کو غلط قرار دیا جا رہا ہے تقدیر عبارت کی اس طرح ہوگی:

﴿ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ بها ما امركم بهذه القبائح ورخص لم ایمانکم بها ''

اگر تم واقعی مؤمن ہو تو کس چیز نے تمہیں ان قبیح کاموں کا حکم دیا ہے۔ کیا یہ بھی ممکن ہے کہ ایمان قبیح کاموں کی رخصت دے۔ واضح ہوا کہ ایمان کے منافی کام اور دعویٰ ایمان ان میں تناقض ہے لہٰذا تمہارا دعویٰ ایمان جھوٹا اور باطل ہے۔ اور تقدیر عبارت کی اس طرح بھی ہے۔

'' ﴿ ان كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ بها فبئس ما آمركم به ایمانکم بها لان المؤمن ینبغی ان لا یتعاطی الا ما یقتضیه ایمانه لکن الایمان بها لا یأمر به فاذن لستم بمؤمنین ''

اگر تمہارا ایمان کا دعویٰ ہے کہ تم مؤمن ہو تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ تمہارا ایمان تمہیں برائی کا حکم دیتا ہے کیونکہ مؤمن تو وہی کام کرتا ہے جو اس کا ایمان تقاضا کرتا ہے لیکن ایمان تو قبیح کاموں کا حکم نہیں دیتا تو اس سے پتہ چلا کہ تم مؤمن ہی نہیں ہو۔
(از بیضاوی)

﴿ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ (آیت ۹۴)

۱) ''تم فرماؤ اگر پچھلا گھر اللہ کے نزدیک خالص تمہارے لئے ہو نہ اوروں کے لئے تو بھلا موت کی آرزو تو کرو اگر سچے ہو''۔

۲) ''آپ فرمادیں، اگر ہے تمہارے لئے دار آخرت اللہ کے نزدیک خالص سوائے اور لوگوں کے، تو تمنا کرو تم موت کی اگر تم سچے ہو''۔

جس طرح پہلے یہود کے غلط دعوے اور قبیح باتیں اور قبیح اعمال کا ذکر ہو رہا ہے اس آیۃ کریمہ میں بھی ان کے غلط دعوی کا رد کیا جا رہا ہے۔

شان نزول میں چند وجوہ:

(۱) یہود کے مختلف دعوؤں کا رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا ان کے رد میں ہی یہ آیۃ نازل ہوئی ان کا دعوی یہ تھا: ﴿ لن یدخل الجنة الامن کان هودا او نصاری ﴾ ہرگز جنت میں کوئی داخل نہیں ہوگا سوائے یہود اور نصاری کے۔

یعنی یہودی کہتے تھے جنت میں ہمارے بغیر کوئی اور نہیں جائے گا، نصرانی کہتے تھے ہمارے بغیر جنت میں کوئی اور نہیں جائے گا اور ان کا دعوی یہ تھا ﴿ نحن ابناء الله و احباؤه ﴾ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔ اسی طرح وہ اور یہ کہتے تھے ﴿ لن تمسنا النار الا ایاما معدودة ﴾ ہمیں آگ ہرگز نہیں مس کرے گی سوائے چند دنوں کے۔ ان کے ان دعاوی باطلہ کے بعد یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

(۲) اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ہم حق پر ہیں کیونکہ نسخ ہماری شریعت میں جائز نہیں باقی سب فرقے باطل پر ہیں۔ ان کے اس دعوی کے رد میں اس آیۃ کریمہ کا نزول ہوا۔

(۳) وہ اپنے آپ کو اکابر انبیاء کرام کی اولاد سے ہونے کی وجہ سے یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ ہمارے آباء واجداد حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام ہمیں رب تعالیٰ سے ضرور چھڑا

لیں گے، کیونکہ ان کا زور چلتا ہے اور ہمیں ثواب تک پہنچا دیں گے اسی وجہ سے وہ اپنے آپ کو تمام عرب لوگوں پر برتر سمجھتے تھے اور نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے سے پہلے کہتے وہ ہمارے ہی خاندان سے تشریف لائیں گے لیکن آپ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے آئے تو وہ لوگوں کے دلوں میں یہ شک ڈالنے لگے کہ یہ آخری نبی نہیں کیونکہ پہلے سارے انبیاء کرام حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد سے آئے یہ بھی اگر نبی ہوتے تو ان کی اولاد سے ہی تشریف لاتے۔

ان کے اس دعویٰ کے بعد کہ ہم اکابر انبیاء کرام کی اولاد ہونے کی وجہ سے جنت کی نعمتیں حاصل کریں گے اس آیۃ کریمہ کا نزول ہوا۔ مسئلہ واضح ہے کہ ان تمام وجوہ کے بعد آیۃ کریمہ کا نزول ہوا۔ تمام وجوہ ہی اس کا شان نزول ہیں۔ (از کبیر)

﴿ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾

''رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ آپ ان سے فرما دیں کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو کہ تم اللہ تعالیٰ کے محبوب ہو اور جنت صرف تمہارے لئے ہے اور جنت کی نعمتیں صرف تمہارے لئے ہیں اور یہ کسی کو حاصل نہیں ہوئیں تو تم موت کے تمنا کرو اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو''۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ کوئی انسان اپنے گھر منتقل ہونے کو ناپسند نہیں کرتا۔ اور نہ ہی کوئی انسان باغ میں جانے اور اس کی سیر کو مکروہ سمجھتا ہے بلکہ ہر شخص اپنے گھر میں آنے اور باغ میں جانے کی تمنا کرتا ہے۔ اسی طرح وہ انسان جس کو یہ معلوم ہو کہ رب تعالیٰ کے پاس جا کر ہمیں کرامات اور درجات حاصل ہونے ہیں اور ہمیں عطیات اور ھدیئے وصول ہونے ہیں تو وہ تمنا رکھے گا کہ جلدی میں اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچ کر یہ انعامات حاصل کرلوں۔

اگر تم بھی اپنے دعویٰ میں سچے ہو کہ تم اللہ کے محبوب ہو تو موت کی تمنا کرو تا کہ تم دنیا کے غموں سے نجات حاصل کرلو، اور مصائب برداشت کرنے سے چھٹکارا حاصل کرلو اور دائمی نعمتوں کو حاصل کرلو۔

اعتراض: یہود الزامی طور پر یوں کہہ سکتے ہیں کہ تمہارا دعویٰ بھی یہ ہے کہ جنت مومنین کے لئے ہے تو تم ہی موت کی تمنا کرلو تا کہ جنت میں جلدی پہنچ جاؤ۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے۔

پہلا جواب: یہود کا دعوی یہ تھا کہ ہمارے بغیر دوسرا کوئی جنت میں جائے گا ہی نہیں۔ نبی کریم ﷺ کی امت کے مؤمنین کا یہ کوئی دعوی نہیں۔ بلکہ ہمارا ایمان یہ ہے کہ آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک جو بھی ایمان والے ہوں گے وہ جنت میں جائیں گے۔ اور انبیاء کا یہ دعوی بھی نہیں کہ ہمیں عذاب ہونا ہی نہیں۔

" بل المؤمن وان جل قدره غير الانبياء عليهم الصلوة والسلام فانه لا يزول عنه خوف الخاتمة "

بلکہ مؤمن کتنی بڑی شان والا ہی کیوں نہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتا ہے اس کے دل سے خاتمہ کا خوف نہیں نکلتا کہ پتہ نہیں میرا انجام کیا ہوگا۔

ہاں صرف انبیاء کرام کو اپنے خاتمہ بالخیر کا یقین ہوتا ہے البتہ تعلیم امت کے لئے وہ بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہتے ہیں۔ جب مؤمنین کو اللہ تعالیٰ کا خوف حاصل رہتا ہے تو وہ موت کی تمنا اس لئے نہیں کرتے کہ ہمیں رب کے حضور جانے سے ڈر لگتا ہے ہوسکتا ہے ہم عذاب میں مبتلاء نہ ہو جائیں۔ لیکن یہود تو خوف رکھتے ہی نہیں اس لئے ان کو موت کی تمنا کرنے کے متعلق کہا گیا کہ تم بلاخوف جنت میں پہنچ جاؤ۔

دوسرا جواب: یہود کا تو یہ دعوی تھا کہ ہم اللہ کے حبیب ہیں اور اللہ کے بیٹے ہیں اس لئے ان کو کہا گیا کہ تم موت کی تمنا کرو کیونکہ موت تمہیں تمہارے دعوی کے مطابق باپ اور محب تک پہنچائے گی۔ " ولا احد يرغب ولا ينفر عن الحبيب والاب " کوئی ایک اپنے حبیب اور اپنے باپ سے اعراض نہیں کرتا اور نفرت نہیں کرتا۔ جب تم تمنا نہیں کر رہے تو تم دعوی میں جھوٹے ہو۔

مؤمنین کا ایسا کوئی دعوی نہیں تھا بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے خوف سے لمبی حیات کو چاہتے تھے اور وہ یہ بھی ایمان رکھتے تھے کہ موت کا وقت مقرر ہے لہذا پہلے موت کی طلب مؤمنین سے ہو ہی نہیں سکتی۔

(او شیخ زادہ)

بہت خوبصورت عبارت:

" ان كنتم احباء الله فالمحبة داعية الى الشوق ، والشوق داع الى محبة لقاء المحبوب ومحبة لقائه داعية الى تمنى سهولة السبيل اليه ولا سبيل الى سهولة السبيل اليه الا بالموت فيجب ان يكون الموت متمنى فتركهم تمنى ذلك دلالة على ان لا محبة منكم له "

(شیخ زادہ)

اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو کہ تم اللہ کے محبوب ہو تو پھر تمہیں یہ خیال کرنا چاہئے کہ محبت شوق کی دعوت دیتی ہے اور شوق محبوب کی ملاقات کی محبت کی دعوت دیتا ہے اور محبوب کی ملاقات کی محبت و تمنا اس چیز کی تمنا کی دعوت دیتی ہے جس سے ملاقات کی آسانی سے راہ نکل آئے۔ تمہارے دعویٰ کے مطابق جو تمہارا محبوب اور محبّ ہے یعنی اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کی آسان راہ سوائے موت کے نہیں، تو ضروری ہے کہ موت کی تمنا کرو اگر تم نے موت کی تمنا نہ کی تو تم جھوٹے ہو تمہیں کوئی محبت نہیں۔

فائدہ جلیلہ : ”لان من ایقن انہ من اھل الجنۃ اشتاقھا واحب التخلص الیھا من الدار ذات الشوائب“

ہاں جن کو یقین ہوتا ہے کہ وہ جنتی ہیں (وہ اللہ تعالیٰ کا خوف رکھتے ہیں) لیکن جنت کے حصول کے مشتاق ہوتے ہیں جنت سے ان کو محبت ہوتی ہے وہ تو بار بار اسے طلب کرتے ہیں۔

شربت الحب کا سا بعد کاس ۔۔۔ وما نفد الشراب ولا رویت

میں نے محبت کا ایک پیالہ پیا پھر دوسرا پیا ۔۔۔ (پیتا ہی رہا) نہ شراب محبت ختم ہوا نہ میں سیراب ہوا

محبت کی زیادتی تو چاہتی ہے کہ انسان اس کی طرح دیوانہ وار لپکے پیچھے ہٹ جائے تو محبّ کیسا؟ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے ”حبک الشئ یعمی ویصم“ کسی چیز کی محبت تمہیں اندھا اور بہرا کر دیتی ہے۔ (رواہ احمد وابوداؤد عن ابی الدرداء رضی اللہ عنہ صابونی ج اول ص ۸۹)

موت اور شیر خدا:

حضرت علی رضی اللہ عنہ صفین (بکسر الصاد وتشدید الفاء وکسرھا، فرات کے کنارے ایک مقام) کے میدان میں ادھر ادھر گھوم رہے تھے ایک طرف آپ کے موافقین کی جماعت ہے اور دوسری طرف آپ کے مخالفین کی جماعت ہے۔ آپ نے ایک کرتی پہنی ہوئی ہے بلا خوف وخطر ادھر ادھر گھوم رہے ہیں آپ کے بیٹے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے عرض کیا ”**ما ھذا بزی المحاربین**“ کیا جنگ کرنے والے ایسا ہی لباس پہنتے ہیں آپ زرع اور خود (لوہے کی ٹوپی) کا استعمال کریں۔

”فقال یا بنی لا یبالی ابوک أعلی الموت سقط اما علیہ سقط الموت“
تو آپ نے فرمایا اے میرے پیارے بیٹے تیرے باپ کو کوئی پرواہ نہیں کہ موت پر گر

جائے یا موت اس پر گر جائے۔

موت کا انسان پر گرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ انسان کے غالب گمان میں موت کے خطرات سامنے موت کے اسباب موجود ہیں۔ دشمن کی یلغار ہو میدان کارزار ہو جنگ کا گرم بازار ہو اس کے ہاتھ میں تلوار ہو۔ بلا خوف وخطر وہ دیوانہ وار جنگ کرتے ہوئے شہید ہو گیا تو یہ سمجھیں کہ وہ موت پر گر گیا کہ اس نے موت کو دبوچ لیا، موت کو جان چھڑانے نہیں دی، موت نکل کر جاتی کہاں اس کو تو بہادر مسلمان سے واسطہ پڑا ہوا تھا کسی کافر سے واسطہ ہوتا تو شائد موت اس سے بچ کر نکل جاتی۔ موت کا انسان پر گرنے کا یہ مطلب ہے کہ موت اس پر اچانک آ جائے وہ موت سے غافل تھا یا وہ موت سے بھاگ رہا تھا لیکن موت نے اسے دبوچ لیا۔

حضرت عمار رضی اللہ عنہ اور موت:

صفین کے میدان میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ دیوانہ وار یہ کہہ رہے تھے:

الآن القى الاحبة ، محمد اثم حزبه

اب میں اپنے محبوبوں سے ملاقات کروں گا ، وہ میرے محبوب محمد ﷺ اور ان کے اصحاب ہیں

کیا خوب تمنا تھی کہ موت جب احباء سے ملاقات کا ذریعہ ہے تو موت سے ڈر کیا؟ موت کی تو مجھے تمنا ہے کہ حبیب پاک اور یاران مصطفیٰ ﷺ سے ملاقات ہوگی۔ سبحان اللہ کیا خوب عقیدہ تھا صحابہ کرام کا کہ موت کے بعد حیات ہے اگر حیات (زندگی) نہیں تو ملاقات کا کیا مطلب؟

معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کا یہ عقیدہ تھا موت مٹنے کا نام نہیں۔ موت تباہ و برباد ہونے کا نام نہیں۔ موت خاک کا ڈھیر بن جانے کا نام نہیں۔ موت کے بعد وہ زندگی حاصل ہوتی ہے جس میں پہلے تشریف لے جانے والے محبوبوں سے ملاقات ہوتی ہے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور موت:

جب حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ پر موت کا وقت آیا آپ فرما رہے تھے:

جاء حبيب على فاقة ، فلا افلح اليوم من قد ندم

حبیب سے مراد موت ہے " علی فاقة " میں دو ترکیبیں ہیں یا تو حال ہے اس صورت میں معنی یہ ہوگا " جاء نی حبیب حال کونی محتاجا الیه و مشتاقا " میرے پاس میری محبوبہ موت آ گئی ایسے حال میں جب اس میں کا محتاج اور مشتاق ہوں۔

دوسری ترکیب کہ حذف مضاف ہو عبارت یوں ہو جائے " جاء علی ذی فاقة و حاجة الیه " معنی اس صورت میں بھی پہلے معنی کے قریب ہی ہوگا۔ دوسرا مصرع " فلا افلح الیوم من قد ندم " ماضی پر " لا " داخل ہے نفس پر بددعا کا احتمال بھی ہے اور شعر کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے " لا " کو "ما " کی جگہ لایا گیا ہو اور خبر ہو یہ بھی احتمال ہے۔

اب شعر کا معنی واضح ہو گیا میرے پاس میرا حبیب (موت) آ گیا جب کہ میں اس کا محتاج اور مشتاق ہوں آج جو شخص نادم ہو گیا وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یا یہ کہا جائے اگر میں موت کو دیکھ کر آج نادم ہو جاؤں تو مجھے کامیابی حاصل نہ ہو۔ (از بیضاوی و شیخ زاده)

نتیجہ واضح ہوا کہ مومن موت سے ڈرتا ہی نہیں بلکہ خوشی سے موت کو گلے لگاتا ہے کافر بڑے دعوے کرتے ہیں بڑی بڑھکیں مارتے ہیں لیکن موت سے ایسے ڈرتے ہیں جیسے کوا غلیل سے ڈرتا ہے۔

یہود اگر موت کی تمنا کر لیتے:

" روی ابن عباس عن النبی ﷺ انه قال لو تمنوا الموت لغص کل انسان بریقه وما بقی علی وجه الارض یهودی الامات "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر وہ موت کی تمنا کر لیتے تو ان میں سے ہر شخص اپنی تھوک میں غوطے کھانے لگتا یعنی ہر ایک تباہ و برباد ہوتا، روئے زمین پر کوئی یہودی باقی نہ رہتا یہاں تک کہ وہ موت کی گرفت میں آ جاتا۔

(از خازن)

فائدہ: " نقل عن العشرة المبشرين بالجنة ان کل واحد منهم یحب الموت ویحن الیه "

وہ دس صحابہ کرام جن کے نام لے کر نبی کریم ﷺ نے ان کو جنت کی بشارت دی یعنی عشرہ مبشرہ میں سے ہر ایک موت سے محبت رکھتا تھا اور ہر کوئی موت کا مشتاق تھا۔ (مدارک)

فوائد عظیمہ:" اخرج ابن المبارک فی الزهد والبیهقی عن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ تحفة المؤمن الموت "

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن کا تحفہ موت ہے

☆ " وعن الحسین بن علی مرفوعا مثله بلفظ الموت ریحانة المؤمن "

حضرت امام حسین بن علی رضی اللہ عنہما سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ موت مؤمن کے لئے گل ریحانہ ہے (پھول کا نام ریحانہ)۔

☆ " وقال حبان بن الاسود الموت جسر یوصل الحبیب الی الحبیب "

حضرت حبان بن اسود فرماتے ہیں موت ایک پل ہے جو دوست کو دوست تک پہنچاتا ہے۔

☆ " ان القبر اول منزل من منازل الآخرة " (رواه الترمذی وابن ماجه عن عثمان مرفوعا)

یہی آیت جو زیر بحث ہے اور جن احادیث کو ذکر کیا گیا ہے ان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قبر آخرت کی منازل میں سے پہلی منزل ہے۔ اسی پر ایک حدیث جو حضرت عثمان ﷺ سے مرفوع طور پر مروی ہے صراحتاً دلالت کر رہی ہے۔ (از مظهری)

موت کی تمنا اور دعا کا حکم: قاضی محمد ثناء اللہ مظہری رحمہ اللہ نے اس مسئلہ کو اسی آیۃ کریمہ کی تفسیر میں واضح طور پر ذکر کیا ہے اس کو ذکر کرنے میں کچھ تکرار بھی ہو جائے گا لیکن وضاحت کے لئے تکرار عذر کی حیثیت رکھتا ہے۔

سوال: کیا موت کی تمنا کرنا اور موت کے لئے دعاء کرنا جائز ہے؟

جواب: اگر مال میں نقصان ہو جانے کی تکلیف کو برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے یا جسمانی تکلیف کی وجہ سے موت کے لئے دعا کرے تو جائز نہیں۔ اسی طرح اہل وعیال کی تکالیف کو دیکھ کر یا اہل وعیال کی طرف سے حاصل ہونے والی تکالیف کے پیش نظر موت کی دعا کرے تو جائز نہیں۔

☆ " عن انس قال قال رسول اللہ ﷺ لا یتمنین احدکم الموت لضر نزل به فان کان ولا بد متمنیا فلیقل اللهم احینی ما کانت الحیوة خیر الی وتوفنی اذا کانت الوفاة خیر الی " (بخاری، مسلم)

حضرت انس ﷺ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے تم میں سے کوئی شخص بھی تکلیف آ جانے کی وجہ سے موت کی ہرگز تمنا نہ کرے۔ اگر موت کی تمنا اس کے لئے ضروری ہے تو وہ یہ دعا کرے اے اللہ جب تک میرے لئے زندگی بہتر ہے اس وقت تک مجھے زندہ رکھ اور جب میرے لئے موت بہتر ہو تو مجھے موت عطا کر دے۔

☆ " وفی روایة لهما " اذا مات احدکم انقطع عمله وانه لا یزید عمره الا خیرا "

بخاری و مسلم کی ایک روایت میں یہ ہے کہ جب تم میں سے کوئی ایک فوت ہو جائے تو اس کے عمل ختم ہو جاتے ہیں بیشک اس کی عمر کی زیادتی نہیں زیادہ کرتی کسی چیز کو سوائے اس کی بھلائی کے۔

اس حدیث سے بھی واضح ہوا کہ عمر کا زیادہ ہونا اس کی نیکیوں کے زیادہ ہونے کا سبب ہے۔

☆ " وعن ابی هریرة مرفوعا لا یتمنین احدکم الموت اما محسنا فلعل ان یزداد واما مسیئا فلعل ان یستعتب " (رواہ البخاری)

حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ تم میں سے ہرگز کوئی ایک موت کی تمنا نہ کرے اگر وہ نیک ہوا تو ہو سکتا ہے (اس کو نیکی کے کام کرنے کی توفیق ہو جائے تو) اس کی نیکیاں بڑھ جائیں۔ اور اگر وہ گنہگار رہا تو ہو سکتا ہے رب تعالیٰ کو راضی کر لے یعنی توبہ کر لے۔

☆ "وعن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ لا یتمنی احدکم الموت ولا یدع به من قبل ان یاتیه انه اذا مات انقطع عمله وانه لا یزید المؤمن عمراه الا خیرا " (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی ایک تم میں سے موت کی تمنا نہ کرے اور نہ ہی موت کے لئے دعا کرے موت کے آنے سے پہلے اس لئے کہ جب کوئی فوت ہو جاتا ہے اس کے عمل ختم ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ مؤمن کی عمر کی زیادتی مؤمن کے لئے بہتر ہی ہوتی ہے۔

تنبیہ: موت کی تمنا زبان سے کرنا اور موت کا سوال منع ہے۔ تکالیف کے پیش نظر بھی موت کا خیال دل میں آ جانا دل میں موت کی رغبت کا آ جانا منع نہیں۔ کیونکہ یہ انسان کی قدرت سے باہر ہے۔

" واما ان کان التمنی لخوف الفتنة فی الدین فلا بأس به "

اگر دین میں فتنہ سے بچنے کے لئے موت کی تمنا کی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

☆ "واخرج مالک والبزار عن ثوبان فی دعائه ﷺ واذا اردت بالناس فتنة فاقبضنی

الیک غیر مفتون"

حضرت ثوبان ﷺ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ یہ دعا فرماتے تھے (اے اللہ) جب تو لوگوں کو فتنہ میں مبتلا کرنے کا ارادہ فرمائے تو میری روح کو قبض کر لینا تا کہ بغیر فتنہ میں مبتلاء ہونے کے میں تیرے حضور پہنچ جاؤں۔

☆ "اخرج الطبرانی عن عمرو بن عنبسته عن رسول اللہ ﷺ قال لا یتمنی احدکم الموت الا ان لا یثق بعمله فان رأیت فی الاسلام ست خصال فتمنوا الموت و ان کانت نفسک فی یدک فارسلها اضاعة الدم و امارة الصبیان و کثرة الشرط و امارة السفهاء وبیع الحکم ونشؤ یتخذ القرآن مزا میر"

حضرت عمرو بن عنبسہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی ایک موت کی تمنا نہیں کرتا سوائے اس کے کہ اسے اپنے اعمال پر بھروسہ نہ ہو۔ اگر تم اسلام میں چھ چیزیں دیکھ لو تو پھر موت کی تمنا کرلو، اگرچہ تمہارا نفس تمہارے ہاتھ میں بھی ہو تو اسے چھوڑ دو،

(وہ چھ چیزیں یہ ہیں) ناحق مؤمنوں کا خون بہانا، اور چھوکروں (کم عمر لوگ) کی حکومت کا قائم کرنا، اور کثیر شرطیں لگانا، اور بے وقوفوں کا حاکم بن جانا، اور عدالتی فیصلوں کو بیچنا اور ایسی جماعت کا پیدا ہو جانا جو قرآن پاک گانے کی طرز پر پڑھیں۔

خیال رہے ایک اور حدیث پاک میں قطع رحم کا بھی ذکر ملتا ہے اس طرح گویا کہ سات چیزوں کا ذکر ہو گیا۔

رب کی ملاقات کا شوق: "واما ان کان التمنی شوقا الی لقاء اللہ تعالیٰ فذلک محمود"

اللہ تعالیٰ کی ملاقات کے شوق کی وجہ سے موت کی تمنا کرنا اچھا فعل، قابل تعریف عمل ہے۔

☆ "عن عائشة قالت کنت اسمع نه لا یموت نبی حتی یخیر بین الدنیا والآخرة قالت اصابت رسول اللہ ﷺ شدیدة فی مرضه فسمعته یقول مع الذین انعم اللہ علیهم من النبیین والصدیقین والشهداء والصالحین وحسن اولئک رفیقا ، فظننت انه خیر"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں (اکثر اوقات حضور سے) سنا کرتی تھی کہ بیشک کوئی نبی

فوت نہیں ہوتے یہاں تک کہ ان کو اختیار دے دیا جاتا ہے دنیا میں رہیں یا آخرت کو پسند کریں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی کریم ﷺ جب شدید مرض میں تھے تو میں نے آپ کو یہ پڑھتے ہوئے سنا:

" مع الذين انعم الله عليهم من النبيين والصديقين والشهداء والصالحين وحسن اولئک رفيقا "

تو میں نے سمجھ لیا کہ آپ کو بھی دنیا و آخرت کا اختیار دے دیا گیا (آپ نے آخرت کو پسند کرلیا)۔

☆ وروى النسائی عنها قالت اغمی رسول الله ﷺ وهو فی حجری فجعلت امسحه وادعو له بالشفاء بهذه الكلمات اذهب الباس رب الناس فافاق فانتزع يده من يدی فقال بل اسئل الله الرفيق الاعلى "

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ پر (آخری ایام مرض میں) بے ہوشی طاری ہوگئی، آپ کا سر مبارک میری گود میں تھا۔ میں نے آپ کے جسم پر پھر ہاتھ پھیر کر آپ کے لئے شفاء حاصل ہونے کی غرض سے دعا کرنے لگی "اے لوگوں کے رب آپ کی تکلیف کو دور فرما" آپ کو افاقہ ہوا تو آپ نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے کھینچ لیا اور آپ فرمانے لگے بلکہ میں سوال کرتا ہوں اللہ تعالیٰ سے رفیق اعلیٰ کا، یعنی آپ اللہ تعالیٰ سے ہی ملاقات کرنے کے لئے بے تاب تھے، رفیق اعلیٰ سے مراد بھی رب تعالیٰ ہے آخری وصال کے وقت آپ کی بے قراری کی بھی یہی وجہ تھی۔

ان دونوں احادیث سے بھی واضح ہوا کہ رسول اللہ ﷺ وفات کی دعا فرما رہے تھے۔

☆ " واخرج الطبرانی ان ملک الموت جاء الی ابراهيم ليقبض روحه فقال ابراهيم يا ملک الموت هل رأيت خليلا يقبض روح خليله ، فعرج ملک الموت الی ربه فقال قل له هل رأيت خليلا يكره لقاء خليله فرجع فقال اقبض روحی الساعة "

ملک الموت (عزرائیل) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آیا تا کہ آپ کی روح کو قبض کرے تو ابراہیم علیہ السلام نے کہا اے ملک الموت کیا تم نے دیکھا ہے کہ دوست اپنے دوست کی روح کو قبض کرتا ہو۔ تو ملک الموت اپنے رب کے حضور حاضر ہوا (ابراہیم علیہ السلام کا پیغام پہنچایا) تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا، جاؤ میرے خلیل کو کہو کیا تم نے دیکھا ہے کہ کوئی دوست اپنے دوست سے ملنا ناپسند کرتا ہو، تو عزرائیل لوٹ کر ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے (اور اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا) تو ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا ابھی میری روح قبض کرلو۔

اعتراض : " روی احمد عن ابی امامة قال جلسنا الی رسول اللہ ﷺ فذکرنا ورقفنا فبکی سعد بن ابی وقاص فاکثر البکاء فقال یا لیتنی مت فقال النبی ﷺ یا سعد اعندی تتمنی الموت فردد فذلک ثلاث مرات ثم قال یا سعد ان کنت خلقت للجنة فما طال عمرک وحسن عملک فھو خیر لک "

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے آپ نے ہمیں رقت آمیز نصیحت فرمائی، تو حضرت سعد بن ابی وقاص بہت زیادہ روئے تو آپ نے کہا کاش کہ میں مرجاتا، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے سعد کیا میرے پاس تم موت کی تمنا کرتے ہو آپ نے ان الفاظ کو تین مرتبہ لوٹایا، پھر فرمایا اے سعد اگر تم جنت کے لئے پیدا کیے گئے تو تمہاری لمبی عمر اور تمہارے اچھے عمل تمہارے لئے بہتر ہیں۔

اس حدیث پاک کو بیان کرنے کے بعد اعتراض کی دارومدار اس پر ہے کہ حضرت سعد موت کی تمنا اپنے مال یا اپنے جسمانی نقصان کی وجہ سے نہیں کر رہے تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کے خوف سے موت کی تمنا کر رہے تھے لیکن نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا پتہ چلا کہ عذاب کے ڈر سے بھی موت کی تمنا جائز نہیں۔

جواب: منع اس لئے کیا گیا تھا کہ حضرت سعد ﷺ نے خیال کیا تھا کہ شائد موت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچنا ممکن ہے۔ لیکن نبی کریم ﷺ کے منع کرنے کی وجہ یہ تھی:

" لکن الموت لا یغنی من عذاب اللہ شیئا بل لابد لذلک من الاستغفار والمبادرة فی الاعمال الصالحة والاجتناب عن المعاصی "

لیکن موت اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہیں بچا سکتی، بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ استغفار کی جائے اور نیک اعمال کی طرف جلدی کی جائے اور گناہوں سے اجتناب کیا جائے۔

یعنی واضح ہوا کہ اگر معصیت کے ڈر سے موت طلب کی جائے کہ اللہ تعالیٰ مجھے موت عطاء کر کے گناہوں سے بچالے تو یہ یقینی طور پر جائز ہے۔ لیکن اگر موت اس لئے طلب کی جائے کہ موت کی وجہ سے عذاب سے بچ جاؤ تو اس کا فائدہ نہیں۔ کیونکہ گناہ توبہ سے معاف ہوتے ہیں موت سے معاف نہیں ہوتے۔

(ماخوذ از مظھری)

﴿ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴾ (آیت ۹۵)

۱) ''اور ہرگز کبھی اس کی آرزو نہ کریں گے ان بداعمالیوں کے سبب جو آگے کر چکے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو''۔

۲) ''اور ہرگز وہ نہیں تمنا کریں گے اس کی کبھی، بوجہ اس کے جو (برے اعمال) وہ پہلے کر چکے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو''۔

یعنی یہود اگر چہ دعوی تو کرتے ہیں کہ جنت صرف ہمارے لئے ہے لیکن وہ اپنی بداعمالیوں کو جانتے ہوئے کبھی بھی موت کی تمنا نہیں کریں گے۔ یعنی حقیقت میں وہ خود بھی سمجھتے ہیں کہ جنت تو نیک لوگوں کے لئے ہے برے لوگوں کے لئے نہیں لہٰذا ان کا دعوی باطل ہے اور وہ ظالم ہیں ظالموں کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔

﴿ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ﴾: ''اور ہرگز وہ نہیں تمنا کریں گی اس کی کبھی''۔ ضمیر منصوب کی موت کی طرف لوٹ رہی ہے اور ﴿ اَبَدًا ﴾ نفی کی تاکید کے لئے ہے زیادہ طور پر مثبت میں اس کا معنی ہوتا ہے ''ہمیشہ'' اور نفی میں ''کبھی بھی''۔ "**وهذه الجملة اخبار بالغيب**" یہ جملہ یعنی ﴿ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا ﴾ غیبی خبر ہے:

"فان عدم تمنيهم الموت في المستقبل وهو غيب لا يعلم بالحس ولا ببديهة العقل ولم ينصب عليه دليل ايضا فكانت الآية من المعجزات الدالة على حقية رسالة بنبينا عليه الصلوة والسلام"

بیشک ان کا موت کی تمنا نہ کرنا مستقبل سے تعلق رکھتا ہے اور یہ غیب کا علم ہے نہ تو اس کا علم حواس سے حاصل ہوتا ہے اور نہ ہی بداہت عقل سے اور نہ ہی اس پر کوئی دلیل قائم ہے۔ اور یہ آیۃ نبی کریم ﷺ کے معجزات سے ہے جو آپ کی رسالت کی حقانیت پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے جو خبر دی وہی ہوا کیونکہ یہود تو آپ کی تکذیب کرنا غنیمت سمجھتے۔ اگر کوئی ان سے موت کی تمنا کرتا تو وہ کہتا کہ میں

موت کی تمنا کر رہا ہوں تو ضرور یہ بات مشہور ہوتی۔

لیکن وہ تو نبی کریم ﷺ کی اس خبر سے ایسے مبہوت ہوئے کہ انہیں معلوم تھا کہ نبی کریم ﷺ نے جو خبر دی وہ ہو کر رہے گی۔ ان کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ نبی کریم ﷺ فرما چکے ہیں کہ اگر کسی یہودی نے موت کی تمنا کی تو سب کے سب مر جائیں گے۔

اس واضح ارشاد کے بعد یہود سے موت کی تمنا ممکن ہی نہیں تھی۔ (از بیضاوی و شیخ زادہ)

تنبیہ: اس خبر کا تعلق نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود سے ہے، ہر زمانہ کے یہود سے نہیں۔ علامہ آلوسی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں:

" والمراد لن يتمنوه ما عاشوا ، وهذا خاص بالمعاصرين له ﷺ على ما روى عن نافع ﷺ قال خاصمنا اليهودى وقال ان فى كتابكم ﴿فتمنو الموت﴾...... الخ ، فانا اتمنى الموت ، فمالى لا اموت ، فسمع ابن عمر رضى الله عنهما فغضب فدخل بيته وسل سيفه وخرج ، فلما رآه اليهودى فر منه ، وقال ابن عمر اما والله لو ادركته لضربت عنقه "

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿ ولن يتمنوه ابدا ﴾ ہرگز وہ موت کی تمنا بھی نہیں کریں گے، اس کا یہ مطلب ہے جب تک وہ زندہ رہیں گے یہ حکم نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود سے خاص ہے۔

اس پر دلیل وہ روایت جو حضرت نافع سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ یہودی نے ہمارے ساتھ جھگڑا کیا اور کہا بیشک تمہاری کتاب میں ﴿ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ ﴾ مذکور ہے میں تو موت کی تمنا کر رہا ہوں مجھے موت کیوں نہیں آتی، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے جب سنا تو آپ غصہ میں آ گئے، آپ اپنے گھر تشریف لے گئے تلوار سونت (تان) کر باہر تشریف لائے، یہودی کو جب پتہ چلا تو وہ بھاگ گیا، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا خبردار قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اگر میں اسے پالیتا تو اس کی گردن اڑا دیتا۔ اس کے بعد حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

" توهم هذا الكلب اللعين الجاهل ان هذا لكل يهودى او لليهود فى كل وقت لا انما هو لاولئك الذين كانوا يعاندون ويجحدون نبوة النبى ﷺ بعد ان عرفوا "

کہ اس جاہل لعنتی کتے کو یہ غلط وہم ہوا کہ یہ حکم ہر زمانے کے ہر یہودی کے لئے ہے حالانکہ ایسا نہیں، بلکہ یہ ان یہود کے لئے جو نبی کریم ﷺ کی نبوت کو پہچان لینے کے باوجود انکار کرنے لگے اور آپ سے عناد رکھنے لگے۔

خیال رہے کہ ابتدائی طور پر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو شدید غصہ آیا حالانکہ آپ دھیمے مزاج کے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی ناسمجھی سے قرآن پاک پر غلط اعتراض کر رہا تھا۔ آپ سے یہ برداشت نہ ہوا تو آپ نے تلوار لے لی، لیکن بعد میں آپ نے ان کو کلام کے ذریعے سمجھایا کہ قرآن پاک کی آیہ کریمہ کا اصل مطلب کیا ہے۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں " **وکانت المحاجة معهم باللسان دون السيف** " یہ حجت آپ نے ان پر زبان سے پیش فرمائی تلوار سے نہیں۔ (از روح المعانی)

اعتراض: یہ کیسے کہا گیا ہے کہ وہ ہرگز تمنا نہیں کریں گے حالانکہ تمنا تو دل کا کام ہے دل پر کوئی مطلع نہیں۔

جواب: ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ تمنا یہاں دل کا فعل مراد ہے، بلکہ ہم کہتے ہیں زبان سے ان کا کہنا مراد ہے " لیت کذا " کاش کہ ایسا ہوتا۔ اگر تسلیم کر بھی لیا جائے کہ امر قلبی ہے تو پھر بھی ظاہر ہو جاتا کیونکہ وہ نبی کریم ﷺ سے مخالفت رکھتے تھے تو یقیناً وہ بتاتے کہ ہم تو تمنا کر رہے ہیں ہم پر موت کیوں نہیں آتی یہ مشہور ہو جاتا۔ (از روح المعانی)

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے رب تعالیٰ نے آپ کو بتایا کہ وہ موت کی ہرگز تمنا نہیں کریں گے۔ جب رب تعالیٰ نے آپ کو ان کے دل کی تمنا پر، مطلع کر دیا تو اب یہ کہنا ممکن ہی نہیں کہ حضور کو ان کے دلوں پر اطلاع حاصل نہیں تھی۔

﴿ **بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ** ﴾: کا حقیقی معنی یہ ہے بسبب اس کے جو ان کے ہاتھوں نے پہلے کیا۔ یہاں اگرچہ حقیقی معنی بھی مراد لیا جا سکتا ہے کہ وہ موت کی تمنا ہرگز کبھی بھی نہیں کریں گے بوجہ توراۃ کی تحریف کرنے کے کیونکہ وہ جانتے ہیں جو اپنے ہاتھوں سے کسب کر چکے ہیں۔

تاہم یہاں مجازی معنی لینا بہتر ہے کیونکہ وہ عام ہے جس میں حقیقی معنی بھی "عموم المجاز" کے ضابطہ کے مطابق داخل ہے " ید " کا مجازی معنی "شخص" آتا رہتا ہے اور "ید" کا معنی "قدرت" بھی لیا جاتا ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ جو ان کے نفسوں نے پہلے کیا۔

﴿ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ﴾ ای بسبب ما عملوا من المعاصی الموجبة للنار کالکفر بمحمد ﷺ والقرآن وقتل الانبیاء "
یعنی وہ ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گی کبھی، بوجہ اس کے کہ جوانہوں نے گناہوں کا ارتکاب کیا ایسے گناہ جو جہنم میں لے جانے کا ذریعہ ہیں جیسا کہ نبی کریم ﷺ اور قرآن پاک سے کفر اور انبیاء کرام کو شہید کرنا ان کے لئے جہنم کے اسباب تھے۔

(از روح المعانی)

﴿ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴾ : ''اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو'' ان کو جو یہ دعوی تھا کہ جنت تو صرف ہمارے لئے ہے کسی اور کے لئے نہیں یہ ظلم تھا کیونکہ وہ جنت کے مستحق نہیں اور مومن مستحق تھے انہوں نے الٹ بیان کیا۔ اور ان الفاظ مبارکہ میں ان کو دھمکی بھی دے دی گئی کہ اللہ تعالی جب ظالموں کے ظلم اور ان کے برے اعمال کو جانتا ہے تو وہ رب تعالی کی گرفت سے کیسے بچ سکیں گے۔ دوسری آیۃ میں اسی مفہوم کو واضح طور پر بیان کر دیا گیا:

﴿ ولا تحسبن الله غافلا عما یعمل الظالمون ﴾

''اور ہرگز گمان نہ کرو کہ اللہ غافل ہے اس چیز سے جو ظالم کرتے ہیں''

(از بیضاوی وشیخ زادہ)

نکتہ : یہاں ذکر فرمایا ﴿ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا ﴾ لفظ '' لن '' سے نفی کی تاکید کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مقام پر ان کا دعوی بہت بڑا تھا کہ دار آخرت صرف ہمارے لئے خاص ہے باقی لوگوں کو اخروی نعمت اور جنت حاصل نہیں ہوگی۔ تو ان کے اس عظیم دعوی کو سخت تاکید سے رد کیا گیا اس لئے لفظ '' لن '' ذکر فرمایا کہ وہ ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گے پتہ چلا کہ وہ اپنے دعوی میں سراسر جھوٹے ہیں۔

لیکن سورۃ جمعہ میں بیان کیا گیا ﴿ ولا یتمنونه ابدا ﴾ یہاں لفظ '' لا '' ذکر کیا جو نفی تو کرتا ہے لیکن تاکید نہیں کرتا کیونکہ اس مقام پر ان کا دعوی تھا ﴿ انهم اولیاء الله من دون الناس ﴾ بیشک وہ اللہ کے دوست ہیں اور وہ لوگ اللہ کے دوست نہیں۔

اگرچہ دعوی ولایت بھی اعلی درجہ کا دعوی تھا لیکن یہ جنت میں جانے کا ذریعہ ہے اس لئے یہ دعوی پہلے دعوی سے کم درجہ ہے لہذا یہاں نفی ''لا'' کے ذریعے کر دی جس میں بنسبت '' لن '' کے کم قوت پائی گئی۔

(ماخوذ از کبیر)

﴿وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ﴾ (آیت ۹۶)

۱) ''اور بیشک تم ضرور انہیں پاؤ گے کہ سب لوگوں سے زیادہ جینے کی ہوس رکھتے ہیں اور مشرکوں سے ایک کو تمنا ہے کہ کہیں ہزار برس جئے اور وہ اسے عذاب سے دور نہیں کرے گا اتنی عمر دیا جانا اور اللہ ان کے کوتک دیکھ رہا ہے''۔

۲) ''اور البتہ تم ضرور برضرور پاؤ گے ان کو لوگوں سے زیادہ حریص زندگی پر اور مشرکوں سے (زیادہ حریص) پسند کرتا ہے ان میں سے ہر ایک کاش عمر دی جاتی اسے ہزار سال، حالانکہ وہ اسے عذاب سے دور نہیں کرے گا عمر کا دیا جانا، اور اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے جو وہ عمل کرتے ہیں''۔

یہود چونکہ اپنے کفر اور برے اعمال سے اچھی طرح باخبر ہیں انہیں معلوم ہے کہ ان کا مقام جہنم ہے وہ تو صرف ظاہری ظاہری اپنے آپ کو ہی جنت کا مستحق مانتے ہیں۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ ضرور برضرور ان کو دوسرے لوگوں سے زیادہ دنیا کی زندگی پر حریص پائیں گے بلکہ مشرک قیامت پر ایمان نہیں رکھتے ان سے بھی ان کو زیادہ حرص ہے زندگی پر تو وہ جنت کے مستحق کیسے ہوئے۔

ان میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ اسے بہت بڑی عمر دے دی جائے، لیکن ان کا بڑی عمر کی تمنا کرنا ان کو عذاب سے نہیں بچا سکے گا جتنی عمر بھی دے دی جائی آخر انہوں نے عذاب میں مبتلاء ہونا ہی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ ایسا بھی نہیں ہو سکے گا کہ وہ اپنے اعمال کو اللہ تعالیٰ سے مخفی رکھ سکیں۔

﴿ وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ﴾

خطاب نبی کریم ﷺ کو یعنی ضمیر خطاب کا مرجع آپ ہیں۔ ''لام'' مؤطہ للقسم ہے اور ﴿تجدن﴾ وجود سے لیا ہوا ہے "الوجود بالعقل" کی دو قسمیں ہیں جب ''عرفت'' کے معنی میں ہو تو ایک مفعول کا تقاضا کرے گا۔ اور جب اس کا معنی "علمت" کی معنی کے قریب ہو تو دو مفعولوں کا تقاضا کرتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے پہلی آیۃ میں خبر دی ہے کہ وہ ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گے تو یہاں علمت والا معنی ہو گیا۔ اسی لئے اسکے دو مفعول ہیں ایک "هم" اور دوسرا ﴿ أَحْرَصَ النَّاسِ ﴾

﴿ حرص ﴾ کا معنی شدت طلب، اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ حرص ضد ہے قناعت کی یعنی تھوڑی چیز پر اکتفاء نہ کرنا حرص ہے۔

﴿ حَيٰوةٍ ﴾ کو نکرہ ذکر کیا جس سے مراد حیات کے افراد سے ایک فرد یعنی حیات متطاولہ (لمبی زندگی) ہے اس لحاظ پر تنوین تعظیم کے لئے ہے۔ اگر تنوین تحقیر کے لئے ہو تو اس سے یہ مسئلہ ثابت ہو گا کہ وہ دنیا کی لمبی زندگی طلب کرتے ہیں لیکن وہ حقیر ہے یعنی اصل زندگی اخروی زندگی ہے رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿ وان الدار الآخرة لهي الحيوان ﴾ اسی پر دلالت کر رہا ہے۔ تیسرا احتمال یہ بھی ہے کہ تنوین ابہام کے لئے ہے مطلب یہ ہو گا کہ وہ مبہم زندگی کی حرص رکھتے ہیں۔ بعد میں ﴿ أَلْفَ سَنَةٍ ﴾ سے لمبی زندگی کا ذکر کر دیا۔ (از بیضاوی و شیخ زادہ، روح المعانی)

﴿ وَمِنَ الَّذِيْنَ أَشْرَكُوْا ﴾ : اس میں اگرچہ ترکیب کے لحاظ پر تین احتمال ہیں البتہ آسان اور مشہور قول کو ہی نقل کرنے پر اکتفاء کر رہا ہوں۔ واؤ عطف کے لئے ہے معنوی صورت یہ ہو جائے گی " ان اليهود احرص الناس على حيوة واحرص من الذين اشركوا '' کہ یہود دنیا کی زندگی پر لوگوں سے زیادہ حریص ہیں اور مشرکوں سے بھی زیادہ حریص ہیں۔ جس طرح یہ جملہ ذکر کیا جاتا ہے " هو اسخى الناس ومن حاتم " وہ شخص لوگوں سے زیادہ سخی ہے اور حاتم سے بھی زیادہ سخی ہے۔

البتہ یہ خیال کیا جائے کہ مشرکین اگر چہ ﴿ النَّاسِ ﴾ ''لوگوں'' میں داخل ہیں لیکن ان کو علیحدہ ذکر کیا اس لئے کہ ان کو شدید حرص حاصل ہے اور یہود کی زیادہ توبیخ پائی گئی ہے کیونکہ مشرکین کا تو قیامت پر ایمان ہی نہیں۔ وہ تو دنیا کی زندگی کے بغیر کوئی اور زندگی جانتے ہی نہیں ان کا دنیا کی زندگی پر زیادہ حرص کرنا اس لئے ہے کہ وہ دنیا کو ہی اپنے لئے جنت سمجھتے ہیں۔ لیکن اہل کتاب جب قیامت کو بھی مانتے ہیں۔ اور یہ بھی دعوی کرتے ہیں کہ جنت کے حقدار صرف ہم ہی ہیں پھر ان کا مشرکوں سے بھی دنیا کی زندگی پر زیادہ حرص کرنا باعث مذمت اور باعث توبیخ ہے۔ یہود کی مشرکین پر دنیا کی زندگی میں زیادہ حرص کی وجہ یہ تھی:

" انهم علموا انهم صائرون الى النار لا محالة والمشركون لا يعلمون ذلك "

کہ وہ جانتے تھے کہ جو ہمارے عمل ہیں ان کی وجہ سے یقیناً ہم نے جہنم کی آگ میں ہی جانا ہے اس لئے وہ یہ تمنا کرتے تھے کہ اے اللہ ہمیں دنیا کی زندگی میں ہی رکھ تاکہ ہم عذاب سے بچ سکیں۔ لیکن مشرکین کو تو جہنم کی آگ کا کوئی علم ہی نہیں تھا لہذا ان کا دنیا کی زندگی کو صرف منافع کیے لئے پسند کرنا تھا نہ کہ کسی ڈر کی وجہ سے۔

﴿ یَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ﴾:

اگر ''لو'' ان مصدریہ کے معنی میں ہو تو اس صورت میں مطلب ہوگا پسند کرتا ہے ہر ایک ان میں سے ہزار سال عمر دیا جانا۔ اور اگر '' لو '' بمعنی ''لیت '' کے ہو یعنی تمنی کیے لئے تو معنی ہوگا، پسند کرتا ہے ہر ایک ان میں سے کاش کہ اسے عمر دی جاتی ہزار سال۔ (از جلالین ، بیضاوی)

یعنی یہود مشرکوں سے بھی دنیا کی زندگی پر حریص تھے ان کی تمنا بھی ان کی طرح ہی تھی ﴿ مِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا ﴾ میں کئی احتمال ہیں ایک یہ ہے اس سے مراد مجوس (آگ پرست) ہوں کیونکہ وہ اپنے بادشاہ کو کہتے تھے '' عش الف نیروز '' تم ہزار نوروز زندہ رہو۔ اور اسی طرح بھی کہتے '' عش الف مهرجان '' تم ہزار مہرجان زندہ رہو۔ چونکہ نوروز اور مہرجان سال میں ایک ایک مرتبہ آتے ہیں

اس لئے ان کا مطلب یہ ہوتا ''تم ہزار سال زندہ رہو''۔

اسی طرح عجمی مشرکین مراد ہوں کیونکہ وہ کہتے تھے ''زی ہزار سال'' ہزار سال زندہ رہو۔ اور اس سے مراد مشرکین عرب بھی لئے گئے ہیں اور اس سے مراد مطلقاً مشرکین بھی لئے گئے ہیں۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ زیادہ مناسب قول یہ ہے کہ مشرکین سے مراد عام مشرک ہی ہوں۔ اور " المراد بالالف التكثير وهو معروف فى كلام العرب " ہزار سال سے مراد خاص ہزار سال معین نہیں بلکہ مراد بہت سال اس طرح عرب میں زیادہ استعمال ہے۔

﴿ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ﴾:

ضمیر غائب یعنی " هو " کا مرجع " احدهم " ہے۔

" الزحزة، التبعيد والانحاء " یعنی "مزحزح " کا معنی دور کرنا، اور کنارہ پر کرنا۔ یعنی ان میں سے جو کوئی بھی چاہتا ہے کہ اسے لمبی عمر عطاء کی جائے اسے لمبی عمر کا عطا کیا جانا عذاب سے دور نہیں کرسکتا۔ یعنی کتنی بھی عمر اسے دے دی جائے اسے عذاب حاصل ہونا ہی ہے۔

﴿وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴾:

''اور اللہ دیکھ رہا ہے جو وہ عمل کرتے ہیں''۔ یا یہ معنی کیا جائے ''اور اللہ جانتا ہے جو وہ عمل کرتے ہیں''۔ مطلب واضح ہے کہ ان کے کفریات رب کے علم میں ہیں تو ان کو لمبی عمر اس کے عذاب سے کیسے بچائے گی۔

☆☆☆☆☆

﴿ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَإِنَّه نَزَّلَه عَلٰى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾

۱) ''تم فرمادو جوکوئی جبریل کا دشمن ہوتو اس (جبریل) نے تو تمہارے دل پر اللہ کے حکم سے یہ قرآن اتارا اگلی کتابوں کی تصدیق فرماتا اور ہدایت و بشارت مسلمانوں کو''۔

۲) ''آپ فرمادیں جو شخص دشمن ہے جبریل کا تو بیشک اس نے اتارا ہے وہ (قرآن) تمہارے دل پر اللہ کے حکم سے، وہ تصدیق کرنے والا ہے اس چیز کی جو ان کے پاس ہے اور ہدایت اور بشارت ہے مومنوں کے لئے''۔ (آیت نمبر ۹۷)

اس آیۃ کریمہ میں یہود کی ایک اور کجروی کا ذکر ہے کہ ایمان نہ لانے کے لئے انہوں نے جھوٹے بہانے بنانے شروع کئے۔

شان نزول: اس آیۃ کریمہ میں شان نزول کی چند وجوہ ہیں۔ یعنی چند واقعات کے در پیش آنے کے بعد یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

(۱) " اخرج البخاری عن انس بن مالک قال سمع (عبد الله بن سلام) بمقدم رسول الله ﷺ وهو فی ارض یخترف فاتی النبی ﷺ فقال انی سائلک عن ثلاث لا یعلمهن الا نبی ما اول اشراط الساعة ، وما اول طعام اهل الجنة ، وما ینزع الولد الی ابیه او الی امه ؟ قال اخبرنی بهذه جبریل آنفا ، قال جبریل ؟ قال نعم ، قال ذاک عدو الیهود من الملائکة فقرأ هذه الایة ﴿ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَإِنَّه نَزَّلَه عَلٰى قَلْبِكَ ﴾ واما اول اشراط الساعة فنار تحشر الناس من المشرق الی المغرب واما اول طعام یاکله اهل الجنة فزیادة کبد الحوت ، واذا سبق ماء الرجل ماء المرأة نزع الولد واذا سبق ماء المرأة نزعت ، قال اشهد ان لا اله الا الله وانک رسول الله ، یا رسول ان الیهود قوم بهت وانهم ان یعلموا باسلامی قبل ان تسألهم یبهتونی ، فجاءت الیهود فقال الیهود فقال لهم رسول الله ﷺ ای رجل عبد الله ابن سلام فیکم ؟ قالوا خیرنا وابن خیرنا وسیدنا وابن سیدنا ، قال ارأیتم ان اسلم ؟ قالوا اعاذه الله من ذلک ، فخرج عبد الله فقال اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان

محمد ارسول الله فقالوا هو شرنا و ابن شرنا و انتقصوه فقال هذا الذی کنت اخاف یا رسول الله "

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص (عبداللہ بن سلام) نے سنا کہ نبی کریم ﷺ (یہاں) تشریف لائے ہیں وہ اپنے باغ میں پھل چن رہا تھا تو وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آیا تو کہا بیشک میں آپ سے تین چیزوں کے متعلق سوال کرتا ہوں۔ جن کو نبی کے بغیر کوئی نہیں جانتا۔

(وہ پہلا سوال یہ ہے) قیمت (قیامت) کی نشانیوں میں پہلی نشانی کون سی ہوگی۔

(دوسرا سوال یہ ہے) کہ جنت والوں کا پہلا طعام کون سا ہوگا۔

(تیسرا سوال یہ ہے) کہ بچہ کبھی باپ کی شکل میں ہوتا ہے اور کبھی ماں کی شکل میں اسکی کیا وجہ ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ان چیزں کے متعلق ابھی مجھے جبریل نے آکر بتایا ہے تو اس شخص نے کہا جبریل نے بتایا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں جبریل نے بتایا ہے وہ کہنے لگا فرشتوں میں سے جبریل تو یہود کا دشمن ہے۔ (اس وقت اس آیۃ کا نزول ہوا) تو نبی کریم ﷺ نے ﴿ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ ﴾ اس آیۃ کو مکمل طور پر پڑھا۔ (پھر آپ نے سوالات کے جوابات دیئے) (آپ نے فرمایا پہلے سوال کا جواب یہ ہے) قیامت کی نشانیوں میں سے پہلی نشانی یہ ہے کہ آگ آئے گی جو لوگوں کو مشرق سے مغرب کی طرف جمع کر دے گی۔

(دوسرے سوال کا جواب یہ ہے) جنت والوں کو کھانے کے لئے سب سے پہلا طعام مچھلی کے جگر کا ایک حصہ دیا جائے گا۔ (تیسرے سوال کا جواب یہ ہے) جب مرد کا پانی (نطفہ) سبقت (پہل) کر جائے تو مرد بچے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے (یعنی اس کا ہم شکل ہوتا ہے) اور جب عورت کا پانی سبقت کر جائے تو وہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہے (یعنی بچہ اس کا ہم شکل ہوتا ہے)

تو اس شخص نے کہا " اشھد ان لا الــه الا الله و انک رسول الله " (یہ تھے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ) وہ کہنے لگے یا رسول اللہ بیشک یہود بہتان لگانے والی قوم ہے۔ اگر ان کو میرے ان سوالات کرنے سے پہلے اسلام قبول کرنے کا پتہ چلتا تو وہ مجھ پر بہتان لگاتے۔

تو (اتنی دیر میں) کچھ اور یہودی آ گئے نبی کریم ﷺ نے ان کو کہا عبداللہ بن سلام تم میں کیسا شخص ہے؟ وہ کہنے لگے کہ وہ تو ہم سے بہتر شخص ہے اور ہمارے بہتر شخص کا بیٹا ہے۔ وہ تو ہمارا سردار ہے اور ہمارے سردار کا بیٹا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمہاری کیا رائے ہے اگر وہ اسلام لے آئیں وہ کہنے لگے اللہ تعالیٰ اس کو اس (اسلام) سے اپنی پناہ میں رکھے۔ تو حضرت عبداللہ بن سلام باغ سے باہر تشریف لے آئے، اور یہ پڑھنے لگے " اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمدا رسول اللہ " تو وہ یہودی کہنے لگے یہ ہم میں بہت برا شخص ہے اور ہم میں بہت برے شخص کا بیٹا ہے۔ اور عبداللہ بن سلام کی تنقیص بیان کرنے لگے (عیب لگانے شروع کر دیئے) تو حضرت عبداللہ بن سلام نے حضور کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ میں اسی (ان کی بہتان بازی) کا خوف رکھتا تھا۔

(۲) شان نزول کی دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہود رسول اللہ ﷺ کے پاس آ کر کہنے لگے اے ابوالقاسم آپ ہمیں پانچ چیزوں کے متعلق خبر دیں۔

" فان انبأتنا بھن عرضنا انک بنی واتبعناک "
اگر آپ نے ان کی خبر دے دی تو ہم پہچان لیں گے کہ آپ نبی ہیں اور ہم آپ کی تابعداری کریں گے۔

نبی کریم ﷺ نے ان سے وعدہ لیا جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے (مصر کی روانگی پر) وعدہ لیا اور کہا " واللہ علی ما نقول وکیل " جو ہم کہتے ہیں اللہ اس پر کارساز ہے۔ پھر آپ نے فرمایا وہ لاؤ (یعنی جن چیزوں کے متعلق پوچھنا چاہو پوچھ لو) انہوں نے کہا آپ ہمیں نبی کی علامات کے متعلق خبر دیں آپ نے فرمایا " تنام عیناہ ولا ینام قلبہ " نبی کی آنکھیں سوتی ہیں اور دل نہیں سوتا۔

پھر انہوں نے کہا آپ ہمیں بتائیں " کیف تؤنث المرأۃ کیف تذکر " عورت کیسے کبھی مؤنث نما بچہ جنتی ہے اور کبھی مذکر نما، تو آپ نے ارشاد فرمایا:

" یلتقی الماء ان فاذا علا ماء الرجل ماء المرأۃ اذکرت واذا علا ماء المرأۃ ماء الرجل انثت"
دو پانی (مرد اور عورت کے) ملتے ہیں جب مرد کا پانی عورت کے پانی پر غالب

آ جائے تو عورت مذکر نما بچہ جنتی ہے اور جب عورت کا پانی مرد کے پانی پر غالب آ جائے تو عورت کا بچہ مؤنث نما ہوتا ہے۔

پھر انہوں نے کہا آپ ہمیں بتائیں حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر کیا چیز حرام کی آپ نے فرمایا:

" کان یشتکی عرق النساء فلم یجد شیأ یلائمه الا البان کذا ، قال احمد قال بعضهم یعنی الابل فحرم لحومها "

کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو عرق النساء کا درد لاحق تھا، کوئی چیز اس کے موافق نہ پائی سوائے اونٹوں کے دودھ کے، تو آپ نے اونٹوں کا گوشت اپنے آپ پر حرام کر لیا۔ یہود نے کہا آپ نے سچ کہا۔

پھر انہوں نے سوال کیا کہ آپ ہمیں بتائیں کہ رعد (بجلی کی کڑک) کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا:

" ملک من ملائكة الله عز و جل مو كل بالسحاب بيديه او فی يديه مخراق من نار یزجر به السحاب یسوقه حیث امره الله تعالیٰ "

وہ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے جو بادلوں پر مقرر ہے اس کے ہاتھ میں لوہے کی گرز ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ بادلوں کو چلاتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ اسے حکم دیتا ہے۔ پھر انہوں نے پوچھا، بجلی میں آواز کیا ہوتی ہے؟ آپ نے فرمایا " صوته " وہ فرشتے کی ہی آواز ہوتی ہے جو بادلوں کو چلاتے وقت وہ نکالتا ہے انہوں نے کہا آپ نے سچ فرمایا۔

پھر یہود نے کہا ایک سوال باقی رہ گیا ہے اس کا اگر آپ نے جواب دیا تو ہم آپ کی تابعداری کر لیں گے۔ (وہ سوال یہ ہے) کہ ہر نبی کے پاس ایک فرشتہ خبریں لاتا رہا آپ ہمیں بتائیں آپ کے پاس کون سا فرشتہ وحی لاتا ہے۔

" قال جبریل علیه السلام " نبی کریم ﷺ نے فرمایا جبریل علیہ السلام (وحی لاتے ہیں)۔

" قالوا جبریل ذلک الذی ینزل بالحرب و القتال و العذاب عدونا لو قلت میکائیل الذی ینزل بالرحمة و القطر و النبات لکان "

وہ کہنے لگے جبریل تو جنگوں اور قتال کے احکام لاتا ہے اور عذاب مسلط کرتا ہے وہ ہمارا دشمن ہے اگر تم میکائیل کا نام لیتے تو پھر ہم ایمان لے آتے کیونکہ وہ رحمت اور بارش اور نباتات اگانے کے

احکام نازل کرتا ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کا نزول فرمایا۔ (روح احمد والترمذی والنسائی)

تنبیہ: بعض مفسرین نے اسی روایت کو ذکر کیا ہے جس میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ سوال کرنے والا ابن صوریا تھا راقم کے نزدیک کوئی تعارض نہیں۔ کیونکہ یہود کی ایک جماعت حاضر ہوئی سوال ابن صوریا نے کئے تصدیق کرنے والے دوسرے بھی تھے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

(۳) شان نزول کی تیسری وجہ یہ تھی کہ حضرت عمر بن خطاب ﷺ اور یہود کے درمیان ایک مناظرہ ہوا۔ یہ آیۃ حضرت عمر ﷺ کی تائید میں نازل ہوئی۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ حضرت عمر ﷺ فرماتے ہیں کہ میں یہود کے مدرسہ میں حاضر ہوتا رہتا تھا وجہ اس کی یہ تھی:

"فاعجب من التوراۃ کیف تصدق القرآن ومن القرآن کیف یصدق التوراۃ"

کہ میں توراۃ کو سن کر تعجب کرتا تھا کہ توراۃ کیسے قرآن پاک کی تصدیق کرتی ہے اور قرآن پاک توراۃ کی کیسے تصدیق کرتا ہے۔

ایک دن یہود مجھے کہنے لگے اے ابن خطاب تمہارے تمام ساتھیوں سے تم ہمیں زیادہ اچھے لگتے ہو اور ہم تم سے محبت کرتے ہیں میں نے پوچھا اس کی وجہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ تم ہماری محافل میں آتے ہو۔ تو میں نے کہا بیشک میں تمہارے پاس صرف اس لئے آتا ہوں کہ میں تعجب کرتا ہوں کہ قرآن پاک کس طرح توراۃ کی تصدیق کرتا ہے اور توراۃ قرآن پاک کی کیسے تصدیق کرتی ہے۔

اتنے میں رسول اللہ ﷺ وہاں سے گزرے وہ کہنے لگے اے ابن خطاب وہ تمہارے صاحب ہیں ان سے جا کر ملو۔ آپ فرماتے ہیں میں نے انہیں کہا میں تمہیں اللہ تعالیٰ جس کے بغیر کوئی معبود نہیں کی قسم دلا کر کہتا ہوں میں تم سے نبی کریم ﷺ کے حقوق کی حفاظت کر مطالبہ نہیں کرتا۔ اور نہ ہی یہ کہتا ہوں کہ تم ان کی کتاب کو امانت کی طرح محفوظ رکھو۔ (پھر آپ نے کہا) کیا تم جانتے ہو کہ بیشک وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں؟ وہ خاموش رہے۔ ان کے بڑے عالم نے انہیں کہا اس شخص نے تمہارے ساتھ بہت سخت وعدہ لے کر کلام کیا ہے تم اسے جواب دو "قالوا فانت عالمنا و کبیرنا فاجبہ انت" ان سب نے کہا تم ہمارے عالم ہو تم ہمارے بڑے ہو تم ہی اسے جواب دے دو۔

"قال اما اذا تشدتنا بما تشدتنا فانا نعلم انہ رسول اللہ"

اس عالم نے کہا جب تم نے ہم سے اللہ تعالیٰ کی قسم دلا کر سوال کیا تو (اس کا جواب یہ ہے) کہ

بیشک ہم یقیناً جانتے ہیں کہ تحقیق وہ اللہ کے رسول ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے انہیں کہا ''تم برباد ہو جاؤ گے'' (یعنی آپ کی رسالت کا یقینی علم جب تمہیں حاصل ہو پھر ایمان نہ لانا دین و دنیا میں ہلاکت کا) نے کہا ہم ہلاک نہیں ہوں گے۔ میں نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم ہلاک نہ ہو جب تم جانتے بھی ہو کہ بیشک وہ اللہ کے رسول ہیں پھر تم ان کی تابعداری نہیں کرتے اور ان کی تصدیق نہیں کرتے۔ انہوں نے کہا فرشتوں میں ایک ہمارا دشمن ہے اور ایک ہمارا دوست ہے اور ان کی نبوت کا ساتھی یعنی ان کے پاس وحی لانے والا ہمارا دشمن ہے۔

" قلت ومن عدو کم ومن سلمکم ؟ قالوا عدونا جبریل وسلمنا میکائیل "

حضرت عمر فرماتے ہیں میں نے کہا تمہارا دشمن کون ہے اور دوست کون؟ انہوں نے کہا ہمارا دشمن جبریل ہے اور ہمارا دوست میکائیل ہے کیونکہ جبرئیل سخت طبیعت کا مالک ہے مشکلات اور سخت عذاب اور ہر قسم کی سختی کی وجوہ کو وہی لاتا ہے لیکن میکائیل رحمت اور مہربانی والا فرشتہ ہے۔

" قال قلت وما منزلتهما من ربهما عزوجل ؟ قالوا احدهما عن يمينه والآخر عن يساره "

آپ فرماتے ہیں میں نے کہا ان دونوں کا اپنے رب تعالیٰ کے حضور کیا مقام ہے انہوں نے کہا ایک اس کے دائیں طرف ہوتا ہے اور دوسرا دوسری طرف ہوتا ہے۔ تو میں نے کہا قسم ہے اس ذات کی جس کے بغیر کوئی معبود نہیں جب ان دونوں کا یہ مقام ہے تو جو دشمن ہے وہ ان دونوں کا دشمن ہوگا اور جو دوست ہے دونوں کا دوست ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ جبریل میکائیل کے دشمن کا دوست ہو اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ میکائیل دوست ہو جبریل کے دشمن کا۔

آپ فرماتے ہیں پھر میں کھڑا ہوا نبی کریم ﷺ کے پیچھے چلا، آپ ایک قبیلہ کے خوخہ (چھوٹا دروازہ) سے نکل رہے تھے۔ تو آپ نے فرمایا اے ابن خطاب کیا میں تمہیں وہ آیات نہ سناؤں جو ابھی تھوڑی دیر پہلے نازل ہوئیں۔ پھر آپ نے ﴿ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ ﴾ سے لے کر دونوں آیتوں کے آخر تک پڑھا۔ تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان میں اسی ارادہ سے آیا تھا کہ آپ کو خبر دوں لیکن رب تعالیٰ لطیف وخبیر نے مجھ سے پہلے ہی آپ کو خبر دے دی۔

(ماخوذ از صاوی)

﴿ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾:

پہلی ضمیر " فانه " میں جبریل کی طرف لوٹ رہی ہے۔اور دوسری ضمیر " نزله " میں قرآن پاک کی طرف لوٹ رہی ہے۔اس لحاظ پر معنی ہوگا بیشک جبریل قرآن نازل کرتا ہے آپ کے دل پر اللہ کے حکم سے۔ایک اور احتمال یہ ہے کہ پہلی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹے اور دوسری جبریل کی طرف اس صورت میں معنی گا:

" فَاِنَّ اللہ نزل جبریل بالقرآن علی قلبک "

بیشک اللہ تعالیٰ نے جبریل کے واسطہ سے آپ کے دل پر قرآن نازل کیا اپنے ہی حکم سے۔

﴿ عَلٰى قَلْبِكَ ﴾ فرمایا " علیک " نہیں فرمایا اس لئے کہ یا تو '' قلب '' سے مراد روح ہے یعنی اس نے وحی نازل کی آپ کی روح پر، اور اگر '' قلب '' سے مراد خاص عضو ہو تو مراد محل فہم اور محل حفظ ہوگا کیونکہ باقی حواس باطنہ مراد نہیں ہوں گے۔مطلب یہ ہوگا کہ آپ کے دل پر قرآن نازل کیا تا کہ آپ سمجھ سکیں اور یاد کر سکیں۔

" وقیل کنی بالقلب عن الجملة الانسانية كما يكنى ببعض الشئى عنه كله "

اور ایک مطلب یہ بھی ہے کہ ذکر قلب کا ہے اور مراد اس سے تمام انسانیت ہے جیسا کہ ذکر بعض اور مراد کل بطور مجاز مرسل آتا رہتا ہے۔اب اس صورت میں مطلب ہوگا '' بیشک اس نے آپ پر نازل کیا۔

" وقيل معنى ﴿ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ ﴾ جعل ﴿ قَلْبِكَ ﴾ متصفا باخلاق القرآن ومتأدبا بآدابه كما في حديث عائشة رضى الله عنها كان خلقه القرآن يرضى لرضاه ويغضب لغضبه "

اور اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ کے دل پر قرآن نازل کیا کہ آپ کا دل قرآن پاک کے اخلاق سے متصف ہو گیا اور قرآن پاک کے آداب سے متصف ہو گیا۔جس طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث پاک میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کا خلق قرآن پاک ہے جن چیزوں کو قرآن پاک نے پسند فرمایا وہی نبی کریم ﷺ کو پسند تھیں۔اور جن چیزوں کو قرآن پاک میں ناپسندیدہ قرار دیا گیا وہ آپ کو ناپسند تھیں۔یعنی پسند یا ناپسند قدرتی طور پر قرآن پاک کے مطابق تھیں۔ان میں تکلف کی ضرورت نہیں تھی۔

تنبیہ : آیۃ کریمہ کی ابتداء " قل " سے ہے اے محبوب آپ فرمادیں اس کے مطابق عقل کا تقاضا

یہ ہے کہ "علی قلبی" ہونا چاہئے تھا لیکن نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ کے قول کی حکایت بیان کی اور اشارہ فرمایا کہ قائل سفیر محض (فقط بیان کرنے والا) ہے۔

﴿ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾: اذن کا معنی بتانا، اجازت دینا، رخصت دینا یہاں اجازت دینا مراد ہو''اللہ کی اجازت سے'' تو پھر بھی درست ہے۔ اور مجازی معنی لیا جائے ''اللہ کے حکم سے'' یا مجازی معنی یہ لیا جائے اللہ تعالیٰ کی طرف سے طاقت دینے سے۔ یا یہ معنی ہو''اللہ تعالیٰ کے اختیار دینے سے'' سب معانی درست ہیں۔

﴿ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ﴾: لفظی معنی اس طرح ہے'' تصدیق کرنے والا ہے اس چیز کی جو ان کے ہاتھوں کے درمیان ہے'' مرادی معنی یہ ہے'' تصدیق کرنے والا ہے اس چیز کی جو انکے سامنے ہے''۔

﴿ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ﴾ من الكتب الالهية التى معظمها التوراة ''

قرآن پاک تمام کتب الاھیہ کی تصدیق کرنے والا ہے ان تمام میں سے معظم توراۃ ہے۔ یہاں توراۃ ہی مراد لینا بہتر ہے کیونکہ خطاب یہود کو ہو رہا ہے۔

﴿ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾: ''اور ہدایت اور بشارت ہے مومنوں کے لئے''

قرآن پاک اگر چہ تمام لوگوں کے لئے ہدایت ہے لیکن اس ہدایت کو قبول مومنوں نے کیا لہٰذا مومنین کا خصوصی ذکر فرمایا اور بشارت بھی یقیناً مومنوں کے لئے ہی ہے جنھوں نے ایمان لایا ہدایت کو قبول کیا وہی جنت اور جنت کی نعمتوں کی بشارت کے مستحق ہیں۔

آیۃ کریمہ سے حاصل ہوا: حضرت جبریل علیہ السلام کی شان بلند ہے آپ رفیع القدر اسلئے کہ اللہ تعالیٰ اور اشرف الخلوق حضرت محمد ﷺ کے درمیان واسطہ ہیں۔ اور اس کتاب کو نازل کرنے والے ہیں جو صفات عظیمہ والی ہے۔ جن میں سے کچھ کا ذکر اس آیۃ میں ہی کر دیا گیا اور اسی آیۃ کریمہ سے یہود کا باعث مذمت ہونا واضح ہو گیا:

'' حيث ابغضوا من كان بهذه المنزلة العظيمة الرفيعة عند الله تعالىٰ ''

کیونکہ انہوں نے اس ذات سے بغض کیا جس کا مقام رب تعالیٰ کے ہاں بہت ہی بلند و بلا ہے۔

﴿ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴾ (آیت ۹۸)

۱) ''جو کوئی دشمن ہو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریل اور میکائیل کا تو اللہ دشمن ہے کافروں کا''۔

۲) ''جو شخص ہے دشمن اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے رسولوں کا اور جبریل کا اور میکائیل کا تو بیشک اللہ دشمن ہے کافروں کا''۔

اس آیۃ میں یہود کا رد کیا گیا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریل اور میکائیل کا دشمن ہے وہ کافر ہے، اللہ تعالیٰ کافروں کا دشمن ہے یعنی ان کو دائمی عذاب میں مبتلاء فرمائے گا ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔

اعتراض: " العداوة للشئی طلب الاضرار به بغضاله "

کسی کے ساتھ بغض رکھنے کی وجہ سے اسے نقصان پہنچانے کی طلب کرنا عداوت کہلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو نقصان پہنچانا جب ممکن نہیں۔ کسی کو اس کی طاقت حاصل نہیں تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ دشمنی کرنے کا کیا مطلب ہوسکتا ہے؟

پہلا جواب: اللہ کے ساتھ عداوت رکھنے کا مجازی معنی معتبر ہے کہ عناد کی وجہ سے رب تعالیٰ کے احکام کی مخالفت کرنا اور رب تعالیٰ کی طاعت کو ناپسند سمجھنا گویا کہ عداوت ہی ہے۔ کیونکہ دشمن بھی اپنے دشمن کے احکام کو پرواہ میں نہیں لاتا اور اپنے دشمن کی فرمانبرداری نہیں کرتا۔

دوسرا جواب: اصل میں مقصود تو رب تعالیٰ کے مقربین کی عداوت کا ذکر کرنا تھا۔

" الا انه افتتح الكلام بذكر عداوة الله تعالیٰ تمهيدا لذكرهم وتعظيما لهم وبيانا لفضل منزلتهم "

لیکن ابتداء کلام میں اللہ تعالیٰ کی عداوت کا ذکر درحقیقت ان کے ذکر کے لئے تمہید ہے۔ اور ان

کی عظمت کے ذکراوران کی فضیلت مراتب کا ذکر ہے۔جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ ﴾—الخ

اس میں مال غنیمت کے مصارف کا ذکر کیا گیا:

"فصدر مضارف خمس الغنيمة بذكره تعالىٰ تعظيما لهم لا لبيان انه تعالىٰ من جملة المصارف"

اورغنیمت کے خمس کے مصارف کو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے شروع فرمایا صرف ان مصارف کی تعظیم کے لئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کوئی مصرف نہیں۔

تیسرا جواب: اللہ تعالیٰ کی عداوت سے مراد درحقیقت اللہ کے بندوں کی عداوت ہے جس کا بعد میں بیان آرہا ہے کہ وہ اللہ کے بندے کون ہیں۔اللہ کے فرشتے اوراس کے رسول اور جبریل میکائیل ہیں۔جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:﴿ ان الذين يحاربون الله ورسوله ﴾ اورارشادگرامی:﴿ ان الذين يؤذون الله ورسوله ﴾ بیشک مراد ان دونوں آیتوں میں:

"بيان حكم محاربة عباد الله وايذائهم دونه لا ستحالة المحاربة والاذية عليه تعالىٰ"

پہلی آیۃ میں ذکر ہے (بیشک وہ لوگ جو اللہ اوراس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں) اور دوسری آیۃ میں ذکر ہے "بیشک وہ لوگ جو اللہ اوراس کے رسول کو ایذاء دیتے ہیں" (تکلیف پہنچاتے ہیں) ان دونوں آیتوں میں بھی ذکر تو اللہ تعالیٰ کا ہے لیکن مراد اس کے بندے ہیں۔کیونکہ اللہ سے جنگ کرنا اور اللہ تعالیٰ کو ایذاء دینا محال ہے کسی انسان کو طاقت ہی نہیں۔ (از شیخ زادہ)

جبرئیل ومیکائیل کو علیحدہ ذکر کرنے کی وجہ:

ملائکہ کا ذکر جب پہلے ہو گیا تو اسی میں جبرئیل اور میکائیل کا ذکر بھی ہو گیا ان کو دوبارہ ذکر کرنے کی وجہ کیا ہے؟ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان دونوں کی فضیلت کو ذکر کرنا مقصود تھا کہ یہ دونوں اپنی رفعت شان کے لحاظ پر گویا کہ ملائکہ سے علیحدہ جنس ہیں:

"فان التغاير في الوصف قد ينزل منزلة التغاير في الذات"

بیشک تغایر وصفی کو کبھی تغایر ذاتی کے درجہ میں سمجھ لیا جاتا ہے۔جیسا کہ ابوالطیب نے کہا:

فان تفق الانام وانت منهم ، فان المسک بعض دم الغزال

اگر چہ لوگ تمام ایک جیسے ہیں اور تم بھی ان میں سے ہو بیشک کستوری بھی ہرن کے خون کا حصہ ہی ہے

یعنی جس طرح کستوری ہرن کے خون کا حصہ ہونے کے باوجود علیحدہ حیثیت رکھتی۔ اسی طرح ابو الطیب نے اپنے ممدوح کو کہا تم اگر چہ لوگوں میں سے ہی ہو لیکن بلند شان رکھنے کی وجہ سے گویا کہ تمہاری حیثیت دوسرے لوگوں سے علیحدہ ہے۔

دوسری وجہ ان دونوں فرشتوں کو علیحدہ ذکر کرنے کی یہ ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے:

" من عادی احدهم فكانما عادی الجميع فی انه كافر "

کہ جس نے اللہ تعالیٰ کے رسولوں میں سے کسی ایک کے ساتھ دشمنی کی اس نے تمام سے ہی دشمنی کی ایک سے دشمنی کرنا بھی کفر ہے اور سب سے دشمنی کرنا بھی کفر ہے۔

خیال رہے کہ یہاں " رسل " سے مراد عام ہے جو پیغمبروں اور رسولوں سب کو شامل ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ الله يصطفی من الملائكة رسلا ومن الناس ﴾

"اللہ تعالیٰ نے ملائکہ اور لوگوں سے رسولوں کو برگزیدہ بنایا"۔

جب کہ ملائکہ کا ذکر رسل میں آ سکتا تھا تو علیحدہ ذکر کیا کیونکہ یہود کا رد اس بات کا کرنا مقصود تھا (کہ جبریل ہمارا دشمن ہے)۔

کسی ایک سے دشمنی پر وعید نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے ثابت ہے۔ بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا:

" قال رسول الله ﷺ من عادی لی وليا فقد بارزنی بالحرب "

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (جس نے میرے ولی سے دشمنی کی تحقیق وہ میرے مقابل جنگ کے لئے آ گیا" (حدیث قدسی)

نتیجہ واضح ہوا:

" ان من عادی وليا لله فقد عادی الله ومن عادی الله فان الله عدوله ومن كان الله عدوه فقد خسر الدنيا والآخرة "

بیشک جس نے اللہ کے ولی سے دشمنی کی تحقیق اس نے اللہ سے دشمنی کی جس نے اللہ سے دشمنی کی بیشک اللہ اس کا دشمن ہوا۔ جس کا اللہ دشمن ہوا وہ دنیا اور آخرت میں خسارے میں رہا۔

تیسری وجہ ان دونوں فرشتوں کو علیحدہ ذکر کرنے کی یہ تھی:

" ان المحاجة التی وقعت بین الیهود ورسول الله ﷺ کانت فیهما والآیة انما نزلت بسببهما فلا جرم نص علی اسمیهما "

یہود اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان جو بحث ہوئی۔ اس میں یہود نے ان دونوں فرشتوں کا ہی ذکر کیا کہ جبریل ہمارا دشمن ہے اور میکائیل ہمارا دوست ہے آیۃ کریمہ کا جب شان نزول ہی یہ ہے تو اسی وجہ سے ان دو کا صراحۃً ذکر کیا گیا۔

" فاعلمهم الله تعالیٰ ان من عادی واحدا منهما فقد عادی الآخر وعادی الله ایضا "

تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بتایا کہ جو شخص ایک کا دشمن ہوگا وہ حقیقت میں دونوں کا ہی دشمن ہوگا، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کا بھی دشمن ہوگا۔ لہٰذا تمہارا یہ کہنا باطل ہے کہ ایک دشمن ہے اور دوسرا دوست ہے۔

(ماخوذ از شیخ زادہ وصاوی و ابن کثیر)

وجہ تسمیہ: " قال الماوردی ان جبریل ومیکائیل اسمان احدهما عبد الله والآخر عبید الله لان ایل هو الله تعالیٰ وجبر هو عبد ومیکا هو عبید فکان جبریل عبد الله ومیکائیل عبید الله "

" ایل " اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی ہے۔ یعنی " ایل " کا معنیٰ ''اللہ'' اور ''جبر'' کا معنیٰ ''عبد'' اور ''میکا'' کا معنیٰ ''عبید'' ہے۔ اس طرح جبریل کا معنیٰ ''عبداللہ'' اور میکائیل کا معنیٰ ''عبیداللہ''۔ اور بعض حضرات نے اسرافیل کا معنیٰ ''عبدالرحمٰن'' بیان کیا۔

☆ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ یہ پڑھتے تھے:

" اللهم رب جبریل ومیکائیل واسرافیل اعوذ بک من حر النار وعذاب القبر "

(از قرطبی)

اور حدیث شریف میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات کو قیام فرماتے اور یہ دعا پڑھتے:

" اللهم رب جبرائیل ومیکائیل واسرافیل فاطر السموت والارض عالم الغیب والشهادة انت تحکم بین عبادک فیما کانوا فیه

یختلفون اهدنی لما اختلف فیه من الحق باذنک انک تهدی من

تشاء الی صراط مستقیم" (ابن کثیر)

لفظ جبریل کے متعلق: اس لفظ میں آٹھ لغات پائی گئی ہیں تاہم چار زیادہ مشہور ہیں:

(۱) جبریل (بکسر الجیم) یہ لغت ہے بنی حجاز کی۔ (۲) جبریل (بفتح الجیم) یہ حسن اور ابن کثیر کی قراءۃ ہے۔ (۳) جبرئیل (بروزن سلسبیل) یہ اہل کوفہ کی قراءت ہے۔ (۴) جبرائیل (بکسر الجیم، والھمزۃ بعد الالف)۔

لفظ میکائیل کے متعلق: اس لفظ میں چھ لغات ہیں تین ان میں سے زیادہ مشہور ہیں:

(۱) میکال، یہ بنی حجاز کی لغت، اسی لغت کے مطابق قرآن پاک میں پڑھا جا رہا ہے۔

(۲) میکاییل (الف کے بعد دو یا ہیں یہ نافع کی قراءت ہے)۔

(۳) میکائیل (الف کے بعد ہمزہ اور یا ہے) یہ حمزہ کی قراءت ہے۔ (ماخوذ از قرطبی)

جبریل کی افضلیت: حضرت جبریل علیہ السلام کی افضلیت پر ایک دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر پہلے کیا ہے اور میکائیل علیہ السلام کا بعد میں۔ ان کا پہلے ذکر کیا جانا ان کی فضیلت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ اکثر طور پر افضل کا ذکر پہلے کیا جاتا ہے اگر چہ کبھی اس کے خلاف بھی واقع ہو جاتا ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ جبریل قرآن پاک نازل کرتے رہے وحی لاتے رہے اور علم ان کے واسطہ سے ہی نبی کریم ﷺ کی امت کو دیا گیا" وھو مادۃ بقاء الارواح" علم روحوں کی بقاء کا مادہ ہے۔ اور اسرافیل خوشحالی اور بارشیں لاتے ہیں یہ بدنوں (جسموں) کی بقاء کا مادہ ہے۔

" ولما کان العلم اشرف من الاغذیۃ وجب ان یکون جبریل افضل من میکائیل "

جب علم غذاؤں سے اشرف ہے تو ضروری ہے کہ جبریل افضل ہوں میکائیل سے۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ جبریل کا وصف رب تعالیٰ نے بیان فرمایا ﴿ مطاع ثم امین ﴾ مطلقاً جب جبریل کو مطاع کہا گیا کہ ان کی طاعت فرشتے کرتے ہیں تو پتہ چلا کہ تمام فرشتے آپ کی طاعت کرنے والے ہیں:

" وظاھرہ یقتضی کونہ مطاعا بالنسبۃ الی میکائیل فوجب ان یکون افضل منہ "

اسی سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ آپ کی طاعت کرنے والے میکائیل بھی ہیں۔ لہذا میکائیل سے جبریل کا افضل ہونا واضح طور پر ثابت ہو گیا۔ خیال رہے کہ راقم نے اس مقام پر روح المعانی کو بھی دیکھا تاہم کبیر کی بحث کو مفید پا کر ذکر کیا گیا۔

﴿وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ وَمَا یَکْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ﴾ (آیت ۹۹)

۱) "اور بیشک ہم نے تمہاری طرف روشن آیتیں اتاریں اور انکے منکر نہ ہوں گے مگر فاسق لوگ"۔

۲) "اور البتہ تحقیق نازل کیں ہم نے تمہاری طرف واضح آیات، اور نہیں کفر کرتے ان کے ساتھ مگر فاسق لوگ"۔

"اعلم ان هذا نوع آخر من قبائحهم وفضائهم" اس آیۃ کریمہ میں یہود کے اور قبیح اقوال اور ان کے لئے رسوا کن عذاب کا ذکر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی واضح آیات کا انکار کر کے کافر ہو گئے اور دائمی عذاب کے مستحق ہو گئے۔

شان نزول کی دو وجہ:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے یہود اوس اور خزرج پر رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے آپ کے وسیلہ سے فتح طلب کرتے تھے آپ جب عرب میں مبعوث ہوئے تو انہوں نے آپ کا انکار کیا اور کفر میں مبتلا ہو گئے تو حضرت معاذ بن جبل ﷺ نے فرمایا اے یہود کے قبیلہ اللہ سے ڈرو اور اسلام لے آؤ۔

"فقد كنتم تستفتحون علينا بمحمد ونحن اهل الشرک وتخبروننا انه مبعوث وتصفون لنا صفته"

تم تو ہم پر محمد (ﷺ) کے وسیلہ سے فتح طلب کرتے تھے اور ہم مشرک تھے تم ہمیں خبر دیتے تھے کہ وہ مبعوث ہونے والے ہیں تم ان کی صفات ہمارے سامنے بیان کرتے تھے۔

"فقال بعضهم ما جاء نا بشئی من البينات وما هو بالذی كنا نذكر لكم فانزل الله تعالىٰ هذه الاية"

ان میں سے کسی نے کہا یہ شخص ہمارے پاس کوئی واضح نشانیاں نہیں لایا۔ یہ وہ شخص نہیں جس کا ہم تمہارے سامنے ذکر کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا۔

(از کبیر)

(۲) شان نزول کی دوسری وجہ یعنی ان دو واقعات کے بعد اس آیۃ کا نزول ہوا یہ بھی خیال رہے کہ یہ دونوں قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ہیں۔ اس آیۃ کریمہ کے نازل ہونے کا سبب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے کہ ابن صوریا نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آیا:

" وقال الرسول الله ﷺ ما جئتنا بشئی نعرفه وما انزل علیک من آیات فنتبعک "

اور آپ کو کہنے لگا تم ہمارے پاس کوئی نشانی نہیں لائے کہ ہم تمہیں پہچان لیں اور تم پر کوئی آیات نازل نہیں ہوئیں کہ ہم تمہیں تابعداری کریں۔ اس وقت اس آیۃ کا نزول ہوا۔ (از روح المعانی)

﴿ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ ﴾:

" ای انزلنا الیک یا محمد علامات واضحات دالات علی نبوتک "

نبی کریم ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے رب تعالیٰ نے فرمایا "البتہ تحقیق ہم نے نازل کیں آپ کی طرف واضح نشانیاں جو آپ کی نبوت پر دلالت کرتی ہیں۔

وہ آیات کیا ہیں؟ وہ آیات یہ ہیں جن پر کتاب اللہ (قرآن پاک) مشتمل ہے یعنی یہود کے علوم کی مخفی باتیں، اور ان کی خبروں کے چھپے ہوئے راز، پہلے بنی اسرائیل (یعنی گزرے ہوئے) کی خبریں۔ اور ان کی کتابوں میں جو کچھ تھا ان کی خبریں قرآن پاک نے دیں حالانکہ تمام یہود بھی وہ نہیں جانتے تھے صرف ان کے علماء اور پادری جانتے تھے۔ بنی اسرائیل کے پہلے لوگوں نے جو تحریف کی قرآن پاک نے اس کا بھی بتایا۔ اور ان کے بعد میں آنے والوں نے جو تحریف کی اس کے متعلق بھی بتایا۔ پھر جو احکام انہوں نے بدلے رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ پر کتاب نازل کر کے انکو اطلاع دی۔

﴿ فکان فی ذلک من امره الآیات البینات لمن انصف من نفسه ﴾

اگر کوئی اپنے آپ پر انصاف کرتے ہوئے حق گوئی سے کام لے تو وہ یقیناً یہ کہے گا کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ پر واضح آیات کو نازل فرمایا۔ (از صابونی)

آیات سے مراد قرآن پاک کی آیات ہوں کیونکہ ظاہر یہی ہے۔لیکن اگر اس کے ساتھ باقی تمام دلائل بھی مراد ہو جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔

" وقال بعضهم لا يمتنع ان يكون المراد من الآيات البينات القرآن مع سائر الدلائل نحو ام تناعهم من المباهلة ومن تمنى الموت وسائر المعجزات نحو اشباع الخلق الكثير من الطعام القليل ونبوع الماء من بين اصابعه وانشقاق القمر "

بعض حضرات نے یہ بیان کیا ہے کہ اس میں کوئی وجہ امتناع کی نہیں کہ قرآن پاک کی آیات بینات کے ساتھ دوسرے تمام دلائل بھی مراد لئے جائیں۔ان لوگوں کا مباہلہ کے لئے سامنے نہ آنا۔ اور موت کی تمنا نہ کرنا۔اور تمام معجزات بھی ساتھ ہی مراد ہوں جس طرح کثیر مخلوق کو تھوڑے طعام سے سیر کرا دینا۔انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری کر دینا اور چاند کے دو ٹکڑے کر دینا۔ (از کبیر)

اگرچہ بعض حضرات نے صرف قرآن پاک کی آیات سے خاص کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ انزال یا تنزیل کا تعلق آیات قرآنیہ سے ہی ہوتا ہے لیکن علامہ آلوسی رحمہ اللہ روح المعانی میں بیان فرماتے ہیں:

" (والآيات) القرآن والمعجزات والاخبار عما خفي واخفي في الكتب السابقة او الشرائع والفرائض اومجموع ما تقدم كله والظاهر الاطلاق "

آیات سے مراد قرآن پاک کی آیات اور معجزات اور مخفی چیزوں کی خبر دینا اور پہلی کتب میں جن چیزوں کو مخفی رکھا گیا ان کی خبر دینا۔یا آیات سے مراد شرعی احکام اور فرائض یا مراد یہ تمام چیزیں ہوں جن کا ذکر کیا گیا۔اسی آخری قول کو پسند کرتے ہوئے کہا گیا کہ ظاہر یہی ہے کہ مطلقاً عموم ذکر ہو۔ابھی تک مفسرین کرام کے اقوال جو ذکر کئے گئے ان سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ اگر کوئی یہ ایمان رکھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ پر آیات بینات کو نازل فرمایا تو اسے نبی کریم ﷺ کا علم غیب ماننا پڑے گا۔کیونکہ مخفی چیزوں کی خبر علم غیب ہی تو ہے۔

آیات کی وجہ تسمیہ: آیات کو آیات کہنے کی کئی وجوہ ہیں۔مقصد سب کا ایک ہی ہے کیونکہ

"آیۃ" اصل مطلب یہ ہے " ان الآیۃ ھی الدالۃ " بیشک آیۃ کا معنی ہے دلالت کرنی والی۔

(۱) آیۃ کو آیۃ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن پاک کی ہر آیۃ اپنی فصاحت و بلاغت کے لحاظ پر صدق مدعی پر دلالت کرتی ہے۔لہذا اس دلالت کے لحاظ پر آیۃ کہہ دیا گیا۔

(۲) دوسری وجہ " ان منھا ما یدل علی الاخبار عن الغیوب فھی دالۃ علی تلک الغیوب " بیشک بعض ایات غیبی خبریں دیتی ہیں۔ان کا غیبی خبروں پر دلالت کرنے کی وجہ سے نام آیات رکھا لیا کیا خوب بات سمجھ میں آئی کی نبی کریم ﷺ پر جب قرآن کے نازل ہونے کو تسلیم کر لیا جائے اور یہ بھی مان لیا جائے کہ قرآنی آیات غیبی علوم، غیبی خبروں پر مشتمل ہیں لیکن یہ نہ مانا جائے کہ نبی کریم ﷺ کو علم غیب حاصل ہے کون سا انصاف ہے۔

(۳) چونکہ قرآن پاک کی آیات توحید، نبوت اور شرعی احکام پر دلالت کرتی ہیں اس لئے ان کو آیات کہا گیا ہے۔

اعتراض: جب آیۃ کا معنی دلیل کر لیا گیا ہے تو آیات کے ساتھ ﴿ بینات ﴾ کے ذکر کا کیا فائدہ ہے؟ کیونکہ " الدلیل لا یکون الا بینا " دلیل تو ہوتی ہی وہ ہے جو بین ہو۔

جواب: دلیل سے علم حاصل کرنے کے طریقہ میں تفاوت پایا جاتا ہے کیونکہ بعض دلیلیں وہ ہوتی ہیں جن کے مقدمات زیادہ ہوتے ہیں ان کے ذریعے مطلب تک پہنچنا مشکل ہوتا ہے۔اور بعض دلیلوں کے مقدمات تھوڑے ہوتے ہیں ان کے ذریعے مقاصد کا حاصل کرنا آسان ہوتا ہے ایسی دلیلوں کو بینات کہا گیا ہے۔ (از کبیر)

اعتراض: " الانزال عبارۃ عن تحریک الشئی من الا علی الی الاسفل وذاک لا یتحقق الا فی الجسمی فھو علی ھذا الکلام محال "

﴿ انزل ﴾ "اتارنا" کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کو بلند مقام سے پست مقام کی طرف حرکت دینا۔یہ صرف جسموں میں متحقق ہے آیات جب اجسام نہیں تو آیات کے اتارنے کا کیا مطلب؟

جواب: " ان جبریل لما نزل من الأعلی الی الاسفل واخبر بہ سمی ذلک انزالہ "

جبریل جب بلندی سے پستی کی طرف تشریف لاتے اور آیات نبی کریم ﷺ پر پیش کرتے تو

اس کو انزال کہہ دیا گیا۔ (از کبیر)

﴿ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴾ :

''اور نہیں کفر کرتے ان کے ساتھ مگر فاسق''۔

آیات سے کفر دو طرح ہے۔ دونوں ہی یہاں مراد ہیں۔ ایک یہ ہے کہ آیات کے صحیح ہونے کا علم حاصل ہو پھر ان کا انکار کر دیا جائے۔ اور دوسرا یہ ہے کہ آیات سے جاہل رہنے اور ان میں غور و فکر نہ کرنے، تدبر نہ کرنے اور ان کے دلائل سے اعراض کرنے کی وجہ سے انکار پایا جائے۔ انکار کسی طرح بھی پایا جائے کفر ہے لہٰذا آیۃ کریمہ میں حکم عام ہے جو دونوں قسموں کو شامل ہے۔

فسق کا لغوی معنی: " الفسق فی اللغة خروج الانسان عما حدله "

انسان کا حد سے نکل جانا فسق ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے ابلیس کے متعلق فرمایا:

﴿ ففسق عن امر ربه ﴾ اس نے اپنے رب کے حکم سے تجاوز کیا۔

اسی خروج کے معنی کا اعتبار کرتے ہوئے عرب کہتے ہیں " فسقت النواة " گٹھلی کھجور سے نکل گئی۔

فسق کے قریب فجور: اس لئے کہ فجور کا معنی ماخوذ ہے۔

" فجور السد الذی یمنع الماء " یعنی وہ رکاوٹ اور بند جو پانی کو روکے اس کا کھل جانا، شگاف پڑ جانا " فجور " کہلاتا ہے۔ چونکہ پانی کے بند کے پھٹ جانے سے فساد پھیلتا ہے پانی ہر طرف تباہی پھیلا دیتا ہے۔ اسی معنی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس انسان کو بھی فاجر کہہ لیا جاتا ہے جو حد سے تجاوز کر جائے۔ اس کے گناہ بھی چونکہ فساد کا ذریعہ بنتے ہیں۔

اعتراض : صغیرہ گناہ کے مرتکب کو فاجر نہیں کہا جاتا حالانکہ حد سے تجاوز وہ بھی کرتا ہے۔ اسے حد سے تجاوز کے باوجود فاجر نہ کہنے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: جس طرح بند سے معمولی پانی کے نکلنے کو فجور نہیں کہتے، بلکہ جب زیادہ پانی نکلے، فساد پھیلائے اس وقت فجور کے لفظ کا استعمال ہوتا ہے اسی طرح جب گناہوں میں بھی زیادہ حد سے

تجاوز ہو جو فساد کا ذریعہ بنے اس وقت اس شخص کو فاجر کہا جائے گا۔

" وکذالک الفسق انما یقال اذ اعظم التعدی "

اسی طرح فسق کا استعمال بھی اس وقت ہوگا جب وہ زیادہ تجاوز کرے اور حد سے زیادہ بڑھ جائے۔

(از کبیر)

﴿ الفاسقون ﴾ المتمردون فی الکفر الخارجون عن الحدود فانّ من لیس علی تلک الصفات من الکفرۃ لا یجتریٔ علی الکفر بمثل ھاتیک البینات "

فاسقوں کا معنی ہے کفر میں سرکشی کرنے والے، حد سے تجاوز کرنے والے اس لئے کہ یہاں ان لوگوں کا ذکر ہے جو واضح آیات کا انکار کرنے والے ہیں، یہ وہی ہو سکتے ہیں جو کفر میں حد سے بڑھے ہوئے ہیں۔ کیونکہ ان کے بغیر کوئی جرات نہیں کر سکتا کہ آیات بینات کا انکار کرے۔

یعنی یہاں معنی تقریباً یہ ہو گیا" وما یکفربھا الا الکافرون المتمردون " آیات بینات سے کفر نہیں کرتے سوائے سرکش کافروں کے۔

" قال الحسن اذا استعمل الفسق فی نوع من المعاصی وقع علی اعظم افراد ذلک النوع من کفر او غیرہ "

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب فسق کا استعمال کسی گناہ سے ہو تو اس سے مراد عظیم گناہ ہوگا خواہ کفر ہو یا غیر کفر ہو۔

" فاذا قیل ھو فاسق فی الشرب فمعناہ ھو اکثر ارتکابا لہ "

جب یہ کہا جائے کہ فلاں شراب کی وجہ سے فاسق ہے تو اس کا معنی ہوتا ہے وہ بہت زیادہ شراب پیتا ہے اور جب کہا جائے " ھو فاسق فی الزنا یکون معناہ ھو اشد ارتکابا لہ " کہ وہ زناء کی وجہ سے فاسق ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ بہت زیادہ زنا کا مرتکب ہے۔

(از روح المعانی و کبیر)

﴿ اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ (آیت ۱۰۰)

۱) ''اور کیا جب کوئی عہد کرتے ہیں ان میں کا ایک فریق اسے پھینک دیتا ہے بلکہ ان میں بہتیروں کو ایمان نہیں''۔

۲) ''اور کیا جب کوئی عہد کیا انہوں نے پختہ عہد، توڑ دیا اسے ایک فریق نے ان سے بلکہ اکثر ان کے ایمان نہیں رکھتے''۔

یہاں سے یہود کی اور قباحت اور کجروی کا ذکر کیا جارہا ہے کہ ان کا طریقہ یہ ہے کہ وعدہ کر لینا اور توڑ دینا۔

شان نزول میں چند وجوہ: یعنی چند وجہ کے درپیش آنے کے بعد آیۂ کریمہ کا نزول ہوا۔

(۱) مالک بن صیف یہودی نے جب یہ کہا:

" واللہ ما اخذ علینا عھد فی کتابنا ان نؤمن بمحمد ﷺ ولا میثاق "

قسم ہے اللہ تعالیٰ کی کہ رب تعالیٰ نے ہم سے کوئی ایسا وعدہ نہیں لیا جو ہماری کتاب میں ہو کہ ہم محمد ﷺ پر ایمان لائیں۔ (تو آیۂ کریمہ نازل ہوئی)

(۲) " وقیل فی الیھود عاھدوا ان خرج لنؤمنن بہ ولنکونن معہ علی مشرکی العرب فلما بعث کفروا بہ "

دوسری وجہ شان نزول کی یہ ہے کہ یہود نے وعدہ کیا کہ جب آخر الزمان نبی تشریف لائیں گے تو ہم ان پر ایمان لائیں گے اور ہم مشرکوں کے خلاف نبی کا ساتھ دیں گے۔ لیکن جب نبی کریم ﷺ تشریف لائے تو انہوں نے وعدہ کو توڑ دیا اور کفر کیا۔

(۳) تیسری وجہ شان نزول کی یہ ہے:

" وقال عطاء فی الیھود عاھدوا رسول اللہ ﷺ بعھود فنقضوھا کفعل قریظۃ والنضیر "

کہ عطاء نے کہا یہود کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔ جب کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے وعدہ کیا کہ وہ آپ کے خلاف مشرکین کا ساتھ نہیں دیں گے لیکن پھر جنگ احزاب (خندق کے موقع پر) میں بنی قریظہ اور بنی نضیر نے مکہ کے مشرکوں کا ساتھ دیا۔ بلکہ مشرکین کو جنگ کے لئے آمادہ کرنے والے ہی یہود تھے۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے جب وہ دلائل ظاہر فرمائے جو رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر دلالت کرنے والے تھے اور آپ کی شریعت کے صحیح ہونے پر دلالت کرتے تھے۔

"کان ذلک کالعهد منه سبحانه وقبولهم لتلک الدلائل کالمعاهدة منهم لله سبحانه وتعالیٰ"

اوران دلائل کو قبول کرنا ان کی طرف سے رب تعالیٰ سے وعدہ کرنا تھا اور پھر ان سے روگردانی کرنا وعدہ کو توڑنا تھا۔

(۵) "انهم کانوا یعاهدون الله کثیرا وینقضونه" یہود کے وعدہ کو توڑنے کا ذکر عام ہے وہ اکثر اوقات اللہ تعالیٰ سے وعدہ کرتے تھے اور پھر اسے توڑ دیتے تھے۔

﴿ اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا ﴾ ہمزہ استفہام انکاری کے لئے ہے یعنی مفہوم یہ ہوگا اور کیا جب انہوں نے وعدہ کیا توڑ دیا ایک فریق نے ان میں سے، حالانکہ ان کو یہ وعدہ نہیں توڑنا چاہئے تھا۔ اور ساتھ ساتھ ہی ہمزہ سے یہ سمجھا دیا گیا" واعظام ما یقدمون علیه " کہ وہ جو کام کرتے تھے ان کے بڑے جرائم تھے۔

﴿ عَهْدًا ﴾ مصدر ہے مفعول مطلق تاکید کے لئے استعمال ہے جب بھی انہوں نے وعدہ کیا وعدہ کرنا، اس تاکید والے معنی سے پختگی سمجھ میں آتی ہے راقم نے اپنے ترجمہ میں "پختہ عہد" ذکر کیا۔

﴿ اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا ﴾ علی عهد بعد عهد نقضوه ونبذوه "

یہاں ﴿ كُلَّمَا ﴾ سے واضح ہوا کہ انہوں نے کئی مرتبہ عہد کیا اور کئی مرتبہ توڑا اور پھینکا (پست پشت ڈالا) اسی سے یہ سمجھ آ گیا کہ بار بار وعدہ کرنا اور توڑنا ان کی عادت بن چکا تھا۔ ضمناً اس میں نبی کریم ﷺ کو تسلی بھی دی گئی کہ آپ دل تنگ نہ ہونا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی آیت سے کفر کرتے ہیں۔

یہ کوئی نئی بات نہیں "بل هو سجیتهم وعادتهم وعادة سلفهم" بلکہ ہمیشہ وعدہ کو توڑنا قبیح اقوال وافعال نے ان کو گھیرے میں لے رکھا ہے اور ان کی یہ عادت بن چکی ہے اور ان سے پہلے گزرے ہوئے ان کے آباء واجداد کی بھی یہی عادت تھی۔ (از کبیر)

﴿ نَبَذَهٗ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ ﴾ : "ای نقضه فریق منهم" منصوب ضمیر عہد کی طرف لوٹ رہی ہے۔اور "نبذ" کا مرادی معنی "توڑنا" ہے یعنی ایک فریق نے ان میں سے وعدہ کو توڑ دیا راقم نے یہی ترجمہ کیا ہے۔(توڑ دیا اسے ایک فریق نے ان سے)۔

وقال ابن جریر "اصل النبذ الطرح والالقاء" ابن جریر نے بیان کیا ہے کہ "نبذ" کا حقیقی معنی پھینکنا اور ڈال دینا اسی وجہ سے پھینکے ہوئے بچے کو لقیط بھی کہا جاتا ہے اور منبوذ بھی۔ اسی طرح تمر (خشک کھجور) اور زبیب (کشمش) کو جب پانی میں ڈالا جائے تو اسے نبیذ کہا جاتا ہے۔
(از صابونی)

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی حقیقی معنی کے مطابق ہے (ان میں کا ایک فریق اسے پھینک دیتا ہے) تفسیر کبیر میں ہے "نقضوه ونبذوه" انہوں نے توڑ دیا اور پھینک دیا۔حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا "توڑ پھینکا"۔

﴿ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ : اس کے دو مقصد ہیں ایک یہ کہ ان فاسقوں میں سے اکثر آپ کی تصدیق نہیں کریں گے کبھی بھی، کیونکہ ان کو آپ سے حسد اور عناد ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی کتابوں کی تصدیق نہیں کرتے بلکہ وہ منافقوں کی طرح ہیں، لوگوں کے سامنے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہمارا اپنی کتابوں اور نبیوں سے ایمان ہے۔لیکن نبی کریم ﷺ پر ایمان نہ لا کر وہ اس بات کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ ان کا ایمان اپنی کتب اور انبیاء سے نہیں۔
(از کبیر)

☆☆☆☆☆

﴿ وَلَـمَّا جَآءَ هُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (آیت ۱۰۱)

۱) ''اور جب ان کے پاس تشریف لایا اللہ کے یہاں سے ایک رسول ان کی کتابوں کی تصدیق فرماتا ہے تو کتاب والوں سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب اپنے پیٹھ پیچھے پھینک دی گویا وہ کچھ علم ہی نہیں رکھتے''۔

۲) ''اور جب تشریف لایا ان کے پاس رسول اللہ کی طرف سے تصدیق کرنے والا اس چیز کی جو ان کے پاس ہے پھینک دیا ایک فریق نے ان لوگوں سے جن کو کتاب دی گئی، اللہ کی کتاب کو پیچھے اپنی پیٹھوں کے گویا کہ وہ نہیں جانتے''۔

اس آیۂ کریمہ میں بھی یہود کی قباحت کجروی کا ذکر ہے کہ ان کے پاس جب بھی کوئی رسول تشریف لائے جو ان کی کتاب، ان کے نبی اور ان کے دین کی تصدیق کرنے والے، حق تو یہ تھا کہ یہ لوگ نبی پر ایمان لائے نبی کی صداقت کو اپنی کتاب سے ہی سمجھتے لیکن انہوں نے علم رکھنے کے باوجود جاہلانہ طریقہ سے اللہ کی کتب سے ہی اعراض کرلیا۔

﴿ وَلَمَّا جَآءَ هُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ﴾ : یہاں رسول سے مراد کون سے رسول ہیں؟ تفسیر خازن اور مدارک ان مذکورہ الفاظ مبارکہ کی تفسیر کی گئی ''یعنی محمد ﷺ'' سے کہ یہاں رسول سے مراد نبی کریم حضرت محمد ﷺ ہیں۔

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے ''جب ان کے پاس تشریف لایا اللہ کے یہاں سے ایک رسول'' ''ایک رسول'' ذکر فرما کر اعلیٰ حضرت نے تخصیص کی طرف اشارہ کر دیا۔ لیکن بیضاوی اور مظہری نے تعیم کو پسند کیا: ﴿ وَلَـمَّا جَآءَ هُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ﴾ کعیسی ومحمد علیهما السلام'' جب ان کے پاس تشریف لایا رسول، یعنی یہاں رسول سے مراد عیسیٰ علیہ السلام

اور نبی کریم حضرت محمد ﷺ دونوں ہی ہیں۔ (بیضاوی)

راقم نے اسی قول کے مطابق ترجمہ کیا ہے "ایک رسول" ترجمہ نہیں کیا بلکہ "رسول" ذکر کیا جو عموم پر دلالت کر رہا ہے۔

﴿ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ﴾: "(وہ رسول) تصدیق کرنے والے اس چیز کی جو ان کے پاس تھی"۔ یعنی ان کے اعتقاد کی تصدیق رسول نے کی وہ اعتقاد جو ان کا موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے متعلق تھا اور اسی طرح توراۃ کی صحت کی تصدیق کی۔

" فان کل واحد من عیسی ومحمد علیهما الصلوة والسلام کان معترفا بذلک ومصدقا له وان کل واحد منهما کان مصدقا معهم من الکتاب فی وجوب التوحید والایمان واصول الشرائع "

بیشک ہر ایک رسول یعنی عیسیٰ علیہ السلام اور نبی کریم ﷺ اعتراف کرتے کہ موسیٰ علیہ السلام سچے نبی ہیں، توراۃ سچی کتاب ہے اور اس کی تصدیق بھی فرماتے تھے۔ اور دونوں رسولوں میں سے ہر ایک نے ان کی کتاب میں جو توحید، ایمان اور اصول شرائع مذکور تھے ان کی تصدیق فرمائی۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ نبی کریم ﷺ کا فقط تشریف لانا ہی توراۃ کی تصدیق تھی کیونکہ توراۃ میں نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے کی بشارت دی گئی اور آپ کے اوصاف بیان کئے گئے۔ ان اوصاف کے مطابق ہی جب آپ تشریف لائے تو توراۃ کی تصدیق ہوگئی۔ (از شیخ زادہ)

عیسیٰ علیہ السلام نے جب نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے کی بشارت دی اور توراۃ میں بھی بشارت دی گئی تھی تو یقیناً حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی توراۃ کی تصدیق کر دی۔

﴿ نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُورِهِمْ ﴾ :

"یعنی اہل کتاب میں سے ایک فریق نے اللہ کی کتاب کو اپنی پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا"۔

﴿ وراء ظهورهم ﴾ مثل لا عراضهم عنه رأسا بالاعراض عما یرمی به وراء الظهر لعدم الالتفات الیه "

پیٹھوں کے پیچھے کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کی کتاب سے اس طرح مکمل طور پر اعراض کرلیا، جس طرح کسی چیز کو پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا جائے اور اس کی طرف توجہ نہ کی جائے۔

﴿ کتاب اللہ ﴾ سے مراد کون سی کتاب ہے جس سے انہوں نے اعراض کیا؟ اس کے متعلق بعض حضرات نے بیان کیا "ما مع الرسول ﷺ وھو القرآن" کہ (کتاب اللہ) سے مراد وہ کتاب ہے جو رسول اللہ ﷺ کے پاس تھی یعنی قرآن پاک۔ مطلب یہ ہوا کہ انہوں نے قرآن پاک سے مکمل اعراض کیا۔ تاہم (کتاب اللہ) سے مراد "توراۃ" لینے کو علامہ رازی رحمہ نے راجح قرار دیا۔ اس پر مندرجہ ذیل دلائل پیش کئے گئے ہیں۔

(۱) "ان النبذ لا یعقل الا فیما تمسکوا به اولا واما اذا لم یلتفتوا الیه لا یقال انهم نبذوه"

رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ نبذوہ ﴾ انہوں نے پھینک دیا۔ یہ اس وقت ہوسکتا ہے جب پہلے ایک چیز کو حاصل کیا جائے پکڑا جائے، پھر پھینک دیا جائے توراۃ میں تو یہ ممکن ہے کیونکہ وہ نبی کریم ﷺ کہ آمد سے پہلے آپ کی اوصاف بھی بیان کرتے رہے۔ آپ کے وسیلہ سے جنگوں میں فتح بھی حاصل کرتے رہے لیکن آپ کے تشریف لانے کے بعد انہوں نے توراۃ کے ان مسائل سے اعراض کردیا۔ لیکن قرآن پاک پر نہ انہوں نے عمل کیا اور نہ ہی ﴿ نبذ ﴾ "پھینکنے" کا معنی پایا جاسکتا ہے۔

(۲) دوسری دلیل یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا:

﴿ نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ ﴾ "اھل کتاب سے ایک فریق نے پھینک دیا"

"ولو کان المراد به القران لم یکن لتخصیص الفریق معنی لان جمیعھم لا یصدقون بالقرآن"

اگر یہ مراد ہوتا کہ اہل کتاب نے قرآن پاک کو پس پشت ڈال دیا تو ایک فریق کا ذکر نہ کیا جاتا، کیونکہ قرآن پاک کی تصدیق تو تمام نے ہی نہیں کی۔

(۳) "وان المعرفة اذا اعیدت معرفة کان الثانی عین الاول"

قانون یہ ہے کہ معرفہ کو جب معرفہ کر کے لوٹایا جائے تو ثانی عین اول ہوتا ہے جب پہلے ﴿أُوتُوا الْكِتٰبَ﴾ میں الکتاب معرفہ ہے جس سے مراد توراۃ ہے تو ثانی ﴿ كِتٰبَ اللهِ ﴾ جو معرفہ ہے اس سے مراد بھی توراۃ ہی ہوگی۔

(۴) " وان مذمتهم فی انهم نبذوا الکتاب الذی اوتوه واعترفوا بحقیته اشد "

ان کی شدید مذمت ہی اس لئے کی گئی کہ انہوں نے اسی کتاب کو پس پشت ڈال دیا جو ان کو عطا کی گئی اور انہوں نے اس کے حق ہونے کا بہت زیادہ اعتراف کیا تھا۔ ان کا اس کے بعد انکار کرنا مکابرہ اور عناد تھا۔ اس سے بھی پتہ چلا کہ ﴿ کِتٰبَ اللّٰہِ ﴾ سے مراد توراۃ ہی ہے۔

(۵) " لما روی عن السدی قال لما جاء هم محمد صلی اللہ تعالیٰ عارضوه بالتوراة فاتفقت التوراة والفرقان فنبذوا التوراة واخذوا الکتاب آصف وسحر هاروت وماروت فلم توافق القران "

سدی سے مروی ہے جب نبی کریم تشریف لائے اور قرآن پاک پیش فرمایا تو انہوں نے قرآن پاک کو توراۃ سے مطابقت دی تو انہوں نے توراۃ کو قرآن پاک کے موافق پایا۔ تو انہوں نے توراۃ کو پس پشت ڈال دیا اور انہوں نے آصف کی کتاب پر عمل شروع کر دیا اور ہاروت اور ماروت کے جادو پر عمل شروع کیا کیونکہ ان کو انہوں نے آصف کی کتاب پر عمل شروع کر دیا اور ہاروت اور ماروت کے جادو پر عمل شروع کیا کیونکہ ان کو انہوں نے قرآن کے موافق نہیں پایا۔ (ماخوذ از کبیر و روح المعانی)

ان تمام دلائل سے یہ پتہ چلا کہ ﴿ کِتٰبَ اللّٰہِ ﴾ سے مراد توراۃ ہے۔

راقم کا موقف یہ ہے کہ تعمیم ہی بہتر ہے جو تمام اقوال کو شامل ہے کہ انہوں نے توراۃ سے بھی اعراض کیا اور قرآن پاک سے بھی اعراض کیا کیونکہ ﴿ نبذ ﴾ کا جب مجازی معنی اعراض کرنا لے لیا تو اب یہ ضرورت نہیں کہ یہ کہا جائے کہ ﴿ نَبَذَ ﴾ کا معنی ہے حاصل کر کے پھینکنا۔ جہاں تک معتبر دلیل معرفہ والی ہے اس کے متعلق بھی نور الانوار پڑھے ہوئے طلباء جانتے ہیں کہ کبھی کبھی اس کے خلاف بھی واقع ہو جاتا ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

﴿ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ : "گویا کہ وہ نہیں جانتے"

" انه کتاب اللہ یعنی ان علمهم به رصین یقین ولکن یتجاهلون عنادا "

یعنی ان کو یقین تھا کہ توراۃ اللہ کی کتاب ہے قرآن پاک اللہ کی کتاب ہے لیکن وہ عناد کی وجہ سے جاہل بنے رہے ایسے جیسا کہ وہ جانتے ہی نہیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔

(از بیضاوی)

فائدہ : ابھی جن دو آیات کا ذکر ہوا ہے ان سے یہ واضح ہوا کہ یہود کے بڑے بڑے چار فرقے تھے:

ایک فرقہ وہ جنھوں نے توراۃ پر ایمان لایا اس کے حقوق کا پاس کیا۔ توراۃ کے حکم کے مطابق ہی انہوں نے نبی کریم ﷺ پر ایمان لایا اور قرآن پاک کو اللہ تعالیٰ کا سچا کلام تسلیم کیا۔ یہ ﴿بل اکثرھم لا یؤمنون﴾ سے سمجھ آیا۔ کہ ان سے اکثر نے ایمان قبول نہیں کیا تو پتہ چلا کہ بعض نے ایمان قبول کیا یہ ایمان لانے والے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی تھے۔

دوسرا فرقہ وہ تھا جنھوں نے ظاہراً تو احکامِ توراۃ کو نہیں توڑا لیکن جہالت کی وجہ سے ایمان بھی قبول نہیں کیا کیونکہ یہ لوگ خود تو جانتے نہیں تھے جیسا ان کو علماء نے کہہ دیا وہ تسلیم کر لیا چونکہ یہود کے علماء تو نبی کریم ﷺ کے اوصاف چھپاتے تھے اس لئے جاہل لوگ کثیر تعداد میں ایمان قبول نہ کر سکے۔ اس فرقہ کا بھی رب تعالیٰ کے ان الفاظ مبارکہ ﴿بل اکثرھم لا یؤمنون﴾ سے ہی علم حاصل ہوا۔

تیسرا فرقہ وہ تھا جنھوں نے علم رکھنے کے باوجود ظاہراً اللہ تعالیٰ کے وعدوں کو توڑا، حدود سے تجاوز کیا سرکشی اور فسق کی وجہ سے " وھم المغیون بقوله نبذہ فریق منھم " یہ وہ لوگ ہیں جن کو حدود سے تجاوز کرنے کی وجہ سے "مغیون" کہا جاتا ہے اس فرقہ کا رب تعالیٰ کے اس ارشاد سے پتہ چلا ﴿نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنْهُم﴾ ۔

چوتھا فرقہ وہ تھا جو ظاہری طور پر توراۃ پر عمل کر رہے تھے لیکن مخفی طور پر توراۃ کے احکام کو پس پشت ڈال دیا یہ لوگ عالم تھے لیکن سرکشی اور عناد کی وجہ سے جاہل بن بیٹھے۔ اس فرقہ کا رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی ﴿كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾ سے پتہ چلا۔

(ماخوذ از بیضاوی)

﴿ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوْا الشَّيَاطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمَانَ وَمَا
كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلٰكِنَّ الشَّيَاطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ
السِّحْرَ وَمَا اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ
وَمَارُوْتَ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَا اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ
فَلَا تَكْفُرْ ☆ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ
وَزَوْجِهٖ وَمَا هُمْ بِضَارِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ
وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ
اشْتَرَاهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖ
اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (آیت ۱۰۲)

۱) ''اور اس کے پیرو ہوئے جو شیطان پڑھا کرتے تھے سلطنت سلیمان کے زمانہ میں ۔ اور سلیمان نے کفر نہیں کیا ہاں شیطان کافر ہوئے لوگوں کو جادو سکھاتے ہیں ۔ اور وہ جادو جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر اترا اور وہ دونوں کسی کو کچھ نہ سکھاتے جب تک یہ نہ کہہ لیتے کہ ہم تو نری آزمائش ہیں ۔ تو اپنا ایمان نہ رکھو ۔ تو ان سے سیکھتے وہ جس سے جدائی ڈالیں مرد اور اس کی عورت میں اور اس سے ضرر نہیں پہنچا سکتے کسی کو مگر خدا کے حکم سے اور وہ سیکھتے ہیں جو انہیں نقصان دے گا اور نفع نہ دے گا اور بیشک ضرور انہیں معلوم ہے کہ جس نے یہ سودا لیا آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں اور بیشک کیا بری چیز ہے وہ جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانیں بیچیں کسی طرح انہیں علم ہوتا''۔

۲) ''اور انہوں نے تابعداری کی جو پڑھتے تھے شیطان سلیمان کی سلطنت کے زمانہ میں اور نہیں کفر کیا سلیمان نے اور لیکن شیطانوں نے کفر کیا، سکھاتے لوگوں کو جادو ۔ اور جو الہام کیا گیا دو فرشتوں پر

بابل میں یعنی ہاروت اور ماروت پر۔اور وہ دونوں نہیں سکھاتے تھے کسی ایک کو یہاں تک کہ وہ کہتے ہم تو صرف آزمائش ہیں۔تو تم کفر نہ کرو۔تو وہ سیکھتے تھے ان دونوں سے، وہ کہ تفریق ڈالتے جس کے ذریعے مرد اور اس کی زوجہ کے درمیان۔اور وہ نہیں ضرر پہنچا سکتے اس کے ذریعے کسی ایک کو سوائے اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے اور وہ سیکھتے جو نقصان دیتا ان کو اور نفع نہیں دیتا ان کو اور تحقیق جان لیا انہوں نے جس نے حاصل کیا یہ نہیں اس کا آخرت میں کوئی حصہ اور برا ہے جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کا سودا کیا کسی طرح وہ جان لیتے''۔

یہاں سے یہود کے اور قبیح افعال کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ وہ جادوگری میں مشغول رہتے۔خود بھی جادو کرتے اور جادو سیکھتے اور دوسروں کو بھی جادوگری کی طرف بلاتے۔

شان نزول: یہود حضرت سلیمان علیہ السلام کو نبی نہیں تسلیم کرتے تھے۔بلکہ ان کو جادوگر اور بادشاہ مانتے تھے وہ کہتے تھے کہ ہوا پر سوار ہو کر سفر کرنے والا جادوگر ہی ہو سکتا ہے۔نبی نہیں ہو سکتا نبی کریم ﷺ نے جب حضرت سلیمان علیہ السلام کی نبوت کا ذکر فرمایا تو یہود نے جو کہا اسے شہر بن حوشب بیان فرماتے ہیں:

" قال اليهود انظروا الى محمد يخلط الحق بالباطل يذكر سليمان مع الانبياء وانما كان ساحرا يركب الريح "

یہود نے کہا محمد کو دیکھو وہ حق کو باطل سے ملا رہا ہے۔سلیمان کو انبیاء کے ساتھ ذکر کر رہا ہے حالانکہ سلیمان تو جادوگر تھا کیونکہ وہ ہوا پر سوار ہوتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت میں اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا اور ضمناً یہ بیان کر دیا کہ سحر کفر ہے۔

کیونکہ جب یہ فرمایا:

﴿ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ﴾

''لیکن شیطانوں نے کفر کیا جو لوگوں کو جادو سکھاتے''۔

تو اسی سے اشارہ فرما دیا کہ جادو کفر ہے۔

سحر کا لغوی معنی: " واصل السحر صرف الشئی عن حقيقته الى غيره فكان الساحر لما ارى الباطل فى صورة الحق وخيل الشئی على غير حقيقته فقد سحرا لشئی عن وجهه اى صرفه " (تاج العروس)

سحر کا حقیقت میں معنی یہ ہے کہ ایک چیز کی حقیقت کو بدل دینا۔ گویا کہ جادوگر جب باطل چیز کو حق کی صورت میں دکھاتا ہے۔ اور وہ چیز اپنی حقیقت کے علاوہ دوسری حقیقت میں نظر آتی ہے۔ تو یہی سمجھ آتا ہے کہ اس نے ایک چیز کو اس کی حقیقت سے بدل دیا ہے۔

سحر کا اصطلاح شرع میں معنی: " السحر یستعمل بما لطف وخفی سببه ویستعان فی تحصیله بالتقرب الی الشیطان بارتکاب القبائح "

سحر کا استعمال وہاں ہوتا ہے جہاں اس کے اسباب مخفی ہوں اور اس کے حاصل کرنے میں شیطان کا تقرب حاصل کیا جائے اور قبیح کاموں کا ارتکاب کیا جائے۔

پھر اس کی تین قسمیں ہیں: قولی، عملی اور اعتقادی۔

سحر قولی: " کالرقی التی فیها الفاظ الشرک ومدح الشیطان وتسخیره "

ایسے منتر جنتر سے جادو کیا جائے جس میں شرک والے الفاظ ہوں اور شیطان کی مدح پائی جائے اور شیطان کو مسخر کر کے اپنا مددگار بنایا جائے۔

سحر عملی: " کعبادة الکواکب والتزام الجنایة وسائر الفسوق "

جیسا کہ ستاروں کی عبادت کرنا، اور جنایت کو لازم پکڑنا، اور ہر قسم کے کبائر گناہوں کا ارتکاب کرنا اور ان کے ذریعے شیطان سے امداد طلب کرنا۔

سحر اعتقادی: " کاستحسان ما یوجب التقرب الیه ومحبته ایاه وذلک لا یستتب الا بمن ینا سبه فی الشرارة وخبث النفس فان التناسب شرط التضام والتعاون "

شیطان کے قریب جو چیز کرے اسے اچھا سمجھنا، شیطان سے محبت کرنا یہ اس وقت تک ٹھیک حاصل نہیں ہوگا جب تک شرارت میں اس کے مناسب نہ ہوا اور اس جیسی خباثت نہ پائی جائے۔ کیونکہ ایک دوسرے سے ملنے اور تعاون کے لئے مناسبت ضروری ہے۔

یعنی شیطان سے امداد طلب کرنا اور اعتقاد رکھنا کہ یہ امداد کرے گا جس سے سحر حاصل ہو جائے گا

یہ اسی وقت ہوگا جب جادو کرنے والا بھی شیطان کی طرح شریر اور خبیث النفس ہوگا۔ (از روح المعانی)

فائدہ : جواہر مکلفہ کی دو قسمیں ہیں، ایک قسم جسمانی محسوس، دوسری قسم روحانی معقول پھر ہر ایک کی تین تین قسمیں ہیں۔ خیر اور شر اور خیر و شر کے درمیان ہونا۔

" فالخیر من الروحانی الارواح المقدسة وهی الملائکة "

روحانی خیر ارواح مقدسہ ہیں اور یہ ملائکہ ہیں۔

" والشریر شیاطین الجن " اور روحانی شرارواح خبیثہ یہ شیاطین جن ہیں۔

" والمتوسط مومنوا الجن " اور متوسط مومن جن ہیں جن کا ذکر سورۂ جن میں ہے۔

ملائکہ صرف بہتر لوگوں سے ملتے ہیں اور ان سے تعاون کرتے ہیں کیونکہ نیک لوگ اپنے اقوال افعال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے میں اور عبادت میں ہمیشگی کرنے کی وجہ سے ملائکہ کے مشابہ ہیں۔

اسی طرح شیاطین صرف شریر لوگوں سے ملتے ہیں اور ان سے تعاون کرتے ہیں یعنی مشرک، خبیث، شیطان کی عبادت کرنے والے اور رب تعالیٰ سے عناد رکھنے والے شیطان کے مشابہ ہوتے ہیں اس لئے شیطان ان کی امداد کرتا ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ هل انبئکم علی من تنزل الشیاطین تنزل علی کل افاک اثیم ﴾

"کیا میں تمہیں خبر دوں کس پر اترتے ہیں شیطان، اترتے ہیں ہر بڑے بہتان والے گنہگار پر"

اور ارشاد فرمایا:

﴿ ومن یعش عن ذکر الرحمن نقیض له شیطانا فهو له قرین ﴾

"اور جو اعراض کرے رب تعالیٰ کے ذکر سے ہم اس پر شیطان کو مسلط کر دیتے ہیں تو وہ اس کا ساتھی ہوتا ہے"۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

سحر اور معجزہ اور کرامت میں فرق:

جادو میں بھی رب تعالیٰ نے بندوں کی آزمائش کے لئے اثرات رکھ دیئے ہیں بظاہر یہ ہی سمجھ

آتا ہے کہ یہ کام خرق عادت ہے لیکن جب جادو کی تعریف کے بعد یہ بیان کیا گیا ہے:

" ذلک لا یستتب الا لمن یناسبه فی الشرارة وخبث النفس فان التناسب شرط فی التضام والتعاون "

سحر (جادو) اس وقت تک نہیں پایا جاسکتا جب تک وہ اپنے مناسب سے امداد طلب نہ کرے اور وہ اس کا مناسب شرارت اور خباثت نفس میں ہو مناسب شرط ہے ان کے آپس میں ملنے اور تعاون کے لئے۔

" وبهذا تمیز الساحر عن النبی والولی " اسی سے واضح ہوگیا کہ ساحر (جادوگر) نبی اور ولی سے دور ہے نبی کا معجزہ خرق عادت کام ہوتا ہے۔ معجزہ میں دعوت نبوت ضروری ہے نبی کا معجزہ اس کے دعوی کے مطابق ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک اعرابی نے نبی کریم ﷺ کو کہا کہ آپ مجھے کوئی "نشانی" (معجزہ) دکھائیں میں اسے دیکھ کر یقین کرلوں کہ آپ اللہ کے نبی ہیں تا کہ میں ایمان لاؤں تو آپ نے فرمایا جاؤ اس درخت کو کہو تمہیں اللہ کا نبی بلا رہا ہے۔

جب اس اعرابی نے درخت کو نبی کریم ﷺ کا پیغام پہنچایا تو اسنے ادھر ادھر جھک کر اپنی جڑوں کو زمین سے اکھیڑا اور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام عرض کیا پھر آپ کے حکم سے اپنی جگہ واپس چلا گیا۔

جھوٹا مدعی نبوت اپنے دعوی کے مطابق کوئی کام خرق عادت نہیں کرسکتا جیسا کہ مسیلمہ کذاب کو لوگوں نے کہا کہ محمد مصطفیٰ ﷺ تو معجزات دکھاتے ہیں تم بھی کوئی معجزہ دکھاؤ تو اس نے کہا کہ ایک آنکھ جس کی ضائع ہو اسے میرے پاس لایا جائے کہ میں اس کی ضائع آنکھ پر ہاتھ پھیر کر اسے درست کر دوں۔ ایک آنکھ والے شخص کو لایا گیا مسیلمہ نے اس کی آنکھ پر ہاتھ پھیرا تو رب تعالیٰ نے اس کی دوسری آنکھ کو بھی ضائع کر دیا۔

اور ولی کی کرامت بھی خرق عادت کام کا نام ہی ہے لیکن اس میں دعوی نبوت نہیں ہوتا۔ اور کرامت دکھانے کا دعوی اور چیلنج بھی نہیں پایا جاتا۔ اب کافی حد تک جادو اور معجزہ اور کرامت میں فرق تو واضح ہو گیا۔ لیکن زیادہ وضاحت کے لئے شیخ زادہ کی مندرجہ ذیل عبارت کو دیکھئے:

" ان السحر لا یثبت الامن کل مشرک خبیث فی نفسہ شریر فی طبعہ متدنس فی بدنہ فلذلک قیل اکثر من یعمل السحرھم الیھود وعبدۃ الاصنام وحیض النساء وانھم لا یعلمونہ الا فی الامکنۃ القذرۃ علی الھیات القبیحۃ وان سحرھم متی قوبل بالاستعاذۃ باللہ تعالیٰ وبذکرہ بطل سلطانہ "

جادو صرف مشرک، خبیث النفس اور شریر طبیعت والے اور جسمانی طور پر گندے شخص سے ہی ہوسکتا ہے اکثر طور پر جادوگر یہود اور بت پرست ہوتے ہیں اور حیض والی عورتیں جادو کرتی ہیں جادو کرنے والے ناپاک جگہ میں اور قبیح حالت میں (ننگے ہوکر) جادو کرتے ہیں یعنی ان کے جادو کے اثر انداز ہونے کے لئے خباثت، ناپاکی اور رب سے دور ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ اپنے جادو میں اگر " اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم " پڑھ لیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کسی طرح بھی کرلیں تو ان کا جادو بے اثر ہوکر رہ جاتا ہے۔

" واما ما کان من الانبیاء والاولیاء فلا یکون الامن یؤمن مخلص فی ایمانہ مقدس فی نفسہ خیر فی طبعہ طاھر فی بدنہ ویزداد ما کان منھم باز دیاد تقربھم الی اللہ تعالیٰ ".

انبیاء کرام اور اولیاء کرام اپنے ایمان میں کامل اور مخلص ہوتے ہیں ان کے نفوس پاکیزہ ہوتے ہیں ان کی طبیعتوں میں خیر اور بھلائی ہوتی ہے ان کے بدن پاکیزہ ہوتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔

ان پاک ہستیوں کے خرق عادت کام معجزات ہوں گے جب انبیاء کرام سے ثابت ہوں۔ اور اولیاء کرام کے خرق عادت کام کرامات ہوں گی۔ اولیاء عظام کو جتنا اللہ تعالیٰ سے تقرب زیادہ ہوتا چلا جائے گا اتنی ہی ان کی کرامات میں زیادتی ہوتی چلی جائے گی۔ (ماخوذ از شیخ زادہ بزیادۃ)

سحر کے اثرات : معتزلہ سحر کے اثرات یعنی حقائق کے بدلنے کو تسلیم نہیں کرتے ان کے نزدیک صرف ملمع سازی اور ظاہری بناوٹ ہوتی ہے۔

" وجوز اھل السنۃ ان یقدر الساحر علی ان یطیر فی الھواء ویقلب الحمار انسانا والانسان حمارا الا انھم قالوا ان اللہ تعالیٰ ھو الخالق

لھـذہ الاشیاء عند ما یقرأ الساحر فی خصوصھا کلمات معینۃ فاما ان
یکون المؤثر فیھا ھو الفلک والنجوم فلا"

اہل سنت و جماعت کے نزدیک ساحر کو یہ قدرت حاصل ہوتی ہے کہ وہ ہوا میں اڑے
اسی طرح گدھے کو انسان بنادے یا انسان کو گدھا بنادے۔ لیکن جادوگر کو ذاتی طور پر
یہ قدرت حاصل نہیں ہوتی بلکہ جادوگر اپنے خاص کلمات سحر یہ جب پڑھتا ہے تو
اللہ تعالیٰ ان میں تاثیر پیدا کر دیتا ہے جس کی وجہ سے اشیاء کی حقیقتیں بدل جاتی ہیں۔
درحقیقت ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اللہ تعالیٰ جادو میں یہ اثر اس لئے پیدا فرماتا ہے
کہ لوگوں کی آزمائش کی جاسکے۔ کون جادو کے اثرات دیکھ کر گمراہ ہوتے ہیں اور کون
ایمان پر قائم کرتے ہیں۔

خیال رہے کہ اہل سنت جادو میں فلک اور ستاروں کو مؤثر نہیں مانتے جیسا کہ ستارہ پرست
ستاروں کو مؤثر بناتے ہیں۔ (از شیخ زادہ)

ساحر کا حکم:

" قال الشیخ ابو منصور الماتریدی رحمہ اللہ القول بان السحر علی
الاطلاق کفر خطأ بل یجب البحث عن حقیقتہ فان کان ذلک رد
مالزم فی شرط الایمان فھو کفر والا فلا ثم السحر الذی ھو کفر
یقتل علیہ الذکور لا الاناث" وما لیس بکفر وفیہ اھلاک النفس ففیہ
حکم قطاع الطریق ویستوی فیہ المذکر والمؤنث وتقبل توبتہ اذا
تاب ومن قال لا تقبل فقد غلط فان سحرۃ فرعون قبلت توبتھم "
(مدارک)

حضرت شیخ ابومنصور ماتریدی رحمہ اللہ نے سحر کو مطلقاً کفر قرار دیا کہ ہر ساحر کافر ہے لیکن یہ قول
درست نہیں بلکہ صحیح قول یہ ہے کہ ایسا سحر جس میں یہ شرط پائی جائے کہ ایسے الفاظ ذکر کئے جائیں جو
ایمان کے زوال کا سبب ہوں تو وہ سحر یقیناً کفر ہے جس میں ایسے الفاظ کا استعمال نہ ہو جو ایمان کے
زوال کا سبب بنیں وہ کفر نہیں۔ وہ جادو جو کفر ہے اس کا مرتکب جادوگر جب مذکر ہو تو اسے قتل کر دیا
جائے گا لیکن مؤنث کو قتل تو نہیں کیا جائے گا البتہ اسے قید کر لیا جائے گا تا کہ وہ توبہ کر لے۔

یعنی جادوگر جب اپنے جادو میں کلمات کفریہ بولے تو وہ مرتد ہے۔ مرد ہو تو اسے تین دنوں کی مہلت دی جائے توبہ کرلے تو ٹھیک ورنہ تین دنوں کے بعد اسے قتل کر دیا جائے گا اور اگر عورت ہو تو اسے توبہ کرنے تک قید میں رکھا جائے گا۔ وہ جادو جس میں کلمات کفریہ تو نہیں لیکن اس جادو کے ذریعے کسی نفس کو قتل کر دیا جائے تو وہ قطاع الطریق (ڈاکوؤں) کے حکم میں ہوگا۔ ایسا جادو کرنے والا خواہ مذکر ہو یا مؤنث ہو واجب القتل ہوگا۔

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ جادوگر کی توبہ قبول نہیں لیکن قول درست نہیں اس لئے کہ فرعون نے جو جادوگر موسیٰ علیہ السلام کے مقابل بلائے تھے انہوں نے توبہ کرلی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ کو قبول فرمالیا۔

تنبیہ : جو جادو کفر نہیں وہ حقیقت میں اصطلاح شرح میں جادو ہی نہیں، کیونکہ جادو میں شیطان سے امداد طلب کرنا ضروری ہے ہاں البتہ بعض کام حیرت انگریز ہوتے ہیں جو بظاہر جادو نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ جادو نہیں ہوتے کیونکہ ان میں شیطان سے امداد طلب نہیں کی جاتی اور کلمات کفریہ نہیں پائے جاتے۔

راقم کے نزدیک شیخ ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ کا قول بھی درست ہے کیونکہ انہوں نے اس سحر کو مطلقاً کفر قرار دیا جو اصطلاح شرع میں سحر ہے۔ وہ یقیناً کفر ہی کفر ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ کی وضاحت بھی درست ہے کیونکہ عوام تو ہر کام جو عام عادت کے خلاف ہو نبی اور ولی سے سرزد نہ ہوا سے سحر کہہ لیتے ہیں۔ اس لئے اس وضاحت کی ضرورت تھی کہ بعض سحر کفر ہیں اور بعض کفر نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اس آیۃ کریمہ کی تفسیر میں علامہ رازی رحمہ اللہ نے کبیر میں اور شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ نے عزیزی میں جادو کی آٹھ قسمیں بیان کی ہیں تا کہ اصطلاح شرع میں جادو اور عوام کے نزدیک جادو میں فرق بھی ہو جائے۔ اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ کون سا جادو کفر ہے اور کون سا کفر نہیں۔

جادو کی اقسام:

جادو کی آٹھ قسمیں بعض ان میں سے کفر ہیں اور بعض کفر نہیں۔

پہلی قسم : کلدانیین اور بابل والے لوگوں کا سحر ہے یہ لوگ پہلے زمانہ میں پائے گئے جو عام طور پر جادو کیا کرتے تھے۔

" وھم قوم یعبدون الکواکب ویزعمون انھا ھی المدبرۃ لھذا العالم "

یہ وہ لوگ تھے جو ستاروں کی عبادت کرتے تھے اور گمان یہ کرتے تھے کہ یہ ستارے ہی اس جہان کے مدبر ہیں۔ ان ستاروں سے ہی خیر و شر حاصل ہوتے ہیں اور ان ستاروں سے ہی نیک بختی اور بدبختی حاصل ہوتی ہے یعنی تمام نظام کائنات میں مؤثر حقیقی وہ لوگ ستاروں کو مانتے۔

" وھم الذین بعث اللہ تعالیٰ ابراھیم علیہ السلام مبطلا لمقالتھم وردا علیھم فی مذاھبھم "

یہ وہ لوگ ہیں جن کا رد کرنے کے لئے اور ان کے اقوال کو باطل ثابت کرنے کے لیے اور ان کے مذہب کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے رب تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ (از کبیر)

یہ قسم جادو کی کفر ہے جیسا کہ تعریف سے واضح ہے۔

نمرودی جادو کی مثالیں:

اسی پہلی قسم کو بیان کرتے ہوئے شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ معتبر تواریخ سے یہ حاصل ہوا کہ نمرود نے جادو سے حیرت انگیز چیزوں کو ایجاد کر رکھا تھا جن کی تعداد چھ تھی:

(۱) اس نے تانبے سے ایک بطخ بنا رکھی تھی جب کوئی جاسوس یا چور شہر میں آتا اس بطخ سے آواز آتی۔ تمام شہر والے اس کی آواز سنتے اور سمجھ جاتے کہ اس کا مقصد کیا ہے وہ جاسوس اور چور کو پکڑ لیتے تھے۔

(۲) ایک طبل اس نے بنوا رکھی تھی۔ جب کوئی چیز کسی شخص کہ گم ہو جاتی تو وہ اس طبل کے پاس آ کر نقارہ کی چوب سے اسے کوٹتا تو طبل سے آواز آتی کی تمہاری چیز فلاں جگہ پر ہے اس کے وہ شخص اپنی چیز کو وہاں سے ہی تلاش کرتا جو اسے مل جاتی۔

(۳) اس نے ایک آئینہ ایجاد کروایا۔ جس سے غائب کے حال کا پتہ چلایا جاتا تھا۔ جب بھی صاحب عرض (سامان کا مالک) اس آئینہ میں نگاہ کرتا اور اس غائب کا تصور کرکے آئینہ کو

دیکھا تو وہ غائب آئینہ میں نمودار ہو جاتا۔ خواہ وہ غائب شہر میں ہوتا یا جنگل میں، کشتی میں ہوتا یا پہاڑ پر، جس حال میں وہ ہوتا اسی حال میں نظر آتا۔ بیمار ہوتا یا تندرست، فقیر ہوتا یا مالدار، زخمی ہوتا یا مقتول جس حال میں ہوتا اسی طرح نظر آتا۔

(۴) ایک حوض اسے نے بنوا رکھا تھا۔ جس کے پاس سال کے بعد ایک مرتبہ بڑے بڑے لوگ آتے تھے وہ اپنی کھانے پینے کی اشیاء لاتے تھے اور حوض میں ڈال دیتے تھے۔ لوگ اس کے اردگرد کھڑے ہو جاتے پانی پلانے والے حوض کے کنارے پر بیٹھ جاتے۔ جس شخص کے لئے جو ڈول نکالتے اس میں کھانے کی وہی چیز آتی جو اس نے ڈالی ہوتی۔

(۵) ایک تالاب اس نے جھگڑے مٹانے اور مقدمات کے فیصلے کرنے کے لئے بنوایا ہوا تھا۔ جب دو شخصوں کے درمیان جھگڑا ہوتا حق و باطل کے درمیان تمیز نہ ہو سکتی تو وہ دونوں اس تالاب کے پاس آ کر اس میں چھلانگ لگاتے۔ جو شخص حق پر ہوتا اس کے ناف کے نیچے کنارے تک پانی پہنچتا۔ اور جو شخص باطل پر ہوتا اس کے سر سے پانی گزر جاتا اگر وہ توبہ کر لیتا تو بچ جاتا اور اگر توبہ نہ کرتا تو غرق ہو جاتا۔

(۶) نمرود کی سرائے کے دروازے کے باہر ایک درخت تھا جس کے سایہ میں اس کے درباری لوگ بیٹھتے تھے۔ جتنے لوگ زیادہ ہوتے جاتے اتنا ہی سایہ بڑھتا رہتا۔ لیکن ایک لاکھ کی تعداد کو تو یہ سایہ کفایت کرتا ایک لاکھ سے اگر ایک شخص بھی بڑھ جاتا تو سایہ مکمل ختم ہو جاتا سب دھوپ پر بیٹھتے۔

" نمرود که بادشاه آنها بود نیز دریں باب توغل بسیار داشت "

جب جادوگروں نے ان چیزوں کو ایجاد کیا تو ان کو ہی دیکھ کر نمرود نے خدائی کا دعویٰ کر دیا کہ جبکہ میری رعایا کے جادوگر اس قسم کے کام کر سکتے تو خود بادشاہ کا کتنا ہی بلند مقام ہوگا۔ لہٰذا میں خدا ہی ہو سکتا ہوں خدا سے کم مرتبہ کے دعویٰ کا کیا فائدہ۔ (از عزیزی)

یقین جانئے آج کل کے بادشاہ فرعون اور نمرود سے عملی طور پر کوئی کم نہیں۔ آئے دن قانون بدلتے رہتے ہیں اپنی مرضی کے قوانین بنانا۔ اپنی مرضی کے لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے لئے قوانین بنانا اور اپنے مخالفین کو نقصان پہنچانے کے لئے قوانین بنانا اور ہی حضوری قاضیوں سے من مانے فیصلے کرانا

کیا فرعون اور نمرود کا مثل نہیں ۔ میرا تو گمان یہی ہے کہ اگر علماء اور عوام کا ان کو ڈر نہ ہو تو یہ خدائی کا دعوی کرنے میں کوئی دیر نہ کریں۔

دوسری قسم : جنوں اور شیطانوں کو اپنے تابع کیا جاتا ہے یہ عمل آسان ہے اور زیادہ رواج بھی اس کا ہے۔ بڑے بڑے جنوں کو مسخر کر لیا جاتا ہے لیکن اس میں بتوں کو معبود سمجھا جاتا ہے ان کا واسطہ پیش کیا جاتا ہے۔ ان بتوں کے نام پر نذر مانی جاتی ہے جانوروں کو ذبح کیا جاتا ہے اور ان بتوں کے پاس اچھے اچھے عطریات پیش کیے جاتے ہیں (کفر صریح لازم می آید) اس سے صریح کفر لازم آتا ہے۔ اس کا سمجھنا کوئی مشکل بھی نہیں کیونکہ بتوں سے امداد طلب کرنا اور ان کے واسطہ سے کوئی کام کرنا یقینی طور پر کفر ہے۔

خیال رہے کہ اسی تسخیر کو " الاستعانة بالارواح الارضية " (زمین روحوں سے امداد طلب کرنا) سے بھی تعبیر کر دیا جاتا ہے اور اسی کا نام "عزائم" اور اسی کا نا" تسخیر الجن " (جنوں کو تابع کرنا) بھی ہے۔

خیال رہے کہ کبھی امداد ارواح فلکیہ سے بھی طلب کی جاتی ہے لیکن وہ عبادت میں اعلیٰ مقام پیدا کرنے اور رب تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے بعد اسے کرامت کہا جائے گا وہ سحر حقیقی بھی نہیں اور مجازی بھی نہیں۔

تیسری قسم : فوت شدہ آدمیوں کی روحوں کو مسخر کرنا (اپنے تابع کرنا) لیکن ان روحوں کو تابع کرنے میں بھی بڑے بڑے شیاطین کے ناموں کا وسیلہ پیش کیا جاتا ہے بہت بڑی تعظیم ان شیاطین کی کی جاتی ہے اور ان کے ناموں کی نذر مانی جاتی ہے۔ اس طرح روحوں کو اس طرح اپنے تابع کر لیا جاتا ہے۔ جس طرح نوکر کو تابع کیا جاتا ہے ان روحوں کو بلا کر ان سے کام کرائے جاتے جو خرق عادت ہوتے ہیں۔ زیادہ طور پر ان روحوں کی مدد سے شہوت اور غضب پر مبنی کام کرائے جاتے ہیں۔ اس قسم کا جادو عام طور پر ہندو لوگ اور فساق لوگ کرتے ہیں۔

" ایں ہم یا مستلزم کفر است یا قریب بسرحد کفر میر ساند "

جادو کی یہ قسم یا تو مستلزم کفر ہے اور یا کفر کے قریب ہے۔

چوتھی قسم : یہ ہے کہ کسی کے خیالات کو فاسد کر دیا جائے ، اس میں بعض جنوں کی روحوں کا وسیلہ پکڑا جاتا ہے۔اور کسی کے خیال میں تصرف کیا جاتا ہے تا کہ جو چیز موجود نہیں اسے نظر آئے یا ہولناک صورتیں کسی کی نظر میں اس جادو سے آجاتی ہیں جن سے وہ دوڑتا ہے یا حرکات غیر واقعیہ کو واقعیہ سمجھتا ہے۔

اس قسم کو نظر بندی اور خیال بندی کہا جاتا ہےفرعون کے جادوگروں نے جو اپنا کرتب دکھایا اس کا ذکر رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فاذا حبالهم وعصيهم يخيل اليه من سحرهم انها تسعى﴾ (طه ٦٦)

تو ان کی رسیاں اور لاٹھیاں ان کے جادو کے زور سے ان کے خیال میں دوڑتی معلوم ہوئیں۔

یہ جادو بذاتہ (ذاتی طور پر) کفر نہیں۔ہاں اگر کوئی یہ جادو کرتے وقت یعنی کسی کی نظر بندی میں جنوں کی ارواح سے التجاء کرے اور بڑے جنات اور شیاطین کا واسطہ ڈالے اور ان کی حد سے زیادہ تعظیم کرے تو اس صورت میں یہ کفر ہوگا۔یہی جادو اگر اولیاء کرام کے مقابل کیا جائے کہ انسان ان کا اس جادو کے ذریعے مقابلہ کرے تو حرام ہے۔اور اسی جادو کے ذریعے اگر کسی شخص کو دھوکہ دینا مقصود ہو کہ اس کا مال ہڑپ کرلیں گے تو یہ بھی گناہ کبیرہ ہوگا اور حرام کا ارتکاب لازم آئے گا۔

اگر اسی جادو کے ذریعے انبیاء کرام سے مقابلہ کیا جائے تو کفر ہوگا کیونکہ انبیاء کرام سے مقابلہ کفر ہے اسی لئے موسیٰ علیہ السلام کے مقابل جادوگروں نے توبہ کے وقت کہا ﴿آمنا برب هارون وموسى﴾ ہم ایمان لائے ھارون اور موسی کے ایمان پر۔

پانچویں قسم : یہ اصحاب اوہام کا سحر ہے (یعنی وہم سے جادو کیا جاتا ہے) اس جادو کا پہلے ہندوؤں میں بہت رواج تھا لیکن اب اس کا نام ونشان نہیں۔اس جادو کو "تعليق الوهم" بھی کہا جاتا ہے۔اس کا طریقہ یہ ہے کہ جو صورت واقعہ میں مطلوب ہو تصور کرنے والا اسے اپنی نظر کے سامنے لاتا ہے پھر اس کو حاصل کرنے کے لئے وہم کو اس کے ساتھ متعلق کرتا ہے تو وہ مطلوبہ صورت حاصل ہو جاتی ہے۔

لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ غذا کم کھائے ، اور لوگوں سے کنارہ کش ہو جائے جس طرح

ہندوؤں کے جوگی کرتے ہیں۔اس قسم کے جادو کا حکم یہ ہے کہ اگر غرض مباح ہوتو یہ جادو بھی مباح ہوگا جیسا کہ دو بدکاروں کے درمیان تفریق کرنی مقصود ہو یا کسی ظالم اور کافر کو ہلاک کرنا مقصود ہوتو یہ جائز ہے۔اگر کسی ممنوع غرض کے لئے یہ جادو کرے تو حرام ہوگا جیسا کہ میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈالنے کے لئے یا کسی معصوم کو ہلاک کرنے کے لئے جادو کیا جائے تو ناجائز ہوگا۔

" بالجملہ حکم مباشرت فعل دارد وفی نفسہ قبیح نیست "

حاصل کلام یہ ہے کہ جادو کی یہ قسم ذاتی طور پر قبیح (بری) نہیں البتہ اغراض فاسدہ کے ملنے سے اس میں قباحت (برائی) آ جاتی ہے۔

چھٹی قسم : یہ ہے کہ بعض دواؤں کے ذریعے عجیب اثر دکھایا جائے۔جب کہ دوسرے شخص کو معلوم نہ ہو کہ اس دوا میں یہ اثر ہے تو حیرت انگیز اثر اس کو دکھائی دے گا اس کا نام سحر نیرنج ہے۔جیسا کہ چونہ کو سرکہ میں تر کر کے سمندر جھاگ اس میں ملالے اور اس کا لیپ انگلیوں پر کرے اس کے اوپر مٹی کا تیل لگا کر آگ لگائے تو انگلیاں چراغ کا کام دیں گی لیکن جلیں گی نہیں۔

البتہ ان کے نہ جلنے کی ایک مختصر میعاد ہوگی۔کوئی تجربہ کرتے کرتے انگلیاں نہ جلا بیٹھے۔اسی طرح طعام میں ایسی دوا کا استعمال کرنا جو عقل کو زائل کر کے بے وقوف بنا دے یا نشہ آور دھواں دماغ تک پہنچے تو دماغ کام نہ کرے۔

" نحو دماغ الحمار اذا تناولہ الانسان تبلد عقلہ وقت فطنتہ "

اسی طرح جب کوئی انسان گدھے کا دماغ کھالے تو وہ بددماغ ہو جاتا ہے اس کی سمجھ کم ہو جاتی ہے اسی وجہ سے بعض لوگوں کو "خر دماغ" کہا جاتا ہے۔

ساتویں قسم : جسے سحر الحیل کہتے ہیں اس میں عجیب آلات کے ذریعے حیرت انگیز کام کرنا لازم آتا ہے۔سائنسی ایجادات تمام اسی میں آتی ہیں جیسے ٹیلی فون، ٹیلی ویژن، ریڈیو وغیرہ۔ لیکن خیال رہے کہ اب ہماری اصطلاح میں ان ایجادات کا نام سحر سرے سے ہے ہی نہیں۔یہ جائز ہے لیکن شرط اس میں بھی یہ ہے کہ کسی کو نقصان پہنچانے کی غرض نہ ہو۔

سنا ہے ایڈز کی مرض یہودی اور عیسائیوں نے جراثیم کو ایجاد کر کے مسلمانوں میں پھیلانے کی

غرض سے ایجاد کی لیکن مسلم ممالک تو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ابھی تک کافی حد تک محفوظ ہیں البتہ وہ لوگ خود اس کی زد میں ہیں۔

آٹھویں قسم : شعبدہ بازی اور ہاتھ کی صفائی ہے یہ عام طور پر مردوں اور عورتوں کو تعجب میں ڈالنے کے لئے لوگ کرتے ہیں۔اس میں صرف چالاکی کو دخل ہوتا ہے۔کسی چیز کو بیگ وغیرہ میں چھپالیا، عام لوگوں کو دکھایا کہ دیکھو بیگ خالی ہے اسمیں کوئی چیز نہیں ، پھر وہاں سے کوئی چیز نکال دیں یا ہاتھ وغیرہ میں وہ چیز رکھ لی تھی پھر جلدی سے اس میں ڈال دی۔اس طرح کے کام بظاہر حیرت انگیز ہوتے ہیں لیکن ان میں چالاکی اور پھرتیلا پن کا دخل ہوتا ہے۔

آخری تین قسموں کا حکم:

"ایں هر سه قسم سحر نه کفراست ونه حرام مگر آنکه غرضی
فاسد قصد کنند پس بآں قصد حرمت متحقق گردد "

آخر میں جن تین قسموں کو ذکر کیا گیا ہے یہ حقیقت میں جادو ہیں ہی نہیں۔ان میں کوئی شیطانوں سے امداد نہیں لی جاتی۔لہٰذا یہ قسمیں نہ کفر ہیں اور نہ حرام ہیں ہاں البتہ کسی غلط ارادہ سے یہ کام کریں اور کسی کو نقصان دینے کا ارادہ ہو تو اس غلط مقصد کی وجہ سے یہ کام حرام ہو جائیں گے۔لیکن ذاتی طور پر ان میں کوئی گناہ نہیں۔ (ماخوذ از کبیر وعزیزی)

جادو کی پہلی قسم کا دفاع:

اللہ تعالیٰ کے اسماء گرامی اور آیات قرانی کے ذریعے اور عبادات میں خلوص پیدا کر کے فرشتوں کے ذریعے اس جادو کو توڑا جاتا ہے جو شیطان کی امداد سے کیا جاتا ہے۔یہ وہی لوگ کرتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے عملیات میں خصوصی مقام دے رکھا ہوتا ہے۔

دوسری قسم کا دفاع:

یعنی وہ جادو جو کہ موکلات ارضیہ اور جنوں کو مسخر کر کے کیا جاتا ہے اس کا زوال بھی اللہ تعالیٰ کے نیک بندے اللہ تعالیٰ کے اسماء اور قرآن پاک کی آیات کے ذریعے ہی کرتے ہیں۔جادو کے دفاع کے لئے پھر

جادوگروں کے جال میں پھنسنا" جو کفر و شرک اور شیطانوں سے امداد طلب کرنے میں مبتلاء ہیں" حماقت ہے۔

تیسری قسم کا دفاع:

یعنی شیطانوں کے واسطہ سے روحوں سے جو امداد لے کر لوگوں کو نقصان پہنچایا جاتا ہے اس کا زوال اللہ تعالیٰ کے نیک بندے اس طرح کرتے ہیں کہ:

" تحصیل ربط بارواح طیبه صلحاء و اولیاء است که اکثر اویسی مشربان بعمل می آرند و در حوائج خود و دیگر خلق بآں منتفع میشوند و در طریق تحصیل آں نیز طهارت و تلاوت و ارسال ثواب صدقات برائے آں ارواح منظور ی دارند "

کہ اپنے آپ کو پاکیزہ رکھ کر، تلاوت قرآن پاک کر کے اور صدقات کا ثواب نیک لوگوں، اولیاء کرام کی روحوں کو پہنچا کر ان بزرگوں کی روحوں سے رابطہ کر کے ان سے اپنی حاجات کے مندفع کرنے کے لئے اور دوسرے لوگوں کو نفع پہنچانے کے لئے امداد طلب کرتے ہیں۔ یعنی ارواح صلحاء و اولیاء ان کی امداد کرتی ہیں جس کی وجہ سے بدروحوں کی وجہ سے کیا ہوا سحر زائل ہوتا ہے۔ یہ عمل اویسی حضرات زیادہ کرتے ہیں۔

چوتھی قسم کا دفاع:

" اصلاح قسم پنجم عقد همت ست که از مشائخ کبار و اولیای ابرار برائے حل مشکلات بوقوع آمده "

پانچویں قسم کی اصطلاح اور اس کا دفاع بھی بڑے بڑے مشائخ اور اولیاء کرام کی ہمت سے ہی ہوسکتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مشکلات کے حل کی ہمت دے رکھی ہے۔ اولیاء کرام اللہ تعالیٰ کے اسماء گرامیہ کے ذکر میں مستغرق ہونے کی وجہ سے رب تعالیٰ کے فضل سے روح کی ترقی کے منازل طے کر لیتے ہیں جن کو درجات رفیعہ حاصل ہو جاتے ہیں۔

پانچویں قسم کا دفاع:

اللہ تعالیٰ کے اسماء اور قرآن پاک کی آیات میں تفکر کرنا اور ان کو پڑھتے رہنا اور اپنے احوال کی اصلاح کرنا اس قسم کے ازالہ کے لئے مفید ہے۔ (ماخوذ از عزیزی)

تعویذات کا حکم:

ولا بأس بالمعاذات اذا كتب فيها القرآن او اسماء الله تعالىٰ"

جو تعویذ قرآن پاک کے الفاظ مبارکہ سے لکھے جائیں، یا اللہ تعالیٰ کے اسماء گرامی لکھے ہوں اسی طرح جن دعاؤں کا احادیث میں ذکر ہے ان میں بھی اللہ تعالیٰ کا ہی ذکر ہے۔ ان میں کوئی حرج نہیں وہ تعویذ لکھنے لکھوانے استعمال کرنے جائز ہیں۔

" ويقال رقاه الراقى رقيا ورقيه اذ اعوذه ونفث فى عوذته "

اسی طرح قرآن واحادیث اللہ تعالیٰ کے ذکر اللہ تعالیٰ کے اسماء گرامی رسول اللہ ﷺ کے اسماء گرامی کو پڑھ کر تکلیف کی جگہ پھونکنا یعنی دم کرنا بھی جائز ہے۔

" وانما نكره العوذة اذا كانت بغير لسان العرب ولا يدرى ما هو ولعله يدخله سحر او كفر او غير ذلك واما ما كان من القرآن او شئى من الدعوات فلا بأس به "

دم اور تعویذ ایسی زبان میں ہوں جن کے معانی کا پتہ نہ ہو تو وہ جائز نہیں کیونکہ ہوسکتا ہے وہ سحر ہو کفریہ کلمات ہوں یا حرام کی طرف لے جانے والے الفاظ ہوں۔ لیکن قرآن پاک اور دعائیہ کلمات سے دم اور تعویذ جائز ہیں۔

" والخيط كان يربط فى العنق او فى اليد فى الجاهلية لدفع المضرة عن انفسهم على زعمهم وهو منهى عنه وذكر فى حدود الايمان انه كفر "

زمانہ جاہلیت میں گردن یا ہاتھ میں ایک دھاگہ باندھا جاتا تھا کہ لاحق ہونے والے نقصانات

اور ضرر دینے والی اشیاء اس سے دور ہو جاتی ہیں۔ یہ نا جائز ہے اگر اس دھاگہ کو مستقل طور پر دافع ضرر، دافع بلاء سمجھے اللہ تعالیٰ کو تسلیم نہ کرے تو یہ کفر ہے۔

تنبیہ : کسی دواء، کسی دم، کسی تعویذ اور کسی جنتر منتر (ٹونہ) کو اگر مستقل طور پر باعث شفاء دافع بلاء سمجھا جائے اور تصور یہ کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو اس میں کوئی دخل نہیں تو شرک لازم آئے گا۔

فائدہ : " وفی المجتبی اختلف فی الاستشفاء بالقرآن بان یقرأ علی المریض او الملدوغ الفاتحة او یکتب فی ورق ویعلق علیه اوفی طست ویغسل ویسقی "

سورۃ فاتحہ سے شفاء حاصل کرنا احادیث سے ثابت ہے بالاتفاق جائز ہے البتہ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ فاتحہ کے ذریعے شفاء حاصل کرنے کا طریقہ بہتر کون سا ہے بعض حضرات نے کہا مریض اور سانپ، بچھو وغیرہ سے ڈسے ہوئے شخص پر فاتحہ کا پڑھ کر پھونکنا بہتر ہے اور بعض حضرات نے کہا کاغذ پر لکھ کر گلے میں ڈالنا بہتر ہے۔ اور بعض حضرات نے کہا کسی طشت، پلیٹ وغیرہ پر لکھ کر پھر دھو کر وہ پانی پلانا بہتر ہے۔

راقم کے نزدیک تینوں طریقوں میں سے جس پر بھی عمل کرے وہ ہی مستحسن طریقہ ہے۔

فائدہ جلیلہ : " وعن النبی ﷺ انه کان یعوذ نفسه قال ؒ وعلی الجواز عمل الناس الیوم وبه وردت الآثار "

نبی کریم ﷺ خود اپنے آپ کو دم کرتے تھے دم کرنے کے جواز پر آج تک لوگ عمل کر رہے ہیں اور اس کا جواز احادیث مبارکہ سے ثابت ہے۔

مسئلہ : " ولا بأس بان یشد الجنب والحائض التعاوید علی العضد اذا کانت ملفوفة "

اجنبی شخص یا حیض والی عورت اپنے بازو پر تعویذ باندھیں جو تعویذ کسی چیز میں بند لپٹا ہوا ہو تو جائز ہے۔ اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ جیب وغیرہ میں رکھا ہوا تعویذ، یا قرآن کی آیۃ کو جیب میں ڈالا ہوا ہو تو بیت الخلاء وغیرہ میں جانا جائز ہے۔

مسئلہ : " وفی الخانیة بساط او مصلی کتب علیه فی النسج " الملک لله " یکره استعماله وبسطه والقعود علیه "

فتاوی قاضی خان میں ہے کہ اگر کوئی چٹائی یا مصلی ایسا ہو جس کو بنتے وقت اس کی بنائی میں "الملک للہ" لکھ دیا گیا اس کا استعمال کرنا، اسے بچھانا اور اس پر بیٹھنا مکروہ ہے۔

خیال رہے تمام متبرک الفاظ کا یہی حکم ہے خواہ وہ بنائی میں لکھے جائیں یا بعد میں اوپر لکھ دیا جائے ان کا ادب کیا جائے توہین نہ کی جائے۔ عام طور پر مصلی میں کعبہ شریف اور نبی کریم ﷺ کے روضہ منورہ کی تصاویر بنی ہوتی ہیں۔ راقم نے ایسے مصلی کو کبھی استعمال نہیں کیا۔ راقم کے نزدیک ان تصاویر پر بیٹھنا ادب کے خلاف ہے اس مسئلہ میں اہل علم کی تحقیق کیا ہے مجھے اس کا کوئی علم نہیں تاہم میں نے اپنی عقیدت و محبت کا ذکر کر دیا ہے۔

مسئلہ : کسی قسم کا تعویذ دوسرے لوگوں کو نقصان پہنچانے کے لئے لکھنا اور لکھوانا حرام ہے کوئی عمل کسی قسم کا بھی ہو، جس سے کسی کو نقصان پہنچانا، تکلیف دینا مقصود ہو وہ حرام ہے۔ علماء کرام کو مساجد سے نکالنے کے لئے منافقانہ طرز رکھنے والے نمازی بھی اسی قسم کے حرام کے مرتکب ہوتے ہیں۔

مسئلہ : " لا بأس بوضع الجماجم فی الزرع والمبطخة لدفع ضرر العين حق تصيب المال والآدمی والحيوان ويظهر اثره فی ذلک عرف بالآثار فاذا نظر الناظر الی الزرع يقع نظره اولا علی الجماجم لارتفعها فتظره بعد ذلک الی الحرث لا يضره "

کھیتی میں اور خربوزوں وغیرہ کی بیلوں میں کھوپریوں کا لٹکانا نظر لگنے سے بچاؤ کے لئے جائز ہے۔ کیونکہ نظر کا لگ جانا حق ہے کبھی مال کو نظر لگ گئی کبھی انسانوں کو اور کبھی حیوانوں کو۔ نظر کے اثرات کا ثبوت احادیث مبارکہ میں موجود ہے۔ اس لئے جب کھیتی پر نظر ڈالنے والا پہلے کھوپریوں کو دیکھے گا اس کے بعد وہ کھیتی کو دیکھے گا تو اس کی نظر سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

لیکن خیال رہے کہ یہ صرف سبب سمجھے۔ حقیقی طور پر یہی سمجھے کہ اللہ تعالیٰ ہی مؤثر حقیقی ہے۔

" روی ان امرأة جاء ت الی النبی ﷺ وقالت نحن من اهل الحرث وانا نخاف عليه العين فامر النبی ﷺ ان يجعل فيه الجماجم "

روایت کیا گیا ہے کہ بیشک ایک عورت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کرنے لگی کہ ہم کھیتی باڑی کرتے ہیں ہمیں نظر لگنے کا ڈر رہتا ہے تو نبی کریم ﷺ نے کھیت میں کھوپریوں کے رکھنے کا حکم دیا۔ (ماخوذ از شامی ج ۵ ص ۲۵۶ کتاب الحظر والاباحة)

عام طور پر لوگ نئے مکانوں پر ہنڈیا رکھ دیتے ہیں اس کا جواز بھی اسی حدیث سے واضح طور پر سمجھ آتا ہے۔ ہر کام کو شرک سے تعبیر کرنا، مسلمانوں کو مشرک بناتے رہنا جہلاء کا کام ہے، اہل علم کا یہ طریقہ نہیں۔ راقم نے جز اول میں بھی اس مسئلہ کو بیان کیا ہے یہاں کچھ مختلف انداز پر بیان کیا تا کہ جادو اور تعویذات میں فرق سمجھ آسکے۔

﴿ وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ﴾:

''اورانہوں نے تابعداری کی جو پڑھتے تھے شیطان سلیمان کی سلطنت کے زمانہ میں''۔ ﴿ وَاتَّبَعُوا ﴾ کا عطف ہے ''نبذ'' پر یعنی یہود نے اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو اور اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا اور جادو کی کتابوں کی تابعداری کرنے لگ گئے۔

﴿ تَتْلُوا ﴾ اگر چہ مستقبل کا صیغہ ہے لیکن ان لوگوں کی ماضی کی حالت کو مستقبل سے تعبیر کر دیا گیا اسی وجہ سے ترجمہ ماضی کا کیا گیا۔

ضابطہ: '' والعرب يستعمل الماضي موضع المستقبل وبالعكس مجازاً ''
عرب حضرات ماضی کو کبھی مجازی طور پر مستقبل کے معنی میں اور کبھی مستقبل کو مجازاً ماضی کے معنی میں استعمال کرتے رہتے ہیں۔

'' تتلوا ما مشتق من التلاوة بمعنى القراءة او من التلو بمعنى التبعية ''

یالفظ ﴿ تَتْلُوا ﴾ مشتق ہے تلاوۃ سے جس کا معنی ہے پڑھنا، اس صورت میں وہی معنی ہوگا جو ذکر کر دیا گیا اور اگر مشتق ہو '' تلو '' سے تو معنی ہوتا ہے تابعداری کرنا۔ اب اس صورت میں معنی یہ ہوگا ''اورانہوں نے (یہود نے) تابعداری کی جس کی تابعداری کی شیاطین نے سلیمان کی سلطنت کے زمانہ میں'' (لیکن راقم کو اس معنی میں تکلف نظر آتا ہے۔

﴿ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ﴾ متعلق بتتلوا على تضمين الافتراء اى تتلوا الشياطين مفترين على ملك سليمان قائلين بان ملكه كان به ''

یعنی ﴿ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ﴾ جار مجرور کا تعلق ﴿ تَتْلُوا ﴾ سے ہے قاعدہ تضمین جاری

کیا گیا یعنی افتراء کے معنی کو متضمن ہے تا کہ ﴿ علٰی ﴾ کا استعمال صحیح ہو سکے۔ پہلے دونوں معانی کے لحاظ پر ﴿ عَلٰی ﴾ بمعنی "فی" استعمال ہے۔ اس ترکیب کے لحاظ پر معنی بہت خوبصورت سمجھ کے قریب ہے۔ اور تابعداری کی انہوں نے جو افتراء باندھتے تھے شیاطین سلیمان کی سلطنت پر (کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی بادشاہت جادو کی وجہ سے قائم تھی)۔

سلیمان علیہ السلام کو انہوں نے جادوگر کیوں کہا؟

بغوی نے بیان کیا کہ سدی نے کہا شیاطین آسمانوں کی طرف چڑھتے (کیونکہ آسمان دنیا پر ان کو چڑھنے کی اجازت تھی) تو فرشتوں کے کلام کو سنتے، خاص کر کے مستقبل کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو جو علم عطا کیا ہوتا ہے اس کے متعلق سن کر "کہ فلاں شخص کی موت فلاں جگہ آئے گی اور یہ یہ کام فلاں لوگوں نے فلاں دنوں میں کرنے ہیں"۔ وہ کاہنوں کے پاس آ کر بتاتے لیکن اس میں وہ اپنی طرف سے بھی کثیر جھوٹوں کی آمیزش کر دیتے۔

بعض روایات میں ستر جھوٹ اور بعض میں ننانوے جھوٹ ملانے کا ذکر ملتا ہے لیکن مراد اس سے تقریباً کثرت ہی ہے یعنی وہ کثیر جھوٹ ملا کر فرشتوں کا کلام کاہنوں تک پہنچاتے لوگ سمجھتے کہ کاہنوں کو علم غیب حاصل ہے لوگوں نے وہ لکھ لیا۔ اور اسی طرح بنی اسرائیل میں یہ مشہور ہو گیا کہ جن غیب کا علم رکھتے ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے کچھ حضرات کو بھیج کر وہ جادو کی تمام کتابیں جمع کرالیں اور ایک صندوق میں بند کر کے اپنی کرسی کے نیچے دفن کرا دیا۔

" وقال لا اسمع احدا یقول ان الشیطان یعلم الغیب الا ضربت عنقه "

اور آپ نے فرمایا کہ میں کسی کو یہ کہتے ہوئے نہ سنوں کی "شیطان غیب جانتا ہے اگر میں نے کسی سے یہ سنا تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا"۔ جب سلیمان علیہ السلام کا وصال ہو گیا اور وہ علماء کرام بھی دنیا سے رخصت ہو گئے جو یہ جانتے تھے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جادو کی کتابوں کو دفن کیا۔ تو ان کے بعد جب دوسرے لوگوں کا زمانہ آ گیا جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے جادو کی کتب کو دفن کرنے

کی وجہ نہیں جانتے تھے تو ان کے پاس شیطان انسانی شکل میں آیا۔ بنی اسرائیل کے چند لوگوں کو جمع کر کے کہنے لگا کیا میں تمہیں ایک خزانہ پر مطلع نہ کروں؟ انہوں نے کہا ہاں تم ہمیں بتاؤ۔

شیطان نے کہا کرسی کے نیچے سے جگہ کو کھودو، ان کو وہ جگہ تو دکھا رہا تھا لیکن خود ایک کنارے پر کھڑا تھا:" وذالک انہ لم یکن یدنو شیطان من الکرسی الا احترق " اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر شیطان خود کرسی کے قریب آتا تو وہ ضرور جل جاتا۔ انہوں نے جگہ کو کھودا اور جادو کی کتابوں کو نکال دیا۔

" قال الشیطان ان سلیمان کان یضبط الجن و الانس و الشیاطین و الطیر بھذہ "

شیطان نے کہا بیشک سلیمان اسی جادو کی وجہ سے جنات اور انسانوں اور شیاطین اور پرندوں پر حکومت کرتے تھے۔ " وفشا فی الناس ان سلیمان کان ساحرا " لوگوں میں یہ مشہور ہو گیا کہ سلیمان جادوگر تھے۔

دوسری وجہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو جادوگر کہنے کی یہ تھی کہ آصف نے حضرت سلیمان علی علیہ السلام سے تعلیم حاصل کی شیطانوں نے خود جادو کی کتابیں لکھ کر آصف کی طرف منسوب کر دیں اور یہ آپ کے مصلی کے نیچے دفن کر دیں۔ آپ کے وصال کے بعد ان کتابوں کو شیطانوں نے نکال کر یہ کہا کہ یہی علم آصف نے سلیمان سے حاصل کیا تھا " وانما ملککم سلیمان بھذا " اور تم پر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسی جادو کی وجہ سے بادشاہت کی۔

" فاما علماء بنی اسرائیل و صلحاؤھم فقالوا معاذ اللہ ان یکون ھذا من علم سلیمان "

بنی اسرائیل کے علماء اور صلحاء نے تو شیطانوں کے اس افشاء پر" کہ سلیمان جادوگر تھے " کہا کہ اللہ کی پناہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ علم ہو اور آپ نے اس کے ذریعے حکومت کی ہو۔

" واما السفلۃ فقالوا ھذا علم سلیمان و اقبلوا علی تعلمہ و رفضوا کتب انبیائھم "

لیکن جاہل گھٹیا، کمینے لوگ یہ کہنے لگے کہ سلیمان کا یہی علم تھا وہ لوگ اسکے سیکھنے کی طرف متوجہ ہو

گئے اور انہوں نے انبیاء کرام کی کتب کو چھوڑ دیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو جادوگر کہنا شروع کر دیا۔

﴿ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ ﴾ :یعنی ما سحر سلیمان فیکفر عبر عن السحر بالکفر لیدل علی ان السحر کفر وان من کان نبیا کان معصوما عنه"

(اور نہیں کفر کیا سلیمان نے) اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کوئی سحر نہیں کیا کہ کفر لازم آتا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے سحر نہ کرنے کو کفر نہ کرنے سے تعبیر فرمایا۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ سحر جس کو اصطلاح شرع میں سحر کہا گیا ہے وہ کفر ہے بیشک نبی کا سحر سے معصوم ہونا ضروری ہے۔

فائدہ: "فلما جاء محمد ﷺ برأ الله تعالیٰ سلیمان من ذلک"

حضرت سلیمان علیہ السلام پر بنی اسرائیل نے جو جادوگر ہونے کا عیب لگایا تھا۔ اس عیب سے اللہ تعالیٰ ان کو اس وقت بری فرمایا جب نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ تشریف لائے۔

اسی سے یہ واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ کے انبیاء کرام پر بھی احسانات عظیمہ ہیں۔

(ماخوذ از مظہری)

﴿ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ﴾ "اور لیکن شیطانوں نے کفر کیا سکھاتے لوگوں کو جادو" اس سے پہلے جو بحث ذکر کی گئی اسی سے واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف جادو کو منسوب کرنے والے شیاطین تھے اور وہ خود ہی لوگوں کو جادو سکھاتے تھے تو رب تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا کہ سلیمان نے تو جادو نہیں کیا کہ کفر لازم آتا ہاں البتہ وہ جادو کرنے والے اور دوسرے لوگوں کو سکھانے والے، اس طرح جادو کے ارتکاب سے کفر کرنے والے شیاطین ہی تے جو جھوٹ کی وجہ سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف جادو کی نسبت کر کے اور ہی جرم کے مرتکب ہوئے۔

﴿ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ﴾:

"اور جو الہام کیا گیا دو فرشتوں پر بابل میں یعنی ہاروت اور ماروت پر اور وہ دونوں نہیں سکھاتے تھے کسی ایک کو یہاں تک کہ وہ کہتے ہم تو صرف آزمائش ہیں تو تم کفر نہ کرو"۔

﴿ وَمَآ اُنۡزِلَ عَلَى الۡمَلَكَيۡنِ ﴾ ای الھماہ من السحر " اس مقام پر انزال کا معنی الہام لیا گیا ہے یعنی جو جادو الہام کیا گیا دو فرشتوں پر۔" ببابل ، بلد فی سواد العراق " بابل عراق کے علاقہ میں شہر کا نام ہے۔ ﴿ هَارُوۡتَ وَمَارُوۡتَ ﴾ ترکیبی لحاظ پر یہ بدل ہے ﴿ مَلَكَيۡنِ ﴾ کا یا عطف بیان ہے اسی لئے راقم نے اپنے ترجمہ میں "یعنی" کا لفظ بڑھایا ہے۔ (ماخوذ از جلالین)

ہاروت وماروت کی وجہ تسمیہ:

بعض حضرات نے تو یہ کہا ہے کہ یہ عجمی لفظ ہیں۔ عجمہ اور علمیت کی وجہ سے غیر منصرف ہیں "وقیل عربیان من الھرت والمرت بمعنی الکسر" بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ دونوں لفظ عربی ہیں "ھرت اور مرت" سے ماخوذ ہیں جس کا معنی ٹوٹنا۔ (از روح المعانی)

ممکن ہے کہ ان کو منکسر المزاج ہونے کی وجہ سے، یعنی نرمی سے دوسروں کو نصیحت کرنے کی وجہ سے ہاروت اور ماروت کہہ دیا گیا ہو آیۃ کریمہ کا مفہوم تقریباً واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی آزمائش کے لئے دو فرشتوں ہاروت اور ماروت کو جادو کا الہام کر کے بابل شہر میں اتارا کہ تم وہاں جا کر لوگوں کو جادو سکھاؤ۔

جو ان کے پاس جادو سیکھنے کے لئے آتا وہ فرشتے پہلے اسے نصیحت کرتے کہ ہم تو رب تعالیٰ کی طرف سے آزمائش بنا کر بھیجے گئے ہیں جو جادو سیکھے گا وہ کافر ہو جائے گا اس لئے تم جادو سیکھ کر کافر نہ بنو۔ البتہ جو شخص جادو سیکھنے سے بچ گیا وہ کفر سے بھی بچ جائے گا۔ اگر کوئی شخص ان کی نصیحت پر عمل کر لیتا تو ٹھیک ورنہ وہ اسے جادو سکھا دیتے۔

تنبیہ: علامہ آلوسی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں کہ تعجب ہے جو قرطبی نے بیان کیا ہے کہ "ہاروت وماروت" بدل ہے شیاطین سے اور ﴿ مَآ اُنۡزِلَ ﴾ میں "ما" نافیہ ہے۔ اور ملکین سے مراد جبرائیل اور میکائیل ہیں۔ اس لئے کہ یہود نے گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں یعنی جبرائیل اور میکائیل پر جادو اتارا۔ اور امام قرطبی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ کلام میں تقدیم وتاخیر ہے تقدیر عبارت کی یہ ہے:

" ﴿ وَمَا كَفَرَ سُلَيۡمٰنُ ﴾ ﴿ وَمَآ اُنۡزِلَ عَلَى الۡمَلَكَيۡنِ ﴾ ﴿ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيۡنَ ﴾ ﴿ هَارُوۡتَ وَمَارُوۡتَ ﴾ ﴿ كَفَرُوۡا يُعَلِّمُوۡنَ النَّاسَ السِّحۡرَ ﴾ ﴿ بِبَابِلَ ﴾ "

اس کا رد علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ان الفاظ سے کیا:

" ولا یخفی لدی کل منصف انه لا ینبغی لمؤمن حمل کلام الله تعالیٰ وهو فی اعلی مراتب البلاغة والفصاحة علی ما هو ادنی من ذلک وما هو الا مسخ لکتاب الله تعالیٰ عزشانه واهباط له علی شاٰواه ومفاسد قلة البضاعة لا تحصی "

کسی انصاف کرنے والے سے یہ مخفی نہیں کہ کسی مؤمن کی شان کے لائق ہو کہ اللہ تعالیٰ کا کلام جوفصاحت و بلاغت کے اعلیٰ مراتب پر ہے اسے ادنی پر محمول کیا جائے اس سے تو اللہ تعالیٰ کے کلام کا مسخ لازم آئے گا۔ اور اس کو اپنے اعلیٰ مقام سے گرانے کے مترادف ہے اور اس کے قیمتی سرمایہ فصاحت و بلاغت کو کم کرنے کے بے شمار مفاسد لازم آئیں گے۔ (از روح المعانی)

خیال رہے کہ راقم کا یہ انداز تحریر نہیں کہ مفسرین کرام کے اختلاف کو ذکر کیا جائے۔ لیکن طلباء کرام کے فائدہ کے لئے اس بحث کو ذکر کر دیا ہے۔

فائدہ : " وقال قتادة کان اخذ علیهما ان لایعلما احد احتی یقولا انما نحن فتنة "

قتادۃ فرماتے ہیں کہ ان دونوں فرشتوں سے رب تعالیٰ نے وعدہ لیا کہ جب بھی کوئی تمہارے پاس جادو سیکھنے کے لئے آئے تو اسے بتانا کہ ہم تو آزمائش ہیں۔ یعنی یہ بتانے کے بغیر ہرگز کسی کو جادو نہ سکھانا۔

" فتنة " سے مراد کیا ہے؟ " واما الفتنة فهی المحنة والاختبار " فتنہ سے مراد محنت، آزمائش۔

" وقال ابن جریج فی هذه الآیة لا یجترئ علی السحر الا کافر "

ابن جریج نے کہا اس آیۃ سے، یہ واضح ہوا کہ جادو کی جرات سوائے کافر کے اور کوئی نہیں کرسکتا۔

حدیث صحیح میں مذکور ہے۔

" من اتی کاهنا او ساحرا فصدقه بما یقول فقد کفر بما انزل الله علی محمد ﷺ "

جو شخص کسی کاہن اور ساحر کے پاس آیا اور اس نے جو کہا اس شخص نے اس کی تصدیق کر دی تو کافر ہو جائے گا۔ مسئلہ واضح ہے کہ کفر کو صحیح تسلیم کرنا بھی کفر ہے۔ (از صابونی)

﴿ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ﴾

''تو وہ سیکھتے تھے ان دونوں سے وہ کہ تفریق ڈالتے جس کے ذریعے مرد اور اس کی زوجہ کے درمیان''

﴿ مِنْهُمَا ﴾ میں ضمیر ''ہاروت وماروت'' کی طرف لوٹ رہی ہے ''ما'' سے مراد سحر ہے یعنی لوگ آتے اور ہاروت اور ماروت سے جادو سیکھتے۔ جس کے ذریعے وہ افعال مذمومہ (برے کام) میں تصرف کر لیتے۔ ان افعال مذمومہ میں سب سے زیادہ قبیح یہ تھا کہ وہ سحر کے ذریعے زوجین (میاں بیوی) کے درمیان تفریق ڈال دیتے حالانکہ پہلے ان دونوں کے درمیان بہت بڑا میل جول اور بہت بڑی محبت پائی جاتی۔ زوجین کے درمیان تفریق ڈالنا شیطانوں کا کام ہے۔ جیسا کہ مسلم نے اپنی صحیح میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ذکر فرمایا:

" ان الشیطان لیضع عرشه علی الماء ثم یبعث سرایاه فی الناس فأقربهم عنده منزلة اعظم عنده فتنة "، یجئی احدهم فیقول ما زلت بفلان حتی ترکته وهو یقول کذا وکذا فیقول ابلیس لا واللہ ما صنعت شیأ ویجئی احدهم فیقول ما ترکته حتی فرقت بینه وبین اهله قال فیقربه ویدنیه ویلتزمه ویقول نعم انت "

بیشک شیطان اپنا تخت پانی پر رکھتا ہے پھر وہ اپنے لشکر لوگوں میں بھیجتا ہے اس کے زیادہ قریب مرتبہ کے لحاظ پر وہ ہوتا ہے جو اس کے نزدیک بڑا فتنہ برپا کر کے آتا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک آتا ہے تو وہ کہتا ہے میں فلاں سے اس وقت تک نہیں ہٹا جب تک اسے ایسے ایسے کہتے ہوئے نہیں چھوڑا۔ ابلیس کہتا ہے قسم ہے اللہ تعالیٰ کی تو نے کچھ نہیں کیا۔ ان میں سے ایک اور آتا ہے وہ کہتا ہے میں نے نہیں چھوڑا اسے یہاں تک کہ میں نے اس کے اور اس کی زوجہ کے درمیان جدائی کرا دی تو وہ اسے اپنے قریب کرتا ہے گلے لگاتا ہے اپنا مقرب بنالیتا ہے اور کہتا ہے تو بہت اچھا ہے۔

یعنی مرد اور عورت کے درمیان جدائی پیدا کرنا بہت بڑا فتنہ ہے کیونکہ اس کے اوپر کئی اور فتنے بدکاریاں مرتب ہوتی ہیں۔ (از صابونی)

﴿ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾:

''اور وہ نہیں ضرر (نقصان) پہنچا سکتے اس کے ذریعے کسی ایک کو سوائے اللہ کے حکم سے''۔

﴿هُمْ﴾ ضمیر کا مرجع ہے ''سحرۃ'' یا ''یہود'' یا ''شیاطین'' ہیں ﴿بہ﴾ ضمیر کا مرجع " السحر " ہے ﴿مِنْ اَحَدٍ﴾ میں من زائد ہے ﴿اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ ای بارادته وقضائه ، یعنی اذن کا معنی ارادہ اور قضاء ہے۔ جن حضرات نے "بامر اللہ" معنی کیا ہے اس کا مطلب بھی ارادہ اور قضاء ہی ہے ''امر'' کا معنی اگرچہ اردو میں ''حکم'' کیا جاتا ہے لیکن حکم سے مراد بھی ''ارادہ وقضاء'' ہی ہے۔

اب معنی واضح ہو گیا اور وہ جادوگر، اور یہود اور شیاطین جادو کے ذریعے کسی ایک کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے سوائے اللہ تعالیٰ کے اردہ اور اس کی قضاء کے۔ خیال رہے کہ ''اذن'' کا معنی ''امر'' کر کے اسے حقیقی معنی میں اس لئے نہیں لیا جا سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ ان اللہ لا یأمر بالفحشاء والمنکر ﴾

''بیشک اللہ تعالیٰ نہیں حکم دیتا بے حیائی اور برے کاموں کا''

اس بحث سے یہ سمجھ لیا جائے کہ ''اذن'' کا معنی ''امر'' مفسرین کرام نے کیا ہے اردو تراجم میں ''حکم'' معنی کیا گیا ہے۔ اعلیٰ حضرت نے بھی یہ معنی کیا ہے لیکن ''امر'' اور حکم کا مجازی معنی ارادہ اور قضاء ہی ہے۔

(ماخوذ از قرطبی وبیضاوی وشیخ زادہ)

﴿ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ﴾:

''اور وہ سیکھتے ہیں جو ان کو ضرر دیتا اور نفع نہ دیتا'' یعنی ان کا جادو سیکھنا ان کے لئے ضرر نقصان کا سبب تھا " والعمل بالسحر کفر یتضرر به المرء فی الاخرۃ " کیونکہ جادو کا عمل کفر ہے اور کفر سے انسان کو آخرت میں نقصان ہوتا ہے یعنی اس کی وجہ سے عذاب دے کر اسے ضرر پہنچایا جائے گا۔ اور جادو سیکھنے میں انہیں کوئی نفع نہیں۔ بعض چیزوں میں کچھ نفع اور کچھ نقصان ہوتا ہے۔ لیکن جادو میں صرف ضرر ہی ضرر ہے۔

" وما یکون ضررا محضا یکون فی غایة الرداءۃ "

اور جس چیز میں صرف نقصان ہی پایا جائے وہ بہت گھٹیا چیز ہوتی ہے۔

بظاہر اس میں وہم یہ ہوتا ہے کہ جادو کا علم حاصل کرنا بذات خود نفع مند ہے کیونکہ یہ علم ہے اور علم نفع دینے والی چیز کا نام ہے تو اس کا جواب یہ دیا گیا۔

﴿ وَلَا یَنْفَعُهُمْ ﴾ اذ مجرد العلم به غير مقصود و لا نافع الدارين "

کہ علم حاصل کرنے کا اصل مقصد اس پر عمل کرنا ور دنیا و آخرت میں اس عمل کے ذریعے نفع حاصل کرنا ہے فقط علم کوئی نفع مند نہیں۔ جب جادو کا علم حاصل کرنا ہی ان کے لئے آزمائش کا سبب تھا، اور اس پر عمل کرنا ناجائز تھا، تو یقیناً اس میں ان کو کوئی نفع نہیں تھا بلکہ ان لوگوں کے لئے جادو سے اجتناب کرنا ضروری تھا۔ (ماخوذ از بیضاوی و شیخ زادہ)

﴿ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴾:

"اور تحقیق جان لیا انہوں نے جس نے حاصل کیا یہ نہیں ہے اس کا آخرت میں کوئی حصہ"۔ یہود نے اللہ کی کتاب اور انبیاء کرام کی تعلیمات کو چھوڑ کر جادو پر عمل شروع کر دیا۔ ان کا اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسولوں کو چھوڑ کر جادو کا عمل کرنا ان کیلئے آخرت میں کسی طرح بھی نفع مند نہیں تھا اور اس کا انہیں بھی علم تھا۔

﴿ خَلَاقٍ ﴾ کا معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے "نصیب" بیان فرمایا۔

مطلب واضح ہے کہ یہود کو یقینی طور پر علم تھا کہ وہ جو سودا کر رہے ہیں کہ دین چھوڑ کر جادو حاصل کر رہے ہیں اس کا آخرت میں انہیں کوئی حصہ یعنی کسی قسم کا اجر و ثواب حاصل نہیں ہوگا۔ (از بیضاوی)

اس میں یہود کی زیادہ مذمت پائی گئی ہے کہ انہوں نے قباحت کا علم رکھنے کے باوجود اس کا ارتکاب کیا۔

﴿ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ﴾

"اور برا ہے جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کا سودا کیا کسی طرح وہ جان لیتے"۔

﴿ وَلَبِئْسَ ﴾ البديل ما استبدلوا به من السحر عوضا عن الايمان ومتابعة الرسول "

مطلب یہ ہے کہ انہوں نے جادو کو حاصل کر کے ایمان اور رسول کی متابعت کو ترک کر دیا جو ان

کی جانوں کے لئے نقصان دہ تھا۔تو گویا کہ انہوں نے جادو کے عوض اپنی جانوں کو عذاب کے حوالے کرنے کا سودا کرلیا۔ (از صابونی)

قاضی مظہری رحمہ اللہ نے حذف مصاف کا قانون بیان فرمایا﴿ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ ﴾ یعنی باعوا به حظوظ ﴿ اَنْفُسَهُمْ ﴾ اور برا ہے جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کے حصوں (منافع ،اجروثواب) کو بیچ دیا۔ (مظہری)

﴿ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ ''کسی طرح ان کوعلم ہوتا'' اس پر بظاہر اعتراض یہ ہوتا ہے کہ پہلے ذکر فرمایا ﴿ وَلَقَدْ عَلِمُوْا ﴾ تحقیق انہوں نے جان لیا۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں معلوم تھا کہ ان کا سودا خسارے کا ہے لیکن ﴿ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ سے پتہ چلتا ہے ان کو علم نہیں تھا ان دونوں میں تطبیق کیسے؟

اس کا ایک جواب یہ ہے " معناه انهم لما لم يعملوا بها علموا فكانهم ما علموا " کہ وہ جانتے تو تھے اور یقینی طور پر جانتے تھے یہ مفہوم ہے﴿ وَلَقَدْ عَلِمُوْا ﴾ کا۔لیکن وہ اپنے علم کے مطابق نہیں کرتے تھے اس لئے گویا کہ وہ نہیں جانتے تھے یہ مفہوم ہے﴿ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ کا۔

اس کا دوسرا جواب ہے:

" وقيل المثبت العقل الغريزی والعلم الاجمالی بقبح الفعل وترتب العقاب والمنفی العلم بحقيقة ما يلحقه من العذاب "

جہاں علم کا ثبوت اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عقل دے رکھی ہے اور ان کو اجمالی طور پر اتنا علم حاصل ہے کہ یہ کام برا ہے اس پر عذاب مرتب ہونا ہے تاہم ان کو تفصیلی علم حاصل نہیں۔ جہاں علم کی نفی کی گئی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ان کو اس حقیقت کا علم نہیں کہ ان کو کتنا عذاب ہونا ہے کیسا عذاب ہونا ہے یعنی وہ اتنا علم رکھتے تھے کہ ان کو عذاب ہوگا وہ اس عذاب کی تفصیل کو نہیں جانتے تھے۔

اس کا تیسرا جواب جس کو قاضی مظہری رحمہ اللہ نے ''والمختار عندی'' (اور میرا مختار یہ ہے) سے تعبیر فرمایا یہ ہے:

" ان العلم علمان علم يتعلق بظاهر القلب وذا لا يستطيع العمل "

بیشک علم کی دو قسمیں ہیں ان میں سے ایک قسم یہ ہے جس کا تعلق دل کے ظاہری حصہ سے ہوتا

ہے وہ دل کے اندر اثر انداز نہیں ہوتا اس علم سے عمل حاصل نہیں ہوتا۔ یہود کو یہی علم حاصل تھا رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿یعرفونہ کما یعرفون ابناء ھم﴾ وہ آپ کو پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں لیکن اس علم اور معرفت نے بھی ان کو کوئی نفع نہ دیا۔ اور رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مثلھم کمثل الحمار یحمل اسفارا﴾

''(ان کی مثال) گدھے کی مثال ہے جو پیٹھ پر کتابیں اٹھائے''

یہ علم یہود کو حاصل تھا جس کا ذکر ﴿ولقد علموا﴾ میں ہے لیکن اس علم نے ان کو کوئی نفع نہ دیا۔

" وعلم وھبی یتخلص الی صمیم القلب بعد انجلائہ والی النفس بعد اطمینانہ "

علم کی دوسری قسم ''علم وہبی'' ہے یہ دل کی کدورت کے زوال اور اسے جلاء حاصل ہونے کے بعد حاصل ہوتا۔ جو دل کی گہرائیوں کے ساتھ خالص اثر انداز ہوتا ہے جس سے صمیم قلب ہو جاتا ہے۔ یہ علم انسان کو عمل کے اعلیٰ مقام تک پہنچا دیتا ہے۔

اور یہی علم نفس کے ساتھ خالص متعلق ہو جاتا ہے جب نفس کو اطمینان حاصل ہو جائے۔ یہی علم وہ ہے جس میں کمال ہے اور یہ علم یہود کو حاصل نہیں تھا اسی لئے فرمایا ﴿لو کانوا یعلمون﴾ ''کسی طرح وہ جانتے''۔ علم وہبی کا ثبوت قرآن وحدیث سے رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء﴾ بیشک اللہ سے ڈرنے والے اللہ کے بندوں سے علماء ہی ہیں۔ یہ علم وہبی ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے علماء کو رب تعالیٰ کا کامل خوف حاصل ہوتا ہے۔

☆ " وقولہ علیہ السلام العلماء ورثۃ الانبیاء یحبھم اھل السماء ویستغفرلھم الحیتان فی البحر اذا ماتوا الی یوم القیمۃ "

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا علماء انبیاء کے وارث ہیں ان سے آسمان والے محبت کرتے ہیں اور جب یہ فوت ہو جائیں تو ان کے لئے دریاؤں میں مچھلیاں قیامت تک بخشش طلب کرتی رہیں گی۔

(رواہ ابن النجار عن انس)

☆ " خیر الخیار خیار العلماء وشر الشرار شرار العلماء "

سب سے بہتر لوگوں میں بہتر وہ علماء ہیں جو بہتر ہوں اور سب شر لوگوں میں زیادہ شر وہ علماء ہیں

جوشر ہوں۔ اس حدیث پاک میں دونوں علموں کا ذکر کیا گیا علم وہبی اور وہ علم جو قلب (دل) کے ظاہر سے متعلق ہو۔ (رواہ الدارمی من حدیث الاحوص بن حکیم)

☆ " وعن الحسن قال العلم علمان فعلم فی القلب فذلک العلم النافع وعلم علی اللسان فذلک حجة الله علی ابن آدم "

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں علم کی دو قسمیں ہیں ایک علم وہ جو دل میں ہوتا ہے یہ علم نفع مند ہے۔ اور دوسرا علم جو زبان پر ہوتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی ابن آدم پر حجت ہے (کہ اے انسان تو جاننے کے باوجود بیان کرنے کے باوجود اس پر عمل کیوں نہیں کرسکے گا۔ (رواہ الدارمی)

ہاروت اور ماروت کے متعلق اسرائیلی روایات:

اس واقعہ میں اسرائیلی روایات بیس سے تجاوز کر جاتی ہیں۔ ایک روایت کے ذکر کرنے کے بعد علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں.

" الی غیر ذلک من الآثار التی بلغت طرقها نیفا وعشرین "

اسی طرح اور روایات سے بھی ثابت ہے جو تیس سے انتیس تک ہیں۔ (روح المعانی)

مختلف اسناد اور مختلف الفاظ سے ثابت ہونے والی روایات کا مفہوم تقریباً ایک ہی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

ھاروت اور ماروت کا واقعہ یہ ہے کہ جب انسانوں کے گناہ فرشتے آسمانوں کی طرف لے جاتے تو وہ کہتے کہ ان کو شرم آنی چاہئے کہ یہ کتنے گناہ کرتے ہیں۔ رب تعالیٰ نے فرمایا اگر میں تمہیں زمین پر بھیجوں اور تم میں وہی چیزیں (شہوات) رکھ دوں جو ان میں رکھی ہیں تو تم بھی ان ہی کاموں کے مرتکب ہو جاؤ جن کے انسان مرتکب ہو رہے ہیں۔

﴿ فقالوا سبحانک مالنا ان نعصیک ﴾

''تو فرشتوں نے کہا اے اللہ تیری ذات پاک ہے ہم تیری نافرمانی نہیں کریں گے''

رب تعالیٰ نے فرمایا تم دو کا انتخاب کرلو جن کو تم بہتر سمجھتے ہو، ہاروت اور ماروت کا انتخاب کرلیا

گیا۔ان کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی طرح خواہشات نفسانیہ عطا کر دیں۔اور زمین پر بھیج دیا اور ان کو حکم دیا کہ لوگوں میں انصاف سے فیصلے کرنا اور ان کو شرک سے منع کرنا، اور ناحق قتل سے روکنا اور زنا سے منع کرنا اور شراب پینے سے لوگوں کو منع کرنا۔

یہ ہر روز زمین پر آتے رب تعالیٰ کے حکم کے مطابق فیصلے کرتے لوگوں کو بتاتے کہ ہم تمہارے لئے آزمائش ہیں۔جادو نہ سیکھو، اگر کوئی ان کے روکنے کے باوجود سیکھتا تو اسے سکھا دیتے۔ہر شام کو یہ اللہ تعالیٰ کے اسم اعظم کو پڑھتے اسی کے ذریعے آسمانوں پر چڑھ جاتے ایک ماہ تک یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔اس کے بعد دونوں فرشتے ایک زھرۃ نامی عورت کے عشق میں مبتلاء ہوگئے جب اس نے انہوں نے اپنی حاجت طلب کرنے کے متعلق کہا تو اس نے کہا تم شراب پیو اور میرے خاوند کو قتل کرو تو میں تمہاری حاجت کو پورا کروں گی۔انہوں نے شراب پی لیا اسی نشہ کی حالت میں اس عورت سے زنا کے مرتکب بھی ہوگئے۔جب ایک شخص (عورت کے خاوند) کو آتے ہوئے دیکھا تو اسے قتل بھی کر دیا۔

ان جرائم کے بعد وہ اسم اعظم پڑھ کر آسمان کی طرف جانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ناکام ہو جاتے ہیں ان کے پروں میں طاقت ہی نہیں رہتی وہ عورت اسم اعظم پڑھ کر آسمانوں پر چلی گئی اسے ستارہ بنا دیا گیا زہرہ ستارہ وہی ہے۔

ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" لعن الله الزهرة فانما هي التي فتنت الملكين هاروت وماروت "

اللہ تعالیٰ زہرہ پر لعنت کرے کہ اس نے دو فرشتوں کو فتنہ میں ڈال کر برباد کر دیا۔

وہ دونوں فرشتے جب آسمانوں پر چڑھنے میں ناکام ہوگئے تو اس وقت کے نبی حضرت ادریس علیہ السلام کے پاس آئے۔اور ان سے عرض کیا کہ ہماری شفاعت کریں۔ان کی شفاعت پر اللہ تعالیٰ نے ان کو اختیار دے دیا کہ چاہیں تو دنیا کا عذاب پسند کرلیں اور چاہیں تو آخرت کا عذاب پسند کرلیں انہوں نے دنیا کا عذاب پسند کیا۔ان کو بابل کے ایک کنوئیں میں ان کے بالوں سے لٹکا دیا گیا وہ کنواں آگ سے بھرا ہوا ہے یہ عذاب ان کو اس وقت ہوتا رہے گا جب تک دنیا قائم ہے۔

(ماخوذ از مظہری)

اسرائیلی روایات کون سی ہیں؟

کعب بن احبار ﷺ جو پہلے یہودیوں کے عالم تھے وہ ایمان لے آئے یہ تابعی تھے صحابی نہیں تھے۔ حضرت کعب بن احبار اکثر طور پر صحابہ کرام اور تابعین کو یہود کے واقعات اوران کے اقوال سناتے رہتے تھے آپ کے سنانے کی وجہ یہ ہوتی تھی کہ لوگ ان کے غلط اقوال سے اجتناب کریں عبرت پکڑیں اور قرآن پاک، دین اسلام اور یہودیت میں فرق کریں۔

حضرت کعب بن احبار ﷺ کے بیان کردہ واقعات کو صحیح اسناد سے آگے بیان بھی کردیا گیا۔ اس لحاظ پر اس واقعہ سے متعلق صحیح اسناد سے بیس روایات سے زائد مروی ہیں۔ اگر ان کا وہی مطلب لیا جائے جو حضرت کعب کے بیان کا ہوتا تھا کہ یہود ہاروت اور ماروت کا واقعہ اس طرح بیان کرتے تھے تو درست ہوگا۔ اگر ان واقعات کا مطلب اس طرح بیان کیا جائے کہ یہ مطلب قرآن وحدیث کے مطابق ہے تو غلط ہوگا۔ (ماخوذ از التبیان للکاظمی)

اسرائیلی روایات کا مفسرین کرام نے رد کیا:

"فقد انكره جماعة منهم القاضي عياض وذكر ان ما ذكره اهل الاخبار ونقله المفسرون في قصة هاروت وماروت لم يرد منه شئى لا سقيم ولا صحيح عن رسول الله ﷺ وليس هو شيا يؤخذ بالقياس"

ان اسرائیلی روایات کا علماء کی جماعت نے انکار کیا ہے جن میں قاضی عیاض رحمہ اللہ بھی ہیں جو واقعات اہل اخبار نے بیان کئے ہیں۔ اور مفسرین کرام نے ہاروت اور ماروت کے متعلق جن روایات کو نقل کیا ہے ان میں سے کوئی روایت بھی صحیح یا ضعیف رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں۔ اور یہ مسئلہ قیاس سے ثابت ہونے والا نہیں کہ قیاس کیا جائے۔

☆ "وذكر في البحر ان جميع ذلك لا يصح منه شئى"

بحر میں ذکر کیا گیا ہے کہ تمام روایات اس واقعہ میں بیان ہونے والی صحیح نہیں۔ یعنی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات ہیں۔

☆ "ولم يصح ان رسول الله ﷺ كان يلعن الزهرة"

نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب ہونے والا قول کہ آپ زہرہ پر لعنت کرتے تھے صحیح نہیں یعنی آپ کا یہ ارشاد ہی نہیں ۔ اور یہ روایت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی جاتی ہے لیکن ان سے بھی اس روایت کا صحیح ثبوت نہیں ۔

☆ اور امام رازی رحمہ اللہ نے بھی اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا: " ان هذه الرواية فاسدة مردودة غير مقبولة " بیشک یہ روایت فاسد ہے مردود ہے، مقبول نہیں ۔

☆ شہاب عراقی رحمہ اللہ نے واضح طور پر ذکر فرمایا کہ جو شخص ہاروت اور ماروت کے متعلق یہ عقیدہ رکھے:

" انهما ملكان يعذبان على خطيئتهما مع الزهرة فهو كافر بالله تعالىٰ العظيم "

کہ وہ دونوں فرشتے زہرہ کے ساتھ گناہ میں مبتلاء ہونے کی وجہ سے عذاب دیئے جا رہے ہیں وہ شخص اللہ تعالیٰ کا منکر ہے، کافر ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتے معصوم ہیں رب تعالیٰ نے ان کی عصمت کو بیان فرمایا:

﴿ لا يعصون الله ما امرهم ويفعلون ما يؤمرون ☆ لا يستكبرون عن عبادته ولا يستحسرون ☆ يسبحون الليل والنهار لا يفترون ﴾

" وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے اور یہ ارشاد فرمایا وہ اللہ کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے اور تھکتے نہیں اور یہ ارشاد فرمایا وہ دن رات اللہ کی تسبیح کرتے ہیں سستی نہیں کرتے"۔

☆ " والزهرة كانت يوم خلق الله تعالىٰ السماوات والارض والقول بانها تمثلت لهما فكان ما كان وردت الى مكانها غير معقول ولا مقبول "

یہ کہنا کہ وہ زہرہ نامی عورت ستارہ بن گئی اور وہاں پہنچ گئی جہاں زہرہ ستارہ کی جگہ تھی یہ عقل کے خلاف ہے اور مقبول بھی نہیں کیونکہ زہرہ ستارہ کو تو اسی دن پیدا کر دیا گیا جس دن اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان پیدا فرمائے۔

تنبیہ : بعض لوگوں نے ہاروت اور ماروت کے اس واقعہ کا مطلقاً انکار کر دیا تھا کہ اس کا کوئی ثبوت

ہی نہیں۔ان پر علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اعتراض کیا کہ نفس واقعہ کا انکار کرنا صحیح نہیں کیونکہ اسے امام احمد، ابن حبان، اور بیہقی وغیرہ نے بیان کیا ہے کوئی روایت مرفوع اور کوئی حضرت علی اور حضرت ابن عباس اور ابن عمر اور ابن مسعود ﷺ پر موقوف ہیں اس میں متعدد صحیح روایات ثابت ہیں جو ان روایات پر واقف ہیں وہ ان کی صحت پر یقین رکھتے ہیں اور ان کی کثرت اور قوت مخرج کے لحاظ پر بھی ان پر کامل وثوق کیا جا سکتا ہے۔

" وذهب بعض المحققين ان ماروى مروى حكاية لما قاله اليهود وهو باطل فى نفسه وبطلانه فى نفسه لاينافى صحة الرواية ولا يرد ما قاله الامام السيوطى عليه انما يرد على المنكرين بالكلية "

محققین علماء کرام نے بیان فرمایا ہے کہ یہود نے جو بیان کیا ہے وہ باطل ہے لیکن ان کے باطل اقوال کو جو بیان کیا گیا ہے اس میں روایات صحیحہ کثیر تعداد میں موجود ہیں واقعہ کا باطل ہونا صحت روایات کے منافی نہیں۔

لہٰذا واضح ہوا کہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے جو بیان فرمایا ہے وہ ان لوگوں کا رد فرمایا جو یہ کہتے تھے کہ یہ واقعہ کسی روایت سے ثابت نہیں علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ واقعہ تو صحیح اسناد سے متعدد روایات سے ثابت ہے۔لیکن آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ واقعہ باطل نہیں کہ آپ کا رد کیا جائے۔

(ماخوذ از روح المعانی)

تنبیہ : حضرت کعب بن احبار کی تمام روایات کو اسرائیلی روایات کہنا بھی بے دانشی (ناسمجھی) ہے صرف وہی روایات اسرائیلی ہوں گے جن کو جلیل القدر مفسرین کرام نے اسرائیلی کہا ہے آج کل کے معاندین کے اقوال باطلہ کا کوئی اعتبار نہیں۔

گزشتہ سے پیوستہ : کیا جادوگر سے سوال کیا جا سکتا ہے کہ وہ جادو کو کھول دے؟ حضرت سعید ابن مسیّب نے اس کی اجازت دی ان کا قول امام بخاری نے نقل فرمایا " **وقال الشعبى لا باس بالنشرة** " اور شعبی نے بھی یہ کہا ہے کہ جادو کھلوانے میں کوئی حرج نہیں۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے اسے مکروہ بیان فرمایا ہے کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے

مروی ہے آپ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا:

" یا رسول اللہ ھلا تنشرت فقال اما اللہ فقد شفانی وخشیت ان افتح علی الناس شرا "

یارسول اللہ آپ جادوکو (کسی جادوگر سے) کھلواتے کیوں نہیں؟ آپ نے فرمایا مجھے اللہ تعالیٰ نے شفا عطا فرمادی ہے مجھے ڈر ہے کہ میرے اس فعل سے (جادوگروں سے جادواگر کھلواؤں) تو لوگوں پر شر کا دروازہ نہ کھل جائے یعنی ایسا نہ ہو کہ لوگ جادوگروں کے پاس جا کر جادو کا عمل عام نہ شروع کر دیں۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے وہب سے نقل کیا کہ بیری کے سات پتے لئے جائیں پھران کو دو پتھروں کے درمیان کوٹ لیا جائے پھران کو پانی میں حل کر دیا جائے ان پر آیۃ الکرسی پڑھی جائے جادو کئے ہوئے شخص کو تین سانسوں میں پلا دیا جائے اور باقی سے وہ غسل کرلے تو اسے شفاء حاصل ہو جائے گی۔

علامہ صابونی رحمہ اللہ فرماتے ہیں زیادہ بہتر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جادو کے زوال کے لئے سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کو نازل فرمایا ان کو ہی پڑھ کر دم کیا جائے۔ چونکہ حدیث شریف میں بھی رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے " لم یتعوذ المتعوذ بمثلھا " ان دو سورتوں جیسی کوئی اور چیز نہیں جس سے پناہ پکڑنے والا پناہ پکڑے۔

" وکذلک قراءۃ آیۃ الکرسی فانھا مطردۃ للشیطان "

اسی طرح آیۃ الکرسی کا پڑھنا بھی شیطان کو بھگاتا ہے۔ (از صابونی)

ہاروت اور ماروت کے آنے کی فقط یہ وجہ:

ان دونوں فرشتوں کو زمین پر بھیجنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگوں کو جادو کے متعلق بتائیں کہ جادو سیکھنا ناجائز ہے اور ان لوگوں کو جادو اور معجزہ میں فرق معلوم ہو جائے۔ اور ان کو یہ پتہ چل جائے کہ اللہ تعالیٰ کی آزمائش میں اسکے حکم کے خلاف کام کرنا باعث کفر ہے۔ اور اس کی منشا کے مطابق کام ذریعہ نجات ہے۔ (از مظہری)

ایک سوال اور اس کا حل: اگر یہاں یہ سوال کیا جائے کہ جب یہ کام انبیاء کرام علیھم الصلوۃ والسلام بھی کر سکتے تھے اس پر فرشتوں کو مامور فرمانے کی کیا حکمت تھی اس کا جواب یہ ہے کہ انبیاء کرام علیھم الصلوۃ والسلام کا بنیادی کام یہ تھا کہ وہ لوگوں کو کفر وشرک سے بچنے کی تعلیم دیتے تھے اگر وہ

فرشتوں کی طرح لوگوں کو سحر کے اعمال کفریہ وشرکیہ سکھاتے تو یہ ان کے بنیادی کام کے خلاف ہوتا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کام پر فرشتوں کو مامور فرمایا۔ (التبیان للکاظمی رحمہ اللہ)

نبی کریم ﷺ پر جادو:

"عن عائشة قالت سحر رسول الله ﷺ يهودی من يهود بنی زريق يقال له لبيد بن الاعصم قالت حتی كان رسول الله ﷺ يخيل اليه انه يفعل الشئ وما يفعله حتی اذا كان ذات يوم او ذات ليلة دعا رسول الله ﷺ ثم دعا ثم دعا ثم قال يا عائشة اشعرت ان الله افتانی فيما استفتية فيه جاء نی رجلان فقعد احدهما عند رأسي والآخر عند رجلی فقال الذی عند رأسي للذی عند رجلی او الذی عند رجلی للذی عند رأسي ما وجع الرجل قال مطبوب قال من طبه قال لبيد بن الاعصم قال فی ای شئ قال فی مشط ومشاطة وجب طلعة ذكر، قال فاين هو قال فی بئرذی اروان قالت فاتاها رسول الله ﷺ فی اناس من اصحابه ثم قال يا عائشة والله لكان ماء ها نقاعة الحناء ولكان نخلها رؤس الشياطين قالت فقلت يا رسول الله افلا احرقته قال لا اما انا فقد عافانی الله وكرهت ان اثير علی الناس شرا فامرت بها فدفنت" (مسلم ج ۲ باب السحر)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ پر بنی زریق کے یہودیوں میں سے ایک یہودی نے جادو کر دیا۔ اس یہودی کا نام لبید بن اعصم تھا۔ آپ فرماتی ہیں اس کا اثر یہاں تک ہو گیا کہ آپ خیال فرماتے تھے کہ یہ کام کر لیا ہے۔ حالانکہ آپ نے وہ کیا نہیں ہوتا تھا۔ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی، پھر دعا فرمائی، پھر دعا فرمائی۔ پھر آپ نے فرمایا اے عائشہ کیا تمہیں معلوم ہے اللہ تعالیٰ نے مجھے وہ بتا دیا ہے جو میں نے پوچھا۔ میرے پاس دو شخص آئے ایک میرے سر کے پاس بیٹھ گیا اور دوسرا میرے پاؤں کے پاس بیٹھ گیا۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے پوچھا اس شخص کو کیا تکلیف ہے (درد

کس وجہ سے ہیں) دوسرے نے جواب دیا کہ اس پر جادو کر دیا گیا ہے پہلے نے کہا اس پر جادو کس نے کیا دوسرے نے کہا لبید بن اعصم نے۔ پہلے نے پھر کہا کس چیز میں جادو کیا ہے؟ دوسرے نے جواب دیا کنگھی اور کنگھی کرتے ہوئے گرنے والے بالوں میں اور مذکر کھجور کے شگوفہ میں۔ پہلے نے پھر کہاں انہیں کہاں رکھا ہوا ہے اس نے کہا" بئر ذی اروان " میں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی کریم ﷺ اپنے صحابہ کرام میں سے چند صحابہ کو ساتھ لے کر اس کنوئیں کے پاس آئے اس کا پانی ایسے سرخ تھا جیسے اس میں مہندی گھول دی گئی ہو۔ اور اس کے (اردگرد) کھجوروں کے سر ایسے ہیں جیسے شیاطین کے سر ہوں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے عرض کیا آپ نے ان کو جلا کیوں نہیں دیا۔ آپ نے فرمایا نہیں جلایا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے آرام دے دیا۔ اور میں نے ناپسند سمجھا کہ لوگوں پر شر پھیلاؤں میں نے حکم دیا ان چیزوں کو دفن کر دیا گیا۔

وضاحت حدیث:

اس حدیث پاک کی وضاحت میں امام رازی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اہل سنت کے جمہور علماء کا یہ مذہب ہے کہ سحر ثابت ہے اور سحر کی حقیقت ہے۔ معتزلہ نے کہا سحر خیالات باطلہ ہیں لیکن حقیقت میں یہ کہنے والوں کے خیالات باطلہ ہیں۔

" وقد انكر بعض المبتدعة هذا الحديث بسبب آخر فزعم انه يحط منصب النبوة "

بعض مبتدعین نے اس حدیث کا انکار کر دیا کہ اس سے منصب نبوت میں فرق پڑتا ہے لیکن یہ ان کا کہنا باطل، جھوٹ اور من گھڑت قول ہے۔

" لان الدلائل لاقطعية قد قامت على صدقه و صحته و عصمته فيما يتعلق بالتبليغ و المعجزة شاهدة بذلک وتجويز ما قام الدليل بخلافه باطل "

اس لئے کہ دلائل قطعیہ قائم ہیں اس پر کہ حدیث پاک صحیح ہے اور آپ پر جادو کا ہونا سچ ہے۔ البتہ نبی کریم ﷺ کی تبلیغ اور اس کے ساتھ متعلق امور جادو کے دوران بھی جاری رہے بلکہ یہ نبی کریم ﷺ

کا معجزہ ہے کہ جادو نے آپ کی تبلیغ میں کوئی اثر نہ کیا۔ لہٰذا واضح ہوا کہ جو علم دلائل سے ثابت ہو اس کے خلاف کہنا باطل ہے۔

" قال القاضی عیاض وقد جاءت روایات ھذا الحدیث مبینة ان السحر انما تسلط علی حسده وظواھر جوارحه لا علی عقله وقلبه واعتقاده "

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس حدیث کی روایات واضح ہیں بیشک جادو کا اثر نبی کریم ﷺ کے جسم پر اور ظاہری اعضاء پر ہوا۔ آپ کی عقل اور دل اور اعتقاد پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اور اس حدیث پاک میں نبی کریم ﷺ کے دعاء کرنے سے یہ ثابت ہوا۔

" ھذا دلیل لا ستحباب الدعاء عند حصول الامور المکروھات وتکریره وحسن الا لتجاء الی اللہ تعالیٰ "

کہ یہ دلیل ہے کہ مشکل اور تکالیف کے وقت دعاء کرنا مستحب ہے اور دعا میں تکرار یعنی اللہ تعالیٰ سے التجاء کرنے میں دعا بار بار کی جائے تین مرتبہ دعا کرنا مستحب ہے۔

(مشاطه) بضم المیم کنگھی کرتے ہوئے سر اور داڑھی کے جو بال گریں۔ (مشط) بضم المیم وبکسرھا ، کنگھی۔ (ذی اروان) ایک کنواں ہے جو مدینہ طیبہ میں بنی زریق کے باغ میں تھا بخاری میں اس کا نام " ذروان " ذکر ہے۔

راقم کے خیال میں اصل نام " ذی اروان " ہے اور مخفف طور پر بولتے میں "ذروان" آیا ہوا ہے اسی لئے علامہ نووی رحمہ اللہ نے دونوں کو صحیح کہا اور پہلے کو اجود (عمدہ) کہا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان چیزوں کو جلایا نہیں جن پر جادو کیا گیا تھا بلکہ دفن کر دیا۔ اس کی وجہ آپ نے خود ہی بیان فرما دی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے آرام دے دیا۔ جلانے میں لوگوں میں شر پھیلتا۔ یعنی جادو کا چرچا ہوتا جادو کے سیکھنے، سکھانے کا عام چرچا ہوتا جس سے مسلمانوں میں فتنہ پھیلتا۔

(ماخوذ از نووی)

﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَیْرٌ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ﴾ (آیت ۱۰۳)

۱) ''اوراگر وہ ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو اللہ کے یہاں کا ثواب بہت اچھا ہے کسی طرح انہیں علم ہوتا''۔

۲) ''اوراگر وہ ایمان لاتے اورتقوی حاصل کرتے البتہ ثواب دیئے جاتے اللہ کی طرف سے (وہ جو) بہت اچھا ہے کسی طرح وہ جانتے''۔

﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ ﴾: ای الیھود ، یعنی '' ھم ''ضمیر یہود کی طرف لوٹ رہی ہے۔

﴿ اٰمَنُوْا ﴾ : بکتابھم وبما امروا بالایمان به مما نزل بعده '' اوراگر وہ یہود اپنی کتاب (توراۃ) پر ایمان لاتے اوراس چیز پر ایمان لاتے جو بعد میں نازل ہوئی اوراس پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا۔ (تبصیر الرحمن)

﴿ اٰمَنُوْا ﴾ بالنبی والقرآن '' اوراگر یہود نبی کریم ﷺ پراورقرآن پاک پر ایمان لاتے۔ (جلالین)

﴿ وَاتَّقَوْا ﴾ ای المعاصی التی حکیت عنھم '' اوراگر وہ ان گناہوں سے بچ جاتے جو گناہ ان کے بیان کئے جاتے ہیں۔ (روح المعانی)

﴿ وَاتَّقَوْا ﴾ عن متابعة المنسوخ بعد نزول الناسخ ومتابعة كتب السحر '' اوراگر وہ منسوخ کتاب ودین کی متابعت سے ناسخ کے نازل ہونے کے بعد بچ جاتے اور جادو کی کتابوں کی تابعداری سے بچ جاتے۔ (تبصیر الرحمن)

﴿ لَمَثُوْبَةٌ ﴾ یہ '' لو '' کا جواب ہےاوراصل میں '' لا ثیبوا مثبوۃ من عند اللہ خیرا '' البتہ ان کوثواب دیا جاتا اللہ کے ہاں بہتر۔ (بیضاوی)

﴿ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَیْرٌ ﴾ یعنی اللہ کے ہاں دنیااوردنیا کی تمام چیزوں سے بہتر ان کوثواب دیا جاتا چہ جائیکہ وہ رشوت حاصل کریں یعنی ان کورشوت سے حاصل ہونے والے مال اور جادو سے حاصل ہونے والے مال سے بہتر ثواب دیا جاتا۔ (تبصیر الرحمن)

﴿ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ ''کسی طرح وہ جانتے''یعنی اگر وہ جانتے حقائق کو کہ ثواب رشوت وغیرہ سے بہتر ہے لیکن ان کو اس کا پتہ نہ چل سکا کیونکہ انہوں نے دنیاوی منافع کو اخروی سعادت پر ترجیح دی۔ (از تبصیر الرحمن)

مفہوم واضح ہے کہ یہود اگر ایمان لاتے اور تقوی اختیار کرتے تو ان کو اللہ کے ہاں بہتر ثواب عطا کیا جاتا کسی طرح وہ حقائق کو جانتے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں علم حق عطا فرمائے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور نبی کریم ﷺ کی محبت پر قائم ودائم رکھے۔

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ (آیت ۱۰۴)

۱) اے ایمان والو راعنا نہ کہو اور یوں عرض کرو کہ حضور ہم پر نظر رکھیں اور پہلے سے ہی بغور سنو اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے۔

۲) اے ایمان والو نہ کہو راعنا اور کہو نظر کرم فرماؤ ہم پر۔ اور (پہلے سے ہی) بغور سنو۔ اور کافروں کے لئے عذاب ہے دردناک۔

اللہ تعالیٰ نے یہود کے قبیح افعال واقوال اور اعتقادات کی وضاحت فرمادی، لیکن ان کا تعلق نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے سے ہے۔ اب ان کے وہ قبائح (برے افعال واقوال) بیان کئے جارہے ہیں جن کا تعلق نبی کریم ﷺ کی بعثت کے بعد سے ہے۔

یہود نے نبی کریم ﷺ کی بعثت کے بعد آپ پر طعن کرنے، آپ کے عیوب نکالنے، اور آپ کے دین میں طعن پیش کرنے کی انتھک کوشش کی، لیکن ان کی کوششیں تمام کی تمام ناکام ثابت ہوئیں۔

شانِ نزول: نبی کریم ﷺ جب کوئی ارشاد فرماتے، اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پر توجہ نہ کرنے کی وجہ سے نہ سمجھ پاتے تو آپ کی خدمت میں عرض کرتے '' راعنا یا رسول اللہ '' آپ ہماری انتظار فرمائیں۔ آپ ہماری رعایت فرمائیں یارسول اللہ۔ یعنی آپ ذرا ٹھہر ٹھہر کر ارشاد فرمائیں۔ اور یہ ارشاد پھر سے لوٹا دیں تاکہ ہم سمجھ سکیں۔

یہود نے جب سنا کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام ان کی خدمت میں " راعنا " کا لفظ بولتے ہیں تو وہ بہت خوش ہوئے کیونکہ یہ کلمہ ان کی زبان میں گالی کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ (جیسا کہ آنے والی وضاحت میں ان شاء اللہ سمجھ آجائے گا) اس لئے وہ ایک دوسرے کو کہنے لگے "کنا نسب محمدا سرا فاعلنوا به الآن" کہ ہم محمد کو دل دل میں گالیاں دیا کرتے تھے، لیکن اب تو اعلانیہ طور پر گالیاں دو۔ یعنی " راعنا " کہہ کر گالی دو۔

انہوں نے بھی اسی لفظ کا استعمال کرنا شروع کر دیا۔ جب وہ منافقانہ چال سے " راعنا یارسول الله " کہتے، تو "یضحکون فیما بینهم " ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنستے، کہ ہم تو گالیاں دے رہے ہیں۔

(نبی کریم ﷺ تو سن کر خاموش رہتے کیونکہ آپ اپنے اخلاق کریمانہ کی وجہ سے ذاتی انتقام نہیں لیتے تھے)

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ یہود کی زبان کو جانتے تھے۔ آپ نے جب ان کو ہنستے ہوئے دیکھا تو سمجھ گئے کہ یہ لوگ تو " راعنا " کے لفظ کو غلط طور پر استعمال کر رہے ہیں تو آپ نے یہود کو کہا " لئن سمعتها من احد منکم یقولها لرسول الله ﷺ لاضربن عنقه " اگر میں نے تم میں سے کسی ایک کو رسول اللہ ﷺ کے سامنے " راعنا " کہتے ہوئے سنا تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔

وہ کہنے لگے کہ یہ لفظ تو تم خود بھی استعمال کرتے ہو۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا صحابہ کرام کو بھی " راعنا " کہنے سے منع کر دیا۔ اگرچہ صحابہ کرام اس لفظ کا معنی وہ لیتے تھے جو نبی کریم ﷺ کی شان کے مطابق ہوتا تھا۔ لیکن یہود مسلمانوں کے "راعنا" کے لفظ کے استعمال سے غلط معنی مراد لیتے تھے تو مسلمانوں کو بھی اس لفظ کے استعمال سے منع کر دیا۔

" لکی لایجد الیهود بذلک سبیلا الی شتم رسول الله ﷺ" تا کہ یہود کو نبی کریم ﷺ کو اس لفظ کے ذریعے گالی دینے کا موقع نہ مل سکے۔ (از خازن)

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا : (اے ایمان والو) اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی امت کو قرآن پاک میں

اٹھاسی مقامات میں ﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ﴾ سے خطاب فرمایا۔

ایک عظیم نکتہ : حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رب تعالیٰ نے توراۃ میں یہود کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا " یاایھاالمساکین " (اے مسکینو) فکأنه سبحانه وتعالى لما خاطبهم اولا بالمساكين اثبت المسكنة لهم آخرا حيث قال ﴿ وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ﴾ رب تعالیٰ نے ابتدائی طور پر ہی جب ان کو مسکین کہہ کر خطاب کیا تو ان پر بعد میں اسی لئے مسکینی کو مسلط کر دیا۔ رب تعالیٰ نے خود فرمایا "اور ان پر مسلط کردی گئی ذلت اور مسکینی" اسی سے یہ ثابت ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے جب نبی کریم ﷺ کی امت کو ﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ﴾ کہہ کر پکارا تو "فانه تعالى يعطيهم الامان من العذاب فی النيران يوم القيامة " اللہ تعالیٰ ان کو قیامت کے دن عذاب سے امان (حفاظت) عطا فرمائے گا۔

اور وجہ یہ ہے کہ " اسم المؤمن اشرف الاسماء والصفات "مؤمن بندوں کے ناموں اور صفات میں اعلیٰ اور اشرف نام اور اشرف صفت ہے۔ جب رب تعالیٰ نے دنیا میں ہمیں اشرف اور اعلیٰ قسم کے نام اور صفت سے خطاب فرمایا " فنرجو من فضله ان يعاملنا فی الآخرة باحسن المعاملات " تو ہم امید کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے آخرت میں بھی ہمارے ساتھ اچھا معاملہ فرمائے گا۔

(از کبیر)

لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا : (نہ کہو راعنا) ایمان والوں کو راعنا کہنے سے منع فرمادیا۔

اس کی چند وجوہ ہیں۔

1) پہلی وجہ تو وہی ہے جس کا ذکر شان نزول میں آچکا ہے، کہ مسلمان " راعنا " کا لفظ ذکر کر کے صحیح معنی لیتے کہ آپ ہماری انتظار فرمائیں۔ اور آپ ہماری رعایت فرمائیں۔ لیکن یہود کی زبان میں یہ لفظ بطور گالی کے استعمال ہوتا تھا۔ وہ اس کا معنی لیتے " اسمع لاسمعت " سنو نہ سن سکو۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں سننے کی توفیق عطا نہ فرمائے۔ (معاذاللہ)

اللہ تعالیٰ کا ایک اور ارشاد گرامی اسے زیادہ واضح کر رہا ہے۔

﴿ مِنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَیَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا وَاسْمَعْ غَیْرَ

مُسۡمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا ۢ بِاَلۡسِنَتِهِمۡ وَطَعۡنًا فِى الدِّيۡنِ ﴿۴۶﴾ (نساء آیۃ ۴۶)

بعض یہودی کلاموں کو ان کی جگہ سے پھیرتے ہیں اور کہتے ہیں ہم نے سنا اور نہ مانا۔ (اور نبی کریم ﷺ کو کہتے) اور آپ سنیں، نہ سنائے جائیں۔ اور راعنا کہتے زبانیں پھیر کر دین میں طعنہ کیلئے۔

۲) قطرب نے کہا اگر چہ یہ لفظ صحیح معنی رکھتا ہے۔ یعنی صحابہ کرام اس کا صحیح معنی ہی مراد لیتے تھے لیکن اہل حجاز " ماكانوا يقولونها الا عند الهزؤ والسخرية فلاجرم نهى الله عنها " اس لفظ کو مزاح اور ٹھٹھا کے وقت استعمال کرتے تھے اس لئے یقیناً اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا۔ تا کہ نبی کریم ﷺ کے حضور ایسا کوئی لفظ استعمال نہ ہو۔ جس میں ٹھٹھا، مزاح کا پہلو نکلے، جس سے ان کے اعمال برباد نہ ہو جائیں۔

۳) یہود اس لفظ " راعنا " کو پھیر کر، لمبا کر کے، یوں پڑھتے " راعينا " اور اس کا معنی یہ مراد لیتے " انت راعينا غنمنا " تم ہماری بھیڑ بکریوں کو چرانے والے ہو۔ رب تعالیٰ نے مومنوں کو بھی اس سے منع فرما دیا کہ تم بھی " راعنا " نہ کہو، تا کہ یہود غلط معنی مراد نہ لے سکیں۔

۴) "راعنا" باب مفاعلہ سے جو شرکت جانبین کو چاہتا ہے۔ اس لحاظ پر معنی یہ ہوگا کہ تم ہماری رعایت کرو ہم تمہاری رعایت کریں گے۔ تم ہماری انتظار کرو ہم تمہاری انتظار کریں گے۔

" فنهاهم الله تعالى عنه وبين ان لابد من تعظيم الرسول عليه السلام فى المخاطبة على ما قال ﴿ لَا تَجۡعَلُوۡا دُعَآءَ الرَّسُوۡلِ بَيۡنَكُمۡ كَدُعَآءِ بَعۡضِكُمۡ بَعۡضًا ﴾

تو رب تعالیٰ نے اس لفظ کے استعمال سے ہی منع کر دیا۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کی تعظیم ضروری ہے۔ اسلئے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا "تم رسول اللہ کو ایسے نہ پکارو جیسے آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو"۔

(۵) " راعنا " میں خطاب کرنے والا اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے۔ اگر چہ صحابہ کرام اس معنی کو مراد نہیں لیتے تھے لیکن لفظ کا تقاضا یہ تھا کہ اس کا معنی یہ ہو " راع كلامى ولا تغفل عنه ولاتشتغل بغيره " میرے کلام کی رعایت کرو، انتظار کرو، غافل نہ ہو۔ کسی اور طرف مشغول نہ ہو۔

یہ معنی یقیناً نبی کریم ﷺ کی شان کے لائق نہ تھا۔ اس لئے وہ لفظ ہی استعمال کرنے سے منع کر دیا، جس لفظ میں بے ادبی کا پہلو پایا جائے۔

لیکن " انظرنا " کہنے والا اپنے آپ کو بڑا نہیں سمجھتا بلکہ عاجزانہ طور پر کہتا ہے، میرے سوال کی انتظار کریں، اپنے کلام میں توقف کریں، اپنا بیان ٹھہرا کر کریں تا کہ میں سمجھ سکوں۔ اسی لئے "انظرنا" کہنے کا حکم دیا۔

(۲) " راعنا " رعونة " سے مشتق ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے " حماقت " یہود چونکہ اس معنی میں بھی استعمال کرتے تھے۔ لہٰذا رب تعالیٰ نے ایمان والوں کو منع کیا کہ تمہارے صحیح استعمال کے باوجود یہود چونکہ نبی کریم ﷺ کو (معاذ اللہ) احمق کہہ رہے ہیں۔ لہٰذا تم یہ لفظ ہی استعمال کرنا چھوڑ دو۔

یہ تمام وجوہ ہی سبب ہیں مومنوں کو "راعنا" کے لفظ کے استعمال کرنے سے منع کرنے کی۔

وَقُوْلُوا انْظُرْنَا : اور کہو ہماری طرف نظر کرم فرماؤ۔

یہاں بھی مختلف وجوہ ہیں۔ ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ کبھی ذکر کیا جاتا ہے " نظرہ " اس کا معنی مراد لیا جاتا ہے "انتظرہ" اس نے فلاں کی انتظار کی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿اُنْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ﴾ میں " انظرونا " انتظار کے معنی میں استعمال ہے۔

اب معنی یہ ہوگا "اور کہو ہماری انتظار فرمائیں۔

اور وجہ یہ ہے کہ کبھی کہا جاتا ہے " انظرنا " تو معنی اس کا یہ لیا جاتا ہے " انظر الینا " ہماری طرف نظر رحمت فرمائیں۔

اور وجہ یہ ہے کہ " انظرنا " ماخوذ ہے "النظرة" سے جس کا معنی ہے مہلت دینا۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا "ہمیں مہلت دیں۔"

وَاسْمَعُوْا: میں تین مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ پہلے ہی کامل توجہ سے سنو۔ ادھر ادھر توجہ نہ کروتا

کہ نبی کریم ﷺ سے لوٹانے کا تمہیں مطالبہ ہی نہ کرنا پڑے۔

اور مطلب یہ ہے کہ یہود کو اشارۃً سمجھانا مقصود تھا کہ انہوں نے کہا تھا﴿ سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا ﴾ ہم نے سنا اور نافرمانی کی۔ مسلمانوں کو حکم دیا﴿ وَاسْمَعُوْا ﴾ تم سن کر قبول کرلو۔ اگرچہ صحابہ کرام نے سن کر قبول کیا ہوا تھا لیکن مقصد یہود کو سنانا تھا کہ تم بھی سن کر قبول کرلو۔ سن کر نافرمانی نہ کرو۔ اور مطلب یہ تھا کہ جو تمہیں " راعنا " کہنے سے منع کیا گیا ہے۔ اسے سنو۔ پھر اس کلمہ کو نہ لوٹانا۔

وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ : اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے۔

" اذا لم يسلكوا مع الرسول هذه الطريقة من الاعظام والتبجيل " یعنی نبی کریم ﷺ کی عظمت نہ بیان کرنا، آپ کی بزرگی کا لحاظ نہ کرنا دردناک عذاب کا سبب ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

"ووضع المظهر موضع المضمر ايذانا بان التهاون برسول الله ﷺ كفر يوجب اليم العذاب"

" وللكافرين " اسم ظاہر کو ذکر کیا، ضمیر کو نہیں لایا گیا یہ بتانے کے لئے کہ نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کرنا، نازیبا الفاظ استعمال کرنا کفر ہے اور باعث عذاب ہے اور وہ عذاب بھی دردناک ہوتا ہے۔ (روح المعانی)

تنبیہ : ان الله تعالىٰ نهى المؤمنين عن مشابهة الكافرين قولا و فعلا " بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو کافروں کی مشابہت سے منع فرمایا ہے کہ قول وفعل میں کفار کی مشابہت نہ کی جائے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے " من تشبه بقوم فهو منهم " جس شخص نے کسی قوم سے مشابہت کی وہ ان سے ہی ہے۔ یہود جب مسلمانوں کو سلام کہتے تو " السام عليكم " کہتے۔ السام کا معنی موت ہے لیکن ہمیں یہ حکم ہے کہ ہم ان کے جواب میں سلام نہ کہیں بلکہ صرف "وعليكم" کہہ کر جواب دیں۔

اسی آیۃ سے یہ پتہ چلا کہ مسلمانوں کو کفار کی مشابہت سے منع کیا گیا ہے یہ ان کے اقوال، افعال، لباس اور ان کی عادات بلکہ ان کی عبادات میں بھی ان کی مشابہت نہ کریں۔ (از صابونی)

مقام توجہ : " فی هذه الآية دلالة على تجنب الالفاظ المحتملة التي فيها التعريض

للتنقیص و الغض"

اسی آیۃ کریمہ سے یہ مسئلہ بھی سمجھ آ گیا کہ ایسے الفاظ جن کے معانی میں احتمال ہو کہ تعریضاً یہ نبی کریم ﷺ کی تنقیص (شان کی کمی) اور آپ کی شان کو چھپانے والے معانی ہیں تو ان الفاظ سے اجتناب ضروری ہے۔

گناہوں کے اسباب سے بچنا بھی ضروری ہے:

''اس آیۃ کریمہ میں مسلمانوں کو ''راعنا'' کہنے سے منع کیا، اس لئے کہ اسی لفظ کو یہود غلط معنی میں لیتے تھے جو باعث کفر تھا، لہٰذا اس لفظ کا استعمال ہی منع کر دیا گیا۔

☆ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ وَلَاتَسُبُّوا الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدۡوًاۢ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ ؕ﴾ (الانعام آیۃ ۱۰۸)

اور انہیں گالی نہ دو جن کو وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں کہ وہ اللہ کی شان میں بے ادبی کریں گے زیادتی اور جہالت سے۔

چونکہ بتوں کی مذمت بیان کرنا، ان کو گالی دینا سبب بنتا ہے اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کرنے کا، کیونکہ کفار جوابی طور پر اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کرتے ہیں، اس لئے معبودانِ باطلہ کو گالی دینے سے منع کر دیا گیا۔

☆ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ام حبیبہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے حبشہ میں ایک گرجا دیکھا جس میں تصاویر تھیں۔ ان دونوں نے ان تصاویر کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا۔

" فقال رسول اللہ ﷺ ان اولئک اذا کان فیھم الرجل الصالح فمات بنوا علی قبرہ مسجدا و صوّروا فیہ تلک الصور اولئک شرار الخلق عنداللہ " (اخرجہ البخاری و مسلم)

تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک ان لوگوں میں جب کوئی نیک آدمی فوت ہو جاتا تو اس کی قبر کے پاس وہ مسجد بنا لیتے پھر اس مسجد میں اس نیک آدمی اور دوسرے نیک آدمیوں کی تصویریں رکھ لیتے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہی بری مخلوق ہے۔

یعنی وہ لوگ نیک آدمیوں کی تصویریں بنا کر مسجد میں رکھ لیتے، تاکہ ان کے ذریعے اپنے دل کو تسلی دیں، اور ان نیک لوگوں کے احوال کو یاد کر کے ان جیسے اعمال کو بجالا سکیں۔ ان قبروں کے پاس وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے۔ اس طرح کچھ وقت گذر گیا۔ ان کے بعد آنے والے لوگ اصلی حالات سے جاہل تھے۔ شیطان نے ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا کہ تمہارے آباء واجداد تو ان بزرگوں کی عبادت کرتے تھے۔ تو ان لوگوں نے ان تصویروں کی عبادت شروع کر دی۔ آہستہ آہستہ ان تصویروں کے بت بنالئے۔ اس طرح بت پرستی شروع ہوگئی۔

" فحذّر النبی ﷺ عن مثل ذلک " نبی کریم ﷺ نے اس قسم کی چیزوں سے ڈرایا۔

یعنی ذی روح چیزوں کی تصویریں بنانا۔ پھر بزرگوں کی تصویروں کو بطور تعظیم گھروں میں رکھنا، اور مساجد میں ذی روح چیزوں کی تصویروں کو رکھنا، اور ان کے سامنے نماز ادا کرنا حرام قرار دیا۔

وجہ اس کی یہی تھی کہ بت پرستی کے اسباب کو بھی حرام قرار دے دیا، تاکہ بت پرستی سے اجتناب ہو سکے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: " اشتد غضب الله علی قوم اتخذوا قبور انبیائهم و صالحیهم مساجد "

اللہ تعالیٰ کا اس قوم پر غضب بہت سخت ہوتا ہے جو انبیاء کرام اور اولیاء کرام کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا اور ارشاد یہ ہے۔ " اللهم لاتجعل قبری وثنا یعبد " اے اللہ میری قبر کو بتوں کی طرح عبادت گاہ نہ بنانا۔ (کہ اسے سجدہ کیا جائے)

☆ " وروی مسلم عن النعمان بن بشیر قال سمعت رسول الله ﷺ یقول الحلال بیّن والحرام بیّن و بینهما امور متشابهات فمن اتقی الشبهات استبرأ لدینه وعرضه ومن وقع فی الشبهات وقع فی الحرام کالراعی یرعی حول الحمی یوشک ان یقع فیه "

حضرت نعمان بن بشیر ﷺ فرماتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ حلال واضح ہے اور حرام واضح ہے۔ ان کے درمیان ایسے امور ہیں جن کے حلال ہونے اور حرام ہونے میں شبہ پایا جاتا ہے۔ جو شخص شبہ والے امور سے بچ گیا، اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو بچالیا۔ جو شخص

شبہ والی چیزوں میں واقع ہوگیا وہ حرام میں واقع ہوگیا۔ جیسا کہ چرواہا جو (کھیت کی) حد بندی کے اردگرد جانوروں کو چرائے ان کے کھیت میں واقع ہونے کا احتمال پایا جاتا ہے۔

واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے شبہات سے اس لئے منع کیا تا کہ حرام کاموں کے ارتکاب سے بچا جا سکے۔

☆ " وقال رسول الله ﷺ ان من الكبائر شتم الرجل والديه قالوا يارسول الله وهل يشتم الرجل والديه ؟ قال ، نعم يسب ابا الرجل فيسب اباه ويسب امه فيسب امه "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا بہت بڑا گناہ ہے کہ کوئی شخص اپنے والدین کو گالی دے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا کوئی شخص اپنے والدین کو بھی گالی دیتا ہے؟ آپ نے فرمایا جو شخص کسی کے باپ کو گالی دے، وہ اس کے باپ کو گالی دے۔ اور جو شخص کسی کی ماں کو گالی دے وہ اس کے ماں کو گالی دے۔

یعنی کسی کے ماں باپ کو گالی دینے سے منع کیا تا کہ وہ اس کے ماں باپ کو گالی نہ دے۔ گویا کہ ماں باپ کو گالی دینے کے ذریعہ اور سبب سے بھی منع فرمایا۔ (ماخوذ از قرطبی)

شان نبوت کے مناسب نہیں کہ ایک بات تم بار بار پوچھتے رہو، یہ کمال ادب اور انتہاء تعظیم ہے جس کی تعلیم عرش وفرش کے مالک نے غلامان مصطفیٰ علیہ السلام کو دی۔ اب جو لوگ حضور کریم ﷺ کو صرف بڑے بھائی کی سی حیثیت دیتے ہیں یا اپنے جیسا بشر ثابت کرنے میں اپنی ساری قابلیتیں صرف کر دیتے ہیں وہ اپنے انجام پر خود ہی غور کر لیں۔

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

(ضیاء القرآن)

☆☆☆

﴿ مَايَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴾ (آیت ۱۰۵)

۱) وہ جو کافر ہیں کتابی یا مشرک وہ نہیں چاہتے کہ تم پر کوئی بھلائی اترے تمہارے رب کے پاس سے، اور اللہ اپنی رحمت سے خاص کرتا ہے جسے چاہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے

۲) نہیں پسند کرتے کافر اہل کتاب ہوں یا مشرک کہ نازل کی جائے کوئی بھلائی تمہارے رب کی طرف سے اور اللہ خاص کرتا ہے اپنی رحمت جسے چاہے اور بڑے فضل والا ہے۔

اس سے پہلے یہ ذکر کیا گیا کہ یہود بظاہر نبی کریم ﷺ سے محبت کرتے، اور ظاہری طور پر آپ کے ادب و احترام کا لحاظ کرتے لیکن در پردہ، دل ہی دل میں آپ کو گالیاں دیتے، آپ کی شان میں گستاخی کرتے، اور اس تاک میں رہتے کہ مسلمان کوئی ایسا لفظ نبی کریم ﷺ کے لئے استعمال کریں جو ذو معنیین (دو معنوں والا) ہو۔ جس کا ایک معنی اچھا ہو جس میں مسلمان اس لفظ کو استعمال کریں۔ اور ایک معنی سے برائی اور مذمت سمجھ آئے جس میں ہم استعمال کریں تا کہ ہم دل ہی دل میں اپنے غیظ و غضب کی بھڑاس نکال لیں۔

اس آیۃ کریمہ میں ان کی وہی چال مسلمانوں سے ذکر کی جا رہی ہے۔ کہ وہ مسلمانوں سے بظاہر محبت کا اظہار کرتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ محبت کرتے ہیں، لیکن مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کی کوئی رحمت بھی دل میں پسند نہیں کرتے۔ (از بیضاوی و شیخ زادہ)

شان نزول: کفار نے مسلمانوں سے جب ظاہری طور پر محبت کرنے کا دعویٰ کیا کہ ہم تمہارے ساتھ محبت کرتے ہیں۔

" فان الكفار لما اظهروا مودّة المسلمين كان المسلمين يوالونهم ويركنون اليهم

فنهوا عن ذلک"

کفار نے جب مسلمانوں سے محبت کرنے کا ظاہری دعویٰ کیا تو مسلمان بھی ان سے محبت کرنے لگے اور ان کی طرف میلان کرنے لگے۔ تو رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل کر کے واضح کر دیا کہ کفار خواہ اہل کتاب ہوں یا مشرک ہوں وہ تو نہیں پسند کرتے کہ تم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی بھلائی نازل ہو۔

وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہیں۔ ان سے محبت نہ کرو، ان سے دوستی قائم نہ کرو۔ ان کی طرف میلان نہ کرو۔

ایک مقام پر فرمایا: ﴿ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ﴾

اے ایمان والو کافروں کو دوست نہ بناؤ مسلمانوں کے سوا۔ (النساء آیۃ ۱۴۴)

یعنی تم صرف آپس میں مسلمان ہی ایک دوسرے سے دوستی قائم کرو۔ کفار سے دوستی قائم نہ کرو

اور ارشاد فرمایا: ﴿ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِیَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴾ (هود، آیۃ ۱۱۳)

اور ظالموں کی طرف نہ جھکو کہ تمہیں آگ چھوئے گی اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی حمایتی نہیں پھر مدد نہ پاؤ گے۔

شان نزول کی ایک اور وجہ:

مسلمانوں نے اپنے حلیف یہود کو کہا تم محمد ﷺ پر ایمان لے آؤ، تو وہ کہنے لگے۔ " وددنا لو کان خیرا مما نحن علیه فنتبعه فاکذبهم اللہ تعالیٰ بذلک " ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ ایمان لے آئیں، لیکن وہ دین جب ہمارے دین سے بہتر ہو جس کی ہم تابعداری کر رہے ہیں۔ رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ میں یہود کی تکذیب کی کہ وہ اپنے اس دعویٰ میں جھوٹے ہیں وہ تو چاہتے ہی نہیں کہ نبی کریم ﷺ پر وحی نازل ہو، یا مومنوں کو کوئی بھلائی حاصل ہو۔

وہ غلط کہتے ہیں کہ ہم تو ایمان لانا پسند کرتے ہیں، لیکن تمہارا دین ہمارے دین سے بہتر نہیں۔

ان کے دونوں دعوے جھوٹے ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ ہم پسند کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائیں یہ سراسر غلط ہے، وہ تو ایمان لانا ہی نہیں چاہتے اور ان کا یہ کہنا بھی باطل ہے کہ تمہارا دین ہمارے دین سے اچھا نہیں، یہ تو صرف ان کا زبانی دعویٰ ہے۔ وہ اپنے اس دعویٰ پر کوئی دلیل تو قائم کریں۔

(ماخوذ از شیخ زادہ و روح المعانی)

مقام توجہ: پہلی آیت میں یہود کے قبائح کا ذکر کیا جو وہ رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کرتے تھے۔ اور اس آیۃ میں بھی یہود کے مسلمانوں سے منافقانہ انداز سے پیش آنے کا ذکر کیا ہے، لیکن دونوں میں وجہ بیان مختلف ہے۔ اور علیحدہ علیحدہ غرض پائی گئی ہے۔

" فان الاول لتأديب المؤمنين وهذا لتكذيب اولئك الكافرين " پہلی آیت میں مومنوں کو ادب سکھانا مقصود ہے کہ تم کوئی ایسا لفظ ذکر ہی نہ کرو جس سے کفار کو نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کا موقع مل سکے۔

اور دوسری آیۃ میں ذکر کیا گیا ہے کہ کفار جھوٹے ہیں۔ ان کی محبت کے دعوے تسلیم نہ کرنا۔

(از روح المعانی)

مَايَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَاالْمُشْرِكِيْنَ :

(نہیں پسند کرتے کافر خواہ اہل کتاب ہوں یا مشرک ہوں)

" ما " نافیہ ہے۔ اور " یود " ماخوذ ہے " ود " سے اور " ود " کے دو معنی آتے ہیں۔ تاہم مراد دونوں ہی ہوتے ہیں۔ البتہ کبھی ایک قصداً مراد ہوتا ہے۔ اور دوسرا تبعاً اور کبھی دوسرا قصداً مراد ہوتا ہے اور پہلا تبعاً۔ " الود محبة الشئ و تمنی کونه " " ود " کا ایک معنی ہے کسی چیز سے محبت کرنا، اور دوسرا معنی ہے تمنا کرنا۔ البتہ ان دونوں معنوں کے استعمال میں فرق ہے۔ اگر کسی چیز کی تمنا کرنے والا معنی لیا جائے تو مفعول جملہ ہوگا۔ جیسا کہ " وددت لو تفعل كذا " میں تمنا کرتا ہوں کاش تو ایسے کرے۔

اور اگر محبت والا معنی لیا جائے تو مفعول مفرد ہوگا۔ " وددت الرجل " میں فلاں شخص سے محبت کرتا ہوں۔

البتہ یہ واضح ہے کہ مراد تمنا والا معنی ہو تو اس میں محبت پائی جائے گی۔ اور اگر مراد محبت والا معنی تو

اس میں تمنا پائی جائے گی۔اور یہ بھی خیال رہے کہ جب " ود " کا ذکر ہوگا تو اسی سے یہ بھی واضح ہوگا کہ وہ اسے ناپسند نہیں کرتا۔ (از روح المعانی)

یعنی اس ایک لفظ " مایود " سے وسیع تر معنی حاصل ہوگیا کہ کافر پسند ہی نہیں کرتے (محبت نہیں رکھتے) اور کافر تمنا ہی نہیں رکھتے۔ بلکہ کافر تو ناپسند کرتے ہیں کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی بھلائی حاصل ہو جائے۔

" من اهل الكتاب ولا المشركين " یہاں " من " بیان کے لئے ہے۔جس کا معنی ہوتا ہے یعنی۔اعلیٰ حضرت کا ترجمہ " من " بیانیہ کے مطابق ہے۔راقم نے وہی نقل کیا۔تاہم " من "تبعیض کے لئے ہو یہ بھی احتمال ہے۔اس وقت " مـن " کا معنی '' سے'' ہوتا ہے۔ضیاء القرآن میں یہی معنی مذکور ہے۔('' من " میں دواحتمالوں کا ذکر روح المعانی میں ہے۔)

اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ :

(یہ کہ نازل کی جائے تم پر کوئی بھلائی تمہارے رب کی طرف سے)

یہاں پہلا'' من " استغراق کے لئے ہے۔اور دوسرا" من " ابتدائیہ ہے۔

''خیر'' سے مراد کیا ہے؟:وفسر الخير بالوحي والمعنى انهم يحسدونكم به وما يحبون ان ينزل عليكم شئ منه "

خیر سے مراد وحی ہے، یعنی وہ تم پر حسد کرتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ تم پر رب تعالیٰ کی طرف کچھ نازل ہو۔ یہود کہتے تھے کہ نبوت حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد کا حق ہے ۔ جب نبی کریم ﷺ بنی اسماعیل میں تشریف لائے تو وہ حسد کرنے لگے اور آپ پر ایمان نہ لائے ، یہود میں سے کئی لوگ منافقانہ طور پر آپ سے محبت کا دم بھی بھرتے تھے لیکن دل میں آپ کو پسند نہیں کرتے تھے اور نہ ہی یہ پسند کرتے کہ آپ پر وحی نازل ہو۔

اسی طرح مشرکین چاہتے تھے کہ مکہ اور طائف میں سے کسی رئیس پر قرآن نازل ہوتا۔وہ اس لئے حسد کرتے تھے کہ قریش میں بنی عبدالمطلب میں ایک یتیم اور غریب شخص پر قرآن کیوں نازل ہوگیا۔

" وقالوا لولا نزل هذا القرآن علی رجل من القریتین عظیم " اورانہوں (مشرکین) نے کہا یہ قرآن کیوں نازل نہیں کیا گیا دو بستیوں (مکہ اور طائف) کے کسی بڑے شخص پر۔

خیر سے مراد علم بھی لیا گیا ہے۔ کہ وہ نہیں چاہتے کہ تمہیں علم جیسی عظیم اور لازوال نعمت عطاء کی جائے۔ اور خیر سے مراد نصرۃ (امداد) بھی ہے۔ کہ کفار نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے امداد عطاء کرے۔

" ولعل المراد به ما یعم ذلک " شاید مراد خیر سے عام ہو۔ ہر قسم کی بھلائی مراد ہو۔

یعنی کفار نہیں چاہتے کہ نبی کریم ﷺ اور مؤمنین کو کسی قسم کی کوئی بھلائی بھی رب تعالیٰ کی طرف سے عطاء ہو کیونکہ وہ حسد کرتے تھے اور انہیں اپنی ریاست (چوہدراہٹ) کے زوال کی فکر رہتی تھی۔

وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ: ''اور اللہ خاص کرتا ہے اپنی رحمت سے جسے چاہے''

یہ جملہ ابتدائیہ ہے۔ خیر کے نازل کرنے اور اس میں حکمت کی وضاحت کی جارہی ہے، کہ کفار باوجود اس کے کہ ناپسند کریں لیکن اللہ تعالیٰ جسے چاہے بھلائی عطاء فرمادے۔

" والمراد من الرحمة ذلک الخیر الا انه عبر بها اعتناء وتعظیما لشانه "

رحمت سے مراد وہی خیر جس کا ذکر پہلے کیا گیا۔ البتہ عظمت شان کے پیش نظر اور اہتمام شان کے لئے رحمت سے تعبیر کردیا گیا۔

یعنی اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جسے چاہے بھلائی عطاء فرمائے، کفار کے ناپسند کرنے سے رب تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو اپنی رحمت اور بھلائی سے محروم نہیں فرماتا۔

ایک عظیم نکتہ:

" وفی اقامة لفظ " اللہ " مقام ضمیر ربکم تنبیه علی ان تخصیص بعض الناس بالخیر دون بعض یلائم الالوهیة کما ان انزال الخیر علی العموم یناسب الربوبیة " (روح المعانی)

جب پہلے " ربکم " ذکر ہو چکا ہے، تو ضمیر ذکر ہو جاتی جو " ربکم " کی طرف لوٹتی، لیکن ظاہر لفظ " اللہ " ذکر کیا گیا اس کی وجہ کیا ہے؟۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ربوبیت کا تقاضا یہ ہے کہ تمام پر

رحمت ہو۔لیکن اللہ تعالیٰ جسے چاہے اپنی رحمت خاصہ سے نوازتا ہے یہ اس کے مقام الوہیت کا تقاضا ہے کہ وہ معبود ہے۔اس پر کوئی چیز لازم نہیں کہ وہ ضرور ہی تمام کو اپنی خاص رحمت عطاء کرے۔

البتہ اللہ تعالیٰ رب بھی ہے۔صفت ربوبیۃ چاہتی ہے کہ ہر کسی پر رحمت ہو۔اس صفت ربوبیۃ کی وجہ سے رحمت عامہ ہر کسی کو حاصل ہے۔جس سے مومن اور کافر تمام ہی نفع حاصل کر رہے ہیں۔

وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ :" ذو " کا معنی صاحب، مالک، والا۔(اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔)

یہاں سے حسد کرنے والے اور مسلمانوں پر رب تعالیٰ کی نعمتوں کو ناپسند کرنے والے لوگوں کو بتانا مقصود ہے، کہ جب رب تعالیٰ کی وسیع نعمتوں سے ہر شخص نفع اٹھا رہا ہے۔اس کے فضل اور نعمتوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں ہر شخص مستغرق ہے تو کسی کو بھی حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی دوسرے سے حسد کرے، اور یہ پسند کرے کہ کسی کو نعمت اور رحمت حاصل نہ ہو۔

مقام توجہ:" وان حرمان بعض عباده ليس لضيق فضله بل لمشيئته وما عرف فيه من حكمته "

اللہ تعالیٰ اگر اپنے بعض بندوں کو اپنی رحمت خاصہ سے محروم کرتا ہے تو اس کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ اسکے فضل میں کوئی کمی ہے یا اسکے فضل میں کوئی تنگی ہے۔اس کا فضل تو وسیع تر ہے۔البتہ اس کی مشیت کا تقاضا جہاں پایا جائے اور اسکی حکمت جہاں پائی جائے وہاں اپنی رحمت خاصہ سے وہ نوازتا ہے۔

جہاں اس کی مشیت میں یہ ہو کہ اسے رحمت خاصہ سے دور رکھنا ہے تو اس کو محروم کرنا بھی حکمت کے عین تقاضا کے مطابق ہے۔اور یہ واضح ہوا کہ " **ان كل خير ناله عباده في دينهم و دنياهم فانه منه ابتداء وتفضلا عليهم من غير استحقاق احدمنهم لذلك بل له الفضل والمنة على خلقه** "

بندوں کو جو بھی بھلائی دین و دنیا میں حاصل ہوتی ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حاصل ہوتی ہے۔یہ وجہ نہیں کہ بندے اس کے مستحق ہوتے ہیں۔یا اللہ تعالیٰ پر واجب ہوتا ہے کہ وہ عطاء کرے۔بندوں پر تو پہلے ہی اللہ تعالیٰ کے ان گنت انعام ہیں ان کا بھی وہ شکریہ ادا نہیں کر سکتے، چہ جائیکہ وہ اپنی عبادات وغیرہ کے ذریعے اپنے آپ کو مستحق سمجھیں۔(ماخوذ از روح المعانی و خازن)

﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ط اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ☆﴾ (آیت ۱۰۶)

۱) جب کوئی آیت ہم منسوخ فرمائیں یا بھلا دیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی لے آئیں گے، کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

۲) جو ہم منسوخ کرتے ہیں کوئی آیت۔ یا بھلا دیتے ہیں کوئی آیت، ہم لے آتے ہیں بہتر اس سے، یا اس کی مثل (اے مخاطب) کیا تو نہیں جانتا بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

شانِ نزول: یہود کے مختلف قسم کے اعتراضات اور دین میں طعن کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ ان اعتراضات میں سے ان کا اسلام کے خلاف یہ اعتراض تھا۔

" فقالوا الا ترون الی محمد یامر اصحابه بامر ثم ینهاهم ویأمرهم بخلافه ویقول الیوم قولا وغدا یرجع عنه فنزلت هذه الآیة "

کہ وہ کہنے لگے کیا تم محمد کو نہیں دیکھتے کہ وہ اپنے اصحاب کو آج ایک حکم دیتا ہے۔ پھر اس سے منع کر دیتا ہے۔ اور اسکے خلاف حکم دے دیتا ہے۔ اور آج ایک بات کرتا ہے۔ کل اس سے رجوع کر لیتا ہے۔ تو ان کے رد کیلئے اور نسخ کی حکمت بیان کرنے کیلئے یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔ (از کبیر)

خصوصاً جب بیت المقدس قبلہ منسوخ کر کے کعبہ شریف کو قبلہ بنا دیا گیا تو وہ زیادہ ہی اعتراض کرنے لگے۔ (خازن)

نسخ کے معانی: نسخ کا معنی زائل کرنا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا" فینسخ الله ما یلقی الشیطن" تو اللہ تعالیٰ زائل کر دیتا ہے (مٹا دیتا ہے) جو شیطان اس میں ڈال دیتا ہے۔

اور نسخ بمعنی تبدیل کرنا۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا" واذا بدلنا آیة مکان آیة "اور جب ہم تبدیل کر دیں ایک آیۃ کو دوسری آیۃ کی جگہ۔ (یہ بھی نسخ ہی ہے اگر چہ لفظ 'بدلنا' استعمال ہوا ہے)

اور نسخ بمعنی تحویل۔ جیسا کہ کہا جاتا" تناسخ المواریث "، یعنی وراثت کا ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہونا۔ اور نسخ بمعنی نقل کرنا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ " نسخت الکتاب " میں نے کتاب کو نقل کیا، یعنی اس کے الفاظ اور خط کو فلاں کتاب یا فلاں جگہ سے نقل کیا۔ (از الاتقان)

نسخ اور متقدمین ومتاخرین علماء کرام:

متقدمین علماء کرام نے پانچ صد آیات کو منسوخ مانا ہے۔ اور متأخرین نے ان کی تعداد کو بہت کم مانا ہے۔

اس پر مفتی محمد شفیع صاحب نے یوں تبصرہ کیا: جس طرح ایک حکم کو بالکلیہ منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم لانے میں ہے۔ جیسے بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ کو قبلہ بنا دینا۔ اسی طرح کسی مطلق یا عام حکم میں کسی قید وشرط کو بڑھا دینا بھی ایک قسم کی تبدیلی ہے۔ اسلاف امت نے نسخ کو اسی عام معنی میں استعمال فرمایا ہے۔ جس میں کسی حکم کی پوری تبدیلی بھی داخل ہے اور جزوی تبدیلی قید وشرط یا استثناء وغیرہ کی بھی اس میں شامل ہے۔ اسی لئے متقدمین حضرات کے نزدیک قرآن میں آیات منسوخہ پانچ سو تک شمار کی گئی ہیں۔

حضرت متأخرین نے صرف اس تبدیلی کا نام نسخ رکھا ہے۔ جس کی پہلے حکم کے ساتھ کسی طرح تطبیق نہ ہو سکے، ظاہر ہے کہ اس اصطلاح کے مطابق آیات منسوخہ کی تعداد بہت گھٹ جائے گی۔

اسی کا لازمی اثر یہ تھا کہ متقدمین نے تقریباً پانچ سو آیات قرآنی میں نسخ ثابت کیا تھا۔ جس میں معمولی سی تبدیلی قید وشرط یا استثناء وغیرہ کو بھی شامل کیا تھا اور حضرات متأخرین میں علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے صرف بیس آیتوں کو منسوخ قرار دیا، ان کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے ان میں بھی تطبیق کی صورت پیدا کر کے صرف پانچ آیتوں کو منسوخ فرمایا ہے۔ جن میں کوئی تطبیق بغیر تاویل بعید کے نہیں ہو سکتی، یہ امر اس لحاظ سے مستحسن ہے کہ احکام میں اصل بقاء حکم ہے، نسخ خلاف اصل ہے۔ اس لئے جہاں آیت کے معمول بہا (اس پر عمل کئے جانے) ہونے کی کوئی توجیہ ہو سکتی ہے۔ اس میں بلاضرورت نسخ ماننا درست نہیں۔ لیکن اس تقلیل کا یہ منشاء ہرگز نہیں ہو سکتا کہ مسئلۂ نسخ اسلام یا قرآن پر کوئی عیب تھا

جس کے ازالہ کی کوشش چودہ سو برس تک چلتی رہی، آخر انکشاف حضرت شاہ ولی اللہ کو ہوا، جس میں گھٹتے گھٹتے پانچ رہ گئیں۔ اور اب اس کا انتظار ہے کہ کوئی جدید محقق ان پانچ کا بھی خاتمہ کر کے بالکل صفر تک پہنچادے۔

مسئلہ نسخ کی تحقیق میں ایسا رخ اختیار کرنا نہ اسلام اور قرآن کی کوئی صحیح خدمت ہے۔ اور نہ ایسا کرنے سے صحابہ و تابعین اور پھر چودہ سو برس کے علماء متقدمین و متأخرین کے مقالات و تحقیقات کو دھویا جاسکتا ہے۔ اور نہ مخالفین کی زبانِ طعن اس سے بند ہوسکتی ہے۔ بلکہ اس زمانے کے ملحدین کے ہاتھ میں یہ ہتھیار دینا ہے کہ یہ بھی ہوسکتا ہے، کہ چودہ سو برس تک علماء کچھ کہتے رہے ہوں اور آخر میں اسکا غلط ہونا ثابت ہوجائے۔ معاذ اللہ" اگر یہ دروازہ کھلے گا تو قرآن اور شریعت سے امن اٹھ جائیگا۔
(معارف القرآن)

راقم نے یہ طویل اقتباس نقل کیا ہے، کیونکہ راقم بھی آخری سطور سے مکمل اتفاق رکھتا ہے۔ اور اسی کے مطابق کامل ذہن میں بات یہی راسخ تھی جسے مفتی صاحب کے تبصرہ سے تائید حاصل ہوئی۔

علامہ کاظمی رحمہ اللہ کا محاکمہ: حضرت علامہ احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ نے متقدمین اور متأخرین کے اقوال میں یوں تبصرہ فرمایا؛ متقدمین نے نسخ کو "ازالہ" کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اور انہوں نے کہا ہے کہ کسی چیز کو کسی دوسری چیز سے زائل کردینا نسخ ہے۔ اور "ازالہ" کو انہوں نے عام رکھا کسی آیت کی تلاوت کا ازالہ بھی نسخ ہے اور کسی حکم شرعی کا بدل جانا بھی نسخ ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ کسی حکم شرعی یا آیۃ کے اوصاف میں سے کسی وصف کے جزوی ازالہ کو بھی اپنی اصطلاح میں وہ نسخ ہی کہتے ہیں۔ مثلاً کسی آیۃ کا اس کے متبادر معنی سے غیر متبادر معنی کی طرف مصروف ہوجانا، اسی طرح استثناء نیز تخصیص عام، تقیید مطلق یا کسی قید کے اتفاقی ہونے کا بیان وغیر ذلک۔ جس آیۃ یا حکم شرعی کے کسی وصف میں انہیں ادنیٰ ترین جزوی ازالہ نظر آیا اسی کو انہوں نے نسخ سے تعبیر کردیا۔ اوصاف آیات کے کسی وصف میں اس نوعیت کا ازالہ بکثرت آیات میں پایا جاتا ہے۔ اس لئے ان کے نزدیک آیات منسوخہ کی تعداد پانچ سو بلکہ اس سے بھی زائد تک پہنچ گئی۔

اور متاخرین نے لفظ نسخ کو صرف ابدال یا تبدیل کے معنی میں استعمال کیا اور مذکورہ بالا نوعیت

کے جزوی ازالہ یا جزوی تبدیلی کو انہوں نے نسخ نہیں کہا، چنانچہ متأخرین اور بعض اصولیین کے نزدیک نسخ کے معنی ہیں:

" بیان انتهاء التعبد بقرائتها ......او الحکم المستفاد منها "......او بهما جمیعا "

(از روح المعانی)

یعنی عبادت سمجھ کر کسی آیۃ کے پڑھنے کی مدت ختم ہوجانے کا بیان۔ یا جو حکم اس آیۃ سے مستفاد ہوتا ہے بطور عبادت اس پر عمل کرنے کی مدت ختم ہوجانے کا بیان۔ یا دونوں کی انتہاء مدت کا بیان نسخ ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوگیا کہ آیات منسوخہ کی تعداد میں متقدمین اور متأخرین کا اختلاف ان کی اصطلاح پر مبنی ہے۔ جس کی حیثیت نزاع لفظی سے زیادہ کچھ نہیں " **لکل ان یصطلح بما شاء** " ہر طبقہ کے علماء کو اپنی اصطلاحات کے وضع کرنے کا حق حاصل ہے۔ (از التبان مع التبیان للکاظمی)

نسخ کا علم عظیم ہے:

" قال الائمة لا یجوز لاحد ان یفسر کتاب الله الا بعد ان یعرف منه الناسخ والمنسوخ "

ائمہ کرام نے فرمایا کہ کسی شخص کو قرآن پاک کی تفسیر لکھنے کا حق نہیں پہنچتا جب تک اسے کتاب اللہ میں ناسخ اور منسوخ کا علم نہ ہو۔

حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ نے ایک قاضی سے پوچھا کیا تو ناسخ ومنسوخ کا علم رکھتا ہے؟ اس نے کہا مجھے تو اس کا علم نہیں تو آپ نے فرمایا " **هلکت واهلکت** " تو خود بھی ہلاک ہوگیا اور دوسروں کو بھی تو نے ہلاکت میں ڈال دیا۔ (الاتقان)

نسخ کا علم رکھنا عظیم فائدہ پر مرتب ہے:

" لا یستغنی عن معرفته العلماء ولا ینکره الا الجهلة الاغبیاء "

علماء کرام نسخ کے علم سے مستغنی نہیں ہوسکتے اور نسخ کا انکار صرف جاہل اور کند ذہن لوگ ہی کرتے ہیں۔ کیونکہ قرآن پاک کے نسخ کے علم پر ہی احکام کے علم کی دارومدار ہے۔ اور اسی پر ہی حلالی وحرام کی معرفت کی دارومدار ہے۔

ابو البختری فرماتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک مسجد میں داخل ہوئے، وہاں ایک شخص

لوگوں کو وعظ کر رہا تھا اور خوف دلا رہا تھا۔ آپ نے فرمایا یہ کیا ہو رہا ہے۔ لوگوں نے کہا ایک شخص لوگوں کو وعظ کر رہا ہے آپ نے فرمایا:

" لیس برجل یذکر الناس ، لکنه یقول انا فلان ابن فلان فاعرفونی "

" یہ شخص لوگوں کو وعظ نہیں سنا رہا بلکہ اپنا چرچا کر رہا ہے کہ لوگ مجھے پہچان لیں کہ میں فلاں ابن فلاں ہوں"

پھر آپ نے اسے اپنی طرف بلایا، اور اس سے پوچھا" اتعرف الناسخ من المنسوخ " کیا تم ناسخ ومنسوخ کو جانتے ہو؟ اس نے کہا میں تو نہیں جانتا۔ تو آپ نے فرمایا " فاخرج من مسجدنا ولا تذکر فیه " پھر تو تم ہماری مسجد سے نکل جاؤ اور یہاں آ کر وعظ نہ کیا کرو۔ (از قرطبی)

مطلب واضح ہوا کہ ناسخ ومنسوخ کا علم عظیم علم ہے۔ اسکے بغیر انسان میں اہلیت نہیں پائی جاتی کہ وہ قرآن پاک کی تفسیر کرے یا لوگوں کو وعظ سنائے۔ اسی سے یہ مسئلہ بھی واضح ہو گیا کہ مبلغ بننے کیلئے علم کا ہونا ضروری ہے بغیر علم کے تبلیغ کرنے سے کسی کو نقصان تو پہنچایا جا سکتا ہے، نفع نہیں پہنچایا جا سکتا۔

نسخ کی حقیقت کو سمجھیں:.......... نسخ کا اصطلاح شرع میں معنی یہ ہے:

" رفع التابید المستفاد من اطلاقها ولذا عرفه بعضهم برفع الحکم الشرعی فهو بیان بالنسبة الی الشارع ورفع بالنسبة الینا "

بظاہر جو حکم سمجھ آ رہا تھا کہ یہ ہمیشہ کے لئے رہے گا، کیونکہ اس میں ظاہری طور پر کوئی قید نہیں تھی کہ یہ حکم فلاں وقت اٹھا لیا جائے، اس حکم کو اٹھا لینا نسخ ہے۔ لیکن شارع (رب تعالیٰ جو شریعت کا حکم دینے والا ہے) کے نزدیک پہلے سے ہی اس حکم کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے کہ فلاں وقت اس حکم کو اٹھا لیا جائے گا، اگرچہ بظاہر اس کا ذکر نہیں ہوتا۔ جب وہ وقت آتا ہے تو اس حکم کو اٹھا لیا جاتا ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ یہ حکم اٹھا لیا گیا ہے۔ یعنی نسخ جب ہماری طرف منسوب ہوگا ہم کہیں گے کہ یہ حکم منسوخ ہو گیا، تو ہماری طرف منسوب ہونے کے لحاظ پر مطلب یہ ہوگا کہ یہ حکم اٹھا لیا گیا ہے۔ اور رب تعالیٰ کی طرف جب منسوب ہوگا تو مطلب یہ ہوگا کہ اس حکم کی مدت ختم ہو چکی ہے جس مدت کے لئے اسے نافذ کیا گیا تھا۔

(از روح المعانی)

نسخ حکمت باری تعالیٰ کا ایک کرشمہ ہے:

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی مصلحتوں کو جانتا ہے کہ کون سا حکم کس وقت تک مفید ہے اور کون سا حکم کس وقت نافذ کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم اپنی ظاہری زندگی میں اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ حکیم اور ڈاکٹر حضرات مریض کی مرض کے مطابق دوا بدلتے رہتے ہیں اور ان کو مختلف اوقات میں مختلف غذائیں کھانے کے لئے مشورہ دیتے ہیں۔ جب اطباء حضرات کا دواؤں اور غذاؤں کو مریضوں کی حالت کے مطابق تبدیل کرتے رہنا حکمت کا تقاضا ہے تو یقیناً رب تعالیٰ جو قادر مطلق ہے اور حکیم مطلق ہے اس کے احکام بھی بندوں کی مصلحتوں کے مطابق ہوتے ہیں۔ حکمت کا یہی تقاضا ہے کہ ایک ضرورت تک ایک حکم نافذ کیا جائے پھر دوسرا۔

خصوصاً عرب لوگ جو کفر و شرک اور عیاشی اور گناہوں میں سرتاپا مبتلاء تھے ان کو راہ راست پر لانا اور ان سے بری رسموں کا چھڑانا یہ تقاضا کرتا تھا کہ ان کو آہستہ آہستہ، تدریجاً تدریجاً سیدھی راہ پر لایا جائے اسی حکمت کے پیش نظر رب تعالیٰ نے احکام کی مدت کی حدود مقرر فرمائیں۔ ان حدود کے آنے پر وہ احکام ختم فرما کر دوسرے احکام نافذ فرمائے۔ جن کو ہم نے سمجھا کہ یہ حکم اٹھا لیا گیا ہے۔

(از بیضاوی و روح المعانی)

قرآن پاک میں کوئی اختلاف نہیں:

یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ قرآن مجید میں کوئی اختلاف نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴾

''یعنی اگر قرآن مجید غیر اللہ کا کلام ہوتا لوگ اس میں بہت اختلاف پاتے''

یعنی نظم کلام میں بہت تفاوت ہوتا۔ مضامین بھی متناقض (ایک دوسرے سے مختلف) ہوتے۔

کثرت الفاظ اور کثرت معانی کے لحاظ سے "اختلافا کثیرا" فرمایا گیا۔ جب کہ قرآن پاک کے نظم کلام اور اس کے معانی و مضامین میں ایک بھی اختلاف موجود نہیں جو صداقت قرآن کی روشن دلیل ہے۔ اگر کسی نے قرآن میں کہیں اختلاف سمجھا تو یہ اس کے اپنے فہم کی غلطی ہے۔ اللہ تعالیٰ

کا کلام تعارض، تناقض اور اختلاف سے پاک ہے۔ قرآن پاک میں نسخ ضرور پایا گیا۔ مگر اختلاف اور تناقض سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ مظہری میں ہے:

" واما الناسخ والمنسوخ فلیس من باب الاختلاف " (مظہری پ ۵ ج ۲ ص ۱۷۰)

یہود اور مشرکین نے بعض احکام شرع کے منسوخ ہونے پر مذاق اڑایا تھا۔ اور آج تک بعض ملحدین بھی یہ اعتراض کرتے ہیں کہ کسی حکم شرعی کے منسوخ ہونے کا قول اس لئے صحیح نہیں کہ اس سے لازم آتا ہے کہ شارع نے جو حکم پہلے دیا تھا وہ قابل عمل نہ تھا جسے منسوخ کرنا پڑا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ نسخ کا قول کسی حکم شرعی کے ناقص ہونے کو ہرگز مستلزم نہیں، نہ اس سے شارع کی لاعلمی ثابت ہوتی ہے۔ نسخ کے معنی پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ اہل حق جن احکامِ شرع کو منسوخ مانتے ہیں وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ احکام منسوخہ ایک وقت خاص تک عمل کرنے کے لئے نازل ہوئے تھے۔ جب وہ مدت پوری ہوگئی تو شارع نے اس مدت عمل کی انتہاء اور اختتام کو بیان کر دیا۔ یہی نسخ ہے اور اس سے کسی حکم کا ناقص ہونا یا شارع کا لاعلم ہونا ثابت نہیں ہوتا، بلکہ اس سے شارع کے کمالِ علم وحکمت کا اثبات ہوتا ہے۔

(از التبیان للکاظمی)

نسخ کی بحیثیت حکم وتلاوت تین قسمیں:

(۱) " نسخ الحکم دون التلاوۃ " حکم منسوخ ہو جائے، تلاوت منسوخ نہ ہو، قرآن پاک میں یہی نسخ زیادہ مشہور ہے۔ اس صورت میں جو آیۃ منسوخ ہوگی وہ قرآن پاک میں موجود ہوگی۔ اور جو ناسخ ہوگی وہ بھی قرآن پاک میں موجود ہوگی۔ دونوں کی تلاوت ہوگی۔ فرق یہ ہوگا کہ منسوخ آیۃ کا حکم جاری نہیں ہوگا۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ﴾

" اور جو تم میں مریں اور بیبیاں چھوڑ جائیں وہ اپنی عورتوں کے لئے وصیت کر جائیں سال بھر تک نان نفقہ دینے کی بے نکالے "

اس آیت کریمہ میں یہ حکم تھا کہ جن عورتوں کے خاوند فوت ہو جائیں ان کی عدت ایک سال ہے۔اوران کو ایک سال تک نان نفقہ دیا جائے اور ایک سال تک ان کو گھر میں رہنے دیا جائے ان کو نکالا نہ جائے۔لیکن اس حکم کی انتہاء کا وقت جب آ گیا، تو دوسرا حکم نافذ فرما کر اسے منسوخ کر دیا۔رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ﴾

''اور تم میں جو مریں اور بیبیاں چھوڑیں وہ چار مہینے دس دن اپنے آپ کو روکے رکھیں''

یعنی جن عورتوں کے خاوند فوت ہو جائیں ان کی عدت ایک سال کو منسوخ کر کے چار مہینے دس دن کر دی گئی تا قیامت اب یہی جاری رہے گی۔

یہ دونوں آیتیں قرآن پاک میں پڑھی جا رہی ہیں۔لیکن جس آیۃ کو پہلے ذکر کیا ہے اس کا حکم منسوخ ہے۔

(۲) "نسخ التلاوة دون الحكم" تلاوت منسوخ ہو جائے، حکم باقی رہے، جیسا کہ آیۃ رجم:

"عن ابن عباس قال عمر بن الخطاب وهو جالس على منبر رسول الله ﷺ ان الله بعث محمدا ﷺ بالحق وانزل عليه الكتاب فكان مما انزل الله آية الرجم قرأناها ووعينا وعقلناها فرجم رسول الله ﷺ ورجمنا بعده فاخشى ان طال بالناس زمان ان يقول قائل ما نجد الرجم في كتاب الله تعالىٰ فيضلوا بترك فريضة انزلها الله وان الرجم في كتاب الله حق ......الخ" (مسلم ج ثانی باب حد الزنا)

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں حضرت عمر بن خطاب ﷺ نے منبر رسول اللہ ﷺ پر بیٹھ کر ارشاد فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو حق سے مبعوث فرمایا اور آپ پر کتاب کو نازل فرمایا، اور اللہ تعالیٰ نے آپ پر آیۃ رجم (زانی کو سنگسار کرنا) کو نازل فرمایا، ہم نے اسے پڑھا، اور یاد کیا اور سمجھا۔رسول اللہ ﷺ نے رجم کرنے کا حکم نافذ فرمایا۔ہم نے آپ کے بعد رجم کا حکم جاری رکھا۔مجھے ڈر ہے کہ کچھ وقت جب گزر جائے گا تو کہنے والا کہے گا کہ ہم رجم کا ذکر اللہ کی کتاب (قرآن پاک) میں نہیں پاتے۔اللہ تعالیٰ نے جس آیۃ کو نازل کر کے ایک حکم کو فرض کیا اسے چھوڑنے کی

وجہ سے وہ گمراہ ہو جائیں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔ حالانکہ رجم کا حکم
کتاب اللہ میں حق طور پر ثابت ہے۔

آیۃ رجم " الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما البتۃ " تلاوت کے لحاظ پر منسوخ ہے۔ لیکن اس کا حکم باقی ہے۔ (سنگسار کرنے کے حکم کو توڑنے والے گمراہ ہیں۔)

" ھذا الذی خشیۃ قد وقع من الخوارج ومن وافقھم وھذا من کرامات عمر ویحتمل من ذلک من جھۃ النبی ﷺ " (نووی)

حضرت عمر کا یہ فرمانا کہ کچھ وقت گزرنے پر لوگ انکار کریں گے۔ خارجیوں نے اور ان کے یاروں نے اس کا انکار کیا۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کرامت ہے جو واقع ہو چکی ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نبی کریم ﷺ سے پتہ چلا ہو۔ تو اس صورت میں نبی کریم ﷺ کا علم غیب ثابت ہوگا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کرامت اور کمال ثابت ہوگا۔

خیال رہے کہ ہمارے ملک پاکستان میں بھی یہود ونصاریٰ کے آلہ کار سرکاری اہم عہدوں پر قائم رہنے والے پڑھے لکھے بے وقوفوں نے ضیاء الحق کے دور حکومت میں رجم کا انکار کیا جس کا کیس عدالت میں چلتا رہا۔ سبحان اللہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول جگمگا رہا ہے۔ گمراہ لوگ آیۃ رجم کا انکار کر کے یہود ونصاریٰ کو خوش کر کے ان سے ڈالر بٹور رہے ہیں۔

(۳) " نسخ الحکم والتلاوۃ معا " حکم اور تلاوت دونوں کا منسوخ ہو جانا۔ جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

" کان فیما انزل من القرآن عشر رضعات معلومات یحرمن، ثم نسخن بخمس معلومات " (رواہ مسلم)

"کہ قرآن پاک میں نازل کیا گیا کہ دس مرتبہ کسی عورت کا دودھ پینے سے رضاعت ثابت ہوگی، جس سے حرمت ثابت ہوگی۔ پھر پانچ مرتبہ دودھ پینے کا حکم نازل کر کے دس مرتبہ والا حکم منسوخ کر دیا گیا"

یہاں یہ خیال رہے کہ دونوں آیتیں دس دفعہ دودھ پینے والی اور پانچ مرتبہ دودھ پینے والی منسوخ ہیں اور دونوں ہی حکم اور تلاوت کے لحاظ پر منسوخ ہیں۔ کیونکہ پانچ مرتبہ والی آیۃ ﴿وَاُمَّھٰتُکُمُ

الّتِیْ اَرْضَعْنَکُمْ وَاَخَوَاتُکُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ ﴾ سے منسوخ ہے۔اس میں حکم مطلق ہے۔لہٰذا اب قلیل دودھ پینے سے یا کثیر پینے سے ہر حالت میں رضاعت ثابت ہوجائے گی۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

نسخ بحیثیت ناسخ کے چار قسم ہے:

(۱) نسخ الکتاب بالکتاب..... قرآن پاک کی آیت کو قرآن پاک کی آیت سے منسوخ کیا گیا۔قرآن پاک میں یہی نسخ باقی قسموں سے زیادہ پایا گیا ہے۔پہلے دو آیتوں کا ذکر کیا گیا کہ جس میں فوت شدہ آدمی کی عورت کی عدت ایک سال وہ منسوخ ہے چار ماہ دس دن والی آیت سے۔اس میں قرآن پاک کی آیۃ کو قرآن پاک کی آیۃ سے ہی منسوخ کیا گیا۔

اسی طرح قتال (جہاد) میں پہلے ایک مسلمان کو دس کافروں کے مقابل قائم رہنے کا حکم تھا، پھر اس میں تخفیف کر کے ایک کو دو کے مقابل قائم رہنے کا حکم دیا گیا۔لہٰذا پہلا حکم ﴿ اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ ﴾ اگر تم میں سے بیس صبر کرنے والے ہوں گے دوسو پر غالب ہوں گے۔منسوخ کر دیا گیا۔یعنی اس میں تخفیف کر کے یہ حکم نافذ فرمایا﴿ فَاِنْ یَّکُنْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ یَّغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ ﴾ اگر تم میں سے ایک سو صبر کرنے والے ہوئے، تو دوسو پر غالب آئیں گے۔

اس طرح الاتقان میں کئی آیات کو ذکر کیا گیا ہے، جو قرآن پاک کی دوسری آیات سے منسوخ ہیں۔

(۲) "نسخ الکتاب بالسنة" قرآن پاک کی کسی آیت کو حدیث پاک سے منسوخ کیا جائے۔جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿ لا یحل لک النساء من بعد ﴾ نبی کریم ﷺ کی زوجیت میں جب بیک وقت نو ازواج مطہرات تھیں تو حکم ہوا کہ اس کے بعد (یعنی نو ازواج کے بعد) آپ کے لئے عورتیں حلال نہیں۔

اس آیۃ کو حدیث پاک سے منسوخ کیا گیا ہے وہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

"ان النبی ﷺ اخبرھا بان اللہ تعالیٰ اباح لہ من النساء ما شاء"

"بیشک نبی کریم ﷺ نے انہیں خبر دی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے جائز کر دیا کہ آپ جتنی عورتوں سے نکاح کرنا چاہیں کر سکتے ہیں"

خیال رہے کہ آپ کے لئے نکاح کرنے کی حد کو اٹھا دیا گیا تھا لیکن پھر بھی آپ نے بیک وقت نو عورتوں سے زائد کے ساتھ نکاح نہیں کیا۔

اعتراض: یہ حدیث خبر واحد ہے۔ خبر واحد سے قرآن پاک کی آیۃ کو منسوخ نہیں کیا جا سکتا۔ تو یہ مثال کیسے صحیح ہے؟

جواب: احادیث کی یہ اقسام ہمارے لحاظ سے ہیں۔ صحابہ کرام کے لحاظ سے نہیں۔

" فان هذا الخبر عنده ليس خبر الواحد بل هو سمع من فی رسول الله ﷺ"

''جس صحابی نے یہ روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کی انہوں نے خود بھی نبی کریم ﷺ کے منہ مبارک سے سنی اس لئے ان کے حق میں یہ خبر واحد نہیں''

(۳) **نسخ السنة بالکتاب**...... حدیث پاک منسوخ ہو قرآن پاک کے ذریعے۔ جیسا کہ بیت المقدس کا قبلہ ہونا حدیث پاک سے ثابت ہے۔ لیکن اس کا منسوخ ہونا قرآن پاک کی آیت ﴿ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴾ (مسجد حرام کی طرف اپنے چہرہ کو پھیر لیں) سے ثابت ہے۔

(۴) نسخ السنة بالسنة...... حدیث پاک منسوخ ہو حدیث پاک کے ذریعے۔ جیسا کہ ابن ماجہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی:

" قال رسول الله ﷺ كنت نهيتكم عن زيارة القبور فزوروها فانها تزهد فی الدنيا وتذكر الآخرة "

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا، (اب) تم قبروں کی زیارت کرو کیونکہ اس سے دنیا میں زہد حاصل ہوتا، اور آخرت کی یاد آتی ہے۔''

واضح ہوا کہ قبروں کی زیارت کی ممانعت والی حدیث منسوخ ہوگئی اور اجازت والی ناسخ ہوگی۔

(ماخوذ از الاتقان و نور الانوار مع قمر الاقمار)

وضاحت حدیث: نبی کریم ﷺ نے پہلے قبروں کی زیارت سے منع فرمایا تھا، کیونکہ زمانہ جاہلیت قریب تھا، لوگ بت پرستی کے عادی تھے، اس لئے منع کیا تا کہ لوگ قبر والوں کو معبود نہ سمجھ لیں، جب صحابہ کرام کے دلوں میں اسلام اور اسلامی طور طریقے راسخ ہو گئے تو آپ نے اجازت فرما دی۔

فائدہ : مرقاۃ شرح مشکوۃ باب زیارۃ القبور میں ہے:

" اذا تحیرتم فی الامور فاستعینوا باھل القبور "

"جب تمھیں کچھ معاملات میں حیرانی و پریشانی ہوتو قبر والوں سے امداد طلب کرو"

اسی طرح قبروں کی زیارت سے انسان کو آخرت کی یاد حاصل ہوتی ہے۔ وہ اس کی تیاری کرتا ہے، برائیوں کو چھوڑ دیتا ہے اور نیکیاں کرتا ہے، وہ کتنے بے نصیب ہیں جو قبرستان میں بھی فحش مزاح سے باز نہیں آتے۔

تنبیہ : عورتوں کے لئے بھی قبروں کی زیارت کرنا جائز ہے۔ عام طور پر ایک حدیث پاک بطور دلیل پیش کی جاتی ہے کہ عورتوں کی قبروں کی زیارت کرنے پر لعنت ہے۔ لیکن حدیث پاک کی مکمل وضاحت نہیں کی جاتی، جو خود محدثین کرام نے بیان کی ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

" لعن زوارات القبور " قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت ہے

(مسند احمد ، ترمذی ، ابن ماجہ ، مشکوۃ باب زیارۃ القبور)

ترمذی نے اس حدیث پاک کو حسن صحیح کہا ہے ، اور خود ہی حدیث پاک کی وضاحت ان الفاظ سے کی ہے۔

" قد رأی بعض اھل العلم ان ھذا کان قبل ان یرخص النبی ﷺ فی زیارۃ القبور فلما رخص دخل فی رخصتہ الرجال والنساء وقال بعضھم انما کرہ زیارۃ القبور للنساء لقلۃ صبرھن ولشدۃ جزعھن " (مشکوۃ باب زیارۃ القبور)

امام ترمذی نے کہا کہ بعض اہل علم نے کہا ہے کہ اس حدیث پاک کے متعلق وضاحت یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قبروں کی جو رخصت فرمائی ہے، یہ حدیث اس سے پہلے کی ہے۔ کیونکہ پہلے مردوں کو منع کیا گیا تھا اور عورتوں کو بھی منع کیا گیا تھا۔ جب اجازت فرمائی تو مردوں اور عورتوں تمام کے لئے ہی اجازت فرمائی۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اگر عورتیں صبر نہ کریں اور قبروں پر جا کر زور زور سے رونا، پیٹنا، جزع وفزع کرنا شروع کر دیں تو ایسی حالت میں ان کا قبروں پر جانا منع ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا کا قبروں کی زیارت کرنا ان کی زبان سے ہی سنیے۔ آپ فرماتی ہیں۔

"کنت ادخل بیتی الذی فیه رسول الله ﷺ وانی واضع وجهی واقول انما هو زوجی وابی فلما دفن عمر معهم فوالله ما دخلته الا وانا مشدودة علی ثیابی حیاء من عمر" (مسند احمد، مشکوۃ باب زیارۃ القبور)

"میں اس حجرہ میں داخل ہوتی جس میں رسول اللہ ﷺ مدفون ہیں تو میں پردے کا زیادہ اہتمام نہ کرتی، کیونکہ میرے خیال میں آتا کہ ایک میرے خاوند ہیں اور دوسرے میرے باپ (ابوبکر صدیق) ہیں۔لیکن جب حضرت عمر بھی اسی حجرہ میں ان کے ساتھ دفن ہو گئے تو میں نے حضرت عمر سے حیاء کرتے ہوئے پہلے سے زیادہ پردہ کا اہتمام شروع کر دیا"

اس حدیث پاک کی شرح بیان کرتے ہوئے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"قولها حیاء من عمر اوضح دلیل علی حیوۃ المیت وعلی انه ینبغی احترام المیت عند زیارته مهما امکن لاسیما الصالحون بان یکون فی غایته الحیاء والتأدب بظاهره وباطنه فان للصالحین مددا ظاهرا بالغا لزوارهم بحسب ادبهم ونیتهم وقبولهم" (لمعات حاشیہ مشکوۃ)

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا کا ارشاد "حیاء من عمر" میت کی حیات پر بڑی واضح دلیل ہے، اور یہ ثابت ہو رہا ہے کہ قبر کی زیارت کے وقت جتنا ممکن ہو سکے صاحب قبر کا اہتمام کیا جائے خصوصاً نیک لوگوں کی قبروں پر جا کر نہایت حیاء کرتے ہوئے ظاہری اور باطنی ادب کا پاس کرے، کیونکہ زیارت کرنے والے جتنا زیادہ ادب کریں گے اور خالص نیت رکھیں گے اور نیک لوگوں کی امداد کو قبول کریں گے اتنی ہی زیادہ ان کی طرف سے ان لوگوں کو کامل امداد حاصل ہوگی"۔

اسی حدیث کی وضاحت میں استاذی المکرم حضرت علامہ مولانا محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی نے جلاء الصدور میں ایک سوال وجواب ذکر فرمایا۔ جو بہت ہی زیادہ مفید ہے۔اور نبی کریم ﷺ کے حاضر وناظر ہونے پر بھی عام حلقوں کی جانب سے یہ ہی سوال کیا جاتا ہے۔ جواب سے انشاء اللہ مزاج میں انصاف رکھنے والوں کو اطمینان قلب حاصل ہوگا۔

سوال: جن کی نگاہ کئی من مٹی کے اندر سے باہر دیکھ سکتی ہے، کیا وہ حجاب وستر کے اندر نہیں

دیکھ سکتی، پھر اس اہتمام کا مقصد کیا ہوگا (یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عمر ﷺ کے دفن کے بعد پردے کا جو اہتمام کیا اس خیال سے کہ وہ مجھے قبر کے اندر سے مٹی کے ڈھیر کے نیچے سے بھی دیکھ رہے ہیں۔ جو اتنی نظر رکھتا ہو اس کی نگاہ میں کپڑے کے پردے کی کیا حیثیت ہوگی)؟

جواب: جتنی قدر بندے کی طاقت میں ہے اس قدر پر اہتمام وانتظام بھی لازم ہے۔ اور شیخ نے " مهما امكن " (جتنا ممکن ہو) سے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ مثلاً خلوت اور تنہائی میں بھی بندہ پر لازم ہے کہ وہ اپنی شرمگاہ کو ڈھانپے۔ انسانوں وغیرہ سے نہ سہی، اللہ رب العزت سے حیاء کرتے ہوئے اس پر ستر (پردہ) لازم ہے۔ لہٰذا جو جواب اللہ علیم وخبیر کی نسبت سے یہاں دیا جائے گا وہی جواب اہل قبور کی طرف سے بھی سمجھ لیا جائے۔ حدیث پاک ملاحظہ ہو۔

" وعن يعلى قال ان رسول الله ﷺ رأى رجلا يغتسل بالبراز فصعد المنبر فحمد الله واثنى عليه ثم قال ان الله حيى ستير يحب الحياء والتستر فاذا اغتسل احدكم فليستتر " (رواه ابوداؤ و نسائی)

'' حضرت یعلی ﷺ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو کھلی جگہ میں بغیر پردہ کے غسل کرتے دیکھا تو آپ منبر پر جلوہ افروز ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا '' بیشک اللہ تعالیٰ شرمیلا، پردہ پوش، حیاء اور پردہ کو پسند کرنے والا ہے۔ لہٰذا تم میں سے کوئی شخص جب بھی غسل کرے تو ستر اور پردہ کے اندر کرے''

ملا علی قاری حنفی نے ابن حجر رحمہما اللہ سے نقل کرتے ہوئے فرمایا:

" من ثم قال ائمتنا يحرم كشف العورة فى الخلوة بغير الحاجة لان فيه ترك الحياء من الله تعالىٰ"

'' اسی وجہ سے ہمارے ائمہ کرام نے فرمایا کہ تنہائی اور علیحدگی میں بھی بلاوجہ ستر وحجاب کا ترک حرام ہے۔ کیونکہ اس میں بارگاہ خداوندی کے لائق شرم وحیاء کو ترک کرنا لازم آتا ہے''

ائمہ کرام کے اس قول پر سوال وارد ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ ظاہر اور چھپی ہوئی ہر چیز کو جانتا ہے تو اس سے پردہ کرنا اور لباس پہن کر ہی نماز ادا کرنا خلوت میں کیوں ضروری، اس کا مقصد کیا ہے؟

اس کا جواب یوں دیا گیا:

" ورده بانه تعالىٰ وانه احاطه علمه بهما الا انه يرى المستور على

حالة تقتضی الادب وشتان ما بینهما " (مرقاۃ المفاتیح)

ائمہ کرام نے اس سوال کو یوں رد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا علم اگر چہ مستور و غیر مستور دونوں کو محیط ہے لیکن شرم وحیاء والے مستور کو ایسی حالت میں دیکھتا ہے جس کا ادب تقاضا کرتا ہے بخلاف غیر مستور کے اور دونوں کے دیکھنے میں بڑا فرق ہے۔

لہٰذا جس طرح علم باری تعالیٰ کے محیط ہونے کے باوجود ستر کا حکم دیا گیا ہے اور شرم وحیاء والی حالت کو اختیار کرنا لازم کیا گیا ہے۔ اسی طرح ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ نے بھی ادب اور شرم وحیاء والی ہیئت کو اختیار فرمایا اور جس طرح اللہ تعالیٰ مستور کے ساتھ تقاضاء ادب کے مطابق سلوک فرماتا ہے، یہی حالت اہل قبور کو بھی سمجھنی چاہئے۔

نیز اللہ تعالیٰ اپنی حیاء (جو اس کی شان کے لائق ہے) کے مطابق کسی کے مخفی اندام کی طرف توجہ نہ فرمائے باوجود " علیم وخبیر وبصیر " ہونے کے اور اسی طرح اپنے مقبول بندے انبیاء کرام، اولیاء عظام کو علم اور نظر عطا فرمانے کے باوجود ان کی توجہ کو اس جانب سے ہٹا لے تو کوئی بعید نہیں۔

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں " انی اراکم من خلفی کما اراکم من بین یدی " (اپنی صفوں کو درست کر کے ایک دوسرے سے مل کر کھڑے ہوا کرو) میں تمہیں پیٹھ کے پیچھے سے اسی طرح دیکھتا ہوں، جس طرح سامنے سے دیکھتا ہوں۔ جب نبی کریم ﷺ پر سامنے اور پیچھے کے حالات ایک جیسے ظاہر ہیں تو یقیناً آپ پر کوئی چیز مخفی تو نہیں، لیکن پھر بھی ادب کا تقاضا یہی ہے کہ لباس پہن کر نماز ادا کی جائے، انسان اپنی طرف سے جتنا ممکن ہو پردہ رکھے۔ اور اسی طرح نبی کریم ﷺ علم و بصارت کے باوجود کسی طرف توجہ نہ فرمائیں جو آپ کی شان کے لائق نہیں تو کوئی بعید نہیں۔ (انتھی)

نسخ الکتاب بالسنۃ میں امام شافعی رحمہ اللہ کا موقف:

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، قرآن پاک کی کسی آیۃ کو منسوخ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنے اس موقف کو دلائل سے پیش کرتے ہیں۔ ان کے دلائل اور جوابات پر نظر کریں۔

امام شافعی رحمہ اللہ کی ایک دلیل یہ ہے کہ رب تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے ﴿ نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا ﴾

ہم اس سے بہتر یا اس کی مثل لے آتے ہیں۔یعنی جو آیۃ منسوخ ہو ناسخ اس سے بہتر ہو، یا اس کی مثل ہو۔
حدیث پاک کو ناسخ نہیں مانا جا سکتا کیونکہ حدیث میں الفاظ نبی کریم ﷺ کے ہوتے ہیں۔

اسی طرح بعض لوگوں کا موقف یہ ہے کہ ناسخ میں آسانی ہو، مشکل نہ ہو، اگر نسخ آسان کی مشکل کے ذریعے ہو جائے تو ناسخ منسوخ سے خیر یا مثل نہیں ہوگا۔

امام شافعی رحمہ اللہ کی پہلی دلیل اور تیسرے درجہ میں بعض لوگوں کا موقف جو بیان کیا ہے کہ ناسخ مشکل نہ ہو منسوخ سے۔ان کا جواب یہ ہے کہ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ناسخ منسوخ سے مشکل نہیں ہو سکتا، کیونکہ احکام کی مشروعیت اور آیات کا نزول بندوں کی مصلحت اور ان کے نفوس کی تکمیل کے لئے ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت پر مبنی ہے۔یہ مصلحت زمانے کے اختلاف سے مختلف ہوگی۔اور بعض لوگوں کے مطابق ایک چیز بہتر ہوتی ہے، اور بعض کے لحاظ پر دوسری چیز بہتر ہوتی ہے۔

جس طرح معالج ایک دواء ایک شخص کے لئے تجویز کرتا ہے اسے وہ نفع دیتی ہے، لیکن دوسرے شخص کو وہی دواء اسی بیماری کے لئے نفع نہیں دیتی کیونکہ مزاج مختلف ہیں۔

اسی طرح کبھی دوسری دواء پہلی سے زیادہ کڑوی ہوگی اور پہلی سے زیادہ مہنگی ہوگی، لیکن مفید زیادہ ہوگی۔اسی سے یہ واضح ہوا:

" قد یکون الاثقل اصلح فی انتظام المعاش وانظم فی اصلاح المعاد واللہ تعالیٰ لطیف حکیم "

کہ کبھی مشکل کام دنیا کی زندگی کی گزران کے انتظام کے لئے زیادہ مفید ہوتا ہے۔اور اخروی زندگی کی بہتری کے لئے بھی مشکل کام ہی کبھی زیادہ نفع مند ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ لطیف وحکیم ہے، وہ اپنے بندوں کی مصلحتوں کو جانتا ہے۔ان مصلحتوں کے مطابق ہی حکم نافذ فرماتا ہے۔اسی بحث سے امام شافعی رحمہ اللہ کی پہلی دلیل کا جواب بھی آ گیا کہ بہتر ہونا ظاہری طور پر مراد نہیں۔بلکہ بہتر ہونے یا مثل ہونے سے مراد نفع دینے میں بہتر ہو یا مثل ہو۔حدیث پاک سے اگر آیۃ کو منسوخ کر دیا گیا ہوگا تو وہ بھی نفع میں بہتر یا مثل ہوگا۔

البتہ یہ کہنا کہ قرآن پاک تو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے قدیم ہے۔حدیث پاک حادث ہے۔

قرآن پاک کی نماز میں تلاوت ہوتی ہے۔اور حدیث پاک کی نہیں ہوتی۔قرآن پاک کو جبرائیل نے رب تعالیٰ کی طرف سے وحی کی صورت میں پیش کیا، حدیث پاک کو یہ حیثیت حاصل نہیں، لہٰذا حدیث قرآن پاک کے نہ مثل ہے اور نہ بہتر ہے۔تو اس کا جواب یہ ہے:

" ولیس المراد بالخیریة والمماثلة فی اللفظ حتی لا تکون السنة کذلک بل فی النفع والثواب فیجوز ان یکون ما اشتملت علیه السنة خیرا فی ذلک "

کہ بہتر ہونے یا مثل ہونے سے مراد لفظ میں بہتری یا مثلیت مراد نہیں کہ حدیث پاک کے الفاظ سے بہتر اور مثل نہیں، بلکہ بہتر یا مثل ہونے کا مقصد نفع اور ثواب میں بہتر یا مثل ہونا ہے۔اس لحاظ پر حدیث پاک میں حکم زیادہ نفع مند یا اس جیسا ہوسکتا ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کی دوسری دلیل کہ رب تعالیٰ نے " نأت " کو اپنی طرف منسوب کیا کہ ہم اس سے بہتر یا اس کی مثل لاتے ہیں حدیث پاک تو نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب ہے۔

اس کا جواب بھی پہلے جواب سے ہی سمجھ آ گیا کہ نسخ میں الفاظ مراد ہی نہیں بلکہ مضمون مراد ہے۔مضمون نبی کریم ﷺ کی احادیث مبارکہ میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی اس میں بہت واضح ہے:

﴿ وَمَا یَنطِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ﴾

"نبی کریم ﷺ اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں کرتے بلکہ وہی کرتے ہیں جو آپ کی طرف وحی کی جاتی ہے"

اس سے واضح ہوا کہ احادیث مبارکہ کے مضامین رب تعالیٰ کی طرف ہی منسوب ہیں، اگرچہ الفاظ نبی کریم ﷺ کے ہوتے ہیں۔لیکن الفاظ جب مقصود ہی نہیں تو حدیث پاک کو ناسخ ماننا " نأت " کے منافی نہیں۔ (ماخوذ از روح المعانی)

اَوْ نُنْسِهَا: اس میں مشہور قراءت نون کے ضمہ اور سین کے کسرہ سے ہے۔جس کا ماخذ انساء یا نسیان ہے۔جس کا معنی ہے بھلانا، یعنی ہم ان آیات کو لوگوں کے دلوں سے ہی بھلا دیتے ہیں۔کہ وہ ان کے پڑھنے پر قادر ہی نہیں رہتے۔جیسا کہ حدیث پاک سے یہ مضمون زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔

ابن شہاب کہتے ہیں مجھے ابوامامہ بن سہل بن حنیف نے سعید بن میسیب (رضی اللہ عنہ) کی مجلس میں حدیث بیان کی:

" ان رجلا قام من الليل ليقرأ سورة من القرآن فلم يقدر على شئ منها وقام آخر فلم يقدر على شئ منها ، وقام آخر فلم يقدر على شئ منها، فغدوا على رسول الله ﷺ فقال احدهم قمت الليلة يا رسول الله لأقرأ سورة من القرآن فلم اقدر على شئ منها فقام الآخر فقال وانا والله كذلك يا رسول الله ، فقام الآخر فقال وانا والله كذلك يا رسول الله فقال رسول الله ﷺ انها مما نسخ الله البارحة " (قرطبی وهكذا فی ابن کثیر)

ایک شخص نے رات کو کھڑے ہوئے ایک سورۃ پڑھنی چاہی وہ اس کے پڑھنے پر قادر نہ ہو سکے، دوسرے صحابی سے بھی یہی صورت درپیش آئی اور تیسرے سے بھی ایسا ہی ہوا۔ صبح نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص نے عرض کیا یارسول اللہ آج رات کو میں فلاں سورۃ پڑھنا چاہتا تھا لیکن نہ پڑھ سکا۔ مجھے اس کے پڑھنے کی قدرت ہی حاصل نہ ہو سکی۔ ایک اور صحابی نے عرض کیا یارسول اللہ قسم ہے اللہ کی میرے ساتھ بھی یہی صورت درپیش آئی۔ اور ایک تیسرے شخص نے کہا اللہ کی قسم یارسول اللہ مجھے بھی اسی کیفیت کا سامنا کرنا پڑا۔ حضور نے فرمایا وہ سورۃ گزشتہ رات منسوخ ہوگئی۔

اور ایک قراءت میں " ننسأها " نون اور سین کے فتح اور اس کے بعد ہمزہ سے پڑھا ہے۔ جس کا معنی ہے تاخیر کرنا اب معنی یہ ہوگا کہ ہم اسے لوح محفوظ میں یا ملائکہ کے پاس ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ اسے کچھ دیر سے نازل کرتے ہیں۔ اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ ہم کسی آیۃ کو مجمل ذکر کرتے ہیں۔ جب ضرورت درپیش آتی ہے تو ہم اسے بیان کر دیتے ہیں " ثم ان علينا بيانه " اسی مفہوم کو واضح کر رہا ہے۔

" اوننسأها اى نؤخر انزالها الى وقت ثان فنأت بدلا منها فى الوقت المتقدم ما يقوم مقامها "

یعنی " ننسأها " کی قراءت میں معنی یہ ہوگا کہ کسی آیت کا نزول ہم کچھ وقت تک مؤخر کر دیتے ہیں۔ پھر اس پہلے وقت کے بدل دوسرے وقت میں ہم اسے لے آتے ہیں...... (از شیخ زادہ)

نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا:

ہم لے آتے ہیں اس سے بہتر یا اس کی مثل اس کا مطلب یہ ہے:

" بما هو خير للعباد في النفع والثواب او مثلها في الثواب "

کہ ہم منسوخ آیت کے بدل وہ ناسخ لے آتے ہیں جو بندوں کے نفع اور ثواب میں ان کے لئے بہتر ہو یا ثواب میں اس کی مثل ہو۔

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ کی اس تفسیر سے ایک اور مسئلہ واضح ہوگیا کہ آیات کی فضیلت بعض کی بعض پر بحسب الذات اور بحسب الالفاظ نہیں، کیونکہ تمام آیات اللہ تعالیٰ کا کلام ہیں:

" فلا يتفاضل بعضها على بعض في انفسها من حيث انها كلام الله ووحيه وكتابه بل التفاضل فيها انما هو بحسب ما يحصل منها للعباد في الآخرة او في الدنيا او فيهما "

اور اللہ تعالیٰ کے کلام میں بعض آیات بعض سے افضل بحیثیت اللہ کا کلام ہونے کے، بحیثیت وحی کے اور بحیثیت کتاب اللہ ہونے کے تو نہیں ہوسکتیں۔ البتہ بندوں کے لئے آخرت میں نفع مند ہونے کے لحاظ سے یا دنیا میں نفع مند ہونے کے لحاظ سے یا دنیا اور آخرت میں نفع مند ہونے کے لحاظ سے فضیلت حاصل ہوسکتی ہے۔

بحیثیت نفع مند ہونے کے نسخ کی تین قسمیں:

(۱) ناسخ بنسبت منسوخ کے خفیف ہو جس کا دنیا میں فائدہ ہو۔ جیسا کہ فوت شدہ شخص کی زوجہ کی عدت ایک سال سے کم کر کے چار ماہ دس دن کردی گئی۔ جو دنیا میں نفع مند ہے۔ کیونکہ ایک سال عدت گزارنا مشکل تھا اور چارہ ماہ دس دن آسان ہے۔

اسی طرح رات کے قیام کی تہجد تک فرضیت کو منسوخ کردینے سے مشکل کو آسان کردیا گیا۔ جس کا دنیا میں نفع ہوا۔

(۲) جو آخرت میں نفع مند ہو اگرچہ دنیا میں وہ زیادہ مشکل نظر آئے۔ جیسا کہ پہلے قتال سے دور

رہنا اور درگزر کرنا اور معاف کرنا ضروری تھا، پھر قتال کا حکم فرض کیا جو بظاہر دنیا کے لحاظ سے مشکل ہے، لیکن اجروثواب اور اخروی نفع کے لحاظ سے پر پہلے حکم سے بڑھ کر ہے۔

اسی طرح زناء کی حد پہلے زبان سے سرزنش کرنا۔ پھر ایک سال تک ان کو گھروں میں بند رکھنے کا حکم تھا، پھر اسے منسوخ کر کے سو کوڑے لگانے یا سنگسار کرنے کا حکم نافذ کر دیا۔ جو بظاہر مشکل ہے۔ لیکن نظام کو درست رکھنے اور لوگوں کو غلط کاری سے روکنے کے لئے زیادہ نفع مند ہے۔ جس میں اخروی ثواب بھی زیادہ ہے۔

اسی طرح پہلے عاشورہ کا روزہ فرض ہوا، پھر ایام بیض (چاند کی تیرہ، چودہ اور پندرہ تاریخوں) کے روزے فرض ہوئے، پھر رمضان کا مکمل مہینہ روزے فرض کر دیئے گئے، جو بظاہر مشکل حکم ہے، لیکن آخرت میں زیادہ نفع مند ہے، کیونکہ اس میں اجروثواب زیادہ ہے۔

(۳) ناسخ اور منسوخ بظاہر برابر ہوں۔ نہ ایک میں مشقت زیادہ ہو اور نہ دوسرے میں۔ بلکہ تخفیف اور مشقت کے لحاظ پر برابر ہوں۔ جیسا کہ بیت المقدس کا قبلہ ہونا منسوخ کر دیا اور کعبہ شریف کے قبلہ ہونے کا حکم نافذ کر دیا گیا۔ مشقت اور تخفیف کے لحاظ پر دونوں برابر ہیں

تاہم راقم کو یہ بات بھی واضح نظر آتی ہے کہ اگرچہ مشقت اور تخفیف کے لحاظ سے دونوں میں مثلیت ہے، لیکن رب تعالیٰ کا منسوخ کرنا جب مصلحت کی وجہ سے ہو تو اس لحاظ سے ناسخ مثل ہونے کے باوجود بھی خیر ہے۔ ابھی جو تین قسمیں بیان کی ہیں ان کو علامہ قرطبی رحمہ اللہ کی تفسیر کے خوبصورت الفاظ میں طلباء کرام دیکھیں:

" والمعنی نات بما هو انفع لكم ايها الناس فی عاجل ان كانت الناسخة اخف وفی آجل ان كانت اثقل ومثلها ان كانت مستوية "

(ماخوذ از شیخ زادہ وقرطبی)

علامہ رازی نے بیان فرمایا:

(نأت بخير منها او مثلها) فيه قولان احدهما انه الاخف والثاني انه الاصلح لحق كان بها والثاني اولى لانه تعالىٰ يصرف المكلف عن مصالحه لا على ما هو اخف لطباعه "

''خیر لانے کا ایک مطلب بعض حضرات نے بیان کیا کہ ناسخ خفیف ہونا چاہئے لیکن محققین کا قول یہ ہے کہ ناسخ بندوں کے لئے نفع مند ہونا چاہئے ، یہی قول زیادہ بہتر تحقیق پر مبنی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ بندوں کو مصلحت پر مبنی حکم دیتا ہے، صرف تخفیف والا حکم دینا مقصود نہیں ہوتا''

اس پر بظاہر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اگر دوسرا حکم اصلح (زیادہ صلاحیت پر مبنی) ہے۔ تو پہلا حکم غیر اصلح ہوگا۔ تو رب تعالیٰ نے اس کا حکم پہلے کیوں دیا تھا جب کہ رب تعالیٰ بندوں کی مصالح کا لحاظ کرتا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے۔

'' الاول كان اصلح من الثاني بالنسبة الى الوقت الاول والثاني على عكس الاول ''

پہلا حکم بھی بہتر تھا لیکن اس کی ایک خاص مدت تھی۔ جب اس کی مدت ختم ہوگئی تو اب دوسرے کی بہتری کا وقت شروع ہوگیا۔ یعنی رب تعالیٰ کا کوئی حکم بھی ایسا نہیں کہ اسے کہا جائے '' یہ بہتر نہیں'' البتہ وقت گزرنے پر جب وہ حکم ہی ختم ہوجائے تو اب یہ کہا جاسکے گا کہ اس پر عمل کرنا اب بہتر نہیں۔ بلکہ دوسرے حکم پر عمل کرنا بہتر ہے۔ (از شیخ زاده)

﴿ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴾

''کیا تمھیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے''

خطاب اگرچہ بظاہر نبی کریم ﷺ کو ہے، لیکن مراد اس سے ہر مخاطب ہے، اور ہمزہ استفہام تقریری کے لئے ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اے سننے والے کیا تمہیں علم نہیں، یعنی تمہیں علم تو حاصل ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ تو اس پر یقین رکھو کہ وہ نسخ پر بھی قادر ہے۔ اور پہلی آیت سے نفع کے لحاظ پر بہتر لانے پر بھی قادر ہے۔ اور پہلی آیت کی مثل نفع والا حکم لانے پر بھی قادر ہے۔ (از بیضاوی)

یعنی جب تم اللہ تعالیٰ کی قدرت کو جانتے ہو تو ناسخ و منسوخ کو نہ تسلیم کرنا تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی پر دلالت کرے گا۔

آیۃ کریمہ سے حاصل ہوا کہ نسخ عقلاً اور نقلاً جائز ہے۔ بلکہ نقلی دلائل یعنی قرآن وحدیث سے

ثابت ہے کہ نسخ واقع ہوا ہے۔لیکن یہود کہتے ہیں کہ نسخ عقلاً جائز نہیں۔اور نقلاً بھی جائز نہیں۔بعض یہود نے کہا کہ عقلاً تو جائز نقلاً ثابت نہیں۔مسلمانوں کا نسخ کے جواز پر اجماع.....صرف ابو مسلم اصفہانی اور معتزلہ نے جواز کا انکار کیا ہے۔

تنبیہ: عقلاً جواز کا یہ مطلب ہے کہ نسخ کے جواز کو عقل تسلیم کرتی ہے۔یہ مطلب نہیں کہ نسخ قیاس سے جائز ہے۔قیاس سے کسی آیۃ اور حدیث کو منسوخ نہیں کیا جا سکتا۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ نسخ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ناسخ اور منسوخ کے متعلق یہ بھی علم ہو کہ پہلی آیت نزول کے لحاظ پر کون سی ہے اور دوسری کون سی۔اسی طرح نبی کریم ﷺ کا پہلا ارشاد یا فعل کون سا اور بعد والا کون سا ہے کیونکہ مؤخر مقدم کا ناسخ ہو سکتا ہے۔مقدم مؤخر کا ناسخ نہیں ہو سکتا۔

منکرین نسخ کے دلائل:

(۱) اس آیۃ میں ''ما ننسخ من آیۃ'' سے مراد قرآن پاک کی آیتیں نہیں، بلکہ پہلی آسمانی کتب کے احکام کی منسوخی ہے۔جیسا کہ ہفتہ کے دن کی تعظیم کو منسوخ کر دیا گیا۔

اسی طرح مشرق اور مغرب کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کو منسوخ کر دیا۔چونکہ یہود و نصاریٰ کہتے تھے '' ولا تؤمنوا الا لمن تبع دینکم '' تم ایمان نہ لاؤ سوائے اس کے جو تمہارے دین کی تابعداری کرے۔اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کو رد کرنے کے لئے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا۔

ان کی اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ ''آیات'' کو جب مطلق ذکر کیا جائے تو اس سے مراد قرآن پاک کی آیات ہی ہوتی ہیں۔پہلی شریعتوں کا منسوخ ہونا احادیث صحیحہ سے بہت واضح طور پر ثابت ہے۔

(۲) ان کی اور دلیل یہ ہے کہ اس آیۃ میں نسخ کا معنی نقل کرنا ہے۔جس کا مطلب ہے قرآن پاک کی آیات کو لوح محفوظ سے نقل کرنا۔

ان کی اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ قرآن پاک تو تمام ہی لوح محفوظ سے نقل کیا گیا ہے۔اس آیۃ کریمہ میں تمام قرآن پاک کی منسوخیت کا ذکر نہیں بلکہ بعض آیات کے منسوخ کرنے کا ذکر ہے۔لہٰذا لوح محفوظ سے منتقل کرنے والا معنی مراد لینا صحیح نہیں۔اور وجہ یہ بھی واضح رہے کہ اگر لوح محفوظ سے منتقل کرنے کا

معنی لیا جائے تو بعد والے الفاظ مبارکہ ﴿ نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا ﴾ کا مفہوم باقی نہیں رہتا۔

(۳) ان کی اور دلیل یہ ہے کہ اس آیۃ کریمہ میں نسخ کا وقوع ذکر نہیں بلکہ امکان ذکر ہے، اس کا مطلب درحقیقت یہ ہے "لو وقع النسخ لو قع الی خیر منه" اگر نسخ واقع ہوتا تو ہم اس سے بہتر یا اس کی مثل لے آتے یعنی نسخ واقع ہی نہیں ہوا کہ ہم اس سے بہتر یا اس کی مثل لاتے

اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیۃ کریمہ میں لفظ " مــا " ذکر ہے جس کے موصولہ ہونے کا بھی احتمال پایا گیا ہے۔ اس کے شرطیہ ہونے کو یقینی نہیں کہا جا سکتا۔ اگر کہا بھی جائے تو یہ کہا جائے گا کہ یہ شرط کے معنی کو متضمن ہے اس لئے " ما " کی جگہ " لو " ذکر کر کے وقوع کی نفی کرنا باطل ہے۔ کیونکہ " لـو " عین شرط پر دلالت کرتا ہے، اور " مـا " شرط کے معنی کو متضمن ہے۔ کہاں عین شرط اور کہاں معنی شرط کو متضمن ہونا " فیهما بو ن بعید "

(۴) رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾

''بیشک ہم نے قرآن نازل کیا، اور بیشک ہم ہی اس کے محافظ ہیں''

اور ارشاد فرمایا ﴿ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى ﴾ ''ہم آپ کو پڑھائیں گے آپ بھولیں گے نہیں''

ان آیات کے بعد ﴿ اَوْ نُنْسِهَا ﴾ یا ہم بھلا دیں گے کا کیا مطلب ہوگا؟ پتہ چلا نسخ کا وقوع درست نہیں۔ ان کی اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ پہلی آیت جو تم نے پیش کی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی اپنی طرف سے قرآن پاک میں تحریف نہیں کر سکے گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ رب تعالیٰ خود بھی منسوخ نہیں فرمائے گا۔

دوسری آیۃ جو تم نے پیش کی اس میں آگے " الا مـا شـاء الله " مستثنیٰ بھی موجود ہے۔ جو واضح طور پر دلالت کر رہا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں سے کسی چیز کو بھلانا چاہے تو بھلا دے گا۔ پھر صحابہ کرام کے بھول جانے سے یہ بھی لازم نہیں کہ نبی کریم ﷺ سے بھی ان آیات کو بھلا دیا گیا ہو۔ ہوسکتا ہے آپ کو یاد رہی ہوں آپ نے پڑھی نہ ہوں۔

(۵) اور ان کی دلیل یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ ﴾ میرے ہاں بات

بدلتی نہیں۔ اس آیۃ کریمہ سے پتہ چلا کہ نسخ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ نسخ میں تبدیلی ہے اور رب تعالیٰ نے اپنے قول میں تبدیلی کی نفی فرمائی۔ ان کی اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ یہ حکم قیامت میں ہوگا جب گمراہ لوگ کہیں گے کہ ہمیں تو شیطان نے ورغلایا تھا۔ تو رب تعالیٰ فرمائے گا کہ میرے پاس جھگڑا نہ کرو میں تمہیں پہلے ہی عذاب کا ڈر بتا چکا تھا۔ اب میرا حکم بدلتا نہیں بلکہ کافروں کو عذاب ہو کر رہے گا۔

اس آیۃ کریمہ میں نسخ کی تبدیلی کی نفی کا کوئی ذکر نہیں۔ بلکہ دوسری آیات میں نسخ اور تبدیلی کا واضح طور پر ذکر ہے:

﴿ وَاِذَا بَدَّلْنَا اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ﴾ اور جب ہم ایک کے بدلے دوسرے آیت کو لے آتے ہیں۔

﴿ يَمْحُو اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ﴾ اللہ تعالیٰ جسے چاہے مٹادے، جسے چاہے ثابت رکھے۔

ان آیات سے منسوخ ہونا واضح ہو چکا ہے۔ خیال رہے کہ ہر آیت کی وضاحت اسی کے محل میں ان شاء اللہ ذکر کی جائے گی۔ یہ اجمالی طور پر ذکر ہے۔

نسخ کے جواز پر دلائل:

نسخ کی جو مختلف لحاظ سے اقسام بیان کی ہیں ان میں آیات اور احادیث سے جو مثالیں ذکر کی ہیں، ان تمام سے واضح ہے کہ نسخ واقع ہوا ہے۔ اسی طرح نسخ کے جواز کے جو لوگ قائل نہیں ان کے دلائل کے جو جوابات ذکر کیے ہیں ان سے بھی نسخ کے جواز کا پتہ چل گیا۔ تا ہم مختصر طور پر کچھ مزید وضاحت کے لئے چند مثالیں پیش کی جارہی ہیں۔

(۱) دلائل سے یہ ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی نبوت برحق ہے " ونبوته لا تصح الا مع القول بنسخ شرع من قبله ، فوجب القطع بالنسخ " اور آپ کی نبوت کو اس وقت تک ماننا صحیح نہیں ہوسکتا جب تک پہلی شریعتوں کو منسوخ نہ مانا جائے۔ تو یقینی طور پر یہ پتہ چل گیا کہ نسخ کا وقوع صحیح ہے۔

(۲) رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىکُمْ صَدَقَةً ﴾

اس آیۃ کریمہ میں نبی کریم ﷺ سے سرگوشی کرنے سے پہلے صدقہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ پھر اسے منسوخ کر دیا گیا۔

خیال رہے کہ حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ نے صدقہ کر کے تنہائی میں بات کی یا نہیں کی۔ وہ ذکر اسی آیۃ کی وضاحت میں ہی انشاء اللہ آئے گا۔ تاہم یہ یاد رہے کہ نسخ کے لئے ایک مرتبہ اس پر عمل کرنا کوئی ضروری نہیں۔ کیونکہ پچاس نمازوں کو منسوخ کر کے پانچ کر دی گئیں۔ پچاس پر کسی نے بھی عمل نہیں کیا، نہ نبی کریم ﷺ نے اور نہ ہی آپ کی امت میں سے کسی ایک نے اس پر عمل کیا۔

(۳) رب تعالیٰ نے نسخ پر اعتراض کرنے والوں کو بے وقوف کہا۔ کیونکہ بیت المقدس کے قبلہ کو منسوخ کر کے کعبہ شریف کو قبلہ بنانے کے حکم پر اعتراضات کرنے والوں کا ذکر رب تعالیٰ نے یوں فرمایا:

﴿ سَیَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ کَانُوْا عَلَیْهَا ﴾

"اب کہیں گے بیوقوف لوگ کس نے پھیر دیا مسلمانوں کو ان کے اس قبلہ سے جس پر تھے"

(ماخوذ از کبیر بتصرف)

☆☆☆☆☆

﴿ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴾ (آیت ۱۰۷)

۱) کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ ہی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اور اللہ کے سوا تمہارا نہ کوئی حمایتی نہ مددگار۔

۲) کیا تمہیں علم نہیں بیشک اللہ کے لئے ہی ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی۔ اور نہیں تمہارے لئے سوائے اللہ کے کوئی حمایت کرنے والا اور نہ کوئی مددگار۔

نسخ کا انکار کرنے والوں کو رب تعالیٰ نے فرمایا کیا تمہیں معلوم نہیں کہ بیشک اسی کے لئے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے، یعنی جس کے قبضہ قدرت میں تمام مخلوق ہے، کیا اس کی قدرت سے بعید ہے کہ وہ نسخ نہ کرسکے، یہ تمہاری سوچ باطل ہے۔ اگر تم اپنی اسی گمراہی پر قائم رہے تو اللہ تعالیٰ کے سوا تمہارا کوئی اور حمایت کرنے والا نہیں ہوگا۔ اور نہ ہی تمہارا کوئی مددگار ہوگا۔

﴿اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾

''کیا تمہیں علم نہیں بیشک اللہ کے لئے ہی ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی''

یعنی اللہ تعالیٰ ہی آسمانوں اور زمین میں متصرف ہے، آسمانوں اور زمین میں اسی کی سلطنت ہے کسی اور کی نہیں۔ آسمانوں اور زمین کی تمام مخلوق میں اسی کا حکم چلتا ہے، یہ بھی خیال رہے کہ آسمانوں اور زمین کا ذکر کر کے رب تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوق کا ذکر کر دیا آسمانوں سے مراد تمام علو یعنی تمام عالم بالا مراد ہے۔ اور زمین سے مراد تمام سفل (تمام عالم پست)۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا ہی حکم چلتا ہے تمام کائنات میں۔ وہ جو چاہے امر فرمائے یا نہی وہ جو چاہے منسوخ فرمائے یا تبدیل کرے، کسی کو حق نہیں کہ اس سے سوال کرے۔

(اَلَمْ تَعْلَمْ) " وان كان خطابا للنبى ﷺ لكن فيه تكذيب لليهود الذين انكروا النسخ وجحدوا نبوة عيسى ومحمد عليهما السلام فاخبرهم الله ان له ملك السموات والارض وان الخلق كلهم عبيده وتحت تصرفه يحكم فيها بما يشاء وعليهم السمع والطاعة "

(الَمْ تعلَمْ) میں بظاہر خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے لیکن حقیقت میں یہود کو خطاب ہے، اوران یہود کی ہی تکذیب ہے جنہوں نے نسخ کا انکار کیا۔ اور عیسیٰ علیہ السلام اور نبی کریم ﷺ کی نبوت کا انکار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو خبر دی کہ بیشک اسی کیلئے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے۔ اور بیشک تمام مخلوق اسی کی غلام ہے اور تمام اسی کی بندے ہیں۔ اور اسی کے زیر تصرف ہیں۔ وہ جو چاہے حکم فرماتا ہے۔ اس کے بندوں کو چاہئے اس کے حکم کو قبولیت کے کانوں سے سنیں اور اسی ذات کی طاعت کریں۔

" وَمَالَكُمْ يعني يا معشر الكفار عند نزول العذاب مِنْ دُوْنِ اللهِ اى مماسوى الله مِنْ وَّلِيّ اى قريب وصديق وقيل من وال وهو المقيم بالامور وَّلَا نَصِيْر اى ناصر يمنعكم من العذاب "

یعنی اے کافرو جب اللہ تعالیٰ کا عذاب تم پر نازل ہوا تو کوئی بھی اللہ کا غیر تمہارا قریبی اور دوست اور تمہارے امور کا والی نہیں ہوگا۔ اور نہ ہی تمہارا کوئی مددگار ہوگا جو تم سے عذاب کو روک کر رکھے۔ عذاب قریب نہ آنے دے۔ (خازن)

ابن کثیر فرماتے ہیں: جس طرح اس کی بادشاہی میں کوئی جھگڑا کرنے والا نہیں، اسی طرح وہ جو چاہے حکم فرمائے ﴿ اِلَا لَه' الْخَلْقَ وَالْحُكْمَ ﴾ خبردار مخلوق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی اس کا ہے۔

سورۃ عمران میں صراحۃً خطاب اہل کتاب کو جس میں نسخ کا وقوع ذکر ہے۔ یعنی اس آیۃ میں نسخ کے وقوع کا ذکر ہے:

﴿ كُلُ الطَّعَامِ كَانَ حِلًا لِبَنِىْ اِسْرَآئِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآئِيْلُ عَلٰى نَفْسِه ﴾

اس آیت کریمہ میں ذکر ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر جس چیز کو (اونٹ کے گوشت کو) حرام کیا وہ بنی اسرائیل پر بھی حرام ہوگئی۔ حالانکہ پہلے وہ ان پر حلال تھی۔

حلت کو ختم کر کے حرمت کا حکم نافذ کرنا ہی نسخ ہے۔ جو خود بنی اسرائیل پر واقع ہو چکا ہے۔

اس کے بعد ابن کثیر فرماتے ہیں:

" والمسلمون كلهم متفقون على جواز النسخ فى احكام الله تعالىٰ لما له فى ذلك من الحكمة البالغة و كلهم قال بوقوعه "

''مسلمان تمام نسخ کے جواز پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے احکام کو نسخ فرمائے۔ تمام مسلمان اس پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں نسخ واقع ہو چکا ہے۔

(اَلَمْ تَعْلَمْ) کی تفسیر میں ابن کثیر کی اس وضاحت سے بھی بخوبی معلوم ہو گیا کہ یہ خطاب یہود کو ہے، مسلمانوں کو نہیں۔ تاہم خازن نے بھی بعد میں ایک قول نقل کیا ہے کہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ خطاب مسلمانوں کو ہے۔ اور اسی طرح کئی اور مفسرین کرام نے بھی بیان کیا ہے۔

اگر خطاب یہود کو ہو تو وہی تفسیر کامل ہے جو خازن نے ذکر فرمائی۔ اس سے یہ واضح ہے کہ (وَمَا لَكُمْ مِنْ دُوْنِ اللهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَانَصِيْرٍ) کا کیا مطلب ہے لیکن اگر خطاب مومنوں کو ہو تو تفسیر عزیزی کی اس تفسیر کو ضرور مدنظر رکھا جائے۔

"یعنی وحال آنکه نیست شما را سوای خدا کارسازی که کار معاش ومعاد شمارا اصلاح کند. اگر کارسازی دیگر شمارا میبود وگنجائش داشت که ایں کارساز را متلون المزاج ومتبدل الحکم فهمید ترك داده بآں کار ساز دیگر رجوع می آوردید وچارهٔ معاش ومعاد خود ازومی جستید" (عزیزی)

یعنی اللہ تعالیٰ کے بغیر دنیا اور آخرت میں کوئی کارساز نہیں۔ اگر کوئی اور کارساز ہوا تو وہ اللہ تعالیٰ کا ہی محتاج ہوگا۔ درحقیقت رب تعالیٰ ہی کارساز ٹھہرے گا۔

اہل سنت وجماعت کا عقیدہ ہی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ حقیقی طور پر مددگار ہے۔ اس کے بندے اسی کی عطاء سے مددگار ہیں۔ اس مسئلہ کو ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ کی وضاحت کرتے ہوئے راقم نے کافی حد تک واضح کر دیا ہے۔

ولی اور نصیر میں فرق: "ولی" کا معنی مالک ہے، اور یہ بھی واضح ہے کہ مالک کبھی نصرت پر قادر نہیں ہوتا، اور کبھی قادر تو ہوتا ہے، لیکن امداد نہیں کرتا۔

اور "نصیر" کا معنی ہے "معین" (مددگار) مدد کرنے والا کبھی مالک ہوتا ہے۔ کبھی مالک نہیں ہوتا بلکہ اجنبی ہوتا ہے۔ (روح المعانی)

خیال رہے کہ روح المعانی کی اس تفسیر سے ہی واضح ہو رہا ہے کہ یہ فرق بندوں کے ولی ہونے اور نصیر ہونے میں ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ کہنا کسی حال میں جائز نہیں "هو الولی ولا يقدر علی النصرة" وہ ولی یعنی مالک تو ہے لیکن امداد کرنے پر قادر نہیں۔

﴿ اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴾

۱) کیا یہ چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے ایسا سوال کرو جو موسیٰ سے پہلے ہوا تھا۔ اور جو ایمان کے بدلے کفر لے وہ ٹھیک راستہ سے بہک گیا۔

۲) کیا تم ارادہ کرتے ہو کہ تم سوال کرو اپنے رسول سے جیسا کہ سوال کیا گیا موسیٰ سے (اس سے) پہلے اور جو حاصل کرے کفر ایمان کے بدلے، تو تحقیق وہ بھٹک گیا سیدھی راہ سے۔ (آیت ۱۰۸)

"ام تریدون" میں خطاب کسے ہے؟ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ سمجھا جائے کہ نبی کریم ﷺ تمام لوگوں کے رسول ہیں۔ خواہ مومن ہوں یا کافر یہود ہوں یا نصاریٰ۔ اس طرح تمام لوگ ہی آپ کی امت میں داخل ہیں۔ البتہ فرق یہ ہے کہ جن لوگوں نے آپ پر ایمان لایا وہ امت اجابت کہلاتے ہیں۔ ان کی شان میں ہی رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ ﴾ تم بہتر امت ہو۔

جن لوگوں نے آپ پر ایمان نہیں لایا وہ امت دعوت کہلاتے ہیں۔ کہ نبی کریم ﷺ نے ان کو دعوت ایمان دی لیکن انہوں نے قبول نہیں کیا وہ کفار یہود اور نصاریٰ ہی رہے۔

اب اس تمہید کے بعد یہ سمجھنا آسان ہوگا کہ (ام تریدون) کے خطاب میں تین احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ یہ خطاب مسلمانوں کو ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ خطاب مشرکین کو ہے اور تیسرا یہ کہ یہ خطاب یہود کو ہے۔ جب خطاب میں یہ چند احتمال ہیں تو شان نزول میں بھی اسی طرح چند وجوہ ہوں گی۔

پہلا احتمال: جب خطاب مسلمانوں کو ہو، تو اس میں پھر کئی وجوہ سے ان کو کہا گیا کہ کیا تم ارادہ رکھتے ہو کہ اپنے رسول ﷺ سے ایسے سوال کرو جیسے موسیٰ علیہ السلام سے سوال کئے گئے۔ یعنی تمہیں سوال نہیں کرنے چاہیں، اگر تم نے رب تعالیٰ کے احکام کا انکار کیا تو کافر ہو جاؤ گے۔ جو شخص ایمان کے بدلے کفر کو اختیار کرے گا وہ سیدھی راہ سے بھٹک جائے گا۔ اگر آیۃ کریمہ میں خطاب

مومنوں کو ہوتو اس کا ایک مطلب یہ ہے:

" نھی اللہ المؤمنین فی ھذہ الآیۃ الکریمۃ عن کثرۃ سؤال النبی ﷺ عن الاشیاء قبل کونھا"

رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ میں مومنوں کو نبی کریم ﷺ سے کثرت سوال سے منع فرمایا کہ کسی چیز کے واقع ہونے سے پہلے جو سوال تم کرتے ہو وہ درست نہیں ان سے باز آ جاؤ۔

کسی چیز کے واقع ہونے سے پہلے سوال کرنے سے منع کرنے میں حکمت یہ تھی " ولا تسألوا عن النبی ﷺ قبل کونہ فلعلہ ان یحرم من اجل تلک المسئلۃ " کہ تم نبی کریم ﷺ سے کسی چیز کے واقع ہونے سے پہلے اس لئے سوال نہ کرو کہ کہیں تمہارے سوال کی وجہ سے وہ چیز حرام نہ ہو جائے جو تمہارے لئے باعث مشقت بن جائے۔

☆ " ولھذا جاء فی الصحیح ان اعظم المسلمین جرما من سأل عن شئ لم یحرم فحرم من اجل مسئلتہ "

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، بیشک مسلمانوں میں سے عظیم جرم والا وہ شخص ہے جس نے کسی چیز کے بارے میں سوال کیا تو وہ حرام ہوگئی، حالانکہ پہلے حرام نہیں تھی۔

☆ " ولما سئل رسول اللہ ﷺ عن الرجل یجد مع امرأتہ رجلا فان تکلم تکلم بامر عظیم وان سکت سکت علی مثل ذلک فکرہ رسول اللہ ﷺ المسائل وعابھا ثم انزل اللہ حکم الملاعنۃ "

نبی کریم ﷺ سے جب یہ سوال کیا گیا کہ ایک شخص اپنی عورت کے ساتھ ایک شخص کو برائی کا ارتکاب کرتے ہوئے پائے تو وہ کیا کرے، اگر کلام کرے تو امر عظیم ہوگا، کیونکہ اس کے پاس گواہ تو ہیں نہیں اور اگر خاموش رہے تو ایسے عظیم جرم پر خاموش کیسے رہے؟ نبی کریم ﷺ نے اس قسم کے سوالات کو ناپسند کیا اور معیوب سمجھا۔ تو لعان کا حکم نافذ ہوا اور لعان والی آیت نازل ہوئی (جس کا ذکر سورۃ نور میں ہے)۔

☆ مسلم اور بخاری میں حدیث حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

" ان رسول اللہ ﷺ کان ینھی عن قیل وقال واضاعۃ المال وکثرۃ السوال "

بیشک رسول اللہ ﷺ قیل وقال (بحث ومباحثہ جو باعث نزاع ہو) سے اور مال کو ضائع کرنے

اورزیادہ سوال کرنے سے منع فرماتے۔

☆ " قال رسول الله ﷺ ان الله كتب عليكم الحج فقال رجل كل عام يا رسول الله فسكت عنه رسول الله ﷺ ثلاثا ثم قال عليه السلام لا ولو قلت نعم لوجبت و لو وجبت لما استطعتم ذروني ما تركتم فانما هلك من كان قبلكم بكثرة سؤالهم واختلافهم على انبيائهم فاذا امرتكم بامر فأتوا منه ماستطعتم وان نهيتكم عن شئ فاجتنبوه " (رواه مسلم)

رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض فرمایا، ایک شخص نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ کیا ہر سال حج فرض ہے، نبی کریم ﷺ نے تین مرتبہ اپنے ارشادکولوٹایااور صحابی بھی سوال کرتے رہے، آپ خاموش رہے۔ پھر آپ نے فرمایا اگر میں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال حج فرض ہو جاتا۔ اگر فرض ہو جاتا تمہیں ادا کرنے کی طاقت نہ ہوتی۔ جب میں تمہیں چھوڑ دوں تو تم بھی چھوڑ دیا کرو بیشک تم سے پہلے لوگ انبیاء کرام سے زیادہ سوال کرنے اوران سے زیادہ اختلاف کرنے کی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔ جب میں تمہیں کوئی حکم دوں تو طاقت کے مطابق اس پر عمل کرو، اور اگر میں تمہیں کسی چیز سے منع کروں تو اس سے رک جاؤ۔

☆ " قال انس بن مالك نهينا ان نسأل رسول الله ﷺ عن شئ فكان يعجبنا ان يأتي الرجل من اهل البادية فيسأله فنسمع "

حضرت انس بن مالک ﷺ فرماتے ہیں، جب ہمیں منع کر دیا گیا کہ ہم رسول اللہ ﷺ سے زیادہ سوال نہ کیا کریں۔ تو ہم یہ چاہتے تھے کہ کوئی شخص دیہات سے آئیں جو آپ سے سوال کریں تو ہم بھی ان کے جوابات سن لیں۔

تنبیہ: جن سوالات سے منع کیا گیا یہ وہ سوالات تھے جو بلاوجہ کئے جاتے تھے۔ اور ایسے سوالات سے منع کیا گیا جن کی وجہ سے کسی حکم کے فرض ہو جانے کا خدشہ ہوتا، یا وہ سوالات کسی چیز کوحرام کرنے کا ذریعہ بنتے، لیکن کسی مسئلہ کو سمجھنے کے لئے دین میں سمجھ حاصل کرنے کے لئے سوال کرنا منع نہیں، بلکہ سوال کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

" انما شفاء الغی السوال " جہالت سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ سوال ہے (ابوداؤد ج ا ص ۴۹)

یہ بھی واضح ہوا کہ طلباء کا اساتذہ سے لغو اور بیہودہ سوال کرنا منع ہے۔ مقصودی، تعمیری سوالات کیے جائیں۔ عبداللہ بن ابی کی ذریت معنوی کا طریقہ بیہودہ باتیں اور بیہودہ سوال کرنا ہے۔

☆ " عن ابی العالیة فی قوله تعالیٰ(ام تریدون ان تسألوا رسولکم ......الخ)قال قال رجل یا رسول اللہ لو کانت کفارتنا کفارات بنی اسرائیل فقال النبی ﷺ اللهم لانبغیها ثلاثا ، ما اعطاکم اللہ خیر مما اعطی بنی اسرائیل ، کانت بنو اسرائیل اذا اصاب احدهم الخطیئة وجدها مکتوبة علی بابه و کفارتها ، فان کفرها کانت له خزیا فی الدنیا و ان لم یکفرها کانت له خزیا فی الآخرة فما اعطاکم اللہ خیر مما اعطی بنی اسرائیل ، قال (ومن یعمل سوء ا او یظلم نفسه ثم یستغفر اللہ یجد اللہ غفورا رحیما) وقال الصلوات الخمس من الجمعة الی الجمعة کفارة لما بینهن وقال من هم بسیئة فلم یعملها لم تکتب علیه و ان عملها کتبت سیئة واحدة ومن هم بحسنة لم یعملها کتبت له حسنة واحدة و ان عملها کتبت له عشر امثالها "

ابوالعالیہ نے اسی آیۃ کی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ ہمارے اسی طرح گناہوں کے کفارات ہونے چاہئیں جیسے بنی اسرائیل کے لئے تھے۔ تو نبی کریم ﷺ نے تین مرتبہ عرض کیا اے اللہ ہم یہ نہیں چاہتے۔ پھر آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے جو تمہیں عطاء کیا ہے وہ بہتر ہے اس سے جو بنی اسرائیل کو عطاء کیا۔ نبی اسرائیل جب بھی کوئی گناہ کرتے تو ان کے دروازوں پر وہ لکھ دیا جاتا اور ان پر کفارہ لازم آتا۔ اگر وہ کفارہ ادا کرتے تو انہیں دنیا میں رسوائی حاصل ہوتی، اور اگر وہ کفارہ نہ ادا کرتے تو ان کو آخرت میں رسوائی حاصل ہوتی۔ جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطاء کیا ہے وہ بہتر ہے اس سے جو بنی اسرائیل کو عطاء کیا۔ پھر آپ نے یہ آیۃ کریمہ پڑھی:

﴿ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾

''اور جو شخص برائی کا عمل کرے یا اپنے نفس پر ظلم کرے، پھر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرے، تو اللہ کو بخشنے والا، رحم کرنے والا پائے گا''۔

اور آپ نے فرمایا جمعہ سے جمعہ تک (ہر روز) پانچ نمازیں ادا کرنا ان کے درمیان خطاؤں کا کفارہ ہیں۔ اور آپ نے فرمایا جس شخص نے برائی کا ارادہ کیا لیکن اس پر عمل نہ کیا تو اس پر کوئی گناہ نہیں

لکھا جائے گا۔اور اگر اس پر عمل کرے گا تو اس پر ایک ہی برائی کو لکھا جائے گا۔اور اگر نیکی کا ارادہ کیا اور اس پر عمل نہ کیا تو ایک نیکی اس کے لئے لکھ دی جائے گی۔اور اگر اس پر عمل بھی کر لیا تو اس کے لئے دس نیکیاں لکھ دی جائیں گی۔

☆ نبی کریم ﷺ جب غزوۂ خیبر کے لئے تشریف لے گئے تو آپ کے لشکر کا ایک درخت کے قریب سے گزر ہوا جس کی مشرکین عبادت کرتے تھے۔اور اس کے ساتھ اپنے ہتھیار اور کھانے، پینے کی اشیاء لٹکا دیتے تھے۔اسے ''ذات انواط'' کہا جاتا، کچھ نومسلم لوگوں نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ " **اجعل لنا ذات انواط کما لھم ذات انواط** " ہمارے لئے بھی ایسا ہی ذات انواط بنا دیں، جس طرح ان کا ہے۔حضور ﷺ نے فرمایا سبحان اللہ " **ھذا کما قال قوم موسی اجعل لنا الھا کما لھم الھة** " یہ تو ایسا ہی سوال ہے جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے ان سے کہا تھا ہمارے لئے ایسا خدا بنا دیں جیسا کہ ان لوگوں کے خدا ہیں۔(یہ سوال ان کا کچھ لوگوں کو بت پرستی کرتے ہوئے اور کچھ کو گاؤ پرستی کرتے ہوئے دیکھ کر تھا) اور ساتھ ہی نبی کریم ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

" والذی نفسی بیدہ لترکبن سنن من قبلکم "

''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے (سوالات کا اگر یہی سلسلہ رہا) تو تم ضرور بر ضرور پہلے لوگوں کے طریقہ پر چل پڑو گے۔

سبحان اللہ نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی کتنا ہی روز روشن کی طرح ظاہر و باہر ہے کیونکہ دنیائے عالم کے تمام مسلمان یہود و نصاریٰ کے طریقہ پر عمل کر کے، یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستی قائم کر کے بظاہر خوش ہیں، لیکن درحقیقت رب تعالیٰ کے اس حکم کی کھلی خلاف ورزی ہے۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ﴾

''اے ایمان والو نہ بناؤ یہود و نصاریٰ کو دوست وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں''

کفار کی دوستی کے نتائج آہستہ آہستہ نکلتے ہیں۔جب مسلمانوں کو وہ ہر طرح کا نقصان پہنچانے پر حاوی ہو جاتے ہیں تو وہ ایسا نقصان پہنچاتے ہیں جس سے مسلمان برسوں تک کراہتے رہیں۔

جن کے نتائج بعد میں برے نکلنے ہوں ان سے پہلے ہی اجتناب کر لیا جائے تو بہتر ہے ورنہ بربادی ہی بربادی ہوتی ہے۔ جب ہمارے ملک پاکستان میں ۱۹۷۳ء میں لاہور کے مسلمانوں پر گولی چلانے کا حکم دیا تو حبیب جالب نے کہا۔

گولیوں سے محبت بو رہے ہو — اہل وطن کا چہرہ خون سے دھو رہے ہو
تمہیں گماں ہے کہ رستہ کٹ رہا ہے — مجھے یقین ہے کہ منزل کھو رہے ہو

حالیہ دور میں جب افغانستان کے مسلمانوں کو شہید کرنے میں نام نہاد مسلمانوں نے اہم کردار ادا کیا، تو راقم نے اسی رباعی کو یوں پڑھا۔

کفار سے محبت کا بیج بو رہے ہو — اہل اسلام کا چہرہ خون سے دھو رہے ہو
تمہیں گماں ہے قرضہ گھٹ رہا ہے — مجھے یقیں ہے قرضے میں ڈبو رہے ہو

دوسرا احتمال: "اَمْ تُرِيْدُوْنَ" کا خطاب مشرکین کو ہو، تو اس میں بھی ان کے چند سوالات کے بعد آیۃ کریمہ کا نزول ہوا اس میں ایک وجہ یہ تھی، کہ عبداللہ بن امیہ مخزومی قریش کے چند لوگوں کو ساتھ لایا اور نبی کریم ﷺ کی خدمت حاضر ہو کر

﴿وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ☆ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ☆ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ☆ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ﴾ (بنی اسرائیل آیات ۹۰ تا ۹۳)

کہنے لگے ہم تم پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ تم ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ جاری کر دو۔ یا تمہارے لئے کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ ہو، پھر تم اس کے اندر بہتی نہریں جاری کر دو۔ یا تم ہم پر آسمان ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرا دو جیسا تم نے ہم پر گمان کیا (یعنی جیسا تم نے ہمیں کہا ہے) یا اللہ اور فرشتوں کو ضامن لے آؤ۔ یا تمہارے لئے سنہری گھر ہو۔ یا تم آسمان پر چڑھ جاؤ اور ہم تمہارے آسمان پر چڑھ جانے پر بھی ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔ جب تک ہم پر ایک کتاب (خط) نہ اتارو کہ ہم پڑھیں۔

کریمہ کا نزول ہوا۔ اس لئے تمام مل کر شان نزول ہیں۔ اس پر تائید علامہ آلوسی رحمہ اللہ کی تفسیر سے مل گئی، آپ نے شان نزول کی کئی وجوہ ذکر کرنے کے بعد فرمایا " ولا مانع کما فی البحر من جعل الکل اسبابا " تمام کو ہی شان نزول کے اسباب بنانے میں کوئی مانع نہیں۔

کَمَا سُئِلَ مُوسٰی مِنْ قَبْلُ : (جیسا کہ سوال کیا گیا موسیٰ سے اس سے پہلے)

تقریباً ابھی تک جو ذکر کیا ہے اس سے واضح ہو چکا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سے رب تعالیٰ کو ظاہر طور پر دیکھنے۔ اور جسم والی کوئی چیز ظاہر طور پر معبود بنا کر دینے کا سوال کیا گیا تھا۔

وَمَنْ يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيلِ :

اگر ﴿ اَمْ تُرِيْدُوْنَ ﴾ میں خطاب مومنوں کو ہو تو " ومن یتبدل " کا معنی " ومن یشتر " ہوگا۔ یعنی جس نے حاصل کیا کفر کو ایمان کے بدلے تحقیق وہ بھٹک گیا سیدھی راہ سے۔ اور اگر خطاب مشرکین اور یہود کو ہو تو ﴿ وَمَنْ يَتَبَدَّلِ ﴾ کا معنی ہوگا جس نے کفر کو اختیار کیا ایمان کے بدلے وہ سیدھی راہ سے بھٹکا ہوا ہے۔

تنبیہ : ابھی تک جو بحث ذکر کی اس میں مختلف سوالات ذکر کئے گئے ہیں ان میں سے بعض کفر پر مبنی ہیں اور بعض گناہ پر۔ اور بعض خلاف اولیٰ ہیں۔ اس لئے ضابطہ یہ جاننا ضروری ہے کہ کون سا سوال جو ان کی سرکشی اور حسد پر مبنی تھا وہ باعث کفر تھا۔

" طلب الدلیل علی الشئ لایکون کفرا " کسی چیز پر دلیل کو طلب کرنا کفر نہیں۔ اسی طرح احکام کے نسخ میں حکمت کا طلب کرنا بھی کفر نہیں کیونکہ ملائکہ نے بھی رب تعالیٰ سے بشر کی تخلیق کی حکمت کا سوال کیا تھا۔

اور ایمان لانے کیلئے معجزات کی طلب بھی کفر نہیں۔ اسی سے معلوم ہو گیا کہ عبداللہ بن امیہ مخزومی کے سوالات سرکشی اور ہٹ دھرمی پر مبنی تھے جو باعث کفر تھے۔

" فَقَدْ ضَلَّ " میں " قد " تحقیق کے لئے ہے۔ " سَوَآءَ السَّبِيلِ " سے مراد سیدھی راہ۔

آیۃ کریمہ سے واضح ہوا کہ انبیاء کرام کی تصدیق کرنے سے عدول، ان کی اتباع سے روگردانی، ان کے احکام کو تسلیم کرنے سے گریز کرنا گمراہی اور بھٹکنے کا ذریعہ ہے۔

(تمام بحث ماخوذ از ابن کثیر و کبیر و شیخ زادہ و روح المعانی و قرطبی)

کتاب اتارنے سے ان کا مطلب یہ تھا کہ رب تعالیٰ کی طرف سے ہماری طرف ایک خط آئے جس میں یہ لکھا ہوا کہ اے عبداللہ بن امیہ مخزومی " ان محمد رسول الله فاتبعوه " بے شک محمد اللہ کے رسول ہیں اوران کی تابعداری کرو۔

دوسرے لوگ کہنے لگے اگر تمہیں یہ طاقت نہیں تو تم قرآن ایک مرتبہ ہی لے آؤ جس میں حلال وحرام اور حدود داور فرائض کا ذکر ہو جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام لائے ایک مرتبہ ہی کتاب کو لائے۔

تو اس وقت ان کو حکم دیا گیا۔ ﴿ اَمْ تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَسْأَلُوْا رَسُوْلَکُمْ کَمَا سُئِلَ مُوْسٰی مِنْ قَبْلُ ﴾ کیا تم ارادہ کرتے ہو کہ تم اپنے رسول (جو تمہیں ایمان کی دعوت دینے کے لئے آئے ہیں) سے ایسے سوال کرو جیسا کہ موسیٰ سے اس سے پہلے سوال کیا گیا۔

کیونکہ ان کی قوم نے کہا تھا ﴿ لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَھْرَۃً ﴾ ہم ہرگز تم پر ایمان نہیں لائیں گے۔ یہاں تک کہ اللہ کو ظاہر طور پر دیکھ لیں۔ مشرکین کو خطاب کی دوسری وجہ تھی کہ بعض مشرکین نے سوال کیا تھا ﴿ اَنْ تَجْعَلَ الصفا لهم ذهبا فقال عليه الصلوٰة والسلام سؤالكم كالمائدة لبنى اسرائيل فابوا ورجعوا "

کہ تم ہمارے لئے صفا پہاڑی کو سونا بنادو، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تمہارا یہ سوال تو ایسا ہی ہے جیسا کہ بنی اسرائیل نے عیسیٰ علیہ السلام سے آسمانوں سے کھانے کا دسترخوان اتارنے کا سوال کیا تھا۔ آپ کے اس ارشاد پر وہ مشرکین واپس چلے گئے۔ اور ایمان لانے سے انہوں نے انکار کر دیا۔ تیسری وجہ قریش کو خطاب کی یہ تھی کہ بعض قریش نے بھی نبی کریم ﷺ سے سوال کیا تھا ہم اللہ کو ظاہر طور پر دیکھنے کے بغیر ایمان نہیں لائیں گے۔

تیسرا احتمال: اَمْ تُرِیْدُوْنَ کے خطاب میں تیسرا احتمال یہ ہے کہ یہ خطاب یہود کو ہو۔ کیونکہ انہوں نے بھی مشرکین کی طرح نبی کریم ﷺ سے سوال کیا تھا کہ تم موسیٰ علیہ السلام کی طرح تمام کتاب ایک مرتبہ ہی لے آؤ۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے اسی قول کو زیادہ پسند کیا ہے کہ پہلے ﴿ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ ﴾ سے تمام ذکر بنی اسرائیل کا آرہا ہے اس لئے یہ خطاب بھی یہود کو ہونا زیادہ صحیح ہے۔

تمام احتمالات اجتماعی طور پر مراد ہیں: راقم کا موقف یہی ہے کہ تمام واقعات کے بعد آیۃ

﴿ وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْ بَعْدِ اِيمَانِكُمْ كُفَّارًا ج حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ج فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ط اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ (آیت ۱۰۹)

۱) بہت کتابیوں نے چاہا کاش تمہیں ایمان کے بعد کفر کی طرف پھیر دیں اپنے دلوں کی جلن سے بعد اس کے کہ حق ان پر خوب ظاہر ہو چکا ہے تو تم چھوڑو اور درگزر کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لائے بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

۲) پسند کرتے ہیں بہت اہل کتاب ، کاش پھیر دیں تمہیں بعد تمہارے ایمان کے کفر کی طرف بوجہ حسد رکھنے اپنے نفسوں میں۔ اس کے بعد جب ظاہر ہو گیا ان پر حق تو تم معاف کر دو اور درگزر کرو یہاں تک کہ لے آئے اللہ تعالیٰ اپنا حکم بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

شان نزول: فخاص ابن عازوراء اور زید بن قیس اور چند اور یہود نے احد کے واقعہ کے بعد حضرت حذیفہ بن یمان اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کو کہا، کیا تم دیکھتے نہیں کہ احد میں تمہیں مصیبت پہنچی اگر تم حق پر ہوتے تو تمہیں یہ مصیبت نہ پہنچتی۔

" فارجعوا الی دیننا فھو خیر لکم و افضل و نحن اھدی منکم سبیلا "

تم ہمارے دین کی طرف آ جاؤ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اور افضل ہے، کیونکہ ہم تم سے زیادہ سیدھی راہ پر قائم ہیں۔

حضرت عمار بن یاسر نے ان سے پوچھا تمہارے دین میں وعدہ کو توڑنے کا کیا حکم ہے؟ انہوں نے کہا وعدہ کو توڑنا بہت شدید جرم ہے، یعنی بہت بڑا گناہ ہے۔

حضرت عمار نے کہا" انی قد عاهدت انی لا اکفر بمحمد ماعشت " بے شک میں نے وعدہ کرلیا ہے کہ جب تک زندہ رہوں گا محمد (ﷺ) سے کفر نہیں کروں گا۔ اس لئے میں تمہارے دین میں آکر وعدہ کو نہیں توڑ سکتا۔

" قالت الیهود اما هذا فقد صبأ " یہودی کہنے لگے یہ شخص دین سے پھر گیا۔ یعنی اس نے بھی، ایمان قبول کر کے اچھا کام نہیں کیا، کیونکہ وہ تو صرف یہودیت کو ہی اپنا دین سمجھتے تھے۔

" وقال حذیفة واما انا فقد رضیت بالله ربا وبالاسلام دینا وبالقرآن اماما وبالکعبة قبلة و بالمؤمنین اخوانا "

حضرت حذیفہ ﷺ نے کہا میں اللہ کے رب ہونے پر (بعض مفسرین نے " و بمحمد نبیا " کے الفاظ بھی ذکر فرمائے۔ کہ محمد ﷺ کے نبی ہونے پر) اور اسلام کے دین ہونے پر، اور قرآن کے امام ہونے پر، اور کعبہ کے قبلہ ہونے اور مؤمنوں کے بھائی ہونے پر راضی ہوں۔

اس کے بعد یہ دونوں حضرات نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہود کے مکر کرنے اور دین سے پھیرنے کی کوشش کرنے اور اپنے اپنے جوابات کو حضور کے سامنے ذکر کیا۔

تو آپ نے فرمایا" اصبتما خیرا وافلحتما "تم دونوں نے بھلائی کو پالیا اور کامیابی حاصل کرلی۔

تو اس واقعہ کے بعد اس آیۃ کریمہ کا نزول ہوا کہ بہت سے اہل کتاب یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں ایمان سے پھیر کر کافر بنا دیں۔ ان کی یہ خواہش حسد کی وجہ سے ہے جو وہ اپنے نفسوں میں رکھتے ہیں۔ حالانکہ ان کے سامنے حق بہت واضح ہے۔ (از کبیر)

یعنی حق کے واضح ہونے کے بعد حق پر قائم لوگوں کو پھیرنے کی کوشش کرنا حماقت ہی حماقت ہے

شان نزول کی اور وجہ:

" روی ان کعب بن اشرف الیهودی کان شاعرا و کان یهجو النبی ﷺ وفیه انزل الله "

اور وجہ یہ بیان کی گئی کہ کعب بن اشرف یہودی اور شاعر تھا۔ نبی کریم ﷺ کی شان کے مخالف اپنے اشعار میں آپ کی ہجو کرتا تھا اور چاہتا یہ تھا کہ تمام مسلمان یہودی ہوجائیں، اس کے رد میں اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کو نازل کیا۔ (از صابونی)

شان نزول کی اور وجہ:

عام یہودی نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے آپکے وسیلہ سے جنگ میں فتح حاصل کرتے۔
" فلما جاء النبی ﷺ من ولد اسمعیل عرفوہ وکفروا بہ بعد معرفتھم ایاہ حسدا "

جب نبی کریم ﷺ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں تشریف لائے تو وہ آپ کو پہچاننے کے باوجود حسد کی وجہ سے آپ سے کفر کرنے لگے، اور اس خیال سے کہ ان کی ریاست نہ چلی جائے اور ان کے متبعین نہ ختم ہو جائیں تو وہ چاہنے لگے کہ کاش مسلمان بھی اپنے دین سے پھر جائیں۔ (از شیخ زادہ)

شان نزول کی اور وجہ:

حیی بن اخطب اور ابو یاسر بن اخطب عرب کے یہود میں سے سب سے زیادہ نبی کریم ﷺ سے حسد کرتے اور مؤمنین سے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خصوصی انعامات سے جوان کو نوازا وہ اس پر حسد کرتے تھے اور کوشش کرتے کہ مؤمنین کو ایمان سے پھیر دیں تو یہ آیۃ نازل ہوئی۔ تمام وجوہ پہلے در پیش آئیں اور آیۃ کریمہ کا نزول بعد میں ہوا اس لئے تمام وجوہ ہی شان نزول ہیں۔ (ابن کثیر)

" وَدَّ " کا معنی محبت کرنا، پسند کرنا اور چاہنا ہے۔ مودت اور محبت کا فرق پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

" كُفَّارًا " حال ہے " کم " ضمیر مخاطب سے، مطلب یہ ہے کہ بہت سے اہل کتاب چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو العیاذ باللہ مرتد بنا دیں۔

حَسَدًا : یا تو مفعول لہ ہے اور علت ہے " ود " کی۔ " یردونکم " کی علت نہیں۔ کیونکہ وہ مطلقا چاہتے تھے کہ مسلمان مرتد ہو جائیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے مصدر ہو منصوب حال ہونے کی وجہ سے ہو اور " حسدا " حاسدین کے معنی میں ہو۔ خیال رہے راقم کا ترجمہ مفعول لہ والا ہے۔

مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ : سے یہ ثابت کیا ہے کہ حسد ان کے نفسوں میں ایسا راسخ ہے جیسا کہ ان کی ذاتیات میں داخل ہے۔

﴿مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ﴾ (اس کے بعد کہ ان کے لئے حق ظاہر ہو گیا) حق ظاہر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان پر نبی کریم ﷺ کی صفات اور معجزات واضح تھے کیونکہ توراۃ میں ان کا ذکر تھا۔

فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا :العفو ترک عقوبة المذنب والصفح ترک التثریب والتانیب "
" عفو " کا معنی گناہگار کی سزا کو ترک کردینا، اور صفح کا معنی ہے ملامت کرنا چھوڑ دینا، اور اس کی طرف رجوع کرنا چھوڑ دینا۔

" صفح " میں بنسبت " عفو " کے زیادہ مبالغہ پایا گیا ہے۔ کیونکہ کبھی کوئی شخص دوسرے کو معاف تو کردیتا ہے۔ لیکن ملامت کرنا نہیں چھوڑتا۔

حتی یأتی اللہ بامرہ : (یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آجائے) ابتدائی طور پر مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ کفار اگر کچھ زیادتی کریں تو معاف کردو اور درگزر کرلو، لیکن پھر قتال کا حکم دے دیا۔ اور ارشاد فرمایا۔
" قاتلوا الذین لا یؤمنون باللہ ولا بالیوم الآخر " ان لوگوں سے قتال کرو (جنگ کرو) جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے۔

اسی طرح " امر " سے مراد قریظہ کو قتل کرنے اور بنی نضیر کو جلاء وطن کرنے کا حکم آجائے تو پھر اس پر عمل کرنا۔

" امر " سے مراد قیامت کا دن بھی ہے کہ قیامت کو ان کا فیصلہ ہوجائے گا۔ اور " امر " سے مراد قوت رسالت اور کثرت امت بھی مراد ہے۔ یعنی ابھی معاف کردو اور درگزر کردو، جب رسول اللہ ﷺ کو اپنی امت کی تعداد زیادہ ہونے پر قوت حاصل ہوجائے گی تو پھر قتال کا حکم نافذ ہوجائے گا۔

حضرت قتادہ، سدی، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا قول یہ ہے۔ " ان الآیة منسوخة بآیة السیف " بے شک یہ آیہ قتال والی آیات سے منسوخ ہے۔

البتہ بعض حضرات نے بیان کیا کہ نسخ کی تعریف جب یہ ہے کہ شارع کی طرف سے ایک حکم کی مدت کی انتہاء ہوتی ہے۔ اور دوسرے حکم کی ابتداء ہوتی ہے۔ وہ پہلا حکم مطلق ہوتا ہے۔ اسکے ساتھ اسکے حکم ختم ہونے کی قید نہیں ہوتی۔ یہاں تو ﴿فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا﴾ کے ساتھ ﴿حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ﴾ کی قید موجود ہے۔ جس سے پہلے ہی پتہ چل رہا ہے کہ اس حکم کو ختم کردیا جائے گا۔ لہٰذا یہ حکم ہمارے نزدیک بھی منسوخ نہیں۔

تاہم یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ اختلاف بھی اصطلاحات کا اختلاف ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک

منسوخ ہونے کے لئے مطلق ہونا ضروری ہے۔اور بعض کے نزدیک مقید کو بھی منسوخ کیا جا سکتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ : (بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے)

یعنی کفار سے انتقام لینا، اور مومنوں کی امداد کرنا، اور مومنوں کو کفار پر قدرت دینا اللہ تعالیٰ کی قدرت میں داخل ہے۔اور یہ بھی مراد ہوسکتا ہے کہ جو میں نے تمہیں ابھی تک معاف کرنے اور درگزر کرنے کا حکم دیا ہے اسے قبول کرلو، جس نے اس حکم سے اعراض کیا اور میرے حکم کی مخالفت کی وہ میری گرفت میں ہوگا۔میں اس کی گرفت پر قادر ہوں۔ (ماخوذ از روح المعانی)

عبداللہ بن ابی کا حسد کرنا اور نبی کریم ﷺ کا معاف کرنا:

اسی آیۃ کے مطابق علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ ایک حدیث پاک کو ذکر فرماتے ہیں۔جس سے واضح ہے کہ جب تک معاف کرنے کا حکم رہا حضور ﷺ معاف فرماتے رہے۔خصوصاً منافقین کو اس لئے بھی معاف فرماتے تھے کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ یہ اپنے مسلمان ساتھیوں کو ہی قتل کر دیتے ہیں۔ چونکہ منافقین بظاہر اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے تھے۔

"عن اسامة بن زيد اخبره ان النبی ﷺ ركب حمارا عليه اكاف تحته قطيفة فدكية واردف وراءه ابیّ وفی المجلس عبدالله بن رواحة فلما غشيت المجلس عجاجة الدابة خمر عبدالله بن ابی انفه بردائه ثم قال لاتغبروا علينا فسلم عليهم النبی ﷺ ثم وقف فنزل فدعاهم الى الله وقرأ عليهم القرآن فقال عبدالله بن ابی ايها المرء لااحسن من هذا ان كان ما تقول حقا فلا تؤذنا فی مجالسنا وارجع الى رحلك فمن جاءك منا فاقصص عليه فقال عبدالله بن رواحة اغشنا فی مجالسنا فانا نحب ذلك قال فاستب المسلمون والمشركون واليهود حتى هموا ان يتواثبوا فلم يزل النبی ﷺ يخفّضهم ثم ركب دابته حتى دخل على سعد بن عبادة فقال الى سعد الم تسمع الى ما قال ابو حباب يريد عبدالله بن ابی قال كذا قال اعف عنه يا رسول الله واصفح فوالله لقد اعطاك الله الذی اعطاك ولقد اصطلح اهل هذه البحيرة ان يتوّجوه فيعصبوه بالعصابة فلما رد الله ذلك بالحق الذی اعطاكه شرق بذلك فذلك فعل به ما رأيت فعفا عنه النبی ﷺ"

(مسلم ج ۲ باب ما لقی النبی ﷺ من اذی المشركين والمنافقين وهكذا فی البخاری)

حضرت اسامہ بن زید فرماتے ہیں۔ بے شک نبی کریم ﷺ گدھے پر سوار ہوئے اس پر زین تھی اور اس کے نیچے فدک کی بنی ہوئی ایک چادر تھی آپ نے اپنے پیچھے میرے باپ کو سوار کیا۔ آپ بنی حارث بن خزرج قبیلہ میں سعد بن عبادہ ﷜ کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔ یہ وقعہ بدر سے پہلے کا ہے۔ نبی کریم ﷺ ایک مجلس سے گذرے وہاں مسلمان اور مشرکین یعنی بت پرست اور یہود موجود تھے۔ ان میں عبداللہ بن ابی بھی موجود تھا۔ جس مجلس میں عبداللہ بن ابی تھا جب اس میں نبی کریم ﷺ کی سواری کے قدموں سے اٹھنے والی گردوغبار پہنچی تو اس نے اپنے ناک کو اپنی چادر سے ڈھانپ لیا۔ پھر کہنے لگا ہمیں غبار آلود نہ کیا کرو۔ اتنی دیر میں نبی کریم ﷺ نے ان کو سلام کہا پھر آپ ٹھہرے اور سواری سے اتر آئے۔ ان کو اللہ تعالیٰ (کی توحید) کی دعوت دی۔ اور ان پر قرآن پڑھا۔ تو عبداللہ بن ابی نے کہا اے انسان میں اسے اچھا نہیں سمجھتا۔ اگر تم حق کہتے ہو تو ہمیں ہماری مجالس میں آ کر تکلیف نہ پہنچایا کرو۔ تم اپنے گھر لوٹ کر چلے جاؤ۔ جو شخص تمہارے پاس آ جائے اسی پر بیان کیا کرو۔ تو حضرت عبداللہ بن رواحہ نے کہا (یارسول اللہ) آپ ہماری مجالس میں تشریف لایا کریں ہم اسے پسند کرتے ہیں۔

راوی کہتے ہیں اس پر مسلمانوں، مشرکوں اور یہود کے درمیان گالی گلوچ شروع ہوگئیں، یہاں تک کہ ایک دوسرے پر حملہ کرنے کا انہوں نے ارادہ کرلیا، نبی کریم ﷺ ان کو خاموش کراتے رہے۔ پھر آپ اپنی سواری پر سوار ہوئے یہاں تک کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے آئے آپ نے (ان کی عیادت کی اور) ان کو کہا، اے سعد کیا تم نے سنا نہیں جو ابوحباب نے کہا، (ابوحباب سے مراد عبداللہ بن ابی ہے) پھر آپ نے بتایا اس نے اس اس طرح کہا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ آپ اسے معاف فرما دیں اور درگزر فرمائیں۔ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی، تحقیق اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطاء کیا (جو منصب اور رفعت) جو عطاء کیا۔ (اس کی ایک وجہ آپ کے منصب کی بلندی، اور دوسری وجہ یہ تھی) اس شہر (مدینہ طیبہ) کے لوگوں نے اتفاق کرلیا تھا کہ حاکمیت کا تاج عبداللہ بن ابی کو پہنادو، اور اسی پر اتفاق کرلو اور اس کی پشت پناہی کرو۔ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو حق سے مبعوث فرمایا۔ آپ یہاں تشریف لائے، تو اس کا معاملہ رب تعالیٰ نے درہم برہم کر دیا۔ تو وہ حسد کرنے لگا، اسی وجہ سے اس نے آپ کو یہ کہا، اور آپ سے وہ سلوک کیا جو

آپ نے دیکھا تو نبی کریم ﷺ نے اسے معاف کر دیا۔

خیال رہے کہ ایک حدیث میں یہ ہے۔ " ذلک قبل ان یسلم عبداللہ " یہ عبداللہ بن ابی کے اسلام لانے سے پہلے کا واقعہ ہے اس اسلام سے مراد اس کا ظاہری اور منافقانہ طور پر اسلام لانا مراد ہے، جو اس نے بدر کے واقعہ کے بعد ظاہری طور پر اسلام لانے کا دعوی کیا تھا۔ اگر چہ وہ مرتے دم تک کافر اور منافق ہی رہا۔

ایک اور حدیث میں ہے۔ " فکان بینھم ضرب بالجرید و بالاید والنعال" مسلمانوں اور کفار کے درمیان چھڑیاں، ہاتھ اور جوتے چل گئے، یعنی لڑائی شروع ہو گئی۔

دونوں حدیثوں میں اختلاف نہیں، مطلب یہ ہے کہ انہوں نے ایک دوسرے پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا کہ ایک دوسرے کو قتل کر دیں، تاہم ان کے درمیان چھڑیوں اور مکوں اور جوتوں سے لڑائی شروع ہو گئی تھی۔

خیال رہے کہ اور حدیث شریف میں یہ بھی ہے۔

" قال الیک عنی فواللہ لقد آذانی نتن حمارک قال فقال رجل من الانصار واللہ لحمار رسول اللہ ﷺ اطیب ریحا منک "

عبداللہ بن ابی نے کہا تم مجھ سے دور ہٹ جاؤ، مجھے تمہارے گدھے کی بو سے تکلیف پہنچی ہے۔ وہاں ہی ایک انصاری صحابی تھے انہوں نے کہا قسم ہے اللہ تعالی کی رسول اللہ ﷺ کا گدھا تمہاری اعلی قسم کی خوشبو سے بھی زیادہ خوشبودار ہے۔ یعنی کستوری کی خوشبو سے بھی آپکے گدھے میں زیادہ خوشبو ہے۔

یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ بعض اوقات مختلف احادیث کا مجموعی بیان واقع کی تکمیل کرتا ہے۔ جیسا کہ یہاں تمام احادیث کو جمع کریں تو واقعہ مکمل نظر آئے گا۔

حسد کے متعلق علامہ رازی رحمہ اللہ کا تفصیلی بیان:

اسی آیۃ کریمہ کی تفسیر میں علامہ رازی رحمہ اللہ نے حسد کی تعریف اور حسد کے اسباب اور حسد کی برائی کو بیان فرمایا ہے۔ جس کا ذکر کرنا یقیناً بہت مفید ہے۔

حسد کی مذمت میں احادیث:

(۱) قال علیه الصلوٰة والسلام " الحسد یأکل الحسنات کما تأکل النار الحطب "

حسد نیکیوں کو ایسے کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔

(۲) حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں۔ہم ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے نبی کریم ﷺ نے فرمایا اس راستہ سے ایک شخص آ رہا ہے جو جنتی ہے۔تو انصار میں سے ایک شخص آ گئے، جن کی داڑھی وضوء کی وجہ سے صاف ستھری تھی، انہوں نے اپنے بائیں ہاتھ میں اپنے جوتے پکڑے ہوئے تھے۔تو انہوں نے سلام کیا دوسرے دن نبی کریم ﷺ نے وہی کل والا ارشاد فرمایا۔اور آنے والے بھی وہی شخص تھے۔اور تیسرے دن بھی آپ نے وہی ارشاد فرمایا اور آنے والے بھی وہی شخص تھے۔

جب نبی کریم ﷺ مجلس سے اٹھ کر تشریف لے گئے۔تو عبداللہ بن عمرو بن العاص اس شخص کے پیچھے چلے، اور ان کو کہا کہ مجھے اپنے باپ سے کچھ تکلیف پہنچی ہے۔میں نے قسم اٹھالی کہ ان کے پاس (یعنی اپنے گھر) تین دن داخل نہیں ہوں گا۔اس لئے میرا خیال ہے کہ آپ مجھے اپنے گھر تین دن رکھ لیں (تاکہ میری قسم پوری ہو جائے) انہوں نے کہا ٹھیک ہے آ جاؤ۔(یہ ان کے گھر چلے گئے) تین راتیں ان کے پاس گزاریں۔عبداللہ بن عمرو بن العاص نے ان کو رات کو اٹھ کر زیادہ عبادت کرتے ہوئے نہ دیکھا سوائے اس کے کہ وہ جب اپنے بستر پر کروٹ بدلتے تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے۔وہ رات کو قیام نہیں کرتے تھے۔نہ دیکھا سوائے اس کے کہ فجر کی نماز کے لئے اٹھتے۔اور البتہ ان سے خیر کے کلمات کے بغیر کوئی کلمہ نہ سنا گیا۔

جب تین راتیں گزر گئیں۔تو یہ کہتے ہیں کہ میں نے ان کے عمل کو کم سمجھا۔تو میں نے کہا اے اللہ کے بندے میرے اور میرے والد کے درمیان کوئی رنجش نہیں تھی۔لیکن میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ نے (تمہارے متعلق) اس اس طرح فرمایا تو میں نے ارادہ کیا کہ میں تمہارے اعمال کو دیکھوں، لیکن میں نے تمہارے اعمال کو کثیر نہیں پایا، تو وہ کیا وجہ ہے جس کی وجہ سے تم اس مرتبے پر پہنچے ہو، تو انہوں نے کہا میرے عمل تو اور کوئی نہیں سوائے اس کے جو تم نے دیکھ لئے۔

یہ کہتے ہیں جب میں نے پیٹھ پھیر لی۔ یعنی واپس لوٹنے لگا، تو آپ نے مجھے واپس بلایا، اور کہا

" ما هو الا ما رأيت غير انى لم اجد على احد من المسلمين فى نفسى عيبا و لا حسدا على خير اعطاه الله اياه "

کہ اور تو کوئی عمل نہیں سوائے اس کے جو تم نے دیکھا ہے۔ البتہ مسلمانوں میں سے میں کسی ایک کو عیب نہیں لگاتا۔ اور اللہ تعالیٰ نے کسی کو اگر کوئی بھلائی عطاء کی ہو تو میں اس پر حسد نہیں کرتا۔

" فقال عبدالله هى التى بلغت بك وهى التى لا تطاق "

حضرت عبداللہ نے کہا یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے تم اس منصب پر پہنچے ہو، اس کی ہر شخص طاقت نہیں رکھتا۔

(۳) قال عليه الصلوة والسلام رب اليكم داء الامم قبلكم ، الحسد والبغضاء ، والبغضة هى الحالقة لا اقول حالقة الشعر ولكن حالقة الدين "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا پہلی امتوں کی بیماری تمہیں لاحق ہوگئی۔ یعنی حسد اور بغض اور بغض حالقہ ہے، حالقہ کہنے سے میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ بالوں کو مونڈنے والی کوئی چیز ہے، بلکہ میرا مقصد تو یہ ہے کہ وہ دین کو برباد کردینے والی چیز ہے۔

(۴) قال عليه الصلوة والسلام انه سيصيب امتى داء الامم قالوا ماداء الامم قال الاشر والبطر والتكاثر والتنافس فى الدنيا والتباعد والتحاسد حتى يكون البغى ثم الهرج "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا، بے شک میری امت کو وہی بیماری لگ جائے گی، جو پہلی امتوں کو لگی۔ صحابہ کرام نے پوچھا (یارسول اللہ) وہ پہلی امتوں کی بیماری کون سی تھی۔ آپ نے فرمایا حرص اور اکڑ (تکبر) اور کثرت مال، اور دنیا کو پسند کرنا، اور ایک دوسرے سے دور رہنا اور حسد کرنا یہاں تک کہ ان میں بغاوت آجائے گی۔ پھر قتل کرنا ایک دوسرے کو ان میں واقع ہو جائے گا۔

(۵) موسیٰ علیہ السلام جب رب کے حضور حاضر ہوئے تو عرش کے سائے میں ایک شخص کو دیکھا، آپ کو اس پر رشک آیا، اور آپ نے کہا یہ شخص رب تعالیٰ کا مکرم ہے۔ اپنے رب سے اس کے نام کے متعلق سوال کیا۔ اس کا نام تو آپ کو نہ بتایا گیا۔ البتہ رب نے کہا۔

" احدثك من عمله ثلاثا كان لايحسد الناس على ما آتاهم الله من فضله ، و كان لا يعق

والدیه ولا یمشی بالنمیمة"

میں تمہیں اس شخص کے تین عمل بتاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اپنے فضل سے جو مال وغیرہ عطاء فرمایا یہ ان پر حسد نہیں کرتا تھا۔ اور اپنے والدین کی نافرمانی نہیں کرتا تھا۔ اور چغلخوری نہیں کرتا تھا۔

(۶) قال علیه الصلوة والسلام ان لنعم الله اعداء قیل وما اولئک قال الذین یحسدون الناس علی ما آتاهم الله من فضله"

نبی کریم ﷺ نے بیان فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے دشمن ہیں، آپ سے پوچھا گیا وہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا جو لوگوں سے حسد کرتے ہیں اس چیز پر جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ان کو عطاء کیا ہوتا ہے۔

حسد کی مذمت میں آثار:

عوف بن عبداللہ گئے فضل ابن مہلب کے پاس جب وہ واسط کے حاکم تھے، تو انہوں نے کہا میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں۔ " ایاک والکبر " کہ اپنے آپ کو تکبر سے بچا کر رکھو، کیونکہ یہی سب سے پہلا گناہ ہے جس کی وجہ سے ابلیس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی، پھر آپ نے یہ آیۃ پڑھی۔

﴿ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ﴾

اور جب ہم نے کہا فرشتوں کو سجدہ کرو آدم کو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے اس نے انکار کیا اور تکبر کیا۔

پھر انہوں نے کہا " ایاک والحرص فانه اخرج آدم من الجنة " تم اپنے آپ کو حرص سے بچا کر رکھو کیونکہ حرص نے آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالا۔ پھر انہوں پڑھا۔ " اهبطا منها " رب تعالیٰ نے آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو حکم دیا جنت سے اتر جاؤ۔ پھر انہوں نے کہا۔ " ایاک والحسد فانه قتل ابن آدم اخاه حین حسده " اپنے آپ کو حسد سے بچا کر رکھو، بے شک حسد کی وجہ سے آدم علیہ السلام کے ایک بیٹے نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا۔

☆ ابن زبیر کہتے ہیں میں نے کسی ایک پر دنیا کی وجہ سے حسد نہیں کیا، اس لئے کہ اگر وہ دنیا دار

جنتی ہے۔ " فکیف احسده علی الدنیا وھی حقیرة فی الجنة " تو میں اس پر دنیا کی وجہ سے کیوں حسد کروں جو بنسبت جنت کے حقیر ہے اور اگر وہ شخص جہنمی ہے۔ "فکیف احسده علی امر الدنیا وھو یصیر الی النار " تو میں اس سے کیسے حسد کروں دنیا کی وجہ سے جو جہنم تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔

☆ قال معاویة کل الناس اقدر علی رضاه الا الحاسد فانه لا یرضیه الا زوال النعمة "

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں تمام لوگوں کو راضی کرنے پر قادر ہوں سوائے حاسد کے، حسد کرنے والے کو سوائے نعمت کے زوال کے کوئی چیز راضی نہیں کرسکتی۔

☆ اور بعض بزرگوں نے کہا ہے حاسد مجالس میں سوائے مذمت اور ذلت کے کچھ حاصل نہیں کرسکتا۔ اور حاسد ملائکہ سے سوائے لعنت اور ان کی ناراضگی کے کچھ حاصل نہیں کرسکتا۔ اور حاسد مخلوق سے سوائے جزع وفزع کے کچھ حاصل نہیں کرسکتا۔ اور حاسد کو جزع وفزع سے زیادہ شدت اور ڈر ہی حاصل ہوتا ہے۔ اور حاسد کو موقف (حساب وکتاب کے لئے قیامت میں ٹھہرنے کے مقام) میں سوائے رسوائی اور عذاب کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

حسد کیا ہے؟ جب اللہ تعالیٰ نے تمہارے بھائی کو نعمت عطاء کی ہو۔ " فان اردت زوالھا فھذا ھو الحسد " اور اس نعمت کے زوال کو تم چاہتے ہو تو یہ حسد ہے۔

خیال رہے کہ حسد میں یہ ضروری نہیں کہ انسان یہ خواہش کرے کہ اس کی نعمت زائل ہو کر مجھے مل جائے۔ کبھی یہ خواہش ہوتی ہے۔ لیکن کبھی دوسرے کی نعمت کا صرف زوال طلب کیا جاتا ہے۔ اس کے حصول کی تمنا نہیں ہوتی، جیسا کہ زیر بحث آیۃ میں واضح ہے اہل کتاب مؤمنین سے ایمان کا زوال تو چاہتے تھے۔ لیکن اپنے لئے ایمان بھی نہیں چاہتے تھے۔

" وان اشتھیت لنفسک مثلھا فھذا ھو الغبطة والمنافسة " اور اگر کسی کی نعمت کے زوال کو تم نہ چاہو صرف یہ تمنا کرو کہ یہ نعمت مجھے بھی مل جائے اسے "غبطہ اور منافسہ" کہا جاتا ہے۔ جسے ہم اپنی زبان میں "رشک کرنا" کہتے ہیں۔ حسد ہر حال میں حرام ہے۔ البتہ اگر نعمت کسی فاجر یا کافر کو حاصل ہو جس کی وجہ سے شر اور فساد پھیلا رہا ہو۔

" فلا یضرک محبتک لزوالها " تو اس شخص کی نعمت کے زوال کی تمنا کرنا جائز نہیں۔ اس لئے کہ اس کی نعمت کے زوال کی تمنا مقصود نہیں، بلکہ اس کی نعمت اور مال و دولت کے زوال کی فقط اس لئے تمنا پائی گئی ہے کہ اس کے فساد سے لوگوں کو آرام مل جائے۔ جیسا کہ کوئی غاصب لیڑا ملک کا حکمران بن جائے، دین اسلام کا مخالف ہو جائے۔ یہود و نصاری کا یار بن جائے تو اس کی حکمرانی کے زوال کی دعاء کرنا حسد نہیں، گناہ نہیں، بلکہ مستحب ہے۔

حسد کی جو تعریف کی گئی ہے اس پر قرآن پاک شاہد ہے۔ ایک تو یہی آیۃ جس کی بحث جاری ہے۔ اس میں ذکر ہے۔ " لویردونکم من بعد ایمانکم کفارا حسدا من عند انفسهم " کثیر اہل کتاب یہ چاہتے ہیں۔ (کاش وہ تمہیں ایمان سے کفر کی طرف پھیر لیں بوجہ اپنے نفسوں میں حسد رکھنے کے) یعنی وہ ایمان والوں کی نعمت ایمان کا زوال چاہتے یہی ان کا حسد تھا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ﴿ وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَآءً ﴾ (النساء آیۃ ۸۹)

وہ (منافقین) تو چاہتے ہیں کہ کہیں تم بھی کافر ہو جاؤ جیسے وہ کافر ہوئے تم سب ایک سے ہو جاؤ

اس آیۃ کریمہ سے بھی ثابت ہے کہ منافقین چاہتے تھے کہ مؤمنین سے ایمان جیسی نعمت عظمیٰ زائل ہو جائے۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿ إِن تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِن تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا ﴾

اگر تمہیں بھلائی پہنچے تو ان کو (منافقین کو) غمناک کر دیتی ہے۔ اور اگر تمہیں کوئی مصیبت پہنچے تو وہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔

" وهذا الفرح شماتة والشماتة والحسد متلازمان " کسی کی مصیبت پر خوش ہونا درحقیقت شماتت ہے لیکن شماتت اور حسد ایک دوسرے کو لازم ہیں۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے حسد کی تعریف پر کئی اور آیات کو بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن مسئلہ سمجھنے کیلئے میرے خیال میں اتنے دلائل ہی کافی ہیں۔ ہر آیۃ کی مکمل وضاحت اپنے اپنے محل سے ہی تعلق رکھتی ہے۔

منافسہ اور غبطہ کا حکم: منافسہ کبھی واجب ہوتا ہے، کبھی مستحب اور کبھی مباح۔

منافسہ واجبہ: اگر دوسرے شخص کو دینی نعمت حاصل ہے جیسا کہ ایمان، نماز اور زکوۃ، اسکی تمنا کرنا واجب ہے، کیونکہ اگر انکی تمنا نہیں کرے گا تو اسکے خلاف تو معصیت ہے اور معصیت پر راضی ہونا حرام ہے۔

منافسہ مستحبہ: واما ان کانت تلک النعمة من الفضائل المندوبة کالانفاق فی سبیل اللہ والتشمیر لتعلیم الناس کانت المنافسة فیھا مندوبة"

اگر کسی کو مستحب کاموں پر عمل کرنے کی نعمت حاصل ہے تو اس جیسی نعمت کے حصول کی تمنا مستحب ہے۔ جیسا کہ کسی کو رب تعالیٰ نے اپنی راہ میں خرچ کرنے کی توفیق عطاء کر رکھی ہے اور لوگوں کو دین کی تعلیم دینے پر کوئی کمربستہ ہو تو ان میں منافسہ مستحب ہے۔

منافسہ مباح: اگر کسی کو مباح قسم کی نعمتیں حاصل ہیں تو ان جیسی نعمتوں کی طلب مباح ہوگی۔ جیسا کہ کسی کے کپڑے دیکھ کر، سواری وغیرہ دیکھ کر یہ تمنا کرے مجھے بھی ایسی چیزیں حاصل ہوں۔

تنبیہ: اگر کسی کو نعمت حرام طریقہ سے حاصل ہے تو انسان یہ چاہے کہ مجھے بھی اسی قسم کی نعمت حاصل ہو جائے اور بے شک حرام طریقہ سے ہی حاصل ہو جائے یہ منافسہ حرام ہوگا۔

حاصل کلام: نتیجہ واضح ہوا کہ کسی کی نعمت کے زوال کا مطالبہ حرام ہے، اور کسی کی نعمت کے زوال کی طلب نہ ہو، لیکن اس جیسی نعمت کے حصول کی طلب جائز ہے۔

منافسہ کے جواز پر دلائل: (۱) ﴿وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ﴾ اور اسی پر چاہئے کہ للچائیں للچانے والے، اس سے پہلے جنت کی نعمتوں کا ذکر ہے، پھر ان پر رغبت رکھنے اور حاصل کرنے کی تمنا کا حکم دیا۔

پتہ چلا کہ کسی کو حاصل شدہ نعمتوں جیسی نعمتیں حاصل ہونے کی تمنا کرنا جائز ہے بشرطیکہ اس کی نعمت کا زوال نہ طلب کیا جائے۔

(۲) اوررب تعالیٰ نے ارشادفرمایا؛﴿ سَابِقُوْا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ اپنے رب کی مغفرت کی طرف سبقت کرو۔یعنی ایک دوسرے سے آگے بڑھنے اور مغفرت حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

کیونکہ سبقت اس وقت کی جاتی ہے جب یہ خوف ہو کہ ہوسکتا ہے میری سستی کی وجہ سے وہ نعمت مجھ سے رہ نہ جائے جس طرح دوغلام ہوں تو ایک دوسرے سے آگے نکل کر اپنے مولیٰ سے انعام حاصل کرنا چاہیں۔

اس آیۃ سے بھی یہ واضح ہوا کہ کسی نعمت کے حاصل کرنے میں کوشش کرنا کسی سے آگے بڑھنا جائز ہے۔

☆ نبی کریم ﷺ نے فرمایا " **لا حسد الا فی اثنین رجل آتاه الله مالا فانفقه فی سبیل الله ، ورجل آتاه الله علما فهو یعمل به و یعلمه الناس** "

سوائے دوشخصوں کے کسی سے حسد نہ کرے، ایک وہ جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطاء کیا ہواور وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا ہواور ایک وہ جس کو اللہ تعالیٰ نے علم عطاء کیا ہو وہ اس پر عمل کرتا ہواور لوگوں کو بھی تعلیم دیتا ہو۔

" وهذا الحديث يدل على ان لفظ الحسد قد يطلق على المنافسة "

اس حدیث پاک سے واضح ہو رہا ہے کہ کبھی حسد کا مجازی معنی منافسہ لیا جاتا ہے ،جیسا اس حدیث میں حسد کا اطلاق منافسہ پر ہے۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ حدیث میں ''دو'' کی قید اتفاقی ہے، ہر شخص جو نیکی کا عمل کرے، اس جیسی نیکی کے حاصل کرنے کی تمنا مستحب ہے،خواہ وہ نیکی کوئی بھی ہو۔

تنبیہ : منافسہ کی دوصورتیں ہیں ۔ایک منافسہ محضہ اور دوسرا منافسہ مستلزمِ حسد، پہلی قسم والا منافسہ جائز ہے۔دوسرا ناجائز ہے۔

منافسہ محضہ : یہ ہے کہ دوسرے کی نعمت کو دیکھ کر یہ طلب کرے کہ مجھے بھی یہ نعمت مل جائے ،نہ تو یہ اس کی نعمت کا زوال طلب کرے،اور نہ ہی اسکی طلب اسکی نعمت کے زوال کو مستلزم ہو، یہ منافسہ جائز ہے۔

منافسہ مستلزم حسد یہ ہے کہ اگر چہ یہ دوسرے کی نعمت کا زوال طلب نہیں کر رہا،لیکن اس کی طلب ایسی ہے جو اس کی نعمت کے زوال کو مستلزم ہے تو یہ حسد ہی ہے جو ناجائز ہے۔ جیسا کہ ایک شخص کسی کے مکان، کسی کی سواری، کسی کے منصب وغیرہ کو دیکھ کر یہ تمنا کرے کہ اس کی یہ چیز مجھے مل جائے۔ اس میں دوسرے کی نعمت کا زوال لازم آتا ہے۔ یہ ناجائز ہے۔ ہاں البتہ یہ خیال کر کے وہ بیچے میں خریدلوں یہ تمنا جائز ہے۔

حسد سے نکلنا قوت ارادیہ پر مبنی ہے:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "ثلاث لاينفک المؤمن عنهن الحسد والظن والطيرة"

تین چیزیں ایسی ہیں جن سے مؤمن کا چھٹکارا نہیں، وہ یہ ہیں حسد اور ظن (کسی کے خلاف بدگمانی) اور فال پکڑنا۔ اور بعد میں آپ نے یہ ذکر فرمایا " وله منهن مخرج اذا حسدت فلا تبغ" ان سے نکلنا کا یہ طریقہ ہے کہ جب تمہارے دل میں حسد آئے تو اس پر عمل نہ کرو، یعنی پختہ ارادہ اور ہمت سے اس سے باز آجاؤ۔ یہی طریقہ دوسری دو چیزوں سے نکلنے کا بھی ہے۔

حسد کے مراتب: علامہ غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ حسد کے چار مراتب ہیں۔

(۱) دوسرے کی نعمت کے زوال کو چاہنا، خواہ اسے وہ نعمت حاصل نہ بھی ہو۔ یہ حسد کا درجہ انتہاء حسد اور مقصودِ حسد ہے۔

(۲) حسد کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ بظاہر تو یہ دوسرے کی نعمت کا زوال طلب نہیں کر رہا، بلکہ صرف اپنے لئے وہ نعمت طلب کر رہا ہے۔ لیکن جب تک اس کی نعمت زائل نہ ہو اسے مل نہیں سکتی جیسا کہ یہ طلب کرے کہ اس کی خوبصورت زوجہ مجھے مل جائے۔ اسے تب ہی ملے گی جو اس سے اس کی زوجیت کا زوال ہوگا۔ یہ تمنا مستلزم زوال نعمت غیر ہے۔

(۳) تیسرا درجہ حسد کا یہ ہے کہ اس کی تمنا دوسرے شخص سے برابری حاصل کرنے کی ہو۔ پہلی تمنا تو یہ ہو کہ مجھے بھی اس کی نعمت جیسی نعمت مل جائے۔ ہاں اگر مجھے اس جیسی نعمت نہ ملے تو

دوسری تمنا یہ ہے کہ اس کی نعمت بھی زائل ہو جائے تا کہ دونوں میں برابری ہو جائے۔

(۴) چوتھا درجہ جو حقیقت حسد نہیں بلکہ منافسہ اور غبطہ ہے، مجازی طور پر اسے حسد کہا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ دوسرے کی نعمت کا زوال طلب نہ کیا جائے، نہ دوسرے کی نعمت کے زوال کو اس کی تمنا مستلزم ہو، اس کی تمنا صرف یہ ہو کہ مجھے اس کی نعمت جیسی مل جائے۔

" وهذا الاخير هو المعفو عنه ان كان فى الدنيا و المندوب اليه ان كان فى الدين "

یہ چوتھی قسم اگر دنیا کی طلب ہو تو معاف ہے یعنی اس پر کوئی گناہ بھی نہیں اور ثواب بھی نہیں۔ اگر دین کے کاموں کی طلب ہو تو مستحب ہے جس پر ثواب ہوتا ہے۔

باقی تینوں قسمیں ناجائز ہیں۔ پہلی قسم زیادہ مذموم (بری) ہے۔ دوسری اس سے کچھ کم، اور تیسری اس سے بھی کچھ کم۔

حسد کے اسباب:

(۱) عداوت اور بغض حسد کا سبب ہیں۔ جب کوئی شخص کسی کو اذیت پہنچائے، تو جسے تکلیف پہنچائی جائے اس کے دل میں بغض اور غضب پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ غضب کینہ پیدا کرتا ہے، اور کینہ کی وجہ سے وہ انتقام لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر انتقام نہ لے سکے تو پھر یہ چاہتا ہے کہ اسے کوئی مصیبت پہنچے، اگر اسے کوئی مصیبت پہنچے تو وہ خوش ہوتا ہے۔ اور کوئی نعمت حاصل ہو تو یہ غم اور پریشانی میں مبتلاء ہو جاتا ہے۔ اور یہی چاہتا ہے کہ اس کی نعمت کب زائل ہو جائے

اسی سے واضح ہو گیا کہ بغض اور غضب کو حسد لازم ہے۔ کبھی ان سے جدا نہیں ہوتا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ کبھی وہ اپنی عداوت اور حسد کو ظاہر کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، اور دل ہی دل میں جلتا رہتا ہے۔ جب اسے مصیبت پہنچے تو یہ خوش ہوتا ہے۔

حسد کی اسی قسم کا رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا؛

" واذا لقوكم قالوا امنا واذا خلوا عضوا عليكم الانامل من الغيظ قل موتوا بغيظكم ان الله عليم بذات الصدور ، ان تمسسكم حسنة تسؤهم وان تصبكم سيئة يفرحوا بها "

جب وہ (منافقین) آپ سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں۔اور جب علیحدہ ہوتے ہیں تو غصے کی وجہ سے تم پر انگلیوں کے پورے کاٹتے ہیں۔فرمادو اپنے غیظ وغضب کی وجہ سے مرجاؤ، بے شک اللہ تعالیٰ سینوں کی باتوں کو جاننے والا ہے۔اگر تمہیں کوئی بھلائی پہنچے تو ان کو پریشانی ہوتی ہے۔اور اگر تمہیں کوئی مصیبت پہنچے تو وہ خوش ہوتے ہیں۔

کبھی کبھی وہ حسد کو اپنے کلام سے ظاہر بھی کرتے رہتے ہیں۔لیکن دلوں میں اور ہی زیادہ وہ حسد رکھتے ہیں۔

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ ﴾

وہ پسند کرتے اسے جو تمہیں مشقت پہنچے، ظاہر ہو گیا ہے بغض ان کے مونہوں سے، اور جو ان کے سینے چھپا کر رکھتے وہ اور ہی بڑا ہے۔

" واعلم ان الحسد ربما افضی الی التنازع والتقاتل "

اس قسم کا حسد جس کا سبب غیظ وغضب اور عداوت ہو وہ بسا اوقات جھگڑے اور فساد اور قتل وغارت تک پہنچا دیتا ہے۔

(۲) حسد کا دوسرا سبب ہے " تـعـزز " اپنے آپ کو بڑی عزت والا سمجھنا، جب کسی ایک کو کوئی منصب حاصل ہو جائے جس کی وجہ سے اسے رفعت (بلندیٔ شان) حاصل ہو جائے، یہ برداشت نہ کر سکے اور یہی چاہے کہ اس کا وہ منصب زائل ہو جائے۔

اس صورت میں یہ ضروری نہیں کہ یہ تمنا کرے کہ مجھے بھی وہ منصب مل جائے۔بلکہ اس کا مقصد تو یہ ہے کہ وہ مجھ سے اونچا نہ رہے، بلکہ میرے برابر ہو جائے۔یہ صرف اس کی رفعت اور منصب کا زوال چاہتا ہے۔

(۳) " الاستخدام من الغیر " تیسرا سبب حسد کا یہ ہے کہ کسی کی طبیعت میں یہ ہو کہ وہ یہ چاہے کہ لوگ میری خدمت گزاری میں رہیں۔جب کسی اور کو کوئی نعمت مل جائے تو یہ سمجھے کہ جب

کوئی شخص با کمال ہوگیا تو وہ میری خدمت کیسے کرے گا۔لہٰذا یہ نعمت اس سے زائل ہو جائے تو پھر ہی وہ مجھے سردار اور چوہدری مانے گا۔

یہی حسد کفار نبی کریم ﷺ سے رکھتے تھے، وہ کہتے تھے۔

"کیف یتقدم علینا غلام یتیم و کیف نطاطئ له رؤوسنا"

ایک یتیم کو ہم پر برتری کیسے حاصل ہوگئی، ہم اس کے سامنے سر کیسے جھکائیں۔

رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا؛

﴿ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْآنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴾

اور انہوں نے کہا قرآن کیوں نازل نہیں ہوا ان دو بستیوں (مکہ اور طائف) کے کسی بڑے شخص پر یعنی وہ لوگ مال دار، اور سردار اور چوہدری، اور بیجا حکم چلانے والوں کو اپنے زعم باطل میں بڑا سمجھتے تھے۔

اسی طرح قریش کے قول کو رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا۔﴿ أَهٰؤُلَاءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْ بَيْنِنَا ﴾ کیا یہی لوگ ہیں جن پر ہمارے درمیان اللہ تعالیٰ نے احسان فرمایا۔یعنی انہوں نے نبی کریم ﷺ اور آپ کے خاندان کو حقیر سمجھتے ہوئے (معاذ اللہ) یہ کہا۔

(۴) حسد کا چوتھا سبب ہے ''تعجب'' جس طرح اللہ تعالیٰ نے پہلی امتوں کی خبر دی۔انہوں نے انبیاء کرام کو کہا ﴿ مَا اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ﴾ نہیں ہو تم مگر ہمارے جیسے بشر۔

فرعون اور اس کی قوم نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے متعلق کہا۔

﴿ اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَ قَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُوْنَ ﴾ کیا ہم اپنے جیسے دو بشروں پر ایمان لے آئیں جن کی قوم کے لوگ ہمارے خدمت گزار ہیں۔

اور انہوں نے تعجب کرتے ہوئے کہا۔ "ابعث الله بشرا رسولا" کیا اللہ تعالیٰ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا۔اور رب تعالیٰ نے ان کے تعجب کو ذکر فرمایا۔

﴿ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ﴾

کیا تم تعجب کرتے ہو اس پر کہ تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آئی تمہارے پاس تم میں سے ہی ایک شخص کے ذریعے جو تمہیں ڈراتا ہے۔

ان تمام آیات سے واضح ہوا کہ ان لوگوں کے ایمان نہ لانا اور انبیاء کرام کی رسالت ونبوت کو نہ تسلیم کرنے ،اور اس پر حسد کرنے کا سبب تعجب تھا۔

(۵) حسد کا پانچواں سبب مقاصد کے فوت ہونے کا خوف ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب کئی لوگ ایک ہی مقصد، ایک منصب، ایک ہی نعمت کے حصول کے لئے ایک دوسرے سے مزاحمت کریں کبھی تو ایک ہی عورت سے شادی کرنے کے لئے کئی آدمی تمنا کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے ہر حربہ استعمال کرتے ہیں۔ اور حسد کرتے ہیں کہ اسے یہ نعمت نہ حاصل ہو۔

اسی طرح کبھی بھائی ایک دوسرے پر حسد کرتے ہیں کہ دوسرے بھائی کو والدین محبوب نہ سمجھیں والدین اسے نہ مال دیں اور نہ اس پر شفقت کریں۔ یہی حسد حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ ان کے بھائیوں کو تھا۔

اسی طرح یہ حسد کبھی واعظین کو حاصل ہوتا ہے، وہ چاہتے ہیں کہ ایک دوسرے سے لوگوں کی مقبولیت میں اور مال کے حاصل کرنے میں بڑھ جائیں۔

اللہ کے فضل وکرم سے راقم اس حسد سے بچا ہوا ہے۔ نہ تو سحر آمیز وعظ آتا ہے، اور نہ ہی مال کی ہوس وتمنا کبھی کی، اور نہ ہی وعظ وخطاب کا شوق دل میں آیا، سیدھے سادے انداز میں لوگوں کو مسائل بتا دیتا ہوں، انداز تکلم کسی کو پسند آئے یا نہ آئے کبھی فکر نہیں ہوتی۔

(۶) حسد کا چھٹا سبب ہے کہ ریاست کو پسند کرے، اور اپنے لئے ایسے مراتب پسند کرے کہ دوسرا اس کے ساتھ اس کے فن میں کوئی شریک نہ ہو، اگر اسے پتہ چل جائے کہ کوئی اور اس جیسا فن رکھتا ہے تو یہ اس کی موت کی تمنا کرے۔ کہ وہ مر جائے تاکہ میرا فن اور میرا منصب یکتا رہے دوسرا اس میں کوئی شریک نہ ہو۔

یا یہ تمنا کرے کہ اس سے وہ نعمت ہی زائل ہو جائے، تاکہ میرا ثانی کوئی نہ رہے۔ راقم کے

خیال میں یہ حسد طبیبوں میں زیادہ پایا جاتا ہے۔اکثر طور پر وہ نسخے سنبھال کر رکھتے ہیں کسی کو نہیں بتاتے بلکہ یوں کہا جائے کہ وہ اپنے نسخے اپنے ساتھ ہی لے کر مر جاتے ہیں۔

(۷) حسد کا ساتواں سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں پر بھلائی کے کاموں میں بخل کرنا، یعنی جب کوئی شخص سخاوت کرے تو اسے پسند نہ آئے، وجہ اس کی بھی درحقیقت یہ ہوتی ہے کہ سخاوت کی وجہ سے جب کسی کی تعریف کی جائے تو اسے پسند نہ آئے اسی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ "البخیل من بخل بمال غیرہ" کامل بخیل وہ ہے جو غیر کے مال سے بخل کرے۔یعنی خود سخاوت نہ کرنا تو دور کنار ہے بلکہ دوسرے کی سخاوت پر بھی جلنا اور حسد کرنا۔

جیسا کہ آج کل یہود و نصاریٰ کے یار دینی مدارس کے امداد کرنے والوں پر جل رہے ہیں۔اور یہ سوچ رہے ہیں کہ ان لوگوں کو تنگ کیا جائے جو امداد کرتے ہیں لیکن ان مکاروں اور منافقوں کو معلوم نہیں کہ

نہ رہا ابن زیاد نہ اس کا جور و جفا　　　رہا تو نام حسین جسے زندہ کرتی ہے کربلا

" وھذا خبث فی الجبلة لاعن سبب عارض فتعسر ازالته "

یہ حسد نفس کی خباثت کی وجہ سے ہوتا ہے۔اس میں کوئی اسباب عارض نہیں ہوتے، اسی وجہ سے پلید شیطانوں کا حسد زائل ہونا مشکل ہوتا ہے۔

حسد کے اسباب سے سمجھ آیا:

ابھی تک حسد کے جو اسباب ذکر کئے گئے ہیں ان سے یہ سمجھ آیا کہ ایک ہی منصب اور ایک ہی پیشہ والے ایک دوسرے سے حسد کریں گے۔دوسرے سے نہیں۔

عالم، عالم سے حسد کرتا ہے عابد سے نہیں، عابد، عابد سے حسد کرتا ہے عالم سے نہیں، تاجر، تاجر سے حسد کرتا ہے۔جوتا بنانے والا، جوتا بنانے والے سے حسد کرتا ہے کپڑا بیچنے والے سے نہیں۔ایک شخص اپنے بھائی اور اپنے چچازاد سے جتنا حسد کرتا ہے اتنا دوسرے لوگوں سے حسد نہیں کرتا۔عورت اپنی سوکن سے جتنا حسد کرتی ہے اتنا اپنے خاوند کی ماں اور بیٹی سے حسد نہیں کرتی۔

حسد سے بچنے کا ذریعہ:

حسد کو زائل کرنے کی دواء دو چیزیں ہیں۔ایک علم، دوسرا عمل۔

علم کے پھر دو مقام ہیں۔اجمال اور تفصیل،

علم اجمالی یہ ہے کہ انسان یہ جانے کہ جس چیز کا تعلق وجود سے ہے خواہ موجود ہے یا موجود ہونا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور قضاء میں داخل ہے۔جب انسان کو یہ علم حاصل ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کی قضاء اور تقدیر پر راضی ہو جائے۔تو حسد خود بخود زائل ہو جائے گا، اس لئے کہ انسان اس پر کامل یقین رکھے گا کہ جو مجھے ملا ہے یا ملنا ہے وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں ہے جو دوسرے کو حاصل ہے وہ بھی اسی کی تقدیر میں ہے۔میرے حسد کرنے اور جلنے کا کیا فائدہ۔

علم تفصیلی یہ ہے کہ انسان کو یہ علم حاصل ہونا چاہئے کہ حسد کا نقصان مجھے ہی حاصل ہونا ہے دین میں اور دنیا میں بھی۔ میں نے جس سے حسد کیا اس کا نقصان نہ تو دینی ہے اور نہ دنیاوی۔ بلکہ میرے حسد کا اسے نفع ہی نفع ہونا ہے۔دین میں بھی اور دنیا میں بھی۔

حسد کرنے والے کو دین میں نقصان ہونے کی چند وجوہ ہیں۔

(۱) اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انسان کو یہ معلوم ہونا چاہیے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے جو تقسیم فرمائی وہ اس کی حکمت کے تقاضا کے مطابق ہے، اگر میں نے اللہ تعالیٰ کی تقسیم کو ناپسند سمجھا اور اس کی تقسیم میں جھگڑا کیا تو یہ اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک پر اعتراض ہوگا۔ جو ایمان سے دور ہونے کا ذریعہ بن جائے گا۔

(۲) انسان کو یہ علم ہونا چاہیے کہ اگر میں نے کسی سے حسد کیا تو مجھے اللہ تعالیٰ کے ولیوں سے دور ہونا پڑے گا اور شیطان کا قرب حاصل ہو جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اولیاء اللہ اس پر خوش ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو نعمتوں سے نوازا ہے۔ جب کوئی شخص اللہ کے بندوں کی نعمتوں پر حسد کرے اولیاء اللہ اسے اپنے آپ سے دور کر دیتے ہیں۔

لیکن شیطان اور تمام کافر حسد کرنے والے پر خوش ہوتے ہیں۔لہٰذا وہ حسد کرنے والے کو اپنا

قریبی دوست بنا لیتے ہیں۔

(۳) "العقاب العظیم المرتب علیه فی الآخرة" حسد کرنے والے کو دینی نقصان کی تیسری وجہ یہ ہے کہ اسے آخرت میں بہت بڑا عذاب ہوتا ہے۔

حسد کرنے والے کو دنیاوی نقصان یہ ہوتا ہے۔ کہ حسد کی وجہ سے وہ ہمیشہ غم میں ہوتا ہے، اور اس کی طبیعت بجھی بجھی رہتی ہے۔ اور سب سے بڑا نقصان اے حسد کرنے والے تیرا یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تیرے دشمنوں کو نعمتیں عطاء کرتا ہی رہے گا۔ جب تو نے ہر نعمت کو دیکھ کر جلنا ہے تو تجھے ہر وقت غم میں رہنا پڑے گا۔

اور غم کی وجہ سے تیرے بدن کو مرض لاحق ہوگی اور صحت تیری زائل ہو جائے گی۔ اور تجھے وسوسہ کی بیماری لاحق ہوگی کھانے پینے میں تجھے کوئی لذت حاصل نہیں ہوگی۔

ابھی تک جو ذکر کیا ہے۔ اس سے بہت واضح ہو گیا ہے کہ حسد کرنے والے کو دین و دنیا میں نقصان ہوتا ہے۔

جس سے حسد کیا جائے اس کا دین اور دنیا میں کوئی نقصان نہیں۔

جب یہ بات واضح ہے کہ کسی کے حسد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا زوال نہیں ہو سکتا، بلکہ جب تک اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں رہنا ہے اس وقت تک رہنا ہی رہنا ہے۔ کیونکہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

﴿ فَاِنَّ كُلَّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ﴾ بے شک ہر چیز اس کے ہاں ایک اندازے کے مطابق ہے، یعنی ہر چیز تقدیر کے مطابق ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ﴿ وَلِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ﴾ ہر اجل لوح محفوظ میں ہے۔

جب ہر چیز کا وقت مقرر ہے، ہر چیز رب تعالیٰ کی تقدیر میں ہے تو کسی کے حسد کرنے سے دوسرے کا کیا نقصان ہونا ہے۔

﴿ ومهما لم تزل النعمة بالحسد لم يكن على المحسود ضرر فى الدنيا ولا عليه اثم فى الآخرة ﴾

جب حسد کی وجہ سے نعمت کا زوال نہیں تو جس سے حسد کیا جائے اس کا دنیا میں کوئی نقصان نہیں اور نہ ہی اسے آخرت میں کوئی گناہ ہوتا ہے کہ اس کا اخروی نقصان ہو۔

جس سے حسد کیا جائے اسے دین میں یہ نفع حاصل ہوتا ہے۔ کہ وہ مظلوم ہے، حاسد اپنے قول اور فعل سے اسے ایذاء پہنچاتا ہے۔ اس کی غیبت کرتا ہے۔ اس پر عیب لگاتا ہے، اس کی پردہ دری کرتا ہے۔ اس کے گناہوں کا ذکر کرتا ہے۔

یہ تمام چیزیں دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لئے نعمتیں اور ہدیئے ہیں۔ کیونکہ اگر حسد کرنے والے نے اس سے اپنے ذمہ حقوق کو معاف نہ کرایا تو قیامت کے دن اس کی نیکیاں اسے دے دی جائیں گی، جس سے یہ حسد کرتا رہا۔ جس سے حسد کیا جائے اسے دنیا میں بھی نفع حاصل ہوتا ہے، کیونکہ انسان کی اہم غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ دشمنوں کو غم پہنچانا چاہتا ہے، جب حاسد اس کی نعمتوں کو دیکھ کر جلے گا، اور اسے غم لاحق ہوگا تو یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا کہ اپنے حاسد دشمن کو جلا رہا ہے۔

" ان العاقل لایشتھی موت عدوہ بل یرید طول حیاتہ لیکون فی عذاب الحسد "

عقلمند شخص اپنے دشمن کی موت کی تمنا نہیں کرتا۔ بلکہ اس کی لمبی حیاتی کو چاہتا ہے۔ تاکہ وہ حسد کے عذاب میں مبتلاء رہے۔

لا مات اعداؤک بل خلدوا　　حتی یروا منک الذی یکمد

لازلت محسودا علی نعمة　　فانما الکامل من یحسد

تمہارے دشمن نہ مریں بلکہ ہمیشہ زندہ رہیں۔ یہاں تک کہ تمہاری نعمتوں کو دیکھ کر ان کی طبیعت میں جمود رہے۔

جس سے حسد کیا جائے ان کی نعمتیں قائم رہیں۔　　تاکہ حسد کرنے والوں کا حسد کامل ہوتا رہے

" ان الحاسد یصیر مذموما بین الخلق ملعونا عندالخالق وھذا من اعظم المقاصد للمحسود "

بے شک حسد کرنے والا مخلوق کے ہاں مذموم (قابل مذمت) ہوتا ہے۔ اور خالق کے ہاں لعنت کا مستحق ہوتا ہے۔ لہٰذا جس سے حسد کیا جائے گا اسے عظیم مقصد حاصل ہو گیا کہ اس کا دشمن مخلوق کے ہاں مذموم اور خالق کے ہاں ملعون ہے۔

عمل سے حسد کا زوال:

ان الحاسد اذا اتی بضد موجبات الحسد علی سبیل التکلف یصیر ذلک بالآخرہ طبعا لہ فیزول الحسد عنہ"

حسد کرنے والا جب حسد کے اسباب کے خلاف کام شروع کردے اگرچہ ابتدائی طور پر تکلف سے وہ کام کرے گا لیکن آہستہ آہستہ وہ کام اسکی طبیعت میں راسخ ہو جائیگا۔ اور حسد کا زوال ہو جائیگا۔

واضح ہوا کہ حسد کے موذی مرض کی دواء علم اور عمل ہے۔ پہلے یہ پتہ چلے کہ حسد کے نقصانات کیا ہیں۔ پھر حسد کے اسباب کے خلاف محنت و مشقت کرے تو ان شاء اللہ حسد سے اسے نجات حاصل ہو جائیگی۔

(ماخوذ از کبیر، واحیاء العلوم)

آیۃ کریمہ سے حاصل ہونے والے مسائل:

اہل کتاب مؤمنین کو ایمان سے ہٹانے کو پسند کرتے تھے، حالانکہ ان پر یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ ایمان صواب (درست) اور حق ہے۔

اور وہ بھی جانتے تھے کہ جو شخص حق پر ہو اسے حق سے پھیرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس پر شبہات نہ ڈالیں جائیں۔ " لان المحق لایعدل عن الحق الا بشبھۃ "

شبہ وہ دو قسم کا ڈالتے تھے، ایک تو یہ کہ مسلمانوں کو کہنا تمہیں گھروں سے نکالا گیا ہے۔ تم پر معیشت تنگ ہے۔ یعنی مال و دولت کی تمہارے پاس کمی ہے۔ اور تم پر کفار کی جنگوں کا ہر وقت خوف مسلط رہتا ہے۔ لہٰذا " فاترکوا الایمان الذی ساقکم الی ھذہ الاشیاء " تم ایمان کو چھوڑ دو جس نے تمہیں ان چیزوں کی طرف پہنچایا ہے۔ اور وہ شبہات اس طرح پیش کرتے کہ نبی کریم ﷺ کے جو اوصاف اور علامات توراۃ میں بیان کئے گئے تھے۔ ان کو بدل دیتے تھے، اور آپ کے معجزات پر شکوک و شبہات پیدا کر کے لوگوں کو ایمان سے پھیرنے کی کوشش کرتے لیکن صحابہ کرام کو ایمان سے پھیرنا ان کی طاقت سے باہر تھا۔

﴿ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا ﴾ (معاف کرواور در گذر کرو) کا یہ مطلب نہیں کہ وہ تمہیں ایمان سے پھیرنے کی کوشش کریں تو تم ان کے اس عمل کو پسند کرلو اس لئے کہ یہ کفر ہے۔

" ولایجوز ان یأمرهم تعالی بالعفو والصفح علی وجه الرضاء بما فعلوا لان ذلک کفر "

بلکہ اس کا مطلب یہ ہے۔ " ان المراد ترک المقابلة والاعراض عن الجواب " کہ تم ان سے مقابلہ کو چھوڑ دو، اور جواب دینے سے اعراض کرلو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آجائے۔ (پہلے وضاحت ذکر کی جاچکی ہے)۔

اعتراض: حسد کرنے والے کے دل میں نفرت پائی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ حسد کرتا ہے۔ جس شخص سے یہ حسد کر رہا ہے جب اس کے خلاف اس کے دل میں نفرت ہے۔ " فهذا امر غیر داخل فی وسعه فکیف یعاقب علیه " تو اس پر عذاب کیسے ہوگا، دل میں پائی جانے والی چیزوں پر تو بندے کو اختیار ہی نہیں۔

جواب: اس کی وسعت میں دو چیزیں پائی گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ اس نفرت پر راضی ہے۔ لہٰذا دل میں پائی جانے والی نفرت پر راضی ہونا جب اسی کے اختیار میں ہے تو اس وجہ سے یہ عذاب کا مستحق ہوگا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ اس نفرت کا اظہار دوسرے کے عیب بیان کر کے کرتا ہے، اور اس کی نعمتوں کو زائل کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے، اور اس کی نعمت کے زوال کے اسباب کو پسند کرتا ہے، یہ سب کچھ اس کے اختیار میں ہے۔ اسی پر عذاب مرتب ہوگا۔ (از کبیر)

☆☆☆

﴿ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَاللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴾ (۱۱۰)

۱) اورنماز قائم رکھواورزکوۃ دواوراپنی جانوں کے لئے جو بھلائی آگے بھیجو گے اسے اللہ کے یہاں پاؤ گے، بے شک اللہ تمہارے کام دیکھ رہا ہے۔

۲) اور قائم رکھونماز، اوردوزکوۃ، اور جوآگے بھیجوگے اپنی جانوں کے لئے پالوگے اسے اللہ کے ہاں، بے شک اللہ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے۔

اس سے پہلی آیت میں یہود کو معاف کرنے اور درگزر کرنے کا حکم دیا۔ جس میں غیر کی اصلاح مقصود تھی۔

اب اس آیۃ کریمہ میں نماز ادا کرنے اورزکوۃ دینے اور ہر قسم کے نیکی کے کام کا حکم دے کران کواپنے نفسوں کی اصلاح کا حکم دیا گیا۔ (از کبیر)

﴿ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ﴾ کے متعلق پہلے وضاحت ذکر ہو چکی ہے

﴿ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ﴾ عطف علی (فاعفوا) كأنه تعالىٰ امرهم بالصبر والمخالقة واللجأ الى الله تعالىٰ بالعبادة والبر ﴾ (بیضاوی)

﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ الخ کا عطف ہے (فَاعْفُوْا) پر، گویا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی آیۃ کریمہ میں ان کو صبر کرنے اور حسن خلق کا حکم دیا، اب اس آیۃ کریمہ میں عبادت اور نیکی سے پناہ پکڑنے کا حکم دیا۔

" واقیموا الصلوۃ ...... الخ " سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو عبادت پر برانگیختہ کیا تا کہ قیامت کے دن ان کو نفع ہو، دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کی ان کو امداد حاصل ہو، اور قیامت کے دن بھی رب تعالیٰ کی طرف سے ان کو نصرت حاصل ہو، قیامت کے دن اعمال نے ہی کام آنا ہے۔ اس دن کوئی عذر قبول نہیں ہوگا۔ (از ابن کثیر)

﴿وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ﴾

(اور جو آگے بھیجو تم اپنے نفسوں کے لئے بھلائی کے کام)

" فان الخير يتناول اعمال البر كلها " خیر کالفظ نیکی کے تمام کاموں کوشامل ہے۔خواہ وہ فرائض ہوں یا نوافل ہوں، نماز ہو یا صدقات ہوں، البتہ نماز اور زکوۃ کو علیحدہ ذکر کیا ہے اس پر تنبیہ کرتے ہوئے کہ یہ اللہ کے ہاں عظمت شان اور قدر میں بلندی رکھتی ہیں۔

نماز اللہ تعالیٰ اور اس کے بندے کے درمیان قربت کا ذریعہ ہے، جو تمام نیکی کے افعال کو جامع ہے۔اور اس میں بہت ہی زیادہ خشوع اور خضوع (عجز وانکسار) پایا جاتا ہے۔اور نماز میں اللہ تعالیٰ کے حضور قیام اور اس ذات کبریاء سے عاجز بندے کی مناجات پائی جاتی ہے۔اور اسی نماز میں تمام باطنی اعضاء استعمال ہوتے ہیں۔ کیونکہ دل میں نیت پائی جاتی ہے۔اور خلوص پایا جاتا ہے۔اور رب تعالیٰ کا خوف پایا جاتا ہے۔اور اس کی رضاء پائی جاتی ہے۔اور ذہن عقلی نماز میں رب تعالیٰ کی تعظیم اور تکریم کے لئے حاضر ہوتا ہے تاکہ اللہ کی نعمتوں کا ہر عضو شکر کر سکے۔جتنی انسان کی وسعت ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کو بجالاتا ہے۔

اسی طرح زکوۃ قربة مالیه ہے،اور اغنیاء اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا میں مال عطاء کر کے اور اس کو ضروریات میں خرچ کرنے کی توفیق عطا کر کے اور لذت عیش عطا فرما کر اپنے فضل سے نوازا ہے تو وہ لوگ زکوۃ ادا کر کے رب تعالیٰ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔رب تعالیٰ کے حکم کو بجالا کر ایک فریضہ کو ادا کرنے کی ذمہ داری پوری کرتے ہیں بالخصوص اللہ تعالیٰ نے جب زمین کو تمام کے لئے مسخر کیا ہے۔﴿ وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا ﴾

اور زمین کی تمام چیزوں کو تمام کے نفع کے لئے بنایا، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا ﴾ پھر بعض لوگوں کو جب زیادہ نعمتیں عطاء ہوں تو ان کا شکر کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔

اور زکوۃ ادا کرنے میں تالیف قلوب بھی پائی گئی ہے۔کیونکہ جس کو زکوۃ دی جائے گی اسکے دل میں دینے والے کیلئے الفت پائی جائے گی۔اسی طرح ایک دوسرے پر اظہار شفقت ورحمت پایا جائیگا۔

اور زکوۃ کا ادا کرنا اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ذریعہ ہے۔" فان الراحمين يرحمهم ارحم الراحمين " کیونکہ رحم کرنے والوں پر ارحم الراحمین رحم کرتا ہے۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

تنبیہ: علامہ رازی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا ہے کہ نماز اور زکوٰۃ احکام فرضیہ ہیں، ان دو کا ذکر عظمت شان کی وجہ سے کر دیا گیا، اور باقی فرضی عبادات ان کے ضمن میں آ گئی ہیں۔ اور ﴿وَمَا تُقَدِّمُوا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ﴾ میں " خیر " سے مراد نفلی نمازیں اور نفلی صدقات ہیں۔

راقم کے نزدیک علامہ رازی رحمہ اللہ نے " من خیر " سے مراد " التطوعات من الصلوٰة والزکوٰت " جو ذکر کیا ہے اس سے مراد بھی یہ ہے کہ نفلی نمازوں اور صدقات کا ذکر ان کی عظمت شان کے پیش نظر کر دیا گیا باقی ہر قسم کی بھلائیاں ان کے ضمن میں آ گئیں۔

راقم کے نزدیک تو یہ عظمت قرآن ہے کہ جب یہ بیان کرو کہ " من خیر " سے مراد ہر قسم کی نیکی کا کام ہے خواہ فرض ہو یا نفل، خواہ نماز و زکوٰۃ ہو یا اس کے علاوہ، البتہ نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ان کی عظمت شان اور رفعت قدر کے پیش نظر کر دیا گیا ہے۔

یا یوں بیان کیا جائے کہ نماز اور زکوٰۃ کا ذکر کر کے تمام فرائض کو ذکر کر دیا گیا۔ اور "من خیر" سے مراد نفلی نماز اور صدقات ذکر کر کے تمام نفلی نیکیوں کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

حکمت: " والحكمة الكلية فی جميع ما انعم الله تعالىٰ به على المكلفين فی الدنيا ان يقدموه الى معادهم ويدخروه الى يومهم الآجل "

اللہ تعالیٰ نے مکلفین کو جو نعمتیں عطاء کی ہیں ان تمام کا تقاضا یہی ہے کہ ان کو قیامت کے لئے آگے بھیجے، رب تعالیٰ نے پاؤں دیئے ہیں تو نیکی کے کاموں کی طرف ان سے چل کر جائے، غرضیکہ ہر عضو، ہر نعمت کو رب کی راہ میں لگا کر اپنی آخرت کو سنوارنے کا ذریعہ بنائے۔

☆ حدیث پاک میں ہے۔

" ان العبد اذا مات قال الناس ما خلّف وقالت الملائكة ما قدّم "

انسان جب فوت ہو جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں وہ پیچھے کیا چھوڑ کر گیا، اور فرشتے کہتے ہیں اس نے آگے کیا بھیجا، یعنی مرنے والے کے ورثاء مال کی فکر میں ہوتے ہیں لیکن فرشتے اس کے نیکی کے کاموں کو دیکھتے ہیں، جن پر اسے جزاء و خیر کا مستحق قرار دیا جاتا ہے۔

☆ عن عبدالله قال قال رسول الله ﷺ " ايكم مال وارثه احب اليه من ماله " قالوا يارسول الله ما منا من احد الا ماله احب اليه من مال وارثه قال رسول الله ﷺ " ليس منكم من احد الامال وارثه احب اليه من ماله ، مالك ما قدمت و مال وارثك ما اخرت "

(نسائی و هكذا فی البخاری بالالفاظ المختلفة)

حضرت عبداللہ ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''تم میں سے کون سا شخص اپنے مال سے زیادہ اپنے وارث کے مال کو محبوب رکھتا ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کیا یارسول اللہ ہم میں سے کوئی ایک بھی نہیں جسے اپنے مال سے زیادہ اپنے وارث کے مال سے محبت ہو (یعنی ہر شخص اپنے مال کو ہی پسند کرتا ہے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جسے اپنے مال سے زیادہ وارث کے مال سے محبت نہ ہو۔

تمہارا مال تو وہ ہے جو تم نے آگے بھیج دیا۔ اور جو تم نے پیچھے چھوڑا وہ تمہارے وارث کا مال ہے۔

☆ " وعن عمر بن خطاب ﷺ انه مر ببقيع الغرقد فقال السلام عليكم اهل القبور اخبار ما عندنا ان نساء كم قد تزوجن و دوركم قد سكنت واموالكم قد قسمت فاجابه هاتف يا ابن الخطاب اخبار ما عندنا ان ما قد مناه وجدناه ، وما انفقنا فقد ربحناه وما خلفناه فقد خسرناه "

حضرت عمر بن خطاب ﷺ جنت البقیع سے گزرے تو آپ نے فرمایا " السلام عليكم اهل القبور " اے قبروں والو تم پر سلام ہو۔ ہمارے پاس (تمہاری) خبر یہ ہے، کہ تمہاری بیویوں نے اور شادیاں کر لیں، اور تمہارے گھروں میں تمہارے ورثاء رہ رہے ہیں، اور تمہارے مال تقسیم کر لئے گئے ہیں۔

غیبی آواز آپ کے پاس آئی، جس میں یہ جواب دیا گیا اے ابن خطاب ہمارے پاس (ہماری) خبر یہ ہے کہ جو ہم نے آگے بھیجا وہ ہم نے پالیا۔ اور جو ہم نے خرچ کر لیا اس سے ہم نے نفع اٹھالیا۔ اور جو ہم پیچھے چھوڑ آئے اس میں ہمیں خسارہ ہوا۔

قدم لنفسک قبل موتک صالحا . واعمل فليس الى الخلود سبيل

اپنی موت سے پہلے اپنے لئے نیکی کے عمل کر لے۔ اور عمل کر لے یہاں تو نے ہمیشہ نہیں رہنا۔

قدم لنفسک توبة مرجوة قبل الممات وقبل حبس الالسن

اپنے لئے توبہ کی قبولیت کی امید پر عمل آگے بھیج

موت کے آنے سے پہلے، اور زبان کے بند ہونے سے پہلے

ولدتک اذ ولدتک امک باكيا والقوم حولک يضحكون سرورا

فاعمل ليوم تكون فيه اذا بكوا في يوم موتک ضاحكا مسرورا

جب تیری ماں نے تجھے جنا تو تو رو رہا تھا اور لوگ تیرے ارد گرد خوشی سے ہنس

رہے تھے۔
آج کچھ عمل کرلے کہ تیری موت کے وقت لوگ رو رہے ہیں، تو خوشی سے ہنس رہا ہو۔

سابق الی الخیر وبادر بہ فانما خلفک ما تعلم
وقدم الخیر فکل امرئ علی الذی قدمہ یقدم

نیکی کے کاموں میں سبقت کر اور اس کی طرف جلدی کر جو تو نے پیچھے چھوڑ جانا ہے اسے تو جانتا ہی ہے۔
نیکیاں آگے بھیج، ہر انسان نے جو آگے بھیجنا ہے اسی سے اس نے آگے بڑھنا ہے۔

اسعد بمالک فی حیاتک انما یبقی وراءک مصلح و مفسد
و اذا ترکت لمفسد لم یبقہ واخوا الصالح قلیلہ یتزید
وان استطعت فکن لنفسک وارثا ان المورّث نفسہ لمسدّد

نیکی کی راہ میں اپنا مال اپنی زندگی میں خرچ کرلو، تمہارے پیچھے باقی رہنے والے کوئی نیک ہوں گے کوئی فسادی۔
جب تم نے اپنا مال فساد پھیلانے والوں کے لئے چھوڑا تو وہ ضائع ہوگیا۔ اور نیک لوگوں کو دیا ہوا قلیل مال بھی بڑھتا رہے گا۔
اگر تم طاقت رکھتے ہو تو اپنا وارث اپنے آپ کو ہی بنالو، جو اپنے آپ کو اپنا وارث بنا لیتا ہے وہ درست راہ پر ہوتا ہے۔

اس تمام بحث سے یہ واضح ہوا کہ اپنے لئے آگے بھیجی ہوئی نیکی نے ہی کام آنا ہے۔ جو مال اللہ کی راہ میں اپنی زندگی میں خرچ کرلیا اس کا نفع حاصل ہوتا ہے۔ اسی کا خود وارث بنتا ہے۔ (از قرطبی)

"تجدوہ عند اللہ" (پالو گے اسے اللہ کے ہاں) یعنی جو کام بھی نیکی کا تم نے کیا اس کا ثواب تم اللہ کے ہاں پالو گے۔

یہاں یہ مطلب نہیں کہ تم وہ اپنے اعمال ہی پالو گے۔ عمل تو باقی نہیں رہتے۔ البتہ ان کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔ (از کبیر)

﴿اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ (بے شک اللہ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے) یعنی تمہارے اعمال کو رب تعالیٰ دیکھ رہا ہے۔ اس لئے تمہارا کوئی عمل ضائع نہیں جائے گا۔ خواہ وہ نیک عمل ہوا یا برا۔ ہر عمل کے مطابق عمل کرنے والے کو ثواب یا عذاب دیا جاتا ہے۔ (از کبیر)

﴿وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾

۱) اور اہل کتاب بولے ہرگز جنت میں نہ جائے گا مگر وہ جو یہودی یا نصرانی ہو یہ ان کی خیال بندیاں ہیں۔تم فرماؤ لاؤ اپنی دلیل اگر سچے ہو۔

۲) اور انہوں نے کہا ہرگز داخل نہیں ہوگا جنت میں سوائے اس کے جو یہودی ہو یا نصرانی، یہ آرزوئیں ہیں ان کی۔تم فرماؤ، لے آؤ تم دلیل اگر ہو تم سچے۔ (آیت ۱۱۱)

اس آیۃ کریمہ میں یہود و نصاری کے کلام کو خلط ملط کرنے اور مسلمانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات ڈالنے کا ذکر کیا جارہا ہے۔کہ وہ کہنے لگے جنت میں تو صرف یہود جائیں گے۔اور دوسرے فرقے کا دعویٰ تھا جنت میں صرف نصاریٰ جائیں گے۔ان کا مطلب یہی ہوتا تھا کہ مسلمان اسلام سے پھر جائیں۔ (از کبیر)

شانِ نزول: نجران کے یہود و نصاریٰ کا ایک وفد نبی کریم ﷺ کے پاس آیا۔وہ ایک دوسرے کی تکذیب کرنے لگے۔یہود کہنے لگے کہ جنت میں صرف یہود جائیں گے۔نصاریٰ کہنے لگے جنت میں صرف نصاریٰ جائیں گے۔اگرچہ مقصد ہر فریق کا مسلمانوں کے دلوں میں مشکوک و شبہات ڈالنا تھا۔تاہم ضمناً ہر فریق ایک دوسرے کی تکذیب بھی کر رہا تھا۔

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى: (اور انہوں نے کہا ہرگز جنت میں نہیں داخل مگر وہ جو یہودی ہو یا نصرانی) یہاں یہ مطلب نہیں کہ یہود و نصاریٰ مجموعی طور پر یہ کہتے تھے کہ جنت میں ہم یہودی اور نصرانی جائیں گے۔بلکہ یہودی صرف اپنے جنتی ہونے کے دعویدار تھے۔اور نصرانی صرف اپنے جنتی ہونے کے دعویدار تھے۔

اس پر قریب ہی آنے والی آیۃ کریمہ شاہد ہے۔﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۪ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ﴾ یہود نے کہا نصاری کسی چیز (کسی

دین) پرنہیں۔اور نصرانیوں نے کہا یہود کسی چیز (یعنی کسی دین) پرنہیں۔

اس سے واضح ہوا کہ ہر فریق دوسرے فریق کو بے دین سمجھتا تھا۔لہٰذا یہود کا نصرانیوں کو جنتی کہنا کسی طرح بھی ثابت نہیں ہوسکتا۔اسی طرح نصاریٰ کا یہود کو جنتی کہنا بھی ثابت نہیں ہوسکتا۔(از خازن)

(وقالوا) عطف علی (ود) والضمیر لاھل الکتاب من الیھود والنصاری " (وقالوا) کا عطف ہے(ود) پراور ضمیر " اھل کتاب " کی طرف لوٹ رہی ہے۔اہل کتاب یہودی بھی ہیں اور نصرانی بھی ہیں۔ " ھودا او نصاری " لف ونشر مرتب ہیں۔یعنی حاصل کلام یہ ہوا۔" وقالت الیھود والنصاری لن یدخل الجنۃ الا من کان ھودا او نصاری "

لف ونشر مرتب یہ ہوتا ہے کہ پہلے چند چیزوں کو ایک ساتھ ذکر کردیا جائے۔پھر چند چیزیں ذکر ہوں۔پہلی کا تعلق پہلی سے ہواور دوسری کا تعلق دوسری سے ہو۔جیسا کہ یہاں " وقالوا " کی ضمیر ''اہل کتاب'' کی طرف لوٹ رہی ہے۔اس سے مراد ''یہود اور نصاریٰ'' ہیں۔اب " ھودا " کا تعلق یہود سے ہوگیا۔اور نصاریٰ کا تعلق نصاریٰ سے ہوگیا۔

اب معنوی طور پر مطلب یہ ہوگیا۔" وقالت الیھود لن یدخل الجنۃ الا من کان ھودا وقالت النصاری لن یدخل الجنۃ الا من کان نصاری "اور یہود نے کہا ہرگز جنت میں کوئی داخل نہیں ہوگا سوائے یہودیوں کے۔اور نصاریٰ نے کہا ہرگز جنت میں کوئی داخل نہیں ہوگا سوائے نصرانیوں کے۔ (از بیضاوی و شیخ زادہ)

اعتراض : کان میں ضمیر جو اسم ہے وہ واحد ہے۔اور خبر " ھودا او نصاری " جمع ہے۔ ''کان '' کا اسم واحد اور خبر جمع کیسے صحیح ہے؟

جواب : چونکہ لفظ " من " کا ذکر ہے۔جو لفظی طور پر واحد ہے۔لیکن اس کے معنی میں عموم پایا جاتا ہے،اس لئے معنوی طور پر جمع ہے۔اسی وجہ سے اس کی دونوں حیثیتوں کا لحاظ کیا گیا ہے۔(روح المعانی)

" ھودا " فراء کے نزدیک اصل میں " یھود " تھا،یاء کو حذف کردیا گیا۔لیکن باقی حضرات کے نزدیک " ھود "جمع ہے۔ " ھائد "کی،جس کا معنی ''توبہ کرنا'' چونکہ یہود نے بچھڑے کی پوجا کے بعد توبہ کرلی تھی اس لئے ان کو " ھود " کہہ لیا گیا۔

"نصاریٰ" لفظ ماخوذ ہے " نصرة " سے جس کا معنی ہے، امداد کرنا۔ نصاریٰ کا نام عیسیٰ علیہ السلام کی امداد کی وجہ سے نصاریٰ رکھ لیا گیا۔ (از شیخ زادہ و عزیزی)

﴿ تِلْکَ اَمَانِیُّهُمْ ﴾ (یہ ان کی آرزوئیں ہیں) امانی جمع ہے امنیة کی۔ اصل میں امنوية ہے بروزن افعولة جیسے اضحوكة اور "اعجوبة" استعمال ہوتے ہیں۔ اور یہ لفظ "التمنی" سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے آرزو کرنا تمنا کرنا۔ (مدارک)

راقم نے اسی کے مطابق معنی کیا ہے، لیکن " تلک الامانی الباطلة " باطل آرزوئیں مراد ہیں، اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے۔ "یہ ان کی خیال بندیاں ہیں"۔

تنبیه : "امنية" کا معنی کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ وہ کلام جو واقع ہونے والی تقریر پر از روئے تمنا کے برانگیختہ کرے۔ اور کبھی صرف تقدیر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے۔

ولا تقولن لشئ سوف افعله حتی تلاقی ما یمنی لک المانی

تم ہرگز کسی چیز کے متعلق یہ نہ کہو کہ میں یہ کروں گا۔

یہاں تک تمہاری ملاقات تو اسی سے ہوتی ہے جو تمہاری تقدیر میں ہونا ہے۔

اور کبھی " امنية "کا معنی صرف تمنا کرنا ہے خواہ حق ہو یا باطل ہو، جس طرح اس آیۃ میں استعمال ہے ﴿ تِلْکَ اَمَانِیُّهُمْ ﴾ یہ جملہ معترضہ ہے، لیکن یہاں جملہ معترضہ کا یہ معنی نہیں کہ ایک جملہ نامکمل ہونے کے درمیان یہ واقع ہے، بلکہ یہاں یہ مطلب ہے کہ دو کلامیں جو معنوی طور پر متصل ہیں ان کے درمیان یہ جملہ واقع ہے۔ اور اس کا کوئی محل اعراب نہیں۔

دو کلاموں کے درمیان اتصال کیسے ہے؟ وہ یہ کہ نبی کریم ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آپ ان کو فرمائیں ﴿ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَکُمْ ﴾ (تم دلیل لاؤ) دلیل تو دعوی پر لائی جاتی ہے۔ ان کا دعوی یہ تھا۔

﴿ لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْنَصٰرٰی ﴾

اعتراض: جملہ معترضہ تو پہلے جملہ کی تاکید کے لئے آتا ہے۔ اس جملہ میں پہلے جملہ کی تاکید کیسے پائی گئی۔

جواب : پہلا جملہ ہے ﴿ وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ﴾ یہ ان کے من گھڑت اور باطل دعویٰ کی حکایت ہے۔اور " امــانـــی " کا معنی کبھی یہ بھی ہوتا ہے۔ "لاثبــوت لهــا " اس کا کوئی ثبوت نہیں۔اب پہلے جملہ اور اس جملہ معترضہ کا مجموعی مفہوم یہ ہو گیا۔ "قـول لا دليـل عليـه غير ثابت " یہ ان کا ایسا قول ہے کہ جس پر کوئی دلیل نہیں اور نہ ہی یہ ثابت ہے۔جیسا کہ کسی شاعر نے کہا؛

من ادعى شيئا بلا شاهد　　　لابد ان تبطل دعواه

جو شخص بلا دلیل دعویٰ کرے　　　ضروری ہے کہ اس کا دعویٰ باطل ہو۔

(ماخوذ از شیخ زادہ)

قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ: "فرمادو لے آؤ تم دلیل اگر تم سچے ہو"

" قل " خطاب ہے نبی کریم ﷺ کو (قل) یعنی یا محمد،اے محمد آپ فرمادیں۔ (خازن)

اعلیٰ حضرت کئی مقام پر " قــل " کا معنی کرتے ہیں۔"اے محبوب" تو اس سے کئی جہلاء جل کر دھوکا میں مبتلاء ہو جاتے ہیں کہ "اے محبوب" کسی لفظ کا معنی نہیں۔کاش ان کو پتہ ہوتا کہ یہ " قل " میں ضمیر کے مرجع کا ذکر ہے۔ " هاتوا "میں مختلف احتمالات پائے گئے ہیں۔

(۱) هاتوا اصل میں " هاتيوا " ہے،امر ہے،اس کا فعل " هـاتـى يهاتى " استعمال ہوتا ہے۔ اس کا معنی حاضر کرو،لاؤ۔ یہ قول ہے ابو حیان کا۔اسی کو علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے پسند کیا ہے

(۲) دوسرا احتمال یہ ہے کہ " هـاتـوا " اصل میں " آتوا " ہے۔ ہمزہ کو " هـاء " سے بدل دیا گیا ہے۔تفسیر ابی السعود اور عزیزی میں یہی قول ذکر کیا گیا ہے۔(معنی وہی ہے حاضر کرو۔لاؤ)

(از کبیر)

(۳) " هات صوت بمنزلة هاء في معنى احضر " " هات " صوت ہے " هاء " کی طرح معنی وہی ہے حاضر کرو لاؤ یہ قول علامہ رازی رحمہ اللہ کا ہے۔ (از کبیر)

(۴) یہ اسم فعل ہے،امر کے معنی میں ہے۔معنی وہی ہوگا "لاؤ" دوسرے اقوال کے ساتھ صاوی میں یہ قول بھی مذکور ہے۔

راقم کے نزدیک یہ تمام احتمالات دراصل اس لفظ کے استعمال کے مختلف طریقے ہیں۔یعنی ان تمام طریقوں پر یہ استعمال ہوتا ہے۔اور ہر طریقہ درست ہے،کسی قول کو غلط کہنا غلط ہے۔

(برھانکم) البرھان الدلیل علی صحة الدعوی " دعویٰ کے صحیح ہونے پر جو دلیل لائی جائے اسے برھان کہا جاتا ہے۔

" برھان " یاتو مشتق ہے۔" البرہ " سے،اورنون زائد ہے۔اس صورت میں معنی ہوتا ہے۔" قطع کرنا " دلیل بھی دعویٰ میں واقع ہونے والے شبہات کو منقطع کر دیتی ہے،اس لئے اسے برھان کہا جاتا ہے۔

اور بعض حضرات نے کہا ہے۔" برھان " مشتق ہے۔" البرھنة " سے،اس صورت میں نون اصلی ہوگا۔معنی یہ ہوگا "بیان کرنا" چونکہ دلیل سے دعویٰ کو بیان کیا جاتا ہے۔اس لئے اسے برھان کہا جاتا ہے۔

﴿اِنْ کُنْتُمْ صَادِقِیْنَ﴾ (اگر تم سچے ہو) جواب شرط محذوف ہے،ماقبل ﴿ھَاتُوْا بُرْھَانَکُمْ﴾ اس پر دلالت کر رہا ہے کیونکہ محققین نحویوں کے نزدیک جزاءِ شرط مقدم نہیں ہوسکتی شرط سے۔

اب مکمل مفہوم یہ ہوگیا۔اے محبوب آپ فرمادو کہ اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو کہ جنت کے مستحق صرف ہم ہی ہیں تو اپنے دعویٰ پر دلیل لاؤ۔ (از روح المعانی)

یعنی اگر تم دلیل نہیں لاسکو گے تو تم اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہوگے۔جب وہ دلیل لانے سے عاجز آگئے تو ان کا جھوٹا ہونا بھی واضح ہوگیا۔

گذشتہ سے پیوستہ:

اعتراض: ﴿تِلْکَ اَمَانِیُّھُمْ﴾ میں اشارہ ﴿وَقَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ﴾ کی طرف ہے،ان کی یہ ایک آرزو ہے۔" امانی " جمع کا صیغہ کیوں ذکر کیا گیا۔

پہلا جواب: " تلک " کا اشارہ صرف ایک چیز کی طرف نہیں بلکہ متعدد چیزوں کی طرف ہے۔ایک تو ﴿مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ﴾ الخ میں ذکر ہو چکا ہے کہ وہ چاہتے تھے مومنوں پر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت نازل نہ فرمائے۔

دوسری چیز ﴿ وَدَّ كَثِيْرٌ ﴾الخ، میں گذر چکی ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ مومن کافر ہو جائیں۔

اور تیسری چیز اس آیۃ میں ذکر ہے کہ جنت میں صرف ہم داخل ہوں گے، مومن داخل نہیں ہوں گے۔ ان تمام چیزوں کی طرف اشارہ ہے کہ ان کی یہ تمام خواہشات باطل ہیں۔ (از کبیر)

دوسرا جواب: وہ اپنی ایک ہی آرزو کو بار بار دل میں لوٹاتے تھے۔ اس تکرار کی وجہ سے گویا کہ ان کی کئی آرزوئیں بن گئیں۔

تیسرا جواب: اگرچہ ان کی آرزو ایک ہی کیوں نہ ہو لیکن وہ اپنے باطل ہونے کی وجہ سے اس درجہ پر پہنچی ہوئی تھی کہ اسے جمع کا درجہ حاصل تھا، گویا کہ متعدد افراد اس میں پائے گئے "وھذا من بدیع الاعجاز ونفائس البیان" ان دونوں جوابوں سے قرآن پاک کا عمدہ اعجاز اور نفیس بیان سمجھ میں آتا ہے۔

چوتھا جواب: اگر اشارہ ﴿ وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ ﴾ کی طرف ہو تو پھر بھی بظاہر ایک چیز ہے، لیکن حقیقت میں متعدد چیزیں ہیں۔ ایک چیز یہود کا کہنا جنت میں صرف یہود داخل ہوں گے۔ اور دوسری چیز نصاریٰ کا کہنا جنت میں صرف نصاریٰ داخل ہوں گے، تیسری چیز ان کا کہنا جنت میں اور کوئی داخل نہیں ہوگا۔ یعنی مسلمان جنت میں داخل ہونے سے محروم ہوں گے۔

(از روح المعانی)

☆☆☆

﴿بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْھَہٗ لِلّٰہِ وَھُوَ مُحْسِنٌ فَلَہٗٓ اَجْرُہٗ عِنْدَ رَبِّہٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ﴾ (آیت ۱۱۲)

۱) ہاں کیوں نہیں جس نے اپنا منہ جھکایا اللہ کے لئے اور وہ نکوکار ہے تو اس کا نیک بدلہ اس کے رب کے ہاں ہے۔ اور انہیں کچھ اندیشہ ہے اور نہ کچھ غم۔

۲) ہاں کیوں نہیں جس شخص نے جھکا دیا اپنے آپ کو اللہ کے لئے اور وہ نکوکار ہے۔ تو اس کے لئے اس کا اجر ہے اس کے رب کے ہاں۔ اور نہ خوف ہوگا ان کو اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ میں یہود اور نصاریٰ دونوں فریقوں کا رد فرمایا کہ وہ دونوں اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہیں۔ ان کا دعویٰ تو یہ ہے کہ جنت میں ہرگز کوئی اور داخل نہیں ہوگا سوائے اس کے جو یہودی ہیں۔ یہ یہود کا قول تھا۔ اور نصاریٰ نے کہا سوائے نصرانیوں کے جنت میں کوئی اور داخل نہیں ہوگا رب تعالیٰ نے فرمایا جنت میں تو صرف وہ لوگ جائیں گے جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ کے لئے جھکا دیا۔ اعتقاد اور اعمال اور اقوال ان کے صرف رب تعالیٰ کی رضاء کے لئے ہوتے ہیں۔

واضح ہوا کہ پہلی قوموں میں بھی اور رسول اللہ ﷺ کی امت میں بھی وہی جنت کے مستحق ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کے مطیع ہیں۔ صرف زبانی دعویٰ کہ جنت کے مستحق ہم ہی ہیں یہ باطل ہے۔

بَلٰی : (ہاں کیوں نہیں) "بلیٰ" نفی کے بعد ثبوت کے لئے آتا ہے۔ جیسا کہ یوم میثاق کو تمام اولاد آدم سے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ﴾ کیا میں تمہارا رب نہیں۔ تو اس کے جواب میں ﴿قَالُوْا بَلٰی﴾ سب نے کہا ہاں کیوں نہیں۔ یعنی تو ہمارا رب ہے۔

اسی طرح یہاں بھی یہود و نصاریٰ کا کسی اور کے لئے جنت میں داخل ہونے کی نفی کرنے کو اللہ تعالیٰ نے "بلیٰ" کہہ کر رد فرما دیا ہاں کیوں نہیں۔ یعنی جنت میں تو اور لوگ بھی داخل ہوں گے۔

خیال رہے کہ یہ مطلب جو بیان کیا ہے۔ اس میں اس ایک لفظ "بلیٰ" سے یہود و نصاریٰ کا

رد ہو گیا، اب " بلٰی " پر وقف کرنا مستحسن ہوگا۔ اب آنے والا جملہ ﴿ مَنْ اَسْلَمَ ﴾ الخ علیحدہ ہوگا

ہاں اگر ﴿ یدخلھا ﴾ کو محذوف مانا جائے، اور ﴿ من اسلم ﴾ کو فاعل مانا جائے تو اس صورت میں " بلٰی " پر وقف درست نہیں ہوگا۔ بلکہ اب تمام کا ایک مفہوم ہوگا۔ جو آیۃ کے ترجمہ کے بعد متصل ذکر کیا جا چکا ہے۔

مَنْ : میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ یہ شرطیہ ہو، اس صورت میں ﴿فله اجره﴾ الخ جواب شرط ہوگا اور فاء جزائیہ کہلائے گی۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ " من " موصولہ ہو۔ لیکن شرط کے معنی کو پھر بھی مستلزم ہے۔ اسی لئے خبر پر فاء آئی ہوئی ہے۔ یہ دراصل قرآن پاک کی عظمت ہے کہ ایک ایک لفظ کتنے کتنے معانی پر مشتمل ہے۔

(از بیضاوی و شیخ زادہ)

اَسْلَمَ وَجْهَه' لِلّٰهِ : "و معنی اَسْلَمَ وَجْهَه' لِلّٰهِ" " اخلص فی دینه لله " ایک معنی اس کا یہ ہے کہ جس نے اپنے دین میں اللہ تعالیٰ کے لئے خلوص رکھا۔

اور اس کا معنی یہ ہے۔ " اخلص عبادته لله " جس نے اللہ کے لئے اپنی عبادت میں خلوص رکھا

اور اس کا معنی یہ ہے کہ جس نے اپنا منہ اللہ کے لئے جھکایا۔ البتہ " وجه " (منہ) کا ذکر کیوں کیا، اس لئے کہ

" انه اشرف الاعضاء و مجمع المشاعر و موضع السجود ومظهر آثار الخضوع الذی هو من اخص خصائص الاخلاص "

کہ یہ تمام اعضاء سے اشرف ہے۔ اسی میں وہ تمام علامات پائی جاتی ہیں جن سے کسی کی پہچان ہوتی۔ یہ سجدہ کا مقام ہے۔ اسی پر خشوع وخضوع کے آثار مرتب ہوتے ہیں۔ جو اخلاص میں سب سے زیادہ مقصود ہے۔ یعنی خضوع سے ہی پتہ چلتا ہے کہ اس میں خلوص پایا گیا ہے۔

" فاذا جاء الانسان بوضع جبهه علی الارض فی السجود فقد جاء بجمیع اعضائه "

جب انسان اپنے منہ کو یعنی پیشانی کو زمین پر رکھے تو گویا کہ اس نے اپنے تمام اعضاء کو زمین پر رکھ لیا۔

عمرو بن نفیل نے کہا:

واسلمت وجهی لمن اسلمت　　له الارض تحمل صخرا ثقالا

واسلمت وجهی لمن اسلمت　　له المزن تحمل عذبا زلالا

اور میں نے اپنے منہ کو جھکا لیا اس ذات کے لئے جس کے لئے جھک گئی زمین جس نے بہت بھاری پتھر اٹھا رکھے ہیں۔

اور میں نے اپنے منہ کو جھکا لیا اس ذات کے لئے جس کے لئے بادل جھک گئے جنہوں نے میٹھا اور ٹھنڈا پانی اٹھا رکھا ہے۔

اعلیٰ حضرت نے ﴿اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ﴾ کا معنی اسی قول کے مطابق کیا ہے۔ ''جس نے اپنا منہ جھکایا''

اس کا اور معنی یہ ہے۔ " وذکر الوجه واراد به نفس الشئ " کبھی وجہ کا ذکر کیا جاتا ہے لیکن اس سے مراد ذات ہوتی ہے۔ یعنی ''جس نے اپنے آپ کو جھکا لیا۔''

علامہ کاظمی رحمہ اللہ نے یہی ترجمہ کیا ہے۔ راقم نے وہی نقل کیا ہے۔

" لله " ای خالصا لله تعالیٰ لایشوبه شرک فلا یکون عابدا مع الله غیره او معلقا رجاء بغیره "

''اللہ کے لئے'' کا مطلب یہ ہے کہ جس نے اپنے آپ کو خالص اللہ تعالیٰ کے لئے جھکایا، اس میں شرک کا کوئی شائبہ نہ پایا جائے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور عبادت کا مستحق نہ سمجھے۔ اور اپنی امید رب کے بغیر کسی اور پر اس طرح نہ رکھے کہ رب تعالیٰ کے مقابل ہو کر حقیقی طور پر کوئی اور بھی امداد کر سکتا ہے۔ ہاں یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی طاقت سے اسکے بندے بھی امداد کرتے ہیں۔

" وفی ذلک دلالة علی ان المرء لاینتفع بعمله الا اذا فعله علی وجه العبادة فی الاخلاص والقربة "

اور اسی سے یہ مسئلہ حاصل ہو گیا کہ انسان کو اپنے اعمال سے اس وقت تک فائدہ حاصل نہیں ہو گا جب تک وہ کام بطور عبادت نہ کرے اور اس میں بھی خلوص پایا جائے اور رب تعالیٰ کے تقرب کا اسے ذریعہ سمجھے۔ (ماخوذ از خازن و تفسیر ابی السعود و کبیر)

اس کا اور معنی یہ ہے " واما مجاز عن القصد لان القاصد للشئ مواجه له " کہ وجہ کا

مجازی معنی قصد کرنا، کیونکہ کسی چیز کا ارادہ کرنے والے کو "مواجه له" کہا جاتا ہے۔ (روح المعانی)

قرطبی میں اس معنی کو سب سے زیادہ مختار سمجھا گیا ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا۔ جس نے اللہ کی طاعت کا ارادہ کرلیا۔

وَهُوَ مُحْسِنٌ: (اور نیکوکار رہوا) ایک معنی احسان کا وہی ہے جس کا ذکر حدیث پاک میں ہے۔
"ان تعبدالله كأنك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك" کہ تو اللہ کی عبادت کرے گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے۔ اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا تو بے شک وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ (از روح المعانی)

یہ جملہ حال ہے۔ یعنی معنی یہ ہوگا۔ "**والحال انه محسن في جميع اعماله التي من جملتها الاسلام المذكور وحقيقة الاحسان الاتيان بالعمل على الوجه اللائق وهو حسنه الوصفي التابع لحسنه الذاتي**"

حال یہ ہے کہ وہ اپنے تمام اعمال اچھے کرے، ان تمام اعمال میں اپنے آپ کو رب کے حضور جھکانا بھی ہے۔

(بلکہ راقم کے نزدیک اپنے آپ کو رب کے حضور جھکانے سے ہی نیک اعمال اور درست اعتقاد حاصل ہوتے ہیں)

جب انسان اچھے اعمال کرتا ہے تو اسے حسن وصفی حاصل ہوتا ہے۔ یہ حسن وصفی درحقیقت حسن ذاتی کے تابع ہوتا ہے۔ جس کی اصل خلقت اور جبلت میں پاکیزگی ہوگی، اس کی عادات اور اس کے اعمال بھی پاکیزہ ہوں گے۔ پھر اسے وہ منصب حاصل ہوگا جس کا ذکر حدیث پاک میں ہے۔ جس کو اوپر روح المعانی کے حوالہ سے ذکر کیا جا چکا ہے۔ (ابوالسعود)

فائدہ: عمل کے مقبول ہونے کی دو شرطیں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ وہ عمل خالص اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے کیا جائے اور دوسرا یہ ہے کہ وہ شریعت کے مطابق ہو۔

اگر کوئی شخص عمل تو اللہ تعالیٰ کے لئے کرتا ہے لیکن وہ عمل شریعت کے مطابق نہیں تو وہ مقبول نہیں۔

☆ قال رسول الله ﷺ من عمل عملا ليس عليه امر فهو رد " (رواه مسلم من حديث عائشة)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے عمل کیا لیکن وہ ہمارے امر کے خلاف ہوتو وہ مردود ہوگا۔

اسی سے معلوم ہوا کہ اسلام میں " رھبـــانیة " نہیں۔یعنی جوگیوں اور پادریوں کی طرح دنیا والوں سے کنارہ کش ہونا، ہمیشہ جنگل میں رہنا، نماز باجماعت کو ترک کر دینا اور انسانوں سے منہ موڑ لینا جائز نہیں۔اگرچہ ان کاموں میں بظاہر اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی مقصود ہوتی ہے۔لیکن نبی کریم ﷺ کی شریعت کے مخالف ہے۔آپ کی اتباع کے خلاف ہے۔

آپ کے ارشاد کے خلاف ہے کیونکہ آپ نے فرمایا" لا رھبانیة فی الاسلام "اسلام میں رہبانیت نہیں۔

دوسری چیز عمل کی مقبولیت کے لئے یہ ہے کہ وہ کام خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہو۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا﴿ فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ ☆ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلٰوتِهِمْ سَاهُوْنَ ☆ الَّذِیْنَ هُمْ یُرَآئُوْنَ ﴾ تو خرابی ہے ان نمازیوں کیلئے جو اپنی نماز سے بھولے بیٹھے ہیں۔اور وہ جو دکھاوا کرتے ہیں۔
(از ابن کثیر)

تنبیہ: شریعت کے مخالف وہ کام ہے جو قرآن اور سنت کے مخالف ہو۔وہ شریعت کے مخالف کام نہیں جو نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام نے نہیں کئے۔بلکہ ہر نئے کام کے لئے ضابطہ خود نبی کریم ﷺ نے بیان فرمایا ہے۔

☆ " قال رسول اللہ ﷺ من سن فی الاسلام سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها من بعده من غیر ان ینقص من اجورهم شئ ومن سن فی الاسلام سنة سیئة کان علیه وزرها ووزر من عمل بها من بعده من غیر ان ینقص من اوزارهم شئ " (مشکوۃ باب العلم)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جس شخص نے اسلام میں اچھا طریقہ ایجاد کیا اسے اس کا ثواب ملے گا، اور اس کے بعد جتنے لوگ اس پر عمل کریں گے ان کے مطابق بھی اس کو ثواب ملے گا۔جب کہ ان عمل کرنے والوں کے ثواب میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔اور جو شخص اسلام میں برا طریقہ رائج کرتا ہے، اس کو برے طریقہ کے رواج دینے کا گناہ ہوگا۔اور جتنے لوگ اس پر عمل کریں گے ان کے مطابق بھی ایجاد کرنے والے کو گناہ ہوگا۔جب کہ ان کے گناہوں میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ اسلام میں اچھا طریقہ ایجاد کرنا ناجائز نہیں۔ بلکہ مستحب ہے کیونکہ نیکیوں کا سبب ہے۔ البتہ برا طریقہ رائج کرنا گناہوں کا سبب ہے اس سے بچنا ضروری ہے۔

یہ سوال نہایت لغو اور بے حقیقت ہے کہ اسلام کیا اس وقت مکمل نہیں تھا؟ اسلام مکمل ہی تھا، اسی لئے تو نبی کریم ﷺ نے خود ہی اپنی امت کے لئے ایک قانون اور ضابطہ پیش فرما دیا تا کہ اس قانون پر عمل کرنے والوں کو کوئی شخص غیر اسلامی شعار پر عمل کرنے کا طعنہ نہ دے سکے، بلکہ ایسا اعتراض علم شریعت سے بے خبری کی علامت ہے۔

﴿فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾

اس کیلئے اجر ہے اسکے رب کے ہاں اور کوئی خوف نہیں ان پر اور نہ ہی وہ غمگین ہونگے۔

یعنی جن لوگوں نے اپنے آپ کو رب کے لئے جھکا دیا ایسے حال میں کہ وہ نیکوکار ہوئے ان کو ان اعمال کا ثواب حاصل ہوگا۔ اور ان کو آخرت میں کوئی خوف نہیں ہوگا۔ اور ان کے دنیا کے فوت ہونے کا کوئی غم نہیں ہوگا۔ (از خازن)

فائدہ جلیلہ: ﴿اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ﴾ میں اپنے آپ کو رب تعالیٰ کے لئے جھکانے کا مقصد ہے کہ اخلاص سے اپنے آپ کو رب کے حضور جھکائے، اخلاص کو سمجھنے کے لئے چند مسائل کا سمجھنا ضروری ہے۔

پہلا مسئلہ: نیت کی فضیلت کے بیان میں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا" **انما الاعمال بالنیات** "اعمال کا دار و مدار نیات پر ہے۔

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: " **ان الله لاینظر الی صورکم وانما ینظر الی قلوبکم ونیاتکم** " بیشک اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتا، بیشک وہ تو صرف تمہارے دلوں اور نیتوں کو دیکھتا ہے

ان احادیث مبارکہ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ نیت ایک اعلیٰ عمل کا نام ہے، جس پر تمام اعمال کا دار و مدار ہے۔

دوسرا مسئلہ : انسان کو جب یقین حاصل ہو یا غالب گمان ہو کہ اس کام میں میرا فائدہ ہے یا اس کام کی وجہ سے میری مصیبت ٹل جاتی ہے، تو وہ اس کام کو کرنے کی طرف کامل میلان رکھتا ہے، اور چاہتا ہے کہ یہ کام کرلیا جائے۔ وہ شخص اس کام کے عدم سے وجود کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کو ارادہ کہا جاتا ہے، اسی ارادہ کا نام نیت ہے۔ اس نیت کی وجہ علم یا غالب گمان یا اعتقاد ہوتے ہیں۔

پھر اس میں چار صورتیں ہیں۔

(۱) اس نیت وارادہ کا باعث ایک چیز ہو، جس طرح انسان کا سامنا اچانک ایک درندے سے ہو جائے، تو انسان درندے کو دیکھ کر اسی جگہ کھڑا ہو جائے۔ اس کھڑے ہونے والے فعل کا سبب صرف اس کا یہ اعتقاد ہے کہ بھاگنے میں کوئی نفع نہیں۔ اور بھاگنے کو چھوڑنے میں کوئی نقصان نہیں۔

اس نیت کا نام ہے خالصہ اور اس نیت کی وجہ سے کئے جانے والے کا نام ہے اخلاص۔

(۲) ایک کام کے کرنے کے دو مستقل سبب ہوں، ہر سبب علیحدہ علیحدہ مستقل طور پر تقاضا کرتا ہو کہ یہ فعل پایا جائے جیسا کہ ایک شخص سے اس کا فقیر دوست سوال کرے، یہ اس کی حاجت کو پورا کرے۔ اس کا رفیق ہونا بھی چاہتا ہے کہ اس کی امداد کی جائے اور اس کا فقیر ہونا بھی تقاضا کرتا ہے کہ اس کی امداد کی جائے۔ اس موافقت کا نام باعث ہے۔

(۳) کسی کام کے دو سبب ہوں لیکن علیحدہ علیحدہ دونوں مستقل نہ ہوں، بلکہ دونوں مل کر ایک سبب کی حیثیت ہوں، جیسا کہ والدین کا خدمت کے مستحق ہونا بوجہ والدین ہونے کے اور ان کے شفیق ہونے کے۔ والدین سے چونکہ شفقت جدا نہیں ہوتی۔ اس لئے یہ مجموعی طور پر سبب ہے کہ اولاد والدین کی خدمت کرے اس سبب کا نام ہے "مشارکۃ۔"

(۴) کسی کام کا ایک سبب ہو اور دوسرا اس کا معاون ہو، جیسے کوئی آدمی کسی نیکی کے کام کے لئے جاتا ہے اور وہاں اس کی ایسے لوگوں سے ملاقات ہو جائے جن کو دیکھنے سے اس پر وہ نیکی کا کام آسان ہو جائے اس سبب کا نام ہے "معاونۃ۔"

تیسرا مسئلہ : نبی کریم ﷺ نے فرمایا " نیة المؤمن خیر من عمله " مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔اس کا مطلب کیا ہے۔

اس میں کئی وجوہ بیان کی گئی ہیں۔لیکن سب سے بہتر اور صحیح وجہ یہ ہے۔نیت جب تک تمام انواع فتور سے خالی نہ ہو وہ نیت جازمہ (یقینی نیت) نہیں ہوسکتی۔

اور جب تمام قسم کے فتور سے نیت خالی ہوگی تو رکاوٹ اگر درپیش نہ آئے تو اس پر عمل کا پایا جانا ضروری ہوگا۔

" واذا کان کذلک ثبت ان النیة لاتنفک البتة عن الفعل " جب اس طرح ہوا تو ثابت ہوگیا کہ نیت فعل سے جدا نہیں ہوگی۔" فیدعی ان هذه النیة افضل من ذلک العمل " بے شک یہ نیت اس عمل سے افضل ہوگی، کیونکہ بغیر نیت کے یہ عمل ممکن ہی نہیں تھا۔

اصل میں مقصد تمام اعمال کا اللہ تعالیٰ کی معرفت سے دل کا منور ہونا ہے۔اور اللہ تعالیٰ کے ماسوا سے دل کا پاک ہونا مقصد عظیم ہے۔اور یہ بھی واضح ہے کہ نیت دل کی صفت ہے، اور عمل دل کی صفت نہیں

لہٰذا صفت قلب کی تاثیر زیادہ قوی ہے بنسبت ظاہری اعضاء کے اعمال کے کیونکہ ان کا دل میں اتنا اثر نہیں جتنا خود دل کی صفات کا دل پر اثر ہے۔

" فلا جرم نیة المؤمن خیر من عمله " اس لحاظ پر یقیناً مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہوگی۔

چوتھا مسئلہ : اعمال کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) طاعات۔ (۲) معاصی۔ (۳) مباحات۔

معاصی : نیت کی وجہ سے گناہ کے افعال نہیں بدلتے، بلکہ وہ گناہ ہی ہوتے ہیں۔کوئی جاہل یہ نہ سمجھے کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد " انما الاعمال بالنیات " کا مطلب یہ ہے کہ نیت سے معصیت طاعت بن جائے گی۔نہیں ایسا نہیں ہوگا۔اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ غیر کا مال اس کی اجازت کے بغیر کسی فقیر کو دینے سے ثواب حاصل ہوگا۔یہ غلط ہے۔ایسا ممکن نہیں۔

کوئی یہ سوچے کہ حرام مال سے مسجد بنانے کا ثواب مل جائے گا۔یہ باطل ہے۔اس سے ثواب

حاصل نہیں ہوسکتا۔

طاعات : کا تعلق نیات سے ہے۔اصل میں بھی اور فضیلت میں بھی۔

اصل میں طاعت کی نیت کا یہ مطلب ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کی نیت کرے اب نیت کا بھی ثواب ہوگا۔اور اگر ریاء کاری کی نیت کرے تو معصیت ہوگی۔

فضیلت میں نیت کا یہ مطلب ہے کہ کثیر کاموں کی نیت سے نیکیاں زیادہ حاصل ہوں، جن کی وجہ سے فضیلت حاصل ہوگی۔ مثال کے طور پر ایک شخص مسجد میں بیٹھے، اس میں اعتقاد رکھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا گھر ہے۔پھر یہ ارادہ رکھے کہ اس میں نیک لوگوں سے ملاقات ہوگی۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" من قعد فی المسجد فقد زار اللہ وحق علی المزور اکرام زائرہ "

جو شخص مسجد میں بیٹھا تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ کی زیارت کی، جس کی زیارت کی جائے اس پر حق ہے کہ وہ زیارت کرنے والے کی عزت کرے۔گویا کہ مسجد میں بیٹھنے والے کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے عزت عطاء فرماتا ہے۔

اور یہ کہ مسجد میں بیٹھنے والا ایک نماز کے بعد دوسری نماز کی انتظار میں ہوتا ہے۔ " فیکون حال الانتظار کمن ھو فی الصلوٰۃ " نماز کی انتظار کرنے والا ایسا ہی ہوتا ہے۔جیسے نماز ادا کرنے والا ہوتا ہے۔

اور یہ کہ مسجد میں بیٹھنے والے کو اعتکاف اور روزے کی حالت حاصل ہوتی ہے۔کیونکہ وہ کئی مشاغل سے اپنے آپ کو روک کر رکھے ہوئے ہے۔

اور یہ ہے کہ مسجد میں بیٹھے ہوئے شخص کو لوگوں سے گپ شپ، ہنسی مذاق سے اجتناب حاصل ہوتا ہے۔

مسجد میں بیٹھے ہوئے شخص کا کامل طور پر دل اللہ تعالیٰ کی طرف مائل ہوتا ہے۔اور اللہ تعالیٰ کے ماسوا کی طرف اس کی توجہ نہیں ہوتی۔ جو شخص مسجد میں ہوگا۔ یقیناً کسی نہ کسی کو اچھے کام کی نصیحت کرے

گا۔ برے کاموں سے روکے گا، تو اسے تعلیم اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ثواب حاصل ہوگا۔

اور فائدہ اسے یہ حاصل ہوگا کہ وہ دوسرے مسلمان لوگوں سے بھائی چارہ کی فضاء حاصل کرے گا۔ اور اسے یہ فائدہ ہوگا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے حیاء کرتے ہوئے گناہوں کو چھوڑ دے گا۔

یعنی بظاہر وہ صرف مسجد میں بیٹھا ہے، لیکن حقیقت میں وہ کئی نیک کاموں کی نیات سے کثیر فضیلتیں حاصل کر رہا ہے۔

مباحات: سائر المباحات ولا شئ منها الا ويحتمل نية او نيات يصير بها من محاسن القربات فما اعظم خسران من يغفل عنها ولا يصرفها الى القربات "

ہر مباح کام نیکی کی نیت سے مستحب اور قربت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ جو شخص اس سے غافل رہے اور وہ مباح کام سے ثواب نہ حاصل کر سکے وہ بہت بڑے خسارے میں ہے۔

مثال کے طور پر انسان خوشبو استعمال کرے تو یہ مباح ہے نہ اس میں کوئی ثواب اور نہ گناہ، لیکن اگر خوشبو کو استعمال کرتے ہوئے دنیا کی لذات کو حاصل کرنے کا ارادہ کرے، اور کثرت مال پر فخر کرے اور مخلوق کو دکھانا چاہے۔ اور یہ ارادہ کرے کہ عورتیں میری طرف میلان کریں تو خوشبو کا استعمال معصیت ہوگا۔

اور اگر یہ ارادہ کرے کہ خوشبو کا لگانا سنت ہے، اور اس سے بو زائل ہوگی جو اللہ تعالیٰ کے بندوں کی اذیت کا سبب بنتی ہے۔ اور خوشبو لگا کر مسجد کی تعظیم کا ارادہ کرے تو یہ طاعت ہوگی۔

☆ واذا عرفت ذلك فقس عليه سائر المباحات "

جب تو نے اس ایک مثال کو سمجھ لیا تو اسی پر تمام مباحات کو قیاس کر۔

" والضابط ان كل ما فعلته لداعي الحق فهو العمل الحق ، و كل ما عملته لغير الله فحلالها حساب و حرامها عذاب "

ضابطہ یہ ہے کہ ہر کام جس میں اللہ تعالیٰ کی رضاء کی نیت ہو وہ کام حق ہے۔ اور وہ کام جس میں اللہ تعالیٰ کی رضاء کو مد نظر نہیں رکھا گیا لیکن وہ کام گناہ والا نہیں تو حلال ہے، اور اگر گناہ والا ہے تو حرام ہوگا، جس پر عذاب ہوگا۔

پانچواں مسئلہ : صرف زبان سے کہنا کہ میں نیت کر رہا ہوں یا دل میں سوچنا کہ میں نیت کر رہا ہوں، یہ حقیقت میں نیت نہیں، بلکہ نیت یہ ہے کہ نفس کوکسی کام پر برانگیختہ کیا جائے۔
تا کہ اس کا میلان پایا جائے اس کام کی طرف جس کا کرنا مقصود ہو۔
جب تک کسی کام کی خواہش نہ پائی جائے اس وقت تک نیت بھی حقیقۃً نہیں پائی جائے گی۔
ایک آدمی نے سیر ہو کر کھانا کھایا ہوا ہے۔ وہ زبان سے کہے " نویت ان اشتھی طعاما " میں کھانے کی خواہش کی نیت کرتا ہوں۔ یا دل میں یہی نیت کرے اسے نیت نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ نیت تو وہ ہے جو کام کرنے پر برانگیختہ کرے۔
اگر نیت کا یہ حقیقی معنی سمجھ آ ئے تو کوئی جاہل نہیں کہہ سکے گا کہ نیت تو صرف دل سے ہوتی ہے زبان سے نہیں۔ بہت واضح مسئلہ ہے کہ اگر نیت نے کام پر برانگیختہ کیا تو وہ نیت ہے خواہ زبان سے ہو یا دل سے، اور اگر کام پر برانگیختہ نہ کیا تو وہ نیت نہیں خواہ زبان سے ہو یا دل سے ہو۔

چھٹا مسئلہ: لوگ مختلف قسم کی نیت کرنے والے ہیں۔ کوئی نیکی کا کام اس نیت پر کرتے ہیں کہ جہنم کی آگ سے بچ جائیں۔ اور کوئی عبادت اس نیت سے کرتے ہیں کہ جنت حاصل ہو جائے۔
کامل لوگ وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی نیت کرتے ہیں۔ جب رب راضی ہو گا تو خود بخود جنت بھی حاصل ہوگی۔ اور جہنم سے نجات بھی حاصل ہوگی۔ (از کبیر)
ان چھ مسائل کو جب انسان سمجھے گا تو اسی وقت کامل اخلاص سمجھ آئے گا، کہ کامل اخلاص کیا ہے

تنبیہ : پانچواں مسئلہ جو ذکر کیا گیا ہے اس پر تفسیر کبیر کی عبارت بھی مدنظر رہے۔

" اعلم ان الجاهل اذا سمع الوجوه العقلية والنقلية فی انه لا بد من النية فيقول فی نفسه عند تدريسه وتجارته نويت ان ادرس لله واتجر لله يظن ان ذلك نية وهيهات فذاك حديث نفس او حديث لسان والنية بمعزل عن جميع ذلك انما النية انبعاث النفس وميلها الى ماظهر لها ان فيه غرضها اما عاجلا واما آجلا والميل اذ لم يحصل لم يقدر الانسان على اكتسابه وهو كقول الشبعان نويت ان اشتهى الطعام " (کبیر)

مفہوم تقریباً ذکر کر دیا گیا۔ لفظی ترجمہ پیش نہیں کیا جاتا۔ عبارت کو آسان طریقہ سے سمجھایا جاتا ہے۔

﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ص وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ لا وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ط كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ج فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ﴾ (آیت ۱۱۳)

۱) اور یہودی بولے نصرانی کچھ نہیں اور نصرانی بولے یہودی کچھ نہیں، حالانکہ وہ کتاب پڑھتے ہیں، اسی طرح جاہلوں نے ان کی سی بات کہی تو اللہ قیامت کے دن میں فیصلہ کردے گا جس بات میں جھگڑ رہے ہیں۔

۲) اور کہا یہودیوں نے نہیں ہیں نصرانی کسی چیز (دین) پر۔ اور کہا نصرانیوں نے نہیں ہیں یہودی کسی چیز (دین) پر، حالانکہ وہ کتاب پڑھتے ہیں۔ اسی طرح کہا ان لوگوں نے جو علم نہیں رکھتے، مثل ان کی بات کے۔ تو اللہ فیصلہ فرمائے گا ان کے درمیان قیامت کے دن جس میں وہ اختلاف کررہے ہیں۔

پہلی آیت میں دونوں یعنی یہود و نصاریٰ کے اقوال جو ایک دوسرے کے خلاف تھے ان کو جمع کر کے ذکر کیا، اس آیۃ میں ان کے اقوال کی تفصیل بیان کی جارہی ہے کہ ہر فریق دوسرے کے متعلق کیا کہتا ہے۔ دونوں فریقوں میں سے ہر فریق دوسرے کے دین کا کیسے انکار کرتا ہے۔

مختصر مطلب: یہود اور نصاریٰ دونوں اہل کتاب تھے۔ یہود اپنے آپ کو موسیٰ علیہ السلام کا پیروکار کہتے تھے اور دعویٰ ان کا یہ تھا کہ ہمارا توراۃ پر ایمان ہے۔ اور نصاریٰ کا دعویٰ یہ تھا کہ ہمارا ایمان انجیل پر ہے اور ہم عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن ہر فریق دوسرے کو جھوٹا کہتا تھا، یہودی کہتے تھے کہ نصرانی کسی دین پر قائم نہیں، اور نصرانی کہتے تھے یہودی کسی دین پر قائم نہیں۔

حالانکہ دونوں فریق اپنے دعویٰ ایمانی میں بھی جھوٹے تھے۔ کیونکہ توراۃ میں انجیل کی تصدیق

پائی جاتی، اورانجیل تصدیق کررہی تھی توراۃ کی۔ اگر یہود کا توراۃ پرایمان ہوتا تو وہ انجیل کو بھی اللہ تعالیٰ کی کتاب تسلیم کرتے اور عیسیٰ علیہ السلام کو بھی اللہ تعالیٰ کا نبی مانتے۔ اور اگر نصاریٰ کا انجیل پرایمان ہوتا تو وہ یقیناً موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا نبی اور توراۃ کو اللہ کی کتاب مانتے۔

واضح ہوا کہ ہرفریق ان میں سے جھوٹا تھا اور اپنے دین پر بھی قائم نہیں تھا۔

اسی طرح مشرکین وکفار کے بعض گروہ دوسرے گروہ کو بے دین کہتے تھے کہ یہ تو کسی چیز پر قائم نہیں

یہ جو دنیا میں اختلاف کررہے ہیں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کے درمیان فیصلہ فرمادے گا۔ وہ فیصلہ یقیناً ہرایک کے خلاف ہوگا کیونکہ ان تمام فریقوں میں سے کوئی بھی ایمان پر قائم نہیں خواہ یہودی ہو یا نصرانی۔ مشرکین ہوں یا مجوسی وغیرھا۔

کچھ تفصیل: آیۃ کریمہ کا شان نزول وہی ہے جو پہلی آیت ﴿ وَقَالُوا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْنَصٰرٰى ﴾ میں ذکر کردیا گیا۔

مدینہ طیبہ کے یہود کے علماء اور نجران کے نصاریٰ کا ایک دوسرے سے مناظرہ ہوا۔ یہ ان کا مناظرہ نبی کریم ﷺ کے پاس تھا۔

"حتی ارتفعت اصواتھم فقال لھم الیھود ما انتم علی شئ من الدین و کفروا بعیسی والانجیل وقالت لھم النصاری ما انتم علی شئ من الدین و کفروا بموسی والتوراۃ فنزلت "

یہاں تک کہ ان کی آواز ایک دوسرے پر بلند ہونے لگی، یہود نے نجران کے عیسائیوں کو کہا تم کسی دین پر نہیں، اور انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل سے کفر کیا۔ اور نصاریٰ نے ان کو کہا تم کسی دین پر نہیں ہو، انہوں نے موسیٰ علیہ السلام اور توراۃ سے کفر کیا۔ اس وقت یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

(از معالم التنزیل)

تنبیہ: " ولاشک ان المناظرۃ علی ھذا الوجہ لیست لاظھار الصواب بل ھی مکابرۃ محضۃ " (شیخ زادہ)

جب ایک دوسرے پرالزام تراشی مقصود ہو، ہرایک فریق کی کوشش ہو کہ میری بات صحیح ہو یا غلط ہو، اسے ہی تسلیم کیا جائے تو اسے مناظرہ نہیں کہا جاتا کیونکہ مناظرہ میں درست راہ کو تلاش کرنا مقصود ہوتا ہے۔

اگر اظہار صواب مقصود ہی نہ ہو، بلکہ صرف جھگڑا اور شور وغل مقصد ہو تو اسے مجادلہ، اور مکابرہ تو کہا جا سکتا ہے۔ مناظرہ نہیں کہا جا سکتا۔ بات بات پر مناظرہ کا چیلنج کرنے والے درحقیقت جہلاء ہوتے ہیں۔ جو جاہل لوگوں میں سستی شہرت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

" اللهم انا نعوذبک من المنافقين المجادلين "

عَلٰی شَیْءٍ: کا ایک مطلب تو وہی ہے جو معالم التنزیل میں بیان کیا گیا ہے۔ " **ما انتم على شئ من الدين** " تم دین کی کسی چیز پر نہیں ہو۔ اس کے مطابق راقم نے ترجمہ کیا ہے تاکہ طلباء کرام کو ایک وجہ یہ بھی سمجھ آ جائے۔

اور دوسرا معنی علامہ آلوسی اور علامہ رازی رحمھما اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ اس میں عموم بہتر ہے یعنی مطلقاً " شئ " کی نفی پائی گئی ہے۔ " **فاذا نفى مطلقا كان ذلك مبالغة في عدم الاعتداد بما هم عليه وصار كقولهم " اقل من لاشئ "**

جب مطلق شے کی نفی ہوگی تو اس میں زیادہ مبالغہ پایا جائے گا کہ ہر فریق دوسرے کے متعلق کہتا تھا کہ وہ تو کچھ بھی نہیں کہ ان کا کوئی شمار کیا جائے۔ یہ کلام ایسے ہی ہے جیسے کہا جاتا " **اقل من لاشئ** " یہ تو لاشئ سے بھی کم ہے۔ (اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی قول کے مطابق ہے) (از روح المعانی)

تنبیہ: اگر چہ یہ بات مدینہ طیبہ کے یہود اور نجران کے نصرانیوں کے درمیان ہوئی، لیکن عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کے بعد سے ہی یہ اختلافات یہودیوں اور نصرانیوں کے درمیان آ رہے تھے۔

كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ: اسی طرح کہا ان لوگوں نے جو نہیں جانتے ان کی بات کی طرح۔ یعنی بے علم لوگوں نے بھی یہود و نصاریٰ کی طرح ہی کہا۔

" الذين لايعلمون " سے مراد کون لوگ ہیں اور کن سے ان کی یہود و نصاریٰ کی بات تھی؟

اس میں مختلف وجوہ ہیں، جو تمام ہی مراد ہیں۔ " **يعني مشركي العرب قالوا في نبيهم محمد ﷺ واصحابه انهم ليس على شئ** " اس سے مراد مشرکین عرب ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کو کہا " تم کسی معتبر دین پر نہیں۔ "

" **وقيل امم كانت قبل اليهود والنصارى مثل قوم نوح وهود وصالح ولوط وشعيب قالوا**

فی انبیائھم لیسوا علی شیٔ"

اسی طرح یہود ونصاریٰ سے پہلے والی قوموں نے ایک دوسری قوم اور اس کے نبی کے متعلق کہا کہ یہ تو کسی معتبر دین پر قائم نہیں۔ یعنی نوح علیہ السلام اور ھود علیہ السلام اور صالح علیہ السلام اور لوط علیہ السلام اور شعیب علیہ السلام کی قوموں نے ایک دوسرے کے متعلق کہا یہ تو کسی چیز پر نہیں۔ (خازن)

اس سے مراد مشرکین عرب اور ان کے بغیر اور بت پرست لوگ ہیں، اور مجوسی، اور اسی طرح پہلے گزرے ہوئے کفار مراد ہیں۔ جب کہ ہر فریق نے دوسرے کی تکذیب کی، خواہ دوسرا فریق حق پر قائم ہی کیوں نہ تھا، یعنی پہلی امتوں میں سے ایمان رکھنے والے لوگوں کی تکذیب کفار ہر زمانہ میں کرتے رہے اور یہی کہتے رہے کہ یہ تو کسی چیز پر نہیں۔ (از مظہری)

" ای الجھلة الذین لا علم عندھم و لا کتاب کعبدة الاصنام و المعطلة قالوا لاھل کل دین لیسوا علی شیٔ وھذا توبیخ عظیم لھم حیث نظموا انفسھم مع علمھم فی سلک من لایعلم "

اس سے مراد وہ جاہل لوگ ہیں جن کے پاس نہ علم تھا اور نہ کتاب جیسے بت پرست لوگ اور تعطیلیہ فرقہ، انہوں نے تمام دین والوں کے متعلق کہا یہ کسی معتبر دین پر نہیں۔ اس آیۃ کریمہ میں یہود ونصاریٰ کو ڈانٹ دی گئی کہ تم نے وہی ایک دوسرے کو کہا جو جاہل لوگ کہتے تھے، لہٰذا تم اہل علم ہونے کے باوجود جاہل لوگوں کی طرح کلام کر رہے ہو۔ (مدارک)

فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ :

تو اللہ فیصلہ کرے گا ان کے درمیان قیامت کے دن جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔

فیصلہ کرنے کا ایک مطلب یہ ہے کہ ہر فریق کی تکذیب فرمائے گا اور ان کو آگ میں داخل کر دے گا۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ تکذیب کرنے والے ظالم سے مظلوم جس کی تکذیب کی گئی ہے، کو انصاف دلائے گا۔ اور تیسرا مطلب یہ ہے کہ جن کو جنت میں داخل کرے گا ان کو بھی دوسرے دیکھ کر حسرت کر رہے ہوں گے۔ اور جن کو جہنم میں داخل کرے گا ان کو جنت والے ظاہر ظاہر دیکھ رہے ہوں گے، اور رب تعالیٰ کا شکر ادا کر رہے ہوں گے کہ ہمیں اس عذاب سے بچا لیا گیا۔

اور چوتھا مطلب یہ ہے کہ حق راہ پر چلنے والے اور باطل راہ پر چلنے والے فریق کے اختلاف میں فیصلہ فرمائے گا۔ (از کبیر)

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَا اِلَّا خَآئِفِيْنَ ۥ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ (آیت ۱۱۴)

۱) اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جو اللہ کی مسجدوں کو روکے ان میں نام خدا لئے جانے سے، اور ان کی ویرانی میں کوشش کرے، ان کو نہ پہنچتا تھا کہ مسجدوں میں جائیں مگر ڈرتے ہوئے ان کیلئے دنیا میں رسوائی ہے۔ اور ان کیلئے آخرت میں بڑا عذاب۔

۲) اور کون شخص بڑا ظالم ہے اس سے جو منع کرے اللہ کی مسجدوں میں اللہ کا نام ذکر کئے جانے سے۔ اور وہ کوشش کرے ان کی ویرانی میں۔ ان لوگوں کے لائق نہیں کہ وہ داخل ہوں مسجدوں میں مگر ڈرتے ہوئے، ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے۔ اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب۔

شان نزول: نبی کریم ﷺ ہجرت کے چھٹے سال تقریباً ڈیڑھ ہزار صحابہ کرام کو ساتھ لے کر مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ کی طرف عمرہ کرنے کی غرض سے روانہ ہوئے۔ لیکن جب آپ مقام حدیبیہ میں پہنچے تو مشرکین نے آپ کو عمرہ کرنے سے روک دیا۔ حضور ﷺ اور صحابہ کرام عمرہ کرنے کے بغیر ہی واپس آ گئے۔ تو یہ آیت کریمہ مشرکین مکہ کی مذمت میں نازل ہوئی۔

اس آیت کریمہ کے نزول سے پہلے ایک اور صورت بھی درپیش آ چکی تھی۔ وہ یہ ہے کہ جب بیت المقدس سے تبدیل ہو کر قبلہ کعبہ شریف بن گیا۔ تو یہود لوگوں کو کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے سے منع کرتے تھے۔ اس طرح گویا کہ وہ کعبہ شریف کو ویران کرنے میں کوشش کرتے تھے۔

آیۃ کریمہ کے نزول کی تو یہ دو ہی وجہ زیادہ واضح ہیں۔ البتہ آیۃ کریمہ اپنے مضمون کے لحاظ پر اور بھی وجوہ کو شامل ہے۔

" ان مشرکی العرب منعوا الرسول علیه الصلوٰة والسلام عن الدعاء الی الله بمکة والجؤه الی الهجرة فصاروا مانعین له ولاصحابه ان یذکروا الله فی المسجد الحرام "

مشرکین عرب نے رسول اللہ ﷺ کو مکہ مکرمہ میں دعوت الی اللہ (اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی طرف دعوت دینے) سے روک دیا تھا، آپ کو اور آپ کے صحابہ کرام کو ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا، تو وہ مسجد حرام میں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے روکنے والے تھے، ان کی مذمت بھی اس آیۃ کریمہ میں موجود ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق ﷺ نے اپنے گھر کے پاس مسجد بنائی جس سے آپ کو روک دیا گیا۔ آپ کو قریش کے بچے اور عورتیں ایذاء پہنچاتے تھے۔ اس آیۃ کریمہ میں ان لوگوں کی مذمت بھی پائی گئی۔

☆ " عن عبدالله قال بینما رسول الله ﷺ ساجد و حوله ناس من قریش اذ جاء ہ عقبة بن ابی معیط بسلا جزور فقذفه علی ظهر رسول الله ﷺ فلم یرفع رأسه فجاء ت فاطمة فاخذته عن ظهره و دعت علی من صنع ذلک "

حضرت عبداللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ ایک وقت رسول اللہ ﷺ سجدہ فرما رہے تھے۔ آپ کے ارد گرد کچھ قریش کے لوگ تھے (سات کی تعداد میں تھے) عقبہ بن ابی معیط (دوسری روایت زیادہ صحیح یہ قرار دیا گیا کہ ولید بن عقبہ آیا) اور اونٹنی کی جیلی لا کر آپ کی پیٹھ پر رکھ دی۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا (جو اس وقت بچی تھیں) نے آ کر آپ کی پیٹھ سے جیلی کو ہٹایا۔ اوران کے خلاف دعاء کی۔

یہ آیت کریمہ اپنے مضمون کے لحاظ پر اس واقعہ کو بھی شامل ہے کہ مشرکین نبی کریم ﷺ کے نماز پڑھنے میں رکاوٹ ڈالتے تھے۔

تنبیہ : سـلا کا معنی اوجری عوام میں زیادہ مشہور ہے، کئی مترجمین نے بھی اوجری معنی کیا ہے۔ تاہم " المنجد " میں معنی جیلی ہی کیا گیا ہے۔ اور " نووی شرح مسلم ج ۲ باب مالقی النبی ﷺ من اذی المشرکین والمنافقین " میں مذکور ہے۔

" السلا بفتح السین و تخفیف اللام مقصور وهو اللفافة التی یکون فیها الولد فی بطن الناقة وسائر الحیوان وهی من الآدمیة مشیمة "

" سلا " سین پر فتح ہے۔ اور لام مخفف اور مقصور ہے۔ یہ وہ پردہ ہے جس میں بچہ ہوتا ہے۔

اونٹنی اور باقی حیوانات کے پیٹ میں پایا جانے والا یہ پردہ " سـلا " کہلاتا ہے۔اور عورتوں کے پیٹ میں بچہ کا یہی لفافہ مشیمہ کہلاتا ہے۔اردو میں اسے جیلی کہا جاتا ہے۔اور پنجابی میں " جیر "

☆ " عن ابی هریرة قال قال ابو جهل هل یعفر محمد وجهه بین اظهر کم قال فقیل نعم قال واللات والعزی لئن رأیته یفعل ذلک لاطأن علی رقبته اولاعفرن وجهه فی التراب قال فاتی رسول الله ﷺ وهو یصلی زعم لیطأ علی رقبته قال فما فجنهم منه الا وهو ینکص علی عقبیه ویتقی بیدیه قال فقیل له ما لک قال ان بینی و بینه لخندقا من نار وهولا واجنحة فقال رسول الله ﷺ لو دنا منی لاختطفته الملائکة عضوا عضوا " (مسلم ج ۲ باب صفة القیامة والجنة والنار)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ۔ایک مرتبہ ابوجہل نے کہا کیا محمد تمہارے سامنے اپنے چہرے کو مٹی میں ملتے ہیں۔(سجدہ کرتے ہیں) دوسرے لوگوں نے کہاہاں۔یہ کہنے لگا قسم ہے لات اور عزیٰ کی اگر میں نے اسے ایسے کرتے ہوئے دیکھا تو اس کی گردن دبوچ دوں گا۔اسی دوران نبی کریم ﷺ تشریف لے آئے اور نماز پڑھنے لگے۔ابوجہل نے خیال کیا کہ آپ کی گردن دبوچ دے۔ابھی آگے آیا ہی تھا کہ اچانک الٹے پاؤں پیچھے بھاگے جارہا ہے۔اور اپنے ہاتھ مار مار کر اپنا بچاؤ کر رہا تھا۔اس سے پوچھا گیا تمہیں کیا ہوگیا۔وہ کہنے لگا میرے اور اس کے درمیان آگ کی ایک خندق تھی اور بہت بڑی ہولناکی تھی۔اور کئی پر تھے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر وہ میرے قریب آتا تو فرشتے اس کا ایک ایک عضوا دھیڑ دیتے۔

☆ آیۃ کریمہ اپنے مضمون کے لحاظ پر اس واقع کو بھی شامل ہے کہ ابوجہل نے نبی کریم ﷺ کو مسجد حرام میں نماز پڑھنے۔اور اللہ تعالیٰ کا نام لینے سے روکنے کی ناکام کوشش کی۔

☆ اسی طرح یہ آیۃ کریمہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس روایت کو بھی اپنے مضمون کے لحاظ پر شامل ہے۔اگرچہ وہ واقعہ وجہ نزول نہیں۔لیکن بیت المقدس سے لوگوں کو عبادت سے منع کر کے اسے ویران کیا گیا۔

" وقال ابن عباس ان ملک النصاری غزا بیت المقدس فخربه والقی فیه الجیف وحاصر

اهـلـه وقتـلهـم وسبـى البـقية واحـرق التـوراة ولم يزل بيت المقدس خرابا حتى بناه اهل الاسلام فی زمن عمر"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ نصرانیوں کے بادشاہ طیطوس بن اسیانوس رومی نے جنگ کر کے بیت المقدس کو خراب کر دیا۔ اور اس میں مردہ جانور ڈال دئے۔ اور اس شہر میں رہنے والوں کا محاصرہ کر لیا۔ اور ان کو قتل کرا دیا اور کچھ کو قید کر لیا۔ اور توراۃ کو جلا ڈالا۔ اسی طرح بیت المقدس کی حالت رہی یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اسی علاقہ کو فتح کر کے بیت المقدس کو تعمیر کیا گیا۔

☆ بخت نصر کے زمانہ میں بھی بیت المقدس کو خراب کیا گیا، لوگوں کو اس میں عبادت سے روکا گیا۔ لہٰذا یہ آیت کریمہ اپنے مضمون کے لحاظ پر اسے بھی شامل ہے۔ (از کبیر بتغیر و تصرف)

اس آیۃ کریمہ کا ماقبل سے تعلق بیان کردہ بحث سے واضح ہو گیا۔ کیونکہ پہلی آیت میں یہود اور نصاریٰ اور مشرکین کا ذکر کیا کہ وہ ایک دوسرے کو بے دین کہتے تھے۔ اس آیۃ کریمہ میں بھی ان کا ہی ذکر ہے کہ وہ مساجد کو ویران کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ اور مساجد میں اللہ تعالیٰ کا نام لینے والوں کو روکتے ہیں۔ (از کبیر)

اعتراض: جب شان نزول سے پتہ چلا کہ مشرکین نے مسجد حرام سے اللہ تعالیٰ کا نام لینے سے منع کیا، تو ﴿مَسَاجِدَ اللهِ﴾ جمع ذکر کرنے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: اگرچہ آیۃ کریمہ کے شان نزول کے لحاظ پر ایک مسجد حرام ہے " لکن المراد به کل المساجد "لیکن حکم کے لحاظ پر تمام مساجد کا یہی لحاظ ہے۔

دوسرا جواب: اگر نزول کے لحاظ پر ایک مسجد کا ہی اعتبار کیا جائے تو پھر بھی مسجد حرام کی فضیلت کے پیش نظر جمع ذکر کر دیا گیا۔ جیسا کہ کوئی شخص کسی ایک نیک شخص کو اذیت (تکلیف) پہنچائے تو یہ کہا جائے۔ ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ آذَى الصَّالِحِيْنَ﴾ اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو نیک لوگوں کو ایذاء پہنچاتا ہے۔ لیکن یہ بھی خیال رہے کہ حکم پھر بھی عام رہی رہے گا۔ تمام مساجد میں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے منع کرنے کا یہی حکم ہے کہ وہ روکنے والا شخص بہت بڑا ظالم ہو گا۔

وَمَنْ اَظْلَمُ : میں استفہام انکاری پایا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی مساجد میں ذکر سے منع کرنے والے سے کوئی بڑا ظالم نہیں ہوسکتا۔

تنبیہ : یہاں مطلقاً ظلم کا ذکر ہے۔ تمام ظلموں سے بڑھ کر ظلم یہی ہو اور کوئی ظلم بڑا نہ ہو یہ مراد نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴾ بے شک شرک ظلم عظیم ہے۔

اسی طرح زنا اور کسی نفس کو قتل کرنا بھی بہت بڑا ظلم ہے۔ یا تو یہی کہا جائے کہ یہ کلام با محاورہ ہے۔ مطلب یہ ہے مساجد سے روکنا بڑا ظلم ہے۔ شرک بڑا ظلم ہے۔ زنا بڑا ظلم ہے۔ کسی نفس کو ناحق قتل کرنا بڑا ظلم ہے۔

یا یہ کہا جائے۔ "انه عام دخله التخصيص فلا يقدح فيه" کہ اگرچہ مساجد میں ذکر سے روکنے کو عام کر کے ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن مراد عام مخصوص البعض ہے۔ لہٰذا شرک اور زنا اور ناحق کسی کو قتل کرنا اس سے بھی بڑا ظلم ہے۔ (از کبیر بزیادة)

اَنْ یُّذْکَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ : ملحوظ رہے کہ یہاں ذکر سے وہی ذکر مراد ہے جس کا تعلق اذان، نماز یا اذکار حسنہ سے ہو۔ جہر شدید کے ساتھ ذکر کرنا جو کسی نمازی یا دوسرے عبادت گزار کے لئے موجب تشویش ہو ہرگز جائز نہیں۔ ایسے جہر شدید سے روکنا ضروری ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے شدت جہر سے صحابہ کرام کو روکا ہے، ارشاد فرمایا

"اربعوا على انفسكم فانكم لاتدعون اصم ولا غائبا" (بخاری ص ۴۲۰)

یعنی تم جہر میں اتنی شدت اختیار نہ کرو، اپنی جانوں پر نرمی کرو، کیونکہ تم کسی بہرے یا غائب کو نہیں پکار رہے۔ (التبیان للکاظمی)

خیال رہے کہ مطلقاً بلند آواز سے ذکر منع نہیں۔ اور نماز کے بعد بھی بہت زیادہ بلند آواز سے ذکر کرنا منع ہوگا۔ جبکہ نمازیوں کو تکلیف ہو۔ معمولی آواز سے ذکر کرنا مستحسن ہے۔ راقم کی کتاب "نماز کے بعد بلند آواز سے ذکر، اور دعا مستحب ہے۔" کا مطالعہ کریں۔

مخفی نہ رہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ذکر اللہ تعالیٰ کے ذکر سے جدا نہیں۔ درود شریف، کلمہ شہادت، اذان اور نماز میں اللہ کے ذکر کے ساتھ حضور ﷺ کا ذکر شامل ہے۔ حضور کے ذکر کے بغیر نہ اذان ہوگی، نہ درود، نہ کلمہ شہادت، نہ نماز، اللہ اور رسول دونوں کے ذکر سے مسجدیں آباد ہوتی ہیں، معلوم ہوا کہ ذکر رسول ﷺ سے روکنا بھی مسجدوں کو ویران کرنا ہے۔ (التبیان للکاظمی)

وَسَعٰی فِیْ خَرَابِهَا : (اور کوشش کرتا ہے ان کو ویران کرنے کی)

اس سے مراد صرف مساجد کو شہید کرنا نہیں، بلکہ عام ہے کہ ہر وہ کام، ہر وہ قول، ہر وہ طریقہ جو نمازیوں کو مسجد میں آنے سے روکے وہی مسجد کو ویران کرنے کا سبب ہے۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ امام اگر یہ کہے رشوت حرام ہے۔ شراب حرام ہے۔ جوا حرام ہے۔ سود حرام ہے تو لوگ ناراض ہو جائیں، کسی قسم کی حق بات کرنے سے لوگ ناراض ہوتے ہوں تو ہوتے رہیں۔

اُولٰٓئِکَ مَا کَانَ لَهُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْهَا اِلَّا خَآئِفِیْنَ :

اس کلام کے کئی مطالب ہیں۔ یعنی ایک جملہ کئی معانی کو شامل ہے۔

(۱) ظاهر الكلام ان الذين آمنوا وسعوا فی تخريب المسجد هم الذين يحرم عليهم دخوله الاخائفين "

بظاہر مطلب یہ ہے کہ بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور کوشش کی مسجد کو ویران کرنے کی، ان لوگوں کو مسجد میں داخل ہونا حرام ہے سوائے اس کے وہ اللہ تعالیٰ کا خوف کرتے ہوئے داخل ہوں۔

(۲) " ما كان ينبغی لهم ان يدخلوا مساجد الله الا خائفين علی حال الهيبة وارتعاد الفرائص من المؤمنين ان يبطشوا بهم فضلا ان يستولوا عليها و يمنعوا المؤمنين منها "

اللہ تعالیٰ کی مساجد میں اس کے ذکر سے روکنے والے کفار کے متعلق ہے کہ انہیں حق نہیں پہنچتا کہ وہ اللہ کی مساجد میں داخل ہوں۔ سوائے اس کے کہ ان پر ہیبت طاری ہوگی، مومنوں سے ڈرتے ہوئے ان کے کندھے کانپ رہے ہوں گے کہ یہ ہمیں پکڑ نہ لیں۔ چہ جائیکہ کہ یہ کفار مساجد کے متولی

بن بیٹھیں اور مؤمنوں کو ان مساجد سے روکنا شروع کر دیں۔

مطلب واضح ہوا کہ انہیں حق تو نہیں پہنچتا، اور زیادہ طور پر مسلمان اپنی مساجد کے امور کے خود ہی متولی ہوتے ہیں۔ اور کفار مساجد میں دخل اندازی سے ڈرتے ہیں۔ ہاں کبھی وہ اپنی سرکشی اور وقتی غلبہ کی وجہ سے مساجد میں تسلط جما بیٹھتے ہیں تو مسلمانوں کو مساجد میں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے روکتے ہیں۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کو اس آیۃ کریمہ میں بشارت دی گئی ہے کہ عنقریب مسجد حرام اور دوسری مساجد پر مسلمانوں کو ہی غلبہ حاصل ہوگا۔ اور کفار و مشرکین کو ذلت حاصل ہوگی۔ یہاں تک کہ مسجد حرام میں کوئی ایک ان میں سے داخل نہیں ہو سکے گا۔ سوائے اس کے کہ وہ ڈر رہا ہوگا کہ کہیں مجھے پکڑ کر سزا نہ دی جائے، یا یہ کہ اگر میں نے اسلام قبول نہ کیا تو مجھے کہیں قتل ہی نہ کر دیا جائے۔

" وقد انجز اللہ صدق ھذا الوعد فمنعھم من دخول المسجد الحرام و نادی فیھم عام حج ابوبکر ﷺ (الا لا یحجن بعد العام مشرک)

تحقیق اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ کو پورا فرمادیا کہ مشرکین کو مسجد حرام میں داخل ہونے سے منع کر دیا گیا اور جس سال حضرت ابوبکر ﷺ کی زیر قیادت حج کیا گیا اسی سال اعلان کر دیا گیا خبردار اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا۔

" وامر النبی ﷺ باخراج الیھود من جزیرۃ العرب " اور نبی کریم ﷺ نے حکم فرمایا یہود کو جزیرۂ عرب سے نکال دینے کا، یعنی یہود کو کبھی جزیرۂ عرب میں داخل نہ ہونے دینا۔

حضرت ابوبکر ﷺ کے زیر قیادت کئے جانے والے حج کے دوسرے سال ہی نبی کریم ﷺ کی زیر قیادت اور آپ کی معیت میں حج کیا گیا، اس وقت مسجد حرام اور تمام باقی مساجد پر مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہو گیا۔

" لایجترئ احد من المشرکین ان یحج و یدخل المسجد الحرام "

اس کے بعد کسی مشرک کو جرأت حاصل نہ ہو سکی کہ وہ حج کرے اور مسجد حرام میں داخل ہو۔

(۴) اگر چہ بظاہر یہ کلام خبری ہے لیکن معنی انشاء ہے۔ اس میں نہی پائی گئی ہے۔ ان کو منع کر دیا گیا کہ تم اللہ کی مساجد میں داخل نہ ہونا سوائے خوف رکھنے کے، یعنی اسلام لانے اور اللہ تعالیٰ کا خوف رکھنے کے بعد داخل ہو سکو گے۔

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ : (ان کو دنیا میں رسوائی ہوگی) اس رسوائی سے مراد یہ ہے کہ ان کو ایسی ذلت حاصل ہوگی جو مساجد میں داخل ہونے سے ان کے لئے مانع ہوگی۔ اور یہ کہ کفار نے اگر مسلمانوں کے ملک میں رہنا ہو تو جزیہ دے کر رہیں۔

یعنی ان پر جزیہ مقرر کیا جانا ان کے لئے باعث ذلت ہوگا۔

اور یہ کہ کفار کو جنگ میں قتل کر دینے کے حکم سے ان کی ذلت ہوگی۔ یعنی ہر قسم کی ذلت کا ان کو سامنا کرنا پڑے گا۔

" ان الخزی لایکون الا مایجری مجری العقوبة من الهوان والاذلال " یعنی ہر طرح کی رسوائی اور ذلت کے حاصل ہونے کو " خزی " کہا جاتا ہے۔

یعنی ان کو رسوائی عطاء کر کے دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے کفر پر قائم رہنے سے جھڑکا جاتا ہے کہ ابھی تمہارے لئے سوچنے کا موقع ہے کہ تم ایمان لے آؤ تا کہ اخروی دائمی عذاب سے بچ جاؤ۔

وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ : (اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہوگا)

اللہ تعالیٰ نے جب ان لوگوں کے بڑے ظلم کو ذکر کیا کہ مساجد کو ویران کرنے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے مساجد میں روکنے کی وجہ سے وہ بڑے ظالم ہیں۔ " فبین انهم یستحقون العقاب العظیم" تو بیان فرمایا کہ وہ بڑے عذاب کے مستحق ہوں گے۔ (از کبیر)

فائدہ : "لایجوز نقض المسجد ولا بیعه ولاتعطیله وان خربت المحلة "

کسی مسجد کو گرانا، کسی مسجد کو بیچنا اور کسی مسجد کو معطل چھوڑنا جائز نہیں، اگر چہ محلّہ برباد بھی کیوں نہ ہو جائے۔

" ولا یمنع بناء المساجد الا ان یقصدوا الشقاق و الخلاف " مساجد کی تعمیر سے کسی کو نہ منع کیا جائے ،ہاں اگر کوئی فتنہ وفساد اور اختلاف پیدا کرنا چاہے تو منع ہوگا ایسی مسجد کو بنانا۔
یعنی اگر ایک مسجد کے متصل ہی دوسری مسجد بنالی جائے ۔مقصد صرف لڑائی جھگڑا ہو۔تو دوسری مسجد بنانے والے ثواب کے بجائے گناہ حاصل کررہے ہیں۔ (از قرطبی)

اگر ایک مسجد میں دو امام اس غرض سے مقرر کردیئے جائیں کہ ان کی آپس میں لڑائی ہوتی رہے۔مسجد کا نظام ایک تماشا دکھائی دے تو دوسرے امام کا مقرر کرنا جائز نہیں ہوگا۔دوسرا امام درحقیقت امام نہیں ہوگا شیطان ہوگا۔ہاں اگر ایک امام ہو۔دوسرا نائب اور معاون ہے بغیر کسی فتنہ وفساد کے نظام چلائے تو درست اقدام ہے۔

مساجد کی انتظامیہ کے لوگ اگرچہ کئی نیک بھی ہوتے ہیں۔لیکن زیادہ طور پر ائمہ مساجد پر اپنا تسلط قائم رکھنے ،ان کو محکوم سمجھنے ،کسی اور نمازی کی رائے کو کوئی فوقیت نہ دینے ،اپنے فیصلوں کو زبردستی ٹھونسنے کی وجہ سے ثواب سے بھی محروم رہتے ہیں ،اور گناہ ہی حاصل کرتے ہیں۔

جب راولپنڈی (پاکستان) میں حکومت کی جانب سے مساجد کو شہید کرکے سڑکوں کو کشادہ کیا جانے لگا ،مساجد کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جانے لگا۔مساجد کی انتظامیہ اور ان کے اماموں سے سودا کیا جانے لگا تو راقم نے ایک رسالہ ''مسجد اور اس کے احکامات'' تحریر کیا فائدہ کے لئے اسے یہاں شامل کیا جارہا ہے۔

☆☆☆

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

﴿ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴾

﴿ مَا کَانَ لِلْمُشْرِکِیْنَ اَنْ یَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰہِ شٰھِدِیْنَ عَلٰی اَنْفُسِھِمْ بِالْکُفْرِ اُولٰٓئِکَ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ وَفِی النَّارِ ھُمْ خٰلِدُوْنَ ☆ اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ وَلَمْ یَخْشَ اِلَّا اللّٰہَ فَعَسٰٓی اُولٰٓئِکَ اَنْ یَّکُوْنُوْا مِنَ الْمُھْتَدِیْنَ ﴾

(پ ۱۰ / ۹)

مشرکوں کو نہیں (حق) پہنچتا کہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں، خود اپنے کفر کی گواہی دے کر۔ ان کا تو سب کیا دھرا اکارت (ضائع) ہے۔ اور وہ ہمیشہ آگ میں رہیں گے۔ اللہ کی مسجدیں وہی آباد کرتے ہیں جو اللہ اور قیامت پر ایمان لاتے اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں۔ اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تو قریب ہے کہ یہ لوگ ہدایت والوں میں ہوں۔

عمارۃ المسجد؟

مسجد کی ''عمارۃ'' کے دو مطلب ہیں، ایک یہ کہ مسجد میں زیادہ سے زیادہ وقت عبادت کے لئے گزارنا، اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ مسجد کی تعمیر کرنا۔ اگر یہ دوسرا معنی لیا جائے تو آیۃ کریمہ کا مطلب یہ ہوگا کہ کافروں کے لئے لائق نہیں کہ وہ مساجد کی تعمیر و مرمت کریں۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔

(۱) کفار و مشرکین کو تعمیر مسجد کا حق اس لئے نہیں پہنچتا کہ مساجد عبادت کے لئے بنائی جاتی ہیں اس لئے ضروری ہے کہ ان کی تعظیم کی جائے لیکن کافر تو مساجد کی بے حرمتی کرتے ہیں ان کی تعظیم نہیں کرتے۔

(۲) اور وجہ یہ ہے کہ کافر ناپاک ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی اس پر واضح طور پر دلالت کر رہا ہے ﴿اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ﴾ یقیناً مشرک ناپاک ہیں اور ناپاک لوگوں سے مساجد کو پاک کرنے کا حکم بھی رب تعالیٰ نے خود فرمایا۔ ﴿ اَنْ طَھِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعٰکِفِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ﴾ یہ کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف بیٹھنے والوں اور رکوع

کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک رکھو۔

(۳) اور وجہ یہ بھی ہے کہ کافر نجاست سے پرہیز نہیں کرتا؛ اس لئے بسا اوقات کافر کے مسجد میں آنے سے مسجد کو گندگی سے ملوث کرنا لازم آئے گا۔

(۴) اور وجہ یہ ہے کہ کافر مسجد میں آ کر مسلمانوں کی عبادت میں فساد ہی پیدا کرے گا حالانکہ مساجد جائے امن وسکون ہیں۔

(۵) اور یہ بھی وجہ ہے کہ کافر مسجد کو تعمیر کر کے مسلمانوں پر اپنا احسان جتائے گا۔ یہ جائز نہیں کہ مسلمان کافر کے احسان مند رہیں اور وہ اپنا احسان جتلاتا پھرے۔

جب پہلا معنی مراد لیا جائے کہ عمارة المسجد کا معنی ''عبادت کے ذریعے مسجد کو آباد کرنا ہے'' تو یہ...... رب کی عبادت کرنا...... کافر سے ویسے ہی ممکن نہیں، اگر کوئی منافقت سے عبادت کے لئے مسجد میں آئے تو اس پر کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

مسجد کو آباد کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ پر ایمان ہونا ضروری ہے۔ اس لئے کہ مسجد وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہے اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے بغیر ممکن نہیں کہ وہ شخص مسجد تعمیر کرے۔ اسی طرح آخرت کے دن پر ایمان ہونا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ جس شخص کا قیامت پر ایمان ہوگا وہی اللہ تعالیٰ کا عبادت گزار ہوگا۔ اور جو شخص قیامت کا منکر ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کا عبادت گزار نہیں ہوگا۔ اور جب تک انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں کرے گا وہ مسجد بھی تعمیر نہیں کرے گا۔

خیال رہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوگا جب تک انبیاء کرام اور کتب الٰہیہ اور ملائکہ پر ایمان نہیں ہوگا۔ اس لئے واضح ہوا کہ مسجد کو وہی شخص عبادت کے ذریعے یا تعمیر کے ذریعے آباد کرے گا جس کا اللہ تعالیٰ، انبیاء کرام، آسمانی کتب، فرشتوں اور قیامت پر ایمان ہوگا۔

اسی طرح وہ شخص جو نماز ادا کرتا ہوگا وہی مسجد کی تعمیر کرے گا کیونکہ مسجد کے تعمیر کرنے میں ''مقصد عظیم'' نماز ادا کرنا ہے۔ انسان جب تک نماز کے وجوب کو ماننے والا نہیں ہوگا وہ مسجد بھی تعمیر نہیں کرے گا۔

علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول......''فالانسان مالم یکن مقرا بوجوب الصلوات امتنع ان یقدم علی بناء المسجد''......سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ انسان نماز کی فرضیت کو ماننے والا ہو لیکن غفلت ولاپرواہی کے باعث نماز ادا نہ کرتا ہو تو وہ بھی بعض اوقات مسجد تعمیر کر دیتا ہے۔

رب تعالیٰ نے مساجد تعمیر کرنے والوں کے اوصاف میں زکوٰۃ ادا کرنے کا ذکر بھی کیا ہے، ایک وجہ تو یہ ہے کہ نماز کے ساتھ کئی مقامات پر زکوٰۃ کا ذکر کیا گیا ہے اس لئے یہاں بھی ذکر کر دیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مسجد تعمیر کرنا مستحب ہے جبکہ زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہے۔ اس لئے انسان کو چاہئے کہ فرائض کو ضروری طور پر ادا کرے، پھر بعد میں اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے تو مستحبات پر بھی عمل کرے۔

مسجد کی تعمیر کرنے والے وہ لوگ ہیں جن کے دل میں تقویٰ اور خشیت الٰہی پائے جائیں۔

مسجد کے فضائل وآداب:

انسان کے لئے ضروری ہے کہ مسجد میں سوائے عبادت اور نیکی کی باتوں کے دنیاوی باتیں نہ کرے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" یأتی فی آخر الزمان ناس من امتی یأتون المساجد یقعدون فیها حلقا ذکرهم الدنیا وحب الدنیا لا تجالسوهم ، فلیس لله بهم حاجة "

آخر زمانہ میں میری امت سے کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو مساجد میں آ کر حلقہ بنا کر بیٹھیں گے وہ دنیا کا ذکر کریں گے اور انہیں دنیا سے ہی محبت ہوگی، ان کے ساتھ تم نہ بیٹھنا، ان لوگوں سے اللہ تعالیٰ کو کوئی واسطہ نہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو ان کے دین سے دور رہنے اور دنیا میں مشغول رہنے کی کوئی پرواہ نہیں بلکہ وہ اپنا ہی نقصان کر رہے ہوں گے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

'' الحدیث فی المسجد یاکل الحسنات کما تأکل البهیمة الحشیش ''

مسجد میں کلام نیکیوں کو ایسے کھا جاتی ہے جیسے چوپائے گھاس کو کھاتے ہیں۔

خیال رہے اس کلام سے مراد وہ کلام ہے جس کا تعلق دنیاداری سے ہو۔ لیکن دینی کلام، مسائل پر گفتگو اور ہر وہ کلام جس میں نیک مقصد ہو۔ کسی کی راہنمائی کرنا مقصود ہو، وہ جائز ہے اور اس میں ثواب ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" من اسرج فی مسجد سراجا لم تزل الملائكة وحملة العرش يستغفرون له مادام فی المسجد ضوؤه "

جس نے مسجد میں چراغ جلایا (یعنی روشنی کی) تو اللہ تعالیٰ کے فرشتے اور حاملین عرش ہمیشہ اس کے لئے بخشش طلب کرتے رہتے ہیں جب تک مسجد میں وہ روشنی رہتی ہے۔

(ماخوذ از تفسیر کبیر ج ١٦ ص ٨ تا ١٠)

تعمیر مسجد ذریعہء جنت:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" من بنى لله مسجدا بنى الله له بيتا فی الجنة "

(بخاری مسلم، مشکوۃ باب المساجد)

جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے لئے مسجد بنائی اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں گھر بنائے گا۔

یعنی جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے مسجد کی تعمیر کی اللہ تعالیٰ اسے جنت میں مقام عطا فرمائے گا۔

مساجد اللہ کی پسندیدہ جگہیں ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" احب البلاد الى الله مساجدها وابغض البلاد الى الله اسواقها "

تمام مقامات سے اللہ تعالیٰ کو مساجد سے زیادہ محبت ہے اور تمام مقامات سے رب تعالیٰ کو زیادہ ناپسند مقام بازار ہیں۔ (مسلم، مشکوۃ، باب المساجد)

مساجد سے محبت کی وجہ یہ ہے کہ مساجد میں انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے جس سے انسان کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اسے اپنی رحمت سے نوازتا ہے۔

" المراد بحب الله المساجد ارادة الخير لاهلها "

اللہ تعالیٰ کا مساجد سے محبت کرنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ مساجد میں عبادت کرنے والوں کو خیر (بھلائی، رحمت) عطا فرماتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

" المساجد مواطن المتقین " مساجد متقین کے مقامات ہیں۔

اللہ تعالیٰ کو بازار کیوں ناپسند ہیں؟

حضرت ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں:

" والاسواق محل افعال الشیاطین من الحرص والطمع و الخیانة و الغفلة "
(مرقاة المفاتیح)

بازار شیطانوں کے مقامات ہیں یہی وجہ ہے کہ بازاروں میں حرص، لالچ، خیانت اور غفلت زیادہ پائی جاتی ہے۔ غفلت سے مراد نمازوں میں کوتاہی کرنا، سچ نہ بولنا، جھوٹ کی پرواہ نہ کرنا، ملاوٹ، دھوکہ بازی جیسے کام ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا بازاروں سے بغض رکھنے کا مطلب یہ ہے ...... " وبالبغض خلافه " ...... کہ مساجد کے برخلاف بازاروں میں رہنے والوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت نہیں ہوتی، وہ اس کی رحمت سے دور ہوتے ہیں۔

تنبیہ : بازار و مسجد کے اس حکم کے متعلق ملا علی قاریؒ وضاحت فرماتے ہیں:

" وهذا بطريق الاغلبية والا فقد يقصد المسجد بقصد نحو الغيبة وقد يدخل السوق لطلب الحلال "
(مرقاة المفاتیح)

مساجد اور بازاروں کا یہ حکم اکثری اور غالب طور پر ہے۔ وگرنہ جو لوگ مسجد میں غیبت کرنے، چوری کرنے، فساد و فتنہ پھیلانے، امام کو تنگ کرنے کے لئے آتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہی رہیں گے۔ ایسے لوگوں سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔

تاہم اگر کوئی شخص بازار میں رزق حلال تلاش کرنے کے لئے جائے، سچ بولے، صاف ستھری تجارت کرے تو وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مستحق ہوتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

" طلب کسب الحلال فریضة بعد الفریضة "

حلال روزی کمانا دوسرے فرائض کو ادا کرنے کے بعد فرض ہے۔ (بیهقی ، مشکوٰۃ باب طلب کسب الحلال)

نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا یا رسول اللہ کون سا کسب پاکیزہ اور حلال ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"عمل الرجل بیده و کل بیع مبرور"

کسی انسان کا اپنے ہاتھوں سے کمانا اور صاف ستھری تجارت کرنا (کسب حلال ہے۔)

(مسند احمد ، مشکوٰۃ باب طلب کسب الحلال)

مسجد میں آمد و رفت سے جنت میں مہمان نوازی:

حضرت ابو ہریرہ ؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" من غدا الی المسجد اوراح اعد الله نزله من الجنة کلما غدا اوراح "

جو شخص صبح، شام مسجد میں جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں مہمانوں والا کھانا تیار فرماتا ہے جب بھی صبح جائے یا شام جائے۔ (بخاری ، مسلم ، مشکوٰۃ باب المساجد)

یعنی عبادت کی غرض سے مسجد میں صبح و شام جانے سے انسان اللہ تعالیٰ کا جنتی مہمان بن جاتا ہے۔ خیال رہے '' راح '' کا لفظ ظہر سے عشاء تک کے تمام وقت کو شامل ہے۔ مطلب واضح ہوا کہ پانچ نمازیں ادا کرنا مقصود ہیں اور یہ عمل بھی ہمیشہ جاری رکھے۔

ملا علی قاریؒ شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

" کلما استمر غدوه ورواحه استمر اعداد نزله فی الجنة "

جب انسان ہمیشہ کے لئے نماز ادا کرے گا، ہر روز مسجد میں جانے کا معمول بنائے گا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وہ اللہ تعالیٰ کا جنت میں مہمان رہے گا۔ ہر روز اسے بطور مہمان کھانے میسر ہوں گے۔

یہاں سے ہی ایک مسئلہ سمجھ میں آیا جیسے کہا جاتا ہے...... ''الحرکة سبب البرکة ''...... حرکت برکت کا سبب ہے۔ یعنی انسان ہاتھ پہ ہاتھ دھرے نہ بیٹھا رہے بلکہ اعمال جاری رکھے۔

دوسرا مسئلہ یہ واضح ہوا کہ ''الذهاب الی الطاعة علامة اعداد الله المثوبة '' نیکی کا

کام کرنے کے لئے جانا، اللہ تعالیٰ کے ثواب عطاء کرنے کی علامت ہے۔ یعنی عبادت سے اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل ہوتی ہے۔ (از مرقاۃ)

مسجد میں دور سے چل کر آنا زیادہ ثواب کا سبب ہے:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مسجد کے اردگرد کچھ جگہ خالی تھی، قبیلہ بنو سلمہ نے ارادہ کیا کہ وہ مسجد کے قریب منتقل ہو جائیں، نبی کریم ﷺ کو پتہ چلا تو آپ نے ان سے کہا مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تم مسجد کے قریب منتقل ہونے کا ارادہ رکھتے ہو (کیا ایسا ہی ہے؟) انہوں نے عرض کیا ہاں یارسول اللہ ﷺ (ہمارا یہی ارادہ ہے) تو آپ ﷺ نے فرمایا اے **بنی سلمہ "دیارکم ! تکتب آثارکم، دیارکم ! تکتب آثارکم"** تم اپنے گھروں کولازم پکڑو تمہارے قدموں کے آثار کو لکھا جائیگا۔ (مسلم، مشکوۃ باب المساجد)

اگر چہ نبی کریم ﷺ نے دومرتبہ "**دیارکم تکتب آثارکم**" کے الفاظ مبارکہ ہی ذکر فرمائے ہیں، لیکن یہ تکرار تاکید کے لئے نہیں بلکہ علیحدہ علیحدہ مفہوم ہے۔

ایک مرتبہ آپ کے الفاظ مبارکہ کا مفہوم یہ ہے۔ "**التزموا دیارکم تکتب فی صحف الاعمال ای کثرۃ الخطا سبب لزیادۃ الاجر**" اپنے گھروں کو لازم پکڑو یعنی وہیں رہو جتنے زیادہ قدم چلو گے اتنا ہی زیادہ ثواب تمہارے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا۔

دوسری مرتبہ بھی آپ نے الفاظ مبارکہ تو وہی ذکر فرمائے لیکن ان کا مطلب یہ ہے۔ "**الزموا دیارکم تکتب فی کتب السیر**" تم اپنے گھروں میں ہی رہو تمہارا ذکر سیرت کی کتابوں میں لکھا جائے گا۔ یعنی تمہارا واقعہ اور تمہارا عبادت میں مشقت برداشت کرنا سلف صالحین کی سیرت کی کتابوں میں لکھا جائے گا؛ تا کہ دوسرے لوگ بھی اسی کی تمنا کریں اور وہ بھی اپنی عبادت میں کوشش کریں اور مشقت برداشت کریں۔

یعنی ان صحابہ کرام کا عمل ایک اور حدیث پاک کا بھی عملی نمونہ تھا۔ وہ حدیث یہ ہے:

"**من سن سنۃ حسنۃ فلہ اجرھا واجر من عمل بھا الی یوم القیامۃ**"

جس شخص نے اچھا عمل رائج کیا اسے اس کا ثواب ملے گا اور جس شخص نے بھی اس پر عمل کیا اسے بھی ایسا ہی ثواب ملے گا۔

" وفيه تنبيه ان فی الحديث معجزة له عليه السلام واشارة الی ان التكرار ليس للتاكيد بل بشارة الی الكتابتين " (مرقاة ج ۲ ص ۱۹۳)

واضح ہوا کہ حدیث پاک سے نبی کریم ﷺ کا معجزہ ثابت ہو رہا ہے کہ آپ نے دو مرتبہ ذکر فرمایا یہ تکرار تاکید کیلئے نہیں بلکہ دو مرتبہ ان کے عمل کو لکھے جانے کا ذکر ہے۔ ایک مرتبہ نامہ اعمال میں اور ایک مرتبہ سیرت کی کتب میں۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد حرف بحرف ثابت ہو چکا ہے کیونکہ حدیث پاک کے شارحین نے اپنی اپنی کتب میں ذکر کیا ہے۔ راقم جیسا سیاہ کار بھی صحابہ کرام کے اس عظیم عمل کو ذکر کر کے اپنی نجات کا ذریعہ بنا رہا ہے۔ (ان شاء الله العزيز)

مسجد سے دل لگانے والا اللہ کی رحمت کے سایہ میں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" سبعة يظلهم الله في ظله يوم لا ظل الا ظله امام عادل وشاب نشأ في عبادة الله وّرجل قلبه معلق بالمسجد اذا خرج منه حتى يعود اليه وّرجلان تحابا في الله اجتمعا عليه وتفرقا عليه وّرجل ذكر الله خاليا ففاضت عيناه وّرجل دعته امرأة ذات حسب وجمال فقال انی اخاف الله وّرجل تصدق بصدقة فاخفاها حتى لا تعلم شماله ماتنفق يمينه "

(بخاری، مسلم مشکوۃ باب المساجد)

سات قسم کے شخص اس دن اللہ تعالیٰ رحمت کے سایہ میں ہوں گے جس دن اس کی رحمت کے سایہ کے بغیر اور کوئی سایہ نہیں ہوگا۔

(۱) عدل وانصاف کرنے والا حاکم۔

(۲) جوانی میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والا۔

(۳) اور وہ شخص جس کا دل مسجد سے معلق رہے جب مسجد سے نکلے تو پھر مسجد کیطرف لوٹنے کی تمنا رکھے

(۴) اور دو شخص جو آپس میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی خاطر محبت رکھیں جب دونوں جمع ہوں اور جب دونوں علیحدہ ہوں (یعنی آمنے سامنے بھی محبت رکھیں اور ایک دوسرے کے پیچھے بھی محبت رکھیں۔ ایسا نہ ہو کہ ان کی محبت منافقت پر مبنی ہو اور وہ کسی ابوجہل کے آلہ کار بنے ہوئے ہوں)

(۵) اور وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کا ذکر علیحدہ ہو کر کرے اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوں (یعنی لوگوں سے علیحدہ ہو کر، ریاکاری سے ہٹ کر اور معبودان باطلہ سے دور رہ کر صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے، خلوص و محبت سے عبادت کرے اور دل میں خوف الٰہی ہو جس سے عبادت کرتے ہوئے آنکھیں ڈبڈبا جائیں)

(۶) اور وہ شخص جسے ایک عورت خوبصورت اور حسب و نسب والی دعوتِ گناہ دے تو وہ کہے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں (اس طرح وہ اس سے بچ کر رہے)

(۷) اور وہ شخص جو مخفی طور پر صدقہ دے یہاں تک کہ بائیں ہاتھ کو معلوم نہ ہو سکے جو دائیں ہاتھ نے خرچ کیا ہو (اس سے مراد نفلی صدقہ ہے کیونکہ زکوٰۃ ظاہراً دینا بہتر ہے تاکہ یہ خود اس تہمت سے بچ سکے کہ یہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ دوسرے لوگ بھی اسے دیکھ کر زکوٰۃ ادا کریں)

تحیۃ المسجد :

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" اذا دخل احدکم المسجد فلیر کع رکعتین قبل ان یجلس "

جب تم میں سے کوئی ایک مسجد میں داخل ہو تو وہ بیٹھنے سے پہلے دو رکعت ادا کرے۔

(بخاری، مسلم، مشکوۃ، باب المساجد)

ایک روایت میں اس طرح ذکر ہے۔

" اعطوا المساجد حقها ، قالوا وما حقها یارسول الله ؟ قال ان تصلوا رکعتین قبل ان تجلسوا "

حضور ﷺ نے فرمایا: مساجد کو ان کا حق دو، صحابہ کرام نے پوچھا یارسول اللہ مساجد کا حق کیا ہے؟

آپ نے فرمایا مساجد میں بیٹھنے سے پہلے دو رکعت (نوافل) ادا کرنا۔ (مرقاۃ ج ۲ ص ۱۹۸)

تحیۃ المسجد کا بدل:

" ومن دخله کراهة الصلوة او وهو محدث قال اربع سبحان الله والحمد لله ولا اله الا الله

واللہ اکبر وزاد بعضھم ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم" (مرقاۃ ج ۲ ص ۱۹۹)

اگر کوئی شخص مسجد میں ایسے وقت داخل ہو جس میں نوافل ادا کرنے منع ہوں (جیسے صبح صادق سے لے کر طلوع آفتاب تک اور عصر کی نماز ادا کر لینے کے بعد سے مغرب کی نماز ادا کر لینے تک نوافل ادا کرنے منع ہیں۔ اسی طرح طلوع آفتاب اور غروب آفتاب اور ضحوۃ کبری یعنی عام طور پر جسے زوال کہا جاتا ہے ان اوقات میں بھی نوافل ادا کرنے مکروہ ہیں) یا وہ بے وضو ہو تو دو رکعت نوافل نہ ادا کرے بلکہ چار مرتبہ...... "سُبْحَانَ اللهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاللهُ اَكْبَرُ"...... پڑھے۔ بعض حضرات نے فرمایا ان الفاظ کے بعد" وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ" بھی پڑھے۔ یعنی تیسرا کلمہ مکمل پڑھے۔ سلف صالحین میں سے بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ چار مرتبہ تیسرا کلمہ پڑھ لینے سے دو رکعت نوافل کا ثواب مل جائے گا۔

اس قول پر امام کبیر تابعی حضرت جابر بن زید کی روایت تائید کر رہی ہے۔ آپؒ نے فرمایا" اذا دخلت المسجد فصل فیہ فان لم تصل فاذکر اللہ فکانک قد صلیت" جب تم مسجد میں داخل ہو تو دو رکعت نوافل ادا کر لو اگر تم نماز نہ ادا کر سکو تو اللہ تعالیٰ کا ذکر ہی کر لو، اس سے تمہیں ایسا ہی ثواب حاصل ہو گا جیسا کہ تم نے نماز ادا کی۔

" ومن دخل المسجد الحرام واراد الطواف فلیبدأ بہ والا فلیصل "

جو شخص مسجد حرام میں داخل ہو وہ اگر طواف کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو وہ پہلے طواف کرے، اگر طواف کا ارادہ نہ ہو تو تحیۃ المسجد ادا کرے۔

" ان الزائر اذا دخل المسجد النبوی یصلی اولا ثم یزورہ تقدیما لحق اللہ تعالیٰ وتعظیمہ علی حق رسول اللہ وتکریمہ "

بے شک رسول اللہ ﷺ کے روضہ مطہرہ کی زیارت کرنے کے ارادہ سے جانے والا شخص جب مسجد نبوی شریف میں داخل ہو تو پہلے تحیۃ المسجد ادا کرے تاکہ اللہ تعالیٰ کے حق اور اللہ تعالیٰ کی تعظیم کو رسول اللہ ﷺ کے حق و تکریم پر مقدم رکھے۔ (مرقاۃ ج ۲ ص ۱۹۹)

" واداء الفرض ینوب عنھا وکل صلوۃ اداھا عند الدخول بلانیۃ التحیۃ لان التحیۃ

لتعظیمه وحرمته وقد حصل ذلک بما صلاه ولا تفوت بالجلوس عندنا وان کان الافضل فعلها قبله "

مسجد میں جاتے ہوئے فرض نماز ادا کرنا یا سنت وغیرہ ادا کرنا "تحیۃ المسجد" کے قائم مقام ہوں گے۔ کیونکہ تحیۃ المسجد ادا کرنے کا مقصد مسجد کی تعظیم وتحریم ہے وہ ہر قسم کی نماز سے حاصل ہوجاتی ہے۔ اگر چہ علیحدہ دو رکعت تحیۃ المسجد کے ارادہ سے ہی ادا کرنا افضل ہے۔

(نورالایضاح، مراقی، ذریعة النجاح ص ۱۰۰)

حدیث شریف میں جو ذکر ہے کہ بیٹھنے سے پہلے تحیۃ المسجد ادا کرے وہ بیان افضلیت ہے۔ اگر پہلے بیٹھ گیا پھر نماز ادا کی تو تحیۃ المسجد کا مقصد فوت نہیں ہوگا۔

مسجد میں داخل ہونے کی دعا:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم میں سے جب بھی کوئی شخص مسجد میں داخل ہو تو یہ پڑھے۔

" اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ رَحْمَتِکَ "

اے اللہ! میرے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول۔

مسجد سے باہر نکلنے کی دعاء:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم میں سے جب بھی کوئی شخص مسجد سے باہر آئے تو یہ کہے۔

" اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ مِنْ فَضْلِکَ "

اے اللہ میں تجھ سے تیرے فضل کا سوال کرتا ہوں۔ (مسلم، مشکوۃ باب المساجد)

دونوں دعاؤں میں وجہ فرق:

مسجد میں داخل ہوتے وقت رحمت کی دعا کی جاتی ہے۔ اس لئے کہ انسان جب مسجد میں داخل ہوتا ہے تو عبادت میں مشغول ہوتا ہے۔ جو حصولِ ثواب اور دخول جنت کا ذریعہ ہے۔ اس کے مناسب رحمت کی دعا ہی ہے۔ لیکن جب مسجد سے باہر آئے تو رزق حلال کی تلاش میں ہوتا ہے۔ اس لئے وہاں مناسب یہی ہے کہ اللہ کے فضل کی طلب کرے؛ کیونکہ رزق حلال کو حاصل کرنا رب تعالیٰ کا فضل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا:

﴿فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾...... جب نماز جمعہ ادا کرلو...... تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل کو حاصل کرو، یعنی تجارت کرو اور رزق حلال کو حاصل کرو۔

(مرقاۃ ج ۲ ص ۱۹۸)

فائدہ جلیلہ:

"عن فاطمة الکبریٰ قالت کان رسول اللہ ﷺ اذا دخل المسجد صلی علی محمد و سلم"

حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ جب مسجد میں داخل ہوتے تھے تو (اپنے آپ پر درود پاک ان الفاظ میں) پڑھتے تھے۔ "صلّی علی محمد و سلّم"

آپ کو اپنے آپ پر ایمان لانا واجب تھا اس وجہ سے آپ اپنے آپ پر درود شریف پڑھتے اور اس میں امت کو تعلیم دینا بھی مقصود تھا تا کہ میری امت بھی جب مسجد میں داخل ہو تو دعا سے پہلے درود شریف پڑھے۔ (حاشیہ ترمذی)

"و فی خبر الحاکم و صححه اذا دخل احدکم المسجد فلیسلم علی النبی ﷺ"

مستدرک حاکم میں صحیح حدیث بیان کی گئی ہے۔ "جب تم میں سے کوئی ایک مسجد میں داخل ہو تو نبی کریم ﷺ پر درود پڑھے" (مرقاۃ ج ۲ ص ۱۹۸)

ان روایات اور اقوال ائمہ سے معلوم ہوا کہ مسجد میں داخل ہوتے اور نکلتے وقت رحمت وفضل کی دعاؤں میں ابتداء درود شریف سے کرے؛ تا کہ حصول برکت اور قبولیت دعا کا ذریعہ ہو۔

مسجد سے نکلتے ہوئے یہ بھی پڑھے:

عالمہ ابن سنی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ جب انسان مسجد سے نکلنے کے ارادہ پر مسجد کے دروازہ پر آ کر کھڑا ہوتا ہے تو شیطانی لشکر اس طرح جمع ہو جاتے ہیں جس طرح شہد کی مکھیاں اپنے چھتے پر جمع ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ درج ذیل دعا پڑھے تا کہ ان کے وسوسوں اور ہر قسم کے ان سے واقع ہونے والے خطرات سے محفوظ رہ سکے۔

(وہ دعا یہ ہے) "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ اِبْلِیْسَ وَجُنُوْدِهٖ"

اے اللہ میں تیری پناہ پکڑتا ہوں شیطان اور اس کے لشکر سے۔ (از مرقاۃ ج ۲ ص ۱۹۸)

مسجد میں سوال کرنا اور سائل کو عطا کرنے کا حکم:

اس مسئلہ میں اگرچہ اہل علم نے اختلاف کیا ہے تاہم علامہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر شاندار محاکمہ بیان کیا ہے، جس میں تمام اقوال جمع ہو سکتے ہیں۔

کچھ حضرات نے مطلقاً سائل کو عطا کرنے سے منع کیا ہے انہوں نے بطور دلیل یہ کہا ہے کہ بعض روایات میں اس طرح آتا ہے۔

"ینادی یوم القیامة لیقم بغیض اللہ فیقوم سؤال المسجد"

قیامت کے دن جب یہ نداء دی جائے گی کہ اللہ کے غیض سے کوئی شخص کھڑا ہو جائے تو وہی شخص کھڑا ہو گا جو مسجد میں سوال کیا کرتا تھا۔ خیال رہے غیـــض کا معنی "کمی، تھوڑی مقدار" ہے۔ لہٰذا یہ معنی ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی جس شخص پر کم رحمت ہے وہ کھڑا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ "غیـــض" بمعنی غیظ ہو جائے جس کا معنی ناراضگی ہے۔

کچھ حضرات نے مطلقاً سوال کرنے اور سائل کو عطا کرنے کا جواز تسلیم کیا ہے ان کی دلیل یہ ہے صحیح حدیث میں یہ مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا:......

"ھل احدکم منکم اطعم الیوم مسکینا فقال ابوبکرؓ دخلت المسجد فاذا انا بسائل فوجدت کسرة خبز فی ید عبدالرحمن فاخذتھا فدفعتھا الیه"

......کیا کسی شخص نے تم میں سے آج سائل کو کھانا کھلایا ہے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا (ہاں یا رسول اللہ) میں مسجد میں داخل ہوا تو میں نے ایک سائل کو پایا میں نے ...... اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کے ہاتھ میں ایک روٹی کا ٹکڑا پایا، میں نے وہ روٹی کا ٹکڑا اس کے ہاتھ سے لے کر سائل کو دے دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق کے اس فعل کو جنت میں جانے کا ذریعہ قرار دیا۔

محاکمہ:

بعض حضرات نے تفصیل ذکر کی ہے اور اس مسئلہ کو اس طرح بیان کیا ہے کہ دونوں قسم کی احادیث پر عمل کیا جا سکے اور یہی قول بہتر بھی ہے۔

(۱) "من یؤذی الناس بالمرور ونحوه فیکره اعطاؤه لانه اعانة له علی ممنوع"

جو شخص لوگوں کو گذرتے ہوئے تکلیف دے یعنی گردنوں کو پھاند کر آگے صف میں پہنچنے کی کوشش کرے یا اور اسی طرح کسی قسم کی تکلیف کا سبب بنے اسے کچھ نہ دیا جائے کیونکہ دوسروں کو تکلیف دینا منع ہے اور ممنوع چیز پر معاونت بھی ممنوع ہے۔

خیال رہے کہ اسی طرح پیشہ ور بھکاری جھوٹی قسمیں اٹھا کر اپنی حالت زار بیان کرنے والے سائلین کی امداد بھی نہ کی جائے۔ ایسے لوگوں کی امداد کرنا درحقیقت ان کو اس پیشہ پر قائم رکھنا لازم آتا ہے۔ ان کی حوصلہ شکنی ضروری ہے۔

(۲) "ومن لایؤذی فیسن اعطاؤه لان السئول کانوا یسألون علی عهد رسول الله ﷺ فی المسجد"

اور جو شخص سوال کرنے میں کسی کو ایذاء نہ پہنچاتا ہو ایسے شخص کو عطا کرنا سنت ہے؛ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ اقدس میں سائل لوگ مسجد میں سوال کرتے تھے (اور ان کے سوال کے مطابق ان کی حاجت کو پورا کیا جاتا تھا)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک سائل کو انگوٹھی عطا کی جب آپ رکوع میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح فرمائی اور ارشاد فرمایا:

﴿ یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رٰاکِعُوْنَ ﴾

وہ حالت رکوع میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں۔

علامہ ملا علی قاری رحمہ الباری فیصلہ کن بات کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"والظاهر ان الخلاف خلاف عصر وزمان لاختلاف السائلین والله اعلم"

(ماخوذ از مرقاۃ ج ۲ ص ۱۹۹، ۲۰۰)

ظاہر بات یہ ہے کہ یہ "اختلاف" زمانہ کے اختلاف اور سائلین کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔ جب سائلین کسی کو تنگ کرنے والے نہیں ہوتے تھے۔ پیشہ ور بھکاری نہیں ہوتے تھے، حاجت مند ہوتے تو سوال کرتے اس وقت سوال کرنے والوں کو دینا مطلقاً جائز تھا۔ اب چونکہ اکثر سائلین دوسروں کو ایذاء پہنچانے والے ہوتے ہیں۔ پیشہ ور بھکاری ہوتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ انسان

اپنی بصیرت سے اندازہ لگائے، کوئی شخص ضعیف ہے۔ کوئی حاجت مند نظر آتا ہو تو اسے کچھ دے دیا جائے ورنہ بغیر کسی تنگی، ترش روئی، ڈانٹ ڈپٹ کے خاموشی سے سائل کے قریب سے ہٹ جائے۔ اس لئے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ ﴾ اور جو مانگنے آئے اسے نہ جھڑکیں۔

بدبودار چیز کھا کر مسجد میں نہ جائے:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"من اکل من ھذہ الشجرۃ المنتنۃ فلا یقربن مسجدنا فان الملائکۃ تتاذی مما یتاذی منہ الانس"

جو شخص اس بدبودار پودے کو کھائے وہ ہماری مساجد کے قریب ہرگز نہ آئے۔ بے شک فرشتوں کو بھی اس چیز سے تکلیف ہوتی ہے جس سے انسانوں کو تکلیف ہوتی ہے۔

(بخاری، مسلم، مشکوۃ باب المساجد)

نبی کریم ﷺ نے جس پودے کی طرف اشارہ کیا اس سے مراد "تھوم" ہے۔ پیاز کا بھی یہی حکم ہے کیونکہ دوسری حدیث پاک میں صراحۃً تھوم اور پیاز سے ممانعت کا ذکر ہے۔ ہر بدبودار چیز کا حکم بھی یہی ہے۔ مسجد میں انسان نہ ہوں تب بھی یہی حکم ہے؛ کیونکہ فرشتوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ اسی سے واضح ہوا کہ سگریٹ، حقہ پی کر یا نسوار کھا کر آنے کا حکم بھی یہی ہے؛ کیونکہ جو انسان سگریٹ یا حقہ نہیں پیتا اور نسوار نہیں کھاتا اسے ان چیزوں کی بدبو سے تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

مسجد میں خوشبو لگانا مستحب ہے:

" عن عائشۃ قالت امر رسول اللہ ﷺ ببناء المسجد فی الدور وان ینظف ویطیب "

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے اپنے اپنے محلّہ میں مسجد بنانے اور ان کو صاف رکھنے اور ان میں خوشبو لگانے کا حکم فرمایا۔ (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، مشکوۃ باب المساجد)

ہر محلّہ میں مسجد بنانے کا حکم اس لئے فرمایا گیا کہ مسجد کے دور ہونے کی وجہ سے بعض اوقات لوگ مسجد میں نماز ادا کرنے کے ثواب سے محروم ہو جاتے ہیں اور جماعت سے نماز ادا نہیں کر سکتے کیونکہ مسجد

دور ہونے کی وجہ سے وہ جانے میں مشقت سمجھتے ہیں۔ اس لئے ہر محلّہ میں مسجد بنانے کا حکم دیا تا کہ لوگ آسانی سے بغیر کسی مشقت کے نماز باجماعت ادا کرسکیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر فرمایا کہ عطاء کہتے ہیں ''اللہ تعالیٰ حضرت عمر ﷺ کو جب بھی کسی شہر کی فتح نصیب فرماتا تو.....

''امر المسلمین ببناء المسجد وامرهم ان لا یبنوا مسجدین یضار احدهما الآخر''

.....آپ مسلمانوں کو مساجد کی تعمیر کا حکم دیتے اور یہ فرماتے کہ دو مسجدیں اس طرح نہ بنائی جائیں کہ ایک مسجد سے دوسری کو نقصان ہو۔

'' ومن المضارة فعل تفریق الجماعة اذا کان هناک مسجد یسعهم فان ضاق سنّ توسعة او اتخاذ مسجد یسعهم .''

ایک مسجد سے دوسری کو نقصان اس وقت ہوتا ہے جب لوگوں کو جماعت سے متفرق کر دیا جائے۔ حالانکہ وہ ایک ہی مسجد سب کے لئے کافی بھی ہو اور بہت زیادہ فاصلہ بھی نہ ہو کہ لوگوں کو آنے جانے میں مشکل درپیش آتی۔

اگر مسجد تنگ ہو جائے تو اسے ہی وسیع کرنا مسنون ہے یا ساتھ ہی نئی مسجد بنالی جائے کہ اس میں تمام نمازی سما سکیں۔ ایسی صورت میں پہلی مسجد کو قرآن پاک پڑھنے، ذکر واذکار وغیرہ کے لئے مختص کر دیا جائے اور سب لوگ ایک ہی مسجد میں نماز ادا کریں۔ ہاں اگر فاصلہ زیادہ ہو لوگوں کو ایک ہی مسجد میں آنا دشوار ہو تو وہ اپنے قریب مسجد بنالیں تو یہ درست ہے۔

☆ ''یستحب تجمیر المسجد بالبخور'' ''مسجد میں خوشبو سلگانا مستحب ہے۔ اگر بتی کا یہی حکم ہے۔ البتہ احتیاط کی ضرورت ہے کہ قالین وغیرہ کو بے احتیاطی سے آگ نہ لگ جائے

☆ '' واستحب بعض السلف تخلیق المسجد بزعفران والطیب''

سلف صالحین نے مسجد کو زعفران سے اور ہر قسم کی خوشبو سے خوشبودار کرنے کو مستحب قرار دیا ہے البتہ خوشبو کا پاک ہونا ضروری ہے۔

☆ '' وانه یستحب کنس المسجد وتنظیفه''

مسجد میں جھاڑو دینا اور مسجد کی صفائی کرنا مستحب ہے۔

" وقد روی ابن ابی شیبة انه علیه السلام کان یتتبع غبار المسجد بجریدة "

ابن ابی شیبہ نے روایت ذکر کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ خود مسجد کی صفائی فرماتے تھے۔ مسجد کے گردو غبار کو کھجور کے جھاڑو سے اپنے ہاتھ مبارک سے صاف فرماتے تھے۔

مسجد میں سونے کا حکم:

" یکره النوم فی المسجد للمقیم عندنا وعند غیرنا ویجوز للمسافر "

مسجد میں مقیم آدمی کے لئے سونا مکروہ ہے۔ البتہ مسافر کے لئے سونا جائز ہے۔

(حاشیة ترمذی باب النوم فی المسجد)

" قال ابن عباس لایتخذه مبیتا ومقیلا " وذهب قوم من اهل العلم الی قول ابن عباس "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا مسجد میں رات کو سونے یا دن کو سونے کی عادت بنانا جائز نہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول کو ہی اہل علم حضرات نے پسند فرمایا ہے۔ (ترمذی باب النوم فی المسجد)

مسجد میں مقیم آدمی کے سونے کی عادت بنانے میں دو خرابیاں لازم آتی ہیں حالانکہ ان سے اجتناب ضروری ہے۔

(ا) "یکره تحریما اخراج الریح فی المسجد ولعله یستثنی منه المعتکف لکونه معذورا "

مسجد میں ہوا کا خارج کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لیٹ کر سونا یا تکیہ اور دیوار وغیرہ سے سہارا لگا کر سونا وضوء کو توڑ دیتا ہے۔ وضوء کے ٹوٹنے کی یہی وجہ ہے کہ مفاصل (جوڑوں) کے ڈھیلے ہونے سے ہوا کے خارج ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ مسجد میں سونے کی عادت بنانے میں بھی یقیناً ہوا کا خارج ہونا لازم آئیگا جو مکروہ تحریمی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ مسجد میں مقیم شخص سونے کی عادت نہ بنائے۔

اعتراض:

" عن ابن عمر قال کنا ننام علی عهد رسول الله ﷺ فی المسجد و نحن شباب "

قال ابو عیسی حدیث ابن عمر حدیث حسن صحیح وقد رخص قوم من اهل العلم فی النوم فی المسجد . "

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ فرماتے ہیں ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں مسجد میں سو جاتے تھے جب ہم جوان تھے۔

ابوعیسیٰ ترمذی نے حضرت ابن عمر کی روایت کردہ حدیث کو حسن صحیح قرار دیا اور ساتھ ہی یہ ذکر کیا ہے کہ اہل علم کی ایک قوم نے مسجد میں سونے کی رخصت دی ہے۔

اس سے تو واضح ہوا کہ مسجد میں سونا جائز ہے۔ نبی کریم ﷺ کا منع نہ فرمانا جواز کے لئے حدیث تقریری ہے لہذا سونے کی عادت بنانے کی ممانعت کیسے ثابت ہوتی ہے؟

جواب:

"اما نوم ابن عمر فکان لانه لم یکن له بیت و کان عزبا و کذلک ثبت النوم عن بعض الصحابة فی شرح مسلم للنووی حملوه علی حالة العذر"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ مسجد میں اس لئے سوتے تھے کہ آپ کا اپنا کوئی مکان نہیں تھا، اس لئے بھی کہ آپ جوان تھے لہٰذا کسی کے گھر سونا ممکن نہیں تھا۔ اسی طرح اور بھی کئی صحابہ کرام اسی عذر کے پیش نظر مسجد میں سو جایا کرتے تھے۔

واضح ہوا کہ بعض صحابہ کرام کا مسجد میں سونا مجبوری کے پیش نظر تھا۔ مسافر کے لئے سونا اب بھی جائز ہے لیکن بغیر مجبوری یا مسافر ہونے کے مسجد میں سونے کی عادت بنانا جائز نہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

"لایزال احدکم فی صلوۃ مادام ینتظرها و لا تزال الملائکة تصلی علی احدکم مادام فی المسجد "اللهم اغفرله اللهم ارحمه" مالم یحدث فقال رجل من حضرموت وما الحدث یا اباهریرۃ؟ فقال فساء او ضراط"

(ترمذی باب ماجاء فی القعود فی المسجد وانتظار الصلوۃ من الفضل)

تم میں سے جب کوئی شخص نماز کی انتظار میں ہو وہ درحقیقت نماز میں ہی ہوگا۔ اور جب تک کوئی شخص مسجد میں ہو فرشتے اس کے لئے یہ دعا کرتے ہیں۔ اے اللہ اس کی مغفرت فرما، اے اللہ اس پر رحم کر۔ فرشتوں کی یہ دعا اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک اس شخص کو "حدث" لاحق نہ ہو۔

''حضر موت'' کے ایک شخص وہاں موجود تھے انہوں نے پوچھا اے ابو ہریرہ ''حدث'' سے مراد کیا ہے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ حدث سے مراد آہستہ آواز میں یا بلند آواز میں ہوا کو خارج کرنا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ مسجد میں ہوا کا خارج کرنا فرشتوں کی رحمت بھری دعا سے محرومیت کا سبب ہے؛ لہٰذا مسجد میں سونے کی عادت نہ بنائے۔

مسجد میں سونے کی دوسری خرابی

(۲) " ان الکلام فی المسجد یأکل الحسنات کما یأکل النار الحطب "

بے شک مسجد میں کلام کرنا نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ مقیم شخص اگر مسجد میں سونے کی عادت بنائے گا تو مسجد میں کلام کرنا بھی اس کی مجبوری اور اس کا مقصود ہوگا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ وہ اس سے اجتناب کرے۔ لیکن خیال رہے کلام سے مراد دنیاوی کلام ہے۔ دینی کلام، شرعی مسائل بیان کرنا سنت اور مستحب ہے۔

دنیاوی کلام میں بھی وعید شدید اس صورت میں ہے۔ جس کے متعلق صاحب بحر الرائق نے فرمایا:

" وقال صاحب البحر هذا اذا دخل المسجد لارادة الکلام ولو عرضه فلا"

(ترمذی مع حاشیہ باب النوم فی المسجد)

صاحب بحر الرائق نے یہ بیان کیا ہے کہ دنیاوی کلام نیکیوں کو اس وقت کھا جاتی ہے جب کہ مسجد میں وہ داخل ہی کلام کی غرض سے ہو اور اگر وہ داخل تو عبادت کی غرض سے ہو لیکن بالطبع کوئی کلام بھی کر لے تو اس میں کوئی حرج نہیں اگر چہ بہتر ہے کہ دنیاوی کلام سے جتنا ہو سکے اجتناب کرے۔

مسجد میں خرید و فروخت اور گم شدہ چیز کا اعلان منع ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''من سمع رجلا ینشد ضالة فی المسجد فلیقل لا ردها الله علیک فان المساجد لم تبن لهذا ''

جو شخص کسی کو مسجد میں گمشدہ چیز کا اعلان کرتے ہوئے سنے وہ کہے اللہ تعالیٰ تمہیں یہ چیز نہ لوٹائے بے شک مساجد اس لئے نہیں بنائی گئیں۔ (بلکہ اللہ تعالیٰ کے ذکر، قرآن پاک کی تلاوت، وعظ و نصیحت

اور عبادت کے لئے بنائی گئی ہیں) (رواہ مسلم ، مشکوۃ باب المساجد)

" واما انشاد الضالة فله صورتان احداهما ان ضل شیٔ فی خارج المسجد وینشده فی المسجد لاجتماع الناس فهواقبح واشنع واما لوضل فی المسجد فیجوز الانشاد بلا شغب "
(حاشیہ ترمذی ص ۱۹۵)

گم شدہ اشیاء کے اعلان کی دوصورتیں ہیں ایک یہ کہ اگر کوئی چیز مسجد کے باہر گم جائے اوراس کا اعلان مسجد میں آ کراس لئے کرے کہ یہاں لوگ جمع ہیں تو یہ بہت قبیح وشنیع (بہت بری چیز) ہے لیکن اگر کوئی چیز مسجد میں گم ہوجائے تو اس کا اعلان جائز ہے بشرطیکہ اس میں شوروغوغا نہ پایا جائے۔

وحسن الترمذی خبر " اذا رأیتم من یبیع اویبتاع فی المسجد فقولوا : لا اربح الله تجارتک "

ترمذی نے حسن حدیث بیان کی ہے کہ جب تم کسی شخص کو مسجد میں خرید وفروخت کرتے ہوئے دیکھو تو کہو اللہ تعالیٰ تمہیں اس تمہاری تجارت میں نفع نہ دے۔

ہاں البتہ یہ خیال رہے کہ اعتکاف بیٹھے ہوئے شخص کے لئے جائز ہے کہ وہ کسی چیز کو خریدے یا بیچے کیونکہ بعض اوقات انسان کو خرید وفروخت کی ضرورت درپیش ہوتی ہے۔ لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ جس چیز کی خرید وفروخت کی جارہی ہواسے مسجد میں نہ لایا جائے۔

" وكذا يندب ان يقال لمن انشد شعرا مذموما " فض الله فاک " ثلاثا للامر بذلک رواه ابن السنی "

اسی طرح مستحب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص برے اشعار مسجد میں پڑھے تو سننے والے یہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دانت توڑ دے، یہ تین مرتبہ کہا جائے، کیونکہ اسی کا حکم دیا گیا ہے۔ ابن سنی نے یہ روایت بیان کی ہے۔

برے شعر کے ساتھ "برے" کی صفت ذکر کرنے سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء، نبی کریم ﷺ کی نعت یا ذکر ونصیحت پر مشتمل اشعار کا یہ حکم نہیں، بلکہ ان کا مسجد میں پڑھنا مستحب ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کے سامنے مسجد میں منبر پر حضرت حسان رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی تعریف میں اشعار پڑھتے تھے اور حضور ان کے لئے دعا فرماتے تھے۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج ۲ ص ۱۹۹ ، حاشیہ ترمذی ص ۱۹۸)

فائدہ عظیمہ:

" عن انس ابن مالک قال قال رسول الله ﷺ صلوۃ الرجل فی بیته بصلوۃ وصلوته فی مسجد القبائل بخمس وعشرین صلوۃ وصلوته فی المسجد الذی یجمع فیه بخمسائة صلوۃ وصلوته فی المسجد الاقصیٰ بخمسین الف صلوۃ وصلوته فی مسجدی بخمسین الف صلوۃ وصلوته فی المسجد الحرام بمائة الف صلوۃ"

(رواہ ابن ماجه . مشکوۃ باب المساجد)

حضرت انس ﷺ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا انسان اپنے گھر نماز ادا کرے تو اسے ایک نماز کا ثواب حاصل ہوگا اپنے محلّہ کی مسجد میں (باجماعت) نماز ادا کرے تو اسے پچیس نمازوں کا ثواب حاصل ہوگا، اور اگر جامع مسجد میں نماز باجماعت ادا کرے تو اسے پانچ سو نمازوں کا ثواب حاصل ہوگا، اور مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) میں نماز ادا کرے تو اسے پچاس ہزار نمازوں کا ثواب حاصل ہوگا، اگر میری مسجد (مسجد نبوی) میں نماز ادا کرے تو اسے پچاس ہزار نمازوں کا ثواب ہوگا اور "مسجد حرام" میں نماز ادا کرے تو اسے ایک لاکھ نمازوں کا ثواب حاصل ہوگا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا محبت بھرا ارشاد:

" واما مزید المضاعفة فاسباب التفضیل لا تنحصر فی ذلک فالصلوات الخمس بمعنی للمتوجه لعرفة افضل بمسجد مکة وان انتفت عنها المضاعفة اذ فی الاتباع مایربو علیها ولذا قال عمر ﷺ بمزید المضاعفة بمسجد مکة مع قوله بتفضیل المدینة "

(از جواہر البحار ج ۴ ص ۱۰)

تعداد کی زیادتی میں فضیلت کا انحصار نہیں .بعض اوقات ایک مقام کو تعداد کی زیادت حاصل ہوتی اور دوسرے مقام کو تعداد کی زیادتی حاصل نہیں ہوتی لیکن افضلیت اسے حاصل ہوتی ہے۔ جیسے دوران حج مقامات عرفات کی طرف متوجہ ہونے والے شخص کا منیٰ میں نماز ادا کرنا افضل ہے بنسبت مسجد حرام میں نماز ادا کرنے کے ،حالانکہ تعداد کی زیادتی منیٰ میں حاصل نہیں۔ یعنی وہ نمازیں جو منیٰ میں ادا کرنی ہیں ان کو منیٰ میں ادا کرنے سے ثواب ایک ایک نماز کا حاصل ہوگا اور وہی نمازیں اگر مسجد حرام میں آکر ادا کرے تو ثواب لاکھ لاکھ کا حاصل ہوگا، لیکن منیٰ میں ادا کرنا باوجود ایک نماز کا ثواب حاصل

ہونے کے زیادہ فضیلت رکھتا ہے؛ کیونکہ دراصل رسول اللہ ﷺ کی تابعداری ہی باعث فضیلت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجد حرام میں نماز ادا کرنے سے ایک لاکھ نماز کے ثواب حاصل ہونے کو ماننے کے باوجود فرماتے تھے کہ مسجد نبوی میں نماز ادا کرنا مسجد حرام میں نماز ادا کرنے سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔

یعنی مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے سے ثواب پچاس ہزار کا ملتا ہے لیکن وہ بھاری ہے بنسبت مسجد حرام میں نماز ادا کرنے پر، حالانکہ مسجد حرام میں نماز ادا کرنے سے ثواب ایک لاکھ کا ہی ملتا ہے۔ وجہ اس کی صرف یہ ہے مسجد نبوی میں رسول اللہ ﷺ کا قرب حاصل ہے جو مسجد حرام میں نہیں۔

''کم و کیف'' کا فرق جاننے والے اس بات کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ ایک طرف ''کمیت'' (مقدار عددی) زیادہ ہے جب کہ دوسری طرف ''کیف'' (مرتبہ وکوالٹی) زیادہ ہے

(از جواهر البحار ج ۴ ص ۱۰)

نبی کریم ﷺ کے قرب کی وجہ سے افضلیت کیوں؟

" ونقل القاضی عیاض وغیره الاجماع علی تفضیل ما ضم الاعضاء الشریفة حتی علی الکعبة المنیفة ونقل عن ابی عقیل الحنبلی ان تلک البقعة افضل من العرش وصرح الفاکهانی بتفضیلها علی السموات." (مرقاة ج۲ ص ۱۹۰ هکذا قال النووی)

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر فرمایا ہے کہ اس پر اجماع امت ہے کہ وہ مقام یعنی رسول اللہ ﷺ کی قبر شریف کا وہ حصہ جس سے آپ کے جسم مبارک کے اعضاء شریفہ کا تعلق ہے وہ کعبہ مکرمہ سے افضل ہے اور ابو عقیل حنبلی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ وہ حصہ عرش معلیٰ سے بھی افضل ہے اور علامہ فاکہانی رحمۃ اللہ علیہ نے وضاحت فرمائی ہے کہ قبر شریف کا وہ حصہ تمام آسمانوں سے افضل ہے۔

واضح ہوا کہ جب حضور ﷺ کی وجہ سے وہ مقام افضل ہوگیا تو آپ کے قرب کی وجہ سے نماز میں بھی افضلیت کا حاصل ہونا یقینی امر ہے۔

ایک غلطی کا ازالہ:

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''لا تشدوا الرحال الا الی ثلاثة مساجد مسجد الحرام والمسجد الاقصیٰ ومسجدی هذا''

(بخاری، مسلم، مشکوۃ باب المساجد)

سوائے تین مساجد کے سامان سفر نہ باندھو! وہ تین مساجد یہ ہیں مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور میری یہ مسجد (مسجد نبوی)۔

اس حدیث پاک سے کئی لوگ غلط فہمی کا شکار ہو گئے اور انہوں نے اس حدیث سے یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی کہ مزارات کی زیارت کے لیے جانا حرام ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں، حدیث پاک کا صحیح مطلب یہ ہے:

"لا تشدوا الی غیرھا لان ما سوی الثلاثة متساو فی الرتبة غیر متفاوت فی الفضیلة و کان الترحل الیه ضائعا و عبثا"۔

ان تین مساجد کے بغیر اور مساجد کی طرف اس غرض سے سفر نہ کرو کہ ان میں ثواب زیادہ ہے کیونکہ باقی مساجد ثواب میں متساوی ہیں، اس لیے ان کی طرف زیادہ ثواب کی غرض سے جانا بے فائدہ ہے۔

اس حدیث پاک سے نیک لوگوں کی قبور کی زیارت کو کیسے منع کیا جاتا ہے جبکہ اسکا ذرا بھر ذکر نہیں؟

" وما تبین لی ان الامر کذلک بل الزیارة مامور بھا لخبر، کنت نھیتکم عن زیارة القبور الا فزوروھا "

علامہ قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، یہی معنی مراد لیا جا سکتا ہے کہ تین مساجد کے بغیر اور مساجد کی طرف زیادتی ثواب کی غرض سے جانے سے منع کیا گیا۔ قبور کی زیارت کی ممانعت کس طرح ثابت ہو سکتی ہے جبکہ دوسری حدیث شریف میں ہے۔ ''میں نے تمہیں قبور کی زیارت سے منع کیا تھا، خبردار اب زیارت کیا کرو'' ۔

یعنی ابتدائے اسلام میں قبور کی زیارت سے منع کیا گیا تھا پھر وہ حکم منسوخ ہو گیا اور قبور کی زیارت کی اجازت دے دی گئی۔

" واما المشاھد فلا تساوی بل برکة زیارتھا علی قدر درجاتھم عند اللہ "

تین مساجد کے بغیر اور مساجد سے روکنا تو ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ وہ مساوی ہیں۔ لیکن مزارات کی زیارت برابر نہیں بلکہ ان کی زیارت میں اسی طرح برکت حاصل ہو گی جس طرح ان کے درجات اللہ تعالیٰ کے ہاں ہوں گے۔

یعنی درجات کے فرق سے زیارت کے حصول میں بھی اسی طرح فرق حاصل رہے گا۔

"ثم لیت شعری من یمنع هذا القائل من شد الرحال لقبور الانبیاء کابراهیم وموسیٰ ویحییٰ والمنع من ذلک فی غایة الاحالة واذا جوز ذلک لقبور الانبیاء والاولیاء فی معناهم فلایبعد ان یکون ذلک من اغراض الرحلة کما ان زیارة العلماء فی الحیاة من المقاصد"

(مرقاۃ ج ۲ ص ۹۰)

علامہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اولیائے کرام کی قبروں کی زیارت سے منع کرنے والوں کو کاش میرے جیسا علم حاصل ہوجاتا تو انہیں یہ بات سمجھ آتی کہ وہ جلیل القدر انبیائے کرام جیسے ابراہیم، موسیٰ اور یحییٰ علیہم السلام کی قبور کی زیارت کے لئے جانے سے کیسے منع کرسکیں گے؟ جبکہ ان کی زیارت سے منع کرنا محال ہے۔ تو واضح ہوا کہ انبیائے کرام کی قبور کی زیارت کے لئے جانا جائز ہے جب یہ جواز ثابت ہوگیا تو اولیائے کرام کی قبور کی زیارت کرنے کا جواز بھی ثابت ہوجائے گا کیونکہ انبیائے کرام کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہے اور اولیاء عظام بھی رب تعالیٰ کے مقرب ہونے کی وجہ سے انبیائے کرام کے مقرب ہوگئے۔

مزید فرماتے ہیں: قبور کی زیارت کرنے میں بھی کئی مقاصد ہوتے ہیں جس طرح علماء کرام کی ظاہری حیات میں ان کی زیارت کرنے میں کئی مقاصد ہوتے ہیں۔

راقم کا موقف:

یہ حدیث زیادہ ثواب یعنی ہزاروں کی تعداد میں ثواب کی غرض سے جانے کے ساتھ مقید ہے اور "نہی" حرمت پر مبنی بھی نہیں۔ کیونکہ پہلے ابن ماجہ سے ایک حدیث ذکر کی جاچکی ہے کہ جامع مسجد میں نماز ادا کرنا پانچ سو نمازوں کا ثواب حاصل کرنا ہے۔ اس سے بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ عام مساجد کی بنسبت جامع مسجد میں ثواب کی غرض سے جانا کوئی منع نہیں بلکہ زیادتی ثواب کا سبب ہے۔

خود نبی کریم ﷺ ہر ہفتہ کے دن مسجد قبا کی زیارت کے لئے تشریف لے جاتے تھے۔

مساجد میں شور وغوغا، قیامت کی نشانی:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے ایک حدیث روایت کی جس میں قیامت کی نشانیوں کا بیان ہے اس میں ایک نشانی یہ ہے۔ "ظهرت الاصوات فی المساجد" مساجد میں

آوازیں بلند ہوں گی۔

جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مساجد میں ایک دوسرے کے خلاف سیاسی محاذ آرائی عروج پر ہے۔ مساجد میں نمازی اور کمیٹیوں کے اختلاف درحقیقت سیاسی اختلافات کی وجہ سے پائے جاتے ہیں یا چوہدراہٹ کا جھگڑا ہوتا ہے۔ آئے دن فساد برپا ہوتا رہتا ہے۔ جس سے شرفاء کا ذہنی سکون چھن جاتا ہے۔ مساجد کے امام بھی ان جھگڑوں کی زد میں آنے کی وجہ سے بے چین ہوتے ہیں۔ مساجد کی شان کے لائق یہ ہے کہ عبادت کی جائے، حق بات بیان ہو، لڑائی جھگڑا نہ ہو اور فتنہ و فساد سے مساجد میں اجتناب کیا جائے

مسجد تا قیامت مسجد ہے:

" ولو خرب ما حوله واستغنیٰ عنه یبقیٰ مسجداعندالاما م والثانی ابدًا الیٰ قیام الساعة وبه یفتی حاوی القدسی. جزم به فی الاسعف حیث قال ولو خرب المسجد وما حوله وتفرق الناس عنه لا یعود الیٰ ملک الواقف عند ابی یوسف فیباع نقضه باذن القاضی ویصرف ثمنه الیٰ بعض المساجد " (شامی ج ۳ ص ۵۰۷)

اگر مسجد کا ارد گرد خراب ہو جائے، اس مسجد کی ضرورت نہ رہے تو وہ مسجد تا قیامت مسجد ہی رہے گی۔ (اس سے مسجد کے احکام واپس نہیں لیے جاسکتے) اسی پر فقہائے کرام کا فتویٰ ہے۔ (حاوی القدسی)

''اسعاف'' میں بھی اسی قول پر اعتماد و یقین کیا گیا ہے کہ اگر مسجد اور مسجد کا ارد گرد خراب بھی ہو جائیں، لوگ وہاں سے دوسری جگہ منتقل ہو جائیں پھر بھی مسجد کی جگہ واقف (وقف کرنے والے) کی ملکیت میں نہیں آئے گی۔ ہاں البتہ مسجد کی تعمیر پر لگا ہوا سامان، دروازے کھڑکیاں، چھت، اینٹیں وغیرہ دوسری مسجد پر لگا دی جائیں تو یہ جائز ہے۔

فتاویٰ قاضی خان میں ہے:

" وفی الخانیة رباط بعید استغنی عنه المارة وبجنبه رباط آخر قال السید الامام ابوشجاع تصرف غلة الی الرباط الثانی کالمسجد اذا خرب واستغنی عنه اهل القریة فرفع ذلک الی القاضی فباع الخشب وصرف الثمن الی مسجد آخر جاز."

(شامی ج ۳ ص ۵۰۷)

فتاوی قاضی خان میں مذکور ہے کہ اگر ایک سرائے راستہ سے دور ہے جو مسافروں کے کام نہیں

آ سکتی اور دوسری سرائے راستہ کے قریب ہے جس میں گزرنے والے سکونت کرتے رہتے ہیں تو اس صورت میں دور والی سرائے کا سامان قریب والی سرائے میں لگا دیا جائے، سید امام شجاع رحمۃ اللہ علیہ کا اسی پر فتویٰ ہے۔

اسی طرح اگر ایک مسجد خراب ہو جائے اور اس بستی والے لوگوں کو اس کی ضرورت نہیں رہی تو قاضی سے اجازت لے کر اس کی لکڑیاں وغیرہ بیچ کر دوسری مسجد پر لگا دی جائیں۔

راقم کے خیال میں قاضی سے اجازت لینے کی قید خورد برد سے بچانے اور نزاع سے بچانے کے لئے ہے۔ اگر ایسے خطرات نہ ہوں تو معاملہ قاضی کے پاس لے جانا ضروری نہیں خاص کر کے آجکل کے قاضی اور آجکل کی عدالتیں۔ الامان الحفیظ۔

"ولا سیما فی زماننا فان المسجد او غیرہ من رباط او حوض اذا لم ینقل یأخذ انقاضہ اللصوص والمتغلبون کما ھو مشاھد" (شامی ج ص۲۰۷)

ایک مسجد، حوض یا سرائے وغیرہ اگر خراب ہو جائے، لوگ وہاں سے منتقل ہو جائیں اور اس کی ضرورت ختم ہو جائے تو زیادہ بہتر یہی ہے کہ اس کا سامان دوسری مسجد، دوسرے حوض یا دوسری سرائے کی طرف منتقل کر دیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو چور، بدمعاش لوگ وہ سامان اٹھا کر لے جائیں گے، خاص کر کے ہمارے زمانہ میں اس طرح کے معاملات واقع ہو رہے ہیں جن کا مشاہدہ کیا جا رہا ہے۔

یہ تو علامہ شامی کے زمانہ کی بات تھی۔ اب ہم اپنے زمانہ کو دیکھیں تو بہت واضح ہے کہ لوگوں کے دلوں سے خوف خدا جاتا رہا، مسجد کے مال کو مالِ غنیمت سمجھ کر لوگ ہڑپ کر جائیں گے۔ جب آباد مساجد کی گھڑیاں، دریاں، ٹونٹیاں، لاؤڈ سپیکر وغیرہ آئے دن چوری ہو رہے ہیں تو غیر آباد مساجد کو مساجد سمجھ کر لوگ کیسے معاف کریں گے؟ یہ کہنا کہ ان کا سامان اپنے تصرف میں کوئی نہیں لائے گا، یہ خوش فہمی باطل ہے۔

وقف کرنے کیساتھ ہی مالک کی ملکیت ختم:

" یزول الملک بالقول عند ابی یوسف رحمه الله وهو قول الائمة الثلاثة وهو قول اکثر اهل العلم وعلیٰ هذا مشائخ بلخ وفی المنیة وعلیه الفتویٰ کذا فی فتح القدیر وعلیه الفتوی کذا فی السراج الوهاج " (عالمگیری ج۲ ص۳۵۲)

زمین کا مالک جب زبان سے ہی وقف کردے تو اس کا ملک زائل ہو جاتا ہے۔ یہی قول ائمہ ثلاثہ کا ہے۔ اسی پر اکثر اہل علم ہیں اور اسی پر بلخ کے مشائخ ہیں۔ منیہ میں ذکر ہے کہ اسی پر فتویٰ ہے۔ فتح القدیر میں بھی یہی ذکر ہے۔

تنبیہ: اگرچہ اس مسئلہ میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے لیکن فتویٰ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر ہی ہے۔...... کہ جونہی واقف (وقف کرنے والے) نے زبان سے وقف کرنے کا قول کیا وہ جائیداد وقف ہو جائے گی اور اس کی ملکیت زائل ہو جائے گی...... امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک زمین کو علیحدہ کر دینا، یہاں تک کہ قبرستان کے لئے زمین ہو تو اس میں کسی ایک کا دفن ہونا، مسجد کے لئے ہو تو کسی ایک کا نماز ادا کر لینا مالک کی ملکیت کو ختم کر دے گا۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صرف علیحدہ کر دینا زوال ملکیت کے لئے کافی ہے۔ لیکن امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صرف زبان سے کہہ دینا ہی کافی ہے۔

صاحب درمختار اور علامہ شامیؒ نے فرمایا:

" ویزول ملکه عن المسجد والمصلی بالفعل والمصلی شمل مصلی الجنازة ومصلی العید بالفعل ای بالصلوٰة فیه وبقوله جعلته مسجدا عند الثانی ای عند ابی یوسف یزول بمجرد القول وشرط محمد والامام الصلوٰة فیه ای مع الافراز "

(من درمختار و شامی ج۳ص ۴۰۴، ۴۰۵)

"واعلم ان الوقف انما احتیج فی لزومه الی القضاء." (شامی ج۳ص ۴۰۵)

اور ایک قول کے مطابق عند الامام توقف علی القضاء بھی ہے۔

" وقدم فی التنویر والدرر والوقایة وغیرها قول ابی یوسف وعلمت ارجحیته فی الوقف والقضاء " (شامی ج۳ص ۴۰۵)

فقہ کی اکثر کتب تنویرالابصار، درر، وقایہ وغیرہا میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو ہی مقدم سمجھا گیا ہے۔علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ اپنا مختار بھی یہی بیان کرتے ہیں کہ میں نے وقف اور قضاء میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو ہی راجح قرار دیا ہے۔

مسجد کو شہید کر کے نئی مسجد بنانے کا حکم:

اگر کوئی شخص اس محلہ کا نہیں جہاں مسجد واقع ہے اور وہ چاہتا ہے کہ میں اس مسجد کو شہید کر کے اس کی جگہ پختہ نئی مسجد بنا دوں۔ تو اسے یہ حق حاصل نہیں ۔ ہاں البتہ اہل محلہ اس پر راضی ہو جائیں تو وہ ایسے کر سکتا ہے۔ یا مسجد کے گرنے کا خطرہ ہو تو اہل محلہ یا قاضی سے پوچھے بغیر وہ نئی مسجد تعمیر کر سکتا ہے۔اہل محلہ خود پہلی مسجد کو شہید کر کے نئی بنانا چاہتے ہوں تو وہ بنا سکتے ہیں لیکن بشرطیکہ وہ اس پر مال اپنی طرف سے خرچ کریں، مسجد کے وقف شدہ مال سے قاضی کی اجازت کے بغیر خرچ نہ کریں۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

" عند الهندية مسجد مبنى اراد رجل ان ينقضه ويبنيه احكم ليس له ذلك لانه لا ولاية لـه "مضمرات" الا ان يخاف ان ينهدم إن لم يهدم . " تتارخانيه" وتاويله ان لم يكن البانى من اهل تلك المحلة واما اهلها فلهم ان يهدموه ويجددوا بناؤه ويفرشوا الحصير ويعلقوا القناديل لكن من ما لهم لا من مال المسجد الا بامر القاضى "خلاصه".

(شامی ج ۳ ص ۴۰۵)

راقم کے نزدیک تعاملِ ناس کے پیشِ نظر قاضی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔

کشادگیٔ مسجد:

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

" قوم بنوا مسجدا واحتاجوا الى مكان يتسع المسجد واخذوا من الطريق وادخلوا فى المسجد ان كان يضر باصحاب الطريق لا يجوز وان كان لا يضر بهم رجوت ان لا يكون به بأس كذا فى المضمرات" (عالمگیری ج ۲ ص ۴۵۶، ۴۵۷)

کچھ حضرات نے مسجد بنائی لیکن بعد میں اس کی توسیع کی ضرورت پیش آئی یعنی نمازیوں پر وہ مسجد تنگ ہوگئی اور ان لوگوں نے راستہ کی کچھ زمین مسجد میں شامل کر لی۔اگر گزرنے والوں کے لئے تکلیف کا

سبب ہے تو ناجائز ہے یعنی گزرنے والوں کے لئے راستہ کو تنگ کرنا جائز نہیں اور اگر راستہ تنگ نہیں ہوا تو یہ جائز ہے، مضمرات میں اسی طرح مذکور ہے اور یہی قول مختار ہے۔

نیز خزانۃ المفتیین میں بھی یہی ہے۔

" ان ارادوا ان یجعلوا شیئًا من المسجد طریقًا للمسلمین فقد قیل لیس لهم ذلک وانه صحیح كذا فی المحیط" (عالمگیری ج۲ ص۴۵۷)

اگر لوگ یہ چاہیں کہ مسجد کی کچھ جگہ مسلمانوں کے راستہ میں شامل کرلیں تو یہ ان کے لئے جائز نہیں اور یہی صحیح ہے۔محیط میں بھی یہی مذکور ہے۔

سبحان اللّٰہ !جب مسجد کا کچھ حصہ بھی سڑک میں شامل نہیں کیا جاسکتا تو پوری مسجد کو سڑک میں شامل کرنا کس طرح جائز ہے۔دراصل جب سے اپنی مرضی کے مطابق دین کو ڈھالنا شروع کر دیا گیا،اس وقت سے دینی مسائل کا حلیہ بگاڑ دیا گیا۔دو جملے اکثر طور میں پڑھے لکھے بے وقوفوں کی زبان سے سنتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں۔ایک تو یہ کہ ''کچھ نہیں ہوتا'' دوسرا یہ کہ ''سب ٹھیک ہے''۔کاش! وہ پیشاب پی کر اور اپنی ماں یا بیٹی سے نکاح کر کے بھی یہی دو جملے استعمال کریں۔

الٹی چال: مسئلہ تو یہ ہے کہ راستہ کی جگہ مسجد میں شامل کرنا جائز ہے بشرطیکہ گزرنے والوں کے لئے راستہ تنگ نہ کر دیا جائے لیکن مسجد کی جگہ کو راستہ میں کسی طرح بھی شامل کرنا جائز نہیں۔

الٹی ہی چال چلتے ہیں چمچگانِ ملوک
خرد کا نام جنوں،جنوں کا نام خرد رکھ دیا

لیکن آج کل اسلامی ملک میں مسلمان حکمران اور ان کے مسلمان چمچگان مساجد کو اس لئے شہید کر رہے ہیں کہ گاڑیوں کی آمد و رفت کے لئے آسانی ہو جبکہ اکثر و بیشتر گاڑیاں حرام کمائی کے مال سے حاصل کی ہوئی ہیں۔

مسجد کی توسیع کیلئے ساتھ والی زمین قاضی جبرًا لے لے:

" ولو ضاق المسجد علی الناس وبجنبه ارض لرجل تؤخذ ارضه بالقیمة كرها كذا فی فتاوٰی قاضیخان " (عالمگیری ج۲ ص۴۵۶)

اگر مسجد لوگوں پر تنگ ہو جائے، اس کے اطراف میں کسی شخص کی زمین ہو تو اس زمین کی قیمت ادا کر کے وہ زمین اس شخص سے زبردستی بھی لی جا سکتی ہے۔

فتاوٰی قاضی خان میں بھی یہی مذکور ہے۔

" ارض وقف علی مسجد والارض بجنب ذلک المسجد وارادوا ان یزیدوا فی المسجد شیئًا من الارض جاز لکن یرفعون الأمر إلی القاضی لیأذن لھم "

(عالمگیری ج۲ ص ۴۵۶)

مسجد کے لئے زمین وقف کی گئی ہو اور اس کے اطراف میں زمین ہو، لوگ چاہتے ہوں کہ اس زمین سے اور بھی ملا کر مسجد کی توسیع کر لی جائے تو یہ ان کے لئے جائز تو ہے لیکن یہ معاملہ قاضی کے پاس لے جائیں تا کہ وہ ان کو اجازت دے۔

وجہ یہ ہی ہے کہ کسی قسم کا نزاع نہ ہو۔ قاضی کے فیصلہ کے بعد ہر شخص مطمئن ہو جائے گا اور معاملہ خوش اسلوبی سے طے پا جائے گا۔ تاہم یہ بھی ضروری ہے کہ صاحب ارض کو قیمت دی جائے تا کہ اس کا بھی نقصان نہ ہو اور اگر مسجد کی زمین کے ساتھ ہی اور وقف شدہ زمین ہو تو مسجد کی ضرورت کے پیش نظر قاضی اس کو مسجد میں ملانے کی اجازت دے سکتا ہے۔

مسجد تعمیر ہو جانے کے بعد نیچے یا اوپر دکانیں بنانا منع ہے:

" اذا اراد انسان ان یتخذ تحت المسجد حوانیت غلۃ لمرمۃ المسجد أو فوقہ لیس لہ ذلک کذا فی الذخیرۃ "

(عالمگیری ج۲ ص ۴۵۵)

مسجد کے نیچے یا اوپر مسجد کی آمدنی کے لئے دکانیں بنانا منع ہے۔ لیکن خیال رہے کہ یہ حکم مسجد بن جانے کے بعد کا ہے۔

مسجد کی تعمیر سے پہلے نیچے دکانیں بنا کر اوپر مسجد بنانا جائز تو ہے تاہم بہتر پھر بھی نہیں۔

" ولو کان السرداب لمصالح المسجد جاز کما فی مسجد بیت المقدس کذا فی الھدایۃ "

(عالمگیری ج۲ ص ۴۵۶)

اگر مسجد کا تہہ خانہ مسجد کی ضروریات و مصالح کے لئے بنایا گیا ہو تو جائز ہے جیسا کہ مسجد بیت المقدس میں تہہ خانہ مسجد کی ضروریات کے لئے بنایا گیا ہے۔ ہدایہ میں بھی یہ مسئلہ اسی طرح مذکور ہے۔

عارضی مسجد حکمِ مسجد میں نہیں:

کسی جگہ ضرورت کے پیش نظر نماز پڑھنی شروع کردی گئی۔ زمین مسجد کے لئے وقف نہیں اور مسجد کا اسے حکم نہیں دیا گیا تو اس پر مسجد والے احکام جاری نہیں کیے جائیں گے۔

" متولی مسجد جعل منزلا موقوفا علی المسجد مسجدا و صلی الناس فیه سنین ثم ترک الناس الصلوة فیه فاعید منزلا مستغلا جاز لانه لم یصح جعل المتولی ایاه مسجدا کذا فی الواقعات الحسامیة " (عالمگیری ج۲ ص ۴۵۶)

مسجد کی آمدنی کے لئے ایک مکان وقف کیا گیا۔ مسجد کے متولی نے اس مکان میں بھی لوگوں کو نماز پڑھنے کی اجازت دے دی، کئی سال اس میں لوگ نماز ادا کرتے رہے، پھر لوگوں نے اس میں نماز ادا کرنی چھوڑ دی تو پھر اسے وہی مکان والی حیثیت حاصل ہوگی، مسجد والا حکم حاصل نہیں ہوگا کیونکہ متولی کی طرف سے اس میں نماز کی اجازت دینے سے وہ مسجد نہیں بن گئی، جب تک وقف کرنے والا اسے مسجد کے لیے وقف نہ کرے وہ وقف ہونے کے باوجود مسجد نہیں۔

مرض موت میں اپنے مکان کو مسجد بنانے کا حکم:

کوئی شخص اپنی جائیداد کے تہائی حصہ سے زائد کی وصیت نہیں کرسکتا۔ اگر تہائی حصہ سے زائد کی وصیت کرے تو وہ بھی تہائی حصہ تک ہی جاری ہوگی، اس سے زائد کی وصیت باطل ہوجائے گی۔

ایک شخص نے اپنی مرض موت میں اپنے مکان کو مسجد بنادیا لیکن یہ مکان اسکی جائیداد کا تہائی حصہ نہیں بن سکتا بلکہ اس مکان میں بھی ورثاء کا حصہ بنتا ہے تو اس مکان کو مسجد بنانا باطل ہوجائیگا۔ یہ مکان اسکے ورثاء میں تقسیم ہوجائے گا۔ (ہاں البتہ مکان کے تہائی حصہ کی قیمت کسی مسجد میں خرچ کرنی پڑے گی)۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

" مریض جعل داره مسجدا ومات ولم تخرج من الثلث ولم تجز الورثة صار کله میراثا وبطل جعله مسجدا لان للورثة فیه حقا فلم یکن مفرزا عن حقوق العباد فقد جعل المسجد جزءا شائعا فیبطل " (عالمگیری ج۲ ص ۴۵۶)

مسجد کی جگہ کو بیچنا جائز نہیں:

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

" وفی وقف الخصاف اذا جعل ارضه مسجدا وبناه واشهد ان له ابطاله وبیعه فهو شرط باطل ویکون مسجدا " (عالمگیری ج۲ص۴۵۷)

امام خصاف نے کتاب الوقف میں ذکر کیا ہے کہ جب کوئی شخص اپنی زمین پر مسجد تعمیر کرلے پھر اس پر گواہ پیش کرے کہ مجھے حق حاصل ہے کہ میں اسے گرادوں اور اپنی زمین بنالوں یا بیچ دوں تو اس کے اس دعوی کو نہیں سنا جائے گا۔ وہ زمین مسجد ہی رہے گی، اس کا یہ شرط لگانا باطل ہوجائے گا۔

مسجد کے لیے جمع ہونے والے مال سے خدام کو تنخواہ دی جاسکتی ہے:-

"وللمتولی ان یستاجر من یخدم المسجد بکنسه ونحو ذلک بأجر مثله او زیادة یتغابن " (عالمگیری ج۲ص۴۶۱)

مسجد کے متولی کے لیے یہ جائز ہے کہ مسجد کی صفائی کے لیے تنخواہ پر خادم مقرر کرے۔ مناسب مقدار میں تنخواہ دی جائے جو عام خدام کی ہوتی ہے یا کچھ زائد بھی ہو تو جائز ہے۔

مسجد کی ضروریات کے لیے جمع ہونے والے فنڈ کا بھی یہی حکم ہے۔

امام اور مؤذن کی رہائش کا حکم:

مسجد کی تعمیر کے نام پر حاصل کیے ہوئے مال سے امام اور مؤذن کی رہائش کے لیے مکان تعمیر نہ کیا جائے بلکہ مسجد کی متعلقہ ضروریات کے لیے ہی مال حاصل کیا جائے۔ اگر صرف مسجد کی تعمیر کا نام لے کر مال حاصل کیا گیا تھا تو ایسے تعمیری کاموں میں خرچ کرنے کیلئے مال دینے والے سے اجازت طلب کرنی پڑے گی۔ اگرچہ عام رواج کے مطابق لوگوں کو معلوم تو ہوتا ہے کہ مسجد کی تعمیر سے مراد مسجد کا وضوء خانہ، استنجاء خانے، امام اور مؤذن کی رہائش گاہیں، مسجد کی ضرورت کا سٹور اور مسجد کی آمدنی کا ذریعہ بنانے کے لیے دکانیں بھی ہیں۔ لیکن پھر بھی اعلان اس انداز میں کیا جائے کہ جس میں کسی قسم کے ناجائز ہونے کا شائبہ بھی نہ پایا جائے۔

" متولی المسجد اذا اشتری بالغلة التی اجتمعت عنده من الوقف منزلا ودفع المنزل الی

المؤذن یسکن فیہ ان علم المؤذن ذلک کرہ ان یسکن فی ذلک المنزل لان هذاالمنزل من مستغلات الوقف ویکرہ للامام والمؤذن ان یسکن فی ذلک المنزل کذا فی فتاوی قاضیخان " (عالمگیری ج ۲ ص ۴۶۲)

مسجد سے گزرنے کا حکم:

بعض اوقات مسجد کے دو دروازے ہوتے ہیں، ایک دروازہ سے داخل ہو کر مسجد کے حصہ سے گزرتے ہوئے دوسرے دروازہ سے گزرا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں بوجہ عذر گزرنا جائز، اور بغیر عذر کے ناجائز ہے۔ مسجد کا ادب واحترام ملحوظ خاطر رکھا جائے۔ عذر سے مراد بارش کا ہونا یا مسجد سے نکلنا ہے۔ مطلقاً شارع عام (گذرگاہ) بنانا جائز نہیں۔

اسی گذرگاہ کے متعلق فرمایا گیا:

" جاز لکل احد ان یمر فیہ حتی الکافر الا الجنب والحائض والدواب " (در مختار، زیلعی)

" وقد قال فی البحر وکذا یکرہ ان یتخذ المسجد طریقا وان یدخلہ بلا طھارۃ " (شامی ج ۳ ص ۴۲۰)

" المشی فیھا وقت المطر ونحوہ لاجل الصلوۃ او للخروج من الجمع لا لمرور المارین مطلقا کالطریق العام " (شامی ج ۳ ص ۴۲۰)

" لا یجوز ان یتخذ المسجد طریقا " (شامی ج ۳ ص ۴۲۰)

"لو جعل الطریق مسجدا یجوز لا جعل المسجد طریقا" (شامی ج ۳ ص ۴۲۰)

راستہ کو مسجد بنانا جائز ہے لیکن مسجد کو راستہ بنانا جائز نہیں۔

خیال رہے کہ مندرجہ بالا حکم کا تعلق اس راستہ سے نہیں جو مسجد کے ایک دروازہ سے داخل ہو کر دوسرے دروازہ سے نکل جائے لیکن مسجد کا صحن یا مسجد کا کوئی حصہ اس میں شامل نہ ہو یا مسجد کی حد بندی سے باہر ہو، اسے مسجد والا حکم حاصل نہیں۔

مسجد کی زمین کو فروخت کرنا جائز نہیں:

" فی فتاوی الحجۃ لو صار احد المسجدین قدیما وتداعی الی الخراب فاراد اھل السکۃ بیع القدیم وصرفہ فی المسجد الجدید فانہ لا یجوز " (عالمگیری ج ۲ ص ۴۵۸)

فتاوی حجۃ میں یہ مذکور ہے کہ ایک مسجد قدیم ہے وہ خراب ہو چکی ہے، اس میں لوگ نماز نہیں ادا کرتے۔ دوسری مسجد جدید ہے، اہل محلہ چاہتے ہیں کہ پرانی مسجد کی زمین کو بیچ کر نئی مسجد کی تعمیر پر لگا دیں تو وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ وجہ وہی ہے جس کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ مسجد تا قیامت مسجد ہے۔ مسجد کی زمین کو بیچا نہیں جا سکتا۔

مسجد کی زمین کو کسی اور تصرف میں لانا منع ہے:

"ارض وقف علی مسجد صارت بحال لا تزرع فجعلها رجل حوضا للعامة لا یجوز للمسلمین انتفاع بماء ذلک الحوض کذا فی القنیة." (عالمگیری ج۳ص ۴۶۲)

مسجد کے لیے زمین وقف کی گئی وہ کاشت کے قابل نہیں (کہ اس کی پیداوار کو مسجد پر خرچ کیا جائے) کسی شخص نے وہاں عام لوگوں کے نفع کے لیے تالاب بنا دیا تو مسلمانوں کے لئے اس تالاب سے نفع حاصل کرنا جائز نہیں۔

بوقت مشکل مسجد کا مال بطور قرض لینا:

"اما المال الموقوف علی المسجد الجامع ان لم تکن للمسجد حاجة للمال فللقاضی ان یصرف فی ذلک(ای لنائبة نابت الاسلام مثل حادثة الروم)لکن علی وجه القرض فیکون دینا فی مال الفئ" (عالمگیری ج۲ص ۴۶۳)

جو مال جامع مسجد پر وقف کیا گیا ہے اگر اس مال کی مسجد کو وقتی طور پر ضرورت نہیں تو قاضی کے لیے جائز ہے (کہ اگر اسلام اور مسلمین پر کوئی مشکل وقت آ جائے، کفار حملہ آور ہو جائیں، ان کی یلغار کو روکنا ہو) کہ وہ مال بطور قرض لے لے اور مال فئ میں سے بعد میں ادا کرے۔

مسجد کے مال کو کیسے خرچ کیا جائے؟

اگر مال دینے والے نے مشروط کیا ہے تعمیر سے تو وہ مال تعمیر پر ہی خرچ کیا جائے۔ اگر مال دینے والے نے بغیر کسی شرط کے مسجد کی ضروریات کے لیے مال دیا ہے تو وہ انتظامیہ جس طرح چاہے خرچ کرے۔

"قالوا ان وسع الواقف ذلک للقیم وقال تفعل ما تری من مصلحة المسجد کان له ان یشتری للمسجد ما شاء وان لم یوسع ولکنه وقف لبناء المسجد وعمارة المسجد لیس للقیم ان یشتری به دھنا او حصیرا او حشیشا وغیرھا." (عالمگیری ج۲ص۴۶۱)

مسجد پر مال وقف کرنے والے شخص نے اگر منتظم مسجد کو اختیار دیا ہو کہ تم جس طرح چاہو خرچ کرو تو منتظم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جیسے چاہے خرچ کرے اور اگر مال دینے والے نے مال صرف مسجد کی تعمیر کے لیے دیا ہے تو منتظم کے لیے جائز نہیں کہ وہ مال ''تعمیرات'' کے بغیر دوسرے مصارف..... چراغ جلانے کے لیے تیل، چٹائیاں، چٹائیوں کی جگہ سردیوں میں ڈالے جانے والے گھاس کی خرید ..... پر خرچ کرے۔اس لیے منتظمین کو چاہیے کہ وہ مطلقاً مسجد کی ضروریات کے لیے چندہ جمع کریں۔کسی خاص کام کے لیے مختص نہ کریں ورنہ اسی کام پر مال خرچ کرنا پڑے گا۔

"ولو وقف علی عمارته یصرف الی بنائه وتطیینه دون تزیینه"

(عالمگیری ج۲ص۴۶۱)

اگر کسی شخص نے مال صرف تعمیر کے لیے دیا ہے تو اس کو تعمیر اور لپائی یعنی پلستر پر خرچ کیا جا سکتا ہے۔وہ مال آرائش اور زیب و زینت پر نہیں خرچ کیا جا سکتا۔

مساجد کو برباد کرنے والے ظالم ہیں:

﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِیْ خَرَابِهَا ﴾

(پ۱ ع۱۴)

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں سے روکے اللہ کا نام لیے جانے سے اور ان کی بربادی میں کوشش کرے۔

آیت کریمہ کا شان نزول خواہ بخت نصر کا بیت المقدس کو برباد کرنا ہو، یا کفار مکہ کا نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کو عمرہ ادا کرنے اور مسجد حرام میں داخل ہونے سے منع کرنا ہو۔خواہ نصاریٰ کے بادشاہ کا بیت المقدس میں مردہ جانوروں کا پھینکنا اور توراۃ کو جلانا ہو یا مشرکین مکہ کا نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کو مسجد حرام میں داخل ہونے سے منع کرنا اور ہجرت پر مجبور کرنا ہو۔خواہ تحویل قبلہ کے وقت یہود کا کعبہ شریف کی طرف متوجہ ہو کر نماز ادا کرنے سے منع کرنا ہو۔ بہرحال مراد عام ہے۔ہر مسجد کا یہی حکم ہے اور ہر شخص جو مساجد میں اللہ کا ذکر کرنے سے منع کرے اور مساجد کو برباد کرے وہ بہت بڑا ظالم ہے۔

علامہ آلوسی اور امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں:

" وظاهر الآية العموم فی کل مانع وفی کل مسجد وخصوص السبب لا یمنعه "

(کبیر، روح المعانی)

ظاہر آیت کریمہ سے عموم ہی سمجھ آ رہا ہے، ہر روکنے والا شخص اور مسجد کو برباد کرنے والا شخص مراد ہے اور ہر مسجد مراد ہے۔ خصوص سبب اس سے مانع نہیں۔

مساجد کو برباد کرنے والا بڑا ظالم کیوں؟

''ظلم'' کا معنی ہے کسی چیز کو اپنے محل میں نہ رکھنا۔ یعنی کسی کا حق مارنا۔ حق دنیاوی بھی ہوتا ہے اور دینی بھی۔ پھر لوگوں کا اپنے آپ پر بھی حق ہوتا ہے۔ پھر کعبہ معظمہ، مسجد اور قرآن شریف کا بھی حق ہے کہ انکی تعظیم کی جائے۔ مساجد کو برباد کرنے والا اللہ اور اسکے رسول ﷺ کا حق مارتا ہے، اور مسلمانوں کا حق بھی مارتا ہے۔ خود مسجد کا حق برباد کرتا ہے، یہاں تک کہ اپنے نفس کا حق بھی تباہ کرتا ہے۔

اس شخص کا حق تو یہ تھا کہ وہ مسجد میں حاضر ہو کر عبادت کرتا، اپنے نفس کو عذاب سے بچاتا، خود مسجد میں عبادت نہ کرنے سے اپنے نفس کا حق بھی برباد کر رہا ہے۔ مسجد کا حق چھین کر مسجد کی بے حرمتی کر رہا ہے، اللہ اور اسکے رسول ﷺ کو ناراض کر رہا ہے اور مسلمانوں کیلئے مشکلات پیدا کر کے ان کو نمازوں سے روک رہا ہے۔ یہ شخص بہت بڑا ظالم کیوں نہ ہو جبکہ چور مالی ظلم کرتا ہے، قاتل جانی ظلم کرتا ہے اور یہ شخص ایمانی ظالم ہے۔ لہٰذا یہ شخص بدترین شخص ہے اور بہت بڑا ظالم ہے۔ (ملخص از تفسیر نعیمی)

مسجد کو برباد کرنے کی دو قسمیں ہیں:

" السعی فی تخریب المسجد قد یکون لوجهین احدهما منع المصلین والمتعبدین والمتعهدین له من دخوله فیکون ذلک تخریبا والثانی بالهدم والتخریب "

(تفسیر کبیر)

مسجد کو برباد کرنے کی کوشش دو طرح ہے:

(۱) ایک ان میں سے یہ ہے کہ نمازیوں، عبادت گزاروں اور مسجد میں جانے کا عہد کرنے والوں کو مساجد میں داخل ہونے سے روکنا یہ درحقیقت مساجد کے لیے تخریب کاری ہے کیونکہ ایسے افعال سے مساجد برباد ہوتی ہیں۔ چونکہ نمازیوں، عبادت گزار لوگوں سے ہی مساجد آباد ہوتی ہیں، جب ان کو ہی

روک دیا گیا تو مساجد خود بخود ویران ہو جائیں گی۔
(۲) مساجد کی بربادی کی دوسری قسم یہ ہے کہ مساجد کو منہدم کر دیا جائے، یعنی مساجد کو گرا کر شہید کر دیا جائے، ان پر بلڈوزر چلا دیے جائیں، یہ ظلم عظیم ہے، ایسے فعل کے مرتکب لوگ ظالم ہیں جو خدا کی گرفت میں آئیں گے، اس وقت ان کو اپنے کیے ہوئے کاموں کے انجام کا پتہ چلے گا۔

مقامِ حیرت!

ہندوستان میں غیر مسلم جب بابری مسجد کو شہید کریں تو پاکستان کے مسلمان احتجاجی مظاہرے کریں، خطباء مساجد میں اپنے اپنے خطابات میں ان کی پرزور مذمت کریں، آج کے وزیراعظم جناب محمد نواز شریف اس وقت کے بھی وزیراعظم تھے، وہ بھی اپنی زبان ذیشان سے ہندوستان کی شدید مذمت کریں، ہماری نیشنل اسمبلی کے ارکان بھی مذمت کریں لیکن شاہراہوں کو کشادہ کرنے کے لئے مساجد کو شہید کرنا کہاں کا انصاف ہے؟ عوام ٹس سے مس نہیں ہو رہے، خطباء خاموش ہیں۔ ارکان اسمبلی کی زبانیں بند ہیں۔حکومت خود یہ کام کرا رہی ہے۔ یہ ظلم عظیم نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ قہر خداوندی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ مجھے امید ہے مساجد کو شہید کرانے والے دنیا میں ہی خدا کی گرفت میں آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمارا حامی وناصر ہو۔

تنبیہ: کسی کی زمین پر بغیر اجازت کے مسجد بنانا جائز نہیں۔ جو مسجد مغصوبہ زمین پر بنائی گئی ہو اس میں نماز ادا کرنا حرام ہے۔ اسلام آباد میں حکومت کی زمین پر ناجائز طور پر جہلاء نے جہاں جہاں مساجد بنائی ہیں۔ان تمام کا یہی حکم ہے۔ ہاں اگر مسجد تو غاصبانہ طور پر بنائی گئی تھی بعد میں حکومت نے اجازت دے دی تو اجازت کے بعد نمازیں ادا کرنا درست ہوگا۔ اجازت سے پہلے جو نمازیں ادا کی گئی تھیں وہ حرام طور پر ادا ہوئیں۔

صاحب نور الانوار لکھتے ہیں:

"وکذا الصلوۃ فی الارض المغصوبۃ مشروعۃ فی ذاتھا وانما تحرم لاجل مشغل ملک الغیر"

(نور الانوار ص ۲۲)

مغصوبہ زمین میں نماز ادا کرنا اگرچہ ذاتی طور پر جائز نظر آتا ہے کہ وہ نماز ادا کر رہا ہے، نیکی کا کام کر رہا ہے لیکن غیر کی ملکیت میں جبراً یا بے اجازت نماز ادا کرنے کی وجہ سے حرام ہے۔

اعتراض: بعض لوگ ایسے غاصبانہ قبضے پر بھی جواز کا فتویٰ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ علامہ

شامی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔

" وفی شرح المنیة للحلبی بنی مسجدا فی ارض غصب لاباس بالصلوة فیه "

(شامی جلد اول ص ۲۸۱)

منیہ کی شرح حلبی میں ذکر ہے کہ مغصوبہ زمین میں مسجد بنائی گئی ہوتو اس میں نماز ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

اس سے تو پتہ چلا ہے کہ مغصوبہ زمین میں نماز جائز ہے۔حرام کہنا کیسے صحیح ہے؟

جواب : جیسا کہ نورالانوار کی عبارت سے واضح ہے کہ مغصوبہ زمین میں نماز ادا کرنا بذاتہ جائز ہے لیکن ملک غیر کی وجہ سے حرام ہے۔علامہ شامی نے جو عبارت نقل کی ہے۔اس کا مطلب بھی یہی ہے۔جیسا کہ میں نے اپنے رسالہ ''اقامت بیٹھ کر سننا مستحب ہے'' میں ذکر کیا ہے کہ علامہ شامی کے لفظ ''لابـأس '' سے کئی جہلاء منافقین غلطی کا شکار ہوئے اصل میں لاباًس سے مطلقاً جواز کا ذکر نہیں۔ بلکہ فریضہ کی ادائیگی کا ذکر ہے۔کیونکہ علامہ شامی نے اسی عبارت کیساتھ متصل یہ عبارت ذکر کی ہے۔

" وفی الواقعات بنی مسجد علی سور المدینة لاینبغی ان یصلی فیه لانه حق العامة فلم یخلص لله تعالیٰ کالمبنی فی ارض مغصوبة "

(شامی جلد اول ص ۲۸۱)

واقعات میں مذکور ہے کہ شہر کی دیوار پر اگر کسی نے مسجد بنائی تو اس میں نماز ادا کرنا درست نہیں کیونکہ وہ خاص اللہ تعالیٰ کا حق نہیں بلکہ اس میں بندوں کا حق ہے جیسا کہ مغصوبہ زمین میں نماز ادا کرنا درست نہیں

اب واضح ہوا کہ مغصوبہ زمین میں نماز ادا کرنا جائز نہیں لہذا مغصوبہ زمین میں مساجد بنا کر اپنے آپ کو مبلغ ظاہر کرنے والے درحقیقت لوگوں کی نمازوں کو برباد کرنے والے ہیں اور لوگوں سے اللہ کے نام پر چندہ بٹور کر حرام کام پر لگانے والے ہیں۔ایسے گربہ مسکینوں، تخریب کاروں سے بچنا ضروری ہے۔

مغصوبہ زمین پر بنائی گئی مسجد میں اعتکاف:

نماز کی طرح مغصوبہ زمین پر بنائی گئی مسجد میں اعتکاف خصوصاً رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں اعتکاف سنت ادا نہ ہوگا۔لہذا ایسی مساجد میں اجر وثواب کی غرض سے اعتکاف بیٹھ کر اپنا وقت ضائع نہ کیا جائے۔

﴿ وَ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴾ (آیت ۱۱۵)

۱) اور پورب پچھم سب اللہ ہی کا ہے تو تم جدھر منہ کرو ادھر وجہ اللہ (خدا کی رحمت تمہاری طرف متوجہ) ہے بے شک اللہ وسعت والا، علم والا ہے۔

۲) اور اللہ کے لئے مشرق ہے اور مغرب، تو جدھر تم منہ کرو ادھر ہی اللہ متوجہ ہے، بیشک اللہ وسعت والا علم والا ہے۔

شان نزول: اس آیۃ کریمہ کے نزول میں چند وجوہ پائی جاتی ہیں۔ یعنی کئی واقعات پہلے رونما ہوئے اور آیۃ کریمہ کا نزول بعد میں ہوا۔ اس طرح تمام صورتیں نزول کی وجوہ ہیں۔

(ا) نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام جب مکہ مکرمہ میں تھے۔ " وقد کان رسول الله ﷺ يصلی بمكة الی بیت المقدس والکعبة بين يديه " تو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا فرماتے تھے البتہ کعبہ شریف بھی آپ کے سامنے ہوتا، یعنی اس طرح کھڑے ہوتے کہ کعبہ بھی سامنے رہے اور توجہ بیت المقدس کی طرف بھی ہو جائے جب آپ مدینہ طیبہ میں آ گئے تو سولہ، سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے رہے۔ یہاں وہ صورت نہیں تھی کہ بیت المقدس کی طرف منہ کرنے سے کعبہ کی طرف بھی منہ ہو جاتا، اس لئے کہ بیت المقدس مدینہ طیبہ سے شمالی جانب ہے اور کعبہ شریف جنوبی جانب ہے۔

حضور کے دل میں خیال آتا رہتا کہ کعبہ شریف ہی قبلہ ہو جائے۔ تو جب تک قبلہ منسوخ نہیں ہوا۔ اس وقت تک آپ کے دل کی تسلی کیلئے یہ آیت نازل ہوئی۔ ﴿ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ﴾ اور اللہ کے لئے ہی ہے مشرق و مغرب۔

مطلب یہ کہ کسی سمت کو بھی کمال حاصل ہوگا تو اس وجہ سے کہ رب تعالیٰ نے اس کی طرف توجہ کرنے کا حکم دیا ہے۔

(۲) " عن ابن عمر انه کان یصلی حیث توجهت به راحلته ویذکر ان رسول الله ﷺ کان یفعل ذلک ویتاول هذه الایة فاینما تولوا فثم وجه الله "

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنی سواری پر نوافل ادا فرماتے رہتے تھے۔ آپ کی سواری جس طرف بھی متوجہ ہوتی رہتی، آپ فرماتے رسول اللہ ﷺ اسی طرح نوافل شہر کے بعد سواری پر ادا فرماتے رہتے۔ تو رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا۔ ﴿ فاینما تولوا فثم وجه الله ﴾

(۳) بخاری میں حضرت نافع سے مروی ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے جب نماز خوف کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے نماز خوف کے متعلق مکمل وضاحت فرمائی۔ پھر فرمایا؛

" فان کان خوف اشد من ذلک صلوا رجالا قیاما علی اقدامهم ورکبانا مستقبلی القبلة وغیر مستقبلیها ، قال نافع ولا اری ابن عمر ذکر ذلک الا عن النبی ﷺ "

کہ اگر خوف بہت ہی زیادہ ہو یعنی ایک امام کے پیچھے دو گروہ بن کر نماز نہ ادا کی جا سکے تو علیحدہ علیحدہ نماز ادا کی جائے جس طرح ممکن ہو۔ سواری پر نماز ادا کریں تو سواری قبلہ کی طرف متوجہ ہو یا قبلہ کی طرف متوجہ نہ ہو۔

حضرت نافع کہتے ہیں حضرت ابن عمر نے یقیناً یہ نبی کریم ﷺ سے سن کر ہی بیان فرمایا ہوگا۔ تو اس سے واضح ہوا کہ اس آیۃ کے نزول کا تعلق صلوۃ خوف سے بھی ہے۔

(۴) قبلہ کے مشتبہ ہونے کی صورت میں صحابہ کرام نے اپنی اپنی سوچ اور خیال کے مطابق نماز ادا کر لی، تو بعد میں پتہ چلا کہ بعض حضرات کا منہ قبلہ کی طرف نہیں ہو سکا، نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا تو اس آیۃ کریمہ کا نزول ہوا۔

خیال رہے کہ قبلہ کے مشتبہ ہونے کے متعلق کئی روایات بیان کی گئی ہیں مقصد سب کا ایک ہی ہے۔

(ماخوذ از فتح القدیر)

قرطبی رحمہ اللہ نے ان وجوہ کے بغیر ایک اور وجہ بھی بیان کی۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے حضرت نجاشی کی وفات پر لوگوں کو مدینہ طیبہ

کے باہر جمع کر کے نماز جنازہ ادا فرمائی، تو بعض حضرات نے کہا۔ " کیف نصلی علی رجل مات وھو یصلی الی بیت المقدس حتی مات " ہم اس شخص پر نماز جنازہ کیسے پڑھیں جو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتا رہا۔ تو اس وقت یہ آیۃ نازل ہوئی۔

خیال رہے کہ حضرت نجاشی حبشہ کے والی (حاکم) تھے۔ ان کا نام "اصحمہ" تھا۔ عربی میں اس کا معنی ہے۔ "عطیہ" انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ صرف اپنے نظام حکومت کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کی ملاقات کے لئے حاضر نہیں ہو سکے تھے۔ اس لئے تابعی ہیں۔ صحابی نہیں۔ شائد بعض حضرات کا یہ کہنا بھی عدم علم کی وجہ سے تھا۔

نجاشی کا جنازہ پڑھانے کی حکمت:

" ان الارض دحیت لہ جنوبا و شمالا حتی رأی نعش النجاشی کما دحیت لہ شمالا و جنوبا حتی رأی المسجد الاقصی "

بے شک نبی کریم ﷺ کے لئے زمین شمال وجنوب کی طرف وسیع فرما دی، حجاب اٹھ گئے، یہاں تک کہ آپ نجاشی کو دیکھ کر ان کی نماز جنازہ پڑھا رہے تھے۔ جس طرح مسجد اقصیٰ آپ کے سامنے کر دی گئی تھی کہ آپ دیکھ کر مسجد اقصیٰ کی تمام علامات کو بیان فرما رہے تھے۔ جب واقعہ معراج ذکر کرنے کے بعد آپ سے مسجد اقصیٰ کی علامات پوچھی گئیں۔

" فانہ اذ رآہ فما صلی علی غائب و انما صلی علی مرئی حاضر و الغائب مالا یری ، واللہ تعالیٰ اعلم "

بے شک جب نبی کریم ﷺ نجاشی کو دیکھ رہے تھے۔ تو یہ غائب شخص کی نماز جنازہ نہیں تھی، بلکہ حاضر جو دیکھا جا رہا تھا۔ اس کی نماز جنازہ تھی۔ کیونکہ غائب تو وہ ہوگا جو دیکھا نہ جائے۔

" قال ابن العربی والذی عندی فی صلوۃ النبی ﷺ علی النجاشی انہ علم ان النجاشی ومن آمن معہ لیس عندھم من سنۃ الصلوۃ علی المیت اثر ، فعلم انھم سیدفونہ بغیر صلوۃ فبادر الی الصلوۃ علیہ "

حضرت ابن عربی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میرے نزدیک ایک اور وجہ بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ کو معلوم

تھا کہ نجاشی اور دوسرے لوگ ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کو نماز جنازہ کا مسنون طریقہ معلوم نہیں۔ ان تک ابھی یہ احادیث نہیں پہنچیں۔ اسلئے آپ نے نماز جنازہ پڑھائی تا کہ وہ اسی طرح دفن نہ کردیں۔ (از قرطبی)

اتنا واضح ہو گیا کہ نماز جنازہ غائبانہ کا کوئی وجود نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے نجاشی کی نماز جنازہ جو پڑھائی اس میں آپ کی تخصیص تھی۔ اس کو دلیل بنانا کہ غائبانہ جنازہ جائز ہے درست نہیں۔ زیادہ وضاحت کے لئے راقم کی کتاب ''موت کا منظر مع احوال حشر ونشر'' کا مطالعہ کیا جائے۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ : (اور اللہ کے لئے ہے مشرق اور مغرب)

مشرق: طلوع ہونے کی جگہ۔ مغرب: غروب ہونے کی جگہ

کبھی ایک سمت کا لحاظ کر کے مفرد ذکر کر دیا جاتا ہے۔ جس طرح یہاں ذکر ہے۔ اور کبھی ہر روز کی معمولی تبدیلی جو ہوتی رہتی ہے۔ کہ طلوع اور غروب میں تھوڑا تھوڑا فرق آتا رہتا ہے۔ اس کو مدنظر رکھتے ہوئے جمع ذکر کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ ﴿ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ ﴾ اور کبھی گرمیوں اور سردیوں کے نمایاں فرق کو مدنظر رکھتے ہوئے تثنیہ ذکر کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَالْمَغْرِبَيْنِ ﴾ یہاں مشرق ومغرب کا ذکر کر کے مراد زمین کے کنارے لئے گئے ہیں اور ثابت یہ کیا گیا ہے۔ " له الارض کلها لایختص به مکان دون مکان " کہ تمام زمین اللہ تعالیٰ کیلئے ہے یہ نہیں کہ کچھ مکان اس کے ہوں کچھ نہ ہوں۔

اسی سے ماقبل آیۃ سے تعلق بھی واضح ہو گیا۔ " فان منعتم ان تصلوا فی المسجد الحرام او لاقصیٰ قد جعلت لکم الارض مسجدا " کہ مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ اگر تمہیں مسجد حرام یا مسجد اقصیٰ سے نماز ادا کرنے سے منع کر دیا جائے تو تمہارے لئے ساری زمین کو ہی مسجد بنا دیا گیا ہے۔ تمام زمین ہی اللہ تعالیٰ کی ہے جہاں چاہو نماز ادا کرلو۔ (ماخوذ از قرطبی، بیضاوی، شیخ زادہ)

فائدہ: ﴿ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ﴾ میں لام اختصاص کا ہے، معنی یہ ہے " هو خالقهما و مالكهما " کہ اللہ تعالیٰ مشرق ومغرب یعنی تمام زمین کا خالق اور مالک ہے۔ اسی سے پتہ چل گیا کہ رب تعالیٰ جسمیت سے پاک ہے، اور اللہ تعالیٰ کا جہت اور مکان سے پاک ہونا واضح ہو گیا۔

دلیل: مشرق اور مغرب دونوں جہتیں اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور مملوک ہیں۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ جہت اس امر ممتد کو کہتے ہیں جو طول اور عرض اور عمق کے لحاظ پر پھیلے۔ ہر وہ چیز جو اس طرح ہو وہ منقسم ہوتی ہے۔ جو چیز منقسم ہو وہ مؤلف و مرکب ہوتی ہے۔ ہر وہ چیز جو مؤلف و مرکب ہو اس کا خالق اور موجد ہونا ضروری ہے۔

یہ دلیل تمام جہات سے متعلق ہے۔ فوق، تحت وغیرہ تمام جہات کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ یقینی بات ہے کہ خالق مقدم ہے مخلوق پر، جب جہات ہی اور مکانات ہی نہیں تھے۔ خالق کا وجود اس وقت ہے تو رب تعالیٰ کا جہات سے پاک ہونا واضح ہے۔

اسی طرح جہان کی تخلیق کے بعد بھی جہات سے پاک ہونا ضروری ہے، کیونکہ انقلاب حقائق ممکن نہیں۔

اعتراض: جب ساتھ ہی آگے آرہا ہے ﴿فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ جس طرف تم منہ پھیرو اسی طرف اللہ تعالیٰ کا منہ ہے۔ تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ جسم اور جہت اور مکان سے پاک ہے۔

جواب: یہاں "وجـــه" کا حقیقی معنیٰ "منہ اور چہرا" مراد ہی نہیں۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں کذب لازم آئے گا کیونکہ "منہ" تو ایک طرف ہوتا ہے۔ مشرق کی طرف تو مغرب اور شمال و جنوب کی طرف نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر کسی دوسری جانب ہو تو اسی جانب ہوگا۔ جب رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ تم جدھر منہ پھیرو ادھر ہی ﴿وَجْهُ اللّٰهِ﴾ ہے۔ تو یقیناً اس کا مجازی معنیٰ معتبر ہے۔ وہ مجازی معنیٰ کیا ہے؟ اس میں کئی احتمال ہیں۔

(۱) وجـــه کی اضافت "اللّٰه" کی طرف تشریفی ہے۔ اور معنیٰ اس کا تخلیق اور ایجاد ہے اب مطلب یہ ہوگا۔ "تم جدھر منہ کرو اسی طرف کو اللہ تعالیٰ نے قبلہ بنایا ہے۔

(۲) وجہ کا معنیٰ قصد اور نیت ہو، جیسے ﴿اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ﴾ الخ میں یہی معنیٰ معتبر ہے اب مطلب یہ ہوگا۔ "جدھر تم منہ کرو وہی اللہ تعالیٰ کے ارادہ میں ہے۔

(۳) وجہ بمعنیٰ "رضا" ہو۔ جس طرح ﴿اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ﴾ میں یہی معنیٰ معتبر ہے۔

بے شک ہم تمہیں اللہ کی رضاء کے لئے کھلاتے ہیں۔اب اس آیۃ کا مفہوم ہوگا تم جدھر منہ کرو ادھر ہی اللہ تعالیٰ کی رضاء ہے۔

"﴿فَثَمَّ وَجۡهُ اللّٰهِ﴾ مع انه لایجوز علیه المکان فلا بد من تأویله بأن المراد فثم قبلته التی یعبد بها اوثم رحمته ونعمته وطریق ثوابه والتماس مرضاته"

جب اللہ تعالیٰ کے لئے مکان اور جہت ثابت کرنا جائز نہیں تو ضروری ہے کہ اس کی تاویل کی جائے یا یہ کہا جائے وہی قبلہ ہے جس کی طرف توجہ کر کے عبادت کی جاتی ہے۔یا یہ کہا جائے کہ اسی طرف اس کی رحمت اور نعمت ہے (اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے۔راقم نے بھی وہی نقل کیا صرف مختصر کیا) اور یا یہ کہا جائے اسی طرف ثواب کا طریقہ ہے، اور یا یہ کہا جائے کہ اسی طرف اس کی رضاء کو حاصل کرنا ہے۔ (از کبیر)

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ان معانی کے علاوہ ذات بھی معنی کیا ہے۔اس لحاظ پر معنی یہ ہوگا۔"تم جدھر منہ کرو اسی طرف اللہ کی ذات ہے۔" (از روح المعانی)

خیال رہے "تولوا" اصل میں "تولیوا" ہے۔"ولی یولی تولیة" سے لیا ہوا ہے۔ جو اصل میں متعدی ہے لیکن اس کا استعمال بمنزل لازم کے ہے۔

"ولی اذا اقبل وولی اذا ادبر وهو من الاضداد و معناه ههنا الاقبال"

ولّـــی کا معنی متوجہ ہونا بھی ہے اور پیٹھ پھیرنا بھی ہے۔یعنی اضداد کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔یہاں معنی متوجہ ہونا۔یعنی جس طرف تم متوجہ ہو۔ (از کبیر و شیخ زادہ)

اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ : بے شک اللہ تعالیٰ وسعت والا، علم والا ہے۔

اعتراض: "انه تعالی وصف نفسه بکونه واسعا والسعة من صفة الاجسام"

اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی صفت واسع ہونے سے بیان فرمائی ہے۔اور "سعة" (وسعت) کا تعلق اجسام سے ہے۔جب اللہ تعالیٰ جسم ہونے سے پاک ہے، تو اس کے "واسع" ہونے کا کیا مطلب ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت واسع ہونا بیان فرمائی ہے۔اس کا حقیقی معنی تو نہیں لیا جا سکتا کیونکہ اس طرح تو رب تعالیٰ کا متجزی ہونا اور متبعض ہونا لازم آئے گا۔اور کسی اور خالق کا ماننا لازم آئے گا، جو جائز نہیں۔

" بل لابد وان یحمل علی السعة فی القدرة والملک ، او علی انه واسع العطاء والرحمة ، او علی انه واسع الانعام ببیان المصلحة للعبید لکی یصلوا الی رضوانه "

اس لئے ضروری ہے کہ اس کا معنی یہ لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ وسیع قدرت اور وسیع ملکیت کا مالک ہے۔یا یہ معنی لیا جائے کہ وہ وسیع عطاء اور وسیع رحمت کا مالک ہے۔یا یہ معنی لیا جائے کہ وہ وسیع انعام کا مالک ہے کہ اپنے بندوں کی مصلحت کے پیش نظر ان کو انعام سے نوازتا ہے تو وہ بھی اس کی رضامندی کو حاصل کرتے ہیں۔

عَلِیۡمٌ: اس مقام پر تہدید کے لئے استعمال ہے کہ نمازی کو جب یہ معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ظاہر و باطن کو جانتا ہے۔تو وہ نماز کی ادائیگی میں اور نماز کے ارکان وغیرہ میں سستی سے کام نہیں لے گا۔

" ویحتمل ان یکون قوله تعالیٰ (واسع علیم) انه تعالی واسع القدرة فی توفیة ثواب من یقوم بالصلوة علی شرطها و توفیة عقاب من یتکاسل عنها "

اور یہ احتمال بھی پایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ وسیع قدرت والا ہے لہٰذا جو نماز کو شرائط کے مطابق ادا کرے گا اس کو کامل ثواب عطاء فرمائے گا۔اور جو سستی سے کام لے گا اسے مکمل عذاب عطاء کرے گا۔

مظہری میں بیان کیا گیا ہے بے شک اللہ تعالیٰ اپنے نور کے احاطہ کے ذریعے وسعت والا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے احاطہ کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی، اور اس کی حقیقت کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔

" قال المجدد ﷺ فی حقیقة الصلوة انها وسعة ذاتیة بلاکیف لا تدرک کنهها "

مجدد رحمہ اللہ نے نماز کی حقیقت کے متعلق بیان فرمایا کہ نماز میں وسعت ذاتیہ پائی جاتی ہے۔ لیکن اس کی حقیقت اور کنہ کو بھی نہیں پایا جا سکتا۔ (مظہری)

قبلہ کے متعلق مسائل:

" لما کان المسجود له هو الله تعالی والتوجه الی الکعبة مامورا به کان السجود لنفس

الکعبة کفرا" (شامی ج اول ص ۳۱۵)

مسجود صرف رب تعالیٰ کی ذات ہے، کعبہ شریف کی طرف صرف توجہ کا حکم ہے۔ اگر کوئی شخص کعبہ کو معبود اور مسجود سمجھے گا تو وہ کافر ہو جائے گا۔

اس سے بت پرستوں کا اعتراض مندفع ہو جائے گا کہ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح تم کعبہ کو سجدہ کرتے ہو اس طرح ہم بت کو سجدہ کرتے ہیں۔ یہ ان کا قول غلط ہے کیونکہ وہ بتوں کو معبود سمجھتے ہیں۔

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اجعل الآلهة واحد، ان هذا لشئ عجاب﴾ کیا اس (محمد) نے بہت معبودوں کا ایک معبود کر دیا، بے شک یہ عجیب بات ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ بت پرست اپنے بتوں کو معبود سمجھتے تھے۔ جب نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔" لا اله الا الله " (اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں) تو وہ اس پر تعجب کرنے لگے کہ کیا یہ شخص کئی معبودوں کو ایک معبود بتا رہا ہے۔ یہ تو عجیب بات ہے۔

اور رب تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ﴿ مانعبدهم الالیقربونا الی الله زلفی ﴾ (وہ کہتے ہیں) ہم تو انہیں صرف اتنی بات کے لئے پوجتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے پاس نزدیک کر دیں۔

اس آیۃ کریمہ سے بھی واضح ہوا کہ بت پرست اپنے بتوں کی پوجا کرتے تھے، ان کو معبود سمجھتے تھے۔

یہاں سے ایک اور ضال و مضل فرقہ کا بھی رد ہو گیا جو یہ کہتے ہیں کہ بت پرستوں نے اپنے بتوں کو رب کے قریب کرنے کا وسیلہ اور ذریعہ بنایا ہوا تھا۔ اور سنیوں نے انبیاء و اولیاء کو وسیلہ بنایا ہوا ہے۔ لہٰذا یہ بھی بت پرستوں کی طرح مشرک ہیں۔

کاش کہ ان عقل کے اندھوں کو یہ آیات نظر آئیں جن کو ابھی ذکر کیا گیا ہے کہ بت پرست بتوں کو معبود اور مسجود سمجھتے تھے۔ اہل سنت و جماعت کے علماء کرام تو کیا بفضلہ تعالیٰ عوام میں سے کوئی جاہل بھی انبیاء کرام اور اولیاء کرام کو معبود نہیں سمجھتا۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا مقرب تسلیم کرتے ہیں۔ اور یہ عقیدہ سچا اور پکا رکھتے ہیں کہ یہ رب تعالیٰ کے قریب کرنے کا ذریعہ ہیں۔

نتیجہ واضح ہو گیا کہ ایک نظام کو مربوط بنانے کے لئے، ایک ڈسپلن پیدا کرنے کے لئے، ایک ہی طرف تمام متوجہ ہوں، جہاں مسلمانوں کو دیکھ کر ہی ان کی اجتماعیت کا پتہ چل جائے، قبلہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا۔

اور روزمرہ انسان نماز پڑھنے سے یہ تجربہ حاصل کر رہا ہے کہ ایک طرف توجہ کرنے سے اور دائیں بائیں، ادھر ادھر نہ دیکھنے سے انسان یکسوئی، کامل توجہ سے نماز ادا کرتا ہے۔ نماز کے ختم ہونے پر، یا نماز سے پہلے جب ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوتے ہیں تو ذکر اور وظائف کے پڑھنے میں وہ کامل توجہ نہیں ہوتی جو نماز میں ہوتی ہے۔

امید ہے کہ استقبال قبلہ اور بت پرستی، اور اسی طرح بت پرستی اور انبیاء کرام اور اولیاء کو تقرب کا ذریعہ سمجھنے میں طلباء کرام فرق سمجھ چکے ہوں گے۔

مسئلہ: جہاں سے کعبہ شریف نظر آ رہا ہو وہاں تو کعبہ شریف کی طرف اس طرح توجہ کرنا ضروری ہے کہ انسان اور کعبہ شریف تک خط مستقیم جائے۔ اگر کعبہ شریف سے معمولی انحراف بھی ہوا تو نماز ادا نہیں ہوگی۔

خیال رہے کہ فقہاء کرام اکثر طور پر یہ مسئلہ تحریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ''مکی'' (مکہ میں رہنے والے) کے لئے یہ ضروری ہے۔ درمختار میں اسے واضح کر دیا گیا۔ '' والمراد بقولی فللمکی مکی یعاین التعینة '' کہ مکی سے مراد یہ ہے کہ جسے کعبہ شریف نظر آ رہا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ عین کعبہ کی طرف توجہ کرے۔ جسے نظر نہ آ رہا ہو اسے سمت مقرر کرنا ضروری ہے۔ پہلے چونکہ مکہ مکرمہ میں رہنے والوں کو کئی جگہ سے کعبہ شریف نظر آتا تھا۔ اب مسجد حرام کی تین منزلہ تعمیر کی وجہ سے مسجد کے اندر ہی آئیں تو کعبہ شریف نظر آتا ہے۔ یا قرب وجوار کی بلند بلڈنگوں کی چھتوں سے نظر آ سکتا ہے۔

مسئلہ: جن حضرات کو کعبہ شریف نظر نہیں آ رہا وہ نماز کے لئے کعبہ شریف کی سمت، جہت مقرر کریں، قریب رہنے والے کافی حد تک سمت بھی درست مقرر کر سکتے ہیں۔ کہ خط بالکل سیدھا کعبہ شریف سے گزرے۔

دور والے جب جہت مقرر کریں تو ان کے لئے اتنا ہی ضروری ہے کہ کافی حد تک جہت مقرر کرنے میں احتیاط سے کام لیں لیکن دور کی وجہ سے معمولی فرق نماز کے لئے مفسد نہیں۔" **فعلم ان الانحراف الیسیرۃ لایضر** " اسی سے معلوم ہوا کہ معمولی انحراف نماز میں نقصان نہیں دیتا۔

(از شامی)

اگرچہ دور والوں کے لئے زاویہ حادہ (جو پینتالیس ڈگری سے کم ہو) تک فرق کو جائز رکھا گیا ہے۔ تاہم آجکل سمت مقرر کرنے کے لئے بہتر آلے ایجاد ہوگئے ہیں۔ اس لئے مساجد کا قبلہ مقرر کرنے کے لئے ان سے کام لیا جائے۔

سمت قبلہ کے معلوم کرنے کا طریقہ:

زمین ہموار کر کے بیچ میں ایک کھونٹی بالکل سیدھی گاڑ دیجئے۔ ۲۸ مئی کو گرینج ٹائم سے صبح کے ۹ بجکر ۱۶، ۱۷ منٹ اور ۱۶ جولائی کو گرینج ٹائم سے صبح کے ۹ بجکر ۲۵، ۲۶ منٹ یا ۲۹ نومبر کو گرینج ٹائم سے رات کے نو بجکر ۷، ۸ منٹ اور ۱۴ جنوری کو گرینج ٹائم سے رات کے ۹ بجکر ۲۸، ۲۹ منٹ پر اس کھونٹی کا سایہ سمت قبلہ بتائے گا۔ یعنی اس کھونٹی کے سایہ کے کنارہ پر کھڑے ہو کر کھونٹی کی طرف رخ کر لیجئے مکہ معظمہ آپ کے سامنے ہوگا۔

تنبیہ: چونکہ مغربی پاکستان کا ٹائم گرینج ٹائم سے پانچ گھنٹے آگے ہے اس لئے گرینج ٹائم سے نو بجے مغربی پاکستان ٹائم سے دو بجتے ہیں۔ اور ہندوستان کا ٹائم گرینج ٹائم سے ساڑھے پانچ گھنٹے آگے ہے۔ اس لئے گرینج ٹائم کے نو بجے ہندوستانی ٹائم اڑھائی بجے ہوگا۔ اور مشرقی پاکستان (جو غداروں نے مل کر بنگلہ دیش بنادیا) کا ٹائم گرینج ٹائم سے چھ گھنٹے آگے ہے۔ اس لئے گرینج ٹائم کے نو بجے مشرقی پاکستان میں تین بجے ہوں گے۔

آسان بات: آجکل پاکستان وہی ہے جو پہلے مغربی پاکستان کہلاتا تھا، اس لئے پاکستان میں قبلہ معلوم کرنے کے لئے ۲۸ مئی دن کے دو بجکر سولہ، سترہ منٹ پر کھونٹی زمین میں گاڑ کر دیکھیں جس طرف سایہ جاری ہو، اس طرف کھڑے ہو کر کھونٹے کو اپنی پیشانی کے سامنے رکھیں وہی قبلہ ہے۔

اور ۱۶ جولائی دن کے دو بجکر پچیس، چھبیس منٹ پر یہی عمل کریں، قبلہ کی سمت معلوم ہو جائے گی۔ (از زبدۃ التوقیت) راقم کے نزدیک دن کو ہی عمل کرنا آسان اور بہتر ہے۔ تاہم اگر رات کو عمل کرنا ہو تو پاکستان میں رات کے دو بجکر سات، آٹھ منٹ پر یہ عمل ۲۹ نومبر کو کرے۔ اور ۱۴ جنوری کو رات کے دو بجکر اٹھائیس، انتیس منٹ پر یہی عمل کرے۔

مسئلہ: قبلہ زمین سے لے کر عرش تک ہے۔ صرف کعبہ شریف کے مکان کا نام نہیں۔ اسی لئے بلند پہاڑوں پر نماز ادا کی جائے جہاں توجہ مکان کی طرف نہ ہو۔ مکان نیچے رہ جائے تو نماز درست ہے۔ اس لئے کہ عرش تک جانے والی سمت اس کے سامنے ہے۔

اگر کعبہ شریف کی عمارت کو اٹھا بھی لیا جائے تو قبلہ وہی زمین اور فضا رہے گی۔ اگر وہی کعبہ کی دیواروں کے پتھر وغیرہ دوسری جگہ لگا کر عمارت بنالی جائے تو وہ قبلہ نہیں بن جائیگا۔

فائدہ جلیلہ:

" وفی البحر عن عدة الفتاوی الکعبة اذا رفعت عن مکانها لزیارة اصحاب الکرامة ففی تلک الحالة جازت الصلوٰة الی ارضها " (شامی ج اول ص ۳۱۸ باب شروط الصلوة)

کعبہ شریف کا مکان اگر نیک لوگوں کی زیارت کے لئے اٹھالیا جائے تو پھر بھی نماز اسی سرزمین کی طرف منہ کر کے ادا کی جائے گی۔ تاہم راقم کا مؤقف اس پر یہ ہے کہ کعبہ شریف کا نیک لوگوں کی زیارت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انوار و تجلیات کعبہ بزرگوں کی زیارت کرتی ہیں۔ مکان شریف اپنی جگہ رہتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

" وما ذکره فی البحر نقله فی التاتر خانیة عن الفتاوی العتابیة قال الخیر المرعلی وهذا صریح فی کرامات الاولیاء " (شامی حوالہ مذکور)

جو البحر الرائق میں ذکر ہے وہ تاتر خانیہ نے بھی فتاوی عتابیہ سے نقل کیا ہے۔ الخیر الرملی نے کہا ہے کہ یہ بہت واضح ثبوت ہے اولیاء کرام کی کرامات کا۔

یہ بھی خیال رہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے کعبہ شریف کو جب شہید کرایا نئی تعمیر

ے لئے اور اسی طرح جب حجاج بن یوسف نے کعبہ شریف کو تعمیر کرنے کے لئے شہید کرایا لوگ اسی سمت کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے رہے۔

مسئلہ : اگر ایک شخص قبلہ کو جانتا تو ہے کہ قبلہ اس سمت ہے، لیکن قبلہ طرف منہ کرنے پر قادر نہیں کسی مرض کی وجہ سے یا مال کے خوف کی وجہ سے، اسی طرح دشمن وغیرہ کا خطرہ ہو تو وہ جس طرف منہ کرنے پر قادر ہو اسی طرف منہ کر کے نماز ادا کرے، اس کا قبلہ ہی جہت قدرت ہے۔

مسئلہ : اگر ایک شخص کو قبلہ کا علم نہیں تو وہاں دیکھے اگر کوئی شخص اس علاقہ کا قبلہ کو جاننے والا مل جائے تو اس سے پوچھے۔

اگر کوئی شخص تو نظر نہیں آتا لیکن کوئی مسجد نظر آئے تو اس سے قبلہ کی سمت کا تعین کرے۔

اگر قبلہ بتانے والا بھی کوئی شخص نہیں، اور مسجد وغیرہ بھی کوئی نہیں تو تحری کرے یعنی خود اپنی کوشش سے سورج وغیرہ کو دیکھ کر قبلہ کو پہچاننے کی کوشش کرے، جس طرف غالب گمان ہو جائے وہی قبلہ ہوگا۔ اگر نماز تو تحری کر کے شروع کی تھی، نماز کے درمیان کسی شخص نے بتا دیا کہ قبلہ اس طرف نہیں جدھر تمہارا منہ ہے بلکہ فلاں جانب ہے تو نماز کے اندر منہ ادھر پھیر لے جدھر کسی نے بتایا ہے۔

اگر نماز کے بعد کسی نے بتایا کہ تمہارا رخ درست نہیں تھا تو نماز کو لوٹانے کی ضرورت نہیں، بلکہ درست ہو چکی ہے کیونکہ قبلہ ہی وہ سمت تھی جو تحری سے متعین کی تھی۔

مسئلہ : اگر ایک شخص کو قبلہ معلوم نہیں تھا اس نے تحری بھی نہیں کی یعنی قبلہ کو جاننے پہچاننے کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ اسی طرح ہی ایک جانب منہ کر کے نماز ادا کر لی۔ اگر بعد میں کسی نے بتا دیا کہ قبلہ اسی طرف تھا جس طرف تم نے منہ کیا تو نماز ہو گئی، کیونکہ مقصود قبلہ ہی تھا جسے پا لیا گیا۔

ہاں اگر اس کا منہ غلط سمت تھا تو نماز نہیں ہوئی، کیونکہ قبلہ بھی نہیں پایا گیا، اور تحری جو فرض تھی وہ بھی نہیں پائی گئی لہذا اس نماز کا لوٹانا ضروری ہے۔

مسئلہ : اگر ایک شخص کو قبلہ کا علم نہیں تھا، لیکن اس نے تحری کر کے نماز کو شروع کیا، دوران نماز ہی رائے بدل گئی تو پھر جائے۔ اگر پھر رائے کسی اور سمت کی طرف بدل جائے پھر بھی پھر جائے۔

یعنی اس شخص کا قبلہ ہی تحری ہے جیسے جیسے تحری بدلے گی، ایسے ایسے اس کا قبلہ بدلتا رہے گا۔

(ماخوذ از درمختار و شامی)

فائدہ: ابھی جو مسائل بیان کیے ہیں ان سے ہی واضح ہو گیا کہ قرآن پاک میں تعارض نہیں، البتہ سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ جب قبلہ معلوم ہو اور قبلہ کی طرف منہ کرنے کی قدرت بھی حاصل ہو تو یہ حکم ہے۔ ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ کہ اپنے منہ مسجد حرام یعنی کعبہ کی طرف پھیر لو۔

اور اگر قبلہ معلوم نہیں۔ یا قبلہ کی طرف منہ کرنے کی قدرت نہیں یا سفر کے دوران سواری پر نفل نماز ادا کرنی ہے یا دشمن کے مقابل نماز خوف ادا کرنی ہے تو پھر اس آیۃ کریمہ کا حکم ثابت ہے۔

﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ اور اللہ کے لئے ہی ہے مشرق اور مغرب تو جس طرف تم منہ پھیرو اسی طرف اللہ کی رحمت متوجہ ہے۔

﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا لا سُبْحٰنَهٗ ط بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ﴾ (آیت ۱۱۶)

۱) اور بولے خدا نے اپنے لئے اولاد رکھی، پاکی ہے اسے، بلکہ اسی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اس کے حضور گردن ڈالے ہیں۔

۲) اور انہوں نے کہا، بنائی ہے اللہ نے اپنی اولاد، حالانکہ وہ پاک ذات ہے، بلکہ اسی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں تمام اسی کے فرمانبردار ہیں۔

پہلی آیۃ ﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَیْءٍ ... الخ﴾ میں یہود اور نصاریٰ اور مشرکین کے جھوٹ کو ذکر کیا گیا۔ اس آیۃ کریمہ میں بھی ان تینوں فرقوں کی کذب بیانی کا ذکر ہے۔ اور ان کا رد کیا گیا۔

شان نزول: ﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرٰى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ﴾

یہود نے کہا عزیر اللہ کا بیٹا ہے۔اور نصاریٰ نے کہا مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔
اور مشرکین نے کہا ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔تو اللہ تعالیٰ نے ان کے رد کے لئے اس آیۃ کریمہ کو
نازل کیا۔

وَقَالُوا اتَّخَذَاللّٰهُ وَلَدًا : اورانہوں نے کہا بنائی ہے اللہ نے اپنی اولاد۔
" اتخاذ " کبھی بمعنی صنعت اور عمل کے آتا ہے۔اس وقت اس کا ایک مفعول ہوتا ہے۔اور کبھی بمعنی " تصیر " کے آتا ہے اس وقت اس کے دومفعول ہوتے ہیں۔اب معنی یہ ہوگا" صیر بعض مخلوقاته ولدا "اس نے اپنی مخلوقات میں سے بعض کو اپنی اولاد بنالیا۔ (ابوالسعود)

ان کا قول اولاد کے متعلق کیسے تھا؟

" وهو اتخذ الله ولدا بمعنى ادعى فى حق بعض مخلوقاته انه ولده لا انه ولد حقيقة و كما يستحيل عليه تعالى ان يلد حقيقة فكذا يستحيل عليه التبنى واتخاذ انولد "

اولاد بنانے کا مقصد یہ ہے کہ انکے کہنے کا یہ مطلب تھا کہ اللہ تعالیٰ کی حقیقی اولاد تو اگر چہ نہیں لیکن اس نے اپنی بعض مخلوق کے متعلق دعویٰ کیا ہے کہ وہ اس کی اولاد ہے۔لیکن ان کا یہ کہنا بھی باطل تھا کیونکہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی حقیقی اولاد محال ہے۔اسی طرح اسکا کسی کومنہ بولی اولاد بنالینا بھی محال ہے۔
(شیخ زادہ)

سُبْحَانَهٗ : (وہ پاک ہے) سبحان مصدر ہے بمعنی تنزیه کے۔یعنی اللہ تعالیٰ ان اسباب سے ہی پاک ہے جو اولاد کا تقاضا کرتے ہیں۔

اولاد کے تقاضا کرنے والے اسباب:

" وهو احتياجه الى من يعينه فى حياته " اولاد کا تقاضا کرنے والا ایک سبب یہ ہے کہ زندگی میں اولاد اس کی معاونت کرے۔

" ويقوم مقامه بعد مماته " اور موت کے بعد اس کے قائم مقام ہو۔یعنی اولاد وارث بنے

اوراس کی جانشین بنے۔

" اما الوحشة تلحقه فیحتاج الی من یستأنس به " یاانسان اکیلے رہنے میں وحشت محسوس کرے تو چاہتا ہے کہ اس کی اولاد ہوتا کہ ان سے انس پکڑے، یعنی اولاد کی محبت اور پیار کی وجہ سے وحشت جاتی رہے۔

" اولدفع عدو یقهره فیحتاج الی من یستنصر فیعینه علی قهره " یااولاد کی محتاجی انسان کواس لئے ہوتی ہے کہ اسے دشمن کے قہراور دبدبہ کا سامنا ہوتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ میری اولاد ہو جو میرے دشمنوں سے مقابلہ کرے اور میری معاونت کر کے ان کے قہر کو مندفع کرے۔

" اولشهوات تغلبه وحوائج تمسه فیقضیها به " یاانسان کوضروریات زندگی کی محتاجی ہو اور کھانے پینے کی اشیاء اور لباس وغیرہ کی ضرورت ہوتو وہ چاہتا ہے کہ اولاد ہوتا کہ میری کفالت کرے۔

ان تمام اسباب میں محتاجی پائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ محتاجی سے پاک ہے، لہٰذا اولاد سے بھی پاک ہے۔ پھر ان میں بعض اسباب موت کا تقاضا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ موت سے پاک ہے کہ اسے جانشین کی ضرورت ہو۔ لہٰذا وہ اولاد سے پاک ہے۔

پھر اولاد اپنے والدین کے مشابہ ہوتی ہے۔ اور اپنے والدین کی جنس سے ہوتی ہے۔ رب تعالیٰ تشبیہ اور جنسیت سے جب پاک ہے تو اولاد سے بھی پاک ہے۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

مخلوق اولاد نہیں ہوسکتی:

وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہے۔ اس کے بغیر ہر چیز ممکن لذاتہ ہے۔ جو چیز ممکن لذاتہ ہو وہ حادث ہوتی ہے۔ ہر حادث واجب لذاتہ کی مخلوق ہے۔ " والمخلوق لا یکون ولدا " اور مخلوق اولاد نہیں ہوسکتی۔

واجب لذاتہ کے بغیر تمام چیزیں ممکن لذاتہ کیوں؟

اسلئے کہ اگر دو چیزیں واجب لذاتہ ہو جائیں تو وہ دونوں واجب الوجود ہونے میں مشترک ہوں گی۔ اور دونوں کے لئے کوئی چیز ایسی نہیں ہوگی جو ان کو ایک دوسرے سے ممتاز کرے۔ کیونکہ جو چیز

دونوں کے لئے وجہ اشتراک ہو وہ وجہ امتیاز نہیں بن سکتی۔

تو دونوں کا دو دو قیدوں سے مرکب ہونا لازم آئے گا۔ ہر مرکب چیز اپنے اجزء کی محتاج ہوتی ہے۔تو گویا کہ مرکب کا غیر چیز کا محتاج ہونا لازم آیا، " وکل مفتقر الی غیرہ فھو ممکن لذاتہ "اور ہر وہ جو غیر کا محتاج ہوتا ہے وہ ممکن لذاتہ ہوتا ہے۔

" فکل واحد من الموجودین الواجبین لذاتھما ممکن لذاتہ، ھذا خلف " اس طرح ہر ایک واجب لذاتہ کا ممکن لذاتہ ہونا لازم آئے گا جو خلاف مفروض ہے۔

تو ثابت ہوگیا کہ واجب لذاتہ، واجب الوجود صرف رب تعالیٰ ہے۔ باقی تمام کائنات ممکن لذاتہ اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔لہٰذا مخلوق میں سے کوئی چیز بھی رب تعالیٰ کی اولاد نہیں ہوسکتی۔ (از کبیر)

رب تعالیٰ کی اولاد ماننا اسے گالی دینا ہے:

رب تعالیٰ کی اولاد ماننا رب تعالیٰ کی توہین ہے۔ کیونکہ اس کی جنس ماننے سے اس کا محتاج ہونا، اس کا فناء ہوجانا لازم آتا ہے جن سے رب تعالیٰ پاک ہے۔

☆ "عن ابن عباس عن النبی ﷺ قال قال اللہ تعالٰی کذبنی ابن آدم ولم یکن له ذلک وشتمنی ولم یکن له ذلک فاما تکذیبه ایای فیزعم انی لا اقدر ان اعیده کما کان واما شتمه ایای فقوله ان لی ولدا فسبحانی ان اتخذ صاحبة او ولدا' انفرد به البخاری من ھذا الوجه"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ رب تعالیٰ کہتا ہے۔ بیشک میرے بندے نے میری تکذیب کی حالانکہ اسے یہ حق نہیں پہنچتا تھا۔ اور میرے بندے نے مجھے گالی دی حالانکہ یہ اس کے لائق نہیں تھا۔ اس نے میری تکذیب کی کہ وہ یہ کہ اس نے گمان کیا کہ میں اسے لوٹانے پر قادر نہیں، اور اس کا مجھے گالی دینے کا مطلب یہ کہ وہ میری اولاد مانتا ہے۔ حالانکہ میری ذات زوجہ اور اولاد سے پاک ہے۔

☆ " وفی الصحیحین عن رسول اللہ ﷺ انه قال لا احد اصبر علی اذی سمعه من اللہ انھم یجعلون له ولدا وھو یرزقھم و یعافیھم"

بخاری اور مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی ایک رب تعالیٰ سے زیادہ صابر نہیں

ہوسکتا کہ وہ اذیت ناک باتیں سنتا ہے کہ لوگ اس کی اولاد مانتے ہیں پھر بھی وہ ان کو رزق دیتا ہے۔ اور معاف کرتا ہے۔ (از ابن کثیر)

بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ :

"بلکہ اسی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں"

"بل" اضراب کے لئے ہے۔ اور "لہ" میں "لام" تملیک کے لئے ہے۔ یہود ونصاریٰ اور مشرکین نے کہا رب کی اولاد ہے ان کے اس کہنے سے رب تعالیٰ کا مخلوق کے توالد وتناسل میں مشابہ ہونا۔ اپنی اولاد کا مشابہ ہونا اور ہم جنس ہونا۔ اور اولاد کا محتاج ہونا اور فوت ہونا لازم آرہا تھا۔

"بل" ذکر کر کے ان کے اس قول کو باطل کر کے یہ ثابت کیا کہ تمہارے اقوال باطل ہیں، ان سے لازم آنے والے عیوب سے وہ پاک ہے، بلکہ تمام آسمانوں اور زمین میں پائی جانی والی مخلوق اس کی ملکیت میں ہے۔ (از روح المعانی)

جب یہ واضح ہوگیا کہ تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں ہے تو یہ خود بخود واضح ہو جائے گا کہ مخلوق میں کوئی بھی رب تعالیٰ کی اولاد نہیں ہوسکتی کیونکہ ولد مملوک نہیں ہوسکتا، یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی اولاد میں سے کسی مملوک ولد کو خرید لے تو وہ خود بخود آزاد ہو جائے گا۔

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ مَا كَانَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ سُبْحٰنَهٗ اِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ (مریم، آیۃ ۳۵) اللہ کو لائق نہیں کسی کو اپنی اولاد ٹھہرائے۔ وہ ذات پاک ہے۔ جب کسی کام کا حکم فرماتا ہے تو یونہی اس سے فرماتا ہے۔ ہوجا وہ فوراً ہو جاتا ہے۔

اس آیۃ کریمہ سے بھی واضح ہے کہ تمام کائنات رب کی مخلوق ہے جو اس کی ملکیت میں ہے۔ لہٰذا مخلوق کا اولاد ہونا ممکن نہیں۔ اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

﴿ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ☆ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا ☆ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ☆ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ☆ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ☆ اِنْ كُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ☆﴾ (مریم ۸۸ تا ۹۳)

اور کافر بولے رحمٰن نے اولاد اختیار کی۔ بے شک تم حد سے بھاری بات لائے۔ قریب ہے کہ آسمان اس سے پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے۔ اور پہاڑ گر کر پھٹ جائیں۔ اس پر کہ انہوں نے رحمان کے لئے اولاد بتائی۔ اور رحمٰن کے لائق نہیں کہ اولاد اختیار کرے۔ آسمانوں اور زمین میں جتنے ہیں سب اس کے حضور بندے ہو کر حاضر ہوں گے۔

ان آیات سے واضح ہوا کہ رب تعالیٰ کی اولاد ماننا عظیم جرم ہے۔ اس سے تو رب تعالیٰ کے عذاب کو دعوت دینا ہے۔ یہ بہتان تو زمین و آسمان اور پہاڑوں کے پھٹ جانے کا سبب ہے۔ رب تعالیٰ کی شان کے ہی لائق نہیں کہ اس کی اولاد مانی جائے۔ اس کی وجہ بہت واضح ہے کہ آسمانوں اور زمین میں پائے جانے والے اس کے عبد ہیں۔ اور عبد کا ولد ہونا ممکن نہیں۔

سوال : یہ آیت جو زیر بحث ہے اس میں ﴿ لَه' مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ ہے، یعنی اس میں لفظ " ما " ذکر ہے اور سورۃ مریم میں ﴿ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ مذکور ہے۔ جس میں " من " آیا ہوا ہے۔ وجہ فرق کیا ہے؟

جواب : " مـــن " ذوی العقول کے لئے آتا ہے۔ ذوی العقول کا اطلاق انسانوں، جنوں اور فرشتوں پر ہے۔

چونکہ رب تعالیٰ کی اولاد ماننے والوں نے حضرت عزیر علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور فرشتوں کو اولاد مانا تھا ان کے عقیدہ کا رد کرتے ہوئے سورۃ مریم میں "مـــن" ذکر کر دیا کہ جن کو تم نے اولاد مانا ہے وہ تو اس کی مخلوق اور اس کے بندے اور اس کے مملوک ہیں۔

اور اس زیر بحث آیت میں عموم ذکر کر کے مکمل ہی راستہ بند کر دیا، کہ مخلوق میں کسی کو بھی اگر کوئی رب تعالیٰ کی اولاد مانے تو غلط ہوگا۔ " ما " چونکہ غیر ذوالعقول کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اور بنسبت " من " کے اس میں عموم زیادہ ہوتا ہے۔

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ ایک آیۃ میں " من " ذکر کر کے واضح کر دیا کہ کوئی ذوی العقول میں سے رب تعالیٰ کی اولاد نہیں بن سکتا۔ اور دوسری آیت میں " مـــا " ذکر کر کے واضح کر دیا کہ کوئی غیر

ذوالعقول میں سے اس کی اولاد نہیں۔

رب تعالیٰ کی اولاد ماننے کا وبال دنیا میں:

ابن ابی حاتم اور ابن المنذر نے روایت ذکر کی کہ کوئی درخت کانٹے دار نہیں تھا، اور کوئی پھل کڑوا اور بدذائقہ اور بدبودار نہیں تھا۔ اور پانی کہیں شور (نمکین) نہیں تھا۔

لیکن جب بدبخت لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی اولاد ماننی شروع کی تو اللہ تعالیٰ نے درختوں کو خاردار اور پھلوں کو کڑوا اور بدذائقہ اور بدبودار بنا دیا۔ اور پانی کو نمکین بنا دیا۔ (از عزیزی)

تنبیہ: مسلمان جب بھی کسی کافر سے سنے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اولاد کہہ رہا ہے۔ تو اسی وقت "سبحانہ" پڑھے کہ اللہ تعالیٰ تو اولاد سے پاک ہے۔ (از عزیزی)

كُلٌّ لَّهُ قَانِتُونَ: تمام اسی کے فرمانبردار ہیں۔

"قنوت" کا اصل میں معنی ہے۔ "دوام" پھر چار معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) ایک تو یہی معنی مراد لیا جاتا ہے یعنی دوام۔

(۲) دوسرا معنی "طاعت" ہے۔ جس طرح رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ "یا مریم اقنتی لربک" "اے مریم اپنے رب کی عبادت کرو۔

(۳) تیسرا معنی "طول القیام" (لمبا قیام) جیسا کہ نبی کریم ﷺ سے جب سوال کیا گیا "ای الصلوٰۃ افضل" کون سی نماز افضل ہے؟

تو آپ نے فرمایا "طول القنوت" جس نماز میں لمبا قیام پایا جائے وہ افضل ہے۔

(۴) چوتھا معنی ہے۔ "سکوت" جس طرح زید بن ارقم ؓ کہتے ہیں۔ "کنا نتکلم فی الصلوٰۃ حتی نزل قولہ تعالیٰ ﴿وَقُومُوا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ﴾ فامسکنا عن الکلام" ہم نماز میں کلام کر لیا کرتے تھے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد نازل ہوا۔ ﴿وَقُومُوا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ﴾ (اور کھڑے ہو اللہ تعالیٰ کے لئے خاموش ہو کر) تو ہم نے نماز میں کلام کرنا چھوڑ دیا۔

﴿كُلٌّ لَّهُ قَانِتُونَ﴾ ای کل ما فی السموات والارض قانتون مطیعون "تمام

چیزیں جو آسمانوں میں ہیں یا زمین میں رب تعالٰی کی فرمانبردار ہیں۔ (از کبیر)

" کل " پر تنوین عوض مضاف الیہ ہے۔ یا معنی یہ ہے۔ " کل ما فیھما " آسمانوں اور زمین میں پائی جانے والے ہر چیز اس کی مطیع ہے۔

اور یا معنی یہ ہو۔ " کل من جعلوہ ولدا له مطیعون مقرون بالعبودیة " وہ تمام لوگ جنہوں نے رب تعالٰی کی اولاد ٹھہرائی ہے وہ بھی اس کے مطیع ہیں، یعنی اپنی عبودیت کا اقرار وہ بھی کرتے ہیں۔

اعتراض : جب پہلے معنی کے لحاظ پر عموم ہے کہ آسمانوں اور زمین میں پائی جانے والی ہر چیز اس کی مطیع ہے، تو آسمانوں اور زمین میں پائی جانے والی چیزیں غیر ذوی العقول کثیر تعداد میں ہیں۔ تو " قانتون " کا ذکر کرنا کیسے صحیح ہے جب کہ واؤ، نون سے جمع ذوی العقول کی آتی ہے۔

جواب : اس جگہ قاعدہ تغلیب استعمال ہوا ہے۔ یعنی ذوی العقول کو مرتبہ اور شرافت کی وجہ سے غیر ذوی العقول پر ترجیح دی گئی ہے۔ (ماخوذ از بیضاوی)

نکتہ : جب قنوت کا اصل معنی دوام ہے۔ تو آیۃ کا معنی ہو گیا۔ ممکنات کا دوام اور ان کی بقاء اللہ تعالٰی کی قدرت کی وجہ سے ہی ہے۔

" وھذا یقتضی ان العالم حال بقائه واستمراره محتاج الیه سبحانه وتعالٰی "

اور یہ چاہتا ہے کہ تمام جہان حالت بقاء اور اپنے دوام وقیام میں ہمیشہ اللہ تعالٰی کی ذات مقدسہ کا محتاج ہے۔

" فثبت ان الممکن یقتضی ان لاتنقطع حاجته عن المؤثر لاحال حدوثه ولا حال بقائه "

اسی سے ایک اور مسئلہ حل ہو گیا کہ ممکن ہمیشہ مؤثر حقیقی کا محتاج رہتا ہے۔ اس کی محتاجی اپنے مؤثر حقیقی سے کبھی حالت حدوث یا حالت بقاء میں ختم نہیں ہوگی۔ (از کبیر)

مقام توجہ : مفردات راغب میں ﴿ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ ﴾ کے متعلق بیان کیا گیا ہے۔ کہ "قنوت" کا معنی ہے۔ " طاعة مع الخضوع " یعنی فرمانبرداری کے ساتھ عجز کا ظہور بھی ہو "اسی کے مطابق اعلٰی حضرت کا ترجمہ اس مقام پر ہے۔" "سب اس کے حضور گردن ڈالے ہیں۔"

ابن کثیر نے ذکر کیا ہے۔

" عن ابی سعید الخدری عن رسول الله ﷺ قال کل حرف من القرآن یذکر فیه القنوت فهو الطاعة "

حضرت ابوسعید خدری فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قرآن پاک میں جہاں بھی " قنوت " استعمال ہوا ہے۔اس کا معنی طاعت ہے۔طاعت والا معنی سب کو شامل ہے۔خواہ دوام ہو یا قیام۔سکوت ہو یا خضوع۔

فائدہ: ﴿كُلٌّ لَّهٗ قَانِتُوْنَ﴾ یعنی لا یمتنعون عن مشیئته و تکوینه و کلما هذا شانه لا یجانسه الواجب " سب اس کے مطیع ہیں۔یعنی رب تعالیٰ کو اس کی مشیت (چاہنا، ارادہ کرنا) اور اس کی تخلیق وایجاد سے کوئی روک نہیں سکتا۔تو واضح ہو گیا کہ جس ذات کی یہ شان ہو اس کا کوئی ہم جنس نہیں ہو سکتا۔کیونکہ وہ واجب الوجود ہے۔کوئی ممکن واجب الوجود کے ہم جنس ہو یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔

" قانتون " سے ہی ایک اور مسئلہ سمجھ آ گیا۔" کلما زعموه الها من المسیح و عزیر و الملائکة کلهم له قانتون مطیعون مقرون بالعبودیة فیکون الزاما بعد اقامة الحجة "

جن کو ان لوگوں نے معبود سمجھا ہے، یعنی عیسیٰ علیہ السلام اور عزیز علیہ السلام اور ملائکہ کو، وہ تمام تو خود اللہ تعالیٰ کے مطیع ہیں وہ تمام تو اقرار کرتے ہیں کہ معبود صرف رب تعالیٰ ہے ہم تو اس کے عبادت گزار ہیں تو یہ لوگ ان کو کیسے معبود تسلیم کر رہے ہیں۔دلائل کے قائم کرنے کے بعد یہ ان کو الزامی جواب دیا گیا۔کہ تم جنہیں معبود کہہ رہے ہو وہ تو خود اپنی عبودیت کا اقرار کرتے ہیں۔(از مظہری)

خلاصہ کلام: " ان الولد لا بد ان یکون من جنس الوالد و الله تعالیٰ منزه عن التشبیه و النظیر " بے شک اولاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ والد کی جنس ہو۔اللہ تعالیٰ تو تشبیہ اور نظیر (مثل) سے پاک ہے۔تو یقیناً اس کی اولاد کا ہونا بھی محال ہے۔

" وان الولد انما یتخذ للحاجة الیه و الانتفاع به عند عجز الوالد و کبره و الله تعالیٰ منزه عن ذلک "

اولاد کی ضرورت تو والدین کو اس لئے ہوتی ہے کہ بوقت حاجت ان سے نفع حاصل کر لیا جائے۔خصوصاً والدین کو عاجز ہونے کے وقت اور بڑھاپے کے وقت اولاد کی ضرورت ہوتی ہے۔جب اللہ تعالیٰ عجز اور بڑھاپے سے پاک ہے، تو یقیناً اولاد سے بھی پاک ہے۔(از خازن)

﴿بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ﴾ (آیت ۱۱۷)

۱) نیا پیدا کرنے والا آسمان اور زمین کا۔ اور جب کسی بات کا حکم فرمائے تو اس سے یہی فرماتا ہے کہ ہو جا وہ فوراً ہو جاتی ہے۔

۲) بغیر مثال سابق کے پیدا کرنے والا ہے آسمانوں اور زمین کا۔ اور جب فیصلہ فرما لیتا ہے کسی چیز کا، تو یہی کہتا ہے اسے، ''ہو جا'' وہ فوراً ہو جاتی ہے۔

مختصر مطلب: اللہ تعالیٰ بغیر مثال اور بغیر نمونہ کے تمام آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کرنے والا ہے وہ زمان و مکان سے پاک ہے، کیونکہ زمان اور مکان کا تعلق زمین و آسمان سے ہی ہے۔ اس نے تمام چیزوں کو پیدا فرمایا، کیونکہ اس آیۃ میں ﴿اَلسَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ سے مراد آسمانوں اور زمینوں کو بمع ان میں پائی جانے والی چیزوں کے پیدا کرنا ہے۔ اور رب تعالیٰ کسی چیز کو پیدا کرنے میں کسی آلہ اور کسی مادہ کا محتاج نہیں۔ وہ صرف یہ فرماتا ہے۔ " کن " ہو جا۔ تو وہ چیز فوراً موجود ہو جاتی ہے۔

قدرے تفصیل:

﴿بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ " ای مخترعهما و بدعهما لا علی مثال سابق " (مدارک)

" والابداع اختراع الشئ لا عن مادة ولا فی زمان ویستعمل ذلک فی ایجاده تعالی للمبادی " (روح المعانی)

" ابداع " کا مطلب ہے کسی چیز کو بنانا، معرض وجود میں لانا، نہ اس کی مثال اور نمونہ پہلے موجود ہو۔ نہ ہی اس کا پہلے کوئی مادہ موجود ہو۔ اور نہ ہی اس پر کوئی زمانہ گزرے۔

یعنی " ابداع " کا اطلاق مخلوق کی ان چیزوں پر ہوتا ہے جو بغیر مثال سابق اور بغیر نمونہ کے ابتدائی طور پر تخلیق کی جائیں۔

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ''نیا پیدا کرانے والا'' بھی یہی ثابت کر رہا ہے کہ ابتدائی طور پر بغیر نمونہ کے

پیدا کرنے والا۔

اور راقم نے جو علامہ کاظمی رحمہ اللہ کا ترجمہ نقل کیا ہے: "پیدا کرنے والا بغیر مثال سابق کے" مطلب اس کا بھی وہی ہے۔ بنسبت اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کے عام فہم ہے۔

علامہ راغب اصفہانی نے بیان فرمایا: "وهو غير الصنع اذ هو تركيب الصورة بالعنصر"

ابداع، صنعت کا غیر ہے۔ کیونکہ صنعت میں کسی چیز کو عناصر سے مرکب ہونا ہوتا ہے جو ابداع میں نہیں

تنبیہ: ﴿بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ میں وہی معنی معتبر ہے جو "مدارک" نے بیان کیا، یا بیضاوی سے وضاحت ان شاء اللہ قریب ہی ذکر کر دی جائے گی۔ "روح المعانی" سے "ابداع" کا جو معنی ذکر کیا ہے اس کا مطلب مطلقاً "ابداع" کا معنی بیان کرنا مقصود تھا کہ "ابداع" کے کون کون سے معانی پائے جاتے ہیں۔ راقم کے اس بیان سے یہ اعتراض خود بخود مندفع ہو گیا کہ زمین و آسمان کی تخلیق کے متعلق تو ﴿فی ستة ايام﴾ کا ذکر ہے کہ چھ دنوں میں پیدا کیا۔ تو بغیر زمان کے پیدا کرنے کا کیا مطلب ہو گا؟

تو اس کا جواب واضح ہے کہ اس مقام پر معنی صرف "بغیر مثال سابق کے پیدا کرنا" لیا گیا ہے۔ بغیر زمان کے پیدا کرنے والا معنی یہاں مراد نہیں۔

اعتراض: اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں مبدعات بھی، مصنوعات بھی ہیں اور مکوّنات بھی ہیں۔ تو کس طرح صحیح ہو گا کہ یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ زمین و آسمان اور ان میں پائی جانے والی تمام چیزوں کا مبدع ہے۔

جواب: یہاں قاعدہ تغلیب پر عمل کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ محتاج نہیں کہ کسی چیز کو پیدا کرنے میں مادہ کا محتاج ہو یا زمان کا محتاج ہو، یا مثال یا نمونہ کا محتاج ہو، البتہ وہ اپنی مرضی سے کسی چیز کو مبدع بنا دے یا مصنوع بنا دے یا مکوّن بنا دے۔ (از روح المعانی)

ان اصطلاحات میں فرق:

"الابداع وهو اختراع الشئ لا عن شئ ولا فی زمان و یستعمل ذلک فی ایجاده

تعالی المبادی"

کسی چیز کو بغیر مادہ کے، بغیر زمانہ کے اور بغیر نمونہ کے بنانا "ابداع" کہلاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ان موجودات پر بولا جاتا ہے جن کو بغیر نمونہ اور مثال سابق کے ابتدائی طور پر موجود کیا جائے۔ یعنی مبادی مبدعات ہیں۔

" والصنع هو تركيب صورة مع العنصر و يستعمل فی ایجاده تعالی الاجسام "

کسی چیز کی صورت کو عناصر سے بنایا جائے اسے "صنع" کہا جاتا ہے۔ صنعت کا تعلق اللہ تعالیٰ کی موجودات میں سے اجسام کے ساتھ ہے۔ یعنی اجسام مصنوعات ہیں۔

" والتسخير هو سوق الشئ الی ما هو الغرض المقصود منه طوعا او قهرا و يستعمل فی القوی التی اوجدها فی السحاب والامطار والاغذية والادوية "

کسی چیز کو غرض مقصود کی طرف چلانا خواہ وہ خوشی سے اسے قبول کرے یا جبر سے، اسے تسخیر کہا جاتا ہے۔ اس کا استعمال ان قوتوں میں سے ہے جو بادل اور بارشوں اور غذاؤں اور دواؤں میں ایجاد کی گئی ہیں۔

" والتكوين الذی يكون بتغيير وفی زمان غالبا " جس کی ایجاد میں تغیر (تبدیلی) اور زمانہ پایا جائے اسے تکوین کہا جاتا ہے۔ تکوین بھی اگرچہ ایجاد اور انشاء (پیدا کرنے) کے معنی میں استعمال ہے۔ لیکن تکوین میں تدریجاً ایک صورت کو بدل کر دوسری صورت میں لایا جاتا ہے۔ زمین و آسمان کی تخلیق میں جب اس قسم کا تغیر نہیں پایا گیا تو انکی تخلیق کے لئے لفظ تکوین بھی استعمال نہیں ہوا۔

(ماخوذ از بیضاوی و شیخ زادہ)

طلباء کرام توجہ فرمائیں:

بدیع، کی وضاحت میں لفظ "ابداع" ذکر کیا گیا ہے۔ جس سے اس مسئلہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ "بدیع" باب افعال کے اسم فاعل "مبدع" (بکسر الدال) کے معنی میں استعمال ہے۔

خیال رہے کہ اگرچہ اصمعی نے کہا ہے کہ فعیل بمعنی مفعل (اسم فاعل) استعمال نہیں ہوتا، لیکن اسکا یہ کہنا غلط ہے۔ ابن بری نے بیان کیا ہے کہ بہت سے الفاظ اس میں استعمال ہیں۔ انکار کرنا ممکن نہیں

سخین بمعنی مسخن، قعید بمعنی مقعد، وصی بمعنی موصی، حکیم بمعنی محکم، بریم بمعنی مبرم، انیق بمعنی موثق اور بھی اس طرح کے کئی الفاظ استعمال ہیں۔ (از روح المعانی)

جو شخص کوئی ایسا کام کرے جو پہلے نہ پایا جائے تو اسے کہا جاتا ہے۔ "ابدعت" تو نے نیا کام کیا ہے۔

اسی وجہ سنت اور جماعت کے خلاف کام کرنے والے کو بدعتی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ دین اسلام میں اس نے صحابہ کرام اور تابعین کے خلاف کام کیا۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ کی وضاحت:

ہر نیا کام جو مخلوق سے صادر ہوا سے دیکھا جائے کہ اس کی اصل شرع میں ہے یا نہیں۔ اگر اس کی اصل شرع میں ہے تو وہ کام محمود ہوگا۔ اور اگر اس کی اصل شرع میں نہیں تو مذموم ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کو بہتر قرار دیا ان کے عموم میں وہ آتا ہے یا نبی کریم ﷺ نے جن کاموں پر برانگیختہ کیا ہے وہ نئے کام ان میں سے ہی ہیں۔ "فهي في حيز المدح" تو یہ کام مقام مدح میں ہیں۔ اگرچہ ان کی مثال موجود نہ ہی ہو۔ لہٰذا ہر قسم کی سخاوت (سخاوت ہے ہی نیک کاموں میں مال خرچ کرنا، برائی کی راہ میں مال خرچ کرنا سخاوت نہیں) اور ہر قسم کا نیک کام کرنا "فهذا فعله من الافعال المحمودة" یہ کام افعال محمودہ سے ہیں۔ اگرچہ کام کرنے والے کو پہلے اس کی مثال نہ ملے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول اسکی تائید کرتا ہے۔ "نعمت البدعة هذه" یہ بڑی اچھی بدعت ہے۔ آپ کا یہ ارشاد تراویح کی نماز کو باجماعت ادا کرنے پر تھا۔

"وهي وان كان النبي ﷺ قد صلاها الا انه تركها ولم يحافظ عليها، ولا جمع الناس عليها، فمحافظة عمر رضی اللہ عنہ عليها، وجمع الناس لها، وندبهم اليها، بدعة لكنها بدعة محمودة ممدوحة"

اگرچہ تراویح کی نماز نبی کریم ﷺ نے پڑھائی، لیکن پھر آپ نے اسے چھوڑ دیا۔ اور اس پر محافظت نہیں فرمائی۔ اور لوگوں کو جمع ہونے کا حکم نہیں فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر محافظت کرنے کو

جاری فرمایا اور لوگوں کو تراویح کی نماز باجماعت ادا کرنے کا حکم دیا۔ اور لوگوں کو نماز کی طرف بلایا۔ یہ تمام کام بدعت ہیں۔ لیکن قابل تعریف ہیں۔ لہٰذا یہ بدعت حسنہ ہے۔

بدعت قبیحہ کیا ہے؟

" وان كانت فی خلاف ما امر الله به ورسوله فهی فی حیز الذم والانكار "

اگر بدعت ایسی ہو جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے خلاف ہو تو وہ مقام مذمت اور انکار میں ہے۔ یعنی وہ بدعت سیئہ، مذمومہ، قبیحہ کہلاتی ہے جو ناجائز ہے۔

" وهو معنی قوله ﷺ فی خطبته و شزالامور محدثاتها و كل بدعة ضلالة "

نبی کریم ﷺ جو اپنے خطبہ کے دوران فرمایا "شرامور وہ ہوں گے جو نئے نئے ہوں گے، اور ہر بدعت گمراہی ہے۔" اس کا یہی مطلب ہے کہ وہ کام قرآن پاک، حدیث پاک اور صحابہ کرام کے ارشادات کے مخالف ہو۔

بدعت کی دو قسموں کا ثبوت حدیث پاک سے:

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا؛

" من سن فی الاسلام سنة حسنة كان له اجرها واجر من عمل بها من بعده من غير ان ينقص من اجورهم شئ ومن سن فی الاسلام سنة سيئة كان عليه وزرها ووزر من عمل بها من بعده من غير ان ينقص من اوزارهم شئ "

جس شخص نے اسلام میں اچھا طریقہ جاری کیا، اس شخص کو اچھا طریقہ ایجاد کرنے کا اجر ملے گا۔ اور اس کے بعد جو اس پر عمل کریں گے ان کے عمل کا بھی اسے ثواب حاصل ہوگا۔ جبکہ ان کے ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ اور جس شخص نے اسلام میں برا طریقہ جاری کیا۔ اس شخص کو برا طریقہ جاری کرنے کا گناہ حاصل ہوگا۔ اور اس کے بعد جتنے لوگ اس پر عمل کریں گے ان کا گناہ بھی اسے حاصل ہوگا۔ جب کہ ان کے گناہوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔

" وهذا اشارة الى ما ابتدع من قبيح و حسن وهو اصل هذا الباب "

اس حدیث سے واضح ہوا کہ کوئی بھی نیا کام ہوگا تو وہ یا تو قبیح ہوگا۔ یا حسن ہوگا۔ یہ حدیث پاک اس مسئلہ میں اصل (قانون اور ضابطہ) ہے۔

" وباللہ العصمة والتوفيق لارب غيره " اللہ تعالیٰ ہی بچانے والا ہے غلو اور تجاوز سے، ہر نئے کام کو حرام کہنا بھی بے وقوفی ہے اور ہر نئے کام کو مطلقاً جائز کہنا بھی نادانی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی توفیق عطاء فرمائے کہ صراط مستقیم سمجھ آئے کہ بدعت حسنہ اور سیئہ کا فرق معلوم ہو جائے۔ رب کائنات سے ہی دعاء ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر کوئی رب حقیقی نہیں۔ (ماخوذ از قرطبی)

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے بیہقی سے اور واضح الفاظ میں نقل فرمایا:

" المحدثات من الامور ضربان احدهما ما احدث مما يخالف كتابا او سنة او اثرا او اجماعا فهذه البدعة والثانی ما احدث من الخير لا خلاف فيه لواحد من هذا او هذه محدثة غير مذمومة " (الحاوی للفتاوی ج ۱ ص ۱۹۲)

نئے امور کی دو قسمیں ہیں ایک ان میں سے وہ ہے جو قرآن پاک یا حدیث پاک یا آثار صحابہ یا اجماع امت کے مخالف ہو، یہ بدعت گمراہی ہے یعنی ناجائز ہے۔ اس سے اجتناب ضروری ہے۔

دوسری قسم ان میں سے یہ ہے کہ کوئی نیا کام ہو لیکن نیکی کا کام ہو، اس کے جائز ہونے میں سے کسی کا کوئی اختلاف نہ ہو۔ بلکہ بالاتفاق جائز ہو، وہ کام مستحسن ہوگا۔ اس پر عمل کرنا باعث ثواب ہوگا۔ اور یہ بدعت کسی طرح بھی بری نہیں۔

اقسام بدعات: کچھ تفصیل سے بدعت کی پانچ قسمیں بن جاتی ہیں۔

واجب: جس طرح قرآن پاک اور حدیث پاک کو سمجھنے کے لئے علم نحو کا پڑھنا۔

حرام: اللہ تعالیٰ کا بندوں کی طرح جسم ثابت کرنا، اسی طرح بندے کو پتھر کی طرح غیر مختار سمجھنا وغیرہ۔

مستحب: دینی مدارس قائم کرنا، سرائے بنانا اور ہر بہتر کام جو نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے زمانہ میں نہیں تھا۔

مکروہ: ہر ایسا کام جس کے کرنے سے سنت کا ترک لازم آئے تو اگر سنت غیر مؤکدہ کا ترک لازم آئے تو مکروہ تنزیہی اور اگر سنت مؤکدہ کا ترک لازم آئے تو مکروہ تحریمی۔

مباح: جیسے صبح کی نماز یا عصر کے بعد مصافحہ کرنا لیکن بغیر سلام کے۔ اگر سلام بھی کرے تو مستحب ہوگا۔ (از حاشیہ مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنة)

وَاِذَا قَضٰٓی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ :

اور جب فیصلہ فرمالیتا ہے کسی چیز کا، تو یہی کہتا ہے اسے ''ہوجا'' وہ فوراً ہوجاتی ہے۔

قضاء کے مختلف معانی استعمال ہیں:

۱) کبھی خلق (پیدا کرنے) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿فَقَضٰھُنَّ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ فِیۡ یَوۡمَیۡنِ﴾ اس نے دو دن میں سات آسمان تخلیق فرمائے۔

۲) قضاء بمعنی اعلام (بتانا، علم عطاء کرنا) جس طرح رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَقَضَیۡنَآ اِلٰی بَنِیۡٓ اِسۡرَآئِیۡلَ فِی الۡکِتٰبِ﴾ ہم نے بتایا بنی اسرائیل کو کتاب میں۔

۳) قضاء بمعنی امر، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡٓا اِلَّآ اِیَّاہُ﴾ اور آپ کے رب نے حکم دیا کہ تم عبادت نہ کرو سوائے اس کے۔

۴) قضاء بمعنی الزام اور احکام جاری کرنا، اسی معنی کے لحاظ سے حاکم قاضی کہا جاتا ہے۔

۵) قضاء بمعنی حق کو پورا کرنا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿فَلَمَّا قَضٰی مُوۡسَی الۡاَجَلَ﴾ جب موسیٰ نے حق (وعدہ) پورا کرلیا۔

۶) ارادہ کرنا، فیصلہ کرنا، جیسا کہ اسی آیۃ میں ﴿وَاِذَا قَضٰٓی اَمۡرًا﴾ اور جب وہ فیصلہ فرمالیتا ہے۔ اور جب وہ کسی چیز کی تخلیق کا ارادہ فرمالیتا ہے۔

۷) قضی بمعنی قدر، اس کی تقدیر میں آگیا۔ (۸) قضی بمعنی امضی جاری کردیا۔

خیال رہے آخری دو معنی اگر یہاں مراد ہوں تو اہل سنت کے نزدیک معنی یہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے ازل میں مقدر فرمادیا۔ اور جس چیز کے جاری کرنے کا فیصلہ فرمالیا۔

لیکن معتزلہ کے نزدیک ایجاد اور تخلیق کے وقت ہی تقدیر اور امضاء مراد ہوتے ہیں۔ (از قرطبی)

﴿وَاِذَا قَضٰٓی اَمۡرًا﴾ ''ای اراد شیئا'' اس مقام پر ''امرا'' ''شیئا'' کے معنی میں ہے۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کی تخلیق کا ارادہ فرمالیتا ہے۔ اور فیصلہ فرمالیتا ہے۔ (بیضاوی)

قرآن پاک میں "امر" کئی معانی میں استعمال ہوا ہے:

۱) امر کا معنی دین، جیسا کہ " حتی جاء الحق وظهر امر الله " میں استعمال ہے۔ (یہاں تک کہ حق آ گیا اور اللہ کا دین یعنی اسلام غالب ہو گیا)۔

۲) امر کا معنی قول۔ جیسا کہ " فاذا جاء امرنا " (جب ہمارا قول آ گیا)۔

۳) امر بمعنی عذاب۔ جیسا کہ " لما قضی الامر " جب عذاب کا فیصلہ کر لیا گیا۔

۴) مذکر "امر" مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام " اذا قضی امرا " جب عیسیٰ کا فیصلہ کر لیا گیا، یعنی اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ آپ بغیر باپ کے پیدا ہوں گے۔

۵) امر سے مراد بدر میں قتل " فاذا جاء امر الله " جب اللہ کا امر (یعنی بدر میں کافروں کے قتل کئے جانے کا فیصلہ) آ گیا۔

۶) فتح مکہ۔ ﴿فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ﴾ انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ مکہ کو فتح فرما دے۔

۷) قریظہ کا قتل کیا جانا اور بنی نضیر کا جلاوطن کیا جانا۔ ﴿فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ﴾ معاف کرو، اور درگزر کرو یہاں تک کہ قریظہ کو قتل کر دیا جائے اور بنی نضیر کو جلاوطن کر دیا جائے۔

۸) اَتٰـــى اَمْـــرُ اللّٰهِ (اللہ کا حکم آ جائے) یعنی قیامت آ جائے۔ اس مقام میں امر بمعنی قیامت استعمال ہے۔

۹) امر بمعنی قضاء، (يُدَبِّرُ الْاَمْرَ) یعنی القضاء، وہ قضاء کی تدبیر فرماتا ہے۔

۱۰) امر بمعنی وحی، ﴿يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ﴾ یعنی وحی نازل فرماتا ہے آسمان سے زمین کی طرف۔

۱۱) امر سے مراد امر الخلق ﴿اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ﴾ یعنی امور الخلائق، خبردار مخلوق کے امور اللہ کی طرف ہی لوٹتے ہیں۔

۱۲) امر سے مراد امداد۔ ﴿يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ﴾ وہ کہتے کیا ہمارے لئے امداد آئے گی۔ ﴿قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ﴾ آپ فرما دیں بے شک امداد ساری کی ساری

اللہ کے پاس ہے۔

۱۳) امر سے مراد گناہ۔ ﴿فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا﴾ (نافرمان بستیوں نے) اپنے عذاب کا وبال چکھا۔

۱۴) امر سے مراد شان اور فعل۔ ﴿ وما امر فرعون برشید ﴾ فرعون کا کوئی کام درست نہیں۔

(از قرطبی)

عقیدہ: مضمون آیت کے بارے میں جو ہمارا اعتقاد ہونا چاہئے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وجود میں آنے والے تمام معلومات کا اللہ تعالیٰ ازل سے آمر ہے۔ مقدورات اور معلومات کے متأخر ہونے کے باوجود وہ ازل سے ہر مقدور کا قادر اور ہر معلوم کا عالم ہے۔ اس آیۃ سے جو زمانہ استقبال پر دلالت مفہوم ہوتی ہے وہ ماموارت کے اعتبار سے ہے، کیونکہ لفظ کن صفت تکوین کا تقاضا کرتا ہے۔ صفت تکوین قدیم ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔

مسئلہ: روح المعانی میں ہے محققین سادات حنفیہ اس طرف گئے ہیں کہ یہاں "کن" امر کا صیغہ ہے۔ حقیقت پر محمول ہے وہ فرماتے ہیں کہ تکوین اشیاء میں سنت الٰہیہ اسی طرف جاری ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی تکوین کلمہ "کن" سے فرماتا ہے۔ اگرچہ اس کلمہ کے بغیر بھی اشیاء کی تکوین ممتنع نہیں۔

اور ﴿اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ سے کلام ازلی مراد ہے، اس لئے کہ کلام لفظی حادث ہے جس کا قیام اللہ تعالیٰ کے ساتھ ممکن نہیں۔ (روح المعانی ص ۲۳۶ ب ۱)

اعتراض: جب امر (کن) سے حقیقت امر مراد ہے تو کن کا مخاطب معدوم کو قرار دیں گے یا موجود کو، معدوم خطاب کا اہل نہیں اور موجود کو خطاب فرمانا ایجاد موجود ہے، جو تحصیل حاصل ہونے کی وجہ سے ممکن نہیں۔

جواب: جس چیز کو اللہ تعالیٰ پیدا فرمانا چاہتا ہے وہ خارج میں موجود نہیں ہوتی۔ لیکن علم الٰہی میں اس کی صورت موجود ہوتی ہے۔ وہی صورت علمیہ امر کن کا مخاطب ہے۔

علامہ آلوسی نے آگے چل کر فرمایا کہ معتزلہ اور کثیر اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ یہاں ﴿كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ سے حقیقت امر اور اس کا بجالانا مراد نہیں، بلکہ جس چیز کے ساتھ ارادہ الٰہیہ متعلق ہو جائے بلا تاخیر اس کے حصول کے لئے بطور تمثیل یہ کلام وارد ہے، کہ جس طرح کوئی مامور اور مطیع اپنے آمر اور

مطاع کا حکم بلاتوقف بجالائے اسی طرح مرادِالٰہی بغیر کسی مہلت اور توقف کے حاصل ہو جاتی ہے۔

سوال : اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے متعلق فرمایا ﴿خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ (کہ اللہ نے آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر ان سے کہا" کن " (ہوجا)"فیکون" تو وہ ہوگئے) جب ہر چیز کی پیدائش امر کن سے ہوتی ہے پھر آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کرنے کے بعد "کن" فرمانا،اور "کن" کے فوراً بعد ان کا ہوجانا کیونکر قابل فہم ہوسکتا ہے؟ جب کہ "کن" بعد میں فرمایا گیا اور وہ پیدا پہلے ہو چکے تھے۔

اس اعتراض کی دارومدار اس پر ہے کہ "خلق" کا معنی پیدا کرنا ہے۔اور "ثم" تراخی کے لئے آتا ہے۔اب مفہوم یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا۔اور مٹی سے پیدا کرنے کے بعد کہا "کن" ہوجا۔تو یہ کس طرح درست ہے؟

جواب: اس آیۃ میں "خلق" بمعنی "قدر" ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے جسم کو مٹی سے پیدا کرنا مقدر فرمادیا، پھر ان سے "کن" کہا تو وہ ہوگئے۔ (مدارک ج ۱ ص ۲۳۵)

ایک اشکال کا حل: اگر یہ اشکال وارد کیا جائے کہ اجسام اور مادیات کی تکوین بسرعت وسہولت نہیں ہوتی۔زمین وآسمان کی پیدائش چھ دن میں ہوئی۔انسانی تخلیق مٹی کے ست (مٹی کی اصل خالص) سے شروع ہوکر ﴿ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا..... الخ﴾ نطفہ،علقہ،مضغہ،عظام،لحم (نطفہ،منجمد خون،لوتھڑا،ہڈیاں،گوشت) کے مراحل سے گزرتی ہوئی نو،دس ماہ کی مدت میں مکمل ہوتی ہے۔تمام حیوانات ونباتات کا یہی حال ہے،کہ عرصہ دراز میں یہ اشیاء معرض وجود میں آتی ہیں۔تدریج وتاخیر بظاہر ﴿كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ کے خلاف ہے۔تو اس کا حل یہ ہے کہ مشیت الٰہیہ کے مطابق اشیاء کا وجود میں آنا "کن فیکون" کے معنی ہیں۔لہٰذا جہاں مشیت الٰہیہ کا تعلق تدریج وتاخیر سے ہو وہاں تدریج وتاخیر ہی ﴿كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ ہے۔

جس درجہ اور لمحہ میں کسی چیز کے وجود میں آنے سے مشیت الٰہیہ کا تعلق ہو،اگر اس سے ذرا پہلے یا بعد وہ چیز وجود میں آئے تو مشیت الٰہیہ کے خلاف ہوگا۔اور یقیناً یہ ﴿كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ کے منافی قرار پائے گا۔لہٰذا اسے ﴿كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ کے خلاف سمجھنا درست نہیں۔

علاوہ ازیں یہاں اس حقیقت کو بھی ملحوظ رکھ لیا جائے کہ تاخیر و تدریج کا ہر مرحلہ بیشمار تکوینات کا نتیجہ ہے۔

غور فرمائیے اگر آپ چراغ میں سرِ شام تیل ڈال کر اسے روشن کر دیں اور اس کی لو کو بغور دیکھتے رہیں۔ وہ آپ کو بالکل متصل ایک حال پر نظر آتی رہے گی۔ جب چراغ بجھنے لگے تو آپ دیکھیں گے کہ تیل کا آخری قطرہ ختم ہوتے ہی چراغ گل ہو جائے گا، دراصل یہ اس بات کا مشاہدہ ہے کہ تیل کا ہر قطرہ جو ہزار ہا اجزاء پر مشتمل ہے نہایت سرعت کے ساتھ چراغ کی لو کی صورت میں آپ کے سامنے موجود ہے، جسے دیکھ کر عارف بے ساختہ بول اٹھتا ہے۔

کشتگان خنجر تسلیم را   ہر زماں از غیب جان دیگر است

پس سمجھ لیجئے کہ اسی طرح تدریجی اشیاء کا وجود بھی لاتعداد تکوینات پر مشتمل ہے، یہ تدریجی نظام بے شمار حکمتوں پر مبنی ہے۔ جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، مختصراً اتنا عرض کیے دیتا ہوں کہ اگر عالم مادیات میں یہ تدریجی نظام نہ ہوتا تو اسباب مادیہ بیکار ہو کر رہ جاتے۔ حالانکہ ہمارے رب نے کوئی چیز بیکار نہیں بنائی ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا﴾ (التبیان للکاظمی رحمہ اللہ) یہاں سے ایک اور سوال کا حل بھی سمجھ آ گیا۔ وہ سوال یہ ہے کہ جب یہود و نصاریٰ کے لوگ عقلاء تھے، ان کو معلوم تھا کہ انسان کی پیدائش میں توالد و تناسل کو دخل ہے تو ان کا عزیر علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو رب تعالیٰ کی اولاد تسلیم کرنے کا کیا مطلب ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے۔" وکان السبب فی هذه الضلالة انه ورد اطلاق الاب علی الله تعالی فی الشرائع المتقدمة باعتبار انه السبب الاول و کثر هذا الاطلاق فی الانجیل یوحنا ثم ظلت الجهلة ان المراد به معنی الولادة فاعتقدوا ذلک تقلیدا و کفروا " کہ ان کی گمراہی کا سبب اصل میں یہ تھا کہ پہلی شریعتوں میں اللہ تعالیٰ پر "اب" کا اطلاق مجازی طور پر جائز تھا، کیونکہ مطلب یہ لیا جاتا تھا کہ وہ تخلیق کا سبب اول ہے۔ (جیسا کہ باپ سبب ثانی ہے) انجیل یوحنا میں اس کا استعمال کثیر طور پر ہوا پھر جاہلوں نے اس کا حقیقی معنی لے کر رب تعالیٰ پر جب "اب" بولنا شروع کر لیا تو اس کی اولاد بھی مان لی اس طرح وہ کافر ہو گئے۔ (از روح المعانی)

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَأْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ﴾ (آیت ۱۱۸)

۱) اور جاہل بولے اللہ ہم سے کیوں نہیں کلام کرتا، یا ہمیں کوئی نشانی ملے، ان سے اگلوں نے بھی ایسی ہی کہی ان کی سی بات ان کے، ان کے دل ایک سے ہیں، بے شک ہم نے نشانیاں کھول دیں یقین والوں کے لئے۔

۲) اور کہا ان لوگوں نے جو علم نہیں رکھتے، کیوں نہیں کلام کرتا ہمارے ساتھ اللہ یا آجاتی ہمارے پاس کوئی نشانی، پہلے تھے ان کے قول کی طرح، مشابہ ہیں ان کے دل تحقیق بیان کیں ہم نے نشانیاں اس قوم کے لئے جو یقین رکھتے ہیں۔

مختصر مطلب: یہود ونصاریٰ اور مشرکین کہنے لگے رب تعالیٰ ہمارے ساتھ کلام کیوں نہیں کرتا، یعنی ان کا مقصد یہ تھا کہ نبی بھیجنے کے بغیر براہ راست ہمیں کہتا یہ کام کرو، یہ نہ کرو، یا ہمارے ساتھ کلام کرکے ہمیں بتاتا، "محمد" میرے نبی ہیں، ان پر ایمان لانا۔

یا ہمارے پاس کوئی ایسی نشانی آجاتی جس سے ہم یقین کر لیتے کہ ہاں واقعی یہ نبی ہیں۔ ہمیں ایمان لانا چاہئے۔ رب تعالیٰ نے ان کے بیہودہ سوال کو رد کرتے ہوئے اور نبی کریم ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ ان لوگوں کے اس طرح کے کلام سے آپ دل تنگی محسوس نہ کریں، ان سے پہلے لوگ بھی انبیاء کرام سے ایسے ہی سوال کرتے رہے۔ اور انبیاء کرام صبر سے کام لیتے رہے۔

یہ لوگ اور پہلے لوگ اپنی کج روی اور ایمان نہ لانے اور طرح طرح کے سوال کرنے میں دلوں کے لحاظ پر ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔ اگر یہ یقین لانے کا ارادہ رکھتے تو ہم نے کتنی ہی واضح نشانیاں بیان کر دی ہیں تو یہ تسلیم کر لیتے۔ لیکن انہوں نے جب نہ ماننے کا فیصلہ ہی کر لیا ہے تو اس کا کوئی علاج نہیں۔

ماقبل سے تعلق بھی واضح ہو گیا کہ پہلے انہوں نے توحید باری تعالیٰ کے خلاف رب تعالیٰ کی اولاد

ٹھہرائی، اس کا ذکر کیا گیا، اب اس آیت میں ان کا نبوت کے خلاف عقیدہ رکھنا اور اس پر معترض ہونا کہ ہمیں کیا معلوم ہے یہ نبی ہیں، ان کی اس کج روی کا ذکر کیا جارہا ہے۔

شان نزول: اس آیۃ کریمہ میں شان نزول کی تین وجوہ ہیں۔ یعنی تین فرقوں کے مختلف اوقات میں سوالات کے بعد آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔ جو تمام واقعات مجموعی طور پر اس آیۃ کریمہ کا شان نزول ہیں۔

۱) مشرکین نے نبی کریم ﷺ سے کہا" **لن نؤمن لک حتی تفجرلنا من الارض ینبوعا** "
ہم ہرگز تم پر ایمان نہیں، یہاں تک تم ہمارے لئے زمین میں چشمے جاری کردو۔

اسی طرح مشرکین نے ہی کہا" **لو لا انزل علینا الملائکة او نری ربنا** " ہماری طرف فرشتے کیوں نہیں نازل کیے جاتے یا ہم اپنے رب کو دیکھ لیتے۔

اسی طرح ان مشرکین نے ہی یہ کہا﴿ لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَاۤ اٰيَةٌ ﴾ ہمارے ساتھ رب کلام کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی آجائے۔

ان مشرکین کے اس قسم کے سوالات اور ایمان نہ لانے کے لئے بہانے تراشنے پر اور ان مطالبات پر آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

اس قول کو قتادہ، سدی اور حسن بصری اور کئی حضرات نے بیان کیا، زیادہ مفسرین نے بھی یہی بیان کیا۔

۲) اور اس آیۃ کریمہ کے نزول کے متعلق یہ قول ہے کہ یہود نے یہ کہا تھا۔ اس پر دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

" ان رافع بن خزیمة من الیهود قال لرسول اللہ ﷺ ان کنت رسولا من عنداللہ تعالیٰ فقل للہ یکلمنا حتی نسمع کلامه "

بے شک رافع بن خزیمہ یہودی نے نبی کریم ﷺ سے کہا" اگر تم اللہ کی طرف سے رسول ہو، تو اللہ تعالیٰ کو کہو، وہ ہمارے ساتھ کلام کرے ہم اس کے کلام کو سنیں۔"

تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ اس کے کہنے پر یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔ یہود بھی اس قسم

کے سوال کرتے رہتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ یَسْئَلُکَ اَهْلُ الْکِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَیْهِمْ کِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤی اَکْبَرَ مِنْ ذٰلِکَ ﴾

آپ سے سوال کرتے ہیں اہل کتاب کہ نازل کی جاتی ان پر کتاب آسمان سے، تحقیق انہوں نے موسیٰ سے اس سے بھی بڑا سوال کیا تھا۔ یعنی وہ کہتے تھے کہ ہمارے سامنے ایک مرتبہ ہی آسمانوں سے کتاب نازل ہو تو ہم ایمان لائیں گے۔ رب تعالیٰ نے ان کی مذمت بیان فرمائی کہ ایمان لانا تو ان کا مقصد ہی نہیں۔ ان کا کام تو صرف بہانے تراشنا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام پر کتاب ایک مرتبہ ہی نازل ہوئی اگر ان کے آباء واجداد ایمان لانا چاہتے تو ایک مرتبہ ہی تمام کتاب کے نازل ہونے پر ایمان لے آتے، لیکن وہ کہنے لگے ہم تو اس وقت تک ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک رب تعالیٰ کو ظاہر طور نہ دیکھ لیں۔

۳) حضرت مجاہد کا قول یہ ہے کہ سوال نصاریٰ نے کیا تھا۔ ان کے سوال پر یہ آیت نازل ہوئی۔

(از روح المعانی)

صحیح یہی ہے کہ مشرکین نے سوال کیا اور یہود نے بھی یہ ہی سوال کیا اور نصرانیوں نے بھی سوال کیا تو آیۃ کریمہ کا نزول ہوا۔ لہٰذا تمام واقعات مجموعی طور پر اس آیۃ کریمہ کا شان نزول ہیں۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ : (اور ان لوگوں نے کہا جو علم نہیں رکھتے) جب اس سے مراد مشرکین ہوں تو ان کو بے علم، جاہل کہنے کی وجہ حقیقی طور پر پائی گئی ہے۔ " **لانهم لم یکن لهم کتاب ولاهم اتباع نبوة** " کیونکہ ان کے پاس نہ کتاب تھی اور نہ ہی وہ کسی نبی کے متبعین تھے۔

اور جب اس سے مراد یہود یا نصاریٰ ہوں تو ان کو بے علم اور جاہل کیوں کہا گیا؟ حالانکہ وہ کتاب کا علم رکھتے تھے اور یہود موسیٰ علیہ السلام اور نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے۔

ان کو بے علم کہنے کی وجہ یہ تھی " **لتجاهلهم او لعدم علمهم بمقتضاه** " کہ وہ علم رکھنے کے باوجود جاہل بنے بیٹھے تھے۔ اور صحیح یہ ہے کہ وہ علم کے تقاضا کے مطابق جب عمل نہیں کر رہے تھے تو وہ جاہل ہی تھے۔ کیونکہ ان دونوں فرقوں کے علم کے مطابق اور ان کی کتابوں کے تقاضا کے مطابق چاہیے یہ تھا کہ وہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لائیں اور قرآن پاک کو اللہ تعالیٰ کی سچی کتاب تسلیم کریں۔ جب انہوں

نے یہ نہ کیا تو جاہل ہی تھے۔

لَوْ لَا یُکَلِّمُنَا اللّٰہُ : (ہمارے ساتھ اللہ کلام کیوں نہیں کرتا) یعنی وہ ہمارے ساتھ کلام کیوں نہیں کرتا کہ بے شک تم اس کے رسول ہو۔ یا تو وہ ہمارے ساتھ اس طرح کلام کرے جیسے ملائکہ سے کرتا ہے۔ اور یا وہ ہماری طرف وحی نازل کرے۔

"وھو استکبار منھم یعد انفسھم الخبیثة کالملائکة والانبیاء المقدسین علیھم الصلوة والسلام"

یہ ان کا کلام تکبر پر مبنی تھا کہ وہ اپنے خبیث نفسوں کو فرشتوں اور انبیاء کرام کی مقدس ذاتوں کی طرح سمجھنے لگے یہ بات وہ نہ سمجھ سکے کہ ہم میں یہ اہلیت ہی نہیں کہ رب ہمارے ساتھ کلام کرے۔ (از روح المعانی)

طلباء کرام توجہ فرمائیں: "لو لا" کی دو قسمیں ہیں۔ ایک "لو لا" تحضیضیہ ہے، اور ایک "لو لا" امتناعیہ ہے۔ "لو لا" تحضیضیہ کے بعد فعل ظاہر ہوتا ہے یا مقدر ہوتا ہے۔ اگر "لو لا" تحضیضیہ ماضی پر داخل ہو تو شرم دلانی مقصود ہوتی "لو لا فعلت ھکذا" تم نے ایسے کیوں نہیں کیا؟

اور اگر مضارع پر داخل ہو تو ایک کام پر برانگیختہ (ابھارنا) کرنا مقصود ہوتا ہے۔ جیسے "لو لا تفعل ھکذا" تم ایسا کیوں نہیں کرتے۔ یعنی تمہیں اس طرح کرنا چاہئے۔

اور "لو لا" امتناعیہ کے بعد فعل نہیں ہوتا۔ بلکہ اسم ہوتا ہے۔ اس میں ایک چیز کا وجود دوسرے کے امتناع پر دلالت کرتا ہے۔ جیسا کہ کہا جائے "لو لا زید لھلکت" اگر زید نہ ہوتا تو میں ہلاک ہو جاتا۔ یعنی وجود زید کی وجہ سے متکلم کی ہلاکت نہیں پائی گئی۔

اَوْ تَاْتِیْنَا اٰیَةٌ : (یا آ جاتی ہمارے پاس کوئی نشانی) یعنی ہمیں کوئی نشانی مل جاتی جو تمہاری صداقت پر دلالت کرتی۔

خیال رہے ان کا یہ کہنا کہ "ہمارے ساتھ اللہ کلام کیوں نہیں کرتا" تکبر کی وجہ سے تھا۔ اور ان کا یہ کہنا کہ "یا ہمارے پاس کوئی نشانی آ جاتی" انکار کی وجہ سے تھا۔

انکار کی دو وجہ تھیں۔ ایک تو یہ کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی نشانیوں کو معاذ اللہ

گھٹیا سمجھا۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ عناد کی وجہ سے انہوں نے نشانیوں کا سرے سے انکار ہی کر دیا کہ نہیں ہمارے پاس تو کوئی نشانی آئی ہی نہیں۔ (بیضاوی و شیخ زادہ)

ان کی نادانی پر تعجب:

" والعجب عظموا انفسهم وهی احقر الاشياء واستهانوا بآيات الله وهی اعظمها "

ان لوگوں کی حماقت اور نادانی پر تعجب ہے کہ انہوں نے اپنے نفسوں کو عظیم سمجھا جو حقیقت میں گھٹیا تھے (کیونکہ کفار تو جانوروں سے بھی زیادہ گھٹیا ہیں) اور اللہ تعالیٰ کی نشانیاں جو اصل میں عظمت رکھتی ہیں ان کو انہوں نے گھٹیا سمجھا۔ (شیخ زادہ)

كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ :

مفہوم یہ ہے کہ ان لوگوں سے پہلے لوگوں نے بھی ان کے قول کی طرح ہی کہا۔

یعنی ان لوگوں نے بھی پہلے لوگوں کی طرح کلام کر کے وہی مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی جو ان کے مقاصد تھے کیونکہ ان کا اس قسم کا کلام عناد، سرکشی، اپنی دنیاوی خواہشات پر مبنی تھا۔ یہ سیدھی راہ کو حاصل کرنے کا ارادہ ہی نہیں رکھتے تھے۔ (از شیخ زادہ)

تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ : (ان کے دل مشابہ ہو گئے) یہ ان لوگوں اور پہلے لوگوں کے دل ایک دوسرے کے مشابہ ہو گئے۔ وجہ مشابہت کیا ہے؟ ﴿ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ﴾ قلوب هؤلاء ومن قبلهم فی العمی والعناد "

ان لوگوں اور پہلے لوگوں کے دل اندھا پن اور عناد اور قساوت میں ایک دوسرے کے مشابہ ہو گئے۔

نکتہ : بظاہر عقل کا تقاضا یہ ہے کہ جب ان لوگوں نے پہلے لوگوں کی طرح سوال کیا، ان کی طرح مطالبہ کیا، تو کہنا یہ چاہئے تھا کہ ان کی زبانیں مشابہ ہو گئیں۔ ان کا کلام مشابہ ہو گیا۔ لیکن کہا یہ گیا ہے کہ ان کے دل مشابہ ہو گئے ہیں اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ کیا خوب بیان کی گئی ہے۔

" فان الالسنة ترجمان القلوب والقلب متی استحكم فيه الكفر والقسوة والعمی والسفه والعناد لايجری علی اللسان الا ما يبتنی علی التعلل والتباعد عن الايمان "

بے شک ہر شخص کی زبان اس کے دل کی ترجمان ہے۔ جس شخص کے دل میں کفر مستحکم ہوگا، اور دل میں قساوت پائی جائے گی، اور دل میں اندھاپن پایا جائے گا، اور دل میں بے وقوفی پائی جائے گی، اور دل میں عناد پایا جائے گا تو یقیناً اس کی زبان پر ہی کلمات جاری ہوں گے جو ایمان سے دور کرنے کا ذریعہ ہوں گے۔ (از شیخ زادہ)

قَدۡ بَیَّنَّا الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یُّوۡقِنُوۡنَ :

تحقیق بیان کیں نشانیاں ہم نے اس قوم کے لئے جو یقین رکھتے ہیں۔

بظاہر یہاں یہ وہم ہوتا ہے کہ نشانیاں تو اس قوم کے لئے بیان کی جائیں جو یقین نہ رکھتے ہوں۔ جن کو پہلے ہی یقین ہے، ان کے لئے نشانیاں بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں " یوقنون " کا یا تو مطلب یہ ہے۔ " یطلبون الیقین " یعنی ہم نے نشانیاں بیان کر دی ہیں اس قوم کے لئے جو یقین کے طلب کرنے والے ہیں۔

مطلب واضح ہے کہ کسی نشانی کو دیکھ کر وہی ایمان لاتا ہے جو یقین طلب کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ جو شروع سے ہی ذہن میں یہ رکھ لے کہ میں نے ماننا ہی نہیں، اس کے لئے کوئی نشانی نفع مند نہیں۔

یا " یوقنون " کا مطلب یہ ہے " یوقنون الحقائق لایعتریھم شبھة و لاعناد "

یعنی ہم نے نشانیاں بیان کر دی ہیں اس قوم کے لئے جو حقائق پر یقین رکھتے ہوں۔ حقائق میں ان کو شبہات لاحق نہ ہوں اور وہ عناد بھی نہ رکھتے ہوں۔ مطلب واضح ہے کہ جو شخص نشانیوں کو دیکھ کر بھی انکار کر دے، ان پر طرح طرح کے شبہات پیش کرے وہ کبھی ایمان نہیں لاسکتا۔ نہ ہی وہ یقین کر سکتا ہے کیونکہ ضد اور عناد کی وجہ سے انکار کرنے اور نہ ماننے کا تو کوئی علاج ہی نہیں۔

روشن نشانیوں کا انکار:

"انہ تعالیٰ قد کلمھم واخبرھم بالوحی وھو القرآن انہ ارسل رسولہ بالھدی و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ"

''ان کا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ کلام کیوں نہیں کرتا؟ وہ ہمیں بتاتا کہ تم سچے رسول ہو۔ تو ہم ایمان لاتے'' ان کا یہ کہنا حماقت پر مبنی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے کلام فرمایا۔ ان کو وحی کے ذریعے خبر دی۔ کیونکہ قرآن اللہ کا کلام ہی تو ہے۔ اسی کلام الٰہی نے یہ بیان کیا'' وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا کہ اسے سب دینوں پر غالب کرے۔''

''و آتی رسوله آیات دالة علی رسالته کالقرآن و غیره من المعجزات کمجیئ الشجر و کلام الذئب و الشاة المشوية المسمومة و اشباع الخلق الکثیر من الطعام القلیل و شق القمر''

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو ایسی نشانیاں عطاء فرمائیں جو آپ کی رسالت پر دلالت کر رہی تھیں جیسے قرآن پاک اور آپ کو کتنے ہی معجزات عطاء فرمائے، جن میں سے چند بہت زیادہ مشہور ہیں۔ جیسے درخت کا آپ کے پاس چل کر آنا۔ بھیڑیئے کا آپ سے کلام کرنا، زہر آلود بھنی بکری (کے گوشت) کا آپ سے کلام کرنا۔ تھوڑے طعام سے بہت سی مخلوق کو سیر کر دینا۔ اور چاند کے دو ٹکڑے کر دینا۔

یہ ایسی نشانیاں تھیں جن کو مشرکین اور یہود و نصاریٰ سب ہی جانتے تھے، پھر ان کا کہنا کہ ہمارے پاس تو کوئی نشانی نہیں آئی اس کی وجہ صرف یہ تھی۔

'' انهم ما قالوا ذلک لخفاء فی الآیات او لطلب مزید القین و انما قالوه عتوا و عنادا ''

کہ انہوں نے سرکشی اور عناد کی وجہ سے انکار کیا تھا، یہ وجہ نہیں تھی کہ یہ نشانیاں کوئی مخفی تھیں۔ یا وہ زیادہ یقین حاصل کرنے کے لئے اور نشانیاں طلب کرنا چاہتے تھے۔

(از بیضاوی و شیخ زاده)

☆☆☆

﴿اِنَّآ اَرۡسَلۡنٰکَ بِالۡحَقِّ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا ۙ وَّلَا تُسۡئَلُ عَنۡ اَصۡحٰبِ الۡجَحِیۡمِ﴾ (آیت ۱۱۹)

۱) بے شک ہم نے تمہیں حق کے ساتھ بھیجا خوشخبری دیتا اور ڈر سناتا اور تم سے دوزخ والوں کا سوال نہ ہوگا۔

۲) بے شک ہم نے بھیجا تمہیں حق کے ساتھ، خوشخبری دینے والا اور ڈر سنانے والے، اور تم سے نہیں سوال کیا جائے گا جہنم والوں کے متعلق۔

شان نزول: مشرکین اور نصاریٰ اور یہود نے جب عناد پر اصرار کیا، اور باطل عقائد ونظریات پر چمٹے رہے، حق کو تسلیم کرنے کی انہوں نے کوئی کوشش نہ کی، کبھی توحید باری تعالیٰ کے خلاف اور کبھی نبوت کے خلاف کلام پیش کرنا انہوں نے طریقہ بنالیا، تو کئی مرتبہ نبی کریم ﷺ انکے ایمان نہ لانے اور جہنم کا ایندھن بننے کی وجہ سے پریشان ہوجائے، تو رب تعالیٰ نے آپ کی تسلی کیلئے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا۔

گویا کہ یوں بیان فرمادیا" انه لامزید علی ما فعله فی مصالح دینهم من اظهار الادلة " کہ ہم نے ان کو دین کی مصلحت کے لئے دلائل بیان کردیے کہ وہ ان سے راہنمائی حاصل کر کے راہ راست پر آجائیں، ایمان لے آئیں تاکہ اپنے آپ کو اخروی عذاب سے بچالیں، اس سے زیادہ ہماری کوئی ذمہ داری نہیں۔

" وانه لامزید علی ما فعله الرسول فی باب الابلاغ والتنبیه "

اور اے نبی کریم ﷺ آپ کا کام یہ تھا کہ آپ وہ دلائل ان تک پہنچادیں، ان کو متنبہ کردیں یعنی آپ کے ذمہ صرف اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچانا تھا کہ ان کو بتادیں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں، اللہ تعالیٰ اولاد اور زوجہ سے پاک ہے۔ اور ان کو ایمان لانے پر اجر عظیم کے حاصل ہونے اور ایمان نہ لانے پر اخروی عذاب حاصل ہونے پر متنبہ کردیں۔

اے نبی کریم آپ نے یہ کام مستحسن طریقہ پر کردیا ہے۔ آپ نے تبلیغ فرمادی۔ آپ نے ان کو

متنبہ کر دیا، اب وہ ایمان نہ لا کر جہنم کا ایندھن بنتے ہیں تو بنتے رہیں، آپ کو غمزدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ آیۃ کریمہ کے شان نزول پر غور کرنے سے رب تعالیٰ کی صفت قہاریت اور جباریت سمجھ آ گئی۔ اور نبی کریم ﷺ کی صفت رحمت نمایاں طور پر جگمگاتی ہوئی نظر آنے لگی۔

بِالْحَقِّ : کا تعلق اگر ارسال سے ہو تو اب مطلب یہ ہوگا۔ " **انا ارسلناک ارسالا بالحق** " بے شک ہم نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا حق کے ساتھ، یعنی ہمارا آپ کو بھیجنا حق کے ساتھ ہے۔

اگر اس کا تعلق ﴿ بَشِيرًا وَّنَذِيرًا ﴾ کے ساتھ ہو تو اب معنی ہوگا۔ " **انت مبشر بالحق و منذر بہ** " ہم نے آپ کو بھیجا بشیر اور نذیر بنا کر۔ آپ ان کو بشارت دیتے ہیں حق کے ساتھ، اور آپ ان کو ڈراتے ہیں حق کے ساتھ یعنی آپ کا بشارت دینا اور آپ کا ڈرانا حق ہے اس میں باطل کا کوئی تصور بھی نہیں۔

اور تیسرا مطلب یہ ہے کہ "حق" سے مراد "دین اور قرآن ہو" اب اس صورت میں معنی یہ ہوگا " **انا ارسلناک بالقرآن حال کونہ بشیرا لمن اطاع اللہ بالثواب و نذیرا لمن کفر بالعقاب** "

بے شک ہم نے آپ کو قرآن دے کر بھیجا، دراں حالیکہ (اس حال میں کہ) جو اللہ کی اطاعت کرے، اسے آپ ثواب کی بشارت دیں۔ اور جو کفر کرے اسے آپ عذاب سے ڈرائیں۔

اگرچہ یہ تینوں معانی معتبر ہیں، ایک ایک لفظ سے کثیر اور عظیم مطالب کا حاصل ہونا دراصل قرآن پاک کی عظمت پر دلالت کرتا ہے۔ تاہم زیادہ مشہور اور بہتر قول یہ ہے۔ "بشیر اور نذیر" صفت ہو رسول کی۔ اور معنی یہ ہو۔

" **انا ارسلناک یا محمد بالحق لتکون مبشرا لمن اتبعک و اھتدی بدینک و منذرا لمن کفر بک و ضل عن دینک** "

اے نبی کریم بے شک ہم نے آپ کو حق سے بھیجا تا کہ جو لوگ آپ کی تابعداری کریں اور آپ کے دین پر چل کر ہدایت حاصل کر لیں ان کو آپ بشارت دیں۔ اور جو لوگ آپ سے کفر کریں، اور آپ کے دین سے گمراہ رہیں، ان کو آپ ڈرائیں۔ (اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی قول کے مطابق ہے، یہی راقم نے بھی نقل کیا)۔ (کبیر)

حق سے مراد: یا توحق سے مراد صدق ہے۔یعنی ہم نے آپ کو بھیجا صدق سے۔اور یا ''حق'' سے مراد قرآن ہے یعنی ہم نے آپ کو بھیجا قرآن عطاء کر کے۔اور یا ''حق'' سے مراد السلام ہے۔یعنی ہم نے آپ کو بھیجا اسلام کے ساتھ۔اور بعض حضرات نے یہ معنی بیان کیا ہے'' **انا لم نرسلک عبثا بل ارسلناک بالحق** '' بے شک ہم نے آپ کو یونہی بے مقصد نہیں بھیجا بلکہ آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔

بَشِيْرًا: ''**ای مبشرا لاولیائی واهل طاعتی بالثواب العظیم** '' آپ کو بشارت دینے والا بنا کر بھیجا کہ آپ میرے دوستوں اور میری طاعت کرنے والوں کو عظیم ثواب کی خوشخبری دیں۔

وَنَذِيْرًا: '' **اے منذرا و مخوفا لاعدائی واهل معصیتی بالعذاب الالیم** '' آپ کو ڈرانے والا ،اور خوف دلانے والا بنا کر بھیجا تا کہ آپ میرے دشمنوں اور میری نافرمانی کرنے والوں کو دردناک عذاب کا خوف دلائیں۔ (خازن)

تنبیه: بشیر اور نذیر ہونے کا ذکر فرمایا کہ آپ اہل طاعت کو خوشخبری دیں،اور اہل معصیت کو ڈرائیں،لیکن آپ پر یہ لازم نہیں کہ آپ ان کو جبری طور پر ایمان لانے پر مجبور کریں۔وہ اپنے عقائد باطلہ پر اصرار کرتے ہیں تو کرنے دیں،تکبر کرتے ہیں تو کرنے دیں۔آپ پر کچھ حرج نہیں۔

(روح المعانی)

وَلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ :

اور آپ سے سوال نہیں کیا جائے گا جہنم والوں کے متعلق''

'' وَلَا تُسْئَلُ '' میں دو قراءتیں ہیں۔مشہور قراءت یہی ہے کہ یہ صیغہ نفی مجہول کا ہے(تاء پر ضمہ ہے)اسی قراءت کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہے۔اب اس قراءت کے مطابق چند مطالب ہیں۔

۱) کافروں کا ٹھکانا جہنم ہے۔ان کی معصیت آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی ،اور ان کے کفریات اور ایمان نہ لانے کا سوال آپ سے نہیں کیا جائے گا۔'' **فانما علیک البلاغ وعلینا الحساب** '' آپ کا کام ہے تبلیغ فرمادینا،ہمارا کام ہے ان سے حساب لینا۔

۲) اے نبی کریم آپ کا کام ہے ہدایت دینا۔اس ہدایت کو کوئی قبول کرے یا نہ کرے آپ

سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا، اس لئے آپ ان کے عذاب اور جہنم، ایمان نہ لانے سے کوئی فکر نہ کریں، آپ کو ان کے متعلق غمزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔

۳) اے نبی کریم آپ کسی کی طاعت اور نافرمانی کا وقتی طور پر کوئی لحاظ نہ کریں، بلکہ آخرت کا دارومدار خاتمہ پر ہے خاتمہ ایمان پر ہوا تو نجات ہوگی اور خاتمہ کفر پر ہوا تو عذاب ہوگا۔

فائدہ: " وفی الآیة دلالة علی ان احدا لایسأل عن ذنب غیرہ و لا یؤاخذ بما اجترمه سواہ سواء کان قریبا و بعیدا "

اس آیۃ کریمہ سے یہ سمجھ آیا کہ کسی شخص سے دوسرے کے گناہوں کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا۔ اور نہ ہی کسی کے جرم کا مؤاخذہ (گرفت، پکڑ) دوسرے کو ہونا ہے خواہ قریبی رشتہ دار ہو، یا دور کا رشتہ دار ہو۔ (از کبیر)

دوسری قراءت: ولاتسأل (تاء پر فتحہ اور لام پر ضمہ) یعنی صیغہ نفی معلوم کا ہے لیکن معنیٰ نہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ جہنم والوں کے متعلق سوال نہ کریں۔

" انا ارسلناک بالحق بشیرا و نذیرا غیر سائل عنهم "

بے شک ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے ان کے عذاب کے متعلق متفکر ہو کر سوال کرنے والا آپ کو بنا کر نہیں بھیجا۔

" لان علم الله تعالیٰ بکفرهم بعد انذارهم یغنی عن سؤاله عنهم "

اس لئے اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ آپ نے ان کو ڈرا دیا ہے لیکن وہ پھر بھی اپنے کفر پر قائم رہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا جاننا ان کے بارے میں سوال سے بے پرواہ کر دیتا ہے۔ جب رب تعالیٰ جانتا ہے ان کے کفر کو تو آپ ان کے متعلق سوال نہ کریں۔ (از قرطبی)

شان نزول میں ایک ضعیف روایت:

یہی دوسری قراءت جو بیان کی گئی کہ نفی معروف کا صیغہ ہے جو نہی کے معنیٰ میں ہے۔ یا عین نہی ہے جیسا کہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا۔

اس قراءت کے مطابق بعض حضرات نے کہا یہ آیۃ نبی کریم ﷺ کے اپنے والدین کے متعلق سوال کرنے پر نازل ہوئی۔اس پر روایت یہ بیان کی جاتی ہے۔

" انه عليه الصلوة والسلام سأل جبريل عن قبريهما فدله عليهما فذهب فدعا لهما وتمنى ان يعرف حالهما في الآخرة ، وقال ليت شعرى ما فعل ابواى " فنزلت .

کہ نبی کریم ﷺ نے جبریل سے اپنے والدین کی قبروں کے متعلق پوچھا،انہوں نے آپ کو ان کی قبروں کی راہنمائی کی، آپ گئے۔ان کے لئے دعاء کی۔آپ کو یہ تمنا لاحق ہوئی کہ میں ان کے اخروی حالات کے متعلق علم حاصل کروں۔تو آپ نے کہا" کاش مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ میرے ماں باپ سے کیا کیا گیا۔"تو یہ آیت نازل ہوئی۔

اس روایت کے مطابق بعض حضرات نے نبی کریم ﷺ کے والدین کا (معاذ اللہ) کفر ثابت کیا ہے۔کہ ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ" آپ جہنمیوں کے متعلق سوال نہ کریں۔"

لیکن علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے:

" لم يرد في هذا الا اثر معضل ضعيف الاسناد فلا يعول عليه "

کہ اس مسئلہ کے متعلق کوئی صحیح یا حسن روایت ثابت نہیں ،سوائے اس کے کہ معضل اور ضعیف الاسناد روایت ثابت ہے جس اعتبار کرنا ممکن نہیں۔ (از روح المعانی)

خیال رہے کہ "معضل" اسے کہا جاتا ہے جس کی سند سے دو یا دو سے زائد راوی ساقط ہوں۔

راقم نے ایک رسالہ لکھا ہے۔جس کا نام" تکریم والدین مصطفیٰ ﷺ ہے۔اس رسالہ میں آپ کے والدین کریمین کے ایمان کے متعلق بحث کی گئی۔اس رسالہ کو مکمل طور پر یہاں شامل کرنا ضروری ہے۔تا کہ طلباء کرام اس مقام پر بعض تفاسیر کے مطالعہ سے غلطی کے مرتکب نہ ہو۔

☆☆☆☆☆

﴿بسم الله الرحمٰن الرحيم﴾

الحمد لله الرزاق الماجد الباسط الراسع القادر . والصلوة على النبی الذی انتقل من الطاهرالی الطاهر ، وعلی آله واصحابه الذین اطاعوه فی الباطن والظاهر . اما بعد !

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾

﴿تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ﴾ (پ ۳ ع ۱)

یہ رسول ہیں کہ ہم نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر افضل کیا۔ ان میں کسی سے اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا، اور کوئی وہ ہے جسے سب پر درجوں بلند کیا۔

(کنز الایمان فی ترجمة القرآن . از امام احمد رضا خان محدث بریلوی)

اجمعت الامة علی ان بعض الانبیاء افضل من بعض وعلی ان محمدا ﷺ افضل من الکل

(تفسیر کبیر ج ۲ ص ۲۰۸ زیر آیت مذکورہ)

اجماع امت اس پر ہے کہ بعض انبیاء کرام بعض پر افضل ہیں او اس پر بھی اجماع امت ہے کہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام سے افضل ہمارے نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔

علامہ رازیؒ نے نبی کریم ﷺ کی افضلیت پر انیس دلائل قائم کئے۔ راقم نے اس پر ایک کا اضافہ کر کے اپنی کتاب ''تذکرة الانبیاء'' میں مکمل بیس دلائل نقل کئے ہیں۔ یہاں تبرکاً صرف ایک کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

قال الله تعالیٰ : ﴿وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ فلما کان رحمة لکل العالمین لزم أن یکون افضل من کل العالمین . (تفسیر کبیر جلد ۲ ص ۲۰۸)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی جب یہ ہے (ترجمہ) '' اور ہم نے تمہیں نہ بھیجا مگر رحمت سارے جہان کے لئے'' جب آپ کو تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا تو یقیناً آپ تمام جہان والوں سے افضل بھی ہیں۔ ''عالمین'' میں تمام انبیاء کرام بھی داخل ہیں۔ تو آپ ﷺ کا تمام انبیائے کرام پر افضل ہونا بھی یقینی ہے۔

افضل الانبیاء بزبان افضل الانبیاء:

عن ابن عباسؓ قال قال رسول اللہ ﷺ ..... انا اکرم الاولین والآخرین علی اللہ ولا فخر "جزء الحدیث" (ترمذی، دارمی، مشکوۃ، باب فضائل سید المرسلین ص ۵۱۳)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں اللہ تعالیٰ کے ہاں تمام اوّلین وآخرین سے زیادہ مکرم ہوں۔

یہ یقینی امر ہے جو سب سے زیادہ رب تعالیٰ کے نزدیک مکرم ہوگا وہ سب سے زیادہ افضل بھی ہوگا۔

"عن جابرؓ أن النبی ﷺ قال انا قائد المرسلین ولا فخر"

(دارمی، مشکوۃ باب فضائل سید المرسلین ص ۵۱۴)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "میں تمام رسولوں کا قائد ہوں گا، مجھے اس پر کوئی فخر نہیں" یعنی آخرت میں، میں سب سے مقدم ہوں گا۔

آپ ﷺ کا تمام انبیائے کرام پر مقدم ہونا اور تمام کا قائد ہونا آپ ﷺ کی افضلیت پر واضح طور پر دلالت کر رہا ہے۔ اس سے آپ ﷺ کا افضل الانبیاء ہونا روزِ روشن سے بھی زیادہ واضح ہوگیا۔

"عن ابی بن کعب عن النبی ﷺ قال اذا کان یوم القیامة کنت امام النبیین وخطیبهم وصاحب شفاعتهم غیر فخر" (ترمذی، مشکوۃ ص ۵۱۴)

حضرت ابی ابن کعبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "میں قیامت کے دن انبیائے کرام کا امام ہوں گا۔ میں ان کا خطیب ہوں گا، میں ان کا شفیع ہوں گا۔ مجھے اس پر کوئی فخر نہیں

"امام ہونا اور قائد ہونا" دونوں کا ایک ہی مقصد ہے، خطیب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ میں اس وقت رب کے حضور کلام کروں گا۔ جب تمام انبیائے کرام خاموش ہوں گے۔ اور میں "مقامِ محمود" میں سب کی شفاعت کروں گا۔ (مرقاۃ المفاتیح)

سبحان اللہ! میرے پیارے حبیب پاک علیہ الصلوۃ والسلام جب امام الانبیاء ہیں اور شفیع الانبیاء ہیں تو افضل الانبیاء کیوں نہ ہوں؟

"عن ابی هریرةؓ قال قال رسول اللہ ﷺ انا سید ولد آدم یوم القیامة"

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن مجھے تمام انسانوں پر سیادت

حاصل ہوگی۔

" السید " قال الهروی هو الذی یفوق قومه فی الخیر " نووی شرح مسلم

علامہ ہرویؒ نے فرمایا: '' سید'' وہ ہوتا ہے جو اپنی قوم پر بہتر ہونے میں فوقیت رکھتا ہو۔

جب میرے حبیب پاک ﷺ تمام انسانوں کے سردار ہیں تو یقیناً تمام سے فوقیت بھی رکھتے ہیں۔ یہی معنی ہے افضل ہونے کا۔

علامہ نوویؒ مزید تفصیل ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

" وقال غيره هو الذی يفزع اليه فی النوائب والشدائد فيقوم بامرهم ويتحمل عنهم مكارههم و يدفعها عنهم " نووی شرح مسلم

علامہ ہروی کے علاوہ دوسرے اہل علم نے '' سید'' کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ '' سید'' وہ ہوتا ہے جس کی طرف لوگ مصائب و آلام میں رجوع کریں اور وہ ان کے مصائب کو دور کرے۔

اس سے پتہ چلا کہ حضور ﷺ تمام لوگوں کے حاجت روا ہیں۔ جن میں انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیم بھی شامل ہیں۔ یقیناً وہ ذات جو دوسرے حضرات کی حاجت روا ہے وہ ان سے افضل ہے۔ اس طرح افضل الانبیاء ہونا واضح ہوا۔

تنبیہ: " قوله ﷺ يوم القيامة مع أنه سيدهم فی الدنيا والآخرة فسبب التقييد أن فی يوم القيامة يظهر سودده لكل احد ولا يبقى منازع ولا معاند " نووی

نبی کریم ﷺ نے اپنی سیادت قیامت کے دن ہونے کا ذکر فرمایا، حالانکہ آپ دنیا میں بھی تمام کے سردار ہیں اور آخرت میں بھی تمام کے سردار ہوں گے۔ قیامت کے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ قیامت کے دن آپ کی سیادت ہر ایک پر ظاہر ہوگی۔ اس دن کوئی جھگڑا کرنے والا، اور کوئی عناد رکھنے والا نہیں ہوگا۔

فقط اتنا سبب ہے انعقادِ بزمِ محشر کا
کہ ان کی شانِ محبوبی دکھائی جانیوالی ہے

نبی کریم ﷺ کا ارشاد بھی ایسے ہی ہے جس طرح رب ذوالجلال کا ارشادِ گرامی: لمن الملك اليوم ؟ آج کس کی بادشاہی ہے؟ یہ بھی قیامت کے دن ہی ذکر ہوگا، حالانکہ دنیا میں بھی رب ذوالجلال

ہی کی بادشاہی ہے۔ لیکن دنیا میں مختلف خطوں کے مختلف بادشاہ کہلانے والے بھی قیامت کے دن صرف رب تعالیٰ ہی کی بادشاہی کو مانیں گے، ایسے ہی دنیا میں نبی کریم ﷺ کے وسیلہ جلیلہ کے منکرین بھی قیامت کے دن آپ ﷺ کا وسیلہ ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ آپ کو حاجت روا ماننے کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہوگا۔

قول صحابی:

"عن ابن عباسؓ قال إن الله تعالیٰ فضل محمدا ﷺ علی الانبیاء وعلیٰ اهل السماء"

(مشکوۃ شریف باب فضائل سید المرسلین ص ۵۱۵)

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو تمام انبیائے کرام پر اور تمام آسمانوں والوں پر فضیلت دی ہے۔

یہاں تک بیان کردہ مختصر مضمون سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو "افضل الانبیاء" کہا؛ کیونکہ مفسرین کرام کا اس پر اجماع ہے کہ "ورفع بعضهم درجت" سے مراد حضور نبی کریم ﷺ ہی ہیں۔ اور نبی کریم ﷺ کے اپنے ارشادات گرامی سے بھی واضح ہوا کہ:

"آپ افضل الانبیاء، سید الانبیاء، امام الانبیاء اور اکرم الانبیاء ہیں"

اور حضرت ابن عباسؓ کے قول سے بھی پتہ چلا کہ آپ تمام آسمان والوں اور تمام انبیائے کرام سے افضل ہیں۔

مقام یوسف علیہ السلام بزبان سید الانبیاء:

"عن ابن عمرؓ قال قال رسول الله ﷺ الكريم ابن الكريم ابن الكريم ابن الكريم يوسف بن يعقوب بن اسحاق بن ابراهيم عليهم السلام"

(بخاری شریف، مشکوۃ شریف باب المفاخرة والعصبية ص ۴۱۷)

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کریم ابن کریم ابن کریم ابن کریم یوسف ابن یعقوب ابن اسحاق ابن ابراہیم علیہم السلام ہیں۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ یوسف علیہ السلام کو خاندانی منصب کی وجہ سے ہی یہ کمال حاصل ہوا۔ کہ آپ صاحب ایمان اور نبی، آپ کے والد گرامی صاحب ایمان اور نبی، اور آپ کے دادا

صاحب ایمان اور نبی، اور آپ کے پردادا صاحب ایمان اور نبی ہیں۔لہٰذا آپ علیہ السلام کو کریم ابن کریم ابن کریم ابن کریم ہونے کا شرف حاصل ہے۔

خاندانی عیب (گھٹیا کفو)

" واما فی العجم فتعتبر حریة واسلاما فمسلم بنفسه او معتق غیر کفء لمن ابوها مسلم او حر او معتق" (درمختار باب الکفاءۃ)

عجم میں کفو کا اعتبار حریت اور اسلام میں بھی ہے۔ جو شخص خود تو مسلمان ہے یا آزاد ہے وہ اس شخص کا کفو نہیں بن سکتا جس کا باپ بھی مسلمان ہے یا آزاد ہے خواہ وہ آزاد ہی آ رہا ہے، یا آزاد کیا گیا ہے۔

خیال رہے: اگرچہ عرب میں اسلام کا لحاظ کفو میں نہیں لیکن عجم میں ہے۔ جب نبی کریم ﷺ تمام عرب و عجم کے نبی ہیں تو یقیناً آپ کی شان کو اس طرح ماننا ضروری ہے کہ آپ ﷺ کو نہ عرب گھٹیا کہہ سکیں اور نہ عجم۔

اہل محبت کے لئے تو اتنا ہی لکھنا کافی ہے کہ:

"نبی کریم ﷺ افضل الانبیاء ہیں، اور یوسف علیہ السلام کریم ابن کریم ابن کریم ابن کریم ہیں۔ اور عجم کے نزدیک وہ شخص جس کا باپ کافر ہو وہ گھٹیا خاندان کا مالک ہے"

اگر یہ کہا جائے کہ نبی کریم ﷺ کے باپ.....معاذ اللہ.....کافر تھے تو آپ ﷺ کا یوسف علیہ السلام سے گھٹیا ہونا عجم کے نزدیک لازم آئے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص آپ ﷺ کی عیب جوئی کر سکے۔ آپ کو تمام عیوب سے پاک پیدا کیا گیا۔

خلقت مبرأ من کل عیب ☆ کانک قد خلقت کما تشاء

اگرچہ نہ ماننے والے کیلئے دلائل کے انبار بھی ناکافی ہیں، تاہم پھر بھی اپنی طرف سے کچھ دلائل پیش کرنے اس لئے ضروری ہیں کہ کم از کم سیدھے سادے، بھولے بھالے مسلمانوں کو منافقانہ چالبازیوں کے ساتھ راہِ حق سے بھٹکایا نہ جا سکے۔

ایمانِ والدینِ کریمین کے متعلق مسالک

اہل علم کا پہلا مسلک:

ایک مسلک یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے والدین زمانہ فترت میں تھے۔ اس وقت ''بت پرست نہ ہونا، مشرک نہ ہونا'' ہی نجات کے لئے کافی ہے۔ وہ بت پرست نہ تھے لہذا جنتی ہیں۔

" المسلک الاول : انهما ماتا قبل البعثة ولا تعذيب قبلها لقوله تعالىٰ " وما كنا معذبين حتى نبعث رسولاً "

نبی کریم ﷺ کے والدین کریمین آپ کی بعثت سے پہلے فوت ہو گئے اور ''زمانہ فترت'' میں فوت ہونے والوں کو عذاب نہیں ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (ترجمہ) اور ہم عذاب دینے والے نہیں جب تک ہم رسول نہ بھیج لیں۔

علمائے علم کلام وعلم اصول میں سے اشاعرہ اور فقہائے کرام میں سے شوافع کا اس مسئلہ میں اجماع ہے کہ '' جسے دعوت اسلام نہ ملے وہ فوت ہو جائے تو وہ نجات پائے گا۔ اور دعوتِ اسلام سے پہلے کسی کو قتل کرنا باعثِ لزومِ دیت وکفارہ ہے ''۔

شیخ الاسلام شریف الدین مناوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے نبی کریم ﷺ کے والد مکرم کے متعلق سوال کیا۔ کیا وہ آگ میں جائیں گے؟ تو آپ نے سائل پر شدید غصہ کا اظہار کیا۔ سائل نے کہا کیا ان کا اسلام ثابت ہے؟ تو انہوں نے فرمایا!

" انه مات في الفترة ولا تعذيب قبل البعثة "

بیشک وہ زمانہ فترت میں فوت ہوئے اور بعثت سے پہلے فوت ہونے والوں کو عذاب نہیں ہوگا۔

دوسرا مسلک: آپ ﷺ کے والدین کریمین مومن تھے۔ کفر وشرک سے پاک تھے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو ماننے والے تھے۔ اور دین ابراہیمی پر قائم تھے، اگرچہ تفصیلی طور پر شریعت مصطفیٰ ﷺ کا نزول بعد میں ہوا لیکن اس کے اصول بھی دین ابراہیمی پر قائم ہیں، لہذا دین ابراہیمی پر قائم رہنے کی وجہ سے وہ جنتی ہیں۔ راقم کا بھی یہی مسلک ہے۔

تیسرا مسلک: نبی کریم ﷺ نے اپنے والدین کو زندہ کر کے ایمان کی دولت سے مالا مال کیا۔

چوتھا مسلک: نبی کریم ﷺ کے والدین......العیاذ باللہ......کافر و مشرک تھے۔

اس آخری مسلک والے کچھ احادیث کو نہ سمجھنے کی وجہ سے غلطی کا شکار ہوئے، جن کی تفصیل ان شاء اللہ بعد میں ذکر کی جائے گی۔

مسلک اول کے شواہد: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جب زندہ آسمانوں پر اٹھا لیا گیا۔ انجیل میں بھی تحریف کر دی گئی۔ اس وقت سے لیکر نبی کریم ﷺ کی بعثت تک کوئی اور شریعت نہیں آئی۔ اس دوران صرف بت پرستی سے دور رہنا ہی نجات کیلئے کافی تھا۔ یہ درمیانی زمانہ "فترۃ" کا زمانہ کہلاتا ہے۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہی مضمون دوسری آیات کریمہ سے بھی ثابت ہے۔

☆ ﴿ ذٰلِکَ اَنْ لَّمْ یَکُنْ رَّبُّکَ مُهْلِکَ الْقُرٰی بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ﴾ (انعام آیت ۱۳۱)

یہ اس لئے کہ تیرا رب بستیوں کو ظلم سے تباہ نہیں کرتا، کہ ان کے لوگ بے خبر ہوں۔

☆ ﴿ وَلَوْلَآ اَنْ تُصِیْبَهُمْ مُّصِیْبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ فَیَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَیْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰیٰتِکَ وَنَکُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴾؟ (القصص آیت ۴۷)

اور اگر نہ ہوتا کہ کبھی پہنچتی انہیں کوئی مصیبت اس کے سبب جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا تو کہتے: اے ہمارے رب تو نے کیوں نہ بھیجا ہماری طرف کوئی رسول کہ ہم تیری آیتوں کی پیروی کرتے اور ایمان لاتے۔

☆ ﴿ وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَکْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَیْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰیٰتِکَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰی ﴾ (طٰہٰ، آیت ۱۳۴)

اور اگر ہم انہیں کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے رسول کے آنے سے پہلے، تو ضرور کہتے: اے ہمارے رب تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم تیری آیتوں پر چلتے قبل اس کے کہ ذلیل و رسوا ہوتے۔

☆ ﴿ وَمَا کَانَ رَبُّکَ مُهْلِکَ الْقُرٰی حَتّٰی یَبْعَثَ فِیْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا یَّتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِنَا ﴾

ترجمہ: اور تمہارا رب شہروں کو ہلاک نہیں کرتا جب تک ان کے اصل مرجع میں رسول نہ بھیجے، جو ان پر ہماری آیتیں پڑھے۔ (القصص آیت ۵۹)

☆ ﴿وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ☆ اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۖ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ﴾ (انعام آیت ۱۵۵، ۱۵۶)

اور یہ برکت والی کتاب ہم نے اتاری تو اس کی پیروی کرو۔ اور پرہیز گاری کرو کہ تم پر رحم ہو، کبھی کہو (یعنی تا کہ تم یہ نہ کہہ سکو) کہ کتاب تو ہم سے پہلے دو گروہوں پر اتری تھی اور ہمیں اس کے پڑھنے پڑھانے کی کچھ خبر نہ تھی۔

☆ ﴿وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ☆ ذِكْرٰى ۛ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ﴾

(الشعراء آیت ۲۰۸ / ۲۰۹)

اور ہم نے کوئی بستی ہلاک نہ کی جسے ڈرسنانے والے نہ ہوں، نصیحت کیلئے۔ اور ہم ظلم نہیں کرتے۔

☆ ﴿وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا ۚ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ۗ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ ۖ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ﴾ (فاطر، آیت ۳۷)

وہ اس (جہنم کی آگ) میں چلاتے ہوں گے: اے ہمارے رب ہمیں نکال کہ ہم اچھا کام کریں، اس کے خلاف جو پہلے کرتے تھے۔ (جواب دیا جائے گا) اور کیا ہم نے تمہیں وہ عمر نہ دی تھی جس میں سمجھ لیتا جس نے سمجھنا ہوتا۔ اور ڈرسنانے والا تمہارے پاس تشریف لایا تھا۔ تو اب چکھو (جہنم کی آگ کا مزہ) کہ ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

انبیاء کرام کی بعثت اور دعوت اسلام کے بغیر کسی کو عذاب نہیں دیا جائے گا، اسی مضمون پر علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے سات احادیث پیش کی ہیں ان میں ایک یہ ہے!

☆ " اخرج عبد الرزاق وابن جرير وابن المنذر وابن ابی حاتم عن ابی هريرة قال اذا كان يوم القيامة جمع الله اهل الفترة والمعتوه والاصم والابكم والشيوخ الذين لم يدركوا الاسلام ثم ارسل اليهم رسولا ان ادخلوا النار فيقولون كيف لم تأتنا رسل قال وايم الله لو دخلوها وكانت عليهم بردا وسلاما ثم يرسل اليهم فيطيعه من كان يريد ان يطيعه قال ابوهريرة اقرأوا ان شئتم "وما كنا معذبين حتى نبعث رسولا" اسناده صحيح على شرط الشيخين ومثله لا يقال من قبل الرأى فله حكم الرفع " (الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۰۴)

حضرت ابو ہریرۃ ﷺ سے مروی ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اصحاب فترت، نیم پاگل،

گونگے، بہرے اور بوڑھے جنہوں نے اسلام کو نہیں پایا ان لوگوں کے پاس فرشتوں کو بھیجے گا کہ ان کو آگ میں داخل کر دیا جائے۔ تو وہ کہیں گے۔ اے اللہ تعالیٰ کیسے ہمیں آگ میں بھیجا جا رہا ہے۔ ہمارے پاس تو کوئی رسول نہیں آیا تھا۔ راوی کہتے ہیں قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اگر ان کو آگ میں بھیج دیا جاتا تو ان پر آگ ٹھنڈی اور سلامتی میں ہو جاتی۔ تو اس وقت ان کے پاس رسول کو بھیجا جائے گا۔ جن کی قسمت میں ہوگا وہ ایمان لے آئیں گے۔ حضرت ابو ہریرۃ نے اس پر دلیل پیش کرتے ہوئے کہا کہ اگر تم چاہتے ہو تو ''وما کنا معذبین حتی نبعث رسولا'' کی آیت پڑھو۔

یعنی ہم عذاب دینے والے نہیں جب تک ہم رسول نہ بھیجیں۔

علامہ سیوطیؒ سند پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ اس حدیث کی سند بخاری و مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح ہے اور یہ حدیث رائے کے مطابق بھی نہیں اس لئے یہ مرفوع حدیث کے حکم میں ہے۔

(الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۰۵)

''وقال الامام فخر الدین الرازی فی المحصول شکر المنعم لا یجب عقلا خلافا للمعتزلة''۔

علامہ فخر الدین رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی کتاب محصول میں ذکر کیا ''منعم ذات'' یعنی اللہ تعالیٰ جس کے ان گنت انعام ہیں ان کا شکر یہ ادا کرنا عقلاً لازم نہیں (بلکہ بعثت رسول ضروری ہے) قاضی تاج الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مختصر ابن الحاجب میں مسئلہء شکر منعم کے ضمن میں کہا کہ اس سے یہ مسئلہ بھی ثابت ہوتا ہے!

" من لم تبلغه الدعوة فعندنا یموت ناجیا ولا یقاتل حتی یدعی الی الاسلام وهو مضمون بالکفارة والدیة ولا یجب القصاص علی قاتله علی الصحیح "

جس کے پاس دعوت اسلام نہ پہنچے اس کی موت حالت نجات پر ہوگی۔ اسے اس وقت تک قتل نہیں کیا جائے گا جب تک اسے دعوت اسلام نہ پہنچے۔ اگر کسی نے قتل کر دیا تو اس پر دیت و کفارہ کی ذمہ داری لازم ہوگی۔ اگرچہ قصاص لازم نہیں ہوگا۔ (الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۰۶)

تنبیہ: " هذا الحکم خاص بمن لم تبلغه دعوة نبی اصلا . اما من بلغه منهم دعوة احد من الانبیاء السابقین ثم اصر علی کفره فهو فی النار قطعا وهذا لانزاع فیه " (الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۰۶)

یہ حکم ان لوگوں کے لئے خاص ہے جن کے پاس کسی نبی کی طرف سے کوئی دعوت اسلام نہ پہنچی ہو، لیکن وہ لوگ جن کے پاس دعوت اسلام پہنچی اور انہوں نے اسے نہ قبول کیا بلکہ وہ کفر پر ہی قائم رہے وہ جہنمی ہوں گے اس پر اہل علم کا اتفاق ہے۔

نبی کریم ﷺ کے والدین کریمین کو نہ تو پہلے انبیائے کرام علیہم السلام کی دعوت پہنچی اور نہ ہی حضور نبی کریم ﷺ کی دعوت پہنچی؛ کیونکہ حضرت عیسیٰؑ اور نبی کریم ﷺ کے درمیان تقریباً چھ سو سال کا زمانہ پایا گیا، اس وقت روئے زمین پر مشرق و مغرب، شمال وجنوب میں جہالت کا دور دورہ تھا۔ صرف چند لوگ اہل کتاب کے اہل علم ملکِ شام میں تھے۔ ان کو بھی حضور ﷺ کے والدین کریمین نہ پا سکے؛ کیونکہ حضرت عبداللہؓ جوانی میں ہی تقریباً اٹھارہ سال کی عمر میں وفات پا گئے۔

اور انہوں نے حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا زمانہ بعثت بھی نہ پایا؛ کیونکہ حضرت عبداللہؓ نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت سے پہلے ہی فوت ہو گئے۔ اور حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا، نبی کریم ﷺ کی چھ سال کی عمر میں وفات پا گئیں۔ (الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۰۷)

اہل علم کا دوسرا مسلک: نبی کریم ﷺ کے والدین سے شرک ثابت نہیں بلکہ وہ ابراہیم علیہ السلام کے دین حنیف پر قائم تھے۔ جس طرح عرب کے کئی اور لوگ بھی دین ابراہیمی پر قائم تھے۔ جیسے زید بن عمرو بن نفیل، ورقہ بن نوفل وغیرہ۔ اس مسلک پر بہت سے اہل علم ہیں۔ جن میں علامہ فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔ آپ نے اپنی کتاب اسرار التنزیل میں بیان کیا ہے۔

" ان آزر لم یکن والد ابراھیم بل کان عمه "

بے شک "آزر" حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ نہیں تھا بلکہ چچا تھا۔

اس پر اہل علم کے بہت دلائل ہیں

" ان آباء الانبیاء ماکانوا کفارا "

بیشک انبیاء کرام میں سے کسی نبی کے آباء کافر نہیں تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی! ﴿ اَلَّذِیْ یَرٰىکَ حِیْنَ تَقُوْمُ وَتَقَلُّبَکَ فِی السّٰجِدِیْنَ ﴾ (سورہ شعراء ۲۱۸، ۲۱۹)

جو تمہیں دیکھتا ہے جب تم کھڑے ہوتے ہو اور دورے کرتے ہوئے سجدہ کرنے والوں میں

" قیل معناه انه کان ینتقل نوره من ساجد الی ساجد وبهذا التقدیر فالآیة دالة علی ان جمیع آباء محمد ﷺ کانوا مسلمین وحینئذ یجب القطع بأن والد ابراهیم ما کان من الکافرین انما ذاک عمه "

آیت کریمہ کا معنی یہ ہوگا کہ آپ کا نور سجدہ کرنے والوں سے سجدہ کرنے والوں کی طرف منتقل ہوتا رہا۔ لہٰذا آیت کریمہ اس پر دلالت کر رہی ہے۔ کہ نبی کریم ﷺ کے آباء و اجداد میں کوئی بھی کافر نہ تھا۔ یہاں سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ ابراہیم علیہ السلام کے باپ کافر نہ تھے، اور آزر آپ کا چچا تھا، باپ نہ تھا

(الحاوی للفتاوی ج ۲، ص ۲۰۲ تا ۲۱۰)

نبی کریم ﷺ کے آباء و اجداد کے مشرک نہ ہونے پر خود نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی!

" ولم ازل انقل من اصلاب الطاهرین الی ارحام الطاهرات وقال تعالی: ﴿انما المشرکون نجس﴾ فوجب ان لا یکون احد من اجداده مشرکا "

حضور ﷺ نے فرمایا میں ہمیشہ پاک پشتوں سے پاک رحموں میں منتقل ہوتا رہا، مشرک کبھی پاک نہیں ہوسکتے۔ اسلئے کہ ان کو خود رب تعالیٰ نے نجس (ناپاک) کہا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ نبی کریم ﷺ کے آباء و اجداد میں سے کوئی بھی مشرک نہ ہو۔ ورنہ حضور کا اپنا ارشاد گرامی ہی غلط ثابت ہوگا۔

(از الحاوی للفتاوی ج ۲، ص ۲۱۰)

اعتراض: حدیث شریف میں طاہر نسلوں سے منتقل ہونے کا مطلب تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ کے آباء و اجداد بدکاری سے پاک ہوں، اس سے شرک سے پاک ہونا ثابت نہیں ہوسکتا۔

جواب! "وتخصیص الطهارة بالطهارة من السفاح لا دلیل له یعول علیه، والعبرة لعموم اللفظ لا لخصوص السبب " (روح المعانی زیر آیت واذ قال ابراهیم لابیه آزر الخ پ ۷)

حدیث شریف میں مذکورہ طہارت کو صرف بدکاری سے طاہر ہونے کے ساتھ خاص کرنے پر کوئی دلیل نہیں پائی گئی جس پر اعتبار کیا جا سکے، اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے۔ خصوص اسباب کا نہیں۔

"آزر" حضرت ابراہیمؑ کا چچا تھا!

" ان آزر اسم لعم ابراهیم علیه السلام وجاء اطلاق الاب علی العم فی " قوله تعالیٰ:

﴿اَم کُنتُم شُھَدَآءَ اِذ حَضَرَ یَعقُوبَ المَوتُ اِذ قَالَ لِبَنِیہِ مَا تَعبُدُونَ مِن بَعدِی قَالُوا نَعبُدُ اِلٰھَکَ وَاِلٰہَ اٰبَآئِکَ اِبرٰھٖمَ وَاِسمٰعِیلَ وَاِسحٰقَ﴾ وفیہ اطلاق الاب علی الجد ایضاً "۔

(روح المعانی زیر آیت مذکورہ بالا)

بے شک ''آزر'' حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چچا کا نام ہے۔لفظ ''اب'' کا اطلاق چچا اور دادا پر اس آیت کریمہ میں آیا ہوا ہے۔'' ام کنتم شهداء ...... الآیۃ '' ترجمہ: کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کو موت آئی جب کہ اس نے اپنے بیٹوں سے فرمایا: میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ بولے: ہم عبادت کریں گے اس کی جو آپ کا خدا ہے اور آپ کے آباء ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق کا، ایک خدا۔ اور ہم اس کے حضور گردن رکھے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں لفظ ''آباء'' استعمال ہوا ہے جو ''اب'' کی جمع ہے۔ لفظ ''اب'' کا اطلاق یعقوبؑ کے باپ حضرت اسحاقؑ پر اور آپ کے چچا (تایا) حضرت اسماعیلؑ پر اور آپ کے دادا حضرت ابراہیم پر ہوا۔

واضح ہوا کہ لفظ ''اب'' کا حقیقی معنی باپ ہے لیکن مجازی معنی کے لحاظ سے چچا اور دادا پر بولا جاتا ہے۔ بلکہ ماموں، نانا، سسر، استاذ کو بھی مجازاً ''اب'' (باپ) کہا جا سکتا ہے۔

اسی طرح حضور نے اپنے چچا حضرت عباس کے متعلق لفظ ''اب'' استعمال کیا۔'' ردوا علی ابی عباس '' فرمایا: مجھ پر میرے باپ (چچا) عباس کو لوٹاؤ!

وعن محمد بن كعب القرظی الخال والد والعم والد وتلا هذه الآیة ﴿ وإذقال ابراهیم لابیه الآیۃ﴾ (روح المعانی ج ۳ جزء ۷ ص ۱۹۵)

محمد بن کعب قرظیؒ نے فرمایا: ماموں کو بھی باپ کہہ لیا جاتا ہے اور چچا کو بھی باپ کہہ لیا جاتا ہے۔ اور یہ آیت کریمہ ﴿ وَاِذقَالَ اِبرٰھِیمُ لِاَبِیہِ اٰزَرَ﴾ کی تلاوت کی۔

آزر کو چچا کہنے والوں کی شاندار دلیل:

" اخرجه ابن المنذر فی تفسیره بسند صحیح عن سلیمان بن صرد قال لما ارادوا أن یلقوا ابراهیم علیه السلام فی النار جعلوا یجمعون الحطب حتی أن كانت

العجوز لتجمع الحطب فلما تحقق ذلک قال " حسبی الله تعالی ونعم الوکیل " فلما القوه قال الله تعالی : ﴿ يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَّ سَلَامًا عَلَى اِبْرَاهِيمَ ﴾ فکانت . فقال عمه من اجلی دفع عنه فارسل الله شرارة من النار فوقعت علی قدمه فاحرقته "

(روح المعانی جلد ۴ جز ۔ ص ۹۵)

ابن منذرؒ نے اپنی تفسیر میں سند صحیح سے سلیمان بن صرد سے روایت ذکر کی ہے کہ جب کفار نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالنے کا ارادہ کیا تو وہ جلانے کیلئے لکڑیاں جمع کرنے لگے۔ یہاں تک کہ کوئی بڑھیا عورت بھی ہوتی تو وہ بھی لکڑیاں جمع کرتی۔ جب آگ جلانے کا معاملہ مکمل ہو گیا تو ابراہیم علیہ السلام نے پڑھا "حسبی الله تعالی و نعم الوکیل" (مجھے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے) جب انہوں نے آپ کو آگ میں ڈال دیا تو اللہ تعالیٰ نے آگ کو حکم دیا: (ترجمہ) "اے آگ ہو جا ٹھنڈی اور سلامتی والی ابراہیم پر" آگ جب آپ پر ٹھنڈی اور باسلامت ہوگئی تو آپ کے چچا نے کہا: "یہ میری وجہ سے ابراہیم پر ٹھنڈی ہوئی ہے" تو اللہ تعالیٰ نے اس پر آگ کی ایک چنگاری بھیجی جو اس کے قدموں پر گری اور اس نے اسے جلا دیا۔

اس روایت میں واضح طور پر لفظ "عمہ" استعمال ہوا ہے جس کا معنی ہی "اس کا چچا" ہے۔

" اخرج محمد بن کعب وقتادة ومجاهد والحسن وغیرهم ان ابراهیم علیه السلام لم یزل یستغفر لابیه حتی مات فلما مات تبین له انه عدو لله فلم یستغفر له ثم هاجر بعد موته وواقعة النار الی الشام ثم دخل مصر واتفق له مع الجبار ما اتفق ثم رجع الی الشام ومعه هاجرة ثم امر الله تعالیٰ ان ینقلها وولدها اسمعیل الی مکة فنقلهما ودعا هناک فقال " ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم " (الی قوله) " رب اغفرلی ولوالدی وللمؤمنین یوم یقوم الحساب "

(روح المعانی زیر آیت مذکورہ)

محمد بن کعب قتادہ، مجاہد اور حسن وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ بے شک ابراہیم علیہ السلام اپنے "اب" کے لئے استغفار کرتے رہے جب آپ پر اس (آزر) کا کفر ظاہر ہوا۔ یعنی جب آپ نے سمجھ لیا کہ یہ کفر کو چھوڑنے والا نہیں تو آپ نے اس اللہ کے دشمن کے لئے استغفار کرنی چھوڑ دی۔ پھر آپ نے اس کی موت اور آگ کے واقعہ کے بعد شام کی طرف ہجرت کی۔ آپ کے ساتھ آپ کی زوجہ "ہاجرہ" بھی تھیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ ھاجرہ اور اسماعیل کو مکہ میں چھوڑ آؤ۔ آپ نے اپنی

زوجہ اور اپنے بیٹے کو مکہ کی سرزمین میں چھوڑ کر دعاء کی۔

''ربنا انی اسکنت ......الآیۃ'' اس دعا میں'' ربنا اغفرلی ولوالدی'' بھی کہا (اے اللہ میری اور میرے والدین کی مغفرت فرما)

" فانه یستنبط من ذلک ان المذکور فی القرآن هو عمه حیث صرح فی الأثر الأول ان الذی هلک قبل الهجرة هو عمه ودل الأثر الثانی علی ان الاستغفار لوالدیه کان بعد هلاک ابیه بمدة مدیدة فلو کان الهالک هو ابوه الحقیقی لم یصح منه علیه السلام هذا الاستغفار له اصلا" . (روح المعانی زیر آیت مذکورہ)

واضح ہوا کہ آپ کا وہ باپ جس کا قرآن پاک میں کافر ہونا مذکور ہے وہ چچا ہے۔ چچا کو بھی باپ کہہ لیا جاتا ہے۔ اور وہ بھی آپ کی ہجرت سے پہلے آگ کے واقعہ کے وقت ہلاک ہو گیا۔ اس وقت ابراہیم علیہ السلام کی عمر تقریبا بیالیس سال تھی۔ یہ بات پہلی حدیث مبارکہ (جو ابن منذر سے سلیمان بن صرد سے روایت کی ہے) سے سمجھ میں آئی۔ اور دوسری حدیث مبارکہ (محمد بن کعب کی روایت کردہ) سے واضح ہوا کہ آپ نے جب ہجرت کی تو راستہ میں ظالم بادشاہ کا واقعہ درپیش آیا۔ آپ شام میں گئے پھر فلسطین میں۔ نوے (۹۰) سال کی عمر میں آپ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کو مکہ میں چھوڑا۔ اس وقت آپ نے اپنے والدین کیلئے دعاء کی'' ربنا اغفر لی ولوالدی'' اے ہمارے رب میری اور میرے والدین کی مغفرت فرما۔

واضح ہوا کہ آپ نے چچا کیلئے دعاء چھوڑ دی تھی اور وہ ہلاک بھی ہو گیا تھا۔ لیکن آپ اپنے والدین کیلئے بہت عرصہ بعد بھی دعاء کرتے رہے۔

نبی کریم ﷺ والدین کریمین کے ایمان پر دلالت کرنے والی احادیث

" عن ابی هریرة قال ، قال رسول الله ﷺ بعثت من خیر قرون بنی آدم فقرنا حتی بعثت عن القرن الذی کنت فیه" . (بخاری الحاوی للفتاوی ج۲ ص ۲۱۰)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں آدم علیہ السلام سے لیکر بہتر خاندانوں میں منتقل ہوتا آرہا ہوں یہاں تک اب جس خاندان میں میں ہوں۔

یقینی بات ہے کہ کافر کو ''خیر'' سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا وہ تو ''شر'' کا مصداق ہے۔ جب آپ نے اپنے تمام آباء واجداد کو خیر کہا ہے تو وہ تمام شرک سے پاک تھے۔

عن انس ان النبی ﷺ قال " ما افترق الناس فرقتین الا جعلنی اللہ فی خیرھما فاخرجت من بین ابویَّ فلم یصبنی شی من عھد الجاھلیۃ " (بیہقی دلائل النبوۃ، الحاوی للفتاوی ج۲ ص ۲۱۰)

جب بھی لوگوں کے دو فرقے بنے تو اللہ تعالیٰ نے مجھے بہتر فرقہ میں رکھا یہاں تک کہ میں اپنے والدین سے دنیا میں آیا، مجھے زمانہ جاہلیت کی کسی برائی نے مس نہیں کیا (چھوا نہیں)۔

حدیث پاک سے واضح ہوا کہ حضور ﷺ ہمیشہ بہتر فرقہ میں تشریف لاتے رہے۔ بہتر فرقہ وہی ہو سکتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو مانتا ہو۔ کافر کبھی بہتر نہیں ہو سکتے۔ اور جب نبی کریم ﷺ کو زمانہ جاہلیت کی کسی برائی نے بھی نہیں مس کیا تو کفر وشرک کیسے آپ کے والدین میں ثابت کیا جا سکتا ہے۔

" عن ابن عباس قال قال رسول اللہ ﷺ لم یزل اللہ ینقلنی من الاصلاب الطیبۃ الی الارحام الطاھرۃ مصفی مھذ با لاتنشعب شعبتان الا کنت فی خیرھما "۔

(ابو نعیم دلائل النبوۃ، الحاوی للفتاوی ج۲ ص ۲۱۱)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہمیشہ مجھے پاک پشتوں سے پاک رحموں کی طرف منتقل کیا گیا۔ صاف مہذب خاندانوں میں منتقل ہوتا رہا۔ جب بھی دو فرقے بنے مجھے بہتر فرقہ میں رکھا گیا۔

اس حدیث پاک میں طہارت، صفائی، تہذیب، خیر کے الفاظ استعمال ہوئے کافر کبھی ان اوصاف کے مالک نہیں ہو سکتے۔

" عن واثلہ بن الاصقع قال قال رسول اللہ ﷺ ان اللہ اصطفی من ولد ابراھیم اسمعیل واصطفی من ولد اسمعیل بنی کنانۃ واصطفی من بنی کنانۃ قریشا واصطفی من قریش بنی ھاشم واصطفانی من بنی ھاشم " . (مسلم، الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۱۱)

واثلہ بن اصقع سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے اسماعیل علیہ السلام کو برگزیدہ بنایا، اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے کنانہ کو برگزیدہ بنایا اور کنانہ کی اولاد سے قریش کو برگزیدہ بنایا اور قریش سے بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم سے مجھے۔

واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ کے آباء واجداد وہی تھے جو رب تعالیٰ کو پسند تھے!

"عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ والله ما افترق فرقتان منذ خلق الله آدم الا كنت في خيرهما" (طبقات ابن سعد، الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۱۱)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی آدم علیہ السلام کی پیدائش سے لے کر جب بھی دو فرقے بنے تو میں ان میں سے بہتر میں رہا۔

رسول اللہ ﷺ قسم اٹھا کر ارشاد فرما رہے ہے کہ آدم علیہ السلام سے لیکر میرے والد تک میرے آباء و اجداد میں سے ہر شخص بہتر تھا، اب اس کے بعد بھی کوئی کافر مانے تو وہ اپنی قسمت پر روئے۔

تیسرا مسلک: نبی کریم ﷺ کے والدین کریمین کے متعلق تیسرا مسلک یہ ہے کہ آپ ﷺ نے والدین کو زندہ کیا۔ اور انہوں نے آپ پر ایمان لایا۔ اگر چہ اس مسلک والوں نے بھی ایک حدیث پیش کی ہے لیکن وہ ضعیف ہے۔ اسی لئے راقم الحروف کے نزدیک دوسرا مسلک ہی قوی ہے۔

"عن عائشة ؓ ان رسول الله ﷺ سئل ربه ان يحي ابويه فاحياهما له فآمنا به ثم اماتهما" (الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۳۰)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: بے شک رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب سے سوال کیا کہ میرے والدین کو زندگی عطا فرما! تو اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ کیا اور انہوں نے آپ پر ایمان لایا، پھر ان کو فوت کر دیا گیا۔

چوتھا مسلک: جیسا کہ ابتداء میں ذکر کیا گیا ہے کہ حضور ﷺ کے والدین کے متعلق چوتھا مسلک یہ ہے کہ وہ (اس مسلک کے پیروکار) انہیں (والدین کریمین) .... العیاذ باللہ .... کافر و مشرک مانتے ہیں۔

ان لوگوں کی غلطی کی وجہ کچھ احادیث اور قرآن پاک کی ایک آیت کریمہ ہے۔ دراصل ان کو سمجھنے میں غلطی لگی ہے۔

درج ذیل میں ان لوگوں کے "مذہب" کو "اعتراض" کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے اور ان کا "رد" جواب کی صورت میں۔

﴿والله يهدى من يشاء الى صراط مستقيم﴾

اعتراض: قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَاتُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴾ جہنم والوں کے متعلق آپ سے نہیں پوچھا جائے گا۔

اس آیت کریمہ کا شان نزول یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا: ''لیت شعری ما فعل ابوای'' کاش کہ مجھے معلوم ہوتا کہ میرے والدین سے کیا کیا گیا۔ تو اس وقت یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی۔

جواب: ''لم يخرج في شيء من كتب الحديث المعتمدة، وإنما ذكر في بعض التفاسير بسند منقطع لا يحتج به ولا يعول عليه'' (الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۲۲)

احادیث کی معتبر کتابوں میں اس روایت کا نام و نشان تک نہیں پایا گیا بعض تفاسیر نے منقطع سند سے بیان کیا ہے، جسے حجت نہیں بنایا جا سکتا اور نہ ہی اس پر کوئی اعتبار ہے۔

علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں اگر اس طرح کی کمزور روایات کو تسلیم کیا جائے تو ہم اس کے جواب میں ایک کمزور روایت پیش کر دیں گے۔ اس طرح ''معارضة الواهي بالواهي'' (کمزور کا معارضہ کمزور سے) ہو جائے گا۔ وہ کمزور روایت یہ ہے:

''هبط جبريل علي فقال إن الله يقرئك السلام ويقول إني حرمت النار على صلب انزلك وبطن حملك وحجر كفلك'' (الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۲۴)

حضرت علی سے مرفوع روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میرے پاس جبریل آئے تو انہوں نے کہا بے شک اللہ تعالیٰ آپ کو سلام کہتا ہے، اور یہ کہہ رہا ہے کہ بے شک میں نے آگ حرام کر دی ہے ان پشتوں پر جن سے آپ منتقل ہو کر آئے، اور ان رحموں (بچہ دانیوں) پر جن میں آپ رہے۔ اور ان گودوں پر جن میں آپ نے پرورش پائی۔

علامہ سیوطیؒ اس روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''إنا لا نرى ذلك ولا نحتج به'' بے شک ہم اس قسم کی کمزور روایات کا سہارا نہیں لیتے اور نہ ہی ان کو بطور حجت پیش کرتے ہیں۔ بلکہ بفضلہ تعالیٰ صحیح روایات کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔

علامہ سیوطی کی اس بحث سے واضح ہو گیا کی آیت کریمہ کے شان نزول کے لحاظ سے جو اعتراض کیا گیا وہ ایک ضعیف اور منقطع سند پر موقوف ہے۔ اس قسم کی روایت سے کسی کا گناہگار ہونا بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا تو کفر و شرک کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے۔

آیت کریمہ کا شانِ نزول: (سند صحیح سے)

" اخرج عبد بن حميد والفريابی وابن جرير وابن المنذر فی تفاسيرهم عن مجاهد قال من اول البقرة أربع آيات في نعت المؤمنين و ثلاث عشرة فی نعت المنافقين ومن أربعين آية إلى عشرين ومائة فی بنی اسرائيل ، اسناده صحيح ومما يؤكد ذلک أن السورة مدنية واكثر ما خوطب فيها اليهود " (الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۲۴)

عبد بن حمید اور فریابی اور ابن جریر اور ابن منذر نے اپنی تفاسیر میں مجاہد سے روایت بیان کی ہے کہ سورہ بقرہ کی پہلی چار آیتیں مومنین کی شان میں نازل ہوئیں اور تیرہ آیات منافقین کے متعلق نازل ہوئیں۔ اور آیت نمبر چالیس سے لیکر آیت نمبر ایک سو بیس تک بنی اسرائیل کے حق میں نازل ہوئیں اس روایت کی سند صحیح ہے اور خاص کر کے یہ بات بھی واضح ہے کہ یہ سورۃ مدنی ہے مدینہ طیبہ میں زیادہ طور پر خطاب یہود کو ہی ہوا۔

آیت کریمہ کا سیاق وسباق (یعنی اس سے پہلے والی آیات اور بعد والی) بھی اسی پر دلالت کر رہا ہے کہ یہ آیت کریمہ بھی بنی اسرائیل کے متعلق ہی ہے۔

واضح ہوا کہ اس آیت کے شان نزول سے نبی کریم ﷺ کے والدین کریمین کا کفر وشرک نہیں ثابت کیا جا سکتا۔

اعتراض: مستدرک حاکم میں ایک روایت مذکور ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ملیکہ کے دو بیٹوں کو کہا" امكما فی النار "تمہاری ماں آگ میں ہے جب آپ کا یہ ارشاد ان پر شاق گذرا تو آپ نے ان کو بلایا اور ارشاد فرمایا" ان امی مع امكما فی النار "بے شک میری ماں بھی تمہاری ماں کے ساتھ آگ میں ہے اس حدیث کی سند کو بھی مستدرک میں صحیح قرار دیا گیا ہے جب اس حدیث سے رسول اللہ ﷺ کی والدہ کا جہنمی ہونا ثابت ہے تو تم کس طرح جنتی ہونا اور حالت ایمان پر ہونا ثابت کرتے ہو؟

جواب: مستدرک میں احادیث کو صحیح کہنے میں بہت جگہ تساہل (آسان طلبی، عدم تحقیق) واقع ہے" وقد تقرر فی علوم الحديث إنه لا يقبل تفرده بالتصحيح "علوم حدیث میں یہ

بات واضح ہے کہ مستدرک میں جن احادیث کو صحیح کہا گیا ہے اگر ان کی تائید میں اور حدیث سند صحیح سے مل جائے تو اسے صحیح قرار دیا جائے گا ورنہ ان کے صحیح کہنے کو بلا چون و چرا صحیح تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

پھر یہی حدیث جب ذہبی رحمہ اللہ نے ''مختصر المستدرک'' میں نقل کی اور حاکم کا قول نقل کیا "انہ صحیح" کہ یہ صحیح حدیث ہے تو اس کا ذہبی نے مؤاخذہ کرتے ہوئے یہ کہا" قلت لا و اللہ فعثمان بن عمیر ضعفه الدار قطني." میں کہتا ہوں قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اس روایت کی سند میں عثمان بن عمیر کا ذکر ہے جسے دار قطنی نے ضعیف قرار دیا ہے۔

جب بھی ذھبی نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے اور قسم اٹھا کر ضعف ثابت کیا ہے۔ تو اس سے کفر و شرک جیسا عظیم جرم کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے۔

اعتراض: مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے!

" ان رجلا قال یا رسول اللہ این ابی قال فی النار فلما قفی دعاہ فقال ان ابی و اباک فی النار "

(مسلم ج اول باب بیان ان من مات علی الکفر فھو فی النار ص ۱۳۲)

ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے عرض کیا یا رسول اللہ میرا باپ کہاں ہے؟ (جنت میں یا دوزخ میں) آپ نے فرمایا آگ میں۔ جب وہ واپس جانے لگا تو آپ نے اسے بلایا اور فرمایا'' بے شک میرا باپ اور تمہارا باپ آگ میں ہیں''۔

ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے۔

" انه ﷺ استاذن فی الاستغفار لأمه فلم یؤذن له "

بیشک نبی کریم ﷺ نے اپنی ماں کے لئے استغفار کرنے کی اجازت طلب کی تو آپ کو اجازت نہیں دی گئی۔

ان دونوں حدیثوں سے پتہ چلا کہ نبی کریم ﷺ کے والدین (معاذاللہ) کافر و شرک تھے، تم کیسے ان کو مسلمان مانتے ہو؟ اور کیسے کہتے ہو وہ مشرک نہیں تھے؟

جواب: مسلم کی یہ حدیث ضعیف ہے۔ ضعیف حدیث سے احکام ثابت نہیں ہوتے۔ چہ جائیکہ کفر ثابت ہو اور وہ بھی سید الانبیا محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ و الثناء کے والدین کریمین کا کفر ثابت ہو، یہ

کبھی ممکن نہیں ہو سکتا۔

" ان هذه اللفظة وهی قوله " ان ابی و اباك فی النار . لم یتفق علی ذکرها الرواة " .

(الحاوی للفتاوی ج ۲ . ص ۲۲۶)

مسلم میں جو یہ لفظ " ان ابی و اباك فی النار " آئے ہوئے ہیں ان میں راویوں کا اتفاق نہیں کیونکہ مسلم نے یہ روایت حماد بن سلمہ سے تخریج کی ہے۔ حماد بن سلمہ اور ثابت حضرت انس سے روایت کرتے ہیں، اور اس کے مخالف " روایتِ معمر " ہے۔ حضرت معمر روایت کرتے ہیں ثابت سے اور ثابت انس سے اس روایت میں " ان ابی و اباك فی النار " کے الفاظ نہیں بلکہ اس میں یہ الفاظ ہیں " اذا مررت بقبر کافر فبشره بالنار " جب تم کسی کافر کی قبر سے گذرو تو اس کو نار کی بشارت دے دو۔ ان الفاظ میں حضور کے والد کا کوئی ذکر نہیں یہ روایت زیادہ صحیح ہے بنسبت حماد کی روایت کے!

" فان معمرا اثبت من حماد فان حمادا تکلم فی حفظه ووقع فی احادیثه مناکیر "

(الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۲۳)

بیشک معمر کی حدیث حماد کی حدیث سے زیادہ صحیح ہے کیونکہ حماد کے حافظہ میں کلام ہے اور حماد کی روایت کردہ زیادہ احادیث منکر ہیں جو معروف کے مقابل ہونے کی وجہ سے مردود العمل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام بخاری نے حماد سے روایت نقل نہیں کی۔

" واما معمر فلم یتکلم فی حفظه ولا استنکر شیء من حدیثه " .

(الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۲۳)

معمر کی روایت بزار اور طبرانی نے بیان کی۔ لیکن معمر کا حافظہ قوی تھا ان کے حافظہ کے متعلق کوئی کلام نہیں اور نہ ہی ان کی مرویات میں سے کوئی منکر ہے۔

معمر کی روایت کی مؤید روایات:

" عن ابراهیم بن سعد عن الزهری عن عامر بن سعد عن ابیه ان اعرابیا قال رسول اللہ ﷺ این ابی ؟ قال فی النار قال فأین ابوک قال حیثما مررت بقبر کافر فبشره بالنار "

(رواه البیهقی)

عامر بن سعد اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا میرا باپ کہاں ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا آگ میں، اس نے کہا آپکے باپ کہاں ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا جب تمہارا گذر کسی کافر کی قبر سے ہوتو اسے آگ کی بشارت دے دیا کرو۔

نبی کریم ﷺ کا یہ جواب نہایت ہی حکیمانہ تھا جس میں آپ نے اس کے سوال کا ایسا جواب دیا جس سے اس کی دل شکنی نہ ہو۔ اگر آپ ﷺ یہ فرماتے کہ میرے والد تو جنت میں ہیں تو یقیناً وہ شخص پریشان ہوتا۔

" وهذا اسناد على شرط الشيخين فتعين الاعتماد على هذا اللفظ وتقديمه على غيره "
(الحاوی للفتاوی ج۲ ص ۲۲۶)

اس روایت کا اسناد شرائط شیخین (بخاری و مسلم) پر ہونے کی وجہ سے صحیح ہے اور اس پر ہی اعتماد ہوگا۔ یہ روایت دوسری روایات سے مقدم ہوگی۔

اور طبرانی اور بیہقی نے اسی حدیث کے آخر میں ذکر کیا ہے کہ اعرابی نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اور اس نے کہا!

" لقد كلفني رسول الله ﷺ تعبا ما مررت بقبر كافر الا بشرته بالنار "

رسول اللہ ﷺ نے مجھے مشقت میں مبتلاء کر دیا ہے کیونکہ میں جس کافر کی قبر سے گذرتا ہوں اسے آگ کی بشارت دیتا ہوں۔

معلوم ہوا کہ وہ اعرابی اپنی عربی زبان سے باخبر تھا، اور نبی کریم ﷺ کے طرز تکلّم سے بھی آشنا تھا، جس سے کلام کیا گیا جب اسی نے آپ کے ارشاد کو عام سمجھا تو دوسرے کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کے والدین کو کافر کہہ کر اپنی عاقبت کو برباد کرے۔

ابن ماجہ نے بھی یہی حدیث ابراہیم بن سعد کی روایت سے ذکر کی ہے، ابراہیم بن سعد نے زہری سے اور زہری نے سالم سے اور سالم نے اپنے باپ (عبد اللہ بن عمر) سے روایت کی ہے۔ انہوں نے کہا!

" جاء اعرابي الى النبي ﷺ فقال يا رسول الله ان ابي كان يصل الرحم فاين هو ؟

قال فی النار قال فکأنہ وجد من ذلک فقال یارسول اللہ فاین ابوک ؟ قال رسول اللہ ﷺ حیثما مررت بقبر مشرک فبشرہ بالنار ، قال فاسلم الاعرابی بعد قال لقد کلفنی رسول اللہ ﷺ تعبا ما مررت بقبر کافر الا بشرتہ بالنار "

نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک اعرابی آیا اس نے کہا یارسول اللہ بیشک میرا باپ صلہ رحمی کرتا تھا وہ کہاں ہے (جنت میں یا دوزخ میں) تو آپ نے فرمایا وہ آگ میں ہے۔ اس نے (یہ جواب سن کر) اپنے دل میں غم پایا پھر کہا۔ یارسول اللہ آپ کے باپ کہاں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تمہارا کسی مشرک کی قبر سے گذر ہو تو اسے آگ کی بشارت دے دو، راوی کہتے ہیں اس کے بعد اس اعرابی نے اسلام قبول کرلیا اور وہ کہتے تھے کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے مشقت میں مبتلاء کردیا ہے کہ میں جس قبر سے گذرتا ہوں اسے آگ کی بشارت دیتا ہوں۔

نکتہ: اعرابی کا اسلام قبول کرنے سے پہلے "یارسول اللہ" کہنا اس پر دلالت کررہا ہے کہ اس کے دل میں اسلام راسخ ہو چکا تھا۔

اور ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس اعرابی کا سوال تو اسلام قبول کرنے کے بعد ہو لیکن مندرجہ بالا عبارت کا مفہوم اس طرح بیان کیا جائے کہ وہ اعرابی چونکہ اسلام لا چکے تھے اس لئے اسلام لانے کے بعد نبی کریم ﷺ کے ارشاد کو تسلیم کرنے کے بغیر کوئی چارۂ کار نہ سمجھا۔ (الحاوی للفتاوی ج۲ ص۲۲۴)

واللہ اعلم بالصواب (راقم)

" فهذه الزيادة اوضحت بلا شک ان هذا اللفظ العام هو الذی صدر منه ﷺ وراٰه الاعرابی بعد اسلامه امرا مقتضيا للامتثال فلم يسعه الا امتثاله " (الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۲۴ ، ۲۳۷)

اس زیادتی سے بلاشک یہ واضح ہوگیا کہ نبی کریم ﷺ نے جواب عمومی طور پر دیا اور اعرابی نے بھی اسلام قبول کرنے کے بعد اس امر کی فرمانبرداری کو لازم قرار دیا، اس نے بغیر تسلیم کرنے کے اپنے لئے کوئی چارہ کار نہ سمجھا۔

جو روایت معمر کی ثابت سے اور ثابت کی انس سے مذکور ہے بعینہ ان الفاظ سے ہی سعد ابن ابی وقاص سے بھی روایت بوار اور طبرانی نے بیان کی ہے۔

مسلم کی روایت میں غلطی کی وجوہ!

پہلی وجہ : وہی ہے جس کا ذکر کیا جاچکا ہے کہ حماد کے حافظہ میں کمی تھی اور اس کی روایات ''منکر'' بھی ہیں؛ لہٰذا حماد کی روایت سے کفر ثابت کرنا ممکن نہیں، ایسی حدیث سے عام حکم ثابت نہیں ہوسکتا تو کفر کیسے ثابت کیا جاسکتا ہے؟

دوسری وجہ :

" فعلم ان هذا اللفظ الاول من تصرف الراوی رواه بالمعنی علی حسب فهمه وقد وقع فی الصحیحین روایات کثیرة من هذا النمط فیها لفظ تصرف فیه الراوی وغیره اثبت منه ''

(الحاوی للفتاوی ج۲ ص ۲۲۰)

معلوم ہوا کہ حماد کی روایت میں الفاظ'' ان اباك و ابی فی النار ''راوی کا تصرف ہے۔ یعنی روایت بالمعنی ہے روایت بالمعنی کا مطلب یہ ہے کہ'' راوی، حدیث کا مفہوم اپنے الفاظ میں پیش کرے، وہ الفاظ نبی کریم ﷺ کے نہ ہوں'' اس طرح کی روایات میں راویوں سے غلطی ہوجاتی ہے، ایسی روایات بخاری اور مسلم میں کئی ہیں ان روایات کے مقابل جب وہ روایات آجائیں جن کو بالفاظہ روایت کیا جائے تو وہ زیادہ معتبر ہوں گی۔ روایت بالفاظہ کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کا راوی نبی کریم ﷺ کے منہ مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ کو ہی ادا کرے ان میں کوئی لفظ بھی اپنی طرف سے نہ لائے۔

حدیث بالمعنی کی اور مثال

"عن عائشة ام المؤمنین انها قالت اتی رسول الله ﷺ بصبی فبال علی ثوبه فدعا بماء فاتبعه ایاه''

(بخاری جلد اول باب بول الصبیان ص ۳۵)

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک بچہ کو لایا گیا اس بچے نے آپ کے کپڑوں پر پیشاب کردیا آپ نے پانی منگایا اور کپڑے پر بہایا۔

اس روایت کے برعکس دوسری روایت بالمعنی ذکر ہے جس میں غلطی کا احتمال ہے وہ روایت یہ ہے:

عن عبید الله بن عتبه عن ام قیس بنت محصن انها اتت بابن لها صغیر لم یاکل

الطعام الی رسول اللہ ﷺ فاجلسه رسول الله ﷺ فی حجره فبال علی ثوبه فدعا بماء فنضحه ولم یغسله ۔ (بخاری جلد اول باب بول الصبیان ص ۳۵)

عبداللہ بن عتبہ ام قیس بنت محصن سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے چھوٹے بچے کو رسول اللہ ﷺ کے پاس لایا جو کھانا نہیں کھا سکتا تھا، اس کو آپ نے اپنی گود میں بٹھایا، اس نے آپ کے کپڑوں پر پیشاب کر دیا آپ نے پانی طلب کیا وہ کپڑوں پر چھڑکا اور کپڑوں کو دھویا نہیں ۔

اسی مضمون کو بعض روایات میں " فرشه " سے بیان کیا گیا۔ اور بعض روایات میں "فصب" کے لفظ سے ذکر کیا گیا ہے ۔

"نضح " کا معنی ہے برتن کا رسنا اور پسینہ بہنا۔ اسلئے اس کا ظاہری مفہوم بنے گا "پانی چھڑکا"

" رش " کا معنی ہے پانی چھڑکنا، بکھیرنا آسمان کا پھوار برسانا۔ اس کا بھی ظاہری معنی یہ ہی ہوگا، پانی چھڑکا پھر " لم یغسله " کے الفاظ سے مزید غلطی ہوتی ہے کہ آپ نے کپڑوں کو دھویا نہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ بچے کا پیشاب ناپاک نہیں اور اس سے کپڑوں کا دھونا لازم نہیں ۔ حالانکہ اس طرح نہیں کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے۔

" بماء فاتبعه " ای اتبع رسول الله ﷺ البول بماء " (حاشیہ بخاری)

نبی کریم ﷺ نے پیشاب کا پانی سے پیچھا کیا یعنی آپ نے پانی بہایا اور کپڑے کو دھویا اس معنی پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جس میں "فصب" کا لفظ ہے اور اس کا معنی ہی پانی بہانا اور گرانا ہے

اب تمام روایات کو تطبیق اس طرح دی جاسکے گی "غسله من غیر فرک وغیر مبالغة " آپ نے کپڑے کو دھویا لیکن دھونے میں مبالغہ نہیں کیا اور کھرچہ نہیں اسلئے کہ بچے کے پیشاب میں زیادہ بو نہیں ہوتی ۔ بدبو کے زائل کرنے کے لئے زیادہ مبالغہ کیا جاتا ہے اب واضح ہوا کہ عبیداللہ بن عتبہ کی روایت بالمعنی ہے اگر اس کی تاویل نہ کی جائے تو معنی باطل ہوتا ہے ۔

تیسری وجہ : " ما خرج مسلم لحماد فی الاصول الا من حدیث عن ثابت "
(الحاوی للفتاوی ج۲ ص ۲۲۴)

مسلم نے حماد کی روایات کو اصول میں ذکر نہیں کیا۔ صرف یہی حدیث "ثابت" سے

اصول میں ذکر کی ہے، اور اس میں بھی راقم کے نزدیک سہو ہوا ہے کہ اسے اصول میں نہیں ذکر کرنا چاہئے تھا۔ یعنی مسلم کا طریقہ ہے کہ بعض روایات کو باب (عنوان) کے مطابق بالاصالت ذکر کرتا ہے۔ اور بعض کو بالتبع۔ وہ روایات جو بالتبع ذکر کرتا ہے ان میں ضعیف حدیثوں کو نقل کر لیتا ہے۔ جیسا کہ کتاب الایمان (جمع الیمین) میں ایک حدیث کی سند یہ ہے۔

" حدثنا الصعق يعنى ابن حزن قال حدثنا مطر الوراق عن زهدم "۔

اس حدیث کی سند پر الدار قطنی نے ان الفاظ سے اعتراض کیا۔

" الصعق ومطر ليسا قويين ولم يسمعه مطر من زهدم وانما رواه عن القاسم عنه "

صعق اور مطر قوی راوی نہیں اور مطر نے زہدم سے سنا بھی نہیں بلکہ اس کی روایت قاسم سے مروی ہے۔

دار قطنی کے اس استدراک پر علامہ نووی نے تحریر کیا!

" وهذا الاستدراك فاسد لان مسلما لم يذكر متاصلا وانما ذكره متابعة للطرق الصحيحة السابقة وقد سبق ان المتابعات يحتمل فيها الضعف "

دار قطنی کا یہ استدراک فاسد ہے کیونکہ مسلم نے یہ روایت بالاصالۃ ذکر نہیں کی بلکہ سابقہ صحیح طرق سے بیان کردہ احادیث کے بالتبع اس روایت کو ذکر کیا ہے۔ اور امام مسلم بالتبع ضعیف روایات بھی نقل کر لیتے ہیں۔

یہاں سے واضح ہوا کہ حماد کی روایت جب مسلم نے سوائے ثابت کی روایت کے بالاصالۃ ذکر نہیں کی تو اس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ مسلم کے نزدیک بھی حماد ضعیف راوی ہے۔ لہذا یہ روایت بالاصالۃ نقل کرنے میں مسلم سے یقیناً سہو ہوا ہے۔ یہ بھی بالتبع ذکر ہونی چاہئے تھی تاکہ اس کا ضعف بھی واضح ہوتا۔

چوتھی وجہ : مسلم اور بخاری کے راویوں سے بھی کہیں نہ کہیں سہو ہوا ہے۔ مثال کے طور پر ایک حدیث پیش کر رہا ہوں اس کی طرف توجہ کریں۔

" عن عطاء قال حضرنا مع ابن عباس جنازة ميمونة بسرف فقال هذا زوجة

رسول الله ﷺ فاذا رفعتم نعشها فلا تزعزعوها ولا تزلزلوها وارفقوا بها فانه كان عند رسول الله ﷺ تسع نسوة كان يقسم منهن لثمان ولا يقسم لواحدة قال عطاء التي كان رسول الله ﷺ لا يقسم لها بلغنا انها صفية وكانت آخرهن موتا ماتت بالمدينة (متفق عليه) وقال رزين قال غير عطاء هي سودة وهو اصح وهبت يومها لعائشة " (مشکوۃ باب القسم)

عطاء سے مروی ہے کہ ہم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی معیت میں حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے جنازہ میں مقام "سرف" میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا: یہ رسول اللہ کی زوجہ ہیں جب تم ان کے جنازہ کو اٹھانا تو اسے نہ حرکت دینا اور نہ جھنجوڑا دینا، بلکہ آرام اور نرمی سے اٹھانا۔ کیونکہ یہ نبی کریم ﷺ کے پاس رہنے والی نو ازواج مطہرات میں سے ہیں۔ جن میں آپ باریوں کو برابر طور پر تقسیم فرماتے تھے وہ آٹھ تھیں ایک کی باری مقرر نہیں تھی۔

عطاء راوی نے کہا کہ وہ زوجہ جس کی باری آپ مقرر نہیں فرماتے تھے وہ حضرت صفیہ تھیں اور وہی مدینہ طیبہ میں سب سے آخر فوت ہوئیں۔

یہ حدیث بخاری اور مسلم دونوں نے ذکر کی ہے۔ لیکن اس کے آخری حصہ میں عطاء راوی سے دو طرح کا سہو واقع ہوا ہے ایک تو وہی جو صاحب مشکوۃ نے رزین کے حوالہ سے نقل کر دیا کہ وہ زوجہ جن کی باری مقرر نہیں تھی وہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا تھیں حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نہیں تھی؛ کیونکہ حضرت سودہ نے خود اپنی باری سے دستبردار ہونے کی درخواست کر دی تھی۔ حضور کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ میں بوڑھی ہوگئی ہوں مجھے عام عورتوں کی سی خواہش نہیں آپ میری باری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دے دیں۔

راوی سے دوسرا سہو یہ ہوا ہے کہ راوی نے کہا سب سے آخری مدینہ طیبہ میں فوت ہونے والی یہی ہیں، حالانکہ یہ درست نہیں۔

" لانها ماتت فی رمضان سنة خمسين فی زمن معاوية وماتت ميمونة بعد سنة احدى وخمسين وعائشة سنة سبع وخمسين وسوده سنة اربع وخمسين وام سلمة سنة تسع وخمسين " (از مرقاۃ المفاتیح)

اس لئے کہ حضرت صفیہ کی وفات پچاس ہجری میں ہوئی اوران کے بعد چار ازواج مطہرات کی وفات ہوئی کیونکہ حضرت میمونہ کی وفات اکاون ہجری میں اور حضرت عائشہ کی ستاون ہجری میں اور حضرت سودہ کی چون ہجری میں اور حضرت ام سلمہ کی انسٹھ ہجری میں ہوئی۔ اس حدیث اور اس کی شرح سے یہ واضح ہوگیا کہ مسلم اور بخاری کے راوی سے بھی سہو ہوسکتا ہے۔ لہذا یہ روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ مسلم اور بخاری کے راوی سے جب سہو ہوسکتا ہے تو اس حدیث میں بھی سہو ہوا ہے۔ جس میں رسول اللہ ﷺ کے والد مکرم کی طرف کفر کی نسبت کی گئی ہے۔

پانچویں وجہ:

مسلم کے راویوں سے ایسی احادیث بھی مروی ہیں جو راوی نے اپنے علم کے مطابق بات بیان کی ہے لیکن وہ دوسرے مشہور راویوں کی روایات کے خلاف ہونے کی وجہ سے معتبر نہ رہیں جیسا کہ حضرت نافع سے مروی ہے۔

" ذکر عند ابن عمر عمرة رسول اللہ من الجعرانہ فقال لم یعتمر منہا "۔

(مسلم ج ۲ باب نذر الکافر وما یفعل فیہ اذا اسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نبی کریم ﷺ کے عمرہ کا تذکرہ کیا گیا کہ آپ نے جعرانہ سے عمرہ کا احرام باندھا، تو آپ نے کہا کہ حضور ﷺ نے وہاں سے عمرہ نہیں کیا۔ اس پر بحث کرتے ہوئے علامہ نووی فرماتے ہیں۔

" لم یعتمر منہا ھذا محمول علی نفی علمہ ای انہ لم یعلم ذلک وقد ثبت ان النبی ﷺ اعتمر من الجعرانة والاثبات مقدم علی النفی لما فیہ من زیادة العلم وقد ذکر مسلم فی کتاب الحج اعتمار النبی ﷺ من الجعرانة عام حنین من روایة انس رضی اللہ عنہ واللہ اعلم "۔

حضرت ابن عمر کا یہ کہنا کہ حضور نے جعرانہ سے عمرہ نہیں کیا اسے ان کے علم نہ ہونے پر محمول کیا جائے گا، کہ آپ کو اس کا علم نہ ہوسکا، ورنہ نبی کریم ﷺ کا جعرانہ سے عمرہ کرنا ثابت ہے۔ اثبات والا قول نفی والے قول سے مقدم ہے؛ کیونکہ اثبات میں علم زیادہ پایا گیا ہے۔ اور خود مسلم نے کتاب الحج میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے نبی کریم ﷺ کے جعرانہ سے عمرہ کرنے کا ذکر کیا ہے۔

ان مندرجہ بالا وجوہ کے پیش نظر یہ کہنا دشوار نہ رہا کہ مسلم کی حدیث بروایت حماد ضعیف ہے اس سے نبی کریم ﷺ کے والدین کا کفر ثابت نہیں ہوسکتا۔

یہی وجہ ہے کہ مسلم کی اس حدیث کے متعلق رئیس المتقین، استاذ الاساتذہ حضرت علامہ پیر سید حسین الدین شاہ دامت برکاتہ العالیہ مہتمم وشیخ الحدیث جامعہ رضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث متناً "مضطرب" ہے، لہٰذا قابل وثوق نہیں۔

متناً مضطرب کی ایک مثال:

فاطمہ بنت قیس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے زکوۃ کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا "ان فی المال لحقا سوی الزکوۃ" بیشک مال میں سوائے زکوۃ کے حق ہے۔
اسی حدیث کے الفاظ اور معانی میں اضطراب ہے لہٰذا یہ حدیث قابل عمل اور قابل اعتبار نہیں، کیونکہ اس کے خلاف ابن ماجہ نے روایت یوں بیان کی ہے "لیس فی المال حق سوی الزکوۃ" مال میں سوائے زکوۃ کوئی حق نہیں۔ (نزھۃ النظر علی نخبۃ الفکر ص ۸۱)

یعنی فرض صرف زکوۃ ہے باقی تو صدقات واجبہ ہیں اور کوئی مستحب یہی ابن ماجہ کی جو روایت ہے وہی معتبر ہے پہلی روایت مضطرب ہو جانے کی وجہ سے قابل اعتبار نہیں۔

ابوداؤد کی حدیث "استغفار کی اجازت نہ ملنا" وہ بھی تعارض کی وجہ سے کفر ثابت کرنے میں ناکام ہے؛ کیونکہ دوسری صحیح احادیث سے پاک رحموں اور پاک صلبوں سے منتقل ہونا ثابت ہے
والحدیث الصحیح إذا عارضہ ادلۃ اخری ھی ارجح منہ وجب تاویلہ وتقدیم تلک الادلۃ علیہ کما ھو مقرر فی الاصول وبھذا الجواب الاخیر یجاب عن حدیث عدم الاذن فی الاستغفار. (الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۲۷)
صحیح حدیث کے مقابل جو دوسری صحیح احادیث آجائیں جو اس سے زیادہ راجح ہوں تو ضروری ہو جاتا ہے کہ صحیح حدیث کی تاویل کی جائے اور اسکے مقابل صحیح اور راجح روایات کو مقدم کیا جائے اصول حدیث میں اس ضابطہ کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے لہٰذا عدم استغفار والی حدیث قابل تاویل ہے۔

اعتراض: امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''فقہ اکبر'' میں نبی کریم ﷺ کے والدین کے متعلق ذکر کیا ہے ''ماتا علی الکفر'' وہ دونوں کفر پر فوت ہوئے جب امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ انہیں کافر کہا ہے تو کس طرح ان کو مومن اور جنتی کہا جا سکتا ہے۔

جواب: فقہ اکبر کے نسخوں میں بہت اختلاف ہے بعض میں ہے'' ماتا علی الکفر'' وہ دونوں کفر پر فوت ہوئے بعض میں ہے ''ماماتا علی الکفر'' وہ دونوں کفر پر فوت نہیں ہوئے اور بعض نسخوں میں'' ماتا علی الفترة'' وہ دونوں دین فترت پر پیدا ہوئے یعنی توحید پر قائم رہتے ہوئے دنیا سے گئے ہیں اور بعض نسخوں میں یہ مسئلہ بالکل ذکر ہی نہیں۔

مولوی وکیل احمد صاحب سکندر پوری نے فقہ اکبر کا نہایت صحیح نسخہ حیدر آباد سے حاصل کر کے چھپوایا اور ثابت کیا کہ یہ صحیح اور باقی نسخے غلط ہیں اس نسخہ میں اس مسئلہ کا ذکر نہیں۔

اتنے شدید اختلاف کے پیش نظر نبی کریم ﷺ کے والدین کریمین کو کافر و مشرک قرار دینا کہاں کا انصاف و ایمان ہے عقل کا تقاضا یہی ہے کہ ان کو مومن جنتی تسلیم کیا جائے۔

(از تفسیر نعیمی پ ۱ ص ۶۱۰)

فقہ اکبر میں راقم کا موقف:

راقم کے نزدیک صحیح یہ ہے کہ فقہ اکبر کا صحیح نسخہ'' ماماتا علی الکفر ''(وہ دونوں کفر پر نہیں فوت ہوئے) والا ہے کتابت کی غلطی سے لفظ مارہ گیا ہے ایسا اکثر طور پر تساہل ہو جاتا ہے کتابت میں غلطیوں کا وقوع ہوتا رہتا ہے اور جب پروف ریڈنگ میں ذرا بھر تساہل ہو جائے تو مسئلہ الٹ پلٹ ہو کر رہ جاتا ہے راقم کو تصنیفی میدان میں قدم رکھنے سے خاص تجربہ حاصل ہے نور الایضاح کا میں نے عربی حاشیہ ذریعۃ النجاح ترتیب دیا ہے جس کے ص ۴۵ حاشیہ نمبر۲ پر مااختلفوا کی جگہ اختلفو اتحریر ہو گیا دو تین ایڈیشن اسی طرح چھپ چکے ہیں اسی طرح کی اور بھی کئی اغلاط آ گئی ہیں اسی طرح میری تصنیف ''تذکرۃ الانبیاء'' کے ص ۵۴۰ پر آپ کی دعوت پر پہلے اسلام لانے والے عنوان کے تحت اصل مسودہ میں یہ عبارت ہے'' آزاد کردہ غلاموں میں حضرت زید اور غلاموں میں حضرت بلال'' لیکن پہلے ایڈیشن میں کتابت کی غلطی سے عبارت یہ ہے آزاد کردہ غلاموں میں حضرت بلال'' دوسرا ایڈیشن مکتبہ ضیائیہ بوہڑ بازار راولپنڈی نے چھپوایا چھپنے سے پہلے میں نے غلطی لگا کر دی لیکن تصحیح پھر غلط ہی ہوئی اب

عبارت یہ ہے آزاد کردہ غلاموں میں حضرت زید اور حضرت بلال'' یہ بھی غلط ہے اس طرح کتابت کی غلطیاں اور پروف ریڈنگ میں تساہل ہوتا رہتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کے والدین کو کافر کہنا درحقیقت آپ کو ایذا دینا ہے

'' قال السهيلي في الروض الانف بعد ايراده حديث مسلم وليس لنا نحن ان نقول ذلک في ابويه ﷺ لقوله " لا تؤذوا الاحياء بسبب الأموات وقال تعالىٰ " ان الذين يؤذون الله ورسوله "(الآية) وسئل القاضی ابو بكر بن العربی احد ائمة المالكيه عن رجل قال: " ان ابا النبی ﷺ فی النار" فاجاب بان من قال ذلک فهو ملعون ؛ لقوله تعالیٰ ﴿ ان الذين يؤذون الله ورسوله لعنهم الله فی الدنيا والآخرة ﴾ قال ولا اذی اعظم من ان يقال عن ابيه انه فی النار '' (الحاوی للفتاوی ج۲ ص ۲۳۱)

حضرت امام سہیلی نے الروض الانف میں مسلم کی حدیث ذکر کرنے کے بعد کہا ہے: ہمیں حق نہیں پہنچتا کہ ہم نبی کریم ﷺ کے والدین کے متعلق کفر کا قول کریں؛ کیونکہ خود نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔ ''زندہ کو مردہ کی وجہ سے ایذا نہ پہنچاؤ'' اور رب تعالیٰ نے بھی فرمایا (ترجمہ) بیشک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کو ایذاء پہنچاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں اللہ کی لعنت ہے۔ قاضی ابوبکر بن عربی سے مالکیہ میں سے کسی ایک شخص کے متعلق پوچھا گیا کہ وہ حضور کے والد کو کافر کہتا ہے (اس کا کیا حکم ہے؟) آپ نے فرمایا وہ ملعون ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو شخص اللہ اور اس کے رسول کو ایذاء پہنچاتا ہے اس پر اللہ کی لعنت ہے دنیا اور آخرت میں۔ اس سے بڑھ کر اور ایذاء کیا ہو سکتی ہے کہ وہ آپ کے باپ کو کافر کہے؟

معاملہ قسمت کا:

کسی کی قسمت میں یہ ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کی عظمت کو بیان کرتا ہے۔ اور کسی کی قسمت میں ہے وہ تنقیص کرتا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں نبی کریم ﷺ کی شان بیان کرنے کی توفیق لازوال عطا فرمائے اور تنقیص کرنے سے بچائے۔ آمین

بقول کسے! تنقیص نبی پہ جو اڑے ہوتے ہیں
وہ قہر مذلت میں پڑے ہوتے ہیں

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

واما متاخرین پس تحقیق اثبات کردہ اند اسلام والدین بلکہ تمام آباء وامہات آنحضرت ﷺ را تا آدم علیہ السلام"

متاخرین نے تحقیق سے نبی کریم ﷺ کے والدین کے ایمان کو ثابت کیا ہے بلکہ آپ کے تمام آباء وامہات آدم علیہ السلام تک مومن ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے۔

ایں علم گویا مستور بود از متقدمین پس کشف کرد آنرا حق تعالیٰ بر متاخرین

" واللہ یختص برحمتہ من یشاء " (اشعۃ اللمعات جلد اول ص ۷۱۸)

یہ علم (یعنی نبی کریم ﷺ کے والدین کا ایمان پر ہونے کا علم) گویا کہ (بعض) متقدمین پر مستور تھا اللہ تعالیٰ نے متاخرین پر اسے منکشف کیا اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جسے چاہے خاص فرماتا ہے۔

واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ کے والدین کریمین کو مومن سمجھنے والوں پر اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہے جو اس رحمت خاصہ سے محروم ہوں گے وہی کافر سمجھیں گے۔

میت کو تکلیف دینا ایسا ہی ہے جیسے زندہ کو تکلیف دینا!

" عن عائشۃ ان رسول اللہ ﷺ قال کسر عظم المیت ککسرہ حیا "

(رواہ مالک وابو داؤد وابن ماجہ، مشکوۃ باب دفن المیت)

حضرت عائشہ سے مروی ہے بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میت کی ہڈی کو توڑنا ایسا ہی ہے جیسا زندہ کی ہڈی کو توڑنا ہے

" قال ابن الملک ان المیت یتألم "

ابن ملک نے کہا اس حدیث سے یہ ثابت ہوا میت کو درد ہوتا ہے۔

" قد اخرج ابن ابی شیبۃ عن ابن مسعود قال اذی المؤمن فی موتہ کأذاہ فی حیاتہ "

ابن ابی شیبہ نے حضرت عبداللہ ابن مسعود سے روایت بیان کی ہے کہ میت کو ایذاء دینا ایسے ہی ہے جیسے اسے اس کی زندگی میں ایذاء دی گئی ہو (مرقاۃ ج ۴ ص ۷۹)

قبروں کو مسمار کرنا ظلم عظیم ہے ایک حدیث جو بیان کی گئی ہے اس سے واضح ہوا کہ حضرت ابن عباس نے نبی کریم کی زوجہ مطہرہ کی چارپائی کو حرکت دینے سے بھی منع کیا۔ اسکی وجہ صرف ادب

واحترام کا لحاظ تھا۔ کسی مسلمان کی قبر کو مسمار کرنا جرم ہے صحابہ کرام اور حضور کے والدین کی قبور کو مسمار کرنے کی خبر اگر صحیح ہے تو یہ عظیم ظلم کیا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو ایذاء پہنچانا

○ اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا عَظِیْمًا﴿

(پ ۲۲ رکوع ۱۴)

بیشک جو ایذاء دیتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کو ان پر اللہ کی لعنت دنیا اور آخرت میں اور اللہ نے ان کے لئے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں قاضی مظہری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا!

وجاز ان یکون معنی الآیة الذین یؤذون رسول اللہ وذکر اللہ لتعظیم الرسول کانّ من اذی الرسول فقد اذی اللہ "

ایک معنی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آیت کریمہ میں مراد صرف رسول اللہ کو ایذاء دینا مراد لیا گیا ہو کیونکہ رسول اللہ ﷺ کو ایذاء دینا درحقیقت اللہ کو ایذاء دینا ہے۔ اس پر ایک حدیثِ پاک بھی شاہد ہے !

"عن عبد اللہ بن مغفل ﷺ قال قال رسول اللہ ﷺ اللہ اللہ فی اصحابی، اللہ اللہ فی اصحابی، لا تتخذوھم غرضا من بعدی فمن احبھم فبحبی احبھم ومن ابغضھم فببغضی ابغضھم ومن آذاھم فقد آذانی ومن آذانی فقد آذی اللہ ومن آذی اللہ فیوشک ان یأخذ "

(رواہ الترمذی مشکوۃ مناقب صحابہ)

میرے صحابہ کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ سے ڈرتے رہو (دو مرتبہ یہی الفاظ فرمائے) ان کو میرے بعد موردِ طعن و تشنیع نہ بنانا۔ جس نے ان سے محبت کی اس نے میری محبت کی وجہ سے ان سے محبت کی، جس نے ان سے بغض رکھا اس نے میرے بغض کی وجہ سے ان سے بغض رکھا۔ جس نے ان کو ایذاء دی اس نے مجھے ایذاء دی، جس نے مجھے ایذاء دی اس نے اللہ کو ایذاء دی، جس نے اللہ تعالیٰ کو ایذاء دی قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنی گرفت میں لے لے۔

اولیاء اللہ کو ایذاء پہنچانا

بعض حضرات نے کہا ہے " ان الذین یؤذون اللہ " کا مفہوم بحذف مضاف بھی ہوسکتا ہے۔ " ان الذین یؤذون اولیاء اللہ " جو لوگ اللہ تعالیٰ کے اولیاء کو ایذاء دیتے ہیں وہ

دنیاوآخرت میں لعنت کے مستحق ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کوایذاءدیناباعثِ کفرہے

"من اذی رسول اللہ ﷺ طعن فی شخصہ او دینہ او نسبہ او صفۃ من صفاتہ او بوجہ من وجوہ الشین فیہ صراحۃ او کنایۃ او اشارۃ کفر ولعنہ اللہ فی الدنیا والآخرۃ واعد لہ عذاب جھنم . وھل یقبل توبتہ ؟ قال ابن ھمام کل من ابغض رسول اللہ ﷺ بقلبہ کان مرتدا فالسباب بالطریق الاولی ویقتل عندنا حدا فلا تقبل توبتہ فی اسقاط القتل "

(مظہری زیر آیت مذکورہ)

جس شخص نے رسول اللہ ﷺ کوایذاءدی خواہ آپ کی ذات میں طعنہ زنی کی ، یا آپ کے دین میں، یا آپ کے نسب میں ، یا آپ کی صفات میں سے کسی صفت میں ، یا آپ کوکسی طرح بھی عیب لگایا صراحۃً یا کنایۃً یا اشارۃً وہ کافر ہوجائے گا۔اوراس پراللہ تعالیٰ کی دنیااورآخرت میں لعنت ہوگی اور اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے عذاب جہنم تیارکیاہے۔(سوال کیاگیا) کیاایسے شخص کی توبہ قبول ہوگی؟ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ہروہ شخص جس نے (العیاذ باللہ) رسول اللہ ﷺ سے دل سے بغض رکھا وہ مرتد ہوگیا اورگالی نکالنے سے بطریق اولیٰ مرتد ہوگا۔ ہمارے نزدیک اسے بطورِحد قتل کیاجائے گا۔اس کی توبہ قتل کے ساقط کرنے کے لئے قبول نہیں کی جائے گی۔

مومنوں کوایذاءدینا:

﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴾

(پ ۲۲ رکوع ۱۴)

اور جولوگ ایمان والے مردوں اورعورتوں کوبغیرکوئی کسب کئے ایذاءدیتے ہیں انہوں نے بہتان اورکھلاگناہ اپنے سرلیا۔

" قال مقاتل نزلت فی علی بن ابی طالب ﷺ وقیل نزل فی شان عائشۃ رضی اللہ عنھا قلت اللفظ عام فی کل من یؤذی مومنا او مومنۃ بای وجہ کان وان کان المراد خاصا عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ والمؤمن من امن الناس علی دمائھم واموالھم " (رواہ الترمذی والنسائی ۔ مظہری)

مقاتل نے کہا یہ آیت حضرت علی ﷺ کی شان میں نازل ہوئی (من سب علیا فقد

اذی رسول اللہ) بعض نے کہا یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شان میں نازل ہوئی (قاضی مظہری کہتے ہیں) میں کہتا ہوں : لفظ عام ہے اگر چہ مورد خاص ہے اسلئے اس سے مراد ہر مومن مرد اور عورت کو ایذاء دینا ہے۔خواہ کسی طرح بھی ایذاء دے۔

حضرت ابو ہریرۃ ﷺ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کامل مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھوں سے مسلمان سلامتی میں رہیں ۔مومن وہ ہے جس سے مومنوں کے مال اور ان کی جانیں محفوظ رہیں۔

نتیجہ :

☆ رسول اللہ ﷺ کو ایذاء دینا کفر ہے۔

☆ رسول اللہ ﷺ کو ایذاء دینے والا واجب القتل ہے توبہ کرنے کے باوجود واجب القتل ہی رہے گا۔

☆ رسول اللہ ﷺ کو ایذاء دینا رب تعالیٰ کو ایذاء دینا ہے۔

☆ رسول اللہ ﷺ کو ایذاء دینے والا ملعون ہے۔

☆ رسول اللہ ﷺ کو ایذاء دینے والا رسوا کن عذاب کا مستحق ہے۔

☆ اولیاء اللہ کو ایذاء دینے والا ملعون ہے۔

☆ ایمان والوں کو ایذاء دینے والا کامل مومن نہیں ہوسکتا۔

قبور کو مسمار کرنے سے مسلمانوں کی دل آزاری ہوتی ہے!

قبور کو مسمار کرنے سے ان کے لواحقین بالخصوص اور دوسرے مسلمان بالعموم قلبی تکلیف محسوس کرتے ہیں ایسا کرنے والے مسلمانوں کو ایذاء پہنچارہے ہیں ۔صحابہ کرام اور نبی کریم ﷺ کے والدین کریمین کی قبور کو مسمار کرنے سے اہل اسلام کو دکھ ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ شعائر اسلامیہ کا پاسِ ادب کرنے کی توفیق عطا فرمائے ، رسول اللہ ﷺ اور آپ کے والدین کریمین ،صحابہ کرام اور اہل بیت اطہار کی محبت پر قائم و دائم رکھے ! اور مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ڈالنے والوں کو ہدایت عطا فرمائے۔

آمین ثم آمین بجاہ سید المرسلین

﴿وَلَنۡ تَرۡضٰی عَنۡکَ الۡیَهُوۡدُ وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمۡ ؕ قُلۡ اِنَّ هُدَی اللّٰهِ هُوَ الۡهُدٰی ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَهۡوَآءَهُمۡ بَعۡدَ الَّذِیۡ جَآءَکَ مِنَ الۡعِلۡمِ ۙ مَا لَکَ مِنَ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیۡرٍ ﴿۱۲۰﴾

۱) اور ہرگز تم سے یہود اور نصاریٰ راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے دین کی پیروی نہ کرو، تم فرمادو، اللہ ہی کی ہدایت، ہدایت ہے۔ (اور اے سننے والے کے باشد) اگر تو ان کی خواہشوں کا پیرو ہوا بعد اس کے تجھے علم آ چکا تو اللہ سے تیرا کوئی بچانے والا نہ ہوگا اور نہ مددگار۔

۲) اور ہرگز راضی نہیں ہوں گے تم سے یہود اور نصاریٰ یہاں تک کہ تم تابعداری کرو ان کے دین کی، تم فرمادو، بے شک اللہ کی ہدایت ہی ہدایت ہے۔ اور (اے عام مخاطب) اگر تابعداری کی تم نے ان کی خواہشات کی اس کے بعد کہ آ گیا تمہارے پاس علم، تو نہیں ہوگا تمہارے لئے اللہ سے بچانے والا کوئی دوست اور نہ مددگار۔

شانِ نزول: اہل کتاب نبی کریم ﷺ سے مہلت طلب کرتے تھے، اور طمع دلاتے تھے کہ ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں اس آیہ کریمہ کو نازل کیا کہ بے شک آپ ان کو مہلت دیں، ان سے پرسکون ماحول قائم کریں وہ آپ سے راضی نہیں ہوں گے سوائے اس کے کہ آپ ان کے دین کی تابعداری کریں۔ یعنی جب وہ چاہتے ہیں کہ تم ان کے دین کو قبول کرلو تو وہ تمہارے دین پر کیسے آئیں گے۔ ان کا ایمان لانے کا طمع دلانا صرف ٹال مٹول کرنا مقصود ہے۔

دوسری وجہ: مدینہ طیبہ کے یہود اور نجران کے نصاری نبی کریم ﷺ کے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کی وجہ سے امید کر رہے تھے کہ یہ ہمارے دین پر آ جائیں گے جب اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس سے کعبہ کو قبلہ بنا دیا تو وہ ناامید ہو گئے کہ یہ لوگ تو ہمارے دین کو قبول نہیں کریں گے۔ تو اس وقت آیہ کریمہ کا نزول ہوا۔

اور ساتھ ساتھ ہی نبی کریم ﷺ کو ان کے ایمان سے مکمل طور پر ناامید ہونے کے لئے کہا، کہ ان لوگوں کے ایمان لانے کی آپ ذرا بھر بھی امید نہ رکھیں کیونکہ یہ لوگ تو چاہتے یہی ہیں کہ تم بھی ان کے دین پر آ جاؤ۔ (از خازن)

فائدہ: یہاں یہود و نصاریٰ کا جو ذکر کیا گیا اس سے مراد ان کی قوم ہے، ہر ہر فرد مراد نہیں کہ ان میں سے کوئی ایک بھی ایمان نہیں لائے گا، بلکہ مراد یہ ہے کہ تمام یہود اور نصاریٰ ایمان نہیں لائیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی یہود میں سے ایمان لے آئے تھے، اور حبشہ وغیرہ کے کئی نصاریٰ بھی ایمان لے آئے تھے۔

اعتراض: اس آیۃ کریمہ سے ثابت ہے کہ یہود و نصاریٰ مجموعی طور پر کبھی ایمان نہیں لائیں گے، بلکہ وہ تو چاہتے ہیں کہ ایمان والے بھی ایمان چھوڑ کر ان کے دین پر آ جائیں۔

لیکن دوسری آیۃ میں ذکر ہے۔ ﴿ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ﴾ اس آیۃ سے واضح ہو رہا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام جب دنیا میں تشریف لے آئیں گے۔ تو اہل کتاب میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہوگا۔ جو عیسیٰ علیہ السلام کی وفات سے پہلے ایمان نہ لے آئے۔

یہ بات بھی واضح ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام تو نبی کریم ﷺ کی شریعت کی تبلیغ فرما رہے ہوں گے تو اہل کتاب کا ایمان نبی کریم ﷺ پر اور آپ کی شریعت پر ہوگا۔

ان دونوں آیتوں میں تعارض نظر آتا ہے۔ ان میں تطبیق کیسے دی جائے کہ تعارض نہ رہے۔

جواب: قرآن پاک میں کہیں بھی تعارض نہیں، صرف کسی کو سمجھ نہ آئے تو وہ بظاہر تعارض سمجھ بیٹھتا ہے۔ کیونکہ اس آیۃ کو اور ﴿ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ﴾ (پسند کرتے ہیں بہت سے اہل کتاب کاش کہ وہ تمہیں ایمان کے بعد کفر کی طرف پھیر دیں، اس حسد کی وجہ سے جو اپنے نفسوں میں رکھتے ہیں۔ اس کے بعد جب ان پر حق ظاہر ہو گیا۔)

کو ایک ساتھ سمجھا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ صرف حسد تھا کہ وہ

نبی کریم ﷺ کی برتری کو پسند نہیں کرتے تھے، اور اپنی چوہدراٹ اور ریاست کے زوال کی وجہ سے ضد اور عناد کی وجہ سے ایمان نہیں لا رہے تھے۔ اس کی یہ وجہ نہیں کہ ان پر حق واضح نہیں تھا۔ بلکہ وہ نبی کریم ﷺ کی حقانیت کو تسلیم کرنے کے باوجود ضد کی وجہ سے ایمان نہ لانے پر ڈٹے ہوئے تھے۔

لیکن عیسیٰ علیہ السلام کے آنے پر جب ان کی ضد اور حسد اور عناد ختم ہو جائے گا تو ایمان لے آئیں گے۔

تنبیہ: ﴿وَلَنْ تَرْضٰی عَنْکَ الْیَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ﴾ کا یہ مطلب نہیں کہ یہود و نصاریٰ دونوں فریق یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان وہ دین قبول کرلیں جو یہودیت اور نصرانیت کا مجموعہ، چونکہ ایسا تو کوئی دین تھا ہی نہیں، بلکہ یہودی نصرانیوں کو بے دین کہتے تھے۔ اور نصرانی یہودیوں کو بے دین کہتے تھے۔

لہٰذا آیۃ کریمہ کا مطلب یہ ہے۔ ﴿وَلَنْ تَرْضٰی عَنْکَ الْیَهُوْدُ﴾ یعنی الا بالیهودیة ﴿وَلَا النَّصٰرٰی﴾ الا بالنصرانیة " کہ تم سے ہرگز یہود راضی نہیں ہوں گے یہاں تک کہ تم ان کے دین یہودیت کو قبول کرلو، اور نصرانی تم سے ہرگز راضی نہیں ہوں گے یہاں تک کہ تم ان کے دین نصرانیت کو قبول کرلو۔ (خازن)

ملت کیا ہے؟ ﴿حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ﴾ یعنی دینهم و طریقتهم " ملت سے مراد طریقہ اور دین ہے۔ (خازن)

یعنی یہود و نصاریٰ ہرگز تم سے راضی نہیں ہوں گے یہاں تک کہ تم ان کے دین اور طریقہ کو اختیار کرلو۔

البتہ ملت کو دین کیوں کہا گیا؟ اس کی وضاحت میں اگرچہ الفاظ مختلف ہیں تاہم مفہوم کچھ قریب قریب ہی ہے۔ ملت اور شریعت اور دین سب کا مطلب یہ ہے۔ " ماشرعه الله تعالیٰ لعباده علی لسان انبیائه " اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے جو شریعت کے احکام انبیاء کرام کے ذریعے مقرر فرمائے۔

شریعت کو شریعت کہنے کی وجہ علامہ جوہری رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں۔ شرع لهم الی سن ای جعله لهم سننا وطریقا والسنة السیرة والطریقة" شریعت کا مطلب ہے کہ ان کے لئے ایک طریقہ رائج کر دیا۔

شریعت، پانی پر وارد ہونے کی جگہ کو بھی کہا جاتا ہے، جس طرح پیاسے لوگ پانی کے حوض وغیرہ پر میٹھا اور ٹھنڈا پانی حاصل کرنے کے لئے جاتے ہیں، اسی طرح رب تعالیٰ کے تقرب کے پیاسے ثواب اور رحمت کی مٹھاس اور ٹھنڈک حاصل کرنے کے لئے احکام دینیہ کے مورد پر جمع ہوتے ہیں۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا" الشریعة مادعا اللہ تعالیٰ عباده الی فعله" شریعت اس راہ کو کہا جاتا ہے۔ جس پر عمل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو بلایا۔

دین کو دین کہنے کی وجہ یہ ہے۔" والدین باعتبار طاعته واجابة دعائه والانقیاد لامره" اللہ تعالیٰ کے حکم کی طاعت کرنے اور اس کے احکام کو بجالانے اور اس کے امر کی فرمانبرداری کرنے کو دین کہا جاتا ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ " والدین مافعله العباد عن امره " اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق بندوں کا عمل کرنا دین ہے۔

ملت کو ملت کہنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے علامہ راغب اصفہانی بیان کرتے ہیں۔ " الملة من امللت الکتاب ای املیته " "ملة" کا معنی ماخوذ ہے " امللت الکتاب " خط لکھانا یہی معنی " املیته " کا بھی ہے۔

عام طور پر شرعی مسائل جو انبیاء کرام کے ذریعے ملے ان کو حفظ کرنے کی غرض سے لکھ لیا جاتا ہے لہذا شریعت کو ملت بھی کہا جانے لگا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا احکام شرع کی طرف بلانے اور کتب کے نازل کرنے کو بھی ملت کہا گیا ہے مطلب واضح ہو گیا کہ "ملت اور شریعت اور دین" ایک چیز کا نام ہے۔ یہ لحاظ کیا جائے کہ انبیاء کرام نے رب تعالیٰ کے احکام کو ظاہر فرمایا اور لکھوائے تو ملت کہا گیا۔ یہ لحاظ کیا جائے کہ بندے

ان احکام پر عمل کر کے رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طاعت کرتے ہیں تو اسے دین کہا گیا۔ اور یہ لحاظ کیا کہ پیاسے اس کی طرف جاتے ہیں تو شریعت کہا گیا۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى : فرمادو بے شک اللہ کی ہدایت ہی ہدایت ہے

نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم ان کو جواب دو کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہی اسلام اور وہی حق کی ہدایت ہے، جو تم دعویٰ کرتے ہو وہ تو راہ ہدایت نہیں، بلکہ باطل راہ اور گمراہی ہے۔ (از بیضاوی)

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ : میں لام مؤطہ للقسم ہے۔ " اھوائھم " اھواء جمع ہے " ھوی " کی۔ اس کا معنی ہے ان کی ٹیڑھی آراء۔ یعنی " ھوی " وہ رائے ہے جو خواہشات پر مبنی ہو۔ خواہشات باطلہ کی وجہ سے جو رائے حاصل ہو وہ گمراہی کی طرف لے جانے والی ہے۔

" وسمي بذلک لانه يهوي صاحبه في الدنيا الى كل داهية وفي الآخرة الى هاوية "

یعنی " ھـوی " کو ھوی اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ انسان کو دنیا میں ہر قسم کی مصیبت میں گرادیتی ہے۔ اور آخرت میں جہنم کے مقام ھاویہ میں گرادے گی۔

بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ : (بعد اس کے کہ تمہارے پاس علم آجائے)

اس علم سے مراد یہ ہے کہ تمہارے پاس بیان آجائے کہ اللہ کا دین اسلام ہی ہے۔ اور یہ بیان آجائے کہ قبلہ وہی قبلہ ہے جو ابراہیم علیہ السلام کا تھا وہ کعبہ شریف ہے۔

مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ : ولی کا مطلب ہے۔ جو امور کا والی ہو، اور ان کے معاملات کو قائم کرے، رب کی طرف سے تمہارا کوئی ولی نہیں ہوگا۔

وَّلَا نَصِيْرٍ : کوئی تمہاری مدد کرنے والا اور کوئی تمہیں اللہ کے عذاب سے بچانے والا نہیں۔

انتباہ : " وقيل في قوله ﴿وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآئَهُمْ﴾ انه خطاب للنبي ﷺ والمراد به امته " ﴿وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ﴾ میں بظاہر خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے۔ (خازن)

اس لئے کہ نبی کریم ﷺ سے یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ رب تعالیٰ کی طرف سے علم آنے کے بعد یہود و نصاریٰ کی خواہشات کی تابعداری کریں۔

" والمعنی ایاکم اخاطب ولکم اؤدب وانھی فقد علمتم ان محمدا ﷺ قد جاء کم بالحق والصدق وقد عصمته فلا تتبعوا انتم اھواء الکافرین ولئن اتبعتم اھوائھم بعد الذی جاء ک من العلم والبینات مالکم من دون الله من ولی ولا نصیر "

آیۃ کریمہ میں ﴿ولئن اتبعت﴾ سے لے کر آیۃ کے آخر تک کا مفہوم واضح ہوگیا کہ یہ حکم نبی کریم ﷺ کی امت کو ہے۔ گویا کہ رب تعالیٰ نے یہ فرمایا اے امت محمد مصطفیٰ ﷺ میں تمہیں خطاب کر رہا ہوں۔ میں تمہیں ادب سکھا رہا ہوں۔ میں تمہیں غلط راہ سے منع کر رہا ہوں۔

اور یہ بات تمہیں یقینی طور پر معلوم ہے کہ محمد ﷺ تمہارے پاس سچا دین اور حق دین لائے ہیں۔ ان کو تو میں نے کافروں کی خواہشات کی تابعداری کرنے سے بچایا ہوا ہے، لیکن تم کافروں کی خواہشات کی تابعداری نہ کرنا اگر تم نے ان کی خواہشات کی تابعداری کی جب کہ تمہارے پاس علم آ گیا اور واضح دلائل آ گئے تو تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچانے کے لئے تمہارا کوئی یار و مدد گار نہیں ہوگا۔
(خازن)

یوں بھی کہا جا سکتا ہے: اگر یہ کہا جائے کہ یہ خطاب تو نبی کریم ﷺ کو ہی ہے، لیکن بالفرض محال کے طور پر تو یہ درست ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ اے نبی کریم اگر تم نے بالفرض محال ان کی خواہشات کی تابعداری کی الخ۔ بالفرض محال میں حقیقت معتبر نہیں ہوتی جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔
﴿قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِیْنَ﴾ فرما دو اگر رحمٰن کی اولاد ہوتی تو میں سب سے پہلے اس کی عبادت کرتا۔ یہ کلام بھی بالفرض محال پر مبنی ہے۔

یعنی خطاب نبی کریم ﷺ کو ہو لیکن بالفرض محال کے طور پر، اور امت کو سخت وعید کی گئی ہو۔
(از جلالین)

☆☆☆

﴿اَلَّذِیْنَ آتَیْنٰـهُمُ الْکِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴾(۱۲۱)

۱) جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ جیسی چاہئے اس کی تلاوت کرتے ہیں وہی اس پر ایمان رکھتے ہیں، اور جو اس کے منکر ہیں تو وہی اس کے زیاں کار ہیں۔

۲) وہ لوگ جنہیں ہم نے عطاء کی کتاب وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا حق ہے اس کی تلاوت کرنا، وہی لوگ ایمان رکھتے ہیں اس کے ساتھ۔ اور جو اس سے کفر کرتے ہیں وہی ہیں خسارہ اٹھانے والے۔

اَلَّذِیْنَ آتَیْنٰـهُمُ الْکِتٰبَ : (وہ لوگ جن کو دی ہم نے کتاب)

اس سے مراد کون سے لوگ ہیں؟

اس سے مراد نبی کریم ﷺ کی امت کے لوگ بھی ہیں۔ اور اس سے مراد نصرانیوں کے چند لوگ بھی ہیں۔ یعنی آیۃ کریمہ اپنے وسیع تر مفہوم کے لحاظ پر دونوں کو شامل ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ کا مختار یہ ہے کہ اس سے مراد مومن ہیں۔ ماقبل سے رابطہ بھی موجود ہے، کیونکہ ﴿وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ﴾ میں خطاب نبی کریم ﷺ کی امت کو ہے۔ اور اس آیۃ کریمہ میں بھی آپ کی امت ہی مراد ہے۔

" الـذین " سے مراد جب ایمان والے لوگ ہوں گے، تو " الـکتاب " سے مراد قرآن پاک ہوگا۔ یہی قول بہتر ہے کیونکہ بعد میں ذکر ہو رہا ہے۔ ﴿یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ﴾ وہ لوگ اس کتاب کی تلاوت کرتے ہیں جیسا حق ہے اس کی تلاوت کرنا۔

اس جملہ میں قرآن پاک کی تلاوت کرنے کی رغبت دلائی گئی، اور قرآن پاک کی تلاوت پر برانگیختہ کیا گیا، اور تلاوت کرنے کی مدح کی گئی۔ جس کتاب کی یہ شان ہے وہ قرآن پاک ہی ہے۔ یہ مقام توراۃ اور انجیل کو حاصل نہیں۔

اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ : (وہی اس پر ایمان رکھتے ہیں) اس جملہ میں حصر پائی گئی ہے کہ ''جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے، وہی اس پر ایمان رکھتے ہیں۔

ایمان کو ان لوگوں پر منحصر کر دیا ہے، یہ شان صرف ایمان والوں کی ہے، اہل کتاب کو یہ مقام حاصل نہیں۔ (از کبیر)

فائدہ : ﴿ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ﴾ کا معنی حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے یہ کیا'' یتبعونہ حق اتباعہ'' وہ تابعداری کرتے ہیں اس کتاب کی جیسے اس کی تابعداری کرنے کا حق ہے۔ یعنی قرآن پاک کے اوامر اور نواہی پر عمل کرتے ہیں۔ حلال کو حلال سمجھتے ہیں۔ اور حرام کو حرام سمجھتے ہیں۔ غرضیکہ قرآن پاک کے جمیع احکام کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے اس پر دلیل اس آیۃ سے پیش کی کہ ﴿ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ﴾ میں ''تلاھا'' کا معنی پیچھے آنا لیا گیا ہے۔ اس معنی پر ایک حدیث بھی پیش کی گئی ہے۔

'' عن ابن عمر عن النبی ﷺ فی قوله تعالی ﴿ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ﴾ قال یتبعونه حق اتباعه ''

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ﴿ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ﴾ کے متعلق فرمایا وہ تابعداری کرتے ہیں اس کی جیسے اس کی تابعداری کرنے کا حق ہے۔

لیکن حدیث کے متعلق قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ '' فی اسناده غیر واحد من المجهولین فیما ذکر الخطیب ابوبکر احمد الا ان معناه صحیح ''

اس حدیث کی اسناد کے متعلق خطیب ابوبکر احمد رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا کہ اس میں کئی مجہول راوی ہیں۔ تاہم حدیث میں جو معنی پیش کیا گیا ہے وہ صحیح ہے۔

☆ '' قال ابوموسیٰ الاشعری من یتبع القرآن یهبط به علی ریاض الجنة ''

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا جو شخص قرآن پاک کی تابعداری کرتا ہے وہ اس کے ذریعہ جنت کے باغات تک پہنچ جاتا ہے۔

☆ '' وعن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ هم الذین اذا مروا بآیة رحمة سالوها من الله واذا

مروا بآية عذاب استعاذوا منها "

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس آیۃ کریمہ میں ﴿ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں، جو قرآن پاک کی تلاوت کرتے وقت جب رحمت کی آیۃ آئے تو وہ رحمت طلب کرتے ہیں۔ اور جب وہ عذاب والی کوئی آیۃ پڑھتے ہیں تو عذاب سے رب تعالیٰ کی پناہ پکڑتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ معنی نبی کریم ﷺ کے طرز عمل سے لیا، حدیث شریف میں آپ کی تلاوت کو اسی طرح بیان کیا گیا۔

" عن النبی ﷺ كان اذا مر بآية رحمة سأل و ذا مر بآية عذاب تعوذ "

نبی کریم ﷺ جب رحمت کی آیۃ کی تلاوت فرماتے تو رب تعالیٰ سے رحمت کا سوال کرتے، اور جب عذاب والی آیۃ کی تلاوت کرتے تو عذاب سے رب تعالیٰ کی پناہ مانگتے۔

☆ " وقال الحسن هم الذين يعملون بمحكمه، ويؤمنون بمتشابهه، ويكلون ما اشكل عليهم الى عالمه "

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ﴿ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہ محکم آیات پر عمل کرتے ہیں۔ اور متشابہات پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور مشکلات کو علماء کے سپرد کر دیتے ہیں۔

(ماخوذ از قرطبی)

☆ " قال ابن مسعود والذى نفسى بيده ان حق تلاوته ان يحل حلاله، ويحرم حرامه ويقرأه كما انزل الله، ولا يحرف الكلم عن مواضعه ولا يتأول منه شيأ على غير تاويله

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ "تلاوت کرنے کا حق" یہ ہے کہ حلال کو حلال سمجھا جائے۔ اور حرام کو حرام سمجھا جائے۔ اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن کو نازل فرمایا اسی طرح اسے پڑھا جائے۔ کسی طرح بھی اس کے کلمات میں تحریف نہ کی جائے۔ اور کسی قسم کی غلط تاویل نہ کی جائے۔

دوسرا احتمال: " الذين " سے مراد اہل کتاب میں سے یہود ہوں۔ اور کتاب سے مراد تورات ہو۔ تو اس سے مراد " هم مؤمنوا اهل الكتاب مثل عبدالله بن سلام و اصحابه " اہل کتاب میں حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی ہیں۔ اب اس صورت میں "کتاب" سے مراد تورات ہوگی۔

اب مطلب یہ ہوگا کہ ''وہ لوگ جن کو ہم نے توراۃ عطاء کی وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ اس کے تلاوت کرنے کا حق ہے۔ اور وہ توارۃ پر ایمان رکھتے ہیں۔ یعنی اس میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف پر کامل ایمان رکھتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کو رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ اور قرآن پر ایمان لانے کی بھی توفیق عطاء فرمادی۔

تیسرا احتمال: '' الـذیـن '' سے مراد نصاریٰ ہوں، اور ''کتاب'' سے مراد انجیل ہو، اس سورۃ میں آیۃ کریمہ کا تعلق اصحابہ سفینہ سے ہوگا، یعنی وہ لوگ جو حضرت جعفر بن ابی طالب کے ساتھ حبشہ سے کشتی میں سوار ہو کر آئے تھے۔ جن کی تعداد چالیس تھی، بتیس آدمی حبشہ سے اور آٹھ شام کے راہب حضرات تھے۔ جن میں بحیرا راہب بھی تھا۔ ان لوگوں نے نبی کریم ﷺ پر ایمان لایا۔

اب آیۃ کریمہ کا مفہوم یہ ہوگا، کہ وہ نصرانی لوگ جن کو ہم۔ نے انجیل دی، انہوں نے انجیل کو پڑھا جیسا اس کے پڑھنے کا حق تھا، یعنی نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو حق مانا، اور انجیل پر ایمان رکھا، ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے کی توفیق عطاء فرمادی۔ (از خازن)

فائدہ: '' وقال الکلبی الضمیر راجع الی محمد ﷺ ای یصفونہ فی کتبھم حق صفتہ لمن سألھم من الناس ''

کلبی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ جب '' الـذیـن '' سے مراد اہل کتاب ہوں خواہ یہود ہوں یا نصاریٰ، تو '' یتلـونـہ '' کی ضمیر نبی کریم ﷺ کی طرف لوٹے گی، اب مطلب یہ ہوگا کہ لوگوں میں سے جب کوئی تم سے نبی کریم ﷺ کے اوصاف کے متعلق پوچھے تو وہ صحیح حق پر مبنی بیان کردو۔ (مظہری)

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ :

اور جو اس سے کفر کرتے ہیں وہی خسارہ اٹھانے والے ہیں۔

جب '' الذین '' سے مراد ایمان والے لوگ ہوں تو '' بہ ''، ضمیر کا مرجع '' الکتاب '' ہوگا، اور مراد اس سے قرآن پاک ہوگا۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ جو لوگ قرآن پاک سے کفر کرتے ہیں وہ خسارہ اٹھانے والے ہیں۔

اور جب "الـذین" سے مراد "اہل کتاب" ہوں تو پھر بھی "بـه" سے مراد قرآن پاک ہی ہونا ہے لیکن بالواسطہ کیونکہ اصل میں اس طرح اسے بیان کیا جائے گا جس طرح خازن کی اس عبارت سے واضح ہے۔

" ﴿ ومن یکفر به ﴾ ای یجحد ما فیه من فرائض الله و نبوة محمد ﷺ "

اور جو اس سے کفر کرتے ہیں، یعنی اہل کتاب کا فریق اپنی اپنی کتاب میں بیان کردہ اللہ تعالیٰ کے فرائض کا انکار کرتے ہیں اور نبی کریم ﷺ کی نبوت کا انکار کرتے ہیں وہ خسارہ اٹھانے والے ہیں

اب اس سے واضح ہو گیا کہ یہود و نصاریٰ کا توارت و انجیل میں بیان کردہ نبی کریم ﷺ کے اوصاف اور آپ کی نبوت کو نہ تسلیم کرنا ہی دراصل قرآن پاک پر ایمان نہ لانے کا سبب تھا۔

تنبیه : اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ ﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ﴾

اور جس شخص نے ان گروہوں میں سے اس (قرآن) کے ساتھ کفر کیا، اس کا ٹھکانا آگ ہے۔

بخاری شریف میں ہے۔

" والـذی نفسی بیده لایسمع بی احد من هذه الامة یهودی ولا نصرانی ثم لایؤمن بی الا دخل النار "

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہء قدرت میں میری جان ہے، اس امت (امت دعوت) میں سے جس نے بھی میرے متعلق سنا خواہ یہودی ہو یا نصرانی پھر مجھ پر ایمان نہ لایا وہ ضرور جہنم کی آگ میں داخل ہوگا۔ (از صابونی)

☆☆☆

﴿ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ☆ وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْھَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُھَا شَفَاعَۃٌ وَّلَاھُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴾ (آیت ۱۲۲، ۱۲۳)

۱) اے اولاد یعقوب یاد کرو میرا احسان جو میں نے تم پر کیا اور وہ جو میں نے اس زمانہ کے سب لوگوں پر تمہیں بڑائی دی۔ اور ڈرو اس دن سے کہ کوئی جان دوسرے کا بدلہ نہ ہوگی اور نہ اس کو کچھ لے کر چھوڑیں، اور نہ کافر کو کوئی سفارش نفع دے اور نہ ان کی مدد ہو۔

۲) اے آلِ یعقوب یاد کرو میری وہ نعمتیں جو میں نے انعام کیں تم پر، اور بے شک میں نے فضیلت دی تمہیں (تمہارے زمانہ کے) تمام لوگوں پر؛ اور ڈرو اس دن سے جس دن نہیں بدلہ دے گا کوئی نفس کسی نفس کی طرف سے، اور نہیں قبول کیا جائیگا اس سے فدیہ، اور نہیں نفع دے گی کسی کو (بغیر اذن الٰہی کے) کوئی شفاعت، اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔

ان دونوں آیتوں کی وضاحت کافی حد تک رکوع نمبر ۵، اور نمبر ۶، میں بیان ہو چکی ہے، تاہم تفسیر عزیزی میں کچھ بحث ان آیات کی تفسیر میں بھی ذکر کی گئی ہے۔ لہٰذا اس سے ذکر کرنا یقیناً مفید ہے۔

تنبیہ : ﴿وَلَاھُمْ یُنْصَرُوْنَ﴾ میں جن لوگوں کی امداد کی نفی کی گئی ہے۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی عدولی کی وجہ سے اس کی گرفت میں ہوں گے، عذاب کے جو مستحق ہو چکے ہوں گے، اگر وہ کافر ہوئے تو ان کی مدد اور شفاعت نہ ہی کوئی کرے گا اور نہ ہی قبول کی جائے گی۔ اور گنہگار لوگوں کی مدد اور شفاعت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت حاصل ہونے پر کی جائے گی اور اسے قبول کیا جائے گا، کیونکہ رب تعالیٰ نے خود فرمایا ﴿اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴾ بے شک ہم امداد کریں گے اپنے رسولوں اور ایمان والوں کی دنیا کی زندگی میں اور قیامت کے دن۔

مکرر ذکر کیوں؟ جب ان آیات کو پہلے بھی ذکر کر دیا گیا تو پھر دوبارہ ذکر کرنے کا کیا فائدہ؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ بنی اسرائیل پر نعمتوں کے ذکر سے پہلے ان آیات کے ذکر کرنے کا مطلب یہ تھا کہ ان کو نعمتیں یاد دلائی جائیں، وہ ان نعمتوں کا شکر کریں، کفران نعم (نعمتوں کے شکر سے انکار) نہ کریں۔ اور منعم حقیقی کے حق کو پہچانیں۔

• یہاں ان آیات کو ذکر کر کے ان کو بتایا گیا کہ تمہارا متبوع بننے کا خیال باطل ہے۔ جو تم چاہتے ہو کہ نبی کریم ﷺ اور ایمان والے حضرات تمہارے دین پر آ جائیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم نے تو خود اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کیا، ان پر طرح طرح کی کجرویاں کرتے رہے۔ تمہاری تو کوئی شفاعت بھی نہیں کر سکے گا۔ تم کسی کی شفاعت کرو یہ تو اور ہی ناممکن ہے۔

لیکن نبی کریم ﷺ کو تو اوروں کی شفاعت کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ اور آپ کی امت کے صالحین کو دوسروں کی شفاعت کا حق حاصل ہوگا۔ لہٰذا تم ان کو اپنے تابع بنانے کے تصورات کو اپنے ذہنوں سے نکال دو۔

اور وجہ مکرر ذکر کرنے کی یہ بھی ہے کہ پہلے اجمالی طور پر نعمتوں کی یاد دلائی، پھر تفصیلی طور پر چند نعمتوں کی یاد دلائی، پھر تفصیلی طور پر چند نعمتوں کا ذکر کیا پھر ان آیات میں نعمتوں کی یاد دلا کر گویا کہ نتیجہ اور خلاصہ ذکر فرما دیا۔

چند الفاظ مبارکہ میں فرق:

۱) پہلی آیۃ میں ذکر کیا گیا ﴿وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ ﴾ اور اس آیۃ کریمہ میں ذکر کیا گیا ﴿وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ ﴾

۲) پہلی آیۃ میں ذکر ہوا ﴿لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ ﴾ اس آیۃ میں ذکر ہوا ﴿لَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ ﴾

۳) پہلی آیۃ میں شفاعت کو مقدم ذکر کیا گیا اور فدیہ کو مؤخر، اور اس آیۃ میں فدیہ کو مقدم ذکر کیا، اور شفاعت کو مؤخر ان میں وجہ فرق کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ کافی حد تک اس قسم کی بحثوں کو پہلے ذکر کر دیا گیا، تاہم قدرے مناسب یہاں بھی ذکر کیا جا رہا ہے۔ شفاعت نفع دینے والی چیز ہے نقصان دہ نہیں، لیکن کافروں کے حق میں شفاعت قبول نہیں ہوگی۔

اسی طرح شفاعت کرنے والا اس کے نزدیک متقبول ہوتا ہے جس کے پاس وہ شفاعت کرنے کے لئے گیا ہے۔

پہلی آیۃ میں ﴿وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ﴾ اس لئے ذکر فرمایا ہے کہ اس سے پہلے ﴿وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ﴾ صراحۃً ذکر ہو چکا ہے۔

یعنی پہلے ان کو کفر سے منع کیا گیا، پھر ان کو بتایا گیا کہ اگر تم نے کفر کیا تو تمہارے حق میں کسی کی شفاعت قبول نہیں کی جائے گی، کیونکہ کافروں کے لئے کوئی شفاعت قبول نہیں۔

دوسری آیۃ سے پہلے مضمون یہ آ رہا تھا کہ یہود و نصاریٰ تو یہ چاہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام بھی ہمارے دین پر آ جائیں، تو ان کو بتایا گیا کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے ساتھ ایمان لانے والوں کی شفاعت لوگوں (گنہگاروں) کو نفع دے گی، لیکن تمہیں نفع نہیں دے گی، کیونکہ تم تو ان کو اپنا تابع بنانا چاہتے ہو، ان کی شفاعت تو ان لوگوں کو نفع دے گی جو ان کی تابعداری کرنے والے ہوں گے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ کافروں کا کوئی فدیہ نفع نہیں دے گا۔ لیکن جہاں پہلے کافروں کا ذکر ہوا وہاں ﴿لَا يُؤْخَذُ﴾ ذکر کیا، کہ ان کے لئے فدیہ کسی سے لیا ہی نہیں جائے گا۔

اس وہم کو بھی رد کر دیا کہ کوئی شخص دنیا والوں پر اسے قیاس نہ کرے کہ بعض اوقات فدیہ لے کر تردد ہوتا ہے کہ اسے قبول کیا جائے یا نہ قبول کیا جائے۔

یہاں چونکہ پہلے صراحۃً ان کے کفر کا ذکر نہیں تھا لیکن اشارۃً ان کا کفر سمجھ میں آ رہا ہے اس لئے صرف ﴿لَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ﴾ پر اکتفاء کر لیا گیا کہ ان سے فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا۔

راقم کے نزدیک دونوں آیات کا مجموعی مضمون مکمل مسئلہ بیان کر رہا ہے کہ ان کے لئے نہ شفاعت قبول کی جائے گی اور نہ ہی ان کو نفع دے گی۔ اور نہ ہی ان کے لئے فدیہ لیا جائے گا اور نہ ہی ان کی طرف سے فدیہ قبول کیا جائے گا۔

شفاعت اور فدیہ کی تقدیم وتاخیر کی وجہ یہ ہے کہ پہلی آیۃ میں ابتداء حادثہ کا ذکر تھا، ابتداء حادثہ میں شفاعت پہلے ہوتی ہے۔ فدیہ بعد میں، لہٰذا اسی انداز پر نفی بھی کر دی گئی۔ اور دوسری آیۃ میں انتہاء حادثہ کا ذکر کیا گیا، اور انتہاء حادثہ میں فدیہ پہلے دینے کی کوشش کی جاتی ہے، اس لئے اسی طرح نفی بھی کر دی گئی، واللہ اعلم بالصواب، (ماخوذ از عزیزی)

خلاصہ کلام: بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کئی نعمتوں کی تفصیل کا ذکر کرنے کے بعد پھر اسی طرح کا خطاب کیا جیسا کہ ان نعمتوں کے ذکر کرنے سے پہلے خطاب فرمایا۔ ان کو فرمایا کہ اے بنی اسرائیل میری نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تمہیں عطاء کی ہیں۔ اور یہ بھی یاد کرو کہ میں نے تمہارے آباء واجداد کو انکے زمانے میں دوسروں پر فضیلت دی۔ جس کی وجہ سے لوگ تمہیں بھی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

اور یہ بھی خیال رکھنا کہ رب تعالیٰ کی عدالت دنیا داروں کی نام نہاد عدالتوں کی طرح نہیں، دنیا دار تو بعض اوقات مجرم کی جگہ دوسرے کو یرغمال بنا کر مجرم کو چھوڑ دیتے ہیں۔ کبھی مجرم کے حق میں کسی کی سفارش مان کر مجرم کو چھوڑ دیتے ہیں۔

اور کبھی مال و دولت لے کر مجرم کو آزاد کر دیتے ہیں۔ اور کبھی اس مجرم کی دوسرے مدد کر کے اسے بزور بازو چھڑا لیتے ہیں۔ جیسا کہ ہم مشاہدہ کرتے ہی رہتے ہیں کہ ہمارے لٹھ بردار نوجوان اسی فیصد ملک کا مال وزر ہڑپ کرنے والے ہمیشہ اپنے مجرم، غاصب اور لیٹرے فرمانروا کی مدد کر کے شرفاء کی پگڑیوں کو اچھالتے ہیں، شرفاء کو مجرم ٹھہراتے ہیں، شرفاء کو اس ڈر سے ملک بدر کر دیتے ہیں کہ وہ کہیں ہمارے اندرونی راز نہ کھول دیں۔

لیکن رب قدوس کی پاک عدالت جو عدالت ہے خجالت نہیں، جو عدالت ہے ذلالت نہیں، جو عدالت ہے رذالت نہیں، اس عدالت عظمیٰ میں کسی مجرم کی جگہ غیر مجرم کو یرغمال نہیں بنایا جائے گا۔ کسی مجرم یعنی کسی کافر ومشرک کے حق میں کسی کی شفاعت کو نہ ہی قبول کیا جائے گا اور نہ ہی کسی کی شفاعت اسے نفع دے گی۔

اور رب کی عدالت میں فدیہ دے کر کسی کو چھڑانے کا تصور کرنا ہی باطل ہے۔ اور رب تعالیٰ سے کوئی زور آور نہیں، کوئی ڈنڈے والا کسی کو چھڑا لے یہ نہیں ہو سکے گا۔ (راقم)

﴿وَاِذِابۡتَلٰۤی اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ﴾ (آیت ۱۲۴)

۱) اور جب ابراہیم کو اس کے رب نے کچھ باتوں سے آزمایا تو اس نے وہ پوری کر دکھائیں، فرمایا میں تمہیں لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں، عرض کی اور میری اولاد سے فرمایا میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا۔

۲) اور جب آزمایا ابراہیم کو ان کے رب نے چند باتوں سے، تو انہوں نے پورا کیا ان کو، کہا (رب نے) بے شک میں بنانے والا ہوں تمہیں لوگوں کا امام۔ انہوں نے کہا اور میری اولاد میں سے، کہا نہیں پہنچتا میرا عہد ظالموں کو۔

جب پہلے قبلہ کا ذکر ہوا کہ قبلہ کے بدل جانے پر یہود ونصاریٰ اس بات سے مایوس ہو گئے کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ ان کے دین کو قبول نہیں کریں گے، جبکہ پہلے وہ امید رکھتے تھے۔

اس کے بعد قبلہ یعنی کعبہ شریف کی تعمیر اور ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا۔ کہ کعبہ شریف ہی ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ تھا۔ (از قرطبی)

جب پہلے یہود اور نصاریٰ اور مشرکین کا ذکر کیا کہ وہ ایمان لانے سے انکار کر رہے تھے، ایمان لانے سے انکار میں کئی حیلے، بہانے بنا رہے تھے۔ ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے۔

تو اس کے بعد ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا کیونکہ مشرکین بھی ان کا احترام کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم ان کی اولاد سے ہیں اور انہوں نے کعبہ تعمیر کیا۔

اور یہود ونصاریٰ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اپنے آپ کو ان کی اولاد سے کہتے تھے تو رب تعالیٰ نے ان کا تذکرہ کر کے گویا کہ یہود ونصاریٰ اور مشرکین کو کہا کہ تم نبی کریم ﷺ

کے اقوال کو قبول کرلو، ان کے دین کا اعتراف کرلو، اوران کی شریعت کے مطیع ہوجاؤ۔

ابراہیم علیہ السلام کے ذکر سے ان کو نبی کریم ﷺ کی اطاعت کا حکم کیسے دیا؟ اس میں چند وجوہ ہیں۔

۱) اللہ تعالیٰ نے جب ابراہیم علیہ السلام کو بعض تکلیف والے کاموں کا حکم دیا تو آپ نے ان کو پورا کیا، اور ذمہ داری کو مکمل کیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصب نبوت اور امامت پر فائز کردیا، یعنی اعلان نبوت کا حکم دیا، کیونکہ نبی پیدائش سے پہلی ہی نبی ہوتا ہے۔

اس سے یہود اور نصاریٰ اور مشرکین کو متنبہ کیا کہ جب تم تمام ہی ابراہیم علیہ السلام کی بزرگی اور بلندیٔ شان کو تسلیم کرتے ہو تو اس پر بھی غور کرو کہ ان کو رب تعالیٰ کے حضور جھکنے اور عجز کرنے کی وجہ سے منازل رفیعہ حاصل ہوئے۔

تو تم بھی اگر دنیا اور آخرت میں بھلائی چاہتے ہو تو سرکشی اور عناد چھوڑ دو، اللہ تعالیٰ کے احکام کو دل و جان سے مان لو، اور رب تعالیٰ کی طرف سے تکالیف کو برداشت کرو، یہ تمام چیزیں اسی وقت حاصل کرسکو گے جب نبی کریم ﷺ پر ایمان لاؤ گے۔

۲) رب تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو جب یہ فرمایا ﴿ لَايَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ﴾ (نہیں پہنچتا میرا عہد ظالموں کو) تو اس سے واضح فرمادیا " ان منصب الامامة والرياسة فی الدين لايصل الی الظالمين " کہ بے شک منصب امامت اور دین میں منصب ریاست ظالموں کو نہیں مل سکتا۔

مشرکین اور یہود و نصاریٰ سب ہی یہ چاہتے تھے کہ یہ منصب ہمیں حاصل ہوتا، تو انہیں بتادیا کہ جھگڑالو اور تعصب کی وجہ سے باطل راہ پر چلنے والے اس منصب کو کیسے حاصل کر سکتے ہیں۔ گویا کہ ان کو دعوت فکر دی کہ ذرا غور کرو، عقل سے کام لو کیا واقعی محمد (ﷺ) اس منصب کی قابل ہیں؟ جب یقیناً ہیں تو ان پر ایمان لے آؤ۔

۳) " وثالثها ان الحج من خصائص دين محمد ﷺ، فحكی الله تعالی ذلک عن ابراهيم ليكون ذلک كالحجة علی اليهود والنصاری فی وجوب الانقياد لذلک "

تیسری وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ شریف کی تعمیر فرمائی، اور حج کا اعلان فرمایا،

لیکن آپ کے بعد حج کی فرضیت نبی کریم ﷺ اور آپ کی امت پر ہوئی، یعنی باقاعدگی سے حج پر عمل نبی کریم ﷺ نے کرایا، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کر کے یہود ونصاریٰ کو بتایا کہ جب تم اسے تسلیم کرتے ہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے مقرب اور جلیل القدر نبی تھے۔ جب تم یہ بھی مانتے ہو کہ کعبہ شریف انہوں نے ہی تعمیر کیا، جب تم یہ بھی مانتے ہو کہ حج کا اعلان انہوں نے ہی تعمیر کعبہ کے بعد فرمایا۔ جب تم یہ بھی تسلیم کرتے ہو کہ ابراہیم علیہ السلام نے حج کیا، اس کے بعد بطور فرض حج پر باقاعدگی سے عمل نہ ہو سکا۔

اب جب نبی کریم ﷺ کی شریعت میں فرض کر دیا گیا، باقاعدگی سے حج جاری ہو چکا ہے تو تمہیں خوش ہونا چاہئے کہ تمہارے جدامجد کی یاد دوبالا ہو رہی ہے۔ لہٰذا تمہیں نبی کریم ﷺ پر ایمان لانا چاہئے۔

۴) جب کعبہ شریف۔ کو قبلہ بنا دیا گیا تو یہود ونصاریٰ پر یہ شاق گذرا، تو رب تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کا ذکر فرمایا کہ اس کی تعمیر کرنے والے تو ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ "**الذی یعترفون عظیمه و وجوب الاقتداء به**" یہ تو وہی ذات ہے جن کی تعظیم کا تم لوگ اعتراف کرتے ہو، اور جن کی اقتداء کو واجب قرار دیتے ہو، تو تمہیں چاہئے کہ دلوں سے غصہ کو نکال کر خوش ہو جاؤ کہ قبلہ تو وہی ہے جس کو ہمارے جدامجد نے بنایا۔ جب یہ بات تمہیں سمجھ آ جائے تو نبی کریم ﷺ پر ایمان بھی لے آؤ۔

۵) مشرکین بھی ابراہیم علیہ السلام کی تعظیم کرتے تھے، بلکہ ابراہیم علیہ السلام نے بطور نظافت جو کام کئے (جن کا ذکر ان شاء اللہ قریب ہی آ رہا ہے) وہ مشرکین بھی کرتے تھے، اور باوجود اس کے کہ نبی کریم ﷺ کی صداقت و امانت کے بھی معترف تھے، اور یہ بھی جانتے تھے کہ آپ کی شریعت میں ملت ابراہیمی کے بہت سے احکام موجود ہیں۔

تو ابراہیم علیہ السلام اور تعمیر کعبہ کا ذکر فرما کر انہیں بھی فرمایا گیا کہ تم نبی کریم ﷺ پر ایمان لاؤ۔ بلکہ تمہیں تو سب سے زیادہ حق پہنچتا ہے کہ تم ایمان لے آؤ کیونکہ تم حرم شریف میں رہنے والے ہو۔

(ماخوذ از کبیر)

وَاِذِابۡتَلٰۤى اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ :

اور جب آزمایا ابراہیم کوان کے رب نے چند باتوں سے تو انہوں نے ان کو پورا کیا۔

قال الجوهری "بلوته بلوا جربته واختبرته " یعنی ابتلاء کا معنی تکالیف شاقہ میں مبتلاء کرنا، اور تجربہ کرنا اور کسی کی آزمائش کرنا۔

آیۃ کریمہ میں ابتلاء کا کیا معنی ہے؟ یا تو معنی یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو رب تعالیٰ نے تکالیف شاقہ میں مبتلاء فرمایا تو آپ نے ان کو پورا کیا، یعنی صبر وتحمل سے ان کو برداشت کیا۔

اور یا معنی ہوگا آزمانا۔ مترجمین حضرات نے تقریباً یہی معنی اختیار کیا ہے۔ لیکن یہ بھی خیال رہے کہ " اختبار " آزمانا) کا حقیقی معنی تو یہ ہے کہ جس کے انجام اور عواقب امور کا پتہ نہ ہو کہ یہ اوامر ونواہی کو تسلیم کرے گا یا نہیں۔ مطیع ہوگا یا عاصی تو اس کو آزمایا جائے کہ پتہ چل جائے کہ یہ کیسا ہے؟ یہ معنی رب تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں کہ وہ کسی کی آزمائش کر کے پتہ چلائے کہ یہ مطیع ہے یا عاصی، رب تعالیٰ تو بندوں کی پیدائش سے پہلے ہی ان کو جانتا ہے۔

لہٰذا رب تعالیٰ کے آزمانے کا مطلب **" کما قال فی الوسیط ابتلاء اللّٰہ تعالیٰ یعود اعلامه عباده لا الی استعلامه "** اس طرح ہوگا جیسا کہ وسیط میں بیان کیا گیا کہ رب تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو آزما کر اپنے بندوں پر ان کا مرتبہ ظاہر فرما دیا۔

رب تعالیٰ نے آپ کو اس لئے نہیں آزمایا کہ پہلے رب تعالیٰ کو علم نہیں تھا تو آزمانے کے بعد علم حاصل ہوا۔ (از شیخ زادہ)

تنبیہ : ابھی جو مسئلہ ذکر کیا کہ رب تعالیٰ کے آزمانے کا مطلب کیا ہے؟ جب تک وہ نہ سمجھا جائے تو انسان اسی طرح بھٹکتا رہتا ہے جیسا کہ ہشام بن حکم بھٹکا، اس نے کہا

" انه تعالی کان فی الازل عالما بحقائق الاشیاء و ما هیا تها فقط ، فاما حدوث تلک الماهیات و دخولها فی الوجود فهو تعالی لا یعلمها الا عند وقوعها " (کبیر)

اللّٰہ تعالیٰ ازل میں صرف اشیاء کی حقیقتوں اور ماہیتوں کو جانتا ہے۔ لیکن ان ماہیات کا حدوث

اور معرض وجود میں آنا اس وقت رب تعالیٰ کو معلوم ہوتا ہے جب وہ چیزیں واقع میں موجود ہو جاتی ہیں علامہ رازی رحمۃ اللہ نے تو اس پر طویل بحث کی ہے۔ تاہم خلاصہ یہی ہے کہ وہ اسی قسم کی آیات کے ظاہری ترجمہ کو دیکھ کر بھٹکا ہے کہ رب تعالیٰ اس لئے تو آزماتا ہے کہ وہ پہلے نہیں جانتا۔

کاش اسے یہ پتہ ہوتا کہ " اختبار " کا کبھی معنی " اعلامہ عبادہ " ہوتا ہے کہ کسی کا امتحان لے کر اس کا مرتبہ دوسروں پر واضح کیا جاتا ہے کہ دوسروں کو اس کی شان کا پتہ چل جائے۔ رب تعالیٰ کے آزمانے کا یہی مطلب ہے۔ اور کبھی " اختبار " کا معنی ہوتا ہے " استعلامہ " یعنی پہلے پتہ نہیں ہوتا تو اس کا پتہ چلانے کے لئے آزمایا جاتا ہے یہ معنی رب تعالیٰ کی شان کے لائق ہی نہیں۔

مقام تعجب یہ ہے کہ علم والے لوگ بھی کبھی بھٹکتے ہیں تو عجیب طریقہ پر، یہ دونوں معنی ایسے ہیں کہ ہم روزمرہ ان کا مشاہدہ کر رہے، تجربہ کر رہے ہیں، کہ آزمانے کی یہ دو ہی وجہ ہیں۔

آجکل قرآن پاک کے تراجم کو دیکھ کر علم سے خالی لیکن علم کے دعویدار اسی طرح بھٹک رہے ہیں ، اور تمام قوم کو بھٹکانے کے لئے علماء کو ختم کر رہے ہیں۔ کہ جو ہم کہیں اسی کو سب ماننے والے ہو جائیں، کوئی اسے غلط کہنے والا نظر نہ آئے۔

اِبْرَاهِيْمَ : یہ لفظ سریانی زبان کا ہے۔ جس کا معنی ہے " اب راحم " رحم کرنے والا باپ۔ آپ کے نام سے ہی پتہ چل رہا ہے کہ آپ بچوں پر رحم کرنے والے ہیں۔

" **ولذالک جعل هو وسارة زوجته كافلين لاطفال المؤمنين الذين يموتون صغار الى يوم القيامة** "

اسی وجہ سے آپ کو اور آپ کی زوجہ حضرت سارہ کو مومنوں کے فوت ہونے والے بچوں کا قیامت تک کفیل بنا دیا گیا ہے۔

بخاری شریف کی حدیث میں اس مسئلہ کی تائید پائی گئی ہے۔ حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے ایک طویل خواب کا ذکر فرمایا ہے۔ جس میں یہ مذکور ہے۔ " **ان النبی ﷺ رأى فى الروضة ابراهيم عليه السلام وحوله اولاد الناس** " بے شک نبی کریم ﷺ نے ابراہیم علیہ السلام کو ایک باغ میں دیکھا، آپ کے اردگرد لوگوں کے بچے موجود تھے۔ (از قرطبی)

ابراہیم علیہ السلام کا نسب:

آپ تارخ ابن ناخور کے فرزند ہیں۔آپ کا نام ابراہیم اور آپ کا لقب ابوالضیفان (بہت بڑے مہمان نواز) ہے۔آپ کا نسب یہ ہے، ابراہیم ابن تارخ ابن ناخور ابن ساروع ابن رعوا بن تاتع ابن عابر ابن شالخ ابن ارفخشذ ابن سام بن نوح (حقانی)

آپ کی پیدائش طوفان نوح کے سترہ سونو سال بعد ہوئی اور عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً دو ہزار تین سوسال پہلے شہر بابل کے قریب قصبہ کونی میں ہوئی۔ (تفسیر عزیزی)

تفسیر خزائن العرفان میں ہے کہ آپ کی پیدائش اہواز کے علاقہ مقام سوس میں ہوئی۔ (خزائن العرفان)

تنبیہ: آزر ابراہیم علیہ السلام کے چچا کا نام ہے آپ کا باپ کا نام تارخ ہے۔

علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" والذی عول علیه الجم الغفیر من اهل السنة ان آزر لم یکن والد ابراهیم علیه السلام وادعوا انه لیس فی آباء النبی ﷺ کافرا اصلا لقوله علیه الصلوٰۃ والسلام لم ازل انقل من اصلاب الطاهر الی ارحام الطاهرات "

اہل سنت کے کثیر اہل علم کا اسی پر اعتماد ہے کہ بے شک آزر ابراہیم علیہ السلام کا باپ نہیں تھا۔

اہل سنت کے جم غفیر کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے آباء واجداد میں کوئی بھی کافر نہیں تھا۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ میں ہمیشہ پاک پشتوں سے پاک رحموں کی طرف منتقل ہوتا رہا۔

اور یہ بھی واضح ہے کہ کفار ومشرکین تو کبھی پاک نہیں ہو سکتے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ ﴾ بے شک مشرک تو ناپاک لوگ ہیں۔ (از روح المعانی)

ابراہیم علیہ السلام کے چار بیٹے ہیں حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، مدین اور مدائن۔ (از قرطبی)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تفصیلی واقعہ ایک جگہ ہی کوئی دیکھنا چاہے تو راقم کی کتاب تذکرۃ الانبیاء کا مطالعہ کرے۔ یہاں تو آیۃ کریمہ کے مناسب ہی ذکر کیا جائے گا۔

بِکَلِمٰتٍ: کلمات جمع ہے کلمہ کی۔ مراد اس سے وہ چیزیں ہیں جن کی تکلیف ابراہیم علیہ السلام کو دی گئی۔ البتہ ان اشیاء کو کلمات اس لئے کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام سے ان کا حکم دیا گیا، اور آپ کو تکلیف دی گئی۔

جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو ''کلمہ'' کہا گیا ہے۔ کیونکہ وہ کلمہ ''کن'' سے پیدا ہوئے۔ (قرطبی)

کلمات سے مراد اوامر و نواہی ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو اوامر و نواہی سے آزمایا، آپ نے ان کو پورا کیا۔ خیال رہے کہ اوامر و نواہی ارواح کے لئے فضل و احسان ہیں۔ لیکن ظاہر طور پر بدن کے لئے مشقت اور تھکاوٹ کا سبب بنتے ہیں۔ اس لئے ان سے انسان کی آزمائش کی جاتی ہے۔
(بیضاوی و شیخ زادہ)

امتحان مطابق شان:

یہ ہر شخص کی عقل تسلیم کرتی ہے کہ امتحان شان کے مطابق ہوتا ہے۔ جتنی شان بڑھتی چلی جائے گی اسی کے مطابق امتحان بڑھتا چلا جائے گا۔ پہلی جماعت کے لڑکے سے امتحان اس کی شان کے مطابق ہوگا۔ اور پانچویں جماعت کے لڑکے سے اس کے شان کے مطابق ہوگا۔ جیسا تعلیمی درجہ بڑھتا چلا جائے گا، اسی طرح امتحان بھی بڑھتا چلا جائے گا۔ نبی کریم ﷺ چونکہ سید الکائنات اور سید الانبیاء ہیں اس لئے آپ پر سب سے بڑے امتحانات آئے اور زیادہ سے زیادہ آپ کو مصائب کا سامنا پڑا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام رفیع منصب رکھنے کی وجہ سے اور جلیل القدر نبی ہونے کی وجہ سے کئی امتحانات میں مبتلاء ہوئے۔ یعنی کلمات سے مراد بہت سے امور ہیں۔

کلمات سے مراد ستارے، چاند اور سورج:

حضرت ابراہیم علیہ السلام جس قوم میں تشریف لائے وہ لوگ ستاروں کی پوجا کرنے والے اور چاند کی پوجا کرنے والے اور سورج کی پوجا کرنے والے تھے۔

ان لوگوں نے کوشش کی کہ ابراہیم بھی ہماری طرح ستاروں اور چاند اور سورج کی پوجا کریں۔ ان لوگوں کا آپ کو ان کی پرستش کی طرف مائل کرنا آپ کے لئے بہت بڑا امتحان تھا۔ جس میں آپ

نے عظیم کامیابی حاصل کی۔

جب ان لوگوں نے آپ کوستاروں کی پوجا کرنے کے لئے کہا، تو آپ نے ان کے کہنے پر غور کیا، کہ ان لوگوں کا کہنا کیسے درست ہے؟

" فلما جن علیه اللیل رأی کوکبا قال هذا ربی فلما افل قال لا احب الآفلین "

پھر جب ان پر رات کا اندھیرا آیا ایک تارا دیکھا، بولے اسے میرا رب ٹھہراتے ہو، پھر جب وہ ڈوب گیا، بولے مجھے خوش نہیں آتے ڈوبنے والے۔

یعنی آپ نے ستارہ پرستوں کو دوٹوک جواب دے دیا کہ یہ ڈوب جانے والے خدا نہیں بن سکتے۔ اس امتحان میں آپ نے عظیم کامیابی حاصل کی۔

چاند کی پوجا کرنے والوں نے آپ کو چاند کی پوجا کرنے کی دعوت دی، آپ نے ان کی دعوت پر چاند کو دیکھ کر کہا۔

" فلما رأی القمر بازغا قال هذا ربی فلما افل قال لئن لم یهدنی ربی لاکونن من القوم الضالین "

پھر جب چاند چمکتا دیکھا بولے اسے میرا رب بتاتے ہو، پھر جب وہ ڈوب گیا، کہا اگر مجھے میرا رب ہدایت نہ کرتا تو میں بھی انہیں گمراہوں میں ہوتا۔

آپ نے چاند پرستوں کو بھی مایوس کر دیا، کہ تم چاہتے ہو کہ میں چاند کی پوجا کروں، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میرے رب نے مجھے ہدایت دے رکھی ہے۔ جسے رب نے ہدایت دے رکھی ہو وہ چاند کی پوجا کرے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سبحان اللہ اس امتحان میں بھی آپ کامیاب ہوئے۔

سورج کی پوجا کرنے والوں نے چاہا کہ ابراہیم بھی سورج کی پوجا کریں۔ انہوں نے بھی کوشش کی، آپ کو دعوت دی کہ تم بھی ہماری طرح سورج کی پرستش کرو۔

" فلما رأی الشمس بازغة قال هذا ربی هذا اکبر فلما افلت قال یقوم انی بریٔ مما تشرکون "

پھر سورج جگمگاتا دیکھا بولے اسے میرا رب کہتے ہو، یہ تو ان سب سے بڑا ہے۔ پھر جب وہ

ڈوب گیا، کہا اے قوم میں بے زار ہوں ان چیزوں سے جنہیں تم شریک ٹھہراتے ہوں۔

سورج کی پوجا کرنے والے بھی ناکام ہو گئے۔ آپ نے امتحان میں عظیم کامیابی حاصل کر لی۔

کلمات سے مراد ذبح ولد:

سات ذی الحج گذر جانے پر رات کو خواب دیکھا کہ کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں بیٹا ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے، آپ نے صبح اس پر تفکر کیا اور کچھ تردد میں رہے کہ کیا یہ اللہ تعالیٰ کا ہی حکم ہے۔ یا خواب فقط خیال تو نہیں۔ اسی وجہ سے آٹھ ذی الحج کا نام یوم الترویہ رکھا گیا۔ (سوچ و بچار کا دن) آٹھ تاریخ کا دن گذر جانے پر رات پھر خواب دیکھا صبح یقین کر لیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی حکم ہے۔ اسی نو ذی الحج کو یوم عرفہ (پہچاننے کا دن) کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد آنے والی رات کو پھر خواب دیکھنے پر صبح اس پر عمل کرنے کا مصمم ارادہ کر لینے پر ہی دس ذی الحج کو یوم النحر (ذبح کا دن) کہا جاتا ہے۔ (کبیر)

" ان اللہ تعالی جعل رؤیا الانبیاء علیھم السلام حقا " (کبیر)

بے شک اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کے خوابوں کو حق بنایا یعنی ان کے خوابات سچے ہوتے ہیں، ان کو اپنے خوابوں پر عمل کرنا لازم ہوتا ہے۔

مطلب واضح ہے کہ بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم دے کر عظیم امتحان لیا گیا۔ لیکن آپ نے اسے بھی پورا کیا۔

تفصیلی واقعہ سورۃ ''والصافات'' میں ان شاء اللہ آئے گا۔

کلمات سے مراد آگ:

ابراہیم علیہ السلام نے جب کفار کے بناوٹی خداؤں کو تباہ و برباد کر دیا، اور دلائل میں بھی ان پر غلبہ حاصل کر لیا، تو انہوں نے آپ سے انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا اور سب سزاؤں سے سخت سزا تجویز کی، یعنی یہ کہ آپ کو آگ میں جلا دیا جائے حالانکہ آگ کا عذاب صرف اللہ تعالیٰ دے سکتا ہے۔ بندے

کے لئے جائز نہیں کہ کسی کو آگ کا عذاب دے۔ لیکن نمرود اور اس کی قوم نے آپ کو جلانے کی سزا دی اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر فرمایا:

﴿ قَالُوا ابْنُوا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِى الْجَحِيْمِ ﴾ (پ ۲۳ ع ۷)

وہ کہنے لگے اس کے لئے ایک عمارت بناؤ پھر اسے بھڑکتی آگ میں ڈال دو۔

یعنی ارد گرد بہت بڑی دیوار بنا کر اس کے درمیان آگ جلاؤ، پھر ابراہیم کو اس میں ڈال دو، ﴿قَالُوا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِيْنَ ﴾ ...... پ ۱۷ ع ۵) بولے اس کو جلا دو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو اگر تمہیں کرنا ہے۔

مکمل واقعہ تو اپنی جگہ پر ہی آنا ہے۔ یہاں تو صرف اتنا سمجھا جائے کہ انہوں نے آگ جلا کر آپ کو آگ میں ڈال دیا۔

کتنا بڑا امتحان، لیکن عظیم کامیابی کو ذرا دیکھئے، آپ کے پاس ہواؤں کا فرشتہ آیا عرض کرنے لگا مجھے آپ حکم دیں تو میں آگ کو ختم کر دوں۔ آپ نے فرمایا مجھے تمہاری امداد کی کوئی ضرورت نہیں ﴿حَسْبِىَ اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴾ میرا اللہ مجھے کافی ہے اور وہی بہتر کارساز ہے۔

آپ کے پاس جبرائیل علیہ السلام آئے اور عرض کیا کہ آپ کو میری امداد کی ضرورت ہو تو میں آپ کی امداد کروں، آپ نے فرمایا مجھے تمہاری امداد کی ضرورت نہیں، جبرائیل نے کہا اچھا تو پھر اپنے رب تعالیٰ سے ہی سوال کر لو، تو آپ نے فرمایا" حسبی من سوالی علمه بحالی "وہ میرے حال کو جانتا ہے سوال کے بغیر ہی مجھے کافی ہے۔

کلمات سے مراد ہجرت:

﴿ وَقَالَ اِنِّىْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّىْ سَيَهْدِيْنِ ﴾ (پ ۲۳)

اور ابراہیم علیہ السلام نے کہا میں جا رہا ہوں، جہاں میرے رب نے حکم دیا ہے وہی میری راہنمائی فرمائے گا۔

یعنی آپ کو ہجرت کا حکم دے کہ آزمایا گیا تو آپ نے ہجرت کر کے آزمائش میں کامیابی حاصل

کی، حالانکہ وطن کو چھوڑنا بہت مشکل کام ہے۔

ابتدائی طور پر آپ نمرودی قوم سے ہجرت کر کے اپنے چچا ہاران کے پاس حران میں آ گئے، ہاران نے ابراہیم علیہ السلام کی نیک بختی دیکھ کر اپنی بیٹی سارہ کا نکاح آپ سے کر دیا۔ سارہ بہت ہی خوبصورت لڑکی تھی، مردوں میں حضرت یوسف اور عورتوں میں حضرت سارہ بہت حسین ہوئے، بلکہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنی دادی حضرت سارہ کے حسن سے ہی حسن ملا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وہاں بھی اپنا سلسلہ تبلیغ جاری رکھا، اس لئے آپ کے چچا ہاران نے بھی آپ کو گھر سے نکال دیا۔ آپ ہجرت کر کے فلسطین میں تشریف لے گئے۔

کلمات سے مراد شرائع اسلام:

- تیس شرائع اسلام سے آپ کو آزمایا گیا، آپ ان پر پورے اترے۔

ان میں سے دس کا ذکر سورۃ براءۃ میں ہے:

﴿اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾

توبہ والے، عبادت والے، حمد کرنے والے، روزے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، اچھے کاموں کا حکم دینے والے، برے کاموں سے روکنے والے، اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے، اور خوشخبری دو مومنوں کو۔

اور دس کا ذکر احزاب میں ہے:

﴿اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا﴾

بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں، اور فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں، اور سچے مرد اور سچی عورتیں، اور صبر والے مرد اور صبر والی عورتیں، اور عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں، اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں، اور روزے رکھنے والے مرد اور روزے رکھنے والی عورتیں۔ اور اپنی پارسائی نگاہ والے مرد، اور نگاہ رکھنے والی عورتیں، اور اللہ کو بہت یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں۔ ان سب کے لئے اللہ نے بخشش اور بڑا ثواب تیار کر رکھا ہے۔

اور دس کا ذکر سورۃ مومنون اور معارج میں ہے:

﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ☆ الَّذِیْنَ هُمْ فِی صَلوٰتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ☆ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ☆ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّکٰوةِ فٰعِلُوْنَ ☆ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ☆ اِلَّا عَلٰی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ ☆ فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ☆ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ ☆ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ☆ ﴾

بے شک کامیاب ہوئے ایمان والے جو اپنی نماز میں گڑگڑاتے ہیں، اور وہ جو کسی بیہودہ بات کی طرف التفات نہیں کرتے۔ اور وہ کہ زکوۃ دینے کا کام کرتے ہیں۔ اور وہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ مگر اپنی بیبیوں یا شرعی باندیوں پر جو ان کے ہاتھ کی ملک ہیں کہ ان پر کوئی علامت نہیں، جو ان دو کے سوا کچھ اور چاہے وہی حد سے بڑھنے والے ہیں۔ اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی رعایت کرتے ہیں۔ اور وہ جو اپنی نمازوں کی نگہبانی کرتے ہیں۔

یعنی ان تیس چیزوں کا حکم اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو دیا تو آپ نے ان کو پورا کر کے کامیابی حاصل کی۔

کلمات سے مراد مناسک حج:

" واذا کلف ابراهیم علیه السلام ربه بمناسک الحج ای بمواضع العبادة المتعلقة بالحج واقامة ما یلیق بکل موضع من العبادة کالطواف والسعی ورمی الجمار والاحرام والوقوف بعرفة و مزدلفة وغیره ذلک فاداهن تامات کاملات من غیر نقصان "(شیخ زاده)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آپ کے رب نے مناسک حج کی تکلیف دی یعنی وہ عبادت جو حج سے متعلق ہے اس کے مقامات کے متعلق حکم دیا کہ ہر فعل کو اسی کے مناسب مقام میں ادا کیا جائے، طواف اور سعی اور جمرات کو کنکریاں مارنے، اور احرام اور مقام عرفات پر ٹھہرنے، اور مزدلفہ میں رات گذارنے، وغیرہا کا حکم دیا آپ نے ان تمام عبادات کو رب تعالیٰ کے حکم کے مطابق کامل طور پر ادا کیا۔ ہر ایک کو اپنے اپنے محل میں ادا کیا، ان میں کوئی نقص نہیں آنے دیا۔

یعنی ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ان کاموں کے مکمل طور پر ادا کرنے کا حکم دے کر آزمایا آپ اس آزمائش میں پورے اترے۔

کلمات سے مراد دس سنن:

یہی وہ چیزیں ہیں جن کو کہا جاتا ہے یہ سنت ابراہیمی ہیں۔

ان دس چیزوں میں پانچ کا تعلق سر سے ہے۔ مونچھوں کا کٹانا، کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، مسواک کرنا، اور سر کے بالوں میں مانگ نکالنا۔

اور پانچ کا تعلق باقی جسم سے ہے۔ ناخن کاٹنا، زیر ناف بال مونڈنا، ختنہ کرانا، بغل کے بال اکھیڑنا، اور پیشاب پاخانہ کے مقام کو دھونا، یعنی استنجاء کرنا، ان کی تفصیل ان شاء اللہ قریب ہی ذکر کی جائے گی۔

تنبیہ: علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا" وبالعشر التی هی من سننه " کہ کلمات سے مراد یہ بھی ہے کہ آپ کو دس چیزوں سے آزمایا جو آپ کی سنتیں ہیں۔ اسی کے مطابق راقم نے عنوان قائم کر دیا ہے۔ ورنہ یہی دس چیزیں خود حضرت ابراہیم علیہ السلام پر فرض تھیں، البتہ ہمارے لئے سنت ہیں۔ یعنی نبی کریم ﷺ نے بھی ان پر عمل کیا، اس لئے ہمارے لئے سنت مصطفیٰ ﷺ بھی ہیں، اور سنت ابراہیمی بھی ہیں۔

اس کو یوں ہی سمجھیں جیسا کہ نبی کریم ﷺ کے لئے تہجد کی نماز واجب تھی اور ہمارے لئے مستحب ہے، ہم اسے اپنے حق میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ تہجد کی نماز نبی کریم ﷺ کی سنت (غیر مؤکدہ) ہے۔

شاندار تحقیق:

اسی مسئلہ کی غزالیٔ دوراں حضرت علامہ سیّد احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ نے شاندار تحقیق فرمائی ہے۔
اسی کو اپنی اس کاوش کا حصہ بنا رہا ہوں آیئے دیکھئے کیا خوب فرمایا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''دس چیزیں فطرت سے ہیں''

اسی حدیث کے ہم معنی حدیث حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ دس قسم کی طہارتوں سے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش فرمائی۔

اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ یہ سب کام ابراہیم علیہ السلام پر فرض تھے ہمارے لئے سنت ہیں۔ تفسیر خازن میں ہے۔ علماء نے فرمایا ''فطرۃ'' کے معنی سنت ہیں یعنی یہ سب کام انبیاء علیھم الصلوٰۃ والسلام کی سنتوں میں سے ہیں۔

بعض نے کہا ''فطرۃ'' سے مراد ملت ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ''فطرۃ'' سے طریقہ مراد ہے۔
(خازن ص۷۹ ج۱)

علامہ نووی نے شرح مسلم میں اسی حدیث کے تحت فرمایا کہ ''فطرۃ'' دین کو کہتے ہیں۔
(مسلم ص۱۲۸ ج۱)

تنبیہ ضروری: ''فطرۃ'' کے بیان میں جو چار قول ہم نے نقل کئے ہیں وہ سب متقارب المعنی (قریب معنی والے) ہیں۔

ان میں تعارض سمجھنا صحیح نہیں۔ البتہ یہ بات ضرور سمجھنے کے لائق ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو جن کاموں سے آزمایا گیا وہ سب ''فطرۃ'' سے ہیں۔ اور انبیاء کرام کو طبائع مقدسہ فطری امور سے مانوس رہتی ہیں۔ بالخصوص ایسے امور جن کا تعلق کمال طہارت و نظافت سے ہو اور حسن صورت و سیرت کا ان سے گہرا تعلق ہو۔

ایسی صورت میں یہ بات بعید از فہم ہو جاتی ہے کہ سب سے پہلے ابراہیم علیہ السلام نے یہ دس کام کئے یعنی ان سے پہلے کسی نبی یا رسول نے ان کاموں میں سے کوئی کام نہیں کیا، نہ لبیں ترشوائیں، نہ پانی سے استنجاء کیا، نہ ناف کے نیچے بال صاف کئے، نہ کلی کی، نہ ناک میں پانی ڈالا، نہ ناخن کٹوائے، ایک

ادنی مسلمان بھی جانتا ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ظاہری و باطنی پاکیزگی سے متصف ہوتے ہیں۔ ان کی طبیعتیں عام لوگوں کے طبائع سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ ان میں اعلیٰ درجہ کی طہارت و نظافت پائی جاتی ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ان پاکیزہ خصلتوں سے محروم رہے ہوں؟

لہٰذا یوں کہنا چاہئے کہ ہر نبی ان خصائل حمیدہ سے متصف تھا، اور اس نے اپنی طبیعت مقدسہ کے تقاضے کے مطابق طہارت و نظافت کے یہ سب کام کئے مگر ان خصائل پر عمل کرنا ان میں سے کسی پر فرض نہ تھا، حکمت ابتلاء کے لئے ان امور خاصہ کی فرضیت سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ہوئی اور وہ ان فرائض پر اس خوبی کے ساتھ عمل پیرا رہے کہ آزمائش میں کامیاب ہو گئے ان سے پہلے کسی نبی کی آزمائش ان امور کے ساتھ نہ ہوئی تھی۔

یہ نہیں کہ ان سے کسی نبی کے عمل میں یہ پاکیزہ خصائل نہ پائے گئے ہوں۔ خصائل حمیدہ کے اعتبار سے ابراہیم علیہ السلام اور ان سے پہلے انبیاء کرام میں صرف اتنا فرق تھا کہ ابراہیم علیہ السلام ابتلاء کے بعد بطور فرض یہ کام کرتے تھے، اور ان سے پہلے انبیاء علیہم السلام محض اپنی طبیعت مقدسہ کے تقاضے سے ان پاکیزہ کاموں کو بجالاتے تھے۔ (التبیان مع البیان للکاظمی)

ابراہیم علیہ السلام سے تمام امتحان لئے گئے:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے امتحان کے متعلق جتنے اقوال کلمات کے متعلق ذکر کئے گئے ہیں، وہ تمام امتحانات ہی آپ سے لئے گئے جن پر آپ پورے اترے۔

''کلمات'' کی تفسیر میں مختلف اقوال کو ذکر کرنے کے بعد علامہ قرطبی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں

" وهذه الاقوال ليست بمتناقضة لان هذا كله مما ابتلى به ابراهيم عليه السلام " (قرطبی)

ان تمام اقوال میں کوئی تعارض نہیں، کیونکہ ان تمام چیزوں سے ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا گیا۔

ابراہیم علیہ السلام کے امتحانات قبل از نبوت ہوئے یا بعد از نبوت؟

" قيل كان قبل النبوة بدليل قوله فى سياق الآية انى جاعلك للناس اماما "

بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ امتحان نبوت سے پہلے تھے، اس لئے کہ بعد میں آ رہا ہے کہ ''بیشک میں بنانے والا ہوں تمہیں لوگوں کا امام'' جب امتحان سبب ہے آپ کو امامت کے عطاء کرنے کا تو سبب پہلے ہوگا۔ اور مسبب بعد میں ہوگا۔

"وقیل بل کان هذا الابتلاء بعد النبوة لان التكليف لا يعلم الا من جهة الوحي الالهي وذلک بعد النبوة"

اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ آپ کے یہ امتحان نبوت کے بعد تھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آنے کے بعد ہی آپ کو ان امور کی تکلیف دی جا سکتی تھی، اور وحی کا آنا یقیناً نبوت کے بعد ہوتا ہے۔

شاندار محاکمہ:

"والصواب ان فسر الابتلاء بالكوكب والقمر والشمس كان ذلک قبل النبوة وان فسر بما وجب عليه من شرائع الدين كان ذلک بعد النبوة"

صحیح بات یہ ہے کہ ستارے اور چاند اور سورج کا امتحان نبوت سے پہلے تھا اور باقی امور شرعیہ جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ان کا امتحان بعد از نبوت کے تھا۔ (خازن)

راقم کا مؤقف:

راقم کا موقف یہ ہے کہ جب امتحان صرف اس لئے تھا کہ لوگوں کو آپ کی شان کا پتہ چل جائے کہ آپ کو منازل رفیعہ حاصل ہیں تو واقعی آپ اس قابل ہیں کہ آپ اتنی عظیم آزمائشوں میں پورے اترے ہیں۔

امتحان لینے کا یہ مقصد ہی نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کو پتہ نہیں تھا تو امتحان لے کر آپ کی شان کا پتہ چلایا کہ اس قابل ہیں اور یہ بات بھی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ منصب نبوت کے لئے امتحان نہیں لیا کرتا، بلکہ وہ بغیر امتحان کے ہی جانتا ہے کہ یہ منصب نبوت کے قابل ہے رب تعالیٰ کا اپنا ارشاد گرامی ہی اس پر واضح دلیل ہے۔ " الله اعلم حيث يجعل رسالته "اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ جانتا ہے کہ منصب نبوت کے قابل کون ہے۔

پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ﴿ وَاِذِابْتَلٰی ﴾ پر مرتب ﴿فَاَتَمَّھُنَّ﴾ ہے۔یعنی مقصد واضح ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام کوان کے رب نے چند باتوں سے آزمایا،توانہوں نے ان کو پورا کیا۔

امتحان کسی صورت میں بھی منصب نبوت عطاء کرنے کا سبب نہیں،اور بظاہر عربی کا کوئی لفظ بھی ایسا نہیں جواس ترتب پر دلالت کرے۔

قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَہۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ

کہا بے شک میں بنانے والا ہوں تمہیں لوگوں کا امام،کہااور میری اولاد سے،کہا نہیں پہنچتا میرا وعدہ ظالموں کو۔

امام لغوی معنی کے لحاظ سے عام ہے:

" والامام هو الذی یؤتم به "امام وہ ہےجس کے اقتداء کی جائے۔(خازن)

نیکی میں کسی کی اقتداء کی جائے یا برائی میں کسی کی اقتداء کی جائے وہ امام ہی ہے۔

رب تعالیٰ نے حضرت ابراہیم،حضرت اسحاق،حضرت یعقوب اور حضرت لوط علیھم السلام کا پہلے ذکر کیا،اس کے بعد فرمایا۔

" وجعلنا هم ائمة یهدون بامرنا و اوحینا الیهم فعل الخیرات واقام الصلوة وایتاء الزکوة وکانوا لنا عابدین "

اور ہم نے انہیں امام بنایا کہ ہمارے حکم سے ہدایت دیتے ہیں۔اور ہم نے وحی کی ان کی طرف اچھے کام کرنے کی اور نماز قائم کرنے کی اور زکوۃ دینے کی،اور وہ ہماری بندگی کرتے ہیں۔

یعنی اس مقام پر''ائمۃ'' کا اطلاق انبیاء کرام پر ہے،اور امامت سے مراد نبوت ہے۔

☆ اور دوسرے مقام پر،پہلے فرعون اور ہامان کا ذکر کیا،اس کے بعد ارشاد فرمایا﴿ وَجَعَلۡنٰـھُمۡ اَئِـمَّۃً یَّدۡعُوۡنَ اِلَی النَّارِ وَیَوۡمَ الۡقِیٰـمَۃِ لَا یُنۡصَرُوۡنَ ﴾ اور ہم نے بنایا ہےان کوامام جو آگ کی طرف بلاتے ہیں،اور قیامت کے دن ان کی امداد نہیں کی جائے گی۔اس آیۃ میں

''ائمہ'' کا ذکر کفار پر ہے، اور امامت سے مراد کفر کی طرف راہنمائی ہے۔

☆ خلفاء کو بھی امام کہا گیا ہے۔" **لانهم رتبوا فی المحل الذی یجب علی الناس اتباعهم وقبول قولهم واحکامهم** "

اس لئے کہ وہ بھی جو احکام نافذ کرتے ہیں جب وہ شریعت کے مطابق ہوں تو لوگوں پر لازم ہوتا ہے کہ ان کے اقوال کو اور احکام کو قبول کریں۔

☆ **والقضاة والفقهاء ایضا ائمة لهذا المعنی** " اسی معنی کے لحاظ پر قاضیوں اور فقہاء کرام کو بھی امام کہا گیا ہے کہ ان کے اقوال اور احکام پر لوگوں کو عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔

☆ اسی وجہ سے جو شخص نماز پڑھائے اسی بھی امام کہا جاتا ہے کیونکہ جو شخص اس کی نماز میں داخل ہو اس پر لازم ہو جاتا ہے۔ کہ وہ اس کی اقتداء کرے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

''**انما جعل الامام اماما لیؤتم به فاذا رکع فارکعوا واذا سجد فاسجدوا ولا تختلفوا علی امامکم** ''

امام کو امام اس لئے بنایا جاتا ہے، کہ اس کی اقتداء کی جائے، جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو، اور جب وہ سجدہ کرے تم بھی سجدہ کرو، اور اپنے امام کی مخالفت نہ کرو۔

ابھی تک جو بحث ذکر کی گئی ہے اس سے یہ واضح ہوا کہ امام عام ہے خواہ وہ سیدھی راہ کی ہدایت کرے اور لوگ اس کی اقتداء کریں، یا غلط راہ کی ہدایت کرے کہ لوگ اس کی اقتداء کریں، لیکن مطلقاً امام سے مراد سیدھی راہ کی ہدایت کرنے والا ہی ہے یہ اس طرح ہے جیسا کہ۔

"اسم الا له لایتناول الا المعبود الحق فاما المعبود الباطل فانما یطلق علیه اسم الا له مع القید "

" الــه " کا لفظ معبود حق پر مطلقاً بولا جاتا ہے، لیکن اگر اس کے ساتھ کوئی قید بڑھا دی جائے تو معبود باطل پر بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ " **فانظر الی الهک الذی ظلت علیه عاکفا** " اور دیکھ اپنے اس معبود کی طرف جس کے سامنے تو دن بھی آسن مار رہا ہے۔ اس آیۃ میں سامری کو خطاب ہے، اسی کے بنائے ہوئے بچھڑے معبود کا ذکر ہے، لیکن مطلقاً " الــه " ذکر نہیں، بلکہ مقید طور پر ذکر ہے۔ تو اپنے الٰہ کو دیکھ۔

زیر بحث آیت میں امام سے مراد کیا؟

جب ثابت ہو گیا کہ امام کا لفظ تو مطلقاً راہنمائی کرنے والوں کو شامل ہے جن کی اقتداء کی جائے ،اور یہ بات بھی ثابت ہے کہ انبیاء کرام امامت کا اعلیٰ مرتبہ رکھتے ہیں۔

" وجب عمل اللفظ ههنا عليه "تو واجب ہے کہ اس آیۃ میں "امام" سے مراد، نبی ہی ہے۔

اور وجہ یہ بھی واضح ہے کہ رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ میں امامت کا ذکر مقام احسان میں کیا ہے۔ اور احسان میں نعمت عظمیٰ کا ذکر ہی ضروری ہے، وہ عظیم نعمت نبوت ہے۔ " فوجب حمل هذه الامامة على النبوة " اس لئے ضروری ہے کہ اس آیۃ کریمہ میں امامۃ سے مراد نبوۃ ہی لی جائے۔
(ماخوذ از کبیر)

"والمراد بالامامة ههنا النبوة او ما هوا عم منه اعنى من يؤتم به ويجب اطاعته وليس المراد به السلطنة والامامة بالمعنى الذى اخترعه الامامية وليس له فى اللغة والشرع اصل "

اس آیۃ کریمہ میں امامۃ سے مراد نبوۃ ہے، یا اس سے عام معنی مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ امام سے مراد اس مقام میں وہ امام ہے جس کی اقتداء کی جائے۔

امامۃ سے مراد نہ سلطنت ہے، اور نہ ہی وہ خاص امامۃ کا معنی مراد ہے جو امامیہ (یعنی شیعہ حضرات) نے گھڑ لیا ہے اس معنی کا لغت اور شرع میں کوئی وجود نہیں۔ (مظهری)

ابراہیم علیہ السلام کی امامت عامہ کا تقاضا نبوت:

رب تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ﴿ للناس اماما ﴾ اس پر دلالت کرتا ہے کہ آپ کو تمام لوگوں کا امام بنایا گیا تھا۔ جس ذات کا یہ مقام اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مستقل رسول ہو،
" لانه لو كان تبعا لرسول آخر لكان ماموما لذلك الرسول لا اماما له فحينئذ يبطل العموم "

اسلئے کہ اگر وہ کسی اور رسول کا تابع ہو تو یہ ماموم (مقتدی) ہو گا۔ امام وہ دوسرا ہو گا۔ اسکی امامت عامہ باطل ہو گی۔ لہذا واضح ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کی امامت عامہ آپ کی نبوت کا تقاضا کرتی ہے۔
(کبیر)

نبی کا معصوم ہونا ضروری ہے:

رب تعالیٰ نے جب نبی کو امام کہا ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ امام وہ ہوتا ہے جس کی اقتداء کی جائے تو اس سے واضح ہو گیا کہ نبی کا معصوم ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ اگر نبی گنہگار ہو جائے۔ " **فیلزم ان یجب علینا فعل المعصیة** " تو ضروری ہوگا کہ ہم بھی معصیت میں اس کی اقتداء کریں کیونکہ نبی تو امام ہے۔ لیکن معصیت میں اقتداء کرنا حرام اور محال ہے تو پتہ چلا کہ نبی کا معصوم ہونا ضروری ہے۔ (کبیر)

قَالَ وَ مِنۡ ذُرِّيَّتِىۡ : (کہا اور میری اولاد میں سے) رب تعالیٰ نے جب فرمایا کہ میں تمہیں امام بنانے والا ہوں، تو ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا ﴿ وَمِنۡ ذُرِّيَّتِىۡ ﴾ **یدل علی انه علیه السلام طلب ان یکون بعض ذریته ائمة للناس**"

اور میری اولاد میں سے۔ یہاں " من " تبعیض کے لئے ہے، گویا کہ آپ نے دعاء ہی یہ کی کہ اے اللہ میری اولاد میں سے بھی بعض کو منصب نبوت عطاء کرنا، آپ کی اس دعاء کو کامل طور پر قبول کر لیا گیا کہ آپ کی اولاد میں سے مؤمنین جو نبوت کے لائق تھے ان کو نبی بنا لیا گیا۔ ان میں سے جلیل القدر حضرات یہ ہیں۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت ہارون، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت ایوب، حضرت یونس، حضرت زکریا، حضرت یحییٰ، حضرت عیسیٰ، اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہم وسلم۔

نبی کریم ﷺ آپ کی اولاد میں سے ہیں۔ جو افضل الانبیاء، افضل الائمہ ہیں۔ (کبیر)

یہ بھی خیال رہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد آنے والے سارے انبیاء کرام ہی آپ کی اولاد سے ہیں۔

قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ : کہا نہیں پہنچتا میرا عہد ظالموں کو۔

جب ابراہیم علیہ السلام نے رب کے حضور عرض کیا کہ میری اولاد میں سے بھی بعض کو نبی بنانا تو رب تعالیٰ نے بھی آپ کی دعاء کو قبول کرلیا۔ اور ساتھ یہ بھی بتادیا کہ میرا یہ وعدہ ظالموں کو حاصل نہیں ہوگا۔

" لایکون جوابا عن ذلک السوال الا اذا کان المراد بهذا العهد تلک الامامة "

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اولاد میں سے بعض کی نبوت کا سوال کیا تو آپ کو جواب جب یہ دیا گیا ﴿ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ﴾ تو اسی سے پتہ چل گیا کہ عہد سے مراد امامت یعنی نبوت ہے، تاکہ رب تعالیٰ کا جواب آپ کے سوال کے مطابق ہو۔ (کبیر)

نکتہ: ﴿ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظَّالِمِیْنَ ﴾ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ رب تعالیٰ نے آپ کو یہ بتادیا کہ آپ کی بعض اولاد کو نبی بنادیا جائے گا، کیونکہ اگر یہ مطلب نہ ہوتا تو جواب صرف " لا " ہوتا یا جواب یہ ہوتا" لاینال عهدی ذریتک " کہ میرا وعدہ تمہاری اولاد کو نہیں پہنچے گا۔

لیکن یہ جواب نہیں دیا گیا، بلکہ کہا گیا کہ ’’میرا وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچے گا‘‘ تو واضح کردیا کہ غیر ظالم جو منصب رسالت و نبوت کے اہل ہوں گے ان کو ضرور نبی بنادوں گا۔ (کبیر)

فائدہ جلیلہ :

یہاں مقام توجہ یہ ہے۔" افما کان ابراهیم علیه السلام عالما بان النبوة لاتلیق بالظالمین قلنا بلی " کہ ابراہیم علیہ السلام کو کیا یہ معلوم تھا کہ نبوت ظالموں کو نہیں مل سکتی یا آپ کو علم نہیں تھا؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ علم حاصل تھا، کہ نبوت ظالموں کو نہیں مل سکتی اور یہ عقل کا تقاضا ہے کہ جب عام آدمی کو یہ پتہ ہے کہ نبی ظالم نہیں ہوسکتا تو نبی کو یہ علم نہ ہو، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔

اب اس پر بظاہر یہ سوال ہوتا ہے کہ آپ نے رب تعالیٰ سے مطلق اولاد کا سوال ہی کیوں کیا ہے۔ یہ سوال کیوں نہیں کیا کہ اے اللہ میری اولاد سے مومنوں کو نبوت عطاء کر۔

تو اس کا جواب یہ ہے۔ " ولکن لم یعلم حال ذریتہ " کہ آپ نے سوال ہی بعض اولاد کے متعلق کیا، لیکن آپ نے اس طرف توجہ نہ کی کہ میری اولاد میں سے بعض ظالم بھی ہوں گے۔

تو رب تعالیٰ نے بیان فرما دیا کہ آپ توجہ فرمائیں، آپ کی اولاد میں سے بعض ظالم بھی ہوں گے، ظالموں کو میرا وعدہ نبوت نہیں پہنچے گا۔ (از کبیر)

خیال رہے کہ " لم یعلم " کا معنی ہے " لم یلتفت لیعلم " آپ نے توجہ نہیں فرمائی کہ جانتے۔

شیعہ اور امامت:

شیعہ حضرات کا قول یہ ہے کہ کوئی امام اس وقت تک امام نہیں ہوسکتا جب اس کی امامت پر نص نہ آئے اللہ تعالیٰ بیان فرمائے کہ یہ امام ہے تو وہی امام ہوسکتا ہے۔ اس آیۃ کریمہ سے بھی یہی سمجھ آیا۔

اور ﴿ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ﴾ سے بھی یہی سمجھ آتا ہے کہ منصب خلافت بغیر نص کے حاصل نہیں ہوسکتا۔ ہم کہتے ہیں یہ غلط ہے، کیونکہ اس آیۃ میں امامۃ سے مراد ہی نبوۃ ہے۔ شیعہ حضرات کی امامۃ مراد ہی نہیں۔ اگر ہم تسلیم کر ہی لیں کہ اس آیۃ میں امامت سے مراد مطلق امامت ہے تو ہم کہیں گے کہ آیت تو طریق امامت ثابت کر رہی ہے۔ اس میں تو کوئی نزاع نہیں۔

" انما النزاع فی انه هل تثبت الامامة بغیر النص ولیس فی هذه الآیة تعرض لهذه المسئلة لا بالنفی ولا بالاثبات "

نزاع اس بات میں ہے کہ نص کے بغیر امامت ہمارے نزدیک ثابت ہوسکتی ہے۔ شیعہ کے نزدیک نہیں۔ اس آیۃ میں اس مسئلہ کی نفی یا اثبات کو بیان ہی نہیں کیا گیا۔ (کبیر)

شیعہ حضرات کی طرف سے اعتراض:

حضرت ابوبکر صدیق و حضرت عمر فاروق و حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کی خلافتوں پر انکے اعتراض یہ ہیں کہ یہ لوگ کفر سے حالت ایمان کی طرف آئے ہیں۔ کافر ظالم ہوتا ہے، معصوم نہیں ہوتا۔ جب رب تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میرا وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچتا تو واضح ہوا کہ یہ لوگ امامت کے مستحق نہیں تھے۔

جواب: جب پہلے واضح طور پر بیان کیا جاچکا ہے کہ اس آیۃ میں " امامة " سے مراد "نبوة" ہے تو ان حضرات کی خلافت پر اس آیۃ کریمہ سے اعتراض کا مقصد ہی اپنی جہالت کا اظہار کرنا ہے۔

یہ صرف نبی کے لئے ضروری ہے کہ وہ نبوت سے پہلے بھی گناہوں سے پاک ہو، خلیفہ کے لئے یہ حکم ثابت کرنا درست نہیں۔

دوسرا جواب: " ان التائب عن الکفر لایسمی کافرا " جو شخص کفر سے توبہ کر لے اسے پھر بھی کافر کہنا اور ظالم کہنا ہی ظلم ہے۔ مؤمن کو کافر کہنے والا اپنی جان پر ظلم کر رہا ہے اور اپنی عاقبت برباد کر رہا ہے۔

اسی طرح " والتائب عن المعصیة لایکون عاصیا " گناہوں سے توبہ کرنے والا عاصی (گنہگار) نہیں رہتا۔ رب تعالیٰ نے جو ارشاد فرمایا ﴿ وَلَاتَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ﴾ ظالموں کی طرف میلان نہ کرو تمہیں آگ مس کرے گی۔ اس آیۃ میں جو ظالموں کی طرف میلان کرنے سے منع کیا گیا، اور اگر اس میلان سے انسان باز نہ آئے تو وہ جہنم کے عذاب کا مستحق ہوگا، اس بیان کا مطلب بھی یہ ہے۔ " فانه نهى عن الركون اليهم حال اقامتهم على الظلم " کہ مومنوں کو ظالموں کی طرف میلان کرنے سے روکا گیا ہے، کہ جب تک وہ ظلم پر قائم ہیں اس وقت تک ان کی طرف میلان نہ کرو۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی توبہ کے بعد بھی تم ان کی طرف میلان نہیں کر سکتے، اور توبہ کے بعد وہ ظالم ہی رہیں گے۔

اور رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ﴾ (احسان کرنے والوں پر کوئی گرفت نہیں) اس کا مطلب بھی یہ ہے، " ما اقاموا على الاحسان " جب تک وہ احسان پر قائم ہیں۔ اس کا بھی یہ مطلب نہیں کہ کوئی شخص بدقسمتی سے احسان کو چھوڑ دے، معصیت کا مرتکب ہو جائے تو پھر اس کی گرفت نہیں۔

غرضیکہ نیک لوگوں کیلئے جس اجر و ثواب کا ذکر ہے اس کا تعلق ان کا اس نیکی پر قائم رہنے سے

ہے، اگر وہ نیکی کو چھوڑ کر معصیت کے مرتکب ہو جائیں تو اس کے بعد ان کا وہ مرتبہ موجود نہیں رہے گا۔

اسی طرح ظالموں کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے انعام سے محرومیت کا جو وعدہ کر رکھا ہے اس کا تعلق بھی ان کے ظلم کے دور سے ہے۔ جو شخص توبہ کر لے جب اس کو ظالم کہنا ہی گناہ ہے وہ ظالم رہتا ہی نہیں تو اس کو رب تعالیٰ کے انعام سے محروم قرار دینا جہالت نہیں تو اور کیا ہے۔ حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔

(ماخوذ از کبیر)

مسئلہ : فاسق حالت فسق میں خلیفہ (مسلمانوں کا حاکم) بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا، البتہ بعد میں فاسق ہو جائے تو دیکھا جائے اگر اس کا فسق اس کی ذات تک محدود ہے دوسرے لوگوں کو شریعت سے دور نہیں کیا جا رہا تو وہ خود بخود معزول تو نہیں ہوا البتہ اسے خلافت کو چھوڑ دینے کے متعلق کہا جائے، اور اگر اس کا فسق دوسروں کو بھی غرق کر رہا ہے۔ ان کو بھی فاسق بنا رہا ہے۔ وہ شرعاً خود بخود معزول ہو جاتا ہے۔ اگر خود بخود اپنے عہدہ سے نہ ہٹے تو مسلمان اسے خود بخود ہٹا دیں۔

اس مسئلہ کی زیادہ تفصیل پہلے ﴿اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ کی وضاحت کے ضمن میں گذر چکی ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک:

بعض لوگوں نے یہ کہا تھا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے۔

" انه يجوز كون الفاسق اماما و خليفة ولا يجوز كون الفاسق قاضيا "

کہ فاسق کا امام اور خلیفہ ہونا جائز ہے۔ اور فاسق کا قاضی بننا جائز نہیں۔

" وهذا خطأ ولم يفرق ابوحنيفة بين الخليفة والحاكم في ان شرط كل واحد منهما العدالة وكيف يكون خليفة وروايته غير مقبولة واحكامه غير نافذة "

ابوبکر رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام صاحب کی طرف یہ منسوب کرنا اور یہ کہنا کہ ان کا یہ مسلک ہے۔ "یہ غلط ہے" امام صاحب رحمہ اللہ نے خلیفہ و حاکم اور قاضی کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا، بلکہ آپ کے نزدیک ہر ایک کا عادل ہونا مشروط ہے۔ جو شخص عادل نہیں وہ خلیفہ نہیں بن سکتا، اس کی

روایت مقبول نہیں اور اس کے احکام نافذ نہیں۔

اس مسئلہ پر ائمہ اور علماء کا اتفاق ہے:

" فثبت بدلالة الآية بطلان امامة الفاسق قال عليه السلام " " لاطاعة لمخلوق فى معصية الخالق " ودل ايضا على ان الفاسق لايكون حاكما ، وان احكامه لاتنفذ اذا ولى الحكم ، وكذلك لاتقبل شهادته ولاخبره اذا اخبره اذا اخبر عن النبى ﷺ ، ولا فتياه اذا أفتى ، ولايقدم للصلوة ، وان كان هوبحيث لواقتدى به فانه لاتفسد صلوته "

اس آیۃ کریمہ سے یہ ثابت ہوا کہ فاسق کی امامت (نبوت) باطل ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔

" خالق کی نافرمانی کر کے مخلوق کی طاعت وفرمانبرداری نہ کی جائے۔"

اسی آیۃ سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ فاسق حاکم نہیں بن سکتا، اور نہ ہی اس کا کوئی حکم جاری ہو سکتا ہے۔ مطلب واضح ہے کہ اگر کوئی فاسق زبردستی حاکم بن جائے تو اس کے احکام کو تسلیم نہ کیا جائے۔

اسی طرح فاسق کی گواہی قبول نہ کی جائے۔ اور اگر فاسق نبی کریم ﷺ کی طرف سے کوئی خبر دے تو اسے قبول نہ کیا جائے۔ اور فاسق اگر کوئی فتوی دے تو اس کے فتوی کو قبول نہ کیا جائے، اور فاسق کو نماز کیلئے امام بنا کر آگے نہ کیا جائے، ہاں اگر فاسق کی اقتداء میں نماز ادا کر لی تو فریضہ ادا ہو جائیگا، اگر چہ وہ نماز ناقص ہوگی اسے لوٹانا واجب ہے۔ یعنی مکروہ تحریمی ہے کہ فاسق کے پیچھے نماز پڑھی جائے۔ (ماخوذ از کبیر)

آیۃ کریمہ سے عصمت انبیاء ثابت ہے:

اگر آیۃ کریمہ میں امامۃ سے مراد عام امامت لیں تو پھر بھی واضح ہے کہ ہر نبی امام ہوتا ہے۔ امام کے لئے دوسروں سے اولیٰ (بہتر) ہونا ضروری ہے۔ اگر نبی گنہگار ہو تو دوسروں سے گھٹیا ہوگا تو وہ نبی بننے کے قابل نہیں ہوگا۔

اور آیۃ کریمہ میں امامۃ سے مراد نبوت ہو جیسا کہ مفسرین کرام کا اتفاق ہے تو اس سے بھی واضح ہے کہ نبوت ظالم اور فاسق کو نہیں مل سکتی، لہٰذا نبی کا معصوم ہونا ضروری ہے۔ (از کبیر)

فائدہ عظیمہ :

''عہد'' کے لفظ سے ایک عظیم فائدہ یہ حاصل ہوا کہ رب تعالیٰ کا اپنے بندوں سے وعدہ ہے اور بندوں کا رب تعالیٰ سے وعدہ ہے، اسی لئے رب تعالیٰ نے فرمایا﴿ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ﴾ اور پورا کرو میرا وعدہ میں پورا کروں گا تمہارا وعدہ۔

بندوں کا رب تعالیٰ سے وعدہ '' لیس الا عهدا لخدمة و العبودية '' صرف اسی کی ذات کی عبادت کرنا، اور اسی کی خدمت کو بجالانا ہے۔

اور رب تعالیٰ کا اپنے بندوں سے وعدہ '' ليس الا عهدا الرحمة و الربوبية '' اپنی کریمی کے پیش نظر بغیر لازم ہونے کے یہ ہے کہ اے میرے بندوں میں تم پر رحم کروں گا اور تم میری ربوبیت سے فائدہ حاصل کرو گے۔

اب کوئی عقلمند شخص جب معمولی تفکر کرے تو اس پر یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی کہ بندوں نے اپنا وعدہ توڑ دیا (الا ما شاء الله) اور رب تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا فرمادیا۔

اس کو یوں سمجھیں '' کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کر کے، اسے زندگی عطاء کر کے، اور اسے عقل عطاء کر کے، اور اعضاء عطاء کر کے عظیم انعامات سے نوازا۔

اور تمام انعامات کا اصل مقصد یہ ہے کہ اے انسان تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت، خدمت اور عبادت میں مشغول ہو جا۔

رب تعالیٰ نے فرمایا﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ ﴾ میں نے جنوں اور انسانوں کو نہیں پیدا فرمایا، سوائے اس کے کہ وہ میری عبادت کریں۔

اور رب تعالیٰ کا مخلوق کو پیدا کرنا بے مقصد نہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا﴿ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا بَاطِلًا ﴾ اور ہم نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان چیزوں کو بے مقصد پیدا نہیں کیا۔

پھر مقصد واضح کر دیا کہ انسانوں اور جنوں کو پیدا کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ رب تعالیٰ کی عبادت کریں۔

" فھو سبحانہ وفی بعھد الربوبیۃ حیث خلقک واحیاک وانعم علیک بوجوہ النعم وجعلک عاقلا ممیزا "

اے انسان رب تعالیٰ نے تجھے پیدا کر کے اور تجھے زندگی عطاء کر کے اور تجھے بے شمار نعمتیں عطاء کر کے، اور تجھے عقل وتمیز عطاء کر کے اپنی ربوبیت کا وعدہ پورا فرما دیا۔

" فاذا لم تشتغل بخدمتہ وطاعتہ و عبودیتہ فقد نقضت عھد عبودیتک "

جب اے انسان تو رب تعالیٰ کی خدمت بجا نہیں لائے گا، اس کی اطاعت نہیں کرے گا، اور اس کی عبادت نہیں کرے گا، تو تو نے اپنے مالک سے کئے ہوئے وعدہ عبودیت کو توڑ دیا ہے۔

ایک اور وجہ دیکھیں:

رب تعالیٰ کا اپنے بندوں سے وعدہ ہے کہ وہ توفیق اور ہدایت عطاء فرمائے گا۔ اور بندوں کا رب تعالیٰ سے یہ وعدہ ہے کہ وہ اس کی عبادت میں کوشش کریں گے۔ اور عمل میں اجتہاد کریں گے۔

رب تعالیٰ نے تو اپنا وعدہ پورا کر دیا کہ ہر ذرہ ذرہ کو اے انسان تیرے لئے ہادی بنا دیا۔ جو تجھے راہ حق کی ہدایت کر رہے ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ﴿ وَاِنۡ مِّنۡ شَىۡءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمۡدِهٖ ﴾ کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتحمید بیان نہ کرتی ہو۔" وانت ما وفیت البتۃ بعھد الطاعۃ والعبودیۃ " لیکن اے انسان تو نے رب قدوس کے ساتھ طاعت وعبودیت کے وعدہ کو پورا نہیں کیا۔

ذرا اور توجہ: اے انسان اللہ تعالیٰ نے تجھے عظیم نعمت عطاء کی یعنی دولت ایمان سے مالا مال کیا

" لو فاتتک ھذہ النعمۃ لکنت اشقی الاشقیاء ابد الآبدین ودھر الداھرین "

اگر تم سے یہ نعمت ایمان (العیاذ باللہ) فوت ہو جائے تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سب بدبختوں سے

زیادہ بدبخت ہو جائے گا۔

پھر یہ نعمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہے، کیونکہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وما بکم من نعمۃ فمن اللہ ﴾ جو بھی نعمت تمہیں حاصل ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں پر شکر کرنے کا حکم دیا، اگر کسی کو شکر کرنے کی توفیق حاصل ہوگئی اور اس نے عبادت کی اور ذات باری تعالیٰ کی اطاعت کی تو اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اس قسم کے لوگ بہت کم ہی ہوتے ہیں۔

لیکن اگر کفرانِ نعمت کیا، یعنی رب تعالیٰ کی عبادت نہ کی، اس کی اطاعت سے منہ موڑ لیا، تو اس نے رب تعالیٰ سے کئے ہوئے اپنے وعدہ کو توڑ دیا، اور اپنی عاقبت کو برباد کر لیا ﴿ قُتِلَ الْاِنسانُ ما اَکْفَرَہ ﴾ انسان کفرانِ نعمت کی وجہ سے برباد ہو گیا۔

اسی مسئلہ پر اور دلیل: اے انسان تیرے ساتھ رب کا وعدہ یہ ہے کہ میں تمہیں نعمتیں عطاء کروں گا۔ اس نے تمہیں ان گنت نعمتیں عطاء کیں اور پھر تمہیں نعمتیں عطاء کئے جا رہا ہے۔ اس نے تم سے نعمتیں چھینیں نہیں، اور نہ ہی اس نے تم سے نعمتوں کو عطاء کرنا بند کیا۔

لیکن تم سے رب نے وعدہ یہ لیا کہ تم اس کی نعمتوں کو اسی کی راہ میں لگانا، پاؤں جب عظیم نعمت ہیں تو اسی کام کے لئے انسان چلے جس میں رب تعالیٰ کی رضاء ہو، ہاتھ جب عظیم نعمت ہیں تو انسان ان ہاتھوں سے وہی کام کرے جس سے رب راضی ہو، غرضیکہ ہر نعمت کو رب تعالیٰ کی رضاء مندی حاصل کرنے کے لئے اسی کی راہ میں لگائے۔

لیکن اے انسان اگر تو نے ایسا نہ کیا تو یقینی بات ہے کہ تو نے رب تعالیٰ سے کئے ہوئے وعدہ کو توڑ دیا ہے۔ انسان کے اسی نقض عہد کو رب تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا۔ ﴿ کَلَّا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰی ☆ اَنْ رَّاٰہُ اسْتَغْنٰی ☆ ﴾ ہاں ہاں بیشک آدمی سرکشی کرتا ہے، اس پر کہ اپنے آپ کو غنی سمجھ لیا

اسی مسئلہ کو اسطرح سمجھیں: اللہ تعالیٰ نے انسان سے وعدہ کیا کہ میں تمہیں نعمتیں عطاء

کروں گا، اس نے ہمہ وقت بے شمار نعمتیں عطاء کر کے اپنا وعدہ پورا فرما دیا۔ لیکن انسان سے یہ وعدہ پورا فرما دیا۔ لیکن انسان سے یہ وعدہ لیا کہ میری نعمتوں سے فقراء کی امداد کرنا، اوران پر احسان کرنا، رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ﴾ اوراحسان کرو بے شک اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے، احسان کرنے والوں کو۔

" ثم انک توسلت به الی ایذاء الناس و ایحاشهم " لیکن اے انسان تو نے ان نعمتوں کے ذریعے ہی لوگوں کو ستانا شروع کر دیا اوران کو خوف زدہ کرنا شروع کر دیا۔ کاش کہ تو رب تعالیٰ کی نعمتوں کو فقراء پر خرچ کر کے معاشرہ میں ان کو ایک مقام عطاء کرتا اور تیری بھی نیک نامی ہوتی، اوراجر عظیم حاصل کرتا۔

لیکن اس وعدہ کو بھی اکثر انسانوں نے توڑ دیا، ان کے اس وعدہ کو توڑنے کی مذمت میں رب تعالیٰ نے فرمایا۔ ﴿اَلَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَیَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ﴾ وہ لوگ بخل (کنجوسی) کرتے ہیں، اورلوگوں کو (بھی) بخل کا حکم دیتے ہیں۔

اسی مسئلہ پر توجہ فرمائیں:

" اعطاک النعم العظیمة لتکون مقبلا علی حمده و انت تحمد غیره "

اے انسان اللہ تعالیٰ کا تیرے ساتھ نعمتیں عطاء کرنے کا وعدہ تھا، اس نے تو اتنی نعمتیں تمہیں عطاء کر رکھی ہیں جو تمہارے شمار سے بھی باہر ہیں، لیکن اس نے تم سے وعدہ لیا تھا کہ میری حمد کرنا، تم اس وعدہ کو پورا نہیں کر رہے ہو، بلکہ اورلوگوں کی تعریفیں کر رہے ہو۔

خیال رہے انبیاء کرام، اولیاء عظام، علماء کرام کی تعریف کرنے میں رب تعالیٰ کی رضاء مندی پائی جاتی ہے۔ ان کی تعریف اسی لئے کی جاتی ہے کہ یہ رب تعالیٰ کے مقبول بندے ہیں۔ ان کی تعریف بالواسطہ اللہ تعالیٰ کی ہی تعریف ہے۔

غیروں کی تعریف اس وقت منع ہے جب دنیاوی منافع حاصل کرنے کے لئے بے دین لوگوں

کی تعریف کی جائے، پھر گویا کہ انسان رب تعالیٰ سے کئے ہوئے وعدہ کو توڑ دیا۔

اے اللہ تو کریم ہے ہم عاجز بندے:

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں، احسانات اور اس کی ربوبیت کو بیان کرنا ہی ہماری طاقت میں نہیں۔ پھر ہم اگر یہ جاننا چاہیں کہ ہم رب تعالیٰ کی کتنی نعمتوں کا شکریہ ادا نہیں کر رہے۔ اور اس کی نعمتوں میں کسی طرح خلوص سے عبادت نہیں کر رہے تو یہ بھی ہماری وسعت سے خارج ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری ابتداء سے انتہاء تک رب تعالیٰ کی نعمتیں کثیر سے کثیر عظیم سے عظیم ہمیں حاصل ہو رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتیں ہمارے علم میں بھی نہیں آ سکتیں۔ حق یہ تھا کہ ہر نعمت کا علیحدہ شکریہ ادا کیا جائے، اور ہر نعمت پر اس کی خدمت بجالائی جائے اور عبادت کی جائے، لیکن ہم یہ نہ تو کر رہے اور نہ ہی کر سکتے ہیں، کیونکہ ہمیں رب تعالیٰ کی تمام نعمتوں کا علم نہیں، اور نہ ہی ہمیں ان نعمتوں کی کیفیات کا علم ہے۔

پھر ہماری طرف سے غفلت اور کوتاہی بڑھتی رہتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ ہماری تقصیرات کو نہیں دیکھتا بلکہ زیادہ سے زیادہ نعمتوں سے ہمیں نوازتا رہتا ہے۔

جب ہماری طرف سے کوتاہیوں کے باوجود رب تعالیٰ کا احسان اور لطف وکرم زیادہ سے زیادہ ہوتا رہتا ہے۔ تو ہم اس رحیم وکریم پروردگار کے حضور یہ عرض کرتے ہیں۔

" الھنا صدر منک مایلیق بک من الکرم والعفو والرحمۃ والاحسان وصدر منا مایلیق بنا من الجھل والعذر والتقصیر والکسل فنسالک بک وبفضلک العمیم ان تتجاوز عنا یا ارحم الراحمین"۔

اے اللہ جو تیری شان کے لائق ہے عفو وکرم اور رحمت واحسان تو وہی ہمارے ساتھ کر رہا ہے۔ اور ہم حقیر لوگوں کے جو لائق ہے ہم سے وہی جہالت وغدر اور کوتاہی اور سستی سرزد ہو رہی ہیں۔ یہ عرض کرتے ہیں کہ اے ارحم الراحمین ہماری غلطیوں کو معاف فرما، ہمارے گناہوں سے درگذر فرما

مطلب تقریباً یہی ہے کہ اے اللہ تو کریم ہے اور ہم تیرے عاجز بندے ہیں۔

(ماخوذ از کبیر)

سنن ابراہیمی پر قدرے تفصیل:

اجمالی طور پر پہلے یہ ذکر کیا جا چکا ہے، کہ دس چیزیں فطرت کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام پر فرض تھیں، اور وہی ہم پر سنت مصطفوی بھی ہیں اور سنت ابراہیمی بھی۔

اب ان کے متعلق کچھ تفصیل احادیث وغیرہ سے ذکر کی جارہی ہے، تاکہ قارئین کے لئے زیادہ نفع مند ہو سکے۔

۱) ختنہ کرنا: مسلم شریف میں اور مسند احمد میں یحییٰ کی روایت میں ہے۔ " انہ اختتن حین بلغ ثمانین سنة واختتن بالقدوم " بے شک ابراہیم علیہ السلام نے اسی سال کی عمر میں ختنہ کیا اور آپ نے تیسہ سے ختنہ کیا۔

یعنی جب آپ پر ختنہ کے فرض ہونے کا حکم نافذ ہوا اس وقت آپ کی عمر اسی سال تھی، آپ نے لکڑی کاٹنے چھیلنے کا آلہ تیسہ لیا، اور اپنا ختنہ خود ہی کر دیا۔ سبحان اللہ یہ انبیاء کرام کے کام ہی ہیں جو مشکل مشکل امتحانات میں پورے اترے ورنہ عام انسان ایسے امتحان میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

خیال رہے "قدوم" قاف پر فتحہ، دال مشدد بھی استعمال ہے اور مخفف بھی، معنی اس کا تیسہ۔

" قال عكرمة اختتن ابراهيم وهو ابن ثمانين سنة " قال : ولم يطف بالبيت بعد على ملة ابراهيم الا مختون "

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ابراہیم علیہ السلام نے اسی سال کی عمر میں اپنا ختنہ کیا، اور حضرت عکرمہ نے کہا کہ اس کے بعد ملت ابراہیمی پر قائم کسی شخص نے بغیر ختنہ کے طواف نہیں کیا۔

مسئلہ: جمہور احناف اور مالکیہ کا مذہب یہ ہے۔

" ان ذلک من مؤكدات السنن ومن فطرة الاسلام التي لايسع تركها في الرجال "

کہ ختنہ کرنے کا فعل سنت مؤکدہ ہے اور فطرۃ اسلامیہ سے ہے۔ مردوں کا چھوڑنا سنت مؤکدہ

کی ترک لازم آئے گی۔

"عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ ﷺ قال الفطرۃ خمس الاختتان الخ"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کا ارشاد بیان فرمایا کہ فطرت اسلامیہ پانچ چیزیں ہیں، ان میں آپ نے ختنہ کا بھی ذکر کیا۔

اس حدیث سے بھی ختنہ کا سنت ہونا واضح ہے۔ خیال رہے کہ ایک ضابطہ یہ ہے ذکر قلیل ذکر کثیر سے مانع نہیں لہٰذا کسی محل اور موقع کی مناسبت سے پانچ کا ذکر کرنا دوسری جگہ دس کے ذکر کے منافی نہیں۔

مسئلہ: اگر کوئی بچہ ختنہ شدہ پیدا ہوا تو وہ ختنہ کی مشقت سے بچ گیا ہے۔ اب اس کا ختنہ نہ ہو سکے گا اور نہ ہی ختنہ کرنے کی کوئی ضرورت ہوگی۔ کیونکہ اس کا ختنہ پہلے قدرتی طور پر ہو چکا ہے۔

حضرت میمونی کہتے ہیں، مجھے امام احمد رحمہ اللہ نے بتایا کہ ہمارے علاقہ میں ایک شخص تھا جس کا بچہ پیدا ہوا جس کا ختنہ قدرتی طور پر ہو چکا تھا۔ وہ شخص بہت غمناک تھا کہ میں بچے کا ختنہ کیسے کروں گا۔

تو آپ نے اس شخص کو فرمایا "اذا کان اللہ قد کفاک المؤنۃ فماغمک بھذا" جب رب تعالیٰ تمہیں اس بچے کے ختنہ کی مشقت سے آزاد کر دیا ہے تو تمہیں اس کا کیا غم ہے۔

فائدہ جلیلہ:

"عن محمد بن حبیب الھاشمی خلق من الانبیاء اربعۃ عشر مختونین آدم وشیث و نوح و ھود و صالح و لوط وشعیب و یوسف و موسیٰ و سلیمٰن و زکریا و عیسٰی و حنظلۃ بن صفوان (نبی اصحاب الرس) و محمد ﷺ"

محمد بن حبیب ہاشمی کہتے ہیں کہ چودہ انبیاء کرام ختنہ شدہ پیدا ہوئے، حضرت آدم، حضرت شیث حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط، حضرت شعیب، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت سلیمان، حضرت زکریا، حضرت عیسیٰ، حضرت حنظلہ بن صفوان (اصحاب الرس کے نبی) اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہم وسلم۔

لیکن یہ بھی خیال رہے کہ ملاعلی قاری رحمہ اللہ نے تمام انبیاء کرام کے ختنہ شدہ ہونے کے قول کو ترجیح دی ہے۔جیسا کہ راقم نے اپنی کتاب تذکرۃ الانبیاء میں ذکر کیا ہے۔

اعتراض: حدیث سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ختنہ ہوا ہے۔لہٰذا یہ کہنا کہ آپ ختنہ شدہ پیدا ہوئے کیسے صحیح ہے؟

" عن ابن عباس ان عبدالمطلب ختن النبی ﷺ یوم سابعه و جعل له مأدبة و سماه محمدا "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بے شک عبدالمطلب نے نبی کریم ﷺ کا ختنہ ساتویں دن کرایا،اوراسی دن احباب کی دعوت کی اوراسی دن آپ کا نام رکھا۔

جواب: یہ حدیث محمد بن ابی سری نے روایت کی ہے۔اس حدیث کے متعلق یحیٰ بن ایوب فرماتے ہیں۔

" طلبت هذا الحديث فلم اجده عند احد من اهل الحديث ممن لقيته الا عند ابن ابى السرى "

میں نے اس حدیث کو بہت تلاش کیا،لیکن حدیث بیان کرنے والے حضرات میں سے میں نے جس سے بھی ملاقات کی مجھی کسی کے پاس بھی یہ حدیث نہیں ملی سوائے ابن ابی السری کے۔

اس سے واضح ہوا کہ یہ حدیث دوسری معتبر احادیث کے مقابل قابل حجت نہیں ، کیونکہ اس حدیث کے متعلق ابوعمرو نے فرمایا۔ " **هذا حديث مسند غريب** " یہ حدیث مسند غریب ہے۔ اس سے بھی اس کے قابل حجت نہ ہونے کا ذکر کیا گیا۔

یہ ذکر کرنے کے بعد ابوعمرو نے کہا۔ " **وقد قيل ان النبى ﷺ ولد مختونا** "تحقیق بیان یہی کیا گیا کہ نبی کریم ﷺ ختنہ شدہ پیدا ہوئے ہیں۔

فذكر ابو نعيم الحافظ فى " كتاب الحلية " باسناده ان النبى ﷺ ولد مختونا

ابونعیم رحمہ اللہ نے " کتاب الحلیۃ " میں ذکر فرمایا ہے اسناد صحیحہ سے کہ نبی کریم ﷺ ختنہ شدہ پیدا ہوئے۔

مسئلہ: ختنہ بالغ ہونے سے پہلے کر دیا جائے۔ بچہ سات دن کا ہو تو ختنہ کرنا بہتر ہے۔

اس مسئلہ پر مختلف روایات ہیں، ان تمام سے نتیجہ واضح ہے جو میں نے عرض کر دیا ہے۔

علماء کے اقوال سے یہ بھی ملتا ہے۔ " **ختن ابراھیم اسماعیل لثلاث عشر سنة** " کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ختنہ جب کیا تو ان کی عمر تیرہ سال تھی۔

" **وختن ابنه اسحاق لسبعة ایام** " اور آپ نے اپنے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام کا جب ختنہ کیا تو وہ سات دن کے تھے۔

☆ " **وروی عن فاطمة انها کانت تختن ولدها یوم السابع** " اور روایات میں آتا ہے حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا نے اپنے بچوں کا ختنہ ساتویں دن کرایا۔

" **وقال اللیث بن سعد " یختن الصبی ما بین سبع سنین الی عشر** " لیث بن سعد رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ بچوں کا ختنہ سات اور دس سال کے درمیان کرا دیا جائے۔

" **وقال احمد " لم اسمع فی ذلک شیأ** " حضرت امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ختنہ کے متعلق معین مدت کے متعلق کوئی روایت سننے میں نہیں آئی۔

بخاری میں سعید بن جبیر کی روایت میں ہے۔

" **سئل ابن عباس مثل من انت حین قبض رسول اللہ ﷺ قال انا یومئذ مختون** "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال کیا گیا کہ جب نبی کریم ﷺ کا وصال ہوا تو آپ کتنے تھے۔ آپ نے فرمایا میں اس وقت مختون تھا، آپ نے مختون کا معنی قریب البلوغ لیا ہے۔

واضح ہوا کہ بالغ ہونے سے پہلے ضرور ختنہ کرا دیا جائے، سات دنوں پر کرائیں یا بعد میں کرائیں جائز ہے۔

بالغ ہونے کے بعد اسلام قبول کرنے کیلئے:

اگرچہ مالکی مذہب میں تو اس کے لئے مستحب ہے کہ وہ ختنہ کسی سے کرائے بعض حضرات نے زیادہ ہی تاکید کی ہے۔

لیکن احناف کے نزدیک بلاوجہ کسی کے ننگیز کو دیکھنا حرام ہے، اس لئے سنت پر عمل کرنے کے لئے حرام کا ارتکاب تو جائز نہیں۔ البتہ وہ شخص کسی ایسی عورت سے نکاح کرے جو ختنہ کرنا جانتی ہو، تو وہ نکاح کے بعد اس کا ختنہ کر دے، کیونکہ زوجہ اپنے خاوند کے ننگیز کو دیکھ سکتی ہے، اس طرح نہ حرام کا ارتکاب ہوگا۔ اور نہ سنت کی ترک لازم آئے گی۔

۲) زیرِ ناف بال مونڈنا:

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر زیر ناف بال مونڈنا بھی فرض تھا، ہم پر سنت ہے۔ خیال رہے کہ زیر ناف بال دور کرنے کے لئے زیادہ طور پر احادیث میں ''استحد'' کے الفاظ استعمال ہیں، یعنی نبی کریم ﷺ نے لوہے کے آلہ (استرہ وغیرہ) کو استعمال کیا۔

اور ایک حدیث حضرت انس ﷺ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں۔

'' ان النبی ﷺ کان لایتنور ، وکان اذا اکثر الشعر علی عانته حلقه ''

کہ بے شک نبی کریم ﷺ نے زیر ناف بالوں کو دور کرنے کے لئے چونہ (پاؤڈر وغیرہ) استعمال نہیں کیا، بلکہ جب بال دور کرنے کی ضرورت در پیش آتی تو آپ ان بالوں کو مونڈ کر دور کرتے

لیکن ایک دوسری حدیث حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔

'' ان النبی ﷺ کان اذا اطلی ولی عانته بیده ''

کہ بے شک نبی کریم ﷺ زیر ناف بالوں پر چونہ (پاؤڈر وغیرہ) استعمال کر کے ہاتھوں سے بالوں کو صاف کر دیتے۔ خیال رہے کہ '' اطلی '' کا معنی یہ بیان کیا گیا ہے۔ '' اطلی '' یعنی بالنورة وهی حجر یتخذ منه طلاء لازالة الشعر من بواطن الجسد '' کہ آپ نے چونہ کا استعمال کیا، کیونکہ پتھر سے حاصل ہونے والے چونہ کو جسم کے اندرونی حصہ کے بال دور کرنے کے لئے جب استعمال کیا جائے تو اسے بھی بعض اوقات '' طلاء '' کہہ لیا جاتا ہے۔

دونوں حدیثوں میں تطبیق:

ابن خویز منداد کہتے ہیں۔

''وهذا یدل علی ان الاکثر من فعله کان الحلق وانما تنور نادرا لیصح الجمع بین الحدیثین ''

اس سے واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے اکثر طور پر زیر ناف بالوں کو مونڈا ہے لیکن کبھی کبھی چونہ وغیرہ سے بھی بالوں کو دور کیا ہے۔ اس طرح دونوں حدیثوں میں مطابقت ہو جائے گی۔

اصل مقصد تو بالوں کو دور کرنا ہے جس طرح بھی کرے خواہ مونڈا کر یا پاؤڈر استعمال کر کے۔

خیال رہے کہ زیر ناف بالوں کو دور کرنا مردوں اور عورتوں کے لئے برابر ہے۔ اور دور کرنے کے دونوں طریقے بھی مردوں اور عورتوں کے لئے برابر ہیں۔

۳) بغلوں کے بال دور کرنا:

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بغلوں کے بال دور کرنا بھی فرض تھا ہم پر سنت ہے۔

تاہم بغلوں کے بال اکھیڑنا، نوچنا زیادہ بہتر ہے۔ اور زیر ناف بالوں کو مونڈنا بہتر ہے۔ تاہم اگر بغلوں کے بال مونڈے اور زیر ناف بال نوچے تو پھر بھی جائز ہے۔ کیونکہ مقصد صفائی کا حصول ہے، تاہم پہلی صورت زیادہ بہتر ہے۔

۴) استنجاء کرنا:

پیشاب، پاخانہ کے مقامات کو پانی سے دھونا مستحب ہے۔ اہل قبا پتھروں سے استنجاء کرنے کے بعد پانی سے استنجاء کرتے تھے، رب تعالیٰ نے ان کی تعریف فرمائی ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوّٰبِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاکیزگی کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

تنبیہ: استنجاء کرنا مستحب اس وقت ہے جب مخرج (نجاست کے نکلنے کا مقام) سے باہر نجاست نہ ہو، اور اگر مخرج سے باہر درہم سے کم نجاست ہو تو پانی سے استنجاء کرنا سنت ہے۔ اور اگر درہم کے برابر ہو تو واجب ہے اور اگر درہم سے زائدہ ہو تو فرض ہے۔ (منية المصلى)

۵) ناخن کاٹنا:

"عن عمر بن بلال الفزاری قال سمعت عبدالله بن بشر المازنی يقول قال رسول الله ﷺ قصوا اظافيركم وادفنوا قلاماتكم ونقوا براجمكم ونظفوا لثاثتكم من الطعام وتسننوا ولاتدخلوا علىّ قخرا بخرا"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے ناخن کاٹو، ناخنوں کے تراشے دفن کردو، اور اپنی انگلیوں کے

جوڑوں کی لکیروں (جھریوں) کو صاف ستھرا رکھو، کھانے کے بعد اپنے مسوڑھے صاف کرو، اور دانتوں کو صاف کرو، اور نہ داخل ہو مجھ پر ایسے حال میں کہ تمہارے دانت میلے کچیلے ہوں اور تمہارے منہ سے بو آ رہی ہے۔

حل اللغات: قلامات جمع ہے قلامۃ (قاف پر ضمہ) کی، جس کا معنی ناخنوں کے تراشے، ان کو دفن کرنے کا حکم دیا کہ انسان کے اعضاء کے حصوں کی عزت پائی جائے، بے حرمتی نہ ہو۔

براجم: انگلیوں کے جوڑوں کے درمیان جھریاں۔ **لثاثة:** مسوڑھے، **تسننوا:** مسواک کرو دانت صاف کرو، **قحرا بخرا:** دانتوں کا میلا کچیلا اور بدبودار ہونا۔

ترمذی نے بیان کیا ہے ناخن کاٹنے کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ بڑے ناخن دوسرے لوگوں کے لئے نقصان دہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان سے کسی کو خراشیں آنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اور وجہ یہ ہے کہ بڑے ناخنوں میں میل جمع ہو جاتی ہے۔ اور جنابت کی حالت میں غسل کرتے ہوئے کبھی ناخنوں کے نیچے پانی نہیں پہنچ پاتا تو انسان حکم جنابت سے نہیں نکلتا۔

☆ "عن سليمان بن فرج ابى واصل قال اتى ابا ايوب ﷺ فصافحته فرأى فى اظفارى طولا فقال جاء رجل الى النبى ﷺ يسأله عن خبر السماء فقال يجئ احدكم يسأل عن خبر السماء واظفاره كاظافير الطير حتى يجتمع فيها الوسخ والتفث"

سلیمان بن فرج ابی واصل کہتے ہیں میں ابوایوب ﷺ کے پاس آیا۔ میں نے ان سے مصافحہ کیا۔ انہوں نے میرے ناخن بڑھے ہوئے دیکھے، تو فرمانے لگے۔ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا، آپ سے آسمانوں کے متعلق خبر پوچھنے لگا، تو آپ نے فرمایا تم میں سے کوئی ایک آتا ہے آسمانوں کے متعلق پوچھتا ہے حالانکہ ناخن اس کے ایسے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں جیسے پرندوں کے، یہاں تک کہ ان میں میل کچیل جمع ہو جاتی ہے۔

فائدہ: جو شخص جمعرات کے دن عصر وقت کے ناخن اس طرح کاٹے کہ دائیں ہاتھ کی شہادت انگلی سے شروع کر کے چھوٹی انگلی پر ختم کرے، پھر بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے شروع انگوٹھے تک کاٹے، پھر دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے ناخن کو کاٹے اس کے بعد دائیں پاؤں کی چھوٹی انگلی سے شروع کر کے

ترتیب وار بائیں پاؤں کی چھوٹی انگلی پر ختم کرے تو ان شاء اللہ تنگدستی و دینوی پریشانی اور آنکھ کی خرابی سے محفوظ رہے گا۔ (از روح البیان و شامی بحوالہ نعیمی)

۶) کلی کرنا: مسنون یہ ہے کہ کلی کرنے میں مبالغہ کرے، کیونکہ نبی کریم ﷺ کلی کرنے میں مبالغہ کرتے تھے مبالغہ کا طریقہ یہ ہے کہ پانی کو ایک طرف سے دوسری طرف پھیرے یا غرغرہ کرے، لیکن روزہ دار شخص کلی کرنے میں مبالغہ نہ کرے، بلکہ کلی کرتے وقت اعتدال رکھے۔

(کشاف الحقائق ، حاشیہ کنز الدقائق)

۷) ناک میں پانی ڈالنا: وضوء کرتے وقت ناک میں پانی ڈالتے وقت بھی مبالغہ کرے، کہ پانی ناک کی ہڈی (منخرین) تک پہنچ جائے، یعنی پانی کو ذرا اوپر کھینچے تا کہ ناک کے نرم حصہ تک وہ گردش کرے، لیکن روزہ دار شخص ناک میں پانی ڈالتے وقت بھی مبالغہ نہ کرے۔

(کشاف الحقائق)

۸) مسواک کرنا: حضرت ابراہیم علیہ السلام پر یہ تمام چیزیں فرض تھیں جو ہمارے لئے مسنون ہیں۔ مسواک کو نبی کریم ﷺ پسند فرماتے تھے۔ اسی لئے آپ نے فرمایا" **لو لا ان اشق علی امتی لامرتهم (امر لوجوب) بالسواک عند کل صلوٰة**" (مسلم)

اگر میں اپنی امت پر شاق نہ سمجھتا تو ہر نماز کے لئے مسواک کا حکم دیتا۔

مقام توجہ: وضوء کے وقت مسواک سنت مؤکدہ ہے۔ احناف کے نزدیک مسواک سنت وضوء ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک سنت نماز ہے۔ یعنی اگر ایک شخص نے ایک وضوء سے کئی نمازیں پڑھ لیں تو سب میں اسے مسواک کی سنت پر عمل کرنے کا ثواب حاصل ہو گیا۔ لیکن امام شافعی فرماتے ہیں۔ ہر نماز کے وقت مسواک کرے گا تو سنت پر عمل ہوگا۔

مسواک کے اوقات مستحبہ:

" ویستحب فی مواضع اصفرار السن و تغیر الرائحة والقيام من النوم والقيام الى الصلوٰة و دخول البيت ولاجتماع والاجتماع بالناس وقراءة القرآن "

چند مقامات وہ ہیں جہاں مسواک مستحب ہے۔ دانتوں کا زرد ہونا، اور منہ میں بو آنی شروع ہو جائے۔ اور نیند سے جب اٹھے۔ اور نماز کے وقت، اور گھر داخل ہوتے وقت، اور لوگوں کی مجلس میں

جانے کیلئے، اور قرآن پاک پڑھنے کیلئے۔ خیال رہے نماز کے وضوء کیلئے مسواک کچھ حضرات کے نزدیک مستحب ہے لیکن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے۔ (کشاف الحقائق)

تنبیہ: اگر لکڑی کی مسواک پاس ہے تو صرف انگلی سے دانت صاف کرنے سے سنت پر عمل نہیں ہوگا۔ ہاں اگر لکڑی کی مسواک پاس نہیں تو انگلی سے دانتوں کو صاف کرنے سے سنت کا ثواب مل جائے گا۔ بہتر تو یہ ہی صورت ہے کہ اسے ہی مدنظر رکھے۔

البتہ بعض فقہاء کرام نے یہ بیان فرمایا ہے کہ لکڑی کی مسواک پاس ہو تو اس کا استعمال کرنا بہتر ہے۔ انگلی کا استعمال کرنا جائز ہے اور سنت پر عمل ہو جائے گا۔ (کشاف الحقائق)

مسواک کیسی ہو: مسواک نرم ہو، سیدھی ہو، کم از کم چھوٹی انگلی جتنی موٹی ہو، اور ایک بالشت لمبی ہو، بالشت سے چھوٹی نہ ہو، ہاں استعمال کرتے کرتے چھوٹی ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ (کشاف الحقائق)

نبی کریم ﷺ کا پیلو درخت کی مسواک کرنا اسی لئے تھا کہ وہ نرم ہوتی ہے، اس کے ریشے دانتوں اور مسوڑھوں کو بہتر طریقہ سے صاف کرتے ہیں اور اس مسواک سے مسوڑھوں کو نقصان بھی نہیں ہوتا۔

☆ " عن ابن عباس قال قال رسول اللہ ﷺ استاکوا مالکم تدخلون علیّ قلحا "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسواک کیا کرو، میرے پاس ملنے کیلئے بدبودار دانت لے کر نہ آیا کرو۔

۹) مونچھوں کا کاٹنا:

" روی الترمذی عن ابن عباس قال کان رسول اللہ ﷺ یقص من شاربہ ویقول ان ابراھیم خلیل الرحمن کان یفعلہ " قال ھذا حدیث حسن غریب۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ اپنی مونچھوں کو کاٹتے تھے، اور فرماتے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اسی طرح کرتے تھے۔

فائدہ:

" اذا نبتت للمرأۃ لحیۃ فیستحب لھا حلقھا " (نووی شرح مسلم ج ۱ ص ۱۴۹ باب خصال الفطرۃ)

عورت کی جب داڑھی نکل آئے تو اس کے لئے منڈانا مستحب ہے۔

"اذانبتت للمرأة لحية او شوارب فلا تحرم ازالتها بل يستحب عندنا"

(نووی شرح مسلم ج ۲ ص ۲۱۳ باب تحریم فعل المواصلة)

عورت کی جب داڑھی یا مونچھیں نکل آئیں تو ان کا زائل کرنا مستحب ہے۔

مقام توجہ:

مرد کو داڑھی بڑھانے اور مونچھیں کٹانے کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے حکم کو بیان فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔

"احفوا الشوارب واعفوا اللحية" مونچھوں کو کٹاؤ اور داڑھی کو بڑھاؤ۔

(مسلم ج ۱ باب خصال الفطرة ص ۱۲۹)

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے فرمایا؛

"يكره حلقها و قصها و تحريقها" داڑھی کا منڈانا، کٹانا اور جلانا مکروہ تحریمی ہے۔

"واما الاخذ من طولها و عرضها فحسن و يكره الشهرة فى تعظيمها كما تكره فى قصها و جزها"

داڑھی کی لمبائی اور چوڑائی سے کانٹ چھانٹ بہتر ہے۔ اس لئے کہ داڑھی کو بڑھانے میں شہرت حاصل کرنا ایسے ہی مکروہ ہے جیسے داڑھی کا کٹانا مکروہ تحریمی ہے۔

"ومنهم من حد وبما زاد على القبضة فيزال" داڑھی کی حد ایک قبضہ (مٹھی برابر یعنی چار انگلیاں) ہے۔ جو اس سے بڑھ جائے اسے کاٹ دیا جائے۔ "كره مالك طولها" امام مالک رحمہ اللہ نے داڑھی کا زیادہ لمبا کرنا مکروہ قرار دیا ہے۔ (نووی شرح حدیث)

"واللحية عندنا طولها بقدر القبضة (بضم القاف)" ہمارے نزدیک داڑھی کی لمبائی ایک قبضہ (مٹھی بھر) کی مقدار ہے۔

"فان الطول المفرط يشوه الخلقة ويطلق السنة المغتابين بالنسبة اليه فلا بأس للاحتراز عنه على هذه النية"

داڑھی جب اتنی لمبی ہو جائے جو بدنما نظر آئے شکل کو بگاڑ دے، اور طعنہ زن اور غیبت کرنے والے لوگوں کی زبانیں اس کے خلاف بدگوئی کریں، باعث تضحیک یعنی مزاح کا سبب بنے تو اس وقت داڑھی کو قبضہ سے جو زائد ہے اس کو کٹادے، بلکہ ایسی صورت میں داڑھی کی زائد مقدار کو کٹانا واجب ہوگا

" وما وراء ذلک یجب قطعه روی عن+ رسول الله ﷺ انه کان یاخذ من اللحیة من طولها و عرضها اورده ابو عیسٰی فی جامعه وقال من سعادة الرجل خفة لحیته "

قبضہ سے زائدہ داڑھی کا کٹانا واجب ہے۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ اپنی داڑھی کو لمبائی اور چوڑائی سے کانٹ چھانٹ فرماتے تھے۔ اس حدیث کو ابوعیسیٰ ترمذی نے اپنی جامع میں ذکر فرمایا اور ساتھ ہی کہا کہ مرد کو قبضہ کی مقدار ہی داڑھی پر اکتفاء کرنا چاہئے یہ اس کی نیک بختی کی علامت ہے۔

" فیجعلها بین اللحیتین ای طویل و قصیر فان التوسط من کل شئ احسن و منه قیل خیر الامور اوسطها "

داڑھی درمیانی ہونی چاہئے قبضہ سے چھوٹی بھی نہ ہو اور بہت بڑی بھی نہ ہو، اس لئے کہ ہر چیز میں میانہ روی ہی بہتر ہے اس لئے کہ تمام امور میں میانہ روی بہتر ہے۔

" ومن ثم قیل کلما طالت اللحیة نقص العقل "

اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ جب داڑھی بہت لمبی ہو جائے تو وہ عقل کی کمی کی علامت ہے۔

(مرقاۃ ج۸ ص۲۹۸ باب الترجل)

داڑھی بھی ناف تک آ رہی ہو پھر سکوٹر پر سوار بھی ہو تو عجیب منظر ہوتا ہے۔ لوگ دیکھ کر نہ ہنسیں تو کیا کریں۔

اسلام کو باعث تضحیک نہ بنایا جائے بلکہ باعث تعریف بنایا جائے۔ بلاوجہ تکلف سے اپنی شکلوں کو نہ بگاڑیں۔

مونچھیں کٹائیں، منڈائیں نہیں:

مرد کے لئے مونچھوں کو کٹانا منڈانے سے افضل ہے۔ دونوں طرفوں میں مونچھیں لمبی کرنا جائز ہے، لیکن درمیان میں لمبی کرنا منع ہے۔

"ان السنة فی قص الشارب ان لایبالغ فی احفائه بل یقتصر علی ماتظهر به حمرة الشفة و طرفها"

مونچھوں کو بہت زیادہ نہ کٹائے بلکہ اتنا کٹائے جس سے ہونٹوں اور اس کی طرفوں میں جسم کی سرخی نظر آ جائے۔ احادیث میں کٹانے سے مراد اتنا ہی ہے۔

" وقیل الافضل حلقه لحدیث والاکثرون علی القص بل رأی مالک تادیب الحالق "

بعضوں نے کہا ہے کہ افضل حلق ہے۔ لیکن زیادہ حضرات اسی طرف ہیں کہ مونچھوں کو کٹایا جائے منڈایا نہ جائے، بلکہ امام مالک رحمہ اللہ تو مونچھوں کو منڈانے والے کو ادب سکھانے کے قائل ہیں۔

(مرقاۃ ج ۸ ص ۱۹۸ کتاب الاطعمة)

اعتراض: حدیث شریف میں تو " احفوا الشوارب " ذکر ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ مونچھوں کو منڈانا افضل ہے۔

جواب: ابوعمر رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اس مسئلہ میں دو حدیثیں استعمال ہیں۔ ایک حدیث میں " احفوا " ذکر ہے " وهو لفظ محتمل التاویل " لیکن اس میں تاویل کا احتمال ہے، کیونکہ "احفاء" کا معنی کاٹنا بھی آتا ہے۔ مونڈنا بھی آتا رہتا ہے، اور نوچنا بھی آتا رہتا ہے۔

اور دوسری حدیث میں " قصوا " ذکر ہے، "وهو مفسر والمفسر یقضی علی المجمل " جس کا معنی واضح طور پر کاٹنا ہے۔ اس لئے یہ لفظ مفسر ہے، اور " احفوا " مجمل ہے۔ لہذا مفسر کو مجمل پر ترجیح دی جائے گی۔

خیال رہے کہ مسئلہ کا تعلق افضلیت سے ہے، یہ نہیں کہ منڈانے کو کوئی حرام کہنا شروع کردے یا مکروہ۔ اس لئے کہ امام احمد رحمہ اللہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما مونچھوں کو بہت شدید پست کرتے تھے یہاں تک کہ ان کا چمڑا نظر آنے لگتا۔ (قرطبی)

ناخن اور بال وغیرہ کتنی مدت میں کاٹے جائیں؟

" عن انس قال وقت لنا فی قص الشارب و تقلیم الاظفار و نتف الابط و حلق العانة الا

نترک اکثر من اربعین لیلة" (مسلم)

حضرت انس ﷺ نے فرمایا ہمارے لئے ناخن کاٹنے، مونچھیں کاٹنے، بغلوں کے بال نوچنے، اور زیر ناف بال مونڈنے کا وقت مقرر کیا گیا تھا کہ ہم چالیس دنوں سے زائد نہیں نہ چھوڑیں

" قال علماؤنا هذا تحديد فی اکثر المدة " علماء کرام نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ تو زیادہ مدت کی حد ہے، کہ اس سے بھی زیادہ دیر کرنا منع ہے، اور یقیناً شکل کا بگاڑ بھی لازم آئے گا۔

" والمستحب تفقد ذلک من الجمعة الی الجمعة " مستحب یہی ہے کہ ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک ناخن اور بال وغیرہ چھوڑے جائیں، پھر ان کو کاٹ دیا جائے۔

تنبیہ: یہ بھی خیال رہے کہ چالیس دن والی حدیث پر کلام ہے۔ لہٰذا وہ قابل حجت بھی نہیں، اس حدیث کے متعلق کیا کہا گیا ہے؟

" وهذا الحديث يرويه جعفر بن سليمان قال العقيلی فی حديثه نظر، وقال ابو عمر فيه ليس بحجة، لسوء حفظه و كثرة غلطه وهذا الحديث ليس بقوی من جهة النقل ولكنه قدل قال به قول، واكثر علی ان لا توقيت فی ذلک و بالله التوفيق "

چالیس دنوں والی حدیث کو جعفر بن سلیمان نے روایت کیا ہے۔ عقیلی نے کہا اس حدیث میں نظر ہے۔ ابو عمر نے کہا اس میں حجت نہیں کیونکہ راوی کا حافظہ درست نہیں تھا جس کی وجہ سے ان سے غلطیاں سرزد ہو جاتی تھیں۔ اور یہ حدیث نقل کے لحاظ سے قوی نہیں۔ البتہ کچھ حضرات نے اس کا قول بھی کیا ہے۔ اور کچھ حضرات نے کہا ہے کہ کوئی وقت مقرر نہیں۔

راقم کا موقف:

انسانی فطرت جن ناخنوں کو بڑا کہے کہ یہ تو کاٹنے چاہئیں۔ بغلوں کے یہ بال بڑے ہو گئے۔ مونچھیں بڑی ہیں۔ لبوں تک آ رہی ہیں وغیرہ بس وہی حد ہے۔ اگر چہ کوئی وقت مقرر تو نہیں، لیکن عقل کا تقاضا یہی ہے۔ کہ ہر ہفتہ میں ان پر عمل ہو، کسی حد تک دو ہفتہ کی تاخیر کی گنجائش سمجھ آتی ہے۔ اس سے زائد انسانی فطرت اچھا نہیں سمجھتی، کسی کو انسانی فطرت ہی نہ حاصل ہو بندروں کی طرح ناخن بڑھائے

ہوئے ہوں تو ان کو دیکھ کر یہ دلیل نہ دی جائے کہ یہ بھی تو انسان ہے، وہ باندری انسان ہوتی تو انسانوں والا کام کرتی۔

۱۰) مانگ نکالنا:

• یعنی سیدھی مانگ نکالنا، ناک کی سیدھ سے سر کے بالوں کو دائیں، بائیں کرنا۔

☆ " خرج النسائی عن ابن عباس ان رسول الله ﷺ کان یسدل شعره و کان المشرکون یفرقون شعورهم ' و کان یحب موافقه اهل الکتاب فیما لم یؤمر فیه بشیٔ ، ثم فرّق رسول الله ﷺ بعد ذلک اخرجه البخاری ، و مسلم عن انس "

نسائی نے حضرت ابن عباس اور بخاری ومسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہم سے روایت بیان کی کہ بے شک رسول اللہ ﷺ اپنے بالوں کو لٹکاتے تھے۔ (یعنی پیشانی پر سیدھا نیچے چھوڑتے تھے) کیونکہ مشرکین مانگ نکالتے تھے، اور نبی کریم ﷺ کو جن چیزوں کا حکم نہیں دیا جاتا تھا ان میں آپ اہل کتاب کی موافقت زیادہ پسند فرماتے تھے، لیکن بعد میں رسول اللہ ﷺ نے مانگ نکالنی شروع فرمائی۔

یقینی بات ہے کہ آپ نے مانگ وحی خفی کے ذریعے نکالنی شروع فرمائی، لہٰذا وہ پہلا عمل بالوں کو سیدھا پیشانی پر چھوڑنے والا منسوخ ہو گیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر مانگ نکالنا فرض تھا، لیکن ہم پر " والفرف فی الشعر سنة لانه الذی رجع الیه النبی ﷺ " بالوں میں مانگ نکالنا سنت ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس عمل کی طرف رجوع کیا۔ یعنی ہمارے۔ لئے سنت ابراہیمی بھی ہے۔ اور سنت مصطفوی بھی ہے۔

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ جمعہ کے دن مسجد کے دروازہ پر کھڑے ہوتے اگر کسی نے اپنے بالوں کو پیشانی پر لٹکایا ہوتا تو آپ اس کے بال کاٹ دیتے تھے۔

(تمام بحث ماخوذ از قرطبی و احکام القرآن للجصاص)

ابراہیم علیہ السلام کے بالوں کا سفید ہونا:

" وفی الموطأ وغیره عن یحییٰ بن سعید انه سمع سعید بن المسیب یقول ابراهیم علیه السلام اوّل من اختتن و اوّل من اضاف الضیف و اوّل من استحد و اول من قلم الاظفار

واول من قص الشارب و اول من شاب ، فلما رای الشیب قال ما هذا ؟ قال وقار ، قال یارب زدنی وقارا"

حضرت سعید بن مسیّب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ابراہیم علیہ السلام نے ہی پہلے پہلے ختنہ کیا، آپ نے ہی پہلے مہمان نوازی (سے بہت زیادہ محبت) کی۔ سب سے پہلے بطور فرض زیر ناف بال آپ نے ہی مونڈے، سب سے پہلے بطور فرض آپ نے ہی ناخن کاٹے، اور سب سے پہلے بطور فرض آپ نے ہی مونچھیں کاٹیں۔ اور سب سے پہلے آپ کے ہی بال سفید ہوئے، آپ نے جب سفید بالوں کو دیکھا تو رب تعالیٰ سے پوچھا، اے رب یہ کیا ہے؟ رب نے فرمایا وقار ہے۔ آپ نے کہا اے میرے رب میرا وقار اور زیادہ کر دے۔

☆ "عن سعید بن ابراهیم عن ابیه قال اوّل من خطب علی المنابر ابراهیم خلیل الله قال غیره و اول من ثرو الشرید واول من ضرب السیف ، واول من استاک ، واول من استنجی بالماء ، واول من لبس السراویل ، ورروی معاذ بن جبل قال قال النبی ﷺ ان اتخذ المنبر فقد اتخذه ابی ابراهیم وان اتخذ العصا فقد اتخذها ابی ابراهیم"

سعید ابن مسیّب اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ سب سے پہلے منبر ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے بنوایا کچھ اور حضرات کی روایات میں آتا ہے۔ سب سے پہلے ثرید آپ نے تیار کیا۔ سب سے پہلے تلوار آپ نے چلائی۔ سب سے پہلے بطور فرض مسواک آپ نے استعمال کی۔ سب سے پہلے پانی سے استنجاء بطور فرض آپ نے ہی کیا۔ سب سے پہلے سلوار آپ نے استعمال کی۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا، نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں منبر اس لئے بنوایا کہ میرے باپ ابراہیم علیہ السلام نے منبر بنوایا۔ اور میں نے عصا اس لئے بنوایا کہ میرے باپ ابراہیم علیہ السلام نے عصا بنوایا۔

مسئلہ: "واما الشیب فنور ویکره نتفه" سفید بال نور ہیں۔ ان کا نوچنا مکروہ ہے۔

نسائی اور ابوداؤد میں ہے کہ عمرو بن شعیب اپنے باپ، دادا سے روایت کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" لاتنتفوا الشیب ما من مسلم یشیب شیبة فی الاسلام الاکانت له نورا یوم القیامة و کتب الله له حسنة و حط عنه خطیئة "

سفید بال نوچو نہیں، کوئی مسلمان نہیں جس کے اسلام میں بال سفید ہو جائیں، مگر قیامت کے دن اس کے لئے نور بن جائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کے لئے نیکیاں لکھے گا، اور خطاء مٹائے گا۔ (از قرطبی)

مسئلہ خضاب: پہلے تو صرف اتنا سمجھنا چاہئے کہ اصل جنس خضاب میں ہی اختلاف ہے کہ خضاب بہتر ہے یا خضاب نہ لگانا بہتر ہے۔

بعض حضرات نے کہا کہ خضاب نہ لگانا بہتر ہے، ان حضرات نے دلیل کے طور پر یہ کہا ہے۔ " لانہ ﷺ لم یغیر شیبه " کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے سفید بالوں پر خضاب نہیں لگایا، لہٰذا خضاب نہ لگانا ہی بہتر ہے۔

کچھ حضرات نے فرمایا ہے کہ خضاب لگانا بہتر ہے، کیونکہ
" خضب جماعة من الصحابة والتابعین ومن بعدهم للاحادیث التی ذکرها مسلم وغیره "

صحابہ کرام اور تابعین اور ان کے بعد ایک ایک جماعت خضاب لگاتی رہی، کیونکہ مسلم وغیرہ میں ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سفید بالوں کو خضاب کے ذریعے بدلنے کا حکم دیا۔

☆ " عن جابر بن عبدالله قال اتی بابی قحافة یوم فتح مکة ورأسه ولحیته کالثغامة بیاضا فقال رسول الله ﷺ غیّروا هذا بشئ واجتنبوا السواد " (مسلم ج ۲ باب استحباب الخضاب)

حضرت جابر بن عبداللہ کہتے ہیں (حضرت ابوبکر صدیق ﷛ کے والد) ابوقحافہ کو فتح مکہ کے دن نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لایا گیا، آپ کا سر اور داڑھی ثغامہ (ایک پودا جو نمک کی طرح سفید ہوتا ہے) کی طرح سفید تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کو کسی چیز سے بدل دو اور سیاہ رنگ سے اجتناب کرو۔

☆ " عن ابی هریرة ان النبی ﷺ قال ان الیهود و النصاری لایصبغون فخالفوهم "
(مسلم ج ۲ باب استحباب الخضاب)

حضرت ابو ہریرہ ﷛ فرماتے ہیں بے شک نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہود اور نصاریٰ (اپنے

بالوں کو) نہیں رنگتے تم ان کی مخالفت کرو۔

سیاہ خضاب کے متعلق:

" و مذهبنا استحباب خضاب الشيب للرجل والمرأة بصفرة او حمرة و يحرم خضابه بالسواد على الاصح وقيل يكره كراهة تنزيه والمختار التحريم لقوله ﷺ واجتبوا السواد "

(نووی)

مرد اور عورت کے لئے سفید بالوں کو رنگنا ہمارے مذہب (قول نووی) میں مستحب ہے۔ وہ خضاب زرد رنگ کا ہو، یا سرخ ہو اصح مذہب یہ ہے کہ سیاہ رنگ سے رنگنا حرام ہے۔ اور بعض حضرات نے کہا کہ مکروہ ہے وہ بھی تنزیہی۔

مختار یہ ہے کہ سیاہ رنگ سے رنگنا حرام ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا" اجتنبوا السواد " (سیاہ سے اجتناب کرو) بعض حضرات نے حرام کہا ہے۔ اس کی اصل وجہ اختلاف یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے " اجتنبوا " امر کا صیغہ ذکر فرمایا ہے۔ کیا یہ وجوب کے لئے ہے، یا استحباب کے لئے۔ جن حضرات نے وجوب کے لئے کہا ہے انہوں نے اس کی مخالف جانب کو حرام کہا ہے۔

اور جن حضرات نے استحباب کیلئے کہا ہے۔ انہوں اسکی مقابل صورت کو مکروہ تنزیہی کہا ہے۔

(راقم)

" وخضب جماعة منهم بالحناء والكتم و بعضهم بالزعفران وخضب جماعة بالسواد روى ذلک عن عثمان والحسن والحيسن ابنى على و عقبة بن عامر وابن سيرين وابى بردة و آخرين " (نووی حوالہ مذکور)

صحابہ کرام اور تابعین کی ایک جماعت نے مہندی اور کتم سیاہ رنگ (پینے والا پودہ) سے خضاب لگایا اور بعض نے زعفران سے اور ایک جماعت نے سیاہ رنگ کا خضاب استعمال کیا۔

یہ روایت حضرت عثمان، حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین اور عقبہ بن عامر اور ابن سیرین اور ابو بردہ اور کئی حضرات سے مروی ہے۔

" قال القاضى قال الطبرانى الصواب ان الآثار المروية عن النبى ﷺ بتغير الشيب و

بالنهی عنه کلها صحیحة ولیس فیها تناقض بل الامر بالتغییر لمن شیبه کشیب ابی قحافة و النهی لمن له شمط فقط "

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ طبرانی نے بیان کیا ہے کہ درست قول یہ ہے کہ احادیث سفید بالوں کو بدلنے کے متعلق بھی وارد ہیں اور خضاب کی ممانعت کے متعلق بھی احادیث وارد ہیں۔ وہ سب صحیح ہیں۔ اور ان میں کوئی تناقض بھی نہیں، بلکہ حکم یہ ہے کہ جب بال حضرت ابوقحافہ رضی اللہ عنہ کی طرح خالص سفید ہو جائیں تو خضاب کو استعمال کرنے کا حکم دیا گیا، اور جب بال سیاہ و سفید ملے جلے ہوں تو خضاب کی ممانعت ہے۔

" قال واختلاف السلف فی فعل الامرین بحسب اختلاف احوالهم فی ذلک مع ان الامر والنهی فی ذلک لیس للوجوب بالاجماع ولهذا لم ینکر بعضهم علی بعض خلافه فی ذلک قال ولا یجوز ان یقال فیهما ناسخ و منسوخ "

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے فرمایا کہ سلف صالحین کا اختلاف خضاب کے لگانے یا نہ لگانے میں اختلاف احوال کی وجہ سے تھا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ احادیث میں امر یا نہی وجوب کے لئے نہیں، اسی پر اجماع امت ہے۔ اسی لئے بعض حضرات نے دوسرے بعض کا انکار نہیں کیا، اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ بعض احادیث ناسخ ہیں، اور بعض منسوخ ہیں۔

سبحان اللہ سلف صالحین کیسے ہی محققین تھے کہ مسئلہ کی تحقیق ان کو حاصل ہوتی بلا وجہ ایک دوسرے کے خلاف کیچڑ اچھالنا حرام کے فتوے لگانا ان کا طریقہ کار نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی عزت کی جاتی تھی، آجکل کچھ بے سمجھ لوگوں نے تمام علماء کرام کی عزت کو خاک میں ملا دیا ہے، یہودیوں اور نصرانیوں کے آلہ کار لوگوں کو موقع میسر آ گیا کہ وہ کل تک جن کو استعمال کرتے رہے آج ان کو ہی دہشت گرد قرار دے دیا۔

" وقال غیره هو علی حالین فمن کان فی موضع عادة اهله الصبغ او ترکه فخروجه عن العادة شهرة و مکروه "

قاضی عیاض رحمہ اللہ کے بغیر دوسرے علماء کرام نے بیان فرمایا، خضاب لگانے یا نہ لگانے کا

دارومدار عادت کے مطابق ہے۔ جہاں عام لوگ خضاب لگاتے ہوں وہاں خضاب لگانا بہتر ہے اور نہ لگانا بہتر نہیں۔ اگر لوگوں کی عادت اس کے خلاف ہو تو حکم بھی اسی طرح مختلف ہوگا۔

" والثاني انه يختلف باختلاف نظافة الشيب فمن كان شيبة تكون نقية احسن منها مصبوغة والترک اولی ومن کانت شيبة تستبشع فالصبغ اولى هذا مانقله القاضی والاصح اوفق للسنة ما قدمناه عن مذهبنا والله اعلم "

اور وجہ اختلاف اور اس میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ جس شخص کو سفید بال خوبصورت لگ رہے ہوں اسے خضاب نہ لگانا بہتر ہے۔ اور جس کے سفید بال صاف نہ ہوں، خوبصورت نہ لگ رہے ہوں، اسے خضاب لگانا بہتر ہے۔ (ماخوذ از نووی)

راقم کا موقف:

خضاب لگانے یا نہ لگانے میں انسان کو اختیار ہے، اگرچہ علامہ نووی رحمہ اللہ اور کئی اہل علم نے مستحب بھی قرار دیا ہے۔

خالص سیاہ رنگ کے خضاب میں بھی اگرچہ اختلاف ہے بعض نے مکروہ تنزیہی کہا ہے۔ اور بعض نے حرام، لیکن راقم کا موقف اس میں یہی ہے کہ خالص سیاہ رنگ سے اجتناب ضروری ہے۔

صحابہ کرام نے مہندی اور کتم (سیاہ رنگ دینے والا پودہ) کو ملا کر خضاب لگایا ہے۔ اس لئے ایسا ہی خضاب لگایا جائے جس میں سرخ اور سیاہ کو ملا کر استعمال کیا جائے، بلکہ اب یہ بھی ضروری نہیں کیونکہ اب جتنے خضاب استعمال ہو رہے ہیں۔ وہ تمام مختلف رنگوں میں مل رہے ہیں، ان رنگوں میں براؤن بھی مل رہا ہے، جو تیار ہی سرخ اور سیاہ سے ہے وہ استعمال کر لیا جائے۔

کسی چیز کی اصل کا شریعت میں ملنا ضروری ہے، یا ممانعت کا نہ ملنا ضروری ہے۔ جب حناء اور کتم کا استعمال صحابہ کرام سے ملتا ہے، تو اسی سے واضح ہو گیا کہ سرخ اور سیاہ خضاب کو ملا کر استعمال کرنا جائز ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ خضاب لگانے والے علماء کرام مسئلے سے بخوبی واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علماء کرام کے بالوں میں جب خضاب کے رنگ کو مدہم دیکھتا ہوں تو وہ سرخی مائل نظر آتے ہیں۔

☆☆☆☆

﴿وَاِذۡ جَعَلۡنَا الۡبَيۡتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمۡنًا ؕ وَاتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدۡنَاۤ اِلٰٓى اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ اَنۡ طَهِّرَا بَيۡتِىَ لِلطَّآئِفِيۡنَ وَالۡعٰكِفِيۡنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوۡدِ﴾ (آیت۱۲۵)

۱) اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کا مرجع اور امان بنایا اور ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کا مقام بناؤ، اور ہم نے تاکید فرمائی ابراہیم واسماعیل کو کہ میرا گھر خوب ستھرا کرو طواف والوں اور اعتکاف والوں اور رکوع وسجود والوں کیلئے۔

۲) اور یاد کرو جب بنایا ہم نے اس مقام کو لوٹنے کی جگہ لوگوں کے لئے۔ اور امن والا، اور بناؤ تم ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کا مقام۔ اور ہم نے تاکید فرمائی ابراہیم اور اسماعیل کو کہ ستھرا کریں میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے۔

آیۂ کریمہ کی وضاحت پیش کرنے سے پہلے راقم اپنی کتاب تسکین الجنان کا ایک ورق ذکر کر رہا ہے۔ جس سے تراجم کا فرق سمجھ میں آ جائے۔

﴿وَاِذۡ جَعَلۡنَا الۡبَيۡتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمۡنًا﴾ (پ۱ ع۱۵)

اور جب ٹھہرایا ہم نے یہ گھر کعبہ اجتماع کی جگہ لوگوں کی اور پناہ	شاہ عبدالقادر
اور جب ہم نے مقرر کیا خانہ کعبہ کو اجتماع کی جگہ لوگوں کے واسطے اور جگہ امن کی	محمود الحسن
اور یہ کہ ہم نے اس گھر (کعبے) کو لوگوں کے لئے مرکز اور امن کی جگہ بنایا	مودودی
اور جب ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے لئے جمع ہونے اور امن پانے کی جگہ مقرر کیا	فتح محمد
اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کے لئے مرجع اور امان بنایا	اعلیحضرت احمد رضا خان

اس مقام پر مثابۃ کا ترجمہ اجتماع کی جگہ کیا گیا ہے، اور اعلی حضرت نے مرجع یعنی جائے رجوع

کیا ہے۔ اور یہ ترجمہ لغت کے مطابق ہے اور مقصد بھی بیان کرنے کا یہی ہے کہ لوگ اس کی طرف بار بار لوٹتے ہیں اور دیکھنے کے لئے بے قرار ہوتے ہیں۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت پر جلالین کی عبارت ملاحظہ ہو۔ " **مرجعا یثوبون الیه من کل جانب** " یعنی مرجع بنایا کہ ہر جانب سے لوگ اس طرف لوٹتے ہیں۔

جلالین کے حاشیہ پر یہ ہے۔ " **یثوبون ای یرجعون** "ثوب گرد آمدن مردم (صراح) یہاں بھی معنی لوٹنا ہے۔

مدارک میں اس طرح ہے۔ " **صباۃ و مرجعا للحجاج والعمار یتفرقون عنه ثم یثوبون الیه** "

حاجیوں اور عمرہ کرنے والوں کے لئے مرجع بنایا جو اس سے جدا ہوتے ہیں اور پھر اس کی طرف لوٹتے ہیں۔

بیضاوی میں ہے۔ " **مرجعا یثوبون الیه الزوار اوامثالهم** " مرجع ہے کہ اس کی طرف زائرین لوٹتے ہیں۔

تفاسیر کی عبارات سے یہ خود بخود پتہ چلتا ہے کہ صرف ''اجتماع کی جگہ'' ترجمہ کرنے سے اس کا مرجع ہونا نہیں سمجھ آتا۔ کیونکہ اجتماع تو ایک مرتبہ بھی پایا جائے۔ اگرچہ یہ کہنا درست تو ہے کہ وہ اجتماع کی جگہ ہے، لیکن بیت اللہ شریف تو بار بار لوٹنے اور مجتمع ہونے کی جگہ ہے۔ البتہ مرجع ترجمہ کرنے سے اجتماع کی جگہ سمجھ میں آجاتی ہے۔

کیونکہ حج کے لئے بار بار لوٹنا اجتماع کو بھی مستلزم ہے۔

(تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان ص ۴۵، ۴۶)

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ: اس مقام پر " البیت " پر الف لام عہد خارجی ہے یا الف لام جنسی ہے۔ بعض حضرات نے الف لام عہد خارجی کہا ہے۔ اور اس کی خصوصیت کا اعتبار کرتے ہوئے۔ "البیت" سے مراد کعبہ شریف لیا ہے۔ اور بعض حضرات نے الف لام جنسی کہا ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ کے نزدیک یہی قول معتبر ہے، آپ فرماتے ہیں، اس مقام پر فقط کعبہ شریف معتبر نہیں، کیونکہ آگے " امنا " آرہا ہے۔ صرف کعبہ شریف کو امن والا نہیں بنایا گیا۔

" **وهذا صفة جميع الحرم، لا صفة الكعبة فقط** "

کیونکہ یہ صفت تمام حرم شریف کی ہے۔صرف کعبہ کی نہیں۔

اس پر دلیل بھی واضح طور پر قرآن پاک میں موجود ہے کہ ذکر " الكعبه " ہے۔اور مراد اس سے ''حرم'' ہے۔جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا﴿هَدْياً بَالِغَ الْكَعْبَةِ ﴾ اس مقام پر " الكعبة " سے مراد ''حرم'' ہے، کیونکہ " هدی " کعبہ میں ذبح نہیں ہوتی اور نہ ہی مسجد حرام میں ذبح ہوتی ہے۔ بلکہ اس سے مراد حرم ہے۔

اسی طرح رب تعالیٰ نے فرمایا﴿ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ﴾ اس مقام پر مسجد حرام سے مراد، حج اور نسکِ حج کے مقامات ہیں۔

ابھی تک جو بحث ذکر کی ہے اس سے واضح ہو گیا کہ " بیت کا وصف " امن " ذکر کر کے واضح کر دیا کہ البیت سے مراد حرم ہے۔البتہ " البيت " ذکر کر کے مراد ''حرم'' لینا کس وجہ سے ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے " ان حرمة الحرم لما كانت معلقة بالبيت جاز ان يعبر عنه باسم البيت " کہ بے شک حرم کی حرمت جب بیت اللہ شریف کی وجہ سے ہی ہے۔تو اسی وجہ سے ''البیت'' ذکر کر کے مراد حرم شریف لے لیا ہے۔

مَثَابَةً لِّلنَّاسِ: یہ ماخوذ ہے " ثاب يثوب مثابة و ثوبا " سے، جس کا معنی ہے ''لوٹنا'' جس طرح کہا جاتا ہے " ثاب الماء " اس کا مطلب ہے۔پانی انقطاع کے بعد نہر کی طرف لوٹ آیا۔

اسی طرح کہا جاتا " ثاب الی فلان عقله و تفرق عنه الناس ثم ثابوا " فلاں آدمی کی بے عقلی کی وجہ سے لوگ اسے چھوڑ چکے تھے لیکن اس کی عقل لوٹ آئی، اور لوگ بھی اس کی طرف لوٹ آئے، یعنی اس عبادت میں " ثاب " اور " ثابوا " کا معنی لوٹنا ہے۔اب مقصد یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا، مقام حرم کو ہم نے امن اور لوٹنے کی جگہ بنایا۔

" قال الحسن معناه انهم يثوبون اليه فی كل عام "

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ حرم شریف کی طرف ہر سال لوٹ کر آتے ہیں۔

اعتراض: تمام لوگ تو ہر سال لوٹ کر نہیں آتے، تو پھر لوٹنے کی جگہ بنانے کا کیا مطلب ہے۔

جواب: " وعن ابن عباس و مجاهد انه لاينصرف عنه احد الا هو يتمنى العود اليه "

حضرت ابن عباس اور مجاہد رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں، کہ بے شک ہر شخص اگرچہ ہر سال لوٹ کر آ تو نہیں سکتا، لیکن ہر آدمی کے دل میں تمنا پائی جاتی ہے کہ وہ لوٹ کر آئے۔

دراصل یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کا اثر ہے۔ آپ نے رب تعالیٰ سے دعاء فرمائی۔

" فاجعل افئدة من الناس تهوى اليهم " تو تو لوگوں کے کچھ دل ان (مکہ میں رہنے والوں) کی طرف مائل کردے۔ " مثابة " کا ایک معنی ثواب دیا جانا بھی ہے۔ یعنی۔ " يحجون اليه فيثابون عليه " کہ وہ حج کریں گے تو ان کو ثواب عطاء کیا جائے گا۔

اسی سے ایک اور مسئلہ بھی واضح ہو گیا کہ تمام اعمال اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ کیونکہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَاللهُ خَلَقَكُمْ وَمَاتَعْمَلُوْنَ ﴾ اور اللہ نے تمہیں اور تمہارے اعمال کو پیدا کیا۔

یعنی ان کا عمل چونکہ رب تعالیٰ کی توفیق سے ہوتا ہے۔ وہ اپنے نیک عمل کی وجہ سے رب تعالیٰ کے فضل سے ثواب کے مستحق ہوں گے لیکن وہ ثواب ان کو مالک الملک کی عطاء سے ہی حاصل ہوگا۔

وَاَمْناً : (اور امن والا بنایا) یعنی اللہ تعالیٰ نے " جعل اهل الحرم آمنين من القحط والجدب " حرم والوں کو قحط سالی اور خشک سالی سے امن والا بنایا۔

اور یہ آیۃ کریمہ امر کے معنی کو بھی مستلزم ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو حکم دیا ہے کہ تم حرم میں قتل و غارت نہ کرو، تم اس مقام کا احترام کرو۔ " فكان البيت محترما بحكم الله تعالىٰ " یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم سے بیت اللہ شریف اور حرم شریف محترم ہو گئے۔ (از کبیر)

☆ " قال رسول الله ﷺ يوم فتح مكة ان هذا البلد حرمه الله يوم خلق السموٰت والارض فهو حرام بحرمة الله الى يوم القيامة وانه لن يحل القتال فيه لاحد ولم يحل لى الا ساعة من نهار فهو حرام بحرمة الله الى يوم القيامة لايعضد شوكه ولاينفر صيده ولا يلتقط لقطته الا من عرفها ولايختلى خلاها ، فقال العباس يا رسول الله الا الا ذخرفانه لقينهم ولبيوتهم فقال الا الا ذخر" (بخاری ، مسلم ، مظهری)

فتح مکہ کے دن نبی کریم ﷺ نے فرمایا، بے شک اس شہر کو اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کے پیدا کرنے کے دن سے ہی محترم بنایا، یہ قیامت تک اللہ تعالیٰ کے محترم کرنے سے محترم ہے۔ بے شک کسی کیلئے حلال نہیں کہ اس میں قتال کرے، میرے لئے بھی حرام ہے، صرف ایک گھڑی کیلئے میرے لئے حلال کیا گیا ہے، پھر قیامت تک اللہ تعالیٰ نے اس میں قتال کو حرام قرار دے دیا۔ اس کے پودے نہ کاٹے جائیں۔ اور اس کے شکار کو نہ بھگایا جائے، اور اس سے کسی گری ہوئی چیز کو نہ اٹھایا جائے، سوائے اس کے کہ اعلان کرنے کی غرض سے اٹھائے اور اس کا گھاس نہ کاٹا جائے۔ حضرت عباس ﷺ نے اذخر گھاس کے مستثنیٰ کرنے کی درخواست کی، تو آپ نے اذخر کو مستثنیٰ فرما دیا۔ یہ گھاس ان کے گھروں کی چھتوں پر ڈالنے کیلئے، لوہار کی بھٹی میں جلانے کے لئے اور قبروں میں ڈالنے کے کام آتا تھا۔

مسئلہ : ہر وہ درخت جو عام طور پر خود اگتا ہے جس طرح جھاڑی، اور کیکر وغیرہ، وہ خود ہی حرم میں اگ پڑے (پیدا ہو جائے) تو اس کا کاٹنا حرام ہے۔

اگر اسے ہی کسی نے لگایا تھا تو اس کا کاٹنا جائز ہے۔ ایسے ہی وہ درخت جن کو عام طور پر لوگ خود لگاتے ہیں جس طرح پھلدار درخت وغیرہ، ان کو کسی نے خود لگایا، یا وہ خود پیدا ہو گئے۔ دونوں صورتوں میں ان کا کاٹنا جائز ہے۔ (از شامی)

کیا خوب امن:

حرم شریف کو اللہ تعالیٰ نے کیا خوب امن والا بنایا کہ حرم میں اگر شکاری کتا اور ہرن جمع ہو جائیں تو کتے کو ہرن کے پکڑنے کے لئے برانگیختہ کرنا منع ہے۔ ہاں اگر ہرن حرم سے باہر نکل جائے تو پھر اس پر کتے کو چھوڑنا جائز ہوگا۔ (احکام القرآن للجصاص)

مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ حرم شریف میں قدرتی طور پر کسی بھیڑیے کو طاقت ہی حاصل نہیں ہوتی کہ وہ کسی بھیڑ، بکری پر حملہ کرے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''جب حرم کے باہر کتا ہرن پر حملہ کرنا چاہے، اور اس کا پیچھا کرے، وہ ہرن اس سے بھاگ پڑے، اور کتا بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو، '' فاذا دخل الظبی الحرم لم یتبعه

الکلب" تو وہ ہرن حرم میں داخل ہو جائے تو کتا اس کا پیچھا کرنا چھوڑ دیتا ہے۔

" وکانت الجاهلية متمسكين بتحريمه ، لايهيجون على احد التجأ اليه "

زمانہ جاہلیت میں بھی لوگ حرم شریف کا احترام کرتے تھے، اگر کوئی شخص حرم کی پناہ لے لیتا، تو دوسرے اس پر حملہ نہیں کرتے تھے۔

" وكانوا يسمعون قريشا اهل الله تعظيما له " چونکہ قریش کعبہ شریف کے خدام، حرم کے پاسبان تھے۔ اسی وجہ سے یعنی حرم کی تعظیم اور حرمت کی وجہ سے زمانہ جاہلیت میں بھی لوگ قریش کو" اہل اللہ" (اللہ والے) کہتے۔ (از کبیر ملخصاً)

مسئلہ: اگر کوئی شخص قتل کر کے حرم میں آ جائے تو اس میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ اس کو حرم شریف میں قصاص کے طور پر قتل نہیں کیا جائے گا۔

" لكن يضيق على الجانى ولايكلم ولا يطعم ولا يعامل حتى يخرج فيقتل "

البتہ اس پر تنگی کی جائے، اس سے کوئی کلام نہ کرے اور نہ اسے طعام دیا جائے۔ اور کسی طرح بھی اس سے کوئی معاملہ نہ کیا جائے، یہاں تک کہ وہ حرم سے نکل جائے، پھر اسے قتل کیا جائے۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی پر حد یا قصاص لازم ہو تو وہ حرم میں پناہ پکڑ لے، تو امام اس پر تنگی کرے تا کہ وہ حرم سے نکل جائے" فاذا خرج اقيم عليه الحد فى الحل فان لم يخرج جاز قتله فيه " جب وہ نکلے تو حرم سے باہر" حل" میں اسے قتل کیا جائے اور اس پر حد لگائی جائے، اگر نہ نکلے تو حرم کے اندر ہی اسے قتل کر دیا جائے۔

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ حرم کے اندر پناہ لینے والے سے کسی طرح بھی قصاص نہیں لیا جائے گا۔ خواہ وہ قتل کا قصاص ہو، یا ہاتھ پاؤں وغیرہ کے کاٹنے کا قصاص ہو۔ ہاں البتہ حرم سے نکلنے پر قصاص لیا جائے گا۔ (از روح المعانی)

امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ بیت اللہ شریف میں تو کسی کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ البتہ حرم میں قتل کرنے والے کو قتل کر دیا جائے گا، اور لڑائی کرنے والے سے لڑائی کی جائے گی۔ اور جو باہر سے

حرم میں پناہ لے اور اس پر حد لازم ہو تو اسے قید کر لیا جائے۔ (قرطبی)

امام اعظم رحمہ اللہ کا مذہب بھی یقیناً اعظم ہے کہ حرم کا بھی لحاظ کیا جائے۔ اور اس شخص پر کھانے، پینے کی اشیاء نہ پہنچنے دی جائیں۔ یقیناً وہ باہر نکلے گا۔ کوئی شخص اپنے کو بھوک سے قتل نہیں کرتا

لہٰذا علامہ قرطبی رحمہ اللہ کا یہ کہنا۔ " فنحن نقتله بالسيف وهو يقتله بالجوع " (ہم تلوار سے قتل کرتے ہیں اور امام اعظم رحمہ اللہ بھوک سے قتل کرتے ہیں) بے حقیقت ہو کر رہ گیا۔

مسئلہ: جو شخص حرم کے اندر قتل کرتا ہے۔ یا باعث حد کام کرتا ہے، تو اس سے قصاص لے لیا جائے گا، اور اس پر حد نافذ کر دی جائے گی۔ اسے حرم کی سرزمین امن نہیں دے گی۔ (قرطبی)

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ : اور بناؤ تم ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کا مقام

اس کی وجہ نزول کا ذکر اس حدیث میں ہے جو ابونعیم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے بیان کی۔

" ان النبی ﷺ اخذ بید عمر رضی اللہ عنہ فقال یا عمر هذا مقام ابراهيم فقال عمر افلا نتخذه مصلی فقال لم او مر بذلک فلم تغب الشمس حتی نزلت هذه الاية "

بے شک نبی کریم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا، اور فرمایا اے عمر یہ مقام ابراہیم ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، کیا ہم اس کو نماز کا مقام نہ بنالیں؟ تو حضور نے فرمایا ابھی مجھے اس کا حکم نہیں دیا گیا اسی دن غروب شمس (سورج غروب ہونے) سے پہلے اس آیۂ کریمہ کا نزول ہو گیا۔

خیال رہے کہ یہ حکم استحبابی ہے، کہ طواف کے بعد دو رکعت مقام ابراہیم کے پاس پڑھے، اگر وہاں جگہ نہ ملے تو مسجد حرام میں جہاں چاہے پڑھ لے۔

☆ عن انس بن مالک قال قال عمر وافقت ربی فی اربع ، قلت یا رسول الله لو صليت خلف المقام فنزلت هذه الاية ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى﴾ وقلت یا رسول الله لو ضربت على نسائک الحجاب فانه يدخل عليهن البر والفاجر فانزل الله ﴿وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْاَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ﴾ ونزلت هذه الاية ﴿ولقد خلقنا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ﴾ فلما نزلت قلت انا تبارک الله احسن الخالقين ، فنزلت

﴿فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ﴾ و دخلت علی ازواج النبی ﷺ فقلت لتنتھن اولیبدلنه الله بازواج خیر منکن فنزلت الآیة ﴿عَسٰی رَبُّه' اَنْ طَلَّقَکُنَّ﴾ (مسند ابی داؤد الطیالسی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد یہ ہے کہ چار آیات کے نزول میں (میرے رب نے میری موافقت فرمائی یا) میں نے اپنے رب کی موافقت کی۔

میں نے کہا یا رسول اللہ کاش کہ مقام ابراہیم کے پیچھے نماز پڑھتے، تو یہ آیۃ نازل ہوئی۔ ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰھِیْمَ مُصَلّٰی﴾ اور آپ فرماتے ہیں۔ میں نے کہا یا رسول اللہ کاش کہ آپ کی ازواج مطہرات پردہ کریں، کیونکہ کئی نیک لوگ اور کئی برے لوگ ان کے سامنے آتے ہیں۔ تو رب تعالیٰ نے پردہ کا حکم اس آیۃ میں نازل فرمادیا۔

﴿وَاِذَا سَاَلْتُمُوْھُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْھُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ﴾

اور جب یہ آیۃ نازل ہوئی ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ﴾ تو میں نے رب تعالیٰ کی توصیف میں یہ پڑھا ﴿فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ﴾ تو اللہ تعالیٰ نے یہ الفاظ مبارکہ نازل فرمائے ﴿فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ﴾ اور آپ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کی ازواج کے پاس گیا اور میں نے کہا تو تم نبی کریم ﷺ سے ناراضگی کا کام چھوڑ دو، یا وہ تمہیں طلاق دے دیں اور رب تعالیٰ تم سے بہتر ازواج ان کو عطاء کر دے، تو رب تعالیٰ نے میری تائید میں آیۃ نازل فرمادی۔ ﴿عَسٰی رَبُّه' اَنْ طَلَّقَکُنَّ ...... الخ﴾

علامہ قرطبی فرماتے ہیں۔ بدر کے قیدیوں کے متعلق بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کے مطابق آیۃ نازل ہوئی، اس طرح پانچ مقام ہوگئے۔ (قرطبی)

تاہم علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے تاریخ الخلفاء میں اور مقامات کا بھی تذکرہ کیا، ایک قول کے مطابق اٹھارہ آیات آپ کی رائے کے مطابق نازل ہوئیں۔

مقام ابراہیم کیا ہے؟

مقام ابراہیم وہ پتھر ہے جس پر ابراہیم علیہ السلام نے اپنے پاؤں رکھے اور آپ کی بہو یعنی

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی زوجہ نے آپ کے پاؤں کو دھویا۔

اور اسی پتھر پر آپ نے کھڑے ہو کر کعبہ شریف کی تعمیر کی۔ اور اسی پتھر پر کھڑے ہو کر تعمیر کعبہ کے بعد آپ نے لوگوں کو حج کے لئے دعوت دی۔

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے تفصیلی واقعہ بخاری شریف سے پیش کیا جاتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا، کہ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کی کچھ چپقلش اور نوک جھوک کی وجہ سے رب تعالیٰ نے اپنے نبی کا امتحان لینے اور کعبہ شریف کی تعمیر اور مکہ شریف کو بسانے کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنی زوجہ ہاجرہ اور اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو وہاں چھوڑ دو جہاں آجکل کعبہ شریف اور مسجد حرام آباد ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام رب تعالیٰ کے حکم سے اپنی زوجہ اور اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو لائے کعبہ شریف کے پاس مسجد میں زمزم کے مقام پر ان کو چھوڑا، اس وقت اسماعیل علیہ السلام شیر خوار (دودھ پیتے) بچے تھے، اس وقت نہ مکہ شریف تھا اور نہ ہی وہاں کوئی پانی تھا۔

ابراہیم علیہ السلام نے اپنی زوجہ اور اپنے بیٹے کو چھوڑتے وقت ان کے پاس ایک تھیلا رکھا، اسمیں کچھ کھجوریں تھیں، اور ایک چھوٹا سا مشکیزہ رکھا اس میں پانی تھا، اور آپ پیچھے کی جانب لوٹے، تو حضرت ہاجرہ نے آپ کا پیچھا کیا اور آپ کو کہا اے ابراہیم آپ ہمیں اس وادی میں کیوں چھوڑ کر جا رہے ہو جہاں کوئی مونس و غمخوار نہیں، اور کوئی چیز نہیں۔ کئی مرتبہ حضرت ہاجرہ نے یہ سوال کیا، لیکن آپ نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔

" فقالت له الله امرک بهذا قال نعم قالت اذ لا يضيعنا "

تو حضرت ہاجرہ نے پھر آپ سے یہ پوچھا، کیا آپ ہمیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہاں چھوڑ کر جا رہے ہو؟ آپ نے فرمایا ہاں، یعنی اللہ کے حکم سے چھوڑ کر جا رہا ہوں، تو حضرت ہاجرہ نے کہا ٹھیک ہے ہمیں اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرے گا۔ یعنی ہماری حفاظت فرمائے گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کام کو سن کر حضرت ہاجرہ اپنی جگہ پر چلی گئیں۔ حضرت ابراہیم علیہ

السلام بھی وہاں سے چلے گئے اور جب آپ وادی میں پہنچے جہاں سے آپ کو وہ جگہ نظر نہیں آ رہی تھی، تو آپ نے بیت اللہ شریف کی طرف متوجہ ہو کر ہاتھ اٹھا کر دعاء کی۔

﴿ رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْ اِلَیْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ ﴾

(سورة ابراهيم ۳۷)

اے میرے رب میں نے اپنی کچھ اولاد ایک نالے میں بسائی، جس میں کھیتی نہیں ہوتی، تیرے حرمت والے گھر کے پاس، اے ہمارے رب اس لئے کہ وہ نماز قائم رکھیں تو تو لوگوں کے کچھ دل ان کی طرف مائل کر دے، اور انہیں کچھ پھل کھانے کو دے شائید وہ احسان مانیں۔

حضرت ہاجرہ اپنے بیٹے کو دودھ پلانے لگیں، اور آپ کے پاس جو تھوڑا سا پانی تھا وہ ختم ہو گیا۔ آپ کو بھی پیاس شدید لگ گئی۔ آپ کا بیٹا بھی بھوکا اور پیاسا ہو گیا۔

آپ ادھر ادھر دیکھنے لگیں کہ کوئی شخص نظر آئے، یا پانی کا کوئی اتہ پتہ چلے، آپ اسی بے قراری میں قریب ہی صفا پہاڑی پر چڑھ کر دیکھنے لگیں، کچھ پتہ نہ چلنے پر مروہ پہاڑی پر آ گئیں، درمیان میں جب وادی (نشیبی جگہ) میں پہنچیں جہاں بچہ نظر نہیں آ رہا تھا وہاں سے آپ تیز چلیں، جب بچہ نظر آنے لگا، آہستہ چلنے لگیں۔

مروہ پر بھی کچھ نظر نہ آیا، اسی بے قراری میں صفا سے مروہ اور مروہ سے صفا پر آپ نے سات چکر لگا ڈالے۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں۔ "**قال النبی ﷺ فلذلک سعی الناس بینهما**"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا اسی لئے لوگ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے ہیں۔

جب آپ کا ساتواں چکر مروہ پر مکمل ہوا تو آپ نے ایک آواز سنی، آپ نے اپنے آپ کو خطاب کرتے ہوئی کہا، ذرا رکو، سنو، یہ آواز کہاں سے آئی، دوسری مرتبہ پھر آواز آئی، تیسری مرتبہ پھر آواز آئی۔ آپ نے کہا اگر یہ فریاد رس کی آواز ہے تو وہ کوئی فرشتہ ہی ہو سکتا ہے۔

"فبحث بعقبه او قال بجناحه حتی ظهر الماء"

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ایڑی کی رگڑ سے، یا (حضرت ابن عباس فرماتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے) فرمایا کہ فرشتے کے پر سے وہاں پانی نکل آیا۔

خیال رہے کہ راقم نے اس کا حسین امتزاج کیا ہے کہ ادھر حضرت اسماعیل علیہ السلام ایڑی رگڑ رہے تھے، اسی ایڑی رگڑنے کی جگہ فرشتے کو پر مارنے کے لئے حکم دیا گیا، تا کہ زمین نرم ہو جائے، دراصل حضرت اسماعیل علیہ السلام کا اعجاز ہی ہے آپ کے ایڑی رگڑنے سے ہی پانی نکلا۔

حضرت ہاجرہ پانی کا چلو بھرتیں تو نیچے سے پانی اور جوش مارتا آپ نے پانی کو روکنے کے لئے اردگرد مٹی کا بند باندھ دیا۔ اور پانی کو کہا ''زم زم'' رک جا رک جا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔

'' یرحم اللہ ام اسماعیل لو ترکت زمزم او قال لو لم تغرف من الماء لکانت زمزم عینا معینا ''

اللہ تعالیٰ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ پر رحم فرمائے، اگر آپ پانی کے لئے ''زم زم'' کے لفظ نہ استعمال فرماتیں۔ یا حضور نے فرمایا، اگر آپ اس پانی سے (جلدی سے) چلو نہ بھرتیں تو وہ پانی بہت بڑا چشمہ ہوتا۔

یعنی وہ عظیم نہر کی شکل اختیار کر کے روئے زمین والے لوگوں کو سیراب کرتا۔

اس فرشتہ نے حضرت ہاجرہ کو کہا، تم ضائع ہونے (ہلاک ہونے) کا کوئی خوف نہ رکھو، بے شک یہاں بیت اللہ ہے۔

'' یبنیہ ھذا الغلام و ابوہ و ان اللہ لایضیع اھلہ ''

جس کی تعمیر یہ بچہ اور اس کا باپ کریں گے، اللہ تعالیٰ اپنے مقربین کو ضائع نہیں کرتا۔

یہ بھی خیال رہے کہ بیت اللہ تو حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے تھا، جس کی تفصیل انشاء اللہ بعد میں ذکر کی جائے گی۔ لیکن اس وقت ایک ٹیلے کی شکل میں نظر آتا تھا، وادیوں کا بارشی پانی اس کے دائیں بائیں گذر جاتا تھا۔

وہاں سے جرہم (جیم پر ضمہ) قبیلہ کا گذر ہوا۔ وہ بھی بیابان جنگل میں پانی کو تلاش کر رہے تھے،

کہیں کچھ دور فاصلہ سے پرندوں کو ایک جگہ کے اوپر اڑتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے سمجھ لیا کہ وہاں کوئی پانی ہوگا جہاں پرندے اڑ رہے ہیں، ان میں کچھ آدمی آئے تو دیکھا کہ پانی کا ایک چشمہ ہے۔ اس کے قریب ایک عورت اور ایک بچہ ہے۔

وہ لوگ واپس گئے اپنے قبیلے والے لوگوں کو بتایا کہ وہاں پانی ہے، اور پانی کے پاس ایک عورت اور ایک بچہ ہے، وہ تمام لوگ وہاں آ گئے۔ حضرت ہاجرہ کو کہا۔

"اتاذنین لنا ان ننزل عندک قالت نعم ولکن لاحق لکم فی الماء قالوا نعم"

کیا تم ہمیں اجازت دیتی ہو کہ ہم تمہارے پاس ہی یہاں ٹھہر جائیں۔ آپ نے فرمایا ٹھیک ہے۔ تم رہ جاؤ۔ لیکن پانی پر تمہارا حق نہیں ہوگا۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔

حضرت ہاجرہ بھی چاہتی تھیں کہ یہاں انسان رہیں۔ تاکہ ان سے انس ہو۔ اس طرح وہ تمام قبیلہ مرد، عورتیں، چھوٹے، بڑے وہاں آباد ہو گئے۔ یہی مکہ شہر کی گویا کہ ابتداء ہے۔ اور بعد میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کعبہ شریف کی بھی تعمیر کر دی۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی پہلے عبرانی زبان تھی، لیکن بنی جرہم کی زبان عربی تھی، جب سے وہ لوگ وہاں آباد ہوئے تو آپ کا ان سے میل جول اکثر اوقات رہتا تو آپ نے بھی عربی زبان بولنی شروع فرما دی۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام جب جوان ہو گئے تو بنی جرہم نے ہی اپنے خاندان کی ایک لڑکی سے آپ کی شادی کر دی حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کا وصال ہو گیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں تمنا واقع ہوئی کہ میں اپنی زوجہ اور بیٹے کو مل کر آؤں۔ (یقینی بات ہے کہ وہاں چھوڑا بھی رب تعالیٰ کے حکم سے تھا، اور ملنا بھی اسی کی اجازت سے تھا، اس سے پہلے اجازت ہی نہیں ملی، اب اجازت ملی) آپ آئے تو آپ کو پتہ چلا کہ حضرت اسماعیل کی شادی ہو چکی ہے۔ آپ ان کی زوجہ کو ملے اس سے اسماعیل علیہ السلام کے متعلق پوچھا، تو اس نے بتایا۔ "خرج یبتغی لنا، وفی روایۃ ذھب یصید لنا" کہ وہ باہر کہیں گئے ہیں کہ ہمارے لئے کوئی رزق تلاش

کر کے لائیں۔اور ایک روایت میں ہے کہ وہ ہمارے لئے شکار کرنے گئے ہیں۔

آپ نے اس عورت سے ان کے گذر اوقات کے متعلق سوال کیا،تو اس نے بتایا" نحن فی ضیق وشدة " ہم تنگ حالی اور شدید پریشانی کی زندگی گذار رہے ہیں۔یعنی ہماری گذر اوقات تنگی سے ہورہی ہے۔

اس کی اس شکایت کو اور رب تعالیٰ کی ناشکری کو ابراہیم علیہ السلام نے پسند نہ فرمایا۔ کہ نبی کی زوجہ کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ رب تعالیٰ کے فیصلہ کے خلاف شکایت کرے۔

" فقال اذا جاء زوجک اقرئی علیه السلام وقولی له یغیر عتبة بابه "

تو آپ نے فرمایا جب تمہارے خاوند آئیں تو ان کو میرا سلام کہنا،اور ان کو کہنا کہ تم اپنے دروازہ کی دہلیز بدل دو۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام جب واپس آئے تو آپ کو محسوس ہوا کہ آج کوئی بزرگ شخصیت ہمارے گھر آئی۔تو آپ نے پوچھا کیا کوئی شخص آج آیا تھا۔آپ کی زوجہ نے بتایا کہ ہاں ایک شخص بزرگ قسم کے تشریف لائے تھے،انہوں نے تمہارے متعلق پوچھا،تو میں نے ان کو بتایا کہ وہ شکار کے لئے گئے ہیں۔پھر انہوں نے ہماری گذر اوقات کے متعلق پوچھا تو میں نے ان کو بتایا کہ ہم تنگ حالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے پوچھا کیا وہ تمہیں کوئی وصیت بھی کر کے گئے ہیں؟ اس نے کہا ہاں وہ مجھے کہہ گئے تھے کہ میں ان کا سلام تمہیں پہنچاؤں،اور یہ بھی کہہ گئے تھے کہ گھر کے دروازہ کی دہلیز بدل دو

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بتایا۔" ذلک ابی وقد امرنی ان افارقک الحقی باهلک فطلقها " کہ وہ میرے باپ تھے وہ مجھے حکم دے گئے کہ میں تمہیں جدا کر دوں،آپ نے اسے طلاق دے دی اور کہا تم اپنے قبیلہ والوں سے مل جاؤ۔

آپ نے اسی قبیلہ کی ایک اور عورت سے شادی کر لی،کچھ عرصہ کے بعد حضرت ابراہیم علی علیہ السلام پھر تشریف لائے،اتفاقی طور پر پھر حضرت اسماعیل علیہ السلام سے ملاقات نہ ہوسکی۔ان کی زوجہ

سے ملکران کے متعلق پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ روزی کی تلاش کے لئے باہر تشریف لے گئے۔آپ نے اس سے گذر اوقات کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا۔ " نحن بخیر وسعة وا ‌ت علی اللہ عزوجل " ہم بہتر حال میں ہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت ہم پر ہے۔ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سے پوچھا تمہارا طعام کیا ہے، تو اس نے بتایا کہ ہمارا طعام (شکار کا) گوشت اور زمزم کا پانی، تو آپ نے دعاء فرمائی۔ " اللھم بارک لھم فی طعامھم و شرابھم " اے اللہ ان کو طعام اور پانی میں برکت عطاء فرما۔

ابراہیم علیہ السلام نے اسے کہا جب تمہارے خاوند آئیں ان کو میرا اسلام کہنا، اور کہنا کہ تمہارے گھر کے دروازہ کی چوکھٹ اچھی ہے، اسے قائم رکھنا۔

اسماعیل علیہ السلام واپس آئے تو آپ نے محسوس کیا کہ کوئی بزرگ آئے تھے۔آپ نے اپنی زوجہ سے پوچھا کیا کوئی بزرگ آئے تھے۔اس نے بتایا ہاں ایک خوبصورت چہرے والے بزرگ تشریف لائے تھے۔

آپ نے پوچھا، کیا وہ کوئی پیغام بھی دے کر گئے ہیں۔تو آپ کی زوجہ نے انہیں بتایا کہ وہ تمہیں سلام کہنے کے متعلق ارشاد فرما کر گئے، اور یہ کہہ گئے کہ تمہارے گھر کے دروازہ کی دہلیز (نیچے والی چوکھٹ) اچھی ہے اسے قائم رکھنا۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ میرے باپ ہیں جو تمہارے متعلق وصیت فرما گئے ہیں کہ میں تمہیں اپنے پاس ہی رکھوں۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اس دوسری زوجہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملاقات کے دوران کہا کہ آپ سواری سے نیچے اتریں، لیکن آپ سواری سے نیچے نہ اترے، آپ کی نیک پارسا بہو نے ایک پتھر لا کر آپ کے دائیں پاؤں کے نیچے رکھ کر دھویا، پھر وہی پتھر دسرے پاؤں کے نیچے رکھ کر دھویا۔

یہ پہلی مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام ابراہیم پر کھڑا ہونا تھا۔کہ آپ نے اس پر یکے بعد دیگرے کھڑے ہو کر پاؤں کو دھلوایا۔

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام تیسری مرتبہ تشریف لائے، اس مرتبہ آپ نے خیال کیا اب اسماعیل علیہ السلام کو مل کر ہی جاؤں گا۔ آپ کعبہ شریف کے پاس ہی رک گئے۔ کچھ دیر بعد اسماعیل علیہ السلام آ گئے۔ زمزم کے قریب تیر درست کرنے لگے، باپ بیٹے نے ایک دوسرے کو دیکھا، گلے لگ کر ملے۔

دوسری مرتبہ مقام ابراہیم پر کھڑا ہونا اس وقت ثابت ہے جب کہ آپ کعبہ شریف کی تعمیر کر رہے تھے، آپ اس پتھر پر کھڑے ہوتے تو وہ نرم ہو جاتا، تا کہ آپ کے پاؤں کو تکلیف نہ ہو، اس پتھر پر آپ کے قدموں کے نشان پڑ گئے۔ (ماخوذ از خازن)

☆ "عن انس قال رأيت فی المقام اثر اصابعه وعقبه و اخمص قدميه غير انه اذهبه مسح الناس بايديهم"

حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں میں نے مقام ابراہیم میں ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں مبارک کی انگلیوں اور ایڑیوں اور قدم کے تلوے اور ایڑی کے درمیان والے حصہ کے نشانات کو دیکھا، لیکن لوگوں کے اسے ہاتھ لگانے (اور چومنے) سے اس سے نشانات مٹ گئے ہیں۔ (قرطبی)

تیسری مرتبہ آپ مقام ابراہیم پر اس وقت کھڑے ہوئے جب آپ کعبہ شریف کی تعمیر سے فارغ ہوئے، تو آپ مقام ابراہیم کو ساتھ لے گئے، جبل ابی قبیس پر کھڑے ہو کر۔ "نادی ایها الناس حجوا بيت ربكم" نداء دی اے لوگو اپنے رب کے گھر کا حج کرو۔

یہ بھی خیال رہے کہ آپ جب اس پتھر پر کھڑے ہو کر کعبہ شریف کی تعمیر کرتے تو فارغ ہونے پر پتھر کو ایک طرف رکھ دیتے تھے۔ اس پتھر کو رکھنے کی کوئی معین جگہ نہ تھی، ابراہیم علیہ السلام کے بعد یہ کعبہ شریف کے اندر بھی رہا۔

البتہ بعد میں "وضع بعيدا من الحجر الاسود بسبعة وعشرين ذراعا" اس کو حجر اسود سے ستائیس ذراع دور رکھ دیا گیا۔ (روح المعانی)

اب بھی تقریباً وہیں ہے۔ چار پانچ فٹ بلند گول خول میں بند ہے، جسے شیشہ لگا ہوا ہے۔ چلتے چلتے کچھ نظر آ جاتا ہے۔ لیکن اسکے پاس کھڑے ہو کر غور سے دیکھنے کی سعودیہ کے خدام اجازت نہیں دیتے۔

حجرِ اسود اور مقام ابراہیم جنتی یاقوت ہیں:

”عن عبداللہ بن عمرو بن العاص قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول ان الرکن والمقام یاقوتان من یاقوت الجنۃ طمس اللہ نورھما ولو لم یطمس نورھما لاضاء ما بین المشرق والمغرب“

(اخرجہ الترمذی)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے میں نے سنا کہ بے شک حجر اسود اور مقام ابراہیم جنت کے یاقوتوں میں سے یاقوت ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے نور کو مٹا دیا ہے۔ اگر ان کا نور محو نہ کیا جاتا تو یہ مشرق و مغرب کے درمیان روشنی پھیلاتے۔

ترمذی نے بیان کیا ہے کہ یہی حدیث حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے موقوف طریقہ سے بھی ثابت ہے۔ (خازن)

تعمیر کعبہ:

آدم علیہ السلام کی تعمیر: ابن عساکر وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جب جنت سے تشریف لائے تو بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ خدایا میں یہاں نہ تو ملائکہ کی تسبیح و تکبیر سنتا ہوں اور نہ کوئی عبادت گاہ دیکھتا ہوں، جیسے کہ آسمان میں بیت المعمور دیکھتا تھا۔ جس کے ارد گرد ملائکہ طواف کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا جاؤ جہاں ہم نشان بتاتے ہیں وہاں کعبہ بنا کر اس کے ارد گرد طواف بھی کر لو اور اس کی طرف نماز بھی ادا کرو۔ حضرت جبرائیل آدم علیہ السلام کی رہبری کے لئے ان کے ساتھ چلے اور انہیں وہاں لائے جہاں سے زمین بنی تھی یعنی کعبہ کی جگہ سے ہی سب سے پہلے پانی پر جھاگ، پھر جھاگ سے زمین کی ابتداء ہوئی۔

جبرائیل نے وہاں اپنا پر مار کر ساتویں زمین تک بنیاد ڈال دی جس کو ملائکہ نے پانچ پہاڑوں کے پتھروں سے بھرا، وہ یہ ہیں۔ کوہ لبنان، کوہ طور، جودی، حرا اور طور زیتا۔

بنیاد بھر کر نشان کے لئے ہر چار طرف کو دیوار اٹھا دی، اس طرف منہ کر کے آدم علیہ السلام نماز پڑھتے رہے، اور اس کا طواف بھی کرتے رہے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ بیت المعمور کو اس بنیاد پر

رکھ دیا گیا۔

طوفان نوح میں بیت المعمور کو اٹھا لیا گیا اور کعبہ کی جگہ اونچے ٹیلے کی طرح رہ گئی ،لوگ یہاں آتے رہے،اور برکت کی دعاء کرتے رہے۔ (از عزیزی)

☆ " عن ابن عباس رضی الله عنهما قال علیه السلام اول بقعة وضعت فی الارض موضع البيت ثم مدت منها الارض وان اول جبل وضعه الله تعالى على وجه الارض ابوقبيس ثم مدت منه الجبال "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے پہلے زمین کا وہ حصہ بنایا گیا جو کعبہ شریف کا مقام ہے پھر اسی سے اور زمین کو پھیلایا گیا۔اور بے شک سب سے پہلے پہاڑ جس کو زمین پر رکھا گیا وہ ابوقبیس ہے۔اور اسی سے پھر اور پہاڑ پھیلائے گئے۔ (از کبیر)

روایت میں ذکر ہے۔" فحج آدم البيت من الهند اربعين سنة " آدم علیہ السلام نے ہند سے بیت اللہ شریف کے چالیس حج کئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کعب سے سوال کیا یہ بیت اللہ کس طرح کا تھا؟ مطلب سوال کا یہ تھا کہ جب مشہور یہ ہے کہ بیت اللہ شریف کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی تو اس وقت کیا صورت ہوگی۔

تو انہوں نے جواب دیا" ان هذا البيت انزله الله من السماء يا قوتة مجوفة " بیشک اس وقت بیت اللہ شریف کی یہ موجودہ حالت نہیں تھی بلکہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں سے یاقوت کا خول جو بیت کی طرح تھا اتار کر ان بنیادوں پر رکھ دیا تھا جو فرشتوں نے کھودی تھیں۔

خیال رہے کہ اس روایت کے مطابق بیت المعمور کو آسمانوں سے زمین پر نازل نہیں کیا گیا۔ بلکہ آسمانوں سے یاقوت جو بیت کی طرح تھا اسے نازل کیا گیا۔واللہ اعلم بالصواب۔

☆ " وعن علی رضی اللہ عنہ قال البيت المعمور بيت فى السماء وهو بحيال الكعبة من فوقها حرمته فى السماء كحرمة البيت فى الارض يصلى فيه كل يوم سبعون من الملائكة لايعودون فيه ابدا "

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا" البیت المعمور" آسمانوں میں ایک گھر ہے، وہ کعبہ شریف کی بالکل

سیدھ پر آسمانوں پر واقع ہے۔اس کی عزت آسمانوں میں ایسے ہی ہے جیسے زمین میں بیت اللہ شریف کی ہے۔اس میں ہر دن ستر ہزار فرشتے نماز پڑھتے ہیں۔جو ایک دفعہ نماز ادا کر لیتے ہیں۔پھر ان کو کبھی دوبارہ نماز ادا کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔یعنی فرشتوں کی بہت زیادہ تعداد کی وجہ سے ان کو دوبارہ موقع نہیں ملے گا۔ (از کبیر)

ابراھیم علیہ السلام کی تعمیر:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب حضرت ہاجرہ اور اپنے بیٹے اسماعیل کو یہاں چھوڑا اور یہاں آبادی ہوگئی تو ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ اسماعیل کو ساتھ لے کر کعبہ تعمیر کرو،ایک بادل کا ٹکڑا بھیج کر کعبہ کی حد کو واضح کیا گیا۔اور جبرائیل نے خط کھینچ دیا۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آدم علیہ السلام کے زمانہ کی بنیادوں پر ہی عمارت تعمیر فرمائی۔کعبہ شریف کی بلندی نو ہاتھ۔رکن اسود سے رکن شامی تک ۳۲ ہاتھ۔رکن غربی سے رکن یمانی تک ۳۱ ہاتھ،رکن یمانی سے رکن اسود تک ۲۰ ہاتھ۔رکن شامی سے رکن غربی تک ۲۲ ہاتھ۔

یعنی کعبہ اس وقت مستطیل تھا۔لیکن طول اور عرض کی ایک ایک دیوار معمولی چھوٹی تھی۔دروازے دو بنائے گئے،جو زمین کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔کواڑ،زنجیر وغیرہ نہیں تھے۔بعد میں تبع حمیری کے زمانہ میں کواڑ زنجیر وغیرہ لگائے گئے۔

ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ شریف کو تعمیر فرمایا اور اسماعیل علیہ السلام پتھر اور گارہ وغیرہ دیتے تھے۔
سبحان اللہ کس شان سے اللہ کا گھر تعمیر ہوا۔اللہ کا نبی ہی معمار اور اللہ کا نبی ہی معاون۔ (از عزیزی،نعیمی)

خیال رہے کہ اوپر جو رکن کا لفظ استعمال ہوا ہے۔اس سے مراد کونہ،رکن اسود سے مراد وہ کونہ ہے دیوار کا جس میں حجر اسود نصب ہے۔اسی طرح ہاتھ سے مراد انگلیوں سے لے کر کہنیوں تک لمبائی یعنی تقریباً ڈیڑھ فٹ،۲۰ ہاتھ کا مطلب تیس فٹ۔

ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر کے بعد:

آپ کی تعمیر کے بعد جزوی طور پر مختلف اوقات میں تعمیر ہوتی رہی۔ ایک مرتبہ عمالقہ اور جرہم نے اسے تعمیر کیا۔ اس کے بعد قصی بن کلاب نے اس کی تعمیر کی جس میں چھت درخت مقل کی لکڑی کی بنائی جس پر بجائے تختوں کے خرمے کی لکڑی ڈالی۔

قریش کی تعمیر:

ایک عورت کعبہ شریف میں خوشبو سلگاتی تھی، ایک بار اچانک اس سے شعلہ اٹھا اور چھت جل گئی۔ اور دیواریں پہلے بوسیدہ ہو چکی تھیں۔ اس لئے قریش نے فیصلہ کیا کہ مکمل طور پر نئی تعمیر کی جائے۔

ولید بن مغیرہ کو عمارت کا امیر مقرر کیا گیا اور یہ طے ہوا کہ اس میں حلال مال خرچ ہوگا۔ اس وقت کے امیر لوگوں کے پاس زیادہ سود کے مال سے حاصل کردہ مال ہوتا تھا۔ اس لئے حلال مال کم مقدار میں جمع ہوا۔ قریش نے مال کی کمی اور کچھ اپنے مقاصد کے پیش نظر چند فرق کر دیے۔

۱) کعبہ کی کچھ زمین باہر نکال دی یعنی عمارت کو چھوٹا کر دیا۔ کعبہ سے باہر نکالی ہوئی زمین کو حطیم کہا جاتا ہے اسی میں میزاب رحمت (پرنالہ) گرتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی دیوار سے آج بھی اسے علیحدہ نمایاں کیا ہوا ہے۔ طواف اس کے باہر سے ہی ہوتا ہے۔

۲) قریش نے دو دروازوں کے بجائے ایک کر دیا۔ وہ بھی بہت بلند تا کہ جسے چاہیں اندر جانے دیں۔ اور جسے چاہیں نہ جانے دیں۔ اب بھی اس پر عمل ہو رہا ہے۔ بادشاہوں کے لئے دروازہ کھلتا ہے خواہ وہ کتنے ہی بدکار کیوں نہ ہوں، صلحاء اتقیاء کے لئے کبھی دروازہ کھلنے کی خبر نہیں سنی گئی۔

۳) خانہ کعبہ کے اندر لکڑی کے ستونوں کی دو صفیں بنائی گئیں۔ ہر صف میں تین ستون بنائے گئے

۴) کعبہ شریف کی بلندی پہلے سے دوگنا کر دی گئی۔ پہلے بلندی نو ہاتھ تھی، انہوں نے اٹھارہ ہاتھ کر دی۔

۵) خانہ کعبہ کے اندر رکن شامی کے قریب ایک زینہ بنایا گیا جس سے چھت پر چڑھ سکیں۔

حضرت عبداللہ بن زبیر کی تعمیر:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے کعبہ کے متصل بنیاد ابراہیمی (یعنی حطیم) کے پتھر مجھے دکھائے اور فرمایا کہ قریش نے اس میں کمی کر دی تھی، لوگ اگر نئے نئے مسلمان نہ ہوتے اور ان کے جذبات بھڑکنے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں ابراہیمی بنیادوں پر کعبہ دوبارہ تعمیر کر دیتا۔

اسی روایت کی بنیاد پر حضرت عبداللہ بن زبیر نے کعبہ شریف کو منہدم کر کے دوبارہ تعمیر کیا، حطیم کو کعبہ میں داخل کیا، دروازے دو بنائے جو زمین کے متصل تھے، خوشبودار مٹی چونہ میں ملا کر گارا لگایا گیا، دروازوں پر اندر باہر عنبر لگا کر خوشبودار کیا گیا، نہایت قیمتی ریشمی غلاف چڑھایا گیا۔ خیال رہے کہ سب سے پہلے کعبہ شریف کو غلاف چڑھانے والے کا نام اسعد ہے جو شاہ یمن تھا اور تبع کے لقب سے مشہور تھا۔ مدینہ طیبہ کی شہری بنیاد رکھنے والا یہی ہے۔

عبداللہ بن زبیر کی تعمیر ۲۷ رجب ۶۴ھ کو مکمل ہوئی۔ پھر حجاج بن یوسف (جو عبدالمالک بن مروان کا نائب تھا) نے ۷۴ھ میں عمارت کو منہدم کر کے پھر اسی طرح بنا دیا جیسے قریش نے بنایا تھا۔

پھر ہارون الرشید نے چاہا کہ کعبہ اس طرح بنا دیا جائے جیسے عبداللہ بن زبیر نے تعمیر کیا تھا، یعنی دراصل وہی ابراہیمی تعمیر بھی تھی۔ لیکن اس وقت کے اہل علم نے اس سے منع کیا کہ کوئی تمہارا مخالف آئے گا۔ وہ پھر تبدیل کر دے گا۔ اس طرح گرانا اور بنانا ایک کھیل بن جائے گا۔

اس کے بعد کئی مرتبہ مرمت ہوتی رہی۔ لیکن مکمل طور پر پوری عمارت کو دوبارہ نہیں بنایا گیا۔

کعبہ کی موجودہ تعمیر:

۱۰۴۰ھ میں سلطان مراد بن احمد خان شاہ قسطنطنیہ نے جب دیکھا کہ اس کی عمارت بہت پرانی ہوگئی ہے۔ تو اس نے سوائے رکن حجر اسود (وہ کونہ جس میں حجر اسود نصب ہے) کے تمام عمارت منہدم کر

کے نئی تعمیر کرائی۔

لیکن انہی بنیادوں اور اسی طرز پر جو حجاج بن یوسف نے بنائی تھی، اندر سنگ مرمر کا فرش بچھایا، اور اندر چھت پر نہایت نفیس مخملی چھت گیری لگائی۔ اور باہر کی دیواریں سنگ خارا سے چونہ میں چنیں۔ نہایت نفیس ریشمی سیاہ پردہ تمام خانہ کعبہ پر ڈالا جس پر کلمہ " **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ﷺ** " لکھا ہوا تھا۔ اور سنہری حاشیہ پر سلطان کا نام تھا۔

موجودہ کعبہ سلطان مراد کا بنا ہوا ہے، یعنی مکمل عمارت کو منہدم کر کے اس کے بعد نئے سرے سے تعمیر نہیں کیا گیا۔ یعنی اب کعبہ ان بنیادوں پر ہی ہے جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں تھیں۔

(ماخوذ از عزیزی و نعیمی)

تنبیہ : شیخ احمد بیہقی رحمہ اللہ نے کتاب شعب الایمان میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی، وہ کہتے ہیں میں نے کہا یا رسول اللہ سب سے پہلے زمین میں کون سی مسجد بنائی گئی؟

" قال المسجد الحرام قال قلت ثم ایّ ؟ قال ثم المسجد الاقصی قلت کم بینھما ؟ قال اربعون سنة فاینما ادرکتک الصلوة فصل فھو مسجد "

آپ نے فرمایا مسجد حرام، انہوں نے پھر پوچھا اس کے بعد تو آپ نے فرمایا مسجد اقصیٰ، یہ کہتے ہیں، میں نے پھر پوچھا ان دونوں میں کتنا فاصلہ ہے؟ تو آپ نے فرمایا چالیس سال، پھر آپ نے فرمایا جہاں بھی تمہیں نماز کا وقت آجائے وہاں ہی نماز ادا کر لیا کرو وہی مسجد ہے۔

اس حدیث پاک سے مراد سب سے پہلے انسانوں کی طرف سے تعمیر ہونے والی مسجد کے لئے آپ نے بیان فرمایا۔ کیونکہ آدم علیہ السلام کے دور میں تو جنتی یاقوت یا بیت المعمور کو بنیادوں پر رکھ دیا گیا تھا۔ اس کے بعد سب سے پہلے بننے والی مسجد حرام ہے۔ جو ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر فرمائی۔ اور مسجد اقصیٰ سب سے پہلے حضرت اسحاق علیہ السلام نے تعمیر فرمائی۔ سلیمان علیہ السلام نے بہت دیر بعد اس کی نئی تعمیر کی۔

اس لئے چالیس سال کا وقفہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام کی تعمیروں کے درمیان ہے۔

﴿ وَعَهِدْنَا اِلٰی اِبْرَاهِیمَ وَ اِسْمٰعِیلَ اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِینَ وَالْعٰکِفِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ ﴾

اور ہم نے تاکید فرمائی ابراہیم اور اسماعیل کو کہ ستھرا کریں میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف والوں اور رکوع کرنے والوں، سجدہ کرنے والوں کے لئے۔

وَعَهِدْنَا: " الزمنا هما ذلک ، وامرنا هما امرا ، وثقنا علیهما فیه " ہم نے لازم کیا ابراہیم اور اسماعیل پر اور ہم نے حکم دیا ان دونوں کو، اور پختہ وعدہ لیا ان دونوں سے اس کا، یعنی ان دونوں کو تاکید فرمائی۔ " وقیل اوحینا " بعض حضرات نے یہ معنی بھی یہاں کیا کہ ہم نے وحی کی ابراہیم اور اسماعیل کی طرف۔ (کبیر)

مطلب تمام معانی کا ایک ہی ہے، کہ ہم نے بذریعہ وحی ان کو تاکیدی حکم دے کر ان پر لازم کر دیا۔

اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ : (ستھرا رکھیں میرے گھر کو)

" فیجب ان یراد به التطهیر من کل امر لایلیق بالبیت "

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کو رب تعالیٰ نے جو تاکیدی حکم فرمایا کہ میرے گھر کو پاک اور صاف ستھرا رکھو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو اللہ کے گھر کے لائق نہیں اس سے اللہ کے گھر کو پاک رکھو۔ جب بیت اللہ شریف کا مقام اور اس کا ارد گرد نماز ادا کرنے کے لئے ہے۔

" وجب تطهیره من الانجاس والاقذار " تو ضروری ہے کہ اسے نجاست اور ہر قسم کی گندگی سے پاک رکھا جائے یہی حکم ہر مسجد کا ہے تا کہ اللہ کے گھر کا تقدس قائم رہے۔

"واذا کان موضع العبادة والاخلاص لله تعالی وجب تطهیره من الشرک و عبادة غیر الله تعالیٰ "

اور جب عبادت اور اخلاص اللہ تعالیٰ کے لئے ہے تو ضروری ہے کہ اللہ کے گھر کو شرک اور غیر اللہ کی عبادت سے پاک رکھا جائے۔ یعنی اللہ کا گھر ظاہری اور باطنی گندگی سے پاک ہو، نہ اس میں شرک ہو، اور نہ اس میں گندگی کے ڈھیر لگے ہوں، ہر قسم کے خس و خاشاک سے پاک رکھنا ضروری ہے (از کبیر)

" (اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ) ای من الاوثان والرفث وقول الزور والرجس "

ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کو تاکید فرمائی کہ میرے گھر کو بت پرستی اور بے حیائی، اور جھوٹے کلام اور نجاست سے پاک رکھنا۔

"قال مجاهد وعطاء و قتادة (اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ) بلا اله الا الله من الشرک"

حضرت مجاہد اور عطاء اور قتادہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ رب تعالیٰ نے ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کو جو اپنا گھر پاکیزہ رکھنے کا حکم دیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ " لاالہ الا اللہ " اس گھر میں پڑھ کر شرک سے پاک رکھو۔ (صابونی)

سبحان اللہ کیا خوب مسئلہ حل ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اس کے گھر میں کرنے سے رب کا گھر پاک رہتا ہے، رب کے ذکر سے روکنے والے کیا شرک سے آلودہ ہی رکھنا چاہتے ہیں۔

آیئے معتبر تفاسیر کے بعد مودودی صاحب کے زہر آلود کلام کو بھی دیکھئے کہ اصل مقصد سے ہٹ کر وہ انبیاء کرام اور اولیاء کرام پر کیسے خفیہ تیر چلاتے ہیں۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں: "پاک رکھنے سے مراد صرف یہی نہیں ہے کہ کوڑے کرکٹ سے اسے پاک رکھا جائے، خدا کے گھر کی اصل پاکی یہ ہے کہ اس میں خدا کے سوا کسی کا نام بلند نہ ہو۔ جس نے خانہ خدا کے سوا کسی دوسرے کو مالک، معبود۔ حاجت روا اور فریاد رس کی حیثیت سے پکارا، اس نے حقیقت میں اسے گندا کر دیا۔ (تفہیم)

راقم کی ﴿ اِيَّاکَ نَعْبُدُ وَاِيَّاکَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ کی وضاحت میں ابحاث کو دیکھیں تو آپ کو پتہ چل جائے گا کہ مسلمان اہلسنت کس طرح انبیاء کرام اور اولیاء کرام کو حاجت روا اور فریاد رس مانتے ہیں۔

تیری اٹکے تو وکیلوں سے کرے استمداد
یا محمد سے بگڑتی ہے طبیعت تیری

اعتراض : بیت اللہ شریف کو پاک اور صاف ستھرا کرنے کا حکم دینے کا کیا مطلب ہے؟ کیا اس سے پہلے بیت اللہ شریف میں بت پرستی تھی یا وہاں گندگی ڈالی جاتی تھی۔

جواب : یہ کلام اس طرح ہے جیسا کہ کوئی شخص کنواں کھودنے لگے تو اسے کہا جائے۔ " ضيق فم الركية " کنویں کا منہ تنگ رکھنا اس کا مطلب یہ ہے کہ ابتدائی طور پر ہی منہ تنگ رکھنا، اس کا یہ مطلب

نہیں، کہ پہلے منہ کھلا رکھنا پھر تنگ کرنا۔

اسی طرح یہاں حکم دیا گیا کہ تم تعمیر کے وقت ہی اسے پاک اور صاف ستھرا بنانا، اعلان فرمانا کہ نوح علیہ السلام کی قوم کی طرح بت پرستی نہ کرنا، اور جیسے وہ عبادت خانوں میں بت رکھ دیتے تھے اے قوم تم ایسا نہ کرنا۔

اور ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کو آنے والے لوگوں کی تعلیم کیلئے حکم دیا گیا کہ تم بیت اللہ کو طہارت قلبی یعنی تقوی کے طور پر تعمیر کرنا۔ اللہ تعالیٰ کے انبیاء کرام کے افعال میں تقوی کے خلاف کا تصور تو ممکن ہی نہیں۔ البتہ بعد میں آنے والوں لوگوں کی تعلیم کیلئے ان حضرات کو یہ حکم دیا گیا۔

(ماخوذ از شیخ زادہ و کبیر)

لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ :

طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے۔

طواف کرنے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو بیت اللہ شریف میں حج اور عمرہ کی غرض سے آتے ہیں اور طواف کرتے ہیں۔ یہ بھی خیال رہے کہ مکہ والے حضرات اکثر طور پر نمازوں کے اوقات میں طواف کرتے رہتے ہیں، اسلئے مراد مطلق طواف بھی ہوسکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ حج اور عمرہ کا طواف ہی ہو۔

(اَلْعَاكِفِيْنَ) سے مراد مسجد حرام یا بیت اللہ شریف کے اندر اعتکاف کرنے والے لوگ ہیں۔ یہ خیال رہے کہ " عکف " ضرب اور نصر دونوں بابوں پر آتا رہتا ہے۔ معنی اس کا " لزم الشیٔ واقام علیه " کسی چیز کو لازم پکڑنا اور اس پر قائم رہنا ہے۔

(وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ) سے مراد وہاں نماز پڑھنے والے لوگ ہیں۔ (از کبیر بزیادة)

مسئلہ : "ان الطواف للغرباء افضل من الصلوٰة" باہر سے آنے والے لوگوں کے لئے طواف کرنا افضل ہے نماز سے۔ (کبیر)

وجہ اس کی واضح ہے کہ باہر سے آنے والوں کو روز روز آنا تو نصیب نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ اس وقت کو غنیمت سمجھتے ہوئے جتنا ممکن ہو سکے طواف ہی کریں۔ شامی نے بھی یہی بیان کیا ہے جو راقم نے

نورالایضاح کے حاشیہ ذریعۃ النجاح میں بیان کیا ہے۔

مسئلہ : "تدل الآیة علی جواز الصلوٰة فی البیت فرضا کان او نفلا" آیۃ کریمہ سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ بیت اللہ شریف میں اعتکاف بیٹھنا جائز ہے۔ (کبیر)

مسئلہ : "تدل الآیة علی جواز الاعتکاف فی البیت" آیۃ کریمہ سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ بیت اللہ شریف میں نماز جائز ہے خواہ فرض ہو یا نفل۔ (کبیر)

"عن ابن عمر قال دخل رسول اللہ ﷺ هو واسامة بن زید و بلال و عثمان بن طلحة الحجبی البیت فاغلقوا علیهم الباب فلما فتحوا کنت اول من ولج فلقیت بلا لا فسألته هل صلی فیه رسول اللہ ﷺ قال نعم بین العمودین الیمانیین" (بخاری، مسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ اور اسامہ بن زید اور بلال اور عثمان بن طلحہ حجبی رضی اللہ عنہم بیت اللہ شریف میں داخل ہوئے، دروازہ بند کر دیا گیا۔ جب ان حضرات نے دروازہ کھولا تو سب سے پہلے میں داخل ہوا، اور حضرت بلال کو ملا، ان سے پوچھا کیا رسول اللہ ﷺ نے بیت اللہ شریف کے اندر نماز پڑھی ہے؟ انہوں نے کہا ہاں آپ نے دو یمنی ستونوں کے درمیان نماز پڑھی۔ مسلم میں یہ الفاظ مبارکہ زائد ہیں۔

" جعل عمودین عن یساره و عمودا عن یمینه و ثلاثة اعمدة وراءه و کان البیت یومئذ علی ستة اعمدة "

ایک ستون آپ کے دائیں جانب تھا اور دو دوسری جانب اور تین آپ کے پیچھے تھے۔ اس وقت بیت اللہ شریف کے چھ ستون تھے۔

فائدہ :

" لما قال اللہ تعالیٰ ﴿اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ﴾ دخل فیه بالمعنی جمیع بیوته تعالی ، فیکون حکمها حکمه فی التطهیر و النظافة "

اسی آیۃ کریمہ سے یہ مسئلہ بھی سمجھ آ گیا کہ کعبہ شریف کی طرح ہی تمام مساجد کو پاک اور صاف ستھرا رکھنے کا حکم ہے۔ البتہ کعبہ شریف کا خصوصی حکم اس کی عظمت اور اس وقت دوسری مسجد کے نہ ہونے

کی وجہ سے تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔

﴿ فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ☆﴾

(النور، آیة ۳۶)

ان گھروں میں جنہیں بلند کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ اور ان میں اس کا نام لیا جاتا ہے اللہ کی تسبیح کرتے ہیں ان میں صبح اور شام۔

☆ " وروی عن عمر بن الخطاب ﷺ انه سمع صوت رجل فی المسجد فقال ما هذا اتدری این انت "

حضرت عمر بن خطاب ﷺ نے ایک شخص کو زور زور سے مسجد میں چلاتے ہوئے سنا، تو آپ نے فرمایا، یہ کیا ہے؟ کیا تمہیں معلوم نہیں تم کہاں ہو۔ (قرطبی)

یعنی مسجد کا احترام ضروری ہے۔ مسجد میں شور وغل، اور دنیاوی باتوں میں بلا مقصد مشغول رہنا مسجد کے وقار کے منافی ہے۔

مسئلہ: ﴿ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ ﴾ سے ہی سمجھ آیا کہ مسجد میں کسی جنبی شخص کا داخل ہونا، یا حیض یا نفاس والی عورت کا مسجد میں داخل ہونا جائز نہیں۔ (از روح المعانی)

طواف کی اقسام:

طواف کی تین قسمیں ہیں۔ یہ آیۃ ان تمام قسموں کو شامل ہے۔

۱) فرض: یہ طواف زیارۃ ہے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴾ (سب سے پہلے مکرم گھر کا طواف کرو) یہ طواف زیارۃ دس ذی الحج کو ہوتا ہے۔ البتہ گیارہ اور بارہ کو کرنے کی بھی اجازت ہے۔

۲) واجب: یہ طواف صدر ہے۔ جسے طواف الوداع بھی کہا جاتا ہے۔ یہ حج سے فارغ ہونے پر لوٹتے وقت کیا جاتا ہے۔ اس کا وجوب حدیث پاک سے ثابت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

" من حج البیت فلیکن آخر عهده بالبیت الطواف " جو شخص بیت اللہ شریف کا حج کرے اس کا آخری کام طواف ہو۔

۳) سنت اور مستحب: یہ طواف قدوم ہے، جو مکہ میں پہنچنے پر سب سے پہلے طواف کیا جاتا ہے۔ یہ سنت ہے واجب نہیں۔ مسنون اس لئے ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ طواف کیا ہے۔

(احکام القرآن للجصاص)

مسئلہ: طواف زیارۃ کے قائم مقام کوئی چیز نہیں۔ جب تک طواف زیارۃ نہ کی جائے حاجی محرم ہی رہتا ہے۔ جب یہ طواف کرلے گا تو اس کی زوجہ اس کے لئے حلال ہوگی۔

طواف صدر رہ جائے تو اس کا قائم مقام دم ہے۔ یعنی جانور ذبح کر کے اس کا جبیرہ بنائے (بدل ادا کرے) طواف قدوم کی ترک سے اگرچہ سنت کی ترک تو لازم آتی ہے۔ لیکن دم وغیرہ لازم نہیں آتا۔ (احکام القرآن للجصاص)

مسئلہ: ہر طواف جس کے بعد سعی ہو اس میں رمل ہے پہلے تین چکروں میں، رمل کا مطلب یہ ہے کہ کندھے ہلا ہلا کر مجاہدوں کی طرح چلنا جس طرح میدان جنگ کی صفوں میں مجاہدین چلتے ہیں اور ہر وہ طواف جس کے بعد صفا اور مروہ کے درمیان سعی نہیں اس میں رمل نہیں۔

یعنی طواف قدوم (جو سب سے پہلے آتے ہوئے طواف کیا جاتا ہے) کے بعد چونکہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی ہے۔ اس لئے اس میں پہلے تین چکروں میں سعی ہے۔

اگر دیر سے پہنچا طواف قدوم نہیں کر سکا۔ یا اس کے بعد سعی نہیں کر سکا تو اب سعی طواف زیارۃ کے بعد کرے گا۔ اور اسی کے پہلے تین چکروں میں رمل کرے گا۔ لیکن اگر طواف قدوم اور سعی پہلے کر چکا ہے تو صرف طواف قدوم والا رمل ہی ہوگا۔ بعد میں طواف زیارۃ اور طواف صدر میں رمل نہیں۔

عمرہ کے طواف میں رمل کرے گا۔ کیونکہ اس کے بعد صفا اور مروہ کے درمیان سعی ہے۔

☆ " روی ابن عمر ان النبی ﷺ رمل فی الثلاثة الاشواط من الحجر الی الحجر "

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ (طواف کے) پہلے تین چکروں میں حجر اسود سے حجر اسود تک رمل کیا۔

رمل کے سنت ہونے کی وجہ:

" انما کان ذلک سنة حین فعله النبی ﷺ مرائیا به للمشرکین اظهارا للتجلد والقوة فی عمرة القضاء لانهم قالوا قد اوهنتهم حمی یثرب فامرهم باظهار الجلد لئلا یطمع فیهم "

نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام جب عمرہ کی قضاء کے لئے تشریف لائے، تو مشرکین نے کہا کہ ان لوگوں کو تو یثرب کے بخار نے کمزور کر دیا ہے تو نبی کریم ﷺ نے رمل کیا اور صحابہ کرام کو بھی رمل کا حکم دیا تا کہ ان پر مسلمانوں کی بہادری اور قوت واضح ہو جائے۔ یہی وجہ ہے رمل کے سنت ہونے کی۔

(از احکام القرآن للجصاص)

﴿وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ رَبِّ اجۡعَلۡ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارۡزُقۡ اَهۡلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنۡ اٰمَنَ مِنۡهُمۡ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنۡ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيۡلًا ثُمَّ اَضۡطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئۡسَ الۡمَصِيۡرُ﴾

۱) اور جب عرض کی ابراہیم نے کہ میرے رب اس شہر کو امان والا کر دے، اور اس کے رہنے والوں کو طرح طرح کے پھلوں سے روزی دے، جو ان میں اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائیں۔ فرمایا اور جو کافر ہو تھوڑا برتنے کو اسے بھی دوں گا، پھر اسے عذاب دوزخ کی طرف مجبور کر دوں گا، اور وہ بہت بری جگہ ہے پلٹنے کی۔

۲) اور (یاد کرو) جب کہا ابراہیم نے اے میرے رب کر دے اس جگہ کو شہر امن والا، اور روزی دے اس کے رہنے والوں کو پھلوں سے جو ایمان لائے ان میں سے اللہ پر اور آخرت کے دن پر، فرمایا جس نے کفر کیا تو میں فائدہ پہنچاؤں گا اسے تھوڑا، پھر میں اسے مجبور کر دوں گا آگ کے عذاب کی طرف، اور وہ بہت برا ٹھکانا۔ (آیت نمبر ۱۲۶)

ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعاء اس وقت کی ہے جب آپ نے اپنی زوجہ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کو مکہ کی زمین میں چھوڑا جب وہاں کوئی شہر نہیں تھا، کوئی آبادی نہیں تھی، آپ کی اس دعاء کا

مطلب یہ تھا کہ اے اللہ اس غیر آباد جگہ کو امن والا شہر بنادے۔

" فَكَأَنَّه' قَالَ هٰهُنَا رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْوَادِي الْقَفْرَ بَلَدً ذَا اَمْنٍ وَ سَلَامَةٍ " یعنی اس آیۃ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ اے میرے رب اس خالی، غیر آباد جگہ کو شہر بنادے جو امن والا اور سلامتی والا ہو۔

" فیجوز ان یکون البلد ایضا داخلا تحت الطلب " اس معنی کے لحاظ پر دعاء میں شہر کی طلب پائی گئی ہے۔ یعنی ایک مطالبہ یہ تھا کہ اے اللہ اس جگہ کو شہر بنادے، اور دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ اے اللہ اسے امن اور سلامتی والا بنادے۔

" وقال فی هذه السورة ﴿ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا ﴾ ای اجعل هذه البقعة بلدا آمنا و ناسب هذا لانه قبل بناء الكعبة "

اور اس سورۃ میں " بلدا " کو نکرہ ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ اس جگہ کو امن والا شہر بنا۔ چونکہ یہ دعاء کعبہ شریف کی تعمیر سے پہلے کی ہے۔

اور سورۃ ابراہیم میں ذکر ہے۔ ﴿ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا ﴾ اس میں " البلد " معرفہ ذکر ہے کیونکہ یہ دعاء کعبہ شریف کی تعمیر کے بعد کی ہے جب وہاں لوگوں کی آبادی ہو چکی تھی، اور اسحاق علیہ السلام بھی پیدا ہو چکے تھے اور آپ چھوٹی عمر کے تھے۔

یہ بھی خیال رہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام عمر میں حضرت اسماعیل علیہ السلام سے تیرہ سال چھوٹے ہیں۔ (از ابن کثیر)

علامہ رازی رحمہ اللہ نے بھی اس آیۃ میں " بلدا " کو نکرہ اور سورۃ ابراہیم میں " البلد " معرفہ ذکر کرنے کی ایک وجہ یہی بیان کی، الفاظ کچھ ابن کثیر سے مختلف ہیں۔ عبارت ملاحظہ ہو۔

" ان الدعوة الاولى وقعت ولم يكن المكان قد جعل بلدا كانه قال ، اجعل هذا الوادى بلدا آمنا لانه تعالى حكى عنه انه قال ﴿ رَبَّنَا اِنِّيْ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ ﴾ فقال ههنا اجعل هذا الوادى بلدا آمنا ، والدعوة الثانية وقعت وقد جعل بلدا ، فكانه قال اجعل هذا المكان الذى صيرته بلدا ذا امن و سلامة " (کبیر)

اس آیۃ کریمہ میں جو دعاء کی گئی ہے یہ اس وقت تھی جب کہ وہاں کوئی شہر نہیں تھا۔ گویا کہ آپ

کی دعاء کا یہ مطلب ہے کے اے اللہ تعالیٰ اس وادی کو شہر بنا جس طرح آپ کی یہ دعاء ہے۔''اے ہمارے رب بے شک میں نے اپنی اولاد کو ایک وادی میں ٹھہرایا ہے جس میں کھیتی باڑی نہیں ہوتی۔

لیکن آپ کی دوسری دعاء جو سورۃ ابراہیم میں ہے، اس کا یہ مطلب ہے کہ اے اللہ اس جگہ کو تو نے شہر بنادیا ہے اب اسے امن اور سلامتی والا بنادے۔ یہ دعاء کعبہ شریف کی تعمیر اور مکہ کے آباد ہونے کے بعد کی ہے۔

تنبیہ : ابھی تک جو بحث کی گئی ہے، اسی کے مطابق راقم کا ترجمہ ہے جو دراصل علامہ کاظمی رحمہ اللہ کے ترجمہ سے منقول ہے۔

لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ نے دوسری توجیہ یہ ذکر فرمائی۔

'' الثانی ان تکون الدعوتان وقعتا بعد ما صارا المکان بلدا فقوله ﴿ اِجۡعَلۡ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا ﴾ تقدیره ، ﴿اِجۡعَلۡ هٰذَا الۡبَلَد بَلَدًا اٰمِنًا﴾ (کبیر)

دوسری وجہ یہ ہے کہ ہوسکتا ہے دونوں دعائیں کعبہ شریف کی تعمیر کے بعد کی گئی ہوں۔ جب کہ وہاں شہر بن چکا تھا۔ اب اس آیۃ میں ﴿ اِجۡعَلۡ هٰذا بَلَدًا اٰمِنًا ﴾ کا مطلب یہ ہوگا، اے میرے رب کردے اس شہر کو امن والا، یہی ترجمہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ہے۔

راقم نے دونوں وجہ ذکر کردی ہیں، تا کہ طلباء کرام کو دونوں ذہن نشین ہوجائیں۔

اٰمِنًا : ابراہیم علیہ السلام نے دعاء فرمائی کہ اے اللہ اس جگہ کو امن والا شہر بنا۔ اس امن سے مراد کیا ہے؟ اس میں چند وجوہ ہیں۔ ایک یہ ہے کہ آپ کی دعاء کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ اس جگہ کو قحط اور خشک سالی سے امن میں رکھنا، کیونکہ میں اپنی اولاد کو بیابان جنگل میں چھوڑ کر جارہا ہوں۔ جہاں نہ تو کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ اور نہ ہی کوئی مال مویشی پائے گئے ہیں۔

بظاہر اس پر اعتراض ہے کہ اگر ''امن'' کا یہ ہی معنی مراد لیا جائے تو ابراہیم علیہ السلام کی دعاء میں تکرار ہوگا۔ کیونکہ اس کے بعد اس کے اہل کے لئے پھلوں کی روزی دینے کی دعاء فرمائی۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں تکرار نہیں۔ '' فهو علیه السلام بالسؤال الاول طلب

ازالة القحط و بالسؤال الثانی التوسعة العظیمة " کیونکہ آپ کی پہلی دعاء کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ اس مقام سے قحط کو دور رکھنا، اور دوسری دعاء کا مطلب ہے کہ اللہ اس مقام کے باشندوں کی روزی میں وسعت عظیمہ عطاء فرمانا۔

دوسری وجہ امن سے مراد کی یہ ہے۔

" والثانی انه الامن من الخسف والمسخ والزلازل والغارات والجنون والجذام والبرص ونحو ذلک من البلایا التی تحل بالبلد "

یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امن کی دعاء کا یہ مطلب ہے کہ اے اللہ اس جگہ کو خسف و مسخ (زمین میں دھنسا دینا اور شکلوں کو تبدیل کر دینا) اور زلزلوں اور لوٹ مار اور جنون (پاگل پن) اور جذام (کوڑھ) اور برص (سفید داغ پڑنا) اور ہر قسم کی مصیبتوں کے واقع ہونے سے اس جگہ کو محفوظ رکھ۔

والثالث الامن من القتل وهو قولابی بکر الرازی حضرت ابوبکر رازی رحمہ اللہ کے ارشاد کے مطابق امتی کی دعا کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ اسے قتل سے امن والا بنا۔ (خیال رہے کہ حرم کے احکام پہلے بیان ہو چکے ہیں۔)

امام واحدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں۔

" یرید بلدا محرما لایصاد طیره ولا یقطع شجره ولایختلی خلاه "

کہ ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کا یہ مطلب ہے۔ کہ اے اللہ اس جگہ کو شہر حرم بنا دے۔ اس کے پرندوں کا شکار نہ کیا جائے، اس کے درخت نہ کاٹے جائیں، اور اس کا (سبز) گھاس نہ کاٹا جائے، کیونکہ مکہ مکرمہ یعنی حرم کے شکار کے درپے ہونا، اور شکار کو بھگانا، اور شکار کو اذیت پہنچانا حرام ہے۔

" ومن قتل صید مکة فعلیه جزاؤه " جس شخص نے حرم کے شکار کو قتل کیا اس پر اس کا بدلہ لازم ہے۔ یعنی اس جانور کی قیمت صدقہ کرنا لازم ہے۔

خیال رہے کہ راقم کے نزدیک یہ تمام مطالب مجتمع ہیں۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام نے ایک لفظ "آمنا" ذکر کر کے اتنی بڑی دعائیں فرما دیں۔

محمد بن مصلح الدین شیخ زادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ میں نے متعدد تفاسیر کی کتب میں دیکھا ہے کہ

حرم کے جانور درندوں سے امن میں ہیں، قدرتی طور پر ان کو رب تعالیٰ کی طرف سے حفاظت حاصل ہے

" فان الاسد ربما يتبع الظبی خارج الحرم فيفر الظبی منه ويدخل الحرم فيرجع الاسد عنه ولايتبعه فی الحرم وان اجتمعا فيه لايهيج السبع عليه ولاينفر الصيد منه حتى اذا خرجا من الحرم عدا السبع عليه "

بسا اوقات حرم کے باہر شیر پیچھا کرتا ہے ہرن کا، لیکن وہ ہرن جب بھاگ کر حرم میں پہنچ جائے، تو شیر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اور حرم میں اس کے پیچھے نہیں دوڑتا، اور حرم میں اگر دونوں جمع بھی ہو جائیں تو شیر اس پر حملہ نہیں کرتا، ہاں اگر وہ حرم کی حدود سے باہر نکل جائے تو شیر اس پر حملہ کر دیتا ہے

(شیخ زادہ)

سبحان اللہ رب تعالیٰ کی قدرت کتنی عظیم ہے، اور مقام حرم کا کیا خوب مقام ہے، اسی سے یہ فائدہ بھی حاصل ہو گیا کہ جانور رب تعالیٰ کے حکم کو مانتے ہیں، تو اے انسان تو اشرف المخلوقات جب ہے تو تجھے زیادہ ہی رب تعالیٰ کے احکام کو ماننے کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔

فائده :

" فاجاب الله تعالٰی دعاء ابراهيم وجعله بلدا آمنا فما قصد جبار الاقصمه الله تعالى كما فعل باصحاب الفيل وغيرهم "

اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کو قبول فرمایا، اور اس جگہ کو امن والا شہر بنایا، جب بھی کسی جابر اور ظالم نے کعبہ شریف کو خراب کرنے کی کوشش کی تو رب تعالیٰ نے اسے ذلیل کیا اور برباد کیا، جیسا کہ اصحاب فیل (ہاتھی والے لوگ ابرہہ اور اس کے لشکر) وغیرہ کو تباہ و برباد کیا۔

اعتراض:

حجاج بن یوسف نے مکہ پر حملہ کیا، کعبہ شریف کو نقصان پہنچا، تو کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ کعبہ کو جابروں سے محفوظ رکھا گیا ہے۔

جواب:

" لم يكن قصده بذلك مكة ولا اهلها ولا اخراب الكعبة وانما كان قصده خلع ابن الزبير من الخلافة "

حجاج کا مقصد مکہ مکرمہ کو برباد کرنا، یا مکہ والے لوگوں کو تباہ کرنا، یا کعبہ شریف کو خراب کرنا نہ تھا، بلکہ اس کا مقصد حضرت عبداللہ بن زبیر کو خلافت سے معزول کرنا تھا۔ وہ مکہ میں تھے اس لئے حجاج کے حملہ سے کعبہ شریف کو نقصان ہوا۔ لیکن حجاج نے بعد میں کعبہ شریف کو تعمیر بھی کرا دیا۔ اگر حجاج کعبہ شریف کو نقصان پہنچانے کی غرض سے حملہ کراتا تو اسے بھی ایسی ہی ذلت کا سامنا کرنا پڑتا جیسا کہ ابرھہ اور اس کے لشکر کو کرنا پڑا۔ (از حازن)

وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ :

اور روزی دے اس کے رہنے والوں کو پھلوں سے جو ایمان لائے ان میں سے اللہ پر اور آخرت کے دن پر

جب یہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ تو معلوم تھا کہ امامت یعنی منصب نبوت کے لائق ظالم، کافر نہیں ہو سکتے، لیکن آپ نے ﴿ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ﴾ کہہ کر رب تعالیٰ سے مطلقاً دعاء فرما دی کہ میری اولاد میں سے بھی بعض کو منصب نبوت عطاء فرمانا۔ اس دعاء میں آپ نے مومنوں کا ذکر نہیں فرمایا، کیونکہ آپ کی توجہ اس طرف نہیں تھی کہ میری اولاد میں کوئی ظالم بھی ہوں گے۔ رب تعالیٰ نے جب ﴿ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ﴾ کہہ کر آپ کی توجہ دلا دی کہ ''ظالموں کو میرا وعدہ حاصل نہیں ہوگا۔'' تو اب آپ کی توجہ اس طرف کامل تھی کہ میری اولاد میں کچھ ظالم کافر بھی ہوتے ہیں اس لئے آپ نے جب رزق کی دعاء کی تو صرف مومنوں کا ذکر کیا وجہ صرف یہ تھی کہ مومن کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کافر کی خوشحالی کے لئے اور کافر کے نفع کی دعاء کرے۔

ورنہ کون نہیں جانتا کہ رب تعالیٰ مومنوں کو رزق دیتا ہے۔ اور کافروں کو بھی وہی رزق دیتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اس مسئلہ سے بخوبی واقف تھے۔ مطلب صرف یہ تھا کہ اے اللہ میں جانتا تو ہوں کہ تو نے کافروں کو بھی رزق دینا ہے لیکن میں تو دعاء صرف مومنوں کے لئے کروں گا۔

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

" واعلم انه تعالى لما علمه ان منهم قوما كفارا بقوله ﴿ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ﴾ لاجرم خصص دعاءه بالمؤمنين دون الكافرين " (کبیر)

جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے جب آپ کو ﴿ لَایَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ﴾ کہہ کر اس
صرف متوجہ کر دیا کہ آپ کی اولاد میں کافر بھی ہوں گے۔ تو یقیناً آپ نے دعا صرف مومنوں کے لئے
کی، کافروں کے لئے نہیں کی۔

چونکہ رب تعالیٰ نے کافروں پر مہربانی کرنے اور ان پر غم کھانے سے ان الفاظ مبارکہ ﴿ فَلَا
تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ ﴾ سے منع فرمایا ہے۔
" دعا لمومنهم بالامن والخصب لان الكافر لايدعى له بذلك الا ترى ان قريشا لما طغت دعا
عليها رسول الله ﷺ اللهم اشدد وطأتك على مضر واجعلها عليهم سنين كسني يوسف "
(البحر المحیط)

یعنی ابراہیم علیہ السلام نے اہل مکہ کے صرف مومنوں کے لئے امن اور خوشحالی کی دعاء کی، کیونکہ
کافر کے لئے دعاء نہیں کی جاتی۔ البتہ کافر کے خلاف دعاء کی جاسکتی ہے جس طرح نبی کریم ﷺ نے
قریش کے خلاف دعاء کی جب وہ دین حق کی زیادہ ہی مخالفت کرنے لگے اور سرکش ہوگئے، آپ نے
رب کے حضور یہ عرض کیا۔
اے اللہ مضر قبیلہ پر اپنی گرفت سخت کر دے، اور ان کو اس طرح قحط سالی میں مبتلاء کر دے جیسا
کہ یوسف علیہ السلام کے زمانہ کے لوگوں کو قحط سالی میں مبتلاء کیا تھا۔

قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِیْلًا : فرمایا جس نے کفر کیا تو میں فائدہ پہنچاؤں گا اسے تھوڑا

یعنی رب تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کے بعد فرمایا کہ تم نے اپنی دعاء میں اگرچہ مومنوں
کو خاص کیا ہے۔ اور حق بھی یہی تھا کہ مومنوں کے لئے ہی دعاء کی جائے، لیکن رزق اور پھل میں
کافروں کو بھی عطا کر دوں گا، کیونکہ یعنی دنیاوی نفع ہے جو مومنوں اور کافروں سب کو میں پہنچاتا ہوں۔

نبوت اور رزق دنیا میں فرق:

منصب نبوت اور امامت فاسقوں کے لائق نہیں۔ کیونکہ امامت و نبوت کے لئے ضروری ہے کہ
قوی عزم پایا جائے۔ اور مصائب و آلام پر بہت زیادہ صبر کیا جائے، تاکہ اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی

لوگوں تک کامل طریقہ سے پہنچا دئے جائیں، دین کے کام میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی کوئی فکر نہ کی جائے۔ کسی جابر وظالم کے ظلم اور دبدبہ کی کوئی پرواہ نہ کی جائے۔

لیکن دنیا میں رزق کافر اور مومن، مطیع اور عاصی، صادق اور منافق سب کو رب تعالیٰ عطاء فرماتا ہے۔ اس میں کوئی قباحت نہیں۔ اصل دارومدار اس پر ہے۔ " فمن آمن فالجنة مسکنه و مثواه، ومن کفر فالنار مستقره ومأواه " جس شخص نے ایمان لایا جنت اس کا مقام ہے۔ اور جس نے کفر کیا اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ (کبیر)

قلیل نفع کا مطلب:

رب تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب "کہ میں کافروں کو تھوڑا نفع پہنچاؤں گا" یہ ہے کہ ان کو نفع فقط دنیا میں ہی حاصل ہونا ہے۔ اخروی نفع سے وہ محروم ہوں گے۔

" فان الدنیا بکلیتها قلیل قال الله تعالی قل متاع الدنیا قلیل " بے شک کسی انسان کو ساری دنیا کا مال ودولت دے دیا جائے تو پھر بھی وہ قلیل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک ﷺ کو فرمایا کہ آپ فرمادیں دنیا کا مال ونفع قلیل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا کہ جو کفر کرے گا اسے میں تھوڑا نفع پہنچاؤں گا۔ حالانکہ بظاہر کافروں کے پاس دنیا کا مال ودولت کثیر ہوتا ہے کیونکہ وہ حرام اور حلال میں تمیز نہیں کرتے۔

" وان کانت کثیرة باضافة بعضها الی بعض فانها قلیل باضافتها الی نعمة الآخرة "

اگرچہ کافروں کا مال کئی دوسرے لوگوں کی بنسبت زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ اخروی نعمتوں کے مقابل قلیل ہوتا ہے، وجہ اس کی یہ ہے۔ " کیف لایقل فی الدنیا ما یتناهی بالاضافة الی مالایتناهی " کہ دنیا کا ختم ہونے والا مال یقیناً قلیل ہی ہے، کیونکہ اس کے مقابل اخروی نعمتیں ہیں جو نہ ختم ہونے والی ہیں۔ جو ختم نہ ہوں حقیقت میں وہی کثیر ہیں۔ (از بیضاوی و شیخ زاده)

(امتعه قلیلا) ایک مطلب اس کا یہ ہے۔ "امتعه بالرزق الی وقت مماته " کہ میں کافروں کو ان کی موت تک رزق دیتا رہوں گا۔ یعنی دنیاوی رزق دینے سے وہ کوئی مکرم نہیں بن جائیں گے۔

اور دوسرا مطلب یہ ہی۔ " امتعه بالبقاء فی الدنیا " میں ان کو دنیا میں زندگی عطاء کر کے ان کو دنیا میں باقی رکھ کر نفع پہنچاؤں گا۔

اور تیسرا مطلب یہ ہے۔

" وقال الحسن امتعه بالرزق والامن الی خروج محمد ﷺ فیقتله ان اقام علی کفره او یجلیه عنها "

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ میں ان کو رزق اور امن اس وقت تک عطاء کروں گا جب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی تشریف آوری نہیں ہوتی۔ اب جب تشریف لے آئیں گے۔ تو جو لوگ کفر پر قائم رہیں یا ان کو قتل کر دیں گے یا ان کو جلاء وطن کر دیں گے۔

چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء اہل مکہ کے لئے تھی، اس کے مقابل وہاں کے ہی کافروں کے متعلق ارشاد ہو رہا ہے۔

راقم کے نزدیک تمام مطالب جمع ہیں کہ رب تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب ہے کہ میں مکہ کے کافروں کو دنیا کا رزق دوں گا۔ دنیا میں زندگی بھی دوں گا، ہاں میرے محبوب ﷺ آ کر ان کو یا تو قتل کر دیں گے، یا جلاء وطن کر دیں گے۔ یہ نفع بہت قلیل ہے۔ جس کی میرے نزدیک کوئی قدر و منزلت نہیں۔

"فتضمنت الآیة حظر قتل من لجأ الیه من وجهین احدهما قوله ﴿رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا﴾ مع وقوع الاستجابة له والثانی قوله ﴿ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِیْلًا ﴾ لانه قد نفی قتله بذکر المتعة الی وقت الوفاة "

اس آیۂ کریمہ سے سمجھ آیا کہ جو شخص حرم شریف میں پناہ لے لے، اسے حرم میں قتل نہ کیا جائے، کیونکہ ایک تو ﴿رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا ﴾ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس مقام کو امن والا شہر بنانے کی دعاء کی اور آپ کی دعاء کو قبول کر لیا گیا۔

اور دوسرا رب تعالیٰ کا ارشاد ﴿ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِیْلًا ﴾ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ میں موت تک ان کو نفع پہنچاؤں گا۔ جس سے واضح ہوا کہ باہر سے کوئی قتل کر کے آئے اور حرم میں پناہ لے تو اسے حرم میں قتل نہ کیا جائے۔ (احکام القرآن للجصاص)

ثُمَّ اَضْطَرُّہٗ اِلٰی عَذَابِ النَّارِ ط وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ :

(پھر میں اسے مجبور کردوں گا آگ کے عذاب کی طرف اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے)

یعنی دنیا میں کافر کو نفع پہنچانے کے بعد اسے جہنم کی آگ کی طرف مجبور کر کے بھیج دیا جائے گا
" اضطرار " ضد ہے اختیار کی، اس کا حقیقی معنی یہ ہے کہ کسی شخص سے کسی فعل کا اس کے اختیار کے بغیر صادر ہونا جیسا کہ کسی کو چھت سے نیچے گرا دیا جائے اس کا چھت سے نیچے گرنا اسکے اختیار کے بغیر تھا۔

اور اس کا مجازی معنی یہ ہے کہ کام تو انسان اپنے اختیار سے کرے لیکن اس سے رکنے میں وہ مختار نہ رہے۔ جیسا کہ کوئی ایسا عارضہ درپیش آجائے جو اسے مجبور کر دے، اور اس کے اختیار کو ختم کر دے، مثال کے طور پر ایک شخص بھوک کے اس درجہ پر پہنچ جائے کہ مجبور ہو کر مردہ جانور کا گوشت کھالے۔

پہلے معنی پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے۔ ﴿ یَوْمَ یُدَعُّوْنَ اِلٰی نَارِ جَھَنَّمَ دَعًّا ﴾ (طور، آیۃ ۱۳) جس دن جہنم کی طرف دھکا دے کر دھکیلا جائے گا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی۔

﴿ یَوْمَ یُسْحَبُوْنَ فِی النَّارِ عَلٰی وُجُوْھِھِمْ ط ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ﴾ (القمر ، آیۃ ۴۸)

جس دن آگ میں اپنے مونہوں پر گھسیٹے جائیں گے، اور فرمایا جائے گا چکھو دوزخ کی آنچ،

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿ فَیُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِیْ وَالْاَقْدَامِ ﴾ (الرحمن آیۃ ۴۱)

تو ماتھا اور پاؤں پکڑ کر جہنم میں ڈالے جائیں گے۔

دوسرے معنی کو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی سے تائید حاصل ہے۔

﴿ وَسِیْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِلٰی جَھَنَّمَ زُمَرًا ط حَتّٰی اِذَا جَآءُوْھَا فُتِحَتْ اَبْوَابُھَا ﴾ (الزمر ، آیۃ ۷۰)

اور کافر جہنم کی طرف ہانکے جائیں گے گروہ گروہ، یہاں تک کہ جب وہاں پہنچیں گے اس کے دروازے کھولے جائیں گے۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ﴿ وَاِنْ مِّنْکُمْ اِلَّا وَارِدُھَا ﴾ (مریم آیۃ ۷۱) اور تم میں کوئی ایسا نہیں جس کا گذر دوزخ پر نہ ہو۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ﴿ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وَارِدُوْنَ ﴾ (الانبیاء، آیۃ ۹۸) بے شک تم اور اللہ کے سوا جنہیں تم پوجتے ہو سب جہنم کے ایندھن ہو تمہیں اس میں جانا ہے۔

تحقیق یہ ہے کہ کفار کے احوال قیامت کے دن آگ میں داخل کرنے کے لحاظ سے مختلف ہوں گے۔ اس لئے آیات کریمہ میں ان کے مختلف حالات کو ذکر کر دیا گیا۔

" وان الاضطرار مجاز عن كون العذاب واقعا به وقوعا محققا حتى كأنه مربوط به "

اس آیۂ کریمہ میں " اضطرہ " کا مطلب یہ ہے کہ کافر کو عذاب یقینی طور پر دیا جائے گا، گویا کہ وہ عذاب اس کے ساتھ چمٹا ہوگا۔ اسے جبری طور پر عذاب میں دھکیل دیا جائے گا۔ اگرچہ وہ عذاب کو پسند نہیں کر رہا ہوگا۔ (از روح المعانی)

وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ: " ای و بئس المكان الذی يصير اليه الكافر وهو العذاب " یعنی وہ مکان بہت برا ہوگا جس کی طرف کافر کو پھیرا جائے گا۔ وہ مکان ہی عذاب اور آگ والا ہوگا۔

اب مفہوم واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کفر کرے گا، اسے میں تھوڑا نفع پہنچاؤں گا، یعنی دنیاء کی زندگی عطاء کر کے دنیا میں رزق دے کر اسے نفع پہنچاؤں گا۔ لیکن یہ بھی اپنے حبیب ﷺ کی تشریف آوری تک پھر ایمان نہ لانے والوں کو دنیا میں قتل کر دیا جائے گا یا جلاء وطن کر دیا جائے گا۔ پھر اس کے بعد ان کو مجبور کر کے جہنم کی آگ میں دھکیل دیا جائے گا۔ یہی ان کا ہمیشہ کے لئے ٹھکانا ہوگا۔ جو شدت عذاب کی وجہ سے ان کے لئے بہت برا ٹھکانا ہوگا۔ (از خازن)

گذشتہ سے پیوستہ:

" قال رسول الله ﷺ لو كانت الدنيا تعدل عند الله جناح بعوضة ما سقى كافرا منها شربة ماء " (رواه الترمذی و صححه)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر دنیا اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو کسی کافر کو اللہ تعالیٰ پانی کا ایک گھونٹ بھی پینے کے لئے نہ دیتا۔

واضح ہوا کہ دنیا کا مال و دولت گھٹیا چیز کا نام ہے، جس کی قدر و منزلت رب تعالیٰ کے ہاں کچھ بھی نہیں۔ (از مظہری)

" ان الطائف كان من مدائن الشام باردن فلما دعا ابراهيم عليه السلام امر الله جبريل حتى اقتلعها من اصلها وادارها حول البيت سبعا ثم وضعها ههنا ومنها اكثر ثمرات مكة "

بے شک طائف کی زمین شام کے شہروں میں سے ایک شہر میں اردن کے علاقہ میں تھی (یہ آج کی شام اور اردن کی حد بندی مراد نہیں اس وقت اردن کا ہی علاقہ شام تھا) جب ابراہیم علیہ السلام نے دعاء فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے جبرائیل کو حکم فرمایا، انہوں نے اس زمین کو وہاں سے اٹھایا، پھر کعبہ کے اردگرد سات چکر لگوائے، پھر اسے طائف میں رکھ دیا گیا۔ وہاں کی زمین اسی لئے بہت زرخیز ہے۔ اور مکہ شریف میں اکثر پھل اور سبزیاں وہاں سے ہی آتی ہیں۔ (از مظہری)

فائدہ جلیلہ :

ابراہیم علیہ السلام نے جب دعاء فرمائی کہ اے اللہ اس جگہ کو امن والا شہر بنا اور اس کے رہنے والوں کو پھلوں کی روزی دے۔ " فاستجاب الله تعالى له فصارت مكة يجبى اليها ثمرات كل شيئ " تو اللہ تعالیٰ اللہ نے ان کی دعاء کو قبول فرمالیا، مکہ میں مختلف مقامات سے ہر قسم کے پھل اچھے سے اچھے، صاف ستھرے آجاتے ہیں۔ حج پر جانے والے حضرات آج تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کی قبولیت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

اللہ تعالیٰ نے حرم کے متعلق فرمایا ﴿يُجْبىٰ اِلَيْهِ ثَمَرَاتُ كُلِّ شَيْئٍ﴾ جس کی طرف ہر چیز کے پھل لائے جاتے ہیں۔ یہ بھی خیال رہے کہ جس طرح " ثمرة " کا معنی پھل مشہور و معروف ہے، اسی طرح " ثمرة " مجازی طور پر یہ معنی بھی لیا جاتا ہے۔ " ويقال لكل نفع يصدر عن شئ ثمرته " ہر چیز سے جو نفع صادر ہو اسے " ثمرة " کہا جاتا ہے۔ (مفردات راغب)

اس معنی کے مطابق ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کا یہ معنی بھی لینا بعید نہیں، کہ اللہ یہاں کے رہنے والوں کو ہر نفع مند چیز عطاء فرما۔ اگر دعاء کا یہ مطلب لیا جائے تو اس کی قبولیت کو جگمگاتا ہوئے آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ہر نفع مند چیز مکہ مکرمہ میں وافر مقدار میں موجود ہے۔ جب حج کے دنوں میں کثیر لوگوں کے مجتمع ہونے کے باوجود کسی چیز کی کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی، تو عام دنوں میں تو کمی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

﴿وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴾ (آیت ۱۲۷)

۱) اور جب اٹھاتا تھا ابراہیم اس گھر کی نیویں اور اسماعیل، یہ کہتے ہوئے اے رب ہمارے ہم سے قبول فرما بے شک تو ہی سنتا جانتا۔

۲) اور (یاد کیجئے) جب اٹھاتے تھے ابراہیم بنیادیں کعبہ کی، اور اسماعیل (بھی) یہ کہتے ہوئے کہ) اے ہمارے رب قبول فرما ہم سے بے شک تو ہی بہت سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔

اَلْقَوَاعِدَ : جمع ہے قاعدہ کی، " وهی اسّ البيت وقيل جدرة من البيت " قاعدہ کا معنی مکان کی بنیاد، اور مکان کی دیواروں کو بھی قاعدہ کہا جاتا ہے۔ (خازن)

" ويحتمل ان يراد بها سافات البناء فان كل ساف قاعدة ما يوضع فوقه ويرفعها بناؤها "

اور یہ بھی احتمال ہے کہ قاعدہ کا معنی ردہ ہو، کیونکہ ایک ردے کے اوپر دوسرا ردہ رکھا جاتا ہے، جس سے بناء کو بلند کیا جاتا ہے۔ (بیضاوی)

وَاِذْ يَرْفَعُ : ماضی کی حکایت بیان کی گئی ہے۔ اسی وجہ سے معنی کیا گیا "جب وہ اٹھاتے تھے"

اَلْبَيْتِ : پر الف لام عہد خارجی ہے، یعنی مراد بیت اللہ شریف ہے۔

اب مفہوم تقریباً واضح ہو گیا کہ یاد کرو اس وقت کو جب ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ شریف کی بنیادوں کو بلند کر رہے تھے۔

اعتراض : بنیاد تو اپنی جگہ پر رہتی ہے، بلند نہیں ہوتی، بنیاد کے بلند کرنے کا کیا مطلب ہے؟

جواب : "رفع الاساس ای البناء عليها لانها اذا بنى عليها نقلت عن هيئة الانخفاض الى هيئة الارتفاع " بنیاد کے بلند کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر عمارت قائم کرنا، اس لئے کہ جب بنیادوں پر عمارت تعمیر کی جاتی ہے تو وہ پستی سے بلندی کی طرف اٹھتی ہے۔ تو بناء کے

بلند کرنے کو بنیادوں کے بلند کرنے سے تعبیر کر دیا گیا۔

اور چونکہ قواعد کا معنی بعض حضرات نے دیواریں بھی کیا ہے، اس معنی کے لحاظ سے مطلب ہوگا۔ ''یاد کرو اس وقت کو جب ابرہیم اور اسماعیل دیواروں کو بلند کر رہے تھے۔

اور یہ بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ قواعد کا معنی ردے بھی ہے۔ یعنی جب ابراہیم اور اسماعیل بنیادوں پر ردے لگا کر ان کو بلند کر رہے تھے۔ (از کبیر و خازن)

علمی نکتہ : " القواعد من البیت " کہا ہے، یرفع قواعد البیت " نہیں کہا، حالانکہ بظاہر یہ مختصر تھا معنی اس کا بھی یہی تھا۔ '' بیت اللہ کی دیواروں کو بلند کر رہے تھے۔''

اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے " القواعد " کو مبہم ذکر فرمایا کہ ابراہیم بنیادوں کو بلند کر رہے تھے۔ اس کے بعد من بیانیہ سے اس کی وضاحت فرمادی۔ " من البیت " وہ بنیادیں بیت اللہ کی تھیں۔

"وتبیینها بعد الابهام من تفخیم الشان ما لیس فی العبارة الاخری " ابہام کے بعد بیان کرنا بلندی شان پر دلالت کرتا ہے۔ جب کہ " قواعد البیت " میں یہ صورت نہیں پائی گئی۔ (کبیر)

وَاِسۡمٰعِیۡلُ : سریانی زبان میں " ایل " کا معنی ہے " اللہ "، مکمل لفظ کا معنی ہے۔ " اسمع یااللہ " اے اللہ سن، ابراہیم علیہ السلام نے ان الفاظ سے رب تعالیٰ کے حضور بچے کے لئے دعاء کی، بچے کی پیدائش کے بعد یہی نام بچے کا رکھ دیا گیا۔ (قرطبی)

اسماعیل علیہ السلام تعمیر میں کیسے شریک تھے؟

اس میں دو احتمال ہیں، بظاہر حقیقی معنی کے لحاظ پر دونوں ہی یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام مل کر دیواروں کی تعمیر کر رہے تھے، یعنی دونوں ہی معمار کا کام کر رہے تھے، چونکہ " اسمعیل " کا عطف ہے۔ " ابراھیم " پر، عطف فعل میں مشارکت کو چاہتا ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ دونوں میں سے ایک تعمیر کر رہے تھے۔ اور دوسرے پتھر اور گارا دے رہے تھے۔

"وعلی الوجهین تصح اضافة الرفع الیهما " دونوں صورتوں میں بنیادوں کو بلند کرنے

کی نسبت دونوں حضرات کی طرف صحیح ہے اگر چہ پہلا معنی حقیقی ہے۔ دوسرا معنی مجازی ہے۔ (از کبیر)

لیکن خیال رہے کہ زیادہ شہور مجازی معنی ہی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام دیواروں کی تعمیر کررہے تھے۔ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام آپ کو پتھر اور گارا دے رہے تھے۔

لیکن قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے ایک اور وجہ بھی بیان کی ہے۔ " **وقیل کانا یبنیان فی طرفین او علی التناوب** " کہ یہ احتمال بھی کہ ایک طرف کی دیوار ابراہیم علیہ السلام اور دوسری طرف کی دیوار اسماعیل علیہ السلام بنارہے ہوں۔ لیکن یہ خیال رہے کہ یہ صورت اسی وقت صحیح ہوسکتی ہے کہ جب یہ کہا جائے کہ دونوں حضرات خود ہی پتھر اٹھا رہے تھے۔ اور خود ہی گارا لے رہے تھے اور ساتھ ساتھ تعمیر بھی کررہے تھے۔ کیونکہ کعبہ شریف کی تعمیر میں کسی اور کا ذکر نہیں۔ اور ایک احتمال یہ ہے کہ باری باری پر تعمیر کررہے ہوں۔ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام تعمیر کررہے تھے اور اسماعیل علیہ السلام پتھر اور گارا دے رہے تھے، اور کسی وقت اسماعیل علیہ السلام تعمیر کرتے اور ابراہیم علیہ السلام پتھر اور گارا دیتے۔

کعبہ شریف کی تعمیر:

کعبہ شریف کی تعمیر کا ذکر پہلے ہوچکا ہے۔ " **الاکثرون من اهل الاخبار علی ان هذا البیت کان موجودا قبل ابرهیم علیه السلام علی ما روینا من الاحادیث فیه** " (کبیر)

اکثر حضرات اس طرف ہیں کہ بیت اللہ شریف کی بنیادیں پہلے موجود تھیں، ان پر ہی ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ شریف کو تعمیر کیا، جیسا کہ ہم نے احادیث سے ثابت کردیا ہے۔

اعتراض: کئی حضرات نے ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کعبہ شریف کی تعمیر کو ثابت نہیں کیا، بلکہ رد کیا ہے۔'' تو کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے بھی کعبہ موجود تھا۔

جواب: یہ پہلے بیان ہوچکا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کعبہ شریف موجود مکان کی شکل میں نہیں تھا۔ کیونکہ آدم علیہ السلام کے زمانہ میں صرف بنیادوں کو قائم کیا گیا اور ان کے اوپر بیت المعمور کو یا جنتی یاقوت کے خیمہ کو اتار کر رکھ دیا گیا، جن حضرات نے انکار کیا انہوں نے بیت اللہ شریف کی موجودہ مکان کی شکل ابراہیم علیہ السلام سے پہلے ہونے کا انکار کیا ہے۔ لہٰذا راقم کو اختلاف نظر نہیں آتا۔

فائدہ جلیلہ :

" عن الزهرى انهم بنوها حتى اذا بلغوا موضع الركن اختصمت قريش فى الركن اى القبائل تلى رفعه حتى شجر بينهم فقالوا تعالوا حتى نحكم اول من يطلع علينا من هذه السكة فاصطلحوا على ذلك فاطلع الله عليهم رسول الله ﷺ فحكموه فامر بالركن فوضع فى ثوب ثم امر سيد كل قبيلة فاعطاه ناحية من الثوب ثم ارتقى هو على البناء فرفعوا اليه الركن فاخذه من الثوب فوضعه فى مكانه " (شیخ زادہ)

کعبہ شریف کی تعمیر کی بحث میں جو پہلے بیان کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ قریش نے تعمیر کیا، اسی تعمیر میں زہری رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ جب وہ حجر اسود کے مقام پر پہنچے تو قریش کا جھگڑا ہو گیا، ہر قبیلہ کے لوگ چاہتے تھے کہ ہمارا سردار اسے کعبہ شریف کی دیوار میں نصب کرے، بالآخران کا اس پر اتفاق ہو گیا کہ صبح جو شخص پہلے آئے گا اسے حکم (فیصل) بنالیں وہ جو فیصلہ کرے اس پر سب رضامند ہو جائیں۔

صبح سب سے پہلے آنے والے رسول اللہ ﷺ تھے، یہاں تک کہ ان لوگوں نے آپ کو فیصل مان لیا۔ آپ نے ایک کپڑا بچھایا جس کے اوپر حجر اسود کو رکھا، پھر ہر ایک قبیلہ کے سردار کو حکم دیا کہ تمام مل کر اس چادر کو اٹھاؤ، سب نے مل کر اٹھایا، آپ نے کپڑے سے پتھر اٹھا کر کعبہ شریف کی دیوار میں نصب کر دیا۔

سبحان اللہ کیا خوب حکمت عملی سے کام حضور ﷺ نے کیا کہ ان کو شدید نزاع اور شدید خطرہ سے بچالیا

غزالی دوران علامہ کاظمی رحمہ اللہ کی تفسیر سے اقتباس:

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ قریش نے جب کعبہ تعمیر کیا تو حضور ﷺ اور حضور کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کعبہ کے لئے پتھر اٹھا کر لا رہے تھے کہ حضرت عباس نے حضور ﷺ سے کہا کہ آپ اپنی ازار شریف (چادر مبارک) اپنے مبارک کاندھے پر رکھ لیجئے، پتھر کی تکلیف سے آپ محفوظ رہیں گے، آپ نے حضرت عباس کا کہنا مان لیا۔ اسی وقت حضور ﷺ بے ہوش ہو گئے اور آپ کی مبارک آنکھیں آسمان کی طرف کھلی رہ گئیں۔ افاقہ ہوتے ہی حضور نے فرمایا، میری ازار، میری ازار، حضرت عباس نے فوراً ازار مبارک حضور پر باندھ دی۔ (بخاری جلد اول ص ۵۲، ۲۱۵، ۵۴۰)

سوال : یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ازار (چادر) کھول کر کاندھے پر رکھ لینا شرم وحیاء کے خلاف اور معیوب وقبیح ہے۔

حضرت عباس نے ایسا کام کرنے کے لئے حضور ﷺ سے کیوں کہا، اور حضور ﷺ نے ان کا کہنا کیسے مان لیا جب کہ حضور تو کنواری لڑکیوں سے بھی زیادہ حیادار تھے، اور معیوب وقبیح امور سے حضور ﷺ کو طبعاً نفرت تھی۔

جواب : اس کا جواب یہ ہے کہ یہ واقعہ حضور ﷺ کی ایسی نوعمری کے زمانہ میں پیش آیا جب اس عمر میں ایسا کرنا نہ حیاء کے خلاف سمجھا جاتا تھا نہ کسی کی نظر میں معیوب وقبیح تھا۔

اور بفحوائے " **عم الرجل صنو ابيه** " حضرت عباس حضور کے چچا ہونے کی وجہ سے بمنزلہ شفیق باپ کے تھے، جن کا کہنا نہ ماننا سعادت مندی کے خلاف تھا۔ حضور ﷺ طبعاً سعادت مند تھے، اس لئے ان کا کہنا مان لیا، لیکن ان کے کہنے پر عمل کرتے ہی حضور ﷺ بے ہوش ہو گئے، اور حضور ﷺ کی مبارک آنکھیں آسمان کی طرف کھلی رہ گئیں۔

افاقہ ہوتے ہی فرمایا ''میری ازار، میری ازار''

حضرت عباس نے فوراً ازار مبارک باندھ دی، یہ حضور ﷺ کے کمال حیاء کا ظہور تھا، معلوم ہوا کہ یہ واقعہ حضور ﷺ کی طبعی سعادتمندی اور فطری حیاء کی دلیل ہے، کسی عیب یا قبح سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں۔

آپ کی عمر کتنی تھی؟ اس میں صحیح قول زہری رحمہ اللہ کا ملتا ہے کہ قریش کی بناء کعبہ کے وقت حضور ﷺ حد بلوغ کو نہ پہنچے تھے۔

امام زہری کا قول اس لئے راجح ہے کہ اس کی بناء پر حضور ﷺ کی طرف کسی عیب اور قبح کی نسبت نہیں ہوئی۔ اور نہ ہی حضور کے کمالِ حیاء کی نفی لازم آئی ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں

علامہ عینی نے بھی اسی قول کے تحت حسب ذیل کلام کر کے ہمارے موقف کی تائید فرمائی، وہ فرماتے ہیں۔

" **ذكر ما فيه من الفوائد منها ان النبي ﷺ كان في صغره محميا عن القبائح والاخلاق الجاهلية منزها عن الرذائل والمعائب قبل النبوة و بعدها ، ومنها انه كان ﷺ جبله الله**

تعالی علی احسن الاخلاق والحیاء الکامل حتی کان اشد حیاء من العذراء فی خدرها فلذلک غشی علیه وما رأی بعد ذلک عریانا" (عمدۃ القاری جلد ۲ ص ۲۔ طبع مصر)

یعنی اس حدیث میں حسب ذیل فوائد پائے جاتے ہیں۔

۱) نبی کریم ﷺ اپنے بچپن میں سب قباحتوں اور اخلاق جاہلیت سے محفوظ تھے، نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد تمام رذائل اور معائب (عیوب) سے منزہ تھے۔

۲) اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو احسن اخلاق اور حیاء کامل پر مخلوق فرمایا تھا، حتی کہ حضور ﷺ ان کنواری، لڑکیوں سے زیادہ حیادار تھے جو اپنے پردے کے اندر چھپی ہوئی ہوں، اس لئے چادر شریف اتارتے ہی حضور ﷺ پر بے ہوشی طاری ہوگئی، اس کے بعد حضور ﷺ کبھی عریاں نہ دیکھے گئے۔

تنبیہ:

اس وقت بھی حضور ﷺ کو عریاں دیکھے جانے کا یہ مفہوم نہیں کہ حضور ﷺ کی شرمگاہ مبارک پر کسی کی نظر پڑی ہو، کیونکہ قیامت کے دن " انکم محشورون حفاۃ عراۃ غرلا " کے متعلق ارشاد مصطفوی ہے کہ تمہارا حشر اس حال میں ہوگا کہ تمہارے پاؤں میں جوتا نہیں ہوگا۔ اور نہ ہی بدن پر کپڑا، نہ تم ختنہ شدہ ہوگے۔ لیکن کوئی کسی کی شرم گاہ کو نہیں دیکھ رہا ہوگا۔ (ماخوذ از التبیان للکاظمی)

راقم کا موقف:

اس مسئلہ میں آسان ہے کہ نبی کریم ﷺ کی قمیص مبارک پاؤں تک تھی، ابھی آپ بالغ نہیں تھے، پتھر اٹھانے میں تیز چلنے میں چادر رکاوٹ بن رہی تھی، حضرت عباس نے اتارنے کا حکم دیا، چچا کا حکم مان بھی لیا، لیکن حضور برداشت نہ کر سکے بے ہوش ہوگئے۔ آپ کو اسی وقت چادر بندھا دی گئی، لہٰذا جب قمیص پاؤں تک ہو، چادر اتارنے سے شرم گاہ کا ننگا ہونا نہیں پایا جاتا۔ واللہ اعلم بالصواب

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ :

یہ کہتے ہوئے اے ہمارے رب قبول فرما ہم سے بے شک تو ہی بہت سننے والا خوب جاننے والا ہے۔

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے " هما يقولان " کے الفاظ محذوف نکالے ہیں، اور جملہ کو حال کہا ہے، جس کے مطابق وہی ترجمہ ہے جو بیان کر دیا گیا ہے۔

" تقبل " کی تفسیر میں متکلمین نے یہ ذکر کیا ہے کہ ہر عمل جسے اللہ تعالیٰ قبول کرلے تو عمل کرنے والے کو وہ ثواب عطاء فرماتا ہے اور اس سے راضی ہوتا ہے۔ اور جس عمل پر رب تعالیٰ کی طرف سے ثواب نہ دیا جائے، اور اس کی رضاء مندی نہ پائی جائے وہ مردود ہے۔

قبولیت اور ثواب و رضاء میں تلازم ہے، ذکر یہ ہے کہ ''اے ہمارے رب قبول فرما ہم سے'' اور مراد یہ ہے کہ اے ہمارے رب تو ہم سے راضی رہے، تو ہی ہمیں اس پر اجر عطاء فرما۔ دنیا کے لحاظ پر بندے کا کسی کو عطیہ دینا اور دوسرے کا وہ عطیہ قبول کر لینا تقبل کہلاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ سے تقبل کی دعا کا یہی مطلب ہے کہ تو راضی ہو جا۔

عارفین حضرات کے نزدیک قبول اور تقبل میں فرق ہے۔ جب کوئی چیز اعلیٰ ہو اور اسے خوشی سے قبول کیا جائے تو اس کے لئے " قبول " کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اور جب کسی چیز کو تکلف سے قبول کیا جائے، اس میں خوشی نہ پائی جائے تو اس کے لئے لفظ " تقبل " استعمال ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حضور لفظ " تقبل " استعمال کیا ہے، جس سے اپنے عجز اور انکسار کا اعتراف کیا ہے۔ اپنے عمل کو مالک الملک کے سامنے پیش کرنے میں گھٹیا سمجھا۔

" وايضا فلم يكن المقصود اعطاء الثواب عليه "

اور اس پر ثواب عطاء کرنے کا قصد نہیں کیا۔

"لان كون الفعل واقعا موقع القبول من المخدوم الذ عند الخادم العاقل من اعطاء الثواب اليه"

اس لئے کہ عقل مند خادم اس میں زیادہ لذت محسوس کرتا ہے کہ میرا فعل میرے مخدوم (مالک) نے مجھ سے قبول کرلیا ہے۔ اسے یہ پرواہ نہیں ہوتی کہ اس پر کوئی اجر ملتا ہے یا نہیں۔ (از کبیر)

''عن وهيب بن الورد انه قرأ ﴿ وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا﴾ ثم يبكى ويقول ياخليل الرحمٰن ترفع قوائم بيت الرحمٰن وانت مشفق

ان لایتقبل منک"

وہیب ابن ورد نے اس آیۃ کریمہ کو پڑھا، یعنی ﴿وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ﴾ پڑھا پھر آپ نے رونا شروع کر دیا۔ روتے ہوئے کہتے ہیں۔ اے اللہ کے خلیل تم رب تعالیٰ کے گھر کی بنیادوں کو بلند کر رہے تھے اور ڈر رہے تھے کہ ہوسکتا ہے یہ عمل قبول نہ ہو۔

یعنی کامل عجز وانکسار آپ میں پایا گیا، کیونکہ اگر عام دنیا دار ہوتا تو اپنے کام پر اتراتا کہ میں نے اللہ کا گھر بنایا، لیکن اللہ کا خلیل اللہ کا گھر بنا کر بھی سراپا عجز وانکسار بن کر رہا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے مخلصین مؤمنین بندوں کی شان میں بیان کیا ہے۔ " والذین یؤتون ما اتوا وقلوبهم وجلة " اور وہ جو دیتے ہیں جو کچھ دیں اور ان کے دل ڈر رہے ہیں۔

یعنی وہ اللہ کے حضور زکوۃ وصدقات اور اعمال صالحہ پیش کرتے ہیں، لیکن پھر بھی ان کے دل ڈر رہے ہوتے ہیں کہ کیا معلوم کہ یہ اللہ تعالیٰ کے حضور شرف قبولیت حاصل کرتے ہیں یا نہیں۔

(از ابن کثیر)

اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ : آپ نے یہ دعاء کر کے رب کے حضور عرض کیا۔

"تسمع دعاء نا وتضرعنا و تعلم ما فی قلبنا من الاخلاص وترک الالتفات الی احد سواک"

اے اللہ تو ہماری دعاء اور عاجزی کو سنتا ہے، تو ہمارے دلوں کے اخلاص کو جانتا ہے۔ اور تو جانتا ہے کہ ہم تیرے سوا کسی اور کی طرف توجہ نہیں کرتے۔

اس دعاء میں ایک لطیف اشارہ:

اس سے پہلے عارفین کا قول نقل کیا جاچکا ہے کہ آپ نے رب تعالیٰ کے حضور "تقبل" کہہ کر اپنے عجز کا اعتراف کیا، اور اپنے عمل کو کمتر سمجھا۔

لیکن اس دعاء میں لطیف اشارہ یہ پایا گیا کہ ہمارے عجز کو کوئی جاہل حقیقت نہ سمجھ بیٹھے۔

"قولهما ﴿ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴾ یدل علی انه لم یقع منهما تقصیر بوجه ما فی اتیان المامور به بل بذلا فی ذلک غایة ما فی وسعهما فان المقصر المتساهل کیف

یتجاسر علی ان یقول باطلق لسان وارق جنان ﴿ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ ﴾ لدعائنا وتضرعنا ﴿ الْعَلِیْمُ ﴾ بما فی قصدنا وصبرنا فی اتباع امرک ودل ذلک علی ان القبول والرد الیه تعالی وانه لایجب علیه شئ"

حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کا رب تعالیٰ کے حضور یہ عرض کرنا ﴿ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴾ یہ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ ان دونوں سے رب تعالیٰ کے حکم بجالانے میں کوئی کوتاہی نہیں ہوئی، بلکہ انہوں نے اپنی پوری کوشش صرف کر دی، اس لئے کہ اگر کوئی شخص کوتاہی کرتا ہے سستی کرتا ہے وہ کیسے جسارت کر سکتا ہے کہ برملا طور پر یہ کہے، دل کی گہرائیوں سے یہ کہے کہ اے اللہ تو ہماری دعاؤں اور عاجزی کو خوب سننے والا ہے۔ اور تو ہمارے ارادہ کو جانتا ہے، تو جانتا ہے کہ ہم نے تیرے حکم کی اتباع میں صبر سے کام لیا ہے۔

اسی سے یہ مسئلہ بھی سمجھ آ گیا کہ کسی کا عمل قبول کرنا رب تعالیٰ پر لازم نہیں، البتہ چاہے تو قبول فرمائے۔ چاہے تو رد کرے۔ ہاں البتہ اللہ تعالیٰ اپنی وسیع رحمت کی وجہ سے کسی کے عمل کو ضائع نہیں فرماتا۔
(از شیخ زادہ)

اعتراض: ﴿ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴾ میں حصر پائی گئی ہے، جس کا معنی ہے کہ بیشک تو ہی سننے والا جاننے والا ہے۔ یہ حصر کس طرح درست ہے جب کہ مخلوق بھی سنتی اور جانتی ہے۔

جواب: "انه سبحانه لکماله فی هذه الصفة یکون کأنه هو المختص بها دون غیره"

اللہ تعالیٰ کو یہ صفات کامل طور پر کما حقہ حاصل ہیں، اس لئے کہ وہی حقیقت میں، ذاتی طور پر سننے والا جاننے والا ہے۔ اور مخلوق کو سننا اور جاننا رب تعالیٰ کی طرف سے ہی حاصل ہے۔ لہٰذا حصر درست ہے۔ (از کبیر)

☆☆☆

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾

۱) اے رب ہمارے اور کر ہمیں تیرے حضور گردن رکھنے والا، اور ہماری اولاد میں سے ایک امت تیری فرمانبردار اور ہمیں عبادت کے قاعدے بتا اور ہم پر اپنی رحمت سے رجوع فرما، بیشک تو ہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان۔

۲) اے ہمارے رب اور رکھ ہم دونوں کو فرمانبردار اپنا، اور کر ہماری اولاد میں سے ایک امت کو فرمانبردار اپنا، اور دکھا ہمیں ہماری عبادت کے طریقے، اور رجوع فرما ہماری طرف، بے شک تو توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ : یہ ابراہیم علیہ السلام کی دوسری دعاء ہے۔ پہلی دعاء کا ذکر پہلی آیت میں ہو چکا ہے۔ اسی وجہ سے "واؤ" ذکر ہے۔

"مسلمین" یا تو لیا ہوا ہے۔ "اسلم وجهه" سے، جس کا معنی ہے، اخلاص، اس صورت میں معنی ہوگا۔ اے ہمارے رب اور ہم دونوں کو اپنا مخلص بنا۔

اور یا یہ لفظ ماخوذ ہے۔ "اسلم" سے لیکن اس کا معنی ہے۔ "استسلم" مطیع ہونا، فرمانبردار ہونا، گردن رکھنا یعنی گردن جھکانا، اس صورت میں معنی ہوگا۔ اے ہمارے رب اور بنا ہمیں اپنا فرمانبردار لیکن ان دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہوگا۔ "والمراد طلب الزيادة في الاخلاص والاذعان" کہ اے ہمارے رب اور ہمیں خلوص اور اطاعت میں زیادہ مرتبہ عطاء فرما۔

اور ایک معنی یہ ہے۔ "والمراد الثبات عليه" اے ہمارے رب اور ہم دونوں کو اسلام اور اطاعت پر قائم و دائم رکھ۔

راقم نے اسی کے مطابق ترجمہ ذکر کیا ہے۔ "اور رکھ ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار"

وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ : اور ہماری اولاد میں سے ایک امت کو اپنا فرمانبردار رکھ بظاہر طور پر یہاں یہ وہم ہے کہ اصحاب ہمت یعنی اولیاء کرام، بزرگان دین اور پھر خاص کر کے انبیاء کرام تو عام لوگوں کے لئے دعاء کرتے ہیں۔ صرف اولاد کے لئے دعاء نہیں کرتے، تو

حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کا اولاد کے لئے دعاء کرنے کا کیا مطلب؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی دو وجہ ہیں ایک یہ ہے کہ اولاد زیادہ حق رکھتی ہے کہ اس پر شفقت کی جائے، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَاَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ ﴾ (اے محبوب) آپ اپنے قبیلے والوں کو ڈرائیں۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ﴿ قُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ وَاَہۡلِیۡکُمۡ نَارًا ﴾ (اے ایمان والو) تم اپنے آپ کو اور اپنی اہل کو آگ سے بچاؤ۔

دوسری وجہ اولاد کیلئے دعاء کرنے کی یہ ہے کہ اگرچہ بظاہر دعاء میں تخصیص ہے، لیکن درحقیقت دعاء میں عموم پایا گیا ہے۔ کیونکہ انبیاء کرام کی اولاد کی اصلاح سے دوسرے لوگوں کی اصلاح ہوتی ہے۔

" فکأنهما قالا واصلح عامة عبادک باصلاح بعض ذریتنا " گویا کہ ان دونوں ہستیوں نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا کہ اے ہمارے رب ہماری بعض اولاد کو اپنی فرمانبرداری پر قائم رکھ کر عام لوگوں کی اصلاح فرما۔

بعض اولاد کے لئے دعاء کیوں؟

جب ان دونوں حضرات کو یہ علم حاصل ہوگیا کہ ہماری اولاد میں سے کوئی نیک لوگ ہوں گے، اور کوئی ظالم ہوں گے۔ اور جب یہ بھی ان کو معلوم تھا کہ دعاء ظالموں، کافروں کے لئے نہیں کی جاتی، اس لئے انہوں نے اپنی بعض اولاد کے لئے دعاء کی، ان کی دعاء کا مطلب ہی یہ ہے کہ اے اللہ ہماری اولاد میں سے جو لوگ مومن ہوں گے، ان کو ایمان پر قائم و دائم رکھ۔

اور ظالموں، جاہلوں کے لئے دعاء نہ کرنے کی یہ وجہ تھی تاکہ نظام دنیا قائم رہے۔ اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ جہان افاضل اور اواسط اور اراذل سے خالی نہ رہے۔

" فالا فاضل هم اهل الله الذين اخلصوا انفسهم لله بالاقبال الكلي عليه "

افاضل وہ اللہ والے ہیں جو خالص اور کامل طور پر اپنے آپ کو رب تعالیٰ کی طرف متوجہ رکھیں

" والاواسط هم اهل الآخرة الذين يجتنبون المنكرات ويواظبون على الطاعات رغبة في نيل المثوبات "

اور اواسط یعنی درمیانے لوگ وہ ہیں جن کی توجہ آخرت کی طرف ہوتی ہے۔ اور گناہوں سے

بچتے ہیں۔اور نیکیوں پر ہمیشہ قائم رہتے ہیں اور ثواب حاصل کرنے کی رغبت رکھتے ہیں۔

" والاراذل هم اهل الدنیا الذین یعلمون ظاهرا من الحیاة وهم عن الآخرة هم غافلون جعلوا همتهم عمارة الدنیا وتهیئة اسبابها "

رذیل لوگ یعنی گھٹیا لوگ وہ ہیں جو صرف دنیا کی زندگی سے ہی تعلق رکھتے ہیں، اور آخرت سے وہ غافل رہتے ہیں وہ دنیا کو آباد کرنے اور اسی کے اسباب کی تیاری میں رہتے ہیں۔

دنیا کا آباد کرنا تین چیزوں پر ہے۔(۱) کھیتی باڑی اور شجرکاری (درخت لگانے) (۲) خاندانی رقابت اور طبیعت میں جوشیلا پن اور جنگ کرنا۔ (۳) اشیاء کو ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف لانا۔

" ومن اکب علی هذه الاشیاء نسی الموت والبعث والحساب "

جو شخص ان چیزوں کی طرف ہی کامل متوجہ رہا، گویا کہ ان پر اوندھا ہو کر گر پڑا تو اسے موت بھول گئی، قیامت اور حساب کو وہ بھول گیا۔

اگر کسی شخص نے کامل طور پر فقط دنیا کو آباد کرنے کی کوشش کی، اور اپنے فکر کو صرف دنیاداری کی طرف ہی لگائے رکھا۔ "فهو متوغل فی الجهل والحماقة " وہ جہالت اور حماقت میں کامل طور گھر گیا۔

" ولهذا قیل لولا الحمقی لخربت الدنیا " اسی وجہ سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر بیوقوف نہ ہوتے تو دنیا خراب ہو جاتی۔ واضح ہوا کہ آپ نے ظالموں کے لئے دعاء اسی لئے نہیں کی تا کہ نظام دنیا بھی آباد رہے اور جہنم کے لئے بھی مخلوق قائم رہے۔ (از بیضاوی و شیخ زاده)

" وقیل اراد بالامة المسلمة امة محمد ﷺ "اور بعض حضرات نے بیان فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام نے جو دعاء امت مسلمہ کے لئے کی اس سے آپ کی مراد امت محمد مصطفیٰ ﷺ ہے۔ (ابوالسعود) تاہم راقم کے نزدیک تعمیم ہی بہتر ہے کہ آپ نے دعاء اپنی اولاد میں سے تمام مسلمانوں کے حق میں کی، خواہ وہ اس وقت موجود تھے، یا بعد میں آنے والے ہوں۔ اس طرح آپ کی دعاء میں خود بخود امت محمد مصطفیٰ ﷺ بھی آ گئی۔

وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا : اس مقام میں" ارنا "یا تو رؤیة بصریة سے لیا ہوا ہے، باب افعال پر آنے کی وجہ سے متعدی بدو مفعول ہو گیا اس صورت میں معنی ہوگا''اور ہمیں دکھا''

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ " رؤیة قلبیة " سے ماخوذ ہو، لیکن معرفت کے معنی میں ہوگا۔ اسی

لئے دو مفعول ہیں۔ اگر علم کے معنی میں ہو تو باب افعال پر آنے سے اس کے تین مفعول ہوتے ہیں۔
آیۃ کریمہ میں دو مفعول ہی ذکر ہیں۔ اس صورت میں معنی ہوگا اور ہمیں پہچان کرا، ہمیں بتا۔

اعتراض: ابن حاجب اور اس کے تبعین ابو حیان وغیرہ نے " رأى "کو " عرف " کے معنی میں استعمال کرنے سے انکار کیا ہے کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ تو معرفت کے معنی میں لینا کیسے صحیح ہے؟

جواب: علامہ زمخشری نے مفصل میں، اور راغب نے اپنی مفردات میں ذکر کیا ہے کہ " رؤية " بمعنی معرفت آتا رہتا ہے۔ " وهما من الثقات فلا عبرة بانكارهما " یہ دونوں علم نحو میں مضبوط مقام رکھتے ہیں۔ اس لئے اس کا انکار ممکن نہیں۔ (از روح المعانی)

مَنَاسِكَنَا : نسک کا معنی عبادت کرنا، عبادت کرنے والے کو " ناسک " کہا جاتا ہے۔

اور ذبح کرنے کو بھی " نسک " کہا جاتا ہے۔ اور ذبیحہ کو "نسیکہ" اور اسی طرح افعال حج کو "مناسک " کہا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا " خذوا عني مناسككم لعلي لاالقاكم بعد عامي هذا "، مجھ سے افعال حج کے طریقے حاصل کرلو، ہوسکتا ہے اس سال کے بعد میری ملاقات تم سے نہ ہو۔

اور وہ مقامات جہاں حج کے احکام ادا ہوتے ہیں ان کو بھی مناسک کہا جاتا ہے۔ اور کبھی فرق بھی کرلیا جاتا ہے کہ جب " منسک " کے سین پر فتحہ ہو تو معنی ہوگا "فعل حج" اور جب کسرہ ہو یعنی مسجد، مشرق اور مغرب کے وزن پر ہو تو معنی ہوگا "جگہ"

آیۃ کریمہ میں " مناسک " کا معنی ذبیحہ تو درست نہیں، البتہ حج کے احکام اور مقامات مراد ہوسکتے ہیں اور اگر عام عبادات مراد لے لی جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔

اب ان الفاظ مبارکہ کے یہ معانی ہوگئے (۱) اور دکھا ہمیں احکام حج (۲) اور دکھا ہمیں مقامات حج۔ (۳) اور بتا ہمیں احکام حج۔ (۴) اور بتا ہمیں مقامات حج (۵) اور دکھا ہمیں عبادات کے طریقے۔ (۶) اور بتا ہمیں عبادت کے طریقے۔

اعلیٰ حضرت کا یہی آخری ترجمہ ہے جو آپ نے کبیر کے ان الفاظ سے لیا ہے۔
"علمنا كيف نعبدک واين نعبدک وبما ذا نتقرب اليک حتى نخدمک به كما يخدم العبد مولاه "

ہمیں بتا ہم تیری عبادت کیسے کریں۔ اور کہاں تیری عبادت کریں۔ اور کن چیزوں سے تیرا تقرب حاصل کریں، یہاں تک کہ تیری خدمت ایسے کریں جیسے غلام اپنے مالک کی خدمت کرتا ہے۔ (از کبیر)

راقم کا ترجمہ خازن کی اس عبارت سے ماخوذ ہے۔ " فاجاب الله دعاء هما وبعث جبريل فاراهما المناسک " اللہ تعالیٰ نے ان دونوں حضرات کی دعاء کو قبول فرما لیا اور جبریل کو بھیجا، انہوں نے ان دونوں حضرات کو عبادات کے طور طریقے دکھا دیئے۔ جب عرفات پر پہنچے تو پوچھا "عرفت يا ابراهيم " اے ابراہیم کیا تم نے پہچان لیا؟ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا ہاں، فسمی ذلک الوقت عرفة والموضع عرفات "اس وقت کو عرفہ کہا گیا اور جگہ کو عرفات کہا گیا۔

(از خازن)

وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ : اور رجوع فرما ہماری طرف، بے شک تو توبہ قبول فرمانے والا، رحم کرنے والا ہے۔ انبیاء کرام رب تعالیٰ سے اپنے مدارج کی بلندی کی دعاء کرتے رہتے ہیں۔ اور جب وہ دنیاوی کاموں میں مشغول ہوں، اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ میں بظاہر کمی محسوس کریں تو وہ رب تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہی ان کی توبہ ہوتی ہے۔ اور مالک الملک کا ان کی طرف کامل رحمت سے توجہ کرنا ان کی توبہ کو قبول کرنا ہوتا ہے۔

اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے " وتب علينا " کا ترجمہ کیا ہے۔ "اور ہم پر اپنی رحمت سے رجوع فرما۔ ابراہیم علیہ السلام کے توبہ کرنے کا بھی یہی مطلب ہے۔

اور وجہ یہ بھی ہے۔

" والمعنى ﴿وَتُبْ﴾ على الظلمة من اولادنا حتى يرجعو الى طاعتک فيكون ظاهر الكلام الدعاء لانفسهما والمراد به ذريتهما "

کہ آپ دونوں حضرات کی دعاء اگر چہ بظاہر اپنے لئے تھی، لیکن حقیقت میں وہ دعاء اپنی اولاد میں سے ظالموں کے لئے تھی، اے اللہ جو لوگ ہماری اولاد میں سے ظالم ہوں گے ان کو توبہ کی توفیق عطاء فرمانا اور ان کی توبہ کو قبول فرمانا۔

اسی وجہ پر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت تائید بھی کر رہی ہے۔ " وقرأ ابن مسعود وارهم مناسكهم " جس کا مطلب ہی یہ ہے کہ اے اللہ ہماری اولاد کو عبادت کے طریقے دکھا، اس کے مناسب توبہ کی قبولیت کی دعاء بھی اولاد کے لئے ہوگی۔

(از روح المعانی)

فائدہ : توبہ کے مختلف مدارج ہیں، کیونکہ توبہ کرنے والوں کے مدارج مختلف ہیں۔

" توبة سائر المسلمين الندم والعزم على عدم العود وردا لمظالم اذا امكن ، ونية الرد اذا لم يمكن "

عام مسلمانوں کی توبہ یہ ہے کہ وہ گناہوں پر نادم ہو جائیں، اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرلیں۔ اور مظالم (یعنی ظلم سے حاصل کئے ہوئے منافع) واپس کرے جہاں تک ممکن ہو۔ اگر ممکن نہ ہو تو نیت کرلے کہ جب مجھے طاقت حاصل ہوگی، تو لوگوں کے حقوق میں ادا کروں گا۔

" وتوبة الخواص الرجوع عن المكروهات من خواطر السوء والفتور في الاعمال والاتيان بالعبادة على وجه غير الكمال "

خواص کی توبہ یہ ہے کہ دل میں برے خیالات کے آنے کی وجہ سے جو مکروہ حالت پیدا ہوتی ہے وہ اس سے بھی توبہ کرتے ہیں اور اعمال میں ذرا بھر کمی محسوس کریں تو توبہ کرتے ہیں۔ اور عبادت کو کامل طریقہ سے نہ ادا کر سکنے پر بھی وہ توبہ کرتے ہیں۔

" وتوبة خواص الخواص لرفع الدرجات والترقي في المقامات "

خواص الخواص کی توبہ درجات کی بلندی اور مقامات کی ترقی کے لئے ہوتی ہے۔ (از روح المعانی)

اسی بحث سے گمراہوں کا رد ہو گیا:

بعض لوگ قرآن پاک اور احادیث مبارکہ کے مطالب کو سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ ظاہر الفاظ کو دیکھ کر ظاہری معانی سے خود بھی بھٹک جاتے ہیں۔ اور دوسروں کو بھی بھٹکاتے رہتے ہیں۔

اس آیۃ کریمہ میں بھی ان لوگوں نے ﴿ وَتُبْ عَلَيْنَا ﴾ سے گمراہی حاصل کی۔ اور یوں کہا۔

" ان التوبة لاتطلب من الله الا بعد تقدم الذنب فلو لا تقدم الذنب لم يكن لطلب التوبة وجه " (خازن)

بے شک توبہ اللہ سے اس وقت تک نہیں طلب کی جاتی جب تک پہلے گناہ نہ پائے جائیں، گناہوں کے بعد ہی توبہ کی جاتی ہے اگر گناہ نہ پائے جائیں تو توبہ کرنے کا مقصد ہی کیا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ انبیاء گنہگار ہوتے ہیں۔

اس کا جواب پہلے آچکا ہے کہ انبیاء کرام کی توبہ مدارج کی بلندی کے لئے ہوتی ہے۔ اور اپنی امت کے گنہگار لوگوں کے لئے ہوتی ہے۔ انبیاء کرام کو گنہگار کہنے والے خود بھی بھٹک جاتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

راقم نے اسی پارہ کی چوتھے رکوع میں انبیاء کرام کے گناہوں سے پاک ہونے کا تذکرہ تفصیل سے کر دیا ہے۔ وہاں دیکھا جائے۔

﴿رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُزَكِّيۡهِمۡ ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ﴾ (آیت ۱۲۹)

۱) اے رب ہمارے اور بھیج ان میں ایک رسول انہیں میں سے کہ ان پر تیری آیتیں تلاوت فرمائے، اور انہیں تیری کتاب اور پختہ علم سکھائے، اور انہیں خوب ستھرا فرما دے اور بے شک تو ہی ہے غالب حکمت والا۔

۲) اے ہمارے رب، اور بھیج ان میں ایک رسول جو ان میں سے ہی ہو، تلاوت کرے ان پر تیری آیتیں، اور سکھائے ان کو کتاب اور حکمت، اور ان کو پاکیزہ کرے۔ بے شک تو ہی غالب، حکمت والا ہے۔

رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ :

اے ہمارے رب، اور بھیج ان میں ایک رسول جو ان میں سے ہی ہو۔

ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کی یہ دعاء نبی کریم ﷺ کے حق میں قبول ہوئی۔ رب تعالیٰ نے دوسرے مقام پر ذکر فرمایا ﴿هُوَ الَّذِىۡ بَعَثَ فِى الۡاُمِّيّٖنَ رَسُوۡلًا﴾ (سورۃ جمعہ) وہ ذات جس نے امیین میں رسول بھیجا۔

اس آیت میں بھی رسول سے مراد حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہی ہیں۔

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کی قبولیت کا آپ کے الفاظ کے مطابق ہی رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا، جس سے مراد بالاتفاق نبی کریم ﷺ ہیں۔

﴿لَقَدۡ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اِذۡ بَعَثَ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡ اَنۡفُسِهِمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيۡهِمۡ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ ۚ وَاِنۡ كَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ﴾ (آل عمران ۱۶۴)

بے شک اللہ کا بڑا احسان ہوا مسلمانوں پر کہ ان میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس

کی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت سکھاتا ہے، اور وہ ضرور اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

اس آیۃ کریمہ کی وضاحت تو اپنے مقام پر آئے گی۔ اتنا واضح ہو کہ رسول سے مراد اس آیۃ میں ''سید عالم خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ'' ہیں۔ (خزائن العرفان)

اس کی تائید حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قراءت سے بھی ملتی ہے۔ ﴿ وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ فِيۡ آخِرِهِمۡ رَسُوۡلاً ﴾ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دعاء کا مطلب ہی یہ تھا کہ اے اللہ اس سرزمین حرم کے باشندوں کے لئے اپنے آخری رسول کو مبعوث فرما۔

اس قراءت کی تائید آثار سے ملتی ہے۔

'' انه لما دعا ابراهيم قيل له قد استجيب لک وهو يکون فی آخر الزمان ''

اس لئے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے دعاء فرمائی تو آپ کو جواب دیا گیا کہ آپ کی دعاء کو قبول کرلیا گیا۔ وہ نبی جن کے لئے تم نے دعاء کی وہ آخر زمانہ میں تشریف لائیں گے (جن کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا)

اس مقام پر علامہ ابوحیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ '' ولا خلاف انه رسول الله محمد ﷺ ''

اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ بے شک وہ اللہ کے رسول جن کے لئے ابراہیم واسماعیل علیہما السلام نے دعاء کی اس سے مراد حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ (البحر المحیط)

'' واما ان الرسول هو محمد ﷺ فیدل علیه وجوه' احدها اجماع المفسرین وهو حجة ''

بے شک اس دعاء میں رسول سے مراد حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں، اس پر چند طرح کے دلائل پائے جاتے ہیں۔ ان میں ایک دلیل یہ ہے کہ اس پر مفسرین کرام کا اجماع ہے۔ جو بہت بڑی قوی دلیل ہے۔

'' وثانيهما ان ابراهيم عليه السلام انما دعا بهذا الدعاء بمكة لذريته الذين يكونون بها وبما حولها ، ولم يبعث الله تعالى الى من بمكة وما حولها الا محمدا ﷺ ''

ان میں سے دوسری دلیل یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعاء مکہ میں کی، اور یہ دعاء مکہ اور اس کے ارد گرد رہنے والوں کے لئے تھی کہ اے اللہ'' ان میں رسول بھیج جو ان میں سے ہی ہو۔''

اللہ تعالیٰ نے مکہ والے لوگوں کے لئے اور اس کے اردگرد والے لوگوں کے لئے کوئی اور رسول سوائے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے مبعوث فرمایا ہی نہیں۔

ان دلائل میں تیسری دلیل یہ ہے کہ خود نبی کریم ﷺ نے فرمایا" **انا دعوۃ ابراھیم** " میں ابراہیم کی دعاء ہوں۔یعنی میں ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کا اثر ہوں، میں ان کا طلب کیا ہوا ہوں۔

(از کبیر)

حدیث اور اس کی وضاحت:

ابھی کبیر کے حوالہ سے حدیث شریف کا ایک جملہ نقل کیا۔وہ حدیث مکمل اس طرح ہے۔

حضرت عرباض بن ساریہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

"**انی عند اللہ مکتوب خاتم النبیین و ان آدم لمنجدل فی طینته وسأخبر کم باوّل امری دعوۃ ابراھیم و بشارۃ عیسٰی و رؤیا امی التی رأت حین وضعتنی وقد خرج لھا نور اضاء لھا منھا قصور الشام**"(شرح السنة، مسند احمد از ساخبر کم تا آخر، مشکوۃ باب فضائل سید المرسلین ص ۵۱۳)

میں اللہ تعالیٰ کے ہاں اس وقت بھی خاتم النبیین لکھا ہوا تھا جب کہ آدم علیہ السلام ابھی کیچڑ میں تھے،یعنی آپ کا خمیر تیار کیا جا رہا تھا۔میں تمہیں اپنے اول امور کی خبر دے رہا ہوں کہ میں ابراہیم کی دعاء ہوں،اور عیسیٰ کی بشارت ہوں،اور اپنی ماں کی رؤیا ہوں، جو آپ نے اس وقت دیکھا جب مجھے جنا کہ آپ سے ایک نور ظاہر ہوا جس سے شام کے محلات روشن ہو گئے۔

" **دعوۃ ابراھیم** " سے اسی دعاء کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اس زیر بحث آیۃ کریمہ میں ہے،یعنی حضور ﷺ نے وضاحت فرمادی کہ ابراہیم علیہ السلام نے میرے آنے کی دعاء کی۔

" **بشارۃ عیسٰی** " سے مراد جو عیسیٰ علیہ السلام نے کہا، رب تعالیٰ نے اسے ان الفاظ مبارکہ سے ذکر فرمایا۔﴿ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ﴾ آپ نے بشارت دی کہ میرے بعد ایک رسول تشریف لائیں گے جن کا نام احمد ہوگا۔

" **رؤیا امی** " سے مراد کیا خواب کا واقعہ ہے یا ظاہر طور پر دیکھنا مراد ہے؟ اس پر شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"**ظاھر ھذا الکلام ان رؤیة نور اضاء به قصور الشام کانت فی المنام وقد جاء ت للاخبار**

انها کانت فی الیقظة و اما الذی فی المنام فهو انها رأت انه اتاها آت فقال لها شعرت انک قد حملت بسید هذه الامة و نبیها فیبنغی ان یحمل الرؤیا علی الرؤیة بالعین واللہ اعلم "
(لمعات)

اگرچہ ظاہر طور پر تو سمجھ آتا ہے کہ آپ کی والدہ کا نور کو دیکھنا، جس سے شام کے محلات روشن ہوئے، خواب کا واقعہ ہو۔ لیکن احادیث میں یہی واقعہ جاگتے ہوئے درپیش آنے کا ذکر بھی ہے، خواب کا واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ کہ آپ کی والدہ نے خواب دیکھا کہ کوئی شخص میرے پاس آکر مجھے کہہ رہا ہے کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم اس امت کے سردار اور نبی حاملہ ہو چکی ہو، مناسب یہی ہے کہ اس حدیث میں رؤیا سے آنکھ سے دیکھنا جاگتے ہوئے مراد لیا جائے۔

راقم کے نزدیک اس حدیث میں خواب کا معنی لینا ہی حقیقت سے دوری کی علامت ہے۔ اس لئے کہ " حین وضعتنی " ظرف ہے۔ " رأت " کی (جس وقت میری والدہ نے مجھے جنا اس وقت دیکھا) پیدائش کے وقت خواب کا دیکھنا ناممکن ہے۔

اس حدیث میں ظاہری طور پر دیکھنا مراد لیا جائے تو یہ معنی ظاہری ترکیب کے بالکل مطابق ہے، خواب والا معنی لینا تکلفات اور تاویلات سے خالی نہیں۔

اصل میں بنیادی طور پر غلطی کی وجہ یہ ہے کہ " رؤیا " کا معنی خواب مشہور و معروف ہے۔ لیکن رؤیا کا معنی " الرؤیة بالعین " (آنکھ سے دیکھنا) کم مشہور ہے، اس لئے اس حدیث میں بھی محققین حضرات نے معنی خواب کر دیا ہے جسے راقم کے ذہن نے قبول نہیں کیا۔

ایک شبہ کا ازالہ:

ظاہر ترجمہ کرنے والوں نے اس حدیث سے بھی غلطی کھائی، وہ کہتے ہیں، کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا " انا دعوۃ ابراھیم " (میں ابراہیم کی دعاء ہوں) اس سے پتہ چلا کہ حضرت اسماعیل علی علیہ السلام کی دعاء قبول نہیں ہوئی، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء قبول ہوئی۔

اس قول کا رد علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ ان کا کہنا باطل ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے۔

" ولما کان اسمعیل علیه السلام شریکا فی الدعوة کان رسول اللہ ﷺ دعوة اسمعیل ایضا الا انه خص ابراهیم لشرافته و کونه اصلا فی الدعاء "

جب حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی دعاء میں شریک تھے تو نبی کریم ﷺ ان کی دعاء کا بھی اثر ہیں، البتہ صرف ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ان کی بزرگی کے پیش نظر تھا، پھر وہ باپ ہونے کے لحاظ پر اصل بھی ہیں۔لہٰذا نبی کریم ﷺ نے بامحاورہ کلام فرمایا، کیونکہ عام طور پر محاورہ یہی ہے کہ کسی گھر کے افراد مل کر بھی کلام کریں، تو عام طور پر گھر کے سربراہ کا نام ہی ذکر ہوتا ہے۔کہ فلاں شخص نے یہ کام کیا۔

(ماخوذ از روح المعانی)

عجیب حکمت:

نماز میں درود شریف پڑھا جاتا ہے اس میں نبی کریم ﷺ کے اسم گرامی کے ساتھ ابراہیم علی علیہ السلام کا اسم گرامی ملا کر پڑھا جاتا ہے۔

" اللھم صل علی محمد وعلی آل محمد کما صلیت علی ابراھیم وعلی آل ابراھیم انک حمید مجید "اس میں کیا حکمت ہے؟

اس میں چند وجوہ پائی گئی ہیں:

۱) جب ابراہیم علیہ السلام نے حضرت محمد ﷺ کے لئے دعاء فرمائی، یعنی عرض کیا ﴿ ربنا وَابۡعَثۡ فِیۡهِمۡ رَسُوۡلاً مِّنۡهُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِکَ ﴾ (اے ہمارے رب اور بھیج ان میں رسول جو ان میں سے ہی ہو، ان پر تیری آیات کی تلاوت کرے) تو اب اللہ کے حبیب پر بھی لازم ہو گیا کہ وہ بھی حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے لئے دعاء فرمائیں۔

" قضی اللہ تعالی غنه حقه بان اجری ذکره علی السنة امته الی یوم القیامة "

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کی طرف سے اپنے خلیل کا حق اس طرح ادا کر دیا کہ نبی کریم ﷺ کی امت کی زبانوں پر قیامت تک جاری فرما دیا۔

۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حضور دعاء کی ﴿ وَاجۡعَلۡ لِّیۡ لِسَانَ صِدۡقٍ فِی الۡاٰخِرِیۡنَ ﴾ (الشعراء ۸۴) اور کر دے میرا اچھا ذکر آنے والوں میں۔

" یعنی ابق لی ثناء حسنا فی امة محمد ﷺ " یعنی آپ کی اس دعاء کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا "میری طرف امت محمد مصطفیٰ ﷺ میں باقی رکھنا۔"

" فاجابه اللہ تعالی وقرن ذکره بذکر حبیبه ابقاء للثناء الحسن الیه فی امته "

تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعاء کو قبول فرمالیا، آپ کے ذکر کو اپنے حبیب ﷺ کے ذکر کے ساتھ ملا لیا، تاکہ آپ کا اچھا ذکر نبی کریم ﷺ کی امت کی زبانوں پر تا قیامت باقی رہے۔

۳) حضرت ابراہیم علیہ السلام " اب الملة " ہیں۔ جس پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿ مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرَاهِیْمَ ﴾ دلالت کر رہا ہے۔ اور نبی کریم ﷺ " اب الرحمة " ہیں۔ رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُفٌ رَّحِیْمٌ ﴾ آپ مومنوں پر مہربان رحم کرنے والے ہیں۔

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا "انما انا لکم مثل الوالد " یعنی فی الرافة والرحمة " بیشک میں تمہارے لئے تمہارے باپ کی طرح ہوں۔ یعنی باپ کی طرح تم پر مہربان اور رحم کرنے والا ہوں " فلما وجب لکل واحد منهما حق الابوة من وجه قرن بین ذکرهما فی باب الثناء والصلوة "

جب دونوں حضرات یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نبی کریم ﷺ کو امت پر مہربانی کی وجہ سے باپ ہونے کا حق حاصل ہے، تو اس وصف کے ظاہری اشتراک کی وجہ سے ان دونوں حضرات کے ذکر کو درود شریف میں ملا دیا۔

۴) حضرت ابراہیم علیہ السلام شریعت میں حج کا اعلان کرنے والے وصف سے متصف ہیں۔ رب تعالیٰ فرمایا ﴿ وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ ﴾ اور لوگوں میں حج کی عام ندا کر دے۔ (الحج ۲۷)

اور نبی کریم ﷺ دین کی ندا دینے والے ہیں، رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ ﴾ اے ہمارے رب ہم نے ایک نداء فرمانے والے کو سنا جو ایمان کی نداء فرماتا ہے۔

(آل عمران ۹۳)

جب دونوں حضرات منادی ہونے کے وصف میں شریک ہیں۔ " فجمع الله تعالى بينهما فى الذكر الجميل " تو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو ذکر جمیل میں ایک جگہ جمع کر دیا۔

(ماخوذ از کبیر)

یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ :

تلاوت کرے ان پر تیری آیات اور سکھائے ان کو کتاب وحکمت۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اللہ تعالیٰ سے دعاء کی کہ اے ہمارے رب اور بھیج ان میں رسول جوان سے ہی ہو، تو ساتھ ہی رب کے حضور اس رسول کی تین صفات کا بھی ذکر کیا۔

۱) ان پر تیری آیات تلاوت کرے، (۲) ان کو کتاب سکھائے۔ (۳) اور ان کو حکمت سکھائے

پہلی صفت ﴿ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ ﴾ میں دو وجہ ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد " انها الفرقان الذى انزل على محمد ﷺ " قرآن پاک ہے جو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل ہوا، اس وجہ سے کہ آپ جو قوم پر تلاوت فرماتے وہ قرآن پاک ہی تو ہے۔ لہٰذا یہی معنی لیا جائے۔

دوسری وجہ یہ ہے۔

"يجوز ان تكون الآيات هى الاعلام الدالة على وجود الصانع و صفاته سبحانه وتعالى ومعنى تلاوته اياها عليهم انه كان يذكرهم بها ويدعوهم اليها ويحملهم على الايمان بها "

کہ آیات سے مراد وہ علامات ہوں جو وجود صانع (رب تعالیٰ کی خالق ذات کے وجود) اور اس کی صفات پر دلالت کریں اور تلاوت کا مطلب یہ ہو جائے کہ وہ ان کے ذریعے ان کو نصیحت کریں۔ اور ان لوگوں کو ان کی طرف آنے کی دعوت دیں اور ان کو ان علامات و آیات پر ایمان لانے پر برانگیختہ کریں۔ دوسری صفت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مطلوب رسول کی یہ بیان کی ﴿ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ ﴾ (اور ان کو کتاب سکھائے) اور مراد اس سے یہ ہے کہ ان کو کتاب کی تلاوت کا حکم دیں اور ان کو کتاب کے معانی اور حقائق سکھائیں۔

تلاوت چند وجہ سے مطلوب ہے:

" منها بقاء لفظها على السنة اهل التواتر فيبقى مصونا عن التحريف و التصحيف "

ان وجوہ میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ قرآن پاک کے الفاظ کی لگاتار تلاوت ہوتی رہے، جب تواتر سے قرآن پاک کی تلاوت ہوتی رہے گی تو اس کے الفاظ مبارکہ میں کسی قسم کی تحریف نہیں ہو سکے گی۔ نہ الفاظ کو توڑ موڑ کر پیش کرنے کی کوئی جسارت کر سکے اور نہ ہی ان میں کوئی کمی اور زیادتی کر سکے۔

" ومنها ان يكون لفظه ونظمه معجزا لمحمد ﷺ "اور تلاوت کا یہ فائدہ ہے کہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن پاک نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے۔

اگر معجزہ نہ ہوتا تو یہود ونصاری قرآن پاک میں تحریف کر چکے ہوتے، اس قرآن جیسا قرآن بنا چکے ہوتے، لیکن قیامت تک اپنے سر دھنتے رہیں، ان شاء اللہ دین اسلام کو نہیں مٹا سکیں گے۔ ایک وقت آئے گا جب یہودیوں کا یار، فریبی ومکار ذلیل ہو کر جائے گا۔

"و منها ان یکون فی تلاوته نوع عبادة وطاعة" تلاوت کرنے کا اور فائدہ یہ ہے کہ تلاوت کرنا عبادت ہے۔ اور تلاوت کرنا طاعت ہے۔ یقیناً عبادت وطاعت پر عظیم ثواب مرتب ہوتا ہے۔ لہٰذا تلاوت کرنا باعث اجر وثواب ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ کے اس قول سے جہلاء کا موقف مردود ہو گیا جو یہ کہتے ہیں کہ قرآن سمجھنے کے بغیر پڑھنا کوئی فائدہ نہیں دیتا۔ وہ دراصل لوگوں کو عبادت سے منع کر رہے ہیں یہود کے ہمنوا ہیں کہ قرآن کی تلاوت نہ ہو۔ تاکہ یہود کو موقع مل سکے وہ اپنی مرضی سے اس میں کچھ نئی سورتیں داخل کر سکیں۔ لیکن ان جہلاء کو معلوم نہیں کہ قرآن پاک کا محافظ رب تعالیٰ ہے۔ کوئی بندہ نہیں کہ وہ حفاظت سے عاجز آ جائے۔

"ومنها ان تکون قراءته فی الصلوات وسائر العبادات نوع عبادة" اور فائدہ یہ ہے کہ قرآن پاک کی تلاوت تمام نمازوں میں ہوتی ہے۔ اس لئے قرآن پاک کی تلاوت عبادت ہے یہاں تک جو حکم بیان کیا گیا ہے۔ اس کا تعلق تلاوت سے ہے۔ لیکن "ان الحکمة العظمی والمقصود الاشرف تعلیم ما فیه من الدلائل والاحکام" عظیم حکمت اور مقصود اشرف قرآن پاک میں جو دلائل اور احکام ہیں ان کی تعلیم دینا ہے۔ اسی لئے رب تعالیٰ نے قرآن پاک کا وصف ﴿ هُدًى وَّنُورٌ ﴾ ذکر فرمایا، کہ یہ ہدایت دینے والی کتاب ہے، اور نور بکھیرنے والی عظیم کتاب ہے۔

اسی وجہ سے اس زیر بحث آیہ کریمہ میں بھی رب تعالیٰ نے پہلے تلاوت کا ذکر فرمایا، پھر اس کے حقائق اور اسرار کی تعلیم کا ذکر فرماتے ہوئے۔ ﴿ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ ﴾ ذکر فرمایا۔

واضح ہوا کہ قرآن پاک کا صرف تلاوت کرنا عبادت باعث اجر وثواب ہے، ہاں البتہ اللہ تعالیٰ سمجھنے کی بھی توفیق عطاء فرمائے تو اور ہی زیادہ نفع مند ہے۔

فائدہ: حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء ﴿ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ ﴾ سے اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ

قرآن پاک کی سمجھ کامل اور کما حقہ اس وقت حاصل ہوسکتی ہے جب وہ نبی کریم ﷺ کی تعلیمات سے سمجھے، ورنہ کفار، مشرکین، منافقین، یہود ونصاریٰ عربی زبان کے ماہر تھے لیکن وہ قرآن پاک کو نہ سمجھ سکے، چونکہ فقط عربی زبان کی مہارت سے قرآن پاک سمجھ میں نہیں آسکتا، صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین اور جلیل القدر مفسرین کرام (جن کی تفاسیر سے اقتباس لئے جارہے ہیں) نے قرآن پاک کو کما حقہ تعلیمات مصطفویہ کی روشنی سے ہی سمجھا۔

وَالْحِكْمَةَ : حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس رسول کے بھیجنے کے لئے رب کے حضور عرض کیا، اس کی تیسری صفت کا بھی ساتھ ہی مطالبہ کیا ''کہ وہ ان کو حکمت سکھائے۔''

حکمت کیا ہے؟

" واعلم ان الحكمة هي الاصابة في القول والعمل " قول اور عمل کا درست ہونا حکمت ہے۔

لہٰذا واضح ہوا کہ حکیم وہی ہوگا جس میں یہ دونوں چیزیں پائی جائیں گی، کہ اس کا قول اور اس کا عمل درست ہو۔ اگر کوئی ایک چیز درست نہیں ہوگی تو وہ حکیم نہیں ہوگا۔

☆ حکمت کا اور معنی ہے۔''رد کرنا'' (لوٹانا) جس طرح کہا جاتا ہے۔ " احكمت الشئ اى رددته " میں نے یہ چیز لوٹادی۔ اس معنی کے لحاظ پر حکمت کو حکمت کہنے کی وجہ یہ ہے۔ "هي التي ترد عن الجهل والخطأ " کہ یہ انسان کو جہالت اور خطأ سے پھیر دیتی ہے۔ لہٰذا اسی سے پتہ چلا کہ قول وفعل کے مطابق بھی وہی ہے، جو انسان کو جہالت اور خطاء سے پھیر دے۔ یعنی حکمت کا مطلب ہوا۔ " وضع كل شئ موضعه " ہر چیز کو اپنی اپنی جگہ میں رکھنا۔

☆ اور بعض فلاسفہ نے یہ معنی بیان کیا ہے۔ " الحكمة هي التشبه بالاله بقدر الطاقة البشرية " حکمت کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی طاقت بشریہ کے مطابق جتنا ہوسکے اپنے آپ کو رب تعالیٰ کی صفات کا مظہر بنائے۔

☆ حضرت ابن وہب کہتے ہیں میں نے امام مالک رحمہ اللہ سے پوچھا اس آیہ کریمہ میں حکمت سے مراد کیا ہے؟ آپ نے فرمایا" معرفة الدين والفقه فيه والاتباع له " دین کی معرفت، دین میں تفقہ حاصل کرنا اور دین کی تابعداری کرنا،

☆ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا" الحکمة سنة رسول الله ﷺ "حکمت رسول اللہ ﷺ کی سنت کو کہا گیا۔

☆ حکمت کا اور معنی یہ بیان کیا گیا ہے۔ " الحکمة هی الفصل بین الحق والباطل " حکمت اس چیز کو کہا جاتا ہے جو حق اور باطل میں فرق کرے۔

اب اس معنی کے لحاظ پر ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کا یہ مطلب ہوگیا کہ" وہ ان کو تیری کتاب سکھائے جو تو نے اس ذات پر نازل کرنی ہے۔اور تیرے فیصلے اور احکام ان کو سکھائے۔

☆ ﴿ ویُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ ﴾ ارادبه الآیات المحکمة ﴿ وَالْحِکْمَةَ ﴾ ارادبها الآیات المتشابهات "

یعنی آپ کی یہ دعاء کہ ان کو کتاب سکھائے ،اس سے مراد یہ ہے کہ کتاب میں جو آیات محکمات ہیں ان کی تعلیم دے،اور حکمت سے مراد آیات متشابہات ہیں۔کہ ان کو یہ بتائے کہ یہ آیات متشابہات ہیں ان کے درپے نہ ہو۔

☆ ﴿ ویُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ ﴾ ای یعلمهم ما فیه من الاحکام ﴿ وَالْحِکْمَةَ ﴾ اراد بها انه یعلمهم حکمة تلک الشرائع وما فیها من وجوه المصالح والمنافع "

آپکا یہ عرض کرنا کہ" انکو کتاب سکھائے" اسکا مطلب یہ ہے کہ انکو احکام سکھائے۔اور حکمت کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو ان احکام شرعیہ میں موجود مصلحتوں اور منفعتوں کی تعلیم دے۔ (از کبیر)

حکمت کے معانی جو بیان کئے گئے ہیں ان میں سے کچھ اور علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے بیان فرمائے۔

☆ " والحکمة مایزیل من القلوب وهج حب الدنیا " حکمت سے مراد وہ چیز ہے جو انسانوں کے دلوں میں دنیا کی محبت کی بھڑکتی آگ کو زائل کر دے۔یعنی دنیا کی شدید محبت کو دلوں سے نکال دے۔

☆ " وقد یقال المراد به حقائق الکتاب و دقائقه وسائر ما اودع فیه " حکمت کا اور معنی یہ ہے، کتاب کے حقائق اور دقائق اور اس میں جو راز ودیعت ہیں۔

اب کتاب سکھانے کی دعاء کا یہ مطلب ہے کہ الفاظ سمجھائے۔اور الفاظ کے اداء کرنے کی کیفیت سمجھائے،اور حکمت کی تعلیم دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں جو راز ودیعت ہیں ان پر مطلع کرنا۔

☆ " وفسرها بعضهم بما تکمل به النفوس من المعارف والاحکام " اورمطلب یہ ہے کہ وہ ان کو حکمت سکھائے ۔یعنی ان کو معرفت کی باتیں اوراحکام سکھائیں تا کہ ان کے نفوس کی تکمیل ہوسکے۔ (از روح المعانی)

خازن نے بھی حکمت کے کئی معانی ذکر کیے ہیں ۔ جوکوکبیر جن اورروح المعانی سے نقل کردیا گیا۔ اور یہ معنی بھی بیان کیا ہے۔

" وقیل کل کلمة وعظتک او دعتک الی مکرمة او نهتک عن قبیح فهی حکمة "

اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہروہ کلمہ جس میں نصیحت پائی جائے ، انسان کوعزت والے مقام پر پہنچائے اور قبیح کاموں سے روکے وہ حکمت ہے۔ (خازن)

اورکتاب سکھانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کوظاہری علوم عطاء کریں ،اورحکمت سکھانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو باطنی علوم سکھائیں جنکی وجہ سے وہ حج کے اسرار پر مطلع ہوسکیں اورنماز کی طرف کامل توجہ کرسکیں۔ (تفسیر الرحمن)

راقم کے نزدیک حکمت کے تمام معانی مجتمع ہیں ،ان میں کوئی تضادنہیں۔

وَيُزَكِّيهِمْ : (اوران کو پاکیزہ کرے) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس رسول کے لئے دعاء فرمائی ،ان کے لئے اورعرض یہ کی کہ وہ ان کو پاکیزہ کریں۔

پاکیزہ کرنے کے معنی میں بھی وسعت پائی گئی ہے ۔ ان کو پاکیزہ کرے شرک سے ، اوران کو پاکیزہ کرے بت پرستی سے اوران کو پاکیزہ کرے ہرنجس چیز سے ،اوران کو پاکیزہ کرے ہررذیل کام سے ،ان کو پاکیزہ کرے ہرنقص سے۔

اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ کی امت انبیاءکرام کے حق میں قیامت کے دن گواہی دے گی کہ انہوں نے تیرے احکام اپنی امتوں کو پہنچادئے تھے۔

جب کفار یہ کہیں گے کہ یہ تو بعد میں آئے ہیں یہ کیسے گواہی دے رہے ہیں ۔تو یہ کہیں گے ہمیں نبی کریم ﷺ نے بتایا،تو نبی کریم ﷺ اپنی امت کی عدالت کی گواہی دیں گے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کا یہی مطلب ہے کہ وہ رسول ان کا تزکیہ کریں ،ان کے عادل ہونے کی گواہی دیں۔

" ای یشهد لهم یوم القیامة بالعدالة اذا شهدوا للانبیاء بالبلاغ " (خازن)

پاکیزہ کرنے کی دعاء میں حکمت:

انسان کے کمال کا حال دو چیزوں پر مبنی ہے۔

" احدهما ان یعرف الحق لذاته " ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ حق کو لذاتہ پہنچانے۔

" والثانی ان یعرف الخیر لاجل العمل "

اور دوسری چیز یہ ہے کہ انسان نیکی کو پہچانے تا کہ اس پر عمل کر سکے۔

اگر ان دونوں چیزوں میں سے کسی ایک میں خلل واقع ہو تو وہ شخص رذیل کاموں اور نقائص سے پاک نہیں ہو سکتا۔ جب اللہ تعالیٰ کے حضور فضل و کمال والی صفات کی دعاء کی تو بعد میں یہ دعاء کی کہ وہ ان کو رذیل اور نقص والے کاموں سے پاک کریں۔ (از کبیر)

عقیدہ: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعاء فرمائی کہ وہ رسول ان کا تزکیہ فرمائیں، اس سے مراد یہ ہے کہ اے اللہ تو ان کو ان تصرفات کی قدرت بھی دینا کیونکہ رسولوں کو مکلفین کے باطن میں تصرف کی ذاتی طور پر قدرت حاصل نہیں۔ (از کبیر)

فائدہ: اتنا واضح ہوا کہ انسان کو ظاہری اور باطنی پاکیزگی اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے، جب نبی کریم ﷺ کا اس میں وسیلہ اور واسطہ پایا جائے، آپ کے بغیر انسان کب مسلمان ہو سکتا تھا۔ یہ تو آپ کا ہی احسان عظیم ہے کہ انسان کو اسلام قبول کر کے شرف انسانیت حاصل ہو گیا۔

نبی کریم ﷺ کا پاکیزہ کرنا:

آپ نے وعد اور وعید، وعظ و نصیحت سے لوگوں کو پاکیزہ فرمایا، پھر بار بار ان کو ان چیزوں کی یاد دلاتے رہے۔ پھر نبی کریم ﷺ نے اپنے اخلاق کریمانہ اور اپنے اعمالِ صالحہ سے لوگوں کو پاک فرمایا کہ انہوں نے آپ کے نیک اعمال کو دیکھ کر وہی عمل کیے اور آپ کے اچھے اخلاق کی وجہ سے آپ کے قریب ہوئے۔ (از کبیر)

اَنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ: (بیشک تو ہی عزیز و حکیم ہے) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنی دعاؤں کو اللہ تعالیٰ کے ذکر (ربنا) سے شروع فرمایا تو ختم بھی اللہ کے ذکر سے فرمایا۔

" العزیز هو القادر الذی لایغلب "

عزیز کا مطلب یہ ہے کہ وہ قادر ہے کوئی اس پر غالب نہیں۔

" والحکیم هو العالم الذی لا یجهل شیئا " حکیم کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ عالم وقادر ہے تو اس کا ہر فعل درست ہے اور اس کے کام عبث اور سفاہت سے دور ہیں۔

اگر اللہ تعالیٰ کو یہ صفات علم وقدرت کی نہ حاصل ہوتیں تو دعاؤں کا قبول کرنا، رسول کا بھیجنا اور کتابوں کا نازل کرنا بھی ممکن نہ ہوتا۔

عزیز ہونا اللہ تعالیٰ کی صفات ذاتیہ سے ایک صفت ہے، جب اس کا قادر ہونا معلوم ہوگیا تو اس سے یہ خود بخود ثابت ہوگیا کہ وہ ذلت ورسوائی سے پاک ہے۔

" لانه اذا کان منزها عن الحاجات لم تلحقه ذلة المحتاج " جب اللہ تعالیٰ حاجات سے پاک ہے تو اس ذات کو محتاج ہونے کی ذلت حاصل نہیں ہوسکتی۔

" ولا یجوز ان یمنع من مراده حتی یلحقه اهتضام ، فهو عزیز لا محالة " اور یہ جائز نہیں کہ اس کو مراد سے روکا جائے کہ اسے اپنی مراد سے ناکام ہونے کی رسوائی لاحق ہو۔ لہٰذا وہ یقینی طور پر عزیز ہے۔

" الحکیم " بھی جب " علیم " ہونے کے معنی میں استعمال ہو تو یہ بھی صفات ذات سے ہے، یعنی اس کی ضد کی خود بخود نفی پائی جاتی ہے کہ وہ جہالت سے پاک ہے۔

فائدہ : اگر عزت سے مراد ' کمال عزت ' ہو۔ اور حکمت سے مراد ' افعال حکمت ' ہو، تو عزیز ہونا اور حکیم ہونا صفات فعل سے ہیں۔

صفات ذات اور صفات فعل میں فرق یہ ہے۔ صفات ذات ازلیہ ہیں اور صفات فعل اس طرح نہیں صفات ذات کی نقیضوں کا سچا آنا کسی وقت میں بھی ممکن نہیں، لیکن صفات فعل کو یہ کیفیت حاصل نہیں۔

صفات فعل امور نسبیہ سے ہیں جن کے تحقق میں اعتبار فاعل سے آثار کا صادر ہونا ہے۔ اور صفات ذات اسی طرح نہیں۔ (از کبیر)

﴿وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرَاهِيْمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾

۱) اور ابراہیم کے دین سے کون منہ پھیرے، سوا اس کے جو دل کا احمق ہے، اور بیشک ضرور ہم نے دنیا میں اسے چن لیا اور بیشک وہ آخرت میں ہمارے خاص قرب کی قابلیت والوں میں ہے۔

۲) اور کون ہے جو منہ پھیرے ابراہیم کے دین سے، سوائے اس کے جو دل کا احمق ہے۔ اور تحقیق ہم نے اسے چن لیا دنیا میں، اور بے شک وہ آخرت میں ہمارے خاص قرب کی قابلیت والوں میں ہے۔ (آیت نمبر ۱۳۰)

جب اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو آزمانے اور ان کے کامیاب ہونے کا ذکر فرمایا، اور کعبہ شریف کی تعمیر، اور آپ کی دعاؤں اور آپ کا لوگوں کی بہتری حاصل کرنے پر حریص ہونے کا ذکر فرمادیا۔ تو اس کے بعد اس آیۃ کریمہ میں ان لوگوں پر تعجب کیا گیا جو ابراہیم علیہ السلام کے دین سے اعراض کرنے والے ہیں۔

شانِ نزول:

۱) حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے جب اسلام قبول کیا تو اس کے بعد انہوں نے اپنے بھائی کے دو بیٹوں سلمہ اور مہاجر کو بھی دعوت اسلام دی۔ اور ساتھ ہی یہ فرمایا کہ تمہیں معلوم ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے توارۃ میں فرمایا: "انی باعث من ولد اسمعیل نبیا اسمه احمد فمن آمن به فقداهتدی و من لم یومن به فهو ملعون" کہ میں اسماعیل کی اولاد سے نبی بھیجنے والا ہوں جس کا نام احمد ہوگا۔ جس شخص نے آپ پر ایمان لایا وہ ہدایت پا گیا، اور جس نے ایمان قبول نہ کیا وہ ملعون ہے۔

سلمہ نے آپ کے اس ارشاد پر ایمان قبول کرلیا، اور مہاجر نے ایمان قبول کرنے سے انکار کردیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا۔ (خازن)

۲) دوسری وجہ شان نزول کی یہ ہے کہ کفار نے جب اللہ تعالیٰ سے شریک ٹھہرانا، اور ابراہیم علیہ السلام

کے دین کی مخالفت کو ایجاد کرلیا، اور اپنے مذہب کا حصہ سمجھ لیا تو رب تعالیٰ نے ان کی مذمت میں اس آیہ کریمہ کو نازل کیا۔ (صابونی)

۳) تیسری وجہ شان نزول کی یہ ہے کہ حضرت قتادہ فرماتے ہیں، جب یہود ونصاریٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے دین سے اعراض کیا، اور یہودیت ونصرانیت میں ان چیزوں کو ایجاد کیا جو اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں تھا تو ان لوگوں کی مذمت میں اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا۔

راقم کے نزدیک تمام وجوہ کے بعد آیۃ کریمہ کا نزول ہوا جو سب وجوہ کا شان نزول ہے۔ ان میں اجتماع جائز ہے، کوئی تعارض نہیں۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرَاهِيمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَه' :

اور کون ہے جو منہ پھیرے ابراہیم کے دین سے سوائے اس کے جو دل کا احمق ہے۔

یعنی ابراہیم علیہ السلام کے دین سے سوائے دل کے احمق کے کوئی اور اعراض نہیں کرسکتا۔

" مـــن " استفہام انکاری کے لئے ہے، یعنی کون ہے جو اعراض کرے، مطلب یہ ہے کہ کوئی عقل مند اعراض نہیں کرسکتا۔ اور یا استفہام استبعادی ہے۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام کے دین سے اعراض کرنا عقلمند شخص کے لئے تو عقلا بہت بعید ہے۔ (مظہری)

اور یا استفہام تعجب کے لئے ہے۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام کے دین سے منہ پھیرنے والوں پر بہت تعجب ہے۔ (قرطبی)

" رغبة " کے بعد جب صلہ " الـــی " آئے تو اس وقت اس کا معنی میلان کرنا ہوتا ہے۔ اسی طرح بعد میں " فی " آئے تو پھر بھی معنی یہی ہوتا ہے۔ جیسا کہ " انـا الـی الله راغبون " بیشک ہم اللہ کی طرف رغبت کرنے والے ہیں۔ اور کہا جاتا ہے " انی رغبت فی هذه المسئلة " بیشک میں اس مسئلہ میں رغبت رکھتا ہوں۔

اور جب اس کے بعد " عـــن " آئے تو معنی ہوتا ہے" اعراض کرنا، نفرت کرنا، مکروہ سمجھنا۔ اس آیۃ کریمہ میں یہی معنی ہے یعنی" منہ پھیرنا" (مظہری)

﴿اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَه'﴾ ای جعلها مهانة ذليلة " سوائے اس کے جس نے اپنے نفس کو ذلیل ورسوا کیا۔ " السفه " کا معنی خفت۔ کہا جاتا ہے۔ " زمام سفيه "خفیف باگ ڈوری۔

اس آیۂ کریمہ میں " سفه " متعدی استعمال ہے۔ " نفسه " مفعول ہے۔ نفس کا معنی جان، دل روح وغیرہ ہے۔ اعلیٰ حضرت نے اسکا معنی دل کیا ہے۔ اسی لئے ترجمہ کیا ہے۔ "جو دل کا احمق ہے۔"

ابن کیسان اور زجاج نے " سفه نفسه " کا معنی کیا ہے۔ " جهل نفسه " جس نے اپنے آپ کو نہ پہچانا۔ " من عبد غير الله فقد جهل نفسه لانه لم يعرف الله خالقها " جس شخص نے غیر اللہ کی عبادت کی وہ اپنے آپ سے جاہل ہے۔ اس لئے کہ اس نے نہ پہچانا کہ اللہ اس کے نفس کا خالق ہے۔

عارف کامل حضرت یحییٰ بن معاذ متوفی ۲۵۸ھ کا مشہور مقولہ ہے۔ " من عرف نفسه فقد عرف ربه " یعنی جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

اپنے آپ کو پہچاننے کا مطلب یہ ہے کہ اسے معلوم ہو کہ میں ممکن ہوں، اپنے وجود میں رب تعالیٰ کا محتاج ہوں وہی میرا خالق ہے، جب یہ اسے سمجھ آئے گی۔ تو اسے خود بخود سمجھ آ جائے گی کہ رب تعالیٰ واجب الوجود ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں۔ وہ خالق ہے۔ وہ قیوم ہے، وہ نور مبین ہے۔

(از التبیان للکاظمی رحمہ اللہ)

☆ روایات میں ہے کہ رب تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی کی اور ارشاد فرمایا۔
" اعرف نفسک واعرفنی فقال یا رب کیف اعرف نفسی و کیف اعرفک، فاوحی الله اليه اعرف نفسک بالضعف والعجز والفناء واعرفنی بالقوة والقدرة والبقاء "

تم اپنے آپ کو پہچانو، اور مجھے پہچانو، آپ نے عرض کی اے میرے رب میں اپنے کو کیسے پہچانوں، اور تمہیں کیسے پہچانوں؟ رب تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی تم اپنے آپ کو ضعف، عجز اور فنا سے پہچانو، اور مجھے قوت وقدرت وبقاء سے پہچانو۔ (از مظهری)

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا : (اور تحقیق ہم نے اس کو چن لیا دنیا میں)

یعنی ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو رسالت کے لئے پسند کرلیا ہے۔ اور ان کو ہر قسم کے گناہوں کی میل کچیل سے پاک رکھا ہے۔ (قرطبی)

﴿اِصْطَفَيْنَاهُ﴾ ای اخترناه للرسالة والنبوة والخلة لعلمنا بانه صفوة العباد فی الدنیا "
ہم نے اسے پسند کرلیا ہے رسالت اور نبوت کے لئے اور خلیل بنانے کے لئے، کیونکہ ہمیں

معلوم ہے کہ بیشک آپ دنیا میں ہمارے بندوں میں سے برگزیدہ بندے ہیں۔ (شیخ زادہ)

وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ :

اور بیشک وہ آخرت میں ہمارے خاص قرب کی قابلیت والوں میں ہے۔

یعنی جس شخص کو رب نے چن لیا اور وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں میں سے ہے۔ جس کی نبوت اور خلت کی رب تعالیٰ نے شہادت دی ہے۔ وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے خاص مقرب ہوں گے۔

"کان حقیقا بالاتباع له لایرغب عنه الا سفیه او متسفه اذل نفسه بالجهل والاعراض عن النظر"

لہٰذا حق یہ ہے کہ ان کی تابعداری کی جائے، ان کے دین سے کوئی اعراض نہیں کرتا سوائے اس کے جو بے وقوف ہے، یا اس نے اپنے آپ کو بے وقوف بنا رکھا ہے۔ جہالت اور نظر وفکر نہ کر کے اپنے آپ کو ذلیل کرلیا ہے۔ (بیضاوی)

تراجم کا تقابلی جائزہ:

﴿وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ﴾

اور وہ آخرت میں نیکوں میں ہے۔	محمود الحسن صاحب
اور آخرت میں نیک ہے۔	شاہ عبد القادر صاحب
اور وہ آخرت میں بڑے لائق لوگوں میں شمار کیے جاتے ہیں	اشرف علی صاحب
اور بے شک وہ آخرت میں ہمارے خاص قرب کی قابلیت والوں میں ہیں۔	اعلیٰحضرت مولانا احمد رضا خان

یہ تو واضح ہو چکا ہے کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے۔ تراجم میں فرق یہ ہے۔ کہ صرف نیکوں میں ہونا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان کو واضح نہیں کرتا، اس لئے کہ نیک تو غیر انبیاء بھی ہوں گے۔ حالانکہ مقام انبیاء اور غیر انبیاء میں بہت بڑا فرق ہے۔

لیکن اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اس مقصد کو شامل ہے کیونکہ آپ نے "خاص قرب کی قابلیت والوں میں ہے۔" ترجمہ کیا ہے جس سے واضح ہو گیا خاص قرب کی قابلیت صرف انبیاء کرام کو ہی حاصل ہوگی عام نیکوں کو وہ مقام حاصل نہیں ہوگا۔

لہٰذا صحیح مقصد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے ہی حاصل ہوا۔اسی پر جلالین کی عبارت دیکھیں۔

صالحین کی تفسیر آپ نے ان الفاظ سے کی" الـذين لهم الدجات العلى " کہ وہ لوگ جن کو بلند درجات حاصل ہوں گے آپ ان ہی میں ہوں گے۔

اسی طرح شیخ زادہ بر بیضاوی میں ہے۔

" قيل المراد بالصالحين الانبياء عليهم الصلوة والسلام لقوله تعالى ومن ذريته داود وسليمان وايوب (الى قوله) كل من الصالحين . (وان ابراهيم عليه السلام دعا ربه وقوله "والحقنى بالصالحين " (اى الانبياء الماضين فاجاب الله دعوته و بين انه معهم فى الجنة)

یہاں بھی مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ صالحین سے مراد انبیاء ہیں، کیونکہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔آپ کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان اور ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون زکریا، یحیٰ، عیسیٰ، الیاس علیہم السلام تمام ہی صالحین سے ہیں۔اور ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے دعاء کی کہ اے میرے رب مجھے صالحین سے، یعنی پہلے انبیاء سے لاحق فرما، رب تعالیٰ نے آپ کی اس دعاء کو قبول فرمایا، اور آپ کو بتایا کہ تم جنت میں ان کے ساتھ ہو گے۔

اس آیۃ کریمہ میں اسی خبر کا بیان ہے کہ آپ آخرت میں انبیاء کے ساتھ ہی ہوں گے، جو خاص قرب کی قابلیت والے ہیں۔ (تسكين الجنان)

﴿ وَانَّه' فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ ﴾ الانبياء ﴿ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ فى مراتب القرب "

بیشک وہ آخرت میں انبیاء کرام کے ساتھ ہوں گے جو خاص قرب کے مراتب والے ہوں گے (مظهری)

تنبیہ : نبی کریم ﷺ کی شریعت پہلی تمام شریعتوں کے لئے ناسخ ہے۔ابراہیم علیہ السلام کے دین کی پیروی کا کیا مطلب؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری کے لئے دعاء کی، تو جن لوگوں نے نبی کریم ﷺ پر ایمان لایا وہ ملت ابراہیمی کے متبع ہوئے۔ جنہوں نے ایمان نہ لایا وہ ملت ابراہیمی سے اعراض کرنے والے ہوئے۔

مزید تفصیل ان شاء اللہ ﴿فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ﴾ کے تحت آئے گی۔

﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ (۱۳۱)

۱) جب اس سے اس کے رب نے فرمایا گردن رکھ، عرض کی میں نے گردن رکھی اس کے لئے جو رب ہے سارے جہانوں کا۔

۲) یاد کرو جب کہا ان کو ان کے رب نے کہا تمام امور میرے سپرد کردو، آپ نے کہا میں نے تمام امور سپرد کردئے اس کے لئے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔

﴿اَسْلِمْ﴾ یعنی نفسک الی اللہ عزوجل و فوض امورک الیہ " (مظہری)

اپنے آپ کو رب تعالیٰ کے سپرد کردواور اپنے تمام امور اسی کے سپرد کردو۔

اللہ تعالیٰ کے تمام قضاء وقدر کے تسلیم کرنے کو بھی اسلام کہا جاتا ہے، یہی معنی اس آیۃ کریمہ میں معتبر ہے۔ (از مفردات راغب)

تنبیه: اسلم ،کا ایک معنی اسلام لانا بھی ہے۔ لیکن وہ معنی یہاں اس لئے ممکن نہیں کہ انبیاء کرام تو پیدا ہی اسلام اور توحید پر ہوتے ہیں۔ ہاں البتہ یہ معنی مراد لینا ممکن ہے۔

" استقم علی الاسلام و اثبت علیہ " اسلام پر قائم رہواور اسی پر ثابت رہو۔ (خازن)

قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ : آپ نے کہا میں نے تمام امور سپرد کردئے اس لئے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔

اور مطلب یہ بھی ہے کہ میں نے طاعت کی وجہ سے خضوع کیا، اور اپنی عبادت خالص مخلوق کے مالک اور مدبر اور خالق کے لئے ہے۔ (خازن)

اپنے آپ کو ابراہیم علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے سپرد یہاں تک کردیا کہ جب آپ کو باندھ کر منجنیق کے ذریعے نمرود کی آگ میں ڈال دیا گیا، تو آپ کے پاس جبرئیل آئے انہوں نے کہا۔ " هل لک حاجة " کیا تمہیں کوئی حاجت ہے؟

تو آپ نے فرمایا" اما الیک فلا " مجھے تم سے تو کوئی حاجت نہیں۔

جبرائیل نے کہا" فاسئل ربک " آپ اپنے رب سے ہی سوال کرلو، آپ نے فرمایا

"حسبی من سوالی علمه بحالی" جب وہ میرے حال کو جانتا ہے تو اس کا علم ہی مجھے کافی ہے، سوال کی ضرورت نہیں۔

"فجعل الله تعالی ببرکة تفویض اموره الی الله تعالی حظیرة النار روضة ولم یحترق منه الا وثاقه"

جب آپ نے اپنے تمام امور اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیئے تو اس کی برکت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آگ کے گڑھے کو باغ بنا دیا، آپ کو ذرا بھر کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ صرف جس رسی سے آپ کو باندھا گیا تھا وہی جلی۔ (مظهری)

آیۃ کریمہ کا مطلب واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ آپ اپنے تمام معاملات میرے سپرد کر دو۔

اور میری طاعت پر قائم رہو، تو آپ نے اپنے تمام معاملات رب تعالیٰ کے سپرد کر دیئے۔

﴿وَوَصّٰى بِهَا اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ (آیت ۱۳۲)

۱) اور اسی دین کی وصیت کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے کہ اے میرے بیٹو، بے شک اللہ نے یہ دین تمہارے لئے چن لیا تو نہ مرنا مگر مسلمان۔

۲) اور وصیت کی اسی ملت (دین) کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے (بھی) کہ اے میرے بیٹو بے شک اللہ نے چن لیا ہے تمہارے لئے یہ دین، پس تم ہرگز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔

یعنی ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی، اور یعقوب علیہ السلام نے بھی اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کر لیا ہے۔ اس لئے تم اسی پر قائم رہنا یہاں تک کہ تمہاری موت اسلام پر آئے، اور تم خالص مومن بن کر رہنا، اور اپنے تمام امور اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دینا۔

وَصّٰی: توصیۃ سے لیا ہوا ہے، جس کا معنی ہے۔ ''اچھے کام اور قربت والے کام کی کسی کو نصیحت کرنا۔

یہ بھی خیال رہے کہ وصیت کا مشہور مطلب یہ ہے کہ موت کے بعد کسی کام کے جاری کرنے کے متعلق کہا جائے۔ لیکن کبھی فقط نصیحت کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

وصیۃ کا معنی اصل میں '' وصلۃ '' (ملنا، ملانا) ہے۔ جس طرح کہا جاتا ہے '' وصّاہ '' وہ فلاں سے متصل ہوا۔ اور '' فصّاہ '' کا معنی ہے '' فصلہ '' جدا کرنا۔

وصیت میں بھی وصیت کرنے والا اپنی وصیت کو اس سے ملاتا ہے جسے وصیت کی جائے۔

بِهَا: ضمیر یا تو '' ملۃ '' کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور یا ﴿ اَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴾ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ (از مظہری)

بَنِیۡهِ : (اپنے بیٹوں کو) ابراہیم علیہ السلام کے چار بیٹے تھے، اسماعیل علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام، اور مدین اور مدان، بعض نے کہا ہے کہ آپ کے آٹھ بیٹے تھے۔ واللہ اعلم۔ (بیضاوی)

وَیَعۡقُوۡبَ : اس کا عطف ہے '' ابراهیم '' پر۔ '' ای وصی هو ایضا بها بنیه '' یعنی یعقوب علیہ السلام نے بھی اپنے بیٹوں کو وہی وصیت کی جو آپ کے جد امجد ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی تھی۔

اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰی لَکُمُ الدِّیۡنَ : بے شک اللہ نے چن لیا تمہارے لئے دین۔

دین سے مراد دین اسلام ہے۔ ''الذی هو صفوۃ الادیان'' جو تمام دینوں سے برگزیدہ دین ہے۔

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے '' الدین '' کے بعد '' دین الاسلام '' کے الفاظ ذکر فرمائے ہیں۔

اس پر شیخ زادہ نے لکھا کہ اشارہ ہے اس طرف کہ '' الدین '' پر الف لام عہد خارجی ہے، اور معہود وہ دین ابراہیم علیہ السلام ہے۔ وہ دین اسلام ہے۔ کیونکہ الف لام جنسی ہو تو مراد جنس دین ہوگا۔ حالانکہ تمام دین برگزیدہ نہیں دینوں میں شان کے لحاظ سے اسی طرح فرق ہے، جیسا کہ انبیاء کرام میں شان کے لحاظ سے فرق ہے کہ بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے۔

تنبیہ:

" فما وقع من تخصیص دین الاسلام بدین نبینا ﷺ لیس قصرا حقیقیا بل الاضافة الی دین الیهود والنصاری وسائر اهل الشرک والضلال "

دین اسلام کی تخصیص جو ہمارے نبی کریم ﷺ کے دین کے ساتھ ہے اس میں قصر حقیقی نہیں، بلکہ قصر اضافی ہے۔ یعنی اس سے مراد یہ ہے کہ یہودی اور نصرانی دین اور مشرکوں کا دین، اسلام نہیں
(شیخ زادہ)

فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ: پس ہرگز نہ مرنا مگر تم اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔

اگر چہ بظاہر اسلام کے خلاف حال میں مرنے سے نہی پائی گئی ہے۔ لیکن ظاہری معنی لینا درست نہیں۔ اس لئے کہ موت انسان کے اختیار میں نہیں کہ جب تک وہ اسلام نہ لائے اس پر موت ہی نہ آئے۔ یہ تو ممکن نہیں۔

البتہ مقصود یہ ہے کہ تمہاری موت کے وقت تم حالت اسلام سے دور نہ ہو۔ چونکہ اسلام قبول کرنا یا نہ کرنا انسان کی طاقت میں ہے۔ (از بیضاوی)

فائدہ: اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا " وامر ابراهیم بنیه " کہ ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو حکم دیا۔ بلکہ یہ فرمایا، ﴿وَوَصّٰی بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِیْهِ﴾ ابراہیم نے اس کی اپنے بیٹوں کو وصیت کی،

اس کی وجہ یہ ہے کہ وصیت بنسبت امر کے زیادہ مؤکد ہے، کیونکہ وصیت کا زیادہ طور پر تعلق موت کے خوف کے وقت سے ہے۔

" وفی ذلک الوقت یکون احتیاط الانسان لدینه اشدوا تم " اس وقت میں انسان دین کے معاملات میں بہت زیادہ اور کامل طور پر احتیاط سے کام لیتا ہے۔

جب یہ معلوم ہو گیا تو یہ بھی خود بخود واضح ہو جاتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس وصیت میں بہت زیادہ اہتمام سے کام لیا۔ " کان القوم الی قبوله اقرب " اسی وجہ سے آپ کی قوم نے بھی اسے جلدی ہی قبول کر لیا۔

اور وجہ یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو خاص کر کے وصیت کی، اور یہ بھی واضح ہے کہ

انسان اپنی اولاد سے جتنی زیادہ شفقت کرتا ہے اتنی کسی اور سے نہیں کرتا، آپ نے جب اپنی اولاد کو آخری عمر میں یہ وصیت کی۔ " علمنا ان اهتمامه بذلک کان اشد من اهتمامه بغیره "تو معلوم ہو گیا کہ آپ نے اس وصیت میں بہت زیادہ اہتمام کیا اتنا اہتمام اور لوگوں کو وصیت کرنے میں نہ ہوتا۔

اور وجہ یہ ہے کہ آپ نے وصیت اپنے تمام بیٹوں کو کی کسی کو وصیت میں خاص نہیں کیا۔ " وذلک ایضا یدل علی شدة الاهتمام " یہ بھی اس پر دلالت کر رہا ہے کہ آپ نے اپنی وصیت شدید اہتمام کیا۔ اور وجہ اس میں یہ ہے کہ آپ نے وصیت مطلق کی جو کسی زمان پر معین اور مکان معین سے مقید نہیں" وذلک ایضا یدل علی شدة الاهتمام " اور یہ بھی دلالت کرتا ہے کہ آپ نے اس میں شدید اہتمام کیا اور وجہ یہ ہے کہ آپ نے اس وصیت کے ساتھ کوئی اور وصیت نہیں ملائی تو اس سے بھی پتہ چلا کہ آپ نے اس معاملہ میں شدید اہتمام کیا۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ ابراہیم علیہ السلام کو رب تعالیٰ نے بہت زیادہ فضیلت عطاء فرمائی، اور حسن طریقت اور کمال سیرت آپ کو عطاء کی گئی۔ پھر آپ نے وصیت میں شدید اہتمام فرمایا، اور وصیت بھی دین پر قائم رہنے کی جو عظیم نصیحت ہے۔ ان وجوہ کے پیش نظر ہی آپ نے اپنے بیٹوں کو خاص کیا۔

" والا فمعلوم من حال ابراهیم علیه السلام انه کان یدعو الکل ابدا الی الاسلام والدین "

ورنہ یہ معلوم ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے ہمیشہ دین اسلام کی دعوت سب لوگوں کو دی، یعنی بیٹوں کو وصیت کرنے سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ آپ کی دعوت الی الحق گھر تک محدود تھی۔ (از کبیر)

☆☆☆

﴿اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِىْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ (آیت ۱۳۳)

۱) بلکہ تم خود موجود تھے جب یعقوب کو موت آئی جب کہ اس نے اپنے بیٹوں سے فرمایا میرے بعد کس کی پوجا کرو گے بولے ہم پوجیں گے اسے جو خدا ہے آپ کا اور آپ کے آباء ابراہیم واسماعیل واسحاق کا ایک خدا اور ہم اسکے حضور گردن رکھے ہیں۔

۲) کیا تم حاضر تھے؟ جب آئی یعقوب کو موت، جب آپ نے کہا اپنے بیٹوں کو، تم کس کی عبادت کرو گے میرے بعد؟ انہوں نے کہا ہم عبادت کریں گے تمہارے معبود کی، اور تمہارے آباء ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق کے معبود کی، ایک معبود کی، اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

شانِ نزول:

یہ آیۃ کریمہ یہود کے باطل دعوی کے رد میں نازل ہوئی، انہوں نے نبی کریم ﷺ کو کہا کہ جب حضرت یعقوب فوت ہونے لگے تو انہوں نے اپنے بیٹوں کو یہودیت کی وصیت کی، رب تعالیٰ نے ان کی تکذیب فرمائی۔ اور یہود کو اس آیۃ میں خطاب کیا گیا، جس کا مطلب یہ ہے۔ "انکم لم تحضروا ذلک فلا تدعوا علی انبیائی ورسلی الا باطیل وتنسبوهم الی الیهودیة" کہ تم تو حضرت یعقوب کی موت کے وقت حاضر ہی نہیں تھے۔ لہٰذا تم میرے انبیاء اور رسل کی طرف باطل دعوے منسوب نہ کرو، اور نہ ہی ان کو یہودیت کی طرف منسوب کرو۔

رب تعالیٰ نے اپنے خلیل کو اور ان کے بیٹوں کو اور بیٹوں کے بیٹوں کو دین اسلام پر قائم رکھا، انہوں نے بھی اپنے بیٹوں کو دین اسلام کی ہی وصیت کی۔ (خازن)

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ : اس مقام میں "ام منقطعة و معنى الهمزة فِيْهَا الانكارى ما كنتم حاضرين اذ حضر يعقوب الموت " ام منقطعہ ہے، اور ہمزہ استفہام کے معنی میں ہے۔ اور استفہام بھی انکاری ہے، کیا تم حاضر تھے؟ یعنی تم تو اس وقت حاضر ہی نہیں تھے جب یعقوب پر موت آئی، تمہیں کیا معلوم کہ آپ نے بیٹوں کو کیا کہا تم ان پر یہ دعوی کیوں کرتے ہو کہ انہوں نے اپنے بیٹوں کو یہودیت کی وصیت کی۔ (راقم کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے)

" او متصلة بمحذوف تقديره اكنتم غائبين ام كنتم شهداء " یا" ام "متصل ہو، اور اس کا تعلق محذوف سے ہو، تو اس صورت میں معنی یہ ہوگا، کیا تم غائب تھے یا تم حاضر تھے، جب یعقوب نے اپنے بیٹوں کو اپنی موت کے وقت وصیت کی۔

"وقيل الخطاب للمؤمنين والمعنٰى ما شهدتم ذلك وانما علمتموه بالوحى "

ایک قول یہ ہے کہ یہ خطاب مومنوں کو ہے اور معنی یہ ہے کہ تم اس وقت حاضر نہیں تھے، تمہیں تو علم وحی کے ذریعے حاصل ہوا۔ (بیضاوی)

" ولك ان تجعل الاستفهام للتقرير اى كانت اوائلكم حاضرين حين وصى بنيه عليه السلام بالاسلام والتوحيد وانتم عالمون بذلك فمالكم تدعون عليه خلاف ما تعلمون "

جائز ہے کہ " ام " ہمزہ استفہام کے معنی میں ہو، اور استفہام تقریری ہو، اور معنی یہ ہو کہ تمہارے پہلے کچھ لوگ حاضر تھے جب یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو اسلام اور توحید کی وصیت کی اور تمہیں بھی اس کا علم ہے تم اپنے علم کے خلاف ان پر دعوی کیوں کرتے ہو۔ (روح المعانی)

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ روح المعانی کے اسی قول کے مطابق ہے۔

" شهداء " جمع ہے " شهيد " کی، یا " شاهد " کی، معنی اس کا حاضر ہونا۔

مَاتَعْبُدُوْنَ مِنْ ۢ بَعْدِيْ : اى اىّ شئ تعبدونه بعد موتى " تم کس چیز کی میرے بعد عبادت کرو گے۔

خیال رہے کہ بظاہر استفہام ہے (سوالیہ فقرہ ہے) لیکن یہ استفہام حقیقی نہیں، بلکہ غرض ان کو توحید اور اسلام پر قائم رہنے کے لئے برانگیختہ کرنا مقصود تھا۔

قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰـهَکَ وَاِلٰـهَ اٰبَآءِکَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهاً وَّاحِدًا :

انہوں نے کہا ہم ایک ہی معبود کی عبادت کریں گے جو تمہارا بھی معبود ہے اور تمہارے آباؤ اجداد یعنی ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق علیہم السلام کا بھی معبود ہے۔

" الٰـه" کہ اضافت متعدد کی طرف کر کے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور الوہیت پر اتفاق ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر پہلے کیا کیونکہ وہ آپ کے جدامجد تھے، بزرگی اور عمر کے لحاظ سے ان کا ہی پہلے ذکر کرنا مناسب تھا۔ پھر اسماعیل علیہ السلام کا ذکر اسحاق علیہ السلام سے پہلے کیا " لکونه اسن منه " کیونکہ وہ عمر میں اسحاق علیہ السلام سے چودہ سال بڑے ہیں۔

اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا اپنے چچا (تایا) حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اپنے آباء میں شامل کرنا" تغلیبا للاکثر علی الاقل "تغلیب کے طور پر تھا، کہ اکثر و اقل پر غالب سمجھا۔

لیکن سب سے عظیم وجہ یہ تھی" لانه شبه لعم بالاب " کہ چچا باپ کے مشابہ ہوتا ہے، کیونکہ دونوں ہی ایک دھاگہ کے موتی ہوتے ہیں۔ یعنی دونوں بھائی ایک باپ یا ایک ماں یا ایک ہی باپ اور ماں کی اولاد ہوتے ہیں۔

بخاری اور مسلم نے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ذکر فرمایا " عم الرجل صنو ابیه " انسان کا چچا اس کے باپ کے مشابہ ہے۔ یہی وجہ اس لئے بھی مناسب ہے کہ ایک لفظ میں حقیقت و مجاز کا اجتماع لازم نہیں آئے گا۔

اور اسی قول کو ابن ابی شیبہ کی روایت سے تائید بھی ملتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "احفظونی فی العباس فانه بقیة آبائی " عباس کی میری وجہ سے حفاظت کرو کیونکہ وہ میرے بقیہ آباء سے ہے

اِلٰهاً وَّاحِدًا : یہ بدل ہے " الٰه آباء ک " سے، مبدل منہ چونکہ معرفہ ہے، اور بدل نکرہ ہے، اسی وجہ سے اس کے ساتھ صفت کو ذکر کیا تا کہ اس میں تخصیص آجائے۔

وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ: " ای مذعنون مقرون بالعبودیة وقیل خاضعون منقادون مستسلمون لنهیه وامره قولا وعقدا وقیل داخلون فی الاسلام ثابتون علیه "

اس مقام میں مسلمون کے کئی معانی ہیں، مطالب تقریباً سب کے قریب ہی ہیں۔

۱) ہم اس کی عبودیت پر یقین رکھتے ہیں۔اور اسی کا اقرار کرتے ہیں۔

۲) ہم اسی کے سامنے اظہار عجز کرتے ہیں۔(۳) ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

(۴) ہم اسی کے اوامر ونواہی کو قولا اور عقیدۃً تسلیم کرتے ہیں۔

(۵) اور ہم اسلام میں داخل ہیں اسی پر قائم رہیں گے۔ (از روح المعانی)

اعتراض: تم نے ﴿ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ ﴾ میں " ام "کو استفہام انکاری بنایا ہے، حالانکہ استفہام انکاری " انما یتوجه علی کلام باطل " تو باطل کلام کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ جب حضرت یعقوب علیہ السلام کے کلام کی حکایت بیان ہو رہی ہے تو وہ کلام تو حق ہے، باطل نہیں تو استفہام انکاری کیسے؟

جواب: " الاستفهام علی سبیل الانکار متعلق بمجرد ادعائهم الحضور عند وفاته فهذا هو الذی انکره اللّٰہ تعالیٰ "

استفہام انکاری کا تعلق انکے اس دعوی سے ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو یہودیت کی وصیت فرمائی یعنی انکے اس دعوی کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس وقت موجود تھے، رب تعالیٰ نے اس کارد فرمایا، کہ تم موجود نہیں تھے۔حضرت یعقوب علیہ السلام کے کلام میں انکار نہیں پایا گیا۔(از کبیر)

اعتراض: "ما "غیر ذوی العقول کے لئے آتا ہے،اس کا اطلاق معبود حقیقی پر ﴿ مَاتَعْبُدُوْنَ ﴾ میں کیسے صحیح ہے؟

جواب اوّل: " ما "عام ہے ہر چیز میں، اس لئے معنی یہ ہے " ای شیئ تعبدون " تم کس چیز کی عبادت کرو گے۔

جواب دوم: جب کسی چیز کی حد یا رسم (تعریف) کا سوال ہو تو "ما " سے ہوتا ہے۔اس وقت ذوی العقول کیلئے بھی " ما "استعمال ہوتا ہے۔جیسا کہ کہا جائے۔ " ما الانسان " انسان کیا ہے؟ (از کبیر)

آیۃ کریمہ سے حاصل ہونے والے مسائل:

۱) اصول دین میں تقلید نہیں، ورنہ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹوں سے سوال نہ کرتے

بلکہ یہ سمجھے کہ وہ میرے مقلد ہی ہوں گے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ جہاں بھی تقلید کی نفی کرتے ہیں، وہاں اصول دین میں تقلید کی نفی کرتے ہیں۔ یہی ہمارا بھی عقیدہ ہے۔

۲) آیۃ اس پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو ایمان لانے کی ترغیب دی اور نبی کریم ﷺ کی اتباع کا حکم دیا، اور آپ کی مخالفت کرنے سے منع فرمایا۔ کیونکہ ایمان پر ثابت رہنے کی تلقین کا یہی تقاضا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ تشریف لائیں تو ان پر ایمان لانا ورنہ تم ایمان پر ثابت نہیں رہ سکو گے۔

۳) اولاد پر شفقت اور ان کی اچھی تربیت (تاکہ وہ عذاب سے بچ سکیں۔ اور اعلیٰ قسم کی اخروی کامیابی حاصل کر سکیں، اور دنیاوی زندگی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے مطابق گذار سکیں) سنت انبیاء کرام ہے۔

۴) انبیاء کرام کی اولاد سے شفقت فقط دین کے لئے تھی، ان کی بلند ہمتیں فقط دینی کاموں میں مصروف رہتی تھیں۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ (آیت ۱۳۴)

۱) یہ ایک امت ہے کہ گذر چکی، ان کے لئے ہے جو انہوں نے کمایا اور تمہارے لئے ہے جو تم کماؤ اور ان کے کاموں کی تم سے پرسش نہ ہوگی۔

۲) وہ ایک جماعت ہے جو گذر چکی ہے۔ اس کے لئے وہ ہے جو اس نے کسب کیا، اور تمہارے لئے وہ ہے جو تم نے کسب کیا۔ اور تم سے سوال نہیں کیا جائے گا اس کے متعلق جو وہ عمل کرتے رہے۔

اس آیۃ کریمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد ایک جماعت تھی جو دنیا سے چلے گئے، ان کے اعمال ان کے لئے اور تمہارے اعمال تمہارے لئے ہیں،

تم سے ان کے اعمال کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا۔ کہ وہ کیا عمل کرتے رہے۔ بلکہ ہر ایک سے اس کے اپنے اعمال کے متعلق سوال ہوگا۔

شانِ نزول:

جب یہود نے کہا کہ ہمارے آباء واجداد حضرت ابراہیم اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام ہیں، ہمارا نسب ان بزرگ ہستیوں کی طرف پہنچتا ہے۔

" فلا جرم ننتفع بصلاحهم و منزلتهم عند الله تعالیٰ قالوا ذلک مفتخرین باوائلهم "

لہٰذا یقیناً ان کی نیکیوں اور اللہ کے ہاں ان کے مرتبے کا فائدہ ہمیں بھی حاصل ہوگا۔ انہوں نے اپنے پہلے آباء واجداد پر فخر کرتے ہوئے یہ کہا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں یہ آیۃ کریمہ نازل فرمائی (از شیخ زادہ)

تِلْکَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ: تلک، کا اشارہ ہے ابراہیم اور یعقوب اور ان کے بیٹوں کی طرف ہے، جن کا ذکر پہلی آیت میں ہو چکا ہے۔

" امۃ " کا اصل معنی ہے مقصود، اَمّ " کا معنی قصد کرنا، جماعت کو امت اس لئے کہا جاتا ہے کہ مختلف فرقے جمع ہونے کا قصد کرتے ہیں۔ (بیضاوی)

" قد خلت " ای مضت ، نعت لامة ، اس مقام میں قد خلت نعت ہے امت کی، جس کا معنی ہے۔ "گذر گئی"

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ: اس جماعت کے لئے وہ جو اس نے کیا اور تمہارے لئے وہ ہے جو تم نے کیا۔ " وحاصله ان احدا لاينفعه كسب غيره " حاصل کلام یہ ہے کہ کسی شخص کو دوسرے کے عمل کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا کہ اس کا عمل اس کا عمل بن جائے ، جہاں تک ایصال ثواب کا مسئلہ ہے وہ راقم نے پہلے رکوع میں تفصیلی طور پر ذکر کر دیا ہے۔

☆ " قال رسول الله ﷺ یاصفیة عمة محمد ، یا فاطمة بنت محمد ائتونی یوم القیامة باعمالکم لانسابکم فانی لا اغنی عنکم من الله شیئاً "

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے صفیہ محمد کی پھوپھی ، اے فاطمہ محمد کی بیٹی قیامت کے دن اپنے

اعمال لانا اپنا نسب نہ لانا، میں اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کیبارے میں بے پرواہ نہیں کرسکوں گا۔

اس حدیث شریف میں وعید پائی گئی ہے، ڈرایا گیا ہے کہ اعمال کو چھوڑ کر صرف نسب پر بھروسہ نہ کرنا، ورنہ عمل بھی نیک ہوں اور نسب بھی اعلیٰ ہوتو یقیناً وہ نسب فائدہ دے گا۔ راقم کی کتاب تذکرۃ الانبیاء کا مطالعہ کریں۔

☆ " وقال علیه الصلوة والسلام من ابطأبه عمله لم یسرع به نسبه "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس نے عمل میں دیر کی اسے نسب جلدی کوئی فائدہ نہیں دے گا۔

☆ " قال علیه الصلوة والسلام یا بنی هاشم لا یاتینی الناس باعمالهم وتاتونی بانسابکم "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے بنی ہاشم ایسا نہ ہو کہ لوگ میرے پاس اپنے اعمال لائیں اور تم اپنے نسب لے کر آجاؤ۔

وَلَاتُسْأَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ :

اور تم سے نہیں سوال کیا جائے گا اس چیز سے جو وہ عمل کرتے رہے۔

﴿ وَلَاتُؤاخذُوْنَ بِسَيِّاٰتِهِمْ كَمَا لَاتُثَابُوْنَ بِحَسَنَاتِهِمْ ﴾

یعنی تم سے ان کے گناہوں کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ ان کی نیکیوں کا تمہیں ثواب حاصل نہیں ہوگا۔

اس آیۃ کریمہ سے یہود کے دونوں دعووں کو رد کر دیا گیا، ایک ان کا دعوی یہ تھا کہ ہم جو عمل بھی کرتے رہیں، ہمیں کوئی نقصان نہیں، ہمیں اپنے آباءواجداد کی نیکیاں نفع دیں گے، ہماری بخشش ہوجائیگی دوسرا ان کا دعوی یہ تھا کہ ہمیں عذاب نہیں ہوگا، ہاں البتہ اتنے دن عذاب ہوگا جتنے دن (چالیس دن) ہمارے آباءواجداد نے بچھڑے کی پوجا کی تھی۔

اس آیۃ کریمہ سے واضح کر دیا کہ آباءواجداد کی نیکیوں کی وجہ سے اپنے دل سے خوف نکال دینا اور گناہوں پر دلیر ہوجانا اور نیکی کا کوئی کام نہ کرنا، اور پھر یہ کہنا کہ ہمیں تو صرف اتنے دن عذاب ہوگا۔

جتنے دن ہمارے آباءواجداد کا گناہ تھا یہ سب تمہارے لغویات ہیں۔ (بیہودہ کلام ہے)۔

(ماخوذ از بیضاوی و شیخ زادہ)

خیال رہے کہ معتزلہ اوران کے ہمنوا لوگوں کو یہود و نصاریٰ کے حق میں نازل ہونے والی آیات اور کفار و مشرکین کے حق میں نازل ہونے والی آیات کا مسلمانوں پر چسپاں کرنا بہت خوب آتا ہے۔ تاہم اپنی عاقبت ہی خراب کررہے ہیں۔

﴿ وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴾ (آیت ۱۳۵)

۱) اور کتابی بولے یہودی یا نصرانی ہو جاؤ راہ پاؤ گے، تم فرماؤ بلکہ ہم تو ابراہیم کا دین لیتے ہیں، جو ہر باطل سے جدا تھے اور مشرکوں سے نہ تھے۔

۲) اور (اہل کتاب نے) کہا یہودی یا نصرانی ہو جاؤ ہدایت پا جاؤ گے۔ تم فرماؤ، بلکہ ہم تو ابراہیم کے دین پر ہیں، جو ہر باطل سے جدا (ہو کر حق پر قائم) تھے، اور مشرکوں سے نہیں تھے۔

شانِ نزول:

۱) یہود نے مومنوں کو کہا " کونوا ھودا تھتدوا " تم یہودی ہو جاؤ تو ہدایت پا جاؤ گے۔ اور نصاریٰ نے کہا " کونوا نصاری تھتدوا " تم نصرانی ہو جاؤ تو ہدایت پا جاؤ گے۔ رب تعالیٰ نے ان کے رد میں اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا۔

۲) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہود کے رئیس کعب بن اشرف اور مالک بن صیف اور وہب بن یہودا، اور ابو یاسر بن اخطب اور نجران کے نصاریٰ کے متعلق یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی، جب کہ انہوں نے مومنوں سے دین کے متعلق جھگڑا کیا، ان میں سے ہر فرقہ اپنے آپ کو حق راہ پر چلنے والا سمجھ رہا تھا اور دوسرے کو باطل۔

یہودی کہہ رہے تھے ہمارے نبی موسیٰ افضل الانبیاء ہیں، اور ہماری کتاب توراۃ افضل الکتب

ہے (تمام کتابوں سے افضل ہے) اور ہمارا دین تمام دینوں سے افضل ہے۔ اور انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل اور نبی کریم ﷺ اور قرآن پاک سے کفر کیا۔

اور نصاریٰ نے کہا ہمارے نبی عیسیٰ افضل الانبیاء ہیں، اور ہماری کتاب انجیل تمام کتابوں سے افضل ہے اور ہمارا دین تمام دینوں سے افضل ہے۔ اور انہوں نے موسیٰ علیہ السلام اور نبی کریم ﷺ اور توراۃ اور قرآن پاک سے کفر کیا۔

وہ دونوں فریق مومنوں کو کہہ رہے تھے "**کونوا علی دیننا فلا دین الا ذلک**" تم ہمارے دین پر آ جاؤ کیونکہ اس دین کے بغیر کوئی اور دین سچا نہیں، تو ان لوگوں کے رد میں یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

۳) ابن اسحاق اور ابن جریر وغیرھما نے ذکر فرمایا کہ ایک مرتبہ عبداللہ بن صوریا اعور نے نبی کریم ﷺ کو کہا۔

"**ماالھدی الا ما نحن علیہ فاتبعنا یا محمد تھتد وقالت النصاری مثل ذلک فانزل اللہ تعالی فیھم الآیۃ**"

نہیں ہدایت سوائے ہمارے راستہ کے، اس لئے اے محمد تم بھی ہماری تابعداری کر لو تو ہدایت پا جاؤ گے، اور نصاریٰ نے بھی اسی طرح کی گفتگو کی تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا۔

مطلب واضح ہے کہ یہ تمام وجوہ پہلے واقع ہوئیں تو آیۃ کریمہ کا نزول بعد میں ہوا، اس لئے تمام ہی شان نزول ہیں۔

قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيمَ : "قل" خطاب ہے نبی کریم ﷺ کو، یعنی آپ ان لوگوں کا رد کرتے ہوئے ان سے فرما دیں، ان کے سامنے واضح طور پر حق بیان کر دیں، اور ان کی راہنمائی کریں، ان کو دوٹوک الفاظ میں یہ کہہ دو۔

"**لانکون کما تقولون ﴿بَلْ﴾ تکون ﴿مِلَّةَ اِبْرَاهِيمَ﴾ ای اھل ملتہ او ﴿بَلْ﴾ نتبع ملۃ ابراھیم**"

کہ ہم تمہارے کہنے پر یہودیت ونصرانیت کو کبھی اختیار نہیں کر سکتے، بلکہ ہم تو دین ابراہیمی والے ہیں۔ ہم تو ابراہیم علیہ السلام کے دین کی تابعداری کرتے ہیں۔

حَنِيْفًا : "ای مستقیما او مائلا عن الباطل الی الحق" وہ ابراہیم علیہ السلام جو دین مستقیم پر قائم ہیں۔ باطل سے ہٹ کر حق دین پر قائم ہیں۔

تنبیہ : حنیف کا معنی مستقیم ہے۔ لنگڑے شخص کو نیک شگونی کے طور پر کہا جاتا ہے "احنف" اللہ کرے کہ یہ درست ہو جائے، جیسا کہ لدیغ (سانپ بچھو کا ڈسا ہوا) کو "سلیم" کہا جاتا ہے اور "مھلکه" (ھلاکت کے قرب) کو مفازۃ (کامیاب) نیک شگونی کے طور پر کہا جاتا ہے۔

اور حنیف کا معنی ہوتا ہے پھرنا، ہٹنا، اس معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ ابراہیم علیہ السلام یہودیت و نصرانیت سے ہٹ کر دین اسلام کی طرف مائل تھے۔

فائدہ : حنیفیة" سے مراد بیت اللہ شریف کا حج کرنا، اور حق کی تابعداری کرنا، اور ابراہیم علیہ السلام کا شرائع اسلام کی تابعداری کرنا، اور عمل میں اخلاص۔

یعنی ان تمام معانی کے لحاظ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام حنیف تھے۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ "حنیفا" پر نصب اس لئے ہے کہ یہ "ابراھیم" سے حال واقع ہے۔ (از کبیر)

وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ : (اور وہ نہیں تھے مشرکوں سے)

اس میں یہود و نصاری اور مشرکین کا رد پایا گیا ہے۔ وہ تمام حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فضیلت کے معترف تھے لیکن یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا، اور نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا اور مشرکین نے بت پرستی کی۔

رب تعالیٰ نے گویا کہ ان کا رد کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو مشرک نہیں تھے، تم ان کی فضیلت کا اعتراف کرنے کے باوجود مشرک کیوں ہو۔ (از کبیر)

☆☆☆

﴿قُوْلُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَا اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَا اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَا اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ (آیت ۱۳۶)

۱) یوں کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو ہماری طرف اترا اور جو اتارا گیا ابراہیم واسماعیل واسحاق ویعقوب اوران کی اولاد پر اور جو عطاء کیے گئے موسیٰ وعیسیٰ اور جو عطاء کیے گئے باقی انبیاء اپنے رب کے پاس سے، ہم ان میں کسی پر ایمان میں فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے حضور گردن رکھے ہیں۔

۲) کہو ہم ایمان لائے اللہ پر، اور اس پر جو اتارا گیا ہماری طرف، اور جو اتارا گیا ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر، اور جو عطاء کیے گئے موسیٰ اور عیسیٰ اور جو عطاء کیے گئے باقی انبیاء اپنے رب کی طرف سے، ہم فرق نہیں کرتے ان میں کسی پر ایمان میں، اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

پہلی آیۃ کریمہ میں خطاب نبی کریم ﷺ کو تھا، اور اس آیۃ کریمہ میں خطاب آپ کی امت کو ہے۔ اسی طرح پہلی آیۃ میں یہود ونصاریٰ کو جدلی جواب دیا گیا اور اس آیۃ میں ان کو تحقیقی جواب دیا گیا ہے۔ (کبیر)

شانِ نزول:

☆ "عن ابی هریرة ﷛ قال كان اهل الكتاب يقرءون التوراة بالعبرانية ويفسرونها بالعربية لاهل الاسلام فقال رسول الله ﷺ لاتصدقوا اهل الكتاب ولاتكذبوهم و ﴿قُوْلُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ﴾ الخ." رواه البخاری

حضرت ابوہریرہ ﷺ فرماتے ہیں اہل کتاب توراۃ عبرانی زبان میں پڑھتے تھے اور اس کی عربی زبان میں مسلمانوں کے سامنے تفسیر بیان کرتے، رسول اللہ ﷺ نے مؤمنین کو کہا تم ان کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب، اور کہو ہمارا ایمان ہے اللہ پر اور جو اس نے نازل فرمایا الخ۔ اس وقت یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔ (قرطبی)

۲) یہود و نصاری نے مومنین کو جب کہا ﴿ كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ﴾ تو رب تعالیٰ نے ان کے رد میں اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا، پہلی آیۃ کریمہ میں ان کو جواب نبی کریم ﷺ کے ذریعے دیا گیا، اور اس آیۃ کریمہ میں ان کو جواب مومنین کے ذریعے دیا۔

یعنی مومنوں کو کہا گیا کہ تم ان کو صاف صاف بتا دو کہ ہم تو اللہ تعالیٰ پر اور قرآن پاک پر ایمان رکھتے ہیں، ہم تو ان صحیفوں پر ایمان رکھتے ہیں جو ابراہیم علیہ السلام پر نازل کیے گئے اور ان پر ہی ان کی اولاد یعنی حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد عمل پیرا رہے۔ اور ہم تو ایمان توراۃ و انجیل پر رکھتے ہیں۔ اور دوسرے انبیاء کرام پر جو صحیفے نازل ہوئے ہمارا تو ان پر ایمان ہے۔ ہم تمام انبیاء پر ایمان رکھتے ہیں، ایسا نہیں کہ بعض انبیاء کو تو نبی تسلیم کریں اور بعض پر ایمان ہی نہ رکھیں، ہم تو اللہ تعالیٰ کے ہی فرمانبردار ہیں۔

عقیدہ : اگر کوئی شخص کسی نبی کے نام سے بے خبر ہے تو اس سے پوچھا جائے کہ فلاں شخص نبی تھا یا نہیں تھا۔ تو یہ جواب ہاں یا نہ سے نہ دے، کیونکہ اسے تو اس شخص کے نبی ہونے یا نہ ہونے کا علم نہیں۔ بلکہ یہ جواب اسی آیۃ کے مطابق دے کہ اللہ تعالیٰ کے جتنے نبی ہیں میں تمام کو نبی مانتا ہوں میرا ان پر ایمان ہے۔

جس کے متعلق تم پوچھ رہے ہو مجھے تو اسکے نبی ہونے یا نہ ہونے کا علم نہیں۔ اگر وہ اللہ کا نبی ہے تو یقینی طور پر میرا اس پر ایمان ہے۔ (ماخوذ از قرطبی)

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا : اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کی راہنمائی کی کہ تم کہو ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل کیا گیا، اس سے مراد قرآن پاک ہے۔

ہماری طرف نازل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے عمل کرنے کے لئے جو کتاب ہم پر ہمارے نبی کریم ﷺ پر نازل ہوئی، ہمارا اس پر تفصیلی ایمان ہے۔ ہم اس کے تمام احکام پر عمل کرنے کے لئے ایمان رکھتے ہیں۔

لیکن باقی انبیاء کرام پر نازل ہونے والی کتب اور صحیفوں پر ہمارا اجمالی ایمان ہے، کہ وہ اللہ کی کتابیں، ان پر تفصیلی ایمان نہ ہونے کی وجہ واضح ہے کہ پہلی شریعتیں منسوخ ہو چکی ہیں۔ (از صابونی)

وَمَا اُنْزِلَ اِلٰی اِبْرٰهٖمَ الخ: "وہ عشر صحف انزلت علی ابراهیم فتعبدبها هو وبنوه واحفاده ولذا نسب انزالها الیهم کما نسب انزال القرآن الینا بمتابعة محمد ﷺ"

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر دس صحیفے نازل کئے گئے، ان کے مطابق ہی آپ نے اور آپ کے بیٹوں اور پوتوں نے عمل کیا، اور عبادت کی، تو نازل کرنے کی نسبت حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد کی طرف کر دی حالانکہ اور حضرات پر صحیفے نازل نہیں، صرف ابراہیم علیہ السلام پر نازل کئے گئے۔

یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ قرآن پاک ہمارے عمل اور ہماری عبادت کے لئے نازل نبی کریم ﷺ پر کیا گیا اور منسوب ہماری طرف بھی کر دیا گیا۔

وَالْاَسْبَاطِ : جمع ہے سبط کی، جیسے حمل کی جمع احمال ہے۔ مراد اس سے بنی اسرائیل کی جماعتیں جیسا کہ عرب کی جماعتوں کو قبائل اور عجم کی جماعتوں کو شعوب کہا جاتا ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے وہ تمام حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام کے اسباط ہی تھے، کیونکہ پوتے اور نواسے پر بھی سبط بولا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہما کو "**سبطا رسول اللہ ﷺ**" کہا گیا ہے۔

سبط چونکہ زیادہ شاخوں والے درخت کو بھی کہا جاتا ہے، اس لئے یعقوب علیہ السلام کی اولاد کو کثرت کی وجہ سے اسباط کہا گیا ہے۔

﴿ وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی ﴾ (اور جو عطا کئے گئے موسیٰ اور عیسیٰ) یعنی ہمارا ایمان توراۃ اور انجیل پر ہے۔ ان دونوں کتابوں کو علیحدہ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اہل کتاب نے ان میں تحریف کر

دی تھی، کئی چیزوں کو نکال دیا اور کئی کو اس میں شامل کر لیا اور دعویٰ یہ کیا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ تو مومنوں سے کہا گیا کہ تم کہو ہمارا ایمان اس چیز پر جو موسیٰ علیہ السلام کو عطاء کی گئی۔ یعنی ہمارا ایمان توارۃ پر ہے۔ اور ہمارا اس چیز پر ہے جو عیسیٰ علیہ السلام کو عطاء کی گئی یعنی انجیل پر ہمارا ایمان ہے۔
اس سے یہ واضح کر دیا کہ ہمارا ایمان اصل کتب پر ہے نہ کہ تحریف کی ہوئیں پر۔ اور ان پر ایمان بھی اجمالی ہے تفصیلی ایمان صرف قرآن پاک پر ہے۔

وَمَا اُوتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ : (اور جو باقی انبیاء دیے گئے اپنے رب کی طرف سے)
اس سے مراد صحیفے بھی ہیں اور "مایشمل ذلک والمعجزات" انبیاء کرام کے معجزات اور احکام ان کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطاء کیے گئے ہیں، ان سب پر ہمارا ایمان ہے۔ "وهو تعميم بعد التخصيص كيلا يخرج من الاعان احد من الانبياء" پہلے خاص انبیاء کرام کا ذکر کر کے پھر مجموعی طور پر تمام انبیاء کرام کا ذکر کر دیا کہ اے مومنوں تم یہ کہو کہ ہمارا ایمان باقی تمام انبیاء کرام کے احکام، ان کے معجزات ان کے صحائف پر ہے، کہ تمام انبیاء کرام کو رب تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ عطاء کیا گیا اس پر ہمارا ایمان ہے، تا کہ کوئی ایک نبی بھی ایمان سے خارج نہ ہو سکے۔
(از روح المعانی)

لَانُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ : ہم ان میں کسی پر ایمان میں فرق نہیں کرتے۔
"ای کما فرق اهل الكتاب فآمنوا ببعض وكفروا ببعض بل نؤمن بهم جميعا"
ہم ان میں سے کسی ایک میں اس طرح فرق نہیں کرتے جیسا کہ اہل کتاب نے کہا ہے۔ بعض پر ایمان لائے اور بعض پر ایمان نہ لا کر کفر کیا بلکہ ہم تمام پر ایمان رکھتے ہیں۔ (روح المعانی)
"فنؤمن ببعض ونكفر ببعض كاليهود والنصارى" یعنی ہم ان میں ایسا فرق نہیں کرتے کہ بعض پر ایمان لائیں اور بعض سے کفر کریں جیسا کہ یہود اور نصاریٰ کرتے تھے (بعض پر ایمان لاتے تھے اور بعض سے کفر۔ (جلالین)
ای لانؤمن ببعض ونكفر ببعض كما فعلت اليهود والنصارى"
یعنی ہم ایسا نہیں کرتے کہ بعض انبیاء پر ایمان نہ لائیں اور کفر کریں، جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے کیا۔ (مدارک)

☆ "لَانُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْھُمْ "، میں دووجہ ہیں ایک یہ ہے۔ " انا لانؤمن ببعض و نکفر ببعض " ہم انبیاء کرام میں اس طرح کا کوئی فرق نہیں کرتے کہ بعض پر ایمان لائیں اور بعض پر ایمان نہ لائیں اور ان سے کفر کریں۔

اور اس میں دوسری وجہ یہ ہے۔

" لانقول ، انھم متفرقون فی اصول الدیانات بل ھم مجتمعون علی الاصول التی ھی الاسلام کما قال اللہ تعالیٰ " (شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحا والذی اوحینا الیک وما وصینا بہ ابراھیم و موسیٰ وعیسی ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ) (الشوری ۱۳)

تمہارے لئے دین کی وہ راہ ڈالی جس کا حکم اس نے نوح کو دیا اور جو ہم نے تمہاری طرف وحی کی اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا کہ دین پر قائم رہو اور اس میں پھوٹ نہ ڈالو۔ (از کبیر)

☆ " عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ انا اولی الناس بعیسی بن مریم فی الاولی والآخرۃ الانبیاء اخوۃ من علات وامھاتھم شتی و دینھم واحد ولیس بیننا نبیٌّ " (بخاری و مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک لوگوں میں سے میں عیسیٰ بن مریم کے زیادہ قریب ہوں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، انبیاء کرام علاتی بھائی ہیں (باپ شریکے) اور ان کی مائیں مختلف ہیں۔ اور ان کا دین ایک ہے۔ اور ہمارے (میرے اور عیسیٰ علیہ السلام کے) درمیان کوئی اور نبی نہیں۔

وضاحت حدیث: نبی کریم ﷺ کا یہ فرمانا " الانبیاء اخوۃ من علات وامھاتھم شتی و دینھم واحد "

اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام انبیاء کرام کی اصل ایک ہے کیونکہ تمام کی طرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے وحی آتی ہے۔ اور ان کی استعداد مختلف ہے۔ استعدادات کے مختلف ہونے کو اور شرائع کے فروع میں اختلاف کی وجہ سے تشبیہ دی گئی کہ مائیں مختلف ہیں۔

اصول دین سب کے ایک ہیں، اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر ایمان لانا، مبدأ و معاد (ابتداء تخلیق اور قیامت) پر ایمان لانا اور اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی پر ایمان لانے میں سب برابر ہیں۔

اس لحاظ پر ان کو علاتی بھائی ہونے سے تشبیہ دی گئی۔ (از مظہری)

تراجم کا فرق: اس بحث کے بعد دیکھیں اعلیٰ حضرت کا ترجمہ مقصد کو سمجھانے میں کتنا واضح اور قریب ہے۔

﴿ لانفرق بين احد منهم ﴾

☆ نہیں جدائی ڈالتے ہم درمیان کسی ان میں سے۔	(شاہ رفیع الدین صاحب
☆ ہم فرق نہیں کرتے ایک میں ان سب سے۔	شاہ عبدالقادر صاحب)
☆ ہم ان پیغمبروں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے۔	(عبدالماجد صاحب)
☆ ہم فرق نہیں کرتے سب میں سے	(محمود الحسن)
☆ ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے۔	(اشرف علی صاحب
☆ ہم ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے۔	(مودودی صاحب
☆ ہم ان میں کسی پر ایمان میں فرق نہیں کرتے۔	اعلحضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی

اس آیۂ کریمہ کی جو وضاحت ذکر کر دی گئی، اس سے واضح ہو گیا کہ اتنا کہنا کافی نہیں کہ "ہم ان میں فرق نہیں کرتے" کیونکہ ہم مدارج اور مراتب کا فرق تو کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو افضل الانبیاء اور قرآن پاک کو افضل الکتب مانتے ہیں۔

لہٰذا یہاں ضروری ہے کہ ترجمہ سے ہی یہ واضح ہو جائے کہ ہم کون سا فرق نہیں کرتے، وہ یہی ہے کہ ہم ایسا فرق نہیں کرتے کہ بعض انبیاء پر ایمان ہو اور بعض سے کفر، اسی طرح بعض آسمانی کتب کو تسلیم کیا جائے اور بعض کا انکار۔

اب اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو ایک نظر پھر دیکھیں (ہم ان میں کسی پر ایمان میں فرق نہیں کرتے) تو واضح ہو جائے کہ کتنا خوب اور کتنا عظیم ترجمہ ہے۔

وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُوْنَ : (اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں)

" ای خاضعون لله تعالى بالطاعة " یعنی ہم طاعت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے سامنے عجز کا اظہار کرنے والے ہیں۔

" مذعنو ن بالعبو دیة "، ہم اللہ تعالیٰ کی عبودیت پر یقین رکھتے ہیں۔

" منقادون لامرہ ونھیہ " ہم اس کے اوامر ونواہی کو تسلیم کرنے والے ہیں، یعنی ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔ (روح المعانی)

(فائدہ : ﴿ وَنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ﴾ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ " ان اسلامنا لاجل طاعة الله لا لاجل الھوی "

بے شک ہمارا اسلام صرف اللہ تعالیٰ کی طاعت کی وجہ سے ہے، اس میں ہماری خواہشات کا کوئی دخل نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ معجزات کے ظاہر ہونے پر ایمان واجب تھا، کیونکہ انکار جن لوگوں نے کیا ان کی خواہشات کا اس میں دخل تھا۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿فَاِنۡ اٰمَنُوۡا بِمِثۡلِ مَاۤ اٰمَنۡتُمۡ بِهٖ فَقَدِ اهۡتَدَوۡا ۚ وَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا هُمۡ فِىۡ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكۡفِيۡكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴾

۱) پھر اگر وہ بھی یوں ہی ایمان لائے جیسا تم لائے جب تو وہ ہدایت پاگئے اور اگر منہ پھیریں تو وہ نری ضد میں ہیں تو اے محبوب عنقریب اللہ ان کی طرف سے تمہیں کفایت کرے گا۔ (آیت نمبر ۱۳۷)

۲) پس اگر وہ ایمان لائیں جیسا تم نے ایمان لایا اس کے ساتھ تو وہ ہدایت پاگئے۔ اور وہ منہ پھیریں تو بیشک وہ صرف مخالفت میں ہیں۔ تو عنقریب کافی ہوگا آپ کو ان کی طرف سے اللہ، اور وہ بہت خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جب پہلی آیۃ کریمہ میں دین کا واضح طریقہ بیان کر دیا تو اس آیۃ میں گویا کہ یہ بیان کیا جا رہا ہے انسان کو چاہئے کہ جب کسی ذات کی نبوت پر دلائل قائم ہو جائیں تو اس کی نبوت کو تسلیم کر لیا جائے، اس کی مخالفت نہ کی جائے۔

مختصر مفہوم : اس آیۃ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو ارشاد فرمایا کہ جس نے

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبی کریم ﷺ کی نبوت اور تمام عقائد صحیحہ پر خلوص نیت سے ایمان لایا اگر اہل کتاب نے بھی اسی طرح ایمان لایا تو وہ ہدایت پا جائیں گے، اگر انہوں نے اس طرح ایمان نہ لایا، بلکہ ضد اور مخالفت پر قائم رہے تو نبی کریم ﷺ کا کچھ نقصان نہیں کرسکیں گے، اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچائیں گے، کیونکہ رب تعالیٰ نبی کریم ﷺ کو ان کی طرف سے کافی ہے اور وہ خوب سننے اور جاننے والا ہے۔

اعتراض : مومنین کا ایمان جب اللہ تعالیٰ پر اور نبی کریم ﷺ پر اور قرآن پاک پر ہے، تو یہود و نصاریٰ ان کے مثل پر کیسے ایمان لائیں گے جب کہ رب تعالیٰ اور اس کے رسول اور قرآن کی مثل کوئی چیز نہیں۔

جواب : یہاں یہ مراد نہیں کہ وہ ان چیزوں پر ایمان لائیں جو ان کے مثل ہوں جن پر ایمان والوں نے ایمان لایا۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ اے ایمان والو تم نے قرآن پاک پر ایمان لایا، اس میں کسی قسم کی تحریف نہیں کی، اگر وہ بھی توراۃ پر اسی طرح ایمان لاتے اس میں تحریف نہ کرتے تو یقیناً ان کو قرآن پر بھی ایمان لانا ضروری ہو جاتا جو ان کی نجات اور ہدایت کا ذریعہ بن جاتا۔

یعنی یہاں مثلیت ایمان اور تصدیق میں ہے، ان چیزوں میں مثلیت بیان کرنا مقصود نہیں جن پر ایمان لانا ہے۔

اسی وجہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے " **لاتقولوا فان آمنوا بمثل ما آمنتم به فليس لله مثل** " تم یہ نہ کہو کہ "اگر وہ ایمان لے آئیں اس چیز پر جو مثل ہو اس چیز کے جس پر تم نے ایمان لایا" اس لئے کہ رب تعالیٰ کے مثل کوئی چیز نہیں۔

" **ولكن قولوا فان آمنوا بالذى آمنتم به** " لیکن یہ کہو کہ "اگر وہ ایمان لائیں اس ذات پر جس پر تم نے ایمان لایا"

البتہ ان کا ایمان تمہارے ایمان کی طرح خلوص پر مبنی ہوا تو وہ ہدایت پا جائیں گے۔

ضمناً اس سے ایک اور مسئلہ حل ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کی مثل کوئی چیز نہیں، اگر مثل کوئی چیز ہوتی تو اس پر ایمان لانے سے بھی ہدایت حاصل ہوتی، اس لئے ضروری ہے کہ وہ ذات باری تعالیٰ پر ہی مومنین کی طرح خلوص اعتقاد سے ایمان لائیں تا کہ ان کو ہدایت حاصل ہو جائے۔ (ماخوذ از کبیر)

فائدہ : " فالمراد فقد عملوا بما ھدوا الیه و قبلوہ " آیۃ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ عمل کریں جس کی ان کو ہدایت کی گئی ہے، اور اسی عمل کو خلوص سے قبول کریں۔

" ومن ھذا حاله یکون ولیا للہ داخلا فی اھل رضوانه " اور اسی سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ وہ شخص اللہ کا ولی ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ کی رضاء حاصل ہوگی ، یہ بہت ہی واضح بات ہے کہ رب تعالیٰ کی رضامندی کے لئے عمل کرنا رب تعالیٰ کی رضامندی کے حصول کا سبب ہے۔

(از کبیر)

وَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا هُمۡ فِىۡ شِقَاقٍ : اگر وہ منہ پھیریں تو بیشک وہ صرف مخالفت میں ہیں

" شقاق " ماخوذ ہے " شق " سے۔ گویا کہ ایک شخص دوسرے کی عداوت کی وجہ سے اس کی شق (طرف) سے دوسری شق اختیار کرلے۔

مسلمانوں کی جماعت جب بکھر جائے ، ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ ہوجائیں۔ تو اس وقت کہا جاتا ہے۔ " وقد شق عصا المسلمین "مسلمانوں کا عصا ٹوٹ گیا۔

اسی طرح لفظ " محادة " اس معنی میں استعمال ہوتا کہ وہ اس حد (طرف) میں ہے، اور دوسرا اس حد میں، اسی طرح " تعادی " کا معنی ایک دوسرے سے دشمنی کرنا۔

اسی طرح " مجانبة " کا مطلب ہے ایک شخص ایک جانب میں ہو اور دوسرا دوسری جانب میں ہوجائے۔ " شقاق " کے متعلق بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ یہ لفظ "مشقة" سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے حریف کو مشقت میں ڈالنے کی کوشش میں ہو اور ایذاء (تکلیف) پہنچانے کی فکر میں ہو۔

ن الفاظ مبار [illegible] کا مطلب واضح ہوگیا کہ اگر وہ ایمان والوں کی طرح خلوص قلب سے ایمان لانا چھوڑ دیں تو وہ مناق [illegible] (مخا [illegible] ولازم پکڑیں گے۔ حالانکہ عقلمند آدمی کا یہ کام نہیں کہ وہ کسی کی مخالفت کی وجہ سے حق چھوڑ دے۔

جب انہوں نے مخالفت کو لازم پکڑ ہی لیا تو ہمیں معلوم ہوگیا" لیس غرضھم طلب الدین

والانقیاد للحق وانما غرضھم المنازعة واظھار العداوة " کہ بے شک ان کی غرض دین کو طلب کرنا اور حق کی فرمانبرداری نہیں، بلکہ ان کی غرض صرف جھگڑا کرنا اور دشمنی کا اظہار کرنا ہے۔

" فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ " میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں، سب کا مطلب یہی ہے (کہ اگر وہ منہ پھیرلیں) تو وہ صرف مخالفت اور خالص ضد کی وجہ سے اعراض کرنے والے ہوں گے۔

ایک معنی لیا گیا ہے۔مخالفت، اور معنی لیا گیا ہے "گمراہی" اور معنی لیا گیا ہے۔ "منازعت و محاربت" (لڑائی جھگڑا) اور معنی لیا گیا ہے "عداوت" سب کا مطلب وہی ہے جو بیان کردیا گیا ہے۔

فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللهُ : تو عنقریب کافی ہوگا آپ کو ان کی طرف سے اللہ۔

رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرمی میں نبی کریم ﷺ اور مومنین کو تسلی دی گئی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کا محافظ ہوگا تو اسے وثوق حاصل ہوگا۔

" قال المتکلمون ھذا اخبار عن الغیب فیکون معجزا دالا علی صدقه " متکلمین حضرات نے بیان فرمایا ہے کہ یہ غیبی خبر ہے جو نبی کریم ﷺ کی صداقت پر دلالت کرنے والا آپ کا معجزہ ہے۔

غیبی خبر اس لئے ہے کہ آپ نے رب تعالیٰ کی عطاء سے یہ خبر دی کہ رب تعالیٰ آپ کی کفایت کرے گا، آپ کو یہود ونصاریٰ کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ اور ان کے خلاف آپ کی امداد فرمائے گا۔

تو ایسا ہی ہوا کہ مسلمان ان پر غالب آگئے، ان کے شہروں کو فتح کرلیا، ان کے مال اپنے قبضہ میں لے لئے۔

مسلمانوں کے ہاتھوں وہ ذلیل ہوئے، خراج اور جزیہ ان کو ادا کرنا لازم ہوا۔ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھڑانے پر قادر نہ ہوئے۔

اس خبر کو نبی کریم ﷺ کا معجزہ قرار دیا گیا کہ آپ نے تفصیل بیان فرمادی وہ حرف بحرف حق ثابت ہوئی۔

"لان المتخرص لا یصیب فی مثل ذلک علی التفصیل " کیونکہ تخمینے سے بات

کرنے والا بھی اس قسم کی تفصیل نہیں بیان کرسکتا۔

تسکین الجنان سے اقتباس: راقم نے تراجم کے تقابلی جائزہ میں ﴿فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ﴾ کو بھی ذکر کیا ہے اس پر بھی ایک نظر کرتے چلے جائیں۔

﴿فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ﴾

☆ تو تمہاری طرف سے عنقریب ہی نمٹ لیں گے۔	(اشرف علی صاحب
☆ سو اب کفایت ہے تیری طرف سے ان کو اللہ۔	(شاہ عبدالقادر صاحب)
☆ سو اب کافی ہے تیری طرف سے اللہ۔	(محمود الحسن صاحب
☆ سو اب اللہ آپ کی طرف سے ان کے مقابلہ میں ہے۔	(عبدالماجد صاحب)
☆ تو اے محبوب عنقریب اللہ ان کی طرف سے تمہیں کفایت کرے گا۔	(اعلیٰحضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی)

یہاں لفظ "اللہ" فاعل ہے۔ اور "ک" ضمیر، اور "ھم" ضمیر مفعول ہیں۔

بظاہر دونوں معنوں کو عقل تسلیم کرتی ہے کہ یہ مطلب ہو کہ اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ کی طرف سے ان کو کافی ہو یعنی عذاب دے۔

یا یہ معنی ہو کہ اللہ ان کی طرف سے نبی کریم ﷺ کو کافی ہو کہ وہ آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچا سکیں، بلکہ خود ہی گرفت میں آجائیں۔

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفاسیر کے عین مطابق ہے۔ مدارک میں ہے۔ "**ضمان من اللہ لاظھار رسولہ علیھم قد انجز وعدہ بقتل بعضھم و اجلاء بعض**" یعنی اللہ تعالیٰ نے ذمہ داری اٹھائی ہے کہ نبی کریم ﷺ کو غالب کرے گا۔

ان پر یعنی اللہ ان کی طرف سے تمہیں کفایت کرے گا، اسی وعدہ کو اللہ نے اس طرح پورا فرمایا کہ بعض ان میں سے قتل ہو گئے، اور بعض جلاء وطن۔

ایسے ہی جلالین میں "**یا محمد شقاقھم**" سے تفسیر کی گئی، جس کا مطلب ہے کہ اے نبی کریم آپ کو اللہ کافی ہے ان کی مخالفت کے باوجود کیونکہ "شقاق" کا ترجمہ خود مفسر رحمہ اللہ نے پہلے

خلاف" کر دیا ہے۔اس آیۃ کریمہ کے اختتام پر بھی جلالین میں مدارک کے مطابق ہی عبارت ہے۔ "

وقد کفاہ اللہ ایاھم بقتل قریظة ونفی النضیر وضرب الجزیة علیھم "

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی ان کی طرف سے کفایت کی تو قریظہ قتل ہو گئے، اور نضیر جلا وطن ہوئے، اور ان پر جزیہ مقرر ہوا، شیخ زادہ حاشیہ بیضاوی میں بھی اسی قسم کا مضمون ہے۔

" فسیکفی اللہ ایاک امر الیھود والنصاری بحفظک من شوء مھم ونصرک علیھم "

یعنی اللہ تعالیٰ آپ کی یہود و نصاری کی طرف سے کفایت کرے گا، ان کے ناپاک ارادوں کو ختم کر کے آپ کی حفاظت فرمائے گا اور آپ کو ان پر غالب فرمائے گا۔

تفاسیر کے بیان کے بعد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر نظر کریں تو آپ کی وسعت علمیت کا اعتراف کرنے کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں رہے گا۔ (تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان ص ۴۹، ۵۰)

وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ : اور وہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔

نبی کریم ﷺ سے امداد کرنے کا جو وعدہ فرمایا گیا، ان الفاظ مبارکہ سے اس کی تائید کی گئی۔

کہ جو تم دعاء کرو وہ اسے خوب سننے والا ہے۔ جو تمہاری نیت میں اظہار دین ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے خوب جاننے والا ہے تمہاری دعا تمہارے اعمال اور دین کے اظہار دین ہے اللہ تعالیٰ اسے خوب جاننے والا ہے۔ تمہاری دعا تمہارے اعمال اور دین کے اظہار کے لئے کوشش کو قبول کرنے والا ہے۔ اور تمہیں مراد تک پہنچانے والا ہے۔

اور ایک احتمال یہ ہے کہ ان الفاظ مبارکہ میں کافروں کے لئے وعید پائی گئی ہے۔ کہ کافر لوگ جو ظاہر کرتے ہیں رب تعالیٰ اسے خوب سننے والا ہے۔ اور جسے وہ چھپاتے ہیں، جس میں کوئی بھلائی نہیں اسے وہ خوب جاننے والا ہے۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ اسی میں پہلے وعدہ کی تاکید بھی موجود ہے۔

" فان وعید الکفرة وعد للمؤمنین "

اس لئے کہ کافروں کے لئے جب وعید پائی جائے یعنی ان کو عذاب سے ڈرایا جائے تو اس میں

مومنوں کے لئے نجات اور رحمت اور نعمتوں کا وعدہ بھی پایا جاتا ہے۔ (از روح المعانی)

تنبیہ: انسان جتنا اللہ تعالیٰ کا مقرب ہوتا ہے اتنے ہی اس پر امتحان زیادہ آتے ہیں، اس لئے تکالیف نبی کریم ﷺ پر بہت آئی ہیں۔ تاہم اس آیۃ کریمہ اور دوسری کئی آیات کریمہ میں رب تعالیٰ نے آپ سے امداد کا جو وعدہ فرمایا، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ پر کوئی غالب نہ آ سکے گا۔ یعنی آپ کو کوئی قتل نہیں کر سکے گا۔ دوسری تکالیف کا آنا اس وعدہ کے مخالف نہیں، بلکہ مدارج کی بلندی کی علامت ہے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے خون کا پہلا قطرہ:

رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی ﴿فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللهُ﴾ پر گرا، یعنی آپ قرآن پاک کی تلاوت فرما رہے تھے جب آپ پر حملہ کیا گیا، اور آپ کے خون کا پہلا قطرہ قرآن پاک پر واقع ہوا۔ آپ کی شہادت کی خبر نبی کریم ﷺ نے پہلے سے ہی دے رکھی تھی۔

طلباء کرام قرطبی کے یہ الفاظ یاد کرلیں۔ " وهذا الحرف ﴿فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللهُ﴾ هو الذی وقع علیه دم عثمان حین قتل باخبار النبی ﷺ ایاه بذلک "

حق گوئی کی درخشاں مثال:

ابو دلامہ ایک مرتبہ مسلمانوں کے حاکم منصور کے پاس گیا، دیکھا کہ " وعلیه قلنسوة طویلة ودرّاعه (جبة مشقوقة المقدم) مکتوب بین کتفیها ﴿فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ وسیف معلق فی وسطه "

اس نے ایک لمبی ٹوپی پہنی ہوئی ہے۔ اور ایک جبہ آگے سے کھلا پہنا ہوا ہے، جس کے کندھے کے مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ لکھا ہوا ہے اور درمیان میں تلوار لٹکی ہوئی ہے۔

منصور نے ابو دلامہ سے پوچھا تمہارا کیا حال ہے؟ ابو دلامہ نے کہا اے امیر المؤمنین آپ کو بشارت ہو، اس نے پوچھا کس طرح کی بشارت؟ ابو دلامہ نے کہا۔

" ماظنک برجل وجهه فی وسطه وسیفه فی استه وقد نبذ کتاب الله وراء ظهره "

اس شخص کے متعلق تمہارا کیا خیال جس کا چہرا وسط میں ہو، تلوار پیچھے، اور اللہ کی کتاب کو اس نے پیٹھ کے پیچھے ڈال دیا ہو۔

اشارہ تھا کہ تمہاری وردی پر آیۃ کریمہ کا پیچھے لکھنا، اور تلوار کو درمیان میں لٹکانا سب غلط ہیں۔ منصور نے اپنی تمام فوج کو اسی قسم کی وردی کا حکم دے رکھا تھا، لیکن ابودلامہ کے کہنے پر، حق بات بتانے پر اس نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا، اور وردی کا ڈیزائن تبدیل کرنے کا حکم دے دیا۔ (از قرطبی)

تنبیہ : ایمان وہی معتبر ہوگا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے بیان فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک لہ' ہے۔ تمام انبیاء کرام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ ہیں، گناہوں سے پاک ہیں۔ نبی کریم ﷺ خاتم الانبیاء ہیں۔

اگر کوئی شخص کسی نبی کو خدا کہے یا خدا کی مثل کہے یا خدا کا بیٹا کہے وہ بے ایمان ہے۔ رب تعالیٰ کا شریک ماننا کفر و شرک ہے، اور وہ شخص بے ایمان ہے۔

انبیاء کرام کو اپنے جیسا سمجھنے والا بھی ایمان سے خارج ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کو آخری نبی نہ ماننا بھی کفر ہے۔ یہ سب لوگ ﴿ وَاِنۡ تَوَلَّوۡا ﴾ میں آتے ہیں، کیونکہ یہ ایمان سے پھر جانے والے ہیں۔

﴿ صِبۡغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبۡغَةً وَّنَحۡنُ لَهٗ عٰبِدُوۡنَ ﴾

۱) ہم نے اللہ کی رینی لی، اور اللہ سے بہتر کسی کی رینی اور ہم اسی کو پوجتے ہیں۔

۲) اللہ کا رنگ، اور کس شخص کا رنگ بہتر ہے اللہ کے رنگ سے، اور ہم اسی کی عبادت کرنے والے ہیں۔ (آیت نمبر ۱۳۸)

شانِ نزول:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ نصرانیوں کا جب کوئی بچہ پیدا ہوتا تو وہ اسے ساتویں دن زرد رنگ سے رنگتے، اس پانی کو وہ معمودیہ کہتے تھے۔ (آجکل اردو میں اسے بتسمہ کہا جاتا ہے) ان

کے رنگنے کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ جس طرح ختنہ پاکیزگی کا سبب ہے۔ یہ رنگ بھی اسے تمام آلائشوں سے پاک کر دیتا ہے۔ "فاذا فعلوا ذلک قالوا الآن صار نصرانیا حقا" جب وہ رنگ سے رنگتے تو کہتے کہ اب یہ پکا نصرانی بن گیا ہے۔

رب تعالیٰ نے ان کے رد میں اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا۔ ﴿صِبْغَةَ اللهِ﴾ کا مطلب یہ ہے۔

﴿صِبْغَةَ اللهِ﴾ احسن صبغة وهى الاسلام" یعنی اللہ تعالیٰ کا رنگ تمام رنگوں سے اچھا ہے کہ تم اسلام قبول کرلو اسلام کو مجازی طور پر رنگ سے تعبیر کر دیا کہ جس طرح رنگ ظاہر ہوتا ہے اسی طرح دیندار شخص پر اعمال صالحہ اور علامات دین کا ظہور ہوتا ہے۔ (از قرطبی)

اسی طرح یہودی اپنے بیٹوں کو رنگتے اور کہتے ہم نے اسے یہودیت کا رنگ چڑھا دیا۔ اور نصرانی اپنے بیٹوں کو رنگ کر کہتے ہم نے اسے نصرانیت کے رنگ میں رنگ دیا. تو اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا۔ (قرطبی)

صِبْغَةَ اللهِ : پر نصب اس وجہ سے ہے کہ اس کا عطف ﴿اٰمَنَّا﴾ پر ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا "قولوا صبغة الله" تم کہو ہم اللہ کے رنگ (یعنی دین اسلام) سے رنگے ہوئے ہیں۔

یا نصب ہے "اغراء" کے طور پر کہ تم یہ ظاہری رنگ سے اپنے بچوں کو رنگتے ہو یہ بیکار ہے، دین اسلام کو قبول کر کے اللہ تعالیٰ کے تقرب کا رنگ حاصل کرو۔

وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللهِ صِبْغَةً : میں استفہام انکاری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رنگ سے بہتر کوئی اور رنگ نہیں۔

وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ: اور ہم اسی کی عبادت کرنے والے ہیں۔ ہم اسی کی وحدانیت کے قائل ہیں ہم اسی کے مطیع ہیں۔ ہم ملت ابراہیمی کی تابعداری کرنے والے ہیں۔ ہم اسی ذات کے سامنے اپنے آپ کو عاجز تصور کرتے ہیں ہمیں حضرت ابرہیم علیہ السلام کے دین کی تابعداری میں سکون حاصل ہے۔ (از روح المعانی)

فائدہ جلیلہ : صوفیاء کرام اولیاء عظام رنگ چڑھانے کے بیان کو خوب انداز میں بیان کر کے خوب رنگ چڑھاتے ہیں۔

حضرت مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں۔

رنگ کیلئے چند چیزیں چاہئیں، رنگ بنانے والا، رنگ جمانے والا، رنگ قبول کرنے والا، دین اسلام رنگ ہے جو کارخانہء قدرت میں تیار ہوا، رب نے تیار کیا، حضور ﷺ نے وہ رنگ جمایا، مسلمانوں کے دل ودماغ اور ظاہر وباطن نے قبول کیا، اور عبادت اور ریاضت نے اس میں جلا دی اور پالش کی۔

اللہ کا رنگ پہلے بندوں کے دل پر چڑھتا ہے۔ اور پھر اس کا اثر ہر ادا پر ظاہر ہوتا ہے، اور یہ میخانہ طیبہ سے بٹتا ہے، اسی رنگ نے نہ معلوم کیسے کیسے کیا کیا کر دیا۔

مولانا رومی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

رنگہائے نیک از خمّ صفا است　　　رنگ زشتاں از سیاہ آب جفا است

صبغۃ اللّٰہ نام آں رنگ لطیف　　　لعنۃ اللّٰہ بوئے آں رنگ کثیف

اچھے رنگ صاف مٹکے سے حاصل ہوتے ہیں　　　برے رنگ جفا کے سیاہ پانی سے حاصل ہوتے ہیں

اسی لطیف رنگ کا نام صبغۃ اللہ ہے　　،　　کثیف رنگ کی بو کا نام لعنۃ اللہ ہے

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہی کہ حضور کی صحبت پاک سے بعض حضرات کے ظاہری رنگ بھی بدل گئے۔ کالے تھے گورے ہو گئے، حبشی تھے رومی ہو گئے۔

حکایت: مثنوی شریف میں ہے کہ ایک جنگل میں لشکر اسلام پیاسا تھا، کسی کافر کا غلام پانی کے مشکیزرے اونٹ پر لادے ہوئے اپنے مولیٰ کے پاس جا رہا تھا۔

نبی کریم ﷺ کے حکم سے اسے روک کر اس کے مشکیزوں سے سارے لشکر کو پانی پلا دیا گیا، اور لشکر کے مشکیزے بھر دئے گئے، لیکن غلام کا پانی اتنا ہی رہا۔ حضور علیہ السلام نے اس کالے غلام کو سینہ سے لگا کر فرمایا کہ جا۔

اللہ جانے اسے ایک آن (لحہ) میں کیا دے دیا وہ نہایت حسین وجمیل خوبصورت جوان ہو گیا۔ جب وہ اپنے مولیٰ کے پاس پہنچا تو وہ اسے نہ پہچان سکا اور کہنے لگا تو کون ہے؟ اور میرا غلام کہاں گیا؟ وہ بولا کہ میں ہی تیرا غلام ہوں۔ مولیٰ نے کہا وہ کالا تو گورا وہ حبشی تو رومی۔ اس نے جواب دیا۔

صدر را دیدم و بدرے گشتہ ام | صاحب فضلے و قدرے گشتہ ام
صبغۃ اللہ ہست رنگ خم او | بشتہا یک رنگ گردد اندر او

یعنی میں تھا تو حبشی ہی مگر کچھ دیر صدر نبوت کے پاس بیٹھ کر بدر (چودھویں کا چاند) بن گیا، اور میری عزت وقدر بڑھ گئی۔ اس کے پاس اللہ کے رنگ کی ایک ماٹ تھی، جس میں غوطہ دے کر رنگ برنگوں کو یک رنگ بناتا تھا، اور بے رنگوں کو رنگ برنگا، اس ماٹ کے رنگ سے کوئی صدیق بن گیا، کوئی فاروق، کوئی ذوالنورین، کوئی حیدر کرار۔

اس غلام کے طفیل اللہ ہم پر بھی وہ رنگ چڑھادے، جو ذریعہ بخشش بن جائے۔ (نعیمی)

﴿قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ﴾ (آیت ۱۳۹)

۱) تم فرماؤ کیا اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو، حالانکہ وہ ہمارا بھی مالک اور تمہارا بھی اور ہماری کرنی ہمارے ساتھ اور تمہاری کرنی تمہارے ساتھ اور ہم نرے اسکے ہیں۔

۲) تم فرماؤ کیا تم جھگڑا کرتے ہو ہمارے ساتھ اللہ کے بارے میں، حالانکہ وہی ہمارا رب ہے اور تمہارا رب ہے اور ہمارے لئے ہمارے عمل ہیں، اور تمہارے لئے تمہارے عمل ہیں، اور ہم اسی کے لئے مخلص ہیں۔

شانِ نزول:

۱) نبی کریم ﷺ کی نبوت کو اہل کتاب نے تسلیم نہ کیا بلکہ حسد سے جل گئے، اور کہنے لگے۔ "الانبیاء کلهم منا فلو کنت نبیا لکنت منا فنزلت" کہ تمام انبیاء کرام ہم میں سے تشریف لائے یعنی تمام انبیاء کرام حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد سے آئے، لیکن تم اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے آئے ہو، للہذا تم نبی نہیں ہوسکتے اگر تم نبی ہوتے تو تم بھی اسحاق علیہ السلام کی اولاد سے ہوتے۔

انکی اس حجت بازی اور جاننے کے باوجود انکار کرنے پر رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا۔

۲) یہود و نصاریٰ یہ دعوی کرتے تھے کہ دین حق یہودیت اور نصرانیت ہے۔ اور ہمیں ہی جنت میں داخل کرنے کی لئے خاص کیا گیا ہے اور ہدایت پر صرف ہم ہی ہیں۔

تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی کہ صرف تمہارا دعوی تو کافی نہیں اگر اللہ نے فرمایا ہوتا کہ جنت کا حقدار صرف میں نے ان لوگوں کو بنایا ہے۔ اور حق راہ پر صرف یہی ہیں۔ تو کسی حد تک تمہارا دعوی سچا ہوسکتا تھا، لیکن یہاں تو معاملہ الٹ ہے۔ تمہاری شریعتیں منسوخ ہوچکی ہیں۔ اب تو صرف نبی کریم ﷺ کی شریعت کی تابعداری کی جاسکتی ہے۔ اس کی تابعداری حق راہ ہے۔ (از روح المعانی)

﴿قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ﴾

فرمادیجئے کیا تم جھگڑا کرتے ہو ہمارے ساتھ اللہ کے بارے میں حالانکہ وہی ہمارا رب ہے اور تمہارا رب ہے، اور ہمارے عمل ہمارے لئے ہیں اور تمہارے عمل تمہارے لئے ہیں۔

"فمعنی الآية قل لهم يا محمد" "قل" سے خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے کہ تم فرمادو اے محمد کیا تم دعوی کرتے ہو کہ تم اللہ کی اولاد ہو! کیا تم دعوی کرتے ہو کہ تم اللہ کے محبوب ہو! کیا تم دعوی کرتے ہو کہ تم پہلے دین پر قائم ہو، تمہارے یہ دعوے کہ حق پر تم ہی ہو سب باطل ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ اسی نے اسحاق علیہ السلام کی اولاد سے نبی بنائے، اسی نے حضرت محمد ﷺ کو اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے نبی بنایا، اسی نے نبی کریم ﷺ کی امت کو تمام امتوں سے افضل بنایا۔

لہٰذا تمہیں ہمارے ساتھ جھگڑا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر تمہیں کوئی طاقت ہے تو رب تعالیٰ سے پوچھ لو کہ اے اللہ تو نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ہونے کے باوجود نبی کیوں بنایا۔ اور رب تعالیٰ سے یہ پوچھ لو کہ ہمارے ہوتے ہوئے حضرت محمد ﷺ کی امت کا مرتبہ بلند کیوں کیا، لیکن افسوس تمہیں معلوم نہیں کہ وہ "هو يفعل مايريد" (وہ جو ارادہ کرتا ہے وہی کرتا ہے) ذات ہے۔ (ماخوذ از قرطبی)

وَنَحۡنُ لَهٗ مُخۡلِصُوۡنَ : (اور ہم اسی کے مخلص ہیں) یعنی ہم صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت خلوص سے کرتے ہیں، ہم کسی اور کو معبود ہی نہیں مانتے، جب کسی کو معبود ہی نہیں مانتے تو کسی اور کی عبادت کرنے یا کسی اور کی عبادت کرنے میں خلوص رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اسی سے یہود ونصاریٰ کا رد بھی ہوگیا" **ولم تخلصوا انتم فیکف تدعون ما نحن اولی بہ منکم** " کہ تم رب تعالیٰ کی عبادت میں خلوص تو رکھتے نہیں، عزیر علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانتے ہو۔ پھر تمہارا یہ دعویٰ کیسے صحیح ہے کہ تم ہم سے بہتر ہو، اور اللہ کے محبوب ہو، ہم تم سے بہتر نہیں ہو سکتے، تمہارے یہ سب دعوے باطل ہیں۔

" **والاخلاص حقیقتہ تصفیہ الفعل عن ملاحظۃ المخلوقین** " اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کوئی کام کرنا جس میں مخلوق کو دکھانا مقصود نہ ہو، خالق کی مرضی کے خلاف مخلوق کو راضی کرنا مقصود نہ ہو، اسی کو اخلاص کہا جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا" **یا ایھا الناس اخلصوا اعمالکم للہ تعالیٰ فان اللہ تعالیٰ لا یقبل الا ما خلص لہ** " اے لوگو اپنے اعمال صرف اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے خلوص سے کرو، بے شک اللہ تعالیٰ ان کو اعمال قبول نہیں فرماتا جن میں خلوص نہ پایا جائے۔

ایک اور روایت میں ذکر ہے کہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں۔

" **سألت جبریل عن الاخلاص ما ھو ؟ فقال سألت رب العزۃ عنہ فقال سر من اسراری استودعتہ قلب من احببتہ من عبادی** "

میں نے جبریل سے اخلاص کے متعلق پوچھا کہ اخلاص کیا ہے؟ انہوں نے کہا میں نے رب تعالیٰ سے اخلاص کے متعلق پوچھا تو رب تعالیٰ نے فرمایا وہ میرے رازوں میں سے ایک راز ہے، اپنے بندوں میں سے جسے میں پسند کرتا ہوں اس کے دل میں وہ راز ودیعت (امانت) رکھتا ہوں۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

" **الاخلاص ان لاتشرک فی دینہ ولا ترائی احدا فی عملہ** "

اخلاص یہ ہے کہ رب تعالیٰ کے دین میں اس کا کوئی شریک نہ ٹھہرایا جائے اور اپنے اعمال کسی کو نہ دکھاؤ۔

حضرت فضیل رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

" ترک العمل من اجل الناس ریاء اوالعمل من اجل الناس شرک والاخلاص ان یعافیک اللہ تعالی منھما "

عمل کو لوگوں کے لئے ریاء کاری کے طور پر چھوڑنا، یا کوئی کام لوگوں کے لئے کرنا شرک ہے۔ اوران دونوں سے رب تمہیں بچائے تو یہ اخلاص ہے۔یعنی صرف لوگوں کے دکھلاوے کیلئے برے اعمال سے بچنا اوراچھے اعمال کرنا شرک ہے، کیونکہ رب تعالیٰ کے اوامر ونواہی میں لوگوں کی رضامندی یاان کی ناراضگی کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔اخلاص تو یہ ہے کہ ہر کام میں صرف رب تعالیٰ کی رضاء پائی جاتے۔

حضرت حذیفہ مرعشی کہتے ہیں۔

" ان تستوی افعال العبد فی الباطن والظاھر " اخلاص یہ ہے کہ انسان کے ظاہری اور باطنی عمل ایک جیسے ہوں۔یعنی جس طرح ظاہر عمل میں خلوص ہو اسی طرح باطن میں بھی خلوص ہو۔

سہل نے کہا " ھوالافلاس و معناہ احتقار العمل وھو معنی قول رویم ، ارتفاع عملک عن الرؤیۃ "

کہ اخلاص درحقیقت افلاس ہے،یعنی انسان اپنے اعمال کو کم سمجھے،اوراپنے آپ کو اعمال کی کمی کی وجہ سے مفلس سمجھے۔یہی معنی رویم کے قول کا ہے کہ اخلاص یہ ہے کہ تمہارے اعمال دکھائی کم دیں، لیکن حقیقت میں وہ زیادہ ہوں، بلند مرتبہ رکھتے ہوں۔

اخلاص کے مقابل ریاء ہے۔سلیمان دارانی بیان فرماتے ہیں کہ ریاء کی تین علامتیں ہیں۔

" الکسل عندالعبادۃ فی الوحدۃ ، والنشاط فی الکثرۃ ، وحب الثناء علی العمل "

جب اکیلے عبادت کرے تو سستی سے کام لے،اور جب بہت لوگوں کے سامنے عبادت کرے تو چستی دکھائے،اور یہ خواہش رکھے کہ لوگ میرے اعمال کی تعریف کریں۔

(ماخوذ از قرطبی و روح المعانی)

عظمت قرآن : جہاں آیۃ کریمہ کی ابتداء میں ﴿ قُوْلُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ﴾ الخ، کہا ہے، اس آیۃ کے اختتام میں ﴿ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴾ ذکر کیا ہے۔ یعنی رب تعالیٰ کی طرف سے گویا کہا گیا ہے کہ تم کہو، ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، اور جو انبیاء کرام پر نازل ہوا اس پر ایمان رکھتے ہیں، اور ہم رب تعالیٰ کے فرمانبردار ہیں۔ اسی کے اوامر ونواہی کو تسلیم کرنے والے اور اسی کے سامنے گردن جھکانے والے ہیں۔

اور جہاں ﴿ صِبْغَةَ اللّٰهِ ﴾ کہا ہے۔ وہاں، ﴿ وَنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴾ ذکر فرمایا ہے، کہ ہم نے تو اللہ کے دین کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگ لیا ہے۔ اس رنگ سے بہتر اور کوئی رنگ نہیں اور ہم اللہ تعالیٰ کی ہی عبادت کرنے والے ہیں یعنی جہاں کوئی لفظ مناسب ہوا اسی مقام پر اسے رکھا۔

اور اس آیۃ کریمہ میں ذکر فرمایا ﴿ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ﴾ اور وہ ہمارا رب ہے اور تمہارا رب ہے۔

اور فرمایا ﴿ وَلَنَا اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ﴾ اور ہمارے عمل ہمارے لئے ہیں اور تمہارے عمل تمہارے لئے ہیں۔

یعنی کوئی شخص یہ دعویٰ نہ کرے کہ رب تعالیٰ کی رحمت میرے لئے ہی خاص ہے۔ رب تعالیٰ جسے چاہے اپنی رحمت سے نواز دے بلکہ اے یہود ونصاریٰ ہمارے اعمال رب تعالیٰ کے اوامر ونواہی کے مطابق ہیں۔ جو اعمال صالحہ اور اعمال حسنہ ہیں، لیکن تمہارے اعمال رب تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہیں، اس لئے وہ ہمیں ہمارے اچھے اعمال کے مطابق اپنی رحمت سے اجر عظیم عطا فرمائے گا، اور تمہیں تمہارے اعمال کے مطابق عذاب دے گا۔

اور اس کی وجہ اس لئے بھی واضح ہے کہ ﴿ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴾ ہم اس کے لئے مخلص ہیں۔
(از روح المعانی)

قرآن پاک کی یہی عظمت اور یہی اعجاز ہے، اسی لئے کوئی شخص قرآن پاک کی مثل کوئی نہ لا سکا۔

☆☆☆

﴿اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ط قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ط وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ط وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ (آیت ۱۴۰)

۱) بلکہ تم یوں کہتے ہو کہ ابراہیم واسماعیل واسحاق ویعقوب اور ان کے بیٹے یہودی یا نصرانی تھے، تم فرماؤ کیا تمہیں۔علم زیادہ ہے یا اللہ کو اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جس کے پاس اللہ کی طرف کی گواہی ہو وہ اسے چھپائے اور خدا تمہارے کوتکوں سے بے خبر نہیں۔

۲) کیا تم کہتے ہو کہ بیشک ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کے بیٹے یہودی تھے یا نصرانی (اے محبوب) تم فرمادو کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ، اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جو چھپاتا ہے اس گواہی کو جو اس کے پاس ہے اللہ کی طرف سے اور نہیں ہے اللہ غافل اس چیز سے جو تم عمل کرتے ہو۔

شانِ نزول:

یہود نے کہا حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب اور ان کے بیٹے یہودی تھے۔اور نصرانیوں نے کہا یہ سب نصرانی تھے۔یہ یہود ونصاری اپنے دعوی میں جھوٹے تھے، کیونکہ " انما حدثت اليهودية والنصرانية بعدهم " یہودیت اور نصرانیت تو ان کے بعد ایجاد ہوئی۔

﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ﴾ (التوبة ۳۰)

اور یہودی بولے عزیر اللہ کا بیٹا ہے، اور نصرانی بولے مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔

یہ ان کی من گھڑت یہودیت اور نصرانیت تھی، جو بعد کی ایجاد تھی، جس سے ان بزرگ ہستیوں کو دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

﴿ ماکان ابراھیم یھودیا ولا نصرانیا ولکن کان حنیفا مسلما وما کان من المشرکین ﴾ (آل عمران ٦٧)

ابراہیم نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی بلکہ ہر باطل سے جدا مسلمان تھے، اور مشرکوں سے نہ تھے۔

اور رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَآ اُنۡزِلَتِ التَّوۡرٰۃُ وَالۡاِنۡجِیۡلُ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِہٖ ﴾ (آلِ عمران ٦٥) توراۃ اور انجیل نہ اتری مگر ان کے بعد۔

تو اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے باطل دعویٰ کو رد کرنے کے لئے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا کہ اے محبوب آپ ان سے فرما دو کیا تم زیادہ علم رکھتے ہو یا کہ اللہ تعالیٰ۔

جب اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے نہ نصرانی تھے۔ تو یقیناً اسی ذات کبریاء کا فرمان سچا ہے تم جھوٹے ہو۔ ام تقولون، میں اَم متصلہ ہے اور ہمزہ استفہام کا ہم معنی ہے اور استفہام انکار کے لئے ہے اس صورت میں معنی ہوگا کیا تم کہتے ہو۔ یعنی تمہیں نہیں کہنا چاہئے۔ (راقم کا ترجمہ اس کے مطابق ہے) یا ام منقطعہ ہو یعنی بل کے معنی میں ہو اس صورت میں معنی ہوگا بلکہ تم کہتے ہو۔ (اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اس کے مطابق ہے) (از خازن و روح المعانی)

استفہام انکاری سے غرض زجر و توبیخ ہے:

نبی کریم ﷺ کی نبوت جب کثیر اور عظیم معجزات سے ثابت ہے اور آپ نے یہود و نصاریٰ کے جھوٹے ہونے کی خبر دی " فثبت لا محالة کذبهم " تو جب اصدق الصادقین نے ان کے جھوٹے ہونے کی خبر دی تو ان کا جھوٹا ہونا یقیناً ثابت ہو گیا۔

اور توراۃ و انجیل نے بھی خبر دی کہ " ان الانبیاء علی التوحید والحنیفیة " انبیاء کرام توحید اور دین حنیف پر قائم تھے۔ توراۃ و انجیل کی اس خبر سے بھی ان کا جھوٹا ہونا ثابت ہو گیا۔

توراۃ اور انجیل جب نازل ہی ان انبیاء کرام کے بعد ہوئیں، تو ان کا یہودی اور نصرانی ہونا کیسے ثابت ہوسکتا ہے؟ جبکہ یہودیت اور نصرانیت کی موجودہ صورت تو توراۃ اور انجیل کی تحریف کے بعد ہوئی۔

اور ان لوگوں کا دعویٰ بغیر دلیل کے تھا۔ لہٰذا "وبخهم الله على ذلك بهذه الوجوه" ان وجوہ کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے ان کو توبیخ (ڈانٹ، ڈپٹ) کی اسی وجہ سے استفہام انکاری ذکر کیا جس سے غرض ان کو زجر و توبیخ کرنا تھا۔ (از کبیر)

قُلْ ءَ اَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ : "فمعناه ان الله اعلم وخبره اصدق" مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ زیادہ جانتا ہے اور اس کی خبر سچی ہے۔ اس نے توراۃ اور انجیل میں ذکر فرما دیا اور قرآن پاک میں ذکر فرمایا نبی کریم ﷺ کے ذریعے ان کو بتا دیا "انهم كانوا مسلمين مبرئين عن اليهودية والنصرانية" کہ بے شک یہ انبیاء کرام رب تعالیٰ کے مطیع و فرمانبردار تھے۔ اسلام پر قائم تھے۔ رب تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کرنے والے تھے۔ یہودیت اور نصرانیت سے پاک تھے۔ (از کبیر)

﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس شخص کے پاس گواہی ہو۔ وہ اسے چھپا دے تو اس سے بڑھ کر اور کوئی شخص ظالم نہیں ہوسکتا۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ کی توحید اور دین حنیف پر قائم رہنے، اور یہودیت اور نصرانیت سے بری ہونے کی خبر دی، رب تعالیٰ کی اس شہادت کو چھپانے والے اہل کتاب بہت بڑے ظالم ہیں۔ "اومنا لو كتمنا هذه الشهادة" اگر بالفرض ہم بھی اس شہادت کو چھپائیں تو ہم سے بھی بڑھ کر کوئی شخص ظالم نہیں ہو سکے گا۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کی عدولی کرنے والا ہر شخص ظالم ہے خواہ اہل کتاب سے ہو، یا مؤمنین سے ہو۔ "وفيه تعريض بكتمانهم شهادة الله لمحمد ﷺ بالنبوة فى كتبهم"

اس میں اشارۃً یہ بھی بتا دیا کہ اہل کتاب اس لئے بھی بہت بڑے ظالم تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی کتب میں نبی کریم ﷺ کی نبوت کو بیان فرمایا، اور آپ کے اوصاف بیان فرمائے، لیکن ان ظالموں نے مالک الملک کی اس شہادت کو بھی چھپا دیا۔ (از بیضاوی)

وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ : اورنہیں ہے اللہ غافل اس سے جوتم عمل کرتے ہو۔

اس میں کامل طور پر وعید پائی گئی ہے۔ کیونکہ جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ ہر ظاہر اور ہر چھپی ہوئی چیز کو جانتا ہے۔اس پر کوئی چیز مخفی نہیں،اوراس نے ہر کام پر جزا دینی ہے۔

" ان خیرا فخیر و ان شرا فشر "اگراچھا عمل ہوا تو اچھی جزا عطاء فرمائے گا۔اوراگر برا عمل ہوا تو اس کے مطابق عذاب عطاء کرے گا۔

جب یہ کسی کو علم ہو جائے تو وہ ایک آنکھ جھپکنے کے برابر بھی اللہ تعالیٰ کے خوف سے اپنے آپ کو دور نہیں کرسکتا۔ جب ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ بادشاہ کی طرف سے جولوگ کسی کام پر مقرر ہوں جب انہیں معلوم ہوا کہ بادشاہ ہمیں دیکھ رہا ہے تو وہ حکم بجالانے میں کوتاہی نہیں کرتے ،انکے دل میں ہر وقت خوف طاری رہتا ہے۔تو یقیناً انسان کو اگر عقل حاصل ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے بے خوف نہیں ہوسکتا۔

(از کبیر)

﴿تِلْکَ اُمَّۃٌ قَدْ خَلَتْ ج لَھَا مَا کَسَبَتْ وَلَکُمْ مَا کَسَبْتُمْ ج وَلَاتُسْئَلُوْنَ عَمَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ﴾ (آیت ۱۴۱)

۱) وہ ایک گروہ ہے کہ گذر گیا،ان کے لئے ان کی کمائی اورتمہارے لئے تمہاری کمائی اوران کے کاموں کی تم سے پرسش نہیں ہوگی۔

۲) وہ ایک گروہ ہے جو گذر گیا،ان کے لئے جوانہوں نے کسب کیا،اورتمہارے لئے جوتم نے کسب کیا،اورتم سے نہیں پوچھا جائے گا،جووہ عمل کرتے ہیں۔

" تِلْکَ " کا اشارہ،حضرت ابراہیم علیہ السلام اوراس کے بعد مذکور آپ کے بیٹوں کی طرف ہے،یعنی حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہم السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام اوران کے بیٹے دنیا سے تشریف لے گئے ہیں ان کے اعمال کی جزاء ان کو حاصل ہوگی ،اورتمہارے اعمال کی جزاءتم کو حاصل ہوگی،تم سے ان کی اعمال کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا۔

یعنی ہر انسان کو اس کے اعمال کی جزا دی جائے گی ،قیامت کے دن ہر انسان سے اس کے

اعمال کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ کسی دوسرے کے اعمال کے متعلق سوال نہیں ہوگا۔

اس آیۃ کریمہ میں یہود کے لئے وعظ بھی ہے اور زجر بھی ہے اور ہر اس شخص کو نصیحت اور زجر ہے جو خود کوئی نیکی کے عمل نہ کرے اور یہ کہے مجھے نماز اور روزہ کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ مجھے ایمان کی بھی ضرورت نہیں، کیونکہ میرے آباء واجداد بہت بڑی فضیلت کے مالک تھے، ان کے نیک اعمال کی وجہ سے مجھے بخش دیا جائے گا اور مجھے عذاب نہیں دیا جائے گا۔

ایسے لوگ جو صرف اپنے آباء کے اعمال پر بھروسہ کرتے ہوئے جان بوجھ کر فرائض کے تارک ہوتے ہیں، اور حرمات کے مرتکب ہوتے ہیں ان کو سمجھایا گیا ہے۔ " **لاتتکلوا علی فضل الآباء فکل یؤخذ بعمله** " اپنے آباء کی فضیلت پر بھروسہ نہ کرو، ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق مؤاخذہ ہوگا۔

یہ آیۃ کریمہ قریب ہی پہلے گزر چکی ہے، لیکن جب حجت کے مقامات مختلف ہوں، مجادلہ مختلف ہو تو دلائل کو دوبارہ ذکر کرنے میں تاکید پائی جاتی ہے۔ اور نصیحت کو دوبارہ ذکر کرنا مفید اور مستحسن ہوتا ہے۔

خصوصاً یہود کو پھر سے متنبہ کیا گیا، کہ نبی کریم ﷺ پر ایمان نہ لا کر اس گھمنڈ میں نہ رہو کہ ہمارے آباء واجداد انبیاء کرام تھے جو بڑی فضیلت والے تھے وہ ہمیں رب سے بخشوا لیں گے۔

یہ دعویٰ تمہارا غلط ہے مصطفیٰ کریم ﷺ سے پھرنے والے کو کسی نبی کے دامن میں پناہ نہیں ملے گی۔
(ماخوذ از خازن بزیادۃ)

اور احتمال یہ بھی ہے کہ آیۃ کریمہ میں مضمون کے لحاظ پر تکرار نہ ہو، بلکہ پہلی آیۃ میں خطاب یہود کو ہو اور اس میں خطاب ہمیں ہو کہ ہمیں ان کی اقتداء سے ڈرایا گیا ہو۔

اور ایک احتمال یہ ہے کہ پہلی آیۃ میں "امة "مراد انبیاء کرام ہوں، اور اس آیۃ میں مراد یہود کے اسلاف ہوں کہ انہوں نے ''حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹوں کو یہودی کہا تھا''، یعنی انہوں نے کہا کہ وہ ہمارے طریقہ پر تھے تو رب تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ یہود کے اسلاف گزر گئے ان کے اعمال ان کے لئے تھے اور اے موجودہ یہود یو تمہارے عمل تمہارے لئے ہیں، تم ایمان لے آؤ، اپنے آباء واجداد کی طرح کجروی (ٹیڑھی چال) اختیار نہ کرو۔ (از روح المعانی)

تنبیہ: قرآن وحدیث سے واضح ہو چکا ہے کہ کسی کو دوسرے کے عمل میں سے حصہ نہیں دیا جائے گا، ہاں یہ بات ممکن ہے کہ ایک کے عمل سے دوسرے کو فائدہ یا نقصان پہنچ جائے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ﴾

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ایمان میں ان کی پیروی کی ان کی اولاد کو ہم ان کے ساتھ تو ملا دیں گے اور ان کے عمل میں سے کوئی کمی بھی نہیں کریں گے۔

مذکورہ آیۃ میں ایمان والوں کے عمل سے ان کی مؤمن اولاد کو فائدہ پہنچنے کا بیان ہے۔

نیز ﴿ وَمَا اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ﴾ (اور ان کے عمل میں کوئی کمی نہیں کریں گے) سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مؤمن اولاد اپنے والدین کے عمل میں حصہ دار نہیں ہوگی ہاں اسے ان کے عمل کا فائدہ ضرور پہنچے گا۔

حدیث مبارک ہے۔

" قال رسول الله ﷺ من سن فی الاسلام سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها من بعده من غیر ان ینقص من اجورهم شیٔ ومن سن فی الاسلام سنة سیئة کان علیه وزرها ووزر من عمل بها من بعده من غیر ان ینقص من اوزارهم شیٔ "

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ نکالا اسے اس کا اجر ملے گا، اور اس شخص کا اجر بھی اسے ملے گا جس نے بعد میں اس پر عمل کیا بغیر اس کے کہ دوسرے شخص کے اجر میں کمی کی جائے۔ اور جس نے اسلام میں کوئی برا طریقہ نکالا تو اس پر اس کا گناہ ہوگا اور اس شخص کا گناہ بھی اسے ملے گا جس نے بعد میں وہ برا کام کیا، ہاں دوسرے شخص کے گناہ میں کچھ کمی نہ آئے گی۔

اس حدیث مبارک میں بھی کسی کے عمل سے دوسرے کو فائدہ یا نقصان پہنچنے کا ذکر ہے۔ یہ نہیں کہ کوئی شخص کسی کے عمل میں سے حصہ پائے گا۔

(وما علینا الا البلاغ المبین)

(از تبیان للعلامہ السید احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ کثیرۃ)

نجوم الفرقان

من تفسیر آیات القرآن

از رشحات قلم

حضرت علامہ مولانا

عبدالرزاق بھترالوی ہزاروی

ناشر

ضیاء العلوم پبلی کیشنز راولپنڈی پاکستان

کتاب لاریب کی توضیحات وتشریحات، علوم عقلیہ ونقلیہ کی روشنی میں
علمی وتحقیقی ذوق رکھنے والوں کے لئے قدیم وجدید احکامات ومسائل پر ابحاث کا حسین مرقع
تفسیر القرآن بالقرآن، ارشادات نبویہ، اقوال صحابہ، تحقیقات اسلاف اور روایات صحیحہ پر مشتمل تفسیر

مسمّٰی بہ

نجوم الفرقان

جلد چہارم

سورۃ البقرہ آیات 142 تا 195

از رشحات قلم

محقق اہلسنت
استاذ العلماء حضرت علامہ مولانا
عبد الرزاق بھترالوی حطاروی
مدظلہ العالی

ناشر ضیاء العلوم پبلی کیشنز راولپنڈی پاکستان

اشاعتی ضابطہ

نام کتاب: نجوم الفرقان من تفسیر آیات القرآن

تصنیف: علامہ مولانا عبد الرزاق چشتی بھترالوی

کمپوزنگ: ضیاء العلوم کمپوزنگ سنٹر سیٹلائیٹ ٹاؤن راولپنڈی

کمپیوٹر گرافکس: قاضی محمد یعقوب چشتی، اظہر اقبال اعوان

ضخامت: $\frac{20 \times 30}{8}$ 864 صفحات

پروف ریڈنگ: اظہر اقبال ملک

بار طبع: اوّل دسمبر 2006ء

قیمت: =/240 روپے

ناشر: سید شہاب الدین شاہ

ضیاء العلوم پبلی کیشنز راولپنڈی پاکستان

رابطہ: 0333- 5166587 - Fax 051-4580404
Email:ziauloom@isb.paknet.com.pk

پیش لفظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ

أما بعد ! خالق کائنات جل جلالہ نے اپنے پیارے حبیب ﷺ کی نسبتِ جلیلہ کا صدقہ اس اُمت کو جوابدی پیغام قرآن مجید فرقانِ حمید کی صورت میں انعام فرمایا وہ بے مثال کلام ہے۔ یہ عظیم معجزہ ہونے کے ساتھ ساتھ علم و معرفت کا بحر زخار ہے۔ اس بحر بے کنار میں جس نے بھی نیک نیتی سے غوطہ لگایا نئے موتی نکال کر لایا۔ اس کے دُرہائے یگانہ غیر متناہی ہیں۔ نہ ختم ہونیوالے اس سلسلہ کو اُمت مسلمہ کے کاملین نے ہر دور میں اپنائے رکھا اور آئندہ آنیوالی نسلوں کے لئے حکمت و دانش کے عظیم باب رقم فرماتے رہے۔

بـاب مـديـنـة العلم حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عظمت قرآنی اور اس کے رموز و دقائق کے دُرہائے بے بہا اور نہ ختم ہونے والی حقیقتوں کے متعلق مرفوعاً روایت فرمائی ہے۔

" قال اما انی سمعت رسول الله ﷺ يقول الا انها ستكون فتنة قلت ما المخرج منها يا رسول الله ؟ قال كتاب الله ، فيه نبأ ما قبلكم و خبرما بعدكم و حكم ما بينكم ، هو الفصل ليس بالهزل ، من تركه من جبار قصمه الله ومن ابتغى الهدى فى غيره اضله الله ، وهو حبل الله المتين ، وهو الذكر الحكيم ، وهو الصراط المستقيم ، هو الذى لا تزيغ به الأهواء ولا تلبس به الألسنة ، ولا يشبع منه العلماء ، ولا يخلق عن كثرة الرد ، ولا ينقضى عجائبه هو الذى لم تنتبه الجنُّ اذا سمعته حتى قالوا انا سمعنا قرانا عجبًا يهدى الى الرشد فامنا به من قال به صدق ، ومن عمل به اجر ، ومن حكم به عدل ، ومن عاد اليه هدى الى صراط مستقيم . "

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خبردار میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے آپ فرماتے تھے خبردار بے شک یہ قصہ عنقریب فتنہ بنے گا۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ

اس کے نکلنے کی جگہ کوئی ہوگی۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ کی کتاب؛ کیونکہ اس میں تم سے پہلے اور بعد والی امتوں کی خبریں ہیں۔ اور تمہارے درمیان جو حوادث ہیں ان کا بھی فیصلہ ہے۔ یہ قرآن حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والا ہے۔ جس نے اس کو کسی جبار کی وجہ سے چھوڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ اس کو توڑ دے گا۔ اور جس نے اس کے غیر میں ہدایت کو تلاش کیا اللہ نے اس کو گمراہ کر دیا۔ کیونکہ یہ اللہ کی مضبوط رسی ہے۔ یہ ذکر، حکم اور صراط مستقیم ہے۔ یہ وہ کلام ہے کہ اہل ہواء اس کی تبدیلی پر قادر نہیں ہیں۔ اس کی وجہ سے زبانوں پر التباس نہیں آتا۔ اس سے علماء سیر نہیں ہوتے۔ اس کی قرأت کی تکرار بار بار لوٹاتے، قرأت کی لذت دوسروں سے سننے کی وجہ سے زائل نہیں ہوتی، کیونکہ اس کے عجائب ختم نہیں ہوتے، یہ وہ چیز ہے کہ جنوں نے جب اس کو سنا تو تو اس پر بلا توقف کہا کہ: ہم نے تعجب میں ڈالنے والے قرآن کو سنا ہے، جو بھلائی کی طرف ہدایت دیتا ہے، ہم اس پر ایمان لائے۔ جس نے اس کے ساتھ کلام کیا وہ سچا ہوا، اور جس نے اس پر عمل کیا اس کو اجر دیا گیا، اور جس نے اس کے ساتھ فیصلہ کیا اس نے عدل کیا، جس نے اس کی طرف بلایا اس کو صراط مستقیم کی طرف ہدایت دی گئی۔

حضرت امام شعرانی اپنی مشہور زمانہ تصنیف ''الیواقیت والجواہر'' میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا وہ ارشاد گرامی نقل کرتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر سورۂ فاتحہ شریف کی تفسیر لکھوں تو اس ایک چھوٹی سورت کے رموز کی تفسیر کا حجم اونٹوں کا بوجھ بن جائے مگر پھر بھی فاتحہ شریف کے رموز باقی رہیں گے۔

تاہم جس نے بھی اپنی فکر و دانش کو غالب کر کے قرآن مجید کے مفاہیم کو بیان کرنے کی کوشش کی اس کیلئے '' من قال فی القرآن برأیه فقد أخطأ '' کے مصداق خائب و خاسر ہونا ہی نصیبہ بنا ہے۔

استاذ العلماء حضرت مولانا عبدالرزاق چشتی بھترالوی کہنہ مشق، نہایت محنتی اور فاضل مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ زود نویس اور سہل نگاری کے بھی جامع ہیں۔ آپ ان خوش نصیبوں میں سے ہیں جنہیں قسام ازل نے پیارے حبیب لبیب ﷺ کی نسبت صدقہ خدمت دین کی سعادت رفیق

فرمائی ہے۔

اللہ تعالیٰ جل مجدہ نے علامہ موصوف کو اسلام کی خدمت اور بالخصوص قرآن وسنت کے مفاہیم اور مطالبِ عالیہ کو قلم وقرطاس کے ذریعہ سہل انداز میں پیش کر کے عامۃ الناس کو بہرہ مند کرنے کا بہترین ملکہ ودیعت فرمایا ہے۔

حضرت مولانا فطری اور طبعی طور پر تدریسی شعبے سے متعلق ہیں۔ علمی خانوادے کا چشم و چراغ ہونے کے ناطے معقولات ومنقولات میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ زندگی کا بیشتر حصہ اسی نہج پر راہ نوردی کرتے گزار دی ہے۔ آپ کے تلامذہ میں سے کئی محقق علماء اپنے علم و تحقیق کا لوہا منوا چکے ہیں۔

درس وتدریس سے متعلق آدمی کے لئے آسان پیرائے میں لکھنا کافی مشکل کام ہوتا ہے؛ کیونکہ ایسے شخص کو...... جو ہمہ وقت فنی اصطلاحات اور علمی محاورات بولنے اور کہنے کا عادی ہو.... مشکل تراکیب کو ترک کرنا قدرے دشوار ہوتا ہے۔ مگر مولانا موصوف اپنی تحریر میں پختگی زود نویسی کے ساتھ عامۃ الناس کے فہم وادراک کا بھی پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔

آپ کے قلم سے کئی علمی شہپارے منصۂ شہود پر آ چکے ہیں، اہل علم اور قدردان عامۃ الناس کے ہاں قبولیت کا شرف پا چکے ہیں۔ میرے خیال میں آپ کی تصنیفات میں بالخصوص نصابی کتب کی شروحات وحواشی آپ کا بہت ہی وقیع کارنامہ ہے۔ اردو خواں طبقہ کے لئے یا درمیانے درجے کے خطباء کے لئے اردو کتابیں ہی بڑا سرمایا ہیں۔ ایسی کتابوں کی مقبولیت مصنف کے لئے حوصلہ افزائی کا باعث ضرور بنتی ہے لیکن وہ پائیدار فائدہ جس سے قابل علماء ومدرسین پیدا ہوتے ہیں وہ درسی کتابوں کا فہم وادراک ہی ہے۔

مولانا موصوف کی تصانیف میں عام قاری اور زیر تعلیم طلباء کے لئے ہی نہیں بلکہ ایک استاد کی سہولت کے لئے کافی علمی مواد موجود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی عربی تصنیفات کو اہل علم کے ہاں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ چند سال پہلے مجھے ساؤتھ افریقہ جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک علمی مجلس میں انڈیا سے تشریف لائے ہوئے ایک عالم دین سے ملاقات ہوئی۔ جب انہیں یہ علم ہوا کہ میرا تعلق

جامعہ رضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی پاکستان سے ہے تو بڑی خوشی کا اظہار فرمایا اور بتایا کہ حضرت مولانا عبدالرزاق چشتی بھترالوی کا نورالایضاح پر عربی حاشیہ ہمارے ہاں بڑا مقبول ہے۔اس حاشیہ وتوضیح کو اہل علم نے بڑا پسند کیا ہے۔

حضرت علامہ بھترالوی کا انداز تحریر انتہائی سادہ اور عام فہم ہے۔آپ قلم برداشتہ لکھنے کے عادی ہیں۔ادبی موشگافیوں کی طرف کم ہی توجہ دیتے ہیں۔تاہم مسائل ومفاہیم کا تذکرہ کرتے وقت اسلاف کرام کا تتبع کرتے ہوئے کوئی پہلوتشنہ چھوڑنے کو عار سمجھتے ہیں۔آپ کی تحریر کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ درس نظامی کے باذوق طلباء کو دورِ اسلاف کا کوئی عظیم مدرس سبق پڑھا رہا ہے اور کتاب کی عبارت کے مالھا اور ماعلیہا سے کوئی بھی نکتہ چھوڑنا نہیں چاہتا۔

حضرت مولانا ایک طویل مدت تک جامعہ رضویہ ضیاء العلوم کے تدریسی شعبہ میں عظیم الشان خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔اس طویل عرصہ میں ہم نے آپ کو انتہائی محب اور شفیق پایا۔آپ کی ہمہ جہت شخصیت میں اور خوبیوں کے علاوہ ایک خوبی یہ بھی ہے کہ آپ وقت کی قدر کو جانتے ہیں۔اور ضیاع وقت اور اسکے نقصانات کا انہیں بھرپور احساس ہے۔اس لئے اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کرتے۔تدریسی خدمت بھی بہت محنت اور محبت سے انجام دیتے ہیں، بلکہ طلباء پر شفقت کرتے ہوئے ادارہ کے مقررہ تعلیمی وقت سے زائد اضافی اسباق پڑھاتے ہیں۔یہ استاد کی شفقت اور اپنے تلامذہ سے انتہائی محبت کی علامت ہے کہ زانوئے تلمذ طے کرنے والے طلباء کی تعلیم وتربیت شفقت ومحبت سے انجام دے۔

زیرنظر تصنیف قرآن مجید فرقانِ حمید کی تفسیر کا مقدمہ اور سورۃ فاتحہ کی تفسیر جو کہ حضرت مولانا کی تدریسی وعلمی تحقیقات کا پرتو اور مظہر ہے۔اگرچہ میں اس کا پورے طور پر مطالعہ نہیں کر پایا تاہم چند ایک مقامات سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔دیکھ اور پڑھ کر دل سے دعا نکلتی ہے۔ **اللّٰھم زد فزد۔**

تفسیر کو دیکھ کر جو تأثر قائم ہوا ہے وہ یہ کہ حضرت علامہ کی زندگی درس وتدریس کرتے گزری ہے۔طلباء وعلماء کو پڑھانے،سمجھانے،ان کے ذوق طبع کے مطابق انداز بیاں اور حسب استعداد طرز تکلم اپنانے کا سلیقہ ومہارت ہے۔اور دوسری طرف فقہی مسائل ومعاملات سے متعلق فتاوٰی کی ذمہ داری

بھی ایک عرصہ سے نباہ رہے ہیں جس کے باعث عامۃ الناس کو درپیش مسائل اوران کے افہام وتفہیم کا تجربہ بھی رکھتے ہیں۔ بایں ہمہ دارالحکومت اسلام آباد میں امامت وخطابت کی سرکاری ذمہ داری کے باعث دورِ جدید کی ضروریات، جدت پسند طبقہ کی مذہبی وفکری ترجیحات ورجحانات اور ذہنی ارتقاء وتنزل سے بخوبی واقف ہیں۔ لہٰذا آپ کی تحریر میں ہر طبقہ کے لوگوں کی علمی تشفی کا ساماں ہے۔ البتہ آپ کی حیات پر تدریسی رنگ غالب ہونے کی وجہ سے آپ کی اس تصنیف میں بھی تشریح وتوضیحات کے ضمن میں یہی تدریسی ذوق غالب نظر آتا ہے۔

اسلاف کرام کی محبت ومودت میں راسخ ہیں۔ اختلاف آراء کی بھول بھلیوں میں بھی اسلاف کرام کی تحقیقات انیقہ سے اکتساب فیض کرنے کو اپنے لئے سعادت گردانتے ہیں۔ انتہائی خلیق طبیعت کے مالک ہیں۔ جی میں آئی بات کو کہہ گزرنے میں باک نہیں رکھتے۔

حضرت علامہ کا تعلق جس علمی خانوادے سے ہے وہ اپنی عظیم تاریخ اور روشن ماضی کے اعتبار سے انتہائی اعلیٰ اقدار کا حامل ہے۔ عصر حاضر کی ہمہ ہمی میں کئی ایک سلف صالحین کے راہِ حق کو خیر باد کہہ چکے ہیں مگر آپ کے پائے ثبات میں کوئی لغزش نہ آئی۔ یہ آپ کی ثابت قدمی کا ہی مظہر ہے کہ تنہا آپ نے تحریری میدان میں وہ کام کر دکھایا جو ایک پوری جماعت کے لئے بھی مشکل نظر آتا ہے۔

حق گوئی وبے باکی کے ساتھ ساتھ مولانا جب بھی اپنے مذہبی ومسلکی مخالفین کو مخاطب کرتے ہیں یا کسی اختلافی مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہیں تو اسلامی واخلاقی اقدار کا بھرپور خیال رکھتے ہوئے انتہائی شستہ انداز میں مخاطب کرتے ہیں۔ اور اصلاح وتبلیغ کے جذبہ سے سرشار ہو کر مخالفین اوران کے پیروکاروں کو راہِ خطر سے محفوظ کرنے کا تہیہ کئے نظر آتے ہیں۔

دعا: اے ارحم الراحمین! اے اجیب دعوۃ الداع اذا دعان کی شان والے رب! تیرے جود وسخا کے مظہر، تیری رحمتوں کی بھرن عطا کرنے والے حبیب لبیب ﷺ نے تیری یہ شان ہمیں بتائی ہے کہ تو اپنے منگتوں کو خالی دامن نہیں لوٹاتا۔ اپنے سائل کو خالی ہاتھ لوٹاتے ہوئے تجھے حیا آتی ہے۔

الٰہی! تیری اسی کریمی کا واسطہ دے کر التجا کرتا ہوں کہ میری اس دعا کو شرف قبولیت سے نواز!

''مولائے کریم حضرت مولانا کے علم وعمل میں برکتیں عطا فرما۔ان کی اس تصنیف کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں اپنی خصوصی نصرت عطا فرما۔ ان کے فیضان علمی کو اور زیادہ وسعتیں دے۔ان کی ذریت نسبی وحسبی کو ان کا حقیقی متبع بنا۔ہم سب کو اپنے پیارے حبیب ﷺ کی حقیقی محبت سے آشنا فرما اور اسی میں زندہ رکھ اور اسی محبت میں ہمارا خاتمہ فرما۔''

ایں دعائے من واز جملہ جہاں آمین باد

ان دعوات صالحہ اور ہدیہ تحسین کے ساتھ حضرت مولانا موصوف بلکہ ہر پائیدار، نفع بخش اور محنت طلب کام میں مصروف بزرگ کو مشورہ پیش کرتا ہوں کہ کئی دفعہ معاصرانہ چشمک سے پیدا ہونے والے مرض تحاسد یا ناپختہ اذہان کی کج بحثی فروعی وغیر ضروری ابحاث کے گرداب میں پھنسا کر دانستہ یا نادانستہ طور پر مقاصد عالیہ کی راہ سے برگشتہ کر لیتے ہیں۔مقصد رفیع کی خاطر ان سے تغافل برتنا ضروری ہے وگرنہ اصلی مقصود پیش نظر رہنے کی بجائے ''شخصیت'' مقصد بن جاتی ہے۔لہٰذا خیر خواہی اسی میں ہے کہ ایسے جذبات انگیز موقع پر نہایت صبر وتحمل سے کام لیتے ہوئے " والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس "اور " اذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما "کو مشعل راہ بنایا جائے۔
وصلی اللہ تعالٰی علی خیر خلقہ محمد و علی آلہ واصحابہ اجمعین

ابوالخیر حسین الدین غفرلہ (مہتمم وشیخ الحدیث)

جامعہ رضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی پاکستان

﴿سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِی كَانُوا عَلَيْهَا قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِی مَنْ يَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾

۱) ''اب کہیں گے بیوقوف لوگ کس نے پھیر دیا مسلمانوں کو ان کے اس قبلہ سے جس پر تھے تم فرمادو کہ پورب پچھم سب اللہ ہی کا ہے جسے چاہے سیدھی راہ چلاتا ہے''۔

۲) ''عنقریب کہیں گے بیوقوف لوگ کس نے پھیر دیا ان کو ان کے اس قبلہ سے جس پر وہ تھے تم فرمادو اللہ کے لئے ہی ہے مشرق اور مغرب ہدایت دیتا ہے جسے چاہے سیدھی راہ کی''۔

شان نزول: نبی کریم ﷺ جب مکہ مکرمہ میں تھے تو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا فرماتے لیکن کعبہ شریف بھی آپ کے سامنے ہوتا۔ لیکن مدینہ طیبہ میں جب آپ تشریف لائے تو بیت المقدس ہی کی طرف متوجہ ہونے کا رب تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا۔ مدینہ طیبہ میں چونکہ کعبہ شریف جنوبی جانب ہے اور بیت المقدس شمالی جانب ہے وہاں ممکن نہ تھا کہ بیت المقدس کی جانب توجہ کرنے سے کعبہ شریف بھی سامنے ہو۔

سولہ سترہ ماہ تو آپ بیت المقدس کی طرف متوجہ ہو کر نماز ادا فرماتے رہے لیکن آپ کی دلی تمنا تھی کہ جدامجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ کعبہ شریف ہی ہمارا قبلہ بھی ہو جائے تو آپ کو کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کا حکم دے دیا گیا۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے تحویل قبلہ سے پہلے ہی اس آیۃ کریمہ کو نازل فرما کر نبی کریم ﷺ کو تسلی دے دی کہ یہود، منافقین اور مشرکین جو بیوقوف لوگ ہیں وہ آپ کو طعنہ دیں گے کہ قبلہ سے تمہیں کس چیز نے پھیر دیا ہے لیکن آپ اطمینان قلب سے ان کو جواب دینا کہ رب تعالیٰ نے ہی بیت المقدس کو قبلہ بنایا تھا اسی نے اب کعبہ کو قبلہ بنا دیا ہے وہی ہر چیز کا مالک ہے، وہی مشرق و مغرب کا مالک ہے، وہ جس سمت کو چاہے قبلہ بنا دے، ہم تو صرف اس کے حکم کو تسلیم کرنے والے ہیں اس کی ذات پر کوئی اعتراض

کرنے والے نہیں۔

﴿ سَیَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ ﴾ ''عنقریب کہیں گے بے وقوف لوگ''

ان الفاظ مبارکہ میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ اگر چہ ﴿ سیقول ﴾ مستقبل کا صیغہ ہے لیکن ماضی کے معنی میں استعمال ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے '' الرجل یعمل عملا فیطعن فیه بعض اعدائه '' فلاں شخص کے کام پر اس کے دشمنوں نے اسے طعنہ دیا۔ اس قول کے مطابق قبلہ کے بدل جانے اور بیوقوفوں کے طعنہ کے بعد اس آیۃ کا نزول ہوا۔ مجازی طور پر معنی یہ ہوگا '' بے وقوف لوگوں نے کہا ان کو قبلہ سے کس چیز نے پھیر دیا ''۔

لیکن دوسرا احتمال قوی ہے راقم نے بھی اس کے مطابق شان نزول ذکر کیا ہے دوسرا احتمال یہ ہے

'' ان الله تعالیٰ اخبر عنهم قبل ان ذکروا هذا الکلام انهم سیذکرونه ''

کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو پہلے نازل کر کے یہ خبر دے دی کہ وہ اس قسم کا کلام کریں گے یہی احتمال قوی ہے اس میں کئی فوائد پائے گئے ہیں۔

پہلا فائدہ: جب نبی کریم ﷺ نے واقعہ سے پہلے خبر دے دی کہ بے وقوف یہ کہیں گے انہوں نے وہی کہا '' کان هذا اخبارا عن الغیب فیکون معجزا '' تو یہ نبی کریم ﷺ کی غیبی خبر ہوگئی جو آپ کا معجزہ ہے سبحان اللہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے نبی کریم ﷺ کے علم غیب کو آپ کا معجزہ کہا ہے۔

پھر یہ بھی واضح کر دیا کہ رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل کر کے آپ کو پہلے علم عطا کر دیا جو آپ کا علم غیب ہے اسی سے ان لوگوں کا رد ہو گیا جو کہتے ہیں کہ جو رب تعالیٰ بتادے وہ غیب نہیں رہتا کاش کہ رب تعالیٰ ان کو علم عطا فرمادے اور حق سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

دوسرا فائدہ: رب تعالیٰ نے جب پہلے ہی آپ کو بتا دیا کہ بیوقوف اس قسم کا کلام کریں گے تو نبی کریم ﷺ کو علم حاصل ہو گیا جب آپ نے ان سے وہی سنا جس کی آپ کو خبر دے دی گئی تھی۔ '' فانه یکون تاذیه من هذا الکلام اقل مما اذا سمعه منهم اولا '' تو آپ کو سن کر زیادہ تکلیف نہ ہوئی اگر آپ ان سے اچانک سنتے تو یقیناً آپ کو بہت تکلیف ہوتی۔

تیسرا فائدہ: اللہ تعالیٰ نے ان کے کلام کرنے سے پہلے ہی آپ کو خبر دے دی اور ساتھ ساتھ

جواب بھی ذکر کر دیا تو جب انہوں نے طعنہ زنی کی تو حضور علیہ السلام نے ان کو فوراً جواب دے دیا۔ نبی کریم علیہ السلام چونکہ رب تعالیٰ کے ارشادِ گرامی کے منتظر رہتے تھے اس لئے پہلے بتا دینا بہتر تھا بنسبت اس کے کہ آپ جواب کا انتظار فرماتے کہ رب تعالیٰ کیا حکم فرماتا ہے۔ (از کبیر)

﴿اَلسُّفَهَآءُ﴾ کا ذکر پہلے ﴿كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ﴾ کی وضاحت میں ہو چکا ہے تاہم "فان من لا یمیز بین ماله وعلیه" جو شخص نفع نقصان میں فرق نہ کر سکے وہ بیوقوف ہے "ویعدل عن طریق منافعه الی ما یضره" جو شخص نفع مند چیزوں کو چھوڑ کر نقصان دہ چیزوں کے درپے ہو جائے وہ بیوقوف ہے "یوصف بالخفة والسفه" کم عقل کو سفیہ (بے وقوف) کہا جاتا ہے۔

اور یہ بھی خیال رکھا جائے کہ جو شخص دنیا کے معاملہ میں نقصان دہ راہ کو اختیار کرے جب اسے سفیہ (بیوقوف) کہا جاتا ہے تو یقیناً دین میں نقصان دہ راہ کو اختیار کرنا بہت بڑی بیوقوفی ہے کیونکہ "ولاشک ان الخطأ فی باب الدین اعظم مضرة منه فی باب الدنیا" اس میں کوئی شک نہیں کہ دین میں غلط راہ کو اختیار کرنا بہت زیادہ نقصان دہ ہے بنسبت دنیا میں غلط راہ پر چلنے کے۔ (از کبیر)

اَلسُّفَهَآءُ سے مراد کون لوگ ہیں؟

"قال ابن عباس ومجاهد هم الیهود" حضرت ابن عباس اور مجاہد رضی اللہ عنہم نے کہا اس سے مراد یہود ہیں اس لئے کہ جب نبی کریم علیہ السلام بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے تھے تو وہ لوگ یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ ابھی یہ نبی ہمارے قبلہ کی موافقت کر رہے ہیں آہستہ آہستہ مکمل طور پر ہمارے دین کی تابعداری کریں گے جب قبلہ شریف کے تبدیل کرنے کا حکم نافذ ہو گیا تو ان کو غم لاحق ہو گیا نبی کریم علیہ السلام سے اپنے آپ کو مکمل دور سمجھنے لگ گئے ان بیوقوفوں نے تحویل قبلہ پر ہی اعتراض کرنا شروع کر دیا جس کی خبر رب تعالیٰ نے پہلے ہی دے دی۔

وہ کہنے لگے کہ یہ شخص اپنے آباء کے دین کی طرف لوٹ گیا اور ان کے دین کا مشتاق ہو گیا اگر ہمارے قبلہ پر ثابت رہتا تو ہمیں معلوم ہوتا "انه الرسول المنتظر المبشر به فی التوراة" کہ بیشک یہ وہی رسول ہے جس کی انتظار کی جا رہی تھی اور جس کی آمد کی بشارت کی خبر توراۃ میں دی گئی۔

" وقال ابن عباس والبراء بن عازب والحسن والاصم انهم مشر کوا العرب "
حضرت ابن عباس اور براء بن عازب اوراصم رضی اللہ عنہم کا ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد مشرکین عرب ہیں۔ اس لئے کہ جب نبی کریم ﷺ مکہ مکرمہ میں رہتے ہوئے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے تو وہ لوگ اسے ناپسند کرتے اور اس سے تکلیف محسوس کرتے اور جب مدینہ طیبہ میں بیت المقدس سے پھر کر کعبہ شریف کی طرف متوجہ ہونے کا حکم ہوا تو وہ کہنے لگے کہ اب محمد ہمارے دین کی طرف لوٹ آئے ہیں۔

" ولو ثبت علیه لکان اولی به " اگر وہ اس پر ثابت رہے تو یہ ان کے لئے بہتر ہے۔
لیکن وہ بیوقوف بھی یہ کہہ رہے تھے کہ پہلے بیت المقدس کی طرف منہ کیوں کیا تھا اب کعبہ کی طرف منہ کیوں کیا ہے اس طرح کے ان کے لغویات کی خبر رب تعالیٰ نے پہلے ہی دے دی " وثالثها انهم المنافقون وهو قول السدی " اور تیسرا قول اس میں سدی رحمہ اللہ کا ہے کہ اس سے مراد منافقین ہیں وہ استہزاء (مزاح) کے طور پر قبلہ کے تبدیل کرنے پر اعتراض کرتے تھے کیونکہ وہ قبلہ کے بدلنے کی حکمت سے بے خبر تھے وہ کہہ رہے تھے کہ یہ قبلہ کی تبدیلی بے مقصد ہے اور فقط رائے اور خواہشات پر مبنی ہے اس آیۃ کریمہ میں بھی ﴿اَلسُّفَهَآءُ﴾ سے مراد منافقین ہی ہیں اور ﴿ اَلَا اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴾ میں بھی منافقین کو ہی بیوقوف کہا گیا ہے۔

تمام اقوال کا جامع قول:

" ورابعها انه یدخل فیه الکل " چوتھا قول یہ ہے کہ اس آیۃ کریمہ میں ﴿ اَلسُّفَهَآءُ ﴾ سے مراد یہود و مشرکین اور منافقین تمام ہی مراد ہیں یہی قول زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس میں تمام اقوال سمٹ کر آ جاتے ہیں اور وجہ یہ بھی واضح ہے کہ اس مقام میں سیاق و سباق (پہلے اور بعد کلام) سے بھی کوئی تخصیص نہیں اس لئے ﴿ اَلسُّفَهَآءُ ﴾ سے مراد عموم ہے اور اس پر الف لام بھی استغراقی ہے جو عموم پر دلالت کر رہا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ " فلا کافر الا سفیه " کوئی کافر ایسا نہیں جو بے وقوف نہ ہو ہر کافر ہی بیوقوف ہے اور رب تعالیٰ نے ملت ابراہیمی سے اعراض کرنے والے تمام

لوگوں کو ہی بے وقوف کہا ہے۔

﴿ وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرَاهِيْمَ اِلَّا مَنْ سفه نَفْسه ﴾

لہٰذا اس آیۃ میں " فوجب ان يتناول الكل " ضروری ہے کہ السفہاء سے مراد یہود مشرکین اور منافقین تمام ہی ہوں عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ تمام ہی مراد لئے جائیں۔

" لان الاعداء مجبولون على القدح والطعن فاذا وجدوا مجالا لم يتركوا مقالا البتة " کیونکہ دشمنوں کا کام ہی یہ ہے وہ عیب لگائیں اور طعنہ دیں اس لئے وہ کوئی موقع اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے جب موقع ملا طعنہ زنی شروع کردی۔ (از بیر)

﴿ ماولّٰهم عن قبلتهم الّتي كانوا عليها ﴾

" کس چیز نے پھیر دیا ہے ان کو ان کے اس قبلہ سے جس پر وہ تھے "

" ما " استفہام کے لئے ہے جو استہزاء اور تعجب کے لئے وہ استعمال کرتے تھے یعنی کفار نے مسلمانوں پر عیب لگاتے ہوئے مزاح اڑاتے ہوئے کہا تمہیں قبلہ سے کس چیز نے پھیر دیا ہے۔ (از کبیر)

قبلہ کو قبلہ کہنے کی وجہ:

قبلہ اس جہت کو کہتے ہیں جس کا انسان استقبال کرے اور یہ " مقابلہ " سے لیا ہوا ہے " وانما سميت القبلة قبلة لان المصلى يقابلها وتقابله " قبلہ کا نام اسی وجہ سے قبلہ رکھا گیا ہے کہ نمازی اس کے مقابل ہوتا ہے اور وہ نمازی کے مقابل ہوتا ہے۔

اور قطرب نے یہ کہا ہے کہ عرب حضرات اس معنی میں بھی قبلہ کا استعمال کرتے ہیں۔

" ليس لفلان قبلة اى ليس له جهة يأوى اليها " فلاں شخص کا قبلہ ہی نہیں یعنی اسے کسی جہت پر قرار نہیں قبلہ کو استقبال سے بھی ماخوذ کرتے ہیں جب دو شخص ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوں تو کہا جاتا ہے "فكل واحد منهما قبلة للآخر " ہر ایک، ایک دوسرے کا استقبال کر رہا ہے اور بعض محدثین نے کہا:

جعلت مأواک لی قرارا	وقبلة حيثما لجأت
تمہارا ٹھکانا میرے لئے قرار ہے	اور جہاں بھی جائے پناہ کی ضرورت ہو وہی میرا قبلہ ہے

﴿ قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ﴾ ''فرما دیجئے اللہ کے لئے ہی مشرق اور مغرب ہے''

یعنی سب جہات اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں کوئی جہت بھی ذاتی طور پر قبلہ بننے کی مستحق نہیں " بل انما تصیر قبلة لان الله تعالیٰ جعلها قبلة " بلکہ قبلہ تو وہی ہوتا ہے جسے رب تعالیٰ قبلہ بنا دے لہٰذا رب تعالیٰ جسے چاہے قبلہ بنا دے ہر جہت اس کی مملوک ہے ہر چیز پر وہ قادر ہے اس سے سوال نہیں کیا جا سکتا تو کیا کر رہا ہے اس لئے ایک جہت سے قبلہ کو پھیر کر دوسری جہت کو قبلہ بنا دے تو اس پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ (از کبیر)

﴿ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ ''ہدایت دیتا ہے جسے چاہے سیدھی راہ کی''

" وهو ما ترتضيه الحكمة وتقتضيه المصلحة من التوجه الى بيت المقدس والكعبة اخرى" رب تعالیٰ کی حکمت کے مطابق ہے اور مصلحت کا تقاضا ہے کہ اس نے جب بیت المقدس کو قبلہ مقرر کرنے میں حکمت سمجھی اسے قبلہ بنا دیا اور جب کعبہ شریف کو قبلہ مقرر کرنے میں حکمت سمجھی اسے قبلہ بنا دیا۔ بھلا کون سا انسان ہے جو رب تعالیٰ کے علم سے مقابلہ کر سکے۔ (ماخوذ از بیضاوی)

☆☆☆☆☆

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِىْ كُنْتَ عَلَيْهَا اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ

۱) ''اور بات یوں ہی ہے کہ ہم نے تمہیں کیا سب امتوں میں افضل کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ اور اے محبوب تم پہلے جس قبلہ پر تھے ہم نے وہ اس لئے مقرر کیا تھا کہ دیکھیں کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کوئی الٹے پاؤں پھر جاتا ہے اور بیشک یہ بھاری تھی مگر ان پر جنہیں اللہ نے ہدایت کی۔ اور اللہ کی شان نہیں کہ تمہارا ایمان اکارت کرے بیشک اللہ آدمیوں پر بہت مہربان رحم والا ہے''۔

۲) ''اور اسی طرح بنایا ہم نے تمہیں افضل امت، کہ تم لوگوں پر گواہ بنو۔ اور ہوں یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ اور نہیں بنایا ہم نے قبلہ جس پر تم تھے سوائے اس کے کہ ہم آزمائیں کون تابعداری کرتا ہے رسول کی اور کون پھر جاتا ہے الٹے پاؤں اور بیشک یہ بھاری تھی سوائے ان لوگوں کے جن کو اللہ نے ہدایت دی اور نہیں اللہ تعالیٰ ضائع کرتا تمہاری نمازوں کو بیشک اللہ لوگوں پر بہت مہربان، رحم کرنے والا ہے''۔

شان نزول : یہود وغیرہ جو قبلہ شریف کے تبدیل ہونے پر مسلمانوں کو طعنہ دے رہے تھے کہ کس چیز نے تمہیں قبلہ سے پھیر دیا ہے تو ان کو ایک اور جواب دینے کے لئے آیۃ کریمہ کو نازل کیا کہ قبلہ شریف کو بدلنے میں درحقیقت لوگوں کی آزمائش مقصود تھی کہ کون لوگ رسول اللہ ﷺ کی تابعداری کرتے ہیں اور کون الٹے پاؤں پھر جاتے ہیں۔

اور اس آیۃ کریمہ میں نبی کریم ﷺ کی امت کی افضلیت کو بھی بیان کر دیا گیا۔ اور مسلمانوں کی اس پریشانی کو بھی دور کر دیا گیا کہ جو لوگ قبلہ کے تبدیل ہونے سے پہلے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں ادا کرتے رہے کیا ان کی نمازیں ضائع تو نہیں ہوئیں تو ان کو ﴿ وما کان اللہ لیضیع ایمانکم ﴾ سے جواب دے دیا گیا جس کا ذکر انشاء اللہ آگے آرہا ہے۔

﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا ﴾ "اور اسی طرح ہم نے بنایا تمہیں افضل امت"

﴿ كَذٰلِكَ ﴾ کا اشارہ ہے پہلی آیۃ کے مفہوم کی طرف، یعنی جس طرح ہم نے تمہیں ہدایت دی سیدھی راہ کی۔ اسی طرح ہم نے تمہیں افضل بنایا۔

یا اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہم نے تمہارا قبلہ تمام قبلوں سے افضل بنایا اسی طرح ہم نے تمہیں تمام امتوں سے افضل امت بنایا۔

﴿ وسطا ﴾ " ای خیارا او عدولا " یعنی وسط کا معنی بہتر اور افضل ہے اگرچہ لغوی معنی کے لحاظ پر درمیان میں جو چیز واقع ہوا سے "وسط" کہا جاتا ہے لیکن یہاں صفت ہے امت کی جس کا معنی "خیر" ہے کیونکہ دوسری آیۃ کریمہ سے اس معنی کو تائید حاصل ہے رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ ﴾ "تم بہتر امت ہو"

اور وسط کا معنی عادل ہونا بھی ہے ترمذی شریف میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے " عن النبی ﷺ انہ فسر وسطا فی ھذہ الآیۃ بقولہ عدلا " کہ نبی کریم ﷺ نے اس آیۃ کریمہ میں " وسطا " کی تفسیر عادل ہونے سے فرمائی ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے تمہیں عادل امت بنایا اور معنی یہ ہے " مزکین بالعلم والعمل " کہ ہم نے تمہیں پاکیزہ بنایا کہ علم اور اچھے اعمال عطا کئے۔

یعنی گناہوں اور جہالت کی میل کچیل سے پاکیزہ بنایا اور علمی فضیلت عطاء کی اور اچھے اعمال سے مزین کیا " ولا شک ان من کان مزکی بالعلم والعمل جامعا بینھما یکون

خیرا وعدلا " یقینی بات ہے جو شخص علم اور اچھے اعمال کی وجہ سے پاکیزگی حاصل کر لیتا ہے وہ بہتر بھی ہوتا ہے اور عادل بھی ہوتا ہے اور تمام اچھی خصلتیں حاصل ہوتی ہیں جو افراط وتفریط (زیادتی اور کمی) کے درمیان پائی جاتی ہیں جیسا کہ جود ان کو حاصل ہے جو بخل اور اسراف کے درمیان پایا جاتا ہے اور شجاعت ان کو حاصل ہے جو بزدلی اور بلاوجہ کسی پر زیادتی کرنے کے درمیان میں ہے۔

فائدہ: انسان کی ترکیب میں تین قوتیں رکھی گئی ہیں ایک مبدأ ادراک حقائق، دوسری مبدأ وجوب منافع اور تیسری عظیم ہولناک کاموں پر مبدأ اقدام اور گناہوں سے بچنے کا شوق۔

پہلی قوت کا نام ہے قوت نطقیہ جب اس میں اعتدال پایا جائے تو اس سے حاصل ہونے والی قوت کا نام ہے حکمت۔

دوسری قوت کا نام ہے قوت شہویہ۔ جب اس میں اعتدال پایا جائے تو اس سے حاصل ہونے والی قوت کو عفت کہا جاتا ہے۔

تیسری قوت غضبیہ ہے جب اس میں اعتدال پایا جائے تو اس سے حاصل ہونے والی قوت کو شجاعت کہا جاتا ہے۔ یہ تین خصلتیں یعنی حکمت اور عفت اور شجاعت تمام اچھے کاموں کے لئے اصل ہیں باقی تمام کیفیات اور اچھی عادات ان کے اوپر متفرع ہیں اور یہ تینوں کیفیات افراط اور تفریط کے درمیان ہیں افراط اور تفریط دونوں رذیل (گھٹیا) ہیں اور درمیانی کیفیت ہی بہتر ہے۔

حکمت: یہ وہ کیفیت اور قوت ہے جو انسان کو طاقت بشریہ کے مطابق حقائق کی معرفت حاصل ہو اور اس میں افراط کو "جربزہ" کہا جاتا ہے افراط یہ ہے کہ فکر کو ان چیزوں میں استعمال کیا جائے جن میں استعمال نہیں کرنا چاہئے جیسے آیات متشبہات۔

اور اس میں تفریط کو "غباوۃ" کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں قوت فکریہ کو مکمل طور پر معطل رکھا جاتا ہے یعنی اس سے کوئی کام نہیں لیا جاتا۔

شجاعت: انسان کو درندگی والی ایک قوت حاصل ہے اگر اسے حکمت اور علم اور صحیح سمجھداری کے مطابق استعمال کیا جائے تو اسے شجاعت کہا جاتا ہے اور اگر اس میں افراط (زیادتی) پائی جائے تو اسے "تہور" کہا جاتا ہے یہ جیسا کہ " الاقدام علی مالا ینبغی " یعنی نامناسب چیزوں کی طرف

قدم بڑھانا۔ اوراس میں تفریط کو''جبانۃ'' کہا جاتا ہے یعنی بزدلی سے کام لینا۔

عفت : انسان کو چوپاؤں والی قوت شہویہ حاصل ہے اگر انسان اسے معتدل طور پر اپنے کام میں لائے اور حکمت کے مطابق اس سے کام لے یعنی وہ شریعت کے مطابق ہو تو اسے عفت کہا جاتا ہے اور اگر حد سے بڑھ جائے تو اسے ''خلاعۃ'' کہا جاتا ہے یعنی ایسی لذات اور خواہشات میں منہمک ہو جانا (کامل ان میں مبتلاء ہو جانا) جو شریعت کے خلاف ہو۔ اوراس میں تفریط کو''جمود'' کہا جاتا ہے یعنی جن لذات اور خواہشات کے حاصل کرنے کی عقلاً اور نقلاً اجازت ہو یعنی شریعت اجازت دے اور عقل بھی جائز سمجھے پھر ان سے دور رہنا۔

نتیجہ واضح ہوا " ان الاوساط فضائل والاطراف رذائل " درمیانی صورت فضیلت والی ہے اور دونوں طرفیں یعنی افراط اور تفریط گھٹیا کیفیتیں ہیں۔ جب یہ تینوں چیزیں انسان کو حاصل ہو جائیں یعنی حکمت اور عفت اور شجاعت تو انسان کو خود بخود عدالت حاصل ہو جاتی ہے اسی لئے " وسطا " کی تفسیر " عدولا " سے کی گئی ہے۔ (بیضاوی و شیخ زادہ)

تنبیہ: اگرچہ " وسطا " کی تفسیر ''خیرا'' سے بھی کی گئی ہے اور " عدولا " سے بھی لیکن " خیرا " سے تفسیر زیادہ بہتر ہے جس میں چند وجوہ پائی گئی ہیں:

ایک وجہ تو یہ ہے کہ ''وسط'' خیر کے معنی میں جمادات میں بھی استعمال ہے لیکن ''وسط'' عادل کے معنی میں جمادات میں استعمال نہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ''وسط'' کو خیر کے معنی میں استعمال کیا جائے تو دوسری آیۃ کریمہ ﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ ﴾ کی مطابقت حاصل ہو جائے گی۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ عام محاورہ میں بھی ''وسط'' خیر کے معنی میں زیادہ استعمال ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے " فلان اوسطنا نسبا " اس کا معنی مراد لیا جاتا ہے " انه اکثر فضلا " کہ بیشک وہ زیادہ فضیلت رکھنے والا ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے " هذا وسط فیهم کواسطة القلادة " یہ ان میں ایسے افضل ہے جیسے ہار کو فضیلت حاصل ہوتی ہے ''وسط'' کو اس لئے بھی افضل کہا جاتا ہے کہ رئیس کے

اردگرد اس کے متبعین گھیرا بنا کر بیٹھتے ہیں اور وہ وسط میں ہوتا ہے اور اسے افضلیت حاصل ہوتی ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی امت افراط اور تفریط کے درمیان ہے نہ ان میں غلو ہے اور نہ ہی ان میں تقصیر پائی جاتی ہے یعنی نصرانیوں کی طرح ان میں غلو نہیں کہ نبی کو اللہ کا بیٹا مان لیا جائے یا نبی کو خدا مان لیا جائے اور نہ ہی یہودیوں کی طرح ان میں تقصیر پائی جاتی ہے جیسا کہ انہوں نے انبیاء کرام کو شہید کیا اور کتب کو تبدیل کر دیا۔ (از کبیر)

اسی آیۃ کریمہ سے معتزلہ کا رد ہو گیا:

معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کا خود خالق ہے لیکن رب تعالیٰ نے ﴿ وکذلک جعلناکم امة وسطا ﴾ ''اور اسی طرح ہم نے بنایا تمہیں افضل امت'' اس سے واضح ہوا کہ بندے کے تمام افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے " **لان هذه الآية دالة على ان عدالة هذه الامة وخيريتهم بجعل الله وخلقه** " کیونکہ اس آیۃ کریمہ سے واضح ہو رہا ہے کہ اس امت کو عدالت اور افضلیت اللہ تعالیٰ کی تخلیق سے حاصل ہے۔ (از کبیر)

اجماع امت دلیل ہے: اس مسئلہ میں جمہور اہل سنت اور معتزلہ کا اتفاق ہے کہ اجماع امت حجت (دلیل) ہے اس مسئلہ پر دلیل یہ پیش کی گئی ہے:

" اخبر الله تعالیٰ عن عدالة هذه الامة عن خيريتهم فلوا قدموا على شئى من المحظورات لما اتصفوا بالخيرية واذا ثبت انهم لا يقدمون على شئى من المحظورات وجب ان يكون قولهم حجة "

اللہ تعالیٰ نے جب اس امت کی عدالت اور خیریت وافضلیت کی خبر دی تو اگر یہ لوگ ممنوعات پر متفق ہو جائیں تو ان کی صفت خیریت سے بیان نہیں ہو سکتی جب یہ ثابت ہو گیا کہ تمام ممنوع اشیاء پر اتفاق نہیں کر سکتے تو اسی سے واضح ہو گیا کہ اجماع امت حجت ہے۔ (کبیر)

اعتراض : اس امت کے کتنے لوگ گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں نیکیوں کو چھوڑ دیتے ہیں تو یہ کس طرح افضل امت اور کس طرح ان کا اجماع حجت ہے؟

جواب : اس امت کی افضلیت کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ بنسبت یہود ونصاری کے یہ افضل ہے کہ نہ تو انہوں نے انبیاء کرام کو رب تعالیٰ کا شریک مانا اور نہ ہی خدا کا بیٹا مانا اور نہ ہی دین میں تحریف کی اور نہ ہی انبیاء کرام کو شہید کیا پھر اگر ان سے گناہ سرزد ہو جائے تو سچے دل سے توبہ کرلیں تو ان کی توبہ قبول ہو جاتی ہے۔

پھر یہ تمام کے تمام گناہ پر متفق نہیں ہو سکتے، پس اجماع امت کے حجت ہونے پر یہی دلیل کافی ہے اور اجماع امت کے حجت ہونے پر معصوم ہونا ضروری نہیں اور مجتہدین کا اجتہادی خطاء سے محفوظ ہونا بھی ضروری نہیں کیونکہ اجتہادی خطا حقیقت میں خطا نہیں۔ (از روح المعانی)

﴿ لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ﴾: "تا کہ تم لوگوں پر گواہ بن جاؤ اور رسول تم پر نگہبان و گواہ" یعنی تمہیں افضل امت بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہی دو۔

" عن عائشة رضی اللہ عنها قالت قال رسول الله ﷺ یعنی فی اهل الکتاب انهم لایحسدوننا علی شئی کما یحسدوننا علی یوم الجمعة التی هدانا الله لها وضلوا عنها وعلی القبلة التی هدانا الله لها وضلوا عنها وعلی قولنا خلف الامام آمین "(مسند احمد)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اہل کتاب ہمارے ساتھ کسی چیز میں حسد نہیں کرتے جیسا کہ وہ (تین چیزوں میں ہمارے ساتھ حسد کرتے ہیں) جمعہ کے دن پر ہمارے ساتھ حسد کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں وہ عطاء کیا اور وہ اس سے محروم رہے اور قبلہ پر وہ ہمارے ساتھ حسد کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطاء کیا اور ان کو اس سے محروم کیا اور وہ ہمارے ساتھ امام کے پیچھے آمین پڑھنے میں حسد کرتے ہیں یعنی وہ اس سے محروم ہیں۔

اور گویا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تمہارے لئے قبلہ کو تبدیل کر کے تمہیں ابراہیم علیہ السلام والا قبلہ عطاء کر دیا اور وہی تمہارے لئے اختیار فرمایا تا کہ تمہیں تمام امتوں سے افضلیت حاصل ہو اور تم لوگوں پر قیامت کے دن گواہی دو " لان الجمیع معترفون لکم بالفضل "اس لئے کہ تمام تمہاری فضیلت کے معترف ہیں۔

نبی کریم ﷺ کی امت کی گواہی پر احادیث مبارکہ:

" عن ابی سعید قال قال رسول اللہ ﷺ یدعی نوح یوم القیامة فیقال له هل بلغت فیقول نعم فیدعی قومه فیقال لهم هل بلغکم فیقولون ما اتانا من نذیر و ما اتانا من احد فیقال لنوح من یشهدلک فیقول محمد و امته "

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ نوح علیہ السلام کو قیامت کے دن بلایا جائے گا ان کو کہا جائے گا کیا تم نے تبلیغ فرمادی تھی آپ عرض کریں گے۔ ہاں (ان کو تیرا پیغام پہنچا دیا تھا) پھر آپ کی قوم کو بلایا جائے گا ان سے پوچھا جائے گا کیا تمہیں انہوں نے تبلیغ کردی تھی۔ وہ کہیں گے ہمارے پاس تو کوئی ڈرانے والا نہیں آیا اور ہمارے پاس تو کوئی ایک بھی نہیں آیا تھا۔ نوح علیہ السلام کو کہا جائیگا تمہاری گواہی کون دے گا وہ کہیں گے حضرت محمد ﷺ اور ان کی امت۔

(مسند احمد)

" عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ ﷺ یجئی النبی یوم القیامة و معه الرجلان و اکثر من ذلک فیدعی قومه فیقال لهم هل بلغکم هذا فیقولون لا فیقال له هل بلغت قومک فیقول نعم فیقال من یشهد لک فیقول محمد و امته فید عی محمد و امته فیقال لهم هل بلغ هذا قومه فیقولون نعم فیقال و ما علمکم فیقولون جاء نبینا فاخبرنا ان الرسل قد بلغوا " (مسند احمد)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن نبی آئیں گے ان کے ساتھ دو آدمی یا دو سے زیادہ ہوں گے ان کی قوم کو بلایا جائے گا ان سے پوچھا جائے گا کیا تمہیں نبی نے تبلیغ کردی تھی وہ کہیں گے نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے پوچھے گا، کیا تم نے ان کو تبلیغ کردی تھی وہ کہیں گے ہاں (اے اللہ تبلیغ کردی تھی) پھر ان کو کہا جائے گا تمہارا گواہ کون ہے وہ کہیں محمد ﷺ اور ان کی امت۔ نبی کریم ﷺ کی امت سے پوچھا جائے گا کیا اس نبی نے اپنی امت کو رب تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیا تھا؟ وہ کہیں گے ہاں انہوں نے پیغام پہنچا دیا تھا پھر ان سے پوچھا جائے گا تمہیں کیسے علم حاصل ہے وہ کہیں گے ہمارے نبی کریم ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے انہوں نے ہمیں خبر دی کہ بیشک رسولوں نے اپنی اپنی امتوں کو رب تعالیٰ کے احکام پہنچا دیئے تھے۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی۔

﴿ لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا ﴾

کا یہی مطلب ہے۔

امت مصطفی ﷺ کی گواہی کا ایک اور مطلب

نبی کریم ﷺ کی امت کے لوگ جب کسی شخص کے نیک اعمال کی گواہی دے دیں تو وہ گواہی اس کے حق میں قبول ہو جاتی ہے اور جب کسی شخص کے برے اعمال کی گواہی دے دیں تو وہ اسی طرح قبول کر لی جاتی ہے۔

عن جابر بن عبد الله قال شهد رسول الله ﷺ جنازة فی بنی مسلمة وکنت الی جانب رسول الله ﷺ فقال بعضهم والله یا رسول الله لنعم المرء کان لقد کان عفیفا مسلما وکان واثنوا علیه خیرا فقال رسول الله ﷺ انت بما تقول فقال الرجل الله اعلم بالسرائر فاما الذی بدالنا منه فذاک فقال النبی ﷺ وجبت ثم شهد جنازة فی نبی حارثة وکنت الی جنب رسول الله ﷺ فقال بعضهم یا رسول الله بئس المرء کان ان کان لفظا غلیظا فاثنوا علیه شرا فقال رسول الله ﷺ لبعضهم انت بالذی تقول فقال الرجل الله اعلم بالسرائر فاما الذی بدالنا منه فذاک فقال رسول الله ﷺ وجبت قال مصعب بن ثابت فقال لنا عند ذلک محمد بن کعب صدق رسول الله ﷺ ثم قرأ ﴿ وکذلک جعلنٰکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا ﴾ قال الحاکم هذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجاه (مستدرک حاکم)

حضرت جابر بن عبداللہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ بنی سلمہ کے جنازہ میں تشریف لے گئے اور میں نبی ﷺ کے ساتھ ہی ایک جانب تھا بعض لوگوں نے کہا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی یا رسول اللہ یہ شخص بہت پاک باز پارسا تھا، کامل مسلمان تھا، عام لوگ اس کو اچھے الفاظ سے یاد کر رہے تھے اس کی نیکیوں سے تعریف کر رہے تھے نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو فرمایا کیا واقعی یہ شخص نیک تھا؟ تو اس شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ چھپے ہوئے بھید تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے جو ہمیں ظاہر طور پر معلوم ہے وہ یہی ہے کہ یہ شخص بہت نیک تھا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "وجبت" ثابت ہو گئی (یعنی تمہاری گواہی

اس کے حق میں قبول ہوگئی جنت اس کے لئے ثابت ہوگئی) پھر آپ بنی حارثہ کے جنازہ میں تشریف لے گئے میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہی ایک جانب تھا بعض حضرات نے کہا یا رسول اللہ یہ بہت برا انسان تھا، بڑا بدمزاج بدخلق تھا ان لوگوں نے اس کی برائیوں کو ہی بیان کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان میں سے ایک شخص سے پوچھا کیا واقعی وہ ایسا ہی تھا جو تم کہہ رہے ہو تو اس شخص نے عرض کیا کہ چھپی ہوئی باتوں کو تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے لیکن ظاہر طور پر ایسا ہی تھا جیسا ہم کہہ رہے ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" وجبت " ثابت ہوگئی (یعنی تمہاری گواہی قبول ہوگئی وہ رب تعالیٰ کی گرفت میں آ گیا) مصعب بن ثابت نے کہا کہ حضرت جابر کی اس روایت کو محمد بن کعب نے بیان کرنے کے بعد فرمایا رسول اللہ کا ارشاد گرامی سچا ہے پھر انہوں نے یہی آیۃ کریمہ تلاوت کی۔ حاکم نے بیان فرمایا کہ یہ حدیث صحیح ہے اگرچہ بخاری ومسلم نے بیان نہیں فرمائی اسی سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ حدیث کے صحیح ہونے کے لئے کسی خاص کتاب میں حدیث کا واقع ہونا ضروری نہیں۔

☆ "عن ابی الاسود انه قال اتیت المدینة فوافقتها وقد وقع بها مرض فهم یموتون موتا ذریعا فجلست الی عمر بن الخطاب فمرت به جنازة فاثنی علی صاحبها خیر فقال وجبت ثم مر بأخری فاثنی علیها شر فقال عمر وجبت فقال ابو الاسود ما وجبت یا امیر المؤمنین قال قلت کما قال رسول الله ﷺ ایما مسلم شهدله اربعة بخیر ادخله الله الجنة قال فقلنا وثلاثة قال فقال وثلاثة قال فقلنا واثنان قال واثنان ثم لم نسأله عن واحد"

(مسند احمد وکذا رواه البخاری والترمذی والنسائی)

ابوالاسود کہتے ہیں کہ میں مدینہ طیبہ میں آیا وہاں اتفاقاً عام بیماری پھیلی ہوئی تھی جس کی وجہ سے لوگ جلدی جلدی فوت ہو رہے تھے میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا وہاں سے ایک جنازہ گزرا لوگوں نے اس کی خیریت کی تعریف کی یعنی اس کی خوبیاں، نیکیاں بیان کیں تو آپ نے فرمایا " وجبت " ثابت ہوگئی۔ کچھ دیر کے بعد دوسرے جنازہ کا گزر ہوا تو اس کی برائیوں کو بیان کیا گیا کہ یہ شخص تو بہت برا تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا " وجبت " ثابت ہوگئی ابوالاسود کہتے ہیں میں نے پوچھا اے امیر المؤمنین " ما وجبت " کیا چیز ثابت ہوگئی آپ نے فرمایا میں نے وہی کہا جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب کسی مسلمان کے لئے چار آدمی گواہی دے دیں کہ وہ نیک

شخص تھا تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرے گا ہم نے پوچھا اگر تین شخص گواہی دیں تو آپ نے فرمایا تین کی گواہی بھی اسی طرح قبول ہوگی ہم نے کہا اگر دو گواہی دیں تو آپ نے فرمایا دو کی گواہی بھی اسی طرح قبول ہوگی ابوالاسود کہتے ہیں کہ پھر ہم نے ایک کے متعلق سوال نہیں کیا۔

☆ " عن ابی بکر بن ابی زهیر الثقفی عن ابیه قال سمعت رسول الله ﷺ بالنباوة یقول یوشک ان تعلموا خیارکم من شرارکم قالوا بم یا رسول الله بالثناء الحسن والثناء السیئی انتم شهداء الله فی الارض " (ابن مردویه)

ابوبکر بن زہیر ثقفی اپنے باپ سے بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے لوگوں کے کلام کے انتقال کے متعلق سنا آپ ارشاد فرما رہے تھے کہ تمہیں خود ہی پتہ چل جائے گا کہ نیک لوگ کون ہیں اور برے کون صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ وہ کیسے آپ نے فرمایا اچھی تعریف سے (نیکوں کا پتہ چل جائے گا) اور بری تعریف سے (برے لوگوں کا پتہ چل جائے گا) تم لوگ زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔
(ماخوذ از ابن کثیر)

چار گواہیوں کا بیان: ایک گواہی ان فرشتوں کی ہوگی جو بندوں کے اعمال پر مقرر ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وجاءت کل نفس معها سائق وشهید ﴾ (ق ۲۱) اور ہر جان یوں حاضر ہوئی کہ اس کے ساتھ ایک ہانکنے والا اور ایک گواہ۔ یعنی گناہ گار، کفار کو ہانک کر جہنم میں لے جانے والا فرشتہ ان کے ساتھ ہوگا اور لوگوں کے اعمال کی گواہی دینے والا فرشتہ بھی ان کے ساتھ ہوگا۔ اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ ﴾ (ق ۱۸)

''کوئی بات وہ زبان سے نہیں نکالتا کہ اس کے پاس ایک محافظ تیار نہ بیٹھا ہو''

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ وَاِنَّ عَلَیْکُمْ لَحٰفِظِیْنَ کِرَامًا کَاتِبِیْنَ یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴾ (الانفطار ۱۰ تا ۱۲)

''اور بیشک تم پر کچھ نگہبان ہیں، معزز لکھنے والے، جانتے ہیں جو تم کرتے ہو''

دوسری گواہی انبیاء کرام کی ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گواہی کا ذکر فرمایا:

﴿ وَکُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ ﴾ (المائدہ ۱۱۷) اور میں ان پر گواہ رہا جب تک

میں ان میں موجود رہا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی امت کے حق میں گواہی دینے کا ذکر ان الفاظ مبارکہ سے فرمایا:

﴿ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ﴾ ''اور ہوں گے رسول تم پر گواہ و نگہبان''

تیسری گواہی امت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہوگی خصوصی طور پر یعنی یہ گواہی کسی اور امت کو حاصل نہیں ہوگی اس آیہ کریمہ میں ذکر فرمایا ﴿ لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ﴾ کہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور فرمایا ﴿ وَجِيْءَ بِالنَّبِيِّنَ وَالشُّهَدَاءِ ﴾ (الزمر ۶۹) اور لائے جائیں گے انبیاء اور یہ نبی اور اس کے امت کے ان پر گواہ ہوں گے۔

چوتھی گواہی انسان کے اعضاء کی ہوگی یہ گواہی اقرار کے درجہ میں ہوگی بلکہ اس سے بڑھ کر تعجبناک ہوگی رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴾ (النور ۲۴)

''اس دن ان پر گواہی دیں گی ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں جو کچھ وہ کرتے رہے''

(ماخود از کبیر)

﴿ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ﴾ ''اور یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ''

یہ مندرجہ بالا ترجمہ اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ہے آپ نے لفظ نگہبان زیادہ کیا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ راقم نے اپنی کتاب تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان میں تراجم کا تقابلی جائزہ پیش کرتے ہوئے یوں بیان کیا۔

☆ اور ہووے پیغمبر اوپر تمہارے گواہ	(شاہ رفیع الدین صاحب)
☆ اور رسول ہو تم پر بتانے والا	(شاہ عبدالقادر صاحب)
☆ اور پیغمبر آخر الزمان تم پر گواہ بنیں	(فتح محمد صاحب)
☆ اور ہو رسول تم پر گواہی دینے والا	(محمود الحسن صاحب)
☆ اور رسول تم پر گواہ ہو	(مودودی صاحب)
☆ اور رسول گواہ ہیں تم پر	(عبدالماجد صاحب)
☆ اور تمہارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گواہ ہو	(اشرف علی صاحب)
☆ اور یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ	(اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان)

نبی کریم ﷺ کی امت لوگوں پر گواہی دے گی اور آپ اپنی امت کی صداقت کی گواہی دیں گے اور ان کے نگہبان ہوں گے دیگر تراجم نے صرف گواہ ذکر کیا جب کہ اعلیٰ حضرت نے نگہبان و گواہ ذکر کیا ہے۔ اس معنی پر مدارک دال ہے " لما کان الشهيد كالرقيب جئى بكلمة استعلاء كقوله تعالى كنت انت الرقيب عليهم " چونکہ گواہ نگہبان کی طرح ہوتا ہے اسی وجہ سے جس طرح "الرقیب" (نگہبان) کے بعد کلمہ علی آتا ہے اسی طرح یہاں بھی لایا گیا ہے۔

بیضاوی نے بھی اسی طرح بیان کیا ہے کہ جب پہلی امتیں تبلیغ انبیاء کا انکار کردیں گی تو رب تعالیٰ باوجود علم کے منکرین پر حجت قائم کرنے کے لئے تبلیغ پر گواہ طلب کرے گا انبیاء کرام امت محمد ﷺ کو گواہ پیش کریں گے پہلی امتیں کہیں گی تم ہمیں کیسے پہچانتے ہو؟ تو یہ کہیں گے کہ ہمیں اپنے سچے نبی کریم ﷺ نے اللہ کا کلام اس کی کتاب کے ذریعے پہنچایا، جس سے ہمیں علم حاصل ہوا۔ پھر ان کے حق میں گواہی کے لئے نبی کریم ﷺ کو لایا جائے گا آخر مقصودی عبارت ملاحظہ ہو:

" فيؤتى بمحمد ﷺ فيسأل عن حال امته فيشهد بعد التهم وهذه الشهادة وان كانت لهم لكن لما كان الرسول عليه السلام كالرقيب المهيمن على امته عدى بعلى "

نبی کریم ﷺ کو لایا جائے گا آپ اپنی امت کی عدالت کی گواہی دیں گے، آگے علامہ بیضاوی نے ایک سوال کا جواب دیا ہے کہ شہادت کے بعد "علیٰ" آئے تو یہ شہادت کسی کے خلاف ہوتی ہے جب کسی کے حق میں شہادت دینی ہو تو شہادت کے بعد "لام" آتا ہے اس کا جواب علامہ نے دیا کہ اگر چہ نبی کریم ﷺ کی شہادت ان کے حق میں ہوگی لیکن آپ چونکہ ان کے لئے رقیبوں (نگہبانوں) کی طرح ہیں۔ اسی وجہ سے "علیٰ" سے متعدی کیا ہے چونکہ آپ نگہبان ہیں نہ کہ یہ مراد ہے کہ ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ اسی سوال و جواب کو اعلیٰ حضرت نے ترجمہ میں "نگہبان" کا لفظ بڑھا کر مندفع کردیا جس کی حقیقت سے دیگر مترجمین بے خبر ہے۔

تنبیہ: ﴿لتكونوا شهداء على الناس﴾ میں بھی لفظ " علی " استعمال ہے۔ لیکن اس کے ترجمہ میں "نگہبان" کو نہیں لایا گیا اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کی امت کی گواہی جہاں انبیاء کرام کے حق میں ہوگی وہاں ان کی امتوں کے خلاف بھی ہوگی۔ لیکن نبی کریم ﷺ کی گواہی اپنی امت کے حق

میں فقط ہوگی کسی کے خلاف نہیں ہوگی۔

فائدہ جلیلہ :

" ان الشهادة والمشاهدة والشهود هو الرؤية يقال شاهدت كذا اذا رأيته وابصرته ولما كان بين الابصار بالعين وبين المعرفة بالقلب مناسبة شديدة لا جرم قد تسمى المعرفة التي في القلب مشاهدة وشهودا والعارف بالشئ شاهدا ومشاهدا ثم سميت الدلالة على الشئ شاهدا على الشئ لانها هي التي بها صار الشاهد شاهدا ولما كان المخبر عن الشئ والمبين لحاله جار يا مجرى الدليل على ذلك سمى ذلك المخبر ايضا شاهدا "

شہادت اور مشاہدہ اور شہود کا معنی ہے دیکھنا جب کوئی شخص کسی کو دیکھے تو وہ کہتا ہے " شاهدت كذا " میں نے اس طرح دیکھا۔ جبکہ آنکھوں سے دیکھنے اور دل کی معرفت کے درمیان مناسبت شدیدہ پائی گئی تو یقیناً دل کی معرفت کو مشاہدہ اور شہود کہا جائے گا اور عارف کو شاہد اور مشاہد کہا جائے گا۔ اسی طرح کسی چیز پر دلالت کرنا ''شاہد'' کہلاتا ہے اسی طرح کسی چیز کی خبر دینے والے اور کسی چیز کے حال کو بیان کرنے والے کو بھی شاہد کہا جاتا ہے۔ (از کبیر)

شہود کے لغوی اور مجازی معانی کو سمجھنے کے بعد تفسیر عزیزی کو دیکھیں کہ نبی کریم ﷺ کیسے شہود سے متصف تھے تو سارے جھگڑے ہی ختم ہو جائیں آیئے دیکھیں شاہ صاحب نے کیا خوب بیان فرمایا:

﴿ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ﴾ ، يعنى وباشد رسول شما بر شما گواه زيرا كه او مطلع ست به نور نبوت به رتبه برمتدين بدين خود كه در كدام درجه ازدين من رسيده وحقيقت ايمان او چيست وحجابى كه بدان از ترقى محجوب مانده است كدام است پس او ميشناسد گناہار شمارا درجات ايمان شمارا واعمال نيک وبد شمارا واخلاص ونفاق شمارا ولهذا شهادت او در دنيا بحكم شرع درحق امت مقبول وواجب العمل است "

نبی کریم ﷺ تمہارے حق میں گواہی دیں گے کیونکہ آپ نور نبوت کی وجہ سے ہر دیندار کے دین کو جانتے ہیں کہ یہ دین کے کس درجہ پر ہے اور اس کے ایمان کی حقیقت کیا ہے اور اس کی ترقی میں کس درجہ کے حجاب پائے گئے ہیں۔ نبی کریم ﷺ تمہارے گناہوں کو پہچانتے ہیں اور تمہارے ایمان کے

درجات کو جانتے ہیں اور تمہارے نیک اور برے اعمال کا آپ کو علم ہے اور تمہارے اعمال میں تمہارے اخلاص اور نفاق کو جانتے ہیں اسی وجہ سے آپ کی شہادت دنیا میں بحکم شرع امت کے حق میں مقبول ہے اور واجب العمل ہے۔ اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے جو خبریں دی ہیں وہ سب سچی ہیں کچھ واقع ہو چکی ہیں کچھ واقع ہو کر رہیں گی انشاء اللہ۔

اس بیان کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں:

" در روایات آمده که هر نبی رابر اعمال امتیان خود مطلع میسازند که فلانے امروز چنین می کند وفلانے چناں تاروز قیامت ادای شهادت تواند کرد "

تمام انبیاء کرام کو ان کی امتوں کے اعمال پر مطلع کیا گیا ہے کہ فلاں آج اس طرح کر رہا ہے اور دوسرا شخص اس طرح کر رہا ہے ان کو مطلع کرنے کی یہ وجہ ہے کہ وہ بھی قیامت کے دن گواہی دے سکیں۔

(از عزیزی)

۞ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَا اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ۞

اور نہیں بنایا ہم نے قبلہ جس پر تم تھے سوائے اس کے کہ ہم آزمائیں کون تابعداری کرتا ہے رسول کی اور کون پھر جاتا ہے الٹے پاؤں۔

یعنی قبلہ کو تبدیل کرنے کی وجہ دراصل لوگوں کا امتحان لینا مقصود تھا کہ کون رسول اللہ ﷺ کی تابعداری کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے یعنی کون تابعداری نہیں کرتا۔

تنبیہ : راقم نے شیخ زادہ کی اس توجیہ کے مطابق ذکر کیا ہے:

" وتقديره وما جعلنا قبلتك بيت المقدس الا لنعلم بصرفك عنها الى الكعبة من يتبعك فى امر تحويل القبلة بان يترك التوجه الى بيت المقدس ويتوجه الى الكعبة وممن لا يتبعك فى ذلك "

حاصل کلام یہ ہے کہ ہم نے نہیں بنایا آپ کا قبلہ بیت المقدس سوائے اس کے کہ ہم آزمائیں اس سے آپ کو پھیر کر کعبہ کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دے کر کہ تحویل قبلہ کے حکم سے کہ کون بیت المقدس کی طرف منہ کرنا چھوڑتا ہے اور کعبہ کی طرف منہ کرنے پر عمل کرتا ہے اور کون آپ کی

اس معاملہ میں یعنی تحویل قبلہ میں تابعداری نہیں کرتا۔ (از شیخ زادہ)

اس میں ایک اور وجہ یہ بھی مذکور ہے:

"یجوز ان یکون قوله ﴿ اَلَّتِیْ كُنتَ عَلَيْهَا ﴾ لسانا للحكمة فی جعل بیت المقدس قبلة یعنی ان اصل امرک ان تستقبل الکعبة وان استقبالک بیت المقدس کان امرا عارضا نعرض وانما جعلنا القبلة الجهة التی کنت علیها قبل وقتک هذا وهی بیت المقدس لنمتحن الناس وننتظر من یتبع الرسول ومن لا یتبع وینفر عنه" (کبیر)

ہوسکتا ہے کہ ﴿ اَلَّتِیْ كُنتَ عَلَيْهَا ﴾ کا مطلب یہ ہو کہ بیت المقدس کو قبلہ بنانے کی حکمت کا ذکر ہو کہ اصل میں آپ کو کعبہ شریف کی طرف ہی منہ کرنے کا حکم تھا لیکن بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کا حکم عارضی تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ کعبہ شریف سے پہلے بیت المقدس کو قبلہ مقرر کر کے لوگوں کا امتحان لیا جائے کہ کون سے لوگ آپ کی تابعداری میں بیت المقدس کی طرف منہ کرتے ہیں اور کون سے تابعداری نہیں کرتے اور نفرت کرتے ہیں اس معنی کے لحاظ پر یہ امتحان تحویل قبلہ سے پہلے ہے۔

اعتراض: رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اِلَّا لِنَعْلَمَ ﴾ اور نہیں بنایا ہم نے قبلہ جس پر آپ تھے مگر یہ کہ ہم جانیں کہ کون تابعداری کرتا ہے رسول کی اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔

اس سے تو ان بے دین لوگوں کے مذہب کو تائید مل رہی ہے جو یہ کہتے ہیں "ان الله تعالی لم یعلم تلک الا شیاء قبل وقوعها" کہ اللہ تعالیٰ کو چیزوں کے واقع ہونے سے پہلے علم حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس آیۃ میں بھی یہی ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تحویل قبلہ کو اپنے علم کا ذریعہ بنایا کہ اس سے لوگوں کا علم حاصل ہو جائے۔

جواب: "الا لنعلم معناه الا لنری ومجاز هذا ان العرب تضع العلم مکان الرؤیة والرؤیة مکان العلم" یہاں آیۃ کریمہ میں علم بمعنی رؤیت استعمال ہے معنی یہ ہے "مگر یہ کہ ہم دیکھ لیں" (اعلیٰ حضرت نے یہی ترجمہ کیا ہے) یہ مجازی معنی ہے عرب حضرات عام طور پر علم کا معنی رؤیت لیتے رہتے ہیں اور رؤیت کو علم کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔

دوسرا جواب: ﴿ اِلَّا لِنَعْلَمَ ﴾ نعاملکم معاملة المختبر، مگر یہ کہ ہم تمہارے ساتھ وہ معاملہ کریں جو امتحان لینے والا کرتا ہے یعنی ہم آزمائیں (راقم نے یہی ترجمہ کیا ہے) (از کبیر)

تسکین الجنان سے اقتباس:

﴿ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَيْهَا اِلَّا لِنَعْلَمَ ﴾

☆ اور جس قبلے پر تم (پہلے) تھے اس کو ہم نے اس لئے مقرر کیا تھا کہ معلوم کریں (فتح محمد صاحب)

☆ اور جس سمت قبلہ پر آپ رہ چکے ہیں وہ تو محض اس کے لئے تھا کہ ہم کو معلوم ہو جاوے۔
(اشرف علی صاحب)

☆ نہیں مقرر کیا تھا ہم نے وہ قبلہ جس پر تو پہلے تھا مگر اس واسطے کہ معلوم کریں۔
(شاہ عبد القادر صاحب)

☆ اور نہیں کیا تھا ہم نے قبلہ جو تھا تو اوپر اس کے مگر تا کہ جانیں ہم۔ (شاہ رفیع الدین صاحب)

☆ اور اے محبوب تم پہلے جس قبلہ پر تھے ہم نے وہ اسی لئے مقرر کیا تھا کہ دیکھیں۔
(اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خانؒ)

یہاں تحویل قبلہ کا ذکر ہے نبی کریم ﷺ کا پہلے قبلہ کعبہ تھا (یعنی بیت المقدس کی طرف بھی منہ رہتا اور کعبہ کی طرف بھی) مدینہ طیبہ میں آ کر سولہ، سترہ ماہ تک بیت المقدس قبلہ بنایا گیا پھر نبی کریم ﷺ کی مرضی کے مطابق کعبہ کو قبلہ بنا دیا گیا۔ اس واقعہ کو رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا کہ تحویل قبلہ کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اور کافر میں فرق ہو جائے کہ کون نبی کریم ﷺ کی تابعداری کرتا ہے اور کون شک کرتا اور روگردانی کرتا ہے۔

اب اس تمہید کے بعد واضح ہوا کہ عام تراجم میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قبلہ کو اس لئے تبدیل کیا کہ اسے متبعین اور منکرین کا علم ہو جائے۔ اس میں ایک وہم ہوتا ہے جو تفاسیر نے ذکر کیا ہے اس کا ازالہ نہیں ہوتا بلکہ اس وہم کو تقویت ملتی ہے وہ وہم جو تفاسیر میں ہے وہ دیکھیں۔

" فان قيل كيف يكون علمه تعالىٰ غاية الجعل وهو لم يزل عالما " (بیضاوی)

اعتراض کیا جاتا ہے کہ علم کو جعل کی غایۃ بنانا صحیح نہیں کہ قبلہ اس لئے بنایا کہ ہم جانیں کیونکہ اللہ تعالیٰ تو ازلاً عالم ہے۔ جواب اس طرح دیا گیا:

" قلت هذا و اشباهه باعتبار التعلق الحالى الذى هو مناط الجزاء والمعنى ليعلق علمنا به موجودا "
(بیضاوی)

یعنی یہاں جزاء کا تعلق موجود کے علم سے ہے اسی جواب کو مدارک میں زیادہ واضح طور پر بیان کیا گیا ہے:

" قال الشیخ ابو منصور معنی قوله لنعلم کائنا موجودا ما قد علمناه انه یکون و یوجد فالله تعالٰی عالم فی الازل بکل ما اراد وجوده انه یوجد فی الوقت الذی شاء وجوده فیه ولایوصف بانه عالم فی الازل بانه موجود کائن لانه لیس بموجود فی الازل فکیف یعلمه موجودا فاذا صار موجودا یدخل تحت علمه الازلی فیصیر معلوماله موجودا کائنا والتغیر علی المعلوم لا علی العلم " (مدارک)

اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ ابو منصور فرماتے ہیں کہ اگرچہ اللہ تعالٰی کو علم ازلی حاصل ہے کہ فلاں چیز نے موجود ہونا ہے لیکن پہلے علم معدوم سے ہوگا جس نے بعد میں موجود ہونا ہے۔ اور جب وہ چیز موجود ہوجائے گی اب موجود سے تعلق ہوگا یہاں علم میں تبدیلی نہیں بلکہ معلوم میں تبدیلی ہے۔ یعنی پہلے علم وہ تھا کہ معلوم مقام ظہور میں نہیں تھا اب علم ہے کہ معلوم مقام ظہور میں ہے۔ اب آپ تراجم میں فرق دیکھیں کہ یہ کہا جائے تاکہ ہم معلوم کریں تو یہ اعتراض مندفع ہوگا یا یہ کہا جائے کہ "ہم دیکھیں" تو اعتراض مندفع ہوگا۔ یہ ہے مولنا احمد رضا خان رحمہ اللہ کی علمی بصیرت جس میں صاحب نظر کو اعتراف کرنے میں کوئی کلام نہیں۔ (تسکین الجنان ص ۵۲ ، ۵۳)

﴿ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ﴾ : " استعارة ومعناه من یکفر بالله ورسوله " اس میں استعارہ پایا گیا ہے معنی اس کا یہ ہے کہ "کون اللہ تعالٰی اور اس کے رسول ﷺ سے کفر کرتا ہے"۔

وجہ تشبیہ یہ ہے کہ ایڑیوں کے بل پلٹ جانے والا، یعنی الٹے پاؤں پھرنے والا اپنے سامنے والی چیز کو چھوڑ دیتا ہے اور اس سے منہ پھیر لیتا ہے جب انہوں نے بھی ایمان کو چھوڑ دیا اور دلائل کو چھوڑ دیا تو وہ اپنے سامنے والی چیزوں کو چھوڑنے والے ہو گئے۔ اسی وجہ سے رب تعالٰی نے ان کا ذکر ان الفاظ مبارکہ سے کیا ہے " ثم ادبر واستکبر " پھر پیٹھ پھیر لی اور تکبر کیا۔ (کبیر)

﴿ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ﴾

اور بیشک یہ بھاری تھی سوائے ان لوگوں کے جن کو اللہ نے ہدایت دی۔ " کانت " میں ضمیر

ما قبل کلام سے حاصل ہونے والے مضمون کی طرف لوٹ رہی ہے اس لئے ضمیر کا مرجع " الجعلة " یا " التولیة " یا "التحویلة " یا " القبلة " ہے یہ سب مؤنث ہیں اس لئے ضمیر بھی مؤنث کی ہے مفہوم یہ ہے کہ قبلہ کو بدلنا منافقین پر بھاری تھا لیکن مخلصین مؤمنین جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت سے نواز رکھا تھا ان پر کوئی بھاری نہیں تھا۔

طلباء کرام توجہ فرمائیں: لفظ ''ان'' کا استعمال چار طرح ہوتا ہے۔

(۱) ان شرطیہ جس کے بعد جزاء آتی ہے۔ (۲) ان زائدہ جس کا کوئی معنی نہیں ہوتا۔

(۳) ان نافیہ جو نفی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے (۴) **ان مخففه من المثقلة**

یعنی یہ حرف مشبہ بالفعل ہوتا ہے جس کی تشدید کو ختم کر کے مخفف بنا لیا جاتا ہے یہ مخفف ہونے کے باوجود معنی تحقیق کا ہی دیتا ہے اس کی خبر پر لام آتا ہے تاکہ ان نافیہ اور **مخففه من المثقلة** میں فرق ہو جائے اسی وجہ سے " لَكَبِيرَةً " پر لام آیا ہوا ہے۔ بعض نحویوں نے اس آیہ کریمہ میں " ان نافیه " کہا ہے اور " لام " جو کہ ''لکبیرة '' میں ہے اسے " الا " کے معنی میں لیا ہے لیکن یہ قول درست نہیں۔ (از کبیر و روح المعانی)

﴿ وَمَا كَانَ اللهُ لِيُضِيعَ اِيمَانَكُمْ ﴾ اور نہیں اللہ ضائع کرتا تمہاری نمازوں کو۔

''ایمان کا ایک مجازی معنی لیا گیا ہے یعنی نماز۔ اس معنی کے لحاظ پر مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری نمازیں جو منسوخ قبلہ کی طرف منہ کر کے ادا کی گئیں ہیں ان کو ضائع نہیں کرتا۔

" ففی الصحیح انه لما وجه رسول الله ﷺ الی القبلة قالوا یا رسول الله فکیف بالذین ماتوا و هم یصلون الی بیت المقدس فنزلت "

حدیث شریف میں ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے کعبہ شریف کی طرف منہ پھیر لیا تو صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ ان لوگوں کا کیا ہوگا جو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے رہے اور فوت بھی ہو چکے ہیں۔ تو اس وقت اس آیہ کریمہ کا نزول ہوا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری نمازوں کو ضائع نہیں کرتا۔ اس معنی کے لحاظ پر لازم کا اطلاق ملزوم پر ہے یعنی اطلاق ایمان کا مراد نماز ہے۔ تاہم ''ایمان'' حقیقی معنی میں بھی استعمال ہے یعنی " ثباتکم علی الایمان " تمہارے ایمان پر ثابت رہنے کو اللہ تعالیٰ ضائع

نہیں کرتا اسی طرح یہ معنی بھی مراد لیا گیا ہے " ایمانکم بالقبلة المنسوخة " بیشک اللہ تعالیٰ منسوخ قبلہ پر تمہارے ایمان کو ضائع نہیں کرتا۔ (از روح المعانی)

خیال رہے کہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے مجازی معنی کو راجح قرار دیا ہے کہ ''ایمان'' بمعنی نماز مراد لینا بہتر ہے راقم نے یہی معنی ذکر کیا تا کہ طلباء کو دونوں معانی ذہن نشین ہو جائیں۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ بیشک اللہ لوگوں پر بہت مہربان رحم کرنیوالا ہے

اللہ تعالیٰ نے اپنی ان دو صفات کا خصوصی طور پر ذکر کر کے ثابت کر دیا کہ " ان الله لا يضيع اجورهم ولا يدع ما فيه صلاحهم " بیشک اللہ تعالیٰ ان کے اجر و ثواب کو ضائع نہیں کرے گا اور ان کے لئے بہتری کو نہیں چھوڑے گا۔ اس کی وجہ یہ کہ " لان رأفة بالناس و اضاعته ما كان منهم من العبادات التي افضلها الايمان متنافيان " اللہ تعالیٰ کا لوگوں پر مہربان ہونا اور ان کی عبادات کو خصوصاً افضل العبادات ایمان کو ضائع کرنا یہ دو متنافی چیزیں ہیں چونکہ یہ قانون ہے کہ دو متنافی چیزوں میں جب ایک پائی جائے تو دوسری کا نہ پایا جانا ضروری ہے جب رب تعالیٰ اپنے بندوں پر رؤف (مہربان) ہے تو یقیناً ان کی عبادات کو ضائع نہیں فرماتا۔ رؤف کو پہلے ذکر کیا اور رحیم کو بعد میں "لان الرأفة بمعنى الرحمة الا انها اشد و ابلغ من الرحمة " اس لئے کہ رأفة بھی اگرچہ رحمت کے معنی میں استعمال ہے لیکن رأفتہ میں بنسبت رحمۃ کے اشد اور ابلغ رحمت پائی گئی ہے۔ اس لئے خاص کو ذکر کیا اور عام کو بعد میں۔

رأفة میں رفع المكروه وازالة الضرر (مکروہ چیز کو اٹھانا اور ضرر کو دور کرنا) پایا گیا ہے اور رحمت میں حصول منافع پایا گیا ہے۔ اس لئے افضال (فضیلت دینا) اور دفع ضرر اہم چیزیں ہیں بنسبت حصول منافع کے اسی وجہ سے رؤف کو رحیم سے پہلے ذکر کیا گیا ہے اور وجہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی صفت رأفتہ کا تعلق اپنے خاص مؤمنین بندوں سے ہے لیکن صفت رحمۃ عام ہے بنسبت رأفتہ کے لہذا صفات کی ترتیب متعلقین کے شرف وقدر کا اعتبار کرتے ہوئے رکھی گئی ہے۔

(از شیخ زادہ روح المعان)

﴿ قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِکَ فِی السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّیَنَّکَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا فَوَلِّ وَجْهَکَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَیْثُ مَا کُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَکُمْ شَطْرَهٗ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ لَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ ﴾

۱) ''ہم دیکھ رہے ہیں بار بار تمہارا آسمان کی طرف منہ کرنا تو ضرور ہم تمہیں پھیر دیں گے اس قبلہ کی طرف جس میں تمہاری خوشی ہے ابھی اپنا منہ پھیر دو مسجد حرام کی طرف اور اے مسلمانو تم جہاں کہیں ہو اپنا منہ اسی کی طرف کرو اور وہ جنہیں کتاب ملی ہے ضرور جانتے ہیں کہ یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے اور اللہ ان کے کوتکوں سے بے خبر نہیں''۔

۲) ''تحقیق ہم دیکھ رہے ہیں پھیرنا تمہارا منہ آسمان کی طرف، تو ضرور ہم پھیر دیں گے تمہیں اس قبلہ کی طرف جس میں تمہاری رضاء ہے تو پھیر لو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف اور جہاں بھی (اے مسلمانو) تم ہو پھیر لو اپنے منہ اسی کی طرف اور بیشک وہ لوگ جن کو کتاب دی گئی وہ ضرور جانتے ہیں بیشک یہ حق ہے انکے رب کی طرف سے اور نہیں اللہ غافل اس سے جو وہ عمل کرتے ہیں''۔

شان نزول: نبی کریم ﷺ نے مدینہ طیبہ میں سولہ، سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کی۔ لیکن دل میں تمنا تھی کہ قبلہ کعبہ شریف ہو جائے تو اسی خواہش پر وحی کے انتظار میں بار بار آپ اپنا منہ آسمانوں کی طرف پلٹ رہے تھے تو رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا کہ اے محبوب ہم آپ کے بار بار چہرہ کو آسمانوں کی طرف اٹھانے کو دیکھ رہے ہیں ہم آپ کو اسی قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جو آپ کو پسند ہے پھر ساتھ ہی حکم دے دیا کہ آپ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کر لیں۔

'' ذکر الامام القرطبی ان العلماء قالوا هذه الآیة متقدمة فی النزول علی قوله تعالٰی (سَیَقُوْلُ السُّفَهَاءُ) الخ ''

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ علماء نے یہی بیان فرمایا کہ یہ آیۃ نزول کے لحاظ پر

(سَیَقُوْلُ السُّفَھَاءُ) آیۃ سے پہلے ہے" وفی الکواشی ان قولہ تعالیٰ (قد نری) مستقبل لفظا و ماضی معنی ومتأخر تلاوۃ متقدم معنی لان رأس القصۃ" تفسیر کواشی میں ہے بیشک اللہ تعالیٰ کا ارشادگرامی " قد نری " لفظاً مستقبل ہے اور معنی ماضی ہے اور تلاوت کے لحاظ سے متأخر ہے اور معنی کے لحاظ سے مقدم ہے کیونکہ یہی واقعہ کی بنیاد اور اصل ہے تاہم "سیقول السفھاء" آیۃ کی وضاحت میں معتبر قول یہ ہے کہ وہ تحویل قبلہ سے پہلے نازل ہوئی۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے۔ آیۃ کریمہ کی وضاحت سے پہلے احادیث کو ذکر کیا جاتا ہے جس سے واقعہ کی تفصیل واضح ہو جائے گی۔

تحویل قبلہ کے متعلق احادیث مبارکہ:

بیہقی نے سنن میں اور ابوداؤد نے ناسخ ومنسوخ میں اور ابن ابی شیبہ نے حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کیا ہے کہ " کان رسول اللہ ﷺ یصلی وھو بمکۃ نحو بیت المقدس والکعبۃ بین یدیہ وبعد ما تحول الی المدینۃ ستۃ عشر شھرا ثم صرف الی الکعبۃ" رسول اللہ ﷺ مکہ میں بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے جبکہ کعبہ آپ کے سامنے ہوتا اور پھر مدینہ طیبہ میں قبلہ بیت المقدس مقرر کردیا گیا پھر سولہ ماہ بعد کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دے دیا گیا۔

(حقانی)

☆ " عن البراء قال کان رسول اللہ ﷺ یصلی نحو بیت المقدس ویکثر النظر الی السماء ینتظر امر اللہ فانزل اللہ (قد نری تقلب وجھک فی السماء فلنولینک قبلۃ ترضھا فول وجھک شطر المسجد الحرام) فقال رجال من المسلمین وددنا لو علمنا علم من مات منا قبل ان نصرف الی القبلۃ وکیف بصلاتنا نحو بیت المقدس فانزل اللہ (وما کان اللہ لیضیع ایمانکم) وقال السفھاء من الناس وھم اھل الکتاب ما ولا ھم عن قبلتھم التی کانوا علیھا فانزل اللہ (سَیَقُوْلُ السُّفَھَاءُ مِنَ النَّاسِ) الخ"

حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے سولہ، سترہ ماہ نماز ادا فرماتے رہے اور آپ زیادہ نظر آسمانوں کی طرف کرتے کیونکہ آپ اللہ تعالیٰ کے حکم کی انتظار فرماتے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ ﴿قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْھِکَ فِی السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّیَنَّکَ قِبْلَۃً تَرْضٰھَا

﴿ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ﴾ کو نازل فرمایا مسلمانوں میں سے کچھ حضرات نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ جو لوگ ہم میں سے قبلہ کے تبدیل کرنے کے حکم سے پہلے فوت ہو گئے ان کی نمازوں کا حکم کیا ہے اور جو ہم نے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں ادا کی ہیں ان کا حکم کیا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيۡعَ اِيۡمَانَكُمۡ ﴾ اور اللہ تمہاری نمازوں کو ضائع نہیں فرماتا اور بیوقوف لوگ اہل کتاب کہنے لگے کہ ان لوگوں کو اس قبلہ سے کس چیز نے پھیر دیا ہے جس پر یہ تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیۃ کریمہ ﴿سَيَقُوۡلُ السُّفَهَآءُ ﴾الخ نازل فرمائی۔
(مسلم)

☆ " عن ابن عباس ان رسول الله ﷺ لما هاجر الى المدنية امره الله ان يستقبل بيت المقدس ففرحت اليهود فاستقبلها رسول الله ﷺ بضعة عشر شهرا و كان رسول الله ﷺ يحب قبلة ابراهيم فكان يدعو الله وينظر الى السماء فانزل الله عزوجل ﴿ فَوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ شَطۡرَه ﴾ اى نحوه ، فارتاب من ذلك اليهود وقالوا ما ولا هم عن قبلتهم التى كانوا عليها فانزل الله ﴿ قُلۡ لِّلّٰهِ الۡمَشۡرِقُ وَالۡمَغۡرِبُ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے جب مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم فرمایا کہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کریں۔ یہود اس پر خوش ہوئے آپ نے سولہ، سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کی آپ پسند فرماتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ (کعبہ) ہمارا بھی قبلہ ہو جائے آپ اللہ تعالیٰ سے دعا فرماتے اور آسمانوں کی طرف دیکھتے تو اللہ تعالیٰ نے ﴿ فَوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ شَطۡرَه ﴾ "تم اپنے منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لو" نازل فرمایا۔ یہود کو اس پر شک ہوا وہ بے وقوف کہنے لگے کس نے ان کو اس قبلہ سے پھیر دیا جس پر تھے تو اللہ تعالیٰ نے ﴿قُلۡ لِّلّٰهِ الۡمَشۡرِقُ وَالۡمَغۡرِبُ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴾ "فرما دو اللہ کے لئے ہی مشرق و مغرب ہے ہدایت دیتا ہے جسے چاہے سیدھی راہ کی" کو نازل فرمایا۔

☆ " عن البراء ان النبى ﷺ صلى قبل بيت المقدس ستة عشر شهرا او سبعة عشر شهرا و كان يعجبه قبلته قبل البيت وانه صلى صلوة العصر وصلى معه قوم فخرج رجل ممن كان يصلى معه فمر على اهل المسجد وهم راكعون فقال اشهد بالله لقد صليت مع رسول الله ﷺ قبل مكة فدا روا كما هم قبل البيت " (ابو نعيم)

حضرت براء فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے بیت المقدس کی طرف سولہ، سترہ ماہ منہ کر کے نماز ادا فرمائی آپ کو پسند یہ تھا کہ آپ کا قبلہ کعبہ شریف ہو جائے۔ بیشک آپ عصر کی نماز ادا فرما رہے تھے اور قوم نے بھی آپ کے ساتھ نماز ادا کی (جس میں قبلہ کے تبدیل کرنے کا حکم آیا) ایک شخص جو آپ کے ساتھ نماز ادا کرنے میں شریک تھے وہ نماز ادا کرنے کے بعد اپنے قبیلہ کی طرف گئے تو دیکھا کہ لوگ نماز ادا کر رہے ہیں جو رکوع میں تھے انہوں نے کہا میں اللہ کی گواہی دیتا ہوں کہ تحقیق میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز ادا کی آپ نے نماز کعبہ کی طرف منہ کر کے ادا کی وہ لوگ نماز میں ہی کعبہ شریف کی طرف پھر گئے۔

اعتراض : جو حدیث تم نے ابھی بیان کی اس سے تو پتہ چلتا ہے کہ تحویل قبلہ کا حکم عصر کی نماز میں آیا اور دوسری حدیث میں ظہر کی نماز کا ذکر ہے دونوں حدیثوں میں تطبیق کیسے ہے؟ وہ حدیث جس میں ظہر کا ذکر ہے وہ یہ ہے:

☆ " عن ابن عمر ان اول صلوة صلاها رسول الله ﷺ الی الکعبة صلوة الظهر وانها الصلوة الوسطی "

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک پہلی نماز جو رسول اللہ ﷺ نے کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے ادا کی وہ ظہر کی تھی بیشک وہ نماز وسطی ہے۔

جواب: " والمشهور ان اول صلوة صلاها الی الکعبة صلوة العصر ولهذا تاخر الخبر عن اهل قباء الی صلوة الفجر " (ماخوذ از کبیر)

مشہور یہی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سب سے پہلے جو نماز کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے ادا کی وہ عصر کی نماز تھی۔ اسی وجہ سے قباء والے حضرات کو دوسرے دن صبح کی نماز میں تحویل قبلہ کے متعلق پتہ چلا۔

راقم کے نزدیک جس حدیث میں ظہر کا ذکر ہے اس سے مراد بھی عصر کی نماز ہے کیونکہ اسے صلوۃ وسطی کہا گیا ہے جب کہ مشہور یہی ہے کہ صلوۃ وسطی عصر کی نماز ہے۔ پھر ظہر کا اطلاق عصر پر اور عشاء کا اطلاق مغرب پر کئی احادیث میں مذکور ہے۔

☆ " عن ابن عمر قال بینهما الناس فی صلوة الصبح بقباء اذ جاء هم رجل فقال ان رسول الله ﷺ قد انزل علیه قرآن وامر ان یستقبل الکعبة الا فاستقبلوها

فاستداروا کھیئتھم الی الکعبۃ و کان وجہ الناس الی الشام"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ لوگ صبح کی نماز قبا میں ادا کر رہے تھے ان کے پاس ایک شخص آیا اس نے کہا بیشک رسول اللہ ﷺ پر قرآن نازل ہوا آپ کو کعبہ شریف کی طرف منہ کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ خبردار تم بھی کعبہ کی طرف منہ کرلو سب لوگ نماز میں ہی پھر گئے، کعبہ کی طرف منہ کرلیا حالانکہ پہلے وہ شام (بیت المقدس) کی طرف منہ کر کے نماز ادا کر رہے تھے۔ (احکام القرآن للجصاص)

تحویل قبلہ کس ماہ میں ہوا:

نبی کریم ﷺ نے پانچ ربیع الاول پیر کے دن مکہ مکرمہ سے ہجرت فرمائی اور بارہ ربیع الاول پیر کے دن مدینہ طیبہ پہنچے اور قبلہ شریف کی تبدیلی کا حکم دوسرے سال بدر کے واقعہ سے دو ماہ پہلے پندرہ رجب زوال کے بعد آیا۔ (مظھری)

ایک قول علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بھی یہی بیان کیا اور اس کے بعد دوسرا قول یہ بیان کیا ابو حاتم بستی رحمہ اللہ نے فرمایا نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ میں بارہ ربیع الاوّل پیر کو پہنچے اور قبلہ شریف کی تبدیلی کا حکم بدھ نصف شعبان کو ہوا۔ اسی وجہ سے بعض روایات میں سولہ ماہ کا ذکر ہے اور بعض میں سترہ ماہ کا ذکر ہے دراصل عرب حضرات اس وقت کسور کا اعتبار نہیں کرتے تھے۔ سولہ ماہ سے کچھ دن اوپر ہونے پر کچھ حضرات سولہ ماہ ہی کہتے تھے اور کچھ سترہ ماہ کہہ لیتے تھے اسی طرح پندرہ ماہ سے کچھ دن زائد ہونے پر بھی سولہ ماہ کہہ لیا جاتا تھا۔ اس پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول دلیل ہے۔

" رواہ الحاکم بسند صحیح عن ابن عباس فمن اعتبر الایام شھرا کاملا عد سبعۃ عشر والا فستۃ عشر"

حاکم نے سند صحیح سے روایت کی کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا جن حضرات نے چند دنوں کو ایک ماہ مکمل شمار کر لیا انہوں نے سترہ ماہ کہہ لیا۔ اور جنہوں نے زائد دنوں کا اعتبار نہیں کیا انہوں نے سولہ ماہ کہہ لیا۔ (از مظھری)

خیال رہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول اور ابو حاتم بستی رحمہ اللہ کے قول میں اتفاق نظر آتا ہے۔

کس مسجد میں قبلہ کی تبدیلی کا حکم آیا:

" وقیل نزل ذلک علی النبی ﷺ فی مسجد بنی سلمة وھو فی صلوٰة الظھر بعد رکعتین منھا فتحول فی الصلوة فسمی ذلک المسجد مسجد القبلتین "

بیان یہ کیا گیا ہے کہ قبلہ کی تبدیلی کا حکم مسجد بنی سلمہ میں نازل ہوا جب کہ آپ ظہر کی نماز ادا فرما رہے تھے دو رکعت بیت المقدس کی طرف منہ کر کے ادا کی جا چکی تھیں، جب حکم آیا تو آپ نماز میں ہی پھر گئے اسی وجہ سے اس مسجد کو ذو قبلتین کہا جاتا ہے۔ اب بھی اس مسجد کے دو محراب بنائے گئے ہیں ایک بیت المقدس کی جانب اور دوسرا کعبہ شریف کی جانب تاہم بورڈ آویزاں ہیں عربی میں تحریر ہے کہ نماز صرف کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے ادا کی جائے بعض جاہل حضرات بیت المقدس کی طرف بھی منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں جو ناجائز ہے۔

راقم جیسے گنہگار کو بھی اس مسجد میں نفل ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی راقم کے ساتھ برادر محترم مولنا فضل دین نقشبندی مدرس جامعہ رضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی بھی تھے۔

" قال عباد بن بشر بن قیظی ان رسول اللہ ﷺ قد استقبل القلبة او قال البیت الحرام فتحول الرجال مکان النساء وتحول النساء مکان الرجال "

عباد بن بشر نے بیان فرمایا کہ بیشک رسول اللہ ﷺ نے جب قبلہ یعنی مسجد حرام کی طرف منہ پھیرا تو مرد عورتوں کی جگہ آ گئے اور عورتیں مردوں کی جگہ آ گئیں (اور خود نبی کریم ﷺ کعبہ کی جانب آ گے تشریف لے گئے)۔ (قرطبی)

مکہ مکرمہ میں نبی کریم ﷺ کا قبلہ کیا تھا؟

اس میں ایک قول پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ مکہ مکرمہ میں بھی آپ کا قبلہ بیت المقدس ہی تھا البتہ آپ اس طرح کھڑے ہوتے کہ کعبہ شریف بھی آپ کے سامنے ہوتا مدینہ طیبہ میں چونکہ کعبہ شریف جنوبی جانب ہے اور بیت المقدس شمالی جانب ہے دونوں مختلف سمتوں میں ہونے کی وجہ سے بیک مرتبہ سامنے نہیں ہو سکتے تھے اس لئے سولہ، سترہ ماہ فقط بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کا حکم جاری رہا پھر قبلہ تبدیل کر کے کعبہ شریف بنا دیا گیا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں قبلہ کعبہ شریف تھا مدینہ طیبہ میں بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کا حکم دیا گیا اور سولہ سترہ ماہ کے بعد قبلہ کو تبدیل کر کے پھر کعبہ شریف کو قبلہ بنا دیا گیا۔
اس قول کے متعلق علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں " قال ابو عمر وھذا اصح القولین عندی " ابوعمر کہتے ہیں دونوں قولوں میں سے میرے نزدیک یہی قول زیادہ صحیح ہے۔ (از قرطبی)

راقم کا بھی پہلے یہی موقف رہا اب تفاسیر کے مطالعہ سے اور فتح الباری، نووی، عمدۃ القاری، مرقاۃ کو دیکھنے سے پہلا قول زیادہ راجح نظر آیا.......... واللہ اعلم بالصواب۔

مسئلہ : بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کا صراحۃً ذکر قرآن پاک میں نہیں بلکہ حدیث پاک میں ہے اس سے ایک بات تو یہ سمجھ آئی کہ قرآن پاک کو سمجھنے کے لئے حدیث پاک کا سمجھنا ضروری ہے۔ حدیث پاک کے بغیر قرآن پاک پر عمل ممکن ہی نہیں۔ دوسری بات یہ سمجھ آئی کہ قرآن پاک سے حدیث پاک کو منسوخ کرنا جائز ہے۔ (ماخوذ از قرطبی)

شان صحابہ کرام: تحویل قبلہ کے حکم سے صحابہ کرام کی شان واضح طور پر سمجھ آتی ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو نماز کی حالت میں پھرتا ہوا دیکھ کر ہی اپنے اپنے رخ پھیر لئے کسی نے اس میں کوئی حجت بازی نہیں کی۔ پھر جہاں جہاں خبر پہنچتی رہی وہاں وہاں بلاچون وچرا لوگ اپنا قبلہ بدلتے رہے۔ سبحان اللہ وہ کتنے ہی شریعت کے پابند تھے اور کتنے ہی زیادہ نبی کریم ﷺ سے محبت کرنیوالے تھے۔

آیۃ کریمہ کی قدرے وضاحت:

" (قَدْ نَرٰی) ربما نری (تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ) تردد وجھک فی جھۃ السماء تطلعا للوحی " ہم بار بار آپ کا منہ آسمانوں کی طرف پلٹتے ہوئے دیکھ رہے ہیں وحی کی انتظار میں نبی کریم ﷺ اپنا رخ بار بار آسمانوں کی طرف اٹھاتے۔

" قد نری " کا معنی " ربما نری " کیا گیا ہے یہ بتانا مقصود ہے کہ " قد فی قولہ تعالیٰ قد نری للتکثیر ومعناھا کثرۃ الرؤیۃ " لفظ " قد " اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی " قد نری " میں کثرت کے معنی میں استعمال ہے معنی اس کا کثرت رؤیت ہے یعنی ہم بار بار دیکھ رہے ہیں۔ اگرچہ

"قد" مضارع پر داخل ہو تو تقلیل کے معنی میں آتا ہے لیکن کبھی کبھی مجازی طور پر تکثیر کے لئے بھی آتا ہے۔ جس طرح "رب" تقلیل کے لئے آتا ہے لیکن کبھی کبھی تکثیر کے لئے بھی آتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہوتی ہے کہ دو چیزیں جو ایک دوسری کی ضد ہیں ان میں مناسبت برقرار رہے۔ (از بیضاوی و شیخ زادہ)

نبی کریم ﷺ پسند کرتے تھے کہ آپ کا قبلہ کعبہ ہو جائے کیونکہ یہود کہتے تھے "یخالفنا محمد فی دیننا ویتبعنا قبلتنا" محمد ہمارے دین کی مخالفت کرتے ہیں اور ہمارے ہی قبلہ کی تابعداری کرتے ہیں۔ تو نبی کریم ﷺ نے ایک دن جبریل کو کہا کہ میں یہ پسند کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمارا قبلہ کعبہ کر دے کیونکہ وہ قبلہ ہی میرے باپ ابراہیم کا ہے تو حضور کی خدمت میں جبریل نے عرض کیا۔

"انما انا عبد مثلک وانت کریم علی ربک فاسئل انت ربک فانک عند المکان"

میں تو آپ کی طرح اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں البتہ آپ اللہ تعالیٰ کے ہاں مکرم ہیں اور آپ کا اللہ تعالیٰ کے ہاں خاص مقام ہے اس لئے آپ اپنے رب سے سوال کرو۔ تو رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ سے کثیر دعاء فرماتے اور بار بار آسمانوں کی طرف نظر اٹھاتے اس انتظار میں کہ اللہ تعالیٰ کا حکم کب آتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا۔ (از مظھری)

جبریل سے کہنے میں حکمت: نبی کریم ﷺ نے قبلہ کی تبدیلی کا ذکر پہلے جبریل سے کیا کہ آپ چاہتے ہیں کہ قبلہ تبدیل کر دیا جائے "فاخبره جبریل بان الله تعالیٰ قد اذن له فی هذا الدعاء" تو جبریل نے آپ کو خبر دی کہ بیشک اللہ تعالیٰ آپ کو قبلہ کے تبدیل کرنے کے لئے دعاء کرنے کی اجازت دیتا ہے:

"وذلک لان الانبیاء لا یسألون الله تعالیٰ شیأ الا باذن منه لئلا یسألوا مالا صلاح فیه فلا یجابوا الیه فیفضی ذلک الی تحقیر شأنهم"

اس کی وجہ دراصل یہ تھی کہ انبیاء کرام اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کوئی سوال نہیں کرتے کہ ایسا نہ ہو کہ وہ ایسا سوال کر دیں جو بہتر نہ ہو اور ان کی دعاء کو قبول نہ کیا جائے کہ ان کی تحقیر شان لازم آئے۔

واضح ہوا کہ انبیاء کرام کوئی ایسا سوال نہیں کرتے جو قبول نہ ہو۔ بلکہ رب تعالیٰ سے اجازت لے کر سوال کرتے ہیں یا پھر رب تعالیٰ کی طرف سے انبیاء کرام کو پہلے ہی منع کر دیا جاتا ہے کہ فلاں چیز کی

دعاء نہ کرنا۔

" فلما اذن اللہ تعالٰی لہ فی الاجابۃ علم انہ یستجاب الیہ فکان یقلب وجھہ فی السماء ینتظر مجئی جبریل علیہ السلام بالوحی فی الاجابۃ "

جب اللہ تعالٰی نے آپ کو دعاء کرنے کی اجازت دے دی کہ آپ کی دعاء کو قبول کیا جائے گا آپ دعاء کی قبولیت کے یقین پر آسمانوں کی طرف بار بار چہرہ اٹھا کر دیکھتے کہ کب جبریل قبولیت کی وحی لاتے ہیں۔ (از کبیر)

اعتراض : بیت المقدس جب رب تعالٰی کے حکم سے قبلہ بنایا گیا تھا تو نبی کریم ﷺ اس کے خلاف خواہش کرنا تو رب تعالٰی کی منشاً کے خلاف ہوگیا۔ گویا کہ رب تعالٰی کی مرضی پر اپنی مرضی کو ترجیح دینا لازم آ گیا یہ کس طرح صحیح ہے؟

جواب : نبی کریم ﷺ کے دل میں رب تعالٰی نے ہی ڈالا۔ خواہش کے مطابق کام اس وقت ہوتا جب رب تعالٰی کے حکم کے بغیر ہوتا۔ جب تمنا یہ تھی کہ رب تعالٰی اجازت دے دے تو یہ تمنا دراصل رب تعالٰی کی رضاء کے مطابق ہے " وای بعد فی ان یمیل طبع الرسول الی شئی فیتمنی فی قلبہ ان یاذن اللہ لہ فیہ " اس میں کون سی خرابی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طبیعت ایک چیز کی طرف مائل ہو، اور آپ کے دل میں یہ تمنا ہو کہ رب تعالٰی اسی کا حکم دے دے۔ (از کبیر)

کعبہ کی تمنا کی وجوہ:

(۱) اس میں ایک وجہ تو وہی تھی جس کا ذکر پہلے ہوا کہ یہود کہتے تھے کہ بیشک یہ ہمارے دین کی مخالفت کرتے ہیں اور ہمارے قبلہ کی تابعداری کرتے ہیں " ولو لا نحن لم یدر این یستقبل " اور اگر ہم نہ ہوتے انہیں معلوم ہی نہ ہوتا کہ نماز میں کدھر متوجہ ہونا ہے۔ تو نبی کریم ﷺ کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ قبلہ بدل جائے، کعبہ شریف کو قبلہ کا حکم آ جائے۔

(۲) " ان الکعبۃ کانت قبلۃ ابراھیم " دوسری وجہ یہ تھی کہ کعبہ چونکہ ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ تھا اس لئے آپ چاہتے تھے کہ میرے جدامجد ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ ہی میرا قبلہ بھی ہو جائے۔

(۳) " انه علیه السلام کان یقدر ان یصیر ذلک سببا لا ستمالة العرب ولدخولهم فی الاسلام " بیشک نبی کریم ﷺ کعبہ شریف کے قبلہ ہو جانے کی تمنا اس لئے کر رہے تھے کہ عرب لوگ اس کی طرف مائل ہو جائیں اور اسلام قبول کر لیں ۔ کیونکہ ان کا پہلے سے ہی میلان کعبہ کی طرف ہی تھا کیونکہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔

(۴) " انه علیه السلام احب ان یحصل هذا الشرف للمسجد الذی فی بلدته ومنشئه " چوتھی وجہ یہ تھی کہ آپ یہ چاہتے تھے کہ یہ شرافت اس مسجد کو حاصل ہو جائے جو آپ کے پیدائش والے شہر میں ہے۔ آپ کا اپنے آبائی گاؤں کی طرف اس لئے میلان کہ اسے عظیم منصب ہو جائے فطرتی امر تھا۔ (از کبیر)

فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا : کا مطلب یہ ہے کہ ہم تمہیں قبلہ کی طرف توجہ کرنے کی قدرت عطاء کر دیں گے جو قبلہ آپ کو پسند ہے " ترضاها " میں چند وجوہ ہیں " احدها ترضاها تحبها وتمیل الیها لان الکعبة کانت احب الیه من غیرها بحسب میل الطبع " ان میں سے ایک یہ ہے کہ " ترضاها " کا معنی یہ ہے کہ جس سے آپ محبت کرتے ہیں اور جس کی طرف آپ میلان کرتے ہیں کیونکہ کعبہ شریف کی طرف آپ کا طبعی طور پر میلان زیادہ تھا۔ " وثانیها (قبلة ترضاها)ای تحبها بسبب اشتمالها علی المصالح الدینیة " اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہم ضرور بضرور پھیر دیں گے اس قبلہ کی طرف جسے تم پسند کرتے ہو کیونکہ اس میں کئی دینی مصلحتیں پائی گئی ہیں " وثالثها قال الاصم ای کل جهة وجهک الله الیها فهی لک رضا لا یجوز ان تسخط کما فعل من انقلب علی عقبیه من العرب الذین کانوا قد اسلموا فلما تحولت القبلة ارتدوا "

اور تیسری وجہ جو اصم رحمہ اللہ نے بیان کی وہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ ہم آپ کا قبلہ تبدیل کر رہے ہیں لیکن آپ کو تو جس طرف متوجہ ہونے کا حکم دے دیا گیا آپ تو اسی پر راضی رہیں گے آپ سے ناراض ہونے کا تصور تو ممکن نہیں ، جس طرح عرب حضرات میں سے بعض اسلام لانے کے باوجود قبلہ کی تبدیلی کے حکم کے بعد (العیاذ باللہ) مرتد ہو گئے تھے۔

" ورابعها (ترضاها) ای ترضی عاقبتها لأنک تعرف بها من یتبعک للاسلام ممن

یتبعک لغیر ذلک من دنیا یصیبھا او من یکتسبه "
اور چوتھی وجہ یہ ہے کہ آپ قبلہ کی تبدیلی کے انجام پر راضی ہیں کیونکہ آپ کو تو معلوم ہے کہ کون آپ کی تابعداری صرف اسلام سے محبت کی وجہ سے کر رہا ہے، اور کون آپ کی تابعداری اس کے بغیر دنیاوی اغراض اور مال حاصل کرنے کے لئے کر رہا ہے۔ یعنی قبلہ کی تبدیلی کے بعد یہ دونوں فریق نمایاں طور پر علیحدہ علیحدہ نظر آئیں گے، جو اسلام کی وجہ سے آپ کی تابعداری کر رہے ہیں وہ تو پھر بھی تابعداری کرتے رہیں گے اور جو دنیاوی اغراض و مقاصد کی وجہ سے تابعداری کر رہے ہیں وہ پھر جائیں گے۔
(از کبیر)

خیال رہے کہ " ترضاھا " میں یہ وجوہ ذکر کرنے کی ضرورت اس لئے درپیش آئی کہ در حقیقت ایک سوال کو مندفع کرنا مقصود تھا وہ سوال یہ تھا کہ "رضا" بمقابلہ "سخط" استعمال ہوتا تھا "سخط" کا معنی ناراض ہونا اور "رضا" کا معنی ناراض نہ ہونا۔ نبی کریم ﷺ کا بیت المقدس کی طرف منہ کرنے پر ناراض ہونے کا کیا مطلب؟ واضح کر دیا کہ یہاں "رضا" کے اور مطالب ہیں۔ ناراض نہ ہونے والا معنی نہیں لیا گیا۔

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ: "فا" تعقیب مع الوصل کو چاہتی ہے۔ جس سے پتہ چلا کہ " فَلَنُوَلِّيَنَّكَ " ارشاد فرما کر ساتھ ہی حکم دے دیا کہ اب آپ کعبہ کی طرف منہ پھیر لیں۔

وجھک سے مراد: ذکر "وجہ" ہے لیکن مراد اس سے تمام بدن ہے کیونکہ انسان پر واجب ہے کہ اپنے تمام بدن سے قبلہ کا استقبال کرے، صرف چہرہ کو قبلہ کی طرف کرنا اور باقی بدن کو قبلہ سے پھیر لینا جائز نہیں۔ چونکہ "وجہ" (چہرہ) تمام اعضاء سے اشرف ہے اسی سے ایک دوسرے انسان کے درمیان تمیز ہوتی ہے۔ " فلھذا السبب قد یعبر عن کل الذات بالوجه " اسی وجہ سے کبھی "وجہ" کا ذکر کر کے مراد کل ذات لے لی جاتی ہے۔
(کبیر)

شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ: یہاں " شطر " کا معنی طرف ہے اگرچہ " شطر " کا اصل میں معنی ہے "جدا ہونا" کہا جاتا ہے " شطر " جب وہ جدا ہو جائے جو گھر دوسرے گھروں سے علیحدہ ہوا سے "دار شطور " کہتے ہیں پھر ایک جانب طرف کو شطر کہہ لیا جاتا ہے خواہ جدا ہو یا نہ ہو۔
" والحرام المحرم ای محرم فیه القتال او ممنوع عن الظلمة ان یتعرضوه "

مسجد حرام کو حرام کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہاں قتال کرنا حرام ہے اور ظالمین کو وہاں ظلم کرنے کی اجازت نہیں۔ (تفصیل پہلے گزر چکی ہے)

مسجد کا ذکر کیا کعبہ کا نہیں، کیا وجہ؟ جب قبلہ کی تبدیلی کا حکم ہوا اس وقت نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ میں تھے جو مکہ مکرمہ سے دور ہے "والبعید یکفیه مراعاة الجهة لان استقبال عینها حرج علیه بخلاف القریب" اور دور والے کے لئے کعبہ کی جہت کی طرف منہ کرنا کافی ہے قریب والے کے لئے یعنی جسے کعبہ شریف نظر آ رہا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ عین کعبہ کی طرف متوجہ ہو دور والے کے لئے عین کعبہ کی طرف توجہ کرنے کی قید لگانا حرج عظیم ہے۔ (ارشادی)

تنبیہ: پہلے پارہ میں " قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ " کی وضاحت کرتے ہوئے کافی حد تک مسئلہ واضح کر دیا گیا، یہاں اتنا سمجھا جائے کہ یہ ضروری نہیں کہ قبلہ کی سمت معین کرنے میں علم ریاضی اور علم ہیئت اور موجودہ سائنسی آلات سے جو سمت معین ہوگی اسی کی طرف منہ کرکے نماز پڑھی جائے تو نماز صحیح ہوگی ورنہ صحیح نہیں ہوگی، یہ کہنا سراسر غلط ہے۔

" ویدل علیه ان الناس من عهد رسول الله ﷺ بنوا المساجد فی جمیع بلاد الاسلام ولم یحضروا قط مهندسا عند تعیین جهة القبلة "

اس پر واضح دلیل یہ موجود ہے کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں مختلف شہروں میں مسلمانوں نے مساجد تعمیر کیں انہوں نے قبلہ کی سمت مقرر کرنے کے لئے کسی ریاضی دان اور سائنس دان کو نہیں بلایا۔

" وحیث اجتمعت الامة من الصحابة والتابعین ومن بعدهم علی صحة ما وقع فیها من الصلوة علمنا ان محاذاة عین الکعبة لیست بشرط "

اور اس میں صحابہ کرام اور تابعین اور بعد میں آنے والے علماء اور صلحاء کا اجماع کہ ان مساجد میں نماز صحیح ہے جو علم ہندسہ وغیرہ والے لوگوں کے بغیر ہی سمت مقرر کر کے بنائی گئی پتہ چلا کہ دور والوں کے لئے کعبہ کی جہت کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنا ضروری ہے عین کعبہ کا تعین ضروری نہیں۔

" لو کان استقبال عین الکعبة واجب لکان تعلم الدلائل لهندسیة واجبا علی کل احد لان استقبال العین لا سبیل الیه الا بتلک الدلائل ولما کان غیر واجب علمنا ان استقبال العین غیر واجب "

اگر عین کعبہ کا استقبال واجب ہوتا تو ہر شخص پر علم ہندسہ کا پڑھنا واجب ہوتا کیونکہ اس کے بغیر عین کعبہ کا تعین ممکن نہیں جب علم ہندسہ، علم ہیئت، علم سائنس کا پڑھنا ہر شخص پر واجب نہیں تو پتہ چلا دور والوں کے لئے صرف جہت کی طرف توجہ کرنا کافی ہے۔ (از شیخ زادہ)

نبی کریم ﷺ کی حدیث پاک بھی " شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ " کی وضاحت کر رہی ہے۔

☆ " عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ ما بین المشرق و المغرب قبلة "

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مشرق و مغرب کے درمیان قبلہ ہے۔ (ترمذی)

آپ کا یہ ارشاد مدینہ طیبہ والے لوگوں کے لئے تھا جن کا قبلہ مشرق اور مغرب کے درمیان جنوبی طرف واقع ہے اس حدیث پاک سے بھی سمت کا تعین کافی سمجھ آتا ہے۔ اس لئے وہ لوگ ضال اور مضل ہیں جن کو نماز تو آتی نہیں، مسائل سے ناواقف ہوتے ہیں لیکن قطب نما اٹھائے پھرتے ہیں۔ اور مساجد کے قبلہ پر معترض ہوتے رہتے ہیں اور صدیوں سے ان مساجد میں نماز پڑھنے والے حضرات کی نمازوں کو باطل قرار دیتے ہیں وہ خود باطل راہ پر ہیں۔

48 ڈگری تک سمت کے معین کرنے کے لئے وسعت ہے اس لئے بنی ہوئی مساجد میں پانچ، سات ڈگری کے فرق سے اعتراض کی ضرورت نہیں۔ البتہ نئی مساجد کے لئے قبلہ کی سمت کو معین کرنے کے لئے آلات سے کام لے لیا جائے تو بہتر ہے۔

اسی وجہ سے علامہ غزالی رحمہ اللہ نے علم ہندسہ، علم ہیئت وغیرہ کو ضرورت کے مطابق سیکھنے کو محمود کہا اور حد سے زیادہ ان علوم میں عمر گنوا دینے کو مذموم کہا لیکن قرآن و حدیث کا زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنا محمود ہے۔

افسوس آجکل یہود و نصاری کو فکر لاحق ہے کہ قرآن و حدیث کا علم مسلمانوں سے کیسے چھڑایا جائے انہوں نے اپنے یار بنا رکھے ہیں، جو بے دینوں کو دیندار بنانے کی فکر تو نہیں کر رہے البتہ دینداروں کو بے دین بنانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں آٹھویں صدی ہجری کے مشہور معروف عالم ابن رجب حنبلی اسی بناء پر سمت قبلہ میں آلات رصدیہ اور تدقیقات ریاضیہ میں پڑنے کو منع فرماتے ہیں۔

" واما علم التيسير فاذا تعلم منه ما يحتاج اليه للاستهداء و معرفة القبلة و الطرق كان

جائزا عند الجمهور وما زاد علیه فلاحاجة الیه وهو یشغل عما هو اهم منه وربما ادی التدقیق فیه الی اساء ة الظن بمحاریب المسلمین فی امصارهم کما وقع فی ذلک کثیر من اهل هذا العلم قدیما وحدیثا وذلک یفضی الی اعتقاد خطأ الصحابة والتابعین فی صلواتهم فی کثیر من الامصار وهو باطل وقد انکر الامام احمد الاستدلال بالجدی وقال انما ورد ما بین المشرق والمغرب قبلة "

لیکن علم تیسیر کا اتنی قدر جمہور کے نزدیک حاصل کرنا جائز ہے جس سے راہ حاصل کر سکے اور قبلہ کی سمت متعین کر سکے اور راستوں کا پتہ چلا سکے۔ اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں کیونکہ اس قسم کے علوم میں زیادہ مشغول رہنا ضروری علوم سے اسے غافل کر دے گا بلکہ بسا اوقات تدقیقات فلسفہ میں پڑنے سے مسلمانوں کے شہروں میں واقع مساجد کے محرابوں کو دیکھ کر بدگمانی پیدا ہوتی ہے جیسا کہ قدیم فلاسفہ یا نئے فلاسفہ اس قسم کی بدگمانی کا شکار ہوتے رہے۔ یہ بدگمانیاں انسان کو یہاں تک پہنچا دیتی ہیں کہ وہ صحابہ کرام اور تابعین مکرمین کی نمازوں کو غلط سمت کی طرف سمجھنے لگ جاتا ہے یہی باطل راہ ہے (یہی مسلمانوں کے زوال کا سبب بنا) حضرت امام احمد رحمہ اللہ نے ستارہ جدی (قطبی ستارہ) سے کعبہ کی تعیین میں دلیل پکڑنے کو منع کیا اور فرمایا کہ قبلہ مشرق اور مغرب کے درمیان ہے۔

نتیجہ واضح ہوا: کعبہ شریف سے مشرق کی طرف رہنے والوں کے لئے موسم گرما اور موسم سرما کے غروب ہونے کے درمیان قبلہ ہے ریاضی کے قواعد کے مطابق ان کے درمیان 48 ڈگری کا فاصلہ ہے 48 ڈگری ہی شرح چغمینی باب رابع ص ٦٦ میں بھی مذکور ہے۔ لہذا 24 ڈگری تک دائیں بائیں ہونے سے نماز درست ہوگی (از معارف) اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے بہت طویل بحث کی ہے آپ کا مختار یہ ہے کہ زوایہ قائمہ 90 ڈگری ہے 45 ڈگری سے کم فرق پر نماز صحیح ہوگی۔ (از فتاوی رضویہ)

ابھی جو 24 ڈگری کا ذکر کیا ہے اس قول کو علامہ رازی رحمہ اللہ علیہ کے اس بیان سے تائید ملتی ہے "شطر" کا ایک معنی نصف ہے کہا جاتا ہے "شطرت الشئی ای جعلته نصفین" میں نے فلاں چیز کے دو حصے بنائے۔

"ان المصلی خارج المسجد لو وقف بحیث یکون متوجها الی المسجد ولکن لا یکون متوجها الی منتصف المسجد الذی هو موضع الکعبة لا تصح صلوته"

نمازی جب مسجد حرام سے باہر ہو اور مسجد کی طرف متوجہ ہو لیکن کعبہ کے مقام کے نصف مسجد کی طرف توجہ نہ کرے تو اس کی نماز نہیں ہوگی۔ (از کبیر)

خیال رہے کہ " شطر " کا معنی جانب کرنا زیادہ بہتر قرار دیا گیا تاہم جب " شطر " میں نصف والے معنی کا بھی احتمال ہے تو احتیاط اسی میں ہے کہ 24 ڈگری سے زائد انحراف کی صورت میں نماز کے نہ ہونے کا قول کیا جائے اگرچہ بعض مفسرین نے 45 ڈگری تک بھی جواز کا قول کیا ہے۔

وَحَیْثُ مَا کُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَکُمْ شَطْرَه‘ :

''اور جہاں بھی تم ہو تو پھیر لو اپنے مونہوں کو اسی طرف''

پہلا خطاب فقط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا گیا ﴿ فَوَلِّ وَجْهَکَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴾ اس لئے کہ آپ کو علیحدہ خطاب میں آپ کی عظمت شان کو ذکر کیا گیا۔ اور ساتھ ساتھ آپ کی رغبت کے مطابق قبلہ کو تبدیل کرنے کی دعا کی قبولیت کو بیان کیا گیا۔ اب تمام لوگوں کو خطاب ہے خواہ وہ اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ موجود تھے، یا موجود نہیں تھے یعنی پہلے خطاب سے ضمناً سمجھ آیا تھا کہ جو حکم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا وہی آپ کی امت کے لئے ہے لیکن اس میں امت کو صراحۃً حکم دیا گیا کہ وہ بھی مسجد حرام کی طرف ہی اپنے اپنے منہ کرلیں۔ (از بیضاوی و شیخ زادہ)

وَاَنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ لَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ :

اور بیشک وہ لوگ جو کتاب دیئے گئے وہ جانتے ہیں کہ بیشک یہ حق ہے ان کے رب کی طرف سے

یعنی یہود کو تورات کے ذریعے یہ علم تھا کہ آخری نبی کے یہ اوصاف ہوں گے " وانه یصلی الی القبلتین " اور وہ دو قبلہ کی طرف استقبال کر کے نماز ادا کریں گے ان کا پہلا قبلہ بیت المقدس ہوگا، اور دوسرا قبلہ کعبہ شریف ہوگا۔ اور ان کے علم کی یہ وجہ بھی تھی: " انهم کانوا یعلمون ان الکعبة هی البیت العتیق الذی جعله اللہ تعالیٰ قبلة لابراهیم واسمعیل علیهما السلام " کہ بیشک وہ جانتے تھے کہ بیشک کعبہ شریف ہی دنیا میں پہلا گھر ہے اور اسی کو قدر و منزلت حاصل ہے اسی کو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کا قبلہ بنایا تھا۔ اور وجہ ان کے علم کی یہ تھی کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو جانتے تھے آپ کے معجزات کو وہ دیکھ چکے تھے:

" ومتی علموا نبوته فقد علموا لا محالة ان کل ما اتی به فهو حق فکان هذا التحویل حقا "
اور جب ان کو آپ کی نبوت کا علم یقینی طور پر حاصل ہو چکا تھا تو یقیناً ان کو یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ یہ قبلہ کی تبدیلی حق ہے۔ (از کبیر)

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ: اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ غافل اس سے جو وہ عمل کرتے ہیں۔

ان الفاظ مبارکہ میں مسلمانوں کے لئے وعد بھی ہے، اور یہود کے لئے وعید بھی اگر خطاب مسلمانوں کو ہو تو ان کے لئے وعدا اور بشارت ہے " لا یخفی علی جدکم واجتهاد کم فی قبول الدین فلا اخل بثوابکم " یعنی تمہارا اپنے نیک اعمال میں کوشش کرنا اور اس میں محنت کرنا رب تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں اس لئے تمہارے اعمال کو وہ دین میں قبول فرمائے گا اور تمہارے ثواب میں کوئی کمی نہیں کرے گا۔ (از کبیر)

قبلہ مقرر کرنے میں حکمتیں:

(۱) اللہ تعالیٰ نے انسان میں قوۃ عقلیہ کو پیدا کیا جس سے وہ مجردات اور معقولات کا ادراک کرتا ہے اور قوۃ خیالیہ کو پیدا فرمایا جو عالم اجسام میں تصرف کرتی ہے قوۃ عقلیہ اور قوۃ خیالیہ ایک دوسری کے ساتھ ہی رہتی ہیں کم ہی ایک دوسری سے جدا ہوتی ہیں۔ انسان جب امر عقلی مجرد کو ذہن میں حاضر کرنا چاہتا ہو تو ضروری ہے کہ اس کی ایک صورۃ خیالیہ کو ذہن میں منقش کرے پھر قوۃ عقلیہ سے اس کا ادراک کرے۔

اسی سے واضح ہو گیا کہ قوۃ خیالیہ اور قوۃ عقلیہ ساتھ ساتھ پائی جاتی ہیں ایک دوسری سے جدا نہیں ہوتیں علم ہیئت والا شخص جب ارادہ کرتا ہے مقادیر کے احکام میں سے کسی حکم کو ادراک کرنے کا تو اس کے لئے شکل وصورت کو معین کر کے ذہن میں لاتا ہے۔ تو اس کو عقل میں لانے کے لئے جس اور خیال کو بھی معین کیا جاتا ہے پھر اس کا ادراک کیا جاتا ہے یعنی کسی چیز کے ادراک کے لئے اس کی طرف کامل توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس تمہید کے بعد بلا تشبیہ وتمثیل مسئلہ کو یوں سمجھا جائے کہ جب انسان جو کہ عبد ضعیف ہے اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری دیتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اس ذات کا استقبال

کرے اس سے اعراض نہ کرے اور اپنی زبان سے اس کی تعریف زیادہ سے زیادہ کرے، اور اس کی خدمت اور عجز کے اظہار میں زیادہ سے زیادہ کوشش کرے۔ چونکہ رب تعالیٰ مکان اور جہت سے پاک ہے اس لئے قبلہ کی طرف توجہ کرنے کا حکم دے کر گویا کہ ذات کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دے دیا گیا، اسی حکم سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ بندہ رب تعالیٰ سے اعراض نہیں کر رہا۔ پھر قراءت اور تسبیحات اللہ تعالیٰ کی تعریف ہیں اور رکوع وسجود رب تعالیٰ کی خدمت کے قائم مقام ہیں۔

(۲) مقصود نماز میں دل کا حاضر رکھنا ہے اور دل کا حضور اس وقت تک نہیں حاصل ہو سکتا جب تک سکون حاصل نہ ہو اور حرکت اور ادھر ادھر توجہ کو چھوڑ نہ دے " **وهذا لا يتاتى الا اذا بقى فى جميع صلوته مستقبلا لجهة واحدة على التعين** " اور یہ کیفیت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب ایک جہت کی طرف توجہ کی جائے پھر کعبہ شریف کی خصوصی فضیلت کی وجہ سے رب تعالیٰ نے اسی کو نماز میں توجہ کرنے کے لئے منتخب فرما دیا۔

(۳) قبلہ مقرر کرنے کی اور وجہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ یہ پسند فرماتا ہے کہ مومن آپس میں ایک دوسرے سے محبت کریں اور ایک دوسرے سے اتفاق واتحاد رکھیں اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کے درمیان اتفاق واتحاد کو مقام احسان میں ذکر فرمایا ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

﴿ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ﴾
(آل عمران: ۱۰۳)

" اور اللہ کا احسان اپنے اوپر یاد کرو جب تم میں دشمنی تھی اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی تو اس کے فضل سے تم آپس میں ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے"۔ اگر ہر شخص نماز میں اپنی مرضی سے جدھر چاہتا منہ کر لیتا تو مومنین کا آپس میں اختلاف ظاہر ہوتا " **فعين الله تعالىٰ لهم جهة معلومة وامرهم جميعا بالتوجه نحوها ليحصل لهم الموافقة بسبب ذلك** " تو اللہ تعالیٰ نے سب کے لئے ایک ہی قبلہ معین فرما دیا اور سب کو اسی کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دے دیا تاکہ ان کے درمیان اتفاق واتحاد رہے۔

" **وفيه اشارة الى ان الله يحب الموافقة بين عباده فى اعمال الخير** "

اسی سے ایک اور مسئلہ سمجھ آ گیا کہ کسی نیکی کے کام میں بندوں کا متفق ہونا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔

کعبہ کو قبلہ بنانے میں حکمتیں:

(۱) اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو اپنی طرف منسوب کر کے اسے خصوصیت وفضیلت عطاء کی رب تعالیٰ نے "بیتی" ذکر فرمایا کہ یہ میری طرف منسوب ہونے کی وجہ سے میرا گھر ہے۔ اور مؤمنین کو اللہ تعالیٰ نے صفت عبودیت سے خاص فرمایا اور اپنی طرف منسوب کیا گویا کہ یوں فرمایا:

"یا مؤمنین انت عبدی والکعبة بیتی والصلوة خدمتی فاقبل بوجهک فی خدمتی الی بیت وبقلبک الی"

اے مومن تو میرا بندہ ہے، اور کعبہ میرا گھر ہے، اور نماز میری خدمت ہے لہذا میری خدمت میں تو میرے گھر کی طرف توجہ کر اور اپنے دل کو کامل طور پر میری طرف متوجہ کر۔

(۲) یہود کا استقبال قبلہ کی غربی جانب تھا یعنی (بیت المقدس کی غربی جانب) کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس نداء غربی جانب سے آئی اور نصاریٰ کا مشرقی جانب تھا کہ جبریل حضرت مریم کے پاس مشرقی جانب سے آئے۔ اور مؤمنین کا قبلہ کعبہ شریف مقرر کیا گیا" **لانها قبلة خليل الله ومولد حبيب الله وهي موضع حرم الله**" کیونکہ یہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا قبلہ ہے اور اللہ کے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیدائشی شہر ہے اور یہ مقام اللہ تعالیٰ کا حرم ہے۔

(۳) "**استقبلت النصارى مطلع الانوار وقد استقبلنا مطلع سيد الانوار وهو محمد صلی اللہ علیہ وسلم فمن نوره خلقت الانوار جميعا**"

نصاریٰ کا قبلہ انوار کے طلوع ہونے کا مقام (سورج کا مطلع) اور ہمارا قبلہ سب نوروں کے سردار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے طلوع ہونے کا مقام ہے آپ کے نور سے تمام نور پیدا کئے گئے۔

(۴) کعبہ چونکہ زمین کے وسط اور مرکز میں ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے زمین کے وسط کو قبلہ مقرر فرمایا:

"وهو اشارة الى انه يجب العدل في كل شئ ولاجله جعل وسط الارض قبلة للخلق"

اس سے یہ مسئلہ واضح کیا کہ ہر چیز میں عدل واجب ہے اسی وجہ سے زمین کے وسط کو مخلوق کا قبلہ بنایا گیا۔

(۵) "**انه تعالیٰ اظهر حبه لمحمد عليه الصلوة والسلام بواسطة امره باستقبال الكعبة**"

بیشک اللہ تعالیٰ نے کعبہ شریف کی طرف توجہ کرنے کا حکم دے کر واضح کر دیا کہ مجھے

محمد مصطفیٰ ﷺ سے محبت ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ یہود کی مخالفت کی وجہ سے چاہتے تھے کہ قبلہ بدل جائے تو رب تعالیٰ نے آپ کی تمنا کے مطابق جب قبلہ تبدیل فرمادیا تو نبی کریم ﷺ کا رب تعالیٰ کا محبوب ہونا واضح ہوگیا:

"فالله تعالی قد حول لاجل حبیبه محمد علیه الصلوة والسلام علی جهة التحقیق"

یہ بات تحقیق سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب محمد مصطفیٰ ﷺ کی تمنا اور خواہش پر قبلہ کو تبدیل فرمایا اس پر دلیل یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے یہ فرمایا ﴿ فلنولینک قبلة ترضاها ﴾ ہم ضرور بضرور آپ کو پھیر دیں گے اس قبلہ کی طرف جسے آپ پسند کرتے ہیں۔ یہ نہیں فرمایا " قبلة ارضاها " کہ آپ کو اس قبلہ کی طرف پھیر دوں گا جو مجھے پسند ہے اس میں اشارہ ہے اس طرف گویا کہ رب تعالیٰ یہ فرماتا ہے" یا محمد کل احد یطلب رضای وانا اطلب رضاک فی الدارین " اے محمد ہر ایک میری رضاء طلب کرتا ہے اور میں دونوں جہانوں میں تمہاری رضاء طلب کرتا ہوں۔ دنیا میں آپ کی رضاء کی طلب تو اسی آیۃ کریمہ سے سمجھ آ گئی اور آخرت میں رب تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ﴿ وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ ﴾ (آپ کو آپ کا رب اتنا دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے) اسی پر دلالت کر رہا ہے۔

(۲) کعبہ شریف کو قبلہ مقرر فرما کر فقراء کی شان کو بیان فرمادیا کیونکہ رب تعالیٰ نے فقراء کے متعلق فرمایا " فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظَّالِمِينَ " اے مخاطب کے باشد اگر تم نے ان فقراء کو اپنی مجالس سے نکال دیا تو تم ظالم ہو جاؤ گے۔ اور کعبہ شریف کے متعلق فرمایا:

" ولئن اتبعت اهوائهم من بعد جاء ک من العلم انک اذا لمن الظالمین "

اور اگر تم نے ان کی خواہشات کی تابعداری کی اس کے بعد جب تمہارے پاس علم آ گیا تو بیشک تم ظالموں سے ہو جاؤ گے گویا کہ رب تعالیٰ نے مومنین کو یہ فرمایا:

" الکعبة قبلة وجهک والفقراء قبلة رحمتی فاعراضک عن قبلة وجهک یوجب کونک ظالما فالاعراض عن قبلة رحمتی کیف یکون "

کہ کعبہ تمہارے چہروں کواس کی طرف متوجہ کرنے کا قبلہ بنایا۔ لیکن فقیر لوگ میری رحمت کا قبلہ ہیں۔ تمہارا اپنے چہرہ کو متوجہ کرنے کے قبلہ سے اعراض جب تمہیں ظالم بنا دیتا ہے تو تمہارا کیا خیال ہے کہ تم میری رحمت کے قبلہ سے اعراض کر کے کتنے ہی مجھ سے دور ہو گے، کتنے ہی بڑے ظالم ہو گے۔

۷) " العرش قبلة الحملة و الكرسى قبلة البررة ، و البيت المعمور قبلة السفرة و الكعبة قبلة المؤمنين و الحق قبلة المتحيرين من المؤمنين قال الله تعالىٰ (فاينما تولوا فثم وجه الله) "

حاملین عرش فرشتوں کا قبلہ عرش ہے، بررہ فرشتوں کا قبلہ کرسی ہے سفرہ فرشتوں کا قبلہ البیت المعمور ہے مؤمنین کا قبلہ کعبہ ہے اور مؤمنین جو متحیر ہوں ان کا قبلہ حق تعالیٰ ہے اسی لئے رب تعالیٰ نے فرمایا" فاينما تولوا فثم وجه الله " جدھر تم منہ کرو اسی طرف اللہ کی ذات ہے۔

اور ثابت ہوا کہ عرش نور سے پیدا کیا گیا اور کرسی موتی سے، اور البیت المعمور یاقوت سے، اور کعبہ شریف پانچ پہاڑوں سے طور سینا، طور زیتا، جودی، لبنان اور حراء سے بنایا گیا گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

" ان كانت عليك ذنوب بمثقال هذه الجبال فاتيت الكعبة حاجا او
توجهت نحوها مصليا كفرتها عنك و غفرتها لك "

اگر تجھ پر ان پہاڑوں کے برابر بھی گناہ ہوئے توجہ کرنے کی غرض سے کعبہ کے پاس آ گیا یا نماز پڑھنے کے لئے کعبہ کی طرف متوجہ ہو گیا (یعنی سچے دل سے تائب ہو کر میرے حضور آ گیا) تو میں تیرے گناہ مٹا دوں گا اور تیری مغفرت کر دوں گا۔ (از کبیر)

تنبیہ : تفاسیر کے حوالے تقدیماً و تاخیراً ذکر کئے گئے ہیں اس لئے " سيقول السفهاء " سے لے کر اس زیر بحث آیات کریمہ تک کی تفاسیر سے حوالے تلاش کئے جائیں۔

مسئلہ : استقبال قبلہ کے لئے نیت کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ آیۃ کریمہ میں قبلہ کی طرف استقبال کرنے کا حکم دیا گیا جب قبلہ کا استقبال کر لیا تو عمل ہو گیا مزید نیت کی ضرورت نہیں جس طرح ستر عورت، طہارت مکان اور کپڑوں کی طہارت میں نیت کی ضرورت نہیں۔ (کبیر)

☆☆☆☆☆

﴿ وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاءَ هُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِيْنَ ﴾

۱) ''اور اگر تم ان کتابیوں کیلئے ہر نشانی لے کر آ ؤ وہ تمہارے قبلہ کی پیروی نہ کریں گے اور نہ تم ان کے قبلہ کی پیروی کرو اور وہ آپس میں بھی ایک دوسرے کے قبلہ کے تابع نہیں اور (اے سننے والے کسے باشد) اگر تو اس کی خواہشوں پر چلا بعد اس کے کہ تجھے علم مل چکا تو اس وقت تو ضرور ستمگار ہوگا''۔

۲) ''اور اگر لاؤ تم'' ان لوگوں کے پاس جو کتاب دیئے گئے'' ہر قسم کی نشانی۔نہیں تابعداری کریں گے وہ تمہارے قبلہ کی اور نہ تم تابعداری کر وان کے قبلہ کی اور وہ آپس میں بھی ایک دوسرے کے قبلہ کی تابعداری کرنے والے نہیں اور (اے سننے والے کسے باشد) اگر تم تابعداری کر وان کی خواہشات کی اس کے بعد جو تمہیں علم حاصل ہو چکا تو بیشک تم ظالموں سے ہو گے''۔

اللہ تعالیٰ نے پہلی آیۃ کریمہ میں بیان فرمایا ﴿ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ﴾ اور بیشک اہل کتاب البتہ جانتے ہیں بیشک یہ (تحویل قبلہ) حق ہے ان کے رب کی طرف سے۔

اس آیۃ کریمہ میں بیان فرمایا کہ آپ ان کے پاس ہر قسم کے دلائل لے آ ؤ وہ پھر بھی تمہارے قبلہ کی تابعداری نہیں کریں گے " لان صفتهم لا تتغير فى الاستمرار على المعاندة " کیونکہ ان کی صفت نہیں بدلے گی، ان کی فطرت میں ہی یہ داخل ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ اور مؤمنین سے عناد رکھنا، اور ہمیشہ اسی پر قائم رہنا ہے۔ پھر ان سے کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ آپ کے قبلہ کی تابعداری کریں گے یعنی ان کے اسلام لانے کی آپ امید نہ رکھیں وہ عناد کی وجہ سے اس نعمت سے محروم

رہیں گے۔ (از کبیر)

﴿ وَلَئِنْ اَتَیْتَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ بِکُلِّ آیَۃٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَکَ ﴾

''اور اگر لاؤ تم ہر قسم کی نشانی اہل کتاب کے پاس تو وہ تمہارے قبلہ کی تابعداری نہیں کریں گے''

'' اتی '' کے بعد '' بـا '' تعدیۃ کے لئے آئی ہوئی ہے اس لئے اس کا معنی لانا۔ '' آیۃ '' فعلۃ کے وزن پر ہے اصل میں یاء مشدد ہے '' آیۃ '' لیکن تشدید میں ثقل تھا اس لئے پہلے یا ساکن ماقبل فتحہ، سے الف سے بدل دیا گیا۔ آیۃ کا معنی حجت اور علامت، اور کہا جاتا ہے '' آیۃ الـرجـل '' جس کا معنی انسان کی ذات اور تشخص اسی طرح کہا جاتا ہے '' خرج القوم بآیتهم '' قوم اپنی جماعت سے نکل گئی۔

قرآن پاک کی آیۃ کو آیۃ کہنے کی وجہ:

ایک وجہ یہ ہے کہ قرآن پاک کی آیۃ میں کئی حروف جمع ہوتے ہیں حروف کی جماعت کو آیۃ کہہ دیا گیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ آیۃ کا معنی علامت ہے یہ بھی بعد والے کلام کے منقطع ہونے کی علامت بنتی ہے اور اس پر بھی دلیل اور علامت ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے مخلوق سے منقطع ہے یعنی مخلوق نہیں (از کبیر)

'' ولئن '' میں لام موطئہ للقسم ہے '' بکل آیۃ '' کا مطلب ہے '' حجۃ قطعیۃ دالۃ علی حقیقۃ التحویل '' کہ آپ ان کے پاس قبلہ کی تبدیلی کے حق ہونے پر ہر قسم کے قطعی دلائل لے آئیں وہ اسے تسلیم نہیں کریں گے اس کی وجہ یہ ہے '' انهم ما ترکوا قبلتک لشبهۃ تزیلها الحجۃ وانما خالفوک مکابرۃ وعنادا '' کہ انہوں نے آپ کے قبلہ کو اس لئے نہیں چھوڑا کہ ان کو اس میں کوئی شبہات حاصل تھے کہ وہ دلائل سے زائل ہو جائیں تو یہ ایمان لے آئیں اور آپ کے قبلہ کو تسلیم کر لیں۔ ان کی مخالفت تو صرف حسد، عناد اور تکبر کی وجہ سے ہے لہٰذا نہ ان سے عناد نے زائل ہونا ہے اور نہ ہی انہوں نے آپ کے قبلہ کی تابعداری کرنی ہے۔ (ابوالسعود)

وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ : اور نہ تم ان کے قبلہ کی پیروی کرو۔

یہ ترجمہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ہے راقم نے بھی اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ

کے اس قول سے اسے تائید حاصل ہے " لفظ خبر ویتضمن الامر ای فلا ترکن الی شئی من ذلک " کہ اگرچہ الفاظ کے لحاظ پر تو یہ جملہ خبریہ ہے لیکن معنی کے لحاظ سے جملہ انشائیہ ہے معنی یہ ہے کہ آپ ان کے قبلہ کی تابعداری نہ کرو۔ تاہم اگر معنی ہی خبر والا کر دیا جائے کہ "آپ تابعداری کرنے والے نہیں ان کے قبلہ کی" تو یہ معنی بھی درست ہے۔

اس ایک جملہ سے پانچ مسائل بیان کر دیئے:

"الاول ، انه دفع لتجويز النسخ وبيان ان هذه القبلة لا تصير منسوخة "

ایک یہ کہ قبلہ کی پھر منسوخی کے احتمال کو ختم کر دیا یہ ثابت کر دیا کہ اب آپ کا یہی قبلہ تا قیامت رہے گا اب یہ حکم پھر منسوخ نہیں ہوگا آپ ان کے قبلہ کی کبھی بھی تابعداری کرنے والے نہیں۔

" والثانی حسما لا طماع اهل الكتاب فانهم قالوا ، لو ثبت علی قبلتنا لكنا نرجو ان تكون صاحبنا الذی ننتظره وطمعوا فی رجوعه الی قبلتهم "

اور دوسرا یہ ثابت ہوا کہ اہل کتاب یہ کہتے تھے کہ اگر یہ نبی ہمارے قبلہ پر قائم رہیں تو ہم امید رکھیں گے کہ یہ وہی نبی ہوں گے جن کی انتظار کی جارہی ہے اور وہ یہ طمع کر رہے تھے کہ یہ ہمارے قبلہ کی طرف رجوع کر لیں گے۔ ان کے اس طمع کو ختم کر دیا گیا کہ اے محبوب آپ تو ان کے قبلہ کی تابعداری کرنے والے نہیں ان کا طمع کرنا بے مقصد ہے اور ان کا یہ کہنا بھی لغو ہے کہ اگر یہ ہمارے قبلہ پر قائم رہیں تو ہم ان کے آخری نبی ہونے کی امید کریں گے۔ اگر یہ سچے ہوتے تو سولہ، سترہ ماہ آپ ان کے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے رہے وہ آپ کو نبی تسلیم کر لیتے جب انہوں نے ایمان نہیں لایا تو یہ جھوٹے ہیں۔

" الثالث ، المقابلة يعنی ما هم بتاركی باطلهم وما انت بتارك حقك "

تیسرا مسئلہ یہ بیان کیا گیا کہ جب وہ اپنے باطل راستہ کو چھوڑنے والے نہیں تو یقیناً آپ بھی اپنی حق راہ کو چھوڑنے والے نہیں۔ اسی مسئلہ کو ابن کثیر رحمہ اللہ نے واضح الفاظ سے بیان فرمایا:

وقوله تعالیٰ " وما انت بتابع قبلتهم " اخبار عن شدة متابعة الرسول ﷺ لما امره الله تعالیٰ به وانه كما هم مستمسكون بآرائهم

واھوانھم فھو ایضا مستمسک بامر اللہ وطاعتہ واتباع مرضاتہ وانہ
لا یتبع اھوانھم فی جمیع احوالہ ولا کونہ متوجھا الی بیت المقدس "

اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشادگرامی " وما انت بتابع قبلتھم " سے خبر دی ہے کہ رسول اللہ ﷺ
کے حکم کی بہت زیادہ تابعداری کرنے والے ہیں۔ جب کہ اہل کتاب اپنی آراء اور اپنی خواہشات کے
مطابق عمل کرتے ہیں اور اپنے نظریات کو نہیں چھوڑتے تو رسول اللہ ﷺ جو کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو تسلیم
کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے متبع ہیں تو وہ
یقیناً یہود ونصاریٰ کی خواہشات کی تابعداری کسی چیز میں نہیں کریں گے اور تحویل قبلہ کے بعد بیت المقدس
کی طرف کبھی بھی منہ نہیں کریں گے:

" الرابع اراد انہ لا یجب علیک استصلاحھم باتباع قبلتھم لان ذلک معصیۃ "

چوتھا مسئلہ یہ سمجھ آیا کہ رب تعالیٰ نے اس کی خبر دی کہ میرے محبوب ان کی خواہش کے مطابق
کبھی ان کے قبلہ کی تابعداری نہیں کریں گے کہ وہ کہیں کہ تم ہمارے قبلہ کی تابعداری کرو تو ہم تمہیں نبی
مان لیں گے۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا کہ نبی کریم ﷺ ان کی اصلاح کے لئے خود اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل چھوڑ
دیں۔ ایسا کرنا تو معصیت ہے جب تمام انبیاء کرام معصیت سے پاک ہیں تو سید الانبیا ﷺ سے
معصیت کے ارتکاب کا تصور کیسے ممکن ہے۔

" الخامس وما انت بتابع قبلۃ جمیع اھل الکتاب من الیھود
والنصاری لان قبلۃ الیھود مخالفۃ لقبلۃ النصاری فللیھود بیت
المقدس وللنصاری المشرق فالزم قبلتک ودع اقوالھم "

اور پانچواں مسئلہ یہ بیان کیا گیا کہ اے محبوب آپ تمام اہل کتاب کے قبلہ کی تابعداری کر ہی نہ
سکتے، یہود چاہتے ہیں آپ ان کے قبلہ کی تابعداری کریں حالانکہ ان کا قبلہ بیت المقدس کی غربی جانب
ہے اور نصاریٰ چاہتے ہیں کہ آپ ان کے قبلہ کی تابعداری کریں حالانکہ ان کا قبلہ بیت المقدس کی شرقی
جانب ہے۔ اس لئے اے محبوب آپ اپنے قبلہ پر ہی قائم رہیں ان کے اقوال کو چھوڑ دیں۔ (از بیہ)

اعتراض : آیۃ کریمہ سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ یہود ونصاریٰ کبھی کعبہ کی طرف متوجہ نہیں ہوں
گے حالانکہ یہود میں سے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی ایمان لے آئے اور کعبہ

کو ہی انہوں نے قبلہ مانا۔اس طرح حضرت نجاشی اور ان کے کچھ ساتھی نصاری میں سے ایمان لے آئے اور کعبہ کی طرف منہ کر کے انہوں نے نمازیں ادا کیں تو آیۃ کریمہ میں نفی کا کیا مطلب ہے؟

جواب اول: "الذین اوتوا الکتاب" سے مراد تمام اہل کتاب ہیں یعنی تمام کے تمام اہل کتاب نہ ایمان لائیں گے اور نہ ہی آپ کے قبلہ کے تابعداری کریں گے۔بعض کے ایمان لانے اور قبلہ کی تابعداری ثابت ہو جائے تو آیۃ کریمہ کے منافی نہیں۔

جواب دوم: آیۃ کریمہ میں مراد یہ ہے کہ یہود ونصاری اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے آپ کے قبلہ کی تابعداری نہیں کریں گے،ہاں جن کی قسمت میں ایمان کی نعمت کا حصول ہوگا وہ ایمان لانے پر یقیناً آپ کے قبلہ کی تابعداری کریں گے۔ (ازعزیزی)

وَمَا بَعْضُهُم بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ : اور وہ آپس میں بھی ایک دوسرے کے قبلہ کی تابعداری کرنے والے نہیں۔یعنی یہود نصاری کے قبلہ کی تابعداری کرنے والے نہیں اور نصاری یہود کے قبلہ کی تابعداری کرنے والے نہیں۔وہ آپس میں ایک دوسرے کے مخالف ہیں وہ ایک دوسرے سے پیٹھ پھیرنے والے ہیں۔اور ایک دوسرے کو گمراہ کہتے ہیں۔

یہود کا قبلہ بیت المقدس میں صخرہ (چٹان) جو غربی جانب ہے اور نصاری کا قبلہ بیت المقدس کی "مطلع الشمس" (سورج کے طلوع ہونے کی) مشرقی جانب ہے وہ آپس میں بھی کبھی اتفاق نہیں کر سکتے اور نہ ہی وہ آپ کے ساتھ متفق ہو کر آپ کے قبلہ کی تابعداری کریں گے۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاءَهُم مِّن بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِينَ :
اور (اے سننے والے کسے باشد) اگر تم تابعداری کرو ان کی خواہشات کی اس کے بعد جو تمہیں علم حاصل ہو چکا تو بیشک تم ظالموں سے ہوگے۔

مسلمانوں کو خطاب ہے کہ قبلہ کی تبدیلی کا جب تمہیں علم حاصل ہو چکا ہے اب اگر تم نے یہود ونصاری کی خواہش کے مطابق ان کے قبلہ کی طرف رخ کیا تو تم ظالم ہوگے۔

واضح ہوا کہ ہر معاملہ میں یہود ونصاری کی خواہشات کے مطابق عمل کرنے والا،ان کے ہر حکم پر سر جھکانے والا بزدل بلی کی طرح کا شیر،بدترین ظالم ہے،خونخوار درندہ ہے لیکن مسلمانوں کے لئے،

دینداروں کے لئے ،علماء کے لئے ،کافروں کے سامنے بلی ہی ہے وہ وقت کا یزید ہے کاش کہ میں اپنی زندگی میں اس یزید کو ذلیل ہوتے ہوئے دیکھ لوں۔

تسکین الجنان سے اقتباس:

﴿ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاءَ هُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَ کَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّکَ اِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِیْنَ ﴾

☆ اور اگر تم باوجود اس کے کہ تمہارے پاس دانش (یعنی وحی خدا) آچکی ہے ان کی خواہشوں کے پیچھے چلو گے تو ظالموں میں داخل ہو جاؤ گے۔ (فتح محمد صاحب)

☆ اور کبھی تو چلا ان کی پسند پر بعد علم کے جو تجھ کو پہنچا تو بیشک تو بھی ہے بے انصافوں میں (شاہ عبدالقادر صاحب)

☆ اور اگر آپ ان کے نفسانی خیالات کو اختیار کرلیں اور (اور وہ بھی) آپ کے پاس علم (وحی) آئے پیچھے یقیناً آپ ظالموں میں شمار ہونے لگیں۔ (اشرف علی صاحب)

☆ اگر تو چلا ان کی خواہشوں پر بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچا تو بے شک تو بھی ہوا بے انصافی میں (محمود الحسن صاحب)

☆ اور اگر تم نے اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آچکا ہے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو یقیناً تمہارا شمار ظالموں میں ہوگا۔ (مودودی صاحب)

☆ اور اگر (کہیں) آپ ان کی خواہشوں کی پیروی کرنے لگیں بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آچکا ہے تو یقیناً آپ (بھی) ظالموں میں (شمار) ہوں گے۔ (عبدالماجد صاحب)

☆ اگر تو پیروی کرے گا خواہشوں ان کی کہ پیچھے اس چیز کے کہ آئی تیرے پاس علم سے تحقیق تو اس وقت ظالموں سے ہے۔ (شاہ رفیع الدین صاحب)

☆ اور (اے سننے والے کسے باشد) اگر تو ان کی خواہشوں پر چلا بعد اس کے کہ تجھے علم مل چکا تو اس وقت تو ضرور ستم گار ہوگا۔ (اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان)

یہاں دیگر تراجم میں " انک من الظالمین " کی نسبت نبی کریم ﷺ کی طرف کی گئی جس میں " ولئن اتیت " کے ساتھ کوئی بالفرض کی قید کا اضافہ نہیں ہوا۔ بظاہر عام تراجم سے یہ سمجھ آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے یہود ونصاریٰ کی خواہشات کی تابعداری ممکن ہے۔ اور اگر آپ نے تابعداری

کرلی تو معاذ اللہ آپ بے انصافوں، ظالموں سے ہوں گے حالانکہ یہ تصور بھی ممکن نہیں۔

اسی وجہ سے جلالین میں ذکر کیا گیا" **انک اذا ان اتبعتهم فرضا لمن الظالمین** " یعنی کلام بالفرض محال پر مبنی ہے (مطلب یہ ہے کہ اگر آپ نے بالفرض ان کی خواہشات کی تابعداری کی تو ظالموں سے ہو جاؤ گے) صاحب مدارک فرماتے ہیں:

" **وفی ذلک لطف للسامعین وتهیج للثبات علی الحق وتحذیر لمن یترک الدلیل بعد انارته ویتبع الهوی وقیل الخطاب فی الظاهر للنبی ﷺ والمراد امته** "

اس میں سامعین پر مہربانی ہے اور حق پر ثابت رہنے کے لئے برانگیختہ کیا گیا ہے اور جو شخص دلیل کے روشن ہونے کے بعد اللہ کے حکم کو چھوڑتا ہے اور خواہشات کے در پے ہوتا ہے اس کو ڈرایا گیا ہے۔

اور یہ کہا گیا ہے کہ یہ خطاب بظاہر نبی کریم ﷺ کو ہے لیکن مراد امت ہے۔

اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت نے اپنے ترجمہ میں (اور اے سننے والے کسے باشد) کا اضافہ کیا ہے تا کہ تفاسیر کا مفہوم ترجمہ سے ہی واضح ہو جائے۔ بیضاوی نے بھی **علی سبیل الفرض والتقدیر** ذکر کیا ہے محشی نے کہا کہ یہ سوال کا جواب ہے۔

" **اتباع اهواء المخالفین لیس بمحتمل فی حقه علیه السلام للقطع بعصمة من المعاصی** "

نبی کریم ﷺ سے مخالفین کی خواہشات کی اتباع کا احتمال قطعی طور پر منتفی ہے کیونکہ آپ تو معاصی سے معصوم ہیں۔ بیضاوی نے " **علی سبیل الفرض والتقدیر** " کے الفاظ ذکر کر کے جواب دیا ہے کہ یہ کلام بالفرض ہے نہ کہ حقیقت۔ محشی نے اس کا جواب بھی نقل کیا ہے:

" **وفی عادة الناس ان یوجهوا امرهم ونهیهم الی من هو اعظم منزلة عندهم ارشادا للغیر وتاکیدا** "

کہ عام لوگوں کی عادت ہے اوامر ونواہی کو بڑے شخص کی طرف متوجہ کر دیتے ہیں اگر چہ مقصود اس سے غیروں کو ہدایت دینی ہوتی ہے اس مقام پر یہی صورت ہے جس کو اعلیٰ حضرت نے اختیار کیا ہے۔

(تسکین الجنان ص ۵۳ تا ص ۵۵)

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بہت واضح بہت خوب بیان فرمایا:

"الخطاب للنبی ﷺ والمراد امته ممن یجوز ان یتبع هواه فیصیر باتباعه ظالما ، ولیس یجوز ان یفعل النبی ﷺ ما یکون به ظالما ، فهو محمول علی ارادة امته لعصمة النبی ﷺ وقطعنا ان ذلک لا یکون منه وخوطب النبی ﷺ تعظیما للامر ولانه المنزل علیه "

یہ خطاب (ولئن اتبعت میں خطاب) نبی کریم ﷺ کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے کیونکہ کسی امتی سے تو یہ ہوسکتا ہے کہ وہ یہود و نصاری کی خواہشات پر چل کر اور ان کی اتباع کر کے ظالم ہو جائے۔ لیکن نبی کریم ﷺ یہود و نصاری کی خواہشات کی تابعداری کر کے (معاذ اللہ) ظالم ہو جائیں یہ تصور کرنا ممکن ہی نہیں لہذا ہم قطعی طور پر یہ کہتے ہیں کہ اس خطاب سے مراد آپ کی امت ہے آپ خود تو معصوم ہیں لہذا اس خطاب سے مراد آپ خود نہیں۔

البتہ خطاب بظاہر آپ کو کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ امر بہت عظیم ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن پاک نازل چونکہ حضور ﷺ پر ہوا اس لئے بظاہر خطاب آپ کو ہی ہونا ہے۔
(قرطبی)

☆☆☆☆☆

﴿ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنْھُمْ لَیَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴾

۱) ''جنہیں ہم نے کتاب عطاء فرمائی وہ اس نبی کو ایسا پہچانتے ہیں جیسے آدمی اپنے بیٹوں کو پہچانتا ہے اور بے شک ان میں سے ایک گروہ جان بوجھ کر حق چھپاتے ہیں''

۲) ''وہ لوگ جن کو عطاء کی ہم نے کتاب، وہ پہچانتے ہیں آپ کو جیسا پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو اور بیشک ایک فریق (کے لوگ) ان میں سے البتہ چھپاتے ہیں حق کو حالانکہ وہ جانتے ہیں''

پہلی آیۃ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی امت کو یہود و نصاریٰ کی خواہشات کی پیروی سے ڈرایا اور اس آیۃ کریمہ میں مومنین کو نبی کریم ﷺ کے حالات کی خبر دی گویا کہ یوں فرمایا:

"اعلموا یا معاشر المؤمنین ان علماء اهل الکتاب یعرفون محمدا وما جاء به و صدقه و دعوته وقبلته لا یشکون فیه کما لا یشکون فی ابنائهم"

اے مومنو جان لو کہ بیشک اہل کتاب کے علماء محمد ﷺ کو پہچانتے ہیں آپ نے جو اللہ کا کلام پیش فرمایا اور دین اسلام پیش کیا اسے وہ لوگ جانتے ہیں آپ کی صداقت کو جانتے ہیں آپ کی دعوت کے برحق ہونے کو وہ جانتے ہیں آپ کے قبلہ کو وہ جانتے ہیں اس میں انہیں کوئی شک نہیں، جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچاننے میں انہیں کوئی شک نہیں۔ (از کبیر)

واضح ہوا کہ یہود و نصاریٰ کے علماء کا نبی کریم ﷺ پر ایمان نہ لانا اس وجہ سے نہیں تھا کہ وہ آپ کو جانتے نہیں تھے بلکہ ضد اور حسد و عناد کی وجہ سے انہوں نے ایمان قبول نہ کیا۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ : سے مراد یہود کے علماء ہیں، یعنی ذکر عام مراد خاص ہے جب کوئی قرینہ موجود ہو تو ذکر عام مراد خاص لینا جائز ہے۔

یَعْرِفُوْنَہٗ : ضمیر منصوب رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹ رہی ہے، اگرچہ پہلے صراحۃ آپ کا ذکر نہیں، لیکن کلام کی دلالت اس پر موجود ہے یعنی وہ رسول اللہ ﷺ کو پہچانتے ہیں جس طرح اپنے

بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ بعض حضرات نے کہا کہ ضمیر علم کی طرف لوٹ رہی ہے کہ وہ علم کو پہچانتے ہیں۔ اور بعض حضرات نے کہا کہ ضمیر قرآن کی طرف لوٹ رہی ہے کہ وہ قرآن کو پہچانتے ہیں اور بعض نے کہا کہ ضمیر تحویل قبلہ کی طرف لوٹ رہی ہے کہ وہ تحویل قبلہ کو پہچانتے ہیں۔ لیکن ضمیر نبی کریم ﷺ کی طرف لوٹانا بہتر ہے کیونکہ اگر ضمیر " من بعد ما جاء ک من العلم "میں علم کی طرف لوٹے تو علم سے مراد بھی نبوت ہی ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا" انهم یعرفون ذلک العلم (ای علم النبوة) کما یعرفون ابناء هم " بیشک وہ اس علم نبوت کو ایسے پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ نبوت سے مراد نبی کریم ﷺ کا علم ہی ہوا کہ وہ نبی کریم ﷺ کا علم ایسے رکھتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کا علم رکھتے ہیں۔

تحویل قبلہ کی طرف ضمیر لوٹے تو مطلب یہ ہوگا کہ قرآن پاک میں جو تحویل قبلہ کا ذکر ہے وہ توراۃ وانجیل میں بھی مذکور ہے اور یہ خبر بھی دی گئی کہ نبی کریم ﷺ کی نبوت بھی توراۃ وانجیل میں مذکور ہے " فکان صرف هذه المعرفة الی امر النبوة اولی " لہذا امر نبوت کی معرفت اولیٰ (بہتر) ہے۔ اور وجہ یہ ہے کہ معجزات پہلے نبی کریم ﷺ کی صداقت پر دلالت کرتے ہیں۔ لیکن قبلہ کی معرفت تو موقوف ہے اس پر کہ پہلے حضور کی نبوت کو تسلیم کرے پھر یہ تسلیم کرے کہ قبلہ کی تحویل کا حکم بھی آپ نے لایا ہے لہذا یہ بھی برحق ہے یعنی دل سے تو وہ حقانیت کو بھی تسلیم کرتے تھے اگر چہ بظاہر نہیں مانتے تھے واضح ہوا کی ضمیر ہر حال میں نبی کریم ﷺ کی طرف ہی لوٹانی بہتر ہے۔ (از کبیر)

" یعرفونه باوصافه " وہ نبی کریم ﷺ کو آپ کے اوصاف کے ذریعے پہچانتے تھے کہ یہ نبی برحق ہیں یہی وہ نبی ہیں جن کے آنے کا وعدہ کیا گیا کیونکہ نبی کریم ﷺ کے اوصاف ان کی کتب میں موجود تھے خصوصاً جب انہوں نے نبی کریم ﷺ کے معجزات کا مشاہدہ کر لیا تو ان کو اس طرح پہچان حاصل ہوگئی جس طرح اپنے بیٹوں کو انسان دوسرے لڑکوں سے واضح طور پر پہچانتا ہے۔

تنبیه : ابھی تک بیٹوں کی پہچان سے مراد ان کی ذاتوں اور ان کے تشخص، شکل وصورت کو پہچاننا لیا گیا اور اگر ہر ایک کی پہچان صفات کے ذریعے مراد ہو، کہ وہ نبی کریم ﷺ کو صفات کے ذریعے ایسے پہچانتے ہیں جیسے بیٹوں کو صفات کے ذریعے پہچانتے ہیں تو اس صورت میں علامہ نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہوگا " یعرفونه بالرسالة والنبوة کما یعرفون ابناء هم بالنسب

والنبوة " وہ رسول اللہ ﷺ کو رسالت و نبوت سے ایسے پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کو نسب اور بیٹا ہونے سے پہچانتے ہیں۔

اس پر حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا قول واضح طور پر دلالت کرتا ہے آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بتاتے ہیں:

" یا عمر لقد عرفته حین رأیته کما عرفت ابنی ومعرفتی بمحمد ﷺ اشد من معرفتی بابنی فقال عمر کیف ذلک فقال انی لست اشک فی محمد ﷺ انه هو النبی الموعود من حیث ان نعوته مبینة فی کتابنا واما ولدی فلا ادری ما صنعت والدته فلعلها خانت فقبل عمر رأسه فقال رفعک الله یا ابن سلام فقد صدقت "

اے عمر میں نے جب نبی کریم ﷺ کو دیکھا اسی وقت آپ کو پہچان لیا جیسا کہ میں اپنے بیٹے کو پہچانتا ہوں بلکہ حضرت محمد ﷺ کو اپنے بیٹے سے بھی زیادہ پہچان لیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا وہ کیسے تو آپ نے کہا بیشک مجھے حضرت محمد ﷺ کے نبی موعود ہونے میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں ہوا کیونکہ آپ کے اوصاف ہماری کتب میں مذکور ہیں۔ لیکن اولاد کے متعلق مجھے معلوم نہیں کہ ان کی ماں نے کیا کیا ہے ہوسکتا ہے کہیں خیانت نہ کر دی ہو تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے سر کو چوما اور کہا اے ابن سلام تم نے سچ کہا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے درجات بلند فرمائے۔ (ماخوذ از بیضاوی وشیخ زادہ)

وَاِنَّ فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ:

''اور بے شک ایک فریق (کے لوگ) ان میں سے حق کو چھپاتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں۔

پہلے یہود و نصاریٰ کے تمام علماء کا ذکر کیا کہ وہ نبی کریم ﷺ کو پہچانتے ہیں اس میں معاندین (عناد رکھنے والے) اور مؤمنین تمام کا ذکر تھا لیکن یہاں صرف معاندین کا ذکر ہے جو علم رکھنے کے باوجود جاننے کے باوجود حق کو چھپاتے تھے۔ (از شیخ زادہ)

یہاں سے ان کی زیادہ مذمت بیان کی گئی کیونکہ علم کے بعد عمل نہ کرنا زیادہ قبیح ہے گویا کہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا: " **لیکتمون ای الناس ما فی کتبهم من صفة النبی ﷺ وهم یعلمون** " یعنی یہود و نصاریٰ نے نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو چھپایا حالانکہ وہ جانتے تھے کیونکہ ان کی کتب میں وہ اوصاف مذکور تھے۔ (ابن کثیر)

﴿اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ فَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ﴾

۱) "(اے سننے والے) یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے (یا حق وہی ہے جو تیرے رب کی طرف سے ہو) تو خبردار تو شک نہ کرنا"

۲) "(اے سننے والے) یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے تو ہرگز نہ ہو شک کرنے والوں میں سے"

اعلیٰ حضرت نے دو ترجمے کئے ہیں ان کو علامہ رازی رحمہ اللہ کی اس بحث میں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ کرتے وقت کتنی محنت کی اور تفاسیر کا نچوڑ پیش کیا۔

" الالف واللام فی قوله (الحق) فیه وجهان ، الاول ان یکون للعهد والاشارة الی الحق الذی علیه رسول اللہ ﷺ او الی الحق الذی فی قوله (لیَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ) ای هذا الذی یکتمونه هو الحق من ربک "

اس مقام میں " اَلْحَقُّ " پر الف لام عہد خارجی ہو تو اس لحاظ سے معنی ہوگا " یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے " یا تو اشارہ ہوگا اس حق کی طرف جس پر رسول اللہ ﷺ قائم ہیں۔ اب تفصیلی مطلب یہ ہوگا یہ حق ہے جس پر رسول ﷺ قائم ہیں تیرے رب کی طرف سے اور یا اشارہ ہوگا اس حق کی طرف جو " لَیَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ " میں مذکور ہے اب تفصیلی ترجمہ یہ ہوگا یہ حق جس کو یہود و نصاری چھپاتے ہیں یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے " وان یکون للجنس علی معنی الحق من اللہ تعالی لا من غیره " اور یا الف لام جنس کے لئے ہو تو اب معنی یہ ہوگا حق وہی ہے جو تیرے رب کی طرف سے ہے جو اس کے غیروں کی طرف سے ہے وہ حق نہیں۔ یعنی حق ہے وہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثابت ہے اور جس پر آپ قائم ہیں۔ اور وہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں بلکہ یہود و نصاری کے اپنے من گھڑت نظریات ہیں جن پر وہ قائم ہیں وہ باطل راہ ہے۔ (از کبیر)

وَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ : ای من الشاکین والخطاب للنبی ﷺ والمراد امته "

" ممترین " کا معنی شک کرنے والے " ولا تکونن " میں خطاب بظاہر نبی کریم ﷺ کو ہے مراد آپ کی امت ہے " امتری فلان " اس وقت بولتے ہیں جب کسی کو کبھی یقین ہو اور کبھی شک ہو

ایک چیز کو دوسرے سے زائل کرے۔ یعنی شک اس کے یقین کو زائل کر دے یا یقین اس کے شک کو زائل کر دے " المراء " جب کوئی شخص دوسرے کے قول میں شک کرے۔ الامتراء کا معنی بھی شک کرنا ہے۔

(از قرطبی)

راقم کی ابتدائی تصنیفی کاوش کو دیکھئے:

﴿ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ فَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ ﴾

☆ تو وہی ہے جو تیرا رب کہے پھر تو نہ ہو شک لانے والا۔ (محمود الحسن صاحب)

☆ حق ہے پروردگار تیرے کی طرف سے پس مت ہو شک لانے والوں سے۔ (شاہ رفیع الدین صاحب)

☆ (اے پیغمبر یہ نیا قبلہ) تمہارے پروردگار کی طرف سے حق ہے تو تم ہرگز شک کرنے والوں میں نہ ہونا۔ (فتح محمد صاحب)

☆ حق وہی جو تیرا رب کہے پھر تو نہ ہو شک لانے والا۔ (شاہ عبدالقادر صاحب)

☆ یہ قطعی ایک امر حق ہے تمہارے رب کی طرف سے لہٰذا اس کے متعلق تم ہرگز کسی شک میں نہ پڑو۔ (مودودی صاحب)

☆ یہ امر حق ہے تمہارے پروردگار کی طرف سے تو کہیں شک کرنے والوں میں ہرگز نہ ہو جانا۔ (عبدالماجد صاحب)

☆ سو ہرگز شک وشبہ کرنے والوں میں شمار نہ ہونا۔ (اشرف علی صاحب)

☆ (اے سننے والے) یہ حق تیرے رب کی طرف سے (یا حق وہی ہے جو تیرے رب کی طرف سے ہو)۔ (اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خانؒ)

اس مقام پر مترجمین نے شک کی نسبت نبی کریم علیہ السلام کی طرف کی اور یہ ترجمہ کیا کہ تو نہ ہو شک لانے والا۔ لیکن اعلیٰ حضرت نے اس نازک مقام کو تفاسیر پر نظر رکھتے ہوئے اپنے ترجمہ سے حل فرمایا (اے سننے والے) لفظ کا اضافہ کیا تا کہ نہی میں مخاطب نبی کریم نہ ہوں بلکہ عام امتی ہو۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر بیضاوی کی عبارت بطور تائید دیکھئے:

" ولیس المراد نھی الرسول ﷺ عن الشک فیه لانه غیر متوقع ولیس بقصد واختیار بل اما تحقیق الامر وانه بحیث لا یشک فیه ناظر

او امر الامة باكتساب المعارف المزيحة للشک علی وجه الا بلغ "

اس پر محشی کی عبارت یہ ہے:

" فان الانسان كما لا ينهى عما لا يتوقع منه ولا ينهى ايضا عما لا مدخل فيه للقصد والاختيار كالشک والجهل والجوع والعطش فاذا اوردت صورة النهي في مثل هذه المواضع لا يراد بها حقيقة النهي بل يقصدبها شئی آخر فقوله تعالٰى فلا تكونن من الممترين من قبيل الخطاب العام الوارد على صورة النهي والمقصود منه اخبار كافة الناس بان المقام ليس بمظنة لان يرتاب فيه عن الانام "

دونوں عبارتوں کا خلاصہ کلام یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو شک سے نہیں روکا گیا کیونکہ آپ سے تو شک کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی کیونکہ جس مقام پر نہی کی توقع نہ کی جاسکے وہاں نہی نہیں پائی جاسکتی اس طرح جہاں قصد و اختیار نہ پایا جاسکے وہاں بھی نہی نہیں پائی جاسکتی۔ لہٰذا یہاں حقیقۃً نہی نہیں پائی گئی، بلکہ یہاں عام خطاب ہے جو صورۃً نہی ہے مقصد یہاں عام لوگوں کو خبر دینا ہے کہ یہ مقام ایسا ہے کہ اس میں کسی ایک کو شک نہیں کرنا چاہئے، حقیقت یہ ہے کہ جس طرح اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ایمان افروز ہے اس کا کوئی ثانی نہیں جس میں علمی بصیرت سے تفاسیر ولغات پر نظر ہوتی ہے محبت رسول اللہ ﷺ کا ایک درس ہے۔

(تسکین الجنان ص ۵۵، ۵۶)

☆☆☆☆☆

﴿ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيعًا إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴾

1: ''اور ہر ایک کے لئے توجہ کی ایک سمت ہے وہ اسی کی طرف منہ کرتا ہے تو یہ چاہو کہ نیکیوں میں اوروں سے آگے نکل جائیں تم کہیں ہو اللہ تم سب کو اکٹھا لے آئیگا بیشک اللہ جو چاہے کرے''۔

2: ''اور ہر ایک کے لئے ایک جہت ہے وہ منہ پھیرتا ہے اسی کی طرف، تم جلدی کرو نیکیوں میں، جہاں بھی تم ہو گے لے آئے گا تم تمام کو اللہ جمع کر کے، بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے''

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا : اور ہر ایک کیلئے ایک جہت ہے وہ منہ پھیرتا ہے اسکی طرف۔

" ولکل " تنوین عوض مضاف الیہ ہے یعنی اس کا معنی یہ ہے " ولکل امة قبلة " ہر گروہ کے لئے ایک قبلہ ہے اس سے مراد یہ نہیں کہ ہر گروہ کا قبلہ رب تعالیٰ نے مقرر کر رکھا بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہر گروہ کا کوئی نہ کوئی قبلہ ہے خواہ وہ اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے یا انہوں نے خود مقرر کر رکھا ہے۔ کیونکہ مؤمنین کا قبلہ تو اللہ تعالیٰ نے کعبہ مقرر فرمایا۔لیکن مشرکین اور یہود و نصاریٰ نے اپنی اپنی مرضی سے قبلے مقرر کئے ہوئے ہیں۔مشرکین کے معبود بھی بت تھے اور ان کی توجہ کا مرکز بھی بت تھے:

" لان فی المشرکین من کان یعبد الاصنام ویتقرب بذلک الی اللہ تعالیٰ کما حکی اللہ تعالیٰ عنھم فی قولہ ھؤلاء شفعاؤنا عند اللہ "

کیونکہ مشرکین بتوں کی عبادت کرتے تھے اور انکے ذریعے ہی اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتے تھے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ بت اللہ تعالیٰ کے ہاں ہمارے شفیع ہوں گے۔

ہاں یہ بھی خیال رہے کہ مشرکین بتوں کو معبود سمجھ کر شفاعت کرنے والے مانتے تھے جو باعث شرک تھا لیکن مؤمنین اللہ تعالیٰ کے انبیاء کرام اور اولیاء کرام کو اللہ کی مخلوق مانتے ہیں ہاں اللہ تعالیٰ کا مقرب سمجھ کر ان کو شفیع مانتے ہیں جو عین ایمان ہے۔

یہود نے اپنا قبلہ مقرر کر رکھا ہے اور نصاریٰ نے اپنا قبلہ مقرر کر رکھا ہے۔البتہ مؤمنین کے لئے

اللہ تعالیٰ نے ان کا قبلہ مقرر فرمایا ہے۔

" وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ " کا اور مطلب یہ ہے:

" لكل قوم من المسلمين وجهة اى جهة من الكعبة يصلي اليها ، جنوبية او شمالية او شرقية او غربية "

مسلمانوں کی ہر قوم کے لئے کعبہ میں سے ہی ایک جہت ہے جس کی طرف وہ منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔ شمال میں رہنے والے کعبہ کی اس جانب منہ کرتے ہیں جنوب والے کعبہ کی اس جانب، اسی طرح کوئی مشرقی جانب منہ کر رہا ہے اور کوئی غربی جانب منہ کر رہے ہیں۔ (از کبیر و بیضاوی)

هُوَ مُوَلِّيهَا : " هو عائد على لفظ كل لا على معناه لانه لو كان على المعنى لقال هم مولوها وجوهم "

" هو " ضمیر کا مرجع لفظ " كل " ہے نہ کہ " كل " کا معنی اگر " كل " کا معنی معتبر ہوتا تو جمع کے صیغے اور ضمائر ہونی چاہئیں تھیں پھر " هم مولوها وجوهم " ہوتا۔ اب اس صورت میں معنی یہ ہوگیا " ولكل صاحب ملة قبلة ، صاحب القبلة موليها وجهه " کہ ہر ملت کے ہر صاحب کا قبلہ ہے وہ صاحب قبلہ اپنے قبلہ کی طرف ہی منہ کرتا ہے۔

لیکن زجاج نے کہا کہ اس میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ " هو " ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹے، اب معنی یہ ہوگا " لكل صاحب ملة قبلة الله موليها اياه " ہر صاحب ملت کا اپنا قبلہ ہے اللہ تعالیٰ اسے اس قبلہ کی طرف ہی پھیر دیتا ہے۔

لیکن یہاں یہ خیال رکھنا اشد ضروری ہوگا کہ جب مراد یہ ہو کہ مشرکین، یہود، نصاریٰ اور مؤمنین کا اپنا اپنا قبلہ ہے تو اللہ تعالیٰ کے اس طرف پھیرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو قدرت و اختیار دے رکھا ہے وہ ادھر ہی منہ پھیر لیتا ہے۔ ہاں اگر " ولكل " سے مسلمان ہی فقط مراد ہوں کہ کعبہ کی مختلف سمتوں میں رہنے والے مسلمان اپنی اپنی سمت میں منہ کرتے ہیں وہی سمت ان کا قبلہ ہوتا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کے پھیرنے کا مطلب بھی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر طرف رہنے والوں مسلمانوں کو اجازت دے رکھی ہے کہ وہ کعبہ کی جس طرف بھی ہوں، کعبہ کی طرف ہی منہ کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ ان

کواس طرف پھیر دیتا ہے۔ (قرطبی باوضاحت)

فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِ : " یعنی بادروا بامتثال کلما امرکم اللہ وان کان قد امرکم فی بعض الاحیان بالاستقبال الی بیت المقدس وفی بعضها الی الکعبة فانه تعالیٰ یحکم ما یشاء فلا تنازعوا فی امر القبلة "

یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں جو حکم دے اسے تسلیم کرنے کے لئے جلدی کرو، جب رب تعالیٰ نے بعض اوقات میں بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا تو اسی کو جلدی ماننا ضروری تھا اور اب جب کعبہ کا حکم دے دیا تو اسی حکم کو جلدی سے ماننا ضروری ہے اللہ تعالیٰ جو چاہے حکم فرماتا ہے، تم قبلہ کے معاملہ میں کسی قسم کا تنازع نہ کرو۔ (مظہری)

اَیْنَ مَا تَکُوْنُوْا یَاْتِ بِکُمُ اللّٰہُ جَمِیْعًا : جہاں بھی تم ہو لے آئے گا تمہیں اللہ جمع کر کے۔

اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ تم جہاں بھی ہو کہ تمہارا منہ اس قبلہ کی طرف ہو جو رب تعالیٰ کو پسند ہے یا اس قبلہ کی طرف منہ ہو جو رب تعالیٰ کو ناپسند ہو۔ " یأت بکم اللہ جمیعا " کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری روحوں کو قبض کرلے گا پھر تمہیں جزاء کے لئے جمع کرے گا اور تمہارے اعمال کے مطابق تمہیں جزاء دے گا۔ اور اگر تمہاری موت تمہاری نماز کے دوران ہی آ جائے، یا واجب کو اپنے ذمہ سے ادا کرنے کے بعد آ جائے تو بہت بڑی سعادت ہوگی۔

آیۃ کریمہ کا ایک مطلب یہ بھی ہے، کہ تمام مسلمانوں کا قبلہ کعبہ کی جانب ہے اگر قبلہ معلوم ہو تو اسی جانب وہ منہ کرے اور قبلہ معلوم نہ ہو تو تحری (کوشش) کرے اور اگر نفل پڑھنے والا ہو اور شہر سے باہر سواری پر ہو تو جس جہت کی طرف اس کی سواری متوجہ ہو وہی اس کا قبلہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ اسے اس کی طرف ہی پھیر دیتا ہے۔ نیکیوں کی طرف جلدی کرو یعنی قبلہ کے مشتبہ ہونے کی صورت میں نماز میں تاخیر نہ کرو بلکہ تحری کر کے نماز اپنے وقت مستحب میں جلدی ادا کردو۔ جس طرف بھی تمہارا رخ ہوا اللہ تعالیٰ تم تمام کو قبلہ کی طرف متوجہ ہونے کا حکم ہی عطا فرمائے گا۔ (از مظہری)

" اَیْنَ مَا تَکُوْنُوْا " کا مطلب علامہ آلوسی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں کہ تم جس جگہ بھی ہو خواہ وہ طبیعت کے موافق ہو جیسے زمین یا تمہاری طبیعت کے موافق نہ ہو جیسے تم آسمان پر ہو۔ پھر تمہارے

اجزاء چٹان کی طرح جمع ہوں یا ریت کے ذرات کی طرح مختلف جگہ پر بکھرے ہوئے ہوں اللہ تعالیٰ تم تمام کو ایک جگہ جمع کر دے گا پھر تمہیں جزاء دے گا اگر بہتر عمل ہوئے تو بہتر جزاء دے گا اور اگر برے عمل ہوئے تو ان کے مطابق ہی جزاء بھی دے گا۔ (از روح المعانی)

اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ : ''بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے''

" ای علی الاعادة بعد الموت والاثابة لاهل الطاعة والعقاب لمستحق العقوبة "

یعنی اللہ تعالیٰ موت کے بعد زندہ کرنے پر قادر ہے اور نیک لوگوں کو ثواب عطاء کرنے اور جو لوگ عذاب کے مستحق ہوں گے ان کو عذاب دینے پر قادر ہے۔ (خازن)

پہلے پارہ کے دوسرے رکوع میں اس جملہ کی وضاحت کافی تفصیل سے بیان کر دی گئی۔

آیۃ کریمہ سے حاصل ہونے والا فائدہ:

اگرچہ آیۃ کریمہ کا تعلق استقبال قبلہ سے ہے لیکن اس میں مطلقاً یہ ثابت ہوتا ہے:

" (فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرَاتِ) ای بادروا بالطاعة وقبول الاوامر وفیه حث علی المبادرة الی الاولویة والافضلیة "

''بھلائی کی طرف جلدی کرو'' یعنی نیکی کی طرف جلدی کرو، اور اوامر کو قبول کرنے میں جلدی کرو اس میں اس چیز کی طرف برانگیختہ کیا گیا ہے کہ ہر وہ کام کیا جائے جو بہتر اور افضل ہو''۔ (خازن)

نماز کس وقت ادا کی جائے:

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب بھی نماز کا وقت شروع ہو اسی وقت جتنا جلدی ہو سکے نماز ادا کرنا افضل ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جماعت کے لئے جو وقت مستحب ہو اس مستحب وقت میں جلدی نماز ادا کرنا افضل ہے آپ کے اس موقف کے خلاف کوئی حدیث نہیں۔ آپ کا مسلک حدیث پاک کے مطابق ہے۔

اس مسئلہ کو تفصیل سے دیکھیں: راقم نے غیر مقلدین کی جانب سے وقتاً فوقتاً جاری ہونے والے اشتہارات کو دیکھ کر ایک کتاب ترتیب دی جس میں نماز کے مختلف مسائل احادیث مبارکہ سے ثابت کئے اس کتاب کا نام ''نماز حبیب کبریا'' ہے وجہ تصنیف صرف یہ ہے کہ اپنے مسلک کے لوگ اگر اپنے مسلک پر قائم رہ سکیں تو یہ بھی غنیمت ہے کسی سے نہ مخالفت نہ مقابلہ۔

راقم بہت معتدل طبیعت کا ہے جسے اپنے کام سے کام ہے۔ نماز حبیب کبریاء میں راقم نے نماز کے اوقات پر تفصیلی بحث کی ہے پہلے وہ دیکھیں۔

نمازوں کے اوقات:

نماز کے وقت میں غیر مقلدین اور احناف میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ غیر مقلدین کہتے ہیں جب نماز کا وقت شروع ہو جائے اسی وقت نماز ادا کی جائے دیر نہ کی جائے۔

احناف کے نزدیک اس مسئلہ میں تفصیل ہے۔ یعنی وقت میں تین حال پائے جاتے ہیں۔

ایک ہے: کل وقت، یعنی نماز کا وقت کب ختم ہوتا ہے۔ وقت کے شروع ہونے سے لیکر وقت کے ختم ہونے تک تمام وقت کہلائے گا۔

دوسرا ہے: مکروہ وقت۔ نماز کے بعض اوقات وہ ہیں جن میں نماز مکروہ ہوگی اگر چہ وہ نماز کا وقت کہلائے گا۔

تیسرا ہے: مستحب وقت جن وقتوں میں نماز ادا کرنا یا جماعت کرانا افضل ہوتا ہے اسے مستحب وقت کہا جاتا ہے۔ دونوں مذہبوں کے دلائل اور مسئلہ پر وضاحت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حق مذہب کونسا ہے۔

غیر مقلدین کا مذہب:

آئمہ مساجد کی خدمت میں ہماری درخواست ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد پاک کے مطابق وہ نمازیں اول وقت پر پڑھایا کریں، اس سے خدا خوش ہوگا اور سنت کی پیروی کے سبب رحمۃ اللعالمین

حشر میں شفاعت فرمائیں گے۔ (صلوۃ الرسول ص ۱۴۸)

سبحان اللہ کبھی نبی کریم علیہ السلام کی شفاعت کا انکار اور کبھی دھوکہ دینے کیلئے اقرار کبھی آپ کی رحمت کو تسلیم نہ کرنا اور کبھی تمام جہانوں کیلئے رحمت مان لینا یہی ان کے باطل مذہب کا بیان کافی ہے۔ بہر حال ان کے مذہب کے دلائل بیان کرنے کے بعد احناف کے مذہب کی وضاحت ہوگی۔

غیر مقلدین کے دلائل:

نماز عصر کا وقت : حضرت بریدہ روایت کرتے ہیں

"فاقام العصر والشمس مرتفعة بيضا نقية" (رواہ مسلم)

یعنی رسول اللہ علیہ السلام نے قائم کی نماز عصر درحالیکہ آفتاب تھا بلند سفید صاف (یعنی زرد نہ تھا)

"وعن انس قال كان رسول الله ﷺ يصلي العصر والشمس مرتفعة حية" (متفق علیہ)

روایت ہے حضرت انس سے وہ کہتے ہیں کہ رسول خدا نماز عصر پڑھتے اور آفتاب ہوتا تھا بلند، زندہ، (یعنی روشن بغیر زردی کے)

منافق کی نماز: حضرت انس روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رسول خدا نے فرمایا

"تلک صلوة المنافق يجلس يرقب الشمس حتى اذا اصفرت وكانت بين قرني الشيطن قام فنقر اربعا لا يذكر الله فيها الاقليلا" (رواہ مسلم)

یہ منافق کی نماز عصر ہے (جو اخیر وقت پڑھی جائے) کہ بیٹھ رہتا ہے، انتظار کرتا ہے آفتاب کا یہاں تک کہ جب ہو جاتا ہے زرد، اور ہوتا ہے درمیان دو سینگوں شیطان کے (یعنی غروب کے وقت) کھڑا ہوتا (نماز کیلئے) پھر ٹھونگیں مارتا ہے چار، نہیں یاد کرتا اس میں اللہ کو مگر تھوڑا۔ (صلوۃ الرسول ص ۱۴۴)

غیر مقلدین اپنا دعویٰ ثابت کرنے میں ناکام ہو گئے:

دعویٰ یہ کہ نماز عصر اول وقت میں پڑھی جائے، گرمیوں میں بھی ساڑھے تین بجے۔ اور جو احادیث بیان کی ہیں، ان سے یہ دعویٰ کیسے ثابت ہے۔ احادیث سے جو ثابت ہو رہا ہے وہ تو احناف کا مذہب ہے۔

پہلی جو دو حدیثیں پیش کی ہیں ان سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام نے عصر کی نماز ادا

کی جب کہ سورج روشن، چمکدار تھا۔

تیسری حدیث جو پیش کی اس سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ عصر کی نماز میں اتنی تاخیر کر دینا کہ سورج زردی مائل ہو جائے۔ بلکہ غروب کے قریب ہو جائے (کیونکہ غروب کے وقت ہی شیطان سورج کے آگے اپنے بازو پھیلا کر کھڑا ہو جاتا ہے تا کہ سورج کی عبادت کرنے والے دراصل مجھے سجدہ کریں) اور نماز پڑھنے والے کو سورج کے غروب ہونے کا خطرہ ہو وہ بے اطمینانی سے نماز ادا کرے تو یہ علامت نفاق ہے۔

یہ بھی خیال رہے کہ ''منافق کی نماز'' کا عنوان بھی غلط ہے اور ظلم عظیم ہے کسی مومن کو منافق کہنا دراصل اپنے آپ کو کافر بنانا ہے۔ احادیث میں جہاں بھی اس قسم کے الفاظ ہیں وہاں منافقت کی علامت مراد ہوتا ہے، بعینہ منافق نہیں کہا گیا اور نہ ہی یہ کہنا درست ہے۔

اب ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیجئے کہ مثال کے طور پر راولپنڈی، اسلام آباد میں گرمیوں کا آخری وقت غروب شمس (سورج کے غروب ہونے کا وقت) کا سات بج کر تیئس منٹ ہے۔ سورج کے غروب ہونے سے بیس یا پچیس منٹ پہلے سورج زردی مائل ہوتا ہے اگر کوئی شخص سات بجے یا اس کے بعد نماز ادا کرے تو وہ مکروہ وقت ہوگا۔ اور اگر کوئی غروب کے وقت نماز ادا کرے یعنی جب سورج غروب ہو رہا ہو تو یہ علامت نفاق ہوگی۔

یہی مذہب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے احناف کا ہے کہ وہ ساڑھے پانچ بجے یا زیادہ سے زیادہ پونے چھ بجے نماز ادا کر لیتے ہیں، جب سورج خوب چمک رہا ہوتا ہے، آب و تاب میں ہوتا ہے۔

ذرا انصاف کیجئے کہ احناف کیا اس وقت نماز نہیں ادا کر رہے ہوتے جو حضور ﷺ کی نماز کا وقت ہوتا ہے۔ یقیناً وہی وقت احناف کی نماز کا ہے جو وقت رسول اللہ ﷺ کی نماز کا ہے۔

عصر کا وقت فقہ حنفی سے:

" واول وقت العصر اذا خرج وقت الظهر على القولين و آخر وقتها مالم تغرب الشمس " (هداية)

عصر کا وقت اس وقت شروع ہوگا جب ظہر کا وقت امام اعظم رحمہ اللہ اور صاحبین کے قول کے

مطابق ختم ہو جائے گا۔یعنی سایہ چیز کا دو مثل ہو جائے اور عصر کا وقت ختم اس وقت ہو گا جب سورج غروب ہو گا۔

خیال رہے کہ عصر کا جو وقت بیان کیا گیا ہے یہ کل وقت ہے۔جس میں مکروہ اور غیر مکروہ دونوں شامل ہیں۔

" ثلاثة اوقات لا يصح فيها شئى من الفرائض والواجبات التي لزمت في الذمة قبل دخولها عند طلوع الشمس الى ان ترتفع وعند استوائها الى ان تزول وعند اصفرارها الى ان تغرب ويصح اداء ماوجب فيها مع الكراهة " (نورالایضاح)

تین وقتوں میں کوئی فرائض ونوافل ادانہیں ہوں گے، جو اس کے ذمہ اس سے پہلے ہیں،ایک طلوع شمس (سورج کے نکلتے) کے وقت یہاں تک کہ سورج (ایک دو نیزے کے برابر) اوپر آ جائے۔اور جب سورج درمیان میں ہو یہاں تک کہ ڈھل جائے۔اور جب سورج زردی مائل ہو جائے البتہ اسی دن کی عصر جو اس وقت اس پر لازم ہوئی بوجہ تاخیر کے وہ ادا ہو گی لیکن مکروہ ہو گی۔

اس فقہی قول کو حدیث پاک سے لیا گیا:

" ولذا استدل بحديث عقبة بن عامر الثابت في مسلم وغيره ثلاث ساعات كان رسول الله ﷺ نهانا ان نصلي فيهن او نقبر فيهن موتانا حين تطلع الشمس بازغة حتى ترتفع وحين يقوم قائم الظهيرة حين تميل الشمس وحين تضيف للغروب حتى تغرب " (فتح القدير)

ان تین اوقات میں نماز کی ممانعت پر اس حدیث پاک سے دلیل پکڑی گئی ہے جو مسلم وغیرہ میں مذکور ہے۔

حضرت عقبہ بن عامر کہتے ہیں۔تین وقتوں میں رسول اللہ ﷺ ہمیں نماز پڑھنے سے منع کرتے تھے اور فوت ہونے والے لوگوں پر نماز جنازہ پڑھنے سے منع فرماتے تھے، جب سورج طلوع ہو رہا ہو یہاں تک کہ بلند ہو جائے اور جب دوپہر کے وقت سورج درمیان میں ہو یہاں تک کہ سورج ڈھل جائے اور غروب ہونے کی طرف مائل ہو یہاں تک کہ غروب ہو جائے۔

سورج کے زردی مائل ہونے اور غروب کے قریب ہونے پر فقہاء کا استدلال:

" قوله ﷺ ان الشمس تطلع بين قرني شيطان فاذا ارتفعت فارقها ثم اذا استوت قارنها فاذا زالت فارقها فاذا دنت للغروب قارنها واذا غربت فارقها ونهى عن الصلوة في تلك الساعات رواه مالك في الموطأ والنسائي فانه افاد كون المنع لما اتصل بالوقت مما يستلزم فعل الاركان فيه التشبيه بعبادة الكفار وهذا المعنى بنقصان الوقت والافالوقت لانقص فيه نفسه بل هو وقت كسائر الاوقات "

(فتح القدیر)

نبی کریم ﷺ کا ارشاد کہ بے شک سورج شیطان کے دوسینگوں (یعنی بازوں) کے درمیان طلوع ہوتا ہے، پھر جب سورج بلند ہوجاتا ہے وہ ہٹ جاتا ہے، پھر جب سورج درمیان میں آتا ہے پھر اس کے سامنے آجاتا ہے۔ پھر جب سورج ڈھل جاتا ہے وہ بھی ہٹ جاتا ہے۔ پھر جب سورج غروب ہونے کے قریب ہوتا ہے وہ پھر اس کے سامنے آجاتا ہے۔ اور جب غروب ہوجاتا ہے جدا ہوجاتا ہے۔ اور تین اوقات میں نبی کریم ﷺ نے نماز ادا کرنے سے منع فرمایا۔ (موطا امام مالک نسائی)

اس حدیث سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے ان اوقات میں نماز پڑھنے سے اسلئے منع فرمایا کہ کافروں کی عبادت کی مشابہت حاصل ہوتی ہے ورنہ وقت میں ذاتی طور پر کوئی نقص نہیں۔ بلکہ یہ بھی دوسری وقتوں کی طرح ہی وقت ہیں۔ نقصان عبادات میں ہوگا تو ضمنا اوقات میں بھی نقص آگیا۔

فقہاء کرام کی عبارات اور دلائل کو دیکھ کر انصاف سے فیصلہ کریں، کیا یہ سچ نہیں، یہ حق نہیں کہ فقہ قرآن وحدیث کے مسائل کی وضاحت کرنیوالے علم کا نام ہے؟ ہاں ہاں یہ حقیقت ہے اسکا انکار ممکن نہیں۔ عوام کو دھوکہ دینا یہ مسئلہ تو فقہ کا ہے ہم تو حدیث بیان کررہے ہیں فقہ کوئی حدیث کے مطابق علم کا نام نہیں۔ فقہ تو اماموں کا من گھڑت علم ہے، یہ سب جھوٹ اور فریب ہے، دھوکہ دہی کے بغیر کچھ نہیں۔

ظہر کی نماز کا وقت اور غیر مقلدین:

گرمی میں ظہر ٹھنڈے وقت: حضرت ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہتے ہیں۔ کہ رسول خدا نے فرمایا

" اذا اشتد الحر فابردوا بالصلوۃ " (متفق علیہ)

جب گرمی سخت ہو تو نماز ٹھنڈے وقت میں پڑھو۔

ملاحظہ : ٹھنڈے وقت کا یہ مطلب نہیں چار بجا دو بلکہ یہ مراد ہے کہ شدت کی گرمی میں سورج ڈھلتے ہی فوراً نہ پڑھو۔ تھوڑی دیر کرو۔

اور نسائی میں حضرت انس سے روایت ہے۔" واذا کان البرد عجل "یعنی جب سردی ہوتی تو حضور ظہر پڑھنے میں جلدی کرتے۔ (صلوۃ الرسول ص ۱۶۴)

غیر مقلدین کی اس دلیل میں بھی ناکامی:

چار بجے نماز پڑھنے کا بہتان ہے، گرمیوں میں نماز ہمارے علاقہ میں ڈیڑھ بجے سے لے کر اڑھائی بجے تک ہوتی ہے۔ سردیوں میں نماز ایک بجے سے لے کر دو بجے تک ہوتی ہے۔

حدیث شریف کی یہ توجیہ بیان کرنا" کہ شدت گرمی میں سورج ڈھلتے ہی فوراً نہ پڑھو تھوڑی دیر کرو "غلط ہے۔ اس پر کوئی دلیل نہیں قائم کی گئی۔ صرف زبانی دعوی قابل قبول نہیں۔

اگر اپنی مرضی سے ہی وجہ گھڑنی ہو تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ شدت گرمی میں زوال کے وقت نماز نہ پڑھو بلکہ سورج ڈھلتے ہی جلدی پڑھ لو۔

احناف کا مذہب فقہ سے:

" ووقت الظهر من زوال الشمس الی ان یصیر ظل کل شئی مثلیه او مثله سوی ظل الاستواء " (نور الایضاح)

ظہر کا وقت سورج کے ڈھل جانے سے شروع ہوا ہے اور ہر چیز کا سایہ اصلی سایہ کے بغیر دو مثل ہو جائے یا ایک مثل ہو جائے۔

ظہر کا یہ کل وقت ہے۔ یعنی ظہر کے وقت کی ابتداء کو بیان کیا گیا ہے، اور ظہر کے وقت کی انتہاء کو بیان کیا گیا ہے۔

ظہر کا مستحب وقت:

" والابراد بالظهر فی الصیف وتعجیله فی الشتاء الافی یوم غیم فیؤخر فیه " (نورالایضاح)

گرمیوں میں ظہر کو ٹھنڈا کر کے پڑھا جائے، سردیوں میں جلدی، ہاں اگر بادل ہو تو تاخیر کرے یہ ضرورت اس وقت تھی جب گھڑیوں کا نظام نہیں تھا، دیر کا حکم اس لئے تھا کہ ایسا نہ ہو کہ وقت سے پہلے ہی نماز پڑھ لی جائے۔

احناف کے دلائل احادیث سے:

" عن ابی هریرة عن النبی ﷺ انه قال اذا اشتد الحر فابردوا بالصلوة فان شدة الحر من فیح جهنم "

(بخاری ج ۱ ص ۷۶ باب الابراد بالظهر ، مسلم ج ۱ ص ۲۲۴ باب استحباب الابراد بالظهر ، ابوداؤد ج ۱ ص ۵۸ باب وقت صلوة الظهر ترمذی ج ۱ ص ۴۰ باب ماجاء فی تاخیر الظهر ، نسائی ج ۱ ص ۸۷ باب الابراد بالظهر ، ابن ماجه ج ۱ ص ۴۹ باب الابراد بالظهر)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ بیشک آپ نے فرمایا جب گرمی سخت ہو تو نماز کو ٹھنڈا کر کے پڑھو، بے شک سخت گرمی جہنم کے سانس لینے سے ہے۔

" عن انس قال کان رسول الله ﷺ اذا کان الحر ابرد بالصلوة واذا کان البرد عجل " (بخاری ، نسائی حواله مذکور)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے جب گرمی ہو تو نماز کو ٹھنڈا کر کے پڑھو۔ اور جب سردی ہو تو جلدی پڑھو۔

" عن ابی ذر الغفاری قال کنا مع رسول الله ﷺ فی سفر فاراد المؤذن ان یؤذن للظهر فقال النبی ﷺ ابرد ثم اراد ان یؤذن فقال له ابرد حتی رأینا فئی التلول فقال النبی ﷺ ان شدة الحر من فیح جهنم فاذا اشتد الحر فابردوا بالصلوة "

(بخاری باب الابراد بالظهر فی السفر ، مسلم باب استحباب الابراد بالظهر)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے۔ مؤذن نے اذان دینے کا ارادہ کیا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا ٹھنڈا کرو، کچھ دیر کے بعد مؤذن نے پھر اذان دینے کا ارادہ کیا تو آپ نے فرمایا ٹھنڈا کرو یہاں تک کہ ٹیلوں کے سائے (پھیلے ہوئے) ہم دیکھ رہے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا بے شک سخت گرمی جہنم کے سانس لینے کی وجہ سے

ہوتی ہے۔ پس جب سخت گرمی ہو تو نماز کو ٹھنڈا کرو۔

اس حدیث پاک میں لفظ ''ثم'' سے بھی پتہ چل رہا ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے روکنے کے بعد کچھ وقت گذر گیا تو مؤذن نے دوبارہ اذان دینے کا ارادہ فرمایا تو آپ نے پھر روک دیا۔

''فیئ التلول'' سے بھی پتہ چلا کہ ٹیلوں کے سائے کافی مقدار میں پھیل چکے تھے جو دور سے دکھائی دے رہے تھے اگر مطلقاً ''سایہ'' ہی معنی لیا جائے تو وہ کسی طرح بھی درست نہیں، کیونکہ جب تک سایہ ڈھلے نہیں اس وقت تک تو ظہر کا وقت شروع ہی نہیں ہوتا۔

اصلی سایہ کے سواء ایک مثل ہونے سے پہلے ظہر ادا کر لیجائے:

اگر چہ ظہر کے وقت میں مکروہ وقت نہیں، لیکن امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور صاحبین کے درمیان اختلاف ہے کہ ظہر کا وقت کب ختم ہوتا ہے ہر چیز کے اصلی سایہ کے بغیر ایک مثل سایہ ختم ہونے تک وقت ختم ہو جاتا ہے یا کہ دو مثل تک پہنچنے تک۔

یہی اختلاف عصر کے وقت کی ابتداء میں ہے کہ ایک مثل کے بعد شروع ہوتا ہے یا دو مثل کے بعد، زیادہ صحیح اور معتبر اور مفتی بہ قول امام اعظم رحمہ اللہ کا دو مثل والا ہے۔

اس لئے بہتر یہ ہے کہ ظہر ایک مثل تک سایہ پہنچنے سے پہلے پہلے ادا ہو جائے اور دو مثل تک سایہ پہنچنے کے بعد ہی عصر کی نماز پڑھی جائے۔

اس فقہی ضابطہ کو بھی بفضلہٖ تعالیٰ حدیث پاک سے ہی لیا گیا ہے۔ آیئے حدیث پاک کو دیکھیں۔

"عن عبداللہ بن رافع مولی ام سلمۃ زوج النبی ﷺ انہ سأل اباھریرۃ عن وقت الصلوۃ فقال ابوھریرۃ انا اخبرک صل الظھر اذا کان ظلک مثلک والعصر اذا کان ظلک مثلیک"

(مؤطا امام مالک کتاب و قوت الصلوۃ)

حضرت عبداللہ بن رافع جو نبی کریم ﷺ کی زوجہ مطہرہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے غلام ہیں وہ روایت کرتے ہیں۔ کہ بے شک انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نماز کے وقت کے متعلق سوال کیا تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں تمہیں خبر دیتا ہوں کہ

ظہر کی نماز ادا کرلو جب تمہارا سایہ ایک مثل ہو جائے اور عصر کی نماز ادا کرو جب تمہارا سایہ دو مثل ہو جائے۔

بہت واضح ہوا کہ ظہر کے وقت کی انتہاء شے کے ایک مثل سایہ پرنہیں ہوتی ورنہ وہاں سے ہی عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے البتہ شے کے ایک مثل سایہ کے ختم ہونے تک ظہر کو ادا کر لینا بہتر ہے۔

راقم عام طور دو بجے ہی ظہر کی نماز ادا کرتا ہے۔ میرے خیال میں یہ وقت تقریباً تمام سال راولپنڈی، اسلام کے علاقوں میں بہتر ہے۔ تعجیل وتاخیر دونوں پر بیک وقت عمل ہو جاتا ہے۔

فجر کی نماز کے متعلق غیر مقلدین کا بیان:

" عن عائشة قالت كان رسول الله ﷺ ليصلى الصبح فتنصرف النساء متلفعات بمروطهن ما يعرفن من الغلس " (متفق عليه)

حضرت عائشہ روایت کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ رسول خدا (جب) نماز صبح پڑھتے تھے۔ پس پھرتیں عورتیں (مسجد سے آپ کے ساتھ نماز پڑھ کر) اپنی چادروں میں لپٹی ہوئی نہ پہچانی جاتی تھیں، بسبب اندھیرے کے۔ (بخاری و مسلم)

ملاحظہ: معلوم ہوا کہ حضور اندھیرے میں اوّل وقت نماز پڑھا کرتے تھے

(صلوۃ الرسول ص ۱۴۵)

فجر کی نماز کے وقت کے متعلق فقہ حنفی سے:

" وقت الصبح من طلوع الفجر الصادق الى قبيل طلوع الشمس " (نور الايضاح)

صبح کا وقت صبح صادق سے لیکر سورج کے نکلنے سے تھوڑا پہلے تک۔

صبح کا یہ وقت ہے، یعنی اس کی ابتداء صبح صادق (پو پھٹنے) سے ہی ہے اور انتہاء سورج کے نکلنے کے وقت کے قریب تک ہے۔

صبح کی جماعت کا مستحب وقت فقہ حنفی سے

میں نے نور الایضاح کے عربی حاشیہ "ذریعۃ النجاح" میں درمختار، شامی، مراقی الفلاح سے

ترتیب دیا اوراس میں اپنی طرف سے وضاحت بھی کی۔ اسے دیکھیں۔

متن کی عبارت یہ ہے:

"ویستحب الاسفار بالفجر للرجال" مردوں کیلئے فجر کی نماز روشنی میں پڑھنا مستحب ہے۔

اس پر راقم کا ترتیب دیا ہوا حاشیہ یہ ہے۔

" الاسفار بالفجر للرجال الی التاخیر للاضائة والابتداء باسفار والختم به وهو المختار بحیث یرتل اربعین اية ثم یعیده بطهارة ولو فسد لقوله علیه السلام اسفروا بالفجر فانه اعظم للاجر ،والاسفار بالفجر مستحب سفرا وحضرا للرجال الافی مزدلفه للحاج فان التغلیس لهم افضل لوجوب الوقوف بعده بها كما هو فی حق النساء دائما لانه اقرب للستر .والفائده فی الاسفار تكثیر الجماعة وفی التغلیس تقلیلها وما یؤدی الی التكثیر افضل

اقول باعث الافضلیة بالاسفار تكثیر الجماعة وان كان تكثیر الجماعة فی التغلیس فالافضل التغلیس وان الذین یعملون فی المعامل والمصانع والمكاتب یرضون التعجیل والتاخیر باعث لحرجهم وتقلیل الجماعة والله اعلم بالصواب "

(ذریعة النجاح)

مردوں کیلئے فجر کی نماز میں اسفار کا یہ مطلب ہے کہ وقت کے روشن ہونے کیلئے تاخیر کرے ،ابتداء بھی روشنی میں ہو اور ختم بھی روشنی میں ہو۔ مختار یہ ہے کہ امام ترتیل سے چالیس آیتیں پڑھے، پھر اگر نماز میں کوئی فساد لازم آجائے تو دوبارہ وضوء کر کے اسی مقدار میں قراءت سے نماز وقت میں ادا ہو سکے۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا فجر کو روشنی میں ادا کرو کہ اس میں زیادہ اجر ہے۔ فجر کی نماز کو مردوں کے لئے روشنی میں ادا کرنا مستحب ہے خواہ سفر میں ہو یا حضر میں۔ سوائے مزدلفہ کے، کیونکہ وہاں اندھیرے میں نماز افضل ہے حاجیوں کے لئے، اس لئے کہ بعد میں وہاں دعاء کے لئے ٹھہرنا ہے تا کہ زیادہ وقت مل سکے، جیسا کہ عورتوں کو ہمیشہ ہی اندھیرے میں نماز پڑھنا افضل ہے، کیونکہ اس میں ان کا پردہ ہے۔ روشنی میں نماز ادا کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ جماعت میں لوگ زیادہ مل سکیں گے اور اندھیرے میں نمازی کم ہوں گے۔ تکثیر جماعت افضل ہے۔

اس پر راقم کی وضاحت یہ ہے کہ جب مقصد روشنی میں پڑھنے کا تکثیر جماعت ہے تو یقیناً اگر

اندھیرے میں نماز پڑھنا نمازیوں کے زیادہ ہونے کا سبب ہو تو اندھیرے میں نماز پڑھنا زیادہ ثواب ہوگا۔ جیسا کہ کارخانوں، فیکٹریوں اور دفاتر میں ملازمت کرنے والے صبح کی نماز جلدی پڑھنا بہتر سمجھتے ہیں ایسی صورت میں صبح کی نماز اندھیرے میں پڑھنا بہتر ہے، کیونکہ اگر دیر سے نماز ادا کی جائے تو یا ان لوگوں کے کاموں میں حرج واقع ہوگی۔ یا وہ نماز جماعت سے پہلے ادا کر کے چلے جائیں گے اس لئے نمازیوں کا اعتبار کرنا ضروری ہے۔

احناف کا استدلال احادیث سے:

"عن رافع بن خدیج ان رسول اللہ ﷺ قال اسفروا لصلوٰۃ الفجر فان ذلک اعظم للاجر اوقال لاجورکم"

(مسند حمیدی ج ۱ ص ۱۹۹، ابوداؤد ج ۱ ص ۶۱ باب وقت الصبح، ترمذی ج ۱ ص ۹۴ باب الاسفار، نصب الرایۃ ج ۱ ص ۲۳۸)

رافع ابن خدیج رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ فجر کو روشنی میں ادا کرو، بے شک اس میں عظیم اجر ہے

اعتراض: نبی کریم ﷺ نے سفیدی میں نماز پڑھنے کا جو حکم دیا ہے، اس کا مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ صبح صادق کے وقت نماز ادا کرو، کیونکہ صبح کاذب کے بعد اندھیرا ہو جاتا ہے۔

جواب: صبح صادق مراد نہیں ہو سکتی، کیونکہ صبح صادق سے پہلے تو نماز ہو ہی نہیں سکتی، پھر روشنی میں نماز پڑھنے کا حکم اور عظیم اجر کے پائے جانے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟۔

ایک اور حدیث پاک کو دیکھیں تو اور واضح ہو جائے گا کہ اس سفیدی سے مراد روشنی ہی ہے، صبح صادق نہیں،

"عن ھریر بن عبدالرحمن بن رافع بن خدیج قال سمعت جدی رافع بن خدیج یقول قال رسول اللہ ﷺ لبلال نوّر بصلوۃ الصبح حتی یبصر القوم مواقع نبلھم من الاسفار" (المعجم الکبیر للطبرانی ص ۲۷۸ رقم الحدیث ۴۴۱۴)

ھریر بن عبدالرحمن بن رافع بن خدیج کہتے ہیں کہ میں نے اپنے دادا رافع بن خدیج کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ صبح کی نماز کو روشن کر کے

پڑھو، یہاں تک کہ اس روشنی میں قوم اپنے تیروں کے گرنے کے مقامات کو دیکھ لے۔

اس حدیث پاک سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ ''اسفار'' سے مراد صبح صادق نہیں بلکہ روشنی مراد ہے۔

" عن علی بن ربیعة قال سمعت علیا یقول لمؤذنه اسفر اسفر "

(مصنف عبدالرزاق ج ۱ ص ۵۶۹ باب وقت الصبح) مصنف ابن ابی شیبه ج ۱ ص ۳۲۱ باب من کان ینور بها، طحاوی ج ۱ ص ۱۲۳ باب وقت الفجر)

حضرت علی بن ربیعہ کہتے ہیں میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنا کہ وہ اپنے مؤذن (ابن نباح) کو کہہ رہے تھے اور روشنی ہونے دو، اور روشنی ہونے دو

" عن عبدالرحمن بن یزید قال کنا نصلی مع ابن مسعود فکان یسفر بصلوة الصبح "

(طحاوی ج ۱ ص ۱۲۵ باب وقت الفجر، مصنف عبدالرزاق ج ۱ ص ۵۶۹، مصنف ابن ابی شیبه ج ۱ ص ۳۲۱ باب من کان ینور بها)

عبدالرحمٰن بن یزید کہتے ہیں کہ ہم حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے ساتھ نماز پڑھتے تھے وہ صبح کی نماز روشنی میں پڑھتے تھے۔

جن احادیث کو ذکر کیا گیا ہے ان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جب تکثیر جماعت روشنی میں ہو تو روشنی میں نماز ادا کرنا مستحب ہے۔ اس پر عمل رسول اللہ ﷺ کا بھی بیان کیا جا چکا ہے۔ اور صحابہ کرام کا بھی

غیر مقلدین کی دلیل کا جواب:

" والحدیث القولی مقدم ای اسفروا بالفجر فانه اعظم للاجر واما ثبوت الغلس فلا ننکره ایضا فانه ایضا جائز فان الخلاف فی الافضلیة فصار الترجیح لمذهب الاحناف " (حاشیه ترمذی)

صبح کی نماز کو روشنی میں پڑھنے والی حدیث قولی ہے۔ اور اندھیرے میں نماز پڑھنے والی حدیث فعلی ہے۔ قانون یہ ہے کہ جب قولی اور فعلی حدیث میں تعارض ہو تو قولی حدیث کو ترجیح دی جاتی ہے۔

اور اصل میں یہ نزاع ہی نہیں کہ اندھیرے میں صبح کی نماز نہیں ہوتی، بلکہ نزاع تو صرف فضلیت میں ہے کہ افضل کیا ہے۔ روشنی والی نماز میں عظیم اجر کا ذکر ہے لہذا یہ افضل ہوگی۔ اندھیرے والی نماز میں صرف پڑھنے کا ذکر ہے لہذا وہ جائز رہے گی۔

اندھیرے میں نماز فجر ادا کرے یا روشنی میں جائز ہے۔لیکن جب روشنی میں نمازی زیادہ ہوں تو روشنی میں افضل ہے۔اور جب اندھیرے میں نماز پڑھنے سے نمازی زیادہ ہوں تو اندھیرے میں افضل ہے۔

راقم جہاں امام ہے وہاں کے لوگ دفتری ملازم ہیں۔دفتر میں جانے سے پہلے سیر کرنا، ناشتہ کرنا غسل کرنا، کپڑے بدلنا ان کے کئی معمولات ہیں سردیوں مین وقت کم ہونیکی وجہ سے راقم صبح کی نماز اندھیرے میں پڑھاتا ہے اور گرمیوں میں وقت زیادہ ہونے کی وجہ سے اور رات کے چھوٹا ہونے اور دیر سے جاگ آنے کی وجہ سے صبح کی نماز اجالے میں پڑھاتا ہے۔یہ دونوں صورتیں نمازیوں کی سہولت کے مدنظر ہیں۔ورنہ راقم خود گرمیوں اور سردیوں میں جلدی جاگنے کا عادی ہے، ہمیشہ اندھیرے میں نماز پڑھنے یا اجالے میں نماز پڑھنے سے راقم کو کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن فقہی نقطہ کو مدنظر رکھ کر بفضلہ تعالیٰ راقم کا عمل ہے۔ضد یا عناد کسی کو نہ ہو تو بفضلہ تعالیٰ راقم کے طریقہ پر کوئی اعتراض نہیں کر سکے گا۔

جلدی نماز پڑھنے پر غیر مقلدین کی ایک اور دلیل:

ترمذی شریف میں حضرت علی روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" یاعلی ثلاث لاتؤخرھا الصلوۃ اذااتت والجنازۃ اذاحضرت والایم اذا وجدت لھا کفوا "

اے علی تین چیزیں (ایسی) ہیں کہ نہ دیر کرنا ان کو (پہلی) نماز جب کہ آئے وقت اس کا (دوسری) جنازہ جب کہ تیار ہو (تیسری) عورت بن خاوند کے جبکہ پائے تو اس کیلئے کفو۔

(صلوۃ الرسول ص۔۱۴۰)

اس حدیث کو غیر مقلدین نے دلیل بنایا ہے کہ نماز کا جب وقت آ جائے اسی وقت نماز ادا کی جائے دیر نہ کی جائے۔

اس دلیل کا جواب:

حدیث شریف میں تین چیزوں کا ذکر ہے، جنازہ جب حاضر ہو تو اس میں دیر نہ کرو۔کیا کوئی غیر مقلد اس کے ظاہر پر عمل کرتا ہے۔کہ ایک شخص فوت ہوا، ادھر قبر تیار ہوئی اور بغیر دیر کے اسے دفن کر دیا؟ نہیں اس پر کوئی عمل نہیں کر رہا، ابھی چند دن ہوئے علامہ عبدالقادر روپڑی فوت ہوئے، ان کی وفات

کے بعد تقریباً سولہ یا اٹھارہ گھنٹے بعد جنازہ ہوا۔

اسی طرح حدیث شریف میں ہے کہ لڑکی غیر شادی شدہ کو جب کفو مل جائے تو اس کی شادی میں دیر نہ کی جائے۔

کیا ایسا کوئی غیر مقلد ہے کہ اپنی بیٹی کی شادی بالغ ہوتے ہوئے کفو ملنے پر کر دیتا ہے کفو تو تقریباً ہر خاندان کو مل ہی جاتی ہے جب ان دونوں پر عمل نہیں تو نماز کے وقت شروع پر نماز ادا کرنے پر زور کیوں؟

بات واضح ہے کہ حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ نماز کا مستحب وقت ہو جائے تو نماز پڑھنے میں اتنی دیر نہ کرو کہ مکروہ وقت آ جائے۔ جب کوئی شخص فوت ہو جائے جنازہ پڑھنے والے چالیس آدمی آ جائیں تو جنازہ ادا کرنے مین بہت دیر نہ کرو کہ جسم سے بدبو آنے لگ جائے یا میت کو برف خانہ میں رکھنا پڑھے لڑکی جوان ہو جائے، کفو مل جائے تو بہت دیر نہ کرو جہاں فتنہ کا خوف ہو۔

یہ مطلب جو راقم نے بیان کیا ہے، یہی تقریباً منصف مزاج علماء کرام کرتے ہیں۔ اور اسی پر عمل بھی ہو رہا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے تین چیزوں کا ذکر کیا ہے ان میں دو پر غیر مقلدین بھی اسی طرح عمل کرتے ہیں جس طرح میں نے بیان کیا ایک پر وہ جلدی جلدی عمل کر کے بظاہر اہل حدیث بننے کی ناکام کوشش کرتے ہیں لیکن در حقیقت وہ وقت مستحب اور مطلق وقت فرق کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے یا سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

غیر مقلدین کا حدیث پر عمل یا حدیث سے انحراف:

غیر مقلدین نے اوقات کے متعلق جو احادیث بیان کی ہیں (ان کا جواب دیا جا چکا ہے) ان سے انہوں نے نتیجہ نکالتے ہوئے بظاہر نصیحت ان الفاظ سے کی ہے (جو در حقیقت فضیحت ہے)

بھائیو اور بہنو! غور کرو رسول اللہ ﷺ نے اپنی ساری زندگی میں پانچوں نمازیں اول وقت پڑھیں۔

(صلوۃ الرسول ص ۱۴۶)

یہ سراسر غلط ہے، گرمیوں میں دیر سے ظہر کی نماز پڑھنے کا ذکر احادیث مبارکہ سے ثابت کیا

جا چکا ہے۔ اور فجر کی نماز نمازیوں کے زیادہ ہونے کی غرض سے روشنی میں ادا کرنے کی فضیلت کو بھی ذکر کیا چکا ہے۔

آیئے اب عشاء کی نماز کی تاخیر کا مستحب ہونا احادیث مبارکہ سے دیکھیں۔ پھر اندازہ کریں کہ غیر مقلدین کی یہ نصیحت واقعی نصیحت ہے یا فضیحت ہے۔ کیا حدیث پر عمل ہے یا حدیث سے انحراف ہے۔

"عن ابی سعید قال انتظرنا رسول اللہ ﷺ لیلة لصلوة العشاء حتی ذهب نحو من شطر اللیل قال فجاء فصلی بنا ثم قال خذوا مقاعدکم فان الناس قد اخذوا مضاجعهم وانکم لم تزالوا فی صلوة منذ انتظرتموها ولو لا ضعف الضعیف وسقم السقیم وحاجة ذی الحاجة لأخرت هذه الصلوة الی شطر اللیل"

(نسائی ج ۱ ص ۹۳ باب ما یستحب من تاخیر العشاء، ابن ماجه ج ۱ ص ۵۰ باب وقت صلوة العشاء، ابوداؤد ج ۱ ص ۶۱ باب وقت صلوة العشاء الاخرة، مسند احمد ج ۳ ص ۵)

حضرت ابوسعید (خدری) رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم ایک رات عشاء کی نماز کیلئے رسول اللہ ﷺ کی انتظار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ رات کا تقریبا نصف حصہ گذر گیا تو آپ تشریف لائے، پھر ہمیں نماز پڑھائی۔ پھر آپ نے فرمایا اپنی اپنی جگہ پر قائم رہو (اس کے بعد آپ نے ہمیں خطاب کرتے ہوئے فرمایا) بے شک لوگ اپنی اپنی آرامگاہ میں سو گئے ہیں بیشک تم جتنی دیر نماز کی انتظار میں رہے ہو نماز میں ہی تھے۔ اگر بوڑھوں کے بڑھاپے۔ بیماروں کی بیماری، صاحب حاجت کی حاجت کا خیال نہ ہوتا تو میں اس نماز کو نصف رات تک مؤخر کر دیتا۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ نماز کی انتظار میں بیٹھنا، دیر کرنا، نہ سونا، نماز پڑھنا ہے۔ یعنی نماز کے پڑھنے کا ثواب حاصل ہوتا رہے گا۔

نبی کریم ﷺ نے عشاء کی نماز کو دیر سے ادا کرنے کو پسند فرمایا صرف بوڑھے، بیماروں، نہ، رتمندوں کا لحاظ کرتے ہوئے آدھی رات تک دیر نہیں کی۔ لیکن رات کے تہائی حصہ تک دیر کرنا مستحب ہے۔

"عن ابی هریرة قال قال رسول اللہ ﷺ لو لا ان اشق علی امتی لأمرتهم ان یؤخروا العشاء الی ثلث اللیل او نصفه"

(مسند احمد ج ۲ ص ۲۵۰، ترمذی ج ۱ ص ۲۳ باب ماجاء فی تاخیر العشاء الاخرة، ابن ماجه ج ۱ ص ۵۰ باب وقت العشاء)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر میں اپنی امت کے لئے مشکل نہ سمجھتا تو حکم دیتا کہ عشاء کی نماز کو رات کے تہائی حصہ تک مؤخر کر دو۔

اس حدیث پاک میں شارحین کا اتفاق ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں امت کی مشکل کو خیال میں نہ لاتا تو عشاء کی نماز کو رات کے تہائی حصہ تک مؤخر کرنے کو واجب کر دیتا۔ یعنی وجوبی حکم دیتا نبی کریم ﷺ نے اگرچہ عشاء کی نماز کو دیر سے پڑھنا واجب تو نہیں قرار دیا لیکن رات کے تہائی حصہ تک دیر کرنا پسند فرمایا۔ مستحب یہی ہے کہ عشاء کی نماز دیر سے پڑھی جائے۔

جب عشاء کی نماز کو دیر سے پڑھنا رسول اللہ ﷺ نے پسند فرمایا تو جلدی نماز پڑھنے پر زور دینا یقیناً حدیث پاک سے انحراف ہے خدارا غور کریں حدیث پر عمل کرنے سے انحراف کرنے پر کوئی شخص اہل حدیث ہوتا ہے یا کہ عمل کرنے سے؟ حقیقت یہی ہے کہ ہمارا نام تو حنفی ہے لیکن ہم حقیقی معنی میں اہل حدیث ہیں۔ غیر مقلدوں نے اپنا نام ہی صرف اہل حدیث رکھا ہوا ہے، ورنہ وہ اہل حدیث کہلانے کے حقدار نہیں۔

ابھی تک نمازوں کے اوقات کی جو تفصیل بیان کی ہے اسی سے واضح ہو گیا کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب احادیث کے مطابق ہے جس میں تمام احادیث میں تطابق پایا جاتا ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ بھی نماز کو اول وقت میں ادا کرنے کے قائل ہیں لیکن اول وقت سے وقت مستحب کی اولیت مراد ہے، نہ کہ کل وقت کی اولیت۔

اب امام اعظم کے مذہب اعظم کو دیکھئے اور آپ کے اعظم دلائل کو دیکھنے کے بعد تفسیر قرطبی اور تفسیر کبیر میں اول وقت کی افضلیت کی ابحاث کو دیکھیں تو انشاء اللہ امام رحمہ اللہ کا مذہب ان دلائل کے مطابق آپ کو نظر آئے گا کیونکہ آپ بھی وقت مستحب کی اولیت کے قائل ہیں۔

☆ " عن ابی هريرة رضی الله عنه ان رسول الله ﷺ قال انما مثل المهجر الی الصلوة كمثل الذی يهدی البدنة ثم الذی علی اثره كالذی يهدی البقرة ثم الذی علی اثره كالذی يهدی الكبش ثم الذی علی اثره كالذی يهدی الدجاجة ثم الذی علی اثره كالذی يهدی البيضة "

(نسائی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص نماز (جمعہ) میں جلدی جائے وہ ایسے ہے جیسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اونٹ قربان کردے اور اس کے بعد جانے والا ایسا ہے جیسے وہ اللہ کی راہ میں گائے قربان کردے اور اس کے بعد جانے والا ایسے ہے جیسا کہ اللہ کی راہ میں بکری قربان کردے اور اس کے بعد جانے والا ایسا ہے جیسے اللہ کی راہ میں کوئی مرغی ذبح کردے) یعنی کسی فقیر کو مرغی ذبح کر کے دے دے)۔ اور اس کے بعد جانے والا ایسا ہے جیسے اللہ کی راہ میں (کسی غریب کو) انڈا دے دے۔

☆ " عن ابی هريرة رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ ان احدكم ليصلی الصلوة لوقتها وقد ترک من الوقت الاول ما هو خير له من اهله وما له " (دار قطنی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک تم میں سے کوئی شخص نماز وقت میں ادا کرتا ہے لیکن اول وقت جو اس کے مال وعیال سے بہتر ہے اسے چھوڑ دیتا ہے۔

☆ " عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ خير الاعمال الصلوة فی اول وقتها " (دار قطنی)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اعمال میں بہتر عمل نماز اول وقت میں ادا کرنا ہے۔

☆ " قوله عليه السلام فی خطبة له " وبادروا بالاعمال الصالحة قبل ان تشتغلوا "

نبی کریم ﷺ نے دوران خطبہ ارشاد فرمایا نیک اعمال کی طرف جلدی کرو (دنیاوی کاموں میں) مشغول ہونے سے پہلے۔ (ماخوذ از قرطبی وکبیر)

بفضلہ تعالیٰ امام اعظم رحمہ اللہ ان تمام احادیث پر عمل ہے آخری حدیث سے جلدی کی وضاحت بھی سمجھ آرہی ہے کہ اور کاموں میں مشغول ہو کر کہیں نیک کاموں کو فوت نہ کردو۔

فائدہ : " وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ " سے ایک فائدہ یہ بھی حاصل ہوا کہ:

" ولكل واحد من الرسل واصحاب الشرائع جهة قبلة فقبلة المقربين العرش ، وقبلة الروحانين الكرسی وقبلة الكروبيين البيت المعمور وقبلة الانبياء الذين قبلک بيت المقدس وقبلتک الكعبة "

تمام رسولوں اور اصحاب شرائع کا قبلہ ہے۔ مقربین کا قبلہ عرش، روحانیین کا قبلہ کرسی، کروبیین کا قبلہ البیت المعمور، آپ سے پہلے انبیاء کرام کا قبلہ بیت المقدس اور آپ کا قبلہ کعبہ ہے۔ (کبیر)

" فاستبقوا الخیرات " ای فالزموا معاشر المسلمین قبلتکم فانکم علی خیرات من ذلک فی الدنیا والآخرۃ اما فی الدنیا فلشرفکم بقبلۃ ابراھیم واما فی الآخرۃ فللثواب العظیم الذی تاخذونہ علی انقیادکم لا وامرہ "

یعنی " فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرَاتِ " کا ایک مفہوم یہ ہے کہ اے مسلمانوں کی جماعت اپنے قبلہ کو لازم پکڑو کیونکہ یہ تمہارے لئے دنیا میں بہتر اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں تمہارے لئے خیر اس لئے ہے کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ ہے جب تم بھی اس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرو گے تو تمہیں ابراہیم علیہ السلام کے قبلہ سے شرف حاصل ہوگا۔ آخرت میں تمہارے لئے خیر اس لئے ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے کی وجہ سے عظیم ثواب حاصل ہوگا۔ (کبیر)

☆☆☆☆☆

۞ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ☆ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۞

۱) ''اور جہاں سے آؤ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کرو اور وہ ضرور تمہارے رب کی طرف سے حق ہے اور اللہ تمہارے کاموں سے غافل نہیں۔ اور محبوب تم جہاں سے آؤ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کرو اور اے مسلمانو تم جہاں کہیں ہو اپنا منہ اسی کی طرف کرو کہ لوگوں کو تم پر کوئی حجت نہ رہے مگر جو ان میں ناانصافی کریں تو ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور یہ اس لئے ہے کہ میں اپنی نعمت تم پر پوری کروں اور کسی طرح تم ہدایت پاؤ''۔

۲) ''اور جہاں سے نکلو تو پھیر لو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف اور بیشک یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے اور نہیں اللہ غافل اس سے جو تم عمل کرتے ہو۔ اور جہاں سے تم نکلو تو پھیر لو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف اور جہاں تم ہو پھیر لو اپنے مونہوں کو اسی کی طرف، تا کہ نہ ہو لوگوں کو تم پر حجت سوائے ان لوگوں کے جو ظالم ہیں ان میں سے تو تم نہ ڈرو ان سے اور ڈرو مجھ سے اور تا کہ میں پوری کروں اپنی نعمتیں تم پر اور تا کہ تم ہدایت پر قائم رہو''۔

تکرار میں فوائد: بظاہر آیات میں تکرار نظر آتا ہے کہ تین مرتبہ منہ کو پھیرنے کا حکم دینے کا کیا مقصد ہے؟ لیکن جب غور کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ حقیقت میں تکرار ہے ہی نہیں بلکہ علیحدہ علیحدہ مطالب ہیں۔

پہلا فائدہ : نماز ادا کرنے والا کبھی مسجد حرام میں ہوتا ہے اور کبھی مسجد حرام سے باہر لیکن مکہ مکرمہ میں ہوتا ہے اور کبھی مکہ مکرمہ سے باہر دور ودراز علاقہ میں ہوتا ہے۔ مسجد حرام میں نماز ادا کرنے والے کو کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم پہلی آیۃ میں ﴿ وَحَیۡثُ مَا کُنۡتُمۡ فَوَلُّوۡا وُجُوۡهَکُمۡ شَطۡرَه ﴾ سے دیا۔ اور دوسری آیۃ میں مسجد حرام سے باہر لیکن مکہ مکرمہ میں ساکن حضرات کو حکم دیا۔ دوسری آیۃ سے مراد زیر بحث دو آیتوں سے پہلی آیۃ ہے۔ اور تیسری آیۃ میں مکہ مکرمہ سے باہر والوں کو مسجد حرام کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا۔ درحقیقت یہ وہم ہوسکتا تھا کہ شائد قریب والوں کے لئے یہ حکم ہو بعید والوں کے لئے نہ ہو تو تمام قریب وبعید والوں کے لئے حکم بیان کر دیا گیا۔ البتہ وضاحت پہلے کر دی گئی کہ کعبہ شریف سامنے ہو تو کیا حکم ہے سامنے نہ ہو تو کیا حکم ہے۔

دوسرا فائدہ : تین مرتبہ ذکر کر کے علیحدہ علیحدہ مقاصد بیان کئے گئے۔ پہلی مرتبہ بیان کرنے کے بعد فرمایا:

﴿ وَاِنَّ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتَابَ لَیَعۡلَمُوۡنَ اَنَّهُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّهِمۡ ﴾

''بیشک اہل کتاب جانتے ہیں کہ یہ حق ہے ان کے رب کی طرف سے''

یعنی اہل کتاب توراۃ وانجیل میں مشاہدہ کرنے کی وجہ سے جانتے ہیں کہ حضرت محمد مصطفی ﷺ کی نبوت برحق ہے اور تحویل قبلہ برحق ہے

دوسری مرتبہ حکم دینے کے بعد فرمایا ﴿ وَاِنَّه لَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ ﴾ ''بیشک یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے'' یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی شہادت کا ذکر فرمایا کہ میں اس پر شہادت دیتا ہوں کہ میرے محبوب کی نبوت اور تحویل قبلہ حق امور ہیں۔

تیسری مرتبہ حکم دینے کے بعد فرمایا: ﴿ لِئَلَّا یَکُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَیۡکُمۡ حُجَّةٌ ﴾ ''تاکہ لوگوں کی تم پر حجت نہ ہو'' "فلما اختلفت هذه الفوائد حسنت اعادتها " جب تینوں مقاموں میں مختلف فوائد پائے گئے ہیں تو ان کا اعادہ اچھا ہے اسی وجہ سے علیحدہ علیحدہ ذکر کیا۔

تیسرا فائدہ : جب پہلی آیۃ میں ذکر فرمایا ﴿ فَلَنُوَلِّیَنَّکَ قِبۡلَةً تَرۡضَاهَا ﴾ ''ہم ضرور بضرور پھیر دیں گے آپ کو اس قبلہ کی طرف جس کو آپ پسند کرتے ہیں'' تو اس سے وہم ہوسکتا

تھا کہ شائد یہ حکم صرف نبی کریم ﷺ کو ہو اور لوگوں کو نہ ہو تو ﴿ فولّوا وجوھکم شطرہ ﴾ ارشاد فرما کر ہر جگہ رہنے والوں کو کعبہ کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دیا تو دوسری آیۃ میں ﴿ ومن حیث خرجت فولّ وجھک شطر المسجد الحرام وانّہ للحق من ربّک ﴾ کہہ کر حکم کو عام فرما دیا اور ساتھ ہی بتا دیا کہ یہ تمہارے رب کی طرف سے حق ہے۔ اور تیسری آیۃ میں بیان فرما دیا کہ تم کعبہ کو قبلہ بنا لو۔ بیت المقدس کا قبلہ ہونا منسوخ ہو چکا ہے اب یہ ہمیشہ کیلئے تمہارا قبلہ رہے گا، منسوخ نہیں ہوگا۔

" والحاصل ان الآیة السالفة امر بالدوام فی جمیع الامکنة والثانیة امر بالدوام فی جمیع الازمنة والامکنة والثالثة امر بالدوام فی جمیع الازمنة واشعار بان هذا لا یصیر منسوخا البتة "

حاصل کلام یہ ہے کہ پہلی آیۃ میں حکم دیا گیا کہ تم جہاں کہیں بھی ہو تمہارا قبلہ کعبہ ہے اور دوسری آیۃ میں حکم دیا گیا تم جس وقت نماز ادا کرو کہیں بھی ہو نماز میں منہ کعبہ کی طرف ہی کرنا۔ تیسری آیۃ میں یہ حکم دیا گیا کہ یہ حکم تمہارے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہے یہ کبھی منسوخ نہیں ہوگا۔

چوتھا فائدہ : پہلی آیۃ میں نبی کریم ﷺ کے اکرام کا ذکر فرمایا کہ کعبہ کو قبلہ نبی کریم ﷺ کی تمنا کے مطابق بنایا جا رہا ہے اور ساتھ ہی آپ کی امت کو بھی حکم دے دیا کہ یہ وہ قبلہ ہے جو ابراہیم علیہ السلام کا بھی تھا اور تمہارے نبی کریم ﷺ کا مطلوب بھی ہے۔

دوسری آیۃ کریمہ میں ذکر فرمایا " ولکلّ وّجھۃ " یعنی ہر صاحب دعوت اور ہر صاحب ملت کا قبلہ ہے جس کی طرف وہ متوجہ ہوتے ہیں " فتوجھوا انتم الی اشرف الجھات التی یعلم اللہ تعالی انھا حق " تو تم تمام جہات میں سے اشرف جہت کی طرف متوجہ ہو اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہی حق ہے۔ اور تیسری آیۃ میں قبلہ کے معاملہ میں یہود کی طرف سے مخاصمت کا رد کرتے ہوئے فرمایا کہ تم مسجد حرام کی طرف منہ کر لو تاکہ ان کی حجت بازیاں ختم ہو جائیں۔

پانچواں فائدہ : اسلام میں منسوخ ہونے والا سب سے پہلا حکم قبلہ کا ہی تھا اس لئے تکرار میں تاکید پائی گئی اور بات کو پختہ کیا گیا۔ اور شبہات کو زائل کیا گیا اور دلائل واضح طور پر بیان کئے گئے۔

(ماخوذ از کبیر)

وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ : اور اللہ تعالیٰ نہیں ہے غافل اس سے جو تم عمل

کرتے ہو۔ یعنی وہ لوگ جو عناد کی وجہ سے آپ کو پہچاننے کے باوجود حق کو چھپاتے ہیں اور لوگوں کے دلوں میں شبہات ڈالتے ہیں اور کہتے ہیں " مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا عَلَیْهَا " کس چیز نے ان کو قبلہ سے پھیر دیا جس پر وہ تھے اور یہ کہتے ہیں کہ یہ نبی اپنے آبائی شہر اور آبائی دین کا مشتاق ہو گیا (معاذ اللہ) ان کو خطاب کرتے ہوئے رب تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں۔ (ازکبیر)

تنبیہ : علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک قراءت میں " یعلمون " (بالیاء) ہے اس میں کفار کو وعید ہے۔ اور ایک قراءت میں " تعلمون " ہے اس میں مؤمنین کے لئے وعدہ ہے اس صورت میں معنی یہ ہوگا " فیجازیکم بذلک احسن الجزاء " وہ تمہیں اچھی جزاء دے گا کیونکہ وہ تمہارے اچھے اعمال سے بے خبر نہیں۔ (روح المعانی)

خیال رہے کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ روح المعانی کے اسی قول کے مطابق ہے کیونکہ آپ نے ترجمہ کیا۔ ''اللہ تمہارے کاموں سے غافل نہیں'' اگر کفار کے لئے وعید ہوتی تو آپ کا ترجمہ ہوتا ''اللہ تمہارے کوتکوں سے غافل نہیں''۔

لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَیْكُمْ حُجَّةٌ . ''تاکہ نہ ہو لوگوں کو تم پر حجت'' پہلے یہ دیکھنا ہے کہ ان کی حجتیں کیا تھیں جو تحویل قبلہ کے بعد ختم ہو گئیں، آہستہ آہستہ خود ہی ان کے منہ بند ہوتے چلے گئے۔ ان کی حجتیں مختلف قسم کی تھیں:

(۱) " احدها ان الیهود قالوا تخالفنا فی دیننا و تتبع قبلتنا " ان میں سے ایک یہ تھی کہ یہود نے کہا یہ شخص ہمارے دین کی مخالفت کرتا ہے اور ہمارے قبلہ کی تابعداری کرتا ہے۔

(۲) " وثانیها قالوا الم یدر محمد این یتوجه فی صلاته حتی هدیناه " دوسری حجت یہود کی یہ تھی کہ وہ کہتے تھے کیا ایسا نہیں کہ محمد کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ نماز میں کس طرف منہ کرے یہاں تک کہ ہم نے اسے یہ سکھایا ہے۔

(۳) " ان العرب قالوا انه کان یقول انا علی دین ابراهیم والآن ترک التوجه الی الکعبة ومن ترک التوجه الی الکعبة فقد ترک دین ابراهیم علیه السلام "

تیسری حجت ان کی (یعنی مشرکین عرب کی) یہ تھی کہ وہ یہ کہتے تھے کہ یہ شخص کہتا تھا کہ میں

ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہوں لیکن اب مدینہ میں جا کر اس نے کعبہ کی طرف نماز میں منہ کرنا چھوڑ دیا ہے بلکہ بیت المقدس کو قبلہ بنالیا ہے جو شخص کعبہ کی طرف متوجہ ہونے کو ترک کر دے اس نے ابراہیم علیہ السلام کے دین کو بھی ترک کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے قبلہ کو تبدیل فرما کر ان کی تمام حجتوں کو ختم کر دیا ان کے منہ بند کر دیئے۔

اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا : ہاں تحویل قبلہ کے بعد بھی ظالموں کی حجتیں قائم رہیں گی۔ یہی وجہ تھی کہ تحویل قبلہ کے بعد مشرکین کہنے لگے "ان محمدا (علیہ الصلوۃ والسلام) عاد الی دیننا فی الکعبة وسیعود الی دیننا بالکلیة" بیشک محمد ﷺ کعبہ کو قبلہ بنانے کے مسئلہ میں تو ہمارے دین کی طرف لوٹ آئے ہیں عنقریب مکمل طور پر ہمارے دین کی طرف لوٹ آئیں گے۔ ان کا یہ کہنا ان کی جہالت اور ان کے کفر پر دلالت کر رہا ہے اور ان کا یہ کہنا اپنے آپ پر ظلم کرنا تھا رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ﴾ بیشک شرک ظلم عظیم ہے۔ اسی طرح یہودیوں میں سے بے وقوف تحویل قبلہ کے بعد بھی کہتے رہے ﴿مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ کَانُوْا عَلَیْهَا﴾ ان کو کس نے پھیر دیا ہے اس قبلہ سے جس پر تھے۔

اعتراض : ظالموں کے شبہات کو حجت نہیں کہا جاتا حجت تو دلیل کو کہا جاتا ہے تو ظالموں کے شبہات کو ﴿لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَیْکُمْ حُجَّةٌ﴾ سے استثناء کرنا کیسے صحیح ہے؟

پہلا جواب : حجت کبھی صحیح ہوتی ہے اور کبھی باطل، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (الشوری ۱۶)

"ان کی دلیل محض بے ثبات (باطل) ہے ان کے رب کے ہاں"

ان کی پہلی حجتیں بھی باطل تھیں اور تحویل قبلہ کے بعد بھی باطل ہی رہیں اس لئے استثناء صحیح ہے۔

دوسرا جواب : جب یہود اور مشرکین نے اپنے شبہات کا نام حجت (دلیل) رکھا تو رب تعالیٰ نے بھی ان کی بیوقوفی کو ظاہر کرنے کے لئے حجت ہی ذکر کر دیا کہ علم وعقل والے لوگ ذرا ان کے دلائل کو دیکھیں تو خود ہی سمجھ جائیں گے کہ وہ کتنے ہی بے وقوف اور جاہل لوگ تھے۔

تیسرا جواب : "اراد بالحجة المحاجة والمجادلة" اس مقام پر حجت کا معنی

جھگڑا کرنا، کج روی، یعنی مطلب یہ ہوا کہ تم جہاں بھی ہو مسجد حرام کی طرف منہ کرلو تاکہ لوگوں کی حجت بازیاں اور ان کے مجادلے اور مباحثے ختم ہو جائیں ہاں البتہ ضد اور عناد رکھنے والے پھر حجت بازیاں کرتے ہی رہیں گے۔ (از کبیر)

سبحان اللہ کیا خوب مسئلہ ثابت ہوگیا کہ بلاوجہ حجت بازی، بلاوجہ مجادلہ، بلاوجہ مباحثہ، کج روی کبھی شان صحابہ کی تنقیص، کبھی انبیاء کرام کی شان میں گھٹیا الفاظ کبھی اولیاء کرام پر مشرکین کے حق میں نازل ہونے والی آیات کو چسپاں کرنا، بتوں والی آیات انبیاء کرام اور اولیاء کرام پر چسپاں کرنا، بیوقوفی نادانی ہے اپنے منہ سے اپنے احمق ہونے کا اعلان ہے۔ طلباء کرام اس قسم کے احمقوں سے ہوشیار رہیں کہیں وہ گمراہ تمہیں بھی گمراہ نہ کردیں۔

فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِىْ : تو ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ہی ڈرو۔

یعنی یہود و نصاریٰ اور مشرکین کی طعنہ بازی، حجت بازی اور مجادلہ سے اے مومنو نہ ڈرو، وہ تمہیں قبلہ کے معاملہ میں طعنہ دیں یا تمہارے دین میں کسی قسم کا اعتراض کریں تو ان سے نہ ڈرو کیونکہ وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ ﴿وَاخْشَوْنِىْ﴾ اور مجھ سے ڈرو، یعنی جن احکام کو میں نے تم پر لازم کیا ہے اور جو امور تم پر فرض ہیں اگر تم نے ان پر عمل نہ کیا، حکم عدولی کی تو میں تمہیں عذاب دوں گا لہٰذا تم میرے عذاب سے ڈرو۔

اس آیۃ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ انسان پر واجب ہے کہ وہ اپنے افعال یا ترک افعال میں صرف رب تعالیٰ کی رضاء کو دیکھے اور رب تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتا رہے۔

" وان یعلم انه لیس فی ید الخلق شئی البتة وان لا یکون مشتغل القلب بهم ولا ملتفت الخاطر الیهم "

''اور انسان کو یہ علم حاصل ہونا چاہئے کہ مخلوق کے ہاتھ میں کچھ نہیں رب کو چھوڑ کر مخلوق کی طرف توجہ کرنا اور رب تعالیٰ سے دور ہو کر مخلوق سے دل لگانا منع ہے۔ (از کبیر)

ہاں البتہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں سے محبت کہ یہ رب تعالیٰ کی مخلوق اور رب تعالیٰ کے عبادت گزار ہیں لیکن اسکے مقبول بندے ہیں ان سے محبت درحقیقت رب تعالیٰ سے محبت ہے یہ عقیدہ اور یہ عمل عین ایمان ہے۔

خشیت اور خوف میں فرق:

" الخشیة اصلها طمانینة فی القلب تبعث علی التوقی "

خشیت کا اصل معنی دل میں اطمینان ہونا جس کی وجہ سے انسان برائیوں سے بچ سکے

" والخوف فزع القلب تخف له الاعضاء ولخفة الاعضاء سمی خوفا "

دل میں گھبراہٹ کا طاری ہونا جس کی وجہ سے اعضاء پر خفت طاری ہونا خوف ہے۔

(از قرطبی)

مجازی طور پر خشیت کبھی خوف کے معنی میں اور خوف خشیت کے معنی میں استعمال ہوتے رہتے ہیں۔

وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِیْ عَلَیْکُمْ : "تاکہ میں پوری کروں اپنی نعمتیں تم پر"۔

لام کے تعلق میں ایک احتمال یہ ہے کہ اس کا تعلق ﴿ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَیْکُمْ حُجَّةٌ ﴾ سے ہو۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ تم جہاں کہیں ہو نماز میں منہ قبلہ کی طرف کرو تا کہ لوگوں کی تم پر کوئی حجت نہ رہے اور میں اپنی نعمتیں تم پر مکمل کروں۔ یعنی کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کی دو حکمتیں بیان فرمادیں ایک یہ کہ لوگوں کی حجت بازیاں ختم ہو جائیں اور دوسری یہ کہ ان پر نعمتوں کی تکمیل ہو جائے۔

لام کے تعلق میں دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس کا تعلق محذوف سے ہو معنوی طور پر اسے یوں بیان کیا جائے گا "ولا تمام النعمة علیکم و ارادتی اهتداء کم امر تکم بذلک " میں نے تم پر اپنی نعمتیں مکمل کرنے کے لئے اور تمہیں ہدایت دینے کے لئے کعبہ شریف کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا۔

تیسرا احتمال اس میں یہ ہے کہ اس کا عطف علۃ مقدرہ پر ہو تقدیر عبارت کی یہ ہو ﴿واخشونی لاوفقکم ولاتم نعمتی علیکم﴾ اور مجھ سے ڈرو کہ میں تمہیں توفیق دوں اور اپنی نعمتیں تم پر مکمل کروں۔

نعمت سے مراد کیا ہے؟

" عن معاذ قال قال رسول الله ﷺ تمام النعمة دخول الجنة والفوز من النار رواه البخاری فی الادب المفرد والترمذی "

" حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمام نعمت جنت میں

داخل ہونا اور جہنم سے نجات حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کرنا ہے''۔

☆ " وعن علی رضی اللہ عنہ اتمام النعمۃ الموت علی الاسلام "

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں تمام نعمت اسلام پر موت کا آنا ہے۔ (از مظہری)

☆ " قال سعید بن جبیر ولم تتم نعمۃ اللہ علی عبد حتی یدخلہ الجنۃ "

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اس وقت تک بندے پر مکمل نہیں ہوگی جب تک اسے جنت میں داخل نہیں فرمائے گا۔

☆ "واتمام النعمۃ الھدایۃ الی القبلۃ" اتمام نعمت کا ایک معنی قبلہ کی ہدایت بھی ہے۔ (از قرطبی)

☆ تمام ہی نعمتیں مراد ہیں خواہ وہ وہبی ہوں یا کسبی۔ وھبی نعمتیں جیسے صحت بدن اور سلامتی اعضاء وغیرہ اور کسبی نعمتیں جیسے ایمان اور اعمال صالحہ اوامر کو تسلیم کرنا اور نواہی سے اجتناب کرنا یہ تمام نعمتیں انسان کے لئے سعادت دارین کا ذریعہ ہے۔ (شیخ زادہ) راقم نے اسی وجہ سے ترجمہ ''نعمتیں'' کیا ہے۔

اعتراض : اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے وصال سے چند دن پہلے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ ﴾

''آج میں نے مکمل کر دیا ہے تمہارے لئے تمہارے دین کو اور مکمل کر دیا ہے تم پر اپنی نعمتوں کو''

جواب : " اجیب بان اتمام النعمۃ فی کل وقت بما یلیق بہ فتدبر "

ہر وقت ہر زمانہ میں جن نعمتوں کی بندوں کو ضرورت رہی اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے ان کی تکمیل فرماتا رہا قرب وصال دین کی تکمیل فرما کر عظیم نعمت کی تکمیل فرما دی۔ (از روح المعانی)

وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ : ''تاکہ تم ہدایت پر قائم رہو'' جب اس سے آگے الفاظ ﴿ للصراط المستقیم ﴾ ہوں تو مطلب ہوگا ''تاکہ تم سیدھی راہ پر قائم رہو'' کیونکہ صحابہ کرام پہلے ہی ہدایت پر تھے اس لئے راقم نے ترجمہ کیا ''تاکہ تم ہدایت پر قائم رہو'' تاہم اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا ہے ''اور کسی طرح تم ہدایت پاؤ''۔ اس پر مدارک کی یہ عبارت شاہد ہے ﴿ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴾ ولکی تھتدوا الی قبلۃ ابراھیم '' تاکہ ابراہیم علیہ السلام کے قبلہ کی ہدایت پا جاؤ۔

﴿ کَمَآ اَرۡسَلۡنَا فِیۡکُمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡکُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتِنَا وَیُزَکِّیۡکُمۡ وَیُعَلِّمُکُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَۃَ وَیُعَلِّمُکُمۡ مَّا لَمۡ تَکُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ ﴾

۱) ''جیسا ہم نے تم میں بھیجا ایک رسول تم میں سے کہ تم پر ہماری آیتیں تلاوت فرماتا ہے اور تمہیں پاک کرتا اور کتاب اور پختہ علم سکھاتا ہے اور تمہیں وہ تعلیم فرماتا ہے جس کا تمہیں علم نہ تھا''۔

۲) ''جیسا ہم نے بھیجا تم میں رسول تم میں سے، تلاوت فرماتا ہے تم پر ہماری آیتیں اور تمہیں پاک کرتا ہے اور سکھاتا ہے تمہیں کتاب اور حکمت اور سکھاتا ہے تمہیں وہ جو تم نہیں جانتے تھے''۔

کَمَآ اَرۡسَلۡنَا فِیۡکُمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡکُمۡ : جیسا ہم نے بھیجا تم میں رسول تم میں سے

''کاف'' کا تعلق ماقبل سے ہے یا مابعد سے، جتنے احتمال ''کاف'' کے تعلق میں ہوں گے وہ تمام ہی اس کے مطالب ہوں گے۔

(۱) ایک مطلب یہ ہے کہ اس کا تعلق ﴿ وَلِاُتِمَّ نِعۡمَتِیۡ ﴾ سے ہو۔ مطلب یہ ہو کہ میں اپنی نعمتیں دنیا میں تم پر پوری کروں کہ تمہیں شرافت حاصل ہو۔ اور آخرت میں تمہیں بہت بڑا ثواب عطاء کر کے کامیابی سے سرفراز کروں '' کما اتممتها علیکم فی الدنیا بارسال الرسول '' جیسا کہ میں نے تم پر دنیا میں رسول بھیج کر اپنی نعمتوں کی تکمیل کی۔

(۲) ابراہیم علیہ السلام نے دعاء کی ﴿ رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِیۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِکَ وَیُزَکِّیۡهِمۡ ﴾ ''اے ہمارے رب مبعوث فرما ان میں رسول ان میں سے جو ان پر تلاوت کرے تیری آیات اور ان کا تزکیہ کرے اور ساتھ یہ دعاء بھی کی ﴿ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّۃً مُّسۡلِمَۃً لَّکَ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا ﴾ اور ہماری اولاد سے ایک گروہ کو اپنا مطیع بنا اور ہمیں دکھا عبادت کے طریقے۔

اب مطلب یہ ہوگا کہ ''میں تم پر شریعت کے احکام کے بیان سے اور دین کی تمہیں ہدایت دے کر اپنی نعمتوں کی تکمیل کروں کہ ابراہیم علیہ السلام کی دعاء میں کامل طور پر قبولیت ہو جائے جیسا کہ میں ''تم میں اپنے رسول کو بھیج کر ان کی دعاء کو قبول کر چکا ہوں۔ گویا کہ اس آیۃ کریمہ میں ابراہیم علیہ السلام

کی دعاء کی قبولیت کو واضح طور پر بیان کر دیا گیا۔

(۳) اس کا تعلق ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا ﴾ سے ہو جائے۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح ہم نے تم میں باکمال رسول کو مبعوث فرمایا اسی طرح تمہیں باکمال امت بنایا۔ جس طرح ہم نے تم میں بہت بڑی شان والے رسول کو بھیجا اسی طرح ہم نے تمہیں بہت شان والی امت بنایا اور جس طرح تم میں ہم نے بہت صفات والے عظیم منصب والے رسول کو مبعوث فرمایا اسی طرح ہم نے تمہیں کامل صفات والی امت بنایا۔

(۴) یا اس کا تعلق مابعد سے ہو یعنی ﴿ فَاذْكُرُوْنِیْ اَذْكُرْكُمْ ﴾ سے اب اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ تم کتاب کو نہیں جانتے تھے اور نہ ہی تم رسول کو جانتے تھے اور محمد ﷺ تم میں سے ہی ہیں جن کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی۔ پھر انہوں نے تم پر وہ کتاب پیش کی جو "اعجب الآیات" (عجیب آیات والی) ہے وہ تم پر تمہاری زبان میں ہی تلاوت کرتے ہیں اور اس میں ان چیزوں کا ذکر ہے جن کا پہلی آسمانی کتابوں میں ذکر ہے اور اس کتاب میں پہلے انبیاء کرام کا ذکر موجود ہے اور رب تعالیٰ کی وحدانیت پر دلائل موجود ہیں اور قیامت کا ذکر اس میں ہے اور اخلاق شریفہ پر اس میں متنبہ کیا گیا ہے اور بے وقوفوں کے اخلاق سے اس میں منع کیا گیا ہے یہ تمام نبی کریم ﷺ کی صداقت پر دلائل ہیں۔ تو گویا کہ رب تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ جس طرح میں نے تمہیں یہ نعمتیں عطاء کی ہیں اور تمہارے لئے یہ دلائل قائم کئے ہیں تو تم مجھے شکر سے یاد کرو میں تمہیں اپنی رحمت اور ثواب سے یاد کروں گا۔ (از کبیر)

فِيْكُمْ : سے مراد عرب ہیں یعنی خطاب عرب حضرات کو ہے "جس طرح ہم نے بھیجا تم میں رسول تم میں سے"

مِنْكُمْ : یعنی وہ رسول محمد ﷺ تم میں سے ہیں اس مقام میں " رسولا " مفعول صریح کو ظرف سے پہلے ذکر کیا تا کہ جلدی فرح و سرور پر دلالت کرے اور "رسول" کی صفات کا ذکر تھا گویا کہ ان میں سے ہونا بھی ایک صفت تھی اس لحاظ پر بھی صفات کو اکٹھا ذکر کیا۔

يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا : "تلاوت فرماتا ہے تم پر ہماری آیات" یہ رسول اللہ ﷺ کی صفت بیان کی گئی ہے اس میں نبی کریم ﷺ کی نبوت کے ثبوت کی طرف اشارہ ہے:

" لان تلاوة الامی الخارجة عن طوق البشر باعتبار بلاغتها واشتمالها علی الاخبار

بالمغیبات و المصالح التی ینتظم بھا امر المعاد و المعاش اقوی دلیل علی نبوتہ "

کیونکہ وہ نبی جوامی ہیں (جنہوں نے کسی انسان کو اپنا استاذ نہیں بنایا) ان کا ایسی آیات تلاوت کرنا جو بلاغت کے لحاظ سے انسانی طاقت سے خارج ہوں اور غیبی خبروں پر مشتمل ہوں، اور دنیا وآخرت کی مصلحتوں پر مشتمل ہوں یہ آپ کی نبوت پر قوی دلیل ہے۔ (روح المعانی)

قرآن پاک کی تلاوت کرنا نبی کریم ﷺ کا عظیم معجزہ ہے " لانہ معجزۃ باقیۃ "اس وجہ سے کہ آپ کا یہ معجزہ باقی رہنے والا معجزہ ہے۔ " و لانہ یتلی فیتأدی بہ العبادات " کیونکہ قرآن پاک کی تلاوت سے عبادات ادا ہوتی ہیں۔ یعنی قرآن پاک کی تلاوت سے ہی نماز، زکواۃ، حج اور روزہ کی فرضیت کا پتہ چلتا ہے بلکہ ایمان بھی قرآن سے ہی حاصل ہوتا ہے " و لانہ یتلی فیستفاد منہ جمیع العلوم " اور قرآن پاک کی تلاوت سے ہی تمام علوم حاصل ہوتے ہیں۔ کیونکہ علم صرف ہو یا نحو خواہ علم معانی ہو یا بیان ہو یا بدیع، خواہ علم کلام ہو یا تصوف، خواہ فقہ ہو یا اصول فقہ، خواہ علم لغت ہو یا ادب تمام علوم ہی قرآن پاک سے حاصل ہوئے ہیں۔ ان کو پڑھنے کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ قرآن پاک سمجھ میں آجائے۔ " و لانہ یتلی فیستفاد منہ مجامع الاخلاق الحمیدۃ " قرآن پاک کی تلاوت سے ہی تمام کے تمام اخلاق حمیدہ حاصل ہوتے ہیں یعنی قرآن پاک نیک اعمال، اچھے اخلاق، بھائی چارہ، اخوت، مروت، عدل و احسان کا سبق دیتا ہے۔

" فکأنہ یحصل من تلاوتہ کل خیرات الدنیا و الآخرۃ "

گویا کہ قرآن پاک کی تلاوت سے دنیا اور آخرت کی ہر قسم کی بھلائیاں حاصل ہوتی ہیں۔ (از کبیر)

وَيُزَكِّيكُم : "اور تمہارا تزکیہ فرماتے ہیں " ای یطھرکم من الشرک " یعنی وہ تمہیں شرک سے پاک کرتے ہیں تلاوت کے بعد تزکیہ کا ذکر کیا کیونکہ یہ بھی آپ کا معجزہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے توفیق دینے کا ارادہ فرماتا ہے کہ اسے ایمان کی توفیق حاصل ہوجائے اسے آپ کے ذریعے توفیق عطاء کرتا ہے گویا کہ ایک معجزہ کے بعد دوسرے معجزہ کا ذکر ہے۔ (از روح المعانی)

اور مطلب یہ ہے " انہ علیہ الصلوۃ و السلام یعلمھم ما اذا تمسکوا بہ صاروا ازکیاء " بیشک نبی کریم ﷺ تمہیں وہ تعلیم دیتے ہیں جس پر عمل کر کے تم پاکیزہ ہوجاتے ہو۔ یعنی آپ کی تعلیم کے ذریعے وہ لوگ شرک کی نجاست، گناہوں کی نحوست، بداخلاقی کی آلودگی سے پاک ہوگئے۔ اور

مطلب یہ ہے:

" ویزکیکم بالثناء والمدح ای یعلم ما انتم علیه من محاسن الاخلاق فیصفکم به "

کہ وہ مدح اور ثناء کے ذریعے تمہارا تزکیہ فرماتے ہیں یعنی تمہیں محاسن اخلاق سکھائے، جن پر عمل کرنے کی وجہ سے تم قابل تعریف ہوئے خود نبی کریم ﷺ نے بھی اپنے صحابہ کرام کی تعریف کی اور جہاں میں بھی وہ قابل تعریف ہوئے سبحان اللہ تعلیمات مصطفویہ کے اثرات تا قیامت جگمگاتے رہیں گے۔

اور مطلب یہ ہے " ان التزکیة عبارة عن التنمیة " یعنی تزکیہ کا معنی بڑھانا بھی آتا ہے اب مطلب یہ ہوگا کہ وہ تمہیں بڑھاتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اِذْ کُنْتُمْ قَلِیْلًا فَکَثَّرَکُمْ ﴾ "جب تم قلیل تھے تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں کثیر کیا"۔ یعنی وہ رسول تمہیں حق پر جمع کرتے ہیں تمہیں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنے اور بھائی بھائی بن کر رہنے کی تعلیم دیتے ہیں جو تمہارے روز بروز بڑھنے کا ذریعہ ہے۔

" وهذه الوجوه غیر متنافیة فلعله تعالیٰ یفعل بالمطیع کل ذلک "

اور یہ تمام وجوہ متنافی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے مطیع لوگوں کو ان تمام نعمتوں سے نوازتا ہے۔

(از کبیر)

وَیُعَلِّمُکُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ : "اور سکھاتا ہے تمہیں کتاب اور حکمت"

پہلے ﴿یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیَاتِنَا﴾ ذکر کیا ہے لیکن تکرار نہیں اس لئے اس میں آیات کی تلاوت کا ذکر ہے یعنی صرف آیات کا سنانا اور ﴿ وَیُعَلِّمُکُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ ﴾ میں اللہ کی کتاب کی تعلیم کا ذکر ہے "والحکمة" سے مراد " العلم بسائر الشریعة التی یشتمل القرآن علی تفصیلها " تمام شرعی مسائل کا علم جن کی تفصیل پر قرآن پاک مشتمل ہے۔

اسی لئے امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا

"الحکمة هی سنة الرسول ﷺ " حکمت رسول اللہ ﷺ کی سنت کو کہا جاتا ہے۔ (از کبیر)

تعلیم کتاب اللہ اور اس میں پائے جانے والے اسرار ربانیہ اور کتاب اللہ میں حکمت الٰھیہ کو مؤخر ذکر کیا اور تزکیہ کا ذکر پہلے کیا اس لئے کہ شرک کی میل سے پاک ہونا، اور شک کی نجاست سے پاک ہونا پہلے ضروری ہے اس کے بعد ہی انسان کتاب اللہ کے احکام کی تابعداری کرتا ہے جو پاکیزگی کا سبب بنتا ہے " وما قبل ذلک فالکفر حجاب " لیکن اس سے پہلے کفر حجاب ہے جس کی وجہ سے

انسان کتاب اللہ کی اطاعت سے دور رہتا ہے لہٰذا وہ شرک کی نجاست میں مبتلاء رہتا ہے۔

نکتہ : حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء میں تزکیہ کا ذکر بعد میں ہے اور تعلیم کا ذکر پہلے اسلئے کہ تزکیہ کا مطلب یہ ہے کہ قوۃ عملیہ کے لحاظ سے تکمیل نفس اور قوۃ نظریہ کے لحاظ سے تکمیل تہذیب۔

● تزکیہ ہر لحاظ سے ایک عظیم نعمت ہے تزکیہ پہلے ہو تعلیم زیادہ اثر انداز ہو یا تعلیم کے بعد کامل طور پر تزکیہ پایا جائے ویسے اسے علۃ غائیہ کی حیثیت بھی حاصل ہے جو تصور کے لحاظ سے پہلے ہوتی ہے اور وجود کے لحاظ پر بعد میں اس لئے ایک مقام پر مقدم ذکر کردیا اور دوسرے مقام پر مؤخر۔ (از روح المعانی)

وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ : ''اور سکھاتا ہے تمہیں جو تم نہیں جانتے تھے''

یعنی تمہیں ہر وہ چیز سکھاتے ہیں جو تم نہیں جانتے تھے اور وہ وحی کے بغیر حاصل بھی نہیں ہوسکتیں اس میں اس مسئلہ پر تنبیہ پائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو اس زمانہ میں مبعوث فرمایا جسے " فترۃ" کا زمانہ کہا جاتا ہے یعنی رسولوں کی آمد منقطع تھی اور امتیں جہالت میں مبتلاء تھیں، مخلوق متحیر (حیران) تھی اور دین کے معاملہ میں وہ بھٹکے ہوئے تھے۔" **فبعث اللہ تعالٰی محمدا بالحق حتی علمھم ما احتاجوا الیہ فی دینھم و ذلک من اعظم النعم**" تو اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو حق سے مبعوث فرمایا یہاں تک کہ لوگ دین میں جن چیزوں کے محتاج تھے انکی آپ نے ان لوگوں کو تعلیم دی۔ نبی کریم ﷺ کا تشریف لانا اور تعلیم دینا لوگوں کے لئے سب نعمتوں سے عظیم نعمت تھی۔ (از کبیر و روح المعانی)

فائدہ جلیلہ : " **تکرار الفعل یدل علی ان ھذا التعلیم من جنس آخر ولعل المراد بہ العلم اللدنی الماخوذ من بطون القرآن ومن مشکوۃ صدر النبی ﷺ الذی لا سبیل الی درکہ الا الانعکاس** "

یعنی فعل دو مرتبہ (وَيُعَلِّمُكُم) ذکر کیا جو اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ پہلی تعلیم ظاہری ہے اور دوسری تعلیم بنسبت پہلی کے علیحدہ ہے شائد اس سے مراد علم لدنی ہو جو قرآن پاک کے باطنی معانی سے اور مصطفیٰ کریم ﷺ کے سینہ مبارک کے علوم سے حاصل ہوتا ہے۔ اس علم لدنی کا ادراک ظاہر سے نہیں ہوسکتا صرف قرآن پاک کے انوار اور مصطفیٰ کریم ﷺ کے باطنی علوم کے انوار کی شعاؤں سے حاصل ہوسکتا ہے" **واما درک درکہ فبعید عن القیاس** "اس علم کے ادراک کا تصور بھی قیاس سے بعید ہے۔

رئیس الصدیقین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں " **العجز عن درک**

الادراک ادراک "ادراک کے درک سے عاجز ہونے کا نام بھی ادراک ہے۔ یعنی جب یہ معلوم ہو کہ علم لدنی کو عام طریقہ سے حاصل کرنا ممکن نہیں تو یہ بھی ایک علم ہے۔

☆ حضرت حنظلہ بن ربیع اسیدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مجھے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ملے تو آپ نے مجھ سے پوچھا اے حنظلہ تمہارا کیا حال ہے؟ میں نے کہا " نافق حنظلة " حنظلہ تو منافق ہوگیا۔ آپ نے فرمایا سبحان اللہ یہ تم کیا کہہ رہے ہو:

" قلت نکون عند رسول الله ﷺ یذکرنا بالنار والجنة کانا رأی عین فاذا خرجنا من عند رسول الله ﷺ عافسنا الازواج والاولاد والضیعات نسینا کثیرا "

میں نے کہا ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس ہوتے ہیں تو آپ ہمارے سامنے جنت ودوزخ کا ذکر کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمارے سامنے ہیں جب ہم نبی کریم ﷺ سے نکل کر اپنی بیبیوں اولاد اور مال وغیرہ میں مشغول ہوتے ہیں تو ہم بہت کچھ بھول جاتے ہیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا حال تو ہمارا بھی اسی طرح ہے آپ کہتے ہیں میں اور ابوبکر چلے یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ کے پاس گئے میں نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا " نافق حنظلة یا رسول الله " یارسول اللہ حنظلہ منافق ہوگیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا" وما ذاک "یہ کیا؟ (کہہ رہے ہو) میں نے عرض کیا یارسول اللہ ہم آپ کے پاس ہوتے ہیں تو آپ جنت ودوزخ کا ذکر کرتے ہیں تو ہم یہی سمجھتے ہیں کہ ہم جنت ودوزخ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں لیکن جب آپ (کی محفل) سے نکلتے ہیں اور اپنی بیبیوں اور اولاد اور مال وغیرہ میں مشغول ہو جاتے ہیں تو بہت کچھ بھول جاتے ہیں۔

" فقال رسول الله ﷺ والذی نفسی بیده لو تدومون علی ما تکونون عندی وفی الذکر لصافحتکم الملائکة علی فرشکم وفی طرقکم ولکن یا حنظلة ساعة وساعة ثلث مرات"

(رواہ مسلم)

تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر تم ہمیشہ اس حال پر رہو جو تمہیں میرے پاس ذکر کے وقت حاصل ہوتا ہے تو فرشتے تمہارے بستروں پر

آ کر تمہارے ساتھ مصافحہ کریں اور راستے میں تمہیں آ کر ملیں لیکن اے حنظلہ یہ وقت وقت کی بات ہے تین مرتبہ آپ نے یہ ارشاد فرمایا۔

نبی کریم ﷺ نے گویا کہ اس طرف اشارہ فرمادیا کہ میرے پاس بھی یہ کیفیت کبھی کبھی تمہیں حاصل ہوتی ہے جب کہ خصوصی توجہ اور علم لدنی کی تعلیم جاری ہوتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا ارشاد گرامی اور زیادہ اس مضمون کو واضح کر رہا ہے۔

" عن ابی هريرة قال حفظت رسول الله ﷺ وعائين فاما احدهما فبثثته فيكم واما الآخر فلو بثثته لقطع هذا البلعوم يعنی مجری العطام " (رواه البخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے (علم کے) دو خزانے حاصل کئے ہیں۔ ایک میں نے تم پر پھیلا دیا (ظاہر کر دیا) ہے اور اگر میں دوسرا تم پر ظاہر کر دوں تو میری رگِ طعام کٹ جائے۔

اس سے مراد بھی وہ خصوصی باطنی علم لدنی ہے جسے عام لوگوں پر ظاہر کرنا منع تھا وہ کیا علوم آپ نے حاصل کئے وہ تو عطاء کرنے والے جانیں یا حاصل کرنے والے جانیں ان دو ہستیوں کے بغیر صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ تاہم ان علوم میں سے غیبی علوم بھی ہو سکتے ہیں۔

اس کی ایک مثال دیکھئے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ یزید کی حکومت کی طرف اشارہ کر کے فرماتے " اعوذ بالله من رأس الستين وامارة الصبيان " میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں ساٹھ سال کے اختتام اور کم عمر لوگوں کی حکومت سے۔

ساٹھویں ہجری کے اختتام پر سینتیس سال کی عمر میں یزید پلید قانون کی دھجیاں بکھیر کر غاصبانہ انداز پر برسر اقتدار آ گیا جس کے بھیانک دور کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے پہلے ہی بھانپ لیا۔ یہ ان خصوصی علوم کا ہی ایک حصہ ہے سبحان اللہ لوگ مصطفیٰ کریم ﷺ کے علم میں شک کرتے ہیں کتنے نادان ہیں جن کو یہ پتہ ہی نہیں کہ آپ نے تو اپنے صحابہ کو بھی غیبی علوم عطاء فرما دیئے۔ (از مظہری)

☆☆☆☆☆

﴿ فَاذْكُرُوْنِيْ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴾

۱) ''تو میری یاد کرو میں تمہارا چرچا کروں گا اور میرا حق مانو اور میری ناشکری نہ کرو۔

۲) تو یاد کرو تم مجھے میں یاد کروں گا تمہیں اور تم شکریہ ادا کرو میرا اور میری ناشکری نہ کرو۔

فَاذْكُرُوْنِيْ اَذْكُرْكُمْ: " فاء " ماقبل سے رابطہ کے لئے ہے جیسا کہ ﴿ كَمَا اَرْسَلْنَا ﴾ میں ایک قول پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

" الذکر " (بکسر الذال) یاد کرنا، ذکر کرنا شہرت کہتے ہیں۔ "له ذكر فی الناس" اس کی لوگوں میں شہرت ہے۔

" الذکر " (بضم الذال) یاد رکھنا (المنجد) دل سے یاد کرنا بھی اس کا معنی آتا رہتا ہے۔

ذکر کی تین قسمیں: زبان سے ذکر کرنا، دل سے ذکر کرنا، اعضاء سے ذکر کرنا۔

ذکر باللسان :" فذكرهم اياه باللسان ان يحمدوه ويسبحوه ويمجدوه ويقرؤا كتابه "

مومنوں کا رب تعالیٰ کو زبان سے ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کریں اور رب تعالیٰ کی تسبیحات بیان کریں اور اس کی بزرگی کا ذکر کریں اور اس کی کتاب (قرآن پاک) کی تلاوت کریں۔

ذکر بالقلب : دل سے ذکر کرنے کی پھر تین قسمیں ہیں:

(۱) ان دلائل میں فکر کریں جو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر دلالت کریں اگر ان دلائل پر کوئی اعتراض وارد ہونے کا گمان ہو تو اس کے جواب کو سوچیں۔

(۲) ان دلائل میں فکر کریں جو انسان کو مکلف بنانے کی تکالیف کی کیفیت پر دلالت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے احکام، اوامر و نواہی اور وعد و وعید پر دلالت کرتے ہوں۔

" فاذا عرفوا كيفية التكليف وعرفوا ما فی الفعل من الوعد وفی الترک من الوعيد سهل فعله عليهم "

جب کیفیت تکلیف کا انہیں علم حاصل ہو جائے گا اور رب تعالیٰ کے اوامر کے مطابق عمل کرنے پر اس کی طرف سے ثواب کے وعدہ کو جان لیں گے اور رب تعالیٰ کی نواہی سے اجتناب نہ کرنے پر اس کی طرف سے سزا کی وعید کا جب پتہ چل جائے گا تو ان لوگوں پر عمل کرنا آسان ہوگا۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کے اسرار میں تفکر کرے یہاں تک کہ مخلوقات کے ذرات میں سے ہر ذرہ اس پر ایسے روشن ہو جائے جیسے کہ صاف وشفاف آئینہ کو عالم قدس کے مقابل رکھ دیا جائے۔

" فاذا نظر العبد الیھا انعکس شعاع بصرہ منھا الی عالم الجلال وھذا المقام مقام لا نھایۃ لہ "

جب بندہ مخلوقات کے ذرات میں تفکر کرتا ہے تو اس کی نظر کا عکس عالم جلال کا علم اسے عطاء کرتا ہے اس منزل کی کوئی انتہاء نہیں۔ تفکر کرنے والوں کے مدارج کے لحاظ سے ان کے علم ذات باری تعالیٰ میں بھی اسی قسم کے مدارج ہوتے ہیں۔

ذکر بالجوارح : اعضاء سے ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے " تکون جوارحھم مستغرقۃ فی الاعمال التی امروا بھا وخالیۃ عن الاعمال التی نھوا عنھا " کہ ان کے اعضاء ان اعمال میں مستغرق ہوں جن کا ان کو حکم دیا گیا ہے اور ان اعمال سے اعضاء کو دور رکھیں جن سے ان کو منع کیا گیا ہے۔ (از کبیر)

نماز تینوں ذکروں کا مجموعہ: رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاسۡعَوۡا اِلٰی ذِکۡرِ اللّٰہِ ﴾ تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو۔ اس مقام میں "ذکر" سے مراد نماز جمعہ ہے۔

جلالین میں مذکور ہے (فاذکرونی) بالصلوۃ والتسبیح ونحوہ " تم مجھے نماز اور تسبیح وغیرہ سے یاد کرو۔ اس پر صاوی میں ہے:

" ونحوہ کالتھلیل والتحمید وانما قال بالصلوۃ لان الذکر اما باللسان او بالجوارح او بالجنان ولا شک ان الصلوۃ جامعۃ لکل ذکر فالقراءۃ والتکبیر والتسبیح والدعاء ذکر لسانی والرکوع والسجود ذکر بالجوارح والخشوع والخضوع والمراقبۃ ذکر قلبی "

" ونحوہ " سے مفسر رحمہ اللہ کا مطلب تہلیل وتحمید ہے مفسر رحمہ اللہ نے ذکر بالصلوۃ بیان کیا

ہے کیونکہ ذکر کی تین قسمیں ہیں، زبان سے ذکر، اعضاء سے ذکر اور دل سے ذکر۔ بلاشک وشبہ نماز ہر قسم کے ذکر پر مشتمل ہے کیونکہ نماز میں قراءت اور تکبیر اور تسبیح اور دعا زبان کا ذکر ہے اور رکوع وسجود اعضاء کا ذکر ہے اور خشوع وخضوع اور مراقبہ دل کا ذکر ہے۔ (ماخوذ از کبیر، جلالین، صاوی)

سب سے اعلیٰ ذکر: "وقال اھل الحقیقة حقیقة ذکر اللہ تعالیٰ ان ینسی کل شئی سواہ" اہل حقیقت کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا حقیقی ذکر یہ ہے کہ اللہ کے سوا ہر چیز کو بھول جائے (روح المعانی) یعنی ہر وقت توجہ کا مرکز صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہو۔ مقصد عظیم اللہ تعالیٰ کی رضاء کا حصول ہو اور تقرب الٰہی مقصود ہو اس مقصد میں کامیابی پر جنت کا حصول اور جہنم سے بچاؤ خود بخود حاصل ہوں گے۔

جمیع اذکار پر مشتمل ذکر: "روی عن سعید بن جبیر انه قال اذکرونی بطاعتی" حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رب تعالیٰ کے ارشاد ﴿اذکرونی﴾ "تم مجھے یاد کرو" کا مطلب یہ ہے کہ تم میری طاعت کرو۔

"فصار الامر بقوله (اذکرونی) متضمنا جمیع الطاعات" لہٰذا ﴿اذکرونی﴾ کا حکم تمام طاعات کو مشتمل ہے یعنی رب تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ تم میری ہر قسم کی طاعت کرو۔ ہر طاعت جب ذکر میں آ گئی تو ذکر بمعنی طاعت کے لینا تمام اذکار پر مشتمل ہو گیا۔ (ماخوذ از کبیر)

اَذْکُرْکُمْ: امر کے جواب میں مضارع واقع ہے اس لئے مجزوم ہے ﴿اَذْکُرْکُمْ﴾ کا مطلب بیان کرتے ہوئے علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "اجازکم بالثواب وعبر عن ذلک للمشاکلة ولانه نتیجته ومنشاہ" میں تمہیں ثواب عطاء کر کے جزاء دوں گا ذکر کی جزاء کو مشاکلت کے طور پر ذکر سے تعبیر کر دیا کیونکہ در حقیقت جزاء خیر ہی ذکر کا نتیجہ اور منشاء ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حدیث قدسی بیان فرمائی "من ذکرنی فی نفسه ذکرته فی نفسی ومن ذکرنی فی ملأ ذکرته فی ملأ خیر من ملائه" اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو مجھے دل میں یاد کرے میں اسے دل میں یاد کرتا ہوں اور جو مجھے اشراف کی جماعت میں یاد کرے میں اس سے بہتر اشراف کی جماعت میں اسے یاد کروں گا "الملأ بالقصر الجماعة الاشراف" الملاء (بالقصر) ایسی جماعت کو کہتے ہیں جو اشراف پر مشتمل ہو۔

اعتراض: نبی کریم ﷺ کی محفل میں صحابہ کرام رب تعالیٰ کا ذکر کرتے رہے اس سے بہتر اور اشرف کون سی محفل ہوسکتی ہے؟

پہلا جواب: " ان الشئی یشرف بما نسب الیہ فان المجلس ینسب لکبیرہ وفرق بین حضرۃ اللہ وملائکتہ وبین حضرۃ النبی واصحابہ "

کسی چیز کو شرافت جو نسبت کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے وہ منسوب الیہ (جس کی طرف نسبت ہو) کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے جس مجلس کی نسبت کبیر ذات کی طرف ہو وہ مجلس بھی اعلیٰ ہوگی اس لئے فرق واضح ہے کہ جس محفل میں رب تعالیٰ کے حضور ملائکہ ہوں گے وہ اعلیٰ ہوگی کیونکہ اس کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف ہے اس محفل سے یقیناً اس محفل کا درجہ کم ہوگا جو نبی کریم ﷺ کے پاس صحابہ کرام کا حاضر ہونا ہے۔

دوسرا جواب، عظیم جواب:

" کون النبی ﷺ فی حضرۃ اللہ اشرف من نفسہ فی حضرۃ اصحابہ فمعنی قولہ خیر من ملئہ ذکرتہ فی حضرۃ النبی والملائکۃ المقربین فی الملأ الاعلی "

نبی کریم ﷺ کا رب تعالیٰ کے حضور ہونا اشرف اور اعلیٰ ہے بنسبت نبی کریم ﷺ کے محفل میں صحابہ کرام کے ہونے کے رب تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ میں اس شخص کو بہتر مجلس میں یاد کروں گا جس میں نبی کریم ﷺ اور ملائکہ مقربین ہوں گے سبحان اللہ وہ کیسی عظیم محفل ہوگی جو رب تعالیٰ کے حضور ہوگی اور اس میں سید الانبیاء بھی موجود ہوں گے اور ملائکہ مقربین بھی ہوں گے۔ اللہ کا ذکر کرنے والا کتنا خوش قسمت ہوگا جس کا ذکر اس عظیم محفل میں ہوگا۔ (ماخوذ از صاوی)

" وقیل معنی اذکرونی تذللوا لجلالی اذکرکم اکشف الحجب عنکم وافیض علیکم رحمتی واحسانی واحبکم وارفع ذکرکم فی الملأ الاعلی "

اور معنی یہ ذکر کیا گیا ہے کہ گویا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا تم مجھے یاد کرو کہ میرے جلال کے سامنے اپنے عجز کا اظہار کرو میں تمہیں یاد کروں گا کہ تم سے حجابات کو اٹھا دوں گا، اور تم پر اپنے احسان اور رحمت کا فیضان کروں گا اور تم سے محبت کروں گا اور ملأ اعلیٰ (ملائکہ کی جماعت) میں

تمہارا ذکر بلند کروں گا۔ (صاوی)

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی ﴿ ارفع ذکرکم ﴾ ''میں تمہارا چرچا کروں گا'' کا ہے کیا خوب نظر تفاسیر پر تھی۔

اللہ تعالیٰ کا ذکر زیادہ سے زیادہ کرے:

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے " والذاکرین اللہ کثیرا و الذاکرات اعد اللہ لھم مغفرۃ واجرا عظیما " اللہ تعالیٰ کا زیادہ ذکر کرنے والے مردوں اور عورتوں کے لئے اللہ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوف نہ کرے:

یا مبتغی طرق اھل اللہ والتسلیک دع عنک اھل الھوی تسلم عن التشکیک

اللہ تعالیٰ کی راہ تلاش کرنے والے اور راہ سلوک اختیار کرنے والے خواہشات پر چلنے والے اور شک ڈالنے والوں کی کوئی پرواہ نہ کر۔

اس راہ میں بڑی دشواریاں ہیں۔ لوگ مجنون بھی کہتے ہیں، طرح طرح کی بیہودہ گفتگو اھل اللہ کے بارے میں اوباش لوگ کرتے ہیں، جو شخص ان پر غصہ کرے دل تنگی اختیار کرے وہ اس راہ میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ صابر و شاکر شخص ہی اس راہ میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ (از صاوی)

دل حاضر نہ ہو تو پھر بھی زبان سے ذکر نہ چھوڑے:

شیخ عارف احمد صاوی رحمہ اللہ کیا خوب فرماتے ہیں " ولا تترک الذکر لعدم حضورک مع اللہ فیہ فربما ذکر مع الغفلۃ یجر لذکر مع حضور "

اگر انسان کو ذکر کرتے وقت اللہ تعالیٰ کے ہاں حضور قلب حاصل نہ ہو اور غفلت کے ساتھ صرف زبانی ذکر کرے تو پھر بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر کو نہ چھوڑے، کیونکہ بسا اوقات غفلت سے کئے ہوئے ذکر کی برکتوں سے انسان کو حضور قلب حاصل ہو جاتا ہے۔

زبان سے کئے ہوئے ذکر کی مثال چقماق کی ہے جس طرح چقماق کو ایک مرتبہ ماریں تو صرف چمک پیدا ہوتی ہے اس سے آگ نہیں سلگائی جاتی، لیکن رگڑتے رہیں تو اس سے آگ سلگائی جا سکتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ذکر زبان سے کرتے رہیں اگر ابتدائی طور پر حضور قلب حاصل نہیں ہوگا تو آخر کچھ دیر کے بعد حضور قلب حاصل ہوگا، جس سے تمام اعضاء روشن ہو جائیں گے۔

" فلا یقدر الشیطان علی وسوسته " تو شیطان اسے وسوسہ نہیں ڈال سکے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا ﴾ (الاعراف ۲۰۱)

''بیشک وہ لوگ جو ڈر رکھتے ہیں جب ان کو شیطانی خیال کی ٹھیس پہنچتی ہے تو وہ ذکر کرتے ہیں''۔

اللہ کے ذکر سے انسان پر اللہ تعالیٰ کی عبادت آسان ہو جاتی ہے اسے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی کسی عارف باللہ نے کیا خوب کہا:

اذا رفع الحجاب فلا ملاله   بتکلیف الا له ولا مشقة

جب حجابات اٹھ جاتے ہیں تو نہ کوئی ملال ہوتا ہے اللہ کی طرف سے دی ہوئی تکلیف پر اور نہ کوئی مشقت (ماخوذ از صاوی)

☆ " وسئل ابو عثمان فقیل له نذکر الله ولا نجد فی قلوبنا حلاوة ، فقال احمدوا الله تعالیٰ علی ان زین جارحة من جوار حکم بطاعته "

ابو عثمان رحمہ اللہ کی خدمت میں کچھ لوگوں نے ذکر کیا کہ ہم اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں لیکن اپنے دلوں میں اس کی حلاوت نہیں پاتے تو آپ نے فرمایا تم اللہ کی حمد بیان کرو، ذات باری تعالیٰ کا شکر ادا کرو جس نے تمہارے اعضاء میں سے ایک عضو (زبان) کو تو اپنی طاعت میں مزین کر رکھا ہے۔ (از قرطبی)

سبحان اللہ بزرگان دین کی کیا تعلیمات تھیں کہ وہ یہ نہیں فرماتے تھے کہ اگر ذکر سے حضور قلب حاصل نہیں تو اللہ کا ذکر ہی چھوڑ دو، بلکہ وہ فرماتے تھے یہ بھی مقام شکر ہے کہ رب تعالیٰ نے تمہاری زبان کو اپنی طاعت سے زینت عطاء کر رکھی ہے۔ ذکر کرتے رہو ایک دن وہ بھی آئے گا جب تمہیں حضور قلب کی عظیم نعمت سے نواز دیا جائے گا۔ ہاں جب یہ کیفیت حاصل ہو جاتی ہے اس کے بعد ہی

صوفیاء کرام فرماتے ہیں " قال رابگذار بندۂ حال شو " قال کو چھوڑ کر حال کو اختیار کر۔

علامہ رازی رحمہ اللہ کا خوبصورت بیان:

آپ فرماتے ہیں ﴿ فَاذْكُرُونِیٓ اَذْكُرْكُمْ ﴾ کے بیان میں مفسرین کرام نے مختلف عبارات پیش کی ہیں یقیناً ان کو دیکھنے سے عظمت قرآن سمجھ آئے گی کہ ایک جملہ میں معانی و مطالب کا کس قدر دریا موجزن ہے۔

" اذکرونی بطاعتی اذکرکم برحمتی " تم مجھے میری طاعت سے یاد کرو میں تمہیں اپنی رحمت سے یاد کروں گا۔

" اذکرونی بالدعاء اذکرکم بالاجابة والاحسان " تم مجھے دعاء سے یاد کرو میں دعاء کو قبول کرنے اور احسان سے تمہیں یاد کروں گا۔

اس کا مطلب تقریباً یہ ہو گیا " ادعونی استجب لکم " تو مجھ سے دعاء کرو تو میں تمہاری دعاء کو قبول کروں گا۔ ابو مسلم رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

امر الخلق بأن یذکروه راغبین راهبین وراجین خائفین ویخلصوا الذکر له عن الشرکاء فاذا هم ذکروه بالاخلاص فی عبادته وربوبیته وذکرهم بالاحسان والرحمة والنعمة فی العاجلة والآجلة "

کہ اللہ تعالیٰ نے گویا کہ حکم دیا ہے مخلوق کو کہ وہ اس کا ذکر کریں اس کی طرف رغبت کرتے ہوئے اور اس سے ڈرتے ہوئے اور اس کی رحمت کی طرف امید کرتے ہوئے اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہوئے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتے ہوئے خلوص سے اس کا ذکر کریں۔ جب لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہوئے، اس کی ربوبیت کو مانتے ہوئے خلوص سے اس کا ذکر کریں گے تو وہ ان کو احسان اور رحمت سے یاد کرے گا اور وہ ان کو دنیا اور آخرت میں نعمتیں عطاء کر کے یاد کرے گا۔

" اذکرونی بالثناء والطاعة اذکرکم بالثناء والنعمة "

تم مجھے یاد کرو میری حمد و ثناء بیان کر کے اور میری طاعت کر کے، میں تمہیں یاد کروں گا تمہاری

تعریف کر کے اور تمہیں نعمتیں عطاء کر کے۔

" اذکرونی فی الدنیا اذکرکم بالآخرة " تم مجھے دنیا میں یاد کرو میں تمہیں آخرت میں یاد کروں گا۔

" اذکرونی فی الخلوات اذکرکم فی الفلوات " تم مجھے خلوتوں میں یاد کرو میں تمہیں جنگلوں میں یاد کروں گا

" اذکرونی فی الرخاء اذکرکم فی البلاء " تم مجھے آسانی میں یاد کرو میں تمہیں مصیبتوں میں یاد کروں گا۔

" اذکرونی بطاعتی اذکرکم بمعونتی " تم مجھے طاعت سے یاد کرو میں تمہیں معاونت سے یاد کروں گا۔

" اذکرونی بمجاھدتی اذکرکم بھدایتی " تم مجھے مجاہدہ سے یاد کرو میں تمہیں ہدایت سے یاد کروں گا۔

" اذکرونی بالصدق والاخلاص اذکرکم بالخلاص ومزید الاختصاص "

تم مجھے یاد کرو صدق واخلاص سے میں تمہیں یاد کروں گا خلاص (آگ سے چھٹکارا) اور مزید اختصاص (خاص انعامات) سے۔

فضائل ذکر احادیث مبارکہ سے:

" عن ابی ھریرة وابی سعید قالا قال رسول اللہ ﷺ لا یقعد قوم یذکرون اللہ الا حفتھم الملائکة وغشیتھم الرحمة ونزلت علیھم السکینة وذکرھم اللہ فیمن عندہ " (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ اور ابو سعید رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی قوم اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے نہیں بیٹھتی سوائے اس کے کہ فرشتے ان کا احاطہ کر لیتے ہیں اور رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے اور سکینت ان پر نازل ہوتی ہے اور رب تعالیٰ ان کا مقربین میں ذکر فرماتا ہے۔

وضاحت حدیث: اگر " قعود " سے مراد "قیام" کی ضد یعنی بیٹھنا مراد ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ اس انداز پر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے کہ تمام حواس اطمینان سے اپنا اپنا کام کریں خواہ وہ حواس ظاہرہ ہوں یا باطنہ ہوں۔ کہ رب تعالیٰ کا ذکر کرتے ہوئے کسی اور کی طرف توجہ مبذول نہ ہو۔

" وان کان کنایة عن الاستمرار ففیه ایماء الی مداومة الاذکار " اگر قعود سے مراد اشارۃ استمرار (ہمیشہ جاری رکھنا) ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ ذکر ہمیشہ جاری رکھیں۔

حضرت ابن حجر رحمہ اللہ نے یہی معنی مختار قرار دیا ہے کہ غالب مقصد یہی ہوتا ہے کہ انسان ذکر

کرنے والوں کے ساتھ بیٹھ کر ذکر جاری رکھے تا کہ ان سے برکت حاصل کرے اور ان سے محبت کر کے اپنے بگڑی سنوارے۔

یہ معنی بہتر کیوں ہے؟ اسلئے کہ " فلاینا فیه قیامه لطاعة "رب تعالیٰ کی طاعت کیلئے اس کا ذکر کھڑے ہو کر اس حدیث کے مخالف نہیں۔ کیونکہ طواف کرنا اور دوران طواف ذکر کرنا اور مقامات مقدسہ کی زیارت کے وقت رب تعالیٰ کا ذکر کرنا، اور نماز جنازہ میں رب تعالیٰ کی ثناء اور علم کی طلب کیلئے جانا اور رب تعالیٰ کو یاد کرنا اور نصیحت سنتے وقت قیام کی حالت میں ذکر کرنا سب ہی محمود ہیں۔

الاحفتهم الملائكة :

"ای احاطت بهم الملائکة الذین یطوفون فی الطرق یلتمسون اهل الذکر"

یعنی وہ ملائکہ جو مختلف راستوں میں پھرتے رہتے ہیں ذکر والوں کو تلاش کرتے رہتے ہیں وہ ان ذکر کرنے والوں کا اپنی رحمت سے احاطہ کر لیتے ہیں۔

وغشیتهم الرحمة :

" ای غطتهم الرحمة الالهیة الخاصة بالذاکرین الله کثیرا والذاکرات "

اور رب تعالیٰ کی خصوصی رحمت ان مردوں اور عورتوں کو ڈھانپ لیتی ہے اور اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے جو اس کا ذکر کرتے ہیں۔

ونزلت علیهم السکینة : یعنی ذکر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ سکینت اور وقار عطاء کرتا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے خود ہی فرمایا:

﴿ اَلَا بِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴾ خبردار اللہ تعالیٰ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔
اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ لِیَزْدَادُوْٓا اِیْمَانًا مَّعَ اِیْمَانِهِمْ ﴾

"وہ ذات جس نے مومنوں کے دلوں میں سکینت (چین) نازل کی تا کہ ان کے ایمان میں اور زیادہ پختگی ہو"

وذکرهم الله : اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا فخر کے طور پر ذکر فرماتا ہے اور ان کا ذکر جمیل فرماتا ہے اور ان کو جزاء جزیل دینے کا وعدہ فرماتا ہے کہ یہ میرا ذکر کر رہے ہیں۔

فیمن عنده : " ای من الملائکة المقربین وارواح الانبیاء والمرسلین "

یعنی اللہ تعالیٰ مقرب فرشتوں اور انبیاء کرام اور مرسلین کے سامنے ذکر کرنے والوں کی تعریف فرماتا ہے۔ یہاں " عنده " کا یہی مطلب ہے کیونکہ رب تعالیٰ زمان اور مکان سے پاک ہے بلکہ ہر وہ چیز جس میں حدوث ہو اور نقصان ہو اس سے رب تعالیٰ پاک ہے۔

(مسلم ، ترمذی ، ابن ماجه ، مشکوٰة باب ذکر الله ، مرقاة)

☆ " عن ابی هريرة قال كان رسول الله ﷺ يسير فی طريق مكة فمر علی جبل يقال له جمدان فقال سيروا هذا جمدان سبق المفردون قالوا وما المفردون يا رسول الله قال الذاكرون الله كثيرا والذاكرات " (رواه مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ مکہ کے راستہ میں چل رہے تھے آپ کا ایک پہاڑ کے قریب سے گزر ہوا جسے جمدان کہا جاتا ہے آپ نے فرمایا چلو یہ جمدان ہے مفردون سبقت لے گئے صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ "مفردون" کون ہیں آپ نے فرمایا وہ مرد اور عورتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کو زیادہ سے زیادہ یاد کرتے ہیں۔

حدیث پاک کا مفہوم واضح ہے البتہ خیال رہے "جمدان" (بضم الجيم وسكون الميم وفی آخره نون) اور " مفردون " بتشديد الراء المكسورة وتخفيفها " مراد اس سے وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر اطمینان حاصل نہ ہو وہ تمام دوستوں کو چھوڑ کر، وطن کی پرواہ کیے بغیر، تمام اسباب کو منقطع کر کے، شہوات کو چھوڑ کر، اور تمام چیزوں کی لذات کو چھوڑ کر صرف رب تعالیٰ کی رحمت کے دروازہ کو لازم پکڑیں، صرف رب تعالیٰ کے ذکر کی لذت حاصل کریں۔

☆ " عن ابی موسیٰ قال قال رسول الله ﷺ مثل الذی يذكر ربه والذی لا يذكر مثل الحی والميت " (رواه البخاری ومسلم)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے اور وہ جو ذکر نہیں کرتا ان کی مثال زندہ اور مردہ کی ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا زندہ شخص کی طرح ہے جس طرح انسان کی ظاہری زینت نور حیات اور تصرف تام ہے اور باطنی زینت نور علم اور ادراک ہے اسی طرح ذکر کرنیوالے کو ظاہری زینت نور طاعت سے حاصل ہوتی ہے اور باطنی زینت نور معرفت سے حاصل ہوتی ہے۔ اور جو اللہ تعالیٰ

کاذکرنہیں کرتا " ظاهره عاطل وباطنه باطل " اس کا ظاہر بھی معطل ہے اور باطن بھی بیکار ہے۔

فائدہ جلیلہ: حدیث شریف میں اس طرف بھی اشارہ پایا گیا ہے:

" ان مداومة ذكر الحي الذي لا يموت تورث الحياة الحقيقية التي لافناء لها كما قيل اولياء الله لا يموتون ولكن ينتقلون من دار الى دار "

کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہمیشگی سے کرنے والے کو زندگی حاصل ہوتی ہے وہ مرتا نہیں یعنی حیات حقیقیہ اسے حاصل ہو جاتی ہے جس میں فنا نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کرنے والے کو مقام ولایت حاصل ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ولی مرتے نہیں بلکہ ایک جہان سے دوسرے جہان کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔

خیال رہے کہ مسلم شریف میں یہ الفاظ مبارکہ ہیں " البيت الذي يذكر الله فيه والبيت الذي لا يذكر الله فيه مثل الحي والميت " یعنی اس میں لفظ " البيت " ذکر ہے البیت سے مراد دل ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے کا دل اللہ تعالیٰ کا گھر ہے " فطوبى لمن احياه وعمره وياحسرتي على من اخربه " کتنی خوشی اور برکت کا مقام ہے اس شخص کے لئے جو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اپنے دل کو زندہ کرتا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے آباد کرتا ہے اور کتنا بدقسمت ہے وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کر کے اپنے دل کو مردہ کرتا ہے اور رب تعالیٰ کی رحمت سے محروم کر کے برباد کر لیتا ہے۔

☆ " عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ يقول الله تعالىٰ انا عند ظن عبدى بى وانا معه اذا ذكرنى فى نفسه ذكرته فى نفسى وان ذكرنى فى ملأ ذكرته فى ملأ خير منهم "

(رواه البخاری ومسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق ہوتا ہوں اور میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ مجھے دل میں یاد کرتا ہے میں اسے دل میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجھے جماعت (مجلس) میں یاد کرے تو میں اسے بہتر اشراف کی جماعت میں یاد کرتا ہوں۔

وضاحت حدیث: مطلب یہ ہوا " انا اعامله على حسب ظنه بى وافعل به مايتوقعه منى من خير اوشر " کہ میں اپنے بندے سے وہی معاملہ کرتا ہوں جیسا وہ میرے متعلق

گمان رکھتا ہے اگر وہ مجھ سے خیر کی توقع رکھے (یعنی ایسے عمل کرے جو ذریعہ خیر ہوں) تو میں اس سے خیر سے درپیش آتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے شر کی توقع رکھے تو میں بھی اس کی توقع کے مطابق اس سے سلوک رکھتا ہوں۔

" **لا مانع لما اعطیت و لا معطی لما منعت** " یعنی رب تعالیٰ کے ذکر کرنے والے پر رب تعالیٰ کی رحمت ہوتی ہے اور نہ ذکر کرنے والا اس سے محروم رہتا ہے۔ گویا کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے جسے میں عطاء کروں اس کو کوئی اس سے منع نہیں کرسکتا اور جسے میں محروم کردوں اسے کوئی عطاء نہیں کرسکتا۔

جب بندے کا مقام توحید میں راسخ عقیدہ ہو جائے، اور ایمان اس کے دل میں جاگزیں ہو جائے اور اللہ تعالیٰ پر اسے کامل بھروسہ ہو جائے " **قرب منه و رفع له الحجاب بحیث اذا دعاه اجاب و اذا سأله استجاب** " تو اسے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو جاتا ہے اس سے حجاب اٹھا لئے جاتے ہیں اس لحاظ پر کہ جب وہ دعاء کرتا ہے تو اس کی دعاء کو قبول کرلیا جاتا ہے اور جب سوال کرتا ہے تو اسے پورا کردیا جاتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رب تعالیٰ کہتا ہے " **اذا علم عبدی ان له ربا یغفر الذنب** " جب میرا بندہ جانتا ہے کہ میں اس کا رب ہوں تو میں اس کی مغفرت کردیتا ہوں۔

و انا معه : ای بالتوفیق و الحفظ و المعونة " یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں اسے توفیق عطاء کرتا ہوں اور اس کی حفاظت کرتا ہوں اور اس کی امداد کرتا ہوں اور اس کے کلام کو سنتا ہوں اور اس کے حال کو جانتا ہوں خواہ وہ مجھے زبان سے یاد کرے یا دل سے یاد کرے۔

فان ذکرنی فی نفسه ذکرته فی نفسی : اگر بندہ مجھے یاد کرے دل میں، پوشیدگی سے، آہستہ طور پر اور خلوص سے تو میں بھی اسے آہستہ طور پر خود اپنے دست قدرت سے ثواب عطاء کروں گا وہ ثواب فرشتوں کے سپرد نہیں کروں گا کہ وہ ذکر کرنے والے کو عطاء کریں۔

و ان ذکرنی فی ملأ ذکرته فی ملأ خیر منهم : یعنی رب تعالیٰ فرماتا ہے اگر بندہ مجھے مومنوں کی جماعت میں یاد کرے اور مومنوں کے سامنے یاد کرے تو میں اسے ملائکہ مقربین اور

رواح مرسلین میں یاد کروں گا اور اس کے ذکر کو شرف قبولیت عطاء کروں گا اس کی تعریف کروں گا اور سے بہت بڑا انعام عطاء کروں گا۔

تنبیہ: "ان خواص البشر کالانبیاء خیر من خواص الملائکة کجبریل واما عوام البشر فلیسوا بخیر من الملائکة اصلا"

انسانوں میں سے خاص لوگ یعنی انبیاء کرام بہتر ہیں خاص ملائکہ سے جیسے جبریل وغیرہ۔ لیکن عام بشر ملائکہ سے بہتر نہیں لہذا عام مؤمنین کی محفل میں بندے کا رب تعالیٰ کو یاد کرنے سے رب تعالیٰ کا ملائکہ مقربین اور ارواح مرسلین میں یاد کرنا یقیناً بہتر ہے۔

☆ "عن ابی ذر قال قال رسول اللہ ﷺ یقول اللہ تعالیٰ من جاء بالحسنة فله عشر امثالها وأزید ومن جاء بالسیئة فجزاء سیئة مثلها او اغفر ومن تقرب منی شبرا تقربت منه ذراعا ومن تقرب منی ذراعا تقربت منه باعا ومن اتانی یمشی اتیته هرولة ومن لقینی بقراب الارض خطیئة لا یشرک بی شیئا لقیته بمثلها مغفرة" (رواه مسلم)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رب تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے جو شخص نیکی کرے اس کے لئے دس گنا بلکہ اس سے بھی زائد اجر وثواب ہے اور جو شخص برائی کا عمل کرے تو اسے اس کی مثل ہی گناہ حاصل ہوگا یا میں اسے (اپنی رحمت) سے بخش دوں۔ اور جو شخص ایک بالشت میرے قریب ہوگا میں ایک ذراع اس کے قریب ہوں گا اور جو شخص ایک ذراع میرے قریب ہوگا میں دونوں بازوؤں کے پھیلانے کی مقدار فاصلے کی مقدار قریب ہوں گا اور جو شخص میرے پاس چل کر آئیگا میں اس کے پاس تیز چل کر آؤں گا اور جو شخص زمین کے قریب گناہ میرے پاس لائے سوائے شرک کے (مجھے میری رحمت کی امید سے ملے) تو میں اسی کے مطابق اسے مغفرت سے ملوں گا۔

وضاحت حدیث: من جاء بالحسنة ای غیر مبطلة ، جو شخص نیکی لائے لیکن وہ نیکی اس کی مقبول ہو مردود نہ ہو، ریاء کاری نہ ہو اور کوئی وجہ اس نیکی کو برباد کرنے والی نہ ہو تو اسے ایک نیکی کے بدلے دس نیکیوں کا ثواب حاصل ہوگا بلکہ نیکی کرنے والے کا جتنا خلوص بڑھتا چلا جائے گا، اسی قدر اس کے ثواب میں بھی زیادتی ہوتی چلی جائے گی وہ سات سو گنا، ایک لاکھ گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ ثواب دیا جائے گا۔

ومن جاء بالسیئة فجزاء سیئة مثلها:

جوشخص برائی کرے گا اسے ایک برائی کا ہی گناہ حاصل ہوگا۔

نکات: (۱) الحسنة فرمایا گیا یہ نہیں فرمایا گیا "**من فعل الحسنة**" اس سے اشارہ کیا گیا کہ الحسنة سے معہودہ نیکی مراد ہے یعنی وہ مقبول ہو، مردود نہ ہو۔

(۲) الحسنة کے ساتھ جزاء کا ذکر نہیں اور السیئة کے ساتھ جزاء کا ذکر ہے اس میں وجہ فرق کیا ہے؟ علامہ طیبی رحمہ اللہ نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی:

" ما یقابل العمل الصالح کله افضال واکرام من الله وما یقابل السیئة فهو عدل وقصاص فلا یکون مقصودا بالذات کالثواب فخص بالجزاء "

نیک اعمال پر ثواب اور وہ بھی کئی گنا زیادہ عطاء کرنا یہ صرف اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے حاصل ہوتا ہے لیکن گناہوں کے بدلے عذاب کا دیا جانا عدل وقصاص کی وجہ سے ہوگا۔ ثواب کی طرح عذاب مقصود بالذات نہیں ہوتا اسی لئے گناہوں کے بدلے عذاب کو "جزاء" سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔

(۳) سیئۃ کو دوبارہ نکرہ ذکر کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے معرفہ میں مطلق ذکر کیا گیا پھر نکرہ ذکر کر کے تنوین وحدت کی ذکر کر کے اس مبہم کی وحدت پر نص قائم کی گئی (یعنی اسے ظاہر کیا گیا ہے) کہ ایک گناہ پر سزا ایک گناہ کی ہی ہوگی، زیادہ نہیں ہوگی۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت اور خصوصی انعام واکرام اپنے بندوں پر ہوگا کہ اس کے انعامات تو زیادہ ہوں گے لیکن اس کی طرف سے سزائیں کم ہوں گی۔

(۴) " فله عشر امثالها وازید " میں "واؤ" کو ذکر کرنے کے فوائد یہ ہیں کہ یا مراد " ازید " سے اللہ تعالیٰ کی زیارت سے مشرف ہونا ہے جیسا کہ " **لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِیَادَةٌ** " میں " وزیادة " سے مراد رؤیۃ باری تعالیٰ ہے۔

اور " أزید " سے مراد کئی گنا نیکیوں کے ثواب کی زیادتی جب مراد ہو تو " واؤ " بمعنیٰ "او" کے ہوگی جو نوع پر دلالت کرتا ہے جس طرح اسی حدیث میں " او اغفر " میں "او" تنویع کے لئے استعمال ہے:

" والاظهر ما قاله ابن حجر من ان العشر والزیادة یمكن اجتماعهما

بخلاف جزاء مثل السیئة ومغفرتها فانه لا یمکن اجتماعهما فوجب ذکر او الدال علی ان الواقع احدهما فقط "

زیادہ ظاہر قول ابن حجر رحمہ اللہ کا ہے کہ ایک نیکی پر دس گنا اور اس سے بھی زیادہ ثواب حاصل ہوتا ہے یہاں دس گنا اور اس سے زیادہ کو جمع کرنا ممکن ہے اس لئے "واؤ" اپنے حقیقی "اجتماع" کے معنی میں استعمال ہے لیکن برائی کی جزاء میں "او" ذکر کرنا ضروری ہے کیونکہ اس میں اجتماع ممکن نہیں بلکہ یا ایک گنا عذاب ہو جائے یا مغفرت ہو جائے۔

اس سے آگے حدیث پاک کے مجازی معانی معتبر ہیں " ومن تقرب منی شبرا تقربت منه ذراعا " کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص میرا قرب حاصل کرنے کے لئے تھوڑی مقدار میں میری طاعت کرتا ہے تو میں اپنی رحمت اسے زیادہ مقدار میں پہنچاتا ہوں۔

درحقیقت بندے کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کا ذکر کرنے کی توفیق حاصل ہونا بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مہربانی ہے، معنی یہ ہو گیا "من تقرب الی بطاعتی تقربت الیه برحمتی " جو شخص میری طاعت سے میرے قریب ہوتا ہے میں اپنی رحمت سے اس کے قریب ہوتا ہوں۔

" ومن تقرب منی ذراعا تقربت منه باعا " اگرچہ "باعا" کا مطلب دونوں ہاتھوں کو پھیلانے سے جو فاصلہ ہوتا ہے اسے کہا جاتا ہے لیکن یہاں اس تمام جملے کا معنی یہ ہے " کلما زاد العبد قربة من الله تعالیٰ زاد الله رحمته " کہ بندہ جتنا زیادہ اللہ تعالیٰ کی طاعت سے قرب حاصل کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اپنی رحمت اتنی ہی زیادہ کرتا ہے۔

" ومن اتانی یمشی اتیته هرولة "اگرچہ " هرولة " کا معنی تیز چلنا ہے، دوڑنا نہیں لیکن یہاں بھی مجازی معنی ہی مراد ہے کہ جو میری طاعت اور زیادہ کرے گا " صببت علیه الرحمة " میں اپنی رحمت کا اس پر اور ہی زیادہ فیضان کروں گا یا یوں کہا جائے " من تقرب منی بسهولة وصل الیه رحمتی بسرعة "جو شخص آسانی سے میرے قریب ہوا میری رحمت جلدی ہی اسے حاصل ہو گئی۔

" ومن لقینی بقراب الارض خطیئة لا یشرک بی شیئا لقیته بمثلها مغفرة "اس

میں ''قراب'' لفظ استعمال ہوا ہے یہ ''قاف'' کے ضمہ اور کسرہ سے پڑھا گیا ہے ''قرب'' سے ماخوذ ہے معنی اس کا یہ ہے " بما یقرب ملأها من الصغائر والکبائر " کہ زمین میں جتنی چیزیں ہیں ان کے قریب صغیرہ اور کبیرہ گناہ کر کے میرے قریب آ جائے تو میری طرف سے اسی کے مطابق اسے رحمت حاصل ہوگی۔

حدیث پاک کا آخری حصہ قرآن پاک کے ان الفاظ مبارکہ کا ترجمان ہے ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ شرک کی مغفرت نہیں فرمائے گا، اس کے بغیر جو چاہے گا معاف فرمادے گا۔

حدیث پاک میں اس مقصد عظیم کو بھی واضح کیا گیا ہے "دفع الیأس بکثرة الذنوب فلا ینبغی ان یغتر فی الاستکثار من الخطایا" کہ زیادہ گناہوں سے ناامید بھی نہ ہو اور بہت زیادہ گناہوں میں مبتلاء ہو کر دھوکہ میں بھی مبتلاء نہ ہو۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے " فانه یغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء ولا یعلم انه من ایهم " کہ وہ جس کی چاہے مغفرت فرمائے اور جسے چاہے عذاب دے چونکہ انسان کو معلوم تو نہیں کہ وہ کن لوگوں سے ہوگا اس کی مغفرت ہونی ہے یا عذاب میں مبتلاء ہونا ہے یہ حدیث کے آخری حصہ کا مطلب ہے۔

حدیث کے اول حصہ میں ترغیب پائی گئی ہے طاعت میں مجاہدہ پر برانگیختہ کیا گیا ہے اور چستی سے عبادت کرنے کا حکم دیا گیا ہے سستی اور کوتاہی کو چھوڑنے کا حکم دیا گیا ہے۔

" فالحدیث معجون مرکب نافع لا مراض قلوب السالکین ومحرک شوق الطالبین ومقولصدور المذنبین "۔

گویا کہ حدیث مرکب معجون کی طرح ہے جو راہ سلوک پر چلنے والوں کے دلوں کی امراض کیلئے نفع مند ہے اور طالبین کے شوق کو حرکت دینے کا ذریعہ ہے اور گناہگاروں کے سینوں کیلئے مقوی ہے۔

نتیجہ واضح ہوا " ینبغی ان یکون المؤمن بین الخوف والرجاء " کہ مومن کے لئے

لائق یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا خوف بھی رکھے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید بھی رکھے۔

☆ " وعن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ ان الله تعالیٰ قال من عادی لی وليا فقد آذنته بالحرب وما تقرب الی عبدی بشئی احب الی مما افترضت عليه وما يزال عبدی يتقرب الی بالنوافل حتی احببته فاذا احببته فكنت سمعه الذی يسمع به وبصره الذی يبصر به ويده التی يبطش بها ورجله التی يمشی بها وان سألنی لا عطينه ولئن استعاذنی لاعيذنه وما ترددت عن شئی انا فاعله ترددی عن نفس المؤمن يكره الموت وانا اكره مساء ته ولا بدله منه " (رواه البخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو شخص میرے ولی سے دشمنی رکھے میں اسے لڑائی کی اطلاع دیتا ہوں اور میرا بندہ میرے قریب ہوتا ہے اس چیز سے جو مجھے پسند ہے یعنی جو میں نے اس پر فرض کیا ہے اور ہمیشہ میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرے قریب ہوتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کی سمع بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور میں اس کی بصر بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور میں اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور میں اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے سوال کرے تو میں اسے عطاء کرتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے پناہ طلب کرے تو میں اسے پناہ دیتا ہوں۔ اور مومن شخص جو موت کو مقام تردد میں سمجھتا ہے میں اس کے تردد کو زائل کرتا ہوں اور جو اس کے لئے ضروری ہے جس سے اس کا چھٹکارا نہیں اس میں اسے تکلیف دینے کو میں ناپسند کرتا ہوں۔

وضاحت حدیث: من عادی لی وليا :

یعنی جو میرے ولیوں میں سے کسی ایک ولی کو ایذاء پہنچائے "ولی" فعیل کا وزن ہے بمعنی مفعول ہے:

" وهو من يتولی الله امره فلا يكله الی نفسه لحظة قال الله تعالیٰ وهو يتولی الصالحين "

یہ وہ شخص ہوتا ہے جو اپنے تمام امور کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے ایک لحظہ بھر بھی اپنے امور کو اپنے سپرد نہ کرے اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وہ نیک لوگوں کا والی ہے"

اور یہ بھی ہوسکتا ہے "فعیل" فاعل کے معنی میں ہو اور اس میں مبالغہ پایا گیا ہو " وهو

المتولی عبادۃ اللہ وطاعته علی التوالی بلا تخلل عصیان " کہ ولی وہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کا متولی ہو اور اس کی طاعت توالی (لگاتار) طور پر کرے عبادت کرنے میں گناہوں سے خلل نہ پیدا کرے۔

''ولی'' جب مفعول کے معنی میں ہو تو مراد اور مجذوب اور سالک کے درجہ میں ہوتا ہے اور جب فاعل کے معنی میں ہو تو مرید اور سالک اور مجذوب کے درجہ میں ہوتا ہے۔

تاہم یہ فرق ابتداء وانتہاء کے لحاظ سے ہے اور عنایت ورعایت کے لحاظ سے ہے کہ پہلے مرید ہوتا ہے اور وہ حق رکھتا ہے کہ اس کی رعایت کی جائے پھر وہ درجہ مراد میں پہنچ جاتا ہے پھر وہ دوسروں پر عنایت ومہربانی کرتا ہے۔

وما تقرب الی عبدی: عبدی سے مراد مومن بندہ ہے ''عبد'' اس لئے ذکر کیا کہ جس طرح غلام اپنے مالک کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے مختلف قسم کی خدمت بجالاتا ہے اور ہر قسم کی طاعت کرتا ہے تو بندے کو بھی چاہئے کہ وہ اپنے مالک کی ہر قسم کی طاعت کرے۔

بشئی احب الی مما افترضت علیه : یعنی انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت کر کے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرے جو عبادت اللہ تعالیٰ نے فرض کی اس پر عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ کے حکم کو بجالایا گیا اور اللہ تعالیٰ کے نواہی سے اجتناب پایا گیا۔ اور ''احب'' کے قول سے پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ کے تقرب کے مختلف ذریعے ہیں ان میں سے اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند یہی ہے کہ فرائض کو ادا کیا جائے۔ مومن کا طریقہ یہ ہے کہ وہ فرائض کے ادا کرتے وقت نوافل بھی ادا کرتا ہے اسی وجہ سے ارشاد فرمایا گیا ''**وما یزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی احببته**'' یعنی انسان جب فرائض سے زائد عبادت نوافل کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے محبت کرتا ہے۔

فکنت سمعه : کے مختلف مطالب ہیں۔

(ا) ''یسرت علیه افعاله المنسوبة الی هذه الحالات ووفقته فیها حتی کأنی نفس هذه الحالات''

یعنی بندہ جب رب تعالیٰ کا قرب حاصل کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے کانوں اور اس کی آنکھوں

اوراس کے ہاتھوں اوراس کے پاؤں پرآسان کردیتا ہےاوران کوتوفیق دیتا ہے کہ وہ حق بات کو سنتے ہیں، حق راہ کودیکھتے ہیں اور ہاتھوں سے وہی کام کرتے ہیں۔جس سے رب تعالیٰ راضی ہوتا ہےاور پاؤں سے نیکی کی راہ پر چلتے ہیں۔توان آلات کودرست راہ پرلگانے کو مالک الملک نے اپنی طرف منسوب کردیا گویایوں سمجھا جائے کہ نیک بندے کےکان اورآنکھیں اور ہاتھ اور پاؤں میں خود ہی ہوتا ہوں۔

(۲) اللہ تعالیٰ اپنے مقرب بندے کےحواس اورآلات کواپنی رضاء کاوسیلہ اورذریعہ بنادیتا ہےتو وہ صرف وہی سنتا ہےجس میں رب تعالیٰ کی رضاء ہواورصرف وہی دیکھتا ہے جسے رب تعالیٰ پسند کرتا ہے اوروہی کام ہاتھ سے کرتا ہےجس میں رب تعالیٰ راضی ہو۔اور پاؤں سے چل کراسی طرف جاتا ہے جو رب تعالیٰ کی پسند کے مطابق ہو۔تو مطلب یہ ہوا کہ وہ رب تعالیٰ کے ذریعےسن رہا ہےاوردیکھ رہا ہے اورپکڑرہا ہےاورچل رہا ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ اپنے مقرب بندے پراپنی محبت اتنی زیادہ غالب کردیتا ہے کہ وہ کسی چیزکودیکھتا ہی نہیں سوائے اس کے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی محبت ہو۔وہ کسی چیزکورب تعالیٰ کی محبت کے بغیرسنتا ہی نہیں۔وہ کسی چیزکورب تعالیٰ کی محبت کے بغیرپکڑتا ہی نہیں وہ رب تعالیٰ کی محبت کے بغیرکسی راہ پر چلتا نہیں۔

"ویکون اللہ سبحانہ فی ذلک لہ یدا وعونا ووکیلا یحمی سمعہ وبصرہ ویدہ ورجلہ عما لا یرضاہ" گویا کہ اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ بن جاتا ہےاس کامددگاراورکارساز بن جاتا ہے جواس کے کانوں اورآنکھوں اور ہاتھوں اور پاؤں کی حفاظت کرتا ہے۔جس کی وجہ سے اس کے اعضاءرب تعالیٰ کی رضاء کےبغیرکوئی کام نہیں کرتے۔

(۴) اورمعنی یہ ہے کہ گویا کہ اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے:

"کنت اسرع الی قضاء حوائجہ من سمعہ فی الاستماع وبصرہ فی النظر ویدہ فی اللمس ورجلہ فی المشی"

کہ جب میرابندہ میراقرب حاصل کرلیتا ہےتواس کی حاجات کو میں جلدی پوراکردیتا ہوں اگر وہ کہیں دورکی بات کوسنناچاہتا ہےتو اسے سنادیتا ہوں اورکہیں دوردیکھنا چاہتا ہےتو اسے دکھادیتا ہوں اورجہاں ہاتھ کوپہنچاناچاہےتواس کے ہاتھ کوپہنچادیتا ہوں اورجہاں چل کرجاناچاہے وہاں پہنچادیتا ہوں۔

(۵) جب انسان فرائض کی ادائیگی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتا ہے اور نوافل کے ذریعے فرائض کی تکمیل کر کے جب اور زیادہ قرب حاصل کرنا چاہے تو اسی قرب کے حصول کے ذرائع میں سے اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی ہے:

" والذکر الموصل الی حضور الوصول وسرور الحصول ومقام الفناء عن نفسه والبقاء بربه ظهر له آثار محبته الازلية وانكشف له انوار قربته الابدية فرأى ان ما به الكمال من السمع والبصر وقوة القوى انما هو من آثار سمعه وبصره وقدرته وقوته "

اور وہ ذکر رب تعالیٰ کے حضور پہنچانے کا ذریعہ ہے اور اسی سے سرور حاصل ہوتا ہے اور انسان اپنے آپ کو مقام فنا میں سمجھتا ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ صرف رب تعالیٰ کی ذات باقی ہے تو اس پر ازلی محبت کے آثار ظاہر ہوتے ہیں اور قربت ابدیہ کے انوار اس پر منکشف ہوتے ہیں پھر وہ اپنی سمع اور بصر اور ہر آلہ میں جو قوت دیکھتا ہے وہ درحقیقت رب تعالیٰ کی قدرت کے آثار ہی اس کی سمع وبصر وقدرت اور قوت میں پائے جاتے ہیں۔

(۶) علامہ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں گویا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرا مقرب بندہ کسی چیز کو سنتا نہیں اور کسی چیز کو دیکھتا نہیں اور کسی چیز کو پکڑتا نہیں اور کہیں چل کر جاتا نہیں مگر وہ یہ شہادت دیتا ہے کہ یہ سب رب تعالیٰ کے انعامات ہیں پھر وہ تمام اعضاء کو میری طاعت میں لگا لیتا ہے کسی عضو سے کوئی کام میری رضاء کے بغیر نہیں لیتا۔ تو میں اس کے کان، آنکھ، ہاتھ اور پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا، دیکھتا، پکڑتا اور چلتا ہے " **كما هو جلي عند ائمة العرفان دون غيرهم** " جس طرح یہ مسئلہ صرف اہل معرفت پر ظاہر ہے ان کے بغیر اسے حقیقۃً کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

وان سألني لا عطينه : اور اگر مجھ سے سوال کرے تو میں ضرور بر ضرور اسے عطاء کروں گا۔

نکتہ : یہاں " ان " سے کلام کو ذکر کیا جس سے اس طرف اشارہ کیا گیا " **قد يصل الى مقام يترك فيه السوال اتكالا على علمه بالحال او لانه لا يطلب غير الملك المتعال** " کہ اللہ کا مقرب بندہ کبھی اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ رب تعالیٰ سے سوال نہیں کرتا اس لئے کہ اسے

بھروسہ ہوتا ہے اس پر کہ جب وہ میرے حال کو جانتا ہے تو مجھے سوال کی ضرورت ہی کیا ہے وہ خود ہی مہربانی فرمائے گا۔

دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ " ان مخففه " ہوجائے، تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ سوال ہی جب مجھ سے کرتا ہے تو میں اسے ضرور برضرور اپنی رحمت عطاء کروں گا۔

ولئن استعاذنی لاعیذنه : اور اگر وہ وہ مجھ سے پناہ پکڑے تو میں اسے ضرور پناہ دوں گا۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ کا مقرب بندہ کسی چیز سے دور رہنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعاء کرتا ہے رب تعالیٰ کی اس چیز سے پناہ طلب کرے تو رب تعالیٰ اسے ضرور برضرور پناہ دے گا۔

" وما ترددت عن شئی انا فاعله ترددی عن نفس المؤمن یکره الموت و انا اکره مساء ته و لا بدله منه "

ان الفاظ مبارکہ کی وضاحت میں اہل علم کے مختلف قول ہیں کیونکہ " وما ترددت " کا ظاہری معنی مراد لینا ممکن نہیں تھا اس لئے تاویل کی ضرورت درپیش آئی، ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا:

" التردد هو التحیر بین امرین لا یدری ایهما اصلح وهو محال علی الله سبحانه فاولوه علی تردید الاسباب و الوسائط "

تردد کا معنی دو چیزوں کے درمیان حیران ہونا ہے یہ معلوم نہ ہو ان میں سے بہتر کیا ہے؟ یہ معنی اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں اسی وجہ سے اس کی تاویل یہ کی گئی ہے کہ اسباب ووسائط میں تردد پایا گیا ہے۔

" وقیل المراد من لفظ التردد ازالة کراهة الموت عن المومن بما یبتلیه الله به من المرض و الفاقة و غیرهما فاخذه المؤمن عما تشبث به من حب الحیاة شینا فشینا بالاسباب التی ذکرنا یشبه فعل المتردد من حیث الصفة فعبر عنه بالتردد "

اور بیان کیا گیا ہے کہ لفظ تردد سے مراد مومن سے موت کے مکروہ سمجھنے کا زوال ہے جب کہ اللہ تعالیٰ مومن کو آزماتا ہے مرض اور فاقہ (بھوک) وغیرہ سے، مومن بھی چونکہ حیات کو پسند کرتا ہے اسی سے آہستہ آہستہ سہارا لگاتا ہے اسباب میں تردد کو فعل متردد سے بیان کردیا گیا (راقم نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے) آسان مفہوم یہ ہے کہ مؤمن اگرچہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور اس میں متردد ہوتا ہے کہ

کہیں مجھ پر موت نہ آجائے لیکن میں اس کے تردد کو ناپسند سمجھتا ہوں اور اسے زائل کر دیتا ہوں۔

اعتراض : "ان نفس الموت تحفة المؤمن یوصله الی لقاء الله فکیف یکره المؤمن"

موت تو مومن کے لئے تحفہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا ذریعہ ہے تو مومن کس طرح موت کو ناپسند کرتا ہے۔

جواب : "المراد انه یکره شدة الموت بمقتضی طبعه البشری"

بعض اوقات انسان سے غیر ارادی طور پر بشری تقاضا کے مطابق کوئی نہ کوئی فعل سرزد ہوتا ہے موت بھی انسان کو بشری تقاضا کے مطابق تلخ معلوم ہوتی ہے ورنہ مومن خاص کر کے رب تعالیٰ کا مقرب بندہ کب چاہتا ہے کہ میری ملاقات رب ذوالجلال سے نہ ہو۔ اسلئے کہ مومن کی شان ہی یہ ہے "فانه لا ینبغی ان یکره الموت بل یحبه فان من احب لقاء الله احب الله لقاءہ ومن کره لقاء الله کره الله لقاءہ" کہ وہ موت کو ناپسند نہ کرے بلکہ موت سے محبت کرے جو شخص اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے ملاقات کو پسند کرتا ہے اور جو شخص رب کو ملنا پسند نہیں کرتا رب بھی اس سے ملنا پسند نہیں کرتا۔

☆ "عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ ان لله ملائکة یطوفون فی الطرق یلتمسون اهل الذکر فاذا وجدوا قوما یذکرون الله تنادوا هلموا الی حاجتکم قال فیحفونهم باجنحتهم الی السماء الدنیا قال فیسالهم ربهم وهو اعلم بهم ما یقول عبادی قال یقولون یسبحونک ویکبرونک ویحمدونک ویمجدونک قال فیقول هل رئونی قال فیقولون لا والله ما رأوک قال فیقول کیف لو راونی قال فیقولون لو رأوک کانوا اشد لک عبادة واشد لک تمجیدا واکثر لک تسبیحا قال فیقول فما یسئلون قال یسألونک الجنة قال یقول وهل رأوها فیقولون لا والله یا رب ما رأوها قال یقول فکیف لو رأوها قال یقولون لو انهم راوها کانوا اشد علیها حرصا واشد لها طلبا واعظم فیها رغبة قال فهم یتعوذون قال یقولون من النار قال یقول فهل رأوها قال یقولون لا والله یا رب ما رأها قال یقول فکیف لو رأوها قال یقولون لو رأوها کانوا اشد منها فرارا واشد لها مخافة قال فیقول فاشهدکم انی قد غفرت لهم قال یقول ملک من الملائکة فیهم فلان لیس منهم انما جاء لحاجة قال هم الجلساء لا یشقی جلیسهم"
(رواه البخاری)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ کے فرشتے راستوں میں پھرتے رہتے ہیں ذکر کرنے والوں کو تلاش کرتے رہتے ہیں جب وہ کسی قوم کو اللہ کا ذکر کرتے ہوئے پاتے ہیں تو ایک دوسرے کو پکارتے ہیں یہاں آجاؤ تمہیں مقصد حاصل ہوگا نبی کریم ﷺ نے فرمایا وہ فرشتے آسمان دنیا تک ان کے اوپر پروں سے رحمت کا سایہ کر لیتے ہیں آپ نے فرمایا ان کا رب جاننے کے باوجود فرشتوں سے ان کے متعلق پوچھتا ہے میرے بندے کیا کہہ رہے تھے؟ آپ نے فرمایا وہ فرشتے کہتے ہیں وہ تیری تسبیح بیان کر رہے اور تیری تحمید کر رہے تھے اور تیری بزرگی بیان کر رہے تھے آپ نے فرمایا رب تعالیٰ کہتا ہے کیا انہوں نے مجھے دیکھا ہے؟ آپ فرماتے ہیں فرشتے کہتے ہیں قسم ہے اللہ تعالیٰ کی انہوں نے تجھے دیکھا تو نہیں، آپ فرماتے ہیں رب تعالیٰ کہتا ہے اگر وہ مجھے دیکھ لیتے؟ آپ فرماتے ہیں فرشتے کہتے ہیں اگر وہ تجھے دیکھ لیتے تو اور ہی زیادہ تیری عبادت کرتے، اور ہی زیادہ تیری بزرگی بیان کرتے، اور ہی زیادہ تیری تسبیح بیان کرتے، آپ فرماتے ہیں رب تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے وہ کسی چیز کا سوال کر رہے تھے؟ تو کہا کہ وہ جنت کا سوال کر رہے تھے حضور نے فرمایا اللہ تعالیٰ کہتا ہے کیا انہوں نے جنت کو دیکھا ہے؟ وہ کہتے ہیں قسم ہے اللہ کی اے ہمارے رب انہوں نے جنت کو نہیں دیکھا آپ فرماتے ہیں رب تعالیٰ فرمائے گا اگر وہ جنت کو دیکھ لیتے تو وہ کہتے ہیں اگر وہ جنت کو دیکھ لیتے تو اور حرص کرتے اور زیادہ اس کی طلب کرتے اور زیادہ اس میں رغبت کرتے رب تعالیٰ پوچھتا ہے وہ کس چیز سے پناہ طلب کر رہے تھے؟ آپ نے فرمایا وہ کہتے ہیں آگ سے پھر فرمایا رب کہتا ہے کیا انہوں نے آگ کو دیکھا ہے؟ فرشتے کہتے ہیں قسم ہے اللہ کی اے رب انہوں نے دیکھا تو نہیں، فرمایا رب کہتا ہے اگر وہ آگ کو دیکھ لیتے تو کیسے ہوتے؟ فرشتے کہتے ہیں اگر وہ دیکھ لیتے تو اور زیادہ اس سے دور بھاگتے اور زیادہ اس سے خوف رکھتے، فرمایا رب تعالیٰ کہتا ہے میں تمہیں گواہ بنا رہا ہوں کہ میں نے ان کی مغفرت کر دی، فرمایا ان فرشتوں میں سے ایک فرشتہ کہتا ہے فلاں شخص ان میں نہیں تھا (وہ ذکر کرنے کی غرض سے نہیں آیا تھا) وہ اپنے کام کے لئے آیا تھا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے وہ ان کے ساتھ بیٹھا تو تھا میرا ذکر کرنے والے بندوں کے ساتھ بیٹھنے والا بدبخت نہیں ہوسکتا۔

مختصر وضاحت:

حدیث پاک کا مفہوم ترجمہ سے ہی واضح ہے تاہم بعض الفاظ کو طلباء کرام ذہن نشین کر لیں۔

یلتمسون اهل الذکر : فرشتے ذکر کرنے والوں کو تلاش کرتے ہیں تا کہ ان کی زیارت کریں اور ان کے ذکر کو سنیں۔ ذکر سے مراد تسبیح، تکبیر، تحمید اور تمجید ہے جس کا ذکر آگے واضح طور پر آ رہا ہے۔ **تنادوا** بعض بعض کو پکارتے ہیں **هلموا** جلدی آ جاؤ، **الی حاجتکم** یعنی ذکر سننے اور ذکر کرنے والوں کی زیارت کے لئے۔ **قال** کا لفظ جہاں بھی ذکر ہے راقم نے ترجمہ کیا ''فرمایا'' اس کا فاعل نبی کریم ﷺ ہیں **فیحفونهم باجنحتهم** یعنی وہ ذکر کرنے والوں کے ارد گرد اپنے پروں کو پھیرتے ہیں **قال هم الجلساء لا یشقی جلیسهم** رب تعالیٰ فرماتا ہے وہ کامل طور پر میرا ذکر کرنے والے ہیں ان کی محفل میں بیٹھنے والا ان کی برکات سے محروم نہیں رہ سکتا۔

" قال الطیبی ای هم جلساء لا یخیب جلیسهم عن کراماتهم فیشقی " علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ لوگ خالص میرا ذکر کرنے والے ہیں ان کے پاس بیٹھنے والا ان کی کرامات اور برکات سے محروم نہیں رہ سکتا کہ بدبخت ہی رہے۔

حدیث پاک میں ذکر والے حضرات کی محافل میں بیٹھنے کی رغبت دلائی گئی رب تعالیٰ نے بھی ارشاد فرمایا:

﴿ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ﴾

''اے ایمان والو اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ''

فائدہ جلیلہ :

" قال بعض العارفین اصحبوا مع الله فان لم تقدروا فاصحبوا مع من یصحب مع الله "

عارفین حضرات فرماتے ہیں تم اللہ تعالیٰ کے مصاحب ہو جاؤ۔ اگر یہ قدرت تمہیں حاصل نہیں تو اللہ والوں کی محفل میں بیٹھو ان کے فیوض و برکات کو حاصل کرو۔

تنبیہ : "انهم زائدون علی الحفظة وغیرهم لا وظیفة لهم الا حلق الذکر"

یہ فرشتے کراماً کاتبین کے علاوہ ہوتے ہیں ان کی عبادت ہی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کی ذکر کی محافل کو تلاش کریں اور اس میں شریک ہوں پھر رب تعالیٰ کے حضور جا کر اس کی خبر دیں۔

سوال عدم علم کی دلیل نہیں:

" فیسألهم الله وهو اعلم " اللہ تعالیٰ جاننے کے باوجود اپنے بندوں کا حال فرشتوں سے پوچھتا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے علم نہیں ہوتا بلکہ رب تعالیٰ اپنے بندوں کی شان اپنے فرشتوں پر واضح کرتا ہے کہ میرے بندے کس شان سے میرا ذکر کر رہے ہیں۔

☆ " عن ابی الدرداء قال قال رسول الله ﷺ الا انبئکم بخیر اعمالکم وازکاها عند ملیککم وارفعها فی درجاتکم وخیرلکم من انفاق الذهب والورق وخیرلکم من ان تلقوا عدوکم فتضربوا اعناقهم ویضربوا اعناقکم قالوا بلی قال ذکر الله "

(رواه مالک واحمد والترمذی وابن ماجه الا ان مالکا وقفه علی ابی الدرداء)

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں بہتر عمل اور تمہارے حاکم (اللہ تعالیٰ) کے پاکیزہ عمل اور تمہارے درجات کے بلند کرنے والا عمل اور تمہارا سونا اور چاندی خرچ کرنے سے بہتر عمل اور تمہاری دشمن سے ملاقات کہ تم ان کی گردنیں اڑاؤ اور وہ تمہاری گردنیں اڑائیں اس سے بہتر عمل کی خبر نہ دوں؟ صحابہ کرام نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ آپ خبر دیں آپ نے فرمایا وہ عمل اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔

وضاحت حدیث: اس حدیث کی وضاحت میں ابن الملک رحمہ اللہ نے فرمایا " المراد الذکر القلبی " کہ جس ذکر کی تعریف رسول اللہ ﷺ نے فرمائی اس سے مراد ''دل کا ذکر ہے'' کیونکہ اسی ذکر کو مال اور جان کے قربان کرنے سے زیادہ فضیلت حاصل ہے کیونکہ یہ نفس کا عمل ہے "وفعل القلب الذی هو اشق من عمل الجوارح بل هو الجهاد الاکبر " اور دل کا عمل ہی ظاہری اعضاء کے عمل سے زیادہ شاق ہے بلکہ جہاد اکبر سے بھی زیادہ شاق ہے۔ لیکن اس کے بعد ذکر لسانی (زبانی ذکر) کے متعلق جو الفاظ آپ نے ذکر فرمائے ان کو علامہ علی قاری رحمہ اللہ نے پسند نہیں فرمایا۔ ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" لا الذکر باللسان المشتمل علی صیاح وانزعاج وشدة تحریک العنق واعوجاج کما یفعله بعض الناس زاعمین ان ذلک جالب للحضور وموجب للسرور حاشا لله بل موجب للغیبة والغرور "

جس ذکر کی تعریف نبی کریم ﷺ نے فرمائی اس سے زبانی ذکر جو بلند آواز سے کیا جائے جس میں زور زور سے چلایا جائے گردن کو پھیرا جائے مراد نہیں جیسا کہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ رب تعالیٰ کے ہاں حضوری کا سبب ہے اور اس سے سرور حاصل ہوتا ہے " **حاشا لله** " خدارا ایسا نہیں بلکہ یہ تو رب سے دوری اور دھوکا کا سبب ہے۔ علامہ علی قاری رحمہ اللہ اس کا رد فرماتے ہیں:

" ولا شک ان الذکر یطلق علی الجنانی وعلی اللسانی وان المدار علی القلب الذی یتقلب بسبب ذکر المذکور من الغیبة الی الحضور وانما اللفظی وسیلة "

یہ شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ ذکر کا اطلاق دل اور زبان کے دونوں ذکروں پر ہے قلب کا مطلب ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر دل کو پھیر دے اور رب تعالیٰ سے دوری کو قریب کر دے یہ کیفیت اسی وقت حاصل ہوگی جب پہلے زبانی ذکر حاصل ہوگا کیونکہ ہر وہ چیز جو مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ ہے اسے پہلے حاصل کرنا ضروری ہے خصوصاً راہ سلوک میں ابتدائی طور پر قدم رکھنے والا پہلے زبانی ذکر ہی کرے گا پھر ذکر اور اہل ذکر کی برکات کی وجہ سے قلبی ذکر اسے خود بخود حاصل ہو جائے گا۔

تنبیه : اصل میں دل سے رب تعالیٰ کو یاد کرنے کی وجہ سے ہی انسان رب تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے اور جہاد کرتا ہے اس لئے قلبی ذکر درحقیقت تمام عبادات کا ذریعہ ہے اور باقی عبادات اس پر موقوف ہیں اس لئے یہ ان سے اعلیٰ اور ارفع ہے اور یہ بھی واضح بات ہے کہ عبادات میں اصل مقصود تقرب الٰہی ہے " **والذکر انما هو المقصود الاسنی والمطلوب الاعلی** " اور اس میں ذکر اعلیٰ مقصود اور اعلیٰ مطلوب ہے۔

رب تعالیٰ کا ارشاد ﴿ فَاذْكُرُونِیۡۤ اَذْكُرْكُمْ ﴾ "تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا"

اور حدیث قدسی میں ارشاد باری تعالیٰ ہے " **وانا جلیس من ذکرنی** " جو مجھے یاد کرے میں اس کے ساتھ ہی ہوتا ہوں۔

اور رب تعالیٰ کا ارشاد حدیث قدسی میں ہے " **وانا معه اذا ذکرنی** " اس شخص کو میری معیت (قربت) حاصل ہوتی ہے جو مجھے یاد کرتا ہے۔

افضل الذکر : " فان قراء ة القرآن من کل ذکر افضل و من جملة الاذکار والادعية والاستغفار "

بیشک قرآن پاک کا پڑھنا ہر قسم کے ذکر سے افضل ہے تمام اذکار، تمام دعاؤں اور ہر قسم کی استغفار سے افضل ہے۔

" وفیه دلیل علی الاجتماع علی الذکر مزیة ومرتبة " ذکر کی محافل قائم کرنا جمع ہو کر ذکر کرنا افضل و اعلیٰ ہے۔ (مرقاۃ ج ۵ ص ۵۲)

" لا ارتیاب ان افضل الذکر قول لا اله الا الله وهی القاعدة التی بنی علیها ارکان الدین وهی الکلمة العلیا وهی القطب الذی یدور علیها رحی الاسلام وهی الشعبة التی اعلی شعب الایمان " (مرقاۃ ج ۵ ص ۶۳)

اس میں کوئی شک نہیں افضل ذکر کلمہ " لا الہ الا اللہ " ہے کیونکہ یہ دین کے ارکان کی بنیاد ہے یہی بلند مرتبہ کلمہ ہے اور یہی قطب (چکی کا کیل) ہے جس پر اسلام کی چکی چلتی ہے یہی ایمان کے شعبوں سے اعلیٰ شعبہ ہے۔ تمام عارفین اور ارباب قلوب ویقین اسی کلمہ کو تمام اذکار پر ترجیح دیتے رہے ان کو اسی طریقہ سے وجدان اور ذوق حاصل ہوتا رہا۔

حکایت : سید علی بن میمون مغربی کے ایک مدرس اور مفتی شیخ علوان حموی مرید ہوئے اور ان کے زیر تصرف آئے تو انہوں نے اپنے اس مرید کو تمام کام چھڑا کر ذکر باری تعالیٰ پر لگا دیا۔

" فطعن الجهال فیه بانه اضل شیخ الاسلام ومنعه عن نفع الانام " عام جاہل لوگوں نے اس پر طعنہ زنی شروع کی کہ شیخ نے مفتی کو راہ راست سے بھٹکا دیا ہے وہ جو لوگوں کو نفع پہنچا رہے تعلیم وافتاء سے اسے دور کر دیا۔ پھر شیخ کو معلوم ہوا کہ مفتی صاحب کبھی کبھی قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہیں شیخ نے قرآن پاک پڑھنے کی بجائے ذکر کرنے کا ہی حکم دیا" فقال الناس انه زندیق یمنع من تلاوة القرآن الذی هو قطب الایمان وغوث الایقان " لوگوں نے کہا شیخ بے دین ہو گیا جو قرآن پاک کی تلاوت سے منع کرتا ہے وہ قرآن جو ایمان کا قطب ہے اور یقین کا غوث ہے۔

لیکن مرید جو مفتی اور مدرس بھی تھے وہ اپنے شیخ کی بات کو تسلیم کرتے رہے یہاں تک کہ

"حصل له المزید وانجلت مرآة قلبه وحصل له مشاهدة ربه" انہیں زیادہ رب تعالیٰ کا فضل وکرم حاصل ہوگیا ان کے دل کا آئینہ روشن ہوگیا، اوران کو رب تعالیٰ کی تجلیات کا مشاہدہ حاصل ہوگیا۔اب شیخ نے ان کو قرآن پاک پڑھنے کی اجازت دے دی:

" فلما فتح المصحف فتح علیه الفتوحات الازلیة والابدیة وظهر له کنوز المعارف والعوارف الظاهریة والباطنیة "

جب انہوں نے قرآن پاک کو کھولا تو ان پر ازلی اور ابدی فتوحات کھل گئیں اور ظاہری اور باطنی معرفت کے خزانے ان پر ظاہر ہوگئے۔اب شیخ نے بتایا کہ میں نے قرآن پاک کی تلاوت سے منع نہیں کیا تھا

" وانما کنت امنعک عن لقلقة اللسان والغفلة عما فیه من البیان فی هذا الشان والله المستعان " میں اس لئے منع کرتا تھا کہ صرف زبان چلتی رہے قرآن پاک کے رموز سے انسان بےخبر رہے کہ قرآن پاک کی شان کیا ہے یہ نفع مند نہیں بلکہ ذکرالٰہی سے دل کو آئینہ کی طرح صاف کر کے رب تعالیٰ سے امداد طلب کرے۔

راقم کا موقف: راقم کے نزدیک درود شریف پڑھنا سب سے افضل ذکر ہے کیونکہ ذکر خدا بھی ہے اور ذکر مصطفیٰ بھی ہے اور دعاء بھی ہے۔درود شریف کے فضائل تو اپنی جگہ پر آئیں گے ایک حدیث پاک کو دیکھئے تو راقم کی عقیدت سے آپ کو اتفاق نہ بھی ہو تو طعنہ زنی کی گنجائش بھی آپ کو نہیں مل سکے گی۔

☆ " عن ابی بن کعب قال قلت یا رسول الله انی اکثر الصلوة علیک فکم اجعل لک من صلاتی فقال ما شئت قلت الربع قال ما شئت فان زدت فهو خیرلک قلت النصف قال ما شئت فان زدت فهو خیرلک قلت فالثلثین قال ما شئت فان زدت فهو خیرلک قلت اجعل لک صلاتی کلها قال اذا تکفی همک ویکفرلک ذنبک "

(رواہ الترمذی)

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے عرض کی کہ یارسول اللہ بیشک میں آپ پر زیادہ سے زیادہ درود شریف پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہوں تو میں اپنے درود شریف پڑھنے میں کتنا وقت صرف کروں؟ تو آپ نے فرمایا جتنا وقت چاہتے ہو اتنا ہی صرف کرو۔ میں نے عرض کیا کیا (اپنے اذکار

وغیرہ کے اوقات سے) چوتھا حصہ وقت صرف کرلیا کروں؟ آپ نے فرمایا جو چاہتے ہو اگر زیادہ کرلو تو تمہارے لئے بہتر ہے میں نے عرض کیا آدھا وقت صرف کرلیا کروں؟ آپ نے فرمایا جو چاہتے ہو اگر زیادہ کرلو تو تمہارے لئے بہتر ہے میں نے عرض کیا دوتہائی وقت صرف کرلیا کروں؟ آپ نے فرمایا جتنا وقت چاہو صرف کرلو اگر اس سے بھی تم زیادہ کرلو تو تمہارے لئے بہتر ہے میں نے عرض کیا میں آپ پر درود تمام اوقات میں پڑھ لیا کروں؟ آپ نے فرمایا یہ تمہارے ارادہ کے لئے کافی ہے اور تمہارے گناہوں کو مٹادے گا۔ (مشکوۃ باب الصلوۃ علی النبی ﷺ)

مختصر وضاحت: " معنی الحدیث کم اجعل لک من دعائی الذی ادعو به لنفسی ولم یزل یفاوضه لیوقفه علی حد من ذلک ولم یر النبی ﷺ ان یحد له ذلک لئلا تلتبس الفضیلة بالفریضة اولا ثم لا یغلق علیه باب المزید ثانیا "

جب صحابی نے پوچھا کہ میں اپنی دعاؤں اور اذکار میں سے کتنا وقت آپ پر دورد شریف پڑھوں وہ وقت کا تعین چاہتے تھے لیکن نبی کریم ﷺ نے وقت کا تعین نہیں فرمایا کہ صرف کچھ وقت کے لئے درود پاک معین اور فرض نہ ہو جائے۔ بلکہ آپ رغبت دلاتے رہے یہاں تک کہ صحابی کو دعاؤں اور اذکار کے تمام اوقات درود شریف پڑھنے کا حکم دیا جب صحابی نے آپ پر تمام اوقات درود شریف پڑھنے کے متعلق عرض کی تو آپ نے ارشاد فرمایا:

(اذن تکفی همک) ای ما اهمک من امر دینک ودنیاک وذلک لان الصلوۃ علیه مشتملة علی ذکر الله وتعظیم الرسول ﷺ والاشتغال باداء حقه عن اداء مقاصد نفسه وایثاره بالدعاء علی نفسه ما اعظمه من خلال جلیلة الاخطار واعمال کریمة الآثار "

کہ اگر تم اپنی دعاء اور ذکر کے تمام اوقات درود شریف مجھ پر پڑھو گے تو تمہیں تمہارے دین اور دنیا کے امور کے ارادوں کے لئے کافی ہے وجہ درحقیقت اس کی یہ ہے کہ درود پاک اللہ تعالیٰ کے ذکر اور رسول اللہ ﷺ کی تعظیم اور آپ کے حقوق کو اداء کرنے میں مشغول ہونا اور انسان کا اپنے حقوق کو اداء کرنے میں مشغول ہونا اور اپنے لئے دعاء کرنے کی بجائے عظیم الشان ذکر میں مشغول ہونا ہے اور اعلیٰ آثار مرتب ہونے والے اعمال میں مشغول ہونا ہے۔ (مرقاۃ ج ۲ ص ۳۴۴)

سبحان اللہ کیا خوب ذکر ہے کیا شاندار کسی نے اپنا عقیدہ بیان کیا وہی راقم کا بھی عقیدہ ہے۔

کھلے آنکھ صل علی محمد کہتے کہتے
میں سو جاؤں یا مصطفیٰ کہتے کہتے

☆ " عن عبد الله بن بسر قال جاء اعرابی الی النبی ﷺ فقال ای الناس خیر قال طوبی لمن طال عمره وحسن عمله قال یا رسول الله ای الا عمال افضل قال ان تفارق الدنیا ولسانک رطب من ذکر الله " (روه احمد والترمذی)

حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک اعرابی نبی کریم ﷺ کے پاس آئے تو اس نے عرض کی تمام لوگوں سے بہتر کون شخص ہے؟ آپ نے فرمایا وہ شخص اچھا ہے جس کی عمر زیادہ لمبی ہو اور اعمال اچھے ہوں پھر وہ اعرابی عرض کرنے لگے یا رسول اللہ عمل کون سے افضل ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ دنیا سے جاؤ تو تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تر ہو۔

وضاحت حدیث: (ای الناس خیر) ای افضل حالا و اطیب مالا "لوگوں میں سے کون سا شخص وہ ہے جس کا حال افضل ہو اور پاکیزہ مال والا ہو؟ آپ نے فرمایا" طوبی لمن طال عمره وحسن عمله " اس مقام میں " طوبی " ذکر فرمایا جو " الطیب " سے ماخوذ ہے فعلی کا وزن ہے، اس سے مراد اس شخص کی تعریف ہے، اور دونوں جہانوں میں اس کے اچھے حال کا ذکر فرمایا اور اس سے مراد جنت کا درخت طوبی بھی ہو سکتا ہے اور جنت میں بھلائی کا حصول بھی ہو سکتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے خبر دی، بیان فرمایا کہ لوگوں میں سے اچھے کون لوگ ہیں؟ وہ لوگ ہیں جن کی عمر لمبی ہو اور اعمال اچھے ہوں" اور "طوبی" ذکر فرما کر ان کیلئے سعادت دارین کی خبر بھی دے دی۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ نے خبر دی کہ اچھے اعمال میں سے اچھا اور بہتر عمل یہ ہے کہ تم دنیا سے جا رہے ہو تو تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تر ہو، اس ذکر سے مراد کون سا ذکر ہے؟

" والذکر یشمل الجلی والخفی واللسان یحتمل القلبی والقالبی ولا منع من الجمع بل هو ادعی الی مقام الجمع "

ذکر جلی اور خفی دونوں کو شامل ہے کیونکہ حدیث شریف میں " لسانک " استعمال ہے جس سے مراد لسان قلبی (دل کی زبان) اور لسان قالبی (جسم کی زبان) دونوں ہی مراد ہو سکتے ہیں دونوں ذکر جمع کرنے میں کوئی ممانعت نہیں بلکہ زیادہ بہتر یہی ہے کہ حدیث شریف میں دونوں ذکروں کو جمع

کرنا ہی مراد ہے۔

اور حدیث پاک سے یہ فائدہ حاصل ہوا " **افضل الاعمال ما یختم به الاحوال** " افضل اعمال یہ ہیں کہ انسان کا خاتمہ بالخیر ہو۔

فائدہ جلیلہ : فارق الدنیا سے مراد " **زهد الدنیا** " بھی ہو سکتا ہے اور " **رطب اللسان** " سے مراد اللہ تعالیٰ کا دل سے ذکر کرنا ہے " **فان الاناء یترشح بما فیه ومن احب شیأ اکثر ذکره بفیه** " یہ یقینی بات ہے جو چیز برتن میں ہوتی ہے وہی ٹپکتی ہے۔جس سے محبت ہو اسی کا انسان اپنے منہ سے بھی ذکر کرتا ہے۔

سبحان اللہ کیا خوب مسئلہ حاصل ہوا کہ جس کے دل میں نور معرفت ہوگا وہ رسول اللہ ﷺ کے فضائل بیان کرے گا۔اور جس کے دل میں کدورت ہوگی وہ (معاذ اللہ) نقائص بیان کرے گا۔

ذرا غور کریں وہ شخص خوش قسمت ہے جو اپنی تمام عمر اپنے پیارے حبیب پاک ﷺ کے کمالات وفضائل تلاش کرنے اور بیان کرنے میں گزار دے یا وہ شخص جو اپنی عمر نبی کریم ﷺ کے کمالات اور فضائل کو کم کرنے کی تلاش میں رہے،نقائص بیان کرنے میں عمر گزار دے، یہ فیصلہ قارئین کرام خود فرمائیں۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ " **رطب اللسان** " سے مراد سہولت سے ادا کرنا۔جس طرح "**یبس اللسان** " کا معنی اس کی ضد ہے یعنی مشکل سے ادا کرنا۔

اب معنی یہ ہوگا " **افضل الذکر مداومة الذکر فان الذکر هو المقصود وسائر الاعمال وسائل الیه** " کہ افضل ذکر وہ ہے جو ہمیشگی سے جاری رکھے بیشک ذکر ہی مقصود ہے بلکہ تمام اعمال ذکر کے وسائل ہی ہیں کیونکہ مقصد عظیم اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا ہی ہے۔

ابن حبان،طبرانی اور بزار نے روایت حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے ذکر فرمائی کہ آپ کو جب نبی کریم ﷺ نے یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو یہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے جدا ہوتے وقت سوال کیا " **ای الاعمال احب الی الله قال ان تموت ولسانک رطب من ذکر الله** " اللہ تعالیٰ کو کون سے عمل زیادہ پسند ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ تمہاری موت اس حال میں آئے کہ تمہاری زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے تر ہو۔طبرانی میں یہ الفاظ بھی زائد ہیں۔

" قلت یا رسول اللہ اوصنی قال علیک بتقوی اللہ ما استطعت واذکر اللہ عند کل حجر وشجر وما عملت من سوء فاحدث للہ فیہ توبۃ السر بالسر والعلانیۃ بالعلانیۃ "

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے نصیحت فرمائیں آپ نے فرمایا جب تک تم طاقت رکھو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو (تقوی رکھو) اور ہر شجر و حجر کے پاس اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو اور تم سے اگر کوئی غلطی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ سے توبہ کرو، پوشیدہ طور پر غلطی ہو تو پوشیدہ طور پر توبہ کرو اور اگر ظاہر طور پر کوئی غلطی سرزد ہو تو ظاہر طور پر ہی اللہ تعالیٰ سے توبہ کرو۔

☆ " عن انس قال قال رسول اللہ ﷺ اذا مررتم بریاض الجنۃ فارتعوا قالوا وما ریاض الجنۃ قال حلق الذکر " (رواہ الترمذی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تمہارا جنت کے باغات سے گزر ہو تو ان سے نفع حاصل کر لیا کرو صحابہ کرام نے عرض کیا وہ جنت کے باغات کیا ہیں؟ تو آپ نے فرمایا ذکر کے حلقے۔

وضاحت حدیث: "حلق" (بکسر الحاء وفتح اللام) جمع ہے حلقہ کی، ذکر کے حلقوں کو جنت کے باغات کہا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ذکر جنت میں پہنچانے کا ذریعہ ہے۔

" حاصل المعنی اذا مررتم بجماعۃ یذکرون اللہ تعالیٰ فاذکروہ انتم موافقۃ لھم فانھم فی ریاض الجنۃ " مطلب یہ ہے کہ جب تمہارا اس جماعت سے گزر ہو جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہے ہوں تو تم بھی ان کے ساتھ مل کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو کیونکہ وہ جنت کے باغات میں ہیں

علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں " واعلم انہ کما یستحب الذکر یستحب الجلوس فی حلق اھلہ " یہ بات یقین سے جان لو کہ جس طرح ذکر کرنا مستحب ہے اسی طرح ذکر کے حلقوں میں بیٹھنا بھی مستحب ہے۔

" وھو قد یکون بالقلب وقد یکون باللسان وافضل منھما ما کان بالقلب واللسان جمیعا " ذکر کبھی دل سے ہوتا ہے اور کبھی زبان سے ہوتا ہے لیکن افضل ذکر وہ ہے جو دل سے بھی ہو اور زبان سے بھی ہو۔

اگر دل سے ذکر حاصل نہیں تو زبان سے ذکر کو نہ چھوڑے۔ پہلے ذکر ہو چکا ہے تاہم مرقاۃ کے حوالہ کو بھی ذہن نشین کرلیں۔

مریدین میں سے کسی نے اپنے شیخ کی خدمت میں عرض کیا " انا اذکر اللہ وقلبی غافل " میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہوں لیکن میرا دل غافل رہتا ہے' شیخ نے ارشاد فرمایا " اذکرو اشکر ان شغل عضوا منک بذکرہ و اسالہ ان یحضر قلبک " اللہ کا ذکر کرتے رہو اور رب تعالیٰ کا شکریہ ادا کرو کہ اس نے آپ کے ایک عضو (یعنی زبان) کو اپنے ذکر میں مشغول رکھا ہوا ہے اور اس سے اپنے دل کے حضور کی بھی دعاء کرتے رہو۔

ایک اور حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع طور پر مروی ہے:

" اذا امررتم بریاض الجنۃ فارتعوا قلت وما ریاض الجنۃ قال المساجد قلت وما الرتع یا رسول اللہ قال سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر "

جب تمہارا جنت کے باغات سے گزر ہو تو وہاں سے نفع حاصل کرلیا کرو میں نے عرض کی وہ جنت کے باغات کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا وہ مساجد ہیں میں نے عرض کی ان میں نفع مند چیزیں کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا " سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر "

☆ " عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ من قعد مقعدا لم یذکر اللہ فیہ کانت علیہ من اللہ ترۃ ومن اضطجع مضجعا لا یذکر اللہ فیہ کانت علیہ من اللہ ترۃ "

(رواہ ابو داؤد)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص کسی بیٹھنے کی جگہ پر بیٹھتا ہے اللہ کا ذکر نہیں کرتا اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے خسارا ہے اور جو شخص کسی لیٹنے کی جگہ میں لیٹتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں کرتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نقصان ہے۔

وضاحت حدیث: "مقعدا " کا معنیٰ " مجلسا او قعودا " یعنی یا ظرف ہے معنیٰ بیٹھنے کی جگہ یا مصدر ہے معنیٰ اس کا بیٹھنا ہے۔

" لم یذکر اللہ فیہ " لفظ فیہ میں ضمیر کا مرجع "مقعدا " ہی ہے یعنی مجلس یا بیٹھنے میں اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کیا۔

علیہ ، ای علی القاعد بیٹھنے والے پر۔ "من اللہ ای من جھة حکمه وامره وقضائه وقدره" اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کے امر اور اس کی قضاء وقدر سے۔

ترة ، مصدر ہے "عدة" کی طرح اصل مادہ وتر یتر ہے اور اس کا معنی ہے "تبعة ومعاتبة او نقصان وحسرة" پیچھا کرنا، عتاب کرنا، نقصان دینا، حسرت وندامت۔

جس طرح کہا جاتا ہے "وترحقه" اس نے اپنے حق کو نقصان پہنچایا جو حسرت کا سبب ہے۔ اسی معنی کے مطابق رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلَنْ يَتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ ﴾ "اور وہ ہرگز تمہیں تمہارے اعمال میں نقصان نہیں دے گا" (سورۃ محمد ۳۵)

حدیث شریف کا مطلب واضح ہے کہ انسان بیٹھتے اور سوتے وقت جب اللہ تعالیٰ کو یاد نہ کرے وہ رب تعالیٰ کے انعام واکرام سے محروم رہ کر خسارہ میں رہتا ہے۔

☆ "عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ ما من قوم يقومون من مجلس لا يذكرون الله فيه الا قاموا عن مثل جيفة الحمار وكان عليهم حسرة" (رواه احمد وابو داؤد)

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی ایسی قوم نہیں جو کسی مجلس سے اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر ہی اٹھ پڑیں سوائے اس کے کہ وہ مردار گدھے کی مثل سے اٹھے اور ان پر حسرت وندامت ہے۔

وضاحت حدیث: قیام کے بعد "عن" آئے تو تجاوز اور دوری کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

اس لئے "قاموا عن مثل جيفة الحمار" کا معنی یہ ہے:

"لا يوجد منهم قيام عن مجلسهم الا كقيام المتفرقين عن اكل الجيفة التى هى غاية فى القذر والنجاسة"

جو لوگ کسی محفل سے بغیر اللہ تعالیٰ کے ذکر کے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں وہ ایسے ہی ہیں جیسے مردہ گدھے کا گوشت کھا کر اٹھ پڑیں جو نہایت گندا اور نجس ہوتا ہے۔

"وقال ابن الملك وتخصيص جيفة الحمار بالذكر لانه ادون الجيف من بين الحيوانات التى تخالطنا ، او لكونه ابلد الحيوانات او لكونه مخالطا للشيطان ولهذا يتعوذ نهيقه بالرحمن"

ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مردہ گدھے کا ذکر خصوصی طور پر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ باقی حیوانوں کی بنسبت گھٹیا جانور ہے اور اسی لئے اس کا مردار ہونا بھی گھٹیا ہے اور یہ تمام حیوانوں سے بے وقوف بھی ہے اور یہ وجہ بھی ہے کہ یہ شیطان سے ملتا ہے اسی لئے اس کے ہینگنے پر اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا۔

یہی حدیث جس کی وضاحت ذکر کی جارہی ہے۔ اسی مضمون کی حدیث نسائی اور ابن حبان نے بھی بیان فرمائی وہ اس طرح ہے:

"ما من قوم جلسوا مجلسا وتفرقوا منه ولم يذكروا الله فيه الا كانما تفرقوا عن جيفة حمار وكان عليهم حسرة يوم القيامة وما مشى احد ممشى لم يذكر الله فيه الا كان عليه ترة وما اوى احد الى فراشه ولم يذكر الله فيه الا كان عليه ترة"

کوئی قوم ایسی نہیں جو کسی مجلس میں بیٹھیں اور اس سے متفرق ہوں کہ اس میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کیا ہو مگر یہ کہ وہ ایسے ہی ہیں جیسے مردار گدھے سے متفرق ہوئے ہوں اور ان پر قیامت کے دن حسرت ہے اور جو شخص چلتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کرے وہ نہیں سوائے نقصان اٹھانے والوں کے۔ اور جو شخص اپنے بستر پر آرام کرے اور اللہ کا ذکر نہ کرے وہ نہیں سوائے نقصان اٹھانے والوں کے۔

☆ **"وعن ابى هريرة قال قال رسول الله ﷺ ما جلس قوم مجلسا لم يذكروا الله فيه ولم يصلوا على نبيهم الا كان عليهم ترة فان شاء عذبهم وان شاء غفرلهم"**

(رواه الترمذی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی قوم کسی مجلس میں نہیں بیٹھتی کہ اس میں وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کریں اور اپنے نبی (ﷺ) پر درود نہ پڑھیں مگر یہ کہ وہ خسارہ میں ہوتے ہیں، پس اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ان کو عذاب دے اور چاہے تو ان کی مغفرت فرمائے۔

حدیث شریف کا مضمون بہت واضح ہے کہ ہر مجلس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے اور نبی کریم ﷺ پر درود شریف پڑھا جائے اگر مجلس اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کے حبیب پاک ﷺ پر درود شریف پڑھنے سے خالی ہو تو وہ بے برکت اور باعث نقصان ہوتی ہے۔ ایسی محفل والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بخشش کا کوئی وعدہ نہیں ہوتا بلکہ رب تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے چاہے تو ان کو عذاب دے اور

چاہے تو ان کی مغفرت فرمائے۔

☆ " عن ام حبیبة قالت قال رسول الله ﷺ کل کلام ابن آدم علیه لا له الا امر بمعروف او نهی عن المنکر او ذکر الله" (رواه الترمذی و ابن ماجه وقال الترمذی هذا حدیث غریب)

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابن آدم کا ہر کلام بے فائدہ ہے، اس کا اسے کوئی فائدہ نہیں سوائے، امر بالمعروف کے یا نہی عن المنکر یا اللہ کے ذکر کے۔

وضاحت حدیث: علی، ضرر کے لئے آتا ہے اور " لام "نفع کے لئے آتا ہے حدیث شریف میں "کل کلام ابن آدم علیه لا له " کا ظاہری معنی تو یہ ہے کہ ابن آدم (آدمی) کا ہر کلام اس کے لئے نقصان دہ ہے نفع مند نہیں۔

حدیث پاک کا یہ ظاہری معنی تو مراد ہو نہیں سکتا، کیونکہ انسان ہر وقت کلام کا محتاج ہے کتنے کلام وہ ہیں جو مباح ہیں ان تین کے علاوہ ہیں جو اس حدیث میں مذکور ہیں تو یہ کس طرح درست ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے " کل کلام ابن آدم حسرة علیه لا منفعة له فیه الا المذکورات وامثا لها " کہ حدیث پاک سے مراد یہ ہے کہ انسان کو ہر کلام پر حسرت ہوگی کوئی فائدہ نہیں ہوگا سوائے ان تین کلاموں کے جن کا ذکر حدیث پاک میں ہے اور اسی طرح کا اور کلام جو خیر پر مبنی ہو۔ یہ حدیث پاک دراصل قرآن پاک کی اس آیت کا اقتباس ہے:

﴿ لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ﴾

"ان کے اکثر مشوروں میں کچھ بھلائی نہیں مگر جو حکم دے خیرات یا اچھی بات یا لوگوں میں صلح کرنے کا" (النساء ۱۱۴)

یہ مسئلہ واضح ہو گیا کہ اس حدیث میں مفید کلام اور غیر مفید کلام کا ذکر ہے نقصان دہ اور نفع مند کا ذکر نہیں۔

امر بالمعروف : "مما فیه نفع الغیر من الاوامر الشریعة"

امر بالمعروف سے مراد یہ ہے کہ وہ کلام جس میں غیر کا نفع ہو وہ یہ ہے کہ شریعت کے احکام کا حکم دے کہ لوگ ان پر عمل کر کے نجات حاصل کر سکیں۔

نهی عن منکر : " مما فیه موعظة الخلق من الامور المنهیة "

یعنی نہی عن منکر سے مراد یہ ہے کہ مخلوق کو برے کاموں سے روکنے کی نصیحت کریں کہ

لوگ ان سے اجتناب کر کے رب تعالیٰ کا تقرب حاصل کرلیں۔

ذکر اللہ : "ای ما فیہ رضاء اللہ من الاذکار الالھیۃ کالتلاوۃ والصلوۃ علی النبی ﷺ والتسبیح والتھلیل والدعاء للوالدین وما اشبہ ذلک"

اللہ کے ذکر سے مراد وہ ذکر ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی رضاء پائی جائے، وہ اذکارالھیہ عام ہیں۔ تلاوت قرآن پاک ہو نبی کریم ﷺ پر درود شریف پڑھا جائے اور تسبیح (سبحان اللہ) پڑھنا اور تہلیل (لا الہ الا اللہ) پڑھنا اور والدین کے لئے دعاء کرنا اور اس کے مشابہ تمام قسم کے اوراد اور وظائف۔

حضرت علامہ قاری رحمہ اللہ نے کیا خوب مسئلہ حل کر دیا کہ والدین کے لئے دعاء کرنا بھی اللہ کا ذکر ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس کے ساتھ " فی الحیاۃ " کی قید نہیں لگائی بلکہ مطلق حکم بیان کیا جس سے واضح ہو رہا ہے کہ والدین کے لئے دعاء کرنا ان کی زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد اللہ تعالیٰ کا ذکر ہی ہے۔

"وما اشبہ ذلک" سے اور واضح ہو رہا ہے کہ تمام مسلمان اقرباء کے لئے بلکہ تمام مسلمانوں کے لئے ان کی زندگی میں اور ان کی موت کے بعد دعاء کرنا اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے، جب اللہ تعالیٰ کا ذکر انسان کے لئے نفع مند ہے اور اللہ تعالیٰ کو پسند ہے تو یقیناً والدین کے لئے اور دوسرے اقرباء اور مسلمانوں کے لئے دعاء کرنا نفع مند بھی ہے اور رب تعالیٰ کو پسند بھی ہے۔

☆ "وعن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ لا تکثروا الکلام بغیر ذکر اللہ فان کثرۃ الکلام بغیر ذکر اللہ قسوۃ للقلب وان ابعد الناس من اللہ القلب القاسی" (رواہ الترمذی)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنھما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر زیادہ کلام نہ کرو بیشک اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر زیادہ کلام کرنا دل کو سخت کر دیتا ہے بیشک اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اور لوگوں کی بنسبت زیادہ دور ہونے والا وہی شخص ہوگا جس کا دل سخت ہو۔

وضاحت حدیث: جب حدیث شریف میں زیادہ کلام سے منع کیا گیا ہے تو اسی سے واضح ہوا کہ دنیا کی کلام مطلقاً منع نہیں، بے مقصد، بے فائدہ کلام سے گریز کیا جائے، اچھا اور خیر پر مبنی کلام کیا جائے، جب بیہودہ کلام دل کو سخت کرتا ہے تو بیہودہ قہقہہ لگا کر ہنسنا قساوت قلب کا سبب کیوں نہیں، کیا دینی مدارس

کے طلباء نے کبھی سوچا کہ ہمارا اور کالجز کے طلباء کا امتیاز ہی متانت اور بیہودگی کا ہے، ہاں دین کے طلباء کرام! بیہودہ قہقہے لگانے کی عادت کبھی نہ ڈالنا ورنہ دینی طلباء کی شرافت کا بھرم برباد ہوکر رہ جائے گا۔

قساوۃ قلب کیا ہے؟

" وھی النبو عن سماع الحق والمیل الی مخالطة الخلق وقلة الخشية وعدم الخشوع والبکاء وکثرة الغفلة عن دار البقاء "

قساوت قلب یہ ہے کہ انسان حق بات سننے سے دور ہو جائے اور مخلوق سے میل جول زیادہ رکھے، رب تعالیٰ کا خوف دل میں کم ہو جائے اور خشوع نہ پایا جائے، دل کی نرمی اور رب تعالیٰ کے خوف کے نہ پائے جانے کی وجہ سے رونا نہ آئے اور آخرت سے بہت زیادہ غافل ہو جائے۔

قساوت قلب کو رب تعالیٰ کے اس ارشاد سے سمجھا جائے:

﴿ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ﴾ (البقرة ۷۴)

'' پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہوگئے تو وہ پتھروں کی مثل ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت''

﴿ اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴾ (الحدید ۱۶)

'' کیا ایمان والوں کے لئے ابھی وقت نہ آیا کہ ان کے دل جھک جائیں اللہ کی یاد اور اس کے حق کیلئے جو اترا، اور ان جیسے نہ ہوں جن کو پہلے کتاب دی گئی پھر ان پر مدت دراز ہوئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں بہت فاسق ہیں''۔

☆ " وعن ثوبان قال لما نزلت (والذین یکنزون الذھب والفضة) کنا مع النبی ﷺ فی بعض اسفاره فقال بعض اصحابه نزلت فی الذھب والفضة لو علمنا ای المال خیر فنتخذه فقال افضله لسان ذاکر وقلب شاکر وزوجة مؤمنة تعینه عن ایمانه "

(رواه احمد والترمذی وابن ماجه)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب یہ آیۃ کریمہ ﴿ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ ﴾ نازل ہوئی تو ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ کسی سفر میں تھے تو بعض صحابہ کرام کہنے لگے کہ یہ آیۃ تو سونے اور چاندی (کی مذمت) کے بارے میں نازل ہوئی کاش ہمیں یہ معلوم ہو جائے کون سا

مال بہتر ہے تو ہم وہی حاصل کر لیں تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمام اموال سے بہتر چیز یہ ہے کہ ذکر کرنے والی زبان حاصل ہو اور شکر کرنے والا دل حاصل ہو اور ایمان دار زوجہ حاصل ہو اور وہ اس کے ایمان کی معاون ہو یعنی وہ شخص ایمان پر قائم ہو۔

وضاحت حدیث: نبی کریم ﷺ کے ساتھ سفر میں کچھ صحابہ کرام تھے اسی سفر کی حالت میں یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔ ﴿ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴾ ''اور وہ جو جمع کر کے رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں خوشخبری سناؤ دردناک عذاب کی''

تو صحابہ کرام میں سے بعض نے کہا کہ یہ تو ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ سونے اور چاندی کی مذمت میں یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی کاش کہ ہمیں یہ بھی معلوم ہو جائے کہ انسان کیلئے افضل کیا چیز ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ انسان کیلئے افضل ذکر کرنے والی زبان، شکر کرنے والا دل، اور ایمان دار زوجہ ہیں اور آپ نے فرمایا وہ عورت اس کے ایمان کی معاون ہو، یعنی اسے دین پر قائم رہنے، نماز ادا کرنے، روزہ رکھنے کی یاد دلاتی ہے، تاکہ وہ ان پر عمل کرے اور تمام عبادات کو بجالائے اور تمام گناہوں سے اجتناب کرے۔

صحابہ کرام کے سوال پر نبی کریم ﷺ نے جواب مال کے متعلق نہیں دیا ''لان المال لا ینفعہ ولاشئی للرجل انفع مما ذکر'' اس لئے کہ مال انسان کے لئے نفع مند نہیں جن چیزوں کا ذکر فرمایا وہی نفع مند ہیں۔ ہاں البتہ یہ بھی خیال رہے کہ ان چیزوں پر عمل کرنے والے کم ہی ہیں۔ کیونکہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی اس پر واضح دلیل ہے '' وقلیل من عبادی الشکور '' اور میرے بندوں سے تھوڑے ہی شکر گزار ہیں۔

☆ '' عن ابی سعید قال خرج معاویة علی حلقة فی المسجد فقال ما اجلسکم قالوا جلسنا لذکر اللہ قال آللہ ما اجلسکم الا ذلک قالوا آللہ ما اجلسنا غیرہ قال اما انی لم استحلفکم تھمة لکم وما کان احد بمنزلتی من رسول اللہ ﷺ اقل عنہ حدیثا منی وان رسول اللہ ﷺ خرج علی حلقة من اصحابہ فقال ما اجلسکم ھھنا قالوا جلسنا نذکر اللہ ونحمدہ علی ما ھدانا للاسلام ومن بہ علینا قال آللہ ما اجلسکم الا ذلک قالوا آللہ ما اجلسنا الا ذلک قال اما انی لم استحلفکم تھمة لکم ولکنہ اتانی جبریل فاخبرنی ان اللہ

عزوجل يباهي بكم الملائكة" (رواه مسلم)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مسجد کے ایک حلقہ میں تشریف لائے تو آپ نے فرمایا تمہیں یہاں کس چیز نے بٹھا رکھا ہے؟ انہوں نے کہا ہم اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے بیٹھے ہیں، آپ نے فرمایا کیا تم اللہ تعالیٰ کی قسم اٹھا کر کہتے ہو تمہیں اس چیز کے بغیر کسی اور چیز نے نہیں بٹھایا؟ انہوں نے کہا ہاں اللہ تعالیٰ کی قسم ہے ہمارے بیٹھنے کی صرف یہی وجہ ہے، پھر آپ نے فرمایا میں نے تم سے قسم بدگمانی کے طور پر نہیں لی (بلکہ اس کی وجہ یہ ہے) کوئی ایک بھی میری طرح رسول اللہ ﷺ کے قریب رہ کر کم حدیثیں بیان کرنے والا نہیں۔

بیشک رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کے ایک حلقہ پر تشریف لائے تو آپ نے فرمایا تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ انہوں نے عرض کیا ہم یہاں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہے ہیں ہمیں جو اس نے اسلام کی ہدایت دے رکھی ہے، اور ہم پر جو اس نے احسان کیا ہوا ہے، ہم اس کی حمد کر رہے ہیں، آپ نے فرمایا کیا اللہ کی قسم تمہارے یہاں بیٹھنے کی صرف یہی وجہ ہے؟ انہوں نے عرض کیا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی ہمارے یہاں بیٹھنے کی صرف یہی وجہ ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں نے تم سے قسم کسی بدگمانی کی وجہ سے نہیں لی۔ میرے پاس ابھی جبریل آئے جنہوں نے خبر دی کہ اللہ تعالیٰ تمہاری وجہ سے فرشتوں پر فخر کر رہا ہے۔

وضاحت حدیث: **حلقة في المسجد**، حلقۃ کے لام پر فتحہ بھی پڑھا گیا ہے اور سکون بھی۔ مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ مسجد میں ایک دوسرے کے سامنے دائرہ بنا کر بیٹھے ہوئے تھے۔

ما اجلسكم، میں "ما" استفہامیہ ہے سوال یہ کیا گیا کہ تمہیں کس سبب نے یہاں بٹھا رکھا ہے یعنی یہاں اس ہیئت پر اس طریقہ پر تمہارے بیٹھنے کی وجہ کیا ہے؟

آللہ، پہلے جو سوال میں ہے اس میں "**همزة الاستفهام وقعت بدلا عن حرف القسم ويجب الجر معها**" ہمزہ استفہام کے لئے ہے اور حرف قسم کا بدل ہے، اس کے بعد جر (زیر) ہے، تقریباً قسم اور استفہام کے دونوں معنی مراد ہیں کیا اللہ کی قسم ہے کہ تمہارے یہاں بیٹھنے کی اور کوئی وجہ نہیں؟

اور جواب میں جو " آللہ " استعمال ہے اس کا مطلب یہ ہے "وقع الھمزۃ موقعھا مشاکلۃ وتقریرا لذلک وتقدیرہ ای او نعم قسم اللہ "

کہ ہمزہ استفہام کے لئے ہے مشاکلت کے طور پر استعمال ہوا ہے استفہام تقریری ہے معنی یہ ہے کہ ہاں اللہ کی قسم ہے کہ ہمارے بیٹھنے کی اور کوئی وجہ نہیں۔

" قال اما انی لم استحلفکم تھمۃ لکم وما کان احد بمنزلتی من رسول اللہ ﷺ اقل عنہ حدیثا منی "

" اما " تنبیہ کے لئے ہے یا " حقا " کے معنی میں ہے آپ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ میں نے تم سے جو قسم لی ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ مجھے تم پر کوئی بدگمانی تھی کہ تم جھوٹ بول رہے ہو در حقیقت میں اس کلام کے مشابہ کلام کرنا چاہتا ہوں جو نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کرام سے ارشاد فرمایا تھا۔

" وقدم بیان قربہ منہ علیہ الصلوۃ والسلام وقلۃ نقلہ من احادیثہ الکرام دفعا لتھمۃ الکذب عن نفسہ فیما ینقلہ من الکلام "

آپ نے پہلے اپنا مقام بیان فرمایا جو آپ کو نبی کریم ﷺ کا قرب رہا، اور اپنے قلیل حدیث بیان کرنے کی وجہ بیان کی۔ تا کہ کوئی آپ کی روایت کو جھوٹا نہ کہہ سکے۔

سبحان اللہ صحابہ کرام کا کیا مقام کشف ہے کہ آپ کو معلوم ہے کہ کئی بے دین اور بے ایمان میرے متعلق لوگوں میں بدگمانیاں پیدا کریں گے، خود بھی گمراہ ہوں گے دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

آیئے ذرا دیکھیں آپ اپنی شان کیا بیان کر رہے ہیں "وما کان احد بمنزلتی من رسول اللہ ﷺ" تمام حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تم میں سے کوئی ایک بھی رسول اللہ ﷺ کے اتنا قریب نہیں جتنا میں ہوں۔ علامہ علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" لکونہ محرما لام حبیبۃ اختہ من امھات المؤمنین ولذا عبر عنہ المولوی فی المثنوی بخال المؤمنین ولکونہ من اجلاء کتبۃ الوحی "

آپ کو اس لئے نبی کریم ﷺ سے قرب حاصل تھا کہ آپ ام المؤمنین رسول اللہ ﷺ کی زوجہ مطہرہ کے بھائی تھے چونکہ حضور کی تمام بیبیاں مومنوں کی مائیں ہیں۔ قرآن پاک میں فرمایا

﴿وَاَزْوَاجُـهٗ اُمَّهَـاتُهُمْ﴾ اورآپ کی ازواج ان (مومنوں) کی مائیں ہیں، ماں کا بھائی ماموں ہوتا ہے اسی لئے مولنا روم رحمہ اللہ نے آپ کو مومنوں کا ماموں قرار دیا

اور حدیث پاک سے یہ بھی ثابت ہے کہ ماموں کو باپ کا مقام حاصل ہوتا ہے تو اس لحاظ سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ مومنوں کے ماموں اور باپ کے درجہ میں ہیں لیکن جب نبی کریم ﷺ کی ازواج کافروں کی مائیں نہیں تو یقینی بات ہے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا ان سے کوئی رشتہ نہیں۔

اقل عنه حديثا منی : آپ فرماتے ہیں مجھے حضور ﷺ سے قرابت بھی حاصل ہے لیکن پھر بھی میں آپ سے احادیث کم روایت کرتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے:

" لا حتياطی فی الحديث والا كان مقتضی منزلته ان يكون كثير الرواية ولعله كان ممن لم يجوز نقل الرواية بالمعنی "

کہ آپ احتیاط فرماتے تھے کہ کہیں حدیث بیان کرتے ہوئے حضور کے الفاظ نہ بدل جائیں ورنہ آپ قرابت کے لحاظ سے زیادہ احادیث بیان فرماتے لیکن کئی حضرات صحابہ کرام حدیث کا مفہوم اپنے الفاظ میں بیان کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے کہ آپ کے الفاظ بدلنے نہ پائیں اسی ڈر سے ان کی روایات بہت کم واقع ہیں۔

اس کے بعد حدیث پاک کا مضمون واضح ہے اور صحابہ کرام کا یہ عرض کرنا کہ ہمارے یہاں بیٹھنے کی صرف وجہ یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے احسان اور اس نے ہمیں جو ہدایت عطاء کر رکھی ہے اس پر اس کی حمد کریں اور اس کا ذکر کریں۔

یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ جنت والے حضرات کہیں گے " اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدَانَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّـا لِـنَهْتَدِیَ لَوْ لَا اَنْ هَدَانَا اللهُ " سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے ہمیں ہدایت دی اس کی اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت نہ فرماتا تو ہم ہدایت حاصل نہ کر پاتے۔

ان الله عزوجل يباهی بكم الملائكة : اس کا معنی یہ ہے:

" ان الله تعالیٰ يقول لملائكته انظروا الی عبيدی هؤلاء كيف سلطت عليهم نفوسهم وشهواتهم، واهويتهم والشيطان وجنوده ومع ذلك

قویت همتهم علی مخالفة هذه الدواعی القویة الی البطالة وترک العبادة والذکر فاستحقوا ان یمدحوا اکثر منکم لانکم لا تجدون للعبادة مشقة بوجه"

بے شک اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائے گا میرے ان بندوں کو دیکھو کس طرح میں نے ان پر ان کے نفوس کو، ان کی خواہشات کو اور ان کی قلبی محبتوں کو اور شیطان کو اور شیطانی لشکر کو مسلط کر رکھا ہے جو ان کو باطل راہ کی طرف لگانے والے ہیں عبادات اور ذکر سے روکنے والے ہیں لیکن یہ پھر بھی کتنی قوی ہمت والے لوگ ہیں کہ تمام سازشوں اور رکاوٹوں کا مقابلہ کرتے ہوئے میرا ذکر کر رہے ہیں لہذا اے فرشتو یہ لوگ تم سے زیادہ مدح کے مستحق ہیں کیونکہ تمہیں عبادت سے روکنے والے کوئی ذرائع نہیں تمہارا عبادت کرنا آسان ہے۔

سبحان اللہ اے انسان اللہ تعالیٰ کے ذکر کی وجہ سے تیرا مقام کتنا بلند ہے کہ فرشتوں کے سامنے رب ذوالجلال تیری تعریف کر رہا ہے۔

☆ "عن عبد الله بن بسر ان رجلا قال یا رسول الله ان شرائع الاسلام قد کثرت علی فاخبرنی بشئی اتشبث به قال لا یزال لسانک رطبا من ذکر الله"

(رواه الترمذی وابن ماجه وقال الترمذی هذا حدیث حسن غریب)

حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ بیشک شرائع اسلام مجھ پر کثیر ہو گئے آپ مجھے کسی ایسی چیز کی خبر دیں جس کے ساتھ میں سہارا پکڑوں (یعنی جس پر میں عمل کروں) آپ نے فرمایا تم اپنی زبان کو ہمیشہ ذکر سے تر رکھو۔

وضاحت حدیث: شریعت کا لغوی معنی یہ ہے "اونٹوں کو جاری پانی پر پیش کرنا" لیکن اصطلاح میں وہ کام جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کیلئے مشروع قرار دیئے یعنی فرائض اور واجبات پر شریعت کا اطلاق زیادہ ہے "والظاهر ان المراد بها هنا النوافل" لیکن ظاہر یہی ہے کہ اس مقام پر مراد نوافل ہیں۔ صحابی کے عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ نفلی عبادات کثیر ہیں تمام پر عمل کرنا تو میرے لئے مشکل ہے تو آپ مجھے کسی قلیل عبادت کی خبر دے دو جس پر ثواب زیادہ مرتب ہو "معناه اخبرنی بشئی یسیر مستجلب لثواب کثیر" یعنی ایسی عبادت ہو جو آسان بھی ہو اور اس کا ثواب بھی زیادہ ہو۔

"التشبث ای اتعلق به من عبادة جامعة غیر شاقة ما نعة فی مکان دون مکان وزمان دون زمان وحال دون حال من قیام وقعود واکل وشرب ومخالطة واعتزال وشباب وهرم وغیر ذلک ویکون جابرا عن بقیتها مشتملا علی کلتیهما"

مقصد یہ تھا کہ میں ایسی عبادت سے تعلق رکھوں ایسی عبادت پر عمل کروں جو کئی نفلی عبادات کو جامع اور شامل ہو اور اس عبادت کا تعلق کسی خاص مکان اور کسی خاص زمان اور کسی خاص حال سے نہ ہو نہ وہ عبادت کھڑے ہو کر کرنے سے مختص ہو اور نہ ہی بیٹھنے سے، وہ ایسی عبادت ہو جو کھانے اور پینے کے وقت بھی جاری رہ سکے اور وہ ایسی عبادت ہو جو لوگوں کی محفل میں بھی جاری رکھی جا سکے اور اکیلے بھی اس پر عمل ہو سکے جوانی میں بھی اس پر عمل جاری رہے اور بڑھاپے میں بھی اور باقی نفلی عبادات کی کمی بھی اس سے پوری کی جا سکے اور جتنی دو دو چیزوں کا ذکر ہے ان تمام میں اس پر عمل کیا جا سکے؟ وہ عظیم عبادت نبی کریم ﷺ نے بیان فرمائی " لا یزال لسانک رطبا من ذکر الله " ہمیشہ تمہاری زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے تر رہے۔ ''لسان'' سے مراد اس حدیث میں قلبی اور قالبی دونوں ہی ہیں یعنی زبان اور دل سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرو۔

☆ " وعن ابی سعید ان رسول الله ﷺ سئل ای العباد افضل وارفع درجة عندالله یوم القیامة قال الذاکرون الله کثیرا والذاکرات قیل یا رسول الله ومن الغازی فی سبیل الله قال لو ضرب بسیفه فی الکفار والمشرکین حتی ینکسر ویختضب دما فان الذاکر لله افضل درجة " (رواه احمد والترمذی وقال هذا حدیث غریب)

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کون سے بندے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے ہاں افضل اور بلند درجہ رکھتے ہوں گے؟ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے خواہ مرد ہوں یا عورتیں، پھر آپ سے پوچھا گیا کیا یہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والوں سے بھی افضل ہوں گے؟ آپ نے فرمایا ہاں اگر ان کی تلوار کفار و مشرکین پر چلاتے ہوئے ٹوٹ بھی جائے اور وہ شخص اور اس کی تلوار خون آلود بھی ہو جائے تو پھر بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر کرنے والوں کا درجہ بلند رہے گا۔

وضاحت حدیث: ذکر سے مراد اس پر ہمیشگی کرنا۔ خیال رہے کہ وہی ذکر قابل تعریف ہے جب کہ

فرائض اور واجبات کو ادا کیا جائے اور ناجائز کاموں سے اجتناب کیا جائے۔ جہاد چونکہ فرض کفایہ ہے اس لئے فرائض کی تکمیل اور ان کے بعد ذکر جہاد سے افضل ہوگا۔ لیکن جب جہاد فرض عین کے درجہ میں ہو تو اب مسجد میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنا کافی نہیں ہوگا بلکہ جہاد کرنا ضروری ہوگا۔

☆ "عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ الشیطان جاثم علی قلب ابن آدم فاذا ذکر الله خنس واذا غفل وسوس" (رواه البخاری تعلیقا)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شیطان انسان کے دل سے چمٹا رہتا ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان ہٹ جاتا ہے اور جب وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل رہتا ہے تو اسے وسوسہ ڈالتا ہے۔

وضاحت حدیث: "جاثم ای لازم الجلوس ودائم اللصوق" حدیث شریف میں جو لفظ "جاثم" استعمال ہوا ہے اس کا معنی ساتھ بیٹھے رہنا، اور ہمیشہ ساتھ چمٹے رہنا۔ خنس: ای انقبض الشیطان وتأخر عنه" یعنی انسان جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان غم کی وجہ سے مرجھا جاتا ہے اور اس سے دور ہو جاتا ہے اور چھپ جاتا ہے اور اس کا وسوسہ کم پڑ جاتا ہے اور اس کا ضرر کم ہو جاتا ہے۔ اور جب انسان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل ہو جاتا ہے تو شیطان وسوسہ ڈالنے پر قادر ہو جاتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث ثابت ہے:

"ان الشیطان واضع خرطومه علی ابن آدم فان ذکر الله خنس وان نسی التقم قلبه، (اخرجه ابن ابی الدنیا ابو یعلی والبیهقی)"

کہ بے شک شیطان اپنا سونڈ انسان پر رکھتا ہے اگر وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے تو شیطان اس سے ہٹ جاتا ہے اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کو ترک کر دے تو وہ اس کے دل کو لقمہ بنالیتا ہے (یعنی اس کے دل پر اثر انداز ہو کر وسوسہ ڈالتا ہے)

اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں میں سے ایک نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا کہ مجھ پر منکشف فرما کہ شیطان کس طرح لوگوں کے دلوں پر اثر کرتا ہے تو رب تعالیٰ نے اس پر منکشف کر دیا:

" فرآه جاثما تحت غضروف الکتف الا یسر کالبعوض له خرطوم طویل یدسه ثم الی ان یصل القلب فان رآه ذاکرا خنس وکف عنه او غافلا مد خرطومه الیه والقی فیه من جنایته ما اراد اللہ ثم لا یزال کذلک الی ان لا یبقی فی القلب خیرقط "

اس نے دیکھا کہ شیطان بائیں کندھے کے نیچے پٹھے سے چمٹا ہوا ہے جس طرح مچھر چمٹ جاتا ہے اس کی لمبی سونڈ ہے جو چبھو رہا ہے یہاں تک کہ وہ دل تک پہنچ جاتی ہے پھر دیکھا کہ اگر انسان اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو وہ اس سے دور ہٹ جاتا ہے اور اگر انسان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل رہے تو وہ اپنی سونڈ کو بڑھا دیتا ہے اور انسان کی بدقسمتی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو گناہ لازم آنے ہوتے ہیں وہ اس کے دل میں ڈال دیتا ہے یہاں تک کہ اس کے دل میں نیکی کی کوئی جگہ نہیں رہتی۔

☆ "وعن مالک قال بلغنی ان رسول اللہ ﷺ کان یقول ذاکر اللہ فی الغافلین کالمقاتل خلف الفارین وذاکر اللہ فی الغافلین کغصن اخضر فی شجر یابس وفی روایة مثل الشجرة الخضراء فی وسط الشجر وذاکر اللہ فی الغافلین مثل مصباح فی بیت مظلم وذاکر اللہ فی الغافلین یریه اللہ مقعده من الجنة وهو حی وذاکر اللہ فی الغافلین یغفر له بعدد کل فصیح واعجم والفصیح بنو آدم والاعجم البهائم" (رواه رزین)

حضرت مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مجھے خبر ملی ہے کہ بیشک رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ غافل لوگوں میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا شخص ایسا ہے جیسا کہ میدان جنگ میں کچھ لوگ بھاگ جائیں لیکن ان کے پیچھے کوئی کافروں کے مقابل جہاد میں ثابت قدم رہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا غافلوں میں ایسا ہے جیسا کہ خشک درختوں میں سرسبز وشاداب درخت پایا جائے، ایک روایت میں صرف اتنا ہے کہ درختوں کے درمیان سبز درخت پایا جائے اور غافل لوگوں میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا ایسا ہے جیسے تاریک گھر میں چراغ پایا جائے اور غافل لوگوں میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کرنے والے کو اللہ تعالیٰ جنت میں اس کا مقام اس کی زندگی میں ہی دکھا دیتا ہے۔ اور غافلین میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے شخص کے گناہ ہر فصیح اور اعجم کی تعداد کے برابر معاف کر دیئے جاتے ہیں فصیح سے مراد انسان اور اعجم سے مراد حیوان ہیں یعنی انسانوں اور حیوانوں کی تعداد کے برابر گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔

وضاحت حدیث: میدان جنگ سے بھاگنے والوں کی شدید مذمت بیان کی گئی ہے اور جب دوسرے لوگ بھاگ جائیں اس وقت ثابت قدمی سے جنگ کرنا عظیم مرتبہ ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل رہنے والوں میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے حضرات کا بلند و بالا مرتبہ ہے۔

بار بار لفظ " **ذاکر اللہ** "کو صراحۃ ذکر کیا صرف ضمیر کو نہیں لوٹا دیا:

" **وکررہ لینیط بہ فی کل مرۃ غیر ما اناط بہ فی الاخری اعلاما بانہ امر عظیم لہ فوائد متعددۃ مستقلۃ** "

اس لئے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ ہر مرتبہ علیحدہ ذکر کرنے میں خصوصی فوائد ہیں جو متعدد اور مستقل ہیں۔

" **فی الغافلین** " کو ظرف مستقر کے طور پر ذکر فرمایا خاص متعلق بہ ذکر نہیں فرمایا، اشارہ کیا ہے کہ غافل لوگ کہیں بھی ہوں مسجد میں یا بازار میں ہوں، گھر میں ہوں یا باہر، سفر میں ہوں یا حضر میں ان میں فضیلت رکھنے والا وہی شخص ہوگا جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا ہی ہوگا۔

غافل لوگوں میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا ایسے ہے جیسے خشک درختوں میں سرسبز و شاداب درخت ہو " **وھو معنی مثل الحی والمیت** " یہی مطلب ہے زندہ اور مردہ ہونے کی طرح یعنی ذکر نہ کرنے والے غافلین کے دل مردہ ہیں جیسے خشک درختوں پر مردگی چھائی ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والوں کے دل اس طرح زندہ ہیں جس طرح سبز ہرا ابھرا درخت زندہ ہوتا ہے۔ غافلین میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا ایسے ہے جیسے تاریک گھر میں چراغ ہو اس کی وجہ یہ ہے۔" **فان الذکر نور وحضور وسرور والغفلۃ ظلمۃ وغیبۃ ونفور** " کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر نور ہے جس سے دل منور ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے رب تعالیٰ کے ہاں حضوری حاصل ہوتی ہے، حضور قلب حاصل ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر میں سرور ہے۔ لیکن اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل رہنے میں دل سیاہ ہو جاتا ہے اور رب تعالیٰ سے دوری حاصل ہوتی ہے اور دل میں نفرت و کدورت پیدا ہوتی ہے۔

" **یریہ اللہ مقعدہ من الجنۃ ای ما اعدلہ** " غافلین میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا ایسے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے جنت میں جو مقام تیار کر رکھا ہے اسے اس کی زندگی میں ہی دکھا دیا جاتا ہے۔ زندگی میں اسے جنت کا مقام کیسے دکھا دیا جاتا ہے؟

" لعل الاراء ة بالمكاشفة او بنزول الملائكة عند النزع لقوله تعالیٰ "﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴾ (حم السجدة ۳۰)

اس کی دو وجہ ہیں ایک تو یہ کہ بعض بزرگوں کو کشف کے ذریعے ان کی زندگی میں جنت میں ان کا مقام دکھا دیا جاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جن کا مقام اتنا بلند نہیں ہوتا ان کو جان کنی (جان کے نکلنے) کے وقت دکھا دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا (ترجمہ) بیشک وہ جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر قائم رہے ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور خوش ہو اس جنت پر جس کا تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے۔

غافلین میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والوں کے گناہ مٹا دیئے جاتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے ذکر نے انہیں صدق دل سے توبہ کرنے کی توفیق عطاء فرما دی تو تمام صغیرہ اور کبیرہ گناہ معاف ہو گئے۔ اور اگر ابھی تک زبان تک ذکر محدود ہے دل پر کامل طور پر اثر انداز نہیں ہوا تو پھر بھی صغیرہ گناہ معاف ہوتے ہیں۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ فَاِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ﴾ "بیشک نیکیاں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں"۔

☆ " عن معاذ بن جبل قال ما عمل العبد عملا انجی له من عذاب الله من ذکر الله " (رواہ مالک والترمذی وابن ماجه)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ انسان کا کوئی عمل اللہ تعالیٰ کے عذاب سے زیادہ نجات دینے والا نہیں بنسبت اللہ تعالیٰ کے ذکر کے۔

وضاحت حدیث: یہ حدیث حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے قول پر موقوف ہے لیکن ضابطہ یہ ہے " ومثله لا یقال من قبل الرأی فهو فی حکم المرفوع " کہ اس قسم کے اقوال انسان اپنی رائے سے تو قائم نہیں کر سکتا جو قول رائے سے پیش نہ کیا جا سکے اور صحابی کا وہ قول ہو وہ مرفوع حدیث کے حکم میں ہوتا ہے۔ بلکہ مسند احمد اور طبرانی اور مصنف ابن ابی شیبہ کی مرفوع حدیث اس کی تائید کر رہی ہے جس کے الفاظ مبارکہ یہ ہیں " ما عمل آدمی عملا انجی له من عذاب الله من ذکر الله" الخ مطلب وہی جو بیان ہو چکا ہے۔

☆ " وعن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ ان الله تعالیٰ یقول انا مع عبدی اذا ذکرنی وتحرکت بی شفتاه "
(رواه البخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے اور میرے ذکر سے اپنے ہونٹوں کو حرکت دیتا ہے۔

وضاحت حدیث: انا مع عبدی ، بالاعانة والتوفیق والرحمة والرعایة "
یعنی رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا بندہ جب میرا ذکر کرتا ہے تو اسے میری طرف سے امداد حاصل ہوتی ہے اور اسے میں ہی اپنی عبادت وذکر کی توفیق عطاء کرتا ہوں اسے اپنی رحمت سے نوازتا ہوں اس پر اپنی مہربانیوں کی نوازش کرتا ہوں۔

" وقیل المعیة کنایة عن الشرف والقربة لما ورد انا جلیس من ذکرنی کما یقال فلان جلیس السلطان ای مقرب مشرف عنده "

اور اس کا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی معیت حاصل ہوگی یعنی اس انسان کو رب تعالیٰ کی قربت حاصل ہوگی اور شرافت حاصل ہوگی۔ جس طرح کہا جاتا ہے " فلان جلیس السلطان " تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فلاں شخص کو بادشاہ کا قرب حاصل ہے اور وہ بادشاہ کا مقرب ہے۔

کیا ہی خوب: " والحدیث ابلغ حیث لم یقل هو جلیس " اے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے، رب تعالیٰ نے کیا خوب تیری شان بیان فرمائی یہ ارشاد فرمایا " انا مع عبدی "، یعنی انا جلیس مع عبدی میں اپنے بندے کے قریب ہوں گا، اسے اپنا مقرب بناؤں گا، اسے تقرب کی وجہ سے مشرف بناؤں گا۔ یہ نہیں فرمایا " وهو معی "، یعنی هو جلیس کہ وہ شخص جو میرا ذکر کرے گا وہ میرے پاس آئے گا وہ میرا مقرب بنے گا۔

سبحان اللہ کسی کا بننا اور ہے جب خود کوئی کسی کو بنائے وہ اور ہے رب تعالیٰ کا بننا بھی نعمت عظمی ہے۔ لیکن رب تعالیٰ جب کسی کو اپنا بنالے وہ کتنا ہی خوش بخت انسان ہے جو بے نظیر و بے مثال ہے۔

اذا ذکرنی وتحرکت بی شفتاه : جب " وتحرکت " میں واؤ حال کیلئے ہو تو " ذکرنی " میں " ذکر باللسان والقلب " (زبان اور دل سے ذکر کرنا) مراد ہوگا۔ اور اگر واؤ عطف کے لئے ہو تو " ذکرنی " سے مراد 'دل سے یاد کرنا' اور " وتحرکت بی شفتاه " سے مراد 'زبان سے یاد کرنا' ہوگا، زبان اور دل سے یاد کرنا مراد لینا بہتر ہے " لان المؤثر النافع هو

الذکر باللسان مع حضور القلب " اسلئے کہ مؤثر اور نفع دینے والا وہی ذکر ہے جو زبان سے کیا جائے اور ساتھ ہی حضور قلب بھی حاصل ہو۔

" واما الذکر باللسان والقلب لاہ فھو قلیل الجدوی " زبان سے ذکر کرنا جب کہ دل لہو ولعب میں مشغول ہو، یعنی دل غافل ہو تو اس میں نفع کم ہے۔ لیکن پہلے تفصیل سے ذکر کیا جا چکا ہے کہ صرف زبان سے بھی ذکر نفع سے مکمل خالی نہیں۔ بلکہ مقام شکر ہے کہ رب تعالیٰ نے زبان کو اپنے ذکر میں لگا دیا ہے۔

☆ " وعن عبد اللہ بن عمر عن النبی ﷺ انہ کان یقول لکل شئی صقالۃ وصقالۃ القلوب ذکر اللہ وما من شئی انجی من عذاب اللہ من ذکر اللہ قالوا ولا الجہاد فی سبیل اللہ قال ولا ان یضرب بسیفہ حتی ینقطع "

(رواہ البیھقی فی الدعوات الکبیر)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ ہر چیز کی صفائی ہے اور دلوں کی صفائی اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے بڑھ کر کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات دینے والی نہیں۔ صحابہ کرام نے پوچھا کیا اللہ کی راہ میں جہاد بھی (اس درجہ کا) نہیں؟ آپ نے فرمایا جہاد بھی نہیں یہاں تک کہ جہاد کرتے کرتے اس کی تلوار بھی کیوں نہ ٹوٹ جائے۔

وضاحت حدیث: ہر چیز زنگ آلود ہوتی ہے حقیقۃً یا حکماً صقالۃ مصدر ہے جس کا معنیٰ " تجلیۃ وتخلیۃ وتزکیۃ وتصفیۃ " صاف کرنا (جلاء عطاء کرنا) اور زنگ اور میل کو دور کرنا، پاک کرنا اور صاف کرنا۔ تاہم علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے " صقالۃ " کو آلہ بنایا ہے یعنی صفائی کا آلہ۔

وصقالۃ القلوب ذکر اللہ : اور دلوں کی صفائی اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔ " فانہ بذکرہ ینجلی غبار الاغیار ویصیر القلب مرآۃ لمطالعۃ الآثار " بیشک اللہ تعالیٰ کے ذکر سے دل اغیار (غیروں) کے غبار سے پاک وصاف ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی توجہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے کسی اور کی طرف نہیں ہوتی اور ان کا دل احادیث اور اقوال صحابہ کے اثر انداز ہونے کیلئے آئینہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا " وصدأ القلوب الرین کما فی قولہ تعالیٰ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ " کہ دلوں پر زنگ کو ہی قرآن پاک میں "رین" کہا گیا (ترجمہ) کوئی نہیں بلکہ ان کے دلوں پر زنگ چڑھا دیا ہے ان چیزوں نے جو وہ کسب کرتے تھے۔

ان کے دل پر زنگ چڑھنے کی وجہ ان کی خواہشات ہوتی ہیں۔ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اَفَرَأَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ ﴾ ''بھلا دیکھو تو وہ جس نے اپنی خواہش کو اپنا خدا ٹھہرالیا''

(الجاثیہ: ۲۳)

" فکلمة لا اله تخليها و كلمة الا الله تجليها " " لا اله " پڑھنے سے دل سے خواہشات نکلتی ہیں اور " الا الله " پڑھنے سے دل منور ہو جاتا ہے۔ ابوعلی دقاق فرماتے ہیں:

" اذا قال العبد لا اله صفا قلبه وحضر سره فيكون ورود قوله الا الله على قلب منقى وسر مصفى "

کہ انسان جب " لا اله " پڑھتا ہے تو اس کا دل گناہوں اور اغیار کی طرف توجہ سے صاف ہو جاتا ہے اور اس کے روح وقلب میں حضور آ جاتا ہے، پھر جب " الا الله " پڑھتا ہے تو وہ کامل طور پر اثر انداز ہوتا ہے کیونکہ اس کا ورود ایسے دل پر ہو رہا ہے جو پہلے ہی " لا اله " سے صاف ہو چکا ہے اور روح وقلب کو پہلے سے جب جلاء حاصل ہے تو اب اور زیادہ جلاء حاصل ہو جائے گی۔

جہاد سے ذکر کو کب فضیلت حاصل ہوتی ہے اس کی تفصیل پہلے ذکر ہو چکی ہے۔

نوٹ: فضیلت ذکر کے متعلق جن احادیث اور ان کی وضاحت کا ذکر کیا گیا اور ان کا حوالہ مذکور نہ ہو تو وہ " مشكوة باب ذكر الله عزوجل والتقرب اليه " میں دیکھیں اور ان کی وضاحت مرقاۃ ج ۵ میں اسی باب میں ان احادیث کے ضمن میں ہی دیکھیں۔

☆ " عن السدی فی قوله تعالیٰ (فاذكروني اذكركم) قال ليس من عبد يذكر الله الا ذكره الله لا يذكر الله مومن الا ذكره برحمة ولا يذكره كافر الا ذكره الله بعذاب "

(ابن جریر بحوالہ در منثور)

سدی رحمہ اللہ نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ فَاذْكُرُوْنِیْ اَذْكُرْكُمْ ﴾ کی تفسیر میں ذکر کیا ہے اللہ تعالیٰ کا بندہ جب اللہ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے یاد کرتا ہے۔ جب مومن اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے رحمت سے ہی یاد کرتا ہے اور کافر جب (کفر سے) رب تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو رب بھی اسے عذاب سے ہی یاد کرتا ہے۔

☆ " اخرج ابن ابی الدنیا عن ابی المخارق قال قال النبی ﷺ مررت لیلة اسری برجل فی نور العرش قلت من هذا ملک ؟ قیل لا قلت نبی ؟ قیل لا قلت من هذا ؟ قال هذا رجل کان فی الدنیا لسانه رطب من ذکر الله وقلبه معلق بالمساجد ولم یستسب لوالدیه " (در منثور)

ابوالمخارق کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں معراج کی رات عرش کے نور میں ایک شخص سے میرا گزر ہوا میں نے کہا یہ کون سا فرشتہ ہے؟ جواب دیا گیا یہ فرشتہ نہیں میں نے کہا کیا یہ نبی ہے؟ جواب دیا گیا یہ نبی بھی نہیں میں نے کہا یہ شخص کون ہے؟ جواب دیا گیا یہ وہ شخص ہے جس کی زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے تر رہتی تھی۔ اور دل اس کا مساجد سے معلق (لٹکا رہنا، چمٹا رہنا) رہتا تھا اور اپنے والدین کو گالی دینے کا سبب نہیں بنتا تھا۔ یعنی دوسروں کے والدین کو گالی نہیں دیتا تھا کہ وہ اس کے والدین کو اس کے بدلے میں گالی دیں۔

☆ " اخرج ابن ابی الدنیا عن ابی ذر عن النبی ﷺ قال ما من یوم ولیلة الا ولله عزوجل فیه صدقة من بها علی من یشاء من عباده وما من الله علی عبد بافضل من ان یلهمه ذکره " (در منثور)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی دن اور رات ایسا نہیں مگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جن پر احسان فرماتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے لئے صدقہ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر سب سے زیادہ فضل یہ ہے کہ وہ ان کو ذکر کی توفیق عطاء فرماتا ہے۔

☆ " اخرج ابن حبان عن ابی سعید الخدری ان رسول الله ﷺ قال لیذکرن الله اقوام فی الدنیا علی الفرش الممهدة یدخلهم الله الدرجات العلی " (در منثور)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کچھ قومیں اللہ تعالیٰ کا ذکر اپنے سونے کے بستروں پر کریں گے (یعنی سوتے وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کریں گے) اللہ تعالیٰ ان کو بلند درجات میں داخل کرے گا۔ (در منثور)

☆ " اخرج احمد والبزار وابو یعلی والطبرانی عن انس عن رسول الله ﷺ قال ما من قوم اجتمعوا یذکرون الله لا یریدون بذلک الا وجهه الا ناداهم مناد من السماء ان قوموا مغفورا لکم قد بدلت سیاتکم حسنات "

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب بھی کوئی قوم اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے جمع ہوتی ہے ان کا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا حصول ہوتا ہے، تو ان کو ضرور آسمان سے نداء دینے والا نداء دیتا ہے کہ تمہارے اس ذکر کی محفل سے کھڑے ہونے پر تمہاری مغفرت ہو چکی ہوگی تحقیق میں نے تمہارے گناہوں کو معاف کر کے نیکیاں عطاء کر دی ہیں۔

☆ "اخرج الطبرانی عن ابی الدرداء قال قال رسول الله ﷺ لیبعثن الله اقواما یوم القیامة فی وجوهم النور علی منابر اللؤلؤ یغبطهم الناس لیسوا بانبیاء و لا شهداء فقال اعرابی یا رسول الله حلهم لنا نعرفهم قال هم المتحابون فی الله من قبائل شتی وبلاد شتی یجتمعون علی ذکر الله یذکرونه" (در منثور)

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ضرور بضرور قیامت کے دن بعض قوموں کو موتیوں کے منبروں پر بٹھائے گا ان لوگوں کے چہروں پر نور ہوگا لوگ ان پر رشک کر رہے ہوں گے حالانکہ وہ انبیاء کرام اور شہداء نہیں ہوں گے ایک اعرابی نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ ہمیں ان کے بارے میں بتائیں تا کہ ہم ان کو پہچان لیں آپ نے فرمایا وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی رضاء کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کرنے والے ہیں جو مختلف قبائل سے ہوں گے اور مختلف شہروں سے آ کر ایک جگہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے جمع ہو کر اللہ کا ذکر کرنے والے ہیں۔

سبحان اللہ بزرگان دین کے آستانے کتنے بابرکت ہیں کہ اس گئے گزرے دور میں بھی لوگ مختلف شہروں سے آ کر جمع ہوتے ہیں اور اللہ کا ذکر کرتے ہیں ان محافل میں کیا ہی خوب وجدانی کیفیت طاری ہوتی ہے۔

وَاشْكُرُوْلِیْ وَلَا تَكْفُرُوْن : "اور میرا شکر کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔

"وَاشْكُرُوْلِیْ" اور "وَاشْكُرُوْنِیْ" کا معنی ایک ہی ہے کہ "میرا شکر کرو" تاہم "وَاشْكُرُوْلِیْ" فصیح ہے۔

ذکر کو شکر سے پہلے ذکر فرمایا کیونکہ ذکر میں انسان رب تعالیٰ کی ذات میں مشغول ہوتا ہے اور شکر میں اس کی نعمتوں کی طرف مشغول ہوتا ہے " والاشتغال بذاته تعالیٰ اولی من الاشتغال

بنعمته " رب تعالیٰ کی ذات میں مشغولیت بہتر ہے بنسبت اس کی نعمتوں میں مشغول ہونے کے۔

وَلَا تَكْفُرُوْنِ: (واوَ) برائے عطف (لا) برائے نہی۔ مضارع کا نون اعرابی محذوف۔ یہ موجودہ نون وقایہ ہے مکسور ہے یائے متکلم محذوف ہے یعنی میری نعمتوں کا انکار نہ کرو اور میرے حکم کی نافرمانی نہ کرو اور اس کا تعلق جمیع زمانوں سے ہے کہ کسی وقت بھی میری ان گنت نعمتوں کا کفران (انکار) نہ کرنا۔
(از روح المعانی)

شکر کیا ھے :

"الشکر تصور النعمة و اظهارها " شکر نعمت کے تصور اور اس کے اظہار کو کہتے ہیں۔

شکر کو کشر سے مقلوب (الٹ کر کے بنانا) بھی تسلیم کیا گیا جس کا معنی ہے کشف یعنی کھولنا اور واضح کرنا۔ اس کی ضد کفر ہے جس کا معنی کفران نعمت ہے یعنی نعمت کو چھپانا اور بھول جانا اور انکار کرنا۔

شکر کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ منعم کے ذکر سے بھرا ہوا رہنا۔ یعنی ہر وقت اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرتے رہنا۔

شکر کی تین قسمیں ہیں:

۱) شکر القلب ، دل سے شکر ادا کرے یعنی یہ تصور رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنی نعمتیں عطاء کر رکھی ہیں جو شمار سے بھی باہر ہیں۔

۲) شکر اللسان ، زبان سے شکر ادا کرنا " وهو الثناء علی المنعم " وہ اللہ تعالیٰ جو انعام عطاء کرنے والا ہے اس کی تعریف کرنا۔

۳) شکر سائر الجوارح ، تمام اعضاء سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا یعنی ہاتھوں سے نیکی کا کام کرنا۔ نیکی کے لئے پاؤں سے چل کر جانا، آنکھوں سے نیکی والی چیزوں کو دیکھنا وغیرہ۔ اسی طرح تمام اعضاء کو نیکی کی طرف لگانا اعضاء کا شکر ہے۔

ہر منعم کا شکریہ ادا کرے:

اسی لئے تو رب تعالیٰ نے فرمایا﴿ اُشْكُرْلِیْ وَلِوَالِدَیْكَ ﴾ میرا شکر ادا کرو اور اپنے

والدین کا شکریہ ادا کرو۔

شکر کا فائدہ شکر کرنے والے کو حاصل ہوتا ہے:

رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَسَنَجْزِی الشَّاكِرِيْنَ ﴾ اور ہم عنقریب شکر کرنے والوں کو جزاء دیں گے اور فرمایا ﴿ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ﴾ اور جو شکر کرے گا وہ شکر اپنے لئے ہی کریگا۔

شکر گزار تھوڑے ناشکرے زیادہ ہیں:

" وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّكُوْرُ " رب تعالیٰ نے فرمایا میرے بندوں میں شکر کرنے والے تھوڑے ہیں۔ (از مفردات راغب)

ہم اس آیۃ کریمہ کی طرف توجہ نہ کرنے کی وجہ سے بعض اوقات دل تنگ ہوتے ہیں لیکن جب رب تعالیٰ کے شکر گزار تھوڑے ہیں تو بندوں کا شکریہ نہ ادا کرنے والے تھوڑے ہوں تو اس پر کیا تعجب ہے؟ جس پر مہربانیاں کریں وہی بے وفا نظر آتا ہے لیکن یہ قانون قدرت ہے ایسا ہی ہونا چاہئے۔

شکر کی فضیلت میں احادیث و آثار:

" عن ابن مسعود قال قال رسول الله ﷺ من اعطی اربعا اعطی اربعا وتفسیر ذلک فی کتاب الله من اعطی الذکر ذکره الله لان الله یقول اذکرونی اذکرکم ومن اعطی الدعاء اعطی الاجابة لان الله یقول ادعونی استجب لکم ومن اعطی الشکر اعطی الزیادة لان الله یقول لئن شکرتم لازیدنکم ومن اعطی الاستغفار اعطی المغفرة لان الله یقول استغفروا ربکم انه کان غفارا " (طبرانی، ابن مردویہ، بیہقی، در منثور)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کو چار چیزیں عطاء ہوں اسے ان پر چار اور عطاء کی جاتی ہیں ان تمام کی تفاسیر کتاب اللہ میں موجود ہے جس کو ذکر کی توفیق عطاء کی جائے اللہ تعالیٰ اس کا ذکر کرتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ فَاذْكُرُوْنِیْٓ اَذْكُرْكُمْ ﴾ تم

مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ اور جس شخص کو دعاء کرنے کی توفیق عطاء کی جائے اسے قبولیت عطاء کی جاتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اُدۡعُوۡنِیۡۤ اَسۡتَجِبۡ لَكُمۡ ﴾ تم مجھ سے دعاء کرو میں تمہاری دعاء کو قبول کروں گا۔ جس شخص کو شکر عطاء کیا گیا اسے زیادتی عطاء کی جاتی ہے کیونکہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِيۡدَنَّكُمۡ ﴾ اگر تم شکر ادا کرو تو میں تمہیں زیادہ عطاء کروں گا۔ اور جس شخص کو استغفار کی توفیق عطاء کی جائے اسے مغفرت عطاء کی جاتی ہے کیونکہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اِسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ﴾ اپنے رب تعالیٰ سے مغفرت طلب کرو بیشک وہ بخشنے والا ہے۔

☆ "عن زید بن اسلم ان موسی علیه السلام قال یا رب اخبرنی کیف اشکرک قال تذکرنی ولا تنسانی فاذا ذکرتنی شکرتنی واذا نسیتنی فقد کفرتنی"

(ابن ابی الدنیا ، ابو حاتم ، بیهقی ، درمنثور)

حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا اے میرے رب مجھے بتاؤ کہ میں تمہارا شکر کیسے ادا کروں، رب تعالیٰ نے فرمایا تم مجھے یاد کرو، میرے ذکر کو نہ چھوڑو جب تم نے میرا ذکر کر لیا تو میرا شکر یہ ادا کر دیا اور جب تم نے میرے ذکر کو چھوڑ دیا تو میری ناشکری کی۔

☆ "عن ابن عباس ان النبی ﷺ قال اربع من اعطیھن فقد اعطی خیر الدنیا والآخرة قلب شاکر ولسان ذاکر وبدن علی البلاء صابرو زوجة لا تبغیه خونا فی نفسها وماله" (ابن ابی الدنیا ، طبرانی ، بیهقی ، در منثور)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا چار چیزیں جسے عطاء کی گئیں اسے دنیا اور آخرت کی بہتر چیزیں عطاء کی گئیں (وہ یہ ہیں) شکر کرنے والا دل، اور ذکر کرنے والی زبان اور مصیبت کے وقت صبر کرنے والا بدن اور زوجہ جو اپنے نفس اور خاوند کے مال میں خیانت نہ کرنے والی ہو۔

☆ "عن ابی هریرة ان رسول الله ﷺ قال لهم اتحبون ایها الناس ان تجتهدوا فی الدعاء قالوا نعم قال قولوا اللهم اعنا علی ذکرک وحسن عبادتک"

(بیهقی ، در منثور

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو فرمایا کیا تم پسند

کرتے ہوئے لوگو کہ تم اپنی دعاء میں کوشش کرو، انہوں نے کہا ہاں، آپ نے فرمایا تم یہ کہو " اللهم اعنا علی ذکرک وشکرک وحسن عبادتک " اے اللہ اپنے ذکر اور اپنے شکر اور اپنی اچھی عبادت کے لئے ہماری امداد فرما۔

☆ " عن ابی جعفر قال ما من شئی احب الی الله من الذکر والشکر " (ابن ابی شیبه ، در منثور)

حضرت ابوجعفر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کو ذکر اور شکر سے زیادہ کوئی چیز پسند نہیں۔

☆ " عن ابن المنکدر قال کان من دعاء رسول الله ﷺ اللهم اعنی علی ذکرک وشکرک وحسن عبادتک " (ابن ابی الدنیا ، بیهقی ، درمنثور)

ابن منکدر فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ دعاء فرماتے تھے " اے اللہ اپنے ذکر اور اپنے شکر اور اپنی اچھی امداد پر میری امداد فرما۔

☆ " عن ابی الجلد قال قرأت فی مساء لة موسی علیه السلام انه قال یا رب کیف لی ان اشکرک واصغر نعمتک وضعتها عندی من نعمک لا یجازی بها عملی کله فاتاه الوحی ان یا موسی الآن شکرتنی " (اخرج احمد فی الزهد وابن ابی الدنیا والبیهقی ، درمنثور)

ابوالجلد کہتے ہیں موسیٰ علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا اے میرے رب میں تیرا شکریہ کیسے ادا کروں تیری نعمتوں کو چھوٹا (تھوڑا) کیسے سمجھوں تو نے تو مجھے اتنی نعمتیں عطاء کر رکھی ہیں کہ میرا کوئی عمل بھی ان کا بدل نہیں بن سکتا۔ تو آپ کے پاس وحی آئی اے موسیٰ تم نے اب میرا شکر ادا کر دیا۔ یعنی رب تعالیٰ کی نعمتوں کو ان گنت سمجھنا، اور رب تعالیٰ کی نعمتوں کا اعتراف کرنا اور اپنے آپ کو عاجز سمجھنا کہ میں کس طرح شکر کروں یہ بھی دل سے شکر ہے بلکہ یہ شکر بہت ہی کامل ہے۔

☆ " عن سلیمان التیمی قال ان الله عزوجل انعم علی العباد علی قدره وکلفهم الشکر علی قدرهم " (ابن ابی الدنیا ، بیهقی ، در منثور)

حضرت سلیمان التیمی فرماتے ہیں بیشک اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر ان کی قدر کے مطابق انعام فرمایا ہے اور ان کی قدر کے مطابق ہی ان کو شکر کرنے کا مکلف بنایا۔

☆ عن اسحاق بن عبد الله بن ابی طلحة ان رجلا کان یاتی النبی ﷺ فیسلم علیه فیقول النبی ﷺ یدعوله فجاء یوما فقال له النبی ﷺ کیف انت یا فلان قال بخیر ان

شکرت فسکت النبی ﷺ فقال الرجل یا نبی الله کنت تسألنی وتدعولی وانک سألتنی الیوم فلم تدع لی قال انی کنت اسألک فتشکر الله دانی سألتک الیوم فشککت فی والشکر" (ابن ابی الدنیا ، بیهقی ، در منثور)

اسحاق بن عبداللہ بن طلحہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور آپ کو سلام کرتے تھے حضور ان کے سلام کا جواب دینے کے بعد ان کیلئے دعا فرماتے تھے۔ایک دن وہ حاضر ہوئے نبی کریم ﷺ نے ان سے پوچھا اے فلاں تمہارا کیا حال ہے؟ انہوں نے عرض کیا بہتر حال ہے میں اس پر شکر گزار ہوں حضور خاموش ہوگئے وہ شخص عرض کرنے لگے اے اللہ کے نبی آپ مجھ سے سوال کرتے تھے اور میرے لئے دعا کرتے تھے آج آپ نے سوال کیا ہے دعا نہیں فرمائی؟ آپ نے فرمایا میں تم سے سوال کرتا تھا یعنی حال پوچھتا تھا تاکہ تم اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرسکو (دعا بھی اسی وجہ سے کرتا تھا) لیکن آج میں نے اسی وجہ سے تمہارا حال پوچھا تھا کہ میں دیکھ سکوں کیا واقعی تم اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بندے بن گئے ہو۔

☆ " عن ابی بکر الصدیق رضی الله عنه کان یقول فی دعائه اسألک تمام النعمة فی الاشیاء کلها والشکرلک علیها حتی ترضی وبعد الرضاء " (ابن ابی الدنیا ، درمنثور)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنی دعا میں عرض کرتے تھے اے اللہ میں تجھ سے تیری نعمتوں کی تمام اشیاء میں تکمیل طلب کرتا ہوں اور ان پر شکر گزار رہنے کی دعا کرتا ہوں تاکہ تو راضی ہوجائے اور تیری رضاء کے بعد بھی میں شکر گزار رہوں۔

☆" عن عامر قال الشکر نصف الایمان والصبر نصف الایمان والیقین الایمان کله "
(ابن ابی الدنیا ، بیهقی، درمنثور)

حضرت عامر کہتے ہیں شکر نصف ایمان ہے اور صبر نصف ایمان ہے اور یقین کامل ایمان ہے۔

☆ " عن سفیان بن عیینة قال قیل للزهری ما الزاهد قال من لم یغلب الحرام صبره ولم یمنع الحلال شکره " (ابن ابی الدنیا ، بیهقی ، درمنثور)

سفیان بن عیینہ کہتے ہیں حضرت زہری سے پوچھا گیا زاہد کی صفات کیا ہیں؟ تو آپ نے فرمایا وہ شخص جس کے صبر پر حرام غالب نہ آجائے اور حلال چیزیں اس کے شکر میں رکاوٹ نہ بنیں۔

☆ "عن ابی عبد الرحمن السلمی قال سئل الاستاذ ابو سهل محمد بن سلیمان الصعلوکی عن الشکر والصبر ایهما افضل فقال هما فی الاستواء فالشکر وظیفة السراء والصبر فریضة الضراء" (بیهقی ، در منثور)

ابوعبدالرحمٰن سلمی فرماتے ہیں استاذ ابوسہل محمد بن سلیمان صعلوکی سے سوال کیا گیا کہ شکر افضل ہے یا صبر؟ تو آپ نے فرمایا دونوں ہی اپنے اپنے مقام پر افضل ہیں کیونکہ نعمتوں کے حصول پر اور خوشی کے وقت شکر کرنا ضروری ہے اس وقت یقیناً شکر افضل ہوگا اور مصیبت کے وقت صبر کرنا ضروری ہے اس وقت یقینی بات ہے کہ صبر کرنا ہی افضل ہوگا۔

☆ "عن صهیب قال قال رسول اللہ ﷺ عجبا لامر المؤمن ان امر المؤمن کله خیر ان اصابته سراء فشکر کان خیرا وان اصابته ضراء فصبر کان خیرا"

(مسلم ، بیهقی ، درمنثور)

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن کا ہر کام باعث تعجب ہے اگر اسے خوشی حاصل ہو تو وہ شکر ادا کرے تو یہ بھی اس کے لئے خیر ہے اور اگر مصیبت پہنچے تو صبر کرے تو یہ بھی اس کے لئے خیر ہے۔

☆ "عن محمد بن کعب القرظی قال یا هؤلاء احفظوا ثنتین شکر النعمة واخلاص الایمان" (الخرائطی ، در منثور)

محمد بن کعب قرظی کہتے ہیں اے لوگو دو چیزوں پر ہمیشہ عمل جاری رکھو نعمت پر شکر کرنا اور ایمان میں خلوص۔

☆☆☆☆☆

﴿ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ ﴾

۱) ''اے ایمان والوصبر اور نماز سے مدد چاہو بے شک اللہ صابروں کے ساتھ ہے''

۲) اے ایمان والو مدد طلب کرو صبر اور نماز سے بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''

یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ : (اے ایمان والو)

" وصفهم بالایمان اثر تعداد ما یوجبه ویقتضیه تنشیطالهم وحثا علی مراعاة ما یعقبه من الامر " (ابو السعود)

ایمان والے کہہ کر پکارنے کی وجہ یہ ہے کہ جب مشکل احکام کا حکم دیا جاتا ہے تو ان کو پیار سے ''ایمان والو'' کہہ کر اس کام کو خوشی سے ادا کرنے پر چست کیا جاتا ہے اور احکام پر عمل کرنے کے لئے برانگیختہ کیا جاتا ہے۔

اِسْتَعِیْنُوْا : امداد طلب کرو " فی کل ما تأتون وما تذرون " امداد طلب کرو ہر اس کام میں جس کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ہر اس کام میں جس کے چھوڑنے کا حکم دیا گیا..... (ابوالسعود)

یہ عام معنی ان تمام خصوصی معانی کو شامل ہے:

" استعینوا بالصبر علی الذکر والشکر وسائر الطاعات من الصوم والجهاد وترک المبالاة بطعن المعاندین فی امر القبلة "

صبر سے امداد طلب کرو ذکر و شکر پر اور تمام طاعات پر خواہ روزہ ہو یا جہاد اور قبلہ کی تبدیلی کے معاملہ میں معاندین (مخالفین، عناد رکھنے والے) کے طعنوں کی کچھ پرواہ نہ کرتے ہوئے صبر سے امداد طلب کرو۔ (روح المعانی)

صبر کیا ہے: " الصبر الامساک فی ضیق " مشکلات میں، تنگی میں رک جانا۔

اصطلاح میں صبر کا معنی یہ ہے " والصبر حبس النفس علی ما یقتضیه العقل والشرع " اپنے آپ کو ان کاموں پر روکنا (یعنی وہ کام کرنا) جو عقل اور شریعت کے مطابق ہوں۔ (از مفردات راغب)

لیکن یہ خیال رہے کہ عقل شریعت کے تابع ہے شریعت کے خلاف عقل کے مطابق کام کرنا زندیقیت، یہودیت ونصرانیت ہے۔

صبر کی تین قسمیں ہیں:

(۱) "صبر علی ترک المحارم والمآثم" حرام کاموں اور گناہوں سے رکنے اور ان سے باز رہنے کو صبر کہا جاتا ہے سب سے پہلے اسی کا مقام بھی ہے کیونکہ ترک کفر پہلے ہے ایمان بعد میں۔

(۲) "صبر علی فعل الطاعات والقربات" نیکی اور قربت کے کاموں میں صبر کرنا یعنی نیکی کے کاموں میں مشقت کو برداشت کرنا یہی صبر عظیم ہے یہی مقصود ہے اسی پر اجر عظیم مرتب ہوتا ہے۔

(۳) "الصبر علی المصائب والنوائب" مصیبتوں اور تنگیوں میں صبر سے کام لینا اور برداشت کرنا۔ (ابن کثیر)

صبر صرف انسانوں کے ساتھ خاص کیوں؟

جانوروں کو صبر کا حکم اس لئے نہیں دیا گیا کہ وہ صرف شہوت رکھتے ہیں عقل نہیں رکھتے، اور فرشتوں کو صبر کا حکم اس لئے نہیں دیا گیا کہ وہ صرف عقل رکھتے ہیں شہوت نہیں۔

انسان چونکہ ابتداء میں حیوانوں کی طرح ہی ہوتا ہے اسے صرف کھانے، پینے کی خواہش ہوتی ہے تھوڑا بڑا ہوا تو کھیلنے کی خواہش پیدا ہوئی، بالغ ہوا تو خواہشات نفسانیہ (جماع وغیرہ کی خواہشات) کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ جس طرح انسان آہستہ آہستہ عمر کے مدارج طے کرتا جاتا ہے اسی طرح عقل میں بھی ترقی ہوتی چلی جاتی ہے اگرچہ بڑھاپے میں پھر اس میں کمی آ جاتی ہے۔

بالغ ہونے کے بعد خواہشات کا تقاضہ یہ ہوتا ہے وہ جلدی سے لذات کو حاصل کرے خواہ وہ ناجائز طریقہ سے ہی کیوں نہ حاصل ہوں۔ اس وقت عقل سے کام لینے کی ضرورت ہے کہ ان خواہشات سے باز رہ کر سعادت مندی حاصل کرے عقل کو خواہشات پر غلبہ حاصل ہو گیا تو صبر خود بخود حاصل ہو گیا اگر خواہشات عقل پر غالب آ گئیں تو اسی کا نام بے صبری ہے۔ (از عزیزی)

صبر کی تقسیم کا خوبصورت انداز:

صبر کی دو قسمیں ہیں بدنی اور نفسانی۔ بدنی کی پھر دو قسمیں ہیں فعلی اور انفعالی۔

صبر فعلی یہ ہے کہ مشکل کاموں پر عمل کرنا، یعنی اعمال شاقہ کو برداشت کرنا، اور ان پر عمل کرنا۔

صبر انفعالی یہ ہے کہ دکھ، درد، مصائب و آلام اور تکالیف کو برداشت کرنا اور ان پر صابر رہنا۔

صبر نفسانی یہ ہے کہ نفس کو اس کی طبیعت کے تقاضا سے دور رکھنا نفسانی خواہشات کا تقاضا ہی برائی کا ہوتا ہے اگر پیٹ اور فرج کو بری خواہشات سے روک رکھے تو اسے عفت کہا جاتا ہے۔ اگر زیادہ مال جمع کرنے کی حرص اور لالچ سے انسان اپنے آپ کو روک رکھے تو اسے زہد اور قناعت کہا جاتا ہے اگر جزع و فزع، آہ و فغاں، چیخ و پکار اور منہ پر طمانچے مارنے اور گریبان چاک کرنے اور کپڑے پھاڑنے سے مصیبت کے وقت باز رہے تو اسے عرف عام میں صبر کہا جاتا ہے جس کا نام صبر عرفی ہے۔

اگر غنی ہونے اور دولت مند ہونے کی صورت میں اپنے آپ کو تکبر سے بچا کر رکھے دوسروں کو پست سمجھنے اور اپنے آپ کو بلند سمجھنے سے بچا کر رکھے تو اس صبر کو فراخی حوصلہ کہتے ہیں۔

اگر میدان جنگ سے اپنے آپ کو بھاگنے سے بچا کر رکھے اور ثابت قدم رہے تو اس صبر کو شجاعت کہتے ہیں۔

اگر غیظ و غضب کی حالت میں کسی کو مارنے اور گالی دینے سے اپنے آپ کو روک کر رکھے تو اس صبر کو حلم کہتے ہیں۔

اگر کسی اہم کام میں اضطرار اور حیرانگی سے بچ کر رہے تو اس صبر کو بھی وسعت حوصلہ کہتے ہیں۔

اگر انسان کسی کے راز کو دوسروں پر ظاہر کرنے سے رک جائے تو اسے راز داری کہتے ہیں۔ صبر کی تمام قسمیں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر کرنا اور زیادہ نعمتوں کے حصول کا ذریعہ ہے۔
(عزیزی)

حقیقت صبر کیا ہے؟ حقیقت میں اسے صبر نہیں کہا جا سکتا کہ آدمی کو کسی مکروہ چیز کی کدورت حاصل نہ ہو یا مکروہ چیز حاصل ہو لیکن یہ مکروہ نہ سمجھے۔ بلکہ حقیقت میں صبر یہ ہے کہ انسان باوجود کدورت اور طبعی کراہیت کے جو عقل اور شرع کے منافی ہے اس پر جزع و فزع، چیخ و پکار سے اپنے آپ کو روک

رکھے۔ ہاں اگر تکالیف اور دکھ درد میں انسان کے بے اختیار آنسو نکل آئیں چہرے کا رنگ بے اختیار بدل جائے تو یہ صبر کے منافی (مخالف) نہیں۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کے اپنے بیٹے ابراہیم کی وفات کے وقت آنسو جاری تھے اور آپ یہ فرمارہے تھے " واللہ انا بفراقک یا ابراھیم لمحزونون " قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اے ابراہیم ہم تیرے فراق (موت) پر غمناک ہیں۔

اور آپ یہ فرمارہے تھے "ان العین تدمع و القلب یحزن و لا نقول الا ما یرضی ربنا " بیشک آنکھ آنسو بہارہی ہے اور دل غمناک ہے اور ہم وہی بات کہتے ہیں جس پر ہمارا رب راضی ہو۔ ہم رب تعالیٰ کی رضامندی کے خلاف کوئی بات نہیں کرتے۔

صرف غم اور ملال کا حاصل ہونا صرف آنسو بہانا لیکن جزع وفزع نہ کرنا اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے اسی قسم کی حالت کو یوں بیان کیا گیا ہے " وانما یرحم اللہ من عبادہ الرحماء "اللہ تعالیٰ اپنے رحم کرنے والے بندوں پر رحم فرماتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ غم اور پریشانی کا لاحق ہونا اور آنسو بہنا انسانی طاقت سے باہر ہے لہٰذا ان سے روکنا تکلیف مالا یطاق ہے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا﴾ اللہ تعالیٰ کسی نفس کو تکلیف نہیں دیتا سوائے اس کی طاقت کے"

(ماخوذ از عزیزی)

فضیلت صبر:

" الصابر علی البلاء یرفعه اللہ ثلا ثمائة درجة بین کل درجتین کما بین السماء والارض مرة والصابر علی دوام الطاعة یرفعه اللہ ستمائة درجة بین کل درجتین کما بین السماء والارض مرتین والصابر عن المعصیة یرفعه اللہ تسعمائة درجة بین کل درجتین کما بین السماء والارض ثلاث مرات "

مصیبت پر صبر کرنے والے شخص کے اللہ تعالیٰ تین سو درجات بلند فرماتا ہے ہر دو درجہ میں اتنی بلندی ہوتی ہے جیسے زمین وآسمان میں ایک مرتبہ کا فاصلہ ہے۔ اور طاعت پر ہمیشہ صبر کرنے والے کے اللہ تعالیٰ چھ سو درجات بلند فرماتا ہے ہر دو درجہ میں اتنی بلندی ہوتی ہے جتنی زمین وآسمان میں فاصلہ کی دو مرتبہ بلندی پائی جاتی ہے اور گناہوں سے رک کر صبر کرنے والے کے اللہ تعالیٰ نو سو درجات بلند فرماتا ہے ہر دو

درجہ کے درمیان اتنا فاصلہ اور بلندی ہوتی ہے جتنا زمین و آسمان کے درمیان فاصلہ تین مرتبہ پایا جائے۔ (صاوی)

اس سے واضح ہوگیا کہ سب سے اعلیٰ درجہ گناہوں سے رکنا ہے کیونکہ اس کے اوپر نیکیوں کا عمل مرتب ہے اور سب سے کم درجہ مصیبت پر صبر کرنا ہے۔ خیال رہے کہ ابن کثیر نے نیکیوں پر عمل کرنے کی فوقیت کا ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تاہم یہ خیال رہے کہ لوگوں کے ذہنوں میں صرف ایک صبر ہے جو سب سے کم درجہ کا صبر ہے اور جو اعلیٰ درجہ کے صبر ہیں ان کو بھولے ہوئے ہیں۔

☆ " قال عبد الرحمن بن زید بن اسلم الصبر فی بابین الصبر لله بما احب وان ثقل علی الانفس والابدان والصبر لله عما کره وان نازعت الیه الا هواء فمن کان هذا فهو من الصابرین الذی یسلم علیهم ان شاء الله " (ابن کثیر)

عبد الرحمٰن بن زید بن اسلم کہتے ہیں صبر کی دو قسمیں عظیم درجہ رکھتی ہیں اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے صبر کرے اس چیز پر جو رب تعالیٰ کو پسند ہے یعنی طاعت پر صبر کرے اگر چہ اس کے نفس اور بدن پر بوجھ بھی محسوس ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضاء کے حصول کے لئے ان چیزوں سے جو رب تعالیٰ کو ناپسند ہیں یعنی معصیت سے باز رہے اگر چہ اس کی خواہشات ان گناہوں سے رکنے پر رکاوٹ ہی کیوں نہ بنیں۔

جس شخص میں یہ دونوں قسم کے صبر پائے جائیں گے وہی صابرین سے ہوگا اور ان کو سلام کرے گا اگر اللہ نے چاہا۔

☆ " قال علی بن الحسین زین العابدین اذا جمع الله الاولین والآخرین ینادی مناد این الصابرون لیدخلوا الجنة قبل الحساب قال فیقوم عنق من الناس فتتلقاهم الملائكة فیقولون الی این یا بنی آدم فیقولون الی الجنة فیقولون وقبل الحساب قالوا نعم قالوا ومن انتم قالوا نحن الصابرون قالوا وما کان صبر کم قالوا صبرنا علی طاعة الله وصبرنا عن معصیة الله حتی توفانا الله قالوا انتم کما قلتم ادخلوا الجنة فنعم اجر العاملین " (ابن کثیر)

حضرت علی بن حسین زین العابدین فرماتے ہیں جب اللہ تعالیٰ اولین و آخرین کو جمع فرمائے گا تو نداء دینے والا نداء دے گا صبر کرنے والے کہاں ہیں کہ وہ حساب سے پہلے ہی جنت میں داخل

ہو جائیں آپ فرمائے کچھ لوگ کھڑے ہوں گے فرشتے ان کو ملیں گے ان سے پوچھیں گے اے لوگو کہاں جا رہے ہو؟ وہ کہیں گے جنت میں جا رہے ہیں فرشتے کہیں گے کیا حساب سے پہلے ہی جنت میں جا رہے ہو؟ وہ کہیں گے ہاں فرشتے ان سے پوچھیں گے تم کون ہو؟ وہ کہیں گے ہم صبر کرنے والے ہیں فرشتے ان سے پوچھیں گے تمہارا صبر کیا ہے؟ وہ کہیں گے ہم اللہ تعالیٰ کی طاعت پر صبر کرتے رہے اور گناہوں سے صبر کرتے رہے یعنی گناہوں سے بچتے رہے ہم اسی حال میں رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں فوت کر دیا فرشتے کہیں گے ہاں واقعی تم ایسے ہی تھے جیسے کہہ رہے ہو لہٰذا اب تم جنت میں داخل ہو جاؤ۔ پس اچھا عمل کرنے والوں کا اجر اچھا ہے۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ حضرت زین العابدین رحمہ اللہ کی اس روایت کو رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی سے تائید حاصل ہے:

﴿ اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴾

''صبر کرنے والوں کو اجر بغیر حساب کے دیا جائے گا'' (ابن کثیر)

وَالصَّلٰوةِ : اور نماز (سے امداد طلب کرو) ابھی تک صبر کی جو بحث کی گئی اس میں تمام طاعات کا ذکر ہو چکا ہے لیکن پھر نماز کا اس کے بعد ذکر کرنا اس وجہ سے ہے " **خصها بعد التعميم لرفعة شانها فانها ام العبادات جامعة للطاعات معراج للمؤمن** " کہ یہ تخصیص بعد از تعمیم ہے (عمومی طور پر اگرچہ پہلے نماز کا ذکر ہو چکا ہے لیکن اب خصوصی طور پر ذکر کیا جا رہا ہے) تاکہ نماز کی شان کی بلندی واضح ہو جائے کیونکہ یہ تمام عبادات کی اصل ہے اور تمام طاعات کی جامع ہے اور مومن کی معراج ہے۔

☆ " **عن علی مرفوعا الصلوة عماد الدين** " (رواه صاحب مسند الفردوس)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ نماز دین کا ستون ہے۔

☆ " **وعن انس مرفوعا الصلوة نور المؤمن** " (رواه ابن عساكر)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ نماز مومن کا نور ہے۔

" **قال المجدد رضی الله عنه غاية مقامات العابدين حقيقة الصلوة والترقی هناک بكثرة الصلوة** "

''مجدد رحمہ اللہ نے فرمایا عابدین کے مقام کی انتہاء حقیقت نماز ہے اور کثرت نماز سے

اس مقام سے ترقی حاصل ہوتی ہے"۔ (مظہری)

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ : "بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے"۔

اللہ تعالیٰ تو ہر شخص کے ساتھ ہے تو صبر کرنے والوں کے ساتھ ہونے کا کیا مطلب ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں مراد معیت (سنگت) خاصہ ہے یعنی **بالعون والنصر والاجابة** "یعنی معاونت اور نصرت اور دعا کی قبولیت کی معیت اللہ تعالیٰ کی صبر کرنے والوں کو حاصل ہے۔

قاضی محمد ثناء اللہ مظہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

" **قلت بل معية غير متكيفة يتضح على العارفين ولا يدرك كنهه غير احسن الخالقين** "

اس معیت کی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی یہ تو صرف عارفین، اولیاء اللہ یعنی اللہ والے ہی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے بلکہ اللہ والوں کی پہچان بھی ظاہری ہے اس معیت کی حقیقت کا ادراک سوائے اللہ تعالیٰ احسن الخالقین کے کوئی نہیں جانتا۔ (مظہری)

جب پہلے دو چیزوں کا ذکر ہے "صبر اور نماز" تو صرف ﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾ کہا گیا ہے لیکن " **ان الله مع المصلين** " نہیں کہا گیا اس کی کیا وجہ ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے " **لانه اذا كان مع الصابرين كان مع المصلين من باب اولى لاشتمال الصلوة على الصبر** " کہ بیشک جب اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے تو نماز ادا کرنے والوں کے ساتھ بھی ہے یقینی طور پر، چونکہ نماز کا ذکر صبر میں آچکا تھا کہ نماز صبر اور تمام عبادات پر مشتمل ہے۔ (سورۃ فاتحہ کی وضاحت میں نجوم الفرقان کو دیکھیں) تو علیحدہ ذکر نہیں کیا۔ (از روح المعانی)

طلباء کرام یہ نہ سمجھیں کہ اس جواب میں تو تعارض ہے کہ امداد طلب کرنے میں تو صبر اور نماز کو علیحدہ ذکر کر دیا گیا تو معیت کے ذکر میں علیحدہ ذکر نہیں کیا اس کی وجہ کیا ہے؟ وجہ واضح ہے کہ نماز کی اہمیت کے لحاظ سے علیحدہ ذکر کیا گیا لیکن جب ایک مرتبہ ذکر کر دیا دوبارہ جب صبر سے نماز کا ذکر سمجھ آرہا تھا تو علیحدہ ذکر نہیں کیا۔

﴿ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴾

۱) ''اور جو خدا کی راہ میں مارے جائیں انہیں مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں ہاں تمہیں خبر نہیں''

۲) ''اور نہ کہو جو اللہ کی راہ میں شہید کردیئے گئے ان کو مردہ بلکہ وہ زندہ ہیں اور لیکن تمہیں شعور نہیں''

شان نزول: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد گرامی یہ ہے کہ " نزلت الآیة فی قتلی بدر " یہ آیۃ بدر میں شہید ہونے والوں کے حق میں نازل ہوئی۔ بدر میں چودہ مسلمان شہید ہوئے چھ مہاجرین سے اور آٹھ انصار سے۔

مہاجرین شہداء کے اسماء گرامی: عبیدہ بن حارث بن عبد المطلب اور عمرو بن ابی وقاص اور ذوالشمالین اور عمرو بن نفیلہ اور عامر بن بکر اور مہجع بن عبداللہ۔

انصار شہداء کے اسماء گرامی: سعید بن خثیمہ اور قیس بن عبد المنذر اور زید بن حارث اور تمیم بن ہمام اور رافع بن معلٰی اور حارثہ بن سراقہ اور معوذ بن عفراء اور عوف بن عفراء۔

لوگ جب ان شہداء کا تذکرہ کرتے تو یہ کہتے ''مات فلان، مات فلان'' فلاں فوت ہوگیا فلاں فوت ہوگیا۔ اسی طرح کافر اور منافق لوگ کہنے لگے " ان الناس یقتلون انفسهم طلبا لمرضاة محمد من غیر فائدة " کہ یہ مسلمان بغیر کسی مقصد اور فائدہ کے صرف محمد کو راضی کرنے کے لئے اپنے آپ کو قتل کرا رہے ہیں "فنزلت هذه الآیة " تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی کہ تم ان کو مردہ نہ کہو وہ تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان قربان کر کے حیات جاودانی (ہمیشہ کی زندگی) پاگئے۔ (از کبیر)

اور یہ بھی واضح ہوگیا کہ نبی کریم ﷺ کی رضاء کو حاصل کرنے والوں کو بے فائدہ کام کرنے والے کہنا کافروں اور منافقوں کا کام ہے۔

فضیلت شہادت:

''عن ابی قتادة عن رسول اللہ ﷺ انه قام فیهم فذکر لهم ان الجهاد

فی سبیل اللہ والایمان باللہ افضل الاعمال فقام رجل فقال یا رسول اللہ ارأیت ان قتلت فی سبیل اللہ اتکفر عنی خطایای فقال رسول اللہ ﷺ نعم ان قتلت فی سبیل اللہ وانت صابر محتسب مقبل غیر مدبر الا الدین فان جبرئیل علیہ السلام قال لی ذلک "

(مسلم ج ۲ ص ۱۴۳ باب من قتل فی سبیل اللہ کفرت خطایاہ الا الدین)

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ صحابہ کرام میں کھڑے ہوئے ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے اور رب تعالیٰ پر ایمان لانے کی فضیلت بیان فرمائی۔ ایک صحابی کھڑے ہوئے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کیا فرماتے ہیں کہ اگر میں اللہ کی راہ میں شہید ہو جاؤں کیا میرے گناہ مٹا دیئے جائیں گے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہاں اگر تمہیں اللہ کی راہ میں شہید کر دیا گیا ایسے حال میں کہ تم نے صبر اور خلوص سے جہاد کیا دشمن کے سامنے رہے پیٹھ پھیر کر نہ بھاگے (تو تمہارے تمام گناہ مٹا دیئے جائیں گے) سوائے قرض کے بیشک جبریل نے مجھے ابھی آ کر بتایا۔

وضاحت حدیث: " فیہ ھذہ الفضیلۃ العظیمۃ للمجاھد وھی تکفیر خطایاہ کلھا الا حقوق الآدمیین "

اس حدیث پاک میں اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کی عظیم فضیلت ذکر کی گئی کہ اس کے تمام گناہ مٹا دیئے جائیں گے لیکن لوگوں کے حقوق معاف نہیں ہوں گے۔

لیکن یہ فضیلت ان شرائط سے مشروط ہے ایک تو یہ کہ وہ جہاد کرنے میں صابر ہو مضطرب ہو کر ادھر ادھر بھاگتا نہ پھرے۔

اور دوسری شرط یہ ہے کہ وہ محتسب ہو۔ اس مقام پر محتسب کا معنی یہ بیان کیا گیا ہے " ھو المخلص للہ تعالیٰ " کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء حاصل کرنے کے لئے خلوص سے جہاد کرے۔

اسی سے یہ مسئلہ خود بخود واضح ہو گیا کہ " فان قاتل لعصبیۃ او لغنیمۃ او لصیت او نحو ذلک فلیس لہ ھذا الثواب ولا غیرہ " اگر کسی شخص نے خاندانی تعصب کے طور پر جہاد میں حصہ لیا۔ یا مال غنیمت حاصل کرنے کے لئے جہاد میں شریک ہوا۔ یا شہرت اور چرچا حاصل کرنے کے لئے یا اور اس قسم کے مقاصد حاصل کرنے کے لئے جہاد میں شریک ہوا جن میں خلوص نہیں پایا گیا تو

وہ ثواب سے محروم رہے گا۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا " اِلَّا الدَّیْنَ " (سوائے قرض کے) ففیه تنبیه علی جمیع حقوق الآدمیین وان الجهاد والشهادة وغیرهما من اعمال البر لا یکفر حقوق الآدمیین وانما تکفر حقوق الله تعالیٰ " اس سے آپ نے اس مسئلہ کی طرف متنبہ کیا کہ انسانوں کے تمام حقوق کسی عبادت سے معاف نہیں ہوتے خواہ جہاد ہو اللہ کی راہ میں، خواہ شہادت حاصل کرلے خواہ اور نیکی کا کوئی کام کرے ہاں البتہ اللہ تعالیٰ اپنے حقوق معاف فرمادیتا ہے۔

صحابی کے سوال میں ابتدائی طور پر مطلقاً "نعم" (ہاں تمام گناہ مٹ جائیں گے) فرمایا لیکن رب تعالیٰ نے جبریل کو بھیج کر بتایا کہ یا رسول اللہ آپ انکو بتادیں کہ حقوق العباد میں کسی عبادت سے معاف نہیں کروں گا۔ وہ حقوق ادا کرکے میرے پاس آئیں نہیں تو پھر ایک اور حدیث میں بیان کردیا گیا ہے کہ حساب کے وقت قیامت کے دن اس شخص کی نیکیاں اسے دی جائیں گی جس کا حق اس نے ادا نہیں کیا تھا اگر نیکیاں دینے سے بھی حق ادا نہ ہوا تو اس شخص کے گناہ اس پر ڈال دیئے جائیں گے جس نے حق دبایا ہوا تھا۔

☆ " عن مسروق قال سألنا عبد الله عن هذه الآیة ﴿ ولا تحسبنّ الّذین قُتلوا فی سبیل الله امواتا بل احیاء عند ربهم یرزقون ﴾ قال اما انا قد سألنا عن ذلک فقال ارواحهم فی جوف طیر خضرلها قنادیل معلقة بالعرش تسرح من الجنة حیث شاء ت ثم تاوی الی تلک القنادیل فاطلع الیهم ربهم اطلاعة فقال هل تشتهون شیأ قالوا أیّ شئی نشتهی ونحن نسرح من الجنة حیث شئنا ففعل ذلک بهم ثلاث مرات فلما رأوا انهم لن یترکوا من ان یسألوا قالوا یا رب ان ترد ارواحنا فی اجسادنا حتی نقتل فی سبیلک مرة اخری فلما رای ان لیس لهم حاجة ترکوا " (مسلم ج ۲ ص ۱۳۳ باب فی بیان ارواح شهداء فی الجنة الخ)

حضرت مسروق کہتے ہیں ہم نے سوال کیا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس آیۃ کریمہ کے متعلق (ترجمہ) (اور ہرگز ہرگز گمان نہ کروان لوگوں کو جو اللہ کی راہ میں شہید کردیئے گئے کہ وہ مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے ہاں ان کو رزق دیا جاتا ہے) انہوں نے کہا بیشک ہم نے اس کا سوال (نبی کریم ﷺ سے) کیا تھا تو آپ نے فرمایا ان کی روحیں سبز رنگ کے پرندوں کے قالب میں رکھی

جائیں گے جن کی قنادیل عرش سے معلق ہوں گی وہ جنت کے پھل کھانے کے لئے جہاں چاہیں گے سیر کریں گے پھر وہ اپنی قندیلوں میں آ جائیں گے تو رب تعالیٰ ان پر جلوہ گری فرمائے گا اور ارشاد فرمائے گا کیا تم کسی چیز کی خواہش رکھتے ہو تو وہ کہیں گے ہمیں اب کسی اور چیز کی خواہش کیا ہونی ہے جب کہ جنت سے منافع ہم حاصل کر رہے ہیں جہاں چاہتے ہیں ہم جاتے ہیں اسی طرح ان سے تین مرتبہ سوال و جواب ہونا ہے۔ جب وہ دیکھیں گے کہ ہم سے بار بار سوال کیا جا رہا ہے ہمیں جواب دینا ہی چاہئے تو وہ عرض کریں گے اے اللہ ہماری روحوں کو ہمارے جسموں میں لوٹا دے تا کہ ہم تیری راہ میں پھر شہید ہو جائیں۔ جب رب تعالیٰ دیکھے گا کہ ان کو کسی چیز کی اب کوئی حاجت نہیں تو ان کو اسی حال میں چھوڑ دیا جائے گا۔

وضاحت حدیث : مسلم شریف کے بعض نسخوں میں ''عبداللہ بن مسعود'' ہے یعنی مسروق نے سوال عبداللہ بن مسعود سے کیا اسی طرح بعض نسخوں میں ہے '' **انا قد سألنا عن ذلک فقال یعنی النبی ﷺ** '' بیشک ہم نے اس کے متعلق سوال کیا تھا یعنی نبی کریم ﷺ سے (راقم نے اسی وجہ سے ترجمہ اسی کے مطابق کیا)

'' وفیہ بیان ان الجنۃ مخلوقۃ موجودۃ وھو مذھب اھل السنۃ وھی التی اھبط منھا آدم وھی التی ینعم فیھا المؤمنون فی الآخرۃ ھذا اجماع اھل السنۃ ''

اس حدیث پاک سے یہ روز روشن کی طرح عیاں ہوا کہ بیشک جنت کی تخلیق ہو چکی ہے اور وہ اب بھی موجود ہے یہی مذہب اہل سنت کا ہے اور یہی وہ جنت ہے جس سے آدم علیہ السلام کو اتارا گیا اور یہی وہ جنت ہے جس میں مومن لوگوں کو آخرت میں نعمتوں سے نوازا جائے گا اسی پر اہل سنت کا اجماع ہے۔

معتزلہ اور بعض بدعتی لوگوں نے کہا کہ جنت اب موجود نہیں وہ جنت جو مومنوں کو حاصل ہونی ہے وہ قیامت کے بعد پیدا کی جائے گی اور جس جنت سے آدم علیہ السلام کو نکالا گیا وہ اور ہے۔ ''وظواھر القرآن والسنۃ تدل لمذھب اھل الحق '' قرآن پاک کی ظاہر اور روشن آیات اور

احادیث مبارکہ اہل حق کے مذہب پر دلالت کر رہی ہیں۔ ان شاء اللہ حق کا ہی بول بالا رہے گا باطل مٹ کر رہے گا۔ معتزلہ اور بدعتی لوگوں سے بھی چند قدم آگے یہود ونصاریٰ کے پروردہ لوگ نکل گئے معتزلہ اور بدعتی لوگوں نے دنیاوی زندگی تک شہداء کے مرتبہ کو کم کرنے کی کوشش کی نہ ابھی تک کوئی جنت ہے اور نہ ہی شہداء کو قیامت سے پہلے جنت سے کوئی فائدہ حاصل ہونا ہے۔ یہ قول بھی احادیث مبارکہ کا صریح طور پر انکار ہے لیکن یہودیوں اور نصرانیوں کے یاروں نے مکمل طور پر جنت کا انکار کر دیا۔ انہوں نے آخرت کے تصور کو ہی (معاذ اللہ) باطل قرار دیا۔ اور قبر کے عذاب کا بھی انکار کیا تاکہ مسلمانوں کے دلوں سے جذبہ جہاد کو نکال دیا جائے اور شوق شہادت سے مومنوں کے دلوں کو خالی کر دیا جائے جب آخرت اور قبر کے عذاب کا ڈر کسی کو حاصل نہیں ہوگا تو وہ من مانیاں کرتا رہے گا اس کو عیاشی کا کھلا موقع مل جائے گا یہی لوگ ملک وملت کے دشمن ہیں۔

قیامت سے پہلے عذاب وثواب: "وفیه اثبات مجازاة الاموات بالثواب والعقاب قبل القیامة" اسی حدیث پاک سے یہ سمجھ آ گیا کہ مردہ لوگوں کو قیامت سے پہلے بھی ثواب عطا ہوگا اور اسی طرح قیامت سے پہلے کچھ لوگوں کو عذاب ہوگا۔ ثواب پر تو رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی جس کا ذکر اس حدیث میں ہے ﴿ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴾ دلالت کر رہا ہے۔

" واما غیرهم فانما یعرض علیه مقعده بالغداة والعشی کما جاء فی حدیث ابن عمرو کما قال فی آل فرعون النار یعرضون علیها غدوا وعشیا "

لیکن مومنین کے بغیر کفار کو ان کا جہنم والا مقام صبح وشام قیامت سے پہلے پیش کیا جائے گا جیسا کہ حدیث ابن عمرو میں واضح ہے اور صریح طور پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی جو کہ آل فرعون کے متعلق ہے دلالت کر رہا ہے ﴿ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ﴾ ان پر صبح وشام آگ کو پیش کیا جائے گا۔ کیونکہ قیامت کے بعد کا ذکر ان الفاظ مبارکہ کے بعد ہے ﴿ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْا آلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴾ اور جس دن قیامت قائم ہوگی (فرشتوں سے کہا جائے گا) آل فرعون کو سخت عذاب میں داخل کر دو۔ (نووی زیر حدیث مذکور)

تنبیه: اسی مضمون کی احادیث میں الفاظ مختلف ہیں مسلم میں ہے " فی جوف

طیر خضر " اور مسلم کے بغیر باقی احادیث کی کتب میں بعض جگہ " لطیر خضر " اور بعض احادیث میں "بحواصل طیر" ہے " جوف " کا معنی پیٹ" حواصل " کا معنی پوٹے ان تمام کا معنی صدر الافاضل حضرت مولنا نعیم الدین مراد آبادی رحمہ اللہ نے خوبصورت کیا (سبز پرندوں کے قالب میں ہوں گی)البتہ حدیث قتادہ میں " فی صورۃ طیر ابیض " ہے سفید پرندے کی صورت میں۔ممکن ہے بعض روحیں سفید پرندوں کی شکل کے قالب میں ہوں اور بعض سبز پرندوں کی شکل کے قالب میں ہوں۔

اعتراض : یہ تو تناسخ ہے کہ اچھی صورتوں میں روحوں کو منتقل کرنا اور ان کو نعمت و راحت پہنچانا۔اور بری صورتوں میں منتقل کرنا اور ان کو عذاب دینا جب یہ مذہب ملحدین کا ہے اور باطل ہے تو حدیث شریف کا مطلب کیا ہے۔

جواب اول: تناسخ یہاں کیسے لازم ہے جب کہ حدیث شریف میں صراحۃً یہ بھی موجود ہے "حتی یرجعه الله الی جسده یوم یبعثه یعنی یوم یجئی بجمیع الخلق و الله اعلم " کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جب سب مخلوق کو اٹھائے گا تو شہداء کی ارواح اپنے اپنے جسموں سے مل جائیں گی۔

جواب دوم: موطا امام مالک میں ہے " انما نسمة المؤمن طیر " مومن کے نسمہ کو پرندے کی شکل دے دی جائے گی " والنسمة تطلق علی ذات الانسان جسما وروحا وتطلق علی الروح مفردة وهو المراد بها " نسمہ انسان کے جسم اور روح کے مجموعہ کو بھی کہتے ہیں اور فقط روح کو بھی کہا جاتا یہاں فقط روح مراد ہے موطأ امام مالک کی حدیث اور علامہ نووی کی وضاحت کے بعد واضح ہوا کہ شہداء کی ارواح کو ہی سبز رنگ کے پرندوں کی شکل دے دی جائے گی جو جنت کی سیر کریں گی بظاہر یوں محسوس ہوگا کہ شہداء کی روحیں پرندوں کے قالب میں ہیں اس جواب سے تمام احادیث میں تطبیق ہو جائے گی۔ (ماخوذ از نووی بتغیر)

جواب سوم: معترضین کا اعتراض ہی غلط ہے کیونکہ وہ تناسخ کے معنی کو ہی نہیں سمجھے کہ تناسخ والوں کا کہنا کیا ہے؟ " من قالوا بالتناسخ فیقولون ان نفس زید مثلا اذا مات زید تنتقل بعینه الی بدن المولود کعمرو " (حاشیہ میر زاہد ص ۱۱۷) تناسخ کا مذہب رکھنے والے یہ کہتے ہیں کہ زید کی روح جب تک زید میں ہے اس وقت تک اسے زندہ رکھی ہوئے ہے اور اس کی نشو و نما کا سبب ہے جب

زید مر جائے گا تو زید کے بدن سے روح کا تعلق ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا پھر وہ روح زید کی طرف نہیں لوٹے گی بلکہ وہ روح عمرو کے پیدا ہونے پر عمرو کے جسم کی طرف منتقل ہو جائے گی اس طرح ایک روح ہزاروں بدنوں کی طرف منتقل ہوتی رہے گی ۔ یہ بھی ضروری وہ نہیں سمجھتے کہ روح انسان کسی دوسرے انسان کی طرف ہی منتقل ہو جائے بلکہ ان کے نزدیک عام ہے کہ روح انسان کسی گدھے یا کتے یا خنزیر کے بدن میں منتقل ہو جائے ۔ یہ لوگ ملحدین ہیں جن کے نزدیک قیامت نے نہ آنا ہے اور نہ ہی کوئی حساب وکتاب ہے اور نہ ہی کوئی ثواب وعذاب ہے ان کے نزدیک انسان کی روح انسان میں منتقل ہو جائے تو یہی ثواب ہے اور انسان کی روح کتے یا خنزیر میں منتقل ہو جائے تو یہی عذاب ہے ۔

تناسخ کا معنی سمجھنے کے بعد حدیث پاک کا مطلب واضح ہو گیا کہ شہداء کی روحوں کو سبز پرندوں کی شکل دی جائے گی ۔ یا ان کے قالب میں بطور اعزاز منتقل کیا جائے گا وہ حقیقی پرندے نہیں ہوں گے ان کی کیفیت کو رب تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے پھر ہر ایک شہید کی روح قیامت کے دن اسی کے جسم سے منتقل ہو جائے گی ۔

راقم کی وضاحت کو علامہ نووی کی اس عبارت میں دیکھیں جو اسی حدیث کے ضمن میں ہے :

" وشبهه بعض الملحدة القائلين بالتناسخ وانتقال الا رواح وتنعيمها
فی الصور الحسان المرفهة وتعذيبها فی الصور القبيحة المسخرة
وزعموا ان هذا هو الثواب والعقاب وهذا ضلال بين وابطال لما
جاء ت به الشرائع من الحشر والنشر والجنة والنار " (نووی)

بعض ملحد (بے دین) لوگوں نے حدیث پاک کو تناسخ سے تشبیہ دی ہے حالانکہ ان کے نزدیک تناسخ روح کا انتقال اور اچھی صورت میں منتقل ہونا اسے راحت ونعمت دیا جانا ثواب ہے اور روح کا بری اور مسخر صورتوں میں منتقل ہونا عذاب ۔

لیکن یہ ان کا قول واضح طور پر گمراہی ہے کیونکہ اس میں حشر ونشر اور جنت ودوزخ کو باطل کرنا اور انکار کرنا لازم آتا ہے جس کا ثبوت شریعت سے روز روشن کی طرح واضح ہے ۔

☆ " عن جابر قال رجل این انا یا رسول اللہ ان قتلت قال فی الجنة فالقی تمرات کن فی یده ثم قاتل حتی قتل وفی حدیث سوید قال رجل للنبی ﷺ یوم احد "

(مسلم ج ۲ ص ۱۴۱ باب ثبوت الجنة للشهید)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ اگر میں شہید کر دیا جاؤں تو کہاں ہوں گا؟ آپ نے فرمایا جنت میں تو اس صحابی نے اپنے کے ہاتھ سے کھجوروں کو ڈال دیا، قتال (جہاد) کیا یہاں تک کہ شہید ہو گئے حضرت سوید کی روایت کردہ حدیث میں ہے کہ یہ واقع احد کا ہے۔

فوائد: " فیه ثبوت الجنة للشهيد " اس حدیث پاک سے ثابت ہوا کہ شہید کے لئے جنت ثابت ہے جو اسے شہید ہوتے ہی حاصل ہو جائے گی۔ ابتدائی طور پر روح جنت میں سیر کرے گی اور اسے جنت کے منافع حاصل ہوں گے لیکن روح کا تعلق جسم سے بھی برقرار رہے گا جس طرح سورج کی شعاعوں کا تعلق زمین سے ہوتا ہے۔

" وفيه مبادرة بالخير " اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ نیکی کے کام میں جلدی کرنی چاہئے کیونکہ صحابی جنت کا ذکر سنتے ہی بغیر کسی تاخیر کے میدان قتال میں پہنچ گئے۔ " وانه لا يشتغل عنه بحظوظ النفس " اور یہ سمجھ آیا کہ انسان نیکی کے مقابل اپنے ذاتی منافع کو چھوڑ دے، کیونکہ وہ صحابی کھجوریں کھا رہے تھے لیکن نبی کریم ﷺ سے شہادت کی فضیلت سن کر کھجوریں ہاتھ سے نکال دیں۔ گویا کہ یہ کہتے ہوئے میدان جنگ میں کود پڑے کہ منصب عظیم اگر حاصل ہو گیا تو بہتر لیکن اگر شہادت جیسا عظیم منصب نہ حاصل ہوا تو کھجوریں کھانے کا وقت بہت ہے۔

جنت تلواروں کے سایہ میں:

" عن ابی بکر بن عبد الله بن قیس عن ابیه قال سمعت ابی وهو بحضرة العد ويقول قال رسول الله ﷺ ان ابواب الجنة تحت ظلال السيوف فقام رجل رث الهيئة فقال ياابا موسى انت سمعت رسول الله ﷺ يقول هذا قال نعم قال فرجع الى اصحابه فقال اقرأ عليكم السلام ثم كسر جفن سيفه فالقاه ثم مشى بسيفه الى العدو فضرب به حتى قتل "

(مسلم ج ۲ ص ۱۴۷ باب ثبوت الجنة للشهيد)

ابو بکر بن عبد اللہ بن قیس اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ سے یہ کہتے ہوئے سنا جب وہ دشمن کے سامنے حاضر تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک جنت کے دروازے تلواروں کے سائے میں ہیں (یعنی شہید ہونا جنت میں جانے کا ذریعہ ہے) ایک شخص کھڑے ہوئے جو

پراگندہ حال میں تھے (یعنی پھٹے پرانے کپڑے، بال بکھرے ہوئے) وہ کہنے لگے اے موسیٰ واقعی تم نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ انہوں نے کہا ہاں تو وہ شخص اپنے اصحاب کے پاس آنے اور کہا کہ میں تمہیں سلام کہتا ہوں پھر تلوار کے نیام کو توڑ کر پھینک دیا۔ پھر اپنی تلوار لے کر دشمن میں گھس گئے ان کو مارا یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔

سبحان اللہ صحابہ کرام کا کتنا پختہ ایمان تھا کتنی زیادہ محبت تھی رسول اللہ ﷺ سے ادھر فرمان مصطفوی کی آواز کانوں میں پہنچی ادھر جان کی بازی لگا دی۔ جان قربان کرنے سے کفار کو سرنگوں کیا جا سکتا ہے آجکل کافر کی ذرا سی دھمکی پر مسلمانوں کے حکام کانپنا شروع ہو جاتے ہیں۔

☆ "عن قتادة قال سمعت انس بن مالک یحدث عن النبی ﷺ قال ما من احد یدخل الجنة یحب ان یرجع الی الدنیا و ان له ما علی الارض من شئی غیر الشهید فانه یتمنی ان یرجع فیقتل عشر مرات لما یری من الکرامة"

(مسلم ج ۲ ص ۱۴۲ باب فضل الشهادة فی سبیل الله)

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے نبی کریم ﷺ کی حدیث بیان کرتے ہوا سنا آپ نے فرمایا کوئی شخص جنت میں داخل ہو کر دنیا میں لوٹنا پسند نہیں کرے گا اور نہ ہی زمین میں کسی چیز کو پسند کرے گا سوائے شہید کے، وہ تمنا کرے گا کہ میں دنیا میں لوٹ جاؤں پھر شہید کر دیا جاؤں اس طرح دس مرتبہ مجھے شہادت حاصل ہو جائے کیونکہ وہ شہادت کی وجہ سے کرامت (عزت) دیکھ چکا ہوگا۔

نبی کریم ﷺ کی تمنائے شہادت:

"عن ابی هریرة قال قال رسول الله کل کلم یکلمه المسلم فی سبیل الله ثم تکون یوم القیامة کهیئتها اذا طعنت تفجر دما اللون لون دم والعرف (بالفتح) عرف المسک وقال رسول الله ﷺ والذی نفس محمد بیده لو لا ان اشق علی المؤمنین ما قعدت خلف سریة تغزو فی سبیل الله ولکن لا اجد سعة فاحملهم ولا یجدون سعة فیتبعونی ولا تطیب انفسهم ان یقعدوا بعدی"

(مسلم ج ۲ ص ۱۴۱ باب فضل الجهاد والخروج فی سبیل الله)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر وہ زخم جو مسلمان کو اللہ تعالیٰ

کی راہ میں آئے قیامت کے دن اس کو ایسی ہیئت (شکل) حاصل ہوگی جیسے اس پر نیزہ چلایا گیا ہو اور خون بہہ رہا ہو۔ رنگ خون کی طرح ہوگا، خوشبو کستوری کی طرح ہوگی اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد کی جان ہے اگر میں مومنوں پر مشکل نہ سمجھتا تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں کی جانے والی کسی جنگ میں، میں پیچھے نہ رہتا لیکن اس میں مشکل یہی ہے کہ میرے جانے پر صحابہ بھی میری تابعداری کریں گے ان کو یہ پسند نہیں آئے گا کہ وہ پیچھے رہیں لیکن تمام کو شریک ہونے کی وسعت بھی حاصل نہیں ہوگی۔

فوائد : حدیث پاک سے حاصل ہوا:'' **ان الشهيد لا يزول عنه الدم بغسل ولا والحكمة في مجيئه يوم القيامة على هيئته ان يكون معه شاهد فضيلته وبذله نفسه في طاعة الله تعالى** '' شہید کے خون کو غسل وغیرہ سے زائل نہیں کیا جائے گا اس میں یہ حکمت ہے کہ قیامت کے دن وہ اسی حالت پر اٹھایا جائے گا اس کی یہ حالت اس کی فضیلت اور اللہ کی اطاعت میں اس کے اپنی جان کو قربان کرنے پر گواہ بن جائے۔

اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ کسی بات کو پختہ کرنے کے لئے سچی قسم اٹھانا جائز ہے جس طرح اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے قسم اٹھائی ارشاد فرمایا'' **والذی نفس محمد بیده** '' قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔

اور اس حدیث پاک سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ نبی کریم ﷺ مسلمانوں پر شفقت اور مہربانی فرماتے تھے یعنی آپ شفیق اور رؤف تھے '' **وانه كان يترك بعض ما يختاره للرفق للمسلمين** '' کہ آپ مسلمانوں پر رحمت اور نرمی فرماتے ہوئے بعض کام جو آپکو پسند ہوتے ان کو چھوڑ دیتے۔

فرض کفایہ جہاد میں شریک ہونے سے بہتر یہ ہے کہ مسلمانوں کو مشقت سے بچانے کے فرض عین پر عمل کیا جائے۔

'' **وانه اذا تعارضت المصالح بدأ باهمها** '' اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ جب نیکی کیلئے دو کام آمنے سامنے ہوتے تو آپ اسے اختیار فرماتے جس کی زیادہ ضرورت اور اہمیت ہوتی۔

اور مسئلہ یہ ہے کہ '' **مراعة الرفق بالمسلمين والسعى فى زوال المكروه والمشقة**

عنهم " مسلمانوں کے معاملات میں ان سے رعایت کرنا اور مسلمانوں کی مشقت کو زائل کرنے میں اور مسلمانوں کی تکالیف کو دور کرنے کی مکمل کوشش کرنا رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے۔

اور یہ فائدہ حاصل ہوا " وفیہ فضیلۃ الشھادۃ والغزو " کہ شہادت اور جہاد میں شریک ہونے سے بہت بڑی فضیلت حاصل ہوتی ہے۔

" وفیہ تمنی الشھادۃ والخیر " اور یہ فائدہ حاصل ہوا کہ شہادت کی تمنا کرنا اور نیکی کے کاموں کی تمنا کرنا نبی کریم ﷺ کی سنت ہے " وفیہ تمنی ما لا یمکن فی العادۃ من الخیرات " اور حدیث پاک سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ جو چیز بظاہر عادت کے مطابق ممکن نہیں لیکن وہ بہتر ہو تو اس کی تمنا کرنا بھی ثواب ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے ﴿ واللہ یعصمک من الناس ﴾ اور اللہ آپ کو بچائے گا لوگوں سے۔ لیکن نبی کریم ﷺ پھر بھی شہادت کی تمنا کرتے رہے۔ (انشاء اللہ مزید تفصیل بعد میں ذکر ہو رہی ہے)۔

شہید کو شہید کہنے کی وجوہ:

(۱) نضر بن شمیل رحمہ اللہ نے فرمایا کہ شہید کو شہید کہنے کی وجہ یہ ہے:

" لانہ حی فان ارواحھم شھدت وحضرت دار السلام وارواح غیرھم انما تشھدھا یوم القیامۃ "

کہ اسے زندگی حاصل ہوتی ہے اور شہداء کی روحیں ان کی شہادت کے ساتھ ہی جنت میں داخل ہو جاتی ہیں اور اس سے منافع حاصل کرتی ہیں۔ لیکن دوسرے لوگوں کی روحیں قیامت کو جنت میں منافع حاصل کریں گی اگرچہ نیک لوگوں کی روحیں اعلیٰ علیین میں ہوتی ہیں وہ مقام بھی جنت میں ہی ہے۔

(۲) ابن انباری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ شہید کو شہید کہنے کی یہ وجہ بھی ہے کہ " لان اللہ تعالٰی وملائکتہ علیھم الصلوۃ والسلام یشھدون لہ بالجنۃ " اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے شہداء کے لئے جنت کی گواہی دیتے ہیں۔ سبحان اللہ شہید کا کیا ہی خوب مقام ہے جس کے گواہ عظمت والے فرشتے اور خود مالک الملک ہو اس کی شان کی عظمت کیا ہوگی۔

(۳) " وقیل لانہ شھد عند خروج روحہ ما اعدہ اللہ تعالیٰ لہ من الثواب والکرامۃ "
اور وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شہید کے لئے ثواب اور مقام عزت وتکریم جو تیار کر رکھا ہے اس کی روح کے نکلنے پر ہی اس کے پاس حاضر کر دیا جاتا ہے اس لئے اسکو شہید کہا جاتا ہے۔

(۴) " وقیل لان ملائکۃ الرحمۃ یشھدونہ فیأخذون روحہ " شہید کو شہید کہنے کی اور وجہ یہ ہے کہ رحمت کے خاص فرشتے اس کے پاس اس کی روح کو حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔

(۵) " وقیل لانہ شھد لہ بالایمان وخاتمۃ الخیر بظاھر حالہ " شہید کو شہید کہنے کی اور وجہ یہ ہے اس کا ظاہری حال اس کے مؤمن ہونے پر اور اس کے خاتمہ بالخیر پر دلالت کرتا ہے۔

(۶) " وقیل لان علیہ شاھدا بکونہ شھیدا وھو الدم " اور بعض حضرات نے کہا کہ شہید کو اس وجہ سے شہید کہا جاتا ہے کہ قیامت کے دن اس کا خون اس کے شہید ہونے کی گواہی دے گا۔

(۷) " وقیل لانہ ممن یشھد علی الامم یوم القیامۃ بابلاغ الرسل الرسالۃ الیھم " اور وجہ شہید کو شہید کہنے کی یہ ہے کہ وہ پہلی امتوں پر گواہی دے گا کہ انبیاء کرام نے اللہ تعالیٰ کا پیغام ان تک پہنچا دیا تھا۔ اگر چہ اس آخری وجہ پر علامہ نووی رحمہ اللہ نے فرمایا " وعلی ھذا القول یشارکھم غیرھم فی ھذا الوصف " اس قول کے مطابق شہداء کے ساتھ اس وصف میں دوسرے نیک لوگ بھی شریک ہوں گے کیونکہ امت کے تمام نیک لوگوں کو یہ مقام حاصل ہوگا۔
تاہم راقم کے نزدیک یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ شہداء کو رفیع درجات حاصل ہونے کی وجہ سے ان کو شہادت خصوصیہ کا درجہ حاصل ہوا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (نووی بر مسلم ج ۲ ص ۱۴۲)

شہید کی زندگی:

" فذھب کثیر من السلف الی انھا حقیقیۃ بالروح والجسد ولکنا لا ندرکھا فی ھذہ النشأۃ "

کثیر سلف صالحین (گزرے ہوئے بزرگ علماء کرام) کا مذہب یہ ہے کہ شہید کو حقیقی زندگی حاصل ہوتی ہے جو روح اور جسم سے متعلق ہوتی ہے البتہ ہم اس زندگی کو سمجھ نہیں سکتے۔ اس پر ﴿عِنْدَ رَبِّهِمْ

یُرْزَقُوْنَ ﴿ "ان کو رب کے ہاں رزق دیا جاتا ہے" ارشاد باری تعالیٰ واضح طور پر دلالت کر رہا ہے۔

" وبان الحیاۃ الروحانیۃ التی لیست بالجسد لیست من خواصھم فلا یکون لھم امتیاز بذلک علی من عداھم ،،

اور کثیر سلف صالحین نے اپنے موقف پر محکم دلیل قائم کی ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ شہداء کو صرف روحانی زندگی حاصل ہے تو اس میں ان کی تخصیص کیسے ثابت ہو سکتی ہے کیونکہ روحانی زندگی تو تمام مومنین کو حاصل ہے بلکہ کفار کو بھی حاصل ہے اسی لئے کفار کو برزخ میں عذاب ہوتا ہے۔ (از روح المعانی)

ان اللہ تعالیٰ یعطی لا رواحھم قوۃ الاجساد فیذھبون من الارض والسماء والجنۃ حیث یشاء ون وینصرون اولیاء ھم ویدمرون اعدائھم ان شاء اللہ تعالیٰ "

بیشک اللہ تعالیٰ شہداء کی روحوں کو جسموں کی قوت عطاء فرماتا ہے وہ زمین و آسمان اور جنت میں جہاں چاہیں جاتے ہیں اور اپنے دوستوں کی امداد کرتے ہیں اور اپنے دشمنوں کو ہلاک کرتے ہیں ان شاء اللہ تعالیٰ۔

" ومن اجل ذلک الحیاۃ لا تأکل الارض اجسادھم ولا اکفانھم " شہداء کرام کو جب رب تعالیٰ زندگی عطاء فرماتا ہے تو اسی وجہ سے زمین ان کے جسموں اور کفنوں کو نہیں کھا سکتی۔

" قال البغوی قیل ان ارواحھم ترکع وتسجد کل لیلۃ تحت العرش الی یوم القیامۃ" علامہ بغوی بیان کرتے ہیں کہ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ بیشک شہداء کی روحیں ہر رات کو عرش کے نیچے رکوع اور سجدہ کرتی ہیں یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ (مظھری ، بغوی)

اعتراض : شہید کی زندگی کس طرح ثابت ہے جب کہ ہم ظاہر طور پر دیکھتے ہیں کہ شہید بے حس وحرکت ہوتا ہے ہم اسے غسل دیتے ہیں اور اس کے جنازہ کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔

جواب : اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے "بَلْ اَحْیَاءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ،، (بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں شعور نہیں) فرمایا ہے اگر ہماری عقل میں آتا تو یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی آیئے تفسیر مظہری کو دیکھئے:

" فیہ تنبیہ علی ان حیاتھم لیست من جنس ما یحسہ کل احد وانما ھی امر لا یدرک بالعقل ولا بالحس بل بالوحی او الفراسۃ الصحیحۃ المقتبسۃ من الوحی "

رب تعالیٰ نے ﴿ وَلٰكِنۡ لَّا تَشۡعُرُوۡنَ ﴾ کہہ کر اس پر متنبہ کر دیا کہ بیشک ان کی زندگی وہ نہیں جو ہر شخص کو محسوس ہو سکے اور نہ ہی یہ عقل میں آنے والی ہے اور نہ حواس میں بلکہ شہداء کی زندگی وحی سے حاصل ہوتی ہے یا اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو وحی سے فیضان حاصل کرنے کی توفیق عطاء فرما دے اور اپنا مقرب بنا لے وہ اپنی کامل فراست سے وحی سے اقتباس حاصل کر لیتے ہیں۔ (مظھری)

زندگی کے لئے حس وحرکت کا ہونا بھی ضروری نہیں " لان العضو المفلوج حی حیث تتحقق قوة الحیاة فیه وان لم یترتب علیها الحس والحرکة لمانع الفلج " کیونکہ جو عضو مفلوج ہے وہ حس وحرکت نہیں کرتا اگرچہ زندگی اس میں پائی جاتی ہے (از شیخ زادہ)

اور یہ بہت واضح ہے کہ اگر مفلوج عضو کو مردہ کہا جائے وہ گل سڑ جائے بدبودار ہو جائے حالانکہ ایسا نہیں۔

نفی قول سے مراد نفی اعتقاد: رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا

﴿ وَلَا تَقُوۡلُوۡا لِمَنۡ يُّقۡتَلُ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ اَمۡوَاتٌ ﴾

"جو اللہ کی راہ میں شہید کر دیے گئے ان کو مردہ نہ کہو"

اصل مقصد یہ ہے کہ تم عقیدہ یہ رکھو وہ زندہ ہیں صرف زبان سے زندہ کہہ دینا اور عقیدہ اس کے خلاف رکھنا بلا مقصد ہے ہاں جب انسان کا عقیدہ یہ ہو کہ شہداء زندہ ہیں لیکن عام محاورہ کے مطابق وہ شہید کے متعلق کہہ دے کہ وہ فوت ہو گیا تو وہ شخص گنہگار نہیں ہوگا۔ پھر بھی اللہ تعالیٰ کا فضل ہے مسلمانوں پر کہ وہ کہتے بھی یہی ہیں کہ فلاں شخص شہید ہو گیا یہ کہتے ہی نہیں کہ وہ فوت ہو گیا۔

راقم نے یہ مسئلہ روح المعانی کی اس بحث سے استنباط کیا ہے ﴿ بَلۡ اَحۡيَآءٌ ﴾ کا مفہوم یہ ہے ﴿ بَلۡ هُمۡ اَحۡيَآءٌ ﴾ بلکہ وہ زندہ ہیں یہ جملہ معطوفہ ہے اس کا عطف ﴿ لَا تَقُوۡلُوۡا ﴾ پر ہے اور اسی سے اضراب (پھیرنا) ہے کیونکہ ﴿ بَلۡ ﴾ اضراب کے لئے آتا ہے۔ عطف مفرد کا مفرد پر نہیں کہ حیز قول میں ہو اور مقصد یہ ہو کہ بلکہ تم کہو کہ وہ زندہ ہیں:

" لان المقصود اثبات الحیاة لهم لا امرهم بان یقولوا فی شانها انهم احیاء وان کان ذلک صحیحا "

کیونکہ مقصد ان کے لئے حیات ثابت کرنا ہے لوگوں کو یہ حکم دینا مقصود نہیں کہ تم ان کو ضرور ہی زندہ کہو اگر چہ ان کو زبان سے زندہ کہنا بھی صحیح ہے ...... واللہ اعلم بالصواب...... (از روح المعانی)

اعتراض : بیان یہ کیا جاتا ہے کہ شہداء کے جسم بھی زندہ ہوتے ہیں حالانکہ کئی مرتبہ مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ ان کے جسم گل سڑ جاتے ہیں راکھ بن جاتے ہیں تو کس طرح کہنا صحیح ہے کہ ان کے جسموں کو زمین پر کھانا حرام کر دیا گیا ہے؟

اجمالی جواب: اگر چہ مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی معارف القرآن میں اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ہوسکتا ہے ان کے جسموں کو زمین کے ذرات نقصان نہ پہنچائیں لیکن دوسری دھاتیں جن کی زمین میں آمیزش ہوتی ہے وہ نقصان پہنچائیں۔ یہ جواب بھی ممکن ہے تاہم زیادہ صحیح اور مختصر جواب یہ ہے کہ جو شہداء خلوص دل سے صرف رب تعالیٰ کی رضاء کی خاطر اپنی جان قربان کرتے ہیں یہ مرتبہ صرف ان شہداء کو حاصل ہوتا ہے، جن کی نیت میں کسی قسم کا فتور لازم آجائے ان کو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوتا اگر چہ ہمیں کسی کی نیت کا علم حاصل نہیں ہوتا اس لئے ہم تو ہر اس شخص کو شہید کہیں گے جس نے بظاہر اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان قربان کی جیسا کہ ہم ہر اس شخص کو مسلمان کہتے ہیں جو بظاہر ایمان رکھتا ہو ہم اس پر مسلمانوں والے احکام ہی جاری کرتے ہیں حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی وہ مومن ہے یا دل میں منافقت رکھتا ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

تفصیلی جواب: شہید کی تین قسمیں ہیں ایک وہ شہید ہیں جو صرف دنیا میں شہید کہلاتے ہیں آخرت میں نہیں، دوسرے وہ شہید ہیں جو دنیا اور آخرت دونوں میں شہید کہلاتے ہیں، اور تیسرے وہ ہیں جو آخرت کے لحاظ سے شہید ہیں دنیا میں ان پر احکام شہادت جاری نہیں ہوتے۔ (نووی برمسلم ج ۲ ص ۱۵۱)

دنیا میں شہید ہو آخرت میں نہ ہو:

" وهو من غل في الغنيمة او قتل مدبرا " یہ وہ شخص ہے جس نے غنیمت میں خیانت کی ہو یا پیٹھ پھیر کر بھاگتے ہوئے قتل کر دیا جائے۔ اسے دنیا میں تو شہید سمجھا جائے گا ظاہری طور پر احکام شہادت بھی جاری کر دیئے جائیں گے لیکن اسے شہادت کی وجہ سے خصوصی مرتبہ اور درجہ حاصل نہیں ہوگا یقینی بات

ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے ہاں شہید نہیں ہوں گے ان کے جسموں کا زمین سے محفوظ رہنا بھی ضروری نہیں۔

احادیث مبارکہ جن سے بہت واضح ہے کہ فقط دنیاوی شہید درجات سے محروم رہتا ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں شہید نہیں کہلاتا۔

"عن ابی موسی الاشعری ان رجلا اعرابیا اتی النبی ﷺ فقال یا رسول اللہ الرجل یقاتل للمغنم والرجل یقاتل لیذکر والرجل یقاتل لیری مکانه فمن فی سبیل اللہ فقال رسول اللہ ﷺ من قاتل لتکون کلمة اللہ اعلی فهو فی سبیل اللہ"

(مسلم ج ۲ ص ۱۴۷ باب من قاتل لتکون کلمة اللہ هی العلیا فهو فی سبیل اللہ

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک اعرابی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کیا یا رسول اللہ ایک شخص جہاد کرتا ہے کہ اسے مال غنیمت حاصل ہو جائے اور ایک شخص جہاد کرتا ہے کہ اس کا چرچا ہو جائے اور ایک شخص جہاد کرتا ہے کہ اس کا مقام دیکھا جائے (یعنی اس کی بہادری کا لوگوں کو پتہ چل جائے) ان میں سے کون سا وہ شخص ہے جس کے جہاد کو جہاد فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں جہاد) کہا جائے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ کی راہ میں اس شخص کا جہاد ہے جو اللہ تعالیٰ کے کلمہ کی بلندی کے لئے جہاد کرے۔

☆ "عن ابی موسی قال سئل رسول اللہ ﷺ عن الرجل یقاتل شجاعة ویقاتل حمیة ویقاتل ریاء ای ذلک فی سبیل اللہ فقال رسول اللہ ﷺ من قاتل لتکون کلمة اللہ هی العلیا فهو فی سبیل اللہ" (مسلم ج ۲ ص ۱۴۸)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے ایک شخص کے متعلق سوال کیا گیا کہ وہ بہادری دکھانے کے لئے جہاد کرتا ہے اور ایک شخص خاندانی رقابت یا غیرت کی وجہ سے جہاد کرتا ہے اور ایک شخص دکھلاوے کے طور پر جہاد کرتا ہے ان میں سے کون سا جہاد اللہ کی راہ میں ہوا؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے جہاد کیا وہی اللہ کی راہ میں جہاد ہے۔

وضاحت: نبی کریم ﷺ کا جواب کیسا خوب حکمت بھرا مختصر تھا چونکہ جوامع الکلم (بات مختصر مطالب زیادہ) آپ کی خصوصیت تھی ایک ایک کو علیحدہ کر کے یہ نہیں فرمایا یہ بھی جہاد نہیں، یہ بھی جہاد نہیں، بلکہ فرمایا جہاد تو یہ ہے، یعنی صرف مقصود کو ذکر فرمایا غیر مقصود کی خود بخود نفی ہو گئی۔

" یقاتل لیذکر " کا مطلب ہے " لیذکرہ الناس بالشجاعة " تا کہ لوگ اس کی شجاعت کا ذکر کریں چرچا کریں " ویقاتل حمیة " هی الانفة والغیرة والمحامة عن عشیرته " یعنی ایک شخص اپنی ذاتی مخالفت، غیرت اور خاندانی رقابت یعنی خاندان کے دشمن سے خاندان کی حمایت کے لئے لڑائی کرتا ہے۔

نبی کریم علیہ السلام کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے گویا کہ بیان فرمادیا:

" انما الاعمال انما تحسب بالنیات الصالحة وان الفضل الذی ورد فی المجاهدین فی سبیل الله یختص بمن قاتل لتکون کلمة الله هی العلیا "

اعمال کی دارومدار نیک نیات پر ہے بیشک فضیلت جس کا ذکر کیا جاتا ہے اس کا تعلق ان مجاہدین سے ہے جوصرف اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے اوردین کی بلندی کے لئے جہاد کرتا ہے۔ (از نووی)

☆ " عن ابی هریرة قال سمعت رسول الله ﷺ یقول اول الناس یقضی یوم القیامة علیه رجل استشهد فاتی به فعرفه نعمته فعرفها قال فما عملت فیها قال قاتلت فیک حتی استشهدت قال کذبت ولکنک قاتلت لان یقال جرئی فقد قیل ثم امر به فسحب علی وجهه حتی القی فی النار، ورجل تعلم العلم وعلمه وقرأ القرآن فاتی به فعرفه نعمه فعرفها قال فما عملت فیها قال تعلمت العلم وعلمته وقرأت فیک القرآن قال کذبت ولکنک تعلمت العلم لیقال عالم وقرأت القرآن لیقال هو قارئ فقد قیل ثم امر به فسحب علی وجهه حتی القی فی النار، ورجل وسع الله علیه واعطاه من اصناف المال کله فاتی به فعرفه نعمه فعرفها قال فما عملت فیها قال ما ترکت من سبیل تحب ان ینفق فیها الا انفقت فیها لک قال کذبت ولکنک فعلت لیقال هو جواد فقد قیل ثم امر به فسحب علی وجهه ثم القی فی النار " (مسلم ج ۲ ص ۱۴۹ باب من قاتل للریا)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ قیامت کے دن سب سے پہلے اس شخص کو فیصلہ کے لئے لایا جائے گا جو شہید کردیا گیا تھا جب اسے لایا جائے گا تو اللہ تعالیٰ اسے اپنی نعمتوں کی پہچان کرائے گا وہ پہچان لے گا (یعنی اقرار کرلے گا) رب تعالیٰ فرمائے گا تو نے ان نعمتوں کے حق میں عمل کیا کیا؟ وہ کہے گا تیرے لئے لڑائی کی یہاں تک کہ مجھے شہید کردیا گیا رب تعالیٰ فرمائے گا تو نے جھوٹ کہا ہے لیکن تو نے تو قتال کیا کہ تجھے بہادر کہا جائے وہ کہہ دیا

گیا، پھر حکم دیا جائے گا اسے چہرے کے بل گھسیٹ کر آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ اور ایک شخص نے علم حاصل کیا ہوگا اور پڑھایا ہوگا اور قرآن پڑھا، اسے لایا جائے گا اللہ تعالیٰ اسے اپنی نعمتوں کی پہچان کرائے گا وہ پہچان لے گا رب تعالیٰ فرمائے گا تو نے ان کی وجہ سے عمل کیا کیا؟ وہ کہے گا علم سیکھا اور سکھایا اور تیرے لئے قرآن پڑھا، رب تعالیٰ فرمائے گا تو نے جھوٹ کہا، لیکن تو نے علم حاصل کیا تھا کہ تجھے عالم کہا جائے اور قرآن پڑھا تھا تاکہ تجھے قاری کہا جائے وہ کہہ دیا گیا، پھر حکم دیا جائے گا اسے منہ کے بل گھسیٹ کر آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ ایک شخص کو اللہ تعالیٰ نے وسعت عطاء کی ہوگی اور اسے ہر قسم کا مال عطاء کیا ہوگا اسے رب تعالیٰ کے حضور لایا جائے گا تو رب تعالیٰ اسے اپنی نعمتوں کی پہچان کرائے گا وہ پہچان لے گا رب تعالیٰ فرمائے گا تو نے ان نعمتوں کے شکریہ میں کیا عمل کئے وہ کہے گا میں نے کوئی ایسا راستہ نہیں چھوڑا جسے تو پسند کرتا تھا کہ اس میں مال خرچ کیا جائے میں نے وہاں تیرے لئے مال خرچ کیا رب تعالیٰ فرمائے گا تو نے جھوٹ کہا لیکن تو نے مال خرچ کیا تھا کہ تجھے جواد (سخی) کہا جائے وہ تو کہہ دیا گیا پھر حکم دیا جائے گا اسے منہ کے بل گھسیٹ کر آگ میں ڈال دیا جائے گا۔

واضح ہوا کہ جن شہداء کی قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں تعریف کی گئی ان کی فضیلت بیان کی گئی اور ان کے مدارج اور منازل رفیعہ کا ذکر کیا گیا یہ وہ شہداء ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے جہاد کرتے ہوئے شہید ہو جائیں اور ان کا مقصد صرف دین کی بلندی ہو ان کو ہی وہ زندگی حاصل ہوتی ہے جس سے روح اور جسم دونوں ہی زندہ رہتے ہیں۔ اور جن کی نیت میں فتور ہو ان کو فضیلت کیا حاصل ہونی ہے بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آئیں گے لہٰذا قرآن پاک اور احادیث مبارکہ کے فیصلے پکے اور سچے ہیں۔

"قوله ﷺ فی الغازی والعالم والجواد وعقابهم علی فعلهم ذلک لغیر الله وادخالهم النار دلیل علی تغلیظ تحریم الریاء وشدة عقوبته وعلی الحث علی وجوب الاخلاص فی الاعمال کما قال الله تعالیٰ وما امروا الا لیعبدوا الله مخلصین له الدین وفیه ان العمومات الواردة فی فضل الجهاد وانما هی لمن اراد الله تعالیٰ بذلک مخلصا وکذلک الثناء علی العلماء وعلی المنفقین فی وجوه الخیرات کله

محمول علی من فعل ذلک لله تعالٰی مخلصا "

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی غازی اور عالم اور سخی کے متعلق کہ ان کو عذاب ہوگا اگر ان کے یہ افعال اللہ تعالٰی کی رضاء کی خاطر نہ پائے گے بلکہ ان میں دکھلاوا مقصود ہوا تو یہ آگ میں ڈال دیئے جائیں گے یہ دلیل ہے کہ ریاء کاری سخت حرام ہے اور اس میں شدید عذاب ہوگا اور حدیث پاک میں اعمال میں اخلاص کے وجوب پر برانگیختہ کیا گیا ہے جیسا کہ اللہ تعالٰی نے فرمایا (ترجمہ) اور ان کو نہیں حکم دیا گیا مگر یہ کہ اللہ تعالٰی کی عبادت کریں اور دین کو اسی کے لئے خالص کریں۔

اور حدیث پاک سے یہ ثابت ہوا کہ جہاد کی فضیلت میں جو آیات واحادیث وارد ہیں ان سے یہی ثابت ہے کہ اللہ تعالٰی یہی چاہتا ہے کہ وہ جہاد صرف اس کی رضاء کے لئے کیا جائے اور اس میں خلوص پایا جائے۔

اسی طرح علماء اور سخی حضرات کی تعریف جو کی گئی اس سے مراد بھی وہی ہیں جو علم اور سخاوت میں خلوص رکھتے ہیں صرف اللہ تعالٰی کی رضامندی کے لئے کام کریں۔ نام ونمود نہ پایا جائے فقط دنیاوی اغراض نہ ہوں۔

اخروی شہید: وہ شہید جس کو " شهيد في الآخرة " کہا گیا ہے یعنی دنیا میں تو ان کو شہید نہیں کہا جاتا لیکن ثواب ان کو شہداء والا حاصل ہوگا۔ جب ان میں خلوص پایا جائے گا تو یقینی طور پر ان کو قرب الٰہی حاصل ہونا ہے۔

اخروی شہید پر احادیث مبارکہ:

☆ "عن انس قال قال رسول الله ﷺ من طلب الشهادة صادقا اعطيها و لو لم تصبه "

(مسلم ج ۲ ص ۱۴۹ باب استحباب طلب الشهادة فی سبیل الله)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے سچے دل سے شہادت کو طلب کیا (یعنی شہادت کے حاصل ہونے کی سچی تمنا کی) تو اسے شہادت کا ثواب عطاء کردیا جائے گا اگرچہ بظاہر اسے شہادت حاصل نہ ہوئی۔

☆ " عن سهل بن حنيف ان النبی ﷺ قال من سأل الله الشهادة بصدق بلغه الله

منازل الشهداء وان مات علی فراشه " (مسلم ج ۲ ص ۱۴۹)

سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے سچے دل سے شہادت طلب کی اللہ تعالیٰ اس کو شہداء کے مراتب تک پہنچا دے گا اگرچہ اس کی موت بستر پر ہی کیوں نہ آئے۔

دوسری حدیث پہلی کی تفسیر بیان کر رہی ہے کیونکہ اس میں زیادہ وضاحت موجود ہے بنسبت پہلی حدیث کے " ومعناهما جميعا انه اذا سأل الشهادة بصدق اعطى من ثواب الشهداء وان كان على فراشه ، وفيه استحباب سوال الشهادة واستحباب نية الخير " دونوں احادیث کا معنی یہی ہے کہ جب کوئی شخص سچے دل سے شہادت طلب کرتا ہے تو اسے شہادت کا ثواب عطاء کر دیا جاتا ہے اگرچہ اس کی موت بستر پر ہی کیوں نہ آئے۔ اور حدیث پاک سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ شہادت کی تمنا اور شہادت کی طلب صدق دل سے کرنا مستحب ہے اور یہ ثابت ہوا کہ نیکی کے کاموں کی نیت مستحب ہے۔ (از نووی)

☆ " عن جابر قال كنا مع النبى ﷺ فى غزاة فقال ان بالمدينة لرجالا ماسرتم مسيرا ولا قطعتم واديا الا كانوا معكم حبسهم المرض " (مسلم ج ۲ ص ۱۴۹)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم نبی کریم ﷺ کی معیت میں جہاد میں شریک تھے آپ نے فرمایا کہ مدینہ طیبہ میں کئی لوگ وہ ہیں جو تمہارے ساتھ چل تو نہیں رہے اور نہ ہی کسی وادی کو طے کر رہے ہیں لیکن وہ تمہارے ساتھ ہی شریک ہیں کیونکہ ان کو مرض نے روک رکھا ہے " وفی روایة الاشركوكم فى الاجر " ایک روایت میں ہے کہ وہ تمہارے ساتھ اجر و ثواب میں شریک ہیں۔

" وفى هذا الحديث فضيلة النية فى الخير وان من نوى الغزو او غيره من الطاعات فعرض له عذر منعه حصل له ثواب نيته وانه كلما اكثر من التأسف على فوات ذلك وتمنى كونه مع الغزاة ونحوهم كثر ثوابه والله اعلم "

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ نیکی کے کام کی نیت کرنا باعث فضیلت ہے اور جس شخص نے جہاد میں شرکت کی نیت کی یا اس کے بغیر نیکی کے کاموں کی نیت کی اسے کوئی عذر درپیش آ گیا جس کی

وجہ سے وہ اس میں شریک نہ ہو سکا تو اس کے سچے دل سے نیت کرنے کا اسے ثواب حاصل ہوگا اور خاص کر کے نیک کام میں شرکت رہ جانے پر جتنا افسوس کرے گا کہ کاش میں ان کے ساتھ شریک ہوتا اتنا ہی زیادہ اسے ثواب حاصل ہوگا۔ (نووی)

سبحان اللہ نبی کریم ﷺ غزوہ میں مدینہ طیبہ کے لوگوں کے دلوں کی تمنا اور تڑپ کا تذکرہ فرما رہے ہیں کاش کہ نور بصیرت حاصل ہو تو شان مصطفیٰ کریم ﷺ سمجھ آ جائے۔

☆ **"عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ ما تعدون الشهيد فيكم قالوا يا رسول الله من قتل فی سبيل الله فهو شهيد قال ان شهداء امتی اذا لقليل قالوا فمن هم يا رسول الله قال من قتل فی سبيل الله فهو شهيد ومن مات فی سبيل الله فهو شهيد ومن مات فی الطاعون فهو شهيد ومن مات فی البطن فهو شهيد قال ابن المقسم اشهد علی ابيک فی هذا الحديث انه قال والغريق شهيد"** (مسلم ج ۲ ص ۱۵۱ باب بیان الشهداء)

حضرت سہیل اپنے باپ سے اور وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اپنے اندر کن لوگوں کو شہید شمار کرتے ہو۔ صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ جو شخص اللہ کی راہ میں جان قربان کر دے وہ شہید ہے تو آپ نے فرمایا اس طرح تو میری امت کے شہید بہت کم ہو جائیں گے اللہ کی راہ میں مقتول شہید ہے اللہ کی راہ میں فوت ہونے والا شہید ہے۔ طاعون سے فوت ہونے والا شہید ہے جو شخص پیٹ کی بیماری سے فوت ہو جائے وہ بھی شہید ہے۔

ابن مقسم نے سہیل کو کہا میں گواہی دیتا ہوں کی آپ کے باپ نے اس حدیث کو بیان کیا تھا کہ غرق ہونے والا بھی شہید ہے۔

"**من مات فی سبيل الله فهو فشهيد**" سے مراد عام ہے دوران حج وعمرہ کوئی فوت ہو جائے طالب علم دینی علم حاصل کرتے ہوئے فوت ہو جائے کوئی عالم دین رب تعالیٰ کے دین کا کام کرتے ہوئے فوت ہو جائے وہ شہید ہے اس طرح کے نیکی کے کام کرتے ہوئے فوت ہو جانے والے شہید ہیں۔

(راقم) یہ تمام حضرات وہ ہیں جن کو دنیا میں تو شہید نہیں کہا جاتا ہے لیکن آخرت میں ان کو درجہ

شہادت حاصل ہوتا ہے۔

تنبیہ : جن اموات کا ذکر کیا گیا ہے ان کے متعلق علامہ نووی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا "**وانما کانت هذه الموتات شهادة بتفضل الله تعالیٰ بسبب شدتها و کثرة المها**" کہ یہ موتیں صرف اللہ تعالیٰ کے فضل کی وجہ سے شہادت کا درجہ رکھتی ہیں کیونکہ ان میں شدت اور درد کی کثرت شہادت کا سبب ہے۔

یہ بھی خیال رہے کہ شہادت کا مرتبہ صرف جن اموات کا ذکر یہاں کیا گیا ہے ان میں بند نہیں بلکہ دوسری احادیث میں اور بھی مذکور ہیں۔ دیوار وغیرہ گرنے سے نیچے آکر فوت ہونے والا، نمونیہ کی مرض سے فوت ہونے والا، آگ میں قدرتی طور پر جل جانے والا، حاملہ عورت حمل کی تکلیف سے فوت ہو جائے یہ سب شہید ہیں۔

اسی طرح ایک حدیث میں آتا ہے "**من قتل دون ماله فهو شهيد ومن قتل دون اهله فهو شهيد**" جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے قتل کر دیا جائے وہ شہید ہے جو شخص اپنی اہل کی حفاظت کرتے ہوئے قتل کر دیا جائے وہ شہید ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے "**ومن قتل دون دينه فهو شهيد**" جو شخص دین کی حفاظت کرتے ہوئے قتل کر دیا جائے وہ شہید ہے۔

دنیوی اور اخروی شہید:" **واما شهيد فى الدنيا والآخرة فهو المقتول فى حرب الكفار**" جو شخص دنیا میں بھی شہید کہلائے اور آخرت میں بھی شہید کا درجہ اسے حاصل ہے جو اپنے خلوص اور صدق دل سے اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء کیلئے اور دین کی بلندی کیلئے قتل کر دیا جائے۔

(نووی بر مسلم ج ۲ ص ۱۵۱)

پھر اس قسم کے شہداء کی دو قسمیں ہیں فقہی شہید، اور غیر فقہی شہید۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ بعد میں ذکر کی جائے گی۔ پہلے ان شہداء کے جسموں کے محفوظ رہنے اور ان کی مزید فضیلت کا ذکر کیا جاتا ہے "**ان اجساد الانبياء والشهداء وبعض الصلحاء لا ياكلها الارض**" بیشک انبیاء کرام اور شہداء کرام اور بعض نیک لوگوں کے جسموں کو زمین نہیں کھاتی۔

☆ "**عن اوس ابن اوس قال قال رسول الله ﷺ ان الله حرم على الارض ان تأكل**

اجساد الانبیاء " (مستدرک حاکم، ابو داؤد، واخرج ابن ماجه عن ابی الدرداء نحوه)

حضرت اوس بن اوس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کردیا ہے کہ وہ انبیاء کرام کے جسموں کو کھائے۔

☆ " واخرج مالک عن عبد الرحمن ابن صعصة انه بلغه ان عمرو بن الجموح وعبد الله بن جبير الانصارى كان قد حفر السيل قبرهما وكان قبرهما مما يلى السيل وكانا فى قبر واحد وهما ممن استشهد يوم احد، فحفرا ليغيرا من مكانهما فوجدا لم يتغيرا كانهما ماتا بالامس وكان بين احد وبين حفر عنها ست واربعون سنة "

عبدالرحمٰن بن صعصہ کہتے ہیں کہ عمرو بن جموح اور عبداللہ بن جبیر انصاری کی قبر کو پانی کی ندی نے گرانا شروع کردیا کیونکہ وہ پانی کی گزرگاہ کے ساتھ تھیں اور دونوں ایک ہی قبر میں دفن تھے یہ دونوں احد میں شہید ہوئے تھے ان کی قبر کو کھودا گیا تا کہ ان کو دوسری جگہ منتقل کردیا جائے تو ان دونوں کو اسی حال میں پایا گیا جیسا کہ ان دونوں کا وصال کل ہی ہوا ہے ان میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ حالانکہ ان کی قبر کو کھودنے کے واقعہ اور احد کے درمیان چھیالیس سال گزر چکے تھے۔

☆ " واخرج البيهقى ان معاوية لما اراد ان يجرى كظامة نادى من كان له قتيل باحد فليشهد فخرج الناس الى قتلاهم فوجدوهم رطابا ينبتون فاصابت المسحات رجل رجل منهم فانبعث دما ولقد كانوا يحفرون التراب فحفروا نثرة من تراب فاح عليهم ريح المسك هكذا اخرج الواقدى عن شيوخه واخرج ابن ابى شيبة نحوه واخرج البيهقى عن جابر وفيه فاصابت المسحات قدم حمزة فانبعث دما "

بیہقی نے بیان کیا ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب ارادہ فرمایا کہ پانی کی گزرگاہ (چھوٹی نہر، نالی) بنائی جائے تو آپ نے اعلان فرمایا کہ جن لوگوں کے رشتہ دار احد میں شہید ہوگئے تھے وہ حاضر ہوں لوگوں نے اپنے شہداء کرام کو نکالنا شروع کیا تو ان کو تروتازہ حالت میں پایا۔

ایک شخص کے پاؤں پر کندال لگ گئی تو خون جاری ہوگیا۔ جب مٹی کھودتے تو مٹی کو باہر نکالنے سے اس طرح خوشبو اٹھتی جیسے کستوری کی خوشبو ہو۔ اسی طرح واقدی رحمہ اللہ نے اپنے شیوخ سے بھی بیان کیا اور ابن ابی شیبہ نے بھی اسی طرح بیان کیا۔ اور بیہقی نے ایک روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی

جس میں یہ ذکر ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قدم مبارک پر کندال لگ گئی تو خون جاری ہوگیا۔

☆ " واخرج الطبرانی عن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ المؤذن المحتسب کالشهید المتشخط فی دمه اذا مات لم یدود فی قبره "

طبرانی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی وہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ مؤذن جو اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے خلوص سے اذان کہتا ہے اس کا ایسا درجہ ہے جیسا کہ شہید خون میں لتھڑا ہوا ہو۔ جب وہ فوت ہو جائے تو اس کی قبر میں کیڑے نہیں پڑتے۔

☆ " واخرج ابن ابی مندة عن جابر عن عبد اللہ قال قال ﷺ اذا مات حامل القرآن اوحی اللہ الی الارض ان لا تاکل لحمه فیقول الارض ای رب کیف آکل لحمه وکلامک فی جوفه "

ابن ابی مندہ رحمہ اللہ نے حضرت جابر بن عبد اللہ سے روایت بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا جب حافظ قرآن فوت ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ زمین کی طرف وحی کرتا ہے (یعنی زمین کو کہتا ہے) اس شخص کے گوشت کو نہ کھانا۔ زمین عرض کرتی ہے اے میرے رب میں کیسے اس کے گوشت کو کھا سکتی ہوں جب کہ اس کے سینہ میں تیرا کلام ہے۔ سبحان اللہ کیا مقام ہے حافظ قرآن کا جس کے سینہ میں قرآن ہونے کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس کے جسم کو محفوظ رکھتا ہے زمین اسے نہیں کھاتی۔

☆ " واخرج المروزی عن قتادة قال بلغنی ان الارض لا تسلط علی جسد الذی لم یعمل خطیئة "

مروزی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا مجھے یہ خبر ملی ہے کہ بیشک زمین اس شخص کے جسم پر مسلط نہیں ہو سکتی جس نے گناہ کا کوئی عمل نہ کیا ہو۔

یعنی نیک لوگوں کے جسم بھی محفوظ رہتے ہیں زمین ان کو بھی نہیں کھا سکتی۔ یہ بھی خیال رہے کہ صحابی کا وہ قول جو عقل سے نہ بیان کیا جا سکے وہ حدیث مرفوع کے درجہ میں ہوتا ہے کہ صحابی نے یقیناً رسول اللہ ﷺ سے سنا ہوگا۔ قاضی محمد ثناء اللہ مظہری فرماتے ہیں:

" قلت لعل المراد بالذی لم یعمل خطیئة الصالحون من عباد اللہ اعنی الاولیاء لما کانوا محفوظین من الخطایا و مغفورین حتی صلحت

قلوبھم واجسادھم واللہ اعلم"

میں کہتا ہوں کہ جن لوگوں کا ذکر ہے کہ انہوں نے گناہ نہ کئے ہوں ان سے مراد اللہ کے بندوں سے نیک لوگ ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے ولی جو گناہوں سے محفوظ ہیں۔ اور بخشے ہوئے ہیں یہاں تک کہ ان کے دل اوران کے جسم درست ہوتے ہیں ان میں خاص صلاحیت پائی جاتی ہے۔ (از مظہری)

فقہی شہید : یعنی وہ شہید جسے "شہید فی الدنیا والآخرۃ" کہا گیا ہے اس کی ایک قسم فقہی شہید ہے جو دنیا اور آخرت میں شہید ہے اور اس پر ظاہری طور پر کئی احکام جاری ہیں جو غیر فقہی شہید پر جاری نہیں۔ فقہی شہید وہ ہے جو عاقل، بالغ، مسلمان اور طاہر ہوا سے ظلماً قتل کر دیا جائے۔

جس قتل سے قصاص لازم آ سکتا ہو اگر ایسا قتل ہو جس سے مال لازم آئے تو اس قتل سے شہادت والے فقہی احکام جاری نہیں ہوں گے۔ اور اس نے دنیا کی زندگی کا کوئی نفع بھی حاصل نہ کیا ہو۔ اسی طرح جس شخص کو حربی کفار یا ڈاکو یا باغی قتل کر دیں خواہ کسی آلہ سے بھی قتل کریں۔ یا کسی مسلمان کی لاش میدان جنگ سے ملی ہے اس پر آثار قتل ہوں وہ فقہی شہید ہے۔

فقہی شہید کے احکام : اسے غسل نہیں دیا جائے گا۔ اور جو کپڑے اس نے پہن رکھے ہیں ان میں ہی اسے دفن کیا جائے گا اگر کفن سے زائد کپڑے ہیں، چمڑے یا اون وغیرہ کی کوٹی وغیرہ پہن رکھی ہیں تو اتار دیئے جائیں۔ جوتے، ٹوپی وغیرہ اتار دیئے جائیں۔ اگر کفن سے کم کپڑے ہوں تو مکمل کر لئے جائیں عام حالات میں شلوار قمیص (کپڑوں کا جوڑا) پہنے ہوئے انسان شہید ہوتا ہے ایسی حالت میں بڑی چادر (لفافہ) پہنا دی جائے۔ شہید کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اگر چہ شہید کے گناہ معاف ہو گئے لیکن نماز جنازہ میں اس کی تکریم پائی گئی ہے اور مدارج کی بلندی پائی گئی۔

غیر فقہی شہید کو غسل دیا جائیگا اور کفن بھی پہنایا جائے گا اور نماز جنازہ بھی پڑھی جائے گی۔ غیر فقہی شہید کی وضاحت سے فقہی شہید کی وضاحت بھی ہو جائے گی جس کو اجمالی طور پر ذکر کیا ہے۔ فقہی شہید میں ذکر کیا تھا۔ عاقل ہو، بالغ ہو لہٰذا نابالغ اور مجنون (پاگل) غیر فقہی ہوں گے ان کو غسل دیا جائے کیونکہ تلوار گناہوں کو مٹاتی ہے اور یہ گناہوں سے پاک ہوتے ہیں۔

خیال رہے مجنون جب نابالغ ہوتو وہ عام نابالغ کے حکم میں ہے بالغ ہوتو پھر بھی اسے غسل دیا جائے گا یعنی مجنون خواہ نابالغ ہو یا بالغ ہو اس کا حکم ایک ہی ہے۔

فقہی شہید کے متعلق ذکر کیا گیا تھا کہ وہ مسلمان ہو کیونکہ کافر کو اگر چہ کوئی شخص ظلماً قتل کردے وہ شہید نہیں۔ نہ اسے فقہی شہید کہیں گے اور نہ ہی غیر فقہی ہاں اگر اس کا کوئی مسلمان رشتہ دار ہے تو اسے اس طرح غسل دے دے جس طرح ناپاک کپڑا دھویا جاتا ہے اور گڑھا کھود کر اسے دفن کردے۔

فقہی شہید کے ساتھ پاک ہونے کی قید ذکر کی تھی کیونکہ اگر عورت حیض یا نفاس میں شہید کر دی گئی تو اسے غسل دیا جائے گا کیونکہ وہ غیر فقہی شہید ہے۔

اسی طرح جنبی آدمی نے غسل نہیں کیا تھا وہ اسی حال میں شہید ہو گیا تو اسے غسل دیا جائے گا وہ بھی غیر فقہی شہید کہلائے گا۔

اس پر دلیل یہ ہے کہ جب حضرت حنظلہ بن ابی عامر ثقفی شہید ہو گئے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا "ان صاحبکم حنظلة تغسله الملائكة فسألوا زوجته فقالت خرج وهو جنب" بیشک تمہارے دوست حنظلہ کو فرشتے غسل دے رہے ہیں جب صحابہ کرام نے ان کی زوجہ سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ یہ جنبی تھے۔ (کیونکہ یہ شادی کی پہلی رات کے بعد ہی صبح صبح اعلان جنگ سنتے ہی اسی طرح شریک ہو گئے تھے)۔

فقہی شہید میں ذکر کیا تھا کہ اس کے قتل پر قصاص لازم آتا ہو (جو ظلماً قتل کیا گیا) تو پھر وہ فقہی شہید ہوگا، یعنی اسے غسل نہیں دیا جائے گا یعنی ایسے آلہ سے قتل کیا جائے جو عام قتل کے لئے استعمال کیا جاتا ہو، تلوار، چھری وغیرہ سوئی وغیرہ سے قتل کر دیا تو وہ شبہ عمد ہے جس پر قصاص نہیں، دیت لازم ہے۔

ہاں اگر قصاص تو لازم ہونا تھا صلح کر لی گئی یا باپ نے بیٹے کو قتل کر دیا تو اس سے قصاص کو اٹھا لیا گیا تو وہ فقہی شہید ہی ہوگا یعنی غسل نہیں دیا جائے گا۔

فقہی شہید میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ اس نے کوئی نفع نہ حاصل کیا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ وہ زخمی ہونے کے بعد کچھ دیر زندہ رہ گیا یعنی ہوش میں رہا اور دوا حاصل کر لی یا اس پر نماز کا وقت گزر گیا یا کوئی

وصیت کرلی تو وہ فقہی شہید نہیں کہلائے گا بلکہ اسے غسل دیا جائے گا۔

اس کا تعلق میدان جنگ سے فقط نہیں بلکہ یہ حکم عام ہے۔ظلماً زخمی ہونے کے بعد زندہ رہا یا میدان جنگ سے جب اٹھایا گیا تو زندہ تھا:

" لما قتل عمر و علی غسلا لانهما ارتثا و عثمان اجهز علیه فی مصرعه ولم یرتث فلم یغسل کما فی البدائع "

جب حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کو شہید کر دیا گیا تو ان کو غسل دیا گیا تھا کیونکہ وہ زخمی ہونے کے بعد کچھ وقت کیلئے زندہ رہے تھے، وصیتیں وغیرہ فرمائی تھیں لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ زخمی ہونے کے ساتھ ہی شہید ہو گئے تھے اس لئے آپ کو غسل نہیں دیا گیا تھا۔لہٰذا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فقہی شہید ہوئے اور حضرت علی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما غیر فقہی شہید ہوئے۔

تنبیہ : جس شخص کو ظلماً قتل کیا گیا اس میں تو آلہ قتل کی قید تھی لیکن جو شخص میدان جنگ میں شہید ہو گیا اس کے ساتھ آلہ قتل کی قید نہیں وہ جس آلہ سے قتل کر دیا گیا ہو وہ فقہی شہید ہو گا اسے غسل نہیں دیا جائیگا۔

مسئلہ : میدان جنگ سے مسلمان کی لاش ملی اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس پر آثار قتل پائے گئے تو وہ فقہی شہید ہے اسے غسل نہیں دیا جائے گا اور اگر یہ شک ہو کہ ہو سکتا ہے اپنی موت سے فوت ہوا ہو گا تو وہ غیر فقہی شہید ہو گا اسے غسل دیا جائے گا۔جیسا کہ آنکھ یا کان یا حلق سے صاف خون (یعنی منجمد خون نہ ہو) نکل رہا ہو تو یہی سمجھا جائے گا کہ اسے قتل کیا گیا ہے اور اگر ناک یا آلہ تناسل یا دبر یا حلق سے منجمد خون نکلا ہوا ہے تو اس میں شک ہے کیونکہ اس طرح خون عام موت کی حالت میں بھی نکل آتا ہے (قتل کرتے ہوئے کسی کو دیکھا نہیں صرف لاش میدان جنگ سے ملی ہے) تو اسے احتیاطی طور پر غسل دیا جائے گا غیر فقہی شہید تصور کیا جائے گا۔

مقام توجہ : اصل میں احد کے شہداء کو غسل نہیں دیا گیا تھا بلکہ ان کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "زملوهم بکلومهم و دمائهم " (مسند احمد) ان کو زخموں اور خون میں ہی لپیٹ دو۔مطلب یہ تھا کہ ان کو غسل نہ دو اس وقت ان شہداء کی جو حالت تھی اس سے ہٹ کر جو صورتیں در پیش ہو سکتی ہیں جن کا ذکر

کیا جا چکا ہے ان میں احتیاطاً غسل دیا جائے گا۔

مسئلہ : فقہی شہید ہو یا غیر فقہی شہید ہو کفار کے ساتھ لڑائی میں شہید ہو یا باغی اور ڈاکو شہید کر دیں یا ظلماً قتل کر دیا جائے سب ہی کامل شہید ہیں البتہ مدارج میں فرق ہو سکتا ہے۔
(از درمختار وشامی باب الشھید)

تنبیہ : جب دو مسلمان لڑیں ہر ایک چاہتا ہو کہ میں دوسرے کو قتل کر دوں تو وہ دونوں جہنمی ہیں ان میں سے قتل ہونے والا ظلماً قتل نہیں کیا گیا ان کے متعلق ہی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا " القاتل والمقتول هما فی النار " قاتل اور مقتول دونوں ہی جہنمی ہیں۔

شہید کے خون کا مسئلہ:

" ودم مسفوح من سائر الحیوانات الادم شهید ای ولو مسفوحا اقتضاه کلامه و کلام البحر ما دام علیه فلو حمله المصلی جازت صلاته الا اذا اصابه منه لانه زال عن المکان الذی حکم بطهارته حموی ونحوه فی الحلیة "
(در مختار وشامی باب الانجاس)

تمام حیوانوں کا دم مسفوح یعنی بہنے والا خون، خواہ ذبح کرتے وقت وہ نکلے یا کسی انسان اور جانور کے زخمی ہونے سے وہ خون نکلے وہ نجاست غلیظہ ہے لیکن شہید کا خون خواہ دم مسفوح ہی کیوں نہ ہو وہ پاک ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ خون شہید پر جب تک ہے اس وقت تک پاک ہے لیکن اگر وہ خون اس سے منتقل ہو جائے تو ناپاک ہو جائے گا کیونکہ جس مکان کو پاک ہونے کا حکم دیا گیا تھا اس سے منتقل ہو گیا اسی لئے خون آلود شہید کو اٹھائے ہوئے کوئی شخص نماز ادا کرے تو اس کی نماز ادا ہو جائے گی لیکن اگر شہید کا خون منتقل ہو کر اٹھانے والے تک پہنچ گیا تو اس شخص کو نجاست لاحق ہو گی۔ (از شامی)

اسی سے واضح ہو گیا کہ شہید کا خون کسی کنوئیں میں گر جائے یا شہید کے خون آلود کپڑے کنوئیں میں گر جائیں تو وہ کنواں ناپاک ہو جائے گا۔

انبیاء کرام اور اولیاء کرام زندہ ہیں: نبی کریم ﷺ کی زندگی کو مفتی اعزاز علی دیو بندی

حاشیہ نورالایضاح پر ان الفاظ سے پیش کرتے ہیں:

"مثلہ ﷺ بعد وفاتہ کمثل شمع فی حجرۃ اغلق بابھا فھو مستور عمن ھو خارج الحجرۃ ولکن نورہ کما کان بل ازید وھذا حرم نکاح ازواجہ بعدہ ﷺ لم یجر احکام المیراث فیما ترکہ لانھما من احکام الموت"

نبی کریم ﷺ کی مثال دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد اس طرح ہے جس طرح ایک شمع کو باہر سے کمرہ میں لے جائیں اور اس کا دروازہ بند کر دیا جائے اگر چہ وہ شمع کمرے سے باہر والوں سے چھپ گئی لیکن اس کی روشنی اس طرح ہے بلکہ پہلے سے بھی زیادہ کیونکہ باہر روشنی کم تھی اندر جا کر زیادہ ہوگئی (اسی طرح نبی کریم ﷺ قبر شریف میں اگر چہ باہر والے لوگوں سے مستور ہیں لیکن آپ کی زندگی پہلے سے بھی زیادہ ارفع وبلند ہے)۔ اسی وجہ سے آپ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے باوجود آپ کی ازواج مطہرات سے نکاح کرنا حرام ہے اور آپ کے ترکہ پر وراثت کے احکام جاری نہیں ہوتے کیونکہ یہ دونوں کام مردوں سے تعلق رکھتے ہیں آپ تو زندہ ہیں۔ تقریباً یہی مضمون مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی اپنی تفسیر معارف القرآن میں ذکر فرماتے ہیں آپ نے اسی زیر بحث آیۃ کریمہ کی تفسیر میں صالحین کی زندگی کا قول بھی کیا ہے۔

علامہ علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فان اللہ تعالٰی قال فی حق الشھداء من امتہ بل احیاء عند ربھم یرزقون فکیف سیدھم بل رئیسھم لانہ حصل لھا ایضا مرتبۃ الشھادۃ مع مزید السعادۃ"

بیشک اللہ تعالٰی نے نبی کریم ﷺ کی امت کے شہداء کے متعلق کہا کہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں روزی پاتے ہیں ان کے سردار اور رئیس کو یہ مقام کیسے حاصل نہ ہو آپ کو بھی مرتبہ شہادت حاصل ہے بلکہ امت کے شہداء سے زیادہ سعادت حاصل ہے۔

چونکہ نبی کریم ﷺ کو خیبر میں ایک یہودیہ نے زہر آلود بکری کا گوشت جو دیا تھا اگر چہ ایک دو لقمہ تناول فرمانے پر ہی خود گوشت نے نبی کریم ﷺ کو بتایا تھا کہ مجھے زہر آلود کیا گیا ہے تاہم آپ کے وصال کے وقت وہ زہر لوٹ کر آ گیا تھا جو (ایک دو لقمہ تناول کرنے پر مؤثر ہوا تھا وہی) اثر انداز ہو گیا

جس سے آپ کو شہادت حاصل ہوئی۔

اسی مقام پر علامہ علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں" **اولیاء اللہ لا یموتون ولکن ینتقلون من دار الفناء الی دار البقاء** " اللہ کے ولی نہیں مرتے بلکہ فانی دنیا سے باقی رہنے والے مقام کی طرف انتقال کرتے ہیں۔ (مرقاۃ باب الجمعۃ)

نبی کی زندگی شہید کی زندگی سے اعلیٰ ہے:

شہید کی زندگی نص قطعی سے ثابت ہے لیکن نبی کی زندگی سے کم درجہ ہے شہید کی بیوہ کو عدت گزارنے کے بعد نکاح کرنے کی اجازت ہے لیکن نبی کی زوجہ کو نکاح کرنے کی اجازت نہیں کیونکہ شہید زندہ ہونے کے باوجود دنیاوی احکام کے لحاظ سے اس پر مردہ ہونے والے احکام جاری ہو جاتے ہیں لیکن نبی کی زندگی اتنی کامل اور ارفع ہے کہ نبی کی زوجہ بیوہ نہیں ہوتی اور اس سے نکاح کرنے کی ممانعت فرمادی ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا اَنْ تَنْكِحُوْا اَزْوَاجَه' مِنْ بَعْدِهٖ اَبَدًا ﴾ ''اور ان کے بعد کبھی ان کی بیبیوں سے نکاح نہ کرو''

یہ نکاح کی ممانعت صرف نبی کریم ﷺ کی زندگی کی وجہ سے ہے آپ کی ازواج مطہرات کا مومنوں کی ماں ہونے کی وجہ سے نہیں اس لئے کہ مومنوں کی ماں ہونے کا شرف تمام ازواج مطہرات کو حاصل ہے، لیکن یہ صرف رتبہ کی وجہ سے، ورنہ حقیقی ماں کے تمام احکامات ان پر جاری نہیں ہوتے کیونکہ جس طرح ماں سے نکاح حرام ہے اسی طرح ماں کی بیٹی سے بھی نکاح حرام ہے حالانکہ حضرت علی، حضرت عثمان اور حضرت ابوالعاص رضی اللہ عنہم کے آپ کی بیٹیوں سے نکاح تھے جو تمام حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی بیٹیاں ہیں۔

شہید کی زندگی سے نبی کی زندگی اس وجہ سے بھی بلند ہے کہ شہید کی باوجود زندہ ہونے کے وراثت تقسیم ہوتی ہے لیکن نبی کی وراثت تقسیم نہیں ہوتی اس سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ شہید پر دنیا کے لحاظ سے فوت شدہ حضرات کے احکام جاری ہوتے ہیں اگرچہ اسے برزخی زندگی حاصل ہے۔

انبیاء کرام کی وراثت تقسیم نہ ہونے کی وجہ حدیث پاک میں ہے " انا معاشر الانبیاء لانرث ولا نورث ما ترکناہ صدقة" ہم انبیاء کرام نہ کسی کے وارث ہوتے ہیں اور نہ ہمارا کوئی وارث ہوتا ہے ہم جو مال چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

آپ نے انبیاء کرام کی حیات پر ایک رسالہ تحریر فرمایا جس کا نام انباء الاذکیاء بحیاۃ الانبیاء ہے الحاوی للفتاوی میں یہ رسالہ شامل ہے جس سے مختصر طور پر کچھ بحث میں نقل کر رہا ہوں:

" حیاة النبی ﷺ فی قبرہ ہو وسائر الانبیاء معلومة عندنا علما قطعیا "

نبی کریم ﷺ کی قبر شریف میں زندگی اور باقی انبیاء کرام کی زندگی ہمیں قطعی طور پر معلوم ہے اس میں دلائل موجود ہیں اور خبریں تواتر کے درجے تک موجود ہیں اسی وجہ سے بیہقی نے انبیاء کرام کی قبروں کی زندگی پر ایک باب تالیف کیا ہے۔

انبیاء کرام اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں:

" اخرجہ مسلم عن انس ان النبی ﷺ لیلة اسری بہ مر بموسی علیہ السلام وہو یصلی فی قبرہ "

مسلم شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ معراج کی رات موسیٰ علیہ السلام کی قبر سے گزرے تو آپ اپنی قبر شریف میں نماز ادا کر رہے تھے۔ اسی طرح ابونعیم نے بھی اس حدیث شریف کو کچھ مختلف الفاظ سے ذکر کیا ہے۔ بیہقی کتاب حیاۃ الانبیاء میں ذکر ہے " عن انس ان النبی ﷺ قال الانبیاء احیاء فی قبورہم یصلون " حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی گئی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ تمام انبیاء کرام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں وہ نماز ادا کرتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ درود پاک سنتے ہیں:

" عن ابی ہریرة قال قال رسول اللہ ﷺ من صلی علی عند قبری سمعتہ ومن صلی علی نائیا بلغتہ "

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص میری قبر کے پاس درود شریف پڑھتا ہے میں اسے سنتا ہوں اور جو شخص مجھ پر دور سے درود پاک پڑھتا ہے وہ مجھ تک پہنچایا جاتا ہے۔

تنبیہ : اس حدیث پاک سے یہ مطلب لینا'' کہ آپ دور سے نہیں سنتے بلکہ آپ کے پاس فرشتے پہنچاتے ہیں'' درست نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سمیع وبصیر بھی ہے لیکن پھر بھی فرشتے اللہ تعالیٰ کے پاس بندوں کے اعمال پہنچاتے ہیں دوسری حدیث جس میں انشاء اللہ تفصیل سے بحث آئے گی اس میں قریب اور بعید کا کوئی ذکر نہیں بلکہ آپ ہر جگہ سے درود وسلام سنتے ہیں اور سلام کا جواب دیتے ہیں۔

" ما من احد يسلم على الا رد الله روحى حتى ارد عليه السلام "

جو شخص مجھ پر سلام بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ میری توجہ اس کی طرف کر دیتا ہے یہاں تک کہ میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔

نبی کریم ﷺ کا علم موت کے بعد ایسے ہی ہے جیسے زندگی میں تھا:

اصبہانی ترغیب میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

" قال رسول الله ﷺ من صلى على مائة فى يوم الجمعة وليلة الجمعة قضى الله له مائة حاجة سبعين من حوائج الآخرة وثلاثين من حوائج الدنيا ثم وكل الله بذلك ملكا يدخله على فى قبرى كما يدخل عليكم الهدايا ان علمى بعد موتى كعلمى فى الحيوة "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص مجھ پر جمعہ کے دن اور جمعہ کی رات میں ایک سو مرتبہ درود پاک پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ایک سو حاجتیں پوری کرتا ہے ستر حاجات آخرت کی اور تیس حاجات دنیا کی۔ پھر اللہ تعالیٰ اس پر ایک فرشتہ مقرر کر دیتا ہے جو میری قبر میں میرے پاس اس درود کو اس طرح پیش کرتا ہے جس طرح تمہارے پاس تحائف لائے جاتے ہیں بیشک میرا علم میری موت کے بعد ایسے ہی ہے جیسے میرا علم میری زندگی میں ہے۔

مقام توجہ: اس حدیث پاک میں مطلقا درود شریف کو فرشتوں کے پہنچانے کا ذکر ہے خواہ درود پاک پڑھنے والا قریب ہو یا بعید۔

ان تمام احادیث کے مجموعی مضامین سے یہ واضح ہوا کہ درود پاک پڑھنے والے شخص کا درود پاک تحفہ کی طرح فرشتے نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچاتے ہیں اور نبی کریم ﷺ خود بھی سنتے ہیں۔

کیونکہ فرشتوں کا کوئی عمل پہنچانا اپنے سننے سے مانع نہیں۔ جب کہ اللہ تعالیٰ خود سنتا بھی ہے اور فرشتے بندوں کے اعمال اس تک پہنچاتے بھی ہیں جس طرح وہاں فرشتوں کا پہنچانا اللہ تعالیٰ کے سننے کے منافی نہیں اسی طرح نبی کریم ﷺ کے پاس فرشتوں کا درود پاک پہنچانا آپ کے سننے کے منافی نہیں۔

نبی کریم ﷺ کی قبر سے اذان کا آواز آنا:

ابن سعد نے طبقات میں سعید ابن مسیب سے روایت کیا ہے وہ فرماتے ہیں:

انه كان يلازم المسجد ايام الحرة والناس يقتتلون قال فكنت اذا حانت الصلوة اسمع اذانا يخرج من قبل القبر الشريف "

سعید بن مسیب کہتے ہیں کہ میں مسجد نبوی میں ہی ہوتا تھا جب ایام حرہ کا واقعہ درپیش آیا (یزیدی دور میں جب مدینہ طیبہ پر حملہ کیا گیا ظلم وستم ہوا مسجد نبوی میں تین دن تک اذانیں نمازیں بند رہیں اس واقعہ کو ایام حرہ سے تعبیر کیا گیا ہے) لوگ جنگ کرنے میں مشغول ہوتے میں قبر شریف سے نماز کے وقت اذان کی آواز سنتا تھا یہ حدیث کچھ مختلف الفاظ سے زبیر ابن بکار نے اخبار مدینہ میں سعید بن مسیب سے روایت کی اور دارمی نے بھی اپنی مسند میں سعید بن مسیب سے ہی روایت کی ہے۔

بیہقی نے کتاب الاعتقاد میں ذکر کیا ہے " **الانبياء بعد ما قبضوا ردت اليهم ارواحهم فهم احياء بهم كالشهداء** " انبیاء کرام کی وفات کے بعد ان کے ارواح لوٹا دیئے جاتے ہیں وہ اسی طرح زندہ ہیں جس طرح شہداء کو زندگی حاصل ہے علامہ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں انبیاء کرام زندہ ہیں، موجود ہیں البتہ ہم ان کو دیکھ نہیں سکتے۔

اسی طرح جس طرح فرشتے زندہ ہیں موجود ہیں لیکن ہم میں سے کوئی انہیں دیکھ نہیں سکتا یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کرام میں سے کسی کو خصوصی کرامت سے نواز دے تو وہ فرشتوں کو دیکھ سکے۔

(اسی طرح اولیاء کرام کو اپنے مزارات میں زندہ نماز پڑھتے دیکھ لیں تو یہ عقل سے بعید نہیں)۔

نبی کریم ﷺ اپنی امت کے اعمال کو جانتے ہیں: استاد ابومنصور عبدالقاہر کہتے ہیں:

" المتکلمون المحققون من اصحابنا ان نبینا ﷺ حی بعد وفاته وان یسر بطاعات امته ویحزن بمعاصی العصاة منهم"

ہمارے اصحاب میں سے متکلمین محققین کہتے ہیں کہ ہمارے نبی کریم ﷺ اپنی وفات کے بعد زندہ ہیں اپنی امت کی نیکیوں پر خوش ہوتے ہیں اور اپنی امت کے نافرمانوں کے گناہوں سے پریشان ہوتے ہیں۔ علامہ قسطلانی شارح بخاری مواہب اللدنیہ میں فرماتے ہیں

" لا فرق بین موته وحیاته ﷺ فی مشاهدته لامته ومعرفته باحوالهم ونیاتهم وعزائمهم وخواطرهم وذلک جلی عنده لا خفاء به" (مواهب اللدنیه مع زرقانی جلد ۸ ص ۳۰۵)

نبی کریم ﷺ کی موت وحیات میں کوئی فرق نہیں آپ ہر حال میں اپنی امت کا مشاہدہ فرما رہے ہیں اور ان کے احوال کو پہچانتے ہیں اور ان کی نیتوں کو جانتے ہیں اور ان کے ارادوں پر مطلع ہیں اور ان کے دل پر کھٹکنے والے واقعات سے باخبر ہیں اور یہ بہت واضح ہے اس میں کوئی خفاء نہیں۔ تقریباً یہی مضمون حضرت عبداللہ بن مبارک رضی اللہ عنہ نے حضرت سعید بن میتب رضی اللہ عنہ سے نقل فرمایا ہے صاحب مواہب لدنیہ نقل فرماتے ہیں:

" عن عبد الله بن المبارک عن سعید بن المسیب رضی الله عنه لیس من یوم الا ویعرض علی النبی ﷺ اعمال امته غدوة وعشیة فیعرفهم بسیماهم واعمالهم فلذلک یشهد علیهم" (مواهب لدنیه ج ۵ ص ۳۳۷)

حضرت سعید بن میتب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں جس میں صبح وشام نبی کریم ﷺ کی خدمت میں امت کے اعمال پیش نہ ہوتے ہوں نبی کریم ﷺ اپنی امت کو اشکال وصورت اور ان کے اعمال کے ساتھ جانتے ہیں اسی لئے وہ ان پر گواہ ہوں گے قیامت کے دن۔
(وکذا فی الملهم ج ۱ ص ۳۱۳ بحواله جلاء الصدور)

اعتراض: مسند امام احمد، ابوداؤد اور بیہقی شریف میں ایک حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے " ان رسول الله ﷺ قال ما من احد یسلم علی الا رد الله روحی حتی ارد علیه السلام " بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص مجھ پر سلام پیش کرتا ہے اللہ تعالیٰ میرے روح کو

لوٹا تا ہے میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔

اس حدیث پاک سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا روح آپ کے بدن سے کبھی جدا ہوتا ہے اور کبھی لوٹ کر آتا ہے تمام وقت آپ کی زندگی ثابت نہیں ہوتی کیونکہ تمام وقت روح موجود نہیں ہوتا اس اعتراض کے کئی جواب علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے دیئے جن میں سے کچھ نقل کئے جار ہے ہیں۔

پہلا جواب: حدیث شریف میں " رد الله " جو جملہ واقع ہے یہ جملہ حالیہ ہے جب فعل ماضی حال واقع ہو اس پر لفظ "قد" داخل ہوتا ہے ظاہر ہو یا مقدر جس طرح" او جاء وکم حصرت صدورهم" میں "قد" مقدر ہے اصل میں " قد حصرت " ہے۔

جملہ ماضیہ سلام پیش کرنے والے کے سلام سے پہلے واقع ہوگا اور حدیث شریف میں جو لفظ حتی ہے وہ تعلیلیہ نہیں بلکہ فقط عطف کیلئے ہے اب حدیث پاک کا مطلب ان الفاظ سے پیش کیا جائے گا۔

" ما من احد يسلم على الا قد رد الله على روحي قبل ذلک فا رد عليه السلام "

مجھ پر جب بھی کوئی سلام پیش کرتا ہے میں اس کا جواب دیتا ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے میرے روح کو پہلے ہی لوٹا دیا ہے۔

یعنی روح سلام کی بعد نہیں لوٹا بلکہ پہلے سے ہی جاودانی زندگی عطاء فرمادی ہے۔

غلطی کی وجہ یہ ہے کہ " رد الله " کو حال یا استقبال کے معنی میں لیا گیا ہے اور حتی کو تعلیلیہ بنایا گیا ہے اور ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے" کہ جب بھی کوئی شخص مجھ پر سلام پیش کرے گا اللہ تعالیٰ میرے روح کو لوٹائے گا یہاں تک کہ میں اس کے سلام کا جواب دوں گا"۔

حالانکہ صحیح ترجمہ ضابطہ کے مطابق وہ ہے جو اوپر پیش کیا جا چکا ہے۔

اگر حال اور استقبال کا معنی لیا جائے تو لازم یہ آئے گا بار بار مسلمان درود پاک پڑھیں گے بار بار نبی کریم ﷺ کے روح کو لوٹایا جائے گا بار بار روح کو لوٹانے میں چار قسم کی رکاوٹیں موجود ہیں۔

(۱) روح کا کئی مرتبہ نکلنا اور لوٹنا جسم کو درد پہنچاتا ہے اس میں نبی کریم ﷺ کی عزت وتکریم نہیں ہوگی بلکہ درد پہنچانا لازم آئے گا جو آپ کی شان کے مخالف ہے۔

(۲) تمام لوگوں یعنی شہداء وغیرہ کی مخالفت لازم آتی ہے کسی کے متعلق قبر میں یعنی برزخی زندگی میں بار بار روح کا جدا ہونا پھر لوٹنا ثابت نہیں۔ نبی کریم ﷺ کے روح کا ہمیشہ رہنا بہت ضروری ہے کیونکہ آپ اعلیٰ مرتبہ والے ہیں۔

(۳) یہ قرآن پاک کے مخالف ہے کیونکہ قرآن پاک سے صرف دو موتیں اور دو زندگیاں ثابت ہیں اس تکرار سے تو کئی موتیں اور کئی زندگیاں ثابت ہوں گی۔ حالانکہ یہ باطل ہے۔

(۴) اس کا تکرار والا معنی لینا احادیث متواترہ کے مخالف ہے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے جن سے ہمیشہ کی زندگی ثابت ہے۔ قانون یہ ہے جو حدیث احادیث متواترہ یا قرآن پاک کے مخالف ہو اس کی تاویل ضروری ہے اگر تاویل نہ ہو سکے تو اس پر عمل نہیں ہو سکتا اس کی تاویل جب ہو سکتی ہے تو ظاہری معنی مراد نہیں بلکہ تاویل کے مطابق ہوگا۔

دوسرا جواب: "عـود" اور "رد" کا معنی عام طور پر لوٹنا اور لوٹانا ہوتا ہے لیکن کبھی ان کا معنی لوٹنا نہیں ہوتا بلکہ آ جانا، ہو جانا، موجود ہونا، اس قسم کے معانی ہوتے ہیں۔ جس طرح حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے کافر سرداروں نے آپ کو کہا یا تو آپ ہمارے دین میں آ جائیں ورنہ ہم تمہیں اپنی بستیوں سے نکال دیں گے آپ نے ان کے جواب میں یہ کہا "قد افترینا علی اللہ کذبا ان عدنا فی ملتکم" ضرور ہم اللہ پر جھوٹ باندھیں گے اگر ہم تمہارے دین میں لوٹ آئیں۔ یہ معنی اس وقت درست ہو سکتا ہے جب معاذ اللہ حضرت شعیب علیہ السلام پہلے ان کے دین میں ہوتے پھر ان کے دین کو چھوڑا ہوتا پھر ان کے مطالبے پر کہتے اگر میں تمہارے دین میں لوٹ آؤں حالانکہ آپ ان کے دین پر تھے ہی نہیں اب اس آیۃ کا صحیح ترجمہ یہ ہوگا "ضرور ہم اللہ پر جھوٹ باندھیں گے اگر ہم تمہارے دین میں آ جائیں"۔

اسی طرح حدیث پاک کا ترجمہ یہ ہوگا اگر کوئی شخص مجھ پر سلام پیش کرے تو میں اس کے سلام کا جواب دوں گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے روح عطا فرمائی ہے۔

تیسرا جواب: رد روح سے مراد روح کا بدن سے جدا ہو کر لوٹنا مراد نہیں۔ نبی کریم ﷺ قبر شریف

میں احوال ملکوت میں مشغول ہیں اور اپنے رب کے مشاہدہ میں مستغرق ہوتے ہیں ۔ جب کوئی سلام پیش کرے تو آپ اس استغراقی حالت سے جب اس انسان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اس توجہ کو روح کے لوٹنے سے تعبیر فرمایا ہے۔اس پر ایک اور حدیث شاہد ہے جس کا تعلق واقعہ معراج سے ہے وہ یہ ہے "فاستیقظت وانا بالمسجد الحرام" اس کا ظاہری معنی یہ ہے جب میں بیدار ہوا تو میں مسجد حرام میں تھا حالانکہ معراج شریف خواب کا واقعہ نہیں بلکہ جاگتے ہوئے در پیش آیا۔اس حدیث کا مطلب بھی یہ ہے کہ آپ معراج کی رات ملکوت کے عجائب وغرائب دیکھنے کی وجہ سے وجدانی کیفیت میں تھے اس حالت سے واپس لوٹے اور مسجد حرام تشریف لائے اس حالت کو جاگنے سے تعبیر فرمایا۔

چوتھا جواب: **" ان الرد یستلزم الاستمرار لان الزمان لا یخلو من مصل علیه فی اقطار الارض فلا یخلو من کون الروح فی بدنه "**

اس مقام پر " رد " کا لفظ خود ہمیشگی کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ کوئی ایسا زمانہ نہیں ہوگا جس میں اطراف زمین میں درود پاک پڑھنے والا نہ ہو لہذا کوئی ایسا وقت نہیں ہوسکتا جس میں روح بدن میں موجود نہ ہو یعنی ہر زمانہ، ہر وقت، ہر آن میں کوئی نہ کوئی شخص زمین کے کسی نہ کسی حصے میں درود پاک پڑھنے والا ہوتا ہے جب بھی کوئی شخص درود پڑھے تو آپ کی روح کا موجود ہونا ضروری ہوتا ہے۔تو معلوم ہوا کہ آپ کی روح مبارک بدن میں ہمیشہ ہی موجود ہے۔

پانچواں جواب: **" لیس المراد بالروح روح الحیاة بل الارتیاح کما فی قوله تعالیٰ (فروح وریحان) فانه قرئ فروح بضم الراء والمراد انه ﷺ یحصل له بسلام المسلم علیه ارتیاح وفرح وهشاشه لحبه ذلک فیحمله ذلک علی ان یرد علیه "**

روح سے مراد روح حیات نہیں بلکہ راحت محسوس کرنا جس طرح اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے (فروح وریحان) ایک قرأت راء کی پیش ہے مراد یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو مسلمان کے سلام سے راحت اور خوشی حاصل ہوتی ہے اور اس کی محبت پر آپ خوش ہوتے ہیں۔حدیث شریف میں روح کے لوٹانے کا یہی مطلب ہے۔ (از الحاوی للفتاوی)

شہید کی زندگی پر روح البیان کا بیان:

انسان میں دو روحیں ہیں ایک روح سلطانی جس کا مقام دل ہے اسی سے زندگی قائم ہے دوسری روح حیوانی جس کا مقام دماغ ہے جس سے ہوش وحواس برقرار رہتے ہیں روح حیوانی سونے کی حالت میں نکل جاتی ہے اور روح سلطانی بروقت موت خارج ہوتی ہے۔ یعنی روح حیوانی کے نکلنے کا نام نیند ہے اور روح سلطانی کے نکلنے کا نام موت ہے پھر جیسے نیند کی حالت میں روح حیوانی جسم سے نکل کر عالم کی سیر کرتی ہے اسی سیر کا نام خواب ہے مگر جسم سے اس کا تعلق رہتا ہے کیونکہ جونہی کسی نے جسم کو ہاتھ لگایا یا پکارا فوراً ہی روح کو خبر ہوئی اور آناً فاناً آ کر جسم میں داخل ہوگئی اور سونے والا جاگ گیا۔

ایسے بعد موت روح سلطانی کا کچھ تعلق جسم سے باقی رہتا ہے کہ جو کوئی قبر پر فاتحہ کے لئے آئے روح کو خبر ہو جاتی ہے اس سے اتنا معلوم ہوا کہ موت نہ تو روح کی فنا کا نام ہے نہ جسم کی۔ صرف جسم سے تعلق کے ضعیف ہونے کا نام ہے اب یہ روح اس جسم کی پرورش نہیں کرتی جسم گل سڑ جاتا ہے۔
(ماخوذ از نعیمی)

لیکن انبیاء کرام کے اجسام سے ان کی ارواح کا تعلق بہت زیادہ قوی ہوتا ہے اس کے بعد شہداء کے اجسام سے اسی لئے ان کے جسم محفوظ رہتے ہیں پھر صلحاء کے جسموں سے بھی ایسا تعلق رہتا ہے کہ ان کے جسم محفوظ رہتے ہیں۔ راقم کے پردادا قاضی غلام نبی رحمہ اللہ کی قبر بارشوں کی وجہ سے جب نقصان میں آئی تو اٹھارا سال کے بعد بھی آپ کا جسم صحیح سلامت تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسا کہ آج ہی دفن کیا گیا آپ کی داڑھی مبارک میں غسل کے وقت کے پانی کے قطرات تک موجود تھے۔ (راقم)

﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ ☆ الَّذِيْنَ اِذَا اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ﴾

۱) ''اور ضرور ہم تمہیں آزمائیں گے کچھ ڈر اور کچھ بھوک سے اور کچھ مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے اور خوشخبری سنا ان صبر والوں کو کہ جب ان پر کوئی مصیبت پڑے تو کہیں ہم اللہ کے مال ہیں اور ہم کو اسی کی طرف پھرنا''

۲) ''اور ضرور بر ضرور ہم آزمائیں گے تمہیں کسی نہ کسی چیز سے یعنی خوف اور بھوک سے اور کمی کر کے مالوں اور جانوں اور پھلوں میں سے اور آپ خوشخبری سنائیں صبر کرنے والوں کو وہ لوگ جب ان کو پہنچے کوئی مصیبت تو کہیں بیشک ہم اللہ کے لئے ہیں اور بیشک ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں''

پہلی آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ نماز اور صبر سے امداد طلب کرو اب بتایا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری ضرور بر ضرور آزمائش کرے گا اس وقت کامیابی تب ہی تم حاصل کرو گے جب صبر کرو گے۔

اعتراض : رب تعالیٰ نے پہلے ذکر فرمایا ﴿ وَاشْكُرُوْالِیْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴾ ''اور میرا شکر کرو اور میری نعمتوں کا انکار نہ کرو''

اور ارشاد فرمایا ﴿ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ ﴾ ''اگر تم نے شکر کیا تو البتہ تمہیں زیادہ عطا کروں گا'' اس کے بعد ﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ ... الخ ﴾ کا کیا مطلب ہے۔

شکر کرنے اور مزید نعمتیں عطا کرنے کے بعد خوف اور بھوک سے آزمانا اور مالوں اور جانوں اور پھلوں میں کمی کر کے آزمانا بظاہر عقل میں نہ آنے والی بات ہے۔

جواب اول : اللہ تعالیٰ نے خبر دی شرائع کو کامل کرنے سے نعمت کی تکمیل ہوگی۔ یعنی اگر تم نے شریعت کے مطابق عمل کر کے میری نعمتوں کا شکر کیا تو تم پر میری طرف سے اور نعمتوں کا فیضان ہوگا۔

'' ثم اخبر ان القیام بتلک الشرائع لا یمکن الا بتحمل المحن

فلاجرم امر فیھا بالصبر "

پھر خبر دی کہ احکام شرع پر اس وقت تک بھی عمل کرنا کامل طور پر ممکن نہیں جب تک وہ مصائب وآلام میں آزمایا نہ جائے اس وقت آزمائش کے وقت صبر کرنا ضروری ہے۔

جواب دوم: اللہ تعالیٰ نے انعام عطاء فرما کے شکر کرنے کا حکم دیا پھر آزمائش میں مبتلاء ہونے پر صبر کا حکم دیا " **لینال الرجل درجة الشاکرین والصابرین معا فیکمل ایمانه** " تاکہ انسان شکر کرنے والے اور صبر کرنے والوں کا درجہ حاصل کرلے اور اس کا ایمان مکمل ہو جائے۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے '' **الایمان نصفان نصف صبر ونصف شکر** " ایمان کے دو حصے ہیں نصف ایمان صبر ہے اور نصف ایمان شکر ہے۔

صبر سے امداد طلب کرنے کے بعد آزمائش کے ذکر کے فوائد:

(۱) پہلے حکم دیا صبر سے امداد طلب کرو تا کہ صبر کرنے کی جب عادت ہو جائے گی اور صبر ان کے نفسوں میں جگہ پکڑ جائے گا پھر جب ان پر آزمائش آئے گی " **فیکون ذلک ابعدلھم عن الجزع واسھل علیھم بعد الورود** " تو ان سے جزع وفزع دور رہے گی اور آزمائشوں پر پورا اترنا ان کے لئے آسان ہوگا۔

(۲) جب ان کو معلوم ہو جائے گا کہ ان کو شدید قسم کے امتحانات سے گزرنا پڑے گا تو ان پر خوف شدید ہو جائے گا" **فیصیر ذلک الخوف تعجیلا للابتلاء فیستحقون به مزید الثواب** ". تو یہ جلدی حاصل ہونے والا خوف بھی امتحان کا ہی ایک حصہ ہے گویا کہ امتحان سے پہلے ہی امتحان کے مزید (زیادہ) ثواب کے وہ مستحق ہو جائیں گے۔

(۳) کفار نے جب نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کو دیکھا کہ یہ لوگ بہت بڑی آزمائشوں میں مبتلاء ہونے کے باوجود اپنے دین پر قائم ہیں " **یعلمون ان القوم انما اختاروا ھذا الدین لقطعھم بصحته فیدعوھم ذلک الی مزید التامل فی دلائله** " تو وہ یقین کرنے لگے کہ یہ لوگ اتنی بڑی آزمائشوں میں مبتلاء ہونے کے باوجود جب دین پر قائم ہے تو یہ دین صحیح ہے اس طرح

وہ لوگ دین کی حقانیت کو سمجھنے کے لئے دلائل میں غور وفکر کرنے لگے۔

اور یہ بھی یقینی بات ہے کہ جب وہ ہستی جو دین اسلام کی دعوت دے رہی تھی وہ خود بڑی بڑی تکالیف برداشت کر رہے تھے تو آپ کے متبعین کو تکالیف برداشت کرنی آسان ہو گئیں اور مخالفین کو سوچنے اور ایمان لانے کی توفیق ملنے لگی۔

(۴) رب تعالیٰ کے حکم کو نبی کریم ﷺ نے پہلے ہی بیان فرمادیا کہ تمہیں ضرور بر ضرور آزمائش میں مبتلاء کیا جائے گا جب آپ کی خبر کے مطابق ہی واقعات رونما ہوئے " **فکان ذلک اخبارا عن الغیب فکان معجزا** " تو یہ غیب کا علم ہے جو نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے۔

سبحان اللہ عظیم مفسر، عظیم محقق علامہ رازی رحمہ اللہ نے کیا خوب بیان فرمایا کہ علم غیب نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ یہ ایسا معجزہ ہے کہ ایسا علم کسی اور کو حاصل ہونا تو دور کی بات ہے لوگوں کی عقلیں علم غیب کو سمجھنے سے بھی عاجز آ گئیں۔

(۵) بیشک منافقین نے نبی کریم ﷺ کی تابعداری کو ظاہر کیا جس کی وجہ سے مال و دولت کے حاصل کرنے کی طمع ولالچ اور رزق میں وسعت حاصل کرنے کی حرص تھی۔ لیکن جب ان کو پتہ چلا کہ اس دین میں قائم رہنے پر تو بہت بڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑے گا:

" **فعند ذلک یتمیز المنافق عن الموافق لان المنافق اذا سمع ذلک نفر منه وترک دینه فکان فی هذا الاختبار هذه الفائدة** "

تو اس کا یہ فائدہ حاصل ہوا کہ منافقین اور موافقین میں فرق نمایاں ہو گیا کیونکہ منافقین نے جب یہ سنا کہ اس دین میں رہنے سے تو خوف اور بھوک میں مبتلاء ہونا پڑے گا اور جان و مال اور پھلوں کی کمی کی آزمائش سے گزرنا پڑے گا تو انہوں نے دین کو چھوڑ کر بھاگنا شروع کر دیا۔

(۶) " **ان اخلاص الانسان حالة البلاء ورجوعه الی باب اللہ تعالیٰ اکثر من اخلاصه حال اقبال الدنیا علیه فکانت الحکمة فی هذا الابتلاء ذلک** "

بیشک انسان کو آزمائش کی حالت میں زیادہ خلوص حاصل ہوتا ہے اور وہ دنیا کی طرف توجہ کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کے در اقدس کی طرف رجوع کرتا ہے اور عبادات خلوص سے ادا کرتا ہے۔

بشئی : " شیئی " واحد ذکر کیا ہے جمع (اشیاء) ذکر نہیں کیا اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی دو وجہ ہیں:

" الاول لئلا یوھم باشیاء من کل واحد فیدل علی ضروب الخوف والتقدیر بشی من کذا وشئی من کذا "

اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جمع اس لئے نہیں ذکر فرمایا تا کہ یہ وہم نہ ہو کہ خوف کی تمام قسمیں مسلط کر کے آزمایا جائے گا فلاں خوف سے اور فلاں خوف سے آزمایا جائے گا۔ بلکہ پہلے " شئی " ذکر کیا کہ کسی نہ کسی چیز سے آزمایا جائے گا پھر " من " بیانیہ ذکر کیا یعنی آزمائش خواہ خوف سے ہو یا بھوک وغیرہ سے (خیال رہے راقم کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے)

" والثانی معناہ بشی قلیل من ھذہ الاشیاء " دوسرا مطلب یہ ہے کہ " شئی " واحد ہے اور نکرہ ہے تنوین تقلیل پر دلالت کرتی ہے اب معنی یہ ہوگا کہ ہم ضرور بر ضرور تمہیں آزمائیں گے ان مذکورہ اشیاء میں سے تھوڑی چیزوں سے (اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اس قول کے مطابق ہے)۔

مِنَ الْخَوْفِ : (خوف سے) اس مقام پر خوف سے مراد کیا ہے؟ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے علامہ رازی رحمہ اللہ کی اس خوبصورت بحث کو مدنظر رکھیں آپ فرماتے ہیں:

انسان کو یا مکروہ (ناپسندیدہ) چیزوں سے واسطہ پڑتا ہے یا محبوب (پسندیدہ) چیزوں سے پھر ان کا تعلق ماضی سے ہوگا یا حال سے، یا استقبال سے

" فاذا خطر ببالک موجود فیما مضی سمی ذکرا وتذکرا " ماضی کی چیزیں جب دل پر کھٹکیں تو ان کو ذکر اور تذکر کہا جاتا ہے یعنی وہ انسان کے لئے نصیحت کا سبب ہے۔

" وان کان موجودا فی الحال یسمی ذوقا ووجدا وانما سمی وجدا لانها حالة تجدها "

اور اگر وہ حال میں موجود ہوں تو ان کو ذوق اور وجد کہا جاتا ہے وجد کہنے کی وجہ ہی یہ ہے کہ انسان اس حالت کو پا رہا ہے۔

" وان کان قد خطر ببالک وجود شئی فی الاستقبال وغلب ذلک علی قلبک سمی انتظارا وتوقعا "

اگر تمہارے دل پر مستقبل میں کسی چیز کے واقع ہونے کا کھٹکا ہو اور وہ تمہارے دل پر غالب طور پر واقع ہو تو اسے انتظار اور توقع کہا جاتا ہے۔

" فان کان المنتظر مکروھا حصل منه الم فی القلب یسمی خوفا و اشفاقا " اگر کسی ناپسندیدہ، پریشان کن چیز کے واقع ہونے کا خطرہ ہو جس سے دل میں درد ہو تو اسے خوف اور اشفاق کہا جاتا ہے۔

" وان کان محبوبا سمی ذلک ارتیاحا والارتیاح رجاء " اور اگر مستقبل میں کسی محبوب چیز کے واقع ہونے کی انتظار ہو تو اسے ارتیاح کہا جاتا ہے اور ارتیاح (راحت حاصل کرنا) کو رجاء (امید کرنا) بھی کہا جاتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہوا کہ جب دل کو درد اور تکلیف ہو کسی پریشان کن چیز کے واقع ہونے کے خطرہ سے تو اسے خوف کہا جائے گا۔ اور اگر دل میں خوشی ہو کہ مستقبل میں فلاں محبوب چیز حاصل ہونے والی ہے تو اس خوشی اور سرور کو ارتیاح اور رجاء کہا جاتا ہے۔

شدید خوف مسلمانوں کو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں دین کے معاملہ میں کفار سے مختلف مواقع پر حاصل ہوتا رہا لیکن سب سے زیادہ خوف اس وقت لاحق ہوا جب تمام اقوام عرب یہود و نصاری اور مشرکین جمع ہو کر اپنے ناپاک ارادے لے کر مدینہ طیبہ کو معاذ اللہ تباہ کرنے کی غرض سے آ گئے ان کا دفاع خندق کھود کر کیا گیا رب تعالیٰ نے ان کو ذلیل کیا اسی کو غزوۂ احزاب اور غزوۂ خندق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تاہم مسلمانوں کو بہت شدید خوف سے آزمایا گیا اس آزمائش کو رب تعالیٰ نے ان الفاظ مبارکہ سے بیان فرمایا ﴿ هُنَالِکَ ابْتُلِیَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِیْدًا ﴾ وہ جگہ تھی کہ مسلمانوں کی جانچ ہوئی اور خوب سختی سے جھنجوڑے گئے۔ (ماخوذ از کبیر)

خوف سے اور آزمائش: " وعن الشافعی رضی اللہ عنه الخوف خوف اللہ "

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں خوف سے مراد اللہ تعالیٰ کا خوف ہے۔ (بیضاوی)

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اپنے اوامر ونواہی سے آزماتا ہے کہ یہ اپنے دلوں میں میرا خوف رکھتے ہوئے ان پر کتنا عمل کرتے ہیں یقیناً جس کے دل میں خوف الٰہی ہوگا وہی اس آزمائش میں کامیاب ہوگا۔

وَالْجُوْعِ : اور بھوک سے، یعنی رب تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کو بھوک سے آزمایا جائے گا بھوک سے آزمانے کا کیا مطلب؟ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے جو امام شافعی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا "والجوع صوم رمضان" بھوک سے مراد رمضان کے روزے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزوں کی فرضیت سے پہلے ہی خبر دے دی کہ ہم تمہیں ضرور بر ضرور آزمائیں گے بھوکا رہنے کا حکم دے کر کہ اس میں کون کامیاب ہوتا ہے۔ (از بیضاوی)

بھوک سے آزمائش کا اور مطلب:

"والمراد من الجوع القحط اقامة للمسبب مقام السبب"

بھوک سے آزمانے کا مطلب یہ ہے کہ قحط سالی سے رب تعالیٰ بندوں کو آزماتا ہے۔

اس مقام پر ذکر بھوک کا لیکن مراد اس کا سبب ہے یعنی قحط سالی مسبب کو سبب کی جگہ رکھا جسے مجاز مرسل کہا جاتا ہے۔ (روح المعانی)

تنبیہ : قحط سالی سے آزمائش بعض قوموں کی ہوتی ہے اور بعض علاقوں میں قحط سالی سے تو رب تعالیٰ اپنے بندوں کو آزماتا ہے لیکن ایسا نہیں کہ تمام مسلمان قحط سالی سے تباہ و برباد ہو جائیں کیونکہ نبی کریم ﷺ رحمۃ للعلمین ﷺ کی دعا پر عام قحط سے رب تعالیٰ نے محفوظ رکھنے کا وعدہ فرما دیا۔

☆ "عن ثوبان قال قال رسول الله ﷺ ان الله زوی لی الارض فرأیت مشارقها ومغاربها وان امتی سیبلغ ملکها مازوی لی منها واعطیت الکنزین الاحمر والابیض وانی سألت ربی لامتی ان لا یهلکها بسنة عامة وان لا یسلط علیهم عدوا من سوی انفسهم فیستبیح بیضتهم وان ربی قال یا محمد انی اذا قضیت قضاء فانه لا یرد وانی اعطیتک لامتک ان لا اهلکهم بسنة عامة ولا اسلط علیهم عدوا من سوی انفسهم یستبیح بیضتهم ولو اجتمع علیهم من باقطارها حتی یکون بعضهم یهلک بعضا ویسبی بعضهم بعضا"

(مسلم ج ۲ ص ۳۹۸ کتاب الفتن)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے میرے لئے زمین کو سمیٹ دیا میں نے اس کے مشارق ومغارب کو دیکھ لیا بیشک میری امت کی بادشاہت وہاں تک پہنچ جائے گی جہاں تک میرے لئے زمین کو سمیٹا گیا۔اور دو خزانے دے دیئے گئے سرخ اور سفید۔اور بیشک میں نے اپنے رب سے اپنی امت کے لئے سوال کیا کہ اسے عام قحط سالی سے ہلاک نہ کرنا۔اور ان پر ان کے اپنے ہی نفسوں کے سوا ان کے دشمن کو مسلط نہ کرنا جو ان کی بادشاہی کو برباد کر دے اور بیشک میرے رب نے کہا اے محمد بیشک جب میں کوئی فیصلہ کر لیتا ہوں تو بیشک میں اسے رد نہیں کرتا۔اور تحقیق میں نے آپ کی امت کو عطا کر دیا ہے کہ ان کو عام قحط سالی سے ہلاک نہیں کروں گا اور ان کے اپنے نفسوں کے سوا ان پر کسی دشمن کو مسلط نہیں کروں گا جو ان کی بادشاہی کو برباد کر دے اگرچہ وہ زمین کی ہر طرف سے کیوں نہ جمع ہو جائیں یہاں تک کہ بعض لوگ بعض کو ہلاک کریں گے اور بعض لوگ بعض کو قید کریں گے۔

وضاحت حدیث: "ان اللہ زوی لی الارض" زویت الشئ کا معنی ہے "میں نے جمع کیا اور قبض کیا" اس سے مراد کسی چیز کو دور سے قریب کر دینا تا کہ اسے دیکھ لے اور مطلع ہو جائے حاصل کلام یہ ہے "طوی لاجلی الارض" کہ میرے لئے رب تعالیٰ نے زمین کو سمیٹ دیا دور کو قریب کر دیا۔ "وجعلها مجموعة کھیئة کف فی مرآة نظره" اور اس زمین کے مجموعہ کو اس طرح نبی کریم ﷺ کے قریب کر دیا جیسے کسی کی ہتھیلی اس کی نظر کے آئینہ کے سامنے ہو۔

"ولذا قال فرأیت مشارقها ومغاربها" اور اسی وجہ سے کہا میں نے اس کے مشارق ومغارب کو دیکھ لیا "ای جمیعها" یعنی زمین کے تمام حصہ کو دیکھ لیا۔

سبحان اللہ رب تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک ﷺ کو کتنا عظیم علم دیا۔ پتہ نہیں لوگ آپ کے علم کو پیمانہ سے کیوں ناپتے ہیں کم علم لو گو وہ تمہارے پیمائش میں آنے والے علوم نہیں "وان امتی سیبلغ ملکها ما زوی لی منها" بیشک میری امت کی بادشاہی وہاں تک پہنچ جائے گی جہاں تک میرے لئے زمین کو سمیٹ دیا گیا۔

علامہ خطابی کہتے بعض لوگوں نے گمان کیا کہ "منها" میں "من" تبعیضہ ہے جس کا مطلب ہے کہ زمین کے بعض حصوں پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گی۔

" ولیس ذلک کما توهمه بل هی للتفصیل للجملة المتقدمة " یہ کہنا صحیح نہیں کہ " من " تبعیضیہ ہے بلکہ " من " بیانیہ ہے پہلے جملہ کی تفصیل ہے مطلب اس کا یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ پر تو زمین ایک مرتبہ ہی لپیٹ دی گئی۔لیکن آپ کی امت پر آہستہ آہستہ زمین فتح ہوگی اور ان کی حکومت قائم ہوگی۔علامہ علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں شائد " من " تبعیضیہ کہنے والوں کی وجہ یہ ہو "فالمراد بالارض ارض الاسلام" کہ زمین سے مراد اسلام کی زمین ہو یعنی اسلام تو ہر جگہ پہنچ جائے گا البتہ مسلمانوں کی بادشاہت بعض علاقوں میں قائم ہوگی۔

راقم کے نزدیک محاکمہ یہی ہے کہ یوں بیان کیا جائے کہ جہاں تک زمین کو میرے لئے سمیٹ دیا گیا وہاں تک اسلام کی حکومت قائم ہوگی یعنی اسلام پہنچ جائے گا اس سے مراد ظاہری حکومت نہیں۔

واعطیت الکنزین الاحمر والابیض ، یہ ماقبل سے بدل ہے یعنی میری امت کو دو خزانے سرخ اور سفید عطا کر دیئے گئے۔

سرخ اور سفید خزانوں سے مراد سونا اور چاندی بھی ہو سکتا ہے جس سے واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے جو خبر دی وہی ہوا کہ آپ کی امت آج کل سونے اور چاندی کی مالک ہے۔اور سرخ وسفید سے مراد کسریٰ اور قیصر کی بادشاہی بھی ہو سکتی ہے کہ میری امت کو فارس اور روم کی بادشاہی حاصل ہو جائے گی آپ کی یہ خبر بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں واقع ہو چکی ہے۔

" وانی سألت ربی لامتی ان لا یهلکها بسنة عامة " السنۃ ، سے مراد قحط اور خشک سالی ہے مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنے رب سے اپنی امت کے لئے سوال کیا کہ ان کے تمام شہروں میں قحط نہ پڑے۔" ای لا اهلكم بقحط یعمهم بل ان وقع قحط فیکون فی ناحية یسیرة" یعنی میں نے اپنے رب تعالیٰ سے سوال کیا کہ میری امت کو عام قحط سے ہلاک نہ کرنا کہیں کہیں مختلف علاقوں میں قحط سے آزمالیا جائے۔

وان لا یسلط علیهم عدوا من سوی انفسهم فیستبیح بیضتهم ،"عدوا" سے مراد کفار ہیں جو مسلمانوں کے دشمن ہیں۔" من سوی انفسهم " یعنی اے اللہ تعالیٰ میری امت پر

کفار دشمنوں کو مسلط نہ کرنا سوائے ان کے اپنے نفسوں کے جوان کو تباہ و برباد کردیں۔

سوائے ان کے اپنے نفسوں کے آپ نے کیوں فرمایا۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ اس سے پہلے یہ دعا کر چکے تھے۔

" عن سعد ان رسول ال ﷺ مربمسجد بنی معاویة دخل فرکع فیه رکعتین وصلینا معه ودعا ربه طویلا ثم انصرف فقال سألت ربی ثلاثا فاعطانی ثنتین ومنعی واحدة سألت ربی ان لا یهلک امتی بالسنة فاعطانیها وسألت ان لا یهلک امتی بالغرق فاعطانیها وسألته ان لا یجعل بأسهم بینهم فمنعنیها " (رواه مسلم)

حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے بیشک رسول اللہ ﷺ بنی معاویہ کی مسجد سے گزرے اس میں داخل ہوئے دو رکعت ادا فرمائیں ہم نے بھی آپ کے ساتھ نماز ادا کی آپ نے اپنے رب تعالیٰ سے لمبی دعاء کی پھر آپ وہاں سے پھرے تو آپ نے فرمایا میں نے اپنے رب سے تین چیزوں کا سوال کیا تو دو چیزیں رب تعالیٰ نے مجھے عطاء کیں اور ایک سے مجھے منع فرما دیا گیا۔ میں نے اپنے رب سے سوال کیا میری امت کو عام قحط سے ہلاک نہ کرنا تو رب تعالیٰ نے مجھے یہ عطاء کر دیا (یعنی اس دعاء کو قبول کرلیا) اور میں نے سوال کیا "میری تمام امت کو غرق کر کے ہلاک نہ کرنا" تو رب تعالیٰ مجھے یہ بھی عطاء کر دیا اور میں نے اپنے رب سے یہ سوال کیا کہ میری امت کو آپس میں ایک دوسرے سے لڑنے والا نہ بنانا تو رب تعالیٰ نے مجھے اس سے منع فرما دیا کہ یہ دعا نہ کرنا۔ اس لئے دوبارہ جب آپ نے دعاء فرمائی تو " من سوی انفسهم " کہہ کر خود ہی اس کو مستثنیٰ کر دیا۔

فیستبیح بیضتهم ، بیضہ، انڈے کو کہا جاتا ہے انڈے سے تشبیہ دی اس لئے کہ کہ انڈا ٹوٹ جائے تو مکمل تباہ ہو جاتا ہے بظاہر معنی تو یہ ہے کہ کفار ان کے انڈے کو مباح نہ سمجھیں لیکن اس سے مراد یہ ہے " یستأصلهم ویهلکهم جمیعا " کہ دشمن میری امت کو مکمل طور پر تباہ و برباد نہ کر دیں ان کو جڑوں سے اکھاڑ نہ پھینکیں " فیفهم انه قد یسلط علیهم عدو " اسی سے یہ سمجھ آ گیا کہ مسلمانوں پر کبھی دشمن مسلط تو ہو جائیں گے لیکن مسلمانوں کو مکمل طور پر تباہ و برباد نہیں کر سکیں گے۔

وجہ واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی دعاء کو قبول فرمالیا اور ساتھ ہی وعدہ فرمالیا کہ یہ ایسا فیصلہ ہے جو مبرم ہے معلق نہیں یعنی اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہونی۔ اور مسئلہ یہ واضح ہوا کہ مسلمان آپس میں لڑ کر اپنی طاقت کو کمزور کر کے یا غدار مسلمان کافروں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو جو نقصان پہنچا سکتا ہے وہ کفار نہیں پہنچا سکتے۔ (ماخوذ از نووی، ومرقاۃ شرح مشکوۃ ج ۱۱ ص ۵۱ باب فضائل سید المرسلین ﷺ)

بھوک سے آزمانے کی ایک اور وجہ: کچھ لوگ اپنے آپ کو دین کے لئے وقف کردیں ذریعہ معاش نہ ہو تو وہ بعض اوقات رب تعالیٰ کی طرف سے اس آزمائش میں مبتلاء ہوتے ہیں کہ بھوک ان پر مسلط ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو سخت آزمائش میں پورا اترنے کی توفیق بھی عطا فرماتا ہے۔

☆ **"عن ابی هریرة قال خرج رسول الله ﷺ ذات یوم او لیلة فاذا هو بابی بکر وعمر فقال ما اخرجکما من بیوتکما هذه الساعة قالا الجوع یا رسول الله قال انا والذی نفسی بیده لاخرجنی الذی اخرجکما قوموا فقاموا معه فاتی رجلا من الانصار فاذا هو لیس فی بیته فلما رأته المرأة قالت مرحبا واهلا فقال لها رسول الله ﷺ این فلان قالت ذهب یستعذب لنامن الماء اذ جاء الانصاری فنظر الی رسول الله ﷺ وصاحبیه ثم قال الحمد لله ما احد الیوم اکرم اضیافا منی قال فانطلق فجاء هم بعذق فیه بسر وتمر ورطب فقال کلوا من هذه واخذ المدیة فقال له رسول الله ﷺ ایاک والحلوب فذبح لهم فاکلوا من الشاة ومن ذلک العذق وشربوا فلما ان شبعوا وروو قال رسول الله ﷺ لابی بکر وعمر والذی نفسی بیده لتسئلن عن هذا النعیم یوم القیامة اخرجکم من بیوتکم الجوع ثم لم ترجعوا حتی اصابکم هذا النعیم"** (مسلم ج ۲ ص ۱۸۵ باب جواز اشباعه غیره ..... الخ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ (گھر سے باہر) نکلے تو آپ کی ملاقات ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما سے ہوگئی تو آپ نے فرمایا تمہیں تمہارے گھروں سے اس گھڑی کس چیز نے نکالا ہے؟ انہوں نے عرض کیا بھوک نے یا رسول اللہ، حضور ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اسی چیز نے مجھے بھی نکالا جس نے تمہیں نکالا۔ اٹھو (چلو) وہ آپ کے ساتھ چلے۔ ایک انصاری صحابی کے گھر تشریف لائے وہ اس وقت گھر میں نہیں تھے جب ان کی زوجہ نے حضور کو دیکھا تو خوش آمدید کہا تو حضور ﷺ نے اس عورت سے پوچھا فلاں

شخص (تمہارے خاوند) کہاں گئے ہیں؟ اسنے کہاوہ ہمارے پینے کے لئے پانی لینے گئے ہیں اسی بات کے دوران انصاری صحابی بھی پہنچ گئے تو انہوں نے نبی کریم ﷺ اور آپ کے دونوں ساتھیوں کو دیکھا پھر کہا الحمد للہ آج کے دن کے مہمانوں سے بڑھ کر میرے نزدیک کوئی اور مکرم نہیں پھر وہ گئے اور کھجوروں کا خوشہ لے کر آئے جس میں خشک اور پکی اور کچھ کچی کھجوریں تھیں آپ کی خدمت میں پیش کیں اور عرض کیا آپ تناول فرمائیں پھر انہوں نے (بکری ذبح کرنے کے لئے) چھری لی۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا دودھ والی سے اپنے آپ کو دور رکھنا۔ انہوں نے بکری ذبح کی حضور ﷺ اور آپ کے ساتھیوں نے گوشت اور کھجوریں کھائیں اور پانی پیا جب آپ نے سیر ہو کر کھانا کھالیا اور پانی پی لیا تو نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے قیامت کے دن ضرور بر ضرور تم سے ان نعمتوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا کہ تمہیں گھروں سے بھوک نے نکالا پھر تم گھروں میں لوٹ کر نہیں گئے کہ تمہیں یہ نعمتیں عطا فرمادیں۔

وضاحت حدیث: اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے بڑے بڑے صحابہ کرام کے پاس دنیا کا مال تھوڑا رہا اور بھوک سے رب تعالیٰ نے ان کو آزمایا۔ ہاں یہ خیال رہے کہ نبی کریم ﷺ کے پاس کبھی مال آجاتا اور آپ کو آسانی حاصل ہوجاتی اور کبھی مال ختم ہوجاتا اور مشکل پیدا ہوجاتی اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ آپ کو مال سے محبت نہیں تھی بلکہ جلدی ہی آپ مال خرچ کر دیتے تھے:

"فکان النبی ﷺ فی وقت یوسر ثم بعد قلیل ینفد ما عندہ لا خراجہ فی طاعۃ اللہ من وجوہ البر وایثار المحتاجین وضیافۃ الطارقین وتجہیز السرایا وغیر ذلک"

نبی کریم ﷺ کو کبھی مال حاصل ہوتا اور آسانی حاصل ہوتی تو آپ جلدی ہی وہ مال ختم کر دیتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طاعت میں نیکی کے مختلف کاموں میں وہ مال خرچ کر دیتے کبھی محتاج لوگوں کو مال عطاء فرماتے اور باہر سے آنے والے مہمانوں خصوصا رات کو پہنچنے والوں کی مہمان نوازی اور دشمن کے مقابل لشکر کی تیاری میں اور اس قسم کے نیکی کے کاموں میں آپ مال خرچ کر دیا کرتے تھے خود پھر

حالت فقر میں آجاتے " وهكذا كان خلق صاحبيه بل اكثر اصحابه " اسی طرح آپ کے یار حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا طریقہ بھی تھا بلکہ آپ کے اکثر صحابہ کرام اسی طریقہ پر عمل کرتے تھے:

" كما ثبت في الصحيح عن ابي هريرة خرج رسول الله ﷺ من الدنيا ولم يشبع من خبز الشعير "

جس طرح صحیح بخاری شریف میں ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے لیکن آپ نے سیر ہو کر جو کی روٹی بھی نہیں کھائی۔

" وعن عائشة ما شبع آل محمد ﷺ مذ قدم المدينة من طعام ثلاث ليال تباعا حتى قبض وتوفي ﷺ ودرعه مرهونة على شعير استدانة لاهله "

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی کریم ﷺ جب سے مدینہ طیبہ میں تشریف لائے آپ نے اور آپ کے اہل وعیال نے تین دن مسلسل سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا یہاں تک کہ اسی حال میں آپ دنیا سے تشریف لے گئے۔ بلکہ جب آپ کا وصال ہوا تو آپ کی زرہ رہن رکھی ہوئی تھی کیونکہ آپ نے اس رہن کی ضمانت پر اپنے اہل وعیال وغیرہ کے لئے جو قرض کے طور پر لئے ہوئے تھے۔

فوائد: حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما رب تعالیٰ کی طاعت میں رہتے اور عبادات میں مشغولیت کی وجہ سے اور مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کر دینے کی وجہ سے خود بھوک میں مبتلاء ہو گئے۔

ان دونوں حضرات کا گھر سے نکلنا بے صبری کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ عبادت میں ضعف کی وجہ سے کمی آرہی تھی صرف اس خیال سے نکلے تھے کہ کوئی دوست کھانا کھلا دے تاکہ عبادت دل جمعی سے ادا کی جائے۔

مسئلہ یہی ہے کہ اگر پیشاب، پاخانہ کی شدید حاجت ہو تو فارغ ہو کر نماز ادا کرے تاکہ نماز میں اضطراب نہ ہو اسی طرح اگر بھوک غالب ہو جو نماز میں خلل انداز ہو تو کھانا پہلے کھائے اور نماز بعد میں ادا کرے۔

نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے مجھے بھی اسی چیز نے گھر سے نکالا ہے جس نے تمہیں نکالا ہے۔ اسی سے یہ واضح ہو گیا۔

" فیہ جواز ذکر الانسان ماینالہ من الم ونحوہ لا علی سبیل التشکی وعدم الرضا بل للتسلیة والتصبر کفعلہ ﷺ ھنا "

کہ انسان کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے درد، تکلیف کو ذکر کرے، اس ذکر کرنے میں بے صبری اور ناراضگی نہ پائی جائے بلکہ دل کو تسلی دینا اور صبر کرنا مقصود ہو جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اس مقام میں ذکر فرمایا۔

انصاری کی زوجہ نے نبی کریم ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو " مرحبا واھلا " کہا اس سے واضح ہو گیا کہ مہمانوں کے آنے پر ان کا خوشدلی سے استقبال کرنا اور ان کو خوش آمدید کہنا مستحب ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے " من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیکرم ضیفہ " جو شخص اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہئے کہ وہ مہمان کی عزت کرے۔

انصاری صحابی نے نبی کریم ﷺ اور آپکے ساتھیوں کو دیکھ کر خوشی سے " الحمد للہ " کہا اس سے واضح ہوا " استحباب اظھار البشر والفرح بالضیف فی وجھہ وحمد اللہ تعالی وھو یسمع " مہمان کی آمد پر اس کے سامنے خوشی کا اظہار کرنا مستحب ہے اور " الحمد للہ " کہنا مستحب ہے جب کہ وہ مہمان سن بھی رہا ہو۔ اصل وجہ یہی ہے کہ مہمان کی عزت کرنے کا حکم خود نبی کریم ﷺ نے دیا۔ صحابی نے پہلے کھجوریں پیش کیں " وفیہ دلیل علی استحباب تقدیم اکل الفاکھة علی الخبز واللحم وغیرھما " اور اس میں یہ دلیل پائی گئی ہے کہ مستحب ہے کہ پھل، روٹی اور گوشت وغیرہ سے پہلے پیش کرنا مستحب ہے۔

اسی طرح مستحب یہ ہے کہ جب معلوم ہو کہ مہمان کو ضرورت درپیش ہے کہ اسے کھانے اور پینے کی کوئی چیز جلدی دی جائے تو جو چیز بھی میسر ہو وہی پیش کر دی جائے۔

اور حدیث پاک سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ دودھ والے جانور کو بلاضرورت اور بغیر کسی عذر کے ذبح نہ کیا جائے تاکہ اس سے جو دودھ حاصل ہو رہا ہے اس سے محروم نہ ہو جائے۔

نبی کریم ﷺ اور آپ کے ساتھیوں نے کھانا سیر ہو کر کھایا:

" فیہ دلیل علی جواز الشبع وما جاء فی کراھة الشبع فمحمول علی

المداومة علیه لانه یقسی القلب وینسی امر المحتاجین"

اس میں یہ دلیل پائی گئی ہے کہ سیر ہو کر کھانا جائز ہے ہاں البتہ ہمیشہ ہی سیر ہو کر کھانے کی عادت بنانا مکروہ ہے کیونکہ اس سے دل میں قساوت (سختی) پیدا ہوتی ہے اور محتاج لوگوں کا خیال دل میں نہیں آتا۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم سے ان نعمتوں کا سوال کیا جائے گا اس کا مطلب یہ ہے " المراد السوال عن القیام بحق شکرہ" کہ یہ سوال کیا جائے گا کہ کیا تم نے میری نعمتوں کا شکریہ ادا کیا ہے۔

لیکن یہ خیال رہے کہ یہ ارشاد گرامی امت کی تعلیم کیلئے تھا ورنہ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایسے جلیل القدر حضرات رب تعالیٰ کی نعمتوں کا شکریہ ادا نہ کریں اسی وجہ سے قاضی عیاض رحمہ اللہ نے بیان فرمایا:

" والذی نعتقده ان السوال هنا سوال تعداد النعم واعلام بالامتنان بها واظهار الکرامة باسباغها لا سوال توبیخ وتقریع ومحاسبة والله اعلم"

اس میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ سوال ان دونوں صاحبوں سے اپنی متعدد نعمتوں اور کامل احسان کرنے کے متعلق علم عطا کرنے اور کامل کرامت کو ظاہر کرنے کے لئے ہوگا اس میں ان کو توبیخ (ڈانٹ وغیرہ) اور کسی قسم کا محاسبہ کرنا مقصود نہیں ہوگا۔ (از نووی)

☆ " عن ابن عمر ان رسول الله ﷺ سمع رجلا یتجشا فقال اقصر من جشاء ک فان اطول الناس جوعا یوم القیامة اطولهم شبعا فی الدنیا"

(رواه فی شرح السنة وروی الترمذی نحوه ، مشکوة کتاب الرقاق)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو ڈکار مارتے ہوئے سنا تو آپ نے فرمایا تھوڑے ڈکار مارو جو شخص دنیا میں زیادہ بھوکا رہے گا قیامت کے دن وہ دنیا میں سیر ہو کر کھانے والوں میں سے زیادہ شان والا ہوگا۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ سیر ہو کر کھانا تو جائز ہے لیکن ہمیشہ سیر ہو کر کھانے کی عادت نہ بنائے اور حد سے زیادہ نہ کھائے جس سے ڈکار آتے رہیں۔

☆ " عن ابی طلحة قال شکونا الی رسول الله ﷺ الجوع فرفعنا عن بطوننا عن حجر حجر فرفع رسول الله ﷺ عن بطنه عن حجرین ، رواه الترمذی وقال هذا حدیث غریب"

(مشکوة باب فضل الفقر)

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم نے رسول اللہ ﷺ سے بھوک کی شکایت کی اور اپنے پیٹوں پر ایک ایک پتھر بندھا ہوا دکھایا تو رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اپنے پیٹ پر دو پتھر بندھے ہوئے دکھائے۔

کتنا شدید امتحان تھا نبی کریم ﷺ کا اور آپ کے صحابہ کرام کا سبحان اللہ اتنے بڑے امتحان میں کامیاب ہونا بھی ان عظیم ہستیوں کا کام ہی تھا۔

پتھر باندھنے کی ایک حکمت تو راقم کو یہ سمجھ آتی ہے کہ جب پیٹ خالی ہو تو ہوا کی گردش سے اضطرابی کیفیت زیادہ ہوتی ہے اور جب اوپر سے پتھر وغیرہ رکھ کر دبا دیا جائے تو سکون ملتا ہے۔

اور وجہ علامہ علی قاری رحمہ اللہ نے اسی حدیث کے تحت مرقاۃ میں بیان فرمائی۔

" من اشتد جوعه وخمص بطنه ان يشتد على بطنه حجرا ليتقوم به صلبه "

صحابہ کرام کی عادت یہ تھی کہ جس شخص کو بہت شدید بھوک میں مبتلاء ہونا پڑتا اور خالی پیٹ ہوتا وہ پیٹ پر پتھر باندھ لیتا تاکہ اس کی پیٹھ سیدھی رہے۔

وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ :

''اور کمی کر کے مالوں اور جانوں اور پھلوں میں''۔

مالوں میں کمی سے آزمانے سے مراد " هلاک المواشی " مویشیوں کو ہلاک کر کے مومنوں کو آزمایا جائے کہ وہ اس آزمائش میں پورے اترتے ہیں یا نہیں۔ (از روح المعانی)

" ﴿ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ ﴾ بسبب الاشتغال بقتال الكفار وقيل الجوائح المتلفة "
(قرطبی)

مالوں میں کمی کر کے آزمانے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ کفار سے جہاد میں مشغول ہونے کی وجہ سے ان کے مالوں میں کمی واقع ہوگی۔ اسی طرح آفات و بلیات کی وجہ سے مالوں میں کمی آجائے۔

اس صورت میں مال سے مراد عام ہے خواہ مویشی ہوں یا سونا، چاندی، روپے وغیرہ میں کمی کر کے آزمایا جائے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا " والنقص من الاموال الزكوات والصدقات " کہ مال کی کمی سے مراد زکواۃ اور صدقات سے آزمانا یعنی اگرچہ زکوۃ وصدقات مال میں خیر و برکت کا ذریعہ ہیں لیکن انسان کو بظاہر مال میں کمی نظر آتی ہے اس لئے رب تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم تمہیں زکوۃ

فرض کر کے اور صدقات واجبہ سے آزمائیں گے کیا تم اس میں کامیابی حاصل کرتے ہو اور صبر واستقلال سے اس پر عمل کرتے ہو یا نہیں۔ (از روح المعانی)

جانوں میں کمی: " وقد يكون النقص في النفس بموت بعض الاخوان والاقارب " یعنی تمہارے بعض بھائیوں اور رشتہ داروں کو فوت کر کے تمہیں آزمائیں گے کہ تم صبر کرتے ہو یا نہیں۔

یہاں " ونقص من (الانفس) " کا استعمال ایسے ہی ہے جیسا کہ ﴿ وَلَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ ﴾ کا ہے جس کا ظاہری معنی ہے تم اپنے آپ کو قتل نہ کرو لیکن مراد یہ ہے کہ تم اپنے بھائیوں کو قتل نہ کرو اسی طرح یہاں بھی مراد ہے کہ تمہارے بھائیوں اور رشتہ داروں کی جانوں میں کمی کر کے تمہیں آزمائیں گے۔

(کبیر)

وَالْاَنْفُسِ : " قال ابن عباس بالقتل والموت في الجهاد " حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا جانوں سے آزمانے کا مطلب یہ ہے کہ جہاد میں تمہیں موت (طبعی طور پر آنے والی) یا شہید کر کے آزمایا جائے گا کہ تم اپنی موت کے آثار دیکھ کر یا آثار شہادت دیکھ کر کتنا صبر کرتے ہو؟

(از قرطبی)

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں " ونقص من ﴿ اَلْاَنْفُسِ ﴾ " کا مطلب ہے " ونقص من ﴿ اَلْاَنْفُسِ ﴾ بالامراض " کہ ہم تمہیں بیمار کر کے جسمانی طور پر کمزور کر کے آزمائیں گے کہ تم اس میں کتنا صبر کرتے ہو۔ (روح المعانی ۶)

وَالثَّمَرَاتِ : ''اور پھلوں میں کمی سے'' اس سے مراد یہ ہے:

" واما نقص من الثمرات فقد يكون بالجدب وقد يكون بترك عمارة الضياع للاشتغال بجهاد الاعداء "

کبھی خشک سالی کی وجہ سے پھلوں میں کمی کر کے آزمایا جاتا ہے اور کبھی دشمنوں کے ساتھ جہاد کرنے کا حکم دے کر جہاد میں مشغول رکھ کر کھیتی باڑی اور باغات میں کام نہ کر سکنے کی وجہ سے پھلوں میں کمی کر کے آزمایا جاتا ہے کہ اس میں پورے اترتے ہیں یا نہیں۔ (کبیر)

" ومن نقص ﴿ اَلثَّمَرَاتِ ﴾ تلفها بالجوائح " اور پھلوں میں کمی کرنے کا یہ مطلب بھی ہے کہ آفات وبلیات سے ان میں کمی کر دی جائے جیسا کہ کثیر بارشوں، آندھیوں، ژالہ باری، گرم لوکی

وجہ سے پھلوں میں نقصان پیدا کر دیا جائے اسی طرح کیڑے مکوڑے کچے پھلوں کو کھا جائیں یہ سب آفات وبلیات ہیں۔ (از روح المعانی)

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں " ومن (الثمرات) موت الاولاد واطلاق الثمرة علی الولد مجاز مشھور " ثمرات میں کمی کر کے آزمانے کا یہ مطلب بھی ہے کہ تمہاری اولاد کو فوت کر کے تمہیں آزمایا جائے گا ثمرہ کا معنی ولد (بچہ، بچی) لینا بہت مشہور ہے یہ مجازی معنی ہے کیونکہ ثمرہ (پھل) سے فائدہ حاصل ہوتا ہے اولاد سے بھی فائدہ حاصل ہوتا ہے اس لئے ثمرات کا اطلاق اولاد پر ہے اسی معنی کی مناسبت سے کہا جاتا ہے " ثمرة العلم العمل " علم کا ثمرہ عمل ہے یعنی علم کے اوپر مرتب ہونے والا نفع عمل ہے۔ اس مجازی معنی پر ترمذی شریف کی حدیث شاہد ہے جو حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور حدیث حسن ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" اذا مات ولد العبد قال اللہ تعالیٰ للملائکة " اقبضتم ولد عبدی ؟ فیقولون : نعم ، فیقول ، اقبضتم ثمرة قلبه ؟ فیقولون : نعم ، فیقول اللہ تعالیٰ : ماذا قال عبدی ؟ فیقولون : حمدک واسترجع ، فیقول اللہ تعالیٰ ، ابنوا لعبدی بیتا فی الجنة وسموہ بیت الحمد "

جب کسی بندے کا بچہ یا بچی فوت ہو جائے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کو کہتا ہے کیا تم نے میرے بندے کے ولد (بچہ، بچی) کی روح کو قبض کر لیا ہے؟ فرشتے کہتے ہیں ہاں (اے اللہ) رب تعالیٰ فرماتا ہے کیا تم نے اس کے دل کے ثمرہ کو قبض کر لیا ہے؟ وہ کہتے ہیں ہاں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے کیا کہا؟ فرشتے کہتے ہیں اس نے " اَلْحَمْدُلِلّٰه " پڑھا اور " اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ " پڑھا تو رب تعالیٰ فرماتا ہے میرے اس بندے کے لئے جنت میں گھر بنا دو اور اس کا نام 'بیت الحمد' رکھ دو۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ ثمرہ کا اطلاق ولد پر مجازی طور پر عام اور مشہور ہے۔

اعتراض : اگرچہ یہ آیۃ کریمہ روزے اور زکوۃ کی فرضیت سے پہلے نازل ہوئی لیکن اللہ تعالیٰ کے خوف سے مومنوں کے دل پہلے ہی بھرے ہوئے تھے پھر آزمانے کا مفہوم سمجھ نہیں آتا۔ اسی طرح امراض اور اولاد کی موت تو پہلے سے واقع ہو رہی تھیں پھر آزمانے کا وعدہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ اسی طرح ''زکوٰۃ'' کا معنی ہی جب بڑھنا اور زیادتی ہے تو اس پر مال کی کمی سے آزمانے کا کیا مطلب؟

جواب : یہ بات قابل تسلیم ہے کہ مومنوں کے دل پہلے سے ہی اللہ تعالیٰ کے خوف سے بھرپور تھے لیکن " لاینافی ابتلاء هم فی الاستقبال بخوف آخر ، فان الخوف یتضاعف بنزول الآیات " یہ مستقبل میں اور خوف لاحق کر کے آزمانے کے منافی نہیں کیونکہ مومنوں کا خوف آیات کے نازل ہونے سے بڑھتا ہی رہا۔

" وکذا الامراض وموت الأولاد امور متجددة یصح الابتلاء بها فی الآتی من الازمان "

اور اسی طرح امراض اور اولاد کی موت اگر چہ پہلے سے آ رہی تھیں لیکن آنے والے زمانہ میں ان سے آزمائش کو جاری رکھنے کے ارشاد سے اور زیادہ خوف لاحق ہوتا ہے اس حال میں صبر کرنے سے کامیابی حاصل ہوتی ہے اور صبر نہ کرنے کی وجہ سے ناکامی حاصل ہوتی ہے۔

" والتعبیر عن الزکوة بالنقص لکونها نقصا صورة وان کانت زیادة معنی فعند الابتلاء سماها نقصا وعند الامر بالاداء سماها زکوة لیسهل اداؤها "

زکوۃ کو مال کی کمی سے تعبیر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان ظاہر طور پر یہ سمجھتا ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے سے میرا مال کم ہو جائے گا حالانکہ زکواۃ کا معنی بھی بڑھنا ہے اور برکت سے مال بھی بڑھتا ہے۔ اس لئے آزمائش کے وقت زکوۃ کو نقص مال سے تعبیر کر دیا گیا اور زکواۃ ادا کرنے کا جو حکم دیا گیا اس میں زکواۃ کا معنی بڑھنا ہی لیا جائے گا تا کہ زکوٰۃ ادا کرنا آسان ہو۔ (از روح المعانی)

سبحان اللہ قرآن پاک کی کیا ہی عظمت ہے کہ ایک ایک لفظ کتنے کتنے معانی پر مشتمل ہے۔

آزمائش کا مقصد: **" والابتلاء من الله لاظهار المطیع من المعاصی لا لیعلم شیئا مما لم یکن عالما به "** (معالم التنزیل)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش کا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی اطاعت کرنے والا اور نافرمان ایک دوسرے سے ممتاز ہو جائیں نیک لوگ اور گنہگار لوگ ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ ہو جائیں۔ دراصل لوگوں پر یہ فرق ظاہر کرنا مقصود ہے یہ مقصد نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو پہلے علم حاصل نہیں ہوتا تو وہ آزمائش کر کے علم حاصل کرتا ہے۔

وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ : "اور بشارت دو صبر کرنے والوں کو" علی البلاء بالجنة "یعنی اللہ تعالیٰ جب اپنے بندوں کو آزمائش میں مبتلاء کرے تو وہ اس پر پورے اتریں تو ان کو جنت کی بشارت دے دو۔ (جلالین)

"بشر" میں خطاب کسے ہے؟ **خطاب للنبی ﷺ اولکل من تتأتی منه البشارة** " یہ خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے کہ آپ صبر کرنے والوں کو بشارت دے دیں۔ یا ہر اس شخص کو ہے جس سے بھی بشارت دینے کی توقع ہوسکتی ہے۔ (روح المعانی)

راقم کے نزدیک پہلے خطاب تو نبی کریم ﷺ کو ہی ہے لیکن اس کے بعد " **العلماء ورثة الانبیاء** " علماء انبیاء کرام کے وارث ہیں۔ کے مطابق یہ خطاب علماء کرام کو ہے اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ علماء کرام جب انبیاء کرام کے بشیر ہونے کے وارث ہیں تو نذیر ہونے کے بھی وارث ہیں نیک لوگوں کو خوشخبری بھی دیں اور گنہگاروں کو ڈرائیں بھی صرف ایک رخ اختیار نہ کیا جائے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا ﴿ وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ ﴾ **ای بالثواب علی الصبر** " صبر کرنے والوں کو ثواب کی بشارت دے دو " **وثوابه غیر مقدر** " ثواب کی کوئی حد ذکر نہیں فرمائی اس لئے کہ عطاء کرنے والا کریم ہے وہ اپنی شان کریمی کے مطابق بے حد و بے حساب ثواب عطاء فرماتا ہے۔

ہاں یہ بھی خیال رہے کہ صبر وہ ہے جو پہلے پہلے صدمہ پہنچے تو انسان صبر کرے پہلے تو جزع وفزع کرتا رہے پھر صبر کرنے کا کیا فائدہ کچھ دیر کے بعد تو بڑی سے بڑی مصیبتیں برداشت کر لی جاتی ہیں۔ اسی پر بخاری شریف کی حدیث جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے دلالت کر رہی ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا " **انما الصبر عند الصدمة الاولی** " بیشک صبر وہی معتبر ہے جو پہلے صدمہ کے وقت حاصل ہو۔ حدیث شریف کا مطلب یہ ہے " **انما الصبر الشاق علی النفس الذی یعظم الثواب علیه انما هو عند هجوم المصیبة وحرارتها** " بیشک صبر کرنا نفس کیلئے مشقت آمیز کام ہے اسی لئے اس پر عظیم ثواب حاصل ہوتا ہے لیکن یہ وہی صبر معتبر ہوگا جو مصیبت کے ہجوم کے وقت کیا جائے جب وہ مصیبت بے قرار کر رہی ہو دل میں حرارت پائی جائے۔ کیونکہ اس وقت صبر کرنا انسان کی قوت قلب پر دلالت کرتا ہے اور صبر کرنے میں اسکی ثابت قدمی پر دلالت کرتا ہے " **واما اذا بردت حرارة المصیبة فکل احد یصیر اذ ذاک** " جب مصیبت کی حرارت ٹھنڈی پڑ جائے تو

ہر ایک شخص اس وقت صبر کر لیتا ہے۔ (قرطبی)

غیر ممکن صبر کا حکم نہیں: قفال رحمہ اللہ نے بیان فرمایا:

" لیس الصبر ان لا یجد الانسان الم المکروہ ولا ان لا یکرہ ذلک لان ذلک غیر ممکن "

صبر اس چیز کا نام نہیں کہ انسان کو کسی تکلیف اور مصیبت پر درد بھی لاحق نہ ہو یا انسان تکلیف کو تکلیف ہی نہ سمجھے کیونکہ ایسا صبر انسان کے لئے ناممکن ہے۔

" انما الصبر ھو حمل النفس علی ترک اظہار الجزع فاذا کظم الحزن و کف النفس عن ابراز آثارہ کان صاحبہ صابرا وان ظہر دمع عین او تغیر لون "

صبر یہ ہے کہ انسان مصیبت کو برداشت کرے جزع وفزع نہ کرے، غم کو برداشت کرلے اور اپنے نفس کو اس کے ظاہر کرنے سے روک کر رکھے جو شخص اس پر عمل کر لے گا وہ صابر کہلائے گا اگرچہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوں یا اس کا رنگ زرد پڑ جائے۔ (کبیر)

اَلَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ :

" وہ لوگ جب پہنچے ان کو مصیبت تو کہیں بیشک ہم اللہ کے لئے ہیں اور بیشک ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

طلباء کرام کی توجہ کے لئے: جلالین میں " الذین " سے پہلے " ھم " نکالا گیا ہے یعنی خبر ہے مبتداء محذوف کی اور اس میں ترکیب یہ ہے کہ یہ تمام جملہ مقام مدح میں منصوب ہو۔ ایک اور ترکیب یہ ہے کہ " اولئک " اس کی خبر محذوف ہو جو مقدم ہو اور یہ جملہ مبتدا ہو۔

" وقیل ان الذین نعت للصابرین وھو احسنھا " اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ " الذین " والا جملہ صفت ہے " صابرین " کی یعنی مجرور محلا ہے یہی ترکیب سب سے بہتر ہے (از صاوی)

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی ترکیب کے مطابق ہے اور راقم نے اپنا ترجمہ گول مول کر دیا ہے تاکہ جس ترکیب پر آپ محمول کرنا چاہیں کر سکیں۔

"مصیبة" اصل میں "مصوبة" ہے اس کی جمع "مصائب" ہے وہ بھی اصل میں "مصاوب" ہے "المصیبة کل ما یؤذی المؤمن ویصیبه" مصیبت ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو مؤمن کو ایذاء پہنچائے۔ (از قرطبی)

مصیبت عام ہے جس سے انسان کو تکلیف ہو خواہ اس تکلیف کا تعلق نفس سے ہو یا مال سے ہو، یا اہل سے ہو خواہ وہ تکلیف تھوڑی ہو یا زیادہ چھوٹی ہو یا بڑی۔ (از روح المعانی)

اللہ تعالیٰ نے مصیبت کو اپنی طرف منسوب نہیں فرمایا کہ میری طرف سے جب ان کو مصیبت پہنچے بلکہ عام مصیبت کا ذکر کیا:

"فالظاهر انه یدخل تحتها کل مضرة ینالها من قبل الله تعالی وینالها من قبل العباد"

ظاہر بات یہ ہے کہ مصیبت سے مراد ہر وہ چیز ہے جو ضرر پہنچائے خواہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہنچے یا بندوں کی طرف سے پہنچے۔

دونوں صورتوں میں انسان کو تکلیف ہوتی ہے انسان کو جو تکلیف اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہنچے "یجب ان یعتقد فیه انه حکمة وصواب وعدل وخیر وصلاح وان الواجب علیه الرضابه وترک الجزع" تو اس پر واجب ہو جاتا ہے کہ وہ اس میں عقیدہ یہ رکھے کہ بیشک اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکمت پائی گئی ہے اور رب تعالیٰ کا میرے حق میں یہ فیصلہ درست ہے اور انصاف پر مبنی ہے رب تعالیٰ کا ہر کام خیر اور صلاح پر مبنی ہے لہٰذا بندے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس پر رضامندی کا اظہار کرے اور جزع وفزع نہ کرے۔ اس لئے کہ جب انسان "انا للّٰه" کہہ رہا ہے تو عبودیت کا اقرار کر رہا ہے تمام امور اللہ تعالیٰ کے سپرد کر رہا ہے تو اب اس پر ضروری ہو چکا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش کے فیصلہ میں رضامندی کا اظہار کرے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مطابق ﴿ وَاللّٰهُ یَقۡضِیۡ بِالۡحَقِّ ﴾ "اور اللہ تعالیٰ حق فیصلہ فرماتا ہے" ایمان رکھے کہ رب تعالیٰ کا کوئی فیصلہ ناحق نہیں ہوتا۔ اگر کوئی تکلیف اللہ تعالیٰ کے غیر یعنی بندوں کی طرف سے آئے تو اسے بھی رب تعالیٰ کی طرف سے ہی سمجھے غیظ وغضب کی صورت میں برداشت سے کام لے یہ بھی "انا للّٰه" میں

داخل ہے کیونکہ تمام امور در حقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی حاصل ہوتے ہیں۔جس تکلیف کے حاصل ہونے میں کسی بندے کا دخل نہ ہو جیسے مریض ہونا اور کسی عزیز وقریبی رشتہ دار کا فوت ہو جانا وغیرہ اس کے متعلق انسان یہ کہے " انا للّٰه یدبر فینا کیف یشاء " بیشک ہم اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں وہی ہم میں جیسے چاہے تدبیر فرماتا ہے۔اور وہ تکلیف جو بظاہر بندوں کی طرف سے حاصل ہے اس کے متعلق یہ کہے " انا للّٰه ینتصف لنا کیف یشاء " بیشک ہم اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں وہ جیسے چاہے ہم میں انصاف کرے۔

" اِنَّـا لِلّٰهِ " کہہ کر ہم یہ اقرار کرتے ہیں کہ بادشاہی صرف رب تعالیٰ کی ہے اور " اِنَّـا اِلَيْـهِ رَاجِعُوْنَ " کہہ کر ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہم نے فوت ہونا ہے اور رب تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا ہے۔

جب انسان کو یہ دونوں چیزوں کا علم ہو تو یقیناً وہ کامل طور پر صبر کر سکے گا اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلہ پر صابر وشاکر رہے گا اور اسے ثواب اور عذاب حاصل ہونے کا بھی یقین ہو جائے گا۔یعنی اسی سے قیامت پر یقین حاصل ہو جاتا ہے اور انسان کو جب اس چیز کا یقین ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے صبر کرنے والوں کو اچھی جزاء عطا کرنی ہے کیونکہ " ولا یضیع عنده اجر المحسنین " اس کے ہاں اچھا کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں ہوتا تو یقیناً انسان کامل طور پر صبر کرے گا۔ (ماخوذ از کبیر)

استرجاع پر احادیث مبارکہ: استرجاع کا مطلب ہے " اِنَّـا لِلّٰهِ وَاِنَّـا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ " پڑھنا چھوٹی مصیبت ہو یا بڑی یہ کلمات مبارکہ پڑھے خواہ کانٹا چبھ جائے، یا مچھر کاٹ جائے یا تسمہ ٹوٹ جائے یا چراغ بجھ جائے۔ (روح المعانی)

☆ انقطع نعال النبی ﷺ فاسترجع فقالوا مصیبة یا رسول اللّٰه فقال رسول اللّٰه ﷺ ما اصاب المومن مما یکره فهو مصیبة "

(رواه الطبرانی فی الکبیر من حدیث ابی امامة وله شواهد مرفوعة وموقوفة)

نبی کریم ﷺ نے نعلین کے ٹوٹنے پر " اِنَّـا لِلّٰـهِ وَاِنَّـا اِلَيْهِ رَاجِعُوْن " پڑھا۔صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا یہ بھی مصیبت ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن کو جو چیز بھی ناپسند پہنچے وہ اس کے لئے مصیبت ہی ہے۔

☆ " عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ اذا انقطع شسع احد کم فلیسترجع فانہ المصاب "

(رواہ البیھقی فی شعب الایمان)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کسی ایک کے جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ " اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن " پڑھے کیونکہ یہ بھی مصیبت ہے

☆ " وفی الحدیث من استرجع عند المصیبۃ خیر اللہ مصیبتہ واحسن عقباہ وجعل لہ خلفا صالحا یرضاہ "

حدیث شریف میں ہے جس نے مصیبت کے وقت " اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن " پڑھا اللہ تعالیٰ اس کی مصیبت کو خیر بنادے گا اور اس کا انجام اچھا کردے گا اور اس کے پیچھے اسے بہتری عطا کردے گا جسے وہ پسند کرے گا۔ (از مظہری)

☆ " قال ابو سنانا دفنت ابنی سنان وابو طلحۃ الخولانی علی شفیر القبر ، فلما اردت الخروج اخذ بیدی فانشطنی وقال الا ابشرک یا ابا سنان حدثنی الضحاک عن ابی موسیٰ ان النبی ﷺ قال اذا مات ولد العبد قال اللہ لملائکتہ اقبضتم ولد عبدی فیقولون نعم فیقول اقبضتم ثمرۃ فوادہ فیقولون نعم فیقول فما ذا قال عبدی فیقولون حمدک واسترجع فیقول اللہ تعالیٰ ابنوا لعبدی بیتا فی الجنۃ وسموہ بیت الحمد "

حضرت ابو سنان رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے اپنے بیٹے سنان کو جب دفن کیا (یعنی قبر کی لحد میں اتار کر پتھر رکھ لئے) تو مجھے ضحاک نے حدیث بیان فرمائی کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب کسی بندے کی اولاد میں سے کوئی فوت ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کو کہتا ہے کیا تم نے میرے بندے کے ولد (بچہ ، بچی) کی روح کو قبض کر لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ہاں (اے اللہ) پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کیا تم نے اس کے دل کے ثمرہ کو قبض کر لیا؟ فرشتے کہتے ہیں ہاں (اے اللہ) تو رب تعالیٰ فرماتا ہے پھر میرے بندے نے کیا کہا؟ وہ کہتے ہیں اس نے " اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" پڑھا اور " اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن " پڑھا۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے اس بندے کے لئے جنت میں ایک مقام بنادو اور اس کا نام بیت الحمد رکھ دو۔ (قرطبی)

تنبیہ : یہی حدیث پہلے ایک اور مسئلہ بیان کرنے کے لئے ذکر کی یہاں اور مسئلہ بیان کیا گیا ہے

احادیث کی کتب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں ایک ایک حدیث کئی جگہ مختلف مسائل بیان کرنے کے لئے آتی ہے۔

☆ " عن ام سلمة قالت اتانی ابوسلمة یوما من عند رسول اللہ ﷺ فقال لقد سمعت من رسول اللہ ﷺ قولا سررت به قال ولا یصیب احدا من المسلمین مصیبة فیسترجع عند مصیبته ثم یقول اللهم اجرنی فی مصیبتی اخلف لی خیرا منها الا فعل ذلک به قالت ام سلمة فحفظت ذلک منه فلما توفی ابو سلمة استرجعت وقلت اللهم اجرنی فی مصیبتی واخلف خیرا منها ثم رجعت الی نفسی فقلت من این لی خیر من ابی سلمة ؟ فلما انقضت عدتی استاذن علی رسول اللہ ﷺ وانا ادبغ اهابالی فغسلت بیدی من القرظ واذنت له فوضعت له وسادة ادم حشوها لیف فقعد علیها فخطبنی الی نفسی ، فلما فرغ من مقالته قلت یا رسول اللہ مالی ان لا یکون بک الرغبة ولکنی امرأة فی غیرة شدیدة فاخاف ان تری منی شیأ یعذبنی اللہ به وانا امرأة قد دخلت فی السن وانا ذات عیال فقال اماما ذکرت من الغیرة فسوف یذهبها اللہ عزوجل عنک واما ما ذکرت من السن فقد اصابنی مثل الذی اصابک واما ما ذکرت من العیال فانما عیالک عیالی قالت فقد سلمت لرسول اللہ ﷺ فتزوجها رسول اللہ ﷺ فقالت ام سلمة بعد ابدلنی اللہ بابی سلمة خیر امنه رسول اللہ ﷺ " (مسند احمد)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میرے پاس ایک دن ابوسلمہ (ان کے خاوند) رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر آئے تو انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ سے ایسا قول سنا جس سے میں خوش ہوگیا نبی کریم ﷺ نے فرمایا کسی ایک شخص کو مصیبت نہیں پہنچتی کہ وہ مصیبت کے وقت "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن" پڑھے اوراس کے بعد یہ پڑھے " اللّٰهم اجرنی فی مصیبتی واخلف لی خیرا منها " اے اللہ مجھے مصیبت میں اپنی حفاظت میں رکھ اوراس مصیبت کے بدلے مجھے بھلائی عطا فرما۔ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے مصیبت کے بعد بھلائی عطا فرمادیتا ہے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی کو یاد کرلیا۔ جب ابوسلمہ رضی اللہ عنہ فوت ہوگئے تو میں نے "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن" پڑھا پھر میں نے یہ پڑھا " اللّٰهم اجرنی فی مصیبتی واخلف لی خیرا منها " پھر میرے دل میں خیال آیا میں نے کہا ابوسلمہ سے میرے لئے اور بہتر کون

ہوگا؟ جب میری عدت ختم ہوئی رسول اللہ ﷺ (تشریف لائے اور آپ) نے مجھ سے (گھر میں داخل ہونے کی) اجازت طلب کی میں اس وقت چمڑا رنگ رہی تھی میں نے کیکر کی چھال والے ہاتھ دھوئے اور آپ کو اجازت دی (آپ تشریف لائے) میں نے آپ کے لئے چمڑے کا تکیہ رکھا جس میں کھجور کے پتے بھرے ہوئے تھے آپ تکیہ سے سہارا لگا کر بیٹھے تو آپ نے مجھے خطبہ کیا (یعنی اپنی ذات سے نکاح کرنے کے لئے مجھے ارشاد فرمایا) جب آپ اپنے کلام سے فارغ ہوئے تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ بات تو نہیں کہ مجھے آپ کی طرف رغبت نہ ہو لیکن (میری مجبوریاں یہ ہیں) کہ میں غیرت والی عورت ہوں ہوسکتا ہے کہ (غیرت کی وجہ سے آپ کی دوسری ازواج سے کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے) آپ مجھ میں کسی چیز کو دیکھ کر ناراض ہو جائیں تو رب تعالیٰ مجھے عذاب دے دے۔

(دوسری مجبوری یہ ہے کہ) میں عمر رسیدہ ہوں (مجھے نکاح کی خواہش نہیں)

(اور تیسری مجبوری یہ ہے) کہ میں عیال دار ہوں (میرے بچے بیکس ہو جائیں گے۔

آپ نے فرمایا ''جو تم نے غیرت (دوسرے کو دیکھ کر جلنا، پریشان ہونا) کا ذکر کیا ہے اسے اللہ تعالیٰ لے جائے گا'' (یعنی یہ کیفیت اللہ تعالیٰ کے فضل اور میری دعا اور میری زوجیت میں آنے کی برکت کی وجہ سے جاتی رہے گی) اور جو تم نے عمر کا ذکر کیا ہے میری بھی ایسی ہی عمر ہے جیسی تمہاری ہے اور جو تم نے بچوں کا ذکر کیا ہے بیشک تمہارے بچے میرے بچے ہیں (یعنی نکاح کی خواہش مجھے بھی نہیں میں بھی ایک بیوہ اور یتیم بچوں کی پرورش کرنا چاہتا ہوں)۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں میں نے اپنے آپ کو رسول اللہ کے سپرد کر دیا۔ ان کا نکاح رسول اللہ ﷺ سے ہو گیا اس کے بعد حضرت ام سلمہ کہتی ہیں کہ مجھے سمجھ آیا کہ واقعی اللہ تعالیٰ نے مجھے ابو سلمہ کے بدلے نے ان سے بہتر یعنی رسول اللہ ﷺ عطا کر دیئے۔ (صابونی)

استرجاع دل سے پڑھے: '' **ولیس الصبر بالاسترجاع باللسان بل الصبر باللسان وبالقلب** '' صبر صرف زبان سے '' اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْن '' پڑھنے کا نام نہیں بلکہ زبان اور دل سے جب پڑھے تو صبر اسے کہا جائے گا۔

استرجاع اس امت کا خاصہ ہے:

" فقد اخرج الطبرانی وابن مردویه عن ابن عباس رضی الله عنه قال قال النبی ﷺ ، اعطیت امتی شیا لم یعطه احد من الامم ان تقول عند المصیبة انا لله وانا الیه راجعون "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا میری امت کو وہ چیز عطاء کی گئی جو پہلی امتوں میں سے کسی امت کو عطا نہیں ہوئی وہ یہ کہ مصیبت کے وقت میری امت یہ پڑھے "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن "

" وفی روایة اعطیت هذه الامة عند المصیبة شیأ لم تعطه الانبیاء قبلهم انا لله وانا الیه راجعون ولو اعطیها الانبیاء قبلهم لاعطیها یعقوب اذ یقول یا اسفا علی یوسف "

اور ایک روایت میں یہ ہے کہ اس امت کو مصیبت کے وقت وہ چیز عطا کی گئی ہے جو ان سے پہلے انبیاء کرام کو بھی وہ عطا نہیں کی گئی ہے وہ چیز ہے " اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن " اگر یہ چیز پہلے انبیاء کرام کو حاصل ہوتی تو حضرت یعقوب علیہ السلام کو حاصل ہوتی جب آپ کہہ رہے تھے " یااسفٰی علی یوسف " اے افسوس یوسف پر۔ (روح المعانی)

یعنی آپ کو اگر یہ کلمات عطا ہوتے تو آپ بھی یہ پڑھتے۔

☆ " واخرج الطبرانی عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ ان للموت فزعا فاذا اتی احدکم وفاة اخیه فلیقل انا لله وانا الیه راجعون وانا الی ربنا لمنقلبون "(درمنثور)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک موت سے گھبراہٹ طاری ہوتی ہے جب بھی تم میں سے کسی ایک کے پاس اپنے بھائی کی موت کی خبر آئے تو وہ یہ پڑھے "انا لله وانا الیه راجعون وانا الی ربنا لمنقلبون " (طبرانی)

☆ " واخرج الدیلمی عن عائشة قالت اقبل رسول الله ﷺ وقد لدغته شوكة فی ابهامه فجعل یسترجع منها ویمسحها فلما سمعت استرجاعه دنوت منه فنظرت فاذا اثر حقیر فضحكت فقلت یا رسول الله بابی انت وامی اكل هذا الاسترجاع من اجل هذه

الشوكة فتبسم ثم ضرب على منكبي فقال يا عائشة ان الله عزوجل اذا اراد ان يجعل الصغير كبيرا جعله واذا اراد ان يجعل الكبير صغيرا جعله" (درمنثور)

دیلمی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ذکر کی آپ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو انگوٹھے میں کانٹا چبھ گیا تو آپ اسی ہاتھ سے ملنے لگے اور "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن" پڑھنا شروع کیا جب میں نے آپ کو "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن" پڑھتے ہوئے سنا تو آپ کے قریب گئی میں نے دیکھا کہ بہت معمولی سا اثر ہے تو میں ہنسنے لگی میں نے کہا یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان کیا ہر چیز پر یعنی کانٹا چبھنے پر بھی "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن" پڑھا جاتا ہے۔ تو آپ مسکرائے پھر میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے ارشاد فرمایا اے عائشہ بیشک اللہ تعالیٰ جب چاہے چھوٹی چیز کو بڑا بنا دے اور جب چاہے بڑی چیز کو چھوٹا بنا دے۔ (مسند دیلمی، درمنثور)

یعنی انسان اگر کسی تکلیف کو چھوٹا سمجھ کر رب تعالیٰ کی طرف توجہ نہ کرے اور "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن" نہ پڑھے تو ہوسکتا ہے وہی تکلیف بڑی ہو جائے اور اگر کسی بڑی تکلیف پر "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن" پڑھ لے اور رب تعالیٰ کو یاد کرلے تو اس کی خیر و برکت سے وہ تکلیف دور ہو جائے۔

آنسو بہانے پر احادیث مبارکہ:

☆ " واخرج ابن سعد عن خيثمة قال لما جاء عبد الله بن مسعود نعي اخيه عتبة دمعت عيناه فقال ان هذه رحمة جعلها الله لا يملكها ابن آدم"

ابن سعد نے خثیمہ سے روایت بیان کی کہ جب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس ان کے بھائی عتبہ کی وفات کی خبر آئی تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے تو آپ نے فرمایا یہ رحمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے بنائی ہے کیونکہ انسان اس پر قادر نہیں (کہ آنسو بھی روک سکے)۔ (درمنثور)

☆ " عن انس بن مالک قال قال رسول الله ﷺ ولدلي الليلة غلام فسميته باسم ابى ابراهيم عليه السلام ثم دفعه الى ام سيف امراة قين يقال له ابو سيف فانطلق ياتيه واتبعته فانتهينا الى ابى سيف وهو ينفخ بكيره قد امتلأ البيت دخانا فاسرعت المشى بين يدى رسول الله ﷺ فقلت يا ابا سيف امسک جاء رسول الله ﷺ فامسک فدعا النبى ﷺ

بالصبی فضمه الیه وقال ما شاء الله ان یقول فقال انس لقد رأیته وهو یکید بنفسه بین یدی رسول الله ﷺ فدمعت عینا رسول الله ﷺ فقال تدمع العین ویحزن القلب ولانقول الا ما یرضی ربنا والله یا ابراهیم انا بک لمحزونون "(مسلم ج ۲ ص ۲۶۲ باب رحمته ﷺ الصبیان)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رات کو میرے بچے کا تولد ہوا میں نے اس کا نام اپنے باپ ابراہیم کے نام پر رکھا۔ پھر وہ آپ نے ام سیف کو (پرورش کے لئے) دے دیا جو ایک لوہار ابوسیف کی زوجہ تھی نبی کریم ﷺ بچے کو ملنے کے لئے چلے میں بھی آپ کے پیچھے چلا ہم ابوسیف کے گھر پہنچے تو وہ آگ کی بھٹی کو دھونکنی کے ذریعے ہوا دے کر بھڑکا رہا تھا گھر دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ میں جلدی جلدی رسول اللہ ﷺ کے آگے آگے چلا۔ میں نے ابوسیف کو کہا اے ابوسیف رک جاؤ۔ رسول اللہ ﷺ تشریف لا رہے ہیں وہ رک گئے نبی کریم ﷺ تشریف لائے بچے کو طلب کیا سینے سے لگایا پھر آپ نے کچھ ارشاد فرمایا جو اللہ تعالیٰ کی مشیت میں تھا کہ آپ فرمائیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ کے ہاتھوں میں ہی بچے کا سانس اکھڑنے لگا (نزع کا عالم طاری ہوگیا) نبی کریم ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے آپ نے فرمایا آنکھوں سے آنسو جاری ہیں دل غمناک ہے لیکن ہم کوئی ایسی بات نہیں کرتے جو رب تعالیٰ کی رضاء کے خلاف ہو قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اے ابراہیم ہم تیری وجہ سے غم زدہ ہیں۔

حدیث پاک سے واضح ہوا:

"جواز البکاء علی المریض والحزن وان ذلک لا یخالف الرضا بالقدر بل هی رحمة جعلها الله فی قلوب عباده وانما المذموم الندب والنیاحة والدعاء بالویل والثبور"

کہ مریض پر رونا جائز ہے اور غم کرنا جائز ہے یہ تقدیر پر رضامندی کے خلاف نہیں بلکہ یہ رحمت ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں ڈال دی ہاں برا یہ ہے کہ واویلا کرنا، بال وغیرہ نوچنا، کسی کے لئے ہلاکت کی دعا کرنا۔ (نووی)

فائدہ جلیلہ : "واخرج الطبرانی عن جابر بن سمرة قال قال رسول الله ﷺ من

دفن ثلاثة فصبر علیهم واحتسب وجبت له الجنة فقالت ام ایمن واثنین قال واثنین قالت او واحد فسکت ثم قال وواحد "

طبرانی نے حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے تین (نابالغ بچے) دفن کئے پھران پر صبر کیا اور اللہ تعالیٰ کی رضاء پر شاکر رہا اس کے لئے جنت واجب ہے حضرت ام ایمن نے عرض کیا اور دو (یعنی دو بچے فوت ہو جائیں تو کیا حکم ہے) آپ نے فرمایا دو کا بھی یہی حکم ہے پھرانہوں نے پوچھا اگر ایک ہوتو؟ آپ ذرا خاموش رہے پھر آپ نے فرمایا ایک کا بھی یہی حکم ہے۔ (طبرانی، درمنثور)

راقم نے بریکٹ میں (نابالغ بچے) جوذکر کیا ہے اس پر ترمذی شریف میں واضح طور پر " لم یبلغوا الحنث " کے الفاظ دلالت کررہے ہیں۔

☆ " عن ابن عباس انه سمع رسول الله ﷺ یقول من کان له فرطان من امتی ادخله الله بهما الجنة فقالت له عائشة فمن کان له فرط من امتک قال ومن کان له فرط یا موفقه قالت فمن لم یکن له فرط من امتک قال فانا فرط امتی لن یصابوا بمثلی "

(ترمذی جلد اول باب ما جاء فی ثواب من قدم ولدا)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا میری امت میں سے جس شخص کے دو بچے آگے منتظم ہوئے تو اللہ تعالیٰ اس شخص کو ان دونوں کے ذریعے جنت میں داخل کرے گا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا آپ کی امت میں سے جس کا ایک بچہ منتظم ہوا تو؟ آپ نے فرمایا اے توفیق دی گئی جس کا ایک بچہ منتظم ہوا اس کا بھی وہی حکم ہے پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ذکر کیا جس کا ایک بچہ بھی منتظم نہ ہوا تو؟ آپ نے فرمایا اس کا میں منتظم ہوں گا میری مثل کسی کو مصائب نہیں پہنچائی گئیں۔

وضاحت: فرط بالتحریک من یتقدم القافلة فهیی لهم ما یحتاجون الیه " فرط کی راء متحرک بالفتحہ ہے یہ اس شخص کو کہا جاتا ہے جو قافلہ سے آگے جاکر وہ چیزیں تیار کرے جن کے وہ محتاج ہوں۔

" والفرط هنا الولد الذی مات قبله فانه یتقدم ویهیی لوالدیه منزلا فی الجنة "

یہاں فرط سے مراد وہ نابالغ بچے ہیں جو والدین سے پہلے فوت ہو جائیں بیشک وہ آگے جاکر

اپنے والدین کے لئے جنت میں مہمان نوازی کا اور جنت میں مقام کا انتظام کریں۔

"ادخله الله الجنة بهما" ان بچوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس شخص کو جنت میں داخل کرے گا "یعنی مع الناجين او لا بالصبر عليهما" یعنی بچوں کی وفات پر صبر کرنے کی وجہ سے ہی ابتدائی طور پر جنت میں داخل کرے گا" او الشفاعة منهما" یا ان بچوں کی شفاعت سے اللہ تعالیٰ ان کے والدین کو جنت میں داخل کرے گا۔

یا موفقة اى بالخيرات والاسولة الواقعة موقعها شفقة على الامة" نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا" اے توفیق دی ہوئی "یعنی بھلائی کی توفیق دی ہوئی" اور سوال جو واقع ہوتے ہیں برمحل تم سے" جو میری امت کے لئے شفقت کا سبب بنتے ہیں ان کی توفیق دی ہوئی۔

(از مرقاۃ بحوالہ حاشیہ ترمذی)

سبحان اللہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سوال نہ کرتیں تو کیسے پتہ چلتا کہ جس کا اور کوئی شفیع نہیں ہوگا اس کے شفیع مصطفیٰ کریم ﷺ ہوں گے۔

"لن يصابوا بمثلى ، اى بمثل مصيبتى لهم فان مصيبتى اشد عليهم من سائر المصائب واكون انا فرطهم"

جس کا اور کوئی نہیں ہوگا اس کا جنت میں پہلے میں منتظم ہوں گا کیونکہ ان میں سے کسی کو بھی وہ مصیبتیں حاصل نہیں ہوئیں جو مجھے حاصل ہوئیں اور میں ان کا شفاعتی اور منتظم ہوں گا۔

(مرقاۃ بحوالہ حاشیہ ترمذی)

خیال رہے کہ "اصاب يصيب" کا مطلقاً معنی پالینا، پہنچادینا بھی آتا رہتا ہے علامہ راغب اصفہانی فرماتے ہیں" واصاب : جاء في الخير والشر ، قال " ان تصبك حسنة تسؤهم" وان تصبك مصيبة "ولئن اصابكم فضل من الله" کہ" اصاب" کا استعمال خیر اور شر دونوں میں آتا رہتا ہے کیونکہ "ان تصبك حسنة تسؤهم" میں اور" ولئن اصابكم فضل من الله" میں خیر کے لئے استعمال ہے "وان تصبك مصيبة" میں اور" وان تصبك سيئة" میں مصیبت کے لئے استعمال ہے۔

" قال بعضهم الاصابة فی الخیر اعتبارا بالصوب ای بالمطر وفی الشر اعتبارا باصابة السهم و کلاهما یرجعان الی الاصل "

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ صوب کا معنی بارش کا ہونا، پانی کا اوپر سے انڈیلنا اس معنی کے لحاظ سے اس کا استعمال خیر کے لئے ہے اور " اصابة السهم " کا معنی تیر کا پہنچنا اس معنی کے لحاظ سے شر میں استعمال ہے۔

اس تمہید کے بعد راقم کا موقف یہ ہے کہ " لن یصابوا بمثلی " کا اگر یہ معنی کر لیا جائے کہ (جس کا کوئی فرط نہیں اس کا میں فرط ہوں) کیونکہ میرے جیسا شفیع اور میرے جیسا منتظم ان کو اور کوئی حاصل نہیں ہوگا تو بہت خوب سے خوب تر معنی نظر آئے گا..... واللہ اعلم بالصواب۔

دین میں بڑی مصیبتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آئیں:

" عن عطاء بن ابی رباح قال قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم اذا اصاب احدکم مصیبة فلیذکر مصابه بی فانها من اعظم المصائب "

عطاء بن ابی رباح فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کسی ایک کو مصیبت پہنچے وہ میری مصیبتوں کو یاد کرے جو سب سے بڑی مصیبتیں ہیں۔

☆ " قال ابو عمر و صدق رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم لان المصیبة به اعظم من کل مصیبة یصاب به المسلم بعده الی یوم القیامة "

ابو عمرو کہتے ہیں کیا خوب سچا ارشاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے کہ مسلمانوں کو میرے بعد بہت بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا جو قیامت تک سلسلہ جاری رہے گا۔ ابو عمرو کہتے ہیں واقعی ہم نے اس ارشاد کا مشاہدہ کیا جب سلسلہ وحی منقطع ہوگیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوگیا تو " کان اول ظهور الشر بارتداد العرب وغیر ذلک " سب سے پہلی مصیبت جو مسلمانوں پر واقع ہوئی وہ کئی عرب کا مرتد ہو جانا تھا اس کے بغیر اور کئی فتنے نمودار ہو گئے۔ " وکان اول انقطاع الخیر واول نقصانه " نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد خیر و بھلائی کا انقطاع ہوگیا اور نقصان پیدا ہوگیا جو آہستہ آہستہ عظیم خلفشار تک پہنچ گیا۔

☆ " قال ابو سعید ما نفضنا ایدینا من التراب من قبر رسول اللہ ﷺ حتی انکرنا قلوبنا "

ابوسعید فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کی قبر شریف کی مٹی سے ابھی ہاتھ بھی نہیں جھاڑے تھے کہ آپ کے وصال کی وجہ سے خیر و برکت کے اٹھ جانے کی وجہ سے ہمارے دلوں میں شکوک وشبہات کی عجیب کیفیت پیدا ہوگئی جو آپ کے بعد بہت بڑی مصیبت تھی۔

☆ ابوالعتاھیہ نے اس حدیث کا معنی نظم کی صورت میں خوبصورت انداز پر پیش کیا۔

اصبر لکل مصیبة وتجلد	واعلم بان المرء غیر مخلد
ہر مصیبت پر صبر کرو اور بہادری سے کام لو	اور یقین کرلو کہ کسی انسان نے ہمیشہ نہیں رہنا
او ما تری ان المصائب جمة	وتری المنیة للعباد بمر صد
کیا تو دیکھتا نہیں کہ بیشک مصیبتیں کثیر ہیں	اور تو موت کو دیکھ جو بندوں کے لئے گھات میں ہے
من لم یصب ممن تری بمصیبة	ھذا سبیل لست فیه باوحد
جن لوگوں کو تم دیکھ رہے ہو کون سا وہ شخص ہے جسے مصیبت نہ پہنچی	یہ وہ راستہ ہے جس میں تم اکیلے نہیں
فاذا ذکرت محمد او مصابه	فاذکر مصابک بالنبی محمد
جب تمہیں یاد آئے نبی کریم ﷺ اور آپ کی مصیبتوں کی	تو اپنی مصیبتوں کو نبی کریم ﷺ کی مصیبتوں کے مقابل یاد کرو۔

(ماخوذ از قرطبی)

نماز باجماعت رہ جانے پر استرجاع:

" واخرج عبد بن حمید عن الحسن قال اذا فاتتک صلوة فی جماعة فاسترجع فانها مصیبة "

عبد بن حمید حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جب تمہاری نماز جماعت سے رہ جائے تو "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْن" پڑھو کیونکہ یہ بھی ایک مصیبت ہے۔

(درمنثور)

☆ " واخرج عبد بن حمید عن سواد بن داود ان سعید بن المسیب جاء وقد فاتته الصلوة فی الجماعة فاسترجع حتی سمع صوته خارجا من المسجد "

عبد بن حمید نے سواد بن داوٗد سے روایت ذکر کی کہ بیشک سعید بن میسب آئے اور ان کی نماز

جماعت سے رہ گئی تو انہوں نے بلند آواز سے " اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْن " پڑھا یہاں تک کہ ان کی آواز مسجد سے باہر سنائی دی۔ (درمنثور)

کلام الامام فی تفسیر الآیت للاختتام:

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ہم اس آیۃ کی تفسیر کو قضاء پر رضاء کے بیان سے ختم کرتے ہیں بندے کا اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی رہنا دو طریقہ سے ہے ایک طریق تصرف سے اور دوسرا طریق جذب سے۔

طریق التصرف: تصرف کے طریقہ میں چند وجوہ ہیں:

(۱) بیشک جب کسی کا دل کسی چیز کی طرف مائل ہو اور اس کے دل کی توجہ کامل طور پر کسی چیز کی طرف ہو جائے تو وہ چیز اس کے لئے منشأ آفات بن جاتی ہے اس وقت دل کی توجہ عالم حدوث سے رب تعالیٰ کی طرف پھیر دی جائے (اس میں رب تعالیٰ کی طرف سے بھی توفیق حاصل ہو جاتی ہے):

" فان آدم علیہ السلام لما تعلق قلبه بالجنة جعلها محنة علیه حتی زالت الجنة فبقی آدم مع ذکر اللہ"

حضرت آدم علیہ السلام کا دل جب جنت سے بہت زیادہ لگ گیا تو وہی جنت آپ کے لئے محنت و مشقت کا ذریعہ بن گئی جب جنت آپ سے زائل ہوگئی تو آپ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں باقی رہے (یعنی اللہ تعالیٰ کے ذکر میں کامل مشغول ہو گئے)۔

"ولما استأنس یعقوب بیوسف علیهما السلام اوقع الفراق بینهما حتی بقی یعقوب مع ذکر الحق"

جب حضرت یعقوب علیہ السلام کو اپنے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام سے بہت زیادہ محبت ہوگئی، تو ان دونوں کے درمیان فراق پیدا کر دیا گیا، یہاں تک کہ حضرت یعقوب علیہ السلام فقط اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہے۔

" ولما طمع محمد ﷺ من اهل مکة فی النصرة والاعانة صاروا من اشد الناس علیه حتی قال ، ما اوذی نبی مثل ما اوذیت "

اور نبی کریم ﷺ کو یہ تمنا لاحق ہوئی کہ اہل مکہ آپ کی نصرت واعانت کریں تو وہی لوگ آپ کے شدید مخالف ہو گئے انہوں نے آپ کو اتنی تکالیف پہنچائیں جس کی مثال نہیں ملتی۔ اسی لئے آپ نے فرمایا کسی نبی کو اتنی تکالیف نہیں دی گئیں جتنی مجھے تکالیف دی گئیں۔ (اسی وجہ سے آپ کو مکہ مکرمہ سے ہجرت کا حکم دے دیا گیا تا کہ آپ دل جمعی سے کامل طور پر صرف اللہ تعالیٰ کے احکام کی تبلیغ اور اس کی عبادت میں منہمک ہو جائیں۔

(۲) انسان پر جب مصیبت آئے تو وہ اس مصیبت کو مصیبت ہی نہ سمجھے اس کو اس طرح دل سے نکال دے کہ اس کی طرف ذرا بھی توجہ نہ کرے وہ مصیبت اسے نہ تو مصیبت نظر آئے گا اور نہ ہی رحمت "فحینئذ یرجع العبد الی اللہ تعالیٰ" پس اس وقت بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف کامل طور پر رجوع کرے گا۔

(۳) بیشک بندے پر جب کوئی چیز واقع ہو تو وہ یہ سمجھے کہ یہ مصیبت اس ذات باری تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے جو ہر طرف کی بھلائیاں عطاء فرماتا ہے اور وہ توقع رکھنے والے کو بغیر کسی واسطہ کے عطاء کرتا ہے جب بندے کو یہ حالت حاصل ہو جاتی ہے " فیستحی العبد فیرجع الی باب رحمۃ اللہ " تو بندے کو شرم آتی ہے کہ وہ رب تعالیٰ جس کے مجھ پر ان گنت انعام ہیں اس کی طرف سے اس معمولی آزمائش میں، میں صبر نہ کروں، واویلا کروں اور بے قراری میں رہوں یہ میرے لئے باعث شرم ہے، جب بندے کو شرم آتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے دروازہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یعنی اس کا رب تعالیٰ کی تقدیر پر راضی رہنا ہی رحمت کی طرف رجوع ہے۔ یعنی رب تعالیٰ کی طرف سے رحمت کا حاصل ہونا تو رحمت ہی ہے لیکن مصیبت پر صبر بھی رحمت ہے۔

طریق الجذب : جذب کے طریقہ کے متعلق نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا " جذبۃ من جذبات الحق توازی عمل الثقلین " حق کے جذبات میں سے ایک جذبہ جن اور انسانوں کے عمل کے برابر ہے۔ جذبہ حق کی اجمالی طور پر تعریف یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو کامل طور پر رب تعالیٰ کی طرف متوجہ کر لے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ جس شخص کو حق تعالیٰ اپنی طرف کھینچ لے (متوجہ کر لے)

وہ مغلوب ہوجاتا ہے "لان الحق غالب لا مغلوب" اس لئے کہ حق غالب ہے مغلوب نہیں۔

" وصفة الرب الربوبية وصفة العبد العبودية والربوبية غالبة على العبودية لا بالضد "

رب تعالیٰ کی صفت ربوبیت ہے اور بندے کی صفت عبودیت ہے اور ربوبیت کو عبودیت پر غلبہ حاصل ہے ایسا نہیں ہوسکتا کہ عبودیت کو ربوبیت پر غلبہ حاصل ہوجائے۔

" وصفة الحق حقيقة وصفة العبد مجاز والحقيقة غالبة على المجاز لا بالضد "

حق کی صفت حقیقت ہے اور بندے کی صفت مجاز ہے حقیقت کو مجاز پر غلبہ حاصل ہے مجاز حقیقت پر غالب نہیں ہوسکتا۔ غالب کو یہ حق حاصل ہے اور یہ قدرت حاصل ہے کہ مغلوب کو ایک صفت سے دوسرے صفت کی طرف منتقل کردے اس لئے کہ وہ علیم وخبیر ہے جانتا ہے کہ اس بندے کے لائق کون سی صفت ہے۔

ذرا غور تو کریں بندہ جب کسی ہیبت ناک بادشاہ کے پاس جائے تو وہ اپنے آپ کو بھول جاتا ہے اپنے دل اور فکر اور حواس کو کامل طور پر اس کی طرف متوجہ کرلیتا ہے اسی کی طرف مشغول ہوجاتا ہے اور غیروں سے غافل ہوجاتا ہے۔ تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ بندہ جب بادشاہوں کے بادشاہ جس کے سامنے سب بادشاہ حقیر ہیں یعنی مالک الملک کے حضور اپنے آپ کو سمجھے تو پھر اپنے آپ کو فانی نہ سمجھے یقیناً جب انسان اپنے آپ کو رب تعالیٰ کے حضور فنا کے مقام پر سمجھتا ہے اور اپنی ذات کے فوائد کی طرف توجہ نہیں کرتا تو وہ رب تعالیٰ کے فیصلوں پر راضی رہتا ہے اور صبر وشکر سے کام لیتا ہے اسے رب تعالیٰ کی عبادت سے روگردانی کا تصور حاصل نہیں ہوتا۔

(ماخوذ از کبیر)

☆☆☆☆☆

﴿ اُولٰئِکَ عَلَیۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَرَحۡمَةٌ وَاُولٰئِکَ هُمُ الۡمُهۡتَدُوۡنَ ﴾

(۱) ''یہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی درودیں ہیں اور رحمت اور یہی لوگ راہ پر ہیں''

(۲) یہ لوگ ہیں جن پر مہربانیاں ہیں ان کے رب کی اور رحمت اور یہی لوگ ہدایت پر ہیں''

صلوات : جمع ہے صلوۃ کی، اگرچہ بظاہر وہم یہ ہوتا ہے کہ صلوۃ کا معنی بھی رحمت ہے پھر اس کے بعد رحمت کا ذکر تکرار ہے تو اس وہم کو مختلف وجوہ سے زائل کیا گیا ہے۔ " **الصلوة فی الاصل الدعا** " صلوۃ کا اصل میں حقیقی معنی دعا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ **وصل علیهم** ﴾ **ای ادع لهم** " یعنی ﴿ **صل علیهم** ﴾ کا معنی ہے آپ ان کے لئے دعا کریں۔ " **ومن الله التزکیة والمغفرة** " اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر صلوات کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کا تزکیہ (پاکیزہ کرنا) فرماتا ہے اور ان کی مغفرت کرتا ہے۔

صلوات، کو جمع ذکر کیا ہے جس سے کثرت اور اس کی مختلف قسمیں واضح ہوتی ہیں جیسے "**لبیک وسعدیک**" میں تکرار ہے (**ورحمة**) **والمراد بالرحمة اللطف والاحسان** " رحمت سے مراد لطف اور احسان ہے۔ (از بیضاوی و شیخ زادہ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے " **صلوات** " کی تفسیر مغفرت سے کی ہے اور یہ ایسے ہی جیسے نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا۔ " **اللهم صل علی آل ابی اوفی ای ارحمهم واغفر لهم** " اے اللہ ابو اوفی کی آل کی مغفرت فرما اور ان پر رحم فرما۔ " **رحمة** " کو نکرہ ذکر کیا ہے جس میں تنوین تعظیم پر دلالت کرتی ہے معنی اس کا بھی ''رحمات'' (کئی رحمتیں) ہے لیکن جمع ذکر کرنے کی ضرورت در پیش نہ آئی۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت ان چیزوں کو بھی شامل ہے جو انسان کے لئے باعث مسرت بنیں اور ان کو بھی شامل ہے جو ضرر کو دور کرنے کا ذریعہ ہیں خواہ دنیاوی ضرر ہو یا اخروی۔

تنبیہ : بعض حضرات نے بیان کیا کہ ''صلوات'' اور ''رحمۃ'' کا ایک ہی معنی ہے یعنی دونوں کا معنی رحمت ہی ہے اگر چہ الفاظ مختلف ہیں جیسا کہ "سرھم ونجواھم" میں مختلف الفاظ کا ایک ہی معنی ہے۔ لیکن یہ قول اتنا درست نہیں کیونکہ جب علیحدہ علیحدہ معنی ممکن ہو تو ایک ہی معنی لینے سے وہ بہتر ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت بھی ایک ہی معنی کے خلاف ہے۔

" روی عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ انه قال فی ھذہ الآیة نعم العدلان ونعم العلاوہ "

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس آیۃ کریمہ میں دو بہتر عدل (بدلے) پائے گئے ہیں اور ان کے علاوہ ایک اور اچھی چیز پائی گئی ہے :

" وجعل قوله ﴿ اُولٰئِکَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ﴾ عدلا ولقوله ورحمةٌ عدلا ولو کان بمعنی لما کانا عدلین وجعل قوله تعالٰی ﴿وَاُولٰئِکَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴾ علاوۃ "

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ﴿ اُولٰئِکَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ﴾ کو ایک عدل (بدلہ) کہا ہے اور ''رحمۃ'' کو دوسرا عدل اگر دونوں کا معنی ایک ہو تو ایک بدلہ بنے گا دو بدلے نہیں بن سکتے اور اللہ تعالٰی کے قول ﴿ وَاُولٰئِکَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴾ کو ان دو بدلوں کے علاوہ رب تعالٰی کا فیضان بیان کیا گیا ہے۔ (از شیخ زادہ)

وَاُولٰئِکَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ : " للحق والصواب حیث استرجعوا واسلموا لقضاء اللہ تعالٰی " یہی لوگ ہدایت پر ہیں یعنی حق اور درست راہ پر ہیں کیونکہ مصیبت کے وقت " انا للہ وانا الیه راجعون " پڑھتے ہیں اور اللہ تعالٰی کی تقدیر کو تسلیم کرتے ہیں۔ (بیضاوی)

" وقال ابن مسعود لان اخر من السماء احب الی من ان اقول قضاہ اللہ تعالٰی لیته لم یکن "

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا میرے نزدیک آسمانوں سے نیچے گرنا زیادہ محبوب ہے بنسبت اس کے کہ میں اللہ تعالٰی کی تقدیر اور فیصلے کے متعلق یہ کہوں ''کاش کہ یہ نہ ہوتا'' (کبیر)

" وحکی عن داؤد الطائی قال : الزھد فی الدنیا ان لا یحب البقاء فیھا

وافضل الاعمال الرضاء عن اللہ ولا ینبغی للمسلم ان یحزن لانہ یعلم ان لکل مصیبۃ ثوابا "

داؤد طائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں دنیا میں زہد یہ ہے کہ اس میں باقی رہنے سے محبت نہ کرے اور تمام اعمال سے افضل عمل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی رہے کسی مسلمان کی شان کے لائق ہی نہیں کہ وہ کسی مصیبت پر غم کرے جب کہ وہ جانتا بھی ہے کہ ہر مصیبت پر ثواب حاصل ہوتا ہے۔ (کبیر)

مقام توجہ : راقم نے " صلوات " کا ترجمہ ''بھلائیاں'' کیا ہے اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ ''درودیں'' کیا ہے مطلب ایک ہی ہے صرف آج کل کے عرف میں ''درود'' کا مفہوم لوگ صرف نبی کریم ﷺ پر پڑھا گیا ''درود'' سمجھتے ہیں لوگوں کو ''درود'' کا مطلب ''رحمت اور بھلائی'' پتہ ہی نہیں۔

یہ تراجم ابھی تک ذکر کی گئی تمام بحث کو شامل ہیں اور علامہ رازی رحمہ اللہ نے جو یہ بیان کیا ہے اسے بھی شامل ہے " فاعلم ان الصلوۃ من اللہ ھی الثناء والمدح والتعظیم واما رحمتہ فھی النعم التی انزلھا بہ عاجلا ثم آجلا " اللہ تعالیٰ کی طرف سے ''صلوۃ'' کا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ تعریف فرماتا ہے مدح کرتا ہے اور عظمت عطا فرماتا ہے اور رحمت کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا میں اور آخرت میں نعمتیں عطا کرتا ہے۔ (کبیر)

گذشتہ سے پیوستہ:

" انا للہ وانا الیہ راجعون " کو ظاہر آواز سے پڑھنا دل میں پڑھنے سے بہتر ہے۔
" فان فی اظھارہ فوائد جزیلۃ ، منھا ان غیرہ یقتدی بہ اذا سمعہ ، ومنھا غیظ الکفار وعلمھم بجدہ واجتھادہ فی دین اللہ والثبات علیہ وعلی طاعتہ "
اس لئے کہ اس کے ظاہر کرنے میں بہت بڑے فوائد ہیں۔ کیونکہ اس سے سن کر دوسروں کو اس کی اقتداء کا فائدہ حاصل ہوگا کہ وہ بھی اپنی مصیبتوں کے وقت " انا للہ وانا الیہ راجعون " پڑھیں گے۔ اور کفار غیظ وغضب سے جل اٹھیں گے، جب ان کو معلوم ہوگا کہ یہ شخص اللہ کے دین میں بڑی کوشش اور محنت کر رہا ہے اور اس پر ثابت قدم ہے، اور اللہ تعالیٰ اور اسکے دین کی طاعت میں قائم ہے۔
(کبیر)

☆ " عن جابر قال قال رسول الله ﷺ یود اهل العافیة یوم القیامة حین یعطی اهل البلاء الثواب لو ان جلودهم کانت قرضت فی الدنیا بالمقاریض رواه الترمذی وقال هذا حدیث غریب " (مظہری)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب مصیبت پر صبر کرنے والوں کو قیامت کے دن ثواب عطا کیا جائے گا تو اہل عافیت یہ تمنا کریں گے کاش کہ ان کے چمڑے دنیا میں قینچیوں سے کاٹ دیئے جاتے۔

☆ " عن ابی سعید الخدری عن النبی ﷺ قال ما یصیب المسلم من نصب ولا وصب ولا هم ولا حزن ولا اذی ولا غم حتی الشوکة یشاکها الا کفر الله بها من خطایاه ، متفق علیه " (مظہری)

مشکل الفاظ کے معانی:

" قوله من نصب وقوله ولا وصب بفتحتین فیهما اول التعب والالم الذی یصیب البدن من جراحة وغیرها والثانی الالم اللازم من السقم الدائم "

" نصب " اور " وصب " دونوں کے پہلے اور دوسرے حرف پر فتحہ (زبر) ہے پہلے لفظ کا معنیٰ " تھک جانا " اور وہ درد جو بدن کو زخم وغیرہ کی وجہ سے پہنچے۔ اور دوسرے لفظ کا معنیٰ دائمی مرض کی وجہ دائمی درد۔

" الهم والحزن " ما یصیب القلب من الالم بفوت محبوب وقیل الهم یختص بما هو آت والحزن بمافات "

" هم " اور " حزن " کا کبھی ایک ہی معنیٰ آتا ہے وہ یہ کہ کسی محبوب چیز کے فوت ہونے پر دل کو جو مصیبت پہنچے اور کبھی فرق کر لیا جاتا ہے آنے والی تکلیف کو " هم " کہا جاتا ہے۔ اور گزری ہوئی پر صدمہ کو " حزن " کہا جاتا ہے۔ (مرقاۃ بحوالہ حاشیہ ترمذی ج اول ص ۱۱۶ باب ماجاء ثواب المریض)

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی شخص کو کوئی عارضی درد یا دائمی درد نہیں پہنچتا اور نہ آنے والی تکالیف سے کوئی غم پہنچتا ہے اور نہ فوت ہونے والی چیز سے۔ کوئی غم ہوتا

ہے اور نہ ہی انہیں کوئی تکلیف ہوتی ہے اور نہ ہی کسی قسم کا غم لاحق ہوتا ہے یہاں تک کہ کسی کو کوئی کانٹا بھی چبھ جائے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کا ان تکالیف کو کفارہ بنا دیتا ہے۔ (از مظہری)

﴿ وَاُولٰئِکَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ ﴾ میں چند وجوہ ہیں ایک یہ ہے " انھم المھتدون لھذہ الطریقة الموصلة بصاحبھا الی کل خیر " بیشک وہ اس راہ پر ہیں جس کی ہر سمت میں بھلائی ہی بھلائی ہے یعنی خیر کی راہ پر قائم ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے " المھتدون الی الجنة الفائزون بالثواب" جنت کی راہ پر قائم ہیں اور ثواب حاصل کرنے میں کامیاب ہیں۔

تیسری وجہ یہ ہے "المھتدون لسائر مالزمھم " تمام اوامر و نواہی جو ان پر لازم ہیں ان پر عمل کرنے کی وجہ سے وہ ہدایت پر ہیں۔ (از کبیر)

فائدہ جلیلہ : " اھتداء " کا ایک معنی یہ ہے "مطالب پر کامیاب ہونا" اس معنی کے لحاظ سے ﴿اُولٰئِکَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ ﴾ کا مطلب ہوگا:

" اولئک ھم الفائزون بمطالبھم الدینیة والدنیویة فان من نال تزکیة اللہ تعالٰی ورحمته لم یفته مطلب "

کہ یہی لوگ اپنے دینی اور دنیاوی مطالب میں کامیاب ہیں بیشک جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سے تزکیہ (پاکیزگی) حاصل کرلے اور رب تعالیٰ کی رحمت حاصل کرلے اسکا کوئی مطلب فوت نہیں ہوتا (روح المعانی)

اسے درد پہنچے یا آرام ہر صورت میں اسے کامیابی حاصل ہوتی ہے کیونکہ اسے ثواب حاصل ہوتا ہے اور رب تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ اسی کا نام کامیابی ہے۔

﴿اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ﴾

۱) ''بیشک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں سے ہیں تو اس گھر کا حج یا عمرہ کرے اس پر کچھ گناہ نہیں کہ ان دونوں کے پھیرے کرے اور جو کوئی بھلی بات اپنی طرف سے کرے تو اللہ نیکی کا صلہ دینے والا خبردار ہے''

۲) ''بیشک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں سے ہیں تو جو شخص حج کرے بیت اللہ کا یا عمرہ کرے تو نہیں گناہ اس پر کہ سعی کرے ان دونوں کی اور جو شخص زیادہ نیکی کرے تو بیشک اللہ اس کے شکر کو قبول کرنے والا علم والا ہے''۔

شان نزول: "عن ابن عباس رضی اللہ عنہ انه كان على الصفا صنم على صورة رجل يقال له اساف وعلى المروة صنم على صورة امرأة تدعى نائلة زعم اهل الكتاب انهما زنيا فى الكعبة فمسخهما الله تعالىٰ حجرين فوضعا على الصفا والمروة ليعتبر بهما فلما طالت المدة عبدا من دون الله تعالىٰ فكان اهل الجاهلية اذا طافوا بينهما مسحوا الوثنين فلما جاء الاسلام وكسرت الاصنام كره المسلمون الطواف بيهنما لاجل الصنمين فانزل الله تعالىٰ "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ بیشک صفا پر ایک بت مرد کی شکل میں تھا جسے اساف کہا جاتا تھا اور مروہ پر ایک بت عورت کی شکل کا تھا جسے نائلہ کہا جاتا تھا اہل کتاب کا گمان تھا (یہ کوئی یقینی بات نہیں) کہ یہ دونوں حقیقت میں انسان ہی تھے انہوں نے کعبہ میں زنا کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو پتھر بنا دیا۔ پھر ان دونوں کو صفا اور مروہ پر رکھ دیا گیا تا کہ لوگ ان دونوں سے عبرت پکڑیں۔ جب کچھ زیادہ ہی عرصہ گزر گیا تو لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان کی عبادت شروع کر دی زمانہ جاہلیت میں اہل جاہلیت جب صفا اور مروہ کے درمیان چکر لگاتے (سعی کرتے) تو ان بتوں کو آ کر چھوتے (ہاتھ لگاتے) جب اسلام آ گیا اور بتوں کو توڑ دیا گیا مسلمانوں نے پھر بھی صفا اور مروہ کے درمیان

سعی کرنے کو ناپسند سمجھا کہ ان پر بت تھے لہٰذا ان میں سعی کرنا گناہ ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا کہ بت پرستی تو منع ہے بتوں کو تبرک کے طور پر ہاتھ لگانا تو منع ہے لیکن صفا اور مروہ تو محترم مقامات ہیں اللہ کی نشانیوں میں سے نشانیاں ہیں حج اور عمرہ میں ان کے درمیان سعی کرنا کوئی گناہ نہیں خصوصاً جب کہ بت توڑ بھی دیئے گئے۔ (از روح المعانی)

اِنَّ الصَّفَا: صفا کو صفا کہنے کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ " **صفا یصفو صفوا** " کا معنی خالص صاف ہونا صفا بھی چونکہ خالص پتھر کی چٹان ہے ایسی پہاڑی نہیں جس میں مٹی، ریت، بجری یا درخت پائے جائیں بلکہ خالص سبز سیاہ رنگ کی چٹان ہے " **الصفا فی الاصل الحجر الاملس لا یخالطه غیره من طین او تراب** " یعنی صفا خالص صاف پتھر کو کہا جاتا ہے جس کے ساتھ کیچڑ اور خشک مٹی وغیرہ نہ پائی جائیں۔

صفا کو صفا کہنے کی اور وجہ یہ ہے " **وقیل سمی (الصفا) لانه جلس علیه آدم صفی الله** " کہ اس پر حضرت آدم صفی اللہ بیٹھے، ان کے بیٹھنے کی وجہ سے اس کا نام ہی صفا رکھ دیا گیا یعنی اس کے نام کی وجہ " صفی اللہ " سے تعلق ہے۔ (از روح المعانی)

مروہ کو مروہ کہنے کی وجہ: اصل میں سفید اور صاف پتھر کو مروہ کہا جاتا ہے لیکن بعد میں صفا کے مقابل دوسری پہاڑی کا نام مروہ ہے اگر چہ اسکے پتھر بھی صفا کی طرح ہی ہیں سفید سنگ مرمر کی طرح نہیں۔ دونوں پہاڑیوں کی چوٹیوں کو جوں کا توں چھوڑا ہوا ہے اگر چہ نیچے حصہ میں تمام سنگ مرمر کا فرش آجکل لگا ہوا ہے۔

مروہ کو مروہ کہنے کی دوسری وجہ یہ ہے " **وسمی المروة لانه جلست علیه امرأته حواء** " مروہ کا نام مروہ اسلئے رکھا گیا ہے کہ بیشک اسکے اوپر حضرت آدم علیہ السلام کی زوجہ (امرأة) حضرت حواء بیٹھی۔ تو گویا کہ (امرأة) حضرت حواء کی نسبت سے وہ پہاڑ مروہ بن گیا۔ (از روح المعانی)

مِنْ شَعَائِرِ اللهِ: '' بیشک صفا اور مروہ '' اللہ کی نشانیوں سے ہیں '' شعائر '' جمع ہی شعیرۃ کی یا شعار کی جس کا معنی ہے '' علامت '' (نشانی)۔

صفا اور مروہ کو ''شعائر اللہ'' کہنے کی وجوہ:

(۱) '' والمراد بهما اعلام المتعبدات '' مراد یہ ہے کہ صفا اور مروہ عبادت کے مقامات کی نشانیاں ہیں کیونکہ ان پر چکر لگانا عبادت ہے۔

(۲) '' او العبادات الحجية '' صفا اور مروہ کو اس لئے اللہ تعالیٰ کی نشانیاں کہا گیا ہے کہ وہاں حج کے مناسک سے سعی ادا کی جاتی ہے تو حج کی عبادات میں سے عبادت کی نشانیاں ہیں۔

(۳) '' وقيل المعنى ان الطواف بين هذين الجبلين من علامات دين الله '' اصل میں ان دونوں (صفا اور مروہ) کے درمیان طواف (چکر لگانا) اللہ تعالیٰ کے دین کی نشانیوں میں سے نشانی ہے۔

اس کی وجہ سے ان دونوں کو بھی اللہ کی نشانیاں کہہ دیا گیا ہے گویا کہ '' اسم المحل باسم الحال '' والا قانون جاری کیا گیا ہے۔

(۴) '' او انهما من المواضع التى يقام فيها دينه '' یا اس وجہ سے ان دونوں کو اللہ تعالیٰ کی نشانیاں کہا گیا ہے کہ یہ ان مقامات میں سے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کا دین قائم کیا جاتا ہے۔

(۵) '' او من علاماته التى تعبد بالسعى بينهما لامن علامات الجاهلية '' ان کو اللہ تعالیٰ کی نشانیاں اس لئے کہا گیا ہے ان میں کیا جانے والا فعل اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کی نشانی ہے جاہلیت کی رسوم میں سے اسلام کے آنے کے بعد کوئی رسم بتوں کو ہاتھ لگانے والی ادا نہیں کی جاتی۔

(از روح المعانی)

شعائر اللہ کہنے کی عظیم وجہ: جیسا کہ پہلے پارہ میں بیان کیا جا چکا ہے ذرا بالاختصار پھر دیکھئے:

> '' فان ابراهيم عليه السلام لما دع ربه بقوله ﴿ وارنا مناسكنا ﴾ علمه الله مناسک الحج وشعائره اجابة لدعوته ثم شرعها الله لامة محمد ﷺ والحكمة فى شروع السعى بين الصفا والمروة ما حكى ان هاجر حين ضاق عليها الامر فى عطشها وعطش ابنها اسمعيل سعت فى هذا المكان الى ان صعدت الجبل ودعت فانبع الله ماء زمزم واجاب دعاء ها فجعل فعلها طاعة لجميع المكلفين الى يوم القيامة ''

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب رب تعالیٰ کے حضور دعا کی کہ اے اللہ ''ہمیں حج کے مناسک دکھا'' تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو قبول کرتے ہوئے حج کے طریقہ اور نشانیاں آپ کو سکھا دیں پھر وہی طریقے نبی کریم ﷺ کی امت کے لئے بھی مقرر فرما دیئے گئے۔

صفا اور مروہ کے درمیان سعی شروع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ہاجرہ پر جب اپنی پیاس اور اپنے بچے کی پیاس کی وجہ سے معاملہ بے قراری کی حد تک پہنچ گیا تو آپ صفا پر چڑھتی ہیں دعا کرتی ہیں اور دیکھتی ہیں کوئی آبادی نظر آجائے کوئی آدمی نظر آجائے کہیں پانی نظر آجائے۔

پھر وہاں سے مروہ پر آتی ہیں درمیان میں نشیبی جگہ جہاں سے بچہ نظر نہیں آتا وہاں آپ دوڑتی ہیں اسی طرح آپ نے سات چکر لگا دیئے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت، حضرت ہاجرہ کی دعا، حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ایڑی کی رگڑ، اور حضرت جبریل کے پر مارنے سے زمزم کا چشمہ جاری کر دیا۔

آج وہی کام جو حضرت ہاجرہ نے کیا حاجیوں کے لئے واجب ہے حضرت ہاجرہ کے قدم لگنے سے ہی صفا اور مروہ اللہ تعالیٰ کی نشانیاں بن گئے بلکہ اس سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کی وجہ سے بھی ان دونوں مقامات کو عظمت مل چکی تھی۔

اس آیۃ کریمہ کا ماقبل سے تعلق: ابھی تک کی گئی بحث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے حکم فرمایا ﴿ فاذکرونی اذکرکم ﴾ تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ یہ حکم تمام عبادات کو شامل ہے اس کے بعد ہمیں حکم دیا:

﴿ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ﴾

''اے ایمان والو نماز اور صبر سے امداد طلب کرو''

اس کے بعد جہاد کی رغبت دلائی کیونکہ شہداء کے مراتب اور ان کی زندگی بیان فرمائی پھر مصائب سے آزمائش اور ان پر صبر کرنے اور اس پر اجر عظیم عطا کرنے کا ذکر فرمایا۔ پھر اس آیۃ کریمہ میں صفا و مروہ کا ذکر فرمایا اور ان کے درمیان سعی کرنا جو عبادت اور باعث ثواب ہے۔ (از شیخ زادہ)

فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا :

توجو شخص حج کرے بیت اللہ کا یا عمرہ کرے تو نہیں گناہ اس پر کہ سعی کرے ان دونوں کے درمیان۔

حج : کا لغوی معنی ارادہ کرنا جس طرح کہا جاتا ہے " رجل محجوج " جب کہ کوئی شخص مقصود ہو اور کبھی کہا جاتا ہے " مکان محجوج " وہ جگہ جس کا ارادہ پایا جائے۔

" فکان الحج لما کان مقصودا بھذا النوع من العبادة سمی ذلک الفعل حجا "

حج کو بھی حج اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں بیت اللہ شریف اور مقام عرفات اور دوسرے مقامات معظمہ کا اردہ پایا جاتا ہے یعنی مقامات مقدسہ اس کا مقصود ہوتے ہیں اسی وجہ سے حج کا اصطلاحی معنی ہے " **القصد الی المعظم** "معظم مقامات کا ارادہ۔

''حج'' کا لغوی معنی حلق کرنا (بال مونڈنا) بھی آتا ہے جیسے کہا جاتا ہے " حج فلان ای حلق" فلاں شخص نے بال منڈوائے۔ چونکہ حج میں بھی حلق کرایا جاتا (بال منڈوائے جاتے ہیں) اس لئے اسے حج کہہ لیا جاتا ہے ''حج'' کا لغوی معنی کسی چیز کی طرف بار بار آنا جانا بھی آتا ہے:

" فمن زار البیت للحج فانه یاتیه اولا لیعرفه ثم یعود الیه للطواف ثم ینصرف الی منی ثم یعود الیه لطواف الزیارة ثم یعود الیه لطواف الصدر "

جو شخص بیت اللہ شریف کی زیارت کا ارادہ کرتا ہے وہ پہلے بیت اللہ شریف کو دیکھنے کے لئے آتا ہے پھر اس کا طواف کرتا ہے پھر منی میں جاتا ہے پھر بیت اللہ شریف میں طواف زیارت کے لئے آتا ہے پھر بیت اللہ شریف میں طواف صدر کے لئے آتا ہے یعنی بیت اللہ شریف میں بار بار طواف کیلئے آنے جانے کی وجہ سے حج کو حج کہا جاتا ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے اسی معنی کو "اشبه للصواب" (زیادہ درست) کہا ہے۔

اور فقہاء کرام نے قصد والا معنی ذکر کیا ہے راقم کو بھی اگر چہ علامہ رازی رحمہ اللہ کا قول ہی پسند ہے لیکن بار بار آنے جانے کی وجہ زیادہ معتبر راقم کو یہ بات نظر آتی ہے کہ ایک مرتبہ جو شخص حج کر لیتا ہے وہ بار بار حج کر سکے یا نہ کر سکے البتہ اس کے دل میں تڑپ پائی جاتی ہے وہ تمنا کرتا ہے کہ بار بار بیت اللہ

شریف کی زیارت کرے۔ (ماخوذ از کبیر)

عمرہ: کو عمرہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ عمرہ کا معنی ''زیارت کرنا'' ہے یہ لفظ ''عمارۃ'' سے لیا ہوا ہے چونکہ زیارت کرنے والا بھی مکان کو آباد کرتا ہے اس لئے اسے عمرہ کہا جاتا ہے (از روح المعانی) عبد القیس کے کلام میں مسجد، کلیسہ، گرجا کو بھی عمرہ کہہ لیا جاتا ہے کیونکہ ان مقامات کی طرف بھی عبادت کرنے والے قصد کرتے ہیں مسلمان مسجد کا، یہود کلیسہ کا اور عیسائی گرجا کا قصد کرتے ہیں۔

جناح: کا لغوی معنی ہے ''میلان کرنا'' جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا ﴾ اور اگر وہ (کفار) صلح کی طرف میلان کریں تو تم میلان کرو اس کی طرف۔ ''جنحت السفینۃ'' کشتی کا ڈولنا (میلان کرنا) جناح الطائر، پرندے کے پر۔ جناح کا معنی زیادہ طور پر گناہ کر لیا جاتا ہے اس لئے کہ اس میں باطل اور گناہ کے کاموں کی طرف میلان پایا جاتا ہے۔

یطوف: طاء پر شد ہے اصل میں یتطوف ہے تاء کو طاء کر کے ادغام کیا گیا۔

طواف کا لغوی معنی پھیرے لگانا (چکر لگانا) اعلیٰ حضرت نے یہی ترجمہ کیا ہے۔ صرف طواف کعبہ شریف کے ارد گرد پھیرے لگانے میں مشہور ہو چکا ہے اور سعی اگر چہ صفا اور مروہ کے درمیان نشیبی جگہ میں تیز چلنے کا نام ہے لیکن صفا اور مروہ پر پھیرے لگانے کے لئے اصطلاح میں سعی زیادہ مشہور ہو چکا ہے اس لئے راقم نے ترجمہ اس کے مطابق کر دیا ہے۔

سعی کرنا: "عن صفية بنت شيبة قالت اخبرتنی بنت ابی تجراة قالت دخلت مع نسوة من قريش دار آل ابی حسين ننظر الی رسول الله ﷺ وهو يسعى بين الصفا والمروة فرأيته يسعى وان منزره ليدور من شدة السعی وسمعته يقول اسعوا فان الله كتب عليكم السعی رواه فی شرح السنة وروی احمد مع اختلاف" (مشکوۃ باب دخول مکۃ والطواف)

صفیہ بنت شیبہ کہتی ہیں مجھے بنت ابی تجراۃ نے بتایا وہ کہتی ہیں میں قریش کی عورتوں کے ساتھ آل ابی حسین کے گھر داخل ہوئی رسول اللہ ﷺ کو ہم دیکھ رہے تھے وہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی فرما رہے تھے میں نے آپ کو سعی کرتے ہوئے دیکھا کہ آپ کی چادر شدت سعی کی وجہ سے (آپ کے پاؤں مبارک پر) چکر لگا رہی ہے اور میں نے آپ کو کہتے ہوئے سنا سعی کرو بیشک اللہ تعالیٰ نے تم پر سعی

کولازم قرار دیا۔

☆ " رواه البیهقی بسند حسن بلفظ انه علیه الصلوة و السلام استقبل الناس فی المسعی وقال یا ایها الناس اسعوا فان الله قد کتب علیکم السعی "

بیہقی نے سند حسن سے روایت ذکر کی کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے مقام سعی میں لوگوں کی طرف متوجہ ہوکر ارشاد فرمایا اے لوگو سعی کرو بیشک اللہ تعالیٰ نے تم پر سعی کو لازم کر دیا ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حدیث شریف میں ''کتب'' کا معنی ہے فرض کیا لہٰذا حدیث پاک اس پر دلالت کر رہی ہے۔ " ان السعی فرض و من لم یسع بطل حجه " بیشک سعی فرض ہے جس شخص نے سعی نہ کی اس کا حج باطل ہے یہی مذہب امام شافعی، امام مالک، امام احمد رحمہ اللہ کا ہے۔

" وقال ابو حنیفة رحمه الله السعی واجب لان الحدیث ظنی و کذا المشی فیه مع القدرة ویترک الواجب یجب دم "

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صفا و مروہ پر پھیرے لگانا واجب ہے اسی طرح نشیبی جگہ میں دوڑنا بھی واجب ہے کیونکہ حدیث ظنی ہے اگر کسی شخص نے صفا و مروہ پر چکر ہی نہ لگائے یا چکر تو لگا لئے لیکن نشیبی جگہ نہ دوڑ لگائی باوجود دوڑنے کی قدرت حاصل ہونے کے تو واجب چھوٹ گیا دم (جانور ذبح کرنا) واجب ہوگا۔

بعض صحابہ کرام سعی کو مستحب قرار دیتے ہیں۔ وہ حضرت ابن عباس اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم ہیں اور تابعین میں سے بھی بعض حضرات کا یہی مذہب ہے۔ ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ﴾ اس میں صفا اور مروہ میں پھیرے لگانے سے گناہ کی نفی ہے اور بھلائی کا کام بطور نفل کرنے کا ذکر ہے۔

امام اعظم رحمہ اللہ کا اعظم مذہب: آپ فرماتے ہیں جب بعض حضرات سعی کو فرض قرار دیتے ہیں اور بعض حضرات سعی کو نفل قرار دیتے ہیں " فالا وسط الاعدل انه واجب " تو درمیان والی صورت ہی بہتر ہے وہ یہ ہے کہ سعی واجب ہے نہ فرض ہے نہ نفل۔

اعتراض: دارقطنی، ابن ابی شیبہ نے اس روایت کو ذکر کیا ہے اور صاحب تنقیح نے کہا ہے ''اسناد

صحیح''اس کی سند صحیح ہے تو اس حدیث کو ظنی کہہ کر وجوب ثابت کرنا فرض ثابت نہ کرنا کیسے صحیح ہے؟

جواب : ہم کہتے ہیں " اذ مثله لا يزيد على افادة الوجوب " اس قسم کی حدیث سے وجوب سے زیادہ کچھ ثابت نہیں ہوسکتا۔

" **واما الركن فانما يثبت عندنا بدليل به فاثباته بهذا الحديث اثبات بغير دليل** "

فرضیت قطعی دلیل سے ہمارے نزدیک ثابت ہوتی ہے اس حدیث سے فرضیت ثابت کرنا بغیر دلیل کے ہوگا۔

اگر قطعی دلیل ہوتی تو صحابہ کرام اور تابعین سعی کے نفل ہونے کے قائل نہ ہوتے۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج۵ ص۳۲۰)

" لَا جُنَاحَ عَلَيْه " سے فقط گناہ کی نفی ہے ﴿لَا جُنَاحَ عَلَيْهِ﴾ **انه لا اثم عليه والذى يصدق عليه انه لا اثم فى فعله يدخل تحته الواجب والمندوبات والمباح** "

﴿لَا جُنَاحَ عَلَيْه﴾ کا معنی یہ ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں اس آیۃ کریمہ سے اتنا ہی سمجھ آتا ہے کہ اس فعل میں کوئی گناہ نہیں اس کے نیچے واجب اور مستحبات اور مباح داخل ہیں۔ ان تینوں میں سے جس کو بھی ثابت کرنا ہوگا اس آیۃ کے بغیر اور دلیل سے ثابت کرنا ہوگا۔ (از کبیر)

امام شافعی رحمہ اللہ نے فرضیت جس حدیث سے ثابت کی وہ اور اسکا جواب پہلے ذکر کیا جاچکا ہے۔

حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا اور اس کا جواب:

" **وما روى مسلم عن عائشة انها قالت لعمرى ما اتم الله تعالىٰ حج من لم يسع بين الصفا والمروة ولا عمرته ، ليس فيه دليل على الفرضية ايضا سلمنا لكنه مذهب لها والمسألة اجتهادية فلا تلزم به على انه معارض بما اخرجه الشعبى عن عروة بن مضرس الطائ انه قال اتيت النبى ﷺ بالمزدلفة فقلت يا رسول الله جئت من جبل طى ما تركت جبلا الا وقفت عليه فهل لى من حج ؟ فقال من صلى معنا هذه الصلوة ووقف معنا هذا الموقف وقد ادرك عرفة قبل ذلك ليلا او نهارا فقد تم حجه وقضى تفثه** "

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں مجھے اپنی عمر کی قسم اس شخص کا حج اور عمرہ مکمل نہیں جس نے

صفااور مروہ کے درمیان سعی نہیں کی۔

اس حدیث سے امام شافعی رحمہ اللہ فرضیت ثابت کرتے ہیں۔لیکن ہم نے کہا کہ اس حدیث میں فرضیت پر کوئی دلالت نہیں پائی گئی۔کیونکہ واجب کی ترک سے بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ کام مکمل نہیں ہوا کیونکہ واجب چھوٹ گیا۔اگر ہم تسلیم کر بھی لیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سعی کی فرضیت کا مذہب رکھتی تھیں تو ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ ان کا مذہب تھا جو اجتہاد پر مبنی تھا۔

ہم اس سے فرضیت کو نہیں مانتے کیونکہ اس حدیث کے معارض عروہ بن مضرس طائی کی حدیث ہے جو شعبی نے تخریج کی ہے وہ یہ ہے وہ کہتے ہیں میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں مزدلفہ میں حاضر ہوا میں نے کہا یا رسول اللہ میں طے پہاڑ سے آیا میں نے کوئی پہاڑ نہیں چھوڑا مگر یہ کہ میں اس پر ٹھہرا کیا میرا حج ہو گیا؟ تو آپ نے فرمایا جس شخص نے ہمارے ساتھ یہ نماز ادا کی اور ہمارے ساتھ اس مقام پر ٹھہرا اور وہ اس سے پہلے دن کو یا رات کو عرفات پر بھی ٹھہرا ہو تو اس نے اپنا حج مکمل کر لیا اور اپنے میل کچیل کو دور کر لیا۔

" فاخبر ﷺ بتمام حجه وليس فيه السعي بينهما ولو كان من فروضه لبينه للسائل لعلمه بجهله "

نبی کریم ﷺ نے اس شخص کو حج کے مکمل کر لینے کی خبر دی لیکن اس میں سعی کا ذکر نہیں فرمایا اگر سعی فرض ہوتی تو آپ سائل کو ضرور بتاتے کیونکہ سائل نے پوچھا ہی اس لئے تھا کہ وہ نہیں جانتے تھے۔ (از روح المعانی)

اعتراض : اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے طواف زیارت کا ذکر نہیں فرمایا حالانکہ وہ فرض ہے اسی طرح سعی کا ذکر نہیں فرمایا وہ فرض ہو جائے تو کیا حرج ہے؟

جواب : طواف زیارت "دلالۃ النص" سے سمجھ آ رہا ہے کیونکہ سائل نے مزدلفہ میں سوال کیا حضور ﷺ نے جب مزدلفہ میں اپنے ساتھ نماز میں شریک پایا تو واضح فرمایا کہ اس سے پہلے مقام عرفات پر وقوف (ٹھہرنا) لازم تھا اس پر جب تم ٹھہر چکے ہو تو پہلے فریضے احرام اور وقوف عرفات پر تو تمہارا عمل ہو چکا ہے۔اب اس کے بعد تم نے ہمارے ساتھ ہی چلنا ہے آگے کے مسائل تم پر خود واضح ہوتے چلے

جائیں گے۔ (احکام القرآن للجصاص مع الزیادۃ)

سعی نفل نہیں بلکہ واجب ہے: نبی کریم ﷺ کا سعی کرنا ثابت ہے جب آپ اپنے حج میں سعی کرنے کی غرض سے صفا کے قریب گئے تو ارشاد فرمایا ﴿ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ ﴾ ابدء وا بما بدأ اللہ بہ " بیشک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں سے ہیں تم اسی سے ابتداء کرو جس سے رب تعالیٰ نے ابتداء فرمائی۔

نبی کریم ﷺ نے ابتداء صفا سے کی آپ صفا پر چڑھے یہاں تک کہ بیت اللہ شریف کو دیکھا:

" واذا ثبت انہ علیہ السلام سعی وجب ان یجب علینا السعی للقرآن والخبر ، اما القرآن فقولہ تعالیٰ ﴿ واتبعوہ ﴾ واما الخبر فقولہ علیہ السلام " خذوا عنی مناسککم "

جب یہ ثابت ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ نے سعی فرمائی تو ہم پر سعی کرنا قرآن پاک اور حدیث پاک سے واجب ہو گیا۔ کیونکہ قرآن پاک میں آپ کی تابعداری کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ " تم ان کی تابعداری کرو " اور حدیث پاک سے بھی ثابت ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا " تم مجھ سے اپنے حج کے مناسک سیکھ لو "۔ ﴿ اتبعوا ﴾ اور ﴿ خذوا ﴾ امر ہیں۔ امر وجوب کے لئے آتا ہے جب اس کے خلاف کوئی قرینہ نہ پایا جائے۔

اعتراض: جب رب تعالیٰ نے واضح طور پر سعی کے ساتھ ﴿ ومن تطوع خیرا ﴾ ذکر فرما دیا ہے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ سعی نفل ہے لہٰذا یہ کہنا کہ سعی نفل نہیں کیسے صحیح ہے؟

جواب: ﴿ ومن تطوع خیرا ﴾ سے سعی کے نفل ہونے پر دلیل پکڑنا ضعیف ہے۔

" لان ھذا لا یقتضی ان یکون المراد من ھذا التطوع ھو الطواف المذکور "

یہاں جو ﴿ تطوع ﴾ کا ذکر ہے اس سے مراد یہی سعی جس کا ذکر پہلے ہے " مراد نہیں " بلکہ اس سے مراد اور ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿ وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین ﴾ یہاں سے شیخ فانی کو روزہ نہ رکھ سکنے کی وجہ سے فدیہ کو واجب قرار دیا۔ اس کے بعد ذکر فرمایا ﴿ فمن تطوع خیرا فھو خیر لہ ﴾ اس سے یہ ثابت فرمایا کہ اگر مقرر حد سے زائد فقیر کو طعام دے

دیا گیا تو اس میں اور زیادہ ثواب حاصل ہوگا۔

اسی طرح یہاں بھی ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے " انہ یزید فی الطواف فیطوف اکثر من الطواف الواجب مثل ان یطوف ثمانیۃ او اکثر " کہ وہ سعی میں سات پھیروں سے زیادہ" آٹھ یا اس سے بھی زائد پھیرے لگادے"۔ تو یہ نفل ہوں گے اسے ثواب حاصل ہوگا۔ اسے عبادت میں اس طرح کی زیادتی شمار نہیں کیا جائیگا (جیسا کہ نماز کی رکعتوں میں زیادتی منع ہے دو رکعت کو تین اور تین کو چار، اور چار کو پانچ رکعت ادا کرنا منع ہے) یا مراد یہ ہے:

" ان یتطوع بعد حج الفرض وعمرتہ بالحج والعمرۃ مرۃ اخری حتی طاف بالصفا والمروۃ تطوعا "

کہ ایک مرتبہ فرض حج ادا کر کے یا احرام کی وجہ سے جو عمرہ اس نے اپنے آپ پر واجب کردیا تھا وہ ادا کرلیا اس کے بعد حج یا عمرہ کرے وہ حج یا عمرہ چونکہ نفلی عبادت ہوگی۔ لہذا اس میں سعی کو نفل کہنے کا یہ مطلب ہے کہ نفلی عبادت کی سعی ہے اگرچہ وہ سعی بھی واجب ہوگی۔ (ماخوذ از کبیر)

ومن تطوع خیرا فان اللہ شاکر علیم : جس شخص نے طاعت کا فعل کیا خواہ فرض ہو یا نفل، یا فرض حج سے زائد ہو، یا عمرہ سے زائد ہو یا طواف میں زیادتی کرے یا نفلی سعی کرے تو اس نے بھلائی کا کام کیا۔ بیشک اللہ تعالیٰ اسے ثواب عطا فرمائے گا کسی کا کوئی فعل اللہ تعالیٰ پر مخفی نہیں۔ (بیضاوی)

﴿ شاکر ﴾ کا لغوی معنی " المظھر للانعام علیہ " جو اس پر انعام ہے اس کو وہ ظاہر کرنے والا ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں محال ہے اس لئے اس لفظ کو جب رب تعالیٰ کے حق میں منسوب کیا جائے گا تو مجازی معنی ہوگا " المجازی علی الطاعۃ " کہ وہ طاعت پر جزاء دینے والا ہے۔

جزاء طاعت کو شکر کہنے کی وجوہ:

۱) " ان اللفظ خرج مخرج التلطف للعباد مبالغۃ فی الاحسان الیھم " اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اس کا اپنے بندوں پر بڑا احسان ہے اور وہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے " شاکر " کے لفظ کو ذکر کیا جو درحقیقت یہ لفظ ان کے لئے استعمال ہوتا ہے جن پر احسان کیا جائے۔

۲) " ان الشکر لما کان مقابلا للانعام او الجزاء علیہ سمی کل ما کان جزاء شکرا علی سبیل التشبیہ "

بیشک شکر جب کہ انعام یا انعام پر جزاء کے مقابل استعمال ہوتا ہے تو ہر جزاء (ثواب) کو تشبیہ کے طور پر جزاء سے تعبیر کر دیا گیا۔

۳) اللہ تعالیٰ گویا کہ یہ کہتا ہے کہ میں تمہاری طاعت سے بے پرواہ ہوں مجھے اس کا کوئی نفع نہیں اگر بالفرض مجھے اس کا نفع ہوتا تو میں اس کا شکر گزار ہوتا" **وبالجملة فالمقصود بیان ان طاعة العبد مقبولة عند الله تعالیٰ وواقعة موقع القبول فی اقصی الدرجات"** حاصل کلام یہ ہے کہ بیان کرنا یہ مقصود ہے کہ بندے کی طاعت اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہے اور اسے اعلیٰ درجہ کا مقام قبولیت حاصل ہے۔ (از کبیر)

علیم : فالمعنی انه یعلم قدر الجزاء فلا یبخس المستحق حقه لانه تعالیٰ عالم بقدره وعالم بما یزید علیه من التفضل"

اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ کس قدر یہ شخص جزاء کا مستحق ہے اس میں وہ کمی نہیں فرماتا بیشک اللہ تعالیٰ اس کی قدر کو بھی جانتا ہے اور جو زیادہ اس نے اپنا فضل عطا کرنا ہے اسے بھی جانتا ہے۔ (از کبیر)

نکتہ : اللہ تعالیٰ نے اپنی دو صفتوں کا ذکر کیا ایک "شاکر" اور دوسری "علیم"۔

"لان التطوع بالخیر یتضمن الفعل والقصد فناسب ذکر الشکر باعتبار الفعل وذکر العلم باعتبار القصد"

اس لئے کہ بھلائی کا کام کرنا دو چیزوں سے متعلق ہوتا ہے ایک فعل یعنی اس پر عمل کرنا اور دوسرا قصد، یعنی اس کام کا ارادہ کرنا۔ اس لئے فعل کے اعتبار سے شکر ذکر کر دیا ہے اور قصد کے لحاظ سے علم کا ذکر کر دیا ہے۔ (روح المعانی)

خیال رہے کہ ﴿ شاکر ﴾ سے تعبیر کرنے کا مقصد یہ بھی ثابت کرنا ہے " **مبالغة فی الاحسان الی العباد** " کہ رب تعالیٰ کا بندوں پر بہت بڑا احسان ہے اس لفظ میں مبالغہ پایا گیا ہے۔

اور اسی طرح ﴿ علیم ﴾ **مبالغ فی العلم بالاشیاء فیعلم مقادیر اعمالهم وکیفیاتها فلا ینقص من اجورهم شیئا** " اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت " **علیم** " سے اشیاء کے علم میں مبالغہ بیان کیا ہے کہ وہ اعمال کی مقادیر کو جانتا ہے اور ان کی کیفیات کو جانتا ہے ان کے اجر میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں کرے گا۔

(از روح المعانی)

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَا اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْهُدٰی مِنْ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِی الْکِتٰبِ اُولٰئِکَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَیَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ☆ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَیَّنُوْا فَاُولٰئِکَ اَتُوْبُ عَلَیْهِمْ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴾

۱) ''بیشک وہ جو ہماری اتاری ہوئی روشن باتوں اور ہدایت کو چھپاتے ہیں بعد اس کے کہ لوگوں کے لئے ہم اس کتاب میں واضح فرما چکے ان پر اللہ کی لعنت ہے اور لعنت کرنے والوں کی لعنت۔ مگر وہ جو توبہ کریں اور سنواریں اور ظاہر کریں تو میں ان کی توبہ قبول فرماؤں گا اور میں ہی ہوں بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان''۔

۲) ''بیشک وہ لوگ جو چھپاتے ہیں اس چیز کو جو نازل کی ہم نے یعنی واضح باتیں اور ہدایت، اس کے بعد جو بیان کیا ہے ہم نے اسے لوگوں کے لئے کتاب میں، ان لوگوں پر لعنت کرتا ہے اللہ اور لعنت کرتے ہیں ان پر لعنت کرنے والے۔ سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے توبہ کی اور اصلاح کی اور واضح بیان کیا، تو ان لوگوں کی میں توبہ قبول کرتا ہوں، اور میں بڑا توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہوں''۔

مختصر مطلب: اللہ تعالیٰ نے کتاب میں جن چیزوں کو لوگوں کے لئے واضح طور پر بیان فرما دیا ہے ان واضح اور روشن ارشادات کو اور ہدایت کو جو لوگ چھپاتے ہیں ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے اور لعنت کرنے والوں کی لعنت۔ ہاں البتہ وہ لوگ اس لعنت سے بچے ہوئے ہیں جنہوں نے توبہ کر لی اور اپنی اصلاح کر لی اور اللہ تعالیٰ کے ارشادات اور ہدایت کو واضح طور پر بیان کر دیا۔ ان لوگوں کی اللہ تعالیٰ توبہ قبول فرماتا ہے کیونکہ وہی بہت بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے وہی اپنے بندوں پر رحم فرمانے والا ہے۔

قدرے تفصیلی ذکر: آیۃ کریمہ کے شان نزول میں چند احتمال ہیں۔

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول یہ ہے، انصار کے چند لوگ یہود کے پاس آئے، ان

کے اصحاب علم حضرات سے نبی کریم کی صفات کے متعلق پوچھا، اور کچھ احکام کے متعلق سوال کیا "فکتموا فنزلت الآیة" تو انہوں نے چھپایا تو آیۃ کریمہ کا نزول ہوا۔

(۲) شان نزول میں دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ یہود اور نصاری کے حق میں نازل ہوئی کہ دونوں فریق ہی حق کو چھپاتے تھے۔

(۳) "انہ کلام مستانف یتناول کل من کتم شیئا من الدین" یہاں سے نئے کلام کو شروع کیا گیا ہے کہ ہر وہ شخص جو دین کے مسائل کو چھپاتا ہے وہی اس آیۃ کا مصداق ہے۔

اصل میں ان تین اقوال میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ یہود نے بھی حق کو چھپایا اور نصاری نے بھی۔

لہذا نزول کا سبب تو خاص تھا لیکن الفاظ کے عموم کے پیش نظر حکم عام ہے کوئی شخص بھی حق کو چھپائے گا تو اس پر یہی وعید ہوگی۔

"نزولہ عند سبب معین لا یقتضی الخصوص علی ما ثبت فی اصول الفقہ ان العبرة بعموم اللفظ لا بخصوص السبب"

آیۃ کریمہ کا نزول کسی معین سبب کی وجہ سے تخصیص پیدا نہیں کرتا کیونکہ اصول فقہ میں یہ ضابطہ موجود ہے کہ اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے خصوص سبب کا نہیں۔

"ثبت ایضا فی اصول الفقہ ان ترتیب الحکم علی الوصف مشعر بکون الوصف علة لذلک الحکم"

اصول فقہ میں یہ ضابطہ بھی موجود ہے کہ حکم کسی وصف پر مرتب ہوتا ہے جب کسی وصف میں اس حکم کے پائے جانے کی علت بننے کی صلاحیت ہو تو وہ حکم اس وصف پر ثابت ہوگا۔ جب کتمان حق (حق چھپانا) سبب ہے لعنت کا، تو اس حکم کو عام رکھنا ہی صحیح ہے اگر چہ بوجوہ نزول خاص ہی کیوں نہ ہو۔
(از کبیر)

کتمان حق کب برا ہے: "ان العالم اذا قصد کتمان العلم عصی، واذا لم یقصدہ لم یلزمہ التبلیغ اذا عرف انہ مع غیرہ، واما من سئل فقد وجب علیہ التبلیغ لهذہ الآیة وللحدیث"

بیشک جب علم کو ارادۃً چھپائے گا گنہگار ہوگا، جب مسائل کو چھپائے گا ارادۃ نہ ہو تو اس پر تبلیغ

لازم نہیں کیونکہ اسے معلوم ہے کہ میرے بغیر اور حضرات یہ فریضہ ادا کر رہے ہیں، ہاں اگر کسی سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے تو اس پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ بیان کرے اس آیۃ کریمہ سے بھی یہی سمجھ آ رہا ہے اور احادیث سے بھی یہ مسئلہ واضح ہے انشاء اللہ آگے احادیث کا ذکر آ رہا ہے۔ (از قرطبی)

" الکتمان ترک اظهار الشئی مع الحاجة الیه وحصول الداعی الی اظهاره لانه متی لم یکن کذلک لا یعد کتمانا "

جب مسائل بیان کرنے کی حاجت ہو اور ان کو ظاہر کرنے کا مطالبہ پایا جائے تو ایسی صورت میں ان مسائل کو نہ بیان کرنا کتمان علم ہے لیکن جب اس قسم کی ضرورت نہ ہو تو کسی کے خاموش رہنے سے کتمان علم کی وعید اس پر صادق نہیں آئے گی۔ (از کبیر)

مقام توجه : رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ مَا اَنزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنَاتِ وَالْهُدٰی ﴾ آیۃ کریمہ میں ﴿اَلْبَیِّنَاتِ ﴾ کا معنی کیا ہے؟ " الآیات الواضحة الدالة علی الحق " وہ آیات جو حق پر واضح دلائل ہیں ان کو ﴿بَیِّنَاتِ﴾ کہا جاتا ہے اور ﴿اَلْهُدٰی ﴾ کا مطلب؟

" والمراد به ما یهدی الی الرشد مطلقا ومنه ما یهدی الی وجوب اتباعه ﷺ والایمان به وهی الآیات الشاهدة علی صدقه علیه الصلوة والسلام "

جس چیز کے ذریعے بھلائی کی ہدایت مل جائے اسے ﴿ اَلْهُدٰی ﴾ کہا جاتا ہے لہذا وہ آیات جن سے نبی کریم ﷺ کی اتباع اور آپ پر ایمان لانے کی رہنمائی حاصل ہو انہیں بھی ﴿ اَلْهُدٰی ﴾ کہا جاتا ہے اور وہ آیات جو واضح طور پر نبی کریم ﷺ کی صداقت پر دلالت کر رہی ہیں وہ بھی ﴿اَلْهُدٰی ﴾ ہیں۔ (از روح المعانی)

اس سے واضح ہوا: جب رب تعالیٰ نے ﴿ اَلْبَیِّنَاتِ وَالْهُدٰی ﴾ ذکر فرمایا تو اسی سے واضح ہوا کہ جن چیزوں کی دین میں زیادہ ضرورت ہے کہ ان کو بیان کیا جائے۔ ان کو قصداً چھپانا اور کسی کے مسئلہ پوچھنے پر چھپانا کتمان حق ہے اسی طرح دنیاوی امور جن کو ظاہر کرنا ضروری ہو جائے مثال کے طور پر گواہی دنیا ضروری ہو تو گواہی نہ دینا بھی کتمان حق ہے۔

" وعلی هذا الوجه یمدح من یقدر علی کتمان السر لان الکتمان مما یشق علی النفس "

اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ راز کو چھپانا اور ظاہر نہ کرنا اچھا کام ہے، کیونکہ راز کو ظاہر کرنا نفس پر شاق ہوتا ہے، لہٰذا وہ چیزیں جن کا ظاہر کرنا کسی نفس پر شاق گزرے ان سے اجتناب کتمان حق نہیں بلکہ قابل تعریف ہے۔ (از کبیر)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

" حفظت عن رسول الله ﷺ وعائين فاما احدهما فبثثته واما الآخر فلو بثثته قطع هذا البلعوم ، اخرجه البخاري قال ابو عبد الله البلعوم مجرى الطعام "

میں نے رسول اللہ ﷺ سے دو قسم کے یاد رکھنے والے مسائل یاد کئے ہیں ان میں سے ایک قسم کو میں نے بیان کر دیا ہے لیکن دوسری قسم کو بیان کر دوں تو میری حلقوم کٹ جائے۔ ابو عبداللہ (بخاری رحمہ اللہ کی کنیت ہے) فرماتے ہیں " البلعوم " وہ رگ ہے جس سے طعام معدہ میں جاتا ہے۔ (از قرطبی)

بعض شارحین نے تو یہ ہی بیان کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جن احادیث کو نہیں بیان کیا یہ وہی ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ کے راز مذکور ہیں مرقاۃ اور نووی میں یہ وجہ مذکور ہے۔

تاہم علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ جن احادیث کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نہیں بیان فرمایا ان کی اصل وجہ یہ ہے " خاف على نفسه فتنة او القتل " کہ آپ کو یہ خطرہ تھا کہ اگر ان کو بیان کر دیا گیا تو مجھے مصیبتوں میں مبتلاء ہونا پڑے گا یا مجھے قتل کر دیا جائے گا کیونکہ ان احادیث میں " والنص على اعيان المرتدين والمنافقين " مرتدین اور منافقین کو معین کر کے ذکر کیا گیا ہے۔

(از قرطبی)

یہ مقامات کتمان حق میں نہیں آتے: " لا يجوز تعليم الكافر القرآن والعلم حتى يسلم " کافر کو قرآن پاک کی تعلیم دینا اور دیگر علوم کی اس وقت تک تعلیم دینا منع ہے جب تک وہ اسلام قبول نہ کر لے لہٰذا کافر کو تعلیم نہ دینا کتمان حق نہیں:

" وكذا لا يجوز تعليم المبتدع الجدال والحجاج ليجادل به اهل الحق "

اسی طرح بدعتی شخص یعنی دین کے خلاف امور کو رواج دینے والے کو تعلیم دینا جائز نہیں کیونکہ وہ تو ہے ہی جھگڑالو اور حجت باز اسے تعلیم دے کر اہل حق سے اور زیادہ جھگڑا کرنے پر قادر کرنا ہے لہٰذا

واضح ہوا کہ دین کے خلاف کام کرنے والے کو تعلیم نہ دینا کتمان حق نہیں۔

" ولا یعلم الخصم علی خصمه حجة یقطع بها ماله " کوئی شخص اپنے مدمقابل جھگڑا کرنے والے کو ایسے دلائل کی تعلیم نہ دے جن کی وجہ سے وہ اس کا مال ہی ہتھیا لے۔

" ولا یعلم السلطان تاویلا یتطرق به الی مکاره الرعیة " اور بادشاہ کو اس طرح کی تاویلات نہ سکھائے جن کی وجہ سے وہ رعیت کے لئے وبال جان ہی بن جائے۔

یہ تو صحیح تاویلات کا مسئلہ ہے غلط اور من گھڑت تاویلات سکھا کر بادشاہ کو ظالم بنانے والے اور اپنی عاقبت برباد کرنے والے بکاؤ مولویوں کا انجام کیا ہوگا۔

واضح ہوا کہ بادشاہ کو تاویلات کی تعلیم نہ دینا کتمان حق نہیں بلکہ رعیت پر مہربانی اور رحم ہے۔

" ولا ینشر الرخص فی السفهاء فیجعلوا ذلک طریقا الی ارتکاب المحظورات وترک الواجبات ونحو ذلک "

بے وقوفوں کو ایسے حیلے نہ سکھائے جن کی وجہ سے وہ شریعت میں ممنوع چیزوں کے مرتکب ہوجائیں اور واجبات کو چھوڑنے کے وہ مرتکب ہوجائیں۔

واضح ہوا کہ بے وقوفوں کو کھلی چھٹی دے کر ممنوعات کا مرتکب بنانا اور واجبات کو چھوڑنے والا بنانا منع ہے۔

یعنی بے وقوفوں کو حیلے، حجتیں نہ سکھانا کتمان حق نہیں بلکہ حق ہے۔

☆ " یروی عن النبی ﷺ انه قال ، لا تمنعوا الحکمة اهلها فتظلموهم ولا تضعوها فی غیر اهلها فتظلموها "

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ جو لوگ علم حاصل کرنے کے اہل ہیں ان سے علم دور نہ رکھو ورنہ تمہاری طرف سے ان پر ظلم ہوگا۔ اور جو علم حاصل کرنے کے اہل نہیں ان کو علم سکھاؤ نہیں ورنہ ان پر ظلم ہوگا۔

ارشاد مصطفوی سے واضح ہوا کہ بدطینت کو علم سکھا کر لوگوں کو مصیبت میں ڈالنا ہے کیونکہ اس

سے خیر کی توقع نہیں ہوسکتی۔ وہ لوگوں کو گمراہ کرے گا ہدایت نہیں دے سکے گا۔

☆ " وروی عنه ﷺ انه قال لا تعلقوا الدر فی اعناق الخنازیر ، یرید تعلیم الفقه من لیس من اهله "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا خنزیروں کی گردنوں میں موتی نہ ڈالو۔ اس سے بھی مراد یہ ہے کہ جو فقہ کا علم حاصل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا اسے نہ تعلیم دو۔ سبحان اللہ کیا ہی خوب تشبیہ ہے کہ نااہل لوگ ناپاک ہیں ان کو پاک علم کی تعلیم دے کر ان کو اور زیادہ پاک لوگوں کے لئے مصیبت کا سبب بنانا ہے۔ (از قرطبی)

کتمان علم پر وعید: " عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ من سئل عن علم علمه ثم کتمه الجم یوم القیامة بلجام من نار "
(رواه احمد وابوداؤد والترمذی ورواه بن ماجه عن انس ، مشکوة کتاب العلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص سے علم کے متعلق سوال کیا گیا اس نے علم حاصل کیا پھر اسے چھپایا قیامت کے دن اسے آگ کا لگام ڈالا جائے گا۔ حدیث شریف میں ذکر ہے " الجم " لگام منہ میں ڈالا جاتا ہے" علم اور کلام بھی منہ سے نکلتے ہیں اس لئے جب اس سے سوال کیا جائے، وہ علم کو چھپائے تو منہ میں ہی لگام بھی ڈالا جائے گا۔

اور یہ واضح ہوتا ہے کہ حیوان سے تشبیہ دی گئی کیونکہ عالم کے لئے حق بات کو چھپانا اور بوقت ضرورت بیان نہ کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ حیوان ہو، وہ بے سمجھ ہے یہ بھی گویا کہ بے سمجھ ہے۔

تنبیہ: اس حدیث کو ابن حبان اور ابویعلی نے بھی بیان کیا ہے اور اس کو تائید سخاوی رحمہ اللہ کی مقاصد حسنہ کی روایت سے ملتی ہے وہ یہ ہے " من کتم علما یعلمه الجم یوم القیامة بلجام من نار لجماعة " اس حدیث کو ترمذی نے حسن کہا اور حاکم نے صحیح کہا ہے۔

زین العرب نے مندرجہ بالا حدیث پر خطابی کی تابعداری کرتے ہوئے یہ جو کہا

" وقد تکلم فی هذا لحدیث بعض العلماء بانه ضعیف بل هو موضوع "

(کہ یہ حدیث ضعیف ہے یا موضوع ہے) (از مرقاة)

راقم کے نزدیک زین العرب کا قول یقیناً علامہ علی قاری رحمہ اللہ کے نزدیک بھی غیر معتبر ہے

کیونکہ انہوں نے اس قول کونقل کرنے کے بعد " المقاصد الحسنة للسخاوی " کی روایت کونقل کیااور کہاہے " وحسنه الترمذی وصححه الحاکم " کاش کہ ایک پہلوکو دیکھنے والے مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کریں۔

☆ " عن عائشة رضی الله عنها انها قالت من زعم ان محمدا علیه الصلوة والسلام کتم شیئا من الوحی فقد اعظم الفریة علی الله والله تعالیٰ یقول ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینات ......الخ "

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں جن لوگوں نے گمان کیا کہ بیشک محمد ﷺ نے وحی سے کچھ چیزوں کو چھپایا انہوں نے اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا بہتان باندھا۔ پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہی آیۃ پڑھی:

" اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَا اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنَاتِ وَالْهُدٰی " (از کبیر)

سبحان اللہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا کلام کتنا ہی علم کا دریا ایک کوزہ میں بند ہے۔ جب وحی کے چھپانے کی نسبت نبی کریم ﷺ کی طرف کی جائے تو یہ اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا افتراء ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا نبی اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کرے یہ ممکن ہی نہیں۔ جب رب تعالیٰ نے علم کو چھپانے والوں کی مذمت بیان کی اور ان کولعنت کا مستحق قرار دیا تو اللہ تعالیٰ کے نبی سے کتمان علم کا گمان کرنا درحقیقت رب تعالیٰ پر افتراء کہ اس کا نبوت کا انتخاب غلط ہے۔ (معاذ اللہ)

☆ " عن ابی هریرة رضی الله عنه قال لو لا آیة فی کتاب الله تعالیٰ ما حدثت احدا بشئی ابدا ثم تلا هذه الآیة " (رواه البخاری وابن ماجه وغیرهما)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ کی کتاب (قرآن مجید) میں ایک آیۃ نہ ہوتی تو میں کسی کے سامنے کوئی ایک حدیث بھی نہ بیان کرتا پھر آپ نے یہی (زیر بحث) آیۃ پڑھی۔ (روح المعانی)

مِنْ بَعْدِ مَا بَیَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِی الْکِتَابِ: جس طرح شان نزول میں اقوال پیش کئے جا چکے ہیں ان کے مطابق اگر ﴿ اَلْکِتَابِ ﴾ سے مراد توراۃ ہو اور اس میں جو بیان کیا گیا ہے اس سے مراد نبی کریم ﷺ ہوں " فعلی هذا یکون المراد بالناس علماء بنی اسرائیل " تو ﴿ اَلنَّاسِ ﴾

سے مراد بنی اسرائیل کے علماء ہوں گے۔

" ومن قال ان المراد بالكتاب جميع ما انزل الله على الانبياء من الاحكام قال المراد بالناس العلماء كافة "

جن حضرات نے یہ کہا کہ "کتاب" سے مراد تمام انبیاء کرام پر نازل ہونے والے احکام ہیں انہوں نے کہا کہ ﴿ اَلنَّاسُ ﴾ سے مراد ہر زمانہ کے تمام علماء کرام ہیں۔ (خازن)

ابوالسعو د رحمہ اللہ نے ﴿ الناس ﴾ کو عام رکھا ہے کہ تمام لوگوں پر جو بیان کیا گیا۔

اُولٰئِکَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ : "ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔

﴿ اُولٰئِکَ ﴾ کا اشارہ ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مِنَ الآیَاتِ ﴾ "بیشک وہ لوگ جو آیات کو چھپاتے ہیں" کی طرف ہے۔ (خازن) ﴿ یلعنهم الله ﴾ اللہ ان کو اپنی رحمت سے دور کرتا ہے " واصل اللعن فى اللغة الطرد والابعاد " اصل میں لغت میں لعنت کا معنی ہی "ہانکنا" اور دور کرنا ہے۔ (خازن)

طلباء کرام توجه فرمائیں: پہلے بیان ہوا ﴿ من بعد بيناه ﴾ جمع متکلم کا صیغہ ہے "بینا" اب اس کے مطابق " نلعنهم " ہونا چاہئے تھا لیکن غائب کا صیغہ اور فاعل اسم ظاہر لفظ "اللہ" ذکر فرمایا اس میں تکلم سے غیب کی طرف التفات پایا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے:

" والالتفات الى الغيبة باظهار اسم الذات لتربية المهابة والاشعار بان مبدأ صدور اللعن صفة الجلال المغائرة لما هو مبدأ الانزال والتبيين من صفة الجمال "

کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ لعنت کا صدور رب تعالیٰ کی صفت جلال سے متعلق ہے اس لئے رب تعالیٰ نے اپنا اسم گرامی ذکر فرمایا جو تمام صفات کمالیہ پر دلالت کرتا ہے ان صفات میں صفت جلالیہ بھی ہے۔ لیکن احکام و آیات کو نازل کرنا اور ان کو بیان کرنا صفت جمال ہے۔

اس لئے ان کے بیان میں متکلم کا صیغہ ذکر کیا تا کہ یہ بھی واضح ہو جائے کہ دونوں ایک دوسرے کے مغائر ہیں۔ (روح المعانی)

ویلعنهم اللاعنون : "اور لعنت کرتے ہیں ان پر لعنت کرنے والے"

لعنت کرنے والے کون ہیں؟ اس میں عموم پایا گیا ہے کہ ان پر فرشتے لعنت کرتے ہیں اور تمام لوگ ان پر لعنت کرتے ہیں۔ جن میں انبیاء کرام اور صالحین حضرات بھی ہیں۔ (کبیر)

﴿ یَلۡعَنُهُمُ اللّٰعِنُوۡنَ ﴾ کی تفسیر میں جلالین میں مذکور ہے:

" الملائکة والمؤمنون او کل شئی بالدعاء علیهم باللعنة "

ان پر ملائکہ اور مؤمنین لعنت کرتے ہیں بلکہ ہر چیز ان پر لعنت کی دعا کرتی ہے۔

" او کل شئی " جلالین کی عبارت کی وضاحت صاوی میں یوں کی گئی ہے " ای حتی الجمادات والحیتان فی البحر " ہر چیز سے مراد جمادات اور دریا کی مچھلیاں ہیں۔

اس پر حدیث پاک شاہد ہے " العاصی یلعنه کل شئی حتی الحیتان فی البحر " گنہگار شخص پر ہر چیز لعنت کرتی ہے یہاں تک کہ دریا میں مچھلیاں بھی اس پر لعنت کرتی ہیں۔

خیال رہے " او کل شئی " میں " او " تنویع کے لئے ہے شک کے لئے نہیں، اسی لئے راقم نے اس کا ترجمہ "بلکہ" کیا ہے۔ (از جلالین وصاوی)

" وقال مجاهد وعکرمة هم الحشرات والبهائم یصیبهم الجدب بذنوب علماء السوء الکاتمین فیلعنونهم "

مجاہد اور عکرمہ کا قول یہ ہے کہ حشرات الارض (سانپ، بچھو، کیڑے مکوڑے وغیرہ) اور چوپائے ان پر لعنت بھیجتے ہیں کیونکہ علماء سوء (برے علماء) حق کو چھپانے والوں کی نحوست کی وجہ سے وہ قحط میں مبتلاء ہو جاتے ہیں انہیں پانی میسر نہیں ہوتا۔ (قرطبی)

براء بن عازب اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کا استدلال:

" اللاعنون کل المخلوقات ما عدا الثقلین الجن والانس وذلک ان النبی ﷺ قال، الکافر اذا ضرب فی قبره فصاح سمعه الکل الا الثقلین ولعنه کل سامع "

"لاعنون" سے مراد تمام مخلوق ہے سوائے ثقلین یعنی جنوں اور انسانوں کے۔

اس پر دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کافر کو جب قبر میں مارا جاتا ہے تو تمام مخلوق اس کے چلانے کو سنتے ہیں سوائے ثقلین (جن وانس) کے اور ہر سننے والا اس پر لعنت بھیجتا ہے (قرطبی)

یہ استدلال معتبر نہیں کیونکہ قبر کے عذاب کو جنوں اور انسانوں سے مخفی رکھنے کی یہ وجہ ہے کہ دنیا امتحان کا مقام ہے اگر ان پر عذاب ظاہر ہو جائے تو سب نیک ہو جائیں امتحان کا مقصد فوت ہو جاتا ہے سننے والوں کی لعنت کا ذکر ہے نہ سننے والوں کا لعنت نہ بھیجنے کا ذکر نہیں بلکہ آنے والی آیۃ میں کفار پر ملائکہ اور تمام انسانوں کی لعنت کا ذکر ہے۔

عربی گرائمر کا قانون: جب ذوی العقول اور غیر ذوی العقول پر اجتماعی طور پر کسی لفظ کا اطلاق ہو تو ذوی العقول کو غالب سمجھتے ہوئے قاعدہ تغلیب جاری کرتے ہیں الفاظ اس طرح ذکر کریں گے جو ذوی العقول کے لئے استعمال ہوتے ہیں جیسے ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾ میں ''عالمین'' جمع یا نون سے آئی ہوئی ہے جو ذوی العقول کے لئے آتی ہے۔

اگر صرف غیر ذوی العقول کے لئے الفاظ کا استعمال کیا جائے لیکن صیغے جمع مذکر کے ہوں یا جمع مذکر سالم کا استعمال ہو تو پہلے غیر ذوی العقول کو ذوی العقول کے درجے میں رکھا جاتا پھر ان کے مناسب صیغے استعمال کئے جاتے ہیں جیسے:

﴿ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَیْتُھُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ ، یٰاَیُّھَا النَّاسُ ادْخُلُوْا مَسٰکِنَکُمْ، وَقَالُوْا لِجُلُوْدِھِمْ لِمَ شَھِدْتُّمْ عَلَیْنَا ، وَکُلٌّ فِیْ فُلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ ﴾

'' لاعنون '' کا اطلاق جب ذوی العقول اور غیر ذوی العقول تمام پر ہوگا تو قاعدہ تغلیب جاری ہوگا۔ اگر براء بن عازب اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کے استدلال کو دیکھا جائے کہ صرف غیر ذوی العقول کو شامل ہے تو دوسرا قانون جاری ہوگا۔ (ماخوذ از کبیر بتصرف)

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَیَّنُوْا فَاُولٰٓئِکَ اَتُوْبُ عَلَیْھِمْ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ :

''سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے توبہ کی اور اصلاح کی اور واضح بیان کیا تو ان لوگوں کی میں توبہ قبول کرتا ہوں اور میں بڑا توبہ قبول کرنے والا، رحم کرنے والا ہوں''۔

پہلے ذکر فرمایا کہ جو لوگ آیات کو چھپاتے ہیں وہ لعنت کے مستحق ہیں اس سے استثناء کرتے ہوئے فرمایا

ہاں وہ لوگ اس لعنت سے دور رہیں گے جنہوں نے توبہ کر لی اور اپنی اصلاح کر لی اور واضح بیان کیا تو ان لوگوں کی میں توبہ قبول کرتا ہوں میں بڑا توبہ قبول کرنے والا، رحم کرنے والا ہوں۔

توبہ میں صرف یہ کہنا دینا کافی نہیں میں نے توبہ کی " حتی یظهر منه فی الثانی خلاف الاول " یہاں تک کہ وہ جس کام سے توبہ کر رہا ہے اس کے خلاف کام پر عمل کرے۔ اگر مرتد ہو گیا تھا تو اس کی توبہ یہ ہے اسلام کی طرف لوٹے اور شرائع اسلام کو ظاہر کرے۔

اگر گنہگار اپنے گناہوں سے توبہ کر رہا ہے تو اس کی توبہ یہ ہے کہ وہ نیک اعمال پر عمل کرے گناہوں کو چھوڑ دے۔ اور اگر بت پرست تھا تو اس کی توبہ یہ ہے کہ بت پرستوں سے اجتناب کرے اور اہل اسلام سے مل جائے۔ اسی طرح جس کام سے توبہ کر رہا ہو اس کو چھوڑ دے اور اس کے خلاف پر عمل کرے۔ (قرطبی)

اللہ تعالیٰ نے جب کتمان آیات پر عظیم وعید فرمائی تو اس سے وہم ہوتا تھا کہ شائد یہ وعید ان کو ہمیشہ لاحق رہے گی تو اس کا ازالہ فرمایا کہ " اذا تابوا تغیر حکمهم و دخلوا فی اهل الوعد " جب وہ توبہ کر لیں گے تو اہل وعد میں داخل ہو جائیں۔

خیال رہے وعید کا استعمال عذاب کے لئے ہے اور وعد کا استعمال ثواب کے لئے ہے جب توبہ کا مطلب ہے " ان لاتوبة عبارة عن الندم علی فعل القبیح " کہ برے فعل پر نادم ہو جانا۔ پھر توبہ میں اخلاص ضروری ہے یعنی " لابدله بعد التوبة من اصلاح ما افسده " جو فساد کے کام کئے تھے ان میں اصلاح پیدا کرنا درحقیقت توبہ میں اخلاص ہے اسی لئے رب تعالیٰ نے ﴿ تَابُوْا ﴾ کے بعد ﴿ وَاَصْلَحُوْا ﴾ ذکر فرمایا۔

پھر یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ " ان التوبة لا تحصل الا بترک کل ما ینبغی وبفعل کل ما ینبغی " بیشک توبہ یہ ہے کہ تمام غیر مناسب کاموں کو چھوڑ دینا اور جو مناسب کام ہیں ان پر عمل کرنا۔

اسی لئے رب تعالیٰ نے ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مِنَ الْبَیِّنَاتِ ﴾ کے بعد توبہ کرنے والوں کا ذکر فرماتے ہوئے بیان فرمایا ﴿ وَبَیَّنُوْا ﴾ کہ ان کی توبہ تب قبول ہوگی جب وہ کتمان آیات کو چھوڑ کر

ان کو واضح طور پر بیان کرنا شروع کریں گے۔ (از کبیر)

معتزلہ کا مذہب: آیۃ دلالت کرتی ہے کہ بعض گناہوں سے توبہ اور بعض گناہوں پر قائم رہنا توبہ نہیں "**لان قولہ تعالیٰ ﴿ وَاَصۡلَحُوۡا ﴾ عام فی الکل**" اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَاَصۡلَحُوۡا ﴾ یہ عام ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام کام اچھے کرے۔

اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ جس گناہ سے توبہ کرے اسے چھوڑ دے اور اس کے خلاف اچھا کام کرے تو اس گناہ کی توبہ قبول ہو جاتی ہے اگر چہ دوسرے گناہ، گناہ ہی ہیں۔ "**ان اللفظ المطلق یکفی فی صدقه حصول فرد واحد من افراده**" بیشک مطلق لفظ کا ایک فرد پر صادق آنا بھی کافی ہے۔

اور دلیل یہ ہے کہ توبہ کا قبول کرنا عقلاً واجب نہیں رب تعالیٰ اپنے فضل سے توبہ قبول کرتا ہے اور اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے "**ذکر ذلک فی معرض المدح والثناء علی نفسه ولو کان ذلک واجبا لما حسن هذا المدح**" توبہ کی قبولیت کو اپنی ذات کے مقام مدح وثناء میں ذکر فرمایا اگر توبہ قبول کرنا رب تعالیٰ پر واجب ہوتا تو اسے مقام مدح میں ذکر نہ کیا جاتا۔

جب رب تعالیٰ پر توبہ قبول کرنا واجب نہیں بلکہ اپنے فضل وکرم سے توبہ قبول فرماتا ہے تو اس کی شان کریمی کے یہی لائق ہے کہ بندہ جس گناہ سے توبہ کرے اسے قبول فرمالے اگر چہ وہ کسی اور گناہ میں مبتلاء ہی کیوں نہ ہو۔

اور دلیل یہ ہے کہ "معنی ﴿ اَتُوۡبُ عَلَیۡهِمۡ ﴾ **اقبل توبتهم وقبول التوبة یتضمن ازالة عقاب ماتاب منها**" ﴿ اَتُوۡبُ عَلَیۡهِمۡ﴾ کا معنی یہ ہے کہ میں ان کی توبہ قبول کرتا ہوں، توبہ کا قبول کرنا یہی تو ہے کہ جس گناہ سے توبہ کرے اسے رب تعالیٰ اپنے فضل سے قبول فرمالے۔

(ماخوذ از کبیر)

اعتراض: ﴿ فَاُولٰٓئِکَ اَتُوۡبُ عَلَیۡهِمۡ ﴾ کا معنی توبہ کی قبولیت پر جزاء اور ثواب دینا کیوں نہیں مراد لیا جاتا جیسا کہ طاعت کی قبولیت پر جزاء اور ثواب دینا مراد لے لیا جاتا ہے۔

جواب: طاعت کا فائدہ ہی استحقاق ثواب ہے اس کے بغیر اور کوئی استحقاق نہیں یہی غرض ہے اس

کے فعل کی لیکن توبہ کی قبولیت اصل میں عذاب کے دور کرنے کے لئے وضع ہے اور وہی اس کے فعل کی غرض ہے۔ ہاں البتہ اگر تمام گناہوں سے توبہ کرلی تو مستحق ثواب بھی ہوگیا لیکن یہ مجازی معنی ہے۔

وانا التواب الرحیم : ﴿ اَلتَّوَّابُ ﴾ القابل لتوبة کل ذی توبة فھو مبالغة فی ھذا الباب "

﴿ اَلتَّــوَّابُ ﴾ کا مطلب ہے ہر توبہ قبول کرنے والے کی توبہ قبول کرنے والا یہ مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا (بڑا توبہ قبول کرنے والا) راقم نے بھی یہی نقل کیا۔ اس کے بعد ﴿ اَلــرَّحِیــمُ ﴾ ذکر کیا جس سے واضح کیا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رحم کرنے والا ہے وہ گناہ بھی کرتے ہیں اور اعمال میں کوتاہیاں بھی لیکن اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کی توبہ قبول فرماتا ہے۔

(از کبیر)

مسئلہ : " لا خلاف فی جواز لعن الکفار فاما الکافر المعین فقد ذھب جماعة من العلماء انه لا یلعن لانا لا ندری بما یختم الله له "

کافروں پر لعنت کرنے کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں البتہ کسی معین کافر کا نام لے کر لعنت جائز نہیں کیونکہ ہمیں علم نہیں کہ اس کا خاتمہ ایمان پر ہوا یا کفر پر (صابونی)

ہاں البتہ جن لوگوں کا کفر قرآن پاک اور حدیث پاک سے یقینی طور پر ثابت ہے ان پر شخصی لعنت بھی جائز ہے جیسا کہ ابوجہل، ابولہب، فرعون وغیرہ۔

خیال رہے مسلمان خواہ کتنا ہی گنہگار کیوں نہ ہو اس پر لعنت اس معنی کے لحاظ سے جائز نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مطلقاً محروم رہے البتہ گنہگار کے لئے رحمت خاصہ سے محرومیت کے معنی میں لعنت جائز ہے۔ (راقم)

گزشتہ سے پیوستہ : " عن مجاھد فی قوله ویلعنھم اللاعنون قال ان البھائم اذ اشتدت علیھم السنة قالت ھذا من اجل عصاة بنی آدم لعن الله عصاة بنی آدم "

حضرت مجاہد نے ﴿ وَیَلْعَنُھُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴾ کی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ چوپاؤں پر جب سال سخت ہو جاتا ہے یعنی قحط پڑ جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ گنہگار انسانوں کی نحوست کی وجہ سے تو وہ کہتے ہیں اللہ کی لعنت ہو گنہگار انسانوں پر۔ (درمنثور)

☆ " عن مجاھد فی قوله تعالیٰ ﴿ وَیَلْعَنُھُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴾ قال دواب الارض العقارب

والخنافس يقولون انما منعنا القطر بذنوبهم فيلعنونهم ، اخرجه ابو نعيم فى الحلية والبيهقى فى شعب الايمان "

حضرت مجاہد نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴾ کی تفسیر میں ذکر کیا کہ زمین پر چلنے والے تمام جانور یہاں تک کہ بچھو اور بھونڈ بھی کہتے ہیں کہ ہمیں پانی کے قطرہ سے ان لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے محروم کر دیا گیا ہے ان پر اللہ کی لعنت ہو۔ (درمنثور)

☆ " عن ابن مسعود فى هذه الآية قال هو الرجل يلعن صاحبه فى امر يرى ان قداتى اليه فترتفع اللعنة فى السماء سريعا فلا تجد صاحبها التى قيلت له اهلا فترجع الى الذى تكلم بها فلا تجده لها اهلا فتنطلق فتقع على اليهود فهو قوله ﴿ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴾ فمن تاب منهم ارتفعت عنه اللعنة "

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس آیۃ کی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ جب کوئی شخص کسی پر لعنت بھیجتا ہے تو وہ لعنت جلدی ہی آسمانوں کی طرف بلند ہوتی ہے جس شخص پر لعنت کی گئی اگر وہ لعنت کا مستحق نہ ہو تو وہ اس شخص کی طرف لوٹ کر آتی ہے جس نے لعنت کی اگر وہ بھی مستحق نہ ہو تو وہ لعنت چلتے چلتے یہود پر واقع ہو جاتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴾ ہاں اگر کوئی شخص ان سے توبہ کر لے تو وہ لعنت اس سے اٹھ جاتی ہے۔ جیسا ﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا ﴾ سے سمجھ آیا۔ (درمنثور)

☆☆☆☆☆

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَھُمْ کُفَّارٌ اُولٰئِکَ عَلَیْھِمْ لَعْنَۃُ اللّٰہِ وَالْمَلَائِکَۃِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ☆ خَالِدِیْنَ فِیْھَا لَا یُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ وَلَا ھُمْ یُنْظَرُوْنَ ﴾

۱) "بیشک وہ جنہوں نے کفر کیا اور کافر ہی مرے ان پر لعنت اللہ اور فرشتوں اور آدمیوں سب کی ہمیشہ رہیں گے اس میں نہ ان پر سے عذاب ہلکا ہو اور نہ انہیں مہلت دی جائے"۔

۲) "بیشک وہ جنہوں نے کفر کیا اور مر گئے ایسے حال میں کہ وہ کافر تھے، وہ لوگ ان پر لعنت اللہ اور فرشتوں اور لوگوں سب کی ہمیشہ رہیں گے وہ اس میں نہیں تخفیف کی جائے گی ان سے عذاب کی اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی"۔

اس آیۂ کریمہ میں دو احتمال ہیں ایک یہ ہے کہ اس میں استیناف (نیا کلام) پایا جائے اور حکم عام کافروں کو شامل ہے کہ تمام کافر جن کی موت کفر پر آئے ان پر اللہ اور فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ آیۃ ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ ﴾ پر مرتب ہے اب مطلب یہ ہوگا کہ وہ لوگ جو واضح مسائل واحکام اور ہدایت کو چھپاتے ہیں ان کی زندگی میں ان پر لعنت ہو پھر ان میں سے توبہ کرنے والوں کا حال ذکر کیا پھر ذکر کیا کہ جن کی موت بغیر توبہ کے حالت کفر پر آجائے ان پر لعنت ہے اللہ اور فرشتوں اور تمام لوگوں کی " **فکأنہ قیل انھم ملعونون حال الحیاۃ وبعد الموت الا من تاب منھم** " گویا کہ یہ کہا گیا ہے کہ کتمان آیات والے زندگی میں اور موت کے بعد لعنت کے مستحق ہیں سوائے انکے جنہوں نے ان میں سے توبہ کر لی۔

زمخشری نے بھی یہ ذکر کیا ہے " **لعنتھم احیاء ولعنتھم امواتا** " ان پر لعنت ہے حالت حیات میں بھی اور حالت ممات میں بھی۔ (از شیخ زادہ، کشاف)

اعتراض : جب پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے ﴿ اُولٰئِکَ یَلْعَنُھُمُ اللّٰہُ ﴾ تو پھر ﴿ اُولٰئِکَ عَلَیْھِمْ لَعْنَۃُ اللّٰہِ ﴾ کے ذکر کا کیا فائدہ ہے۔

جواب: پہلے جملہ میں خبر جملہ فعلیہ ہے جو حدوث اور تجدد پر دلالت کرتا ہے دوسرے جملہ میں خبر اسم ہے جو دوام واستمرار پر دلالت کرتا ہے اس لئے ﴿ اُولٰئِکَ عَلَیْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ ﴾ کا مطلب یہ ہے "استقر علیهم اللعن من الله" ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہمیشہ کے لئے ثابت ہے۔

(از شیخ زادہ وبیضاوی)

تنبیہ: ﴿ وَهُمْ كُفَّارٌ ﴾ "الواو واو الحال" ﴿ وَهُمْ كُفَّارٌ ﴾ میں واؤ حال کے لئے ہے۔

(قرطبی)

اگرچہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بھی حال کے مطابق ہی ہے لیکن میں نے ترجمہ حال کے مطابق واضح طور پر ذکر کیا ہے تاکہ طلباء کرام صحیح سمجھ سکیں۔

مقام توجہ: بعض حضرات نے ابن عربی کے اس قول "والصحیح عندی جواز لعنه لظاهر حاله ولجواز قتله وقتاله" (میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ ہر شخص کے ظاہر حال کو دیکھ کر لعنت کرنی جائز ہے۔ اسی طرح اس کے ظاہر حال کو دیکھ کر اس سے قتل وقتال جائز ہے) پر اعتراض کیا ہے کہ مسلمانوں پر لعنت جائز نہیں۔ لیکن یہ قول درست نہیں کیونکہ جیسا پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ مسلمانوں پر لعنت بمعنی رحمت خاصہ سے محرومی کے جائز ہے۔ (ابن عربی رحمہ اللہ کا قول درست ہے) نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "لعن الله السارق يسرق البيضة فتقطع يده"

اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اس چور پر جو انڈا (چاندی یا سونا انڈے کے برابر) چوری کرے اور اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ (قرطبی)

"کل من جاهر بالمعاصی کشراب الخمر وآکلة الربو ومن تشبه من النساء بالرجال ومن الرجل بالنساء الی غیر ذلک مماورد فی الاحادیث لعنه"

ہر وہ شخص جو معاصی کا مرتکب ہو جیسے شراب پینے والا اور سود کھانے والا اور مردوں کی مشابہت کرنے والی عورتوں پر اور وہ مرد جو عورتیں کی مشابہت کرنے والے ہیں ان پر احادیث مبارکہ سے لعنت کرنا ثابت ہے۔ (ماخوذ از قرطبی)

اعتراض: اس آیۃ کریمہ میں ذکر کیا گیا ہے ﴿ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴾ سب لوگ ان پر لعنت

کرتے ہیں حالانکہ ان کے اپنے دین اور مذہب والے ان پر لعنت نہیں کرتے تو کس طرح کہنا صحیح ہے کہ سب لوگ ان پر لعنت کرتے ہیں۔

جواب اول: ان پر ان کے اپنے دین والے بھی آخرت میں لعنت کریں گے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ﴾

''پھر قیامت کے دن بعض، بعض سے کفر کریں گے اور تم میں سے بعض، بعض پر لعنت بھیجیں گے''

جواب دوم: قتادہ اور ربیع کا قول یہ ہے کہ ﴿وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ﴾ سے مراد مومن لوگ ہیں۔ گویا کہ غیر کا اعتبار ہی نہیں کیا گیا'' **وحكم بان المؤمنين هم الناس لا غير** '' اور حکم یہ لگایا گیا کہ صرف مؤمن ہی انسان کہلانے کے حقدار ہیں کفار انسانیت سے ہی دور ہیں۔

جواب سوم: ہر شخص ظالم اور جاہل پر لعنت کرتا ہے کیونکہ ظلم اور جہالت کو ہر شخص قبیح سمجھتا ہے۔ چونکہ تمام کافر جاہل اور ظالم ہیں اس لئے ظالم اور جاہل پر لعنت کرنے کی وجہ سے ہر کافر دوسرے کافر پر لعنت بھیج رہا ہے۔

جواب چہارم: مستحق لعنت پر ہر شخص لعنت بھیجتا ہے اس طرح کفار بھی مستحق لعنت پر لعنت کرتے ہیں جو لعنت حقیقت میں ان کفار پر ہی لوٹ کر آتی ہے کیونکہ وہ سمجھتے نہیں کہ لعنت کے مستحق تو کفار ہی ہیں۔

(از کبیر)

خَالِدِيْنَ فِيْهَا: **فیھا** کی ضمیر یا تو لعنت کی طرف لوٹ رہی ہے، مطلب اس کا یہ ہے کہ وہ ہمیشہ لعنت میں رہیں گے ضمیر یا تو نار (آگ) کی طرف لوٹ رہی ہے اگرچہ نار کا پہلے ذکر نہیں لیکن نار ذہن میں ہے۔ اس لئے کہ جب ان پر لعنت کا ذکر کیا گیا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مکمل طور پر دور ہیں۔ ''**فهذا يستلزم الخلود في النار خارجا و ذهنا**'' جو شخص لعنت کا مستحق ہو وہ خارجی اور ذہنی طور پر آگ میں ہمیشہ رہنے کا مستحق ہوتا ہے۔

خیال رہے کہ موت کا کفر کے حال میں آنا خارجی طور پر تو آگ میں ہمیشہ رہنے کو مستلزم ہے لیکن ذہنی طور پر نہیں کیونکہ ذہن یہ بھی کہتا ہے کہ ہوسکتا ہے وہ ظاہری طور پر کفر پر مرا ہو لیکن باطنی طور پر ایمان دار ہو۔

(ماخوذ از روح المعانی)

لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ : ''نہیں تخفیف کی جائے گی ان سے عذاب کی''اس میں ایک احتمال ہے استیناف کا یعنی پہلے لعنت کا ذکر کیا کہ ان پر اللہ اور فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہے یہ عذاب ہے اور اس کی کثرت تعداد کے لحاظ پر ذکر کی گئی کہ ان پر بے شمار لعنتیں ہوں گی۔ اب یہاں کیفیت کے لحاظ پر کثرت عذاب کو ذکر کیا جا رہا ہے ان پر شدید عذاب ہوگا جس میں تخفیف نہیں ہوگی۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ جملہ ﴿خَالِدِیْنَ فِیْهَا﴾ سے حال واقع ہو وہ ہمیشہ لعنت اور آگ میں رہیں گے حال یہ ہے کہ ان سے عذاب میں تخفیف نہیں ہوگی۔ (از ابو السعود)

وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ : ''اور نہیں ان کو مہلت دی جائے گی''

جب لا ینظرون کو انظار سے لیا جائے تو معنی ہوگا " امهال " اور " تأجیل "۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں " لا یمهلون للرجعة ولا للتوبة ولا للمعذرة " ان کو واپس لوٹنے اور توبہ کرنے اور عذر پیش کرنے کی مہلت نہیں دی جائے گی۔ یہی معنی اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ هٰذَا یَوْمُ لَا یَنْطِقُوْنَ ﴾ ''یہ وہ دن ہے جس میں وہ بول نہیں سکیں گے'' اور " ولا یؤذن لهم فیعتذرون " (ان کو (قیامت کے دن) اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ عذر پیش کریں) سے سمجھ آ رہا ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے پیش کیا۔

﴿ یُنْظَرُوْنَ ﴾ میں ایک احتمال یہ ہے کہ یہ لفظ انظار سے نہ لیا جائے بلکہ نظر سے لیا جائے اب اس کے دو مطلب ہوں گے ایک انتظار کرنا جیسا کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی میں اس معنی میں بھی استعمال ہے ﴿ انظرونا نقتبس من نورکم ﴾ ای انتظرونا " ہماری انتظار کرو ہم تمہارے نور سے اقتباس (روشنی) حاصل کر لیں''اس معنی کے لحاظ پر مطلب ہوگا" لاینظرون لیعتذرو "ان کو انتظار کا وقت نہیں دیا جائے گا کہ وہ عذر پیش کریں۔ اور یا ''نظر'' کا معنی ''دیکھنا'' ہوگا اب مطلب یہ ہوگا " لاینظر الیهم نظر الرحمة " ان کی طرف نظر رحمت نہیں کی جائے گی۔ (از بیضاوی وشیخ زادہ)

آثار مبارکہ : " اخرج ابن جریر وابن ابی حاتم عن ابی العالیة قال ان الکافر یوقف یوم القیامة فیلعنه الله ثم تلعنه الملائکة ثم یلعنه الناس اجمعون "

ابو العالیہ کہتے ہیں کہ کافر کو قیامت کے دن کھڑا کیا جائے گا تو اس پر اللہ تعالیٰ لعنت کرے گا پھر

فرشتے اس پرلعنت کریں گے پھراس پرتمام لوگ لعنت کریں گے۔ (درمنثور)

☆ " اخرج عبد بن حميد وابن جرير عن قتادة في قوله اولئك عليهم لعنة الله والملائكة والناس اجمعين يعني بالناس اجمعين المؤمنين "

حضرت قتادہ فرماتے ہیں (ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت اور فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی) اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴾ سے مراد تمام مؤمنین ہیں (حقیقت میں انسان کہلانے کے حقدار وہی ہیں)۔

☆ " اخرج ابن جرير عن السدي في الآية قال لا يتلا عن اثنان مؤمنان ولا كافران فيقول احدهما لعن الله الظالم الا رجعت تلك اللعنة على الكافر لانه فكل احد من الخلق يلعنه "

سدی رحمہ اللہ نے آیۃ کی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ دو مؤمن لعنت نہیں کرتے اور نہ ہی دو کافر "یہاں تک کہ ایک ان میں سے کہتا ہے اللہ کی لعنت ہو ظالم پر" مگر یہ کہ وہ لعنت کافر کی طرف لوٹ کر آتی ہے مخلوق میں سے ہر ایک اس پر لعنت کرتا ہے۔ (درمنثور)

☆ " اخرج ابن جرير عن ابي العالية في قوله تعالیٰ خالدين فيها بقول خالدين في جهنم في اللعنة وفي قوله ولا هم ينظرون يقول لا ينظرون فيعتذرون "

ابوالعالیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ﴾ کا مطلب ہے کہ وہ جہنم میں لعنت میں ہمیشہ رہیں گے اور ﴿ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴾ کا مطلب ہے کہ ان کو مہلت نہیں دی جائے گی کہ وہ عذر پیش کریں۔ (درمنثور)

☆ " واخرج ابن ابي حاتم عن ابن عباس في قوله ولا هم ينظرون قال لا يؤخرون "

ابن حاتم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول پیش کرتے ہیں کہ ﴿ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴾ کا مطلب ہے ان کو تاخیر کا موقع نہیں عطا کیا جائے گا۔ (درمنثور)

☆☆☆☆☆

﴿ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴾

۱) ''اور تمہارا معبود ایک معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں مگر وہی بڑی رحمت والا مہربان''

۲) ''اور تمہارا معبود ایک معبود ہے نہیں معبود سوائے اس کے وہی بہت بڑی رحمت والا مہربان ہے''

شان نزول: قریش کے کفار نے کہا'' یا محمد صف لنا ربک وانسبه فانزل الله هذه الآية وسورة الاخلاص '' اے محمد تم ہمیں اپنے رب کے اوصاف بتاؤ اور اس کا نسب بیان کرو تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیۃ اور سورۃ اخلاص نازل فرمائی۔ (خازن)

پہلی آیات میں کتمان آیات سے ڈرایا گیا ہے اور انہیں لعنت کا مستحق قرار دیا گیا ہے اس آیۃ میں ذکر کیا گیا ہے '' ان اول ما یجب اظهاره ولا یجوز کتمانه امر التوحید '' کہ سب سے پہلے جس چیز کو ظاہر کرنا ضروری ہے اور اس کا چھپانا جائز نہیں وہ امر توحید ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید کو دلائل سے ذکر فرمایا اور انسان کو نظر و فکر کرنے کی دعوت دی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور اس کی صنعت کے عجائب میں تفکر کرے تو اسے خود بخود سمجھ آ جائے گا '' انه لا بدله من فاعل لا يشبهه شئی '' کہ مخلوق کا خالق ہونا ضروری ہے اور مصنوع کا صانع ہونا ضروری ہے اور کوئی چیز اس کی مثل نہیں ہو سکتی وہ ذات بے مثل ہے۔ (از قرطبی)

والهكم: کیا '' اله '' کی نسبت تمام مخلوق کی طرف ہو سکتی ہے یا صرف مکلفین کی طرف؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ '' اله '' کا مطلب ہے ''مستحق عبادت'' جب اس وصف کی وجہ سے ذات باری تعالیٰ کا معبود ہونا ضروری ہے تو نسبت بھی ان کی طرف ہوگی جن سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا متصور ہو سکے۔ ''فاذن هذه الاضافة صحيحة بالنسبة الى كل المكلفين، والى جميع من تصح صيرورته مكلفا تقديرا '' تو ''اله'' کی نسبت ان کی طرف ہی ہو سکتی ہے جو حقیقت میں مکلفین ہیں یا تقدیری طور پر ان کو مکلف تصور کیا جائے۔ (از کبیر)

اله واحد: ''ومعنى الوحدة الانفراد '' وحدت کا معنی ہے منفرد ہونا یعنی اللہ تعالیٰ منفرد ہے پھر منفرد ہونے کی دو قسمیں ہیں ذات میں منفرد ہونا اور صفت میں منفرد ہونا:

'' وحقيقة الواحد هو الشئی الذی لا يتبعض ولا ينقسم ''

حقیقت اور ذات میں واحد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تقسیم نہیں ہوسکتی اور اس کے حصے نہیں ہوسکتے۔ یعنی جسموں کے متعلق تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ عناصر اربعہ (آگ، مٹی، پانی، ہوا) سے مرکب ہیں اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ اس کے اعضاء (ہاتھ، پاؤں وغیرہ) ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ مرکب ہونے سے اور اعضاء وغیرہ سے پاک ہے وہ منفرد ہے ذات میں۔ صفت کے لحاظ پر منفرد ہونے کا یہ مطلب ہے " لا نظیر له ولیس کمثله شئی وقیل واحد فی الوهیته وربوبیته لیس له شریک "۔ کہ اس کی کوئی نظیر نہیں کیونکہ رب تعالیٰ نے خود اپنی شان بیان کی کہ اس کی مثل کوئی چیز نہیں بعض حضرات نے کہا کہ اس کا صفت میں واحد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ "الوہیت اور ربوبیت" میں واحد ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ مشرکوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرائے ہوئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کیا اور فرمایا۔ " والھکم الہ واحد " یعنی اس کا الوہیت میں کوئی شریک نہیں اس کی ربوبیت میں کوئی نظیر نہیں۔

توحید کیا ہے؟ " والتوحید هو نفی الشریک والقسیم والشبیه " توحید کا مطلب یہ ہے کہ اس کا کوئی شریک نہیں اس کی کوئی جز نہیں اس کی کوئی شبیہ نہیں۔

فالله تعالیٰ واحد فی افعاله لا شریک له یشارکه فی مصنوعاته وواحد فی ذاته لا قسیم له وواحد فی صفاته لا یشبهه شئی من خلقه "

اللہ تعالیٰ اپنے افعال میں ایک ہے اس کی مصنوعات میں اس کا کوئی شریک نہیں وہ اپنی ذات میں ایک ہے اس کا کوئی قسیم نہیں یعنی اس کی کوئی جزء اور کوئی حصہ نہیں۔ اور وہ اپنی صفات میں واحد ہے اس کی مخلوق میں اس کوئی کے مشابہ نہیں۔ (خازن)

لا الہ الا ھو : (کوئی معبود نہیں سوائے اس کے) اس کلمہ کی پہلی جز نفی ہے اور دوسری اثبات۔ صرف " لا الــــہ " کا ورد کرنا اور صرف اتنا ہی کلمہ پڑھتے رہنا کفر ہے اور " الا اللہ " ملائے۔ یا "الاھو " ساتھ ملائے تو ایمان ہے۔ کیونکہ پہلے کلمہ میں معبودان باطلہ کی نفی پائی گئی اور دوسرے کلمہ میں معبود حق کا ثبوت پایا گیا ہے۔

☆ " قال رسول ﷺ، من کان آخر کلامه لا اله الا الله دخل الجنة ، خرجه الموطأ والبخاری ومسلم وغیرهم "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس کا آخری کلام " لا الـــه الا الله " ہوا وہ جنت میں داخل ہوگا۔

"خرجه مسلم والمقصود القلب لا اللسان " مسلم نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ مقصد دل سے "لاالـه الا الله " کہنا ہے صرف زبان سے کہنے سے مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر صرف اسی کے معبود ہونے پر عقیدہ ہو اگر عقیدہ اس کے خلاف ہو تو زبان سے کہنا بے مقصد ہے۔

مسئله : " فلو قال لا اله ومات ومعتقده وضميره الوحدانية وما يجب له من الصفات لكان من اهل الجنة باتفاق اهل السنة "

اگر کسی شخص نے زبان سے "لا الہ" پڑھا۔ اس کی موت اسی حال میں آ گئی لیکن اس کا عقیدہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے متعلق کامل تھا اور اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت تھی اور اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ پر اس کا ایمان تھا اور اسے یقین تھا تو وہ شخص جنتی ہے اس پر اہل سنت کا اتفاق ہے۔

حضرت شیخ شبلی رحمہ اللہ کا تقویٰ: حضرت شبلی رحمہ اللہ "اللہ، اللہ" کا ورد کرتے تھے لیکن " لا الــه الا الله " کا ورد نہیں کرتے تھے جب آپ سے پوچھا گیا کہ آپ کلمہ طیبہ (جو نفی و اثبات پر مشتمل ہے) کا وظیفہ نہیں پڑھتے صرف "اللہ، اللہ" کا وظیفہ پڑھتے ہیں اس کی وجہ کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا:

" اخشى ان اخذ فى كلمة الجحود ولا اصل الى كلمة الاقرار "

میں ڈرتا ہوں کہ میں نفی والا کلمہ پڑھ لوں اور اثبات و اقرار والے کلمہ تک پہنچ ہی نہ سکوں تو میری موت آ جائے مقصد یہ تھا کہ میں نہیں چاہتا کہ میری موت "لا الہ" کے کلمہ پڑھنے پر آ جائے بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ میری زبان پر "اللہ، اللہ" جاری ہو تو میری موت آ جائے۔

تاہم یہ خیال رہے کہ یہ صرف تقویٰ کی بات ہے ورنہ مسئلہ وہی ہے جو پہلے ذکر کر دیا گیا ہے۔
اسی وجہ سے علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا:

"قلت وهذا من علومهم الدقيقة التى ليست لها حقيقة " میں یہ کہتا ہوں کہ یہ صوفیاء کرام کے مسائل دقیقہ ہیں جو ان کے تقویٰ کے مطابق ہو تو وہ جنتی ہے۔ (ماخوذ از قرطبی)

راقم کا موقف یہ ہے کہ مسئلہ کی دارومدار نیت پر ہے اگر کوئی یہ تمنا رکھے کہ میری موت "اللہ، اللہ" کے ذکر پر آئے تو اس کا "اللہ، اللہ" کرنا اور " لا الــه الا الله " نہ پڑھنا ہی باکمال ہے۔ اور اگر کوئی

اصل مسئلہ پر عمل کرے کہ جب کلمہ طیبہ " لا الہ الا اللہ " پڑھنے کی فضیلت حدیث شریف سے ثابت ہے تو اسی کا ورد کروں گا اگر میری موت " لا الـہ " پر آ بھی گئی تو میں اپنے عقیدہ کے صحیح ہونے کی وجہ سے رب تعالیٰ کی رحمت سے محروم نہیں رہوں گا تو اس کا " لا الہ الا اللہ " کا وظیفہ کرنا بھی با کمال ہے

(راقم)

الرحمن الرحیم : اللہ تعالیٰ نے جب اس سے پہلے اپنی دو صفتوں کا ذکر فرمایا ایک الوہیت اور دوسری وحدانیت " یفید القهر والعلو " تو ان کے ذکر سے یہ فائدہ حاصل ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کو قہر اور بلندی مرتبت یعنی دبدبہ حاصل ہے تو ان کے پیچھے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات رحمٰن اور رحیم کو ذکر فرمایا " ترويحا للقلوب عن هيبة الالهية وعزة الفردانية " تاکہ میرے بندوں کے دلوں کو چین حاصل ہو جائے کہ بیشک وہ الہ ہے اور واحد ہے یقیناً اسے قہر و دبدبہ بھی حاصل ہے لیکن وہ رحمٰن و رحیم بھی ہے۔

" واشعارا بان رحمته سبقت غضبه وانه ما خلق الخلق الا للرحمة والاحسان "

اسی سے یہ بھی واضح کر دیا کہ اس کی رحمت کو اس کے غضب پر سبقت حاصل ہے اس نے اپنی تمام مخلوق کو فقط رحمت اور احسان کے لئے بھیجا ہے۔ (از کبیر)

یعنی مخلوق خود اپنے کفر کی وجہ سے اپنے آپ کو رحمت خاصہ سے محروم کر دے اور غیظ و غضب کا مستحق بنا لے تو اس میں مخلوق خود ہی قصوروار ہے۔

رحمٰن اور رحیم کی تفصیلی بحث سورۃ فاتحہ میں بیان کی جا چکی ہے یہاں اتنا یاد کر لیا جائے کہ رحمٰن کے معنی میں مبالغہ ہے اس کا معنی ہے زیادہ رحم کرنے والا اور رحیم میں یہ مبالغہ نہیں پایا گیا۔

﴿ الرحمن الرحيم ﴾ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ وہ تمام نعمتوں کا مالک ہے خواہ وہ اصول ہوں یا فروع اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی اور کو یہ مقام حاصل نہیں۔ کیونکہ اس کے بغیر یا تو نعمت ہوگی۔ یا جن پر نعمتیں ہوں گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ پر کسی کا کوئی انعام نہیں " وهو المنعم على خلقه الرحيم بهم " وہ اپنی مخلوق پر انعام کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

☆ " عن اسماء بنت يزيد قالت سمعت رسول الله ﷺ يقول اسم الله الاعظم فى هاتين الآيتين والهكم اله واحد لا اله الا هو الرحمن الرحيم ،وفاتحة آل عمران

الم اللہ لا الٰہ الا ھو الحی القیوم " (اخرجہ ابو داؤد والترمذی وقال حدیث صحیح)

حضرت اسماء بنت یزید کہتی ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ان دو آیتوں میں ہے ایک ﴿ والھکم الہ واحد لا الہ الا ھو الرحمن الرحیم ﴾ میں اور دوسری سورۃ آل عمران کی پہلی آیۃ میں ﴿ الم ☆ اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم ﴾ (خازن)

طلباء کرام کے لئے: لفظ " ھو " میں اسرار معنویہ کو دیکھا جائے تو عجیب مسائل سمجھ آئیں گے۔ الفاظ کی دو قسمیں ہیں اسم ظاہر اور اسم ضمیر۔ لیکن اسم ظاہر یہ وہ الفاظ ہیں جو ماہیات مخصوصہ پر دلالت کرتے ہیں اس لحاظ پر کہ وہ ماہیات مخصوصہ ہیں جیسے سواد و بیاض، حجر اور انسان۔ مضمرات یہ وہ الفاظ ہیں جو کسی نہ کسی چیز پر دلالت کرتے ہیں۔ خواہ وہ متکلم ہو یا مخاطب ہو یا غائب ضمائر کی دلالت معین ماہیات پر نہیں ہوتی۔

اصل ضمیریں تین ہیں " انا " اور " انت " اور " ھو " ان میں سے اعرف (زیادہ معرفہ) " انا " ہے پھر " انت " پھر " ھو " اس ترتیب کے صحیح ہونے پر دلیل یہ ہے کہ جب مجھے اپنی ذات کا تصور آئے گا اور میں گویا کہ جب یوں کہوں " انی انا " بیشک میں، میں ہی ہوں اس میں کوئی اشتباہ نہیں ہوگا۔ " فانہ من المستحیل ان اصیر مشتبھا بغیری او یشتبہ بی غیری " یہ محال ہوگا کہ میں کسی غیر سے مشتبہ ہو جاؤں یا کوئی غیر مجھ سے مشتبہ ہو جائے۔

یعنی مجھے اپنا تصور آنے کے بعد میں یہ نہیں کہہ سکوں گا کہ میں فلاں شخص ہوں۔ یا فلاں شخص میں ہوں۔ بخلاف اس کے کہ جب میں " انت " کہوں " فانک قد تشتبہ بغیرک وغیرک یشتبہ یک فی عقلی وظنی " تو تم کبھی اپنے غیر سے مشتبہ ہو جاؤ گے اور تمہارا غیر تمہارے مشتبہ ہوگا میرے عقل اور میرے گمان میں پھر " انت " اعرف ہے " ھو " سے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ضمیروں سے " انا " سے زیادہ معرفت حاصل ہوتی ہے اور " ھو " سے بہت کم اور " انت " سے متوسط درجہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

متکلم کا اعرف ہونا اس سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ متکلم کی ضمیر خواہ متصل ہو یا منفصل ہو واحد ہو تو مذکر اور مؤنث میں مشترک ہے اور جمع کی ضمیر تثنیہ مذکر اور مؤنث اور جمع مذکر اور مؤنث کو شامل ہے

کیونکہ اس میں التباس کم لازم آتا ہے۔اس کے بعد واضح ہوا کہ جتنی معرفت کسی کو اپنی ذات کی ہوتی ہے اتنی غیر کو نہیں ہوتی اسی وجہ سے یہ کہا جائے گا" فالعرفان التام باللہ لیس الا للہ " اللہ تعالیٰ کی کامل معرفت اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی اور کو نہیں ۔ اسی وجہ سے رب تعالیٰ اپنی ذات کے متعلق کہتا ہے "انا اللّٰہ " میں اللہ ہوں دوسرا کوئی شخص اس لفظ کا استعمال نہیں کر سکتا۔

اعتراض: مشہور تو یہ ہے کہ ارواح بشریہ جب اس حقیقت کی معرفت سے منور ہو جاتی ہیں تو عاقل اور معقول متحد ہو جاتے ہیں اس اتحاد کے وقت عارف کو یہ کہنا صحیح ہے " انا اللّٰہ " تو کس طرح یہ کہنا صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی دوسرا " انا اللہ " نہیں کہہ سکتا۔

جواب: " ان القول بالاتحاد غیر معقول " بیشک اتحاد کا قول ہی عقل کے خلاف ہے لہٰذا باطل ہے اس لئے کہ اتحاد کے وقت دونوں فنا ہو جاتے ہیں یا ایک فنا ہو جاتا ہے " فذاک لیس باتحاد " یہ اتحاد نہیں ہو سکتا۔ " وان بقیا فھما اثنان لا واحد " اگر دونوں باقی رہیں تو ایک نہ ہوئے جب ایک نہ ہوئے تو اتحاد کیسے؟

مقصد: جب کوئی شخص " انا اللّٰہ "نہیں کہہ سکتا تو اب دو احتمال باقی ہیں کہ انسان رب تعالیٰ کو "انت" کہے یا" ھو " کہے۔

"انت" کا استعمال: " اما انت فھو للحاضرین فی مقامات المکاشفات والمشاھدات لمن فنی عن جمیع الحظوظ البشریۃ " جو لوگ مکاشفہ کا مقام حاصل کر لیتے ہیں اور رب تعالیٰ کے حضور حاضر ہوتے ہیں اور انسانی خواہشات کو فناء کر کے مقام مشاہدہ حاصل کر لیتے ہیں وہ" انت " کا استعمال کرتے ہیں۔

حضرت یونس علیہ السلام کی رب تعالیٰ نے خبر دی کہ آپ نے کہا " فنادی فی الظلمات ان لا الہ الا انت "(تو انہوں نے تاریکیوں میں (مچھلی کے پیٹ میں) پکارا یہ کہ کوئی معبود نہیں سوائے تیرے) لیکن یہ آپ نے اسی وقت کہا جب آپ نے آثار حدوث اور عالم حدوث کی تاریکیوں سے اپنے آپ کو فنا کے درجہ میں پہنچا کر مقام شہود تک پہنچ گئے۔

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا" لا احصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسک" میں تیری ثناء کو اس طرح شمار میں نہیں لا سکتا جیسا کہ تو نے اپنی ذات کی تعریف کی۔

ہاں البتہ یہ خیال رہے کہ اصل میں " انــت " کا استعمال ان خواص کے لئے ہے جو مقام شہود میں پہنچے ہوتے ہیں۔ لیکن بوقت دعاء عام انسان بھی یہ خیال کرتے ہوئے کہ وہ ذات تو میرے قریب ہے میں اس کے سامنے حاضر ہوں اگر چہ مجھے مقام شہود حاصل نہیں " انت " کا استعمال کر لیتے ہیں۔

''ھو'' کا استعمال: واما " ھو " فـللغائبین " لیکن " ھو " کا استعمال غائبین کے لئے ہے یعنی جن لوگوں کو مکاشفہ اور مشاہدہ حاصل نہیں ہوتا وہ درجہ غائبین تک پہنچے ہوتے ہیں۔ " ان " ھو فی حقـه اشرف الاسماء " بیشک " ھو " رب تعالیٰ کے حق میں اشرف الاسماء (بہتر نام) ہے اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ سمجھا جائے کہ اسم یا کلی ہوگا یا جزئی۔ کلی کا نفس تصور شرکت سے مانع نہیں۔ لیکن جزئی کا نفس تصور شرکت سے مانع ہے اسی سے واضح ہو گیا کہ رب تعالیٰ کا اسم کلی نہیں ہو سکتا کیونکہ رب تعالیٰ معین ذات ہے اور کلی سے معین ذات کا پتہ نہیں چلتا۔ یہی وجہ ہے کہ '' الرحمٰن، الرحیم، الحکیم، العلیم، القادر'' یعنی تمام اسماء مشتقہ لغوی معنی کے لحاظ پر رب تعالیٰ کی ذات سے خاص نہیں کیونکہ شرکتہ بین کثیرین سے مانع نہیں۔

ہاں البتہ جزئی کا استعمال رب تعالیٰ کے لئے صحیح ہے کیونکہ اس سے معین اور مخصوص ذات کا پتہ چلتا ہے پھر اس میں دو صورتیں علم ذکر کریں یا ضمیر ہر حال میں معین اور مخصوص ہونا واضح وہ جائے گا لہٰذا "یا اللہ " کہیں یا کہ " یا انت " کہیں اور یا کہ " یا ھو " کہیں ان میں کوئی فرق نہیں سب سے تعیین حاصل ہوگئی۔ بلکہ یہ بھی خیال رہے کہ علم ضمیروں کی فرع ہے " والاصل اشرف من الفرع " اصل فرع سے اشرف اور افضل ہے۔ " فـقـولـنـا یـا انت یا ھـو ، اشرف من سائر الاسماء بالکلیة " اس لئے ہم یا انت کہیں یا کہ "یاھو " کہیں یہ تمام اسماء سے افضل ہیں۔ لیکن " انت " کا استعمال حاضرین کے لئے ہے اور ھو کا غائبین کے لئے جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔

فائدہ : " ھو " کا استعمال اس صورت کے لئے ہوتا ہے جو عقل میں آئے جب " ھو " کو اس صورت کے لئے تم استعمال کرو گے تو وہ صورت تمہارے ذہن میں حاضر ہوگی۔ " فـقـد عـاد الـقـول الـی ان " ھـو " ایـضـا لا یـتـنـاول الا الحاضر " تو اس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ " ھو " کا استعمال بھی حاضر کے لئے ہے۔ اگر چہ انسان کو مکاشفہ اور مشاہدہ کا درجہ بھی حاصل ہو لیکن وہ رب تعالیٰ کی صفات کو اپنے ذہن میں لا کر درجہ حضور حاصل کر لیتا ہے تو کہتا ہے " یا ھو "

لفظ ''ھو'' کا اور کمال: بیشک ہم دلیل پیش کرتے ہیں کہ حقیقت حق تمام تراکیب کی اقسام سے پاک ہیں رب تعالیٰ کی ذات فرد مطلق ہے اس کی نعت ذکر کر کے اس کی حقیقت کو بیان نہیں کیا جا سکتا:

" لان النعت یقتضی المغایرۃ بین الموصوف والصفۃ وعند حصول الغیریۃ لا تبقی الفردانیۃ "

کیونکہ نعت چاہتی ہے کہ موصوف اور صفت میں مغائرت پائی جائے اور جب غیریت ثابت ہو تو فردانیت باقی نہیں رہتی۔ یہاں یہ خیال رہے کہ کوئی یہ اعتراض نہ کرے کہ رب تعالیٰ کی صفات نہ اس کا عین ہیں اور نہ غیر ہیں تو غیریت کیسے ثابت ہوئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں صفت کی بات نہیں ہو رہی۔ بلکہ بیان صفت کی بات ہو رہی ہے کہ بیان صفت حقیقت حق کا عین نہیں۔ اور رب تعالیٰ کی حقیقت کے متعلق خبر بھی نہیں دی جا سکتی۔" لان الاخبار یقتضی مخبرا عنہ ومخبرا بہ وذلک ینافی الفردانیۃ " کیونکہ خبر دینے کا تقاضا یہ ہے کہ مخبر عنہ اور مخبر بہ پائے جائیں یہ فردانیت کے منافی ہے اسی سے یہ واضح ہو گیا کہ جمیع اسماء مشتقہ حقیقت حق کی کنہ تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔

" واما لفظ " ھو " فانہ یصل الی کنہ تلک الحقیقۃ المفردۃ المبراۃ عن جمیع جھات الکثرۃ فھذہ اللفظۃ لو صولھا الی کنہ الحقیقۃ، وجب ان تکون اشرف من سائر الالفاظ التی یمتنع وصولھا الی تلک الحقیقۃ "

لیکن لفظ " ھو " اس ذات کی حقیقت تک پہنچتا ہے جو کثرت کی تمام جہات سے پاک ہے اور حقیقت مفردہ ہے جب یہ لفظ حقیقت حق کی کنہ تک پہنچتا ہے تو ان تمام الفاظ سے اس لفظ کو فوقیت حاصل ہو گئی جو حقیقت حق تک رسائی سے قاصر ہیں۔

لفظ ''ھو'' کا اور کمال: جو الفاظ مشتق ہیں وہ ذات کی صفت کے حصول پر دلالت کرتے ہیں۔ پھر حق تعالیٰ کی صفات کی ماہیات بھی غیر معلوم ہیں وہ بھی عالم حدوث سے متعلق ہونے کی وجہ سے ان کی علامات ظاہر ہوتی ہیں۔ مخلوق کو دیکھ کر اس کی صفت خالقیت کا پتہ چلتا ہے مرزوق کو دیکھ کر اس کی صفت رازقیت کا پتہ چلتا ہے لیکن اس معرفت سے اس کی حقیقت کا پتہ نہیں چلتا جس سے یقین کا درجہ حاصل ہو جائے۔ ہاں البتہ اس کی قدرت کا ان اشیاء سے پتہ چلتا ہے لیکن ساتھ ساتھ عالم حدوث کا دخل بھی

ہوتا ہے جب انسان دو چیزوں کی طرف نظر کرتا ہے تو کسی ایک چیز کو بھی مکمل طور پر حاصل نہیں کر سکتا بلکہ اس کی معرفت قاصر ہوتی ہے۔

" فاذن جمیع الاسماء المشتقة لا تفید کمال الاستغراق فی مقام معرفة بل کانها تصیر حجابا بین العبد وبین الاستغراق فی معرفة الرب "

تو واضح ہوا کہ تمام اسماء مشتقہ رب تعالیٰ کی معرفت میں کامل طور پر مستغرق ہونے کا فائدہ نہیں دیتے بلکہ اس معرفت میں عالم حدوث کا بھی دخل ہوتا ہے اس لئے یہ اسماء مشتقہ بوجہ عالم حدوث کے ساتھ معلق ہونے کی وجہ سے بندے اور رب تعالیٰ کی معرفت میں مستغرق ہونے کے درمیان حجاب بن جاتے ہیں۔ لیکن لفظ " ھو " رب تعالیٰ کی ذات پر دلالت کرتا ہے ذاتی طور پر اس میں کسی چیز کی اضافت ونسبت نہیں پائی جاتی " فکان لفظ " ھو " یوصلک الی الحق ویقطعک عما ما سواہ " لفظ " ھو " رب تعالیٰ تک براہ راست پہنچاتا ہے اس کی ذات کے ماسواہ تعلق کو منقطع کر دیتا ہے لیکن اس کے ماسوا الفاظ رب تعالیٰ کی ذات کے ماسوا سے رابطہ منقطع نہیں کرتے اسی لئے لفظ "ھو" اشرف ہے۔

لفظ "ھو" کا اور کمال: ابھی تک جو بحث ذکر کی گئی ہے اس سے واضح ہوا کہ " منبع الجلال والعزة ھو الذات " جلال اور عزت کا منبع اس کی ذات ہے صفات کے ذریعے اس کی ذات کی تکمیل نہیں۔ " بل ذاته لکمالها استلزمت صفات الکمال " بلکہ اس کی ذات اپنے کمال کی وجہ سے صفات کے کمال کو مستلزم ہے

" ولفظ ھو یوصلک الی ینبوع الرحمة والعزة والعلو وھو الذات وسائر الالفاظ لا توقفک الا فی مقام النعوت والصفات فکان لفظ "ھو" اشرف ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

لفظ " ھو " تمہیں رحمت اور عزت اور علو کے چشمہ تک پہنچا دیتا ہے اور وہ ذات ہے باقی الفاظ تمہیں صرف مقام نعوت اور صفات تک پہنچاتے ہیں لہٰذا لفظ " ھو " جب ذات تک پہنچاتا ہے تو وہ اشرف ہے۔ (از کبیر)

☆☆☆☆☆

﴿ اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَالۡفُلۡكِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ﴾

۱) ''بیشک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات دن کا بدلتے آنا اور کشتی کہ دریا میں لوگوں کے فائدے لے کر چلتی ہے اور وہ جو اللہ نے آسمان سے پانی اتار کر مردہ زمین کو اس سے جلا دیا اور زمین میں ہر قسم کے جانور پھیلائے اور ہواؤں کی گردش اور وہ بادل کہ آسمان و زمین کے بیچ میں حکم کا باندھنا ہے ان سب میں عقل مندوں کے لئے ضرور نشانیاں ہیں''۔

۲) ''بیشک آسمانوں اور زمین کی مخلوق میں اور رات اور دن کے بدلنے میں، اور کشتیوں میں جو چلتی ہیں دریاؤں میں کہ نفع پہنچائیں لوگوں کو اور نازل کرنے اللہ کے آسمانوں سے پانی میں زندہ کیا جس کے ذریعے زمین کو بعد مرنے اس کے اور پھیلانے اس میں ہر قسم کے جانوروں میں اور ہواؤں کے چلانے میں اور بادلوں میں جو مسخر ہیں (حکم کے پابند ہیں) درمیان آسمانوں اور زمین کے یقیناً نشانیاں ہیں اس قوم کے لئے جو عقل رکھتے ہیں''۔

جب اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلی آیۃ میں اپنی وحدانیت کا ذکر فرمایا تو اس آیۃ میں آٹھ قسم کے دلائل کا ذکر کیا جن سے عقل مند انسان اس کے وجود پر دلائل حاصل کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد دوسری آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت اور ضد اور مثل سے پاک ہونے پر دلائل قائم فرمائے ہیں۔
(کبیر)

شان نزول:

(۱) ابن جریر نے اس آیۃ کریمہ کا شان نزول یہ بیان کیا ہے کہ عطا کہتے ہیں جب نبی کریم ﷺ

مدینہ طیبہ میں آئے تو آیۃ کریمہ ﴿ وَالٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ﴾ نازل ہوئی تو مکہ کے قریش جو کافر تھے ان کو جب پتہ چلا تو وہ کہنے لگے " کیف یسع الناس الہ واحد " ایک ہی خدا تمام لوگوں کو کیسے کافی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا اس میں آٹھ نشانیوں کا ذکر کیا جو اس کی قدرت پر دلالت کر رہی ہیں جن سے عقل والوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ایک ہی ذات ہے اس کی کوئی مثل نہیں۔

(۲) سعید بن مسروق کہتے ہیں قریش نے یہود سے سوال کیا کہ تم ہمیں بتاؤ موسیٰ علیہ السلام کون کون سے معجزات لائے؟ انہوں نے بتایا کہ وہ عصا اور ید بیضاء لائے۔ اور قریش نے نصاریٰ سے بھی یہی سوال کیا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو کون کون سے معجزات عطا کئے گئے۔ انہوں نے جواب دیا" مادر زاد اندھے کو نظر عطا کرنا، برص والے شخص کی مرض کو دور کرنا، اور مردے زندہ کرنا۔ تو قریش نے نبی کریم ﷺ کو کہا کہ تم ہمارے لئے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لئے صفا پہاڑ کو سونا بنادے تا کہ ہمیں یقین ہو جائے (کہ تم نبی ہو) اور ہمیں دشمن پر قوت حاصل ہو جائے۔

تو نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا کہ قریش یہ کہتے ہیں تو رب تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ان کو عطا تو کر دوں گا" ولکن ان کذبوا بعد ذلک عذبتھم عذابا لا اعذبہ احدا من العالمین " لیکن اس کے بعد اگر انہوں نے تکذیب کی تو میں ان کو ایسا عذاب دوں گا جو تمام جہان والوں میں سے کسی ایک کو ایسا عذاب نہیں دوں گا۔

" فقال علیہ السلام ذرنی وقومی ادعوھم یوما فیوما "

تو نبی کریم ﷺ نے عرض کیا اے اللہ مجھے اور میری قوم کو اسی حال پر رہنے دے میں ان کو ہر دن دعوت اسلام دیتا رہوں گا۔

تو اللہ تعالیٰ اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا اور ان کے لئے بیان فرمایا کہ اگر وہ چاہتے ہیں کہ صفا سونا بنے تو وہ ایمان لائیں گے اور انہیں یقین زیادہ ہوگا" فخلق السموات والارض وسائر ما ذکر اعظم " تو آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور دوسری نشانیاں جو ذکر فرمائی ہیں ان میں رب تعالیٰ کی قدرت کی عظیم نشانیاں موجود ہیں ان میں تفکر کر کے انہیں زیادہ یقین آنا چاہئے لیکن وہ تو ایمان لانا ہی نہیں چاہتے بلکہ حجت بازی میں وقت گزارنا چاہتے ہیں۔ (از کبیر)

(۳) بیہقی نے ابوالضحیٰ سے روایت ذکر کی کہ مشرکین کے کعبہ کے اردگرد تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے جب انہوں نے ﴿ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ﴾ آیۃ کو سنا تو تعجب کرنے لگے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ کو کہا" ان كنت صادقا فأت بآية نعرف بها صدقك " اگر تم سچے ہو تو کوئی نشانی لاؤ جس سے ہمیں پتہ چل جائے کہ تم سچے ہو تو اس وقت یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی کہ ان نشانیوں میں تم غور وفکر کیوں نہیں کرتے۔ (از روح المعانی)

اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ : سب معطوف علیہ اور معطوف پر مرتب ہے ﴿لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ﴾ تو گویا کہ مفہوم یہ ہوا بیشک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں نشانیاں ہیں اس قوم کے لئے جو عقل رکھتے ہیں آسمانوں کا بغیر ستونوں کے قائم رہنا اور اوپر سے بھی کسی چیز سے بندھا ہوا نہ ہونا یہ رب تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی نشانی ہے۔ اور یہ کام عام عادت کے خلاف ہے:

" ولو جاء نبی فتحدی بوقوف جبل فی الهواء دون علاقة كان معجزا "

اگر نبی سے مطالبہ کیا جائے کہ تم زمین اور آسمان کے درمیان فضاء میں پہاڑ کو معلق کر کے دکھاؤ نبی یہی کام کر دکھائے تو یہ نبی کا معجزہ ہوگا۔

اور یہ محال بھی نہیں کیونکہ جبریل کا مقام تمام انبیاء کرام سے کم ہے اگر جبریل طور پہاڑ کو بنی اسرائیل کے سروں پر معلق کر سکتے ہیں تو نبی بھی یہ کام کر سکتے ہیں جبریل کو بھی طاقت رب تعالیٰ نے ہی دی ہے اور رب تعالیٰ ہی انبیاء کرام کو معجزات بھی عطا کرتا ہے۔

اسی طرح سورج اور چاند، سیارے اور ستارے سب اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں کیونکہ وہ طلوع ہوتے ہیں اور غروب ہوتے ہیں کبھی روشن ہوتے ہیں کبھی ان کی روشنی نہیں رہتی۔ یہ تمام رب تعالیٰ کی قدرت سے کام ہو رہا ہے یہ اس ذات کبریاء کی قدرت اور بے مثل ہونے کی نشانیاں ہیں۔ اور زمین میں دریاؤں اور سمندروں کا پایا جانا اور ہر قسم کی معدنیات کا پایا جانا، اور درختوں کا پایا جانا اور کہیں سے زمین کا نرم ہونا اور کہیں سے سخت ہونا یہ رب تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں۔ (از قرطبی)

سماوات جمع اور ارض واحد کیوں؟ " انما جمع السموات وافرد الارض لا نها طبقات متفاصلة بالذات مختلفة بالحقيقة بخلاف الارضين "

سماوات کو جمع ذکر کیا کیونکہ وہ مختلف طبقات ہیں اور ان کے درمیان ذاتی طور پر فاصلہ موجود ہے لیکن ''ارض'' کو مفرد ذکر کیا کہ زمینوں میں فاصلہ نہیں بلکہ وہ تہہ بتہہ ہیں۔ (بیضاوی)

دوسری وجہ یہ ہے '' جمع السماوات لانها اجناس مختلفة كل سماء من جنس غير جنس الاخرى ووحد الارض لانها كلها تراب '' والله تعالیٰ اعلم ۔سماوات کو جمع ذکر کیا کہ تمام آسمان مختلف جنس ہیں ہر آسمان دوسرے آسمان سے علیحدہ جنس ہے اور ارض کو واحد ذکر کیا کیونکہ تمام زمینیں ایک جنس یعنی مٹی سے ہیں۔ (قرطبی)

خلق : کا معنی مخلوق ہے یا مخلوق کا غیر ہے اس پر علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں '' **فقال عالم من الناس الخلق هو المخلوق** '' لوگوں میں سے عظیم عالم کا یہ قول ہے کہ خلق بمعنی مخلوق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ﴿ انَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ پر مرتب فرمایا ﴿ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴾ کو اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ آیات (نشانیاں) صرف مخلوق ہی ہے:

'' لان المخلوق هو الذى يدل على الصانع فدلت هذه الآية على ان الخلق هو المخلوق ''

کیونکہ مخلوق وہ ہے جو صانع پر دلالت کرتی ہے لہٰذا آیۃ کریمہ اس پر دلالت کر رہی ہے کہ خلق بمعنی مخلوق ہے راقم نے اسی وجہ سے یہ ترجمہ کیا ہے تاکہ یہ قول بھی واضح ہو جائے۔

ایک اور خیال بھی رہے '' **فقال عالم من الناس** '' کا ترجمہ راقم نے کیا ''لوگوں میں سے عظیم عالم کا یہ قول ہے'' یہ ترجمہ تنوین کو تعظیم کی سمجھتے ہوئے کیا ہے اگر تنوین کو تکثیر کے لئے بنایا جائے تو مطلب ہوگا ''لوگوں میں سے کثیر علماء نے یہ کہا ہے'' یہ ترجمہ اور زیادہ خوب ترین ہے۔ کچھ حضرات نے خلق کو غیر مخلوق کہا یعنی مصدری معنی ذکر کیا ہے (پیدا کرنا) ان کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوق سے پہلے ہی خالق ہے لہٰذا مخلوق سے پہلے خلق موجود ہے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اس قول کے مطابق ہے۔ (از کبیر)

وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ : ''اور رات اور دن کے بدلنے میں (نشانیاں ہیں اس قوم کیلئے جو عقل رکھتے ہیں'' ﴿ اِخْتِلَاف ﴾ کا معنی ایک کا آنا اور دوسرے کا جانا۔ یعنی رات کے آنے کے بعد دن کا جانا۔ اور دن کے آنے کے بعد رات کا جانا، اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں وہ واحد

اور بے مثل ذات ہی اس قدرت کی مالک ہے کسی اور کو یہ قدرت حاصل ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔اسی اختلاف کورب تعالیٰ نے بیان فرمایا﴿ وهو الذی جعل الليل والنهار خلفة ﴾ وہ ذات جس نے رات اور دن کوایک دوسرے کے پیچھے بنایا۔

" والثانی اراد اختلاف الليل والنهار فی الطول والقصر والنور والظلمة والزيادة والنقصان "

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ اِخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ رات اور دن کے لمبا اور چھوٹا ہونے میں اور روشن اور تاریک ہونے میں اور زیادتی اور نقصان ہونے میں نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے۔

اور تیسری وجہ ﴿ اِخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ ﴾ کی یہ ہے کہ جس طرح دن رات کا لمبا ہونا اور چھوٹا ہونا زمانہ سے متعلق ہے ایسے ہی مکانات کے اختلاف کی وجہ سے بھی دن رات کے لمبے اور چھوٹے ہونے میں اختلاف ہوتا ہے۔ایک ہی وقت میں ایک جگہ صبح ہے اسی وقت دوسری جگہ ظہر ہے اور اسی وقت اور جگہ عصر ہے اور اسی وقت اور جگہ میں مغرب ہے اور اسی وقت میں اور مقام میں عشاء ہے۔اس کی وجہ طول البلد میں اختلاف ہے لیکن عرض البلد کے اختلاف کی وجہ سے جن شہروں اور ملکوں کا عرض شمالی ہوگا ان میں گرمیوں کے دن لمبے اور راتیں چھوٹی اور سردیوں کے دن چھوٹے اور راتیں لمبی ہوں گے۔

پاکستان بھی ان ممالک میں ہی آتا ہے۔لہذا واضح ہوا کہ طول البلد اور عرض البلد کے اختلاف سے عجیب نشانیاں پائی جاتی ہیں جو رب تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر دلالت کرتی ہیں۔

دن رات کا اختلاف وجود صانع پر دلالت کرتا ہے: اس میں پھر کئی وجوہ ہیں:

(۱) رات اور دن کے احوال کا اختلاف حرکات شمس سے مرتبط ہے یعنی سورج کی حرکات سے متعلق ہے " **وهی من الآيات العظام** "اللہ تعالیٰ کی بڑی نشانیوں میں سے یہ ایک بڑی نشانی ہے۔

(۲) دن کبھی لمبے ہوتے ہیں اور کبھی راتیں لمبی ہوتی ہیں اس اختلاف کی وجہ سے مختلف موسم آتے ہیں کبھی موسم بہار اور کبھی گرمیوں کا موسم اور کبھی موسم خزاں اور کبھی سردیوں کا موسم " **وهو من الآيات**

العظام " یہ بھی اختلاف بڑی نشانیوں میں سے ہے جورب تعالیٰ کی قدرت پر دلالت کر رہا ہے۔

(۳) بندوں کا دن کو کسب کرنا اور معیشت کے لئے رزق کو طلب کرنا اور رات کو سونا اور آرام کرنا بھی دن اور رات کے اختلاف پر مبنی ہے جو بڑی نشانیوں میں سے ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت عقل والوں کو سمجھ آتی ہے۔

(۴) مخلوق کی مصلحتوں کے حصول کے لئے رات اور دن ایک دوسرے سے تعاون کر رہے ہیں "مع ما بینهما من التضاد والتنافی من الآیات العظام " باوجود اس کے کہ ان دونوں کے درمیان تضاد اور منافاۃ ہے لیکن پھر ان کا بندوں کی مصلحتوں کے حصول کے لئے ایک دوسرے سے تعاون کرنا بڑی نشانیوں میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ کی قدرت پر دلالت کر رہا ہے حالانکہ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ جن دو چیزوں میں تضاد اور منافاۃ ہو وہ ایک دوسرے سے تعاون نہیں کرتیں بلکہ فساد برپا کرتی ہیں۔

(۵) مخلوق کا رات کے اول حصہ میں سونے کی طرف متوجہ ہونا اس موت کے مشابہ ہے جو اسرافیل کے پہلی مرتبہ صور پھونکنے پر آئے گی۔ پھر مخلوق کا صبح جاگنا اس زندگی کے مشابہ ہے جو دوسری مرتبہ صور پھونکنے پر حاصل ہونی ہے تو واضح ہوا کہ دن رات کا بدلنا قیامت کی یاد دلاتا ہے جو عقل والوں کے لئے قدرت باری تعالیٰ پر دلالت کرنے والی بڑی نشانی ہے۔

(۶) رات کی تاریکی کا صبح کے آنے پر پھٹ جانا اس طرح کی بڑی نشانی ہے جیسے صاف پانی کی چھوٹی نہر گدلے (مٹیالے رنگ کے) پانی کے دریا کے ساتھ چل رہی ہو نہ صاف پانی مٹیالے کو صاف کرے اور نہ ہی مٹیالے رنگ کا پانی صاف کو مٹیالا کرے یہ نشانی بھی دن رات کے بدلنے سے حاصل ہوتی ہے۔

(۷) رات اور دن کا معتدل مقدار پر ہونا اور لوگوں کی مصلحتوں کے مطابق ہونا کہ وہ ان مقامات میں سکونت اختیار کر سکیں جہاں دن رات کا یہ نظام ہو یہ بھی قدرت باری تعالیٰ کی ایک عظیم نشانی ہے جسے عقل والے سمجھتے ہیں بخلاف اس کے جن مقامات میں قطب بالکل سیدھا سر کے مقابل ہو وہاں سال میں چھ ماہ کی رات ہوتی ہے " وهناک لا یتم النضج ، ولا یصلح المسکن لحیوان ولا یتهیأ فیه شئی من اسباب المعیشة " اور وہاں پھلوں اور کھیتی وغیرہ کا پکنا مکمل نہیں ہوتا۔ اور جاندار چیزوں کا وہاں رہنا بہت مشکل ہے اور وہاں اسباب معیشت کا مہیا ہونا بھی مشکل کام ہے۔

(۸) صبح کے وقت سورج کا طلوع ہونا اور روشنی کرنا اور شام کو غروب ہونا اور تاریکی چھا جانا یہ کیفیت بھی دن اور رات کے بدلنے سے حاصل ہوتی ہے جس سے عقل والے لوگ رب تعالیٰ کی قدرت پر نشانی حاصل کر لیتے ہیں۔ (از کبیر)

وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ :

اور کشتیوں میں (نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے) جو چلتی ہیں دریاؤں میں کہ نفع پہنچائیں لوگوں کو۔

طلباء کے لئے: فلک ، بضم الفاء اور بفتح الفاء ، کا مادہ ایک ہی ہے جس کا معنی ہے گھومنا پھر ہر گول چیز کو فلک (بفتح الفاء) کہا جاتا ہے۔ کشتی کو " فلک " (بضم الفاء) کہا جاتا ہے کیونکہ یہ پانی میں آسانی سے گھومتی ہے۔ فلک (بضم الفاء) واحد اور جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے البتہ جب واحد مراد لیا جائے گا تو اس وقت اس کے ساتھ مذکر صیغے استعمال کئے جائیں گے کیونکہ یہ لفظ مذکر ہو گا اور جمع کی صورت میں مؤنث ہوگا کیونکہ جمع مکسر حکم مؤنث میں ہوتی ہے۔

طلباء کرام کی توجہ کے لئے: " البحر سمی بحرا لاستبحاره وهو سعته وانبساطه "

بحر کو بحر اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں استبحار یعنی وسعت اور بساطت پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے "استبحر فلان فی العلم ، تبحر فلان فی العلم " فلاں شخص کو علم میں وسعت حاصل ہے اسی طرح کہا جاتا ہے " تبحر فلان فی المال " فلاں کا مال وسیع ہے " والبحر الشق ومنه البحیرة " بحر کا ایک معنی ہے پھٹنا اسی معنی کے لحاظ سے بحیرہ کا استعمال ہے۔ بحر میں دونوں معانی معتبر ہو سکتے ہیں کہ اس میں وسعت پائی جاتی ہے اور وہ زمین کے پھٹنے سے واقع ہے۔

مشہور بحور پانچ ہیں:

(۱) بحر ہند اسی کو بحر چین بھی کہا جاتا ہے۔ (۲) بحر مغرب۔

(۳) بحر شام وروم ومصر۔ (۴) بحر نیطش۔ (۵) بحر جرجان۔

تنبیہ : طلباء کرام اس مسئلہ کو نہ بھولیں کہ "بحر" کا اطلاق سمندر پر بھی ہے اور دریا پر بھی ہے اور "نہر" کا اطلاق دریا پر بھی ہے اور نہر پر بھی۔ اس لئے عربی کتب میں سیاق وسباق کو دیکھ کر ترجمہ کیا جائے کہ

یہاں مراد کون سا معنی لیا گیا ہے۔

بحر ہند: اس کا طول مشرق سے مغرب کی جانب ہے حبشہ کی زمین کی انتہاء سے شروع ہوتا ہے اور ہند اور چین کی طرف آتا ہے "**یکون مقدار ذلک ثمانمائة الف میل**" طول کے لحاظ پر اس کی مقدار آٹھ لاکھ میل ہے "**وعرضه الفی وسبعمائة میل**" اس کی مقدار عرض کے لحاظ دو ہزار سات سو میل بنتی ہے اور خط استواء سے دو ہزار سات سو میل متجاوز ہے۔

اس بحر کی **ایک خلیج** (**الخلیج ، من البحر** ،کھاڑی ،ندی، **خلیج النهر** ،دریا کے دونوں کنارے (المنجد) یہاں مراد بڑے دریا ہیں جو سمندروں میں گرتے ہیں۔ حبشہ کی زمین سے بربر کے کنارے تک ہے اسے خلیج بربری بھی کہتے ہیں اس کا طول پانچ سو میل کی مقدار ہے اور عرض ایک سو میل ہے۔

دوسری خلیج : بحر ایلہ ہے، اسی کو بحر قلزم بھی کہا جاتا ہے اس کا طول ایک ہزار چار سو میل ہے اور عرض سات سو میل ہے اس کی انتہاء اس بحر تک ہے جسے بحر اخضر، اس کے کنارے پر قلزم واقع ہے اسی لئے اسے بحر قلزم بھی کہا جاتا ہے اور اس کی مشرقی جانب یمن اور عدن کی زمین ہے اور مغربی جانب حبشہ ہے۔

تیسری خلیج : بحر ارض فارس ہے اس کو خلیج فارسی کہا جاتا ہے وہ بحر بصرہ اور فارس ہے اس کی مشرقی جانب تبر اور مکران ہیں اور اس کی مغربی جانب عمان ہے اس کا طول ایک ہزار چار سو میل ہے اور عرض پانچ سو میل ہے۔ ان دو خلیجوں یعنی خلیج ایلہ اور خلیج فارس کے درمیان حجاز اور یمن کی زمین ہے اور تمام ممالک عرب ان کے درمیان ہی ہیں ان دو خلیجوں کے درمیان مسافت ایک ہزار پانچ سو میل ہے۔

چوتھی خلیج: تیسری خلیج سے ہی چوتھی خلیج نکلتی ہے جو ہند کے ممالک تک پھیلی ہوئی ہے اسے خلیج اخضر کہا جاتا ہے اس کا طول ایک ہزار پانچ سو میل ہے۔

جزیرہ بحر ہند: میں کئی جزائر ہیں کوئی آباد ہیں اور کوئی غیر آباد ہیں کل ایک ہزار تین سو ستر جزیرے ہیں اسی بحر اخضر کی انتہاء میں ہند کی زمین کے مقابل چین کے متصل مشرقی کنارے میں جزیرہ سرانديپ ہے۔ جس کا احاطہ تین ہزار میل ہے اس میں بڑے بڑے پہاڑ ہیں اور بہت سے دریا ہیں ان مقامات میں سرخ رنگ کا یاقوت پایا جاتا ہے۔

آباد جزائر : اس جزیرہ کے اردگرد انیس جزیرے آباد ہیں ان میں شہر آباد ہیں اور دیہات آباد

ہیں۔اسی بحراحضر کے جزیروں میں سے جزیرہ کلۃ ہے جس میں رصاص (قلعی) پائی جاتی ہے۔اور اسی بحر کے جزائر میں جزیرہ سریرہ ہے جس میں کافور پائی جاتی ہے۔

بحر مغرب: کا نام محیط بھی ہے یونانیوں نے اس کا نام اوقیانوس رکھا ہے اسی کے ساتھ بحر ہند متصل ہے اس کا طول معلوم نہیں سوائے مغربی اور شمالی کناروں کے۔ یہ روس اور صقالیہ کی زمین کے مقابل ہے جنوبی جانب کی انتہاء سے شروع ہوتا ہے سوڈان کی زمین کے مقابل ہے سوس کی انتہائی حدود سے گزرتا ہے طنجہ، تاہرت، اندلس، جلالقہ اور صقالیہ سے گزرتا ہے پھر وہاں سے پہاڑوں کے پیچھے گزرتا ہے جن پر لوگ نہیں جاتے پھر اس کے ساتھ ساتھ غیر آباد زمین ہے پھر یہ بحر مشرق کی طرف آ جاتا ہے۔ اس بحر میں کشتیاں نہیں چلتیں (یہ علامہ رازی کے زمانہ کی بات ہے) بلکہ لوگ مشکیزوں (ہماری پنجابی میں سنٹراہی کہا جاتا ہے) کے ذریعہ اس میں تیرتے ہیں۔

حبشہ کی زمین کے مقابل اس میں چھ جزیرے ہیں جن کو جزائر خالدات کہتے ہیں اس بحر مغرب سے ایک عظیم خلیج شمال صقالیہ میں نکلتی ہے اور یہ بلغاریہ میں مسلمانوں کے علاقہ تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا طول مشرق سے مغرب کی طرف تین سومیل اور عرض ایک سومیل ہے۔

بحر روم: جو افریقہ اور مصر اور شام تک وسیع ہے اس کا طول پانچ ہزار میل کی مقدار ہے اور اس کی عرض چھ سومیل ہے اور اسی سے ایک خلیج شمالی کنارہ کی طرف نکلتی ہے جو روم کے قریب ہے اس کی لمبائی پانچ سومیل ہے اور اس کی چوڑائی چھ سومیل ہے۔ اور اسی سے ایک اور خلیج نکلتی ہے جو ارض سرین کی طرف جاتی ہے جس کی لمبائی دو سومیل ہے اس بحر روم میں ایک سو باسٹھ جزیرے آباد ہیں جن میں سے پچاس جزیرے بہت بڑے ہیں۔

بحر نیطش: یہ لاذقیہ سے قسطنطنیہ کے خلف کی طرف ہے روس اور صقالیہ کی زمین میں واقع ہے اس کی لمبائی ایک ہزار تین سومیل ہے اور چوڑائی تین سومیل ہے۔

بحر جرجان: اس کی لمبائی مغرب سے مشرق کی جانب تین سومیل ہے اور چوڑائی چھ سومیل ہے اس میں دو جزیرے آباد ہیں اسے ''بحر آب سکون'' بھی کہا جاتا ہے یہ طبرستان، دیلم، نہروان، باب الابواب اور اران کے کنارہ تک پھیلا ہوا ہے یہ کسی اور بحر سے متصل نہیں۔ یہ بڑے بڑے بحروں

کے متعلق مختصر بحث پیش کی گئی اور ان سے چھوٹے جن کو بحیرہ کہا جاتا ہے وہ پھر کثیر تعداد میں ہیں جیسا کہ بحیرہ خوارزم اور بحیرہ طبریہ وغیرہ۔ ارسطو نے بیان کیا ہے کہ بحر اوقیانوس کو زمین میں مرکزی حاصل ہے جیسا کہ کمر بند کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

بما ینفع الناس : ''وہ کشتیاں جو دریاؤں میں چلتی ہیں'' جن سے لوگ نفع حاصل کرتے ہیں (وہ عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں)۔ لوگوں کو کشتیوں سے نفع کیسے حاصل ہے؟ وہ یہ ہے کہ ان پر سوار ہونا مباح ہے اور ان کے ذریعے مال حاصل کرنا اور تجارت کرنا جائز قرار دے دیا گیا ہے اور دریا کی سیر سے لذت حاصل کرنا کشتیوں کے ذریعے ہی ہوتا ہے یہ سب لوگوں کے لئے منافع ہیں۔

کشتیوں کا دریاؤں میں چلنا نشانیاں کیسے؟ اس میں چند وجوہ پائی گئی ہیں جن سے انسان سمجھ سکتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی عظیم نشانیاں ہیں:

(۱) کشتیاں اگرچہ لوگ تیار کرتے ہیں لیکن وہ آلات وغیرہ جن سے کشتیوں کو بنایا جاتا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ ان چیزوں کو نہ پیدا کرتا تو کشتیاں بھی نہ بنائی جاسکتیں۔ اس لئے یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی عظیم نشانیاں ہیں۔

(۲) کشتیوں کے چلاتے وقت اگر ہوائیں سازگار نہ ہوں تو پھر بھی کشتیوں کا چلانا اور ان سے نفع حاصل کرنا ممکن نہیں۔ ہواؤں کو سازگار بنانا، اور کشتیوں کا مددگار بنانا رب تعالیٰ کی ہی قدرت ہے۔ جس کا پتہ عقل والوں کو کشتیوں کے چلانے سے حاصل ہوتا ہے۔

(۳) اگر ہوا کو مکمل طور پر رب تعالیٰ بند کر دے یا ہوا کو ہمیشہ آندھی کی شکل میں چلائے تو کشتیاں تباہ و برباد ہو کر رہ جائیں ہواؤں کو ان کیفیات سے بچانا دراصل کشتیوں کو بچانا اور نفع مند بنانا ہے یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرت عظیمہ پر دلالت کر رہا ہے۔

(۴) اگر اللہ تعالیٰ بندوں کے دلوں کو قوت نہ عطا فرماتا تو وہ کشتی پر سوار ہونے سے ڈر محسوس کرتے کوئی مقصد حاصل نہ ہو سکتا، اللہ تعالیٰ نے بندوں کی مصلحت کے لئے اور منافع حاصل کرنے کے لئے اور تجارت کے طریقوں پر عمل کرنے کے لئے کشتیوں میں بیٹھنے کی ان کے دلوں میں

قوت بھی پیدا کردی جو اللہ تعالیٰ کی قدرت عظیمہ پر دلالت کر رہی ہے۔

(۵) اللہ تعالیٰ نے جہان میں ہر طرف میں کوئی نہ کوئی معین اشیاء پیدا فرمادی ہیں جو وہاں ہی مل سکتی ہیں دوسری جگہ نہیں مل سکتیں اگر ہر چیز ہر جگہ ملتی تو لوگ نہ سفر کرنے کے محتاج ہوتے اور نہ ہی کشتیوں پر سوار ہونے کی ضرورت درپیش آتی، اس لئے کشتیوں پر سوار ہو کر خصوصی منافع حاصل کرنے میں عقل والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی عظیم نشانی پائی جاتی ہے۔

(۶) اللہ تعالیٰ کا دریاؤں کو کشتیوں کا بوجھ اٹھانے کے لئے مسخر کرنا اس کی قدرت کی عظیم نشانی ہے ورنہ دریاؤں کی طغیانی، فراوانی، موجوں کا اٹھنا پانی کا حرکت کرنا کشتیوں کو تہہ بالا کر کے رکھ دیتا لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہی ایسا ممکن ہے۔

(۷) بڑی بڑی وادیاں جیسے جیحون اور سیحون بحیرہ خوارزم میں گرتی ہیں حالانکہ وہ دریا ہے یعنی چھوٹا سمندر ہے لیکن پھر بھی وہ نہ زیادہ ہوتا ہے اور نہ لمبا ہوتا ہے۔

" فالحق سبحانه وتعالىٰ هو العالم بكيفية حال هذه المياه العظيمة التي تنصب فيها "

اللہ تعالیٰ ہی اس کیفیت کو بہتر جانتا ہے کہ اتنے بڑے پانی ایک بحیرہ میں گر کر اسے نہ بڑھائیں یہ اس کی قدرت کی عظیم نشانی ہے۔

(۸) دریا میں بڑے بڑے عظیم جانور، بڑی بڑی مچھلیاں ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ ان سے کشتیوں کو محفوظ فرماتا ہے اور ان کو صحیح وسلامت کنارے پر پہنچا دیتا ہے۔ اگر انسان اس میں تدبر فرمائے تو یقیناً سمجھ جائے گا کہ ہاں واقعی اس میں اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کی عظیم نشانی پائی گئی ہے۔

(۹) دریاؤں میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی عجیب نشانی جس سے انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ یہ کام صرف رب تعالیٰ کی قدرت میں ہے انسان کو یہ طاقت رب تعالیٰ نے عطاء ہی نہیں کی کہ وہ ایسا کام کر سکے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ ﴾

اس نے دو سمندر بہائے کہ دیکھنے میں معلوم ہوں ملے ہوئے اور ہے ان میں روک کہ ایک

دوسرے پر بڑھ نہیں سکتا۔ (سورۃ رحمن)

اور رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وهو الذی مرج البحرین هذا عذب فرات وهذا ملح اجاج وجعل بینهما برزخا وحجرا محجورا ﴾ (الفرقان ۵۳)

''اور وہی جس نے ملے ہوئے رواں کئے دو سمندر یہ میٹھا ہے نہایت شریں اور یہ کھاری ہے نہایت تلخ اوران کے بیچ میں پردہ رکھا اور روکی ہوئی آڑ''

یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ دو سمندر اور دو دریا ایک ساتھ چل رہے ہوں بظاہران میں کوئی آڑ نہ ہو لیکن ایک کے پانی کا رنگ اور ہو دوسرے کا اور ہو ایک دوسرے پر تجاوز نہ کرے اسی طرح ایک کا پانی میٹھا ہو دوسرے کا نمکین ہو کوئی ایک دوسرے پر تجاوز نہ کرے عقل والوں کے لئے اس میں نشانی ہے کہ اس میں ضرور کسی ذات کی حفاظت اور تدبیر کا دخل ہے جس کی حکمرانی ان دریاؤں اور سمندروں پر بھی ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

وَمَا اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنۡ مَّاءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا:

اور جو نازل کیا اللہ نے آسمانوں سے پانی تو زندہ کیا اس کے ذریعے زمین کو اس کے مرنے کے بعد (اس میں نشانیاں ہیں عقل والوں کیلئے)۔یعنی بارش برسانا اور اس کے ذریعے خشک زمین کو سرسبز وشاداب کرنا اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے وجود صانع پر نشانی ہے اس کے نشانی ہونے میں چند وجوہ ہیں۔

(۱) یہ اجسام ہیں ان کے ساتھ جو صفات قائم ہیں رقت اور رطوبت اور میٹھا ہونا۔'' ولا یقدر احد علی خلقها الا الله تعالیٰ ''اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ایک بھی پانی کی صفات کو پیدا کرنے پر قادر نہیں تو واضح ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کی نشانی ہے۔رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ اَصۡبَحَ مَآؤُكُمۡ غَوۡرًا فَمَنۡ یَّاۡتِیۡكُمۡ بِمَآءٍ مَّعِیۡنٍ ﴾ (سورۃ الملک ۳۰)

''تم فرماء بھلا دیکھو تو اگر صبح کو تمہارا پانی زمین میں دھنس جائے تو وہ کون ہے جو تمہیں پانی لادے نگاہ کے سامنے بہتا''۔

(۲) بیشک اللہ تعالیٰ نے پانی کو حیات انسان کا سبب بنایا اور انسان کے رزق کا ذریعہ بنایا۔ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَفِی السَّمَاءِ رِزۡقُكُمۡ وَمَا تُوۡعَدُوۡنَ ﴾ (الذاریات ، ۲۲) اور آسمان میں

تمہارا رزق ہے اور جو تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے۔ کہ اسی (آسمان) کی طرف سے بارش کر کے زمین کو پیداوار سے مالا مال کیا جاتا ہے اور آخرت کے ثواب وعذاب کا (جو تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے) وہ سب آسمان (لوح محفوظ) میں مکتوب ہے۔ (خزائن العرفان)

(۳) بادل اور بادلوں میں بہت بڑے پانی جن سے بڑی بڑی وادیاں بہتی ہیں ان کو آسمانوں کی فضاء میں معلق رکھنا یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی نشانیوں میں سے بڑی نشانی ہے کیونکہ جب چاہے پانی کو نازل فرمائے اور جب چاہے بارشوں کو روک رکھے۔

(۴) پانی کو ہی اللہ تعالیٰ نے انسان کی زندگی کا سبب بنایا اور انسان کے اکثر منافع کی دارومدار پانی پر ہی ہے رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ افرأيتم الماء الذى تشربون ء انتم انزلتموه من المزن ام نحن المنزلون ﴾

''تو بھلا بتاؤ تو وہ پانی جو پیتے ہو کیا تم نے اسے بادل سے اتارا یا ہم ہیں اتارنے والے'' (الواقعة: ۶۹)

(۵) جب انسان بارش کے محتاج ہوں تو اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتے ہوئے عاجزی اور زاری سے رب تعالیٰ کے حضور جب دعا کریں تو اللہ تعالیٰ ان کو عظیم منافع عطاء فرماتا ہے یعنی بارش عطا کرتا ہے جو عظیم منافع کا ذریعہ ہے یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کی عظیم نشانی ہے۔

نوح علیہ السلام کی حکایت بیان کرتے ہوئے رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فقلت استغفروا ربكم انه كان غفارا يرسل السماء عليكم مدرارا ﴾ (سورۃ نوح: ۱۰، ۱۱)

''تو میں نے کہا اپنے رب سے معافی مانگو وہ بڑا معاف فرمانے والا ہے تم پر موسلا دھار بارش برسائے گا'' (ماخوذ از کبیر)

سوال: ایک آیۃ کریمہ میں ہے ﴿ وانزل من السماء ماء ﴾ جس سے پتہ چلا کہ بارش آسمانوں سے آتی ہے دوسری آیۃ کریمہ میں ہے ﴿ ء انتم انزلتموه من المزن ام نحن المنزلون ﴾ جس سے سمجھ آتا ہے کہ بارش بادل سے آتی ہے۔ اور فلاسفہ کا مشہور قول ہے کہ سورج کا زمین میں اثر ہوتا ہے زمین کا پانی بخار بن کر اوپر جاتا ہے جب وہ ٹھنڈی فضاء میں پہنچتا ہے تو وہ بخارات ٹھنڈے ہو

کر پانی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو وہ بارش کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ان میں تطبیق کیسے ہے؟ کس قول پر عمل کیا جائے اور کس قول کو چھوڑا جائے۔

جواب: اللہ تعالیٰ آسمانوں سے پانی نازل فرماتا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے اس آیۃ میں ذکر فرمایا ﴿ وھو الصادق فی خبرہ ﴾ اور وہ اپنی خبر میں سچا ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ بادلوں میں پانی کو روک کر رکھتا ہے " فای بعد فی ان یمسکہ فی السماء " تو کون سی بعید بات ہے کہ وہ آسمانوں میں پانی کو روک کر رکھے۔ یعنی رب تعالیٰ آسمانوں میں پانی کو روک کر رکھتا ہے پھر اسے بادلوں میں روک کر رکھتا ہے جب چاہتا ہے بارش برسا کر پانی کو زمین پر نازل کر دیتا ہے۔

البتہ یہ قول کہ زمین سے بخارات اٹھتے ہیں اور اوپر جا کر فضاء میں ٹھنڈے ہو کر بارش کی شکل میں آتے ہیں اس کے متعلق اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اسباب میں سے یہ بھی ایک سبب بنایا ہے تو جائز ہے۔ لیکن اگر مستقل طور پر اسی کو سبب مانا جائے اور رب تعالیٰ جو قادر مختار ہے اس کے قول کی نفی کی جائے تو جائز نہیں بلکہ یہ کفر ہے۔ (ماخوذ از کبیر) (زیادہ تفصیل پہلے پارہ میں گزر چکی ہے)۔

زمین کو زندہ کرنے کا کیا مطلب؟ بیشک یہ حیات مختلف وجہ سے پائی گئی ہے۔

(۱) بارش کی وجہ سے گھاس اور پودے وغیرہ اگتے ہیں اگر یہ نہ پائے جائیں " لما عاشت دواب الارض " تو زمین پر چلنے والے جانور زندہ نہ رہیں۔ تو گویا کہ زمین کی زندگی سے مراد زمین کی پیداوار سے جانوروں کو زندگی عطا کرنا ہے۔

(۲) اگر بارش نہ ہو زمین کی پیداوار نہ ہو " لما حصلت الاقوات للعباد " تو بندوں کو روزی حاصل نہیں ہو سکتی تو پتہ چلا کہ بارش سبب ہے زمین میں مختلف چیزوں کے پیدا ہونے کا جو بندوں کی زندگی کا سبب ہے اس لئے زمین کو زندہ کرنے سے تعبیر کر دیا۔

(۳) اللہ تعالیٰ ہر چیز کو بقدر حاجت پیدا فرماتا ہے کیونکہ اس نے اپنے فضل و کرم سے بندوں کے رزق کو اپنے ذمہ لے لیا ارشاد فرمایا ﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا ﴾ تو گویا کہ تمام ذی روح چیزوں کی زندگی کا سبب بارش اور زمین ہیں اسی وجہ سے بارش کے ذریعہ زمین کو زندہ کرنے سے ذکر فرما دیا۔

(۴) زمین میں رنگ برنگ پودے پیدا فرمائے مختلف کھانے کی چیزیں اور مختلف خوشبودار پھول اور لباس بنانے کے لئے کپاس وغیرہ بارش کے ذریعے پیدا فرمائے " لان ذلک کلہ مما لا یقدر علیہ الا اللہ" اس لئے کہ ان تمام چیزوں کی تخلیق پر اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی قادر نہیں گویا کہ رب تعالیٰ نے بارش کے ذریعے ان چیزوں کو پیدا فرما کر زمین کو زندگی عطا فرمائی۔

(۵) اللہ تعالیٰ بارش کی وجہ سے زمین میں حسن اور سبزہ اور تازگی اور رونق پیدا فرماتا ہے " فذلک هو الحیاة "اسی کو حیات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

تنبیہ : اللہ تعالیٰ نے بارش کے ذریعے زمین کو زندہ کرنے کا جو ذکر فرمایا اس کا مجازی معنی لیا گیا ہے "لان الحیاة لا تصح الا علی من یدرک ویصح ان یعلم" اس لئے کہ زندگی کا اطلاق اس وقت تک صحیح نہیں جب تک ادراک اور علم نہ پایا جائے اسی طرح موت کا اطلاق بھی وہاں ہوتا ہے جہاں حیات پائی جائے ہاں البتہ جسم جب زندہ ہوتا ہے تو اس میں حسن و جمال اور نشو ونما پائے جاتے ہیں تو زمین میں جب یہی چیزیں پائی جائیں تو ان پر مجازی طور پر حیات کا ذکر فرما دیا ہے " وھذا من فصیح الکلام الذی علی اختصار یجمع المعانی الکثیرة " یہ فصیح کلام ہے جو مختصر ہونے کے باوجود بہت بڑے معانی کو جامع ہے۔ (از کبیر)

زمین کا زندہ ہونا نشانی کیسے؟

اللہ تعالیٰ کے صانع ہونے اور اس کی قدرت پر اس میں چند وجوہ سے نشانی پائی گئی ہے:

(۱) " احدها نفس الزرع لان ذلک لیس فی مقدور احد علی الحد الذی یخرج علیه "

ایک ان میں کھیتی ہے کیونکہ کسی اور کی قدرت میں یہ داخل نہیں کہ رب تعالیٰ کے بغیر کوئی اور پیدا کرے اور رب تعالیٰ کی قدرت سے باہر ہو ایسا نہیں ہرگز نہیں۔

(۲) " وثانیها اختلاف الوانها علی وجه لا یکاد یحد ویحصی "

اور دوسری نشانی یہ ہے کہ مختلف رنگوں کی اشیاء کا پیدا ہونا ایسے طریقہ پر کہ وہ رب تعالیٰ کی قدرت کے بغیر ان کی کوئی حد ہی نہ ہو اور شمار میں آ ہی نہ سکیں۔

(۳) " وثالثها اختلاف طعوم ما یظهر علی الزرع والشجر "

اور تیسری نشانی یہ ہے کہ مختلف ذائقوں والے طعام جو کھیتی اور درختوں سے پیدا ہوتے ہیں وہ صرف رب تعالیٰ کی قدرت میں ہیں اس لئے یہ رب تعالیٰ کی قدرت پر نشانی ہے۔

(۴) " ورابعها استمرار العادات بظهور ذلک فی اوقاتها المخصوصة "

چوتھی نشانی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عادت شریف یہ ہے کہ وہ مقررہ وقت میں کھیتی اور درختوں سے غلہ اور درختوں سے پھل پیدا فرماتا ہے۔ (از کبیر)

یعنی ایک ایک چیز میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی کئی کئی نشانیاں موجود ہیں ہاں البتہ انسان کو اسی وقت رب تعالیٰ کی قدرت کی عظیم نشانی حاصل ہوگی جب اسے ان میں تفکر اور تدبر حاصل ہوگا۔

وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ :

اور پھیلانے اس میں ہر قسم کے جانوروں میں (نشانیوں ہیں عقل والوں کے لئے)

یعنی زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلانے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ جو صانع کے موجود ہونے اور خالق ہونے پر دلالت کررہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی عجیب صنعت پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دلیل: ایک شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا اور کہنے لگا میں شطرنج کے معاملہ میں بہت تعجب کرتا ہوں کہ ایک ذراع (ڈیڑھ فٹ) کا ٹکڑا ہوتا ہے اگر انسان کروڑ مرتبہ بھی کھیلے تو دو مرتبہ بھی ایک چال پر متفق نہیں ہوسکتا۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں تمہیں اس سے زیادہ تعجب والی چیز بتاتا ہوں وہ یہ ہے کہ انسان کے چہرہ کی مقدار ایک بالشت ہے پھر اعضاء اس میں پائے جانے والے سب انسانوں میں دو ابرو دو آنکھیں، ناک اور منہ ہیں جن میں کوئی تبدیلی نہیں:

" ثم انک لا تری شخصین فی الشرق والغرب یشتبهان فی فما اعظم تلک القدرة والحکمة التی اظهرت فی هذه الرفعة الصغیرة هذه الاختلاف التی لاحدلها "

پھر بیشک تم نہیں دیکھتے ہو کہ مشرق ومغرب کوئی دو شخص ایک دوسرے کے مشابہ نہیں ہوتے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت سے بڑھ کر کسی اور کو یہ مقام کب حاصل ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت

وحکمت کی یہ چھوٹی سی رفعت حاصل ہے اس طرح اسکی قدرت کے مختلف مقامات کی کوئی حد نہیں۔

انسان اپنے آپ کو دیکھ کر رب تعالیٰ کی قدرت کا اندازہ کرے:

رب تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا جس کی ابتداء نطفہ سے ہے پھر اس سے خون، پھر اس سے گوشت اور ہڈیوں کو پیدا کرنا، پھر انسان کو شعور اور ادراک اور علم اور حکمت عطاء کرنا ہی واضح کر رہا ہے کہ اس کا کوئی مدبر بھی ہے اور اس کو اعضاء عطاء کرنے والا اور قوت عطاء کرنے والا اور اعضاء میں ترکیب پیدا کرنے والی قادر ذات موجود ہے۔

حیوانات قدرت باری تعالیٰ پر دلالت کر رہے ہیں:

حیوانوں کی تخلیق ان کے اعضاء ان میں قوت ترکیبیہ کا پیدا کرنا، پھر مختلف حیوانات کی مختلف طاقت، مختلف حرکات یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر دلالت کر رہی ہیں اور صانع کے موجود ہونے پر دلالت کر رہی ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا شاندار قول: سبحان من بصر بشحم، واسمع بعظم، وانطق بلحم، وہ ذات پاک ہے جس کو عظیم قدرت حاصل ہے جس نے چربی کو (آنکھ کی چربی) دیکھنے کی طاقت عطاء کی۔ اور ہڈیوں کو سننے کی طاقت عطاً (مراد اس سے کان کے پٹھے ہیں ہیں) اور گوشت کو بولنے کی طاقت عطا کی (مراد اس سے زبان کا گوشت ہے)

عناصر اربعہ سے تخلیق قدرت کی نشانی:

انسان ہو یا دوسرے حیوان ہوں ان کی تخلیق عناصر اربعہ سے ہوئی آگ، ہوا، پانی اور مٹی سے۔ اس میں عقل کا تقاضا یہ ہے کہ تمام عناصر سے اوپر آگ ہونی چاہیے کیونکہ اس میں حرارت اور یبوستہ (گرمی، خشکی) پائی جاتی ہیں اور اس سے کم لطافت میں ہوا ہے یعنی ریح کا درجہ اوپر نیچے دوسرے مقام پر ہونا عقل کا تقاضا ہے اور اس کے بعد درجہ ہے پانی کا اور اس کے بعد درجہ ہے زمین کا۔ بدن انسان کی ترکیب میں عقل تقاضا کے مطابق مٹی (یعنی یبوسة وبرودة) کو سب سے نیچے ہونا چاہیے لیکن

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کی عقل کے تقاضا کے بالکل خلاف بنایا ہے۔

سب سے اوپر ہڈیوں یعنی سر کی کھوپڑی کو رکھا جن میں زمین کی طبیعت (یعنی مٹی کی تاثیر) برودۃ اور یبوسۃ کو رکھا اور اس کے نیچے دماغ کو رکھا جس میں پانی کی تاثیر یعنی برودۃ اور رطوبۃ پائی جاتی ہے۔ اور اس کے نیچے نفس (سانس) کو رکھا جس میں ہوا کی تاثیر یعنی حرارت اور رطوبت پائی جاتی ہے۔ اور سب سے نیچے دل کو رکھا جس میں آگ کی تاثیر یعنی حرارت اور یبوست پائی جاتی ہے۔

"فسبحان من بیده قلب الطبائع یرتبها کیف یشاء ویرکبها کیف اراد"

اللہ تعالیٰ کی پاک ذات کے قبضہ قدرت میں ہی طبائع کو بدلنا ہے جسے جس طرح چاہے مرتب فرمادے اور جیسے ارادہ فرمائے اسی طرح مرکب کردے۔

یعنی انسان اگر عقل سے کام لے تو صرف اپنی بناوٹ کی طرف توجہ کرے تو رب تعالیٰ کی قدرت کا اسے پتہ چل جائے کہ رب تعالیٰ نے عقل کے تقاضا کے خلاف کس طرح عناصر اربعہ کو مرکب کیا جب کہ ان کی تاثیرات وہی ہیں جو پہلے تھیں عقل کا تقاضا یہ ہے کہ اس طرح ترکیب ہو نہیں سکتی لیکن قدرت باری تعالیٰ سے کوئی چیز بعید نہیں۔

عناصر اربعہ پر شکل کو مرتب کرنا ایک اور قدرت ہے:

ہر صانع اپنی صنعت کے نقش ونگار جس چیز پر قائم کرنا چاہے۔ اسے مٹی سے بچاتا ہے۔ تاکہ مٹی اس کے نقوش کو مکدر نہ کردے۔ اور پانی سے بچاتا ہے، تاکہ پانی اسکے نقش ونگار کو مٹا نہ دے۔ اور ہوا سے اس چیز کو بچا کر رکھتا ہے۔ تاکہ میری صنعت کے نقوش اس کی طراوت اور لطافت کی زد میں نہ آجائیں۔ اور آگ سے اس چیز کو بچاتا ہے۔ تاکہ آگ اس چیز کو ہی جلا کر راکھ نہ کردے جس کے نقوش بھی زائل نہ ہوجائیں۔ "ثم انه سبحانه وتعالی وضع نقش خلقته علی هذه الاشیاء" پھر رب سبحانہ کی قدرت دیکھو کہ اس نے اپنی مخلوق پر اپنی خلقت کے ان چیزوں پر ہی نقوش بنائے ہیں جن سے لوگ اپنی مصنوعات کو بچا کر رکھتے ہیں۔ رب تعالیٰ نے فرمایا:

○ انَّ مَثَل عیسٰی عِنْدَ اللّٰه کمثل آدم خلقه مِنْ تراب ﴿

''بیشک عیسیٰ اللہ کے ہاں آدم کی طرح ہیں ان کو پیدا کیا مٹی سے''

اورارشادفرمایا: ﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ ''ہم نے پانی سے ہر چیز کو زندگی عطاء کی''

اورفرمایا: ﴿فَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ رُّوحِنَا﴾ ''ہم نے اس میں اپنی طرف سے روح پھونکی''

اورفرمایا: ﴿وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ﴾ ''اورجن کو پیدافرمایا آگ کی لو سے''

''وهذا يدل على ان صنعته بخلاف صنع كل احد'' اسی سے واضح ہو گیا اللہ تعالیٰ کی صنعت اوراس کی قدرت اس کی مخلوق کی صنعت اور قدرت سے بالاتر ہے۔

سبحان اللہ خالق ومخلوق کی طاقت کے امتیاز پر ہر چیز دلالت کررہی۔انسان اپنے آپ کو ہی دیکھ لےتو اسے پتہ چل جائے،انسان تفکر ہی نہ کرے تو فرعون بن جائے تو اس کی اپنی بدقسمتی۔

بچے کا قدرت باری تعالیٰ کی نشانی ہونا:

بچے کا ماں سے جدا ہونے یعنی پیدا ہونے میں تفکر کرواور دیکھو کہ اگر بچے کے منہ اور ناک پر کپڑا رکھ دیں تو اس کا سانس رک جائے تو وہ مرجائے گا:

''ثم انه بقى فى الرحم الضيق مدة مديدة مع تعذر النفس هناک ولم يمت''

لیکن بچے کا تنگ رحم (بچہ دانی) میں کتنی مدت تک رہنا باوجود اس کے بچے کو وہاں سانس لینے میں تنگی محسوس ہونا اور بچے کا نہ مرنا بلاشبہ رب تعالیٰ کی قدرت کی نشانی ہے۔پھر بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس وقت وہ ضعیف وناتواں ہوتا ہے اور سمجھ سے دور ہوتا ہے وہ آگ اور پانی میں فرق نہیں کرسکتا اور نقصان دہ اور لذت والی چیزوں میں فرق کرنے کی اس میں صلاحیت نہیں پائی جاتی۔وہ یہ نہیں سمجھتا کہ یہ میری ماں ہے یا کہ اور کوئی عورت ہے۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ بچہ ابتدائی پیدائش میں سمجھ سے دور ہوتا ہے لیکن آہستہ آہستہ اسے فہم اور عقل اور ادراک میں کمال حاصل ہوتا ہے تو وہ تمام حیوانات سے بڑھ جاتا ہے اور کمال درجہ حاصل کر لیتا ہے ''ليعلم ان ذلک من عطية القادر الحكيم'' تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ قادر وحکیم کی طرف سے عطیہ ہے۔اگر انسان طبعی طور پر پیدائش کے وقت ہی ذکی ہوتا تو فہم وادراک کی تکمیل حاصل کرنے میں اسے اور زیادہ کمال حاصل ہوتا حالانکہ اس طرح نہیں بلکہ

ابتدائی پیدائش میں سمجھ سے خالی ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ اسے فہم وادراک میں کمال حاصل ہوتا ہے " علمنا ان کل ذلک من عطية الله الخالق الحكيم " تو اس سے ہمیں معلوم ہوگیا کہ یہ اللہ تعالیٰ خالق وحکیم کی طرف سے عطیہ ہے۔

واضح ہوا کہ انسان اپنے آپ کو 'ماں کے پیٹ میں ہونے اور پیدا ہونے کے وقت اور علم کے کمال تک مختلف حالات سے گزرنے کو دیکھے تو اسے قدرت کی عظیم نشانیاں نظر آئیں گی۔

انسانوں کے مختلف مزاج قدرت کی نشانی ہیں:

جب ہم دیکھتے ہیں کہ جنگلی اور پہاڑی حیوانات ایک دوسرے کے بہت مشابہ ہیں پھر ہم انسانوں کو دیکھتے ہیں جو صورت میں ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف ہوتے ہیں پھر ان کی زبانیں مختلف ہیں اور ان کی طبیعتیں مختلف ہیں اور ان کے مزاج مختلف ہیں اگر ہر انسان ایک دوسرے کے کامل طور پر مشابہ ہوتا اور ہر انسان ایک دوسرے کے برابر ہوتا تو معیشت برباد ہو کر رہ جاتی۔

کیونکہ حاکم اور محکوم کے فرق سے ہی نظام دنیا قائم ہے کوئی کھیتی باڑی کرتا ہے کوئی کپڑے سلائی کرتا ہے کوئی جوتے بناتا ہے کوئی مکان تعمیر کرتا ہے اور کوئی لکڑی کا کام کرتا ہے تو کوئی لوہے کا کام کرتا ہے کوئی معالج ہے کوئی قاضی ہے یہ تمام صورتیں مختلف طبائع اور مختلف مزاجات کی وجہ سے ہی حاصل ہیں اسی سے معاشرہ قائم ہے اسی سے نظام معیشت قائم ہوتا ہے۔

" واستقصاء الكلام فی هذا النوع لا مطمع فيه لانه بحر لاساحل له "

علامہ رازی رحمہ اللہ نے " وبث فيها من كل دابة " کی تفسیر میں قدرت کی نشانیوں پر دلائل کو ذکر فرماتے ہوئے آخر میں ذکر کیا کہ اس نوع میں کلام کو انتہاء پر پہنچانا تو مقصد ہی نہیں کیونکہ یہ تو ایسا سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ ہی نہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ: ''اور ہواؤں کے چلانے میں (نشانیاں ہیں عقل والی قوم کے لئے)
ہواؤں کا چلنا قدرت کی نشانی کیسے؟ ہوا اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے جو تصرف (ایک جگہ سے دوسرے جگہ پھیرنے) کو قبول کرتی ہے ہوا میں رقت اور لطافت پائی جاتی ہے پھر اللہ تعالیٰ اس کو اکثر اوقات ایسے طریقہ سے چلاتا ہے جس میں انسانوں اور حیوانوں اور نباتات کا عظیم فائدہ پایا جاتا ہے۔ پھر اس کی نشانی ہونے میں چند وجوہ ہیں ایک تو یہ کہ ہوا سانس کی اصل ہے اگر ایک گھڑی بھی سانس رک جائے تو انسان مرجائے اور یہ ہے کہ جس چیز کی حاجت زیادہ پائی جاتی ہے وہ چیز آسانی سے حاصل ہوتی ہے۔

چونکہ انسان ہوا کا محتاج ہے، ہوا " اعظم الحاجات " ہے اس لئے کہ ایک لحظہ بھی ہوا ختم ہو جائے تو انسان مرجائے اسی وجہ سے تمام چیزوں کی بنسبت ہوا آسانی سے حاصل ہوتی ہے۔ ہوا سے کم لیکن باقی چیزوں سے زیادہ پانی کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے پانی کا پایا جانا بھی آسان ہے، لیکن ہوا سے کچھ مشکل کیونکہ پانی کنوئیں سے نکالنا پڑتا ہے نہر وغیرہ سے چلو بھرنے پڑتے ہیں۔ لیکن ہوا کے حاصل کرنے میں تکلفات کی ضرورت درپیش نہیں آتی۔ پھر پانی کے بعد طعام کی ضرورت درپیش آتی ہے لیکن پانی سے کم ضرورت درپیش آتی ہے یہی وجہ ہے کہ طعام کا حاصل کرنا بنسبت پانی کے حاصل کرنے کے مشکل ہے۔ طعام کے بعد انسان کو اپنی زندگی میں بیماری کی حالت میں معجونوں اور دواؤں کی ضرور درپیش آتی ہے لیکن ان کی ضرورت کم درپیش آتی ہے اسی لئے ان کو حاصل کرنا مشکل ہے۔ ادویات کے بعد زمرد اور یاقوت وغیرہ کی انسان کو بہت ہی کم ضرورت درپیش آتی ہے اسی لئے ان کو حاصل کرنا بھی بہت مشکل ہوتا ہے۔

جب یہ واضح ہو گیا کہ جس چیز کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے وہ آسانی سے حاصل ہوتی ہے اور جس چیز کی ضرورت کم درپیش ہوتی ہے وہ مشکل سے حاصل ہوتی ہے۔

" وما ذاک الا رحمة منه علی العباد " یہ صرف اللہ تعالیٰ کی بندوں پر رحمت کی وجہ سے ہے

اسی سے نتیجہ یہ حاصل ہوا:

" ولما کانت الحاجة الی رحمة الله تعالٰی اعظم الحاجات فنرجو ان یکون وجد

انها اسھل من وجدان کل شئی"

کہ جب اللہ تعالیٰ کی رحمت کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے تو ہم امید رکھتے ہیں کہ سب چیزوں سے آسان ہمیں اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی میسر ہوگی کیا خوب کسی شاعر نے کہا:

سبحان من خص القلیل بعزہ	والناس مستغنون عن اجناسہ
واذل انفاس الھواء وکل ذی	نفس لمحتاج الی انفاسہ
پاک ہے وہ ذات جس نے قلیل کو عزیز بنا دیا	لوگ مستغنی ہوتے ہیں اس قسم کی چیزوں سے
اور ہوا میں سانس لینے کو آسان کردیا	اور ہر ذی روح چیز سانس لینے کی محتاج ہے

ہواؤں کے چلنے میں قدرت کی اور نشانی یہ ہے کہ اگر ہوائیں نہ چلتیں تو کشتیاں بھی نہ چلتیں اس پر اللہ تعالیٰ کے بغیر اور کسی کو قدرت حاصل نہیں۔ اگر دنیا کے لوگ تمام اپنی طاقت صرف کردیں تو کسی کو یہ طاقت حاصل نہیں کہ وہ شمالی ہوا کو جنوبی بنادے اور نہ ہی کسی کو یہ طاقت حاصل ہے کہ رکی ہوا کو چلادے۔

ہواؤں کی چار قسمیں ہیں:

(۱) شمال (بفتح الشین) جو شمالی نقطہ سے چلتی ہے۔ (۲) جنوب (بفتح الجیم) جو جنوبی نقطہ سے چلتی ہے۔ (۳) دبور (بفتح الدال) جو مغرب کی طرف سے چلتی ہے۔ (۴) صبا، یہ مشرقی جانب سے چلتی ہے اس کا دوسرا نام قبول (بفتح القاف) بھی ہے۔ (از کبیر)

ریح کی وجہ تسمیہ:

" قال ابن الانباری انما سمیت الریح ریحا لان الغالب علیھا فی ھبوبھا المجئ بالروح والراحۃ وانقطاع ھبوبھا یکسب الکرب والغم فھی ماخوذۃ من الروح"

ابن انباری فرماتے ہیں ریح کا نام ریح اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس کے چلنے سے خوشی اور راحت محسوس ہوتی ہے۔ اور جب یہ رک جائے تو غم اور مصیبت حاصل ہوتی ہے یہ روح سے ماخوذ ہے۔ (از کبیر)

اعتراض: تم نے ریح کو خوشی اور راحت کا سبب کہا ہے حالانکہ حدیث شریف میں ریح کو مصیبت

کہا گیا ہے۔حدیث شریف میں ہے:

" انه علیه الصلوۃ والسلام کان اذا اهبت الریح قال ، اللهم اجعلها ریاحا ولا تجعلها ریحا "

نبی کریم ﷺ جب ہوا چلتی تھی تو یہ دعا فرماتے تھے اے اللہ اسے ''ریاح'' بنادے اور اے اللہ اسے ''ریح'' نہ بنانا۔اس سے تو پتہ چلا کہ ''ریاح'' باعث راحت ہے اور ''ریح'' باعث اضطراب ہے۔

جواب: ریح کا لغوی معنی راحت اور خوشی ہے بلکہ صرف ہوا کا چلنا بھی لغوی معنی ہے ہاں البتہ قرآن پاک میں زیادہ طور پر ''ریح'' کا اطلاق اس ہوا پر ہے جو آندھی کی شکل میں عذاب کا سبب ہو جیسا کہ ارشاد ہوا ﴿ وَفِیْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمُ الرِّیْحَ الْعَقِیْمَ ﴾ اور ارشاد ہوا ﴿ اِنَّا اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا صَرْصَرًا ﴾ ان مقامات میں ''ریح'' کا استعمال بغیر بارش کے آندھی کی شکل میں ہوا پر کیا گیا ہے اور ﴿ وَمِنْ آیَاتِهٖ اَنْ یُّرْسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرَاتٍ ﴾ اور اللہ کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ ہواؤں کو (رحمت کی) بشارت بنا کر بھیجا۔اس مقام میں ''ریاح'' کو رحمت اور راحت کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

نتیجہ واضح ہوا کہ ''ریح'' کا لغوی معنی مطلقا ہوا ہے جو زیادہ طور پر راحت کا سبب ہوتی ہے لیکن ہوا کبھی آندھی کی شکل میں عذاب کا سبب بھی بنتی ہے اس لئے قرآن پاک میں استعمال کے لحاظ پر مفرد اور جمع میں فرق کرلیا گیا ہے مفرد کا زیادہ استعمال اس ہوا کے لئے کیا گیا ہے جس میں عذاب ہو اور جمع کا استعمال زیادہ طور پر راحت والی ہواؤں پر کیا گیا ہے۔ (ماخوذ از کبیر و مفردات راغب)

وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ :

''اور بادلوں میں جو مسخر ہیں آسمانوں اور زمین میں (نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے)'' "سحاب" ماخوذ ہے۔" سحب " سے۔

جس کا ایک معنی کھینچنا، گھسیٹنا بھی آتا ہے جیسے کہا جاتا ہے " فلان یسحب ذیله " فلاں شخص اپنے دامن کو گھسیٹتا ہے۔بادلوں کو سحاب کہا جاتا ہے کیونکہ یہ فضاء میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں بعض بعض کو اپنی طرف کھینچتے ہیں " ومعنی التسخیر التذلیل " کسی چیز کو مسخر کرنے کا مطلب ہے ''حکم کا پابند کرنا'' اور حکم کے سامنے اپنے آپ کو عاجزی سے مطیع کر لینا، مسخر ہو جانا ہے۔

بادلوں کے مسخر ہونے میں قدرت کی نشانیاں:

(۱) بیشک پانی کی طبع میں ثقل ہے ثقیل چیز اوپر سے نیچے اترنے کا تقاضا کرتی ہے پانی کا فضاء میں ٹھہرے رہنا اس کی طبیعت کے خلاف ہے۔ " فلا بد من قاسر قاهر يقهره على ذلك فلذلک سماه بالمسخر " اس لئے ضروری ہے کہ یہ تسلیم کیا جائے کہ فضاء میں پانی کا بلندی پر بغیر کسی رکاوٹ کے رکنا ایسی ذات کی وجہ سے ہے جسے ہر چیز پر قہر اور غلبہ حاصل ہے جس نے اسے روک کر رکھا ہوا ہے اسی کا نام تسخیر ہے کہ بادلوں میں پانی کو اپنے حکم کا پابند کیا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی ذات کے وجود پر بہت عظیم نشانی ہے۔

(۲) بادل اگر ہمیشہ چھائے رہتے تو سورج کی روشنی زمین پر نہ پڑتی اور زیادہ بارشیں ہوتیں زمین لگاتار نمناک رہتی تو کھیتیاں، نباتات وغیرہ نہ پائے جاتے کیونکہ سورج کی روشنی کے بغیر بھی بہت کم ہی کوئی پودا پایا جاتا ہے اور زمین ہمیشہ ہی تر رہے پانی سے جل تھل رہے تو پوداجات نہیں پائے جاتے۔ اور اگر بارش ہمیشہ کے لئے منقطع رہے تو قحط ہی قحط نظر آئے ہر طرف درخت، نباتات، گھاس وغیرہ خشک نظر آئیں کہیں بھی کوئی چیز سرسبز وشاداب نظر نہ آئے۔

" فكان تقديره بالمقدار المعلوم هو المصلحة فهو كالمسخر لله سبحانه ياتى به وقت الحاجة ويرده عند زوال الحاجة "

ایک خاص مقدار کے مطابق بارشوں کو برسانے میں مصلحت پائی جاتی ہے جتنی ضرورت ہو اور جب ضرورت ہو اس وقت بارشوں کا برسانا اور جب ضرورت نہ ہو اس وقت بارشوں کو روک رکھنا رب تعالیٰ کی قدرت اور حکمت پر دلالت کرتا ہے اور اسی کا نام تسخیر ہے۔

(۳) بادل ایک معین جگہ میں نہیں رکتے بلکہ اللہ تعالیٰ جہاں چاہے ان کو ہواؤں کے ذریعہ چلاتا ہے یہ تسخیر بھی ہے اور رب تعالیٰ کے وجود اور اس کی صنعت کی نشانی بھی ہے۔

لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ : ''نشانیاں ہیں اس قوم کے لئے جو عقل رکھتے ہیں''

" آیات " لفظ جمع ہے احتمال ہے کل کی طرف راجع ہو کہ یہ تمام آٹھ چیزیں جن کا ذکر کیا گیا

ہے وہ عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور اس میں ایک اور یہ بھی احتمال پایا جاتا ہے کہ " آیات " کا تعلق ہر ایک ایک سے ہو اور مطلب یہ ہو کہ ایک چیز میں کئی کئی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ یہی معنی زیادہ درست ہے کیونکہ جن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں قدرت کی ان گنت، ان گنت نشانیاں ہیں یہ وہ سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں پھر بھی چند چند قسمیں ذکر کر دی گئیں۔

عقل والوں کے لئے نشانیاں کہا کیونکہ جو لوگ ان چیزوں میں نظر کریں گے اور ان سے دلیل پکڑیں گے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر اور اللہ تعالیٰ کے عدل پر اور حکمت پر تو وہ اس کا شکر ادا کریں گے اور اس کی عبادت کریں گے اور اس کی طاعت کریں گے۔

فائدہ جلیلہ : نعمتوں کی دو قسمیں ہیں دنیاوی نعمتیں اور دینی نعمتیں۔ یہ آٹھ امور جن کو اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے بظاہر یہ دنیاوی نعمتیں ہیں دنیا میں انسان ان سے نفع حاصل کرتا ہے:

" فاذا تفکر العاقل فیها واستدل بها علی معرفة الصانع صارت نعما دینیة "

جب عقل مند انسان ان نعمتوں میں تفکر کریں اور رب تعالیٰ کی صنعت کی معرفت میں ان سے دلائل حاصل کریں تو یہی دینی نعمتیں بن جاتی ہیں۔ لیکن دنیاوی نعمتوں سے انسان اس وقت تک نفع حاصل نہیں کر سکتا جب تک اس کے حواس صحیح وسلامت نہ ہوں اور اس کا مزاج صحیح نہ ہو۔

" فکذا الا نتفاع بها من حیث انها نعم دینیة لا یکمل الا عند سلامة العقول وانفتاح بصر الباطن فلذلک قال لآیات لقوم یعقلون "

اسی طرح دینی نعمتوں سے نفع حاصل کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک عقل میں سلامتی نہ ہو اور باطنی نظر ان کی نہ کھلے اسی لئے رب تعالیٰ نے ان امور کو عقل والوں کے لئے نشانیاں کہا ہے۔

(ماخوذ از کبیر)

اس آیۂ کریمہ کے متعلق آثار کا تذکرہ:

☆ " اخرج ابو عبید وابن ابی الدنیا فی کتاب المطر وابن المنذر وابن ابی حاتم وابو الشیخ فی العظمة عن ابن عمر وقال الریاح ثمان اربع منها رحمة واربع عذاب فاما الرحمة فالنا شرات والمبشرات والمرسلات والذاریات واما العذاب فالعقیم والصرصر وهما فی البر والعاصف والقاصف فی البحر "

حضرت ابن عمرو (بن العاص) رضی اللہ عنہ نے فرمایا رحمت والی ہواؤں کے چار نام ذکر کیے گئے ہیں ناشرات اور مبشرات اور مرسلات اور ذاریات۔ اور عذاب والی ہواؤں کے بھی چار نام ہیں دو خشکی میں "عقیم اور صرصر" اور دو دریاؤں میں "عاصف اور قاصف" (در منشور)

☆ " واخرج عبد الله بن احمد بن حنبل فی زوائد الزهد وابو الشيخ فی العظمة عن كعب قال لو احتبست الريح عن الناس ثلاثة ايام لانتن ما بين السماء والارض "

حضرت کعب کہتے ہیں اگر ہوا لوگوں پر تین دن بند ہو جائے تو زمین و آسمان کے درمیان تمام چیزیں (گل سڑ کر) بدبودار ہو جائیں۔ (درمنشور)

☆ " واخرج ابو الشيخ عن انس قال قال رسول الله ﷺ الجنوب من ريح الجنة "

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا نبی کریم ﷺ نے فرمایا جنوبی ہوا جنتی ہوا ہے۔ (درمنشور)

☆ " واخرج الترمذی والنسائی وعبد الله بن احمد فی زوائد المسند عن ابی بن كعب قال قال رسول الله ﷺ لا تسبوا الريح فانها من روح الله وسلوا الله خيرها وخير ما فيها وخير ما ارسلت به وتعوذوا بالله من شرها وشرما فيها و شرما ارسلت به "

ابی بن کعب کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ہوا کو گالیاں نہ دو کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے اللہ تعالیٰ سے اس کی خیر اور اس میں جو کچھ ہے اس کی خیر اور جو اس کی ذریعہ بھیجا گیا ہے اس کی خیر کا سوال کرو اور اس کے شر اور اس میں جو کچھ ہے اس کے شر اور اس کے ذریعے جو عطا کی جائے اس کے شر سے پناہ طلب کرے۔ (درمنشور)

☆ " واخرج ابو الشيخ عن الحسن انه كان اذا نظر الى السحاب قال فيه والله رزقكم ولكنكم تحرمونه بذنوبكم "

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ جب بادل کو دیکھتے تو فرماتے کہ اللہ کی قسم اس میں تمہارا رزق ہے لیکن تم اپنے گناہوں کی وجہ سے اپنے آپ کو محروم کر دیتے ہو۔ (درمنشور)

اس سے واضح ہوا کہ بارشوں کا بروقت نہ ہونا یا حد سے زیادہ بارشیں برسیں تو ان کے اسباب میں سے لوگوں کے گناہ بھی سبب ہوتے ہیں جن کی وجہ سے کھیتیاں برباد ہوتی ہیں قحط پڑ جاتا ہے۔

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴾

(۱) ''اور کچھ لوگ اللہ کے سوا اور معبود بنا لیتے ہیں کہ انہیں اللہ کی طرح محبوب رکھتے ہیں اور ایمان والوں کو اللہ کے برابر کسی کی محبت نہیں اور کیسی ہو اگر دیکھیں ظالم وہ وقت جب کہ عذاب ان کے سامنے آئے اس لئے کہ سارا زور خدا کو ہے اور اس لئے کہ اللہ کا عذاب بہت سخت ہے''۔

(۲) ''اور بعض لوگ بنا لیتے ہیں اللہ کے سوا اور (اس کی) مثل محبت کرتے ہیں ان سے جیسے محبت کرتے ہیں اللہ سے اور وہ لوگ جو ایمان والے ہیں وہ بہت شدید محبت کرتے ہیں اللہ سے اور اگر معلوم کر لیں وہ لوگ جو ظالم ہیں اس وقت کو جب دیکھیں گے عذاب بیشک قوت اللہ کے لئے ہی ہے سب اور بیشک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے''۔

وضاحت: جب پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت کا ذکر فرمایا اور اپنی قدرت کی نشانیوں کا ذکر فرمایا تو اس آیۃ کریمہ میں ان لوگوں کا ذکر فرمایا جو عقل رکھنے کے باوجود بے عقل بنے بیٹھے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں جو بتوں کی پوجا کرتے ہیں ان کے لئے شدید عذاب ہوگا۔ (از قرطبی)

'' بیان لحال المشرکین بعد بیان الدلائل الدالة علی توحیده ''

پہلے وہ دلائل ذکر کیے جو اللہ تعالیٰ کی توحید پر دلالت کر رہے اب اس آیۃ کریمہ میں مشرکوں کا حال بیان کیا جا رہا ہے۔ (روح المعانی)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا :

اور بعض لوگ بنا لیتے ہیں اللہ کے سوا (اس کی) مثل۔

﴿ یَتَّخِذُ ﴾ اخذ سے لیا ہوا ہے باب افتعال ہے دومفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے اور "جعل" کے قائم مقام ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَالنَّصَارٰی اَوْلِیَاءَ ﴾

''اے ایمان والو نہ بناؤ یہود ونصاریٰ کو دوست'' (مفردات راغب)

یہاں بھی اسی معنی میں استعمال ہے اس کا ایک مفعول ﴿ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ ہے اور دوسرا مفعول ﴿ اَنْدَادًا ﴾ ہے۔

دون: جو چیز کسی دوسری چیز سے گھٹیا ہوا سے " دون " کہا جاتا ہے اب حقیقی معنی تو اس طرح بنا اور بعض لوگ بنا لیتے ہیں اللہ سے گھٹیا کو (اس کی) مثل۔ البتہ مراد یہ ہے کہ اللہ کے بغیر اوروں کو اسی لئے زیادہ طور پر " دون " کا معنی (سوا، علاوہ) کیا جاتا ہے اور کبھی " دون " دنو " سے مقلوب ہو کر آتا ہے اس وقت اس کا معنی کیا جاتا ہے ''قریب ہونا'' (از مفردات راغب بزیادۃ)

ند: " ندید الشئی مشارکه فی جوهره وذلک ضرب من المماثلة فان المثل یقال فی ای مشارکة کانت "

ایک چیز کا دوسری چیز کے اصل میں شریک ہونا " ند " کہلاتا ہے یہ مماثلت کی ایک قسم ہے اسی لئے ہر ''ند'' کو مماثل کہہ لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی ذہن میں رہے " فکل ند مثل ولیس کل مثل ندا " ہر ''ند'' کو تو مثل کہا جا سکتا ہے لیکن ہر مثل کو ند کہنا غلط ہے۔ (از مفردات راغب)

''اندادا'' جمع ہے ند کی۔

آیۃ کریمہ میں ''اندادا'' کا مطلب کیا ہے؟ اس کے اگرچہ مختلف مطالب بیان کئے گئے ہیں لیکن سب کا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ سے دور کر دینے والا اس کی مثل کسی کو نہ بنایا جائے۔

(۱) اس کا ایک مطلب یہ ہے " انها هی الاوثان التی اتخذوها آلهة لتقربهم الی الله زلفی " کہ بعض لوگوں نے بتوں کو معبود بنا لیا کہ یہ ان کو اللہ کے قریب کر دیتے ہیں۔ بت پرست لوگ اپنے بتوں سے نفع اور نقصان حاصل کرنے کی امید کرتے تھے اور اپنے مسائل میں ان کی طرف ہی قصد کرتے تھے اور ان کے لئے ہی نذریں مانتے تھے اور ان کے لئے قربانیاں کرتے تھے " وهو قول

اکثر المفسرین "یہی قول اکثر مفسرین کرام کا ہے۔ (از کبیر)

اعتراض : اس قول کے مطابق بتوں کو ﴿ اندادا ﴾ کیسے کہا گیا ہے جب کہ " انداد "کا معنی "مثل" ہے بت تو اللہ تعالیٰ کی مثل ہونہیں سکتے۔

پہلا جواب: " وعلی ھذا الاصنام انداد بعضھا لبعض ای امثال لیس لھا انداد اللہ "

اس قول کے مطابق بتوں کو " انداد " کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بت ایک دوسرے کی مثل ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی مثل نہیں۔ اب مطلب یہ ہوگیا بعض لوگوں نے اللہ کے بغیر اور معبود بنالئے ہیں جو سب عاجز ہونے میں معبود بننے کے قابل نہ ہونے میں ایک دوسرے کی مثل ہیں۔

دوسرا جواب: " انھا انداد اللہ تعالیٰ بحسب ظنونھم الفاسدۃ "

بیشک بت وغیرہ معبودان باطلہ تمام ہی اللہ تعالیٰ کی مثل نہیں ہو سکتے لیکن مشرکین اپنے فاسد گمانوں کے مطابق ان کو اللہ تعالیٰ کی مثل سمجھتے تھے اسی وجہ سے ان کی عبادت کرتے تھے۔(از کبیر)

☆ " واخرج عبد بن حمید عن عکرمۃ " ومن الناس من یتخذ من دون اللہ اندادا ای شرکاء "

بعض لوگوں نے اللہ کے سوا اس کے شریک بنالئے (اس سے مراد بھی بت وغیرہ ہی ہیں) (درمنثور)

☆ " واخرج عبد بن حمید عن قتادۃ فی قولہ ﴿ یُحِبُّوْنَھُمْ کَحُبِّ اللہ ﴾ قال یحبونھم یحبون اوثانھم "

قتادہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ یُحِبُّوْنَھُمْ کَحُبِّ اللہ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہ مشرکین اپنے بتوں سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسے اللہ سے محبت کی جاتی ہے۔ (درمنثور)

" الانداد ، الامثال والمراد بھا الاصنام کما ھو الشائع فی القرآن " انداد کا معنی امثال ہے مراد اس سے بت لئے گئے ہیں" انداد" کا اطلاق بتوں پر قرآن پاک میں واضح طور پر موجود ہے۔ (از روح المعانی)

خیال رہے ابھی تک جو وضاحت کی گئی اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے راقم نے انداد کا

لغوی معنی ''مثل'' ذکر کیا ہے تا کہ دوسرے اقوال کو بھی شامل ہو سکے۔ یہ قول قتادہ اور مجاہد اور اکثر مفسرین کا ہے (روح المعانی) " وهو قول اكثر المفسرين " یہی قول اکثر مفسرین کا ہے۔ (کبیر)

(۲) " اندادا'' کا اس آیۃ کریمہ میں دوسرا مطلب یہ ہے:

﴿ وثانيها انها السادة الذين كانوا يطيعونهم فيحلون لمكان طاعتهم ما حرم الله ويحرمون ما احل الله ﴾

کہ اس سے مراد ان کے بڑے سرکردہ راہنما، رئیس، لیڈر ہیں کیونکہ یہ لوگ ان کی فرمانبرداری کرتے تھے ان کو انہوں نے رب تعالیٰ کی مثل بنا رکھا تھا اس لئے کہ اپنے رئیسوں کی اطاعت میں جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا وہ ان کو حلال کرتے تھے اور جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا وہ ان کو حرام کرتے تھے۔ یعنی جب ان کے رئیس کسی چیز کو حلال کہہ دیتے تو ان کی تابعداری کرنے والے لوگ اسے حلال ہی کہتے خواہ اس چیز کو رب تعالیٰ (اور اس کے رسول ﷺ) نے حرام ہی کیوں نہ کیا ہو۔ اور ان کے رئیس اگر کسی چیز کو حرام کہہ دیتے تو وہ اسے حرام ہی کہتے تھے حالانکہ وہی چیز رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے حلال کی ہوتی۔ (کبیر)

" وقال ابن عباس والسدی المراد بالانداد الرؤسا المتبعون يطيعونهم فی معاصی الله "

حضرت ابن عباس اور سدی رضی اللہ عنہم کا قول یہ ہے کہ ''انداد'' سے مراد ان کے رئیس تھے جن کی تابعداری کی جاتی تھی اور یہ لوگ ان کی گناہوں میں اطاعت کرتے تھے۔ (قرطبی)

نتیجہ واضح ہوا: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ ﴾ سے مراد کفار اور مشرکین لوگ ہیں خواہ " اندادا " سے مراد بت لئے جائیں یا ان کے رئیس لئے جائیں کیونکہ رب تعالیٰ کی طرف سے حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال سمجھنا اور رب تعالیٰ نے جن چیزوں کو حلال کیا ان کو رئیسوں کی تابعداری میں حرام کرنا کفر ہی تو ہے۔

مقام افسوس: کافروں کے حق میں نازل ہونے والی آیات کو مسلمانوں پر اور بتوں کے حق میں نازل ہونے والی آیات یا رب تعالیٰ کے مقابل حلال اور حرام کرنے والے لوگوں کے متعلق نازل ہونے والی آیات کو انبیاء کرام اور اولیاء کرام پر چسپاں کرنا ظلم عظیم نہیں تو اور کیا ہے۔

مودودی صاحب کی تفسیر کے یہ الفاظ (یعنی خدائی کی جو صفات اللہ کے لئے خاص ہیں ان میں سے بعض کو دوسروں کی طرف منسوب کرتے ہیں اور خدا ہونے کی حیثیت سے بندوں پر اللہ تعالیٰ کے جو حقوق ہیں وہ سب یا ان میں سے بعض حقوق یہ لوگ ان دوسرے بناوٹی معبودوں کو ادا کرتے ہیں مثلاً سلسلہ اسباب پر حکمرانی، حاجت روائی، مشکل کشائی، فریاد رسی، دعائیں سننا اور غیب وشہادت ہر چیز سے واقف ہونا یہ سب اللہ کی مخصوص صفات ہیں)۔

اسی مضمون کو پیش کر رہے ہیں جو اوپر ذکر کیا گیا ہے انبیاء کرام اور اولیاء کرام کو کس طرح مسلمان کس طرح حاجت روا، مشکل کشا، اور فریاد رس سمجھتے ہیں اس کا ذکر راقم نے ﴿ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ﴾ کی بحث میں کر دیا ہے۔ اور انبیاء کرام کے علم غیب کی بحث انشاء اللہ اپنے محل پر آ جائے گی البتہ ضمنی طور پر کئی مقام پر علامہ رازی رحمہ اللہ کے اقوال سے (نبی کریم ﷺ کا علم غیب آپ کا معجزہ ہے) بیان ہو چکا ہے۔

نبی کریم ﷺ دعا فرمائیں تو صاف آسمان پر بادل آ جائیں اسی وقت برسنا شروع کر دیں اور جب تک آپ دعا نہ فرمائیں بارش رُکے نہیں یہ اسباب پر حکمرانی نہیں تو اور کیا ہے؟

ہاں البتہ یہ حکمرانی رب تعالیٰ نے آپ کو عطاً کی ہے اور رب تعالیٰ کی حکمرانی ذاتی ہے کسی کی عطاً سے حاصل نہیں رب تعالیٰ کی عطاء پر بھی کسی کا دل جلے تو کیا کہا جا سکتا ہے؟ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کی زبان میں یہی کہہ دینا کافی ہے

جلتے ہیں جل جائیں گے سب اعداء تیرے   نہ مٹا ہے نہ مٹے گا کبھی چرچا تیرا

اعتراض: صوفیاء کرام خود کہتے ہیں "غیر اللہ" (اللہ کے سوا اوروں) کی طرف دھیان نہ دو صرف رب تعالیٰ کی طرف توجہ کرو تم کہتے ہو "انبیاء کرام اور اولیاء کرام" بھی رب تعالیٰ کی عطاء سے حاجت روا ہیں کیا یہ تعلیمات اولیاء کرام کے مخالف تمہارا قول نہیں؟ علامہ رازی رحمہ اللہ صوفیاء کرام کا قول نقل فرماتے ہوئے رقم طراز ہیں:

" القول الثالث فی تفسیر الانداد قول الصوفیة و العارفین وھو ان کل شئی شغلت قلبک به سوی اللہ تعالیٰ فقد جعلته فی قلبک ندا للہ تعالیٰ" (کبیر)

" اَنـــدَادًا " کی تفسیر میں تیسرا قول صوفیاء کرام اور عارفین کا ہے کہ ہر وہ چیز جو تمہارے دل کو اللہ تعالیٰ کے سوا اوروں کی طرف لگا دے وہ اللہ تعالیٰ کی " ند " ہے۔

اس سے پتہ چلا کہ اللہ کے سواء اوروں کی طرف توجہ کرنا رب تعالیٰ کے " انـــداد " ماننے کے مترادف ہے۔

جواب: اولیاء کرام کے اقوال کو سمجھنا محبان اولیاء کرام کا ہی کام ہے بھلا عام انسان کیا سمجھے؟ صوفیاء کرام نے یہ فرمایا ہر وہ چیز جو تمہیں رب تعالیٰ سے ہٹا کر اوروں کی طرف لے جائے وہ رب تعالیٰ کی "ند" ہے لیکن انبیاء کرام اور اولیاء کرام کی طرف توجہ سے تو رب ملتا ہے یہ رب تعالیٰ سے ہٹانے والے نہیں بلکہ ملانے والے ہیں یہ اللہ والے ہیں جو اللہ سے ملا دیتے ہیں۔

آیئے ولی کامل کی تفسیر کو دیکھئے " ولی ولی مے شناسد " (ولی کو ولی پہچانتا ہے) کے مطابق اقوال اولیاء کرام کو سمجھتے ہوئے کیا خوب کہا میری مراد اس سے پیر محمد کرم شاہ الازہری بھیروی رحمہ اللہ ہیں آپ فرماتے ہیں صوفیاء کرام نے " انداد " کی تفسیر یہ فرمائی " کل مـا كـان مشغلا عن الله مانعا من امتثال امره " ہر وہ چیز جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل کر دے اور اس کے احکام کی تعمیل سے روک دے وہ " انـداد" سے ہے خواہ وہ بت ہوں گمراہ رئیس ہوں مال و دولت ہو فرزند و زن ہوں یا علم و فن ہر چیز جو اللہ تعالیٰ سے دور کرنے والی ہو وہ ''ند ہے اور پاش پاش کر دینے کے لائق۔

حضور نبی کریم ﷺ سے ہمیں جو عشق و عقیدت اور اولیاء کرام سے ہمیں جو محبت ہے وہ صرف اس لئے ہی تو ہے کہ وہ محبوبان خدا ہیں اور محبوب کا محبوب بھی محبوب ہی ہوا کرتا ہے جو اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کے محبوب رسول اللہ ﷺ کے لئے محبت محسوس نہیں کرتا وہ یہ سمجھ لے کہ اسے اللہ تعالیٰ سے بھی محبت نہیں۔ (ضیاء القرآن)

راقم بھی پیر صاحب اور دوسرے پیران عظام سے اسی لئے محبت کرتا ہے کہ یہ محبوبان محبوب خدا ہیں۔ حضرت پیر صاحب کو میں روح جان، دل کی دھڑکن سے تعبیر کرتا ہوں یہ میری ان سے والہانہ عقیدت و محبت ہے۔ (راقم)

يُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللهِ : محبت کرتے ہیں ان سے جیسے محبت کرتے ہیں اللہ سے

محبت کیا ہے؟ محبة ماخوذ ہے حب (بفتح الحاء) سے جس کا معنی ہے " دانه " جیسے کہا جاتا

ہے حبة الحنطة (گندم کا دانہ) حبة الشعیر (جو کا دانہ) ۔ دل کے دانہ (نقطہ) کو عام دانہ سے تشبیہ دی گئی پھر مجازی طور پر " حب القلب " کا معنیٰ " میلان قلب " لے لیا گیا۔ کہا جا تا ہے " حببت فھو محبوب الی اصاب حبه حبة قلبی ورسخ فیھا " میں نے اس سے محبت کی وہ میرا محبوب ہے اس کی محبت میرے دل کے نکتہ تک پہنچ گئی یعنی دل کی گہرائی تک پہنچ گئی اور راسخ ہو گئی۔ اور کہا جا تا ہے "احببته فانا محب ای حببته بحبة قلبی " میں نے اس سے محبت کی کیونکہ میں اس کا محبّ ہوں یعنی میں نے دل کی گہرائی سے اس کے ساتھ محبت کی۔

بندے کی محبت رب تعالیٰ سے:

" ومحبة الله للعبد ارادة اكرامه واستعماله فى الطاعة وصونه عن المعاصى "

یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندے کی محبت کرنے کا مقصد یہ ہے، کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا ارادہ رکھتا ہے، اور اس کی ذات کو راضی کرنے کی مکمل کوشش کرتا ہے، اور یہی اس کا مقصد عظیم ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی محبت بندے سے:

" ومحبة الله للعبد ارادة اكرامه واستعماله فى الطاعة وصونه عن المعاصى "

یعنی بندے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی محبت کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے بندے کو اپنا مکرم بنانے کا ارادہ رکھتا ہے اور بندے کو طاعت کی توفیق عطا فرماتا ہے اس لئے بندہ اس کا مطیع بن جاتا ہے اور بندے کو رب تعالیٰ گناہوں سے بچالیتا ہے۔ (ماخوذ از بیضاوی وشیخ زادہ)

﴿يُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ الله﴾ کا مطلب کیا ہے؟ زیادہ واضح اور صحیح قول تو یہ ہے:

" ﴿يُحِبُّوْنَهُمْ﴾ يعظمونهم ويطيعونهم ﴿كَحُبِّ الله﴾ كتعظيمه "

وہ ان سے جن کو اللہ کے سوا معبود بنائے ہوئے ہیں محبت کرتے ہیں یعنی ان کی تعظیم کرتے ہیں اور ان کی اطاعت کرتے ہیں جیسا کہ اللہ سے محبت کرتے ہیں اور اس کی تعظیم کرتے ہیں۔ (بیضاوی)

﴿يحبونهم كحب الله﴾ اى يسوون بين الاصنام وبين الله تعالىٰ فى المحبة قال ابو اسحق وهذا القول الصحيح "

ابواسحٰق نے کہا ہے کہ صحیح قول یہ ہے کہ اس کا مطلب ہے کہ وہ بتوں اور اللہ تعالیٰ سے محبت میں برابری کرتے ہیں۔ (قرطبی)

﴿ کَحُبِّ اللہ ﴾ فیہ ثلاثۃ اقوال قیل فیہ کحبھم للہ وقیل فیہ کالحب اللازم علیھم للہ وقیل فیہ کحب المؤمنین للہ "

اس میں تین قول ہیں ایک یہ کہ وہ اپنے بنائے ہوئے معبودوں سے ایسی محبت کرتے جیسے اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے یہ ان حضرات کا قول ہے جو یہ کہتے ہیں کہ وہ رب تعالیٰ کو پہچانتے تھے لیکن پھر بھی انہوں نے رب تعالیٰ کے شریک بنائے ہوئے تھے۔ اس کے بعد دو قول اور ذکر کرنے کے بعد علامہ رازی رحمہ اللہ نے اسی قول کے متعلق تحریر فرمایا" والقول الاول اقرب " پہلا قول زیادہ قریب ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے بتوں اور رئیسوں سے اس طرح محبت کرتے جس طرح ان پر اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا لازم تھا اگر چہ وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے نہیں تھے۔

تیسرا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے بتوں اور رئیسوں سے اس طرح محبت کرتے تھے جس طرح مومن اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔ یہ دونوں قول ان حضرات کے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کو نہیں پہچانتے تھے۔ (از کبیر)

مبرد نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے "یحبون اصنامھم علی الباطل کحب المؤمنین للہ علی الحق " وہ اپنے بتوں سے باطل طریقہ سے محبت کرتے تھے جیسے مومنین اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں حق طور پر زجاج نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے:

" ای انھم مع عجز الاصنام یحبونھم کحب المؤمنین للہ مع قدرتہ "

کہ وہ بتوں کے عاجز ہونے کے باوجود ان سے ایسی محبت کرتے جیسی مومنین اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں جو قادر ذات ہے۔ (قرطبی)

تاہم راقم کے نزدیک بھی پہلا قول ہی زیادہ معتبر ہے کہ وہ اپنے بنائے ہوئے معبودوں سے محبت کرتے جیسے اللہ سے محبت کرتے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھتے تھے اس پر اللہ تعالیٰ کا ارشادگرامی بہت واضح ہے:

﴿ وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖۤ اَوْلِیَآءَ مَا نَعْبُدُھُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی ﴾ (زمر ۳)

''اور وہ جنہوں نے اس کے سوا اور والی بنا لئے (کہتے ہیں) ہم تو انہیں صرف اس لئے پوجتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں''۔

بندہ رب تعالیٰ سے محبت کرتا ہے اس میں اختلاف نہیں:

امت کا اس میں اختلاف نہیں کہ یہ کہنا درست ہے کہ بندہ رب تعالیٰ سے محبت کرتا ہے قرآن پاک سے یہ مسئلہ واضح طور پر ثابت ہے یہ آیۃ جس کی وضاحت جاری ہے اس میں سے۔ **وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ** : ایمان والے اللہ سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ اور دوسری آیۃ کریمہ میں ﴿ یحبوھم ویحبونہ ﴾ رب ان سے محبت کرتا ہے اور وہ رب سے محبت کرتے ہیں۔

(از کبیر)

حضرت ابراہیم علیہ السلام رب تعالیٰ کے محبّ ومحبوب:

ابراہیم علیہ السلام کے پاس ملک الموت (عزرائیل) آئے کہ آپ کی روح کو قبض کر لیں تو آپ نے اس فرشتے کو کہا'' ھل رأیت خلیلا یمیت خلیلہ '' کیا تم نے دیکھا ہے کہ کوئی دوست اپنے ہی دوست کو مار دے۔ یعنی میں جب رب تعالیٰ کا خلیل ہوں تو رب تعالیٰ کا تمہیں میرے پاس روح قبض کرنے کے لئے بھیجنا عجیب سا معلوم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی ارشاد فرمایا ﴿ھل رأیت خلیلا یکرہ لقاء خلیلہ ﴾ کیا تم نے دیکھا ہے کہ دوست اپنے دوست سے ملنے کو ناپسند کرے۔ تو آپ نے یہ سنتے ہی ملک الموت کو کہا'' یا ملک الموت الآن فاقبض '' اے ملک الموت اب روح قبض کر لے۔ (از کبیر)

نبی کریم ﷺ کی محبت جنت کا ذریعہ:

'' وجاء اعرابی الی النبی ﷺ فقال یا رسول اللہ متی الساعۃ ؟ فقال ما اعددت لھا ؟ فقال ما اعددت کثیر صلوۃ ولاصیام الا انی احب اللہ ورسولہ فقال علیہ الصلوۃ والسلام المرء مع من احب فقال انس فما رأیت المسلمین فرحوا بشئی بعد الاسلام فرحھم بذلک ''

ایک اعرابی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کرنے لگے'' یا رسول اللہ قیامت

کب آئے گی" آپ نے فرمایا تم نے قیامت کے لئے تیاری کیا کی؟ تو وہ کہنے لگے میں نے بہت (نفلی) نمازیں تو نہیں ادا کیں اور بہت (نفلی) روزے تو نہیں رکھے البتہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرتا ہوں آپ نے فرمایا انسان اسی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرتا ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے مسلمانوں کو اسلام لانے کے بعد کسی چیز پر اتنا خوش ہوتے ہوئے نہیں دیکھا جتنا آپ کے اس ارشاد گرامی پر خوش ہوئے۔

واضح ہوا کہ محبت حبیب خدا قرب الٰہی کا ذریعہ ہے اور جنت میں جانے کا ذریعہ ہے اللہ تعالیٰ محبت مصطفیٰ کریم ﷺ پر ہی قائم رکھے یہی مسلمان کا سرمایہ ہے۔ (از کبیر)

عیسیٰ علیہ السلام کا ارشاد: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تین آدمیوں پر گزر ہوا جن کے بدن کمزور تھے اور ان کے رنگ بدلے ہوئے تھے آپ نے ان سے پوچھا تمہارا حال جو میں دیکھ رہا ہوں اس کی وجہ کیا ہے؟" **فقالوا الخوف من النار** " تو انہوں نے کہا آگ کے خوف سے ہمارا یہ حال ہے۔ "**فقال حق علی اللہ ان یؤمن الخائف** " تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے اپنے ذمہ یہ لگا رکھا ہے کہ وہ خوف کرنے والوں کو امن میں رکھے۔

پھر آپ کا گزر تین اور آدمیوں پر ہوا وہ ان پہلے آدمیوں سے زیادہ کمزور تھے اور ان کے رنگ بدلے ہوئے تھے آپ نے ان سے پوچھا تمہیں اس حال پر کس چیز نے پہنچایا ہے؟ " **قالوا الشوق الی الجنة** " انہوں نے کہا جنت کے شوق نے ہمیں اس حال پر پہنچا دیا ہے " **فقال حق علی اللہ ان یعطیکم ما ترجون** " تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ کرم پر لیا ہوا ہے کہ وہ تمہیں وہ چیز عطا کرے جس کی تم امید کرتے ہو۔

پھر آپ کا تین اور آدمیوں سے گزر ہوا جو پہلے تمام کی بنسبت زیادہ کمزور تھے اور ان کے رنگ بدلے ہوئے تھے اور گویا کہ ان کے چہروں پر نور نظر آ رہا تھا آپ نے ان سے پوچھا تم اس حال پر کیسے پہنچ گئے ہو؟ "**قالوا بحب اللہ** " انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے کی وجہ سے ہم اس حال پر پہنچ گئے ہیں۔

" **فقال علیه الصلوة و السلام انتم المقربون الی اللہ یوم القیامة** "

تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا قیامت کے دن تم اللہ تعالیٰ کے مقرب ہو گے۔

فائدہ: قیامت کے دن امتوں کو ان کے انبیاء کرام کے ناموں سے بلایا جائے گا" یا امة موسی ، یا امة عیسی ، یا امة محمد " اے موسیٰ علیہ السلام کی امت، اے عیسیٰ علیہ السلام کی امت، اے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت۔" غیر المحبین منھم فانھم ینادون یا اولیاء اللہ " جو ان میں سے محبت کرنے والے نہیں ہوں گے بیشک ان کو ندا دی جائے گی اے اللہ کے دوستو۔ (یعنی تمہارے مومن ہونے کی وجہ سے رب تعالیٰ نے تمہارے ساتھ محبت کو نہیں چھوڑا وہ تمہیں اپنا دوست سمجھتا ہے)

" وفی بعض الکتب ،عبدی انا وحقک لک محب فبحقی علیک کن لی محبا "

اور بعض کتب میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے میرے بندے میں نے اپنے ذمہ کرم پر یہ لگایا ہے کہ میں تیرے ساتھ محبت کروں اور تیرا حق یہ ہے کہ تو میرے ساتھ محبت کر۔ (از کبیر)

رب تعالیٰ سے عوام کی محبت:

" فاذا قلنا نحب اللہ فمعناہ نحب طاعة اللہ وخدمته او نحب ثوابه واحسانه "

جب ہم کہتے ہیں ہم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ ہم اس کی طاعت اور خدمت سے محبت کرتے ہیں یا اس کا مطلب یہ ہوگا ہم اس کی طرف سے حاصل ہونے والے ثواب اور احسان سے محبت کرتے ہیں۔

عارفین کی رب تعالیٰ سے محبت:

" واما العارفون فقد قالوا ، العبد قد یحب اللہ تعالیٰ لذاته واما حب خدمته او حب ثوابه فدرجة نازلة "

عارفین حضرات یہ فرماتے ہیں کہ کبھی بندہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک سے بلا کیف محبت کرتا ہے رب تعالیٰ کی خدمت یعنی طاعت سے محبت کرنا اور اس کی طرف سے حاصل ہونے والے ثواب سے محبت کرنا یہ گھٹیا درجہ ہے یعنی درجہ عوام کا ہے اور ذات کبریاء سے محبت کرنا عارفین کا درجہ ہے۔

عارفین کی دلیل:

عارفین حضرات یہ کہتے ہیں کہ ہم دیکھتے کہ لذت ذاتی طور پر محبوب ہے اور کمال بھی ذاتی طور پر محبوب ہے۔

لذت سے ذاتی طور پر محبت کیسے؟

وہ اس طرح ہے کہ جب ہم سے پوچھا جائے تو تم کسب کیوں کرتے ہو؟ تو ہم کہتے ہیں ہم مال حاصل کرنے کے لئے کسب کرتے ہیں اگر پوچھا جائے تم مال کیوں حاصل کرتے ہو؟ تو ہم جواب دیتے ہیں کہ ہم مال اس لئے حاصل کرتے ہیں تا کہ کھانے اور پینے کی چیزیں حاصل کرسکیں پھر اگر ہم سے پوچھا جائے کہ تم کھانے اور پینے کی چیزیں کیوں حاصل کرتے ہو؟ تو ہم کہتے ہیں اس لئے کہ لذت حاصل کریں اور درد کو دور کریں۔

" فاذا قیل لنا ولم تطلبون اللذة وتکرھون الالم ؟ قلنا ھذا غیر معلل "

جب ہم سے یہ کہا جائے کہ تم لذت حاصل کیوں کرتے ہو اور درد کو ناپسند کیوں کرتے ہو؟ تو ہم جواب دیتے ہیں اس کی کوئی اور وجہ نہیں۔ کیونکہ اگر ہر چیز کی علت ہی پیش کی جائے تو دور یا تسلسل لازم آئے گا جو محال ہے اس لئے ضروری ہے کہ مطلوب تک اسباب کا سلسلہ ختم ہو جائے مطلوب کے حصول کی اور کوئی وجہ نہ پائی جائے۔

" واذا ثبت ذلک فنحن نعلم ان اللذة مطلوبة الحصول لذاتھا والالم مطلوب الدفع لذاته "

جب یہ بات ثابت ہوگئی تو اسی سے ہمیں معلوم ہو گیا کہ لذت کا حصول ذاتی طور پر مطلوب ہے اور اسی طرح درد و تکلیف کو مندفع کرنا بھی ذاتی طور پر مطلوب ہے۔

کمال محبوب لذاته کیسے؟

" واما الکمال فلأنا نحب الانبیاء والاولیاء لمجرد کونھم موصوفین بصفات الکمال "

جب ہم انبیاء کرام اور اولیاء کرام سے محبت کرتے ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ کمال سے متصف ہیں یعنی ان کے کمال کو دیکھ کر ان سے محبت کرنا ذاتی طور پر کمال سے ہی محبت ہے۔ جب ہم بعض بہادروں کے واقعات سنتے ہیں اور ان کی شجاعت کے واقعات سنتے ہیں جیسے رستم اور اسفندیار کے تو " مالت قلوبنا الیھم " ہمارے دل ان کی طرف میلان کرتے ہیں یعنی ہمیں ان سے محبت ہو جاتی ہے۔

" حتی انہ قد یبلغ ذلک المیل الی انفاق المال العظیم فی تقریر تعظیمہ وقد ینتھی ذلک الی المخاطرۃ بالروح "

یہاں تک کہ وہ محبت اس درجہ تک پہنچ جاتی ہے کہ ہم اس محبوب کی عظمت کو ثابت کرنے لئے عظیم مال خرچ کرتے ہیں اور کبھی اس محبت کی انتہاء روح کے سرور اور وجدانی کیفیت کی حرکت تک پہنچا دیتی ہے۔

مقام توجہ: " وکون اللذۃ محبوبۃ لذاتھا لا ینافی کون الکمال محبوبا لذاتہ "

لذت کا ذاتی طور پر محبوب ہونا کمال کے ذاتی طور پر محبوب ہونے کے منافی نہیں یعنی ایک چیز کی لذت بھی مطلوب ہو اور وہ چیز بھی مطلوب ہو ایسا ممکن ہے اس میں کوئی منافات نہیں۔

مذکورہ بالا بحث سے نتیجہ حاصل ہوا: جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ سے محبت کو اس کی طاعت کی محبت اور اس سے حاصل ہونے والے ثواب سے تعبیر کیا " فھؤلاء ھم الذین عرفوا ان اللذۃ محبوبۃ لذاتھا ولم یعرفوا ان الکمال محبوب لذاتہ " یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے صرف لذت کو ہی ذاتی طور پر محبوب سمجھا وہ کمال کو ذاتی طور پر محبوب نہ سمجھ سکے۔ یہ لوگ درحقیقت عارفین کے درجہ میں نہیں پہنچے اسی وجہ سے ان کی نظر کوتاہ ہے۔

" اما العارفون الذین قالوا انہ تعالیٰ محبوب فی ذاتہ ولذاتہ فھم الذین انکشف لھم ان الکمال محبوب لذاتہ "

عارفین حضرات نے کہا کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہی کی ذات محبوب ہے اور اس کی محبت میں کوئی واسطہ نہیں بلکہ اس کی محبت ذاتی ہے ان حضرات پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ کمال محبوب لذاتہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اکمل الکاملین ہے اس لئے کہ وہ واجب الوجود ہے اور اپنے سوا ہر کسی سے بے پرواہ ہے اس کو کسی کی محتاجی نہیں۔

" وکمال کل شئی فھو مستفاد منہ وانہ سبحانہ وتعالیٰ اکمل الکاملین فی العلم والقدرۃ "

بلکہ ہر چیز کو کمال اللہ تعالیٰ سے ہی حاصل ہے وہی ذات علم وقدرت میں اکمل الکاملین ہے جب

ہم کسی عالم انسان سے محبت کرتے ہیں تو اس کے علم کے کمال کی وجہ سے اس سے محبت کرتے ہیں۔ اور جب ہم کسی شجاع انسان سے محبت کرتے ہیں تو اس کی شجاعت کے کمال کی وجہ سے اس سے محبت کرتے ہیں اور جب ہم زاہد سے محبت کرتے ہیں تو اس کے غیر مناسب افعال سے بری ہونے کی وجہ سے اس سے محبت کرتے ہیں۔

" فکیف لا نحب اللہ وجمیع العلوم بالنسبة الی علمه کالعدم وجمیع القدرة بالنسبة الی قدرته کالعدم وجمیع ما للخلق من البراءة عن النقائص بالنسبة الی ما للحق من ذلک کالعدم "

تو ہم اللہ تعالیٰ سے کیوں محبت نہ کریں جب کہ اسکے علم کے سامنے تمام مخلوق کے علوم نہ ہونے کے برابر ہیں اور اس کی قدرت کے سامنے تمام مخلوق کی قدرت نہ ہونے کے برابر ہے اور اس کے نقائص سے پاک ہونے کے سامنے تمام مخلوق کا نقائص سے پاک ہونا نہ ہونے کے برابر ہے "فلزم القطع بان المحبوب الحق هو اللہ تعالیٰ " یقینی طور پر واضح ہوا کہ حقیقی محبوب حق تعالیٰ کی ذات پاک ہی ہے اسی کی ذات محبوب ہے اس کی ذات کے محبوب ہونے میں کوئی واسطہ نہیں پایا گیا۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت کا ذریعہ: جب یہ نکتہ بیان ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ سے محبت ہی کمال لذاتہ ہے تو اسی سے یہ واضح ہو جانا چاہیے کہ عام بندے کی رسائی (سوائے انبیاء کرام کے) اللہ تعالیٰ کی ذات اور کمال تک ممکن نہیں جب تک وہ کائنات کو نہ دیکھے کیونکہ تمام کائنات اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور مملوک ہے انسان جب اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں نظر و فکر کرے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور قدرت کے دقائق پر مطلع ہو گا۔

" ولما کان لانهایة لمراتب وقوف العبد علی دقائق حکمة اللہ تعالیٰ فلا جرم لانهایة لمراتب محبة العباد لجلال حضرة اللہ تعالیٰ "

جب اللہ تعالیٰ کی حکمت کے دقائق پر بندے کی معرفت کے مراتب کی کوئی انتہا نہیں تو یقیناً اس کے اوپر مرتب ہونے والی محبت جو بندوں کو اللہ تعالیٰ سے ہے اس کے مراتب کی بھی کوئی حد نہیں۔

محبت کے مراتب کے اسباب: جب یہ واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں اس کی قدرت اور حکمت کے دقائق میں نظر و فکر کرنے سے رب تعالیٰ کی محبت حاصل ہوتی ہے تو اسی سے یہ واضح ہو گیا کہ

بندہ جتنا زیادہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے دقائق کا مطالعہ کرے گا اسی قدر اسے اللہ تعالیٰ کی محبت میں ترقی حاصل ہوگی جتنا یہ مطالعہ اور غور وفکر بڑھتا چلا جائے گا اتنا ہی وہ بندے کے دل پر محبت باری تعالیٰ کے غلبہ کا ذریعہ ہوگا۔

رب تعالیٰ کی محبت بارش کی مثال ہے جس طرح کثیر مقدار موسلا دھار بارش جب برستی ہے تو باوجود اس کے کہ بارش میں لطافت ہے لیکن وہ پتھر میں سوراخ کر دیتی ہے " فاذا غاصت محبة الله فی القلب تکیف القلب بکیفیتها و اشتد الفه بها " جب اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں اثر انداز ہو جاتی ہے تو دل کی کیفیت بدل جاتی ہے اس میں وجدانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور محبت میں شدت آ جاتی ہے۔

محبت کا اعلیٰ معیار:

" وکلما کان الالف اشد کانت النفرة عما سواه اشد لان الالتفات الی ما عداه یشغله عن الالتفات الیه والمانع عن حضور المحبوب مکروه فلا تزال تتعاقب محبة الله ونفرته عما سواه علی القلب "

جب رب تعالیٰ سے محبت زیادہ ہوتی چلی جائے گی تو اس کے ماسوا سے اسی طرح نفرت شدید ہوتی چلی جائے گی کیونکہ وہ رب تعالیٰ کی ذات کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتے۔ یہ یقینی بات جو چیز محبوب سے روکے وہ مکروہ نظر آتی ہے لہٰذا محبت تعاقب کرتی رہتی ہے جو ماسوا سے دل میں نفرت پیدا کر دیتی ہے۔ نفرت اسے ماسوا سے دور کر دیتی ہے وہ رب تعالیٰ کے ماسوا کو درجہ فنا میں سمجھتا ہے:

" فیصیر ذلک القلب مستنیرا بانوار القدس مستضیاً باضواء عالم العصمة فانیا عن الحظوظ المتعلقة بعالم الحدوث وهذا المقام اعلی الدرجات "

تو اس کا دل انوار قدس سے روشن ہو جاتا ہے جو چیزیں رب تعالیٰ سے دور ہونے سے اسے بچاتی ہیں ان کی روشنی سے وہ روشنی حاصل کرتا ہے اور جو چیزیں اسے رب تعالیٰ سے دور کر کے اس عالم حادث (فانی دنیا) کی طرف لگاتی ہیں وہ ان سے مکمل طور پر درجہ فنا میں سمجھتا ہے یہی محبت کا اعلیٰ معیار ہے۔

غلط فہمی کا ازالہ: غیر اللہ سے مدد نہ مانگو کی رٹ لگانے والے علامہ رازی رحمہ اللہ کی اس عبارت کو تو پیش کر دیتے ہیں کہ انبیاء کرام اور اولیاء کرام تمام کو فانی سمجھ کر رب تعالیٰ سے محبت کرو اگر ایسا نہیں کرو گے تو تمہیں اللہ تعالیٰ کی کامل محبت حاصل نہیں ہوگی۔ لیکن حقیقت بات یہ ہے کہ وہ علم سے دور ہیں عبارات کی اصل روح کو سمجھنے سے غافل ہیں کاش کہ وہ علامہ رازی رحمہ اللہ کی ان عبارات " **لان الالتفات الی ما عداہ یشغلہ عن الالتفات الیہ** " ماسوا کی طرف توجہ کرنے سے رب تعالیٰ سے توجہ ہٹ جائے۔

" **والمانع عن حضور المحبوب مکروہ** " جو چیز محبوب کے ذکر سے روکے وہ مکروہ ہے " **مستضیاء باضواء عالم العصمة** " جو چیزیں اللہ تعالیٰ سے دور ہونے سے بچائیں ان سے وہ اپنے آپ کو روشن کریں۔ " **فانیا عن الحظوظ المتعلقة بعالم الحدوث** " وہ چیز جو انسان کو فانی دنیا کی طرف لگا دیں ان کو دور پھینک دے۔ (از کبیر) کو محبت سے پڑھیں نفرت سے نہ پڑھیں علم سے پڑھیں، جہالت سے نہ پڑھیں۔ غور سے پڑھیں بغیر سوچنے کے نہ پڑھیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے میرے علم سے پڑھیں۔ تو ان کو یہ بات سمجھ آ جائے کہ جو چیزیں اللہ تعالیٰ سے دور کریں ان سے وہ بھی دور رہے اور جو چیزیں اللہ تعالیٰ کے قریب کریں ان کے یہ بھی قریب رہے۔

گناہ، معاصی اللہ تعالیٰ سے دور کرتے ہیں ان سے دور رہے انبیاء کرام کی محبت اور اولیاء کرام کی محبت کو رب تعالیٰ کی محبت کا ذریعہ سمجھے اور یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا ہی دراصل مقصود ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے محبوب اس کی محبت کا ذریعہ ہیں اس لئے ان سے محبت کرنا دراصل رب تعالیٰ سے ہی محبت ہے۔ جس طرح نماز کے صحیح ادا کرنے میں اس کے لئے شرائط ہیں طہارت اور نیت وغیرہ ان کا نماز کے ساتھ پایا جانا ضروری ہے وہ نماز سے جدا نہیں۔ (راقم)

شوق الی اللہ کا مطلب: شوق اس وقت تک متصور نہیں ہوتا جب تک اس چیز کا کچھ ادراک (علم) پایا جائے اور کچھ نہ پایا جائے " **فاما الذی لم یدرک اصلا فلا یشتاق الیہ** " جب کسی چیز کا ذرا بھی ادراک نہ پایا جائے انسان اس کا مشتاق نہیں ہوتا اسلئے کہ جب کسی کو دیکھا ہی نہ ہو اور کسی چیز کے اوصاف کا ہی پتہ نہ ہو تو اس کے مشتاق ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ "**ولو ادرک**

كماله لا يشتاق اليه "اور اگر ایک چیز کی ذات کو کامل طور پالیا گیا تو اسکا اشتیاق بھی باقی نہیں رہتا۔

محبوب کے اشتیاق کی دو وجہ: ایک ان میں سے یہ ہے کہ محبوب کو دیکھا لیکن محبوب غائب ہو گیا تو محب کو خیالات آتے ہی رہیں گے اس کا اشتیاق بڑھتا ہی چلا جائے گا کہ وہ مجھ سے دور کیوں ہو گیا۔ اس کے غائب ہونے کی کیا وجہ ہے کاش کہ وہ پھر نظر آئے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ محبوب کے چہرہ کی ایک جھلک نظر آئی لیکن اس کے گیسو نہیں دیکھے اس کی آنکھوں کا مشاہدہ نہیں کیا اس کے دیگر محاسن نہیں دیکھے تو یہ مشتاق ہوتا ہے کہ میں اسے کامل طور پر دیکھ لوں اس کے تمام محاسن نظر آ جائیں۔

بندے کا رب تعالیٰ کا مشتاق ہونا: دونوں وجہ جو بیان کی گئی ہیں انکے لحاظ سے بندہ رب تعالیٰ کا مشتاق ہوتا ہے اگر چہ اسکی کیفیت وہ نہیں جو بندہ کسی بندے کا مشتاق ہو تو اس کی کیفیات جو بیان کی گئی ہیں۔ رب تعالیٰ کے اشتیاق کی ایک وجہ یوں بیان کی جاتی ہے۔ عارفین پر اگر چہ امور الھیہ بہت زیادہ واضح ہوتے ہیں لیکن پھر بھی وہ اور خیالات سے مکمل طور پر پاک نہیں ہوتے ہیں خیالات کا اس جہان میں پایا جانا ضروری ہے حکایات اور تمثیلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسلئے رب تعالیٰ کی تجلیات آخرت میں ہی حاصل ہونی ہے لہٰذا ان تجلیات کے حاصل ہونے کا اشتیاق ہر عارف کو رہتا ہے۔

دوسری وجہ اللہ تعالیٰ کے اشتیاق کی یہ ہے کہ امور الھیہ کی کوئی انتہا نہیں بندے پر بعض امور منکشف ہوتے ہیں اور باقی امور پوشیدہ رہتے ہیں جن کی کوئی انتہا نہیں۔ جب عارف کو جن امور کا ادراک حاصل ہوتا ہے وہ کم ہیں اور جن کا ادراک حاصل نہیں ہوتا وہ زیادہ ہیں۔" **فانه لا يزال يكون مشتاقا الى معرفتها** " بیشک وہ ہمیشہ ان کی معرفت کا مشتاق رہتا ہے۔

تنبیه: پہلی قسم کا اشتیاق دار آخرت میں ختم ہو جائے گا کیونکہ اس میں طلب اللہ تعالیٰ کو دیکھنے اور ملاقات کرنے اور مشاہدہ کرنے کی پائی گئی ہے وہ آخرت میں حاصل ہو جائے گی تو لازمی طور پر اشتیاق بھی باقی نہیں رہے گا۔

دوسری وجہ کا اشتیاق ختم نہیں ہو گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے افعال کی حکمت کی کوئی انتہا نہیں اسی وجہ سے ان کے اشتیاق کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

مومنوں کو رب تعالیٰ سے محبت کیسے؟ متکلمین حضرات بیان فرماتے ہیں کہ مومنوں کو رب تعالیٰ سے محبت دو وجہ سے ہے۔ ایک یہ ہے کہ مومنین کی محبت کی دار و مدار اس بات پر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم کرتے ہیں اور اس کی مدح اور ثناء بیان کرتے ہیں اور عبادت صرف اسی ذات کی کرتے ہیں جو شرک سے پاک ہوتی ہے اور غیر مناسب اعتقادات سے وہ پاک ہوتے ہیں۔ لیکن مومنوں کے بغیر کفار اور مشرکین، یہود اور نصاری اور ہنود رب تعالیٰ سے اس طرح کی محبت نہیں کرتے۔

دوسری وجہ مومنین کی رب تعالیٰ سے محبت کی یہ ہے کہ اس کے ساتھ امید اور ثواب ملے ہوئے ہوں اور اس کے عظیم مرتبہ کی رغبت پائی جائے اور عذاب کا خوف پایا جائے اور عذاب سے خلاصی کی راہ تلاش کی جائے۔

" ومن یعبد اللہ ویعظمہ علی ھذا الحد تکون محبتہ للہ اشد "

اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہو اور اس کی تعظیم اس حد تک کرتا ہو جو ہم نے بیان کی تو اسے اللہ تعالیٰ سے بہت محبت حاصل ہے۔ عارفین حضرات کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی محبت کا سبب اس کی معرفت ہے وہ اللہ تعالیٰ کو بقدر طاقت بشریہ کے پہچانیں۔ کیونکہ معرفت کو محبت لازم ہے جیسے جیسے معرفت بڑھتی چلی جائے گی ایسے ہی ان کی محبت بھی بڑھتی چلی جائے گی۔

مومنین کی رب تعالیٰ سے محبت زیادہ کیسے؟

بظاہر ایک وہم پیدا ہوتا ہے کہ مومنوں کو اللہ تعالیٰ سے محبت زیادہ کیسے ہے:

"مع انا نری الھنود یاتون بطاعات شاقۃ لا یأتی بشئی منھا احد من المسلمین ولا یاتون بھا الا للہ تعالیٰ ثم یقتلون انفسھم حبا للہ تعالیٰ"

حالانکہ ہندو لوگ بھی مشقت آمیز عبادت وطاعت بجالاتے ہیں مسلمان اس طرح مشقت نہیں برداشت کرتے ان کی طاعات بھی اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہوتی ہیں پھر وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی محبت میں قتل بھی کر دیتے ہیں۔

پہلا جواب: بیشک مومنین اپنے عجز اور خشوع وخضوع میں صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء طلب کرتے ہیں بخلاف مشرکین کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں جب انہیں کوئی حاجت در پیش آتی ہے

جب ان کی حاجت زائل ہو جاتی ہے تو وہ اپنے معبودان باطلہ کی طرف رجوع کر لیتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ارشادفرمایا:

﴿ فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴾ (عنکبوت ۶۵)

پھر جب کشتی میں سوار ہوتے ہیں اللہ کو پکارتے ہیں خالص کرتے ہیں اسی کے لئے دین پھر جب وہ نجات دیتا ہے ان کو خشکی کی طرف جبھی شرک کرنے لگتے ہیں۔

" والمومن لا يعرض عن الله في الضراء والسراء والشدة والرخاء والكافر قد يعرض عن ربه فكان حب المؤمن اقوى "

اور مومن اللہ تعالیٰ سے اعراض نہیں کرتا خواہ تنگی ہو یا خوشی ہو خواہ مشکل ہو یا آسانی ہو لیکن کافر کبھی اللہ تعالیٰ سے اعراض بھی کر لیتا ہے اسی وجہ سے مؤمن کی اللہ تعالیٰ سے محبت قوی اور کثیر ہے۔

دوسرا جواب: جو شخص اللہ تعالیٰ کے غیر کسی چیز کی قضاء پر راضی ہو گیا تو اس نے اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں غیر کو شریک کر لیا حالانکہ اس کی ملکیت میں کسی کو تصرف کا کوئی حق حاصل نہیں۔

" فاولئک الجهال قتلوا انفسهم بغير اذنه اما المؤمنون قد يقتلون انفسهم باذنه وذلک في الجهاد "

یہ جاہل لوگ اپنے اپ کو قتل کرتے ہیں لیکن ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حکم نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی اجازت نہیں ہوتی، اپنے آپ کو آگ لگا دینا، بھوک سے اپنے آپ کو مار دینا رب تعالیٰ کو ناراض کرنا ہے نہ کہ راضی کرنا، یہ اللہ تعالیٰ کی محبت نہیں بلکہ اس کے احکام سے عدولی کر کے اس سے بغاوت ہے۔ لیکن مؤمنین اپنی جانوں کو اللہ تعالیٰ کی اجازت سے قربان کرتے ہیں یعنی جہاد میں اپنی جانیں قربان کرتے ہیں کیونکہ کافروں سے جہاد کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے لہذا اس میں اس کی رضاء پائی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کو اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ محبت ہے اور اتنی محبت کفار کو کبھی نہیں ہو سکتی۔

تیسرا جواب: کافر کو جب شدید عذاب میں مبتلا کیا جائے گا تو اسے رب تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں

رہے گی جو اس نے کام کیے تھے وہ باطل ہو جائیں گے۔لیکن مومن کے اعمال ضائع نہیں ہوں گے اسے اپنے نیک اعمال کی جزاء حاصل ہوگی مومن اگر گناہوں کی وجہ سے زیر عتاب آبھی گئے تو وہ رب تعالیٰ کو نہیں بھولیں گے انہیں رب تعالیٰ کی معرفت حاصل رہے گی یہی وجہ ہے کہ مومن کو اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ محبت حاصل ہے۔

چوتھا جواب: " قال ابن عباس ان المشرکین کانوا یعبدون صنما فاذا رأو اشیاء احسن منه ترکوا ذلک واقبلوا علی عبادة الاحسن "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ بیشک مشرکین ایک بت کی عبادت کرتے جب اس سے اور کوئی خوبصورت بت مل گیا تو پہلے خدا کو پھینک دیتے تو نئے خوبصورت معبود کی عبادت شروع کر دیتے۔

کیا ہی گھٹیا معیار تھا ان کی عبادت کا، لیکن بفضلہ تعالیٰ مومن کی عبادت کا معیار بہت بلند وبالا ہے وہ صرف رب تعالیٰ کی ہی محبت کرتا ہے اسی لئے اس کی عبادت کرتا ہے باقی تمام محبوبان خدا سے مومنین کی محبت درحقیقت محبت خدا کا ذریعہ ہے اس لئے مؤمن کسی نبی کو کسی ولی کو معبود نہیں مانتا۔

پانچواں جواب: مومنین صرف ایک رب تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں اسے " وحده لا شریک له " مانتے ہیں لیکن کافر کئی کئی بتوں کی عبادت کرتے ہیں لہٰذا اگر وہ کسی ایک بڑے بت کو اپنا معیاری خدا بھی مانے تو پھر اس کے ساتھ اور بتوں کو شریک کرنے کی وجہ سے اس ایک سے ان کی محبت میں کمی واقع ہوتی ہے۔ " اما الا له الواحد فتنضم محبة الجميع اليه "لیکن مومنین کا فقط ایک ہی معبود ہے اس لئے مومنوں کی تمام محبتیں اسی ایک کے ساتھ آکر مل جاتی ہیں۔ (از کبیر)

یہ الفاظ ذرا غور وفکر سے ایمان اور محبت سے پڑھیں تو خود بخود سمجھ آئے گا کہ مومنوں کی محبت اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی اور سے معبود سمجھ کر نہیں اور نہ ہی خالق سمجھ کر اللہ تعالیٰ کی مخلوق سمجھ کر اور اس کے برگزیدہ بندے سمجھ کر جب ان سے محبت ہوئی تو وہ تمام محبوبان خدا سے محبت درحقیقت خدا سے ہی محبت ہے کاش کہ اللہ بے سمجھوں کو سمجھ عطا کر دے حق و باطل میں تمیز کر سکیں۔ (راقم)

کافروں کا اپنے معبودوں سے دلچسپ سلوک:

" ویعبدون الصنم زمانا ثم یرفضونه الی غیره وربما اکلوه کما یحکی ، ان باهلة کانت لهم اصنام من حیس فجاعوا فی قحط اصابهم فاکلوها "

کافر اپنے بتوں کی عبادت کرتے رہتے تھے لیکن پھر ان کو چھوڑ کر نئے بت تراش لیتے تھے گویا یوں سمجھیں کہ ان کے خدا پرانے ہو جاتے تھے پھر نئے بنا لیتے تھے۔ وہ اپنے خداؤں کو کبھی کھا لیتے تھے بنی باہلہ (ایک قبیلہ کا نام ہے) نے اپنے بت حیس (کھجور، کھویا اور میدہ سے بنے ہوئے حلوے) سے بنا رکھے تھے جب وہ قحط سالی میں بھوکے ہوئے تو انہوں نے اپنے معبودوں کو کھالیا "ان باهلة کانت لهم اصنام من حیس فجاعوا فی قحط اصابهم فاکلوها " (روح المعانی)

محبت کی زیادتی ثبات سے حاصل ہوتی ہے:

" لیس المراد الزیادة فی اصل الفعل بل الرسوخ والثبات وهو ملاک الامر ولهذا نزل (فاستقم کما امرت) وکان احب الاعمال الیه ﷺ ادومها "

زیادتی سے مراد اصل فعل میں زیادتی نہیں بلکہ عمل میں راسخ ہونا اور ثابت قدم رہنا یہی تمام امور کا بادشاہ ہے اسی لئے رب تعالیٰ نے فرمایا ثابت رہو جیسا تمہیں حکم دیا گیا۔ نبی کریم ﷺ کو کسی عمل پر ہمیشہ عمل کرنا پسند تھا۔ (خواہ وہ عمل قلیل ہی کیوں نہ ہو)۔ یہی وجہ ہے کہ رب تعالیٰ نے ﴿ اَشَدُّ حُبًّا ﴾ کہا ہے " احب " نہیں فرمایا تا کہ کسی کو وہم نہ ہو کہ کبھی کافر مقدار کے لحاظ پر طاعت زیادہ کر لیتے ہیں تو مؤمنین کی محبت رب تعالیٰ سے زیادہ کیسے۔

جب یہ واضح ہو گیا کہ مؤمنین کی طاعت اور عبادت کرنے میں ہمیشگی پائی گئی ہے تو اسی سے پتہ چل گیا کہ مؤمنین کی محبت بوجہ ثبات اور قرار کے "اشد" ہے کافروں کی محبت بوجہ زوال کے "غیر اشد" ہے۔

(ماخوذ از روح المعانی)

ولو یری الذین ظلموا اذ یرون العذاب ان القوۃ للّٰہ جمیعا :

اور اگر معلوم کرلیں ظالم اس وقت کو جب دیکھیں گے عذاب بیشک قوت اللہ کے لئے ہی ہے سب۔

راقم نے محذوف الفاظ کے بغیر لفظی ترجمہ کیا ہے جس سے مطلب اتنا واضح نہیں جتنا کہ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے واضح ہے۔ (اور کیسی ہو اگر دیکھیں ظالم وہ وقت جب عذاب ان کے سامنے آئے گا اس لئے کہ سارا زور خدا کو ہے)۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ﴿ وَلَوْ يَرَى ﴾ کا معنی " لو یعلم " کیا ہے (اگر ان کو علم حاصل ہو جائے) اب مطلب یہ ہوگا اور اگر ظالموں کو ابھی سے معلوم ہو جائے کہ ان کے لئے عذاب تیار کیا گیا ہے جو عذاب وہ قیامت کو دیکھیں گے تو ان کو ابھی سے یہ بھی پتہ چل جائے کہ بیشک تمام قوت اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ بلکہ دوسرا معنی اس سے زیادہ واضح ہے

﴿ وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا ﴾ اندادھم لا ینفع لعلموا ﴿ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيعًا ﴾ لا ینفع ولا یضر غیرہ "

اگر ظالموں کو ابھی پتہ چل جائے کہ ان کے معبودان باطلہ انہیں نفع نہیں دے سکتے جو علم ان کو قیامت کے دن عذاب دیکھ کر ہوگا تو ان کو ابھی سے یہ بھی پتہ چل جائے کہ بیشک قوت تمام اللہ تعالیٰ کو ہی حاصل ہے اس کے بغیر دوسرے معبودان باطلہ نفع ونقصان نہیں پہنچا سکتے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

وَاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ : اور بیشک اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے۔ اس میں قوی احتمال تو یہ ہے کہ اس میں استیناف (نیا کلام) پایا گیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو عذاب سے ڈراتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا "کہ بیشک اللہ تعالیٰ کا عذاب سخت ہے"۔ اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ان کے قول کے ساتھ ہی متعلق ہو۔ کہ انہیں علم حاصل ہو جائے کہ بیشک قوت تمام رب تعالیٰ کو حاصل ہے اور وہ یہ کہیں کہ بیشک اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے۔ (از رح المعانی)

☆☆☆☆☆

﴿ اِذْ تَبَرَّأَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ﴾

۱) ''جب بیزار ہوں گے پیشوا اپنے پیروں سے اور دیکھیں گے عذاب اور کٹ جائیں گی ان سب کی ڈوریں''

۲) جب بے زار ہوں گے وہ جن کی تابعداری کی گئی ان سے جنہوں نے تابعداری کی جب دیکھیں گے عذاب اور منقطع ہو جائیں گے (کٹ جائیں گے) ان کے اسباب (تعلقات)''

مختصر مطلب: یعنی قیامت کے دن جب مشرکین کے قائد اپنے آپ سے عذاب کو دور نہیں کر سکیں گے تو اپنے متبعین سے وہ بے زار ہو جائیں گے اور ان کے تعلقات ختم ہو جائیں گے خواہ وہ ان کے تعلقات رشتہ داری کے تھے یا دوستی کے تھے اسی طرح ان کے معاہدے بھی ختم ہو جائیں کوئی ایک دوسرے کی امداد نہیں کر سکے گا ہر ایک کو اپنی فکر ہوگی۔ (ماخوذ از خازن)

قدرے تفصیل: جب پہلے ذکر کیا گیا کہ کفار نے رب تعالیٰ کی مثل اس کے شریک بنا لئے اس کے بعد ان سے بطور تہدید (دھمکی آمیز) کلام کی ﴿ اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ ﴾۔ اب مزید وعید کی گئی (ان کو ڈرایا گیا) اور کہا گیا ﴿اِذْ تَبَرَّأَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا ﴾۔

آیۃ کریمہ کا مطلب یہ ہے: " ان الذین افنوا عمرهم فی عبادتهم و اعتقدوا انهم من اوکد اسباب نجاتهم فانهم یتبرؤن منهم عند احتیاجهم الیهم "

بیشک وہ لوگ جنہوں نے معبودان باطلہ کی عبادت میں عمریں گزار دیں اور یہ عقیدہ رکھا کہ بیشک یہ ان کی نجات کے اسباب ہیں قیامت کے دن جب ان کو شدید محتاجی ہو گی اس وقت ان کے معبودان سے بیزار ہو جائیں گے۔

اسی کی اور مثالیں قرآن پاک سے:

﴿ وقال انما اتخذتم من دون الله اوثانا مودة بینکم فی الحیوة الدنیا ثم یوم القیامة یکفر

بعضکم ببعض ویلعن بعضکم بعضا ومأ واکم النار ومالکم من نصرین ﴾ (عنکبوت ۲۵)
اور ابراہیم نے فرمایا تم نے اللہ کے سوا یہ بت بنا لئے ہیں جن سے تمہاری دوستی یہی دنیا کی زندگی تک ہے پھر قیامت کے دن تم میں ایک دوسرے کے ساتھ کفر کرے گا اور ایک دوسرے پر لعنت ڈالے گا اور تم سب کا ٹھکانا جہنم ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں''۔

﴿ اَلْاَخِلَّاءُ یَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ ﴾ (الزخرف : ۶۷)

''گہرے دوست اس دن (قیامت کے دن) ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے مگر پرہیزگار''

یعنی نیک لوگوں کی دوستی قیامت کے دن بھی کام آئے گی اور کافر دنیا میں ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں لیکن قیامت کے دن ایک دوسرے سے بےزار ہوں گے اور ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے۔

﴿ کُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ﴾ (الاعراف : ۳۸)

''جب ایک گروہ داخل ہوتا ہے دوسرے پر لعنت کرتا ہے''

﴿ اِنِّیْ کَفَرْتُ بِمَا اَشْرَکْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ﴾ (ابراہیم۲۲)

''وہ جو پہلے تم نے مجھے شریک ٹھہرایا تھا میں اس سے سخت بےزار ہوں''

(از کبیر)

متبوعین کی تابعین سے بےزاری کیوں؟ جن لوگوں کی تابعداری کی گئی وہ تابعداری کرنے والوں سے اس لئے بےزار ہوں گے کہ جب وہ عذاب دیکھیں گے تو عذاب سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کوئی چارہ ان کو نظر نہیں آئے گا۔ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴾ کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ جب وہ عذاب کو دیکھ کر اپنے آپ کو اور اپنے متبعین (تابعداری کرنے والے) کو چھڑانے سے عاجز آجائیں گے اور کلی طور پر ناامید ہو جائیں گے اور سمجھ جائیں گے کہ آج وہ اپنے آپ کو اور اپنے متبعین کو بچا نہیں سکتے ان کے بچاؤ کے اسباب سب ختم ہو جائیں گے۔ (از کبیر)

متبوعین سے مراد کون؟ اس میں مختلف اقوال ہیں جو تمام ہی معتبر ہیں۔

(۱) '' انهم السادة والرؤساء من مشرکی الانس '' مشرکین جن لوگوں کی تابعداری کرتے تھے وہ بھی مشرک لوگ ہی تھے جو ان کے سردار اور رئیس تھے جن کا کام حرام کو حلال کرنا اور حلال کو حرام کرنا تھا۔

(۲) مشرکین شیاطین جنوں کی تابعداری کرتے تھے اور وہ ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالتے تھے۔

(۳) " انهم شیاطین الجن والانس " مشرکین شیطان جنوں اور شیطان انسانوں کی تابعداری کرتے تھے جو ان کو گمراہ کرتے تھے کبھی شرک کی راہ چلاتے تھے یعنی بت پرستی کراتے اور کبھی حلال کو حرام کر کے اور کبھی حرام کو حلال کر کے ان کو کافر بناتے۔

(۴) " الاوثان الذین کانوا یسمونها بالآلهة " مشرکین کے متبوعین یعنی جن کی یہ تابعداری کرتے تھے وہ ان کے بت تھے جن کی وجہ سے یہ لوگ راہ راست سے بھٹکے ہوئے تھے۔

راقم کے نزدیک تو تمام اقوال اجتماعی طور پر معتبر ہیں تاہم علامہ رازی رحمہ اللہ نے پہلے قول کو ترجیح دی کہ ان کے انسانوں میں سے رئیس اور سردار ہی معتبر ہیں زیادہ صحیح قول یہ ہے کیونکہ ان سے امر اور نہی ممکن ہے جن امور اور نواہی پر چل کر یہ گمراہ ہوتے۔ اسی قول کی ترجیح ایک اور آیۃ کریمہ سے سمجھ آتی ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿ اِنَّا اَطَعۡنَا سَادَتَنَا وَکُبَرَاءَ نَا فَاَضَلُّوۡنَا السَّبِیۡلَا ﴾ (الاحزاب)

"بیشک ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی اطاعت کی انہوں نے ہی ہمیں سیدھی راہ سے بھٹکا دیا"

(از کبیر)

متبوعین اپنے متبعین سے کیسے بے زار ہوں گے: ان کی بے زاری چند طرح ہوگی۔

(۱) " احدها ان یقع منهم ذلک القول " بے زاری کا ایک طریقہ تو یہ ہوگا کہ وہ ظاہر طور پر اپنے متبعین سے کہہ دیں گے کہ آج ہم تم سے بے زار ہیں ہماری امداد کی کوئی توقع نہ رکھو۔

(۲) " وثانیها ان یکون نزول العذاب بهم وعجزهم عن دفعهم عن انفسهم فکیف عن غیرهم فتبرؤا "

اور دوسری وجہ یہ ہوگی کہ ان پر جب عذاب نازل ہوگا وہ اپنے آپ سے عذاب کو دور کرنے سے عاجز ہوں گے تو غیروں سے عذاب کو کیسے دور کر سکیں گے یہی ان کا عجز ہی ان سے بے زاری ہوگی۔

(۳) " وثالثها انه ظهر فیهم الندم علی ما کان منهم من الکفر بالله والاعراض عن انبیائه ورسله فسمی ذلک الندم تبرؤا "

اور تیسرا طریقہ انکی بے زاری کا یہ ہوگا کہ وہ جو دنیا میں اللہ تعالیٰ سے کفر کرتے رہے اور انبیاء کرام

اور اللہ تعالیٰ کے رسولوں سے اعراض کرتے رہے قیامت کے دن وہ اس پر نادم ہوں گے ان کی اس ندامت کو ہی بے زاری سے تعبیر کیا گیا کیونکہ جب وہ خود نادم ہوں گے تو اوروں کی کیا امداد کریں گے۔

(ماخوذ از کبیر)

وَرَأَوُا الْعَذَابَ : ''جب دیکھیں گے عذاب'' " الواو للحال ای یتبرؤن فی حال رؤیتھم العذاب "اس مقام پر ''واؤ'' حال کے لئے ہے یعنی وہ بے زار ہوں گے اس حال میں کہ جب وہ عذاب دیکھیں گے۔

راقم نے اسی لئے واؤ کا معنی " جب " کیا ہے۔ تاہم اس میں اور اقوال بھی ہیں اسی لئے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ''واؤ عطف'' کا معنی کیا ہے (اور)۔

" وھذا اولی من سائر الاقوال لان فی تلک الحالة یزداد الھول والخوف "

اور یہ حال والا قول تمام اقوال سے زیادہ بہتر ہے اسلئے کہ اس حالت میں ڈر اور خوف زیادہ ہوتا ہے

(از کبیر)

وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ : ''اور ان سے اسباب کو منقطع کردیا جائے گا''۔ ''سبب'' کا لغوی معنی ہے ''رسی'' جس کے ذریعے نیچے سے اوپر چڑھے یا اوپر سے نیچے آئے پھر ہر وہ چیز جو کسی جگہ تک پہنچائے یا کسی حاجت تک پہنچائے اسے سبب کہا جاتا ہے۔ محبت اور قرابت داری کو بھی سبب کہا جاتا ہے کہ یہ ایک دوسرے کے درمیان تعلق کا ذریعہ ہے اسی لئے کہا جاتا ہے " ما بینی وبینک سبب " میرے اور تمہارے درمیان کوئی محبت اور قرابت نہیں۔

راستے کو بھی سبب کہا جاتا ہے کہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچاتا ہے " فاتبع سببا " اسے نے راستہ اختیار کیا۔ آسمان کے دروازوں کو بھی ان میں داخل ہو کر آسمانوں تک پہنچانے کا ذریعہ ہیں ﴿اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ﴾ میں اسباب کا معنی دروازے ہیں۔

آیۃ کریمہ میں اسباب سے مراد: اس میں بھی چند وجوہ ہیں جو تمام ہی یہاں مراد ہیں۔

(۱) " الاول انھا المواصلات التی کانوا یتواصلون علیھا " پہلا قول یہ ہے کہ آیۃ کریمہ میں اسباب سے مراد وہ اسباب اور ذرائع ہیں جن کے واسطہ سے متبوعین اور تبعین ایک دوسرے سے تعلق قائم کئے ہوئے ہیں۔

(۲) " والثانی الارحام التی کانوا یتعاطفون بھا " اسباب سے مراد دوسرا قول یہ ہے کہ " قرابت داری مراد ہے جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے پر مہربانی کرتے تھے لیکن قیامت کے دن ان کے درمیان رشتہ داری کا تعلق ختم ہو جائے گا کوئی ایک دوسرے کا حال پوچھنے والا نہیں ہوگا۔

(۳) " الاعمال التی کانوا یلزمونھا " ان کے وہ اعمال جن کو وہ لازم پکڑے ہوئے تھے قیامت کے دن وہ ختم ہو جائیں گے اس لئے ان کے اعمال بھی ان کو قیامت کے دن کوئی نفع نہیں پہنچا سکیں گے۔

(۴) " والرابع العھود والحلف التی کانت بینھم یتوادون علیھا " چوتھا قول یہ ہے کہ ان کے وعدے اور قسمیں جو انہوں نے دوسروں لوگوں سے ملنے کے لئے اٹھا رکھی تھیں وہ ختم ہو جائیں گی۔

(۵) " والخامس ما کانوا یتوا اصلون بہ من الکفر " پانچواں قول اس میں یہ ہے کہ یہاں اسباب سے مراد وہ ذرائع ہیں جن کے ذریعے وہ کفر تک پہنچتے تھے قیامت کے دن وہ سبب ختم ہو جائیں گے۔

(۶) " السادس المنازل التی کانت لھم فی الدنیا " چھٹا قول یہ ہے کہ اسباب سے مراد اس آیۃ کریمہ میں ان کے وہ مراتب ہیں جو انہیں دنیا میں حاصل تھے یعنی قیامت کے دن ان کی سرداری ختم ہو جائے گی اسی وجہ سے وہ اپنے متبعین کی امداد نہ کر سکنے کی وجہ سے بے زار ہو جائیں گے۔

(۷) " السابع اسباب النجاۃ قتطعت عنھم " ساتواں قول یہ ہے کہ اسباب نجات ان سے منقطع ہو جائیں گے۔

(۸) آٹھواں قول ہی وہ قول ہے جو زیادہ معتبر ہے جس میں پہلے سات قول سمٹ کر آ جاتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہاں اسباب سے مراد کل ہیں کیونکہ منقطع ہو جانے کا معنیٰ " نہ رہنا ہے " یہ نفی ہے جو عموم کو چاہتی ہے اس لئے مطلب یہ ہوگا۔ " زال عنھم کل سبب یمکن ان یتعلق بہ " ان سے ہر سبب زائل ہو جائے گا جس سے بھی تعلق ممکن ہو سکتا ہو۔ ان کو مراتب اور اسباب اور نسب اور قسمیں اور آپس میں باندھے ہوئے عقد اور معاہدے کام نہیں آئیں گے۔ ان کو انتہائی ناامیدی ہوگی۔ (از کبیر)

وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ وَمَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنَ النَّارِ

۱) ''اور کہیں گے پیروکار ہمیں لوٹ کر جانا ہوتا (دنیا میں) تو ہم ان سے توڑ دیتے جیسے انہوں نے ہم سے توڑی یونہی اللہ انہیں دکھائے گا ان کے کام ان پر حسرتیں ہو کر اور وہ دوزخ سے نکلنے والے نہیں''۔

۲) ''اور کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے تابعداری کی کاش کہ ہمیں لوٹ کر جانا ہوتا (دنیا میں) تو ہم بیزار ہو جاتے ان سے جیسا کہ وہ بیزار ہوئے ہم سے اسی طرح دکھائے گا ان کو اللہ ان کے اعمال جو حسرتیں ہوں گی ان پر اور نہیں وہ نکلنے والے آگ سے''۔

مختصر مطلب: جن لوگوں نے اپنے رئیسوں، سرداروں، بتوں اور شیاطین کی تابعداری کی جب ان سے قیامت کے دن وہ بے زار ہوں گے جن کی انہوں نے تابعداری کی ہوگی تو یہ حسرت بھری تمنا کر رہے ہوں گے کاش کہ ہمیں بھی دنیا میں لوٹنا نصیب ہو جانے اور ہمارے ساتھ ہی یہ ہمارے متبوعین بھی دنیا میں چلے جائیں تو ہم بھی ان سے ایسے ہی بے زار ہو جائیں جیسے یہ ہم سے بے زار ہو گئے۔ اسی طرح اللہ تعالٰی ان کو دکھائے گا ان کے اعمال جو ان پر حسرت ہوں گے اور وہ آگ میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے رہیں گے جس سے ان کو نکلنا نہیں ہوگا۔

قدرے تفصیل:

وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا:

یہاں ''لـو'' کا استعمال معنی کیلئے ہے اسی وجہ سے جواب میں ''فاء'' آئی ہوئی ہے ''کرۃ'' کا معنی ہے ''رجعۃ'' اور ''عود'' یعنی لوٹنا۔ اب معنی یہ ہوگا'' لیت لنا کرۃ الی الدنیا فنتبرأ منھم کما تبرأ وامنا'' کاش کہ ہمیں دنیا میں لوٹنا ہو تو ہم ان سے بے زار ہو جائیں جیسا کہ وہ ہم سے بیزار ہوئے

(از بیضاوی وشیخ زادہ)

وہ رجوع کی تمنا کیوں کریں گے؟ اس لئے کہ وہ یہ خواہش کریں گے کہ ہمیں دنیا میں لوٹا دیا جائے تا کہ ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کریں اور ہمارے متبوعین جس طرح آج ہم پر غصے میں ہیں اور ہم سے دور ہیں اسی طرح دنیا میں ہم بھی ان پر غصے کا اظہار کریں اور ہم بھی ان سے دور رہیں۔

خیال رہے کہ ان کی یہ تمنا دنیا میں اسی لئے نہیں پائی گئی کہ وہ عذاب کو نہیں دیکھ پائے قیامت کے دن جب عذاب کو دیکھیں گے تو پھر وہ تمنا کریں گے۔ (از روح المعانی)

كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ:

''اسی طرح دکھائے گا ان کو اللہ ان کے اعمال جو ان پر حسرت ہوں گے۔'' یہاں دو احتمال ہیں ایک یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ دکھایا کہ ان کے متبوعین ان سے بیزار ہو گئے اسی طرح ان کے اعمال ان کو دکھائے گا جن پر ان کو حسرت ہوگی۔ ان کو اعمال دکھانے کی وجہ بھی یہ ہوگی کہ یہ ایک دوسرے سے کامل طور پر بے زار ہو کر نادم ہو جائیں۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ جس طرح ان کو اللہ تعالیٰ نے عذاب دکھایا اسی طرح ان کو اعمال دکھائے گا جن پر یہ حسرت کریں گے اور ان کو یقین ہو جائے گا اب ہماری بربادی ہی بربادی ہے۔

کون سے اعمال ان کو دکھائے جائیں گے: اس میں کئی احتمال ہیں تاہم وہ سب ہی مجتمع ہوں گے۔

(۱) ''الاول الطاعات یتحسرون لم ضیعوھا'' ان میں سے پہلا یہ قول ہوگا کہ ان کو طاعات دکھائی جائیں گی جن پر یہ حسرت کریں گے کہ ان اچھے اعمال کو ہم نے کیوں ضائع کر دیا کہ آج ہم عذاب میں مبتلاء ہیں اور ہماری کوئی نجات نہیں۔ ''الثانی المعاصی واعمالھم الخبیثة یتحسرون لم عملوھا'' دوسرا قول یہ ہے کہ ان کو ان کے گناہ اور ان کے خبیث اعمال دکھائے جائیں گے جن پر وہ حسرت کریں گے کہ یہ اعمال انہوں نے کیوں کئے تھے۔

''الثالث ثواب طاعاتھم التی اتوابھا فاحبطوہ بالکفر''

تیسرا قول ان میں سے یہ ہے کہ ان لوگوں کو ان کی اچھائیوں کا ثواب دکھایا جائے گا کہ تمہیں یہ ثواب دیا جانا تھا لیکن تم نے کفر کے ذریعے اس ثواب کو ضائع کر دیا ہے۔

''الرابع، اعمالھم التی تقربوا بھا الی رؤسائھم من تعظیمھم والانقیاد لامرھم''

چوتھا قول یہ ہے کہ اعمال سے مراد ان کے وہ اعمال ہیں جن کی وجہ سے وہ اپنے رئیسوں کے قریب ہوئے یعنی ان کی تعظیم اوران کی اطاعت۔

" والظاهر ان المراد الاعمال التی اتبعوا فيها السّادة وهو كفرهم ومعاصيهم "

ظاہر یہ ہے کہ ان کے وہ اعمال مراد ہیں جوانہوں نے اپنے رئیسوں اور سرداروں کے کہنے پر کئے ہوں گے یعنی ان کا کفراوران کے گناہ معتبر ہوں گے۔

وہ اعمال ان پر حسرت ہوں گے: جب وہ اپنے اعمال یعنی کفراور معاصی کواپنے اپنے نامہ اعمال میں دیکھیں گے۔تو ان کو دیکھ کر حسرت ہوگی اورانہیں یقین ہو جائے گا کہ ان کواب اس کی جزاءضرور دی جانی ہے حالانکہ ان پر ممکن تھا وہ ان کو چھوڑ دیتے اور طاعات پر عمل کرتے۔

حسرت کیا ہے؟ اصل میں " الحسر " کا معنیٰ "کشف" کھولنا،ظاہر کرنا ہے جس طرح کہا جاتا ہے " حسر عن ذراعيه " فلاں شخص نے اپنی کلائیوں کو کھولا یعنی ان سے کپڑا اٹھایا۔ " الحسرة " کا معنیٰ شدید ندامت ہے کیونکہ ندامت کے وقت نادم کا حال کھل جاتا ہے۔اور " الحسير " ایسے کیڑے مکوڑے کوبھی کہا جاتا ہے جس میں بظاہر کوئی نفع نہ ہو۔اس معنیٰ کی مناسبت سے " الحسرة " کا معنیٰ شدید ندامت ہوگا کیونکہ نادم شخص اس کیڑے کی طرح ہی ہو جاتا ہے جس میں کوئی نفع نہ پایا جائے۔اور "الحسور " کا معنیٰ تھک جانا بھی ہے اس معنیٰ کے لحاظ سے " الحسرة " کا معنیٰ یہ ہوگا کہ نادم کا ندامت کی وجہ سے تھک ہار جانا۔

وَمَا هُم بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ : اور وہ آگ سے نکلنے والے نہیں۔چونکہ ذکر ہی کفار ومشرکین کا ہو رہا ہے اس لئے ان کو جہنم سے کبھی نہیں نکالا جائے گا۔دوسری آیۃ کریمہ اس پر دلالت کر رہی ہے:

﴿ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِيْمٍ يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِيْنَ ﴾ (الانفطار)

''اور بیشک فاجر (کافر) لوگ جہنم میں ہوں گے قیامت کے دن اس میں وہ جلیں گے اور وہ اس سے غائب نہیں ہوں گے۔" وثبت ان المراد بالفجار ههنا الكفار لدلالة هذه الآية " معلوم ہو گیا کہ فجار سے مراد کفار ہیں کیونکہ یہ آیۃ اس پر دلالت کر رہی ہے۔روز روشن کی طرح واضح ہوگیا کہ ان آیات میں کفار کا ذکر ہے کیونکہ یہاں ذکر ہو رہا ہے ان کو جہنم سے نہیں نکالا جائے گا۔

" وان اصحاب الكبيرة من اهل القبلة يخرجون من النار "

بیشک کبیرہ گناہ والوں کوتو جہنم سے نکال لیا جائے گا اس پر اہل سنت کا اجماع ہے۔ (از کبیر)

﴿ یَا اَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴾

۱) ''اے لوگو کھاؤ جو کچھ زمین میں حلال پاکیزہ ہے اور شیطان کے قدم پر قدم نہ رکھو بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے''۔

۲) ''اے لوگو کھاؤ جو کچھ زمین میں حلال پاکیزہ ہے اور نہ تابعداری کرو شیطان کے قدموں کی بیشک وہ تمہارا دشمن ہے کھلا''۔

ماقبل سے رابطہ: اللہ تعالیٰ نے پہلے توحید کو ذکر فرمایا اور اس پر دلائل قائم فرمائے پھر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کرنے والوں کا ثواب ذکر فرمایا۔ اس کے بعد ﴿ وَمَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا ﴾ سے مشرکین کے شرک کو بیان فرمایا۔ پھر رئیس کافروں کی تابعداری کرنے والے کفار کا ذکر فرمایا اس کے بعد اس آیۃ میں دونوں فریقوں پر انعام کا ذکر فرمایا اور ان پر احسان کو بیان فرمایا۔ اور یہ بیان فرمایا کہ جو شخص گناہوں میں مبتلا ہو گا وہ گنہگار ہو گا کفر کی وجہ سے کافر ہو گا لیکن اللہ تعالیٰ کا احسان ان پر برقرار رہے گا ''**لم تؤثر فی قطع احسانه ونعمه عنهم**'' یعنی ان کے گناہ اور کفر رب تعالیٰ کے احسان اور نعمتوں کو ختم کرنے کا ذریعہ نہیں ہوں گے۔ (از کبیر)

شان نزول: چند واقعات کے بعد آیۃ کریمہ کا نزول ہوا جو تمام ہی شان نزول ہیں۔ (راقم)

(۱) یہ آیۃ کریمہ مشرکین کے متعلق نازل ہوئی جب کہ انہوں نے اپنے آپ پر بحیرہ اور سائبہ اور وصیلہ اور حام حرام قرار دے دیئے تھے تو ان کو اس آیۃ کریمہ میں اس سے منع کیا گیا کہ حلال پاکیزہ جانوروں کو کھاؤ حلال کو اپنے آپ پر حرام نہ کرو۔ (از روح المعانی)

خیال رہے کہ زمانہ جاہلیت میں کفار کا یہ دستور تھا کہ جو اونٹنی پانچ مرتبہ بچے جنتی اور آخر مرتبہ اس کا بچہ نر ہوتا اس کا کان چیر دیتے پھر نہ اس پر سواری کرتے نہ اس کو ذبح کرتے نہ پانی اور چارے سے اسے ہانکتے اس کو بحیرہ کہتے۔ اور جب سفر پیش ہوتا یا کوئی بیمار ہوتا تو یہ نذر کرتے کہ اگر میں سفر سے

بخریت واپس آ ؤں یا تندرست ہو جاؤں تو میری اونٹنی سائبہ (بجار) ہے اور اس سے بھی بحیرہ کی طرح نفع اٹھانا حرام سمجھتے اور اسے آزاد چھوڑ دیتے۔ اور بکری جب سات مرتبہ بچے جن چکتی تو اگر ساتواں بچہ نر ہوتا تو اس کو مرد کھاتے اور اگر مادہ ہوتا تو بکریوں میں چھوڑ دیتے اور ایسے ہی اگر نر مادہ دونوں ہوتے اور کہتے کہ یہ اپنے بھائی سے مل گئی اس کو وصیلہ کہتے۔ اور جب نر اونٹ دس گیا بھ (دس مرتبہ مؤنث گابھن ہوتی) حاصل ہو جاتے تو اس کو چھوڑ دیتے نہ اس پر سواری کرتے نہ اس سے کام لیتے نہ اسے چارے پانی سے روکتے اس کو ''حامی'' کہتے۔ (خزائن العرفان)

(۲) شان نزول میں ایک اور قول یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام پہلے یہودیت میں تھے انہوں نے اور ان کے چند ساتھیوں نے ایمان قبول کر لیا یہودیت میں اونٹ کا گوشت حرام تھا انہوں نے اسلام لانے کے بعد بھی اپنے آپ پر حرام کر لیا تو یہ آیۃ نازل ہوئی۔

(۳) تیسرا قول شان نزول میں یہ ہے کہ ثقیف اور بنی عامر بن صعصہ اور خزاعہ اور بنی مدلج نے جب اپنے آپ پر کھجور اور پنیر کو حرام کر لیا تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔ (از روح المعانی)

(۴) چوتھا قول شان نزول میں یہ ہے کہ بعض لوگوں نے اپنے آپ پر اچھے طعام اور اچھے لباس حرام کر لئے تھے تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

اعتراض: قاضی ابوالسعو د محمد بن محمد عمادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وقيل نزلت في قوم من المؤمنين حرموا على انفسهم رفيع الاطعمة والملابس ويرده قوله عزوجل ﴿وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ﴾ اى لا تقتدوا بها فى اتباع الهوى فانه صريح فى ان الخطاب للكفرة كيف لا وتحريم الحلال على نفسه تذهدا ليس من باب اتباع خطوات الشيطان"

بعض حضرات نے کہا کہ یہ آیۃ کریمہ مومنوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے اپنے آپ پر اچھے طعام اور اچھے لباس حرام کر لئے تھے لیکن یہ قول صحیح نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی:

﴿وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ﴾ ''اور نہ تابعداری کرو شیطان کے قدموں کی'' اسے رد کر رہا ہے کیونکہ ان الفاظ مبارکہ کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی خواہشات کی تابعداری کرتے ہوئے شیطان

کی اقتداء نہ کرو شیطان کی اقتداء صریح کفر ہے۔ یہ قول کس طرح درست نہ ہو جب کہ زہد کے لئے اپنے آپ پر کسی چیز کو حرام کر لینا شیطان کے قدموں کی تابعداری نہیں۔ (ابوالسعود)

اس تفسیر سے تو واضح ہوا کہ آخری تینوں شان نزول درست نہیں کس طرح ان کو جلیل القدر مفسرین کرام نے بیان کیا ہے۔

جواب: اصل میں ان تمام اقوال میں محاکمہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حلال چیز کو اپنے پر حرام کرے لاعلمی کی وجہ سے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھیوں (رضی اللہ عنہم) نے اپنے آپ پر اونٹ کا گوشت حرام کیا تھا یہ کفر نہیں۔ اگر کوئی شخص زہد کی خاطر اپنے آپ پر کسی حلال چیز کو حرام کرے تو پھر بھی کفر نہیں لیکن اگر سنت سے اعراض لازم آئے تو منع ہے۔

شیطان کی تابعداری سے منع کیا گیا ہے تو اس کا صرف یہ مطلب نہیں کہ تم اس کی تابعداری کر کے کافر نہ ہو جاؤ بلکہ شیطان کی تابعداری کر کے گناہوں میں مبتلا ہونا بھی تو منع ہے۔ یہی وجہ ہے جب چند صحابہ نے اپنے آپ پر عبادات کو لازم کیا اور ایک صحابی نے کہا " انا اعتزل النساء فلا اتزوج ابدا " میں عورتوں سے جدا رہوں گا اور کبھی شادی نہیں کروں گا تو ان کے جواب میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا " فمن رغب عن سنتی فلیس منی " جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں۔

(مشکوۃ کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

اس لئے تمام اقوال ہی صحیح ہیں ابوالسعود رحمہ اللہ کا رد کرنا درست نہیں۔ (راقم)

حلالا: حلال کا معنی ہے کھولنا شریعت میں حلال اس چیز کو کہیں گے جس سے ممانعت کو ختم کر دیا جائے

تنبیہ: حرام کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو حرام ہوتا ہے خبث (ناپاک) کی وجہ سے جیسے مردار کا گوشت خنزیر کا گوشت، دم مسفوح (بہنے والا خون)۔ اور ایک حرام وہ ہوتا ہے جو خبث کی وجہ سے تو نہیں لیکن شریعت نے اس سے منع کر دیا جیسا کہ غیر کی ملکیت چیز خواہ وہ پاک اور ستھری ہی کیوں نہ ہو شریعت کی طرف سے اجازت نہ ہونے کی وجہ سے وہ حرام ہے۔ حلال میں یہ دونوں قیدیں نہیں۔ (از کبیر)

امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا:

" الحلال ما یجدہ فم الشرع لذیذا لا یعافہ ولا یکرہ او تراہ عینہ

طاهرا عن دنس الشبهة"

حلال وہ ہے جسے شریعت کا منہ لذیذ سمجھے اس سے نفرت نہ کرے اور اسے ناپسند نہ سمجھے۔اور مطلب یہ ہے کہ شریعت کی آنکھ جس چیز کو شبہات کی میل سے پاک سمجھے وہ حلال ہے۔(روح المعانی) یعنی شریعت اسے چکھنے کی اجازت دے منع نہ کرے تو گویا کہ شریعت کے منہ نے اسے لذیذ سمجھا۔اور اس میں حرام ہونے کا کوئی شبہ نہ پایا جائے تو گویا کہ اسے آنکھ نے حلال سمجھا یہی مطلب ہے شریعت کی آنکھ کے حلال سمجھنے کا۔(راقم)

طیبا : "الطیب فی اللغة قد یکون بمعنی الطاهر" طیب کا لغت میں معنی پاک ہونا بھی آتا ہے۔اور حلال کو بھی طیب کہا گیا ہے کیونکہ اس کے مقابل حرام کو خبیث کہا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿قُل لَّا یَسۡتَوِی الۡخَبِیۡثُ وَالطَّیِّبُ﴾ "(اے محبوب) آپ فرمادیں حرام اور حلال برابر نہیں۔ اصل میں طیب کا مطلب ہے وہ چیز جس سے لذت حاصل ہو اور طبیعت اسے اچھا سمجھے، چونکہ اس کا وصف اصل میں طاہر ہوتا ہے۔حلال کو بھی اس مناسبت کی وجہ سے طیب کہا جاتا ہے کیونکہ شریعت حرام سے منع کرتی ہے لہذا حرام میں شرعی طور پر لذت نہیں پائی جاتی بلکہ حلال میں ہی شرعاً لذت ہے۔اس آیۃ کریمہ میں اگرچہ طیب کا معنی حلال بھی کیا جاسکتا ہے لیکن اس میں تکرار لازم آئے گا حلال اور طیب کا ایک معنی ہوگا۔

لہذا بہتر یہ ہے کہ طیباً کا معنی پاکیزہ، لذت دار، طبیعت کے مطابق ہو بشرطیکہ شرعاً اس میں ممانعت نہ پائی گئی ہو۔ (از کبیر)

" والمراد بالحلال ما نص الشارع علی حله وبهذا (ای الطیب) مالم یرد فیه النص ولکنه مما یستلذ ویشتهیه الطبع المستقیم ولم یکن فی الشرع ما یدل علی حرمته کاسکار وضرر "

حلال سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے اس کے حلال ہونے کو بیان کیا ہو طیب کو بیان تو نہیں کیا البتہ اس سے لذت حاصل ہوتی ہے اور طبع مستقیم (درست طبیعت) اس کی خواہش رکھتی ہے لیکن شرع میں اس کی حرمت کو بیان نہیں کیا گیا۔کیونکہ نشہ والی چیزیں اور نقصان دینے

والی چیزوں سے شریعت نے منع کیا ہے اس لئے وہ طیب نہیں۔

اسی سے ایک اعتراض اٹھ گیا کہ اگر کوئی یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ نے طیب کے کھانے کا حکم دیا ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ جو طیب نہیں تو اس کا کھانا حرام ہو جائے جب کہ طیب کا معنی بیان کیا گیا ہے کہ اس سے لذت حاصل ہو اور طبع مستقیم اس کی خواہش کرے تو اس سے یہ سمجھ آئے گا کہ سیر ہو کر کھانے کے بعد چونکہ لذت نہیں آتی۔ بیمار آدمی کی طبع مستقیم نہیں ہوتی تو ان حالات میں کھانا منع ہو جائے۔ اس کا جواب پہلے آ چکا ہے کہ جس چیز سے شریعت نے منع کیا ہو وہ غیر طیب ناجائز ہوگی جس سے شریعت نے منع نہیں کیا وہ منع نہیں کیونکہ مفہوم مخالف ثابت کرنا ہمارے نزدیک کوئی دلیل نہیں۔

(ماخوذ از روح المعانی)

وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ : ''اور تابعداری نہ کرو شیطان کے قدموں کی'' خطوة (بفتح الخاء وسکون الطاء) اور ''خطوَة'' (بضمتین) کا معنی ایک ہی ہے دو قدموں کے درمیان فاصلہ کو " خطوة " کہا جاتا ہے۔ (قرطبی)

مطلب یہ ہوا: " لا تعتقدوا به وتستنوا فتحرموا الحلال وتحللوا الحرام " تم شیطان کے ساتھ عقیدت نہ رکھو اس کے طریقہ پر نہ چلو کہ تم حلال کو حرام بناتے رہو یا حرام کو حلال بناتے رہو یعنی شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں (قدم پر قدم نہ رکھو) کا یہی مطلب ہے۔

تنبیه : طلاق کی قسم اٹھانا، حرام کاموں اور گناہ والے کاموں کی نذر ماننا اور اللہ تعالیٰ کے نام کے غیر کی قسم اٹھانا یہ تمام کام شیطان کی تابعداری میں آتے ہیں۔ (از روح المعانی)

اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ : بیشک وہ تمہارا دشمن ہے کھلا، ﴿ مُبِيْنٌ ﴾ باب افعال سے ہے یعنی "ابانة" سے لیا ہوا ہے اصل مادہ " بان يبين بيانا " ہے اس کا معنی ہے ''ظاہر طور'' یعنی بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

اعتراض: کھلے دشمن سے تو انسان دھوکے میں نہیں آتا شیطان تو دوست بن کر ورغلاتا ہے۔ دوسرے مقام پر رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَوْلِيٰٓؤُهُمُ الطَّاغُوْتُ ﴾ کافروں کے

دوست شیطان ہیں کھلا دشمن کہنا کیسے صحیح ہے۔

جواب: " انه ظاهر العداوة عند ذوی البصيرة وان كان يظهر الولاية لمن يغويه "

جولوگ بصیرت رکھتے ہیں ان کے سامنے اس کی عداوت ظاہر ہے اور جن کو بھٹکانا چاہتا ہے ان کے لئے اس کی دوستی ظاہر ہے۔لہذا کھلا دشمن کہنا بھی صحیح ہے" اور دوست بن کر بھٹکانے والا" کہنا بھی صحیح ہے۔

(ماخوذ از روح المعانی)

فائدہ: آج کل صاف ستھری چیزوں کے کھانے پر بہت زور دیا جاتا ہے گلی سڑی چیزوں کے کھانے سے پرہیز کرنے کی تلقین کی جاتی ہے کہ گلی سڑی چیزیں صحت کے لئے نقصان دہ ہیں لیکن مقام افسوس یہ ہے کہ حرام اور حلال میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا نہ ہی حرام سے بچنے کی ترغیب دی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمان ذلیل وحقیر ہورہے ہیں۔

کاش کہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو مدنظر رکھا جاتا کیا خوب حکم فرمایا کہ حلال چیزیں کھاؤ تا کہ تمہارا باطن پاکیزہ رہے اور پاکیزہ اور صاف ستھری چیزیں کھاؤ تا کہ تمہارا ظاہری بدن صحیح وسلامت رہے۔آج کل ظاہری علاج کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی ہے لیکن قرآن پاک نے باطنی اور ظاہری علاج پر زور دیا ہے۔

(ماخوذ از ضیاء القرآن)

قبولیت دعاء رزق حلال پر موقوف ہے: ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان فرمائی کہ نبی کریم ﷺ کے پاس یہی آیت ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا﴾ پڑھی گئی۔

" فقام سعد بن ابی وقاص فقال يا رسول الله ادع الله ان يجعلنی مستجاب الدعوة فقال يا سعد اطب مطعمك تكن مستجاب الدعوة والذی نفس محمد بيده ان الرجل ليقذف اللقمة الحرام فی جوفه فما يتقبل منه اربعين يوما وايما عبد نبت لحمه من السحت والربا فالنار اولی به "

توسعد بن ابی وقاص کھڑے ہوئے عرض کرنے لگے یارسول اللہ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں کہ وہ مجھے دعا کی قبولیت کا شرف عطا کردے (میری دعا قبول ہوجایا کرے) تو آپ نے فرمایا اے سعد تم اپنا طعام

پاکیزہ اور حلال رکھو تو اللہ تعالیٰ تمہاری دعا کو قبول فرمایا کرے گا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے بیشک جب کوئی شخص حرام لقمہ اپنے پیٹ میں ڈالتا ہے تو چالیس دن اس کی عبادات کو قبول نہیں کیا جاتا۔ جس کی نشوونما ہی حرام مال سے ہو اور ربو (سود) کے مال سے ہو وہ جہنم کا مستحق ہے۔ (درمنثور)

تین چیزوں میں نجات:

" وقال ابو عبد اللہ الساجی واسمہ سعید بن یزید خمس خصال بھا تمام العلم وھی معرفۃ اللہ عزوجل ومعرفۃ الحق واخلاص العمل للہ والعمل علی السنۃ واکل الحلال فان فقدت واحدۃ لم یرفع العمل "

ابوعبداللہ ساجی جن کا نام سعید بن یزید ہے وہ فرماتے ہیں پانچ چیزوں سے علم کی تکمیل ہوتی ہے وہ یہ ہیں: اللہ تعالیٰ کی معرفت، حق راہ کی معرفت اور عمل صرف اللہ تعالیٰ کے لئے خلوص سے کرنا اور سنت کے مطابق عمل کرنا اور حلال مال کھانا ان پانچ میں سے کوئی ایک بھی حاصل نہ ہو تو اس کے عمل کو رب تعالیٰ کے ہاں شرف قبولیت حاصل نہیں ہوگا۔ (قرطبی)

جب یقین ہو حلال میں پھر کھائے: " قال سھل ولا یصح اکل الحلال الا بالعلم "

سہل کہتے ہیں اس وقت تک حلال مال کو کھانا بھی صحیح نہیں جب تک یقین نہ ہو یعنی اگر شک ہو کہ یہ مال حلال ہے یا حرام ہے تو اس کا کھانا جائز نہیں۔ (از قرطبی)

حلال مال کا چھ چیزوں سے پاک ہونا ضروری ہے:

" ولا یکون المال حلالا حتی یصفو من ست خصال الربا والحرام والسحت (وھو اسم مجمل) والغلول والمروہ والشبھۃ "

اس وقت تک مال حلال نہیں ہوسکتا جب تک وہ چھ چیزوں سے پاک نہ ہو ربو (سود) سے پاک ہو اور حرام ہونے سے پاک ہو اور ایسا مال ہو جس میں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی نہ پائی گئی ہو اور مال غنیمت میں خیانت والا مال نہ ہو اور شرعاً مکروہ مال نہ ہو اور ایسا مال جس میں حرام ہونے کا شبہ پایا گیا ہو اس سے پاک ہو۔ (قرطبی)

مقام توجه : رب تعالیٰ نے فرمایا﴿ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ﴾ اور تابعداری نہ کرو شیطان کے قدموں کی بیشک وہ تمہارا دشمن ہے کھلا۔

" والصحیح ان اللفظ فی کل ما عدا السنن والشرائع من البدع والمعاصی "

صحیح یہ ہے کہ ﴿ خطوات ﴾ عام ہے اس لیے سنتوں اور شرعی احکام کے بغیر ایسی بدعات جو بری ہوں شریعت کے مخالف ہوں یعنی جن میں معصیت پائی جاتی ہو (گناہ کے کام ہوں) وہ سب شیطانی عمل ہوں گے ان پر چلنا شیطان کی تابعداری کہلائے گا۔ (قرطبی)

شیطان سے بچنے کا حکم رب تعالیٰ نے کئی مقامات پر دیا: ایک اسی آیۃ کے آخری الفاظ مبارکہ ﴿ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴾ اور شیطان کے قدموں کی تابعداری نہ کرو بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اور آنے والی آیۃ کریمہ میں ﴿ اِنَّمَا یَاْمُرُکُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ ﴾ بیشک وہ تمہیں برائی اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور ارشاد فرمایا ﴿ اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ ﴾ ''شیطان تمہیں فقر (غریب ہو جانے) سے ڈراتا ہے اور حکم دیتا ہے تمہیں بے حیائی کا''۔

﴿ وَیُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّضِلَّھُمْ ضَلٰلًا بَعِیْدًا ﴾

''اور ارادہ رکھتا ہے شیطان کی تمہیں بہت بڑی گمراہی میں مبتلا کر دے''

﴿ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَآءَ ﴾

''بیشک شیطان ارادہ رکھتا ہے کہ واقع کرے تمہارے درمیان دشمنی اور بغض''

﴿ اِنَّہٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِیْنٌ ﴾ ''بیشک وہ دشمن بھٹکانے والا ہے کھلا''

﴿ ان الشیطان لکم عدو فاتخذوہ عدوا ﴾ ''بیشک شیطان تمہارا دشمن ہے اسے دشمن ہی سمجھو''

ان آیات میں شیطان سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ تمہارا دشمن ہے اور تمہیں بھٹکانے والا جب تم دشمن کو دشمن سمجھو گے تو اس کے مکر سے محفوظ رہو گے اگر تم نے اسے اپنا یار بنا لیا تو ذلیل و خوار ہو جاؤ گے قرآن پاک میں اور بھی بہت مقامات میں شیطان کا ذکر کیا گیا ہے۔ (از قرطبی)

☆ " وقال عبد اللہ بن عمر ان ابلیس موثق فی الارض السفلی فاذا تحرک فان کل

شر فی الارض بین اثنین فصا عدا من تحر که"

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک شیطان جب سب سے نیچے والی زمین میں ہو اس طرح جیسا کہ اسے مضبوطی سے باندھ دیا گیا ہو تو پھر بھی جب وہ حرکت کرے دو شخصوں کے درمیان یا زیادہ لوگوں کے درمیان واقع ہونے والے فسادات اس کی حرکت کی وجہ سے ہی ہوتے ہیں۔

(قرطبی)

☆ ترمذی نے ابو مالک اشعری سے روایت ذکر کی جس میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد موجود ہے۔

" و آمرکم ان تذکروا اللہ فان مثل ذلک کمثل رجل خرج العدو فی اثرہ سراعا حتی اذا اتی علی حصن حصین فاحرز نفسہ منھم کذالک العبد لا یحزر نفسہ من الشیطان الا بذکر اللہ "

(ھذا حدیث حسن صحیح غریب)

اور میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم اللہ کا ذکر کرو بیشک اس کی مثال ایسے ہے جیسے کسی شخص کے پیچھے اس کا دشمن جلدی جلدی بھاگے آ رہا ہو یہاں تک کہ وہ شخص ایک مضبوط قلعہ میں آ جائے تو وہ اپنے آپ کو بچا لیتا ہے اسی طرح بندہ اپنے آپ کو شیطان سے سوائے اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بچا نہیں سکتا۔

(قرطبی)

یعنی اللہ تعالیٰ کا ذکر شیطان کے مکر و فریب سے بچنے کے لئے ایک مضبوط قلعہ کی حیثیت رکھتا ہے جس نے اللہ کا ذکر کیا وہ مضبوط قلعہ میں آ گیا اس نے اپنے آپ کو بچا لیا۔ جو غافل رہا وہ شیطان کی زد میں آ گیا۔

☆☆☆☆☆

﴿ اِنَّمَا یَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْءِ وَالْفَحْشَاءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾

۱) ''وہ تو تمہیں یہی حکم دے گا بدی اور بے حیائی کا اور یہ کہ اللہ پر وہ بات جوڑو جس کی تمہیں خبر نہیں''

۲) بیشک وہ تو تمہیں حکم دیتا ہے برائی اور بے حیائی کا اور یہ کہ تم کہو اللہ پر وہ جو تم نہیں جانتے''

اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں شیطان کی تابعداری کرنے سے منع فرمایا گیا اور شیطان کی دشمنی کا ذکر کیا گیا اس آیۃ کریمہ میں شیطان کی تابعداری کے نقصانات اور اس کے بھٹکانے کی قسمیں بیان کی جارہی ہیں۔

عداوت کے تین امور (چیزوں) کا ذکر:

(۱) '' اولها السوء وهو متناول جميع المعاصى سواء كانت تلك المعاصى من افعال الجوارح او من افعال القلوب ''

ان میں سے پہلی چیز '' اَلسُّــــوْءِ '' ہے جو تمام برائیوں کو شامل ہے خواہ ان برائیوں کا تعلق ظاہری اعضاء سے ہو یا وہ باطنی افعال ہوں۔

(۲) '' وثانيها ، الفحشاء وهى نوع من السوء لانها اقبح انواعه وهو الذى يستعظم ويستفحش من المعاصى ''

ان میں دوسری چیز '' اَلْـفَـحْشَــاءِ '' یہ بھی برائیوں میں برائی ہی ہے لیکن بہت بڑا گناہ اور گناہوں میں سے بے حیائی کا کام ہے۔

(۳) '' وثالثها اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ '' وكانه اقبح انواع الفحشاء لانه وصف الله تعالىٰ بما لا ينبغى من اعظم انواع الكبائر ''

ان میں تیسری چیز یہ ہے ﴿ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ شیطان تمہیں یہ وسوسہ ڈالے گا کہ تم اللہ تعالیٰ کے لئے وہ کہو جو تم نہیں جانتے۔ یہ اور ہی زیادہ بڑا گناہ اور بڑی بے حیائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وہ اوصاف بیان کئے جائیں جو اس کے شان کے لائق نہیں۔ (از کبیر)

جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے حرام نہیں کیں ان کو حرام کہہ کر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا کہ یہ اللہ تعالیٰ نے حرام کی ہیں اور اس طرح حرام چیزوں کے متعلق یہ کہنا کہ یہ اللہ تعالیٰ نے حلال کر دی ہیں یہ شیطانی چال ہے اور اللہ تعالیٰ کی اولاد ماننا، اور اللہ تعالیٰ کا عام جسموں کی طرح جسم ماننا، اور اللہ تعالیٰ کو معاذ اللہ معطل ماننا تمام شیطانی مکروفریب ہیں۔ (راقم)

شیطان کے حکم دینے کا مطلب: شیطان انسانوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے جس طرح کوئی آہستہ آہستہ کلام کر کے کسی کو ورغلائے اس کے وسوسہ میں بھی آہستہ کلام ہوتی ہے اگرچہ اسے کوئی سنتا نہیں لیکن اس کا اثر ہوتا ہے۔

☆ حدیث صحیح میں وارد ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا " **ان الشیطن یجری من ابن آدم مجری الدم** " بیشک شیطان انسان میں اس طرح اثر انداز ہوتا ہے جس طرح انسان میں خون کا دوران ہوتا ہے۔ (از خازن)

☆ " **عن ابن مسعود قال قال رسول اللہ ﷺ ان للشیطن لمة بابن آدم وللملک لمة فاما لمة الشیطن فایعاد بالشر وتکذیب بالحق واما لمة الملک فایعاد بالخیر وتصدیق بالحق فمن وجد ذلک فلیعلم انه من اللہ فلیحمد اللہ ومن وجد الاخری فلیتعوذ باللہ من الشیطن ثم قرأ الشیطن یعدکم الفقر ویامرکم بالفحشاء** " (رواہ الترمذی)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ انسان پر شیطان کا بھی اثر ہے اور فرشتے کا بھی اثر ہوتا ہے شیطان کا اثر یہ ہے کہ ان کو وہ شر کاموں میں لگا دیتا ہے اور حق کی تکذیب کرتا ہے اور انسان پر فرشتے کا اثر یہ ہے کہ وہ نیکی کے کاموں پر لگا دیتا ہے اور حق کی تصدیق کرتا ہے۔ پھر آپ نے (بطور دلیل) پڑھا ﴿اَلشَّیْطَانُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَاءِ﴾ شیطان تمہیں (اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے) فقر سے ڈراتا ہے (غریب ہو جاؤ گے) اور تمہیں بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔

☆ " **وفی حدیث ابن عباس قوله ﷺ الحمد للہ الذی رد امره الی الوسوسة** " (رواہ ابو داؤد)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا نبی کریم ﷺ نے فرمایا سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کی جس

نے شیطان کے امر کو وسوسہ کی طرف پھیر دیا۔ (مظھری)

یعنی شیطان لازمی طور پر حکم نہیں دے سکتا بلکہ صرف دل میں وسوسہ ڈال سکتا ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں پر اس کا داؤ نہیں چلتا اگر وہ لازمی طور پر حکم چلانے کی صلاحیت رکھتا تو سب کو بھٹکا تا رہتا۔ اسی حدیث پاک سے یہ واضح ہو گیا کہ آیۃ کریمہ میں شیطان کے حکم دینے سے مراد اس کا وسوسہ ڈالنا ہے۔

تنبیہ : ﴿اِنَّمَا﴾ کا معنی " ما الا " والا ہوتا ہے جو حصر کا فائدہ دیتا ہے اس کے معنی کو اس طرح بیان کیا جاتا ہے سوائے اس کے کہ نہیں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے یہ بخوبی واضح ہے۔ اسی سے پتہ چل گیا کہ شیطان ہمیشہ برائیوں کا حکم دیتا ہے نیکی کی راہ پر نہیں چلاتا ہاں البتہ بعض عارفین نے کہا کہ کبھی نیکی کی راہ پر بظاہر چلاتا ہے لیکن مقصد اس کا شر ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک نیکی کا کام افضل (زیادہ فضیلت والا) ہو اور دوسرا کام فاضل (فضیلت والا) ہو لیکن زیادہ فضیلت والا نہ ہو۔ تو شیطان کبھی افضل سے ہٹا کر فاضل کی طرف لگا دیتا ہے حالانکہ فاضل بھی نیکی کا کام ہی ہوتا ہے لیکن اس کے بعد فاضل کام چھڑا کر شر کی طرف لے جانا اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔

اور کبھی فاضل آسان سے ہٹا کر افضل مشکل کی طرف لے جاتا ہے تا کہ اس شخص کو دین سے نفرت ہو جائے عام لوگوں پر اس طرح یہ کامیابی حاصل کر لیتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں پر اس کا داؤ نہیں چلتا بلکہ وہ افضل مشکل کام کو ترجیح دیتے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

مقام توجہ: فلاسفہ اور صوفیاء ملک (فرشتہ) جو خیر کی طرف دعوت دیتا ہے اسے قوۃ عقلیہ کہتے ہیں اور شیطان جو شر کی طرف دعوت دیتا ہے اسے قوۃ غضبیہ اور قوۃ شہویہ کہتے ہیں (از کبیر)

السوء کا لغوی معنی: " ساء یسوء سوءا (بفتح السین) مساءۃ " غم میں ڈالنا۔ گناہ چونکہ انسان کو برے انجام کی وجہ سے غم میں ڈالتے ہیں اس لئے گناہ کو " سوء " کہا جاتا ہے۔ (قرطبی)

"الفحشاء" کا لغوی معنی قبیح المنظر (بدصورت) جیسا کہ کہا گیا ہے " وجید کمجید الریم لیس بفاحش " (اور اس کی گردن ہرن کی گردن کی طرح ہے بدصورت نہیں) پھر برے مقاصد کے لئے "الفحشاء" بولتے ہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَ نَا اَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْأً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ

۱) ''اور جب ان سے کہا جائے اللہ کے اتارے پر چلو تو کہیں بلکہ ہم تو اس پر چلیں گے جس پر اپنے باپ دادا کو پایا کیا اگر چہ ان کے باپ دادا نہ کچھ عقل رکھتے ہوں نہ ہدایت''۔

۲) ''اور جب کہا جاتا ہے ان کو تابعداری کرو اس چیز کی جو نازل کی ہے اللہ نے وہ کہتے ہیں بلکہ تابعداری کرتے ہیں ہم اس چیز کی پایا ہم نے جس پر اپنے باپ دادوں کو کیا جب کہ ان کے باپ دادے نہیں سمجھتے ہیں کچھ چیز اور نہ ہی ہدایت (سیدھی راہ) پر ہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ: اور جب کہا جاتا ہے ان کو تابعداری کرو اس چیز کی جو نازل کی ہے اللہ نے یہ کن لوگوں سے کہا گیا؟ اس میں تین احتمال ہیں کہ " لهم " میں ضمیر کا مرجع کیا ہے

(۱) اس میں ایک احتمال یہ ہے کہ ضمیر " من " کی طرف لوٹے جو ﴿ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا ﴾ میں ہے معنوی لحاظ پر " من " میں عموم پایا جاتا ہے اس لئے جمع کی ضمیر لوٹانا درست ہے۔ مراد اس سے مشرکین ہیں یعنی مشرکین کو کہا گیا کہ تم اس چیز کی تابعداری کرو جو اللہ تعالیٰ نے نازل کی تو وہ کہتے ہیں ہم تو اس چیز کی تابعداری کرتے ہیں جس پر ہمارے آباء واجداد (باپ دادے) تھے۔

(۲) دوسرا احتمال یہ ہے کہ ﴿ يَا اَيُّهَا النَّاسُ ﴾ میں جو " الناس " ہے ضمیر اس کی طرف لوٹ رہی ہے پہلے تو خطاب کر کے ان کو حکم دیا گیا۔ اب لوگوں میں سے جو قرآن پاک کے احکام سے عدولی کر کے اپنے آباء واجدا کے دین پر چلنے والے کافر تھے ان کی طرف غائب کی ضمیر لوٹا کر قاعدہ التفات پر عمل کرتے ہوئے عقلاء کو گویا کہ خطاب کرتے ہوئے یوں کہا ﴿ انظروا الی هؤلاء الحمقی ماذا یقولون ﴾ ان بیوقوفوں کو دیکھو یہ کیا کہتے ہیں۔

(۳) تیسرا احتمال یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ یہود کے متعلق نازل ہوئی جب ان کو نبی کریم ﷺ نے دعوت اسلام دی تو انہوں نے کہا" نتبع ما وجدنا

علیہ آباء نا فهم کانوا خیرا منا واعلم منا " ہم تو اس چیز کی تابعداری کرتے ہیں جس پر ہم نے اپنے آباء واجداد کو پایا وہ ہم سے بہتر تھے اور ہم سے زیادہ علم رکھتے تھے۔ (از کبیر)

راقم کے نزدیک تمام صورتیں مجموعی طور پر آیۃ کریمہ کا شان نزول ہیں۔

قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَ نَا:

وہ کہتے ہیں بلکہ تابعداری کرتے ہیں ہم اس چیز کی پایا ہم نے جس پر اپنے باپ دادوں کو۔

یہ جملہ ان کے حال ماضی کی حکایت ہے اسی وجہ سے ترجمہ راقم نے حال والا کیا ہے۔ یعنی وہ کہتے کہ ہم تو اپنے آباء واجداد کے دین پر ہیں وہ بت پرستی کرتے تھے تو ہم بھی بت پوجتے ہیں جن چیزوں کو وہ حلال کہتے رہے ہم تو وہی حلال مانتے ہیں اور جن کو وہ حرام کہتے رہے ہم صرف ان چیزوں کو ہی حرام کہتے ہیں ہمیں کیا غرض ہے اس چیز سے جو اللہ تعالیٰ نے نازل کی۔

طلباء کرام توجہ فرمائیں: " بـــل " اضراب کے لئے آتا ہے جب ان کو کہا گیا تم اس چیز کی تابعداری کرو جو اللہ تعالیٰ نے نازل کی تو انہوں نے کہا ہم ایسا نہیں کریں گے بلکہ ہم تو اسی چیز کی تابعداری کرتے ہیں جس چیز پر ہم نے اپنے آباء واجداد کو پایا۔ ﴿ اَلْفَيْنَا ﴾ کا معنی ہے " وجدنا " ہم نے پایا چونکہ دوسری جگہ صراحۃً لفظ " وَجَدْنَا " آیا ہوا ہے۔

﴿ بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آ بَاءَ نَا ﴾

''بلکہ ہم تو تابعداری کرتے ہیں اس چیز کی جس پر پایا ہم نے اپنے آباء واجداد کو''

اَوَلَوْ كَانَ آ بَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْأً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ:

کیا جب کہ ان کے باپ دادے نہیں سمجھتے ہیں کچھ چیز اور نہ ہی ہدایت (سیدھی راہ) پر ہیں:

" الواو للحال والهمزة بمعنى الرد والتعجب معناه ايتبعونهم ولو كان آبا ئهم لا يعقلون شيا من الدين ولا يهتدون للصواب "

واؤ حال کے لئے ہے ہمزہ استفہام انکاری کیلئے ہے ان (کی حماقت) پر تعجب کرتے ہوئے کہا گیا ہے ان پر تعجب ہے کیا وہ تابعداری کرتے ہیں اپنے آباء واجداد کی جب کہ ان کے آباء واجداد دین کی کسی چیز کو سمجھتے نہیں اور سیدھی راہ پر قائم نہیں۔ (مدارک)

مدارک کی اس تفسیر کے مطابق راقم نے ترجمہ کیا ہے کبیر میں واؤ کو عطف کے لئے بنایا گیا ہے۔اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ اس کے مطابق ہے۔اگرچہ مدارک کی تفسیر کے مطابق اعتراض وجواب کی گنجائش نہیں تاہم زیادتی وضاحت کے لئے علامہ رازی رحمہ اللہ کے اعتراض وجواب کوذکر کیا جاتا ہے۔

﴿ لا یعقلون شیا ﴾ لفظ عام ومعناه الخصوص لانهم كانوا يعقلون كثيرا من امور الدنيا فهذا يدل على جواز ذكر العام مع ان المراد به الخاص فالمراد انهم لا يعلمون شيا من الدين " (كبير)

یعنی اگرکوئی یہ اعتراض کرے کہ ﴿ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْاً ﴾ (وہ نہیں سمجھتے کچھ چیز) کا کیا مطلب ہے جب کہ وہ دنیاوی معاملات کثیر مقدار میں جانتے تھے تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ لفظ عام بول کر خاص مراد لینا عربی قانون میں جائز ہے یہاں بھی ذکر عام ہے اور مراد خاص ہے یعنی مراد یہ ہے کہ وہ دین کے معاملہ میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ (از کبیر)

تقلید کے متعلق علامہ قرطبی رحمہ اللہ کا ارشاد:

" تعلق قوم بهذه الآية فی ذم التقليد لذم الله تعالیٰ الكفار باتباعهم لآبائهم فی الباطل واقتدائهم بهم فی الكفر والمعصية وهذا فی الباطل صحيح ، اما التقليد فی الحق فاصل من اصول الدين وعصمة من عصم المسلمين يلجا اليها الجاهل المقصر عن درك النظر "

بعض لوگوں نے اس آیۃ کریمہ کوتقلید کی مذمت پر چسپاں کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کفار کی مذمت اسی وجہ سے اس آیۃ کریمہ میں بیان کی ہے کہ وہ باطل نظریات میں اپنے آباء واجداد کی تقلید کرتے تھے اور کفر ومعصیت میں ان کی اقتداء کرتے تھے۔اگر اس دلیل کا مطلب کفر کی حدتک ہوتو صحیح ہے یعنی کافروں کی تقلید ناجائز اور حرام ہے۔لیکن حق میں تقلید تو دین کے اصول میں سے ایک اصل ہے (یعنی دین کے قوانین میں سے ایک قانون ہے) اور مسلمانوں کو باطل راہ پر چلنے سے بچانے کا ایک خاص ذریعہ ہے جاہل لوگ جو خود مسائل میں علم اور نظر وفکر نہیں رکھتے۔وہ مجتہدین کرام کی محنتوں سے

فائدہ اٹھالیتے ہیں اوران کے علم کی آغوش میں بھٹکانے والوں سے بچ کر پناہ لے لیتے ہیں۔
تقلید کا معنی: " وهو فی اللغة ماخوذ من قلادة البعیر " یہ لغت میں اونٹ کے قلادہ (گلے کی رسی) سے ماخوذ ہے اصطلاح میں " التقلید عندنا حقیقته قبول قول بلا حجة " تقلید ہمارے نزدیک اس کی حقیقت یہ ہے کہ کسی کے قول کو بغیر کسی حجت کے قبول کرلیا جائے۔
تقلید فروع میں: " واما جوازه فی مسائل الفروع فصحیح " فروع (مسائل واحکام) میں تقلید صحیح ہے۔
اصول میں صحیح یہ ہے تقلید نہیں: " واختلف العلماء فی جواز فی مسائل الاصول " اصول یعنی عقائد میں تقلید کے پائے جانے یا نہ پائے جانے میں اختلاف ہے بعض حضرات کے نزدیک توحید میں تقلید صحیح ہے لیکن یہ قول درست نہیں اس لئے کہ توحید " لا یحصل الا من جهة الکتاب و السنة " نہیں ہوتی سوائے کتاب اور سنت کے۔

عقائد میں تقلید کے متعلق صحیح اور درست قول یہ ہے '' قال ابن عطیة اجمعت الامة علی ابطال التقلید فی العقائد '' ابن عطیہ نے کہا امت کا اس مسئلہ میں اجماع ہے کہ عقائد میں تقلید باطل ہے۔
تقلید کے مخالفین ٹیڑھے ہیں: علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے تقلید کے مخالفین کو " اهل الزیغ " (ٹیڑھی راہ پر چلنے والے) کہا ہے اور بیان کیا ہے کہ انہوں نے دلائل قرآن پاک کی ان آیات سے پیش کئے ہیں۔ ﴿ رَبَّنَا اِنَّا اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ کُبَرَاءَ نَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِیْلَا ﴾
''اے ہمارے رب ہم اپنے سرداروں اوراپنے بڑوں کے کہنے پر چلے تو انہوں نے ہمیں راہ سے بہکادیا'' (الاحذاب ٦٧)

﴿ بَلْ قَالُوْا اِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَ نَا عَلٰی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰی آثَارِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ☆ وَكَذٰلِكَ مَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَا اِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَ نَا عَلٰی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰی آثَارِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ☆ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰی مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَیْهِ آبَاءَ كُمْ قَالُوْا اِنَّا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ☆ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ ﴾ (الزخرف، ۲۲ تا ۲۵)

بلکہ بولے ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک دین پر پایا اور ہم ان کی لکیر پر چل رہے ہیں اور ایسے ہی ہم نے تم سے پہلے جب کسی شہر میں کوئی ڈر سنانے والا بھیجا وہاں کے آسودہ حال والوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک دین پر پایا اور ہم ان کی لکیر کے پیچھے ہیں۔ نبی نے فرمایا اور کیا جب بھی کہ میں تمہارے پاس وہ لاؤں جو سیدھی راہ ہو اس سے جس پر تمہارے باپ دادا تھے بولے جو کچھ تم لے کر بھیجے گئے ہم اسے نہیں مانتے۔ تو ہم نے ان سے بدلہ لیا تو دیکھو جھٹلانے والوں کا کیسا انجام ہو'' (کنز الایمان)

ان مندرجہ بالا آیات سے دلیل پکڑنا باطل ہے کیونکہ یہ کفار کے حق میں نازل ہیں کافروں کی اپنے آباء واجداد اور اپنے سرداروں اور بڑوں کی تقلید کفر ہی تھی کیونکہ جن کی وہ تقلید کر رہے تھے وہ بھی کافر ہی تو تھے۔ " واولئک نسبوا افکھم ای اھل الا باطیل فازدادوا فی التضلیل " ان لوگوں نے اپنے چھوٹے عقائد باطل راہ پر چلنے والوں کی طرف منسوب کئے اسلئے یہ اور زیادہ بھٹک گئے۔

نیک لوگوں کی تابعداری: انبیاء کرام کی (اور نیک لوگوں کی یعنی ائمہ مجتہدین کی) تابعداری "وھو الدین الخالص الذی ارتضاہ اللہ" وہ خالص دین ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا ہے " کان اتباعہ آباءہ من صفات المدح " اس قسم کے آباء واجداد کی اتباع کی رب تعالیٰ نے تعریف فرمائی جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے کلام کا ذکر قرآن پاک میں فرمایا:

﴿اِنِّیۡ تَرَکۡتُ مِلَّةَ قَوۡمٍ لَّا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَهُمۡ بِالۡآخِرَةِ هُمۡ كٰفِرُوۡنَ ☆ وَاتَّبَعۡتُ مِلَّةَ آبَآئِیۡۤ اِبۡرٰهِیۡمَ وَاِسۡحٰقَ وَیَعۡقُوۡبَ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنۡ نُّشۡرِكَ بِاللّٰهِ مِنۡ شَیۡءٍ ذٰلِكَ مِنۡ فَضۡلِ اللّٰهِ عَلَیۡنَا وَعَلَی النَّاسِ﴾ (یوسف ۳۷، ۳۸)

بیشک میں نے ان لوگوں کا دین نہ مانا جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور وہ آخرت سے منکر ہیں اور میں نے اپنے باپ دادا ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کا دین اختیار کیا ہمیں نہیں پہنچتا کہ کسی چیز کو اللہ کا شریک ٹھہرائیں یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور لوگوں پر۔ (کنز الایمان) (بحث ماخوذ از قرطبی)

نوٹ: اس مسئلہ کی زیادہ وضاحت کیلئے جس سے عوام اور طلباء کرام یکساں فائدہ حاصل کریں اپنے رسالہ ''فقہ اور امام اعظم'' کو یہاں شامل کر رہا ہوں تا کہ مسئلہ نکھر کر واضح ہو جائے۔

﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾

"الحمد لله رب العلمین ☆ والصلوٰة والسلام علی رسوله رحمة للعلمین ☆ وعلی اله وصحابه اجمعین"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"فقیه واحد اشد علی الشیطان من الف عابد" (ترمذی ، ابن ماجه ، مشکوة کتاب العلم

یعنی ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابد سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔

ہزار عابد سے مراد معین تعداد نہیں بلکہ "المراد الکثرة" مراد کثیر عبادت گذار لوگ ہیں خواہ ہزار سے زائد ہی کیوں نہ ہوں ، ایک فقیہ کثیر عابدوں کی بنسبت شیطان پر سخت اور بھاری کیوں ہے؟ اس لئے کہ جب شیطان مکروفریب کے دروازے کھولتا ہے تو فقیہ اسے جانتا ہے وہ اپنی تقریر وتحریر کے ذریعے دوسرے لوگوں کو بھی اس کے مکروفریب سے آگاہ کرتا ہے اس طرح وہ شیطانی راستے کو بند کرتا ہے کیونکہ جب لوگ شیطان کے جال میں نہیں پھنستے تو وہ رسوا ہو جاتا ہے۔

لیکن عابد اپنی عبادت میں مشغول رہتا ہے اسکی توجہ ہی شیطانی مکروفریب کی طرف نہیں ہوتی، اس لئے وہ تو خود شیطانی جال کی زد میں ہوتا ہے دوسروں کو کیا بچائے گا خیال رہے کہ فقیہ یعنی عالم سے مراد باعمل عالم ہے اور عابد سے مراد بے علم عابد ہے۔

اعتراض : اس حدیث کے متعلق تو طبرانی نے لکھا ہے "سنده ضعیف وله شواهد اسانیدها ضعیفة" اس کی سند ضعیف ہے اور اس کے ضعیف ہونے پر کثیر شواہد پائے جاتے ہیں؟

جواب : طبرانی نے اگر چہ اسی حدیث کے متعلق لکھا ہے لیکن سند اس کی دوسری ہے وہ بیہقی نے شعب میں اور طبرانی نے اوسط میں ذکر کی ہے جسکی سند حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تک پہنچتی ہے۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

"لکن کثرة طرقه تخرجه من الضعف خصوصا حیث اعتضده بروایة الترمذی وابن ماجه عن ابن عباس"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث بے شک راویوں کے لحاظ سے ضعیف ہے لیکن

کثرت طرق کی وجہ سے ضعف سے خارج بلکہ حسن لغیرہ ہے خصوصا جب اس کو تائید حاصل ہے ترمذی اور ابن ماجہ کی روایت سے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ واضح ہوا کہ حضرت ابن عباس کی سند سے مروی حدیث نے تو حضرت ابو ہریرہ سے مروی حدیث کو بھی ضعف سے نکال دیا ہے، یہ خود ضعیف نہیں۔ (مرقاۃ جلد ۱ ص ۲۸۴)

اجتہاد کے درجہ کا علم فرض کفایہ ہے:

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة "

ہر مسلمان پر علم کا حاصل کرنا فرض ہے۔ ہر مسلمان پر جس علم کا حاصل کرنا فرض عین ہے یہ وہ علم ہے کہ جس کے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے، خالق ہونے کا علم، اس کی وحدانیت کا علم اور اس کے رسولوں کی نبوت کا علم، اور نماز کی کیفیت کا علم فرض عین ہے یعنی یہ باتیں ہر شخص کو جاننا ضروری ہیں اگر کوئی ان چیزوں سے بے خبر رہا تو گناہگار ہوگا۔

"واما بلوغ رتبة الاجتهاد والفتیا ففرض کفایة" (از مرقاۃ ج ۱ ص ۲۸۴)

یعنی اجتہاد اور فتوی دینے کی حد تک علم حاصل کرنا فرض کفایہ ہے۔ تقریبا ستاون میل کے اندر کوئی ایک بھی ایسا عالم پایا جائے جو تفصیلی علم رکھتا ہو تو دوسرے لوگ گنہگار نہیں ہونگے ورنہ تمام گناہگار ہونگے۔

اس سے واضح ہوا کہ تفصیلی علم حاصل کرنا ہر شخص پر فرض نہیں لیکن مسائل کا خود علم نہ رکھنے کی وجہ سے مجتہد عالم کی طرف رجوع کرنا ضروری ہوگا۔

فائدہ: " فان قیل ما الفرض قبل الفرض فقل العلم قبل العمل وان قیل ما الفرض فی الفرض فقل الاخلاص فی العلم والعمل وان قیل ما الفرض بعد العمل فقل الخوف والرجاء ' (مرقاۃ ج ۱ ص ۲۸۴)

اگر کہا جائے کہ فرض سے پہلے کیا فرض ہے تو تم کہو عمل سے پہلے علم یعنی فرض دونوں ہی ہیں لیکن علم پہلے اور عمل بعد میں) اگر کہا جائے کہ فرض میں فرض کیا ہے تو تم کہو علم اور عمل میں خلوص (یعنی جس طرح علم اور عمل فرض ہیں اسی طرح ان میں خلوص بھی فرض ہے) اگر کوئی کہے عمل کے بعد کیا چیز فرض ہے تو تم کہو خوف اور امید (یعنی عمل بھی فرض ہے اور عمل کے بعد یہ

بھی فرض ہے کہ انسان بخشش کی امید بھی رکھے اور اللہ تعالے کے عذاب سے ڈرتا بھی رہے، یہ امید وبیم بھی فرض ہے۔

فقہ کیا ہے؟

فقہ کا لغوی معنی ہے ''سمجھنا'' اور اہل شرع کے نزدیک فقہ ایک خاص علم کا نام جسکی تعریف یہ ہے:

'' الفقة هو العلم الحاصل بجملة من الاحكام الشرعية الفرعية بالنظر والاستدلال'' (مقدمہ نور الانوار)

فقہ وہ علم ہے کہ نظر واستدلال سے تمام احکام شرعیہ فروعیہ حاصل ہوں۔

فقہ کی تعریف میں لفظ علم استعمال کیا گیا ہے یہ بمعنی یقین کے ہے یعنی جس کے ذریعے احکام شرعیہ فروعیہ کا یقین حاصل ہو اگر گمان حاصل ہوا تو وہ حقیقی معنی کے لحاظ سے فقہ نہیں اگر چہ مجازاً اسے فقہ کہہ لیا جاتا ہے۔ اور یہ بیان کیا ہے کہ تمام احکام کا علم حاصل ہو اسلئے کہ اگر کسی کو ایک دو مسئلے آ جائیں تو اس کے علم کو فقہ نہیں کہا جائے گا۔

یہ کہا گیا کہ احکام بھی شرعی ہوں، اس لئے کہ اگر عقلی یا حسی اشیاء کا علم حاصل ہو جائے تو اسے فقہ نہیں کہتے۔ فروعیہ کہا گیا ہے جسکا مطلب ہے کہ وہ علم جو خود دلیلوں کے حجت ہونے کا ہے یعنی قرآن سنت (حدیث)، اجماع اور قیاس دلائل فقہ ہیں اس چیز کے جاننے کا نام فقہ نہیں بلکہ ان سے حاصل ہونے والے مسائل کا نام فقہ ہے نیز اصولی اشیاء کا علم بھی فقہ نہیں توحید باری تعالیٰ رسالت ونبوت، قیامت کا علم جنت ودوزخ وغیرہ اس قسم کے عقائد کا علم فقہ نہیں۔

فقیہ کون ہے؟

''ولم يطلق الفقيه الاعلى المستنبطين منهم يعنى يشترط لهم ملكة الاستنباط الصحيح وهو ان يكون مقرونا بشرائطه'' (از توضیح)

یعنی فقیہ وہ ہوگا جسے تمام احکام شرعیہ فرعیہ کے استنباط صحیح کا ملکہ حاصل ہو اور استنباط صحیح کی تمام شرائط پائی جائیں یعنی مجتہد ہو اور اجتہاد کی شرائط اسمیں پائی گئی ہوں۔

وشرط الاجتهاد ان يحتوى علم الكتاب بمعانيه اللغوية والشرعية ووجوهه التى

قلنا من الخاص والعام والامر والنهي وسائر الاقسام السابقة وعلم السنة بطرقها المذكورة وان يعرف وجوه القياس بطرقها وشرائطها. (از منار و نورالانوار ص ۲۴۲)

اجتہاد کی شرط یہ ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے معانی لغویہ اور شرعیہ پر انسان حاوی ہو اور اصول فقہ کے تمام ضوابط یعنی خاص، عام، مشترک، ماؤل، ظاہر، نص، مفسر، محکم، خفی، مشکل، مجمل، متشابہ، حقیقت، مجاز، صریح، کنایہ، عبارۃ النص، دلالۃ النص، اشارۃ النص، اقتضاء النص، اور امر و نہی وغیرہ کو جانتا ہو، اور تمام طریقوں کا علم اسے سنت میں بھی حاصل ہو جیسے قرآن پاک کا علم ان طریقوں کے مطابق ہونا ضروری ہے نیز قیاس کے تمام طریقے اور انکی شرائط کو جانتا ہو۔

خیال رہے کہ جو مسائل کتاب وسنت واجماع سے ثابت ہوں ان میں قیاس واجتہاد نہیں ہوگا البتہ ایک مسئلہ مختلف احادیث سے مختلف طریقوں سے ثابت ہو رہا ہو تو ان احادیث میں تطبیق دینا اور مسئلہ کا استنباط کرنا مجتہد کا کام ہے اسی طرح قرآن پاک کی آیت اور حدیث میں اگر بظاہر تعارض نظر آ رہا ہو تو اس تعارض کو ختم کرنے کے لیئے اجتہاد ہوگا۔

اسلام کے پہلے فقیہ و مجتہد:

رسول اللہ ﷺ کے صحابی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں آپ سے پوچھا گیا کہ ایک عورت کا خاوند جماع سے پہلے ہی فوت ہو گیا اور نکاح کے وقت اسکا مہر بھی مقرر نہیں کیا گیا تھا اسکا کیا حکم ہے یعنی وہ عورت کتنا مہر لینے کی حقدار ہے؟ آپ نے فرمایا:

"اجتهد فيها برايي ان اصبت فمن الله وان اخطات فمني ومن الشيطان"

میں اپنی رائے سے اس میں اجتہاد کروں گا اگر میں نے درست بیان کر دیا تو یہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور مہربانی ہوگی اور اگر میں نے اس میں غلط فیصلہ کیا تو میرے اجتہاد میں میری اپنی ہی غلطی ہوگی یا شیطان کی طرف سے شک ڈالا گیا ہوگا۔

آپ نے اس مسئلہ میں ایک ماہ تک اجتہاد کرنے کے بعد یہ فیصلہ صادر فرمایا "اری لها مهر مثل نسائها لا وكس ولا شطط" میں نے اپنے اجتہاد سے یہ مسئلہ حاصل کیا کہ اسکا مہر اس کے خاندان کی اس جیسی عورتوں کی مثل ہوگا یعنی وہ مہر مثل کی حقدار ہے نہ اس سے کچھ کم ہوگا اور نہ زائد۔

آپ کا یہ قول سنکر ایک صحابی نے کہا کہ حضور ﷺ نے بھی ایک عورت کے متعلق یہی فیصلہ کیا تھا۔ یہ سن کر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بہت خوش ہوئے کہ میرا اجتہاد نبی کریم ﷺ کے فیصلہ کے مطابق ہوگیا کیونکہ آپ نے پہلے اس مسئلہ کے متعلق کسی سے نہیں سنا تھا کہ نبی کریم ﷺ نے بھی اس میں کوئی حکم فرمایا ہے۔

" وکان ذالک بمحضر من الصحابة ولم ینکر علیه احد منهم"

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ اجتہاد کئی صحابہ کرام کی موجودگی میں فرمایا اور کسی نے انکار نہیں کیا لہٰذا اس مسئلہ پر اجماع صحابہ ہوگیا کہ اجتہاد کیا جاسکتا ہے، اور اجتہاد میں غلطی کا بھی گمان ہوسکتا ہے اور اجتہاد صحیح بھی ہوسکتا ہے۔

مجتہد کو اجتہاد کرنیکا ثواب ہر حالت میں حاصل ہوگا اگر درست فیصلہ ہوا تو دو ثواب حاصل ہونگے ایک اجتہاد کا، اور دوسرا درست فیصلے کا اور اگر خطا ہوگئی تو بھی اجتہاد کا ثواب ضرور حاصل ہوا۔
(از نور الانوار ص ۲۴۶)

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بعد کے فقہاء کرام:

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد مزید فقہ کی مزید وضاحت حضرت علقمہ بن قیس نے کی، یہ ابراہیم نخعی کے ماموں ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی ظاہری حیات میں ہی پیدا ہوگئے تھے انہوں نے حضرت ابن مسعود، حضرت علی، حضرت ابوالدرداء اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے علم حاصل کیا اور ان سے ہی قرآن پاک پڑھا۔ ان کے بعد ابراہیم بن یزید نخعی نے مختلف فوائد و نوادر جمع کئے اور ان کے بعد مزید وضاحت اور چھان بین حضرت حماد مسلم کوفی نے کی۔

ان کے بعد اثر اصول وضوابط امام الائمہ سراج الامۃ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مرتب فرمائے، سب سے پہلے فقہ کو تدوین کرنے والے آپ ہی ہیں آپ نے ہی فقہ کی کتب کو کتاب باب وغیرہ میں مرتب فرمایا اور آج تک اسی پر فقہی کتب مرتب ہو رہی ہیں خیال رہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بھی اپنے مؤطا میں امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی ترتیب ہی کی

تابعداری کی ہے۔ کتاب الفرائض اور کتاب الشروط کو بھی سب سے پہلے مرتب کرنے والے امام اعظم ہی ہیں، آپ کے بعد امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ نے امام صاحب کے بیان کردہ اصول وضوابط میں مزید نظر فرمائی اور فروع کا استنباط کیا ان کے بعد مزید وضاحت اور استنباط امام محمد بن حسن شیبانی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کیا۔ (شامی جلد ۱ ص ۳۵)

تقلید کیا ہے؟

" التقليد اتباع الرجل غيره فيما يقول او فی فعله علی زعم انه محق بلانظر فی الدليل فكان المقلد جعل قول الغير او فعله قلادة فی عنقه كذافی مختصر المنار "

(حاشیہ نور الانوار ص ۲۱۶)

تقلید کا لغوی معنی ہے گردن میں قلادہ یعنی پٹا ڈالنا۔ اور اصطلاحی معنی یہ ہے کہ غیر کے قول اور فعل کی تابعداری کرنا یہ قوی اور غالب گمان کرتے ہوئے کہ اس شخص کا قول اور فعل حق ہے اس کے دلائل کو بھی نہ دیکھا جائے کہ اس کے دلائل کس درجہ کے ہیں لغوی اور اصطلاحی معنی میں مطابقت واضح ہے کہ تقلید کرنے والے نے گویا اپنے گلے میں غیر کے قول وفعل کا قلادہ ڈال لیا ہے۔

تقلید صرف مجتہد کی ہوگی:

صاحب منار نے تحریر فرمایا ہے "تقليد الصحابی واجب يترك به القياس" صحابی کی تقلید واجب ہے اس کے ذریعے قیاس کو چھوڑ دیا جائیگا۔ اس عبارت کی وضاحت میں صاحب قمر الاقمار فرماتے ہیں

"والمراد بالصحابی الصحابی المجتهد كذافی التلويح فان رواية الصحابی الغير المجتهد قدتترک اذاكالف القيس من كل وجه فوله اولی بالترک "

(نور الانوار ص ۲۱۶)

صحابی سے مراد وہ صحابی ہے جو مجتہد ہو یعنی مجتہد صحابی کے قول کے خلاف اگر قیاس ہو تو اسے چھوڑ دیا جائیگا۔ جیسا کہ اصول فقہ کی مشہور کتاب تلویح میں بھی ذکر ہے لیکن غیر مجتہد صحابی کی روایت جب قیاس کے سراسر مخالف ہو اور ان میں تطبیق کی کوئی وجہ نہ ہو تو وہاں قیاس پر عمل

ہوگا اور قول صحابی کو چھوڑ دیا جائے گا۔

مذاہب اربعہ حق ہیں:

مذہب حنفی، مذہب مالکی، مذہب شافعی اور مذہب حنبلی چاروں حق ہیں ان چاروں مذاہب میں جس کسی کی تقلید کی جائے صحیح ہے تقلید کرنے والا گناہ گار نہ ہوگا کیونکہ مجتہد سے اپنے اجتہاد میں خطا بھی ہو جائے تو وہ گناہگار نہیں۔ وہ اپنے اجتہاد کے مطابق عمل کرے تو اسکا عمل صحیح ہوگا اور اس کی تقلید بھی اس اجتہاد میں صحیح ہوگی۔

"ان المجتهد يخطي ويصيب والحق في موضع الخلاف واحد لكن لايعلم ذلك الواحد باليقين فهذا قلنا بحقيه المذاهب الاربعة اى الحنفي والشافعي والمالكي والحنبلي" (منار، نور الانوار، قمر الاقمار ۲۴۶)

بے شک مجتہد سے اجتہاد میں کبھی خطا ہو جاتی ہے اور کبھی اسکا اجتہاد درست ہوتا ہے جب مجتہدین کے اجتہادات مین اختلاف ہو تو حق صرف ایک میں ہے ہوگا کیونکہ یقینی طور پر معلوم نہیں کہ کس اجتہاد میں حقانیت ہے اسلئے چاروں مذاہب یعنی حنفی، شافعی مالکی اور حنبلی حق ہونگے۔ خیال رہے کہ ایک کے حق ہونے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان میں سے حق ایک ہی ہے۔

"ان الله تعالى في كل مسئالة فيها المجتهدون حكما معينا فمن اصابه اصاب ومن اخطأه اخطاء" (قمر الاقمار حاشیہ نور الانوار ص ۲۴۶)

یعنی جس مسئلہ میں مجتہدین کا اختلاف ہوگا ان مختلف اجتہادات میں سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک ہی حکم معین ہوگا جس کو اس کی طرف سے توفیق کامل حاصل ہوئی اس نے راہ حق کو پالیا اور دوسرے سے خطا واقع ہوگئی۔ لیکن خیال رہے کہ تقلید کرنے والے صرف دلائل کی برتری اور طرز استدلال کو دیکھ کر کسی ایک مذہب کو ترجیح دیں گے اسلئے جس مذہب کو غالب سمجھ کر کسی نے تقلید کر لی وہی اس کے حق میں درست ہوگا۔

مذاہب اربعہ کے بغیر تقلید منع ہے:

"ولايجوز تقليد ماعدا المذاهب الاربعة ولو وافق قول الصحابة والحديث

الصحیح والایة فالخارج عن المذاهب الاربعة ضال مضل وربما اداه ذالک الی الکفر لان الاخذ بظواهر الکتاب والسنة من اصول الکفر "

(صاوی ، سورۃ الکہف ایۃ واذکر ربک اذا نسیت)

ان چاروں مذاہب کے علاوہ کسی اور مذہب کی تقلید درست نہیں اگرچہ وہ بظاہر صحابہ کے قول اور حدیث اور کسی آیت کے مطابق ہی کیوں نہ ہو، جو ان چاروں مذاہب سے خارج ہے وہ گمراہ ہے اور گمراہ کرنے والا ہے کیونکہ بسا اوقات یہ کفر تک پہنچا دیتا ہے اسلئے کہ قرآن وحدیث کے ظاہری معانی مراد لینا اور انکی حقیقت کو نہ سمجھنا کفر کی جڑ ہے۔

تقلید بہت ضروری ہے:

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا.....!فاسئلوا اهل الذکر ان کنتم لاتعلمون تم اہل علم سے پوچھ لو اگر تم خود نہیں جانتے۔اہل ذکر سے مراد کون ہیں؟فاسئلوا المؤمنین العالمین من اهل القرآن (خازن) یعنی جو مومن ہیں اور قرآن کا علم رکھتے ہیں ان سے پوچھ لو اگر تم خود نہیں جانتے۔مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں علامہ سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ درمنثور میں فرماتے ہیں:

" اخرج ابن مردویه عن انس قال سمعت النبی ﷺ یقول ان الرجل یصلی ویصوم ویحج ویغزو وانه لمنافق قالوا یارسول الله بما ذا دخل علیه النفاق قال لطعنه علی امامه' وامامه من قال الله فی کتابه فاسئلوا اهل الذکر ان کنتم لاتعلمون"

ابن مردویہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ وہ کہتے ہیں میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے سنا کہ بیشک ایک شخص نماز پڑھتا ہوگا، روزے رکھتا ہوگا، حج کرتا ہوگا اور جہاد کرتا ہوگا لیکن وہ منافق ہوگا۔صحابہ نے عرض کی، یا رسول ﷺ! وہ کس وجہ سے منافق ہوگا؟ آپ نے فرمایا! اپنے امام پر طعنہ کرنے کی وجہ سے، امام کون ہے؟ فرمایا، رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:فاسئلوا اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون.

تقلید مذاہبِ اربعہ ہی کی کیوں ضروری ہے:

صرف ان چاروں ائمہ کی ہی تقلید ہوسکتی ہے کسی اور کی نہیں کیونکہ ان حضرات نے ہی وہ قوانین وضوابط

مرتب فرمائے ہیں جن کے ذریعہ مسائل کا حل نکالا جا سکتا ہے اور باقی تمام لوگ ان کے ہی پیروکار ہیں ۔خیال رہے کہ غیر مقلدین بھی اپنے دلائل وہی پیش کرتے ہیں جو کسی نہ کسی امام کے مذہب میں پیش کیے گئے ہیں ۔تمام حنفی فقہاء امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مقلد ہیں

تمام فقہاء کے کل سات درجے ہیں :

پہلا درجہ ان حضرات کا جو مجتہد فی الشرع ہیں جس طرح چاروں امام یعنی امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم اجمعین انہی حضرات نے فقہ کے قواعد واصول مرتب فرمائے ہیں۔

دوسرا درجہ ان حضرات کا ہے جو مجتہد فی المذہب ہیں جیسے امام ابو یوسف، امام محمد، رحمۃ اللہ علیہما اور امام اعظم کے دیگر شاگرد جن کو یہ طاقت حاصل تھی کہ وہ اپنے امام اور استاذ کے بتائے ہوئے قوانین کے ذریعے قرآن وحدیث سے مسائل نکال سکتے تھے۔

تیسرا درجہ مجتہدین فے المسائل کا ہے یہ وہ حضرات ہیں جو اصول اور فروع میں اپنے امام کے مقلد ہیں ہاں البتہ جن مسائل میں کوئی نص نہیں پائی جاتی یہ حضرات وہ مسائل اپنے امام کے بنائے ہوئے اصول وقوانین سے نکالنے کی طاقت رکھتے ہیں ۔ جیسے خصاف، ابوجعفر طحاوی، ابوالحسن کرخی، شمس الائمہ حلوانی، شمس الائمہ سرخسی ،فخر الاسلام بزدوی ،فخر الدین قاضیخان وغیرہ۔

چوتھا درجہ مقلدین میں اصحاب تخریج کا ہے یہ حضرات اجتہاد پر تو بالکل قادر نہیں ہوتے لیکن انہیں قوانین اور ماخذ کا علم ہوتا ہے اگر کوئی مسئلہ مجمل ہوتا اور اس میں دو وجوہات ہوتیں یا اسی طرح کوئی مسئلہ مبہم ہوتا جس میں دو احتمال پائے جاتے تو یہ ترجیح دے سکتے تھے جیسے رازی وغیرہ۔

پانچواں درجہ مقلدین میں اصحاب ترجیح کا ہے یہ وہ حضرات ہیں جو روایات کے متعلق یہ فیصلہ کرنے کی طاقت رکھتے تھے کہ یہ اولیٰ ہے، یہ اصح ہے، یہ لوگوں کی لئے بہتر اور آسان ہے جیسے ابوالحسن قدوری اور صاحب ہدایہ۔

چھٹا درجہ مقلدین میں سے ان حضرات کا ہے جو زیادہ قوی اور قوی اور ضعیف کے درمیان فرق

کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور ظاہر اور روایات نادرہ وغیرہ میں تمیز کر سکتے تھے جیسے متأخرین فقہاء کرام جنہوں نے وہ کتب تصنیف کیں جنہیں متن کہا جاتا ہے جیسے صاحب کنز، صاحب مختار، صاحب وقایہ، صاحب مجمع وغیرہ۔ یہ حضرات اقوال مردود اور روایات ضعیفہ نقل نہیں کرتے۔

ساتواں درجہ ان فقہائے کرام کا ہے جو ان چھ مذکورہ مدارج میں سے کسی درجہ پر نہیں ہوتے بلکہ انہیں صرف یہ مقام حاصل ہوتا ہے کہ وہ فقہ کی کسی کتاب کو دیکھ کر مسئلہ بتا سکتے ہیں۔ جو فقہ کی کتب کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہو اسے ہم فقیہ اعظم اور فقیہ العصر کے القاب دیتے ہیں یہ کامل طور پر مقلد ہوتے ہیں۔

(ارشامی ج ۱ ص ۵۷)

تنبیہ: ایک درجہ کے فقہاء ایک دوسرے کے مقلد نہیں ہوتے لیکن اوپر والے درجہ کے فقہاء کے مقلد کی حیثیت میں ہوتے ہیں اگرچہ درحقیقت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ ہی کے مقلد ہوتے ہیں۔

امام اعظم کے شاگردوں کا آپ سے کئی مسائل میں اختلاف کیوں؟

ایک مرتبہ امام اعظم رحمۃ اللہ تعالی علیہ نے ایک بچہ کو کیچڑ میں کھیلتے ہوئے دیکھ کر فرمایا، دیکھنا کہیں گر نہ جانا۔ اس بچے نے عرض کی:

" احذر انت السقوط فان فی سقوط العالم سقوط العالم "

آپ احتیاط کرنا کیونکہ ایک عالم کے پھسلنے اور گرنے سے تمام جہان گر جاتا ہے۔

یعنی عالم کی غلطیوں سے لوگ غلطی میں پڑ جاتے ہیں۔ اس واقعہ کے بعد امام صاحب نے اپنے اصحاب کو حکم دیا: " ان توجه لكم دليل فقولوا به "۔

اگر تمہیں کوئی دلیل نظر آئے تو اس کے مطابق تم مسئلہ بیان کر دیا کرو، آپ کا یہ ارشاد آپکے کامل تقوی پر دلالت کرتا ہے آپ کے اس ارشاد کے باوجود آپ کے تلامذہ نے آپکے بیان کردہ اصول وضوابط کے خلاف کوئی قانون نہیں وضع کیا بلکہ آپکے اصولوں کے مطابق ہی مسائل میں اجتہاد کیا ہے۔

امام ابو یوسف فرماتے ہیں:

" ماقلت قولا خالفت فيه اباحنيفة الا قولا قد كان قوله "

یعنی میں نے امام اعظم علیہ الرحمۃ کے کسی قول کی سوائے ایک قول کے مخالفت نہیں کی۔

امام زفر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

" ماخالفت اباحنیفة فی شئی الاقد قاله ثم رجع عنه "

میں نے امام صاحب کے کسی قول کی مخالفت نہیں کی ہاں البتہ آپ کا ایسا کوئی قول ہو جس سے آپ نے خود ہی رجوع فرمالیا ہو تو اس کی مخالفت اگرچہ میں نے کی لیکن وہ بھی درحقیقت مخالفت نہیں کیونکہ آپ نے اسے ترک کر دیا تھا۔

" فهذا اشارة الی انهم ماسلكوا الطريق الخلاف بل قالوا ماقالوا عن اجتهاد ورأی اتباعا لما قاله استاذهم ابو حنیفة رحمه الله تعالیٰ "(درمختار و شامی ج ا ص ۴۹، ۵۰)

اس سے واضح ہوا کہ امام صاحب کے شاگردوں نے آپ کے مخالف کسی راہ کو اختیار نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنے اجتہاد یا اپنی رائے سے جو مسئلہ بھی بیان کیا ہے اس میں انہوں نے اپنے استاذ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہی کی تابعداری کی ہے۔

اس بحث سے واضح ہوا کہ تمام فقہاء کے طبقات امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے ہی مقلد ہیں اور آپکے شاگرد بھی آپ ہی کے مقلد ہیں ایک درجے کا فقیہ اپنے ہی درجے کے فقیہ کا مقلد نہیں نیز ہمارے زمانے کے سب فقہاء پہلے تمام فقہاء کے تابع ہیں۔

تقلید کن مسائل میں جائز ہے؟

علامہ اسماعیل حقی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر روح البیان میں آیۃ "نصیبهم غیر منقوص" کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

" وفی الاية ذم التقليد وهو قبول قول الغير بلادليل وهو جائز فی الفروع والعمليات ولايجوز فی اصول الدين والاعتقاديات بل لابد من النظر والاستدلال "

تقلید صرف فروعی مسائل اور عملیات میں ہے اصول دین اور اعتقادی مسائل میں تقلید جائز نہیں بلکہ ان میں نظر و استدلال ضروری ہے آیت کریمہ میں جس تقلید کی مذمت کی گئی ہے وہ یہی ہے کہ اعتقادیات اور اصول دین کو بغیر نظر و استدلال کے صرف کسی شخص کے کہنے پر تسلیم

نہ کیا جائے۔

اپنے امام کے مذہب کو حق ماننا واجب ہے:

" اذا سئلنا عن مذهبنا ومذهب مخالفنا قلنا وجوبا مذهبنا صواب يحتمل الخطاء ومذهب مخالفنا خطاء يحتمل الصواب " (مقدمه در مختار)

جب ہم سے ہمارے مذہب (مذہب حنفی) اور دوسروں کے مذہب کے متعلق سوال کیا جائے تو ہم پر واجب ہوگا کہ ہم یہ جواب دیں، ہمارا مذہب حق اور درست ہے اور غلطی کا اس میں بہت ہی کم احتمال ہے جبکہ ہمارے غیر کا مذہب درست نہیں اور اس کے صحیح ہونے کا بہت ہی کم احتمال ہے۔

" واذا سئلنا عن معتقدنا ومعتقد خصومنا قلنا وجوبا بالحق ما نحن عليه والباطل ما عليه خصومنا " (درمختار)

اور جب ہم سے پوچھا جائے کہ ہمارا عقیدہ سچا ہے یا ہمارے مخالفین کا تو ہم پر یہ جواب دینا واجب ہے کہ ہمارا عقیدہ حق، اور سچ اور درست ہے اور ہمارے مخالفین کا عقیدہ باطل ہے۔

یعنی ہمیں اپنے عقیدے کی اور اپنے مذہب کی حقانیت پر کامل یقین ہو کیونکہ یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے عقیدے اور مذہب میں متزلزل اور متردد نہ ہوں۔

درمختار کی اس عبارت پر علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

" عن معتقدنا اى عما نعتقده من غير المسائل الفرعية مما يجب اعتقاده على كل مكلف بلا تقليد لاحد وهو ما عليه اهل السنة والجماعة وهم الاشاعرة والماتريدية وهم متوافقون الافى مسائل يسيرة اربعها بعضهم الى الخلاف اللفظى " (شامى ج ا ص ۳۶)

عقیدہ سے مراد فروعی مسائل کے بغیر اصول دین ہیں عقائد میں ہر مکلف یعنی عاقل و بالغ کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی شخص کی تقلید کے بغیر ان پر اعتقاد رکھے۔ (فروعی مسائل میں تقلید واجب ہوگی) عقائد صحیحہ صرف وہی ہونگے جن پر اہل سنت و جماعت یعنی اشاعرہ اور ماتریدیہ کا اجماع ہے، انکا آپس میں بہت ہی کم اختلاف ہے وہ بھی بعض حضرات کے نزدیک لفظی اختلاف ہے۔

علامہ شامی کی اس تحقیق کے بعد یہ واضح ہوگیا کہ اعتقادیات یعنی اصول دین میں تقلید نہیں، صرف فروعی مسائل میں تقلید ہوگی۔ اسی وجہ سے صاحب درمختار نے بھی مذہب اور عقیدہ کا الگ الگ ذکر کیا ہے کیونکہ مذہب سے مراد فروعی مسائل میں امام کی تقلید ہے اور عقیدہ سے مراد اصول دین ہیں جنہیں بغیر تقلید کے تسلیم کرنا اوران پر قائم رہنا واجب ہے۔

خیال رہے کہ صریح احکام جن میں احادیث متعارض نہیں ان میں بھی تقلید نہیں اور نہ ہی ان میں کسی امام کا اختلاف ہے جیسے نماز کی رکعتیں یعنی فجر کی نماز دو رکعت فرض ہیں اور ظہر کی چار، اسی طرح رمضان کے پورے مہینے کے روزے فرض ہیں، اس قسم کے مسائل میں تقلید نہیں۔

صحابہ کرام پر کس کی تقلید ضروری تھی؟

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کہ فقہاء کرام کے کئی طبقات ہیں ہر طبقہ کے لوگوں کو اپنے ہی درجے کے لوگوں کا مقلد ہونا ضروری نہیں البتہ اپنے سے اوپر والے درجے کے فقہاء کا مقلد ہونا ضروری ہے اس سے واضح ہوگیا کہ صحابہ کرام کو آقائے دو جہاں ﷺ کے ہوتے ہوئے کسی کی تقلید کی ضرورت نہ تھی وہ جب چاہتے نبی کریم ﷺ سے مسائل پوچھ لیتے تھے اسلئے انکو دین سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی تھی۔

اسی طرح تابعین صحابہ کرام کی طرف رجوع فرما لیتے تھے اور انکو بھی کسی ایسے امام کی ضرورت نہیں تھی لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا مسائل کو سمجھنا اور احادیث میں تطبیق دینا دشوار ہوتا چلا گیا اسلئے بعد کے لوگوں کو ائمہ کی تقلید کرنا واجب ہوا کیونکہ ان ائمہ نے مسائل کے حل اور احادیث میں تطبیق کے لئے اصول وضوابط مقرر فرما دیئے۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کو فوقیت کیوں؟

1: مذہب حنفی کی فضیلت کی سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ تابعی ہیں اور تابعی کا قول حدیث قولی ہے اور تابعی کا فعل حدیث فعلی ہے اور تابعی کے سامنے کوئی کام کیا جائے اور وہ اس سے نہ روکے تو وہ حدیث تقریری ہے یعنی جس طرح نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے اقوال وافعال اوران کا کسی کام کے کرنے سے نہ روکنا احادیث ہیں اسے طرح تابعی کے بارے میں بھی یہی حکم ہے

قوت اور ضعف کا فرق ہوگا لیکن حدیث ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور خصوصاً جبکہ تابعی بھی وہ ہو جسے علم اور تقویٰ کا اعلیٰ مقام حاصل ہو تو یقیناً اس کے اقوال نے حجت ہونا ہی ہے۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا تابعی ہونا:

" ادرک بالسن نحو عشرین صحابیا " (مقدمہ درمختار)

آپ نے اپنی عمر میں تقریباً بیس صحابہ کرام سے ملاقات کی۔

جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

ابن نفیل، واثلہ، عبداللہ بن عامر، ابن ابی اوفیٰ، ابن جزء، عتبہ، مقداد، ابن بسر، ابن ثعلبہ، سہل بن سعد، انس، عبدالرحمٰن بن یزید، محمود بن لبید، محمود بن ربیع، ابوامامہ، ابوالطفیل، عمرو بن حریث، عمرو بن سلمہ، ابن عباس، سہل بن منیف رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

"وصح ان اباحنیفة سمع الحدیث من سبعة من الصحابة " (مقدمه درمختار)

صحیح طور پر یہ بات ثابت ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے سات صحابہ کرام سے احادیث بلاواسطہ سنیں ہیں:

" ولم یثبت ذلک لاحد من ائمة المعاصرین له کالاوزاعی بالشامی والحمادین بالبصرة والثوری بالکوفة ومالک بالمدینة الشریفة واللیث بن سعد بمصر " (شامی ج ۱ ص ۴۸)

علامہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے کوفہ میں صحابہ کی ایک جماعت کو پایا اور یہ مقام آپ کے زمانے کے دوسرے اکابر ائمہ کو حاصل نہیں ہوسکا جن میں ملک شام میں اوزاعی، بصرہ میں حمادین، کوفہ میں ثوری، مدینہ طیبہ میں امام مالک اور مصر میں لیث بن سعد علیہم الرحمۃ تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے لئے دعا:

دوسری وجہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کی فوقیت کی یہ ہے کہ آپکے لئے شیر خدا، حیدر کرار حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے دعا فرمائی جو یقیناً قبول ہوئی اسی وجہ سے کسی امام کو آپکا

سا مرتب حاصل نہ ہوا دعا کی۔ یقینی قبولیت کا میں نے اسلیئے ذکر کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سید الاولیاء اور مستجاب الدعوات ہیں۔

وقد ثبت ان ثابتا ادرک الامام علی بن ابی طالب فدعا له ولذریتة بالبرکة

(مقدمہ در مختار)

یعنی تحقیق یہی ہے کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے والد حضرت ثابت بن نعمان (آپ اپنے دادا کے ہم نام ہیں) نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضری دی تو انہوں نے ان کے لئے اور انکی اولاد کے لئے برکت کی دعا فرمائی۔

اسی لئے امام اعظم کے پوتے اسماعیل بن حماد بن نعمان بن ثابت فرماتے ہیں، نحن نرجو ان یکون اللہ تعالیٰ قد استجاب لعلی فینا. یعنی ہم امید کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے حق میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دعا قبول فرمالی ہے۔ قد استجاب کا معنی یہ ہے یقیناً دعا قبول فرمالی ہے۔

یہ بھی خیال رہے کہ یہ دعا امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش سے پہلے کی ہے کیونکہ آپکی پیدائش ۸۰ھ میں جبکہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت ۴۰ھ میں ہوئی اصل میں جو مشہور ہے کہ امام اعظم کے والد آپکو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس لے گئے اس کی وجہ یہ ہے کہ تاریخ ابن خلکان کے بعض نسخوں میں امام صاحب کے پوتے اسماعیل بن حماد کا قول اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"ولد جدی ابوحنیفة سنة ثمانین وذهب ثابت بجدی الی علی ابن ابی طالب"

یعنی میرے دادا ابوحنیفہ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور انکے باپ ثابت انہیں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس لے گئے، لیکن صحیح نسخہ میں "ذهب ثابت جدی" کے الفاظ ہیں۔

یعنی میرے دادا ثابت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گئے۔

"والظاهر ان لفظة بجدی من زیادة النسخ او الباء زائدة واصله جدی لان علیا مات سنة اربعین من الهجرة" (شامی ج ۱ ص ۴۷)

ظاہر یہی ہے کہ بجدی یا تو کتابت کی غلطی اور یا لفظ باء زائد ہے اصل جدی ہے کیونکہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۴۰ھ میں شہید ہو گئے۔

آپکی فضیلت میں حضور علیہ السلام کے ارشادات:

تیسری وجہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور انکے مذہب کی برتری کی یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے کئی ارشادات ایسے ہیں جو امام صاحب کی افضلیت پر دلالت کرر ہے ہیں اگر چہ بعض احادیث میں صراحت کے ساتھ بھی ذکر ملتا ہے کہ حضور ﷺ نے آپکا نام لے کر آپ کی افضلیت بیان کی ہے لیکن ان احادیث پر بعض حضرات نے جرح کی ہے۔

حدیث نمبر ۱:

" وعنه عليه الصلوة والسلام ان ادم افتخربی و انا افتخر برجل من امتی اسمه نعمان و كنيته ابو حنيفة هو سراج امتی"

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں آدم علیہ السلام کو مجھ پر فخر تھا اور مجھے اپنی امت کے ایک شخص پر فخر ہے جسکا نام نعمان ہوگا اور کنیت ابوحنیفہ۔ وہ میری امت میں ایک چراغ کی حیثیت رکھے گا۔

حدیث نمبر ۲:

" وعنه عليه الصلوة والسلام ان سائر الانبياء يفتخرون بی و انا افتخر بابی حنيفة من احبه فقد احبنی و من ابغضه فقد ابغضنی "

حضور ﷺ فرماتے ہیں، بیشک تمام انبیاء کرام نے مجھ پر فخر کیا اور مجھے ابوحنیفہ پر فخر ہے جس نے اس سے محبت کی وہ میری محبت کی وجہ سے ہی اس سے محبت کرتا ہوگا اور جس نے اس سے بغض رکھا وہ میرے ساتھ بغض رکھنے کی وجہ سے ہی اس سے بغض رکھے گا۔

ان دونوں حدیثوں کے متعلق ابن جوزی نے کہا ہے کہ یہ موضوع ہیں اگر چہ صاحب درمختار نے اسکا رد ان الفاظ سے کیا ہے۔

" وقول ابن الجوزی انه موضع تعصب لانه روی بطرق مختلفة "

ابن جوزی کا موضوع کہنا صرف تعصب کی وجہ سے ہے کیونکہ یہ مختلف طریقوں سے مروی ہے جو حسن لغیرہ کے درجہ میں ہے لیکن علامہ شامی کہتے ہیں کہ ان احادیث کوئی اور حضرات نے بھی موضوع کہا ہے۔ اسلئے علامہ ابن حجر عسقلانی شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب خیرات الحسان میں فرمایا:

" ومن اطلع على مايأتی فی هذا الكتاب من احوال ابی حنيفة و كراماته و اخلاقه

وسیرته علم انه غنی عن ان یستشهد علی فضله بخبر موضوع"
جو شخص اس کتاب میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے احوال، کرامات اخلاق اور سیرت پر مطلع ہوگا اسے معلوم ہو جائے گا کہ آپ کے فضائل پر موضوع احادیث کے دلیل بنانے کی ضرورت نہیں کیونکہ صحیح احادیث آپ کی شان پر دلالت کر رہی ہیں۔

حدیث نمبر ۳:

" روی عنه علیه الصلوۃ ولسلام انه قال ترفع زینة الدنیا سنة خمسین ومأة "
نبی کریم ﷺ نے فرمایا ایک سو پچاس سن ہجری میں دنیا کی زینت کو اٹھا لیا جائے گا۔ اس حدیث کی شرح میں شمس الائمه کردی بیان کرتے ہیں" ان هذا الحدیث محمول علی ابی حیفة لانه مات تلک السنة "یعنی بے شک یہ حدیث امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی شان کو واضح کر رہی ہے کیونکہ آپ کا وصال ۱۵۰ھ میں ہی ہے۔

بخاری اور مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے اور طبرانی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث روایت کی۔

حدیث نمبر ۴:

" ان النبی ﷺ قال لو کان الایمان عند الثریا لتناوله رجال من ابناء فارس "
بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر ایمان ثریا یعنی آسمان کے پاس بھی ہوا تو فارس کے شخص اسے حاصل کر لیں گے۔

ابونعیم نے ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے اور شیرازی اور طبرانی نے قیس بن سعد بن عبادہ سے روایت کی ہے:

"ان النبی ﷺ قال لو کان العلم معلقا عندالثریا لتناوله رجال من ابناء فارس".
بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا، اگر علم آسمان کے پاس بھی لٹکا ہوا ہوگا تو فارس کے شخص اسے حاصل کر لیں گے۔

طبرانی کے الفاظ قیس کی روایت سے یہ ہیں:

" لا تناله العرب لناله رجال من ابناء الفارس "

یعنی جسے عرب حاصل نہیں کرسکیں گے اسے فارس کے شخص حاصل کرلیں گے۔

مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا:

"لو کان الایمان عند الثریا لذهب به رجل من ابناء فارس حتیٰ یتناوله"

اگر ایمان آسمان کے پاس بھی ہوا تو فارس سے ایک شخص جائے گا اور اسے حاصل کرلے گا۔

بخاری اور مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا:

"والذی نفسی بیده لو کان الدین معلقا بالثریا لتناوله رجل من فارس"

ارشاد نبوی ہے، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اگر دین آسمان کے ساتھ بھی ہوا تو فارس کا ایک شخص اسے حاصل کرلے گا۔

اعتراض : امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ ۸۰ھ میں عبدالملک بن مروان کے زمانے میں کوفہ میں پیدا ہوئے، جب آپ شیراز وغیرہ کے نہیں تو یہ حدیثیں آپ پر کیسے صادق آرہی ہیں؟

جواب : جس طرح فقہ وغیرہ کی کتب میں اردو، پنجابی، سرائیکی وغیرہ تمام زبانوں کو ہندیہ کہا گیا ہے اور ہندوستان و پاکستان کے تمام علاقوں کو ملک ہند بولا گیا ہے اسی طرح حجاز سے باہر کے علاقے جن پر اسوقت بلاد عرب کا اطلاق نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کو بلاد عجم کہا جاتا تھا، ان علاقوں کے لیے فارس ہی بولا جاتا تھا اس لئے فارس سے مراد خاص شیراز وغیرہ کا علاقہ نہیں" **و لیس المراد بفارس البلاد المعروفة بل جنس من العجم** " فارس سے مراد خاص فارس کا خطہ نہیں بلکہ اسی کی جنس سے دوسرے عجمی علاقے بھی فارس کہلاتے ہیں۔

دیلمی میں مذکور ہے" **خیر العجم فارس** "یعنی عجم میں سے بہتر حضرات کو فارس کہا جاتا تھا۔

و قد کان جد ابی حنیفه من فارس علی ما علیه الاکثرون" ۔دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے دادا محترم خاص مشہور ملک فارس کے تھے اسلئے بھی آپ کو فارس کا شخص کہا گیا ہے جیسا کہ ہمارے علاقہ میں ہندوستانی، کشمیری وغیرہ کے الفاظ ان لوگوں پر بھی استعمال ہو رہے ہیں جن کے آباؤ اجداد ہندوستان یا کشمیر سے تشریف لائے تھے۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

" هذا الحديث الذى رواه الشيخان اصل صحيح يعتمد عليه في الاشارة لابى حنفيه و هو متفق على صحته "

یہ حدیث جو بخاری اور مسلم نے بیان کی ہے اسکے صحیح ہونے پر اہل علم کا اتفاق ہے اور اسی پر کامل اعتماد کیا جا سکتا ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی شان کی طرف یہ حدیث واضح طور پر اشارہ کر رہی ہے اسلئے موضوع احادیث کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں۔

مواہب کے حاشیہ پر علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک شاگرد علامہ شامی (یہ اور شامی ہیں، مشہور علامہ شامی نہیں) فرماتے ہیں:

" ماجزم به شيخنا من ان اباحنيفة هو المراد من هذا الحديث ظاهر لا شك فيه لانه لم يبلغ من ابناء فارس في العلم مبلغه احد " (شامی ج ۱ ص ۳۹، ۴۰)

ہمارے شیخ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر یقین کیا ہے کہ بخاری و مسلم کی حدیث سے مراد امام ابو حنیفہ ہی ہیں، یہ ظاہر بات ہے اور اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کیونکہ فارس کے علاقوں میں سے کوئی ایک بھی امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے منصب پر نہیں پہنچ سکا۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا علمی مقام:

چوتھی وجہ امام اعظم اور آپکے مذہب کی برتری کی یہ ہے آپ کے علمی مقام کو کسی اور امام نے نہ پایا، ابھی آپ کے علمی مقام کی طرف حدیث پاک میں اشارہ ہونا ثابت ہو چکا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ تقوی کا بادشاہ اور احادیث میں کامل علم رکھنے والا علامہ سیوطی حنفی نہیں، جس نے ثابت کیا ہے کہ حدیث میں بلا شک اشارہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہی کی طرف ہے۔ امام اعظم کے علمی مقام کو سمجھنے کے لئے پہلے آپکے دو مشہور شاگردوں کے علم کا اندازہ کریں پھر خود بخود سمجھ میں آئے گا کہ آپکا مقام کیا ہے۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ:

آپ کا نام یعقوب ہے، کنیت سے ہی مشہور ہیں، امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کردہ اصول وقواعد میں آپ نے دقیق نظر فرمائی، فروع واحکام کے استنباط میں آپ نے اجتہاد فرمایا، قاضی القضاۃ

(چیف جسٹس آف سپریم کورٹ) کے منصب پر قائم رہے، آپ نے حنفی مذہب کو مختلف علاقوں تک پہنچایا

" وهو افقه اهل عصره ولم يتقدمه احد في زمانه وكان النهاية في العلم والحكم والرياسة "

آپ اپنے زمانے میں تمام اہل علم سے زیادہ فقیہ تھے آپکے زمانہ میں کوئی ایک شخص بھی آپ سے زیادہ فقہ میں مہارت نہیں رکھتا تھا آپکو علم و حکمت و ریاست میں اعلیٰ مقام حاصل تھا۔

آپکی پیدائش ۱۱۳ھ میں ہوئی اور وفات بغداد میں ۱۸۲ھ میں ہوئی۔ (شامی ج ۱ ص ۳۷)

آپکو موضوع احادیث ہی ہزاروں کی تعداد میں یاد تھیں تاکہ اگر کوئی شخص کسی مسئلہ پر موضوع حدیث کو بطور دلیل پیش کرے تو دفاع کیا جاسکے اور اسے بتایا جاسکے کہ یہ حدیث تو موضوع ہے۔ صحیح حدیثیں آپکو بہت ہی کثیر تعداد میں یاد تھیں یہاں سے ہی ایک اور سوال خود بخود رد ہوگیا کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو احادیث کا علم نہیں تھا، یہ بہتان عظیم ہے۔ حقیت یہ ہے کہ اسوقت احادیث لکھنے کا رواج کم تھا یاد کرنے کا ہی زیادہ رواج تھا، آپکو ہزاروں بلکہ لاکھوں احادیث یاد تھیں۔ جس شخص نے صحابہ کرام سے بلاواسطہ احادیث سنیں ہوں اور وہ خود بھی تابعی ہو اور اسے جلیل القدر تابعین کے ساتھ بیٹھنے اٹھنے کے ہزاروں مواقع میسر آئے ہوں اسکے متعلق یہ تصور کرنا باطل ہے۔

آپکی کتاب **مسند امام اعظم** اور آپکے شاگرد امام محمد کی **مؤطا امام محمد** اس پر شاہد ہیں کہ آپ سے بڑھ کر کسے حدیث کا علم ہوسکتا ہے۔ صرف یہ خیال کر کے کہنا کہ آپ سے کم احادیث مروی ہیں یا آپ نے کتابی شکل میں احادیث کو جمع نہیں کیا اسلئے آپکو احادیث کا علم نہیں تھا، یہ ایسی عظیم غلطی ہے کہ اس سے معاذ اللہ یہ لازم آئے گا کہ کسی صحابی کو بھی حدیث مین کوئی دسترس حاصل نہ ہو۔ کیونکہ کسی نے بھی کتابی شکل میں احادیث کو جمع نہیں کیا۔ نیز خلفاء راشدین کا علم حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کم ماننا پڑے گا کیونکہ خلفاء راشدین سے مروی احادیث کی تعداد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی احادیث سے بہت ہی کم ہے، لیکن یہ دلیل ہی باطل ہے۔

مقامِ تفکر:

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ۸۰ھ میں اور وفات ۱۵۰ھ میں ہوئی جبکہ امام بخاری کی پیدائش ۱۹۴ھ میں اور وفات ۲۵۶ھ میں ہوئی اور امام مسلم کی ولادت ۲۰۴ھ میں اور وفات ۲۶۱ھ

میں اب آپ خود غور وفکر کریں کہ دوسو سال تک مسلمان کیا دین سے اور علم حدیث سے بے خبر تھے ؟

لوگوں کو گمراہ کرنے کی ایک سازش یہ کی جاتی ہے کہ صرف وہ حدیثیں معتبر ہیں جو صحاح ستہ میں ہیں یہ بھی ایک غلط روش ہے کیونکہ صحیح احادیث صرف صحاح ستہ ہی میں نہیں ہیں ۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

" وقد حدث هذا فرقة من المبتدعة اطالوا السنتهم بالطعن على ائمة الدين بان مجموع ماصح عندكم من الاحاديث لم يبلغ زهاء الاف "

ایک نیا بدعتی فرقہ ایجاد ہو چکا ہے جو ائمہ کرام پر طعن کی زبانیں لمبی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تمہارے پاس تو دس ہزار تک صحیح حدیثیں نہیں پہنچیں ۔

حالانکہ ان کا یہ قول سراسر باطل ہے کیونکہ امام بخاری خود کہتے ہیں :

" حفظت من الصحاح مأة الف حديث و من غير الصحاح مأتى الف "

یعنی میں نے صحیح حدیثیں ایک لاکھ حفظ کیں اور غیر صحیح حدیثیں یعنی حسن ، ضعیف وغیرہ دو لاکھ ۔

حالانکہ بخاری نے اپنی کتاب میں صرف سات ہزار دو سو پچھتر (۷۲۷۵) احادیث جمع کیں جبکہ کثیر حدیثیں تکرار سے آئی ہوئی ہیں اگر تکرار کو حذف کیا جائے تو صرف چار ہزار حدیثیں باقی رہ جاتی ہیں ۔ یہ بھی خیال رہے کہ بخاری اور مسلم نے یہ نہیں کہا کہ صحیح حدیثیں صرف وہی ہیں جو ہم نے جمع کی ہیں بلکہ امام بخاری کہتے ہیں ۔

" ما اوردت في كتابي هذا الاماصح ولقد تركت كثيرا من الصحاح "

یعنی میں نے اپنی صحیح میں صرف صحیح حدیثوں کو جمع کیا ہے لیکن بہت سی صحیح حدیثوں کو جمع نہیں بھی کیا ۔

امام مسلم کہتے ہیں : " الذى اوردت فى هذا الكتاب من الاحاديث صحيح ولا اقول ان ما تركت ضعيف "

یعنی میں نے اس کتاب میں جو احادیث جمع کی ہیں وہ صحیح ہیں لیکن میں یہ نہیں کہتا کہ میں نے جن کو ذکر نہیں کیا وہ ضعیف ہیں ۔

واضح ہوا کہ یہ رٹ لگانا کہ حدیث وہی معتبر ہے جو صحاح ستہ میں ہو ۔ یہ اپنی زبان سے اپنی

جہالت کا ثبوت پیش کرنا ہے:

" ولقد صنف الآخرون من الائمة صحاحا مثل ابن خزيمه وصحيح ابن حبان وصحيح الحاكم ابى عبد الله النيشابورى المسمى بالمستدرك وصحيح ابن عوانه وابن السكن والمنتقى لابن جارود وهذه الكتب كلها مختص بالصحاح ، ولقد اورد السيوطى فى كتاب جمع الجوامع من كتب كثيرة يتجاوز خمسين مشتملة على الصحاح والحسن والضعاف " (از مقدمه مشكوة)

یعنی دوسرے ائمہ نے بھی صحیح احادیث جمع کی ہیں جیسے صحیح ابن خزیمہ اور صحیح ابن حبان اور حاکم ابوعبداللہ نیشاپوری کی صحیح جس کا نام مستدرک ہے اور صحیح ابن عوانہ اور صحیح ابن جارود کی صحیح منتقی ، یہ سب کتب صحیح احادیث پر مشتمل ہیں علامہ سیوطی نے جمع الجوامع میں احادیث کی پچاس سے زائد کتب کا ذکر کیا ہے جن میں صحیح حسن اور ضعیف حدیثوں کا ذکر ہے۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دن رات یہ رٹ لگانے والے کہ ہم تو صرف قرآن وحدیث کو مانتے ہیں اور اسکے بعد کی کسی کتاب کو نہیں مانتے ، تو وہ جب حدیث کی سند پر بحث کرتے ہیں یہ حدیث ضعیف ہے تو قرآن سے کیسے ثابت کریں گے کہ یہ ضعیف ہے اور رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام اور تابعین عظام کے اقوال سے کیسے ثابت کریں گی کہ یہ حدیث ضعیف ہے ۔ جب وہ بعد کی لکھی ہوئی کتب سے اسماء الرجال کی بحثوں کو صحیح مانتے ہیں تو فقہی مسائل کو تسلیم کرنے میں انہیں کیا تکلیف ہوتی ہے جبکہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے اجتہادات امام بخاری ومسلم کی پیدائش سے بھی پہلے کے ہیں ۔ بات صرف ضد اور ہٹ دھرمی کی ہے اور اس کا کوئی علاج نہیں ، حقیقت پسندی ہی انسانیت ہے ۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ:

آپ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں اور امام اعظمؒ کے شاگرد امام ابو یوسفؒ کے بھی شاگرد ہیں ۔ جو مسائل آپ نے امام اعظم سے بلاواسطہ سنے ان کو آپ نے جس کتاب میں جمع کیا اسکا نام جامع کبیر ہے اور جو مسائل امام ابو یوسف کے واسطہ سے سنے انکو اپنی کتاب جامع صغیر میں جمع کیا اور جو ثقہ راویوں سے آپ تک امام صاحب کے مسائل تواتر اور مشہور طریقے سے پہنچے ان کو آپ نے جمع کیا وہ اصل یعنی مسبوط اور ظاہر الروایۃ ہیں ۔

نوادر کو آپ نے اپنی دوسری کتب کیسانیات، ہارونیات، جرجانیات، رقیات، میں جمع کیا اسطرح آپ کی کتاب سیر صغیر ہے جب کچھ لوگوں نے اس کے مختصر ہونے پر چہ میگوئیاں کیں تو آپ نے سیر کبیر تصنیف فرمائی۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ آپکے شاگرد ہیں:

امام شافعیؒ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں اور یہ بھی خیال رہے کہ جس دن امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی اسی دن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش ہوئی اور آپ کے والد کے فوت ہونے پر آپکی والدہ نے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے نکاح کرلیا یوں امام شافعی امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے زیر تربیت زیر پرورش اور زیر تعلیم رہے۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف کردہ کتب بھی انکے ہی حوالے کردی تھیں اسی لئے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ انصاف کرتے ہوئے، حقیقت پسندی سی کام لیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"من اراد الفقه فليلزم اصحاب ابی حنيفة فان المعانی قد تيسرت لهم والله ماصرت فقيها الابكتب محمد بن الحسن" (مقدمه در مختار)

یعنی جو شخص فقہ کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے وہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں کے پاس جائے، ان سے فیض حاصل کرے کیونکہ وہ آسانی سے مسائل ومعانی کو سمجھتے ہیں، اللہ تعالی کی قسم! میں امام محمد بن حسن شیبانی کی کتابوں کو پڑھنے سے ہی فقیہ بنا ہوں۔

"روی الخطيب عن الربيع قال سمعت الشافعی يقول الناس عيال علی ابی حنيفة فی الفقة كان ابو حنيفة ممن وفق له الفقة" (شامی ج ۱ ص ۳۷)

خطیب نے ربیع سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ تمام لوگ حضرت امام اعظم رحمہ اللہ کے بچے ہیں کیونکہ امام اعظم ہی وہ شخص ہیں جنہیں اللہ تعالی نے فقہ کے علم میں خاص توفیق عطا فرمائی، باقی امام آپ کے شاگردوں کے شاگرد ہیں صرف امام مالک رحمۃ اللہ علیہ آپکے شاگرد نہیں لیکن امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو سات صحابہ کرام سی بلاواسطہ روایت بیان کرنے کی وجہ سے ان پر بھی برتری حاصل ہے اور آپ کے طرز استدلال سے انکا بھی مقابلہ نہیں۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا علمی مقام کافی حد تک واضح ہو چکا ہے لیکن ایک دو مثالوں سے اندازہ کریں کہ آپ کا علمی مقام کتنا بلند ہے۔

نماز کی تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھوں کا اٹھانا سنت ہے۔ ہاتھ کہا تک اٹھائے جائیں؟ اس بارے میں ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ "کان یرفع یدیه حذو منکبیه اذا افتتح الصلوۃ" جب نماز کو شروع فرماتے تو ہاتھ کانوں تک اٹھاتے تھے، اور دوسری روایت میں ہے:

كان رسول الله ﷺ اذا كبر رفع يديه حتى يحاذى بهما اذنيه

حضور ﷺ جب نماز شروع فرماتے اور تکبیر کہتے تو اپنے ہاتھ کانوں کے برابر اٹھاتے تھے۔

ایک اور روایت میں ہے۔

"یرفع ابهامیه الی شحمة اذنیه" رسول اللہ ﷺ جب ہاتھ اٹھاتے تو آپ کے ہاتھوں کے انگوٹھے کانوں کی لو (نرم حصہ) تک آتے تھے۔

ایک اور روایت میں ہے،" الی فروع الاذنین "کانوں کے اوپر تک ہاتھ اٹھاتے تھے اب اس مسئلہ میں امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما ہاتھوں کے کندھوں تک اٹھانے کے قائل ہیں اس طرح ان کے مسلک میں صرف ایک روایت پر عمل ہوتا ہے۔ دوسری روایات پر عمل نہیں ہوتا لیکن امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ ہاتھوں کے انگوٹھوں کو کانوں کی لو تک اٹھانے کا حکم فرماتے ہیں اس پر عمل کرنے سے تمام روایات پر عمل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہاتھوں کی ہتھیلیاں کندھوں کے برابر ہونگی، انگوٹھے کانوں کی لو کے برابر ہونگے اور انگلیاں کانوں کے اوپر ہوں گی۔

یعنی امام اعظمؒ کے مسلک کو مدنظر رکھتے ہوئے اور ہاتھوں کے اٹھانے کی روایات کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ واقعہ ایک ہی ہے جسے صحابہ کرام نے اپنے اپنے انداز پر بیان کر دیا، جس نے ہتھیلیوں کو دیکھا اسنے کندھوں کے برابر اٹھانے کا ذکر کر دیا، جس نے ہاتھ کے انگوٹھوں کو دیکھا اس نے کہہ دیا کہ آپ نے ہاتھ کانوں تک اٹھائے اور جس نے آپکی انگلیوں کو دیکھا اس نے کہا کہ آپ نے اپنے ہاتھ کانوں کے اوپر تک اٹھائے، واقعہ ایک ہے مگر انداز بیاں مختلف ہے۔

اس پوری تفصیل پر ابوداؤد شریف کی حدیث حضرت وائل بن حجر سے مروی شاہد ہے، وہ کہتے ہیں:

" انه بصر النبی ﷺ حین قام الی الصلوۃ رفع یدیه حتی کانتا بحیال منکبیه

وحاذی ابھامیہ اذنیہ " (مشکوۃ باب صفۃ الصلوۃ)

ایک اور مثال دیکھئے امام صاحب اور دوسرے اہل علم حضرات ایک ولیمہ میں شریک تھے میزبان نے اپنی دو بیٹیوں کا نکاح دو بھائیوں سے کردیا تھا، ولی مکان سے باہر آیا اور اس نے کہا ہم سخت مصیبت میں پڑ گئے ہیں کیونکہ رات کو غلطی سے دلہنیں بدل گئیں اور ایک کی زوجہ سے دوسرے نے اور اس دوسرے کی زوجہ سے اس نے وطی کرلی ہے اب کیا کیا جائے؟ اس پر سفیان نے کہا، کوئی حرج نہیں ہر شخص جس سے اس نے وطی کی ہے اسے مہر دے اور پھر اپنی زوجہ واپس لے اور دوسری مرتبہ مہر اسے دے۔

شرعی نکتہ نظر سے مسئلہ کا یہ حل بھی ٹھیک ہے کیونکہ شُبہ سے جو وطی ہو جائے اس کا مہر ادا کرنا لازم آتا ہے اور اپنا نکاح برقرار رہتا ہے لیکن اس میں خرابی یہ تھی کہ ہر ایک جس نے وطی کی اسکے دل میں اس سے تعلق برقرار رہتا ہے جس سے کئی خرابیاں پیدا ہوتیں۔ امام اعظم نے دونوں لڑکوں کو بلایا اور پوچھا، تم نے جس جس عورت سے وطی کی ہے وہ تمہیں پسند بھی ہے؟ ہر ایک نے کہا ہاں ہمیں وہ پسند ہے آپ نے فرمایا تم دونوں اپنی اپنی زوجہ کو یعنی جس سے نکاح ہوا ہے اسے طلاق دو اور پھر جس جس سے وطی کی ہے اس سے نکاح کرلو۔ مسئلہ کا یہ حل بہت زیادہ اچھا تھا اس لئے تمام حاضرین نے آپکو داد دی۔

(خیرات الحسان)

امام ابوحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب:

" قد صح عنه انه قال اذاصح الحديث فهومذهبی " (شامی ج ۱ ص ۵۰)

صحیح طور پر یہ بات ثابت ہے کہ امام اعظمؒ نے فرمایا، جو حدیث صحیح ہوگی وہی میرا مذہب ہے۔

آپ کے اس ارشاد سے واضح ہوا کہ آپ کا مذہب احادیث صحیح کے مطابق ہے ان کے مخالف نہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کئی ایسی احادیث سے مسائل کو حاصل کرتے ہیں جن سے امام صاحب نے مسائل کو حاصل نہیں کیا۔

" ظن الناس ان مذهبه مخالف لاحاديث والحال ان ههنا احاديث اصح واقوى من

تلک الاحادیث التی تمسک بها الشافعی ترکها ابو حنیفة لاجلها"

یعنی لوگوں نے سمجھا کہ آپ کا مذہب احادیث کے مخالف ہے حالانکہ امام صاحب نے ان احادیث سے زیادہ صحیح اور قوی احادیث کو بطور دلیل پیش کیا۔

خیال رہے کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے جو احادیث بطور دلیل پیش کیں ان پر اصحاب شافعی اور بعد والوں نے جو ضعف کا قول کیا ہے ان کے اس قول سے امام صاحب کے مذہب پر کوئی عیب نہیں لگایا جا سکتا، کیونکہ آپ تابعی ہیں آپ کے پاس پہنچنے والی بعض احادیث صحابہ کرام سے بلا واسطہ ہیں اور بعض احادیث آپ کے پاس تابعین کے ذریعے پہنچی ہیں۔ حدیث کا ضعیف ہونا راوی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یعنی راوی ثقہ نہ ہو تو حدیث میں ضعف آئے گا۔

" ولکم بضعف الحدیث من جهة الراوی لا یستلزم الحکم بضعفه فی الزمان المتقدم الذی لم یکن هذا الراوی موجودا فیه "

(مقدمہ مرقاۃ شرح مشکوۃ ص ۱۰)

راوی کی وجہ سے ان احادیث کو ضعیف کہنا جو امام صاحب نے بطور دلائل پیش کی ہیں، درست نہیں کیونکہ متاخرین کے پاس وہ احادیث کئی واسطوں سے پہنچی ہیں اور ان میں کوئی راوی ضعیف ہو تو حدیث ضعیف ہو جائے گی لیکن امام اعظم کے پاس تو وہ حدیث صحابی سے بلا واسطہ پہنچی ہے یا صرف ایک واسطہ تابعی کا ہے اور جب آپ کا ارشاد ہی یہ ہے کہ میرا مذہب وہی ہے جو صحیح احادیث سے ثابت ہے تو پھر ان احادیث کو امام صاحب کے زمانہ میں ضعیف کیسے کہا جا سکتا ہے۔

خیال رہے کہ صحابہ کرام کے زمانہ میں کوئی حدیث بھی ضعیف، حسن، معلل، شاذ وغیرہ نہیں بلکہ سب حدیثیں صحیح تھیں اسی طرح نبی کریم ﷺ سے براہ راست سننے والے کے لئے آپ کے ارشاد پر عمل کرنا اتنا ہی ضروری تھا جتنا قرآن پاک کے احکام پر عمل کرنا ضروری تھا اور یہ بھی خیال رہے کہ احادیث کے راویوں کے متعلق کئی حضرات نے بحثیں کی ہیں۔ بعض حضرات نے کسی راوی کو غیر ثقہ کہا، بعض دوسرے حضرات نے اسے ثقہ کہا ہے، یہ اپنے اپنے علم کے مطابق کہا ہے۔ اسلئے کسی حدیث کو مطلقاً غیر ثقہ راوی کی روایت نہیں کہا جائے گا۔

حضرت ابن ہمام فرماتے ہیں:

" کم من راو یختلف فیه الناس باجتهاد هم ومن جارح ومعدل فعسی ان یکون

الذی عدلوہ مجروحا عند امامنا " (مقدمہ مرقاۃ ص ۷۸)

کتنے راوی ایسے ہیں جن میں لوگوں کا اپنے اپنے اجتہاد کی وجہ سے اختلاف ہے کسی نے راوی پر جرح کی تو کسی نے عادل کہا، ہوسکتا ہے کہ بعض راویوں کو دوسرے حضرات عادل کہیں۔ اور وہ ہمارے نزدیک عادل نہ ہوں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی راوی کو دوسرے حضرات ضعیف کہیں اور وہ ہمارے نزدیک ثقہ راوی ہو۔

" لاترجیح بکثرۃ الرواۃ وانما ھو بفقہ الراوی وھکذا لاترجیح بکثرۃ الرویات وانما ھو بقوۃ الروایۃ "

کثیر راویوں کی وجہ سے روایت کو ترجیح نہیں دی جاتی بلکہ راوی کی فقاہت سے ترجیح دی جاتی ہے اسی طرح کثیر روایات وجہ ترجیح نہیں بلکہ روایت کا قوی ہونا وجہ ترجیح ہے۔ یہ کہنا ہی غلط ہے کہ فلاں مسئلہ میں ہمارے عقیدہ کے مطابق اتنی حدیثیں ہیں جو تمہارے مسلک کے مطابق پیش کردہ حدیثوں سے زائد ہیں، بات دلیل کی قوت وضعف پر مبنی ہے، کثرت وقلت پر نہیں۔

بخاری یا مسلم میں آنے والی کئی حدیثیں منسوخ بھی ہیں جن پر عمل نہیں کیا جائے گا، کئی حدیثیں دوسری حدیثوں سے متعارض بھی ہیں ان میں یا تطبیق دی جائے گی یا تعارض کو ختم کرنے کے لیے ایک حدیث کو چھوڑنا پڑے گا۔ اہل علم کو انصاف سے لوگوں کو حق بات بتانی چاہیے صرف قوم کو انتشار میں مبتلا کر کے دین سے برگشتہ کرنا علم وعقل سے دوری کی علامت ہے۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے اساتذہ وشاگرد:

علامہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں، امام صاحب کے اساتذہ بیشمار ہیں جن کے لیے یہ مختصر کتاب گنجائش نہیں رکھتی، امام ابوحفص کبیر نے آپ کے اساتذہ کی تعداد چار ہزار بیان کی ہے اور دوسروں نے کہا ہے کہ صرف تابعین میں سے آپ کے اساتذہ کی یہ تعداد ہے اور غیر تابعین میں بھی آپکے اساتذہ ہیں۔

امام صاحب کے شاگرد بھی اتنی کثیر تعداد میں ہیں کہ جن کا ذکر کرنا دشوار ہے اسی وجہ سے بعض علماء نے کہا ہے کسی کے اتنے زیادہ شاگرد نہیں ہوئے جتنے امام صاحب کے شاگرد ہیں اور عام لوگوں کو کسی اور سے اسقدر فائدہ نہ پہنچا جتنا امام صاحب اور انکے شاگردوں سے احادیث مشتبہ کی تفسیر،

مسائل کی تفسیر اور مسائل مستنبط اور نوازل وقضا واحکام کے بیان میں فائدہ پہنچا، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو بہتر جزا دے۔ بعض متاخرین نے امام صاحب کے تذکرہ میں آٹھ سو شاگردوں کا ذکر کیا ہے اور انکے نام ونسب کو بھی بیان کیا ہے۔ (الخیرات الحسان)

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے تقویٰ کی ایک جھلک:

" وقد صلی الفجر بوضوء العشاء اربعین سنۃ "

آپ نے چالیس سال عشاء کے وضو سے صبح کی نماز ادا کی۔ یعنی جس وضو سے عشاء ادا کرتے اسی وضو سے فجر کی نماز ادا کرتے، اگر سو جاتے تو یقیناً فجر کی نماز کے لیے تازہ وضو کرنا پڑتا کیونکہ سہارا لگا کر یا لیٹ کر سونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ آپ تمام رات عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ " و حج خمسا و خمسین حجۃ " آپ نے پچپن حج ادا فرمائے، جب ایک ہی حج کرنے سے انسان صغیرہ گناہوں سے اس طرح پاک ہو جاتا ہے جس طرح پیدائش کے دن گناہوں سے پاک ہوتا ہے تو آپ اندازہ کریں کہ پچپن حج کرنے والے کی بزرگی اور تقویٰ کا کیا مقام ہوگا۔ آپ نے اپنے آخری حج میں کعبہ شریف کے دربانوں سے اجازت طلب کی اور اندر تشریف لے گئے پھر!

" فقام بین العمودین علی رجلہ الیمنی حتی ختم نصف القرآن ثم رکع وسجد ثم قام علی رجل الیسری حتی نصف القرآن یعنی مع وضع القدمین علی الارض بدون رفع احدھما"

آپ دوستونوں کے درمیان کھڑے ہو گئے آپ نے پہلی رکعت میں اپنے دائیں پاؤں پر زور رکھا اور بائیں پر دباؤ نہیں تھا اگرچہ دونوں پاؤں زمین پر تھے اس حال میں آپ نے نصف قرآن کی تلاوت کی اور پھر رکوع کیا اور سجدہ کیا پھر دوسری رکعت میں کھڑے ہوئے بائیں پاؤں پر زور رکھا اور نصف قرآن پڑھ کر اس رکعت کا رکوع اور سجدہ کیا اسطرح آپ نے دو رکعت نفل نماز میں مکمل قرآن شریف کی تلاوت کی۔

(خیال رہے کہ یہ جو ذکر ملتا ہے کہ ایک پاؤں پر کھڑے ہوئے اور دوسرے پاؤں کو پیٹھ کی طرف کر دیا اسے علامہ شامی نے رد کیا کہ یہ سنت کے خلاف ہے، صحیح وہی ہے جو ذکر کیا گیا)

" فلما سلم بکی وناجی ربہ وقال الھی ماعبدک ھذا العبد الضعیف حق

عبادتک لکن عرفک حق معرفتک "

جب آپ نے سلام پھیرا تو روتے ہوئے رب کے حضور عرض کیا، الٰہی! اس تیرے ضعیف بندے نے تیری عبادت کا حق تو ادا نہیں کیا لیکن تجھے پہچانا ہے ایسے جیسے تجھے پہچاننے کا حق ہے۔

یعنی اگر صرف یہ کہا جاتا کہ اے اللہ تیرے بندے نے تیری عبادت کا حق ادا نہیں کیا تو وہم ہوتا شائد آپ نے اللہ تعالیٰ کو پہچانا ہی نہ ہو اس لئے عبادت کا حق ادا نہ کیا ہو، جب یہ کہا کہ الٰہی تجھے ایسے پہچانا جیسے پہچاننے کا حق ہے تو اب اس وہم کا ازالہ ہو گیا۔ البتہ یہ خیال کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کو پہچاننا انسان کی طاقت میں نہیں۔ پھر آپ نے عرض کیا، اے اللہ! اگرچہ ادائیگی خدمت میں تو نقصان ہے لیکن پہچاننے میں کمال ہے لہٰذا اسی کے طفیل تو اپنا احسان فرمایا تو آپ کو غیبی طور پر آواز آئی، اے ابوحنیفہ! تم نے ہمیں ایسا پہچانا جیسے پہچاننے کا حق ہے اور تم نے ہماری عبادت کے ذریعے ہماری ایسی خدمت کی جسے ہم نے اچھا پایا، ہم نے تمہاری مغفرت کر دی اور قیامت تک تمہاری اتباع کرنے والے تمہارے مذہب پر چلنے والوں کی بھی مغفرت کر دی۔ (مقدمه در مختار، شامی ج ۱ ص ۳۸)

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مقلدین اولیاء کرام:

وقد اتبعه على مذهبه كثير من الاولياء الكرام ممن اتصف ثبات المجاهدة وركض في ميدان المشاهدة۔

کثیر اولیاء کرام نے آپ کے مذہب کی تابعداری کی اور اولیاء کرام بھی وہ کہ جن کا مجاہدہ اور مشاہدہ کی میدان میں سبقت لے جانا واضح طور پر ثابت ہے۔

فلو وجدوا فيه مااتبعوه ولا اقتدوا به ولا وافقوه۔

اگر وہ اس میں ذرا بھر بھی شبہ پاتے تو کبھی آپ کی تابعداری نہ کرتے اور نہ ہی آپ کی اقتداء کرتے اور نہ ہی آپ کی موافقت کرتے۔ وہ جلیل القدر اولیاء کرام ایسی ہستیاں ہیں، ابراہیم بن ادہم، شفیق بلخی، معروف کرخی، ابو یزید بسطامی، فضیل بن عیاض، داؤد طائی، ابو حامد لفاف، خلف بن ایوب، عبداللہ بن مبارک، وکیع بن جراح، ابوبکر وراق، رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ یہ تو چند مشہور و معروف حضرات تھے "وغیرهم ممن لايحصى" ورنہ ان کے علاوہ اتنے اہل علم، اہل کشف، علماء و صلحاء، اولیاء اللہ آپ کے مذہب کے متبعین اور آپکے مقلدین تھے جو شمار میں نہیں آسکتے۔ (مقدمہ درمختار)

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ طریقت کے بادشاہ:

ابوالقاسم قشیری جو شافعی المذہب تھے اور اپنے مذہب میں بہت پختہ تھے وہ کہتے ہیں میں نے اپنے استاذ ابوعلی دقاق کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے طریقت کو ابوالقاسم نصر سے حاصل کیا اور انہوں نے امام ابوبکر شبلی سے اور انہوں نے ابوالحسن سری سقطی سے اور انہوں نے معروف کرخی سے اور انہوں نے داؤد طائی سے اور انہوں نے علم اور طریقت کو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کیا ان تمام حضرات نے آپ کے علم اور تقوی کی تعریف کی ہے، یہ سب لوگ طریقت وشریعت کے امام تھے۔

(مقدمہ در مختار)

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور امام باقر رضی اللہ عنہ:

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی مدینہ طیبہ میں امام باقر سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایا، سنا ہے کہ تم قیاس کی بناء پر ہمارے نانا (حضورﷺ) کی احادیث کی مخالفت کرتے ہو؟ عرض کی یہ بہتان ہے، دیکھیے عورت مرد سے کمزور ہے لیکن وراثت میں اس کا حصہ مرد سے نصف ہے اگر میں قیاس کرتا تو فتوی دیتا کہ عورت کو مرد سے دوگنا حصہ ملنا چاہیے لیکن میں ایسا نہیں کرتا، اسی طرح نماز، روزے سے افضل ہے اگر میں قیاس کرتا تو حائضہ عورت کو نماز کی قضاء کا حکم دیتا مگر میں حدیث کے مطابق روزہ ہی کی قضاء کا حکم دیتا ہوں۔ یہ سن کر امام باقر اس قدر خوش ہوئے کہ انہوں آپ کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ آپ نے ایک مدت تک ان سے اکتساب فیض کیا۔

(مناقب الامام للموفق)

اللہ تعالی ہمیں ان اولیاء کرام کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے مذہب پر طعن کرنے والے مردودین ومبتدعین سے محفوظ رکھے۔

آمین ثم آمین بجاہ النبی الکریم ﷺ

﴿ وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَّنِدَاءً صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴾

۱) ''اور کافروں کی کہاوت اس کی سی ہے جو پکارے ایسے کو کہ خالی چیخ پکار کے سوا کچھ نہ سنے بہرے اندھے تو انہیں سمجھ نہیں''۔

۲) اور مثال ان لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا مثل اس شخص کے ہے جو آواز دے ایسی چیزوں کو جو نہ سنیں سوائے چیخ و پکار کے، بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں تو وہ عقل نہیں رکھتے''۔

اس مثال سے یہ واضح کیا گیا کہ جس طرح چرواہا بھیڑ بکریوں کو آواز دے تو ان کو بات کا مطلب تو سمجھ نہیں آتا بلکہ وہ فقط چیخ و پکار سنتی ہیں۔ اسی طرح یہ کافر بھی چوپاؤں کی طرح ہیں ان کو دعوت ایمان دیں تو یہ بھی اسے دل کے کانوں سے نہیں سنتے اور نہ ہی حق بات بولتے ہیں اور نہ ہی حق راہ دیکھ سکتے ہیں تو وہ عقل نہیں رکھتے۔ (از قرطبی)

یعنی کافر اپنے آباء و اجداد کی تقلید میں اس طرح منہمک (گھرے ہوئے) ہیں اور گمراہی میں ہمیشہ کیلئے قائم ہیں ان کے سامنے قرآن پاک کی آیات تلاوت کی جائیں تو وہ ان کی طرف اپنے ذہن نہیں لگاتے جب ان کے سامنے کسی چیز کو بیان کیا جائے تو وہ اسے سوچتے نہیں غور و فکر نہیں کرتے بلکہ چوپاؤں کی طرح صرف آواز کی طرف کان لگاتے ہیں کہ انکی سمجھیں ختم ہو چکی ہیں۔ (از روح المعانی)

" والنعيق التتابع في التصويت على البهائم للزجر "

چوپاؤں کو ڈانٹنے کے لے جو آواز بار بار دی جائے اسے " نعق " کہا جاتا ہے۔ " لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَّنِدَاءً، كناية عن عدم الفهم والاستجابة " یعنی رب تعالیٰ کے ارشاد ﴿لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَّنِدَاءً﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہ سمجھ نہیں سکتے اور نہ ہی قبول کرتے ہیں:

" قيل نعب بالباء والدعاء والنداء بمعنى وقيل ان الدعاء ما يسمع والنداء قد يسمع وقد لا يسمع "

نعب اور نداء اور دعا کا بعض حضرات نے ایک ہی معنی لیا ہے یعنی پکارنا اور بعض حضرات نے بیان کیا کہ ''دعا'' اس پکار کو کہتے ہیں جو کبھی سنی جائے اور نداء اس پکار کو کہتے ہیں جو کبھی سنی جائے اور کبھی نہ سنی جائے کیونکہ نداء قریب کے لئے بھی ہوتا ہے اور بعید کے لئے بھی۔ (از روح المعانی)

تنبیہ : کوا جب گردن اٹھا کر اور گردن کو حرکت دے کر آواز نکالے تو اس وقت " نعق الغراب (بالمعجمة) کہتے ہیں اور جب وہ بغیر گردن کے اٹھانے اور حرکت دینے کے آواز نکالے تو اس وقت نعق الغراب (بالمہملة) کہتے ہیں۔ (از روح المعانی)

فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ : "ای لا یدرکون شیا لفقدان الحواس الثلاثة" تو وہ عقل نہیں رکھتے۔ یعنی تینوں حواس سننا، دیکھنا اور بولنا ہی جب ان میں نہیں پائے گئے تو وہ کسی چیز کو نہیں سمجھ سکتے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے "من فقد حسا فقد فقد علما" جس شخص نے حواس کھو دیئے تحقیق اس نے علم ضائع کر دیا یہاں عقل کی حقیقی نفی نہیں بلکہ سمجھنے کی صلاحیت سے جو ثمرات مرتب ہوتے ہیں ان کی نفی ہے۔ (از روح المعانی)

☆ **" اخرج ابن جریر وابن ابی حاتم عن ابن عباس فی قوله ومثل الذین کفروا کمثل الذی ینعق بما لا یسمع قال کمثل البقر والحمار والشاة ، ان قلت لبعضهم کلاما لم یعلم ما تقول غیر انه یسمع صوتک وکذلک الکافر ان امرته بخیر او نهیته عن شر او وعظته لم یعقل ما تقول غیر انه یسمع صوتک "**

ابن جریر اور ابن حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِیْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ کافر بھیڑ، بکریوں اور بیل اور گدھے کی طرح ہیں اگر تم ان سے کلام کرو تو وہ نہیں جانتے تم کیا کہہ رہے ہو وہ صرف تمہاری آواز سنتے ہیں۔ اسی طرح کافر کو اگر تم اچھے کام کا حکم دو یا برے کام سے منع کرو یا نصیحت کرو تو وہ نہیں سمجھتے کہ تم کیا کہہ رہے ہو وہ صرف تمہاری آواز سنتے ہیں۔ (درمنثور)

☆ **" واخرج ابن جریر عن ابن عباس فی الآیة قال مثل الدابة تنادی فتسمع ولا تعقل ما یقال لها کذلک الکافر یسمع الصوت ولا یعقل "**

ابن جریر نے بیان فرمایا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیۃ کے متعلق بیان فرمایا کہ جس طرح چوپاؤں کو ندا دی جائے تو وہ سنتے ہیں اور سمجھتے نہیں اسی طرح کافر آواز سنتا ہے اور سمجھتا نہیں۔ (درمنثور)

☆ **" واخرج وکیع عکرمة فی قوله ینعق بما لا یسمع الا دعاء ونداء قال مثل الکافر مثل البهیمة تسمع الصوت ولا تعقل "**

وکیع نے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے اس آیۃ کریمہ کے متعلق یہی بیان کیا کہ کافر چوپاؤں کی طرح ہیں آواز سنتے ہیں اور سمجھتے نہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ

۱) ''اے ایمان والو کھاؤ ہماری دی ہوئی ستھری چیزیں اور اللہ کا احسان مانو اگر تم اسی کو پوجتے ہو''

۲) ''اے وہ لوگو جنہوں نے ایمان لایا کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے عطا کیں اور شکر کرو اللہ کا اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو''۔

پہلے عام لوگوں کو حلال اور پاکیزہ چیزیں کھانے کا حکم دیا اب اس آیۃ کریمہ میں ایمان والوں کی عظمت کے پیش نظر ان کو علیحدہ حکم پھر دیا حالانکہ ان کا ذکر بھی ﴿ يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا ﴾ ''اے لوگو کھاؤ جو چیزیں زمین میں ہیں حلال اور پاکیزہ'' میں آچکا تھا۔ اسے تخصیص بعد از تعمیم کہا جاتا ہے کہ عمومی ذکر کے بعد خصوصی ذکر ہوتا کہ خاص کا عظیم الشان اور رفیع الشان ہونا پتہ چل جائے۔ (از روح المعانی)

طیب قرآن پاک میں چار معانی میں استعمال ہے:

(۱) ''طیب بمعنی حلال'' رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ ، ای ولا تتبدلوا الحرام بالحلال ﴾ اور تم حلال کے بدلے حرام کو حاصل نہ کرو۔

(۲) طیب بمعنی طاہر (پاک) ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿ فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا ﴾ تو تیمم کرو پاک مٹی سے۔

(۳) طیب بمعنی حسن (اچھا) رب قدوس نے ارشاد فرمایا ﴿ إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ ﴾ اسی کی طرف اچھے کلمات چڑھتے ہیں یعنی رب تعالیٰ کے ہاں مؤمنین کے اچھے کلمات کو شرف قبولیت حاصل ہوتا ہے۔

(۴) طیب بمعنی مومن رب قدوس نے ارشاد فرمایا ﴿ لِيَمِيزَ اللَّهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ ﴾ تاکہ اللہ تعالیٰ جدا کر دے کافر کو مومن سے۔ (شیخ زادہ)

دونوں کلاموں کے فرق میں عجیب نکتہ: پہلے خطاب میں فرمایا:

﴿ يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا ﴾

اس آیۂ کریمہ میں ارشاد فرمایا: ﴿ یَـا اَیُّهَـا الَّذِیْنَ آمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاکُمْ ﴾ پہلا حکم عام لوگوں کو ہے ان کو حکم دیتے ہوئے وسعت فرمائی سوائے حرام کے زمین میں پائی جانے والی تمام چیزوں کو مباح قرار دیا گویا کہ حکم یوں پایا گیا ﴿ کلوا حلالا ﴾ حلال چیزیں کھاؤ۔

" تـنبیه علی انه لم یحظر علیهم الا تناول المحرم " حلال چیزوں کے کھانے کا حکم دے کر اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ ان پر حرام چیزوں کے کھانے کے بغیر کوئی چیز منع نہیں۔ اسی وجہ سے اس کے بعد ﴿ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّیْطٰنِ ﴾ کو ذکر کیا گیا کہ تم شیطان کے قدموں کی تابعداری نہ کرو کہ اتنی وسعت دینے کے باوجود وہ پھر بھی تمہیں حرام چیزوں کے کھانے کی رغبت دلائے گا اگر تم نے اس کی تابعداری کی تو وہ اپنی دشمنی کی وجہ سے تمہیں برباد کر دے گا۔

مومنین کو خطاب:

اس آیۂ کریمہ میں مومنین کو خطاب ہے جس میں صرف طیب چیزوں کے کھانے کا حکم دیا:

" وامرهـم ان لا یتـوسـعـوا فی تناول ما رزقوه بل یتخیروا من الطیب بخیر الناس مما فی الارض "

یعنی مؤمنین کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم اپنے کھانے میں جو تمہیں رب تعالیٰ نے حلال مال دے رکھا ہے وسعت نہ پیدا کرو زیادہ کھانے کے عادی نہ بن جاؤ بلکہ پاک چیزیں اتنی ہی اختیار کرو جتنی بہتر لوگوں یعنی اللہ تعالیٰ کے مقرب لوگوں کی شان کے لائق ہے کہ وہ زمین میں پائی جانے والی حلال چیزوں کو بھی بقدر ضرورت استعمال کرتے ہیں۔

پہلی آیۃ میں عام لوگوں کو شیطان کی تابعداری سے منع کیا گیا اور شیطان کے مزین کئے ہوئے گناہوں سے بچنے کا حکم دیا لیکن یہاں مومنین کو شکر کرنے کا حکم دیا " الذی هو ارفع منازل للعباد " جو بندوں کے لئے بلند مرتبہ کا ذریعہ ہے۔ بلکہ

اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ : سے اس پر تنبیہ کر دی " ان عبـادته تعالیٰ لا تتم الا بشکره " کہ بیشک اللہ تعالیٰ کی عبادت اس وقت تک مکمل ہی نہیں جب تک اس کا شکر ادا نہ کیا جائے۔

شکر کا حکم وجوبی ہے: یہ امر ﴿ واشـکـروا الله ﴾ اباحت کے لئے نہیں بلکہ وجوب کے لئے ہے

اس لئے کہ ہر عقل مند آدمی کے دل میں یہ اعتقاد ہوتا ہے:

" ان من اوجده وانعم علی بما لم یخص من النعم الجلیلة مستحق لغایة التعظیم وان یظهر بلسانه وبسائر جوارحه "

بیشک وہ ذات جس نے اسے موجود کیا ہے اور بہت بڑی بڑی نعمتیں عطاء کی ہیں یہ ان نعمتوں کے لئے کوئی مختص تو نہیں تھا وہ ذات بہت ہی تعظیم کے مستحق ہے یعنی دل میں اس کی عظمت کا لحاظ کیا جائے اور اس کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے زبان اور باقی اعضاء سے اظہار (ظاہر) کیا جائے اسے ہی شکر کہا جاتا ہے۔ (از شیخ زادہ)

احادیث مبارکہ: " عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ ان الله طیب لا یقبل الا الطیب وان الله امر المؤمنین بما امر المرسلین فقال ﴿ یَا اَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّیِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا ﴾ وقال ﴿ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا كُلُوا مِنْ طَیِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ ﴾ ثم ذكر الرجل یطیل السفر یمدیده الی السماء یا رب یا رب اشعث اغبر مطعمه حرام ومشربه حرام وملبسه حرام وغذی بالحرام فانی یستجاب لذلک " (رواه مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ طیب (پاک) ہے وہ سوائے طیب کے کسی اور چیز (یعنی خبیث چیز) کو قبول نہیں کرتا۔ اور بیشک اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو وہ حکم فرمایا جو حکم رسولوں کو فرمایا یعنی رب تعالیٰ نے رسولوں کو حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ یَا اَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّیِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا ﴾

"اے رسولو کھاؤ پاکیزہ چیزیں اور اچھے عمل کرو"

اور مؤمنین کو حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا كُلُوا مِنْ طَیِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ ﴾

"اے ایمان والو کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تمہیں عطا کیں"

پھر ایک شخص کا ذکر فرمایا کہ ایک شخص لمبا سفر کر کے آتا ہے اس کے بال بکھرے ہوتے ہیں اس کی حالت پراگندہ ہوتی ہے وہ کہتا ہے اے رب اے رب (یعنی دعا کرتا ہے) اس کی دعا کو کیسے قبول کیا جائے گا۔ جب اس کا کھانا حرام ہو اور پینا حرام ہو اور لباس حرام ہو اور غذا حرام ہو۔

☆ " عن النبی ﷺ یقول اللہ تعالیٰ انی والانس والجن فی نبأ عظیم اخلق ویعبد غیرہ وارزق ویشکر غیری ، اخرجہ الطبرانی فی مسندات الشامیین والبیھقی فی شعب الایمان والدیلمی من حدیث ابی الدرداء "

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے بیشک میں اور انسان اور جن ایک عظیم خبر میں ہیں (یعنی میرا اور انسانوں اور جنوں کا معاملہ عجیب ہے) پیدا میں کرتا ہوں اور وہ عبادت غیروں کی کرتے ہیں اور رزق میں دیتا ہوں وہ شکر غیروں کا ادا کرتے ہیں۔

(از مظھری)

☆ " واخرج ابن ابی شیبة واحمد ومسلم عن انس قال قال رسول اللہ ﷺ ان اللہ لیرضی عن العبد ان یاکل الاکلة ویشرب الشربة فیحمد اللہ علیھا "

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے یہ پسند کرتا ہے کہ کھانے کی کوئی چیز کھائے اور پینے کی کوئی چیز پئے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد کرے۔

(از درمنثور)

یعنی رب تعالیٰ کا دل سے شکر کرے یہی شکر اس کا معتبر ہے کیونکہ جب تک رب تعالیٰ کی تعظیم دل میں نہ ہو صرف زبان سے شکر کرنا یا صرف اعضاء سے شکر کرنا حقیقت میں مطلوب نہیں۔

(از کبیر)

☆☆☆☆☆

﴿ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيۡكُمُ الۡمَيۡتَةَ وَالدَّمَ وَلَحۡمَ الۡخِنۡزِيۡرِ وَمَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيۡرِ اللّٰهِ فَمَنِ اضۡطُرَّ غَيۡرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَيۡهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴾

۱) ''اس نے یہی تم پر حرام کئے ہیں مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور جو غیر خدا کا نام لے کر ذبح کیا گیا تو جو ناچار ہو نہ یوں کہ خواہش سے کھائے اور نہ یوں کہ ضرورت سے آگے بڑھے تو اس پر گناہ نہیں بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے''۔

۲) ''بیشک جو حرام کئے اللہ نے تم پر وہ مردار اور خون اور گوشت سور کا اور وہ جانور جو ذبح کئے گئے ہوں اللہ کے غیر کا نام لے کر اور جو مجبور ہو جائے وہ تجاوز نہ کرے اور حد سے نہ بڑھے تو نہیں گناہ اس پر بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے''۔

طلباء کرام کی توجہ کے لئے: بظاہر اعتراض یہ ہے کہ ﴿ اِنَّمَا ﴾ حصر کا فائدہ دیتا ہے اس کا ترجمہ ہوتا ''جز ایں نیست'' (سوائے اس کہ نہیں) اس ترجمہ سے تو یہ صورت بنے گی کہ چار چیزوں کے بغیر اور کوئی چیز حرام نہیں وہ چار چیزیں جو اس آیۃ میں رب تعالیٰ نے بیان فرما دی ہیں مردہ جانور اور خون اور سور کا گوشت اور جن جانوروں پر ذبح کے وقت اللہ کے بغیر کسی اور کا نام لیا جائے۔

حالانکہ ان کے بغیر اور بھی کتنی چیزیں حرام ہیں تو یہاں حصر کا معنی کیسے صحیح ہے؟ اس کے جواب کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ سمجھا جائے کہ ﴿ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيۡكُمُ الۡمَيۡتَةَ ﴾ میں تین قراءتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ﴿ اَلۡمَيۡتَةَ ﴾ منصوب ہے اور ''حرم'' فعل معروف ہے (مبنی للفاعل) اس صورت میں ''ان'' حرف مشبہ بالفعل ہے اور ''ما'' کافہ ہے یعنی ان کو عمل سے روک رہا ہے اب اس صورت میں دو مذہب ہیں ایک یہ کہ ﴿ اِنَّمَا ﴾ حصر کا فائدہ دے رہا ہے اور دوسرا مذہب یہ ہے کہ اس صورت میں ﴿ اِنَّمَا ﴾ حصر کا فائدہ نہیں دے رہا۔ اسی مذہب کو اختیار کرتے ہوئے جواب دیا گیا:

'' قلنا المختار عند الحنفية ما قال نحاة الكوفة ان كلمة انما ليست

للقصر بل هي مركبة من ان للتحقيق وما الكافة "

ہم نے کہا احناف کے نزدیک کوفہ کے نحویوں کا قول معتبر ہے وہ یہ کہتے ہیں کلمہ ﴿ اِنَّمَا ﴾ قصر (حصر) کا فائدہ ہی نہیں دیتا۔ کیونکہ یہ مستقل کلمہ ہی نہیں بلکہ یہ " ان " حرف تحقیق اور " ما " کافہ سے مرکب ہے۔

" وعلى تقدير التسليم فالقصر اضافي بالنسبة الى ما حرمه الكفار من بحيرة وسائبة ووصيلة وحام ونحوها "

اگر بصرہ والے نحویوں کے قول کو تسلیم کر کے قصر (حصر) والا معنیٰ لیا جائے تو قصر اضافی ہے قصر حقیقی نہیں کہ اعتراض وارد ہو سکے بلکہ اضافی ہے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ حرام تو وہ چیزیں ہیں جو رب تعالیٰ نے حرام کی ہیں کافر لوگ جو خود اپنے آپ پر حرام کرتے ہیں یہ ان کا باطل مذہب ہے جیسا کہ انہوں نے بحیرہ اور سائبہ اور وصیلہ اور حامی اپنے آپ پر حرام کر لئے ہیں۔

(ماخوز از مختصر المعانی و کواشی ومظہری)

خیال رہے کہ " حامٍ " سے یاء بوجہ کسرہ کے گرانے اور التقاء ساکنین یاء اور تنوین کے درمیان لازم کی وجہ سے حذف ہوگئی پچھلی آیات میں ان کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

قراءت میں دوسری صورت یہ ہے کہ "حرم" فعل معروف ہو اور " ميتة " پر رفع ہو بوجہ خبر کے اور ﴿اِنَّمَا﴾ میں " ان " حرف تحقیق ہو اور " ما " موصول ہو اور صلہ میں ضمیر بوجہ قرینہ کے پائے جانے کے حذف ہو اب اس میں پھر دو مذہب ہیں کوفہ کے نحویوں کے نزدیک قصر نہیں تقدیر عبارت یہ ہے "انما حرمه الله عليكم الميتة " بیشک جس چیز کو اللہ نے حرام کیا ہے وہ مردار ہے۔ راقم نے اسی ترجمہ کو اختیار کیا ہے۔

اور بصری نحویوں کے نزدیک قصر والا معنیٰ ہوگا تقدیر عبارت کی یہ ہوگی ﴿ انما حرمه الله عليكم هو الميتة ﴾ اللہ تعالیٰ نے تم پر صرف میتہ وغیرہ کو حرام کیا۔

اب بھی جواب وہی ہوگا کہ یہاں قصر اضافی ہے قصر حقیقی نہیں۔

(ماخوذ از کواشی ومختصر المعانی مع وضاحت راقم)

قراءت میں تیسری صورت یہ ہے کہ " حـــرم "فعل مجہول ہے اور المیتۃ مفعول مالم یسم فاعلہ ہے۔کلمہ " ما " میں دو احتمال ہیں کہ " ما "کافہ ہو یا موصولہ پھر اسی طرح دو مذہب ہیں کہ قصر ہے یا نہیں قصر نہ ہونے کی صورت میں کوئی اعتراض نہیں اور قصر پائے جانے کی صورت میں قصر اضافی ہوگا۔

(از مختصر المعانی و کواشی مع وضاحت راقم)

میتہ سے مراد کیا ہے: میتہ اس جانور کو کہا جاتا ہے جو خود بخود مر جائے اس کو کسی نے ذبح نہ کیا ہو یا کسی نے ذبح تو کیا ہے لیکن اس میں ذبح کی شرائط نہیں پائی گئی۔ (احکام القرآن للجصاص)

زندہ جانور سے گوشت کاٹنے کا حکم: زمانہ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ زندہ جانوروں کے جسموں سے کہیں سے گوشت کاٹ کر پکا لیا جاتا تھا اور کھالیا جاتا تھا اس کے متعلق ارشاد نبوی یہ ہے:

" عن ابی واقد اللیثی قال قال رسول الله ﷺ ما قطع من البهیمة حیة فهو میتة " (اخرجه ابو داؤد والترمذی حسنه)

ابو واقد لیثی فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو گوشت زندہ جانور سے کاٹا وہ مردار ہی ہے یعنی وہ اسی طرح حرام ہے جس طرح مردہ جانور حرام ہے۔ (مظهری)

مردہ جانور سے نفع حاصل کرنا منع ہے:

اس پر اجماع ہے کہ مردہ جانور کو بیچنا اور اس کی قیمت سے نفع حاصل کرنا حرام ہے اسی طرح اس کی چربی سے نفع حاصل کرنا منع کیا گیا ہے اور مردہ جانور کے چمڑے سے دباغت (چمڑے کو خشک کر کے اس سے خون وغیرہ کو دور کر کے کارآمد بنانا) سے پہلے نفع حاصل کرنا منع ہے۔

☆ " عن جابر انه سمع رسول الله ﷺ یقول عام الفتح وهو بمکة ان الله ورسوله حرم بیع الخمر والمیتة والخنزیر والاصنام فقیل یا رسول الله ارأیت شحوم المیتة فانه یطلی بها السفن ویدهن بها الجلود ویستصبح بها الناس فقال لا هو حرام ثم قال عند ذلک قاتل الله الیهود ان الله لما حرم شحومها اجملوه ثم باعوه فاکلوا ثمنه "

(بخاری ومسلم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فتح مکہ کے دن مکہ میں فرماتے ہوئے سنا بیشک اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے شراب اور مردار اور سور اور بتوں کی خرید وفروخت حرام

کردی۔ پھر آپ سے سوال کیا گیا یا رسول اللہ مردہ جانوروں کی چربی کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟ کیونکہ اس کے ذریعے کشتیوں کو تیل لگایا جاتا ہے اور چمڑے کو چربی کا تیل لگایا جاتا ہے اور اس سے لوگ چراغ جلاتے ہیں تو آپ نے فرمایا نہیں (چربی سے نفع حاصل کرنا بھی جائز نہیں) وہ حرام ہے۔ پھر آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ یہود کو برباد کرے بیشک اللہ تعالیٰ نے ان پر مردہ جانوروں کی چربی کو حرام کیا لیکن انہوں نے چربی کو ڈھال کر تیل نکال کر اسے بیچنا شروع کر دیا اور اس کی قیمت کو کھانا شروع کر دیا۔
(از مظہری)

☆ "عن عبد اللہ بن عکیم قال اتانا کتاب رسول اللہ ﷺ الا لا تنتفعوا من المیتۃ باھاب ولا عصب" (رواہ احمد والشافعی واصحاب السنن الاربعۃ)

حضرت عبداللہ بن عکیم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ کا خط آیا آپ نے فرمایا خبردار مردہ جانور کے چمڑے اور پٹھوں سے نفع حاصل نہ کرو۔ (مظہری)

خیال رہے کہ " اھاب "اس چمڑے کو ہی کہا جاتا ہے جس کو دباغت نہ دی جائے دباغت کے بعد ہر چمڑہ پاک ہو جاتا ہے اس سے نفع حاصل کرنا جائز ہے سوائے انسان کے چمڑے کے کیونکہ انسان رب تعالیٰ کی مخلوق میں مکرم ہے اس لئے اس کے اعضاء سے نفع حاصل کرنا منع ہے۔ اسی طرح خنزیر (سور) کے چمڑے سے دباغت کے بعد بھی نفع حاصل کرنا جائز نہیں وہ مکمل طور پر ناپاک ہے۔

☆ " عن ابن عباس قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول ای اھاب دبغ فقد طھر "
(رواہ مسلم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے جو چمڑہ بھی دباغت دے دیا جائے وہ پاک ہو جاتا ہے۔ (از مظہری)

☆ " وعن عائشۃ ان رسول اللہ ﷺ امر ان ینتفع بجلود المیتۃ اذا دبغت "

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا کہ مردہ جانور کے چمڑے کو دباغت دے کر اس سے نفع حاصل کیا جائے۔ (مظہری)

تنبیہ : جن احادیث میں درندے کے چمڑے سے نفع حاصل کرنا منع کیا گیا ہے ان سے مراد بھی دباغت سے پہلے نفع حاصل کرنا مراد ہے دباغت کے بعد جائز ہے۔

دباغت کیا ہے؟ دباغت کی دو قسمیں ہیں حقیقی اور حکمی۔ دباغت حقیقی یہ ہے کہ کیکر کی چھال وغیرہ سے چمڑے کو تیار کیا جائے جیسے آج کل کیمیائی اجزاء کے استعمال سے چمڑے کو تیار کیا جاتا ہے۔
دباغت حکمی یہ ہے کہ چمڑے پر مٹی وغیرہ ڈال کر اور دھوپ میں رکھ کر خشک کر لیا جائے۔ (از کتب فقہ)

مسئلہ: ہر جانور خواہ ذبح کیا گیا ہو یا مردار ہو اس کے بالوں اور ہڈیوں اور خشک پٹھوں اور سینگوں اور پاؤں کی ہڈی سے نفع حاصل کرنا جائز ہے۔ (از مظہری)

انتباہ: بعض ائمہ نے خنزیر کے بالوں سے سلا ہوا جوتا استعمال کرنا بوقت ضرورت جائز قرار دیا۔ لیکن ابن ہمام رحمہ اللہ نے فرمایا" ان الضرورة لیست ثابتة فی الخرز به بل یمکن ان یقام بغیره " بیشک ضرورت جوتے کی سلائی میں نہیں پائی جاتی اور دھاگہ وغیرہ سلائی کے لئے حاصل کرنا ممکن ہے ایسے جوتوں کی خرید و فروخت منع ہے۔

" وقد کان ابن سیرین لا یلبس خفا خزر بشعر الخنزیر "

حضرت ابن سیرین رحمہ اللہ کبھی وہ جوتا استعمال نہیں کرتے تھے جس میں سور کے بال ہوں۔

کیا کوئی جانور ذبح کرنے کے بغیر حلال ہے؟

جی ہاں اس مسئلہ پر رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی موجود ہے:

☆ " عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ احلت لنا میتتان ودمان فاما المیتتان فالجراد والسمک واما الدمان فالطحال والکبد "

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو جانور بغیر ذبح کرنے کے ہی ہم پر حلال ہیں اور دو خون ہم پر حلال ہیں دو غیر مذبوح سے مراد مکڑی اور مچھلی اور دو خونوں سے مراد تلی کا خون اور جگر کا خون۔ (از صحاح)

واضح ہوا کہ مکڑی اور مچھلی ذبح کرنے کے بغیر ہی حلال ہیں۔

تنبیہ: " عن جابر عن عبد الله قال قال رسول الله ﷺ اذا وجدتموه حیا فکلوه وما القی البحر حیا فمات فکلوه وما وجدتموه میتاطا فیا فلا تاکلوه "

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم مچھلی کو زندہ

پکڑ و تو اسے کھا سکتے ہو اور جسے دریا نے زندہ ہی باہر پھینک دیا پھر وہ مر گئی اسے بھی کھا سکتے ہو اور جسے تم مردہ پانی پر تیرتا ہوا پاؤ اسے نہ کھاؤ۔ (جصاص)

بعض لوگوں نے اس حدیث پاک سے غلط مطلب سمجھا انہوں نے کہا اس مچھلی کا پانی میں رہنا مراد ہے اور یہی وجہ حرام ہونے کی ہے اگر کوئی جانور ذبح کر کے پانی میں پھینک دیا جائے اور وہ پانی کی سطح میں آجائے تو وہ حرام ہو جائے گا۔ یہ قول غلط اور باطل ہے ذبح کیا ہوا جانور پانی میں ڈالنے سے حرام نہیں ہوتا۔

" ان السمک لو مات ثم طفا علی الماء لاکل ولو مات حتف انفه ولم یطف علی الماء لم یؤکل والمعنی فیه عندنا هو موته فی الماء حتف انفه لا غیر "

مچھلی کو زندہ پکڑا وہ مر گئی پھر اسے پانی میں ڈال دیا گیا وہ پانی کی سطح پر آ گئی اسے کھایا جائے جو مچھلی خود بخود مر جائے بیشک وہ پانی پر نہ تیرے اسے نہیں کھایا جائے گا۔

مردہ مچھلی کو نہ کھانے کی اصل وجہ اس کا خود بخود مر جانا ہے اور کوئی وجہ نہیں لہٰذا وہ مچھلی پانی میں ہو یا باہر کنارے میں ہو یہ معلوم نہ ہو کہ پانی نے اسے زندہ ہی باہر پھینکا ہے تو اس کا کھانا جائز نہیں۔

(الجامع لا حکام القرآن للجصاص)

جانوروں کے پیٹ میں بچے کا حکم: جب کسی گائے، بھینس، بھیڑ، بکری اور اونٹنی وغیرہ کو ذبح کیا تو اس کے پیٹ سے مردہ بچہ نکلا تو اس بچے کے گوشت کو کھانا حرام ہے اور اگر زندہ نکلا ذبح نہیں کیا اور مر گیا پھر بھی وہ حرام ہے اور اگر زندہ نکلا اور اسے ذبح کر لیا گیا تو اس کے گوشت کا کھانا حلال ہے یہ قول امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا ہے یہی درست ہے۔

بعض ائمہ نے کہا جب اس بچے کی ماں کو ذبح کر دیا گیا تو یہ اس بچے کے لئے کافی ہے وہ حلال ہونے یا حرام ہونے میں اپنی ماں کے تابع ہے۔ اس لئے بچہ زندہ نکلے یا مردہ اس کے جسم پر بال نکل آئے تھے یا نہیں نکلے ہر حال میں وہ حلال ہے کیونکہ اس کی ماں ذبح کی وجہ سے حلال ہو گئی۔ ان حضرات نے اپنے موقف پر یہ حدیث پاک پیش کی " عن علی وابن عمر قالا ذکاة الجنین

ذکـة امـه " حضرت علی اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم نے فرمایا ماں کے پیٹ میں بچے کا ذبح اس کی ماں کا ذبح ہی ہے اس کا جواب یہ ہے " وهذه الاخبار كلها واهية السند " اس مسئلہ میں اس قسم کی آنے والی تمام روایات کی اسناد میں ضعف پایا گیا ہے ضعیف حدیثوں سے کسی حرام چیز میں حلت ثابت نہیں ہوسکتی۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ جو حدیث پیش کی گئی ہے اس میں دو احتمال پیش کئے گئے ہیں ایک تو وہی جو بعض حضرات نے بطور دلیل پیش کیا ہے کہ " ذكاة الجنين ذكاة امه " کا معنی یہ ہوگا" ان ذكاة امه ذكاة له " بیشک اس کی ماں کا ذبح کرنا اس کا ذبح کرنا ہے۔

لیکن دوسرا احتمال یہ ہے کہ بچے کو ذبح کرنے کا وجوبی طور پر حکم دیا گیا ہو حدیث پاک کا مطلب یہ ہو " تذكيته كما تذكى امه " اس بچے کو ذبح کرنے کا وہی حکم ہے جو اس کی ماں کے ذبح کرنے کا حکم ہے " کاف " عام طور پر محذوف ہوتا رہتا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ جَنَّةٍ عَـرْضُهَـا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ﴾ اس کا معنی ہے " كعرض السموات والارض " جنت کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کی چوڑائی کی طرح ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے " قولي قولك " یعنی " قولي كقولك " میرا قول تمہارے قول کی طرح ہے۔ اور کہا جاتا ہے " مـذهبي مـذهبك " میرا مذہب تمہارے مذہب کی طرح ہے یعنی " مذهبي كمذهبك " کسی شاعر نے اپنی محبوبہ کو ہرنی سے تشبیہ دے کر اس کی تعریف کرتے ہوئے محبوبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

فعيناك عيناها وجيدك جيدها سوى ان عظم الساق منك دقيق

تو تمہاری آنکھیں اس کی آنکھوں کی طرح ہیں اور تمہاری گردن اس کی گردن کی طرح ہے سوائے اس کے کہ اس کی پنڈلی کی ہڈی تم سے باریک ہے۔

اس شعر میں بھی کاف محذوف ہے۔ واضح ہوا کہ اس حدیث پاک کا زیادہ واضح مطلب ہی یہ ہے کہ اس بچے کو ایسے ہی ذبح کیا جائے جیسا کہ اس کی ماں کو ذبح کیا گیا ہے۔

(ماخوذ از الجامع لاحكام القرن للجصاص)

چوہے وغیرہ کا گھی میں مرجانے کا حکم:

" عن الزهری عن سعید بن المسیب عن ابی هریرة قال سئل النبیﷺ عن الفارة تقع فی السمن فقال علیه السلام ان کان جامدا فالقوها وما حولها وان کان مائعا فلا تقربوه "

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ چوہا گھی میں گر جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا اگر گھی منجمد (جما ہوا) ہے تو جہاں گرا ہے اس کے اردگرد سے گھی نکال لیا جائے اور چوہے کو بھی نکال کر پھینک دیا جائے اور اگر گھی پگھلا ہوا ہے تو اس کے قریب نہ جاؤ۔

تنبیہ: حدیث شریف میں جو حکم بیان ہے اس کا تعلق کھانے سے ہے اگر یہی گھی جو پگھلا ہوا تھا اور چوہا اس میں گر کر مر گیا وہ بیچ دیا اور یہ واضح کر دیا جائے کہ اس میں چوہا گر کر مر گیا ہے تو اس کا بیچنا جائز ہے اس لئے چراغ جلانے کشتیوں وغیرہ کی لکڑیوں پر اسے استعمال کرنا جائز ہے۔ یعنی جس طرح گدھے وغیرہ کو بیچنا جائز ہے کہ اس سے نفع حاصل کیا جائے لیکن اسے کھایا نہ جائے یہی حکم اس گھی کا بھی ہے کیونکہ یہ نجس العین نہیں۔ (از جصاص)

ہنڈیا میں پرندہ گر کر مرجانے کا حکم:

علی بن مسہر کہتے ہیں کہ میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے پاس تھا آپ کے پاس ابن مبارک آئے جنہوں نے خراسانی ہیئت (شکل) اختیار کی ہوئی تھی انہوں نے امام صاحب سے سوال کیا کہ ایک شخص نے ہنڈیا کو آگ پر چڑھایا اس میں گوشت تھا ایک پرندہ اس پر سے گزرتے ہوئے گر کر مر گیا تو اس کا حکم کیا ہے؟

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے اپنے اصحاب سے پوچھا کہ تمہارے نزدیک اس کا کیا حکم ہے؟ انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول سے دلیل پیش کرتے ہوئے کہا کہ شوربا انڈیل دیا جائے اور گوشت دھو کر کھا لیا جائے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ہم بھی یہی کہتے ہیں لیکن اس میں تفصیل ہے وہ یہ ہے۔

" فان کان وقع فیها فی حال سکونها فکما فی هذه الروایة وان وقع فیها فی حال غلیانها لم یؤکل اللحم ولا المرق "

اگر پرندہ گرا ہے جب کہ ہنڈیا جوش نہیں مار رہی تھی تو پھر یہی حکم ہی کہ شوربا انڈیل دیا جائے اور گوشت دھوکر کھالیا جائے لیکن پرندہ اگر ہنڈیا کے جوش مارتے وقت گرے تو شوربا اور گوشت دونوں چیزوں کو کھانا منع ہے۔

حضرت ابن مبارک نے اس تفصیل کی وجہ پوچھی تو آپ نے بتایا کہ جب جوش مارتے وقت پرندہ گرے تو اس کی نجاست گوشت کے اندر سرایت کر جاتی ہے۔ اور جب ہنڈیا جوش نہ مار رہی ہو تو پرندہ گرے تو وہ گوشت میں اثر انداز نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ گوشت اوپر سے میلا (گندہ) ہوگیا اسے دھوکر کھالیا جائے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت مطلق ہے اس میں یہ دونوں احتمال پائے جاسکتے ہیں جن کی تفصیل امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے بیان فرمادی سبحان اللہ امام اعظم رحمہ اللہ کا کلام بھی اعظم ہے۔

روایت ابن عباس: " روی ابن المبارک عن عثمان بن عبد الله الباهلی قال حدثنی عکرمة عن ابن عباس فی طیر وقع فی قدر فمات فقال یهراق المرق ویؤکل اللحم "

حضرت عکرمہ فرماتے ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا جب کوئی پرندہ ہنڈیا میں گر جائے اور مر جائے تو شوربا گرا دیا جائے اور گوشت (دھوکر) کھالیا جائے۔ اس روایت میں گوشت کے جوش مارنے کی حالت میں پرندے کے گرنے کا ذکر نہیں لہٰذا امام صاحب رحمہ اللہ کی تفصیل بہت درست ہے۔

اعتراض: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت اور ثابت ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ پرندہ ہنڈیا کے جوش مارنے کی حالت میں بھی گر کر مر جائے تو گوشت کا کھانا جائز ہے۔

" روی محمد بن ثوبان عن السائب بن خباب انه کان له قدر علی النار فسقطت فیها دجاجة فماتت ونضجت مع اللحم فسألت ابن عباس فقال اطرح المیتة واهرق المرق وکل اللحم فان کرهته فارسل الی منه عضوا او عضوین "

محمد بن ثوبان سائب بن خباب سے روایت کرتے ہیں کہ ان کی ہنڈیا آگ پر پک رہی تھی اس میں مرغی گر کر مر گئی اور گوشت کے ساتھ پک گئی تو میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے

متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ مردار کو پھینک دو، شوربا بہا دو، اور گوشت کھا لو اگر تمہیں گوشت کھانے میں کراہت محسوس ہو تو گوشت کا ایک یا دو عضو میری طرف بھی بھیج دو۔

اس حدیث سے پتہ چلا کہ ہنڈیا جوش مار رہی تھی اسی وجہ سے مرغی اس میں پک گئی تو امام صاحب کی توجیہ کس طرح صحیح ہی؟

جواب: " لا دلالة فيه على حال الغليان لانه جائز ان يكون وقعت فيه بعد سكون الغليان والمرق حار فنضجت فيه والله سبحان اعلم "

اس روایت میں یہ کوئی دلالت نہیں پائی گئی کہ وہ مرغی ہنڈیا کے جوش مارنے کی حالت میں گری ہو سکتا ہے کہ ہنڈیا کا جوش ختم ہونے کے بعد گری ہو شوربے کے گرم ہونے کی وجہ سے پک گئی ہو۔ (اس کی نجاست گوشت کے اندر اثر انداز نہ ہوئی ہو) (از جصاص)

خیال رہے کہ " نضج " کا معنی کامل طور پر پک کر تیار ہونا مراد بھی نہیں بلکہ پکنے کی حالت کو "نضج" کہا جاتا ہے۔

والدم : "اور خون" یعنی جو چیزیں تم پر اللہ تعالیٰ نے حرام کی ہیں ان میں سے خون بھی ہے جو حرام ہے۔

کون سا خون حرام ہے: خون سے مراد بہنے والا خون ہے کیونکہ دوسری آیۃ میں ﴿اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا﴾ ذکر فرمایا جس سے واضح ہوتا ہے کہ مراد " دم مسفوح " بہنے والا خون ہی ہے۔ البتہ جس طرح پہلے حدیث پاک بیان کر دی گئی کہ دو بہنے والے خون حلال ہیں یعنی تلی اور جگر کا خون بہنے کے باوجود حلال ہے۔ ذبح کے وقت جو خون نکلے یا زخم سے اور پھوڑے وغیرہ کے پھٹ جانے سے جو خون نکلے وہ حرام ہے۔

دم مسفوح نجاست غلیظہ ہے: بہنے والا خون اگر جسم اور کپڑے پر درھم سے کچھ زائد ہو جائے تو اس کا دھونا فرض ہے اس کے ہوتے ہوئے نماز ادا نہیں ہوگی۔ اگر درہم کی مقدار ہو جائے تو واجب ہے کہ اسے دھو دیا جائے درھم کی مقدار یہ ہے کہ ہاتھ کو سیدھا اکڑا کر رکھے اور پانی ہتھیلی میں ڈالے جتنی جگہ پانی رک جائے اتنی مقدار ہے درھم کی۔

مسئلہ : جسم کے کسی حصہ سے خون کے نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ ہاں اگر خراش آئے خون

ظاہر ہوا لیکن آگے نہیں چلا تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔ دانتوں سے خون نکلے تو تھوک کر دیکھے اگر تھوک زردی مائل ہو تو وضو نہیں ٹوٹا اگرچہ وضو بنا کر لینا بہتر ہے اور اگر تھوک سرخی مائل ہو تو وضو ٹوٹ گیا۔ جو خون وضوء کو توڑ دیتا ہے وہ ناپاک ہے اور جو خون وضوء کو نہیں توڑتا وہ ناپاک نہیں۔ (از شامی)

ذبح کے بعد گوشت میں رہ جانے والے خون کا حکم:

" واما اللحم يخالطه الدم فلا بأس به " گوشت میں جو خون پایا جاتا ہے اس میں کوئی حرج نہیں یعنی وہ حلال اور پاک ہے۔ خون کے جو اجزاء گوشت میں رہ جاتے ہیں اور رگوں میں رہ جاتے ہیں ان کا کھانا جائز ہے اس مسئلہ میں فقہاء کرام کا کوئی اختلاف نہیں۔

" الا ترى انه متى صب عليه الماء ظهرت تلك الاجزاء وليس هو بمحرم اذ ليس هو مسفوحا "

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ جب اس پر پانی بہایا جائے تو خون کے اجزا ظاہر ہو جاتے ہیں حالانکہ وہ حرام نہیں کیونکہ وہ بہنے والا خون نہیں۔

☆ " روى القاسم بن محمد عن عائشة انها سئلت عن الدم يكون في اللحم والمذبح قالت انما نهى الله عن الدم المسفوح "

قاسم بن محمد رحمہ اللہ سے مروی ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا گیا کہ جو خون گوشت میں رہ جاتا ہے اور ذبح کرنے کے بعد جانور میں خون رہ جاتا ہے اس کا حکم کیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بہنے والے خون سے منع فرمایا ہے۔ (از جصاص)

آپ کا مطلب یہ تھا کہ جو خون گوشت میں رہ جاتا ہے اس سے رب تعالیٰ نے منع نہیں فرمایا۔ جب رب تعالیٰ نے منع نہیں فرمایا تو حلال ہے۔

آپ کے ارشاد سے واضح ہو گیا کہ جس چیز سے رب قدوس نے منع نہ فرمایا ہو وہ حلال رہتی ہے کیونکہ اشیاء میں اصل اباحت ہے۔ (راقم)

☆ " وقد روت عائشة رضى الله عنها قالت كنا نطبخ البرمة على عهد رسول الله ﷺ تعلوها الصفرة من الدم فناكل ولا ننكره "

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہنڈیا پکاتی تھیں

گوشت کے اوپر خون کی وجہ سے زردی آ جاتی تھی ہم اسے کھا لیتے تھے کبھی ہم نے اس کا انکار نہیں کیا۔ (از قرطبی)

شرعی ضابطہ: " لان التحفظ من هذا اصر وفيه مشقة والاصر والمشقة فی الدين موضوع وهذا اصل فی الشرع "

شرع میں قانون اور ضابطہ یہ پایا گیا ہے کہ جس کام میں مشقت اور بوجھ پایا جائے اسے شریعت میں رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اٹھا لیتے ہیں گوشت میں رہ جانے والے خون سے بچنا بھی مشکل اور مشقت کا سبب تھا اسی وجہ سے اسے حلال کر دیا گیا اس کے حرام ہونے کا حکم نہیں دیا گیا۔

اسی ضابطہ کی وجہ سے جو کام امت پر حرج کا سبب بنے ہیں عبادت میں ان کو عبادات میں سے ساقط کر دیا گیا۔ (ہٹا دیا گیا) یہی وجہ ہے کہ جو شخص مجبور ہو جائے اسے مردار کھانے کی اجازت دے دی گئی۔ (جس کا ذکر تفصیل سے انشاء اللہ اسی آیۃ کریمہ کے آخر میں آ رہا ہے) اور مریض کو روزہ افطار کرنے کی اور تیمم کرنے کی اجازت دی گئی۔ (از قرطبی)

مچھلی کا خون پاک اور حلال ہے: قالیسی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ مچھلی کا خون پاک ہے اور انہوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ یہ حلال ہے اور یہی قول ابن عربی رحمہ اللہ کے نزدیک معتبر ہے۔

" **لانه لو كان دم السمک نجسا لشرعت ذكاته** اسی لئے کہ اگر مچھلی کا خون نجس ہوتا تو مچھلی کو ذبح کرنا بھی شریعت میں لازم ہوتا۔

یہی مذہب امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا ہے مچھلی کا خون حقیقت میں خون ہی نہیں صرف اس کے ظاہری رنگ کو دیکھ کر اس پر "دم" (خون) کا لفظ بول لیا جاتا ہے اس لئے کہ قانون یہ ہے کہ خون دھوپ پر سیاہ ہو جاتا ہے لیکن مچھلی کا خون دھوب پر سفید ہو جاتا ہے اس سے پتہ چلا کہ مچھلی کا خون حقیقت میں خون ہی نہیں۔

اعتراض: گوشت خون سے پیدا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے مچھلی کے لئے " لحما طريا " (تر و تازہ گوشت) کے الفاظ کا استعمال کیا ہے تو کس طرح کہا جاتا ہے کہ مچھلی میں خون نہیں۔

جواب: ﴿ لحم ﴾ بھی مچھلی پر ایسے ہی بولا گیا ہے جیسے ﴿ دم ﴾ بولا گیا ہے اس لئے کہ ضابطہ یہ ہے

کہ خون میں حرارت (گرمی) اور پانی میں برودت (ٹھنڈک) پائی جاتی ہی اسی وجہ سے دموی (خون والے جانور) ہمیشہ پانی میں نہیں رہ سکتے۔

بطخ اور مرغابی میں خون پایا جاتا ہے اس لئے وہ ہمیشہ پانی میں نہیں رہتیں حالانکہ مچھلی کی پیدائش بھی پانی میں ہوتی ہے اور ہمیشہ ہی پانی میں رہتی ہے پانی کے بغیرہ زندہ رہ ہی نہیں سکتی اسی سے واضح ہو گیا کہ مچھلی میں خون نہیں۔ (ماخوذ از قرطبی ونور الانوار)

جانوروں کے حلال ہونے اور حرام ہونے پر شاندار ضابطہ:

کل حرام جانور یہ ہی نہیں بلکہ اسکے علاوہ کتا، بلی، گدھا وغیرہ سب حرام ہیں عالمگیری میں اسکی پہچان کا عجیب قاعدہ بیان کیا وہ یہ کہ جانور دو قسم کی ہیں، دریائی اور خشکی کے، دریائی سب حرام ہیں سوائے مچھلی کے۔ خشکی والے پھر دو طرح کی ہیں، پرندے اور چرندے، یعنی ہوائی اور زمینی۔ پرندے پھر دو قسم کے ہیں ایک خون والے اور بغیر خون کے۔ جن میں بہنے والا خون نہیں وہ سب حرام ہیں سوائے مکڑی کے۔ خون والے پرندے جو پنجے سے پکڑ کر چیز کھائیں وہ حرام باقی حلال۔ زمینی جانور بھی دو طرح کے ہیں خون والے اور بغیر خون کے جن میں خون نہیں وہ سب حرام ہیں۔ اور خون والے جو دوسرے پر حملہ کرنیوالے درندے ہیں جیسے کتا، بلی، شیر وغیرہ یہ سب حرام ہیں باقی حلال۔ اور خون والے حشرت الارض کیڑے مکوڑے وغیرہ اور موذی جانور بچھو، سانپ، چوہا، چھپکلی وغیرہ سب حرام ہیں۔ (از نعیمی)

مسئلہ : حلال جانوروں کی یہ چیزیں حرام ہیں، خون بہنے والا، پتہ، مثانہ، نر کا ذکر، مادہ کی فرج مذکر اور مؤنث کی دبر۔ (از نعیمی)

فائدہ : تلی اور گردہ نبی کریم ﷺ کو ناپسند تھے ایسے ہی اوجڑی وغیرہ۔ اور بکری کا دست (اگلے پاؤں) اور سینہ کا گوشت بھی حضور ﷺ کو پسند تھا۔ (از نعیمی)

طوطے کا حکم: "یحرم اکلھا علی الاصح فی الرافعی ونقلہ فی البحر عن الضمیری واقرہ وعلل ذلک بخبث لحمھا"

طوطے کا کھانا حرام ہے صحیح قول یہی ہی رافعی میں یہی مذکور ہے اور البحر الرائق ضمیری سے یہی

ذکر کیا ہے پھر اس قول کو اسی طرح ثابت رکھا ہے کوئی رد نہیں کیا اور علت اس کی یہ بیان کی گئی ہے کہ اس کا گوشت خبیث (ناپاک) ہے۔ تاہم بعض حضرات نے حلال بھی کہا ہے کہ یہ پاکیزہ چیزیں کھاتا ہے اور زہریلے جانوروں سے نہیں، اور دوسرے پرندوں کا شکار نہیں کرتا اور نہ ہی اس کے قتل کا حکم دیا گیا ہے اور نہ ہی اس سے منع کیا گیا ہے یہ تمام وجوہ ہیں حلال ہونے کی۔ لیکن صحیح وہی جو جلیل القدر فقہاء کرام نے بیان کیا ہے کہ یہ حرام ہے۔ (از حیوۃ الحیون)

مور کا حکم: "**یحرم اکل لحم الطاؤس لخبث لحمه**" مور کا گوشت کھانا حرام ہے کیونکہ اس کا گوشت خبیث (ناپاک) ہے۔ تاہم اس میں بھی ایک قول حلال ہونے کا ملتا ہے کہ یہ گندی چیزیں نہیں کھاتا۔ لیکن جب حرام ہونا واضح طور پر ملتا ہے تو حرام ہی سمجھا جائے۔ (از حیوۃ الحیوان)

مور کے پر دوسرے پرندوں کے پروں کی طرح پاک ہیں خوبصورتی کی وجہ سے لوگ قرآن پاک میں رکھ لیتے ہیں یہ جائز ہے۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ نے بھی قرآن پاک میں مور کے پروں کا خوبصورتی کی وجہ سے رکھنے کا ذکر اپنے کتاب گلستان میں کیا ہے۔ گویا کہ یہ قدیم زمانہ کا رواج ہے جب جائز ہے تو اس پر کسی قسم کی بحث کی ضرورت نہیں۔ (راقم)

خنزیر: یہ مردار کھاتا ہے۔ یہ اپنی مؤنث کی پیٹھ پر سوار ہو جاتا ہے اور وہ چرتی رہتی ہے کئی میلوں تک وہ چلتی رہتی ہے یہ اس کی پیٹھ پر سوار رہتا ہے۔ یہ جب کسی کتے کو کاٹ لے تو اس کے بال گر جاتے ہیں اسے بیشک گھڑیال بھی لیں اس کی بے حیائی والی حرکات میں کوئی فرق نہیں آتا۔ سانپ کو یہ کھا لیتا ہے سانپ کا زہر اس پر اثر نہیں کرتا۔ اگر یہ تین دن بھوکا رہے پھر دو دن کھالے تو موٹا ہو جاتا ہے اسے گدھے کے ساتھ باندھ دیں جب گدھا پیشاب کرے تو یہ مر جاتا ہے۔ اس کی ایک آنکھ نکال دیں تو یہ جلدی مر جاتا ہے۔ یہ جب مریض ہو جائے تو کیکڑا کھائے تو ٹھیک ہو جاتا ہے۔ شہوت بھی اس میں بہت ہے اور بے حیا بھی ہے۔ خنزیرنی جب پندرہ سال کی ہو جائے تو اس کی اولاد کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے خنزیر کی نسل تیزی سے پھیلتی ہے۔ (حیوۃ الحیوان)

کبھی پاکستانیوں نے سوچا ہے کہ آج کل خنزیروں کی بہتات کیوں ہے؟ اسکی صرف وجہ یہ ہے کہ تیل کمپنیوں کے انگریزوں نے خنزیر کے بچوں کے جوڑے لاکر پاکستانی جنگلوں میں چھوڑ دیئے۔

انگریز کی یاری کا یہ فائدہ حاصل ہوا کہ آج کل کھیتی باڑی تباہ ہو رہی ہے خنزیروں کو ختم کرنا اب ممکن نظر نہیں آتا

ولحم الخنزیر : (اور سور کا گوشت) یعنی تم پر سور کا گوشت حرام کر دیا ہے۔ سور (نجس العین) یعنی مکمل طور پر ناپاک ہے اس کا گوشت، ہڈیاں، پٹھے اور بال وغیرہ تمام اعضاء اس کے ناپاک ہیں ان سے نفع حاصل کرنا جائز نہیں۔ خنزیر اور اس کے تمام اعضاء گوشت وغیرہ کی خرید و فروخت حرام ہے۔ (از کتب فقہ)

سوال و جواب : افریقہ کے ایک دوست نے یہ مسائل پوچھے تھے کہ ہمارے علاقہ میں صابن وغیرہ ایسا ملتا ہے جس میں مردہ جانوروں کی چربی استعمال ہوتی ہے ان کا استعمال جائز ہے یا نہیں۔ اسی طرح دانتوں والے برش میں سور کے بال استعمال ہوتے ہیں ایسے برش کا استعمال شرعاً جائز ہے یا نہیں۔ اور بعض صابنوں میں سور کی چربی استعمال ہوتی ہے اس کا حکم کیا ہے؟

راقم نے جو جواب تحریر کر کے دیا تھا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر صابن مردہ جانور کی چربی کے بغیر دوسرے تیل سے بنا ہوا ملتا ہے تو مردہ جانور کی چربی والا استعمال جائز نہیں۔ اگر اور کوئی صابن نہیں ملتا تو عذر ہے اس صابن کو استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن یہ صابن نجس (ناپاک) ہے اس لئے جس کپڑے یا جسم پر استعمال کیا جائے تو اس کے بعد تین مرتبہ پانی سے پاک کرنا ضروری ہے کیونکہ ناپاک صابن سے جسم ناپاک ہو گیا ہے۔ ایسا برش جس میں سور کے بال ہوں اور یقین ہو اس برش کا استعمال کرنا حرام ہے تاہم پاکستان میں اکثر طور پر دانتوں والے برش پلاسٹک کے بالوں سے تیار ہیں جن کا استعمال جائز ہے ممکن ہے عیسائیوں کے یا سور کے بالوں والے برش استعمال کرتے ہوں تو یہ حرام ہے۔ سور کی چربی والا صابن جب یقین ہو کہ اس میں سور کی چربی استعمال کی گئی ہے اسے استعمال کرنا حرام ہے۔

(واللہ اعلم بالصواب)

تنبیہ : کسی حرام جانور کو مسلمان اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ذبح کر دے تو وہ حلال تو نہیں ہوتا لیکن گوشت اس کا پاک ہو جاتا ہے وہ گوشت یا گوشت میں رہ جانے والا خون انسان کے جسم یا کپڑے کو لگ جائے تو وہ جسم اور کپڑا ناپاک نہیں ہوگا۔ خنزیر کو مسلمان اللہ کا نام لے کر ذبح بھی کر دے پھر بھی وہ حرام اور نجس (ناپاک) ہی رہے گا۔ (از کتب فقہ)

مسئلہ : کسی کافر کا ذبح کیا ہوا جانور حلال نہیں ہوتا البتہ اہل کتاب کا ذبح کیا ہوا جانور حلال

ہو جاتا ہے کیونکہ ان کا اللہ تعالیٰ پر ایمان ہوتا ہے۔لیکن آج کل زیادہ اہل کتاب یعنی یہود ونصاری زندیق، دہریئے ہیں جن کا اللہ تعالیٰ پر اور قیامت پر ایمان نہیں ان کا ذبح کیا ہوا جانور حرام ہوتا ہے۔

زیادہ طور پر وہ بڑے جانور کو گولی مار کر ہلاک کر دیتے ہیں جو حرام ہو جاتا ہے۔

یہ بھی خیال رہے کہ بندوق کی گولی مسلمان بسم اللہ پڑھ کر جانور پر چلائے تو وہ گولی سے مر جائے تو حرام ہے کیونکہ گولی جانور کو پھاڑتی نہیں بلکہ اس کی ضرب سے جانور مر جاتا ہے۔

پکی گولی اگر چہ پھاڑتی ہے لیکن جس جانب سے وہ لگتی ہی اس جانب سے صرف سوراخ کرتی ہی دوسری جانب سے گولی کا بارود اور اس میں ملے ہوئے لوہے کی ٹکڑے پھاڑتے ہیں اس لئے وہ بھی حرام ہی ہوتا ہے۔

یہود ونصاری آج کل مرغی کی گردن پکڑ کر کھینچ کر ہلاک کر دیتے ہیں اور بھیڑ بکری کے سر میں دماغ کے اندر کیل ٹھونک کر مار دیتے ہیں اس لئے یہود ونصاری کے ہاتھوں مارے ہوئے جانوروں کا گوشت کھانا حرام ہے۔ (از کتب فقه بمع وضاحت راقم)

مسئلہ : مردہ مرغی کے پیٹ سے پکا انڈا نکلے تو اس کا کھانا جائز ہے اور کچا انڈا جس پر سخت خول نہ آئے اس کا کھانا جائز نہیں۔ذبح کی ہوئی مرغی کے پیٹ سے پکا انڈا نکلے یا کچا اس کا کھانا جائز ہے۔

(از قرطبی)

تنبیہ : انفحہ (بکری کے بچے کے معدے سے بنا ہوا پنیر (المنجد) سے جو پنیر حاصل ہوتا ہے یعنی دودھ کو منجمد کرنے کے لئے، کھویا بنانے کے لئے "انفحہ" کا استعمال بعض حضرات نے جائز قرار دیا ہے خواہ مردار سے حاصل ہو۔کہ نبی کریم ﷺ کے پاس پنیر عجم سے آتا تھا جو آپ نے استعمال کیا ہے حالانکہ وہ انفحہ مردہ جانوروں سے حاصل کیا جاتا تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ صحابہ کرام فتوحات کے بعد عجم میں پھیل گئے تھے ذبح کئے ہوئے جانوروں کے انفحہ سے حاصل ہونے والا پنیر استعمال کیا گیا۔

لیکن مردہ جانوروں کے انفحہ سے بنایا جانے والا پنیر (کھویا) حرام ہے۔(ماخوذ از قرطبی)

☆ " عن سلمان الفارسی قال سئل رسول الله ﷺ عن السمن والجبن والفراء فقال الحلال ما احل الله فی کتابه والحرام ما حرم الله فی کتابه وما سکت عنه فهو مما عفا عنه "

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا '' گھی '' اور پنیر (کھویا) اور جنگلی گدھے کے متعلق ۔ تو آپ نے فرمایا حلال وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال کر دیا ہے اور حرام وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام کیا ہے ۔ اور جس سے سکوت (خاموشی کو) اختیار کیا ہے وہ معاف ہے ۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ مردہ جانور سے حاصل ہونے والا انفحہ حرام ہے لہذا جب اسے دودھ میں استعمال کر کے کھویا بنائے جائے تو وہ کھویا بھی حرام ہے ۔ اور حلال جانور سے حاصل ہونے والا انفحہ حلال ہے جب اسے دودھ میں ڈال کر کھویا بنایا جائے تو وہ حلال ہے ۔ (ماخوذ از قرطبی)

تنبیه : جس چیز کو نبی کریم ﷺ حلال کر دیں وہ حلال ہے اور جس چیز کو نبی کریم ﷺ حرام کر دیں وہ حرام ہے وہ دراصل رب تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے لہٰذا گویا کہ وہ کتاب اللہ کا حکم ہی ہوتا ہے ۔

☆ " وعن المقدام بن معد یکرب قال قال رسول الله ﷺ الا انی اوتیت القرآن ومثله معه الا یوشک رجل شبعان علی اریکته یقول علیکم بهذا القرآن فما وجدتم فیه حلال فاحلوه وما وجدتم فیه من حرام فحرموه وان ما حرم رسول الله کما حرم الله الا لایحل الحمار الاهلی ولا کل ذی ناب من السباع ولا لقطة معاهد الا ان یستغنی عنها صاحبها ... الخ ، رواه ابو داؤد روی الدارمی نحوه وکذ ابن ماجه الی قوله کما حرم الله "

(مشکوۃ کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة)

مقدام بن معد یکرب فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خبردار بیشک مجھے قرآن پاک اور اس کی مثل (حدیث پاک) عطا کئے گئے ۔ خبردار ایک وقت میں ایک شخص امیر آرام دہ کرسی پر بیٹھنے والا کہے گا ۔ تم پر لازم ہے کہ صرف قرآن پر عمل کرو ۔ جو قرآن میں حلال پاؤ وہی حلال ہے اور جو قرآن میں حرام پاؤ وہی حرام ہے بیشک اللہ کے رسول نے جس چیز کو حرام کیا وہ ایسے ہی حرام ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کو حرام کیا ۔ خبردار تمہارے لئے گھریلو گدھے حلال نہیں ۔ اور درندے حلال نہیں (جیسے شیر ، چیتا ، بھیڑیا وغیرہ ۔ دوسری حدیث میں دوسرے پرندوں کا شکار کرنے والے پرندوں کو بھی حرام قرار دیا جیسے

چیل، باز وغیرہ) اور کسی ذمی (جس سے تمہارا معاہدہ ہو کہ تو ہمارے ملک میں رہ سکتا ہے ہم تیرے مال اور تیری جان کے محافظ ہیں باوجود اس کے کہ وہ کافر ہوتا ہے) کی گری ہوئی چیز تمہارے لئے حلال نہیں ہاں اگر اس کا مالک اس سے بے پرواہ ہو۔

اس حدیث میں ذمی کی گری ہوئی چیز کا ذکر کیا ہے حالانکہ مسلمان کی گری ہوئی چیز کا بھی یہی حکم ہے کہ وہ چیز اٹھانے والا خود استعمال نہ کرے ہاں اگر کوئی حقیر چیز ہو پتہ ہو کہ مالک اسے تلاش نہیں کر رہا ہوگا، تو وہ کسی غریب کو دے دے، یا خود محتاج ہو تو استعمال کر لے۔

ذمی کے ذکر کا مقصد یہ ہے کہ بعض اوقات انسان لاپرواہی سے کام لیتا ہے کہ چلو یہ چیز تو کافر کی ہے اسے کیا دینی ہے واضح ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے حلال ہونے والی چیزیں یا حرام ہونے والی چیزیں قرآن پاک کے مطابق ہی ہیں کیونکہ آپ وہی ارشاد فرماتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے۔

اعتراض: تم نے کہا ہے مردہ جانور کا انفحہ (بکری کے بچے کے معدہ کے ساتھ پایا جانا والا کوئی عضو) حرام ہے۔ حالانکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اسے پاک کہا ہے۔

جواب: امام مالک اور امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ کا اس میں قول یہ ہے "**ان ذلک لا ینجس بالموت ولکن ینجس بمجاورۃ الوعاء النجس**" یہ جانور کے مرنے سے اگرچہ نجس نہیں ہوتا لیکن جس جگہ میں ہوتا ہے وہ جگہ اس جانور کے مرنے سے ناپاک ہو جاتی ہے اس لئے یہ بھی ناپاک ہو جاتا ہے۔
(ماخوذ از قرطبی)

وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ : "اور وہ جانور جو ذبح کئے گئے ہوں اللہ کے غیر کا نام لے کر" یعنی جن جانوروں کو اللہ تعالیٰ کے نام کے بغیر ہی ذبح کر دیا جائے وہ حرام ہیں اس گوشت کا کھانا مسلمان کیلئے جائز نہیں۔

تنبیہ: ﴿وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ کے مسئلہ میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے وجہ اختلاف یہ ہے کہ مسئلہ کو واضح طور پر کھول کر نہیں بیان کیا جاتا جس کی وجہ سے اختلاف کا سبب بنتا ہے اگر مسئلہ کو واضح طور پر بیان کیا جائے تو کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔

مقام افسوس ہے کہ اہل علم مسئلہ کی ایک ایک صورت کو بیان کر کے اختلاف کا شکار ہیں کاش کہ

مسئلہ مکمل بیان کر دیا جائے۔

اس مسئلہ میں تین وجوہ: دوصورتوں میں حرام ہے ایک صورت جائز اور حلال ہے۔

حرام ہونے کی پہلی وجہ: جس جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام نہ لیا جائے بتوں کے نام لے کر ذبح کیا جائے اس کا کھانا حرام ہے:

﴿ وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ﴾ ای ذکر علیہ غیر اسم اللہ تعالیٰ وھی ذبیحۃ المجوسی والوثنی والمعطل فالوثنی یذبح للوثن والمجوسی للنار والمعطل لا یعتقد شیا فیذبح لنفسہ "

جس جانور پر اللہ تعالیٰ کے غیر کا نام لے کر ذبح کیا جائے وہ حرام ہے آگ پرست آگ کا نام لے کر ذبح کرتا تھا اس لئے اس کا ذبح کیا ہوا جانور حرام ہے۔ اور بت پرست بتوں کے نام لے کر ذبح کرتے تھے اس لئے ان کا ذبح کیا ہوا جانور حرام ہے۔ اور تعطیلیہ فرقہ کا کوئی شخص جانور کو ذبح کرتا تو وہ بھی حرام ہوتا کیونکہ ان کے عقیدہ میں رب تعالیٰ نے عقل اول کو پیدا کیا پھر وہ خود معطل ہو گیا۔ اب نظام عقول عشرہ چلا رہے ہیں۔ اس لئے یہ کافر ہیں لہٰذا ان کا ذبح کیا ہوا جانور بھی حرام ہوتا ہے۔ اگرچہ ذبح کے وقت یہ کسی کا نام بھی نہیں لیتے آگ پرست اور بت پرست آگ یا بت کا نام نہ بھی لیں تو پھر بھی ان کے ذبح کرنے سے جانور حرام ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ مشرکین ہیں مشرکین کے ذبح کرنے سے جانور حرام ہو جاتا ہے۔

" والاھلال رفع الصوت یقال اھل بکذا ای رفع صوتہ "

" اھلال " کا معنی ہے آواز بلند کرنا، کہا جاتا ہے **" اھل بکذا "** اس نے اس طرح آواز کو بلند کیا۔ **"ومنہ اھلال الصبی واستھلالہ وھو صیاحہ عند ولادتہ "** پیدائش کے وقت بچے کے رونے کو بھی " اھلال " کہتے ہیں۔ **(از قرطبی)**

" وقدروی عطاء بن السائب عن زادان ومیسرۃ ان علیا علیہ السلام قال اذ اسمعتم الیھود والنصاری یھلون لغیر اللہ تعالیٰ فلا تأکلوا واذا لم تسمعوھم فکلوا فان اللہ قد احل ذبائحھم وھو یعلم ما یقولون "

عطاء بن سائب نے زادان اور میسرہ سے روایت کیا ہے کہ بیشک حضرت علی رضی اللہ عنہ نے

فرمایا جب تم سنو کہ یہود اور نصاریٰ نے ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کے غیر کا نام لیا ہے تو اسے نہ کھاؤ اور اگر ان سے یہ نہ سنو تو کھالو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کا ذبیحہ حلال کیا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔

(الجصاص وفتح البیان ج ۱ ص ۲۲۲)

" ای رفع به الصوت عند ذبحه " (بیضاوی)

﴿ وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ذبح کے وقت آواز کو بلند کرنا۔

" قال الاصمعی **الاهلال اصله رفع الصوت فكل رافع صوته فهو مهل** وقال ابن احمر ، يهل بالفد ركبانها ، كما يهل الراكب المعتمر هذا معنى الاهلال في اللغة ثم قيل للمحرم مهل لرفعه الصوت بالتلبية عند الاحرام هذا معنى الاهلال يقال اهل فلان بحجة او عمرة اى احرم بها وذلك لانه يرفع الصوت بالتلبية عند الاحرام والذابح مهل لان العرب كانوا يسمون الاوثان عند الذبح ويرفعون اصواتهم بذكرها "

امام فرماتے ہیں کہ اہلال کا اصلی معنی آواز بلند کرنا ہے پس جو شخص بھی آواز بلند کرے گا اس کو عربی میں مہل کہیں گے ابن احمر کا ایک شعر ہے:

جنگل میں اس کے سواروں نے آواز بلند کی ، جس طرح عمرہ کرنے والا آواز بلند کرتا ہے

لغت میں اہلال کے یہی معنی ہیں اسی وجہ سے محرم (احرام باندھنے والے) کو مہل کہا جاتا ہے کیونکہ وہ احرام کی حالت میں تلبیہ پڑھتے ہوئے آواز بلند کرتا ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے " اهل فلان بحجة او عمرة " فلاں شخص نے حج اور عمرہ کا احرام باندھا اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ تلبیہ پڑھتے وقت آواز کو بلند کرتا ہے۔ ذبح کرنے والے کو بھی مہل کہا جاتا ہے کیونکہ عرب والے لوگ ذبح کے وقت اپنے بتوں کا نام بلند کرتے تھے۔ (کبیر)

یعنی وما ذبح للاصنام والطواغيت واصل الاهلال رفع الصوت وذلک انهم کانوا يرفعون اصواتهم بذکر آلهتهم اذا ذبحوا لها فجرى ذلک مجرى امرهم وحالهم حتى قيل لكل ذابح مهل وان لم يجهر بالتسمية "

یعنی ذبح کے وقت جن جانوروں پر بتوں اور شیطانوں کا نام لیا گیا ہو وہ حرام ہیں۔ اصل میں

اہلال کا معنیٰ آواز کو بلند کرنا ہے۔ اس لئے کہ وہ ذبح کے وقت اپنے باطل معبودوں کا نام لیتے تھے۔ اگر چہ اصل میں آواز بلند کرنے کو اہلال کہتے ہیں لیکن مطلقاً سبب کو مسبب کی جگہ رکھ دیا اگر چہ آواز کو بلند نہ کریں بلکہ آہستہ آواز میں بھی بتوں کا نام استعمال کریں اسے بھی اہلال کہا جاتا ہے۔ (خازن)

☆ " اخرج ابن المنذر عن ابن عباس فی قوله تعالیٰ ﴿ وَمَا اُهِلَّ ﴾ قال ذبح "

☆ " واخرج ابن جریر عن ابن عباس فی قوله تعالیٰ ﴿ وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ ﴾ یعنی ما اهل للطواغیت "

☆ " واخرج ابن ابی حاتم عن مجاهد ﴿ وَمَا اُهِلَّ ﴾ قال ما ذبح لغیر الله "

☆ " واخرج ابن ابی حاتم عن ابی العالیة " ﴿ وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ ﴾ یقول ما ذکر علیه اسم غیر الله "

(اللہ کے نام کے بغیر) ابن منذر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ ﴿وَمَآ اُهِلَّ ﴾ کا مطلب ذبح کرنا ہے۔

اور ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ ﴿وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ ﴾ کا مطلب ہے بتوں کے نام پر ذبح کرنا۔

ابن ابی حاتم نے مجاہد سے روایت بیان کی کہ ﴿ وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ ﴾ کا مطلب یہ ہے اللہ کے غیر کا نام لے کر ذبح کیا جائے۔ ابن ابی حاتم نے ابوالعالیہ سے روایت ذکر کی کہ ﴿ وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ ﴾ کا مطلب ہے جس پر اللہ کے غیر کا نام لیا جائے۔ (درمنثور)

" قال الربیع بن انس یعنی ما ذکر عند ذبحه اسم غیر الله والاهلال اصله رؤیته الهلال یقال اهل الهلال ثم لماجرت العادة برفع الصوت بالتکبیر عند رؤیة الهلال سمی لرفع الصوت مطلقا الاهلال وکان الکفار اذا ذبحوا لا لهتهم یرفعون اصواتهم بذکرها فجری ذلک من امرهم حتی قیل لکل ذابح وان لم یجهر مهل "

حضرت ربیع بن انس فرماتے ہیں ﴿وَ مَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ ﴾ سے مراد وہ ہے جس پر ذبح کے وقت اللہ کے غیر کا نام پکارا جائے " اھــلال " اصل میں چاند دیکھنے کو کہا جاتا ہے جس طرح کہا جاتا

ہے "اھل الھلال" فلاں نے چاند دیکھا پھر چاند دیکھنے کے وقت عام عادت جاری ہوگئی کہ وہ بلند آواز سے تکبیر کہتے بلند آواز کی وجہ سے کہے گئے الفاظ کو مطلقاً اہلال کہا جانے لگا۔

کافر چونکہ ذبح کے وقت اپنے باطل معبودوں کا نام لیتے اور اپنی آوازوں کو بلند کرتے تو اس وجہ سے ذبح کرنے والے کو مہل کہا جانے لگا خواہ اس نے آواز کو بلند کیا ہوتا یا بلند نہ کیا ہوتا۔ (از مظھری)

" یعنی ما ذبح للاصنام والطواغیت وصبح فی ذبح "

یعنی ذبح کے وقت بتوں اور شیطانوں کے نام لئے جاتے اور ان پر آواز کو بلند کیا جاتا۔

(فتح البیان)

﴿ وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ﴾ ای وحرم ما رفع به الصوت عند ذبحه للصنم واصل الاهلال رفع الصوت وکانوا اذا ذبحوا الآلهتهم یرفعون اصواتهم بذکرها ویقولون باسم اللات ولاعزی فجری ذلک من امرهم حتی قیل لکل ذابح وان لم یجهر بالتسمیة مهل "

جس جانور پر ذبح کے وقت بتوں کا نام پکارا جائے وہ حرام ہے اہلال اصل میں مطلقاً آواز بلند کرنے کو کہتے ہیں کفار جب کسی جانور کو ذبح کرتے تو بلند آواز سے باسم اللات والعزی کہتے پھر ہر ذبح کرنے والے کو " مهل " کہا جانا لگے خواہ وہ آواز بلند نہ کرے۔ (روح البیان)

" وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ای رفع به الصوت عند ذبح للصنم "

﴿ وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ذبح کرتے وقت جب بت کا نام لیا جائے تو وہ جانور حرام ہوگا۔ (ابوالسعود) " ای ذبح علی اسم غیرہ " یعنی غیر کا نام لے کر ذبح کر دیا جائے۔

(جلالین)

﴿ وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ﴾ ای ما ذبح للاصنام والطواغیت واصل الاهلال رفع الصوت وکانوا اذا ذبحوا لآلهتهم یرفعون اصواتهم بذکرها فجری ذلک من امرهم حتی قیل لکل ذابح وان لم یجهر بالتسمیة مهل وقال الربیع بن انس وغیرہ ﴿ وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ قال ذکر اسم غیر اللہ ﴾ (معالم التنزیل)

اسی عبارت کا ترجمہ مظہری اور درمنثور کی عبارات کا ہے اس لئے تکرار کی ضرورت نہیں۔

مذکورہ بالا بحث سے حاصل ہوا :

ابھی تک تفاسیر کی عبارات جونقل کی ہیں ان سے دو باتیں واضح طور پر سمجھ آئیں ایک یہ کہ تقریبا جمہور مفسرین کرام کا مذہب یہ ہے کہ ﴿ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللهِ ﴾ کا مطلب یہی ہے کہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لئے بغیر ذبح کئے جانے والا جانور حرام ہے۔ اور دوسری بات یہ سمجھ آئی کہ مراد اس سے کفار ہیں جو اپنے جانوروں کو ذبح کرتے وقت اپنے بتوں کا نام لیتے تھے۔

اور یہ بھی واضح ہوا کہ "اهلال" کا مطلب ذبح کے وقت نام لینا خواہ آہستہ آواز میں ہی کیوں نہ ہو۔

دوسری قسم جو حرام ہے: ذبح سے مقصد غیر خدا کا تقرب حاصل ہو یعنی غیر خدا کو خدا سمجھ کر اس کے لئے ذبح کیا جائے ذبح کو عبادت سمجھا جائے اور جس کے لئے ذبح کیا ہے اسے معبود سمجھا جائے تو یہ قطعی طور پر حرام ہے اگر چہ ذبح کے وقت اس پر اللہ تعالیٰ کا نام بھی لے لیا ہو۔ یہی وہ قسم ہے جس کو فقہاء نے "الذبح لغير الله" غیر اللہ کے لئے ذبح کرنا بیان کیا ہے۔ یا "ما ذبح لتقرب غير الله" سے تعبیر کرتے ہیں یعنی جس میں غیر اللہ کا تقرب حاصل کرنا اسے معبود سمجھنا مقصود ہو یہ حرام ہے۔

تیسری قسم جو حلال ہے: وہ یہ کہ ذبح اللہ تعالیٰ کا نام لے کر کیا رب تعالیٰ کو ہی معبود سمجھا لیکن اس ذبح میں گوشت غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کر کے کسی بزرگ کو ثواب پہنچانا مقصود ہو تو یہ جائز ہے۔

یعنی اس قسم میں ذبح سے مقصود جانور کی جان نکالنا اور خون گرانا نہیں بلکہ مطلوب گوشت ہے وہ گوشت اس وقت حاصل ہوگا جب جانور کو ذبح کیا جائے گا گویا کہ مقصد مطلوب ہوگا اور ذبح ذریعہ اور وسیلہ ہوگا۔ جیسا کہ گوشت بیچنا اور خریدنا مباح ہے گوشت کھانا مباح ہے گوشت کھانے یا بیچنے کے لئے جانور کو ذبح کیا اللہ تعالیٰ کا نام لے کر وہ جانور حلال ہے یہاں ذبح وسیلہ ہے مباح کام کا۔

اسی طرح جانور کے ذبح کرنے میں مقصد ولیمہ کرنا ہے تو یہ ذبح ذریعہ ہے سنت کے لئے کیونکہ ولیمہ مسنون ہے۔

اسی طرح جانور ذبح کیا مہمانوں کے لئے یا اپنے اقرباء کے ایصال ثواب کے لئے یا بزرگوں کے ایصال ثواب کے لئے تو یہ جانور ذبح کرنے میں مقصد ثواب حاصل کرنا ہے اس لئے یہ ذبح مستحب

کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے یہ تمام قسم کے ذبح کئے جانے والے جانور حلال ہیں۔

لطف کی بات یہ ہے کہ اگر کوئی جانور کسی ظالم کو بطور رشوت دینے کے ذبح کیا اور ذبح مسلمان نے اللہ کا نام لے کر کیا تو وہ جانور بھی حلال ہے حالانکہ یہ کام حرام ہے جس کے لئے ذبح کیا مقصد حاصل کرنا حرام ہے لیکن جانور کا ذبح کرنا حلال ہے۔

آخری دونوں قسموں پر دلائل: سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ ذبح کی کون سی شرط نہیں پائی گئی جس کی وجہ سے جانور حرام ہوگیا یا تمام شرائط پائی گئی ہیں کہ وہ حلال ہوگیا۔

ذبح کرنے کی چھ شرائط ہیں:

" والشرط ذكر الذابح اسمه تعالىٰ المجرد على الذبيحه عند الذبح لله تعالىٰ "

یعنی ذبح کرنے کی شرط یہ ہے ذبح کرنے والا خالص اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کرے ذبح پر جب کہ ذبح اللہ تعالیٰ کے لئے ہو اس مختصر عبارت میں چھ شرطیں پائی گئی ہیں۔

پہلی شرط: **" انما قلنا الذابح لانه لو سمي غير لا يحل كما في المحيط "** ذبح کرنے والا خود بسم اللہ پڑھے ذبح کرنے والا اور ہو بسم اللہ پڑھنے والا اور ہو تو وہ جانور حلال نہیں محیط میں ایسا ہی ذکر ہے یہ فائدہ عبارت مذکورہ میں لفظ **" الذابح "** سے حاصل ہوا۔

دوسری شرط: **" وانما قلنا اسمه تعالىٰ لانه لو ذكر اسم غيره تعالىٰ لم يحل "**

ذبح کرنے والا اللہ کا نام لے کر ذبح کرے تو وہ جانور حلال ہوگا اللہ تعالیٰ کے غیر کا نام لے تو وہ حلال نہیں ہوگا۔ یہ فائدہ عبارت مذکورہ میں **" اسمه تعالىٰ "** سے حاصل ہوا۔

تیسری شرط: **" وانما قلنا المجرد لانه لو قال اللهم اغفرلي لم يجز لانه دعاء كما في الهداية "**

ذبح کرنے والا فقط اللہ کا نام لے دعائیہ کلمات اس کے ساتھ شامل نہ کرے اسی لئے ذبح کرنے والے نے اگر ﴿ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ ﴾ پڑھ کر جانور ذبح کیا تو وہ حلال نہیں ہوگا کیونکہ اس میں خالص اللہ تعالیٰ کا نام نہیں لیا گیا یہ مسئلہ حاصل ہوا **" المجرد "** سے۔

چوتھی شرط: **" وانما قلنا على الذبيحة لانه لو سمى عند الذبح لا فتتاح عمل لم يحل "**

جس جانور کو ذبح کرنا ہے اسی پر بسم اللہ پڑھے تو حلال ہوگا اگر کسی اور کام کو شروع کرنے کے لئے ''بسم اللہ'' پڑھی پھر دوبارہ بسم اللہ نہ پڑھی پہلی پر اکتفا کرلیا تو جانور حلال نہیں ہوگا۔ یہ مسئلہ حاصل ہوا" علی الذبیحة " کے الفاظ سے۔

پانچویں شرط: " وانما قلنا عند الذبح لانه اذا فصل بينه وبين التسمية بعمل كثير لم يحل وقال الزعفرانی لوحد الشفرة لم يحل فلوسمی علی ذبيحة وذبح غيرها لم يحل "

ذبح کرتے وقت بسم اللہ پڑھے تو جانور حلال ہوگا اگر بسم اللہ پڑھ کر کوئی اور کام شروع کرلیا کچھ دیر بعد بغیر بسم اللہ پڑھنے کے جانور ذبح کر دیا تو وہ حلال نہیں ہوگا۔ زعفرانی رحمہ اللہ نے فرمایا بسم اللہ پڑھ کر چھری کو تیز کرنا شروع کر دیا پھر دوبارہ بسم اللہ نہ پڑھی تو جانور حلال نہیں ہوگا۔ اگر ایک جانور پر بسم اللہ پڑھی ذبح دوسرا کر دیا تو وہ حلال نہیں ہوگا۔ یہ شرط حاصل ہوئی " عند الذبح " کے الفاظ سے۔

تنبیہ: بسم اللہ پڑھنا جان بوجھ کر چھوڑ دیا تو جانور حرام ہوگا اگر بھول کر بسم اللہ رہ جائے تو جانور حلال ہوگا۔

چھٹی شرط: " وانما قلنا لله تعالى لانه لو سمى وذبح لقدوم الامير او غيره من العظماء لا يحل لانه ذبح تعظيما له لا لله تعالى "

اگر جانور کو ذبح کیا امیر کے آنے کی وجہ سے یا کسی اور بڑے شخص کے آنے کی وجہ سے اس بڑے کا تقرب حاصل کرنا مقصود ہو اس کی عظمت مقصود ہو اور اللہ تعالیٰ کی عظمت مقصود نہ ہو تو وہ جانور حلال نہیں ہوگا یہ شرط حاصل ہوئی " لله تعالى " کے الفاظ مبارکہ سے۔

غیر اللہ کے لئے ذبح کرنے کی حلت وحرمت کی دار ومدار چھٹی شرط پر ہے:

کسی بزرگ، کسی بڑے کے لئے ذبح کرنے میں مقصد اس کی تعظیم ہو اسے مقرب سمجھا جائے اسے معبود سمجھا جائے اللہ تعالیٰ کی تعظیم مقصود نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کو مقرب نہ سمجھا جائے اور اللہ تعالیٰ کو معبود نہ سمجھا جائے تو وہ جانور یقینی طور پر حرام ہوگا بیشک اس پر اللہ کا نام ذبح کے وقت لے لیا گیا ہو۔ جب باقی تمام شرطیں بھی پائی جائیں اور اللہ تعالیٰ کو معبود سمجھ کر اسی کی تعظیم مقصود ہو کسی بڑے کا آنا صرف ذریعہ ہو

کسی بزرگ کا ایصال ثواب صرف ذریعہ ہوتو وہ جانور حلال ہوگا۔

غیر اللہ کیلئے بنیت تقرب ذبح کرنا حرام ہے:

"قال النیشابوری تحت قوله تعالیٰ ﴿ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللهِ ﴾ قال العلماء لو ان مسلما ذبح ذبيحة وقصد بذبحها التقرب الى غير الله صار مرتدا و ذبيحته ذبيحة مرتد"

علامہ نیشاپوری رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں زیر بحث آیۃ کریمہ کی وضاحت میں لکھا ہے کہ اگر مسلمان کسی جانور کو ذبح کرے اور اس میں غیر اللہ کے تقرب کا ارادہ کرے تو وہ شخص مرتد ہو جائے گا اور جانور مرتد کا ذبح کیا ہوگا۔ نیشاپوری کی تفسیر میں " وقصد بها بذبحها التقرب الى غير الله " کے الفاظ کو غور سے پڑھیں پھر یہ انصاف سے فیصلہ کریں کہ علماء اہل سنت و جماعت (بریلوی مسلک) کا کیا یہی عقیدہ نہیں؟

غیر اللہ کے لئے ذبح بغیر ارادہ تقرب کے حلال ہے:

صاحب ہدایہ نے اس مسئلہ کو واضح کیا ہے اور شیخ احمد ملا جیون رحمہ اللہ نے تفسیرات احمدیہ میں بہت ہی واضح الفاظ سے اس مسئلہ کو حل کیا ہے۔ صاحب ہدایہ اور کفایہ کی وضاحت کے ساتھ ہی درمختار اور شامی کا اتفاق ہے:

" ويكره ان يذكر مع اسم الله تعالىٰ شيأ غيره وان يقول عند الذبح اللهم تقبل من فلان "

ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ کسی اور کا نام ملانا اور یہ کہنا اے اللہ یہ فلاں کی طرف سے قبول فرما یہ مکروہ ہے۔ اس عبارت کی وضاحت فرماتے ہوئے صاحب ہدایہ تحریر فرماتے ہیں:

" وهذه ثلاث مسائل احداها ان يذكر موصولا لا معطوفا فيكره ولا تحرم الذبيحة وهو المرد بما قال ونظيره ان يقول باسم الله محمد رسول الله لان الشركة لم توجد فلم يكن الذبح واقعاله الا انه يكره لوجود القرآن صورة فيتصور بصورة المحرم " (هداية)

یہاں تین مسائل ہیں ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ ذبح کے وقت غیر کا نام متصل طور پر ذکر کرے درمیان میں واؤ عاطفہ ذکر نہ ہوتو وہ جانور مکروہ ہوگا حرام نہیں متن کی عبارت میں یہی مسئلہ معتبر ہے اس کی مثال یہ ہے کہ جب ذبح کرنے والا ذکر کرے " باسم اللہ محمد رسول اللہ " اس میں لفظ " محمد رسول اللہ " لفظ ''اللہ'' کے ساتھ حکم میں شریک نہیں اس لئے ذبح میں رسول اللہ ﷺ کا تقرب نہیں پایا گیا لہذا یہ جانور حرام نہیں ہوگا البتہ مکروہ اس لئے ہے کہ دونوں نام ملا کر اکٹھے ذکر کردیئے گئے جو بظاہر حرام نظر آتا ہے حالانکہ حرام نہیں۔

یہ بھی خیال رہے کہ امام التمر تاشی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا کہ اللہ کا ذکر اور رسول اللہ ﷺ کا ذکر بغیر واؤ عاطفہ کے چند وجہ پر ہیں:

" اما ان یکون بنصب محمدا او بحفضه او برفعه وفی کلها یحل لان اسم الرسول غیر مذکور علی سبیل العطف فیکون مبتدئا لکن یکره لوجود الوصل صورة " (کفایه)

یا تو لفظ محمد پر نصب (زبر) ہوگی یا جر (زیر) ہوگی اور یا رفع (پیش) ہوگا ان تمام صورتوں میں جانور حلال ہوگا کیونکہ " محمد رسول اللہ " کا ماقبل سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ جملہ علیحدہ ہے ہاں البتہ مکروہ ہے کیونکہ بظاہر لفظ ''اللہ'' اور لفظ محمد ملے ہوئے ہیں۔

" والثانية ان یذکر موصولا علی وجه العطف والشرکة بان یقول باسم اللہ واسم فلان او یقول باسم اللہ وفلان او باسم اللہ ومحمد رسول اللہ بکسر الدال فتحرم الذبیحة لانه اهل به لغیر اللہ " (هدایه)

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ذبح کرنے والے نے ذبح کے وقت " باسم اللہ واسم فلان " پڑھا۔ یا بغیر لفظ اسم کے " باسم اللہ وفلان " پڑھا۔ یا " بسم اللہ ومحمد رسول اللہ " لفظ محمد کے نیچے کسرہ (زیر) سے پڑھا۔ ان صورتوں میں جانور حرام ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ غیر کو عطف کے ساتھ شریک کردیا گیا لہذا اس جانور کو اللہ کے غیر کے نام کے ساتھ ذبح کردیا گیا۔

لیکن اسی صورت میں یعنی " بسم اللہ ومحمد رسول اللہ " میں لفظ محمد پر پیش پڑھا تو وہ

جانور حلال ہوگا۔ کیونکہ یہ ابتدائی کلام بن گئی اور اگر نصب (زبر) سے پڑھے تو اگر چہ اس میں اختلاف ہے (لیکن صحیح یہی ہے کہ جانور حرام نہیں ہوگا کیونکہ اس صورت میں بھی ماقبل سے رابطہ نہیں ہوگا)۔

(کفایہ)

" والثالثة ان یقول مفصولا عنه صورة ومعنی بان یقول قبل التسمية وقبل ان یضجع الذبیحة او بعده وهذا لا بأس به لما روی عن النبی ﷺ انه قال بعد الذبح اللهم تقبل هذه عن امة محمد ممن شهدلک ولی بالبلاغ "

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ جانور کو لٹانے اور بسم اللہ پڑھنے سے پہلے یا ذبح کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے ذکر سے جدا طور پر اللہ کے غیر کا ذکر کرے (اے اللہ فلاں کے ایصال ثواب کے لئے قبول فرما) تو اس میں کوئی حرج نہیں یعنی یہ مکروہ نہیں۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے جانور کو ذبح کرنے کے بعد رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا:

" اللهم تقبل هذه عن امة محمد (ﷺ) ممن شهد لک بالوحدانية ولی بالبلاغ "

اے اللہ یہ امت محمد (ﷺ) کی طرف سے قبول فرما یعنی ان لوگوں کی طرف سے جنہوں نے تیری وحدانیت کی شہادت دی اور میرے حق میں یہ شہادت دی کہ میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا ہے (ہدایہ)

شامی نے درمختار کے الفاظ ''لا باس'' (جیسا کہ ہدایہ میں بھی ہیں) کی وضاحت ''لا یکرہ'' سے کی ہے ہدایہ اور کفایہ سے جو بحث ذکر کی ہے وہ تمام درمختار اور شامی میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

شیخ احمد ملا جیون رحمہ اللہ کی وضاحت:

ہدایہ کی بحث جو ذکر کی ہے اسی کو مختصر طور پر ملا جیون رحمہ اللہ نے ذکر کرنے کے بعد خلاصہ اور نچوڑ ایسے خوبصورت اور واضح الفاظ سے بیان کر دیا جس سے طعنہ زنوں کی اور زبان دراز لوگوں کی زبانیں گنگ ہوگئیں۔ آپ فرماتے ہیں:

ومن ههنا علم ان البقرة المنذورة للاولیاء کما هو الرسم فی زماننا حلال طیب لانه لم یذکر اسم غیر الله علیها وقت الذبح وان کانوا ینذورنها له "

یہاں سے پتہ چل گیا کہ بیشک گائے (وغیرہ) جس کی اولیاء کرام کے لئے نذر مانی جائے جیسا کہ ہمارے زمانہ میں یہ رسم پائی جاتی ہے وہ حلال اور طیب (پاکیزہ) ہے کیونکہ اس پر ذبح کے وقت اللہ کے غیر کا نام نہیں لیا جاتا ہے اگر چہ اولیاء کرام کے لئے اس کی نذر مان لی جاتی ہے۔ (تفسیرات احمدیہ)

یہ یاد رہنا چاہئے کہ یہ نذر اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کے ایصال ثواب کے معنی میں ہے اسے نذر و نیاز کہا جاتا ہے تقرب حاصل کرنے کے لئے معبود سمجھ کر نذر صرف رب تعالیٰ کے لئے ہی ہوتی ہے۔ (راقم)

بہت خوب فیصلہ: " ذبح لقدوم الامیر ونحوه کواحد من العظماء یحرم لانه اهل به لغیره الله ولو (وصلية) ذکر اسم الله تعالیٰ " (درمختار کتاب الذبح)

اگر کوئی شخص حاکم یا کسی بڑے شخص کے آنے کی وجہ سے ذبح کرے تو وہ جانور حرام ہو جائے گا کیونکہ اس پر اللہ کے غیر کا نام پیش کر دیا گیا ہے یہ جانور اگر چہ اللہ کے نام پر ہی کیوں نہ ذبح کر دیا گیا ہو۔

" ولو ذبح للضیف لا یحرم لانه سنة الخلیل واکرام الضیف اکرام الله تعالیٰ " (درمختار)

اور اگر مہمان کے لئے ذبح کیا جائے تو وہ جانور حرام نہیں ہوگا کیونکہ وہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی سنت ہے مہمان کا اکرام اللہ تعالیٰ کا اکرام ہے:

" قوله لا یحرم ، قال البزازی ومن ظن انه لا یحل لانه ذبح لاکرام ابن آدم فیکون اهل به لغیر الله تعالیٰ فقد خالف القرآن والحدیث والعقل فانه لا ریب ان القصاب یذبح للربح ولو علم انه نجس لا یذبح فیلزم هذا الجاهل ان لا یاکل ما ذبحه القصاب وما ذبح للولائم والاعراس والعقیقة " (شامی)

جو جانور مہمان کے لئے ذبح کیا جائے وہ حرام نہیں ہوتا اس پر علامہ شامی رحمہ اللہ علیہ نے بزازیہ کے حوالہ سے تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ مہمان کی تکریم (عزت) کے لئے جو جانور ذبح کیا گیا وہ حرام ہے کیونکہ اس میں آدمی کی عزت کی گئی یہ ﴿ مَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ ﴾ میں آ گیا تو وہ شخص قرآن پاک اور حدیث پاک کا مخالف ہے اور یہ عقل کے بھی خلاف ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ قصاب نفع حاصل کرنے کے لئے جانور ذبح کرتا ہے اگر اسے معلوم ہو کہ یہ جانور نجس

ہے تو وہ ذبح نہیں کرتا۔

اس سے تو یہ لازم آئے گا کہ جاہل انسان وہ جانور بھی نہ کھائے جسے قصاب نے ذبح کیا ہے اور ولیمہ کے لئے اور شادی کے لئے اور عقیقہ کے لئے ذبح کئے جانور بھی نہ کھائے ان کو بھی حرام سمجھے۔

(شامی)

کیونکہ ان جانوروں کے ذبح کرنے میں بھی انسانوں کی عزت پائی گئی ہے۔(راقم)

وجہ فرق: کسی حاکم کے آنے کی تعظیم کے لئے ذبح کیا ہوا جانور حرام ہو جائے اور مہمان کے آنے پر ذبح کیا جانے والا حلال ہو اس میں فرق کیا ہے؟

" والفارق انه قدمها لياكل منها كان الذبح لله والمنفعة للضيف او للوليمة او للربح وان لم يقدمها لياكل منها بل يدفعها لغيره كان لتعظيم غير الله فتحرم "

فرق یہ ہے کہ غیر اللہ کے لئے ذبح کئے ہوئے جانور سے خود بھی کھا لے اپنے آپ پر حرام نہ کرے تو یہ جانور حلال ہوگا کیونکہ اس کو ذبح اللہ تعالیٰ کے لئے کیا گیا تھا البتہ نفع مہمان نے بھی حاصل کر لیا۔ اور اگر غیر اللہ کے لئے ذبح کئے ہوئے جانور سے خود نہ کھائے بلکہ غیر کو دے دے تو وہ حرام ہوگا اس لئے کہ اس میں غیر کی تعظیم پائی گئی۔ (درمختار)

شامی رحمہ اللہ کی مزید وضاحت:

" قوله والفارق) اى بين ما اهل به لغير الله بسبب تعظيم المخلوق وبين غيره وعلى هذا فالذبح عند وضع الجدار او عروض مرض اوشفا منه لا شک فی حله لان القصد منه التصدق حموی ومثله النذر بقربان معلقا بسلامته من بحر فيلزمه التصدق به على الفقراء فقط كما فى فتاوى الشلبى "

اگر کوئی شخص دیوار بناتے وقت دیوار پر شہتیر رکھتے ہوئے مرض کے لاحق ہونے پر مرض سے شفا حاصل ہونے پر جانور ذبح کرے وہ حلال ہے اس میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں اس میں اس کا ارادہ

صدقہ کرنا ہے یہ نفلی صدقہ ہے اس سے خود بھی کھا سکتا ہے بلکہ خود بھی کھا لے تاکہ غیر اللہ کی تعظیم کا وہم نہ پایا جائے۔ (حموی) اگر نذر مانے کہ مجھے اس مرض سے سلامتی حاصل ہوگئی یا اس سفر سے میں سلامتی سے لوٹ آیا تو یہ نذر واجب ہے اس واجب نذر کا حکم یہ ہے کہ یہ گوشت صرف فقراء پر صدقہ کرے خود بھی نہ کھائے اور غنی لوگوں کو بھی نہ کھلائے صدقہ واجبہ کا یہی حکم ہے" البحر الرائق وچلبی "

(ماخوذ از شامی)

وجہ فرق پر شامی رحمہ اللہ کا وضاحتی قول: اگر غیر اللہ کے لئے ذبح کئے ہوئے جانور میں غیر کی تعظیم بطور تقرب مقصود تھی تو وہ جانور حرام ہوگا اگر صرف مہمان سمجھ کر عزت کرنا مقصود تھا تو حلال ہوگا۔ ذبح کرنے والے کا اپنا کھانا اور نہ کھانا مقصود نہیں۔ صرف وہ اپنے آپ پر حرام کرتا ہے یا نہیں۔ (ماخوذ از شامی) شامی کی عبارت یہ ہے:

" (قوله) وان لم يقدمها ليأكل منها) هذا مناط الفرق لامجرد دفعها لغيره اى يغير من ذبحت لاجله او غير الذابح فان الذابح قديتر كها او يأخذها كلها او بعضها فافهم واعلم ان المدار على القصد عند ابتداء الذبح فلا يلزم انه لو قدم للضيف غيرها ان لا تحل لانه حين الذبح لم يقصد تعظيمه بل اكرامه بالا كل منها وان قدم اليه غيرها ويظهر ذلك ايضا فيما لو ضافه امير فذبح عند قدومه فان قصد التعظيم لا تحل وان اضافه بها وان قصد الاكرام تحل وان اطعمه غيرها تأمل " (شامی)

غیر اللہ کے تقرب کا مطلب: ماتن یعنی صاحب تنویر الابصار کے عبارت میں لفظ " یحرم " پر بحث کرتے ہوئے مومن کی شان کو بیان فرمایا اور اس پر شامی نے مزید وضاحت کی جس سے لفظ تقرب کا معنی بھی سمجھ آ گیا اور مسئلہ بھی نکھر کر واضح ہوگیا:

" وهل يكفر قولان بزازيه وشرح وهبانيه ، قلت وفى صيد المنية انه يكره ولا يكفر لانا لا نسئى الظن بالمسلم انه يتقرب الى الآدمى بهذا النحر ونحوه فى شرح الوهبانية عن الذخيرة ونظمه فقال وفاعله جمهورهم قال كافر وفضلى اسمعيلى ليس يكفر " (درمختار)

کیا غیر اللہ کے لئے ذبح کرنے والا کافر ہوگا اس میں دو قول ہیں۔ بعض نے کہا کافر ہوگا بعض نے کہا نہیں۔ (بزازیہ، شرح وھبانیۃ) اور صید المنیۃ میں ہے کہ بیشک فقط مکروہ ہے اور وہ شخص کافر نہیں ہوگا بیشک ہم کسی مسلمان پر بدگمانی نہیں کرتے کہ وہ اس ذبح میں کسی آدمی کا تقرب حاصل کر رہا ہے۔ (السحر الفائق وشرح وھبانیۃ عن الذخیرۃ) اور نظم میں کہا گیا ہے جمہور حضرات نے کافر کہا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ فضلی یعنی اسماعیلی جو عظیم فقیہ ہیں انہوں نے بھی کہا ہے کافر نہیں ہوگا۔

علامہ شامی کی وضاحت: " (هل يكفر) اى فيما بينه وبين الله تعالىٰ اذلا يفتى بكفر مسلم امكن حمل كلامه او فعله على محمل حسن او كان فى كفره خلاف "

متن کی عبارت ﴿ هل يكفر ﴾ کو جو سوالیہ طور پر پیش کیا گیا ہے کہ غور یہ کرنا ہے کہ غیر اللہ کے لئے ذبح کرنے والا کیا اپنے اور اپنے اللہ کے درمیان جو رابطہ اور تعلق ہے اسے توڑ کر کافر ہو گیا ہے؟ پھر فرماتے ہیں نہیں نہیں۔ کسی مسلمان کے قول اور فعل کو جب تک اچھے معانی اور مقاصد پر استعمال کرنے کا احتمال موجود ہو تو اس کے کافر ہونے کا فتویٰ جاری نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طرح اگر کسی کے کافر ہونے میں اہل علم کا اختلاف ہو تو اس کے کافر ہونے کا فتویٰ بھی جاری نہیں کیا جا سکتا:

" (انه يتقرب الى الآدمى) اى على وجه العبادة لانه المكفر وهذا بعيد من حال المسلم فالظاهر انه قصد الدنيا او القبول عنده باظهار المحبة بذبح فداء عنه لكن لما كان فى ذلك تعظيم له لم تكن التسمية مجردة لله تعالىٰ حكما كما لو قال بسم الله واسم فلان حرمت ولا ملازمة بين الحرمة والكفر كما قدمناه عن المقدسى فافهم "

متن کی عبارت میں جو یہ کہا گیا ہے کہ غیر اللہ کے لئے ذبح کرنا مکروہ ہے فقط کیونکہ ہم کسی مسلمان کے متعلق بدگمانی نہیں کر سکتے وہ اس میں کسی آدمی کا تقرب حاصل کر رہا ہے۔ شامی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ " انه يتقرب الى الآدمى " کا مطلب ہے یہ ہے کہ وہ کسی انسان کو معبود سمجھے اور کسی انسان کے لئے کئے ہوئے کام کو عبادت سمجھے یہ مسلمان کے حال سے دور ہے۔ ظاہر یہی ہے کہ وہ

کسی حاکم کے لئے ذبح کر رہا ہے تو اس میں اس کے دنیاوی مقاصد ہیں یا وہ یہ چاہتا کہ اس ظاہری محبت کی وجہ سے میں اس کا مقبول ہو جاؤں کہ میں اس کے لئے ذبح کر کے اس پر فدا ہوں۔ ہاں اگر ذبح کر کے اتنی تعظیم کرے کہ گوشت بچ بھی جائے پھر بھی خود نہ کھائے کہ یہ بادشاہ صاحب کے لئے ذبح کیا گیا تھا اور ان کے لئے ہی پکایا گیا تھا مجھ پر تو یہ کھانا حرام ہے تو اس شخص کے متعلق حرمت کا قول کیا جا سکے گا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ گویا کہ غیروں کو ملا لیا ہے لیکن پھر بھی کافر نہیں کہا جا سکتا۔ (شامی)

لیکن یہ بھی خیال رہے کہ حرام بمعنی مکروہ لینا صاحب درمختار کا مختار قول ہے اور یہی صید المنیہ میں مذکور ہے۔

خلاصہ کلام: اللہ تعالیٰ کا نام ذبح کے وقت نہ لیا جائے بلکہ کسی اور کا نام لیا جائے تو وہ جانور حرام ہے اور ایسا کرنے والا کافر ہے۔

اور ذبح اللہ تعالیٰ کے نام سے کیا لیکن غیر کے لئے کیا اسے معبود سمجھا تو پھر بھی یہ شخص مرتد ہے اور وہ جانور حرام ہے۔

اگر غیر کی تعظیم کا گمان ہے اور ذبح کے وقت ''بسم اللہ'' کے ساتھ ''اللّٰھم تقبل من فلان'' ملا لیا تو یہ مکروہ ہے۔

ذبح سے پہلے ہو یا بعد میں '' اللھم تقبل من فلان '' کہے تو یہ جائز ہے نہ مکروہ نہ حرام اور نہ ہی کفر ہے یہ ہے مکمل مسئلہ۔

اور یہی تمام صورتیں بکرا پالنے میں بھی ہوں گی ویسے ہی مسلمانوں کو کافر اور مشرک بنانا سوائے جہالت اور حماقت کے اور کچھ نہیں۔

علم معانی کا ضابطہ: فعل یا شبہ فعل کی نسبت ماھولہ کی طرف ہو تو حقیقۃ عقلیہ اور اگر نسبت غیر ماھولہ کی طرف ہو تو مجاز عقلی ہے۔ کافر جب کہے '' انبت الربیع البقل '' (موسم بہار نے سبزہ اگایا) تو یہ کلام حقیقۃ عقلیہ ہے کیونکہ کافر موسم بہار کو موثر حقیقی مانتا ہے اس کا رب تعالیٰ پر ایمان نہیں اس کا یہ کلام کافرانہ ہے۔

اگر یہی کلام مومن کرے تو اس کا یہ کلام مجاز عقلی ہے اس میں کوئی کفر نہیں کیونکہ وہ موسم بہار کو

موثر حقیقی نہیں مانتا اس کے نزدیک اللہ تعالیٰ موثر حقیقی ہے موسم بہار صرف سبب ہے۔(از مختصر المعانی)

اہل علم سے انصاف کی توقع: خدارا انصاف سے کام لیتے ہوئے یہ تو بتاؤ کہ کون سا وہ مسلمان ہے جو کسی نبی یا ولی کو خدا مانتا ہے ان کو خالق مانتا ہے ان کو حقیقی کارساز مانتا ہے؟

جب مسلمان نبی کو اللہ کا نبی مانتے ہیں، ولی کو اللہ کا ولی مانتا ہے، تو مسلمانوں کو کافر اور مشرک بنا کر کون سا دین کا کام کیا جارہا ہے۔

وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ میں سب سے پہلا اختلاف: سب سے پہلے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی تفسیر عزیزی میں اس مقام پر پھسلے ہیں لطف کی بات یہ ہے کہ آپ کے فتاوی عزیزیہ میں یہ مسئلہ اس طرح لکھا گیا ہے جیسا کہ اہل سنت و جماعت کا عقیدہ ہے۔ تفسیر عزیزی میں آپ نے جمہور کی مخالفت کی ہے آپ اس میں بالکل اکیلے ہیں آپ کے دلائل کے جوابات سید الاولیاء حضرت مہر علی شاہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "اعلاء کلمة الله فی بیان وما اهل به لغیر الله" میں کامل طور پر بیان فرمائے ہیں۔

آپ کا انداز بیان کچھ مشکل ہوتا ہے اس لئے راقم نے اسے آسان انداز میں پیش کر دیا ہے شاہ عبدالعزیز صاحب کے دلائل یا قبلہ سید الاولیاء حضر پیر مہر علی شاہ گولڑوی رحمہ اللہ کے جوابات کو ذکر نہیں کیا۔ تاہم زیادہ بحث حضرت پیر صاحب کی کتاب سے ہی لی ہے۔ البتہ اس کی ابتداء اور انتہاء میں راقم کی اپنی طرف سے بھی بحث شامل ہے۔

مسئلہ کافی حد تک واضح کر دیا گیا ہے جو طلباء اور عوام کے لئے کافی ہے البتہ علماء کرام اپنے علمی ذوق کو پورا کرنے کے لئے حضرت کی کتاب کا مطالعہ کریں۔ شاہ صاحب کی تفسیر عزیزی کی مکمل بحث اور فتاوی عزیزیہ کا مکمل فتوی اور مولنا عبدالحکیم سیالکوٹی رحمہ نے شاہ عبدالعزیز صاحب کا جو رد کیا ہے وہ رسالہ بھی حضرت کی کتاب میں شامل ہے۔

نوٹ: اگر چہ بعض حضرات نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ تفسیر عزیزی میں یہ بحث شاہ صاحب کی اپنی نہیں ورنہ آپ اپنے ہی فتوی کے مخالف تحریر نہ کرتے بلکہ یہ بحث کسی اور نے شامل کی ہے۔ عقل سے یہ بھی

کوئی بعید نہیں لیکن انسان سے خطا واقع ہونا کوئی امر بعید نہیں شاہ ولی اللہ صاحب کی نسخ کے متعلق بحث کی مخالفت مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی معارف القرآن میں کی ہے راقم بھی الفوز الکبیر کا قائل نہیں۔

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ :

اور جو مجبور ہو جائے تجاوز نہ کرے اور حد سے نہ بڑھے تو نہیں گناہ اس پر بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے یعنی جو شخص بھوک کی وجہ سے مجبور اور لاچار ہو جائے ہلاکت کا خطرہ ہو تو وہ یہی حرام چیزوں میں سے اپنی زندگی بچانے کے لئے کچھ کھالے تو اس کے لئے جائز ہے البتہ تجاوز نہ کرے اور حد سے نہ بڑھے بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

فَمَنِ اضْطُرَّ : اضطرار کی دو صورتیں ہیں ان دونوں صورتوں میں ان حرام اشیاء سے تھوڑی مقدار میں کھانا جائز ہے " **احدهما الجوع الشديد مع عدم وجدان ما كول حلال يسد رمقه** " ان میں سے ایک یہ ہے کہ بہت ہی شدید بھوک ہو ہلاکت کا خطرہ ہو کوئی حلال چیز کھانے کی ملی نہیں تو ایسی صورت میں وہ اتنی مقدار میں حرام چیز کو کھالے جس سے اپنے آپ کو بھوک کی ہلاکت سے بچالے۔

" **وثانيهما الاكراه على تناوله** " اور ان میں دوسری صورت یہ ہے کہ حرام چیز کے کھانے پر کوئی شخص اس طرح مجبور کر رہا ہے کہ وہ جابر اور ظالم ہے یہ کہہ رہا ہے کہ اگر تم یہ حرام چیز نہیں کھاؤ گے تو میں تمہیں قتل کر دوں گا یا میں تمہارا کوئی عضو کاٹ دوں گا اس صورت میں بھی تھوڑی مقدار میں حرام چیز کھا کر اپنے آپ کو بچالینا ضروری ہے ہاں اگر کوئی شخص دھمکی دے کہ اگر تم حرام چیز نہیں کھاؤ گے تو میں تمہیں بہت ماروں گا۔ یا یہ کہے کہ اگر تم یہ حرام چیز نہیں کھاؤ گے تو میں تمہیں قید کر لوں گا ان صورتوں میں حرام چیز کا کھانا جائز نہیں۔ (از شیخ زادہ)

غَيْرَ بَاغٍ : ''تجاوز نہ کرے'' یعنی اگر کوئی دوسرا شخص بھی بھوک کی وجہ سے ہلاکت کے قریب ہو اور حرام چیز بھی بہت زیادہ نہیں تو اکیلے ہی وہ حرام چیز کھا کر دوسرے پر تجاوز نہ کرے بلکہ کچھ حصہ خود کھائے اور کچھ حصہ دوسرے کو دے تاکہ دونوں ہی ہلاکت سے بچ جائیں۔

" بَــاغٍ " اصل میں ''باغی'' ہے یاء پر ضمہ ثقیل ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا پھر یاء اور نون

تنوین دوساکن جمع ہوگئے یاء کو بھی حذف کر (گرا) دیا گیا۔

" غیر باغ " فی اکلہ فوق حاجتہ " حاجت سے زائد کھانے میں حد سے تجاوز نہ کرے۔ یہ معنی قتادہ اور حسن اور ربیع اور ابن زید اور عکرمہ رحمہم اللہ نے بیان کیا ہے اور راقم نے بھی یہی ترجمہ کیا ہے۔ (از قرطبی)

﴿غَیۡرَ بَاغٍ﴾ حال ای اکل غیر باغ للذۃ و شھوۃ " اور لذت اور خواہش سے کھا کر تجاوز نہ کرے (مظہری) یہ ترجمہ سدی رحمہ اللہ نے کیا ہے (قرطبی) اور یہی ترجمہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ہے (اور نہ یوں کہ خواہش سے کھائے)

وَلَا عَادٍ : "اور نہ حد سے بڑھے" یعنی صرف بھوک کو بند کرنے کے لئے کھائے اس سے آگے نہ بڑھے ایسا نہ ہو کہ سیر ہو کر کھائے۔ " عاد " اصل میں " عائد " ہے جس کا معنی ہے لوٹنا۔ یعنی بار بار لوٹ لوٹ کر نہ کھائے مراد یہی ہے کہ سیر ہو کر نہ کھائے کیونکہ اس میں حد سے بڑھنا لازم آئے گا۔ " عائد " میں اس طرح قلب پایا گیا ہے جس طرح "شاک" میں پایا گیا ہے کیونکہ یہ بھی اصل میں "شائک" تھا " شاکی السلاح " یہی لفظ ہے۔

فَلَا اِثۡمَ عَلَیۡهِ : "تو اس پر کوئی گناہ نہیں"

یعنی جتنی مقدار میں اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے اتنی مقدار میں کھانے میں کوئی گناہ نہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ : "بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے) یعنی اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کی خود ہی رخصت دی ہے ان میں اس کی طرف سے کوئی پکڑ نہیں ہوئی کیونکہ وہ بخشنے والا ہے اور اس نے اپنی رحمت کی وجہ سے ہی رخصت دی ہے۔ (قرطبی)

تنبیہ : امام شافعی رحمہ اللہ نے ﴿غَیۡرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ﴾ کا یہ معنی بھی کیا ہے۔ ﴿غَیۡرَ بَاغٍ﴾ علی المسلمین ﴿وَّلَا عَادٍ﴾ علیھم " مسلمانوں پر تجاوز نہ کرے اور مسلمانوں پر حد سے نہ بڑھے یعنی باغی (بادشاہ حق کے خلاف ہتھیار اٹھانے والا) ڈاکو، چور اور اپنے قریبی رشتہ داروں سے قطع تعلقی کی غرض سے سفر کرنے والا۔ یہ تمام لوگ بھوک کی وجہ سے مر بھی رہیں ہوں تو یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مستحق نہیں۔ ان کے لئے حرام کو حلال نہیں کیا گیا خواہ وہ حالت اضطرار میں ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب ہے امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک دنیا میں رب تعالیٰ کی رحمت سے

مجرم بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں البتہ قیامت میں کافر رب تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہوں گے اور مومن گنہگار اللہ تعالیٰ کی مشیت میں ہوں گے رب تعالیٰ چاہے تو معاف فرما دے اور چاہے تو پکڑ فرمالے۔ اس لئے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک عاصی اور مطیع دونوں ہی اضطرار کی حالت میں حرام چیزوں کو کھا کر اپنی زندگی بچا سکتے ہیں ان کے لئے جائز ہے۔

مسئلہ : بھوک کی وجہ سے مجبور صرف اتنی مقدار میں کھا سکتا ہے جس سے اس کی جان بچ جائے اس سے زائد مقدار میں اس کے لئے جائز نہیں۔ (الجصاص)

مسئلہ : جس شخص کو قتل یا عضو کے کاٹنے کی دھمکی دی گئی وہ صرف اسی وقت حرام چیز کو استعمال کر سکتا ہے۔ جب تک وہ خطرہ موجود ہے اگر دھمکی دینے والے ظالم نے اپنی دھمکی کو چھوڑ دیا تو اس کے لئے کھانا جائز نہیں۔ (الجصاص)

یاد رکھنے کے قابل : جب کوئی شخص اضطرار کی حالت میں ہو تو اس کے لئے حرام چیز کو حلال کر دیا جاتا ہے جب وہ چیز حرام ہی نہیں تو اس کے لئے واجب ہے کہ وہ چیز کھا کر اپنی جان بچائے۔ اگر نہیں کھائے گا اور بھوک کی شدت کی وجہ سے مر گیا تو گنہگار ہوگا۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی:

﴿ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ﴾

''حرام کو ذکر کرنے کے بعد اضطرار کی حالت کو اس حکم سے علیحدہ کر دیا گیا''

'' فبقی علی الاصل مباحا والمباح واجب اکله عند خوف الهلاک ''

اس لئے اصل میں یہ حرام چیز ہلاکت کے خطرے کے وقت حلال ہو گئی حرام رہی ہی نہیں اس لئے ہلاکت کے خوف کے وقت حلال چیز کا استعمال کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ (از مظهری)

تنبیہ : اگر بھوک کی شدت کی وجہ سے مجبور شخص کو مذکورہ تمام چیزیں مل جائیں تو کون سی چیز کھا کر اپنی بھوک کو زائل کرے؟'' وهذا هو الالیق بظاهر هذه الآیة '' اس آیۂ کریمہ کے ظاہر سے یہی قول زیادہ مناسب نظر آتا ہے تاہم بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ جہاں تک ہو سکے خنزیر کو استعمال نہ کرے بلکہ دوسرے مردار کا گوشت کھالے۔ (از کبیر)

اگرچہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے تاہم راقم کو بھی یہ دوسرا قول زیادہ پسند

آیا۔ تاہم یوں کہا جاسکتا ہے تحقیق کے لحاظ سے پہلا قول زیادہ راجح ہے مومن کو خنزیر سے نفرت کے لحاظ پر دوسرا قول زیادہ پسند نظر آتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب (راقم)

حالت اضطرار میں شراب کا حکم:

جس طرح حرام ہونے کا حکم ان چار چیزوں میں بند نہیں اسی طرح مجبور ہونے کی حالت میں حلال ہونا بھی ان چار چیزوں میں بند نہیں بلکہ ہر حرام چیز ہلاکت سے بچانے کے لئے حلال ہو جائے گی۔ اس لئے جان بچانے کی حد تک شراب بھی حلال ہوگا۔ اسی طرح اگر گلے میں لقمہ پھنس جائے کوئی حلال چیز پینے والی نہیں سوائے شراب کے تو لقمہ کو گلے میں نیچے اتارنے کے لئے شراب کا اتنی مقدار میں استعمال جائز ہوگا جس سے وہ لقمہ نیچے اتر جائے تا کہ ہلاکت سے بچ سکے۔

" فان اللہ تعالیٰ انما اباح ھذہ المحرمات ابقاء للنفس و دفعا للھلاک عنھا فکذلک فی ھذہ الصورۃ وھذا ھو اقرب الی الظاھر "

جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو ہلاکت سے بچانے کے لئے ان چار حرام چیزوں کو حلال قرار دے دیا تو شراب کا بھی یہی حکم ہے کہ اس کا استعمال کرنا جائز ہے بلکہ ہر حرام چیز کا یہی حکم ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور حضرت سعید ابن جبیر رضی اللہ عنہ کا یہی مذہب جو ذکر کر دیا گیا۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بھوک کی شدت کی وجہ سے بھی شراب کا استعمال جائز نہیں بیشک کوئی اور حلال چیز نہ بھی ملے اس لئے کہ شراب سے بھوک اور پیاس میں زیادتی ہوتی ہے اور اس سے عقل بھی زائل ہوتی ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قول زیادہ پائیدار نہیں کیونکہ بھوک کی شدت کی وجہ سے ہلاکت کا خطرہ ہو کوئی اور چیز مل نہیں رہی سوائے شراب کے تو شراب کو استعمال کر لے کچھ نہ کچھ بھوک کے زائل کرنے کا ذریعہ ضرور بنے گی۔

" وقولہ یزیل العقل فکلامنا فی القلیل الذی لا یکون کذلک "

اور جہاں تک آپ کے قول کا تعلق عقل کے زائل ہونے سے ہے اس کا جواب یہ ہے کہ زیادہ مقدار میں شراب پینا جائز نہیں۔ بلکہ بہت معمولی مقدار میں صرف ہلاکت سے بچنے کے لئے استعمال

جائز سمجھا گیا ہے اس سے عقل کا زوال نہیں۔ (از کبیر)

شراب سے علاج کا حکم: علامہ رازی رحمہ اللہ کا اس مسئلہ میں مسلک یہ ہے کہ اگر مرض ہلاک کرنے والی ہو اور مسلمان ماہر طبیب یہ کہے کہ اس مرض کا علاج صرف شراب میں ہے تو بطور دوا استعمال جائز ہے۔ اگر مرض ہلاک کرنے والی بظاہر نظر نہیں آتی یا مسلمان ماہر طبیب یہ کہتے ہیں کہ اس کا علاج اور بھی دواؤں میں ہے صرف شراب میں نہیں تو بطور دوا شراب کا استعمال جائز نہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بطور دوا شراب کا استعمال جائز نہیں کیونکہ حرام چیز کے استعمال کرنے سے مرض کے زائل ہونے کا جب یقین نہیں تو حرام چیز کو بطور دوا کیوں استعمال کیا جائے جب کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی بہت واضح ہے:

" ان اللہ تعالٰی لم یجعل شفاء امتی فیما حرم علیہم "

"بیشک اللہ تعالٰی نے میری امت کی شفا حرام چیزوں میں نہیں رکھی"

اگر چہ اس کا جواب بھی دیا گیا کہ مرض ہلاک کرنے والی جب ہو اور مسلمان ماہر طبیب جب علاج بھی صرف شراب کو قرار دیں تو وہ شراب اس آدمی کے حق میں حرام ہی نہیں رہتا۔ نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا تعلق ان اشیاء سے ہے جن کا استعمال مریض کے لئے حرام ہے۔ (از کبیر)

تاہم راقم کے نزدیک امام اعظم رحمہ اللہ کا قول ہی عظیم ہے تقوی بھی اسی میں ہے فتوی بھی اسی پر دیا جائے۔ (راقم)

مرکب ادویات: جن مرکب دواؤں میں بعض چیزیں ایسی استعمال ہوں جن کا اکیلے استعمال جائز نہ ہو لیکن جب یہ معمولی مقدار میں ہوں اور دوسری اور دوائیں ان کے ساتھ مل جائیں تو بعض حضرات نے ان دواؤں کا استعمال جائز رکھا ہے ہومیو پیتھک کی دواؤں میں بھی اگر چہ معمولی مقدار میں الکحل کا استعمال ہوتا ہے لیکن ان کا استعمال بھی جائز نظر آتا ہے۔ **" ان التریاق الذی جعل فیہ لحوم الافاعی مستطاب "** تریاق میں سانپوں کا گوشت بھی استعمال ہوتا ہے۔ حالانکہ تریاق کا استعمال کرنا جائز ہے۔

راقم کا اس میں موقف یہی ہے کہ مرکب دوا میں جب غیر طیب کی معمولی آمیزش ہو وہ جائز ہے تقوی کے طور پر اجتناب کیا جائے تو علیحدہ بات ہے ورنہ تریاق کا استعمال ناجائز ہوگا حالانکہ جائز ہے۔

واللہ اعلم بالصواب۔ (از کبیر)

خون دینے کا حکم: ایک انسان کا خون دوسرے کو لگایا جاتا ہے جب کہ خون حرام ہے اور نجس، تو یہ کیسے جائز ہے؟ اس کا جواب بھی یہی ہے کہ جب کسی انسان کا علاج مسلمان ماہر طبیبوں نے فقط اپریشن منتخب کیا ہے یا کوئی شخص جنگ میں شدید زخمی ہوگیا یا حادثہ میں شدید زخمی ہوگیا جسے خون لگانا ضروری ہوگیا ان صورتوں میں جان بچانے کے لئے خون لگانا جائز ہے۔

عام طور پر معمولی معمولی تکالیف میں یا کمزوری کو دور کرنے کے لئے خون لگا دیا جاتا ہے یہ حرام ہے، ناجائز ہے اکثر طور پر ضعیف آدمی جن کی وفات یقینی طور پر نظر آتی ہے ڈاکٹر حضرات ان کا اپریشن کرنا تجویز کر دیتے ہیں صرف وہ اپنے تجربات کرنے کے لئے۔ ایسی حالت میں جب موت کا غالب گمان ہو زندگی کا کم گمان ہو اپریشن تجویز کرنا ظلم عظیم ہے خون دینا بھی منع ہوگا۔ ڈاکٹر حضرات کچھ انصاف سے کام لیا کریں۔ بے مقصد لوگوں کا خرچ کرانا اور ضعیف آدمی کو کاٹ کر موت تک پہنچانا کون سا انصاف ہے۔ (راقم)

فائدہ: " قال رسول اللہ ﷺ لطارق بن سوید وقد سأله عن الخمر فنهاه او كره ان يصنعها فقال انما اصنعها للدواء فقال انه ليس بدواء ولكنه داء "(رواہ مسلم فی الصحیح)

رسول اللہ ﷺ نے طارق بن سوید کو فرمایا جب انہوں نے آپ سے شراب کے متعلق سوال کیا تو آپ نے ان کو منع فرمایا بلکہ آپ نے شراب بنانے کو بھی ناپسند سمجھا۔ وہ کہنے لگے میں شراب دوا کے لئے بناتا ہوں آپ نے فرمایا یہ دوا نہیں بلکہ بیماری ہے۔

" وهذا يحتمل ان يقيد بحالة الاضطرار فانه يجوز التداوى بالسم ولا يجوز شربه ،والله اعلم "

ہوسکتا ہے کہ صرف اضطرار کی حالت میں جواز ہو کیونکہ زہر سے دوا جائز ہے زہر کا پینا جائز نہیں (قرطبی)

مسئلہ: کسی نجس چیز کو جب جلا کر راکھ بنا دیا جائے اس کی حقیقت بدل جانے کی وجہ سے وہ راکھ پاک ہو جاتی ہے اس راکھ کو دوا میں استعمال کرنا جائز ہوگا۔ (از قرطبی)

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَا اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ الۡکِتٰبِ وَیَشۡتَرُوۡنَ بِہٖ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ، اُولٰٓئِکَ مَا یَاۡکُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِہِمۡ اِلَّا النَّارَ وَلَا یُکَلِّمُہُمُ اللّٰہُ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ وَلَا یُزَکِّیۡہِمۡ وَلَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ

۱) ''وہ جو چھپاتے ہیں اللہ کی اتاری کتاب اور اس کے بدلے ذلیل قیمت لے لیتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ ہی بھرتے ہیں اور اللہ ان سے قیامت کے دن بات نہ کرے گا اور وہ انہیں ستھرا کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے''۔

۲) ''بیشک وہ لوگ جو چھپاتے ہیں وہ جو نازل کی اللہ نے کتاب اور حاصل کرتے ہیں اس کے ذریعے گھٹیا قیمت وہ لوگ نہیں کھاتے اپنے پیٹوں میں سوائے آگ کے اور نہیں کلام کرے گا ان سے اللہ دن قیامت کے اور نہ تزکیہ کرے گا ان کا اور ان کے لئے عذاب دردناک ہے''۔

شانِ نزول : یہود کے علماء اور رئیس لوگ اپنے سے کم درجہ کے لوگوں سے ہدیئے طلب کرتے تھے اور کھانے کی چیزیں لیتے تھے اور امید یہ رکھتے تھے کہ آخری نبی ہمارے خاندان یعنی بنی اسحاق میں سے تشریف لائیں گے۔ جب نبی کریم ﷺ بنی اسمٰعیل میں سے تشریف لے آئے تو ان کو خوف لاحق ہوا کہ ہمارے ہدیئے اور کھانے کی چیزیں ختم ہو جائیں گی:

" فعمدوا الی صفة رسول الله ﷺ فغیر وھاثم اخرجوھا الیھم فلما نظرت السفلة الی النعت المغیر وجدوہ مخالفا لصفة محمد ﷺ فلم یتبعوہ "

تو انہوں نے نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو اپنی کتب میں تبدیل کر دیا پھر وہ اپنی طرف سے من گھڑت اوصاف اپنے سے کم درجہ والوں پر پیش کئے وہ کہنے لگے یہ اوصاف تو اس شخص میں نہیں جو مدعی نبوت ہے تو انہوں نے ایمان قبول نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت میں اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا۔

(بغوی، مظہری)

یہود کے مشہور رئیس اور عالم لوگ:

کعب بن اشرف اور کعب بن سعد اور مالک بن صیف اور حیی بن اخطب اور ابویاسر بن اخطب'' (از کبیر)

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْکِتٰبِ:

"بیشک وہ لوگ چھپاتے ہیں جو نازل کی اللہ نے کتاب"

یہود کیا چھپاتے تھے؟ " فقیل کانوا یکتمون صفة محمد ﷺ ونعته والبشارة به"

وہ نبی کریم ﷺ کے اوصاف چھپاتے تھے اور آپ کے تشریف لانے کی بشارت جو ان کی کتاب میں دی گئی اسے چھپاتے تھے، یہ قول حضرت ابن عباس اور قتادہ اور سدی اور اصم اور ابو مسلم کا ہے یہود کی طرح نصاری یہ چھپاتے تھے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے آپ کے تشریف لانے کی بشارت دی لیکن انہوں نے اسے ظاہر نہ کیا لیکن ان کے ظاہر نہ کرنے کی وجہ سے آپ کی شان کو کم نہیں کیا جا سکتا تھا قرآن پاک میں عیسی علیہ السلام کی بشارت کو ذکر کر دیا جو نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری کے متعلق تھی۔

" وقال الحسن کتموا الاحکام وھو قوله تعالیٰ ان کثیرا من الاحبار والرھبان لیأ کلون اموال الناس بالباطل ویصدون عن سبیل الله "

اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں وہ احکام کو بھی چھپاتے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر کیا "بیشک بہت سے ان کے علماء اور پادری لوگوں کا مال ناحق طور پر کھا لیتے تھے اور اللہ کی راہ سے روکتے تھے"

(از کبیر)

وہ آیات کو کیسے چھپاتے تھے؟ کبھی تو وہ آیات میں تحریف کر دیتے تھے الفاظ بدل دیتے تھے جن سے مطالب غلط بیان کرتے تھے۔ اور کبھی وہ الفاظ تو نہیں بدلتے تھے لیکن ان کی تاویلیں غلط کرتے تھے۔

" وکانوا یذکرون لھا تاویلات باطلة ویصرفونھا عن محالھا الصحیة الدالة علی نبوة محمد ﷺ "

ان غلط تاویلوں کے ذریعے نبی کریم ﷺ کی نبوت پر دلالت کرنے والی آیات کے صحیح مطالب کو پھیر کر باطل کر دیتے تھے ان کے آیات کو چھپانے کا یہ مطلب بھی ہے۔ (از کبیر)

یہودیوں کا کیا ہی عجیب طریقہ تھا کہ وہ اپنی ساری کوششیں اور ساری توانائیاں نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو بدلنے میں صرف کرتے تھے ان کو یہ پسند نہیں ہوتا تھا کہ کوئی نبی کریم ﷺ کی تعریف کرے اور آپ کے کمالات بیان کرے۔ اگر یہ طریقہ کسی نام نہاد مسلمان میں بھی پایا جائے تو سمجھ لیں کہ وہ یہود کا پروردہ (پالا ہوا) ہے یا ان کے نقش قدم پر چلنے والا ہے۔

واضح ہو گیا: ﴿ مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ الْکِتَابِ ﴾ سے مراد توراۃ وانجیل ہیں جن کو اہل کتاب بدل دیتے تھے اور ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ ﴾ سے مراد یہود ونصاری ہیں۔ لیکن اگر قرآن پاک میں نبی کریم ﷺ کی شان کو واضح طور پر بیان کرنے والی آیات کو کوئی شخص صحیح نہ بیان کرے ان کی غلط تاویلیں کریں تو وہ بھی شدید مجرم ہوگا۔ (راقم)

وَیَشْتَرُوْنَ بِہٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا : ''اور حاصل کرتے ہیں اس کے ذریعے حقیر قیمت'' ''بہ'' میں ضمیر کا مرجع ''کتمان'' ہے جو ﴿ یَکْتُمُوْنَ ﴾ کے ضمن میں پایا گیا ہے یعنی ان کا کتمان حق میں مقصد ہی مال حاصل کرنا ہوتا تھا وہ مال کی خاطر دین کو برباد کر دیتے۔

ثَمَنًا قَلِیْلًا کہنے کی وجہ کیا ہے؟

اس میں چند وجوہ ہیں ان میں سے ایک یہ ہے ''انہ فی نفسہ قلیل'' بیشک وہ جو مال حاصل کرتے تھے وہ حقیقت میں ہوتا ہی قلیل تھا یعنی ان کو معمولی مقدار میں جو کے دانے، یا گھٹیا قسم کے کپڑوں کا جوڑا مل جاتا ہے۔

اور دوسری وجہ یہ ہے ''انہ بالاضافۃ الی ما فیہ الضرر العظیم قلیل'' کہ ان کو حق کے چھپانے میں جو گناہ حاصل ہوتا اور عذاب کے مستحق ہوتے اس میں بہت ہی زیادہ نقصان تھا اس لئے عظیم نقصان کے مقابلہ میں مال قلیل ہی تھا۔ (از کبیر)

اور تیسری وجہ یہ تھی ''وسماہ قلیلا لانقطاع مدتہ وسوء عاقبتہ'' کہ وہ جو مال حاصل کرتے تھے وہ جلدی ختم ہو جایا کرتا تھا اور ان کو جو عذاب ہونا ہے وہ نہ ختم ہونے والا ہے۔ (قرطبی)

اور چوتھی وجہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ ﴾ اے محبوب آپ فرما دیں دنیا کا مال قلیل ہے یعنی دنیا کا مال جتنا زیادہ بھی ہو وہ اخروی نعمتوں کے مقابل قلیل ہی ہے۔ (راقم)

''وانھم باعوا آخرتھم بحظھم من المعظم الذی لا خطر لہ''

یعنی وہ کتنے ہی بیوقوف تھے جنہوں نے آخرت کی عظیم نعمتوں کو دنیا کے حقیر مال کے بدلے بیچ دیا۔ (از قرطبی)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ''قلیل'' کا معنی ''ذلیل'' کیا ہے راقم نے بھی اسی کی نقل کی ہے اور عام فہم لفظ ''حقیر'' سے ترجمہ کر دیا ہے۔ یہ تراجم تمام مذکورہ وجوہ (جو وجہ ذکر کی گئی ہیں) کو شامل ہیں۔

أُولٰئِکَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ :

''وہ لوگ نہیں کھا رہے اپنے پیٹوں میں سوائے آگ کے۔

﴿يَأْكُلُونَ﴾ کے بعد بطور تاکید ﴿فِي بُطُونِهِمْ﴾ ذکر کر کے اشارہ کیا گیا ہے کہ اس میں ﴿يَأْكُلُونَ﴾ کا حقیقی معنی ہے ''کھانا''۔ مجازی معنی نہیں کیونکہ کبھی کسی کی زمین کوئی شخص غصب کر لے تو اس وقت بھی کہا جاتا ہے "اکل ارضی" فلاں شخص میری زمین کھا گیا۔ اسی طرح کوئی شخص کسی کا مال بے مقصد ضائع کر دے تو اس وقت بھی کہا جاتا ہے "اکل مالی" فلاں شخص نے میرا مال کھا لیا ہے لیکن یہ مجازی معانی ہیں۔

آگ کھانے کا مطلب:

چونکہ انہوں نے حق کو چھپایا۔ حق کو چھپانا حرام ہے حرام کام پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب ہوگا خصوصا حق کو چھپانے سے رشوت لینا حرام طریقہ سے مال حاصل کرنا آگ میں جانے کا ذریعہ ہے۔

" فسمی ما اکلوہ من الرشاء نارا لانہ یؤدیھم الی النار "

ان کے رشوت کھانے کو آگ سے تعبیر کر دیا کیونکہ یہ انہیں آگ میں پہنچانے کا ذریعہ ہے۔
اکثر مفسرین کرام نے آگ کا یہی مطلب ذکر کیا تاہم بعض حضرات نے یہ بھی بیان کیا ہے۔

" وقیل ای انہ یعاقبھم علی کتمانھم بأکل النار فی جھنم حقیقۃ "

اور بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ ان کو حق کے چھپانے کی وجہ سے جہنم میں حقیقۃً آگ کھلائی جائے گی۔ (قرطبی)

وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ : ''اور نہیں کلام کرے گا ان سے اللہ قیامت کے دن''

کلام نہ کرنے کی تین وجوہ: بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کلام تو تمام لوگوں سے کرنا ہے کیونکہ رب تعالیٰ نے فرمایا ہے ﴿فَوَرَبِّكَ لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ قسم ہے تیرے رب کی ہم ضرور بر ضرور تمام سے سوال کریں گے اس سے جو وہ عمل کرتے رہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْأَلَنَّ الْمُرْسَلِينَ﴾

''ہم ضرور بر ضرور سوال کریں گے ان لوگوں سے جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور ضرور بر ضرور ہم سوال کریں گے مرسلین سے''

ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ رب تعالیٰ نے کلام تو مومنوں اور کافروں سب سے ہی فرمانا ہے کلام نہ کرنے کا کیا مطلب؟ تو اس کے جواب میں یہ بتایا گیا ہے کہ کلام نہ کرنے کی تین وجوہ ہیں:

اس میں **ایک** وجہ یہ ہے "کان المراد من الآیۃ انہ تعالیٰ لا یکلمھم بتحیۃ وسلام" کہ اللہ تعالیٰ ان سے رحمت کا کلام نہیں فرمائے گا ان پر سلام نہیں فرمائیگا اس آیۃ سے یہ مراد جن آیات میں کلام کرنے کا ذکر ہے انکا مطلب یہ ہے کہ کفار سے غیظ وغضب کا کلام کریگا جس سے انکا غم زیادہ بڑھے گا۔ حسرت زیادہ ہوگی کہ کاش ہم نے وہ کام نہ کئے ہوتے جن کی وجہ آج ہمیں ذلت کا سامنا ہے اللہ تعالیٰ فرمائے گا ﴿ اخْسَئُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ ﴾ "یہاں سے ہٹ جاؤ میرے ساتھ کلام نہ کرو" تقریباً اس کا آسان لفظوں میں مطلب یہ ہے دفعہ ہو جاؤ میرے ساتھ کوئی بات نہ کرو۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ " ولا یکلمھم " کا مجازی معنی یہ ہے (قیامت کے دن) رب تعالیٰ ان پر ناراض ہوگا:

" لان عادۃ الملوک انھم عند الغضب یعرضون عن المغضوب علیہ ولا یکلمونہ کما انھم عند الرضا یقبلون علیہ بالوجہ والحدیث "

اس لئے کہ بادشاہوں کی عادت یہ ہے کہ وہ غضب کے وقت اس شخص سے منہ پھیر لیتے ہیں جس پر ان کو غصہ ہوتا ہے اور اس سے وہ کلام نہیں کرتے جس طرح وہ راضی ہونے کے وقت اس کی طرف توجہ کرتے ہیں اور کلام کرتے ہیں۔

تیسری وجہ یہ بھی ممکن ہے کہ جن آیات میں کلام کرنے کا ذکر ہے ان سے مراد اللہ تعالیٰ کا کلام کرنا فرشتوں کے واسطہ سے ہو۔ اور جن میں کلام نہ کرنے کا ذکر ہے اس سے مراد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ بالکل ہی کافروں سے کلام نہیں فرمائے گا۔ (از کبیر)

پہلی دو وجہ زیادہ قوی نظر آتی ہیں کیونکہ غیظ وغضب سے کلام کرنیکو در حقیقت کلام کرنا نہیں کہا جاتا۔ (راقم)

وَلَا يُزَكِّيهِمْ: "اور تزکیہ نہیں کرے گا ان کا" اس جملہ کا مشہور معنی تو یہ ہے ﴿ وَلَا يُزَكِّيهِمْ ﴾ ای لا یطھرھم من دنس الذنوب " اور ان کو گناہوں کی میل سے پاکیزہ نہیں کرے گا۔

یعنی جس طرح مسلمان اگر گہنگار رہوئے اور اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ان کو گناہوں سے پاک کر کے ان کی بخشش فرمادے گا لیکن کفار کو گناہوں سے پاک نہیں فرمائے گا کیونکہ کفر وشرک کو اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ کے مطابق معاف فرمانا ہی نہیں۔ (ماخوذ از روح المعانی)۔ اس کا اور معنی یہ ہے "لا ینسبھم الی

التزكية و لا يثني عليهم " کہ اللہ تعالیٰ ان کو پاکیزگی کی طرف منسوب نہیں کرے گا اور نہ ہی ان کی تعریف فرمائے گا۔

اس کا اور معنی یہ ہے " لا يقبل اعمالهم كما يقبل اعمال الازكياء " کہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال قبول نہیں فرمائے گا جس طرح وہ پاکیزہ لوگوں کے اعمال کو قبول فرمائے گا۔

اور اس کا معنی یہ ہے "لا ينزلهم منازل الا زكياء " کہ اللہ تعالیٰ ان کو پاکیزہ لوگوں کے مراتب عطا نہیں فرمائے گا۔

اردو کا دائرہ تنگ ہے کوئی ایسا لفظ نہ ملا جو ان تمام معانی کو شامل ہوتا تو راقم نے ترجمہ میں بھی عربی لفظ ہی شامل کر دیا (اور ان کا تزکیہ نہیں فرمائے گا)۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ : ''اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے''

طلباء کرام کی توجہ کے لئے : فعیل کبھی بمعنی فاعل ہوتا ہے جیسے " سميع " بمعنی " سامع " اور " علیم " بمعنی ''عالم'' اور فعیل کبھی بمعنی مفعول ہوتا ہے جیسے " جريح " بمعنی ''مجروح'' اور قتیل'' بمعنی ''مقتول'' اور فعیل کبھی معنی مفعل ہوتا ہے جیسے " بصير "، بمعنی ''مبصر''۔ (از کبیر)

اس میں پھر دو احتمال ہیں کہ فاعل کا معنی ہے ان کے لئے عذاب ہوگا درد پہنچانے والا۔

اور ایک احتمال یہ ہی کہ مفعول کا معنی ہو'' جلالین میں مفعول والا معنی لیا گیا ہے'' کہ ان کو عذاب ہوگا درد پہنچایا ہوا یعنی اتنا شدید عذاب ہوگا کہ خود عذاب کو درد محسوس ہوگا۔ (راقم)

عجیب نکتہ : جب کسی کو خالص ضرر (نقصان و تکلیف) پہنچایا جائے اور اس کے ساتھ اس کی ذلت وحقارت بھی پائی جائے تو اسے عقاب کہا جاتا ہے۔ یہاں رب تعالیٰ نے پہلے ان کی ذلت وحقارت کو ﴿وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ﴾ سے بیان فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کے اوصاف چھپانے والے اتنے حقیر اور ذلیل ہوں گے کہ رب تعالیٰ ان سے قیامت کے دن نہ ہی رحمت والا کلام فرمائے گا اور نہ ہی ان کو سلام دے گا۔ اور اپنے گناہوں کی آلودگی میں جوں کے توں ہی رہیں گے رب تعالیٰ انہیں پاک نہیں فرمائے گا۔ اس کے بعد رب تعالیٰ نے ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ سے ان کے ضرر کو بیان فرمایا (گویا یوں سمجھا جائے کہ اس مقام پر علیحدہ علیحدہ اجزا کو ذکر فرما کر کہ ان کی حقارت وذلت بھی ہوگی اور ان کو ضرر بھی ہوگا اس کو واضح کر دیا کہ ان کو جو عذاب دیا جائے گا وہ عقاب ہی ہوگا۔

" وقدم الاهانة علی المضرة تنبیها علی ان الاهانة اشق واصعب "

اوران کی حقارت وذلت کوضرر سے پہلے ذکر فرما کراس پرتنبیہ کی گئی ہے کہ بیشک کسی کوحقیر سمجھنا اوراسے ذلیل کرنا اسے عذاب دینے سے زیادہ اس پرشاق گزرتا ہےاوراس کی طبیعت پراس کا زیادہ بوجھ ہوتا ہے جواسے مشکل نظر آتا ہے۔

شدید عذاب کی عظیم وجہ: آیۃ کریمہ میں جب شدید عذاب کا ذکر کیا کہ وہ اپنے پیٹوں میں آگ کھائیں گے۔ان کیلئے ذلیل ورسوا کرنے والا عذاب ہوگا۔اتنا شدید عذاب کیوں ہوگا؟اس کی صرف یہی وجہ ہے کہ ان کا جرم سب جرموں سے بڑا ہوگا کہ انہوں نے محبوب خدا کے اوصاف چھپائے جب کہ رب تعالیٰ نے آپ کے اوصاف وکمالات کو بیان کرنے کا حکم دیا﴿ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ اور آپ اپنے رب کی نعمت کوخوب بیان کرو۔جب مصطفیٰ کریم ﷺ رب تعالیٰ کی نعمت عظمیٰ ہیں تو آپ کے اوصاف کو بیان کوواجب ہوگیا جنہوں نے آپ کے اوصاف کو چھپایا یقیناً وہ عظیم مجرم ہیں۔(راقم)

مسئلہ: " دلت الآیة علی تحریم الکتمان لکل عالم فی باب الدین یجب اظهاره "

آیۃ کریمہ سے یہ واضح ہوا کہ دین میں جن چیزوں کا ظاہر کرنا ضروری ہےان کو چھپانا کسی عالم کے لئے جائز نہیں (کبیر) بس یہی وجہ ہے کہ علماء بے دینوں کی نظر میں کھٹکتے ہیں کہ وہ حق کو ظاہر کرتے ہیں بے دین اسے پسند نہیں کرتے۔

تنبیہ: " العبرة بعموم اللفظ لا بخصوص السبب فالآیة وان نزلت فی الیهود لکنها عامة فی حق کل من کتم شیئا من باب الدین یجب اظهاره فتصلح لان یتمسک بها القاطعون بوعید اصحابه الکبائر والله اعلم "

اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے خصوص سبب کا نہیں آیۃ اگرچہ یہود کے متعلق نازل ہوئی لیکن عام ہے ہراس شخص کے متعلق جس نے دین سے ان مسائل کو چھپایا جن کو ظاہر کرنا ضروری ہے۔اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ جوکبیرہ گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں وہ رب تعالیٰ کی شدید وعید کے مستحق ہوتے ہیں۔(از کبیر)

﴿ اُولٰئِکَ الَّذِیۡنَ اشۡتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالۡهُدٰی وَ الۡعَذَابَ بِالۡمَغۡفِرَةِ فَمَاۤ اَصۡبَرَهُمۡ عَلَی النَّارِ ﴾

۱) ''یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی مول لی اور بخشش کے بدلے عذاب تو کس درجہ انہیں آگ کا سہارا ہے''۔

۲) ''یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے حاصل کیا گمراہی کو بدلے ہدایت کے اور عذاب کو حاصل کیا بدلے بخشش کے تو کتنا ہی صبر ہے ان کا آگ پر''۔

اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں علماء یہود کے کتمان حق (حق چھپانا) کا ذکر کیا اور ان پر وعید شدید (سخت عذاب) کا ذکر کیا اب اس آیۃ کریمہ میں ان کے جرم پر مرتب ہونے والے آثار کا ذکر کیا جارہا ہے کہ وہ گمراہی کو ہدایت کے بدلے حاصل کررہے تھے اور عذاب کو مغفرت کے بدلے حاصل کررہے تھے ان کا یہ طریقہ آگ کے عذاب تک پہنچانے کا ذریعہ ہے وہ کیسے ہی لوگ تھے جو آگ تک پہنچانے والے کاموں پر قائم تھے۔

قدرے وضاحت: ہر انسان جو کام بھی کرتا ہے اس کا تعلق یا دنیا سے ہوتا ہے اور یا آخرت سے۔ دنیا سے تعلق رکھنے والے کام دو قسم کے ہیں ایک اچھے اور دوسرے برے دنیا کے لحاظ پر اچھے کاموں میں زیادہ اچھے دو کام ہیں ہدایت پر رہنا اور علم حاصل کرنا کیونکہ تمام اچھے کاموں کی دارومدار ان دو چیزوں پر ہی ہے۔ اور دنیا میں سب سے بری چیزیں دو ہیں گمراہی اور جہالت کیونکہ تمام برائیاں ان میں ہی پائی جاتی ہیں جب انہوں نے دنیا میں ہدایت اور علم کو چھوڑ دیا اور گمراہی اور جہالت پر راضی ہوگئے۔

'' فلا شک انهم فی نهایة الخیانة فی الدنیا ''

اس میں کوئی شک نہیں کہ بیشک وہ دنیا میں بہت بڑی خیانت پر ہیں یہی ان کے لئے بہت بڑے خسارے کا سبب ہے۔ آخرت میں سب سے اچھی چیز مغفرت ہے اور سب سے زیادہ خسارے والی چیز عذاب ہے جب انہوں نے مغفرت کو چھوڑ دیا اور عذاب پر راضی ہوگئے۔ تو یقیناً وہ آخرت میں بہت بڑے خسارے میں ہوں گے۔

" واذا کانت صفتهم علی ما ذکرناه کانوا لا محالة اعظم الناس خسارا فی الدنیا وفی الآخرة "

جب ان لوگوں کی صفات وہ ہیں جو ہم نے ذکر کی ہیں تو وہ یقینی طور پر تمام لوگوں سے زیادہ دنیا اور آخرت میں خسارے میں ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق کہا ہے کہ "انہوں نے مغفرت کے بدلے عذاب حاصل کیا"۔ کیونکہ جب ان کو علم تھا کہ حضور علیہ السلام کے اوصاف برحق ہیں اور یہ بھی انہیں علم تھا کہ ان اوصاف کا ظاہر کرنا شکوک وشبہات کو دور کرنا ہے اور اس پر عظیم ثواب حاصل ہونا ہے۔ اور ان کو چھپانے میں اور شبہادت ڈالنے کی وجہ سے بہت بڑا عذاب ہونا ہے جب سب کچھ جاننے کے باوجود انہوں نے حق چھپایا " کانوا بالعین للمغفرة بالعذاب لا محالة " تو وہ یقیناً مغفرت کے بدلے عذاب حاصل کرنے والے ہوئے۔ (از کبیر)

تنبیہ : آیہ کریمہ میں ﴿اِشْتَرَوُا﴾ اپنے حقیقی معنی "خریدنے" میں استعمال نہیں بلکہ اس کا مجازی معنی "تبدیل کرنا اور" حاصل کرنا" ہے کیونکہ حقیقی معنی میں مال کا تبادلہ مال سے ہوتا ہے یہاں وہ صورت نہیں پائی گئی۔ (راقم)

فَمَا اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ : "تو کتنا ہی صبر ہوگا ان کا آگ پر" اس جملہ کے مطلب دو طرح بیان کئے گئے ہیں ایک یہ کہ "ما" استفہامیہ (برائے سوال) لیکن استفہام بمعنی توبیخ (ڈانٹ ڈپٹ) کے استعمال ہے اب معنی یہ ہوا " ما الذی اصبرهم ، وای شئی صبرهم علی النار حتی ترکوا الحق واتبعوا الباطل " کس چیز نے انہیں آگ پر صبر دلایا یعنی انہوں نے حق کو چھوڑ کر باطل کی تابعداری شروع کر لی جو ان کو آگ تک پہنچانے کا ذریعہ ہے کتنے ہی نادان ہیں وہ لوگ جو اس پر سہارا لگا بیٹھے ہیں۔

اس معنی کے لحاظ پر " اصبر " صبر کے معنی میں ہوگا کثیر مقام پر " افعل "، بمعنی "فعل" اور " اکرم " بمعنی "کرم" اور " اخبر "، بمعنی "خبر" استعمال ہوتا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ تعجب کا معنی لیا گیا ہو کیونکہ جو شخص کسی چیز کے اسباب پر راضی ہوتا ہے وہ اس چیز پر بھی راضی ہوتا ہے جب وہ ایسے کام کر رہے تھے جو آگ میں جانے کا ذریعہ تھے تو گویا

انہیں آگ پسند تھی اس وجہ سے کہا گیا ﴿ فَمَا اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴾ (تعجب ہے اس پر کہ) کتنا ہی صبر ہے ان کا آگ پر۔

اسی طرح جب وہ ایسے کام کر رہے تھے جو عذاب کا سبب تھے وہ جانتے بھی تھے کہ ہم عذاب والے کام کر رہے ہیں تو گویا کہ " بذلک کالراضین بعذاب الله تعالیٰ " وہ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب پر راضی تھے۔ عربی زبان کا یہ محاورہ بھی ہے کہ جب کوئی شخص بادشاہ کی مخالفت کرتا ہے اس کو غضب دلانے والے کام کرتا ہے تو کہا جاتا ہے " ما اصبرک علی القید و السجن " تو کتنا ہی صبر کرنے والا ہے قید اور قید خانہ پر۔

اسی سے یہ واضح ہو گیا کہ مراد اس سے دنیا میں صبر کرنا ہے کیونکہ وہ دنیا میں وہ کام کر رہے تھے جو ان کو آگ تک پہنچانے والے تھے دنیا میں ہی وہ ہدایت کے بدلے گمراہی حاصل کر رہے تھے۔ لہٰذا اصم کا یہ کہنا کہ اس کا تعلق آخرت سے ہے کہ رب تعالیٰ جب انہیں فرمائے گا ﴿ اخسؤ فیھا ولا تکلمون ﴾ دھتکارے پڑے رہو اس میں میرے ساتھ کلام نہ کرو۔

تو اس وقت وہ اپنے سروں کو جھکائے ہوں گے اور خاموش ہوں گے یہی ان کا صبر ہوگا۔ لیکن اصم کا یہ قول درست نہیں کیونکہ رب تعالیٰ نے ان کا یہ وصف فی الحال بیان کیا ہے یہ نہیں کہ آئندہ ایسا ہوگا دوسری وجہ یہ ہے کہ جہنمیوں کا خاموش رہنا بھی درست نہیں " قد یقع منھم الجزع و الاستغاثة " بلکہ وہ چلائیں گے اور فریاد طلب کریں گے۔

طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

یہاں یہ ذکر کرنا ہے کہ تعجب کیا ہے اور اس کے صیغے کیا ہیں اس میں دو بحثیں ہیں۔

پہلی بحث کہ تعجب کیا ہے؟ " وھو استعظام الشئی مع خفاء سبب حصول عظم ذلک الشئی " تعجب یہ ہے کہ کسی چیز کو عظیم سمجھنا اور اس کی عظمت کے حاصل ہونے کے اسباب کا پتہ نہ ہو۔ حقیقی تعجب تو ان دو معنوں کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ ہاں البتہ کبھی کسی چیز کے عظیم ہونے پر تعجب کر لیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کے اسباب پوشیدہ نہ ہوں یا عظمت کے اسباب حصول ہی نہ پائے جائیں۔

تنبیہ : علامہ نحعی رحمہ اللہ نے فرمایا "معنی التعجب فی حق اللہ تعالیٰ مجردہ الاستعظام" تعجب کی نسبت جب رب تعالیٰ کی طرف ہوتو اسوقت معنی صرف کسی چیز کا بڑا ہونا مراد ہوتا ہے۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کے اسباب کا مخفی ہونا ممکن نہیں۔ البتہ بندوں کے لئے تعجب کی وہی تعریف ہے جو ذکر کی گئی کہ چیز عظیم بھی ہو اور اس کی عظمت کے حصول کے اسباب مخفی ہوں۔

اسی طرح "سخریة" اور "استھزاء" اور "مکر" کی نسبت بندوں کی طرف کریں تو اور معانی ہیں اور رب تعالیٰ کی طرف منسوب کریں تو اور معانی ہیں۔

دوسری بحث: فعل تعجب کے دو صیغے ہیں "ما افعله و افعل به" ﴿فَمَا اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ﴾ پہلے صیغہ کے مطابق ہے اس میں نحویوں کے تین مذہب ہیں ایک سیبویہ کا اس کے نزدیک "ما" نکرہ ہے لیکن "شر اھر ذ اناب" کی طرح مبتدا ہے اور اس کے مابعد خبر ہے۔ اور اخفش کے نزدیک "ما" موصولہ ہے اور خبر محذوف ہے تقدیر عبارت کی یہ ہے یعنی "ما احسنه" کا معنی یہ ہوگیا:

"الذی احسن زیدا ای جعله ذا حسن شئی عظیم"

اور فراء کے نزدیک "ما" استفہامیہ ہے اور اس کے بعد خبر ہے اب تقدیر عبارت کی یہ ہوگی "ای شئی احسن زیدا"

فراء کے مذہب کو علامہ رضی نے راجح قرار دیا بہر حال معنی تعجب کا "زید کتنا ہی حسین ہے" اور ﴿فَمَا اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ﴾ کا معنی تعجب کے طور پر "ان کو کتنا ہی صبر ہے آگ پر"

(از کبیر و کافیہ و جامی)

﴿ ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِی الْکِتٰبِ لَفِیْ شِقَاقٍ بَعِیْدٍ ﴾

۱) ''یہ اس لئے کہ اللہ نے کتاب حق کے ساتھ اتاری اور بیشک جو لوگ کتاب میں اختلاف ڈالنے لگے وہ ضرور پرلے سرے کے جھگڑالو ہیں''۔

۲) ''یہ اس لئے کہ بیشک اللہ نے اتاری کتاب حق کے ساتھ اور بیشک وہ لوگ جنہوں نے اختلاف کیا کتاب میں وہ بھٹکے ہوئے ہیں بہت بڑے''۔

'' ذلک ای مجموع ماذکر '' اس مقام میں '' ذلک '' کا اشارہ'' مجموع ما ذکر '' (تمام چیزیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) کی طرف ہے یعنی ان کا پیٹوں میں آگ کھانا۔ اور اللہ تعالیٰ کا ان سے کلام نہ کرنا اور اللہ تعالیٰ کا ان کی پاکیزگی بیان نہ کرنا اور ان کا دردناک عذاب میں مبتلا ہونا جو ان کے کتمان حق (حق چھپانے) پر مرتب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب کو حق سے اتارا لیکن انہوں نے اس میں اختلاف کیا بعض پر ایمان لائے اور بعض سے کفر کیا وہ حق راہ سے دور ہو کر گمراہی میں مبتلا ہوئے۔

بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ : '' باء '' سبب کے لئے ہے '' الکتاب '' سے مراد قرآن پاک یا توراۃ ہے۔ '' بالحق '' یعنی متلبسا بالحق کہ کتاب کو حق سے اتارا یعنی ان میں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتارا گیا وہ حق ہے توراۃ میں تو تحریف کر دی گئی اور وہ منسوخ بھی ہو گئی لیکن قرآن پاک کی حفاظت کا ذمہ رب تعالیٰ نے خود اٹھا لیا اس لئے اس میں نہ تحریف ہوئی ہے اور نہ ہی منسوخ۔

مقصد بیان یہ ہے کہ وہ کتاب جو حق سے نازل کی اگر مراد توراۃ ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ توراۃ میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف حق سے بیان کئے گئے ہیں لیکن یہ لوگ ان کو چھپا کر گمراہ ہو گئے۔ اور اگر مراد قرآن پاک ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ نے حق سے نازل فرمایا لیکن وہ اسے چھوڑ کر گمراہی میں مبتلا ہو گئے۔

وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتَابِ : الکتاب، پر الف لام جنسی ہے یعنی جنس کتاب مراد اس سے یہ ہے کہ بیشک وہ لوگ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں اختلاف کیا بعض کتابوں پر ایمان لایا اور بعض پر ایمان نہیں لایا۔

یا الف لام عہد خارجی ہو اور کتاب سے مراد توراۃ ہو اب ﴿ اختلفوا ﴾ بمعنی "تخلفوا" ہوگا مطلب یہ ہوگا کہ بیشک "توراۃ میں جو حق بیان کیا گیا ہے" اس پر چلنے سے وہ ہٹ گئے یا معنی یہ بیان کیا جائے گا کہ بیشک توراۃ میں نبی کریم ﷺ کے جو اوصاف تھے اور جو احکام تھے " جعلوا ما بدلوه خلفا عما فيها "ان کو بدل کر ان کے پیچھے (ان کی جگہ) اور رکھ دیئے۔

الف لام عہد خارجی سے مراد قرآن پاک بھی ہو سکتا ہے اب ان کے اختلاف کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ بعض نے کہا قرآن سحر (جادو) ہے اور بعض نے کہا قرآن شعر ہے اور بعض نے کہا قرآن پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔

لَفِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ : " ﴿شِقَاقٍ﴾ اى خلاف ﴿ بَعِيْدٍ ﴾ عن الحق موجب لاشد العذاب "

وہ اس اختلاف میں ہیں جو حق سے دور ہے جو سخت عذاب کا سبب ہے۔ (از روح المعانی)

﴿ لَفِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ ﴾ کے معنی میں چند وجوہ ہیں۔

(۱) ایک ان میں سے یہ ہے کہ بیشک یہ لوگ آپ کی عداوت کی وجہ سے توراۃ اور انجیل کی تحریف کی کیفیت میں اختلاف رکھتے ہیں اسی وجہ سے " هم فيما بينهم فى شقاق بعيد ومنازعة شديدة " وہ آپس میں بہت زیادہ اختلاف رکھتے ہیں شدید جھگڑا کرتے ہیں۔

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی قول کے مطابق ہے "اور ضرور پرلے سرے کے جھگڑالو ہیں"۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے گویا کہ رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرمایا:

" هؤلاء وان اختلفوا فيما بينهم فانهم كالمتفقين على عداوتك وغاية المشاقة لك فلهذا خصهم الله بذلك الوعيد "

یہ لوگ اگرچہ آپس میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے لیکن آپ کے ساتھ عداوت رکھنے میں سب متفق ہیں جو آپ کو بہت زیادہ مشقت میں ڈالنے کا ذریعہ ہے اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے اس

وعید میں یہود ونصاریٰ کو خاص کیا۔

اب مطلب یہ ہوگا کہ بیشک جن لوگوں نے کتاب میں اختلاف کیا وہ آپ کے ساتھ عداوت کرنے کی وجہ سے آپ کو بہت بڑی مشقت میں ڈال رہے ہیں۔

(۳) تیسرا معنی یہ ہے کہ انہوں نے اصل تحریف میں تو اتفاق کیا لیکن تحریف کی کیفیت میں اختلاف کیا" فان کل واحد منهم یکذب صاحبه ویشاقه وینازعه " بیشک ہر ایک ان میں سے اپنے صاحب کی تکذیب کرتا ہے اور مخالفت کرتا ہے اور جھگڑا کرتا ہے۔ (از کبیر)

خیال رہے کہ پہلے معنی اور تیسرے معنی میں فرق یہ ہے کہ پہلے معنی میں مطلقاً ان کا اختلاف ذکر کیا کہ وہ آپس میں اختلاف رکھتے ہیں اور جھگڑا کرتے ہیں۔ اور تیسرا معنی خاص اور مقید ذکر کیا کہ وہ تحریف کی کیفیت میں ایک دوسرے کی مخالفت کرتے ہیں اور جھگڑا کرتے ہیں۔

تمام معانی کا جامع معنی: ﴿ لَفِیْ شِقَاقٍ بَعِیْدٍ ﴾ لفی ضلال بعید عن الحق "

بیشک جن لوگوں نے اختلاف کیا ہے کتاب میں وہ گمراہی میں ہیں جو حق سے دور ہے۔

یعنی "شِقَاقٍ "کا معنی" گمراہی" اور "بعید" سے مراد حق سے دور ہونا ہے۔ (از بیضاوی)

راقم کے نزدیک علامہ بیضاوی رحمہ اللہ کا بیان کیا ہوا معنی روح المعانی کے معنی کو اور کبیر کے تینوں معانی کو شامل ہے اس لئے راقم نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے "وہ بہت بڑی گمراہی میں ہیں" کیونکہ حق سے دور ہونا در حقیقت بڑی گمراہی میں مبتلا ہونا ہی ہے۔

☆☆☆☆☆

﴿ لَیۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَکُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ
وَلٰکِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡآخِرِ وَالۡمَلٰٓئِکَةِ وَالۡکِتَابِ
وَالنَّبِیّٖنَ وَآتَی الۡمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الۡقُرۡبٰی وَالۡیَتٰمٰی
وَالۡمَسَاکِیۡنَ وَابۡنَ السَّبِیۡلِ وَالسَّآئِلِیۡنَ وَفِی الرِّقَابِ وَاَقَامَ
الصَّلٰوةَ وَآتَی الزَّکٰوةَ وَالۡمُوۡفُوۡنَ بِعَهۡدِهِمۡ اِذَا عَاهَدُوۡا
وَالصّٰبِرِیۡنَ فِی الۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیۡنَ الۡبَاۡسِ اُولٰٓئِکَ
الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ ﴾

۱) ''کچھ اصل نیکی یہ نہیں کہ منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرو ہاں اصل نیکی یہ کہ ایمان لائے اللہ اور قیامت اور فرشتوں اور کتاب اور پیغمبروں پر، اور اللہ کی محبت میں اپنا عزیز مال دے رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور راہ گیر اور سائلوں کو گردنیں چھڑانے میں اور نماز قائم رکھے اور زکوٰۃ دے اور اپنا قول پورا کرنے والے جب عہد کریں اور صبر والے مصیبت اور سختی میں اور جہاد کے وقت یہی ہیں جنہوں نے اپنی بات سچی کی اور یہی پرہیزگار ہیں''

۲) ''نہیں ہے کامل نیکی کہ تم پھیرو اپنے چہروں کو طرف مشرق اور مغرب کے اور لیکن کامل نیکی یہ ہے کہ جو شخص ایمان لائے اللہ پر اور دن آخرت پر اور کتاب پر اور نبیوں پر اور دے مال محبت سے قریبی لوگوں کو اور یتیموں کو اور مسکینوں کو اور مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں اور قائم رکھے نماز اور دے زکوٰۃ اور پورا کرنے والے ہیں اپنے وعدوں کو جب وہ وعدہ کرتے ہیں اور صبر کرنے والے ہیں مصیبت اور سختی میں اور بوقت جہاد یہی لوگ ہیں وہ جنھوں نے سچ کہا اور یہی لوگ تقویٰ رکھنے والے ہیں''۔

شان نزول: اس آیۃ کریمہ کے شان نزول میں چند احتمال ہیں:

۱) یہ آیۃ کریمہ اہل کتاب کے حق میں نازل ہوئی جب انہوں نے بیت المقدس کی طرف توجہ کرنے میں شدت اختیار کی اور مؤمنین کو بھی طعنے دینے لگے کہ تم نے بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبہ کو قبلہ بنالیا رب تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا کہ مشرق اور مغرب کی طرف منہ کرنا ہی نیکی نہیں بلکہ کامل نیکی اس وقت حاصل ہوگی جب ایمان کامل ہوگا اور نیک اعمال پائے جائیں گے (تفصیلی ذکر انشاء اللہ آگے آرہا ہے)

۲) یہ آیۃ کریمہ مومنین کے حق میں نازل ہوئی جب قبلہ تبدیل کردیا گیا تو بعض مومن حضرات نے کعبہ کے قبلہ بن جانے کو ہی مقصود اعظم سمجھا اسی پر سہارا لگا بیٹھے تو رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا کہ کامل نیکی صرف مشرق ومغرب کی طرف منہ کرنے سے حاصل نہیں بلکہ جن پر ایمان لانا ضروری ہے ان پر ایمان لائے اور عبادات پر عمل کرے تو پھر کامل نیکی حاصل ہوگی۔

۳) شان نزول میں تیسرا قول یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ مومنین اور یہود کے متعلق نازل ہوئی یعنی اس کا حکم عام ہے کیونکہ قبلہ کی تبدیلی پر مومنین نے خوشی کا اظہار کیا اور یہود نے تشدد شروع کیا یعنی وہ مسلمانوں کو طعنے دینے لگے کہ تم نے قبلہ تبدیل کردیا ہے۔ جس سے رب تعالیٰ تم پر ناراض ہے وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ مسلمانوں کا قبلہ تبدیل کرنا اپنے رائے سے نہ تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھا۔

" حتی ظنوا انه الغرض الاکبر فی الدین فبعثهم الله تعالیٰ بهذا الخطاب علی استیفاء جمیع العبادات والطاعات "

یہاں تک کہ ہر فریق نے یہی سمجھا تھا کہ کامیابی کی دارومدار صرف قبلہ پر ہے اور یہی بہت بڑا مقصد ہے تو رب تعالیٰ نے ان کو اس خطاب سے بتایا کہ اصل میں تمام عبادات اور تمام طاعات کو مکمل کرنے میں کامیابی ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ اس تیسری وجہ کو ترجیح دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

" وهذا اشبه بالظاهر اذ لا تخصیص فیه فکانه تعالیٰ قال لیس البر المطلوب هو امر القبلة بل البر المطلوب هذه الخصال التی عدها "

کہ یہ قول زیادہ بہتر ہے کیونکہ آیۃ کریمہ میں ظاہر طور پر کوئی تخصیص نہیں پائی گئی کہ یہ کسی ایک

فریق سے خاص ہو گویا کہ اللہ تعالیٰ نے عام ارشاد فرمایا کہ مطلوب صرف قبلہ نہیں بلکہ تمام نیکیوں پر عمل کرنا ہی بڑا مقصد ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

۴) سب سے پہلے حکم صرف ایمان لانے کا تھا احکام فرض نہیں تھے فرائض سے پہلے جس نے کلمہ شہادت صدق دل سے پڑھ لیا﴿ اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمد اعبده ورسوله ﴾ وہ جنت کا مستحق ہو گیا حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے اسی آیۃ کے ذریعے احکام فرض ہوئے۔ (قرطبی)

راقم کے نزدیک بھی تیسرا قول ہی راجح ہے جس کو علامہ رازی رحمہ اللہ نے ترجیح دی ہے۔

طلباء کرام توجہ فرمائیں: ﴿ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا ﴾ اس مقام میں " البر " کو بعض قراءتوں میں مرفوع پڑھا گیا ہے اور بعض میں منصوب۔ دونوں قراءتیں اولی (بہتر) ہیں ہر ایک میں وجہ ترجیح موجود ہے۔

حمزہ اور حفص کی قراءت جو عاصم سے منقول ہے اس پر نصب (زبر) ہے ان کی دلیل اپنے قول کے راجح ہونے پر یہ ہے کہ " البر " معرفہ ہے اور ﴿ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ ﴾ بھی مصدر کی تاویل میں معرفہ ہے۔" ان المصدر المؤول اعرف من المحلى بالالف واللام " بیشک فعل جب ان مصدریہ کی وجہ سے تاویل مصدر میں ہو وہ زیادہ معرفہ ہوتا ہے بنسبت الف لام کے ذریعے معرفہ سے۔ اس لئے جو زیادہ معرفہ ہو اسے اسم بنانا چاہئے لہٰذا " البـــر " خبر مقدم ہے اور ﴿ اَنْ تُــوَلُّــوْا وُجُوْهَكُمْ ﴾ اسم مؤخر۔

اور رفع والی قراءت کا قول کرنے والے حضرات کی دلیل یہ ہے کہ " لیـــس " کا اسم فاعل کے مشابہ ہے اور خبر مشابہ ہے مفعول کے، فاعل کے لئے اصل یہ ہے کہ وہ فعل کے ساتھ متصل ہو یعنی بغیر کسی وجہ کے فاعل کو مؤخر کرنا اور مفعول کو مقدم ذکر کرنا بہتر نہیں اسی طرح " لیـــس " کا اسم بھی مؤخر کرنا بہتر نہیں۔

دونوں قراءتیں صحیح ہیں دونوں کے دلائل قوی ہیں تاہم ہمارے نزدیک حفص کی قراءت بہتر

ہے لہٰذا " البر " پر نصب کے بہتر ہونے کا قول کیا گیا ہے۔ (از شیخ زادہ و کبیر)

یہود و نصاری کے ایمان اور عبادات میں خلل واقع ہونا:

یہود اور نصاری کا قبلہ میں بھی اتفاق نہ تھا بیت المقدس کی مغربی جانب کا استقبال کرتے تھے اور نصاری مشرق جانب کا۔ پھر بھی وہ سمجھتے یہی تھے کہ صرف بیت المقدس کو قبلہ مان لینے سے تمام مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا صرف بیت المقدس کو قبلہ تسلیم کر لینے میں کامیابی نہیں بلکہ ایمان لانے اور عبادات کرنے میں کامیابی ہے۔ لیکن ان میں بھی تم خلل ڈالتے ہو۔

اہل کتاب کے ایمان میں خلل:

یہود اللہ تعالیٰ کے جسم کے قائل تھے کہ وہ جسم ہے اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے ان کے قول کی حکایت بیان " وَقَالَتِ الیهود عزیر ن ابن الله "اور یہود نے کہا عزیر اللہ کے بیٹے ہیں۔

اور یہود نے اللہ تعالیٰ کو معاذ اللہ بخیل (کنجوس) کہا" قَالُوْا اِنَّ اللهَ فَقِیْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِیَاء " یہود نے کہا اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔

" وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ یَدُ اللهِ مَغْلُوْلَةٌ " اور یہود نے کہا اللہ کا ہاتھ تنگ ہے۔

نصاری نے بھی اللہ تعالیٰ کو جسم سمجھا اسی لئے وہ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا تسلیم کرتے تھے ﴿وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِیْحُ ابْنُ اللهِ﴾ ''اور نصاری نے کہا مسیح (عیسیٰ) اللہ کا بیٹا ہے۔

واضح ہوا کہ یہود و نصاری کا اللہ تعالیٰ پر وہ ایمان نہ تھا جو اس کی شان کے لائق تھا بلکہ ان کا ایمان حقیقت میں کفر تھا۔

آخرت پر ایمان لانے میں خلل: " وَقَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ کَانَ هُوْدًا اَوْ نَصَارٰی "

اور انہوں نے کہا ہر گز جنت میں کوئی بھی داخل نہیں ہوگا سوائے اس کے جو یہودی ہوا یا نصرانی۔

یعنی یہود کا دعوی یہ تھا کہ جنت میں صرف یہودی جائیں گے اور نصرانیوں کا دعوی یہ تھا کہ جنت میں صرف نصرانی جائیں گے ان دونوں فریقوں کا یہ دعوی من گھڑت تھا لہٰذا آخرت پر ایمان لانے میں انہوں نے خلل پیدا کیا۔

﴿ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ﴾

''اورانہوں نے کہا ہرگز آگ ہمیں مس نہیں کرے گی سوائے چند دنوں کے''

یعنی انہوں نے کہا کہ ہمارے آباءواجداد نے چالیس دن تک بچھڑے کی پوجا کی تھی ہمیں صرف اتنے دن ہی عذاب ہوگا یہ من گھڑت قول بھی انکے آخرت پر ایمان لانے میں خلل اندازی کا سبب تھا۔

" والنصاری انکروا المعاد الجسمانی " نصاری نے جسم کے پھر زندہ ہونے کا انکار کیا

"وکل ذلک تکذیب بالیوم الآخر "یہ تمام اقوال درحقیقت قیامت کے دن کے انکار کا سبب ہیں۔

ملائکہ پر ایمان لانے میں خلل: یہود نے اس میں خلل پیدا کیا جب انہوں نے جبریل سے اپنی عداوت کا اظہار کیا رب تعالیٰ نے فرمایا جبریل کی عداوت باعث کفر ہے۔یعنی جبریل کی عداوت درحقیقت رب تعالیٰ سے عداوت اور تمام فرشتوں سے عداوت ہے ان تمام سے عداوت رکھنے والے یقیناً کافر ہیں۔

اللہ کی کتابوں پر ایمان لانے میں خلل: یہود و نصاری نے اس میں بھی خلل ڈالا جب وہ جانتے تھے قرآن پاک اللہ کی کتاب ہے پھر بھی انہوں نے اس کا رد کیا اور اسے قبول نہ کیا۔اور اپنی کتب کے بھی بعض احکام پر ایمان لایا اور بعض سے کفر کیا رب تعالیٰ نے ان کی مذمت میں فرمایا:

﴿ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ﴾

''اوراگر آئیں تمہارے پاس قیدی تو ان کا تم فدیہ دیتے ہو حالانکہ ان کا نکالنا ہی تم پر حرام تھا کیا تم بعض کتاب پر ایمان رکھتے ہو اور بعض سے کفر کرتے ہو''۔

ان کا یہ طریقہ اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر ایمان لانے میں خلل اندازی کا سبب تھا۔

انبیاء کرام پر ایمان لانے میں خلل: یہود نے انبیاء کرام پر ایمان لانے کی بجائے ان کو شہید کر دیا رب تعالیٰ نے ان کی مذمت میں بیان فرمایا:

﴿ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ﴾ ''اوروہ شہید کرتے ہیں انبیاء کو ناحق''

" وحیث طعنوا فی نبوة محمد ﷺ "اورانہوں نے نبی کریم ﷺ کی نبوت میں بھی

طعنہ زنی کی اور آپ کی نبوت کو تسلیم نہ کیا اور نہ ہی آپ پر ایمان لایا۔

مال کے خرچ کرنے میں خلل: اللہ تعالیٰ نے جس طرح مال کے خرچ کرنے کا حکم دیا انہوں نے اس کے خلاف دوسرے لوگوں کو شبہات میں ڈال کر ان سے گھٹیا مال حاصل کیا۔ گویا کہ ان کو ثواب سے محروم کر کے حرام طریقہ پر مال خرچ کرنے کا حکم دیا رب تعالیٰ نے ان کی مذمت میں بیان فرمایا:

﴿ واشتروا به ثمنا قليلا ﴾ ''اور حاصل کیا انہوں نے اس کے ذریعے گھٹیا مال''

نماز اور زکوٰۃ میں خلل:

یہود و نصاریٰ نے نبی کریم ﷺ پر ایمان ہی نہ لایا کہ وہ آپ کی شریعت کے مطابق نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے بلکہ " والیهود کانوا یمنعون الناس بها "۔ وہ دوسرے لوگوں کو بھی نماز اور زکوٰۃ ادا کرنے سے منع کرتے تھے۔

ایفاء عہد میں خلل: وہ اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے وعدے پورے نہیں کر رہے تھے اس لئے رب تعالیٰ نے ان کو " اَوْفُوْا بِعَهْدِیْ " کا حکم دیا کہ تم میرے ساتھ کیے ہوئے وعدے پورے کرو۔ (از کبیر)

اعتراض: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ ﴾

''نیکی نہیں کہ تم اپنے چہروں کو پھیرو مشرق کی طرف اور مغرب کی طرف''

پھر حکم دیا ﴿ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ ﴾ نماز کے قائم کرنے کا'' نماز میں قبلہ کی طرف منہ کرنا شرط ہے اور نیکی کا کام ہے تو قبلہ کی طرف منہ کرنے کی نفی کرنا کیسے صحیح ہے؟

پہلا جواب: " ﴿ لَيْسَ الْبِرَّ ﴾ نفی لكمال البر وليس نفيا لأصله "

کہ یہاں یہ مطلب نہیں کہ قبلہ کی طرف منہ کرنا بالکل نیکی نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ کامل نیکی نہیں گویا کہ یہ کہا گیا ہے نیکی صرف یہ نہیں بلکہ نیکی تمام اچھی عادات کو حاصل کرنے کا نام ہے۔ "واستقبال القبلة واحد منها فلا يكون ذلك تمام البر " اور قبلہ کا استقبال بھی خصال حمیدہ (اچھی عادات یعنی عبادات) میں سے ایک ہے صرف استقبال قبلہ کامل نیکی نہیں۔

دوسرا جواب: جب یہود مسلمانوں کو قبلہ کی تبدیلی پر طعنے دے رہے تھے کہ تم نے بیت المقدس سے

کعبہ کی طرف منہ پھیر کر اپنی نیکیوں کو برباد کرلیا ہے جب تک بیت المقدس کی طرف منہ نہیں کرو گے تمہیں کوئی نیکی حاصل نہیں ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں یہ آیۂ کریمہ نازل فرمائی کہ جب قبلہ کی تبدیلی میرے حکم سے ہوئی میں نے خود بیت المقدس کے قبلہ ہونے کو منسوخ کر دیا ہے اور کعبہ کو قبلہ بنالیا ہے لہذا اب بیت المقدس کی طرف منہ کرنا کوئی نیکی نہیں:

"بل كان ذلك اثما وفجورا لانه عمل بمنسوخ قد نهى الله عنه وما يكون كذلك فانه لا يعد في البر"

بلکہ گناہ اور فسق وفجور ہے اس لئے کہ منسوخ پر عمل کرنا منع ہے جس کام سے رب تعالیٰ منع فرما دے اس پر عمل کرنا کوئی نیکی نہیں اس جواب کے مطابق مطلقا نیکی کی نفی کی گئی۔

تیسرا جواب: "ان استقبال القبلة لا يكون برا اذا لم يقارنه معرفة الله"

بیشک قبلہ کا استقبال اس وقت تک نیکی نہیں جب تک اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی معرفت نہ پائی جائے اللہ تعالیٰ کی معرفت اسوقت حاصل ہوگی جب ایمان حاصل ہوا اور عبادات پر عمل کیا جیسا کہ سجدہ اس وقت تک عبادت نہیں جب تک اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان نہ ہو۔

﴿ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّيْنَ ﴾

"اور لیکن نیکی وہ ہے جو (نیکی) ایمان لایا اللہ تعالیٰ پر اور آخرت پر اور فرشتوں پر اور نبیوں پر"

"البر" اسم جامع للطاعات، جو تمام طاعات کا جامع ہو اسے "البر" کہا جاتا ہے۔

اور اعمال خیر جو اللہ تعالیٰ کا مقرب بنائیں وہ "البر" ہیں اسی معنی کے لحاظ سے ماں، باپ کی فرمانبرداری کو "بر الو الدین" کہا جاتا ہے۔ اور اسی معنی کا لحاظ کیا گیا ہے ان الفاظ مبارکہ میں ﴿ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴾ "بیشک نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے (مراد جنت کی نعمتیں)۔ اسی طرح "البر" مطلقا ضد ہے "اثم" (گناہ) کی۔ اور ضد ہے "الفجور" (بڑے گناہ) کی۔ یہاں حذف مضاف ہے اصل عبارت یوں ہوگی ﴿ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ بِرٌّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ ﴾ اور لیکن نیکی نیکی

ہے اس شخص کی جس نے اللہ پر ایمان لایا۔

نیکی کا اعتبار چند امور پر: اللہ تعالیٰ نے نیکی کی ماہیت کے پائے جانے کو چند چیزوں پر موقوف کیا ہے ان میں سے پہلی چیز ہے ''ایمان لانا پانچ چیزوں پر یعنی اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن اور فرشتوں اور آسمانی کتابوں اور انبیاء کرام پر ایمان لانا۔

رب تعالیٰ پر ایمان میں وہم اور اس کا ازالہ: بظاہر تو یہ پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ممکن نہیں کیونکہ ایمان لانے کے لئے اس کی ذات کا علم ہونا ضروری ہے اور رب تعالیٰ کی ذات کا علم حاصل ہونا محال ہے؟ تو اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کا علم دلائل اور اصول سے ممکن ہے۔ اگر چہ اس کی ذات تک رسائی ممکن نہیں۔ جب دلائل سے واضح ہے کہ مخلوق کا علم اور عالم اور تمام جہان حادث ہیں یعنی ان کو کسی ذات نے موجود کیا ہے تمام کائنات اپنے وجود میں کسی ذات کی محتاج ہے وہ ذات اللہ تعالیٰ کی ہے ایمان لانے کے لئے اتنا علم کافی ہے۔

اسی طرح جب یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہے قدیم ہے ہمیشہ کے لئے بقاء اسے حاصل ہے تو اسی سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ تمام معلومات اس کے علم میں ہیں وہ تمام ممکنات پر قادر ہے وہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہے وہ ارادہ کا مالک، وہ سننے کی قوت کا مالک ہے، وہ دیکھنے کی قوت کا مالک ہے وہ کلام فرمانے پر قادر ہے یعنی حی، مرید، سمیع، بصیر اور متکلم ہے۔

ان تمام صفات کے علم سے پتہ چل گیا کہ تمام مخلوق حادث ہے رب تعالیٰ نے ہی تمام کو موجود کیا اور اللہ تعالیٰ کی صفات سلبیہ کے علم سے بھی کائنات کا محتاج ہونا اور مخلوق ہونا پتہ چل جاتا ہے کیونکہ یہ صفات مخلوق کے کسی فرد میں نہیں کہ وہ محل اور حیز (مکان) اور عرض ہونے سے پاک ہو یہ صرف اللہ تعالیٰ کو ہی صفات حاصل ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

رب تعالیٰ پر ایمان کیسے؟ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے کہ وہ اپنی ذات میں واحد ہے اور اپنی صفت میں یکتا ہے اور واجب الوجود ہے اور اس کا کرم اور جود ثابت ہے اور تمام صفات کمال اسے حاصل ہیں جن میں بعض صفات جمالیہ اور بعض صفات جلالیہ ہیں وہ ہر عیب سے پاک ہے وہ ہر صفت حدوث سے

پاک ہے وہی واجب الوجود ہے۔ (از مرقاۃ ج ۱ ص ۵۵)

یوم آخرت پر ایمان لانا: یعنی قیامت کے دن پر ایمان لانا کہ قیامت یقینی طور پر آنی ہے اور اس میں جسموں کو اٹھایا جانا ہے اور حساب ہونا ہے اس کے بعد جنت کے مستحقین کو جنت میں بھیجا جانا ہے اور جہنم والوں کو جہنم میں بھیج دیا جائے گا۔ قیامت کے دن کو " الیوم الآخر " کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ دنیا کا آخری دن ہوگا۔

فرشتوں پر ایمان لانا:

ہم اس پر ایمان رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے موجود ہیں جن میں سے چار مقربین کے نام بھی معلوم ہیں جبریل، میکائیل، اسرافیل اور عزرائیل۔ اور باقی فرشتوں پر اجمالی ایمان لانا ہوگا:

﴿ اِنَّهُمْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ وَلَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴾

کہ بیشک وہ اللہ تعالیٰ کے مکرم عبادت گزار ہیں رات اور دن کو تسبیحات پڑھتے ہیں تھکتے نہیں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے جو اس نے ان کو حکم دیا اور وہ وہی کرتے ہیں جو ان کو حکم دیا جاتا ہے۔

اور فرشتوں پر یہ ایمان بھی رکھے کہ ان میں کراماً کاتبین (لوگوں کے اعمال لکھنے والے) بھی ہیں۔ اور حاملین عرش مقربین بھی ہیں (رب تعالیٰ کے قریبی عرش کو اٹھانے والے جس کی کیفیت رب تعالیٰ ہی جانتا ہے)۔ اور ان کے پر بھی ہیں کسی کے دو، کسی کے تین اور کسی کے چار اور وہ مذکر ہونے اور مؤنث ہونے سے پاک ہیں۔

فرشتے جواہر علویہ نورانیہ ہیں جسمانی کدورت سے پاک ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء کرام کے درمیان واسطہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کے خاص اصفیاء کو فرشتوں کی تائید حاصل ہوتی ہے۔

الہامی کتابوں پر ایمان لانا: اللہ تعالیٰ نے جو کتابیں انبیاء کرام پر نازل فرمائیں ان کے حق ہونے پر ہمارا اعتقاد ہونا چاہئے کہ توراۃ موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی، زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ اور انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ اور قرآن پاک ہمارے نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل ہوا۔ اور ہمارا یہ ایمان ہو کہ:

" انها مسفوح بالقرآن وانه لا یجوز علیه نسخ ولا تحریف الی قیام الساعة لقوله تعالیٰ ﴿ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوۡنَ ﴾

تمام کتابیں قرآن پاک کے نازل ہونے پر منسوخ ہو گئیں اور قرآن پاک کا مکمل طور پر منسوخ ہونا ابتداء سے ہی منع تھا۔ البتہ نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد قرآن پاک کا کوئی حصہ بھی منسوخ نہیں ہوسکتا۔ اور قیامت تک قرآن پاک میں کوئی شخص تحریف (تبدیلی) نہیں کر سکے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کو اپنے ذمہ لگایا ہے۔

انبیاء کرام پر ایمان لانا: یہ ایمان رکھنا کہ اللہ تعالیٰ نے جو احکام انبیاء کرام پر نازل فرمائے وہ انہوں نے لوگوں تک پہنچا دیئے۔ اور یہ عقیدہ رکھنا کہ انبیاء کرام معصوم ہیں یعنی گناہوں سے پاک ہیں صغائر اور کبائر گناہوں سے انبیاء کرام پاک ہیں۔ جن انبیاء کرام کا ذکر قرآن شریف اور حدیث پاک میں آ چکا ہے ان پر تفصیلی طور پر ایمان لانا اور جن کا ذکر نہیں ہوا ان پر اجمالی طور پر ایمان لانا۔ اور انبیاء کرام کی تعداد معین نہ کرنا بلکہ یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ کے جتنے انبیاء کرام ہیں میرا ان پر ایمان ہے۔

(ماخوذ از مرقاۃ ج ۱ ص ۵۵ تا ص ۵۷)

اور یہ عقیدہ رکھے " وانهم اشرف الناس حسبا ونسبا وان لیس فیهم وصمة ولا عیب منفر " کہ انبیاء کرام حسب و نسب کے لحاظ سے لوگوں سے اشرف (زیادہ بزرگی رکھنے والے) ہوتے ہیں اور بیشک ان میں کوئی عیب اور عار نہیں پائی جاتی اور ان میں کوئی ایسا عیب نہیں پایا جاتا جس سے لوگ نفرت کریں (لیکن اہل علم حضرات عیب اور بیماری میں فرق ضرور ذہن میں رکھیں عیب اور چیز ہے مرض اور) (راقم)

ویعتقد ان سیدهم وخاتمهم محمد ﷺ وشریعته ناسخة لجمیع الشرائع والتمسک بها لازم لجمیع المکلفین الی یوم القیامة "

اور یہ عقیدہ رکھے کہ تمام انبیاء کے سردار اور تمام انبیاء کے بعد آ کر سلسلہ نبوت کو ختم کرنے والے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں اور آپ کی شریعت تمام شریعتوں کو منسوخ کرنے والی ہے قیامت تک تمام مکلفین کو اسی پر عمل کرنا لازم ہوگا۔ (روح المعانی)

وَ آتَی الۡمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ : ''اور دے مال محبت پر''

یعنی کامل نیکی کے کاموں میں سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنا ہے پھر اس میں زیادہ کمال اس وقت آئے جب مال محبت پر خرچ کرے کیونکہ مطلقا مال خرچ کرنا ثواب کا کام ہے اور جتنا خلوص اس میں زیادہ پایا جائے گا اتنا ہی زیادہ اس میں ثواب ہوگا۔

﴿ وَآتَى الْمَالَ ﴾ میں ''واو'' حال کے لئے ﴿ عَلٰى حُبِّهٖ ﴾ کی ضمیر مجرور کا مرجع کیا ہے؟
اس میں کئی احتمال ہیں ایک احتمال یہ ہے کہ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹے اب معنی یہ ہوگا اور دے مال اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ ضمیر لوٹے ﴿ وَآتَى ﴾ کے مصدر کی طرف۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ وہ دے مال جب کہ مال دینے میں اس کی محبت پائی جائے۔

اور تیسرا احتمال یہ ہے کہ ضمیر لوٹے مال کی طرف اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ وہ مال دے جب اسے مال سے محبت ہو۔ (راقم نے اپنے ترجمہ میں اسی لئے ضمیر کے مرجع کا معنی ذکر نہیں کیا تا کہ طلباء ہر احتمال کے مطابق ترجمہ کرسکیں)۔

☆ " عن ابی هريرة قال جاء رجل الى النبی ﷺ فقال يا رسول الله الى الصدقة اعظم اجرا قال ان تصدق وانت صحيح شحيح تخشی الفقر وتامل الغنی ولا تمهل حتی اذا بلغت الحلقوم قلت لفلان كذا ولفلان كذا وقد كان لفلان "
(اخرجه احمد والبخاری ومسلم وابو داؤد والنسائی وابن حبان بحواله درمنثور)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا۔ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ کون سا صدقہ میں زیادہ اجر ہے؟ آپ نے فرمایا تم صدقہ کرو جب کہ تم تندرست ہو اور مال پر حریص ہو اور تمہیں احتیاج کا ڈر ہو۔ اور تم غنی ہونے کی امید رکھتے ہو ہاں اتنی دیر نہ کرنا کہ روح تمہارے گلے تک پہنچ جائے (یعنی موت قریب آجائے) تو پھر کہو اتنا مال فلاں کو دے دینا اور اتنا مال فلاں کو دے دینا حالانکہ وہ مال فلاں کو تو خود بخود مل جاتا ہے۔ (یعنی وارثوں کو تمہارے کہنے کے بغیر ہی مال مل جاتا ہے) (از روح المعانی)

☆ " واخرج البيهقی فی شعب الايمان عن المطلب انه قيل يا رسول الله ما آتی المال على حبه فكلنا نحبه قال رسول الله ﷺ توتيه حين توتيه ونفسک حين تحدثک بطول العمر والفقر " (درمنثور)

مطلب کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا گیا یارسول اللہ ﴿ آتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ﴾ کا کیا مطلب ہے؟ ہم تمام ہی محبت سے مال دیتے ہیں آپ نے فرمایا تم مال اللہ کی راہ میں خرچ کرو اس وقت جب تمہارا نفس لمبی عمر اور فقیر ہو جانے کی تمہارے ساتھ باتیں کر رہا ہو۔

☆ " واخرج احمد وابو داؤد والترمذی وصححہ والنسائی والحاکم وصححہ والبیہقی عن ابی الدرداء قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول مثل الذی ینفق او یتصدق عند الموت مثل الذی یھدی اذا شبع "

حضرت ابو الدرداء فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص موت کے وقت خرچ کرتا ہے یا صدقہ کرتا ہے وہ ایسے ہی ہے جیسے خود کوئی سیر ہو کر کھالے پھر کسی کو ہدیہ دے دے۔ (درمنثور)

نتیجہ واضح ہوا: " ان الصدقۃ حال الصحۃ افضل منھا عند القرب من الموت "

بیشک صدقہ تندرستی کے وقت افضل ہے بنسبت موت کے وقت کے قریب صدقہ دینے سے۔

احادیث مبارکہ کو ذکر کر دیا گیا ہے اور عقلی دلائل سے بھی یہ مسئلہ واضح ہے:

(۱) تندرستی کے وقت انسان کو مال کی حاجت کا گمان حاصل ہوتا ہے اور موت کے وقت کے قریب استغناء کا گمان حاصل ہوتا ہے۔ عقل کا تقاضا ہے کہ محتاجی کے وقت نیکی کے کاموں میں مال خرچ کرنا بہت بہتر ہے بنسبت مستغنی ہونے کی صورت میں ''رب تعالیٰ نے فرمایا'':

﴿ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ﴾

''ہرگز نیکی کو تم نہیں پا سکتے یہاں تک کہ خرچ کرو جو تمہیں پسند ہے''

(۲) جو شخص تندرستی کے وقت مال خرچ کرتا ہے اس کو رب تعالیٰ کے وعد اور وعید پر یقین ہوتا ہے لیکن موت کے وقت مال کے خرچ کرنے میں یہ صورت نہیں پائی جاتی۔

(۳) صحت کے حال میں مال خرچ کرنے پر زیادہ ثواب حاصل ہوتا ہے کیونکہ اس وقت انسان کو مال کی شدید ضرورت ہوتی ہے اور ایسے حال میں مال خرچ کرنے سے بظاہر فقر بھی آتا ہے۔ اسی وجہ سے اس میں زیادہ ثواب حاصل ہوتا ہے کیونکہ موت کے وقت انسان مال کا محتاج نہیں ہوتا۔

اسی سے واضح ہو گیا کہ فقیر محتاج کا خرچ کرنا بہتر ہے غنی اور غیر محتاج کے خرچ کرنے سے۔

(۴) جب کسی انسان کو مال کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو اس وقت کسی کو ہبہ کرنا اس خیال سے کہ اگر میں نے یہ مال نہ دیا تو ضائع تو ہو ہی جانا ہے اس میں وہ کمال نہیں جو اس وقت کسی کو دے جب یہ خطرہ نہ ہو اس وقت مال خرچ کرنے میں خوشی اور رغبت ہوتی ہے لیکن موت کے وقت جب مال کے ضائع ہونے کی فکر ہو اس وقت صدقہ کرنا مجبوری نظر آتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

وآتی المال سے مراد صدقہ یا زکوٰۃ: ایک قول یہ ہے کہ ﴿ وَآتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ﴾ سے مراد اور ﴿وَآتَى الزَّكٰوةَ﴾ سے مراد زکوٰۃ ہی ہے۔ البتہ پہلے الفاظ مبارکہ سے مصارف کا ذکر کیا کہ زکوٰۃ کن لوگوں کو دی جائے اور دوسرے الفاظ مبارکہ سے مراد زکوٰۃ کا ادا کرنا اور اس پر برانگیختہ کرنا ہے لیکن مراد اول سے نفلی صدقات کا قول زیادہ بہتر ہے کیونکہ معطوف علیہ اور معطوف میں مغائرت ہوتی ہے۔ اسی طرح ﴿ وَآتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ﴾ حقوق واجبہ کو بھی شامل ہے۔

حدیث شریف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول " نسخت الزکوۃ کل صدقة " (زکوٰۃ نے تمام صدقات کو منسوخ کر دیا) کا مطلب بھی یہی ہے کہ زکوٰۃ فرض ہے اس کے بغیر صدقہ کوئی فرض نہیں بلکہ واجب یا نفل ہے۔ کسی عذر کی وجہ سے فرض ہو جانا اس سے مستثنیٰ رہے گا۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی:

﴿ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴾

''اور ان کے مالوں میں سائلین اور محرومین کا حق ہے''

بھی اسی پر دلالت کر رہا ہے کہ نفلی صدقات اور وجوبی صدقات ان مذکور لوگوں کے لئے ہیں اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد " فی المال حقوق سوی الزکوة " مال میں حقوق ہیں سوائے زکوٰۃ کے

اور ارشاد نبوی ہے " لا یؤمن باللہ و الیوم الآخر من بات شبعانا و جارہ طاو الی جنبه "

وہ شخص اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر کامل ایمان رکھنے والا نہیں جو رات سیر ہو کر گزارے اور اس کا پڑوسی (بھوک کی وجہ سے) کروٹیں بدلتا رہے۔

" روی ان الشعبی سئل عمن له فادی زکوته فهل علیه سواء قال نعم

یصل القرابة ویعطی السائل ثم تلا هذه الآیة "

حضرت شعبی سے پوچھا گیا کہ ایک شخص زکوٰۃ ادا کرتا ہے کیا اسے کوئی اور مال بھی خرچ کا حکم دیا جائے گا؟ انہوں نے فرمایا ہاں اقرباء سے صلہ رحمی کی وجہ سے ان پر مال خرچ کرنا۔ اور سائل کو مال دینا پھر اپنے قول پر بطور دلیل انہوں نے یہی آیۃ تلاوت کی۔ (از بیضاوی وشیخ زادہ بتغیر)

ذوی القربی : (قریبیوں کو) یعنی نیکی کے کاموں میں سے یہ ہے کہ مال عطاء کرے قریبی رشتہ داروں کو یہاں ذوی القربی سے مراد کون سے لوگ ہیں " الذین یقربون منه بولادة الابوین او بولادة الجدین " وہ لوگ مراد ہیں جو اس کے ماں باپ کی اولاد ہو یا اس کے دادا، دادی اور نانا، نانی کی اولاد ہو یہاں صرف ذی رحم مراد نہیں کیونکہ محرمیۃ (یعنی کسی سے نکاح کرنا حرام ہونا) حکم شرعی ہے۔ اور ''قرابۃ'' لغوی لفظ ہے جو نہی قرابت پر استعمال ہوتا ہے اس میں وہ تمام لوگ آئیں گے جن کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ہاں البتہ رشتہ جتنا زیادہ قریبی ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ حقدار ہوگا اور ان کو مال دینے میں اتنا ہی زیادہ ثواب ہوگا۔ (از کبیر)

رشتہ دار کو صدقہ دینا زیادہ ثواب ہے:

" اخرج الطبرانی والحاکم وصححه والبیهقی فی سننه عن ام کلثوم بنت عقبة بن ابی معیط سمعت رسول الله ﷺ یقول افضل الصدقة علی ذی الرحم الکاشح "

ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط کہتی ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا عداوت رکھنے والے ذی رحم (قریبی رشتہ) پر صدقہ کرنا افضل ہے۔ (درمنثور)

یہی روایت ہدایہ اخیرین ص ۶۵۸ میں حضرت ابوایوب انصاری سے بحوالہ مسند امام احمد مذکور ہے کفایہ میں حدیث پاک کی وضاحت میں کہا گیا ہے:

" وانما جعل هذه التصدق افضل لان التصدق علی المحب الصدیق یمیل الیه النفس لمحبته وصداقته وفی القریب الکاشح المنظور الیه هو معنی القرابة لا غیر مع مخالفة نفسه لان نفسه لا تدعوا الی التصدق "

عداوت رکھنے والے رشتہ دار کو صدقہ دینا افضل اس لئے قرار دیا ہے کہ محب اور صدیق کی طرف تو اس کی محبت اور صداقت کے پیش نظر انسان کا نفس خود ہی مائل ہوتا ہے کہ اس کو صدقہ دیا جائے لیکن عداوت رکھنے والے رشتہ دار کی طرف انسان کا نفس تو میلان نہیں کرتا اور صدقہ بھی نہیں دینا چاہتا لیکن وہ رشتہ داری کی وجہ سے جب صدقہ دے گا تو یہ اس کے لئے افضل ہوگا (کفایۃ)

☆ " واخرج ابن ابی شیبة واحمد والترمذی وحسنه والنسائی وابن ماجه والحاکم والبهیقی فی سننه عن سلمان بن عامر الضبی قال قال رسول الله ﷺ الصدقة علی المسکین صدقة وعلی ذی الرحم اثنتان صدقة وصلة "

سلمان بن عامر ضبی کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسکین کو صدقہ دینا ایک صدقہ ہے اور ذی رحم کو صدقہ دینے سے دو چیزیں حاصل ہوتی ہیں ایک صدقہ (کا ثواب) اور دوسری صلہ رحمی۔ (درمنثور، ومشکوۃ)

یعنی عام فقراء اور غرباء کو صدقہ دینے میں ایک ثواب اور رشتہ داروں کو صدقہ دینے میں دو ثواب حاصل ہوتے ہیں۔

☆ " واخرج احمد وابو داؤد وابن حبان والحاکم وصححه عن میمونة ام المؤمنین قالت اعتقت جاریة لی فقال النبی ﷺ اما انک لو اعطیتها بعض اخواتک کان اعظم لاجرک "

ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے اپنی لونڈی کو آزاد کر دیا نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہی غلامہ اگر تم اپنی بہنوں میں سے کسی کو دے دیتی تو تمہیں عظیم اجر حاصل ہوتا۔ (درمنثور)

☆ " واخرج ابن المنذر عن فاطمة بنت قیس انها قالت یا رسول الله ان لی مثقالا من ذهب قال اجعلیها فی قرابتک "

فاطمہ بنت قیس کہتی ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ بیشک میرے پاس ایک مثقال (ساڑھے چار ماشے) سونا ہے آپ نے فرمایا اپنے رشتہ داروں کو دے دو۔ (درمنثور)

☆ " واخرج احمد والبخاری ومسلم والنسائی وابن ماجه عن زینب امرأة عبد الله بن مسعود قالت سالت رسول الله ﷺ اتجزئی عنی من الصدقة النفقة علی زوجی وایتام فی حجری قال لک اجران اجر الصدقة واجر القرابة "

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زوجہ زینب کہتی ہیں میں نے سوال کیا رسول اللہ ﷺ سے کہ میں صدقہ کا مال اپنے خاوند اور اپنی زیر پرورش یتیموں کو دے سکتی ہوں؟ تو آپ نے فرمایا ہاں تمہیں دو ثواب حاصل ہوں گے ایک صدقہ کا اور دوسرا قرابت کا (یعنی صلہ رحمی کا)۔ (درمنثور)

نفلی اور وجوبی صدقہ کے مصرف میں فرق:

" ولا یجوز ان یدفع الزکوۃ الی ذمی لقوله علیه السلام لمعاذ رضی الله عنه خذها من اغنیاء هم وردها فی فقراء هم ویدفع الیه ما سوی ذلک من الصدقة لقوله علیه السلام تصدقوا علی اهل الادیان کلها ولو لا حدیث معاذ لقلنا بالجواز فی الزکوۃ " (از هدایه اولین ۱۸۵)

زکوٰۃ ذمی کو دینا جائز نہیں اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو (جب عامل بنایا تو) فرمایا کہ مسلمانوں کے اغنیاء سے زکوٰۃ کا مال وصول کرو اور مسلمانوں کے فقراء پر تقسیم کرو۔ زکوٰۃ اور صدقہ فطر اور نذر اور کفارات کے سواء تمام صدقات ذمی (مسلمانوں کے ملک میں حاکم کی اجازت سے شہریت رکھنے والا) کو دیئے جاسکتے ہیں۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "تمام دینوں والوں کو صدقہ دو" اگر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ والی حدیث اس کے معارض نہ ہوتی تو اس حدیث کی وجہ سے ہم ذمی کو زکوٰۃ دینے کا حکم بھی ثابت کر سکتے تھے لیکن حدیث معاذ کے معارض ہونے کی وجہ سے صدقات واجبہ کا حکم علیحدہ ہوگیا۔ یہاں سے بہت ہی واضح ہوگیا کہ صدقات واجبہ اور صدقات نفلیہ کا حکم علیحدہ علیحدہ ہوگیا۔ صدقات واجبہ غنی کو دینا نفع ہے۔ لیکن صدقات نفلیہ جائز ہیں۔

" قد یقصد بالصدقة علی الغنی الثواب وقد حصل "

(هدایة اخیرین ص ۲۹۳ فصل فی الصدقة)

کبھی غنی کو صدقہ ادا کرنے میں ثواب کا ارادہ کیا جاتا ہے وہ حاصل بھی ہو جاتا ہے۔

" فان من له نصاب وله عیال کثیرة فالناس یتصدقون علیه علی قصد الثواب " (حاشیه هدایة)

بے شک وہ شخص جو صاحب نصاب (غنی) ہوتا ہے لیکن اس کے اہل و عیال کثیر ہوتے ہیں اس

لئے لوگ اس پر ثواب کی غرض سے صدقہ کرتے ہیں۔ اسی سے ایک اور مسئلہ بھی حل ہو گیا کہ ایصال ثواب وغیرہ کی محافل میں غرباء اور فقراء کے لئے کھانا پکایا جائے اور اغنیا بھی شریک ہوں تو کوئی حرج نہیں کیونکہ نفلی صدقہ ان کو دینا جائز ہے۔ (راقم)

" ولا تدفع الی بنی هاشم "بنی ہاشم کو زکوۃ نہیں دی جاسکتی۔ (ھدایہ اولین ص ۱۸٦)

" عن عبد المطلب بن ربیعة قال قال رسول الله ﷺ ان هذه الصدقات انما هی اوساخ الناس وانها لا تحل لمحمد ولا لآل محمد رواه مسلم " (مشکوة باب من لا تحل له الصدقة)

حضرت عبد المطلب بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک یہ صدقات لوگوں (کے مالوں) کی میل کچیل ہیں فرمایا بیشک یہ محمد (ﷺ) اور آل محمد کے لئے حلال نہیں۔

اسی حدیث کی شرح میں علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" قال ابن الملک الصدقة لا تحل للنبی ﷺ فرضا کانت او نفلا وکذا المفروضة لا له الی اقربائه واما التطوع فمباح لهم "

(مرقاة ج ۴ ص ۱۱۱)

ابن ملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کے لئے فرضی اور نفلی صدقہ تو حلال نہیں تھا لیکن آپ کی آل کے لئے اور آپ کے اقرباء کے لئے فرضی صدقہ تو حلال نہیں لیکن نفلی صدقہ حلال ہے۔

" واما الصدقة النافلة فقال فی النهایة ویجوز النفل بالاجماع وکذا یجوز النفل للغنی " (مرقاة ج ۴ ص ۱۱۱)

نفلی صدقہ کا حکم بیان کرتے ہوئے صاحب نہایہ نے بیان فرمایا کہ بنو ہاشم کے لئے نفلی صدقہ بالاجماع جائز ہے اور اسی طرح غنی کے لئے بھی نفلی صدقہ جائز ہے۔

" لان المال ههنا کالماء یتدنس باسقاط الفرض اما التطوع بمنزلة التبرد بالماء " (هدایه اولین ص ۱۸٦)

اس لئے کہ مال پانی کی طرح ہے فرض کے ساقط کرنے سے میلا ہو جاتا ہے اور نفل کا ادا کرنا پانی سے ٹھنڈک حاصل کرنے کی طرح ہے۔

البتہ یہ خیال رہے کہ غنی کو نفلی صدقہ ،صدقہ کی نیت سے دینا مطلق جائز ہے۔اس میں کسی قسم کا خلاف ادب لازم نہیں آتا لیکن بنو ہاشم کے ادب کا تقاضا کچھ اور ہے۔علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" فلا تدفع الیهم النافلة الا علی وجه الهبة مع الادب " (مرقاۃ ج ۲ ص ۱۱۱)

کہ بنو ہاشم کو نفلی صدقہ بھی ''ہبہ'' کی نیت سے دیا جائے اس میں صدقہ کی نیت نہ کی جائے تا کہ ان کے ادب واحترام کا لحاظ پایا جائے۔

" ولا الی امرأته للاشتراک فی النفع عادة ولا تدفع المرأة الی زوجها عند ابی حنفیة لما ذکرنا وقالا تدفع الیه لقوله علیه السلام لک اجر ان اجر الصدقة واجر الصلة قاله لأمرأة ابن مسعود وقد سالته عن التصدق علیه قلنا هو محمول علی النافلة " (هدایه اولین ۱۲۶)

خاوند اپنی زوجہ کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا کیونکہ زوجین کے منافع مشترک ہیں زوجہ اپنے خاوند کو بھی زکوٰۃ نہیں دے سکتی وجہ اس کی بھی یہی ہے کہ منافع دونوں کے مشترک ہیں یہ امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک ہے۔البتہ صاحبین (حضرت امام ابو یوسف اور حضرت امام محمد) کے نزدیک زوجہ اپنے خاوند کو زکوٰۃ دے سکتی ہے۔کیونکہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زوجہ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ میں اپنے خاوند کو صدقہ دے سکتی ہوں؟ تو آپ نے فرمایا ہاں تمہیں دو اجر حاصل ہوں گے ایک صدقہ کا اور دوسرا صلہ رحمی کا۔

امام اعظم رحمہ اللہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اس صدقہ سے مراد نفلی صدقہ ہے اس بحث سے یہ واضح ہو گیا کہ نفلی صدقہ عورت اپنے خاوند کو بالاتفاق دے سکتی البتہ وجوبی صدقہ امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک نہیں دے سکتی۔اسی قول پر فتویٰ ہے۔ابھی تک جو بحث ذکر کی ہے اس سے مسئلہ بہت واضح ہو گیا کہ وجوبی صدقہ اور نفلی صدقہ علیحدہ علیحدہ احکام رکھتے ہیں۔

وَالْیَتٰمٰی : (اور یتیموں کو) یعنی نیکی کے کاموں میں یہ ہے کہ وہ محبت پر مال یتیموں کو دے۔

یتیم نابالغ بچے اور بچی کو کہا جاتا ہے جس کا باپ فوت ہو چکا ہے بالغ ہونے کے بعد اس پر یتیم

کا حکم باقی نہیں رہتا۔ زکوٰۃ کا مال تو یتیم کو اس وقت دیا جائے گا جب وہ غریب بھی ہو۔ اگر محتاج نہیں تو اس کو زکوٰۃ اور دوسرے صدقات واجبہ کا مال نہیں دیا جائے گا۔ لیکن نفلی صدقہ یتیم کو شفقت کے لئے دیا جائے گا جیسا کہ مندرجہ بالا بحث میں بیان کیا جاچکا ہے۔

وَالْمَسَاكِيْنَ : ''اور مساکین کو'' یعنی نیکی کے کاموں میں محبت پر مال مسکینوں کو دینا۔ ﴿مَسَاكِيْنَ﴾ جمع ہے " مسكين " کی جس کا معنی ہے الدائم السكون "(ہمیشہ سکونت اختیار کرنے والا) چونکہ مسکین کو بھی حاجت ایک جگہ ٹھہرا لیتی ہے اس میں حرکت نہیں پائی جاتی۔ اس لئے اسے مسکین کہا جاتا ہے۔ اور یا معنی ہے " دائم السكون " ہمیشہ سکون میں رہنا کہ وہ غریب و مسکین ہونے کے باوجود یعنی کسی مال کا مالک نہ ہونے کے باوجود وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا سوال نہیں کرتا۔ بڑے اطمینان سے پرسکون زندگی بسر کرتا ہے جس حال پر رب تعالیٰ نے اسے رکھا ہوا ہے وہ اسی پر صابر و شاکر رہتا ہے۔

وَابْنَ السَّبِيْلِ : ''اور مسافر کو'' یعنی نیکی کے کاموں میں اور یہ ہے کہ محبت پر مال مسافر کو دے مسافر کو ﴿وَابْنَ السَّبِيْلِ﴾ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ راستہ کو لازم پکڑتا ہے اسی طرح " قاطع الطريق " (ڈاکو) کو بھی " ابن الطريق " کہہ لیا جاتا ہے۔

یا اس لئے مسافر کو ﴿ ابن السبيل ﴾ کہا جاتا ہے کہ راستہ اسے ظاہر کرتا ہے گویا کہ اس کی ماں نے اسے جنا ہے اور وہ مقام ظہور میں آ گیا۔ مسافر جب دوران سفر محتاج ہو جائے اور بے خرچ ہو جائے تو اسے صدقات واجبہ اور صدقات نفلیہ اور زکوٰۃ کا مال دینا جائز ہے اگر چہ گھر اس کا مال بھی ہو ﴿ وَابْنَ السَّبِيْلِ ﴾ کو مفرد ذکر کرنے میں عجیب حکمت پائی جاتی ہے:

" وكان افراده الى انفراده عن احبابه ووطنه واصحابه فهو ابدا يتوق الى الجمع "

گویا کہ مفرد ذکر کر کے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مسافر اپنے احباب اور اپنے وطن اور اپنے ساتھیوں سے علیحدہ ہونے کی وجہ سے اکیلا ہوتا ہے یعنی وہ مفرد ہوتا ہے اور جمع کا مشتاق ہوتا ہے۔ یعنی اس کے دل میں تمنا پائی جاتی ہے کہ میں اپنے احباب سے مل کر جمع بن جاؤں۔

وَالسَّائِلِيْنَ : ''اور سوال کرنے والوں کو'' محبت پر مال دے سوال کرنے والوں کو۔ یعنی جو لوگ حاجت مند ہیں اور اسی احتیاجی کی وجہ سے وہ سوال کر رہے ہیں تو ان کو مال دیا جائے بیشک وہ غنی بھی کیوں نہ ہوں۔ (ہاں البتہ پیشہ ور بھکاریوں کو مال نہ دے کر ان کی حوصلہ شکنی ضروری ہے):

'' عن الحسين بن علي رضي الله عنهما قال قال رسول الله ﷺ للسائل حق وان جاء على فرس ''

سائل کا (تمہارے مالوں میں) حق ہے اگر چہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے۔

گویا کہ مسکین اور سائل میں یہ فرق ہے کہ مسکین سوال نہیں کرتا اگر چہ حاجت مند ہوتا ہے ان کا حال ان کی حاجت مندی کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے۔ اور سوال کرنے والا بعض اوقات غنی بھی ہوتا ہے لیکن اسے مال دینا جائز ہے ہاں اگر دینے والے کے پاس مال نہیں یا سائل کو زیادہ مستحق نہ سمجھ کر مال نہ دے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

(ماخوذ از بیضاوی وروح المعانی بتغیر)

☆ '' عن ام بجيد انها قالت يا رسول الله ان المسكين ليقوم على بابي فماجد شيا اعطيه اياه فقال لها ان لم تجدى الا ظلفا محرقافا دفعيه اليه اخرجه ابن سعد والترمذى ''

ام بجید کہتی ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے دروازے پر مسکین آتے ہیں لیکن میرے پاس کوئی چیز نہیں ہوتی کہ میں اسے دوں تو آپ نے فرمایا اور تمہیں کچھ نہ ملے سوائے جانور کے پاؤں کی ہڈی کے جلے ہوئے حصہ کے تو وہی دے دو۔ (درمنشور)

مطلب یہ ہے کہ جتنی معمولی چیز بھی ہو سکے وہی دے دے۔

☆ '' واخرج ابو نعيم والثعلبى والديلمى والخطيب فى رواة مالك بسند رواه عن ابن عمر مرفوعا هدية الله للمؤمن السائل على بابه ''

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوع حدیث مروی ہے (اگر چہ سند ضعیف ہے) اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومن کے لئے ہدیہ (تحفہ) ہے کہ سائل اس کے دروازے پر آئے۔ (درمنشور)

☆ '' واخرج ابن شاهين وابن النجار فى تاريخه عن ابى بن كعب قال قال رسول الله ﷺ الا ادلكم على هدايا الله عزوجل الى خلقه قلنا بلى قال الفقير هو هدية الله قبل ذلك او ترك ''

ابی بن کعب کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں اللہ تعالیٰ کے ہدایا (تحفوں) کی خبر نہ دوں؟ صحابہ کرام نے عرض کیا ہاں یارسول اللہ آپ بتائیں تو آپ نے فرمایا فقیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدیہ ہے انسان اسے قبول کرتا ہے یا چھوڑتا ہے۔ (درمنثور)

یقینی بات ہے کہ رب تعالیٰ کے ہدیہ کو چھوڑنا درست نہیں البتہ کوئی عذر ہو تو کوئی حرج بھی نہیں۔

وَفِی الرِّقَابِ : "اور گردنوں کے چھڑانے میں) یعنی نیکی کے کاموں میں سے "محبت پر مال خرچ کرنا گردنوں کے چھڑانے میں" بھی ہے۔ گردنوں کے چھڑانے کے تین مطلب ہیں۔

ایک یہ کہ مکاتب غلام کو مال دے تاکہ وہ مولی کو مال دے کر اپنے آپ کو آزاد کرالے۔

دوسرا مطلب یہ کہ غلام خرید کر آزاد کردے۔

اور تیسرا مطلب یہ ہے کہ مال خرچ کرکے کافروں کے ہاتھوں سے قیدی چھڑالے۔ (از بیضاوی)

پیشہ ور مجرمین کو مال دے کر چھڑانا اس وقت تک ثواب نہیں جب تک وہ توبہ نہ کرلیں کیونکہ مجرمین کی معاونت درحقیقت جرموں کو بڑھانا ہے۔ (راقم)

وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَآتَى الزَّكٰوةَ : "اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے"

یعنی نیکی کے کاموں میں سے فرض نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا بھی ہے:

"اخرج ابن حاتم عن سعید بن جبیر فی قوله واقام الصلوة یعنی واتم الصلوة المکتوبة وآتی الزکوة یعنی الزکوة المفروضة"

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ فرض نماز کو مکمل کرنا ہے۔

اور ﴿ وَآتَى الزَّكٰوةَ ﴾ کا مطلب ہے فرض زکوٰۃ ادا کرنا۔ (درمنثور)

وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عَاهَدُوْا :

"اور پورا کرنے والے ہیں اپنے وعدوں کو جب وہ وعدہ کرتے ہیں"

کون سا وعدہ مراد ہے؟ وعدہ سے مراد مختلف وعدے ہیں جو تمام ہی مراد ہیں۔

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے وعدہ:

" اخرج ابن جریر وابن ابی حاتم عن ابی العالیة فی قوله ﴿ والموفون بعهدهم اذا عاهدوا ﴾ قال فمن اعطی عهد الله ثم نقضه فالله ینتقم منه ومن اعطی ذمة النبی ﷺ ثم غدر بها فالنبی ﷺ خصمه یوم القیامة "

ابوالعالیہ کہتے ہیں رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ ﴾ سے مراد اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے وعدہ کرنا ہے جس نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کر کے اسے توڑ دیا اللہ تعالیٰ اس سے انتقام لے گا اور جس نے اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کے ذمہ کر کے (ذمی ہونے کو قبول کر کے) بے وفائی کی قیامت کے دن اسے رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ (درمنثور)

لوگوں سے وعدہ کرنا:

" واخرج ابن ابی حاتم عن سعید بن جبیر فی قوله ﴿وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ ﴾ اذا عاهدوا یعنی فیما بینهم وبین الناس "

سعید بن جبیر فرماتے ہیں اس آیۃ میں وعدہ کرنے سے مراد لوگوں کا آپس میں وعدہ کرنا مراد ہے کہ مومن کئے ہوئے وعدہ کو پورا کرتے ہیں۔ (درمنثور)

ایفاء عہد میں وسعت: کہ وہ اللہ تعالیٰ سے وعدہ کرتے ہیں (یعنی جو وعدہ اللہ تعالیٰ نے ان سے لیا) کہ وہ حدود قائم کریں گے اور طاعت کا عمل کریں گے۔ اور اسی طرح وعدہ سے مراد ابتدائی طور پر بندوں کی جانب سے رب تعالیٰ سے وعدہ کرنا ہے کہ وہ نذر مان کر اسے پورا کرتے ہیں۔ بندوں سے وعدہ کرنے سے مراد وعدوں کی وفا اور امانتوں کو ادا کرنا ہے۔

" یعنی اذا وعدوا انجزوا واذا نذروا اوفوا واذا حلفوا بروا فی ایمانهم واذا قالوا صدقوا فی اقوالهم واذا ائتمنوا ادوا "

یعنی جب وہ وعدہ کرتے ہیں پورا کرتے ہیں اور جب نذر مانتے ہیں تو اسے پورا کرتے ہیں اور جب قسم اٹھاتے ہیں اس پر قائم رہتے ہیں اور جب بات کرتے ہیں تو سچی بات کرتے ہیں اور ان کے پاس جب امانت رکھی جائے تو وہ (بغیر خیانت کے) ادا کر دیتے ہیں۔ (از خازن)

وَالصَّابِرِیْنَ فِی الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِیْنَ الْبَأْسِ:

''اورصبر کرنے والے ہیں مصیبت اور سختی میں اور جہاد کے وقت میں'' ﴿فِی الْبَأْسَاءِ﴾ ای فی الشدة والفقر والفاقة '' ﴿بأسا﴾ سے مراد شدت اور فقر(غربت) اور فاقہ۔ ﴿وَالضَّرَّاءِ﴾ یعنی المرض والزمانة ''ضراء سے مراد مریض ہو جانا اور چلنے پھرنے سے عاجز ہونا ہے۔ ﴿وَحِیْنَ الْبَأْسِ﴾ سے مراد اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے کی وجہ سے شدت کا حاصل ہونا ہے۔

☆ " عن البراء قال كنا والله اذا احمر البأس نتقی به وان الشجاع منا الذی يحاذی به يعنی النبی ﷺ " (بخاری ومسلم)

حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں قسم ہے اللہ تعالیٰ کی جب شدید لڑائی جاری ہوتی تو ہم اپنا بچاؤ کرتے لیکن ہم میں سب سے زیادہ بہادر یعنی نبی کریم ﷺ میدان جنگ میں دشمن کے مقابل آگے بڑھتے چلے جاتے۔ (از خازن)

طلباء کرام کی توجہ کے لئے: ﴿وَالصَّابِرِیْنَ﴾ کی نصبی حالت ہے مدح کی وجہ سے۔

تقدیر عبارت اخص یا امدح ہے ماقبل سے انداز بیان کو تبدیل کیا ہے کہ صبر کی فضیلت واضح ہو جائے اور باقی تمام اعمال پر فوقیت حاصل ہو جائے گویا کہ یہ جنس ہی علیحدہ ہے۔ اگر عطف ﴿وَالْمُوْفُوْنَ﴾ پر ہوتا تو" والصابرون "پڑھا جاتا۔ (از روح المعانی)

نصب کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ عطف تو" من آمن " پر ہے اس لحاظ پر رفع آنا چاہئے تھا لیکن " ونصبها على تطاول الكلام " نصب کلام لمبا ہونے کی وجہ سے ہے اس لئے کہ جب بات لمبی ہو رہی ہو تو عرب حضرات حرکات ماقبل سے تبدیل کر لیتے ہیں تا کہ توجہ کی جائے بے توجہی سے بات کو نہ سنا جائے۔ سورۃ مائدہ میں ﴿والصابؤن﴾ کی رفعی حالت بھی ماقبل سے مختلف ہونے کی یہی وجہ ہے اور سورۃ نساء میں ﴿وَالْمُقِیْمِیْنَ الصَّلٰوةَ﴾ میں نصب کی بھی یہی وجہ ہے۔ (مظہری)

اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا: ''یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے سچ کہا'' ﴿اُولٰئِکَ﴾ کا اشارہ ہے ما قبل تمام مذکورہ چیزوں کی طرف یعنی جن لوگوں میں یہ تمام اوصاف پائے گئے وہ ایمان اور نیکی میں سچے ہیں۔

وَاُولٰئِکَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ: ''اور یہی لوگ تقویٰ والے ہیں''

یعنی کفر اور گناہوں والے رذیل کاموں سے بچنے والے ہیں۔

یہ آیۃ کریمہ اصل الاحکام ہے: اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا یعنی اس کی ذات اور صفات اور اسماء پر ایمان لانا۔ آخرت کے دن پر ایمان لانا، اس میں ''نشر اور حشر، میزان اور صراط (پل صراط) اور حوض (کوثر) اور شفاعت اور جنت اور دوزخ'' تمام چیزوں پر ایمان لانا آ گیا۔ ملائکہ پر ایمان لانا اور آسمانی کتابوں پر ایمان لانا کہ یہ حق ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں۔ انبیاء کرام پر ایمان لانا، اور مال خرچ کرنا بطور وجوب یا بطور استحباب۔ اور قریبی رشتہ داروں کو مال دینا، اسی سے صلہ رحمی کی فضیلت اور قطع رحمی سے دور رہنے کا پتہ چل گیا۔ اور یتیموں پر مہربانی کرنا اور ان کی کفالت کرنا، اور مساکین کی معاونت کرنا، اور مسافروں کی امداد کرنا۔

﴿ وَابْنَ السَّبِيلِ ﴾ میں ہی مہمان بھی داخل ہیں، یعنی مہمانوں کی مہمان نوازی کرنا، اور سوال کرنے والے کو مال دینا، اور مکاتب کو آزاد کرانا، اور غلام خرید کر آزاد کرنا، اور کافروں کے ہاتھوں قیدیوں کو چھڑانا، اور نماز اور زکوٰۃ کے ادا کرنے کی پابندی کرنا، اور وعدہ پورا کرنا، ور مصیبتوں میں صبر کرنا، اور غربت وفقر میں صبر کرنا، اور فاقہ میں صبر کرنا، اور مرض میں صبر کرنا، اور اعضاء کے کمزور ہو جانے اور چلنے پھرنے سے عاجز آنے میں صبر کرنا، اور جہاد میں صبر کرنا۔ ان تمام چیزوں کا تذکرہ جب اس آیۃ کریمہ میں موجود ہے تو یقیناً یہ آیۃ عظیمہ کثیر احکام پر مشتمل ہے۔ (قرطبی)

اور اس آیۃ کے آخر میں: نیک بندوں کا وصف سچائی اور تقویٰ اور وعدہ کی وفاء کا ذکر فرمایا جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ امور دین میں عمدہ ہیں اس طرح یہ اوصاف رکھنے والوں کی کامل تعریف پائی گئی ہے صدق بمقابلہ کذب استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے " صدقوهم القتال " انہوں نے جنگ کو سچ کر دکھایا۔ "الصدیق" جو سچائی کو لازم پکڑے حدیث شریف میں ہے۔

☆ " عليكم بالصدق فان الصدق يهدى الى البر و ان البر يهدى الى الجنة و ما يزال الرجل يصدق ويتحرى الصدق حتى يكتب عند الله صديقا "

تم پر لازم ہے کہ سچ بولو بیشک سچائی انسان کو نیکی کی ہدایت دیتی ہے اور بیشک نیکی جنت کی ہدایت دیتی ہے جب انسان ہمیشہ سچ بولتا رہے اور سچ بولنے میں تحری (کوشش) کرتا رہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صدیق لکھ دیا جاتا ہے۔ (از قرطبی)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى
اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ
مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ
ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ
فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ

۱) ''اے ایمان والوتم پرفرض ہے کہ جوناحق مارے جائیں ان کے خون کا بدلہ لو آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت تو جس کے لئے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معافی ہوئی تو بھلائی سے تقاضا ہو اور اچھی طرح ادا۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارا بوجھ ہلکا کرنا ہے اور تم پر رحمت تو اس کے بعد جو زیادتی کرے اس کے لئے دردناک عذاب ہے''۔

۲) ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو ثابت کردیا گیا ہے تم پر قصاص (بدلہ لینا خون کا) ان کا جو ناحق قتل کردیئے گئے، آزاد بدلے آزاد کے، اور غلام بدلے غلام کے، اور عورت بدلے عورت، کے تو وہ شخص معاف کردیا گیا جسے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ، تو پیچھا کیا جائے بھلائی سے، اور ادا کرے اسے اچھے طریقہ سے، یہ تخفیف ہے تمہارے رب کی طرف سے اور رحمت، تو جو شخص تجاوز کرے اس کے بعد تو اس کے لئے عذاب ہے دردناک''۔

شان نزول:

(۱) بغوی، شعبی، کلبی اور قتادہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ عرب میں دو قبیلے تھے جو زمانہ جاہلیت میں ایک دوسرے سے معمولی معمولی بات پر لڑائی شروع کرتے جو ایک دوسرے کو قتل کرنے اور زخمی کرنے پر ختم ہوتی۔ ایک قبیلہ کو دوسرے پر طاقت اور دنیاوی شرافت حاصل ہوتی تھی وہ دوسرے قبیلہ کی عورتوں سے

بغیر مہر کے نکاح کر لیتے تھے وہ قسم اٹھاتے تھے کہ ہم ضرور بضرور اپنے غلام کے بدلے تمہارے آزاد آدمی کو قتل کریں گے اور ہم اپنی عورتوں کے بدلے تمہارے مردوں کو قتل کریں گے تم نے ہمارا ایک آدمی قتل کیا تو ہم تمہارے دو آدمی قتل کریں گے۔

تم جتنے زخم ہمیں پہنچاؤ گے ہم ان سے دوگنا تمہیں زخم پہنچائیں گے یہ زمانہ جاہلیت میں ان کا طریقہ تھا لیکن اب دونوں قبیلے مسلمان ہو چکے تھے یہ دو قبیلے اوس اور خزرج تھے یہی قول سعید ابن جبیر کا ہے اور یہی صحیح ہے کیونکہ رب تعالیٰ نے ﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ﴾ سے خطاب فرمایا اگرچہ مقاتل بن حبان کا قول یہ ہے کہ یہ دو قبیلے بنی نضیر اور قریظہ تھے لیکن یہ قول درست نہیں کیونکہ انہوں نے ایمان قبول نہیں کیا اوس اور خزرج کی زمانہ جاہلیت میں جنگ کے دوران جو لوگ قتل ہو گئے تھے یا زخمی ہو گئے تھے ابھی تک انہوں نے ایک دوسرے سے بدلہ نہیں لیا تھا اب وہ مسلمان ہو چکے تھے لہٰذا دونوں یعنی اوس اور خزرج نے اپنا معاملہ اور اپنی قسموں کو نبی کریم ﷺ کے سامنے پیش کیا تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی جس میں مساوات کا حکم دیا گیا۔ دونوں قبیلوں نے اسے تسلیم کیا اور فیصلہ پر راضی ہو گئے اسلام کی برکت سے ان کی لڑائیاں بھی ختم ہو گئیں۔ (مظھری)

(۲) شان نزول کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہود پر قتل میں صرف قصاص فرض تھا اور نصاری پر مطلقاً معاف کرنا فرض تھا " **وخير هذه الامة بينهما وبين الدية تيسيرا عليهم وتقديرا للحكم على حسب مراتبهم** " اس امت کو اختیار دے دیا گیا کہ مقتول کے ورثا چاہیں تو قصاص لیں چاہیں تو معاف کر دیں اور چاہیں تو دیۃ (فدیہ) لے لیں۔

یہ حکم اس امت کی آسانی کے لئے دیا گیا رب تعالیٰ کے احکام ان کے مراتب کے مطابق دیئے گئے۔ چونکہ نبی کریم ﷺ کی امت تمام امتوں سے افضل ہے اس لئے ان کو ان کی شان کے مطابق ہی احکام دیئے گئے اور اسی طرح ان کے درجات بھی بلند کئے گئے۔ (ماخوذ از بیضاوی وشیخ زادہ)

(۳) علامہ رازی رحمہ اللہ نے یہ دو وجہ بھی ذکر کی ہیں اور تیسری وجہ بھی ذکر کی ہے کہ یہ آیۃ کریمہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد نازل ہوئی۔ تاہم پہلے دو قول زیادہ قوی ہیں اور دونوں مجتمع ہیں۔ بلکہ علامہ بیضاوی نے پہلی وجہ شان نزول کی بیان کی اور دوسری وجہ ﴿ ذٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِنْ

رَبِّكُمْ ﴾ کی تفسیر میں ذکر کی ہے۔

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی :

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو ثابت کر دیا گیا ہے تم پر قصاص (بدلہ لینا خون کا) ان کا جو ناحق قتل کر دیئے گئے''

اَلْقِصَاصُ : ''تتبع الدم بالقود'' خون کا بدلہ خون سے یعنی کسی کو ناحق قتل کرنے سے جب مقتول (جسے قتل کیا گیا) کے ورثاء مطالبہ کریں کہ ہمارے مقتول کے بدلے قاتل کو قتل کیا جائے تو اسے قصاص کہا جاتا ہے۔ (مفردات راغب)

فِی الْقَتْلٰی : فعلی کا وزن جمع ہے فعیل کی جب اس کا معنی مفعول کا ہو اس لئے قتلی جمع ہے قتیل بمعنی مقتول کی اور ''فی'' اس مقام میں سببیت کے لئے استعمال ہے اب معنی یہ ہوگا ''بسبب قتل القتلی'' قصاص ثابت کیا گیا ہے بوجہ مقتولوں کے قتل کے۔

حدیث شریف میں بھی ''فی'' سبب کے معنی میں استعمال ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا'' ان امرأة دخلت النار فی هرة'' بیشک ایک عورت بلی کی وجہ سے جہنم میں داخل ہوگئی۔

وجہ اس کی یہ تھی کہ اس نے بلی کو باندھ دیا تھا کوئی چیز کھانے اور پینے کی نہ دی اور نہ ہی کھولا کہ وہ کوئی چیز کھا پی لے تو وہ بلی بھوک اور پیاس کی وجہ سے تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ تو اس عظیم ظلم کی وجہ سے وہ عورت جہنم میں داخل ہونے کی مستحق ہوگئی۔

﴿ القتل ﴾ اصل القتل ازالة الروح عن الجسد کالموت ''

قتل اور موت کا حقیقت میں ایک ہی معنی ہے یعنی روح کا جسم سے زائل کرنا لیکن استعمال کے لحاظ پر فرق ہے جب روح کے زوال کی نسبت کسی انسان کی طرف ظاہر کو دیکھ کر کی جائے تو اسے قتل کہا جائے اگر اس میں ظاہری طور پر کسی انسان کا دخل نہیں تو وہ موت ہے۔ (از مفردات راغب بتغیر)

اعتراض : ''کتب'' اصل معنی کتابۃ کا لکھنا ہے کبھی لکھنے کو فرضیت لازم ہو جاتی ہے اسی ضابطہ کی وجہ سے (یعنی تسمیۃ الملزوم باسم اللازم کے ضابطہ کی وجہ سے) ''کتب'' کا معنی کیا جاتا ہے ''فرض کیا گیا'' جب ناحق قتل میں مقتول کے ورثاء کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ قصاص لیں یا معاف کر دیں یا فدیہ لے لیں تو ''کتب'' (فرض کیا گیا) کا کیا مطلب ہے۔

پہلا جواب: "کتب معناه فرض واثبت "یعنی "کتب" کا معنی فرض کیا گیا بھی ہے اور ثابت کیا گیا بھی آتا ہے اس لئے معنی اگر "ثابت کیا گیا" کرلیا جائے تو کوئی اعتراض وارد نہیں ہوگا۔

دوسرا جواب: "ان ﴿کُتِبَ﴾ هنا اخبار عما کتب فی اللوح المحفوظ وسبق به القضاء"

بیشک یہاں "کتب" سے یہ خبر دی گئی ہے کہ قصاص کا حکم لوح محفوظ پر لکھ دیا گیا ہے اور قتل میں تقدیر سبقت لے گئی یعنی اگر "کتب" کا معنی کیا جائے "لکھ دیا گیا ہے" تو پھر بھی اعتراض نہیں ہوگا۔

(از قرطبی بتغیر)

تیسرا جواب: "﴿کُتِبَ عَلَیۡکُمُ﴾ ای فرض والزم عند المطالبة صاحب الحق فلایضر فیه قدرة الولی علی العفو فان الوجوب انما اعتبر بالنسبة الی الحکام او القاتلین"

(کتب) کا معنی تو یہی ہے کہ فرض کیا گیا ہے یا تو خطاب حکام کو ہے کہ جب صاحب حق مطالبہ کرے کہ میں نے تو قصاص ہی لینا ہے تو اس وقت احکام تم پر فرض ہو جائے گا کہ تم قصاص دلاؤ۔ ولی اگر معاف کرنے کی طاقت رکھتا ہے اسے اختیار بھی ہے لیکن وہ معاف نہیں کر رہا تو قصاص فرض ہو گیا۔ اسی طرح یہ خطاب قاتلین کو ہو تقدیر عبارت کی یہ ہو "یا ایها القاتلون کتب علیکم تسلیم النفس عند مطالبة الولی القصاص" اے قاتلو جب مقتول کا ولی قصاص کا مطالبہ کرے تو تم پر فرض ہے کہ تم اپنے آپ کو قصاص کے لئے پیش کر دو۔

اس صورت میں قاتل کے لئے جائز نہیں کہ اپنے آپ کو نہ پیش کرے اور یہ بھی جائز نہیں کہ وہ قصاص سے انکار کرے۔ (یہ در حقیقت چوتھا جواب ہے) (ماخوذ از روح المعانی و کبیر)

کون سے قتل میں قصاص ہے؟ قتل کی پانچ قسمیں ہیں باقی کی تفصیل انشاء اللہ پانچویں پارہ میں آئے گی۔ البتہ یہ یاد رکھا جائے کہ قصاص قتل عمد میں لازم آتا ہے۔

قتل عمد یہ ہے کہ جان بوجھ کر ارادہ سے کسی کو ہتھیار سے قتل کرنا یا جو ہتھیار کے قائم مقام ہوں جیسے نوک دار لکڑی اور بانس کا چھلکا اور پتھر نوک دار اور آگ سے کسی کو اپنے ارادہ سے قتل کرنا قتل عمد ہے آسان لفظوں میں یہ سمجھا جائے کہ کسی کو ایسے آلہ سے جان بوجھ کر قتل کیا جائے جس سے زخم ہوں خون

چلے وہ قتل عمد ہے۔

قتل عمد پر مرتب ہونے والے احکام: قاتل گہنگار ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا ﴾

"جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر اپنے ارادہ سے قتل کرے اس کی جزاء جہنم ہے جس میں وہ بہت دیر رہے گا"

(هدایه باب القصاص)

قتل سے گناہ پر احادیث مبارکہ:

"عن عبد الله بن مسعود قال قال رسول الله ﷺ لا يحل دم امری مسلم يشهد ان لا اله الا الله وانی رسول الله الا باحدى ثلاث النفس بالنفس والثيب الزانی والمارق لدينه التارک للجماعة"

(بخاری ومسلم مشکوة کتاب القصاص)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی شخص کے لئے حلال نہیں کہ وہ کسی مسلمان کا خون بہائے جس نے گواہی دی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور گواہی دی بیشک میں اللہ کا رسول ہوں۔ سوائے تین شخصوں کے (ان کو قتل کیا جائے گا) جو شخص کسی کو ناحق عمداً قتل کردے اس قاتل کو قصاص کے طور پر قتل کردیا جائے اور زانی محصن کو سنگسار کر کے قتل کردیا جائے۔ اور دین کو چھوڑ کر جماعت کے عقائد کو چھوڑ کر جو مرتد ہوجائے اسے قتل کردیا جائے۔

☆ "عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ لن يزال المؤمن فی فسحة من دينه ما لم يصب دما حراما" (رواه البخاری)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن کو ہمیشہ اپنے دین میں کشادگی حاصل رہتی ہے جب تک حرام خون کو نہ پالے۔ (مشکوۃ کتاب القصاص)

یعنی مومن کو اللہ تعالیٰ کی طرف رحمت کی امید کرنے میں وسعت حاصل رہتی ہے جب وہ کسی کو ناحق قتل کر ڈالے تو اس پر دین میں چلنا تنگ کر دیا جاتا ہے اور رب تعالیٰ کی رحمت کی امید بھی اس پر تنگ کردی جاتی ہے۔ (لمعات)

☆ "عن المقداد بن الاسود انه قال يا رسول الله ارأيت ان لقيت رجلا من الكفار

فاقتلنا فضرب احدی یدی بالسیف فقطعها ثم لا ذمنی بشجرة فقال اسلمت لله وفی روایة فلما اھویت لاقتله قال لا اله الا الله اقتله بعد ان قالها قال لا تقتله فقال یا رسول الله انه قطع احدی یدی فقال رسول الله ﷺ لا تقتله فان قتلته فانه بمنزلتک قبل ان تقتله وانک بمنزلته قبل ان یقول کلمته قال" (بخاری ومسلم)

مقداد بن اسود کہتے ہیں کہ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ اس کے متعلق کیا ارشاد فرماتے ہیں کہ میں اگر کسی کافر سے مقابلہ کروں ہمارے درمیان لڑائی واقع ہو اس کافر نے میرا ایک ہاتھ تلوار سے کاٹ دیا ہو پھر وہ ایک درخت کے ساتھ سہارا لگاتے ہوئے مجھ سے پناہ حاصل کرے یہ کہتے ہوئے کہ میں اللہ کے لئے اسلام لے آیا۔ ایک روایت میں ہے میں اس کو قتل کرنے کا ارادہ کرتا ہوں تو وہ کہتا ہے " لا اله الا الله " کیا اس شخص کو میں قتل کردوں؟ آپ نے فرمایا تم اسے قتل نہ کرو انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ (میں اسے کیوں نہ قتل کروں) اس نے تو میرا ہاتھ کاٹ دیا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اسے قتل نہ کرو۔ اگر تم نے اسے قتل کردیا تو قتل کرنے سے پہلے جو تمہارا مقام تھا وہ اس پر آجائے گا اور اس کے کلمہ (لا الہ الا اللہ) پڑھنے سے پہلے جو اس کا مقام تھا تم اس پر چلے جاؤ گے۔

وضاحت حدیث: نبی کریم ﷺ نے ﴿ لا تقتله ﴾ ارشاد فرما کر واضح کردیا کہ کسی مسلمان کو ناحق قتل کرنا جائز نہیں اسی لئے آپ نے منع فرمایا۔ اور مسئلہ یہ واضح ہوا کہ اگر کافر حربی کسی مسلمان پر کوئی جنایت کرے پھر وہ اسلام قبول کرلے تو اس سے بدلہ نہیں لیا جائے گا کیونکہ جب کافر نے مسلمان کا ہاتھ حالت کفر میں کاٹا ہو پھر مسلمان ہوجائے تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ اسے قتل نہ کرو البتہ اپنے ہاتھ کے بدلے ہاتھ کاٹ لو۔ اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ مسلمان کا خون بہانا (قتل کرنا) جائز نہیں اور کافر کو قتل کرنا جائز ہے اب حدیث پاک کے آخری الفاظ کا مطلب واضح ہوجائے گا۔ اگر تم نے اسے قتل کیا تو تم سمجھ لو کہ جب وہ کافر تھا اسے قتل کرنا جائز تھا اب وہ مسلمان ہوچکا ہے اس کے قتل کے بدلے تمہیں قتل کردیا جائے گا یعنی جس طرح اسلام سے پہلے اس کو قتل کرنا جائز تھا اب تمہیں قتل کرنا جائز ہوجائے گا۔ اگرچہ وجوہ قتل مختلف ہوں گے۔ اس کے قتل کئے جانے کا سبب کفر تھا تمہارے قتل کئے جانے کا سبب قصاص ہوگا۔

اس کو قتل کرنے سے پہلے تمہارا مقام یہ تھا کہ تمہیں بحیثیت مسلمان قتل کرنا منع تھا اور تمہارے قتل کئے جانے سے قصاص لیا جانا تھا اور تم اللہ تعالیٰ کے مقرب تھے قتل کے بعد رب تعالیٰ تم سے ناراض ہو جائے گا۔ اگر تم نے اسے قتل کر دیا تو یہ تمہارا مقام اسے حاصل ہو جاتا ہے۔ (از مرقاۃ)

☆ " عن السامة بن زيد قال بعثنا رسول الله ﷺ الى اناس من جهينة فاتيت على رجل منهم فذهبت اطعنه فقال لا اله الا الله فطعنته فقتلته فجئت الى النبى ﷺ فاخبرته فقال اقتلته وقد شهد ان لا اله الا الله قلت يا رسول الله انما فعل ذلک تعوذا قال فهلا شققت عن قلبه " (بخارى ومسلم) " وفى رواية جندب بن عبد الله البجلى ان رسول الله ﷺ قال كيف تصنع بلا اله الا الله اذا جاء ت يوم القيامة قال مرارا رواه مسلم "

(مشکوۃ کتاب القصاص)

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ہمیں جہینہ قبیلہ کے لوگوں کی طرف بھیجا (اور لوگ بھاگ گئے) ایک آدمی ان میں سے ثابت رہا میں نے اسے نیزہ مارنا چاہا تو اس نے کہا "لا الـه الا الله" میں نے نیزہ مار کر اسے قتل کر دیا تو میں نبی کریم ﷺ کے پاس (جب) آیا تو میں نے آپ کو اس کی خبر دی تو آپ نے فرمایا تم نے اس شخص کو قتل کر دیا جس نے اس کی شہادت دی کہ "لا الـه الا الله" میں نے عرض کیا یا رسول اللہ اس نے اپنے بچاؤ کے لئے ایسے کیا آپ نے فرمایا تم نے اس کے دل کو کیوں نہیں پھاڑا۔ جندب بن عبد اللہ بجلی کی روایت میں یہ ہے کہ بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب قیامت کے دن لا الہ الا اللہ آ گیا تو تم کیا کرو گے۔ یہ الفاظ نبی کریم ﷺ نے کئی مرتبہ ارشاد فرمائے۔

وضاحت : حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے یا تو اس گمان پر اسے قتل کیا تھا کہ اس نے سچے دل سے ایمان قبول نہیں کیا اور یا آپ نے اجتہاد کیا کہ ایسے حال میں جب مسلمان کافر کو قتل کرنے لگے وہ اسلام لے آئے تو وہ اسلام اس کا قبول نہیں۔ لیکن حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کا گمان اور اجتہاد دونوں ہی درست نہیں تھے اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا " هلا شققت قلبه " یہاں "شق قلب" کا مجازی معنی ہے "غور و فکر" کرنا دیر کرنا کہ پہلے اس سے پوچھا جائے پھر اور ذرائع سے معلوم کیا جائے ہو سکتا ہے وہ سچا ہی ہو۔ اب مطلب یہ ہو گیا:

" لم لا شققت قلبه لتعلم وتطلع علی ما فی قلبه وتبین لک "

تم نے اس کے دل کے حال پر توجہ کیوں نہیں کی غور وفکر نہیں کیا کہ تمہیں معلوم ہوتا اور تم اس کے دل پر مطلع ہوتے اور تم پر واضح ہوتا کہ اس نے صرف بچاؤ کے لئے کلمہ پڑھا تھا یا خلوص دل سے۔ (از مرقاۃ)

دوسری روایت کے الفاظ " کیف تصنع بلا اله الا الله اذا جاء ت یوم القیامة " کا مطلب یہ ہے کہ اگر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نے " لا الــه الا الله " کو انسانی شکل دے دی اس نے تمہارے ساتھ مخاصمت شروع کر دی کہ اس نے میرا لحاظ نہیں کیا تو تم کیا کرو گے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر کلمہ شریف کی طرف سے فرشتہ نے آ کر مخاصمت کی کہ اس نے کلمہ کا پاس نہیں کیا تو اس حال میں تم کیا کرو گے۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ اگر اس شخص نے تمہارے ساتھ مخاصمت کی جس نے کلمہ شریف پڑھ لیا تھا پھر تم نے اسے قتل کر دیا تو تم کیا کرو گے۔ (از لمعات) نبی کریم ﷺ نے یہ الفاظ کئی مرتبہ اسی لئے ارشاد فرمائے کہ آپ کو دکھ ہوا کہ ایک مسلمان کو قتل کر دیا گیا۔ واضح ہوا کہ شک کی وجہ سے کہ ہوسکتا ہے یہ کافر ہو کسی کو قتل کرنا ہرگز ہرگز جائز نہیں۔ (راقم)

☆ " وعن عبد الله ابن عمرو قال قال رسول الله ﷺ من قتل معاهدا لم یرح رائحة الجنة وان ریحها توجد من مسیرة اربعین خریفا " رواه البخاری (مشکوۃ کتاب القصاص)

عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے کسی ذمی کو قتل کیا وہ جنت کی خوشبو نہیں پائے گا۔ حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس سال کی مسافت سے پائی جائے گی۔

وضاحت: ذمی (معاہد) اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کافر ہو مسلمانوں کے ملک میں رہے مسلمان حاکم نے اس کے مال اور اس کی جان کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھائی ہو۔ " خریف " اگرچہ موسم خریف کو کہا جاتا ہے لیکن یہاں مراد سال ہے کیونکہ خریف بھی سال میں ایک دفعہ آتا ہے۔ (از لمعات و مرقاۃ)

خودکشی کا جرم:

" عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ من تردی من جبل فقتل نفسه فهو فی نار جهنم یتردی فیها خالدا مخلدا فیها ابدا ومن تحسی

سما فقتل نفسه فسمه في يده يتحساه في نار جهنم خالدا مخلدا فيها
ابدا ومن قتل نفسه بحديدة فحديدته في يده يتوجا بها في بطنه في
نار جهنم خالد مخلدا فيها ابدا ...... بخاری ومسلم"

(مشکوۃ کتاب القصاص)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص پہاڑ سے اپنے آپ کو گرا کر قتل کر دے تو اسے جہنم کی آگ میں ہمیشہ اوپر سے نیچے گرایا جاتا رہے گا۔ اور جس شخص نے زہر پی کر اپنے آپ کو قتل کر دیا تو اس کے ہاتھ میں زہر دیا جائے گا جو جہنم کی آگ ہمیشہ وہ پیتا رہے گا اور جس شخص نے اپنے آپ کو کسی تیز دھار آلہ سے قتل کر دیا تو اس کے ہاتھ میں تیز دھار آلہ دیا جائے گا وہ جہنم کی آگ میں اپنے آپ کو ہمیشہ اس سے قتل کرتا رہے گا۔

وضاحت: یعنی خود کشی کرنے والا جس طرح دنیا میں اپنے آپ کو قتل کرے گا قیامت کے دن اسے ایسا ہی عذاب ہوگا۔ اور اسی طرح وہ اپنے آپ کو قتل کرے گا پھر زندہ کر دیا جائے گا پھر وہ اپنے آپ کو قتل کرے گا۔ یہ سلسلہ لگاتار جاری رہے گا۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا ﴾

''جب بھی ان کے چمڑے جل جائیں گے ان کے بدلے ہم ان کو اور چمڑے دے دیں گے''

(راقم)

☆ " عن ابی سعید وابی هريرة عن رسول الله ﷺ قال لو ان اهل السماء والارض اشتركوا في دم مؤمن لاكبهم الله في النار رواه الترمذی وقال هذا حديث غريب"

(مشکوۃ کتاب القصاص)

حضرت ابو سعید اور ابو ھریرہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر بیشک تمام آسمان والے اور زمین والے کسی مومن کے خون (قتل میں شریک ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ ان کو آگ میں اوندھا گرا دے گا۔

قتل عمد کا اور حکم: ابھی تک قتل عمد کا ایک حکم بیان ہوا کہ قاتل گہنگار ہوگا۔ اب دوسرا حکم بیان کیا جار ہا ہے وہ ہے قصاص جیسا کہ اس آیۃ مبارکہ میں جو زیر بحث ہے مذکور ہے ﴿ كتب عليكم القصاص في القتلى ﴾ ہاں البتہ جان بوجھ کر قتل کرنے سے قصاص کو حدیث پاک کے ذریعے مقید کیا گیا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشادگرامی ہے " العمد قود " ، ای موجبہ "جان بوجھ کرقتل کرنا قصاص کا سبب ہے۔

(من حدیث ابن عباس رواہ ابن ابی شیہ)

عقل کا بھی یہی تقاضا ہے کہ عمداً قتل کرنے سے جنایت کامل پائی جاتی ہے اس لئے اس پر زجر بھی کامل ہونی ضروری ہے سزا اس پر قصاص سے بڑھ کر اور کوئی نہیں اسی لئے قصاص مقرر کیا۔

(از ھدایۃ اخیرین کتاب الجنایات)

قتل عمد کا اور حکم: ابھی تک دو حکم بیان کئے گئے ہیں کہ عمداً قتل کرنے والا گہنگار ہوگا اور اس پر قصاص لازم ہوگا۔ تیسرا حکم یہ ہے کہ مقتول کے ورثاء اگر اسے معاف کردیں تو جائز ہے اور اگر وہ کچھ مال لے کر معاف کردیں تو ان کی مرضی رب تعالیٰ نے یہ حق ان کو دیا ہے۔ یہ دونوں حکم اسی زیر بحث آیۃ کریمہ میں آگے (انشاءاللہ) آرہے ہیں جن پر مناسب بحث کردی جائے گی۔

قتل عمد کا ایک اور حکم: ابھی تک قتل عمد کے تین حکم بیان کئے جاچکے ہیں چوتھا حکم یہ ہے:

" عن ابی ھریرۃ عن النبی ﷺ قال القاتل لا یرث ، اخرجہ الترمذی فی الفرائض "

کہ قاتل اگر اس شخص کو قتل کردے جس کی وراثت اسے ملنی تھی تو یہ شخص وراثت سے محروم ہوجائے گا۔ کیونکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قاتل وارث نہیں ہوتا۔

(ماخوذ از ھدایہ بمع حاشیہ کتاب الجنایات)

اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی:

آزاد بدلے آزاد کے اور غلام بدلے غلام کے اور عورت بدلے عورت کے۔

جیسا کہ شان نزول سے بیان ہوچکا ہے کہ اوس اور خزرج کے حق میں یہ آیۃ نازل ہوئی جب کہ ان میں سے ایک قبیلہ نے قسم اٹھائی ہوئی تھی کہ تم ہمارے غلام کو قتل کروگے تو ہم تمہارے آزاد آدمی کو قتل کریں گے تم ہماری عورت کو قتل کروں گے تو ہم تمہارے مرد کو قتل کریں گے۔

اسلام لانے کے بعد جب انہوں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا تو ان کو اس غلط طریقہ سے روک دیا گیا۔ کہ اگر غلام غلام کو قتل کرے تو غلام کو ہی قتل کیا جائے۔ اگر آزاد شخص آزاد کو قتل کرے تو آزاد قاتل کو ہی قتل کیا جائے۔ اگر مؤنث قتل کرے مؤنث کو تو مؤنث کو ہی قتل کیا جائے۔

آیۃ کریمہ کا یہی مطلب جو شان نزول سے واضح ہوا:

﴿ ولا یدل علی ان لا یقتل الحر بالعبد والذکر بالانثی کما لا یدل علی عکسہ ﴾

آیۃ کریمہ اس پر دلالت ہی نہیں کر رہی کہ غلام کا قاتل آزاد ہو تو آزاد کو قتل نہ کیا جائے یا مذکر قتل کر دے مؤنث کو تو مذکر کو قتل نہ کیا جائے۔ اسی طرح آیۃ کریمہ سے اس کا عکس (الٹ) بھی ثابت نہیں کہ اگر غلام قتل کر دے آزاد کو تو غلام کو قتل نہ کیا جائے اور اگر مؤنث مذکر کو قتل کر دے تو مؤنث کو قتل نہ کیا جائے۔

(از بیضاوی مع زیادتی وضاحت)

مسئلہ: ہر وہ شخص جس کے خون کی حفاظت کا حکم شریعت نے دیا ہے یعنی مسلمان اور ذمی ان کو ناحق جان بوجھ کر کوئی شخص بھی قتل کر دے اس سے قصاص لیا جائے گا۔ قصاص میں مساوات خون کی حفاظت میں ہے نہ کی حریت اور عبدیت میں اور نہ ہی تذکیر و تانیث میں کیونکہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی مطلق ہے ﴿ اِنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ﴾ بیشک نفس، نفس کے بدلے یعنی ایک جان کے بدلے جان کو ہی قتل کر کے قصاص لیا جائے۔

خیال رہے یہ آیۃ مومنوں کے حق میں وہی حکم ثابت کر رہی ہے جو بنی اسرائیل کے لئے حکم تھا یہ آیۃ منسوخ نہیں اور نہ بنی اسرائیل سے خاص نہیں اور بنی اسرائیل کے عذاب کا اس میں ذکر نہیں۔ اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد بھی مطلق ہے "العمد القود" جان بوجھ کر قتل کرنے میں قصاص ہے۔

(از ھدایۃ مع حاشیہ)

مسئلہ: اگر مسلمان نے کسی ذمی کو قتل کر دیا تو مسلمان کو قصاص کے طور پر قتل کر دیا جائے گا" عن ابن عمر ان رسول اللہ ﷺ قتل مسلما بمعاهد " (دارقطنی)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے ذمی کے بدلے مسلمان کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ (از ھدایۃ مع حاشیہ)

مسئلہ: حربی کافر کو کسی مسلمان نے یا کسی ذمی نے دار الحرب میں قتل کر دیا ہو تو یہ قتل کرنا جائز ہے لہٰذا اس کافر مقتول کے بدلے مسلمان یا ذمی کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾

"ان لوگوں سے قتال کرو جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے"

اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی " **لا یقتل مؤمن بکافر** " (اخرجہ ابوداؤد عن علی)

مومن کو کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے۔ (از ھدایہ مع حاشیہ)

مسئلہ : اگر کوئی کافر دار حرب سے مسلمانوں کے ملک میں حاکم کی اجازت سے آتا ہے اسے کوئی مسلمان یا ذمی قتل کر دیتا ہے تو اس قتل کے بدلے مسلمان یا ذمی کو قتل نہیں کیا جائے گا اس لئے کہ یہ کافر ہمیشہ کے لئے محفوظ الدم نہیں اس نے لوٹ کر بھی جانا تھا اور مسلمانوں سے لڑائی بھی کرنی تھی۔

(از ھدایہ)

لیکن یہ کبھی نہ بھولیں کہ مسلمان اپنے حاکم کے وعدہ کے خلاف کام کرنے کی وجہ سے شدید گنہگار ہوگا خصوصا آج کل کے بین الاقوامی قوانین کے مطابق دوسرے ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کے لئے اس قسم کے عمل سے مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔

اسی طرح ذمی اگر حربی کافر مستامن (جو اجازت لے کر آیا ہے) کو قتل کر دے تو وہ بھی مسلمانوں کے حاکم اور دوسرے مسلمانوں کیلئے مشکلات پیدا کرنے کا سبب بن رہا ہے۔ مسلمان حاکم کو اختیار ہے کہ امن لے کر آنیوالے کے قاتل کو تعزیری سزا دے "قید یا کوڑوں سے" قتل نہیں کرا سکتا۔ (راقم)

مسئلہ : عورت کو مرد قتل کر دے تو عورت کے بدلے مرد کو قتل کر دیا جائے گا۔ اور اگر عورت نے مرد کو قتل کر دیا تو عورت کو مرد کے بدلے قتل کر دیا جائے گا۔ بڑے نے چھوٹے کو قتل کر دیا تو بڑے کو چھوٹے کے بدلے قتل کر دیا جائے گا۔ اور صحیح شخص نے نابینا کو یا چلنے پھرنے سے معذور شخص کو قتل کر دیا تو صحیح کو قصاص کے طور پر قتل کر دیا جائے گا۔ اور صحیح شخص نے اس شخص کو قتل کر دیا جس کا عضو کاٹا ہوا تھا۔ یا کوئی عضو شل تھا تو صحیح کو اس کے بدلے قتل کر دیا جائے گا۔ اسی طرح صحیح شخص نے پاگل کو قتل کر دیا تو اس کے بدلے صحیح کو قتل کر دیا جائے گا۔ وجہ سب میں ﴿ اِنَّ النَّفۡسَ بِالنَّفۡسِ ﴾ "بیشک جان کے بدلے جان ہے"۔ (ماخوذ از ہدایہ)

مسئلہ : کسی شخص نے اپنے بیٹے کو قتل کر دیا تو گنہگار ہوگا، وراثت سے محروم ہوگا لیکن اسکے باپ ہونے کی تحریم کو دیکھتے ہوئے قصاص کے طور پر اسے قتل نہیں کیا جائیگا۔ " **لقوله عليه السلام لايقاد الوالد بولده** "

(اخرجه الترمذی و ابن ماجه فی الدیات عن عمر ابن الخطاب)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا باپ سے بیٹے کا قصاص نہ لیا جائے۔ (ھدایہ مع النقایہ)

مسئلہ : اگر کوئی شخص آزاد کسی کے غلام کو قتل کر دے تو آزاد کو اس کے بدلے قتل کر دیا جائے گا۔
لیکن اگر کسی نے اپنے غلام کو قتل کر دیا تو اسے اس کے بدلے قتل نہیں کیا جائے۔ (از ہدایہ)

اعتراض : حدیث شریف میں ہے "من قتل عبده قتلناه" جس شخص نے اپنے غلام کو قتل کیا ہم اسے قتل کر دیں گے۔

جواب : "هو حديث ضعيف" یہ حدیث ضعیف ہے۔ (قرطبی)

نوٹ: بین الاقوامی قوانین کے مطابق آج کل کوئی غلام نہیں پائے جاتے گھریلو ملازم کو غلام سمجھنا نادانی ہے۔ (راقم)

مسئلہ : جب چند آدمی مل کر ایک مسلمان کو ناحق قتل کر دیں یا ذمی کو ناحق قتل کر دیں تو اس ایک مقتول کے بدلے تمام قاتلین کو قتل کر دیا جائے گا:

"عن سعيد بن مسيب ان عمر بن الخطاب قتل نفرا خمسة او سبعة برجل واحد قتلوه قتل غيلة وقال عمر لوتمالأ عليه اهل صنعاء لقتلتهم جميعا" (رواه مالك وروى البخاري عن ابن عمر نحوه ، مشكوة باب الديات)

حضرت سعید بن مسیب فرماتے ہیں کہ بیشک حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے پانچ یا سات آدمیوں کو قتل کرنے کا حکم دیا جنہوں نے مل کر ایک شخص کو دھوکے سے چھپ کر قتل کر دیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر صنعاء کے تمام لوگ جمع ہو کر ایک شخص کے قتل میں ایک دوسرے کی امداد کرتے تو میں تمام کو قتل کرنے کا حکم نافذ کرتا۔

مسئلہ : اگر کوئی شخص مسلمانوں پر تلوار تان لیتا ہے یعنی ان کو قتل کرنے کی دھمکی دیتا ہے خواہ وہ شہر میں ہے یا باہر کہیں ہے دن ہو یا رات تو مسلمانوں کو حق پہنچتا ہے اسے قتل کر دیں اس شخص کے قتل میں نہ گناہ ہے اور نہ ہی قصاص ہے۔

ابونعیم نے بیان کیا ہے کہ تاریخ اصبہان میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: "من شهر على المسلمين سيفا فقد اطل دمه" جس شخص نے مسلمانوں پر تلوار تان لی تحقیق اس نے

اپنا خون ضائع کر دیا۔

نسائی میں حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث مروی ہے: "من شهر سيفه ثم وضعه فدمه هدر " جس شخص نے تلوار تان لی پھر رکھ دی تو اس کا خون معاف ہے۔(ازھدایۃ مع حاشیۃ)

مسئلہ : ایک شخص نے مسلمان یا ذمی کو زخمی کر دیا وہ ان زخموں سے ہی فوت ہو گیا تو یہ زخمی کرنے والا اب قاتل ہے اس کو اس شخص کے بدلے قتل کر دیا جائے گا۔ (ازہدایۃ)

مسئلہ : جس شخص پر قصاص لازم تھا وہ فوت ہو جائے تو قصاص ساقط ہو جائے گا اب اس کے ورثاء پر کسی قسم کی کوئی ضمان لازم نہیں۔ (ازہدایہ)

قصاص صرف تیز دھار آلہ سے لیا جائے:

جب کسی شخص کو قصاص کے طور پر قتل کرنا ہے تو صرف تلوار یا کسی ایسے آلہ سے قتل کیا جائے جس سے اسے زیادہ تکلیف نہ ہو۔

" عن ابی بکر عن النبی ﷺ لا قود الا بالسیف " (ابن ماجه)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا قصاص نہیں سوائے تلوار کے۔

"والمراد به السلاح" نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی میں تلوار سے مراد ہتھیار ہے۔(ازہدایہ مع نقایۃ)

مفتی شجاعت علی قادری رحمہ اللہ کا فتوی راقم کی نظر سے گزرا جس میں آپ نے موجودہ طریقہ پھانسی دینے کو بھی جائز قرار دیا کہ اس میں ایسی تکلیف نہیں ہوتی جیسی ہڈی وغیرہ کے توڑنے سے ہوتی ہے ایک ہی جھٹکے سے انسان مر جاتا ہے۔

اعتراض: ایک حدیث شریف سے تو یہ سمجھ آتا ہے کہ جس طرح کوئی شخص دوسرے کو قتل کرے اسی طرح اس سے قصاص لیا جائے دونوں حدیثوں میں تطبیق کیسے ہوگی وہ حدیث شریف یہ ہے:

" عن انس ان يهودیا رض رأس جارية بين حجرين فقيل له من فعل بک هذا افلان افلان حتى سمی اليهودی فاومت براسها فجئی باليهودی فاعترف وامر به رسول الله ﷺ فرض رأسه بالحجارة "

(بخاری ومسلم ،مشکوۃ کتاب القصاص)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک ایک یہودی نے ایک لڑکی کا سر دو پتھروں کے درمیان رکھ کر کوٹ دیا۔ (اس میں ابھی جان باقی تھی) اس سے پوچھا گیا تمہارے ساتھ یہ معاملہ کس نے کیا (کئی نام لئے گئے) کیا فلاں نے کیا؟ کیا فلاں نے کیا؟ یہاں تک کہ جب یہودی کا نام لیا گیا تو اس نے سر کے اشارے سے بتا دیا کہ ہاں اسی نے میرا سر کوٹ دیا ہے۔ یہودی کو لایا گیا اس نے اعتراف کرلیا رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا اس کا سر بھی پتھر سے کوٹ دیا گیا۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا جس طرح کوئی قتل کرے اسی طرح اس کو قصاص میں قتل کیا جائے۔

پہلا جواب: نبی کریم ﷺ نے یہودی کا سر پتھر سے پھوڑنے کا جب حکم دیا اس وقت کفار سے سخت طریقہ سے نمٹنے کا حکم تھا" **وقد كان ذلك جائزا على وجه المثلة كما سمل العرنيين ثم نسخ** "اس وقت مثلہ بنانا بھی جائز تھا کیونکہ عرینہ قبیلہ کے لوگوں کی آنکھیں نکالنے کا حکم بھی دیا گیا پھر مثلہ بنانا منسوخ کردیا گیا۔

دوسرا جواب: حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں یہ ہے:

" **فامر به النبي ﷺ ان يرجم حتى قتل ، فذكر في هذا الحديث الرجم وليس ذلك بقصاص عند الجميع** "

کہ نبی کریم ﷺ نے حکم فرمایا کہ اس یہودی کو سنگسار کردیا جائے یہاں تک کہ یہ قتل ہو جائے جب اس حدیث میں سنگسار کرنے کا حکم دیا گیا تو یہ بالاتفاق قصاص نہیں (اسی وجہ سے شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ نے لمعات میں ذکر فرمایا کہ یہ قتل قصاصا نہیں تھا بلکہ سیاسۃً تھا۔

تیسرا جواب: جب یہودی کو پتہ چلا کہ اب مجھے قتل کی وجہ سے قصاصا قتل کردیا جائے گا کیونکہ یہ معاہد (ذمی) تھا۔ یہ مدینہ طیبہ بھاگ کر قریب ہی یہودیوں کے محلہ میں چلا گیا جو اس وقت دار حرب کے حکم میں تھا" **فاخذ بعد ذلك فقتله على انه حربي ناقض للعهد** "بعد میں اسے پکڑ لیا گیا اور اسے پتھروں سے قتل کردیا گیا اب قتل کرنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ معاہدہ کو توڑ کر حربی بن چکا تھا۔

(از احکام القرآن للجصاص)

فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ

تو وہ شخص معاف کردیا گیا جسے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ، تو پیچھا کیا جائے بھلائی سے، اور ادا

کرے اسے اچھے طریقہ سے۔

﴿ فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ ﴾

ان الفاظ مبارکہ کی زیادہ مفسرین کرام کے نزدیک تفسیر یہ ہے کہ

العفو الصفح وترک عقوبة المستحق عفی عنه ذنبه وعفی له ذنبه "(قاموس)

" عفو " کا معنی ہے درگزر کرنا اور جس سزا کا وہ مستحق ہے اسے چھوڑ دینا یعنی وہ سزا نہ دینا۔ " عفو " ذنب کی طرف بلا واسطہ متعدی ہے اور گناہ کرنے والے کی طرف " عــن " سے متعدی ہونے کی صورت میں پڑھا جاتا ہے " عفی عنه ذنبه " اور " لام " کے واسطہ سے متعدی ہونے کی صورت میں پڑھا جاتا ہے " عفی له ذنبه " معنی دونوں صورتوں میں ایک ہی ہوتا ہے اس کے گناہ معاف کر دیئے گئے۔

" من " مبتداء ہے، یا شرطیہ ہے، یا موصولہ، مراد اس سے "قاتل" ہے اور ﴿ مِنْ اَخِیْهِ ﴾ میں "من " ابتدائیہ ہے اور ظرف لغو ہے متعلق ہے " عفی " کے اور " اخیه " میں " اخ " سے مراد مقتول کا ولی ہے اور "ضمیر" لوٹ رہی ہے " من " کی طرف اور " شئی " کی تنکیر تبعیض پر دلالت کر رہی ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ قاتل کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا گیا۔ مقتول کے جو وارث ہیں وہی قصاص کا مطالبہ کرنے کے حقدار ہیں تمام قصاص کا مطالبہ کریں تو قاتل کو قصاص کے طور پر قتل کر دیا جائے گا۔

لیکن یہ خیال کریں کہ قصاص کا فیصلہ صرف حکام یعنی قاضی کو کرنا ہوگا ان کے حکم سے قصاص لیا جائے گا۔ مقتول کے ورثاء مطالبہ کریں گے اور قاضی فیصلہ کرے گا پھر قصاص جاری ہوگا مقتول کے ورثاء قاضی کے فیصلہ کے بغیر اگر قاتل کو قتل کریں گے تو گنہگار ہوں گے۔ مقتول کے تمام ورثاء قاتل کو معاف کر دیں یا کچھ لوگ معاف کر دیں تو قاتل سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔

تنبیہ : ﴿ فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ ﴾ سے معاف کرنے کی دو صورتیں بیان کی گئیں ہیں ایک تو یہ ہے مقتول کے تمام ورثاء قصاص معاف کر دیں اور مال بھی نہ لیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اگرچہ وہ قصاص تو معاف کر رہے ہیں لیکن مال لے کر صلح کرنا چاہتے

ہیں تو اس صورت میں حکم یہ ہے:

" واذا اصطلح القاتل و اولیاء القتیل علی مال سقط القصاص ووجب المال قلیلا کان او کثیرا "

کہ جب قاتل اور مقتول کے ورثاء مال پر صلح کرلیں تو قصاص ساقط ہو جائے گا مال کی کوئی حد نہیں دونوں فریق جس پر رضاء مند ہو جائیں خواہ قلیل مال ہو یا کثیر ﴿ فَمَنْ عُفِیَ ﴾ سے مطلقا معاف کرنا ثابت ہے یعنی بغیر مال لینے کے معاف کرنے کا بھی مقتول کے ولیوں کو حق حاصل ہے۔

﴿ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ ﴾

سے ثابت ہو رہا ہے کہ قصاص معاف کرنے کی دوسری صورت یہ ہے کہ مال پر فریقین کی صلح ہو جائے۔

" ای فله اتباع ای فلولی القتیل اتباع المصالح بالمعروف ای مطالبة ببدل الصلح علی حسن معاملته "

یعنی معروف طریقہ سے اتباع کا مطلب یہ ہے کہ مقتول کے ولی کے لئے یہ ہے کہ جب ان کی قاتل سے مال پر صلح ہو جائے تو اس سے مطالبہ کرنے میں اس کا پیچھا کرنے میں اچھے طریقہ سے درپیش آئے۔ یعنی سختی سے مطالبہ نہ کرے بلکہ نرمی سے مطالبہ کرے:

" ﴿ وَاَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ ﴾ ای وعلی المصالح اداء الی ولی القتیل باحسان فی الاداء "

یعنی جب مال پر صلح ہو جائے تو قاتل کو بھی چاہئے کہ مقتول کے اولیاء (ورثاء) کو مال اچھی طرح ادا کردے نہ اس میں کمی کرے اور نہ ہی تاخیر کرے کہ انہیں بار بار مطالبہ کرنا پڑے۔ (هدایة مع کفایة)

مقام توجہ: جب بعض ورثاء معاف کریں اور بعض معاف نہ کریں تو قصاص ساقط ہو جائے گا لیکن دیت مقرر ہوگی جن لوگوں نے معاف نہیں کیا ان کی کل دیت سے وراثت کے حساب سے جتنا مال ملنا ہوگا وہ دے دیا جائے گا۔ اور جنہوں نے معاف کردیا ان کا جو حصہ ہوگا اس کا فائدہ قاتل کو ہوگا۔
(از هدایة)

مقرر دیت کیا ہے؟ ایک سو اونٹ، یا ایک ہزار دینار، یا دس ہزار درہم، ان میں سے جو چاہے دے۔

ایک ہزار دینار کا وزن: دینار سونے کا سکہ ہے ایک ہزار دینار کا وزن 375 تولے سونا ہے

دس ہزار درہم: درہم چاندی کا سکہ ہے دس درہم کا وزن 2625 تولے چاندی ہے۔

﴿مِنْ اَخِيْهِ﴾ سے ایک لطیف اشارہ: جو تفسیر بیان کی جارہی ہے اس کے مطابق مطلب یہ ہے کہ قاتل کو اس کے بھائی کی طرف سے معاف کر دیا جائے۔ بھائی کہہ کر مقتول کے ورثاء کو معاف کرنے کی ترغیب دی گئی کہ اگرچہ قاتل نے تمہارے رشتہ دار کو قتل کر کے سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔جس کی وجہ سے انتقام کی آگ کا دلوں میں بھڑکنا قدرتی بات ہے لیکن یہ نفس کا تقاضا ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے۔

اگر تم غور کرو تو یہ بات تمہیں سمجھ آجائے گی کہ وہ گنہگار تو ہے لیکن اس کا ایمان تو ضائع نہیں ہوا لہذا وہ ایمان کی وجہ سے دین کی وجہ سے تمہارا بھائی ہے بھائی کے لئے یہی بہتر ہے کہ اپنے بھائی کو معاف کر دے زیادہ بھلائی تو اس میں ہے کہ بغیر مال لینے کے معاف کر دو ہاں اگر یہ نہیں کر سکتے تو مال لے کر معاف کر دو یہ بھی تمہاری طرف سے قاتل پر احسان ہوگا۔اگر تم یہ بھی نہیں کر سکتے تمہارے انتقام کی آگ بغیر بدلہ لینے کے ٹھنڈی نہیں ہوتی تو قاضی کے پاس مقدمہ لے جاؤ تا کہ وہ قصاص کا فیصلہ کر دے۔قصاص کا حق دے کر تجاوز سے منع کر دیا گیا کہ کہیں ایک کے بدلے کئی کو قتل نہ کر دو قاتل غلام ہو تو آزاد کو قتل نہ کر دینا، اور اسی طرح قتل کرنے والی عورت ہو تم مذکر کو نہ قتل کر دینا اگر رب تعالیٰ کے حکم کو ٹھکراؤ گے اور حد سے تجاوز کرو گے تو دردناک عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

﴿فَمَنْ عُفِيَ﴾ میں دوسرا احتمال: "من" سے مراد قاتل ہو "عفی" متضمن ہو "عافی" معاف کرنے والے کو وہ ہے مقتول کا ولی اور "اخ" سے مراد مقتول اور "شئی" سے مراد خون۔ اب معنی یہ ہوگا" ان القاتل اذا عفا عنه ولی المقتول عن دم مقتوله" بیشک قاتل کو جب مقتول کا ولی اپنے مقتول بھائی کا خون معاف کر دے تو قصاص ساقط ہو جائے گا بغیر مال کے معاف کرے یا مال سے معاف کرے۔ (از قرطبی)

ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ: یہ تخفیف ہے تمہارے رب کی طرف سے اور رحمت یعنی اہل توراۃ کے لئے قتل کے بعد صرف قتل تھا اور اہل انجیل کے لئے صرف معاف کرنا تھا لیکن نبی کریم ﷺ کی امت کے لئے تخفیف کر دی گئی اور رحمت کرتے ہوئے ان کے لئے حکم آسان کر دیا گیا

''فمن شاء قتل ومن شاء اخذ الدية ومن شاء عفا '' جو شخص چاہے قصاص لے جو چاہے معاف کردے جو چاہے مال لے لے۔

فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِکَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ :

جو شخص تجاوز کرے گا اس کے بعد تو اس کے لئے عذاب ہوگا دردناک۔

زمانہ جاہلت میں پہلے دیت طے کر کے صلح کر لیتے جب قاتل مطمئن ہو جاتا کہ اب مجھے قتل نہیں کیا جائے گا پھر موقع پا کر اسے قتل کر دیا جاتا۔ اس بری رسم کو ختم کرنے کے لئے رب تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ جو شخص دیت طے کر کے پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے تجاوز کرتے ہوئے قتل بھی کرے گا اس کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔ (از قرطبی)

ضیاء القرآن کی ضیاء پاشیاں : اسلام سے پہلے عرب میں دستور تھا کہ اگر طاقتور قبیلے کا کوئی شخص قتل کر دیا جاتا تو وہ صرف قاتل کے قتل پر اکتفاء نہ کرتے بلکہ قاتل کے قبیلہ کے دس دس بیس بیس آدمی قتل کرنا اپنا حق سمجھتے اگر کسی آزاد کو غلام قتل کر دیتا تو غلام کے بدلے غیر قاتل آزاد کا سر قلم کیا جاتا اور اگر عورت قتل کرتی تو مرد قتل کیا جاتا اسی ظالمانہ اور غیر اسلام دستور پر صدیوں عمل ہوتا رہا اور عرب اپنی نسلی نخوت اور قبائلی برتری کی تسکین بے گناہوں کا خون بہا بہا کر کرتے رہے قرآن کریم نے اس دستور کو ایک قلم منسوخ کر دیا اور حکم دیا کہ مقتول کا قاتل ہی قصاص میں قتل کیا جائے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت آزاد ہو یا غلام۔

یہ رواج صرف عرب ہی میں نہ تھا بلکہ دوسری قوموں میں بھی تھا بلکہ آج تک یورپ کی حکمران قومیں بھی اس پر عمل پیرا رہی ہیں جنوبی افریقہ کے حبشی آسٹریلیا کے اصلی باشندے اور امریکہ کے ریڈ انڈین آج بھی اس پر شاہد ہیں یہ فخر اسلام کو ہی حاصل ہے کہ اس نے جھوٹے امتیازات کے بت مدت ہوئی پاش پاش کر دیئے اور انسانی مساوات کا صرف قانون ہی پیش نہیں کیا بلکہ عمل کر کے دکھا دیا۔ (ضیاء القران)

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ

۱) ''اور خون کا بدلہ لینے میں تمہاری زندگی ہے اے عقل مندو کہ تم کہیں بچو''۔

۲) اور تمہارے لئے قصاص میں عظیم زندگی ہے اے عقل والو تا کہ تم بچ جاؤ''۔

جب پہلی آیۃ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے قاتل کیلئے جو حکم بیان کیا ہے اسے اپنی رحمت قرار دیا ہے تو بظاہر اس میں وہم ہوتا ہے کہ عبد ضعیف کو قصاص کا حکم دینے میں رحمت باری تعالیٰ کیسے؟ جب کہ بظاہر تو اس میں شدت پائی جاتی ہے۔ اس آیۃ کریمہ میں قصاص کی حکمت بیان کی جا رہی ہے جب انسان کو قصاص کی حکمت کا پتہ چل جائے گا تو خود بخود سمجھ آ جائیگا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم رحمت ہے۔ (از کبیر)

قصاص میں حکمت: جب قاتل کو یہ پتہ چل جائے کہ اگر میں نے قتل کیا تو مجھے اس کے بدلے میں قتل کیا جائے تو وہ یقیناً قتل کرنے سے رک جائے گا اس طرح دو جانوں کی حفاظت ہوگئی۔ جسے قتل کرنے کا ارادہ تھا جب قتل نہ کیا تو اسے حیات حاصل ہوگئی قاتل جب قتل سے رک گیا تو قصاص سے بچ گیا اسے زندگی حاصل ہوگی۔

﴿ حَيٰوةٌ ﴾ سے حیات عظیمہ کا ذکر: ﴿ حَيٰوةٌ ﴾ کو نکرہ ذکر کیا جس کی تنوین تعظیم پر دلالت کرتی ہے جس کا مطلب ہے اور تمہارے لئے قصاص میں عظیم زندگی ہے۔

حیات عظیمہ کیسے؟ اس لئے کہ زمانہ جاہلیت میں دستور یہ تھا کہ اگر ایک شخص قتل ہو جاتا تو دونوں فریقوں میں قتل عام شروع ہو جاتا جب قصاص مقرر کیا گیا تو یہ بری رسم یک لخت ختم ہوگئی کیونکہ اب ہر شخص کو معلوم ہو رہا تھا کہ جو قتل کرے گا اگر مقتول کے ورثاء نے مطالبہ کیا تو اسے اس کے بدلہ میں قتل کر دیا جائے گا۔ اس طرح قصاص کے قانون سے کئی لوگوں کی جانیں بچ گئیں یہی تو حیات عظیمہ ہے۔

آج کل اپنے معاشرہ کو دیکھیں اسلام قوانین پر فیصلے نہ ہونے کی وجہ سے اور حکام کے لئے علیحدہ قوانین پیسے والوں کے لئے علیحدہ قوانین، غنڈوں کے لئے علیحدہ قوانین نے ہی تو قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا ہے قانون کے شکنجے میں صرف غریب اور شریف آتا ہے۔

کاش کہ عدل وانصاف پر فیصلے ہوتے غریب اور امیر رعایا اور حکام کے لئے ایک جیسے قوانین

ہوتے اسلام کا نظام عدل قائم ہوتا اور قصاص کا قانون انصاف کے تقاضوں کے مطابق ہوتا تو قتل وغارت کا سلسلہ بند ہو جاتا۔

نظام قصاص سے لڑائی جھگڑے کی روک تھام:

قصاص کا لغوی معنی صرف بدلہ لینا ہے اور سورۃ مائدہ میں قصاص کے قانون کو عام کر کے جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور زخمی کرنے پر بھی قصاص کو نافذ کر کے مطلقاً لڑائی جھگڑے کا دروازہ بند کر دیا۔ انگریز کے پجاری شرعی قوانین پر عمل کر کے تو دیکھیں پھر ان کی برکات اور ان پر مرتب ہونے والے کمالات کو دیکھیں۔ (ماخوذ از کبیر)

قصاص میں زندگی کی ایک اور وجہ:

" اتفق ائمة الفتوی علی انه لا یجوز لاحد ان یقتص من احد حقه دون السلطان "

اس پر فتوی دینے والے ائمہ کرام کا اتفاق ہے کہ کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ خود ہی قصاص لے بلکہ قصاص صرف بادشاہ اور اس کی طرف سے مقرر کیا ہوا قاضی (جج) دلا سکتا ہے۔ اس قانون سے بھی لوگوں کا قتل کے معاملہ میں حد سے تجاوز کرنا ختم ہوا جس نے قتل عام سے لوگوں کو بچا لیا جو حیات عظیمہ کا سبب بنا۔ (ماخوذ از قرطبی)

نبی کریم ﷺ کا اپنے آپ کو قصاص کے لئے پیش کرنا:

" عن ابی سعید الخدری قال بینا رسول الله ﷺ یقسم شیئا اذا کب علیه رجل فطعنه رسول الله ﷺ بعرجون کان معه فصاح الرجل فقال له رسول الله (تعال) فاستقد ، قال بل عفوت یا رسول الله " (رواہ النسائی)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان کچھ چیز تقسیم فرماتے ایک شخص آپ پر اوندھا گرا آپ کے پاس کھجور کی چھڑی تھی جس سے آپ نے اسے ضرب لگائی وہ شخص چلایا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (آؤ) بدلہ لے لو اس نے عرض کیا یا رسول اللہ میں آپ کو معاف کر رہا ہوں۔ اس شخص نے بدلہ بیشک نہیں لیا لیکن نبی کریم ﷺ کا اپنے آپ کو بدلہ کے

لئے پیش کرنا درحقیقت قانون کی حکمرانی کو ثابت کرنا تھا۔

"عن ابی فراس قال خطب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فقال الا من ظلمه امیره فلیرفع ذلک الی اقیده منه فقام عمرو بن العاص فقال یا امیر المؤمنین لئن ادب رجل منا رجلا من اهل رعیته لتقصنه منه قال کیف لا اقصه منه وقد رأیت رسول اللہ ﷺ یقص من نفسه"

(رواہ ابو داؤد الطیالسی)

حضرت ابوفراس کہتے ہیں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا تو آپ نے فرمایا خبردار جس شخص پر اس کے امیر (گورنر) نے ظلم کیا وہ معاملہ میرے پاس لایا گیا تو میں اس سے قصاص (بدلہ) لوں گا حضرت عمرو بن عاص کھڑے ہوئے عرض کرنے لگے اے امیر المؤمنین اگر کسی امیر نے کسی شخص کو ادب سکھانے کے لئے مار دیا تو پھر بھی آپ قصاص لیں گے؟ آپ نے فرمایا کیوں میں قصاص نہ لوں جب میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے اپنے آپ کو قصاص کے لئے پیش کیا۔

(ماخوذ از قرطبی)

یٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ : "اے عقل والو" اولوالالباب سے مراد کامل عقل والے، کامل عقل والوں کو خطاب اس لئے کیا گیا کہ وہ عقل سے سوچیں اور سمجھیں کہ قصاص میں حیات عظیمہ ہے۔(از بیضاوی)

لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ : "تاکہ تم بچ جاؤ" یعنی قصاص پر عمل کر کے قتل سے بچ جاؤ اور اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کر کے گناہوں سے بچ جاؤ۔ یہی اسباب ہیں تقویٰ کے۔ (از بیضاوی)

مقام توجہ: اگر چہ قصاص کے ساتھ ساتھ معاف کرنے اور خون بہا لینے کا بھی اختیار دیا گیا لیکن انسانی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ انتقام لے کر ہی اپنے غصہ کو ٹھنڈا کرتا ہے اسی لئے ذکر فرمایا ﴿وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ﴾ اور تمہارے لئے قصاص میں عظیم زندگی ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿یٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ﴾ سے مراد وہ عقلاء ہیں جو عواقب کو پہچانتے ہیں اور وجوہ خوف کو جانتے ہیں جب وہ کسی دشمن کو قتل کرنے کا ارادہ کریں گے تو انہیں معلوم ہو جائیگا کہ ہم سے قصاص لیا جائیگا کوئی عقل مند انسان اپنی جان کو ہلاکت میں ڈال کر غیر کو قتل نہیں کرتا۔ جب اسے خوف دامن گیر ہوگا تو وہ یقیناً قتل سے رک جائیگا جو دونوں کیلئے زندگی کا سبب بنے گا اسی لئے رب تعالیٰ نے عقل والوں کو خطاب کیا۔ بے وقوف جہلاء کو یہ نقطہ کیسے سمجھ آ سکتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

قرآن پاک کی فصاحت: رب تعالیٰ نے جس مضمون کو ﴿فِی الْقِصَاصِ حَیٰوةٌ﴾ کو پیش کیا اسی مضمون کو عرب حضرات ان جملوں سے ادا کرتے "قتل البعض احیاء للجمیع" بعض کا قتل تمام کی زندگی ہے، اور کبھی کہتے "اکثروا القتل لیقل القتل" زیادہ قتل کرو تا کہ قتل میں کمی واقع ہو جائے۔ان کے نزدیک زیادہ فصیح کلمہ یہ تھا "القتل انفی القتل" قتل نفی کرتا ہے قتل کی۔لیکن غور کیا جائے تو رب تعالیٰ کے ارشاد﴿فِی الْقِصَاصِ حَیٰوةٌ﴾ کے مقابل القتل انفی للقتل "کو فصاحت میں کوئی حیثیت ہی حاصل نہیں آیئے ان دونوں میں چند وجہ سے فرق دیکھئے:

(۱) ﴿فِی الْقِصَاصِ حَیٰوةٌ﴾ میں الفاظ کم ہیں مقاصد زیادہ کیونکہ یہ دس حروف ہیں اس لئے کہ تنوین مستقل حرف نہیں بلکہ دوسرے حرف کے تابع ہے۔اور "القتل انفی للقتل" میں چودہ حروف ہیں اور وہ مقاصد بھی حاصل نہیں جو ﴿فِی الْقِصَاصِ حَیٰوةٌ﴾ سے حاصل ہیں۔

(۲) ان دونوں جملوں میں اور فرق یہ ہے کہ ﴿فِی الْقِصَاصِ حَیٰوةٌ﴾ میں اطراد پایا گیا ہے یعنی یہ ضابطہ لگا تار جاری ہے کیونکہ ہر قصاص میں عظیم زندگی حاصل ہے لیکن "القتل انفی للقتل" میں اطراد نہیں کیونکہ "فان القتل ظلما ادعی للقتل" ظلماً قتل زیادہ قتل کا سبب بنتا ہے قتل کو روکتا نہیں۔

(۳) ﴿فِی الْقِصَاصِ حَیٰوةٌ﴾ میں تنوین عظمت پر دلالت کر رہی ہے کہ قصاص میں عظیم زندگی ہے لیکن یہ کمال "القتل انفی للقتل" میں نہیں کیونکہ اس میں مطلقاً ذکر ہے کہ قتل روکتا ہے قتل کو۔

(۴) ﴿فِی الْقِصَاصِ حَیٰوةٌ﴾ میں صنعت طباق پائی گئی ہے کہ ضد سے ایک عظیم حکم ثابت کیا گیا ہے کیونکہ بظاہر قصاص زوال حیات پر دلالت کرتا ہے لیکن حقیقت میں حصول حیات عظیمہ کا ذریعہ ہے۔اس صورت کا تصور تک "القتل انفی للقتل" میں نہیں پایا گیا۔

(۵) ﴿وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ﴾ میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ قصاص سے بالذات حیات حاصل ہوتی ہے یعنی قصاص بالذات حیات پر دلالت کر رہا ہے اور "القتل انفی للقتل" سے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے واسطوں کی ضرورت ہے۔

(۶) ﴿وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ﴾ میں ایک عجیب و غریب حکمت پہلے بیان ہوئی کہ اس میں ایک ضد سے دوسری ضد کا ثبوت پایا گیا۔اور کمال یہ ہے کہ قانون یہ ہے کہ ظرف جب اپنے مظروف پر مشتمل

ہوتو مظروف کے اجزاء کو بکھرنے سے بچالیتی ہے " **فکان القصاص فیما نحن فیه یحمی الحیاة من الآفات** " اس قانون کو مدنظر رکھتے ہوئے زیر بحث الفاظ گرامی کا کمال خود بخود واضح ہو جاتا ہے کہ قصاص حیات کو آفات سے بچاتا ہے قصاص یا دیت وغیرہ لینے کے بعد رب تعالیٰ نے تجاوز سے منع فرما دیا اور تجاوز کرنے پر دردناک عذاب کا ذکر فرمایا۔لیکن یہ " **القتل انفی للقتل** "کو حاصل نہیں۔

(۷) وہ جملہ جو تکرار سے خالی ہو اس میں مطالب کو سمجھنا قریب ہوتا ہے اور عربی کی روانگی میں خصوصی ذوق پایا جاتا ہے یہ کمال ﴿ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ ﴾ کو حاصل ہے۔لیکن " **القتل انفی للقتل** " میں تکرار ہے آخری کلمہ پہلے کلمہ پر مرتب ہے تکرار کی وجہ سے اس میں نہ ذوق ہے اور نہ ہی مطالب کو سمجھنا قریب ہے۔

(۸) " **القصاص** " میں الف لام جنسی ہے جو قتل اور مارنے اور زخمی کرنے کو شامل ہے یعنی قتل اور مار اور زخمی کرنے اور اعضاء کے کاٹنے میں بدلہ لینا عظیم زندگی کا سبب ہے جس میں جرائم کی روک تھام پائی جاتی ہے۔اور " **القتل انفی للقتل** " میں صرف قتل کو ختم کرنا بھی لازم نہیں آتا مار یا زخمی کرنا یا اعضاء کو کاٹنے کی روک تھام اس جملہ سے سمجھ نہیں آئی۔

(۹) " **القتل انفی للقتل** " میں 'انفی' افعل کا وزن ہے جس سے زیادتی کی نفی تو سمجھ آتی ہے لیکن اصل فعل کی نفی سمجھ نہیں آتی یعنی یہ سمجھ آتا ہے کہ قتل زیادہ قتل کو روکتا ہے لیکن یہ سمجھ نہیں آتا کہ قتل مطلقاً قتل کو روکتا ہے۔یہ کمال صرف ﴿ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ ﴾ کو حاصل ہے۔

(۱۰) ﴿ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ ﴾ سے پتہ چلتا ہے کہ قصاص سے دنیاوی زندگی حاصل ہوتی ہے کیونکہ قتل اور عظیم فتنہ وفساد کی روک تھام حاصل ہوتی ہے۔اور اخروی زندگی بھی حاصل ہوتی ہے کیونکہ جب مومن سے قصاص لیا جائے گا تو یقیناً وہ توبہ بھی کرلے گا جو اس کی نجات اور اخروی زندگی کے حصول کا سبب بنے گا۔لیکن یہ مقاصد " **القتل انفی للقتل** " سے حاصل نہیں ہوتے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انسانوں کے کلام کو رب تعالیٰ کے کلام سے نسبت ہی کیا ہے۔

(ماخوذ از روح المعانی و کبیر)

﴿كُتِبَ عَلَيۡكُمۡ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الۡمَوۡتُ اِنۡ تَرَكَ خَيۡرَا ۨ الۡوَصِيَّةُ لِلۡوَالِدَيۡنِ وَالۡاَقۡرَبِيۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ حَقًّا عَلَى الۡمُتَّقِيۡنَ﴾

۱) ''تم پر فرض ہوا کہ جب تم میں کسی کو موت آئے اگر کچھ مال چھوڑے تو وصیت کر جائے اپنے ماں باپ اور قریب کے رشتہ داروں کے لئے موافق دستور یہ واجب ہے پرہیز گاروں پر''۔

۲) ''فرض کیا گیا تم پر جب حاضر ہو تم میں سے کسی ایک پر موت اگر چھوڑے کچھ مال تو وصیت کرے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لئے اچھی طرح ثابت ہے پرہیز گاروں پر''۔

شان نزول: آیۃ میراث جو سورۃ نساء میں ہے اس کے نازل ہونے سے پہلے جو شخص فوت ہونے کے قریب ہوتا اس پر لازم تھا کہ وہ اپنے والدین اور قریبی رشتہ داروں کیلئے عدل وانصاف سے وصیت کر جائے تاکہ ان کو مال ان کے رشتوں کے لحاظ سے مناسب مقدار میں مل جائے۔ پھر رب تعالیٰ نے وراثت کے حصہ داروں کا خود ہی حصہ مقرر فرما دیا جس کی وجہ سے وصیت کرنے کی فرضیت منسوخ ہوگئی خصوصاً ورثاء کے لئے وصیت کرنا منع قرار دے دیا گیا۔

حدیث پاک سے اس آیۃ کی منسوخیت: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

'' ان الله قد اعطى كل ذى حق حقه ولا وصية لوارث ''

''بیشک اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب حق کو (وراثت سے) حق دے دیا، وارث کے لئے کوئی وصیت نہیں''۔

اعتراض: یہ حدیث خبر واحد ہے خبر واحد سے قرآن پاک کی آیۃ کو منسوخ کرنا درست نہیں اس حدیث کے متعلق صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسے امت نے قبول کیا ہے '' والحديث من الآحاد تلقى الامة له بالقبول لا يلحقه بالمتواتر '' خبر واحد کو اگر امت قبول کرلے تو وہ خبر متواتر نہیں بن جاتی۔

نیز اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے ذکر نہیں کیا ان کا نہ ذکر کرنا دلیل ہے اس پر کہ یہ حدیث قابل حجت نہیں اور آیۂ میراث میں صراحۃً منسوخیت کا ذکر ہی نہیں تو منسوخ کرنا کیسے صحیح ہے۔

(از بیضاوی)

پہلا جواب: آیۃ میراث میں ورثاء کے حصے مقرر کر دیئے گئے اس سے اتنا پتہ چل گیا کہ اب مرنے والے کو حصے مقرر نہیں کرنے۔ حدیث پاک سے آیۃ میراث کو تائید مل گئی اور حدیث پاک ناسخ بن گئی جہاں تک یہ اعتراض ہے کہ حدیث خبر واحد ہے ناسخ نہیں بن سکتی اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث خبر واحد نہیں بلکہ مشہور ہے اگرچہ صحابہ کرام کے دور میں درجہ احاد میں ہے لیکن تابعین اور تبع تابعین کے دور میں اس کے راوی کثیر ہو گئے۔

" وان الاحناف یجوزون النسخ بالحدیث المشهور احد قسمی المتواتر عند ابی یوسف رحمه الله فیجوز نسخ الکتاب به "

یہ حدیث مشہور ہے اور مشہور حدیث قرآن پاک کے لئے ناسخ ہے کیونکہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک متواتر کی دو قسمیں ہیں یا اس کا تواتر صحابہ کرام کے زمانہ سے ثابت ہوگا یا تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ میں تواتر ثابت ہوگا۔ یہی دوسری قسم متواتر کی وہ قسم ہے جس سے نسخ قرآن جائز ہے۔

(از شیخ زادہ)

دوسرا جواب: ہم کہتے ہیں کہ آیۃ میراث سے اتنا پتہ چل گیا کہ ورثاء کے حقوق رب تعالیٰ نے خود مقرر فرمادیئے ہیں قریب المرگ شخص کو ان کے لئے وصیت نہیں کرنا۔

حدیث پاک سے یہ ثابت ہو گیا کہ وارث کے لئے وصیت جائز نہیں۔ حدیث پاک سے ثابت ہونے پر اجماع امت ہو گیا کہ وراث کے لئے وصیت جائز نہیں۔ اجماع امت ناسخ ہے جیسا کہ مؤلفۃ قلوب کا حق زکوۃ میں اجماع امت سے منسوخ ہے۔

جہاں تک یہ کہنا ہے کہ بخاری اور مسلم نے اس حدیث کو نہیں ذکر کیا لہذا یہ حدیث قابل حجت نہیں۔ یہ قول معتبر ہی نہیں۔ حدیث کی سند کو دیکھنا مقصود ہوتا ہے یہ مقصود ہی نہیں کہ فلاں کتب میں آنا ضروری ہے آیئے اس حدیث کی اسناد اور کتب احادیث کو دیکھیں کہ یہ حدیث کس درجہ کی ہے۔

" ونور دهھنا احادیث یصلح ان یکون سندا للاجماع منها حدیث ابی امامة الباهلی قال سمعت رسول الله ﷺ یقول فی خطبة حجة الوداع ان الله قد اعطی کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث "

(رواہ ابو داؤد والترمذی والنسائی وابن ماجہ وقال الحافظ حسن الاسناد)

ہم چند احادیث ذکر کرتے ہیں جو اجماع امت کے لئے سند ہیں ان احادیث میں ایک حدیث ابوامامۃ باہلی نے روایت کی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو حجۃ الوداع میں ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب حق کو (وراثت میں) حق دے دیا ہے تو وارث کے لئے کوئی وصیت نہیں۔ اس حدیث کو ابوداؤد اور ترمذی اور نسائی اور ابن ماجہ نے بیان کیا ہے یہ حدیث سند کے لحاظ پر حسن ہے:

" وكذا رواه احمد والترمذى والنسائى وابن ماجه من حديث عمرو بن خارجه "

اسی طرح یہ حدیث احمد اور ترمذی اور نسائی اور ابن ماجہ نے عمرو بن خارجہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے " ورواه ابن ماجه من حديث سعيد بن سعيد عن انس " اور یہی حدیث ابن ماجہ نے سعید بن سعید کی روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی ذکر فرمائی ہے:

" والبيهقى من طريق الشافعى عن ابن عيينة عن سليمان الاحول عن مجاهد ان رسول الله ﷺ قال لا وصية لوارث "

بیہقی نے امام شافعی رحمہ اللہ سے انہوں نے ابن عیینہ سے انہوں نے سلیمان احوال سے انہوں نے مجاہد سے روایت ذکر کی ہے بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "وارث کیلئے وصیت نہیں"۔

(ماخوذ از مظهری)

یہاں تک جو بحث ذکر کی ہے اس سے پتہ چل گیا کہ والدین کے لئے اور قریبی رشتہ داروں کے لئے وصیت کرنا فرض تھا جو منسوخ ہو گیا۔

اب اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بلا غبار سمجھ آئے گا کیونکہ آپ نے "خیرا" کا ترجمہ کیا ہے "کچھ مال" اور "حقا" کا ترجمہ کیا ہے "واجب" اس لئے کہ جب وصیت فرض تھی اس وقت جتنا مال بھی ہوتا اس میں وصیت فرض تھی اس میں قلیل وکثیر کی کوئی حد نہیں تھی۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ :

﴿ اِذَا حَضَرَ ﴾ سے مراد موت کے آثار جب ظاہر ہوں۔

اِنْ تَرَكَ خَيْرَ نِ الْوَصِيَّةُ : ﴿ خَيْرًا ﴾ سے مراد مال ہے جیسا کہ ﴿ قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ ﴾ سے مراد مال ہے ﴿ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ﴾ میں بھی خیر سے مراد مال ہے۔

لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ : ﴿ اَقْرَبِيْنَ ﴾ سے مراد قریبی رشتہ دار ہیں بالمعروف سے مراد عدل وانصاف سے اسی لئے اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا ہے موافق دستور۔

راقم نے ظاہری معنی کر دیا ہے اچھے طریقہ سے یعنی شرعا جو اچھا طریقہ ہوگا اس میں یقیناً عدل وانصاف ہوتا ہی ہے۔ مفہوم کافی حد تک واضح ہو گیا کہ تم پر وصیت کرنا فرض قرار دے دیا گیا ہے جب تم پر آثار موت ظاہر ہوں وہ وصیت اس وقت فرض ہوگی جب تمہارا مال پیچھے رہ رہا ہوگا۔ اور وہ وصیت والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لئے ہے۔

حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ : اعلیٰ حضرت نے ﴿ حَقًّا ﴾ کا معنی ''واجب'' کیا ہے اور راقم نے لغوی معنی کیا ہے ''ثابت'' بظاہر وہم ہوتا ہے کہ یہ حکم عام ہے صرف متقین کے ساتھ خاص نہیں تو متقین کا ذکر کیسے صحیح ہے؟ تو اس کا ایک جواب یہ دیا گیا ہے ﴿ والمراد بالمتقين المؤمنون ﴾ متقین سے مراد مومنین ہیں۔ یعنی ذکر خاص اور مراد عام ہے البتہ متقین ذکر کر کے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ہر مومن کو چاہئے کہ وہ تقویٰ اختیار کرے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر چہ حکم عام ہے لیکن متقین کا ذکر کر کے یہ بتایا گیا ہے:

''ان المحافظة على الوصية والقيام بها من شعائر المتقين الخائفين من الله تعالىٰ''

کہ وصیت پر عمل کرنا اور اس کے حقوق کی حفاظت کرنا متقین کی علامت ہے یہ کام وہی کرتے ہیں جن کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہو اور تقویٰ حاصل ہو۔ (ماخوذ از روح المعانی)

وہ وصیت جو منسوخ نہیں: مطلقاً وصیت کرنا منسوخ نہیں بلکہ مستحب ہے البتہ اس کیلئے تین شرطیں ہیں:

(۱) وہ وصیت ورثا کے لئے نہ ہو۔ (۲) مال کثیر ہو۔ (۳) تیسرے حصہ مال سے زیادہ کی وصیت نہ ہو۔ ورثاء کے لئے وصیت کی ممانعت پہلے احادیث مبارکہ سے ثابت کی جا چکی ہے۔

کثیر مال میں وصیت کرے:

''عن عروة ان عليا كرم الله تعالىٰ وجهه دخل على مولى له في الموت وله سبعمائة درهم او ستمائة درهم فقال الا اوصي ؟ قال لا انما قال الله تعالىٰ (ان ترك خيرا) وليس لك كثير مال فدع مالك لورثتك'' (رواه البيهقي)

حضرت عروہ سے مروی ہے کہ بیشک حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے آزاد کردہ غلام کے پاس (عیادت) کے لئے تشریف لے گئے جب اس پر آثار موت واقع ہو رہے تھے اس کے پاس سات سو یا چھ سو درہم تھے اس نے پوچھا کیا میں وصیت نہ کر جاؤں؟ آپ نے فرمایا نہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اِنْ تَرَکَ خَیْرَا ﴾ جب کثیر مال ہو تو اسے " خیر " کہا جاتا ہے اور تمہارے پاس کثیر مال نہیں اس لئے تم وہ مال اپنے ورثاء کے لئے چھوڑ جاؤ۔

" عن عائشة رضی الله عنها ان رجلا قال لها اريد ان اوصی قالت كم مالک ؟ قال ثلاثة آلاف قالت كم عيالک ؟ قال اربعة قالت قال الله تعالیٰ (ان ترک خيرا) وهذا لشئی يسير فاتركه لعيالک فهو افضل "

(رواه ابن ابی شيبة)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ بیشک ایک شخص نے آپکی خدمت میں عرض کیا میں وصیت کرنا چاہتا ہوں آپ نے پوچھا تمہارا مال کتنا ہے؟ تو اس نے کہا تین ہزار درہم پھر آپ نے پوچھا تمہارے عیال کتنے ہیں؟ اس نے کہا چار افراد ہیں آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ﴿ اِنْ تَرَکَ خَیْرَ ﴾ '' وہ تو کثیر مال مراد ہے '' اور تمہارا یہ مال تھوڑا ہے بہتر یہی ہے کہ تم اپنے عیال کیلئے چھوڑ دو۔

فائدہ : " والظاهر من هذا ان الكثرة غير مقدرة بمقدار بل تختلف باختلاف حال الرجل فانه بمقدار من المال يوصف رجل بالغنی ولا يوصف به غيره لكثرة العيال "

کتنا مال ہو جسے کثیر کہا جائے جس میں وصیت کرنا درست ہو؟ ظاہر یہ ہے کہ کثرت کے لئے مال کی کوئی حد مقرر نہیں بلکہ مال کو دیکھا جائے اور عیال کو دیکھا جائے اندازہ کرلیا جائے کہ اس مال سے فقراء وغیرہ کے لئے وصیت کرنے میں عیال جلدی ہی محتاج نہیں ہوں گے لوگوں سے ہاتھ نہیں پھیلائیں گے وہ مال کثیر ہے۔ ایک شخص کے عیال کم ہوں تو اس کے لئے جو مال کثیر ہوگا وہی دوسرے شخص کیلئے قلیل ہوگا جس کے عیال زیادہ ہوں گے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے نزدیک کثرت کی حد:

عبد بن حمید نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تقدیر کو بیان کیا ہے کہ وہ اس حد کے قائل تھے " من لم يترک ستين دينار رالم يترک خيرا " جس شخص نے ساٹھ دینار نہیں چھوڑے

اس نے ''خیر'' ''مال کثیر'' نہیں چھوڑا۔ (ماخوذ از روح المعانی)

راقم کے نزدیک ممکن ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول بھی کسی شخص کے حال کو دیکھ کر ہو اس طرح حد مقرر نہ ہونے کا قول اتفاقی ہو۔ (واللہ اعلم بالصواب)

تنبیہ: اگر آیۃ کریمہ میں صرف وصیت کی فرضیت اور ورثاء کے لئے وصیت کرنے کو منسوخ مانا جائے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما کے اقوال بغیر کسی تاویل کے صحیح رہیں گے کہ وصیت کرنا مستحب ہے وہ جب کہ کثیر مال ہو۔ (واللہ اعلم بالصواب)(راقم)

وصیت تہائی مال سے زیادہ نہ کرے:

"عن عامر بن سعد عن ابيه قال عادني رسول الله ﷺ في حجة الوداع من وجع اشفيت منه على الموت قلت يا رسول الله بلغ بي ما ترى من الوجع وانا ذومال ولا يرثني الا ابنة لي واحدة افأتصدق بثلثي مالي قال لا قلت افاتصدق بشطره قال لا الثلث والثلث كثير انك ان تذر ورثتك اغنياء خير من ان تذرهم عالة يتكففون الناس ولست تنفق نفقة تبتغي بها وجه الله الا اجرت بها حتى اللقمة تجعلها في في امرأتك قال قلت يا رسول اخلف بعد اصحابي قال انك لن تخلف فتعمل عملا تبتغي به وجه الله الا ازددت به درجة ورفعة ولعلك تخلف حتى ينفع بك اقوام ويضربك آخرون اللهم امض لا صحابي هجرتهم ولا ترد على اعقابهم لكن البائس سعد بن خولة قال رثى له رسول الله ﷺ من ان توفي بمكة" (مسلم ج ۲ كتاب الوصية)

حضرت عامر بن سعد نے اپنے باپ سے روایت کی وہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع میں میری عیادت کی جب کہ میں درد کی وجہ سے موت کے کنارے پر پہنچا ہوا تھا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے جو درد تکلیف لاحق ہے وہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں اور میں مالدار شخص ہوں اور میری بیٹی کے سوا میرا اور کوئی وارث نہیں کیا میں اپنے مال کے دو تہائی حصے صدقہ کر دوں؟ آپ فرمایا نہیں میں نے عرض کیا کیا میں نصف مال صدقہ کر دوں؟ آپ نے فرمایا نہیں (پھر آپ نے فرمایا) تہائی مال صدقہ کر دو، تہائی بہت ہے بیشک تمہارا ورثا کو غنی چھوڑ کر جانا اس سے بہتر ہے کہ تم ان کو حاجت مند چھوڑ

جاؤ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہیں۔ تم کوئی مال اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے خرچ نہیں کرو گے سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اجر عطا فرمائے گا یہاں تک کہ تم اپنی زوجہ کے منہ میں جو لقمہ ڈالو گے (اس کا اجر وثواب بھی تمہیں حاصل ہوگا) میں نے کہا یا رسول اللہ کیا میں اپنے دوستوں کے پیچھے یہاں ہی رہ جاؤں گا؟ آپ نے فرمایا بیشک تم ہرگز پیچھے نہیں رہو گے بلکہ تم اللہ تعالیٰ کی رضاء کی خاطر عمل کرو گے جس سے تمہارے درجات بلند ہوں گے اور تمہیں رفعت حاصل ہوگی (تم ابھی پیچھے رہو گے یعنی تم نے ابھی زندہ رہنا ہے) یہاں تک کہ تمہارے ذریعے بعض قوموں کو فائدہ ہوگا اور بعض دوسرے لوگوں کو تمہاری وجہ سے نقصان ہوگا۔ (پھر حضور ﷺ نے دعا فرمائی) اے اللہ میرے اصحابہ کو ہجرت پر جاری رکھ (یعنی انہوں نے جہاں سے ہجرت کی وہاں ان کو موت نہ آئے) کہ وہ اپنے ایڑیوں پر نہ لوٹیں۔ لیکن افسوس تو سعد بن خولہ پر ہے رسول اللہ ﷺ نے ان پر اظہار تعزیت کیا کہ ان کی وفات مکہ میں ہوگئی۔

وضاحت حدیث: اس حدیث پاک سے ایک مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ مریض کی عیادت مستحب ہے۔ اور یہ ثابت ہوا کہ حاکم (امام) کے لئے بھی مریض کی عیادت کرنا ایسے ہی مستحب ہے جیسے کہ عام افراد کے لئے مستحب ہے۔ " **اشفیت منه علی الموت** " یہ ماخوذ ہے " **شفا** " (**بفتح الشین**) سے جس کا معنی ہے کنارہ۔ معنی یہ ہے کہ میں اس تکلیف کی وجہ سے موت کے کنارے پر تھا یعنی موت کے قریب تھا۔ ابن قتیبہ کا قول یہ ہے کہ " **اشفی** " کسی تکلیف وغیرہ پریشان کن چیز کے کنارے پر ہونے کو کہا جاتا ہے۔ کسی اچھی چیز کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔ اس لئے " **اشقی علی الجنة** " (میں جنت کے کنارے پر ہوں) نہیں کہا جائے گا " **الوجع** " کا اگرچہ معنیٰ "درد" ہے لیکن ابراہیم حربی کہتے ہیں " **الوجع اسم لکل مرض** " کہ ہر قسم کی بیماری کو " **وجع** " کہا جاتا ہے۔ اور مسئلہ یہ سمجھ آیا کہ جائز ہے مریض اپنی مرض کا ذکر کرے مقاصد اس کے صحیح ہوں دوا حاصل کرنے کے لئے ذکر کرے یا کسی نیک آدمی سے دعا کرانا مقصود ہو یا وصیت کرنا مقصود ہو یا اپنے حال کے متعلق فتویٰ طلب کرنا مقصود ہو اس طرح کے اور نیک جائز مقاصد کے لئے مرض کا ذکر کرنا درست ہے۔

" **وانما یکره من ذلک ما کان علی سبیل التسخط ونحوه فانه قادح فی اجر مرضه** "

مکروہ اس وقت ہے کہ مرض کو اچھا نہ سمجھے ناراضگی کے طور پر دل تنگی کے طور پر ذکر کرے یہ عیب ہے مرض کے اجر و ثواب میں کمی کا باعث ہے " **وانا ذومال** " اگر چہ اس کا ظاہری معنی صرف صاحب مال ہوتا ہے لیکن عرف میں زیادہ مال کا مالک ہونا معتبر ہے اور ان الفاظ سے ہی یہ سمجھ آیا کہ " **ھذا دلیل علی اباحۃ جمع المال** " یہ دلیل اس پر ہے کہ جائز طریقہ سے مال جمع کرنا جائز ہے۔ " **لا یرثنی الا ابنۃ لی** " سوائے میری بیٹی کے میرا کوئی وارث نہیں۔

اعتراض : حضرت سعد کے ورثاء تو اور بھی تھے بلکہ حدیث کا روای ہی آپ کا بیٹا ہے تو یہ کہنا کیسے درست ہے کہ ان کا سوائے بیٹی کے کوئی اور وارث نہیں تھا؟

جواب : " **وقیل معناہ لا یرثنی من اصحاب الفروض** " بعض حضرات نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے یہ فرمایا کہ ان کا کہنا "میرا کوئی وارث نہیں سوائے بیٹی کے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اصحاب فروض سے میرا کوئی وارث نہیں سوائے بیٹی کے۔

" **والثلث کثیر** " نبی کریم ﷺ نے تہائی مال کی وصیت کی اجازت فرمائی۔ اور تہائی مال کو کثیر کہا۔ " **وفی ھذا الحدیث مراعاۃ العدل بین الورثۃ والوصیۃ** " اس حدیث پاک سے ورثاء اور وصیت کے درمیان عدل کرنے کا حکم دیا گیا۔ علماء نے بیان کیا ہے کہ ورثا اگر غنی ہوں تو تہائی حصہ مال کی وصیت کرنا چاہتا ہے تو کر دے لیکن جب اس کے ورثا فقیر، حاجت مند ہوں تو تہائی حصہ سے کم کی وصیت کرے۔ ہاں اگر تمام ورثا متفق ہو کر اسے کل مال کی وصیت کرنے کی اجازت دے دیں تو اس کے لئے جائز ہے کل مال کی وصیت کر جائے۔ اور نبی کریم ﷺ کا یہ فرمانا کہ تمہارا ورثا کو غنی چھوڑ کر جانا بہتر ہے فقیر چھوڑ کر جانے سے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہیں اسی سے واضح ہوا:

" **وفی ھذا الحدیث علی صلۃ الارحام والاحسان الی الاقارب والشفقۃ علی الورثۃ وان صلۃ القریب الاقرب والاحسان الیہ افضل من الابعد** "

اس حدیث میں صلہ رحمی کرنے اور قریبی رشتہ داروں پر احسان کرنے اور ورثا پر شفقت کرنے پر برانگیختہ کیا گیا ہے۔ اسی حدیث پاک سے یہ واضح ہوا کہ جتنا زیادہ رشتہ دار قریبی ہوگا اس کے ساتھ صلہ رحمی کرنا اور اس پر احسان کرنا دور والے رشتہ دار پر احسان کرنے سے افضل ہے۔

" واستدل به بعضهم علی ترجیح الغنی علی الفقیر "

بعض حضرات نے اسی حدیث پاک سے یہ ثابت کیا ہے کہ رشتہ دار غنی کو (نفلی) صدقہ دینا زیادہ بہتر ہے بنسبت اجنبی فقیر کے۔

طلباء کرام توجہ فرمائیں: " فی فی امرأتک " میں پہلا "فی" حرف جار ہے اور دوسرا "فی" اسماء ستہ مکبرہ سے ہے جس کی رفعی حالت میں " فو " اور نصبی حالت میں " فا " اور جری حالت میں " فی " پڑھا جاتا ہے جس کا معنی ہے "منہ" نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے جو مال تم خرچ کرو گے اس میں تمہیں اجر حاصل ہوگا یہاں تک کہ تم اپنی زوجہ کے منہ میں لقمہ ڈالو (تو اس کا اجر بھی تمہیں ملے گا) اسی سے یہ سمجھ آ گیا کہ نیکی کی راہ کوئی بھی ہو اس میں مال خرچ کرنا باعث اجر وثواب ہوگا دارومدار نیت پر ہے:

" وفیه ان الانفاق علی العیال یثاب علیه اذا قصد به وجه الله تعالیٰ "

اور اسی حدیث سے یہ بھی سمجھ آ گیا کہ عیال پر مال خرچ کرنا اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے باعث ثواب ہے۔

فائدہ عظیمہ : " ان المباح اذا قصد به وجه الله تعالیٰ صار طاعة ویثاب علیه "

بیشک مباح کام جب اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے کیا جائے تو وہ طاعت بن جاتا ہے اور اس پر ثواب حاصل ہوتا ہے۔

اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے زوجہ کے منہ میں اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے لقمہ ڈالنا باعث ثواب قرار دیا حالانکہ انسان کو زوجہ سے دنیاوی تعلقات حاصل ہوتے ہیں اس سے خواہشات حاصل کرتا ہے اور زوجہ سے کھیل وغیرہ میں لذت حاصل ہوتی ہے یہ مباح کام ہیں۔ جب کہ زوجہ کے منہ میں لقمہ ڈالنے کی اصل وجوہ یہی ہیں لیکن نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ کی رضاء کے لئے زوجہ کے منہ میں لقمہ ڈالنا باعث اجر وثواب قرار دیا۔

" ویتضمن ذلک ان الانسان اذا فعل شیاء اصله علی الا باحة وقصد به وجه الله تعالیٰ یثاب علیه "

یہ حدیث اس کو متضمن ہے (یہ مسئلہ اپنے اندر لئے ہوئے ہے) کہ بیشک انسان جب مباح کام کرے اور اس میں ارادہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا کرے تو اسے ثواب حاصل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی طاعت کے لئے اور تقوی حاصل کرنے کے لئے کھانا بھی باعث ثواب ہے اس غرض سے سونا کہ نیند کا غلبہ اور سستی ختم ہو جائے اور میں جاگ کر تازہ دم ہو کر عبادت چستی سے کرسکوں تو سونا بھی باعث ثواب ہے زوجہ سے اس لئے نفع حاصل کرنا کہ حرام کاری سے بچ جائے تو زوجہ سے منافع حاصل کرنا بھی اجر و ثواب کا باعث ہیں۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے "**وفی بضع احدکم صدقة**" تمہاری زوجہ کی بضع میں تمہارے لئے ثواب ہے۔ اس کا بھی یہی مطلب ہے جو ترجمہ سے واضح ہے۔

" **اخلف بعد اصحابی قال انک لن تخلف فتعمل عملا تبتغی به وجه الله تعالیٰ الا ازددت به درجة ورفعة** "

حضرت سعد کا یہ کہنا کیا میں اپنے ساتھیوں کے پیچھے رہ جاؤں گا اس سے مراد ان کا مکہ میں رہ جانے پر ڈر تھا اس کی چند وجوہ تھیں ایک وجہ یہ تھی وہ ڈر رہے تھے کہ میری موت مکہ کرمہ میں آ گئی تو کہیں میری ہجرت کے ثواب میں کمی نہ آ جائے کیونکہ دوسری روایت اس کی تائید بھی کرتی ہے **اخلف عن هجرتی** کیا میں اپنی ہجرت سے پیچھے رہ جاؤں گا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ ڈر اس بات کا تھا کہ میں بیمار ہوں میں یہاں مکہ مکرمہ میں رہ جاؤں گا اور نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام تشریف لے جائیں گے یعنی اصل ان کے مکہ مکرمہ میں رہ جانے کے ڈر کی وجہ یہ تھی کہ میں آپ کے فراق کو کیسے برداشت کروں گا۔ "**ولعلک تخلف حتی ینفع بک اقوام**" نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم تو ابھی باقی رہو گے تم سے کئی قومیں نفع حاصل کریں گی۔ یہ آپ کا معجزہ ہے کیونکہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ فتح عراق تک زندہ رہے آپ کے ذریعے کئی قوموں نے دین اور دنیا میں نفع حاصل کیا۔

اسی حدیث سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ نیک اعمال کے لئے زیادہ عمر حاصل ہونا افضل ہے اسی طرح جس عمر میں اللہ تعالیٰ کی رضاء کی خاطر کام کئے جائیں وہ عمر بھی افضل ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کا حضرت سعد کو یہ فرمانا کہ کئی لوگوں کو تم سے نقصان ہوگا آپ کا یہ ارشاد بھی واقع ہو کر رہا کیونکہ کئی کافران

کے ہاتھوں قید ہوئے کئی قتل ہوئے ، اسی طرح کافروں کی عورتوں کو انہوں نے قید کر لیا۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو عراق کا والی بنایا۔ اسی دوران آپ کے ہاتھ پر کئی لوگ بیعت کر کے مسلمان ہوئے اور کافروں کو آپ کے ہاتھوں نقصان ہوا۔ (ماخوذ از نووی)

وصیت کی اہمیت: وصیت کرنا اگرچہ مستحب ہے عمل کرے تو ثواب ہے عمل نہ کرے تو گناہ نہیں تاہم نبی کریم ﷺ نے وصیت کو اہم قرار دیا:

" عن سالم عن ابیه انه سمع رسول الله ﷺ قال ما حق امرئ مسلم له شئی یوصی فیه یبیت ثلاث لیال الا و وصیته عنده مکتوبة قال عبد الله بن عمر ما مرت علی لیلة منذ سمعت رسول الله ﷺ قال ذلک الا وعندی وصیتی " (مسلم ج ۲ کتاب الوصیة)

حضرت سالم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ کسی مسلمان کو حق نہیں پہنچتا کہ جس مال میں اس نے وصیت کرنی ہے تو تین راتیں اسی طرح گزار دے مگر یہ کہ اس کے وصیت لکھی ہوئی ہونی چاہئے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جب سے میں نے نبی کریم ﷺ کا ایہ ارشاد سنا تو مجھ پر کوئی رات نہیں گزری مگر یہ کہ میرے پاس وصیت لکھی ہوئی موجود رہی۔

مستحب یہ ہے کہ وصیت جلدی لکھ دے اور اپنی صحت میں وصیت کر دے اور اس پر گواہ بنا لے۔ ہر دن کے چھوٹے چھوٹے معاملات اور جزی جزی امور کے مطابق وصیت لکھنے کا حکم دینا وسعت سے زائد امر ہے " **تکلیف ما لا یطاق** " (یعنی جن کاموں کی طاقت نہ ہو ان کی تکلیف دینا) منع ہے۔
(از نووی)

وصیت کے متعلق کچھ مسائل: وصیت تہائی حصہ مال سے زائد جائز نہیں لیکن اگر تمام ورثا بالغ ہوں اور تمام ہی اجازت دے دیں تو تیسرے حصہ سے زائد وصیت بھی جائز ہے۔ تیسرے حصہ سے زائد کی وصیت کی ممانعت ورثا کو نقصان پہنچانے کی وجہ سے ہے۔

" عن ابن عباس عن النبی ﷺ قال الاضرار فی الوصیة من الکبائر "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وصیت میں (ورثاء) کو

نقصان پہنچانا کبیرہ گناہ ہے۔ (دارقطنی)

" وقد جاء فی الحدیث الحیف فی الوصیة من اکبر الکبائر " (ابن مردویہ)

حدیث پاک میں ہے وصیت میں ظلم کرنا بہت بڑا گناہ ہے (وصیت میں ظلم کرنے کا یہی مطلب ہے کہ تیسرے حصہ سے زائد وصیت کرنا ورثاء پر ظلم ہے)۔

مسئلہ واضح ہو گیا کہ وصیت تیسرے حصہ زائد مال سے منع اس لئے ہے کہ ورثا کا نقصان نہ ہو جب تمام ورثا اجازت دے رہے ہوں اور بالغ ہوں تو یقیناً تہائی سے زائد کی وصیت جائز ہے کیونکہ اصحاب حقوق نے اپنے حق میں کمی کی اجازت دے دی۔ بلکہ ورثا کی اجازت سے کل مال کی وصیت کرنا بھی جائز ہے کیونکہ اپنا حق مکمل ختم کرنے کا بھی اختیار ہے۔

تنبیہ : ورثا کی اجازت اس شخص کی موت کے بعد قابل قبول ہے اس لئے کہ ان کو وراثت میں جب حق مل جائے گا تو وہ اپنے حق میں تصرف کرسکیں گے۔ لیکن اس شخص کی موت سے پہلے ان کو حق وراثت ہی نہیں ملا تو ان کی اجازت کا کوئی اعتبار نہیں۔ موت کے بعد وصیت کی اجازت دینے کا کیا مطلب؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے کل مال کی وصیت کردی تھی یا تہائی حصہ سے زائد کی پھر وہ فوت ہو گیا اس کی وفات کے بعد تمام ورثاء نے اجازت دے دی کہ وہ جو وصیت کر گیا ہے ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں تو وہ وصیت جاری ہو جائے گی اگر ورثا نے اجازت نہ دی تو وہ وصیت رد ہو جائے گی۔

(ماخوذ از هدایة مع عنایة)

مسئلہ : وارث کیلئے وصیت کرنا جائز نہیں لیکن اگر کوئی شخص کسی وارث کیلئے وصیت کر کے فوت ہو گیا اسکی وفات کے بعد اس کے ورثاء اجازت دے دیں تو وصیت جائز ہوگی اس وارث کو وصیت کے مطابق مال حاصل ہو جائے گا لیکن اگر ورثاء نے اجازت نہ دی تو وہ وصیت رد ہو جائیگی۔ (ماخوذ از ہدایہ)

مسئلہ : مسلمان ذمی کے لئے وصیت کرے یا ذمی مسلمان کے لئے وصیت کرے جائز ہے جس طرح زندگی میں نفلی صدقات دینا جائز ہے اسی طرح موت کے بعد جاری کرنا بھی جائز ہے۔ لیکن جواز اور اولویت (بہتری) میں فرق ذہن میں رہے اگرچہ جائز ہے لیکن ثواب حاصل نہیں ہونا ثواب اسی وقت حاصل ہوگا جب مسلمان کے لئے وصیت کرے یا کسی اور کار خیر کے لئے وصیت کرے۔ اسی سے

یہ بھی واضح ہو گیا کہ وصیت اور وراثت کے احکام میں فرق ہے۔ وصیت ذمی کفار کے لئے جائز ہے وراثت جائز نہیں کیونکہ کافر مسلمان کا یا مسلمان کافر کا وارث نہیں بن سکتا۔ (ماخوذ از ھدایہ مع عنایۃ)

مسئلہ : تہائی حصہ تک وصیت جائز ہے لیکن تہائی حصہ سے کم وصیت کرنا بہتر ہے:

" روی عن ابی بکر وعمر انهما قالا لان یوصی بالخمس احب الینا من یوصی بالربع ولان یوصی بالربع احب الینا من ان یوصی بالثلث "

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مال کے پانچویں حصہ کی وصیت کرنا ہمارے نزدیک محبوب ہے بنسبت چوتھے حصہ مال کی وصیت کرنے سے اور تہائی حصہ کی وصیت کرنے سے ہمیں زیادہ پسند یہ ہے کہ چوتھے حصہ کی وصیت کرے۔ (کفایہ باب الایصاء)

مسئلہ : اگر کوئی شخص کسی کو جان بوجھ کر یا خطاء کے طور پر زخمی کردے وہ زخمی ہونے والا اسی شخص کے حق میں مال کی وصیت کردے جس نے اسے زخمی کیا پھر ان زخموں سے ہی وہ مرجائے تو یہ وصیت جائز نہیں بلکہ رد ہو جائے گی " عن علی ابن ابی طالب قال قال رسول الله ﷺ **لیس لقاتل وصیة** "

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قاتل کے لئے وصیت نہیں۔ (از ہدایہ مع حاشیۃ)

مسئلہ : جس شخص کے حق میں وصیت کی گئی وصیت کرنیوالے کی وفات کے بعد اسے قبول کرنے اور رد کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے جب تک قبول نہ کرے وہ مالک نہیں بنے گا ہاں ایک صورت میں اسے ملکیت حاصل ہوگی وہ یہ ہے کہ وصیت کرنیوالا فوت ہو جائے اور جس کے حق میں وصیت کی گئی وہ بھی اسکے پیچھے وصیت رد کرنے سے پہلے فوت ہو جائے تو وہ وصیت والے مال کا مالک ہو کر فوت ہوا۔ (از ہدایۃ)

مسئلہ : کسی آدمی نے اپنے مال کی وصیت کردی لیکن اس پر قرض اتنا ہے کہ تمام مال قرض کی ادائیگی میں خرچ ہو جاتا ہے تو اس صورت میں اس کا وصیت کرنا باطل ہو جاتا ہے۔ (از ہدایۃ)

مسئلہ : نابالغ بچے کا اپنے مال کی وصیت کرنا جائز نہیں۔ (ھدایۃ)

مسئلہ : مرنے والے شخص کے مال سے پہلے اس کی تجہیز و تکفین پر مال خرچ ہوگا پھر اس کا قرض اتارا جائے۔ پھر جو مال بچ جائے اس کے تہائی حصہ سے اس کی وصیت پر عمل کرے پھر باقی مال ورثا پر تقسیم کردیا جائے۔ (سراجی)

﴿ فَمَنْ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴾

۱) ''توجو وصیت کوسن سنا کر بدل دے اسکا گناہ انہیں بدلنے والوں پر ہے بیشک اللہ سنتا جانتا ہے''۔

۲) ''توجس شخص نے بدل دیا اسے بعد اس کے کہ اس نے سن لیا بیشک اس کا گناہ ان لوگوں پر ہے جنہوں نے اسے بدل دیا بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے''۔

جن لوگوں کو کہا گیا تھا کہ تم وصیت جاری کرو وہ لوگ ہی وصیت کو بدل دیں یا گواہ وصیت کو بدل دیں تو اس کا گناہ وصیت کے بدلنے والوں پر ہوگا۔ خواہ انہوں نے وصیت کرنے والے سے خود سنا تھا یا اس کا پیغام کسی نے بمع گواہوں کے پہنچایا۔ اس کے بعد وصیت کو بدلنا حق کو بدلنا ہے جو گناہوں کا سبب ہے بیشک اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے اس لئے اس کے عذاب سے کوئی بچ نہیں سکے گا۔

فَمَنْ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ : ضمیر منصوب بدلہ کی اور سمعہ کی وصیت کی طرف لوٹ رہی ہے وصیت کو ایصاء کے معنی میں لے کر یا اس سے مراد حکم لے کر ضمیر لوٹائی تا کہ یہ وہم نہ ہو کہ ضمیر مذکر کی وصیۃ مؤنث کی طرف کیسے لوٹائی گئی ہے۔ تبدیل کرنے والا کون ہے؟ یا تو وہ شخص جس کو وصیت جاری کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ مراد ہے کہ وہ لکھنے میں یا حقوق کے تقسیم کرنے میں تبدیلی کر دے۔ یا مراد گواہ ہیں کہ وہ گواہی جو دینی تھی اسے تبدیل کر کے گواہی دے دیں یا وہ گواہی چھپا کر تبدیل کر دیں یا اس سے مراد عام لوگ ہیں کہ وہ حقدار تک وصیت نہ پہنچنے دیں اس طرح وہ وصیت کو تبدیل کر دیں ﴿ بعد ما سمعه ﴾ سے مراد عام ہے کہ براہ راست سنیں یا بالواسطہ سنیں۔

فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ گناہ صرف ان لوگوں کو ہی ہوگا جو اس وصیت کو تبدیل کریں گے گواہوں وغیرہ میں سے جو لوگ تبدیل کرنے سے باز رہے وہ اس وعید سے بھی پاک ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ : بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

یعنی تبدیل کرنے والوں اور وصیت کرنیوالوں کے اقوال کو سنتا ہے اور ان کی نیات کو جانتا ہے۔

یہ الفاظ مبارکہ وصیت کرنے والوں اور وصیت کو جاری کرنے والوں اور گواہوں کے لئے وعید

بھی ہیں اور وعد بھی ہیں اگر ان میں ہر شخص نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق عمل کیا تو ان کیلئے اجر وثواب ہے یہ وعد ہے اور ان میں سے اگر کسی شخص نے رب تعالیٰ کے حکم سے عدولی کی تو وہ رب تعالیٰ کی گرفت میں آئے گا یہ وعید ہے۔ (راقم)

وصیت کرنے والوں کو حق میں وعد ہے کہ جب وہ صحیح وصیت کر کے فوت ہوں تو پھر وصیت جاری کرنے والے اور گواہ اس وصیت کو تبدیل کر دیں تو ان کے حق میں وعید ہے۔

فائدہ : اس آیۃ میں جب یہ ذکر ہوا کہ گناہ صرف تبدیل کرنے والے کو ہوگا جس کی وصیت کو تبدیل کیا گیا اسے کسی قسم کا کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ اسی سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ بچے کو اس کے ماں باپ کے کفر کی وجہ سے عذاب نہیں ہوگا۔ کافروں کے بچے مقام اعراف میں ہوں گے یا جنت میں ہوں گے اس میں اہل علم کے مختلف اقوال ہیں تاہم اتنی بات واضح اور راجح ہے کہ ان کو جہنم میں عذاب نہیں دیا جائیگا۔

اور یہ فائدہ حاصل ہوا کہ کسی شخص نے اپنے ورثا کو بتا دیا کہ مجھ پر اتنا قرض ہے وہ ادا کر دینا پھر اس کے مال سے ورثا نے قرض ادا نہ کیا تو کوتاہی کی وجہ سے گناہ ان کے ذمہ ہوگا مرنے والے پر کوئی گناہ نہیں کیونکہ وہ اتنا مال چھوڑ کر گیا کہ اس کا قرض ادا ہو سکتا تھا اور وصیت بھی اس نے کر دی تھی کہ میرا قرض ادا کر دینا۔

اور یہ فائدہ حاصل ہوا کہ کسی کے رونے پیٹنے سے میت کو عذاب نہیں ہوگا عقل کا بھی یہی تقاضا ہے کہ روئے پیٹے کوئی اور عذاب کسی اور کو ہو ایسا نہیں ہوگا۔ (از کبیر)

اعتراض : علامہ رازی رحمہ اللہ نے کیسے بیان کیا ہے " **ان المیت لا یعذب ببکاء غیرہ علیہ** " کہ بیشک میت کو دوسرے لوگوں کے رونے (چلانے، پیٹنے) سے عذاب نہیں ہوگا۔ حالانکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے " ان المیت یعذب ببکاء اھلہ علیہ " بیشک میت کو اسکے اہل کے رونے سے عذاب دیا جاتا ہے۔

جواب : زمانہ جاہلیت میں رواج تھا مرنے والا وصیت کر جاتا تھا کہ میرے مرنے کے بعد نوحہ کرنے والی عورتوں کو بلانا جو مجھ پر بین کر کے روئیں اس رونے سے میت کو عذاب دیا جائے گا۔ اور عذاب سے مراد مطلقاً تکلیف بھی ہو سکتی ہے کہ میت درحقیقت پھر سے زندگی سے متصف ہو جاتا ہے جیسا زندہ شخص کو رونے چلانے سے تکلیف ہوتی ہے ایسے ہی میت کو بھی تکلیف ہوتی ہے اس سے مراد حقیقی عذاب نہ ہو واضح ہوا کہ حدیث پاک اور علامہ رازی رحمہ اللہ کے قول میں کوئی تعارض نہیں۔ (ماخوذ از مرقاۃ، نووی)

﴿ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾

۱) ''پھر جسے اندیشہ ہوا کہ وصیت کرنے والے نے کچھ بے انصافی یا گناہ کیا تو اس نے اس میں صلح کرادی اس پر کچھ گناہ نہیں بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے''۔

۲) ''پھر جو شخص خوف رکھے وصیت کرنے والے سے بے انصافی یا گناہ کی تو اس نے صلح کرادی تو اس پر کوئی گناہ نہیں بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے''۔

اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں وصیت بدلنے والے کے لئے رب تعالیٰ کی طرف سے وعید پائی گئی ہے لیکن وہ تبدیلی حق سے باطل کی طرف تھی اب اس آیۃ کریمہ میں وصیت کو باطل سے حق کی طرف بدلنے کی اجازت دی گئی ہے کیونکہ اصلاح کی غرض سے بدلنا مستحسن (اچھا) ہے۔ اصلاح خود ہی تبدیلی اور تغیر کا تقاضا کرتی ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس تبدیلی (یعنی جو اصلاح کی غرض سے ہو) اور پہلی تبدیلی (جو باطل طریقہ سے ہو) میں فرق بیان فرمایا کہ کوئی شخص جہالت کی وجہ سے دونوں کا حکم ایک نہ سمجھ لے بلکہ حق سے باطل کی طرف تبدیلی باعث گناہ ہے اور باطل سے حق کی طرف تبدیلی میں کوئی گناہ نہیں بلکہ ثواب ہے۔ (از کبیر)

" قال مجاهد معناه ان الرجل اذا حضر مريضا وهو يوصى فرآه يميل عن الحق فامره بمعروف ونهاه عن منكر "

حضرت مجاہد کہتے ہیں آیۃ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی مریض کے پاس حاضر ہو وہ مریض وصیت کررہا ہو یہ شخص دیکھے کہ مریض وصیت کرنے میں حق راہ سے اعراض کررہا ہے تو یہ اس کو اچھے کاموں کا حکم دے اور برے کاموں سے روکے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو تہائی حصہ مال سے زائد کی وصیت سے منع فرمایا اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے مال کے کم ہونے کی وجہ سے مطلقا وصیت کرنے سے ہی منع فرمایا۔

(از مظہری)

ایک اور روایت ملاحظہ فرمائیں:

" عن النعمان بن بشير ان اباه اتى به الى رسول الله ﷺ فقال انی نحلت ابنی هذا غلاما فقال اكل ولدک نحلت مثله قال لا قال فارجعه "

نعمان بن بشیر فرماتے ہیں بیشک ان کے باپ ان کو رسول اللہ ﷺ کے پاس لائے تو کہا کہ بیشک میں نے اپنے اس بیٹے کو غلام بطور عطیہ دے دیا۔ تو آپ نے فرمایا کیا آپ نے اپنی تمام اولاد کو اسی طرح عطیہ دیا ہے؟ صحابی نے عرض کیا نہیں یا رسول اللہ تو آپ نے فرمایا کہ یہ عطیہ لوٹا لو۔ ایک روایت میں ہے کہ نعمان کی والدہ نے کہا تھا کہ میرے اس بیٹے کو خصوصی طور پر عطیہ دو اس عطیہ پر رسول اللہ ﷺ کو گواہ بنالو جب وہ اپنے بیٹے کو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لائے تا کہ اس پر آپ کو گواہ بنائیں تو آپ نے فرمایا " لا اشهد على جور " میں ظلم پر گواہ نہیں بنتا۔ (از مظہری و مسلم ج ۲ کتاب الوصیۃ)

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا :

" پھر جو شخص خوف رکھے وصیت کرنے والے سے بے انصافی یا گناہ کی"

الجنف : " الميل في الامور " امور میں میلان کرنے کو "جنف" کہا جاتا ہے " واصله العدول عن الاستواء " اصل میں برابری سے عدول کرنا ہے اسی معنی کے لحاظ سے اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا ہے " بے انصافی " راقم نے بھی وہی نقل کیا ہے۔ " جنف يجنف " باب علم يعلم کے وزن پر ہے " تنجانف " بھی میلان کرنے کو کہا جاتا ہے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ﴾ سوائے گناہوں کی طرف میلان کرنے کے۔

جنفاً اور اثماً میں فرق: "ان الجنف هو الخطأ من حيث لا يعلم به والاثم هو العمد "

اگر بے علمی سے بے انصافی ہو جائے خطا کے طور پر حق سے میلان ہو جائے تو اسے " جنف " کہا جاتا ہے اور ارادہ سے گناہ کرنے کو اثم کہا جاتا ہے۔

فَمَنْ خَافَ : کے معنی میں دو قول ہیں ایک یہ ہے کہ اس کا معنی ہے " فمن علم " جو شخص جان لے (یعنی اس کے علم میں آجائے) خوف اور خشیۃ دونوں علم کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں یعنی خوف سے مراد خاص حالت ہے جو خاص گمان سے حاصل ہوتی ہے یعنی آنے والے حضرات سے خوف زدہ

ہونے کا گمان ہی خوف کہلاتا ہے۔ پھر گمان بمعنی علم اور علم بمعنی ظن کے استعمال ہوتا رہتا ہے کیونکہ ظن اور علم کئی امور میں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں اب معنی یہ ہوگا کہ جب کسی کو معلوم ہو کہ میت نے وصیت میں خطا کی ہے یا جان بوجھ کر ظلم کیا ہے تو کوئی حرج نہیں کہ اسے بدل دے اور اس کی موت کے بعد اس میں اصلاح کر دے۔ یہ قول حضرت ابن عباس اور قتادہ اور ربیع کا ہے۔ دوسرا قول اس میں یہ ہے کہ "خاف" خوف اور خشیۃ کے معنی میں استعمال ہے (یہی قول زیادہ مشہور ہے)

اعتراض: ''خوف'' کا استعمال تو امر منتظر (آنے والے خطرات) میں ہوتا ہے وصیت کرنے والے نے جب خطاء یا عمداً بے انصافی کر دی تو اب خوف کا کیا مطلب؟

پہلا جواب: مراد یہ ہے کہ اصلاح کرنے والا شخص جب دیکھے وصیت کرنے والا وصیت کر رہا ہے لیکن اس کی جہالت کی وجہ سے اس سے بے انصافی کے علامات نظر آ رہی ہیں، یا کسی تاویل وغیرہ کی وجہ سے اس سے بے انصافی کی علامات ظاہر ہو رہی ہیں، یا دیکھے کہ وہ جان بوجھ کر غیر مستحق کو زیادہ دے رہا ہے، یا مستحق کا حق کم کر رہا ہے، یا مستحق کو حق دے ہی نہیں رہا تو ان علامات کے ظاہر ہونے پر وصیت کے مکمل ہونے سے پہلے وہ اصلاح کرے۔

" لان اصلاح الامر عند ظهور امارات فساده وقبل تقرر فساده يكون اسهل "

کیونکہ معاملات کے فاسد ہونے سے پہلے صرف علامت فساد کے ظاہر ہوتے وقت ان کی اصلاح آسان ہے بنسبت اس کے کہ ان میں فساد پیدا ہو جائے تو پھر ان کی اصلاح مشکل ہوگی۔ اسی وجہ سے ''خاف'' ذکر فرمایا ''علم'' ذکر نہیں فرمایا کیونکہ ان حالات میں انسان کو گمان تو ہوتا ہے کہ وصیت کرنے والا غلطی کر رہا ہے اسے یقین نہیں۔

دوسرا جواب: جن وجوہ کا ذکر کیا ہے ہو سکتا ہے وصیت کرنے والا ان کو ختم کر کے نئی وصیت جاری کر دے اس لئے اس کی بے انصافی کا خوف ہے لیکن یقین نہیں اسی وجہ سے ﴿خَافَ﴾ ذکر کیا ''علم'' نہیں۔

تیسرا جواب: ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اس کی بے انصافی کو تو دیکھ رہا ہے لیکن ابھی تک اس پر یقین نہیں کہ اس کی موت بے انصافی پر ہوگی ہو سکتا ہے کہ وصیت کرنے والے اور حقداروں کے درمیان صلح ہو جائے۔ لہٰذا گمان تو بے انصافی کا ہو سکتا ہے یقین نہیں اسی وجہ سے ﴿خَافَ﴾ کہا ہے ''علم'' نہیں کہا۔

(ماخوذ از کبیر)

قابل توجہ مسئلہ: ابھی پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ ''جنف'' بغیر ارادہ کے حق سے پھرنے کو کہا جاتا ہے اور ''اثم'' ارادہ سے غلطی کے ارتکاب کرنے کو کہا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے '' رفع عن امتی الخطأ والنسیان '' میری امت سے خطا اور بھول کو اٹھالیا گیا ہے۔ یعنی ان کی کوئی پکڑ نہیں ہوگی ان پر کوئی گناہ مرتب نہیں ہوگا۔ لیکن یہ اس وقت ہے جب انسان سے خطا اپنے حق میں ہو جب وہ خطا دوسروں کے حق میں ہو تو اس کا حکم یہ ہے:

'' ومعلوم ان الخطأ فی حق الغیر فی انه یجب ابطاله بمنزلة العمد فلا فصل بین الخطأ والعمد فی ذلک فمن هذا الوجه سوی عز وجل بین الأمرین ''

معلوم یہ ہوا کہ غیر کے حق میں خطا کو باطل کرنا ضروری ہے جیسے جان بوجھ کر کی ہوئی غلطی کو ختم کرنا ضرور ہے غیر کے حق میں جان بوجھ کر بے انصافی کی جائے یا کہ خطاً سے ایک ہی حکم ہے دونوں کا اسی لئے رب تعالیٰ نے دونوں کو ایک جگہ جمع کیا ہے۔

فَاَصْلَحَ بَیْنَهُمْ : ''تو ان کے درمیان صلح کرا دے (تو نہیں ہے کوئی گناہ اس پر)

یہ صلح کرانے والا کون ہوگا؟ ظاہر ہے کہ یہ وہ شخص ہوگا جس کو وصیت کرنے والا مقرر کرے گا کہ میری وصیت کو جاری کر دینا۔ اور اس حکم میں گواہ بھی داخل ہے کہ وہ بھی جب بے انصافی کو دیکھے تو اصلاح کرا دے اور یہ حکم عام مسلمانوں کو بھی ہے کہ جو کوئی بھی وصیت کرنے والے میں بے انصافی کو دیکھے وہ اصلاح کر دے۔ (از کبیر)

فَلَا اِثْمَ عَلَیْهِ : ''تو نہیں ہے گناہ اس پر'' بظاہر وہم ہوا ہے کہ اصلاح کرنے والا عظیم نیکی کا کام کرتا ہے صرف گناہ کی نفی کا کیا مطلب؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ گناہ کی نفی کرنے میں چند حکمتیں ہیں:

(۱) جب رب تعالیٰ نے پہلی آیۃ میں وصیت کو بدلنے پر گناہ کا ذکر فرمایا اور یہاں بھی وصیت کی تبدیلی کا ذکر ہے لیکن یہ تبدیلی پہلی سے مختلف ہے اس لئے گناہ کی نفی کی تا کہ یہ وہم نہ ہو کہ شائد اس تبدیلی میں بھی گناہ ہوگا۔

(۲) جب مصلح وصیت میں کمی کرے گا تو یقیناً جن لوگوں کے حق میں حق سے زائد وصیت کی گئی تھی

بظاہران پر مشکل ہوگی وہ یہ سمجھیں گے کہ یہ شخص گنہگار ہورہا ہے اس لئے ضروری ہوا کہ گناہ کی نفی کر کے ان کے وہم کا ازالہ کیا جائے۔

(۳) وصیت اور گواہی یقینی امور نہیں ان پر عمل کرنے سے پہلے حق کی طرف تبدیلی ممکن ہے اسی لئے ناحق وصیت کرنے والا وصیت کرنے کے ساتھ ہی گہنگار نہیں ہوتا بلکہ اس وقت گہنگار ہوتا ہے جب اسی ناحق وصیت پر قائم رہتے ہوئے فوت ہوجائے اور اس میں اصلاح بھی نہ کی جائے۔ جب اس میں اصلاح کی جائے گی تو وصیت کرنے والے کے ذہن میں بظاہر اصلاح میں قباحت آئے گی اس لئے گناہ کی نفی کرنا ہی زیادہ مفید ہے تا کہ اس وہم کا ازالہ ہوجائے۔

(۴) اصلاح کرنے والے کو زیادہ باتیں کرنی پڑتی ہیں ہوسکتا ہے اس کے کسی قول یا فعل پر کوئی ناراض ہوجائے تو اس کے قول اور فعل کو گناہ سمجھ بیٹھے تو رب تعالیٰ نے گناہ کی نفی کی کہ جو شخص صرف اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے صلح کرارہا ہے تو وہ گنہگار نہیں۔ (از کبیر)

فائدہ: اس آیۃ کریمہ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ جب دو شخصوں میں جھگڑا ہو اور خطرہ ہو کہ یہ نزاع ان کو شریعت کے خلاف کی طرف لے جائے گا تو ان کے درمیان صلح کرادی جائے تا کہ وہ دونوں شریعت کے پابند رہیں۔ صلح کرانے والے کو ثواب حاصل ہوگا۔ (از کبیر)

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ : ''بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے''۔

اگر اس سے مراد وصیت کرنے والے کی بے انصافی اور گناہ کی مغفرت ہو تو واضح ہے کہ جب اس کی وصیت میں اصلاح کردی جائے گی تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے گا اور رحم فرمائے گا۔ اور اگر اصلاح کرنے والے کی مغفرت مراد ہو تو بظاہر وہم ہوگا کہ اس نے تو عظیم نیکی کا کام کیا ہے اس کے تو ثواب کا ذکر کیا جانا تھا صرف مغفرت کے ذکر کا کیا مقصد؟

تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہاں ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی پائی گئی پہلے مغفرت کا ذکر فرما کر پھر رحمت کا ذکر فرما کر گویا کہ رب تعالیٰ نے یہ فرمایا:

﴿ان الذی اغفر الذنوب ثم ارحم المذنب﴾

''بیشک میں پہلے گناہوں کی مغفرت کرتا ہوں پھر گنہگار پر رحم کرتا ہوں''

گویا کہ رب تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یوں کہا:

" اوصل رحمتی وثوابی الیک مع انک تحملت المحن الکثیرة فی اصلاح هذا لمهم کان اولی "

میری رحمت اور ثواب تمہیں ملے گا جب کہ پہلے تم اصلاح میں کثیر محنتیں برداشت کرو گے بلکہ یوں کہا جائے کہ تمام عبادات میں یہی کیفیت ہے کہ انسان جتنی زیادہ مشقت برداشت کرے گا اتنا ہی زیادہ ثواب پائے گا۔

بلکہ نظام دنیا کو بھی ہم دیکھتے ہیں تو مقام مقبولیت اسے ہی حاصل ہوتا ہے جو اس حد تک محنت کرتا ہے کہ وہ اساتذہ کو بھی بھونکنے سے باز نہیں آتا اسی کو دیکھ کر راقم نے اپنے مکتب پر لکھ کر رکھا ہوا ہے۔

" اللهم انا نعوذ بک من کلاب السادات لان النباح واظهارا لاسنان لها العادات "

زندگی وصحت میں صدقہ افضل ہے:

اس مسئلہ میں اتفاق ہے کہ زندگی اور صحت میں صدقہ افضل ہے بنسبت اس صدقہ کے جو موت کے بعد کیا جائے:

" لقوله علیه السلام وقد سئل ای الصدقة افضل ؟ فقال ان تصدق وانت صحیح شحیح "

نبی کریم ﷺ سے سوال کیا گیا کون سا صدقہ افضل ہے تو آپ نے فرمایا کہ تم صدقہ کرو ایسے حال میں جب تم صحیح ہو اور مال پر حریص ہو۔

" وروی الدار قطنی عن ابی سعید الخدری ان رسول الله ﷺ قال لان یتصدق المرء فی حیاته بدرهم خیر له من ان یتصدق عند موته بمائة "

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ انسان کا اپنی زندگی میں ایک درہم صدقہ کرنا موت کے وقت ایک سو درہم صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔

" وروی النسائی عن ابی الدرداء عن النبی ﷺ قال مثل الذی ینفق

او یتصدق عند موته مثل الذی یهدی بعد ما یشبع "

حضرت ابوالدردا فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص موت کے وقت مال خرچ کرتا ہے اور صدقہ کرتا ہے وہ ایسے ہی ہے جیسے سیر ہونے کے بعد کسی کو ہدیہ دیا جائے۔ (از قرطبی)

فائدہ عظیمہ: نفلی عبادات سنن مؤکدہ میں کچھ کمی واقع ہونے کا کفارہ بنتی ہے اور سنن مؤکدہ ادا کرنے سے واجبات میں کچھ خطا وغیرہ ہوگئی تو کفارہ بنیں گی اور واجبات فرائض میں کوتاہیوں کا کفارہ بنتے ہیں اسی طرح زکوٰۃ میں کوئی کمی ہوگئی کمی ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ ہوسکتا ہے حساب لگانے میں بھول واقع ہوئی ہو کوئی خطا ہو مستحق کے سمجھنے میں خطا واقع ہوئی ہو تو اس صورت میں وصیت اس کا کفارہ ہوگی:

" روی الدار قطنی عن معاویة بن قرة عن ابیه قال قال رسول الله ﷺ من حضرته الوفاة فاوصی فکانت وصیته علی کتاب الله کانت کفارة لما ترک من زکوته "

معاویہ بن قرۃ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کو وفات حاضر ہوا اس نے کتاب اللہ کے مطابق وصیت کی تو یہ زکوٰۃ میں واقع ہونے والی کوتاہی کا کفارہ بنے گی۔

(از قرطبی بزیادۃ)

وصیت میں ورثاء کو ضرر پہنچانے پر وعید:

" عن ابن عباس عن رسول الله ﷺ قال الاضرار فی الوصیة من الکبائر رواه الدار قطنی "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وصیت میں کسی کو نقصان پہنچانا کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔

" وروی ابو داؤد عن ابی هریرة رضی الله عنه رسول الله ﷺ قال ان الرجل او المرأة لیعمل بطاعة الله ستین سنة ثم یحضرهما الموت فیضاران فی الوصیة فتجب لهما النار "

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مرد یا عورت اللہ تعالیٰ

کی طاعت میں ساٹھ سال عمل کرتے رہیں پھر ان پر موت آتی ہے تو وہ وصیت کرنے میں (اپنے ورثا کو) نقصان پہنچاتے ہیں تو وہ دونوں جہنم کے مستحق ہیں۔

"عن عمر ان بن حصین رضی اللہ عنہ ان رجلا اعتق ستة مملوكين له عند موته ولم یکن له مال غیرهم فبلغ ذلک النبی ﷺ فغضب من ذلک وقال لقد هممت الا اصلی علیه" (رواہ النسائی)

عمران بن حصین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص نے اپنی موت کے وقت چھ غلام آزاد کر دیئے ان کے بغیر اس کا اور کوئی مال نہیں تھا نبی کریم ﷺ کو جب یہ خبر ملی تو آپ غصہ میں ہوئے فرمایا میرا ارادہ بنتا ہے کہ میں اس کی نماز جنازہ نہ پڑھاؤں۔ (ماخوذ از قرطبی)

فائدہ: "وفی صحیح البخاری ان ابن عباس قال لو ان الناس غضوا من الثلث الی الربع فان رسول اللہ ﷺ قال الثلث والثلث کثیر"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اگر لوگ تیسرے حصہ سے کم وصیت کریں تو ان کے لئے بہتر ہے اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے تہائی حصہ کو اجازت دی اور تہائی کو کثیر قرار دیا۔ (پتہ چلا کہ تہائی حصہ سے کم کی وصیت کرنا بہتر ہے)۔ (از خازن وصابونی)

☆☆☆☆☆

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ☆ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ

۱) ''اے ایمان والوتم پر روزے فرض کیے گئے جیسے اگلوں پر روزے فرض ہوئے تھے کہ کہیں تمہیں پرہیز گاری ملے گنتی کے دن ہیں تو تم میں جوکوئی بیمار یا سفر میں ہوتو اتنے روزے اور دنوں میں اور جنہیں اسکی طاقت نہ ہووہ بدلہ دیں ایک مسکین کا کھانا پھر جو اپنی طرف سے نیکی زیادہ کرے تو وہ اس کیلئے بہتر ہے اور روزہ رکھنا تمہارے لئے زیادہ بھلا ہے اگر تم جانو''۔

۲) ''اے ایمان والوں فرض کیے گئے تم پر روزے جیسے فرض کیے گئے ان لوگوں پر جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیز گار بنو گنتی کے دن ہیں تو جو شخص تم میں سے ہو مریض، یا سفر میں ہوتو اتنے اور دنوں میں اور ان لوگوں پر جو طاقت نہیں رکھتے فدیہ ہے طعام ایک مسکین کا پھر جو شخص زیادہ نیکی کرے تو وہ بہتر ہے اس کے لئے اور تمہارا روزہ رکھنا بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم جانتے ہو''۔

جب اس سے پہلے قصاص اور وصیت کی فرضیت کا ذکر کیا تو اس آیۃ کریمہ میں روزہ کی فرضیت کا ذکر کیا اور روزہ چونکہ اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک رکن ہے اس لئے اس کا ذکر کرنا اہم تھا۔

ارکان اسلام:

" قال رسول الله ﷺ بنی الاسلام علی خمس شهادة ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله واقام الصلوة وايتاء الزكوة وصوم رمضان والحج " (رواه ابن عمر ، متفق عليه)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے گواہی دینا کہ اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں اور بیشک محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا اور رمضان کا روزہ رکھنا اور حج کرنا۔ (ماخوذ از قرطبی)

مختصر مطلب : ان دونوں آیتوں کا مختصر مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا اے ایمان والو تم پر روزے فرض کیے گئے ایسے ہی جیسے تم سے پہلے آدم علیہ السلام سے لے کر نبی کریم ﷺ تک تمام انبیاء کرام اور ان کی امتوں پر روزے فرض کیے گئے روزے اس لیے تم پر فرض کیے گئے ہیں کہ تم متقی بن جاؤ۔ وہ روزے بھی چند دن ہیں جو شخص تم میں سے مریض ہو جائے یا مسافر ہو تو وہ اس وقت روزہ افطار کر لے تو اس کے لیے جائز ہے بعد میں جتنے روزے افطار کیے اتنی تعداد میں قضاء کر لے۔

جو شخص شیخ فانی ہو روزہ نہ رکھ سکے وہ ایک روزہ کے بدلہ ایک مسکین کو طعام دو وقت کھلا کر فدیہ ادا کر دے اگر فدیہ کی اس مقدار سے جو زیادہ دے اس کے لیے بہتر ہے روزہ رکھنا تمہارے لیے بہتر ہے اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ روزہ میں کیا خیر و برکات ہیں۔

قدرے تفصیل:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ : "اے ایمان والو فرض کیے تم پر روزے"

روزہ کی فرضیت کیسے ہوئی؟ نبی کریم ﷺ کی امت پر پہلے یوم عاشورا کا روزہ فرض ہوا پھر اسے منسوخ کر دیا گیا اور ہر ماہ کے ایام بیض (چاند کی تیرہ، چودہ، پندرہ تاریخوں) کو روزے فرض کیے گئے پھر یہ حکم منسوخ کر کے رمضان کے مہینے کے روزے فرض کیے گئے۔ اس میں اختیار تھا جو چاہیں روزہ رکھیں اور جو چاہیں روزہ نہ رکھیں بلکہ فدیہ دے دیں۔ پھر اختیار کو منسوخ کر دیا گیا تمام لوگ جو روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں ان پر روزہ رکھنا فرض کر دیا گیا صرف چند عذروں کی وجہ سے روزہ افطار کرنے کی اجازت دی گئی (جس کی تفصیل ان شاء اللہ آگے آ رہی ہے)۔

(ماخوذ از روح المعانی ونور الانوار)

كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ : "جیسا کہ فرض کیے گئے تم سے پہلے لوگوں پر"

" یعنی هذه العبادة کانت مکتوبة واجبة علی الانبیاء والامم من لدن آدم الی عهدکم "

یعنی یہ عبادت (روزہ رکھنے کا حکم) فرض تھی تمام انبیاء کرام اور تمام امتوں پر آدم علیہ السلام سے لے کر تمہارے عہد تک یہ سلسلہ اسی طرح چلا آرہا ہے۔ کوئی امت بھی نہیں گزری جن پر روزہ فرض نہ کیا گیا ہو بلکہ ہر امت پر روزے فرض تھے۔

قرآن پاک کا بیان ذیشان: سب سے پہلے تو کہا ﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ﴾ "اے ایمان والو یعنی مجھ پر ایمان لانے والو میری محبت کا دم بھرنے والو، میرے پیار و محبت و پیار کا تقاضا یہی ہے کہ میرا حکم بھی مانو میرا حکم یہ ہے کہ تم روزے رکھو کیونکہ تم پر روزے فرض کر دیئے گئے۔ اور آسان یوں کیا کہ روزے ہر نبی اور ہر امت پر فرض کئے گئے " **لا یفرضها علیکم وحدکم** " تم پر ہی تو فرض نہیں کئے گئے۔ جب تم تمام امتوں سے بہتر ہو تو اپنے منصب میں خلل نہ آنے دینا بلکہ روزے رکھ کر میرے حکم کو تسلیم کر کے اپنی برتری کو برقرار رکھنا۔

پھر اس حکم پر عمل کرنے کے لئے اور آسانی پیدا کی گئی کہ روزہ رکھنے میں تمہارا ہی فائدہ ہے کیونکہ تقویٰ تمہیں ہی حاصل ہونا ہے اس لئے تقویٰ حاصل کرنے کیلئے بڑھ چڑھ کر عمل کرو۔ اس کے بعد اس حکم کو تسلیم کرنے کے لئے ﴿ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ﴾ "چند دن" کہا کہ یہ روزے زیادہ نہیں بلکہ حساب کریں تو ہر ماہ کے تین روزے بھی مکمل نہیں ہوتے۔ جب چند دن تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں تو تمہارا حق ہے کہ ان پر عمل کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کرنا پھر حکم کو اور آسان کیا گیا کہ مرض اور سفر کی حالت میں روزہ افطار کر کے تمہیں قضاء کرنے کی اجازت ہے۔ پھر اور آسانی پیدا کرنے کے لئے شیخ فانی کو روزہ کے بدلے فدیہ دینے کی اجازت دی گئی۔ تو روزہ رکھنے کی طرف مزید رغبت دلانے کے لئے ﴿ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ ﴾ "اور تمہارا روزہ رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے" کہا کہ جب روزہ خیر و برکت کا ذریعہ تو روزہ رکھ کر خیر و برکت کو حاصل کرو۔ پھر ﴿ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ کہہ کر روزہ رکھنے کا مزید احساس دلایا گیا کہ اگر تمہیں روزہ کی خیر و برکت کا علم حاصل ہو جائے تو یقیناً تم روزہ رکھو گے۔ (راقم)

پہلے لوگوں کے روزں سے مشابہت کی وجہ: مسلمانوں کے روزے پہلی قوموں کے روزوں

سے اصل وجوب میں مشابہ ہیں کہ ان پر بھی روزے فرض تھے اور مسلمانوں پر بھی فرض ہیں لیکن مسلمانوں کے روزوں کے پہلی قوموں کے روزوں کے ساتھ وقت اور کیفیت میں مشابہت نہیں تھی۔ البتہ نصاری کے روزوں سے دو وجہ سے مشابہت تھی ایک تو یہ کہ ان پر کھانا، پینا اور جماع کرنا دن کو منع تھا افطار کے وقت جائز تھا لیکن جب ایک مرتبہ کوئی سو جاتا تو پھر اس پر یہ چیزیں حرام ہو جاتیں خواہ رات کو ہی وہ کیوں نہ جاگ جائے۔

ابتداء اسلام میں مسلمانوں کو بھی یہی حکم تھا لیکن بعد میں صرف صبح صادق سے غروب آفتاب تک روزہ رکھنا لازم قرار دیا گیا رات سے روزے کا حکم منسوخ کر دیا گیا۔ اور ان سے دوسری مشابہت کی وجہ یہ ہے کہ نصاری کو بھی حکم رمضان کا مہینہ روزہ رکھنے کا تھا لیکن انہوں نے جب یہ سوچا کہ روزے کبھی سردیوں میں آتے ہیں اور کبھی گرمیوں میں۔ گرمیوں میں روزے رکھنا بڑا مشکل کام ہے تو انہوں نے اپنے علماء کے ذریعے یہ حکم بدل دیا کہ روزے رمضان کے بدلے موسم بہار میں رکھا کریں گے جب ان میں بیماری پھیل گئی تو انہوں نے ڈر کر بیس روزے اور بڑھا دیئے یعنی اب وہ پچاس روزے رکھتے ہیں ان کی عید الفطر ہمیشہ اپریل میں ہوتی ہے تفسیر بیضاوی نے یہی بیان کیا ہے البتہ روح المعانی اور قرطبی نے کچھ مختلف بیان کیا ہے۔ (از قرطبی)

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ :

''تا کہ تم پرہیزگار ہو جاؤ'' یعنی تم تمام گناہوں سے بچ جاؤ۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا'' الصیام جنة ووجاء ''روزہ ڈھال ہے اور شہوت کو کم کرتا ہے یقیناً شہوت کی کمی گناہوں سے روکتی ہے۔

اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ :

''چند دن ہیں'' یعنی روزے چند دن فرض ہیں وہ سال بھر میں صرف رمضان کا مہینہ ہے۔ (از قرطبی)

صوم کا لغوی معنی: '' ھو لغة الامساک مطلقا '' لغت میں مطلقاً امساک کو صوم کہتے ہیں اسی لغوی معنوی کے لحاظ سے مطلقا کلام سے رکنے کو بھی رب تعالیٰ نے ''صوم'' فرمایا رب تعالیٰ نے حضرت مریم کو کہا تم کہو:

﴿ اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْیَوْمَ اِنْسِیًّا ﴾ (مریم ۲٦)

''میں نے آج رحمٰن کا روزہ مانا ہے تو آج ہرگز کسی آدمی سے بات نہیں کروں گی''۔

صوم کا اصطلاحی معنی: یعنی اصطلاح شرع میں ''صوم'' (روزہ) کا مطلب یہ ہے کہ روزے کی نیت سے صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک جماع سے رکنا اور پیٹ میں کسی چیز کو داخل کرنے سے رکنا اور ہر وہ مقام جس کو باطن کا حکم دیا جائے اس میں کسی چیز کو داخل کرنے سے روکنا یعنی ایسی رگیں وغیرہ جن کا تعلق براہ راست دماغ یا معدہ سے ہے ان میں دواء وغیرہ ڈالنے سے رکنا۔ (اس کی تفصیل ان شاءاللہ آئے گی)۔

روزہ کے فوائد:

(۱) چونکہ نفس امارہ کی خواہشات کی وجہ سے باقی اعضا یعنی آنکھوں، کانوں اور زبان اور ہاتھ، پاؤں وغیرہ میں بھی خواہشات پائی جاتی ہیں جن سے انسان مختلف گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے روزہ کی وجہ سے نفس امارہ کی خواہشات ماند پڑ جاتی ہیں جن کی وجہ سے دوسرے اعضاء کو بھی قرار آ جاتا ہے اور انسان گناہوں سے باز آ جاتا ہے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے " **اذا جاعت النفس شبعت جميع الاعضاء واذا شبعت جاعت كلها** " کہ جب نفس بھوکا ہوتا ہے تو تمام اعضاء سیر ہوتے ہیں اور جب نفس سیر ہوتا ہے تو تمام اعضا بھوکے ہوتے ہیں۔

(۲) روزہ کی وجہ سے دل کدورت سے پاک وصاف ہوتا ہے کیونکہ دل میں کدورت کے اسباب سے زبان سے لغویات کا سرزد ہونا اور آنکھوں کا ناجائز طرف اٹھنا۔ اسی طرح باقی اعضاء سے گناہوں کا سرزد ہونا جب روزہ کی وجہ سے ان اعضاء میں نیکیاں آ جائیں گی تو ان کے درجات بلند ہوں گے اور ان کی وجہ سے دل کی کدورت بھی جاتی رہے گی۔ دل میں جلا (صفائی) آئے گی۔

(۳) روزہ کی وجہ سے انسان کو غرباء وفقراء پر رحم کرنے اور مہربانی کرنے کا دل میں خیال آتا ہے اس لئے کہ جب روزہ کی حالت میں انسان کو خود بھوک کی وجہ سے تکلیف محسوس ہوگی تو غریب اور فقیر لوگوں کی بھوک کا بھی اسے احساس ہوگا اسی طرح یہ ان پر رحمت اور مہربانی کرے گا غربا پر مہربانی کرنا درحقیقت اس پر رب تعالیٰ کی مہربانی ہوگی نیکی کی توفیق حاصل ہونا اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ہی ہوگا۔

(۴) روزہ سے فقراء کی موافقت حاصل ہوگی جس طرح وہ کبھی کبھی بھوک میں اپنے اوقات گزار دیتے ہیں روزہ دار بھی بھوک برداشت کر کے ان کی موافقت کر رہا ہے " **وفی ذلک رفع حالہ عند اللہ** "روزہ کی حالت میں اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا مقام بلند ہوگا۔

حضرت بشر حافی کسی نیک شخص کے پاس جاتے ہیں دیکھتے کہ وہ سخت سردی میں کپڑا اوڑھے بغیر بیٹھے ہوئے سردی کی وجہ سے کانپ رہا ہے حالانکہ اس کے قریب ہی کپڑا لٹکا ہوا ہے۔ بشر حافی نے اس بزرگ کو کہا یہ وقت ہے کپڑا اتار کر لپیٹنے کا تاکہ تم سردی سے بچ سکو۔

" فقال یا اخی الفقراء کثیر ولیس لی طاقة مواساتھم بالثیاب فاواسیھم بتحمل البرد کما یتحملون "

تو وہ کہنے لگے اے میرے بھائی فقراء بہت ہیں ان کے پاس کپڑے نہیں اور مجھے طاقت حاصل نہیں کہ میں تمام کو کپڑے دے کر ان پر ایثار کرسکوں اس لئے جس طرح وہ سردی برداشت کر رہے ہیں میں بھی سردی برداشت کر کے جس حد تک ممکن ہے ان سے غمخواری کر رہا ہوں۔

اسی وجہ سے اولیاء عارفین میں سے ایک بزرگ کھانا کھاتے وقت یہ دعا کرتے تھے " **اللھم لا تؤاخذنی بحق الجائعین** "اے اللہ بھوکے لوگوں کے حق کی وجہ سے میری گرفت (پکڑ) نہ کرنا۔

حضرت یوسف علیہ السلام قحط کے سال میں سیر ہو کر کھانا نہیں کھاتے تھے تاکہ بھوک اور فاقہ میں مبتلاء لوگوں کو نہ بھول سکیں اور خود ان جیسی بھوک برداشت کریں۔ (از مرقاۃ کتاب الصوم ج ۴ ص ۲۲۹)

رمضان کے روزے کب فرض ہوئے؟

" کانت فرضیته صوم رمضان بعد ما صرفت القبلة الی الکعبة بشھر فی شعبان علی رأس ثمانیة عشر شھرا من الھجرة "

قبلہ کی تبدیلی کے ایک ماہ بعد ہجرت کے اٹھارہ ماہ بعد شعبان کے مہینہ میں رمضان شریف کے روزے فرض کر دیئے گئے یعنی ہجرت کے دوسرے سال روزے فرض ہوئے۔ (مرقاۃ حوالہ مذکور)

روزہ ایمان کا چوتھا حصہ ہے: نبی کریم ﷺ نے فرمایا " **الصوم نصف الصبر** " روزہ نصف

صبر ہے اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد یہ ہے "**الصبر نصف الایمان**" صبر نصف ایمان ہے دونوں حدیثوں کو ملا کر پڑھنے سے نتیجہ واضح ہے کہ روزہ ایمان کا چوتھا حصہ ہے۔ (از احیاء العلوم ج اول ص ۱۴۴)

روزے کے تین درجے: عوام کا روزہ، خواص کا روزہ، اخص الخواص حضرات کا روزہ۔

عوام کا روزہ:

صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک نیت روزہ سے جماع اور کھانے پینے سے رک جانا۔

خواص کا روزہ: کانوں اور آنکھوں اور زبان اور ہاتھ اور پاؤں اور تمام اعضاء کو بھی گناہوں سے بچانا یعنی خواص کا روزہ عوام کے روزہ پر بھی مشتمل ہوگا اور اس سے زائد بھی۔

اخص الخواص حضرات کا روزہ: عوام کے روزہ کے ساتھ خواص کا روزہ بھی پایا جائے گا اس سے زائد یہ کہ اس کا دل دنیا کی گھٹیا چیزوں سے دور ہوگا دنیاوی افکار اس میں نہیں پائی جائیں گی بلکہ خالص اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی توجہ پائی جائے گی۔ (از احیاء العلوم ج اول ص ۱۴۶)

روزے میں کمال چھ چیزوں سے آئے گا:

نظر کو پست کرنا: غیر محرم عورتوں سے نظر نیچے رکھے ہر قسم کی برائی کی طرف نظر اٹھانے سے نظر کو بچا کر رکھے اس طرح نظر نہ اٹھے جو اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ سے ہی پھیر دے۔

" قال ﷺ النظرة سهم مسموم من سهام ابليس لعنه الله فمن تركها خو فامن الله اتاه الله عزوجل ايمانا يجد حلاوته "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ابلیس ملعون کے تیروں میں سے زہر آلود تیر نظر ہے جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے نظر بد کو چھوڑ دے اللہ تعالیٰ اس کو کامل ایمان پر قائم رکھے گا اور اسے ایمان کی حلاوت (مٹھاس) حاصل ہوگی۔

" وروى جابر عن انس عن رسول الله ﷺ انه قال خمس يفطرن الصائم الكذب والغيبة والنميمة واليمين الكاذبة والنظر بشهوة "

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پانچ چیزوں سے روزے دار کا روزہ افطار ہو جاتا ہے جھوٹ اور غیبت اور چغل خوری اور جھوٹی قسم اور شہوت سے نظر (غیر محرمہ کی طرف) کرنا۔

زبان کی حفاظت کرنا: روزے کا کمال اس میں ہے کہ زبان کو بیہودہ باتوں سے اور جھوٹ سے اور غیبت سے اور چغل خوری سے اور فحش کلام سے اور ظالمانہ کلام سے اور جھگڑے سے محفوظ رکھے اور خاموشی کو لازم پکڑے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہے اور تلاوت قرآن پاک میں مشغول رہے یہ زبان کا روزہ ہے۔

"وقد قال سفيان الغيبة تفسد الصوم رواه بشر بن الحارث عنه"

بشر بن حارث نے سفیان رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ غیبت روزہ کو فاسد کر دیتی ہے۔ لیث نے مجاہد سے روایت کیا" خصلتان يفسدان الصيام الغيبة والكذب " دو چیزیں روزہ کو فاسد کر دیتی ہیں یعنی غیبت اور جھوٹ روزے کا فاسد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ روزہ کا کمال فاسد ہو جاتا ہے۔

"قال ﷺ انما الصوم جنة فاذا كان احدكم صائما فلا يرفث ولا يجهل وان امرأ قاتله او شاتمه فليقل انى صائم"

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک روزہ ڈھال ہے جب تم میں سے کوئی ایک روزہ دار ہو تو کسی کو گالی وغیرہ نہ دے اور نہ ہی کسی سے جاہلانہ کلام کرے اگر روزہ دار سے کوئی شخص جھگڑا کرے اور گالی دے تو یہ کہے کہ بیشک میں روزہ دار ہوں (میں تمہیں گالیوں کا جواب نہیں دیتا)۔

خبر میں آیا ہوا ہے کہ دو عورتیں نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں روزہ دار تھیں شام کے قریب پچھلے پہر ان کا بھوک اور پیاس سے ان کا برا حال ہو گیا ہلاک ہونے کے قریب پہنچ گئیں انہوں نے نبی کریم ﷺ کے پاس پیغام بھیج کر روزہ توڑ دینے کی اجازت طلب کی آپ نے ان کی طرف ایک پیالہ بھیجا کہ اس میں دونوں قے کر دو (یعنی زبردستی منہ میں انگلی وغیرہ ڈال کر قے کرو) ان میں سے ایک نے قے کی جس میں خون اور گوشت کے لوتھڑے تھے دوسری نے قے کی اس کا بھی یہی حال تھا لوگوں نے اس پر تعجب کیا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"هاتان صامتا احل الله لهما وافطرتا على ما حرم الله تعالىٰ عليهما قعدت احداهما الى الاخرى فجعلتا يغتا بان الناس فهذا ما اكلتا من لحومهم"

ان دونوں نے روزہ رکھا ہوا تھا ان چیزوں سے جو اللہ تعالیٰ نے حلال فرمائی ہیں اور افطار کر رہی

تھیں اس چیز سے جو اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی ہیں یعنی ایک دوسری کے پاس بیٹھ کر لوگوں کی غیبت کر رہی تھیں ان کے قے میں وہی گوشت کے ٹکڑے ہیں جو انہوں نے اپنے بہن بھائیوں کی غیبت کی وجہ سے ان کا گوشت کھایا تھا۔ خیال رہے کہ حدیث کی صحت اور عدم صحت کی دار و مدار علامہ غزالی رحمہ اللہ پر ہے۔

کانوں کو بچانا: مکروہ قسم کے کلام کے سننے سے اپنے کانوں کو بچانا بھی روزہ کے کمال کا ذریعہ ہے "کل ما حرم قوله حرم الاصغاء اليه" ہر وہ کلام جس کا کرنا حرام ہے اس کا سننا بھی حرام ہے۔ رب تعالیٰ نے جھوٹ اور حرام کھانے کو ایک ساتھ ذکر کر کے دونوں کی حرمت اور قباحت کو ذکر فرما دیا ہے۔ "سماعون للكذب اكالون للسحت" وہ جھوٹ سنتے ہیں اور حرام کھاتے ہیں۔

مسئلہ: غیبت پر خاموش ہونا منع ہے بلکہ غیبت کرنے والے کو غیبت سے منع کرنا ضروری ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا "المغتاب والمستمع شريكان في الاثم" غیبت کرنے والا اور اس کے کلام کو سننے والا دونوں ہی گناہ میں شریک ہیں۔

باقی اعضاء کو گناہوں سے روکنا: یعنی روزہ کامل اس وقت ہوگا جب باقی اعضاء کو بھی گناہوں سے روکے ہاتھ اور پاؤں کو غیر شرعی افعال سے روک کر رکھے۔ اور پیٹ کو شبہات والی چیزوں سے منع کرے کیونکہ حلال چیزوں کے کھانے سے اس لئے رک جاتا کہ میں روزہ دار ہوں لیکن حرام چیزوں کے حاصل کرنے میں کوئی پرواہ نہ کرے اس کی مثال یہ ہے " من يبني قصرا ويهدم مصرا "کہ گھر بنا کر شہر برباد کر دیا جائے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا "كم من صائم ليس له من صومه الا الجوع" کتنے ہی روزے دار ہیں جن کا روزہ سوائے بھوک کے نہیں۔

افطار کے وقت زیادہ طعام نہ کھائے: روزہ کے کامل ہونے کے لے اور یہ ضروری ہے کہ افطار کے وقت زیادہ مقدار میں کھانا تناول نہ کرے کیونکہ روزہ کا مقصد یہ ہے کہ نفس پر قہر کیا جائے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے اور مقصد یہ ہے کہ نفس کی شہوت کو توڑا جائے۔ روزہ دار جب افطار کے وقت اتنا کھا لے کہ دن کے نہ کھانے کی کمی کو بھی پورا کر دے بلکہ عام عادت سے ہٹ کر طرح طرح کے کھانے کھائے تو مقصد فوت ہو گیا بلکہ نفس کو زیادہ قوت دے دی۔

افطار کے بعد خوف و رجاء میں ہو: یعنی روزہ کے کامل ہونے کا اور ذریعہ یہ ہے کہ اپنی طرف

سے مکمل کوشش کر کے روزہ میں جماع، کھانے پینے وغیرہ سے اجتناب کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اعضاء کو گناہوں سے بچانے کے بعد جب روزہ افطار کرے تو اس کا دل خوف اور امید کے درمیان مضطرب رہے:

" اذ لیس یدری ایقبل صومه فهو من المقربین او یرد علیه فهو من الممقوتین "

کیونکہ اسے معلوم نہیں کہ اس کا روزہ مقبول ہوا ہے کہ وہ مقربین کے درجہ میں پہنچ گیا یا اس کا روزہ مردود ہو گیا یہ ان لوگوں میں سے ہو گیا جن پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ہوتی ہے۔ حضرت حسن بن ابی الحسن بصری رحمہ اللہ کا ایک قوم سے گزر ہوا وہ ہنس رہے تھے (یہ ماہ رمضان تھا) آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ماہ رمضان کو گھوڑوں کی دوڑ کے میدان کی طرح بنا دیا ہے کہ لوگ اس میں طاعت کا مقابلہ کریں "فسبق قوم ففازوا وتخلف اقوام فخابوا" جو قوم طاعت میں سبقت لے گئی وہ کامیاب ہوگئی اور جو قومیں پیچھے رہ گئیں وہ رسوا ہو گئیں پھر آپ نے فرمایا بہت بڑا تعجب ہے ایسے لوگوں پر جو ایسے دن میں ہنس رہے ہیں اور کھیل رہے ہیں جس دن میں طاعت میں جلدی کرنے والے کامیاب ہو رہے ہیں اور باطل راہ پر چلنے والے رسوا ہو رہے ہیں:

" اما والله لو کشف الغطاء لا شتغل المحسن باحسانه والمسی باساء ته ای کان سرور المقبول یشغله عن اللعب وحسرة المردود وتسد علیه باب الضحک "

خبردار قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اگر پردے ہٹ جائیں یہ منظر سامنے آ جائے کہ احسان کرنے والا اپنے احسان میں مشغول ہے اور برائیاں کرنے والا اپنی برائیوں میں مشغول تو مقبول شخص کے سردار کو دیکھ کر ہنسنے اور کھیلنے والا شخص اپنی ہنسی اور کھیل سے اعراض کرلے اور اسے اپنے اوقات کے ضائع ہونے پر حسرت ہو اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے آپ پر ہنسی کا دروازہ بند کرلے۔

ذرا مقام غور: ایک مرتبہ اس جملہ کو " فسبق قوم ففازوا وتخلف اقوام فخابوا " غور سے سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ طاعت کرنے والوں کا جب ذکر کیا تو " قوم" واحد ذکر کیا۔ اور جب نافرمانوں کا ذکر کیا تو " اقوام" جمع ذکر کیا جس سے واضح ہو رہا ہے کہ ہر دور میں طاعت کرنے والے

تھوڑی تعداد میں رہے اور نافرمان زیادہ تعداد میں رہے۔ (راقم)

خلاصہ کلام : روزہ کی مقبولیت اور عدم مقبولیت علماء آخرت (صوفیاء کرام اولیاء عظام) کے نزدیک ہے یعنی انسان کو جب اللہ تعالیٰ کی صفت صمدیت (بے نیازی) کا عکس حاصل ہو جائے تو اس کا روزہ مقبول ہوگا کیونکہ شہوات کو ترک کرنے سے انسان مقام حیوانیت سے نکل کر مقام ملائکہ میں آ جاتا ہے صرف رب تعالیٰ کی طرف توجہ ہوتی ہے اور دوسری چیزوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

(تمام بحث ماخوذ از احیاء العلوم کتاب الصوم)

روزہ اور رمضان کے فضائل:

"عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ اذا دخل رمضان فتحت ابواب السماء وفی رواية فتحت ابواب الجنة☆ وغلقت ابواب جهنم وسلسلت الشياطين وفی رواية فتحت ابواب الرحمة"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب رمضان داخل ہوتا ہے تو آسمانوں کے دروزے کھول دیئے جاتے ہیں ایک روایت میں ہے جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور شیطانوں کو زنجیروں سے جکڑ دیا جاتا ہے اور ایک روایت میں ہے رحمت کے دروازہ کھول دیئے جاتے ہیں۔ (بخاری، مسلم مشکوۃ کتاب الصوم)

ایک روایت میں " صفدت الشياطين " ہے قاضی عیاض رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ یہ الفاظ اپنے ظاہری حقیقی معانی میں استعمال ہیں کہ حقیقت میں جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور شیطانوں کو قید کر لیا جاتا ہے اس کی وجہ " علامة لدخول الشهر وتعظيم لحرمته ويكون التصفيد ليمتنعوا من ايذاء المؤمنين والتهويش عليهم " ماہ رمضان کے داخل ہونے کی علامت ہے اور اس ماہ کی حرمت کی عظمت کا لحاظ ہے اور شیطانوں کو قید اس لئے کیا جاتا ہے کہ وہ مومنوں کو ایذاء نہ پہنچا سکیں اور ان کو نیک عمل کرنے میں پریشان نہ کر سکیں۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ مجازی معنی مراد ہو یعنی رحمت اور آسمانوں اور جنت کے دروازے کھولنے کا مطلب یہ ہو کہ کثیر ثواب عطا کیا جاتا ہے اور کثرت سے معاف کیا جاتا ہے اور

شیطان مومنوں کو کم بھٹکاتے ہیں اور ان کو کم ایذاء پہنچاتے ہیں اس لئے گویا کہ وہ قید ہوتے ہیں:

" ویکون تصفیدھم عن اشیاء دون اشیاء ولناس دون ناس "

اور ان کو بعض چیزوں سے روکا جاتا ہے اور بعض سے نہیں اور بعض لوگوں سے روکا جاتا ہے بعض سے نہیں دوسری حدیث میں ہے " صفدت مردۃ الشیاطین "سرکش شیطانوں کو قید کرلیا جاتا ہے۔

اب مسئلہ واضح ہوا کہ رمضان شریف میں بڑے بڑے سرکش شیطان قید ہوتے ہیں شطونگڑے کھلے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے بعض لوگ بعض جرائم میں مبتلاء ہوتے ہیں اسی طرح نفس امارہ بھی جرائم کا ذریعہ ہوتا ہے۔ ایک اور احتمال یہ ہے کہ جنت کے دروازے کھولنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کو توفیق عطا فرماتا ہے کہ وہ عبادات زیادہ کرتے ہیں روزے رکھتے ہیں رات کو تراویح کے لئے قیام کرتے ہیں اور ہر قسم کی نیکی کے کام زیادہ کرتے ہیں یہ جنت میں داخل ہونے کے ذرائع ہیں اور یہی جنت کے دروازے ہیں۔ اور جہنم کے دروازے بند کئے جانے اور شیطانوں کو قید کرنے کا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی مہربانی سے رمضان میں مؤمنین کافی حد تک گناہوں سے باز رہتے ہیں۔

(ماخوذ از نووی مسلم ج اول ص ۳٦٦)

☆ " عن سهل بن سعد قال قال رسول الله ﷺ فی الجنة ثمانية ابواب منها باب يسمى الريان لا يدخله الا الصائمون "

سہل بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت میں آٹھ دروازے ہیں ان میں سے ایک دروازے کا نام "ریان" ہے اس میں صرف روزے دار داخل ہوں گے۔

(بخاری مسلم مشکوۃ کتاب الصوم)

اور ایک روایت میں یہ الفاظ زائد ہیں:

" لا يدخل معهم احد غيرهم يقال اين الصائمون فيدخلون منه فاذا دخل آخرهم اغلق فلم يدخل منه احد " (مسلم)

اسی دروازہ میں روزے داروں کے ساتھ کوئی اور داخل نہیں ہوگا کہا جائے گا روزے دار کہاں ہیں جب روزے دار اس دروازے سے داخل ہوں گے جب آخری روزہ دار اس دروازے سے داخل ہوجائے گا تو دروازہ بند کردیا جائے گا کوئی اور اس سے داخل نہیں ہوسکے گا۔ اس دروازہ کو "ریان" کہنے

کی وجہ یہ ہے کہ اس میں کثیر نہریں جاری ہوں گی تروتازہ پھل اور پھول اس میں ہوں گے اور وجہ یہ ہے کہ اس دروزہ سے داخل ہونے والے کو سیراب کردیا جائے گا اسے کوئی پیاس محسوس نہیں ہوگی۔

(مرقاۃ)

☆ " عن ابی هریرة قال قال رسول اللہ ﷺ من صام رمضان ایمانا واحتسابا غفرله ما تقدم من ذنب ومن قام رمضان ایمانا واحتسابا غفرله ما تقدم من ذنبه ومن قام لیلة القدر ایمانا واحتسابا غفرله ما تقدم من ذنبه "

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے رمضان کے روزے رکھے ایمان وخلوص سے اس کے پہلے گناہ معاف کردیئے گئے اور جس شخص نے رمضان میں ایمان وخلوص سے قیام کیا (نماز تراویح ادا کی) تو اس کے پہلے گناہ معاف کردیئے گئے اور جس شخص نے لیلۃ القدر میں ایمان وخلوص سے قیام کیا تو اس کے پہلے گناہ معاف کردیئے گئے۔

وضاحت حدیث: ایمانا : سے مراد یہ ہے کہ وہ ایمان کی وجہ سے روزہ رکھتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے روزہ کی فرضیت کا جو حکم فرمایا اس کی وہ تصدیق کرتا ہے اور اس کے ثواب کی وہ تصدیق کرتا ہے۔

احتسابا : کا مطلب یہ ہے کہ وہ طلب ثواب کے لئے روزہ رکھتا ہے اور اس میں خلوص پایا جاتا ہے لوگوں کے خوف اور لوگوں سے حیا اور چرچا کرنا اور لوگوں کو دکھانا اس کے روزہ رکھنے کے اسباب نہیں۔

"**احتسابا**" کا اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کا حکم دیا ہے ان پر صابر رہے جھوٹ اور غیبت وغیرہ سے باز رہے نیکی کے کام خوشی سے کرے جبر سے نہیں روزے کو بوجھ نہ سمجھے اور روزے کے دنوں کو لمبا سمجھ کر روزہ ترک نہ کرے۔

غُفِرَلَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ :

''اس کے پہلے گناہ معاف کردیئے گئے'' اس کے متعلق علامہ نووی رحمہ اللہ نے فرمایا:

" ان المکفرات ان صادفت السیآت تمحوها اذا کانت صغائر وتخففها اذا کانت کبائر والا تکون موجبة لرفع الدرجات فی الجنات "

کہ جتنی عبادات بھی گناہوں کو مٹاتی ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ صغائر گناہوں کو مٹاتی ہیں اور کبیرہ گناہوں میں تخفیف پیدا کرتی ہیں اگر عبادت کرنے والا گناہوں سے محفوظ ہو تو اس کے درجات کو

بلند کرتی ہیں علامہ طیبی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں کہ ان تین صورتوں کو ایک ہی صورت میں یوں پیش کیا جاسکتا ہے کہ عبادت کے ذریعے مومن کو وہ مغفرت کا درجہ حاصل ہوجاتا ہے:

" الغفران نتیجة الفتوحات الالهية و مستتبع للعواطف الربانية قال تعالیٰ انا فتحنا لک فتحا مبینا لیغفرلک اللہ "

کہ اس پر فتوحات الھیہ اور رب تعالیٰ کی مہربانیاں مرتب ہوتی ہیں رب تعالیٰ نے فرمایا: بیشک ہم نے آپ کو فتح مبین (واضح فتح) عطا کی تا کہ تمہاری وجہ سے اللہ تعالیٰ اگلے اور پچھلوں کے گناہ معاف کردے۔

من قام رمضان : سے مراد رمضان کی راتوں کو کھڑے ہوکر نماز ادا کرنا رمضان کی راتوں کو معظم سمجھتے ہوئے تراویح ادا کرے قرآن پاک کی تلاوت کرے اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے اور اگر مکہ مکرمہ میں ہو تو کعبہ شریف کا طواف کرے۔

" ومن قام لیلة القدر " سے مراد یہ ہے کہ اسے علم حاصل ہو یا نہ ہو رمضان کی ہر رات کو لیلۃ القدر سمجھتے ہوئے یا آخری دس راتوں کو لیلۃ القدر سمجھتے ہوئے یا آخری دس راتوں میں سے طاق راتوں کو "لیلۃ القدر" سمجھتے ہوئے یا ستائیسویں رات کو لیلۃ القدر سمجھتے ہوئے قیام کرے اور لیلۃ القدر کے وجود پر ایمان ہو اور یہ بھی ایمان ہو کہ اس میں عبادت کرنے سے اللہ تعالیٰ عظیم ثواب عطا فرماتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے پہلے گناہ اپنی مہربانی سے معاف فرماتا ہے۔ (ماخوذ از مرقاۃ بزیادۃ)

☆ " وعن ابی هریرة قال قال رسول اللہ ﷺ کل عمل ابن آدم یضاعف الحسنة بعشر امثالها الی سبعمائة ضعف قال اللہ تعالیٰ الا الصوم فانه لی و انا اجزی به یدع شهوته وطعامه من اجلی للصائم فرحتان فرحة عند فطره و فرحة عند لقاء ربه ولخلوف فم الصائم اطیب عند اللہ من ریح المسک والصیام جنة واذا کان یوم صوم احدکم فلا یرفث ولا یصخب فان سابه احد او قاتله فلیقل انی امرؤ صائم "
(بخاری ، مسلم ، مشکوۃ کتاب الصوم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا انسان کو ہر نیک عمل پر اس کی دس مثل سے لے کر سات سو مثل تک ثواب عطا کیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے سوائے روزے کے

بیشک وہ میرے لئے ہوتا ہے میں خود ہی اس کی جزاء عطا کروں گا وہ اپنی خواہشات اور کھانے کو میرے لئے چھوڑتا ہے روزے دار کے لئے دو خوشیاں ہیں ایک خوشی اس کو افطار کے وقت ہوتی ہے اور ایک خوشی اس کو رب تعالیٰ کی ملاقات کے وقت حاصل ہوگی۔ روزے دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے ہاں افضل ہے کستوری کی خوشبو سے اور روزے ڈھال ہیں اور تم میں سے جب کوئی شخص کسی دن روزہ رکھے ہوئے ہو تو وہ گالی نہ دے اور چلائے نہیں اگر کوئی شخص اسے گالی دے یا اس سے لڑائی کرے تو یہ کہے میں روزہ دار ہوں۔

وضاحت حدیث:

کل عمل ابن آدم : سے مراد ہے " کل عمل صالح لابن آدم " انسان کا ہر نیک عمل۔

یضاعف الحسنة : سے مراد یہ ہے کہ انسان جو بھی نیکی کا کام کرے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اسے زیادہ ثواب عطا فرماتا ہے۔

بعشر امثالها : وہ زیادتی دس مثل ہوتی ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ﴾ جو ایک نیکی کا کام کرے تو اس کے لئے اس کی دس مثل ہیں۔

الیٰ سبعمائة ضعف: یعنی دس مثل ایک نیکی پر ثواب عطا کرنا کم از کم درجہ ہے ورنہ کبھی ایک نیکی پر سات سو مثل ثواب عطا کیا جاتا ہے " بل الی اضعاف کثیرة " بلکہ بہت ہی زیادہ ثواب عطا کیا جاتا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً ﴾

"جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں خلوص سے مال خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے کئی گنا ثواب زیادہ عطا فرماتا ہے"

قال اللہ تعالیٰ الا الصوم : "رب تعالیٰ نے فرمایا سوائے روزے کے" اس کلام کے دو مقصد ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ نبی کریم ﷺ نے مطلق ارشاد فرمایا کہ ہر عبادت کا ثواب دس مثل سے لے کر سات سو مثل تک بلکہ اس سے بھی زیادہ رب تعالیٰ عطا فرماتا ہے دوران گفتگو ہی رب تعالیٰ کا ارشاد آ گیا ہو کہ روزے کو مستثنیٰ (علیحدہ) فرما دیں اسی وجہ سے آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ الا الصوم ﴾ سوائے روزے کے۔

دوسرا مقصد یہ ہوسکتا ہے کہ اگر چہ اس سے پہلے مستثنی منہ صراحۃ ذکر نہیں لیکن پہلی عبارت سے سمجھ آ رہا ہے کہ مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مومن کو ہر عبادت پر دس مثل سے سات سو مثل تک بلکہ اس سے بھی زائد ثواب عطا کیا جائے گا سوائے روزہ کے۔

روزہ کا حکم علیحدہ کرنے کی وجہ: "فان ثوابه لا يقادر قدره ولا يحصى حصره الا الله تعالیٰ"

روزے کا ثواب اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا اور نہ ہی اس کے بغیر کوئی شمار کر سکتا ہے روزہ کو وہ خصوصیات حاصل ہیں جو اور کسی عبادت کو حاصل نہیں اسی وجہ سے اس کی جزاء رب تعالیٰ نے اپنے ذمہ کی ہے فرشتوں کے سپرد نہیں کی۔

روزہ کی فضیلت کی دو وجہ: ایک وجہ ان میں سے یہ ہے "انـه سر لا يطلع عليه العباد بخلاف سائر العبادات" کہ یہ راز ہے کہ اس پر بندے مطلع نہیں ہو سکتے لیکن دوسری تمام عبادات پر بندے مطلع ہوتے ہیں نماز ادا کرے یا حج یا زکوۃ ان تمام پر کوئی نہ کوئی ضرور مطلع ہوتا ہے روزہ میں کوئی ریاء کاری کا شبہ نہیں پایا جاتا اس میں صرف رب تعالیٰ کی رضاء پائی جاتی ہے اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿فَـاِنَّـهٗ لِـیْ﴾ بیشک روزہ میرے لئے رکھا جاتا ہے یعنی اس کی ظاہری طور پر کوئی علامات نہیں ہیں باقی تمام عبادات پر کوئی نہ کوئی علامت پائی جاتی ہے جسے دیکھ کر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ شخص فلاں عبادت کر رہا ہے۔

وانا اجزی به: "ای وانا العالم بجزائه والی امره ولا اوکله الی غیری"

میں خود ہی اسے جزاء دیتا ہوں کیونکہ اس کی جزاء اور اس کے امور کو میں خود ہی جانتا ہوں اسی لئے اس کی جزاء میں کسی اور کے سپرد نہیں کرتا۔ دوسری وجہ روزہ کی فضیلت کی یہ ہے کہ روزہ سے نفس کی شہوات کو توڑا جاتا ہے اور کھانا پینا بند کر کے بظاہر بدن کو نقصان پہنچایا جاتا ہے باقی عبادات میں یہ کیفیت نہیں ہوتی اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے روزہ دار کی تعریف فرمائی کہ "يـدع شهوتـه وطعامه من اجـلـی" وہ خواہشات کو اور کھانے پینے کی اشیاء کو میری وجہ سے چھوڑتا ہے۔ "من اجلی" کا مطلب یہ ہے کہ وہ میرے حکم اور میری رضاء کو حاصل کرنے کے ارادہ سے اور مجھ سے اجر حاصل کرنے کے لئے وہ روزہ رکھتا ہے۔ روزہ میں نیت اور خلوص پایا جاتا ہے اور اسی خلوص اعتقاد کی وجہ سے یہ واضح

ہو جاتا ہے کہ " **لا ریاء فی الصوم اصلا** "روزے میں بالکل ریاءکاری نہیں پائی جاتی۔

ہاں البتہ زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ خبر دے کہ میں ''روزہ دار'' ہوں لیکن اس خبر سے اصل روزہ میں ریانہیں پائی گئی۔

للصائم فرحتان : روزہ دارکودوعظیم خوشیاں حاصل ہوتی ہیں ایک دنیامیں اورایک آخرت میں۔

فرحة عند فطره : فطر کے وقت خوشی کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان سمجھتا ہے کہ رب تعالیٰ کی مہربانی سے میں نے فرض ادا کر دیا ہے میں نے ذمہ داری پوری کر دی۔ اور دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان کوبھوک اور پیاس کے بعد جب کھانے پینے کی اجازت حاصل ہوتی ہے تو انسان کوطبعی طور پر سرور حاصل ہوتا ہے۔ اور تیسری وجہ یہ ہے کہ افطار کے وقت اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کامل اجر حاصل ہونے کی امید پرخوشی ہوتی ہے کیونکہ حدیث شریف میں ہے " **ان للصائم عند افطاره دعوة مستجابة** " بیشک روزہ دار کی دعاافطار کے وقت قبول ہوتی ہے۔

وفرحة عند لقاء ربه : اورخوشی اسے حاصل ہوگی اپنے رب تعالیٰ کی ملاقات کے وقت۔اس لئے کہ رب تعالیٰ کی طرف سے روزہ دار کوخصوصی جزاء حاصل ہوگی اور رب تعالیٰ اپنے اس بندے کی خصوصی تعریف فرمائے گااور سب سے بڑی وجہ یہ ہے " **بنیل الفوز باللقاء** " کہ رب تعالیٰ سے ملاقات حاصل ہونے پر کامیابی حاصل کر کے خوشی ہوگی۔اسی وجہ سے بعض شارحین نے ﴿ **وانا اجزی بہٖ** ﴾ میں ''اجزیٰ'' کومضارع مجہول واحد متکلم کا صیغہ بھی پڑھا ہے کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ روزہ دار کی میں خود جزاء بن جاؤں گا کہ اسے اپنے خصوصی دیدار سے مشرف کروں گا۔

ولخلوف الصائم اطیب عند اللہ من ریح المسک :

روزے دار کے منہ کی بواللہ تعالیٰ کوکستوری کی خوشبو سے زیادہ پسند ہے۔''خلوف'' کی خاء پر ضمہ ہے اگرچہ بعض حضرات نے فتح بھی پڑھا ہے لیکن یہ درست نہیں " **خلوف من خلف فمه اذا تغیر رائحة فمه** " روزہ کی وجہ سے جب منہ کی بو میں تبدیلی آجائے اسے خلوف کہا جاتا ہے۔لیکن یہ خیال رہے کہ اس بو کی وجہ روزہ یعنی معدہ کا خالی ہونا ہے یہ بو مسواک سے زائل نہیں ہوتی۔

اسی لئے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک روزہ کے حال میں جس وقت چاہے مسواک کرے

جائز ہے البتہ امام شافعی رحمہ اللہ پچھلے پہر روزہ دار کے لئے مسواک کرنے کو منع قرار دیتے ہیں۔
"اطیب" کا معنی افضل، ارضی، کا معنی احب ہے سب کا مطلب تقریباً ایک ہی ہے افضل، پسندیدہ اور محبوب ہونا۔ روزہ چونکہ عبادت ہے رب تعالیٰ کو عبادت پسند ہے جب کہ روزہ دار کے منہ کی بو روزہ کا اثر ہے تو رب تعالیٰ کو اثرِ عبادت بھی پسند ہے۔

والصیام جنۃٌ : اور روزے ڈھال ہیں "**جنۃ بضم الجیم وقایۃ**" جنۃ کی جیم پر پیش ہے اس کا معنی ہے بچانے کا آلہ روزے بھی انسان کو دنیا میں گناہوں سے بچاتے ہیں اور آخرت میں آگ سے بچائیں گے۔

فلا یرفث : فاء پر ضمہ ہے اور کسرہ بھی آتا ہے

ولا یصخب : خاء پر فتح ہے "**لا یرفع صوتہ بالھذیان**" مطلب واضح ہے کہ روزے کی حالت میں گالی گلوچ نہ نکالے بیہودہ قہقہے نہ لگائے زور زور سے نہ چیخے چلائے بیہودہ شوروغل نہ کرے بلکہ دوسرا کوئی اسے گالی دے یا لڑائی کرے تو پھر بھی جواب نہ دے بلکہ یہ کہہ کر خاموش ہو جائے کہ میں تو روزہ دار ہوں۔ جب تک دوسرا اس پر زیادتی کر رہا ہے یہ خاموش ہے اور صبر سے کام لے رہا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری میں ہے اور جب یہ خود اس کا جواب دے تو اس سے اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری اٹھ جاتی ہے۔

☆ **" عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ اذا کان اول لیلۃ من شھر رمضان صفدت الشیاطین ومردۃ الجن وغلقت ابواب النار فلم یفتح منھا باب وفتحت ابواب الجنۃ فلم یغلق منھا باب وینادی مناد یا باغی الخیر اقبل ویا باغی الشر اقصر و للہ عتقاء من النار وذلک کل لیلۃ "** (روہ الترمذی وابن ماجہ ورواہ احمد عن رجل وقال الترمذی ھذا حدیث غریب "

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب ماہ رمضان کی پہلی رات آتی ہے تو شیطانوں اور سرکش جنوں کو قید کر لیا جاتا ہے اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں کوئی دروازہ ان کیلئے کھلا نہیں ہوتا اور جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں کوئی دروازہ ان سے بند نہیں کیا جاتا۔ اور نداء دینے والا ندا دیتا ہے اے نیکیوں کو حاصل کرنیوالے متوجہ ہوا ے گناہوں کو حاصل کرنیوالے پیچھے ہٹ جا اور اللہ کیلئے ہی آگ سے آزاد ہونیوالے ہیں یہ آواز تمام رات دی جاتی ہے۔

وضاحت حدیث: حدیث کے پہلے حصہ کی وضاحت تو پہلے ایک حدیث میں گزر چکی ہے۔

وینادی مناد : اور نداد ینے والا نداد ے گا یہ آواز زبان حال سے اللہ تعالیٰ کی طرف براہ راست آئے گی یا زبان مقال سے فرشتہ کے واسطہ سے یہ آواز دی جائے گی۔

یا باغی الخیر اقبل : اے عمل کو طلب کرنے والے نیکیوں کو حاصل کرنے والے اللہ تعالیٰ کی طرف اور اس کی اطاعت کی طرف متوجہ ہو جا اس کی عبادت میں زیادہ سے زیادہ کوشش کر کیونکہ یہی وقت ہے رب تعالیٰ کی خصوصی رحمت کا کہ تھوڑے عمل پر تجھے خیر کثیر عطا کیا جائے گا۔ گویا کہ رب تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں کو کہا جاتا ہے کہ تم عبادت کے ذریعے میری طرف توجہ کرو میں اپنی مہربانیوں کے ذریعے تمہاری طرف اپنی رحمت کو متوجہ کروں گا کیونکہ " **فان الخیر کلہ تحت قدرتنا وارادتنا** " تمام خیر ہماری قدرت اور ہمارے اختیار میں ہے۔

ویاباغی الشر اقصر : اے گناہوں کی طرف قصد کرنے والے شخص گناہوں سے رک جا۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کر اپنے گناہوں سے مغفرت طلب کر یہ دعا کی قبولیت اور مغفرت کا وقت ہے رمضان شریف میں اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت کے پیش نظر ہی لوگ زیادہ عبادت کرتے ہیں زیادہ رب تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں اکثر لوگ روزے رکھتے ہیں یہاں تک کہ چھوٹے بچے بھی روزے رکھتے ہیں کئی گنہگار بھی روزے رکھتے ہیں نماز نہ پڑھنے والے بھی نماز پڑھتے ہیں حالانکہ روزے کی وجہ سے سستی اور نیند کا غلبہ بھی حاصل ہوتا ہے۔

" ومع ذلک تری المساجد معمورة وباحیاء اللیالی مغمورة والحمد لله ولا حول ولا قوة الا بالله "

باوجود اس کے تم مساجد کو نمازیوں سے آباد دیکھو گے رات کو مساجد بھری ہوئی نظر آئیں گی الحمدللہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی ہے جس کی وجہ سے انسان گناہوں سے بچ جاتے ہیں اور نیکی کی ان کو توفیق حاصل رہتی ہے۔

ولله عتقاء من النار : کثیر لوگ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے اس کی طرف رجوع کر کے آگ سے چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں۔

وذلک کل لیلة : اللہ تعالیٰ کی رحمت کا اعلان تمام رات ہی ہوتا رہتا ہے۔(از مرقاۃ)

فائدہ : ﴿ولله عتقاء﴾ ای کثیرون ﴿من النار﴾ فلعلک تکون منهم " اللہ تعالیٰ نے جب اپنی رحمت سے رمضان میں خیر حاصل کرنے والوں اور شر سے اجتناب کرنے والوں کو آگ سے آزاد کرنا ہے تو اے انسان ہوسکتا ہے تو بھی ان میں سے ہی ہو اس لئے وقت کو ہاتھ سے نہ جانے دو (از مرقاۃ)

☆ "عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ اتاكم رمضان شهر مبارك فرض الله عليكم صيامه تفتح فيه ابواب السماء وتغلق فيه ابواب الجحيم وتغل فيه مردة الشياطين لله فيه خير من الف شهر من حرم خيرها فقد حرم "(رواه احمد والنسائی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے پاس رمضان آ گیا جو برکت والا مہینہ ہے اللہ تعالیٰ نے تم پر روزے فرض کیے ہیں اس میں آسمانوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور سرکش شیاطین زنجیروں سے جکڑ دیئے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کے لئے اس میں ایک رات وہ ہوتی ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے جو اس کی بھلائی سے محروم کر دیا گیا وہ مکمل طور پر محروم کر دیا گیا۔ (مشکوۃ کتاب الصوم)

وضاحت حدیث:

اتاکم رمضان : تمہارے پاس رمضان کا وقت اور رمضان کے دن آ گئے۔

شهر رمبارک : زیادہ ظاہر مطلب تو یہ ہے کہ یہ "رمضان" سے بدل ہے یا عطف بیان ہے یعنی خبر دی گئی ہے " هو شهر مبارک " وہ برکت والا مہینہ ہے یعنی اس میں بہت مقدار میں حسی اور معنوی بھلائیاں پائی گئی ہیں جیسا کہ عام طور پر یہ بات مشاہدہ میں آتی ہے۔اس میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ یہ دعائیہ کلمہ ہو معنی یہ ہو " جعله الله مبارکا علینا وعلیکم " اللہ تعالیٰ اس مہینہ کو ہمارے اور تمہارے لئے برکت والا بنا دے۔

" وهو اصل فی التهنئة المتعارفة فی اول الشهور بالمبارکة "

یہ اصل میں رمضان کی ابتداء میں اس کی برکت کی تہنیت (مبارک باد) دی گئی ہے۔

نبی کریم ﷺ رجب میں یہ دعا فرماتے تھے " اللھم بارک لنا فی رجب وشعبان وبلغنا رمضان " اے اللہ رجب اور شعبان میں ہمیں برکت عطا فرما اور ہمیں رمضان تک پہنچا۔ اس دعا میں اگرچہ اس طرف اشارہ ہے کہ رمضان خود ہی ذاتی طور پر برکت والا ہے اس کی برکت کی دعا کرنے کی ضرورت نہیں " ولکن لا مانع من قبول زیادۃ البرکۃ " لیکن زیادہ برکت کے لئے دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ بلکہ راقم کے نزدیک تو یہ صورت ہے کہ رمضان ذاتی طور پر برکت والا ہے لیکن اس کی برکت سے فائدہ حاصل کرنا قسمت والوں کو ہی نصیب ہوتا ہے۔ لہذا یہ دعا کرنا کہ اے اللہ تعالیٰ اسے ہمارے لئے برکت والا بنا۔ کہ ہمیں اس سے برکت حاصل کرنا نصیب ہو جائے یہ زیادہ ہی مفید اور باعث سعادت ہے۔

لله فيه ليلة خير من الف شهر:

" یعنی رمضان کی راتوں میں ایک رات وہ ہے جو لیلۃ القدر کے نام سے مشہور ہے اس ایک رات کی عبادت ان ہزار مہینوں کی عبادت سے بہتر ہے جن میں لیلۃ القدر نہ ہو۔

ومن حرم خيرها : (حرم مجہول اور خیرھا منصوب ہے) یعنی جس شخص کو یہ توفیق حاصل نہ ہوئی کہ وہ لیلۃ القدر کو جاگ کر عبادت کر سکے یا کسی طرح بھی لیلۃ القدر کی برکات کو حاصل نہ کر سکے۔

"فقد حرم اى منع الخير كله " وہ مکمل طور پر بھلائی سے محروم ہو گیا لیکن مراد ثواب کامل سے محرومیت ہے اور اس مغفرت سے محرومیت ہے جو لیلۃ القدر سے حاصل ہونی تھی جس پر بہت بڑی کامیابی کی دار و مدار ہے۔

فائدہ جلیلہ : " من صلى العشاء والصبح بجماعة فقد ادرك حظه من ليلة القدر واما ما وقع فى شرح المسلم من انه لا ينال فضلها الا من اطلعه الله عليها فالمراد منه فضلها الكامل "

جس شخص نے عشاء کی نماز جماعت سے ادا کی اور صبح کی بھی جماعت سے ادا کی تحقیق اس نے لیلۃ القدر کا حصہ پالیا البتہ مسلم شریف کی شرح نووی میں جو یہ ذکر ہے کہ جو شخص لیلۃ القدر پر مطلع ہوا صرف اسی نے لیلۃ القدر کی فضیلت کو حاصل کیا اس سے مراد یہ ہے کہ کامل فضیلت اور کامل درجہ اسے

ہی حاصل ہوا جس کو رب تعالیٰ نے کشف وغیرہ کے ذریعے مطلع کر دیا اور اس نے وہ رات عبادت میں اور بیداری میں گزار دی۔ (ازمرقاۃ)

یقیناً ہمارے جیسے انسانوں کے لئے یہی نفع مند ہے اور اسی سے دل کو تسلی ہوگی کہ ہر رات کو لیلۃ القدر سمجھتے ہوئے عشاء کی نماز جماعت سے ادا کرے اور صبح کی نماز بھی جماعت سے ادا کرے اور رمضان شریف میں خصوصی طور پر اس کا اور ہی زیادہ اہتمام کرے۔ (راقم)

☆ "وعن عبد الله بن عمرو ان رسول الله ﷺ قال الصيام والقرآن يشفعان للعبد يقول الصيام اى انى منعته الطعام والشهوات بالنهار وشفعنى فيه ويقول القرآن منعته النوم بالليل فشفعنى فيه فيشفعان ، رواه البيهقى فى شعب الايمان "

عبداللہ بن عمرو (بن العاص) رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا روزے اور قرآن بندے کی شفاعت کریں گے روزے کہیں گے بیشک ہم نے اس کو دن میں کھانے اور خواہشات سے منع کیا تھا اس لئے اے اللہ اس شخص کے لئے ہماری شفاعت قبول فرما اور قرآن کہے گا میں نے اس کو رات کو سونے سے منع کیا تھا اس کے حق میں میری شفاعت قبول فرما تو ان دونوں کی شفاعت قبول کی جائے گی۔

وضاحت حدیث: کافی حد تک ترجمہ سے مطلب واضح ہے تاہم مختصر یہ سمجھا جائے کہ "الصیام" سے مراد رمضان کے روزے ہیں اگرچہ یہ جمع ہیں آگے صیغے واحد کے ہیں یعنی ہر روزہ کہے گا میں نے اسے کھانے پینے اور خواہشات سے منع کیا تھا راقم نے آسانی کے لئے جمع کا ترجمہ کر دیا۔ قرآن پاک تراویح میں پڑھنا اور سننا اور تہجد میں پڑھنا مراد ہے کیونکہ رات کو سونے سے منع کرنے کا یہی مطلب ہوسکتا ہے۔ (ازمرقاۃ)

☆ عن سلمان الفارسى قال خطبنا رسول الله ﷺ فى آخر يوم من شعبان فقال يا ايها الناس قد اظلكم شهر عظيم شهر مبارک شهر فيه ليلة خير من الف شهر جعل الله صيامه فريضة وقيام ليله تطوعا من تقرب فيه بخصلة من الخير كان كم ادى فريضة فيما سواه ومن ادى فريضة فيه كان كمن ادى سبعين فريضة فيما سواه وهو شهر الصبر والصبر ثوابه الجنة وشهر المواساة وشهر يزاد فيه رزق المؤمن من فطر فيه صائما كان له

مغفرة لذنوبه وعتق رقبته من النار وكان له مثل اجره من غير ان ينتقص من اجره شئي قلنا يا رسول الله ليس كلنا نجد ما نفطر به الصائم فقال رسول الله ﷺ يعطي الله هذا الثواب من فطر صائما على مذقة لبن او تمرة اوشربة من ماء ومن اشبع صائما سقاه الله من حوضي شربة لا يظمأ حتي يدخل الجنة وهو شهر اوله رحمة واوسطه مغفرة وآخره عتق من النار ومن خفف عن مملوكه فيه غفر الله له واعتقه من النار "

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہمیں رسول اللہ ﷺ نے خطبہ دیا شعبان کے آخری دن میں تو فرمایا اے لوگو ایک عظیم مہینہ تمہارے قریب آ رہا ہے وہ برکت والا مہینہ ہے اس مہینہ میں ایک رات ہے جو ہزار مہینہ سے بہتر ہے اللہ تعالیٰ نے اس مہینہ میں روزے فرض کئے ہیں اور اس کی رات کو قیام فرض سے زائد عبادت بنائی ہے۔ جو شخص اس میں بھلائی کی کسی ایک عادت سے بھی قرب حاصل کرے وہ ایسا ہی ہے جیسا اس نے اس کے ماسواء میں فرض ادا کیا جس نے اس میں فرض ادا کیا وہ ایسے ہے جیسے اس کے ماسواء میں ستر فرض ادا کئے یہ ماہ صبر ہے اور صبر کا ثواب جنت ہے اور یہ ماہ مواسات ہے اور اس مہینہ میں مومن کا رزق زیادہ کیا جاتا ہے جس شخص نے روزہ دار کا روزہ افطار کرایا اس کے گناہ بخش دیئے جائیں گے اور اسے آگ سے آزاد کر دیا جائے گا روزہ دار کو روزہ افطار کرانے کا ثواب روزہ دار جیسا ہو گا اس کے ثواب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ ہم نے کہا یا رسول اللہ ہم تمام روزہ دار کو روزہ افطار کرانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ یہ ثواب اس شخص کو بھی عطا فرمائے گا جس نے روزہ دار کا روزہ ایک گھونٹ دودھ سے یا ایک کھجور سے یا ایک گھونٹ پانی سے افطار کرا دیا جس شخص نے روزہ دار کو سیر کر کے کھلایا اللہ تعالیٰ اس کو میرے حوض سے پلائے گا وہ پیاسا نہیں ہو گا یہاں تک کہ جنت میں داخل ہو گا۔ یہ وہ مہینہ ہے جس کا اول حصہ رحمت ہے اور درمیانہ حصہ مغفرت ہے اور آخر حصہ آگ سے آزاد ہونا ہے جس شخص نے اپنے غلام پر تخفیف کی اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے گا اور اس کو آگ سے آزاد کرے گا۔

وضاحت حدیث:

قال خطبنا رسول الله ﷺ : اس خطبہ سے مراد جمعہ کا خطبہ ہو یا آپ نے وعظ و نصیحت

کے طور پر کسی وقت خطبہ دیا ہو۔

فقال یا ایھا الناس : " بعد ان حمد اللہ واثنی علیہ " یعنی نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کے بعد لوگوں کو خطاب کیا چونکہ آپ کا ہر خطبہ رب تعالیٰ کی حمد وثناء کے بعد ہی ہوا کرتا تھا۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے خطبہ میں حمد وثناء کا ذکر نہیں کیا اختصار سے کام لیا کیونکہ جو چیز مشہور ہوا سے ذکر نہ کرنے کے باوجود ہی اس کا علم حاصل ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے اختصار سے کام نہیں لیا کہ حمد وثناء کو حذف کیا ہو بلکہ اقتصار سے کام لیا الفاظ تھوڑے ہیں مطلب مکمل ہے کیونکہ آپ نے ذکر فرمایا " خطبنا " **فان الخطبة هی الحمد والثناء کما هو المشهور عند العلماء والفقهاء** " خطبہ علماء وفقہاء کے نزدیک ہے ہی وہ جس میں حمد وثناء پائی جائے۔

قد اظلکم شهر عظیم : ای اقبل علیکم ودنا منکم کانه القی علیکم ظله " اے لوگو تمہاری طرف عظیم مہینہ متوجہ ہو رہا ہے جو تمہارے قریب آ چکا ہے گویا کہ وہ تم پر اپنا سایہ کرنے والا ہے۔

جعل اللہ صیامه فریضة : اللہ تعالیٰ نے اس مہینہ کے دنوں میں روزہ رکھنا فرض قطعی کر دیا۔

وقیام لیله تطوعا : قیام لیلہ سے مراد تراویح کی نماز کے لئے بیدار ہونا ہے اور " تطوعا " سے مراد سنت مؤکدہ ہے کیونکہ تراویح کی نماز ادا کرنا سنت مؤکدہ ہے۔

" فمن فعله فاز بعظیم ثوابه ومن ترکه حرم الخیر وعوقب بعتابه "

جس شخص نے تراویح کو ادا کیا وہ بہت بڑے ثواب سے عظیم کامیاب ہو گیا جس نے تراویح کو ادا نہ کیا وہ بھلائی سے یعنی رب تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہو گیا اور رب تعالیٰ کی سرزنش کی سزا کا مستحق ہو گیا۔ رمضان شریف میں کسی قسم کا نفلی عبادت کا کام کرنا ثواب کے لحاظ سے ان فرضوں کے برابر ہو گا جو رمضان کے علاوہ ادا کئے جاتے ہیں اور رمضان شریف میں فرض ادا کرنے کا وہ ثواب حاصل ہو گا جو رمضان کے علاوہ ستر فرض ادا کرنے کا ثواب حاصل ہوتا ہے یعنی رمضان شریف میں عبادت کا ثواب ستر گناہ ہو جاتا ہے۔

وهو شهر الصبر : رمضان کے مہینے میں انسان کھانے اور پینے اور خواہشات سے رکا رہتا ہے اور رات کو زیادہ دیر تک بیدار رہتا ہے پھر سحری کے وقت اٹھتا ہے یہ تمام کام صبر کے ہیں اس لئے اسے

ماہ صبر کہا گیا ہے گویا کہ ﴿ وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ﴾ کا ایک مطلب یہ ہو گیا کہ روزے اور نماز سے امداد طلب کرو " وفیه اشارہ لطیفة بان باقی الاشہر شہور الشکر " رمضان کو ماہ صبر کہنے سے ایک اور لطیف اشارہ ملتا ہے کہ باقی مہینے شکر والے ہیں کہ ان میں ہر وقت نعمتوں کا استعمال کر کے رب تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔ اور رمضان ماہ صبر ہے " وکمال الصبر متضمن للشکر " اور کامل صبر بغیر شکر کے حاصل نہیں کیونکہ روزہ کے افطار کے وقت تکمیل عبادت کا شکر اور نعمتوں کے استعمال پر شکر لازم ہے۔ اس طرح رمضان شکر و صبر کا مہینہ ہے جو تمام مہینوں کے کمال پر مشتمل ہے۔

وشہر المواساۃ : "بھائی چارگی کا مہینہ" مواساۃ، اصل میں ہمزہ سے جس کو واؤ سے تبدیل کیا گیا ہے اس کا معنی ہے " المساھمة والمشارکة فی المعاش والرزق " ایک دوسرے کے ساتھ حصہ ڈالنا اور رزق اور معیشت میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہونا۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا کہ رمضان کا نام مواساۃ رکھنے میں اس پر تنبیہ ہے کہ رمضان میں انسانوں کے تمام افراد پر احسان کیا جائے خصوصا فقراء و غرباء پر زیادہ رحم کیا جائے۔

وشہر یزاد فیه رزق المومن : یہ وہ مہینہ ہے جس میں رب تعالیٰ رزق کی کثرت کر دیتا ہے خواہ غنی ہو یا فقیر " وھذا امر مشاھد فیه " اس معاملہ کا مشاہدہ پایا گیا ہے۔

" ویحتمل تعمیم الرزق بالحسی والمعنوی وفی الحدیث تشجیع علی الکرم "

اور یہ احتمال بھی ہے کہ رزق حسی اور معنوی کو عام کر دیا جاتا ہو کیونکہ حدیث شریف میں ہے کرم پر شجاعت عطا کر دی جاتی ہے۔

من فطر بتشدید الطاء : یہاں سے روزہ افطار کرانے والے کے اجر و ثواب کو ذکر فرمایا لیکن اس کے ساتھ شرط یہ ہے " اطعمه او سقاہ عند افطارہ من کسب حلال " روزہ دار کو افطار کے وقت کھلانا اور پلانا اس وقت ثواب کا کام ہے جب وہ رزق حلال ہو دوسری روایت میں واضح طور پر رزق حلال کا ذکر ہے روزہ افطار کرانے کی فضیلت کو سن کر صحابہ کرام نے یہ سمجھا کہ شائد سیر ہو کر کھلانا مقصود ہے اسی لئے صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم تمام تو روزہ افطار کرانے کی طاقت نہیں رکھتے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس کی وضاحت فرمائی کہ دارومدار تو خلوص نیت پر ہے صرف دودھ کے ایک گھونٹ یا ایک کھجور یا ایک گھونٹ پانی سے افطار کرانے سے بھی اجر وثواب حاصل ہوتا ہے وہ اجر ثواب حصول مغفرت اور آگ سے آزاد ہونے کا ذریعہ ہے۔اور روزہ افطار کرانے والے کو روزہ دار جیسا ثواب حاصل ہوتا ہے جب کہ روزہ دار کے ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

بیہودہ سوچ: بعض لوگ روزہ نہ رکھنے والے سمجھتے ہیں کہ روزہ افطار کرانے سے ہمیں بھی روزہ دار کی طرح ثواب حاصل ہو جائے گا یہ سوچ ان کی بیہودہ ہے رب تعالیٰ کے احکام کو توڑنے کی جسارت کر کے کوئی یہ سمجھے کہ وہ رزق حرام یا رزق حلال سے روزہ دار کو پکوڑے کھلا کر روزہ کو حاصل کر رہا ہے یہ غلط ہے بلکہ گناہ پر گناہ ہے۔(راقم)

جس شخص نے رب تعالیٰ کے احکام کے مطابق خود بھی عمل کیا اور رزق حلال سے روزہ دار کو سیر ہو کر کھانا کھلایا اسے رب تعالیٰ حضور ﷺ کے حوض کوثر سے پلائے گا جنت میں داخل ہونے تک وہ پیاسا نہیں ہوگا۔

وھو شھر اولہ رحمۃ : رمضان کا وہ مہینہ ہے جس کا اول حصہ رحمت ہے یعنی پہلے دس دن رحمت کے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی رحمت کا نزول ہوتا ہے اسی وجہ سے مومنین روزہ رکھتے ہیں اور تراویح ادا کرتے ہیں ورنہ انسان طبعی طور پر ایسے مشکل کام کیسے کر سکتا ہے۔ "**لو لا اللہ ما اھتدینا و لا تصدقنا و لا صلینا**" اگر اللہ تعالیٰ کی رحمت نہ ہوتی تو نہ ہم ہدایت پر ہوتے اور نہ ہم صدقہ عطا کرتے اور نہ ہم نماز ادا کرتے **الحمد للہ الذی ھدانا لھذا و ما کنا لنھتدی لو لا ان ھدانا اللہ**"

واوسطہ مغفرۃ : اور اس کا درمیانہ حصہ مغفرت ہے یعنی دوسرے دس دنوں میں رب تعالیٰ کی طرف سے مومنین کو مغفرت حاصل ہوتی ہے جس طرح کام کرانے والا مالک مزدوروں کو بھی وقت سے پہلے مزدوری دے دیتا ہے ایسے ہی اللہ تعالیٰ رمضان کو ختم ہونے سے پہلے ہی (اپنے لامحدود علم کی وجہ سے کہ یہ مخلصین مؤمنین ہیں انہوں نے رمضان کی آخر تک قدر کرنی ہے) مغفرت فرما دیتا ہے۔

وآخرہ عتق من النار : رمضان کے آخری دس دن آگ سے آزادی کے ہیں کیونکہ آخر میں

کامل اجر عطا کیا جاتا ہے:

" والکل بفضل الجبار وتوفیق الغفار للمؤمنین الابرار للاعمال الموجبة للرحمة والمغفرة والعتق من النار "

یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہے کہ وہ مومنوں کو ایسے نیک اعمال کی توفیق عطا فرماتا ہے جو ان کے لئے رحمت اور مغفرت اور آگ سے آزاد ہونے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

ومن خفف : جس شخص نے اپنے مملوک غلام پر رحم کرتے ہوئے رمضان میں اس سے خدمت لینے میں تخفیف کی اور اس پر روزوں کی آسانی پیدا کرنے کے لئے اس سے تعاون کیا تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے گا اور اسے آگ سے آزاد کردے گا۔

" وفی روایة لابی الشیخ قال رسول اللہ ﷺ من فطر صائما فی شهر رمضان من کسب حلال صلت علیه الملائکة لیالی رمضان کلها وصافحه جبریل لیلة القدر ومن صافحه جبریل علیه السلام یرق قلبه وتکثر دموعه قال فقلت یا رسول اللہ من لم یکن عنده قال فقبضته من طعام قلت افرأیت ان لم یکن عنده لقمة خبز قال فمذقة لبن قلت افرأیت ان لم یکن عنده قال فشربة من ماء "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص رزق حلال سے رمضان میں کسی کا روزہ افطار کرادے تو فرشتے اس پر رمضان کی تمام راتوں میں رحمت بھیجتے ہیں اور لیلۃ القدر میں جبریل اس سے مصافحہ کرتا ہے۔ اور جس سے جبریل مصافحہ کرے اس کا دل نرم ہو جاتا ہے اور اس کے آنسو زیادہ جاری ہوتے ہیں۔ راوی کہتے ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم میں سے ہر شخص اس کی طاقت نہیں رکھتا آپ نے فرمایا طعام مٹھی بھر سے روزہ افطار کرادے میں نے کہا اگر اس کی بھی کوئی شخص طاقت نہ رکھے تو پھر آپ کی کیا رائے ہے آپ نے فرمایا ایک گھونٹ دودھ دے دے میں نے کہا اگر اس کی بھی کسی کو طاقت نہ ہو؟ تو آپ نے فرمایا کہ ایک گھونٹ پانی ہی دے دے۔ (از مرقاۃ)

☆ " عن ابن عباس قال کان رسول اللہ ﷺ اذا دخل شهر رمضان اطلق کل اسیر واعطی کل سائل "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ رمضان شریف کے آتے ہی ہر قیدی کو چھوڑ دیتے تھے اور ہر سائل کو عطا فرماتے تھے۔ (مشکوۃ باب الصوم)

وضاحت حدیث: اسیر، سے مراد ہر محبوس شخص خواہ وہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کی وجہ سے قید کیا جاتا یا کسی بندے کے حقوق کی وجہ سے قید کیا جاتا۔

"بتخليصه منه تخلقا باخلاق الله تعالىٰ فان الاطلاق في معنى الاعتاق"

اللہ تعالیٰ رمضان شریف میں بندوں کو آزاد کرتا ہے چونکہ نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کی صفات سے متصف ہیں اس لئے آپ قیدیوں کو آزاد کرتے تھے۔

واعطى كل سائل: اور آپ ہر سائل کو عطا فرماتے تھے اس سے مراد عادت سے زائد آپ رمضان شریف میں عطا فرماتے تھے ورنہ آپ نے کبھی سائل کو یہ نہیں کہا میں نہیں دیتا

"انه ما سئل شيئا الا اعطاه فجاء ه رجل فاعطاه غنما بين جبلين فرجع الى قومه فقال يا قوم اسلموا فان محمدا يعطى عطاء من لايخشى الفقر" (رواه مسلم)

نبی کریم ﷺ سے جب بھی سوال کیا گیا آپ نے ضرور عطا فرمایا ایک شخص آپ کے پاس حاضر ہوا آپ نے اسے دو پہاڑوں کے درمیان چرنے والی بھیڑ بکریاں (تمام یا کثیر) عطا فرما دیں۔ وہ شخص جب اپنی قوم کی طرف لوٹا تو اپنی قوم کو کہنے لگا اے میری قوم اسلام لے آؤ۔ بیشک محمد (ﷺ) تو اتنا دیتے ہیں کہ غربت کا خوف باقی نہیں رہتا۔

"وروى البخاري من حديث جابر ما سئل رسول الله ﷺ عن شئى قط فقال لا"

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایسا نہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے کسی چیز کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا ہو "لا" میں نہیں دیتا۔

"وكذا غير مسلم اى ما طلب منه شئى من امر الدنيا فمنعه"

مسلم شریف میں ہے نبی کریم ﷺ سے دنیا کے متعلق کوئی چیز بھی طلب کی گئی تو آپ نے اس سے منع نہیں فرمایا۔

فرزدق نے کہا:

ما قال لا قط الا فی تشهده　　　　لو لا اتشهد کانت لاؤہ نعم

نبی کریم ﷺ نے سوائے تشہد کے " لا " (نہیں دیتا) نہیں فرمایا اگر تشہد نہ ہوتا تو آپ کا "لا" (نہیں) بھی "نعم" (ہاں) ہوتا۔

تنبیہ: شیخ عزالدین بن عبدالسلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے "لا" نہ کہنے کا مطلب یہ ہے:

" لم یقل لا منعا للعطاء و لا یلزم من ذلک ان لا یقولها اعتذارا "

کہ آپ نے کسی سائل کو منع کرنے کی غرض سے اور نہ دینے کے ارادہ سے " لا " ارشاد نہیں فرمایا البتہ عذر کے طور پر آپ نے " لا " ارشاد فرمایا۔ نبی کریم ﷺ کے پاس جنگ کے موقع پر صحابی حاضر ہوئے کہ ہمارے پاس سواریاں نہیں آپ ہمیں سواریاں عطا فرمائیں۔ تو آپ کے جواب کو رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا " قلت لا اجد ما احملکم علیه " آپ نے فرمایا میں نہیں پاتا کہ تمہیں اس پر سوار کردوں۔

" و لا یخفی الفرق بین قول لا اجد ما احملکم و بین لا احملکم "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا " لا اجد ما احملکم علیه " میرے پاس کوئی سواری نہیں کہ میں تمہیں سواری پر سوار کروں۔ آپ نے یہ ارشاد نہیں فرمایا " لا احملکم " میں تمہیں سواری عطا نہیں کرتا۔ دونوں کلاموں میں بہت بڑا فرق ہے:

" و فی حدیث ابن عباس عند الشیخین قال کان النبی ﷺ اجود الناس و اجود ما یکون فی رمضان حین یلقاه جبریل فیدا رسه القرآن فلرسول الله ﷺ حین یلقاه جبریل اجود بالخیر من الریح المرسلة "

بخاری و مسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حدیث کو روایت کیا رسول اللہ ﷺ سب لوگوں سے زیادہ سخی تھے۔ اور رمضان شریف میں جب آپ سے جبریل ملتے اور قرآن پاک کا دور کرتے تو آپ اور ہی زیادہ سخاوت فرماتے۔ رسول اللہ ﷺ جبریل کی ملاقات کے وقت تیز چلنے والی ہوا سے بھی زیادہ سخاوت فرماتے۔ (از مرقاۃ)

☆ "عن ابن عمر ان النبی ﷺ قال ان الجنة تزخرف لرمضان من رأس الحول الی

حول قابل قال فاذا كان اول يوم من رمضان هبت ريح تحت العرش من ورق الجنة على حور العين فيقلن يا رب اجعل لنا من عبادك ازواجا تقربهم اعيننا وتقرا عينهم بنا"
(رواه البيهقي الاحاديث الثلاثة في شعب الايمان)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک جنت کو ایک سال کے رمضان سے دوسرے سال کے رمضان تک آراستہ کیا جاتا ہے عرش کے نیچے سے جنت کے پتوں سے ہوا بڑی آنکھوں والی حوروں پر چلتی ہے وہ حوریں کہتی ہیں اے ہمارے رب اپنے بندوں سے ہمارے زوج بنا جن سے ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور ہماری وجہ سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔
(مشکوۃ کتاب الصوم)

وضاحت حدیث:

تزخرف : سونے وغیرہ سے مزین کرنا۔ **لرمضان** : رمضان کے آنے کے لئے۔

من رأس الحول الی حول قابل : اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ ہے کہ محرم سے آنے والے محرم تک جنت کو سجایا جاتا ہے اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ رمضان سے رمضان تک جنت کو سجایا جاتا ہے ہر صورت میں مطلب یہ ہے:

" وحاصله ان الجنة في جميع السنة من اولها الى آخرها مزينة لاجل رمضان وما يترتب عليه من كثرة الغفران ورفع درجات الجنان ما قبله وما بعده من الزمان "

کہ جنت کو تمام سال اول سے آخر تک سجائے رکھا جاتا ہے یعنی رمضان کے آنے اور اس پر کثیر مغفرت کے واقع ہونے اور جنتوں کا مقام بلند ہونے کی وجہ سے ان کو سجایا جاتا ہے۔ " **ويناسبه كونه يوم عيد وسرور** " رمضان کی آمد جنت والوں کے لئے عید کا دن ہوتا ہے۔

فائدہ : جب رمضان کی آمد کے لئے جنت کو سجایا جاتا ہے اور رمضان کا آنا جنت والوں کے لئے عید کا دن ہوتا ہے تو اسی سے واضح ہو گیا کہ جس ذات کے طفیل رمضان ملا وہ ذات نبی کریم ﷺ کی ہے اس ذات کے آنے پر گھروں، گلیوں اور محلوں کو سجانا اور اس دن کو عید ماننا فرشتوں کی سنت ہے۔ (راقم)

جب رمضان کا پہلا دن ہوتا ہے تو عرش کے نیچے سے معطر (خوشبودار) ہوا چلتی ہے جو جنت

کے درختوں سے ہوتی ہوئی جنتی حوروں کے سروں تک پہنچتی ہے باوجود اس کے کہ وہ ہوا خوشبودار ہوگی لیکن روزہ دار کے منہ کی بو اس سے بھی زیادہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اسی لئے حوریں بھی اللہ تعالیٰ کے نیک روزے دار بندوں کی زوجیت میں آنے کو پسند کریں گی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: " **لو یعلم العباد ما رمضان لتمنت امتی ان تکون السنة کلها رمضان** " اگر بندوں کو پتہ چل جائے کہ رمضان (کی فضیلت) کیا ہے تو امت یہ تمنا کرتی کہ تمام سال رمضان ہوتا۔ (از مرقاۃ)

☆ " **عن ابی ھریرة عن النبی ﷺ انه قال یغفر لامته فی آخر لیلة فی رمضان قیل یا رسول الله اھی لیلة القدر قال لا ولکن العامل انما یوفی فی اجره اذا قضی عمله** "

(رواہ احمد)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ آپ کی امت (کے روزہ داروں) کی رمضان کی آخری رات کو مغفرت کردی جاتی ہے صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ کیا وہ لیلۃ القدر ہوگی؟ آپ نے فرمایا نہیں لیکن عمل کرنے والا جب اپنا عمل مکمل کر لیتا ہے تو رب تعالیٰ کی طرف سے اسے مکمل اجر عطا کیا جاتا ہے۔ (مشکوۃ کتاب الصوم)

وضاحت: صحابہ کرام نے سمجھا شائد مغفرت کی وجہ آخری رات کا لیلۃ القدر ہونا ہے لیکن حضور ﷺ نے فرمایا کہ مغفرت کی وجہ روزے داروں کے عمل کی تکمیل ہوگی۔ لیلۃ القدر چونکہ معین بھی نہیں پھر آخری رات کا انتیس کی طاق رات ہونا بھی ضروری نہیں وہ تیس بھی ہو سکتی ہے پھر لیلۃ القدر ذاتی طور پر تو بخشش کا ذریعہ نہیں۔ بلکہ اس میں عبادت کی جائے تب وہ بخشش کا ذریعہ ہے۔ (از مرقاۃ)

☆ " **عن عبد الله بن مسعود قال خرجنا مع رسول الله ﷺ ونحن شباب لا نقدر علی شیء وقال یا معشر الشباب علیکم بالباءة فانه اغض للبصر واحصن للفرج فمن لم یستطع منکم الباءة فعلیه بالصوم فان الصوم له وجاء ھذا حدیث حسن صحیح** "

(ترمذی ابواب النکاح

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ نکلے اور ہم جوان تھے ہم کسی چیز پر قادر نہیں تھے آپ نے فرمایا اے جوانوں کے قبیلہ تم پر لازم ہے کہ شادی کر لو بیشک یہ نظر کو پست کرنے والی ہے اور فرج کی حفاظت کرنے والی ہے جو شخص تم میں سے شادی کی طاقت

نہیں رکھتا اس پر لازم ہے کہ وہ روزے رکھے بیشک روزہ اس کی شہوت کو کم کرنے کا ذریعہ ہے۔

یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھ کچھ اور جوان بھی تھے یہ حضرات غربت کی وجہ سے شادی کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے کہ مہر وغیرہ ادا کریں نبی کریم ﷺ کے ساتھ یہ لوگ چل رہے تھے تو آپ نے ان کو مشورہ دیا کہ شادی کرلو مطلب یہی تھا کہ تم محنت مزدوری کرو اور والدین کو بھی کہو کہ وہ بھی محنت مزدوری کر کے تمہاری شادی کا انتظام کرلیں۔ جب تک شادی کا انتظام نہیں ہوسکتا روزے رکھا کرو کیونکہ ان سے شہوت کم ہوتی ہے۔

"وجاء" اگر چہ معنی خصی بنتا ہے تاہم یہاں مراد شہوت کا کم ہونا ہے۔اور یہ بھی خیال رہے کہ نبی کریم ﷺ کا نوجوان صحابہ کرام کو روزہ رکھنے کا مشورہ دینا عام نفلی روزے رکھنے کے متعلق تھا کیونکہ رمضان کا روزہ تو ہر بالغ شخص پر فرض ہے۔

فَمَنْ كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ :

"جو شخص تم میں سے ہو مریض یا سفر میں ہو تو اتنے اور دنوں میں"یعنی جو شخص مریض ہو یا سفر میں ہو روزہ نہ رکھ سکے تو جتنے روزے نہیں رکھ سکا اتنے دن روزہ قضا کرلے۔

مریض کب روزہ افطار کرسکتا ہے؟ جب اتنی شدید مرض ہو کہ روزہ سے ہلاک ہونے کا خطرہ ہو تو روزہ افطار کرنے کی شرعا اجازت ہے۔اگر مسلمان ماہر طبیب یہ کہے کہ روزہ رکھنے سے یہ مرض بڑھ جائے گی تو پھر بھی روزہ افطار کیا جاسکتا ہے۔اسی طرح اگر مسلمان ماہر طبیب یہ بتائے کہ روزہ رکھنے سے یہ مرض لمبی ہوجائے گی دیر سے ٹھیک ہوگی تو اس صورت میں بھی روزہ افطار کیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح تندرست شخص کو مسلمان ماہر طبیب یہ بتائے کہ روزہ رکھنے سے تم فلاں مرض میں مبتلا ہو جاؤ گے تو روزہ افطار کرنے کی اجازت ہے۔ (از تبیین الحقائق للزیلعی رحمہ اللہ)

مسافر کب روزہ افطار کرسکتا ہے؟ جب سفر کا ارادہ پایا جائے اور سفر کی وہ مقدار جو شرعاً انسان کو مسافر بناتی ہے اتنی مقدار سفر کرنے کا ارادہ ہو۔حکومت آج امریکی حکم پر تعمیل کرنے کی غرض سے دینی مدارس کے خلاف جو غیر اسلامی پروپیگنڈہ میں مشغول ہے بے دینوں کو دین دار بنانے کی فکر نہیں لیکن دین داروں کو بے دین بنانے کی فکر بہت شدت سے لاحق ہے۔ہوٹلوں میں برتن دھونے والے بچوں کو

پڑھانے کی فکر نہیں، چھوٹے چھوٹے بچے کوڑے سے کاغذ اٹھا کر بیچ کر محنت مزدوری کر رہے ہیں ان کو تعلیم دینے کی فکر نہیں، جوتے پالش کرنے والے بچوں کو اور ادھر سے ادھر اٹھا کر سامان لے جانے والے بچوں کو پڑھانے کی فکر نہیں لیکن بے دینوں کو فکر ہے تو اس کی کہ قرآن پاک، حدیث پاک، فقہ، اصول فقہ، علم کلام، علم معانی، علم بیان، علم بدیع، علم صرف، علم نحو، علم منطق، فلسفہ، ادب، مناظرہ، نظم، عروض وغیرہ پڑھنے والوں کو انگلش پڑھا کر بکاؤ مال کیسے بنایا جائے امریکہ کا ہمنوا کیسے بنایا جائے لیکن انشاء اللہ علماء کرام علوم عصریہ کو پڑھ کر زیادہ ان کا وبال جان بنیں گے۔

راقم نے 1994ء میں لکھا: سراجی کے اردو حاشیہ کے آخر میں ''خیالات محشی'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا اس کا مختصر اقتباس دیکھیں ساتھ ساتھ ہی انشاء اللہ مقدار سفر بھی معلوم ہوگی اور علماء کے نظریات کا بھی پتہ چل جائے گا۔

سلف صالحین علوم شرعیہ نقلیہ میں جہاں بلند و بالا مقام رکھتے تھے وہاں علوم عقلیہ میں بھی ان کو مہارت تامہ حاصل تھی۔ منطق فلسفہ ہیئت ریاضی وغیرہ علوم میں ان کی تصنیفات کو دیکھنے سے ان کے جواہر علمی کا پتہ چلتا ہے لیکن یہ خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ فلسفہ میں علمی ابحاث کی ضرورت کیوں در پیش آئی؟ اس لئے کہ جب فلاسفہ بخت و اتفاق کے قائل ہوئے دہریئے ہوئے مالک الملک کا تصور چھوڑ بیٹھے تو سلف صالحین، علماء ربانیین نے ان کا رد بلیغ فرمایا۔ حضرت علامہ مولنا فضل حق خیر آبادی رحمہ اللہ کا ''ھدیہ سعیدیہ'' اس پر شاہد ہے غرضیکہ فلسفی بحثوں میں عرق ریزی صرف وقتی تقاضا کے پیش نظر تھی سلف صالحین کی طرح ہر زمانہ میں علماء کرام وقتی تقاضا کو پیش نظر رکھیں پیمانہ بدلنے سے ذہن کا بدلنا ضروری ہے۔

فقہاء کرام نے مقدار سفر اڑتالیس میل بیان کی ہے لیکن اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے ساڑھے ستاون میل بیان کی ہے وجہ کیا ہے؟ وجہ صرف یہ ہے کہ آپ کو علمی کمالات کے ساتھ ذہنی فراست بھی حاصل تھی حقیقت یہ ہے کہ ایک حصہ علم کے ساتھ نو حصہ عقل کی بھی ضرورت ہے۔

فقہاء کرام کے بیان کردہ میل اور ہمارے مروج میل کی مقدار میں فرق ہے اس فرق کو سمجھا

جائے تو کوئی صاحب عقل اب بھی اڑتالیس میل کا فتوی نہ دے لیکن کچھ لکیر کے فقیر اب بھی اڑتالیس میل کا راگ الاپتے رہتے ہیں وہ فرق میں انشاء اللہ آگے واضح کر رہا ہوں۔ درحقیقت ذہنوں میں جمود طاری رہنا دائیں بائیں نہ دیکھنا، دائیں بائیں دیکھنے کو شجرہ ممنوعہ سمجھنا ہی اس قسم کی غلطیوں کا سبب ہے اس لئے میرے خیال میں موجودہ دور کے تقاضا کے مطابق علماء کرام کا مقصد عظیم مطمح نظر علوم دینیہ کو ہی سمجھیں لیکن جدید علوم، انگلش، سائنس ریاضی اور اکنامکس جیسے مضامین بھی پڑھیں۔

یہ حقائق روز روشن کی طرح واضح ہیں کہ انگریز کی سازش سے علوم دینیہ کو "العوام کالانعام" کی نظر میں حقیر کر کے دکھایا گیا۔ آج کل بھی کئی لوگوں کو کہتے سنا گیا کہ یہ لوگ مدارس میں ایک دو کتابیں پڑھاتے ہیں احمقوں کی جنت میں بسنے والے ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ دینی مدارس میں بیس بائیس علوم پڑھائے جاتے ہیں یہ فقط دینی مدارس کا خاصہ ہے کہ ان کے مدرسین صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر بغیر کسی وقفہ کے پانچ چھ گھنٹے لگا تار پڑھاتے ہیں ہڑتالیں اور سہولیات کے مطالبات کا یہاں نام ونشان نہیں۔ سال کی دو ماہ کی چھٹیاں اور ہر جمعہ کی چھٹی نکال کر آپ حساب کریں تو یقیناً آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ سال میں تقریباً 240 دن تک پڑھائی کا جاری رہنا صرف دینی مدارس کا خاصہ ہے ورنہ دنیاوی مدارس سال میں 150 دن پڑھائی بھی مکمل نہیں کر پاتے۔ جن حضرات نے دینی تعلیم حاصل کی پھر دنیاوی تعلیم حاصل کر کے سکولوں کالجوں سے منسلک ہو گئے وہ بفضلہٖ تعالیٰ اسے تسلیم کرتے ہیں کہ حقیقت میں پڑھائی دینی مدارس میں ہے جہاں علوم کو علوم کر کے پڑھایا جاتا ہے خلاصے یاد کرا کے امتحان پاس کرانا ان کا شیوہ نہیں اب صرف اس پر کف دست (ہتھیلیاں) ملنا اور اظہار تأسف (افسوس) کرتے رہنا کہ "انگریز نے علوم دینیہ کی وقعت کو کم کر دیا" کافی نہیں بلکہ اس کا مقابلہ کرنا ضروری ہے۔

اس لئے عزیز طلباء کرام جور و جفا کی آندھیوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے مستقبل کو درخشاں کرنے کے لئے علوم دینیہ میں مہارت تامہ حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ کو حاصل کرنے کے لئے قدم بڑھاؤ۔ بڑھتے چلے جاؤ انشاء اللہ برتری علوم دینیہ کو ہی حاصل رہے گی۔ تا کہ علوم جدیدہ کی وجہ سے کوئی کند ذہن دین کا باغی تمہیں جاہل کہنے کی جرات نہ کر سکے۔ بڑے بڑے ڈاکٹر بھی اپنی ڈاکٹریٹ کی ڈگری کو انشاء اللہ تمہارے علوم کے سامنے کم ترین سمجھیں گے۔

مقدار سفر کی تحقیق: "المیل وهو اربعة آلاف ذراع وهو اربع وعشرون اصبعا وهی ست شعیرات ظهر لبطن وهوست شعرات بغل" (شامی)

میل چار ہزار ذراع کا ہے ایک ذراع چوبیس انگلیوں کا ہے ایک انگلی چھ جو کی ہے جن دعرضا رکھا جائے اور ایک جو خچر کے چھ بالوں کے برابر ہے۔ عام مشہور یہ ہے کہ ذراع ہاتھ کی انگلیوں سے لے کر کہنیوں تک ہے جو نصف گز ہے (ڈیڑھ فٹ ہے) اس لحاظ پر فقہی میل اور ہمارے مشہور میل میں فرق واضح ہو گیا اس فرق کو نکالنے سے واضح ہو جائے گا کہ مقدار سفر کیا ہے؟ وہ فرق یہ ہے

فقہی میل ۴۸x۴۰۰۰---۱۷۶۰ (رواجی میل) =۸۰ گز۔۴ فرلانگ۔۵۴ میل۔

راقم نے ۲۴ انگلیوں کی پیمائش کی ہے جو انیس انچ سے کچھ زائد بنتی ہیں اسی وجہ سے جلیل القدر ہستیوں کے حساب میں تھوڑا فرق پایا گیا ہے مفکر اسلام مفسر قرآن حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری نے ضیاء القرآن میں مقدار سفر چون 54 میل لکھی ہے اور حضرت علامہ محمود احمد رضوی رحمہ اللہ نے فیوض الباری میں ستاون میل اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے فتاوی رضویہ میں ساڑھے ستاون میل ذکر فرمائی ہے راقم کو احتیاط ساڑھے ستاون میل میں ہی نظر آتی ہے اس مقدار کے مطابق آج کل پیمائش کے نئے انداز کے مطابق مقدار سفر = بانوے کلومیٹر پانچ سو سینتیس میٹر ہے۔

مسافر روزہ رکھ سکے تو روزہ رکھنا بہتر ہے: مسافر نے صبح صادق سے پہلے سفر شروع کر لیا تو روزہ افطار کر سکتا ہے۔ اگر صبح صادق کے بعد سفر شروع کیا تو رزہ افطار کرنا درست نہیں تاہم اگر روزہ افطار کر لے تو اس پر کفارہ لازم نہیں آئے گا۔ مسافر کو اگر روزہ رکھنے سے ہلاکت کا خطرہ ہو تو اس پر واجب ہے کہ روزہ افطار کرے اگر ہلاکت کا خطرہ نہیں دوران سفر روزہ رکھ سکتا ہے تو روزہ رکھنا بہتر ہے کیونکہ جب تمام لوگ روزہ دار ہوں تو ان کے ساتھ روزہ رکھنا آسان ہوتا ہے اکیلے روزہ رکھنا مشکل ہے۔ لیکن اگر سفر کی مقدار مکمل ہے سفر بڑی آسانی کا ہو خواہ ہوائی جہاز پر سفر کر رہا ہو تو یہ روزہ افطار کرنا چاہے تو روزہ افطار کر سکتا ہے بعد میں قضاء کر لے۔ (ازنور الایضاح وطحطاوی)

مرض اور سفر کے حکم میں فرق: سفر سے روزہ افطار کرنا مباح نہیں ہوتا اگر سفر کرنے کا ارادہ ہے تو

روزہ شروع میں رکھے ہی نہیں روزہ رکھ کر صبح صادق کے بعد سفر کرنے پر افطار کرنا جائز نہیں لیکن مریض ہوتو روزہ شروع میں نہ رکھے پھر بھی جائز ہے اور دن کے کسی وقت بھی مریض ہو جائے روزہ مکمل کرنا دشوار ہوتو روزہ افطار کرسکتا ہے۔ (ازطحاوی)

قضاء کا حکم: مریض حالت مرض میں اور مسافر حالت سفر میں اگر فوت ہو جائیں تو ان پر قضاء کرنا لازم نہیں اور نہ ہی فدیہ دینے کی وصیت کرنا لازم ہے کیونکہ اس نے قضاء کرنے کے دن پائے ہی نہیں۔ مریض درست ہو گیا، مسافر مقیم ہو گیا تو جتنا جلدی ہو سکے روزے قضا کرلے کیونکہ زندگی کا پتہ نہیں اپنے ذمہ سے فرض کو اتارنا ضروری ہے تاہم اگر وقفے وقفے سے روزے قضاء کرے تو جائز ہے لگاتار قضا کرنا لازم نہیں اگر قضاء میں اتنی دیر کردے کہ دوسرا رمضان آجائے تو پہلے وقتی رمضان کے روزے ادا کرے پھر رمضان کے بعد جن روزوں کی قضاء لازم تھی ان کو قضاء کرے۔ (ازطحاوی)

مسافر کے روزہ کے متعلق احادیث:

" عن عائشة قالت ان حمزة بن عمرو الاسلمی قال للنبی ﷺ اصوم فی السفر وکان کثیر الصیام فقال ان شئت فصم وان شئت فافطر "

(بخاری ، مسلم ، مشکوۃ باب صوم المسافر)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ بیشک حمزہ بن عمرو اسلمی نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں سفر میں روزہ رکھتا ہوں یہ بہت روزے رکھتے تھے نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر تم چاہو تو روزہ رکھلو اور اگر تم چاہو تو افطار کرلو۔

وضاحت حدیث: صحابی کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ میں سفر میں روزہ رکھتا ہوں اس کا حکم کیا ہے کیا میں گنہگار تو نہیں ہو رہا نبی کریم ﷺ نے فرمایا چاہو تو روزہ رکھ لو چاہو تو افطار کرلو یعنی تمہیں اختیار ہے:

" فقال بعضهم الصوم افضل وهو قول مالک والثوری والشافعی واصحاب ابی حنفية "

بعض حضرات کا قول ہے کہ مسافر کے لئے روزہ رکھنا افضل ہے یہی قول امام مالک، سفیان

ثوری، امام شافعی اور احناف رحمھم اللہ کا ہے۔

اعتراض : نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے " لیس من البر الصیام فی السفر " سفر میں روزہ رکھنا نیکی کا کام نہیں اس سے تو پتہ چلتا ہے کہ روزہ رکھنا گناہ ہے۔

جواب : نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ایک خاص موقع پر ہے:

" حین رأی زحما ورجلا قد ظلل علیه فقال ما هذا قالوا صائم فقال لیس من البر الصیام فی السفر "

جب کہ آپ نے دیکھا کہ لوگ ہجوم کئے ہوئے ہیں آپ نے دیکھا کہ ایک شخص پر لوگ سایہ کئے ہوئے ہیں (شدید گرمی روزہ کی وجہ سے ایک شخص بیہوش ہو گئے تھا اس حالت کو دیکھ کر) آپ نے فرمایا سفر کی حالت میں روزے رکھنا نیکی کا کام نہیں۔ آپ کا یہ ارشاد ہمارے موقف کے خلاف نہیں کیونکہ ہمارا موقف یہ ہے " واما الذی یجهده الصوم فی السفر ولا یطیقه فافطاره اولی " کہ جو شخص سفر میں روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتا ہو بلکہ روزہ اسے مشقت میں ڈالے تو اس کے لئے روزہ افطار کرنا بہتر ہے۔ (از مرقاۃ)

☆ " وعن ابی سعید الخدری قال غزونا مع رسول الله ﷺ لست عشرة مضت من شهر رمضان فمنا من صام ومنا من افطر فلم یعب الصائم علی المفطر ولا المفطر علی الصائم " (رواہ مسلم)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مل کر غزوہ (جہاد) کیا جب کہ رمضان کے سولہ دن گزر گئے تھے بعض ہم میں سے روزہ دار تھے اور بعض ہم میں سے افطار کر رہے تھے روزہ دار افطار کرنے والے کا کوئی عیب نہیں بیان کر رہا تھا اور افطار کرنے والا روزہ دار کا کوئی عیب بیان نہیں کر رہا تھا۔ (مشکوۃ باب صوم المسافر)

وضاحت حدیث : اس حدیث پاک سے عظیم فائدہ یہ حاصل ہوا کہ جب کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی شریعت نے اجازت دی ہو تو کوئی عمل کرے تو اس سے نہ پوچھا جائے کہ تم نے اس پر عمل کیوں کیا ہے؟ اور اگر کوئی عمل نہ کرے تو اس سے نہ پوچھا جائے کہ تو نے یہ عمل کیوں نہیں کیا کاش کہ اس حدیث پاک کو لوگ سمجھیں مستحبات اور مباحات میں جھگڑے پیدا کر کے اپنی بے وقوفی کا

اظہار نہ کریں اور لوگوں کو دین سے برگشتہ نہ کریں۔

☆ عن انس قال کنا مع النبی ﷺ فی السفر فمنا الصائم ومنا المفطر فنزلنا منزلا فی یوم حار فسقط الصوامون وقام المفطرون فضربوا الابنیة وسقوا الرکاب فقال رسول اللہ ﷺ ذھب المفطرون الیوم بالاجر " (بخاری ومسلم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے بعض ہم میں سے روزہ دار تھے اور بعض افطار کرنے والے تھے ہم ایک جگہ اترے سخت گرم دن تھا روزے دار گر گئے اور افطار کرنے والے قائم رہے انہوں نے ہی خیمے لگائے اور سواریوں کو پانی پلایا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آج افطار کرنے والوں نے زیادہ اجر حاصل کرلیا۔ (مشکوۃ باب صوم المسافر)

وضاحت حدیث : سقط الصوامون ، کا ظاہری معنی ہی مراد لے لیا جائے تو پھر بھی درست ہے کہ روزے دار نڈھال ہو کر گر گئے لیٹ گئے اور مجازی معنی زیادہ مناسب ہے کہ وہ حرکت کرنے یعنی چلنے پھرنے سے عاجز آ گئے یہاں تک کہ وہ اپنا کام خیمے لگانے اور اپنی سواریوں کو پانی پلانے کا بھی سرانجام نہ دے سکے۔ افطار کرنے والوں نے اپنا کام بھی کیا اور روزے داروں کا کام بھی کیا۔ اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ وہ روزے داروں سے زیادہ اجر حاصل کر گئے۔

اس حدیث پاک سے یہ واضح ہوا کہ اگر سفر میں روزہ سفر کرنے سے رکاوٹ بنے یا مشقت کا سبب بنے تو ایسے حال میں روزہ افطار کرنا زیادہ بہتر ہے۔ (از مرقاۃ)

☆ عن ابن عباس قال خرج رسول اللہ ﷺ من المدینة الی مکة فصام حتی بلغ عسفان ثم دعا بماء فرفعه الی یده لیراه الناس فافطر حتی قدم مکة وذلک فی رمضان فکان ابن عباس یقول قد صام رسول اللہ ﷺ وافطر فمن شاء صام ومن شاء افطر "
(بخاری ومسلم ، وفی روایة عن جابر انه شرب بعد العصر)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ کی طرف نکلے یہاں تک کہ آپ عسفان میں پہنچے تو آپ نے پانی طلب کیا جو اپنے ہاتھ میں لیا پھر ہاتھوں کو بلند کیا تا کہ لوگ دیکھ لیں تو آپ نے روزہ افطار کر دیا یہاں تک کہ مکہ مکرمہ میں آ گئے یہ رمضان میں افطار کیا گیا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے رسول اللہ ﷺ نے روزہ بھی رکھا اور افطار بھی کیا اس

لئے سفر کے حال میں جو چاہے روزہ رکھے اور جو چاہے افطار کر دے۔ (مشکوۃ باب صوم المسافر)

وضاحت حدیث: عسفان (بضم العین وسکون السین) مکہ شریف سے دو مرحلے دور ایک جگہ کا نام ہے "ثم دعا بماء" (پھر پانی طلب کیا) فرفعه الی یده" کا معنی یہ بیان کیا گیا "فرفعه رفعا بلیغ منتهیا الی رفع یده" کہ پھر آپ نے وہ پانی اپنے ہاتھوں کو جہاں تک بلند کر سکتے تھے بلند کیا۔

لیراه الناس فافطر : لیعلموا جوازه او لیختاروا متابعته" پانی کو بلند کر کے روزہ افطار کرنے کی وجہ یہ تھی کہ لوگ دیکھ لیں کہ روزہ افطار کرنا جائز ہو چکا ہے تا کہ وہ بھی نبی کریم ﷺ کی متابعت کر سکیں۔

اعتراض: پہلے تو بیان کیا گیا ہے کہ مسافر کے لئے روزہ رکھ کر صبح صادق کے بعد سفر کرنے پر افطار کرنا جائز نہیں۔ تو وہ کس طرح درست ہے جب نبی کریم ﷺ نے سفر میں عصر کے وقت روزہ افطار فرمادیا۔

جواب: " وهو لحصول العذر الحادث وهو التهيؤ للقتال ان احتیج الیه فی الاستقبال "

نبی کریم ﷺ کا روزہ افطار کرنا عذر کی وجہ سے تھا ایک تو یہ کہ لمبا سفر طے کیا جا چکا تھا پھر آنے والے وقت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ قتال کی تیاری کے لئے روزہ افطار کرنا بہتر ہے کیونکہ یہ فتح مکہ کے دوران واقع درپیش آیا۔ " وهو اما لبیان الجواز " اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بیان جواز مقصود ہو کیونکہ جیسا پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اگر چہ افطار درست تو نہیں لیکن اگر افطار کر دے تو کفارہ لازم نہیں جس سے یہ سمجھ آتا ہے کہ افطار نہ کرنا بہتر ہے اگر افطار کر لیا تو کسی حد تک جائز ہے نبی کریم ﷺ پر لازم تھا کہ آپ ہر اس فعل پر ایک مرتبہ عمل کریں جو جائز ہے۔ (از مرقاۃ)

تنبیہ: امت کے حق میں جو کام خلاف اولیٰ ہے لیکن جائز ہے وہ کام کرنا نبی کریم ﷺ پر بیان جواز کے لئے واجب ہوتا تھا۔ جب آپ پر واجب ہوتا تھا تو آپ کے حق میں وہ خلاف اولی نہیں ہوتا تھا۔ جاہل عشاق یہ فرق نہیں سمجھتے اگر کوئی یہ کہہ دے نبی کریم ﷺ نے بظاہر خلاف اولی کام کیا۔ تو اس

پروہ اودھم مچا دیتے ہیں "بظاہر" کے باریک فرق کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

☆ "عن انس بن مالک الکعبی قال قال رسول اللہ ﷺ ان اللہ وضع عن المسافر شطر الصلوۃ والصوم عن المسافر وعن المرضع والحبلی رواہ ابو داؤد والترمذی والنسائی وابن ماجہ"

حضرت انس بن مالک کعبی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے مسافر سے نصف نماز کی تخفیف فرمائی۔ اور مسافر اور دودھ پلانے والی عورت اور حاملہ عورت سے روزوں میں تخفیف فرمائی۔ (مشکوۃ باب صوم المسافر)

وضاحت حدیث : سب سے پہلے تو راوی حضرت انس رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ سمجھا جائے کہ یہ ابو امامہ انس بن مالک کعبی قشیری، عقیلی، عامری ہیں ان سے صرف یہ ایک حدیث مروی ہے۔ دوسرے انس، ابو حمزہ انس بن مالک انصاری، تجاری، خزرجی ہیں جو نبی کریم ﷺ کے مدینہ طیبہ میں رہنے کی تمام مدت خدمت گزاری میں رہے ان سے کثیر روایات مروی ہیں۔

" شطر الصلوۃ " سے مراد چار رکعت والی نمازوں میں نصف نماز یعنی دو رکعتیں معاف فرما دیں جن کی قضا نہیں۔ " والصوم عن المسافر والمرضع والحبلی " سے ایک اور مسئلہ کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ دودھ پلانے والی عورت یا حاملہ عورت پر نماز دوگانہ نہیں۔ بلکہ صرف روزہ کا حکم ان پر، مسافر کی طرح ہے کہ اگر وہ روزہ نہ رکھ سکیں کہ ان کے روزہ سے ان کے مریض ہونے کا خطرہ ہے یا بچے کو اور کوئی چیز نہیں کھلائی اور پلائی جا سکتی تو وہ وقتی طور پر روزہ افطار کرلیں اور بعد میں قضاء کرلیں ان کو فدیہ دینا جائز نہیں کہ روزے کے بدلے فدیہ پر اکتفا کرلیں بلکہ قضا لازم ہے۔

اعتراض : تم نے پہلے ثابت کیا ہے کہ مسافر خواہ جہاز پر بھی سفر کر رہا ہو تو وہ روزہ افطار کر سکتا۔ حالانکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد اس کے خلاف نظر آتا ہے وہ یہ ہے:

"عن سلمة بن المحبق قال قال رسول اللہ ﷺ من کان له حمولة تأوی الی شبع فلیصم رمضان حیث ادرکه رواہ ابو داؤد"

سلمہ بن محبق فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کے پاس سواری رکے سیر

ہونے کی حالت میں (یعنی اس کے پاس زادہ راہ موجود ہو جہاں قیام کرے اسے کوئی مشکل در پیش نہ آئے) تو جہاں روزے کا وقت ہو جائے وہ روزہ رکھے۔ (مشکوۃ باب صوم المسافر)

اس حدیث سے تو یہ سمجھ آ رہا ہے کہ سواری میسر ہونے کی صورت میں اور کھانا حاصل ہونے کی صورت میں سفر میں روزہ رکھا جائے۔ سفر میں آسانی حاصل ہونے کے باوجود مسافر کو روزہ افطار کرنے کے جواز کا قول کیسے صحیح ہے؟

جواب: یہ حدیث پاک ہمارے موقف کے مخالف نہیں حدیث پاک کی وضاحت میں یہ بیان کیا گیا ہے:

" قال الطيبي الامر فيه محمول على الندب بالحث على الاولى والافضل للنصوص الدالة على جواز الافطار فى السفر مطلقا "

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ مستحب ہے کہ جس شخص کے پاس سواری بھی اور زادہ راہ (خرچ) بھی ہو اس کے لئے چونکہ مشکل نہیں لہذا روزہ رکھنا اس کے لئے اولی اور افضل ہے البتہ افطار کرنا چاہے تو افطار کر لے افطار والی روایات مطلق ہیں بس یہی ہمارا موقف ہے کہ روزہ رکھ سکے تو سفر میں روزہ رکھنا افضل ہے۔ (از مرقاۃ)

☆ **" عن جابر ان رسول الله ﷺ خرج عام الفتح الى مكة فى رمضان فصام حتى بلغ كراع الغميم فصام الناس ثم دعا بقدح من ماء فرفعه حتى نظر الناس اليه ثم شرب فقيل له بعد ذلك ان بعض الناس قد صام فقال اولئك العصاة اولئك العصاة "** (رواہ مسلم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے سال (مدینہ طیبہ سے) نکلے رمضان کا مہینہ تھا آپ نے روزہ رکھا ہوا تھا یہاں تک کہ کراع غمیم میں آپ پہنچے لوگوں نے بھی روزہ رکھا ہوا تھا پھر آپ نے پانی کا پیالہ منگوایا اس پیالے کو بلند کیا یہاں تک لوگوں نے جب دیکھ لیا تو آپ نے پانی پی لیا (روزہ غروب آفتاب سے پہلے عصر کے وقت افطار کر دیا) پھر آپ کو بتایا گیا کہ بیشک بعض لوگوں نے روزہ رکھا ہوا ہے آپ نے فرمایا وہ لوگ نافرمان ہیں وہ لوگ نافرمان ہیں۔

وضاحت حدیث: کراع غمیم (بضم الكاف) کا ایک حصہ عسفان سے ملتا ہے اس لئے پہلے جو حدیث مذکور ہوئی اس میں عسفان کا ذکر ہے اور اس حدیث میں کراع غمیم کا ذکر ہے

واقعہ ایک ہے وجہ وہی ہے کہ سفر کی مشکل اور مستقبل میں قتال کی تیاری کے لئے آپ نے روزہ افطار فرمایا " اولئک العصاۃ " کے الفاظ کو نبی کریم ﷺ نے تاکیداً دومرتبہ ذکر فرمایا جس کا معنی ہے "اولئک الکاملون فی العصیان " وہ لوگ کامل طور پر نافرمان ہیں۔ روزہ رکھنے والوں کو آپ نے کامل نافرمان کیوں فرمایا؟ اس کی دو وجہ ہیں ایک یہ ہے کہ:

" حیث عملوا بالظن مع القدرة علی الیقین بالسؤال منه علیه الصلوة والسلام "

انہوں نے اپنے گمان پر عمل کیا کہ روزہ رکھنا جائز ہے حالانکہ ان میں نبی کریم ﷺ تشریف فرما تھے آپ سے پوچھ کر وہ یقین پر عمل کر سکتے تھے۔

دوسری وجہ ان کی طرف نافرمانی منسوب کرنے کی یہ ہے:

" فان النبی ﷺ انما رفع قدح الماء لیراه الناس فیتبعوه فی قبول رخصة اللہ تعالیٰ فمن صام فقد بالغ فی عصیانه "

کہ نبی کریم ﷺ نے پانی کا پیالہ بلند کیا تا کہ لوگ اسے دیکھ لیں اور آپ کی تابعداری کریں کہ اللہ تعالیٰ نے روزہ افطار کرنے کی رخصت دی ہے پھر جن لوگوں نے روزہ رکھا انہوں نے گویا کہ بہت نافرمانی کی۔

تنبیه : یہ محبت کی وجہ سے زجر ہے (ڈانٹ ڈپٹ ہے) کیونکہ محبت کا تقاضا یہ تھا کہ محبوب کی ادا کو اپنایا جاتا۔ جو حضرات ایسا نہ کر سکے ان پر مصطفیٰ کریم ﷺ کا دل رنجیدہ ہوا گویا یوں کہا جائے کہ مصطفیٰ کریم ﷺ نے یہ فرمایا کہ اے میرے پیارو تم سے تو یہ توقع نہیں تھی کہ میرے عمل کے مطابق تم عمل نہیں کرو گے۔ ورنہ حقیقت میں صحابہ کرام کی کوئی غلطی نہ تھی:

" لان الظاهر ان هذا وقع منهم بناء علی خطأ اجتهادهم اذ لم یقع امر صریح بافطارهم "

کیونکہ یہ ان سے اجتہادی خطا واقع ہوئی اجتہادی خطا گناہ نہیں اور نہ ہی کوئی ایسا جرم ہے کہ اس کے متعلق پوچھا جائے اس لئے کہ ان کو واضح طور پر روزہ رکھنے سے منع نہیں کیا گیا تھا۔ (از مرقاۃ)

سفر میں شدید تکلیف اٹھا کر روزہ رکھنا منع ہے:

" عن عبد الرحمن بن عوف قال قال رسول الله ﷺ صائم رمضان في السفر كالمفطر في الحضر رواه ابن ماجه "

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رمضان میں سفر کے دوران روزہ رکھنا ایسے ہی ہے جس طرح مقیم شخص (بغیر کسی عذر کے) روزہ افطار کر لے۔

وضاحت حدیث :" صائم رمضان في السفر اى مع احتمال المشقة المضرة "

رمضان میں سفر کے دوران جو شخص نقصان دہ مشقت اٹھا کر روزہ رکھے یعنی روزہ ہلاک کرنے والا ہو بیمار کرنے والا ہو، بیہوشی تک پہنچانے والا ہو ایسی صورت میں روزہ رکھنا اسی طرح گناہ ہوگا جیسا کہ مقیم شخص کو بلا عذر روزہ افطار کرنا گناہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو جب آسانی عطا فرمائی ہے تو انسان اپنے آپ کو مشقت میں نہ ڈالے۔ (از مرقاة)

ایک حدیث میں کیا خوب بیان:

" عن حمزة بن عمرو الاسلمي انه قال يا رسول الله انى اجد بى قوة على الصيام فى السفر فهل على جناح قال هى رخصة من الله عزوجل فمن اخذ بها فحسن ومن احب ان يصوم فلا جناح عليه " (رواه مسلم)

حمزہ بن عمرو اسلمی نے عرض کیا یا رسول اللہ میں سفر میں روزہ رکھنے کی طاقت رکھتا ہوں کیا مجھ پر (روزہ رکھنا) گناہ ہے؟ آپ نے فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رخصت ہے جو شخص اس پر عمل کرے (رخصت سے فائدہ اٹھائے) تو اچھا ہے اور جس شخص کو روزہ محبوب ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔

(مشکوۃ باب صوم المسافر)

وضاحت : جب کسی کام پر عمل کرنا اصل ہو تو اس کیلئے لفظ عزیمۃ بولا جاتا ہے اکثر طور پر عمل عزیمۃ پر بہتر ہوتا ہے لیکن جس کام کو آسان کرنے کیلئے اس میں ڈھیل دی جائے اس کو نرم کیا جائے اس کو رخصۃ کہا جاتا ہے۔اس پر عمل کرنا جائز ہوتا ہے لیکن اسکے مقابل صورت پر عمل کرنا اکثر اوقات بہتر ہوتا ہے۔اس تمہید کے بعد نبی کریم ﷺ کے ارشاد کو دیکھئے آپ نے کیا خوب فرمایا" **قال هی رخصة من الله عزوجل** " کہ سفر کے دوران روزہ نہ رکھنا رخصت ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔اسی ارشاد سے ضمناً یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی " **فان الصوم عزیمة منه تعالیٰ لقوله فمن شهد منكم الشهر فليصمه** " کہ بیشک روزہ رکھنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے عزیمت ہے۔کیونکہ رب تعالیٰ نے رمضان کو پالینے والے پر روزہ فرض کیا ہے۔چونکہ سائل کے سوال کی دارومدار" **انی اجد قوة علی الصیام فی السفر** " (بیشک میں سفر میں روزہ رکھنے کی طاقت رکھتا ہوں) پر ہے لہٰذا اسی سے واضح ہو گیا:

" **الافطار فی السفر رخصة ای تسهیل من الله عزوجل لعباده دفعا للمشقة علیهم (ما جعل علیكم فی الدین من حرج)** "

کہ سفر کے دوران افطار کی رخصت اس لئے دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے مشقت کو اٹھا کر آسانی پیدا فرمائی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دین میں مشکل نہیں پیدا فرمائی۔" **فمن اخذ بها فحسن** " (جس نے رخصت پر عمل کیا تو اچھا ہے) اس کا مطلب یہ ہے:

" **فعله حسن مرضی لاجناح علیه للحدیث الآخر ان الله یحب ان یؤتی رخصة كما یحب ان یؤتی عزائمه** "

کہ رخصت پر عمل کرنا بھی اچھا اور پسندیدہ ہے یعنی کبھی کبھی رخصت پر عمل بھی کیا جائے تا کہ رخصت کا مقصد فوت نہ ہو جائے۔کیونکہ ایک اور حدیث میں ہے بیشک اللہ تعالیٰ کو پسند ہے کہ رخصت پر بھی ایسے ہی عمل کیا جائے جیسے عزیمت پر عمل کیا جاتا ہے۔" **ومن احب ان یصوم فلا جناح علیه** " اور جسے روزہ رکھنے سے محبت ہو اس پر کوئی گناہ نہیں کہ روزہ رکھے:

" **وفی مغایرة العبارة بین الشرطین اشارة لطیفة الی افضلیة الصوم** "

دونوں شرطوں کی علیحدہ علیحدہ عبارتوں سے لطیف اشارہ اس طرف کر دیا گیا ہے کہ روزہ رکھنا افضل

ہے۔ وہ کیسے؟ وہ اس طرح کہ رخصت کا ذکر نبی کریم ﷺ نے ان الفاظ مبارکہ سے کیا " فمن اخذ بھا فحسن " جس نے رخصت پر عمل کیا تو اچھا ہے لیکن جب عزیمت کا ذکر فرمایا تو ارشاد فرمایا " ومن احب ان یصوم فلا جناح علیہ " جس شخص کو روزہ رکھنا محبوب ہو وہ روزہ رکھے اس پر کوئی گناہ نہیں۔

" فمن اخذ بھا " (جو اس پر عمل کرے) ومن احب (اور جسے محبت ہو) کے الفاظ کو ذرا غور سے دیکھیں خود بخود سمجھ آ جائے گا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد کس لطافت اور فصاحت پر مبنی ہے۔

اعتراض: حدیث پاک میں تو رخصت پر عمل کرنے کو "حسن" کہا گیا ہے اور روزے رکھنے کی صورت میں " فلا جناح علیہ " کہہ کر صرف گناہ کی نفی کی گئی ہے اس میں روزہ کی افضلیت کیسے ثابت ہے؟

جواب: ایک وجہ تو پہلے ثابت کی جا چکی ہے کہ " ومن احب " کے الفاظ سے روزہ کی افضلیت روز روشن کی طرح ثابت ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جب رخصت کے لئے " حسن " کا لفظ استعمال کیا تو اسی سے اشارہ فرما دیا کہ جب کوئی شخص عزیمت پر عمل کرے گا اور روزہ اسے محبوب ہوگا تو یقیناً روزہ رکھنا احسن ہوگا۔ ابھی راقم نے جو مفہوم پیش کیا ہے اسے ملا علی قاری رحمہ اللہ کے ان الفاظ میں دیکھا جائے "لان الرخصة اذا کانت حسنا فالعزیمة اولی بذلک " اس لئے کہ رخصت پر عمل کرنا جب حسن ہوگا تو عزیمت پر عمل کرنا اس سے بھی زیادہ بہتر ہوگا اور سب سے عظیم وجہ یہ ہے:

" ولعلہ علیہ السلام علم بنور النبوة ان مراد السائل بقولہ فھل علی جناح ای فی الصوم ویدل علیہ المقدمة المتقدمة من قولہ انی اجدبی قوة علی الصیام "

کہ اگر چہ سائل نے " فھو علی جناح " میں وضاحت نہیں کی کہ وہ کس چیز کے متعلق سوال کر رہا ہے کہ مجھ پر کس چیز کا گناہ نہیں لیکن نبی کریم ﷺ سے نور نبوت سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ سائل کا مقصد یہ ہے کہ دوران سفر کیا روزہ رکھنے کا مجھ پر گناہ تو نہیں۔ نیز اس کے پہلے الفاظ بھی اس پر دلالت کر رہے ہیں کہ اس نے یہ کہا کہ میں دوران سفر روزہ رکھنے کی طاقت پاتا ہوں۔

روزے کی قضاء کے متعلق احادیث مبارکہ:

" عن عائشة قالت کان یکون علی الصوم من رمضان فما استطیع ان

اقضی الا فی شعبان قال یحی بن سعید تعنی الشغل من النبی او بالنبی ﷺ "......بخاری ومسلم (مشکوة باب القضاء)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھ پر رمضان کے روزے ہوتے جو میں قضا کی طاقت نہیں رکھتی تھی یہاں تک کہ شعبان آ جاتا تو میں روزے قضا کرتی۔ یحی بن سعید (روای حدیث) کہتے ہیں کہ اس کی وجہ کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ مشغولیت تھی۔

وضاحت حدیث : حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر رمضان کے روزے لازم ہونے کی وجہ وہی تھی جو ہر عورت کو لاحق ہوتی ہے یعنی حیض کے دنوں میں چونکہ روزے رکھنے منع ہیں ان کو قضاء کرنا پڑتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کے ساتھ مشغولیت کا کیا مطلب؟ اس کا مطلب یہ ہے:

" انها كانت مهيئة نفسها لرسول الله ﷺ لا ستمتاعه فی جميع اوقاتها ان اراده بذلک ذکره الطيبی "

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے مدنظر نبی کریم ﷺ کا ادب واحترام تھا کہ آپ کہیں نفع حاصل کرنے کا مطالبہ کریں تو میں روزہ کا عذر نہ پیش کروں بلکہ ہمہ وقت نبی کریم ﷺ کی خواہشات کا خیال ان کے دل میں رہتا تھا۔

شعبان میں آپ روزے قضاء کرتی تھیں اس کی وجہ تو یہ تھی کہ آپ کے دل میں خیال ہوتا تھا کہ آنے والے رمضان سے پہلے وہ روزے قضاء کر لئے جائیں جو کہ سابق رمضان کے آپ کے ذمہ ہیں کیونکہ آنے والے رمضان میں وہی عذر پھر اور روزے میرے ذمہ لازم کرنے کا سبب بنے گا اس طرح بوجھ بڑھتا چلا جائے گا۔ لیکن شعبان میں روزے قضا کرنے کی عظیم وجہ یہ تھی:

" ان النبی ﷺ كان يصوم اكثر شعبان علی ما روی انه كان يصوم شعبان الا قليلا ، ولا يحتاج اليها فيه "

کہ شعبان کے مہینے میں نبی کریم ﷺ بہت روزے رکھتے تھے جیسا کہ روایت میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ شعبان میں کم ہی افطار کرتے تھے زیادہ روزے رکھتے تھے۔ اس وجہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی روزے قضاء کرنے کا وقت آسانی سے مل جاتا ہے۔

☆ " وعن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ لا يحل للمرأة ان تصوم وزوجها شاهد

الا باذنه ولا تأذن فی بیته الا باذنه " (رواہ مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی عورت کے لئے جائز نہیں کہ وہ روزہ رکھے جب اس کا خاوند موجود ہو تو اس سے پہلے اجازت طلب کرے اور زوج کے گھر میں زوج کے بغیر کسی اور سے اجازت طلب نہ کرے۔ (مشکوۃ باب القضاء)

وضاحت حدیث : حدیث پاک میں جو روزے نہ رکھنے کا ذکر ہے اس سے مراد یہ ہے:

" لا ینبغی ان تصوم قضاء رمضان او قضاء صوم النفل اذا کان الوقت متسعا "

مناسب نہیں کہ عورت خاوند کی اجازت کے بغیر رمضان کے روزے قضاء کرے۔ یا نفلی روزہ کہیں رکھ کر توڑ دیا تھا تو اس کی قضاء کرے البتہ شرط یہ ہے کہ وقت میں وسعت ہو۔ اور یہ بھی قانون شریعت واضح ہے کہ خاوند کو چاہئے کہ وہ زوجہ کو فرائض اور واجبات سے منع نہ کرے۔ اس لئے کسی دن تو منع کر سکتا ہے ہر دن ہی منع کرنا اس کے لئے جائز نہیں ہوگا۔ ضمنی طور پر اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ عورت نفلی روزے خاوند کی اجازت کے بغیر نہ رکھے:

" ولا تاذن فی بیته الا باذنه " یعنی ولا یحل لها ان تأذن احدا من الاجانب او الاقارب حتی النساء "

یعنی عورت کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ خاوند کے بغیر دوسرے اجنبی یا قریبی لوگوں سے اجازت طلب کرے بلکہ اس کے لئے یہ بھی جائز نہیں کہ وہ عورتوں سے اجازت طلب کرے یہ اجازت صرف خاوند سے طلب کرے " الا باذنه وفی معناه العلم برضاه " خاوند سے اجازت صراحۃً طلب کرنا ضروری نہیں بلکہ جب یہ علم حاصل ہو کہ خاوند روزوں کی قضاء یا نفلی روزے رکھنے پر راضی ہے تو یہ اجازت ہی ہوگی۔ (از مرقاۃ)

حیض کی حالت میں چھوٹ جانے والی نمازوں اور روزں کا حکم:

" وعن معاذة العدوية انها قالت لعائشة ما بال الحائض تقضی الصوم ولا تقضی الصلوة قالت کان یصیبنا ذلک فتؤمر بقضاء الصوم ولا نؤمر بقضاء الصلوة " (رواہ مسلم)

حضرت معاذہ عدویہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا کہ حیض والی عورتوں کا کیا حال

ہے کہ وہ روزہ قضاء کرتی ہیں اور نمازیں قضاء نہیں کرتیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ہمیں یہ (حیض) پہنچتا تو ہمیں حکم دیا جاتا کہ ہم روزے قضا کریں اور ہمیں نمازیں قضا کرنے کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔
(مشکوۃ باب القضاء)

وضاحت حدیث: ایک تو یہ خیال کیا جائے کہ حیض اور نفاس کے احکام نماز اور روزے کے ایک ہیں۔ اس لئے سوال کا تعلق گویا کہ دونوں سے رہے گا۔ حضرت معاذۃ عدویہ کا سوال تعجب کی وجہ سے تھا کہ نماز بھی فرض ہے اور روزہ بھی فرض ہے نماز اور روزہ کے چھوٹ جانے کی وجہ ایک ہے پھر کتنا ہی مقام تعجب ہے کہ نمازوں کو قضاء نہیں کیا جاتا اور روزوں کو قضاء کیا جاتا ہے۔

اگرچہ اس کا عقلی جواب بھی اہل علم نے دیا ہے کہ نمازیں زیادہ رہ جاتی ہیں ان کے قضاء کرنے میں حرج لازم آتی ہے اس لئے حرج کو اٹھایا گیا ہے لیکن روزے سال میں ایک دفعہ آتے ہیں تھوڑی مقدار میں روزوں کا رہ جانا پھر ان کی سال میں قضاء کوئی مشکل نہیں۔ لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا جواب بہت ہی خوب حکمت بھرا جواب ہے کہ شریعت تو رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کا نام ہے جب ہمیں حکم ہی یہ دیا گیا ہے کہ ہم روزے قضاء کریں اور نمازیں قضا نہ کریں تو ہم نے وہی کام کرنا ہے جس کا ہمیں حکم دیا گیا۔

سبحان اللہ کیا خوب علم تھا صحابیات کا سوال بھی حکمت بھرا جو باعث تعجب تھا۔ جواب بھی بہت خوب حکمت وفصاحت پر مبنی دراصل سوال کرنے والی صحابیہ کا مقصد ہی یہ تھا کہ اس کے متعلق کیا تم نے نبی کریم ﷺ سے کچھ سنا ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ ہاں جو سنا ہے اسی پر عمل کر رہے ہیں۔ (از مرقاۃ)

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ :

''اور جنھیں اس کی طاقت نہ ہو وہ بدلہ دیں ایک مسکین کا کھانا'' ان الفاظ مبارکہ میں ﴿ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ ﴾ کا ترجمہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا ''اور جنہیں اس کی طاقت نہ ہو۔ اور راقم نے بھی یہی ترجمہ نقل کیا ہے۔ راقم نے تراجم کا تقابلی جائزہ اپنی کتاب ''تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان'' میں پیش کیا ہے اسی کو یہاں نقل کر رہا ہوں کافی حد تک مفہوم بھی سمجھ آ جائے گا اور دوسرے حضرات کا ترجمہ مثبت ہے ''جو طاقت رکھتے ہیں'' تراجم میں فرق بھی سمجھ آ جائے گا۔

مختلف تراجم:

☆ اور جن کو طاقت ہے روزہ کی ان کے ذمہ بدلا ہے ایک فقیر کا کھانا۔ (محمود الحسن صاحب)

☆ جو لوگ روزہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہوں (پھر نہ رکھیں) تو وہ فدیہ دیں۔ (مودودی صاحب)

☆ اور جو لوگ اسے مشکل سے برداشت کر سکیں ان کے ذمہ فدیہ ہے کہ (وہ) ایک مسکین کا کھانا ہے۔ (عبد الماجد صاحب)

☆ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھیں (لیکن رکھیں نہیں) وہ روزے کے بدلے محتاج کو کھانا کھلائیں۔ (فتح محمد صاحب)

☆ اور اوپر ان لوگوں کے کہ طاقت رکھتے ہیں اس کا بدلہ ہے کھانا ایک فقیر کا۔ (شاہ رفیع الدین صاحب)

☆ اور جنہیں اس کی طاقت نہ ہو وہ بدلہ دے ایک فقیر کا کھانا۔ (اعلیٰ حضرت)

یہاں روزے کا فدیہ دینے کا ذکر ہے آیا فدیہ وہ شخص دے جو روزہ رکھ سکتا ہے پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا یا یہ کہ حکم ابھی باقی ہے فدیہ دینے کا حکم اس شخص کو جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس مقام پر اعلیٰ حضرت کا دوسرا قول ہے یہ ہی زیادہ معتبر ہے۔ اگرچہ پہلے قول کو بھی ذکر کیا گیا ہے:

﴿ وَعَلَى الَّذِيْنَ ﴾ لا ﴿ يُطِيْقُوْنَه ﴾ لكبر او مرض لا يرجى برؤه " (جلالين)

فدیہ ان لوگوں پر ہے جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے بڑھاپے کی وجہ سے یا مرض دائمی کی وجہ سے حاشیہ جلالین میں اس طرح مذکور ہے:

" قوله ﴿ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَه ﴾ اى لايطيقونه واعلم ان عند اكثر المفسرين فيه قولان احدهما ان المراد بالذين يطيقونه الاصحاء المقيمون خيرهم فى ابتداء الاسلام بين الامرين بين ان يصوموا وبين ان يفدوا ويفدا لئلا يشق عليهم لانهم كانوا لم يتعودوا ثم نسخ التخيير ونزلت العزيمة بقوله فمن شهد منكم الشهر فليصمه وثانيهما ان يكون لا محذوفا وهو واقع فى كثير من استعمال الفصحاء كما فى قوله تعالىٰ ﴿ يُبَيِّنُ اللهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ﴾ وكان المعنى وعلى الذين لا يطيقونه فدية طعام مسكين "

بے شک اکثر مفسرین کے اس میں دو قول ہیں ایک یہ ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو طاقت رکھتے ہیں صحیح ہوں مقیم ہوں ان کو ابتداء اسلام میں دو امروں میں اختیار دیا گیا تھا کہ وہ روزہ رکھیں یا افطار کریں اور فدیہ دے دیں تا کہ ان پر شاق نہ ہو کیونکہ ان کو روزہ رکھنے کی پہلے عادت نہ تھی پھر اس اختیار کو منسوخ کر دیا گیا ﴿ فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهرَ فَلْيَصُمْهُ ﴾ سے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہاں ''لا'' محذوف ہے فصحاء کے استعمال میں ایسا کثیر الوقوع ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ يُبَيِّنُ اللهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ﴾ میں بھی '' لا '' محذوف ہے اور معنی ﴿ ان لا تضلوا ﴾ ہے (بیان کرتا اللہ تعالیٰ کا تمہارے لئے تا کہ تم گمراہ نہ ہو)۔ زیر بحث آیۃ کریمہ میں۔ ''وعلى الذين يطيقونه فدية '' اس معنی میں ہے۔ '' وعلى الذين لايطيقونه فدية '' اور جنہیں اس کی طاقت نہ ہو وہ فدیہ دیں۔ اس نفی والے قول پر ایک اور صورت پیش کی گئی، قوله يطيقونه قال في تفسير الشيخ يطيق من اطاق فلان اذا زالت طاقته والهمزة للسلب اى لايقدرون على الصوم يطيقونه '' کہ ﴿ يُطِيْقُوْنَهٗ ﴾ باب افعال سے ہے جس کا ہمزہ کبھی سلب کے لئے آتا ہے اس صورت میں بھی معنی یہ ہو گا جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے ان پر فدیہ ہے۔ زیادہ پسندیدہ قول یہی ہے کہ یہ حکم منسوخ نہیں بلکہ شیخ فانی کے حق میں موجود ہے۔ (تسکین الجنان ص ۶۱، ۶۲)

فدیہ کب لازم آئے گا: ایک وجہ تو مندرجہ بالا سے سمجھ آئی کہ جو شخص شیخ فانی ہو (یعنی ایسی عمر میں کہ روزہ نہ رکھ سکے اور نہ ہی آئندہ روزہ رکھنے کی کوئی امید ہو) وہ روزہ کی جگہ فدیہ دے دے۔ جو شخص مریض تھا یا مسافر تھا روزے نہیں رکھ سکا۔ پھر صحیح ہو گیا یا مقیم ہو گیا روزے قضاء کرنے کا وقت مل گیا لیکن قضاء نہ کر سکا تو اس پر لازم ہے کہ وصیت کر جائے کہ اس کے روزوں کا فدیہ ادا کر دیا جائے اگر اس نے وصیت کر دی تو اس کے تہائی مال سے اس کے روزوں کا فدیہ ادا کرنا واجب ہو جائے گا۔ تہائی حصہ سے زائد مال بطور فدیہ تمام ورثاء اتفاق سے اور خوشی سے ادا کر دیں تو جائز ہے۔ اگر اس شخص نے وصیت تو نہیں کی لیکن ورثاء کو معلوم تھا کہ اس کے ذمے اتنے روزے تھے وہ اپنی مرضی سے اس کا فدیہ ادا کر دیں تو اللہ تعالیٰ سے قوی امید رکھی جائے کہ وہ اس فدیہ کو قبول فرمائے گا۔ (از شامی)

فدیہ کی مقدار کیا ہے؟ یا تو ایک روزے کے بدلے ایک مسکین کو دو وقت کا کھانا کھلا دے یا ہر روزہ

کے بدلے ایک صاع جو یا ایک صاع کھجور دے یا نصف صاع گندم، یا نصف صاع کشمش ادا کرے یا ان میں سے کسی ایک چیز کی قیمت حساب کر کے ادا کرے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ فدیہ کی مقدار وہی ہے جو صدقۃ الفطر کی ہے صدقۃ الفطر کی مقدار وہی ہے جو بیان کر دی گئی ہے۔

صاع کیا ہے؟ صاع ایک پیمانہ ہے۔ جس کے متعلق سید الاولیاء حضرت قبلہ عالم پیر سید مہر علی شاہ رحمہ اللہ گولڑوی فرماتے ہیں جس کی مقدار فقہاء کرام نے یہ بیان کی ہے "**وھو ای صاع المعتبر ما یسع الفا واربعین درھما من ماش اوعدس**" (درمختار) صاع وہ ہے جس میں ایک ہزار چالیس درھم کے وزن کے برابر ماش یا مسور سما سکیں۔ ایک ہزار چالیس درھم کے تین ہزار چھ سو چالیس ماشے ہوتے ہیں جس کے تین سو تین تولہ چار ماشے بنتے ہیں اور اس کے کلدار روپے تین سو سولہ روپے چھ آنے ہوتے ہیں پس بحساب فی سیر اسی روپیہ کلدار ایک صاع کا وزن تین سیر تین پاؤ سوا تین چھٹانک ہوتا ہے علماء کرام نے صاع کا وزن احتیاطاً پورے چار سیر رکھا ہے۔ (فتاوی مہریہ)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے صاع کی مقدار چار سیر سات چھٹانک بیان کی ہے یہ اختلاف دراصل صاع کی مقدار میں فقہاء کرام کے مختلف اقوال ہیں بلکہ شامی کے ایک قول کے مطابق صاع میں آٹھ رطل ہوتے ہیں ہر رطل ایک سو چالیس درھم کا وزن ہوتا ہے اس قول کے مطابق صاع چار سیر سات چھٹانک ہے بعض حضرات نے اس قول کو بھی پیش کیا ہے۔ کسی قول کو رد کرنا تو ممکن نہیں صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ وزن جو سب سے زیادہ بیان کیا گیا ہے اس میں احتیاط ہے لیکن آج کل وزن کلو اور گرام سے ہو رہا ہے سیر اور چھٹانک سے نہیں ہو رہا۔

کلو، سیر سے تقریباً ڈیڑھ چھٹانک بڑا ہے اس لئے آج کل کے حساب سے اعلیٰ حضرت کے قول کے مطابق بھی نصف صاع کا وزن دو کلو بیان کیا جائے تو کافی ہے اس کے اوپر دس بارہ گرام بنتے ہیں ان کی قیمت لوگ پانچ روپے بنا دیتے ہیں حالانکہ آج کل دس روپے فی کلو کے حساب سے دس گرام کی قیمت دس پیسے بنتی ہے۔

تنبیہ: یہ ضروری نہیں کہ فدیہ صرف گندم کا حساب کر کے ہی دیا جائے۔ چار کلو جو کی قیمت دے دیں بلکہ اغنیاء چار کلو کھجور یا دو کلو کشمش کی قیمت دے دیں تو اور ہی زیادہ بہتر ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ

فدیہ صدقہ فطر کی طرح ہی ہے مقدار وغیرہ میں البتہ صدقہ فطر کے مکمل احکام کو بھی کسی مناسب جگہ انشاء اللہ ذکر کردیا جائے گا۔

مسئلہ : ایک روزہ کا فدیہ ایک ہی مسکین کو دے تو جائز ہوگا۔ اگر وہ مختلف مساکین پر تقسیم کردے ایک روپیہ ایک کو دیا اور دوسرا دوسرے کو دیا تو یہ جائز نہیں۔

مسئلہ :ہر روزہ کا فدیہ ہر دن ایک فقیر کو دے خواہ وہی فقیر ہو جسے کل دیا تھا یہ بھی جائز ہے اگر تمام روزوں کا فدیہ ایک ہی دن ایک ہی مسکین کو دے دے تو یہ بھی جائز ہے۔ ان دونوں مسئلوں کا بیان علامہ شامی رحمہ اللہ کی اس عبارت میں دیکھیں:

"قال القهستانی واطلاق کامله یدل علی انه لو دفع الی فقیر جملة جاز ولم یشترط العدد ولا المقدار لکن لو دفع الیه قال من نصف صاع لم یعتد به وبه یفتی" (شامی ج ۲ ص ۱۲۸)

فدیہ کی جگہ دوسرا شخص روزہ نہیں رکھ سکتا: جس شخص پر فدیہ لازم ہو تو اس کا وارث ولی فدیہ نہ ادا کرے بلکہ اس کے ذمہ جتنے روزے تھے وہ روزے رکھ دے تو یہ جائز نہیں اس پر حدیث پاک کو دیکھیں:

"عن مالک بلغه ان ابن عمر کان یسأل هل یصوم احد عن احد او یصلی احد عن احد فیقول لا یصوم احد عن احد ولا یصلی احد عن احد"

(رواہ فی الموطا)

حضرت امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں مجھے یہ روایت ملی کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے سوال کیا جاتا تھا کہ کوئی دوسرا شخص کسی کی طرف سے روزے رکھ دے یا کسی کی طرف سے نماز ادا کر دے تو اس کا حکم کیا ہے؟ تو آپ اس کا جواب دیتے کہ کوئی شخص دوسرے کے روزے کے بدلے روزے نہیں رکھ سکتا اور نہ ہی دوسرے کے بدلے نماز ادا کرسکتا ہے۔ (مشکوۃ باب القضاء)

بلکہ فدیہ کا حکم ہی صراحۃ قرآن پاک میں زیر بحث آیۃ مقدسہ میں ذکر کیا گیا ہے اور حدیث شریف میں بھی فدیہ کا حکم دیا گیا ہے:

"عن نافع عن ابن عمر النبی ﷺ قال من مات وعلیه صیام شهر رمضان فلیطعم عنه مکان کل یوم مسکین رواه الترمذی وقال

والصحیح انه موقوف علی ابن عمر "

حضرت نافع ابن عمر (رضی اللہ عنہم) سے روایت کرتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص فوت ہوگیا اور اس پر رمضان کے روزے تھے تو اس کی طرف سے ہر روزہ ایک مسکین کو (دو وقت) کھانا کھلایا جائے۔ (مشکوۃ باب القضاء) یہ حدیث اس سند سے مرفوع ہے ترمذی نے اسے موقوف کہا ہے تاہم حدیث قابل حجت ہے خواہ مرفوع ہو یا موقوف۔

اعتراض : ایک اور حدیث شریف میں تو اجازت دی گئی ہے کہ ولی اپنے شخص کی جانب سے روزہ رکھ سکتا ہے اور نماز ادا کرسکتا ہے بخاری و مسلم میں حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

" جاء رجل الی النبی ﷺ فقال ان امی ماتت وعلیها صوم شهر افاقضیه عنها فقال لو کان علی امک دین اکنت قاضیه عنها قال نعم قال فدین الله احق "

ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا عرض کیا کہ بیشک میری والدہ فوت ہوگئی اس کے ذمہ ایک ماہ کے روزے تھے کیا میں اس کی طرف سے روزے قضاء کردوں؟ تو آپ نے فرمایا کیا تمہاری ماں پر قرض ہوتا تو تم ادا کرتے؟ وہ شخص عرض کرنے لگا ہاں (ادا کرتا) آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے قرض کو ادا کرنا زیادہ حق ہے۔

اس حدیث سے تو پتہ چلتا ہے کہ جس کے ذمہ روزے یا نمازیں ہوں اس کا رشتہ دار اس کی طرف سے ادا کرسکتا ہے۔

جواب : یہ حدیث قابل حجت نہیں کیونکہ اس میں نماز کا ذکر نہیں لہٰذا اس سے یہ ثابت کرنا ممکن نہیں کہ کوئی شخص کسی دوسرے کی جانب سے نماز ادا کرسکتا ہے۔ پھر قانون یہ ہے کہ راوی جب اپنے ہی روایت کے خلاف فتوی دے تو وہ روایت یقیناً راوی کے نزدیک منسوخ ہوگی ورنہ اس کا فتوی اس کے خلاف نہ ہوتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی نسائی نے سنن کبری میں یہ روایت نقل کی ہے:

" لا یصلی احد عن احد ولا یصوم احد عن احد "

کوئی ایک کسی دوسرے کی طرف سے نماز نہ ادا کرے اور نہ ہی کوئی شخص دوسرے کی طرف سے

روزہ رکھے۔ پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سنن کبری میں درحقیقت آپ کا ایک فتوی ہے اسی لئے ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وفتوی الراوی علی خلاف مرویة بمنزلة روایته للناسخ ونسخ الحکم یدل علی اخراج المناط عن الاعتبار "

راوی کا فتوی جب اس کی روایت کے خلاف ہو تو اس کی وہ پہلی روایت منسوخ ہو جاتی ہے جب کسی حکم کو منسوخ کر دیا جائے تو اس کا اعتبار ختم ہو جاتا ہے۔ اور اس مسئلہ پر اجماع امت ہے کیونکہ امام مالک رحمہ اللہ نے اپنے موطا میں ذکر فرمایا ہے:

" ولم اسمع عن احد من الصحابة ولا من التابعین بالمدینة ، ان احدا منهم امر احد یصوم عن احد ولا یصلی احد عن احد "

کہ میں نے نہیں سنا کہ مدینہ طیبہ میں کسی صحابی یا کسی تابعی نے یہ کہا ہو کہ کوئی شخص دوسرے کی طرف سے روزہ رکھ سکتا ہے اور نہ ہی میں نے یہ سنا کہ کوئی شخص دوسرے کی طرف سے نماز ادا کر لے۔ اور جو روایت نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے:

" ان من البر بعد البر بالوالدین ان تصلی لهما مع صلاتک وتصوم لهما مع صومک "

والدین سے بھلائی اور فرمانبرداری یہ ہے کہ تم ان کے لئے نماز پڑھو اور ان کے لئے روزہ رکھو۔ اس سے مراد یہ ہے کہ " انه یدعو لهما " بیٹا اپنے والدین کو نفلی نمازوں اور نفلی روزں کا ثواب پہنچائے اور ان کے لئے دعا کرے۔ بلکہ محب طبری جو متأخرین شوافع سے ہیں انہوں نے عبادات واجبہ اور نافلہ کا ثواب میت کو پہنچانے کا ذکر فرمایا ہے:

" ویصل للمیت ثواب کل عبادة فعلت عنه واجبة او مندوبة "

تمہاری ہر عبادت کا ثواب میت کو پہنچتا ہے خواہ وہ عبادت واجب ہو یا مستحب۔ اور ہمارے اصحاب احناف ارشاد فرماتے ہیں " ان للانسان ان یجعل ثواب عمله لغیره صلوة او غیرها " کہ بیشک انسان کے لائق یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کا ثواب دوسرے کو پہنچائے خواہ اس کے اعمال نمازیں ہوں یا اور عبادات اس قسم کی کثیر عبارات احناف کے علماء وفقہاء کی موجود ہیں بلکہ " هذا

مذهب اهل السنة والجماعة " یہی مذہب اہل سنت وجماعت کا ہے۔
اور بخاری ومسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا " من مات وعليه صوم صام عنه وليه " جو شخص فوت ہو جائے اس کے ذمہ روزہ ہو تو اس کا ولی اس کی طرف سے روزہ رکھے اس حدیث پاک کی وضاحت علامہ طیبی رحمہ اللہ ان الفاظ سے فرماتے ہیں " انه يتدارك ذلك وليه بالاطعام فكأنه صام " اس شخص کا رشتہ دار اس کی طرف سے طعام بطور فدیہ دے کر اس کا تدارک (اس کے چھوٹ جانے والے روزہ کا بدل دے کر اس کی کمی کو پورا کر دینا تدارک کہلاتا ہے) کرے تو گویا کہ اس نے اس میت کی جانب سے روزہ رکھ دیا۔
(از مرقاۃ ج ۴ ص ۲۸۲، ۲۸۳)

حاصل کلام یہ ہے: کہ عبادت کا ثواب میت کو پہنچانا جائز ہے لیکن کسی کی نماز کے بدلے کوئی دوسرا نماز ادا نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی کوئی دوسرا کسی کے بدلے روزہ رکھ سکتا ہے روزے کا فدیہ دینا ہی ضروری ہوگا۔

فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ: "پھر جو اپنی طرف سے زیادہ نیکی کرے وہ اسکے لئے بہتر ہے۔ یعنی جو شخص مقرر مقدار سے زیادہ فدیہ دے تو اس کے لئے بہتر ہے۔

فائدہ: اسی سے یہ فائدہ واضح طور پر حاصل ہوا کہ نیکی کا کام جتنا زیادہ کرے گا اسے اتنا ہی زیادہ ثواب حاصل ہوگا۔ نوافل، مستحبات کی کوئی حد مقرر نہیں ہاں البتہ جن اوقات میں نوافل ادا کرنا منع کیا گیا ہے ان اوقات میں وہ منع رہیں گے اسی طرح فرائض میں زیادتی حرام ہوگی کہ کوئی شخص کہے صبح کے دو فرض کی جگہ تین یا چار پڑھ لئے جائیں اس طرح کی زیادتی عبادات میں ناجائز ہے۔

وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ: "اور تمہارا روزہ رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے" " وان تصوموا في السفر والمرض غير الشاق " یعنی سفر اور مرض کی حالت میں جب زیادہ مشقت نہ ہو روزہ تکلیف کا سبب نہ بنے تو تمہارا روزہ رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے۔ (قرطبی)

اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ: "اگر تم جانتے ہو" یعنی اگر تمہیں علم ہو کہ روزہ کب رکھنا بہتر ہے تو اس وقت روزہ رکھو (مظہری) ضمناً یہ سمجھ آ گیا کہ جب تمہیں معلوم ہو کہ اب روزہ رکھنا منع ہے تو اس وقت اپنے آپ کو ہلاکت سے بچانے کے لئے روزہ نہ رکھنا بہتر ہے۔ (راقم)

﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾

۱) ''رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اترا لوگوں کے لئے ہدایت اور راہنمائی اور فیصلہ کی روشن باتیں تو تم میں جو کوئی یہ مہینہ پائے ضرور اس کے روزے رکھے اور جو بیمار یا سفر میں ہو تو اتنے روزے اور دنوں میں اللہ تم پر آسانی چاہتا ہے اور تم پر دشواری نہیں چاہتا۔ اور اس لئے کہ تم گنتی پوری کرو اور اللہ کی بڑائی بولو اس پر کہ اس نے تمہیں ہدایت کی اور کہیں تم حق گزار ہو''۔

۲) ماہ رمضان وہ ہے کہ نازل کیا گیا اس میں قرآن جو ہدایت ہے لوگوں کے لئے اور وہ واضح دلیلیں ہیں ہدایت کی اور فرق کرنے والا ہے (حق و باطل میں) تو جو شخص حاضر ہو تم میں سے اس مہینہ میں تو وہ روزے رکھے اس کے اور جو شخص مریض ہو یا سفر میں ہو تو وہ اتنے ہی اور دنوں میں (روزے رکھے) ارادہ کرتا ہے اللہ تم پر آسانی کا اور نہیں ارادہ کرتا تم پر مشکل کا اور مکمل کرو تم گنتی اور تم بڑائی بیان کرو اللہ کی اس پر جو ہدایت دی اس نے تمہیں اور تا کہ تم شکر کرو''۔

شَهْرُ رَمَضَانَ : ''ماہ رمضان'' اہل تاریخ نے بیان کیا ہے کہ سب سے پہلے رمضان کے روزے نوح علیہ السلام نے رکھے جب آپ کشتی سے باہر تشریف لائے۔ راقم کے نزدیک '' لما خرج من السفينة '' کے الفاظ اس پر دلالت کر رہے ہیں کہ آپ نے وہ روزے کشتی کے صحیح و سلامت کنارے پر لگنے پر بطور شکر رکھے ہیں اس سے یہ پتہ چلا کہ کسی نعمت کے حاصل ہونے پر رب تعالیٰ کی عبادت کرنا بطور شکر سنت انبیاء کرام ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ '' كتب الله رمضان على

کل امة " اللہ تعالٰی نے ہر امت پر رمضان کے روزے فرض کیے۔ چونکہ نوح علیہ السلام سے پہلے بھی امتیں تھیں اس لئے واضح ہوا کہ رمضان کے روزے حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے آ رہے ہاں البتہ روزں کی تعداد میں کمی وبیشی ہوسکتی ہے۔ (ماخوذ از قرطبی)

شہر کی وجہ تسمیہ: شہر کا لفظ ہے شھرة سے، جب کوئی چیز ظاہر ہو مشہور ہو تو کہا جاتا ہے " شهر الشئی يشهر شهرة و شهرا " اسی طرح کہا جاتا ہے " شهرت السيف " میں نے تلوار کو سونت کر بلند کیا۔ مطلب اس کا بھی ظاہر کرنا ہے۔

رمضان کو یا دوسرے مہینوں کو " شهر " کہا جاتا ہے کیونکہ ہر مہینہ لوگوں پر ظاہر ہوتا ہے مخفی نہیں رہتا لوگ یاد رکھتے ہیں کیونکہ لوگوں کی مہینے کی پہچان سے اغراض اور حاجات وابستہ ہوتی ہیں۔ دفتری حاجات، روزے، حج، عیدین وغیرہ مختلف محافل ومجالس کا تعلق مہینوں سے ہی ہوتا ہے اس لئے لوگوں پر ہر مہینہ ظاہر ہوتا ہے تو مہینہ کو " شهر " کہہ لیا جاتا ہے۔ (از قرطبی کبیر) کہا جاتا ہے " اشهر " ایک مہینہ گزرا " اشهرنا فی هذا المكان " اس مکان میں ہم نے مہینہ گزارا " اشهرت المرأة " عورت کا ولادت کے مہینہ میں داخل ہونا، شاھرہ مشاھرة مہینہ کے لئے نوکر رکھنا۔ (المنجد)

رمضان کی وجہ تسمیہ:

(۱) اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ رمضان کا لفظ مشتق ہے " رمضاء " بسکون المیم سے۔ "رمضاء" گرمی کے آخر اور خریف کی ابتداء میں برسنے والی بارش کو کہتے ہیں اس بارش سے زمین کا گرد وغبار صاف ہو جاتا، زمین دھل جاتی ہے۔

" فكذلك شهر رمضان يغسل ابدان هذه الامة من الذنوب و يطهر قلوبهم "

اس معنی کی مناسبت سے رمضان کا نام رمضان رکھنے کی یہ وجہ ہے کہ یہ نبی کریم ﷺ کی امت سے روزے رکھنے والے خوش بخت مسلمانوں کے بدنوں کو گناہوں سے دھو دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے جسم پاک وصاف ہو جاتے ہیں اور ان کے دل پاک ہو جاتے ہیں۔

(۲) اور وجہ یہ ہے کہ "رمضان" ماخوذ ہے " رمض " سے جس کا معنی ہے سورج کی گرمی سے

پتھروں کا گرم ہو جانا اس سے اسم آتا ہے " رمضاء " جس کا معنی ہے گرمی کی تیز کی دھوپ کی تیزی کی وجہ سے گرم زمین۔

☆ اس معنی کی مناسبت سے ''رمضان'' کا مطلب ہوگا بھوک کی حرارت کی وجہ سے انسان کے دل میں حرارت کا پیدا ہونا۔

☆ اسی معنی کی مناسبت سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ مہینوں کے نام جس وقت میں وہ آئے اس کی مناسبت سے نام رکھ لئے گئے۔ " **فوافق هذا الشهر ايام رمض الحر** " چونکہ سب سے پہلے دنیا میں جب رمضان واقع ہوا وہ سخت گرمی کے دن تھے اس مناسبت سے اس کا نام ''رمضان'' رکھ دیا گیا۔

☆ اسی معنی کی مناسبت سے اور وجہ یہ بیان کی گئی کہ ''رمضان'' بندوں کے گناہوں کو جلا دیتا ہے اس لئے اسے رمضان کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے " **انما سمی رمضان لأنه يرمض ذنوب عباد الله** " کہ رمضان کا نام اس لئے رمضان رکھا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کے گناہوں کو جلا کر رکھ دیتا ہے۔

(۳) رمضان کے نام رکھنے کی اور وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ ماخوذ ہے " **رمضت النصل** " میں نے تلوار کے پھل کو کوٹا۔ چونکہ وہ لوگ رمضان میں اپنی تلواروں کے پھل (لوہے کا پترا) کو کوٹ کے باریک کر لیتے تھے۔ اس وجہ سے اس مہینے کا نام ہی رمضان رکھ لیا گیا۔

(۴) اگر یہ قول صحیح ثابت ہو جائے کہ ''رمضان'' اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی ہے تو اس معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ رمضان کے مہینے کا نام اللہ کے نام پر رکھ لیا گیا:

" فالمعنى ان الذنوب تتلاشى فى جنب رحمة الله حتى كانها احترقت
وهذا الشهر ايضا رمضان بمعنى ان الذنوب تحترق فى جنب بركته "

اب اس کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وجہ سے گناہ جل کر نیست و نابود ہو جاتے ہیں یہ مہینہ بھی رب تعالیٰ کے نام سے شریک ہونے کی برکت سے گناہوں کو جلا دیتا ہے۔ (کبیر)

تنبیہ : علامہ رازی رحمہ اللہ نے چوتھی وجہ رمضان نام رکھنے کی بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

" الرابع ، لوصح قولهم ان رمضان اسم الله تعالىٰ "

چوتھی وجہ رمضان نام رکھنے کی اگر اہل علم حضرات کا یہ قول صحیح ثابت ہو جائے کہ ''رمضان'' اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی ہے اگر صحیح ثابت ہو جائے، سے اس طرف اشارہ کر دیا کہ جس حدیث سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ ''رمضان'' اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی ہے وہ ضعیف ہے۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ واضح طور پر بیان کرتے ہیں وہ حدیث پاک جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے:

" عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ من صام رمضان ايمانا واحتسابا غفرله ما تقدم من ذنبه "

اس کی وضاحت میں فرماتے ہیں:

" وفيه انه لا يكره ان يقال رمضان بدون شهر وكرهه بعض العلماء لخبر انه من اسماء الله تعالىٰ وهو شاذ لان الخبر الضعيف لا يثبت اسم الله "

(مرقاۃ ج ۴ ص ۲۳۱ کتاب الصوم)

اس حدیث پاک سے ثابت ہوا کہ یہ کہنا رمضان آ گیا میں نے رمضان کے روزے رکھے جائز ہے بیشک اس کے ساتھ مہینہ کا لفظ نہیں ذکر کیا البتہ بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ نہ کہا جائے کہ رمضان آ گیا بلکہ یہ کہا جائے ماہ رمضان آ گیا کیونکہ حدیث پاک سے یہی ثابت ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔ لیکن ملا علی قاری رحمہ اللہ نے فرمایا یہ قول شاذ ہے جس حدیث کا ذکر کیا جاتا ہے وہ ضعیف ہے ضعیف حدیث سے اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ (مرقاۃ) علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" ومنع بعضهم ان يقال رمضان بدون شهر لما اخرجه ابن ابی حاتم وابو الشيخ وابن عدی والبيهقی والديلمی عن ابی هريرة مرفوعا وموقوفا ﴿ لا تقولوا ﴾ رمضان فان رمضان اسم من اسماء الله تعالىٰ ولكن قولوا شهر رمضان، والى ذلك ذهب مجاهد والصحيح الجواز فقد روی ذلك فی الصحيح والاحتياط لا يخفی "

بعض حضرات نے صرف رمضان کہنا بغیر مہینہ یا ماہ کے ملانے کے منع قرار دیا ہے کہ ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ اور ابن عدی اور بیہقی اور دیلمی نے حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے جو بطریق مرفوع اور موقوف بیان ہے کہ تم نہ کہو رمضان بیشک رمضان اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے لیکن تم کہو ماہ رمضان، یہی قول مجاہد رحمہ اللہ کا بھی ہے۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ اپنا مختار بیان کرتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ صرف ''رمضان'' کہنا صحیح ہے اس لئے کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں فقط رمضان بغیر شہر کے آیا ہوا ہے البتہ احتیاط مخفی نہیں یعنی اگر احتیاط کے طور پر ماہ رمضان کہے صرف رمضان نہ کہے تو بہتر ہے۔ کیا خوب علم تھا محققین کا کہ حدیث پاک کے ضعف کو بیان کر دیا لیکن احتیاطی طور پر عمل کرنے کا حکم بھی دے دیا۔ آج کل کے جاہل مصنفین اور مقررین جب احادیث پر بحث کرنے کی بجائے کتب احادیث کو ہی ضعیف کہہ دیتے ہیں تو ان کی جہالت روز روشن کی طرح آشکارا ہوتی ہے۔

اَلَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ :

''وہ کہ نازل کیا گیا اس میں قرآن'' یعنی رمضان وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔

مقام توجہ:

''نزل صحف ابراهيم فی اول ليلة من رمضان وانزلت التوراة لست مضين والانجيل لثلاث عشرة والقرآن لاربع وعشرين''

ابراہیم علیہ السلام پر صحیفے رمضان کی پہلی رات کو نازل ہوئے۔ اور توراۃ نازل ہوئی جب رمضان کے چھ دن گزر چکے تھے۔ اور انجیل نازل ہوئی تیرہ رمضان کو اور قرآن نازل ہوا چوبیس رمضان کو۔ (کبیر)

اور یہ بھی مشہور ہے کہ قرآن پاک کا نزول ایک مرتبہ نہیں ہوا بلکہ ''وانما نزل عليه فی مدة ثلاث وعشرين سنة منجما مبعضا'' بلکہ آہستہ آہستہ تھوڑی تھوڑی مقدار میں تئیس سال نازل ہوتا رہا۔ اور یہ بھی مشہور ہے کہ نبی کریم ﷺ پر قرآن پاک بیس سال نازل ہوتا رہا۔ اور حدیث پاک سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ قرآن پاک چوبیس رمضان کو نازل ہوا۔ اور قرآن پاک میں یہ بھی ہے:

﴿ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ﴾ ''بیشک ہم نے نازل کیا اسے قدر والی رات میں''

اس سے مراد مشہور لیلۃ القدر ہے ان تمام میں تطبیق کیسے ہے۔

جواب : قرطبی، روح المعانی، کبیر وغیرہ تفاسیر اور شروح احادیث کو دیکھنے سے مختلف جگہ سے عبارات لے کر جمع کرنے سے نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ قرآن پاک کی سورۃ اقراء کی ابتدائی آیات مبارکہ پہلے

نازل ہوئیں پھر تین سال کے بعد سورۃ مدثر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں پھر نزول کا سلسلہ جاری رہا تئیس سال ابتداء وحی سے انتہاء وحی تک ہیں اور بیس سال مسلسل وحی کا نزول ہے یہ سوال کی ایک شق کا جواب آ گیا۔ پھر بعض مفسرین کرام نے " انا انزلناہ فی لیلة مبارکة " سے اور انا انزلناہ فی لیلة القدر " سے مراد ایک ہی رات لی ہے جسے لیلۃ القدر کہا جاتا ہے۔

بعض مفسرین کرام نے دونوں راتوں کو علیحدہ علیحدہ کہا ہے اگر علیحدہ علیحدہ راتیں مراد ہوں (جیسا راقم کا بھی موقف ہے) تو صورت مسئلہ یہ ہوگی کہ قرآن پاک ''لوح محفوظ'' سے نازل ہو کر صحف ملائکہ میں پندرھویں شعبان کی رات میں منتقل ہو گیا پھر لیلۃ القدر جو رمضان میں ہوتی ہے (زیادہ حضرات کا یہی قول ہے) رمضان کی لیلۃ القدر میں صحف ملائکہ سے نازل ہو کر آسمان دنیا میں بیت العزۃ میں منتقل ہو گیا پھر وہاں سے ابتداء وحی یا تین سال کے بعد مسلسل وحی کا جاری رہنا والا سلسلہ چوبیس رمضان کو شروع ہوا ہو۔ بلکہ بعض حضرات نے اس حدیث سے چوبیس رمضان کی رات کو لیلۃ القدر کہا ہے تاہم راقم کے نزدیک لیلۃ القدر کا جس طرح واضح طور پر تعین نہیں فرمایا گیا اسی طرح مبہم رکھنا ہی بہتر ہے۔ مذکورہ بالا بحث سے واضح ہو گیا کہ قرآن پاک میں تعارض نہیں بلکہ سمجھنے کی حد تک کمی ہے جس سے تعارض سمجھ آتا ہے۔

فائدہ: اسی مذکورہ بحث سے واضح ہو گیا کہ قرآن پاک ایک مرتبہ ہی لوح محفوظ سے صحف ملائکہ میں اور ایک مرتبہ ہی صحف ملائکہ سے آسمان دنیا میں منتقل ہوا اسی وجہ سے قرآن پاک کے نزول کے لئے "انزلناہ" ذکر کیا کیونکہ انزال کا مطلب ہوتا ہے ایک مرتبہ نازل کرنا۔ لیکن قرآن پاک نبی کریم ﷺ پر آہستہ آہستہ بھی نازل ہوتا رہا اسی وجہ سے فرمایا ﴿ نزل علی محمد ﴾ اس لئے کہ تنزیل کا مطلب ہوتا ہے آہستہ آہستہ اتارنا۔

قرآن کی وجہ تسمیہ: اس میں دو مذہب ہیں ایک یہ ہے قرآن بروزن فعال ہے اس میں ہمزہ نہیں اور دوسرا مذہب یہ ہے کہ قرآن کا وزن فعلان ہے اس میں ہمزہ پایا گیا ہے پہلے مذہب والے جن کے نزدیک ہمزہ نہیں وہ کہتے ہیں یہ مشتق ہے " قرن " سے کہا جاتا ہے " قرنت الشئی بالشئی " میں نے ایک چیز کو دوسری چیز سے ملایا۔ قرآن پاک میں سورتیں سورتوں سے اور آیات، آیات سے

اور حروف، حروف سے ملے ہوئے ہیں اس لئے اس کا نام قرآن رکھا گیا۔

اور وجہ یہ ہے کہ اس میں احکام وشرائع بعض بعض کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اسلئے اس کا نام قرآن رکھا گیا اور وجہ یہ ہے کہ اس میں وہ دلائل جو اس پر دلالت کر رہے ہیں کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے وہ دلائل آپس میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ وہ دلائل یہ ہیں: کہ قرآن پاک فصاحت کی تمام وجوہ پر مشتمل ہے بلکہ قرآن پاک کو دیکھ کر ہی تو علم بیان اور علم معانی معرض وجود میں آئے پھر قرآن پاک عجیب وغریب اسلوب پر مشتمل ہے پھر قرآن پاک میں غیبی خبریں موجود ہیں پھر قرآن پاک کثیر علوم پر مشتمل ہے۔

ابھی تک جو وجہ ذکر کی گئی ہیں ان سے واضح ہوا کہ قرآن میں ہمزہ نہیں یہ " قرن " سے بنایا گیا ہے اور اگر اس میں ہمزہ ہو اور نام قرآن ہو تو فراء کے نزدیک اس کا معنی " قرائن " سے لیا ہوا ہے یہ معنی قرآن پاک پر اس طرح سچا آتا ہے کہ بعض آیات دوسری بعض آیات کی تصدیق کرتی ہیں اس مقام پر ''قرائن'' کا یہی مطلب ہے۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی بھی اس پر دلالت کر رہا ہے:

﴿ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴾

''اور اگر یہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی اور طرف سے ہوتا تو اس میں کثیر اختلاف پاتے''

ہمزہ کی صورت میں یہ مشتق ہوگا " قراءة " سے جس کا معنی ہے پڑھنا۔ یہ مصدر مفعول کے معنی میں استعمال ہے قرآن مصدر ہے جیسے رجحان، نقصان، خسران اور غفران مصادر ہیں۔ اسی معنی میں یہ آیۃ استعمال ہے ﴿ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ﴾ بیشک صبح کے قرآن پڑھنے میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔ اور ہمزہ کی صورت میں اور احتمال یہ ہے کہ یہ مشتق ہو " قرء " سے جس کا معنی ہے جمع کرنا۔ قرآن پاک میں اولین وآخرین کے علوم مجتمع ہیں اس لئے اسے قرآن کہا گیا اور یہ کہ تمام مسلمان خواہ وہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں شمال میں ہوں یا جنوب میں ان تمام کو قرآن پاک ایمان واسلام کی ایک سلک (لڑی) میں پرو کر جمع کر دیتا ہے۔ (از کبیر)

قرآن پاک کے فضائل مقدمہ میں اور ﴿ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ ﴾ آیۃ میں بیان ہو چکے ہیں۔

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ : ''جو ہدایت ہے لوگوں کے لئے اور وہ

واضح دلیلیں ہیں ہدایت کی اور فرق کرنے والا (حق و باطل میں)۔ راقم نے ترجمہ علامہ رازی رحمہ اللہ کی اس عبارت سے لیا ہے:

" ای انزل وھو ھدایة للناس الی الحق وھو آیات واضحات مکشوفات بما یھدی الی الحق ویفرق بین الحق والباطل "

وہ قرآن ہدایت ہے لوگوں کے لئے اور وہ قرآن واضح کھلی دلیلیں ہیں حق کی اور وہ قرآن حق و باطل میں فرق کرنے والا ہے۔

اعتراض: ﴿ هُدًى لِّلنَّاسِ ﴾ کہنے کے بعد ﴿ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ ﴾ کہنے کا کیا مطلب ہے

پہلا جواب: پہلے ذکر فرمایا کہ قرآن پاک لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور اس کے بعد اس طرف اشارہ فرمادیا کہ ہدایت کی دو قسمیں ہیں کبھی وہ ہدایت واضح اور جلی ہوتی ہے لوگوں کے لئے۔ اور کبھی ہدایت تو ہوتی ہے لیکن واضح نہیں بلکہ مخفی اور یہ یقینی بات ہے کہ وہ ہدایت افضل ہے جو واضح ہوگی۔ گویا کہ یہ کہا گیا ہے " ھو ھدی لانہ ھو البین من الھدی " وہ قرآن لوگوں کے لئے ہدایت ہے کیونکہ وہ واضح ہدایت ہے "والفرقان" وہ قرآن حق و باطل میں فرق کرنے والا ہے۔

حاصل کلام یہ ہوا کہ پہلے جنس ہدایت کو ذکر کیا گیا پھر اس پر اس کی انواع میں سے ایک نوع کا عطف کیا گیا ہے وہ ہے واضح ہدایت اس کے بعد ﴿ وَالْفُرْقَانِ ﴾ کو بطور عطف ذکر کیا ایک اور نوع کو ذکر کیا کہ وہ قرآن ایسی ہدایت دیتا ہے کہ حق و باطل میں فرق کردیتا ہے۔ پھر ﴿ بَيِّنَاتٍ ﴾ جمع ذکر کر کے یہ مسئلہ سمجھا دیا گیا کہ قرآن پاک کی ہر آیۃ روشن دلیل ہے یعنی قرآن پاک میں جتنی آیات ہیں وہ تمام ہی واضح دلیلیں ہیں۔

خیال رہے کہ متشابہات بھی واضح دلیلیں ہیں کیونکہ ان پر سقوط اختیار کرنا اپنے علمی گھوڑے نہ دوڑانا بھی ان کے روشن دلیل ہونے کی علامت ہے۔

دوسرا جواب: جس طرح نبی کریم ﷺ کو تمام انبیاء کرام کے اوصاف و کمالات حاصل ہیں اسی طرح قرآن پاک کو تمام آسمانی کتابوں کے کمالات حاصل ہیں۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گویا کہ یہ بیان فرمایا:

" ان القرآن مع کونہ ھدی فی نفسہ ففیہ ایضا ھدی من الکتب

المتقدمة التی هی هدی وفرقان"

کہ قرآن پاک خود بذاتہ بھی منبع ہدایت ہے اوراس میں پہلی کتابوں کی ہدایت بھی موجود ہے کیونکہ پہلی کتابیں بھی ہدایت اور فرقان ہیں۔اس لئے کہ توراۃ وانجیل کے متعلق رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰاةَ وَالْاِنْجِیْلَ مِنْ قَبْلُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَالْفُرْقَانِ ﴾

''اور رب تعالیٰ نے نازل فرمایا توراۃ وانجیل کواس سے پہلے (قرآن سے پہلے) جو ہدایت ہیں لوگوں کے لئے اور فرق کرنے والی ہیں حق وباطل میں''

تیسرا جواب: " ان یحمل الاول علی اصول الدین والهدی الثانی علی فروع الدین "

رب تعالیٰ نے فرمایا﴿ هُدًی لِّلنَّاسِ ﴾ سے یہ واضح فرمایا کہ قرآن پاک میں اصول دین کا ذکر فرمایا جن اصولوں پر چل کر ہی انسان کے اعتقادات درست ہو سکتے ہیں یعنی قرآن پاک میں اعتقادیات کا ذکر ہے اور ﴿ وَبَیِّنٰاتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ ﴾ سے یہ ثابت فرمایا کہ قرآن پاک میں فروع دین کا ذکر بھی ہے یعنی احکام جن کا تعلق عملیات سے ہے۔(ماخوذ از کبیر)

سبحان اللہ قرآن پاک کی عظمت پر قربان ایک ہی جملہ سے کتنے کتنے عظیم معانی بیان کردئے گئے۔

فَمَنْ شَهِدَ مِنْکُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ : ''تو جو شخص حاضر ہو تم میں سے اس مہینہ میں تو روزے رکھے اس کے'' " شهد ، حضر ، اوالشهود ای الحضور " شہود کا معنی ہے حضور اور شہد کا معنی حاضر ہوا۔

راقم کے نزدیک مطلب یہ ہے کہ جو شخص حاضر ہو تم میں اس مہینہ میں اہلیت کے ساتھ تو وہ اس مہینہ کے روزے رکھے مسافر کو روزہ رکھنے کی اہلیت حاصل ہے تو وہ روزہ رکھے اگر روزہ رکھنے کی اہلیت نہیں تو وہ روزہ نہ رکھے جب مقیم ہو جائے تو روزے قضاء کرلے۔

مریض کو روزہ رکھنے کی اہلیت حاصل ہو یعنی مرض کے بڑھنے ،مرض کے زیادہ ہونے اور مرض سے ہلاک ہونے کا کوئی خطرہ نہ ہو تو وہ روزہ رکھے اگر روزہ رکھنے کی اہلیت نہیں تو روزے نہ رکھے بعد میں صحت یاب ہو تو روزے قضا کرلے۔ بچے اور مجنوں (پاگل) میں روزہ رکھنے کی اہلیت ہی نہیں پائی

جاتی اس لئے ان پر روزے فرض نہیں۔علامہ رازی رحمہ فرماتے ہیں۔" فمن شهد منكم البلد او بيته بمعنى لم يكن مسافرا" کہ آیۃ کریمہ ﴿ فَمَنْ شَهِدَ ﴾ کا ایک مطلب یہ ہے کہ جو شخص تم میں سے اس مہینہ میں اپنے گھر یا اپنے شہر میں حاضر ہو مسافر نہ ہو وہ اس مہینہ کے مکمل روزے رکھے۔اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ "من شاهد الشهر بعقله و معرفته فليصمه" جو شخص اس مہینہ میں اپنی عقل اور معرفت سے حاضر ہو وہ پورا مہینہ روزے رکھیں بچہ اور مجنون کامل عقل و معرفت نہیں رکھتے اس لئے ان پر روزے فرض نہیں۔ (کبیر)

جواب: کبھی جزاء شرط کے مجموعہ پر مرتب ہوتی ہے اور کبھی شرط کے اجزاء پر مرتب ہوتی ہے، اس مقام میں اجزاء پر حکم مرتب ہے، مطلب یہ ہے "من شهد جزأ من اجزاء الشهر فليصم" کہ جو شخص رمضان کا جو دن پالے اس دن روزہ رکھے اگر کل دن رمضان کے پالے تو تمام مہینہ روزے رکھے۔

(ماخوذ از کبیر)

طلباء کرام توجہ فرمائیں: " من " شرطیہ ہے اور " فليصمه " جزاء ہے قانون یہ ہے کہ شرط کے پائے جانے پر جزا مرتب ہوتی ہے جب " شهر " سے مراد ﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ ﴾ "ماہ رمضان" ہے تو یہاں شرط کے پائے جانے پر جزاء کا مرتب ہونا کیسے صحیح ہوا؟ کیونکہ مطلب تو یہ بنے گا کہ جب رمضان کا مہینہ گزر جائے تو روزے رکھو، یہ کیسے صحیح ہے؟

جواب: کبھی جزاء شرط کے مجموعہ پر مرتب ہوتی ہے اور کبھی شرط کیجز اء پر مرتب ہوتی ہے، اس مقام میں اجزاء پر حکم مرتب ہے، مطلب یہ ہے " من شهدجزأ من اجزاء الشهر فليصم " کہ جو شخص رمضان کا جو دن پالے اس دن روزہ رکھے اگر کل دن رمضان کے پالے تو تمام مہینہ روزے رکھے۔

(ماخوذ از کبیر)

ماہ رمضان کو پالینے کا کیا مطلب ہے؟ رمضان شریف کو پالینے کا مطلب یہ ہے کہ یا خود چاند دیکھ لے یا چاند کی شہادت اسے مل جائے تو اس نے رمضان کو پالیا ہے وہ ماہ رمضان کے روزے رکھے۔

رمضان کی چاند کی شہادت: اگر شعبان کے تیس دن مکمل ہو جائیں تو مطلع صاف ہو یا بادل چھائے ہوئے ہوں ہر حال میں بغیر کسی شہادت یا خبر کے روزہ رکھنا فرض ہوگا اس لئے کہ پہلا مہینہ تیس

دن کے مکمل ہونے پر مکمل ہو چکا ہے۔ اگر ایک شخص نے اکیلے رمضان کا چاند دیکھا حاکم وقت نے اس کی شہادت کو قبول نہیں کیا تو وہ شخص جس نے چاند دیکھا وہ روزہ رکھے کیونکہ اسے اس دن رمضان ہونے میں کوئی شک نہیں۔ لیکن اگر اس نے روزہ رکھ کر توڑ دیا تو اس پر کفارہ لازم نہیں کیونکہ حاکم نے جب اس کی شہادت کو رد کر دیا تو اس کے حق میں بھی حکم قطعی نہ رہا۔ اگر ایک مسلمان شخص رمضان کے چاند دیکھنے کی خبر دے جب کہ آسمان ابر آلود ہو دھند ہو، گرد و غبار چھایا ہوا ہو تو اس ایک مسلمان کی خبر کو قبول کر لیا جائے روزہ رکھنے کا حکم دیا جائے خواہ وہ خبر دینے والا نیک ہو یا گنہگار ہو۔

" قال ابن عباس جاء اعرابی الی النبی ﷺ فقال انی رأیت الهلال یعنی هلال رمضان فقال اتشهد ان لا اله الا الله قال نعم قال اتشهد ان محمد رسول الله قال نعم قال یا بلال اذن فی الناس فلیصوموا غدا "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ایک اعرابی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے کہا بیشک میں نے رمضان کا چاند دیکھا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم شہادت دیتے ہو کہ اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں؟ انہوں نے کہا ہاں آپ نے فرمایا کیا تم شہادت دیتے ہو محمد اللہ کے رسول ہیں انہوں نے کہا ہاں۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال کو کہا لوگوں میں اعلان کر دو کہ کل روزہ رکھیں۔

اس حدیث پاک سے یہ مسئلہ ثابت ہو گیا کہ ایک مسلمان کی خبر رمضان کے چاند کے متعلق قبول ہے جب کہ آسمان ابر آلود ہو۔ ہاں البتہ یہ بات یاد رہے کہ وہ شخص جو دیہات سے آئے تھے وہ اس وقت آئے تھے جب کہ روزے کی نیت کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ یعنی ظہر کا وقت ہو چکا تھا۔

اگر آسمان صاف ہے ابر آلود نہیں تو رمضان کے چاند دیکھنے کی شہادت اتنے لوگ دیں جن پر اعتبار آ جائے کہ یہ سچے ہوں گے جھوٹ نہیں بول رہے تو ان کی شہادت قبول ہوگی۔

عید الفطر کے چاند کی شہادت: اگر رمضان کے تیس دن مکمل ہو جائیں تو آسمان صاف ہو یا ابر آلود ہو چاند دیکھنے کی کوئی خبر دے یا نہ دے عید الفطر ثابت ہو جائے گی۔

اگر ایک شخص کہے کہ میں نے چاند دیکھا ہے تو اس کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی خواہ آسمان

صاف ہو یا ابر آلود ہو بلکہ وہ شخص جو کہہ رہا ہے کہ میں نے چاند دیکھا ہے اسے بھی روزہ رکھنا پڑے گا کیونکہ اسے کے چاند دیکھنے کی شہادت جب رد ہوگئی تو اس کے چاند دیکھنے میں اشتباہ پڑ گیا۔ اگر آسمان ابر آلود ہو تو عید الفطر کے چاند دیکھنے کی شہادت دو مسلمان آزاد مردوں کی قبول ہوگی یا ایک مسلمان آزاد مرد اور دو مسلمان آزاد عورتوں کی گواہی قبول ہوگی۔ اگر آسمان صاف ہوا تو عید الفطر کے چاند دیکھنے کی اتنے آدمیوں کی شہادت قبول ہوگی جن پر اعتبار آ جائے کہ یہ سچے ہیں اتنے لوگ جھوٹ پر متفق نہیں ہو سکتے۔

فائدہ : عید الاضحیٰ کا چاند دیکھنے کا حکم وہی ہے جو عید الفطر کا ہے بلکہ رمضان کے علاوہ تمام مہینوں کا حکم یہی ہے۔ (نور الایضاح مع ذریعۃ النجاح)

رؤیۃ ھلال : ''چاند دیکھنا'' چاند دیکھنے کے متعلق احادیث اور فقہی کتب سے چند مسائل ذکر کئے جاتے ہیں۔

☆ **" عن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ لا تصوموا حتی تروا الھلال و لا تفطروا حتی تروہ فان غم علیکم فاقدروا لہ وفی روایۃ قال الشھر تسع وعشرون لیلۃ فلا تصوموا حتی تروہ فان غم علیکم فاکملوا العدۃ ثلاثین "** (بخاری و مسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا روزہ نہ رکھو یہاں تک کہ چاند دیکھ لو اور فطر نہ کرو (یعنی عید الفطر نہ کرو) یہاں تک کہ چاند دیکھ لو۔ اگر مطلع ابر آلود ہو تو اس کی قدر مکمل کرو۔ ایک روایت میں (وضاحت سے بیان کیا گیا) مہینہ انتیس راتوں کا ہے روزہ نہ رکھو یہاں تک کہ چاند دیکھ لو اگر آسمان ابر آلود ہو جائے تو تیس دن مکمل کرو۔ (مشکوۃ باب رؤیۃ الھلال)

وضاحت حدیث : " **لا تصوموا حتی تروا الھلال** " روزہ نہ رکھو یہاں تک کہ چاند دیکھ لو، حدیث پاک کے ان الفاظ کا یہ مطلب نہیں کہ ہر شخص چاند دیکھ لے جو دیکھے وہ روزے رکھے اور جو نہ دیکھے وہ روزے نہ رکھے بلکہ مطلب یہ ہے " **حتی یثبت عندکم رؤیۃ ھلال رمضان** " یہاں تک کہ تمہارے نزدیک رمضان کا چاند دیکھنا ثابت ہو جائے خواہ خود دیکھ لو یا شہادت مل جائے کہ چاند نظر آ گیا تو چاند کا دیکھنا ثابت ہو گیا۔

ولا تفطروه حتی تروه : اور فطر نہ کرو (عید الفطر نہ کرو) یہاں تک کہ چاند دیکھ لو، حدیث پاک کے ان الفاظ مبارکہ کا بھی یہی مطلب ہے جو ابھی رمضان کے چاند کے متعلق بیان کر دیا گیا کہ چاند کا ثبوت مل جائے خواہ خود دیکھنے سے یا چاند کی خبر ملنے سے۔

فان غم علیکم فاقدروا له : ''غم'' کا معنی ہے '' غطی الهلال بالغیم '' بادلوں کی وجہ سے چاند چھپ جائے دکھائی نہ دے '' فاقدروا '' دال کے نیچے کسرہ ہے ضمہ کا قول مغرب (کتاب کا نام) میں رد کیا گیا ہے معنی اندازہ لگاؤ '' فان غم علیکم فاقدروا له '' اور دوسری روایت میں الفاظ مبارکہ '' فان غم علیکم الهلال فاکملوا العدة ثلاثین '' کا مطلب ایک ہی ہے کہ اگر آسمان پر بادل وغیرہ چھائے ہوئے ہوں چاند تم سے پوشیدہ ہو جائے دکھائی نہ دے یعنی چاند کے ثبوت کی کوئی شہادت بھی نہ ملے تو تیس دن مکمل کرو۔ یعنی اگر شعبان کا مہینہ ہے تو تیس دن مکمل کر کے روزے رکھو اور اگر رمضان کا مہینہ ہے تو تیس دن مکمل کر کے عید الفطر کرو۔

تنبیہ : عام طور پر ہم اپنے محاورات اور کلام کرنے کے انداز کو دیکھیں تو بات واضح ہو جائے کہ ایک ہی مطلب کو بیان کرنے کے لئے ہم مختلف الفاظ استعمال کرتے ہیں آج کوئی اور لفظ بول دیئے کل کوئی اور لیکن مقصد کلام کا آج بھی وہی ہے جو کل تھا اگرچہ الفاظ وہ نہیں جو کل تھے۔ ہر زبان کا یہی طریقہ تھا اسی طرف تکلم (کلام کے انداز) پر ایک حدیث شریف '' فاقدروا له ''اور دوسری حدیث شریف میں'' فاکملوا العدة '' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں معنی دونوں کا ایک ہے۔ آیئے دیکھئے محققین اہل علم نے ''فاقدروا له '' کے معانی کیا بیان کئے ہیں۔

ایک معنی یہ بیان کیا گیا '' اجعلوا الشهر ثلاثین یوما '' اگر چاند بادل میں چھپ جائے دکھائی نہ دے تو مہینہ تیس دنوں کا بناؤ۔ دوسرا معنی یہ بیان کیا گیا ہے:

'' قال الزرکشی یعنی حققوا مقادیر ایام شعبان حتی تکملوه ثلاثین یوما ''

علامہ زرکشی رحمہ اللہ نے فرمایا اس کا معنی یہ ہے کہ شعبان کے دنوں کی مقدار کو ثابت کرو یہاں تک کہ تیس دن مکمل کرو۔ '' وفی شرح السنة معناه التقدیر باکمال العدد '' تیسرا معنی شرح السنۃ میں بیان کیا گیا ہے کہ '' فاقدروا له '' کا معنی یہ ہے کہ مہینہ کے (تیس دن) دنوں کی تعداد مکمل کرنے کا تحقیق

اندازہ کرو۔ جتنے معانی بیان کئے گئے ہیں ان میں اگرچہ الفاظ مختلف ہیں لیکن مقصد سب نے ایک ہی بیان کیا ہے۔

غلط فہمی: جب محققین اہل علم نے جو معانی ذکر فرمائے ان کو دیکھا جائے تو بعض حضرات جو "فاقدروا لہ" کے الفاظ سے غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں ان کی غلط فہمی آشکارا ہو جائے گی ان کی غلطی کی وجہ سے دوسرے بھی غلطی کا شکار نہ ہو جائیں۔ ہر زمانہ میں جن لوگوں کے ذہنوں پر فلسفہ اور سائنس سوار ہے وہ راہ راست سے بھٹکتے رہے فلسفہ نے بعض ان لوگوں کو بھی راہ راست سے بھٹکا دیا جو دین کا علم رکھتے تھے جو دینی علوم سے بھی خالی ہیں ان کو فلسفہ اگر بھٹکا کر دین سے برگشتہ کر دے تو کوئی مقام تعجب نہیں۔

آیئے فلسفہ کی زد میں آنے والوں نے "فاقدروا لہ" کا کیا معنی کیا ہے ذرا دیکھئے:

" ذهب بعض الى ان المراد به التقدير بحساب القمر فى المنازل اى اقدروا منازل القمر فانه يدلكم على ان الشهر تسع وعشرون او ثلاثون "

بعض حضرات نے کہا نبی کریم ﷺ کے ارشاد " فاقدروا لہ " کا مطلب یہ ہے کہ چاند کے حساب سے اندازہ کرو یعنی چاند کی منزلوں سے حساب کرو تو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ مہینہ انتیس دن کا ہے یا تیس دن کا۔

غلط فہمی کا ازالہ: کسی مہینہ کی ابتدائی تاریخ یا انتہائی تاریخ کو ستاروں کا حساب لگانے والے علم ہیئت والوں کا اعتبار نہیں کیا جائے گا" والاجماع على عدم الاعتداد بقول المنجمين ولو اتفقوا على انه يرى " کیونکہ اس مسئلہ پر محققین اہل علم کا اجماع ہے کہ صرف چاند کی منازل اور ستاروں کی منازل کا حساب کرنے والوں پر اعتبار نہیں کیا جائے گا اگرچہ وہ سب اس پر اتفاق بھی کر لیں کہ آج چاند دکھائی دینے کی تاریخ ہے۔ اس لئے کہ رب تعالیٰ نے صرف حساب دانوں کو "خیر امۃ" سے خطاب نہیں کیا۔ بلکہ نبی کریم ﷺ کی تمام امت کو فرمایا ﴿ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ﴾ تم بہتر امت ہو ان تمام امتوں میں سے جو لوگوں میں ظاہر ہوئیں۔ پھر تمام امت کو ہی یہ حکم فرمایا:

﴿ فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ﴾

"جو شخص حاضر ہو تم میں سے اس مہینہ میں تو وہ روزے رکھے"

یعنی جو شخص تم میں سے اس مہینہ کو چاند دیکھنے سے پالے یا شہادت سے پالے تو وہ روزے رکھے۔ اس آیۃ کریمہ میں صرف حساب لگانے والوں کو حکم نہیں دیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی بھی تمام امت کو ہیں یہی حدیث پاک جسے ذکر کیا جارہا ہے اس میں بھی حکم عام ہے اور احادیث کو بھی دیکھئے جن میں حکم عام ہے:

☆ " عن ابی هریرة قال رسول الله ﷺ صوموا لرؤیته وافطروا لرؤیته فان غم علیکم فاکملوا عدة شعبان ثلاثین بخاری ومسلم " (مشکوة باب رؤیة الهلال)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا روزہ رکھو چاند دیکھ کر اور افطار کرو چاند دیکھ کر پھر اگر بادل میں چاند آ کر تم سے چھپ جائے تو تیس دنوں شعبان کی گنتی مکمل کرو (پھر رمضان کا روزہ رکھو) حدیث شریف میں حکم عام ہے صرف حساب لگانے والوں کو نہیں پھر آپ نے واضح طور پر دیکھنے کا حکم فرمایا حساب لگانے کا نہیں:

" قال ابن الهمام وعند ابی داؤد والترمذی حسنه ، فان حال بینکم وبینه سحاب فکملوا العدة ثلاثین ولا تستقبلوا الشهرا استقبالا "

ابن ہمام فرماتے ہیں ابوداؤد اور ترمذی نے حدیث ذکر فرمائی اور ترمذی نے اسے حسن کہا ہے وہ حدیث یہ ہے اگر تمہارے اور چاند کے درمیان بادل حائل ہو جائے تو تیس دنوں کی تعداد مکمل کرو اور مہینے کا استقبال نہ کرو۔ یعنی جلدی جلدی بغیر چاند دیکھنے بغیر شہادت کے انتیس دنوں پر پہلے مہینہ کو ختم کر کے نئے کا استقبال نہ کرو۔

احادیث کے مختلف الفاظ کا مطلب ایک ہے: ابھی جو حدیث بیان کی یا جو پہلے بیان کی گئیں ہیں سب کا مطلب یہی ہے کہ چاند نہ دکھائی دینے پر اور شہادت نہ ملنے پر تیس دن مکمل کرو:

☆ ایک روایت میں ہے:" فان حال بینکم وبینه سحاب فکملوا العدة ثلاثین "

☆ ایک اور روایت میں ہے: "فان اغمی علیکم فاکملوا عدة شعبان ثلاثین یوما ثم صوموا "

☆ ایک اور روایت میں ہے:" فان اغمی علیکم الشهر فعدوا ثلاثین ثم صوموا "

☆ ایک اور روایت میں ہے:" کان ﷺ یتحفظ من شعبان مالا یتحفظ من غیره ثم

یصوم لرؤیة رمضان فان غم علیه عد ثلاثین یوما ثم صام "

ان تمام روایات کے متعلق ملا علی قاری رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں " وهذه روايات صحيحة لا تقبل التاويل " یہ سب روایات صحیح ہیں ان میں تاویل کی کوئی گنجائش نہیں۔ سب کا مطلب یہی ہے کہ چاند دیکھ کر روزہ رکھو، چاند دیکھ کر فطر (عید الفطر) کرو۔ اگر چاند بادل میں آ جائے دکھائی نہ دے تو تیس دن مکمل کرو جلد بازی سے نئے مہینہ کو نہ شروع کرلو۔

مندرجہ بالا بحث سے ایک اور قول رد ہو گیا: فلسفہ کی زد میں آنے والے اہل علم نے ایک اور ٹھوکر کھائی تھی اس کی حیثیت بھی پانی کے ایک بلبلہ سے زائد نہ رہی وہ قول یہ ہے:

" قال ابن سريج فاقدروا خطاب عنه خصه الله بهذا العلم وقوله فاكملوا العدة خطاب للعامة "

ابن سریج نے کہا نبی کریم ﷺ کا ارشاد " فاقدروا " علم ہیئت والوں کو خطاب ہے کہ وہ حساب لگائیں اور " فاكملوا العدة " کا خطاب عوام کو ہے کہ وہ تیس دن مکمل کریں۔ یہ قول سرے سے باطل ہے کیونکہ شرع میں احکام سب کے لئے برابر ہیں عوام و خواص کا کوئی فرق نہیں۔ بلکہ راقم کے نزدیک تو خواص ہی وہ ہیں جو مصطفیٰ کریم ﷺ کے ارشاد پر سر جھکا دیں وہ خواص کیسے جو ارشادات نبوی کی غلط تاویلیں کر کے عقلی گھوڑے دوڑائیں۔ ایک اور حدیث پاک دیکھئے جس میں بہت واضح کر دیا گیا کہ مہینہ انتیس دن کا یا تیس دن کا ہوتا ہے۔

☆ " وعن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ انا امة امية لا نكتب ولا نحسب الشهر هكذا وهكذا وهكذا وعقد الا بهام في الثالثة ثم قال الشهر هكذ وهكذا وهكذا يعني تمام الثلاثين يعني مرة تسعا وعشرين ومرة ثلاثين " (بخاری ومسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہم امی لوگ ہیں حساب و کتاب نہیں جانتے (تین دفعہ دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر انگلیاں کھول کر فرمایا) مہینہ اس طرح ہے اور اس طرح ہے پھر آپ نے تیسری مرتبہ ایک ہاتھ کے انگوٹھے کو بند کر کے فرمایا مہینہ اس طرح ہے اور اس طرح اور اس طرح اس کے بعد راوی نے وضاحت کر دی یعنی پہلی مرتبہ جو ارشاد فرمایا اس سے تیس دن مکمل مراد لئے۔

راوی نے پھر مزید وضاحت کردی کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ مہینہ یا تو انتیس دنوں کا ہوگا کیونکہ دوسری مرتبہ ایک انگوٹھے کو بند کرنے کا یہ مطلب ہی تھا اور آپ نے فرمایا. کہ مہینہ کبھی تیس دنوں کا ہوگا کیونکہ پہلی مرتبہ تینوں دفعہ دونوں ہاتھ کھلے رکھ کر یہی مسئلہ سمجھایا۔

(مشکوۃ باب رؤیة الهلال)

حدیث پاک سے مسئلہ روز روشن کی طرح واضح ہوگیا کہ آپ نے قیامت تک آنے والی اپنی امت کے متعلق فرمادیا کہ میری امت میں کئی لوگ وہ ہوں گے جو حساب وکتاب ہی نہیں جانتے ہوں گے۔ان کو چاند کی منازل کے حساب کے بھنور میں نہیں پھنسایا جاسکتا۔وہ چاند دیکھ کر یا شہادت ملنے پر چاند کی تاریخوں کا تعین کرلیا کریں انتیس کو چاند نظر آجائے تو ٹھیک ہے اگر مطلع صاف ہونے پر یا ابر آلود ہونے پر انتیس کو چاند نظر نہ آئے تو تیس دن مکمل کرلیں۔

" فالمعنى ان العمل على ما يعتاده المنجمون ليس من هدينا وسنتنا بل علمنا يتعلق برؤية الهلال فانا نراه مرة تسعا وعشرين ومرة ثلاثين "

حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ چاند کی منازل کے حساب سے چاند کی تاریخ متعین کرنے کی نہ ہی ہم نے ہدایت دی اور نہ ہی یہ ہماری سنت اور ہمارا طریقہ ہے بلکہ ہم تو یہ بتارہے ہیں کہ چاند دیکھ کر تاریخ متعین کرنا۔مہینہ کبھی انتیس دنوں کا ہوگا اور کبھی تیس دنوں کا۔

قال اكثر ائمتنا لا يعمل بحساب المنجم وهو من يرى ان اول الشهر طلوع النجم الفلانى "

اس کا کبھی اعتبار نہیں کیا جائے گا کہ چاند اور ستاروں کی منازل کا حساب کرنے والوں کی بات کو مان لیا جائے کہ فلاں دن چاند نظر آنے کی تاریخ ہے اس حساب کا کوئی اعتبار نہیں اعتبار ہے تو رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کا ہے۔

انتیس کا چاند نظر آنے پر ثواب میں کوئی کمی نہیں:

" عن ابى بكرة قال قال رسول الله ﷺ شهرا عيد لا ينقصان رمضان وذو الحجة " (بخاری ومسلم مشکوۃ باب رؤیة الهلال)

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عید کے دونوں مہینے رمضان اور ذوالحجہ میں کوئی کمی نہیں کرتے " لا ینقصان ثوابا ولا نقصا عددا " یعنی رمضان کے انتیس دن مکمل ہونے پر اگر عید الفطر کا چاند نظر آ جائے تو باوجود دنوں کی تعداد کی کمی کے رمضان کے ثواب میں کمی نہیں آئے گی کیونکہ یہ رعایت خود رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے حاصل ہے۔

اسی طرح ذی الحج کی انتیس تاریخ کو چاند نظر آ جائے تو ذی الحج کے ثواب اور خیر و برکت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔ خیال رہے کہ حدیث شریف میں ذوالحج کو عید کا مہینہ کہنا تو واضح ہے کہ اس میں عید الاضحیٰ ہوتی ہے لیکن رمضان کو عید کا مہینہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ عید اس کے مجاور (متصل) ہوتی ہے تو مجازاً عید کا مہینہ کہہ لیا گیا۔ (مرقاۃ ج۴ ص۲۴۵)

تنبیہ : یہ تصور باطل ہے کہ رمضان ہر سال ضرور ہی تیس دنوں کا ہو بات چاند دیکھنے کی ہے۔

" فصح عن جماعة من الصحابة صمنا مع رسول الله ﷺ تسعا وعشرين اكثر مما صمنا معه ثلاثين "

صحابہ کرام کی ایک جماعت سے ثابت ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کی معیت میں انتیس روزے زیادہ رکھے بنسبت تیس کے۔

" ومن صام قال بعض الحفاظ صام رسول الله ﷺ تسع رمضانات منها رمضانان فقط ثلاثون كذا فى شرح ابن حجر "

اسی وجہ سے بعض حفاظ حدیث نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نو رمضانوں کے روزے رکھے جن میں صرف دو رمضان تیس دنوں کے آئے۔

شک کے دن روزہ رکھنے کی ممانعت:

" عن ابى هريرة قال قال رسول الله ﷺ لا يتقد من احدكم رمضان بصوم يوم او يومين الا ان يكون رجل كان يصوم يوما فليصم ذلك اليوم "

(متفق علیہ ، مشکوۃ باب رؤیۃ الھلال)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی ایک بھی

رمضان سے ایک دن یا دو دن پہلے روزہ نہ رکھے ہاں مگر وہ شخص جو پہلے اس دن رکھتا تھا تو رمضان سے پہلے ایک دن وہی دن تھا تو روزہ رکھ لے۔

☆ " عن عمار بن یاسر قال من صام الیوم الذی یشک فیه فقد عصی ابا القاسم ﷺ "

(ابو داؤد ، ترمذی ، نسائی ، ابن ماجه ، دارمی)

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جس نے شک کے دن روزہ رکھا اس نے رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کی۔

ہاں البتہ یہ ذہن میں رہے کہ چاند نظر آنے اور چاند کی شہادت کے بغیر رمضان کی نیت کرنا یا یہ نیت کرنا کہ اگر رمضان کا روزہ ہوا تو میرا روزہ رمضان کا ہوگا اور اگر رمضان نہ ہوا تو میرا روزہ کوئی اور ہوگا یہ منع ہے۔ ہاں اگر کسی نے بغیر شک کے خالص نفلی روزہ کی نیت کر لی تو یہ جائز ہے اس میں کسی قسم کی کوئی وعید نہیں۔ اسی طرح اگر اس دن قضاء یا نذر کا روزہ رکھے تو جائز ہے۔

چاند کے بڑا ہونے یا چھوٹا ہونے کو دیکھ کر شک نہ کرے:

" عن ابی البختری قال خرجنا للعمرة فلما نزلنا ببطن نخلة تراء ینا الهلال فقال بعض القوم هو ابن ثلاث وقال بعض القوم هو ابن لیلتین فلقینا ابن عباس فقلنا انا رأینا الهلال فقال بعض القوم هو ابن ثلاث وقال بعض القوم هو ابن لیلتین فقال ای لیلة رأیتموه قلنا لیلة کذا وکذا فقال ان رسول الله ﷺ مدة للرؤیة فهو للیلة رأیتموه وفی روایة عنه قال اهللنا رمضان ونحن بذات عرق فارسلنا رجلا الی ابن عباس یسأله فقال ابن عباس قال رسول الله ﷺ ان الله تعالیٰ قد امده لرؤیته فان اغمی علیکم فاکملوا العدة " (رواه مسلم ، مشکوة باب رؤیة الهلال)

ابوالبختری کہتے ہیں ہم عمرہ کیلئے نکلے جب ہم بطن نخلہ میں پہنچے تو ہم نے چاند دیکھا بعض لوگ کہنے لگے کہ چاند تین راتوں کا ہے بعض کہنے لگے دو راتوں کا ہے تو ہم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو ملے ہم نے کہا بیشک ہم نے چاند دیکھا ہے تو ہم میں سے بعض نے کہا ہے کہ چاند تین راتوں کا ہے اور بعض نے کہا دو راتوں کا ہے تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے پوچھا تم نے کس رات کو چاند دیکھا؟ ہم

نے کہا ہم نے فلاں رات کو چاند دیکھا تو آپ نے فرمایا وہی رات ہے چاند دیکھنے کی کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے چاند دیکھنے کی رات کو ہی دیکھنے کی مدت قرار دیا۔

اور ایک روایت ابوالبختری سے ہی مروی ہے کہ ہم نے ذات عرق میں رمضان کا چاند دیکھا تو ہم نے ایک شخص کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس بھیجا کہ ان سے چاند کے متعلق سوال کرو۔ تو انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے چاند کی مدت کو تمہارے دیکھنے کی مدت تک بڑھا دیا ہے اگر مطلع ابرآلود ہو تو گنتی (تیس دن) مکمل کرو۔

واضح ہوا کہ چاند انتیس تاریخ کو دیکھ لیا یا شہادت مل گئی تو روزہ رکھ لیا جائے اور عید کر لی جائے اگر ابرآلود ہو چاند کے دیکھنے کی کوئی شہادت نہ ملے تو تیس دن مکمل کئے جائیں بعد میں چاند دیکھ کر شک میں پڑنا منع ہے کہ یہ کہے کہ یہ چاند تو بڑا ہے پچھلی تاریخ کا ہونا چاہیے یہ کہنا منع کیوں ہے؟ اس لئے کہ جب نبی کریم ﷺ نے چاند کا اعتبار دیکھنے سے کر دیا ہے تو جب دیکھے گا وہی تاریخ معتبر ہوگی۔

مقام توجہ: ایک روایت میں ذات عرق کا ذکر ہے اور ایک روایت میں بطن نخلہ کا ذکر ہے کیا ایک ہی واقع ہے یا دو واقعات ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہی واقعہ ہے کہ چاند انہوں نے مقام ذات عرق میں دیکھا اور ان کا نزاع ہوا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آدمی بھیجنا اور ان کا جواب دینا بطن نخلہ میں واقع ہوا۔

مسئلہ: حدیث شریف میں "للیلۃ رأیتموہ" مذکور ہے (جس رات کو تم چاند دیکھو وہی مدت دیکھنے کی ہوگی) اس سے واضح ہوا کہ دن کو چاند دیکھنے کا کوئی اعتبار نہیں۔ اگر کسی شخص نے تیس شعبان کو دن کو چاند دیکھا خواہ زوال سے پہلے یا بعد تو بقیہ دن کھانے پینے سے رکنے کی ضرورت نہیں یعنی وہ دن رمضان کا نہیں۔ اور اگر تیس رمضان کو دن کو چاند دیکھ لیا تو اسی وقت افطار کرنا جائز نہیں بلکہ غروب آفتاب تک روزہ مکمل کرنا ضروری ہوگا۔ (مرقاۃ ج ۴ ص ۲۵۰)

اختلاف مطالع کا مسئلہ: ایک جگہ چاند نظر آئے تو کیا دوسری جگہ روزہ رکھنا لازم ہے یا نہیں؟ اسی طرح ایک جگہ چاند نظر آئے تو دوسری جگہ عید ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اس مسئلہ میں فقہاء کرام کی مختلف عبارات ہیں جن کی وجہ سے عام لوگ غلطی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ میں

اختلاف نہیں صرف سمجھنے کی ضرورت ہے۔

فقہاء کرام کی ایک عبارت یہ ہے " **ولا عبرة باختلاف المطالع** " اختلاف مطالع کا کوئی اعتبار نہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کے کسی ایک شہر میں چاند نظر آجائے تو تمام دنیا کے شہروں میں روزہ رکھنا ضروری ہوگا۔

اور ایک عبارت فقہاء کرام کی یہ ہے " **وقیل یعتبر** " بعض حضرات نے کہا اختلاف مطالع کا اعتبار ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہر شہر میں چاند دیکھنا ضروری ہے ایک شہر میں چاند دیکھنے سے دوسرے شہر میں روزہ رکھنا یا عید کرنا درست نہیں۔ لیکن حقیقت میں اختلاف نہیں بلکہ دونوں قولوں میں تطبیق یہ ہے " **وان کان بینهما تقارب بحیث لا تختلف المطالع یجب وان کان بحیث تختلف لا یجب** " اگر ایک شہر اور دوسرے شہر میں زیادہ دوری نہ ہو بلکہ وقت کا معمولی فرق ہو تو ایک شہر میں چاند نظر آجائے تو دوسرے میں اس کا حکم ثابت ہو جائے گا۔

یہ بات نہ بھولیں کہ انتیس کا چاند صرف پچاس منٹ نظر آسکتا ہے وہ بھی ابتدائی پانچ منٹ نظر آنا مشکل ہوتا ہے۔ اس لئے جن دو شہروں میں پینتالیس منٹ یا اس سے کم وقت کی تقدیم و تاخیر ہو تو وہ معتبر ہوگا کہ ایک شہر میں چاند نظر آئے تو دوسرے شہر میں اس کا اعتبار کر لیا جائے۔ لیکن اگر اس سے زائد وقت کا فرق ہو تو ایک شہر میں چاند دیکھنے سے دوسرے شہر میں روزہ رکھنا لازم نہیں ہوگا اور نہ ہی عید کرنا جائز ہوگی۔ یعنی جب دونوں شہروں کے وقت میں پینتالیس منٹ سے زیادہ تقدیم و تاخیر ہو تو اس کا حکم یہ ہے:

> **" والاشبه ان یعتبر لان کل قوم مخاطبون بما عندهم وانفصال الهلال عن شعاع الشمس یختلف باختلاف الاقطار کما ان دخول الوقت وخروجه یختلف باختلاف الاقطار حتی اذا زالت الشمس فی المشرق لایلزم منه ان نزول فی المغرب وکذا طلوع الفجر وغروب الشمس بل کلما تحرکت الشمس درجة فتلک طلوع الفجر لقوم وطلوع الشمس لآخرین وغروب لبعض ونصف لیل لغیرهم "**

کہ زیادہ صحیح یہی ہے کہ ہر قوم کو خطاب ان کے مطابق ہو گا کیونکہ چاند کا سورج کی شعاؤں سے جدا ہونا مختلف قطروں (مراد علاقہ اور جگہ ہے) کے لحاظ پر مختلف ہوتا ہے جس طرح وقت کا نکلنا اور داخل ہونا مختلف ہوتا ہے یہاں تک کہ مشرق میں جب سورج ڈھل جائے تو لازم نہیں کہ مغرب میں بھی ڈھل جائے۔ اسی طرح سورج کے طلوع ہونے اور غروب ہونے کا بھی یہی حکم ہے ایک جگہ سورج نکل کر ایک درجہ بلند ہو کر حرکت کر رہا ہوتا ہے اور اسی وقت دوسری جگہ فجر طلوع ہو رہی ہوتی ہے اور اسی وقت دوسری جگہ سورج نکل رہا ہوتا ہے اور دوسری جگہ غروب ہو رہا ہوتا اور کہیں آدھی رات ہو جاتی ہے۔

واضح ہوا کہ ایک علاقہ میں جس وقت صبح کی نماز ہو رہی ہو تو لازم نہیں کہ دوسرے علاقہ میں بھی صبح کی نماز ہو رہی ہو اسی طرح یہ ضروری نہیں کہ ایک جگہ مغرب ہو تو دوسری جگہ بھی مغرب ہو۔

"وروی ان ابا موسی الضریر الفقیہ صاحب المختصر قدم الاسکندریۃ فسئل عمن صعد علی منارۃ الاسکندریۃ فیری الشمس بزمان طویل بعد ما غربت عندھم فی البلد ایحل لہ ان یفطر فقال لا ویحل لاھل البلد لان کلا مخاطب بما عندہ"

اور روایت کیا گیا ہے کہ بیشک ابو موسیٰ ضریر فقیہ اسکندریہ میں آئے تو ان سے پوچھا گیا کہ ایک شخص اسکندریہ کے مینار پر چڑھے تو وہ سورج کو دیکھ رہا ہو لیکن شہر والوں کے نزدیک سورج غروب ہو چکا ہو تو وہ مینار والا شخص کیا اس وقت روزہ افطار کر سکتا ہے؟ تو انہوں نے کہا نہیں وہ تو افطار نہیں کر سکتا البتہ شہر والے افطار کر سکتے ہیں کیونکہ ہر ایک کا اپنا اپنا حکم ہے۔ جن کے نزدیک سورج غروب ہو گیا ان کے لئے افطار کرنا جائز ہے اور جن کے نزدیک غروب نہیں ہوا ان کے لئے جائز نہیں۔ مطالع کے اعتبار پر اور دلیل یہ ہے:

"عن کریب ان ام الفضل بعثتہ الی معاویۃ بالشام فقال فقدمت الشام وقضیت حاجتھا واستھل علی شھر رمضان وانا بالشام فرأیت الھلال لیلۃ الجمعۃ ثم قدمت المدینۃ فی آخر الشھر فسألنی عبد اللہ بن عباس ثم ذکر الھلال فقال متی رأیتم الھلال فقلت رأیناہ لیلۃ الجمعۃ فقال انت رأیتہ فقلت نعم وراہ الناس وصاموا وصام معاویۃ فقال لکنا رأیناہ لیلۃ

السبت فلا نزال نصوم حتی نکمل ثلاثین او نراہ فقلت اولا تکتفی برؤیة معاویة وصیامه فقال لا هکذا امرنا رسول الله ﷺ"

(قال فی المنتقی رواہ الجماعة الا البخاری وابن ماجه)

حضرت کریب کہتے ہیں کہ بیشک ام الفضل رضی اللہ عنہا نے مجھے شام میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا میں شام کو آ گیا ان کے کام سے فارغ ہوا رمضان کا چاند میں نے وہاں ہی پا لیا جب کہ میں شام میں ہی تھا۔ میں نے چاند جمعہ کی رات کو دیکھا پھر میں مدینہ طیبہ میں مہینہ کے آخر میں آ گیا تو مجھ سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے سوال کیا (یعنی تم کہاں گئے تھے، کیوں گئے تھے وغیرہا) پھر چاند کا ذکر آ گیا تو آپ نے فرمایا تم نے کب چاند دیکھا تھا؟ تو میں نے کہا ہم نے جمعہ کی رات کو چاند دیکھا تھا تو آپ نے کہا کیا تم نے بھی دیکھا تھا تو میں نے کہا ہاں (یعنی میں نے دیکھا) اور لوگوں نے بھی دیکھا اور انہوں نے روزہ رکھا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی روزہ رکھا۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا لیکن ہم نے تو ہفتہ کی رات کو دیکھا ہم روزے رکھیں گے چاند نظر آ گیا (انتیس کو) تو بہتر ورنہ ہم تیس دن مکمل کریں گے۔ تو میں نے کہا کیا آپ کو حضرت معاویہ کا چاند دیکھنا اور روزہ رکھنا کافی نہیں؟ (کہ آپ اس کا اعتبار کر کے ایک دن روزہ قضاء کرنے کا حکم دیں) آپ نے کہا نہیں یعنی وہ رؤیت کافی نہیں اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ (از تبیین الحقائق للزیلعی)

تنبیہ : آج کل شام کا علاقہ محدود ہے جب کہ پہلے وسیع تھا شام میں ہی فلسطین، بعلبک، حلب، طرابلس، انطاکیہ، دمشق اور طرطوس تھے۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ زمین گول ہے اس کا چوتھائی حصہ آبادی ہے مغرب اور مشرق کے درمیان خط استواء کے ساتھ اقلیم اول ہے اسی میں مکہ مکرمہ ہے اور اس کے ساتھ شمالی جانب اقلیم دوم ہے اسی کے وسط میں مدینہ طیبہ ہے اس دوسری اقلیم کا سب سے بڑا دن پونے چودہ گھنٹے کا ہے۔ اور پہلے جو علاقہ شام کا تھا اس کے بعض شہر تیسری اقلیم میں آتے ہیں جو دوسری اقلیم کے شمال میں واقع ہے اس میں واقع شہروں کا سب سے بڑا دن ساڑھے چودہ گھنٹہ کا ہے۔ اور پہلے جو علاقہ شام کا تھا اس کے بعض علاقے چوتھی اقلیم میں آتے ہیں جو تیسری اقلیم کے شمال میں واقع ہے ان علاقوں میں سب سے بڑا دن پونے پندرہ گھنٹے کا ہے۔ (از غیاث اللغات)

اسی سے واضح ہوا کہ شام کا وسیع علاقہ جو پہلے تھا اس کے بعض شہروں اور مدینہ طیبہ میں پینتالیس منٹ کا فرق تھا اور بعض میں ایک گھنٹہ کا اسی وجہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے شام کے علاقہ میں دیکھے جانے والے چاند کا مدینہ طیبہ میں اعتبار نہیں کیا وجہ اس کی وہی ہے جو ذکر کر دی گئی کہ ہر علاقہ کا مطلع (مقام طلوع چاند) علیحدہ علیحدہ ہے اگر وقت کا اتنا فرق ہو کہ ایک جگہ دکھائے دینے والا چاند اسی وقت دوسری جگہ نہیں دکھائی دے سکتا تو یقیناً ایک جگہ چاند دیکھنے سے دوسری جگہ اس کا حکم جاری نہیں ہوگا۔

امید ہے کہ اس بحث کے بعد انصاف کی نظر سے دیکھنے والے یہ رٹ لگانا چھوڑ دیں گے کہ سعودیہ میں جس دن روزہ ہو اسی دن پاکستان میں بھی روزہ ہو اور جس دن سعودیہ میں عید ہو اسی دن پاکستان میں بھی عید ہو۔ جب سعودیہ اور پاکستان کے اوقات میں دو گھنٹہ کا فرق ہے نمازوں کے اوقات مختلف ہیں تو روزہ اور عید ان کے ساتھ رکھنے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟

وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ :

''اور جو شخص مریض ہو یا سفر میں ہو تو وہ اتنے ہی اور دنوں میں (روزہ رکھے) اس سے پہلی آیۃ میں مریض اور مسافر کا ذکر تفصیلی طور پر بیان کیا جا چکا ہے البتہ اللہ تعالیٰ نے دوبارہ ان الفاظ مبارکہ کا ذکر کیا ہے اس کی دو وجہ ہیں۔ ایک وجہ یہ ہے کہ پہلے ذکر فرمایا ﴿ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ﴾ تو جو شخص حاضر ہو تم میں سے اس مہینہ میں تو اس کے روزے رکھے۔ چونکہ مسافر اور مریض بھی رمضان کے مہینہ کو پا لیتے ہیں اس لئے بظاہر یہ سمجھ آ رہا ہے کہ شائد ان پر بھی روزے فرض ہوں گے تو ان الفاظ مبارکہ سے مریض اور مسافر کو خاص کیا کہ ان کے لئے روزہ افطار کرنا جائز ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ پہلے ذکر ہوا ﴿ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ ﴾ جب ان الفاظ مبارکہ کا یہ مفہوم ہو کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں وہ فدیہ دے دیں۔ یعنی ایک قول کے مطابق ابتداء اسلام میں روزہ رکھنے کی طاقت کے باوجود فدیہ دینا جائز تھا لیکن بعد میں اسے منسوخ کر دیا گیا۔ اس لحاظ پر مسافر اور مریض کا حکم دوبارہ ذکر کر کے واضح کر دیا کہ ان کے حق میں جو حکم ثابت ہے وہ محکم ہے اسے منسوخ نہیں کیا گیا ہے۔

یہاں سے تین چیزیں ثابت ہوگئیں ایک یہ کہ جو شخص حالت اسلام اور بلوغ میں رمضان کو پا

لے اس پر روزے فرض ہیں۔ دوسرا یہ ثابت ہوا کہ مسافر اور مریض کے لئے رخصت ہے کہ وہ روزے نہ رکھیں تاہم یہ حکم ان کے لئے واجب نہیں۔ تیسری چیز یہ ثابت ہوئی کہ مریض کے صحت یاب ہونے پر اور مسافر کے مقیم ہونے پر ان پر روزے کی قضاء کرنا لازم ہے۔ (بیضاوی، خفاجی، شیخ زادہ)

یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ :

''ارادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ تم پر آسانی کا اور نہیں ارادہ کرتا تم پر مشکل کا'' لغایة رأفته وسعة رحمته'' یعنی اللہ تعالیٰ اپنی بہت بڑی مہربانی اور وسعت رحمت کی وجہ سے تم پر آسانی کا ارادہ کرتا ہے اور تم پر مشکل کا ارادہ نہیں فرماتا۔ (ابوالسعود) اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مریض اور مسافر کو افطار کی اجازت دی کہ وہ حالت مرض اور سفر میں روزہ نہ رکھیں بلکہ صحت اور اقامت میں قضاء کرلیں۔ (بیضاوی)

☆ "اخرج احمد عن الاعرج انه سمع النبی ﷺ یقول ان خیر دینکم ایسره ان خیر دینکم ایسره" (درمنثور)

حضرت اعرج فرماتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا بیشک تمہارے دین میں بہتر وہ ہے جو آسان ہے یہ الفاظ آپ نے دو مرتبہ دہرائے۔ کیونکہ خود نبی کریم ﷺ جو کام دین کے مطابق ہوتا مخالف نہ ہوتا لیکن آسان ہوتا اسی کو اختیار فرماتے ہاں اگر آسانی شریعت کے خلاف کام میں ہوتی تو آپ اس سے دور بھاگتے۔

☆ "واخرج البزار عن انس ان رسول الله ﷺ قال یسروا ولا تعسروا وسکنوا ولا تنفروا" (در منثور)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آسانی پیدا کرو مشکل نہ پیدا کرو اور تسلی دو اور نفرت نہ پیدا کرو۔

☆ "واخرج احمد عن انس قال قال رسول الله ﷺ ان هذا الدین متین فاوغلوا فیه برفق" (در منثور)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک یہ دین پختہ دین ہے اس میں نرمی سے جدوجہد کرو۔

☆ "واخرج الطبرانی والبیهقی عن سهل بن ابی امامة بن سهل بن حنیف عن ابیه عن جده ان رسول الله ﷺ قال لا تشددوا علی انفسکم فانما هلک من کان قبلکم

بتشدیدهم علی انفسهم وستجدون بقایاهم فی الصوامع والدیارات " (درمنشور)

سہل بن ابی امامۃ اپنے باپ، دادا سے روایت کرتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اپنے نفسوں پر سختی نہ کرو بیشک تم سے پہلے لوگ اپنے نفسوں پر سختی کی وجہ سے ہی ہلاک ہو چکے ہیں اور عنقریب تم ان کے بقایا (آثارونشانات) کو گرجا اور دیر کے مقامات پر پاؤ گے۔

☆ " واخرج البیهقی عن ابن عمر ان رسول الله ﷺ قال ان الله یحب ان تؤتی رخصته کما یحب ان تؤتی عزائمه " (درمنشور)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے کہ رخصت پر عمل کیا جائے جس طرح پسند کرتا ہے کہ عزیمت پر عمل کیا جائے۔

☆ " واخرج احمد والبزار وابن خزیمة وابن حبان والطبرانی فی الاوسط والبیهقی عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ ان الله یحب ان تؤتی رخصة کما لا یحب ان تؤتی معصیة " (درمنشور)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے کہ اس کی طرف دی گئی رخصت پر عمل کیا جائے یہ نہیں پسند فرماتا کہ معصیت پر عمل کیا جائے۔

☆ " واخرج الطبرانی عن عبد الله بن یزید بن ادیم قال حدثنی ابو الدرداء وواثلة بن الاسقع وابو امامة وانس بن مالک ان رسول الله ﷺ قال ان الله یحب ان تقبل رخصة کما یحب العبد مغفرة ربه " (درمنشور)

بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے کہ رخصت کو قبول کیا جائے جس طرح بندہ پسند کرتا ہے کہ رب تعالیٰ اس کی مغفرت کر دے۔

☆ " واخرج الحکیم الترمذی فی نوادر الاصول عن الحسن قال ان دین الله وضع دون الغلو وفوق التقصیر " (درمنشور)

حضرت حسن (بصری) فرماتے ہیں بیشک اللہ تعالیٰ کے دین میں میانہ روی ہے نہ ہی اس میں غلو ہے اور نہ ہی اس میں کوتاہی ہے کمی سے اوپر اور غلو سے نیچے وسط درجہ میں ہے۔

وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ : ''اور مکمل کرو تم گنتی''

گنتی کے مکمل کرنے کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ سفر کے دوران یا مرض کی حالت میں جو روزے تمہارے رہ گئے ہیں ان کو قضاء کرتے وقت ان کی گنتی مکمل کرو ان میں کمی نہ ہو۔

اور دوسرا مطلب ہے کہ چاند دیکھو اگر انتیس کا چاند نظر آ جائے تو بہتر ورنہ تیس دن مکمل کرو۔ (قرطبی)

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے دوسرے قول کو ہی ترجیح دی ہے اسی کے مطابق درمنشور میں احادیث نقل کی ہیں۔

☆ " اخرج ابن ابی حاتم عن الربیع فی قولہ ﴿ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ ﴾ قال عدۃ رمضان " (درمنشور)

ربیع کہتے ہیں رب تعالیٰ کے ارشاد ﴿ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ رمضان کی گنتی مکمل کرو

☆ واخرج ابو داؤد والنسائی وابن المنذر والدار قطنی فی سنه عن حذیفة قا ل قال رسول الله ﷺ لا تقدموا الشهر حتی تروا الهلال او تکملوا العدة ثلاثین ثم صوموا حتی تروا الهلال او تکملوا العدة ثلاثین " (درمنشور)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مہینہ کو مقدم نہ کرو یہاں تک کہ چاند دیکھ لو یا تیس دن مکمل کر لو۔ پھر روزہ رکھو یہاں تک کہ چاند دیکھ لو یا تیس دن مکمل کر لو۔

☆ " واخرج ابو داؤد والترمذی والنسائی عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ لاتقدموا الشهر بصیام یوم ولا یومین الا ان یکون شئی یصومه احدکم ولا تصوموا حتی تروه ثم صوموا حتی تروه فان حال دونه غمام فاتموا العدة ثلاثین ثم افطروا " (درمنشور)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (رمضان کے) مہینہ کو ایک یا دو دن پہلے روزہ رکھ کر مقدم نہ کرو ہاں مگر یہ کہ کوئی شخص اس دن روزہ رکھتا ہو روزہ نہ رکھو یہاں تک کہ چاند دیکھ لو پھر روزہ رکھو یہاں تک کہ چاند دیکھ لو اگر موسم ابر آلود ہو جائے تو تیس دن مکمل کرو پھر افطار کرو۔

☆ " واخرج الدار قطنی عن رافع بن خدیج قال قال رسول الله ﷺ احصوا عدة شعبان لرمضان ولا تقدموا الشهر بصوم فاذا رایتموہ فصوموا واذا رایتموہ فافطروا فان غم علیکم فاکملوا العدة ثلاثین یوما ثم افطروا فان الشهر هکذا وهکذا وهکذا او هکذا وهکذا وهکذا وحبس ابهامه فی الثالثة " (درمنشور)

رافع بن خدیج کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شعبان کے دن رمضان کے لئے شمار کرو

(رمضان کے) مہینہ کو روزہ رکھ کر مقدم نہ کرو جب تم دیکھو تو روزہ رکھو اور جب تم دیکھو تو افطار کرو اگر تم پر بادل چھا جائیں تو تیس دن مکمل کرو پھر افطار کرو بیشک مہینہ اس طرح اور اس طرح اور اس طرح ہے (آپ نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے اشارہ کر کے بتایا تین مرتبہ دس دس انگلیوں سے اشارہ کر کے بتایا کہ مہینہ تیس دنوں کا ہے) اور یا مہینہ اس طرح ہے اور اس طرح ہے اور اس طرح ہے تیسری مرتبہ آپ نے ایک انگوٹھے کو بند کر لیا (یعنی دو مرتبہ دس دس انگلیوں سے اشارہ کیا اور تیسری مرتبہ نو انگلیوں سے اشارہ کیا بتایا کہ یا مہینہ انتیس دنوں کا ہوتا ہے)۔

☆ " واخرج الدار قطنی عن عبد الرحمن بن زید بن الخطاب قال انا صحبنا اصحاب النبی ﷺ وانهم حدثونا ان النبی ﷺ قال صوموا لرؤیته وافطروا لرؤیته فان اغمی علیکم فعدوا ثلاثین فان شهد ذو عدل فصوموا وافطروا ونسکوا " (درمنثور)

عبدالرحمٰن بن زید بن خطاب کہتے ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کے صحابہ کی مصاحبت میں تھے انہوں نے ہمیں بتایا کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور دیکھ کر افطار کرو اگر تم پر بادل چھا جائیں تو تیس دن مکمل کرو اگر عادل شخص گواہی دے دیں تو روزہ رکھو اور افطار کرو اور قربانی کرو (شہادت کا ذکر پہلے تفصیلی طور پر بیان ہو چکا ہے)۔

☆ "واخرج الدار قطنی عن ابی مسعود الانصاری ان النبی ﷺ اصبح صائما لتمام الثلاثین من رمضان فجاء اعرابیان فشهد ان لا اله الا الله وانهما اهلا بالامس فامرهم فافطروا" (درمنثور)

حضرت ابو مسعود انصاری فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے رمضان کے تیس دن مکمل کرنے کی غرض سے صبح روزہ رکھا تھا دو اعرابی آئے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی شہادت دی پھر بتایا کہ ہم نے کل چاند دیکھا تھا تو آپ نے لوگوں کو حکم دیا کہ روزہ افطار کر لو۔

☆ " واخرج ابن جریر عن الضحاک فی قوله ولتکملوا العدة قال عدة ما فطر المریض والمسافر" (درمنثور)

ضحاک کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ مریض اور مسافر ہونے کی حالت میں جو روزے تم افطار کرو وہ مکمل کرو۔

وَلِتُكَبِّرُوا اللهَ عَلٰى مَا هَدَاكُمْ : "اورتم بڑائی بیان کرواللہ کی اس پر جو ہدایت دی اس نے تمہیں"

وَلِتُكَبِّرُوا اللهَ سے مراد تکبیر: یعنی ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ فطر کی رات تکبیر پڑھو۔

☆ " قال ابن عباس حق على المسلمين اذا رأوا هلال شوال ان يكبروا "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں مسلمانوں پر یہ حق ہے کہ وہ جب شوال کا چاند دیکھیں تو تکبیر پڑھیں۔ (کبیر)

☆ " اخرج ابن المنذر وابن ابي حاتم والمروزي في كتاب العيدين عن زيد بن اسلم في قوله ﴿ وَلِتُكَبِّرُوا اللهَ عَلٰى مَا هَدَاكُمْ ﴾ قال لتكبروا يوم الفطر " (درمنثور)

حضرت زید بن اسلم فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللهَ عَلٰى مَا هَدَاكُمْ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ فطر کے دن تکبیر پڑھو۔

☆ " واخرج الطبراني في المعجم الصغير عن انس قال قال رسول الله ﷺ زينوا اعيادكم بالتكبير " (درمنثور)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اپنی عیدوں کو تکبیر کے ذریعے مزین کرو۔

☆ " واخرج المروزي والدار قطني والبيهقي في السنن عن ابي عبد الرحمن السلمي قال كانوا في الفطر اشد منهم في الاضحى يعني في التكبير " (درمنثور)

ابوعبدالرحمٰن سلمی فرماتے ہیں صحابہ کرام بنسبت اضحیٰ کے فطر میں زیادہ تکبیر کا اہتمام کرتے تھے یعنی تکبیر کہنے میں۔

کون سی تکبیر پڑھی جائے؟ زیادہ طور پر تو یہی قول ہے اہل علم کا کہ جو عید الاضحیٰ اور ایام تشریق میں تکبیر پڑھی جاتی ہے وہی تکبیر پڑھی جائے تاہم کچھ مختلف الفاظ بھی ملتے ہیں۔

☆ " واخرج سعيد بن منصور وابن ابي شيبه والمروزي عن ابن مسعود انه كان يكبر الله اكبر الله اكبر لا اله الا الله والله اكبر ولله الحمد " (درمنثور)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ یہ تکبیر پڑھتے تھے " الله اكبر الله اكبر لا اله الا الله والله

اکبر وللہ الحمد "

☆ واخرج ابن ابی شیبة والمروزی والبیھقی فی سننه عن ابن عباس انه کان یکبر اللہ اکبر کبیرا اللہ اکبر کبیرا اللہ اکبر وللہ الحمد واجل اللہ اکبر علی ما ھدانا "

(درمنثور)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ یہ تکبیر پڑھتے تھے اللہ اکبر کبیرا اللہ اکبر کبیرا اللہ اکبر وللہ الحمد واجل اللہ اکبر علی ما ھدانا "

☆ " واخرج البیھقی عن ابی عثمان النھدی قال کان عثمان یعلمنا التکبیر اللہ اکبر اللہ اکبر کبیرا اللھم انت اعلی واجل من ان یکون لک صاحبة او یکون لک ولد او یکون لک شریک فی الملک او یکون لک ولی من الذل و کبرہ تکبیرا اللھم اغفرلنا اللھم ارحمنا " (درمنثور)

ابوعثمان نہدی کہتے ہیں حضرت عثمان (ذوالنورین) رضی اللہ عنہ ہمیں یہ تکبیر سکھاتے تھے۔

" اللہ اکبر اللہ اکبر کبیرا اللھم انت اعلی واجل من ان یکون لک صاحبة او یکون لک ولدا او یکون لک شریک فی الملک او یکون لک ولی من الذل و کبرہ تکبیرا اللھم اغفرلنا اللھم ارحمنا "

کیسے تکبیر کہے؟ امام شافعی رحمہ اللہ اور صاحبین (امام ابو یوسف اور امام محمد رحمھما اللہ) کے نزدیک بلند آواز سے تکبیر کہنا مستحب ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک آہستہ آواز سے تکبیر کہنا مستحب ہے۔

تکبیر کب کہے: شوال کا چاند جب نظر آجائے تو رات کو تکبیر پڑھے اور صبح بھی تکبیر پڑھے۔

(از کتب فقه)

تکبیر کیوں کہے؟ اس لئے کہ پہلے ذکر فرمایا کہ جو شخص رمضان کے مہینہ میں حاضر ہو یعنی مسلمان اور بالغ ہونے کی حالت میں رمضان کو پالے وہ روزے رکھے پھر مسافر اور مریض کو افطار کرنے کی رخصت دی پھر ان کو قضاء کرنے کا حکم دیا پھر ارشاد فرمایا ﴿ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ ﴾ علة الامر بمراعاة العدة " گنتی پوری کرو اس میں تعداد کی رعایت کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر تعداد کی رعایت میں وہی دوصورتیں ہیں جن کا پہلے ذکر کر دیا گیا ہے یعنی رمضان کی گنتی مکمل کر و یا جو روزے سفر اور مرض کی

حالت میں تم سے قضاء ہو گئے تھے ان کی گنتی پوری کرو۔ پھر فرمایا:

﴿ ولتکبروا اللہ ﴾ علة ما علم من كيفية القضاء والخروج عن عهدة الفطر "

یعنی جب تمہیں قضاء کی کیفیت اور فطر کی ذمہ داری سے نکلنے کا علم عطا کیا گیا ہے تو تمہیں چاہئے کہ جس ذات نے تمہیں علم عطا کیا ہے اس کی بڑائی بیان کرو۔ (از مدارک، وکبیر)

﴿ ولتکبروا اللہ ﴾ بمشاهدته بعد استكما لها ليلة العيد وفجرها شكرا"

اللہ تعالیٰ نے جب تمہیں روزے مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے تو تم چاند دیکھ کر رات کو اور فجر کو بھی اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو تا کہ تم اپنی وسعت کے مطابق کچھ نہ کچھ شکر ادا کر سکو اگر چہ حقیقی طور پر شکر ادا کرنے سے انسان قاصر ہے۔ (از تبصیر الرحمٰن)

وَلِتُكَبِّرُوا اللهَ بمعنی تعظیم باری تعالیٰ:

" ان المراد منه التعظيم لله شكرا على وفق هذه الطاعة "

اللہ کی بڑائی بیان کرو یعنی اللہ تعالیٰ کی عظمت بیان کرو اس کی تعظیم بجالاؤ، کیونکہ جب اس منعم ذات نے تمہیں اس طاعت کی توفیق عطا فرمائی ہے تو تم پر بھی اس کا شکر کرنا ضروری ہے۔ (از کبیر)

خیال رہے کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ایسا خوب ہے کہ علامہ رازی رحمہ اللہ کے دونوں معانی کو حاوی ہے (اور اللہ کی بڑائی بولو) اس کا مطلب خواہ یہ لیں کہ اللہ کی تکبیر کہو یا یہ مطلب لیں کہ اللہ کی تعظیم بجالاؤ دونوں معانی ہی درست ہیں۔ راقم نے بھی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو ہی معمولی تبدیلی سے نقل کیا ہے (اور تم بڑائی بیان کرو اللہ کی)۔

اللہ کی بڑائی میں تین چیزیں پائی جائیں:

" واعلم ان تمام هذا التكبير انما يكون بالقول والاعتقاد والعمل "

یہ جاننا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بڑائی اس وقت مکمل ہو گی اور صحیح معتبر ہو گی جب زبان سے بھی اس کی بڑائی بیان کی جائے اور عقیدہ بھی اس کی بڑائی کا ہو اور عمل بھی اس کے مطابق ہو۔

قول سے بڑائی بیان کرنا:

" اما القول فالاقرار بصفاته العلی واسمائه الحسنی وتنزیهه عما لایلیق به من ند وصاحبة وولد وشبه بالخلق "

زبان سے اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی بلند صفات کا اقرار کرے اور اس کے اسماء حسنیٰ (اچھے ناموں) کا ذکر کرے اور اللہ تعالیٰ کی شریکوں سے اور زوجہ سے اور اولاد اور مخلوق کی مشابہت سے پاکیزگی بیان کرے۔

بڑائی کا اعتقاد رکھنا: " وکل ذلک لا یصح الا بعد صحة الاعتقاد بالقلب "

جن چیزوں کا قول میں ذکر کیا ہے ان تمام کا عقیدہ رکھنا کیونکہ جب دل سے اعتقاد صحیح ہوگا تب ہی ان کا اقرار بھی کیا جائے گا۔

عمل سے بڑائی بیان کرنا: " واما العمل فالتعبد بالطاعات من الصلوة والصیام والحج "

لیکن عمل سے رب تعالیٰ کی بڑائی بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اس کی فرمانبرداری کرے یعنی نماز ادا کرے اور روزے رکھے اور حج ادا کرے اور زکواۃ ادا کرے۔ غرضیکہ تمام عبادات کو بجالانا اور تمام ممنوعات سے بچ جانا اور زبان سے رب تعالیٰ کی عظمت بیان کرنا اور رب تعالیٰ کی عظمت کا اعتقاد رکھنا اور تکبیرات کا پڑھنا یہ تمام چیزیں ﴿ ولتکبروا اللہ ﴾ میں آجاتی ہیں۔

عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ : لفظ "ما" میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ "ما" موصولہ ہو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا:

" علی الذی ارشدکم الیه مما تکسبوا به مرضات ربکم وفراغ ذمتکم وجزیل المثوبة "

(اور تم بڑائی بیان کرو اللہ کی) اس پر جو ہدایت دی اس نے تمہیں جس کے ذریعے تم رب تعالیٰ کی رضاء مندی حاصل کرتے ہو اور اپنی ذمہ داریوں سے فراغت حاصل کرتے ہو اور زیادہ ثواب حاصل کرتے ہو۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ "ما" مصدریہ ہو اس صورت میں معنی یہ ہوگا " علی ارشادکم " اور تم بڑائی بیان کرو اس کی راہنمائی پر۔ (از مظہری)

خیال رہے کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ''ما'' موصولہ کے مطابق ہے راقم نے بھی اسی کو آسان سمجھ کر نقل کر دیا ہے تاہم طلباء کرام ''ما'' مصدریہ کے مطابق بھی ترجمہ ذہن نشین کر لیں۔

ہدایت دینے کا مطلب کیا؟ اگر معنی یہ کیا جائے کہ اس نے ''طاعت کی تخلیق کر کے تمہیں ہدایت دی'' تو یہ معنی وسیع تر ہوگا جو تمام معانی کو شامل ہوگا تاہم اسے یوں بیان کرنا بھی مناسب ہوگا کہ اس نے تمہیں دنیا میں عظیم انعامات عطا کر کے اور دلائل عطا کر کے اور چیزوں کی پہچان کرا کے اور تمہیں نیکیوں کی توفیق عطا کر کے اور گناہوں سے بچا کر ہدایت عطا کی۔ (از کبیر بتصرف)

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ : ''اور تا کہ تم شکر کرو''

ان الفاظ مبارکہ کا اس مقام پر ذکر کرنے کا یہ فائدہ ہے کہ انسان کو جب رب تعالیٰ نے یہ حکم دیا کہ ''تم اللہ کی بڑائی بیان کرو'' تو یہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک بندہ اللہ تعالیٰ کے جلال اور اس کی کبریائی اور اس کی عزت اور اس کی عظمت کو نہ جان لے اور بندے کو یہ علم حاصل ہو:

'' ان الله اکبر من ان تصل الیہ عقول العقلاء واوصاف الواصفین وذکر الذاکرین ''

کہ بیشک اللہ تعالیٰ بہت بڑا ہے اس تک بڑے بڑے عقلمندوں کی عقلوں کی رسائی نہیں اور اس کے اوصاف بیان کرنے والے اس سے قاصر ہیں کہ اس کے اوصاف کما حقہ بیان کر سکیں اور اس کا ذکر کرنے والے اس کے ذکر سے قاصر ہیں:

'' ثم یعلم انه سبحانه مع جلاله وعزته واستغنائه عن جمیع المخلوقات فضلا عن هذا المسکین خصه الله بهذه الهدایة العظیمة ''

پھر بندے کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے جلال اور عظمت کی وجہ سے تمام مخلوق سے مستغنی ہے چہ جائیکہ اس مسکین کو اللہ تعالیٰ نے جو اس ہدایت عظیمہ سے خاص کیا ہے اس سے مستغنی نہ ہو ایسا ممکن نہیں جب انسان کو یہ علم حاصل ہوگا تو وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے میں مشغول ہوگا اور اپنی طاقت اور وسعت کے مطابق رب تعالیٰ کا شکر کرے گا۔ اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ ''اور تا کہ تم شکر کرو'' (از کبیر) اور مطلب یہ ہے:

'' ولکی تشکروا علی وجوب الصوم فانه وسیلة لنیل الدرجات وعلی

اباحة الفطر للمریض والمسافر فان فیه تخفیفا ورخصة "(مظہری)

اور تا کہ تم روزے کے وجوب پر شکر ادا کرو کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر روزے فرض کئے ہیں کیونکہ روزہ رکھنا درجات کی بلندی کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور تم مریض اور مسافر کی تخفیف اور رخصت کی وجہ سے روزہ کے افطار کرنے کی اجازت کا شکریہ ادا کرو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے آسانی پیدا کر دی۔ شکر کرنے کا اور فائدہ یہ ہوگا:

﴿ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ هذا التخفیف فیجبرا لشكر ما نقصر من تلك الایام بالاجر"

کہ تم اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہونے والی تخفیف کا شکر ادا کرو تا کہ شکر کی وجہ سے بظاہر رمضان کی فضیلت جو حاصل نہ ہو سکی وہ کمی پوری ہو جائے اور اجر کی تکمیل ہو جائے۔ (تیسیر الرحمٰن)

نفلی روزہ کے متعلق احادیث مبارکہ:

"عن عائشة قالت كان رسول الله ﷺ یصوم حتی نقول لا یفطر ویفطر حتی نقول لا یصوم وما رأیت رسول الله ﷺ استكمل صیام شهر قط الا رمضان وما رأیته فی شهر اكثر منه صیاما فی شعبان وفی روایة قالت كان یصوم شعبان كله وكان یصوم شعبان الا قلیلا" (بخاری ومسلم، مشكوة باب صیام التطوع)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ روزے رکھتے تھے تو ہم کہتے آپ افطار نہیں کریں گے۔ اور آپ افطار کرتے تو ہم کہتے آپ روزہ نہیں رکھیں گے اور میں نے رسول اللہ ﷺ کو نہیں دیکھا کہ آپ نے کسی مہینے کے مکمل روزے رکھے ہوں سوائے رمضان کے اور میں نے آپ کو نہیں دیکھا کہ آپ نے شعبان کے مہینے سے زیادہ کسی اور مہینے میں روزے رکھے ہوں۔ اور ایک روایت میں ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں حضور ﷺ شعبان کا کل مہینہ روزہ رکھتے تھے اور شعبان کے روزے رکھتے تھے سوائے تھوڑوں کے۔

وضاحت حدیث: نبی کریم ﷺ رمضان کے روزے مکمل رکھتے تھے لیکن نفلی روزے کبھی چاہا تو کسی دن لگا تار رکھ لئے اور کبھی چاہا تو کئی دن افطار کر لئے۔ جب آپ کئی دن لگا تار روزہ رکھتے تو

سمجھ یہ آتا کہ آپ افطار نہیں کریں گے اور جب کئی دن روزہ نہ رکھتے تو سمجھ یہ آتا کہ آپ روزہ نہیں رکھیں گے۔ رمضان کے بغیر کسی اور مہینہ میں اگر آپ زیادہ روزے رکھتے تھے تو وہ شعبان کا مہینہ ہوتا۔

ہاں البتہ بظاہر اس پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے مطابق تو یہ سمجھ آتا ہے کہ آپ شعبان کا مہینہ مکمل ہی روزہ رکھتے۔ اور دوسری روایت سے پتہ چلتا ہے کہ آپ شعبان کے مہینہ کے اکثر دن روزہ رکھتے ان دونوں میں تعارض نظر آتا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے:

" وقيل المراد انه يصومه كله فى سنة واكثره فى سنة اخرى فالمعنى على العطف وهو اقرب لظاهر اللفظ "

کہ آپ ایک سال شعبان کا مکمل مہینہ روزہ رکھتے اور دوسرے سال شعبان کے اکثر دن روزہ رکھتے یہ معنی بظاہر الفاظ کے مطابق ہے جس میں عطف کا لحاظ کیا گیا ہے۔ البتہ اس توجیہ کے مطابق حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اس ارشاد ''کہ آپ نے مکمل مہینہ صرف رمضان کے روزے رکھے'' کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمیشہ ہر سال مکمل مہینے کے روزے صرف رمضان کے رکھے البتہ شعبان کے کبھی مکمل مہینہ روزے رکھے اور کبھی شعبان کے زیادہ دنوں کے روزے رکھے۔ (از مرقاۃ)

☆ " عن عبد الله بن شقيق قال قلت لعائشة اكان النبى ﷺ يصوم شهرا كان قالت ما علمته صام شهرا كله الا رمضان ولا افطره كله حتى يصوم منه حتى مضى لسبيله "

(رواه مسلم، مشكوة باب صيام التطوع)

عبداللہ بن شقیق کہتے ہیں میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا۔ کیا نبی کریم ﷺ تمام مہینہ روزہ رکھتے تھے تو انہوں نے جواب دیا کہ مجھے علم نہیں کہ حضور ﷺ نے تمام مہینہ روزے رکھے ہوں سوائے رمضان کے اور نہ ہی آپ نے تمام مہینہ افطار کیا یہاں تک کہ آپ روزہ رکھتے آپ کا یہی عمل رہا یہاں تک کہ آپ دنیا سے تشریف لے گئے۔

وضاحت حدیث: اس حدیث پاک کا یہی مطلب ہے کہ باقاعدگی سے ہمیشہ تو آپ نے صرف رمضان کے روزے ہی رکھے البتہ شعبان کے کبھی مکمل مہینہ کے روزے رکھے اور کبھی شعبان کے زیادہ دن روزے رکھے۔ یہ مطلب پچھلی حدیث سے ثابت ہوا۔ اور آپ نے کسی مہینہ کے مکمل دن افطار بھی نہیں کیا بلکہ ہر مہینہ کے ایام بیض یعنی ہر چاند کی تیرہ چودہ اور پندرہ تاریخ کو آپ نے روزے رکھے۔ از مرقاۃ)

☆ " وعن ابن عباس قال حین صام رسول الله ﷺ یوم عاشوراء وامر بصیامه قالوا یارسول الله ﷺ انه یوم یعظمه الیهود والنصاری فقال رسول الله ﷺ لئن بقیت الی قابل لاصو من التاسع " (رواه مسلم مشکوۃ باب صیام التطوع)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جب رسول اللہ ﷺ نے عاشورہ (دس محرم) کے دن روزہ رکھا اور اس دن روزہ رکھنے کا حکم دیا صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ اس دن کی یہود اور نصاریٰ تعظیم کرتے ہیں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر میں آنے والے سال تک باقی رہا تو نو محرم کو بھی روزہ رکھوں گا۔

وضاحت حدیث: نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام جب مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو دیکھا کہ یہود عاشورہ کے دن روزہ رکھتے ہیں آپ نے ان سے پوچھا کہ تم اس دن کیوں روزہ رکھتے ہو؟ تو انہوں نے کہا:

" هذا یوم نعظمه اظفر الله فیه موسی علیه الصلوۃ والسلام وبنی اسرائیل علی فرعون "

ہم اس دن کی تعظیم اس لئے کرتے ہیں کہ اس دن موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے فرعون پر کامیاب کیا یعنی ان کو فرعون اور قبطیوں سے نجات دی۔" فقال النبی ﷺ نحن اولی بموسی " تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ہم زیادہ حق رکھتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی موافقت کریں آپ نے خود بھی روزہ رکھا اور صحابہ کرام کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ شروع شروع میں عاشوراء کا روزہ فرض رہا پھر اس کی فرضیت کو منسوخ کر دیا اور استحباب باقی رہا۔

یہ سلسلہ دس ہجری تک چلتا رہا۔ ہجرت کے دسویں سال صحابہ کرام نے عرض کیا" اذ تجب مخالفتهم فکیف نوافقهم علی تعظیمه " کہ جب یہود و نصاریٰ کی مخالفت کا حکم ہے تو ہم عاشوراء کے دن کی تعظیم کر کے ان کی موافقت کیوں کر رہے ہیں۔ صحابہ کرام نے ظاہر کا خیال کیا کہ ہمیں یہود کی مخالفت کرنی چاہئے لیکن نبی کریم ﷺ حقیقت کا اعتبار کر رہے تھے کہ اس میں یہود کی موافقت کا لحاظ نہیں بلکہ یہ سمجھا جائے کہ عاشورہ کے دن ہمارا روزہ رکھنا تو صرف موسیٰ علیہ السلام اور ان

کے ساتھ ان کی قوم کو فرعون اور فرعونیوں سے نجات دینے کی وجہ سے ہے لیکن پھر صحابہ کرام کی تسلی کے لئے آپ نے فرمایا کہ اگر میں آئندہ سال رہا تو نو تاریخ کا بھی ہم روزہ رکھیں گے۔ آپ نے دس تاریخ کے روزہ کو ختم نہیں کیا بلکہ نو تاریخ کے روزہ کو ساتھ ملانے کا حکم دیا:

" قال الطیبی لم یعش رسول اللہ ﷺ الی القابل بل توفی فی الثانی عشر من ربیع الاول فصار الیوم التاسع من المحرم سنة وان لم یصمه لانه عزم علی صومه "

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ آنے والے محرم تک ظاہری حیات میں نہ رہے بلکہ ربیع الاول میں ہی آپ کا وصال ہو گیا لیکن پھر بھی نو محرم کا روزہ رکھنا سنت ہے اگر آپ نے نو محرم کا روزہ رکھا تو نہیں لیکن آپ نے روزہ رکھنے کا پختہ ارادہ فرمالیا تھا لہٰذا اس تاریخ کو روزہ رکھنا مسنون ہو گیا۔

مسئلہ واضح ہے کہ صرف عاشورہ کے دن کا روزہ رکھنا مکروہ ہے بلکہ نو محرم کا روزہ ساتھ رکھنا مسنون ہے تاہم کراہیت سے بچنے کے لئے اگر نو تاریخ کو روزہ نہ رکھے بلکہ گیارہ تاریخ کو دس کے ساتھ روزہ رکھ لے تو کافی ہے۔ (از مرقاۃ)

یوم عرفہ کے روزہ کا حکم:

" عن ام الفضل بنت الحارث ان ناسا تماروا عندها یوم عرفة فی صیام رسول اللہ ﷺ فقال بعضهم هو صائم وقال بعضهم لیس بصائم فارسلت الیه بقدح لبن وهو واقد علی بعیره فشربه "

(بخاری ومسلم ،مشکوۃ باب صیام التطوع)

ام الفضل بنت حارث فرماتی ہیں کہ میرے قریب کچھ لوگ عرفہ کے دن (نو ذی الحج) بحث کر رہے تھے نبی کریم ﷺ کے روزہ کے متعلق۔ کچھ حضرات کہہ رہے تھے آپ نے روزہ رکھا ہوا ہے کچھ حضرات کہہ رہے تھے آپ کا روزہ نہیں میں نے ایک پیالہ دودھ کا نبی کریم ﷺ کے پاس بھیجا آپ اپنے اونٹ پر سوار تھے تو آپ نے وہ دودھ پی لیا۔

وضاحت:

یوم عرفہ کے روزہ رکھنے میں اگرچہ کئی اقوال ہیں صحیح قول وہ ہے جو حضرت ابن ہمام رحمہ اللہ کا ہے:

" صوم يوم عرفة لغير الحاج مستحب وللحاج ان كان يضعفه عن الوقوف والدعوات فالمستحب تركه "

یوم عرفہ کو روزہ رکھنا اس شخص کے لئے مستحب ہے جو حاجی نہیں اور حاجی کو روزہ اگر کمزور کردے جس کی وجہ سے اسے مقام عرفات میں ٹھہرنا اور دعائیں کرنا مشکل ہو اور باعث ضعف ہو تو روزہ کو ترک کرنا اس کے لئے مستحب ہے۔

تاہم علامہ نووی رحمہ اللہ نے حاجی کے لئے مطلقاً روزہ رکھنا مکروہ قرار دیا ہے کیونکہ اس دن میں روزہ رکھنے سے نہی آئی ہوئی ہے فقہاء کرام نے زیادہ اسی قول کو پسند کیا ہے۔ (از مرقاۃ)

پیر کے دن روزہ رکھنا مسنون ہے:

" وعن ابی قتادہ قال سئل رسول الله ﷺ عن صوم الاثنین فقال فیه ولدت فیه انزل علی " (رواہ مسلم، مشکوۃ باب صیام التطوع)

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے پیر کے دن روزہ رکھنے کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا اسی دن میری ولادت ہوئی اور اس دن مجھ پر وحی نازل کی گئی۔

وضاحت: سوال کرنے والے نے اس لئے سوال کیا تھا کہ حضور ﷺ اس دن اکثر طور پر روزہ رکھتے تھے تو آپ سے اس دن کی فضیلت کی وجہ پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا کہ یہ دن تمہارے نبی کے دنیا میں موجود ہونے کا دن ہے اور تمہاری کتاب کے نزول کا پہلا دن ہے یعنی حسن ظاہری اور حسن باطنی کے آفتاب کے طلوع ہونے کا دن ہے۔ (از مرقاۃ)

اسی سے واضح ہوا کہ نعمت کے حصول پر خوشی کا اظہار کرنا مسنون ہے۔ خود نبی کریم ﷺ نے اپنا یوم ولادت روزہ رکھ کر منایا۔

شوال کے چھ روزے:

" وعن ابی ایوب الانصاری انه حدثه ان رسول الله ﷺ قال من صام رمضان ثم اتبعه ستامن شوال کان کصیام الدهر "

(روہ مسلم، مشکوۃ باب صیام التطوع)

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے رمضان کے روزے رکھے پھر ان کے پیچھے چھ روزے شوال کے رکھے تو اسے زمانہ بھر کے روزوں کا ثواب مل گیا۔

وضاحت : مراد یہ ہے کہ جس شخص نے ہر سال یہ عمل کیا تو اسے زندگی بھر کے روزوں کا ثواب مل جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ﴾ جس شخص نے ایک نیکی کی اسے دس دنوں کا ثواب حاصل ہوگا۔اس رمضان کے تیس روزوں کا ثواب تین سو دنوں کا ہو گیا اور شوال کے چھ روزوں کا ثواب ساٹھ دنوں کے روزوں کا ثواب حاصل ہو جائے گا۔
اس طرح ایک سال کے روزوں کا ثواب مل گیا۔اسی طرح ہر سال اگر کوئی شخص اس پر عمل کرے گا تو زندگی بھر کے روزوں کا ثواب حاصل ہو جائے گا۔

فائدہ: ابن ماجہ وغیرہ نے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث بیان کی ہے:" **من صام ستة ايام بعد الفطر كأنه صام السنة ثم قال وان فرقها جاز** " جس شخص نے عید الفطر کے بعد شوال کے چھ روزے رکھے گویا کہ اس نے سال کے روزے رکھے پھر انہوں نے فرمایا اگر متفرق طور پر روزے رکھے تو جائز ہے۔خیال رہے بعض حضرات نے عید الفطر کے بعد چھ دن مسلسل روزے رکھنے مستحب بیان کئے ہیں لیکن وہ صرف اسلئے کہ زندگی کا پتہ نہیں نیکی کا کام جتنا جلدی ہو سکے بہتر ہے۔ لیکن اگر شوال کے مہینہ میں چھ روزے مکمل کر لے بیشک علیحدہ علیحدہ روزے رکھے مسلسل نہ رکھے تو ثواب وہی حاصل ہوگا کیونکہ حدیث شریف میں عید الفطر کے متصل اور مسلسل رکھنے کا کوئی حکم نہیں پایا گیا
(از مرقاة)

پیر اور جمعرات کو روزہ رکھنا:

" عن عائشة قال كان رسول الله ﷺ يصوم الاثنين والخميس "
(رواه الترمذی والنسائی)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ پیر اور جمعرات کو روزہ رکھتے تھے۔

" وعن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ تعرض الاعمال يوم الاثنين والخميس فاحب ان يعرض عملی وانا صائم " (رواه الترمذی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اعمال پیر اور جمعرات کو پیش کیے جاتے ہیں تو میں پسند کرتا ہوں میرے عمل پیش کیے جائیں تو میں روزہ دار ہوں۔

(مشکوۃ باب صیام التطوع)

وضاحت: پیر کو روزہ رکھنے کی ایک وجہ پہلے گزر گئی کہ نبی کریم ﷺ کی پیدائش کا دن ہے اور نزول وحی کی ابتداء کا دن ہے اور دوسری وجہ اس حدیث میں ذکر ہوگئی کہ جمعرات اور پیر کو (**تعرض الاعمال**) **ای علی الملک المتعال**" لوگوں کے اعمال اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کیے جاتے ہیں اس لئے آپ روزہ رکھتے تھے تا کہ جب میرے اعمال اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوں تو میں روزہ دار ہوں۔

اس کی وجہ یہ تھی "**طلبا لزیادۃ رفعۃ الدرجۃ**" کہ حضور ﷺ درجات کی بلندی کے لئے نفلی نیک اعمال زیادہ سے زیادہ فرماتے تھے اور مقصود تعلیم امت بھی ہوا کرتا کہ امت کے لوگ بھی نفلی عبادات پر عمل کریں تا کہ ان کے مدارج بھی بلند ہوں۔

ایام بیض کے روزے: ایام بیض چاند کی تیرہ، چودہ اور پندرہ تاریخ کے دنوں کو کہا جاتا ہے

☆ "**وعن ابی ذر قال قال رسول اللہ ﷺ یا اباذر اذا صمت من الشھر ثلاثۃ ایام فصم ثلاث عشرۃ واربع عشرۃ وخمس عشرۃ**"

(رواہ الترمذی والنسائی، مشکوۃ باب صیام التطوع)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے ابوذر جب تم مہینہ میں تین دن روزے رکھو تو تیرہ اور چودہ اور پندرہ تاریخوں کو رکھو۔

جمعہ کے دن روزہ رکھنا: "**عن عبد اللہ بن مسعود قال کان رسول اللہ ﷺ یصوم من غرۃ کل شھر ثلاثۃ ایام وقلما کان یفطر یوم الجمعۃ**"

(رواہ الترمذی والنسائی۔ مشکوۃ باب صیام التطوع)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ ہر مہینہ کی روشن تین راتوں کے دنوں میں روزہ رکھتے تھے اور جمعہ کے دن آپ کم ہی افطار کرتے تھے۔

وضاحت: غرۃ، کا معنی ہے روشن اور چمکدار اور "بیض"، جمع ہے ابیض اور بیضاء کی جس کا معنی ہے سفید چونکہ تیرہ اور چودہ اور پندرہ تاریخوں کی راتوں میں چاند روشن ہوتا ہے تو اصل میں وہ

راتیں سفید اور چمکدار ہوتی ہیں تو اسی مناسبت سے دنوں کو بھی " ایام بیض اور ایام غرۃ " کہہ لیا گیا
نبی کریم ﷺ جمعہ کے دن اکثر روزہ رکھتے تھے کبھی کبھی جمعہ کے دن روزہ کو ترک بھی فرما لیتے تھے۔

اعتراض : جمعہ کے دن روزہ رکھنے سے تو نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے جب تک جمعہ سے پہلے دن یا دوسرے دن روزہ نہ رکھے تو خود نبی کریم ﷺ جمعہ کو روزہ کیوں رکھتے تھے؟ ممانعت کی حدیث یہ ہے۔

" عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ لا يصوم احدكم يوم الجمعة
الا ان يصوم قبله او يصوم بعده " (بخاری ومسلم مشکوۃ باب صیام التطوع)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی ایک جمعہ کے دن روزہ نہ رکھے مگر یہ کہ اس سے پہلے دن روزہ رکھے یا اس کے بعد والے دن روزہ رکھے۔

جواب : " قال ابن همام ولا بأس بصوم يوم الجمعة منفردا عند ابی حنيفة ومحمد رحمهما الله تعالیٰ "

حضرت ابن ہمام رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ صرف جمعہ کے دن کا روزہ رکھنا منع نہیں اور نہ ہی اس میں کوئی حرج ہے یہی مذہب امام ابوحنیفہ وامام محمد رحمہما اللہ کا ہے۔ صرف جمعہ کے دن روزہ رکھنا اس وقت مکروہ ہے جب صرف جمعہ کی تعظیم کے لئے روزہ رکھے اور جمعہ کو خاص کر لے عبادت کے لئے دوسرے کسی دن عبادت کو جائز نہ سمجھے جیسا کہ یہود ہفتہ کے دن کی تعظیم کرتے تھے اور نصاریٰ صرف اتوار کی تعظیم کرتے تھے۔ اگر یہ عقیدہ نہ ہو بلکہ صرف یہ عقیدہ ہو کہ جمعہ کا دن افضل ہے اس میں روزہ رکھ لیا جائے یا اور نفلی عبادت کر لی جائے تو ثواب ہوگا اگرچہ اور دنوں میں بھی نفلی روزہ اور نماز کا ثواب حاصل ہوتا ہے تو یہ جائز ہے کوئی مکروہ نہیں۔ اسی پر نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے:

" عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ لا تختصوا ليلة الجمعة بقيام
من بين الليالی ولا تختصوا يوم الجمعة بصيام من بين الايام الا ان
يكون فی صوم يصومه احدكم " (رواہ مسلم ، مشکوۃ باب صیام التطوع)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا راتوں میں سے صرف جمعہ کی رات کو قیام کے لئے (نوافل ادا کرنے کے لئے) خاص نہ کرو اور دنوں میں سے صرف جمعہ کے دن کو روزہ کے لئے خاص نہ ہو ہاں مگر کوئی شخص اس تاریخ کو روزہ رکھتا ہو۔

اس سے واضح ہوا کہ باقی راتوں کو چھوڑ کر صرف جمعہ کی رات کو عبادت کے لئے خاص کرنے کا اعتقاد ہو اور باقی دنوں کو چھوڑ کر صرف جمعہ کے دن روزہ رکھنے سے خاص کرنا اچھا نہیں ۔ یہ عقیدہ نہ ہو صرف جمعہ کی رات اور جمعہ کے دن کو افضل سمجھ کر عبادت کرنے میں کوئی ممانعت نہیں البتہ بہتر یہی ہے کہ اور دنوں میں بھی کبھی کبھی عبادت کرلی جائے تاکہ بظاہر عمل سے تخصیص کے عقیدہ کا وہم نہ ہو۔

دوسرا جواب: نبی کریم ﷺ کا جمعہ کے دن روزہ رکھنا جو ثابت ہے اس میں یہ ذکر نہیں کہ آپ جمعہ کے دن سے پہلے یا بعد میں روزہ رکھ لیتے ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کی اس میں تخصیص ہو کہ آپ روزہ صرف جمعہ کو رکھ لیتے ہوں یہ وجہ بھی واضح ہے کہ آپ جمعہ کو روزہ رکھ کر جمعہ کو تعظیم میں خاص نہیں کرتے تھے بلکہ نبی کریم ﷺ کا تمام دنوں میں روزہ رکھنا اس حدیث سے ثابت ہے:

"عن عائشة قالت كان رسول الله ﷺ يصوم من الشهر السبت والاحد والاثنين ومن الشهر الآخر الثلاثاء والاربعاء والخميس"

(رواه الترمذی ، مشکوۃ باب صیام التطوع)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ کسی مہینہ میں ہفتہ اور اتوار اور پیر کو روزہ رکھ لیتے تھے اور کسی مہینہ میں منگل اور بدھ اور جمعرات کو روزہ رکھ لیتے تھے۔

تین روزے بغیر معین تاریخوں کے:

"عن معاذة العدوية انها سألت عائشة اكان رسول الله ﷺ يصوم من كل شهر ثلاثة ايام قالت نعم فقلت لها من اى ايام الشهر كان يصوم قالت لم يكن يبالی من ای ايام الشهر يصوم" (رواه مسلم ، مشکوۃ باب صیام التطوع)

حضرت معاذہ عدویہ کہتی ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کیا رسول اللہ ﷺ ہر مہینہ میں تین دن روزے رکھتے تھے؟ تو انہوں نے فرمایا ہاں۔ تو میں نے کہا مہینہ کے کون سے دنوں میں روزہ رکھتے تھے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ آپ یہ پرواہ نہیں فرماتے تھے کہ آپ کس دن روزہ رکھ رہے ہیں۔

وضاحت: نبی کریم ﷺ نے ایام بیض کو روزے رکھے اور پسند فرمایا کہ آپ کی امت کے

لوگ بھی ایام بیض کو روزے رکھیں تاہم کبھی آپ نے مہینہ میں تین روزے رکھے لیکن وہ تاریخیں معین نہیں فرمائیں بلکہ بغیر معین کرنے کے تین دن روزے رکھے وجہ وہی ہوسکتی ہے کہ صرف ایام بیض کی تعظیم کا اعتقاد کر کے دوسرے دنوں میں عبادت کو کوئی نہ چھوڑے۔

داؤد علیہ السلام کے روزوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا:

" وعن عبد الله بن عمرو بن العاص قال قال لی رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم یاعبدالله الم اخبر انک تصوم النهار وتقوم الليل فقلت بلی یا رسول الله قال فلا تفعل صم وافطر وقم ونم فان لجسدک علیک حقا وان لعينک علیک حقا وان لزوجک علیک حقا وان لزورک علیک حقا لا صام من صام الدهر صوم ثلاثة ايام من كل شهر صوم الدهر كله صم كل شهر ثلاثة ايام واقرأ القرآن فی كل شهر فقلت ان اطيق اكثر من ذلک قال صم افضل الصوم صوم داؤد صيام يوم وافطار يوم واقرأ كل سبع ليال مرة ولا تزد علی ذلک "

(بخاری ومسلم ، مشکوٰۃ باب صیام التطوع)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کہتے ہیں مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عبداللہ کیا مجھے یہ خبر نہیں ملی کہ بیشک تم دن کو روزہ رکھتے ہو اور رات کو قیام کرتے ہو (نوافل ادا کرتے ہو) تو میں نے کہا ہاں ایسا ہی ہے یا رسول اللہ آپ نے فرمایا ایسا نہ کرو (بلکہ) روزہ رکھو اور افطار کرو اور قیام کرو اور سو جایا کرو بیشک تمہارے جسم کا تم پر حق ہے اور بیشک تمہاری آنکھ کا تم پر حق ہے اور بیشک تمہاری زوجہ کا تم پر حق ہے اور بیشک تمہاری زیارت کرنے والوں کا تم پر حق ہے اس شخص کا روزہ نہیں جس نے ہمیشہ روزہ رکھا ہر مہینہ کے تین دن روزے رکھنا ہمیشہ روزے رکھنا ہے اور ہر مہینہ میں (ایک مرتبہ) قرآن پڑھو تو میں نے کہا میں اس سے زیاد کی طاقت رکھتا ہوں آپ نے فرمایا (اچھا پھر) تم افضل روزے رکھو جو حضرت داؤد علیہ السلام رکھتے تھے ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دان افطار کرتے تھے اور قرآن سات راتوں میں ایک مرتبہ پڑھو اور اس سے زیادہ نہ کرو۔

وضاحت حدیث: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد " الم اخبر انک تصوم النهار وتقوم

اللیل " کیا مجھے خبر نہیں دی گئی کہ تم دن کو روزہ رکھتے ہو یعنی تم ہر دن روزہ رکھتے ہو کسی دن افطار نہیں کرتے۔ اور رات کو قیام کرتے ہو یعنی تمام رات نوافل ادا کرتے رہتے ہو کبھی سوتے نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے جب عرض کیا ہاں ایسا ہی ہے یارسول اللہ تو حضور ﷺ نے فرمایا:

فلا تفعل : "ایسا نہ کرو" کیونکہ اس میں تمہارے لئے ضرر ہے یعنی ہمیشہ دن کا روزہ اور ہر رات کا قیام تمہارے بدن کو ضعیف کر دیں گے جس کی وجہ سے تم سے عبادات ضرور یہ بھی چھوٹ جائیں گی۔

صم و افطر : یعنی روزہ رکھو جب تمہیں چستی حاصل ہو اور بعض دنوں میں روزہ رکھو اور جب نفس کی شہوت کا غلبہ ہو تو روزہ رکھو تا کہ شہوت کا دبدبہ ختم ہو جائے۔ اور سستی کے وقت افطار کرو اور جب ملال حاصل ہو اور نفس کی شہوت کی آگ بجھ جائے اور شہوت ماند پڑ جائے تو افطار کرو۔ اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جن دنوں کی فضیلت حاصل ہے ان میں روزہ رکھ لیا کرو تا کہ ثواب بھی زیادہ حاصل ہو جائے اور دوسرے دنوں میں افطار کر لیا کرو تا کہ بدن کو تقویت حاصل ہو جائے اس طرح کبھی روزہ اور کبھی افطار سے اخلاق حسینہ حاصل ہوں گے اور عادات اچھی ہوں گی۔

وقم و نم : یعنی تم رات کے اول حصہ اور آخر حصہ میں قیام کر لیا کرو اور درمیان میں سو جایا کرو:

" واسمع نصیحة الطبیب الحبیب من غیر معرفة العلة فکیف وقد بینها بقوله " فان لجسدک علیک حقا "

طبیب حبیب کی نصیحت کو سن کر قبول کرنا چاہئے اگر وہ بیماری کا ذکر نہ بھی کرے لیکن نبی کریم ﷺ نے تو علتوں (اسباب) کا ذکر بھی فرما دیا ہے کہ تمہارے جسم کا تم پر حق ہے اس لئے تم کھاؤ اور پیو اور قیام کرو اور سو جایا کرو تا کہ تمہیں روزے رکھنے اور قیام کرنے کی ہمیشہ کے لئے مناسب طاقت رہے کیونکہ بہت زیادہ اپنے آپ پر بوجھ ڈال کر عبادات فریضہ سے بھی اپنے آپ کو عاجز نہ کر لو "والحاصل اعتدل فی الامور کلها" حاصل یہ ہے کہ تمام امور میں اعتدال سے کام لو۔

وان لعینک علیک حقا : اور بیشک تمہاری آنکھ کا تم پر حق ہے۔ اس میں تاکید پائی گئی ہے اس لئے کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ آنکھ کا حق یہ ہے کہ دیکھنے کی ضرورت پر دیکھے یہ اسی وقت ہو گا جب انسان بیدار ہو اور آنکھ کھلی ہو لیکن آرام کے لئے آنکھ کا بند کرنا بھی اس کا حق ہے مطلب یہ ہے کہ

کبھی سو جایا کو اور کبھی جاگ کر عبادت کر لیا کرو۔

وان لزوجک علیک حقا : ''اور بیشک تمہاری زوجہ کا تم پر حق ہے''۔ یعنی تمہاری زوجہ نے تم سے منافع حاصل کرنے ہیں اسلئے تم ہمیشہ تمام رات قیام نہ کرو اور نہ ہی ہر دن روزہ رکھو بلکہ کبھی لیٹ جاؤ تا کہ وہ تم سے نفع حاصل کر سکے اسی طرح ہر دن روزہ رکھ کر اپنی قوت شہوانیہ کو ضائع نہ کر دو۔

وان لزورک علیک حقا ، بفتح الزاء وسکون الواو ای لاصحابک الزائرین واحبانک القادمین''

اور بیشک تم پر تمہاری زیارت کرنیوالے احباب کا بھی حق ہے اور تمہارے پاس آنیوالے دوستوں کا بھی حق ہے۔ مطلب واضح ہے کہ ہمیشہ تمام رات قیام کرنے اور ہر دن روزہ رکھنے سے تھکاوٹ حاصل ہوگی اور ضعف بدن حاصل ہوگا جس کی وجہ سے انسان کے دنیاوی مشاغل معطل ہو جائیں گے لوگوں سے ملنے کی وجہ سے کچھ ان سے علمی نفع حاصل کرنا اور کچھ انہیں علمی نفع پہنچانا اور نیک لوگوں کی زیارت کرنا اور نیک شخص کا دوسروں کو زیارت شرف بخشنا یہ سب کام رہ جائیں گے۔ اسلئے مناسب مقدار میں قیام ہو اور روزے مناسب مقدار میں رکھے جائیں تا کہ یہ تمام کام معطل نہ ہوں۔

لا صام من صام الدھر : ''اس شخص کا روزہ نہیں جس نے ہمیشہ ہر دن روزہ رکھا''۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ اگر اپنے آپ کو مشقت میں ڈال کر ہمیشہ روزہ رکھے جو دوسری ضروری عبادت کے کاموں میں خلل ڈالیں تو روزے میں وہ کامل ثواب حاصل نہ ہوا جو دینی علوم کی تعلیم دینے یا دینی علوم کے حاصل کرنے سے ثواب حاصل ہونا تھا۔ پھر رب تعالیٰ نے جب انسان کو آسانی عطا فرمائی ہے تو انسان اپنے لئے مشکلات کیوں پیدا کرے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ یرید الله بکم الیسر و لا یرید بکم العسر ﴾

''اللہ تعالیٰ تم پر آسانی کا ارادہ فرماتا اور تم پر تنگی کا ارادہ نہیں فرماتا''

اور نبی کریم ﷺ کا بھی ارشاد ہے '' و لا تشددوا فیشدد الله علیکم '' اور تم اپنے آپ پر سختی نہ کرو (ورنہ) اللہ تعالیٰ تم پر سختی فرمائے گا۔ ہاں یہ خیال رہے کہ ہمیشہ روزہ رکھنے کی ممانعت کی وجوہ نبی کریم ﷺ نے جب بیان فرمادی ہیں تو اتنا واضح ہوا کہ ہمیشہ روزہ رکھنے میں کمال نہیں تاہم زوال بھی

نہیں یعنی مطلقاً منع بھی نہیں نفی کمال ثواب کی ہے مطلق ثواب کی نفی نہیں۔

صوم ثلاثة ایام من کل شهر صوم الدهر کله صم کل شهر ثلاثة ایام :

"ہر مہینہ کے تین دن روزہ رکھنا ہر دن روزہ رکھنے کے برابر ہے تم ہر مہینے کے تین دن روزہ رکھ لیا کرو"۔ یعنی ایک نیکی دس نیکیوں کے برابر ہے تو ہر مہینہ میں تین دن روزہ رکھنا ثواب کے لحاظ پر اور حکماً تیس روزوں کے برابر ہوگا۔ لہذا تم ہر مہینہ کے تین روزے رکھ لیا کرو تمہیں تمام مہینہ کا ثواب حاصل ہو جائے گا۔ یہی عمل تم زندگی بھر جاری رکھوگے "صائم الدهر" (زمانہ بھر روزہ رکھنے والا) ہونے کا شرف حاصل ہو جائے گا۔ اور قرآن پاک مہینہ میں ایک مرتبہ پڑھ لیا کرو۔

جب حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح روزے رکھ لیا کرو یعنی ایک دن روزہ رکھ لیا کرو اور ایک دن افطار کر لیا کرو کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام اسی طرح روزے رکھتے تھے یہی افضل ہیں کہ ان میں طاقت رہتی ہے۔ اور قرآن پاک سات راتوں میں ایک مرتبہ پڑھ لیا کرو۔ یہ بھی ہمیشہ ہر رات کو ختم کرنے کی ممانعت ہے کہ اس سے ضعف بدن نہ حاصل ہو جائے اور فرائض نہ چھوٹ جائیں۔

ولا تزد علی ذلک : کے کئی مطالب ہیں ایک احتمال یہ ہے "**ولا تزد علی المذکور من الصوم والختم**" کہ جو مقدار روزں اور ختم کی بیان کی گئی ہے اس سے زیادہ نہ کرو۔

دوسرا احتمال یہ ہے "**ولا تزد علی ذلک من السؤال**" جو تمہیں بتادیا ہے اسی پر عمل کرو اور زیادہ سوال نہ کرو تیسرا احتمال یہ ہے "**ولا تزد علی ذلک دعوی زیادة الطاقة**" اور اس سے زیادہ اپنی طاقت کے زائد ہونے کا دعوی نہ کرو۔

جن دونوں میں روزہ رکھنا منع ہے : عید الفطر اور عید الاضحیٰ اور عید الاضحیٰ کے تین دن بعد جن کو ایام تشریق کہا جاتا ہے ان پانچ دنوں میں روزہ رکھنا منع ہے۔

☆ "**عن ابی سعید الخدری قال قال رسول الله ﷺ لا صوم فی یومین الفطر والاضحی**"

(بخاری و مسلم، مشکوۃ باب صیام التطوع)

حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو دنوں میں روزہ نہیں

یعنی عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن (روزہ نہ رکھا جائے)۔

☆ " وعن نبیشة (مصغر) الهذلی قال قال رسول الله ﷺ ایام التشریق ایام اکل وشرب وذکر الله " (رواه مسلم مشکوة باب صیام التطوع)

نبیشہ ہذلی کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایام تشریق کھانے اور پینے اور اللہ کے ذکر کے دن ہیں۔

وضاحت حدیث: ایام تشریق عید الاضحیٰ کے بعد تین دن یعنی گیارہ اور بارہ اور تیرہ ذی الحج ہیں۔ ان دنوں کو ایام تشریق اس لئے کہتے ہیں کہ ان دنوں میں گوشت کو دھوپ پر رکھ کر خشک کیا جاتا تھا یہ بھی خیال رہے کہ عید کے دن بھی روزہ رکھنا منع ہے بلکہ وہ ممانعت میں اصل ہے اور ایام تشریق اس کے تابع ہیں۔ لیکن یوم النحر کا دوسری حدیث میں ذکر موجود ہے اس لئے اس کی ممانعت ثابت ہے۔

" قال ابن الملک اتفقوا علی حرمة صومها وانما حرم صوم یوم العید وایام التشریق لان الناس اضیاف الله فیها "

ابن الملک رحمہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس مسئلہ میں اتفاق ہے کہ عید کے دن اور ایام تشریق میں روزہ رکھنا حرام ہے کیونکہ لوگ ان دنوں میں اللہ تعالیٰ کے مہمان ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کے مہمانی سے اعراض کرنا مومن کی شان نہیں۔

تنبیہ: نوروز اور مہرجان کو روزہ رکھنا مکروہ ہے کیونکہ ان دنوں کو کفار معظم سمجھتے تھے لیکن یہ اسی وقت مکروہ ہے جب مسلمان بھی کفار کی طرح ان دنوں کو معظم سمجھیں۔ اگر ایک شخص چاند کی کسی تاریخ میں روزہ رکھتا ہے وہ تاریخ نوروز یا مہرجان کو آئے تو اس شخص کے لئے روزہ رکھنا جائز ہے نوروز چیت کی نو تاریخ اور مہرجان اسوج کی نو تاریخ کو کہا جاتا ہے۔

مسئلہ: " ولو وقع الاحتلام فی حال الصیام لا یضر مع ان الانبیاء علیهم الصلوة والسلام سالمون من الاحتلام لانه علامة تأتی الشیطان فی حال المنام " (مرقاة ج ص ۲۶۱)

اگر روزے کی حالت میں احتلام ہو جائے تو روزے میں کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ ہاں یہ خیال رہے کہ انبیاء کرام احتلام سے محفوظ ہوتے ہیں کیونکہ خواب کی صورت میں مجامعت اور انزال شیطان کی جانب سے پایا جاتا ہے اور انبیاء کرام شیطان کی دخل اندازی سے محفوظ ہوتے ہیں۔

البتہ یہ بھی خیال رہے کہ انبیاء کرام کو سوتے ہوئے انزال ہو جائے خواب میں کوئی مجامعت نہ پائی جائے تو یہ جائز ہے اور ممکن ہے۔ کیونکہ یہ بدن کے سیر ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے یہ پیدائشی اور عادی امور کی وجہ سے ہوتا ہے اس میں شیطان کی دخل اندازی نہیں ہوتی اسی وجہ سے انبیاء کرام کے لئے یہ پایا جانا ممکن ہے۔ لیکن علامہ علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بھی احتمال ہے کہ ایسا پایا جا سکتا ہے اس کے پائے جانے کا کوئی یقین نہیں۔ " **وفیہ ان الاحتمال غیر مفید فی موضع الاستدلال** " جب کسی چیز میں فقط احتمال پایا جائے تو وہ استدلال کے لئے مفید نہیں۔ (حوالہ مذکور)

مسئلہ : روزہ کی حالت میں زوجہ کا بوسہ لینا جائز ہے جب کہ انزال نہ ہو اور فتنہ سے خالی ہو لیکن اجتناب بہتر ہے۔

☆ " **وعن عائشة قالت كان رسول الله ﷺ يقبل ويباشر وهو صائم وكان املككم لأربه** " (بخاری ومسلم مشکوۃ باب)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ روزہ کی حالت میں بوسہ لے لیتے تھے اور (اپنی ازواج کے ساتھ لیٹ جاتے تھے جس کی وجہ سے) آپ کا جسم آپ کی ازواج کے جسم سے مس کرتا تھا اور آپ تم سے زیادہ اپنی حاجت پر مالک ہوتے تھے۔

وضاحت حدیث: روزہ کی حالت میں بوسہ لینے کے متعلق حکم یہ ہے:

" كره القبلة واللمس والمباشرة فی ظاهر الرواية ان خاف علی نفسه الجماع او الانزال "

روزہ کی حالت میں اپنی زوجہ کا بوسہ لینا اور ہاتھ وغیرہ سے چھونا اور (ننگے) جسم کا جسم سے ٹکرانا جائز تو ہے لیکن جب اپنے نفس پر خوف ہو کہ ان حالات میں جماع پر عمل ہو جائے گا یا انزال (شہوت سے منی کا خروج) ہو جائے گا تو ایسی صورت میں مکروہ ہے " **وقال محمد تكره القبلة مطلقا لانها لا تخلو عن الفتنة** " حضرت امام محمد رحمہ اللہ نے احتیاطی طور پر اپنے اس قول سے فتوی دیا کہ روزہ کی حالت میں بوسہ مطلقاً مکروہ ہے کیونکہ یہ فتنہ سے خالی نہیں ہو سکتا ہے معاملہ جماع اور انزال سے پہلے نہ رکے۔

" وقال ابن عباس یکره للشاب ویرخص للشیب " حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بھی اس مسئلہ میں احتیاط سے کام لیتے ہوئے یہ ارشاد فرماتے تھے کہ جوانوں کے لئے روزہ کی حالت میں اپنی زوجہ کا بوسہ لینا یا چھونا یا بغل وغیرہ میں لینا مکروہ ہے کیونکہ یہ صورتیں فتنہ سے خالی نہیں لیکن بوڑھوں کے لئے جائز ہے اس لئے کہ ان کی شہوت زائل ہو چکی ہوتی ہے۔

" فلا ینبغی ان یقاس به علیه الصلوة والسلام فی ذلک لقولها رضی الله عنها (وکان املکم لأ ربه) من ملک اذا قدر علی شئی او صار حاکما علیه "

نبی کریم ﷺ کے بوس و کنار پر اپنے آپ کو قیاس نہ کیا جائے کیونکہ آپ کا وصف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یوں بیان فرمایا کہ آپ ان حالات میں تم سے زیادہ اپنی حاجت پر مالک ہوتے تھے یعنی جماع پر قادر ہونے کے باوجود جماع سے دور رہنا آپ کا وصف خاص تھا اس لئے کہ آپ اپنی حاجات کے حاکم تھے آپ کی حاجات آپ کے تابع تھیں جب کہ دوسرے لوگ حاجات کے تابع ہوتے ہیں اور خواہشات سے مغلوب ہوتے ہیں لیکن آپ اپنی شہوات پر غالب رہتے تھے۔

(از مرقاۃ ج ۴ ص ۲۶۰)

مسئلہ : کوئی شخص جنبی ہو اس نے روزہ رکھنا ہے تو بہتر یہ ہے کہ پہلے غسل کر لے پھر کھانا کھائے اور روزہ رکھے۔ لیکن اگر وقت کم ہو تو وضوء کر کے کھانا کھائے، روزہ رکھ لے اور بعد میں غسل کر لے بلکہ صرف ہاتھ دھو کر کلی کر کے کھانا کھا لے تو پھر بھی جائز ہے۔

☆ " وعن عائشة قالت کان رسول الله ﷺ یدرکه الفجر فی رمضان وهو جنب من غیر حلم فیغتسل ویصوم " (بخاری ومسلم مشکوة کتاب الصوم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ رمضان میں حالت جنابت میں بغیر احتلام کے ہوتے تو فجر کو پا لیتے تو آپ غسل فرماتے اور روزہ رکھ لیتے۔

وضاحت حدیث : ایک مسئلہ تو اس حدیث کی شرح سے پہلے بیان کر دیا گیا ہے کہ انبیاء کرام احتلام سے محفوظ تھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ارشاد میں اسکی وضاحت کر دی گئی ہے " وهو جنب من غیر حلم " کہ آپ حالت جنابت میں ہوتے (جماع وغیرہ سے) لیکن احتلام کی حالت نہیں ہوتی تھی۔

دوسرا مسئلہ یہ واضح ہو گیا کہ آپ بعض اوقات حالت جنابت میں ہوتے صبح کو پالیتے اس حدیث کے ظاہری الفاظ مبارکہ سے تو یہ سمجھ آ رہا ہے کہ اسی حالت میں صبح ہو جاتی اور آپ غسل بعد میں فرما لیتے اور روزہ رکھ لیتے اس میں دو احتمال ہیں کہ بغیر کھانے اور پینے کے صرف نیت سے ہی روزہ رکھ لیتے یا یہ مطلب ہے کہ آپ حالت جنابت میں وضو کر کے کھا لیتے اور روزہ رکھ لیتے پھر غسل فرما لیتے تھے۔

فیغتسل ویصوم :"ظاهر الحديث قول عامة العلماء من اصبح جنبا اغتسل واتم صومه"

اکثر اہل علم حضرات کا قول یہ ہے کہ ظاہر حدیث پاک سے یہی مطلب حاصل ہو رہا ہے کہ جو شخص جنابت کی حالت میں صبح کو پالے وہ غسل کر لے اور روزہ کو مکمل کر لے اس میں دو احتمال وہی ہیں جن کا ذکر ابھی نبی کریم ﷺ کے فعل کے ضمن میں کر دیا گیا ہے:

"وقال البيضاوى فى قوله تعالىٰ ﴿فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ﴾ فى تجويز المباشرة الى الصبح الدلالة على جواز تأخير الغسل اليه وصحة صوم المصبح جنبا"

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے آیۃ کریمہ ﴿فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ﴾ کی تفسیر میں بیان فرمایا ہے کہ جب رات کو مجامعت کا جواز صبح صادق تک ہے یعنی ایک لمحہ پہلے تک تو اس سے واضح ہو گیا کہ غسل میں تاخیر جائز ہے اور جنابت کی حالت میں صبح کرنے والے کا روزہ صحیح ہے۔

لیکن یہ خیال رہے کہ جب جماع صبح سے ایک لمحہ پہلے تک کرے گا تو اس صورت میں یا جماع سے پہلے کھا اور پی لے یا پھر بغیر کھانے اور پینے کے صرف نیت سے روزہ رکھ لے کیونکہ اس صورت میں جماع کے بعد وضو کر کے کھانے اور پینے کا تو وقت ہی نہیں۔

اعتراض : بخاری رحمہ اللہ نے تو یہ بیان فرمایا ہے "من اصبح جنبا فلا صوم له" جس شخص نے جنابت کی حالت میں صبح کو پایا اس کا روزہ نہیں۔ ان دونوں احادیث میں بظاہر تعارض پایا جاتا ہے تو کس طرح دوسری حدیث پر اہل علم نے فتوی دیا ہے؟

جواب اول: "واجابوا عنه بانه منسوخ واستحسنه ابن المنذر"

اہل علم حضرات نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ جو حدیث بخاری نے بیان کی ہے کہ "جس شخص

نے حالت جنابت میں صبح کی اس کا روزہ نہیں'' وہ بخاری اور مسلم کی زیر بحث حدیث سے منسوخ ہے جس میں نبی کریم ﷺ کا حالت جنابت میں صبح کو پالینا اور غسل کرنا اور روزہ کو مکمل کرنے کا ذکر ہے یہی جواب ابن منذر رحمہ اللہ نے بھی مستحسن سمجھا ہے۔

جواب دوم: '' او محمول علی من اصبح مجامعا و استدام الجماع ''

بعض حضرات نے بخاری کی حدیث '' من اصبح جنبا فلا صوم له '' کی تاویل یہ کی ہے کہ اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جس شخص نے جماع ایسے وقت میں کیا کہ حالت جماع میں ہی صبح صادق ہوگئی تو اس کا روزہ نہیں۔ یہ بہت واضح ہے کہ کھانے، پینے اور جماع کرنے کی حد صبح صادق ہے صبح صادق سے لحہ بھر پہلے ختم کرنا ضروری ہے۔ (از مرقاۃ ج۴ص۲۶۱)

بھول کر کھانے اور پینے اور جماع سے روزہ نہیں ٹوٹتا:

☆ '' عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ من نسی وهو صائم فأكل او شرب فليتم صومه فانما اطعمه الله وسقاه '' (بخاری، مسلم مشکوۃ کتاب الصوم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص بھول گیا اور اس نے روزہ کی حالت میں کھا اور پی لیا تو وہ روزہ کو مکمل کرے بیشک اسے اللہ تعالیٰ نے کھلایا اور پلایا ہے۔

اسی حکم کو دوسری حدیث پاک سے بھی تائید حاصل ہے '' رفع عن امتی الخطاء والنسيان وما استكرهوا عليه '' میری امت سے خطا اور نسیان اور جبر اٹھالیا گیا ہے۔

یعنی ان حالتوں میں کوئی مواخذہ نہیں لیکن یہ خیال رہے کہ خطا کی حالت میں روزہ ٹوٹ جائے گا البتہ کفارہ لازم نہیں آئے گا۔ خطا یہ ہے کہ روزہ یاد ہو لیکن بے احتیاطی ہو جائے جیسا کہ کلی کرتے ہوئے بے اختیار پانی حلق میں چلا جائے اسی طرح کسی نے جبراً کھلا اور پلا دیا تو روزہ ٹوٹ جائے گا لیکن کفارہ لازم نہیں آئے گا۔ (از مرقاۃ بزیادۃ)

فائدہ : اگر کسی شخص نے بھول کر کھانا اور پینا شروع کر دیا اور وہ شخص روزہ رکھنے کی طاقت رکھتا ہے تو دوسرا شخص اسے یاد کرا دے کہ تمہارا روزہ ہے لیکن اگر وہ روزہ مشکل سے رکھے ہوئے تھا اور بھول گیا تو

ایسی حالت میں دوسرا شخص اسے یاد نہ دلائے کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ کھلا اور پلا رہا ہے تو اسے کھانے پینے دیا جائے کہ اس کا روزہ بھی مکمل ہو جائے اور مشکل سے بھی بچ جائے۔ (از طحطاوی)

عمداً (جان بوجھ کر) روزہ توڑنے سے قضاء اور کفارہ لازم آئے گا:

" عن ابی هريرة قال بينما نحن جلوس عند النبی ﷺ اذ جاء ه رجل فقال يا رسول الله هلكت قال مالک قال وقعت علی امرأتی وانا صائم قال رسول الله ﷺ هل تجد رقبة تعتقها قال لا قال فهل تستطيع ان تصوم شهرين متتابعين قال لا قال هل تجد اطعام ستين مسكينا قال لا قال اجلس ومكث النبی ﷺ فبينا نحن علی ذلک اتی النبی ﷺ بعرق فيه تمر والعرق المكتل الضخم قال اين السائل قال انا قال خذ هذا فتصدق به فقال الرجل اعلی افقر منی يا رسول الله فو الله ما بين لا بتيها يريد الحرتين اهل بيت افقر من اهل بيتی فضحک النبی ﷺ حتی بدت انيابه ثم قال اطعمه اهلک "

(بخاری ومسلم، مشکوۃ کتاب الصوم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے ایک شخص آ گئے تو کہنے لگے یا رسول اللہ میں ہلاک ہو گیا حضور ﷺ نے پوچھا تمہیں کیا ہو گیا؟ وہ عرض کرنے لگے میں نے روزے کی حالت میں اپنی عورت سے جماع کر لیا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم کوئی غلام پاتے ہو کہ وہ آزاد کر دو وہ عرض کرنے لگے نہیں (میں کسی غلام اور غلامہ کا مالک تو نہیں) آپ نے فرمایا کیا تم دو ماہ لگاتار روزے رکھ سکتے ہو؟ وہ کہنے لگے نہیں۔ آپ نے فرمایا کیا تم ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکتے ہو؟ وہ کہنے لگے نہیں آپ نے فرمایا بیٹھ جاؤ اور کچھ دیر نبی کریم ﷺ ٹھہرے اور ہم بھی ایسی حالت میں رہے نبی کریم ﷺ کے پاس کھجوروں کا ایک بڑا ٹوکرہ لایا گیا آپ نے فرمایا وہ مسئلہ پوچھنے والا شخص کہاں ہے وہ کہنے لگے میں ہوں آپ نے فرمایا یہ (کھجوروں کا ٹوکرہ) لے لو اور اسے صدقہ کر دو۔ وہ شخص عرض کرنے لگے کیا میں اپنے سے زیادہ محتاج پر (صدقہ کروں) قسم ہے اللہ تعالیٰ کی مدینہ طیبہ کے اطراف میں کسی گھر والے بھی میرے گھر والوں سے زیادہ محتاج نہیں تو نبی کریم ﷺ

مسکرائے یہاں تک کہ آپ کی داڑھیں ظاہر ہوگئیں پھر آپ نے فرمایا اپنے اہل وعیال کو کھلا دو۔

وضاحت حدیث: واضح ہو گیا کہ جان بوجھ کر روزہ توڑنے پر قضاء اور کفارہ لازم ہے یہ بھی پتہ چل گیا کہ کفارہ کیا ہے۔

بخاری اور مسلم کی ایک حدیث میں ہے:

" عن ابی هريرة انه عليه الصلوة والسلام امر رجلا افطر فی رمضان ان يعتق رقبة او يصوم شهرين متتابعين او يطعم ستين مسكينا "

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو حکم دیا جس نے رمضان میں روزہ توڑ دیا تھا کہ وہ غلام آزاد کرے یا دو ماہ لگاتار روزے رکھے یا ساٹھ مسکینوں کو طعام کھلائے:

" وروى الدار قطنی عن ابی هريرة ان رجلا اكل فی رمضان فامره النبی ﷺ ان يعتق رقبة او يصوم شهرين متتابعين او يطعم ستين مسكينا "

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک ایک شخص نے رمضان میں کھالیا تو نبی کریم ﷺ نے اسے غلام آزاد کرنے یا دو ماہ لگاتار روزے رکھنے یا ساٹھ مسکینوں کو طعام کھلانے کا حکم فرمایا

"المكتل (بكسر الميم) الضخم ، بڑا تھیلا یا کھجور کے پتوں کا بنا ہوا بڑا ٹوکرہ۔

ما بين لا بيتها : کا مطلب " الحرتين "لیا گیا ہے مراد چھوٹے چھوٹے سیاہ پتھروں والے دو مقام شرقی اور غربی یعنی مدینہ طیبہ کے اطراف۔

نبی کریم ﷺ کا اختیار واضح طور پر ثابت ہوا کہ آپ نے خود ہی کھجوریں دیں وہ بھی تھوڑی مقدار میں تیس صاع بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ وہ پندرہ صاع تھیں پھر وہ بھی اس شخص کو اپنے گھر والوں کو کھلانے کی جازت دی۔ (از مرقاۃ)

راقم نے کئی احادیث کو دیکھ کر ایک اندازہ لگایا ہے کہ صحابہ کرام نے نبی کریم ﷺ کی رحمت کو دیکھ کر زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جیسا کہ اس حدیث میں مسئلہ پوچھنے والے شخص نے فائدہ اٹھایا۔

روزہ کی حالت میں قے کا حکم:

(۱) قے خود بخود آئے خواہ تھوڑی مقدار میں آئے یا زیادہ اس سے روزہ نہ ہی ٹوٹتا ہے اور نہ ہی

مکروہ ہوتا ہے البتہ شرط یہ ہے کہ قے کو اس نے واپس نہ لوٹایا ہو یا پھر نگل نہ لیا ہو۔

(۲) اگر خود بخود واپس لوٹ جائے اس شخص نے قے کو خود نہیں لوٹایا تو پھر بھی روزہ نہیں ٹوٹتا خواہ وہ قے منہ بھر کر ہی کیوں نہ ہو۔

(۳) اگر قے کو خود جان بوجھ کر واپس لوٹایا تو روزہ بالاتفاق ٹوٹ جائے گا خواہ وہ قے تھوڑی تھی یا زیادہ یعنی ایک چنے کی مقدار کو بھی واپس لوٹانا روزہ کو توڑ دیتا ہے اگرچہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جان بوجھ کر قے کو لوٹانا اس وقت روزہ کو توڑے گا جب قے منہ بھر کر آئے پھر خواہ تھوڑی مقدار میں لوٹائے یا زیادہ مقدار میں لوٹائے۔ فتوی کے لحاظ پر مختار اس قول کو سمجھا گیا ہے اور تقوی کے لحاظ پر یہ قول مختار ہے کہ قے تھوڑی مقدار میں آئے یا زیادہ قے کو لوٹانے سے روزہ ٹوٹ جائے گا خواہ تھوڑی مقدار میں لوٹائے یا زیادہ مقدر میں۔

(۴) اگر کوئی شخص جان بوجھ کر زبردستی منہ میں انگلی وغیرہ ڈال کر قے کو لائے اور روزہ بھی یاد ہو تو منہ بھر کر قے کو لانے سے روزہ ٹوٹ جائے گا اور کم مقدار سے روزہ ٹوٹے گا تو نہیں البتہ اس میں کراہیت پائی جائے گی۔ (از درمختار و شامی)

☆ "عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ من ذرعه القی وهو صائم فليس عليه قضاء ومن استقاء عمدا فليقض" (رواه الترمذی وابوداؤد وابن ماجه والدارمی ، مشكوة كتاب الصوم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کو روزے کی حالت میں خود بخود قے آجائے اس پر روزہ کی قضا لازم نہیں اور جان بوجھ کر جس نے قے کو لایا وہ روزہ کی قضا کرے۔ وجہ اصل میں یہ ہے کہ خود بخود قے کا آنا غیر اختیاری ہے انسان کے فعل کا اس میں دخل نہیں اور انسان نے اس میں کوئی کوتاہی نہیں کی اسلئے روزہ نہ ٹوٹا اور جان بوجھ کر قے کو لانے میں کوتاہی اس کی جانب سے پائی گئی اس نے اپنے اختیار سے قے کو لوٹایا ہے اسلئے اس کا روزہ ٹوٹ گیا۔

ہاں البتہ یہ خیال رہے مندرجہ بالا صورتوں میں جن میں روزہ کے ٹوٹنے کا ذکر ہے ان میں صرف قضا لازم ہے کفارہ لازم نہیں۔

روزہ کی حالت میں خون نکلوانے کا حکم:

خون نکلوانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ ہاں البتہ بغیر کسی عذر شدید کے اتنی مقدار میں خون نکلوانا

مکروہ ہے جس سے کمزوری ہو جائے اور روزہ رکھنا دشوار ہو جائے۔

☆ " وعن ابن عباس قال ان النبی ﷺ احتجم وهو محرم واحتجم وهو صائم "

(بخاری ومسلم، مشکوۃ کتاب الصوم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے حالت احرام میں خون نکلوایا اور روزہ کی حالت میں خون نکلوایا۔

وضاحت حدیث: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں بھی ایک ہی واقعہ کا ذکر ہے کیونکہ حدیث ابی داؤد میں ہے "احتجم صائما محرما" اور ترمذی میں ہے "احتجم وهو محرم صائم" سب روایات کا ایک ہی مطلب ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حالت احرام میں روزہ رکھا ہوا تھا اسی احرام اور روزہ کی حالت میں آپ نے خون نکلوایا۔ (از مرقاۃ ج۴ص ۲۶۱)

☆ " عن شداد بن اوس ان رسول الله ﷺ اتی رجلا بالبقيع وهو يحتجم وهو آخذ بيدی لثمانی عشرة خلت من رمضان فقال افطر الحاجم والمحجوم "

(رواه ابو داؤد وابن ماجه والدارمی مشکوۃ کتاب الصوم)

شداد بن اوس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رمضان کے اٹھارہ دن گزر چکے تھے (یعنی انیسویں روزہ کو) آپ نے میرے ہاتھ کو پکڑا ہوا تھا اسی حال میں آپ بقیع (مدینہ طیبہ کا قبرستان) میں تشریف لائے وہاں ایک شخص خون نکلوا رہا تھا تو آپ نے فرمایا خون نکالنے والے اور نکلوانے والے کا روزہ فاسد ہونے کے قریب ہو جاتا ہے۔

وضاحت حدیث: راقم نے جو ترجمہ کیا ہے اسے غور سے پڑھنے سے ہی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ مراد نہیں کہ خون نکالنے والے اور نکلوانے والے کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ روزہ ٹوٹنے کے قریب ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے "هلک فلان" تو مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ وہ ہلاکت کے قریب ہو گیا اس نے اپنے آپ کو ہلاکت پر پیش کر دیا اس حدیث کی وضاحت صاحب مصابیح محی السنۃ رحمہ اللہ نے ان الفاظ سے بیان فرما دی:

" تأوله بعض من رخص في الحجامة ای تعرضا للافطار المحجوم للضعف والحاجم لأنه لا يأمن من ان يصل شئی الی جوفه الملازم "

کہ جن حضرات کا مسلک یہ ہے کہ روزہ کی حالت میں خون نکلوانے کی رخصت پائی گئی ہے (صحیح یہی ہے) ان حضرات نے فرمایا کہ حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ خون نکلوانے والے کا روزہ اس لئے افطار کے قریب ہو جاتا ہے کہ اسے کمزوری لاحق ہو جائے گی وہ روزہ نہیں رکھ سکے گا تو گویا کہ اس نے خود اپنے آپ کو روزہ کے افطار کے قریب پہنچا دیا ہے اور خون نکالنے والے (چونکہ دوسرے کے جسم میں آلہ چبھو کر خون چوس کر نکالتے تھے) کا روزہ اس لئے ٹوٹنے کے قریب ہو جاتا ہے کہ اس کے آلہ سے اس کے خون کا پیٹ میں پہنچنے کا گمان ہوتا ہے:

"الملازم وهو بفتح الميم جمع الملزمة بكسر الميم قارورة الحجام التي يجمع فيها الدم وسميت لانها تلزم على المحل"

ملازم جمع ہے ملزمۃ کی جمع کی صورت میں میم پر فتحہ (زبر) ہے اور اس کے واحد میں میم کے نیچے کسرہ (زیر) ہے۔ اس سے مراد خون نکالنے والا آلہ ہے جس میں خون جمع ہو جاتا ہے (اور وہ آلہ محل کے ساتھ چمٹا رہنے کی وجہ سے ملازمہ کہلاتا ہے)

مختصر مسئلہ یہ ہے کہ روزہ کی حالت میں اتنی مقدار میں خون نکلوانا جس سے کمزوری نہ ہو جائز ہے لیکن زیادہ مقدار میں خون نکلوانا جس سے کمزوری ہو جائے مکروہ ہے۔

روزہ کی حالت میں ٹیکہ کا حکم:

بازو کے گوشت میں ٹیکہ لگوانا جائز ہے اس سے روزہ نہ ٹوٹے گا نہ ہی مکروہ ہوگا ہر وہ رگ جس کا تعلق معدہ یا دماغ سے ہو اس رگ میں ٹیکہ لگوانے سے روزہ ٹوٹ جائے گا۔ اگر کسی رگ کا تعلق براہ راست معدہ یا دماغ سے نہیں تو پھر بھی رگ میں ٹیکہ لگوانے سے اجتناب بہتر ہے۔ کسی ماہر سرجن سے پوچھ لیا جائے کہ کون سی رگ کا تعلق معدہ یا دماغ سے ہے ایسی رگوں میں روزہ کی حالت میں ٹیکہ لگوانا جائز نہیں ہوگا۔ فقہاء کرام نے ایک رگ "جائفہ" کا ذکر کیا ہے جس کا تعلق معدہ سے ہے اور ایک رگ "آمۃ" کا ذکر کیا ہے جس کا تعلق دماغ سے ان میں دوا ڈالنے سے روزہ کے ٹوٹ جانے کا حکم دیا ہے۔ فتاوی نوریہ میں اسی مسئلہ کو ایک استفتاء کے جواب میں شیخ کامل فقیہ العصر حضرت علامہ مولنا نور اللہ بصیر پوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

الاستفتاء : کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ روزہ دار شخص ٹیکہ چیچک یا بخاری یا ہیضہ وغیرہ کا بحالت روزہ کراسکتا ہے یا نہیں؟ ٹیکہ کرانے سے روزہ فاسد ہوگا یا نہیں؟ اگر ہوگا تو صرف قضاء لازم ہوگی یا قضاء وکفارہ ہر دو براھین قاطعہ ودلائل ساطعہ سے مسئلہ کو واضح فرمایا جائے "بینوا توجروا"۔

الجواب اللّٰھم اجعل لی النور والصواب :

(۱) اگر مریض ہے اور غروب شمس کا انتظار کرے تو ہلاک جان یا فساد عضو یا زیادتی مرض یا درازی مرض کی علامت صادقہ یا تجربہ صحیحہ یا طبیب وڈاکٹر مسلمان غیر ظاہر الفسق کی خبر سے گمان غالب ہو جائے۔ تو ٹیکہ کراسکتا ہے کہ یہ عذر افطار ہیں اور ایسے ہی اگر تندرست کو ظنِ غالب ہو جائے کہ فوری ٹیکہ نہ کرائے تو بیمار ہو جائے گا فتاوی عالمگیری وغیرہا اسفارِ مذہب مہذب میں مصرح ہے:

" والنظم من الهندية ج ا ص ۱۰۶ المريض اذا خاف على نفسه التلف او ذهاب عضو يفطر بالاجماع وان خاف زيادة العلة فلكذلك عندنا وعليه القضا اذا افطر كذا في المحيط "

اگر کوئی خطرہ نہ ہو اور عدم افطار بھی ثابت ہو جائے تو روا ورنہ نہیں۔ (یعنی مریض کو جب اپنی جان کی ہلاکت کا خطرہ ہو یا کسی عضو کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو بالاتفاق اس کے لئے روزہ افطار کرنا جائز ہے اور اگر بیماری کے زیادہ ہونے کا خطرہ ہو تو پھر بھی یہی حکم ہے ہمارے نزدیک اور اس پر قضاء لازم ہوگی جب افطار کرے)۔

(۲) اگر بدن کے کسی منفذ ومسلک سے بذریعہ ٹیکہ جوف (پیٹ) یا دماغ میں دوائی پہنچ جاتی ہے تو روزہ فاسد ہو جاتا ہے اور اگر مسامات سے سرایت کرتی ہے تو نہیں اگر چہ ذائقہ یا اندورن جوف ودماغ میں اثر پایا جائے۔ البحر الرائق ج ۲ ص ۲۷۳ والهندية ج ا ص ۱۰۴ ومراقی الفلاح شرح نور الایضاح وحاشية الطحطاوی علی المراقی ص ۳۹۸ اور شامی، حاشیہ طحطاوی کے انہی صفحات میں ہے:

" والنظم للطحطاوی والداخل من المسام لاينا فيه ای الصوم بحروشامی میں ہے والنظم منها

لوافطر شیأ من الدواء فی عینه لا یفسد صومه عندنا وان وجد طعمه فی حلقه واذا بزق فرأی اثر الکحل ولونه فی بزاقه عامة المشائخ علی انه لا یفسد صومه کذا فی الذخیرة وهو الاصح هکذا فی التبیین اور چونکه وصول من المنفذ او المسام (براہ راست پیٹ یا دماغ تک پہنچے یا مساموں کے ذریعے پہنچے) کا مسئلہ تشریح البدن (سرجنی) اور طب کا ہے۔لہذا اس کا حل ماہرین اطباء اور ڈاکٹروں کے حوالہ کیا جاتا ہے۔اور مبنی اختلاف علماء یہ ہے) علماء کے اختلاف کی وجہ اصل میں یہ ہے) کہ جس صاحب نے " وصول من المنفذ " (براہ راست دوا کے پیٹ اور دماغ تک پہنچنے کو) سمجھا مفسد فرمایا (کہ روزہ ٹوٹ جاتا ہے) اور جس نے "وصول من المسام " (مساموں کے ذریعے دوا کے پہنچنے کا) خیال کیا مفسد قرار نہ دیا (کہ اس کا روزہ نہیں ٹوٹا) (اس لئے اس مسئلہ کو ماہر سرجن کے حوالہ کر دیا جائے تفصیل شروع میں ذکر کر دی گئی)

اس کی نظیر فقہی ہمارے ائمہ کرام کا اختلاف " واصل الی المثانة " (مثانہ تک دوا کا پہنچنا) کے مفسد اور غیر مفسد ہونے میں ہے عند امامنا الاعظم (ہمارے امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک) مفسد نہیں کہ جوف (پیٹ) اور مسامہ کے درمیان مسام ہیں اور منفذ نہیں اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک مفسد ہے کہ منفذ ہے۔وقول محمد مضطرب علیهم الرحمة (اور امام محمد رحمہ اللہ کا قول اس مسئلہ میں مضطرب ہے) فتح القدیر ج ۲ ص ۲۶۷ بحر الرائق ج ۲ ص ۲۷۹ مراقی الفلاح ص ۳۹۹ ، شامی ج ۲ ص ۱۳۷ میں ہے والنظم للشامی والاختلاف مبنی علی انہ ھل بین المثانة والجوف منفذ اولا (یہ اختلاف اصل میں اسی وجہ سے ہے کہ مثانہ اور پیٹ کے درمیان براہ راست تعلق ہے یا نہیں۔لیکن آج کل انسان کو چیر پھاڑ کر سرجن حضرات کو ایک ایک رگ وغیرہ کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ براہ راست تعلق ہے یا مساموں کے ذریعے)

کفایہ ج ۲ ص ۲۶۷ ، بحر الرائق ج ۳ ص ۲۷۹ میں ہے والنظم من البحر قال فی الهدایة وهذا لیس من باب الفقه لانه متعلق بالطب حاشیہ طحطاوی میں ہے قوله کذا تقوله الاطباء انما اسنده الیهم لان هذا المقام یرجع الیهم فیه لکونه من التشـریح (یہ مسئلہ فقہ کا نہیں بلکہ علم طب کا ہے طبیب حضرات جو فیصلہ کریں ان کی طرف رجوع کیا جائے کیونکہ حقیقت میں اس مسئلہ کا تعلق اپریشن کے علم سے ہے لہذا اسے سرجن حضرات ہی جانتے

ہیں)۔اگر (سرجن حضرات کے کہنے پر) مفسد ہونا ثابت ہو جائے تو صرف قضاء لازم ہوگی۔

(فتاوی نوریہ ج ۲ ص ۸۷، ۸۸)

اس کے بعد فتاوی نوریہ میں تفصیلی طور پر اس مسئلہ پر بحث کی گئی ہے تاہم خلاصہ اس کا وہی ہے جو ذکر کر دیا گیا ہے۔ البتہ اس بحث سے اتنے الفاظ ذہن میں رہیں بعض حضرات کہتے ہیں کہ ٹیکہ سے دواء گوشت میں پہنچ کر خون سے مل کر جسم کے تمام حصوں میں پہنچ جاتی ہے تو لامحالہ معدہ میں بھی پہنچ جاتی ہے اور جس طرح معدہ کی ظاہری سطح پر رگیں ہوتی ہیں یونہی باطن میں بھی رگیں ہوتی ہیں تو ان رگوں کے ذریعے باطن میں بھی دواء پہنچ جاتی ہے اور وریدی (رگ کا) ٹیکہ میں تو یہ بات اور واضح ہے لہٰذا روزہ ٹوٹ جاتا ہے تو یہ کہنا بھی صحیح نہیں کیونکہ جب خون خود ہی معدہ کے اندر نہیں پہنچتا تو اس کے اندر ملی ہوئی دوا کیسے پہنچے گی؟ اور یہ کہنا کہ باطن میں رگیں ہیں مفید نہیں کیونکہ یہ رگیں معدہ میں نہیں بلکہ معدہ کی اندورنی سطح میں ہوتی ہیں اور معدہ میں کھلتی بھی نہیں کہ خون براہ راست معدہ میں گرے جیسے حوض میں نالی کے ذریعے پانی گرتا ہے بلکہ دواء کا اثر صرف مسامات کے ذریعے پہنچ سکتا ہے حالانکہ مسامات سے پہنچی ہوئی چیز کا مفسد نہ ہونا آفتاب و ماہتاب کی طرح واضح ہے۔ (فتاوی نوریہ ج ۲ ص ۱۰۱)

روزہ کی حالت میں آنکھ میں سرمہ لگانا یا دوا ڈالنے کا حکم:

روزہ کی حالت میں سرمہ لگانا جائز ہے اور سرمہ کی طرح خشک دوا لگانا جائز ہے لیکن تر دوا (ڈراپ وغیرہ) کا استعمال جائز نہیں۔

☆ "عن انس قال جاء رجل الی النبی ﷺ قال اشتکیت عینی انا اکتحل وانا صائم قال نعم" (رواہ الترمذی مشکوۃ کتاب الصوم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے کہ میری آنکھوں میں درد ہے کیا میں روزے کی حالت میں سرمہ لگا لیا کروں؟ آپ نے فرمایا ہاں (لگا لیا کرو)" **قال المظهر الاكتحال ليس بمكروه للصائم** " مظہر رحمہ اللہ نے بیان فرمایا سرمہ لگانا روزہ دار کے لئے مکروہ نہیں۔

تنبیہ: آنکھ کا تعلق براہ راست معدہ یا دماغ سے ہے یا نہیں اگرچہ فقہاء کرام نے بیان کیا ہے:

" قال ابن الهمام ولو اكتحل لم يفطر سواء وجد طعمه فی حلقه اولا لان

الموجود فی حلقه اثره داخلا من المسام والمفطر الداخل من المنافذ كالمدخل والمخرج لامن المسام الذی هو جميع البدن للاتفاق "

(مرقاة ج ۴ ص ۲۶۹)

ابن ہمام رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ اگر کوئی روزہ دار سرمہ لگائے تو اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا خواہ حلق میں ذائقہ پائے یا نہ پائے کیونکہ حلق میں جو اثر پایا گیا ہے وہ مساموں کے ذریعے داخل ہوا ہے براہ راست نہیں روزہ اس چیز سے ٹوٹتا ہے جو براہ راست پیٹ یا دماغ تک پہنچے مساموں کا تعلق کل بدن سے ہے براہ راست پیٹ اور دماغ سے نہیں اس لئے مساموں کے ذریعے سرمہ کا اثر حلق میں آجائے تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔

لیکن آج کل ڈاکٹر سرجن حضرات کی تحقیق یہ ہے کہ آنکھ کا تعلق براہ راست حلق سے ہے اور حلق کا تعلق براہ راست معدہ سے ہے اس لئے اب دوسرے مسئلہ کو مدنظر رکھنا پڑے گا وہ یہ ہے کہ جائفہ پیٹ تک پہنچنے والے زخم یا رگ اور آمہ دماغ تک پہنچنے والے زخم یا رگ میں خشک دوا ڈالنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ وہ منجمد ہو جاتی ہے صرف اسکے اثر یا ذائقہ سے روزہ نہیں ٹوٹتا لیکن تر دوا سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ وہ براہ راست پیٹ یا دماغ تک پہنچ جاتی ہے اسی مسئلہ سے آنکھ کا مسئلہ سرجن حضرات کی تحقیق کے مطابق یوں بیان کیا جائے کہ سرمہ لگانا جائز ہے کیونکہ یہ خشک دوا ہے اور خصوصاً نبی کریم ﷺ کا روزہ کی حالت میں سرمہ لگانا اور سرمہ لگانے کی اجازت دینا واضح کر رہا ہے کہ سرمہ لگانا جائز ہے لیکن تر دوا براہ راست حلق میں آجاتی ہے اس لئے اگر کوئی شخص بہت احتیاط سے کام لے کہ بار بار دوا کے اثر کو تھوکتا رہے معدہ میں نہ جانے دے تو روزہ ٹوٹے گا نہیں البتہ مکروہ ہوگا کیونکہ کسی چیز کا روزہ دار کو بغیر عذر کے چکھنا مکروہ ہے لیکن اگر احتیاط سے کام نہ لے آنکھ میں ڈالی ہوئی دوا براہ راست حلق میں آگئی اور معدہ میں پہنچ گئی تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔

اعتراض : جس حدیث سے سرمہ لگانا جائز ثابت کیا گیا ہے اس کے متعلق تو ترمذی نے یہ تحریر کیا ہے " ليس اسناده بالقوی وابو عاتكة الراوی يضعف " اس حدیث کے راویوں میں ابو عاتکہ راوی پائے گئے جن کو ضعیف قرار دیا گیا ہے لہذا اس حدیث کی سند قوی نہ رہی۔ جب حدیث کا

ضعیف ہونا ثابت ہو گیا تو اس سے حکم جواز کیسے ثابت ہے جب کہ اصول حدیث میں واضح طور پر قانون موجود ہے کہ ضعیف احادیث سے احکام ثابت نہیں ہو سکتے۔

جواب: ضعیف حدیث جب متعدد طرف سے ثابت ہو جائے تو وہ حسن لغیرہ بن جاتی ہے اس سے احکام ثابت ہو سکتے ہیں۔" **واخرج الترمذی عن عائشة قالت اکتحل النبی ﷺ وهو صائم**" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی کریم ﷺ نے روزہ کی حالت میں سرمہ لگایا ہے۔ "**واخرجه البیهقی مرفوعا بسند ضعیف**" بیہقی نے سند ضعیف سے یہی حدیث جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی گئی ہے مرفوع طور پر ذکر کی ہے "**واخرجه ابو داؤد موقوفا علی انس**" اور ابو داؤد نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے موقوف حدیث بیان کی ہے:

"**فهذه عدة طرق وان لم یحتج بواحد منها فالمجموع یحتج به لتعدد الطرق**"

یہ حدیث (سرمہ لگانے والی) متعدد طرق سے ثابت ہے اگر چہ ایک ایک حدیث سے علیحدہ علیحدہ طور پر حجت نہیں پکڑی جا سکتی لیکن متعدد طرق کے مجموع کو دلیل بنایا جا سکتا ہے۔

اعتراض:

ابو داؤد کی ایک حدیث میں تو روزہ دار کے لئے سرمہ لگانے کی ممانعت ہے تو جواز کس طرح ثابت ہوگا:

"**ما فی ابی داؤد انه علیه الصلوة والسلام امر بالاثمد عند النوم وقال لیتقه الصائم**"

بیشک نبی کریم ﷺ نے سوتے وقت سرمہ لگانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ روزہ دار سرمہ لگانے سے بچ جائے۔

جواب: یہ حدیث ضعیف ہے اس کو دوسری ضعیف احادیث کی تائید بھی خاص نہیں کہ حسن لغیرہ بن جائے۔ لیکن سرمہ لگانے والی احادیث ضعیف ہونے کے باوجود متعدد طرق سے ثابت ہیں وہ اس درجہ میں ہیں کہ حسن لغیرہ ان کو کہا جا سکتا ہے اور ان سے احکام ثابت کرنے کے لئے استدلال درست ہے۔

"**انه علیه الصلوة والسلام کان یکتحل بالاثمد وهو صائم**" (بیهقی، حاکم)

بیشک نبی کریم ﷺ روزہ کی حالت میں سرمہ لگاتے تھے:

"**وعن ابن عمر رضی الله عنهما قال خرج علینا رسول الله ﷺ**

وعیناه مملؤ تان من الکحل و ذلک فی رمضان "

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رمضان شریف میں ایک مرتبہ تشریف لائے تو آپ کی آنکھیں سرمہ سے پر تھیں۔ یہ دونوں حدیثیں بھی ضعیف الاسناد ہونے کے باوجود سرمہ لگانے والی دوسری احادیث کی تائید کرتی ہیں۔ (از مرقاۃ)

کان اور ناک میں روزہ دار کا دوا ڈالنا:

ناک کا تعلق براہ راست دماغ اور معدہ سے ہے اس لئے ناک میں دوا ڈالنا منع ہے کیونکہ اگر دوا دماغ یا پیٹ تک پہنچ گئی تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔ اگر چہ کان میں پردہ ہے براہ راست دماغ اور پیٹ سے تعلق تو نہیں لیکن فقہاء کرام نے کان میں دوا ڈالنے سے منع کیا ہے لہذا کان میں دوا ڈالنے سے اجتناب کیا جائے۔

گرمی اور پیاس کی وجہ سے روزہ دار کا سر پر پانی ڈالنا:

" وعن بعض اصحابہ النبی ﷺ قال قد رأیت النبی ﷺ بالعرج یصب علی رأسہ الماء وھو صائم من العطش او من الحر "

(رواہ مالک وابو داؤد ، مشکوۃ کتاب الصوم)

نبی کریم ﷺ کے ایک صحابی فرماتے ہیں کہ تحقیق میں نے دیکھا نبی کریم ﷺ کو مقام عرج میں پیاس یا گرمی کی وجہ سے روزہ دار ہونے کے باوجود اپنے سر پر آپ پانی ڈال رہے ہیں۔

وضاحت حدیث : اگر چہ حدیث پاک کی سند میں راوی صحابی کا نام نہیں ذکر کیا لیکن ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ مواہب اللدنیہ میں فرماتے ہیں " الجھالۃ بالصحابی لاتضر ای لان الصحابۃ کلھم عدول " صحابی کا نام نہیں ذکر کیا اور صرف یہ کہہ دینا کہ یہ حدیث ایک صحابی سے مروی ہے کافی ہے کیونکہ صحابی کے مجہول ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑھتا اس لئے کہ تمام صحابہ کرام عادل ہیں ان کی روایات معتبر ہیں۔

حدیث پاک سے یہ واضح ہوا کہ گرمی کی شدت سے بچنے کے لئے غسل کرنا سر پر پانی ڈالنا اور کپڑا اتر کر کے سر پر رکھنا جائز ہے۔

اعتراض: نبی کریم ﷺ نے جب روزہ کی حالت میں گرمی اور پیاس سے بچنے کے لئے اپنے سر پر پانی ڈالا تو امام اعظم رحمہ اللہ اسے مکروہ کیوں کہتے ہیں؟

جواب: " وھو علیہ الصلوۃ والسلام فعل ذلک لبیان الجواز من اظہار العجز للرحمۃ علی ضعفاء الامۃ "

نبی کریم ﷺ نے یہ فعل جواز ثابت کرنے کے لئے کیا ہے کہ جب میری امت کے لوگ روزہ کی تکمیل سے عاجز ہو جائیں تو اس پر عمل کر لیں آپ کا یہ فعل درحقیقت امت پر رحمت کے لئے تھا۔ یہ بھی خیال رہے کہ بعض کام خلاف اولیٰ ہوتے ہیں یعنی ان پر عمل کرنا بہتر نہیں ہوتا لیکن ان کا جواز ثابت کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ پر واجب ہوتا ہے کہ آپ اس پر عمل کریں۔ آپ جب اس پر عمل کریں گے اس کا ثواب وجوب والا حاصل ہوگا اور وہی کام امت کے لئے جائز ہونے کے باوجود بہتر نہیں ہوگا اسی وجہ سے امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ روزہ کی حالت میں عبادت سے ضجر اور تنگی محسوس کرتے ہوئے سر پر پانی بہانا اور تر کپڑا لپیٹنا خلافِ اولیٰ ہے لیکن انسان جب اپنے آپ کو عاجز سمجھتے ہوئے یہی کام کرے تو امام اعظم رحمہ اللہ بھی اسے خلافِ اولیٰ نہیں کہتے۔ (از مرقاۃ ج۴ ص۲۶۹)

فوائد: " عن ام ھانی قالت لما کان یوم الفتح فتح مکۃ جاء ت فاطمۃ فجلست علی یسار رسول اللہ ﷺ وام ھانی عن یمینہ فجاء ت الولیدۃ باناء فیہ شراب فناولتہ فشرب منہ ثم ناولہ ام ھانی فشربت منہ فقالت یا رسول اللہ لقد افطرت وکنت صائمۃ فقال لھا اکنت تقضین شیئا قالت لا قال فلا یضرک ان کان تطوعا رواہ ابو داؤد والترمذی والدارمی وفی روایۃ لاحمد والترمذی . نحوہ وفیہ فقالت یا رسول اللہ اما ان کنت صائمۃ فقال الصائم المتطوع امیر نفسہ ان شاء صام وان شاء افطر " (مشکوۃ کتاب الصوم)

حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں فتح مکہ کے دن میں نبی کریم ﷺ کی دائیں جانب بیٹھی ہوئی تھی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں اور آپ کی دوسری جانب بیٹھ گئیں اتنے میں ایک لڑکی پانی کا پیالہ لائی تو نبی کریم ﷺ نے اس سے کچھ پیا پھر ام ہانی رضی اللہ عنہا کو دیا انہوں نے اس سے پیا پھر عرض کیا یا رسول اللہ میں نے افطار کر لیا حالانکہ میں روزہ دار تھی تو آپ نے فرمایا کیا تم کوئی چیز قضاء کر رہی تھی انہوں نے کہا نہیں آپ نے فرمایا اگر یہ روزہ نفلی تھا تو تمہارا اس میں کوئی نقصان نہیں ہوا۔ ترمذی

کی روایت میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ میں تو روزہ دار تھی تو آپ نے فرمایا نفلی روزہ رکھنے والا اپنے نفس کا امیر ہوتا ہے چاہے تو روزہ رکھے اور چاہے تو افطار کرلے۔

وضاحت حدیث: حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا ابوطالب کی بیٹی ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی چچازاد بہن اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بہن ہیں۔

حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ کی بائیں جانب بیٹھنا کیوں پسند کیا؟ اسکی کئی وجوہ ہیں:

(۱) نبی کریم ﷺ نے خود ارشاد فرمایا ہو کہ ادھر بیٹھ جاؤ۔

(۲) انہوں نے خود خیال کیا ہو کہ نبی کریم ﷺ کا دل تو بائیں جانب ہے لہذا اسی جانب بیٹھنے کو ترجیح دی کہ دل کی توجہ ادھر ہی زیادہ ہوگی۔

(۳) ممکن ہے کہ آپ بائیں طور بطور عجز بیٹھ گئی ہو کہ ام ہانی میرے خاوند کی بہن ہیں اور میرے بچوں کی پھوپھی ہیں اور میرے والد محترم کے چچا کی بیٹی ہیں اور یہ بھی ممکن کہ وہ آپ سے بڑی ہوں تو ان کے بڑے ہونے کا بھی لحاظ کیا ہو۔

(۴) اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضور ﷺ کی دائیں جانب جگہ نہ ہو تو بائیں جانب بیٹھ گئی ہوں۔

"فجاءت الولیدۃ باناء فیہ شراب" اس مقام میں "شراب" کا معنی "پانی" لیا گیا ہے کیونکہ مطلق "شراب" جب عربی زبان میں استعمال ہو تو اس سے مراد پانی ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے پہلے مشروب حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کو دیا کیونکہ وہ دائیں جانب تھیں نبی کریم ﷺ دائیں جانب سے ہی ابتداء کو پسند فرماتے تھے۔ حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا نے پانی پینے کے بعد نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں روزہ دار تھی میں نے روزہ افطار کرلیا پہلے کیوں نہیں بتایا۔ اس کی دو وجہ ہیں۔

(۱) " قال ابن حجر وانما لم تذكر هذا قبل تناولها ايثارا لما آثرها به من التقديم على بنته سيدة النساء وذلک عندها اشرف واعلى من الصوم "

ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا نے پانی پینے سے پہلے نہیں بتایا کیونکہ جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا سے پہلے ان کو مشروب دیا تو انہوں نے روزہ سے اعلیٰ اور اشرف پانی سمجھا اسی لئے پہلے جلدی سے پی لیا پھر بتایا۔

(۲) "او قصدها فانها لم تذکر خوفا عن فوت سؤره علیه الصلوة والسلام"

یا انہوں نے ارادہ تو کیا ہو کہ پہلے بتادیں لیکن پھر اس ڈر سے نہ بتایا ہو کہ نبی کریم ﷺ کے بقیہ پانی (جوٹھے) سے کہیں محروم نہ ہو جاؤں "اکنت تقضین شیأ" کا مطلب یہ ہے کہ کیا تمہارے ذمہ کوئی روزے واجب تھے کہ ان کی قضاء کا یہ روزہ رکھ رہی تھی؟ انہوں نے کہا نہیں یہ روزہ قضاء کا تو نہیں تھا۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا اگر نفلی روزہ تھا تو تمہیں کوئی ضرر لاحق نہیں ہوا یعنی کوئی گناہ نہیں ہوا۔ نفلی روزہ بغیر عذر کے نہیں توڑنا چاہئے اور عذر کی وجہ سے توڑا جا سکتا ہے۔ اگر عذر یا بغیر عذر کے نفلی روزہ توڑ دے تو اس کی قضاء لازم ہوگی کفارہ لازم نہیں آئے گا۔ (از مرقاۃ)

☆ "وعن الزهری عن عروة عن عائشة قالت كنت انا وحفصة صائمتين فعرض لنا طعام اشتهيناه فاكلنا منه فقالت حفصة يا رسول الله انا كنا صائمتين فعرض لنا طعام اشتهيناه فاكلنا منه قال اقضيا يوما آخر مكانه" (رواه الترمذی، مشکوۃ کتاب الصوم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں اور حفصہ روزہ دار تھیں ہمیں طعام دیا گیا (ہمیں سخت بھوک کی وجہ سے) خواہش غالب ہوئی تو ہم نے طعام کھا لیا۔ تو حضرت حفصہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم دونوں روزہ دار تھیں۔ ہمیں طعام دیا گیا ہم پر (بھوک کی وجہ سے) خواہش غالب ہوئی تو ہم نے اس طعام سے کھا لیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اس کی جگہ ایک دن روزہ قضاء کر لینا۔

اس حدیث سے بھی واضح ہوا کہ عذر کی وجہ سے نفلی روزہ توڑا جا سکتا ہے لیکن قضاء کرنا لازم ہے۔

روزہ دار کا افطار والوں کے پاس صابر رہنا باعث اجر و ثواب ہے:

☆ "وعن ام عمارة بنت كعب ان النبی ﷺ دخل عليها فدعت له بطعام فقال لها كلی فقالت انی صائمة فقال النبی ﷺ ان لصائم اذا اكل عنده صلت عليه الملائكة حتی يفرغوا" (رواه احمد والترمذی وابن ماجه والدارمی مشكوة كتاب الصوم)

ام عمارہ بنت کعب کہتی ہیں بیشک نبی کریم ﷺ ہمارے گھر تشریف لائے تو انہوں نے آپ کیلئے طعام طلب کیا تو آپ نے ان کو کہا تم بھی کھاؤ تو انہوں نے کہا میں روزہ دار ہوں تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک روزہ دار کے پاس جب کھایا جائے تو اس کے لئے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں یہاں تک کہ وہ (کھانے والے کھانے سے) فارغ ہو جائیں۔

حدیث شریف کا مطلب واضح ہے کہ باقی لوگ روزہ افطار کرنے والے ہوں ان کے کھانے کے دوران روزہ دار صبر سے بیٹھا رہے تو فرشتے اس کے لئے رحمت کی دعا کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ کھانے والے لوگ کھانے سے فارغ ہو جائیں۔

☆ " عن بریدة قال دخل بلال علی رسول الله ﷺ وهو یتغدی فقال رسول الله ﷺ الغداء یا بلال قال انی صائم یا رسول الله فقال رسول الله ﷺ نأکل رزقنا وفضل رزق بلال فی الجنة اشعرت یا بلال ان الصائم یسبح عظامه ویستغفر له الملائکة ما اکل عنده "

(رواه البیهقی فی شعب الایمان ، مشکوٰة کتاب الصوم)

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضرت بلال رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے رسول اللہ ﷺ صبح کا کھانا کھا رہے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے بلال صبح کا کھانا حاضر ہے حضرت بلال نے کہا یا رسول اللہ میں روزہ دار ہوں، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہم اپنا رزق کھا رہے ہیں اور بلال کا جنت میں فاضل رزق ہے اے بلال کیا تمہیں معلوم ہے بیشک روزہ دار کی ہڈیاں تسبیح پڑھتی ہیں اور فرشتے اس کے لئے استغفار کرتے ہیں جب تک اس کے پاس کھایا جائے۔

وضاحت حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" نأکل رزقنا " ہم اپنا رزق کھاتے ہیں"ای رزق الله تعالٰی الذی اعطانا الآن " یعنی اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو رزق اب عطا کیا ہے وہ ہم کھا رہے ہیں " وفضل رزق بلال " یعنی بلال کو ہمارے کھانے سے اعلیٰ اور فضیلت والا کھانا جنت میں حاصل ہوگا اسے روزے کی جزاء حاصل ہوگی کیونکہ روزے نے ابھی اسکو کھانے سے روک رکھا ہے:

" ما اکل عنده " ای ما دام یؤکل عند الصائم جزاء علی صبره حال جوعه "

یعنی جب تک روزہ دار کے پاس دوسرے لوگ کھانا کھاتے رہیں وہ بھوک پر صابر رہے تو اسے یہ جزاء حاصل ہوتی ہے کہ اس کی ہڈیاں اللہ تعالیٰ کی تسبیح پڑھتی ہیں جس کا ثواب اس شخص کو حاصل ہوتا ہے اور فرشتے اس کے لئے استغفار کرتے ہیں۔ (از مرقاة)

سبحان اللہ روزہ دار کا کیا عظیم مقام ہے کہ وہ ہستیاں اس کے لئے بخشش طلب کرتی ہیں جن کی دعا کی قبولیت یقینی ہوتی ہے۔

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ

۱) ''اور اے محبوب جب تم سے میرے بندے مجھے پوچھیں تو میں نزدیک ہوں دعا قبول کرتا ہوں پکارنے والے کی جب مجھے پکارے تو انہیں چاہئے میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں کہ کہیں راہ پائیں''

۲) ''اور جب سوال کریں آپ سے (اے میرے حبیب) میرے بندے میرے متعلق تو بیشک میں قریب ہوں قبول کرتا ہوں دعا، دعا کرنے والے کی جب دعا مانگے مجھ سے تو چاہئے کہ وہ مجھ سے قبولیت طلب کریں اور مجھ پر ایمان لائیں تا کہ وہ ہدایت پا جائیں''۔

شان نزول: چند واقعات کے درپیش آنے کے بعد اس آیۃ کریمہ کا نزول ہوا گویا کہ تمام وجوہ اجتماعی طور پر وجہ نزول ہیں۔

☆ '' اخرج ابن جریر والبغوی فی معجمه وابن ابی حاتم وابو الشیخ وابن مردویه من طریق الصلت بن حکیم عن رجل من الانصار عن ابیه عن جده قال جاء رجل الی رسول الله ﷺ فقال یا رسول الله اقریب ربنا فنناجیه ام بعید فننادیه فسکت النبی ﷺ فانزل الله ﴿ وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ......الخ) (درمنثور)

ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کرنے لگے یا رسول اللہ کیا ہمارا رب مقرب ہے کہ ہم اس سے آہستہ دعا کریں یا دور ہے کہ ہم پکار پکار کر دعا کریں؟ تو نبی کریم ﷺ (وحی کی انتظار میں) خاموش رہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا:

☆ '' واخرج عبد الرزاق وابن جریر عن الحسن قال سال اصحابه النبی ﷺ این ربنا فانزل الله ﴿ وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ الایة ﴾ (درمنثور)

حضرت حسن بصری فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام نے پوچھا ہمارا رب کہاں ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا۔

☆ " وروی الکلمی عن ابی صالح عن ابن عباس قال قالت الیهود کیف یسمع ربنا دعاء نا وانت تزعم ان بیننا وبین السماء خمسمائة عام فغلظ کل سماء مثل ذلک فنزلت هذه الایة " (قرطبی)

یہود نے کہا ہمارا رب کس طرح ہماری دعاؤں کو سنتا ہے جو تم یہ گمان کرتے ہو کہ ایک آسمان اور دوسرے آسمان کے درمیان پانچ سو سال کی راہ ہے اور ہر آسمان کی موٹائی پانچ سو سال کی راہ ہے تو یہ آیۂ کریمہ نازل ہوئی۔

☆ " اخرج عبد بن حمید وابن المنذر عن عبد الله بن عبید قال لما نزلت هذه الآیة ﴿ اُدْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ﴾ قالوا کیف لنا به ان نلقاه حتی ندعوه فانزل الله ﴿ وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ﴾ الآیة ، فقالوا صدق ربنا وهو بکل مکان " (درمنثور)

عبداللہ بن عبید کہتے ہیں جب یہ آیۂ کریمہ نازل ہوئی ﴿اُدْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ﴾ مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا کو قبول کروں گا۔ تو صحابہ کرام نے عرض کیا ہم کس طرح اللہ تعالیٰ کی ملاقات کرسکتے ہیں کہ ہم اس سے دعا کریں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۂ کریمہ کو نازل کیا، تو صحابہ کرام نے کہا ہمارے رب تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے کہ وہ ہر جگہ پر موجود ہے۔

☆ " واخرج وکیع وعبد بن حمید وابن جریر وابن المنذر وابن حاتم عن عطاء بن ابی رباح انه بلغه لما انزلت ﴿ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ﴾ قالوا لو نعلم ای ساعة ندعو فنزلت ﴿ وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ﴾ الی قوله ﴿ یَرْشُدُوْنَ ﴾"

عطاء بن ابی رباح کہتے ہیں کہ انہیں یہ خبر ملی ہے کہ جب رب تعالیٰ نے اس آیۂ کریمہ کو نازل فرمایا ﴿ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ﴾ (اور تمہارے رب نے کہا مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا کو قبول کروں گا) تو صحابہ کرام نے عرض کیا کاش کہ ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ ہم کس گھڑی میں دعا کریں تو یہ آیۂ کریمہ نازل ہوئی۔

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ : اور جب سوال کریں آپ سے (اے میرے حبیب) میرے بندے میرے متعلق ضمیر منصوب متصل (ک) نبی کریم ﷺ کی طرف راجع ہے اسی لئے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ میں "اے محبوب" ذکر فرمایا اور حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا "اے

میرے حبیب'' راقم نے بھی ترجمہ ضیاء القرآن سے لیا ہے اس لئے'' اے میرے حبیب'' ہی ذکر کیا ہے۔

ما قبل سے ربط:

اللہ تعالیٰ نے پہلے روزے کی فرضیت کا ذکر فرمایا اور روزے کے احکام ذکر فرمائے پھر ارشاد فرمایا:

﴿ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾

''اور اللہ تعالیٰ کے بڑائی بیان کرو جو اس نے تمہیں ہدایت دی ہے اور تا کہ تم شکر گزار بن جاؤ''۔

جب بندے کو بڑائی بیان کرنے اور شکر کرنے کا حکم دیا ہے تو اس آیۃ کریمہ میں گویا کہ:

" بین انه سبحانه بلطفه ورحمته قريب من العبد مطلع على ذكره وشكره فيسمع نداءه ويجيب دعاءه ولا نجيب رجاءه "

بیان فرمایا کہ بیشک اللہ تعالیٰ اپنے لطف اور اپنی رحمت کے لحاظ پر بندے کے قریب ہے اور جو اسے یاد کرے اور جو اس کا شکریہ ادا کرے وہ اس پر مطلع ہوتا ہے بندے کی نداء کو سنتا ہے اور اس کی دعا کو قبول فرماتا ہے اور اس کی امید سے اسے رسوانہیں کرتا۔ اور وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے تکبیر کا حکم دیا پھر دعا میں رغبت دلائی " تنبيها على ان الدعاء لا بدوان يكون مسبوقا بالثناء الجميل " اس پر متنبہ کرتے ہوئے کہ بیشک دعا کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ کی تعریف کرے پھر دعا کرے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلے اللہ تعالیٰ کی ثناء کی پھر دعا کی، ثناء ان الفاظ مبارکہ سے کی:

﴿ اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ☆ وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ☆ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ☆ وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ ☆ وَالَّذِیْ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَلِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ﴾

وہ جس نے مجھے پیدا کیا تو وہ مجھے راہ دے گا اور وہ جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے اور وہی مجھے وفات دے گا پھر مجھے زندہ کرے گا اور وہ جس کی مجھے آس لگی ہے کہ میری خطائیں قیامت کے دن بخشے گا۔ اللہ تعالیٰ کی اتنے الفاظ مبارکہ سے ثناء کرنے کے بعد ان الفاظ مبارکہ سے دعا کی:

﴿ رَبِّ هَبْ لِیْ حُكْمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ☆ وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ ☆ وَاجْعَلْنِیْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِیْمِ ﴾

''اے میرے رب مجھے حکم عطا کر اور مجھے ان سے ملا دے جو تیرے قرب خاص کے سزاوار ہیں اور میری سچی ناموری رکھ پچھلوں میں اور مجھے ان میں سے کر جو چین کے باغوں کے وارث ہیں۔

(الشعراء ۸۳ تا ۸۵)

فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ: ''تو بیشک میں قریب ہوں'' یعنی اے میرے حبیب جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق سوال کریں تو آپ ان کو بتا دیں کہ بیشک میں قریب ہوں۔

تنبیہ: شان نزول میں جب مختلف وجوہ ذکر کر دی گئیں تو ان سے ہی واضح ہو گیا کہ رب تعالیٰ کے متعلق سوال کرنے والوں کے مختلف انداز تھے۔ بعض نے سوال کیا اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق کہ وہ کیسی ذات ہے، کیا اسے کسی چیز سے تشبیہ دی جا سکتی ہے یا نہیں کیا وہ کسی مکان کے لحاظ پر قریب ہے یا بعید ہے کیا اس کی ذات قریب ہے یا بعید۔ بعض کا سوال اس کی صفات کے متعلق تھا کہ کیا اللہ تعالیٰ ہماری دعا کو سنتا ہے؟ ہم دعا کریں تو کیا واقعی یہ سمجھ لیں کہ اس رب تعالیٰ سے دعا کر رہے جو سمیع ہے؟ اسی طرح صفات کے متعلق سوال کرنے والوں کا یہ مطلب بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دعاء کرنے کی کس طرح اجازت ہے کیا اس کی طرف سے دعا کرنے کی اجازت بھی ہے یا نہیں۔ کیا ہم اس کے تمام اسماء سے اسے پکار کر دعا کر سکتے ہیں یا بعض معین اسماء کو ہی دعا میں شامل کر سکتے ہیں۔ کیا ہم اللہ تعالیٰ سے ہر قسم کی دعا کر سکتے ہیں یا خاص قسم کی دعا کر سکتے ہیں۔

تو رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرما کر اور نبی کریم ﷺ نے وضاحت فرما کر تمام سوالوں کا جواب دے دیا۔ اللہ تعالیٰ جسم سے پاک ہے اپنی رحمت کے لحاظ پر قریب اس کے تمام نام ہی پاکیزہ ہیں جس نام سے چاہو اسے پکار لو۔ جب چاہو اس سے دعا کرو کوئی وقت معین نہیں۔ جو چاہو اس سے مانگو البتہ حرام چیزیں اس سے نہ مانگو۔ اجمالی طور پر جن چیزوں کو ابھی ذکر کیا ہے ان کو تفصیلی طور پر انشاء اللہ ساتھ ہی ذکر کیا جا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے کا کیا مطلب؟

" فهنا قرب معنوی لا حسی فليس الله مادة ولا جسما ولا عرضا وانما هو مقدس عن المادة يتعالى عن النور " (جو اهر طنطاوی)

یہاں قرب سے مراد قرب معنوی ہے، حسی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نہ مادہ ہے اور نہ ہی جسم ہے اور نہ

ہی عرض ہے وہ مادہ سے مقدس ہے وہ نور سے بلند ذات ہے لہذا یہ بیان کرنا ممکن ہی نہیں کہ یہ کہا جائے کہ وہ ذات فلاں مادہ سے بنی ہوئی ہے:

" اعلم انه ليس المراد من هذا القرب بالجهة والمكان بل المراد منه القرب بالعلم والحفظ "

اس مقام میں قرب سے مراد یہ نہیں کہ اس کی جہت کا ذکر ہو یا اس کے مکان کا ذکر ہو کہ وہ فلاں جہت یا فلاں مکان میں قریب ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ علم اور حفاظت اور رحمت اور دعا کی قبولیت کے لحاظ پر قریب ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا قرب مکانی ثابت کیا جائے تو اسکی طرف اشارہ کرنا بھی ممکن ہوگا اور جس چیز کی طرف اشارہ ہو سکے وہ منقسم بھی ہو سکتا ہے یہ تمام چیزیں حدوث پر دلالت کرتی ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ حدوث سے پاک ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کا قرب اس طرح ثابت کیا جائے جو اس کی شان کے لائق ہے یعنی جب وہ سوال کریں " اين ربنا " ہمارا رب کہاں ہے تو ان کو جواب دو " فانى قريب " بیشک میں مکان اور جسم سے پاک ہوں ہر جگہ پر موجود ہونے کے لحاظ پر قریب ہوں اگر وہ سوال کریں " هل يسمع ربنا دعاء نا " کیا ہمارا رب ہماری دعا سنتا ہے؟ تو ان کو جواب دیا جائے:

﴿ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ﴾ فان القريب من المتكلم يسمع كلامه "

کہ بیشک میں قریب ہوں جو متکلم کے قریب ہوتا ہے وہ اس کے کلام کو بھی سنتا ہے اور اگر وہ سوال کریں کہ ہم دعا بلند آواز سے کریں یا آہستہ " صح ان يجيب بقوله ﴿ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ﴾ تو صحیح یہ ہے کہ ان کو میرے قول سے ہی جواب دیا جائے ﴿ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ﴾ بیشک میں قریب ہوں۔

" وان سألوه انه هل يعطينا مطلوبنا بالدعاء ؟ صلح هذا الجواب "

اگر وہ سوال کریں کہ کیا اللہ تعالیٰ دعا سے ہمیں مطلوب عطا کرے گا یا نہیں تو یہی جواب دو کہ میں قریب ہوں دعا کرنے والے کی دعا کو قبول کرتا ہوں۔ اگر وہ سوال کریں کہ اگر ہم گناہ کر کے توبہ کر لیں تو کیا وہ ہماری توبہ قبول فرماتا ہے تو اس کا جواب بھی یہی دیا جائے:

" فانى قريب اى فانا القريب بالنظر لهم والتجاوز عنهم وقبول التوبة منهم "

بیشک میں قریب ہوں یعنی میں لان کی طرف نظر رحمت فرمانے کے لحاظ پر اور ان سے تجاوز کرنے پر اور ان کی توبہ قبول کرنے کے لحاظ پر قریب ہوں۔ (از کبیر)

أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ : دعا کرنے والا جب مجھ سے دعا کرتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں'' " الداع " ناقص واوی ہے واو یاء سے بدل جاتی ہے " الداعی " بن جاتا ہے اور "دعان " بھی اصل میں " دعانی " ہے یاء متکلم ضمیر متصل مفعول ہے:

" قرأ ابو عمرو وقالون عن نافع ﴿ الداعی اذا دعانی ﴾ باثبات الیاء فیھما فی الوصل والباقون بحذ فھا فالاولی علی الوصل والثانیة علی التخفیف "

ابوعمرو اور قالون نے نافع کی قراءت کے مطابق دونوں مقاموں میں یاء کو ثابت رکھ کر پڑھا ہے ﴿ الداعی اذا دعانی ﴾ اور باقی حضرات نے یاء کو حذف کیا ہے، یاء کو باقی رکھ کر پڑھنا بہتر ہے اگرچہ حذف میں تخفیف ہے۔

اعتراض : آیۃ کریمہ سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ ہر شخص کی دعا قبول ہوتی ہے حالانکہ کتنے لوگ دعا کرتے ہیں ان کی دعا قبول نہیں ہوتی تو اس آیۃ کریمہ کا کیا مطلب ہے؟

پہلا جواب: دعاء کی قبولیت کے تین طریقے ہیں ان میں سے کسی ایک طریقہ پر دعا قبول ہو جاتی ہے بندہ سمجھتا ہے شائد دعاء قبول نہیں ہوئی حالانکہ دعا قبول ہو چکی ہوتی ہے وہ تین طریقے یہ ہیں یا تو دعا دنیا میں ہی قبول ہو جائے یعنی جس چیز کا مطالبہ کر رہا ہے وہ چیز حاصل ہو جائے یا وہ دعا اس کی خطاؤں اور لغزشوں کا کفارہ بن جائے یا اس دعا کو آخرت کے لئے ذخیرہ بنا دیا جائے کہ اسے آخرت میں اس دعا کا نفع حاصل ہو جائے۔

اسی قول پر حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی ایک روایت شاہد ہے وہ فرماتے ہیں:

" قال رسول اللہ ﷺ ما من مسلم یدعو بدعوۃ لیس فیھا اثم ولا قطیعۃ رحم الا اعطاہ اللہ بھا احدی ثلاث اما ان یعجل له دعوته واما ان یدخرله واما ان یکف عنه من السوء بمثلھا قالوا اذن نکثر قال اللہ اکثر "

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی مسلمان ایسا نہیں جو دعا کرے اس کی دعا گناہ پر مبنی نہ ہو اور اس کی دعا میں قطع رحم کا مطالبہ نہ ہو تو سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ اسے اس دعا کے ذریعے تین چیزوں میں ایک چیز عطا کرتا ہے۔ یا اس کی دعا کو جلدی قبول کر لیتا ہے یا اس کی دعا کو ذخیرہ بنا لیا جاتا ہے یا اس کی دعا کی مثل اسے گناہوں سے روک دیا جاتا ہے۔ صحابہ کرام نے کہا (یا رسول اللہ) اب تو ہم زیادہ دعا کریں

گے آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ بھی تمہیں زیادہ عطا کرے گا۔

☆ یہ حدیث ابوعمر بن عبدالبر نے تخریج کی اور اسے ابومحمد عبدالحق نے صحیح کہا ہے اور یہ مؤطا میں بھی منقطع السند (سند کے انقطاع سے) موجود ہے اور ابوعمر نے کہا ہے یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ﴾ کی تفسیر میں مسند طور پر بھی مذکور۔ اس حدیث سے یہ واضح ہو گیا کہ ہر دعا قبول ہوتی ہے:

☆ "وقال ابن عباس کل عبد دعا استجیب له فان کان الذی یدعو به رز قاله فی الدنیا اعطیه وان لم یکن رزقا له فی الدنیا ذخرله"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ہر شخص کی دعا قبول کی جاتی ہے اگر وہ شخص جو دعا کر رہا ہے اس کا حصہ دنیا میں ہے تو دنیا میں ہی وہ چیز اسے عطا کر دی جاتی ہے اور اگر اس کا حصہ دنیا میں نہیں تو وہ اس کے لئے (آخرت میں) ذخیرہ بنا دی جاتی ہے۔

☆ "عن ابن عمر النبی ﷺ من فتح له فی الدعاء فتحت له ابواب الجنة"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص کے لئے دعا کا دروازہ کھول دیا گیا اس کے لئے جنت کے دروازے کھول دیئے گئے۔

☆ "واوحی اللہ تعالٰی الی داؤد ان قل للظلمة من عبادی لا یدعونی فانی اوجبت علی نفسی ان اجیب من دعانی وانی اذا اجبت الظلمة لعنتهم"

اور اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ میرے ظالم بندوں کو کہو کہ مجھ سے دعا نہ کریں کیونکہ میں نے اپنے کرم سے اپنے نفس پر واجب کر دیا ہے کہ میں دعاؤں کو قبول کروں گا بیشک جب ظالموں کی دعا میں قبول کروں گا تو ان پر لعنت کروں گا۔

یہاں یہ بھی خیال رہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ظالم اپنے ظلم پر رہتے ہوئے مجھ سے کسی چیز کا مطالبہ نہ کریں ورنہ ان کی دعا کو ضرور قبول کیا جائے گا لیکن ان پر اس کے بدلے لعنت بھیجی جائے گی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ظالم ظلم کو چھوڑ کر مجھ سے گناہوں کی معافی طلب نہ کریں اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے کہ اس سے گناہوں کی معافی طلب کی جائے۔

دوسرا جواب: اللہ تعالیٰ دعا کو قبول کرتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس میں کوئی مانع موجود نہ ہو اگر کوئی مانع موجود ہو تو پھر دعا کی قبولیت اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَاءَ ﴾

''اگر اللہ چاہے تو تمہاری دعا کو قبول کر کے تمہارے ضرر دور کر دے''

☆ "عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ لا يزال يستجاب للعبد ما لم يدع باثم او قطيعة مالم يستعجل قيل يا رسول الله ما الاستعجال قال يقول قد دعوت وقد دعوت فلم ار يستجيب لی فيستحسر عند ذلک ويدع الدعاء" (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندے کی دعا ہمیشہ قبول کی جاتی ہے جب تک وہ گناہ کی حصول کی دعا نہ کرے اور قطع رحم کی دعا نہ کرے اور جلدی نہ کرے صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ جلدی کرنے کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے فرمایا ایک شخص دعا کرے تو یہ کہے کہ میری دعا تو قبول نہیں ہو رہی وہ اس دعا سے ملال میں پڑ جائے، تھک جائے اور دعا کرنی ہی چھوڑ دے

اسی طرح ایک روایت بخاری، مسلم اور ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کی:

"ان رسول الله ﷺ قال يستجاب لاحدكم ما لم يعجل يقول دعوت فلم يستجب لی"

بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے ہر ایک کی دعاء کو قبول کیا جاتا ہے جب تک کہ وہ جلدی نہ کرے یعنی یہ کہے کہ میں نے دعا کی وہ قبول نہیں کی گئی (اس کا یہ کہنا دعا کی قبولیت سے مانع ہے)

واضح ہوا کہ گناہوں کے حصول کی دعا اور قطع رحم کی دعا اور دعا سے ملال میں پڑ کر دعا کو چھوڑ دینا یہ سب ذرائع ہیں دعا کے قبول نہ ہونے کے۔ اور دعا کے نہ قبول ہونے کا سبب حرام مال کا کھانا بھی ہے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی اس کی وضاحت کر رہا ہے:

"قال ﷺ الرجل يطيل السفر اشعث اغبر يمديديه الى السماء يا رب يا رب ومطعمه حرام ومشربه حرام وملبسه حرام وغذى بالحرام فانی يستجاب لذلک"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک شخص لمبا سفر کرتا ہے بال اسے کے بکھرے ہوئے اور غبار آلود

ہوتے ہیں وہ اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف پھیلاتا ہے اور کہتا ہے اے میرے رب اے میرے رب اس کی دعا کب قبول ہوگی جب کہ اس کا کھانا حرام ہے اور پینا حرام ہے اور اس کا لباس حرام ہے اور اسے حرام غذا حاصل ہو رہی ہے۔

☆ " وقیل لا براهيم بن ادهم ما بالنا ندعو فلا يستجاب لنا ؟ قال لانكم عرفتم الله فلم تطيعوه وعرفتم الرسول فلم تتبعوا سنته وعرفتم القرآن فلم تعملوا به واكلتم نعم الله فلم تؤدوا شكرها وعرفتم الجنة فلم تطلبوها وعرفتم النار فلم تهربوا منها وعرفتم الشيطان فلم تحاربوه ووافقتموه وعرفتم الموت فلم تستعدواله ودفنتم الاموات فلم تعتبروا وتركتم عيوبكم واشتغلتم بعيوب الناس "

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ سے پوچھا گیا ہمارا کیا حال ہے ہم دعا کرتے ہیں ہماری دعا قبول نہیں کی جاتی ؟ آپ نے فرمایا وجہ یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کو پہچانتے ہو لیکن اس کی اطاعت نہیں کرتے اور تم رسول اللہ ﷺ کو پہچانتے ہو لیکن تم ان کی سنت کی تابعداری نہیں کرتے اور تم قرآن کو پہچانتے ہو لیکن اس پر عمل نہیں کرتے ہو اور تم اللہ تعالیٰ کی نعمتیں کھاتے ہو لیکن تم ان نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے اور تم جنت کو پہچانتے ہو لیکن اسے طلب نہیں کرتے (یعنی ایسے عمل نہیں کرتے جس سے جنت حاصل ہو جائے) اور تم آگ کو پہچانتے ہو لیکن اس سے بھاگتے نہیں (یعنی ان اعمال سے بچنے کی کوشش نہیں کرتے تو جہنم سے بچانے والے ہیں) اور تم شیطان کو پہچانتے ہو لیکن اس سے لڑائی نہیں کرتے (یعنی اس کی مخالفت نہیں کرتے) بلکہ اس کی موافقت کرتے ہو (اس کے کہنے پر چلتے ہو) اور تم موت کو پہچانتے ہو لیکن اس کے لئے تیاری نہیں کرتے اور تم فوت شدہ حضرات کو دفن تو کرتے ہو لیکن خود ان سے تم عبرت حاصل نہیں کرتے اور تم اپنے عیوب کی پرواہ نہیں کرتے ہو لیکن لوگوں کے عیبوں کو تلاش کرنے میں مشغول رہتے ہو۔ (از قرطبی تفسیر)

دعا کرنے والے کے لئے شرائط: دعا کرنے والے کے لئے یہ علم حاصل ہونا ضروری ہے " لا قادر علی حاجته الا الله " کہ اس کی حاجت کو حقیقی طور پر پورا کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اس کے علم میں ہونا یہ بھی ضروری ہے " وان الوسائط فی قبضته ومسخرة بتسخيره " کہ تمام اسباب اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور اللہ تعالیٰ جن کو چاہے وہ اسباب ان کے تابع کر دے

یعنی مجازی طور پر بعض اسباب سے جن چیزوں کو حصول ہوتا ہے ان کے متعلق بھی معلوم ہونا چاہئے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ اور یہ ہے کہ دعا کرنے والا سچی نیت اور حضور قلب سے دعا کرے کیونکہ " **فان الله لا یستجیب دعاء من قلب غافل لاه** " بیشک اللہ تعالیٰ اس شخص کی دعا قبول نہیں فرماتا جو غافل دل اور لہو لعب میں مشغول دل سے دعا کرے۔ اور دعا کرنے والے کیلئے ضروری ہے کہ " **وان یکون مجتنبا لأکل الحرام** " حرام چیزوں کے استعمال سے اجتناب کرے یہاں یہ بھی خیال رہے کہ " **اکل الحرام** " کا بامحاورہ ترجمہ حرام اشیاء کا استعمال ہے۔ اور دعا کرنیوالے کیلئے یہ ضروری ہے " **وان لا یمل من الدعاء** " کہ دعا کرنے سے ملال میں نہ پڑے ایسا نہ ہو کہ یہ کہے میری دعا تو قبول نہیں ہوتی لہذا میں دعا کو ہی چھوڑ دیتا ہوں۔ (از قرطبی)

مطلوب چیز کے لئے شرط: جس چیز کو دعا میں طلب کر رہا ہے وہ شرعاً جائز ہو اس پر عمل کرنا جائز ہو کیونکہ نبی کریم ﷺ نے دعا کی قبولیت کو اس سے مشروط کیا ہے " **ما لم یدع باثم او قطیعة رحم** " کہ ہر دعا کرنے والے کی دعا قبول ہوتی ہے جب کہ وہ دعا گناہ کی اور قطع رحم کی نہ کرے " **فیدخل فی الاثم کل ما یاثم به من الذنوب** " نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی مطلق ہے اس لئے ہر قسم کے گناہوں کی دعا کرنا منع ہے کسی انسان کو ناحق نقصان پہنچانے کی دعا، چوری، ڈاکہ، غضب، جیب تراشی قتل و غارت، حصول رشوت اور حصول مظالم وغیرہا کی دعا حرام ہے۔

" **ویدخل فی الرحم جمیع حقوق المسلمین ومظالمهم** " نبی کریم ﷺ نے جو ارشاد فرمایا کہ قطع رحم کی دعا نہ کی جائے اس میں مسلمانوں کے تمام حقوق داخل ہیں کہ مسلمانوں کے حقوق کو پائمال کرنے کی دعا نہ کرے اور اس میں تمام مظالم داخل ہیں کہ لوگوں پر ظلم کرنے کی دسترس کی دعا نہ کرے۔ (از قرطبی)

شروط دعاء سات ہیں:

(۱) عاجزی سے دعا کرے۔ (۲) دعا کرنے والے کے دل میں خوف ہو۔

(۳) دعا کرنے والا دعا کی قبولیت کی امید کرے۔

(۴) دعا ہمیشہ کرتا ہی رہے، دعا سے دل ہٹائے نہیں۔

(۵) دعا کرنے والا خشوع سے دعا کرے۔

(۶) دعا کرنے والا عام لوگوں کے لئے دعا کرے صرف اپنے لئے دعا نہ کرے جب دعا میں عموم پایا جائے گا تو اور لوگوں کے لئے بھی اس میں بھلائی ہوگی اور ممکن ہے کہ کسی اور کے حق میں دعا کی قبولیت اس کے حق میں بھی قبولیت کا سبب بن جائے۔

(۷) اور دعا کرنے والا حلال چیزوں کا استعمال کرے۔ (از قرطبی)

دعاء کے آداب: دعا کے بہت سے آداب ہیں جن میں سے ہم کچھ عرض کرتے ہیں:

(۱) دعا کے وقت چاہئے کہ ہتھیلیاں آسمان کی طرف پھیلی ہوں دونوں ہاتھوں میں کچھ فاصلہ ہو نہ بہت نیچے ہوں اور نہ بہت اونچے بلکہ کندھے کے مقابل رہیں اور دعا کے بعد ان کو منہ پر پھیر لیا جائے۔ (مشکوۃ)

(۲) ضروری ہے کہ دعا کرنے والے کا رزق حلال ہو صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ دعا آسمان کے دروازہ کی کنجی ہے اور غذا حلال اس کنجی کے دانتے۔ (روح البیان)

(۳) دعا کے وقت دل حاضر ہو۔

(۴) دعا کے وقت قبول کی قوی امید ہونا نا امیدوں کی دعا قبول نہیں ہوتی۔

(۵) طریقہ دعا یہ ہے کہ اولاً حمد الٰہی کرے پھر حضور ﷺ پر درود بھیجے پھر اپنے گناہوں کو یاد کر کے توبہ کرے اور پھر عرض حاجات کرے پھر درود شریف پر ختم کرے دعا کے وقت اپنے مقصد کو دھیان میں رکھے کیونکہ خیال کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ (روح البیان)

(۶) بہتر ہے کہ صرف اپنے لئے دعا نہ کرے بلکہ اور مسلمانوں کے لئے بھی دعا کرے مگر ابتدا اپنے سے کرے۔ (نعیمی)

فائدہ: حضرت ابن عطار رحمہ اللہ فرماتے ہیں بیشک دعا کے لئے کچھ ارکان ہیں اور کچھ پر ہیں اور کچھ اسباب ہیں اور کچھ اوقات ہیں:

" فان وافق ارکانہ قوی وان وافق اجنحتہ طار فی السماء وان وافق مواقیتہ فازوان وافق اسبابہ انجح "

جب دعا کے ارکان پائے جائیں گے تو دعا کو قوت حاصل ہوگی اور اگر دعا کے پر پائے گئے تو دعا کو آسمانوں تک اڑان حاصل ہوگی اور اگر دعا اوقات قبولیت میں پائی گئی تو کامیابی حاصل ہوگی اور اگر دعا میں اسباب پائے گئے تو دعا کی قبولیت میں کامیابی حاصل ہوگی۔

" فارکانه حضور القلب والرأفة والاستكانة والخشوع ، واجنحته الصدق ومواقيته الاسحار واسبابه الصلوة على محمد "

دعا کے ارکان یہ ہیں کہ دعا حضورِ قلب (حاضر دل) سے کرے دعا کرتے وقت نرمی، عجز اور خشوع پایا جائے اور دعا کا پر صدق ہے سچے دل سے دعا کرے اور صداقت سے کام لے اور کذب سے بچ جائے اور اس کے قبولیت کے اوقات میں سے سحری کا وقت خصوصی اہمیت رکھتا ہے اور دعا کی قبولیت کا سبب دعا سے پہلے اور دعا کے بعد درود شریف پڑھنا ہے:

" وقيل شرائطه اربع اولها حفظ القلب عند الوحدة وحفظ اللسان مع الخلق وحفظ العين عن النظر الى ما لا يحل وحفظ البطن من الحرام "

بعض حضرات نے بیان فرمایا ہے کہ دعا کی قبولیت کی شرائط چار ہیں ان میں سے پہلی یہ ہے کہ انسان جب اکیلا ہو تو اپنے دل کی حفاظت کرے کہ دل کو غفلت سے بچائے۔ اور جب مخلوق کے ساتھ اس کا معاملہ ہو تو زبان کو بچائے یعنی گالی گلوچ سے، غیبت سے، چغلخوری سے اور جھوٹ سے زبان کو محفوظ رکھے اور آنکھ کو ان چیزوں سے محفوظ رکھے جن کی طرف دیکھنا حلال نہیں۔ اور اپنے پیٹ کو حرام چیزوں سے بچا کر رکھے۔

" وقد قيل ان من شرط الدعا ان يكون سليما من اللحن "

دعا کی قبولیت کی اور شرط یہ ہے کہ دعا میں لحن نہ پایا جائے کیونکہ سریلی آواز سے، ترنم سے دعا کرنے میں توجہ آواز کی طرف مبذول ہوتی ہے اس میں خشوع نہیں پایا جاتا۔ دعا کرنے والا یہ دعا نہ کرے: " اللهم اعطنى ان شئت اللهم اغفرلى ان شئت اللهم ارحمنى ان شئت " اے اللہ اگر تو چاہتا ہے تو مجھے عطا کر اگر تو چاہتا ہے تو میری مغفرت فرما اگر تو چاہتا ہے تو مجھ پر رحم فرما۔

(از قرطبی)

خیال رہے کہ جو شرائط اور آداب ذکر کیے گئے ہیں وہ مجموعی طور پر دعا میں پائے جائیں تو دعا

میں مقبولیت پائی جاتی ہے۔

اوقات دعاء: بعض اوقات وہ ہیں جن میں غالباً دعا قبول ہوتی ہے وہ اوقات یہ ہیں۔ سحری کا وقت، افطار کا وقت، اذان اور اقامت کے درمیان، بدھ کے دن ظہر اور عصر کے درمیان، پریشانی کے وقت، دوران سفر، مرض کی حالت میں، بارش کے نازل ہونے کے وقت اور جہاد کی صف میں۔ (قرطبی)

تنبیہ: بعض حضرات دعا نہ کرنے کے قائل ہیں انہوں نے اپنے دلائل قائم کئے ہیں ان کے دلائل بمع جوابات کے ذکر کئے جا رہے ہیں تاکہ اصل مسئلہ نکھر کر سامنے آئے۔

ان حضرات کی پہلی دلیل یہ ہے کہ اگر کام نے عنداللہ ہونا ہے تو ضروری ہے کہ وہ کام ہو جائے گا اور اگر کام نے نہیں ہونا تو یقیناً نہیں ہوگا دعا کرنے کا مقصد کیا ہے۔ ان حضرات کی دوسری دلیل یہ ہے کہ حوادثات بغیر مؤثر کے تو پائے نہیں جاسکتے اور حوادثات مؤثر قدیم سے پائے جاسکتے ہیں جن کی انتہاء آخرت میں ہوگی تو اس سے بھی پتہ چلا کہ حوادثات نے واقع ہونا ہی ہے۔ پھر دعا کرنے کا مقصد کیا ہے اور خصوصاً تقادیر تو لوح محفوظ میں لکھ دی گئی ہیں جب ان میں کمی اور زیادتی نہیں تو دعا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد یہ ہے:

" قدر اللہ المقا دیر قبل ان یخلق الخلق بکذا و کذا عاما "

اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی تخلیق سے پہلے کئی سال تقادیر کو مقدر کر دیا ہے۔ اور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا " جف القلم بما ھو کائن " جس کام نے ہونا ہے قلم (اسے لکھ کر) خشک ہو چکی ہے ان حضرات کی اور دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ علام الغیوب ہے " یعلم خائنة الاعین وما تخفی الصدور " وہ آنکھ کی خیانت اور سینوں کی چھپی چیزوں کو جانتا ہے۔ پھر دعا کرنے کی کیا ضرورت جب کہ وہ ہمارے حالات سے باخبر ہے۔ اور ان کی دلیل یہ ہے کہ مطلوب دعا میں اگر بندوں کی مصلحت ہے تو پھر بھی دعا کا فائدہ نہیں اللہ تعالیٰ جواد ہے وہ اپنے بندوں کی مصلحتوں کو کیسے چھوڑے گا وہ تو اپنی صفت کریمی کی وجہ سے خود ہی اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا۔ اور ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ عقل اس بات پر شاہد ہے اور احادیث صحیحہ سے یہ بات ثابت ہے کہ صدیقین کا اعلیٰ مقام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی ہونا اور دعا اس کے منافی ہے۔ ان حضرات کی اور دلیل یہ ہے کہ امر اور نہی کے صیغے دعا

میں استعمال ہوتے ہیں تو بندہ مولی کے حضور امر یا نہی کے صیغے استعمال کرے تو اس میں بے ادبی ہے۔
ان حضرات کی اور دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ من شغله ذكرى عن مسألتي اعطيته افضل ما اعطى السائلين ﴾

"جو شخص مجھ سے سوال کرنے کے بجائے میری ذکر میں مشغول رہے تو میں اسے سوال کرنے والوں سے زیادہ عطا کرتا ہوں"۔

ان دلائل کے جوابات یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے علم کی کیفیت اور اس کی قضاء وقدر کی کیفیت عقلوں سے غائب ہے۔

" والحكمة الالهية تقتضي ان يكون العبد معلقا بين الرجاء والخوف اللذين بهما تتم العبودية "

اور اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ بندہ امید اور خوف کے درمیان معلق ہو کیونکہ امید اور خوف سے ہی عبودیت مکمل ہوتی ہے۔ اسی مسئلہ پر تکالیف کی دارومدار ہے باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ کا علم تمام چیزوں کا احاطہ کیا ہوا اور تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی قضا وقدر میں ہیں لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو امر ونہی کا مکلف بنایا۔ اسی اشکال کے پیش نظر صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا یا رسول اللہ آپ اس کے متعلق کیا فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اعمال کی تقادیر سے فارغ ہو چکا ہے یا کہ بعد میں وہ لکھے گا؟ آپ نے فرمایا وہ تقادیر سے فارغ ہو چکا ہے تو صحابہ کرام نے عرض کیا: " ففيم العمل اذن " پھر ہم عمل کیوں کریں " قال اعملوا فكل ميسر لما خلق له " آپ نے فرمایا عمل کرو جس کے لئے انسان پیدا کیا گیا ہے اپنے عمل سے اس کے لئے آسانی پیدا کرے۔

حدیث شریف میں پہلے تقدیر سے فراغت کا ذکر کیا گیا ہے جس میں خوف دلایا گیا ہے پھر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ اپنی زندگی میں عمل کر کے تقدیر کے مطابق آسانی پیدا کرے " الا انک تحب ان تعلم ههنا فرق ما بين الميسر والمسخر " خبردار بیشک تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میسر اور ہے مسخر اور ہے یعنی عمل اس لئے کرو کہ تمہیں رب تعالیٰ نے مختار بنایا ہے اور عمل کا حکم دیا ہے تمہارے عمل پر جنت کو لازم نہیں کیا گیا۔

یہی حال رزق کا ہے اگر چہ رزق بھی تقدیر میں مقسوم اور معین ہے لیکن پھر بھی انسان کو کسب حلال کا حکم دیا گیا ہے اور دعا میں مقصد یہ نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کو علم حاصل نہیں کہ اسے بتایا جائے وہ یقیناً عالم الغیب ہے بلکہ دعا میں مقصد اظہار عبودیت اور عجز وانکساری کا اظہار اور کامل طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اور دعا میں عجز وانکساری کے اظہار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تقدیر وقضاء پر راضی ہونا مقصود ہے یہ بہت بڑا مقام ہے کیونکہ " الرضاء بالقضاء "عظیم عبادت ہے پھر دعا کرنا بھی عبادت ہے۔ (کبیر)

ہاں البتہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہنا اور اس خیال سے دعا نہ کرنا کہ وہ خود ہی مہربانی فرمادیگا میں تو عجز وانکساری سے اسکی عبادت کر رہا ہوں یہ مستحسن امر ہے قابل اعتراض نہیں۔ (مرقاۃ ج۵ص۳۲)

دعا کے عبادت ہونے اور دعا کے افضل ہونے کو احادیث مبارکہ کی روشنی میں دیکھا جائے تو دعا کا اہم ہونا واضح ہو جائے گا۔

دعا کے متعلق احادیث مبارکہ:

" عن ابی هريرة رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ لكل نبی دعوة مستجابة فتعجل كل نبی دعوته وانی اختبأت دعوتی شفاعة لامتی الی يوم القيامة فهي نائلة ان شاء الله من مات من امتی لا يشرك بالله شيئا "

(روه مسلم والبخاری اقصر منه ، مشكوة كتاب الدعوات)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر نبی کو ایک قبول ہونے والی دعا عطا کی گئی ہر نبی نے اس دعا میں جلدی کر لی اور بیشک میں نے اپنی دعا کو چھپا کر رکھ لیا ہے یعنی قیامت تک اسے اپنی امت کو شفاعت کے لئے مؤخر کر دیا ہے۔ وہ (میری شفاعت) میری امت کے ہر شخص کو پہنچے گی بشرطیکہ اس نے اللہ تعالیٰ سے کوئی شریک نہ ٹھہرایا ہو۔

وضاحت حدیث :

" (لكل نبی دعوة مستجابة) ای فی حق مخالفی امته جميعهم بالاستئصال "

یعنی ہر نبی کو ایک قبول ہونے والی وہ دعا عطا کی گئی جس سے وہ اپنی امت میں سے اپنے مخالفین

کو تباہ و برباد کردے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر نبی کو ایک خصوصی دعا کرنے کا حق دیا گیا اور ساتھ ساتھ بتا دیا گیا کہ یہ دعا تمہاری ضرور قبول کی جائے گی۔ باقی دعائیں اگرچہ انبیاء کرام کی شرف قبولیت حاصل کر لیتی ہیں لیکن ان کی قبولیت کا وعدہ نہیں کیا گیا۔

" **فتعجل کل نبی دعوته** " (ہر نبی نے اپنی اپنی دعا میں جلدی کر لی) یعنی نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کی ہلاکت کی دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی قوم کو غرق کر دیا۔ اور ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کی ہلاکت کی دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی زوردار گرجدار آواز سے ان کو ہلاک کر دیا۔

" **وانی اختبأت دعوتی** " اور میں نے اپنی دعا کو چھپا کر رکھ لیا ہے یعنی اسے ذخیرہ بنا لیا ہے قیامت کے لئے اسے جمع کر لیا ہے " **وهو الاختفاء بالصبر علی اذی قومه لانی بعثت رحمة للعالمین** " یعنی آپ کے ارشاد کا یہ مطلب ہے کہ میں نے اپنی قوم کی اذیت پر صبر کر کے اپنی دعا کو مخفی کر لیا ہے کیونکہ مجھے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا گیا۔

" **شفاعة لامتی الی یوم القیامة ای مؤخرة الی ذلک الیوم** "

"میرے پیارے حبیب علیہ السلام نے اپنی رحمۃ کاملہ کی وجہ سے اپنی دعا کو اپنی امت کی شفاعت کیلئے قیامت تک مؤخر کر دیا ہے"۔ جن لوگوں نے آپ کی دعوت پر ایمان لایا اور پھر شرک نہیں کیا تو ان تمام کو مصطفیٰ کریم ﷺ کی شفاعت سے فائدہ حاصل ہوگا۔ (از مرقاۃ ج ۵ ص ۳۳)

☆ " **عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ اذا دعا احدکم فلا یقل اللهم اغفرلی ان شئت ارحمنی ان شئت ارزقنی ان شئت ولیعزم مسئلته انه یفعل ما یشاء ولا مکره له** "

(رواہ البخاری، مشکوۃ کتاب الدعوات)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی ایک دعا کرے یہ نہ کہے اے اللہ اگر تو چاہتا ہے تو میری مغفرت فرما اگر تو چاہتا ہے تو مجھے رزق عطا فرما اگر تو چاہتا ہے تو مجھ پر رحم فرما بلکہ وہ پختہ عزم سے سوال کرے اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہی کرتا اور اللہ پر کوئی جبر نہیں کر سکتا۔

وضاحت حدیث: " **ان شئت** " کہنے سے ممانعت کی وجہ کیا ہے؟ " **لانه شک فی القبول والله تعالٰی کریم لا بخل عنده فلیستیقن بالقبول** " وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر دعا میں یہ کہا جاتا

اگر تو چاہتا ہے تو میرا یہ کام کر تو اس دعا کرنے والے نے اللہ تعالیٰ کی قبولیت میں شک کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کریم ہے وہ بخیل (کنجوس) نہیں لہذا رب تعالیٰ سے جب دعا کرے تو اس کی قبولیت کا یقین کرے۔

" ولیعزم مسئلته ، ای لیطلب جازما من غیر شک " یعنی اللہ تعالیٰ سے جو چیز طلب کرے اس میں شک نہ کرے بلکہ یقین رکھے اور پختہ ارادہ سے اس سے سوال کرے۔

☆ " عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ اذا دعا احدکم فلا یقل اللهم اغفرلی ان شئت ولکن لیعزم ولیعظم الرغبة فان الله لا یتعاظمه شئی اعطاه "

(رواه مسلم مشکوة کتاب الدعوات)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی ایک شخص دعا کرے تو یہ نہ کہے اے اللہ اگر تو چاہتا ہے تو میری مغفرت فرما لیکن پختہ ارادہ سے دعا کرے اور عظیم رغبت سے دعا کرے بیشک اللہ تعالیٰ جو عطا فرماتا ہے اس کے سامنے وہ چیز کوئی عظیم نہیں ہوتی۔

وضاحت حدیث:

پہلے الفاظ کی وضاحت تو مندرجہ بالا حدیث میں گزر چکی ہے البتہ آگے الفاظ کی وضاحت کی جاتی ہے:

" (ولیعظم) بالتشدید علی (الرغبة) ای المیل فیه بالالحاح والوسائل "

یعنی انسان رب تعالیٰ سے عظیم رغبت سے دعا کرے عاجزی سے گڑگڑا کر دعا کرے اور دعا کی قبولیت کے تمام وسائل (جن کو پہلے ذکر کر دیا گیا ہے) کو اپنے کام میں لائے۔ " فان الله لا یتعاظمه شئی اعطاه " بیشک اللہ تعالیٰ کا کوئی چیز عطا کرنا اس کے سامنے عظیم نہیں۔

" لا یعظم علیه اعطاه شئی بل جمیع الموجودات فی امره یسیر وهو علی کل شئی قدیر"

اللہ تعالیٰ کسی کو کچھ عطاء کرے تو اس پر وہ چیز عطا کرنا بھاری نہیں ہوتا بلکہ وہ تمام مخلوق کو جو چیز عطا کرتا ہے اس پر وہ آسان ہوتا ہے کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ایک اور حدیث شریف میں ہے:

" لو اجتمع الاولون والآخرون علی صعید واحد فسال کل مسالته واعطیه ایاها ما نقص ذلک من ملکی شیأ "

اگر پہلے اور پچھلے تمام لوگ ایک میدان میں جمع ہو جائیں رب تعالیٰ سے اپنے اپنے سوال کریں

تو رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں ہر ایک کو اس کے سوال کے مطابق عطا کر دوں تو میری بادشاہی میں ذرا بھر کسی چیز کی کمی نہیں ہوتی۔

☆ "وعن ابی الدرداء قال قال رسول اللہ ﷺ دعوۃ المرء المسلم لاخیہ بظھر الغیب مستجابۃ عند رأسہ ملک موکل کلما دعا لاخیہ بخیر قال الملک لموکل بہ آمین ولک بمثل" (رواہ مسلم، مشکوۃ کتاب الدعوات)

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلمان شخص اپنے مومن بھائی کے لئے اس کی غیر موجودگی میں دعا کرے تو اس دعا کو قبول کیا جاتا ہے اس دعا کرنے والے کے سر پر ایک فرشتہ موکل ہوتا ہے جب وہ اپنے بھائی کے لئے خیر کی دعا کرتا ہے تو وہ موکل فرشتہ آمین کہتا ہے اور تمہارے لئے بھی اسی کی مثل۔

وضاحت: کافی حد تک حدیث پاک کا مطلب ترجمہ سے ہی سمجھ آرہا ہے کہ کوئی مسلمان مرد یا عورت اپنے مسلمان بھائی یا بہن کے لئے اس کی غیر موجودگی میں دعا کرے تو اس دعا کو شرف قبولیت زیادہ حاصل ہوتا ہے کیونکہ اس دعا میں خلوص پایا جاتا ہے وہ دکھلاوے اور چرچے سے پاک ہوتی ہے کسی کے سامنے دعا کرنے میں احتمال پایا جاتا ہے کہ ہوسکتا ہے یہ دکھلاوے سے کام لے رہا ہو۔ اگر کسی کے سامنے دعا بھی خلوص سے کی جائے تو یقیناً اسے بھی قبولیت حاصل ہوگی۔ اصل قبولیت کی وجہ کو مدنظر رکھا جائے تو راقم کی وضاحت سمجھ آجائے گی۔

ایک فرشتہ اس کی دعا پر آمین کہنے کے لئے مقرر کر دیا جاتا ہے جب وہ اپنے مومن بھائی کے لئے اس کی غیر موجودگی میں دعا کرتا ہے تو فرشتہ آمین کہتا ہے یعنی جس کے لئے دعا کی جاتی ہے اس کیلئے بھی آمین کہتا ہے اور دعا کرنے والے کے لئے اسی کی مثل وہ فرشتہ دعا کرتا ہے اور آمین کہتا ہے۔

☆ "وعن جابر قال قال رسول اللہ ﷺ لا تدعوا علی انفسکم ولا تدعوا علی اولادکم ولا تدعوا علی اموالکم لاتوا فقوا من اللہ ساعۃ یسئل فیھا عطاء فیستجیب لکم" (رواہ مسلم، مشکوۃ کتاب الدعوات)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی جانوں کے خلاف دعا نہ کرو اور اپنی اولاد کے خلاف دعا نہ کرو اور اپنے مالوں کے خلاف دعا نہ کرو اور اپنی دعا کو اس گھڑی کے موافق نہ کر جس میں اللہ تعالیٰ سے سوال کیا جائے تو وہ عطا کرتا ہے۔

وضاحت حدیث: یعنی دن رات میں ایک گھڑی وہ بھی آتی ہے جس میں رب تعالیٰ سے جو طلب کیا جائے وہ عطا کرتا ہے اس گھڑی کو معین نہیں فرمایا گیا اس لئے تم اپنی ہلاکت یا اپنی اولاد کی ہلاکت اور اپنے مالوں (یعنی غلاموں اور باندیوں اور جانوروں) کی ہلاکت کی دعا نہ کرو ہوسکتا ہے وہ گھڑی مقبولیت کی ہو جس میں تم دعا کر رہے ہو کہ میں ہلاک ہو جاؤں برباد ہو جاؤں۔ یا تم دعا میں اولاد کے متعلق یہ کہہ رہے ہو کہ تم ہلاک ہو جاؤ تمہارے پاس کچھ نہ رہے تم اندھے ہو جاؤ تمہارے ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائیں۔ یا تم دعا کر رہے ہو کہ یہ مال ہلاک ہو جائے وغیرہ تو اس مقبولیت کی گھڑی میں تمہاری دعا مقبول ہو کر تمہاری اور تمہاری اولاد کے لئے اور تمہارے مالوں کے لئے بربادی کا سبب نہ بن جائے۔

☆ "عن النعمان بن بشير قال قال رسول الله ﷺ الدعاء هو العبادة ثم قرأ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ"

(رواه احمد والترمذى وابوداؤد والنسائى وابن ماجه، مشكوة كتاب الدعوات)

نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دعا عبادت ہی ہے پھر آپ نے پڑھا " وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ " اور آپ کے رب نے کہا مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا کو قبول کروں گا۔

وضاحت حدیث: " الدعاء هو العبادة " میں مبتدا اور خبر دونوں معرفہ ہیں درمیان میں ضمیر ہے اس میں حصر پائی گئی ہے یعنی دعا عبادت ہی ہے راقم کا یہ ترجمہ قصر الصفة علی الموصوف کے ضابطہ کے مطابق ہے جس کو دینی طلباء کرام بخوبی سمجھتے ہیں۔ دعا عبادت حقیقیہ ہے یعنی دعا میں یہ اہلیت پائی گئی ہے کہ اسے عبادت کہا جائے اس کی وجہ یہ ہے:

" لدلالته على الاقبال على الله والاعراض عما سواه بحيث لا يرجو ولا يخاف الا اياه قائما بوجوب العبودية معترفا بحق الربوبية عالما بنعمة الا يجاد طالبا لمدد الامداد على وفق المراد وتوفيق الاسعاد "

کہ دعا میں انسان کی کامل توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ماسواء سے وہ اعراض کر رہا ہوتا کہ اس لحاظ پر کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی سے امید نہیں کر رہا ہوتا کسی کا خوف اسے نہیں ہوتا، وہ وجوب عبودیت کو قائم کرنے والا ہوتا ہے حق ربوبیت کا معترف ہوتا ہے، وہ ایجاد کی نعمت کو

جاننے والا ہوتا ہے، وہ اپنی مراد کے مطابق رب تعالیٰ سے ہی کامل امداد طلب کر رہا ہوتا ہے اور اسی سے نیک بختی کی توفیق طلب کر رہا ہوتا ہے۔ پھر نبی کریم ﷺ نے اپنے ارشاد پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے دلیل پیش فرمائی: " وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ " کیونکہ رب تعالیٰ نے دعا کرنے کا حکم دیا ہے " والمامور به عبادة " جس چیز کا رب تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا جائے وہ عبادت ہوتا ہے۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آیۃ کریمہ سے مقصد بیان یہ تھا کہ آیۃ کریمہ کے الفاظ مبارکہ اس پر دلالت کر رہے ہیں۔ کہ جزاء مرتب ہے شرط پر اور مُسبب مرتب ہے سبب پر۔ جس سے یہ واضح ہوا " ویکون اتم العبادات " کہ دعا عبادات کی تکمیل کا ذریعہ ہے جس پر دوسری حدیث "الدعاء مخ العبادۃ" (دعا عبادت کا مغز ہے) دلالت کر رہی ہے۔

چونکہ یہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ دعا میں عبودیت کا حق ادا کرنا ہے اور عبودیت کے متعلق علامہ راغب اصفہانی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں " العبودیة اظهار التذلل "عبودیت عجز کا اظہار ہے اور کوئی عبادت اس سے زیادہ افضل نہیں کیونکہ سب سے زیادہ عجز کا اظہار اس ذات کے سامنے ہوگا "من له غاية الافضال وهو الله تعالیٰ " جس کو بہت بڑی فضیلت حاصل ہوگی سب سے زیادہ افضل اور سب سے زیادہ فضل فرمانے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد " الدعا هو العبادة " میں عبادت کا لغوی معنی لینا بھی ممکن ہے کیونکہ عبادت کا لغوی معنی یہ ہے " هو غاية التذلل والافتقار والاستكانة " کہ جس میں بہت زیادہ عجز اور محتاجی اور مسکینی پائی جائے وہ عبادت ہے اور یہ بھی واضح ہے " وما شرعت العبادة الا للخضوع للبارئی واظهار الافتقار " کہ عبادت کو مشروع ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ باری تعالیٰ کے حضور اظہار عجز کرے اور اپنی احتیاجی کا اظہار اسی سے کرے۔ آیۃ کریمہ کے بعد والے الفاظ اس پر دلالت کر رہے ہیں:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ ﴾

"بیشک وہ لوگ جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں وہ جہنم میں ذلیل ہو کر داخل ہوں گے"۔

رب تعالیٰ نے بندوں کے عجز کے اظہار نہ کرنے اور اپنے احتیاجی کو اس کے حضور نہ پیش کرنے

کوتکبر سے تعبیر فرمایا کہ وہ لوگ متکبر ہیں " ووضع عبادتی موضع دعائی "اور " عن عبادتی " کو " عن دعائی " کی جگہ رکھ کر یہ ثابت فرمایا کہ میری عبادت یعنی مجھ سے دعا کرنے میں تکبر کرنے والے جہنم میں ذلیل ہو کر داخل ہوں گے۔

جگہ جگہ پر دعا سے روکنے والے فرضوں کے بعد دعا نہیں، نماز سے فارغ ہونے پر دعا نہیں، جنازہ کے بعد دعا نہیں، میت کے ایصال ثواب کے لئے دعا نہیں، چوتھے دن، چالیسویں دن دعا نہیں، کوئی فوت ہو جائے تو اس کے اقرباء کے پاس جا کر دعا کرنا ثابت نہیں۔ ایسے لوگ متکبر ہیں عبادت سے منہ موڑنے والے ہیں، ذلیل ہیں جہنم کا ایندھن ہیں خود تو گمراہ ہیں لیکن دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں ایسے ذلیلوں سے بچ کر رہیں صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے حکم پر عمل کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ دعا کریں کیونکہ جتنی زیادہ دعا کریں گے اتنی ہی زیادہ عبادت پائی جائے گی۔

تنبیہ : علامہ میرک رحمہ اللہ نے " الدعاء هو العبادة " میں خبر کے معرف باللام ہونے اور مبتدا اور خبر کے درمیان ضمیر فصل لانے سے حصر کا معنی ثابت کرتے ہوئے یہ بیان فرمایا کہ ان الفاظ گرامی کا مطلب یہ ہے " ان العبادة ليست غير الدعاء " کہ بیشک عبادت سوائے دعا کے نہیں۔ اس میں مبالغہ پایا گیا ہے اور معنی یہ ہے " ان الدعاء معظم العبادة " بیشک دعا عظیم عبادت ہے۔ جس طرح نبی کریم ﷺ نے فرمایا: " الحج عرفة " (حج عرفہ ہے) اس کا مطلب یہ ہے کہ حج کے ارکان میں سے عرفہ عظیم رکن ہے اسی طرح مطلب اس حدیث کا یہ ہوگا کہ عبادات میں سے عظیم عبادت دعا ہے۔ یہ معنی قصر الموصوف علی الصفۃ کے ضابطہ کے مطابق ہے لیکن راقم نے جو ترجمہ قصر الصفۃ علی الموصوف کا کیا ہے اسے علامہ ابن حجر رحمہ اللہ سے تائید حاصل ہے کیونکہ انہوں نے کہا " وصوابه ان الدعاء ليس غير العبادة " درست معنی یہ ہے کہ بیشک دعا عبادت کا غیر نہیں۔ اگرچہ علامہ ابن حجر رحمہ اللہ کے قول پر ملا علی قاری رحمہ اللہ نے بحث بھی کی ہے لیکن راقم کا ذہن جس بزرگ کا قول قبول کرے اسے نقل کر دیتا ہے یہ کبھی نہیں دیکھا کہ کس نے کیا کہا ہے اور کس نے کیا کہا ہے۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ اس حدیث کو ترمذی نے " حديث حسن صحيح " (یہ حدیث حسن صحیح ہے) اور حاکم نے بھی اس حدیث کو ذکر کر کے صحیح الاسناد کہا ہے اور اس حدیث کو طبرانی نے بھی

کتاب الدعا میں ذکر کیا ہے۔ (از مرقاۃ)

☆ " عن انس قال قال رسول اللہ ﷺ الدعاء مخ العبادۃ "

(رواہ الترمذی ، مشکوۃ کتاب الدعوات)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دعا عبادت کا مغز ہے۔

" والمعنی ان العبادۃ لا تقوم الا بالدعاء کما ان الانسان لا یقوم الا بالمخ " (مرقاۃ)

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ عبادت بغیر دعا کے قائم نہیں ہو سکتی جس طرح انسان بغیر دماغ کے قائم نہیں ہو سکتا۔ " مخ الشئی خالصہ وما یقوم بہ " کسی چیز کا جس سے قیام ہو اور جو اس کے لئے خالص ہو اسے " مخ " کہا جاتا۔ جس طرح انسان کا قیام دماغ سے ہے تو اس مغز کو "مخ" کہا جائے گا گویا انسان میں خالص چیز وہی ہے اسی طرح آنکھ کی پتلی آنکھ کے لئے " مخ " ہے اور ہڈیوں کی چربی ہڈیوں کے لئے " مخ " ہے۔

☆ " وعن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ لیس شئی اکرم علی اللہ من الدعاء "

(رواہ الترمذی و ابن ماجہ وقال الترمذی ھذا حدیث حسن غریب ، مشکوۃ کتاب الدعوات)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ہاں دعا سے افضل کوئی چیز نہیں۔

وضاحت: اس حدیث پر بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ ﴾ بیشک تم میں زیادہ مکرم اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ ہے جس میں تقوی زیادہ پایا جائے ان میں تعارض ہے۔ حدیث پاک سے ثابت ہے کہ دعا اکرم و افضل ہے اور قرآن پاک سے ثابت ہے کہ تقوی اکرم و افضل ہے ان میں تطبیق کیسے پائی جائے گی تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ دعا عبادت ہے اور عبادت سے تقوی حاصل ہوتا ہے لہذا معلوم ہوا کہ دعا اکرم ہے کیونکہ عبادت ہے اور اسی عبادت سے حاصل ہونے والا تقوی بھی یقیناً مکرم ہوگا۔

☆ " وعن سلمان الفارسی قال قال رسول اللہ ﷺ لا یرد القضاء الا الدعاء ولا یزید فی العمر الا البر " (رواہ الترمذی ، مشکوۃ کتاب الدعوات)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قضاء رد نہیں ہوتی

سوائے دعا کے اور عمر میں زیادتی نہیں ہوتی سوائے نیکی کے۔

وضاحت حدیث: قضاء سے مراد امر مقدر یعنی جو چیز تقدیر میں ہے تقدیر رد ہونے کا ایک مطلب یہ ہے کہ انسان کسی مکروہ (ناپسندیدہ، مصیبت) چیز کے واقع ہونے کا خوف رکھتا ہو تو اس شے سے بچنے کی کوشش میں اللہ تعالیٰ نے اسے دعا کی توفیق عطا فرمادی اس دعا کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اس کو بچا لیا۔ مجازی طور پر اسے تقدیر کے ٹلنے سے تعبیر کر دیا رسول اللہ ﷺ نے دم کرنے کو تقدیر کا حصہ قرار دیا پھر مریض کو دواء لینے کا حکم دیا اور دعا کرنے کا حکم دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام کے علاقہ میں گئے تو آپ کو پتہ چلا کہ وہاں طاعون کی مرض پھیلی ہوئی ہے آپ وہاں سے لوٹ پڑے۔ تو حضرت ابوعبیدہ نے کہا " **اتفر من القضاء یا امیر المؤمنین** " اے امیر المؤمنین کیا تم تقدیر سے بھاگ رہے ہو؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے ابوعبیدہ " **لو غیرک قالها** " کاش تمہارا غیر یہ کہتا۔ یعنی کوئی جاہل یہ بات کرتا تو تعجب نہ ہوتا لیکن تم تو صاحب علم شخصیت ہو تم نے یہ کیا کہا ہے؟ اس پر تعجب ہے ہاں یہ بات سن لو " **نعم نفر من قضاء الله الی قضاء الله** " ہم اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے اللہ کی تقدیر کی طرف بھاگے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارا یہاں آنا بھی تقدیر کے مطابق ہے اور ہمارا یہاں سے جانا بھی تقدیر کے مطابق ہے۔ " **ولا یزید فی العمر الاالبر** " عمر میں زیادتی نہیں ہوتی سوائے نیکی کے " **البر** " **بکسر الباء وهو الاحسان والطاعة** " **البر** " کا معنی احسان اور طاعت ہے۔

عمر کی زیادتی سے کیا مراد ہے؟ بعض حضرات نے نے کہا حقیقی طور پر عمر کی زیادتی ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد اس پر دلالت کر رہا ہے " **وما یعمر من معمر ولا ینقص من عمره الا فی کتاب** " کسی کی عمر میں زیادتی نہیں کی جاتی اور کسی کی عمر کو کم نہیں کیا جاتا مگر یہ کہ وہ کتاب (لوح محفوظ) میں ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے " **یمحو الله ما یشاء ویثبت وعنده ام الکتاب** " اللہ تعالیٰ مٹاتا ہے جو چاہے اور ثابت رکھتا ہے جو چاہے ام الکتاب (لوح محفوظ) اسی کے پاس ہے۔ اور کشاف میں ذکر کیا گیا ہے " **انه لا یطول عمر انسان ولا یقصر الی فی کتاب** " بیشک کسی انسان کی

عمر لمبی نہیں ہوتی اور نہ ہی چھوٹی ہوتی ہے مگر یہ کہ وہ کتاب میں (لوح محفوظ میں) پائی جاتی ہے۔

صورت اس کی یہ ہے کہ لوح محفوظ میں لکھا جاتا ہے کہ اگر فلاں نے حج نہ کیا یا جہاد میں شریک نہ ہوا تو عمر اس کی (مثال کے طور پر) چالیس سال ہوگی اور اگر اس نے حج کرلیا یا جہاد میں شریک ہو گیا تو اس کی عمر ساٹھ سال ہوگی۔ گویا کہ جب اس نے نیکی کے کام پر عمل کیا تو عمر بڑھ گئی اور نیکی کا کام نہ کیا تو عمر کم ہوگئی۔ عمر کی زیادتی کا اور مطلب یہ ہے " انه اذا بر لا يضيع عمره فكأنه زاد "کہ بیشک جب وہ نیکی کرے گا تو اس کی عمر ضائع نہیں ہوگی (اور گناہ کرنے کی وجہ سے گویا کہ عمر ضائع ہو جائے گی)۔

عمر کی زیادتی کا اور مطلب یہ ہے کہ نیکی کے اعمال عمر کی زیادتی کا سبب ہیں یہ بھی تقدیر میں موجود ہے جیسا کہ دعا کا ردالبلاء ہونا بھی تقدیر میں موجود ہے:

" فالدعاء للوالدين وبقية الارحام يزيد في العمر اما بمعنى انه يبارك له في عمره فيسير له في الزمن القليل من الاعمال الصالحة مالا يتسير لغيره من العمل الكثير "

یعنی والدین کی دعا اور قریبی رشتہ داروں کی دعا عمر میں زیادتی کرتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کی عمر میں برکت پائی جاتی ہے تھوڑے سے وقت میں وہ اتنے زیادہ نیک عمل کرلیتا ہے جتنے عمل دوسرا کوئی شخص نہیں کرسکتا۔ (از مرقاۃ)

☆ " وعن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ ان الدعاء ينفع مما نزل ومما لم ينزل فعليكم عباد الله بالدعاء " (رواه الترمذی ورواه احمد عن معاذ بن جبل وقال الترمذی هذا حديث غريب

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک دعا اس چیز میں بھی نفع دیتی ہے جو واقع ہو چکی ہے اور جو واقع نہیں ہوئی اسمیں بھی نفع دینی والی ہے اے اللہ کے بندوں تم پر لازم ہے کہ دعا کرو۔

وضاحت حدیث: یعنی جو مصیبت وغیرہ واقع ہو جائے اسے صبر سے برداشت کرے اور دعا کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ اس میں آسانی پیدا فرمائے گا اور جو مصیبت واقع نہیں ہوئی جب دعا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے پھیر دے گا وہ مصیبت واقع ہونے سے مندفع ہو جائے (ٹل جائے گی)۔ جب دعا کا یہ

مقام ہے تو اے اللہ کے بندو تم پر لازم ہے کہ دعا کرو " لانہ من لوازم العبودیة التی ھی القیام بحق الربوبیة " اس لئے کہ دعا میں عبودیت یعنی عجز وانکساری پائی جاتی ہے انسان کے لئے لازم ہے کہ وہ رب تعالیٰ کی ربوبیت کا اپنی عبودیت کے ذریعے حق ادا کرے۔

☆ " وعن ابن مسعود قال قال رسول اللہ ﷺ سلوا اللہ من فضلہ فان اللہ یحب ان یسئل و افضل العبادة انتظار الفرج " (رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث غریب)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کا سوال کرو بیشک اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے کہ اس سے سوال کیا جائے اور افضل عبادت یہ ہے کہ کشادگی کی انتظار کی جائے۔

وضاحت حدیث: جب اللہ تعالیٰ وسیع فضل کا مالک ہے اور وہ کامل صفات کا مالک ہے یعنی " انہ کریم منعم وھاب معط غنی مغن باسط " وہ ذات کریم ہے انعام عطا فرمانے والا ہے اور بخشیش عطا فرمانے والا ہے اور عطیات عطاء کرنے والا ہے اور غنی ہے اور غنی کرنے والا ہے اور کشادگی عطاء کرنے والا ہے "یحب ان یسأل " اس لئے وہ پسند فرماتا ہے کہ اس سے اس کے فضل کو طلب کیا جائے " وفیہ ایماء الی ان احدا لم یقدر علی عدلہ " اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ ہر انسان اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کو ہی طلب کرے کسی انسان کی یہ مجال نہیں کہ وہ اس کے عدل کا سامنا کر سکے۔

" وافضل العبادة انتظار الفرج " یعنی افضل عبادت یہ ہے کہ انسان مصیبت اور حزن کے جانے کی انتظار کرے کیونکہ انسان جب اپنی مصیبتوں کی شکایت اللہ تعالیٰ کے غیر کی طرف نہیں کرے گا تو یہ افضل عبادت ہوگی۔

" وکونہ افضل العبادة لان الصبر فی البلاء انقیاد للقضاء وذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء "

کیونکہ مصیبت پر صبر کرنا، تقدیر پر راضی ہونا بہت بڑی افضل عبادت ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جسے چاہے عطا کرتا ہے۔

☆ "عن ابی هریرة قال قال رسول اللہ ﷺ من لم یسأل اللہ یغضب علیہ "

(رواہ الترمذی ، مشکوۃ کتاب الدعوات)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اللہ تعالیٰ سے سوال نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس پر غضب فرماتا ہے۔

وضاحت حدیث : " لان ترک السؤال تکبر واستغناء وھذا لا یجوز للعبد "

اس لئے کہ رب تعالیٰ سے سوال نہ کرنا علامت ہے۔ (از مرقاۃ) اس بات کی کہ وہ شخص متکبر ہے اور مستغنی ہے بندے کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے آپ کو رب تعالیٰ سے مستغنی سمجھے اور اس کے سامنے تکبر کا اظہار کرے۔ حدیث شریف میں "غضب" کا جو ذکر ہے اس سے مراد سزا دینا ہے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وذلک لان اللہ یحب ان یسأل من فضلہ فمن لم یسأل اللہ یبغضہ والمبغوض مغضوب علیہ لا محالة "

کہ دونوں احادیث کا مطلب یہ ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے کہ اس سے اس کے فضل کو طلب کیا جائے جو شخص اللہ تعالیٰ سے سوال نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ جس سے ناراض ہوگا یقیناً اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب بھی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سے مانگنے اور بندوں سے مانگنے کو کسی شاعر نے کیا خوب بیان فرمایا:

اللہ یغضب ان ترکت سؤالہ ۔۔۔ وبنی آدم حین یسئل یغضب

اللہ سے سوال کرنا چھوڑ دو تو وہ اس پر ناراض ہوتا ۔۔۔ اور بندوں سے سوال کرو تو وہ اس پر ناراض ہوتے ہیں

دعا خواہ لسان مقال (زبان) سے کرے یا لسان حال (دل کی توجہ) سے کرے ہر حال میں بہتر ہے بلکہ بلند پایہ شخصیات کی دعا لسان حال سے ہی زیادہ ثابت ہے " یعنی ان السؤال بلسان الحال ادعی الی وصول الکمال من بیان المقال " زبان حال سے سوال کرنا بنسبت زبان مقال سے سوال کرنے کے زیادہ کمال تک پہنچانے والا ہے۔ حدیث صحیح میں ہے " من شغلہ ذکری عن مسئلتی اعطیتہ افضل ما اعطی السائلین " اللہ تعالیٰ سوال کرنے والوں کی بنسبت اسے زیادہ عطا کرتا ہے جو اس کے ذکر میں مشغول ہے (یعنی دل کی توجہ سے اس سے سوال کرے)۔

اسی لئے ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا " **حسبی من سؤالی علمه بحالی** " میرے سوال کی بنسبت اس کا علم میرے حال کو کافی ہے کیا خوب کسی شاعر نے کہا ہے:

اذا اثنی علیک المرء یوما　　　كفاه من تعرضه الثناء

جب کوئی شخص تمہاری کسی دن تعریف کرے تو اس کا تعریف کے درپے ہونا ہی اس کی کفایت کا تقاضا کرتا ہے۔

☆ " **وعن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ من فتح له منکم باب الدعاء فتحت له ابواب الرحمة وما سئل الله شيأ يعني احب اليه من ان يسأل العافية** "

(رواہ الترمذی، مشکوۃ کتاب الدعوات)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کے لئے دعا کا دروازہ کھول دیا جائے اس کے لئے رحمت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے جب بھی کسی چیز کا سوال کرو تو اسے یہ پسند ہے کہ اس سے عافیت کا سوال کیا جائے۔

وضاحت حدیث: حدیث پاک سے بہت واضح طور پر سمجھ آیا کہ دعا کرنا ذریعہ رحمت ہے۔ اور آخری الفاظ راوی کی وضاحت ہے کہ سب چیزوں سے زیادہ رب تعالیٰ کو پسند یہ ہے کہ اس سے عافیت کا سوال کیا جائے۔ تاہم یہ خیال رہے کہ عافیت سے مراد اخروی اور دینی عافیت ہے اس سے مراد دنیاوی اور جسمانی عافیت نہیں۔ ایک شخص میرے سردار شیخ ابوالعباس مرسی کے پاس آیا آپ کو تکلیف تھی درد لاحق تھا اس شخص نے آپ کے لئے دعا کی " **عافاک یا سیدی** " اے میرے سردار اللہ تعالیٰ آپ کو عافیت عطا فرمائے۔ آپ سن کر خاموش رہے آپ نے کوئی جواب نہ دیا اس شخص نے پھر وہی دعا کی تو شیخ نے فرمایا کہ درد کے آرام کی میں نے تو دعا نہیں کی تم نے میرے درد کے آرام کی دعا کی ہے " **والذی انا فیه وهو العافية** " قسم ہے ذات باری تعالیٰ کی میں جس حال میں ہوں وہی عافیت ہے۔ وجہ اصل میں یہ ہے کہ بیماری اور تکالیف مدارج کی بلندی کا ذریعہ ہیں:

"**وقد سال رسول الله ﷺ العافية وقال ما زالت اكلة خيبر تعاودني فالآن قطعت ابهري**"

نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے عافیت کا سوال کیا تو آپ پر خیبر میں زہر آلود بکری کے گوشت

کے زہر کا اثر لوٹ آیا آپ کی انتڑیاں اسے کٹنے لگیں۔ اسی زہر کے اثر سے آپ کو منصب شہادت حاصل ہوگیا اخروی عافیت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتی تھی۔ " وابوبکر سأل العافية ومات مسموما " حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عافیت کا سوال کیا تو آپ پر غار ثور میں سانپ کے ڈسنے کی زہر کا اثر لوٹ آیا آپ کو منصب شہادت حاصل ہوگیا جو اخروی لحاظ پر عظیم عافیت تھی. " وعمر سأل العافية ومات مطعونا " حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عافیت کا سوال کیا اور آپ نیزے کے زخم سے شہید ہوگئے آپ کے حق میں اخروی لحاظ پر یہی عافیت عظیمہ تھی. " وعثمان سأل العافية ومات مذبوحا " اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عافیت کا سوال کیا تو آپ کو ذبح کر کے شہید کر دیا گیا اس طرح آپ نے بھی اخروی نعمت عظیمہ کو حاصل کرلیا " وعلی سأل العافية ومات مذبوحا" حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عافیت کا سوال کیا تو آپ کو بھی شہادت نصیب ہوئی گویا کہ آپ کے لئے یہی عافیت تھی جو آپ کو عطا کر دی گئی۔

اس مندرجہ بالا بحث سے یہ فائدہ حاصل ہوا:

" فاذا سألت الله العافية فسئله العافية من حيث يعلم انها لک عافية "

جب تو اللہ تعالیٰ سے عافیت کا سوال کر تو یہ عرض کر اے اللہ میرے حق میں جس عافیت کو تو بہتر جانتا ہے وہی عافیت مجھے عطاء فرما اس کا یہ فائدہ ہوگا کہ اگر انسان کی مرض کو دور کر کے اسے زندہ رکھنا اس کے لئے مفید ہو تو اللہ تعالیٰ سے اسے جسمانی راحت حاصل ہوگی اور اگر اس کے حق میں اس کے لئے موت بہتر ہوئی تو اسے موت عطا کر دی جائے گی۔ چونکہ " العافية دفع العفاء وهو الهلاک " عافیت ہلاک کو دور کرنے کا نام ہے اس لئے اتنی روزی عطاء کرنا جو کفایت کر جائے وہ بھی عافیت ہے۔ اور بدن کو قوت عطاء کرنا جس سے انسان عبادت ادا کر سکے یہ بھی عافیت ہے اور دین کے کاموں میں علم وعمل کے لحاظ پر مشغول رکھنا بھی عافیت ہے اور جو کام انسان کے لئے بہتر نہ ہو اسے چھوڑ دینا بھی عافیت ہے اور جو کام غیر ضروری ہوں ان کو چھوڑ دینا بھی عافیت ہے اس لئے عافیت کی دعا کرتے ہوئے معین نہ کرے بلکہ یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ میرے حق میں جو جو عافیت بہتر ہے وہ عطاء فرما۔

☆ " وعن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ من سره ان يستجيب الله له عند

الشدائد فلیکثر الدعاء فی الرخاء "

(رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث غریب ، مشکوۃ کتاب الدعوات)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کو یہ پسند ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کی مشکلات میں اس کی دعا کو قبول کرلے تو وہ آسانی میں زیادہ دعا کرے۔

وضاحت حدیث: یعنی مومن کی یہ شان ہے " یلتجی الی اللہ تعالیٰ قبل مس الاضطرار " کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور رجوع کرتا ہے اور اسی سے پناہ پکڑتا ہے مصیبت کے پہنچنے سے پہلے، بخلاف کافر کے اسے جب مصیبت پہنچتی ہے۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور جب اسے خوشحالی ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ سے روگردانی کرتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿ واذا مس الانسان ضردعا ربه منیبا الیه ثم اذا خوله نعمة منه نسی ما کان یدعو الیه من قبل ﴾

''اور جب آدمی کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے اپنے رب کو پکارتا ہے اسی طرف جھکا ہوا پھر جب اللہ نے اسے اپنے پاس سے کوئی نعمت دی تو بھول جاتا ہے جس لئے پہلے پکارتا تھا۔ آیۃ کریمہ میں آدمی سے مراد مطلقا کافر یا خاص ابوجہل یا عتبہ بن ربیعہ مراد ہے۔ (خزائن العرفان)

☆ " وعن مالک بن یسار قال قال رسول اللہ ﷺ اذا سألتم اللہ فاسألوه ببطون اکفکم ولا تسألوه بظهورها وفی روایة ابن عباس قال سلوا اللہ ببطون اکفکم ولا تسألوه بظهورها فان فرغتم فامسحوا بها وجوهکم " (رواہ ابو داؤد)

حضرت مالک بن یسار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو اپنی ہتھیلیوں کے اندرونی حصہ سے سوال کرو ان کی پیٹھ سے سوال نہ کرو۔ ایک روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اس میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اپنی ہتھیلیوں کے اندرونی حصہ سے سوال کرو اور ان کی پیٹھ سے سوال نہ کرو۔ پھر جب تم فارغ ہو جاؤ تو اپنے ہاتھ اپنے مونہوں پر پھیرلو۔

وضاحت حدیث: عام حالات میں دعا سیدھے ہاتھوں سے کی جائے البتہ " قیل فی دفع البلاء یجعل ظهر الکف فوق بطنها تفاؤلا " مصیبت کو مندفع کرنے کے لئے بعض حضرات نے الٹے ہاتھوں سے دعا کرنا مناسب سمجھا ہے کہ اس میں نیک شگونی پائی جاتی ہے۔ کہ انسان جب الٹے ہاتھوں سے دعا کرتا ہے پھر منہ پر پھیرنے کے لئے ہاتھ سیدھے کرتا ہے تو گویا کہ وہ زبان حال

سے یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ اللہ جس طرح میں نے ہاتھوں کو الٹا کر کے پھر سیدھا کر کے منہ پر پھیر دیا ہے اس طرح تو میرے الٹے حالات کو سیدھا کر دے۔ایک روایت میں ہے " انه علیه الصلوة والسلام اشار فی الاستسقاء بظهر کفیه " کہ بیشک نبی کریم ﷺ بارش کی طلب کی دعاء میں ہاتھوں کی پیٹھ سے اشارہ فرمایا۔بعض حضرات نے تو اس کا ظاہر معنی ہی لیا ہے کہ بارش کے لئے الٹے ہاتھوں سے دعا کی جائے۔

لیکن علامی طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" ومعناه انه رفع یدیه رفعا بلیغا حتی ظهر بیاض ابطیه وصارت کفاه محاذین لرأسه ملتمسا ان یغمره برحمته من رأسه الی قدمیه "

اور معنی اس کا یہ ہے کہ بیشک آپ نے بارش کی دعا کے لئے بہت بلند ہاتھ اٹھائے یہاں تک کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی ظاہر ہوگئی۔اور آپ کی ہتھیلیاں آپ کے سر کے برابر تھیں وجہ اس کی یہ تھی کہ آپ گویا کہ رب تعالٰی سے یہ مطالبہ کررہے تھے کہ اے اللہ جس طرح میں نے اپنے ہاتھوں کو سر تک اٹھایا اسی طرح تو اپنی رحمت سے ہمیں سر سے قدموں تک ڈھانپ دے۔

راقم کا موقف اس میں یہ ہے کہ بارش کی دعا میں ہاتھ بلند کر کے سر تک اٹھائے اور ہاتھ سیدھے رکھے یا الٹے ہاتھوں سے دعا کرے دونوں صورتیں جائز ہیں جو شارحین نے بیان فرمائی ہیں:

﴿ فَاِذَا فَرَغْتُمْ فَامْسَحُوْا بِهَا وُجُوْهَكُمْ ﴾

''جب تم دعا سے فارغ ہو جاؤ تو اپنے ہاتھ منہ پر پھیرو''

چہرے پر ہاتھ پھیرنے کی وجہ یہ ہے " فانها تنزل علیها آثار الرحمة فتصل برکتها الیها " بیشک دعا کی وجہ سے رحمت کے آثار ہاتھوں تک پہنچتے ہیں اس لئے ہاتھوں کو منہ پر پھیرنے کا حکم ہے کہ ہاتھوں سے برکت چہرے پر پہنچ جائے۔

فائدہ : قال ابن حجر استفید من هذا الحدیث والذی قبله انه یسن رفع الیدین الی السماء فی کل دعاء وصحت به الاحادیث الکثیرة عنه علیه الصلوة والسلام من غیر حصر قال النووی ومن ادعی حصرها فقد غلط غلطا فاحشا "

حضرت ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس حدیث اور اس سے پہلی حدیث سے یہ فائدہ حاصل ہوا

کہ ہر دعا میں آسمانوں کی طرف ہاتھوں کو اٹھانا سنت ہے نبی کریم ﷺ کی کثیر احادیث اس مسئلہ کو ثابت کر رہی ہیں جو شمار میں ہی نہیں۔ اگر کوئی چند احادیث میں اس مسئلہ کو منحصر کرے تو اسکی فاحش غلطی ہوگی۔

اعتراض : "عن انس قال کان النبی ﷺ لا یرفع یدیه فی شئی من دعائه الا فی الاستسقاء فانه یرفع حتی یری بیاض ابطیه" (بخاری ومسلم، مشکوۃ باب الاستسقاء)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کسی دعا میں اپنے ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے سوائے بارش طلب کرنے کی دعا کے بیشک آپ اس میں ہاتھ اٹھاتے یہاں تک کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آتی۔ اس حدیث پاک سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سوائے استسقاء کے کسی دعا میں ہاتھ نہیں اٹھائے تو کس طرح کہنا ثابت ہے کہ ہر دعا میں ہاتھ اٹھائے جائیں۔

پہلا جواب : کہ جن احادیث میں ہاتھ اٹھانے کا ذکر ہے وہ مثبت ہیں اور جن میں ہاتھ نہ اٹھانے کا ذکر ہے وہ منفی ہیں۔ قانون یہ ہے کہ مثبت مقدم ہوتی ہے نافی روایت سے لہٰذا دعا میں ہاتھ اٹھانے والی احادیث راجح ہیں۔

دوسرا جواب: "ان المراد انه کان لا یبالغ فی رفع یدیه فی شئی من الدعاء الا الاستسقاء"

جس حدیث میں نفی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دعا میں ہاتھ اٹھانے میں اتنا مبالغہ نہیں کیا جتنا استسقاء میں کیا ہے کہ سر تک ہاتھ اٹھائے ہیں۔ (مرقاۃ ج ۵ ص ۳۳۳)

"وقال القاضی لا یرفعهما کل الرفع حتی یجاوز رأسه ویری بیاض ابطیه لو لم یکن علیه ثوب الا فی الاستسقاء لانه ثبت استحباب رفع الیدین فی الادعیة کلها ای غالبها" (مرقاۃ ج ۳ ص ۳۳۳)

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے فرمایا کہ آپ دعا میں اتنے زیادہ ہاتھ نہیں اٹھاتے کہ آپ کے سر سے ہاتھ تجاوز کر جاتے اور آپ کی بغلوں کی سفید نظر آتی جب کہ آپ پر کپڑا نہ ہوتا سوائے استسقاء کے کیونکہ تمام دعاؤں میں آپ کا غالباً ہاتھ اٹھانا ثابت ہے۔

"وفیه ان الجزری عد فی الحصن من جملة آداب الدعاء مسح وجهه بیدیه بعد فراغه" (مرقاۃ ج ۵ ص ۴۲)

علامہ جزری نے اپنی کتاب حصن میں آداب دعا ذکر فرمائے ان میں یہ بھی ذکر فرمایا کہ دعا سے

فارغ ہونے کے بعد اپنے ہاتھ منہ پر پھیر لے۔

☆ "وعن سلمان قال قال رسول اللہ ﷺ ان ربکم حی کریم یستحی من عبدہ اذا رفع یدیه الیه ان یردھما صفرا" (رواہ الترمذی وابو داؤد والبیھقی فی الدعوات الکبر)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک تمہارا رب حیاء فرمانے والا ہے (جو اس کی شان کے لائق ہے) اور کریم ہے اپنے بندے سے حیاء فرماتا ہے جب وہ اپنے ہاتھ اس کی طرف اٹھاتا ہے کہ ان کو خالی لوٹا دے۔

وضاحت حدیث: حیی (فعیل کا وزن ہے) حیاء فرمانے والا، رب تعالیٰ کے حیاء کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جو کام بندے کے لئے نفع مند ہو وہ کرتا ہے اور جو کام نقصان دہ ہو اسے چھوڑ دیتا ہے۔

" کریم " وھو الذی یعطی من غیر سؤال فکیف بعدہ "

اللہ تعالیٰ کے کریم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بغیر سوال کے عطا کرتا ہے سوال کے بعد کس طرح عطا نہیں کرے گا۔ " صفرا " (بکسر الصا دو سکون الفاء) خالی ہونا، فارغ ہونا۔

حدیث شریف کا مطلب واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شان کے جو لائق ہے وہ حیاء فرماتا ہے اور وہ کریم ہے اس لئے بندہ جب اس کے حضور اپنے ہاتھ اٹھاتا ہے تو وہ اپنے بندے کے ہاتھوں کو خالی لوٹانے سے حیاء فرماتا ہے یعنی وہ اپنے بندے کی دعا قبول فرماتا ہے۔

☆ "وعن عمر قال کان رسول اللہ ﷺ اذا رفع یدیه فی الدعاء لم یحطھما حتی یمسح بھما وجھه" (رواہ الترمذی، مشکوۃ کتاب الدعوات)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ دعا میں جب اپنے ہاتھ اٹھاتے تو ان کو واپس نہیں لوٹاتے تھے یہاں تک کہ ان کو اپنے منہ پر پھیر لیتے۔

وضاحت حدیث : "قیل حکمة الرفع الی السماء انھا قبلة الدعاء ومھبط الرزق والوحی والرحمة والبرکة"

ہاتھوں کو آسمانوں کی طرف اٹھانے میں حکمت یہ ہے کہ وہ دعا کا قبلہ ہے اور رزق وہاں سے اترتا ہے اور وحی کے آنے کا مقام ہے کیونکہ قرآن پاک ایک مرتبہ ہی لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر نازل ہوا ہے پھر وہاں سے ضرورت کے مطابق بذریعہ وحی نازل ہوتا رہا:

" قال الغزالی ولایرفع بصره الی السماء لخبر فیه "

علامہ غزالی رحمہ اللہ نے فرمایا دعا میں نظر آسمانوں کی طرف نہ اٹھائے۔

" وقد عد الجزری فی الحصن من آداب الدعاء ان لا یرفع بصره الی السماء "

جزری رحمہ اللہ نے بھی آداب دعا میں یہی ذکر کیا ہے کہ دعا میں اپنی نظر کو آسمانوں کی طرف نہ اٹھائے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں میں ہے حالانکہ وہ تو مکان سے پاک ہے۔''ہاتھ نیچے واپس لوٹانے سے پہلے اپنے چہرے پر پھیرے'' وجہ اس کی وہی ہے جو پہلے ذکر کر دی گئی کہ اس کے ہاتھ رحمت و برکت سے بھر جاتے ہیں پھر وہ چہرے پر پھیر دیئے جائیں تا کہ چہرہ بھی رحمت و برکت کے انوار سے منور ہو جائے۔ (ازمرقاۃ)

☆ " وعن عائشة قالت كان رسول الله ﷺ يستحب الجوامع من الدعاء ويدع ماسوى ذلك " (رواه ابوداؤد ، مشكوة كتاب الدعوات)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ دعا میں سے جوامع کو پسند فرماتے تھے اور اس کے ماسوا کو چھوڑ دیتے تھے۔

وضاحت حدیث: " الجوامع " کے مختلف مطالب بیان کئے گئے ہیں جو تمام ہی مراد ہیں۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ آپ ایسی دعا فرماتے جو نیک اغراض کی جامع ہوتی۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ایسی دعا فرماتے جو اللہ تعالیٰ کی ثناء کی جامع ہوتی۔ اور یہ مطلب ہے کہ آپ ایسی دعا فرماتے جو آداب مسئلہ کی جامع ہوتی۔ علامہ مظہر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''جوامع'' کا یہاں بھی وہی معنی ہے جو آپ کے خصوصی صفت جوامع الکلم کا معنی ہے وہ یہ ہے:

" ما لفظه قليل ومعناه كثير شامل لامور الدنيا والآخرة "

جس کے لفظ قلیل ہوں اور معانی کثیر ہوں جو امور دنیا اور آخرت پر مشتمل ہو۔ نبی کریم ﷺ مختصر دعائیں کرتے جو کثیر معانی پر مشتمل ہوتیں وہ یہ ہیں:

﴿ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴾

﴿ اللهم انی اسألک العفو والعافية فی الدين والدنيا والآخرة ﴾

﴿ اللهم ان اسألک الهدى والتقى والعفاف والغنى ﴾

اور جو دعا جامع نہیں ہوتی تھی وہ دعا آپ نہیں فرماتے تھے اور آپ صرف اپنی ذات کے لئے دعا نہیں فرماتے تھے بلکہ اپنی دعا میں اور لوگوں کو بھی شامل کرتے تھے۔

☆ " وعن عمر بن الخطاب قال استأذنت النبی ﷺ فی العمرة فاذن لی وقال اشرکنا یا اخی فی دعائک ولا تنسنا فقال کلمة ما یسرنی ان لی بھا الدنیا "

(رواہ ابو داؤد والترمذی وانتھت روایته عند قوله ولا تنسنا مشکوۃ کتاب الدعوات)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے عمرہ میں نبی کریم ﷺ سے اجازت طلب کی تو آپ نے مجھے اجازت دے دی اور آپ نے فرمایا اے میرے پیارے بھائی ہمیں اپنی دعا میں شریک رکھنا اور ہمیں بھلانا نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے وہ کلمہ ارشاد فرمایا جو میرے لئے تمام دنیا سے زیادہ خوش کرنے والا تھا۔

وضاحت حدیث : یہ اس عمرہ کی بات ہے جو آپ نے زمانہ جاہلیت میں نذر مانی تھی کہ میں عمرہ ادا کروں گا۔ اگر چہ وہ نذر پوری کرنی آپ پر واجب نہ تھی لیکن عبادت خواہ مستحب ہو عبادت ہی ہوتی ہے اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے آپ کو اجازت فرمادی۔

" وقال اشرکنا " میں " نا " ضمیر جمع متکلم کی ہے جو مفعول ہے اشرک امر کا صیغہ ہے۔ جمع متکلم کی ضمیر کے ذکر کرنے کی دو مطلب ہوسکتے ہیں " یحتمل نون العظمة وان یرید نحن واتباعنا " کہ نون عظمت پر دلالت کر رہا ہو یا آپ کی مراد یہ ہو کہ مجھے اور میرے متبعین تمام کو اپنی دعا میں شریک رکھنا یعنی ہمارے لئے بھی دعا کرنا۔ " یا اخی " تصغیر کا صیغہ ہے جو لطف ومہربانی پر دلالت کر رہا ہے۔ اگر چہ تصغیر کبھی تحقیر کے لئے بھی آتی ہے لیکن وہ یہاں معتبر نہیں۔ نبی کریم ﷺ کا یہ فرمانا کہ ہمیں اپنا دعا میں شریک رکھنا اس سے چند فوائد حاصل ہوئے:

(۱) " فیه اظھار الخضوع والمسکنة فی مقام العبودیة بالتماس الدعاء ممن عرف له الھدایة "

نبی کریم ﷺ نے مقام عبودیت میں اپنے عجز اور اپنی مسکینی کا اظہار فرمایا کہ آپ اس شخص سے دعا کرنا کا التماس کر رہے ہیں کہ جس کے متعلق آپ کو معلوم ہے کہ وہ ہدایت کے اعلیٰ منصب پر قائم ہیں۔

(۲) " وحث للامة علی المرغبة فی دعاء الصالحین واھل العبادة "

اور آپ نے اپنی امت کو اس پر برانگیختہ کیا کہ وہ نیک اور عبادت گزار لوگوں سے دعا کرانے میں رغبت رکھیں۔

(۳) " وتنبیه لهم علی ان لا یخصوا انفسهم بالدعاء ولا یشارکوا فیه اقاربهم واحیاء هم لا سیما فی مظان الاجابة "

اور اس پر متنبہ فرمایا کہ دعا کرتے وقت صرف اپنے لئے دعا نہ کرو اور ایسی دعا نہ کرو جس میں اپنے رشتہ داروں اور اپنے احباب کو شریک نہ کرو خاص کر کے اس دعا میں جس کی قبولیت کی قوی امید ہو۔ یعنی دعا کرتے وقت اپنے ساتھ اپنے رشتہ داروں اور اپنے احباب اور تمام مسلمانوں کو شریک کرے۔

(۴) " وتفخیم لشان عمر " اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شان بیان کی گئی ہے کہ آپ کی دعا کی قبولیت کی قوی امید پائی گئی ہے۔ " ولا تنسنا " (اور ہمیں بھلائیں نہیں) یہ الفاظ تاکید پر دلالت کر رہے ہیں کہ عمرہ کرتے ہوئے تمام احوال میں ہمیں یاد رکھنا ہمیں نہ بھلانا۔

" فقال کلمة ما یسرنی ان لی بها الدنیا " ان الفاظ مبارکہ میں " قال " کا فاعل " عمر " ہیں اور " کلمة " مفعول ہے فعل محذوف کا یعنی " تکلم النبی ﷺ کلمة "۔ " ما " نافیه ہے اور " بها " میں باء بدلیت کے لئے ہے۔ اب عبارت کا مطلب یہ ہوگا:

"قال عمر تکلم النبی ﷺ کلمة لا یعجبنی ولا یفرحنی کون جمیع الدنیا لی بدلها "

کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے ایسا کلمہ ارشاد فرمایا کہ تمام دنیا اگر اس کے بدلہ میں مجھے مل جائے تو تمام دنیا کا مال و دولت مجھے اتنا خوش نہیں کر سکتا جتنا اس ایک کلمہ نے مجھے خوش کیا (خیال ہے راقم نے ان الفاظ کا ترجمہ اوپر مرادی ذکر کیا ہے لفظوں کے مطابق تفصیلی ترجمہ یہی ہے جو ذکر کر دیا گیا۔

☆ " وعن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ ثلاثة لا ترد دعوتهم الصائم حین یفطر والامام العادل ودعوة المظلوم یرفعها الله فوق الغمام وتفتح لها ابواب السماء ویقول الرب وعزتی لا نصرنک ولو بعد حین " (رواه الترمذی، مشکوة کتاب الدعوات)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین شخصوں کی دعا کو رد نہیں

کیا جاتا روزہ دار جب افطار کے وقت دعا کرے اور عادل امام جب دعا کرے اور مظلوم کی دعا کو اللہ تعالیٰ بادلوں سے اوپر اٹھالیتا ہے اور اس کے لئے آسمانوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور رب تعالیٰ کہتا ہے مجھے میری عزت کی قسم میں تمہاری ضرور بر ضرور امداد کروں گا اگر چہ کچھ وقت کے بعد۔

وضاحت حدیث : تین اشخاص کا جو ذکر کیا گیا ہے ان میں دعا کی قبولیت کو منحصر نہیں کیا بلکہ بعد میں آنے والی احادیث میں اور اشخاص کا بھی ذکر ہے یہ قید اتفاقی ہے " **لا ترد دعوتهم** " (ان کی دعا کو رد نہیں کیا جاتا) اس سے یہ واضح ہوا کہ دعا کی جلدی قبولیت دعا کرنے والے کی نیکی سے ہوتی ہے یا دعا میں خلوص اور عجز وانکساری پائے جائیں۔ چونکہ روزہ دار بھی صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے روزہ رکھتا ہے۔ اس کی عبادت میں خلوص پایا جاتا ہے اس لئے اس عبادت کی تکمیل کے وقت اس کی دعا کو قبول کیا جاتا ہے۔

" **والامام العادل اذ عدل ساعة منه خير من عبادة ستين ساعة كما في حديث** "

عادل حاکم کی دعا کو اس لئے قبول کیا جاتا ہے کہ اس کا ایک گھڑی عدل کرنا ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے اسی طرح حدیث پاک میں مذکور ہے۔ مظلوم کی دعا کو اس لئے قبول کیا جاتا ہے کہ ظلم کی آگ اس کی انتڑیوں کو جلا دیتی ہے وہ نہایت عاجزی اور انکساری سے رب تعالیٰ کے حضور دعا کرتا ہے اس لئے اس کی دعا کی قبولیت کا بڑا وثوق دلایا جاتا ہے رب تعالیٰ فرماتا ہے:

" **وعزتی لا نصر نک ولو بعد حین** " مجھے اپنے عزت کی قسم میں تمہاری ضرور امداد کروں گا اگر چہ کچھ وقت کے بعد۔ گویا کہ رب تعالیٰ کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ تمہارا حق ضائع نہیں کیا جائے گا تمہاری دعا کو رد نہیں کیا جائے گا اگر چہ کچھ وقت بھی گزر گیا کیونکہ میں حلیم ہوں میں اپنے بندوں کو جلدی سزا نہیں دیتا ہوسکتا ہے کہ وہ ظلم سے باز آ جائے تائب ہو جائے اسی سے پتہ چلا " **انه تعالىٰ يمهل الظالم ولا يهمله** " بیشک اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت تو دیتا ہے لیکن ظالم کو چھوڑتا نہیں اسی پر رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی دلالت کررہا ہے۔

﴿ وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾

''اور ہرگز گمان نہ کرو کہ اللہ غافل ہے اس سے جو ظالم عمل کرتے ہیں''۔

یعنی رب تعالیٰ ظالموں کے ظلم سے غافل نہیں بلکہ ان کو انجام تک پہنچاتا ہے رب تعالیٰ کے دربار میں دیر ہے اندھیر نہیں۔ (از مرقاۃ)

☆ " وعن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ ثلاث دعوات مستجابات لا شک فیهن دعوة الوالد ودعوة المسافر ودعوة المظلوم "

(رواه الترمذی وابوداؤد وابن ماجه ، مشکوٰة کتاب الدعوات)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین دعاؤں کو قبول کیا جاتا ہے جن کی قبولیت میں کوئی شک نہیں والد کی دعا اور مسافر کی دعا اور مظلوم کی دعا۔

وضاحت حدیث : ان تین دعاؤں کی قبولیت کی وجہ بھی یہ ہے " لا لتجاء هؤلاء الثلاثة الی الله تعالیٰ بصدق الطلب ورقة القلب وانكسار الخاطر " کہ یہ لوگ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سچی طلب اور رقتِ قلب (دل کی نرمی) اور شکستہ دل سے التجاء کرتے ہیں لہٰذا ان کی دعائیں ان کے عجز اور خلوص کی وجہ سے قبول کی جاتی ہیں۔ والد اپنی اولاد کے حق میں دعا کرے یا اولاد کے خلاف دعا کرے اللہ تعالیٰ اسے قبول فرماتا ہے والد کا ذکر حدیث پاک میں کیا گیا ہے والدہ کا ذکر نہیں کیا گیا اسکی وجہ یہ ہے کہ اکثر مقامات میں قرآن پاک اور حدیث پاک میں مذکر کے صیغے استعمال ہیں۔ ان میں بالتبع مؤنث کا ذکر بھی پایا جاتا ہے دوسری وجہ یہ ہے " ان حقها اكثر فدعاؤها اولی بالاجابة " کہ بیشک ماں کا حق زیادہ ہے اس لئے اس کی دعا میں شرف قبولیت بھی زیادہ ہے اس مسئلہ کو واضح ہونے کی وجہ سے ذکر نہیں کیا گیا۔ تاہم راقم کے نزدیک پہلی وجہ زیادہ قوی ہے۔ مسافر کی دعا کی قبولیت کی وجہ یہ ہے کہ مسافر رقتِ قلب سے دعا کرتا ہے خواہ کسی کے حق میں دعا کرے کہ اس پر کسی نے مہربانی کی ہو یا وہ کسی کے خلاف دعا کرے کہ اس پر کسی نے ظلم کیا ہے یا اسے کسی نے ستایا ہے۔ (از مرقاۃ)

☆ " وعن ابن عباس عن النبی ﷺ قال خمس دعوات يستجاب لهن دعوة المظلوم حتى ينتصر ودعوة الحاج حتى يصدر ودعوة المجاهد حتى يقعد ودعوة المريض حتى يبرأ ودعوة الاخ لاخيه بظهر الغيب ثم قال واسرع هذه الدعوات اجابة دعوة الاخ بظهر الغيب "

(رواه البیهقی فی الدعوات الکبیر ، مشکوٰة کتاب الدعوات)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا پانچ دعائیں قبول کی جاتی ہیں مظلوم کی دعا یہاں تک کہ وہ اپنی امداد خود کر لے۔ حاجی کی دعا یہاں تک کہ وہ لوٹ آئے اور مجاہد کی دعا یہاں تک کہ وہ (جہاد سے ہٹ کر) بیٹھ جائے۔ اور مریض کی دعا یہاں تک کہ وہ صحت یاب ہو جائے اور بھائی کی اپنے (مؤمن) بھائی کے لئے دعا اس کی غیر موجودگی میں کی جائے۔

وضاحت حدیث: مظلوم کی دعا جلدی قبول ہوتی ہے بشرطیکہ مظلوم ظالم سے انتقام نہ لے اگر اس نے زبان سے یا ہاتھ سے انتقام لے لیا تو اس نے اپنا حق حاصل کر لیا اب دعا کی قبولیت کا وہ مقام نہ رہا جو مظلومیت کے حال میں تھا۔ یہ بھی خیال رہے کہ اگر مظلوم نے اپنے سے زیادہ زیادتی کر لی تو اب یہ ظالم ہو گیا اور ظالم مظلوم ہو گیا اس لئے جتنی اس سے زیادتی کی گئی اس سے بڑھ کر انتقام لینا جائز نہیں۔ حاجی کی دعائیں دوران حج جلدی قبول ہوتی ہیں جب وہ اپنے گھر اور اپنے اہل وعیال میں لوٹ کر آ جائے تو وہ مقام مقبولیت اسے حاصل نہیں رہتا جو اسے حج کے دوران حاصل تھا۔

مجاہد جب تک جہاد میں شریک ہوتا ہے اسوقت تک اسکی دعا میں جو قبولیت ہوتی ہے وہ جہاد سے فارغ ہونے کے بعد نہیں ہوتی۔ مریض کی دعا اسکی مرض میں جو شرف قبولیت حاصل کرتی ہے وہ مرض سے صحت یاب ہونے کے بعد نہیں۔ جب کوئی مومن شخص اپنے مومن بھائی کی غیر موجودگی میں اسکے حق میں دعا کرے تو وہ زیادہ جلدی قبول ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں خلوص نیت پائی جاتی ہے ریاء سے خالی ہوتی ہے اسی لئے مروی ہے " ان اللہ فی عون العبد ما دام العبد فی عون اخیہ المسلم " بیشک اللہ تعالیٰ بندے کا معاون ہوتا ہے جب تک وہ اپنے مسلمان بھائی کی امداد کرتا ہے۔ (از مرقاۃ)

☆ " وعن انس قال ان رسول اللہ ﷺ یرفع یدیہ فی الدعاء حتی یری بیاض ابطیہ "

☆ " وعن سہل بن سعد عن النبی ﷺ قال کان یحمل اصبعیہ خدا ء منکبیہ ویدعو "

☆ " وعن السائب بن یزید عن ابیہ ان النبی ﷺ کان اذا دعا رفع یدیہ مسح وجہہ بیدیہ "

(روای البیہقی الاحادیث الثلاثۃ فی الدعوات الکبیر ، مشکوۃ)

مندرجہ بالا تین حدیثیں بیہقی نے دعوات کبیر میں ذکر فرمائی ہیں۔ پہلی حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ دعا میں اپنے ہاتھ اٹھاتے تھے یہاں تک کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آتی۔ عام طور پر دعا کرتے وقت سینے کے برابر رہنے چاہئیں لیکن جواز ثابت کرنے کے لئے آپ نے کبھی کبھی ہاتھ زیادہ بلند بھی کئے ہیں۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ اس حدیث میں استسقاء کے وقت دعا

کرنے کا ذکر ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس حدیث میں مصیبت کے وقت دعا کرتے ہوئے زیادہ بلند کرنے کا ذکر ہو۔

دوسری حدیث میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ دعا کرتے وقت اپنی انگلیوں کو کندھوں کے برابر کرتے۔ اس حدیث پاک میں یا تو یہی ذکر ہے کہ آپ دعا میں جب ہاتھ اٹھاتے تو ہتھیلیاں سینہ کے برابر ہوتیں اور انگلیاں کندوں کے برابر ہوتیں۔ اور یا یہ مطلب ہے " وهی حالة المبالغة والالحاح فی الدعاء والمسئلة " کہ آپ دعا جب زیادہ گڑگڑا کر کرتے اور اہم سوال کرتے اور بار بار عاجزی سے دعا کرتے تو ہاتھ زیادہ بلند کر کے اٹھاتے۔ تیسری حدیث سائب بن یزید اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ بیشک نبی کریم ﷺ اپنے ہاتھوں کو اٹھاتے تو پھر اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر پھیر لیتے۔

☆ " عن عكرمة عن ابن عباس قال المسئلة ان ترفع يديك حذو منكبيك او نحوهما والاستغفار ان تشير باصبع واحد والابتهال ان تمد يديك جميعا وفی رواية قال والابتهال هكذا ورفع يديه وجعل ظهورها مما يلی وجهه "

(رواہ ابو داؤد، مشکوۃ کتاب الدعوات)

حضرت عکرمہ حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہم) سے روایت کرتے ہیں سوال یہ ہے (دعا کے آداب میں سے یہ ہے) کہ تم اپنے ہاتھ کندھے تک یا اس کے قریب اٹھاؤ۔ اور استغفار کے وقت ایک انگلی سے اشارہ کرو اور زیادہ عجز کے وقت اپنے ہاتھوں کو اٹھاؤ اور ان کی پیٹھ اپنے چہرہ کی طرف کرو۔

وضاحت حدیث : حدیث شریف میں " المسئلة " سے مراد سوال اور دعا ہے یعنی دعا کرتے وقت ہاتھوں کی انگلیاں کندھے کے برابر رہیں اور ہتھیلیاں سینہ کے برابر رہیں۔ اور استغفار کے وقت ایک انگلی سے اشارہ کرے یعنی " ادب الاستغفار الاشارة بالسبابة سبها للنفس الامارة والشيطان والتعوذ منهما " استغفار کے آداب میں سے ایک یہ ہے کہ اپنی سبابہ (شہادت کی انگلی) سے اشارہ کرنا مقصد اس میں شیطان اور نفس امارہ کو گالیاں دینا ہوگا اور ان دونوں سے پناہ پکڑنا ہوگا۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ استغفار کرتے وقت ایک انگلی سے اشارہ کرے دو انگلیوں سے اشارہ نہ کرے۔

" لما روی انه عليه الصلوة والسلام رأی رجلا يشير بهما فقال له احد احد "

کیونکہ مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا جو دو انگلیوں سے اشارہ کر رہا ہے تو آپ نے فرمایا ایک انگلی سے اشارہ کرو ایک انگلی سے اشارہ کرو۔

" والابتهال ای التضرع والمبالغة فی الدعاء فی دفع المکروه عن النفس "

ابتہال کا معنی یہ ہے کہ عاجزی کرے اور اپنے نفس سے مصیبت کے دور کرنے میں مبالغہ سے دعا کرے۔ یعنی مصیبت کے دور کرنے میں دعا کرتے وقت بہتر یہ ہے کہ ہاتھ بہت زیادہ بلند کرے اور ایک روایت میں یہ ہے " **وجعل ظهورهما مما یلی وجهه** " اس عبارت کے دو مطلب ہیں کہ ہاتھ بہت زیادہ بلند کرے سر کے برابر کر دے تاکہ اسکے ہاتھوں کی پیٹھ اسکے چہرہ کے برابر ہو جائے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ الٹے ہاتھوں سے دعا کرے دونوں وجوہ شارحین کے اقوال سے ملتی ہیں۔

☆ " **عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ ان الله عزوجل ليرفع الدرجة للعبد الصالح فی الجنة فيقول يا رب انى لى هذه فيقول باستغفار ولدک** "

(رواه احمد، مشکوة کتاب الاستغفار والتوبة)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ جنت میں ایک نیک بندے کے درجات کو بلند فرمائے گا تو وہ کہے گا اے میرے رب مجھے یہ درجات کہاں سے مل گئے؟ تو رب تعالیٰ فرمائے گا تیری اولاد کی استغفار کی وجہ سے۔ اس حدیث سے واضح ہوا کہ اولاد کی استغفار اور والدین کے حق میں دعا سے والدین کے مدارج بلند ہوتے ہیں۔

☆ " **وعن عبد الله بن عباس قال قال رسول الله ﷺ الميت فی القبر الا كالغريق المتغوث ينتظر دعوة تلحقه من اب او ام او اخ او صديق فاذا لحقه كان احب اليه من الدنيا وما فيها وان الله تعالىٰ ليدخل على اهل القبور من دعاء اهل الارض امثال الجبال وان هدية الاحياء الى الاموات الاستغفار لهم** "

(رواه البيهقی فی شعب الايمان مشکوة باب الاستغفار والتوبة)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قبر میں کوئی میت نہیں مگر یہ کہ غرق ہونے والے فریاد طلب کرنے والے کی طرح ہوتا ہے۔ وہ دعا کی انتظار میں ہوتا ہے کہ اسے دعا ملے اس کے باپ یا ماں یا بھائی یا دوست کی طرف سے جب اسے وہ دعا لاحق ہوتی ہے تو دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے اسے وہ زیادہ محبوب ہوتی ہے بیشک اللہ تعالیٰ قبروں والوں کے پاس

زمین والوں کی دعا سے پہاڑوں کی طرح ثواب داخل کرتا ہے۔اور بیشک زندہ لوگوں کی طرف سے مردوں کے لئے ہدیہ یہ ہے کہ ان کے لئے بخشش طلب کریں۔

وضاحت حدیث : کالغریق ،غرق ہونے کے قریب یعنی ڈوب رہا ہو " المتغوث " فریاد طلب کرنے والا امداد طلب کرنے والا ، پناہ پکڑنے والا ، بلند آواز سے قرب وجوار کے لوگوں کو پکارنے والا کہ کوئی اسے آکر بچائے۔

حدیث پاک کا مفہوم واضح ہے کہ قبر میں میت ڈوبنے والے کی طرح فریاد کر رہا ہوتا ہے امداد کرنے کی درخواست کر رہا ہوتا ہے " **کالغریق یتعلق بکل حشیش** " جیسا کہ ڈوبنے والا ہر تنکے کا سہارا لیتا ہے۔جس طرح ڈوبنے والا اس انتظار میں ہوتا ہے کہ کوئی شخص کنارے پر ہو یا میری آواز سن رہا ہو تو وہ میری امداد کرے اسی طرح قبر والا شخص اس انتظار میں ہوتا ہے کہ اس کا باپ یا ماں یا بھائی یا اولاد اور دوست احباب اس کے لئے مغفرت کی دعا کریں۔قبر والے شخص کو دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ پسندیدہ پیچھے رہنے والوں کی دعا ہے۔

پیچھے رہنے والوں کی دعا کی وجہ سے اس کے اعمال میں ترقی ہوتی رہتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب پیچھے رہنے والے اس کے لئے زیادہ سے زیادہ دعا کریں گے تو اسے پہاڑوں جتنا ثواب جب حاصل ہوگا تو وہ تعجب سے رب تعالیٰ سے سوال کرے گا کہ یہ ثواب مجھے کہاں سے حاصل ہو گیا میرے اعمال تو اس قابل نہیں تو اسے بتایا جائے گا کہ یہ وہ ہدیہ ہے جو زندہ لوگوں کی طرف سے مردہ حضرات کی بخشش طلب کی گئی۔

فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ : ''تو چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں''

اس کا ایک معنی مجاہد وغیرہ نے یہ بیان کیا ہے:

" **فلیجیبوا الی فیما دعوتھم الیہ من الایمان ای الطاعۃ و العمل** "

کہ میں ان کو ایمان کی دعوت دیتا ہوں اسے قبول کریں اس کی فرمانبرداری کریں اور اس پر عمل کریں " **اجاب و استجاب بمعنی** " اجاب اور استجاب ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

اعلیٰ حضرت و پیر محمد کرم شاہ رحمھما اللہ نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔لیکن ابو رجاء خراسانی رحمہ

اللہ نے یہ ترجمہ کیا ہے " فلیدعوالی "وہ مجھ سے ہی دعا کریں۔اورابن عطیہ نے یہ ترجمہ کیا ہے "فلیطلبوا ان اجیبھم " وہ مجھ سے طلب کریں کہ میں ان کی دعا کو قبول کروں ان دونوں قولوں کے مطابق ترجمہ یہ ہوگا تو چاہئے کہ وہ مجھ سے قبولیت طلب کریں (طلباء کرام یہ ترجمہ بھی یاد کرلیں) راقم کا یہی ترجمہ ہے) اس صورت میں سین اور تاء طلب کیلئے ہیں پہلی صورت سین زائد ہے اور لام امر کا لام ہے۔
(قرطبی)

وَلْيُؤْمِنُوْا بِیْ : "اور مجھ پر ایمان لائیں" ﴿ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِیْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِیْ ﴾ ان دونوں جملوں کا ماقبل سے ربط یہ ہے کہ گویا کہ اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرماتا ہے:

" انا اجیب دعاءک مع انی غنی عنک مطلقا فکن انت ایضا مجیبا لدعائی مع انک محتاج الی من کل الوجوہ فما اعظم ھذا الکرم "

کہ میں تمہاری دعا کو قبول کرتا ہوں باوجود اس کے کہ میں تم سے مطلقاً غنی ہوں تم بھی میرے حکم کو مانو اور دعا کرو باوجود اس کے تم ہر طرح میرے محتاج ہو رب تعالیٰ کا یہ کہنا بہت عظیم کرم ہے۔اور اس میں عجیب نکتہ یہ پایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا" اجب دعائی حتی اجیب دعاءک " (تم میرا حکم مانو تو میں تمہاری دعا کو قبول کروں گا):

" وھذا تنبیه علی ان اجابة الله عبده فضل منه ابتداء وانه غیر معلل بطاعة العبد "

یہاں یہ واضح کردیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا دعا کو قبول کرنا اس سے ابتدائی طور پر فضل ہے اس قبولیت کی دارومدار بندے کی طاعت پر موقوف نہیں بلکہ رب تعالیٰ اپنے فضل سے بعض اوقات بندے کی طاعت میں مشغولیت سے پہلے ہی دعا قبول فرمالیتا ہے۔

تنبیہ : اجابة کی نسبت بندے کی طرف بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف بھی ہے لیکن " الاجابة من العبد لله الطاعة و اجابة الله لعبده اعطاؤه ایاه مطلوبه " جب نسبت بندے کی طرف ہوگی تو معنی ہوگا" طاعت" یعنی بندہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو مانتا ہے اور جب نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جائے تو معنی ہوگا"قبول کرنا" یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی دعا کو قبول کرکے اس کا مطلوب اسے ادا کرے گا۔

اعتراض : اگر ﴿ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِیْ ﴾ میں " استجابة " کو بمعنی" اجابة "لیا جائے تو "اجابة" کا معنی کیا جائے گا؟ اگر معنی یہ ہو کہ دل اور زبان سے میرا حکم ہونا" فذاک ھو الایمان " تو

یہ عین ایمان ہے۔تو اس صورت میں ﴿ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ ﴾ میں تکرار محض ہوگا۔اگر "اجابۃ" کا معنیٰ "طاعت" لیا جائے تو معاملہ الٹ ہو جائے گا کیونکہ ایمان پہلے ہے اور طاعت بعد میں یہاں طاعت پہلے ہو جائے گی اور ایمان بعد میں۔

جواب: استجابۃ کا معنیٰ ہے اطاعت وفرمانبرداری اور ایمان دل کی صفت ہے۔اگرچہ یہ بات درست ہے کہ اصل ایمان پہلے ہے اور طاعت بعد میں لیکن مراد تو کمال ایمان اور نور ایمان ہے:

" فهذا يدل على ان العبد لا يصل الى نور الايمان وقوته الا بتقدم الطاعات والعبادات "

تو یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ بندہ نور ایمان اور قوت ایمان تک اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک طاعات اور عبادت کو مقدم نہ کیا جائے گویا کہ حکم یوں ہو گیا کہ میرے بندوں کو چاہئے کہ وہ میری فرمانبرداری کریں میرا حکم مانیں اور کامل ایمان مجھ پر ہی رکھیں اور میرے احکام مان کر نور ایمان حاصل کریں۔ (از کبیر)

لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ : "تا کہ وہ ہدایت پا جائیں" رشد مقابل ہے غی کے ہدایت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا اس آیۃ میں استعمال ہے اسی طرح " فان آنستم منهم رشدا " میں بھی تقریباً اسی معنی میں استعمال ہے۔یہ خیال رہے کہ " رشد " (بفتح الراء والشين) خاص ہے بنسبت "رشد" (بضم الراء وسكون الشين) کے اس لئے کہ " رشد " (بضم الراء) استعمال ہوتا ہے امور دنیوی اور اخروی دونوں میں اور رشد (بفتح الراء) کا استعمال صرف امور اخروی میں ہے راشد اور رشید دونوں ہی ہدایت پر چلنے کے معنی میں استعمال ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ﴾ اور " وما امر فرعون برشيد " سے واضح ہو رہا ہے۔

(از مفردات راغب)

" ومعنى الآية انهم اذا استجابوا لى و آمنوا بى اهتدوا لمصالح دينهم و دنياهم "

آیۃ کریمہ کا معنیٰ یہ ہے کہ بیشک میرے بندے جب میرے احکام مانیں گے یا مجھ سے ہی دعا کی قبولیت کی درخواست کریں گے اور مجھ پر ایمان لائیں تو ان کو دینی اور دنیاوی مصلحتوں کی ہدایت حاصل ہو جائے گی اس لئے کہ رشد کا معنیٰ ہی ہدایت ہے۔ (کبیر)

☆☆☆☆☆

﴿ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴾

۱) ''روزوں کی راتوں میں اپنی عورتوں کے پاس جانا تمہارے لئے حلال ہوا وہ تمہاری لباس ہیں اور تم ان کے لباس اللہ نے جانا کہ تم اپنی جانوں کو خیانت میں ڈالتے تھے تو اس نے تمہاری توبہ قبول کی اور تمہیں معاف فرمایا تو اب ان سے صحبت کرو اور طلب کرو جو اللہ نے تمہارے نصیب میں لکھا ہو اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ تمہارے لئے ظاہر ہو جائے سفیدی کا ڈورا سیاہی کے ڈورے سے پوپھٹکر پھر رات آنے تک روزے پورے کرو اور عورتوں کو ہاتھ نہ لگاؤ جب تم مسجدوں میں اعتکاف سے ہو یہ اللہ کی حدیں ہیں ان کے پاس نہ جاؤ اللہ یوں ہی بیان کرتا ہے لوگوں سے اپنی آیتیں کہ کہیں انہیں پرہیز گاری ملے''۔

۲) ''حلال کیا گیا ہے تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں تمہارا اپنی عورتوں کے پاس جانا وہ لباس ہیں تمہارا اور تم لباس ہو ان کا اللہ کو معلوم ہے بیشک تم خیانت میں ڈالتے ہو اپنے نفسوں کو تو اس نے تمہاری توبہ قبول فرمائی اور تمہیں معاف کیا تو اب ان سے صحبت کرو اور طلب کرو جو

لکھا ہے اللہ نے تمہارے لئے اور کھاؤ او پیو یہاں تک کہ ظاہر ہو جائے تمہارے لئے دھاگہ سفید دھاگے سیاہ سے یعنی فجر سے پھر پورا کرو تم روزوں کو رات تک اور ہاتھ نہ لگاؤ ان (عورتوں) کو ایسے حال میں کہ جب تم اعتکاف میں ہو مساجد میں یہ اللہ کی حدیں ہیں تو نہ قریب جاؤ ان کے اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ اپنی نشانیاں لوگوں کے لئے تا کہ وہ پرہیزگار ہو جائیں''۔

شان نزول : چند واقعات کے درپیش آنے کے بعد اس آیۃ کریمہ کا نزول ہوا وہ تمام واقعات مجموعی طور پر اس آیت کے نزول کا سبب ہیں اور " اُحِلَّ لَکُمْ " کے الفاظ بھی اس پر دلالت کر رہے ہیں کہ جو کام پہلے حرام تھا اسے حلال کر دیا گیا:

☆ " روی ابو داؤد عن ابن ابی لیلی قال وحدثنا اصحابنا قال وکان الرجل اذا فطر فنام قبل ان یأکل لم یأکل حتی یصبح قال فجاء عمر فاراد امرأته فقالت انی قد نمت فظن انها تعتل فاتاها ، فجاء رجل من الانصار فاراد طعاما فقالوا حتی نسخن لک شیأ فنام فلما اصبحوا انزلت هذه الآیة "

ایک وجہ شان نزول کی ابوداود نے ابولیلی سے روایت جو ذکر کی ہے اس میں ہے کہ جب کوئی شخص افطار کرتا تو کھانے سے پہلے اگر سو جاتا تو پھر وہ صبح تک کھا نہیں سکتا تھا (یہی حکم جماع کا بھی تھا) حضرت عمر رضی اللہ عنہ گھر تشریف لائے تو اپنی زوجہ سے جماع کا ارادہ فرمایا تو آپ کی زوجہ نے کہا بیشک میں تو سو گئی تھی آپ نے خیال کیا کہ یہ ویسے ہی حیلہ و بہانہ کر رہی ہے آپ اس کے پاس آ گئے یعنی آپ نے اس سے جماع کر لیا۔ اسی طرح ایک اور وجہ یہ ہے کہ ایک شخص انصاری نے طعام کا ارادہ کیا تو گھر والوں نے کہا ہم تمہارے لئے کوئی چیز (کھانے کی) گرم کرتے ہیں تو اتنی دیر میں وہ سو گئے جب صبح ہوئی تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

☆ " وروی البخاری عن البراء قال کان اصحاب محمد ﷺ اذا کان الرجل صائما فحضر الافطار فنام قبل ان یفطر لم یأکل لیلته ولا یومه حتی یمسی وان قیس بن صرمة الانصاری کان صائما ، وفی روایة کان یعمل فی النخیل بالنهار وکان صائما فلما حضر الافطار اتی امرأته فقال لها اعندک طعام ؟ قالت لا ولکن انطلق فاطلب لک

وكان يومه يعمل فغلبته عيناه فجاء ته امرأته فلما رأته قالت خيبة لک فلما انتصف النهار غشي عليه فذكر ذلک للنبی ﷺ فنزلت هذه الآية (احل لكم ليلة الصيام الرفث الى نسائكم) ففرحوا فرحا شديدا ونزلت وكلوا واشربوا حتى يتبين لكم الخيط الابيض من الخيط الاسود من الفجر"

بخاری نے حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی کہ نبی کریم ﷺ کا جو صحابی بھی روزہ رکھتا تو جب روزہ کے افطار کا وقت ہوتا تو اگر وہ افطار سے پہلے سو جاتا تو رات اور دن کو وہ کچھ نہ کھا سکتا بلکہ پھر شام ہونے پر افطار کرتا حضرت قیس بن صرمۃ انصاری روزہ دار تھے اور ایک روایت میں یہ ہے کہ وہ دن کو کھجوروں کے باغ میں کام کرتے اور روزہ دار تھے جب افطار کا وقت ہوا تو آپ اپنی زوجہ کے پاس آئے ان سے پوچھا کیا تمہارے پاس کوئی کھانے کی چیز ہے؟ انہوں نے کہا پاس تو کچھ نہیں البتہ (گھر) چل کر دیکھتی ہوں کہ تمہارے لئے کوئی چیز مل جائے چونکہ وہ دن کو کام کرتے تھے اس لئے ان کی آنکھوں پر نیند کا غلبہ ہو گیا تو آپ کے پاس جب آپ کی عورت آئی (اور کھانے کی کوئی چیز لائی) تو اس نے کہا تم تو محروم ہو چکے ہو (تو انہوں نے کچھ نہ کھایا) جب نصف دن گزرا تو ان پر بیہوشی طاری ہو گئی تو یہ نبی کریم ﷺ کے سامنے ذکر کیا گیا اس وقت یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی یعنی ﴿ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ﴾ تک الفاظ مبارکہ نازل ہوئے تو صحابہ کرام بہت زیادہ خوش ہوئے اس کے بعد ﴿وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا ﴾ (الی) مِنَ الْفَجْرِ ﴾ الفاظ مبارکہ نازل ہوئے۔

☆ " وفي البخاری ايضا عن البراء قال لما نزل صوم رمضان كانوا لا يقربون النساء رمضان كله وكان رجلا يخونون انفسهم فانزل الله تعالیٰ ﴿ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ﴾

بخاری شریف میں حضرت براء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جب رمضان کے روزں کا حکم نازل ہوا تو صحابہ کرام اپنی عورتوں کے قریب تمام رمضان میں نہیں جاتے تھے تاہم بعض حضرات نے اپنے نفسوں کو خیانت میں ڈال لیا تو یہ الفاظ مبارکہ نازل فرمائے ﴿ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ﴾ (خیانت کا ذکر انشاء اللہ بعد میں آئے گا)

☆ " وذكر الطبری ان عمر رضی الله تعالیٰ عنه رجع من عند النبی ﷺ وقد سمر

عنده لیلة فوجد امرأته قد نامت فارادها فقالت له قد نمت فقال لها مانمت فوقع بها وصنع کعب بن مالک مثله فغدا عمر علی النبی ﷺ فقال اعتذر الی اللہ والیک فان نفسی زینت لی فواقعت اهلی فهل تجد لی من رخصة فقال لی لم تکن حقیقا بذلک یا عمر فلما بلغ بیته ارسل الیه فأنبأ بعذره فی آیة من القران "

طبری نے ذکر کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک رات نبی کریم ﷺ سے گفتگو فرماتے رہے جب گھر لوٹے تو آپ کی عورت سوکر اٹھی آپ نے اس کی طرف ارادہ فرمایا تو اس نے کہا کہ میں تو سو چکی تھی تو آپ نے اسے کہا تم نہیں سوئی تھی تو آپ نے جماع کرلیا۔ یہی صورت حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے بھی درپیش آ چکی تھی صبح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کیا میں اپنا عذر اللہ تعالیٰ کے حضور اور آپ کے حضور پیش کر رہا ہوں بیشک میں نے اپنی زوجہ سے جماع کرلیا۔ تو آپ نے فرمایا اے عمر تمہیں حق نہیں تھا۔ جب آپ اپنے گھر پہنچے تو آپ کو خبر دی گئی کہ قرآن پاک کی آیۃ نازل ہوگئی جس میں تمہارے عذر کو قبول کرلیا گیا۔

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ :

''حلال کیا گیا ہے تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں تمہارا اپنی عورتوں کے پاس جانا'' '' الرفث '' سے مراد کنایۃً جماع ہے چونکہ اللہ تعالیٰ کریم ہے اس لئے وہ ارشاد کنایۃً فرمایا ہے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے بھی کنایۃً ترجمہ کیا ہے ''عورتوں کے پاس جانا۔

زجاج نے کہا ہے کہ " الرفث " کا معنی عام ہے تمام ان مقاصد کو شامل ہے " ما یرید الرجل من امرأته " جو مرد اپنی عورت سے ارادہ کرتا ہے۔" وقال ابن عرفة ، الرفث ههنا الجماع " ابن عرفہ نے کہا ہے کہ " الرفث "کا معنی یہاں جماع ہے " وقیل الرفث اصله قول الفحش "، بعض حضرات نے بیان کیا "الرفث " کا اصل میں معنی بری باتیں کرنا ہے" رفث " اور " ارفث " لفظ اس کے لئے استعمال ہوتے جو قبیح کلام کرے کسی شاعر نے ذکر کیا ہے:

رب اسراب حجیج کظم عن اللغا ورفث التکلم

کتنے ہی ریگستان پر چلنے والے حاجی (اپنی آپ کو) روک کر رکھتے ہیں لغو کاموں اور قبیح کلام

کرنے سے۔(از قرطبی) لیکن خیال رہے کہ اس آیۃ کریمہ میں مراد جماع ہی ہے فحش کلامی یا عورتوں سے عشقیہ کلام کرنا مراد نہیں۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں: یہاں بظاہر اعتراض کہ " الرفث "کو " الی " سے متعدی کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے ﴿ اَلرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِکُمْ ﴾ حالانکہ " الرفث "کو" الی " سے متعدی نہیں کیا جاتا یہ نہیں کہا جاتا" رفثت الی النساء " تو یہاں متعدی الی سے کرنا کیسے صحیح ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں قاعدہ تضمین جاری ہے کہ " الرفث "کو " الافضاء " کے معنی میں لیا گیا جو " الیٰ " سے متعدی ہوتا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَقَدْ اَفْضٰی بَعْضُکُمْ اِلٰی بَعْضٍ ﴾ ''اور تحقیق بعض تمہارا بعض کی طرف پہنچا ہے''

یہاں بھی مراد عورتوں کی طرف جانا ہے لیکن پھر مراد ملابست یعنی مجامعت ہے۔(از قرطبی)

عجیب نکتہ : الرفث کا اصل معنی قبیح کلام ہے پھر اس کا مجازی معنی عورتوں کی موجودگی میں ان سے عشقیہ کلام کرنا پھر مجازی معنی جماع کرنا اور جماع کے دواعی (جماع کے دعوت دینے والے) بوس و کنار، چھونا وغیرہ۔ اب بظاہر اس پر اعتراض یہ ہوتا ہے کہ ایسا لفظ جس کا حقیقی معنی فحش کلامی ہے اس سے کنایۃ جماع معنی کیوں لیا گیا جب کہ جماع کے لئے کنایۃ الفاظ مبارکہ قرآن پاک میں اور بھی استعمال ہیں جیسا کہ

" وَقَدْ اَفْضٰی بَعْضُکُمْ اِلٰی بَعْضٍ فَلَمَّا تَغَشَّاهَا / اولا مستم النساء / دخلتهم بهن / فاتوا حرثكم / من قبل ان تمسوهن ، فما استمتعتم به منهن ،ولا تقربوهن "

" جوابه السبب فيه استهجان ما وجد منهم قبل الاباحة كما سماه اختيانا لانفسهم "

اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ صحابہ کرام سے حکم کے مباح ہونے سے پہلے بھول واقع ہوتی رہی جس کو رب تعالیٰ نے خیانت سے تعبیر فرمایا تو اسی طرح جماع کے حلال ہونے کے لئے وہ لفظ ذکر فرمایا کہ جو قباحت پر دلالت کرتا ہے ضمناً اس طرف توجہ دلائی گئی اگر چہ تم سے خیانت واقع ہوئی جو حقیقت میں قباحت تھی لیکن اب اسے حلال کر دیا گیا ہے۔ (از کبیر)

اعتراض: ﴿ لَيۡلَةَ الصِّيَامِ ﴾ میں " لیلة " واحد ذکر ہے حالانکہ مراد جمع ہے (روزوں کی راتوں میں عورتوں کے پاس جانا حلال کر دیا گیا) تو " لیالی " کیوں نہیں ذکر کیا گیا۔

جواب: کئی مقام پر واحد کو جماعت کے لئے استعمال کرتے ہیں جیسا کہ العباس بن مرداس کے قول میں ہے " فقلنا اسلموا انا اخوکم " ہم نے کہا اسلام لے آؤ تو بیشک ہم تمہارے بھائی ہوں گے یہاں بھی "اخوانکم" کی جگہ " اخوکم " ذکر ہے۔ (کبیر)

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لِبَاسٌ لَّهُنَّ : "وہ لباس ہیں تمہارا اور تم لباس ہو ان کا" عورتوں کو مردوں کا لباس اور مردوں کو عورتوں کا لباس قرار دینے میں چند وجوہ ہیں۔

ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ لباس بمعنی تسکین کے ہے " هن سكن لكم وانتم سكن لهن " کہ وہ تمہارے لئے باعث تسکین ہیں اور تم ان کے لئے باعث تسکین ہو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جب نافع بن ارزق نے آیۃ کریمہ میں لباس کا معنی پوچھا تو آپ نے یہی معنی بیان فرمایا اور اس پر ذبیانی کا ایک شعر بطور دلیل پیش کیا:

اذا ما الضجيع ثنى عطفه ثنت عليه فكانت لباسا

جب پاس لیٹنے والا اپنی کروٹ پھیرتا ہے تو میں اس کی طرف کروٹ پھیر دیتا ہوں جو ایک دوسرے کے لئے تسلی کا سبب بنتا ہے۔

اور وجہ تشبیہ یہ ہے کہ جب مرد اور عورت ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں تو ایک دوسرے پر اس طرح لپٹ جاتے ہیں جس طرح لباس لپٹا ہوتا ہے ربیع نے کہا " هن فراش لكم وانتم لحاف لهن " عورتیں تمہارا فراش (بچھونا) ہیں اور تم ان کا لحاف ہو۔

اور وجہ تشبیہ یہ ہے کہ ہر ایک زوجین میں سے دوسرے کے لئے پردہ بن جاتا ہے اور اس کو فجور سے روکتا ہے حدیث شریف میں آیا ہوا ہے " ومن تزوج فقد احرز ثلثى دينه " جس شخص نے شادی کر لی تحقیق اس نے اپنے دین کے دو تہائی حصہ کو بچا لیا۔

اور وجہ تشبیہ یہ ہے کہ مرد عورت ایک دوسرے کا لباس اس لئے ہیں کہ انسان جس طرح لباس اپنے لئے مختص کرتا ہے اسی طرح زوج اپنی زوجہ کو اور زوجہ اپنے زوج کو اپنے لئے مختص کرتے ہیں۔

اور وجہ تشبیہ یہ ہے کہ جس طرح لباس پورے بدن پر چھا جاتا ہے اسی طرح مرد کا بدن عورت کے تمام بدن سے مل جاتا ہے اور عورت کا بدن مرد کے تمام بدن سے مل جاتا ہے۔

اور وجہ تشبیہ یہ ہے کہ جس طرح لباس انسان کو گرمی اور سردی اور کیڑوں مکوڑوں سے بچاتا ہے اسی طرح انسان کی زوجہ اس کے گھر کو مفاسد سے بچاتی ہے گھر کی محافظ ہوتی ہے اسکے مال کی محافظ ہوتی ہے اسلئے انسان کو اجنبی عورتوں کے میل جول سے بچالیتی ہے۔ گھر کے مال کو بربادی سے بچاتی ہے گویا کہ مال اور جان اور آبرو کی محافظ ہوتی ہے۔ اسی طرح یقیناً مرد عورت کو مفاسد سے بچاتا ہے یعنی اجنبی مردوں سے بچاتا ہے اور عورت کو ذریعہ معاشی کیلیے در بدر دھکے کھانے سے بچاتا ہے یقیناً مرد کہلانے کا وہی حق دار ہے جو اپنے اہل وعیال کے خرچ کیلئے ذمہ دار ہو۔ وہ شخص نکھد گھٹیا بلکہ انسانیت سے دور ہے جو یہ تمنا کرے کہ میرے خرچ اور اپنے خرچ اور اولاد کے خرچ کو عورت اپنی محنت ومزدوری سے چلائے۔

(از روح المعانی و کبیر)

آیئے ضیاء القران سے مفکر اسلام مفسر قرآن پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ کا اس آیۃ کریمہ کی تفسیر سے ایک اقتباس دیکھئے کیا خوب آپ نے بیان فرمایا، کیا ایک اچھی بیوی اپنے خاوند کے لئے اور ایک اچھا خاوند اپنے بیوی کے لئے پردہ، زینت اور راحت نہیں؟ یقیناً ہے جس ملت کے ہر گھر میں زوجیت کا یہ بلند تصور اور اعلیٰ معیار ہو اس کے لئے یہ دنیا جنت نہیں تو اور کیا ہے اسلام پر یہ اعتراض کرنے والے کہ اس نے عورت کے حقوق کو پامال کر دیا ہے اگر آیت کے اسی حصہ پر نظر ڈالیں تو انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا ہاں اسلام نے ملت ابراہیمی کی بیٹیوں کے چہروں سے شرم وحیا کا نقاب نوچنے کا حکم نہیں دیا۔ اس نے عورت کو محفل رقص وسرور کی زینت بننے کی اجازت نہیں دی اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام ایک مستقل دین ہے اس کا اپنا نظام، اپنا قانون اور اپنا ضابطہ حیات ہے اور اس کے استقلال کی یہی علامت ہے کہ وہ ہر حالت میں اسی ضابطے کا پابند رہے کسی کو پسند آئے یہی بات یا نہ، کوئی خوش ہو یا ناخوش، اسلام کو ہر دل عزیز بنانے اور اسے تہذیب مغرب سے ہم آہنگ کرنے کے لئے اس کے سادہ لوح بہی خواہوں نے اس کے فطری خدوخال میں جس وقت قطع وبرید (کانٹ چھانٹ) گوارا کر لی اس دن اسلام بحیثیت ایک مستقل ضابطہ حیات کے ہم سے چھن جائے گا اللہ تعالیٰ اس روز بد (برے

دن) سے بچائے۔ (ضیاء القرآن)

یہ الفاظ مبارکہ یعنی ﴿ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ﴾ ماقبل کے مضمون کا بیان ہیں کہ مرد عورتوں کے محتاج ہیں اور ان میں صبر کم پایا جاتا ہے اور عورتوں میں بھی صبر کم پایا جاتا اور ان کا اجتناب مشکل ہوتا ہے بلکہ مردوں کی بنسبت عورتوں میں صبر کی کمی زیادہ پائی جاتی ہے حدیث شریف میں آتا ہے:

" لا خير في النساء ولا صبر عنهن يغلبن كريما ويغلبهن لئيم واحب ان اكون كريما مغلوبا ولا احب ان اكون لئيما غالبا "

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عورتوں میں خیر نہیں اور نہ ان میں صبر ہے وہ کریم شخص پر غالب آجاتی ہیں اور ذلیل شخص ان پر غالب آجاتا ہے۔ میں پسند کرتا ہوں کہ میں کریم اور مغلوب ہو جاؤں اور یہ نہیں پسند کرتا کہ میں غالب اور ذلیل ہو جاؤں۔ (از روح المعانی)

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ:

''اللہ کو معلوم ہے بیشک تم خیانت میں ڈالتے ہوا پنے نفسوں کو تو اس نے تمہاری توبہ قبول فرمائی اور تمہیں معاف کیا''۔

﴿ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ ﴾ اى تفعلون خفية فعل الخائن فتظلمون ﴿ اَنْفُسَكُمْ ﴾ بتعريضها للعقاب ونقص حظها من الثواب باشر عمر رضى الله عنه بعد العشاء فندم واعتذر الى النبى صلى الله عليه وسلم فقام رجال واعترفوا بمثله ثم ندموا عليه ﴿ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ﴾ اى قبل توبتكم ﴿ وَعَفَا عَنْكُمْ ﴾ اى جاوز عنكم تحريمه بلا كراهة " (تبصير الرحمن)

اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ تم پوشیدہ طور پر خائن کی طرح فعل کر کے اپنی نفسوں پر ظلم کر رہے ہو اور اپنے آپ کو عذاب کے لئے پیش کر رہے ہو اور اپنے ثواب کا حصہ کم کر رہے ہو چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عشاء کے بعد مباشرت کر لی پھر اس پر نادم ہو گئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے عذر پیش کیا تو کئی صحابہ کرام کھڑے ہو گئے اسی قسم کا معاملہ در پیش آنے کا اعتراف کیا پھر سب نادم ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ کو قبول فرمالیا اور ان کو معاف کر دیا یعنی تم سے حرمت کو اٹھالیا گیا یہاں تک کہ اس میں کراہیت کو بھی باقی نہیں رکھا۔

تنبیه : راقم تو اس مسئلہ میں اس بات کا قائل ہے کہ صحابہ کرام سے خطا ہوئی یعنی بلا ارادہ غلطی ہوئی جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زوجہ نے بتایا کہ میں سو چکی تھی لیکن آپ نے سمجھا کہ یہ بہانہ بنا رہی ہے تو آپ نے اس کی بات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جماع کر لیا بعد میں جب یقین ہو گیا کہ زوجہ نے تو سچ کہا تھا غلطی تو مجھ سے ہی سرزد ہوئی تو آپ نادم ہو گئے توبہ کی اللہ تعالیٰ نے آپ کی توبہ کو قبول فرمایا۔

راقم کے خیال کو علامہ قرطبی رحمہ اللہ کی تفسیر سے بہت زیادہ تقویت ملتی ہے آپ رقم طراز ہیں:

﴿ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ ﴾ يستامر بعضكم فی مواقعة المحظور من الجماع والاكل بعد النوم فی ليالی الصوم "

یہاں خیانت کا یہ مطلب ہے کہ تم ایک دوسرے سے پوچھتے ہو کہ روزوں کی راتوں کو سونے کے بعد جماع اور کھانے پینے کی ممانعت کب اٹھے گی تمہارا ایک دوسرے سے مخفی طور پر پوچھنا خیانت کی طرح ہے۔ ﴿ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ﴾ میں دو احتمال ہیں ایک ان میں سے یہ ہے " قبول التوبة من خيانتهم لانفسهم " کہ اس نے تمہاری توبہ کو قبول کیا جو تم نے اپنے نفسوں کو خیانت میں ڈالا اگرچہ بلا ارادہ خطا تھی لیکن صحابہ کرام کا مقام بلند تھا زیادہ تحقیق کی ضرورت تھی اور دوسرا احتمال یہ ہے "التخفيف عنهم بالرخصة والاباحة " توبہ قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رخصت عطا فرمائی اور مباشرت اور کھانے پینے کو مباح قرار دیا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ (علم ان لن تحصوه فتاب عليكم) میں ﴿ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ﴾ کا معنی " خفف عنكم " ہے کہ اس نے تم سے تخفیف فرمائی۔ اسی طرح رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ ﴾ وان لم يكن من النبی ما يوجب التوبة منه " نبی کریم ﷺ سے تو کوئی ایسا کام سرزد نہیں ہوا جو توبہ کرنے کا ذریعہ بنتا البتہ آپ کا ذکر صحابہ کرام مہاجرین وانصار کے ساتھ ان کی دل جوئی کے لئے ذکر فرما دیا لہذا نبی کریم ﷺ کی طرف توبہ کی نسبت کا مطلب ہی وسعت امر ہے:

﴿ وَعَفَا عَنْكُمْ ﴾ يحتمل العفو من الذنب ويحتمل التوسعة والتسهيل قول النبی ﷺ اول الوقت رضوان الله وآخره عفوا الله يعنی تسهيلة وتوسعته "

معاف کرنے کے بھی دو ہی مطلب ہیں ایک یہ کہ گناہوں کو معاف کرنا اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ وسعت اور آسانی کا عطا کرنا جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے اول وقت میں رب تعالیٰ کی رضامندی پائی جاتی ہے اور آخر میں عفو اس مقام میں عفو کا معنی آسانی اور وسعت عطا کرنا ہی ہے۔

(از قرطبی)

تاہم اس مسئلہ کو حضرت مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے اعتراض و جواب کی صورت میں مستحسن انداز پر پیش کیا۔

اعتراض : اس آیۃ سے معلوم ہوا کہ حضرت عمر و دیگر صحابہ خیانت کرتے تھے اور خائن خلافت کے قابل نہیں۔ لہذا ان کی خلافت باطل ہے نیز تمہارا یہ عقیدہ بھی باطل ہے کہ کوئی صحابی فاسق نہیں اس آیۃ سے ان کی خیانت ثابت ہوئی جو کہ اولی درجہ کا فسق ہے۔ (رافضی)

جواب: ہم صحابہ کرام کو معصوم نہیں مانتے عادل مانتے ہیں یعنی وہ گناہ پر قائم نہیں رہتے بلکہ اگر غلطی ہو جائے تو توبہ کر کے رب سے معافی حاصل کر لیتے ہیں یہاں بھی یہ ہی ہوا۔ نیز یہاں خیانت سے مراد انسانی امانت میں خیانت مراد نہیں بلکہ فقط بے اختیاری گناہ مراد ہے کیونکہ انہوں نے کسی کا مال نہیں مارا تھا اپنی حلال بیبیوں سے جماع کیا تھا اسی لئے فرمایا گیا ﴿ اَنۡفُسَکُمۡ ﴾ اپنے نفسوں کی خیانت کی کسی کا مال یا کسی کا باپ نہ مارا نیز جب رب انہیں معافی کا پروانہ دے چکا تو تمہیں انکے عیب نکالنے کا کیا حق ہے رب تو معاف کرے اور تم شور مچاؤ بلکہ اس آیۃ سے ان کی عظمت ثابت ہوتی ہے کیونکہ رب نے ان کے نفسوں کو اپنی ملک قرار دیا اور فرمایا اے عمر تمہارا نفس تو جنت کے عوض خرید چکا اب تو نام تمہارا رہ گیا چیز ہماری ہو گئی تم نے مجھ سے بغیر پوچھے اپنے اختیار سے جماع بھی قبول کر لیا، سبحان اللہ کوئی ایسا خوش نصیب بھی تو ہو جس کو رب اپنی ملک بتائے اسکی تفسیر وہ آیۃ ہے ﴿ اِنَّ اللّٰهَ اشۡتَرٰى مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ ﴾ (نعیمی)

فائدہ: حضرت ابن عربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں علماء زہد و تقوی نے بیان فرمایا:

''وکذا فلتکن العناية وشرف المنزلة خان نفسه عمر رضى الله عنه فجعلها الله تعالىٰ شريعة وخفف من اجله عن الامة فرضى الله عنه وارضاه''

رب تعالیٰ کی طرف سے کتنی ہی مہربانی اور کتنی ہی بلندی مرتبت پائی گئی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ

نے اپنے نفس کو خیانت میں ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے اسکو شریعت کا حصہ بنادیا آپکی وجہ سے تمام امت پر مہربانی پائی گئی۔آپ نے اللہ تعالیٰ کے حضور عذر پیش کر کے اسے راضی کرلیا اور رب آپ سے راضی ہو گیا۔

(قرطبی)

فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ : ''تو اب ان سے صحبت کرو''

جب حرمت منسوخ ہوگئی تو اب تم اپنی عورتوں سے مباشرت کر سکتے ہو خیال رہے کہ یہ امر وجوب کے لئے نہیں بلکہ اباحت کے لئے ہے''﴿ الآن ﴾ اصل میں '' آن ''بمعنی '' حان '' ہے فعل ہے پھر اس کو زمانہ حاضر کے لئے اسم بنالیا گیا اور معرف باللام بنالیا گیا اور فتحہ باقی رکھا گیا:

'' والمباشرة الزاق بالبشرة كنى بها عن الجماع الذى يلتزمها ''

مباشرت کا معنی ہے چمڑے کا چمڑے سے ملنا، کنایۃً اس کا معنی جماع لیا گیا ہے جس کو چمڑے کا ملنا لازم ہے اسی طرح اس مباشرت کے حکم میں جماع کے دواعی یعنی بوسہ لینا اور معانقہ وغیرہ داخل ہیں اس سے ایک اور مسئلہ ثابت ہو گیا کہ حدیث کا قرآن پاک سے منسوخ ہونا ثابت ہو گیا کہ رمضان کی راتوں کو سونے کے بعد کھانے پینے اور جماع کرنے کی حرمت حدیث پاک سے ثابت تھی لیکن قرآن پاک سے اسے منسوخ کردیا گیا۔

البتہ بعض حضرات نے کہا کہ ان چیزوں کی حرمت پہلی شریعتوں سے ثابت تھی اور قرآن پاک کی اس آیۃ سے پہلی شریعتوں کے احکام کو منسوخ کردیا گیا لیکن یہ قول درست نہیں کیونکہ پہلی شریعتوں کے احکام ہم پر لازم ہی نہیں۔ (از روح البیان)

وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ : ''اور طلب کرو جو لکھا ہے اللہ نے تمہارے لئے''یعنی اللہ تعالیٰ نے جو اولاد تمہاری تقدیر میں لکھ دی ہے اور لوح محفوظ میں ثابت ہے وہ طلب کرو۔اسی سے یہ مسئلہ سمجھ آ گیا کہ مباشرت میں مقصد اولاد اور نسل کی طلب ہو کیونکہ شہوت کے پیدا کرنے اور نکاح کی مشروعیت میں حکمت ہی یہی ہے صرف خواہشات کو پورا کرنا مقصود نہ ہو حدیث شریف میں ہے:

'' عن معقل بن يسار قال قال رسول الله ﷺ تزوجوا الودود الولود فانى مكاثر بكم الامم ''

(ابو داؤد ، نسائی)

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا محبت کرنے والی اور بچے جننے والی عورتوں سے نکاح کرو بیشک میں دوسری امتوں پر تمہاری کثرت پر فخر محسوس کروں گا۔اور مسئلہ یہ سمجھ آیا کہ جماع صرف قبل یعنی مولد میں ہوسکتا ہے دبر میں نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ مقام اولاد نہیں۔ اور مسئلہ یہ سمجھ آیا" ان العزل مکروہ " کہ عزل مکروہ ہے۔ (از روح البیان ومظہری)

عزل، برتھ کنٹرول، خاندانی منصوبہ بندی:

عزل کے مسئلہ کو علامہ سید محمود احمد رضوی شارح بخاری نے رضوان ماہ نومبر 1991ء میں یوں ذکر کیا:

(۱) حدیث وفقہ کی تقریباً تمام کتب میں مستقل طور پر باب العزل کا عنوان قائم ہے اور شارحین نے عزل کے متعلق شرح وبسط کے ساتھ گفتگو کی ہے شارحین حدیث اور فقہاء کرام نے عزل کے معنی یہ کئے ہیں کہ اپنی بیوی سے جماع کے وقت ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ مادہ باہر گرے۔مقصد اس عمل کا یہ ہے بچے پیدا نہ ہوں۔

جہاں تک میرے علم وعقل کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ عزل اور برتھ کنٹرول یا دوسرے لفظوں میں خاندانی منصوبہ بندی کا مطلب ومقصد ایک ہی ہے۔فی زمانہ (اس دور میں) برتھ کنٹرول کے مختلف طریقے ہیں ادویہ کا استعمال وغیرہ وغیرہ زمانہ رسالت میں مانع حمل ادویہ اور دیگر اشیاء ایجاد نہیں ہوئی تھیں اس لئے صرف عزل کے ذریعے بچہ کی پیدائش کو روکا جاتا تھا۔

(۲) صحابہ کرام کے عزل کی وجوہ:

ایک وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ لونڈی سے عزل کرتے تھے تاکہ اس کی اولاد نہ ہو کیونکہ جس لونڈی کی اولاد ہو جائے وہ شرعاً ام ولد ہو جاتی ہے اس کی بیع (اسے بیچنا) ممنوع وناجائز قرار پاتی ہے چنانچہ بخاری ومسلم وابوداؤد ومسند احمد وابن ماجہ کی متعدد احادیث میں اس وجہ کا واضح طور پر ذکر ہے۔

دوسری وجہ اپنی بیوی سے عزل کرنا،صحابہ کرام اپنی بیویوں سے اس لئے عزل کرتے تھے تاکہ اولاد زیادہ نہ ہو۔چنانچہ مسلم ومسند احمد کی حدیث میں ہے کہ حضرت اسامہ فرماتے ہیں کہ بحضور نبوی ایک شخص حاضر ہوا عرض کی:

" انی اعزل من امرأتی فقال له ﷺ لم تفعل ذلک فقال اشفق علی ولدھا او علی اولادھا " (مسلم)

میں اپنی بیوی سے عزل کرتا ہوں نبی کریم ﷺ نے فرمایا عزل کیوں کرتے ہو اس نے جوابا عرض کی کہ اس کے بچہ یا اولاد پر شفقت کی بناء پر۔ علامہ شوکانی نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ اس میں عزل کی وجوہات میں سے ایک وجہ کا ذکر ہے اور وہ یہ کہ کثرت اولاد سے بچا جائے۔
(نیل الاوطار ج ٦ ص ١٩٨)

اس حدیث سے واضح ہوا کہ صحابہ کرام اپنی ازواج سے عزل (برتھ کنٹرول) کرتے تھے اور اس لئے کرتے تھے تا کہ اولاد کی کثرت نہ ہو۔ ثابت ہوا کہ کثرت اولاد کی مشکلات سے بچنے کے لئے اپنی بیوی سے عزل جائز ہے۔ (یعنی عقیدہ کی صحت وسلامتی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو قادر وقدیر اور خالق ورازق سمجھتے ہوئے) محض سبب کے طور پر عزل کے عمل کو اپنانا جائز ہے شرط صرف یہ ہے کہ اس عمل کو مؤثر حقیقی نہ سمجھے اور یہ عقیدہ رکھے کہ خواہ کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جائے جسے پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کو مقصود ہو بہر حال اور بہر صورت پیدا ہوگا۔

چنانچہ یورپ میں جن عورتوں نے مانع حمل گولیاں استعمال کیں اخبارات شاہد ہیں کہ ان کے ایک نہیں دو بچے بھی پیدا ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ سے جب کسی صحابی نے عزل کے متعلق سوال کیا۔ تو آپ نے بڑے حکیمانہ انداز میں انہیں بتایا کہ عزل محض ایک سبب ہے اسے مؤثر حقیقی نہ سمجھا جائے اور اللہ تعالیٰ کے خالق ورازق ہونے کے عقیدہ کو ذہنوں سے اوجھل نہ ہونے دیا جائے۔ چنانچہ بخاری ومسلم وابوداؤد ومسند احمد ومؤطا امام محمد کی احادیث میں اس امر کی تصریح ہے۔

حضرت جابر سے روایت ہے کہ ایک شخص نے بحضور نبوی عرض کی میں اس بات کو اچھا نہیں سمجھتا کہ میری لونڈی حاملہ ہو نبی علیہ السلام نے فرمایا " اعزل عنھا ان شئت فانه سیأتیھا ما قدر لھا " اگر تو چاہتا ہے تو عزل کر مگر اس کے باوجود جو مقدر ہے وہ ضرور پیدا ہوگا۔ (موطا امام محمد)

اسی طرح امام احمد اور بزار نے باسناد حسن حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ ایک شخص نے عزل کے متعلق نبی علیہ السلام سے سوال کیا تو آپ نے فرمایا وہ پانی جس سے بچے کی

پیدائش اللہ کو منظور ہے " اھرقته علی صخرة لاخرج الله منها ولدا ویخلقن الله نفسا ھو خالقھا " (موطاامام محمد) اسے تو پتھر پر بھی ڈال دے تو اس صورت میں بھی اللہ تعالیٰ بچہ پیدا فرما دے گا یا نفس کو پیدا فرمادے گا جس کا وہ خالق ہے۔

عزل جائز ہے لیکن مکروہ تنزیھی: موطاامام محمد کی شرح التعلیق الممجد میں حضرت مولنا عبدالحی لکھنوی علیہ الرحمۃ زیر عنوان باب العزل لکھتے ہیں کہ صحابی رسول حضرت ابن عباس وجابر بن عبداللہ وسعد بن ابی وقاص وزید بن ثابت وحضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم اپنی بیوی اور لونڈی سے عزل جائز قرار دیتے ہیں البتہ حضرت عمر وحضرت علی وحضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے کراہت کا قول کیا ہے۔ (یعنی یہ حضرات عزل کو جائز تو قرار دیتے ہیں مگر اس عمل کو اچھا نہیں سمجھتے یعنی مکروہ تنزیہی قرار دیتے ہیں اور مکروہ تنزیہی فعل جائز ہے حرام یا مکروہ تحریمی یا گناہ ہرگز نہیں)

" ونقل ابن عبد البر وابن ھبرة الاجماع علی انه ما لا یعزل عن الزوجة الحرة الا باذنھا " (التعلیق الممجد)

علامہ ابن عبدالبر اور علامہ ابن ہبیرہ نے لکھا ہے کہ اپنی بیوی کی اجازت سے عزل کے جواز پر اجماع ہے۔

اسقاط حمل کی وجوہ: " قال حافظ ابن حجر ینتزع من حکم العزل معالجة المرأة اسقاط النطفة قبل نفخ الروح " (التعلیق الممجد)

حافظ ابن حجر شارح بخاری میں فرماتے ہیں عزل کے جواز سے بغرض علاج اسقاط حمل کا جواز بھی واضح ہو جاتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ بچہ میں روح نہ پڑی ہو۔

" قال ابن الھمام یباح الاسقاط النطفة قبل نفخ الروح " (التعلیق الممجد)

علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ فتح القدیر میں لکھتے ہیں کہ اسقاط حمل مباح ہے جب تک اعضاء نہ بنے ہوں اور روح نہ پڑی ہو (یعنی اگر حاملہ بیوی کو حمل کی وجہ سے جان کا خطرہ پیدا ہو جائے یا سخت بیماری کا تو جب تک بچہ میں جان نہ پڑی ہو اسقاط حمل جائز ہے)۔

بلاعذر اسقاط حمل ناجائز:

" لا اقول انه يباح الاسقاط مطلقا ان يلحقها اثم منها اذا اسقطت من غير عذر " (التعليق الممجد)

فقہ حنفی کی مشہور کتاب خانیہ (قاضی خان) میں ہے کہ اپنی بیوی کا اسقاط حمل اس صورت میں ناجائز اور گناہ ہے جب کہ عذر شرعی نہ ہو (یعنی حاملہ کی جان یا سخت وشدید بیماری کا خطرہ نہ ہو)۔

" قال في البحر ينبغي الاعتماد عليه لان له اصلا صحيحا يقاس عليه " (التعليق الممجد)

اور صاحب البحر الرائق نے فرمایا بضرورت اسقاط حمل جائز ہے کیونکہ اس کے لئے دلیل صحیح موجود ہے جس پر اسقاط حمل کو قیاس کیا جائے۔ صحابی رسول حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے ابن فہید یمنی نے اپنی لونڈی سے عزل کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا:

" هو حرثک ان شئت عطشته وان شئت سقيته " (موطا امام محمد ص ۱۹۵)

وہ تیری کھیتی ہے اب یہ تیری مرضی ہے خواہ اس کو پیاسا رکھ یا سیراب کر دے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

" لا نرى بالعزل بأسا عن الامة امام الحرة لله فلا ينبغي ان يعزل عنها الا باذن " (موطا امام محمد ص ۱۹۵)

ہمارا موقف بھی یہی ہے کہ لونڈی سے عزل میں حرج نہیں البتہ اگر بیوی حرہ (آزاد) ہو تو اس کی اجازت سے عزل کرنا جائز ہے (یہ بھی خیال رہے آج کل تمام عورتیں آزاد ہیں بین الاقوامی قوانین کی وجہ سے کوئی لونڈی نہیں)۔ مولنا عبدالحی لکھنوی موطا امام محمد کی ان روایات کی شرح میں لکھتے ہیں کہ حضرت امام مالک اور امام احمد کا بھی یہی مذہب ہے۔

سید المفسرین حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے قرآن مجید کی آیۃ ﴿ نِسَآءُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ﴾ سے عزل کے جواز کا استدلال فرمایا ہے آیۃ میں ﴿ اَنّٰى شِئْتُمْ ﴾ بمعنی " کیف شئتم " ہے اور آیۃ کے اس جملہ سے عزل کا جواز ثابت ہوتا ہے مکمل عبارت مندرجہ ذیل ہے:

" ان جواز العزل مستنبط من الکتاب فانه تعالیٰ قال فی باب وطی النساء نساء کم حرث لکم فاتوا حرثکم انی شئتم فسمی بضع المرأة حرثا ومن المعلوم ان الحرث یستخیر فیه الانسان بین ان یسقیه وان لا یسقیه فکذلک بضع النساء وبل قبل ان نزول انی شئتم ای کیف شئتم کان لبیان جواز العزل " (طبرانی وحاکم)

بیشک عزل کا جواز قرآن پاک سے مستنبط ہے بیشک اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے ساتھ وطی کا ذکر فرماتے ہوئے فرمایا تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں اپنی کھیتی میں آؤ جسطرح تم چاہو، عورت کی فرج کو کھیتی کہا اور یہ بات یقیناً معلوم ہے کہ کھیتی میں انسان کو اختیار حاصل ہے چاہے تو اسے سیراب کرے یا نہ کرے یہی حکم عورت کی بضع کا بھی ہے یعنی مادہ کو اندر گرائے یا باہر اور بلکہ دوسری دلیل یہ بھی پیش کی گئی ہے کہ آیہ کریمہ میں ﴿ اَنّٰی شِئۡتُمۡ ﴾ بمعنی "کیف شئتم " کے ہے یعنی جیسے تم چاہو۔اس سے بھی عزل کا اختیار حاصل ہونا سمجھ آتا ہے۔اور حضرت ابن مسعود وحضرت ابن عباس وحضرت ابن عمر وحضرت امیر المؤمنین فاروق اعظم رضی اللہ عنہم سے ابن ابی شیبہ وعبد الرزاق وبیہقی نے مرفوع احادیث روایت کی ہیں جن میں لونڈی سے اس کی اجازت کے بغیر اور اپنی حرہ بیوی سے اس کی اجازت سے عزل کا جائز ہونا واضح ہے۔

اسی طرح ابن ماجہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث اور علامہ ابن حجر نے تلخیص الجبیر میں اور امام طحاوی علیہ الرحمۃ نے شرح معانی الآثار میں متعدد احادیث وآثار نقل کئے ہیں جن سے عزل کا جواز ثابت ہوتا ہے۔اور حضرت عمر نے جو یہ فرمایا ہے کہ لوگ اپنی لونڈیوں سے عزل کرتے ہیں جو لونڈی میرے پاس آئے گی اور اس کا آقا یہ اعتراف کرے گا کہ میں نے اس سے جماع کیا ہے تو یہ اولاد آقا ہی کی قرار دوں گا۔اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ تم عزل کرو یا نہ کرو تو حضرت عمر نے اپنے اس فرمان میں لونڈی سے حرمت کا قصد نہیں فرمایا کیونکہ وہ بھی لونڈی سے عزل کو جائز قرار دیتے ہیں۔

حدیث جدامہ میں نبی کریم ﷺ نے عزل کو واد خفی یعنی کم درجہ کا زندہ درگور کرنا قرار دیا تھا۔ اگرچہ حدیث کے اس جملہ سے شارحین نے کراھۃ تنزیہی مراد لی ہے تاہم صاحب فتح القدیر نے صحابہ

کرام کے درمیان عزل کے متعلق ایک علمی مذاکرے کا ذکر کیا ہے جس میں حضرت عمر۔ وحضرت زبیرو حضرت سعد بن ابی وقاص اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی موجود تھے انہوں نے آپس میں عزل کا ذکر کیا اور سب نے کہا کہ اس میں کوئی جرم نہیں۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ عزل مؤدہ صغریٰ ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ مؤدہ صغریٰ نہیں جب تک اس پر سات ادوار نہ گزر جائیں یعنی (۱) سلالہ (۲) نطفہ (۳) علقہ (۴) مضغہ (۵) عظام (۶) لحم (۷) خلق آخر (یعنی روح پڑ جانے پر زندہ درگور کرنے کا حکم ثابت ہوگا پہلے نہیں) اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ آپ نے سچ کہا اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے۔

نوٹ: یہ تمام مضمون موطا امام محمد اور اس کی شرح تعلیق مجد کا خلاصہ ہے جسے ہم نے آسان زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ (موطا امام محمد ص ۱۹۴، ۱۹۵)

مولنا عبدالحی لکھنوی علیہ الرحمۃ نے احادیث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بعض صحابہ کرام نے عزل کو مکروہ اس لئے قرار دیا کہ عزل کی کراہت کا قول کرنے سے ایک تو حق زوجہ کو تقویت ملتی ہے اور دوم یہ کہ عزل کا عمل قضاء وقدر کے معاند (مخالف) ہے۔ حق زوجہ کی تقویت کی دلیل حدیث احمد وابن ماجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

" قال نهى رسول الله ﷺ ان يعزل عن الحرة الا باذنها "

(نیل الاوطار ج ۶ ص ۱۹۶)

نبی کریم ﷺ نے آزاد بیوی سے اس کی اجازت کے بغیر عزل سے منع فرمایا ہے۔ اور قضاء وقدر کے معاند کی دلیل حدیث جابر وانس ہے " فافهم " (سمجھئے) (التعليق الممجد)

واضح ہوا حدیث جدامہ سے عزل کی ممانعت کا قول کیا جاتا ہے جس میں عزل کے متعلق سوال کے جواب میں نبی علیہ السلام نے فرمایا " ذلک الوأد الخفی " (یہ ہلکا زندہ درگور کرنا ہے) (احمد، مسلم) اور حدیث ابوسعید میں ہے یہود نے عزل کو " الموؤدة الصغرىٰ " قرار دیا اس پر نبی علیہ السلام نے فرمایا " کذبت یهود " یہود جھوٹ بولتے ہیں۔ یہ دونوں حدیثیں آپس میں معارض ہیں ایک سے عزل کا

جواز اور دوسری سے ممانعت ثابت ہوتی ہے۔

اسی طرح بخاری شریف کی حدیث میں ہے حضور ﷺ سے عزل کے متعلق سوال ہوا تو آپ نے فرمایا "ما علیکم ان لا تفعلوا" حدیث کے اس جملہ سے بھی ممانعت کا قول کیا گیا ہے۔ شارح مسلم حضرت امام نووی علیہ الرحمۃ اور علامہ ابن قیم نے ان احادیث میں تطبیق دی ہے فرماتے ہیں:

"ثم هذه الاحاديث مع غيرها يجمع بينهما بان ما ورد في النفي محمول على كراهة التنزيه وما ورد في الاذن في ذلك محمول على انه ليس بحرام" (حاشیہ مسلم ج ۱ ص ۴۶۴)

جن احادیث میں عزل کی ممانعت ہے وہ کراہیت تنزیہی پر محمول ہیں اور جن میں عزل کی اجازت ہے وہ اس پر محمول ہیں کہ یہ فعل حرام نہیں۔ غرضیکہ شارحین کرام نے ممانعت کی احادیث میں نہی کو نہی تنزیہی قرار دیا ہے اور جو فعل مکروہ تنزیہی ہو وہ جائز ہوتا ہے۔

علامہ ابن ہمام علیہ الرحمۃ نے اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ عزل جائز ہے اور عامۃ العلماء کا یہی مذہب ہے دس صحابہ کرام حضرت علی، سعد بن ابی وقاص، زید بن ثابت، ابو یوب، جبر، ابن عباس، حسن بن علی، خباب بن ارت، ابو سعید خدری اور عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم سے عزل کا جائز ہونا مروی ہے۔ (فتح القدیر ج ۳ ص ۲۷۲)

"عن جابر قال كنا نعزل والقرآن ينزل زاد اسحق قال سفيان لو كان شيا ينهى عنه لنهانا عنه القرآن"

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم عزل کیا کرتے تھے اور قرآن کا نزول جاری تھا سفیان نے کہا اگر عزل کا عمل ممنوع ہوتا تو قرآن مجید میں اس کی ممانعت آجاتی۔ (مسلم)

"عن جابر قال كنا نعزل على عهد رسول الله ﷺ فبلغ ذلك نبي الله ﷺ فلم ينهانا"

حضرت جابر فرماتے ہیں کہ ہم عہد نبوی میں عزل کرتے تھے نبی کریم ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے منع نہیں فرمایا۔ (مسلم ج ۱ ص ۴۶۵)

فقہاء کرام، ائمہ دین اور شارحین حدیث نے بخاری و مسلم کی ان ہی احادیث کی بناء پر عزل کو جائز و مباح قرار دیا ہے اس لئے اس عمل کو مطلقاً حرام و ناجائز قرار دینا سخت زیادتی ہے۔

البتہ ایک احتیاط کی سخت ضرورت ہے: اور یہ حکومت کا کام ہے کہ وہ عزل اور برتھ کنٹرول کی ادویہ و آلات وغیرہ صرف شادی شدہ افراد کے لئے مختص کر دے اور ایسا انتظام کیا جائے کہ یہ ادویہ و آلات وغیرہ غیر شادی شدہ مرد و عورت نہ حاصل کر سکیں تا کہ کوئی ان سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکے۔

اور یہ بھی ضروری ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی کی تشہیر کے ساتھ ساتھ ان احادیث کو بھی بیان کیا جائے جن میں نبی کریم ﷺ نے یہ فرمایا ہے جسے پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کو مقصود ہے وہ بہر حال و بہر صورت پیدا ہوگا تا کہ لوگ عقیدہ کی درستگی کے ساتھ اس عمل کو اپنانا چاہیں تو اپنا لیں مگر اسے محض ایک سبب سمجھیں اور مؤثر حقیقی صرف اور صرف خداوند قدوس کو جانیں۔ (انتہی)

وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ : ''اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ ظاہر ہو جائے تمہارے لئے دھاگہ سفید دھاگے سیاہ سے یعنی فجر سے''۔ آیۃ کریمہ میں سفید دھاگہ سے مراد صبح صادق ہے اور سیاہ دھاگہ سے مراد صبح کاذب اور '' مِنَ الْفَجْرِ '' اس کا بیان ہے یہاں سے کھانے پینے کی انتہاء اور روزہ کی ابتداء بیان کی گئی۔ یعنی صبح کاذب میں تم کھا پی سکتے ہو اور صبح صادق میں کھانے پینے سے رک جاؤ سفید اور سیاہ دھاگہ سے فجر کی دونوں قسمیں ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نافع ازرق نے رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ ﴾ کے متعلق سوال کیا کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ تو آپ نے فرمایا: '' بیاض النهار من سواد الليل وهو الصبح '' اس سے مراد صبح ہے یعنی رات کی تاریکی سے جو دن کی سفیدی ظاہر ہوتی ہے۔ مطلب واضح ہے کہ آپ نے فرمایا سیاہ دھاگہ سے مراد رات کی تاریکی ہے جو صبح کاذب میں بھی رہتی ہے اور سفید دھاگہ سے مراد صبح صادق کی سفیدی ہے۔

سوال کرنے والے شخص نے کہا کیا یہ محاورہ عرب حضرات کے کسی کلام میں بھی استعمال ہے؟

آپ نے فرمایاہاں کیاتم نے امیہ کاقول نہیں سنا:

الخیط الابیض ضوء الصبح منفلق   والخیط الاسود لون اللیل مکموم

سفید دھاگہ صبح کی روشنی یعنی پو پھٹنا ہے   اورسیاہ دھاگہ رات کی تاریکی کاچھپا(چھایاہواہونا)

☆ " واخرج البخاری ومسلم والنسائی وابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم والبیہقی فی سننہ عن سہل بن سعد قال انزلت ﴿ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ ﴾ ولم ینزل ﴿ مِنَ الْفَجْرِ ﴾ فکان رجال اذا ارادوا الصوم ربط احدهم فی رجلیہ الخیط الابیض والخیط الاسود فلا یزال یا کل ویشرب حتی یتبین له رؤیتهما فانزل الله بعد ﴿ مِنَ الْفَجْرِ ﴾ فعلموا انما یعنی اللیل والنهار "

بخاری، مسلم اورنسائی وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت سہل بن سعد کہتے ہیں جب آیۃ کریمہ کے یہ الفاظ مبارکہ نازل ہوئے ﴿ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ ﴾ اس وقت ﴿ مِنَ الْفَجْرِ ﴾ کے الفاظ نازل نہیں ہوتے تھے تو لوگ جب روزہ رکھنے کا ارادہ کرتے تو اپنے ایک پاؤں (یعنی ٹانگ) سے سفید دھاگہ باندھ لیتے اور دوسرے سے سیاہ دھاگہ باندھ لیتے دونوں دھاگوں کو دیکھتے رہتے جب تک واضح طور پر دونوں میں فرق نظر آتا اس وقت تک کھاتے پیتے رہتے تو اللہ تعالیٰ نے ﴿ مِنَ الْفَجْرِ ﴾ کے الفاظ نازل فرمائے تو سمجھ گئے کہ سیاہ دھاگہ سے مراد رات اور سفید دھاگہ سے مراد صبح ہے۔

☆ " واخرج سفیان بن عیینہ وسعید بن منصور وابن ابی شیبة واحمد والبخاری ومسلم وابو داود والترمذی وابن جریر وابن المنذر والبیہقی عن عدی بن حاتم قال لما انزلت هذه الآية ﴿ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ ﴾ عمدت الی عقالین احدهما اسود والآخر ابیض فجعلتهما تحت وسادتی فجعلت انظر الیهما فلا یتبین لی الابیض من الاسود فلما اصبحت غدوت علی رسول الله ﷺ فاخبرته بالذی صنعت فقال ان وسادک اذا لعریض انما ذاک بیاض النهار من سواد اللیل "

بخاری مسند احمد، مصنف ابن ابی شیبہ، مسلم، ابوداود اور ترمذی وغیرہ میں ہے کہ عدی بن حاتم کہتے ہیں کہ جب آیۃ کریمہ میں یہ الفاظ نازل ہوئے ﴿ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ ﴾ تو میں نے اونٹ باندھنے والی دو رسیاں ایک سیاہ اور سفید اپنے

تکیہ (سرہانے) کے نیچے رکھ لیں ان کو دیکھنے لگ گیا سفید اور سیاہ میں فرق نظر نہیں آ رہا تھا۔ صبح میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا میں نے آپ کو خبر دی کہ میں نے ایسے کیا تھا تو آپ نے فرمایا کہ پھر تو تمہارا تکیہ بہت چوڑا (وسیع) ہوگا، حالانکہ اس سے مراد تو دن کی سفیدی اور رات کی سیاہی ہے مطلب یہ تھا کہ کیا تمہارا تکیہ اتنا وسیع ہو سکتا ہے کہ اس میں دن کی سفیدی اور رات کی تاریکی سما سکیں۔

☆ " واخرج عبد بن حميد والبخاری وابن جرير عن عدی بن حاتم قال قلت يا رسول الله ما الخيط الابيض من الخيط الاسود اهما الخيطان فقال انک لعريض القفا ان ابصرت الخيطين ثم قال لا بل هو سواد الليل وبياض النهار "

بخاری وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ عدی بن حاتم کہتے ہیں میں نے کہا یا رسول اللہ سفید دھاگے اور سیاہ دھاگے سے مراد کیا دو دھاگے ہی ہیں؟ آپ نے فرمایا اگر تم حقیقۃً دو دھاگے ہی سمجھ رہے ہو تو تم چوڑی گدی والے ہو (یعنی بے وقوف ہو) آپ نے فرمایا اس سے مراد دھاگے نہیں بلکہ رات کی سیاہی اور دن کی سفیدی مراد ہے۔ (درمنثور)

خیال رہے " عریض القفا " کا کنایۃً معنی بے وقوف لیا جاتا ہے " قفا " سر کے پچھلے حصہ کو کہا جاتا ہے۔

فائدہ : زیر بحث الفاظ مبارکہ ﴿ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا ...... الخ ﴾ سے ایک مسئلہ یہ سمجھ آیا کہ طلوع فجر تک کھانا جائز ہے۔ اور اسی سے یہ سمجھ آیا کہ سحری کے وقت کھانا تناول کرنا مستحب ہے البتہ رخصت ہے اگر کوئی نہ کھائے تو مؤاخذہ نہیں لیکن اس پر عمل کرنا مستحب ہے۔ (از صابونی)

سحری کے کھانے کے متعلق احادیث مبارکہ:

" عن انس قال قال رسول الله ﷺ تسحروا فان فی السحور بركة "

(بخاری ومسلم، مشکوٰۃ کتاب الصوم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سحری کا کھانا تناول کرو بیشک سحری کے کھانے میں برکت ہے۔

وضاحت حدیث : (تسحروا) امر ندب كما اجمعوا عليه " سحری کے کھانے کا حکم وجوبی نہیں بلکہ استحبابی ہے یعنی سحری کے وقت کچھ نہ کچھ کھا لینا مستحب ہے دوسری حدیث شریف

میں ہے " **تسحروا ولو بجرعة ماء** " سحری کروا گرچہ پانی کے ایک گھونٹ سے بھی کیوں نہ ہو۔

ابن حبان نے اس حدیث " **تسحروا ولو بجرعة ماء** " کو صحیح قرار دیا" **وقیل انه ضعیف لکنه یعمل به فی فضائل الاعمال** " البتہ بعض حضرات نے اس کوضعیف کہا ہے لیکن ضعیف ہونے کے باوجود بھی اس پر عمل ہوگا کیونکہ فضائل اعمال میں ضعیف حدیث معتبر ہے۔

یہاں سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ ہر حدیث کوضعیف کہہ کر عبادات سے روکنا اور فضائل کو کم کرنا سوائے حماقت وجہالت کے اور کچھ نہیں۔ اور ساتھ یہ بھی خیال کریں کہ اگر ایک حدیث کو بعض حضرات صحیح قرار دیں اور بعض ضعیف تو دیکھا جائے اگر اس کا تعلق نیک اعمال اور فضائل انبیاء واولیاء سے ہے تو اس پر عمل کیا جائے یہی تقوی ہے ہاں اگر اس کا تعلق کچھ اعمال کی ممانعت سے ہے اور اس کے مقابل کوئی اور مثبت روایت نہیں تو پھر البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ تقوی یہ ہے کہ اس سے اجتناب کرلیا جائے لیکن حرمت ثابت کرنا پھر بھی ناجائز ہوگا۔

قاموس میں ذکر ہے " **السحر هو قبيل الصبح** " صبح سے تھوڑا پہلے وقت سحری کا وقت ہے اور کشاف میں ہے " **هو السدس الاخير من الليل** " رات کا آخری چھٹا حصہ ہے " **وقيل وقته يدخل بنصف الليل** " اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ سحری کا وقت آدھی رات سے داخل ہوجاتا ہے " **السحور** " سین پر فتح ہے سحری کے وقت کھانے، پینے کی اشیاء پر یہ لفظ بولا جاتا ہے " **فان في السحور بركة** " بیشک سحری کے کھانے میں برکت ہے اس میں برکت کی ایک وجہ یہ ہے " **لان فيه اجرا عظيما باقامة السنة** " کہ سحری کھانا سنت ہے سنت پر عمل کرنا عظیم اجر وثواب کا ذریعہ ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ سحری کے وقت کھانے سے دن میں روزہ رکھنے کی طاقت حاصل ہوگی روزہ کو زیادہ بوجھ نہیں سمجھا جائے گا بلکہ خوش دلی سے عبادت سمجھ کر ادا کیا جائے گا جس سے اجر وثواب حاصل ہوگا۔

علمی بحث کثیر فوائد پر مشتمل:

نہایہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ حدیث شریف میں " سحور " کا جو ذکر ہے اس میں زیادہ طور پر مشہور سین کا فتح ہے :" **وقیل الصواب بالضم لانه المصدر والاجر فی الفعل لافی الطعام**" بعض حضرات نے کہا کہ درست اس میں سین کا ضمہ ہے کیونکہ اس صورت میں مصدر ہے اور اجر مصدری معنی یعنی تناول کرنے میں ہے نہ کہ سحری کے وقت کھانے والی اشیاء (چیزوں) میں۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ درست فتحہ ہے کیونکہ فعل پر ثواب اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ سنت کے مطابق ہو " **فاذا اثیب علی اثره فبا لاولی علی نفسه** " جب ثواب ایک چیز کے اثر پر یعنی تناول کرنے پر ہوگا تو اس چیز پر ثواب تو یقیناً بہتر طریقہ سے حاصل ہوتا ہے۔

واضح ہوا کہ کھانے کی چیزیں حاصل کرنا اور ان کو تیار کرنا بھی باعث برکت ہے سحری کے وقت کھایا جانے والا کھانا بھی مبارک ہے اور اس کا تناول کرنا بھی باعث برکت ہے " **کما ورد فی الحدیث مداد العلماء افضل من دماء الشهداء** " جس طرح حدیث شریف میں ہے علماء کی سیاہی شہداء کے خون سے افضل ہے۔

واضح ہوا کہ علماء کا علمی اور فقہی مسائل لکھنا بھی افضل ہے اور لکھنے کے لئے استعمال ہونے والی سیاہی بھی افضل ہے۔ ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ برکت سے مراد تقوی ہے کہ سحری کے کھانے میں روزہ رکھنے کی تیاری اور نیت پائی گئی جو تقوی کا سبب ہے اسی کو برکت سے تعبیر کر دیا گیا۔ اور سحری کے کھانے میں اس لئے بھی برکت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی سنت پر عمل پایا جاتا ہے۔

(ماخوذ از مرقاۃ ج ۴ ص ۲۵۱)

☆ " **وعن عمرو بن العاص قال قال رسول الله ﷺ فصل ما بين صيامنا و صيام اهل الكتاب اكلة السحر** " (رواہ مسلم، مشکوۃ کتاب الصوم)

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہمارے اور اہل کتاب کے روزوں میں فرق سحری کے کھانے سے ہے۔

وضاحت حدیث: "اکلة" ہمزہ کے فتحہ سے مصدری معنی کا بھی احتمال ہے جیسا کہ راقم نے ترجمہ کیا ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ "ایک مرتبہ کھانا" معنی لیا جائے اور ہمزہ کے ضمہ سے لقمہ معنی بھی لیا جا سکتا ہے تاہم راقم کے نزدیک وہی معنی درست ہے جو تحریر کر دیا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب پر سونے کے بعد کھانا پینا حرام کر دیا تھا یا مطلقاً افطار کے بعد پھر دوبارہ ان پر کھانا پینا منع کر دیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم پر ابتداء اسلام میں حرام کر دیا تھا لیکن بعد میں اس حرمت کو اٹھا لیا گیا" **ومخالفتنا ایاهم تقع موقع الشکر لتلک النعمة** " اس لئے ہم پر اللہ تعالیٰ نے یہ انعام فرمایا ہے تو اس انعام کے لحاظ سے ہمارا ان سے مختلف ہونا تقاضا کرتا ہے کہ ہم اس کا شکر کریں۔ (مرقاۃ ج۴ص ۲۵۱)

☆ " **وعن العرباض بن سارية قال دعانی رسول الله ﷺ الی السحور فی رمضان فقال هلم الی الغداء المبارک** "

(رواه ابو داود والنسائی، مشکوٰة کتاب الصوم) (ورواه ابن خزیمه وابن حبان فی صحیحیهما)

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مجھے رسول اللہ ﷺ نے رمضان میں سحری کے کھانے کی طرف بلایا اور فرمایا آ و صبح کے مبارک کھانے کی طرف۔

وضاحت حدیث: " هلم " مبنی بر فتحہ ہے اس کا معنی ہے " **تعال** " آ و۔ کبھی اس کا معنی ہوتا ہے لاؤ حاضر کرو جیسا کہ " **هلم شهداء کم** " میں معنی لیا گیا ہے " **احضروهم** " گواہ حاضر کرو۔ یہ لفظ واحد، تثنیہ، جمع اور مذکر و مؤنث سب کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ "الغداء" (غین کے فتحہ سے) صبح کے کھانے کو کہا جاتا ہے سحری کے کھانے کو صبح کا کھانا کہنے میں یہ حکمت تھی کہ یہ کھانا چونکہ صبح کے کھانے کی طرح دن میں کفایت کرتا ہے۔

☆ " **عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ نعم سحور المؤمن التمر** "

(رواه ابو داود، مشکوٰة کتاب الصوم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مؤمن کا سحری کا بہترین کھانا کھجور ہے۔

وضاحت حدیث: علامہ ابن طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے سحری کے وقت کھجور کھانے کی تعریف بیان فرمائی، حالانکہ سحری کے وقت کوئی چیز بھی کھائی جائے تو اس میں برکت

ہوتی ہے " وتخصیصه بالتمر برکة علی برکة " اور کھجور کے ساتھ خاص کرنے میں برکت پر برکت ہے۔ پھر خاص کر کے اگر کھجور کے ساتھ افطار بھی کرے تو اس میں اور ہی زیادہ برکت ہوگی "لیکون المبدؤہ به والمنتهی الیه البرکة" کیونکہ روزہ کی ابتداء بھی بابرکت چیز سے ہوگی اور انتہاء بھی بابرکت چیز ہے۔ (مرقاۃ ج ۴ ص ۲۵۹)

مسئله : جب صبح صادق تک کھانے، پینے اور جماع کرنے کی اجازت دی گئی ہے تو اگر یقین ہو جائے کہ صبح صادق ہو چکی ہے تو روزہ رکھنے والے کے لئے اس وقت کھانا پینا حرام ہوگا۔ یہی حکم ظن غالب کا ہے یعنی جب غالب گمان ہو کہ صبح صادق ہو چکی ہوگی اس وقت کھانا، پینا اور جماع کرنا منع ہے اس وقت کھانے اور پینے سے روزہ نہیں ہوگا۔ اور اگر غالب گمان ہو کہ صبح نہیں ہوئی تو اس وقت کھانا اور پینا مباح ہے لیکن اگر غالب گمان تھا کہ صبح نہیں ہوئی کھا، پی لیا بعد میں صبح ہونے کا یقین ہو گیا کہ صبح ہو جانے پر میں نے کھانا کھالیا تھا تو اس روزہ کی قضاء لازم ہے۔ (ازکبیر) یہی مطلب ہے اس حدیث کا:

" عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ اذا سمع النداء احدکم والاناء فی یده فلا یضعه حتی یقض حاجته منه "

(رواہ ابو داؤد، مشکوۃ کتاب الصوم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب کوئی ایک تم سے نداء (اذان) سنے ایسے حال میں کہ برتن اس کے ہاتھ میں ہو تو برتن نہ رکھے یہاں تک کہ اس سے اپنی حاجت پوری کر لے۔

وضاحت حدیث : بظاہر مطلب یہ ہے کہ روزہ رکھنے والا شخص جب اذان سنے تو اس کے ہاتھ میں کھانے، پینے والا برتن ہو تو کھا، پی لے اسی وقت رکھ نہ دے لیکن یہ حکم مطلق نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے " وهذا اذا علم او ظن عدم الطلوع " یہ حکم اس وقت ہے جب یہ یقین ہو جائے یا غالب گمان ہو کہ صبح طلوع نہیں ہوئی۔ اس سے زیادہ واضح عبدالمالک رحمہ اللہ کا قول ہے وہ فرماتے ہیں:

" هذا اذا لم یعلم طلوع الصبح اما اذا علم انه قد طلع او شک فیه فلا "

یہ حکم اس وقت ہے کہ جب صبح صادق کے طلوع ہونے کا یقین نہ ہو۔ لیکن جب یقین ہو جائے کہ صبح طلوع ہو چکی ہے یا شک واقع ہو رہا ہو صبح کے طلوع ہونے میں تو کھانا، پینا چھوڑ دینا لازم ہے۔

نبی کریم ﷺ کا دوسرا ارشاد گرامی اسی وضاحت کی تائید کررہا ہے آپ فرماتے ہیں:

" ان بلا لا یؤذن بلیل فکلوا واشربوا حتی یؤذن ابن ام مکتوم "

بیشک بلال رات کو اذان کہتے ہیں اس وقت کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ ابن ام مکتوم اذان کہیں۔

یعنی حضرت بلال رضی اللہ عنہ سحری کے وقت تہجد کی نماز کے لئے اذان کہتے تھے اس وقت روزہ رکھنے کی غرض سے کھانا، پینا جائز تھا لیکن حضرت عبداللہ بن ام مکتوم صبح صادق کے وقت اذان کہتے تھے اس وقت پہلے کلمہ کے ساتھ ہی کھانے اور پینے سے رک جانا لازم تھا۔

راقم کا موقف تو یہ ہے کہ آج کل گھڑیوں کا دور ہے صبح صادق کا وقت معین ہوتا ہے لیکن پھر بھی احتیاط اسی میں ہے کہ معین وقت سے تین چار منٹ پہلے کھانے سے رک جائیں۔ راقم خود پانچ منٹ پہلے ضرور کھانا، پینا چھوڑ دیتا ہے۔ یعنی اصل مسئلہ اذان کی ہونے یا نہ ہونے سے متعلق نہیں بلکہ " ان المعتبر اول طلوع الصبح عند جمہور العلماء " جمہور علماء کے نزدیک صبح صادق کا طلوع ہونا ہی معتبر ہے کہ اس وقت کھانا پینا چھوڑ دے۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج ۴ ص ۲۵۴، ۲۵۵)

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

﴿ مِنَ الْفَجْرِ ﴾ میں " من " بیانیہ ہے اسلئے راقم نے اس کا معنی "یعنی" کیا ہے:

" ومن الفجر بیان للخیط الابیض کانہ قیل الخیط الابیض الذی ھو الفجر "

یعنی آیۂ کریمہ میں ﴿ مِنَ الْفَجْرِ ﴾ بیان ہے " الخیط الابیض " کا گویا کہ کہا گیا ہے کہ کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ ظاہر ہوجائے تمہارے لئے سفید دھاگہ، سفید دھاگہ وہ فجر ہے اس کو مختصر طور پر یعنی فجر ہے سے راقم نے بیان کردیا۔

" من " بیانیہ لانے کی ضرورت اسی لئے درپیش آئی کہ ذکر تشبیہ کا تھا لیکن بعض صحابہ کرام نے حقیقی سمجھ کر دھاگے ہی مراد لے لئے تھے تو اسے واضح کردیا گیا اب بظاہر وہم یہ ہے کہ ﴿ مِنَ الْفَجْرِ ﴾ تو صرف ﴿ اَلْخَیْطُ الْاَبْیَضُ ﴾ کا بیان ہوسکتا ہے ﴿ اَلْخَیْطُ الْاَسْوَدِ ﴾ کا نہیں ہوسکتا۔ تو چاہئے تھا کہ ﴿ اَلْخَیْطُ الْاَسْوَدِ ﴾ کا بیان " مِنَ الَّیْلِ " سے آتا ایسا کیوں نہیں کیا گیا؟ اس کا جواب یہ

ہے کہ جب ایک لفظ کا بیان آ گیا تو اتنا واضح ہو گیا کہ سفید دھاگہ سے مراد حقیقی دھاگہ نہیں بلکہ تشبیہ کے طور پر مراد فجر ہے اسی سے خود واضح ہو گیا کہ سیاہ دھاگہ سے مراد رات ہے۔ (از شیخ زادہ)

ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ : ''پھر تم پورا کرو روزں کو رات تک'' ''بیان آخر وقتہ واخراج الليل عنه ونفي صوم الوصال'' (بیضاوی) یعنی یہاں سے تین مسئلے ذکر کئے گئے ہیں ایک یہ کہ روزہ کا آخری وقت رات کا آ جانا ہے۔ دوسرا یہ ثابت کیا گیا کہ رات خود روزے میں داخل نہیں۔ یہ شان نزول سے واضح ہو چکا ہے۔ اور تیسرا مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ صوم وصال منع ہے۔ تینوں مسائل کو واضح طور پر انشاء اللہ بیان کیا جا رہا ہے۔

رات سے مراد کیا ہے: اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ایک حدیث پاک اور اس کی شرح کی طرف توجہ فرمائیں:

☆ " وعن عمر قال قال رسول الله ﷺ اذا اقبل الليل من ههنا وادبر النهار من ههنا وغربت الشمس فقد افطر الصائم " (بخاری، مسلم مشکوۃ کتاب الصوم)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب یہاں سے رات آ جائے اور یہاں سے دن پیٹھ پھیر جائے اور سورج غروب ہو جائے تو روزہ دار روزہ افطار کر لے۔

وضاحت حدیث : (اذا اقبل الليل) اى ظلامه (من ههنا) اى جانب الشرق " جب یہاں سے رات آ جائے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے مشرقی جانب اشارہ کر کے فرمایا کہ مشرقی جانب جب اندھیرا ہو جائے۔

(وادبر النهار) اى ضياءه (من ههنا) اى جانب الغرب "

پھر مغربی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ادھر سے دن کی روشنی پیٹھ پھیر جائے (وغربت الشمس) بفتح الراء اى غابت الشمس كلها " پھر اس کی اور وضاحت فرمائی کہ سورج مکمل طور پر غروب ہو جائے۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ سورج ابھی تک مکمل غروب ہی نہ ہو تو روزہ افطار کر کے تمام دن کی محنت کو ضائع کر بیٹھو۔

رات کے دو وصف ذکر کر کے یہ واضح کیا:

" ان غروبها عن العيون لا يكفى لانها قد تغيب ولا تكون غربت حقيقة فلا بد من اقبال الليل "

کہ صرف آنکھوں سے سورج کا چھپ جانا کافی نہیں کیونکہ کبھی حقیقۃً غروب نہیں ہوتا اس لئے ضروری ہے کہ رات متوجہ ہو اور دن پیٹھ پھیرے۔ (مرقاۃ ج ۴ ص ۲۵۲)

" والمراد بالغروب زمان غیبوبة جرم الشمس بحیث تظهر الظلمة فی جهة الشرق قال ﷺ اذا اقبل اللیل من ههنا فقد افطر الصائم ای اذا وجدت الظلمة حسا فی جهة المشرق فقد ظهر وقت الفطر "

(شامی ج ۲ ص ۸۹)

روزہ صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک ہے غروب سے مراد سورج کی ٹکیہ کا چھپ جانا ہے اس لحاظ پر کہ مشرقی جانب تاریکی ہو جائے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب رات ادھر سے چھا جائے تو روزہ دار روزہ افطار کرلے یعنی جب مشرقی جانب تاریکی محسوس ہونے لگے تو فطر کا وقت ظاہر ہوگا۔

رات روزہ کے حکم سے خارج ہے:

چونکہ آیۃ کریمہ میں " الی اللیل " غایۃ امتداد ہے غایۃ امتداد اپنے مغیا سے خارج ہوتی اس لئے روزہ رات کو نہیں رکھا جاتا بخلاف اس کے کہ وضو کے حکم میں کلائیوں کے دھونے کی غایۃ " الی المرافق " ذکر کی گئی اور پاؤں کے دھونے کی غایۃ " الی الکعبین " ذکر کی گئی لیکن ان دونوں مقاموں میں " غایة اسقاط " ہے جہاں غایۃ اسقاط ہو وہاں غایۃ اپنے مغیا میں داخل ہوتی ہے اس لئے وضو میں کہنیوں اور ٹخنوں کا دھونا فرض ہے۔ (اس بحث کا تعلق دینی طلباء کرام سے ہے)۔

روزہ جلدی افطار کرے:

" عن سهل قال قال رسول الله ﷺ لا یزال الناس بخیر ما عجلوا الفطر " (بخاری ، مسلم ، مشکوۃ کتاب الصوم)

حضرت سہل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ لوگ ہمیشہ بھلائی پر قائم رہیں گے جب تک وہ جلدی افطار کرتے رہیں گے۔ روزہ کے جلدی افطار کرنے کو کیوں پسند کیا گیا؟

" فان فی التعجیل مخالفة اهل الکتاب فانهم یؤخروه الی اشتباک النجوم "

جلدی افطار کرنے کو اس لئے مختار قرار دیا گیا کہ اس میں اہل کتاب کی مخالفت پائی گئی کیونکہ وہ

ستاروں کے خلط ملط ہونے تک افطار میں تاخیر کرتے تھے " ثم صار عادة لاهل البدعة فی ملتنا " پھر ہماری ملت میں اہل بدعت نے اپنی عادت یہ بنالی کہ وہ روزہ دیر سے افطار کرتے ہیں۔

بعض حضرات نے یہ کہا تھا کہ اگر روزہ اس لئے دیر سے افطار کرے کہ وہ اپنے نفس پر تنگی کر رہا ہے روزہ افطار کرنے میں تاخیر کے واجب ہونے کا عقیدہ نہیں رکھتا تو اس میں کوئی حرج نہیں، کوئی ضرر نہیں لیکن ملا علی قاری رحمہ اللہ اسے رد کرتے ہیں " اقول بل یضره حیث یفوته السنة " فرماتے ہیں کہ میں کہتا ہوں اس میں سنت کی ترک کی وجہ سے ضرر (نقصان) لازم آتا ہے مزید آپ بیان فرماتے ہیں:

" ان فی التعجیل اظهار العجز المناسب للعبودية ومبادرة الی قبول الرخصة "

کہ روزہ جلدی افطار کرنے میں اظہار وعجز پایا جائے گا کیونکہ اس میں اپنی عبودیت کا اقرار پایا جاتا ہے اور رخصت کی قبولیت کی طرف جلدی پائی جاتی ہے " ویؤیده ما صح ان الصحابة کانوا اعجل الناس افطارا وابطاهم سحورا " اور اس کو صحابہ کرام کے عمل سے تائید ملتی ہے کہ وہ جلدی افطار کرتے تھے اور سحری میں تاخیر کرتے تھے۔ (از مرقاۃ ج ۴ ص ۲۵۲) بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ رات کا کچھ حصہ گزر جائے تا کہ دن کا گزرنا یقینی ہو جائے تو پھر روزہ افطار کیا جائے۔ اس کے متعلق علامہ بدالدرین ابومحمد محمود بن احمد عینی رحمہ اللہ لکھتے ہیں " ولا یجب امساک جزء من اللیل لتحقق مضی النهار " رات کے کچھ حصہ میں افطار سے رکنا کوئی واجب نہیں کہ دن کا گزرنا یقینی طور پر ثابت ہو جائے۔ (عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۶۵)

☆ " عن ابی هریرة قال قال رسول اللہ ﷺ قال اللہ تعالیٰ احب عبادی الی اعجلهم فطرا "
(رواه الترمذی . مشکوة کتاب الصوم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندوں میں سے وہ مجھے پسند ہیں جو جلدی افطار کرتے ہیں۔

وضاحت حدیث:

" وقال الطیبی ولعل السبب فی هذه المحبة المتابعة للسنة

والمباعدة عن البدعة والمخالفة لاهل الکتاب "

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جلدی افطار کرنے والوں کو اللہ اس لئے پسند کرتا ہے کہ وہ سنت کی تابعداری کرتے ہیں اور بدعت سے دور رہتے ہیں اور اہل کتاب کی مخالفت کرتے ہیں ۔ اور اس امت کی افضلیت ثابت ہوئی کہ وہ حدیث پاک کی متابعت کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے محبوب بن جاتے ہیں اور اس آیۂ کریمہ کا مصداق بن جاتے ہیں:

﴿ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ﴾

''اے محبوب تم فرمادو کہ لوگو اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میرے فرمانبردار ہو جاؤ اللہ تمہیں دوست رکھے گا''۔

(مرقاۃ ج ۴ ص ۲۵۵)

☆ " عن ابی عطیة قال دخلت انا ومسروق علی عائشة فقلنا یا ام المؤمنین رجلان من اصحاب محمد ﷺ احدهما یعجل الافطار ویعجل الصلوة والآخر یؤخر الافطار ویؤخر الصلوة قالت ایهما یعجل الافطار ویعجل الصلوة فقلنا عبد الله بن مسعود قالت هكذا صنع رسول الله ﷺ والآخر ابو موسی " (رواہ مسلم، مشکوۃ کتاب الصوم)

حضرت ابو عطیہ کہتے ہیں میں اور مسروق (دونوں تابعی ہیں) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس حاضر ہوئے اور ہم نے کہا اے ام المؤمنین (مومنوں کی ماں) نبی کریم ﷺ کے دو صحابیوں میں سے ایک جلدی افطار کرتے ہیں اور جلدی (مغرب کی) نماز ادا کرتے ہیں اور دوسرے دیر سے افطار کرتے ہیں اور دیر سے نماز ادا کرتے ہیں آپ نے فرمایا ان دونوں میں سے کون جلدی افطار کرتے ہیں اور جلدی نماز ادا کرتے ہیں تو ہم نے کہا وہ عبداللہ بن مسعود ہیں آپ نے فرمایا اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے کیا ہے (یعنی وہ بھی جلدی کرتے تھے) اور دوسرے صحابی (جو دیر کرتے تھے وہ) ابو موسیٰ اشعری ہیں۔

وضاحت حدیث : " قال الطیبی الاول عمل بالعزیمة والسنة والثانی بالرخصة "

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا عمل عزیمت (عمل میں فوقیت) پر تھا اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا عمل رخصت پر تھا۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" والاحسن ان یحمل عمل ابن مسعود علی السنة وعمل ابی موسی علی

بیان الجواز کما سبق من عمل عمرو عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین "

بہتر یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا عمل سنت کے مطابق تھا اور حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کا عمل بیان جواز پر تھا۔ جیسا کہ حضرت عثمان اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا بھی دیر سے افطار کرنا بیان جواز کے لئے تھا۔ اگر چہ بعض حضرات نے یہ کہا تھا کہ حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کی تاخیر کی وجہ عذر ہو کہ آپ تک یہ بات نہ پہنچی ہو کہ نبی کریم ﷺ جلدی افطار کرتے تھے۔ لیکن اس قول کو علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے رد کیا ہے کہ یہ درست نہیں۔ (مرقاۃ ج ۴ ص ۲۵۹)

☆ " عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ لا یزال الدین ظاهرا ما عجل الناس الفطر لان الیهود و النصاری یؤخرون " (رواه ابو داؤد وابن ماجه ، مشکوة کتاب الصوم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دین ہمیشہ ظاہر رہے گا جب تک لوگ جلدی افطار کرتے رہے کیونکہ یہود ونصاری روزہ دیر سے افطار کرتے تھے۔

وضاحت حدیث : (ظاهرا) ای غالبا وعالیا او واضحا ولائحا "

دین ہمیشہ ظاہر رہے گا ظاہر کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دین ہمیشہ غالب رہے گا اور دین ہمیشہ بلند رہے گا۔ اور یہ معنی بھی مراد لیا جاسکتا ہے کہ دین ہمیشہ ظاہر، واضح اور روشن رہے گا جب تک لوگ جلدی افطار کرتے رہے کیونکہ یہود ونصاری دیر سے افطار کرتے ہیں۔ اسی سے یہ واضح ہوا:

" ان قواما الدین الحنیفی علی مخالفة الاعداء من اهل الکتاب وان موافقتهم تلفاللدین "

کہ بیشک دین حنیف کا قیام دشمن اہل کتاب کی مخالفت پر ہے اور یہود ونصاری کی موافقت پر دین کو ضائع کرنا لازم آئے گا۔

راقم کا موقف:

راقم خود تو اگر چہ روزہ افطار کرنے میں تعجیل کا قائل ہے لیکن محققین اہل سنت وجماعت جو تاخیر کے قائل ہیں ان پر زبان طعن دراز کرنے کو بھی حماقت سمجھتا ہے۔ جب صحابہ کرام میں سے حضرت ابوموسی اشعری، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم بھی تاخیر پر عمل کرتے تھے بلکہ ایک روایت میں

حضرت عثمان اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا نماز کے بعد بھی روزہ افطار کرنا ثابت ہے۔

(طحاوی ج اول باب مواقیت الصلوۃ ص ۱۰۷)

تو تحقیق کے اختلاف کو تحقیق پر مبنی ہی قرار دیا جائے۔

جب میں شیخ الاسلام خواجہ قمر الدین سیالوی، استاذ استاذی المکرم حضرت مولانا حافظ عطاء محمد بندیالوی اور مفکر اسلام اور مفسر قرآن حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمھم اللہ جیسی ہستیوں کو تاخیر کا قائل دیکھتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ یہ اختلاف رحمت ہے اور صحابہ کرام کے مختلف اعمال کے مطابق ہی یہ اختلاف بھی ہے۔

پیر صاحب فرماتے ہیں'' پہلے روزہ کی ابتداء کا وقت بتایا اب اس کے اختتام کا وقت بتایا جارہا ہے صبح صادق سے لے کر رات کے آنے تک روزہ رکھو۔ حضور ﷺ نے اپنے ارشاد سے وضاحت فرما دی " اذا ادبر النهار من ههنا واقبل الليل من ههنا " جب ادھر (مغرب) سے دن پیٹھ پھیر دے اور ادھر (مشرق) سے رات آجائے وہ وقت ہے افطار کا۔ بعض لوگ روزے کے افطار میں اتنی جلدی کرنے لگے ہیں کہ سورج بھی صحیح طور پر غروب نہیں ہوتا کہ وہ افطار کا نقارہ بجادیتے ہیں۔

(ضیاء القرآن)

راقم ایک سال سلانوالی ضلع سرگودھا میں بھی استاذی المکرم حضرت ابو الحسنات محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی سے پڑھتا رہا وہاں رمضان میں رہنے والے طلباء نے بتایا کہ ایک دن روزہ جلدی افطار کرانے والوں نے افطار کرادیا جب کہ ابھی سورج مکمل غروب نہیں ہوا تھا۔ راقم نے بھی تین سال پہلے رمضان میں پولی کلینک اسلام آباد سے واپس آتے ہوئے صدر روڈ پر یہی کیفیت دیکھی کہ ایک مسجد سے اذان کی آواز آرہی ہے جب کہ سورج کا ایک کنارہ غروب ہونے سے رہتا ہے خدارا اتنا ظلم عظیم بھی نہ کیا جائے۔

خیال رہے کہ راقم کا خاندان کئی پشتوں سے علمی چلا آرہا ہے راقم کے پردادا قاضی غلام نبی رحمہ اللہ کے دو بیٹے تھے قاضی فیض احمد اور قاضی رسول احمد رحمھما اللہ ان کا زمانہ تو راقم نے نہ پایا البتہ قاضی فیض احمد صاحب کے دو بیٹے قاضی عبد العزیز رحمہ اللہ (راقم کے والد) اور قاضی غلام ربانی رحمہ اللہ اور قاضی رسول احمد رحمہ اللہ کے دو بیٹے قاضی عبد الواحد اور قاضی عبد الخالق رحمھما اللہ کا زمانہ پایا۔ تمام ہی

فقہی مسائل میں بہت زیادہ سمجھ رکھتے تھے۔ان چار بھائیوں میں تین سوائے قاضی عبد الخالق رحمہ اللہ کے سب ہی تاخیر کے قائل تھے۔ بلکہ قاضی عبد الواحد رحمہ اللہ نے یہی حدیث جو بھی ضیاء القرآن کے حوالہ سے پیش کی بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ بزرگ (قاضی رسول احمد صاحب) بھی اسی کے قائل تھے۔ ۔تاہم راقم گاؤں میں تین سال امام رہا ایک مرتبہ چچا صاحب، قاضی عبد الخالق رحمہ اللہ نے میرے تاخیر سے روزہ افطار کرانے پر ناراضگی کا اظہار فرمایا جب میں نے عرض کیا کہ چچا عبد الواحد صاحب نے تو مجھے مسئلہ اس طرح بتایا اور ساتھ یہ بھی بتایا کہ والد رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل تھے تو آپ نے اپنی عادت شریفہ کے مطابق بڑے پیار ومحبت سے فرمایا بچے جی تحقیق کا اختلاف رحمت ہے۔اسی وقت سے راقم کا موقف بدل گیا پھر کچھ خود بھی کتابوں کو دیکھنے کی صلاحیت حاصل ہوگئی۔تاہم بزرگوں کے خلاف لب کشائی کا قائل نہیں۔

صوم وصال کی ممانعت:

" وعن ابی هريرة قال نهی رسول الله ﷺ عن الوصال فی الصوم فقال له رجل انک تواصل یا رسول الله قال وايكم انی ابيت يطعمنی ربی ويسقينی " (بخاری، مسلم، مشكوة كتاب الصوم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے صوم وصال سے منع فرمایا تو ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ بیشک آپ خود تو صوم وصال رکھتے ہیں آپ نے فرمایا تم میں سے میری مثل کون ہوسکتا ہے۔بیشک میں رات (اپنے رب کے ہاں) گزارتا ہوں میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔

وضاحت حدیث: صوم وصال کیا ہیں؟ " تتابع الصوم من غير افطار بالليل " صوم وصال یہ ہیں کہ روزہ رکھا جائے اور افطار کے وقت روزہ افطار نہ کیا بلکہ بغیر افطار کرنے کے دن کے روزہ کے ساتھ رات کا روزہ بھی پایا جائے صوم وصال کے منع کرنے میں حکمت یہ تھی کہ اسطرح روزہ رکھنے سے ضعف پیدا ہوگا ملال ہوگا عبادت کی ادائیگی میں کوتاہی واقع ہوگی اور یہ بھی خیال رہے کہ مختار مذہب یہ ہے کہ صوم وصال سے نہی تحریم پر مبنی ہے۔

ایک صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ خود تو صوم وصال رکھتے ہیں۔ صحابی کا یہ کہنا تعجب کی وجہ سے تھا کہ اس میں حکمت کیا ہے کہ آپ خود تو صوم وصال رکھتے ہیں اور ہمیں منع کرتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کا جواب کیا ہی حکیمانہ تھا " ایکم مثلی " تم میں سے میری مثل کون ہو سکتا ہے۔ یعنی میں صوم وصال رکھوں تو میری طاقت میں کوئی کمی نہیں ہو سکتی مجھے ایسا ضعف لاحق نہیں ہو سکتا جو عبادت سے روکنے کا ذریعہ بنے پھر اس کی وضاحت ان الفاظ سے فرمادی " ان ابیت یطعمنی ربی ویسقینی " بیشک میں رات گزارتا ہوں میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔

بعض حضرات نے کھلانے اور پلانے سے مراد جنت کے کھانے اور مشروبات لئے ہیں لیکن مولنا عبدالحلیم رحمہ اللہ نے قمر الاقمار حاشیہ نور الانوار میں اسے رد کیا ہے اور ملا علی قاری رحمہ اللہ بھی بیان فرماتے ہیں " وان الوصال مع تناول الطعام والشراب من المحال " بیشک کھانے اور پینے کے ساتھ ساتھ صوم وصال کا پایا جانا محال ہے صوم وصال تو وہی ہو سکتے ہیں کہ افطار کے وقت نہ کھایا جائے اور نہ پیا جائے۔ پھر اس کھلانے اور پلانے سے کیا مراد ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے انوار کی تجلیات کا مشاہدہ کرتا ہوں تو مجھے کھانے اور پینے کی حاجت ہی نہیں رہتی۔

ایک اور طویل حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس میں یہ الفاظ آتے ہیں:

" فاخذ یو اصل رسول اللہ ﷺ وذلک فی آخر الشھر فاخذ رجال من اصحابہ واصلون فقال النبی ﷺ ما بال رجال واصلون انکم لستم مثلی اما واللہ لو تماد بی الشھر لو اصلت وصالا یدع المتعمقون بتعمقھم "

کہ نبی کریم ﷺ نے رمضان کے آخر میں صوم وصال شروع کیے تو صحابہ کرام نے بھی صوم وصال شروع کیے تو حضور ﷺ نے فرمایا لوگوں کا کیا حال ہے کہ وہ صوم وصال رکھتے ہیں بیشک تم میری مثل نہیں ہو سکتے۔ خبردار قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں ایک مہینہ بھی صوم وصال رکھنا چاہوں تو رکھ سکتا ہوں بڑی گہرائی میں ڈوب کر عبادت کرنے والے گہرائی میں ڈوبنا چھوڑ دیں (یعنی انہیں اس کی طاقت ہی

حاصل نہیں ہوگی)۔

یہ بھی خیال رہے کہ صحابہ کرام کے صوم وصال کی وجہ سے ضعف کو دیکھ کر نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا:" ان النبی ﷺ واصل باصحابه یومین حین ابوا ان ینتهوا " بیشک نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کرام کے صوم وصال پر خاموشی رکھی یعنی ان کو ابتدائی طور پر اجازت دے رکھی لیکن وہ دوسرے دن ہی نڈھال ہو گئے دوسرے دن روزہ کو مکمل کرنے کی طاقت نہیں رہی۔

(از عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۷۲)

اعتراض: اس آیۃ کریمہ سے معلوم ہوا کہ روزہ رات میں افطار کیا جائے تو جس جگہ کئی کئی ماہ کا دن ہوتا ہے وہاں روزہ کی کیا صورت ہوگی؟

جواب: اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ ایسی جگہ آبادی ہی نہیں کیونکہ وہاں سردی سخت ہے دوسرا جواب اگر وہاں آبادی بھی ہو تو وہاں کے باشندے ماہ رمضان پائیں گے ہی نہیں لہذا ان پر روزہ واجب ہی نہیں۔ جیسے کہ بہت سے علماء کرام نے فتوی دیا ہے کہ جس زمانہ میں بلغار یا لندن میں عشاء کا وقت آتا ہی نہ ہو یعنی شفق غائب ہی نہ ہوتا ہو ان پر نماز عشاء واجب ہی نہیں کیونکہ انہوں نے وقت ہی نہیں پایا۔ یا جیسے کہ جس شخص کے ہاتھ و پاؤں نہ ہوں اس پر وضو کے فرض فقط دو ہیں منہ دھونا اور سر کا مسح کیونکہ اس کے پاس باقی فرضوں کا محل ہی نہیں۔ (شامی کتاب الصلوۃ)

راقم کہتا ہے یہ اس وقت ہے جب کٹے ہوئے ہاتھوں سے منہ دھو سکے اور سر کا مسح کر سکے اگر ایسا نہ کر سکے تو اس سے وضوء مکمل ساقط ہو جائے گا کیونکہ وضو میں غیر سے امداد طلب کرنی امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک واجب نہیں)۔ رب فرماتا ہے:

﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ "جو رمضان پائے وہ روزہ رکھے"۔

انہوں نے رمضان پایا ہی نہیں لہذا روزہ واجب نہیں۔

تیسرا جواب ایسے لوگوں پر روزہ کا فدیہ واجب ہے اور ان پر یہ آیۃ صادق ہے ﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ﴾ یہ جواب اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان رحمہ اللہ نے دیا ہے اور یہ ہی قوی ہے۔

اعتراض : جب ماہ رمضان روزہ کا سبب ہے اور وہ انہیں نہ ملا تو ان پر فدیہ کیونکر واجب ہوا فدیہ تو روزہ کا عوض ہے۔

جواب: حدیث شریف میں ہے کہ دجال کے ظہور کا پہلا دن ایک سال کا ہوگا دوسرا ایک ماہ کا صحابہ کرام نے پوچھا کہ اس دن میں نمازوں کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا حساب لگا کر پڑھنا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے لئے اس دن حکمی وقت معتبر ہے اور چونکہ وہ دن ایک سال کا ہے لہذا روزے بھی ضرور رکھیں جائیں گے کیونکہ روزہ بھی نماز کی طرح فرض ہے۔ (نعیمی)

راقم کے نزدیک نمازیں اوقات کا حساب کر کے پڑھی جائیں روزہ کی ابتداء اور انتہاء کا وقت محسوس ہو خواہ بہت قلیل ہی کیوں نہ ہو تو روزہ رکھے ورنہ فدیہ دے۔

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسَاجِدِ : ''اور ہاتھ نہ لگاؤ ان (عورتوں) کو ایسے حال میں کہ جب تم اعتکاف میں ہو مساجد میں''۔ آیئے سب سے پہلے راقم کی تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان کا ایک ورق دیکھئے۔

فَالْاٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ :

☆ ''پھر ملو اپنی عورتوں سے'' (محمود الحسن صاحب)

☆ ''اب تم اپنی بیویوں کے ساتھ شب باشی کرو''۔ (مودودی صاحب)

☆ ''سو اب تم ان سے ملو ملاؤ'' (عبدالماجد صاحب)

☆ ''اب (تم کو اختیار ہے کہ) ان سے مباشرت کرو''۔ (فتح محمد صاحب)

☆ ''پس اب ملا کرو ان سے'' (شاہ رفیع الدین صاحب)

☆ ''تو اب ان سے صحبت کرو''۔ (مولنا احمد رضا خان رحمہ اللہ)

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ :

☆ ''اور نہ ملو عورتوں سے'' (محمود الحسن صاحب)

☆ ''تو بیویوں سے مباشرت نہ کرو'' (مودودی صاحب)

☆ ''بیویوں سے صحبت نہ کرو'' (عبدالماجد صاحب)

☆ ''ان سے مباشرت نہ کرو'' (فتح محمد صاحب)

☆ ''اور مت ملو ان سے'' (شاہ رفیع الدین صاحب)

☆ ''اور عورتوں کو ہاتھ نہ لگاؤ'' (مولنا احمد رضا خان رحمہ اللہ)

یہاں اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان رحمہ اللہ کے ترجمہ اور دوسروں میں فرق سمجھنے کیلئے ایک تو یہ خیال کیا جائے کہ ''عورتوں سے ملو'' یا ان سے صحبت کرو یا ان سے شب باشی کرو، ایک ہی معنی میں استعمال ہوئے ہیں یعنی جماع کرنا اور ''نہ ملو عورتوں سے یا ان سے مباشرت نہ کرو'' یہ اسی پہلے معنی کی نفی ہے یعنی جماع نہ کرو۔ لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ ''صحبت کرو'' پر نفی نہیں کہ ترجمہ یہ ہوتا ''ان سے صحبت نہ کرو'' لیکن آپ نے ترجمہ کیا ہے ''اور عورتوں کو ہاتھ نہ لگاؤ'' وجہ فرق کیا ہے اس مسئلہ کو سمجھنے سے پہلے یہ سمجھا جائے کہ ﴿ بَاشِرُوْهُنَّ ﴾ میں امر کا تعلق رمضان کی راتوں سے ہے اور ﴿ ولا تُبَاشِرُوْهُنَّ ﴾ کی نہی کا تعلق اعتکاف سے ہے ﴿ بَاشِرُوْهُنَّ ﴾ کا ترجمہ سمجھنے سے پہلے اصل وجہ نزول کو ذہن میں رکھیں:

" عن ابن عباس کانوا علی عهده ﷺ اذا صلوا العشاء حرم علیهم الطعام والشراب والنساء وفی البخاری عن البراء کون المنع مقیدا بالنوم قال الحافظ یحتمل ان یکون التقید بالحقیقة انما هو بالنوم وذکر صلوة لکون ما بعدها مظنة النوم غالبا " (حاشیه جلالین بحواله کمالین)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد کھانا، پینا جماع کرنا منع تھا بخاری شریف میں حضرت براء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ حکم سونے کے بعد تھا۔ ان دونوں حدیثوں میں محاکمہ اس طرح کیا گیا ہے کہ حکم حقیقۃً نیند سے ہی مقید تھا لیکن چونکہ بعد از نماز عشاء عام طور پر سویا جاتا ہے لہٰذا ایک جگہ نماز عشاء کا ذکر ہے اور دوسری جگہ نیند کا۔

لیکن یہ حکم کئی صحابہ کرام کی معذوریت پر منسوخ کر دیا گیا اور جماع کو یا کھانے پینے کو رات میں جائز کر دیا گیا۔ لیکن رمضان کے دن میں شہوت سے ہاتھ لگانا اور بوس و کنار منع نہیں جب کہ انسان کو اپنے آپ پر اعتماد ہو کہ انزال نہیں ہوگا یا وہ بے صبری سے کام لے کر غلطی نہ کر دے یعنی جماع نہ کر دے۔

لیکن اعتکاف کی حالت میں جس طرح صحبت کرنا منع ہے اسی طرح اس کے دواعی (ہاتھ لگانا

شہوت سے اور بوس وکنار) بھی منع ہیں اب اس مسئلہ کی حقیقت جاننے کے بعد تراجم کی طرف توجہ کریں یہ مسئلہ صرف اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے واضح ہوگا کہ رمضان شریف میں جماع کی قید کو اٹھایا گیا ہے لیکن اعتکاف کی حالت میں جماع سے اور اس کے اسباب سے بھی ممانعت ہے ہدایہ کتاب الصوم میں دیکھیں:

" ولا بأس بالقبلة اذا امن علی نفسه ای الجماع والانزال ویکره اذا لم یأمن "

روزے کی حالت میں جماع یا انزال کی فکر نہ ہو تو بوسہ لینے میں کوئی حرج نہیں لیکن اگر یہ خطرہ ہو تو مکروہ ہے ہاں یہ بھی خیال رہے کہ انزال ہو جائے تو روزہ ٹوٹ جائے گا البتہ کفارہ نہیں ہوگا اور اگر جماع کر لیا تو روزہ ٹوٹ گیا قضاء بھی لازم ہوگی اور کفارہ بھی۔

لیکن اعتکاف میں کیا حکم ہے؟ دیکھئے ہدایہ باب الاعتکاف:

" ویحرم علی المعتکف الوطی لقوله تعالیٰ ولا تباشروهن وانتم عاکفون فی المساجد وکذا اللمس والقبلة لانه دواعیه فیحرم علیه اذ هو محظوره کما فی الاحرام بخلاف الصوم لان الکف رکنه لا محظوره فلم یتعد الی دواعیه "

حالت اعتکاف میں وطی حرام ہے اور اسی طرح بوسہ لینا اور چھونا بھی منع ہے جس طرح احرام میں منع ہیں لیکن یہ حکم روزے کا نہیں کیونکہ وہاں صرف جماع سے رکنا رکنِ صوم ہے بوسہ لینے اور مس کرنے سے رکنا روزے کا رکن نہیں۔ یہ فرق واضح کرنے کے لئے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ موزوں ترین ہے ارباب نظر خدارا انصاف کریں اسی فقہی فرق پر کون سا ترجمہ دال ہے اور کون سے کوسوں دور ہیں۔

اسی پر شیخ زادہ کی عبارت بھی شاہد ہے:

" واما اذا لمسها بشهوة او قبلها او باشر فیما دون الفرج فهو حرام علی المعتکف "

شہوت کے ساتھ عورت کو چھونا اور بوسہ لینا تفخیذ وتبطین سب ہی اعتکاف والے پر حرام ہیں۔
(تسکین الجنان ص ۵۹، ۶۰)

اعتکاف کے مسائل وفضائل: اعتکاف کالفظ **عکف یعکف (بکسر الکاف وضمها)** سے لیا ہوا ہے۔لغوی معنی یہ ہے''کسی چیز پر رک جانا، اور سانس کو روکنا اور اصطلاح شرع میں مسجد میں رکنا اور عورتوں کا اپنے گھر میں نماز کی جگہ رکنا۔اعتکاف کی تین قسمیں ہیں: واجب، مستحب، سنت۔

اعتکاف واجب: اس وقت ہوتا ہے جب کہ انسان نذر مانے کہ میں اتنے دنوں کا اعتکاف کروں گا۔اتنے دن اور اتنی ہی راتیں اعتکاف واجب ہوجائے گا۔اور ہر دن روزہ رکھنا بھی ضروری ہوگا۔

اعتکاف مستحب: بہتر تو یہ ہے کہ بغیر کسی نذر کے کم ازکم ایک دن ایک رات کا اعتکاف ہو روزہ بھی رکھے زیادہ جتنے دن چاہے اعتکاف کرے اور روزہ بھی رکھے۔تاہم مسجد میں جتنی دیر رہے اتنی دیر کی نیت اعتکاف کی کرلے تو یہ بھی اعتکاف مستحب ہوگا:

" **وقال محمد من اصحابنا فی اعتکاف النفل فینبغی اذا دخل المسجد ان یقول نویت الاعتکاف ما دمت فی المسجد** "

اور امام محمد رحمہ اللہ نے نفلی اعتکاف کے متعلق ارشاد فرمایا کہ لائق یہ ہے کہ جب کوئی شخص مسجد میں داخل ہو تو یہ کہے''میں اعتکاف کی نیت کرتا ہوں جب تک مسجد میں رہوں'' بلکہ زیادہ بہتر یہی ہے کہ مسجد میں نماز کی انتظار میں بیٹھنے والا شخص، یا دنیاوی اور اخروی کام کے لئے مسجد میں ہے تو اعتکاف کی نیت کرلے " **فاذا خرج ثم دخل یجدد النیة** " جب مسجد سے نکلے پھر مسجد میں داخل ہو تو اعتکاف کی نیت دوبارہ از سرنو کرلے۔

اعتکاف سنۃ: رمضان شریف کے آخری دس دن اعتکاف سنۃ مؤکدہ کفایہ ہے یعنی جو شخص اعتکاف کریگا ثواب تو اسے ہی حاصل ہوگا دوسرے کو ثواب تو حاصل نہیں تاہم کسی ایک کے اعتکاف سے دوسروں پر سنۃ مؤکدہ کے ترک کی وجہ سے جو ملامت لازم ہوتی تھی وہ نہیں ہوگی۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج ۴ص ۳۲۵)

یہ بھی خیال رہے کہ شہر میں کوئی ایک مرد یا عورت اعتکاف کرلے تو تمام شہر والوں پر ترک سنۃ کا بوجھ لازم نہیں رہے گا فقہاء کرام کی صحیح تحقیق یہی ہے ہر مسجد میں یا ہر محلّہ میں اگر کوئی معتکف نہ ہو تو دوسروں پر بوجھ ہوگا یہ قول معتبر نہیں۔ نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد صحابہ کرام کو جنگوں کا سامنا کرنا پڑا۔ان کی تیاری وغیرہ کی وجہ سے مرد حضرات اعتکاف نہ کرسکے صرف ازواج مطہرات کے اعتکاف پر

اکتفا کرلیا گیا۔

مسئلہ : اعتکاف ایسی مسجد میں کیا جائے جس میں پانچ نمازیں جماعت سے ادا کی جاتی ہوں کیونکہ جماعت سے نماز ادا کرنا واجب ہے لیکن اعتکاف سنت ہے ایسا درست نہیں کہ سنت پر عمل کرنے کی وجہ سے واجب کی ترک لازم آجائے۔

مسئلہ : عورت کا مسجد میں اعتکاف مکروہ ہے عورت اپنے گھر میں جو مقام نماز ادا کرنے کے لئے اس نے مختص کیا ہوا ہے اسی میں اعتکاف کرے۔

" عن عائشة ان النبی ﷺ کان یعتکف العشر الاواخر من رمضان حتی توفاه الله ثم اعتکف ازواجه من بعده " (بخاری ومسلم، مشکوۃ باب الاعتکاف)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں بیشک نبی کریم ﷺ رمضان کے آخری دس دنوں کا اعتکاف کرتے تھے یہاں تک کہ آپ کا اللہ تعالیٰ نے وصال فرمایا پھر آپ کے بعد آپ کی ازواج (بیبیوں) نے اعتکاف کیا:

" ثم اعتکف ازواجه ای فی بیوتهن لعدم رضانه علیه الصلوة والسلام لفعلهن ولذا قال الفقهاء یستحب للنساء ان یعتکفن فی مکانهن (من بعده) ای من بعد موته احیاء لسنته وابقاء لطریقته "

نبی کریم ﷺ کی ازواج نے اپنے گھروں میں اعتکاف کیا کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اپنی ظاہری حیات میں ان کے مسجد میں اعتکاف کو ناپسند فرمایا تھا۔ نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات نے آپ کے بعد اعتکاف کیا تاکہ آپ کی سنت زندہ رہے اور آپ کا طریقہ باقی رہے۔ نبی کریم ﷺ نے ازواج مطہرات کے مسجد میں اعتکاف کو ناپسند فرمایا اس پر حدیث پاک کو دیکھیں:

" عن عائشة قالت کان النبی ﷺ اذا اراد ان یعتکف صلی الصبح ثم دخل المکان الذی یرید ان یعتکف فیه فاراد ان یعتکف العشر الاواخر من رمضان فامر فضرب له خباء فامرت عائشة بخباء فضرب لها وامرت حفصة بخباء فضرب لها فلما رأت زینب خباء هما امرت بخباء فضرب لها فلما رأی ذلک رسول الله ﷺ قال البر تردن فلم یعتکف فی رمضان واعتکف عشرا من شوال " (ابن ماجه باب الاعتکاف)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی کریم ﷺ جب اعتکاف کرنے کا ارادہ فرماتے صبح نماز ادا کرتے پھر اس جگہ داخل ہوتے جہاں اعتکاف کا ارادہ کرتے آپ نے رمضان کے آخری دس دنوں کے اعتکاف کا ارادہ فرمایا تو آپ نے حکم فرمایا آپ کے لئے خیمہ لگا دیا گیا (یعنی اعتکاف کے لئے چادریں تان دی گئیں) پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حکم دیا ان کے لئے خیمہ لگایا گیا۔ پھر حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے حکم دیا ان کے لئے خیمہ لگا دیا گیا۔ پھر حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے ان دونوں کے خیموں کو دیکھا تو انہوں نے حکم دیا ان کے لئے خیمہ لگا دیا گیا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اسے دیکھا تو آپ نے فرمایا کیا نیکی صرف یہی ہے جو تم ارادہ رکھتی ہو۔ آپ نے اس رمضان میں اعتکاف نہ کیا بلکہ شوال میں دس دن اعتکاف کیا۔

وضاحت حدیث : اس حدیث پاک سے یہ واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے عورتوں کا مسجد میں اعتکاف بیٹھنا ناپسند فرمایا۔ اور واضح ہو گیا کہ اگرچہ ضروری تو صرف اعتکاف کی حالت میں مسجد میں رہنا ہے چادریں تاننا فرض یا واجب تو نہیں لیکن مسنون ہے کہ اس سے یکسوئی حاصل ہوتی ہے عام آدمی پاس بیٹھ کر باتیں نہیں کرتے۔

نبی کریم ﷺ اپنے اعتکاف کے مقام پر صبح ہی تشریف لے جاتے حالانکہ مغرب سے پہلے اعتکاف کی جگہ پر پہنچ جانا ضروری ہے تو اس کی وجہ یا آپ کی تخصیص تھی کہ آپ وقت سے زیادہ اعتکاف فرما لیتے تھے کیونکہ کمی درست نہیں لیکن زیادتی میں کوئی حرج نہیں۔

لیکن راقم کے نزدیک یہ کوئی ثابت نہیں کہ آپ اعتکاف کی جگہ صبح تشریف لے جاتے تھے پھر وہیں آخری رمضان تک قیام فرماتے ممکن ہے صبح اعتکاف کی جگہ کا جائزہ لیتے ہوں اور پھر مغرب سے پہلے آ کر بیٹھ جاتے ہوں (واللہ اعلم بالصواب)۔

مسئلہ : اعتکاف بیٹھنے والا مرد ہو یا عورت ان کیلئے ضروری ہے کہ وہ مسلمان ہوں عاقل ہوں (پاگل نہ ہوں) اور جنابت سے پاک ہوں اور عورت کیلئے حیض ونفاس سے پاک ہونا بھی ضروری ہے۔

تنبیہ : رمضان شریف کے آخری دس دن اعتکاف سنۃ مؤکدہ علی الکفایۃ ہے لیکن اگر کوئی شخص رمضان کے آخری دس دنوں میں ایک دن یا تین دن یا پانچ دن کا اعتکاف بیٹھنا چاہتا ہے تو درست ہے اس کا اعتکاف مستحب ہوگا۔ بظاہر یہاں اعتراض یہ ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مدینہ طیبہ میں اعتکاف

ہر رمضان کے آخری دس دن کیا ہے ایک مرتبہ (جس کا ذکر کیا جاچکا ہے) چھوڑا لیکن وہ بھی شوال میں قضا کیا ہے اس سے تو پتہ چلتا ہے کہ اعتکاف واجب ہونا چاہئے:

" والجواب كما في العناية انه عليه الصلوة والسلام لم ينكر على من تركه ولو كان واجبا لأنكر، وحاصله ان المواظبة انما تفيد الوجوب اذا اقترنت بالانكار على التارك "

تو اس کا جواب یہ ہے کہ کوئی کام نبی کریم ﷺ نے ہمیشہ کیا ہو اور اس کے تارک پر وعید فرمائی ہو اور ترک کرنے کی اجازت نہ دی تو وہ کام واجب ہوتا ہے یہاں تارک پر انکار نہیں فرمایا لہذا سنۃ مؤکدہ ہے واجب نہیں۔ (شامی)

☆ عن ابی هريرة قال كان يعرض على النبی ﷺ القرآن كل عام مرة فعرض عليه مرتين فی العام الذی قبض وكان يعتكف كل عام عشر فاعتكف عشرين فی العام الذی قبض " (رواه البخاری، مشكوة كتاب الاعتكاف)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے ہر سال ایک مرتبہ قرآن پاک کا دور کیا جاتا تھا۔ جس سال آپ کا وصال ہو گیا اس سال آپ سے دو مرتبہ دور کیا گیا۔ آپ ہر سال دس دن اعتکاف بیٹھتے تھے لیکن جس سال آپ کا وصال ہو گیا اس سال آپ بیس دن اعتکاف بیٹھے۔

وضاحت حدیث: نبی کریم ﷺ سے ہر رمضان میں جبریل دور کرتے تھے۔ جس رمضان کے بعد پھر رمضان نہیں آنا تھا اس میں دو مرتبہ دور کیا اسی طرح نبی کریم ﷺ ہر رمضان کے آخری دس دن اعتکاف بیٹھتے تھے لیکن آپ نے اپنی زندگی کے آخری رمضان میں بیس دن کا اعتکاف کیا۔

اس حدیث سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو اپنے وصال کا علم تھا کہ اس رمضان کے بعد آپ پر آپ کی ظاہری حیات میں اور رمضان نہیں آئیگا۔ اور آپ نے اپنی امت کو یہ درس دیا کہ ہر انسان اپنی زندگی کے آخری ایام میں زیادہ سے زیادہ نیک اعمال کرے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حضور جانے اور اس سے ملاقات کے قابل بنائے۔ اور یہ بھی ثابت ہوا کہ حفاظ کا قرآن پاک کا دور کرنا سنت جبریل اور سنت نبی کریم ﷺ ہے یعنی حفاظ کو دور کرنے سے سنت پر عمل کا ثواب بھی حاصل ہوتا ہے۔ (مرقاۃ)

مسئلہ : مرد کا مسجد سے اور عورت کا گھر کی نماز کی جگہ (جہاں وہ اعتکاف میں ہو) سے بغیر ضرورت انسانیہ اور بغیر ضرورت شرعیہ کے نکلنا منع ہے انسانی حاجات یہ ہیں پیشاب، پاخانہ کے لئے نکلنا اور اگر احتلام ہو جائے تو تیمّم کر کے مسجد سے نکل جائے اور مسجد سے باہر غسل کرے۔ اور حاجات شرعیہ یہ ہیں۔ اگر اذان کہنی ہو اور اذان کا مینارہ مسجد کے باہر ہو تو اعتکاف والے کا اذان کہنا جائز ہوگا۔ اس طرح جس مسجد میں اعتکاف بیٹھا ہوا ہے اس میں جمعہ ادا نہیں ہوتا تو اتنا وقت لے کر جامع مسجد میں چلا جائے کہ وہاں سنتیں ادا کر سکے اور خطبہ سن سکے اور جمعہ کے فرض ادا کر سکے۔ فرضوں کے بعد والی سنتیں اپنی اعتکاف والی مسجد میں ادا کرے تو بہتر ہے۔ لیکن اگر فاصلہ زیادہ ہو واپس آ کر سنتیں ادا نہ کر سکے یا جامع مسجد سے نکلنا دشوار ہو تو وہاں ہی سنتیں ادا کر لے۔

☆ " وعن عائشة قالت كان رسول الله ﷺ اذا اعتكف ادنى الى رأسه وهو فى المسجد فارجله وكان لا يدخل البيت الالحاجة الانسان "

(بخاری، مسلم، مشکوۃ باب الاعتکاف)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب اعتکاف بیٹھتے تھے تو اپنا سر میرے قریب کرتے آپ خود مسجد میں ہی رہتے تو میں آپ کی کنگھی کرتی آپ گھر میں سوائے حاجت انسانیہ کے داخل نہیں ہوتے تھے۔

وضاحت حدیث: ادنی کا معنی قریب کرنا دنو سے لیا ہوا ہے مطلب یہ ہوا " اخرج رأسه من المسجد الى حجرتى " کہ نبی کریم ﷺ مسجد میں ہی تشریف فرما ہوتے اور سر مبارک کھڑکی سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں کر دیتے کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہی حجرہ تھا جواب نبی کریم ﷺ کا روضہ مطہرہ ہے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کی کنگھی کر دیتیں۔

اور مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ اعتکاف والا شخص اگر اپنے بعض اعضاء کو مسجد سے نکالے اور خود مسجد میں رہے تو اس کا اعتکاف ٹوٹتا نہیں۔ اور مسئلہ یہ سمجھ آیا کہ بڑا برتن (ٹپ) وغیرہ رکھ کر اس میں بیٹھ کر غسل کرے جب مسجد ملوث نہ ہو تو جائز ہے۔ حاجت انسانیہ سے مراد پیشاب پاخانہ ہے یعنی حضور ﷺ قضاء حاجت کے لئے مسجد سے نکل کر گھر تشریف لائے۔

مسئلہ : اعتکاف والا شخص اگر قضا حاجت کے لئے گھر آئے تو گھر میں کسی بیمار سے چلتے چلتے پوچھ لے کہ تمہارا کیا حال ہے تو یہ جائز ہے۔

☆ " وعن عائشة قالت كان رسول الله ﷺ يعود المريض وهو معتكف فيمر كما هو فلا يعرج يسال عنه " (رواه ابو داود وابن ماجه ، مشكوة باب الاعتكاف)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ مریض کی عیادت کرتے تھے جب آپ اعتکاف میں ہوتے تھے لیکن چلتے چلتے آپ رک کر اس سے سوال نہیں کرتے تھے۔

وضاحت حدیث : اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ مریض مسجد سے باہر ہو تو اعتکاف والا شخص اپنی حاجت انسانیہ کے لئے مسجد سے نکلے تو چلتے چلتے مریض کی عیادت کر لے تو جائز ہے:

" فيمر كما هو " اى يمر مرورا فلا يميل الى الجوانب ولا يقف وقولها (فلا يعرج) اى لا يمكث بيان للجمل لان التعريج الاقامة "

یعنی چلتے چلتے عیادت کی جائے دائیں بائیں نہ پھرے اپنے راستے پر چلتے ہوئے بغیر رکنے کے عیادت کرے اگر راستہ سے ہٹ کر دائیں بائیں جا کر مریض کی عیادت کرے یا مسجد سے باہر رک کر عیادت کرے تو یہ نا جائز ہے۔ (از مرقاۃ)

☆ " عن عائشة قالت السنة على المعتكف ان لا يعود مريضا ولا يشهد جنازة ولا يمس المرأة ولا يباشرها ولا يخرج لحاجة الا لما لا بد منه ولا اعتكاف الا بصوم ولا اعتكاف الا في المسجد جامع " (رواه ابو داؤد ، مشكوة باب الاعتكاف)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں اعتکاف والے شخص کے لئے سنت یہ ہے کہ وہ مریض کی عیادت نہ کرے اور نماز جنازہ میں حاضر نہ ہو اور کسی عورت کو مس نہ کرے اور عورت سے مباشرت نہ کرے کسی کام کے لئے مسجد سے باہر نہ نکلے سوائے ضرورت کے۔ اور اعتکاف بغیر روزہ کے صحیح نہیں اور اعتکاف سوائے اس مسجد کے نہیں جس میں جماعت ہوتی ہے۔

وضاحت حدیث : حدیث پاک میں " سنة " کا لفظ جو ذکر ہے اس سے مراد دین اور شرع اور وہ راہ جس پر چلا جائے۔ یعنی اعتکاف والے کے لئے شرعی طریقہ یہ ہے کہ مسجد سے باہر کسی کی جا کر عیادت نہ کرے ہاں البتہ حاجت انسانیہ کے لئے نکلے تو چلتے چلتے مریض کی عیادت کر لے۔

اور مسجد سے باہر جنازہ ادا کرنے کے لئے نہ نکلے۔ اور اعتکاف میں روزہ رکھنا ضروری ہے ایک دن ایک رات کا بھی اعتکاف ہو تو روزہ رکھنا لازم ہوگا ہاں البتہ کچھ دیر کے لئے اعتکاف کی نیت کرے دن رات سے کم ہو تو اس میں روزہ رکھنا ضروری نہیں۔

اعتکاف کے لئے ضروری ہے کہ مسجد میں ہو اور اس میں جماعت ہوتی ہو۔ اگر مسجد میں جماعت نہ ہوتی ہو تو ایسی مسجد میں اعتکاف نہ بیٹھے۔ حدیث شریف میں "الا فی مسجد جامع" کا مطلب یہ کہ وہ مسجد جس میں جماعت ہوتی ہو اس سے مراد جامع مسجد (جس میں جمعہ ہوتا ہو) نہیں۔
(از مرقاۃ)

معتکف کو معتکف کہنے کی وجہ:

"عن ابن عباس ان رسول الله ﷺ قال فی المعتکف هو یعتکف الذنوب و یجری له من الحسنات کعامل الحسنات کلها"

(رواہ ابن ماجہ، مشکوۃ باب الاعتکاف)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا معتکف وہ ہے جو گناہوں سے بچ جائے۔ اور اس کو (مسجد میں بیٹھنے کی وجہ سے) نیکیوں کا ثواب ملتا رہتا ہے جیسا کہ نیکیوں پر عمل کرنے والے کو ثواب ملتا ہے۔

وضاحت: حدیث پاک کا مطلب واضح ہے کہ اعتکاف والا شخص دنیا سے کنارہ کش ہو کر مسجد میں بیٹھ جاتا ہے اور اپنے آپ کو گناہوں سے بچا لیتا ہے پھر اس کا ہر لمحہ نیکی میں گزر رہا ہوتا ہے خواہ وہ اٹھے یا بیٹھے جاگے یا سوئے۔ یعنی اس کا جاگنا بھی عبادت اور اس کا سونا بھی عبادت ہے۔

مسئلہ: اعتکاف والے شخص کیلئے مسجد میں کھانا اور پینا جائز ہے بلکہ وہ مسجد سے باہر نکل کر کھا اور پی نہیں سکتا یہ اس کیلئے جائز ہی نہیں اور اعتکاف کے دنوں میں وہ لازماً مسجد میں ہی سوئے گا اعتکاف والا شخص اگر کسی چیز کو خریدنے یا بیچنے کا محتاج ہو یعنی بہت ضرورت درپیش آئے تو اس چیز کو مسجد میں نہ لایا البتہ زبانی طور پر وہ سودا کر سکتا ہے ہاں بغیر عذر کے تجارت کی غرض سے خرید و فروخت منع ہوگی۔ (درمختار، شامی)

مسئلہ: اعتکاف کی حالت میں قرآن پاک پڑھے، درود شریف پڑھے ہر قسم کا وہ ذکر کرے جو

قرآن وحدیث میں ہو دعائیں کرے لیکن اس عقیدہ سے بالکل خاموش ہو کر نہ بیٹھے کہ خاموش رہنا بھی عبادت ہے پہلی قوموں پر خاموشی کا روزہ بھی عبادت سمجھا جاتا تھا لیکن نبی کریم ﷺ کی شریعت میں اسے منسوخ کر دیا گیا:

"عن ابی هریرة قال ان النبی ﷺ نهی عن صوم الوصال وعن صوم الصمت"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے صوم وصال سے اور خاموشی کے روزے سے منع فرمایا۔ ہاں البتہ لغو کلام سے بچنے کے لئے خاموش رہنا بہتر ہے بلکہ کہیں فرض اور واجب ہوتا ہے کہ خاموش رہا جائے۔ حدیث شریف میں ہے "من صمت نجا" جو خاموش رہا اس نے نجات حاصل کر لی۔ اور حدیث شریف میں ہے:

"رحم الله امرأ تکلم فغنم او سکت فسلم"

اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے جو کلام کرے تو غنیمت حاصل کر لے (یعنی کلام سے نفع حاصل کرے، کلام خیر ہو) یا خاموش رہے تو سلامتی میں رہے۔ خیال رہے غیبت سے بچنا اور جھوٹ سے بچنا فرض ہے اور برے اشعار پڑھنے سے بچنا اور سامان تجارت کو لوگوں کو سامنے خالص اور کھرا بیان کرنے کے لئے اللہ کے ذکر سے بچنا واجب ہے۔

خیال رہے کہ برا کلام نہ ہو تو وہ مباح ہے لیکن اعتکاف والے کے لئے مباح کلام کرنا بھی مکروہ ہے ہاں البتہ قرآن پاک اور حدیث پاک کا درس دے اور طلباء کو پڑھائے اور انبیاء کرام کے واقعات بیان کرے اور نیک لوگوں کی حکایات بیان کرے اور دینی مسائل پر مشتمل کتاب لکھے فتوی لکھے یہ سب کام جائز اور مستحسن ہیں۔ (از درمختار، شامی)

مسئلہ : اگر ایک شخص نذر مانے کہ میں اتنے دن اعتکاف بیٹھوں گا تو اتنی راتیں بھی تو وہ اس پر لازم ہو جائیں گے اور روزہ رکھنا بھی لازم ہو جائے گا اور اگر راتوں کی نذر مانے کہ میں اتنی راتیں اعتکاف بیٹھوں گا تو اتنے دن بھی خود بخود لازم ہو جائیں گے۔ ہاں اگر نذر میں یہ کہے میں صرف دن دن کا اعتکاف بیٹھوں گا رات کو اعتکاف نہیں کروں گا تو صرف دن کا اعتکاف لازم ہوگا۔ (درمختار، شامی)

مسئلہ : اگر کسی عذر، یعنی شدید بیماری وغیرہ کی وجہ سے اعتکاف توڑ دیا تو جتنے دن اس کی نیت کے مطابق اعتکاف کے رہتے تھے اتنے دن اعتکاف کی قضاء کرنی لازم ہوگی اور روزہ رکھنا بھی لازم ہو گا۔ یہ بھی خیال رہے کہ یہ اعتکاف کے دن مستقل طور پر روزہ رکھنا لازم ہوگا کوئی شخص یہ خیال کرے کہ وہ پھر آنے والے رمضان میں اعتکاف قضاء کرلے گا یہ درست نہیں ہوگا کیونکہ رمضان میں تو روزہ رکھنا ہی ہے وہ مستقل روزہ اعتکاف کی قضا کی وجہ سے نہیں رکھا جاتا۔

مسئلہ : اگر ایک مسجد شہید ہونے کا خطرہ لاحق ہو جائے یا وہاں کے بدمعاش لوگ اسے نکال دیں کہ وہ کسی کو اعتکاف نہیں بیٹھنے دیتے تو دوسری مسجد میں منتقل ہونا جائز ہے۔

مسئلہ : اعتکاف کی حالت میں مسجد میں رہنا ضروری ہے خواہ کمرے میں ہو یا صحن میں یا مسجد کی چھت میں ہو لیکن مسجد سے نکلنا منع ہے وضو والی جگہ مسجد سے باہر ہوتی ہے اس لئے وضو کرنے کی اجازت ہے لیکن برتن صاف کرنے کے لئے وضو کی جگہ بیٹھنا منع ہے۔ بغیر مجبوری یعنی جنابت کے غسل کے بغیر جمعہ وغیرہ کا غسل کرنا منع ہے کیونکہ بلاوجہ مسجد سے باہر نکلنا لازم آئے گا۔

تنبیہ : مسجد کا محراب آج کل کے رواج کے مطابق مسجد کا حصہ ہی سمجھا جاتا ہے اس لئے مسجد کے محراب کو مسجد کے غیر کا حکم دینا درست نہیں۔ ہاں مسجد بناتے وقت محراب کو یا کسی حصہ کو مسجد سے باہر شمار کرلیا گیا تو اس جگہ اعتکاف والے شخص کا بیٹھنا وغیرہ منع ہوگا۔ مسجد کا ہی حصہ شمار کیا جائے درمیان میں دیوار وغیرہ دے کر اعتکاف والوں کے لئے علیحدہ جگہ منتخب کرلی تو جائز ہے۔ ایسی سیڑھی جو مسجد سے باہر ہو اسے استعمال کر کے مسجد کی چھت پر معتکف کو جانا منع ہوگا۔ محراب کے متعلق راقم نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے، کوئی اتفاق کرے یا نہ کرے۔

تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ فَلَا تَقْرَبُوْھَا : ''یہ اللہ کی حدیں ہیں تو نہ قریب جاؤ ان کے'' ﴿ حد ﴾ کا معنی ہے کسی چیز کی انتہاء کسی چیز کے منقطع ہونے کا مقام، جو شخص رزق سے محروم ہوا سے بھی محدود کہا جاتا ہے کہ اس سے رزق کو منقطع کرلیا گیا۔ اور دربان کو حداد کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو اندر داخل ہونے سے روکتا ہے اور کہتا ہے تمہارے آنے کی حد دروازہ ہی ہے اور حد الدار کا مطلب ہوتا ہے یہاں غیر کا

داخل ہونا منع ہے۔اور اللہ تعالیٰ کی حدود سے مراد وہ چیزیں اور وہ احکام ہیں جن کی مخالفت منع ہے۔ (از کبیر)

اعتراض : "تِـلْـکَ" کا اشارہ ہے پہلے احکام مذکورہ کی طرف وہ تمام تو حرام نہیں بلکہ بعض ان میں سے مباح ہیں تو سب کے متعلق یہ کہنا کس طرح درست ہے ﴿ فَلا تَـقْـرَبُوْهَا ﴾ ان کے قریب نہ جاؤ۔

جواب : اگر چہ پہلے کئی احکام کا ذکر ہے لیکن قریب ﴿ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِی الْمَسَاجِدِ ﴾ ہے کہ تم عورتوں کو ہاتھ نہ لگاؤ جب کہ تم مساجد میں معتکف ہو۔

اسی طرح ذکر ہے ﴿ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ﴾ "پھر تم پورا کرو روزوں کو رات تک" اس سے پتہ چلا کہ رات آنے سے پہلے روزہ افطار کرنا حرام ہے اس لئے یہ کام جو حرام ہیں وہی "تلک" کا مشار الیہ ہیں ان کے قریب جانے سے منع کیا گیا ہے۔ (خازن)

اعتراض : اعتراض اس آیہ کریمہ میں ذکر ہے

﴿ تِلْکَ حُدُوْدُ اللهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ﴾ "یہ اللہ کی حدیں ہیں ان کے قریب نہ جاؤ۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿ تِلْکَ حُدُوْدُ اللهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ﴾ "یہ اللہ کی حدیں ہیں ان سے تجاوز نہ کرو"۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ وَ مَنْ يَّعْصِ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ ﴾

"اس میں بھی حدود سے تجاوز کرنے پر وعید فرمائی تو یہ وجہ فرق کیا ہے؟

جواب : جو شخص اللہ تعالیٰ کی طاعت میں ہو اور اللہ تعالیٰ کے فرائض کی ادائیگی میں ہو وہ مقام حق میں ہے اسے منع کیا گیا کہ حدود سے تجاوز کر کے باطل مقام میں داخل نہ ہونا پھر اور زیادہ تاکید کی گئی کہ حق اور باطل کے درمیان حدود کے قریب بھی نہ جانا کہ کہیں بے خبری اور بے احتیاطی کی وجہ سے باطل راہ میں داخل نہ ہو جانا۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" الحلال بين والحرام بين وبينهما امور مشتبهات لا يعلمها كثير من الناس فمن اتقى المشتبهات استبرأ لعرضه ودينه ومن وقع فی

المشتبھات وقع فی الحرام کراع یرعی حول الحمی یوشک ان یواقعہ الا وان لکل ملک حمی الا وان حمی اللہ فی ارضہ محارمہ "

(متفق علیہ)

حلال چیزیں واضح ہیں اور حرام بھی واضح ہیں اور ان کے درمیان کچھ امور مشتبہ ہیں کثیر لوگ ان کو نہیں جانتے۔ جو شخص مشتبہ چیزوں سے بچ گیا اس نے اپنی عزت اور اپنے دین کو بچا لیا اور جو شخص مشتبہ چیزوں میں واقع ہو گیا وہ حرام میں واقع ہو گیا جیسا کہ جانوروں کو چرانے والا جب حد بندی کے اردگرد جانوروں کو چرائے تو قریب ہے کہ اس کے جانور (اس حد بندی کے اندر) واقع ہو جائیں بیشک ہر بادشاہ کی حد بندی ہے خبردار اللہ تعالیٰ کی زمین میں اس کی حد بندی اس کے محارم ہیں۔

مطلب واضح ہے کہ جس طرح جانوروں کو چرانے والا کسی کی زمین کی حد کے ساتھ جانوروں کو چرائے تو ممکن ہے کہ وہ جانور دوسرے کے فصل میں واقع ہو کر فصل برباد کر دیں اسی طرح جن امور کے متعلق شک ہو کہ ہو سکتا ہے یہ حرام ہوں تو ان سے دور رہے کیونکہ اگر ان میں واقع ہو گا تو ہو سکتا ہے کہ عین حرام کاموں میں واقع ہو جائے۔ اور جن کاموں کا حرام ہونا یقینی ہو تو ان کے قریب بھی نہ آئے تا کہ ان سے مکمل بچ سکے۔ (ماخوذ از خازن ومظہری)

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ آيَاتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ :

" اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی نشانیاں لوگوں کے لئے تا کہ وہ پرہیز گار ہو جائیں"۔

﴿كَذٰلِكَ﴾ میں کاف محل نصب میں ہے اور مصدر محذوف کی صفت ہے حاصل کلام یہ ہے:

" کذلک ای بیانا مثل ھذا البیان الوافی والواضح "

اور آیات سے مراد دلائل دین اور نصوص احکام اور مقصد بیان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر جو رحمت اور اس کی طرف سے ان کو ہدایت حاصل ہے اس کی عظمت کو واضح کرنا ہے۔ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے یہاں احکام واضح طور پر بیان فرمائے ہیں اسی طرح تمام دلائل دین اور احکام پر نصوص کو واضح طور پر بیان فرماتا ہے تا کہ لوگ ہدایت پا جائیں اور اس کی رحمت سے فائدہ حاصل کریں تا کہ اس کے اوامر و نواہی کی مخالفت سے بچ جائیں۔

تقوی کا پہلا درجہ شرک سے بچنا ہے پھر گناہوں سے بچنا، پھر شہوات سے بچنا ہے پھر بے فائدہ چیزوں سے بچنا ہے حدیث شریف میں ہے:

" لا يبلغ العبد درجة المتقين حتى يدع مالا باس به حذرا مما باس به "

بندہ اس وقت تک متقین کے درجہ کو نہیں پا سکتا جب تک ان چیزوں کو نہ چھوڑ دے جن میں کوئی حرج نہیں ان سے بچنے کی غرض سے جن میں حرج پائی جاتی ہے۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ نے کیا خوب فرمایا:

ترا آنکه چشم ودهان داد وگوش اگر عاقلی در خلافش مکوش

تجھے جس ذات نے آنکھیں اور منہ اور کان دیئے اگر تو عقل مند ہے تو اس کے خلاف کام کرنے کی کوشش نہ کر:

چوں پاك آفريدت بهش باش وپاك كه ننگست ناپاك رفتن بخاك

جب رب تعالیٰ نے تجھے پاک پیدا کیا ہے تو ہوش میں رہ اور پاک ہی رہ۔ کہ مقام شرم ہے ناپاک ہو کر خاک میں جانا:

مرو زیر باره گناه ای پسر که حمال عاجز بود درسفر

اے لڑکے گناہوں کا بوجھ اٹھا کر نہ جا کہ بوجھ اٹھانے والا سفر میں عاجز ہو جاتا ہے

مکن عمر ضائع بافسوس وحیف که فرصت عزیز است ووقت سیف

اپنی عمر بے مقصد ضائع نہ کر دے کہ فرصت عزیز ہے اور وقت تلوار (کی طرح چمکنے والا جانے والا ہے)

(از روح البیان)

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ

۱) ''اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ اور نہ حاکموں کے پاس ان کا مقدمہ اس لئے پہنچاؤ کہ لوگوں کا کچھ مال ناجائز طور پر کھالو جان بوجھ کر''

۲) ''اور نہ کھاؤ تم ایک دوسرے کا مال آپس میں ناحق طریقہ سے اور نہ پیش کرو ان کو حاکموں کی طرف کہ تم کھاؤ مال لوگوں کے مالوں میں سے ناجائز طور پر حالانکہ تم جانتے ہو''۔

شان نزول:

(۱) عبدان حضرمی نے امرؤ القیس کندی پر زمین کا دعوی کیا لیکن عبدان حضرمی کے پاس گواہ نہیں تھے جو یہ گواہی دیں کہ یہ زمین جو امرؤ القیس کے پاس ہے وہ عبدان حضرمی کی ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے امرؤ القیس کو حکم فرمایا کہ وہ قسم اٹھائے اس نے قسم اٹھانے کا ارادہ کر لیا تو نبی کریم ﷺ نے یہ آیۃ کریمہ تلاوت کی:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾

بیشک وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے گھٹیا دام (یعنی حقیر دنیا کا مال) لیتے ہیں آخرت میں ان کا کچھ حصہ نہیں اور اللہ نہ ان سے بات کرے نہ ان کی طرف نظر فرمائے قیامت کے دن اور نہ انہیں پاک کرے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

امرؤ القیس نے جب نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے اس آیۃ کریمہ کو سنا تو قسم اٹھانے سے رک گیا اور زمین فی الواقع حقدار عبدان حضرمی کو دے دی۔ ایک اس واقعہ کے در پیش آنے کے بعد یہ آیۃ کریمہ (زیر بحث) نازل ہوئی۔

۲) '' روی انہ اختصم الیہ خصمان فقال علیہ السلام انما انا بشر مثلکم و انتم تختصمون

الی ولعل بعضکم الحن بحجته من بعض فاقض له علی نحو ما اسمع منه فمن قضیت له بشئی من حق اخیه فانما اقضی له قطعة من نار فبکیا فقال کل واحد منهما حقی لصاحبی "

نبی کریم ﷺ کی خدمت میں دو شخصوں کا جھگڑا پیش ہوا تو آپ نے فرمایا بیشک میں تمہاری طرح بشر ہوں اور تم جھگڑا میرے پاس لے کر آتے ہو، ہوسکتا ہے تم میں سے بعض دوسرے بعض سے اپنے دلائل اچھی طرح پیش کر دے تو میں اس کے حق میں فیصلہ کر دوں اگر میں نے کسی شخص کے حق میں فیصلہ کر دیا اور اسے اس کے دوسرے بھائی کا حق دے دیا تو میں نے اسے آگ کا ٹکڑا دے دیا۔ یہ سن کر دونوں صحابی رونے لگے ہر ایک یہی کہہ رہا تھا کہ یہ میرے بھائی کا حق ہے۔ میرا اس میں کوئی حق نہیں۔ (یہ واقعہ بھی در پیش آنے کے بعد اس آیۃ کریمہ کا نزول ہوا)۔ (از تفسیر ابی السعود)

سبحان اللہ تعلیمات مصطفویہ کا کیا خوب اثر ہوا کہ جھگڑا کرنے والے خود ہی اپنے اپنے حق سے دستبردار ہو کر آپس میں شیر وشکر ہو گئے اور نبی کریم ﷺ نے ایک قانون کی طرف اشارہ کر دیا کہ قاضی فیصلہ اپنے علم کے مطابق نہیں کر سکتا بلکہ مدعی کے گواہ یا مدعی علیہ کی قسم کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ ہوسکتا ہے کو کوئی شخص جھوٹے گواہوں کے ذریعے یا جھوٹی قسم کے ذریعے ناحق فیصلہ کرا لے اور اپنے دوسرے بھائی کے حق پر ناجائز قابض ہو جائے تو اس کا یہ عمل جہنم میں جانے کا ذریعہ ہے اس لئے اس نے اپنے حق میں جہنم کی آگ کے ٹکڑے کا فیصلہ کرا لیا۔

نبی کریم ﷺ کو اگر چہ حقی اور ملکی حیثیت بھی حاصل تھی لیکن تعلیم امت کیلئے آپ کا فیصلہ بشری حیثیت میں ہوا کرتا تھا۔

وَلَا تَأْكُلُوٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ : بظاہر مطلب ﴿ وَلَا تَأْكُلُوٓا اَمْوَالَكُمْ ﴾ کا یہ ہے کہ تم اپنے مال باطل طریقے سے نہ کھاؤ۔ لیکن مراد یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقہ سے نہ کھاؤ کیونکہ ایک دوسرے کے مال کی حفاظت تم پر لازم ہے اپنے ہی بھائیوں کا مال ناجائز طور پر کھانا گویا کہ اپنا مال ہی باطل طریقے سے کھانا ہے جس سے منع فرمایا گیا بہت حسین اشارہ کیا گیا کہ اپنے بھائیوں کے مال کو اپنا مال سمجھو نہ اپنے مال میں ناجائز تصرف کرو اور نہ ہی اپنے بھائیوں کے مال میں ناجائز تصرف کرو۔ (از تعبیر الرحمٰن)

﴿ وَلَا تَاْكُلُوْا ﴾ کا معنی تو ہے ''اور نہ کھاؤ'' لیکن مراد عام ہے کہ " اخذ اور استیلاء "کو بھی شامل ہے ۔یعنی مطلب یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طور پر کسی طرح بھی نہ حاصل کرو کسی کے مال پر ناجائز غلبہ حاصل نہ کرو۔ البتہ کھانے کی ممانعت اس لئے کی ہے کہ عام طور پر مال کھانے میں سرف کیا جاتا ہے اور غیر کا مال زیادہ طور پر کھا کر برباد کیا جاتا ہے۔(از روح المعانی)

﴿ بِالْبَاطِلِ ﴾ باطل کا لغوی معنی ہے زائل ہونا، چلا جانا (بطل الشئی بطو لا فھو باطل) باطل کی جمع بواطل آتی ہے اور البطولۃ ، پھر البطولۃ کی جمع اباطیل آتی ہے عرب حضرات کہتے ہیں " بطل الاجیر " مزدور نے لہو ولعب میں مشغول ہو کر چھٹی کر کے اپنی مزدوری زائل کر دی۔ (از کبیر)

باطل سے مراد کیا ہے؟ باطل طریقہ سے مال نہ کھانے سے مراد کیا ہے؟ ضابطہ تو اس میں روح المعانی کے یہ الفاظ ہیں " کل ما لم یأذن بأخذہ الشرع " ہر وہ چیز جس کی شریعت نے اجازت نہ دی ہو یعنی غیر شرع طور پر مال کا استعمال باطل کہلاتا ہے جو ناجائز ہے ۔مختلف تقاسیر کو دیکھنے سے جزئیات کئی واضح ہو جاتی ہیں:

" والا کل بالباطل علی وجھین احدھما ان یأکلہ علی وجہ الظلم بنحو الغصب والسرقۃ والیمین الکاذبۃ والثانی ان یاکلہ علی جھۃ الھزؤ واللعب کالذی یؤخذ فی القمار والملاھی وغیر ذلک "

باطل طریقے سے مال حاصل کرنے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ ظلم سے کسی کا مال حاصل کرے جیسا کہ کسی کا مال غصب کر لے یا چوری کر لے، یا جھوٹی قسم اٹھا کر کسی کا مال ناحق طور پر لے لیا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مال مزاح اور لہو ولہب سے حاصل کر لے یعنی جوا بازی سے مال حاصل کرے یا کھیل کود وغیرہ سے شرط لگا کر مال حاصل کرے۔ (شیخ زادہ)

قاضی محمد ثناء اللہ مظہری فرماتے ہیں باطل طریقہ سے مال حاصل کرنے کی کئی مثالیں ہیں جھوٹے دعوی سے مال حاصل کرے۔ جھوٹی گواہی سے مال حاصل کرے حق کا انکار کرنے کے بعد جھوٹی قسم اٹھا کر مال حاصل کرے، کسی کا مال غصب کرے کسی کا مال اچک لے، چوری سے مال حاصل کرے۔ خیانت کے ذریعے مال حاصل کرے جوا بازی سے مال حاصل کرے گانا گا کر اجرت سے مال

حاصل کرے فاحشہ عورت بدکاری کے ذریعے مال حاصل کرے، کاہن اور نجومی لوگ اپنے اس فن سے جو مال حاصل کرتے ہیں اور نر جانور کو مادہ کے گابھن کرنے کے لئے مادہ پر چڑھانے کی اجرت۔ اور ہر قسم کی فاسد بیع سے مال حاصل کرنا اور رشوت کے ذریعے مال حاصل کرنا سب حرام اور باطل ہیں یہ مثالیں ذکر کرنے کے بعد آپ نے بھی یہ فرمایا" وغیر ذلک من الوجوہ التی لا یبیحہ الشرع " اس کے علاوہ وہ تمام وجوہ جن کی شریعت نے اجازت نہیں دی ان سے مال حاصل کرنا باطل اور حرام ہے۔ (مظہری)

تنبیہ : " ومن الاکل بالباطل ان یقضی القاضی لک وانت تعلم انک مبطل فالحرام لا یصیر حلالا بقضاء القاضی لانہ انما یقضی بالظاهر "

اگر قاضی نے گواہوں کی گواہی کو سن کر یا مدعی علیہ کی قسم کالا اعتبار کر کے فیصلہ کر دیا جس کے حق میں فیصلہ کیا گیا وہ جانتا ہے کہ میں نے ناحق فیصلہ کرالیا ہے تو اس صورت میں قاضی تو گنہگار نہیں ہوگا البتہ وہ شخص باطل اور حرام طریقہ سے مال حاصل کر رہا ہے کیونکہ قاضی نے ظاہر طور پر فیصلہ کیا ہے اس سے حرام حلال نہیں ہوا اور نہ ہی حلال چیز قاضی کے فیصلہ سے حرام ہوتی ہے۔

مقام توجہ : تفسیر صاوی نے باطل طریقہ سے مال کھانے کی چند مثالیں دی ہیں جو مظہری کے حوالہ سے نقل کی جاچکی ہیں البتہ انہوں نے ایک اور مثال "مکس" (ٹیکس) بھی دی ہے۔ یعنی ظالمانہ ٹیکس مقرر کرنا بھی باطل اور حرام ہے ہاں اگر لوگوں کے نفع کے لئے کوئی حاکم ایمانداری سے کوئی کام کرنا چاہے نہر کھدوانی ہے، ڈیم بنانا ہے وغیرہ تو لوگوں پر ٹیکس مقرر کیا جاسکتا ہے لیکن مقام افسوس یہ ہے کہ سارا نظام برباد اس وجہ سے کہ ٹیکس مقرر غرباء پر ہوتا ہے یا زمیندار پر ہوتا یا تاجر پر ہوتا ہے۔ یا تنخواہ دار پر ہوتا ہے یہی لوگ ملک کو چلانے والے ہیں یہی ملک کی ریڑھ کی ہڈی ہیں لیکن وہ پیسہ کھانے والے لنگے تلنگے، غاصب لیٹرے ہوتے ہیں۔

کسی منصوبہ پر اربوں روپے یا کروڑوں روپے خرچ کرنے کا اعلان ہوتا ہے کبھی آپ نے سوچا کہ وہ پیسہ صرف دس فیصد خرچ ہوتا ہے نوے فیصد مختلف ہاتھوں میں چلا جاتا ہے۔ ملک کو قرضے میں جکڑ دیا گیا ہے قرض پر قرض لئے جارہے ہیں اب حالت یہ ہے کہ صرف سود ادا کرنے کے لئے بھی قرض لینے کی ضرورت پڑتی ہے وہ قرض ہم بے مقصد کاموں پر صرف کر دیتے ہیں ایک ایک محفل پر کروڑوں روپے خرچ ہو جاتے ہیں کہ صدر صاحب آرہے ہیں، وزیر اعظم صاحب آرہے ہیں۔

اسمبلیوں کے ممبران کی تعداد بڑھا بڑھا کران کی مراعات بڑھا بڑھا کر ملک کو کنگال کیا جا رہا ہے وزراء کی مراعات بڑھائی جا رہی ہیں صدر اپنی ہی قلم سے اپنی مراعات بڑھا دیتا ہے کیا یہ سب کچھ ظلم ہے یا نہیں؟

باطل طریقے سے مال کھانے پر مختلف ارشادات:

﴿ يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً ﴾

''اے ایمان والو نہ کھاؤ آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقے سے سوائے اس کے کہ تجارت سے (نفع حاصل) ہو''

﴿ اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَّسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ﴾

''وہ لوگ جو یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ کھاتے ہیں اور عنقریب جہنم کی بھڑکتی آگ میں جلیں گے''۔

﴿ يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِىَ مِنَ الرِّبٰوۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾

''اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور باقی سود چھوڑ دو اگر تم مومن ہو''۔

ان آیات میں حرام، ناحق، باطل طریقے سے مال کھانے پر وعید فرمائی اور ساتھ ہی ایمان والوں کو حلال اور پاکیزہ مال کھانے کا حکم دیا۔

﴿ يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ﴾

''اے ایمان والو کھاؤ پاکیزہ، حلال مال جو ہم نے تمہیں عطا کیا ہے''

اور یہی حکم رب تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ بندوں یعنی رسولوں کو دیا ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ ﴾ ''اے رسولو کھاؤ پاکیزہ، حلال مال''

حلال وحرام کی پہچان میں ایک شاندار ضابطہ:

شیخ ابو حامد محمد غزالی رحمہ اللہ نے خوبصورت ضابطہ بیان فرمایا علامہ رازی رحمہ اللہ نے تفسیر کبیر میں بھی ذکر فرمایا۔ زمین میں پائی جانی والی اشیاء جن کو کھایا جاتا ہے وہ تین قسم کی ہیں: معدنیات،

نباتات اور حیوانات۔

معدنیات کا حکم : معدنیات وہ چیزیں ہیں جو زمین کے اجزا ہیں یا زمین سے نکلتی ہیں وہ تمام حلال ہیں جب تک کھانے والے کو نقصان نہ پہنچائیں۔اگر کھانے والے کو نقصان پہنچائیں تو نقصان پہنچانے کی وجہ سے ان کا استعمال ناجائز ہوگا۔کیونکہ بعض معدنیات میں زہریلے اثرات پائے جاتے ہیں۔اس ضابطہ کے مطابق " والخبز لو کان مضرا الحرام اکله " اگر کوئی ماہر طبیب بتائے کہ تمہارے لئے روٹی کھانا زہر قاتل ہے تو اس شخص کے لئے روٹی کھانا بھی حرام ہو جائے گا۔

مٹی بھی اجزاء ارض سے ہونے کی وجہ سے معدنیات سے تعلق رکھتی ہے مٹی کا کھانا بھی مضر صحت کی وجہ سے حرام ہے حالانکہ پاک مٹی پر کھانے کی کوئی چیز گر جائے تو اسے اٹھا کر صاف کر کے کھانے کا حکم ہے۔

نباتات کا حکم: نباتات تمام ہی حلال ہیں ہاں البتہ وہ نباتات جو عقل کو زائل کردیں یا زندگی کو زائل کردیں یا صحت کو زائل کریں وہ حرام ہوں گی۔عقل کو زائل کرنے والی چیزیں جو حرام ہیں وہ یہ ہیں بھنگ ،شراب اور تمام نشہ دینے والی چیزیں۔زندگی کو زائل کرنے والی اشیاء یعنی نباتات میں سے کوئی چیز جس میں زہریلے اثرات ہوئے جس سے زندگی ختم ہونے کا خطرہ ہو وہ حرام ہے۔صحت کو زائل کرنے والی چیزیں حرام ہیں جیسا کہ دوا بغیر وقت کے اور بغیر طبیب کے مشورہ کے استعمال کرنا جو صحت کو زائل کردے۔

تنبیه : " والمسکرات فان الذی لا یسکر منها ایضا حرام مع قلته لعینه ولصفته وهی الشدة المطربة "

نشہ آور چیزیں تمام حرام ہیں ان کو تھوڑا استعمال کرے یا زیادہ استعمال کرے کیونکہ ان میں ذاتی طور پر نشہ پایا گیا ہے لہٰذا یہ کہنا باطل ہے کہ نشہ آور چیز اتنی مقدار میں جائز ہے جس سے نشہ نہ آئے۔ہاں البتہ کسی دوا وغیرہ کے تابع ہو تو اس کا حکم ﴿ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ ﴾ کے تحت ذکر کیا جاچکا ہے۔

فائدہ : زہر کا زہریلا اثر ختم ہوگیا یا اس کے کم ہونے کی وجہ سے یا کسی اور دوا وغیرہ میں ملا کر اس سے کوئی کشتہ تیار کرلیا گیا جس سے اس کے اثرات زائل ہوگئے تو اس کا استعمال جائز ہے۔

حیوانات کا حکم: بعض جانوروں کا گوشت کھانا حلال ہے اور بعض کا حرام۔ کئی جانوروں کے حلال ہونے اور حرام ہونے کو قرآن پاک یا احادیث مبارکہ میں واضح کر دیا گیا ہے تاہم ہر درندہ خواہ حیوانات سے ہو یا پرندوں سے ہو حرام ہے۔ ہر جانور جو پنجے سے پکڑ کر چونچ سے کھائے حرام ہے ہمیشہ بلوں میں بسیرا کرنے والے جانور حرام ہیں۔ لیکن یہ بھی خیال رہے کہ حلال جانوروں کو شرعی ضابطہ کے مطابق ذبح کیا جائے یا شکار کیا جائے تو وہ حلال ہوتے ہیں ورنہ وہ حلال ہونے کے باوجود حرام ہو جائیں گے ہاں البتہ مچھلی اور مکڑی بغیر ذبح کے حلال ہیں۔ پانی والے جانور سوائے مچھلی کے باقی تمام حرام ہیں سوائے ان جانوروں کے جن کی مثال خشکی میں حلال ہو جیسا کہ بھینس، مینڈھا وغیرہ، یہ دریائی بھی حلال ہیں۔

حرام طریقہ سے حاصل کیا ہوا مال حرام ہے:

اس میں کل چھ قسمیں ہیں پھر ہر ایک میں دو دو صورتیں ہیں ایک حلال اور ایک حرام۔

(۱) معدنیات کو حاصل کرنا اور شکار کرنا اور لکڑیاں حاصل کرنا اگر کسی مالک کی زمین ہے تو اس سے اجازت طلب کر کے یا حکومت کی ملکیت ہے تو حکومت سے اجازت طلب کر کے یہ کام کئے گئے تو حلال ہیں۔ یا جنگل میں سے شکار کرنے کی ہر شخص کو اجازت ہے اسی طرح لکڑیاں حاصل کرنے کی اجازت ہے تو یہ کام جائز ہیں اگر زبردستی یا چوری سے یہ کام کیے ہیں تو ناجائز ہیں۔

(۲) مال غنیمت اور مال فئی اور کافروں کی املاک پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا حاکم نے شرعی قوانین کے مطابق انہیں تقسیم کیا تو جس کے حصہ میں جو آیا حلال ہے اور اگر خود ہی ناجائز طور پر قبضہ کر لیا تو اس سے نفع حاصل کرنا منع ہے۔

(۳) کسی شخص سے مال اس کی رضامندی سے حاصل کیا تو حلال ہے اور جبری طور پر لے لیا چوری کر لیا یا کسی قسم کے فراڈ سے مال لے لیا تو حرام ہے۔

(۴) اگر کسی سے مال خریدا یا کرایہ پر لیا تو اس میں شرعی حدود و قیود کا لحاظ پایا گیا تو جائز ہے اور اگر شریعت کے خلاف کوئی شرائط وغیرہ پائی گئیں تو ناجائز ہوگا۔

(۵) اگر کسی نے مال ہبہ کیا یا وصیت کی تو اس میں بھی شرعی امور کا لحاظ رکھا گیا ہے تو درست ہے اور

شرعی امور کا لحاظ نہیں کیا گیا تو ناجائز ہے۔

(۲) وراثت کے طور پر مال ملا اور اپنا حق شرعی ہی لیا تو حلال ہے اور اگر شرعی حق سے تجاوز کر کے کسی کا حق غصب کیا تو حرام ہے۔ (ماخوذ از احیاء العلوم ج ۲ ص ۵۳،۵۴)

فضیلت حلال اور مذمت حرام بیان میں:

چند آیات کا پہلے ذکر کر دیا گیا ہے، اب چند احادیث و آثار کی طرف توجہ کی جائے۔

☆ "روی ابن مسعود رضی الله عنه عن النبی ﷺ انه قال طلب الحلال فریضة علی کل مسلم"

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہر مسلمان پر حلال چیزوں کا طلب کرنا فرض ہے۔ دوسری حدیث میں فرمایا" **طلب العلم فریضة علی کل مسلم**" ہر مسلمان پر علم کا طلب کرنا فرض ہے۔ لیکن اس علم سے مراد کون سا علم ہے؟" **طلب علم الحلال والحرام**" حلال اور حرام کا علم طلب کرنا فرض ہے۔ گویا کہ دونوں حدیثوں کا مطلب ایک ہی ہے علم سے مراد دینی علم ہے جس سے حلال اور حرام میں تمیز حاصل ہوتی ہے۔ ایسا علم مراد نہیں جس سے رشوت اور لوٹ کھسوٹ اور ملک کی چلتی حکومت کو توڑ کر خود قابض ہو جانے اور ساری عسکریہ کو لوگوں کی نفرت کا نشانہ بنانے کا علم حاصل ہو۔

☆ "وقال ﷺ من سعی علی عیاله من حله فهو کالمجاهد فی سبیل الله ومن طلب الدنیا حلالا فی عفاف کان فی درجة الشهداء"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو حلال مال کی طلب میں اہل و عیال کے لئے کوشش کرتا ہے وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے اور جو پاک دامن رہتے ہوئے دنیا کا حلال مال طلب کرے وہ درجہ شہدا میں ہے۔

☆ "وقال ﷺ من اکل الحلال اربعین یوما نور الله قلبه واجری ینابیع الحکمة من قلبه علی لسانه"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے چالیس دن رزق حلال کھایا اللہ تعالیٰ اس کے دل کو منور کر

دے گا اور اس کے دل سے اس کی زبان پر حکمت کے چشمے جاری کر دیتا ہے۔

☆ "روی ان سعیدا سأل رسول الله ﷺ ان یسأل الله تعالیٰ ان یجعله مجاب الدعوة فقال له اطب طعمتک تستجب دعوتک"

حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ آپ اللہ تعالیٰ سے میرے لئے سوال کریں کہ مجھے مستجاب الدعوات بنا دے (یعنی میری دعاؤں کو وہ قبول کرے) تو آپ نے فرمایا تم اپنا مال حلال اور پاکیزہ رکھو تو تمہاری دعاؤں کو قبول کیا جائے گا۔

☆ "ولما ذکر ﷺ الحریص علی الدنیا قال رب اشعث اغبر مشردا فی الاسفار مطعمه حرام وملبسه حرام وغذی بالحرام یرفع یدیه فیقول یا رب یا رب فانی یستجاب لذلک"

جب نبی کریم ﷺ کے سامنے دنیا کے حریص کا ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا کتنے پراگندہ حال اور غبار آلود اور سفر میں بغیر کسی مونس کے ہوتے ہیں طعام ان کا حرام ہوتا ہے اور لباس ان کا حرام ہوتا ہے اور غذا ان کی حرام ہوتی ہے وہ اپنے ہاتھوں کو اٹھاتا ہے عرض کرتا ہے اے میرے رب اے میرے رب تو اس کی دعا کیسے قبول کی جائے گی۔

مطلب یہ تھا کہ ایک شخص مسافر بھی ہو اکیلا ہو پریشان حال ہو پراگندہ حالت ہو، کپڑے غبار آلود ہوں یا سے شخص کی دعا زیادہ قبول ہوتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس کا رزق حلال ہو اگر رزق حرام ہو تو اس کی دعا کی قبولیت کی امید نہیں کی جا سکتی۔

☆ "وقال ﷺ کل لحم نبت من حرام فالنار اولی به"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس کے گوشت کی نشوونما حرام مال سے ہوئی آگ اسکے زیادہ قریب ہوگی۔

☆ "وقال ﷺ من لم یبال من این اکتسب المال لم یبال الله من این ادخله بالنار"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص یہ پرواہ نہیں کرتا کہ اس کا مال کہاں سے آ رہا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی کوئی پرواہ نہیں کرتا کہ اسے کس جانب سے آگ میں داخل کرے۔ یعنی اس کے لئے جہنم کے دروازے ہر طرف سے کھلے ہوں گے جس طرف سے رب چاہے گا اسے آگ میں داخل کر دے گا۔

(از احیاء العلوم ج ۲ ص ۵۲)

بعض حضرات نے کسی ابدال کی خدمت میں طعام پیش کیا تو انہوں نے کھانے سے انکار کر دیا انہوں نے ابدال سے نہ کھانے کے متعلق سوال کیا تو اس نے کہا (ہم وہ کھانا نہیں کھاتے جس میں اشتباہ ہو کہ حرام ہے یا حلال):

" نحن لا ناکل الا فلذلک نستقیم قلوبنا ویدوم حالنا ونکاشف بالملکوت ونشاهد الآخرة ولو اکلنا مایاکلون ثلاثة ایام لما رجعنا الی شئی من علم الیقین ولذهب الخوف والمشاهدة من قلوبنا "

ہم صرف حلال مال کھاتے ہیں (یعنی جس کے حلال ہونے کا یقین ہو) اسی وجہ سے ہمارے دل درست رہتے ہیں اور ہمارا حال ہمیشہ ایک طرح کا ہوتا ہے اور ملکوت کا ہمیں کشف حاصل ہوتا ہے اور آخرت کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں اور اگر ہم تین دن وہ چیزیں کھائیں جو عام لوگ کھاتے ہیں (یعنی حلال وحرام کی تحقیق کے بغیر) تو ہم کبھی علم یقین کا درجہ نہیں پا سکتے اور ہمارے دل سے رب تعالیٰ کا خوف جاتا رہے گا اور ہمارے دلوں کا مشاہدہ زائل ہو جائے گا۔ (احیاء العلوم ج ۲ ص ۵۳)

وَتُدۡلُوۡا بِهَاۤ اِلَی الۡحُکَّامِ : ''اور نہ پیش کرو ان کو حاکموں کی طرف''

" ادلاء " کا معنی ہے ڈول ڈالنا کہ پانی حاصل کرے پھر کسی کی طرف بات پیش کرنا اور فعل پیش کرنا بھی اس کا معنی لیا جاتا ہے اسی طرح کہا جاتا ہے " ادلی بحجته " اس نے اپنی دلیل پیش کی ﴿وَتُدۡلُوۡا بِهَا﴾ کا عطف منہی عنہ پر ہے اور معطوف علیہ سے پہلے جو ''لا'' ہے وہ معطوف سے پہلے بھی مراد ہوگا۔ اب تقدیر عبارت یہ ہوگی:

﴿ وَلَا تَاۡکُلُوۡۤا اَمۡوَالَکُمۡ بَیۡنَکُمۡ بِالۡبَاطِلِ وَلَا تُدۡلُوۡا بِهَاۤ اِلَی الۡحُکَّامِ ﴾

''اور تم آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق نہ کھاؤ اور نہ پیش کرو ان کو حکام کی طرف''

"بھا " ضمیر کا مرجع کیا ہے؟ اس میں دو احتمال ہیں (بھا) ای بحکومتها او بالاموال رشوة "

ایک احتمال یہ ہے کہ حکام سے حکومت جو سمجھ آ رہا ہے وہ مرجع ہو تو اب معنی یہ ہوگا کہ اپنے مقدمات حاکموں کے پاس اس لئے نہ لے جاؤ کہ (ان سے غلط فیصلے کرا کے) لوگوں کا مال گناہ سے کھالو۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ ضمیر کا مرجع " اموال " ہو اب معنی یہ ہوگا کہ حاکموں کے پاس اپنے مال بطور رشوت نہ پیش کرو کہ ان کے ذریعے لوگوں کا مال گناہ سے کھاؤ۔ (جلالین)

خیال رہے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ پہلے احتمال کے مطابق ہے اور راقم کا ترجمہ مطلق ہے تاکہ عموم المجاز کے مطابق دونوں احتمالوں کو شامل ہو جائے۔ یعنی مطلب جب یہ ہو کہ ان کو حاکموں کی طرف باطل طریقہ سے نہ پیش کرو خواہ وہ باطل مقدمات ہوں یا رشوت کے طور پر دیا ہوا باطل مال ہو۔

سبحان اللہ راقم نے اپنا موقف پیش کرنے کے بعد تفسیر کبیر کو دیکھا تو اپنے قول کے مطابق پا کر رب تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے صحیح سمجھنے کی توفیق عطا کی۔ آپ پہلے تو یہ بیان کرتے ہیں:

" هو ان يدفع الى الحكام رشوة وهذا اقرب الى الظاهر "

حاکموں کو رشوت کے طور پر مال دینے سے منع کیا گیا ہے اور یہ قول مراد لینا زیادہ بہتر ہے۔ اس کے بعد آپ فرماتے ہیں:

" ولا يبعد ايضا حمل اللفظ على الكل لانها باسرها اكل بالباطل "

یہ کوئی بعید بات نہیں کہ مفسرین کے تمام اقوال ہی مراد ہوں حکام کے پاس باطل طریقہ سے کسی چیز کو پیش کر کے لوگوں کا مال ناحق کھانا منع ہے۔

فائدہ: رشوت پیش کرنے کی ممانعت کو ڈول ڈالنے سے تشبیہ اس لئے دی گئی کی رشوۃ اور رشاء کا مادہ ایک ہی ہے رشاء کا معنی ہے رسہ۔ جس طرح بھرا ہوا ڈول دور سے یعنی کنوئیں کی نیچے جانب سے رسے کے واسطہ سے قریب لایا جاتا ہے کہ اسے کنویں کی اوپر جانب کی طرف لایا جاتا ہے۔ ایسے ہی رشوت کے ذریعے دور والے مقصد کو قریب کیا جاتا ہے۔

دوسری وجہ تشبیہ کی یہ ہے کہ جس طرح ڈول ڈال کر پانی حاصل کر لیا جاتا ہے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کنویں والا پانی لینے سے ناراض تو نہیں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کنواں پاک ہے یا ناپاک اسی طرح رشوت لینے والا حاکم یہ نہیں دیکھتا کہ میں فیصلہ حق کے مطابق کر رہا ہوں یا ناحق فیصلہ کر رہا ہوں۔ اس نے تو رشوت دینے والے کے حق میں فیصلہ کرنا ہی ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ: "کہ کھاؤ تم مال لوگوں کے مالوں میں سے ناجائز طور پر" "فریقا" کا اکثر مفسرین نے "طائفة" سے ترجمہ کیا ہے (کچھ مال) اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا بھی یہی ترجمہ ہے لیکن تفسیر تبصیر الرحمٰن میں علامہ علی بن احمد بن ابراہیم بن اسمٰعیل رحمھم اللہ بیان

فرماتے ہیں (فریقا) ای طائفة عظیمة " حاکموں کے پاس باطل طریقہ سے مقدمات نہ لے جاؤ یا ان کو رشوت دے کر اپنے حق میں باطل فیصلہ اس لئے نہ کراؤ کہ لوگوں کا بہت بڑا مال ناجائز طریقہ سے کھالو۔

روح المعانی میں علامہ ابوالفضل شہاب الدین السید محمود آلوسی بغدادی فرماتے ہیں (فریقا) قطعة او جملة " (کچھ مال یا کل مال) تمام تفاسیر کے مجموعہ سے نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں کا کل مال یا زیادہ مال یا کچھ مال غلط مقدمات کے ذریعے یا رشوت کا مال دے کر کھانا حرام ہے اسی لئے راقم نے ترجمہ میں " کچھ" کا لفظ نہیں شامل کیا " بالاثم " (گناہ کے ذریعے، ناجائز طریقہ سے) یعنی جھوٹے گواہ پیش کر کے، جھوٹی قسمیں اٹھا کر، جان بوجھ کر ناجائز مقدمات پیش کر کے، رشوت کا مال دے کر اپنے حق میں مقدمات کا فیصلہ کرنا گناہ کا سبب ہے ایسے ناجائز طریقہ سے مال حاصل کرنے سے اجتناب کا حکم دیا

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ: " حالانکہ تم جانتے ہو" "جملة حالية من فاعل تاكلوا " یہ جملہ اسمیہ "تاکلوا " کے فاعل سے حال واقع ہو رہا ہے۔ (صاوی)

ایسے حال میں کہ تم جانتے ہو کہ تم باطل طریقہ پر ہو:

" ولا شک ان الاقدام على القبيح مع العلم بقبح اقبح وصاحبه بالتوبيخ احق "

اسمیں کوئی شک نہیں کہ بیشک برے کام کا علم رکھنے والے کا اقدام اس برائی کی طرف زیادہ برا ہے اور صاحب علم کا برائی کا ارتکاب توبیخ (زجر، ڈانٹ) کا زیادہ حق رکھتا ہے۔

☆ " روی عن ابی هريرة رضی الله عنه انه قال اختصم رجلان الى النبی ﷺ عالم بالخصومة وجاهل بها فقضى رسول الله ﷺ للعالم فقال من قضى عليه يا رسول الله والذی لا اله الا هو انی محق فقال ان شئت اعاوده فعاوده فقضى للعالم فقال المقضی عليه مثل ما قال اولاثم عاوده ثالثا ، ثم قال عليه الصلوة والسلام " من اقتطع حق امرئ مسلم بخصومته فانما اقتطع قطعة من النار " فقال العالم المقضی له " يا رسول الله ان الحق حقه " فقال عليه الصلوة والسلام ، من اقتطع بخصومته وجد له حق غير فليتبوأ مقعده من النار "

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک دو شخصوں نے نبی کریم ﷺ کے پاس اپنا جھگڑا لایا۔ ایک شخص مقدمہ لڑنے کا طریقہ جانتا اور دوسرا نہیں جانتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ اس شخص کے حق میں کر دیا جو مقدمہ کا علم رکھتا تھا جس کے خلاف فیصلہ ہوا اس نے عرض کیا قسم ہے اس ذات کی جس کے بغیر کوئی معبود نہیں میں حق پر ہوں تو حضور ﷺ نے اسے پھر مقدمہ لوٹانے کی اجازت دی اس شخص نے مقدمہ لوٹایا لیکن پھر فیصلہ اسی کے حق میں ہو گیا جو مقدمہ کا طریقہ جانتا تھا۔ جس کے خلاف فیصلہ ہوا اس نے پھر کہا قسم ہے اس ذات کی جس کے بغیر کوئی معبود نہیں بیشک میں حق پر ہوں۔ (آپ نے اسے پھر مقدمہ لوٹانے کی اجازت دے دی) اس نے پھر مقدمہ لوٹایا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص جھگڑا کر کے (اپنا مقدمہ چرب زبانی سے پیش کر کے جھوٹے گواہ پیش کر کے، جھوٹی قسم کے ذریعے) اپنے مسلمان بھائی کا حق لے لیا تو اس نے اپنے لئے آگ کا ٹکڑا کاٹ کر رکھ لیا۔ (یہ سن کر) وہ شخص جو مقدمہ کرنے کا علم رکھتا تھا جس کے حق میں فیصلہ ہو چکا تھا (اس کے دل میں خوف طاری ہو گیا) کہنے لگا یا رسول اللہ بیشک یہ اسی کا حق ہے پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے دوسرے کا حق جھگڑا کر کے حاصل کر لیا اس نے اپنا ٹھکانا جہنم بنا لیا۔

امام اعظم رحمہ اللہ کے تقوی کی شاندار مثال:

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کسی مجوسی سے قرض لینا تھا آپ قرض کا مطالبہ کرنے کے لئے اس کے دروازے پر تشریف لے گئے جب آپ اس کے دروازے پر پہنچے آپ کا جوتا نجاست (گوبر وغیرہ) پر واقع ہو گیا تو آپ نے اپنے جوتے کو جھاڑا، جوتے سے نجاست گر کر مجوسی کی دیوار پر پڑ گئی تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ حیران ہو گئے اور دل ہی دل میں یہ کہہ رہے ہیں:

" ان ترکتها کان ذلک شینا یقبح جدار ذلک المجوسی و ان حککتها احضر التراب "

اگر یہ نجاست دیوار پر ہی رہنے دیتا ہوں تو دیوار اس مجوسی کی قبیح (بدزیب) نظر آئے گی اور اگر میں اسے کھرچتا ہوں تو اس کی مٹی بھی ساتھ کھرچی جائے گی (مٹی کے کھرچے جانے سے دیوار کا نقصان ہوگا) آپ نے دروازہ کھٹکھٹایا اندر سے ایک غلامہ باہر آئی آپ نے اسے کہا اپنے مولیٰ سے جا کر کہو کہ ابوحنیفہ دروازہ پر ہے وہ مجوسی باہر نکلا اس نے گمان کیا کہ آپ قرض کا مطالبہ کریں گے تو اس

نے پہلے ہی عذر پیش کرنا شروع کر دیا تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اب تو میں ایک عذر پیش کرنے کا زیادہ حقدار ہوں۔ پھر آپ نے دیوار پر نجاست لگنے کا واقع بیان کیا اور پوچھا" **وانہ کیف السبیل الی التطہیر** " اب اس کو پاک کرنے کا کیا طریقہ ہے (یعنی تمہاری اجازت ہو تو مٹی کھرچ دوں) "**فقال المجوسی فانا ابدأ بتطہیر نفسی فاسلم فی الحال** " مجوسی نے حضرت امام اعظم رحمہ اللہ کے تقوی کو دیکھ کر کہا میں پہلے اپنے نفس کو پاکیزہ کرلوں تو اسی وقت اس نے اسلام قبول کرلیا۔

اس واقعہ سے مطلب یہ حاصل ہوا کہ جب لوگوں کا ناحق مال کھانا ظلم ہے تو یقیناً ظلم میں واقع ہونا باعث نقصان اور باعث ذلت ہے اور " **فمن احترز عن الظلم نال سعادۃ الدارین** " جو شخص ظلم سے بچ گیا اس نے دونوں جہانوں کی سعادت کو حاصل کرلیا یہی وجہ ہے:

" **ان ابا حنفیۃ لما احترز عن ظلم ذلک المجوسی فی ذلک القدر القلیل فلاجل برکۃ ذلک اسلم المجوسی ونجا من شقاوۃ الابد** "

کہ بیشک امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے جب مجوسی پر معمولی ظلم کرنے سے اجتناب کیا اور اس کے معذرت طلب کی تو وہ اس کی برکت کی وجہ سے اسلام لے آیا اور ہمیشہ کی بدبختی سے نجات حاصل کر گیا۔
(از روح البیان)

تنبیہ : دنیا میں تین قسم کی چیزیں پائی جاتی ہیں حلال، حرام، شبہ۔

" **فالحرام یوجب العقاب** " حرام اشیاء کی وجہ سے رب تعالیٰ کی طرف سے عذاب ہوگا یعنی شدید مؤاخذہ ہوگا " **والشبہۃ توجب العتاب** " اور شبہات کی وجہ سے عتاب ثابت ہوگا یعنی ڈانٹ ڈپٹ، زجر و توبیخ ہوگی۔ (شبہات وہ چیزیں ہوں گی جن میں واضح طور پر حلت و حرمت کی کوئی دلیل تو نہیں ہوگی البتہ ان میں شک پایا جائے کہ ہوسکتا ہے کہ یہ ناجائز ہو ورنہ جس میں شک نہیں اور شریعت میں ان کو منع بھی نہیں کیا گیا وہ اشیاء مباح ہیں۔

" **والحلال یوجب الحساب** " اور حلال اشیاء کا بھی حساب ہوگا یعنی ضرورت سے زائد بے جا استعمال سے گریز کیا جائے۔ حکیم سنائی نے کیا خوب کہا:

این جہاں بر مثال مردا است　گرگساں اندروں ہزار ہزار

یہ جہاں (دنیا) مردار کی طرح ہے　اس میں ہزاروں گدھیں پائی جاتی ہیں

ایں مرآں راہمی زند فحلب وآں مر ایں راہمی زند منقار
کوئی ادھر سے اسے پنجے مار رہی ہے اور کوئی ادھر سے اسے چونچ مار رہی ہے
آخر الامر بگذر ندبمه وزبمه باز ماند ایں مردار
آخر کار سب گزر جائیں گے اور یہ مردار سب سے باقی رہ جائے گا۔

یعنی دینادار گدھوں کی طرح دنیا کے مال و دولت پر جھپٹیں گے جو مردار کی طرح ہے۔ کوئی ادھر سے مال بٹورنے کی طرف ہاتھ پاؤں مارے گا کوئی ادھر سے تگ و دو کرے گا۔ حلال و حرام کی پرواہ نہیں کریں گے صرف مال حاصل کرنا ان کا وطیرہ ہوگا۔ لیکن یہ دنیا یہیں رہ جائے گی لوگ دنیا سے چلے جائیں گے اس لئے " **فعلی العاقل ان یجتنب عن حقوق العباد و المظالم** " عقل مند آدمی پر لازم ہے کہ وہ حقوق العباد کا خیال کرے لوگوں کے حقوق نہ دبائے اور لوگوں پر ظلم کرنے سے اجتناب کرے۔

حکایت : نوشیرواں نے وصیت کی کہ جب میں مر جاؤں تو میرے تابوت کو میری مملکت کے مختلف اطراف میں پھیرا جائے اور اعلان کیا جائے کسی شخص کا کوئی حق بادشاہ پر ہو تو وہ آجائے اور اس کا وہ حق ادا کیا جائے۔ بادشاہ کی وصیت کے مطابق ایسا ہی کیا گیا لیکن کسی شخص نے آ کر ایک درہم کا سوال بھی نہ کیا یہی وجہ ہے کہ نوشیرواں کے عدل و انصاف کی وجہ سے اس کا نام آج تک زندہ ہے۔

حکایت: ایک نصرانی (عیسائی) اپنی زوجہ کو گدھے پر سوار کر کے کہیں جا رہا تھا اس کا گزر مسلمانوں کی ایک بستی سے ہوا تو ایک نشہ میں مست شخص نے اس کے گدھے کی دم کو نیچے سے کاٹ دیا گدھا درد کے مارے اضطراب میں آ گیا گدھے کی چھلانگ سے عورت گر گئی اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا اور اس کا حمل گر گیا۔

وہ عیسائی اس بستی کے قاضی کے پاس گیا قاضی نے اس نشئی کو بلایا اور کہا ابھی گدھا تم اپنے پاس رکھ لو جب گدھے کی دم اگ آئے (صحیح ہو جائے) تو پھر اس کو گدھا واپس کر دینا۔ اور اسکی عورت کو بھی اپنے پاس رکھ لے جب یہ پھر حاملہ ہو جائے اور اس کا ہاتھ درست ہو جائے تو اسکی عورت واپس کر دینا۔

نصرانی نے کہا " **اھکذا حکم شریعتکم** " کیا تمہاری شریعت کا یہی حکم ہے؟ پھر اس نے سر آسمانوں کی طرف اٹھایا اور کہا:

" الهی انت حلیم ولاصبر لی علی هذا فاحکم یا ناظر الملهوفین
ویاناصر المظلومین فمسخ الله ذلک القاضی فصار حجرا من ساعته "

اے اللہ تو حلیم ہے مجھے اس پر صبر حاصل نہیں اے اللہ تو ہی فیصلہ فرما۔ اے مظلوموں پر نظر رحمت فرمانے والے اور اے مظلوموں کی امداد کرنے والے تو بہتر فیصلہ فرمادے تو اللہ تعالیٰ نے اس قاضی کو پتھر بنادیا۔ اس واقعہ سے دو فائدے حاصل ہوئے " الاول ان هذا القاضی بظلمه وقع فیما وقع من البلاء العظیم " پہلا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ قاضی ظلم کی وجہ سے بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہوا۔ (ظالموں کا انجام یہی ہوتا ہے لیکن افسوس کہ ظالموں کو بروقت عقل نہیں آتی ساتھ ساتھ یہ بھی پتہ چلا کہ شریعت کے احکام سے عدولی کر کے اپنی مرضی کے فیصلے کرنے والے ملک وملت کے لئے باعث ننگ وعار (شرم وحیا کا سبب) ہیں ایسے قاضی ملک کو برباد کرتے ہیں۔

اور دوسرا فائدہ یہ حاصل ہوا " یجب الاحتراز عن الظلم وان کان الظالم " ظلم سے اجتناب ضروری ہے کسی کافر پر بھی ظلم نہ کیا جائے، مظلوم کی آہ سے عرش الٰہی کانپتا ہے مظلوم کی دعا قبول ہوتی ظالم اپنے انجام کو پہنچتا ہے اگرچہ اس میں دیر ہی کیوں نہ ہو۔

آیۃ کریمہ میں لطیف اشارہ:

مال انسان کی مصلحت کے لئے پیدا کیا گیا ہے کہ انسان اس سے اپنے بدن کو درست کر سکے۔
اور نفس کو اس لئے پیدا کیا گیا کہ وہ حق عبودیت ادا کر سکے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ ﴾

''اور نہیں پیدا کیا میں نے جنوں اور انسانوں کو مگر یہ کہ میری عبادت کریں''

﴿ لیعلموا ان الاموال والانفس لله فلا یتصرفون فیهما الا بامر الله ﴾

''ہر انسان کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ بیشک اس کا مال اور اس کی جان اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اس لئے وہ مال اور جان میں اللہ کے امر کے خلاف کوئی تصرف نہ کریں''۔ (از روح البیان)

☆☆☆☆☆

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ

۱) ''تم سے نئے چاند کو پوچھتے ہیں تم فرمادو وہ وقت کی علامتیں ہیں لوگوں اور حج کے لئے اور یہ کچھ بھلائی نہیں کہ گھروں میں پچھیت توڑ کر آؤ ہاں بھلائی تو پرہیزگاری ہے اور گھروں میں دروازوں سے آؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو اس امید پر کہ فلاح پاؤ''۔

۲) ''سوال کرتے ہیں آپ سے چاند کی حالتوں کا، فرمادیجئے وہ وقت کی علامتیں ہیں لوگوں اور حج کے لئے اور یہ نہیں ہے نیکی کہ تم آؤ گھروں کو ان کی پچھلی جانب سے اور لیکن نیکی تو اسے حاصل ہے جس شخص نے تقوی اختیار کیا، اور گھروں میں آؤ ان کے دروازوں سے اور ڈرو اللہ سے تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ''۔

شان نزول:

۱) حضرت معاذ بن جبل اور ثعلبہ بن غنم نے سوال کیا کہ کیا وجہ ہے چاند شروع میں دھاگے کی طرح باریک ہوتا ہے پھر زیادہ ہوتا ہے یعنی آہستہ آہستہ بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ مکمل ہو جاتا ہے پھر آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہوتا ہے یہاں تک کہ اپنی پہلی حالت کی طرف لوٹ آتا ہے اس میں حکمت کیا ہے۔

(تفسیر ابی السعود)

" وقال الربيع بلغنا انهم قالوا يا رسول الله لم خلقت الاهلة فانزل الله ، يسئلونک عن الاهلة ......الخ "

(۲) ربیع فرماتے ہیں کہ ہمیں یہ خبر ملی ہے کہ صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ چاند کو کیوں پیدا کیا گیا تو اس کے جواب میں یہ آیہ کریمہ نازل کی گئی۔ (صابونی)

ہلال کو ہلال کہنے کی وجہ:

ہلال کا معنی ہے آواز بلند کرنا، پیدائش کے بعد بچے کے رونے کو بھی استھلال کہا جاتا ہے:

" وھو اول حال القمر حین یراہ الناس یقال لہ ھلال لیلتین من اول الشھر ھلالا و کذلک لیلتین من آخر الشھر " (کبیر)

چاند کی اول حالت کو ہلال کہا جاتا ہے جب کہ لوگ دیکھ کر کہیں وہ چاند ہے پہلی دو راتوں میں چاند کو ہلال کہا جاتا ہے اور آخری دو راتوں کو بھی چاند کو ہلال کہا جاتا ہے یا تو اس وجہ سے کہ پہلی اور آخری راتوں میں چاند ایک جیسا ہوتا ہے یا یہ وجہ ہے کہ آخری راتوں میں صبح کے وقت چاند نکلنے پر لوگ دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ چاند ہے سمجھ آتا ہے کہ چاند انتیس کا ہوگا اور کبھی کہا جاتا ہے کہ سمجھ آتا ہے کہ چاند تیس کا ہوگا:

" وھو اول حال القمر حین یراہ الناس اول لیلۃ من الشھر "

چاند کی پہلی حالت جس وقت لوگ چاند کو دیکھتے ہیں اور مہینے کی پہلی رات کے چاند کو ہلال کہتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت نے اسی لئے ترجمہ یہ کیا ہے تم سے نئے چاند کو پوچھتے ہیں۔ لیکن راقم نے شان نزول کی مدنظر رکھتے ہوئے یعنی:

" لم تبدو دقیقۃ ثم تزید حتی تمتلی نورا ثم تعود کما بدت و لا تکون علی حالۃ واحدۃ کالشمس "

سوال یہ تھا کہ چاند کیوں باریک ظاہر ہوتا ہے پھر نور سے کامل روشن ہوتا ہے پھر لوٹ کر پہلی حالت کی طرف آجاتا ہے سورج کی طرح ایک حالت پر کیوں نہیں رہتا۔ (جلالین) اور روح المعانی کی اس عبارت کو مدنظر رکھتے ہوئے:

" وان کانت فی الظاھر سوالا عن التعدد الا انھا فی الحقیقۃ متضمنۃ للسوال عن اختلاف التشکلات النوریۃ لان التعدد یتبع اختلافھا اذ لو کان الھلال علی شکل واحد لا یحصل التعدد کما لا یخفی "

(جمع کا صیغہ " اھلۃ " استعمال کیا گیا ہے بظاہر یہ معنی ہے کہ سوال کرتے ہیں آپ سے چاندوں کے بارے میں، مگر حقیقت میں مراد یہ ہے کہ وہ نورانیت کے لحاظ سے چاند کی شکل اور حالت کے بدلنے کے متعلق سوال کر رہے تھے اگر چاند کی ایک ہی حالت رہتی تو تعدد حاصل نہ ہوتا) ترجمہ کیا ہے سوال کرتے ہیں آپ سے چاند کی حالتوں کا۔

تنبیہ : صحابہ کرام کے سوال میں دو احتمال ہیں:

" والسؤال یحتمل ان یکون عن الغایة والحکمة وان یکون عن السبب والعلة "

ایک احتمال یہ ہے کہ ان کے سوال کا مقصد یہ تھا کہ یہ بتایا جائے کہ چاند کی حالتوں کے بدلنے میں حکمت کیا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے؟ دوسرا احتمال یہ ہے کہ سوال ہو سبب اور علت کے متعلق کہ چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کی وجہ اور سبب کیا ہے " ولا نص فی الآیة والخبر علی احدھما " قرآن پاک اور حدیث پاک میں کسی احتمال پر کوئی نص موجود نہیں۔ ظاہر یہی ہے کہ سوال حکمت کے متعلق ہی تھا اسی احتمال کو ابو السعود رحمہ اللہ نے بھی ترجیح دی ہے اور جواب " قل ھی مواقیت للناس والحج " بھی اس پر دلالت کرتا ہے کیونکہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ﴿قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾ اسی احتمال کے مطابق بظاہر نظر آتا ہے کہ حکمت بیان کی گئی ہے کہ چاند کی حالتوں کے بدلنے میں مقصد یہ ہے " وھی ان یکون معالم للناس یوقتون بھا " کہ یہ لوگوں کے لئے وقت علامتیں ہیں کہ وہ اپنے دنیاوی امور کے لئے وقت مقرر کر سکیں اور اپنی کھیتی باڑی اور تجارت اور عبادات مقررہ کے اوقات کی علامتیں مقرر کر سکیں مثلاً روزوں کی تاریخوں اور افطار کی تاریخوں کا تعین کر سکیں اور خصوصاً حج کے وقت کی علامتیں ہیں اگر چاند ایک ہی حالت میں رہتا تو یہ فوائد حاصل نہ ہوتے۔

اگر دوسرا احتمال مراد ہو تو جواب پھر بھی حکمت کے بیان کا دیا گیا ہے اور اس پر متنبہ کیا گیا ہے کہ سوال حکمت کے متعلق ہونا چاہئے نہ کہ اسباب کے متعلق کیونکہ چاند کی تبدیلی کے اسباب کا تعلق ان کی زندگی سے متعلق نہیں نہ ہی دنیاوی زندگی اور نہ ہی اخروی زندگی سے اس کا تعلق ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کو بھی اس لئے مبعوث کیا گیا ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے وہ مسائل ذکر فرمائیں جو ان کے لئے دنیا اور آخرت میں نفع مند ہوں آپ کو علم ہیئت کے مسائل بیان کرنے کے لئے مبعوث نہیں کیا گیا۔ چاند کی حالتوں کی تبدیلی کی حکمت بیان کرنے کی یہی وجہ ہے:

" لا لان الصحابة رضی اللہ عنھم لیسوا ممن یطلع علی دقائق علم

الهيئة الموقوفة على الارصاد والادلة الفلسفية كما وهم"

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس لئے علم ہیئت کا مسئلہ نہیں بیان کیا گیا کہ فلسفہ والوں کے دلائل پر جو علم ہیئت موقوف ہے صحابہ کرام اسے سمجھ نہیں سکتے تھے یہ گمان جن لوگوں نے کیا ان کا گمان باطل ہے کیونکہ صحابہ کرام:

"اولئک المشاؤون فی رکاب النبوة والمرتاضون فی رواق الفتوة والفائزون باشراق الانوار والمطلعون بارصاد قلوبهم علی دقائق الاسرار"

تو وہ ہستیاں جن کو نبی کریم ﷺ کے ہمرکاب ہوکر چلنے کے مواقع میسر ہوئے صحابہ کرام تو وہ ہیں جن کو مصطفیٰ کریم ﷺ کے کرم کے باغ سے پھول اور کلیاں حاصل کرنے کا مقام ملا وہ تو حضور ﷺ کی نورانیت سے منور ہوکر کامل طور پر کامیاب ہوئے وہ تو اسرار کے باریک نکات پر مطلع ہوئے جس کی وجہ سے ہر مشکل مسئلہ ان کے دلوں میں جاگزیں ہوگا۔

اس شان کے لائق حضرات کے متعلق یہ تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ علم ہیئت کے مسائل کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کو چاند کی حالتوں کے بدلنے کے متعلق غرض وغایت کو بتا دیا گیا کہ اسی پر لوگوں کے اوقات مقرر کرنے کی دارومدار ہے اور علم ہیئت کا مسئلہ نہ بیان کر کے اس طرف اشارہ کیا گیا:

"ان سبب الاختلاف ما بین فی علم الهیئة من بعد القمر عن الشمس وقربه الیها وهو باطل عند اهل الشریعة فانه مبنی علی امور لم یثبت جزما شئی منها"

کہ علم ہیئت میں چاند کے زیادہ روشن ہونے یا کم روشن ہونے کا دارومدار جو سورج کے قریب ہونے اور دور ہونے پر رکھی گئی ہے اس کا اعتبار شریعت میں نہیں کیونکہ وہ جن امور اور دلائل پر موقوف ہے وہ کوئی یقینی نہیں بلکہ محض خیالی ہیں۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ فلاسفہ کا خود بہت مسائل میں اختلاف ہے کسی نے کہا سورج اور زمین مرکز ہیں اور ستارے ان کے اردگرد گھومتے ہیں کسی نے کہا زمین چلتی ہے کسی نے کہا آسمان چلتا ہے کسی نے کہا تمام سیارے چلتے ہیں یعنی سورج بھی چلتا ہے۔ اس شدید

اختلاف کو مدنظر رکھتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ جس علم کی تھیوریاں، قوانین بدلتے رہیں وہ علم معتبر نہیں۔ معتبر قرآن وحدیث کے علوم ہیں جن کے قوانین " الیوم اکملت لکم دینکم " کے نزول کے بعد بدلنے کا تصور ختم ہو گیا تا قیامت وہی قوانین رہیں گے۔

ہاں البتہ فلاسفہ کے وہ قوانین اور مسائل جو شریعت سے نہ ٹکرائیں ان سے فوائد حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ (ماخوذ از روح المعانی)

اَلْمَوَاقِیْتُ : جمع ہے ''میقات'' کی جو آلہ کا صیغہ ہے معنی یہ ہوا " ما یعرف به الوقت " جس کے ذریعے وقت کو پہچانا جائے " وهی ان یکون معالم للناس یوقتون بها امورهم " یہ لوگوں کے لئے علامتیں ہیں جن کے ذریعے وہ اپنے امور کے وقت مقرر کرتے ہیں۔ (از روح المعانی)

روح المعانی کی اس وضاحت کے بعد اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کو دیکھا جائے تو کیا خوب نظر آئے گا ''وہ وقت کی علامتیں ہیں'' راقم نے بھی اسی خوب ترجمہ کو نقل کیا ہے۔

وقت و مدت و زمان میں فرق: علامہ راغب اصفہانی کے کلام سے ان میں یہ فرق نظر آتا ہے۔

مدت : مطلقاً حرکت فلک کے امتداد کا نام ہے جو مبدأ سے منتہاء تک ہے یعنی آسمان (یا زمین کی حرکت جو ابتدا سے انتہاء تک ہوتی ہے اسی سے ظاہر ہونے والے وقت کو مدت کہا جاتا ہے۔

زمان: اس وقت اور مدت کو کہا جائے گا جس کی تقسیم سالوں اور مہینوں اور دنوں اور ساعات کی طرف کی جائے۔

وقت : معین اور مقدر زمانہ کو کہا جاتا ہے یہ کام اتنے وقت میں کر دوں گا یعنی آٹھ دنوں میں مثلاً (از روح المعانی)

وَالْحَجِّ : کا عطف " لِلنَّاسِ " پر ہے اب معنی یہ ہوا کہ وہ وقت کی علامتیں ہیں لوگوں کے لئے اور حج کے لئے'' اگرچہ " لِلنَّاسِ " میں لوگوں کی تمام عبادات کے اوقات کا ذکر ہو چکا ہے لیکن " وَالْحَجِّ " کو علیحدہ ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے۔

" ان الحج مقصور علی الاشهر التی عینها الله تعالیٰ لفرضه وانه لا یجوز نقل الحج من تلک الاشهر الی اشهر کما کانت العرب تفعل ذلک فی النسئ "

کہ حج ان مہینوں میں ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے حج کے لئے معین کئے ہیں یہ جائز نہیں کہ اپنی مرضی سے حج کے مہینے کو اپنی جگہ سے ہٹا کر ہمیشہ حج موسم بہار میں کیا جائے عرب حج کے مہینے کو اپنی جگہ سے ہٹا دیتے تھے۔ مکمل تفصیل ﴿ اِنَّمَا النَّسِیْءُ زِیَادَةٌ فِی الْکُفْرِ ﴾ میں انشاء اللہ آئے گی۔

گزشتہ سے پیوستہ:

صحابہ کرام کے علم ہیئت کے حصول پر شاندار دلیل کی طرف توجہ فرمائیں:

" واخرج الطستی عن ابن عباس ان نافع بن الازرق قاله له اخبرنی عن قوله مواقیت للناس قال عدة نسائهم ومحل دینهم وشروط الناس قال وهل تعرف قال ذلک نعم اما سمعت قول الشاعر وهو یقول :

والشمس تجری علی وقت مسخرة　　　اذا قضت سفرا استقبلت سفرا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نافع بن ازرق نے پوچھا کہ ﴿ قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ ﴾ کا کیا مطلب ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ چاند کی حالتوں کے بدلنے کا یہ مطلب ہے کہ وہ اپنی عورتوں کی عدت کے دن پہچان لیں اور اپنے قرض وغیرہ کی ادائیگی کی تاریخوں کا تعین کرلیں اور لوگوں سے جو عہد و پیمان وغیرہ باندھ رکھے ہوں ان کی تاریخوں کا تعین کرلیں۔ نافع بن ازرق نے پوچھا کیا چاند کی حالتوں کی تبدیلی کی باریکیوں کو عرب حضرات جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہاں تم نے ایک شاعر کے شعر کو نہیں دیکھا جس نے یہ کہا ہے۔ سورج حکم کا پابند ہو کر ایک وقت پر چلتا ہے جب اس کا ایک سفر ختم ہوتا ہے تو دوسرا سفر اس کا شروع ہوتا ہے۔

☆ " واخرج الحاکم وصححه والبیهقی فی سننه عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ جعل الله الاهلة مواقیت للناس فصوموا لرؤیته وافطروا لرؤیته فان غم علیکم فعدوا ثلاثین یوما "

حاکم نے حدیث بیان کی جسے صحیح کہا اور بیہقی نے اپنی سنن میں حدیث ذکر کی کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے چاند کو مختلف حالتوں میں تبدیل کر کے لوگوں کے لئے وقت کی علامتیں بنایا اس لئے تم چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر روزہ افطار کرو اگر

بادل چھا جائیں تو تیس دن مکمل کرو۔

☆ " واخرج احمد والطبراني وابن عدی والدار قطنی بسند ضعیف عن طلق بن علی قال قال رسول الله ﷺ جعل الله الاهلة مواقيت للناس فاذا رأيتم الهلال فصوموا واذا رأيتموه فافطروا فان غم عليكم فاكملوا العدة ثلاثين "

طلق بن علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے چاند کی حالتوں میں تبدیلی کر کے لوگوں کے لئے وقت کی علامتیں بنایا ہے جب تم چاند دیکھو تو روزہ رکھو اور جب تم چاند دیکھو تو افطار کرو اگر چاند بادل میں آ جائے تو تیس دن مکمل کرو۔ (درمنثور)

رؤیت ہلال سے متعلق چند مسائل:

رؤیت ہلال کمیٹی کا اعلان چاند کے ثبوت کے لئے معتبر ہے کیونکہ ایک مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی ہے اور چند ذیلی کمیٹیاں ہیں جن میں علماء کرام کو نمائندگی حاصل ہے وہ شرعی طور پر شہادتوں پر وثوق کر کے اعلان کرتے ہیں اس لئے ان کا اعلان معتبر ہوتا ہے، کیونکہ البحر الرائق وغیرہ میں ہے کہ اگر چاند دیکھ کر حاکم نقارہ بجوا دے، ڈھنڈورا پیٹ دے توپوں کا فائر کر دے، آگ جلا دے جس سے لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ چاند کا اعلان کیا جا رہا ہے تو اس سے روزہ رکھنا اور عید کرنا جائز ہے۔ تو یقیناً ریڈیو کی خبر سے بھی چاند کا ثبوت یقینی طور پر صحیح ہوگا۔ اگر کوئی شخص اس مسئلہ میں تفصیل طلب کرنا چاہے تو فتاوی نوریہ کی جلد ۲ کا مطالعہ کرے۔

مسئلہ: اگر ایک شخص جدہ سے عید کا چاند دیکھ کر آئے لیکن پاکستان میں چاند نظر نہیں آیا عید نہیں بلکہ روزہ ہے تو وہ شخص بھی روزہ رکھے گا اگر چہ اس کے روزے تیس مکمل ہی کیوں نہ ہو چکے ہوں اس لئے فقہاء کرام نے بیان کیا ہے:

" ان المنفرد برؤية هلال رمضان اذا صام واكمل ثلاثين يوما لم يفطر الامع الامام " (تبیین الحقائق، البحر الرائق)

اگر کسی شخص نے رمضان کا چاند اکیلے دیکھا لیکن اس کے قول پر اعتبار نہ کرتے ہوئے حاکم نے رمضان کا روزہ رکھنے کا حکم دیا تو وہ خود اکیلا ہی روزہ رکھے۔ اب اس شخص کے تیس روزے مکمل ہو گئے

اور باقی لوگوں کے انتیس روزے ہوئے ہیں لیکن چاند بادلوں کی وجہ سے نظر نہیں آیا تو باقی لوگ تیس روزے مکمل کریں گے۔ تو یہ شخص جس کے تیس روزے مکمل ہو چکے تھے افطار (عید) نہیں کر سکتا بلکہ حاکم اور دوسرے لوگوں کے ساتھ ہی افطار کرے گا لہذا اسے اکتیسواں روزہ بھی رکھنا پڑے گا۔

رہا مسئلہ اختلافِ مطالع کا تو اس کا عدم اعتبار ظاہر الروایۃ سے ثابت ہے اگر سعودیہ سے چند لوگ اکٹھے پاکستان آئیں اور وہ شہادت دیں کہ ہم عید کا چاند دیکھ کر آئے ہیں تو پھر بھی ان کی شہادت سے پاکستان میں عید نہیں کی جا سکتی بلکہ پاکستان میں چاند دیکھنا اور چاند کی شہادتوں کا موصول ہونا ہی معتبر ہوگا۔ (ماخوذ از فتاوی نوریہ ج ۲ ص ۱۴۴)

چاند کے نام حالتوں کے لحاظ پر: چاند کی پہلی دو راتوں میں اور آخری دو راتوں میں چاند کو ہلال کہا جاتا ہے اور چودھویں رات کو جب چاند مکمل ہو جاتا ہے تو اسے بدر کہا جاتا ہے اور باقی راتوں میں قمر، بلکہ قمر کا اطلاق عام ہے شروع سے آخر تک خواہ ہلال ہو یا بدر ہو یا ان کے سوا ہو ہر حال میں قمر کہا جا سکتا ہے۔

سال، مہینہ، دن اور ساعت کی بحث:

سال: سورج کی حرکت جب فلک کے نقطہ معین سے شروع ہو تو یہ سال کی ابتداء ہے یہ بھی خیال رہے کہ سورج کی حرکت فلک کی حرکت کے مخالف ہوگی۔ جب سورج کی حرکت اسی نقطہ معین پر ختم ہو جائے تو سال کی انتہا ہے۔

سال میں چار موسم: سورج کے دوران کے لحاظ پر سال میں چار موسم ہوتے ہیں۔

سورج جب برج حمل میں ہو تو وہاں سے جب شمالی جانب ہوتا ہے تو ہوا میں گرمی آجاتی ہے پھر یہ گرمی آہستہ آہستہ بڑھتی رہتی ہے کیونکہ سورج برج سرطان کی طرف بڑھ رہا ہوتا ہے جب تک سرطان اور اسد میں رہتا ہے۔ اس وقت تک بہت شدید گرمی ہوتی ہے اور یہ گرمی لگاتار باقی رہتی ہے۔

پھر سورج واپس میزان میں پہنچتا ہے تو اب ہوا معتدل ہو جاتی ہے اس میں معمولی خنکی آجاتی ہے وہ شدت حرارت ختم ہو جاتی ہے۔ پھر حرارت میں آہستہ آہستہ کمی آنی شروع ہو جاتی ہے اور

برودت (ٹھنڈک) میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ سورج جدی میں پہنچ جاتا ہے جب تک یہاں رہتا ہے اس وقت تک سخت سردی رہتی ہے۔ پھر وہاں سے سورج شمالی جانب چڑھنا شروع کرتا ہے تو آہستہ آہستہ ہوا میں اعتدال آنا شروع ہوتا ہے سردی میں کمی واقع ہوتی ہے اب سورج پھر حمل میں پہنچ جاتا ہے اس وقت ہوا مکمل طور پر معتدل ہوتی ہے۔

واضح ہوا کہ سورج سال کی ابتدا میں جہاں سے شروع ہوا تھا سال کی انتہا میں وہاں ہی پہنچا اس دوران سے چار موسم ربیع (موسم بہار) صیف (موسم گرما) خریف (موسم خزان) شتاء (موسم سرما) معرض وجود میں آتے ہیں۔

مہینہ : چاند کی خاص فلک سے حرکت شروع ہونے سے مہینہ کی ابتداء ہوتی ہے پھر اسی نقطہ پر پہنچنے پر مہینہ کی انتہاء ہوتی ہے۔ چاند کی روشنی کے کم ہونے اور زیادہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ ضابطہ بیان کیا گیا ہے "**نور القمر مستفاد من نور الشمس**" سورج کی ضیاء (روشنی) سے چاند روشنی حاصل کرتا ہے۔

چاند سورج کے سامنے جب ہوتا ہے تو چاند مکمل روشن ہوتا ہے اور جب چاند کا کچھ حصہ سورج کے سامنے ہوتا ہے تو اتنی مقدار میں روشن ہوتا ہے اور باقی دھاگہ کی شکل میں گول دائرہ ہوتا ہے۔ اسی طرح آہستہ آہستہ چاند کی روشنی بڑھتی جاتی ہے پھر چاند کا سورج سے سامنا جب کم ہوتا ہے تو کمی آنی شروع ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ کم ہوتے ہوتے پہلی حالت میں آ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سورج اور چاند کے درمیان زمین حائل ہو جاتی ہے تو چاند کو گرہن لگ جاتا ہے۔

بعض اہل علم کا قول: سورج بھی جسم ہے اور چاند بھی جسم ہے تمام اجسام جسمیت میں برابر ہیں جو اشیاء ماہیت میں برابر ہوں ان کے لئے یہ کہنا ممکن نہیں کہ اس چیز کو فلاں چیز لازم ہے اور اس کو کوئی اور چیز لازم ہے بلکہ تمام کے لوازمات ایک جیسے ہوں گے۔ اس لئے یہ کہنا درست نہیں کہ چاند سورج سے روشنی حاصل کرتا ہے بلکہ یہ کہا جائے۔

"ان حصول النور فی جرم الشمس انما کان بسبب ایجاد القادر المختار وکذا الذی فی جرم القمر"

کہ سورج کی روشنی اللہ تعالیٰ کی ایجاد سے حاصل ہے جو قادر مختار ہے اور چاند کی روشنی بھی اسی قادر مختار سے حاصل ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

محشی کا محاکمہ: اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی قدرت کا انکار کرے اور صرف یہ عقیدہ رکھے کہ چاند ذاتی طور پر سورج سے فائدہ حاصل کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت کو کوئی دخل نہیں تو یہ ناجائز ہے بلکہ کفر ہے۔ اور اگر کسی کا یہ عقیدہ ہو کہ اصل ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہے وہی سورج اور چاند کو روشنی عطا کرنے والا ہے البتہ اس نے خود ہی یہ سبب پیدا فرمادیا ہے کہ سورج سے چاند کو روشنی حاصل ہو تو یہ کہنا جائز ہے۔

نظام شمسی اور قمری:

سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فاعل مختار ہے جو چاہے وہ کرتا ہے اس سے یہ نہیں پوچھا جاسکتا کہ یہ تو نے کیوں کیا ہے اور یہ کیوں نہیں کیا ہے لہذا سورج کی روشنی کمی وبیشی نہ رکھ کر اور گھٹنا وبڑھنا نہ رکھ کر اور چاند کی روشنی کو کم اور زیادہ رکھ کر اور اس کے گھٹنے اور بڑھنے کی حالت پیدا کر کے اپنی قدرت کاملہ کا ذکر فرمادیا کہ میرے کام کسی غرض کے محتاج نہیں۔

تاہم حضرت قبلہ مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے نظامی شمسی اور قمری کو بہت خوب انداز میں پیش کیا جو قارئین کے پیش خدمت ہے:

ا) قمری مہینے شمسی مہینوں سے افضل ہیں کہ رب نے تاریخیں معلوم کرنے ہی کیلئے چاند کو گھٹایا یا بڑھایا۔

(۲) نیز شمسی مہینوں کی جنتری زمین پر ہے اور قمری مہینوں کی جنتی آسمانوں پر ہے۔

(۳) اور وجہ فرق یہ ہے کہ شمسی مہینوں کی جنتری بندوں نے بنائی ہے اور قمری مہینوں کی جنتری فقط رب تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔

(۴) اور ذرا غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ شمسی تاریخوں پر سورج کو دیکھ کر کوئی دلیل حاصل نہیں کی جاسکتی لیکن قمری تاریخوں پہ جاہل انسان بھی چاند کو دیکھ کر کافی حد تک سمجھ جاتا ہے کہ آج کیا تاریخ ہونی چاہیے۔

(۵) اور وجہ فرق یہ ہے کہ شمسی مہینوں میں موسم کے تبدیل ہونے کو دخل ہے لیکن قمری مہینوں میں

موسم کی تبدیلی کو کوئی دخل نہیں۔

(۶) اور شمسی مہینوں میں چار سال کے بعد فرق کرنا پڑتا ہے یعنی فروری کا مہینہ 28 دنوں کے بجائے 29 دنوں کا کرنا پڑتا ہے کیونکہ ہر سال سورج کا دور مکمل ہونے سے اتنا پیچھے رہ جاتا ہے کہ جتنا دن کا چوتھائی حصہ ہوتا ہے لہذا چار سال کے بعد مکمل دن کے برابر پیچھے رہ جاتا ہے تو ایک دن کا اضافہ کرنا پڑتا ہے۔

(۷) اور ہندی مہینوں میں بھی یہی صورت حال رہتی ہے کہ کچھ سالوں کے بعد سال 12 مہینوں کے بجائے 13 مہینوں کا کرنا پڑتا لیکن اب اس کمی کو پورا کرنے کے لئے کئی مہینے اکتیس دنوں کے اور کئی بتیس دنوں کے بنانے پڑتے ہیں۔ لیکن قمری مہینے اس کے محتاج نہیں کہ ان میں پنکچر لگایا جائے وہ اس خرابی سے بچ کر صاف وشفاف ہیں۔

(۸) اسلامی کام قمری مہینہ سے ہوں گے لہذا روزے، زکواۃ، حج، عدت وغیرہ سب میں قمری مہینے معتبر ہوں گے نہ کہ شمسی، یہی وجہ ہے کہ تمام اسلامی تہوار قمری مہینہ کے تاریخوں کے مطابق ہوتے ہیں۔

(۹) چاند میں جمال ہے اور سورج میں جلال ہے نبی کریم ﷺ کو بھی جمال حاصل ہے اور آپ کی رحمت اور رب تعالیٰ کی رحمت سے امت کو بھی جمال حاصل ہے لہذا ان کو تاریخیں بھی جمالی حاصل ہیں یعنی قمری تاریخوں کے مطابق ان کا حساب رکھا گیا ہے۔

(۱۰) سورج میں کمی وبیشی نہیں اس لئے شمسی تاریخوں سے حساب لگانے والوں کو اس سے مقام عبرت حاصل نہیں ہوتی۔ لیکن چاند کی کمی اور زیادتی سے عقل مند انسان اپنے کمال وزوال کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ چاند شروع میں باریک ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ بڑھتا ہے پھر چودھویں رات کو اپنی کامل تابانی پر ہوتا ہے۔ اور مکمل دائرہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے پھر آہستہ آہستہ اس میں کمی آنی شروع ہو جاتی ہے آخر میں ایک دن آنکھوں سے اوجھل ہو کر گویا کہ درجہ معدومیت میں پہنچ جاتا ہے۔

یہی حال انسان کا ہے معدومیت سے وجود میں آتا ہے چھوٹا بچہ ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ جوان ہو جاتا ہے کامل عروج پر پہنچ کر آہستہ آہستہ زوال کی طرف آتا ہے یعنی بڑھاپا حاصل ہوتا ہے پھر وفات طاری ہو جاتی ہے۔

لہٰذا انسان اپنی زندگی کو غنیمت سمجھے زوال اور فنا سے پہلے جو ہو سکے نیکی کے عمل کر لے اور یہ ہر وقت خیال کرتا رہے کہ کمال کے بعد زوال ہے یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام نے جب آیۃ کریمہ ﴿ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ ﴾ کو سنا تو سمجھ لیا کہ حضورﷺ کے وصال کا وقت قریب آ چکا ہے کیونکہ کمال حاصل ہو چکا ہے اب زوال کی باری ہے۔

(۱۱) ستارہ پرستوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ ذرا غور کرو سورج ہو یا چاند یا دوسرے ستارے تمام کے تمام اللہ تعالیٰ کے حکم کے پابند ہیں ایک محور پر گھوم رہے ہیں ایک نقطہ سے چل کر پھر اسی نقطہ پر پہنچ جاتے ہیں یہ خود جب قدرت باری تعالیٰ کے محتاج ہیں اسکے چلانے سے چل رہے ہیں تو یقیناً یہ معبود نہیں بن سکتے۔ (از نعیمی بتصرف)

دن رات : معدل النہار یا نصف النہار کے دائرہ افق سے سورج کا جدا ہونا پھر اسی نقطہ کی طرف لوٹ آنا اسے دن رات سے تعبیر کیا جائے گا۔ فلاسفہ کا ایک قول یہ ہے کہ سورج کا زمین سے اوپر ہونا دن کہلاتا ہے اور زمین کے نیچے ہونا رات کہلاتا ہے کیونکہ آسمان زمین کے اوپر بھی ہیں اور نیچے بھی زمین درمیان میں معلق ہے۔

تنبیہ : فلاسفہ کے نزدیک دن طلوع آفتاب سے شروع ہوتا ہے اور غروب آفتاب پر ختم ہوتا ہے لیکن شریعت میں دن صبح صادق سے شروع ہوتا ہے اور غروب آفتاب پر ختم ہوتا ہے۔

ساعت : کی دو قسمیں ہیں مستویہ اور معوجہ۔ مستویہ ساعت چوبیس ساعتوں میں سے ایک ہے جو دن رات میں پائی جاتی ہیں یعنی دن اور رات کے مجموعی چوبیس گھنٹوں کو ساعات مستویہ کہا جاتا ہے۔ اور دن کی بارہ ساعتوں میں سے ایک یا رات کی بارہ ساعتوں میں ایک کو ساعت معوجہ کہا جاتا ہے۔ اس طرح دن کے بارہ گھنٹوں کو یا رات کے بارہ گھنٹوں کو ساعات معوجہ کہا جاتا ہے۔

خیال رہے کہ دن اور رات کے بارہ بارہ گھنٹے یا تو اس وقت مراد ہو سکتے ہیں جب دن اور رات برابر ہوں۔ لیکن زیادہ گمان یہ ہے کہ جس طرح گھڑیوں میں رات کے بارہ بجے کے بعد ایک دو کا حساب ہوتا ہے اس وقت گویا کہ دن کا آغاز سمجھا جاتا ہے اور دن کے بارہ بجے کے بعد تیرہ چودہ کا حساب ہوتا ہے اسے رات کا آغاز سمجھا جاتا ہے۔ اس حساب سے ہر دن بارہ گھنٹے کا اور ہر رات بارہ گھنٹے کی شمار ہوگی۔ (ماخوذ از کبیر)

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ

''اور یہ نہیں ہے نیکی کہ تم آؤ گھروں کو ان کی پچھلی جانب سے، اور لیکن نیکی تو اسے حاصل ہے جس شخص نے تقویٰ اختیار کیا۔ اور گھروں میں آؤ ان کے دروازں سے اور ڈرو اللہ سے تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ''۔

شانِ نزول:

آیۂ کریمہ کے اس حصہ کے شان نزول میں تین وجہ بیان کی گئی ہیں جو مجموعی طور پر مل کر شان نزول ہیں یعنی تین واقعات کے بعد یہ آیۂ کریمہ نازل ہوئی۔

(۱) حضرت حسن اور اصم رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں اگر کوئی شخص کسی کام کا ارادہ کرتا تو وہ کام اس کا اگر نہ ہوتا تو وہ اپنے گھر دروازے کی جانب سے داخل نہ ہوتا بلکہ پچھلی جانب سے داخل ہوتا اور ایک سال تک اسی پر عمل کرتا، اس طریقہ کو وہ لوگ نیک تفاؤلی یعنی نیک شگونی سمجھتے تھے کہ اس سے کام ہو جائے گا۔ تو رب تعالیٰ نے اس آیۂ کریمہ کو نازل فرما کر ان کو اس سے منع کیا کہ گھروں کے دروازوں سے نیک شگونی کے ارادہ سے داخل نہ ہونے کو تم نیکی کا کام سمجھ رہے ہو حالانکہ یہ نیکی کا کام نہیں۔ نیکی تو اس شخص کو حاصل ہوگی جو اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا اور کسی کا ڈر اور خوف اسے حاصل نہیں ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ پر توکل رکھے گا اسی وحدہ لا شریک سے ڈر رکھے اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾، ای لتفوزوا بالخیر فی الدین و الدنیا "

اور اللہ سے ڈرو تا کہ تم دین اور دنیا میں کامیاب ہو جاؤ۔ اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ☆ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ﴾

(الطلاق آیۃ ۳،۲)

''اور جو اللہ سے ڈرے اور اللہ اسکے لئے نجات کی راہ نکال دے گا اور اسے وہاں سے روزی

دے گا جہاں اس کا گمان نہ ہو' اور رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ﴾

''اور جو اللہ سے ڈرے اللہ اس کے کام میں آسانی فرمادے گا''

اسی سے واضح ہوا '' **من رجع خائبا فهو ما افلح وما انجح** '' جو شخص اللہ سے نہیں ڈرے گا وہ رسوا ہوگا اور اسے کامیابی حاصل نہیں ہوگی۔ آیۃ کریمہ کے اس مذکور شان نزول سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ فال نکالنا منع ہے اسی لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا'' **لا عدوی ولا طیرة** '' کوئی بیماری متعدی آگے تجاوز کرنے والی نہیں اور نہ ہی کوئی فال کارگر ہے۔

صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ ایک اونٹ خارش کی مرض میں مبتلا ہو تو دوسرے بھی خارش میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ بیماری آگے تجاوز کرتی ہے تو آپ نے فرمایا کہ سب سے پہلے کو کیسے خارش لاحق ہوئی؟ مطلب یہ تھا کہ عقیدہ یہ رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے محفوظ رکھے اور جسے چاہے بیماری میں مبتلا کرے ذاتی طور پر کوئی بیماری متعدی (تجاوز کرنے والی) نہیں۔

اسی طرح کسی چیز کو نیک شگونی سمجھنا یا کسی چیز کو بدگمانی سمجھنا بھی غلط ہے اسی لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا'' **من ردہ عن سفرہ تطیر فقد اشرک** '' جس شخص کو فال نے سفر سے روکا وہ مشرک ہوگیا۔ یعنی یہ سمجھا کہ فلاں وجہ سے میرا کام نہیں ہوگا لہذا مجھے سفر نہیں کرنا چاہئے جب فال کے ذریعے سفر سے رک گیا تو گویا کہ رب تعالیٰ پر کامل ایمان نہ رہا اور کامل توکل اس پر نہ رہا گویا کہ شرک خفی پایا گیا یہاں شرک کا معنی حقیقی نہیں۔

'' **ویحب الفال الحسن** '' اچھی فال محبوب ہے جیسا کہ کسی کام کے لئے چلے تو کوئی نیک آدمی مل جائے یا اچھے نام والا کوئی شخص مل جائے جیسے سعد، طاہر، صالح، محمد حسین، عبداللہ وغیرہ نام کا کوئی شخص مل گیا تو یہ خیال کیا کہ میرے کام میں برکت ہوگی تو یہ جائز بلکہ مستحسن ہے۔

(۲) شان نزول کی دوسری وجہ جو زیادہ مشہور ہے وہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص حج یا عمرہ احرام کا باندھ لیتا تو پھر اگر اسے کوئی کام پڑ جاتا تو وہ گھر دروازے سے داخل نہیں ہوتا تھا بلکہ گھر کی پچھلی دیوار کو نقب لگاتا (سوراخ کرتا) اس سے داخل ہوتا۔ اسی طرح خیموں میں رہنے والے بھی داخل ہونے کی سمت

سے داخل نہیں ہوتے تھے بلکہ خیمہ کی پچھلی جانب سے داخل ہوتے تو رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا کہ گھروں کے دروازوں سے داخل نہ ہونا نیکی کا کام نہیں نیکی کا کام تو تقوی حاصل کرنا ہے۔

(۳) ابن ابی حاتم اور حاکم نے حدیث بیان کی اور اس حدیث کو صحیح قرار دیا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں قریش کو حمس کہا جاتا تھا وہ احرام کی حالت میں گھروں کے دروازوں میں داخل ہوتے تھے (یعنی احرام کے بعد اگر گھر کسی کام کے لئے لوٹنا پڑتا تو گھروں میں دروازوں سے داخل ہوتے) اور انصار اور باقی عرب گھروں میں احرام کی حالت میں دروازوں سے داخل نہیں ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ ایک باغ سے احرام باندھ کر نکلے پھر اسی باغ کے دروازے سے احرام کی حالت میں داخل ہوئے تو آپ کو دیکھ کر قطبہ بن عامر انصاری بھی دروازے سے اسی باغ میں داخل ہو گئے تو بعض حضرات نے کہا قطبہ بن عامر انصاری فاسق وفاجر ہو گیا کیونکہ وہ دروازے سے داخل ہو گیا حالانکہ وہ انصاری ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس سے پوچھا "ما حملك على ما صنعت" تمہیں اس فعل پر کس چیز نے برانگیختہ کیا (ابھارا) ہے۔ تو اس شخص نے کہا "رأیتک فعلتہ ففعلتہ کما فعلت" میں نے آپ کو جو کام کرتے ہوئے دیکھا ہے وہی میں نے بھی کیا ہے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا "انی رجل احمس" میں تو احمس شخص ہوں (تم انصاری ہو) تو وہ شخص عرض کرنے لگے "فان دینی دینک" بیشک میرا دین وہی ہے جو آپ کا دین ہے۔

اور ایک روایت میں ان کے جواب کے یہ الفاظ ذکر کیے گئے ہیں:

"انی رضیت بسنتک وھدیک، وقد رأیتک دخلت فدخلت"

بیشک میں آپ کی سنت اور آپ کی ہدایت پر راضی ہوں جب میں نے آپ کو دروازے سے نکلتے ہوئے اور داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو میں نے بھی وہی کام کیا۔ ان کے اس محبت بھرے جواب پر یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے محبت بھرے کلمات کو پسند فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہاں گھروں میں دروازوں سے داخل نہ ہونا نیکی نہیں بلکہ نیکی تو تقوی سے یعنی اتباع رسول اللہ ﷺ سے حاصل ہوتی ہے۔

حمس کا مطلب کیا ہے؟

یہ لفظ جمع ہے " فعل بضمتین " کا وزن ہے اس کا واحد احمس ہے یہ لفظ " حماسة " سے مشتق ہے جس کا معنی شدت ہے۔ حمس ان قبائل کو کہا جاتا تھا قریش، کنانہ، خزاعہ، ثقیف، خثیم، بنو عامر بن صعصعۃ، بنو نصر بن معاویۃ، ان قبائل کو حمس اس لئے کہا جاتا تھا کہ یہ لوگ اپنے دین میں سختی سے کار بند رہتے تھے یہ لوگ احرام باندھ کر گھروں میں نہیں لوٹتے تھے اور جن خیموں سے احرام باندھ کر نکلتے ان کا پھر سایہ حاصل نہیں کرتے تھے اور گھی اور پنیر نہیں کھاتے تھے، ہاں البتہ اگر کوئی مجبوری ان کو در پیش آ جاتی تو گھروں میں ان کے دروازوں سے ہی داخل ہوتے تھے لیکن دوسرے تمام عرب حضرات اور خصوصاً انصار گھروں کی پچھلی دیوار کو نقب لگا کر داخل ہوتے تھے دروازوں سے داخل نہیں ہوتے تھے۔
(از کبیر و درمنثور)

سوال: جب اسی آیۃ کے پہلے حصہ میں ہے:

﴿ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ﴾

''کہ وہ آپ سے چاند کی حالتوں کے متعلق سوال کرتے ہیں آپ فرما دو وہ علامتیں ہیں وقت کی لوگوں کے لئے اور حج کے لئے''۔ تو اس شان نزول کی پہلی وجہ (فال والے واقعہ) کی کوئی مناسبت نہیں تو اسے شان نزول کی وجہ کیسے قرار دیا جائے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے ﴿ وَلَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا ﴾ کو ﴿ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ﴾ کے ساتھ ذکر فرمایا:

" انما اتفق وقوع القصتین فی وقت واحد فنزلت الآیة فیهما فی وقت واحد "

تو اتفاق یہ ہوا کہ دونوں واقعے یعنی فال کے متعلق سوال اور احرام کے متعلق واقعہ ایک ساتھ در پیش آئے تو آیۃ کریمہ کا نزول ہوا۔ (از کبیر)

شان نزول کی مختلف وجوہ کو علامہ رازی رحمہ اللہ کے اسی قول کی روشنی میں دیکھا جائے اور یہی استاذی المکرم مولنا محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی بیان فرماتے تھے۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے: ﴿ لَیْسَ الْبِرُّ ﴾ میں لفظ "البر" پر رفع (پیش) لازم ہے کیونکہ ﴿ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ ﴾ میں باء داخل ہے باء خبر پر داخل ہوتی ہے نہ کہ اسم لیس پر اس لئے "البر" کا اسم لیس ہونا معین ہوگیا۔ (صاوی)

اور توجہ: اللہ تعالیٰ نے دو جملے خبریئے ذکر فرمائے ہیں اور دو امر ذکر فرمائے ہیں لف ونشر مرتب کلام ہے یعنی پہلے امر کو پہلے جملہ خبریہ پر مرتب فرمایا ہے اور دوسرے امر کو دوسرے جملہ خبریہ پر مرتب فرمایا ہے:

﴿ لَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا ﴾

جملہ خبریہ ہے اس پر امر ﴿ وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ﴾ کو مرتب فرمایا ہے اور ﴿ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ﴾ جملہ خبریہ ہے اور اس پر امر ﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ﴾ کو مرتب فرمایا۔ (صاوی)

ذرا اور توجہ: ﴿ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ﴾ میں یا تو خبر محذوف ہے اصل عبارت ﴿ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ﴾ لیکن نیکی تو معتبر تقوی کرنے والے شخص کی نیکی ہے۔ یا حذف مضاف ہے (وَلٰكِنْ) ذا (اَلْبِرَّ) البار (مَنِ اتَّقٰى) لیکن نیکی کرنے والا نیک شخص تو وہ ہے جس نے تقوی اختیار کیا یعنی محارم اور باطل شہوات سے اپنے آپ کو بچا کر رکھا۔ (روح المعانی)

وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ : ای لکی تفوزوا بالمطلوب من الهدی والبر " اور اللہ سے ڈرو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ یعنی تم ہدایت حاصل کرنے اور نیکی حاصل کرنے کے مطلوب کو پا لینے میں کامیاب ہو جاؤ۔ (روح المعانی)

شریعت کے خلاف کوئی کام نیکی کا نہیں ہوسکتا:

" عن ابن عباس قال بینما رسول اللہ ﷺ یخطب اذا هو برجل قائم فی الشمس فسال عنه فقالوا هو ابو اسرائیل نذر ان یقوم ولا یقعد ولا یستظل ولا یتکلم ویصوم فقال النبی ﷺ مروه فلیتکلم ویستظل ولیقعد ولیتم صومه "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ خطبہ دے رہے تھے تو ایک شخص کو دھوپ پر کھڑے دیکھا آپ نے اس کے متعلق سوال کیا تو صحابہ کرام نے بتایا یہ ابو اسرائیل

ہے (یہ انصاری صحابی ہیں جن کی کنیت ابواسرائیل ہے ان کے نام میں اختلاف پایا جاتا ہے) جس نے نذر مانی ہوئی ہے کہ وہ کھڑا رہے گا اور بیٹھے گا نہیں اور سایہ حاصل نہیں کرے گا اور کلام نہیں کرے گا اور روزہ رکھے گا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اسے حکم دو کہ وہ سایہ حاصل کرے اور بیٹھ جائے اور اپنے روزہ کو مکمل کرے۔

کیا خوب قانون مقرر فرمایا:

" فابطل النبی ﷺ ماکان غیر قربة مما لا اصل له فی شریعته وصحه ما کان قربة مما له نظیر فی الفرائض والسنن "

نبی کریم ﷺ نے اس شخص کو کھڑے رہنے اور سایہ نہ حاصل کرنے اور کلام نہ کرنے کی نذر سے منع فرمایا کہ اس کی کوئی اصل شریعت میں نہیں لیکن آپ نے روزہ مکمل کرنے کی ہدایت فرمائی کیونکہ اس کی نظیر (مثال) فرضی روزوں اور مسنون روزں سے ملتی ہے۔ (قرطبی)

واضح ہوا کہ ہر وہ کام جو شریعت کے مخالف ہو وہ ناجائز ہوگا لیکن جو کام شریعت کے مطابق ہوگا وہ جائز ہوگا یہ دلیل ناقص ترین ہے کہ جو کام نبی کریم ﷺ نے نہیں کیا وہ جائز نہیں، یہ دلیل دینے والوں کا چلنا پھرنا، تصنیفی کام اور نئی وضع کی مساجد اور نئی طرز پہ مدارس کا قیام سب حرام ہو جائے گا۔

بیان کردہ آیات میں لطیف اشارات:

انسان میں تین قسم کی قوتیں پائی جاتی ہیں درندگی کی قوت، حیوانی قوت اور ملکی (فرشتوں والی) قوت۔ قصاص کا حکم نافذ کر کے اس طرف بھی اشارہ فرمادیا کہ جس طرح قتل کا بدلہ قتل ہے یہ عدل ہے اسی طرح جب تم کسی کے دل کو ستاؤ گے یا کسی کی روح کو تکلیف دو گے تو تم پر قصاص لازم آئے گا کہ تم یا تو اپنے قلب و روح کو اس پر پیش کرو کہ وہ اپنا بدلہ لے لے یا وہ تمہیں معاف کر دے یا تم اس کے قلب و روح کو خوش کر کے گویا کہ خون بہادے کر اس سے اپنے آپ کو معاف کرالو۔

پھر رب تعالیٰ نے وصیت کرنے کا حکم فرمایا اس میں یہ بھی اشارہ پایا گیا ہے کہ تم اللہ والوں کو

صرف اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے اور اللہ تعالیٰ کے ازلی اسرار کو یاد رکھنے کی وصیت کر کے اپنی قوت ملکی کو محفوظ رکھو اگر تم نے اس وصیت میں کمی کی تو تمہاری قوت ملکی میں بھی کمی ہو گی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے روزے رکھنے کا حکم دیا اس میں یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ اے انسان تو اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے جسطرح روزہ رکھتا ہے اسی طرح اپنے قول وفعل اور حرکت کو صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء کے مطابق رکھ تا کہ تیری قوت حیوانی میں کمی آئے کیونکہ حیوانوں کا کام صرف کھانا پینا ہے تو روزہ رکھنے سے ان کی اس قوت حیوانی میں کسی حد تک کمی واقع ہو گی۔ اور حیوان اپنے قول وفعل اور حرکات میں مکلف نہیں تو انسان بھی اپنے آپ کو اس قوت حیوانی کی وجہ سے غیر مکلّف نہ سمجھے بلکہ اپنے اقوال وافعال اور اپنی حرکات کو رب تعالیٰ کی مرضی کے مطابق کر کے اپنے آپ کو مکلّف سمجھے اس طرح اس کی قوت حیوانی میں کمی واقع ہو گی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کو تسلی دیتے ہوئے ﴿ يُرِيدُ اللهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾ اس طرف اشارہ فرمادیا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی کا ارادہ فرماتا ہے کہ تم اپنے آپ کو واصل الی اللہ (اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے) کے درجہ پر پہنچاؤ اور اپنے آپ کو رب تعالیٰ کی صفات سے متصف کرو تا کہ تمہیں رب تعالیٰ اپنی قدرت اور صفات کا مظہر بنادے۔

رب تعالیٰ تم پر مشکل کا ارادہ نہیں فرماتا کہ تم اپنے آپ کو رب تعالیٰ کے قریب نہ کرو، بلکہ وہ تو اپنے قریب کرنے کیلئے آسانی کی راہ پیدا فرماتا ہے انسان چونکہ متلون مزاج ہے یعنی اس کا مزاج بدلتا رہتا ہے کبھی اس پر صفات روحانیہ غالب ہوتی ہیں یعنی ملکی قوت جب غالب ہوتی ہے تو یہ انسانی خواہشات سے روزہ رکھتا ہے یعنی گناہوں کو قریب بھی نہیں آنے دیتا اور کبھی انسان پر صفات حیوانیہ غالب ہوتی ہیں یہ وہ وقت غفلت کا ہوتا ہے انسان اپنی خواہشات کی تکمیل کا خواہش مند ہوتا ہے۔ اگر جائز طریقہ سے اپنی خواہشات کی تکمیل کرے یعنی اپنی زوجہ کی جانب رجوع کرے تو اسکی طرف اشارہ ﴿ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ﴾ ''وہ عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو'' سے کر دیا۔

اور اگر خواہشات کی تکمیل ناجائز طریقہ سے کی تو اسکی طرف اشارہ ﴿ عَلِمَ اللهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ

تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ ﴾ "اللہ کو معلوم ہے کی بیشک تم اپنے نفسوں کو خیانت میں ڈالتے ہو" سے اشارہ کر دیا۔

پھر اگر انسان اپنے گناہوں سے تائب ہو جائے اللہ تعالیٰ کے حضور رجوع کرے تو رب تعالیٰ توبہ قبول کرتا ہے اور معاف فرماتا ہے اس مسئلہ کی طرف ﴿ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ﴾ "وہ تمہاری توبہ قبول کرتا اور معاف کرتا ہے" سے اشارہ فرمادیا۔

چونکہ انسان اگر تمام وقت عبادات میں گزارے تو دنیاوی زندگی اور ذریعہ معاش معطل ہو کر رہ جاتا ہے اسلئے بندے کا عبادت کرنا بھی رب تعالیٰ کو محبوب ہے اور اپنے اہل وعیال کیلئے رزق حلال کے حصول کیلئے کسب کرنا بھی رب تعالیٰ کو پسند ہے بلکہ اسے بھی عبادت قرار دیا۔ اس کی طرف اشارہ:

﴿ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ﴾

"کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ فجر کا سفید دھاگہ ظاہر ہو جائے سیاہ دھاگہ سے) کر دیا" کہ کسی وقت کھانے اور پینے کی ممانعت کر کے اشارہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف مشغول ہونے کے وقت کا بھی لحاظ کرو اور کسی وقت کھانے اور پینے کی اجازت عطا فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ اپنے بعض اوقات دنیاوی مشاغل میں بھی گزار لو۔ نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے بھی یہی ثابت ہو رہا ہے آپ کا ارشاد گرامی ہے:

" لی مع الله وقت لا یسعنی فیه ملک مقرب ولا نبی مرسل ، ولی مع حفصة وزینب "

میرا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک وقت ہوتا ہے جس میں کوئی مقرب فرشتہ اور کوئی نبی مرسل دم نہیں مار سکتا اور میرا کوئی وقت (اپنی ازواج) حفصہ اور زینب (وغیرہما) سے گزرتا ہے۔ (از روح المعانی)

﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ...... الخ ﴾ اس آیۃ کریمہ سے اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ سیدھی راہ کامل وہ ہے کہ یقینی دلائل کو ظنی دلائل پر ترجیح دی جائے، اگر ظنی دلائل کو یقینی دلائل پر ترجیح دے گا تو معاملہ الٹ ہو جائے گا جو کام واجب ہو گا اس کو انسان واجب نہیں سمجھے گا اور جو واجب نہیں ہو گا اسے واجب سمجھے گا۔ اس کے بعد یہ سمجھنا ضروری ہے کہ رب تعالیٰ عالم، صانع، مختار اور حکیم ہے اور یہ بھی بہت واضح ہے کہ:

" ان الحکیم لا یفعل الا الصواب البرئی عن العبث والسفه "

حکیم ذات کا کوئی کام بھی غلط نہیں ہوتا بلکہ درست ہی درست ہوتا ہے اس کا ہر کام بے فائدہ ہونے سے خالی ہوتا ہے یعنی ہر کام حکمت کے مطابق ہوتا ہے۔ اس قانون سے ہی یہ پتہ چل گیا کہ اللہ تعالیٰ نے چاند کو مختلف حالتوں میں رکھ کر اپنی حکمت کاملہ کا اظہار فرما دیا۔ لہذا رب تعالیٰ کے ہر امر و نہی کو حکمت پر مبنی سمجھ کر اسے تسلیم کرنا گویا کہ گھروں کو دروازوں کی جانب سے آنا ہے اور اس کے حکم کے خلاف چلنا گویا کہ گھروں کے پچھلی جانب سے آنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق چلنے کا نام ہی صراط مستقیم ہے اور اس کی مرضی کے خلاف چلنے کا نام باطل راہ ہے۔ (از کبیر)

ایک انوکھی تفسیر: آیۃ کریمہ وضاحت احادیث مبارکہ اور معتبر تفاسیر سے بیان کر دی گئی اور جو لطیف اشارات پائے گئے ہیں وہ بھی بیان کر دیئے گئے تاہم تمام تفاسیر سے ہٹ کر عقلی ڈھکو سلے کے مطابق تفسیر کو دیکھئے۔

" واما قوله ﴿لَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا﴾ قال نزلت في امير المؤمنين عليه السلام لقول رسول الله ﷺ انا مدينة العلم و علي عليه السلام بابها ولا تدخلوا المدينة الا من بابها " (تفسير قمي لاهل التشيع)

یہ آیۃ امیر المؤمنین علیہ السلام کے متعلق نازل ہوئی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں علم کا شہر ہوں اور علی علیہ السلام اس کا دروازہ ہیں اور شہر میں سوائے دروازہ کے داخل نہ ہو۔

راقم نے اس تفسیر کو انوکھا کیوں قرار دیا؟

اس لئے کہ اس آیۃ کریمہ کا شان نزول کسی حدیث کی کتاب میں نہیں کیونکہ احادیث سے شان نزول کی وہی تین وجوہ ثابت ہیں جن کو ذکر کر دیا گیا خصوصا درمنثور میں بھی نہ ذکر ہونا واضح کرتا ہے کہ اس انوکھی تفسیر کے مطابق شان نزول پر کوئی ضعیف حدیث بھی نہیں کیونکہ درمنثور میں صحیح اور حسن اور ضعیف تمام احادیث ہی تقریباً مذکور ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ رئیس المحققین عمدۃ الاذکیاء رازی دوراں استاذی المکرم حضرت علامہ مولنا محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ میں علم کا شہر ہوں

اور علی اس کا ایک دروازہ ہیں۔ یعنی تمام صحابہ کرام اس شہر کے دروازے ہیں ان میں سے ایک دروازہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ہیں ورنہ وہ شہر کیسا ہوگا جس کا ایک ہی دروازہ ہوگا۔ استاذی المکرم کی اس وضاحت کو اور مرقاۃ شرح مشکوۃ کو دیکھیں تو مطابقت نظر آئے گی۔ حضرت علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں ترمذی شریف میں تو حدیث یہ ہے:

"عن علی قال قال رسول الله ﷺ انا دار الحكمة وعلی بابها"

"حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں حکمت کا دار ہوں اور علی اسکا دروازہ ہیں"۔

"وفی رواية انا مدينة العلم وعلی بابها"

"ایک روایت میں ہے میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں"

"وفی رواية المصابيح انا دار العلم وعلی بابها"

"اور مصابیح کی روایت میں ہے میں علم کا دار ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں"

"وفی رواية زيادة فمن اراد العلم فليأته من بابه"

"اور ایک روایت میں یہ زیادتی بھی ہے کہ جو شخص علم کا ارادہ رکھتا ہے وہ اس کے دروازے سے آئے"

حدیث پاک کا مطلب کیا ہے؟

"والمعنى علی باب من ابوابها ولكن التخصيص يفيد نوعا من التعظيم وهو كذلك لانه بالنسبة الى بعض الصحابة اعظمهم واعلمهم"

حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ علم کے شہر کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہیں لیکن آپ کا ذکر خصوصی طور پر کرنا آپ کی عظمت پر دلالت کرتا ہے اس بات کا کوئی انکار نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بنسبت بعض صحابہ کرام کے (نہ کہ بنسبت تمام صحابہ کرام کے) افضل بھی ہیں یعنی آپ کو عظمت حاصل ہے اور بنسبت بعض صحابہ کرام کے آپ زیادہ علم بھی رکھتے ہیں۔

"ومما يدل على ان جميع الاصحاب بمنزلة الابواب قوله ﷺ

اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم "

اس پر دلیل یہ ہے کہ تمام صحابہ کرام ہی علم کے شہر کے دروازے ہیں خود نبی کریم ﷺ کا ارشادگرامی ہے کہ میرے صحابہ تمام ہی ستاروں کی طرح ہیں ان میں سے جس کی اقتداء کرو گے ہدایت پا جاؤ گے۔ البتہ ستاروں سے تشبیہ دے کر یہ ثابت کر دیا کہ جس طرح بعض ستارے زیادہ نورانیت رکھتے ہیں اور بعض کم، اسی طرح صحابہ کرام بھی انوار ہدایت میں مختلف مراتب رکھیں گے۔

اس پر اور دلیل یہ ہے کہ تابعین نے علوم شرعیہ کی مختلف اقسام یعنی قراءت اور تفسیر اور حدیث فقہ تمام صحابہ کرام سے حاصل کیے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حاصل نہیں کیے " فعلم عدم انحصار البابية فی حقه " اسی سے معلوم ہو گیا کہ علم کے شہر کا دروازہ ہونا صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ پر بند نہیں۔ ہاں اگر جزوی فضیلت ثابت کی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں:

" اللھم الا ان یختص بباب القضاء فانه ورد فی شانه انه اقضاکم "

ہاں اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو علم قضاء (عدالتی فیصلے کرنے) کے شہر کا دروازہ مان لیا جائے تو یہ درست ہے اسلئے کہ ان کی شان میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا وہ تم تمام سے اچھے قاضی ہیں۔ اس طرح جزوی فضیلت اور صحابہ کرام کو بھی حاصل ہے کیونکہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے متعلق ارشاد مصطفوی ہے " انه اقرؤكم " وہ تم تمام سے زیادہ اچھے قاری ہیں اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے متعلق ارشاد فرمایا" انه افرضكم " بیشک وہ تم تمام سے زیادہ علم فرائض رکھتے ہیں یعنی وراثت کے مسائل وہ تمام صحابہ کرام سے زیادہ جانتے ہیں اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا "انه اعلمكم بالحلال والحرام " بیشک وہ تم تمام سے حلال وحرام کا زیادہ علم رکھتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کچھ لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان کے متعلق پوچھا تو آپ نے بتایا:

" کان قد ملی جوفه حکما وعلما وباسا ونجدة مع قرابته من رسول الله ﷺ " (اخرجه احمد)

کہ وہ علم وحکمت اور بہادری ورفعت سے بھرے ہوئے تھے باوجود اس کے کہ رسول اللہ ﷺ

کے ساتھ آپ کو قرابت بھی حاصل تھی۔

" وعن سعید بن مسیب قال عمر کان یتعوذ من معضلة لیس الها ابوحسن " (اخرجه احمد)

حضرت سعید بن میتب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان پیچیدہ مسائل سے پناہ مانگتے جن کا فیصلہ کرنے کے لئے حضرت ابوالحسن (حضرت علی) رضی اللہ عنہ نہ ہوتے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث (میں علم کا شہر ہوں علی اس کا دروازہ ہیں) سے اہل تشیع کا یہ دلیل پیش کرنا کہ علم اور حکمت صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حاصل کرنا خاص ہے کسی اور کی طرف آپ کے واسطہ کے بغیر تجاوز نہیں ہوسکتا کیونکہ دار (گھر) میں داخل صرف دروازے سے ہی ہوسکتا ہے رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ واتوا البیوت من ابوابها ﴾ "گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ"

" ولا حجة لهم فیه اذ لیس دار الجنة باوسع من دار الحکمة ولها ثمانیة ابواب "

اس میں اہل تشیع کی دلیل ثابت نہیں ہوسکتی کیونکہ جنت کا دار علم کے دار سے زیادہ وسیع نہیں حالانکہ جنت کے بھی آٹھ دروازے ہیں۔ (مرقاة ج ۱۱ ص ۳۴۶)

یعنی مقام جنت علم وحکمت کے شہر سے چھوٹا ہے جبکہ آٹھ دروازے جنت کے بھی ہیں تو علم کا شہر کیسا شہر ہوگا جس کا ایک ہی دروازہ ہو ہاں یقیناً اس کے دروازے بہت ہیں وہ سب صحابہ کرام ہی اس کے دروازے ہیں البتہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ کوئی دروازہ بڑا ہوگا اور کوئی چھوٹا۔

حدیث پاک پر محدثین کے اقوال:

" رواه الترمذی وقال هذا حدیث غریب وقال روی بعضهم هذا الحدیث عن شریک ولم یذکروا فیه الصنا بحی (بضم صاء وکسر موحدة ومهملة) ولا نعرف هذا الحدیث عن احد من الثقات غیر شریک "

یہ حدیث (انا دار الحکمة وعلی بابھا) ترمذی نے ذکر کی ہے اور فرمایا یہ حدیث غریب ہے اور یہ کہا کہ یہ حدیث شریک سے بعض نے روایت کی ہے اور سند میں صنابحی کا بھی ذکر نہیں اور بعض کا نام بھی نہیں اور یہ حدیث سوائے شریک کے اور ثقہ راویوں سے ثابت نہیں۔

اور حدیث " انا مدینة العلم وعلی بابھا " حاکم نے اپنی مستدرک کے باب المناقب میں ذکر کی ہے " وقال صحیح " اور انہوں نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا" وتعقبه الذھبی فقال بل ھو موضوع "اور ذہبی نے اس کا تعاقب کیا ہے اور کہا ہے بلکہ وہ موضوع ہے" وقال ابو زرعة کم خلق افتضحوا فیه " اور ابو زرعہ نے کہا ہے کہ اس میں کتنے لوگ رسواء ہوئے ہیں۔ (یعنی اس کی سند کو صحیح نہیں ثابت کر سکے)۔

" وقال یحی بن معین لا اصل له کذا قال ابو حاتم ویحی بن سعید "

اور یحی بن معین نے کہا ہے کہ اس حدیث کی کوئی اصل نہیں اس طرح ابو حاتم اور یحی بن سعید نے بھی کہا ہے۔ " وقال الدار قطنی ثابت " اور دارقطنی نے کہا ہے یہ حدیث ثابت ہے "ورواہ الترمذی فی المناقب من جامعه وقال انه منکر "اور ترمذی نے یہ حدیث اپنی جامع کے باب المناقب میں ذکر کی ہے کہ یہ حدیث منکر ہے یعنی ثقہ راویوں کی حدیث معرف کے مقابل ہے جسے منکر کہا جاتا ہے۔

" وکذا قال البخاری انه لیس له وجه صحیح " اور بخاری نے بھی اسی طرح بیان کیا ہے کہ اس حدیث کی کوئی وجہ صحیح نہیں۔" واوردہ ابن الجوزی فی الموضوعات" اور ابن جوزی نے اسے موضوعات میں ذکر کیا ہے۔

" وقال ابن دقیق العبد ھذا الحدیث لم یثبتوہ وقیل انه باطل "

ابن دقیق العبد نے کہا یہ حدیث ثابت نہیں اور بعض نے کہا یہ باطل ہے۔

صحیح قول بطور محاکمہ: لیکن حافظ ابو سعید علائی رحمہ اللہ نے فرمایا درست قول یہ ہے:

" انه حسن باعتبار طرقه لا صحیح ولا ضعیف فضلا عن ان یکون

موضوعا ذکرہ الزرکشی"

کہ یہ حدیث باعتبار طرق سند کے حسن ہے صحیح بھی نہیں اور ضعیف بھی نہیں۔ جب حسن ہے تو موضوع کہنا کیسے صحیح یعنی موضوع کا قول لغو ہے علامہ زرکشی رحمہ اللہ نے حضرت علائی کے قول کو یوں ہی نقل فرمایا۔ علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ صاحب فتح الباری شرح بخاری سے اس حدیث کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

" انہ حسن لا صحیح کما قال الحاکم ولا موضوع کما قال ابن الجوزی"

یہ حدیث حسن ہے صحیح نہیں جیسا کہ حاکم نے کہا ہے اور موضوع بھی نہیں جیسا کہ ابن جوزی نے کہا ہے۔ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس حدیث کے متعلق علامہ علائی رحمہ اللہ نے اور علامہ عسقلانی رحمہ اللہ نے بہت تفصیل سے بحث فرمائی ہے۔ (مرقاۃ ج ۱۱ ص ۳۴۶)

ہاں البتہ یہ کہا جائے کہ آیۃ کریمہ میں اس طرف اشارہ ملتا ہے کہ جس طرح احرام باندھنے کے بعد گھروں میں آنے کی ضرورت ہو تو گھروں کے دروازوں کی طرف سے آؤ اسی طرح علم حاصل کرنا چاہو علم کے شہر میں آنا چاہو تو اس کے شہر کے دروازوں سے آؤ وہ دروازے تمام صحابہ کرام ہیں تعلیمات صحابہ کرام کی راہنمائی میں ہی علم ہدایت حاصل ہوسکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

﴿وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ﴾

۱) ''اور اللہ کی راہ میں لڑو ان سے جو تم سے لڑتے ہیں اور حد سے نہ بڑھو اللہ پسند نہیں رکھتا حد سے بڑھنے والوں کو''۔

۲) ''اور لڑائی کرو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو لڑائی کرتے ہیں تم سے اور نہ تجاوز کرو بیشک اللہ نہیں پسند کرتا تجاوز کرنے والوں کو''۔

ماقبل سے تعلق:

پہلی آیۃ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے تقوی کا حکم دیا یعنی دین میں استقامت اور اللہ تعالیٰ کی معرفت راہ تقوی سے حاصل ہوتی ہے صرف اپنی عقلی رائے کا دخل نہ ہو عقل سے بھی کسی چیز کو سوچنا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کے تابع ہو۔

تقوی کا حکم دینے کا مطلب یہ ہے " هو ترک المحظورات وفعل الواجبات " کہ ممنوع چیزوں کو چھوڑ دیا جائے اور واجب چیزوں پر عمل کیا جائے اس بحث سے واضح ہو گیا" ان الاستقامة علم وا لتقوى عمل " بیشک استقامت علم ہے اور تقوی عمل ہے ان دو چیزوں کی ہی مومن کو تکلیف دی گئی ہے کہ علم و عمل دونوں کو ہی حاصل کرو۔ تقوی کے حکم کے بعد:

" امر فی هذه الآیة باشد اقسام التقوی و اشقها علی النفس و هو قتل اعداء الله "

اس آیۃ میں تقوی کی سخت قسم کا حکم دیا جو انسان کو بظاہر بہت بھاری اور مشقت آمیز نظر آتی ہے تقوی کی شدید قسم اللہ تعالیٰ کی راہ میں اللہ تعالیٰ کے دشمنوں یعنی کافروں سے جہاد کرنا ہے۔ (از کبیر)

شان نزول:

اس آیۃ کریمہ کے شان نزول میں دو احتمال پائے گئے ہیں ایک احتمال کے لحاظ سے یہ آیۃ کریمہ

منسوخ ہے اور دوسرے لحاظ سے منسوخ نہیں۔ مکہ مکرمہ میں جہاد کرنے کی ممانعت تھی نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ میں آئے تو آپ سے جہاد کی ممانعت کی پابندی اٹھائی لیکن اسے پھر بھی اس شرط سے مشروط کر دیا کہ جو تم سے لڑائی کرے اس سے لڑائی کرو اور جو تم سے لڑائی نہ کرے اس سے لڑائی نہ کرو اس لئے کہ جو لڑائی نہ کرے اگر اس سے لڑائی کرو گے تو تمہاری طرف سے تجاوز پایا جائے گا۔ اس آیۃ کریمہ کے نزول کے بعد:

" کان رسول اللہ ﷺ یقاتل من قاتل ویکف عن قتال من ترکہ "

رسول اللہ ﷺ ان لوگوں سے لڑائی کرتے جو آپ سے لڑائی کرتے اور جو آپ سے لڑائی نہیں کرتے تھے رسول اللہ ﷺ بھی ان سے لڑائی نہیں کرتے تھے:

" و بقی علی ھذہ الحالۃ الی ان نزل قولہ تعالیٰ ﴿اُقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ﴾

نبی کریم ﷺ نے اسی پر کچھ دیر عمل کیا پھر اللہ تعالیٰ نے جہاد کا حکم عام کر دیا اور آیۃ کریمہ ﴿اُقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ﴾ نازل فرما کر مطلقاً کفار و مشرکین کو قتل کرنے کا حکم دیا جس سے پہلے لڑائی نہ کرنے کی شرط منسوخ کر دی گئی۔

شان نزول کی دوسری وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ چھٹے سن ہجری میں اپنے صحابہ کرام کو ساتھ لے کر عمرہ کرنے کی غرض سے مکہ مکرمہ کی طرف چلے۔ مقام حدیبیہ میں آپ نے قیام کیا اس جگہ اترنے کی وجہ یہ تھی کہ اس جگہ میں درخت بہت تھے اور پانی بھی تھا۔ لیکن کفار مکہ کو آپ کے تشریف لانے اور حدیبیہ میں اترنے کے متعلق معلوم ہو گیا تو انہوں نے آپ کو مکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے منع کر دیا، ایک مہینہ تک آپ نے وہاں قیام کیا اور کفار سے بات چیت کے بعد ان سے چند شرائط پر صلح ہو گئی جن میں ایک شرط یہ تھی کہ تم اب واپس چلے جاؤ اور آئندہ سال آ ؤ عمرہ کر لو یعنی طواف کرو اور ہدی کے جانور ذبح کرو تین دن تک ٹھہرو اس میں نیکی کے کام جو چاہو کرو اور تین دن کے بعد پھر واپس لوٹ جانا۔

صلح کے بعد نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام مدینہ طیبہ میں لوٹ گئے آئندہ سال عمرہ کی تیاری کی تو صحابہ کرام کے دل میں خیال آیا کہ ہو سکتا ہے قریش وعدہ کی وفا نہ کریں ہمارے ساتھ لڑائی شروع کر دیں تو ہم شہر حرام اور حرم شریف میں ان سے لڑائی نہیں کر سکیں گے تو ہم کیا کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس

آیۃ کریمہ کو نازل کر کے ان کے اس خدشہ کو دور کر دیا کہ اگر وہ تمہارے ساتھ پہلے لڑائی کریں تو جواباً تم بھی ان سے لڑائی کر سکو گے تمہارے لئے یہ لڑائی جائز ہوگی۔

شان نزول کی اگر یہ وجہ ہو تو آیۃ کریمہ منسوخ نہیں ہوگی کیونکہ حرم شریف میں اگر کوئی لڑائی کرے تو اس کے جواب میں لڑائی جائز ہے لیکن لڑائی کی ابتداء کرنا جائز نہیں یہ حکم باقی ہے۔ بعض حضرات نے پہلے شان نزول کے مطابق بھی آیۃ کریمہ کو منسوخ نہیں مانا کہ تجاوز کرنے کا مطلب کفار کی عورتوں اور بچوں اور بوڑھوں کو قتل نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے جس کی تفصیل انشاء اللہ احادیث مبارکہ کے بیان میں آئے گی۔

راقم کا موقف: تفاسیر کے مختلف اقوال دیکھنے کے بعد راقم نے یہ رائے قائم کی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب مکہ مکرمہ میں تھے جہاد کرنا بالکل منع تھا لیکن مدینہ طیبہ میں آنے کے بعد اس آیۃ کریمہ کے نزول سے ممانعت کے حکم میں کچھ نرمی کر دی گئی آہستہ آہستہ حکم کو مزید نرم کیا گیا لہٰذا اس آیۃ کریمہ کے منسوخ ہونے کی کوئی خاص وجہ نہیں۔

جب مسلمانوں کی تعداد قلیل تھی تو لڑائی سے مکمل منع کیا گیا تا کہ لڑائی میں زیادہ تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔ جب مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوگئی تو پھر بھی ابتدائی طور پر حکم یہ دیا کہ جو تمہارے ساتھ لڑائی کرے اس سے لڑائی کرو اور جو لڑائی نہ کرے اس سے لڑائی نہ کرو پھر حکم اور عام کر دیا گیا کہ کافروں سے جہاد کرو خواہ وہ تمہارے ساتھ لڑائی کریں یا نہ کریں۔

پھر صلح حدیبیہ کے بعد دوسرے سال عمرہ کی تیاری میں جب صحابہ کرام کے دل میں خدشہ پیدا ہوا کہ وہ حرم شریف میں ہمارے ساتھ اگر لڑائی کے درپے ہوئے تو ہم کیا کریں گے تو اسی آیۃ کریمہ سے پھر ان کو متنبہ کیا کہ حرم میں پہلے تم پر لڑائی کو منع کیا گیا ہے اگر کافر تمہارے ساتھ لڑائی کریں تو تم اپنا دفاع حرم میں بھی کر سکتے ہو۔

(ماخوذ از کبیر بتصرف)

﴿ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقَاتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقَاتِلُوْكُمْ فِيْهِ فَاِنْ قَاتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكَافِرِيْنَ ﴾

۱) ''اور کافروں کو جہاں پاؤ مارو اور انہیں نکال دو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا تھا اور ان کا فساد تو قتل سے بھی سخت ہے اور مسجد حرام کے پاس ان سے نہ لڑو جب تک وہ تم سے وہاں نہ لڑیں اور اگر تم سے لڑیں تو انہیں قتل کرو کافروں کی یہی سزا ہے''۔

۲) ''اور قتل کرو ان (کافروں) کو جہاں تم ان کو پاؤ، اور نکالو ان کو جہاں سے انہوں نے نکالا تمہیں اور فتنہ سخت ہے قتل سے اور تم نہ لڑو ان سے مسجد حرم کے پاس یہاں تک کہ وہ لڑائی کریں تمہارے ساتھ اس میں تو اگر وہ لڑائی کریں تمہارے ساتھ تو ان کو قتل کرو اسی طرح بدلہ ہے کافروں کا''۔

مختصر وضاحت:

ثقف یثقف کا لغوی معنی ہے کسی چیز میں مہارت حاصل کرنا خواہ علم کے لحاظ پر ہو یا عمل کے لحاظ پر ہو۔

'' فھو یتضمن معنی الغلبة فالمعنی حیث تمکنتم علی قتلھم ''

پھر یہ غالب آنے کے معنی کو متضمن ہے اب معنی یہ ہے جہاں بھی تم ان کو قتل کرنے پر قادر ہو وہاں ہی ان کو قتل کر دو (مظہری) اسی معنی کے مناسب زیادہ مفسرین نے ﴿ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ﴾ کا ترجمہ کیا ہے '' حیث وجدتموھم '' اور قتل کرو ان کو جہاں تم ان کو پالو۔

﴿ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ ﴾

''اور نکال دو ان کو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا''

یعنی کفار نے تمہیں مکہ سے نکالا تھا اب تم ان کفار کو مکہ سے نکال دو فتح مکہ کے بعد جن لوگوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا ان کو مکہ مکرمہ سے نکال دیا گیا۔ مکمل تفصیل تو چھبیسویں پارہ میں ہے یہاں صرف اتنا سمجھ آئے کہ حدیبیہ میں اگر چہ صلح کا معاہدہ دس سال کے لئے ہوا تھا لیکن کفار نے خود ہی عمرہ کی قضا کے بعد اس معاہدہ کے خلاف کام کرنا شروع کر دیا تھا جس کی وجہ سے انہوں نے خود ہی معاہدہ پہلے توڑ دیا تھا۔ اس لئے فتح مکہ اور کفار کو مکہ سے نکالنا مسلمانوں کی طرف سے نہ کوئی زیادتی تھی اور نہ ہی وعدہ کی خلافورزی تھی۔

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ : ''اور فتنہ سخت ہے قتل سے''۔

یعنی تم جو خوف کر رہے ہو کہ ہم احرام میں ہوں گے اور حرم کی سرزمین ہوگی تو ہمارے ساتھ اگر کافر لڑائی کریں گے تو ہم کیا کریں گے؟ تو اس پر اللہ تعالیٰ تمہیں بتا رہا ہے کہ کفار کا شرک کرنا اور تمہیں مسجد حرام سے روکنا اور طرح طرح کا فساد برپا کرنا فتنہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں فتنہ عظیم جرم ہے اور عظیم گناہ ہے بنسبت لڑائی کرنے اور ان کو قتل کرنے کے، اگر چہ تمہاری طرف سے قتل کی ابتدا تو رب تعالیٰ کو پسند نہیں لیکن اگر وہ تمہارے قتل کے درپے ہوتے ہیں۔ تو تم بھی ان کو قتل کر دینا تمہارے لئے حرم میں دفاعی جنگ کو حلال کر دیا گیا ہے۔

﴿ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ﴾

''اور تم نہ لڑو ان سے مسجد حرام کے پاس یہاں تک کہ وہ لڑائی کریں تم سے اس میں تو اگر وہ لڑائی کریں تمہارے ساتھ تو تم قتل کر دو ان کو''۔ یہاں ذکر مسجد حرام کا ہے مراد تمام حرم ہے یعنی ذکر جزء کا ہے اور مراد کل ہے جسے مجاز مرسل کہا جاتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حرم میں تم ان سے لڑائی نہ کرنا جب تک وہ تمہارے ساتھ لڑائی نہ کریں ہاں اگر وہ حرم شریف کا احترام نہ کریں اور تمہارے ساتھ لڑائی کریں تو تم بھی ان کو قتل کر دینا۔

مطلب واضح ہوا کہ حرم شریف کے احترام کا حکم تاقیامت موجود رہے گا مسلمانوں کے لئے جائز نہیں کہ وہ حرم شریف میں لڑائی کریں ہاں اگر کافر مسلمانوں کو حرم شریف میں اس لئے قتل کرنا شروع کر دیں کہ یہ حرم شریف کے احترام کی وجہ سے ہمارے ساتھ لڑائی نہیں کریں گے تو تم اس وقت بہت

شریف اور سید ھے سادے بن کر نہ رہنا بلکہ ان کو بطور دفاع حرم شریف میں ہی قتل کر دینا یہ تمہارے لئے جائز ہے۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا:

" ان ھذا البلد حرمه الله یوم خلق السماوات والارض فهو حرام بحرمة الله الی یوم القیامة وانه لن یحل القتال فیه لاحد قبلی ولم یحل لی الا ساعة من نهار فهو حرام بحرمة الله الی یوم القیامة لا یعضد شوکه ولا ینفر صیده " (رواہ البخاری ومسلم)

بیشک اللہ تعالیٰ نے اس شہر (حرم مکہ) کو زمین وآسمان کی پیدائش کے دن سے ہی محترم بنا دیا ہے اس لئے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے احترام عطا کرنے کی وجہ سے قیامت تک احترام حاصل رہے گا مجھ سے پہلے کسی کے لئے اس میں جنگ کرنا جائز نہ ہوا اور میرے لئے بھی سوائے دن کی ایک گھڑی کے اس میں جنگ حلال نہ ہوئی تا قیامت اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے احترام عطا کرنے کی وجہ احترام حاصل ہے اس کے کانٹے نہ کاٹے جائیں اور اس کے شکار کو نہ بھگایا جائے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا " لا یحل لاحدکم ان یحمل بمکة السلاح " (رواہ مسلم) تم میں سے کسی کے لئے حلال نہیں کہ وہ مکہ میں ہتھیار اٹھائے۔

وَكَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكَافِرِيْنَ: "اور اسی طرح بدلہ ہے کافروں کا"

یعنی دنیا میں ان کی سزا اور ان کا بدلہ یہ ہے کہ جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا وہاں سے تم ان کافروں کو نکال دو اور اگر وہ تمہارے ساتھ حرم میں اور شہر حرام (یعنی ذیقعد جس میں عمرہ کو قضا کیا جا رہا تھا) میں اور تمہارے احرام کی حالت میں لڑائی کریں تو تم بھی ان کو قتل کر دو اور آخرت میں ان کو دردناک عذاب دیا جائے گا۔

(از جلالین وصاوی ومظہری)

☆☆☆☆☆

﴿ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴾

۱) "پھر اگر وہ باز رہیں تو بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے"۔

۲) "پھر اگر وہ رک جائیں تو بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے"۔

یعنی اگر وہ کافر کفر و شرک سے اور لڑائی کرنے سے اور فتنہ و فساد سے رک جائیں اور اسلام لے آئیں اور توبہ کرلیں تو اللہ تعالیٰ ان کے پہلے جرموں کو بخش دے گا جب وہ ایمان لے آئے تو اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے بن جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے گا۔ (از جلالین ومظہری)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

اِنْتَهَوْا اصل میں " انتھیوا " ہے یاء متحرک ماقبل فتح ہونے کی وجہ سے یاء کو الف سے تبدیل کردیا الف التقاء ساکنین کی وجہ سے گرگیا تو " انتھوا " رہ گیا۔ (از صاوی)

﴿ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَكُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَاعُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِیْنَ ﴾

۱) "اور ان سے لڑو یہاں تک کہ کوئی فتنہ نہ رہے اور ایک اللہ کی پوجا ہو پھر اگر وہ باز آئیں تو زیادتی نہیں مگر ظالموں پر۔

۲) "اور لڑائی کرو ان سے یہاں تک کہ نہ رہے فتنہ اور ہو جائے دین خالص (اللہ) کے لئے پھر اگر وہ رک جائیں تو زیادتی نہیں مگر ظالموں پر"

یعنی مشرکوں سے جنگ کرو یہاں تک کہ شرک اور فتنہ و فساد ختم ہو جائے اور مکہ مکرمہ میں دین خالص اللہ تعالیٰ کیلئے ہو جائے عبادت اور طاعت صرف رب تعالیٰ کو ہو اسکے غیر کی عبادت نہ کی جائے۔

☆ "عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ امرت ان اقاتل الناس حتی یشهدوا ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله ویقیموا الصلوة ویؤتوا الزكوة فاذا فعلوا ذلك عصموا منی دماء هم واموالهم الا بحق الاسلام وحسابهم علی الله تعالیٰ" (بخاری ومسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں (کافروں) سے لڑائی کروں یہاں تک کہ وہ شہادت دیں کہ اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں اور بیشک محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں۔ تو جب یہ کام وہ کرلیں تو انہوں نے اپنے خونوں اور مالوں کو مجھ سے بچالیا سوائے حقوق اسلامیہ کے (کی وجہ سے جوان پر بطور قصاص قتل لازم آئے یا کسی کے مال کے بدلے مال لازم آئے) اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ پر ہے۔

اگر وہ لوگ شرک اور لڑائی اور فتنہ وفساد سے رک جائیں تو ان پر کوئی زیادتی نہیں یعنی ان کو قتل نہ کیا جائے اور نہ ہی ان کو قید کیا جائے ہاں البتہ ان میں سے جو شرک پر قائم رہیں تو ان کو قتل کر دیا جائے۔

(از مظہری)

﴿ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴾

۱) ”ماہ حرام کے بدلے ماہ حرام اور ادب کے بدلے ادب ہے جو تم پر زیادتی کرے اس پر زیادتی کرو اتنی ہی جتنی اس نے کی اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ ڈر والوں کیساتھ ہے“۔

۲) ”عزت والا مہینہ بدلے عزت والے مہینہ کے اور حرمت کے بدلے حرمت تو جو تم پر زیادتی کرے تم اس سے انتقام لو اتنا جتنی اس نے زیادتی کی ہے تم پر اور ڈرو اللہ سے اور جان لو بیشک اللہ ساتھ ہے تقوی رکھنے والوں کے“۔

مختصر وضاحت : حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمہ اللہ نے ﴿ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ ﴾ کی تفسیر میں یوں بیان فرمایا ”جب گزشتہ سال ذی القعدہ 6ء میں مشرکین عرب نے ماہ حرام کی حرمت وادب کا لحاظ نہ رکھا اور تمہیں ادائے عمرہ سے روکا تو بے حرمتی ان سے واقع ہوئی اور اس کے بدلے بتوفیق الٰہی 7ء کے ذی القعدہ میں تمہیں موقع ملا کہ تم عمرہ قضاء کو ادا کرلو۔ (خزائن العرفان)

تاہم جلالین میں یوں ذکر ہے:

﴿ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ ﴾ المحرم مقابل ﴿ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ ﴾ فكما قاتلوكم فيه فاقتلوهم فی مثله رد لا ستعظام المسلمين ذلك "

حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینہ کے مقابل ہے اگر وہ حرمت والے مہینہ کا لحاظ نہ کریں تمہارے ساتھ لڑائی کریں تو تم بھی اسی طرح ان سے لڑائی کرو اور ان کو قتل کردو۔ یہ آیۃ کریمہ مسلمانوں کے اس خدشہ کو دور کرنے کے لئے نازل ہوئی جو ان کو لاحق تھا کہ حرمت والے مہینہ اور حرم میں ان سے ہم کیسے لڑائی کریں گے؟

" ﴿ وَالْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ ﴾ ای متى حصل انتهاک من احد لحرمة آخر سقطت حرمته فيقتص له منه "

عزت کے بدلے عزت کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک شخص دوسرے کی حرمت وعزت کا لحاظ رکھے تو یہ بھی اس کا لحاظ رکھے اور اگر ایک شخص دوسرے کی عزت کا لحاظ نہ رکھے تو یہ بھی اس کی عزت کا پاس چھوڑ دے۔ (صاوی)

﴿ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ﴾ جو شخص تم پر تجاوز کرے زیادتی کرے یعنی حد سے تجاوز کر جائے ﴿فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ﴾ ای انتقموا منه " تو تم اس سے انتقام لو انتقام لینے اور ان سے قتال (لڑائی) کرنے کو ﴿ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ ﴾ سے تعبیر کردیا اس کی وجہ مشاکلت ہے ان کی زیادتی کے بدلے کو زیادتی کہہ دیا چونکہ بظاہر شکل ایک جیسی ہوگی۔

﴿ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ﴾ سے وہی مسئلہ بطور تاکید ذکر فرمایا جو ﴿ اَلْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ ﴾ میں ذکر فرمایا کہ جب وہ تم پر زیادتی کریں تو تم بھی ان کی زیادتی کی طرح ان سے انتقام لے لو۔

﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ﴾ اور ڈرو اللہ سے یعنی اللہ تعالیٰ سے تقوی حاصل کرو تقوی حاصل ہونا درحقیقت اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے اپنے بندوں پر اس لئے اپنے آپ کو اس رحمت کا مستحق بناؤ اس سے اپنے آپ کو محروم نہ کرو۔

﴿ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ اور جان لو بیشک اللہ تعالیٰ تقویٰ کرنے والوں کے ساتھ ہے یعنی خصوصی معیت ان کو حاصل ہے جس کی وجہ سے خصوصی امداد ان کو حاصل ہے ورنہ اللہ تعالیٰ اپنے علم وتصرف کے لحاظ سے ہر انسان کے ساتھ ہے خواہ وہ مومن ہو یا کافر۔ (از جلالین وصاوی)

آیات جہاد کے متعلق تفصیلی بحث:

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ ''اور لڑائی کرو اللہ کی راہ میں''

اس سے واضح ہوا کہ وہی جہاد باعث اجر وثواب ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی رضاء پائی جائے اور اللہ تعالیٰ کے دین کی بلندی کے لئے جہاد کرے " **وقال ابن الهمام وهو دعوتهم الى الدين الحق** " جہاد کا مقصد ہی دین حق کی طرف دعوت دینا ہے۔ (مرقاۃ ج ۷ ص ۲۶۴)

☆ " **وعن ابی موسی قال جاء رجل الی النبی ﷺ فقال الرجل يقاتل للمغنم والرجل يقاتل للذكر والرجل يقاتل ليرى مكانه فمن في سبيل الله قال من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا فهو في سبيل الله** " (بخاری ومسلم، مشکوۃ کتاب الجهاد)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا کہ ایک شخص مال غنیمت حاصل کرنے کے لئے جہاد کرتا ہے اور ایک شخص جہاد کرتا ہے کہ اس کا چرچا ہو اور ایک شخص جہاد کرتا ہے کہ اس کی شجاعت وبہادری کو لوگ دیکھیں ان میں سے کس شخص کا جہاد اللہ کی راہ میں ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، جس نے جہاد اللہ تعالیٰ کے کلمہ کی بلندی کیلئے کیا، وہی جہاد اللہ کی راہ میں جہاد ہے،،

وضاحت حدیث: " الرجل " اس حدیث میں جتنی مرتبہ استعمال ہوا ہے وہ شخص کے معنی میں ہے سوائے پہلی مرتبہ کے "جاء رجل" میں ایک مرد آیا، اس کا معنی ہے اگرچہ راقم نے بامحاورہ معنی شخص سے ہی کیا ہے " **فقال الرجل يقاتل للمغنم** " اس مقام میں " قال " کا فاعل " هو " ضمیر مقدر ہے۔ اور '' الرجل '' سوالیہ جملہ کا مبتداء ہے عبارت اس طرح ہوگی:

" (فقال) ذلک الرجل (الرجل) ای جنس الرجل بمعنی الشخص یقاتل للمغنم "

یعنی وہ شخص جو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے کہا (پوچھا) کہ ایک شخص مال غنیمت کے لئے جہاد کرتا ہے: (والرجل) الآخر (یقاتل للذکر) ایک اور شخص جہاد کرتا ہے کہ اس کا چرچا ہو اس مقام میں "ذکر" کا معنی ہے آواز، شہرت، دکھلاوا، لوگوں کو سنانا یعنی اس کے جہاد کرنے میں مقصد لوگوں کو اپنی بہادری دکھانی اور اپنا چرچا کرنا مقصود ہوتا ہے کہ لوگ میری بہادری کی تعریف کریں:

" ﴿ والرجل ﴾ الآخر (یقاتل لیری) بصیغة المجھول ای لیعلم او یبصر (مکانه) بالرفع ای مرتبته فی الشجاعة "

ایک اور شخص جہاد کرتا ہے کہ اس کا شجاعت و بہادری میں مرتبہ لوگوں کو دکھایا جائے اور ان کو معلوم ہو جائے کہ میں کتنا بہادر ہوں ان میں سے کس شخص کا جہاد اللہ کی راہ میں شمار ہوگا؟ نبی کریم ﷺ نے نہایت حکیمانہ جواب دیا:

" من قاتل لتکون کلمة الله (ای کلمة التوحید وھی لا اله الا الله) فھو فی سبیل الله "

جو شخص اللہ تعالیٰ کے کلمہ (یعنی کلمہ توحید) کی بلندی کے لئے جہاد کرتا ہے اسی کا جہاد اللہ کی راہ میں شمار ہوگا۔ کیا خوب جواب ہے کہ جہاد کرنے میں مقصد اللہ تعالیٰ کی رضاء حاصل کرنی ہو اور اللہ تعالیٰ کے دین کی بلندی مقصود ہو تو وہی جہاد اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد ہوگا۔ نیت صرف مال غنیمت کی نہ ہو کیونکہ مال غنیمت خود ہی حاصل ہو جاتا ہے اور اسی طرح نیت صرف اپنا چرچا اور اپنی بہادری کا مرتبہ نہ دکھانا ہو بلکہ صرف دین کی بلندی مقصود ہو تو یہ چیزیں خود بخود حاصل ہو جائیں گی۔ یہ بھی خیال رہے کہ جنت کے حصول کے لئے جہاد اللہ کی راہ میں ہی شمار ہوگا کیونکہ اس میں مقصد ہی اللہ کے دین کی بلندی ہوگی جس پر جنت کا حاصل ہونا مرتب ہوگا اس لئے نبی کریم ﷺ نے جہاد میں شرکت کے لئے فرمایا" قوموا الی جنة " جنت کی طرف جانے کے لئے کھڑے ہو جاؤ "فالمراد بھما واحدو المآل متحد " اس لئے جنت حاصل ہونے کے ارادہ سے اور دین کی بلندی کے لئے جہاد کرنے سے ایک ہی چیز مراد ہے اور مقصد ایک ہی ہے یہ دونوں چیزیں متحد ہیں علیحدہ علیحدہ نہیں۔ (از مرقاۃ ج ۷ ص ۲۸۴)

☆ " وعن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ عینان لا تمسهما النار عین بکت من خشیة الله وعین باتت تحرس فی سبیل الله "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو آنکھوں کو آگ مس نہیں کرے گی ایک وہ آنکھ جو اللہ تعالیٰ کے ڈر کی وجہ سے روئی اور دوسری وہ آنکھ جس نے اللہ کی راہ میں رات نگہبانی کرتے ہوئے گزاری۔ (ترمذی، مشکوۃ باب الجہاد)

پہلی آنکھ نفس سے جہاد کرنے والوں کی مراد ہے جو گناہوں سے توبہ کرتے ہیں عبادت میں رو روکر رات گزار دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا خوف کسی کو بھی حاصل ہو اور روئے خواہ عالم ہو یا جاہل ہے اس کی رونے والی آنکھ سے بھی مراد اس شخص کی ذات ہے کہ وہ شخص جہنم کی آگ سے محفوظ رہے گا لیکن عالم کو یہ مرتبہ زیادہ حاصل ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی شان میں بیان فرمایا:

﴿ انما یخشی الله من عباده العلماء ﴾

''اللہ تعالیٰ سے کامل ڈرنے والے اس کے بندوں سے صرف علماء ہی ہیں''۔

اور دوسری آنکھ، یعنی دوسرا شخص وہ مراد ہے جو جہاد میں دشمن کے سامنے کھڑا ہو اور رات نگہبانی کرتے ہوئے گزار دے یعنی صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء مقصود ہو اسے بھی جہنم کی آگ مس نہیں کرے گی۔

علامہ غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" الخوف سوط الله تعالیٰ یسوق به عباده الی المواظبة علی العلم والعمل لینا لوا بهما رتبة القرب الی الله تعالیٰ "

خوف اللہ تعالیٰ کا کوڑا ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو علم و عمل پر قائم رکھتا ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر سکیں۔ جس کو علم و عمل حاصل ہوگا اس کو ہی حقیقی خوف ہوگا۔ اسی خوف سے رونے والی آنکھ جہنم کو آگ سے محفوظ رہے گی۔ مندرجہ بالا حدیث سے بھی واضح ہوا کہ جہاد ہی اللہ کی راہ میں شمار ہوگا جس میں اللہ تعالیٰ کی رضاء حاصل کرنی مقصود ہوگی۔

☆ " وعن ابی هریرة ان رجلا قال یا رسول الله رجل یرید الجهاد فی سبیل الله وهو یبتغی عرضا من عرض الدنیا فقال النبی ﷺ لا اجر له "

(رواه ابو داؤد، مشکوة کتاب الجهاد)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ (اس شخص کا کیا حکم ہے) جو شخص اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے لیکن وہ دنیا کے سامان میں سے کسی چیز کو حاصل کرنا چاہتا ہو تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اسے کوئی اجر حاصل نہیں۔

وضاحت حدیث:

" عرض (بفتح الراء) ما کان من مال قل او کثر ، وبالسکون المتاع "

یعنی "عرض" کی راء پر جب زبر ہو تو معنی ہوگا مال خواہ قلیل ہو یا کثیر۔ اور جب راء ساکن ہو تو اس کا معنی سامان ہوتا ہے۔ درہم اور دینار کے بغیر ہر قسم کے مال کو "عرض" کہا جاتا ہے۔ مطلب واضح ہے کہ سائل نے یہ پوچھا کہ اگر کوئی شخص مال حاصل کرنے کی غرض سے جہاد کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟ تو آپ نے فرمایا اسے کوئی اجر حاصل نہیں۔

یہ حکم اس وقت ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے جہاد نہ کرے بلکہ صرف جہاد نہ کرے بلکہ صرف مال و دولت حاصل کرنے کے لئے جہاد کرے۔

" واما اذا غزا للہ وقصد حصول الغنیمۃ فلا شک ان لہ الاجر "

لیکن جب کوئی شخص جہاد تو صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے کرتا ہے البتہ مال غنیمت حاصل ہونے کی بھی نیت کر لے تو اسے یقیناً اجر حاصل ہونا ہے۔ ہاں البتہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضاء کی نیت کرے تو اسے ثواب زیادہ حاصل ہوگا۔

☆ " وعن معاذ قال قال رسول اللہ ﷺ الغز وغزوان فاما من ابتغی وجہ اللہ واطاع الامام وانفق الکریمۃ وياسر الشریک واجتنب الفساد فان نومہ ونبھہ اجر کلہ واما من غزا فخرا ورياء وسمعۃ وعصی الامام وافسد فی الارض فانہ لم یرجع بالکفاف "

(رواہ مالک وابوداود والنسائی ، مشکوۃ باب الجہاد)

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جہاد کی دو قسمیں ہیں ایک یہ ہے کہ جہاد میں اللہ تعالیٰ کی رضاء کی طلب پائی جائے اور امام کی اطاعت کرے اور اپنا پسندیدہ مال خرچ کرے اور اپنے ساتھ شریک (دوست) کے لئے آسانی پیدا کرے اور فساد سے اجتناب کرے بیشک

اس کا سونا اور جاگنا سب ہی باعث ثواب ہیں (دوسری قسم جہاد کی یہ ہے) جس شخص نے جہاد کیا فخر کے طور پر دکھلاوا کے لئے اور چرچا کے لئے اور امام کی نافرمانی کی اور زمین میں فساد برپا کیا تو اسے کوئی ثواب حاصل نہیں۔

" فانه لم يرجع بالكفاف ، قال القاضى اى لم يرجع بالثواب ماخوذ من مكفاف الشئى " (مرقاة ج ٧ ص ٣٠٢)

(ترجمہ ذکر کر دیا گیا)۔

☆ " عن عبد الله بن عمرو انه قال يا رسول الله اخبرنى عن الجهاد فقال يا عبد الله بن عمرو ان قاتلت صابرا محتسبا بعثك الله صابرا محتسبا وان قاتلت مرائيا مكاثرا بعثك الله مرائيا مكاثرا يا عبد الله بن عمرو على اى حال قاتلت او قتلت بعثك الله على تلك الحال " (رواه ابو داؤد ، مشكوة باب الجهاد)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے مروی ہے کہ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے جہاد کے متعلق خبر دیں آپ نے فرمایا اے عبداللہ بن عمرو اگر تم نے جہاد کیا صبر سے اور ثواب کی امید سے اللہ تعالیٰ سے خلوص رکھتے ہوئے تو اللہ تعالیٰ تمہیں صابر و مخلص اٹھائے گا اور اگر تم نے جہاد کیا دکھلاوے اور کثرت پر فخر کرتے ہوئے تو اللہ تعالیٰ تمہیں ریاء کار اور کثرت پر فخر کے حال میں ہی اٹھائے گا۔ اے عبداللہ بن عمرو جس حال میں تم جہاد کرو گے اس حال میں تمہیں اللہ تعالیٰ اٹھائے گا۔

وضاحت حدیث:

جہاد کے متعلق سوال کا یہ مطلب تھا کہ آپ بتائیں کہ کونسا وہ جہاد ہے جو افضل ہے اور باعث ثواب ہے اور مقبول ہے اسی سے غیر مقبول خود بخود سمجھ آ جائے گا۔ " صابرا محتسبا " صابر کا معنی صبر کرنے والا " محتسبا خالصا لله تعالىٰ " اور محتسب کا معنی اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے خلوص رکھنے والا یعنی جہاد کرنے والا جب صبر و خلوص سے جہاد کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے صبر و خلوص کی حالت میں ہی اٹھائے گا۔

خیال رہے کہ اگرچہ دونوں مقاموں میں " صابرا محتسبا " نکرہ ذکر ہے لیکن پہلے مقام پر

تنوین تقلیل کے لئے ہے دوسرے مقام پر تنوین تکثیر و تعظیم کے لئے ہے۔اب مطلب یہ ہوا کہ جہاد کرنے والے نے معمولی صبر و خلوص سے بھی جہاد کیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے " انہ لہ اجرا وثوابا لا یقادر قدرہ " اسے اتنا اجر و ثواب حاصل ہوگا کہ اس کا اندازہ نہیں کر سکے گا۔اور اللہ تعالیٰ اسے کامل صابر کے درجے میں اٹھائے گا اور بے حساب اجر اسے عطا فرمائے گا۔اور اسے کامل اخلاص کے درجہ میں اٹھائے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہوگا اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوگا۔

" ورضوان من الله اکبر " اللہ تعالیٰ کی معمولی رضامندی بہت بڑی چیز ہے۔تمام انعام واکرام اسی میں موجود ہوں گے۔روایت میں آتا ہے " کما تعیشون تموتون و کما تموتون تحشرون " جس طرح تم زندگی گزارو گے اس طرح تمہاری موت آئے گی اور جس طرح تم پر موت آئے گی اس طرح تمہیں اٹھایا جائے گا۔

" وان قاتلت مرائیا مکاثرا بعثک الله مرائیا مکاثرا "

مرائیا، کا معنی واضح ہے دکھلاوا کرنا، یعنی جو شخص جہاد دکھلاوے کی غرض سے کرے گا وہ اجر وثواب سے محروم ہوگا کیونکہ اسے اٹھایا ہی اس حال میں جائے گا کہ سب کو معلوم ہوگا کہ یہ ریاء کاری کرنے والا شخص ہے۔خیال رہے جو عمل بھی ریاء کاری سے ہوگا اس میں اجر وثواب حاصل نہیں ہوگا۔

﴿ التکاثر ﴾ کے معنی میں وسعت ہے " التکاثر التباری فی الکثرة والتباهی بها " کثرت میں مقابلہ کرنا اور کثرت میں فخر کرنا ﴿ التکاثر ﴾ کہلاتا ہے کبھی کوئی شخص جہاد کرتا ہے اس غرض سے کہ مال غنیمت حاصل ہوگا اور مال میں زیادتی ہوگی۔اور کبھی کوئی شخص جہاد کرتا ہے اس پر فخر کرتے ہوئے کہ میرے پاس لشکر زیادہ ہے مددگار زیادہ ہیں مجھے شجاعت زیادہ حاصل ہے اس غرض سے کیا ہوا جہاد اللہ تعالیٰ کے کلمہ اور دین کی بلندی کے لئے نہیں ہوگا اور نہ ہی اس میں کوئی اجر وثواب حاصل ہوگا۔ (از مرقاۃ ج ۷ ص ۳۰۳، ۳۰۴)

اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے مطلقاً ایک ضابطہ بیان کر دیا کہ جو شخص جس نیت سے جہاد کرے گا اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ اسے اٹھائے گا (واضح ہوا کہ جہاد وہی اللہ تعالیٰ کے حضور معتبر ہے جو اس کی رضاء کے لئے ہو)

جہاد تدریجاً فرض ہوا: اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو جہاد کا حکم تدریجی طور پر بالترتیب دیا ہے:

پہلا حکم: "وقد کان ﷺ ماموراً اولاً بالتبلیغ والاعراض (فاصدع بما تؤمر واعرض عن المشرکین"

نبی کریم ﷺ کو پہلے صرف تبلیغ کرنے کا حکم تھا رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿یا ایھا الرسل بلغ ما انزل الیک من ربک﴾

''اے رسول تبلیغ فرمادو اس کی جو تمہاری طرف نازل ہوا تمہارے رب کی طرف سے''

اور ارشاد فرمایا:

﴿فاصدع بما تؤمروا عرض عن المشرکین"

''تو علانیہ کہہ دو جس بات کا تمہیں حکم ہے اور مشرکوں سے منہ پھیرلو''

یعنی ابتدائی طور پر مشرکوں کی طرف سے ایذاء اور ملامت کرنے کا جواب نہ دینے کا حکم تھا کہ تم درگزر کرو اور ان کو معاف کردو علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے "الاتقان" میں بیان فرمایا ہے کہ ایک سو چوبیس آیات قرآن پاک میں وہ ہیں جن میں درگزر کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ کافروں کی زیادتیاں برداشت کی جائیں لیکن ﴿فاقتلوھم حیث ثقفتموھم﴾ سے وہ تمام منسوخ کردی گئیں۔

دوسرا حکم: "ثم بالمجادلة بالاحسن ﴿ادع الی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلھم بالتی ھی احسن﴾ (النحل ۱۲۵)

پھر اچھے طریقہ سے جھگڑا کرنے کا حکم دیا یعنی دلائل سے ان کا رد کریں اتنی حد تک کفار سے درپے ہونے کی اجازت دی ارشاد باری تعالیٰ کا ترجمہ: ''اپنے رب کی راہ کی طرف بلاؤ پکی تدبیر اور اچھی نصیحت سے اور ان سے اس طریقہ پر بحث کرو جو سب سے بہتر ہو۔ اچھے طریقہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی آیات ودلائل سے بلاؤ اسی کو مجادلہ حسنہ (اچھا جھگڑا) کہا ہے۔

تیسرا حکم: "ثم اذن لھم بالقتال اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللہ علی نصرھم لقدیر" (الحج ۳۹)

اجازت عطا ہوئی انہیں جن سے کافر لڑتے ہیں اس بنا پر کہ ان پر ظلم کیا جائے اور بیشک اللہ ان

کی مدد کرنے پر ضرور قادر ہے۔

یعنی اس آیۃ سے مظلومین مسلمانوں کو کفار سے لڑنے کی اجازت دے دی گئی یہ نہیں فرمایا کہ ضرور لڑائی کرو بلکہ ان کی مشیت پر حکم کو موقوف کر دیا گیا چاہیں تو لڑائی کریں اور چاہیں تو درگزر سے کام لیں۔

چوتھا حکم: " ثم امروا بالقتال ان قاتلوهم ﴿ فان قاتلوكم فاقتلوهم ﴾

پھر ان کو لڑائی کرنے کا حکم دیا لیکن مشروط طور پر کہ اگر وہ تمہارے ساتھ لڑائی کریں تو تم بھی ان سے لڑائی کرو لیکن اس میں بھی ان کی زیادتی کے مطابق ان سے انتقام لینے کا حکم دیا، تجاوز نہ کرنے کا حکم دیا اور پہلے مسلمانوں کو لڑائی کرنے سے بھی منع کر دیا گیا۔

پانچواں حکم: " ثم امروا به بشرط انسلاخ الاشهر الحرم (فاذا انسلخ الاشهر الحرم فاقتلوا المشركين)

کافروں کی طرف سے لڑائی شروع کرنے پر بھی حرمت والے مہینوں (رجب، شوال، ذیقعد، ذی الحج) میں مسلمانوں کو پہلوتہی کرنے کا حکم دیا گیا البتہ حرمت والے مہینوں کے گزر جانے پر ان سے لڑائی کرنے کا حکم دیا گیا۔

چھٹا حکم: " ثم امروا به مطلقا ﴿ وقاتلوا فی سبيل الله ﴾

پھر مطلقاً حکم دے دیا گیا کہ اللہ کی راہ میں لڑائی کرو اور حکم دیا ﴿ فاقتلوهم حيث ثقفتموهم ﴾ ان کو قتل کرو جہاں ان کو پاؤ۔ لیکن اس حکم میں بھی حرم شریف میں قتل کرنے کی ممانعت جوں کی توں رہی اور اب بھی حکم یہی ہے۔

" واستقر الامر على هذا فی جميع الا زمان والاما كن سوى الحرام "

علامہ سرخسی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ اب حکم یہی ہے کہ ہر زمانہ میں اور ہر جگہ میں جہاد کرنا جائز ہے لیکن حرم شریف میں اب بھی منع ہے تاقیامت منع رہے گا جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی پہلے ذکر کر دیا گیا ہے۔

تنبیہ: " وفی الخانية ان الا فضل ان لا يبتدأ به فی الاشهر الحرم "

قاضی خان رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ افضل یہ ہے کہ مسلمان حرمت والے مہینوں میں جنگ کی ابتدا نہ کریں کفار کی طرف سے حرمت والے مہینوں میں جنگ چھیڑ دی جائے تو اس کے جواب میں جنگ ضرور کی جائے کفار کا منہ توڑ جواب دیا جائے۔ اگر مسلمان ہی حرمت والے مہینوں میں جنگ کی ابتدا کریں تو پھر بھی جائز ہے صرف بہتر یہ ہے کہ ہو سکے تو مسلمان ابتدا نہ کریں۔

ساتواں حکم: " والمراد بقوله سوى الحرم اذا لم يدخلوا فيه للقتال فلو دخلوه للقتال حل قتالهم فيه لقوله تعالىٰ ﴿حتى يقاتلوكم فيه﴾

حرم شریف میں بھی لڑائی کرنا اس وقت تک منع ہے جب تک کفار حرم میں لڑائی نہ شروع کریں اگر کفار یہ خیال کریں کہ مسلمانوں کو تو منع کیا گیا ہے حرم شریف میں لڑائی کرنے سے اس لئے ان کو حرم میں قتل کر دیا جائے تو اس صورت میں جب وہ حرم میں لڑائی شروع کریں تو مسلمانوں کو بھی حکم دیا گیا کہ تم بھی ان کو حرم میں قتل کر دو شریف بن کر قتل نہ ہوتے رہو۔ (ماخوذ از شامی بزیادۃ ج ۳ ص ۳۳۹ باب الجہاد)

مقام توجہ: اگر چہ بظاہر یہاں یہ وہم ہوتا ہے کہ کافر تو کافر ہیں وہ حرم شریف کی عزت کا لحاظ نہ کریں تو عقل کے مطابق ہے لیکن مومنوں کو ان کے جواب میں حرم شریف میں لڑائی کرنے کا حکم دینا اور بے حرمتی کرنے کی اجازت کا کیا مقصد ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ بظاہر یہ سمجھ آتا ہے کہ حرم شریف کی بے حرمتی ہے لیکن حقیقت میں حرم شریف کی عزت ہے کیونکہ اگر مومنوں کو لڑائی کرنے کی اجازت نہ دی جاتی تو کفار حرم میں خصوصاً حج کے موقع پر آئے دن مسلمانوں کو شہید ہی کرتے رہتے بار بار حرم شریف کی بے حرمتی ہوتی رہتی لیکن جب مسلمانوں کو اجازت دے دی کہ تم بھی ان کو قتل کر دو تو اب کفار کے ارادے خاک میں مل گئے وہ آرام سے (ٹک کر) بیٹھ گئے۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

جہاد فرض کفایہ:

" وهو فرض كفاية ابتداؤه " جہاد کی ابتداء فرض کفایہ ہے۔ یعنی جب بعض حضرات کے جہاد کرنے سے مقصد حاصل ہو جائے تو فرض کفایہ ہے اگر بعض لوگ جہاد قائم کر لیں تو دوسرے حضرات

سے ساقط ہو جائے گا کوئی گنہگار نہیں ہوگا:

" والاثموا بترکه ای اثم الکل من المکلفین "

اگر کوئی بھی جہاد قائم نہ کرے تو تمام گنہگار ہو جائیں گے۔

" وایاک ان تتوهم ان فرضیته تسقط عن اهل الهند بقیام اهل الروم

بل یفرض علی الاقرب فالاقرب من العدو "

تم یہ وہم نہ کرنا کہ ہندوستان کے لوگ جہاد قائم کر دیں تو روم والوں سے جہاد ساقط ہو جائے گا ایسا نہیں بلکہ جو مسلمان کافروں کے قریب ہوں گے ان پر جہاد کرنا فرض کفایہ ہے۔ لہذا واضح ہو کہ ایران پر جہاد علیحدہ فرض کفایہ ہے اور پاکستان پر علیحدہ اور ترکی پر علیحدہ تمام ممالک کا یہی ضابطہ ہے۔

ماں، باپ کی خدمت اور جہاد:

جب تک جہاد فرض کفایہ کے درجہ میں ہوگا اس وقت تک ماں باپ کی اجازت کے بغیر جہاد کا حکم یہ ہے:

"لا یفرض علی صبی وبالغ له ابوان او احدهما لان طاعتهما فرض عین "

بچہ خواہ نابالغ ہو یا بالغ ہو جب اس کے باپ اور ماں موجود ہیں یا دونوں میں سے کوئی ایک موجود ہے تو اس پر جہاد فرض ہی نہیں بلکہ یہ اپنے ماں باپ کی خدمت کرے کیونکہ ان کی اطاعت اس پر فرض عین ہے۔ (درمختار)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

" لان طاعتهما فرض عین " کے تحت شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تجنیس میں ذکر ہے "والجهاد لم یتعین فکان مراعاة فرض العین اولی " ماں باپ کی خدمت فرض عین ہے اور جہاد اس پر معین نہیں، یعنی جہاد اس پر فرض عین نہیں لہذا فرض عین کی رعایت کرنا اولیٰ (بہتر) ہے۔

علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ نے فرمایا ماں باپ جب خدمت گزاری کے محتاج ہوں تو ان کو چھوڑ کر جہاد میں جانا" انه یحرم " بیشک حرام ہے فتح القدیر کی اس وضاحت (کہ حرام ہے) پر صاحب

البحرالرائق نے اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ حرام کہنا صحیح نہیں بلکہ " **كراهة الخروج بلا اذنهما** " ماں باپ کی اجازت کے بغیر جہاد پر جانا مکروہ ہے۔شامی فرماتے ہیں کہ صاحب البحرالرائق کا قول غلط ہے ان کو غلطی تجنیس کے قول ''اولیٰ'' سے لگی ہے شامی اپنا موقف یوں بیان فرماتے ہیں۔

" فان الاولى هنا بمعنى الاقوى والارجح اى ان الاقوى مراعاة فرض العين لقوته ورحجانه على فرض الكفاية فحيث ثبت انه فرض كان خلافه حراما "

تجنیس میں جو لفظ " اولى " ذکر ہے اس کا مطلب ''زیادہ قوی ہونا اور راجح ہونا'' ہے مطلب یہ ہے کہ ماں باپ کی خدمت فرض عین ہے جس کی رعایت بنسبت فرض کفایہ کے زیادہ قوی اور زیادہ راجح ہے اس لئے یہی ثابت ہے کہ ماں باپ کی خدمت فرض عین ہے اسے ترک کرنا حرام ہے۔

(شامی ج ۳ ص ۲۴۱)

☆ بخاری شریف میں ہے ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جہاد کی اجازت طلب کی آپ نے فرمایا " **احى والداك قال نعم قال ففيهما فجاهد** " کیا تمہارے والدین زندہ ہیں؟ تو اس نے عرض کیا ہاں (یارسول اللہ والدین زندہ ہیں) تو آپ نے فرمایا ان دونوں میں جہاد کرو (یعنی ان کی فرمانبرداری اور ان کی خدمت میں کوشش کرو یہی تمہارا جہاد ہے)۔

☆ " **عن ابن عباس بن مرداس انه قال يا رسول الله انى اريد الجهاد قال الك ام قال نعم قال الزم امك فان الجنة تحت رجل امك** "

ابن عباس بن مرداس فرماتے ہیں کہ انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ بیشک میں جہاد کا ارادہ رکھتا ہوں تو آپ نے فرمایا کیا تمہاری ماں ہے؟ تو انہوں نے عرض کیا ہاں (ماں تو ہے) آپ نے فرمایا ماں کو لازم پکڑو (یعنی ماں کی خدمت کو لازم پکڑو) بیشک جنت تمہاری ماں کے پاؤں کے نیچے ہے۔

شامی فرماتے ہیں کہ دوسری حدیث یہ ہے'' الجنة تحت اقدام الامهات "جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے:

" اعلم تقبيل رجلها او هو كناية عن التواضع لها واطلقت الجنة على

سبب دخولها"

حدیث پاک کا ایک معنی یہ ہوسکتا ہے ماں کے قدموں کو چومنا جنت میں جانے کا ذریعہ ہے اور دوسرا معنی یہ ہوسکتا ہے کہ ماں سے عاجزانہ طور پر پیش آنا جنت میں داخل ہونے کا سبب ہے اس سے پتہ چل گیا کہ ماں سے سخت کلامی، بیہودگی انسان کو جنت سے دور رکھے گی کاش کہ نوجوانوں کو یہ مسئلہ سمجھ آجائے۔ (از در مختار و شامی بزیادۃ ج ۳ ص ۲۴۱)

فائدہ : "وفیہ لا یحل سفر فیہ خطر الا باذنھما وما لا خطر فیہ یحل بلا اذن ومنہ السفر فی طلب العلم"

اسی بحث سے یہ مسئلہ بھی ثابت ہوگیا کہ تجارت، نوکری، حج اور عمرہ وغیرہ کے لئے سفر ماں باپ کی اجازت کے بغیر جائز ہے جب کہ اس میں خطرہ نہ ہو اگر اس کے ضائع ہوجانے یعنی دشمنوں کے قتل کردینے کا خطرہ ہو تو ماں باپ کو حق پہنچتا ہے کہ اولاد کو روک دیں اس خطرہ والی صورت میں ماں باپ کی اجازت کے بغیر جانا جائز نہیں ہوگا۔

خیال رہے کہ جب تک حج میں جانا کفار وغیرہ کے حملہ اور قتل وغارت سے خالی نہ ہو اس وقت تک حج فرض نہیں ہوتا۔ یہی حکم علم کی طلب میں سفر کا بھی ہے کہ اگر خطرہ نہ ہو اور ماں باپ خدمت گزاری کے محتاج نہیں تو علم حاصل کرنے کے لئے سفر کرے اور اگر ایسے علاقہ میں جانے کا ارادہ ہو جہاں کفار، فساق اور بدمعاش لوگوں کا خطرہ ہو کہ وہ جان سے مارڈالیں گے اعضاء کاٹ دیں گے تو وہاں ماں باپ کی اجازت کے بغیر نہ جائے بلکہ راقم کے نزدیک وہاں سرے سے جانا ہی منع ہے۔

(ماخوذ از درمختار، و شامی ج ۳ ص ۲۴۱)

عورت اور غلام اور معذور لوگوں کا جہاد میں حکم:

جب تک جہاد فرض کفایہ کے درجہ میں ہو اس وقت عورت جہاد کے لئے نہ جائے کیونکہ خاوند کا حق خدمت فوت ہوگا ہاں اگر خاوند اجازت دے اور ضرورت محسوس کرے تو کسی حد تک جواز ہوگا۔ (کچھ مزید تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی) غلام مولی کی اجازت کے بغیر جہاد میں شریک نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کے جہاد میں جانے سے مولی کی خدمتگزاری کا حق ضائع ہوتا ہے۔ معذور لوگ نابینا، لنگڑا اور ہاتھ پاؤں وغیرہ کٹے ہوئے ہوں ایسے لوگوں پر جہاد فرض نہیں۔ (درمختار، شامی)

مسئلہ : " ومدیون بغیر اذن غریمه " مقروض شخص قرض خواہ کی اجازت کے بغیر جہاد میں شریک نہیں ہوسکتا فقہاء کرام کی مختلف عبارات سے جامع مسئلہ یہ ہے کہ اگر ایک شخص پر قرض ادا کرنا اب لازم ہو تو وہ بغیر قرض خواہ کی اجازت کے جہاد میں نہیں جاسکتا اجازت سے اسوقت جاسکتا ہے جب صحیح لوٹنے کی غالب امید ہو یا قرض خواہ اس کی شہادت پر قرض معاف کرنے کا وعدہ کرے یا اتنا ترکہ ہو کہ قرض ادا کیا جاسکے گا۔ اگر قرض ادا کرنے میں وقت موجود ہے اور اسکے زندہ سلامت لوٹنے کی بھی امید ہے یا ترکہ سے قرض ادا کرنے کی صلاحیت ہے تو قرض خواہ کی اجازت کے بغیر جانا جائز ہے

فائدہ : " وعالم لیس فی البلدة افقه فلیس له الغز وخوف ضیاعهم "

اگر ایک شخص عالم فقہی مسائل پر عبور رکھتا ہو اس شہر میں اس سے بڑھ کر کوئی فقہ کا عالم نہیں تو جب تک جہاد فرض کفایہ کے درجہ میں ہے وہ جہاد میں شریک نہ ہو کیونکہ اس کے شہید ہونے سے شہر کے تمام لوگ فقہی مسائل سے محروم ہو کر ضائع ہو جائیں گے۔ (درمختار)

جہاد فرض عین کب ہے؟

" وفرض عین ان هجم العدو فیخرج الکل ولا بلا اذن ویاثم الزوج ونحوه بالمنع "

جب کفار اچانک حملہ کر دیں اور ان کا ہجوم ہو کثیر تعداد میں ہوں تو اس وقت جہاد فرض عین ہو جاتا ہے یعنی ہر شخص پر جہاد فرض ہو جاتا ہے بغیر اجازت کے جہاد کے لئے نکل پڑیں۔ جب جہاد فرض

عین ہوتو خاوند اپنی زوجہ کو منع کرے یا مالک اپنے غلام کو منع کرے یا والدین اپنی اولاد کو منع کریں تو وہ گنہگار ہوں گے۔

ہاں البتہ یہ خیال رہے کہ جہاد فرض عین تدریجاً (درجہ بدرجہ) ہوگا یعنی پہلے ان لوگوں پر فرض عین ہوگا جو قریب ہوں گے اگر قریب والے عاجز ہو جائیں کفار کا دفاع نہ کرسکیں یا سست ہو جائیں کفار کا مقابلہ نہ کریں تو جو ان کے قریب ہوں گے ان پر جہاد فرض عین ہوگا اسی طرح اگر یہ عاجز آ جائیں یا اپنی کاہلی (سستی) کی وجہ سے جہاد میں شریک نہ ہوں تو پھر جو ان کے قریب ہوں ان پر جہاد فرض ہو جائے گا۔

"حتی یفترض علی ھذا التدریج علی کل المسلمین شرقا وغربا"

یہاں تک کہ اسی طرح درجہ بدرجہ تمام مسلمانوں پر جہاد فرض عین ہو جائے گا یعنی مشرق ومغرب (شمال وجنوب) میں بسنے والے تمام مسلمانوں پر جہاد فرض عین ہو جائے گا۔

فائدہ : "ویجب ان لا یأثم من عزم علی الخروج وقعودہ لعدم خروج الناس وتکاسلھم او قعود السلطان او منعہ"

جب جہاد فرض عین ہو جائے تو ایک شخص جہاد میں جانے کا پختہ ارادہ رکھتا ہے لیکن اور کوئی جہاد کے لئے نہیں نکلتا اس لئے کہ لوگ ست ہو گئے ہیں یا مسلمانوں کا بادشاہ ہی ڈر کر بیٹھ جائے یا مسلمانوں کو جہاد سے منع کرے تو ایسی صورت میں وہ شخص گنہگار ہو گا جو جہاد کا مصمم ارادہ (پکا ارادہ) رکھتا ہے۔

تنبیہ : "وفی البزازیۃ مسلمۃ سبیت بالمشرق وجب علی اھل المغرب تخلیصھا من الاسر"

فتاویٰ بزازیہ میں مذکور ہے کہ اگر مسلمان عورت مسرق میں کفار کی قید میں آ جائے تو مغرب والوں پر لازم ہے کہ اسے قید سے آزاد کروائیں۔

محمد بن قاسم نے مغرب میں ایک مظلوم عورت کی آواز مشرق سے سنی تو عرب کی سرزمین سے سندھ میں آ گیا۔ کہاں محمد بن قسم کی یاد میں مجالس کا قیام، تعریف وتقاریر اور اخبارات میں مضامین اور کہاں مسلمانوں کے خلاف نصاریٰ کا ساتھ دینا یہ دوغلہ پالیسی ایک نام نہاد مسلمان تو کرسکتا ہے حقیقی

مسلمان کا یہ شیوہ نہیں کہ وہ یہودیوں اور نصارانیوں کا ساتھی بن جائے اور مسلمانوں کو اور مسلمانوں کی عورتوں اور بچوں کو ذبح کرادے۔

مسئلہ : جس طرح جہاد کے فرض عین ہونے پر عورت بغیر خاوند کی اجازت کے اور غلام بغیر مالک کی اجازت کے اور مقروض بغیر قرض خواہ کی اجازت کے جہاد میں شریک ہوں:

" وکذلک الغلمان الذین لم یبلغوا اذا اطاقو القتال فلا بأس بان یخرجوا ویقاتلوا فی النفیر العام وان کرہ ذلک الآباء والامهات "

اسی طرح وہ بچے جو بالغ تو نہیں ہوئے لیکن جہاد کرنے کی طاقت رکھتے ہوں ان کے جہاد میں شریک ہونے میں کوئی حرج نہیں بلکہ وہ عام لڑائی میں چلے جائیں اگرچہ ان کے ماں باپ اسے ناپسند ہی کیوں نہ سمجھیں۔ (درمختار، شامی ج ۳ ص ۲۴۲)

جہاد کے لئے چندہ جمع کرنا:

" وکرہ الجعل ای اخذ المال من الناس لاجل الغزاة مع الفیئ ای مع وجود شئی فی البیت المال والفیئ هنا یعم الغنیمة والا لا لدفع الضرر الا علی بالادنی "

غازیوں کے لئے لوگوں سے مال طلب کرنا اس وقت مکروہ ہے جب مسلمانوں کے بیت المال میں مال موجود ہو خواہ مال فے ہو یا مال غنیمت ہو اور اگر بیت المال میں مال نہیں تو پھر لوگوں سے مال طلب کیا جاسکتا ہے اگرچہ لوگوں سے مال مانگنا بھی بظاہر عیب اور نقصان ہے لیکن کافروں کا مسلمانوں پر غالب آنا اور ہی باعث ضرر ہے اس لئے چندہ حاصل کرنا معمولی ضرر ہے لہذا معمولی ضرر سے کفار کا زیادہ ضرر دور کرنا ضروری ہے۔ (درمختار)

تنبیہ : جو شخص جہاد کرنے پر قادر ہو اور اس کے پاس مال بھی ہو تو اس پر جہاد فرض ہوگا اور لوگوں سے مال حاصل کرنا منع ہوگا۔ اور جو شخص خود جہاد کرنے پر تو قادر نہیں لیکن اس کے پاس مال ہے تو وہ دوسرے شخص کی مالی معاونت کر کے جہاد پر بھیجے جس کے پاس مال نہیں اور جب بادشاہ مالی معاونت کرے تو لوگوں سے مالی تعاون حاصل نہ کیا جائے۔

اور جب ایک شخص جہاد کرنے کی طاقت رکھتا ہو خود جہاد کے لئے نہ جائے حالانکہ جہاد فرض عین ہو چکا ہے خود گھر بیٹھ جائے اور اپنی طرف سے دوسرے شخص کو مال دے کر جہاد پر بھیج دے "فلا یجوز لانه استجار علی الجهاد" تو یہ جائز نہیں کیونکہ کرایہ کا جہاد جائز نہیں ہاں یہ نہ کہے کہ تم مال لے کر میری طرف سے جہاد کرو صرف جہاد کے لئے مالی معاونیت کرے تو جائز ہے۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ غازی کو اتنا مال گھر چھوڑنا بھی ضروری ہے جو اس کی واپسی تک اس کے اہل وعیال کو کفایت کرے۔
(از شامی ج ۳ ص ۲۴۲)

مسئلہ: اگر ہم کفار کا محاصرہ کریں تو دیکھا جائے اگر ان کو دعوت اسلام پہلے نہیں دی گئی تو واجب ہے کہ ان کو دعوت اسلام دی جائے اور اگر ان کو دعوت اسلام پہلے دی جا چکی ہے تو پھر بھی مستحب ہے کہ ان کو دعوت اسلام دی جائے اگر وہ اسلام لے آئیں تو بہتر اگر وہ اسلام نہیں لائے لیکن جزیہ دینے کو قبول کرتے ہوں تو ان پر جزیہ مقرر کر دیا جائے تو پھر ہم پر لازم ہو جائے گا کہ ہم ان سے وہی انصاف کریں جو مسلمانوں سے کرتے ہیں اور ان کو وہی انصاف دلائیں جو انصاف مسلمانوں کو دلاتے ہیں ان کے مال اور جانوں کی حفاظت ہم پر لازم ہوگی یعنی ان کو ناحق قتل نہیں کیا جائے گا اور ان کا مال غصب نہیں کیا جائے گا۔ اگر وہ جزیہ ادا کرنا بھی نہ قبول کریں تو ان کو قتل کر دیا جائے۔ (از درمختار، شامی)

خصوصی مقام توجہ:

" ویجب علی الامام ان یبعث سریة الی دار الحرب کل سنة مرة او مرتین وعلی الرعیة اعانته الا اذا اخذ الخراج فان لم یبعث کان کل الاثم علیه وهذا اذا غلب علی ظنه انه یکافئهم والا فلا یباح قتالهم بخلاف الامر بالمعروف" (شامی ج ۳ ص ۲۳۹)

مسلمانوں کے حاکم پر واجب ہوتا ہے کہ وہ ہر سال ایک مرتبہ یا دو مرتبہ دار حرب میں اپنا لشکر بھیجے جو کافروں سے جنگ کریں اور رعیت پر بھی لازم ہے کہ وہ امام کے حکم کی فرمانبرداری کریں۔ ہاں اگر امام رعیت سے ٹیکس بھی لے کر جہاد کے لئے یہ ٹیکس دو اور جہاد میں بھی چلو تو رعیت حاکم کے حکم کو نہ مانے اگر مسلمانوں کا حاکم ہر سال ایک یا دو مرتبہ کفار کی طرف اپنا لشکر نہیں بھیجتا تو حاکم اور رعیت تمام

گنہگار ہوں گے۔

ہاں یہ خیال بھی رکھا جائے کہ ہر سال لشکر بھیجنا اس وقت واجب ہوگا جب مسلمانوں کے حاکم کو معلوم ہو کہ ہم غالب رہیں گے لیکن اگر معلوم ہو کہ ہم کفار کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے بلکہ اپنے آپ کو تباہ کر دیں گے تو ایسی صورت میں جنگ چھیڑنا منع ہوگا البتہ کفار کو زبان سے اسلام کی حقانیت، دین اسلام کی افادیت اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور محمد مصطفیٰ ﷺ کی رسالت اور اقامت قیامت اور عبادت وغیرہ کی تبلیغ کرتے رہیں۔

مسلمانوں کا کفار سے صلح کرنا:

''ویجوز الصلح علی ترک الجهاد معهم بمال منهم اومنا لو خیرا لقوله تعالیٰ وان جنحوا للسلم فاجنح لها''

مسلمانوں کا حاکم جب جنگ نہ کرنے میں اپنی اور مسلمانوں کی بہتری سمجھے تو جہاد کو چھوڑ کر کفار سے صلح کرلے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر وہ صلح کی طرف میلان کریں تو تم بھی صلح پر آمادہ ہو جاؤ۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

''وفی المصباح والسلم بالکسر والفتح الصلح یذکر ویؤنث''

مصباح میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ سلم کے سین پر فتح اور کسرہ دونوں جائز ہیں معنی اس کا صلح کرنا یہ لفظ مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے ''فاجنح لها'' میں ''ها'' ضمیر مؤنث لائی گئی جو ''سلم'' کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ اس میں تانیث کا اعتبار کیا گیا ہے۔

پھر سے مسئلہ کی طرف توجہ: کفار سے مال لے کر صلح کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جنگ کے حالات پیدا ہو گئے تو ایک دوسرے نے اپنے قاصد بھیجے مسلمانوں کو جب جنگی برتری حاصل ہوئی تو یہ ان سے مال لے کر صلح کرلیں کہ مسلمانوں کا فائدہ اس میں ہے کہ زیادہ تباہی سے بچ جائیں تو یہ بھی جائز ہے۔ اور اگر مسلمانوں کو برتری حاصل نہیں جنگ میں زیادہ بربادی ہو تو مسلمانوں کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ مال دے کر صلح کرلیں:

" ان نصلح بمال نعطیه لهم ان خاف الامام الهلاک علی نفسه والمسلمین بای طریق کان "

لیکن یہ خیال رہے کہ کفار سے صلح اس وقت جائز ہے جب مسلمانوں کا اس میں فائدہ ہو ان کو اس میں مصلحت نظر آئے کفار کی چالبازیوں اور دھوکا بازیوں اور غداریوں سے مسلمان غافل نہ ہوں۔ مسلمان وقتی مصلحت کے لئے صلح کر لیں لیکن اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے غافل نہ رہیں۔ ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ﴾ تم ان کافروں کے لئے تیاری رکھو جتنی تم طاقت رکھتے ہو۔

کفار اگر وعدہ کا پاس نہ کریں تو مسلمان بھی وعدہ توڑ دیں:

نبی کریم ﷺ نے کفار سے دس سال کے لئے صلح کی اور معاہدہ کیا لیکن جب کفار مکہ نے وعدہ کو توڑ دیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھی حکم دے دیا کہ اب آپ پر بھی وعدہ کی پابندی لازم نہیں رہی ایسا نہ ہو کہ مسلمان وعدہ کی پابندی کا خیال کرتے رہیں اور کفار وعدہ کو توڑ کر ان کی سرکوبی کرتے رہیں ہاں جب وہ وعدہ توڑ دیں تو مسلمانوں کو چاہئے کہ ان کو قتل کر دیں۔ (ماخوذ از شامی ج ۳ ص ۲۴۷)

اسلامی جہاد اور کفار کی جنگ میں فرق:

اسلامی جہاد میں کفار کی سرکوبی کا حکم بھی اسلام نہ قبول کرنے پر اور جزیہ نہ قبول کرنے پر ہے مقصد کفار کو ذلیل کرنا نہیں بلکہ اسلام کی سربلندی مقصود ہے۔ اسلامی جہاد میں ظلم کرنے سے منع کیا گیا ہے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ﴾ اور تجاوز نہ کرو بیشک اللہ تعالیٰ تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

☆ " عن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما قال نهی رسول اللہ ﷺ عن قتل النساء والصبیان " (بخاری ومسلم، ترمذی ابن ماجہ ابوداؤد، مشکوۃ کتاب الجهاد)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا۔

عورتوں کے قتل کا حکم:

عورتوں کو قتل کرنے سے اس وقت نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا جب آپ نے ایک عورت کو مقتول پایا لیکن یہ حکم اس وقت ہے جب عورتیں جنگ میں کسی طرح بھی نہ شریک ہوں لیکن ''ان قاتلن قتلن'' اگر وہ جنگ میں قتال کر رہی ہوں تو ان کو قتل کر دیا جائے۔

عورت کی جنگ میں اگر مالی امداد ہو تو پھر بھی عورت کو قتل کر دیا جائے۔اور اگر وہ زبان سے یعنی تقریر سے مردوں کو جنگ پر ابھار رہی ہے تو پھر بھی اسے قتل کر دیا جائے اور اگر وہ اشعار اور گانوں سے مردوں کو جنگ پر ابھار رہی ہو تو پھر بھی اسے قتل کر دیا جائے۔

'' قال سحنون فی حالة المقاتلة وبعدها '' سحنون رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان صورتوں میں عورت کو جنگ میں بھی قتل کیا جائے جنگ کے بعد بھی۔وجہ اس کی یہ ہے کہ جنگ میں قتال کرنے والوں کو قتل کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے عام فرمایا ہے

﴿ وَقَاتِلُوْ فِیْ سَبِیْلِ اللهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ ﴾

''اور لڑائی کرو (قتل کرو) اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو تمہارے ساتھ قتال کرتے ہیں''

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ﴾ ''اور ان (کافروں) کو قتل کرو جہاں ان کو پاؤ۔

اسی طرح عورت جب کفار کی ملکہ ہو یا صدر یا وزیرہ عظمیٰ (وزیراعظم) ہو تو اسے قتل کر دیا جائے کیونکہ جنگ تو اسی نے برپا کر رکھی ہے۔

بچوں کو قتل نہ کیا جائے:

نبی کریم ﷺ نے کافروں کے بچوں کو بھی قتل کرنے سے منع فرمایا ہے لیکن بچے بھی اگر جنگ میں قتل کر رہے ہوں تو ان کو قتل کر دیا جائے کیونکہ وہ جنگ میں شریک ہیں اسی طرح اگر نابالغ بچہ ان کا بادشاہ یا صدر یا وزیراعظم ہو تو اسے بھی قتل کر دیا جائے۔

راہبوں کو نہ قتل کیا جائے:

یہود و نصاریٰ میں راہب وہ ہوتے ہیں جو دنیا سے کنارہ کش ہوتے ہیں دنیا والوں سے ان کا تعلق نہیں ہوتا اسی طرح ہندوؤں میں جوگی ان کو جنگ میں قتل نہ کیا جائے اور نہ ہی ان کو غلام بنایا جائے
حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یزید بن سفیان رضی اللہ عنہ کو فرمایا:
"وستجد اقواما زعموا انهم حبسوا انفسهم لله فذرهم وما زعموا انهم حبسوا انفسهم له"
کہ تم ایسے لوگوں کو پاؤ جو دنیا سے کنارہ کش ہو کر اپنے گمان کے مطابق وہ اللہ کی عبادت میں مشغول ہوں تو ان کو چھوڑ دو اور ان کے لئے ضرورت کے مطابق رزق چھوڑ دیا جائے۔ ہاں اگر یہ راہب لوگ بھی قتال میں شریک ہوں یا انہوں نے اپنے عبادت خانوں میں اور کافروں کو بھی ساتھ رکھا ہوا ہے جن کو یہ قتال کی ترغیب دے رہے ہیں یا وہ دوسرے کافران کی وجہ سے اپنا بچاؤ چاہتے ہیں تو ان راہبوں کو بھی قتل کر دیا جائے۔

معذور لوگوں کو قتل نہ کیا جائے:

معذور لوگوں کو اس وقت تک قتل نہ کیا جائے جب تک ان کی طرف سے مسلمانوں کو تکلیف نہ ہو اگر معذور لوگ بھی جنگ میں کافروں کو جنگی تدابیر بتا رہے ہوں اور جنگ میں کسی طرح معاونت کر رہے ہوں تو ان کو بھی قتل کر دیا جائے۔

بوڑھوں کو قتل نہ کیا جائے:

جنگ میں بوڑھے کافروں کو قتل نہ کیا جائے:" ان كان شيخ كبيرا هو مالا يطيق القتال" لیکن اس وقت جب کہ وہ اتنے بوڑھے ہوں کہ وہ جنگ کرنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے۔ "ولا ينتفع به فی رأی ولا مدافعة فانه لا يقتل" اور نہ ہی ان کی رائے پر جنگ میں کوئی عمل ہو رہا ہو اور نہ ہی ان میں دماغ کی صلاحیت ہو تو ایسی صورت میں بوڑھوں کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ اگر بوڑھے کافر جنگ میں اپنی رائے دے رہے ہوں یا دفاع کر رہے ہوں یا قتال کر رہے ہوں یا بوڑھا

شخص ان کا حاکم ہو تو ایسی صورت میں بوڑھے کو بھی قتل کر دیا جائے گا۔

معتوہ (نیم پاگل) کو قتل نہ کیا جائے:

جو شخص کسی وقت پاگلوں والی باتیں کرتا ہے کسی وقت عقل مندوں والی باتیں کرتا ہے اس کو جنگ میں قتل نہ کیا جائے ہاں اگر وہ قتال میں شریک ہے یا ان کا سربراہ مملکت ہے تو اسے بھی قتل کر دیا جائے۔

خادم کو قتل نہ کیا جائے:

" عن رباح بن الربيع قال كنا مع رسول الله ﷺ في غزوة فرأى الناس مجتمعين على شئى فبعث رجلا فقال انظر على ما اجتمع هؤلاء فجاء فقال على امرأة قتيل فقال ما كانت هذه لتقاتل وعلى المقدمة خالد بن الوليد فبعث رجلا فقال قل لخالد لا تقتل امرأة ولا عسيفا " (رواه ابو داؤد ، مشكوة باب القتال فى الجهاد)

رباح بن ربیع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک غزوہ میں تھے تو آپ نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ کسی چیز پر جمع ہیں آپ نے ایک شخص کو بھیجا کہ دیکھو وہ لوگ کیوں جمع ہیں؟ وہ شخص آئے تو کہا کہ وہ ایک مقتول عورت پر مجتمع ہیں تو آپ نے فرمایا اس عورت کو قتل نہیں کیا جانا تھا۔ آگے والے لشکر کے قائد حضرت خالد بن ولید تھے تو نبی کریم ﷺ ایک شخص کو بھیجا کہ ان کو کہو کسی عورت اور خادم کو قتل نہ کرو۔

" ولا عسيفا اى اجيرا وتابعا للخدمة ولعل علامته ان يكون بلاسلاح " (مرقاة ج ۷ ص ۳۶۲)

عسیف کا معنی خادم اور تابعدار ہے جو خدمت کے لئے مقرر کیا جائے اس وقت ان کی علامت یہ ہوتی تھی کہ ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہوتا تھا۔ مطلب اس میں بھی یہی ہے کہ نوکر صرف خدمت کے لئے میدان جنگ میں ہو وہ خود لڑائی نہیں کر رہا اور کوئی مشورہ نہیں دے رہا تو اسے قتل نہ کیا جائے اور اگر جنگ کرنے میں کسی قسم کا بھی تعاون کر رہا ہے تو اسے قتل کر دیا جائے۔

کفار کے اعضاء نہ کاٹے جائیں:

" عن بریدة قال کان رسول الله ﷺ اذا امر امیرا علی جیش او سریة اوصاه فی خاصته بتقوی الله ومن معه من المسلمین خیرا ثم قال اغزوا بالله فی سبیل الله قاتلوا من کفر بالله اغزوا ولا تغلوا ولا تعتدوا ولا تمثلوا ولا تقتلوا ولیدا " (مسلم)

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ جب کسی لشکر پر امیر مقرر فرماتے تھے تو اسے خصوصی طور پر نصیحت فرماتے کہ اللہ تعالیٰ سے تقوی رکھنا یعنی رب تعالیٰ سے ڈرتے رہنا۔ اور اپنے مسلمان ساتھیوں سے بہتر سلوک رکھنا پھر آپ فرماتے اللہ تعالیٰ کی امداد سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرو جو شخص اللہ تعالیٰ سے کفر کرنے والا ہوا سے قتل کردو۔ جہاد کرو اور مال غنیمت میں خیانت نہ کرو، اور تجاوز نہ کرنا اور کفار کو مثلہ نہ بنانا (یعنی ان کے اعضاء نہ کاٹو اور ان کی شکلیں نہ بگاڑو) اور بچوں کو قتل نہ کرو۔ (از خازن)

غدر سے منع فرمایا: کفار سے وعدہ کر کے کہ ہم تم سے جنگ نہیں کریں گے پھر اچانک ان پر حملہ کر کے ان کو قتل کرنا حرام ہے اسے غدر کہا جاتا ہے۔

☆ " عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ اذا جمع الله الاولین والآخرین یوم القیامة یرفع لکل غادر لواء فقیل هذه غدرة فلان بن فلان " (مسلم ج ۲ ص ۹۱ باب تحریم الغدر)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ اولین وآخرین کو قیامت کے دن جمع کرے گا تو ہر غدر کرنے والے کا جھنڈا بلند کیا جائے گا تو بتایا جائے گا یہ شخص فلاں ابن فلاں کا غدر ہے۔

حدیث پاک کا مطلب واضح ہے کہ جنگ میں وعدہ کر کے اس کے خلاف دھوکا بازی حرام ہے لیکن پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ کفار اگر وعدہ کو توڑ دیں تو مسلمانوں پر بھی وعدہ کی پابندی ختم ہو جاتی ہے۔

جنگی چالبازی جائز ہے:

" عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ الحرب خدعة "

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنگ چالبازی ہے''۔

وضاحت:

'' خدعة (بفتح الخاء وسكون الدال ، بضم الخاء واسكان الدال ، بضم الخاء وفتح الدال ''

'' خدعة '' کا معنیٰ ہے دھوکا دینا یعنی کفار کو جنگ میں دھوکا دینا جائز ہے:

'' كيف امكن الخدع الا ان يكون فيه نقض العهد او امان فلا يحل ''

جس طرح بھی ممکن ہو کفار کو جنگ میں دھوکا دیا جائے البتہ وعدہ کرکے توڑنا اور کسی کو امن دے کر قتل کرنا حلال نہیں۔ جنگ میں دھوکا دینے سے مراد جنگی چالبازی ہی ہے کہ فوجیں ایک طرف کھڑی کی جائیں وہ سمجھیں فوجیں ادھر ہیں لیکن حملہ دوسری جانب سے کرا دیا جائے اس طرح کی ہر قسم کی چالبازی جائز ہوگی۔

کفار کی جنگ: ابھی تک بیان کردہ مضمون سے قارئین کرام نے واضح طور پر سمجھ لیا ہوگا کہ مسلمانوں کو کفار سے جنگ کرنے میں ظلم کرنے سے منع کیا گیا ہے بلکہ احسان کرنے کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ بچوں اور عورتوں وغیرہ کو قتل نہ کرنا احسان نہیں تو اور کیا ہے لیکن کفار کی جنگ میں سراسر ظلم ہی ظلم ہے۔

پہلے پارہ میں شیطانی وسوسہ کے اثرات غزالی دوراں علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ کی تفسیر سے نقل کئے تھے ان میں سے ایک اقتباس کا اعادہ کیا جا رہا ہے اسی سے سمجھیں کہ کفار کی جنگ ظالمانہ ہے۔

شیطانی وسوسہ سے متاثر ہونے والا دوسرا گروہ وہ ہے جس میں جسمانی استعداد تو باقی رہی مگر شیطان کے بھٹکانے سے بھٹک گیا اور روحانی استعداد کو ضائع کر دیا اس لئے روحانی تقاضوں کو بروئے کار لانے سے وہ محروم ہو گیا معرفت الٰہیہ تو درکنار اللہ تعالیٰ کی ہستی سے بھی منکر ہو گیا اس نے صرف جسم اور مادہ کو اپنا مقصد سمجھ لیا اور اپنی بقیہ استعداد کا رخ مادیات کی طرف موڑ دیا وہ عقلی پیچیدگیوں میں گم ہو کر رہ گئے بعض نے جدید انکشافات اور مادی ایجادات میں بڑی کامیابی حاصل کر لی بیشمار مفید چیزیں ایجاد کیں فضاء میں اڑنے والے طیارے اور خلانورد سیارے کے ذریعے زمین و آسمان تک رابطے قائم کر لئے، حیرت انگیز آلات ایجاد کر لئے اب ان کی ترقی کا آخری مرحلہ ہے کہ انہوں نے بنی نوع

انسان کی ہلاکت کے لئے ہزاروں میل تک مار کرنے والے میزائل تیار کر لئے ایٹم بم، نیپام بم بنائے، آواز سے زیادہ تیز رفتار ہوائی جہاز تیار کئے جن کے ذریعے چند سکینڈ میں روئے زمین کو ہلاکت خیز منظر میں تبدیل کیا جاسکتا ہے اور ایٹم بموں کے ذریعے کرۂ ارض (زمینی کرہ) کو آنکھ جھپکنے کی مقدار میں اڑا کر تباہ و برباد کر دینا آسان ہے۔

خلافت الٰہیہ کی وہ استعداد جو بنی نوع انسان کی جسمانی، روحانی، دنیوی اور اخروی فوائد کے لئے تھی اسے انسانوں کے ہلاک کر دینے والے آلات کے لئے وقف کر دیا گیا۔ اب معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ ان ہتھیاروں کو ایجاد کرنے والے خود اپنے آپ کو ان کی زد میں محسوس کر رہے ہیں انہیں ہر وقت یہ خطرہ لاحق ہے کہ ہمارے ایجاد کئے ہوئے آلات نہ معلوم کس وقت ہم پر پھٹ پڑیں اور کرۂ ارض کے ساتھ ہم بھی لقمہ اجل بن کر رہ جائیں۔

اس اقتباس کو ذرہ ہوش و حواس سے پڑھیں پھر خود اندازہ لگائیں کے کفار کے ایجاد کردہ آلات اور جنگ میں ظلم ہی ظلم ہے یا نہیں کیا انہوں نے کبھی سوچا کہ بچوں، عورتوں، بوڑھوں، عبادت گزاروں، معذوروں اور خدام کو نہیں قتل کرنا، کیا انہوں نے کبھی یہ خیال کیا کہ کسی کے اعضاء نہیں کاٹنے، انہوں نے تو صرف تباہی و بربادی کے آلات ایجاد کئے انہوں نے تو تمام مسلمانوں کو تباہ کرنے کے منصوبے تیار کئے۔

دہشت گرد کون؟

ذرا غور کیجئے دہشت گرد کون ہے؟ دہشت گرد یقیناً وہ ہے جو صرف ایٹم بم بنانے والا نہیں بلکہ دو مرتبہ ایٹم بم چلا چکا ہے۔ دہشت گرد وہ ہے جو فلسطینی مسلمانوں پر نصف صدی سے زائد عرصہ مظالم ڈھا چکا ہے ابھی تک ظلم کئے جا رہے ہیں عراق اور افغانستان کو برباد کر چکا ہے ابھی تک پھر بھی عراق اس کی آنکھ میں کھٹک رہا ہے پاکستان اور ایران پر بھی اس کی ناپاک نظریں لگی ہوئی ہیں وہی بڑا دہشت گرد اور بڑا ظالم ہے مسلمان اپنا دفاع کرنے والا، مسلمان اپنے مسلمان بھائیوں کو کفار کے چنگل سے آزاد کرانے میں تعاون کرنے والا کبھی دہشت گرد نہیں ہوسکتا۔

افسوس کہ مسلمانوں کے حکمران دہشت گردوں کے ساتھی بن کر مسلمانوں کو دہشت گرد کہنے لگ

گئے۔جن کی تربیت کی ان کو دہشت گرد کہنا ناانصافی ہے جن کو اپنے ساتھ ملا کر کئی سال روس سے جنگ کرائی ان کو عیسائیوں اور یہودیوں کے ہاتھوں برباد کرادینا اور یہود ونصاری کا ساتھی بن جانا ظلم عظیم ہے۔مسلمان تجھے انصاف کرنا چاہئے لیکن افسوس تو ظالم بن گیا اے مسلمان تو مسلمان کا بھائی ہے افسوس کہ تو نصاری اور یہود وہنود کا بھائی بن بیٹھا۔

مسلمان کفار سے انتقام لیں:

﴿ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ﴾

''جو شخص زیادتی کرے تم پر، تم اس سے انتقام لو اس کی مثل جو اس نے زیادتی کی ہے تم پر''

تفسیر صاوی کے حوالہ سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ﴿ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ ﴾ کا مطلب یہ ہے تم ان سے انتقام لو لیکن کافروں کی زیادتی کے انتقام کو مشکلات کی وجہ سے زیادتی سے تعبیر کر دیا جس کا بظاہر مطلب یہ ہے کہ جو تم پر زیادتی کرے تم اس پر زیادتی کرو جیسا کہ اس نے تم پر زیادتی کی۔

تو اسی سے واضح ہو گیا کہ کافر اگر میزائل تم پر گرائیں تو تم بھی میزائلوں سے ان سے انتقام لو وہ توپوں کے گولے برسائیں تو تم بھی ایسی ہی جوابی کروائی کرو، وہ طیاروں سے لڑائی کریں تو تم بھی طیاروں سے لڑائی کرو وہ ایٹم بم گرائیں تو تم بھی ایٹم بم گراؤ۔

کافروں کے ظالمانہ رویہ کا بڑھ کر جواب دو کافروں کے ظلم کا جواب ظلم نہیں۔یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب سب مسلمان متحد ہو کر یہود ونصاری کو سبق سکھائیں ایک اسلامی ملک کو تباہ کرانے میں مسلمان بھی یہود ونصاری کے ہمنوا بن جائیں تو کس طرح ان کفار کا مقابلہ کیا جائے۔اے مسلمانو جاگ جاؤ، ذرا ہوشیار ہو جاؤ، خواب غفلت میں نہ رہو، کفار کے دام فریب میں نہ آؤ، اسلامی احکام پر عمل کرو پھر کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔

" وترى الامة الاسلامية لما كانت تعظم الأعمال الدينية وترعاها حق رعايتها غلبت اعداءها فلما تفرقت اهوائها وخضدت شوكتها تخطفتها الاعداء من كل جانب ، فان الناس اذا استعبد والشهواتهم وذلوا لاهوائهم تفرقت كلمتهم وذهبت ريحهم وذاق بأس بعضهم

بأس بعض " (جواهر طنطاوی)

امت اسلامیہ کے ماضی کی طرف جھانک کر دیکھو، تاریخ کا مطالعہ کرو تو تمہیں پتہ چلے گا کہ جب تک دینی اعمال کی عظمت کا مسلمان پاس کرتے رہے تو دشمن پر غالب رہے جب ان کی خواہشات بکھر گئیں ان کا دبدبہ جاتا رہا تو ہر طرف سے دشمن ان کو گدھوں کی طرح نوچ رہے ہیں بیشک لوگ جب اپنی خواہشات کی وجہ سے غلام بن گئے اور اپنی خواہشات کی وجہ سے ذلیل ہو گئے تو ان کی اجتماعیت ختم ہو گئی جتنے منہ اتنی باتیں ہونے لگیں، ان کے رعب اور دبدبہ کی ہوا اڑ گئی، ان کی بہادری کا چرچا جاتا رہا اور لوگوں کے رعب میں آ گئے جو ان کو اپنا تر نوالہ بنا رہے ہیں۔

جہاد قیامت تک جاری رہے گا:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا " الجهاد ماض الى يوم القيامة " جہاد قیامت تک جاری رہے گا اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ جہاد منسوخ نہیں ہوا کیونکہ نبی کریم ﷺ کا مندرجہ بالا ارشاد گرامی جب قیامت تک کے متعلق ایک حکم کو ثابت کر رہا ہے تو منسوخ کس نے کرنا تھا۔

☆ " وعن جابر بن سمرة قال قال رسول الله ﷺ لن يبرح هذا الدين قائما يقاتل عليه عصابة من المسلمين حتى تقوم الساعة " (رواہ مسلم، مشکوۃ کتاب الجهاد)

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ دین ہمیشہ قائم رہے گا مسلمانوں کی ایک جماعت جہاد کرتی رہے گی یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے گی۔

وضاحت حدیث : " يقاتل عليه " میں " على " مذکور ہے جو دلالت کر رہا ہے کہ یہ جملہ "يظاهر" کے معنی کو متضمن ہے معنی ہو گیا:

" يظاهرون بالمقاتلة على اعداء الدين يعنى ان هذا الدين لم يزل قائما بسبب مقاتلة هذه الطائفة "

کہ جب تک مسلمانوں کی کوئی نہ کوئی جماعت جہاد کرتی رہی تو دین قائم رہے گا۔ اور یہ بھی نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے واضح ہے کہ مسلمانوں کی کوئی نہ کوئی جماعت قیامت تک جہاد کرتی رہے گی اور قیامت تک دین قائم رہے گا۔

" لا یخلو وجه الارض من الجهاد ان لم یکن فی ناحیة یکون فی ناحیة اخری "

یعنی زمین جہاد سے خالی نہیں رہے گی اگر زمین کے ایک علاقے میں جہاد نہیں ہوگا تو دوسرے علاقے میں جاری رہے گا۔ (مرقاۃ ج ۷ ص ۲۷۵)

جہاد اصغر اور جہاد اکبر:

جہاد کا لغوی معنی ہے مشقت اٹھانا، لغت کی کتاب مغرب میں ذکر کیا گیا ہے " جهده حمله فوق طاقته " جب کوئی شخص طاقت سے زائد بوجھ اٹھائے تو کہا جاتا ہے " جهده " پھر غالب طور پر اس کا استعمال کفار کے ساتھ جنگ کرنے پر ہونے لگا۔ اب شرعی طور پر اس معنی میں استعمال ہونے لگا:

" بذل المجهود فی قتل الکفار مباشرة او معاونة بالمال "

کفار سے قتال میں اپنی جان پیش کرنا یا مالی معاونت سے کوشش کرنا۔ اور کہا جاتا ہے "جاهدت العدو اذا قابلته فی نحمل الجهد" کہ میں نے دشمن سے جہاد کیا یعنی خوب کوشش کی اور مشقت برداشت کی۔

" وهو دعوتهم الی الدین الحق وقتالهم ان لم یقبلوا "

جہاد دین حق کی طرف دعوت دینا ہے اور اگر کفار دین حق کی دعوت کو نہ قبول کریں تو ان سے قتال (لڑائی) کرنا ہے:

" وفضل الجهاد عظیم وکیف وحاصله بذل اعز المحبوبات وادخال اعظم المشقات علیه وهو نفس الانسان ابتغآء مرضاة الله وتقربا بذلک الیه تعالیٰ "

اور جہاد میں بہت بڑی فضیلت پائی گئی ہے اس فضیلت کی اصل وجہ واضح ہے کہ اس پر عظیم محبوب چیز یعنی اپنی جان کو اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی حاصل کرنے کے لئے اور اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے لئے پیش کیا جاتا ہے اور بہت بڑی مشقت کو برداشت کیا جاتا ہے لیکن اس سے بھی زیادہ فضیلت کس میں ہے؟

" واشق منه قصر النفس علی الطاعات فی النشاط و دفع الکسل علی الدوام ومجانبة اھویتھا "

اور جہاد سے بھی زیادہ اس میں مشقت پائی جاتی ہے کہ ہمیشہ اپنے نفس کو چستی سے عبادات وطاعت میں لگایا جائے اور اپنی خواہشات نفسانیہ سے مکمل طور پر اجتناب کیا جائے اس کے مشقت آمیز ہونے کی وجہ سے ہی تو نبی کریم ﷺ نے جہاد سے واپس لوٹتے ہوئے ارشاد فرمایا " رجعنا من الجهاد الاصغر الی الجهاد الاکبر " ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹے ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سے اس پر دلیل پائی گئی کہ نماز اپنے وقت میں ادا کرنا افضل ہے اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے نماز کو وقت پر ادا کرنے سے افضل قرار دیا پھر جہاد کو:

" عن ابن مسعود قلت یا رسول الله ای الاعمال افضل ؟ قال الصلوة علی میقاتھا قلت ثم ای ؟ قال بر الوالدین قلت ثم ای ؟ قال الجهاد فی سبیل الله ولو استزدته لزادنی رواه البخاری "

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کون سا عمل افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا نماز اپنے وقت میں ادا کرنا۔ میں نے کہا کہ پھر کون سے عمل افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا والدین کی فرمانبرداری، میں نے عرض کیا پھر کون سے عمل افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد اور اگر میں آپ سے اور زیادہ سوال کرتا تو آپ اس کا جواب مجھے ارشاد فرماتے (لیکن میں نے اتنا ہی سوال کیا)۔

اعتراض : ایک اور روایت میں ایمان کے بعد جہاد کو افضل قرار دیا گیا تو پھر کس طرح کہا جائے گا کہ نماز افضل ہے۔

☆ " عن ابی هریرة رضی الله عنه قال سئل رسول الله ﷺ ای العمل افضل ؟ قال الایمان بالله ورسوله ، قیل ثم ما ذا ؟ قال الجهاد فی سبیل الله ، قیل ثم ماذا ؟ قال حج مبرور " (بخاری ومسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے سوال کیا گیا کہ کون سا عمل افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (ﷺ) پر ایمان لانا پھر پوچھا گیا کہ پھر کون سا عمل

افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا حج مقبول۔

جواب : اگر چہ بظاہر احادیث میں تعارض ہے لیکن صحیح ترتیب یہ ہے کہ ایمان سب سے افضل ہے کیونکہ تمام عبادات کی دار و مدار ایمان پر ہے ایمان نہیں تو کوئی عبادت کارگر نہیں۔ اس کے بعد نماز اور وہ عبادات جو فرض عین ہیں وہ افضل ہیں:

" الصلوة علی میقاتها افضل من الجهاد لان هذه فرض عین وتتكرر والجهاد لیس کذلک "

کہ جہاد فرض ہی اس لئے ہوا ہے کہ کافر ایمان لائیں اور اللہ تعالیٰ کے دین کو بلندی حاصل ہو اور لوگ نماز ادا کریں لہذا واضح ہوا کہ جہاد مقصود لغیرہ ہے اور حسن لغیرہ ہے یعنی جہاد ایمان اور نماز کے لئے ہی مقصود ہے اور ان کی وجہ سے ہی حسین ہے لیکن نماز ذاتی طور پر مقصود ہے اور اس میں حسن ذاتی پایا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ سے ایک طویل حدیث حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس میں یہ الفاظ گرامی مذکور ہیں:

" والذی نفس محمد بیده ما شجت وجه ولا اغبرت قدم فی عمل یبتغی به درجات الآخرة بعد الصلوة المفروضة كجهاد فی سبیل الله صححه الترمذی "

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد کی جان ہے کوئی چہرہ زخمی نہیں اور کوئی قدم غبار آلود نہیں جس کے ذریعے آخرت کے درجات حاصل کئے گئے ہوں فرض نماز کے بعد جیسے اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ہے۔ یعنی نماز فرض کے بعد جہاد ہی وہ عبادت ہے جس کے ذریعے آخرت کے درجات حاصل ہوتے ہیں اور اس میں مشقت اٹھائی جاتی ہے اور اللہ کی راہ میں انسان اپنے آپ کو زخمی کرتا ہے اور اپنے قدموں کو غبار آلود کرتا ہے۔

ہاں البتہ جب جہاد فرض عین ہو جائے تو اس وقت جہاں تک ممکن ہو نماز بھی ادا کرے اور جہاد بھی کرے اگر سخت مشکل درپیش آجائے کہ نماز ادا کرنی ممکن نہیں ہو رہی تو نماز مؤخر بھی ہو سکتی ہے اس صورت میں یقیناً ایمان کے بعد افضلیت کے لحاظ پر پہلا درجہ جہاد کا ہوگا۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ خندق

کے دن نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کی چار نمازیں قضاء ہو گئی تھیں۔

(ماخوذ از مرقاۃ ج ۷ ص ۲۶۴ ، وشامی ج ۳ ص ۲۳۷)

کون سے جہاد افضل ہے؟

" عن عبد الله بن حبشی ان النبی ﷺ سئل ای الاعمال افضل ؟ قال طول القيام قيل ای الصدقة افضل ؟ قال جهد المقل قيل فای الهجرة افضل ؟ قال من هجر ما حرم الله عليه قيل فای الجهاد افضل ؟ قال من جاهد المشركين بما له ونفسه ، قيل فای القتل اشرف ؟ قال من اهريق دمه وعقرجواده رواه ابوداؤد وفی رواية النسائی ان النبی ﷺ سئل ای الاعمال افضل ؟ قال ايمان لا شک فيه وجهاد دلاغلول فيه وحجة مبرورة " (مشکوۃ کتاب الجهاد)

حضرت عبداللہ بن حبشی (بضم مہملۃ وسکون موحدۃ) رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کون سا عمل افضل ہے؟ آپ نے فرمایا لمبا قیام پھر پوچھا گیا کون سا صدقہ افضل ہے؟ آپ نے فرمایا جو تھوڑے مال والا شخص مشقت سے صدقہ کرے پھر سوال کیا گیا کون سی ہجرت افضل ہے؟ آپ نے فرمایا جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا ان کو چھوڑ دینا پھر پوچھا گیا کون سا جہاد افضل ہے؟ آپ نے فرمایا مشرکین سے اپنے جانوں اور مال سے جہاد کرنا پھر سوال کیا گیا کون سا قتل ہونا افضل ہے! آپ نے فرمایا کہ اس شخص کا مقتول (شہید) ہونا افضل ہے جس کا خون بہایا گیا ہو اور اس کے گھوڑیں کی کچیں کاٹ دی گئی ہوں۔ (ابوداؤد)

نسائی کی روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ سے سوال کیا گیا کونسا عمل افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا ایمان جس میں شک نہ ہو اور جہاد جس کے مال غنیمت میں خیانت نہ پائی جائے اور حج مقبول۔

وضاحت حدیث: لمبا قیام افضل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں قراءت بھی لمبی ہوگی اور مشقت بھی زیادہ ہوگی جس عبادت میں مشقت زیادہ ہو وہ یقیناً افضل ہوتی ہے:

" واما ماورد من اطالة السجود افضل فلكونها تدل على كمال المسكنة الموجبة للقرب الى الله تعالىٰ "

بعض روایات میں لمبا سجدہ افضل ہونے کا ذکر ہے اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ وہ کامل مسکینی پر دلالت کرتا ہے انسان جب رب تعالیٰ کے حضور کامل مسکینی سے سجدہ ریز ہوتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔

" جهد المقل " بضم الجيم وضم الميم و كسر القاف وتشديد اللام اى طاقة الفقير ومجهوده "

یعنی قلیل مال والا فقیر شخص جو مشقت سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرے وہ افضل ہے البتہ شرط یہ ہے کہ اپنے اہل وعیال کو محتاج نہ کرے یا اس کے اہل وعیال نہ ہوں۔

" ولهذا ورد سبق درهم مائة الف درهم رجل له درهمان اخذ احدهما فتصدق به ورجل له مال كثير فاخذ من عرضه مائة الف فتصدق بها رواه النسائی عن ابی ذر "

اسی وجہ سے وارد ہے کہ ایک درہم ایک لاکھ درہم سے سبقت لے جاتا ہے کیونکہ جب ایک شخص کے پاس دو درہم ہوں ایک اپنے پاس رکھ لے اور ایک اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دے اس کا ایک درہم اس شخص کے لاکھ درہم سے سبقت لے جائے گا جس کے پاس کثیر مال ہے تو اس نے اس سے ایک لاکھ درہم صدقہ کر دیا۔

ہجرت کے سوال پر (کہ کونسی ہجرت افضل ہے)؟ آپ نے جواب دیا جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ان کو چھوڑ دینا کیونکہ لغوی معنی ہی " هجر يهجر " کا چھوڑنا ہے عام مشہور ہجرت کو بھی اسی لئے ہجرت کہا جاتا ہے کہ اس میں انسان اپنے وطن کو چھوڑ کر دوسرے وطن میں چلا جاتا ہے۔ افضل جہاد ہے وہ جس میں مشقت زیادہ پائی جائے اسی لئے نبی کریم ﷺ نے جان اور مال سے جہاد کرنے کو افضل قرار دیا " ولتوقف هذا الجهاد على مجاهدة النفس " کیونکہ اس جہاد میں نفس پر مشقت ہوتی ہے:

" ورد افضل الجهاد ان يجاهد الرجل نفسه وهواه رواه ابن البخاری عن ابی ذر "

اور یہ روایت بھی مذکور ہے کہ انسان کا اپنے نفس اور اپنی خواہشات سے جہاد کرنا افضل ہے وجہ

اس کی بھی یہی ہے کہ اسمیں مشقت پائی جاتی ہے اسی لئے اس کو جہاد اکبر کہا گیا ہے۔

اعتراض : نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے " افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جابر " افضل جہاد کلمہ حق ظالم بادشاہ کے سامنے کہنا ہے (تو ان تمام میں تطبیق کیسے؟)۔

جواب اول: " هذا لا ينا فيه لانه اشق على النفس " یہ حدیث پہلی احادیث کے مخالف نہیں کیونکہ افضیلت کی وجہ جب نفس پر مشقت ہے تو یہ بھی افضل جہاد ہے کیونکہ جابر اور ظالم بادشاہ کے سامنے کلمہ حق کہنا اپنے آپ کو شدید مصائب میں مبتلا کرنا ہے تو اس سے بڑھ کر اور نفس پر مشقت کیا ہوگی۔

دوسرا جواب: " او الا فضلية اضافية " یا افضیلت اضافی پائی گئی ہے کہ بعض جہادوں سے افضل جہاد یہ ہے کہ ظالم اور جابر بادشاہ کے سامنے کلمہ حق کہا جائے۔" اشرف القتل " کے سوال کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ انسان ثابت قدمی سے جہاد کرے پیٹھ پھیر کر بھاگے نہیں اس کا خون بہا دیا جائے گا اس کے گھوڑے کی ٹانگیں کاٹ دی جائیں تو یہی شہادت افضل درجہ رکھتی ہے۔

(از مرقاة ج ۷ ص ۲۹۵)

مجاہدین کی ازواج کی حرمت:

" عن بريدة قال قال رسول الله ﷺ حرمة نساء المجاهدين على القاعدين كحرمة امهاتهم وما من رجل من القاعدين يخلف رجلا من المجاهدين في اهله فيخونه فيهم الاوقف له يوم القيامة فيأخذ من عمله ما شاء فما ظنكم " (رواه مسلم، مشكوة كتاب الجهاد)

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجاہدین کی عورتوں کی عزت پیچھے رہ جانے والوں پر ایسے ہے جیسے ان کی ماؤں کی عزت ان پر ہے مجاہدین میں سے کسی شخص نے پیچھے رہ جانے والوں میں سے کسی کو اپنی اہل میں اپنا جانشین بنایا (کہ وہ ان کی دیکھ بھال رکھے اور ان کا کام میں ہاتھ بٹائے) تو اس نے خیانت کر لی تو قیامت کے دن اسے کھڑا کیا جائے گا وہ اس کے اعمال میں سے جو چاہے گا لے لے گا تمہارا کیا گمان۔

وضاحت حدیث : جو لوگ جہاد میں نہ شریک ہوسکیں ان پر لازم ہے کہ مجاہدین کی بیویوں

کی عزت اسی طرح کریں جس طرح وہ اپنی ماؤں کی عزت کرتے ہیں اگران سے کسی نے دست درازی کر کے خیانت کی تو قیامت کے دن ضرور اس کے اعمال میں سے مجاہد کو لینے کا حق دے دیا جائے گا کہ تو اس کے نیک اعمال سے جو چاہے لے لے ﴿ فَمَاظَنُّكُمْ ﴾ تمہارا کیا گمان ہے؟ یعنی وہ شخص جو اپنے نیک اعمال سے مکمل محروم ہو گیا اور مجاہد کو اس کی نیکیاں لینے کا حق دے دیا گیا تو اس کے متعلق تمہارا کیا گمان ہے کہ وہ خیانت کرنے والا کتنا بد بخت ہوگا اور مجاہد اور اس کی زوجہ کا مقام کتنا بلند ہوگا۔

مجاہد کی فضیلت:

☆ " عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ مثل المجاهد فی سبيل كمثل الصائم القائم القانت بآيات الله لا يفتر من صيام ولا صلوة حتى يرجع المجاهد فی سبيل الله "

(بخاری ومسلم، مشکوۃ کتاب الجهاد)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا جہاد سے لوٹنے تک اس درجہ میں ہوتا ہے جس درجہ میں روزے دار، قیام کرنے والا اور اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھنے والا ہوتا ہے جو کہ روزے رکھنے میں اور نماز ادا کرنے میں سستی سے کام نہیں لیتا۔

وضاحت حدیث: اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کو وہ اجر وثواب حاصل ہوتا ہے جو نفلی روزے رکھنے والوں اور رات کو نوافل ادا کرنے والوں کو ہوتا ہے حالانکہ مجاہدین نفلی روزے نہیں رکھ رہے ہوتے اور نہ ہی نوافل ادا کر رہے ہوتے ہیں" القانت بآيات الله ای القارئ بها ' یہاں قانت کا معنی قاری ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرنے والا۔ مراد عبادت ہی ہے صاحب نہایۃ نے بیان فرمایا ہے کہ احادیث میں " قانت " چند معانی میں استعمال ہوا ہے وہ یہ ہیں:

طاعت، خشوع، نماز، دعا، عبادت، قیام، لمبا قیام اور سکوت۔

" شبه المجاهد الذی لا يضيع لمحة من لمحا ته من اجر وثواب سواء كان قائما او نائما يقاتل العدو ام لا بالصائم القائم الذی لا يفتر عما هو فيه فهو من التشبيه الذی المشبه به مفروض غير محقق "

مجاہد کو اس روزہ دار اور رات کو قیام کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرنے والے

سے تشبیہ دی گئی جن کو عبادت سے ملال نہیں ہوتا تھکتے نہیں اور سست نہیں ہوتے گویا کہ ان کا ہر لحہ عبادت میں گزر رہا ہے اسی طرح مجاہد کا ہر لحہ یعنی حرکت وسکون عبادت شمار ہوتا ہے اگر چہ وہ روزہ دار نہیں ہوتا قیام کرنے والا نہیں ہوتا۔ (از مرقاۃ ج ۷ ص ۲۶۷)

☆ " عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ انتدب الله لمن خرج فی سبیله لایخرجه الا ایمان بی وتصدیق برسلی ان ارجعه بما نال من اجر او غنیمة وادخله الجنة "
(بخاری ومسلم ، مشکوة کتاب الجهاد)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ضامن ہے اس شخص کا جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں نکلتا ہے اور صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے رسول (ﷺ) کی تصدیق کرتے ہوئے نکلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اجر وثواب یا غنیمت سے لوٹاتا ہے اور اسے جنت میں داخل کرتا ہے۔

وضاحت حدیث : جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کی تصدیق کرتے ہوئے جہاد میں شریک ہو اللہ تعالیٰ نے اس سے وعدہ کر رکھا ہے کہ اسے اجر وثواب عطا کرے گا اور یا مال غنیمت عطا کرے گا اور یا اسے درجہ شہادت عطا کرے گا کہ وہ جنت میں داخل ہوگا۔

☆ " عن سهل بن سعد قال قال رسول الله ﷺ رباط یوم فی سبیل الله خیر من الدنیا وما علیها " (بخاری مسلم مشکوة کتاب الجهاد)

سہل بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک دن (دشمن کے مقابل) ٹھہرنا دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے بہتر ہے۔

وضاحت : " رباط بکسر اوله هو الاقامة فی مکان یتوقع هجوم العدو فیه لقصد دفعه لله تعالیٰ "

" رباط " کا معنی یہ ہے کہ ایسی جگہ ٹھہرنا جہاں دشمن (کفار) کے ہجوم کا خطرہ ہو کہ جب دشمن آئیں گے تو میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی کیلئے ان کو مندفع کروں گا۔

☆ " وعن انس قال قال رسول الله ﷺ لغدوة فی سبیل الله او روحة خیر من الدنیا وما فیها " (بخاری ومسلم ، مشکوة کتاب الجهاد)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک صبح یا ایک شام دنیا اور دنیا میں پائی جانی والی چیزوں سے بہتر ہے۔

وضاحت : یعنی جہاد میں ایک صبح اور ایک شام گزارنا دنیا کی تمام نعمتوں سے بہتر ہیں۔ اسی طرح جہاد میں ایک صبح اور ایک شام گزارنے سے جو ثواب حاصل ہوتا ہے وہ دنیا کی نعمتوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے بھی افضل ہے۔

☆ "عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ افشوا السلام واطعموا الطعام واضربوا الهام تورثوا الجنان ، رواه الترمذی وقال هذا هديث غريب" (مشکوۃ کتاب الجهاد)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سلام کو عام کرو اور طعام کھلاؤ اور کھوپڑیوں کو اڑا دو کہ تمہیں جنت عطا کر دی جائے۔

وضاحت : "تورثوا" باب افعال سے مجہول کا صیغہ ہے "جنان" بکسر الجیم جمع ہے جنت کی یعنی جنات نعیم سلام کو عام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے مسلمان بھائیوں کو سلام کرو اور ان کے سلام کا جواب دو۔ طعام کھلانے کا مطلب یہ ہے کہ فقیروں، غریبوں، یتیموں کو طعام کھلاؤ کیونکہ یہ باعث برکت ہے اور ذریعہ جنت ہے۔ کھوپڑیاں اڑانے سے مراد کفار سے جہاد کرنا اور میدان جہاد میں ان کے سر اڑا دینے کا حکم دیا گیا ہے۔

مسئلہ : "ورميهم بنبل ونحوه وان تترسوا ببعضنا ونقصدهم ای الكفار وما اصيب منهم ای من المسلمن لادية فيه ولا كفارة"

کفار اگر اپنے بچاؤ کے لئے مسلمانوں کو آگے کر کے اپنی ڈھال بنا دیں تو ہم ان مسلمانوں کا خیال کرتے ہوئے کفار کو نہیں بچائیں گے بلکہ ان پر اپنے ہتھیار چلا دیں گے اس کی زد میں آکر مسلمان قتل ہو جائے تو ہم پر کوئی کفارہ اور دیت لازم نہیں آئے گا کیونکہ ہم نے کافروں کو قتل کرنے کا ارادہ کیا نہ کہ مسلمانوں کو۔ اسی طرح کوئی گناہ بھی ہم پر لازم نہیں آئے گا۔ (درمختار)

ہاں یہ بھی خیال رہے کہ اگر مسلمانوں کو زبردستی آگے کر لیا گیا تو وہ مسلمان گنہگار نہیں ہوں گے بلکہ کفار کے جبر کی وجہ سے ان کو درجہ شہادت بھی حاصل ہوگا لیکن اگر مسلمان کافروں کی فوج میں ہوں

کافروں کا ساتھ دے رہے ہوں اور کافر مسلمانوں پر حملہ آور بھی ہیں تو پھر بھی ان مسلمانوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کفار کو قتل کیا جائے گا۔ اس صورت میں کفار کا بچاؤ کرنے والے مسلمان گنہگار ہوں گے اور مسلمانوں کی تلوار کی زد میں آنے سے درجہ شہادت سے بھی محروم ہو گئے کیونکہ انہوں نے دنیاوی لالچ یعنی تنخواہ کی وجہ سے کافروں کا ساتھ اپنی خوشی سے دیا جبر سے نہیں۔ ہاں فتح کے بعد مسلمان اس علاقے کے کفار کو تہ تیغ نہیں کر سکتے جس میں مسلمانوں اور ذمی لوگ اس کی زد میں آرہے ہوں پہلے وہاں سے ان کو نکال لیا جائے پھر کفار کے سر اڑا دیئے جائیں۔

مسئلہ : جب جنگ میں کافروں کے غالب آنے کا خطرہ ہو اور یہ بھی خطرہ ہو کہ اگر ہمارے پاس قرآن پاک ہوا تو وہ اس کی بے حرمتی کریں گے تو ایسی صورت میں قرآن پاک میدان جنگ میں لے جانا منع ہے۔

مسئلہ : مسلمانوں پر حرام ہے کہ وہ اپنا اسلحہ جنگی آلات وہتھیار کفار پر بیچیں کیونکہ اس سے کفار کو طاقت حاصل ہو گی اور مسلمانوں کی بربادی کا ذریعہ بنے گا۔ لیکن اس مسئلہ کا تعلق غالباً اس وقت سے تھا جب مسلمان واقعی مسلمان تھے کفار پر غالب تھے اپنے اسلحہ میں خود کفیل تھے، اب تو مسلمان زبوں حالی کا شکار کفار سے دب کر جی حضوری بن کر وقت گزار رہے ہیں اب انہوں نے کیا اسلحہ بیچنا ہے بلکہ کفار سے اسلحہ خریدنے کے لئے منت سماجت کرنی ہے ایک علاقے کے کافر نے جو دوسرے کافر کو اسلحہ دینا ہے وہ مسلمانوں کو نہیں دینا بلکہ ناکارہ دینا ہے۔

کاش کہ گزرا ہوا دور واپس آجائے ایک مرتبہ پھر کفار مسلمانوں کو دیکھ کر کانپنے لگ جائیں وہ ہم سے اسلحہ مانگیں نہ کہ ہم ان سے دست سوال دراز کریں۔

☆☆☆☆☆

﴿ وَاَنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡکُمۡ اِلَی التَّہۡلُکَۃِ وَاَحۡسِنُوۡا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴾

۱) ''اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو اور بھلائی والے ہو جاؤ بیشک بھلائی والے اللہ کے محبوب ہیں''۔

۲) ''اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور نہ ڈالو اپنے آپ کو ہلاکت میں اور احسان کرو بیشک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے احسان کرنیوالوں سے''۔

ماقبل سے رابطہ:

(۱) اللہ تعالیٰ نے جب کافروں سے جنگ کرنے کا حکم دیا تو جنگ میں آلات قتال (اسلحہ) کی محتاجی ہوتی ہے یقیناً اس میں مال خرچ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا حکم دیا پھر خصوصاً کئی لوگ مال دار ہوتے ہیں لیکن بیماری، ضعف اور کسی نہ کسی عذر کی وجہ سے جہاد میں شریک نہیں ہو سکتے اور کئی لوگ جہاد کرنے کی طاقت رکھتے ہیں لیکن ان کے پاس ہتھیار خریدنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ اس لئے رب تعالیٰ نے مال خرچ کرنے کا حکم دیا کہ مالی طاقت رکھنے والے جب جانی طور پر خود جہاد میں شریک نہیں ہو سکتے تو دوسروں کی مالی معاونت کر کے بھی جہاد میں شرکت کا ثواب حاصل کیا جا سکتا ہے۔

(۲) جب آیۂ کریمہ ﴿ اَلشَّھۡرُ الۡحَرَامُ بِالشَّھۡرِ الۡحَرَامِ وَالۡحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ﴾ نازل ہوئی تو ایک شخص نے عرض کیا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی یا رسول اللہ ہمارے پاس خرچ نہیں اور کوئی ایک بھی ہمیں کھلاتا نہیں۔ (مالی معاونت نہیں کرتا)

'' فامر رسول اللہ ﷺ ان ینفقوا فی سبیل اللہ وان یتصدقوا وان لایکفوا ایدیھم عن الصدقۃ ولو بشق تمرۃ تحمل فی سبیل اللہ فیھلکوا ''

تو رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو اور صدقہ کرو اور اپنے ہاتھوں کو

صدقہ کرنے سے نہ روکو (اپنی طاقت کے مطابق خلوص سے صدقہ کرو) اگرچہ کھجور کا کچھ حصہ بھی دے دو جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جانے کے لئے معاون بن سکے ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا۔ (کبیر)

شان نزول:

دو وجہ یہی جو ماقبل سے رابطہ کے لئے کبیر میں ذکر کی گئی ہیں یہ شان نزول ہی ہیں پہلی وجہ کی وضاحت عام مفسرین کرام نے بطور شان نزول ذکر فرمائی۔ ابوعمران روایت کرتے ہیں کہ ہم قسطنطنیہ میں تھے تو رومیوں کا ایک بہت بڑا لشکر ہمارے مقابلہ کے لئے آ گیا تو مسلمانوں میں سے ایک شخص ان کے لشکر میں گھس کر لڑائی کرنے لگا تو دوسرے مسلمان حضرات کہنے لگے " القی بیدیه الی التهلكة " اس شخص نے اپنے آپ کو اپنے ہی ہاتھوں ہلاکت میں ڈال دیا (مطلب یہ تھا کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے سے تو اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے) تو مسلمانوں کے لشکر میں حضرت ابوایوب انصاری بھی تھے وہ کھڑے ہوئے انہوں نے فرمایا تم رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾ کی یہ وجہ بیان کرتے ہو حالانکہ یہ وجہ نہیں بلکہ یہ آیۃ ہم انصار کے حق میں نازل ہوئی اس کی اصل وجہ نزول یہ ہے:

" ان لما اعز الله تعالیٰ دينه وكثر ناصروه قال بعضنا لبعض سرا دون رسول الله ﷺ ان اموالنا قد ضاعت وان الله تعالیٰ قد اعز الاسلام وكثر ناصروه فلو اقمنا في اموالنا فاصلحنا ما ضاع منها فانزل الله تعالیٰ على نبيه ما يرد علينا "

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو عزت دے دی یعنی غلبہ عطا فرما دیا اور دین اسلام کے بہت مددگار ہو گئے تو ہم میں سے رسول اللہ ﷺ کی غیر موجودگی میں بعض حضرات بعض سے آہستہ آہستہ کہنے لگے کہ اب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ عطا کر دیا ہے عزت عطا فرما دی ہے اور اس کے کثیر مددگار ہو چکے ہیں ہم پہلے ہی بہت مال خرچ کر چکے ہیں اب ہمیں اپنے مالوں کی حفاظت کرنی چاہئے اور اپنی ضروریات واصلاح کے لئے مال بچا کر رکھنا چاہئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ پر ہمارے اس

قول کے رد میں یہ آیۃ کریمہ نازل فرمائی کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو اگر مال خرچ نہیں کرو گے کفار سے جنگ کی تیاری نہیں کرو گے تو اپنے ہاتھوں سے ہی اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دو گے۔

(روح المعانی)

(۲) شان نزول کی دوسری وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب عمرہ کی قضاء کے لئے مکہ مکرمہ میں جانے لگے تو صحابہ کرام کے دلوں میں خیال پیدا ہوا کہ ہوسکتا ہے کفار ہمیں پھر روک دیں اور ہمارے ساتھ جنگ چھیڑ دیں اور ہمیں بھی ان سے لڑنا پڑے تو ہمیں بھی تیاری رکھنی چاہئے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کی تسلی کے لئے آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرو:

" فکانت عمرة وجهادا واجتمع فيه المعينان فلما كان الامر كذلك لا جرم قال الله تعالىٰ ﴿ وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ ولم يقل وانتفقوا في الجهاد والعمرة "

قرآن پاک کا یہ خصوصی کمال ہے کہ مختصر الفاظ کثیر مطالب کو حاوی ہوتے ہیں اگرچہ مسلمانوں کو جہاد اور معرہ کے لئے مال خرچ کرنے کا حکم دیا لیکن لمبا جملہ " وانفقوا في الجهاد والعمرة " (اور خرچ کرو جہاد میں اور عمرہ میں) ذکر نہیں کیا بلکہ مختصر جملہ ذکر کیا جو طویل مقصد کو شامل ہے ارشاد فرمایا:

﴿ وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ ''اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو''

فائدہ جلیلہ : شان نزول کی پہلی وجہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ان کی روایت کو ذکر کرنے کے ساتھ مفسرین کرام نے یہ بھی ذکر فرمایا:

" قال البغوى فمازال ابو ايوب رضى الله عنه يجاهد في سبيل الله حتى كان آخر غزوة غزاها بقسطنطنية فاستشهدو دفن في اصل سور قسطنطنية وهم يستسقون به "

بغوی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا کہ حضرت ابوایوب انصاری ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد میں شریک ہوتے رہے یہاں تک کہ آپ نے سب سے آخری جہاد قسطنطنیہ میں شرکت کی جس میں آپ شہید ہو گئے اور قسطنطنیہ کے قلعہ کی دیواروں کے ساتھ ہی آپ کو دفن کر دیا گیا لوگ قحط سالی میں آپ کے توسل سے رب تعالیٰ سے بارش طلب کرتے ہیں۔ (مظہری)

روح البیان نے بھی یہ واقعہ ذکر کیا ساتھ وضاحت کی کہ یہ قسطنطنیہ کی وہ جنگ مراد ہے جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ہوئی (یعنی پہلی جنگ جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ کی زیر قیادت ہوئی وہ مراد نہیں):

" فتوفی هناک و دفن فی اصل سور قسطنطنية وهم يستشقفون به "

وہ وہاں ہی شہید ہوئے اور قسطنطنیہ کی دیواروں کے ساتھ ہی آپ کو دفن کر دیا گیا اور لوگ آپ کے وسیلہ جلیلہ سے اللہ تعالیٰ سے شفا حاصل کرتے ہیں۔

سبحان اللہ کیا خوب مسئلہ حل ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کے وسیلہ سے اپنی خصوصی رحمت کا نزول فرماتا ہے جس کی وجہ سے لوگوں کو بارش بھی حاصل ہوتی ہے اور بیماریوں سے شفا بھی یعنی حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا مزار پر انوار مرجع خلائق ہے اور رب تعالیٰ کی رحمت کے نزول کا ذریعہ ہے۔

وَ اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ : "اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں"۔ انفاق، کا معنیٰ ہے کہ مال خیر کے کاموں میں صرف کیا جائے اگر کوئی مال ضائع کر دے تو اس ضائع کرنے والے کو عربی میں " مضیع المال " کہا جائے گا "منفق" نہیں کہا جائے گا۔ پھر " انفاق " کو ﴿ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ﴾ سے مقید کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرو اللہ تعالیٰ کی راہ سے مراد دین اسلام ہے سبیل کا معنیٰ "راستہ" اور "سَبِیْلِ اللّٰہِ" کا معنیٰ اللہ کا راستہ یعنی دین اسلام۔

اب آیۃ کا مفہوم وسیع تر ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے دین میں جہاں بھی مال خرچ کرنے کا حکم دیا ہے وہ اس میں داخل ہیں:

" سواء کان انفاقا فی حج او عمرة او کان جهادا بالنفس او تجهيزا للغير او کان انفاقا فی صلة الرحم او فی الصدقات او علی العيال او فی الزکوات والکفارات او عمارة السبيل وغيره ذلک "

خواہ وہ مال حج میں خرچ کرنا ہو یا عمرہ میں خواہ اپنے نفس سے جہاد کرنے میں مال خرچ کرنے کی ضرورت یا غیر کی تجہیز و تکفین میں مال خرچ کرنا ہو، یا صلہ رحمی کے طور پر مال خرچ کرنا یا بطور صدقات

مال خرچ کرنا اسی طرح رفاہ عامہ کے لئے کنوواں کھدوانے اور تیار کرنے میں مال خرچ کرنا ہو وغیرہ
تمام نیکی کے کاموں میں مال خرچ اس آیۃ کریمہ میں داخل ہے کیونکہ یہ سب کام دین اسلام نے ہی تو
بتائے ہیں کہ یہ نیکی کے کام ہیں۔ ہاں البتہ جہاد کا ذکر ساتھ ہی پہلے آچکا ہے اس لئے یہ آیۃ کریمہ جہاد
میں مال خرچ کرنے کو زیادہ واضح کررہی ہے۔ (کبیر)

کیا خوب حکمت:

سبحان اللہ رب تعالیٰ کا کلام کتنی ہی حکمت سے لبریز ہے اور کیا خوب انداز بیان ہے جب مال
خرچ کرنے کو واجب کیا گیا تو اس وجوب کی علت اور وجہ ﴿ وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ﴾ ''اللہ کی راہ
میں مال خرچ کرو'' سے یوں بیان کردی:

'' وذلک لان المال مال اللہ فیجب انفاقه فی سبیل اللہ ''

کہ جب مال ہی تمہیں رب تعالیٰ نے عطا کیا ہے اور درحقیقت مال ہی اس کا ہے تو تم پر واجب
ہے کہ اسی کی راہ میں خرچ کرو یعنی مال اس طرح خرچ کرو جس طرح رب تعالیٰ نے بیان فرمایا:

'' ولان المؤمن اذا سمع ذکر اللہ اهتز ونشط فیسهل علیه انفاق المال ''

اور رب تعالیٰ نے ﴿ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ﴾ کہا ہے اس میں حکمت یہ ہے کہ مومن جب اللہ تعالیٰ کا
نام سنتا ہے تو خوشی سے جھوم اٹھتا ہے اور خوشی سے پھولے نہیں سماتا تو اس پر اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا
آسان ہوجاتا ہے۔ (کبیر)

وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ : ''اور نہ ڈالو اپنے آپ کو ہلاکت میں'' اس میں ایک
قول یہ ہے کہ باء زائدہ ہے اور '' ایدی '' سے مراد نفس (ذاتیں) ہیں یعنی ذکر جزء کا اور مراد کل ہے۔
'' والمعنی لا تلقوا انفسکم الی التھلکة '' اور معنی یہ ہے کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو (راقم
کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے)

اور ایک قول یہ ہے کہ باء اپنے اصل ہے پر زائدہ نہیں اور کلام میں عبارت محذوف ہے تقدیر
عبارت کی یہ ہے '' وَلَا تُلْقُوْا اَنْفُسَکُمْ بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ '' اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ
پڑو یہ ترجمہ اعلیٰ حضرت کا ہے جو بامحاورہ ہے اصل میں ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے (اور نہ ڈالو اپنے آپ کو

اپنے ہی ہاتھوں سے ہلاکت میں)۔ (خازن)

تاہم مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے ظاہری الفاظ کے مطابق ترجمہ کیا ہے ''اور نہ ڈالو اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں'' ضیاء القرآن کا ترجمہ بھی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کے مطابق ہی ہے۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

﴿ وَلَا تُلْقُوْا ﴾ اصل میں مضارع کا صیغہ " تلقیون " ہے لاء نہی کے ذریعے نون اعراب گر گیا۔ ''لا تلقیو '' ہو گیا۔ ضمہ یاء پر ثقیل تھا نقل کر کے ما قبل کو دے دیا۔ یاء کو التقاء ساکنین کی وجہ سے حذف کر دیا " ولا تلقوا " ہو گیا۔

" الالقاء ، طرح الشئی ، والقی بیده لا یستعمل الا فی الشر "

القاء کا معنی ڈالنا اور پھینکنا ہے " القی بیده " صرف شر میں استعمال ہوتا ہے خیر کے معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ " الی " سے فعل کو متعدی کیا گیا کیونکہ اس میں معنی انتہاء کا پایا گیا ہے یعنی ایسا کام نہ کرو جس کی انتہاء ہلاکت ہو۔ (مظہری)

" اِلَی التَّهْلُكَةِ " ای الهلاک " یعنی ہر وہ چیز جس کا انجام ہلاکت ہو اسے " تهلكة " کہا جاتا ہے۔ بعض حضرات نے یہ بیان کیا ہے کہ جس ہلاکت سے بچنا ممکن ہو اسے " تهلكة " کہتے ہیں اور جس سے بچنا ممکن نہ ہو اسے ''ہلاک'' کہا جاتا ہے۔ (مظہری)

''تھلکۃ'' کا بہت وسیع مفہوم ہے:

یعنی اپنے آپ کو اسباب ہلاکت میں نہ ڈالو وہ اسباب ہلاکت کیا ہیں؟

" امساک الاموال والانفس عن الجهاد لان به یقوی العدو وتکثر المصائب فی الدین والذل لاهله کما هو مشاهد "

جہاد کے لئے مال خرچ نہ کرنا اور اپنی جانوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان نہ کرنا کیونکہ اس سے دشمن کو قوت حاصل ہوتی ہے اور دین میں زیادہ مصیبتیں حاصل ہوتی ہیں اور مسلمانوں کو ذلت حاصل

ہوتی ہے جسے ہم آئے دن دیکھ رہے ہیں۔ بخلاف اس کے جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنا مال اور جان پیش کرتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں دائمی عزت عطا فرماتا ہے یہی لوگ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مستحق ہوتے ہیں:

﴿ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَرَحۡمَةٌ ﴾

''ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی مہربانیاں اور رحمت ہے''

(صاوی)

" الا ترون ان الامة الاسلامية لما نكصت على اعقابها ونامت على وسادة الراحة الوثير وتقهقرت الى الوراء ونامت عن جمع المال وانفاقه فى الجهاد وسبقتها الامم اخذت تبيد وتهلك "

کیا تم دیکھتے نہیں جب ملت اسلامیہ نے پیچھے کی جانب جانا شروع کر لیا اور آرام دہ بستر پر سونے کی عادت بنا لی اور الٹی چال چلنے لگے اور جہاد میں مال جمع کرنے اور خرچ کرنے سے آنکھیں بند کر لیں تو دوسری قومیں ان پر سبقت لے گئیں اور انہوں نے مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنا شروع کر دیا۔

(جواهر طنطاوی)

کفار نے مسلمانوں کی ہلاکت کے لئے طیارے تیار کر لئے، میزائل بنا لئے ہر قسم کی تباہی پھیلانے والے آلات حرب تیار کر لئے اور مسلمانوں نے قرض لے لے کر محافل سرود ورقص قائم کیں بسنت پر کروڑوں روپے اڑا دیئے جب جنگ کی باری آئی تو نوے ہزار مسلمانوں کو قید کرا کے اپنے ملک ک دولخت کر کے ایسی ذلت حاصل کی جس کی مثال نہیں ملتی۔ حق تو یہ تھا کہ اس پر شرم آتی لیکن کرتوت وہی رہے۔ چال وہی رہی۔

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے یہی مضمون بیان کرنے کے ساتھ زیادہ یہ بھی بیان کیا:

﴿ وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَيۡدِيۡكُمۡ اِلَى التَّهۡلُكَةِ ﴾ بالاسراف وتضييع وجه المعاش "

تم اپنے مالوں میں اسراف کر کے (بیجا خرچ کر کے) اور اپنے ذرائع معاش ضائع کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ (بیضاوی)

" وقال بعضهم نزلت الآية فى البخل وترك الانفاق فى سبيل الله "

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ آیۃ کریمہ بخل اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کو چھوڑنے کے متعلق نازل ہوئی یعنی مقصد یہ ہے کہ تم کنجوسی کرکے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے کو چھوڑ کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ (مظہری)

خرچ میں اعتدال سے کام لینا:

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے ایک معنی جو تحریر فرمایا کہ اسراف کرکے اور ذرائع معاش کو ضائع کرکے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو اسی کی وضاحت میں شیخ زادہ رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں۔

☆ "عن سعید بن المسیب ومقاتل بن حیان رضی اللہ عنہما قالا لما امر اللہ تعالیٰ بالانفاق قال رجال امرنا بالانفاق فی سبیل اللہ ولو انفقنا اموالنا بقینا فقراء فانزل اللہ تعالیٰ ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ"

حضرت سعید بن مسیب اور مقاتل بن حیان رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے مال خرچ کرنے کا حکم دیا تو کچھ لوگ کہنے لگے کہ ہمیں اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن ہم نے اپنے مال اگر خرچ کر دیئے تو ہم خود فقیر ہو جائیں گے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ﴿وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ﴾ یعنی تمہیں یہ حکم نہیں دیا گیا کہ تم اللہ کی راہ میں سارا مال ہی خرچ کر دو خود بھوکے اور ننگے ہو جاؤ اور اپنے اہل وعیال کو بھوک کی وجہ سے ضائع کر دو بلکہ مال خرچ کرنے میں اعتدال سے کام لو کچھ مال اپنے لئے اور اپنی زوجہ اور اولاد اور اپنے ضعیف والدین کے لئے بھی رکھ لو اور کچھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں بھی خرچ کر دو سارا مال خرچ کرکے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو یہ مسئلہ اللہ تعالیٰ کے ارشادات گرامیہ سے واضح طور پر ثابت ہے:

﴿وَلَا تَجْعَلْ یَدَکَ مَغْلُوْلَۃً اِلٰی عُنُقِکَ وَلَا تَبْسُطْھَا کُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا﴾
(بنی اسرائیل ۲۹ پ ۱۵)

"اور اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا ہوا نہ رکھ اور نہ پورا کھول دے کہ تو بیٹھ رہے ملامت کیا ہوا تھکا ہوا"

﴿وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا﴾

"اور وہ کہ جب خرچ کرتے ہیں نہ حد سے بڑھیں اور نہ تنگی کریں اور ان دونوں کے درمیان اعتدال پر رہیں"
(از شیخ زادہ)

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے چند اوصاف ذکر فرمائے ان میں یہ بھی ذکر کیا کہ وہ خرچ میں اعتدال رکھتے ہیں نہ حد سے زیادہ مال خرچ کرتے ہیں اور نہ ہی کنجوسی سے کام لیتے ہیں لیکن راقم کا موقف یہ ہے کہ یہ عام نیک لوگوں کا وصف ہے البتہ وہ حضرات جو تقوی میں بہت بلند مقام رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر کامل توکل رکھتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں سارا مال بھی خرچ کر دیں تو یہ ان کی شان ہے جیسا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے سارا مال نبی کریم ﷺ کی خدمت میں غزوہ (جہاد) کی تیاری کے لئے پیش کر دیا۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے ان کی اس فعل پر تعریف فرمائی:

گناہوں میں مبتلا ہو کر ہلاکت میں نہ پڑو:

"اخرج عبد بن حميد وابن المنذر وابن مردويه والطبراني والبيهقي في الشعب عن النعمان بن بشير قال كان الرجل يذنب الذنب فيقول لا يغفر الله لي فانزل الله ولا تلقوا بايديكم الى التهلكة"

حضرت نعمانی بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب کوئی شخص گناہ کرتا تو کہتا اللہ تعالیٰ میری مغفرت نہیں کرے گا (اس طرح وہ مزید گناہوں میں مبتلا ہوتا) تو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ مبارکہ کو نازل کیا ﴿ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾ اب اس کا مطلب یہ ہوگا کہ گناہوں میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

☆ "واخرج وكيع وسفيان بن عيينة والفريابي وعبد بن حميد وابن جرير وابن المنذر وابن ابي حاتم والحاكم وصححه والبيهقي عن البراء بن عازب انه قيل له ﴿وَلَاتُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾ هو الرجل يلقى العدو فيقاتل حتى يقتل قال لا ولكن وهو الرجل يذنب الذنب فيلقي بيديه فيقول لا يغفر الله لي ابدا"

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾ کا کیا یہ مطلب ہے۔ کہ ایک شخص دشمن سے مقابلہ کرے اور لڑائی کرتے ہوئے مقتول ہو جائے (کیا اس سے منع کیا گیا ہے کہ تم اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو) تو انہوں نے فرمایا نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص گناہوں میں مبتلا ہو کر یہ نہ کہے کہ وہ مجھے اللہ تعالیٰ کبھی بھی نہیں بخشے گا تو وہ اور گناہوں میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالے۔

رب تعالیٰ کی رحمت سے ناامید ہوکر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو:

ابھی جو دو حدیثیں بیان کی ہیں ان کا ایک وہی مطلب ہے جو ذکر کر دیا گیا ہے جس کو اس حدیث سے تائید حاصل ہے:

" واخرج ابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم عن ابن عباس قال التھلکة عذاب الله "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ﴿ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾ میں " التھلکة " کا معنی اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے اور دوسرا مطلب یہ ہے جو اب عنوان قائم کیا ہے کہ کوئی شخص گناہ کر کے یہ نہ کہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی بھی مجھے نہیں بخشے گا یہ رب تعالیٰ کی رحمت سے ناامیدی ہے جو انسان کو ہلاکت میں ڈال دیتی ہے اس لئے توبہ کرے اور رب تعالیٰ کی رحمت کی امید رکھے کہ وہ مجھے بخشے گا اس مسئلہ کو اس حدیث سے تائید حاصل ہے۔

" واخرج وکیع وعبد بن حمید وابن جریر عن عبیدة السلمانی فی قوله ﴿وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ قال القنوط "

عبیدہ سلیمانی رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید ہو کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔
(ماخوذ از در منثور)

مال کم سمجھ کر، خرچ نہ کر کے ہلاکت میں نہ پڑو:

" قال ابن عباس انفق فی سبیل الله وان لم یکن ذلک الاسهم او مشقص ولا یقولن احدکم لا اجد شیئا "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو اگر چہ سوائے ایک تیر یا تیر کی نوک کے تمہارے پاس اور کچھ نہ ہو تم میں سے کوئی ایک یہ نہ کہے کہ میں کچھ نہیں پاتا۔ اب مطلب یہ ہو گیا کہ مال کو تھوڑا سمجھ کر اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا چھوڑ کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو

" ونحوه عن السدی انفق ولا عقالا ولا تلقی بیدک الی التهلکة

فتقول لیس عندی شئی "

حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرو خواہ تمہارے پاس اونٹ کی ایک رسی ہو تو وہی اللہ تعالیٰ کی راہ میں دے دو لیکن یہ کہہ کر کہ "میرے پاس دینے کے لئے کوئی چیز نہیں" اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ (قرطبی)

اپنی اولاد کی فکر میں مال خرچ نہ کر کے ہلاکت میں نہ پڑو:

حضرت حذیفہ بن یمان اور حضرت ابن عباس اور حضرت عکرمہ اور عطا اور مجاہد اور جمہور حضرات نے یہ معنی بھی تحریر فرمایا ہے:

" لا تلقوا بایدیکم بان تترکوا النفقة فی سبیل اللہ وتخافوا لعیلة فیقول الرجل لیس عندی ، والی ھذا ذھب البخاری "

اپنی اولاد کی فکر میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنا چھوڑ کر اور یہ کہہ کر کہ میرے پاس دینے کے لئے کچھ نہیں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو بخاری رحمہ اللہ نے بھی یہ معنی لیا ہے۔

ثواب سے محروم ہو کر ہلاکت میں نہ پڑو:

" لا تمسکوا اموالکم فیرثھا منکم غیرکم فتھلکوا بحرمان منفعة اموالکم ومعنی آخر ولا تمسکوا فیذھب علکم الخلف فی الدنیا والثواب فی الآخرة "

اپنے مال روک کر اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کر کے اپنے آپ کو دنیاوی منافع اور اخروی ثواب سے محروم کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو کیونکہ وہ تمہار اموال تمہارے پیچھے رہ جانیوالے ورثاء سمیٹ لیں گے بلکہ دنیا میں بھی تمہیں اس مال سے محروم کرنے کیلئے مختلف ہتھکنڈے استعمال کریں گے۔

حرام مال خرچ کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو:

" لا تنفقوا من حرام فیرد علیکم فتھلکوا " حرام مال خرچ نہ کرو کیونکہ اگر تمہیں بھی حرام مال ہی عطا کر دیا گیا تو تم ہلاکت میں پڑ جاؤ گے اور اگر تم نے حرام مال ثواب کی غرض سے خرچ یا تو اس کے بدلے تمہیں جو جزاء حاصل ہوتی ہے وہ جزاء خیر تو ہوتی نہیں اس لئے تم اپنے آپ کو ہلاکت

میں نہ ڈالو۔

جنگ میں بلا خطر کود پڑنا اس آیۃ کا مصداق نہیں:

ایک مسلمان کفار کے ایک بڑے لشکر پر حملہ کرتا ہے اس امید پر کہ میں ان پر غالب آ جاؤں گا "اذا طلبت الشهادة وخلصت النية فليحمل" اور اس کی نیت بھی خالص ہے اور شہادت کی طلب کے لئے وہ کفار پر حملہ کرتا ہے تو یہ جائز ہے۔ اگر چہ بعض حضرات نے کہا" فان لم تكن فيه قوة فذلك من التهلكة" کہ اگر کسی شخص میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ کفار کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتا تو پھر جنگ میں اکیلے شخص کا شریک ہونا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ (از قرطبی)

لیکن راقم کے نزدیک یہ ہلاکت میں واقع ہونا لازم نہیں آتا۔ اسی پر علامہ قرطبی اور علامہ رازی رحمہ اللہ کے دلائل ملاحظہ ہوں ایک دلیل تو علامہ رازی نے وہی بیان فرمائی جو شان نزول میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا ارشاد ذکر کیا گیا۔

☆ " الثاني روى الشافعي رضى الله عنه ان رسول الله ﷺ ذكر الجنة فقال له رجل من الانصار ارأيت يا رسول الله ان قتلت صابرا محتسبا قال عليه الصلوة والسلام لك الجنة فانغمس في جماعة العدو فقتلوه بين يدى رسول الله ﷺ"

دوسری دلیل اس پر روایت امام شافعی رحمہ اللہ ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے جنت کا ذکر فرمایا تو ایک انصاری شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ اگر میں صبر وخلوص سے رب تعالیٰ کی راہ میں شہید ہو جاؤں تو آپ کی رائے کیا ہے؟ آپ نے فرمایا تمہارے لئے جنت ہے تو وہ شخص دشمن کی جماعت میں گھس گئے دشمن لوگوں نے ان کو رسول اللہ ﷺ کے سامنے شہید کر دیا۔ (واضح ہوا کہ بلا خطر جنگ میں کود پڑنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا لازم نہیں آتا):

" وان رجلا من الانصار القى درعا كانت عليه حين ذكر النبى ﷺ الجنة ثم انغمس في العدو فقتلوه"

ایک اور انصاری شخص نے رسول اللہ ﷺ سے جنت کا ذکر سنا تو انہوں نے اپنی زرہ کو اتار پھینک دیا اور دشمن کی جماعت میں گھس گئے ان لوگوں نے ان کو شہید کر دیا۔

☆ " والثالث روی ان رجلا من الانصار تخلف عن بنی معاویة فرأی الطیر عکوفا علی من قتل من اصحابه فقال لبعض من معه سأتقدم ای العدو فیقتلوننی ولا تخلف عن مشهد قتل فیه اصحابی ففعل ذلک فذکروا ذلک للنبی ﷺ فقال فیه قولا حسنا "

اور تیسری دلیل یہ ہے کہ روایت میں ہے کہ ایک انصاری شخص بنی معاویہ سے پیچھے رہ گئے ان کے کچھ دوست شہید ہو گئے انہوں نے جب شہداء احباب کے پاس پرندوں کو دیکھا تو اپنے کسی ساتھ کو کہا کہ میں دشمن سے مقابلہ کے لئے آگے بڑھ رہا ہوں دشمن اپنی کثرت کی وجہ سے مجھے شہید کر دیں گے لیکن میں اپنے احباب کے ساتھ میدان جنگ میں رہوں گا ان سے پیچھے نہیں رہوں گا۔ جب نبی کریم ﷺ کو اس کی خبر ملی تو آپ نے اس شخص کی تعریف کی حضور ﷺ کا اس کی تعریف کرنا ہی دلالت کرر ہا ہے کہ جنگ میں مسلمانوں کا بلا خطر کود پڑنا ہلاکت میں ڈالنا نہیں بلکہ قابل تحسین ہے۔

☆ " والرابع روی ان قوما حاصروا حصنا فقاتل رجل حتی قتل فقیل القی بیده الی التهلکة فبلغ عمر بن الخطاب رضی الله عنه ذلک فقال کذبوا الیس یقول الله تعالیٰ ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ﴾

(البقرة ۲۰۶ پ ۲)

اور چوتھی دلیل یہ ہے کہ ایک قوم نے ایک قلعہ کا محاصرہ کر لیا تو ایک شخص بلا خطر لڑائی میں مشغول ہو گیا یہاں تک کہ شہید ہو گیا تو اس کے متعلق بعض حضرات کہنے لگے کہ اس نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال لیا ہے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خبر ملی تو آپ نے کہا وہ جھوٹ کہتے ہیں کیا اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا (ترجمہ) اور کوئی آدمی اپنی جان بیچتا ہے اللہ کی مرضی چاہنے میں اور اللہ بندوں پر مہربان ہے۔

(از کبیر)

☆ " وفی صحیح مسلم عن انس بن مالک ان رسول الله ﷺ افرد یوم احد فی سبعة من الانصار ورجلین من القریش فلما رهقوه قال من یردهم عنا وله الجنة او هو رفیقی فی الجنة فتقدم رجل من الانصار فقاتل حتی قتل ثم رهقوه ایضا فقال من یردهم عنا وله الجنة اوهو رفیقی فی الجنة فتقدم اجل من الانصار فقاتل حتی قتل فلم یذل کذلک حتی قتل السبعة "

مسلم شریف میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے بیشک رسول اللہ ﷺ احد

کے دن سات انصار اور دو مہاجرین کے ساتھ (باقی صحابہ کرام سے کٹ کر) علیحدہ رہ گئے جب کفار نے آپ کو گھیرے میں لے لیا تو آپ نے فرمایا کون وہ شخص ہے جو ہماری طرف دفاع کرے ان کو واپس دھکیل دے وہ جنت میں میرا رفیق ہوگا۔ تو ایک انصاری صحابی آگے بڑھے ان سے لڑائی کی یہاں تک کہ وہ شہید ہو گئے۔ پھر ان کفار نے جب گھیرا ڈالا تو پھر نبی کریم ﷺ نے وہی ارشاد فرمایا پھر ایک انصاری صحابی آگے بڑھے جنہوں نے قتال کیا یہاں تک کہ شہید ہو گئے اسی طرح ایک ایک کر کے سات انصاری صحابی شہید ہو گئے۔

حضرت امام محمد رحمہ اللہ کی خوبصورت تفصیل:

(۱) اگر ایک مسلمان ایک ہزار کافر پر حملہ کرتا ہے اور اسے اپنی نجات کی امید ہے یا اس کا یہ خیال ہے کہ میرے حملہ سے مسلمانوں کو فائدہ ہوگا اور دشمن کا نقصان ہوگا تو یہ صورت جائز ہے۔

(۲) اور اگر اس لئے حملہ کرے کہ میرے ایک کے حملہ کرنے سے دوسرے مسلمان بھی حملہ کریں گے اور بہادری کا مظاہرہ کریں گے کہ جب ہمارا ایک بھائی اکیلے میدان جنگ میں کود پڑا ہے تو ہم کیوں پیچھے رہیں تو یہ صورت بھی جائز ہے کیونکہ مسلمانوں کا اس میں بھی نفع پایا گیا ہے۔

(۳) اور اگر دشمن کو ڈرانے کے لئے حملہ کرے کہ وہ سمجھیں کہ ایک شخص ہزار کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اگر حملہ آور ہو چکا ہے تو دوسرے بھی جب حملہ آور ہوئے تو ہماری تباہی ہو جائیگی اس طرح ان کے دلوں پر رعب طاری کرنے کے لئے حملہ کرنا بھی جائز ہے۔

(۴) جب مسلمانوں کا کامل نفع ہو اور دین کو عزت وعظمت حاصل ہو اور کفار کو ذلت حاصل ہو تو اس صورت میں اس شخص کا اپنی جان قربان کا قابل مدح ہے ایسے حضرات کی شان میں ہی فرمایا:

﴿ اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَیَقۡتُلُوۡنَ وَ یُقۡتَلُوۡنَ ﴾ (التوبة ۱۱۱ پ ۱۱)

''بیشک اللہ نے مسلمانوں سے ان کے مال اور جان خرید لئے ہیں اس بدلے پر ان کے لئے جنت ہے اللہ کی راہ میں لڑائیں تو ماریں اور شہید ہو جائیں۔

(۵) اگر ایک شخص ہزار پر حملہ کرتا ہے جس سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا تو یہ شہید ہو جاتا ہے

اگرچہ شہادت بذاتہ باعث اجر وثواب ہے لیکن اس لئے مکروہ ہے کہ کم از کم ایسی صورت کو اختیار کرنا جس سے مسلمانوں کو نفع حاصل ہوتا کافروں کو ذلت حاصل ہوتی پھر یہ شہید ہوتا تو زیادہ بہتر تھا۔

(از قرطبی)

فائدہ : اسی سے یہ فائدہ بھی حاصل ہو گیا جو فقہاء کرام نے تحریر فرمایا ہے کہ جب مسلمانوں کا حاکم یہ دیکھے کہ ابھی ہمیں شکست نظر آتی ہے تو وقتی طور پر جنگ کو ٹال دے اور تیاری کر کے جنگ کریں لیکن ہمیشہ خرگوش کی نیند نہ سو جائیں اور غفلت میں وقت نہ گزاریں اور ہمیشہ ہی کافروں سے شر کر وقت نہ گزاریں یعنی نہ ہی اپنے آپ کو ہلاکت وتباہی میں ڈالیں اور نہ ہی ہمیشہ کے لئے خوف وہراس میں رہیں۔

وَاَحۡسِنُوۡا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ :

''اور احسان کرو بیشک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے احسان کرنے والوں سے'' احسان کے دو معنی ہیں:

" احدهما فعل فعلا حسنا فی نفسه سواء تعدی نفعه الی غیره اولا "

احسان کا پہلا معنی یہ ہے کہ اچھا فعل کرنا خواہ اس کا نفع غیر کو پہنچے یا نہ پہنچے اس معنی کا لحاظ پر جس شخص نے نماز ادا کی اور روزہ رکھا اور کوئی نیکی کا کام کیا اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے ''احسن الرجل'' فلاں شخص نے احسان کیا یعنی اچھا عمل کیا۔ (شیخ زادہ) اسی معنی کے لحاظ سے بعض صحابہ کرام سے مروی ہے کہ رب تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے " **احسنوا فی اعمالکم بامتثال الطاعات** " کہ اپنے عمل اچھے کرو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کو تسلیم کرو اور ان پر عمل کرو۔ (قرطبی)

یہ معنی ماخوذ ہے " **الاحسان هو فعل الحسن** " سے یعنی اچھا کام۔ اسی معنی کے لحاظ پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے " **فالضرب والقتل اذا حسنا کان فاعلهما فحسنا** " ضرب اور قتل جب اچھے ہوں تو ان پر عمل کرنے والے کے متعلق بھی یہ کہا جائے گا کہ وہ احسان کر رہا ہے:

" واخرج ابن جریر عن رجل من الصحابة فی قوله واحسنوا قال ادوا الفرائض "

ایک صحابی سے مروی ہے کہ " احسنوا " کا مطلب یہ ہے کہ فرائض ادا کرو۔

" واخرج عبد بن حمید وابن جریر عن عکرمة فی قوله ﴿ وَاَحۡسِنُوۡا

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴾ قال احسنوا الظن باللہ "

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ﴿وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر اچھا گمان کرو کہ تم نیک عمل کرو اور اللہ تعالیٰ پر اچھا گمان کرو کہ وہ تمہیں جزاء عطا فرمائے گا۔ (درمنثور)

اسی معنی کے لحاظ پر ایک حدیث پاک کے یہ الفاظ گرامی بھی مدنظر رہیں:

" قال (یعنی جبرائیل) اخبرنی عن الاحسان قال (علیہ السلام) ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک (یعنی بالحضور والخشوع)

جبریل علیہ السلام نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا احسان کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو (یہ تصور کرتے ہوئے) گویا کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو اگر تم نہیں دیکھ رہے تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے یعنی حضور قلب اور خشوع سے عبادت کرو۔ عجز وانکساری سے عبادت کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ ابھی تک احسان کا جو معنی بیان کیا ہے اسے الاحسان فی العبادات کہا جاتا ہے (مظہری)

احسان کا دوسرا معنی یہ ہے:

" ایصال الخیرا الی المحتاج " محتاج تک بھلائی کو پہنچانا۔ اس معنی کے لحاظ پر نماز پڑھنے یا روزے رکھنے کو احسان نہیں کہا جائے گا بلکہ صدقہ کرنا یا اور کسی طرح محتاج نفع پہنچانے کو احسان کہا جائے گا۔ (شیخ زادہ)

یہ معنی ماخوذ ہے ''احسان'' سے:

" ففاعل الحسن لا یوصف بکونہ محسنا الا اذا کان فعلہ حسنا واحسانا معا "

اچھا کام کرنے والا اس وقت تک محسن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کا کام اچھا نہ ہو اور دوسرے کو نفع نہ پہنچائے یعنی حسن اور احسان دونوں بیک وقت جس میں پائے جائیں گے وہ محسن کہلائے گا۔ (کبیر)

اسی معنی کا اعتبار کرتے ہوئے کہا جاتا" الاحسان فی المعاملات " (معاملات میں احسان)(مظہری) اب مطلب یہ ہوگا " واحسنوا فی الانفاق علی من تلزمکم مؤمنت ونفقته " کہ جن لوگوں کا خرچ تمہارے ذمہ ہے تمہاری زوجہ اور اولاد اور ضعیف والدین یا محتاج رشتہ داران پر خرچ کر کے احسان کرو اور اس خرچ میں اعتدال رکھو نہ حد سے زائد خرچ کرو اور نہ ہی حد سے کم (کبیر)

احسان معاملات پر احادیث مبارکہ :

" قال رسول الله ﷺ تحب للناس ما تحب لنفسک وتکره لهم ما تکره لنفسک " (رواه احمد عن معاذ)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم لوگوں کے لئے وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو اور لوگوں کے لئے وہی ناپسند کرو جو اپنے لئے ناپسند کرتے ہو۔

☆ " قال رسول الله ﷺ المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده ، رواه اصحاب السنن عن ابی هریرة "

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں مسلمان تو حقیقت میں وہی ہے جس کی زبان اور جس کے ہاتھوں سے مسلمان محفوظ رہیں۔

☆ " ورواه احمد عن عمرو بن عنبسة فی جواب ای السلام افضل قال ان من احبکم الی احسنکم اخلاقا "

عمرو بن عنبسہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کون سا اسلام (اسلام کا کون سا عمل) افضل ہے؟ آپ نے فرمایا تم میں سے جس کے اچھے اخلاق ہوئے وہی مجھے محبوب ہوگا۔

" رواه البخاری عن عبد الله بن عمرو وفی الصحیحین بلفظ من خیارکم احسنکم اخلاقکم "

بخاری و مسلم نے روایت ذکر کی جو بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص تم میں سے اچھے اخلاق رکھتا ہو وہی تم میں سے بہتر ہے۔

☆ " قال رسول الله ﷺ ان الله کتب الاحسان علی کل شئی فاذا قتلتم فاحسنوا

القتلة واذا ذبحتم فاحسنوا الذبحة ولیحد احدکم شفرته ولیرح ذبیحته "

(رواہ مسلم)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر احسان کرنے کا حکم فرمایا اس لئے جب تم کسی کو قتل کرو تو اچھے طریقہ سے قتل کرو (یعنی ان کے اعضا نہ کاٹو شکل نہ بگاڑو اور جب (قصاص وغیرہ کے طور پر) قتل کرو تو پھر بھی تیز دھار آلہ سے قتل کرو کند آلہ سے تکلیف نہ پہنچاؤ) اور جب جانور کو ذبح کرو تو اس پر ذبح میں احسان کرو یعنی تم اپنی چھری کو تیز کرلو اور اپنے ذبیحہ (ذبح ہونے والے جانور) کو راحت پہنچاؤ۔ (مظہری)

تنبیہ : جتنے معانی احسان کے بیان کیے گئے ہیں وہ تمام ہی ﴿ اِنَّ اللہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴾ میں اسی ترتیب سے مراد لئے جائیں یعنی عبادات و معاملات میں احسان کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے۔

مخالفین جہاد کے اعتراضات:

مخالفین اسلام تعصب و عناد سے جہاد کے متعلق یہ اعتراض کر کے اسلام پر دھبہ لگاتے ہیں

۱) پہلی کتب میں اخوت اور محبت اور عفو کا سبق دیا گیا ہے انجیل میں ہے "جو تیرے گال پر ایک طمانچہ مارے تو اس کی طرف دوسرا گال کر دے اور جو تیرا برا چاہے تو اس کی بھلائی چاہ۔ لیکن قرآن و اسلام سے اس سے خالی ہے بلکہ اس کا حکم پہلے انبیاء کرام کی تعلیمات کے خلاف ہے۔

۲) تمام انبیاء کرام کی تعلیمات کے خلاف قرآن نے بزور شمشیر اسلام پھیلانے کا حکم دیا جو اسلام نہ لائے اس کو بے رحمی سے قتل کر دیا جائے اور قیدیوں کو غلام بنالیا جائے۔

۳) جہاد کے مسئلہ نے مسلمانوں کو غیر مذہب والوں پر ظلم و ستم کی اجازت دے دی حالانکہ کفار کے ممالک میں مسلمان بھی آزادی سے حفاظت میں رہتے ہیں۔

یہ اعتراضات یورپ کے مخالفین اسلام اور ان کے مرید مشنری یعنی نام نہاد روشن دماغ جہاد اور اسلام اور قرآن پاک اور نبی کریم ﷺ پر کرتے ہیں۔

جواب: یہ کہنا ہی لغو اور باطل ہے کہ پہلے انبیاء کرام نے جہاد نہیں کیا یا کفار اور بدطنیت لوگوں کی بربادی کے لئے دعا نہیں کی موسیٰ علیہ السلام کا بنی عمالقہ سے جہاد کرنا اور حضرت حزقیل علیہ السلام اور حضرت سمویل علیہ السلام کا جہاد کرنا بہت واضح طور پر ثابت ہے نوح علیہ السلام اور کئی انبیاء کرام کا اپنی کافر قوم کی بربادی کے لئے دعا کرنا بھی بہت ہی روز روشن کی طرح ثابت ہے۔

کیا کسی قاتل، چور اور ڈاکو کو سزا دینا یہود و نصاریٰ اور ان کے ہمنواؤں کے نزدیک جرم ہے؟ کیا انہوں نے کبھی سزائیں نہیں دیں؟ جب وہ بھی سزائیں دیتے ہیں تو صرف اسلام پر اعتراض کیوں؟

ذرا ماقبل اوراق پر نظر دوڑائیں تو آپ کو راقم کی بیان کردہ بحث سے واضح ہو جائے گا کہ اسلامی جہاد اور کافروں کی جنگوں میں کتنا عظیم فرق ہے۔ اسلام نے جنگ میں بھی بچوں، بوڑھوں اور عورتوں پر رحم کرنے کا حکم دیا۔ مقتولین سے بھی اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا اور کفار نے مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کا ہمیشہ ہی منصوبہ بنایا اور اسی پر عمل کیا۔ کوئی مسلمان حاکم ڈر کے مارے جرات نہیں کرسکتا کہ وہ یہ کہے کہ دہشت گرد تو تم ہو مسلمانوں کو دہشت گرد کیوں کہتے ہو؟ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ مسلمان بھی ان کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو ہی دہشت گرد کہہ رہے ہیں۔

اسلام چند صورتوں میں جہاد کا حکم دیتا ہے:

اول یہ کہ مخالفین اسلام مسلمانوں کے ملک اور مساجد پر قبضہ کرنے کے ارادہ سے حملہ آور ہوں اور مسلمان پر چڑھائی کریں جیسا کہ احزاب کی جنگ میں کفار سے جہاد کرنا اور اپنا دفاع کرنا فرض کیا گیا۔

دوم یہ کہ کسی جگہ مسلمان اور کافر قدیم وقت سے ملے جلے رہتے ہیں اور پھر کفار مسلمانوں کو مذہبی رسوم و عبادات پر عمل کرنے کی اجازت نہ دیں تو ایسی صورت میں وہاں رہ کر کفار سے مقابلہ کرسکیں تو مقابلہ کر کے اپنی مذہبی آزادی حاصل کر کے رہیں لیکن کفار سے جب ان کے ملک میں رہتے ہو مقابلہ ممکن نہ ہو تو وہ وہاں رہ کر اپنے اسلام شعار کو نہ چھپائیں بلکہ وہ وہاں سے ہجرت کرلیں جیسے صحابہ کرام نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ میں ہجرت کرلی جب مذہبی آزادی کوئی چھیننے کی کوشش کرے تو وہاں سے ہجرت کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

سوم مسلمان اپنی شان وشوکت اور سامان حرب وقتال بہم پہنچا کر اپنے آس پاس کے بادشاہوں اور قریب وبعید ملکوں کو دین حق کی منادی کریں اور بت پرستی اور دیگر بری عادات ترک کرنے اور فطرت اسلامیہ کے مطابق ان کو عمل کرنے کے متعلق کہیں۔

اسی عظیم مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا اور اسی مقصد عظیم کے لئے نبی کریم ﷺ تشریف لائے اسی پر آپ علم کے وارث علماء کرام تا قیامت عمل کرتے رہیں گے۔ اگر کفار امر حق اختیار کرلیں اور فساد سے باز آئیں تو ان سے کچھ نہ کہا جائے ورنہ اللہ کا نام لے کر مسلمان اس طرح حملہ کریں جیسے صحابہ کرام جہاد کرتے رہیں۔

یہود ونصاری اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں:

اور جو نا انصاف یہود ونصاری اب بھی اعتراض سے باز نہ آئیں اور ملحدانہ طور سے کہیں کہ قران نے ریلجس لبرٹی اور کانمنشیں کا ستیاناس کر دیا اور مذہبی آزادی کو باقی نہ رکھا اور آسمانی حقوق کے لئے کیوں تلوار اٹھائی اور کیوں کافروں پر قہر وغضب کیا تو وہ پہلے بائبل اور اپنی دینی پیشواؤں پر بھی اعتراض کریں جنہوں نے مذہبی جنگیں قائم کیں اور جنہوں نے کفار سے عہد باندھنے کی سخت ممانعت کر دی۔

توراۃ سفر خروج باب نمبر ۲۲ اور درس نمبر ۱۸ میں ہے، تو جادوگرنی کو جینے مت دے جو کوئی چارپائے سے مباشرت کرے مارا جائے جو کوئی خدا کے سوا اور معبود کی عبادت کرے مارا جائے عذاب دے کر۔

پھر باب نمبر ۱۷ میں ذکرہ قوم عمالیق سے جنگ کی اور نسل در نسل ان سے جنگ کرنے کا حکم دیا۔

پھر باب نمبر ۳۳ میں خدا کا کفار سے دشمنی رکھنا اور تمام کفار کی ہلاکت کا وعدہ کرنا اور ان سے معاہدہ کرنے کی سخت ممانعت مذکور ہے۔ پھر باب نمبر ۳۲ میں بسبب گوسالہ پرستی کے بھائی کو بھائی اور دوست کو دوست کے ہاتھ سے قتل کرنے کا حکم اور نیز ہزاروں کا قتل بھی مذکور ہے۔ پھر کتاب استثناء کے باب نمبر ۲ میں ”حسبوں کے بادشاہ موری سے جنگ کرنے کا حکم“ مذکور ہے۔ پھر باب نمبر ۳ میں عوج کو اس کی تمام قوم سمیت قتل کرنے کا ذکر ہے جس میں ان کی عورتیں اور معصوم بچے بھی بحکم خدا قتل کئے گئے اس طرح کے سینکڑوں مقامات میں یہود کی مذہبی کتاب میں قتال کا ذکر ہے۔

اب عیسائیوں کے بزرگوں کی طرف آیئے۔ قسطنطین اعظم نے عیسوی چوتھی صدی میں مذہبی قتل عام کیا پھر ایرین چرچ نے مقلدین اتناسیس کو کس بے رحمی سے افریقہ میں قتل کیا۔ اور ''روس چرچ کر'' نے جرمن و برطانیہ و فرانس میں اور اٹلی کے شمال میں الپس کے پہاڑوں میں دریا خون خاص مذہب کے لئے ہی بہائی۔ اسٹریا میں تیس برس تک مذہبی جنگ رہی۔ ملک فرانس میں چارلس نہم عیسائی نے تین لاکھ پراٹسٹنٹ کو بے رحمی سے قتل کیا۔

پھر یہ دیکھئے کہ کوئن میری اور لوئیس چہاردہم نے کیسا قتل عام مذہب کے لئے کیا اور ہنری ششم شاہ انگلستان نے کاتھولیک لوگوں قتل کر کے مذہب پراٹسٹنٹ پھیلایا۔ پھر انگلستان میں ایک سوتیس برس تک پراٹسٹنٹوں نے اپنا مذہب جاری کرنے کے لئے کیسے کیسے ظلم وستم کئے پھر جان کالوں نے شاہ سروئیس کو ترغیب دی کہ جو ہمارے مذہب کو نہ مانے قتل کیا جائے۔ پھر اسپین میں مسلمانوں پر پادریوں نے کیا کچھ جوروستم نہ کئے؟

پھر ہندوؤں میں ویدوں اور بدمذہب والوں میں سالہا سال تک کیسے کیسے قتل عام ہوئے اگر مذہبی آزادی خدا کا حکم ہے تو ان نام نہاد روشن دماغوں نے یہ قتل عام کیوں کئے ا کے لئے سب کچھ جائز تھا اور صرف مسلمانوں کے لئے ناجائز ہے کیا ان کی طرف سے عدل تھا اور مسلمانوں کی طرف سے ظلم ہے۔ کیا اب بھی یہود و نصاریٰ بنی نوع انسان کو اپنا غلام بنانے کے لئے طرح طرح کے جابجا مظالم نہیں ڈھا رہے۔

کیا مسلمانوں کو اور اسلام کو بزعم خویش مٹانے کے لئے وہ فلسطین، عراق، افغانستان، کشمیر اور چیچنیا میں ظلم نہیں کر رہے انسانی ہمدردی کا جھوٹا ڈھنڈورا پیٹنے والے مسلمانوں کو دہشت گردی کا الزام لگا کر دہشت گردی کر رہے ہیں بے جان مسلمان حکمران، ڈرپوک، خوف زدہ ان درندوں کا نام سن کر کانپ رہے ہیں اور ان کے ہمنوا بن کر جہاد کو دہشت گردی کہہ رہے ہیں۔ تُف تمہاری عقل پر۔

(ماخوذ از حقانی بتصرف)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نجوم الفرقان

من تفسیر آیات القرآن

جلد پنجم

سورۃ البقرہ آیات 196 تا 242

از رشحاتِ قلم

حافظ قاضی عبدالرزاق عبدالوحید ہزاروی

جامعہ جماعتیہ مظہر العلوم

رحیم ٹاؤن شکریال راولپنڈی

کتاب لاریب کی توضیحات وتشریحات، علوم عقلیہ ونقلیہ کی روشنی میں

علمی وتحقیقی ذوق رکھنے والوں کے لئے قدیم وجدید احکامات ومسائل پر ابحاث کا حسین مرقع

تفسیر القرآن بالقرآن، ارشادات نبویہ، اقوال صحابہ، تحقیقات اسلاف اور روایت صحیحہ پر مشتمل تفسیر

مسمٰی بہ

نجوم الفرقان

من تفسیر آیات القرآن

جلد پنجم

(سورۃ البقرۃ آیات 196 تا 242)

از رشحات قلم

حافظ قاضی عبد الرزاق بھترالوی، حطاروی

جامعہ جماعتیہ مہر العلوم

رحیم ٹاؤن شکریال، راولپنڈی

نام کتاب .... نجوم الفرقان من تفسیر آیات القرآن، جلد پنجم

سورۃ البقرۃ آیات 196 تا 242

تالیف حافظ قاضی عبدالرزاق بھتر الوی، حطاروی

کمپوزنگ مفتی محمد محمود احمد، محلہ لطیف شاہ غازی، کھاریاں، ضلع گجرات

بار طباعت .... اول

تاریخ اشاعت ....

ناشر .... جامعہ جماعتیہ مہر العلوم رحیم ٹاؤن شکریال، راولپنڈی

ملنے کے پتے

☆ ضیاء القرآن پبلی کیشنز اردو بازار لاہور

☆ فرید بک سٹال اردو بازار لاہور

☆ نیو مکتبہ ضیائیہ بوہڑ بازار راولپنڈی

☆ احمد بک کارپوریشن اقبال روڈ نزد کمیٹی چوک راولپنڈی

☆ جامع مسجد غوثیہ ایف سکس ون اسلام آباد

☆ جامعہ جماعتیہ مہر العلوم رحیم ٹاؤن شکریال، راولپنڈی

☆ مکتبہ قادریہ نزد دستا ہوٹل گنج بخش روڈ لاہور

☆ مکتبہ برکاتیہ گنج بخش روڈ لاہور

☆ جامع مسجد کنز الایمان آئی 10-1 اسلام آباد

اور ہر اچھے بک سٹال سے طلب فرمائیں

فہرست

نجوم الفرقان فی تفسیر القرآن

جلد پنجم

سورۃ البقرۃ آیات 196 تا 242

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَااسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَ لَاتَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيْضًا اَوْبِهٖ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْصَدَقَةٍ اَوْنُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِالْحَرَامِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ☆ (سورہ بقرۃ آیت،۱۹۶)

﴿۱﴾

اور حج اور عمرہ اللہ کے لئے پورا کرو، پھر اگر تم روکے جاؤ تو قربانی بھیجو جو میسر آئے اور اپنا سر نہ منڈاؤ، جب تک قربانی اپنے ٹھکانے نہ پہنچ جائے، پھر جو تم میں بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ تکلیف ہو تو بدلہ دے روزے یا خیرات یا قربانی، پھر جب تم اطمینان سے ہو تو جو حج سے عمرہ ملانے کا فائدہ اٹھائے اس پر قربانی ہے جیسی میسر آئے، پھر جسے مقدور نہ ہو تو تین روزے حج کے دنوں میں رکھے اور سات، جب اپنے گھر پلٹ کر جاؤ، یہ پورے دس ہوئے، یہ حکم اس کے لئے ہے جو مکہ کا رہنے والا نہ ہو، اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ کا عذاب سخت ہے۔

﴿۲﴾

اور مکمل کرو حج اور عمرہ اللہ کے لئے، پھر اگر تمہیں کہیں روک لیا جائے تو جو میسر ہو

ہدی، اور نہ منڈاؤ اپنے سروں کو یہاں تک کہ پہنچ جائے ہدی اپنی (ذبح کی) جگہ، پھر ہو جائے تم میں سے کوئی شخص مریض یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو جائے تو فدیہ دے روزے یا صدقہ یا جانور ذبح کرنے سے، پھر جب تم امن میں ہو تو جو شخص نفع حاصل کرے عمرہ سے حج تک تو جو میسر ہو اسے ہدی، تو جو شخص (ہدی) نہ پائے تو روزے ہیں (تمہارے ذمہ) تین دن حج کے دنوں میں اور سات جب فارغ ہو جاؤ تم، یہ دس دن مکمل ہیں۔ یہ اس شخص کے لئے ہے جو نہ ہو باشندہ حدود میقات کا اور ڈرو اللہ سے اور جان لو بیشک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔

مختصر مطلب:

• حج اور عمرہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے مکمل کرو، اس میں کوئی دکھلاوا اور چرچا اور سیر و تفریح مقصود نہ ہو، خصوصاً جب حج اور عمرہ کی نیت کر لو احرام باندھ لو تو پھر حج اور عمرہ کو مکمل کرنا تم پر لازم ہے، جب جی چاہے حج اور عمرہ کو مکمل کئے بغیر چھوڑ دینا منع ہے۔ اگر حج یا عمرہ میں جانے کے لئے تمہیں روک دیا جائے تو بطور ہدی ایک جانور حرم میں بھیج دو، جس شخص کے ہاتھ وہ بھیجو اس سے ایک تاریخ مقرر کر لو کہ فلاں تاریخ یہ ہدی حرم میں پہنچ جائے گی اس دن تم احرام سے فارغ ہو جاؤ۔ اگر مرض یا سر میں تکلیف کی وجہ سے تمہیں حالت احرام میں سر منڈانا پڑے تو سر منڈالو اس کے بدلے تین روزے رکھ لو یا چھ مسکینوں کو دو وقت طعام کھلا دو یا کوئی جانور ذبح کر دو، پھر جب تم امن میں ہو اگر اس ایک سفر میں ہی عمرہ سے بھی حج تک نفع حاصل کر لو یعنی قران یا تمتع کر لو تو بطور شکر جو ہدی تمہیں میسر ہو اسے ذبح کرو۔ اگر تمہیں ہدی میسر نہ ہو تو تین دن حج کے دنوں میں روزے رکھ لو یعنی تین دن روزے یوم عرفہ (نو ذی الحج) تک مکمل کر لو، اور پھر حج سے فارغ ہو تو سات دن اور روزے رکھو، یہ کل دس دن ہو گئے۔ یعنی جو شخص ہدی ذبح کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ دس دن روزے رکھے ان میں تین دن ایام حج میں اور سات دن حج سے فارغ ہونے کے بعد، قران یا تمتع

کرنے کی ان لوگوں کو اجازت ہے جو آفاقی ہوں یعنی حدود مواقیت سے باہر سے آئے ہوئے ہوں، جو آفاقی نہیں میقاتوں کے اندر اندر رہنے والے ہیں ان کے لئے قران یا تمتع کی اجازت نہیں۔ جتنے احکام بیان کردیئے ہیں ان پر عمل کرنے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ ان احکام کی مخالفت کر کے اور اللہ تعالیٰ سے بے خوف ہو کر اپنے آپ کو عذاب کا مستحق نہ بنالو، یہ یقینی طور پر جان لو کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب بہت سخت ہے۔

ماقبل سے رابطہ:

رب تعالیٰ نے پہلے ذکر فرمایا کہ آپ سے چاند کی حالتوں کے بدلنے کے متعلق سوال کرتے ہیں آپ فرمادیجئے کہ یہ لوگوں کے لئے وقت کی علامتیں ہیں اور حج کے لئے۔

تو جب پہلے یہ بیان کردیا کہ حج وقت مقررہ میں ہوتا ہے تو یہاں حج کے مسائل کی تفصیل بیان کرنی شروع فرمائی۔

اور وجہ یہ ہے کہ پہلے ذکر فرمایا "وَاَنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ" اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو۔

اس کے بعد حج کا ذکر فرمایا کہ اس میں بھی مال خرچ ہوتا ہے۔ عبادت کی تین قسمیں ہیں۔

"بدنی، مالی، اور بدنی و مالی کا مجموعہ"۔

بدنی عبادت، جیسے نماز اور روزہ، اس عبادت میں کسی دوسرے کو اپنا نمائندہ نہیں بنایا جاسکتا بلکہ انسان خود ہی یہ عبادت کرے خواہ کوئی عذر ہو یا نہ ہو، دوسرے کے ذمہ یہ عبادت نہیں لگائی جاسکتی۔

عبادت مالی، جیسے زکوٰۃ، اس میں عذر اور بغیر عذر کے ہر حال میں دوسرے شخص کو اپنا نمائندہ بنایا جاسکتا ہے۔

اور بدنی اور مالی کا مجموعہ عبادت حج ہے، اس میں بغیر عذر کے تو اپنا نمائندہ نہیں بنایا جاسکتا، لیکن عذر کی حالت میں اپنا بدل کسی اور کو بنایا سکتا ہے، جس کی تفصیل ان شاء اللہ بعد میں آئے گی۔

عمرہ کرنا سنت ہے:

عمرہ فرض یا واجب نہیں بلکہ سنت اور مستحب ہے، کیونکہ اس آیۃ کریمہ میں بھی "وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ" کہا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ عمرہ کو پورا کرو، یعنی جب عمرہ کی نیت کر لی، احرام باندھ لیا تو پھر مکمل کرنا واجب ہوگا، لیکن ابتدائی طور پر واجب نہیں۔

"عن محمد بن المنکدر عن جابر بن عبداللہ قال سأل رجل النبی ﷺ عن الصلوۃ والحج اواجب قال نعم وسأله عن العمرة اهی واجبة قال لا ولان تعتمر خیر لک"

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کیا نماز اور حج فرض ہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں، پھر اس نے عمرہ کے متعلق سوال کیا، کیا عمرہ واجب ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں، ہاں البتہ تم عمرہ کر لو تو تمہارے لئے بہتر ہے۔

"عن ابی صالح قال قال رسول اللہ ﷺ الحج جهاد والعمرة تطوع"

ابو صالح کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حج جہاد ہے اور عمرہ نفل ہے۔ یعنی حج فرض ہے اور عمرہ مستحب ہے۔

اعتراض: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں تو ذکر ہے۔

"قال رسول اللہ ﷺ الحج والعمرة فریضتان واجبتان"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حج اور عمرہ فرض ہیں۔

تو کس طرح یہ کہنا صحیح ہے کہ عمرہ واجب نہیں بلکہ مستحب ہے۔

جواب: **"فاما حدیث جابر فی وجوب العمرة من طریق ابن لهیعة فهو ضعیف"**

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ابن لھیعۃ سے مروی ہے، اس لئے یہ حدیث ضعیف ہے۔ ضعیف حدیث سے فرضیت اور وجوب ثابت نہیں۔ (ماخوذ از احکام القرآن للجصاص)

عمرہ کے ارکان وشرائط وغیرہ:

عمرہ کا احرام شرط ہے، اور طواف کرنا رکن ہے، اس کے بغیر اشیاء کوئی واجب، کوئی سنت اور کوئی مستحب ہیں۔

طوف کے زیادہ چکر فرض اور کم واجب اور سعی کرنا واجب اور سر منڈانا یا بال کٹانے واجب ہیں۔

باقی احکام عمرہ کے وہی ہیں جو حج کے لئے، جس طرح حج کے احرام کے منافی جو کام ہوں گے وہی عمرہ کے احکام کے بھی منافی ہوں گے۔

عمرہ اور حج میں فرق:

حج کا وقت مقرر ہے اور عمرہ کا وقت مقرر نہیں، حج وقت مقررہ سے رہ جائے یعنی احرام کے بعد وقت پر مقام عرفات پر نہ پہنچا تو حج فوت ہو گیا۔ لیکن عمرہ کا احرام باندھ کر جس وقت بھی مکہ مکرمہ میں پہنچ جائے عمرہ ادا ہی ہوگا۔ اس میں فوت ہونے کا کوئی احتمال نہیں۔ اور حج میں مقام عرفات میں قیام فرض ہے عمرہ میں نہیں۔

حج میں مزدلفہ میں آنا اور رمی میں کنکریاں مارنا اور منیٰ میں ٹھہرنا واجب ہے عمرہ میں نہیں، حج میں طواف قدوم اور طواف صدر ہیں لیکن عمرہ میں نہیں۔ اسی طرح مقام عرفات میں دو نمازیں ظہر اور عصر اور مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کو جمع کر کے پڑھنا ہے عمرہ میں نہیں۔ آفاقی لوگوں کے لئے حج وعمرہ کے احرام کے میقات ایک ہی ہیں۔ لیکن میقاتوں کی حدود کے اندر رہنے والے مکی کہلاتے ہیں ان کے لئے عمرہ کا احرام باندھنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ حرم کی زمین سے باہر جا کر احرام باندھیں، لیکن حج کا احرام حرم شریف کے کسی مقام سے بھی باندھ سکتے ہیں۔ حرم کے باہر سے احرام نہیں باندھ سکتے۔

رمضان میں عمرہ کرنا افضل ہے:

عمرہ کے لئے وقت مقرر نہیں جب چاہے عمرہ کر لے لیکن رمضان میں عمرہ کرنا زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔

"عن ابن عباس عمرة فی رمضان تعدل حجة"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رمضان میں عمرہ کرنے سے حج کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے " وکان السلف رحمنا اللہ تعالیٰ بهم یسمونها الحج الاصغر "سلف صالحین اللہ تعالیٰ ان کے طفیل ہم پر بھی رحم فرمائے عمرہ کا نام حج اصغر (چھوٹا حج) رکھتے تھے۔

فائدہ: " وقد اعتمر رسول اللہ ﷺ اربع عمرات کلهن بعد الهجرة فی ذی القعدة "

نبی کریم ﷺ نے ہجرت کے بعد چار عمرے کئے ہیں وہ تمام ذیقعد میں تھے۔ تاہم رمضان کی افضلیت کے یہ منافی نہیں۔

اعتراض: بعض کتب میں ملتا ہے کہ عمرہ کرنا رجب میں سنت ہے۔ اس کے متعلق سنت ہونے کا قول کیسے درست ہے؟

جواب: رجب میں عمرہ کرنا اس وجہ سے تو سنت نہیں کہ نبی کریم ﷺ نے رجب میں عمرہ کیا ہو یا آپ نے رجب میں عمرہ کرنے کا حکم دیا ہو۔ البتہ حضرت ابن زُبیر رضی اللہ عنہ جب کعبہ شریف کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو آپ نے ستائیس رجب کو عمرہ کیا اور بطور شکر جانور بھی ذبح کئے اور اہل مکہ کو بھی عمرہ کرنے کا حکم دیا۔

"ولاشک ان فعل الصحابة حجة ومارآه المسلمون حسنافهو عنداللہ حسن"

اور یہ یقینی طور پر ثابت ہے کہ صحابہ کرام کا فعل حجت ہے، اور خود نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے، جس کام کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ والے رجب میں عمرہ کرتے ہیں۔ واضح ہوا کہ رجب میں عمرہ کرنا سنت صحابہ ہے۔

تنبیہ: نو ذی الحج اور چار دن اس کے بعد عمرہ کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ ہاں اگر وہ شخص قران کرنے والا ہو اور دیر سے پہنچے، نو ذی الحج کی صبح کو پہلے عمرہ کرلے پھر مقام عرفات پر پہنچ جائے تو اس کے لئے جائز ہے کوئی مکروہ نہیں۔

میقاتوں کے اندر رہنے والوں کے لئے عمرہ کا حکم:

میقاتوں کی حدود کے اندر رہنے والے لوگوں کے لئے شوال، ذیقعداور ذی الحج کے دس دن عمرہ کرنا منع ہے، کیونکہ یہ لوگ قریب ہونے کی وجہ سے ہر سال حج کر سکتے ہیں اور جب چاہیں عمرہ کر سکتے ہیں اس لئے یہ حج کے مہینوں میں دور سے آنے والوں کو موقع دیں کہ وہ آسانی سے عمرہ کر سکیں۔

عمرہ کیسے کریں؟

آفاقی حضرات یعنی میقاتوں سے باہر رہنے والے میقات سے احرام باندھیں اور میقاتوں کے اندر رہنے والے حرم شریف کے باہر سے احرام باندھیں۔ پھر طواف کریں۔ پھر صفا اور مروہ کی سعی کریں۔ پھر سر منڈالیں یا بال کٹالیں، اس طرح عمرہ ادا ہو گیا۔

مواقیت:

وہ مقام جس سے آگے احرام کے بغیر تجاوز جائز نہیں اسے میقات کہتے ہیں، اس کی جمع مواقیت ہے۔ وہ مقامات کون سے ہیں جن سے احرام کے بغیر تجاوز منع ہے؟

" عن ابن عباس قال وقت رسول اللہ ﷺ لاھل المدینة ذاالحلیفة ولاھل الشام الجحفة ولأھل نجدقرن المنازل ولاھل الیمن یلملم فھن لھن ولمن اتی علیھن من غیر اھلھن لمن کان یریدالحج والعمرة فمن کان دونھن فمھله من اھله و کذاک و کذاک حتی اھل مکة یھلون منھا (بخاری ومسلم،مشکوۃ کتاب الحج)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے مدینہ والوں کے لئے ذوالحلیفہ میقات مقرر فرمایا، اور شام والوں کے لئے جحفہ اور نجد والوں کے لئے قرن المنازل اور یمن والوں کے لئے یلملم ، یہ مقامات ان لوگوں کے لئے بھی ہیں اور جو ان راستوں سے دوسرے علاقوں سے حج

اورعمرہ کرنے کے ارادہ سے آئیں، جوان میقاتوں کے اندر ہوں وہ اپنے گھروں سے ہی احرام باندھ لیں، اسی اسی طرح جو قریب ہوتے چلے جائیں، یہاں تک کہ مکہ والے (حج کے لئے) اپنے گھروں سے ہی احرام باندھ لیں۔ (البتہ عمرہ کے لئے حرم کے باہر سے احرام باندھیں)

خیال رہے کہ ہندوستان و پاکستان والوں کا میقات بھی یلملم ہے۔اب فضائی سروس کی وجہ سے احرام ائیر پورٹ سے ہی باندھ لیا جاتا ہے، ویسے بھی قانون شرعی یہی ہے کہ احرام میقات سے پہلے باندھا جا سکتا ہے،لیکن میقات سے بغیر احرام کے تجاوز کرنا جائز نہیں۔

تنبیہ: جو شخص مکہ مکرمہ میں میقاتوں کے باہر سے آئے اس کے لئے احرام باندھنا ضروری ہوتا ہے۔خواہ وہ حج کی غرض سے آئے یا عمرہ کے لئے آئے یا کسی اور کام کے لئے آئے یعنی تجارت وغیرہ کے لئے آئے، کیونکہ یہ حرم کا احترام ہے، البتہ وہ لوگ جو میقاتوں کے اندر ہیں ان کو بغیر احرام کے آنا جائز ہے، اور جو شخص میقاتوں سے باہر سے آئے اور حرم کے باہر اس کے عزیز واقارب ہوں ان کو ملنے کی غرض سے آئے تو احرام کی ضرورت نہیں۔ پھر وہاں سے عمرہ کی نیت کرلے۔لیکن راقم کا موقف یہ ہے کہ جو لوگ عمرہ کا ویزہ لگواتے ہیں وہ خواہ راستہ میں اقارب کے پاس ٹھہریں بھی احرام میں ہی رہنا چاہئے وعدہ کا تقاضا یہی ہے۔ **واللہ اعلم بالصواب**

فائدہ: مکہ والوں کے لئے حرم سے باہر کہیں سے بھی عمرہ کے لئے احرام باندھنا جائز ہے لیکن تنعیم سے احرام باندھنا افضل ہے، اس لئے کہ......

"امر علیه الصلوٰة والسلام عبدالرحمن بان یذهب باخته عائشة الی التنعیم لتحرم منه"

نبی کریم ﷺ نے عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اپنی بہن عائشہ کو تنعیم میں لے جاؤ تا کہ وہاں سے یہ احرام باندھ لے۔

عمرہ کی فضیلت:

"عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ العمرة الی العمرة کفارة لمابینهماوالحج المبرورلیس له جزاء الاالجنة" (نسائی ج۲ باب فضل العمرة)

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک عمرہ سے لے کر دوسرے عمرہ تک درمیان میں گناہوں کا کفارہ ہے۔ اور حج مبرور کی جزا نہیں سوائے جنت کے۔

حج مبرور کی وضاحت ان شاء اللہ قریب ہی آ رہی ہے۔

یعنی ایک عمرہ کیا تو وہ پہلے گناہوں کا کفارہ ہے، پھر اس عمرہ کے بعد گناہ ہو گئے تو دوسرا عمرہ کیا تو وہ ان گناہوں کا کفارہ ہے لیکن گناہوں سے مراد صغائر گناہ ہیں۔ کبیرہ گناہ توبہ سے معاف ہوتے ہیں۔

حج مفرد کے مسائل:

حج عمر میں ایک مرتبہ فرض ہے، آزاد ہو، بالغ ہو، عاقل ہو، صحت میں ہو کہ حج ادا کر سکے، اور اس کے پاس آنے جانے کا کرایہ اور وہاں کا خرچ اس کے پاس ہو اور واپس لوٹنے تک اہل وعیال کا خرچ بھی موجود ہو تو حج فرض ہوتا ہے۔

حج مرد اور عورت دونوں پر فرض ہے لیکن عورت کے لئے محرم کا ساتھ ہونا بھی ضروری ہے، بغیر محرم کے عورت کو حج کرنا منع ہے، خواہ جوان ہو یا بوڑھی خواہ وہ اور عورتوں کی جماعت سے مل کر جائے یا مردوں کے ساتھ جائے ہر حال میں بغیر محرم کے حج کرنا سوائے پیسے ضائع کرنے اور مشقت اٹھانے کے کچھ نہیں۔ رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کی عدولی کر کے کون سا نیکی کا کام کر لیا۔ جھوٹے محرم بنانا جرم پر جرم ہے۔

"عن ابی هريرة قال خطبنارسول الله ﷺ قال یاایها الناس قدفرض علیکم الحج فحجوا فقال رجل اکل عام یارسول الله فسکت حتی قالها ثلاثا فقال لو قلت نعم لوجبت ولما استطعتم ثم قال ذرونی ماترکتم فانما هلک من کان قبلکم بکثرة سؤالهم واختلافهم علی انبیائهم فاذاامرتکم بشیئ فاتوا منه مااستطعتم و اذانهیتکم عن شیئ فدعوه" (رواہ مسلم۔ مشکوۃ کتاب المناسک)

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہمیں رسول اللہ ﷺ نے خطبہ دیا تو آپ نے فرمایا اے لوگو

تحقیق تم پر حج فرض کر دیا گیا پس حج کرو۔ ایک شخص (اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ) نے عرض کیا یارسول اللہ کیا ہر سال حج فرض ہے؟ تو آپ خاموش رہے، یہاں تک کہ اس شخص نے تین مرتبہ سوال کیا۔ پھر آپ نے فرمایا اگر میں ہاں کہہ دیتا تو (ہر سال) واجب ہو جاتا تمہیں اس کی طاقت نہ ہوتی۔ پھر آپ نے فرمایا جب میں تمہیں چھوڑ دوں تو تم بھی مجھے چھوڑ دیا کرو بیشک تم سے پہلے لوگ انبیاء کرام سے زیادہ سوال کرنے اور اختلاف کرنے کی وجہ سے ہلاک ہو گئے، جب میں تمہیں کسی چیز کا حکم دوں تو تم اپنی استطاعت کے مطابق اس پر عمل کرو، اور جب میں تمہیں کسی چیز سے روک دوں تو تم اسے چھوڑ دو۔

وضاحت حدیث: "یا ایھا الناس قدفرض علیکم الحج" اے لوگو تم پر حج فرض کر دیا گیا۔

حج کب فرض ہوا؟

حضرت ابن ہمام رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ حج نو یا چھ یا پانچ سن ہجری میں فرض کیا گیا۔

علامہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں۔

"والأظھر انہ علیہ الصلوۃ والسلام اخرہ عن سنۃ خمس اوست لعدم فتح مکۃ و اما تاخیرہ عن سنۃ ثمان فلاجل النسیٔ واماتاخیرہ عن سنۃ تسع فی موقف الصدیق ھذا"

زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ حج پانچ یا چھ ہجری کو فرض کر دیا گیا تھا، لیکن ان سالوں میں حج نہ کیا جا سکا کیونکہ مکہ مکرمہ اس وقت کفار کے زیر تسلط تھا، لیکن آٹھ ہجری کو فتح مکہ کے بعد کچھ لوگوں نے عتاب بن اسید کی معیت میں حج کیا۔

خود نبی کریم ﷺ نے اس سال حج نہ کیا تاکہ امت کے لئے یہ جائز ہو سکے کہ جب حج کرنے کی طاقت حاصل ہو جائے تو اسی سال اگر وہ حج نہ کر سکیں تو وہ گناہگار نہیں ہوں گے۔

پھر نو ہجری میں نبی کریم ﷺ نے خود حج نہ کیا بلکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت لوگوں نے حج کیا۔

راقم کے نزدیک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت حج کرانے سے اس طرف اشارہ تھا کہ میرے بعد آپ ہی مسلمانوں کے اجماع سے منصب خلافت پر فائز ہوں گے۔

نبی کریم ﷺ کے حج میں تاخیر کی عظیم وجہ یہ تھی۔

" وتاخیره علیه الصلوة والسلام لیس یتحقق فیه تعریض الفوات وهو الموجب للفور لانه کان یعلم انه یعیش حتی یحج ویعلم الناس مناسکهم تکمیلاللتبلیغ"

کہ عام لوگوں کے لئے یہ حکم ہے کہ وہ حج کے فرض ہونے پر جلدی حج کر لیں کہ زندگی کا پتہ نہیں ہوسکتا ہے کہ موت واقع ہو جائے تو فرض کی ادائیگی نہ کرنے کی وجہ سے گناہگار ہو کر نہ مرے، لیکن نبی کریم ﷺ کو اپنی زندگی کے متعلق یقین تھا کیونکہ رب تعالیٰ نے آپ کو وفات کا علم دے رکھا تھا۔لہٰذا آپ پر حج جلدی کرنا ضروری نہیں تھا بلکہ تاخیر میں فائدہ تھا کہ امت کے لئے تاخیر کا جواز ثابت ہو جائے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو آپ کے ساتھ حج کرنے کا وقت مل سکے تاکہ آپ احکام حج کامل طور پر لوگوں کو سکھا سکیں۔ (از مرقاۃ، ج ۵، ص ۲۶۳)

فائدہ: ہجرت سے پہلے اگرچہ نبی کریم ﷺ پر حج فرض نہیں تھا لیکن

" قال ابن الاثیر کان علیه الصلوة والسلام یحج کل سنة قبل ان یهاجر"

ابن اثیر کہتے ہیں نبی کریم ﷺ ہجرت سے پہلے ہر سال حج کرتے تھے۔

ابن جوزی کا بھی یہی قول ہے۔اسی کو روایت حاکم کی تائید بھی حاصل ہے۔

" واخرج الحاکم بسندصحیح عن الثوری انه علیه الصلوة والسلام حج قبل ان یهاجر حججا"

حاکم نے سند صحیح سے ثوری سے روایت کی کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے ہجرت سے پہلے کئی مرتبہ حج کیا۔

" واماماروی الترمذی عن جابر ان النبی ﷺ حج قبل ان یهاجر حجتین وفی روایة لابن ماجه والحاکم ثلاثافمبنی علی علمه ولاینافی اثبات زیادة غیره"

ترمذی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی کہ ہجرت سے پہلے نبی کریم ﷺ نے دو حج کئے اور ان سے ہی ابن ماجہ نے اور حاکم نے تین حج کرنے کا ذکر کیا ہے لیکن وہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے علم کی بات ہے دوسرے حضرات نے اپنے علم کے مطابق ہر سال حج کرنے کا ذکر فرمایا یہ اپنے اپنے علم کی بات ہے ان میں کوئی منافات نہیں۔

ہاں البتہ یہ مسئلہ اتفاقی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہجرت کے بعد ایک ہی حج کیا جسے حجۃ الوداع کہا جاتا ہے، یہ دس ہجری میں تھا اس کے بعد آنے والے ربیع الاول میں آپ کا وصال ہوگیا۔ (مرقاۃ، ج۵، ص۲۶۳)

"وعن ابی هريرة قال سئل رسول الله ﷺ ای العمل افضل قال ایمان باللّٰہ ورسوله قيل ثم ماذاقال الجهادفی سبيل اللّٰہ قيل ثم ماذاقال حج مبرور"

(بخاری ومسلم، مشکوۃ کتاب المناسک)

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کون سا عمل افضل ہے تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (ﷺ) پر ایمان لانا، پھر پوچھا گیا کہ اس کے بعد کون سا عمل افضل ہے تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنا، پھر پوچھا گیا اس کے بعد کون سا عمل افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا حج مبرور۔

وضاحت حدیث: ایمان سب سے افضل ہے کیونکہ تمام اعمال کا دارومدار ایمان پر ہے، پھر جہاد افضل ہے۔

"لان المجاهدلايكون الامصلياوصائما"

کیونکہ مجاہد یقیناً نماز ادا کرنے والا ہوتا ہے اور روزہ رکھنے والا ہوتا ہے۔

اس لئے نماز اور روزہ جہاد سے افضل ہیں ان کے نہ ذکر کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس کے بعد حج مبرور افضل ہے۔

حج مبرور کیا ہے؟

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اصبہانی رحمہ اللہ سے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ ان سے پوچھا گیا،

حج مبرور کیا ہے؟ آپ نے فرمایا۔

"یرجع زاھدا فی الدنیا راغبا فی الاخرۃ"

دنیا میں زاہد ہو کر لوٹنا اور آخرت کی طرف رغبت کرنا حج مبرور ہے۔

حج مبرور کا معنی حج مقبول ہے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے۔

"بر اللہ عملہ ای قبلہ کأنہ احسن الی عملہ بقبولہ"

کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے عمل قبول کر کے اس پر احسان فرمایا ہے، کیونکہ کہا جاتا ہے "برہ ای احسن الیہ"

واضح ہوا کہ حج مبرور وہ ہے کہ انسان خلوص سے حج کرے، ثواب کی نیت ہو، گناہوں سے محفوظ رہے تو اللہ تعالیٰ اسے قبول فرماتا ہے، اس کا قبول کرنا بندے پر احسان عظیم ہے۔

☆ حج اس شخص پر فرض ہوتا جو آنے جانے کا خرچ رکھے اور واپسی تک اہل وعیال کا خرچ بھی ہو، اس پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی واضح ہے۔

"وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا"

اور لوگوں پر اللہ کے لئے اس کے گھر کا حج کرنا لازم ہے جو اس تک پہنچنے کی طاقت رکھیں۔

عورت بغیر محرم کے حج نہیں کر سکتی:

"قال رسول اللہ ﷺ لاتسافر امرأۃ الا ومعھا ذو محرم" (بخاری ومسلم)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی عورت سفر نہ کرے سوائے اس کے کہ اس کے ساتھ محرم ہو۔

"عن ابن عباس ان رسول اللہ ﷺ قال لاتحج امرأۃ الا ومعھا محرم" (رواہ البزار)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی عورت بغیر محرم کے حج نہ کرے۔

عن ابن جریج قال رسول اللہ ﷺ "لاتحجن امرأة الاومعهاذومحرم"

کوئی عورت بغیر محرم کے ہرگز حج نہ کرے۔

ہاں البتہ ساڑھے بانوے کلومیٹر سے سفر کم ہوتو عورت بغیر محرم کے حج کرسکتی ہے۔

محرم وہ ہوتا ہے جس سے شادی کرنا ہمیشہ کے لئے حرام ہو، جیسے باپ، بیٹا، ماموں، چچا، بھانجا، بھتیجا وغیرہ۔ ماموں زاد، چچازاد وغیرہ محرم نہیں ہوسکتے۔ رضاعی طور پر یا نکاح کی وجہ سے کسی سے ہمیشہ نکاح کرنا حرام ہو جائے تو اس کے ساتھ بھی حج کرنا جائز ہوگا۔ رضاعی بھائی، باپ یا سُسر اور خاوند کا بیٹا ہو ان کے ساتھ حج کرسکتی ہے لیکن بہنوئی کے ساتھ نہیں کیونکہ اس سے عارضی طور پر نکاح حرام ہے ایک بہن کے فوت ہونے یا مطلقہ ہونے پر اس کی بہن سے نکاح جائز ہے۔

عورت اپنے خاوند کے ساتھ حج کرسکتی ہے اگر چہ وہ محرم نہیں لیکن مقصد فتنہ سے عورت کو بچانا ہے وہ خاوند کے ساتھ بہتر اور کامل طریقہ سے حاصل ہے۔

احرام باندھنا:

جب کوئی شخص احرام کا ارادہ کرے، غسل کرے یا وضوء کرے، البتہ غسل کرنا افضل ہے۔ مرد کے لئے ضروری ہے کہ وہ دو چادریں استعمال کرے ایک ستر عورت کے لئے کمر سے باندھے اور دوسری کندھوں پر لپیٹے، سلا ہوا کپڑا شلوار، قمیص وغیرہ نہیں پہن سکتا۔ سلائی کا یہ مطلب نہیں کہ چادر کی کناری کا سلائی کرنا بھی منع ہے، یہ لوگوں میں غلط مشہور ہے۔ یہ چادریں استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ اگر خوشبو میسر ہوتو وہ لگالے، اور دو رکعت نماز احرام کی نیت سے پڑھے۔

" لماروی عن ابن عباس ان النبی ﷺ صلی بذی الحلیفة رکعتین عنداحرامه"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے احرام کے وقت ذوالحلیفہ کے مقام پر دو رکعت ادا فرمائیں۔

نماز کے بعد تلبیہ پڑھے۔

"لماروی ان النبی ﷺ لبّٰی فی دبر صلوتہ" (ترمذی،نسائی)

کیونکہ نبی کریم ﷺ نے نماز کے بعد تلبیہ پڑھا۔

ساتھ ہی حج کی نیت کرلے اگر صرف حج کا احرام باندھا ہے تو۔نیت یہ ہے کہ اے اللہ میں تیرے لئے حج کررہاہوں تو اسے قبول فرما اور میرے لئے حج کرنا آسان فرما۔

تلبیہ یہ ہے:

"لبیک اللھم لبیک لبیک لَاشریک لکَ اِنَّ الْحَمْدَوَالنِّعْمَۃَ لکَ وَالْمُلْکَ لَاشَرِیْکَ لَکَ"

خیال رہے نیت کی تکمیل ہی تلبیہ سے ہوتی ہے،صرف نیت سے احرام کافی نہیں۔

مسئلہ: احرام میں مرد جس طرح شلوار اور قمیص نہیں پہن سکتا اسی طرح سر کو پگڑی،ٹوپی وغیرہ کسی چیز سے نہیں ڈھانپ سکتا،اور جوتا وہ استعمال کرسکتا ہے جس سے اس کے پاؤں کے درمیان اوپر والا حصہ ننگا ہو۔عام طور پر ہوائی چپل ہی استعمال ہورہی ہے۔کوئی اور جوتا پہننے سے ہر طرف سے اعتراض شروع ہوجاتے ہیں،ورنہ حقیقت یہ ہے کہ سیالکوٹی دیسی جوتے جو ٹخنے سے بھی نیچے ہوتے ہیں اور پاؤں کا پنجہ معمولی ان سے ڈھانکا جاتا ہے ان کا استعمال جائز ہے۔

مسئلہ: مرد احرام کی حالت میں اپنے سر کو بھی نہ ڈھانپے اور چہرہ کو بھی نہ ڈھانپے۔

"عن ابن عمراحرام الرجل فی رأسہ واحرام المرأۃوجھھا" (رواہ دارقطنی والبیھقی)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مرد کا احرام اس کے سر میں ہے اور عورت کا احرام اس کے چہرے میں ہے۔

"عن ابن عباس اَنّ رجلاوقصتہ راحلتہ فمات فقال رسول اللہ ﷺ اغسلوہ بماء و سدروکفنوہ فی ثوبیہ ولاتمسوہ طیباولاتخمرواراسہ ووجھہ فانہ یبعث یوم القیامۃ ملبیا" (رواہ مسلم ونسائی وابن ماجہ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ایک شخص (احرام کی حالت میں) سواری سے گر کر فوت ہو گئے ان کی گردن کا منکا ٹوٹ گیا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان کو غسل دے دو پانی اور بیری کے پتوں سے، اور دو کپڑوں میں کفن دے دو، اور خوشبو نہ لگاؤ، اور سر اور چہرے کو نہ ڈھانپو بیشک یہ شخص قیامت کے دن تلبیہ پڑھتے ہوئے اٹھایا جائے گا۔

مسئلہ: عورت سلے ہوئے کپڑے پہنے گی۔ سر کو ڈھانپ کر رکھے گی۔ صرف چہرا ننگا رکھے گی۔ اگر پردہ کرنا چاہے تو سر پر ایسے ٹوپی پہن لے جس کا کچھ حصہ آگے کی طرف بڑھا ہوتا ہے (ہیٹ) اس کے اوپر کپڑا اوڑھ لے جو چہرے سے ہٹ کر رہے۔ اسی طرح عورت تلبیہ بلند آواز سے نہیں پڑھے گی اور مرد تلبیہ بلند آواز سے پڑھے گا۔

مسئلہ: احرام کی حالت میں خوشبو لگانا، بال منڈانا یا کٹانا، تیل لگانا، ناخن کٹانا منع ہے۔ البتہ غسل کرنا جائز ہے لیکن خوشبودار صابن یا میل اتارنے والے صابن کا استعمال منع رہے گا۔

مسئلہ: احرام کی حالت میں پیسوں والی تھیلی یا پیٹی کمر سے باندھنا جائز ہے۔

مسئلہ: نمازوں کے بعد اور سحری کے وقت اور کسی سوار کو ملتے وقت اور کسی بلند جگہ چڑھتے وقت یا پستی کی جانب اترتے وقت تلبیہ زیادہ پڑھے اور آواز بلند کرے، صحابہ کرام کا اسی پر عمل تھا۔

طواف قدوم:

مکہ مکرمہ میں پہنچ کر سب سے پہلے مسجد حرام میں آئے، کعبہ شریف کو دیکھ کر "اللہ اکبر"، اور "لا الہ الا اللہ" پڑھے، اپنے ہاتھ کندھوں کے برابر رکھ کر دعاء کرے۔

پھر حجر اسود سے طواف کی ابتداء کرے، سب سے پہلے اگر کسی کو تکلیف دینے کے بغیر حجر اسود کو چومنا ممکن ہو تو چومے۔

"لماروی ان النبی علیہ السلام قبل الحجر الاسود ووضع شفتیہ علیہ"

اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے حجر اسود کو چوما اور اس پر اپنے ہونٹ مبارک رکھے۔

لیکن حجر اسود کو چومنا مستحب ہے، کسی کو تکلیف نہ دینا واجب ہے، لہٰذا اگر کسی کو تکلیف دینے کے بغیر چومنا ممکن ہو تو چومے ورنہ ہاتھ لگا کر ہاتھ کو چوم لے، اگر ہاتھ لگانا بھی ممکن نہ ہو تو اپنی چھڑی وغیرہ حجر اسود کو لگا کر چھڑی کو چوم لے، یہ بھی ممکن نہ ہو تو صرف حجر اسود کو دیکھ کر "اللہ اکبر" اور "لاالہ الااللہ" اور "الحمدللہ" اور نبی کریم ﷺ پر درود شریف پڑھ لے۔

"قال رسول اللہ ﷺ لعمر انک رجل ایدتؤذی الضعیف فلا تزاحم الناس علی الحجر ولکن ان وجدت فرجة فاستلمه والافاستقبله وهلل و کبر"

(رواہ ابویعلی واحمدواسحق بن راھویه والشافعی رحمهم اللہ)

رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فرمایا بیشک تم طاقت ور شخص ہو، کمزور لوگوں کو تکلیف نہ پہنچانا، حجر اسود پر لوگوں سے مزاحمت (بھیڑ کرنا، اژدھام کرنا) نہ کرنا، اگر جگہ کشادہ مل جائے تو حجر اسود کا استلام کر لینا (چوم لینا یا ہاتھ لگا لینا) ورنہ صرف استقبال کر لینا اور "لاالـه الااللہ" اور "اللہ اکبر" پڑھ لینا۔

"روی انه علیه السلام طاف علی راحلته واستلم الارکان بمحجنه"

نبی کریم ﷺ نے اپنی سواری پر طواف کیا اور حجر اسود اور رکن یمانی کا اپنے عصا سے استلام فرمایا۔

"عن سویدبن غفلة ان عمر قبّل الحجر والتزمه وقال رأیت اباالقاسم ﷺ بک حفیا"

(نسائی)

سوید بن غفلۃ فرماتے ہیں کہ بیشک حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حجر اسود کو چوما اور لازم پکڑا اور فرمایا میں نے ابوالقاسم ﷺ کو تمہارے ساتھ اسی شفقت سے درپیش آتے ہوئے دیکھا۔

لازمی طور پر جگہ کشادہ ملنے پر آپ نے چوما۔ اور یہ یاد رہے کہ اس مقام پر "التزمه" کا معنی گلے لگانا نہیں، کیونکہ حجر اسود ایک کونے میں نصب ہے وہاں گلے لگانا ممکن ہی نہیں۔ ابوالقاسم رسول اللہ ﷺ کی کنیت ہے۔

"عن ابن عباس ان النبی ﷺ قال الحجر الاسود من الجنة"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حجر اسود جنت سے آیا ہوا ہے۔

(حضرت آدم علیہ السلام جب جنت سے زمین پر تشریف لائے تو جنت سے حجر اسود کو بھی ساتھ لائے)۔

"عن عابس بن ربیعة قال رأیت عمرجاء الی الحجرفقال انی لأعلم انک حجر و لولانی رأیت رسول اللہ ﷺ یقبلک ماقبلتک ثم دنامنه فقبله" (نسائی)

حضرت عابس بن ربیعہ کہتے ہیں میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا وہ حجر اسود کے پاس آئے تو فرمایا۔ بیشک میں جانتا ہوں بیشک تو پتھر ہے، اگر میں رسول اللہ ﷺ کو تمہیں چومتے ہوئے نہ دیکھتا تو میں تمہیں نہ چومتا۔ پھر آپ اس کے قریب ہوئے اور اسے چوما۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا۔" انک حجر لاتضر و لاتنفع" بیشک تو پتھر ہے نہ نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ نفع دے سکتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ تو پتھر ہے اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر نفع اور نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ وجہ اصل میں یہ تھی کہ زمانہ جاہلیت قریب ہی گذرا تھا اس لئے آپ نے فرمایا کہ حجر اسود کو چومتے ہوئے دیکھ کر کوئی بت پرستی کو جائز نہ سمجھ لے، جہاں تک تعلق ہے اللہ تعالیٰ کی اجازت سے نفع ونقصان پہنچانے کا اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت شاہد ہے۔

"قدروی الحاکم من حدیث ابی سعیدان عمررضی اللہ عنه لماقال هذاقال له علی بن ابی طالب انه یضروینفع وذکران اللہ تعالی لمااخذالمواثیق علی ولدآدم کتب ذلک فی ورق والقمه الحجرقال وسمعت رسول اللہ ﷺ یقول یؤتی یوم القیامة بالحجروله لسان ذلق یشهدلمن یستلمه بالتوصیة"

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا" بیشک تو پتھر ہے کوئی نفع اور نقصان نہیں پہنچا سکتا، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ نفع ونقصان پہنچا سکتا ہے، اور آپ نے ذکر فرمایا بیشک جب اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم سے وعدہ لیا تو اسے لکھ کر اسی پتھر میں ڈال دیا۔ اور

آپ نے فرمایامیں نے رسول اللہﷺکوفرماتے ہوئے سنا کہ قیامت کے دن حجراسودکوزبان دی جائے گی جولوگ اس کا استلام کریں گےان کے حق میں گواہی دے گا۔ (حاشیہ نسائی)

" عن ابن عباس قال قال رسول اللہﷺ نزل الحجر الاسود من الجنة وھو اشد بیاضا من اللبن فسودته خطایابنی آدم" (رواہ احمد والترمذی وقال ھذاحدیث حسن صحیح)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہﷺ نے فرمایا حجراسود جنت سے اترا ہے یہ دودھ سے زیادہ سفید تھا، انسانوں کے گناہوں نے اسے سیاہ کردیا۔

" وعن ابن عمر قال سمعت رسول اللہﷺ یقول ان الرکن والمقام یاقوتتان من یاقوت الجنة طمس اللہ نورھما ولولم یطمس نورھما لاضاء مابین المشرق والمغرب"

(رواہ الترمذی)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں میں نے رسول اللہﷺکوفرماتے ہوئے سنا بیشک حجراسوداور مقام ابراہیم جنت کے یاقوت ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے نورکومٹادیا۔اگران کے نورکونہ مٹایا جاتا تو یہ مشرق ومغرب کے درمیان (تمام جگہ کو) روشن کردیتے۔

طواف حطیم کے باہر سے کرے:

جہاں کعبہ شریف کا میزاب رحمت (رحمت والا پرنالہ) گرتا ہے اس کے باہر چھوٹی چھوٹی دیوار سے کچھ حصہ علیحدہ کیا ہوا ہے اسے حطیم کہا جاتا ہے۔یہ دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعمیر کردہ کعبہ شریف کا ہی حصہ ہے۔

" عن عائشة قالت کنت احب ان ادخل البیت فاصلی فیه فاخذ رسول اللہ ﷺ بیدی فادخلنی الحجر فقال اذاردت دخول البیت فصلی ھھنافانماھو قطعة من البیت و لکن قومک اقتصروا حیث بنوہ" (نسائی)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں یہ پسند کرتی تھی کہ میں بیت اللہ شریف میں داخل ہوکر نمازاداکروں، تورسول اللہﷺ نے میرے ہاتھ کو پکڑ کر مجھے حطیم میں داخل کردیا۔پھرآپ نے

فرمایا جب تم بیت اللہ شریف میں داخل ہونے کا ارادہ کرو تو یہاں نماز ادا کر لو بیشک یہ بیت اللہ شریف کا حصہ ہی ہے، لیکن تماری قوم نے جب اسے تعمیر کیا تو چھوٹا کر دیا۔

طواف قدوم میں اضطباع کرے:

اضطباع کا یہ مطلب ہے کہ کندھوں پر اوڑھنے والی چادر دائیں بغل کے نیچے سے گذارے اور بائیں کندھے کے اوپر کرے یہ سنت ہے۔

پہلے تین چکروں میں رمل کرے:

رمل کا یہ مطلب ہے کہ جس طرح مجاہد میدان جنگ میں صفوں کے درمیان اپنی بہادری دکھانے کے لئے کندھوں کو ناز و نخرے سے ہلا کر چلتا ہے اس طرح یہ طواف کرنے والا بھی چلے۔

مقام توجہ: جب مسئلہ یہ ہے کہ جماعت ہو رہی ہو تو امام رکوع میں چلا گیا تو کوئی شخص رکعت کو حاصل کرنے کے لئے دوڑ کر رکوع میں آکر نہ ملے بلکہ آہستہ آہستہ چل کر آئے رکعت مل جائے تو بہتر ورنہ سلام کے بعد اپنی رکعت مکمل کر لے، کیونکہ مسجد میں دوڑنا مسجد کی تعظیم کے منافی ہے۔ لیکن مسجد حرام جس میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نماز کا ثواب حاصل ہوتا ہے اس میں ناز و نخرے اور تکبرانہ انداز پر چلنے کا کیا مقصد ہے؟ ہاں مقصد صرف یہ ہے کہ حج اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کی یاد تازہ رکھنے کا نام ہے، آیئے رمل کرنے کی وجہ دیکھئے۔

"عن ابن عباس قال لماقدم النبی ﷺ واصحابه مكة قال المشركون وهنتهم حمى يثرب ولقوا منها شرا فاطلع الله نبيه ﷺ على ذلک فامر اصحابه ان يرملوا" (نسائی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جب نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام مکہ مکرمہ میں تشریف لائے تو مشرکین نے کہا ان لوگوں کو یثرب کے بخار نے کمزور کر دیا ہے۔ انہوں نے وہاں سے شر ہی حاصل کیا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس پر مطلع فرما دیا تو آپ نے اپنے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ رمل کرو۔

جب صحابہ کرام نے رمل کیا، مجاہدین کی طرح طواف کیا تو وہ دیکھ کر کہنے لگے یہ فلاں شخص تو ہمارے فلاں سے بہادر نظر آتا ہے، اس طرح انہوں نے کئی حضرات کے نام لئے۔

اب اگرچہ کفار کو اپنی بہادری دکھانی مقصود نہیں ہوتی لیکن رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کی اداء کو حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے۔

طواف کے آخری چار چکر:

رمل صرف پہلے تین چکروں میں ہے۔ طواف کے آخری چار چکر آرام آرام سے چلے، اور طواف کے ہر چکر میں حجر اسود سے گزرتے ہوئے استلام کرے، اگر استلام نہ کر سکے تو صرف استقبال کرلے۔

"عن ابن عمر قال رمل رسول اللہ ﷺ من الحجر الی الحجر ثلاثا و مشی اربعا"

(رواہ البخاری)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے حجر اسود سے لے کر حجر اسود تک تین چکر رمل کیا اور چار چکر آہستہ آہستہ چلے۔

تنبیہ: رمل کا کوئی بدل نہیں، اس لئے اگر ہجوم ہو رمل نہ کر سکے تو رک جائے، جس وقت رمل کا موقع مل سکے اس وقت طواف کرے اور رمل بھی کرے۔

طواف قدوم کے بعد دو رکعت نماز ادا کرنا:

طواف مکمل کرنے کے بعد مقام ابراہیم کے پاس آکر دو رکعت ادا کرے، اگر مقام ابراہیم کے پاس ممکن نہ ہو تو مسجد حرام میں جہاں بھی جگہ میسر ہو وہاں ہی ادا کرلے۔ یہ دو رکعت ادا کرنا واجب ہے۔ البتہ اوقات مکروہہ ہوں جن میں نماز ادا کرنا منع ہے تو تاخیر کرے۔ یعنی طواف کرنے میں ممانعت نہیں تاہم نماز اوقات مکروہہ کے بعد ادا کرے۔ یہی حکم عصر کے بعد اور صبح صادق کے بعد کا بھی ہے۔ کیونکہ ان دو رکعت کے واجب ہونے اور مستحب ہونے میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ لہٰذا ان اوقات سے بھی مؤخر کیا جائے۔

تنبیہ: طواف قدوم کا دوسرا نام طواف تحیۃ ہے، یہ طواف سنت ہے، واجب نہیں، یہ آفاقی لوگوں کے لئے سنت ہے، میقاتوں کے اندر رہنے والے حضرات کے لئے طواف قدوم نہیں۔

سعی کرنا:

صفا سے مروہ پر آنا ایک چکر ہے، پھر مروہ سے صفا پر آنا دوسرا چکر ہے، اس طرح صفا اور مروہ کے درمیان سات چکر لگانا سعی کہلاتا ہے جو حج میں واجب ہے۔ نشیبی جگہ جس کو آجکل بجلی کی سبز رنگ کی ٹیوب سے واضح کیا گیا ہے اس جگہ تک مرد کو دوڑنا ضروری ہے، عورت اس جگہ بھی آہستہ آہستہ چلے، اس کے پردے کا لحاظ کیا گیا ہے۔

صفا اور مروہ کا ذکر" ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ" کے بیان میں ہو چکا ہے۔

صفا پر کعبہ شریف کی طرف متوجہ ہو کر اللہ اکبر، لاالہ الااللہ اور درود شریف پڑھے پھر دعا کرے، مروہ پر بھی اسی طرح کرے۔

پھر مکہ مکرمہ میں ہی حالت احرام میں ہی رہے جب بھی طواف کر سکے تو طواف کرے، ہر طواف کے بعد دو رکعت ادا کرے، دوران طواف دعاء کرے اور ذکر کرے، البتہ دنیاوی باتیں نہ کرے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔

"الطواف صلوٰۃ" طواف نماز (کی طرح) ہے۔

جس طرح نماز میں کلام کرنا منع ہے، اسی طرح طواف میں بھی منع رہے گا، اور یہ بھی خیال رہے کہ آفاقی شخص کو نوافل ادا کرنے سے بہتر یہ ہے کہ وہ طواف کرے۔

منیٰ میں جانا:

آٹھ ذی الحج کو صبح کی نماز مکہ مکرمہ میں پڑھ کر منیٰ میں جانا ہے۔

"عن جابر ان النبی ﷺ صلی الفجر یوم الترویۃ بمکۃ فلما طلعت الشمس راح الی منی فصل بمنی الظھر والعصر والمغرب والعشاء ثم راح الی عرفات"

(ھذہ قطعۃ من روایۃ مسلم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ آٹھ ذی الحجہ کو صبح کی نماز مکہ مکرمہ میں ادا کی جب سورج طلوع ہوگیا تو آپ منی کی طرف چلے، وہاں ظہر اور عصر اور مغرب اور عشاء کی نماز ادا کی۔ پھر (نو ذی الحج کو صبح کی نماز کے بعد) عرفات کی طرف چلے۔

مسئلہ: اگر آٹھ ذی الحج کو مکہ مکرمہ میں ہی رہا اور نو ذی الحج کو فجر کی نماز ادا کر کے عرفات کی طرف چلا اور منی کے راستہ سے گذرا تو جائز ہے لیکن سنت رسول اللہ ﷺ کا تارک ہوگیا۔

عرفات میں جانا:

نو ذی الحج منی میں فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد عرفات کی طرف چل پڑے۔ عرفات میں ظہر کا وقت شروع ہوتے ہی اذان ہوگی اور اقامت پھر امام ظہر کی نماز پڑھائے گا۔ پھر ساتھ عصر کی نماز کی اقامت ہوجائے گی اور عصر کی نماز امام پڑھائے گا، عصر کے لئے دوسری اذان نہیں ہوگی۔ دونوں نمازوں کے فرض ادا کئے جائیں گے، ان کے درمیان سنتیں اور نوافل ادا نہیں کئے جائیں گے۔ امام خطبہ دے گا۔

"عن جابر ان النبی ﷺ صلاھما باذان واقامتین"

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ظہر اور عصر کی نماز ایک اذان اور دو اقامتوں سے پڑھائیں۔

تنبیہ: دو نمازوں کو وہی لوگ جمع کریں جو وہاں کے امام کی اقتداء میں نماز ادا کریں، جو لوگ اپنی اپنی جگہ نماز ادا کریں گے وہ ہر نماز کو اپنے اپنے وقت میں ادا کریں گے، یہ لوگ سنتیں بھی ادا کریں گے۔

مقام عرفات میں ٹھہرنا فرض ہے:

نو ذی الحج کے دن کو یا آنے والی رات کو مقام عرفات سے گذر گیا تو حج ادا ہوجائے گا اگر مقام عرفات پر نہ پہنچ سکا تو حج ادا نہیں ہوگا، آئندہ سال حج قضاء کرنا پڑے گا۔

عرفات تمام ہی ٹھہرنے کا مقام ہے سوائے بطن عرنہ کے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔

"عرفات کلھاموقف وارتفعواعن بطن عرنة والمزدلفة کلھاموقف وارتفعواعن وادی محسر"

عرفات تمام ہی ٹھہرنے کا مقام ہے سوائے بطن عرنہ کے اور مزدلفہ تمام ہی ٹھہرنے کا مقام ہے سوائے وادیٔ محسر کے۔

مقام عرفات میں دعاء کرنا:

دعاء کرتے وقت منہ قبلہ کی طرف کرے، اور بڑی عاجزی سے دعاء کرے۔

" قال رسول اللہ ﷺ لکل شئ شرفاوان شرف المجالس مااستقبل به القبلة"

(رواہ الحاکم)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر چیز کو شرافت اور بلندی حاصل ہے، مجالس کی شرافت یہ ہے کہ منہ قبلہ کی طرف کیا جائے۔

"عن ابن عباس عن الفضل قال رأیت رسول اللہ ﷺ واقفابعرفة مادایدیه کالمستطعم "

(اخرجه البزار)

رسول اللہ ﷺ نے مقام عرفات پر اس طرح ہاتھ پھیلا کر (عاجزی سے) دعاء کی جس طرح طعام طلب کرنے والا ہاتھ پھیلاتا ہے۔

" عن ابن عباس رضی اللہ عنهمارأیته علیه الصلوة والسلام یدعوبعرفة الی صدره کالمستطعم المسکین "

(رواہ البیهقی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو مقام عرفات پر دعا کرتے ہوئے دیکھا کہ آپ نے اپنے ہاتھوں کو سینہ کے برابر اٹھایا ہوا ہے اور ایسے دعاء کر رہے ہیں جس طرح کوئی مسکین طعام طلب کر رہا ہو۔

مقام عرفات اگر چہ تمام ہی ٹھہرنے کا مقام ہے لیکن جبل رحمت کے پاس ٹھہرنا نصیب ہو جائے تو یہ خوش بختی ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نماز کے بعد اسی مقام پر ٹھہرے۔

مقام عرفات میں وقتاً فوقتاً تلبیہ پڑھتا رہے۔

" لأن النبی ﷺ مازال یلبی حتی اتی جمرة العقبة "

اس لئے کہ نبی کریم ﷺ جمرہ عقبہ تک پہنچنے کے وقت تک تلبیہ پڑھتے رہے۔

مزدلفہ میں آنا:

نو ذی الحج کا سورج جب غروب ہو جائے تو وہاں کا امام اور تمام لوگ آہستہ آہستہ چلیں یہاں تک کہ مزدلفہ میں آجائیں، اگر جبل قزح کے قریب جگہ مل جائے تو خوش قسمتی ورنہ مزدلفہ کے کسی مقام پر ٹھہر جائے۔ امام لوگوں کو مغرب اور عشاء کی نماز ایک اذان اور ایک اقامت سے پڑھائے۔ یعنی یہاں دونوں نمازوں کو جمع کر کے پڑھا جائے گا، ان دو نمازوں کے درمیان بھی نوافل نہیں پڑھے جائیں گے۔

مقام توجہ: اس دن مغرب کی نماز مزدلفہ میں پہنچنے سے پہلے ادا نہیں کی جائے گی۔ یعنی مزدلفہ میں پہنچنے سے پہلے مغرب کی نماز کا وقت ہی شمار نہیں ہوگا۔ اگر راستہ میں مغرب کی نماز ادا کی تو وہ نماز نہیں ہوگی۔

مزدلفہ میں فجر کی نماز:

صبح صادق ہوتے ہی اندھیرے میں ہی امام فجر کی نماز مزدلفہ میں پڑھا دے۔ تا کہ نماز کے بعد زیادہ دیر ٹھہرنے اور دعاء کرنے کا وقت میسر ہو سکے، اندھیرے میں نماز ادا کرنے پر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت بخاری و مسلم میں موجود ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مزدلفہ میں فجر کی نماز عام معمول سے ہٹ کر سویرے اندھیرے میں پڑھائی۔

نماز کے بعد مقام مزدلفہ میں رک کر دعاء کی جائے۔ دعاء عاجزی سے ہاتھ پھیلا کر کرے جیسا کہ عرفات میں دعاء کرنے کا ذکر ہو چکا ہے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

" ان النبی ﷺ وقف فی هذه الموضع (ای المشعر الحرام) یدعو"

نبی کریم ﷺ مزدلفہ میں مشعر حرام کے پاس دعاء کرنے کے لئے ٹھہرے۔

مزدلفہ میں ٹھہرنا حج میں واجب ہے، واجب کے چھوٹ جانے سے دم (جانور ذبح کرنا) لازم آ جاتا ہے۔

مقام مزدلفہ تمام ہی ٹھہرنے کی جگہ ہے سوائے وادی محسر کے، جیسا کہ پہلے حدیث پاک کو ذکر کیا گیا ہے۔

مزدلفہ سے منیٰ میں آنا:

صبح کی نماز کے بعد مزدلفہ میں دعاء میں مشغول رہے جب روشنی خوب ہو جائے سورج کے طلوع ہونے سے پہلے مزدلفہ سے چل کر منی میں آ جائیں۔ یہ ذی الحج کی دس تاریخ ہوگی۔

فائدہ: ضعیف حضرات اور عورتیں اگر مزدلفہ میں کچھ دیر رک کر اژدھام سے بچنے کی غرض سے رات کو ہی منی میں آ جائیں تو جائز ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اپنے اہل کے ضعیف حضرات کو رات میں ہی منی بھیج دیا تھا۔

" عن ابن عباس قال انا ممن قدم النبی ﷺ لیلة المزدلفة فی ضعفة اهله"

(بخاری، مسلم، مشکوۃ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، نبی کریم ﷺ نے اپنی اہل کے جن ضعیف لوگوں کو مزدلفہ سے رات کو ہی بھیج دیا تھا میں بھی ان میں تھا۔ (کیونکہ یہ اس وقت بچے تھے)

پتہ چلا کہ ضعیف سے مراد صرف بوڑھے ہی نہیں بلکہ عورتیں اور بچے بھی مراد ہیں۔

کنکریاں مارنا:

جب منی میں پہنچیں تو سب سے پہلے جمرات کے پاس آ جائیں کنکریاں ماریں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے منی میں پہنچتے ہی بغیر ٹھہرنے کے سب سے پہلے کنکریاں ہی ماری ہیں۔

سات کنکریاں مارنی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی کنکریاں ہوں جو دوسرے کسی شخص کو تکلیف نہ دیں، مستحب یہ ہے کہ جمرۃ سے پانچ ذراع (تقریباً آٹھ فٹ) کے فاصلہ سے کنکریاں مارے اور دائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر کنکری کو رکھ کر شہادت انگلی سے پھینک دے۔ لیکن آجکل بہت سے زیادہ ہجوم ہوتا ہے، اس لئے اتنی دور سے کھڑے ہو کر کنکریاں مارے جو جمرۃ کے قریب پہنچ جائیں۔ اگر بہت دور رہیں تو رمی (کنکریاں مارنے کا فعل) نہیں ہوگی۔ کنکری ایک ایک کر کے مارے، اگر سات کنکریاں ایک ہی مرتبہ مار دے تو ایک ہی کنکری شمار ہوگی۔

فائدہ: ''حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب حکم ہوا کہ اپنے بیٹے کی قربانی کرو تو آپ اسمٰعیل علیہ السلام کو قربانی کرنے کے لئے لے جا رہے ہیں تو آپ کو شیطان نے وسوسہ ڈالنے کی ناکام کوشش کی، آپ نے اسے کنکریاں مار کر بھگا دیا، اسی مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جہاں شیطان کو ایک مرتبہ تھوڑا آگے جا کر دوسری مرتبہ پھر ذرا آگے جا کر تیسری مرتبہ کنکریاں ماریں، تینوں مرتبہ اس کی کوشش کو ناکام بنا دیا'' حاجی حضرات کنکریاں مار کر آپ کی یاد کو تازہ کرتے ہیں، ورنہ اب وہاں کوئی شیطان نہیں ہوتا۔

کنکریاں مارنے کا مستحب وقت:

دس ذی الحج کو سورج کے ڈھلنے سے پہلے کنکریاں مارنا مستحب ہے۔ تاہم آجکل بہت زیادہ ہجوم کی وجہ سے کنکریاں مارنا سب سے مشکل کام ہے، بعض اوقات ایک دوسرے سے دھکا لگنے کی وجہ سے کئی لوگ گر کر ہجوم کے پاؤں سے روندے جانے کی وجہ سے اس دنیا سے چل بسے ہیں، اس لئے اگر کوئی شخص سورج کے ڈھلنے سے پہلے کنکریاں مارنے کی ہمت نہ سمجھے تو بعد میں جس وقت بھی ہمت سمجھے کنکریاں مار لے کیونکہ جان بچانا بھی فرض ہے۔ البتہ کوشش کر کے دیکھ لے کہ اگر سورج کے ڈھلنے سے پہلے کنکریاں مار سکے تو بہتر ہے۔ یہ بھی یاد رہے پہلے دن صرف جمرہ عقبہ کو کنکریاں ماری جائیں گی۔

قربانی کرنا:

اگر کوئی شخص مسافر نہیں اور صاحب نصاب ہے تو اس پر قربانی واجب ہوگی۔ اگر صاحب نصاب نہیں یا کوئی شخص مسافر ہے تو اس پر قربانی کرنی واجب نہیں ہوگی۔ وہ چاہے تو قربانی کرے چاہے تو نہ کرے۔ قربانی کرنا اس کے لئے مستحب ہے۔

حلق یا قصر کرنا:

قربانی کے بعد سر منڈائے یا انگلی کے پورے برابر بال چھوٹے کرادے۔ البتہ بال منڈانا افضل ہے۔

"عن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ رحم اللہ المحلقین قالوا والمقصرین یارسول اللہ فلما کانت الرابعة قال والمقصرین" (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ سر منڈانے والوں پر رحم فرمائے۔ صحابہ کرام نے فرمایا۔ "بال چھوٹے کرانے والوں پر بھی" تو آپ نے چوتھی مرتبہ اپنی دعاء میں بال چھوٹے کرانے والوں کو شامل کیا اور کہا کہ بال چھوٹے کرانے والوں پر بھی اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔

حلق کے ساتھ احرام کی کافی پابندیاں ختم:

جب انسان نے سر منڈالیا یا بال چھوٹے کرالئے تو اس کے لئے ہر وہ چیز حلال ہوگئی جو احرام کی وجہ سے اس پر منع تھی سوائے عورتوں کے، ابھی تک زوجہ سے وطی کرنا جائز نہیں ہوا۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

" حل له کل شیء الا النساء" (اخرجه الطبرانی)

اس کے لئے سوائے عورتوں کے ہر چیز حلال ہوگئی۔

طواف زیارۃ کرنا:

طواف زیارۃ فرض ہے، دس ذی الحج کی صبح کو اس وقت شروع ہو جاتا ہے، بہتر یہی ہے کہ دس ذی الحج کو ہی طواف کرے، کیونکہ نبی کریم ﷺ سر منڈانے کے بعد مکہ مکرمہ میں تشریف لائے اور طواف زیارۃ کیا لیکن اگر دیر ہو جائے تو گیارہ اور بارہ ذی الحج کو بھی طواف کیا جا سکتا ہے۔

تنبیہ: اگر ایک شخص نے طواف قدوم کر لیا تھا اس میں رمل بھی کر لیا تھا اور طواف قدوم کے بعد صفا و مروہ میں سعی بھی کر لی تھی تو اب طواف زیارۃ میں رمل بھی نہیں کرے گا اور اس کے بعد سعی بھی نہیں کرے گا، لیکن اگر پہلے کسی وجہ سے سعی نہیں کر سکا تو اب طواف زیارۃ میں رمل کرے گا اور اس کے بعد سعی بھی کرے گا۔

طواف کے بعد دو رکعت ادا کرے اور ہر مرتبہ حجر اسود سے گذرتے ہوئے استلام کرے۔

عورتوں کا حلال ہونا:

طواف زیارۃ جب کر لیا تو اب احرام کی مکمل پابندی ختم ہو گئی، یعنی زوجہ سے جماع کرنا جو ابھی تک حرام تھا اب وہ بھی جائز ہو گیا۔

تنبیہ: اگر بارہ ذی الحج سے بھی طواف زیارۃ کو مؤخر کر دیا تو اس شخص پر دم (جانور کا ذبح کرنا) لازم آجائے گا۔

گیارہ ذی الحج کو کنکریاں مارنا:

گیارہ ذی الحج کو جب سورج ڈھل جائے تو تینوں جمرات کو سات سات کنکریاں مارنی ہوں گی۔ ابتداء اس جمرہ سے کرے گا جو مسجد خیف کے قریب ہے، پھر جو اس کے قریب ہے، پھر آخر میں جمرہ عقبہ کو کنکریاں مارے گا، کنکریاں مارتے ہوئے اللہ اکبر پڑھے۔ ایک جمرہ کو کنکریاں مار کر رک جائے تحمید، تہلیل کرے، ثناء پڑھے اور نبی کریم ﷺ پر درود پاک پڑھے اور اپنی حاجت کے لئے دعاء کرے اور دعاء کرتے وقت ہاتھ اٹھائے، پھر دوسرے جمرہ

کو کنکریاں مارے، البتہ تیسرے جمرہ عقبہ کو کنکریاں مار کر رکے نہیں، لیکن آجکل بہت زیادہ ہجوم کی وجہ سے رک کر تحمید و تہلیل وغیرہ اور دعاء کرنا بہت مشکل کام ہے جان بچاتے ہوئے چلتے ہوئے ذکر کرنا اور دعاء کرنا بہتر نظر آتا ہے۔

بارہ ذی الحج کو کنکریاں مارنا:

جس طرح گیارہ ذی الحج کو سورج ڈھلنے کے بعد کنکریاں ماری گئیں اسی طرح بارہ ذی الحج کو بھی ماری جائیں، یعنی تینوں جمرات کو کنکریاں مارے، ہر جمرے کو کنکریاں مار کر رک کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے اور دعا کرے، اور اس دن بھی کنکریاں مارنے کا مستحب وقت سورج ڈھلنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔

تیرہ ذی الحج کو کنکریاں مارنا:

بارہ ذی الحج کو کنکریاں مار کر مکہ مکرمہ میں آنے کی اجازت ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص رات منیٰ میں ہی رہا تو تیرہ ذی الحج کو بھی سورج کے ڈھلنے کے بعد کنکریاں مار کر مکہ مکرمہ میں آئے، البتہ اس دن سورج کے ڈھلنے سے پہلے بھی کنکریاں مار کر مکہ مکرمہ میں آنا جائز ہے۔

البتہ یہ خیال رہے کہ تیرہ ذی الحج کو بھی کنکریاں مار کر آنا افضل ہے۔

"لماروی ان النبی ﷺ صبر حتی رمی الجمار الثلاث فی الیوم الرابع" (ابوداؤد)

کیونکہ نبی کریم ﷺ وہاں رکے، یہاں تک کہ تیرہ ذی الحج کو بھی کنکریاں مار کر وہاں سے چلے۔

اس مسئلہ کی مزید تفصیل ان شاء اللہ "فمن تعجل فی یومین فلااثم علیه ومن تاخر فلااثم علیه لمن اتقی" کی وضاحت میں آجائے گی۔

آٹھ ذی الحج کے بعد اور دس ذی الحج کے بعد اور گیارہ کے بعد آنے والی راتیں منیٰ میں ہی گذاری جائیں، وہاں رات نہ گذارنا مکروہ ہے۔

"لماروی ان النبی ﷺ بات" (ابوداؤد)

اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ راتیں منیٰ میں ہی گذاریں۔

طواف وداع:

مکہ مکرمہ میں پہنچ کر طواف کرے، اس طواف میں رمل نہیں، اس طواف کو طواف صدر اور طواف آخر عہد بالبیت بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ "صدر یصدر" کا معنی ہے رجوع کرنا، یہ طواف بھی لوٹنے اور کعبہ شریف کو الوداع کرنے کی غرض سے آخری طواف ہوتا ہے، اسی لئے اس کے یہ نام ہیں۔ یہ طواف واجب ہے۔

مسئلہ: عورت حج میں تمام کام وہی کرے گی جو مرد کرتا ہے، البتہ چند کاموں میں عورت مرد سے مختلف رہے گی۔ عورت اپنا سر ننگا نہیں کرے گی۔ البتہ چہرہ ننگا کر سکتی ہے۔ چہرے کا پردہ کرے تو کوئی چیز سر پر ایسی استعمال کرے جس سے لٹکانے والا کپڑا اس کے چہرے سے مس نہ کرے تو یہ صورت بھی جائز ہے۔

اور عورت بلند آواز سے تلبیہ نہ پڑھے بلکہ آہستہ آواز میں پڑھے اور عورت رمل نہیں کرے گی۔ اور عورت صفا اور مروہ کے درمیان دوڑے گی نہیں۔ اگر چہ یہ سنت حضرت ہاجرہ کی ہے جو عورت ہیں لیکن آپ جب دوڑی تھیں تو اس وقت کوئی مرد وہاں موجود نہیں تھا۔ اب وہاں مرد بھی ہوتے ہیں، اس لئے عورت کے دوڑنے میں اس کی بے پردگی ہوتی ہے، لہٰذا اس کے پردے کا لحاظ کر کے اسے دوڑنے سے منع کر دیا گیا۔

اور عورت سر نہیں منڈائے گی البتہ انگلی کے پورے کے برابر لٹکے ہوئے بالوں کو نیچے سے کٹوائے۔

اور عورت سلے ہوئے کپڑے پہنے گی، چادریں استعمال نہیں کرے گی۔

مسئلہ: اگر عورت کو حیض آجائے تو باقی تمام کام حج کے کرلے سوائے طواف کے، کیونکہ حیض کے دنوں میں عورت کو طواف کرنا منع ہے، اگر طواف زیارۃ سے پہلے حیض آجائے تو حیض کے ختم ہونے اور طواف کرنے تک وہاں رکنا پڑے گا لیکن طواف زیارۃ اگر کرلیا اور طواف وداع رہتا تھا تو طواف وداع کئے بغیر عورت کو وہاں سے چلے آنا جائز ہے۔

مسئلہ: طواف وداع آفاقی لوگوں کے لئے واجب ہے جو میقاتوں کے اندر رہنے والے ہیں ان کے لئے طواف وداع واجب نہیں، اسی طرح اگر آفاقی شخص حج کے بعد مکہ میں ہی مقیم ہو گیا تو یہ بھی مکی کے حکم میں ہوگا۔ ہاں البتہ عارضی سکون سے مکی نہیں بنے گا بلکہ اسے طواف وداع کرنا واجب ہوگا۔

آیۃ کریمہ کا شان نزول:

" اخرج الشافعی واحمدوابن شیبه والبخاری ومسلم وابوداؤدوالترمذی والنسائی عن یعلی بن امیة قال جاء رجل الی النبی ﷺ وهوبالجعرانة علیه جبة وعلیهاخلوق فقال کیف تامرنی ان اصنع فی عمرتی قال فانزل علی النبی ﷺ فتستربثوب وکان یعلی یقول وددت انی اری النبی ﷺ وقدانزل علیه الوحی فقال عمرایسرک ان تنظرالی النبی ﷺ وقدانزل علیه الوحی فرفع عمرطرف الثوب فنظرت الیه له غطیط کغطیط البکرفلماسری عنه قال این السائل عن العمرة اغسل عنک اثر الخلوق واخلع عنک جبتک واصنع فی عمرتک ماانت صانع فی حجک"

(درمنثور)

حضرت یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں مقام جعرانہ میں حاضر ہوا جبہ پہنا ہوا تھا اور اس نے خوشبو لگائی ہوئی تھی۔ اس نے عرض کیا آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں کہ میں عمرہ میں کس کس طرح عمل کروں، یعلی کہتے ہیں اتنے میں رسول اللہ ﷺ پر وحی نازل ہونا شروع ہوگئی، آپ نے کپڑا اوڑھ لیا۔ یعلی کہتے ہیں میں تمنا کرتا تھا کہ کبھی نبی کریم ﷺ پر وحی کو آتے ہوئے دیکھ لوں، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا، کیا تم نبی کریم ﷺ پر وحی کے آنے کو دیکھنا پسند کرتے ہو؟ (آؤ میں آپ کو دکھاؤں) حضرت عمر نے کپڑے کی ایک طرف کو اٹھایا تو میں نے آپ کی طرف نظر کی آپ خراٹے لے رہے تھے، جب آپ سے وہ کیفیت جاتی رہی تو آپ نے فرمایا عمرہ کے متعلق پوچھنے والا شخص کہاں ہے، خوشبو کے اثرات کو اپنے آپ سے دھو دو اور اپنا جبہ اتار دو، اپنے عمرہ میں وہی کام کرو جو حج میں کرتے ہو۔ (یعنی طواف، سعی اور حلق یا قصر کرو)

"واخرج ابن جریروابن المنذرعن ابن عباس فی الآیة قال من احرم بحج اوعمرة فلیس له ان یحل حتی یتمهاتمام الحج یوم النحراذارمی الجمرةالعقبة وزارالبیت فقدحل وتمام العمرة اذاطاف بالبیت وبالصفاوالمروة فقدحل (درمنثور)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں (کہ رب تعالیٰ نے حج اور عمرہ کو مکمل کرنے کا جو حکم دیا اس کا مطلب یہ ہے) کہ جو شخص حج یا عمرہ کا احرام باندھ لے اس کے لئے احرام کھول لینا جائز نہیں یہاں تک کہ اگر احرام حج کا تھا تو دس ذی الحج کو جمرہ عقبہ کو کنکریاں مارلے اور بیت اللہ شریف کی زیارت کرلے یعنی طواف زیارت کرلے اور اگر عمرہ کا احرام تھا تو بیت اللہ شریف کا طواف اور صفا و مروہ میں سعی کرنے کے بغیر احرام کھولنا جائز نہیں۔

"وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ" اور مکمل کرو حج اور عمرہ اللہ کے لئے۔

اس کے معنی میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ یہ حکم مطلق ہے کہ حج اور عمرہ اللہ تعالیٰ کی رضا مندی حاصل کرنے کے لئے مکمل طور پر ادا کرو، ان کے ارکان و واجبات کا کامل لحاظ کرو۔

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ حج یا عمرہ کا احرام باندھ کر حج یا عمرہ کے احرام کو بلا وجہ کھول نہ دو بلکہ ان کو مکمل کر کے احرام سے فارغ ہو، کیونکہ زمانہ جاہلیت میں مختلف قبائل اپنی مرضی سے حج کرتے تھے جہاں چاہیں ختم کرلیں، ان کو اس طریقہ سے منع کیا گیا۔

یہی دوسرا احتمال شان نزول کی دوسری وجہ کے مطابق ہے، علامہ رازی رحمہ اللہ نے بھی اسے ہی راجح قرار دیا کہ معنی یہ کیا جائے۔

" واذاشرعتم فی الفعل فاتموه"

اور جب تم حج اور عمرہ کے فعل کو شروع کرو تو پھر اسے پورا کرو یعنی مکمل کرنے سے پہلے ہی فارغ نہ ہو جاؤ۔

فائدہ: احرام سے پہلے آٹھ چیزوں پر عمل کرنا بھی اس آیۃ کا تقاضا ہے، یعنی یہ آیت ان تمام امور کو شامل ہے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

﴿۱﴾ ان میں سے پہلی چیز کا تعلق مال سے ہے، احرام باندھنے سے پہلے توبہ کرلے وہ توبہ اس طرح ہوگی کہ ظلم سے حاصل کیا ہوا مال واپس لوٹا دے، اور قرضے ادا کردے، اور جن لوگوں کا خرچ اس کے ذمہ ہے واپس

آنے تک کا خرچ ان کو ادا کر کے جائے، اور لوگوں کی جو امانتیں پاس ہوں وہ ان کے حوالے کر کے جائے، اور اپنے پاس پاک وحلال مال ہو جو آنے جانے تک کافی ہو اس میں کوئی کمی نہ ہو، بلکہ اپنے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ مال رکھے تاکہ فقراء پر اور اپنے ساتھیوں پر مہربانی کر سکے، اور چلنے سے پہلے کچھ مال صدقہ کرے، اور اپنے لئے سواری خریدے، اور اگر سواری کرایہ پر لینی ہے "**فلیظهر للمکاری کل ما یحصل رضاه فیه**" تو کرایہ پر دینے والا شخص کامل رضاء مند ہونا چاہیے، کسی قسم کا اس پر جبر نہ ہو، اور اس سے کوئی دھوکا نہ کیا جائے۔

اسی سے واضح ہوا کہ آجکل جن قوانین پر عمل کرنا ضروری ہے خواہ وہ اپنے ملک سے تعلق رکھتے ہوں یا سعودیہ سے ان پر عمل کرے، جھوٹ، فریب سے کام لے کر حج کرنے کا مقصد کیا ہے؟ جب حج ثواب کے لئے کرنا ہے تو اس میں جھوٹ اور فریب جیسے کبیرہ گناہوں کو شامل کر کے کون سا ثواب حاصل ہوگا؟

﴿۲﴾ دوسری چیز کا تعلق رفیق سے ہے۔

"**فینبغی ان یلتمس رفیقا صالحا محبا للخیر معینا علیه**"

بہتر یہ ہے کہ اپنے ساتھ ایسا نیک دوست رکھے جو نیکیوں سے محبت رکھتا ہو اور اس کا بھی نیکیوں میں معاون ہو۔

"**ان نسی ذکره**" اگر یہ کوئی کام بھول جائے تو وہ یاد دلا دے۔

"**وان ذکر ساعده**" اور اگر اسے یاد ہو تو وہ اس کی معاونت کرے۔

"**وان جبن شجعه**" اور اگر اس کے دل میں کوئی ڈر لاحق ہو تو وہ تسلی دے کہ گھبراؤ نہیں سفر میں مشکلات آتی رہتی ہیں۔

"**وان عجز قواه**" اور اگر یہ عاجز آجائے تو وہ اس کو سہارا دے، ڈھارس بندھائے۔

"**وان ضاق صدره صبره**" اور اگر اسے کہیں دل تنگی ہو تو وہ اسے صبر دلائے۔

اور پیچھے رہ جانے والے بھائیوں اور احباب کو الوداع کر کے جائے، ان سے دعاؤں کی درخواست کرے، کیونکہ

"**ان الله تعالی جعل فی دعائهم خیرا**" بیشک اللہ تعالیٰ نے ان کی دعاء میں بھلائی رکھی ہے۔

﴿۳﴾ تیسری چیز گھر سے نکلنے کے ساتھ متعلق ہے۔جب وہ گھر سے نکلنے کا ارادہ کرے تو دو رکعت نماز نفل ادا کرے، پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ اور "قل یاایھاالکافرون" سورۃ پڑھے۔اور دوسری رکعت میں سورہ فاتحہ اور سورۃ اخلاص پڑھے "بعدالفراغ یتضرع الی اللّٰہ بالاخلاص" اور فارغ ہونے کے بعد اخلاص اور عاجزی سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے، یعنی عجز وانکساری سے دعاء کرے۔

﴿۴﴾ چوتھی چیز کا تعلق ہے گھر کے دروازہ سے، گھر کے دروازہ سے نکلتے ہوئے پڑھے۔

"بسم اللّٰہ توکلت علی اللّٰہ لاحول ولاقوۃ الاباللّٰہ"

"وکلماکانت الدعوات ازید کانت اولی"

جتنی زیادہ دعائیں کرے گا اتنا ہی اس کے لئے بہتر ہوگا۔

﴿۵﴾ پانچویں چیز کا تعلق سواری پر سوار ہونے سے ہے، جب سوار ہونے لگے تو یہ پڑھے۔

"بسم اللّٰہ وباللّٰہ واللّٰہ اکبر توکلت علی اللّٰہ لاحول ولاقوۃ الاباللّٰہ العلی العظیم، ماشاء اللّٰہ کان ومالم یشأ لم یکن، سبحان اللّٰہ الذی سخرلنا ھذا وما کناله مقرنین، وانا الی ربنا لمنقلبون"

﴿۶﴾ چھٹی چیز کا تعلق ہے سفر سے، رات کو سفر کرنا مسنون ہے، جب دھوپ نکل آئے تو آرام کرلے، (لیکن آجکل ہوائی جہاز اور گاڑیوں پر سفر کرنا ہوتا ہے، اس لئے ہوائی سروس کے اوقات کا حاجی کو پابند رہنا ہوگا)

سواری سے اتر کر دو رکعت نماز نفل ادا کرے اور زیادہ سے زیادہ دعائیں کرے۔

﴿۷﴾ ساتویں چیز یہ ہے کہ اگر دشمن یا کسی درندے کا خوف لاحق ہو تو آیۃ الکرسی اور کلمہ شہادت اور سورۃ اخلاص اور "قل اعوذ برب الفلق" اور "قل اعوذ برب الناس" پڑھے۔اور یہ عرض کرے۔"تحصنت باللّٰہ العظیم" اور یہ کہے "استعنت بالحی الذی لایموت"

﴿۸﴾ چلتے ہوئے جب بھی کسی بلند جگہ پر چڑھنا ہو تو تین مرتبہ "اللّٰہ اکبر" پڑھے۔لیکن احرام کے بعد تکبیر بھی پڑھے لیکن تلبیہ پڑھنے میں کثرت سے کام لے۔

﴿۹﴾ نویں چیز یہ ہے کہ سفر صرف حج کے لئے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہو، اس میں دنیاوی غرض تجارت وغیرہ کا ارادہ نہ ہو، ہاں البتہ بہتر یہ ہے ورنہ تجارت جائز ہے جس کا ذکر ان شاء اللہ آگے آئے گا۔

﴿۱۰﴾ دسویں چیز یہ ہے کہ دوران حج اپنی زبان کو گالی گلوچ، جھگڑا فساد سے بچا کر رکھے، (اس کا ذکر بھی ان شاء اللہ آگے آئے گا) اور تمام ارکان وواجبات وسنن حج کو اچھی طرح ادا کرے۔

"ویکون غرضه فی کل هذه الامور ابتغاء مرضاة الله"

اور اس کی غرض ان تمام امور میں اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کا حصول ہو۔

"فقوله "اتموا الحج والعمرة لله" کلمة شاملة جامعة لهذه المعانی"

یہ چیزیں جن کا ذکر کیا گیا ہے ان تمام کو اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی "واتموا الحج والعمرة لله" شامل ہے۔

جب بندہ حج کو اس طرح ادا کرے گا تو اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اتباع حاصل ہوگی۔ کیونکہ آپ کے متعلق رب تعالیٰ نے فرمایا۔

"واذابتلی ابراهیم ربه بکلمات فاتمهن" اور جب ابراہیم کو اللہ نے چند کلمات سے آزمایا تو انہوں نے ان کو پورا کیا۔

اسی طرح رب تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم دیا۔ "واتموا الحج والعمرة لله" اور پورا کرو حج اور عمرہ اللہ کے لئے۔ تو اللہ کے بندوں نے اس کا حکم مانتے ہوئے ان کو پورا کیا۔

"فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْهَدْیِ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰی یَبْلُغَ الْهَدْیُ مَحِلَّهٗ"

پھر اگر تمہیں روک لیا جائے تو جو میسر ہو ہدی، اور نہ منڈاؤ اپنے سروں کو یہاں تک پہنچ جائے ہدی اپنی (ذبح کی) جگہ۔

"احصار" کا معنی ہے روکنا، حج سے روکے جانے کی چند صورتیں ہیں۔ دشمن کی طرف سے رکاوٹ واقع ہو جائے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کو حدیبیہ کے مقام پر کفار نے روک لیا تھا۔

جس شخص نے حج یا عمرہ کا احرام باندھا ہوا تھا وہ مریض ہو گیا۔ ایسی مرض لاحق ہو گئی کہ اس کا حج کرنا ممکن ہی نہ رہا۔ یا اس کے پاس حج کا خرچ ہی ختم ہو گیا۔ یا عورت کا خاوند یا محرم جس کے ساتھ وہ حج کر رہی تھی وہ راستہ میں ہی فوت ہو گیا۔ ان تمام صورتوں میں محرم کو روک لیا گیا ہے۔ اسے چاہئے کہ وہ بطور ہدی ایک بکری یا بھیڑ جو بھی میسر ہو بھیج دے، جس شخص کے ہاتھ بھیجے اس سے ایک دن مقرر کر لے کہ وہ فلاں دن پہنچ جائے گا اور حرم میں یہ جانور ذبح کر دے گا۔ جو دن مقرر کیا تھا اس دن یہ شخص اپنے بال منڈا کر یا بال کٹا کر احرام کھول لے، یہی مطلب ہے۔ "ولا تحلقوا رؤسکم حتی یبلغ الھدی محلہ" کا کہ جب تک ہدی حرم میں نہ پہنچے اس وقت تک احرام نہیں کھول سکتا۔

خیال رہے کہ جانور بھیجنا تو ہر جگہ سے ممکن نہیں، یقیناً اس کی قیمت بھیجے گا جس سے وہ شخص جانور خرید کر حرم میں ذبح کر دے گا، ہدی کو ذبح کرنے کے لیے دنوں کی کوئی تخصیص نہیں۔ جس دن بھی پہنچ جائے ذبح کر دے، البتہ حرم میں ذبح کرنا ضروری ہے۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ بھیڑ یا بکری کم از کم ہدی کی حد ہے، اگر کوئی شخص بطور ہدی گائے یا اونٹ کی رقم بھیج دے اور اس کی طرف سے مکمل ایک گائے یا اونٹ ذبح کر لئے گئے تو یہ بطریق اولیٰ (بہتر طریقہ سے) ادا ہو گی۔

قارن کا حکم:

جس شخص نے حج اور عمرہ دونوں کا ہی ایک ساتھ میقات سے احرام باندھ رکھا ہے اسے قارن کہتے ہیں، قران کی وضاحت ان شاء اللہ آگے آئے گی۔ اگر قران کرنے والے کو روک لیا گیا ہو تو وہ دو بکریاں حرم میں ذبح کرنے کے لئے بھیجے، کیونکہ اس نے دو احرام باندھ رکھے ہیں، دونوں سے آزاد ہونا ہے، اس لئے اس پر دو دم لازم آئیں گے، قران کرنے والا اگر ایک ہدی بھیجے کہ وہ حج کے احرام سے آزاد ہو جائے اور عمرہ کا احرام باقی رہے تو وہ کسی ایک سے بھی حلال نہیں ہو گا، بلکہ اس کے دونوں احرام برقرار رہیں گے۔

مسئلہ: جس شخص نے حج کا احرام باندھ رکھا تھا اگر اسے روک لیا گیا اس نے ہدی بھیج کر احرام کھول لیا تو اس پر آئندہ حج کی قضاء لازم ہوگی اور ساتھ ہی ایک عمرہ کرنا بھی لازم ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے اسی طرح ثابت ہے۔ حج کی قضاء تو اس لئے لازم ہے کہ وہ شروع کی وجہ سے لازم ہو چکا تھا اور عمرہ کرنا اس لئے لازم ہے کہ اگر کسی کا حج فوت ہو جائے تو وہ وقتی طور پر عمرہ کر کے حج کے احرام سے آزاد ہو جائے، یہ بھی حج کو فوت کرنے والا ہے۔ جب حج سے روک لیا گیا ہے تو بعد میں حج بھی کرے اور عمرہ بھی۔

مسئلہ: اگر عمرہ کا احرام باندھا ہوا تھا تو روک لیا گیا تو ہدی کا جانور بھیج کر ذبح کے مقرر دن میں سر منڈا کر احرام کھول لے، آئندہ صرف ایک عمرہ قضاء کرے۔

مسئلہ: اگر قران کرنے والے کو روک لیا گیا اس نے دو جانور ہدی کے بھیج دیئے، پھر احرام کھول لیا تو آئندہ وہ ایک حج اور دو عمرے قضاء کرے گا۔

مسئلہ: جس شخص نے حج کا احرام باندھا ہوا تھا لیکن وہ نو ذی الحج کے دن اور اس کے بعد آنے والی رات کو صبح صادق تک مقام عرفات پر نہ پہنچ سکا تو اس پر لازم ہے کہ طواف کرلے اور سعی کرلے اور حلق کرا کے احرام سے فارغ ہو جائے، آئندہ حج کی قضاء کرے، اس پر ہدی کا جانور ذبح کرنا لازم نہیں، اور آئندہ حج کے ساتھ عمرہ کرنا بھی ضروری نہیں۔

فائدہ: عمرہ کا وقت مقرر نہیں اس لئے عمرہ فوت نہیں ہوتا، عمرہ سال میں جب بھی ادا کرے ادا ہی ہوگا، البتہ نو ذی الحج سے لے کر تیرہ ذی الحج تک یعنی پانچ دن سال کے عمرہ کرنا ان میں مکروہ ہے۔

احصار کے متعلق احادیث مبارکہ:

"عن ابن عباس قال قد احصر رسول الله ﷺ فحلق رأسه وجامع نسائه ونحر هديه حتى اعتمر عاما قابلا" (رواه البخاری، مشکوۃ باب الاحصار)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کو جب روک دیا گیا تو آپ نے سر منڈایا اور عورتوں سے جماع کیا اور ہدی کے جانور ذبح کئے، عمرہ دوسرے سال کیا۔

وضاحت حدیث: " ونحر هدیه" میں واؤ مطلقاً جمع کے لئے استعمال ہے، اس میں کوئی ترتیب نہیں پائی گئی، یعنی آپ نے ہدی کے جانور پہلے ذبح کئے، اس کے بعد سر منڈایا، اسی کے ساتھ کامل طور پر احرام سے آزادی حاصل ہوگئی، اسی ترتیب پر بخاری اور مسلم کی حدیث دلالت کر رہی ہے۔

"انه علیه الصلوة والسلام تحلل هو واصحابه بالحدیبیة لماصده المشرکون وکان محرما بالعمرة فنحر ثم حلق ثم قال لاصحابه قوموا فانحروا ثم احلقوا"

نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ نے حدیبیہ کے مقام میں احرام کھولا، کیونکہ آپ کو مشرکین نے روک دیا تھا، جبکہ آپ نے عمرہ کا احرام باندھا ہوا تھا۔ آپ نے ہدی کے جانور ذبح کئے، پھر سر منڈایا، پھر آپ نے صحابہ کرام کو فرمایا اٹھو جانور ذبح کرو اور سر منڈادو۔

" وعن الحجاج بن عمرو الانصاری قال قال رسول اللہ ﷺ من کسر او عرج فقد حل وعلیه الحج من قابل" (مشکوۃ باب الاحصار) وفی روایة او مرض

حجاج بن عمرو انصاری کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی کی ہڈی توڑ دی گئی یا اس میں لنگڑا پن آ گیا تو وہ احرام کھول لے اور آئندہ سال حج کرلے۔ (ایک اور روایت میں مرض کا بھی ذکر ہے)

واضح ہوا کہ کسی طرح بھی محرم کو روک دیا جائے، خواہ دشمن کے ذریعے یا مرض وغیرہ کے ذریعے وہ ہدی کے جانور ذبح کر کے احرام کھول سکتا ہے۔

" فَمَنْ كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِّن رَّأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِّن صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ "

پھر ہو جائے کوئی شخص تم میں سے مریض یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو جائے تو فدیہ دے روزے یا صدقہ یا جانور ذبح کرنے سے۔

یعنی کوئی شخص حالت احرام میں سر نہ منڈائے، اگر کوئی رکاوٹ درپیش آجائے تو بطور ہدی ایک جانور حرم شریف میں بھیج دے، اس کے ذبح کرنے کا جو دن مقرر ہو جائے اس دن سر منڈا کر احرام کی پابندیوں سے آزاد ہو

جائے، لیکن اگر کوئی شخص مریض ہو جائے یعنی اس کے سر کو شدید درد لاحق ہو جائے، یا سر میں بہت زیادہ خارش ہوتی ہے، یا سر میں کثیر مقدار میں جوئیں پڑ گئیں لیکن اور کوئی رکاوٹ نہیں تو ایسی صورت میں وہ شخص اپنا سر منڈا کر احرام کھول لے اور فدیہ دے دے، اس کو فدیہ دینے میں اختیار ہے چاہے تو تین روزے رکھ لے اور چاہے تو چھ مساکین کو نصف نصف صاع گندم دے دے، یعنی صدقہ فطر کی مقدار ہر مسکین کو نصف صاع گندم یا کشمش یا ایک ایک صاع کھجور یا جو دے دے۔

طلبائے کرام توجہ فرمائیں:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی "فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِنْ رَأْسِهِ فَفِدْيَةٌ" مرتب ہے "وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ" پر، پھر "فَفِدْيَةٌ" ایک حکم ہے جس کا بیان "مِنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ" ہے، پھر لفظ "اَوْ" تخییر کے لئے ہے کہ ان تینوں کے ادا کرنے میں اس شخص کو اختیار ہے، جس پر چاہے عمل کر لے۔

اس کی تفصیل خود نبی کریم ﷺ نے بیان فرمادی۔ آپ نے کعب بن عجرہ کو دیکھا کہ ان کے سر میں بہت جوئیں پڑ گئیں۔

"فقال آذابک ھوامک قال نعم قال فاحلق رأسک واطعم فرقا بین ستة مساکین (والفرق ثلاثة اصوع) اوصم ثلاثة ایام او انسک شاة" (رواہ ائمة الستة)

تو آپ نے فرمایا کیا یہ کیڑے تمہیں تکلیف دے رہے ہیں؟ تو انہوں نے عرض کیا ہاں یارسول اللہ؟ یعنی تکلیف تو دے رہے ہیں تو آپ نے ان کو فرمایا کہ سر منڈا دو اور چھ مسکینوں کو ایک فرق طعام کھلا دو یا تین روزے رکھ لو یا ایک بکری ذبح کر دو۔

یہ بھی خیال میں رہے کہ فرق تین صاع کا ہے، حدیث شریف میں طعام سے مراد گندم ہے کہ تین صاع گندم چھ مسکینوں کو نصف نصف صاع دے دی جائے۔

اسی طرح ایک صاع گندم کے بدلے ایک روزے کا حکم دیا۔ یعنی چاہے تو تین روزے بطور فدیہ رکھ لے، اور چاہے تو بکری ذبح کرلے۔

اس مسئلہ میں ایک اور مقام توجہ یہ ہے کہ صدقہ جہاں چاہے مسکینوں کو دے، اور روزے بھی جہاں چاہے رکھ لے، لیکن بکری یا بھیڑ کو حرم شریف میں ہی ذبح کرنا لازم ہوگا، اس لئے کہ کسی جانور کا خون بہانا کسی زمان یا مکان سے خاص ہوکر ذریعہ قربت بنے گا، جس طرح قربانی کرنا ذی الحج کے تین دنوں (دس، گیارہ، بارہ) کے ساتھ خاص ہے، اس سے آگے پیچھے قربانی نہیں ہوگی، اسی طرح ہدی کا تعلق حرم میں ذبح ہونے سے ہے، حرم کے بغیر ذبح کیا جانے والا جانور ہدی نہیں بن سکے گا اور نہ ہی اس سے فدیہ ادا ہوگا۔

تنبیہ: مذکورہ بالا مسئلہ میں تین روزے رکھنے کے لئے نہ مکان کی قید ہے اور نہ زمان کی اور نہ ہی ان کے بعد سات روزے رکھ کر دس روزے مکمل کرنے کا حکم ہے، دس روزے رکھنے کا حکم ہی علیحدہ ہے، جو آنے والے مسئلہ سے ان شاء اللہ واضح ہو رہا ہے۔

(فَمَنْ كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا) مرضا يحوجه الى الحلق (اَوْبِهٖ اَذًى مِّنْ رَّأْسِهٖ) كجراحة وقمل (فَفِدْيَةٌ) فعليه فدية ان حلق (مِنْ صِيَامٍ اَوْصَدَقَةٍ اَوْنُسُكٍ) بيان لجنس الفدية

(بیضاوی)

والنسک بضمتين جمع نسكة وهى الذبيحة اعلاها بدنة واوسطها بقرة وادناها شاة

(شیخ زاده)

مرض سے مراد عام ہے کوئی بھی تکلیف ہو جو سر منڈانے کی طرف مجبور کرے، سر میں تکلیف سے مراد زخم یا جوئیوں کا پڑنا، اسی طرح خارش کی تکلیف واقع ہونا، سر منڈانے پر فدیہ کا حکم ثابت ہے، وہ فدیہ کیا ہے؟ اس کا بیان یہ ہے کہ وہ روزے ہیں یا صدقہ یا جانور ذبح کرنا ہے۔ جانور ذبح کرنے میں کم از کم بکری یا بھیڑ مراد ہے، اور سب سے اعلیٰ اونٹ کا ذبح کرنا ہے، اور ان کے درمیان گائے کا ذبح کرنا ہے۔

اعتراض: نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کو تو مقام حدیبیہ میں روک لیا گیا تھا آپ نے وہاں ہی ہدی کے جانور ذبح کر لئے تھے تو یہ کس طرح کہنا صحیح ہے کہ ہدی کے جانور صرف حرم میں ذبح کئے جائیں۔

جواب: حدیبیہ کا کچھ مقام حرم سے باہر ہے اور کچھ حصہ حرم میں داخل ہے، جانور حرم کے حصہ میں ذبح کئے گئے تھے۔

"فَاِذَا اَمِنْتُمْ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ"

پھر جب تم امن میں ہو تو جو شخص نفع حاصل کرے عمرہ سے حج تک تو جو میسر ہوا سے ہدی۔

"فَاِذَا اَمِنْتُمْ" کے معنی میں وسعت پائی گئی ہے، صرف یہ معنی نہیں کہ "جب تم امن میں ہو جاؤ" یعنی تم سے رکاوٹ کو اٹھالیا جائے، بلکہ اس کا ایک معنی یہ بھی ہے اور یہ معنی بھی ہے کہ جب تم امن میں ہو، یعنی تم پر کوئی رکاوٹ نہیں آئی اور نہ ہی کسی مرض میں تم مبتلا ہو۔

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے یہ دونوں معانی ان الفاظ سے بیان فرمائے۔

"(فَاِذَا اَمِنْتُمْ) الاحصار او کنتم فی حال امن وسعة"

جب تم احصار سے امن میں ہو جاؤ یا پہلے سے ہی حالت امن اور وسعت میں ہو۔

"فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ" تو جو شخص نفع حاصل کرے عمرہ سے حج تک۔

یہ الفاظ گرامی قران اور تمتع دونوں کو شامل ہیں۔ یعنی جو شخص ایک ہی سفر میں پہلے عمرہ کرے اور پھر حج کرے تو وہ بطور شکر ہدی کا جانور ذبح کرے۔

قران کیا ہے؟

میقات سے حج اور عمرہ کا احرام ایک ساتھ باندھ لینا قران ہے۔ احرام کے بعد دو رکعت ادا کرنے کے بعد یہ دعا کرے۔

"اللھم انی اریدالحج والعمرة فیسرھمالی وتقبلھمامنی"

اے اللہ! میں حج اور عمرہ کا ارادہ کرتا ہوں وہ میرے لئے آسان فرما اور وہ دونوں مجھ سے قبول فرما۔

اسی طرح احرام تو صرف عمرہ کا باندھا تھا لیکن مکہ مکرمہ میں پہنچ کر طواف کرنے سے پہلے یا تین چکر طواف کرنے سے پہلے حج کا احرام بھی ساتھ ہی باندھ لیا تو یہ بھی قران ہے۔

قران ادا کرنے کا طریقہ:

پہلے عمرہ کا طواف کرے، سات چکروں میں سے پہلے تین چکروں میں رمل کرے اور پھر چار چکر آرام آرام سے چلے، طواف کے بعد صفا و مروہ کے درمیان سعی کرے، پھر حلق نہ کرائے بلکہ احرام کی پابندیاں برقرار رہیں گی، پھر حج کا طواف قدوم کرے لیکن اس میں رمل نہیں۔ پھر سعی کرے، پھر حج کے باقی فرائض و واجبات و سنن وغیرہ کو ادا کرے۔ جو حج مفرد میں بیان کر دیئے گئے۔ حج کا حلق جب کرالے گا تو پھر احرام کی پابندیوں سے آزاد ہو گا۔ سوائے جماع کرنے کے، جب طواف زیارت بھی کرلے گا تو جماع کی اجازت بھی ہوگی۔

فائدہ: بہتر طریقہ تو وہی ہے جو بیان کر دیا گیا، لیکن قران کرنے والا اگر عمرہ اور حج کا طواف ایک مرتبہ ہی کرلے پھر دو مرتبہ سعی بھی ایک ساتھ کرلے تو جائز ہے۔

تمتع کیا ہے اور کیسے ادا کیا جائے؟

تمتع کا یہ مطلب ہے کہ میقات سے احرام عمرہ کا باندھے اور عمرہ ادا کر کے فارغ ہو جائے، مکہ شریف میں بغیر احرام کے رہے، جب آٹھ ذی الحج ہو جائے تو حرم شریف سے احرام باندھ کر حج کرے، حج اس طرح ادا کرے گا جس طرح حج مفرد ادا کیا جاتا ہے، البتہ یہ اب مکی کے حکم میں ہے اس لئے طواف قدوم نہیں کرے گا، اور طواف زیارت میں رمل کرے گا اور طواف زیارت کے بعد سعی کرے گا۔ اگر اس شخص نے احرام باندھنے کے بعد طواف کرلیا اور اس میں رمل بھی کرلیا اور طواف کے بعد سعی بھی کرلی تو اب طواف زیارت میں رمل نہیں کرے گا اور نہ طواف زیارت کے بعد سعی کرے گا۔

لیکن یہ خیال رہے کہ عمرہ کے بعد احرام اس وقت تمتع کرنے والا کھول سکتا ہے جب ہدی کا جانور ساتھ لے کر نہ جائے اور اگر ہدی کا جانور ساتھ لے کر جائے تو باوجود اس کے کہ اس نے میقات سے احرام صرف عمرہ کا باندھا تھا اور اب حج بھی کرنا چاہتا ہے تو یہ عمرہ کا احرام نہیں کھول سکتا بلکہ قران کرنے والے کی طرح حج سے فارغ ہو کر احرام کھولے گا۔

مقام توجہ: تمتع اس وقت ہوگا جب شوال کی پہلی تاریخ سے لے کر آٹھ ذی الحج سے پہلے تک عمرہ کا احرام باندھا تھا پھر گھر لوٹ کر بھی نہیں آیا، اور اسی سفر میں حج بھی کر لیا۔

اگر شوال سے پہلے عمرہ کا احرام باندھا تھا، یا احرام تو یکم شوال کے بعد باندھا تھا لیکن عمرہ کر کے واپس لوٹ آیا، پھر اسی سال حج بھی کر لیا تو یہ حج مفرد ہوگا، تمتع نہیں ہوگا۔

تنبیہ: قران کرنے والے اور تمتع کرنے والے نے حج کے دنوں تک یعنی حج سے پہلے عمرہ سے نفع حاصل کر لیا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسے دو نعمتوں سے ایک سفر میں نوازا ہے تو یہ رب تعالیٰ کی رحمت کا شکر ادا کرنے کے لئے بکری یا گائے یا اونٹ ذبح کرے، اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی " فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ " کا یہی مطلب ہے کہ جس نے حج کے دنوں سے پہلے عمرہ سے بھی نفع حاصل کر لیا خواہ قران کیا یا تمتع اسے جو ہدی میسر ہو وہ حرم شریف میں ذبح کرے۔

"فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ۭ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ "

جو شخص نہ پائے (ہدی) تو روزے ہیں تین دن حج کے دنوں میں اور سات ہیں جب فارغ ہو جاؤ تم یہ دس دن مکمل ہیں۔

یعنی قران اور تمتع کرنے والے پر بطور شکر ھدی کا جانور ذبح کرنا لازم ہے لیکن اگر اسے ھدی میسر نہ ہو کہ وہ جانور خریدنے کی طاقت نہیں رکھتا تو تین دن روزے رکھے یہ روزے نو ذی الحج تک مکمل کر لے اور سات روزے جب حج سے فارغ ہو جائے یعنی ایام تشریق کے بعد رکھے۔ اس طرح ھدی کے بدلے اس نے دس دن مکمل روزے

رکھنے ہیں۔ جب روزے ھدی کا بدل ہیں تو افضل یہ ہے کہ سات، آٹھ اور نو ذی الحج کو روزے رکھے۔ تاخیر اس لئے مستحب ہے کہ ہوسکتا ہے اسے ھدی مل جائے۔

مسئلہ: اگر تین روزے مکمل نہیں کرسکا تھا کہ ھدی کو پالیا تو ھدی کا ذبح کرنا لازم ہوگیا، کیونکہ اصل پر قادر ہو گیا۔ اصل پر جب قدرت ہو تو بدل پر عمل نہیں کرسکتا۔ اسی طرح تین روزے تو مکمل کرلئے تھے لیکن ابھی تک احرام نہیں کھولا تھا تو ھدی کو پالیا پھر بھی ھدی کا ذبح کرنا لازم ہے۔ اور اگر احرام کھول لیا یعنی سر منڈا لیا اس کے بعد ھدی پالے تو ہدی کا ذبح کرنا لازم نہیں، کیونکہ روزے سے مقصد حاصل ہوگیا، کیونکہ روزے ہدی کا بدل اس لئے رکھے گئے کہ یہ احرام کھول سکے۔ جب اس نے احرام کھول لیا تو مقصد حاصل ہوگیا، اب ہدی کو ذبح کرنا لازم نہ رہا۔

(روح المعانی)

مسئلہ: قران کرنے والا یا تمتع کرنے والا ہدی نہیں پاتا لیکن روزے بھی نہیں رکھتا یہاں تک کہ دس ذی الحج آ گیا، تو اس پر ہدی ذبح کرنا واجب ہوگیا۔ اگر ہدی کے ذبح کے بغیر احرام کھول لیا تو دو جانور ذبح کرنے لازم ہوگئے ایک ہدی جو قران یا تمتع کی وجہ سے اور دوسری ہدی بطور جنایۃ (سزاء) کہ اس نے بغیر ہدی کے ذبح کرنے کے احرام کیوں کھولا ہے۔

"وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ" ای فرغتم ونفرتم من اعماله.

اس مقام پر "رَجَعْتُمْ" کا معنی فارغ ہوجانا اور اعمال حج سے لوٹنا، ذکر رجوع کا ہے مراد سبب رجوع ہے۔

"او المعنی اذا رجعتم من منی" یا معنی یہ ہے کہ جب تم منی سے لوٹ کر آؤ تو سات روزے رکھ لو۔

(روح المعانی)

مسئلہ: یہ سات روزے ایام تشریق کے بعد مکہ میں رکھے یا گھر لوٹ کر رکھے جائز ہے۔

مسئلہ: پہلے تین روزے دیر سے رکھنا بہتر ہے جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے، لیکن قران کرنے والا یا تمتع کرنے والا سمجھتا ہے کہ ہدی کا پانا تو میرے لئے ممکن نہیں تو وہ عمرہ کے احرام کے بعد تین روزے رکھ لے اسی نیت سے کہ یہ روزے میں ہدی کا بدل رکھ رہا ہوں تو جائز ہے۔

"ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ"

یہ اس شخص کے لئے جو نہ ہو باشندہ حدود میقات کا۔

"ذٰلِکَ" کا اشارہ "تمتع" مصدر کی طرف ہے جو "فَمَنْ تَمَتَّعَ" سے سمجھ میں آرہا ہے۔

یعنی قران اور تمتع سے نفع صرف وہ لوگ حاصل کر سکتے ہیں جو میقاتوں کی حدود سے باہر ہوں، جو میقاتوں کے اندر اندر رہنے والے ہیں ان کو قران اور تمتع کی اجازت نہیں۔ کیونکہ وہ قریب رہنے کی وجہ سے جب چاہیں عمرہ کر سکتے ہیں، لیکن باہر سے آنے والوں کو بار بار آنا دشوار ہوتا ہے، لہٰذا ان کو موقع دیا جائے کہ وہ قران اور تمتع کر کے زیادہ ثواب حاصل کرلیں۔ حج کے دنوں تک جب چاہیں عمرہ کر کے نفع حاصل کرلیں۔

جب میقاتوں کی حدود کے اندر رہنے والوں پر قران اور تمتع نہیں تو یقیناً ان پر یہ ہدی بھی لازم نہیں جو قران اور تمتع کی وجہ سے لازم آتی ہے۔

تنبیہ: آیۂ کریمہ میں "حَاضِر" مسافر کی ضد کے طور پر استعمال ہے، غائب کی ضد کے طور پر استعمال نہیں ہوا۔ اور مسجد حرام سے مراد بھی صرف مسجد حرام یا حرم نہیں بلکہ میقاتوں تک تمام جگہ مراد ہے۔

مطلب واضح ہے کہ میقاتوں کی حدود کے اندر جو رہنے والے نہیں وہی قران اور تمتع سے نفع حاصل کر سکتے ہیں اور ان پر ہی ہدی بھی لازم ہے۔

"وَاتَّقُوا اللّٰهَ": اور ڈرو اللہ سے۔

اس مقام میں عموم پایا گیا ہے کہ "في كل ما يأمركم به وينهاكم عنه" اللہ تعالیٰ تمہیں جن چیزوں کا حکم دیتا ہے اور جن چیزوں سے روکتا ہے ان میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اس لئے حج اور عمرہ کی ابتداء سے تکمیل تک تمام احکام کو اللہ تعالیٰ کی رضاء کے مطابق ادا کیا جائے۔

"وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ": اور جان لو بیشک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔

یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کا ڈر نہیں رکھے گا، رب تعالیٰ کے احکام سے عدول کرے گا اور گناہوں میں مبتلاء ہوگا، وہ اللہ تعالیٰ کی گرفت میں ہوگا، اللہ تعالیٰ اسے سخت عذاب میں مبتلاء کرے گا۔ (از روح المعانی)

دم شکر اور دم جنایۃ میں فرق:

سب سے پہلے تو یہ سمجھا جائے کہ جنایۃ (احرام کے منافی کام کرنے) کی وجہ سے جو جانور ذبح کرنا لازم آتا ہے اسے ہدی کہا جاتا ہے، عذر کی وجہ سے سر منڈانے یا بال کٹانے کی وجہ سے اگر جانور ذبح کرے تو وہ بھی ہدی کے حکم میں ہے۔ اور حج یا عمرہ سے روکے جانے کی وجہ سے جو جانور ذبح کر کے احرام کی پابندیوں سے آزاد ہونا ہے وہ بھی ہدی ہے۔

اور قران اور تمتع کرنے پر بطور شکر جو جانور ذبح کرنا ہے وہ بھی ہدی ہے۔

ہدی کوئی بھی ہو وہ حرم میں ذبح کی جائے گی، بلکہ ہدی وہی ہے جو حرم میں ذبح ہو، اگر حرم میں نہ ذبح کی جائے تو اسے ہدی نہیں کہا جا سکتا۔

دم شکر یعنی قران اور تمتع کرنے پر بطور شکر جو ہدی کا جانور ذبح کرنا ہے جس طرح ضروری ہے کہ وہ حرم میں ذبح کیا جائے اسی طرح وہ جانور دس ذی الحج کو ذبح کیا جائے، دس ذی الحج سے پہلے ذبح نہ کیا جائے۔

اگرچہ اس مسئلہ میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے کہ دس ذی الحج کو ذبح کرنا واجب ہے یا فقط افضل ہے، تاہم احتیاط اسی میں ہے کہ واجب ہی سمجھا جائے۔

قران اور تمتع کی ہدی کا گوشت انسان خود بھی کھا سکتا ہے اور اغنیاء اور فقراء بھی کھا سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ دم شکر ہے۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث جو مناسک حج میں مسلم نے ذکر کی ہے، اس میں یہ بھی ہے۔

"إن النبی ﷺ اکل من لحم هديه وحسامن المرقة"

بیشک نبی کریم ﷺ نے اپنی ہدی کا گوشت کھایا اور اس کا شوربا پیا۔

باقی تمام وجوہ سے لازم آنے والی ہدی کو حرم میں ذبح کرنا تو ضروری ہے لیکن ان کا وقت مقرر نہیں، جس وقت بھی ذبح کر دیں جائز ہے۔

اوران ہدایا کا گوشت انسان خود بھی نہیں کھا سکتا اور نہ ہی غنی کھا سکتا ہے۔صرف فقراء کھا سکتے ہیں،خواہ وہ فقراء حرم کے ہوں یا حرم سے باہر کسی جگہ کے ہوں۔

وجہ فرق اصل میں یہ ہے کہ قران اور تمتع کی وجہ سے لازم آنے والی ہدی کا ذبح کرنا واجب ہے لیکن گوشت کا صدقہ کرنا مستحب ہے اور باقی ہر قسم کی ہدی کا ذبح کرنا بھی واجب ہے اور گوشت کا صدقہ کرنا بھی واجب ہے۔

قانون شرع یہ ہے کہ صدقات مستحبہ کو صدقہ کرنے والا اور غنی اور فقیر سب لوگ کھا سکتے ہیں،اور صدقات واجبہ کو صرف فقراء کھا سکتے ہیں،اغنیاء اور صدقہ کرنے والے نہیں کھا سکتے۔

ہدی اور قربانی میں فرق:

قربانی ہر صاحب نصاب پر لازم ہے جو دس، گیارہ اور بارہ ذی الحج کو ذبح کی جاتی ہے،اس کے لئے حرم کی کوئی قید نہیں اور نہ ہی حج یا عمرہ کے احرام سے اس کا تعلق ہے۔

ہدی کی جتنی صورتیں بیان کی ہیں وہ تمام ہی حرم میں ذبح ہو سکتی ہیں حرم سے باہر ان کا ذبح کرنا جائز نہیں اور سوائے قران اور تمتع کے وقتِ ذبح ان میں مقرر نہیں،اوران تمام کا تعلق حج اور عمرہ کے احرام سے ہے۔ہاں البتہ جانور وہی ہوں گے جو قربانی میں ہوتے ہیں۔یعنی بھیڑ، بکری، گائے، بھینس اور اونٹ کی ہی قربانی بھی ہو سکتی ہے اور ہدی بھی۔

اور جانوروں کی عمر اور ان میں کسی قسم کا عیب نہ پایا جانا ہدی اور قربانی کے لئے ایک ہی حکم ہے۔

دم جنایۃ اونٹ یا گائے ذبح کرنا ضروری:

دو جنایتیں وہ ہیں جن کی وجہ سے اکیلے ہی مکمل گائے یا اونٹ ذبح کرنا لازم ہوگا۔

﴿۱﴾ طواف زیارت حالت جنابت میں کر لے،یعنی غسل کرنا اس پر واجب تھا،غسل نہ کیا یونہی طواف زیارت کر لیا تو اونٹ یا گائے ذبح کرنا لازم ہے۔

﴿۲﴾ مقام عرفات میں ٹھہرنے کے بعد لیکن سر منڈانے اور طواف زیارت سے پہلے جماع کر لیا تو اونٹ یا گائے ذبح کرنا لازم ہے۔لیکن یہ بھی خیال رہے کہ اگر مقام عرفات میں ٹھہرنے سے پہلے حالت احرام میں جماع کر لیا تو حج باطل ہو گیا۔حاجیوں کے ساتھ چلتا پھرتا ہے ان کی طرح ہی مناسک حج کرتا ہے لیکن حج آئندہ قضاء کرے گا۔

وہ جنایات جہاں بکری کا ذبح کرنا کافی ہے:

یعنی جنایۃ کی وجہ سے جانور کا ذبح کرنا واجب ہو گیا،خواہ اونٹ ذبح کرے یا گائے یا بکری،لیکن بکری کا ذبح کرنا کافی ہے۔وہ مقامات مندرجہ ذیل ہیں۔

کامل عضو یا عضو کے اکثر حصہ پر خوشبو لگا دی تو دم لازم ہے۔سر پر مہندی لگا دی تو دم لازم ہے،لیکن یہ بھی خیال رہے کہ اگر سر پر مہندی موٹی تہہ والی لگا دی تو دو جانور ذبح کرنے پڑیں گے ایک خوشبو لگانے کی وجہ سے (جو مہندی سے حاصل ہو رہی ہے) اور دوسرا مہندی سے سر کو ڈھانپنے کی وجہ سے (سر پر وسمہ لگانے میں کوئی حرج نہیں) عضو کے کچھ حصہ پر خوشبو لگانے سے صدقہ لازم ہے۔سر یا داڑھی پر زیتوں کا تیل لگانے سے دم لازم ہے۔زخم وغیرہ پر دوا لگانے میں کوئی حرج نہیں۔اگر ایک دن مکمل سلے ہوئے کپڑے پہن لئے یا سر کو ڈھانپ لیا تو دم لازم ہے۔اگر دن کے کچھ حصہ میں یہ کام کیا تو صدقہ لازم ہے۔

جبہ کو کندھوں پر لٹکا دینے سے کوئی چیز لازم نہیں۔البتہ بازو بھی اس کی آستینوں میں ڈال لئے تو سلے ہوئے کپڑے کا حکم نافذ ہو گا۔سر اور داڑھی منڈانے سے دم لازم ہو گا خواہ چوتھے حصہ کو بھی منڈا دے تو پھر بھی دم لازم ہو گا۔

ہاں اگر چوتھے حصہ سے کم ہو تو صدقہ لازم ہے۔

اگر گردن کے مکمل بال منڈا دیئے تو دم لازم ہے کیونکہ گردن علیحدہ عضو ہے،(بال کٹانے یا منڈانے کا حکم جنایۃ میں ایک ہی ہے)۔

تنبیہ: اگر محرم کے حکم سے دوسرے محرم نے اس کا سر مونڈ دیا یا بال کاٹ دیئے تو بال کاٹنے والے یا مونڈنے والے پر صدقہ لازم ہے اور منڈوانے والے پر دم لازم ہے۔

ہاں ایک طریقہ یہ ہے کہ ایک شخص غیر محرم سے سر منڈوالے اور پھر وہ دوسرے محرم کا سر مونڈ دے، یہ صورت جائز ہے۔ اگر محرم نے دونوں ہاتھوں اور دونوں پاؤں کے ناخن کاٹ لئے تو ایک دم لازم ہے۔ اور اگر صرف ایک ہاتھ کے یا صرف ایک پاؤں کے ناخن کاٹ لئے پھر بھی ایک دم لازم ہے۔

اگر پانچ ناخنوں سے کم ناخن کاٹے یا پانچ کاٹے لیکن متفرق طور پر تو اس پر صدقہ لازم ہے۔

اگر کسی عذر کی وجہ سے مکمل عضو کو خوشبو لگالی یا سلے ہوئے کپڑے پہن لئے یا سر منڈالیا تو اس کو اختیار ہے، چاہے تو ایک بکری ذبح کرے، یا تین روزے رکھے، یا چھ مسکینوں کو تین صاع گندم دے دے، یعنی ہر مسکین کو نصف نصف صاع (دو دو کلو) گندم دے۔ اگر چھ مسکینوں کو طعام پکا کر کھلانا چاہے تو دو وقت صبح اور شام طعام کھلانا ہوگا۔

اگر حالت احرام میں شہوت سے بوسہ لیا یا شہوت سے زوجہ کو ہاتھ لگایا تو دم لازم آئے گا۔

اور اگر حلق کے (سر منڈانے کے) بعد اور طواف زیارت سے پہلے جماع کر لیا تو دم لازم آئے گا۔

اگر طواف قدوم بغیر وضو کے کر لیا تو صدقہ لازم ہوگا اور اگر طواف زیارت بے وضو کر لیا تو دم لازم آئے گا۔

اگر طواف وداع بے وضو کیا تو صدقہ لازم ہے اور اگر جنابت کی حالت میں کیا تو دم لازم ہے۔

طواف وداع ایام تشریق میں کرنے سے بھی دم لازم ہوگا۔ اور طواف زیارت بے وضو کرنے سے بھی دم لازم ہوگا۔

اگر صفا و مروہ کے درمیان سعی نہ کر سکا تو پھر بھی دم لازم ہوگا۔ مقام عرفات سے امام سے پہلے لوٹ آیا تو دم لازم ہوگا۔

اگر مزدلفہ میں نہ رک سکا تو دم لازم ہوگا۔

جس شخص نے کنکریاں نہ ماریں اس پر بھی دم لازم ہے۔ تین دن ہی کنکریاں نہ مار سکا تو پھر بھی ایک ہی دم

لازم ہے۔ایک دن کنکریاں نہ مار سکا تو پھر بھی ایک دم لازم ہے۔

اگر تین جمرات میں سے ایک جمرہ کو کنکریاں نہ مار سکا تو اس پر صدقہ لازم ہے۔

اگر سات کنکریاں مکمل نہ کر سکا ایک یا دو یا تین کنکریاں کم مارے تو ہر کنکری کے بدلے صدقہ لازم ہوگا۔

جس آدمی نے سر منڈانے میں تاخیر کر دی یہاں تک کہ ایام نحر (دس، گیارہ، بارہ ذی الحج) کے بعد سر منڈایا تو اس پر دم لازم ہے اور اگر ایام نحر میں سر منڈایا لیکن حرم سے باہر جا کر سر منڈایا تو پھر بھی دم لازم ہے۔

جس شخص نے عمرہ کیا اور حرم سے باہر جا کر سر منڈایا تو اس پر بھی دم لازم ہے۔تاہم عمرہ کے احرام سے نکلنے کے لئے وقت مقرر نہیں۔سعی کرنے کے بعد بال کٹوالے یا منڈالے۔خواہ دیر سے عمل کرے۔البتہ احرام کی پابندیوں سے آزاد بال کٹانے سے ہی ہوگا۔

تنبیہ: جن مقاموں پر ذکر کیا گیا ہے کہ دم لازم ہے اس سے مراد کم از کم بکری ذبح کرنا ہے۔اور جن مقاموں پر صدقہ کرنے کا ذکر ہے اس سے مراد نصف صاع (دو کلو) گندم فقیر کو دینا ہے۔ (مسائل حج و عمرہ ماخوذ از ہدایہ و شامی)

غیر کی طرف سے حج کرنا:

اس کی دو قسمیں ہیں۔

پہلی قسم یہ ہے کہ خود حج کر کے ثواب کسی دوسرے کو پہنچائے۔

"والاصل فی هذاالباب ان الانسان له ان يجعل ثواب عمله لغيره صلوة اوصوما او صدقة اوغيرهاعنداهل السنة والجماعة" (هداية)

اہل سنت و جماعت کے نزدیک یہ جائز ہے کہ وہ اپنی عبادات کا ثواب دوسرے کو پہنچائے خواہ نماز ہو، روزہ ہو، یا صدقہ وغیرہ ہو، تمام کا ثواب پہنچانا جائز ہے۔معتزلہ (دین سے پھر جانے والا گروہ) کے نزدیک جائز نہیں۔

"ان النبی ﷺ ضحی بکبشین املحین احدهماعن نفسه والآخرعن امته"

نبی کریم ﷺ نے دو دنبے سفید سیاہی مائل قربانی فرمائے ایک اپنی طرف سے اور دوسرا اپنی امت کی طرف سے۔

یعنی آپ نے اپنی قربانی کا ثواب اپنی امت کو پہنچایا۔

ابن ابی شیبہ کی حدیث میں صریح الفاظ یہ موجود ہیں۔

" اللهم عن محمدوامته فمن شهدلک بالتوحيدو شهدلی بالبلاغ"

اے اللہ محمد کی طرف سے قبول فرما، اور امت محمد (امتِ دعوت) میں سے جنہوں نے تیری وحدانیت کی شہادت اور میرے حق میں یہ شہادت دی کہ میں نے تیرا حکم پہنچادیا ہے ان لوگوں کے لئے قبول فرما۔

" روى الدارقطنى ان رجلاسأله ﷺ فقال لى ابوان ابرهماحال حياتهمافكيف لى ببرهمابعدموتهمافقال له ﷺ ان من البربعدالموت ان تصلى لهمامع صلوتک و تصوم لهمامع صيامک"

ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کیا یارسول اللہ میرے ماں باپ ہیں جن کی حیات میں تو میں ان کی اطاعت کر رہا ہوں، ان کی خدمت گزاری اور ان سے اچھا سلوک رکھنے میں مشغول رہتا ہوں۔

ان کی وفات کے بعد میں ان سے کس طرح حسن سلوک رکھوں گا، تو آپ نے فرمایا بیشک ان کی موت کے بعد ان سے صلہ رحمی یہ ہے کہ تم اپنی نمازوں کے ساتھ ان کے لئے بھی نماز پڑھنا اور اپنے روزوں کے ساتھ ان کے لئے بھی روزے رکھنا۔ یعنی ان کو اپنی عبادات نافلہ کا ثواب پہنچانا۔

(دارقطنی)

"وروى ايضاعن على رضى اللهعنه انه قال من مرّعلى المقابروقرأقل هو الله احد احدى عشرة مرة وهب اجرهاللاموات اعطى من الاجربعددالاموات"

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جو شخص قبرستان سے گزرے اور گیارہ مرتبہ قل ھواللہ احد سورة

پڑھ کر ثواب فوت شدہ لوگوں کو پہنچائے تو اس شخص کو (قبرستان میں) فوت شدہ لوگوں کی تعداد کے مطابق اجر دیا جائے گا۔ (دار قطنی)

"عن انس انه سأله ﷺ فقال یارسول اللہ انا نتصدق عن موتانا و نحج عنهم و ندعو هم فهل یصل ذلک الیهم قال نعم انه لیصل الیهم و انهم لیفرحون به کمایفرح احدکم بالطبق اذا اهدی الیه" (رواه ابو حفص الکبیر العکبری)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ سے انہوں نے سوال کیا۔ یارسول اللہ کیا ہم اپنے فوت ہونے والے حضرات کے لئے صدقہ کریں اور ان کے لئے حج کریں اور ان کے لئے دعاء کریں کیا یہ ان تک پہنچیں گے، فرمایا ہاں بیشک انہیں پہنچیں گے اور بیشک انہیں اس سے اسی طرح خوشی حاصل ہوتی ہے جیسے تم میں سے کسی ایک کو بطور ہدیہ (کھانے کا) طشت دیا جائے تو وہ خوش ہوتا ہے۔

" وعنه ﷺ اقرؤا علی موتاکم یٰس" (رواه ابو داؤد)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے فوت شدہ لوگوں کے لئے یٰس پڑھو۔

رب تعالیٰ نے والدین کے لئے دعاء کرنے کا حکم ان الفاظ مبارکہ سے دیا۔

" وقل رب ارحمهما کماربیانی صغیرا"

اور کہو اے میرے رب ان دونوں پر رحم فرما جیسے انہوں نے بچپن میں میری پرورش کی۔

اور رب تعالیٰ نے فرشتوں کی مومنوں کے حق میں دعاء کا ذکر فرمایا۔

" والملائکة یسبحون بحمد ربهم ویستغفرون لمن فی الارض"

اور فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیحات بیان کرتے ہیں اور زمین والوں (مومنین) کے لئے مغفرت طلب کرتے ہیں۔

اور ارشاد فرمایا۔

" الذین یحملون العرش ومن حوله یسبحون بحمد ربهم ویؤمنون به ویستغفرون للذین امنوا "
حاملین عرش اوراس کے اردگرد والے فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیحات بیان کرتے ہیں
اوراس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان والوں کے لئے مغفرت طلب کرتے ہیں۔ (از فتح القدیر)

نتیجہ: ان آیات واحادیث سے پتہ چلا کہ عبادات کے ذریعے فوت شدہ حضرات کوثواب پہنچتا ہے اورثواب پہنچانے والے کوبھی ان تمام کی تعداد کے مطابق ثواب حاصل ہوتا ہے، لہٰذا حج کا ثواب بھی دوسرے شخص کو پہنچایا جا سکتا ہے۔ ایصال ثواب کی تفصیل نجوم الفرقان سورہ بقرہ کی ابتداء میں پہلے پارہ میں دیکھئے۔

دوسری صورت کسی اور کی طرف سے حج کرنے کی یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کوخرچ دے کہ تو میری طرف سے حج کرآ۔اس کی پھر دوقسمیں ہیں۔نفلی حج کا بدل۔اورفرض حج کا بدل۔

نفلی حج کا بدل:

" اعلم ان الحج النفل فلایشترط فیه العجز لانه لم یجب علیه"
نفلی حج کا بدل بنانے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ جوشخص حج کرارہا ہے وہ خود عاجز ہو یعنی بوڑھا اور بیمار ہو کہ خود حج نہ کرسکے تو کسی اور سے کرائے۔
اس لئے کہ نفلی حج کرنے یا نہ کرنے میں جب اس کو اختیار ہے تو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کے لئے "فله الاستنابة صحیحا" اس کے لئے جائز ہے کہ وہ صحیح وتندرست ہونے کی حالت میں اپنے بدلے کسی اورکوحج کرا کے ثواب حاصل کرلے۔

فرض حج کا بدل:

اگرکوئی شخص مالدار ہے کہ اس کے پاس اتنا مال ہے کہ وہ حج کرسکتا ہے لیکن بڑھاپے اورمرض کی وجہ سے وہ حج کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو کسی دوسرے کوحج کا خرچ دے کرحج کرالے۔ (از فتح القدیر)

عبادت کا بدل بنانے کا قانون شرعی:

عبادات کی تین قسمیں ہیں۔

عبادات مالیہ، جیسے زکوٰۃ۔ عبادات بدنیہ، جیسے نماز اور روزہ۔ اور مالی اور بدنی سے مرکب عبادات جیسے حج۔

عبادات مالیہ میں کسی کو نائب بنانا ہر حال میں جائز ہے خواہ اختیاری حالت ہو یا کوئی عذر اور مجبوری درپیش آئے، زکوٰۃ اور صدقات مالیہ کے ادا کرنے میں نائب بنانا ہر حال میں جائز ہے۔

عبادات بدنیہ میں کسی حالت میں بھی نائب بنانا جائز نہیں، مجبوری درپیش ہو یا نہ ہو، یعنی کوئی دوسرا شخص کسی کی طرف سے نماز اور روزہ ادا نہیں کرسکتا۔

مالی اور بدنی سے مرکب عبادت، جیسے حج ہے۔ جب حج فرض ہو اور انسان خود حج کرسکتا ہو کوئی ضعف اور عجز عارض نہیں تو وہ اپنا نائب نہیں بنا سکتا، ہاں اگر کوئی عذر ہو تو نائب بنا سکتا ہے۔ (ھدایہ)

حج بدل کا ثبوت حدیث پاک سے:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے پاس خثعم قبیلہ کی ایک عورت آئی۔

"فقالت یارسول اللّٰہ ان فریضۃ اللّٰہ فی الحج علی عبادہ ادرکت ابی شیخا کبیرا لایستوی علی الراحلۃ فھل یقضی عنہ ان احج عنہ فقال لھا رسول اللّٰہ ﷺ نعم"

(نسائی، ج ۲، ص ۳)

اس نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ)! اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر حج فرض کیا ہے، لیکن میرے باپ بوڑھے ہیں جو سواری پر بیٹھنے کی طاقت نہیں رکھتے کیا میں ان کی طرف سے حج ادا کروں تو ان کا حج ادا ہو جائے گا، حضور ﷺ نے فرمایا ہاں (تمہارے باپ کا حج ادا ہو جائے گا)

" عن الفضل بن عباس انہ کان ردیف رسول اللّٰہ ﷺ فجاءہ رجل فقال یارسول اللّٰہ ان

امی عجوز کبیرة وان حملتھالم تستمسک وان ربطتھاخشیت ان اقتلھافقال رسول اللہ ﷺ ارأیت لو کان علی امک دین اکنت قاضیہ قال نعم قال فحج عن امک"

(نسائی ج۲،ص۳)

حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سواری پر سوار تھا کہ ایک شخص آپ کے پاس حاضر ہوئے ،عرض کیا یارسول اللہ بیشک میری ماں بہت زیادہ بوڑھی ہے، اگر میں ان کو سواری پر بٹھادوں تو وہ بیٹھنے کی طاقت نہیں رکھیں گی۔اور اگر سواری پر سوار کر کے (گرنے کے خوف سے سواری پر) ان کو باندھ دوں تو خطرہ ہے کہ ان پر موت واقع ہوجائے۔تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر تمہاری ماں پر قرض ہوتا تو کیا تم ادا کرتے؟ وہ شخص کہنے لگے ہاں یارسول اللہ ادا کرتا۔تو آپ نے فرمایا کہ تم اپنی ماں کی طرف سے حج ادا کرو۔

حج بدل کی شرائط:

فرض حج کی ادائیگی کے لئے نائب بنانے کے لئے مندرجہ ذیل شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔

﴿۱﴾ جو شخ نائب بنارہا ہے وہ عاجز ہو خود ادا نہ کرسکے اور اس کے پاس مال ہے تو وہ دوسرے کو مال دے کر نائب بنالے جو اس کی طرف سے حج کرے۔

اگر مالدار شخص خود حج کرسکتا ہو عاجز نہ ہو تو وہ نائب نہیں بنا سکتا۔اگر ایک شخص فقیر ہے مالدار نہیں، بدن اس کا صحیح ہے وہ خود حج کرنے کی جسمانی طور پر طاقت رکھتا ہے تو وہ بھی نائب نہیں بنا سکتا، کیونکہ اس پر حج فرض ہی نہیں۔

﴿۲﴾ نائب بنانے کے لئے اور شرط یہ ہے کہ موت کے وقت تک عاجز رہے،اگر ایک شخص نے مرض کی حالت میں اپنے حج کا نائب بنایا جبکہ وہ خود حج کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔"فان مات اجزأة وان تعافی بطل" اگر اسی حالت میں اس پر موت واقع ہوگئی تو اس کا حج ادا ہوگیا،اور اگر صحیح ہوگیا تو اسے حج پھر ادا کرنا پڑے گا،وہ حج تو اس کی طرف سے ادا نہیں ہوا،البتہ اسے حج کے لئے خرچ ادا کرنے کا ثواب حاصل ہوگا۔

اگر کوئی شخص قید ہو تو وہ نائب کے ذریعے حج کرائے تو اس کا بھی یہی حکم ہے اگر اس قید کی حالت میں فوت ہو گیا تو حج اس کا ادا ہو گا، اگر قید سے آزاد ہو گیا تو اسے خود پھر حج کرنا پڑے گا۔

﴿۳﴾ اور شرط یہ ہے کہ جس شخص کی طرف سے حج ادا کیا جائے وہ حج کرنے کے متعلق اسے کہے۔ اگر اس کی اجازت کے بغیر کوئی دوسرا شخص اس کی طرف سے حج کرے تو اس کا حج ادا نہیں ہو گا۔ اسی طرح وارث خود ہی اپنے مورث لہ (جس کا یہ وارث ہے) کی طرف سے حج کرے تو اس کی طرف سے حج نہیں ہو گا۔ بلکہ اس کا حکم دینا ضروری ہے۔

﴿۴﴾ نائب کے لئے ضروری ہے کہ جس کی طرف سے حج کر رہا ہے اسی کے حج کی نیت کرے اور اسی کی جانب سے احرام باندھے بلکہ زیادہ بہتر یہ ہے "یقول بلسانه لبیک عن فلان" کہ زبان سے یہ کہے کہ اللہ میں تیرے دربار میں فلاں کی جانب سے حج کے لئے حاضر ہوں۔

﴿۵﴾ جس شخص کو حج کرنے کے لئے نائب بنایا گیا ہے وہ اسی کے مال سے حج کرے۔ اگر اپنے مال سے حج کرے گا تو اس کا حج نہیں ہو گا۔ ہاں البتہ اس نے حکم دیا کہ تم میری طرف سے حج کرو، اس نے پہلے اپنا مال خرچ کر لیا پھر اس نے مال اسے دے دیا تو یہ حج اس کی طرف سے ادا ہو جائے گا۔

اسی طرح اگر ایک شخص نے وصیت کی تھی کہ میرے مال سے میری طرف سے میرا فرض حج ادا کرا دینا، اگر اس کے مال سے حج کرا دیا گیا تو یہ حج بدل ہو گیا۔ اگر اس کا مال ورثاء نے تقسیم کر لیا، کسی ایک وارث نے خوشی سے اپنے مال سے حج کرا دیا تو یہ حج بدل نہیں ہو گا۔ البتہ حج کا ثواب اسے پہنچایا جا سکے گا۔

﴿۶﴾ نائب کے لئے اور شرط یہ ہے کہ جس نے حج کے لئے نائب بنایا ہے وہ سواری کا کرایہ اور باقی خرچ دے، پیدل حج بدل کرنے کی اس شخص پر کوئی ذمہ داری نہیں۔

فائدہ: "ثم الصحیح من المذهب فیمن حج عن غیره ان اصل الحج یقع عن المحجوج عنه ولهذا لایسقط به الفرض عن المامور وهو الحاج کذافی التبیین"

پھر صحیح مذہب یہ ہے کہ حج اس شخص کا ہو گا جس نے خرچ دیا ہے، اور اپنا نائب بنایا ہے۔ حج کرنے

اگر کوئی شخص قید ہو تو وہ نائب کے ذریعے حج کرائے تو اس کا بھی یہی حکم ہے اگر اس قید کی حالت میں فوت ہو گیا تو حج اس کا ادا ہو گا، اگر قید سے آزاد ہو گیا تو اسے خود پھر حج کرنا پڑے گا۔

﴿۳﴾ اور شرط یہ ہے کہ جس شخص کی طرف سے حج ادا کیا جائے وہ حج کرنے کے متعلق اسے کہے۔ اگر اس کی اجازت کے بغیر کوئی دوسرا شخص اس کی طرف سے حج کرے تو اس کا حج ادا نہیں ہو گا۔ اسی طرح وارث خود ہی اپنے مورث لہ (جس کا یہ وارث ہے) کی طرف سے حج کرے تو اس کی طرف سے حج نہیں ہو گا۔ بلکہ اس کا حکم دینا ضروری ہے۔

﴿۴﴾ نائب کے لئے ضروری ہے کہ جس کی طرف سے حج کر رہا ہے اسی کے حج کی نیت کرے اور اسی کی جانب سے احرام باندھے بلکہ زیادہ بہتر یہ ہے "**یقول بلسانه لبیک عن فلان**" کہ زبان سے یہ کہے کہ اللہ میں تیرے دربار میں فلاں کی جانب سے حج کے لئے حاضر ہوں۔

﴿۵﴾ جس شخص کو حج کرنے کے لئے نائب بنایا گیا ہے وہ اسی کے مال سے حج کرے۔ اگر اپنے مال سے حج کرے گا تو اس کا حج نہیں ہو گا۔ ہاں البتہ اس نے حکم دیا کہ تم میری طرف سے حج کرو، اس نے پہلے اپنا مال خرچ کر لیا پھر اس نے مال اسے دے دیا تو یہ حج اس کی طرف سے ادا ہو جائے گا۔

اسی طرح اگر ایک شخص نے وصیت کی تھی کہ میرے مال سے میری طرف سے میرا فرض حج ادا کرا دینا، اگر اس کے مال سے حج کرا دیا گیا تو یہ حج بدل ہو گیا۔ اگر اس کا مال ورثاء نے تقسیم کر لیا، کسی ایک وارث نے خوشی سے اپنے مال سے حج کرا دیا تو یہ حج بدل نہیں ہو گا۔ البتہ حج کا ثواب اسے پہنچایا جا سکے گا۔

﴿۶﴾ نائب کے لئے اور شرط یہ ہے کہ جس نے حج کے لئے نائب بنایا ہے وہ سواری کا کرایہ اور باقی خرچ دے، پیدل حج بدل کرنے کی اس شخص پر کوئی ذمہ داری نہیں۔

فائدہ: "**ثم الصحیح من المذهب فیمن حج عن غیره ان اصل الحج یقع عن المحجوج عنه ولهذالایسقط به الفرض عن المامور وهو الحاج کذافی التبیین**"

پھر صحیح مذہب یہ ہے کہ حج اس شخص کا ہو گا جس نے خرچ دیا ہے، اور اپنا نائب بنایا ہے۔ حج کرنے

والے کا اپنا حج اس خرچ سے ادا نہیں ہوگا۔

" والافضل عن للانسان اذاارادان یحج رجلاعن نفسه ان یحج رجلاقدحج عن نفسه ومع هذالواحج رجلالم یحج عن نفسه حجةالاسلام یجوز عندناو سقط الحج عن الآمر کذافی المحیط"

افضل یہ ہے کہ جس شخص کو حج بدل کا نائب بنایا جائے اس نے اپنا فرض حج ادا کیا ہو، ہاں اگر ایسے شخص کو نائب بنایا جائے جس نے اپنا فرض حج ادا نہیں کیا ہوا تو پھر بھی حج پر بھیجنے والے کی طرف سے حج ادا ہو جائے گا۔ حج کرنے والے شخص کو اپنا حج پھر ادا کرنے پڑے گا۔

﴿۷﴾ حج بدل ادا کرنے والے کا عاقل اور بالغ ہونا ضروری ہے، بچے کو نائب بنانے سے اس کا حج ادا نہیں ہوگا۔

خیال رہے کہ نابالغ ہونے کی حالت میں جو حج ادا کیا جائے اس سے فرض ادا نہیں ہوتا۔

تنبیہ: حج بدل میں نائب بننے والے کے لئے بلکہ ہر شخص جو حج کرنے والا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ حج کرنے کا طریقہ جانتا ہو، خصوصاً حج کے فرائض اور واجبات ہر شخص کو جاننے ضروری ہیں۔

﴿۸﴾ ایک شخص ایک وقت میں ایک شخص کا نائب بن کر ہی حج کر سکتا ہے۔ اگر دو آدمیوں نے ایک شخص کو اپنا نائب بنایا اس نے ایک سال ہی دونوں کا احرام ایک ساتھ باندھ لیا تو یہ حج اسی شخص کا ہوگا جو حج کر رہا ہے، جنہوں نے اسے خرچ دے کر اپنا نائب بنایا تھا ان میں سے کسی ایک کا بھی حج ادا نہیں ہوا۔ حج کرنے والے پر لازم ہوگا کہ ان کا خرچ انہیں واپس کر دے۔

پہلے دونوں کا احرام باندھ لیا تھا حج کرنے کے بعد کسی ایک کے لئے حج معین کر دے تو پھر بھی اس کی طرف سے ادا نہیں ہوگا۔ ہاں اگر ماں باپ کی طرف سے حج کیا لیکن بعد میں دونوں میں سے ایک کے لئے خاص کر دے تو یہ جس کی طرف سے خاص کیا اس کی طرف سے ادا ہو جائے گا۔

﴿۹﴾ ایک شخص کے لئے احرام معین کرنا ضروری ہے۔ اگر دو شخصوں نے ایک ہی آدمی کو حج کرنے کے لئے اپنا نائب بنا دیا اس نے ایک سال میں ایک کا ہی احرام باندھا ہے لیکن معین نہیں کیا بلکہ احرام باندھتے وقت یہ

کہا کہ یہ احرام دونوں میں سے ایک کا ہے اور اسی پر حج کرلیا تو حج اس کا اپنا ہوگا اور ان دونوں کو خرچ واپس کرنا ضروری ہوگا، ہاں اگر چہ احرام باندھتے وقت تو کسی ایک کو معین نہیں کیا تھا لیکن طواف قدوم سے پہلے پہلے دونوں میں سے ایک کو خاص کرلیا کہ اس مرتبہ یہ حج فلاں شخص کی طرف سے ہے تو جس کو معین کیا اس کی طرف سے ادا ہوجائے گا۔

﴿۱۰﴾ نائب کے لئے ضروری ہے کہ خرچ دینے والے کے حکم کے مطابق عمل کرے۔ اگر ایک شخص نے دوسرے کو حج مفرد کرنے یا عمرہ کرنے کا حکم دیا اس نے قران کرلیا (حج اور عمرہ کو ایک احرام میں جمع کرلیا) تو اس نے حج کرانے والے کے حکم کے مخالف کام کیا اس کی طرف سے حج یا عمرہ ادا نہیں ہوگا اس پر لازم رہے گا کہ خرچ واپس لوٹائے۔

ہاں اس کی طرف سے صرف حج کیا یا عمرہ کیا لیکن احرام ایک ساتھ باندھ کر دوسرے کام کی نیت اپنے لئے کرلی یا کسی اور کے لئے کرلی تو اب بھی نائب بنانے والے کے حکم کی مخالفت ہے البتہ خرچ لوٹانے کا ضامن نہیں۔

تنبیہ: حج یا عمرہ جس کے لئے کسی کو نائب بنایا جائے اسے چاہئے کہ حج، عمرہ سے فارغ ہونے کے بعد جلدی واپس لوٹ آئے، اگر واپس لوٹ سکتا تھا جان بوجھ کر دیر کرتا رہا تو جتنے دن زائد رہے گا اتنے دنوں کا خرچ اس کا اپنا ہوگا، نائب بنانے والے پر لازم نہیں کہ وہ زائد دنوں کا خرچ دے۔ (ماخوذ از عالمگیری)

آجکل حکومت حج کے لئے زیادہ پیسے جمع کرتی ہے، مناسب مقدار میں خرچ کیا جائے، عیاشی نہ کی جائے تو کچھ رقم بچ جاتی ہے، اس لئے حج بدل کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ بچی ہوئی رقم واپس لوٹادے، ہاں البتہ وہ شخص کہے کہ جتنے پیسے حکومت نے جمع کرلئے ہیں وہ سب تمہارے ہی ہیں تو بچا کر رقم اپنے پاس رکھ لے تو جائز ہے۔

روح حج زیارۃ النبی ﷺ:

عشق ومحبت والوں کے لئے اس بحث کو ذکر کیا جارہا ہے، کیونکہ اس وقت ان کا حج نامکمل ہی رہتا ہے، البتہ

ضعیف ایمان والے ان احادیث کو ضعیف کہتے رہیں گے جن میں رسول اللہ ﷺ کے روضہ مطہرہ کی زیارت کا ذکر ہے۔

" قال مشائخنا رحمهم الله من افضل المندوبات وفی مناسک الفارسی وشرح المختار انها قريبة من الوجوب لمن له سعة"

ہمارے مشائخ رحمہم اللہ نے ذکر فرمایا ہے کہ تمام مستحبات میں سے افضل یہ ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی قبر شریف کی زیارت کرے، بلکہ مناسک فارسی اور شرح مختار میں ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے روضہ مطہرہ کی زیارت کرنے کی طاقت رکھتا ہو اس پر حاضر ہونا واجب کے قریب ہے۔

" قال رسول الله ﷺ من زار قبری وجبت له شفاعتی"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لئے میری شفاعت واجب ہوگئی۔ (دارقطنی ومسند بزار)

" قال رسول الله ﷺ من جاء نی زائرا لا تعمله حاجة الا زيارتی كان حقا علی ان اكون له شفيعا يوم القيامة"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو میری زیارت کے لئے آئے، اس کے آنے کی اور کوئی وجہ نہیں سوائے میری زیارت کے تو مجھ پر یہ حق لازم ہو جاتا ہے کہ میں قیامت کے دن اس کی شفاعت کروں۔

(دارقطنی)

" قال رسول الله ﷺ من حج وزار قبری بعد موتی كان كمن زارنی فی حیاتی"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے حج کیا اور میری موت کے بعد میری قبر کی زیارت کی تو وہ شخص ایسا ہی ہے جیسا کہ اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔ (فتح القدیر)

سوال: نبی کریم ﷺ کی ظاہری زندگی میں آپ کی حالت ایمان زیارت کرنے والا اور تا موت ایمان پر قائم رہنے والا تو صحابی بن جاتا تھا لیکن آپ کی قبر کی زیارت کرنے والا تو صحابی نہیں بنتا تو وجہ تشبیہ کیا ہے؟

جواب: تشبیہ میں مکمل طور پر ایک چیز کا دوسری چیز جیسا بننا لازم نہیں ہوتا۔ بعض وجوہ سے مشابہت کافی ہے۔

مطلب یہ کہ جس شخص نے رسول اللہ ﷺ کی قبر کی زیارت کی اس نے اگرچہ آپ کے ظاہری جلوے نہیں دیکھے اس لئے وہ تو صحابی نہیں بن سکتا لیکن نبی کریم ﷺ کی طرف سے اس پر بھی ایسے ہی رحمت ہے جیسے آپ کی رحمت آپ کے صحابہ کرام پر تھی۔ (راقم)

تنبیہ: جب فرض حج ادا کرے تو بہتر یہ ہے کہ پہلے حج کرے پھر نبی کریم ﷺ کے روضہ مطہرہ کی زیارت کرے اور اگر نفلی حج ہو تو اسے اختیار ہے چاہے تو پہلے حج کرے اور چاہے تو پہلے رسول اللہ ﷺ کے مزار پرانوار کی زیارت کرے۔

" فاذا نوی زیارۃ القبر فلینو معه زیارۃ المسجدای مسجدرسول اللہ ﷺ فانه احد المساجدالثلاثة التی تشدالیھاالرحال"

جب رسول اللہ ﷺ کی قبر شریف کی زیارت کی نیت کرے تو ساتھ ہی مسجد نبوی کی زیارت کی بھی نیت کرلے، کیونکہ یہ تین مساجد میں سے ہے جن کی طرف سفر کرنے کی اجازت ہے۔

علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ کا مختار:

" والاولی فیمایقع عندالعبدالضعیف تجریدالنیة لزیارۃقبرالنبی ﷺ ثم اذاحصل له اذا قدم زیارۃالمسجد"

عبد ضعیف (ابن ہمام) کے نزدیک زیادہ بہتر یہ ہے صرف نبی کریم ﷺ کے مزار پرانوار کی زیارت کی نیت کرے پھر جب وہاں پہنچے گا تو مسجد کی زیارت بھی حاصل ہو جائے گی۔ (فتح القدیر)

اعتراض: حدیث ابی ہریرہ سے تو منع نظر آتا ہے کہ قبروں کی زیارت کے لئے سفر منع ہے، کس طرح نبی کریم ﷺ کے مزار پرانوار کی زیارت سے مدینہ طیبہ میں جانا جائز ہے؟

" عن ابی ھریرۃ عن رسول اللہ ﷺ قال لاتشدالرحال الاالی ثلاثة مساجد مسجد الحرام ومسجدی ھذاومسجدالاقصی"

(نسائی جلداول، ص ۸۱باب ماتشدالرحال الیه من المساجد)

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سامان رخت نہ باندھا جائے (سفر نہ کیا جائے) سوائے تین مساجد کے، (وہ مساجد یہ ہیں) مسجد حرام، اور میری یہ مسجد (مسجد نبوی) اور مسجد اقصیٰ۔

اس حدیث سے تو پتہ چلا کہ سوائے تین مساجد کے کہیں اور مزارات وغیرہ کی زیارت کی نیت سے جانا منع ہے۔

جواب: حدیث کا مطلب یہ نہیں جو معترضین نے سمجھا۔

" والمعنی لاینبغی شدالرحال والسفرمن بین المساجدالاالی ثلاثۃ مساجد"

بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ سوائے تین مساجد کے اور کسی مسجد میں زیادہ ثواب حاصل کرنے کی غرض سے سفر نہ کرے کیونکہ زیادہ ثواب صرف ان تین مساجد میں ہے۔

" واماالسفرللتعلم وزیارۃ العلماء والصلحاء وللتجارۃ ونحوذلک فغیرداخل فی حین المنع"

علم حاصل کرنے کے لئے سفر کرنا، علماء اور صلحاء کی زیارت کے لئے سفر کرنا، تجارت کے لئے سفر کرنا اور ضروری کاموں کے لئے سفر کرنا اس ممانعت میں داخل نہیں، بلکہ یہ تمام سفر مستحب ہیں۔

" قال الحافظ ابن حجرفی فتح الباری ذهب البعض الی حرمۃ الشدالی غیر المساجدالثلاثۃ عملابظاهرالحدیث والصحیح عندامام الحرمین وغیرہ من الشافعیۃ لایحرم"

فتح الباری شرح بخاری میں علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ جن لوگوں نے حدیث پاک کے ظاہر الفاظ سے یہ سمجھا ہے کہ تین مساجد کے بغیر کہیں سفر کر کے جانا جائز نہیں یہ غلط ہے۔ صحیح مطلب وہ ہے جو امام الحرمین اور دوسرے اہل علم شوافع وغیرہ نے بیان فرمایا ہے کہ حدیث پاک سے کوئی حرمت ثابت نہیں۔

" ان المرادان الفضیلۃ الثابتۃ فی شدالرحال الی هذه المساجدبخلاف غیرهافانه جائز"

حدیث کا مطلب واضح ہے کہ تین مساجد کی طرف سفر کرنا تو باعث فضیلت، ان کے بغیر کہیں اور جانا جائز ہے۔

" او المراد انه لاتشدالرحال الی مسجدمن المساجدللصلوة فیه غیرهذا"

یا یہ مقصد ہے کہ تم سوائے تین مساجد کے کسی اور مسجد کی طرف اس غرض سے سفر نہ کرو کہ وہاں نماز ادا کرنے سے جو ثواب حاصل ہوتا ہے وہ کسی اور مسجد میں نہیں حاصل ہوتا۔ یہ نظریہ صرف مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصٰی کے متعلق ہی قائم کیا جا سکتا ہے۔

" واماقصدزیارة صالح ونحوهافلایدخل تحت النهی"

نیک آدمیوں کی زیارت کے لئے یا اور اس طرح نیکی وغیرہ کے کاموں کی طرف سفر کرنا جائز ہے اس میں کوئی ممانعت ثابت نہیں۔

مسند احمد میں حدیث ہی اس طرح واضح ہے کہ خود ہی مسئلہ حل ہو جاتا ہے کوئی اشتباہ باقی نہیں رہتا۔

" قال رسول اللهﷺ لاینبغی للمصلی ان یشدرحاله الی مسجدیبتغی فیه الصلوة غیر المسجدالحرام والمسجدالاقصی ومسجدی هذا"

رسول اللہﷺ نے فرمایا کسی نمازی کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ سوائے مسجد حرام اور مسجد اقصٰی اور اس میری مسجد کے کسی اور مسجد کی طرف اس لئے سفر کرے کہ وہاں نماز ادا کرنا زیادہ ثواب ہے۔

فتح الباری کی طرح ہی عمدۃ القاری میں بھی یہی ثابت کیا گیا ہے۔ کہ نیک آدمیوں کی زیارت کے لئے سفر کرنا جائز ہے۔

" قال النووی قال ابومحمدالجوینی یحرم شدالرحال الی غیرثلاثة وهوغلط"

علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابو محمد جوینی کا یہ کہنا غلط ہے کہ سوائے تین مساجد کہیں اور سفر کرنا جائز نہیں۔

" وفی الاحیاء ذهب البعض الی الاستدلال به علی المنع من الرحلة لزیارة المشاهد

وقبور العلماء والصالحين وماتبين لي ان الامر كذلك بل الزيارة مامور بها لخبر كنت نهيتكم عن زيارة القبور الافزوروها"

احیاء العلوم میں علامہ غزالی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ بعض لوگوں نے اس حدیث سے جو یہ دلیل حاصل کی کہ تین مساجد کے بغیر کہیں اور سفر کر کے جانا منع ہے نہ شہداء کے مزارات پر جائے اور نہ علماء وصلحاء کی قبور کی زیارت کے لئے جائے۔ مجھے نہیں سمجھ آسکا کہ انہوں نے یہ ناقص دلیل کیوں دی، اس لئے کہ قبور کی زیارت کا تو خود نبی کریم ﷺ نے حکم فرمایا کہ میں نے تمہیں قبور کی زیارت سے منع کیا تھا، خبردار قبروں کی زیارت کرو۔

" والحديث انماورد نهيها عن الشد لغير المساجد لتماثلها بل لابلد الا و فيها مسجد فلامعنى للرحلة الى مسجد آخر واما المشاهد فلاتساوى بل بركة زيارتها على قدر درجاتهم عندالله"

حدیث پاک سے صرف یہ ثابت ہو رہا ہے کہ تمام مساجد میں عبادت کرنا ایک جیسا مرتبہ رکھتا ہے سوائے تین مساجد کے، کہ ان میں زیادہ ثواب ہے، مسجد حرام میں ایک نماز ادا کرنے کا ثواب ایک لاکھ نماز ادا کرنے کے برابر ہے اور مسجد نبوی میں پچاس ہزار نمازوں کا ثواب حاصل ہوتا ہے (پچاس ہزار نمازوں کے ثواب والی روایت ترمذی میں دیکھئے) اور بیت المقدس (مسجد اقصیٰ) میں ایک نماز کا ثواب دس ہزار نمازوں کے برابر ہے۔

ورنہ مطلقاً اگر یہ بھی کہا جائے کہ کسی اور مسجد کی طرف سفر کر کے نہ جاؤ تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ ہر شہر اور ہر بستی میں کوئی نہ کوئی مسجد ہے جس کی طرف چل کر جانا ہے اور نماز ادا کرنی ہے۔ پھر جمعہ ادا کرنے کے لئے ایک گاؤں سے شہر یا قصبہ میں جانا ہے وہ بھی سفر کر کے ادا کرنا ہے۔

ہاں البتہ قبور کی زیارت کرنا برابر نہیں بلکہ اصحاب قبور کے جس طرح اللہ تعالیٰ کے ہاں درجات ہوں گے اسی طرح ان کے مزارات سے برکت حاصل ہوگی۔ (ماخوذ از حاشیہ نسائی)

زیارۃ النبی ﷺ پر راقم کی دلیل:

نورالایضاح میں باب زیارۃ النبی میں ذکر کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے مزار پرانوار کی زیارت کرنا قریب الوجوب ہے، اس پرانہوں نے یہ دلیل قائم کی ہے۔

" فانه ﷺ حرض علیها وبالغ فی الندب الیها فقال من وجدسعة ولم یزرنی فقدجفانی"

بیشک نبی کریم ﷺ نے اپنی زیارت پر برانگیختہ کیا ہے، اوراس کی فضیلت اورثواب میں مبالغہ فرمایا ہے۔آپ کا ارشادگرامی ہے۔جس شخص نے طاقت پائی اورمیری زیارت نہ کی تواس نے مجھ پرظلم کیا۔

راقم نے نورالایضاح کے حاشیہ ذریعۃ النجاح میں اس عربی پرحاشیہ یوں تحریرکیا۔

(حرض علیها)"ای حث علیها اعنی شوّق علیها الوعدالشفاعة وخوّف لتارکها بوعدالمحرومية"

نبی کریم ﷺ نے اپنی زیارت پر برانگیختہ کیا یعنی اس کی شوق دلائی کہ جس نے زیارت کی وہ میری شفاعت کا مستحق ہوگا اورجس نے زیارت نہ کی اسے اپنی رحمت سے محرومیت کا خوف دلایا۔

(وبالغ فی الندب الیها)" ای بالغ فی طلبها والمبالغة بذکرالوعدوالوعید"

آپ نے اپنی زیارت کی طلب میں مبالغہ فرمایا یعنی زیارت کرنے والے کے لئے وعدہ شفاعت اورنہ کرنے والے کے لئے وعیدمحرومیت بیان کرکے واضح کیا کہ آپ کی زیارت کرنا مستحب بلکہ قریب الوجوب ہے۔

(فقال من وجدسعة) "بفتح السین وکسرها والمرادمن سعة قدرة علی الزاد لنفسه وعیاله الی وقت العود لان بغیرالاستطاعة تکلیف مالایطاق وهو غیر جائز لقوله تعالی لایکلف اللهٰ نفسا الاوسعها اذلایکلف اللهٰ بغیرالوسعة فرسوله کیف یکلف

بغیر الوسعة لان الرسول لایخالفه علی حال کماقال اللّٰہ تعالٰی ماینطق عن الهوی ان هوالأوحی یوحی"

رسول اللہ ﷺ نے وسعت کا ذکر فرمایا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جس آدمی کے پاس آنے جانے کا خرچ ہواور واپس لوٹنے تک اہل وعیال کا خرچ بھی ہو،اس پر میری زیارت کرنا ضروری ہے اگر اس نے میری زیارت نہ کی تو مجھ پراس نے جفا کی ،اگر آپ یہ ذکر نہ فرماتے تو طاقت سے بڑھ کر تکلیف ہوتی۔طاقت سے زائد تکلیف اللہ تعالیٰ بھی نہیں دیتا اوراس کے رسول ﷺ بھی نہیں دیتے۔کیونکہ اللہ کا رسول کسی حال میں بھی اللہ کی مخالفت نہیں کرتا۔اور نہ اللہ تعالیٰ کی وحی کے بغیر اپنی خواہشات سے کوئی کلام کرتے ہیں۔

آیئے اصل دلیل کی طرف توجہ فرمائیں،راقم نے نورالایضاح کے حاشیہ سے بطور نمونہ کچھ اقتباس پیش کردیا۔

(فقدجفانی) "من کان له بصیرة فی العلم وهویعلم ان هذاالحدیث اشد وعیدا لتارک الزیارة لان الجفاء هوالایذاء وایذاء رسول اللہ ﷺ حرام بالنص القطعی ان الذین یؤذون اللّٰہ ورسوله لعنهم اللہ فی الدنیاوالآخرة وهذه الآیة تدل علی من اعرض بلاعذر قادرا فهولایعرف حق رسول اللہ ﷺ ویؤذیه ومن آذی رسول اللہ ﷺ فهوخسر الدنیا و الآخرة وورث یزیدواباجهل وماکان لمؤمن ان یرث یزیدواباجهل بایذائه بل لمؤمن ان یحب بتربة رسول اللہ ﷺ ویحصل قرة عینه منها" (ذریعةالنجاح حاشیه نورالایضاح)

جس شخص کوعلم میں بصیرت حاصل ہے وہ جانتا ہے کہ اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کی زیارت کو بغیر عذر کے چھوڑنے والے کے لئے وعید شدید فرمائی گئی۔کیونکہ آپ نے جفاء کا ذکر فرمایا، نبی کریم ﷺ پر جفا کرنا آپ کو ایذاء پہنچانا ہے،اور آپ کو ایذاء پہنچانا حرام ہے جو نص قطعی سے ثابت ہے، کیونکہ رب تعالیٰ نے فرمایا''بیشک جولوگ اللہ اوراس کے رسول (ﷺ) کو ایذاء پہنچاتے ہیں ان پر اللہ کی لعنت ہو دنیا اور آخرت میں''

گویا کہ اس آیۃ اور حدیث پاک کو ملا کر نتیجہ یہ نکلا کہ نبی کریم ﷺ کی زیارت پر قادر ہونے کے باوجود جو شخص آپ کی زیارت نہیں کرتا وہ آپ کو ایذاء پہنچا رہا ہے۔آپ کو ایذاء پہنچانے والا دنیا اور آخرت میں خسارے میں ہے اور یزید اور ابوجہل کا وارث ہے ۔مومن کی شان کے یہ لائق نہیں کہ وہ یزید اور ابوجہل کا وارث بنے۔ بلکہ مؤمن کو چاہئے کہ وہ رسول اللہ کے مزار اقدس کی خاک سے بھی محبت رکھے اور اسے اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک سمجھے۔

مدینہ طیبہ میں حاضری کے آداب:

جب حاضری کے ارادہ سے چلے تو راستہ میں کثرت سے درود شریف پڑھے۔

☆ مدینہ طیبہ میں پہنچ کر نبی کریم ﷺ کے مزار پر انوار پر حاضری کے لئے غسل کرے یا وضو کرے، غسل کرنا افضل ہے۔

☆ صاف ستھرے کپڑے پہنے، نئے کپڑے پہننا زیادہ بہتر ہے۔

☆ مدینہ طیبہ کے قریب پہنچ کر سواریوں سے جو لوگ اتر جاتے ہیں اور پیدل چلتے ہیں ان کا یہ فعل مستحسن ہے۔

☆ "وکل ماکان ادخل فی الادب والاجلال کان حسنا"

ہر وہ کام جو ادب اور بزرگی پر دلالت کرے وہ احسن ہوگا۔

☆ جب مدینہ طیبہ میں داخل ہو تو پڑھے۔

" باسم اللہ رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا"

☆ اور یہ دعاء کرے۔

"اللھم افتح لی ابواب رحمتک وارزقنی من زیارۃ رسولک ﷺ مارزقت اولیائک و اھل طاعتک واغفرلی وارحمنی یاخیر مسئول"

☆ نبی کریم ﷺ کے مزار پر انوار کی حرمت اور عزت کا لحاظ کرے، نہایت عجز وانکساری اور خشوع وخضوع سے حاضر ہو۔

☆ نبی کریم ﷺ پر درود پاک پڑھنے میں کوئی کمی نہ چھوڑے۔

حضرت امام مالک رحمہ اللہ مدینہ طیبہ میں سواری پر سوار نہیں ہوتے تھے، آپ یہ کہتے تھے۔

" استحی من اللہ تعالی ان اطأ تربة فیھا رسول اللہ ﷺ بحافر دابة"

مجھے اللہ تعالیٰ سے شرم آتی ہے کہ میں اس مٹی کو سواری کے پاؤں سے روندوں جس میں رسول اللہ ﷺ مدفون ہیں۔

راقم کے نزدیک حضرت امام مالک رحمہ اللہ کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ اگر سر کے بل آپ چل سکتے تو یقیناً اپنے پاؤں بھی مدینہ طیبہ کی گلیوں میں نہ لگاتے۔

☆ مسجد میں داخل ہوکر مسجد کے آداب کا لحاظ کرے، دایاں پاؤں پہلے مسجد میں رکھے اور دعاء پڑھے۔

"اللھم افتح لی ابواب رحمتک"

☆ نبی کریم ﷺ کے مزار پرانوار اور منبر تک مسجد کا حصہ جسے ریاض الجنۃ کہا جاتا ہے، اس میں تحیۃ المسجد ادا کرے۔ آجکل بہت ہجوم ہوتا ہے اس لئے ریاض الجنۃ میں جگہ نہ ملے تو تمام مسجد نبوی میں کہیں بھی جگہ ملے تو نوافل ادا کرے۔ مسجد نبوی میں جتنا بھی اضافہ ہوتا جائے گا وہ مسجد نبوی کے درجہ میں ہی ہوگا۔

☆ مدینہ طیبہ کی حاضری چونکہ عظیم نعمت ہے، اس لئے دو رکعت بطور شکر نفل ادا کرے۔

☆ نبی کریم ﷺ کی قبر شریف کے چھ سات فٹ کے فاصلہ پر قبلہ کی طرف چہرہ کر کے اور قبلہ شریف کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو۔ (از فتح القدیر)

مزار پرانوار پر ہدیہ درود وسلام پیش کرے:

مندرجہ ذیل الفاظ مبارکہ سے درود وسلام پڑھے۔

"الصلوۃ والسلام علیک یاسیدی یارسول اللہ الصلوۃ والسلام علیک یانبی اللہ

الصلوۃ والسلام علیک یاحبیب اللہ الصلوۃوالسلام علیک یانبی الرحمۃ

الصلوة والسلام علیک یاشفیع الامة　　الصلوة والسلام علیک یاسیدالمرسلین

الصلوة والسلام علیک یاخاتم النبیین　　الصلوة والسلام علیک یامزمل

الصلوة والسلام علیک یامدثر

الصلوة والسلام علیک وعلی اصولک الطیبین واهل بیتک الطاهرین

نبی کریم ﷺ سے شفاعت کی عرض کرے:

عاجزانہ انداز پر یوں عرض کرے۔

" انت الشافع المشفع الموعودبالشفاعة العظمی والمقام المحمودوالوسیلة "

آپ شفاعت کرنے والے ہیں۔آپ کی شفاعت کوقبول کرنے کا آپ سے رب تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔شفاعت عظمیٰ کا منصب آپ کو حاصل ہوگا۔مقام محموداور مقام وسیلہ آپ کو ہی حاصل ہونا ہے۔

رب تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا۔

" ولوانهم اذظلموا انفسهم جاء وک فاستغفرالله واستغفرلهم الرسول لوجدوا الله توابارحیما "

اوراگر بیشک یہ لوگ اپنی جانوں پرظلم کریں تو آپ کے پاس آجائیں،تواللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کریں اوران کے لئے رسول بھی بخشش طلب کریں تواللہ کوتوبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا پائیں گے۔

ہم گناہوں کی وجہ سے اپنی جانوں پرظلم کرکے آپ کی خدمت میں حاضر ہو چکے ہیں،ہم خودتو بخشش طلب کر رہے ہیں،آپ بھی شفاعت فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے گناہ معاف فرمادے۔اور ہماری موت آپ کی سنت پر قائم رہتے ہوئے آئے۔

" الشفاعة الشفاعة الشفاعة یارسول الله"

تین مرتبہ عرض کرے، یارسول اللہ! آپ شفاعت فرمائیں۔

پھر تمام مومنوں کے لئے یہ دعاء کرے۔

" ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولاتجعل فی قلوبنا غلا للذین امنوا ربنا انک رؤف رحیم"

پھر جن لوگوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں سلام پیش کرنے کے متعلق کہا تھا ان کے نام لے کر آپ کی خدمت میں ان کے سلام پیش کرے۔ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں سلام عرض کرے۔

"السلام علیک یاخلیفة رسول اللہ

السلام علیک یاصاحب رسول اللہ جزاک اللہ عنا افضل الجزاء"

پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں تعریفی الفاظ ذکر کرے کہ آپ نبی کریم ﷺ کے غار کے ساتھی ہیں اور سفر وحضر کے ساتھی، آپ حضور کے رازوں کے امین ہیں۔ اس قسم کے آپ کو جو اوصاف بھی ذہن میں ہوں، وہ آپ کے حضور عرض کرے۔

پھر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں سلام پیش کرے۔ یوں عرض کرے۔

" السلام علیک یاامیر المؤمنین

السلام علیک یامظہر الاسلام

السلام علیک یامکسر الاصنام جزاک اللہ عنا افضل الجزاء "

پھر آپ کے حضور تعریفی کلمات پیش کرے اور یہ عرض کرے آپ نے مسلمانوں اور اسلام کی امداد فرمائی، اور آپ نے نبی کریم ﷺ کے بعد بہت سے علاقوں کو فتح فرمایا، یتیموں کی آپ نے کفالت کی۔ اس قسم کے جو الفاظ بھی ذہن میں آئیں جو آپ کی شان پر دلالت کریں وہی الفاظ آپ کے حضور پیش کرے۔

پھر دعاء کرے:

سلام پیش کرنے کے بعد اپنے لئے اور اپنے والدین کے لئے دعاء کرے۔اور جن لوگوں نے دعاء کے متعلق کہا تھا ان کے لئے دعاء کرے اور تمام مسلمانوں کے لئے دعاء کرے۔

متبرک مقامات سے حصول برکت:

اسطوانہ ءابی لبابۃ کے پاس نوافل پڑھے اور دعاء کرے۔(حاجی حضرات ریاض الجنۃ میں ستونوں کو دیکھیں تو آج بھی ایک ستون پر"اسطوانہ ءابی لبابہ" لکھا ہوا نظر آئے گا) پھر نبی کریم ﷺ کے منبر کے پاس آئے اور اپنا ہاتھ رکھے اور برکت حاصل کرے۔

" ویجتهد فی احیاء اللیالی مدة اقامته واغتنام مشاهدة الحضرة النبوية وزيارته فی عموم الاوقات"

مدینہ طیبہ میں جتنے دن رہے نبی کریم ﷺ کے مزار پر انوار کی زیادہ سے زیادہ زیارت کرے وہاں کی حاضری کو غنیمت سمجھے۔جتنا ممکن ہو راتیں جاگ کر گذارے۔

" ویستحب ان یخرج الی البقیع فیأتی المشاهدوالمزارات خصوصاً قبر سید الشهداء حمزة رضی اللهعنه ثم الی البقیع الآخرفیزورالعباس والحسن بن علی بن علی وبقية آل الرسول رضی اللهعنهم ويزورامير المؤمنين عثمان بن عفان وابراهيم بن النبی ﷺ وازواج النبی ﷺ وعمته صفية والصحابة والتابعين رضی اللهعنهم"

مستحب یہ ہے کہ مزارات پر حاضری دے،خصوصاً سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے مزار پر حاضری دے، پھر بقیع میں حضرت عباس، حضرت امام حسن اور آل رسول کے دوسرے حضرات، اور امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور نبی کریم ﷺ کے بیٹے حضرت ابراہیم اور نبی کریم ﷺ کی

ازواج مطہرات اور آپ کی پھوپھی حضرت صفیہ اور صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم کے مزارات پر حاضری دے۔

" ویزور شهداء احد وان تیسر یوم الخمیس فهو احسن ویقول سلام علیکم بما صبرتم فنعم عقبی الدار ویقرأ آیة الکرسی والاخلاص احدی عشرة مرة وسورة یٰس ان تیسر ویهدی ثواب ذلک جمیع الشهداء ومن بجوارهم من المؤمنین"

شہداء احد کے مزارات پر حاضری دے، اگر جمعرات کو حاضر ہونے میں آسانی ہو تو بہتر یہی ہے کہ جمعرات کو حاضری دے۔ حاضری کے وقت ان کے حضور سلام پیش کرے اور کہے۔ "سلام علیکم بماصبرتم فنعم عقبی الدار"

اور آیۃ الکرسی اور سورۃ اخلاص گیارہ مرتبہ پڑھے اور اگر ہو سکے تو سورۃ یٰسن پڑھے، اس کا ثواب تمام شہداء اور ان کے قریب تمام مومنوں کو پہنچائے۔

" ویستحب ان یاتی مسجد قباء یوم السبت اوغیره ویصلی فیه"

اور مستحب یہ ہے کہ مسجد قباء میں ہفتہ کے دن حاضر ہو کر نوافل پڑھے۔

مدینہ طیبہ میں جتنے دن رہنا نصیب ہو زیادہ سے زیادہ درود شریف پڑھتا رہے۔ زیادہ سے زیادہ عجز و انکساری سے کام لے۔ جتنا زیادہ ادب واحترام کرے گا اتنا زیادہ بلند مقام حاصل ہوگا اور روح حج حاصل ہوگی۔

(ماخوذ از فتح القدیر و نور الایضاح)

☆☆☆☆☆

اَلۡحَجُّ اَشۡهُرٌ مَّعۡلُوۡمٰتٌ ۚ فَمَنۡ فَرَضَ فِيۡهِنَّ الۡحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَ لَا فُسُوۡقَ وَلَا جِدَالَ فِى الۡحَجِّ ؕ وَمَا تَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ يَّعۡلَمۡهُ اللّٰهُ ؕ وَ تَزَوَّدُوۡا فَاِنَّ خَيۡرَ الزَّادِ التَّقۡوٰى وَاتَّقُوۡنِ يٰٓاُولِى الۡاَلۡبَابِ☆

(سورۃالبقرۃ آیت،۱۹۷)

﴿۱﴾

حج کے کئی مہینے ہیں جانے ہوئے، تو جو ان میں حج کی نیت کرے تو نہ عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ ہو، نہ کوئی گناہ، نہ کسی سے جھگڑا حج کے وقت، اور تم جو بھلائی کرو اللہ اسے جانتا ہے، اور توشہ ساتھ لو کہ سب سے بہتر توشہ پرہیزگاری ہے، اور مجھ سے ڈرتے رہو اے عقل والو!

﴿۲﴾

حج کے مہینے معلوم ہیں، تو جس شخص نے لازم کرلیا ان (مہینوں) میں حج تو نہ عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ ہو نہ کوئی گناہ نہ کسی سے جھگڑا حج کے دنوں میں، اور جو تم کرو بھلائی جانتا ہے اسے اللہ، اور توشہ ساتھ لو، بیشک بہتر توشہ پرہیزگاری ہے اور ڈرو مجھ سے اے عقل والو!

ماقبل سے تعلق:

پہلے ارشاد باری ذکر ہوا۔ ”یسئلونک عن الاھلة قل ھی مواقیت للناس والحج“ جس سے یہ پتہ چلتا تھا کہ چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کا فائدہ یہ ہے کہ لوگ اس سے اپنے افعال کے اوقات مقرر کرتے ہیں، اور یہ حج کے وقت کی علامتیں ہیں۔

اس سے یہ وہم ہوتا تھا کہ تمام مہینے حج کے لئے کس طرح علامات ہیں، تو اس کی وضاحت اس آیۃ کریمہ میں فرمائی۔ یعنی " ان الآیة الاولی مجملة وھذہ الآیة مفسرة لھا" پہلی آیت میں اجمال تھا، اس میں تفسیر ہے کہ حج کے مہینے معلوم ہیں۔ تمام سال کے تمام مہینے مراد نہیں۔ (از خازن)

پہلے حج اور عمرہ کا ذکر فرمایا۔ چونکہ عمرہ کا وقت مقرر نہیں لیکن حج کا وقت مقرر ہے، عمرہ سال میں کئی مرتبہ بھی ادا ہو سکتا ہے لیکن حج سال میں ایک مرتبہ ہی ادا ہوتا ہے۔ اس آیۃ کریمہ میں یہی وضاحت کی گئی ہے کہ حج کے مہینے تو مشہور و معروف ہیں۔

" اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ" اس میں حذف مضاف ہے۔ اگر "اَشْهُرٌ" کا لفظ محذوف ہو تو عبارت معنوی طور پر اس طرح ہوگی "اَشْهُرُ الْحَجِّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ" حج کے مہینے معلوم مہینے ہیں۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے اور راقم نے بھی یہی نقل کیا ہے۔

اگر لفظ "وقت" محذوف ہو تو عبارت معنوی طور پر یہ ہوگی "وقت الحج اشھر معلومات" حج کا وقت معلوم مہینے ہیں۔

حج کے مہینے کون سے ہیں؟

وہ شوال اور ذیقعد اور ذی الحج کے دس دن ہیں۔

☆ "اخرج الطبرانی وابن مردویہ عن ابی امامة قال قال رسول اللہ ﷺ فی قولہ الحج اشھر معلومات شوال وذو القعدة وذو الحجة"

ابو امامہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے "الحج اشھر معلومات" کے متعلق فرمایا کہ اس سے مراد شوال اور ذیقعد اور ذی الحج ہے۔ (اس حدیث میں تین مہینوں کا ذکر ہے، یہ وضاحت نہیں کہ ذی الحج سے مراد کل مہینہ ہے یا بعض)

☆ "واخرج وکیع وسعید بن منصور وابن ابی شیبة وعبد بن حمید وابن جریر وابن

المنذر وابن ابی حاتم والبیهقی عن ابن مسعود الحج اشهرمعلومات قال شوال وذوالقعدة وعشرلیال من ذی الحجة"

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔"الحج اشهرمعلومات" سے مرادشوال اور ذیقعداورذی الحج کی دس راتیں ہیں۔

ان دونوں حدیثوں سے یہ واضح ہوا ذی الحج کا مہینہ مکمل مرادنہیں بلکہ اس کی دس راتیں مراد ہیں۔

☆ "واخرج وکیع وسعیدبن منصوروابن ابی شیبة وعبدبن حمیدوابن جریروابن المنذروالحاکم وصححه والبیهقی فی سننه من طرق عن ابن عمرالحج اشهر معلومات قال شوال وذوالقعدةوعشرلیال من ذی الحجة"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا"الحج اشهرمعلومات" سے مرادشوال اورذیقعداورذی الحج کی دس راتیں ہیں۔

☆ " واخرج ابن المنذروالدارقطنی والطبرانی والبیهقی عن عبداللّٰہبن الزبیرالحج اشهر معلومات قال شوال وذوالقعدة وعشرمن ذی الحجة"

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں۔"الحج اشهرمعلومات" سے مرادشوال، ذیقعداوردس ذی الحج کے۔

☆ واخرج ابن ابی شیبة عن الحسن ومحمدوابراهیم مثله

ابن ابی شیبہ نے حسن اورمحمداورابراہیم رضی اللہ عنہم سے روایات ذکر کی ہیں جن کا وہی مطلب ہے جو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی حدیث کا ہے۔

ان احادیث میں مطلق دس کا ذکر ہے۔دس دن یادس راتوں کا ذکرنہیں۔لیکن بظاہراس سے مراد دس دن ہی ہیں اوریہی امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔ (ماخوذازدرمنثور)

☆ " قلت المرادشوال وذوالقعدةوتسع من ذی الحجة الی طلوع الفجرمن یوم النحر"

ابوامامہ کی حدیث طبرانی سے جوذکر کی ہے اس پرقاضی مظہری رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا کہ ذی الحج سے مرادنودن ذی الحج کے ہیں،یعنی دس ذی الحج کی صبح تک حج کاوقت ہے۔

تمام احادیث میں تطبیق:

اس مسئلہ میں کافی حد تک اتفاق ہے کہ ذی الحج کا مہینہ بعض مراد ہے کل نہیں۔

ذی الحج کے نو اور دس کے اقوال میں علامہ بغوی رحمہ اللہ نے تطبیق یوں دی۔

- "کل واحدمن اللفظین صحیح والمآل واحدغیر مختلف فیه فمن قال عشر عبر عن اللیالی ومن قال تسع عبر عن الایام"

دونوں لفظ "نو اور دس" صحیح ہیں، اور دونوں کا مطلب ایک ہی ہے۔ جن حضرات نے ذی الحج کے نو کا ذکر فرمایا ان کی مراد ذی الحج کے نو دن ہیں، اور جن حضرات نے دس کا ذکر فرمایا ان کی مراد دس راتیں ہیں۔ (از مظہری)

راقم کے نزدیک چار اقوال میں تطبیق:

چونکہ حج میں وقوف عرفات فرض ہے، جو شخص مقام عرفات پر ذی الحج کی نو تاریخ دن کو یا آنے والی رات کو نہ جاسکے اس کا حج فوت ہو جاتا ہے، اس لحاظ سے ذی الحج کے نو دن مراد ہیں، کیونکہ ذی الحج کی دس تاریخ پہنچ کر مقام عرفات پر ٹھہرنے کے باوجود حج نہیں ہوتا، لیکن یہ اس وقت ہے جب یہ لحاظ کیا جائے کہ ذی الحج کے دن کتنے مراد ہیں۔

اور اگر مطلقا دن یا رات میں سے کوئی وقت بھی مراد ہو تو دس ذی الحج سے پہلی رات جو عام اوقات میں آنے والے دن کی ہی رات ہوتی ہے اس کا اعتبار کرتے ہوئے دس راتیں کہہ دیا کہ حج کے معلوم مہینوں میں سے ذی الحج کی دس راتیں مراد ہیں اور جب یہ لحاظ کیا جائے کہ اگرچہ وقوف عرفات کے پائے جانے پر حج فوت تو نہیں ہوتا لیکن حج کے فرائض کی تکمیل تو دس ذی الحج کو ہی ہو سکتی ہے، اس لئے کہ حلق یا قصر (سر منڈانے یا بال کٹانے) سے احرام کی باقی پابندیاں ختم ہوں گی لیکن ازواج سے جماع کرنے کی پابندی طواف زیارت کرنے سے ہی اٹھے گی، یہ طواف زیارت فرض ہے جو دس ذی الحج سے پہلے ادا نہیں ہوگا۔ اس لحاظ سے ذی الحج کے دن مراد ہیں۔

اور جب یہ لحاظ کیا جائے کہ کنکریاں مارنے کا عمل بارہ ذی الحج تک واجب ہے اور تیرہ ذی الحج کو کنکریاں مارنا مستحسن کام ہے، پھر طواف وداع کی تاریخ مقرر نہیں جس دن لوٹتا ہوا اس دن کرے یا اس سے پہلے کرلے اس لحاظ پر ذی الحج کا مکمل مہینہ یا کم از کم ذی الحج کے بارہ دن مراد لینے پڑتے ہیں تو مطلقاً ذی الحج کا ذکر ہو گیا جس میں مکمل یا بعض کو ذکر نہیں کیا گیا۔

سب روایات میں مقصد بیان تو حج کے وقت کا بیان ہی ہے لیکن انداز بیان مختلف حالتوں کو دیکھنے سے متعلق ہے۔

اعتراض: جمع قلت کے کم از کم تین فرد ہوتے ہیں تو "اشھر" جب جمع ہے تو تیسرے مہینہ کے دس دن مراد لینا کیسے صحیح ہے؟

جواب: جمع قلت کا اطلاق کبھی مافوق الواحد پر بھی ہوتا ہے اور اسی طرح تیسرے فرد کا بعض ذکر ہو تو کل ذکر کر دیا جاتا ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔"ایام منی ثلاثة" منی کے دن تین ہیں۔(یعنی دس ذی الحج اور گیارہ اور بارہ) لیکن حقیقت یہ ہے کہ بارہ ذی الحج کو سورج کے ڈھلنے کے ساتھ کنکریاں مار کر مکہ مکرمہ میں آجانا درست ہے تو حدیث پاک میں بھی تیسرے فرد کے بعض حصہ کو کل سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔

اور قرآن پاک میں ہے۔"فقد صغت قلوبکما" یہاں ذکر قلوب ہے جو جمع ہے لیکن مراد تثنیہ ہے کیونکہ مراد دو ہیں۔

اعتراض: حج تو آٹھ ذہ الحج سے شروع ہو کر بارہ ذی الحج کے سورج ڈھلنے پر کنکریاں مارنے سے ختم ہو جاتا ہے، دو مہینے دس دن حج کے وقت سے کیا مراد ہے۔

جواب: ایک وجہ تو تمتع کے بیان میں گذر چکی ہے کہ جس شخص نے شوال کی پہلی تاریخ یا اس کے بعد اپنی میقات سے عمرہ کا احرام باندھا، پھر عمرہ کر کے فارغ ہو گیا احرام کھول کر مکہ مکرمہ میں یا میقاتوں کے اندر اندر رہا پھر آٹھ ذی الحج کو حج کا احرام باندھ کر حج کیا وہ متمتع ہے۔

اگر شوال سے پہلے عمرہ کا احرام باندھ کر عمرہ کر کے وہیں میقاتوں کے اندر اندر رہے، لوٹ کر نہ آئے تو پھر بھی حج کر لینے سے متمتع نہیں بنے گا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ حج کا احرام باندھنے کے لئے شوال سے وقت مستحب شروع ہوتا ہے کہ بہتر یہ ہے کہ شوال سے پہلے حج کا احرام نہ باندھے۔ہاں اگر شوال سے پہلے احرام باندھ لیا اسی احرام سے حج کر لیا تو مکروہ ہوگا، کیونکہ جتنا زیادہ وقت احرام کا ہوگا اسی قدر احرام کی پابندیوں پر عمل دشوار ہوگا۔

درحقیقت یہ وقت مقرر فرما کر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر رحمت کا اظہار فرمایا کہ اے میرے بندو بہت لمبے وقت کے لئے احرام باندھ کر اپنے آپ کو مشقت میں نہ ڈالو۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب:

اس مسئلہ میں یہی ہے کہ شوال سے پہلے احرام باندھنا مکروہ ہے۔ پہلے احرام باندھ لیا تو حج ہو جائے گا۔ لیکن امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اگر احرام پہلے باندھا تو حج ادا نہیں ہوگا۔

امام اعظم رحمہ اللہ کا مذہب احادیث کی روشنی میں دیکھئے۔

☆ " واخرج ابن ابی شیبة وابن خزیمة والحاکم وصححه والبیهقی عن ابن عباس قال لایحرم بالحج الافی اشهر الحج فان من سنةالحج ان یحرم بالحج فی اشهر الحج"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حج کے مہینوں کے سواء کسی اور مہینہ میں حج کا احرام نہ باندھے، کیونکہ حج میں سنت یہ ہے کہ حج کے مہینوں میں ہی حج کا احرام باندھے۔

حدیث پاک میں واضح طور پر سنت کے ذکر سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب روز روشن کی طرح واضح ہو رہا ہے کیونکہ ترک سنت سے کراہیت تو آئے گی لیکن فساد لازم نہیں آئے گا۔

☆ " واخرج الشافعی فی الامّ وابن ابی حاتم وابن ابی مردویه عن ابن عباس قال لاینبغی لاحدان یحرم بالحج الافی اشهر الحج"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ کسی ایک کے لئے مناسب نہیں کہ حج کا احرام سوائے حج کے مہینوں کے باندھے۔لطف کی بات یہ ہے کہ یہ حدیث حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے بھی

پیش فرمائی لیکن لفظ ''لاینبغی'' کی طرف کابل نظرامام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی ہی رہی۔ کہ یہ مناسب نہیں۔ یہ نہیں فرمایا ''لایجوز'' یہ جائز ہی نہیں۔ لہٰذا صرف یہی کہا جائے گا کہ حج کے مہینوں سے پہلے احرام باندھنا مکروہ ہے۔ حرام نہیں۔ حج ہو جائے گا، حج فاسد نہیں ہوگا۔ (درمنثور)

اعتراض: ''واخرج ابن ابی شیبة عن عطاء انه قال لرجل قداحرم بالحج فی غیراشهر الحج اجعلها عمرة فانه لیس لک حج فان اللّٰہیقول الحج اشهرمعلومات فمن فرض فیهن الحج''

عطا کہتے ہیں کہ ابن عباس نے ایک شخص کو کہا کہ تم نے حج کا احرام حج کے مہینوں کے علاوہ (وقت سے پہلے) باندھ لیا ہے اس احرام کو عمرہ کا احرام بنالو بیشک تمہارا حج نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ''الحج اشهرمعلومات فمن فرض فیهن الحج'' آیۃ کریمہ سے واضح ہو رہا ہے کہ حج کے مہینے معلوم ہیں اور ان میں ہی احرام باندھا جائے۔

اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ حج کا احرام حج کے مہینوں میں باندھنا فرض ہے، اس سے پہلے اگر احرام باندھ لیا تو حج نہیں ہوگا، بلکہ حج کو چھوڑ کر اسی احرام سے عمرہ کر لے اور دم (جانور ذبح کر کے ہدی) ادا کر دے۔ تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب کس طرح صحیح ہوگا؟

جواب: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا حج سنت کے مطابق نہیں۔ سنت یہ ہے کہ حج کے مہینوں میں احرام باندھا جائے، تم نے وقت سے پہلے احرام باندھ لیا ہے جو مناسب نہیں، اس لئے بہتر یہ ہے کہ احرام عمرہ کا کرلو اور دم ادا کر دو، اور پھر وقت کے شروع ہونے پر احرام باندھنا تا کہ تمہارا احرام سنت کے مطابق ہو جائے ''فانه لیس لک حج'' کا مطلب ہی یہ ہے کہ تمہارا حج کامل سنت کے مطابق نہیں۔

جواب کے الفاظ سے ذرا غور سے پڑھیں اور تینوں احادیث کو غور سے پڑھیں تو ان شاء اللہ ان میں شاندار تطبیق پائیں گے۔

"فَمَنۡ فَرَضَ فِيۡهِنَّ الۡحَجَّ فَلَارَفَثَ وَ لَافُسُوۡقَ وَلَاجِدَالَ فِى الۡحَجِّ "

جس شخص نے لازم کرلیاان میں حج تو نہ عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ ہو نہ کوئی گناہ نہ کسی سے جھگڑا حج کے دنوں میں۔

(**فمن فرض فیهن الحج**)"ای الزمه نفسه بالشروع فيه بالنية قصدا باطنا و بالاحرام فعلاظاهر او بالتلبية نطقامسموعا"

جس شخص نے اپنے آپ پر حج کولازم کرلیایعنی دل سے نیت کر کےاور ظاہری طور پر احرام باندھ کراور بلند آواز سے زبان سے تلبیہ پڑھ کر حج کو شروع کر کے اپنے آپ پر لازم کرلیا۔ (قرطبی)

خیال رہے کہ راقم کا ترجمہ قرطبی رحمہ اللہ کی تفصیلی تفسیر کے مطابق ہے۔اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ مختصر لیکن جامع ہے۔

"**فمن فرض فیهن الحج**" جوان میں حج کی نیت کرے۔

یہ ترجمہ بہت مختصر لیکن جامع کیسے؟ اس لئے کہ حج کی نیت کرنے سے حج لازم ہوتا ہے،اور حج کی نیت احرام باندھنےاور تلبیہ پڑھنے سے مکمل ہوتی ہے۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"(**فمن فرض**) اى الزم نفسه (**فیهن الحج**) بالاحرام ويصير محرمابمجرد النية عند الشافعى لكون الاحرام التزام الكف عن المحظورات فيصير شارعافيه بمجردها كالصوم وعندنالا،بل لابدمن مقارنة التلبية لانه عقدعلى الاداء فلابدمن ذكر كمافى تحريمةالصلوة،، (روح المعانی)

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک صرف احرام باندھنے سے ہی نیت کی تکمیل ہو جاتی ہے کیونکہ اس نے احرام باندھ کر اپنے آپ پر کئی چیزوں کو منع کرلیا تو اس کا حج شروع ہوگیا۔لیکن ہمارے نزدیک نیت کی تکمیل احرام اور تلبیہ سے ہوتی ہے کیونکہ احرام اداء پر عقد ہے اس کے ساتھ ذکر بھی ضروری ہے جس طرح نماز میں نیت کے ساتھ تکبیر تحریمہ بھی ضروری ہے۔

"**فَلَارَفَث**": تو نہ عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ ہو۔

یہ ترجمہ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ہے۔ راقم نے بھی یہی نقل کیا ہے۔ اس ترجمہ کے کمال پر راقم کی کتاب تسکین الجنان سے ایک ورق دیکھئے۔

"**اُحِلَّ لَکُمْ لَیْلَةَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِکُمْ**"

حلال کی گئی واسطے تمہارے رات روزے کی رغبت کرنا طرف بیبیوں اپنی کی۔ (شاہ رفیع الدین صاحب)

تمہارے لئے روزوں میں راتوں کو اپنی بیبیوں کے پاس جانا حلال ہوا۔ (مودودی صاحب)

حلال ہوا تم کو روزہ کی رات میں بے حجاب ہونا اپنی عورتوں سے۔ (محمود الحسن صاحب)

حلال ہوا تم کو روزے کی رات میں بے پردہ ہونا اپنی عورتوں سے۔ (شاہ عبدالقادر صاحب)

روزوں کی راتوں میں تمہارے لئے اپنی عورتوں کے پاس جانا جائز کر دیا گیا۔ (فتح محمد صاحب)

روزوں کی راتوں میں اپنی عورتوں کے پاس جانا تمہارے لئے حلال ہوا۔ (مولانا احمد رضا خان رحمہ اللہ)

"**فَلَارَفَث**"

تو بے حجاب ہونا جائز نہیں۔ (محمود الحسن صاحب)

کوئی شہوانی فعل سرزد نہ ہو۔ (مودودی صاحب)

تو بے پردہ ہونا عورت سے۔ (شاہ عبدالقادر صاحب)

تو (حج کے دنوں میں) نہ عورتوں سے اختلاط کرے۔ (فتح محمد صاحب)

تو نہ عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ ہو۔ (مولانا احمد رضا خان رحمہ اللہ)

ان دونوں مقامات میں "رفث" کا معنی ایک ہی لیا گیا ہے، ایک جگہ مثبت اور ایک جگہ منفی۔

لیکن اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے مثبت مقام میں (یعنی پہلی آیت میں) جماع معنی لیا ہے

، کیونکہ عورتوں کے پاس جاناعام محاورہ میں جماع ہی ہے۔لیکن آپ نے دوسرے مقام میں ایسا ترجمہ نہیں کیا جس سے صرف جماع کی نفی ہوتی، بلکہ ایسا ترجمہ کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ عورتوں کے ساتھ صحبت کا تذکرہ بھی نہ ہو۔

وجہ فرق کیا ہے؟ پہلی آیت کی وجہ تو "باشروهن" کے ضمن میں گذر چکی ہے کہ رمضان شریف میں رات کی قیود کو (یعنی جماع نہ کرنے کے حکم کو) اٹھایا، اور جماع کو حلال کیا گیا۔

اب معنی بے حجاب ہونا یا بے پردہ ہونا، یا عورتوں کی طرف رغبت کرنا کرلیا جائے یا عورتوں کی پاس جانا کرلیا جائے ایک ہی صورت ہے۔

لیکن دوسرا مقام حج کے احکام میں ہے کہ حج میں "رفث" منع ہے، اب یہاں صرف جماع منع ہونا کافی نہیں، بلکہ عورتوں کے سامنے ذکرِ صحبت بھی منع ہے۔

تفسیر مدارک میں ہے۔

(فلارفث) ھوالجماع اوذکرہ عندالنساء"

رفث جماع ہے یا جماع کا عورتوں کے سامنے ذکر کرنا۔

ہدایہ میں بھی "رفث" کے معنی "ذکر الجماع بحضرة النساء" ذکر کیا گیا ہے۔

اسی طرح درمختار میں ہے۔

"یتقی الرفث ای الجماع اوذکر بحضرة النساء"

یعنی رفث سے بچے رفث کا معنی جماع ہے۔اور اسی طرح عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ کرنا۔

علامہ شامی رحمہ اللہ نے "بحضرة النساء" پر تحریر فرمایا "قول ابن عباس" یعنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول یہی ہے کہ عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ کرنا منع ہے۔

اب اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت پر نظر کی جائے تو یقیناً سمجھ آئے گا کہ آپ نے اسی فقہی باریکی کو مدنظر رکھ کر ترجمہ کیا جبکہ دوسرے مترجمین حضرات اسے نہ سمجھ سکے۔ (تسکین الجنان، ص ٦٢ تا ٦٤)

فائدہ: اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے "فلا رفث" کا ترجمہ کیا ہے۔تو نہ عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ ہو۔
اس سے ایک اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ عورت سامنے نہ ہو تو صحبت کا تذکرہ منع نہیں۔کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما احرام کی حالت میں اونٹ کو چلانے کے لئے حدی پڑھتے ہوئے اپنی لونڈی ہمیس کا تذکرہ ان الفاظ میں کر رہے تھے۔

وھن یمشین بناھمیسا ان یصدق الطیر ففک لمیسا

آپ کے اس شعر کو سن کر ابو العالیہ نے کہا۔"اترفث وانت محرم" کیا تو رفث کر رہا ہے جبکہ تو محرم ہے۔"فقال انما الرفث مایقال عندالنساء" تو آپ نے فرمایا "رفث" اس وقت ہوتا ہے جبکہ عورتوں کے پاس صحبت کا یا ان کو چھونے کا ذکر ہو، میرے پاس ہمیس موجود نہیں اس لئے یہ رفث نہیں۔ (از شیخ زادہ)

رفث کی تمام اقسام منع ہیں:

یعنی انسان جب احرام باندھ لے تو حالت احرام میں مطلقاً رفث منع ہے، رفث کی چند قسمیں ہیں۔
"الرفث باللسان ذکر المجامعة ومایتعلق بھا" زبان سے رفث بھی منع ہے۔زبان سے رفث یہ ہے کہ عورتوں کے سامنے جماع یا جماع سے متعلق چھونے اور بوسہ لینے کا ذکر ہو۔
"والرفث بالید المس والغمز" احرام کی حالت میں ہاتھ سے رفث بھی منع ہے۔ہاتھ سے رفث یہ ہے کہ ہاتھ سے چھونا اور انگلی وغیرہ کو محبت سے مروڑنا۔
" والرفث بالفرج الجماع" فرج (شرمگاہ) سے رفث بھی احرام کی حالت میں منع ہے۔شرمگاہ سے رفث کا مطلب جماع کرنا ہے۔

"وَلَافُسُوْق" (اور نہ گناہ) یعنی حالت احرام میں کسی قسم کا معصیت والا کوئی کام نہ کرے۔
(ولافسوق)" یعنی جمیع المعاصی کلھا" یعنی رب تعالیٰ نے "ولافسوق" ارشاد فرما کر تمام

معاصی سے منع فرمادیا۔ کہ حالت احرام میں ہر قسم کے گناہ کے کام سے اجتناب کرو۔

احرام کی حالت میں خشکی کا شکار کرنا۔ اور ناخن کاٹنا۔ بال کاٹنا اور سلے ہوئے کپڑے پہننا تمام کام غیر شرعی کام ہیں۔ لہٰذا یہ بھی فسق میں داخل ہیں۔ ان سے بھی اجتناب کرے۔

بتوں کے نام پر ذبح کرنا بھی فسق ہے اس سے بھی دور رہنا ضروری ہے۔

رب تعالیٰ نے فرمایا۔ "او فسقا اهل لغير الله به"

کسی کو برے القاب سے پکارنا بھی فسق ہے۔ اس سے بچ کر رہنا بھی ضروری ہے۔

رب تعالیٰ نے اس کی مذمت میں فرمایا "بئس الإسم الفسوق"

کسی کو گالی دینا بھی فسق ہے، لہٰذا احرام کی حالت میں کسی کو گالی نہ دے، گالی کی مذمت میں ارشاد نبوی ہے۔

" قال ﷺ سباب المسلم فسوق وقتاله كفر"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا مسلمان کو گالیاں دینا فسق ہے اور قتل کرنا (جائز سمجھ کر) کفر ہے۔

مطلب واضح ہے کہ یہ تمام مثالیں ہیں۔ قانون اور ضابطہ وہی ہے جو پہلے ذکر کر دیا گیا کہ ہر قسم کے گناہ سے اجتناب کرے۔

☆ " قال ﷺ من حج فلم يرفث ولم يفسق رجع كيوم ولدته امه" (خرجه مسلم وغيره)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے حج کیا تو (حالت احرام میں) نہ رفث کیا اور نہ فسق کیا تو واپس لوٹے گا اس دن کی طرح جس میں اس کی ماں نے اسے جنا۔

یعنی جس طرح ولادت کے دن انسان گناہوں سے پاک وصاف ہوتا ہے اسی طرح اگر حج کرے جو رفث وفسق سے پاک ہو تو انسان گناہوں سے پاک وصاف ہو جاتا ہے۔

☆ قال ﷺ والحج المبرور ليس له جزاء الا الجنة" (خرجه مسلم وغيره)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا حج مبرور کی جزا نہیں سوائے جنت کے۔

☆ قال ﷺ والذی نفسی بیده مابین السماء والارض من عمل افضل من الجهاد فی سبیل الله او حجة مبرورة لا رفث فیها ولا فسوق ولا جدال"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے زمین و آسمان میں کوئی عمل اللہ کی راہ میں جہاد سے افضل نہیں اور حج مبرور سے (کوئی عمل افضل نہیں) جس میں رفث اور فسق اور جھگڑا نہ پایا جائے۔ (قرطبی)

فائدہ: اگرچہ حج مبرور کا ذکر پہلے گذر چکا ہے تاہم علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اس مقام پر بھی ذکر کیا جس میں مختلف اقوال ذکر فرمائے ان تمام کے جمع کرنے سے عظیم فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

"قال الفقهاء الحج المبرور هو الذی لم یعص اللہ تعالی فی اثناء ادائه"

حج ادا کرنے کے دوران کسی قسم کی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کرنا حج مبرور ہے۔

"وقال الفراء هو الذی لم یعص اللہ سبحانه بعدہ"

حج کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کرنا حج مبرور ہے۔

یہ دونوں قول درحقیقت علامہ محی الدین ابن عربی رحمہ اللہ کے ہیں۔ پہلا قول فقہاء کرام نے نقل کیا ہے اور دوسرا قول فراء نے نقل کیا ہے۔

"قلت الحج المبرور هو الذی لم یعص اللہ سبحانه فیه لا بعدہ"

قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک دونوں قولوں کا مجموعہ معتبر ہے، یعنی حج مبرور یہ ہے کہ دوران حج بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کرے اور بعد میں بھی نافرمانی نہ کرے۔

"قال الحسن الحج المبرور هو ان یرجع صاحبه زاهدا فی الدنیا راغبا فی الآخرة"

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حج مبرور یہ ہے کہ حج کرنے والا جب حج کر کے لوٹے تو دنیا میں زاہد ہو اور آخرت کی طرف رغبت کرنے والا ہو۔ (قرطبی)

مندرجہ بالا بحث سے ایک اور مسئلہ سمجھ آیا:

اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ حج سے تمام صغائر اور کبائر گناہ معاف ہو جاتے ہیں یا کہ صرف صغائر معاف ہوتے ہیں اور کبائر توبہ سے معاف ہوتے ہیں۔

علامہ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب حدیث شریف مطلقاً گناہوں کے معاف ہونے کا ذکر ہے تو صغائر سے مقید نہ کیا جائے۔

علامہ ملاعلی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حج سے صرف صغائر گناہ معاف ہوتے ہیں کبائر صرف توبہ سے معاف ہوتے ہیں۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ کی بحث سے راقم کو دونوں قولوں میں محاکمہ سمجھ آیا کہ حج مبرور سے تو تمام صغائر اور کبائر گناہ معاف ہوتے ہیں لیکن حج مبرور میں توبہ یقینی طور پر پائی گئی کہ دوران حج بھی معصیت سے باز رہا اور بعد میں بھی گناہ نہ کیا اسی کا نام توبہ ہے، توبہ کے بعد غلطی سے گناہ ہو جانے پر توبہ کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔

اگر دوران حج کوئی لغزش ہوگئی یا بعد میں کوئی لغزش ہوگئی تو اس حج سے صرف صغائر گناہ معاف ہوں گے، کبائر کے لئے توبہ کی ضرورت ہوگی۔

"وَلَا جِدَالَ" (اور نہ جھگڑا)، یعنی حالت احرام میں کسی سے کوئی جھگڑا نہ کرے۔

جدال کا لغوی معنی ہے بٹنا۔ "زمام مجدول و جدیل" بٹی ہوئی رسی کو کہا جاتا ہے۔ پھر جھگڑا کرنے کو بھی جدال کہا جاتا ہے کیونکہ دو جھگڑا کرنے والوں میں سے ہر ایک دوسرے کی رائے کو بٹنا چاہتا ہے کہ اس کی رائے پیچ دار ہو جائے اور میری رائے غالب ہو جائے۔ (از کبیر)

(ولا جدال) ھو مقابلة الحجة بالحجة لنصرة الباطل و اما لنصرة الحق فلا بأس بذلک"

(صاوی)

یہاں جس جدال سے منع کیا گیا ہے اس سے مراد ایک دوسرے کے خلاف باطل طریقہ سے حجت بازی ہے، ورنہ دین کی خاطر ایک دوسرے سے بحث کرنا تاکہ حق راہ سمجھ آجائے اس میں کوئی حرج نہیں۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے اس مسئلہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے، آپ فرماتے ہیں۔

"واما جمهور المتکلمین فانهم قالوا الجدال فی الدین طاعة عظیمة"

دین میں ایک دوسرے کے خلاف حجت قائم کرنا بہت بڑی نیکی ہے۔

اس لئے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا۔

" ادع الی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن"

دعوت دیں اپنے رب کی راہ کی حکمت سے اور اچھی نصیحت سے اور ان سے اچھے طریقہ سے مجادلہ کریں۔

اور نوح علیہ السلام کی قوم نے جو آپ کو کہا رب تعالیٰ نے اسے بیان فرمایا۔

" یانوح قدجادلتنافاکثرت جدالنا"

اے نوح تم نے ہمارے ساتھ جھگڑا کیا پھر زیادہ ہی تم جھگڑا کر چکے ہو۔

" ومعلوم انه ماکان ذلک الجدال الالتقریر اصول الدین"

اور ان آیات سے یقینی طور پر معلوم ہو گیا کہ یہ جدال صرف اصول دین کو ثابت کرنے کے لئے تھا جو جائز اور عبادت عظیمہ تھا۔

جب یہ ثابت ہوا کہ رب تعالیٰ نے جدال سے منع بھی فرمایا اور جدال کا حکم بھی فرمایا اور جدال کی تعریف بھی کی تو ان آیات میں وجہ تطبیق کیا ہے؟ ان میں وجہ تطبیق یہ ہے۔

" فنحمل الجدل المذموم علی الجدل فی تقریر الباطل وطلب المال والجاه و الجدل الممدوح علی الجدل فی تقریر الحق ودعوة الخلق الی سبیل الله والذب عن دین الله تعالی" (کبیر)

ہم کہتے ہیں کہ جدل کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مذموم اور دوسرا ممدوح۔ جن آیات میں جدل سے منع کیا گیا ہے انکو ہم جدل مذموم (برے جھگڑے) پر محمول کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ جھگڑا کر کے باطل راہ کو ثابت کیا جائے، باطل طریقہ سے کوئی جھگڑا بھی ہوگا برا ہوگا خواہ مال کی طلب کے لئے ہو یا مرتبہ کے حصول کے لئے۔

اور جن آیات میں جھگڑا کرنے کی تعریف بیان کی گئی ہے ان سے مراد، جدل ممدوح (قابل تعریف جھگڑا) ہے۔

حق بات کے لئے دلائل قائم کر کے مجادلہ کرنا قابل تعریف ہے خواہ اس کا تعلق مخلوق کو اللہ کی راہ کی طرف بلانے سے ہو یا دین حق پر اٹھنے والے اعتراضات سے اس مجادلہ کا تعلق ہو۔

مختصر الفاظ، کثیر مطالب:

"ولا جدال" کا مطلب واضح کر دیا گیا ہے البتہ مختلف قسم کے واقع ہونے والے جھگڑوں کا ذکر کئی حضرات نے کیا جس سے بظاہر سمجھ آتا ہے کہ شائد ان اقوال میں اختلاف پایا گیا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں۔ کسی ایک واقعہ کا ذکر ایک صاحب نے کر دیا، دوسرے واقعہ کا ذکر دوسرے صاحب نے کر دیا۔

﴿۱﴾ جدال کی ایک وجہ کا ذکر حضرت بصری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے۔

" الجدال الذی یخاف منه الخروج الی السباب و التکذیب و التجهیل"

ایسا جھگڑا (بھی) منع ہے جس سے انسان گالیوں تک پہنچ جائے۔ اور دوسرے کو جھوٹا کہنے اور جاہل کہنے تک پہنچائے۔

﴿۲﴾ جدال کی دوسری وجہ محمد بن کعب قرظی نے بیان فرمائی ہے۔

" ان قریشا کانوا اذا اجتمعوا بمنی قال بعضهم حجنا اتم و قال آخرون بل حجنا اتم فنهاهم اللہ تعالی عن ذلک"

بیشک قریش جب منی میں جمع ہوتے تو بعض کہتے کہ ہمارا حج مکمل ہو گیا۔ دوسرے کہتے تھے کہ ہمارا حج مکمل ہو گیا۔ اللہ تعالی نے ان کو اس جھگڑے سے (بھی) منع فرمایا۔

﴿۳﴾ تیسری وجہ امام مالک رحمہ اللہ نے مؤطا میں بیان فرمائی ہے۔

" الجدال فی الحج ان قریشا کانو یقفون عند المشعر الحرام فی المزدلفة بقزح و

کان غیرھم یقفون بعرفات، وکانوا یتجادلون یقولون ھؤلاء نحن اصوب ویقول ھؤلاء نحن اصوب"

حج میں قریش مزدلفہ میں مشعرحرام کے پاس مقام قزح میں وقوف کر کے واپس آ جاتے اور دوسرے لوگ مقام عرفات میں قیام کر کے آتے۔ پھر قریش کہتے ہمارا حج درست طور پر ادا ہوا۔ دوسرے حضرات کہتے ہمارا حج صحیح ادا ہوا۔ ایک دوسرے سے اس جھگڑے سے رب تعالیٰ نے ان کو منع کیا۔

بلکہ قریش کو مقام عرفات میں وقوف کر کے لوٹنے کا حکم دیا جس کا ذکر ان شاء اللہ قریب ہی آ جائے گا۔

﴿۴﴾ جدال کی چوتھی وجہ قاسم بن محمد رحمہ اللہ نے بیان فرمائی۔

"الجدال فی الحج ان یقول بعضھم الحج الیوم وآخرون یقولون بل غدا"

کہ حج میں ان لوگوں کا جدال اس بات پر ہوتا کہ بعض لوگ ان میں سے یہ کہتے کہ حج آج ہے اور بعض لوگ کہتے حج کل ہے۔

ان کے اختلاف کی اصل وجہ یہ ہوتی کہ کچھ لوگ چاند دیکھ کر تاریخ کا تعین کرتے اور کچھ لوگ دنوں کی گنتی سے حساب لگاتے تھے، اسی وجہ سے ان کا عید میں بھی اختلاف ہوتا تھا کوئی کہتا آج عید ہے اور کوئی کہتا کل عید ہے، اس اختلاف سے اللہ تعالیٰ نے ان کو منع فرمایا۔ اور گویا رب تعالیٰ کی طرف سے ان کو یہ کہا گیا۔

" قدبینالکم ان الاھلۃ مواقیت للناس والحج فاستقیمواعلی ذلک ولاتجادلوافیہ من غیرھذہ الجھۃ"

کہ ہم نے جب تمہیں بتادیا ہے کہ تم اپنے اوقات اور حج کا حساب چاند سے لگاؤ تو تم تمام کو اسی پر قائم ہونا چاہئے اور چاند کے دیکھنے کے بغیر کسی اور وجہ سے حساب لگا کر ایک دوسرے سے جھگڑا نہ کرو۔

﴿۵﴾ قفال رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جدال کی وجہ یہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام کو عمرہ کر کے احرام کھولنے کا حکم دیا کہ حج کا احرام آٹھ ذی الحج کو باندھا جائے، صحابہ کرام نے بطور تعجب عرض کیا۔

" نروح الی منی ومذاکیرناتقطرمنیا"

یارسول اللہ اب ہم احرام کھول لیں اوراپنی ازواج سے جماع کرلیں، پھر ہم آٹھ ذی الحج کواحرام باندھ کرمنی میں پہنچ جائیں یہ تو عجیب حالت ہوگی کہ رات کوہم نے جماع کیا ہوگا صبح ہم منی میں جارہے ہوں گے۔

صحابہ کرام کے تعجب کی وجہ سے کلام کورب تعالیٰ نے جدال سے تعبیر فرمادیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔

" لواستقبلت من امری مااستدبرت ماسقت الهدی ولجعلتهاعمرة "

میں جب کسی کام کی طرف آگے بڑھتا ہوں تو پیچھے نہیں ہٹتا، میں نے اگرہدی اپنے ساتھ نہ چلائے ہوتی تو میں بھی عمرہ کرکے احرام کھول لیتا۔اورحج کا احرام بعد میں باندھتا۔

صحابہ کرام کاتعجب جاتارہا،انہوں نے پھرکوئی کلام نہ کیا۔

"وتر کوا الجدال حینئذ" گویا کہ انہوں نے اس وقت جھگڑا چھوڑ دیا۔

﴿۶﴾ عبدالرحمٰن نے ابن زید نے جدال کی وجہ یہ بیان کی۔

" جدالهم فی الحج بسبب اختلافهم فی ایهم المصیب فی الحج لوقت ابراهیم علیه السلام"

کہ ان لوگوں کااختلاف اس میں ہوتا تھا کہ کوئی کہتا جس موسم میں ہم نے حج کیا ابراہیم علیہ السلام کاحج بھی اس وقت میں تھا،کوئی کہتے نہیں ہم نے ابراہیم علیہ السلام کے حج کرنے کے وقت کوپایا تھارب تعالیٰ نے ان کواس جھگڑے سے منع فرمایا کہ حج کاتعلق تو چاند سے ہے گرمیوں سردیوں سے تونہیں۔

﴿۷﴾ " انهم کانومختلفین فی السنین فقیل لهم لاجدال فی الحج "

ان کااختلاف سالوں میں ہوتا تھا، بلکہ وہ حج ہمیشہ موسم بہار میں کرتے تھے، زمانہ جاہلیت کی اس رسم کومٹادیا گیا کہ حج میں جھگڑانہ کرو۔

اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا۔

" الاان الزمان قداستدار کهیئة یوم خلق اللہ السماوات والارض"

خبردار! بیشک زمانہ اپنی پہلی ہیئت کی طرف لوٹ کر آ گیا جو ہیئت اسے زمین وآسمان کی تخلیق کے دن حاصل تھی۔ (اس جھگڑے سے بھی منع کیا گیا)۔ (از کبیر)

حاصل کلام:

" والمرادبالرفث الجماع ومقدماته وقول الفحش،وان یرادبالفسوق جمیع انواعه وبالجدال جمیع انواعه لان اللفظ مطلق ومتناول لکل هذه الاقسام"

آیۃ کریمہ میں تین چیزوں سے منع کیا گیا ہے۔رفث،فسق اور جدال سے۔تینوں الفاظ اپنی اپنی تمام قسموں کو شامل ہیں کیونکہ ان کو مطلق ذکر کیا گیا ہے جس کا تقاضا ہے کہ تمام اقسام کو شامل ہو۔

"رفث" جماع اور مقدمات جماع یعنی چھونے،بوسہ لینے،عورتوں کے سامنے صحبت کے ذکر اور فحش کلام کو شامل ہے۔"فلا رفث" کہہ کر ان تمام چیزوں سے دوران حج منع کر دیا گیا۔

"فسق" اپنی تمام قسموں کو شامل ہے۔"ولا فسوق" کہہ کر دوران حج تمام قسم کے گناہوں سے منع کر دیا گیا۔

"جدال" بھی اپنی تمام قسموں کو شامل ہے۔"ولا جدال" کہہ کر ہر قسم کے باطل جھگڑے سے منع کر دیا گیا ہے۔ (از کبیر)

سوال: فسق اور جھگڑا تو ہر حال میں منع ہے۔حج کے دوران ممانعت کا کیا مطلب ہے؟

جواب: "وهذه الاموروان کانت قبیحة واجبة الاجتناب فی کل حال الاانهافی حال الحج اقبح واشنع کلبس الحریرفی الصلوة والتطریب فی قرأة القرآن "

اگر چہ یہ کام ہر حال میں قبیح (برے) ہیں،ان سے اجتناب ضروری ہے،مگر حج میں زیادہ ہی برے

ہیں، جس طرح ریشم کا کپڑا پہننا مرد کے لئے ہر حال میں گناہ ہے لیکن نماز میں زیادہ ہی گناہ ہے۔اوراسی طرح قرآن کو عجیب سریلی آواز میں پڑھنا ہر حال میں قبیح ہے لیکن نماز میں اور ہی زیادہ قبیح ہے۔

" التطریب المنهی عنه مایفعله قراء زماننابین یدی الوعاظ فی المجالس من الالحان العجیبة"

عجیب وغریب طرز جو ہمارے زمانے میں واعظین کی مجالس میں لگائی جاتی ہے، وہ منع ہے، اس طرح پڑھنا قبیح ہے۔

" واماتحسین القرأة ومدهافهومندوب الیه قال ﷺ"حسنواالقرآن باصواتکم فان الصوت الحسن یزیدالقرآن حسنا"

ہاں البتہ قرآن پاک کو تجوید کے مطابق اچھی طرح پڑھنا، جہاں مد کی ضرورت ہو وہاں مد کرنا مستحب ہے، اسی کی طرف نبی کریم ﷺ کا ارشادگرامی راہنمائی کررہا ہے کہ ’’قرآن پاک کو اچھی آوازوں سے پڑھو بیشک اچھی آواز قرآن پاک میں حسن پیدا کرتی ہے۔ (شیخ زادہ)

دینی طلبائے کرام توجہ فرمائیں:

" فلارفث ولافسوق ولاجدال" تینوں مقامات میں لانفی جنس کا ہے اور یہ تینوں الفاظ مبنی برفتحہ ہیں۔
اور پہلے دونوں پر ایک قرأت میں رفع بھی پڑھا گیا ہے، تقدیر عبارت کی یہ ہے۔

"لایکن رفث ولافسوق"

" والافعال الثلاثة وان کانت خبراعلی صورةالنفی بمعنی ان شیأمنهالایقع فی خلال الحج الاانه المرادبهاالنهی لان ابقاء هاخبراعلی ظاهرهایستلزم الخلف فی خبر الله للعلم بان هذه الاشیاء کثیرماتقع فی خلال الحج"

جن تین کاموں سے منع کیا گیا ہے وہ اگر چہ خبر ہیں یعنی نفی ان میں پائی گئی ہے جن کا ظاہری معنی یہ ہے کہ حج میں کوئی رفث اور کوئی فسق اور کوئی جھگڑا نہیں پایا گیا۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان چیزوں کا وقوع تو ہوتا رہتا ہے تو یہ معنی لینے سے اللہ تعالیٰ کے کلام میں کذب لازم آئے گا، اس لئے بظاہر ان میں نفی ہے لیکن مراد ان میں نہی ہے کہ یہ کام حج میں نہ کرو۔ البتہ حکم میں زور دینے کے لئے نفی کی صورت میں نہی کو ذکر کر دیا گیا۔ (از شیخ زادہ)

تین چیزوں سے ممانعت کی حکمت:

علوم عقلیہ میں یہ بات ثابت ہے کہ انسان میں چار قوتیں پائی جاتی ہیں۔

﴿۱﴾ قوۃ شھوانیہ بھیمیۃ (چوپایوں کی طرح شہوت والی قوت)

﴿۲﴾ قوۃ غضبیہ سبعیۃ (درندوں کی طرح غضب والی قوت)

﴿۳﴾ قوۃ وھمیۃ شیطانیۃ (شیطانوں کی طرح وہم والی قوت)

﴿۴﴾ قوۃ عقلیہ ملکیۃ (فرشتوں کی طرح عقل والی قوت)

"والمقصود من جمیع العبادات قھر القوی الثلاثۃ اعنی الشھوانیۃ والغضبیۃ والوھمیۃ"

تمام عبادات کا مقصد تین قوتوں یعنی شہوانیہ، غضبیہ اور وہمیہ پر قہر کرنا ہے کہ یہ دب کر رہیں اور قوت ملکیہ ان پر غالب رہے۔

"فلا رفث" ارشاد فرما کر قوت شہوانیہ پر قہر کیا گیا کہ جماع یا جماع کے اسباب سے منع کر دیا گیا۔ غرضیکہ عورتوں کے سامنے صرف صحبت (جماع) کے ذکر کی بھی ممانعت کر دی گئی کیونکہ یہ بھی جماع تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔

ہاں ایک بات یہ ذہن میں رہے کہ حج یا عمرہ کے احرام کے آگے پیچھے اپنی ازواج سے جماع یا جماع کے اسباب پر عمل کرنا جائز ہے صرف ناجائز طریقہ پر عمل کی ممانعت ہے۔ لیکن حج میں طواف زیارت سے فارغ ہونے تک اپنی ازواج سے بھی یہ منافع حاصل کرنے سے منع کر دیئے گئے تا کہ نفس کی قوت شہوانیہ کو مکمل طور پر دبایا جا سکے۔

"ولافسوق" کہہ کر انسان میں پائی جانے والی قوت غضبیہ پر قہر کیا گیا۔ کیونکہ درندے اپنے غیظ و غضب کی وجہ سے اور اپنی سرکشی کی وجہ سے دوسرے جانوروں کو چیر پھاڑ دیتے ہیں، اسی قوت کی وجہ سے ہی انسان بھی سرکش ہو جاتا ہے، فرعونیت اس کے ذہن پر سوار ہو جاتی ہے۔ اس لئے انسان کو ہمیشہ ہر قسم کے گناہوں سے باز رہنے کا حکم دے کر اور بالخصوص دوران حج برائیوں سے منع کر کے قوت غضبیہ کو دبایا گیا۔

"ولاجدال" کہہ کر قوت وہمیہ پر قہر کیا گیا، کیونکہ قوت وہمیہ کی وجہ سے انسان اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں اور اس کے افعال و احکام میں، اور اس کے اسماء میں جھگڑا شروع کر دیتا ہے۔

اور پھر یہی وہم اس کو انسانوں کے ساتھ جھگڑا کرنے پر ابھارتا ہے یہاں تک کہ وہ بات بات پر ہر کسی سے جھگڑا کرتا رہتا ہے۔ اس لئے ہر حال میں عمومی طور پر اور دوران حج خصوصی طور پر جھگڑا کرنے سے منع کر کے قوت وہمیہ کو دبایا گیا ہے۔

"فلما كان منشأ الشر محصورا فى هذه الامور الثلاثة لاجرم قال (فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فى الحج)"

جب تمام قسم کے شر ان تینوں چیزوں کی وجہ سے ہی پائے جاتے ہیں تو ان تینوں سے ہی دوران حج خصوصی طور پر اس آیۃ کریمہ میں منع کیا گیا ہے۔

مقصد عظیم:

"فمن قصد معرفة الله ومحبته والاطلاع على نور جلاله والانخراط فى سلك الخواص من عباده فلا يكون فيه هذه الامور وهذه اسرار نفيسة هى المقصد الاقصى من هذه الآيات فلا ينبغى ان يكون العاقل غافلا عنها ومن الله التوفيق فى كل الامور"

جو شخص اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا چاہے، اور اس سے محبت کرنے کا ارادہ رکھے، اور اس کے نور جلال پر مطلع ہونا چاہے، اور اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کی سلک (ڈوری) میں اپنے آپ کو پرونا چاہے تو اس میں یہ تینوں چیزیں جن سے منع کیا گیا ہے نہ پائی جائیں۔

ان آیات سے حاصل ہونے والے یہ نفیس قسم کے اسرار اور مقاصد اعلیٰ ہیں، عقلمند انسان کو چاہئے کہ ان سے غافل نہ رہے، تمام امور میں اللہ تعالیٰ کی توفیق حاصل کرنے کی دعاء کرتا رہے۔ (از کبیر)

اے میرے رب مولائے کائنات اپنے عاجز بندے کو اپنا قرب عطا فرما دے۔ تیری رحمت سے کچھ دور نہیں۔

(فی الحج) "فی ایامه" یعنی عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ اور فسق اور جھگڑا نہ ہو حج کے دنوں میں۔ یعنی "فی الحج" کا مطلب ہے۔ "فی ایام الحج" (بیضاوی)

گذشتہ سے پیوستہ:

قرآن پاک میں فرض کا لفظ پانچ معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

" الاول فرض بمعنی اوجب" پہلا فرض بمعنی واجب کرنے کے استعمال ہوا جیسا کہ اس زیر بحث آیۃ کریمہ میں ہے۔

"فمن فرض فیهن الحج" جس شخص نے اپنے آپ پر ان دنوں میں حج واجب کیا (لازم کیا)

اسی طرح "فنصف مافرضتم" میں بھی فرض بمعنی واجب کرنے کے استعمال ہوا ہے۔

"الثانی فرض بمعنی بین" دوسرا معنی فرض کا بیان کرنا۔ واضح کرنا۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا۔

"قدفرض اللہ لکم تحلة ایمانکم" تحقیق اللہ تعالیٰ نے تم پر واضح کر دیا ہے قسموں کا کھولنا۔

یعنی اگر معصیت کی قسم اٹھا دی جائے تو اس قسم کو توڑ کر اس کا کفارہ دینے کا حکم واضح طور پر بیان کر دیا گیا۔

اسی طرح یہی معنی مراد ہے۔ "سورة انزلناها وفرضناها" سورت کو ہم نے نازل کیا اور اسے ہم نے بیان کیا۔

"والثالث فرض بمعنی احل" تیسرا فرض کا معنی ہے حلال کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"ماکان علی النبی من حرج فیمافرض اللہ"

نبی پر کوئی حرج نہیں اس چیز میں جو اللہ نے اس کے لئے حلال کی۔

"والرابع فرض بمعنی انزل" فرض کا چوتھا معنی ہے نازل کرنا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"ان الذی فرض علیک القرآن" بیشک وہ ذات جس نے تم پر قرآن نازل کیا۔

"والخامس بمعنی الفریضة" پانچواں معنی فرض کا حصہ مقرر کرنا۔ جیسا کہ وراثت کے مسائل میں اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا۔ "فریضة من اللہ" اللہ تعالیٰ کی طرف سے (وراثت میں ہر وارث کا) حصہ مقرر ہے۔

"وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ یَّعْلَمْهُ اللّٰهُ"

اور جو تم کرو بھلائی جانتا ہے اسے اللہ۔

اللہ تعالیٰ نے تین چیزوں سے منع فرمایا جو تمام شرامور کا سبب ہیں، اس کے بعد ان الفاظ مبارکہ کے ذریعے

"رغب فی کل الطاعات فهوحث علی فعل الخیر"

ہر قسم کی نیکی کی طرف رغبت دلائی گئی اور نیکی کے کاموں پر برانگیختہ کیا گیا ہے۔

"فیدخل فیه استعمال الکلام الحسن مکان القبیح والبر والتقوی مکان الفسوق والوفاق والاخلاق الجمیلة مکان الجدال"

ان الفاظ مبارکہ سے یہ واضح کیا گیا ہے کہ قبیح کلام کو چھوڑ دو اس کی جگہ اچھا کلام لاؤ۔

اچھا کلام اپنے معنی میں وسعت رکھتا ہے۔ قرآن پاک پڑھنا، تسبیح و تحمید، تکبیر و تہلیل، وعظ و نصیحت، نعت خوانی وغیرہ ہر قسم کا اچھا کلام ذکر کرنا اس میں آ گیا۔

اور یہ بتایا گیا کہ فسق کو چھوڑ کر نیکی اور تقویٰ کو اختیار کرو۔ یعنی ہر قسم کے گناہوں سے اجتناب کرو اور ہر قسم کے نیکی کے کام کرو۔

اور یہ فرمایا گیا کہ ہر قسم کے جھگڑے کو چھوڑ دو اور اخلاق جمیلہ سے کام لو اور ایک دوسرے سے محبت و اتفاق سے در پیش آؤ۔ (سبحان اللہ قرآن پاک کا یہی کمال ہے کہ مختصر الفاظ کتنے عظیم مطالب کو شامل ہوتے ہیں)۔ (از روح البیان)

ذکر خیر میں حکمت:

انسان خواہ عمل خیر کرے یا عمل شر، اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ لیکن رب تعالیٰ نے اچھے کام کے متعلق فرمایا کہ جو تم بھلائی کرو، اچھا کام کرو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے، یہ نہیں فرمایا کہ تم اچھا کام کرو یا برا کام کرو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے۔

اس میں عجیب حکمت یہ پائی گئی ہے۔

" اذاعلمت منک الخیر ذکرته وشهرته، واذاعلمت منک الشرسترته واخفیته لتعلم انه اذاکانت رحمتی بک فی الدنیاهکذافکیف فی العقبی"

کہ گویا اللہ تعالیٰ کے فرمان کا یہ مطلب ہے کہ جب میں تمہارے اچھے اعمال کو دیکھوں گا تو اس کا ذکر کروں گا اور اسے مشہور کروں گا، اور جب تمہارے برے اعمال کو دیکھوں گا تو ان کی پردہ پوشی کروں گا اور ان کو مخفی رکھوں گا۔ تاکہ تجھے معلوم ہو جائے جب میری رحمت تجھ پر دنیا میں یہ ہے تو آخرت میں میری رحمت کتنی عظیم ہوگی۔

اور حکمت یہ ہے کہ بادشاہ جب اپنے مطیع غلام کو یہ کہتا ہے کہ میری وجہ سے جو مشقت تم اٹھاتے ہو اور جو تم خدمت کرتے ہو میں اسے جانتا ہوں اور اس پر مطلع ہوں "کان هذاوعداله بالثواب العظیم" تو بادشاہ کی جانب سے یہ کہنا کہ میں جانتا ہوں یہ عظیم اجر کا وعدہ ہے۔

اور اگر سرکش غلام کو یہ کہا جائے کہ میں تمہارے اعمال کو جانتا ہوں تو "کان توعدابالعقاب الشدید" یہ شدید سزا کی دھمکی ہے۔

"ولماکان الحق سبحانه اکرم الاکرمین لاجرم ذکرمایدل علی الوعدبالثواب ولم یذکرمایدل علی الوعیدبالعقاب"

اللہ تعالیٰ جب کہ اکرم الاکرمین (سب سے زیادہ کرم کرنے والا) ہے تو اس نے اپنی شان کریمی کے مطابق بھلائی کے کاموں کے جاننے کا ذکر فرمایا جو باعث ثواب ہیں۔ برے کاموں کے جاننے

کا ذکر نہیں فرمایا جو باعث عذاب ہیں اور دھمکی پر دلالت کرنے والے الفاظ ذکر نہیں فرمائے۔

اور وجہ یہ ہے کہ جبرئیل نے جب رسول اللہ ﷺ سے پوچھا" ماالاحسان "احسان کیا ہے؟

تو آپ نے ارشاد فرمایا۔

" الاحسان ان تعبداللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک"

احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو کہ تم اسے دیکھ رہے ہو، اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو بیشک وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

جب بندے پر واضح کر دیا گیا ہے کہ وہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے تو گویا کہ یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ وہ مالک الملک تمہارے اعمال پر مطلع ہے تو تمہیں اس کی فرمانبرداری میں کوشش کرنی چاہئے کیونکہ خادم کو جب معلوم ہو کہ میرے اعمال پر میرا مخدوم مطلع ہے تو وہ " کان احرص علی العمل و اکثر التذاذابہ" زیادہ کام کرنے پر حریص ہوتا ہے اور زیادہ لذت محسوس کرتا ہے، اسی طرح اے انسان تجھے بھی چاہئے کہ تو اپنے کریم مالک کی فرمانبرداری کر اور نافرمانی نہ کر کیونکہ وہ تیری بداعمالیوں کو ظاہر نہیں کرتا تیرے اچھے اعمال کا چرچا کرتا ہے۔

(ماخوذ از کبیر)

"وَتَزَوَّدُوْافَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى"

اور توشہ ساتھ لو، بیشک بہتر توشہ پرہیزگاری ہے۔

شان نزول:

ان الفاظ مبارکہ کے شان نزول کی ایک وجہ یہ ہے جو حضرت ابن عمر اور مجاہد اور قتادہ اور ابن زید رضی اللہ عنہم نے بیان فرمائی ہے۔

" نزلت الآیۃ فی طائفۃ من العرب کانت تجی الی الحج بلازادو یقول بعضھم کیف نحج بیت اللہ و لایطعمنافکانوا یبقون عالۃ علی الناس فنھوا عن ذلک و امروا بالزاد"

کہ یہ آیۃ کریمہ عرب کے ایک گروہ کے متعلق نازل ہوئی جو حج کے لئے بغیر توشہ کے آجاتے، پھر ان میں سے کچھ کہتے ہم حج بیت اللہ کیسے کریں کہ ہمیں کوئی طعام کھلاتا ہی نہیں، اس طرح وہ لوگوں پر بوجھ بن جاتے۔ ان کو اس سے منع کیا گیا ہے اور زادراہ (راستے کا اور وہاں کا خرچ) ساتھ لینے کا حکم فرمایا۔ (قرطبی)

☆ عن ابن عباس قال کان اهل الیمن یحجون فلایتزودون ویقولون نحن متوکلون فاذا قدموا مکة سألوا الناس " (رواه البخاری)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یمن کے کچھ لوگ حج کے لئے آتے تھے اور اپنا خرچ ساتھ نہیں رکھتے تھے، اور کہتے یہ تھے کہ ہم توکل کرنے والے ہیں، جب وہ مکہ میں آجاتے تو لوگوں سے مانگنا شروع کردیتے تھے۔

" وقال البغوی انمایفضی حالهم الی النهب والغصب فانزل الله تعالی وتزودوا"

علامہ بغوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ وہ کبھی تنگ حالی کی وجہ سے دوسرے کا مال چھین لیتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ میں " وتزودوا " کے الفاظ مبارکہ کو نازل فرمایا کہ اپنا خرچ ساتھ رکھو۔

(مظهری، البحر المحیط)

☆ قال رجل لاحمدبن حنبل اریدان اخرج الی مکة علی التوکل بغیرزاد، فقال له احمد اخرج فی غیر القافلة فقال لا، الامعهم، قال فعلی جرب الناس توکلت (جرب جمع جراب ای وعاء)

ایک شخص نے حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کو کہا کہ میں مکہ میں جانے کا ارادہ رکھتا ہوں، لیکن بغیر خرچ ساتھ لے جانے کے توکل پر جانا چاہتا ہوں، آپ نے فرمایا بغیر کسی قافلہ کے ساتھ جانے کے اکیلے چلے جاؤ۔

اس نے کہا میں اکیلے تو نہیں جاسکتا قافلے کے ساتھ ہی جاؤں گا۔ تو آپ نے فرمایا کیا تم لوگوں کے توشہ دانوں پر توکل کرنا چاہتے ہو۔ (قرطبی)

☆ ابوالفرج ابن جوزی کہتے ہیں۔

" وقد لبّس ابلیس علی قوم یدعون التوکل فخرجوا بلازاد وظنوا ان ھذا ھو التوکل و ھم علی غایة الخطاء"

بعض لوگوں کو ابلیس اس دھوکے میں مبتلاء کر دیتا ہے کہ وہ توکل کا دعوی کریں، بغیر خرچ کے گھر سے نکل جائیں لیکن ان کا اسے توکل سمجھنا غلطی ہے۔ (از قرطبی)

ابن عربی کا شاندار موقف:

" قال ابن العربی امر اللہ بالتزود لمن کان له مال و من لم یکن له مال فان کان ذا حرفة تنفق فی الطریق او سائلا فلا خطاب علیه "

ابن عربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی نے زادِ راہ ساتھ لینے کا جو حکم فرمایا اس کا تعلق مالدار لوگوں کے لئے ہے جن کے پاس مال ہوتا تھا لیکن مال وہ اپنے گھر ہی چھوڑ کر چل پڑتے کہ ہم بغیر مال کے حج کرنے جا رہے ہیں کہ ہم متوکل ہیں، لیکن اگر کوئی شخص کسی فن کو جانتا ہے اور وہ اپنا کاروبار راستے میں کرتا ہے اور اپنا خرچ اپنے کسب سے چلا رہا ہے یا ایک انسان مالدار ہی نہیں وہ صرف سوال کے ذریعے ہی اپنا گذر اوقات چلا رہا ہے، یعنی محنت و مزدوری کے قابل نہیں تو وہ اس حکم میں نہیں آتے، ان کا بغیر خرچ ساتھ لئے گھر سے نکلنا رب تعالی کے حکم کی عدولی نہیں۔

(قرطبی و ابن عربی)

دینی طلبائے کرام توجہ فرمائیں:

" تزودوا" باب تفعل ہے، زاد یزود، قال یقول کے وزن پر ہے جس طرح قال سے باب تفعل تقول ہے، اسی طرح زاد سے باب تفعل تزود ہے۔

بہتر زادراہ تقوی ہے:

" والتقوی فی عرف الشرع والقرآن عبارۃ عن فعل الواجبات وترک المحظورات"

قرآن پاک سے ثابت ہے کہ شریعت میں تقوی یہ ہے کہ واجب کاموں پر عمل کرے اور ممنوع کاموں کو چھوڑ دے۔

پہلے معصیت کے کاموں سے منع کیا، اب مکمل طور پر تقوی کرنے کا حکم دیا کہ ممنوعات سے رکنا بھی ضروری ہے اور واجبات پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔

دو سفر اور دو زادراہ:

سفر کی دو قسمیں ہیں، ایک "سفر فی الدنیا" اور دوسرا "سفر من الدنیا"

دنیا میں سفر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ کھانے پینے کی اشیاء اپنے ساتھ رکھے اور سواری ہو سفر کے لئے اور اپنے ساتھ مال رکھے۔

اور دنیا سے سفر کے لئے بھی زادراہ ضروری ہے۔

" وھو معرفۃ اللہ ومحبتہ والاعراض عماسواہ"

وہ زادراہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو اور اس کی محبت حاصل ہو اور اس کے سواء اور چیزوں سے اعراض کرے۔

تقوی کی بہتری کی وجوہ:

جب یہ واضح ہو گیا کہ تقوی آخرت کا توشہ ہے اور ظاہری اسباب اور مال دنیا کا توشہ ہے تو بہت واضح ہے کہ آخرت کا توشہ دنیا کے توشہ سے اعلیٰ ہے۔ تاہم اس کی چند وجوہ ذکر کی جارہی ہیں۔

" ان زادالدنیا یخلصک من عذاب موھوم وزادالآخرۃ یخلصک من عذاب متیقن"

بیشک دنیا کا توشہ ان تکالیف سے بچاتا ہے جن کے متعلق صرف گمان ہوتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اگر میں اپنے ساتھ خرچ نہ لے کر گیا تو مجھے تکالیف کا سامنا نہ کرنا پڑے، لیکن اخروی عذاب تو یقینی ہے فقط وہمی نہیں، لہٰذا اپنے ساتھ تقویٰ کو بطور زادراہ رکھے، کیونکہ یہ یقینی عذاب سے بچاتا ہے۔

﴿۲﴾ "ان زادالدنیایخلصک من عذاب منقطع وزادالآخرة یخلصک من عذاب دائم"

بیشک دنیا کا زادراہ تمہیں اس عذاب سے بچائے گا جس نے ختم ہو جانا ہے، کیونکہ جب دنیا نے ختم ہو جانا ہے بلکہ دنیا کے اختتام سے پہلے انسان نے خود فوت ہو جانا ہے تو دنیاوی تکالیف نے بھی ختم ہو جانا ہے۔

لیکن اخروی زادراہ نے اس عذاب سے بچانا ہے جو عذاب نہ ختم ہونے والا ہے، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قائم رہے گا، تاہم مؤمنین کو ایمان کا توشہ ساتھ لے جانے کی وجہ سے آخر کار نجات حاصل ہونی ہے اور تقویٰ کا توشہ ساتھ لے جانے کی وجہ سے رب تعالیٰ کی رحمت سے عذاب نہ ہونے کی نعمت حاصل ہوگی۔"ان شاء اللہ"

﴿۳﴾ "ان زادالدنیایوصلک الی لذة ممزوجة بالآلام والاسقام والبلیات ، وزادالآخرة یوصلک الی لذات باقیة خالصة عن شوائب المضرة آمنة من الانقطاع والزوال"

بیشک دنیا کے زادراہ میں جہاں لذات ہیں وہاں اس میں درد، بیماریاں اور مصیبتیں بھی ہیں، اور زادآخرت سے وہ لذات حاصل ہوتی ہے جو باقی رہنے والی ہیں اور نقصان پہنچانے سے پاک وصاف ہوتی ہیں۔اور وہ نہ ختم ہونے والی ہیں۔

﴿۴﴾ "ان زادالدنیایوصلک الی الدنیاوھی کل ساعة فی الادبار والانقضاء وزادالآخرة یوصلک الی الآخرة وھی کل ساعة فی الاقبال والقرب والوصول"

بیشک دنیا کا توشہ دنیا تک پہنچاتا ہے، دنیا کی ہر گھڑی پیچھے کی طرف جارہی ہے اور دنیا کا ہر لمحہ اختتام کی طرف جارہا ہے، یہ علیحدہ بات ہے کہ انسان اپنی عمر کے گھٹنے کو بڑا ہونا سمجھ رہا ہے اور پستی

کوترقی کا نام دے رہا ہےاورزوال کی طرف توجہ نہ کرنے کی وجہ سے دنیا کوہی سب کچھ سمجھ رہا ہے۔
لیکن آخرت کا توشہ آخرت کی طرف لے جانے والا ہےاس کی ہر گھڑی آگے کی طرف جائے گی۔اورانسان کورب تعالٰی کا قرب حاصل ہوگا۔اورخوش قسمت لوگ واصل الی اللہ (رب کو پالینے کا درجہ حاصل کرنے والے) ہوں گے۔

۵ ان زادالدنیایوصلک الی منصة الشهوة والنفس وزادالآخرة یوصلک الی عتبة الجلال والقدس"
دنیا کا توشہ تجھے خواہشات نفسانیہ عطاء کرے گااورآخرت کا توشہ تمہیں مالک الملک کے دربار کی دہلیز تک پہنچائے گا۔

ان تمام وجوہ سے واضح ہوگیا کہ اگر چہ دنیا کا توشہ بھی ساتھ رکھنا ضروری ہے لیکن آخرت کا توشہ تقوی ہی بہتر ہےاورمقصود ہے۔

اعشی شاعر نے بہت ہی خوبصورت طریقہ سےاس مفہوم کو بیان کیا ہے۔

اذاانت لم ترحل بزادمن التقی ولاقیت بعدالموت من قدتزودا
ندمت علی ان لاتکون کمثله وانک لم ترصد کماکان ارصدا

جب تو دنیا سے تقوی کا توشہ ساتھ لے کر کوچ نہیں کرے گا۔
تو تیری ملاقات ایسے شخصوں سے ہوگی جن کے پاس تقوی کا توشہ ہوگا۔
تو نادم ہوگا کہ تو ان شخصوں کی طرح نہیں۔
اس لئے کہ تیرے پاس وہ رصد نہیں ہوگی جو ان کے پاس ہوگی۔ (ازکبیر)

"وَاتَّقُونِ يٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ" اورڈرو مجھ سے اے عقل والو!

یعنی عقل کا تقاضا ہے کہ انسان اللہ تعالٰی سے ڈرے اورتقوی اختیار کرے۔ پہلے تقوی کا ذکر کر کے اس پر برانگیختہ کیا۔

" ثم امرهم بان یکون المقصود بها هو الله فیتبروا عن کل شیٔ سواہ وهو مقتضی العقل المعری عن شوائب الهوی"

پھران کوحکم دیا کہ اصل مقصد تمہارا اللہ تعالیٰ ہے۔ اس لئے تم اللہ تعالیٰ کے بغیر تمام چیزوں سے اپنے آپ کو بیزار سمجھو۔

ہاں یہ منصب اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جو خواہشات کے شائبہ سے اپنی عقل کو دور رکھے۔ اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے عقل والوں کو خطاب کیا۔

" فانه من لم یتقه فکأنه لالب له"

جس شخص کو تقوی حاصل نہیں گویا کہ اسے عقل ہی حاصل نہیں۔

سبحان اللہ کامل عقل اولیاء کرام اور متقین حضرات کو ہی حاصل ہوتی ہے، ہمارے جیسے ہیچمدان صرف دعویدار ہی ہیں کہ ان کو عقل حاصل ہے۔

عقلمند شخص کے لئے ضروری ہے کہ اپنی عقل کو دنیاوی لغزشوں سے دور رکھے اور اپنے نفس کو مہذب کرے اور اپنے آپ کو اعلیٰ مراتب تک پہنچانے کی پوری پوری کوشش کرے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا۔

ولم ارفی عیوب الناس شیأ　　　کنقص القادرین علی التمام

میں نے لوگوں میں اس سے بڑھ کر کوئی عیب نہیں دیکھا۔

کہ کمال حاصل کرنے کی قدرت رکھنے کے باوجود ناقص ہی رہیں۔

حج کی تکمیل:

تین چیزوں کا حاصل کرنا ہر شخص کے لئے ضروری ہے اور حاجی کے لئے خاص کر کے اور ہی زیادہ ضروری ہے۔

﴿۱﴾ " الورع یحجزہ عن محارم اللہ"

انسان کوورع (تقوی سے بلند پرہیز گاری) حاصل ہو جس کی وجہ سے انسان ان چیزوں سے اپنے آپ کوروک کرر کھے جن کو اللہ تعالی نے حرام کیا ہے۔ بلکہ جن میں ناجائز ہونے کا شبہ ہوان سے بھی اجتناب کرے۔

﴿۲﴾ "وحلم یکف غضبه" اور بردباری رکھے جس کی وجہ سے اپنے غصہ کوروک کرر کھے۔

﴿۳﴾ "وحسن الصحابة لمن یصحبه من المسلمین" اپنے ساتھ مسلمان رفقاء سے اچھا سلوک رکھے۔

"فمن کملهافقد کمل حجه والافلا"

جس نے تینوں چیزوں کو کامل طور پر حاصل کرلیا اس کا حج مکمل ہو گیا، جو ان تین چیزوں کو مکمل نہ کر سکا اس کا حج بھی مکمل نہ ہوا۔

شیخ سعدی رحمہ اللہ نے کیا خوب فرمایا۔

ازمن بگوی حاجی مردم آزار را   کو پوستین خلق بآزار میدرد

حاجی تونیستی شتراست از برای آنکہ   بیچارہ خار میخوردو بار میبرد

لوگوں کو ستانے والے حاجی کو میری طرف سے کہہ دو۔ جو مخلوق کی ظلم سے چمڑی ادھیڑ رہا ہے۔

کہ تو حاجی نہیں اونٹ ہے۔ (بلکہ اس سے بھی گھٹیا ہے) اس لئے کہ وہ۔ بیچارہ کانٹے کھاتا ہے اور بوجھ اٹھاتا ہے۔

(ماخوذاز روح البیان)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

" اتقون" میں "اتقو" جمع مذکر مخاطب امر حاضر ہے، اصل میں "اوتقیوا" تھا، نون وقایہ ہے۔ اور یای متکلم ضمیر منصوب جو مفعول ہے محذوف ہے۔ اصل میں "اتقونی" ہے۔

☆☆☆☆☆

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلاً مِّنْ رَّبِّكُمْ . فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ . وَاذْكُرُوْهُ كَمَاهَدٰكُمْ . وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ (سورۃالبقرۃ آیت۱۹۸)

﴿۱﴾

تم پر کچھ گناہ نہیں کہ اپنے رب کا فضل تلاش کرو،تو جب عرفات سے پلٹو تو اللہ کی یادکرو مشعر حرام کے پاس اوراس کا ذکر کرو جیسے اس نے تمہیں ہدایت فرمائی ،اور بے شک اس سے پہلے تم بہکے ہوئے تھے۔

﴿۲﴾

نہیں ہے تم پر کچھ گناہ کہ تم طلب کرو فضل اپنے رب کا،تو جب لوٹو تم عرفات سے تو ذکر کرو اللہ کا مشعر حرام کے پاس اور ذکر کرو اس کا اس لئے کہ اس نے ہدایت دی تمہیں اور بیشک تم اس سے پہلے بھٹکے ہوئے تھے۔

شان نزول:

چند واقعات کے درپیش آنے کے بعد آیۃ کریمہ کا نزول ہوا۔جو احادیث میں مذکور ہیں۔

☆ ”عن ابن عباس قال كانت عكاظ ومجنة وذوالمجاز اسواقافى الجاهلية فلما كان الاسلام فكانهم تأثموا ان يتجروافى المواسم فنزلت“ (رواہ البخاری)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ عکاظ اور مجنہ اور ذوالمجاز بازار تھے زمانہ جاہلیت میں، جب اسلام آ گیا تو لوگوں نے حج کے دنوں میں تجارت کرنے کو گناہ سمجھا تو اس آیۃ کریمہ کا نزول ہوا کہ تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم حج کے دنوں میں اپنے رب کا فضل طلب کرو۔یعنی تجارت کے

ذریعے تم مال حاصل کرو تو یہ تمہارے لئے جائز ہے۔

خیال رہے کہ یہ تینوں بازار مکہ کے قریب حج کے دنوں میں لگائے جاتے تھے۔ ذیقعد کی پہلی تاریخ سے بیس تاریخ تک عکاظ بازار قائم ہوتا تھا۔ پھر ذیقعد کی اکیس تاریخ سے ذی الحج کی آٹھ تاریخ تک مجنہ (بفتح المیم وکسرھا) بازار قائم ہوتا تھا۔ پھر آٹھ ذی الحج کو ہی مقام عرفات کے قریب ذوالمجاز بازار قائم ہوتا تھا۔

عن ابی امامة التیمی قال کنت رجلا اکری فی هذاالوجه وکان الناس یقولون لی انه لیس لک حج فلقیت ابن عمرفقلت له یااباعبدالرحمن انی رجل اکری فی هذا الوجه وان اناسایقولون انه لیس لک حج فقال ابن عمرالیس تحرم وتلبی وتطوف بالبیت وتفیض من عرفات وترمی الجمار فقلت بلی قال فان لک حجا،جاء رجل الی رسول الله ﷺ فسأله عن مثل ماسألتنی عنه فسکت رسول الله ﷺ فلم یجبه حتی نزلت هذه الآیة "لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلامن ربکم"فارسل الیه رسول الله ﷺ وقرأها علیه وقال لک حج" (اخرجه ابوداؤد والترمذی)

حضرت ابوامامہ تیمی کہتے ہیں کہ میں حج کے دنوں میں اپنے اونٹ وغیرہ کو کرایہ پر دے دیتا تھا، لوگ مجھے کہتے کہ تمہارا حج نہیں، تو میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو ملا تو میں نے کہا اے ابوعبدالرحمٰن بیشک میں حج کے دنوں میں محنت ومزدوری کرتا ہوں اور لوگ کہتے ہیں کہ تمہارا حج نہیں (کیا وہ صحیح کہتے ہیں) تو ابن عمر نے فرمایا کیا تم احرام نہیں باندھتے، کیا تم تلبیہ نہیں پڑھتے، کیا تم بیت اللہ شریف کا طواف نہیں کرتے، کیا تم مقام عرفات پر جا کر نہیں لوٹتے، کیا تم جمرات کو کنکریاں نہیں مارتے؟ تو میں نے کہا یہ سارے کام تو میں کرتا ہوں، آپ نے فرمایا بیشک تمہارا حج ہے، پھر انہوں نے بتایا کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے اسی طرح آپ سے سوال کیا جیسا کہ تم نے مجھ سے سوال کیا۔ تو رسول اللہ ﷺ (وحی کی انتظار میں) خاموش رہے، آپ نے اسے کوئی جواب نہ دیا یہاں تک کہ یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے اس کی طرف پیغام بھیجا اسے یہ آیۃ کریمہ پڑھ کر سنائی گئی اور اسے بتایا گیا کہ تمہارا حج ہے۔ (از خازن)

☆ " عن ابن عباس قال کانوا یتقون البیوع والتجارة فی الموسم والحج یقولون ایام ذکر فانزل اللہ تعالی لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم" (رواہ ابو داؤد)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ لوگ حج کے دنوں میں خرید وفروخت اور تجارت سے دور رہتے کہ یہ صرف ذکر کے دن ہیں تو اس وقت یہ آیۂ کریمہ نازل ہوئی کہ "نہیں تم پر کچھ گناہ کہ تم طلب کرو فضل اپنے رب سے"

☆ " وعن ابی صالح مولی عمر قال قلت یاامیر المؤمنین کنتم تتجرون فی الحج قال و هل کانت معایشهم الافی الحج"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے غلام ابو صالح کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا اے امیر المؤمنین کیا تم حج کے دنوں میں تجارت کرتے تھے؟ آپ نے فرمایا ہاں لوگوں کا ذریعہ معاش ہی حج کی تجارت پر موقوف تھا۔ (از صاوی)

حج کے دنوں میں تجارت نہ کرنا افضل ہے:

" والحق ان التجارة وان کانت مباحة فی الحج الاان الاولی ترکها"

حق یہ ہے کہ تجارت کرنا حج کے دنوں میں جائز تو ہے لیکن تجارت نہ کرنا بہتر ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالی نے فرمایا۔

" وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین له الدین "

اور ان کو نہیں حکم دیا گیا مگر یہ کہ وہ اللہ کی عبادت کریں اسی کے لئے دین میں اخلاص پیدا کریں۔

" والاخلاص ان لایکون حامل علی الفعل سوی کونه طاعة وعبادة "

جو شخص طاعت اور عبادت کے بغیر اور کاموں میں مشغول رہے اس کی عبادت میں کامل اخلاص نہیں پایا جاتا۔ لہٰذا بہتر ہے کہ اگر کوئی شخص تجارت کرنے کے بغیر ہی حج کرے تو اس میں زیادہ ثواب حاصل ہوگا۔

(روح البیان)

نزول آیۃ سے پہلے تجارت کے ناجائز ہونے کا گمان کیوں ہوا؟

اس میں چند وجوہ پائی گئی ہیں۔

﴿۱﴾ رب تعالیٰ نے جب جھگڑے سے منع فرمایا تو لوگوں نے اس سے یہ خیال کیا کہ تجارت میں بھی قیمت کی کمی اور زیادتی کی وجہ سے جھگڑا ہوتا رہتا ہے" **فوجب ان تکون التجارۃ محرمۃ وقت الحج** " تو ضروری ہے کہ دوران حج تجارت حرام ہو، لیکن اللہ تعالیٰ نے تجارت کی اجازت دے کر ان کے اس وہم کو رد کر دیا۔

﴿۲﴾ زمانہ جاہلیت میں لوگ تجارت کو دین کے خلاف سمجھتے تھے اگر چہ تجارت کرتے بھی تھے۔ اسلام کے آنے کے بعد بھی ان لوگوں کے نظریات یہ رہے کہ دنیاوی طمع کی وجہ سے حج ضائع ہو جائے گا۔ ان کے اس باطل نظریہ کا رد کیا گیا کہ تجارت کرنے سے حج ضائع نہیں ہوتا، بلکہ تجارت کی تمہیں اجازت ہے۔

﴿۳﴾ حج میں کئی وہ کام ناجائز کر دیئے گئے جو حج کے آگے پیچھے جائز ہوتے ہیں جیسا کہ لباس پہننا، خوشبو لگانا اور شکار کرنا اور اپنی اہلیہ سے مباشرت کرنا، تو ان چیزوں سے لوگوں نے اندازہ لگایا کہ لباس پہننے کی ضرورت تو زیادہ ہوتی ہے، اور تجارت کی ضرورت کم ہوتی ہے، اس لئے تجارت ناجائز ہونی چاہئے۔ رب تعالیٰ نے حج کے دنوں میں تجارت کی اجازت دے کر واضح فرمایا کہ یہ جائز ہے۔

﴿۴﴾ نماز میں مشغول ہونے کی حالت میں کئی جائز کام حرام ہو جاتے ہیں، کھانا، پینا، کلام کرنا، چلنا وغیرہ تو لوگوں نے اسی سے یہ سمجھا کہ شاید حج کے دنوں میں تجارت بھی منع ہو گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے تجارت کے جواز کا حکم فرما کر اس وہم کا ازالہ کر دیا۔ (از کبیر)

حج میں اور کاموں کی آمیزش کو شدید جرم سمجھا گیا تھا۔

" **واذا دخل العشر بالغوافی ترک البیع والشراء بالکلیۃ** "

ذی الحج کی پہلی تاریخ سے دس تاریخ تک وہ مکمل طور پر خرید و فروخت چھوڑ دیتے تھے، بلکہ وہ حج

کے دنوں میں تجارت کرنے والے کے متعلق کہتے تھے۔

''ھؤلاء الداج ولیسوا بالحاج''

یہ ''الحاج'' نہیں بلکہ ''الداج'' ہے۔

'' الداج'' کا معنی کسب کرنا اور چننا۔ اسی وجہ سے مرغی کو ''الدجاجۃ'' کہتے ہیں کہ وہ زمین سے دانے چنتی (اٹھاتی) ہے۔ وہ لوگ حج کے دنوں میں کسی مظلوم کی امداد، کسی ضعیف کی فریادرسی اور بھوکے کو طعام کھلانے کو بھی ناجائز سمجھتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے تجارت کی اجازت دے کران کے اس وہم کو زائل کر دیا۔

'' لَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا فَضۡلاً مِّنۡ رَّبِّکُمۡ ''

نہیں ہے تم پر کچھ گناہ کہ تم طلب کرو فضل اپنے رب کا۔

(لیس علیکم جناح) ''ای اثم من الجنوح وھو المیل عن القصد''

جناح کا معنی ''جنوح'' سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہوتا ہے میانہ روی سے عدول کر جانا۔ سیدھی راہ سے ہٹ جانا، گناہگار بھی اللہ تعالیٰ کے احکاموں پر عمل کرنے سے عدول کرتا ہے اس لئے گناہ کو ''جناح'' کہا گیا ہے۔ (از روح البیان)

''جناح'' نکرہ ذکر کر کے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر تجارت میں اور کوئی ناجائز ہونے کی صورت نہ پائی گئی تو حج میں تجارت کا کچھ گناہ بھی نہیں ہوگا نہ صغیرہ اور نہ کبیرہ۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں '' کچھ'' کا لفظ اسی خوبی پر دلالت کر رہا ہے۔

اعتراض: آیۂ کریمہ میں حج کا ذکر نہیں کیونکہ حکم مطلق ہے۔

'' لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم''

اس میں صرف اتنا ہی ذکر ہے۔ ''تم پر کچھ گناہ نہیں کہ تم تلاش کرو اپنے رب کا فضل''

اس سے دوران حج تجارت کا جواز کیسے ثابت ہوا؟

جواب: " ماروی عطاء عن ابن مسعود وابن الزبیر انهماقرء ا "ان تبتغوا فضلامن ربکم فی مواسم الحج"

عطا کی روایت کے مطابق ابن مسعود اور ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی قرأت میں "**فی مواسم الحج**" کے الفاظ موجود ہیں، جس کا مطلب ہی یہ ہے کہ تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو حج کے موسم میں یعنی حج کے دنوں میں۔

اور اصول فقہ میں یہ ضابطہ موجود ہے جو قرأتیں اخبار احاد سے ثابت ہیں وہ اگرچہ نماز میں تلاوت نہیں ہوں گی لیکن ان کا معنی اخبار مشہورہ کی تائید کرے گا۔ (ماخوذ از کبیر)

(ان تبتغوا) "ای تطلبوا" (جلالین)

تم طلب کرو، تم تلاش کرو، تم حاصل کرو۔

(ان تبتغوا) "ای فی ان تقصدوا وتطلبوا" (روح البیان)

تم پر کوئی گناہ نہیں اللہ کے فضل کا ارادہ کرنے اور طلب کرنے میں۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

" ان تبتغوا " میں نون اعرابی ان ناصبہ کی وجہ سے حذف ہو گیا۔ یہ باب افتعال ہے، اصل اس کا مادہ "بغی" ہے۔ "البغی تجاوز الاقتصاد فیما یتحری "کسی کام میں اتنی کوشش کرنا کہ درمیانی راہ سے تجاوز کر جائے اسے "بغی" کہا جاتا ہے۔ پھر "بغی" کی دو قسمیں ہیں۔

" احدهما محمود وهو تجاوز العدل الی الاحسان والفرض الی التطوع "

" بغی "یعنی درمیانی راہ سے تجاوز کرنے کی ایک قسم اچھی ہے، قابل تعریف ہے، وہ عدل سے تجاوز کر کے احسان تک پہنچنا، اور فرض سے تجاوز کر کے نفل تک پہنچنا۔

کاش کہ یہ معنی لوگوں کو سمجھ آجائے تو سارے جھگڑے ہی ختم ہو جائیں، جو آئے دن لوگوں کو مستحبات سے

اس لئے روکنے کی مذموم کوشش کرتے ہیں کہ یہ کام نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں نہیں تھا۔

" والثانی مذموم وهو تجاوز الحق الی الباطل اوتجاوزه الی الشبه کماقال علیه الصلوة والسلام الحق بین و الباطل بین وبین ذلک امور مشتبهات و من وقع حول الحمی اوشک ان یقع فیه"

اوردوسری قسم "بغی "تجاوز کی مذموم (بری) ہے۔وہ یہ ہے کہ حق سے باطل کی طرف تجاوز کرنا یا شبہات کی طرف تجاوز کرنا جس طرح نبی کریم ﷺ نے فرمایا حق واضح ہے۔اور باطل واضح ہے۔ اوران کے درمیان ایسے کام ہیں جن میں اشتباہ پایا جاتا ہے۔جوشخص چراگاہ کے اردگرد (یعنی حدبندی کے ساتھ ساتھ) جانوروں کو چراتا ہے قریب ہے کہ وہ اس میں واقع ہو جائیں۔

(ازمفردات راغب)

" فضلامن ربکم "(اپنے رب کا فضل)

" عطاء وتفضلاوهو النفع و الربح بالتجارة و الکراء " (مدارک)

تم پر کچھ گناہ نہیں کہ تم طلب کرو اپنے رب کی عطاء اوراس کے فضل کو۔یعنی رب تعالیٰ سے منافع حاصل کرو،اورتجارت کر کے مالی نفع حاصل کرو،اورمحنت مزدوری کر کے اوراپنے اونٹ وغیرہ کرایہ پردے کر مالی نفع حاصل کرو۔

فائدہ: رزق حلال حاصل کرنا اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ انسان اپنے آپ کواوراپنے اہل وعیال کوحرام مال سے بچالیتا ہے۔

فضل کے معنی میں وسعت:

" ثم ان الفضل علی ثلاثة اقسام بالنسبة الی احوال العبدفان التنوع راجع الی تغییر احوال العبادلاالی تغییر صفة من صفات الحق تعالی "

فضل اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔اللہ تعالیٰ کی صفات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ہاں البتہ جب فضل کا تعلق بندوں سے ہوتا ہے تواس تعلق کے لحاظ پراللہ تعالیٰ کے فضل کی تین قسمیں ہیں۔

﴿۱﴾ " فالاول منھامایتعلق بالمعاش الانسانی من المال والجاہ"

ان میں سے پہلی قسم وہ ہے جس کا تعلق انسان کی معاش سے ہے خواہ وہ مال ہو یا مرتبہ۔

پھر مال کا تعلق یا غذا حاصل کرنے سے ہوگا یا لباس حاصل کرنے سے۔

اس فضل کی تفسیر رزق سے کی جاتی ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا۔

"وابتغوا من فضل اللہ" اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔ (سورۃالجمعۃآیت ۱۰)

یعنی رزق تلاش کرو۔

﴿۲﴾ والثانی منھامایتعلق بالمصالح الاخرویۃ للعبد"

دوسری قسم ان میں سے یہ ہے کہ فضل کا تعلق بندے کی اخروی بہتریوں سے ہو۔

اس کی پھر دو قسمیں ہیں، ایک وہ ہے جس کا تعلق اعمال بدن سے ہو، یعنی شریعت کے مطابق کام ہوں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی تابعداری کرے۔ اور شیطانی راستہ سے بچ کر رہے۔

اس فضل کو اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا۔

" یبتغون فضلامن اللہ ورضوانا " اللہ کا فضل اور رضا چاہتے ہیں۔ (سورۃالفتح آیت ۲۹)

یہاں فضل کا معنی اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری اور اس کی رضامندی کا حصول۔

اور دوسری قسم وہ ہے جس کا تعلق دل کے اعمال اور تزکیہ نفس (نفس کو پاک کرنے) سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

" ولولافضل اللہ علیکم ورحمتہ مازکی منکم من احدابداولکن اللہ یزکی من یشاء"

(سورۃالنور آیت ۲۱)

اور اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم میں کوئی پاکیزہ نہ ہوسکتا ہاں اللہ پاکیزہ کرتا ہے جسے چاہے۔

یہاں اللہ کے فضل سے مراد تزکیہ نفس ہے جس کا تعلق اعمالِ قلب سے ہے۔

﴿۳﴾ والقسم الثالث منھامایتعلق باللہ تعالیٰ"

فضل کی تیسری قسم وہ ہے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔

اس کی پھر دو قسمیں ہیں، ایک وہ ہے جس کا تعلق "مواھب قربة" (رب تعالیٰ کی طرف سے قربت ملنا) سے ہے۔ اسی کو رب قدوس نے یوں بیان فرمایا۔

"وبشر المؤمنین بانّ لھم من اللہ فضلا کبیرا" (سورۃ الاحزاب آیت ۴۷)

اور بشارت دو مومنوں کو کہ ان کے لئے اللہ کا بڑا فضل ہے۔

"ای قربا کبیرا فانہ اکبر من الدنیا والآخرۃ"

یعنی ان کو اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا قرب حاصل ہے جو دنیا اور آخرت کی تمام نعمتوں سے بڑی نعمت ہے۔

اور اس کی دوسری قسم وہ ہے جس کا تعلق "مواھب وصلة" (اللہ تعالیٰ کے ساتھ وصال) سے ہوتا ہے۔
یہ فضل باقی تمام قسموں سے اعلیٰ ہے، کیونکہ جب خدا مل گیا تو خود بخود خدائی مل گئی۔

تجھ سے تجھی کو مانگ کر مانگ لی کائنات
مجھ سا کوئی گدا نہیں، تجھ سا کوئی شاہ نہیں

اس آیۃ کریمہ میں تینوں قسم کے فضل حاصل کرنے کا حکم دیا گیا کہ حج میں بے خرچ ہو کر بھی نہ رہ جاؤ ضرورت پڑے تو رزق حلال حاصل کرو۔ اور حج میں تمام کام اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی کے مطابق ہوں اور مقصد اللہ تعالیٰ کو حاصل کرنا ہو۔

ہر حال میں انسان کو ان تمام قسم کے فضلوں کو تلاش کرے۔ خصوصاً حج میں زیادہ ہی اس کا لحاظ کرے۔

فائدہ جلیلہ: اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں یعنی اہل سلوک کی ابتداء ترک دنیا سے ہوتی ہے کہ وہ دنیا سے الگ تھلگ ہو کر اللہ تعالیٰ کی یاد میں چلہ کشی کرتے ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ پر کامل توکل کرتے ہیں، دنیاداروں سے اپنے آپ کو بے نیاز سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد ان کو معرفت وتوحید میں بلند مقام حاصل ہو جاتا ہے۔

اب اس اعلیٰ درجہ پر پہنچ کر ان کی یہی دعاء ہوتی ہے کہ اے اللہ ہمارے دلوں کو دنیا کی محبت سے پاکیزہ رکھ

اور ہمارے دلوں کو اپنی رحمت کے نور سے بھر دے۔

" اللهم طهرقلوبنامن رجزحب الدنياالدنية و املاقلوبنانورابالطاف الخفية"

ان لوگوں کو دنیا کی طرف کوئی توجہ نہیں ہوتی بلکہ آخرت کی طرف توجہ ہوتی ہے۔

" فلا يتصرفون في شئ منهاوتصرفهم باللّٰه وفي اللّٰه ولله"

ان کا دنیا میں کوئی تصرف نہیں ہوتا بلکہ ان کا تصرف اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی کے حصول کے لئے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے میں ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے وصال کے حصول کے لئے ہوتا ہے۔

" لايتصرفون لحظوظ النفس بل لمصالح الدين واصابة الخيرالى الغيروكذافي التاويلات النجمية"

اللہ والے اپنی خواہشات کے مطابق کام نہیں کرتے بلکہ دین کی مصلحت کے لئے کام کرتے ہیں۔ اور دوسروں کو فائدہ پہنچانے میں بھرپور کوشش کرتے ہیں، تاویلات نجمیہ میں بھی اسی طرح مذکور ہے۔

مولانا روم مثنوی میں فرماتے ہیں۔

کار پاکاں راقیاس ازخود مگیر	گرچہ ماند درنوشتن شیر وشیر
شیر آں باشد کہ مردم رادرد	وشیر آں باشد کہ مردم اوراخورد
نیک لوگوں کے کام کو اپنے کام پر قیاس نہ کرو۔	اگرچہ شیر اور شیر لکھنے میں ایک جیسے ہیں۔
شیر وہ ہے جو لوگوں کو پھاڑ دیتا ہے۔	شیر (دودھ) وہ ہے جسے لوگ پیتے ہیں۔

(ماخوذازروح البیان)

فضل کے معنی میں مزید وسعت:

ابوجعفر محمد بن علی باقر رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ ایک اس کا یہ مطلب بھی ہے۔

" هوان يبتغى الانسان حال كونه حاجاعمالااخرى تكون موجبة لاستحقاق فضل الله ورحمته مثل اعانة الضعيف و اغاثة الملهوف واطعام الجائع"

کہ انسان دوران حج اور بھی وہ کام کرے جو اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کا ذریعہ بنیں، یعنی ضعیف لوگوں کی امداد کرے اور مظلوموں کی فریاد رسی کرے اور بھوکوں کو کھانا کھلائے۔

تنبیہ: " اتفقوا علی ان التجارة اذا اوقعت نقصانا فی الطاعة لم تکن مباحة اما ان لم توقع نقصانا البتة فیها فهی من المباحات التی اولی ترکها"

اس مسئلہ میں اتفاق ہے کہ اگر تجارت حج کے احکام بجالانے میں خلل پیدا کرے، یا تجارت میں جھوٹ وغیرہ کی آمیزش سے معصیت ہو تو تجارت کرنا جائز نہیں۔ اگر یہ نقصانات نہیں تو تجارت کرنا جائز ہے۔ البتہ تجارت نہ کرنا بہتر ہے۔

" والحاصل ان الاذن فی هذه التجارة جار مجری الرخص"

حاصل کلام یہ ہے کہ دوران حج تجارت کرنے کی اجازت دی گئی، تجارت کرنا لازم نہیں۔ اور نہ ہی تجارت کرنا افضل ہے۔ بلکہ تجارت نہ کرنا افضل ہے۔

" فَإِذَآ أَفَضۡتُم مِّنۡ عَرَفَٰتٖ فَٱذۡكُرُواْ ٱللَّهَ عِندَ ٱلۡمَشۡعَرِ ٱلۡحَرَامِ "

تو جب لوٹو تم عرفات سے تو ذکر کرو اللہ کا مشعر حرام کے پاس۔

یعنی نو ذی الحج کو غروب آفتاب کے بعد عرفات سے لوٹ کر مزدلفہ میں آجاؤ، اگرچہ تمام مزدلفہ ہی ٹھہرنے کا مقام ہے لیکن مشعر حرام کے پاس ٹھہرنا اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔ جس طرح مقام عرفات تمام ہی موقف (ٹھہرنے کا مقام) ہے لیکن جبل رحمت پر وقوف زیادہ ثواب رکھتا ہے۔

مشعر حرام: ایک پہاڑ ہے جسے قزح کہا جاتا ہے جہاں امام کھڑا ہوتا ہے، اس کے اوپر "میقدة" ہے، جہاں آگ جلائی جاتی تھی، یہ مقام عرفہ کے دو پہاڑوں کے درمیان ہے، وادئ محسر تک پھیلا ہوا ہے۔ البتہ یہ دونوں پہاڑ جو عرفہ میں ہیں اور وادئ محسر یہ مزدلفہ کا موقف نہیں۔

"مشعر" "شعار" سے لیا ہوا ہے، جس کا معنی علامت ہے، اور حرام کا معنی روکنا، چونکہ وہ مقام حج کی علامت ہے اور حج کے منافی کاموں سے روکنے کا مقام ہے اس لئے اسے مشعر حرام کہا گیا ہے۔ (مدارک، خازن)

مقام عرفات سے غروب آفتاب کے بعد لوٹنا:

زمانہ جاہلیت میں غروف آفتاب سے پہلے لوگ لوٹ پڑتے تھے، لیکن نبی کریم ﷺ غروب آفتاب کے بعد لوٹے اور بعد میں لوٹنے کا آپ نے حکم دیا۔

☆ "عن اسامة بن زیدقال دفع رسول اللہ ﷺ من عرفة حتی اذاکان بالشعب نزل فبال ثم توضأولم یسبغ الوضوء فقلت الصلوۃ یارسول اللہ فقال الصلوۃ امامک فلماجاء المزدلفة نزل فتوضأفاسبغ الوضوء ثم اقیمت الصلوۃ فصلی المغرب ثم اناخ کل انسان بعیرہ فی منزلہ ثم اقیمت العشاء فصلی ولم یصل بینھماشیأ"

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ عرفات سے لوٹے جب آپ وادی میں پہنچے تو آپ سواری سے اترے، پیشاب فرمایا پھر وضوء فرمایا لیکن کامل وضوء نہ فرمایا (یعنی صرف ہاتھ وغیرہ دھونے پر اکتفاء کیا) میں نے کہا نماز (کا وقت ہو گیا) یارسول اللہ! آپ نے فرمایا نماز کا وقت آگے ہوگا، پھر آپ سوار ہوئے، جب مزدلفہ آگیا تو آپ سواری سے اترے، وضوء فرمایا، کامل وضوفرمایا پھر نماز کے لئے اقامت کہی گئی مغرب کی نماز آپ نے ادافرمائی، تمام لوگوں نے اپنی اپنی سواریوں کو بٹھایا، پھر عشاء کی اقامت کہی گئی، آپ نے عشاء کی نماز ادا فرمائی۔ ان کے درمیان کوئی اور نماز (یعنی نوافل وغیرہ) ادا نہیں کی۔ (بخاری ومسلم)(خازن)

☆ "واخرج الحاکم وابن مردویہ والبیھقی فی سننه عن المسوربن مخرمة قال خطبنا رسول اللہ ﷺ بعرفة فحمداللہ واثنی علیه ثم قال امابعدو کان اذاخطب قال امابعدفان ھذاالیوم الحج الاکبرالاوان اھل الشرک والاوثان کانوایدفعون من ھھناقبل ان تغیب الشمس اذاکانت الشمس فی رؤس الجبال کانھاعمائم الرجال فی وجوھھا واناندفع بعدان تغیب الشمس وکانوایدفعون من المشعرالحرام بعدان تطلع الشمس اذاکانت الشمس فی رؤس الجبال کانھاعمائم الرجال فی وجوھھا وانا ندفع ان تطلع الشمس مخالفاھدیناالھدی اھل الشرک"

مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہمیں رسول اللہ ﷺ نے عرفات میں خطبہ دیا۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان فرمائی۔ پھر آپ نے کہا۔''امابعد'' آپ خطبہ میں (حمد وثناء کے بعد)''امابعد'' کہتے تھے۔ آپ نے فرمایا آج کا دن حج اکبر کا دن ہے۔ خبردار بیشک اہل شرک اور بت پرست یہاں سے سورج کے غروب ہونے سے پہلے لوٹ جاتے تھے جبکہ سورج پہاڑوں کی چوٹیوں پر لوگوں کے سامنے پگڑیوں کی طرح نظر آتا تھا۔ لیکن ہم یہاں سے سورج کے غروب ہونے کے بعد لوٹیں گے۔ اور وہ لوگ مشعر حرام (مزدلفہ) سے اس وقت لوٹتے تھے جبکہ سورج طلوع ہو کر پہاڑ کی چوٹیوں پر لوگوں کے سامنے پگڑیوں کی طرح نظر آتا۔ لیکن ہم وہاں سے سورج کے طلوع ہونے سے پہلے لوٹیں گے کیونکہ ہمیں رب تعالیٰ نے مشرکین کی راہ کے مخالف حق راہ کی ہدایت دی ہے۔ (درمنثور)

☆ " واخرج ابوداؤد والترمذی واللفظ له وصححه وابن ماجه عن علی قال وقف رسول اللہ ﷺ بعرفة فقال هذه عرفة وهو الموقف وعرفة كلهاموقف ثم افاض حين غربت الشمس واردف اسامة بن زيدوجعل يشيربيده على هينته والناس يضربون يميناوشمالالايلتفت اليهم ويقول ياايهاالناس عليكم السكينة ثم اتى جمعافصلى بهم الصلوتين جميعافلمااصبح اتى قزح وقف عليه وقال هذاقزح وهو الموقف وجمع كلهاموقف ثم افاض حتى انتهى الى وادى محسرفقرع ناقته فخبب حتى جاوز الوادى فوقف واردف الفضل ثم اتى الجمرة فرماهاثم اتى المنحرفقال هذا المنحر ومنى كلهامنحر"

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ عرفات پر ٹھہرے تو آپ نے فرمایا یہ عرفات ہے، یہ ٹھہرنے کا مقام ہے، عرفات تمام ہی ٹھہرنے کا مقام ہے، پھر سورج کے غروب ہونے پر آپ وہاں سے لوٹ پڑے اور اسامہ بن زید کو اپنے ساتھ اپنی سواریوں پر سوار کرلیا۔ آپ اپنے ہاتھ کے اشارہ سے لوگوں کو آہستہ آہستہ چلنے کے متعلق کہہ رہے تھے اور لوگ آپ کے دائیں

بائیں چل رہے تھے آپ ان کی طرف توجہ کررہے تھے اور فرمارہے تھے اے لوگو آہستہ آہستہ چلو، پھر آپ مزدلفہ میں آ گئے وہاں آپ نے دو نمازیں ایک وقت میں جمع کر کے پڑھائیں، جب صبح ہوئی تو آپ جبل قزح پر آئے اور وہاں نہ ٹھہرے۔ اور آپ نے فرمایا یہ قزح ہے یہ ٹھہرنے کا مقام ہے اور مزدلفہ تمام ہی ٹھہرنے کا مقام ہے، پھر آپ لوٹے یہاں تک کہ وادئ محسر میں پہنچے تو وہاں سے جلدی جلدی آگے نکلنے کے لئے اپنی اونٹنی کو دوڑایا یہاں تک کہ وادی سے نکل گئے، پھر آپ نے اپنی سواری پر اپنے ساتھ فضل بن عباس کو سوار کیا اور (مقام منیٰ میں) جمرات کے پاس آگئے ان کو کنکریاں ماریں، پھر آپ ذبح کرنے کے مقام میں آئے، اور فرمایا یہ ذبح کرنے کا مقام ہے۔ تمام منیٰ ہی ذبح کا مقام ہے۔ (درمنثور)

☆ " واخرج البخاری ومسلم وابوداؤدوالنسائی وابن ماجة عن اسامة بن زیدانه سئل کیف کان رسول اللہ ﷺ یسیر حین افاض من عرفة وکان رسول اللہ ﷺ اردفه من عرفات قال کان یسیر العنق فاذاو جدفجوة نص"

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ عرفہ سے لوٹتے ہوئے کس طرح چلتے تھے، تو انہوں نے بتایا کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سواری پر سوار تھا آپ آہستہ آہستہ سواری کو چلا رہے تھے۔ جب آپ کو جگہ کشادہ مل جاتی تو کچھ تیز چلتے۔ (درمنثور)

☆ " واخرج ابن خزیمة عن ابن عمران رسول اللہ ﷺ وقف حتی غربت الشمس فاقبل یکبر اللہ ویهلله ویعظمه ویمجده حتی انتهی الی المزدلفة"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ (عرفات پر) ٹھہرے یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا تو آپ متوجہ ہوئے (یعنی مزدلفہ کی طرف) "اللہ اکبر" اور "لا الہ الا اللہ" پڑھ رہے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کی عظمت اور بزرگی بیان فرما رہے تھے یہاں تک کہ آپ مزدلفہ میں پہنچ گئے۔

(درمنثور)

☆ "واخرج البخاری ومسلم والنسائی عن ابن عباس ان اسامة بن زید کان ردف رسول اللہ ﷺ من عرفة الی مزدلفة ثم اردف الفضل من المزدلفة الی منی فکلاھما قال لم یزل النبی ﷺ یلبی حتی رمی جمرة العقبة"

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں بیشک اسامہ بن زید رسول اللہ ﷺ کی سواری پر آپ کے ساتھ عرفہ سے مزدلفہ تک سوار رہے۔ پھر مزدلفہ سے منی تک فضل بن عباس آپ کے ساتھ سوار رہے۔ دونوں فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ منی میں جمرۂ عقبہ تک پہنچنے تک تلبیہ پڑھتے رہے۔

☆ واخرج سعیدبن منصور وابن جریر وابن المنذر والبیھقی فی سننه عن ابن عمر فی قوله فاذکروا اللہ عندالمشعر الحرام قال ھو الجبل وما حوله"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے "فاذکروا اللہ عندالمشعر الحرام" کے متعلق فرمایا کہ مشعر حرام ایک پہاڑ (جبل قزح) اور اس کے اردگرد کا حصہ ہے۔ (درمنثور)

☆ واخرج ابن ابی شیبة عن سعیدبن جبیر قال مابین جبلی مزدلفة فھو المشعر الحرام"

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مزدلفہ کے دو پہاڑوں کے درمیان مشعر حرام ہے۔

(درمنثور)

اعتراض: پہلے یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ عرفہ کے دو پہاڑوں کے درمیان مشعر حرام ہے۔ اس حدیث پاک میں مزدلفہ کے دو پہاڑوں کے درمیان مشعر حرام کا ذکر ہے۔ ان میں تطبیق کیسے صحیح ہے؟

جواب: عرفہ کی آخری حد اور مزدلفہ کی ابتدائی حد پر یہ پہاڑ واقع ہیں، اس لئے عرفہ کے پہاڑ کہنا بھی صحیح ہے اور مزدلفہ کے پہاڑ کہنا بھی صحیح ہے۔

مشعر حرام پر ٹھہرنے کے لئے دھکے نہ دیئے جائیں:

" واخرج عبدالرزاق وعبدبن حمیدوابن جریر عن ابن عمر انه رأی الناس یزدحمون علی قزح فقال علام یزدحم ھؤلاء کل ماھھنامشعر"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے لوگوں کو جبل قزح پر بھیڑ کرتے ہوئے لوگوں کو دیکھا تو آپ نے فرمایا یہ ایک دوسرے کو کس لئے دھکے دے رہے ہیں تمام مقام ہی مشعر ہے۔ (در منثور)

یعنی مزدلفہ تمام ہی ٹھہرنے کا مقام ہے بغیر دھکے دیئے اور کسی کو تکالیف پہنچانے کے بغیر مشعر حرام (جبل قزح) پر ٹھہرنے اور دعا کرنے کی جگہ مل جائے تو بہتر ورنہ مزدلفہ کے کسی مقام پر بھی ٹھہر جائیں۔

''وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰكُم'' اور ذکر کرو اس کا اس لئے کہ ہدایت دی اس نے تمہیں۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ یہ ہے۔ ''اور اس کا ذکر کرو جیسے اس نے تمہیں ہدایت فرمائی''

یہ ترجمہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ کی اس تفسیر کے مطابق ہے۔

(واذكروه كماهداكم) ''اى كما علمكم المناسك والتشبيه لبيان الحال وافادة التقييداى اذكروه على ذلك النحو ولا تعدلوا عنه''

اور اس کا ذکر کرو جس طرح اس نے ہدایت دی یعنی جس طرح اس نے تمہیں حج کے طریقہ سکھائے۔ یہاں تشبیہ بیان حال کے لئے ہے اور مقید کرنے کا فائدہ بتانے کے لئے ہے۔ یعنی رب تعالیٰ کو اسی طرح یاد کرو۔ اسی طرح اس کا ذکر کرو جیسا اس نے تمہیں بتایا ہے۔ اس سے اپنی مرضی کے مطابق عدول نہ کرو۔

'' ويحتمل ان يراد مطلق الهداية ومفاد التشبيه التسوية في الحسن والكمال اى (اذكروه) ذكرا حسنا كماهداكم هداية حسنة الى المناسك وغيرها''

اور ایک احتمال یہ ہے کہ مراد مطلق ہدایت ہو، تشبیہ کا تعلق حسن اور کمال سے ہو، مطلب یوں ہو، اس کا ذکر حسین وجمیل طریقہ سے کرو جیسا کہ اس نے حج کے طریقوں وغیرہ میں حسین وجمیل ہدایت دی۔ (روح المعانی)

لیکن راقم کا ترجمہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ کی اس تفسیر کے مطابق ہے۔

'' وذهب بعضهم الى ان الكاف للتعليل''

بعض حضرات نے کہا ہے کہ کاف تعلیل کے لئے ہے۔ (روح المعانی)

جلالین نے بھی یہی معنی بیان کیا ہے۔اور صاوی کی مزید وضاحت اس طرح ہے۔

(والکاف للتعلیل) "ای فالمعنی اذکروہ لاجل ھدایتہ ایاکم و لاجل انکم کنتم من قبل ذلک لمن الضالین"

کاف تعلیل کے لئے۔اس صورت میں معنی یہ ہے کہ اس کا ذکر کرو اس لئے کہ اس نے تمہیں ہدایت دی ہے اور اس لئے کہ اس کی ہدایت سے پہلے بیشک تم بھٹکے ہوئے تھے۔

(جلالین و صاوی)

راقم نے صاوی اور جلالین اور روح المعانی کی ایک تفسیر کے مطابق اس لئے ترجمہ کیا ہے تاکہ طلباء کرام کو یہ بحث بھی ذہن نشین ہو جائے۔

فائدہ: اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے بہت ہی زیادہ۔اور عاجزی اور خشوع سے ذکر کرے۔اور ذکر کرے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کی طرف توجہ کرے اور اس کا خوف دل میں رکھے،اور اس کا ذکر کرتے ہوئے یوں سمجھو کہ تم اس کے جلال و جمال کا مشاہدہ کر رہے ہو، نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے یہ واضح ہو رہا ہے۔

"الاحسان ان تعبداللہ کأنک تراہ"

احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو گویا کہ تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو۔

سب سے پہلے "ذکر باللسان" (زبان سے ذکر) کا درجہ ہے۔پھر اس کی دو قسمیں ہیں۔جہری ذکر اور سری ذکر (یعنی بلند آواز سے اور آہستہ)۔جب مقصد یہ ہو کہ بلند آواز سے ذکر کرنے سے دوسرے غافل لوگ بھی ذکر کریں گے تو بلند آواز سے ذکر کرنا بہتر ہوگا جہاں تک آواز جائے گی وہاں تک شجر و حجر گواہی دیں گے۔اور اگر یہ مقصد ہو کہ آہستہ ذکر کیا جائے تاکہ اس میں ریاء کاری کا کوئی شائبہ بھی نہ پایا جائے تو یہ بھی کمال ہے۔

پہلی قسم کا نام ہے "ذکر اللسان فی مقام اللسان" اور دوسری قسم کا نام ہے "ذکر اللسان فی مقام النفس"

اس کے بعد درجہ ہے "ذکر بالقلب فی مقام الافعال" کا، یعنی دل سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا کہ اس کی نعمتوں میں غور وفکر کرنا اور اس کے اوامر ونواہی کے مطابق عمل کرنا۔

اس کے بعد سری ذکر (مخفی ذکر) کا وہ درجہ ہے جس میں رب تعالیٰ کے افعال کا معاینہ پایا جاتا ہے اور رب تعالیٰ کی صفات کی تجلیات کا علم مکاشفہ پایا جاتا ہے۔ پھر درجہ ہے ذکر روح کا، وہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی صفات کی تجلیات کے انوار کے مشاہدہ کے ساتھ نور ذات کا ملاحظہ بھی ہو۔ خیال رہے کہ ملاحظہ کا اصل مطلب آنکھ کے ایک کنارے سے دیکھنا ہے۔ یہاں مراد یہ ہے "کچھ توجہ کرنا"

اس کے بعد درجہ ہے ذکر خفی کے اس مقام کا جس سے رب تعالیٰ کی ذات کے جمال کا (بلا کیف) مشاہدہ پایا جائے لیکن دوئی باقی رہے، کہ بندہ اپنے آپ کو رب تعالیٰ کے وجود کا عکس نہ تصور کرے۔

اس کے بعد درجہ ہے ذکر ذات کا جس سے شہود ذاتی حاصل ہوتا ہے۔ دوئی کی دوری ختم ہو جاتی ہے۔ بندہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ میرا وجود اور کائنات کا وجود رب تعالیٰ کے وجود کا عکس ہے۔ اسی کے وجود کے قیام سے کائنات موجود، اس کے وجود میں عدم نہیں۔ اگر وہ معدوم ہوتا تو کائنات بھی معدوم ہو جاتی۔ ہاں وہ جب چاہے خود موجود ہوتے ہوئے کسی کو معدوم کر دے یہ اس کی شان قدرت ہے۔ (روح البیان بتصرف)

سوال: جب پہلے متصل ہی "فاذکروا اللہ" (اللہ کا ذکر کرو) آچکا ہے تو دوبارہ "واذکروہ" (اور اسے یاد کرو) کو کیوں ذکر کیا گیا ہے۔

جواب: یہاں ذکر میں تکرار نہیں۔ بلکہ چند وجوہ سے فرق ہے۔ پہلے ذکر سے مراد اور ہے، دوسرے سے مراد اور ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ کے اسماء توقیفیہ ہیں قیاسیہ نہیں۔ (یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے جو نام ذکر فرمائے ہیں وہ توقیفیہ کہلاتے ہیں، اپنی عقل سے بیان کرنا قیاسیہ کہلاتے ہیں)

پہلے حکم فرمایا "اذکروا اللہ" اللہ کا ذکر فرمایا، پھر اس کی وضاحت "واذکروہ کما ھداکم" سے کی۔ کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ان اسماء وصفات سے کرو جن کی ہدایت رب تعالیٰ نے تمہیں دی۔

"لابالاسماء التی نذکرھابحسب الرای و القیاس "

انسان یہ یاد رکھے کہ ایسے اسماء سے ہم نے رب تعالیٰ کو یاد نہیں کرنا جن میں صرف رائے اور قیاس کا دخل ہو۔ رب تعالیٰ کے اسماء کی تفصیلی بحث نجوم الفرقان جلد اول سورہ فاتحہ میں دیکھیں۔

﴿۲﴾ اللہ تعالیٰ نے پہلے ذکر کرنے کا حکم دیا۔ پھر فرمایا "واذکروہ کماھداکم" جس کا مطلب یہ ہے۔

" وافعلوا ماامرناکم بہ من الذکر کماھداکم اللہ لدین الاسلام فکأنہ تعالی قال انما امرتکم بھذاالذکر لتکونوا شاکرین لتلک النعمۃ"

ہم نے جو تمہیں اللہ کے ذکر کا حکم دیا ہے وہ ذکر کرو جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہیں دین اسلام کی ہدایت دی ہے۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ میرا ذکر کر کے میری نعمتوں کا شکر ادا کرو۔

﴿۳﴾ "فاذکروااللہ عندالمشعر الحرام" میں زبان کے ذکر کو بیان فرمایا، اور "اذکروہ کماھداکم" میں دل سے ذکر کرنے کا حکم دیا۔ کیونکہ ذکر کبھی نسیان کے مقابل استعمال ہوتا ہے اور کبھی قول کے مقابل استعمال ہوتا ہے۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے حکم دیا ہے اس کا ذکر زبان سے بھی کرو اور دل سے بھی کرو۔

﴿۴﴾ پہلے "اذکرواللہ" میں مطلق ذکر کا حکم دیا، پھر "واذکروہ کماھداکم" میں یہ بتایا "اذکروہ بتوحیدہ کماذکرکم بھدایتہ" کہ تم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا ذکر کرو کیونکہ اس نے تمہیں اپنی وحدانیت پر ایمان لانے کی ہدایت بھی دی ہے۔

﴿۵﴾ ایک احتمال یہ ہے کہ مراد یہ ہو کہ ذکر کے ساتھ ذکر ملاتے چلو، گویا کہ یہ کہا گیا ہے۔

" اذکروہ ذکرابعدذکر کماھداکم ھدایۃ بعدھدایۃ "

اللہ کا ذکر کرو، پھر اللہ کا ذکر کرو جس طرح اس نے تمہیں ہدایت ایمان دی پھر ہدایت اعمال صالحہ دی، پھر ہدایت ذکر وغیرہ دی۔

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی " یاایھاالذین امنوااذکرو اللہ ذکراکثیرا" (اے ایمان والو اللہ تعالیٰ کا ذکر کثیر کرو) اسی مفہوم کو واضح کر رہا ہے۔

۶ رب تعالیٰ نے پہلے مشعر حرام کے پاس ذکر کرنے کا حکم دے کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ احکام شریعہ کو بجالایا جائے پھر "واذکروہ کماھداکم" کہہ کر یہ ثابت کیا گیا کہ مشعر حرام کے پاس ذکر کا حکم دینے کا مطلب صرف اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجالانے ہے۔ مشعر حرام مقصود نہیں۔

" فاذاعرفت هذاقربت الى مراتب الحقيقة وهوان ينقطع قلبك عن المشعرالحرام بل عمن سواه فيصير مستغرقافي نور جلاله وصمديته ويذكره لانه هوالذى يستحق لهذاالذكر"

اے انسان جب تجھے یہ معلوم ہوجائے گا تو تو مراتب حقیقت کے قریب ہوجائے گا۔ وہ یہ کہ تمہارا دل مشعر حرام سے اور اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے منقطع ہوجائے گا صرف اللہ تعالیٰ جو ذات صمد ہے اس کی صفت صمدیہ اور اس کے نور جلال میں تمہارا دل مستغرق ہوجائے گا اور تم جب اللہ تعالیٰ کا ذکر اس شان سے کروگے تو تمہیں مقام عروج حاصل ہوجائے گا جس کے بیان سے زبان قاصر ہے اور خیال وگمان اس کے ادراک سے قاصر ہیں۔

۷ پہلے جو ذکر کا حکم دیا اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ اور صفات حسنیٰ ہیں، اور دوسری مرتبہ جو ذکر کا حکم دیا اس سے مراد اس کا شکر ادا کرنا ہے۔ کیونکہ اس کو ہدایت کے ساتھ معلق کیا ہے اور ہدایت اللہ تعالیٰ کی نعمت عظمیٰ ہے۔ "والذكرالمرتب على النعمة ليس الاالشكر" نعمت پر مرتب ہونے والا ذکر شکر ہی ہے۔

۸ پہلے جب رب تعالیٰ نے مشعر حرام کے پاس ذکر کرنے کا حکم دیا تو اس سے یہ گمان ہورہا تھا کہ دوران حج اور اس خاص مقام پر ہی شاید اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کا حکم ہے۔ دوبارہ ذکر کا حکم دے کر اس وہم کا ازالہ کیا گیا۔

" يعنى اذكروه على كل حال وفى كل مكان لان هذاالذكر انماوجب شكرا على هدايته فلماكانت نعمة الهداية متواصلة غير منقطعة فكذلك الشكريجب ان يكون مستمراغيرمنقطع"

یعنی اللہ تعالیٰ کا ذکر ہر حال میں کرو۔ اور ہر جگہ کرو کیونکہ یہ ذکر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی ہدایت کا شکرادا کرنے کے لئے ہے جب ہدایت کی نعمت لگاتار حاصل ہونے والی ہے۔ منقطع نہیں ہونے والی، اسی طرح شکر بھی ہمیشہ کے لئے جاری ہے منقطع نہ ہونے والا ہے۔

﴿۹﴾ یہ بھی ممکن ہے کہ "فاذکروا اللہ عند المشعر الحرام" سے مراد مغرب اور عشاء کی نمازوں کو جمع کرنا ہو، اور "واذکروہ کما ھداکم" سے مراد تسبیح و تہلیل ہو۔ (ماخوذ از کبیر)

ان بیان کردہ وجوہ سے واضح ہو گیا کہ دو مرتبہ ذکر کا حکم دینا علیحدہ علیحدہ مطالب پر مبنی ہے۔

"وَاِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ" اور بیشک تم اس سے پہلے بھٹکے ہوئے تھے۔

"من قبلہ" میں ضمیر مجرور کا مرجع یا ہدایت ہے، تقدیر عبارت کی یہ ہوگی۔

"وان کنتم من قبل ان ھداکم من الضالین"

بیشک تم اللہ کی ہدایت سے پہلے بھٹکے ہوئے تھے۔

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ ضمیر قرآن پاک کی طرف لوٹ رہی ہے جو التزاما "ھداکم" سے سمجھ آرہا ہے۔ تقدیر عبارت کی یہ ہے۔

" واذکروہ کما ھداکم بکتابہ الذی بین لکم معالم دینہ ،وان کنتم من قبل انزالہ ذلک علیکم من الضالین "

اور ذکر کرو اس کا کہ اس نے تمہیں اپنی کتاب یعنی قرآن پاک کے ذریعے ہدایت دی اور تمہارے لئے اس میں دین کی معلومات اور علامات کا ذکر فرمایا، اور بیشک تم قرآن پاک کے نازل ہونے سے پہلے بھٹکے ہوئے تھے۔ (کبیر)

ضالین کے معنی میں ہدایت کے معنی کی طرح وسعت ہے:

یعنی ہدایت کے معنی میں جس طرح وسعت ہے اس کے مقابل ہی یہاں ضالین کا استعمال ہوگا تم ایمان

سے جاہل اور بھٹکے ہوئے تھے اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایمان کی ہدایت دی۔ تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری سے دور تھے یعنی بھٹکے ہوئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں اطاعت کی ہدایت دی۔ (بیضاوی)

اسی طرح وسیع مفہوم میں ہے کہ تم حج کا طریقہ نہیں جانتے تھے، نماز کا طریقہ نہیں جانتے تھے، غرضیکہ تمہیں اوامر ونواہی کا کچھ پتہ نہ تھا اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک اور اپنے رسول ﷺ کے ذریعے تمہیں ہدایت دی۔

دینی طلباء کرام خصوصی توجہ فرمائیں:

"واذکروہ کماھداکم" میں "ما" کے لفظ میں دو احتمال ہیں کہ ما مصدریہ ہو۔ یا۔ ما کافہ ہو۔

دونوں معنوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں مراد مطلق دلالت ہے۔ اور کیفیت ذکر کی تعلیم ہے۔ اس صورت میں کاف سے مراد تشبیہ نہیں بلکہ فقط تقیید مراد ہے۔ معنی یہ ہوگا۔

"اذکروہ علی الوجہ الذی ھداکم الیہ لاتعدلو عماھدیتم الیہ"

اس کا ذکر کرو اس وجہ پر جو اس نے تمہیں ہدایت دی۔ جس راہ کی تمہیں ہدایت دی گئی اس سے عدول نہ کرو۔

یہ معنی ایسے ہے جیسے عرب حضرات کہتے۔ "افعل کما علمتک" میں نے تمہیں جو تعلیم دی اس کے مطابق کام کرو۔

دوسری صورت میں ہدایت کا معنی ہوگا۔ "دلالة موصلة" مقصد تک پہنچانے والی راہنمائی۔ یعنی بندے کو دنیا اور آخرت کی ہر طرح کی بھلائی کی راہ دکھانا۔ اس صورت میں کاف تشبیہ کے لئے ہوگا۔ معنی یہ ہے۔ "یاد کرو اس کو جس طرح اس نے تمہیں ہدایت دی"۔

یہ معنی عرب حضرات کے اس قول کے مطابق ہے۔ "اخدمہ کمااکرمک" تو اس کی خدمت کر جیسے اس نے تیری عزت کی، یعنی اس کی خدمت کرنے میں کوتاہی نہ کر۔

ایک اور توجہ: " وان کنتم من قبلہ لمن الضالین" میں لفظ "ان" میں دو احتمال ہیں۔

﴿۱﴾ وان ھی المخففۃ من الثقیلۃ و اللام ھی الفارقۃ "

"ان" اصل میں ثقیلہ تھا پھر اسے مخفف کر دیا گیا، اور اس کی خبر پر "لام" اسی لئے لگایا گیا تا کہ "ان" مخففہ من الثقیلۃ، اور "ان" نافیہ میں فرق ہو سکے۔ اگر چہ مخفف ہونے کی صورت میں لفظی عمل اس کا باقی نہیں رہتا لیکن معنی وہی تاکید والا رہتا ہے۔ اسی کے مطابق اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہے اور راقم نے بھی وہی ترجمہ نقل کیا ہے کہ زیادہ معتبر بھی وہی ہے۔

﴿۲﴾ " وقیل ان نافیۃ و اللام بمعنی الا" فراء نے یہ کہا ہے کہ "ان" نافیہ ہے، اور لام بمعنی "الا" ہے۔ جیسا کہ "وان نظنک لمن الکاذبین" میں ہے۔

اس صورت میں معنی ہوگا "وما کنتم من قبلہ الا من الضالین" اور نہیں تھے تم اس سے پہلے مگر بھٹکے ہوئے۔ کسائی رحمہ اللہ کا موقف اس مسئلہ میں راقم کو مستحسن نظر آتا ہے، آپ فرماتے ہیں اگر "ان" جملہ فعلیہ پر داخل ہو تو بمعنی "قد" آتا ہے، اور اگر جملہ اسمیہ پر داخل ہو تو نافیہ ہوتا ہے، جیسا کہ " وان کل لما علیھا حافظ" میں "ان" نافیہ ہے اور "لما" بمعنی "الا" ہے۔ (بیضاوی و شیخ زادہ)

ایک اور توجہ: (فاذاافضتم) "الافاضۃ الاندفاع فی السیر بکثرۃ" سیر میں کثرت سے لوٹنا "افاضۃ" ہے۔

"افاض البعیر" اونٹ کا جگالی کرنا یعنی چارہ پہلے پیٹ میں جمع کر لینا پھر نکال نکال کر چبانا۔

"افاض الاقداح فی المسیر" جوأ کے تیر جمع کرنا پھر پھیلانا۔

"افاضۃ الماء" پانی انڈیلنا یعنی پانی جمع کر کے متفرق کرنا۔ (انڈیلنا)

"فاذاافضتم" کا ترجمہ اگر چہ مختصر "جب تم لوٹو" کر دیا گیا ہے۔ لیکن تفصیلی طور پر مطلب یہ ہوگا "جب تم عرفات پر جمع ہو کر لوٹو"۔ (از کبیر)

ایک اور توجہ:

عرفات جمع ہے عرفۃ کی، ایک جگہ کا نام عرفات (جمع) اسی طرح رکھا گیا جیسا کہ "ثوب اخلاق" میں مختلف جگہ سے کپڑے کے پھٹے ہونے کی وجہ سے ایک کپڑے پر "اخلاق" جمع کا اطلاق ہے۔

گویا کہ ہر ٹکڑا عرفۃ ہے۔ مجموعہ کا نام عرفات رکھ دیا گیا ہے۔ بظاہر اس میں تعریف اور تانیث دو سبب منع صرف کے نظر آتے ہیں لیکن غیر منصرف نہ بنانے کی وجہ یہ ہے زمین کے ایک حصہ پر علیحدہ علیحدہ ٹکڑا کو جب عرفہ کہا گیا "وعلی ھذا التقدیر لم یکن علما" تو اس تقدیر پر علم نہ ہوا۔ پھر جمع کی صورت میں بظاہر علمیت کے پائے جانے کے اصل کا اعتبار کر کے غیر منصرف نہیں بنایا گیا۔ (کبیر)

تفسیر کبیر سے مزید اقتباسات:

ذی الحج کی آٹھ تاریخ کا نام ہے "یوم الترویہ" اور نو تاریخ کا نام ہے "یوم عرفہ" اور ایک خاص جگہ کا نام ہے "عرفات" ان مقامات کے یہ نام کیوں رکھے گئے۔ ان کی مختلف وجوہ بیان کی گئی ہیں جن کو ذکر کیا جا رہا ہے۔

یوم الترویہ کی وجہ تسمیہ:

اس میں دو قول ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی ماخوذ ہے۔ "روی یروی ترویۃ" سے۔ جس کا معنی ہے "فکر کرنا اور فکر کا عمل کرنا" کہا جاتا ہے "روّیتہٗ" میں نے اس کا فکر کیا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا معنی ماخوذ ہے۔ "رواہ من الماء یرویہ" سے۔ جس کا معنی ہے "پیاسے کو پانی پلانا"

پہلے قول میں پھر تین وجوہ ہیں۔

ایک وجہ یہ کہ آدم علیہ السلام کو جب بیت اللہ شریف بنانے کا حکم دیا گیا تو آپ نے جب فرشتوں کے ساتھ مل

کر کعبہ شریف کی بنیادوں کو مکمل کر لیا جس پر بیت المعمور کو رکھ دیا گیا۔ "فلما بناہ تفکر" تو آپ نے کعبہ شریف کو بنانے کے بعد فکر کیا اور رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا کہ اے میرے رب ہر عمل کرنے والے کو اجر ملتا ہے اس عمل پر میرا کیا اجر ہے؟ رب تعالیٰ کی طرف سے جواب دیا گیا۔

"اذاطفت به غفرت لک ذنوبک باول شوط من طوافک"

جب تم طواف کرو گے تو طواف کے پہلے چکر سے تمہاری مغفرت کر دوں گا۔

(مغفرت کا مطلب پہلے پارہ میں عصمت انبیاء کی بحث میں دیکھو)

"قال یارب زدنی" آپ نے عرض کیا اے میرے رب مجھے اور زیادہ اجر عطاء فرما۔

"قال اغفر لاولادک اذاطافوا به"

رب تعالیٰ نے فرمایا تمہاری اولاد میں سے بھی جو طوافِ کعبہ کریں گے ان کی مغفرت کر دوں گا۔

"قال زدنی" پھر عرض کیا، اے اللہ اور زیادہ اجر عطا فرما۔

"قال اغفر لکل من استغفر له الطائفون من موحدی اولادک"

تو رب تعالیٰ نے فرمایا تمہاری اولاد میں سے جو کعبہ کا طواف کر کے دوسرے مومن بھائیوں کے لئے استغفار کریں گے ان کی بھی مغفرت کر دوں گا۔

"قال حسبی یارب حسبی" آپ نے عرض کیا مجھے کافی ہے۔ اے میرے رب مجھے کافی ہے۔

گذشتہ اوراق میں حج مبرور کی بحث دیکھیں تو ان شاء اللہ آپ کو یہ بحث بھی سمجھ آ جائے گی۔

دوسری وجہ تفکر کی یہ ہے۔ کہ ذی الحج کی آٹھویں رات کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب دیکھا گویا کہ میں بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں۔

"فاصبح مفکرا اهل هذا من الله تعالى او من الشيطان"

صبح آپ نے تفکر کیا، کیا یہ خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے یا شیطان نے وسوسہ ڈالنے کی کوئی کوشش تو نہیں کی۔

"فلمارأه لیلة عرفة یؤمربه اصبح فقال عرفت یارب انه من عندک"

جب آپ ذی الحج کی نویں تاریخ کو پھر دیکھا کہ آپ کو حکم دیا جارہا ہے کہ بیٹے کو ذبح کرو تو آپ نے عرض کیا اے میرے رب میں نے پہچان لیا ہے کہ یہ حکم تیری طرف سے ہے۔

تیسری وجہ تفکر کی یہ ہے۔

"ان اهل مکة یخرجون یوم الترویة الی منی فیروون فی الادعیة التی یریدون ان یذکرها فی غدهم بعرفات"

کہ اہل مکہ آٹھ ذی الحج کو منی میں یہ تفکر کرتے تھے کہ کل عرفات پر جانا ہے وہاں کون کون سی دعائیں کرنی ہیں۔

دوسرے قول میں بھی تین وجوہ ہیں۔ یعنی جب "ترویة الماء" سے "یوم الترویة" ماخوذ ہو تو معنی یہ ہوگا پیاسے کو پانی پلانے کا دن، اس معنی کے لحاظ پر تین وجوہ ہیں۔

ایک وجہ یہ ہے کہ اہل مکہ دور سے آنے والے (آفاقی) حاجیوں کے لئے پانی جمع کرکے مخفی رکھتے تھے۔ وہ حاجی حضرات اس دن میں سفر کی مشقت سے راحت پکڑتے تھے۔

"ویتسعون فی الماء ویروون بهائمهم بعدمقاستهم قلة الماء فی طریقهم"

اور اہل مکہ کے جمع کئے ہوئے پانی سے وسعت حاصل کرتے اور اپنے چوپاؤں کو پانی پلاتے اسی طرح وہ راستے میں پانی کی قلت سے حاصل ہونے والی تکلیف اور مشقت سے راحت حاصل کرتے تھے۔

دوسری وجہ پانی سے سیراب ہونے کی یہ ہے کہ آٹھ ذی الحج کو وہ عرفہ میں پانی کو جمع کرتے تھے، تو پانی کا توشہ جمع کرنے کی وجہ سے نام یوم الترویہ رکھ لیا گیا۔

تیسری وجہ یہ ہے۔

" ان المذنبین کالعطاش الذین وردوا بحارر حمۃاللہ فشربوا منھا حتی روو ا"

کہ گناہگار لوگ پیاسوں کی طرح حج کا آغاز آٹھ ذی الحج سے کر کے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سمندر میں وارد ہو جاتے ہیں اور گویا کہ وہ رحمت کا پانی پی کر اس دن سیراب ہوتے ہیں۔ اسی لئے اس کا نام یوم الترویۃ ہے۔

اس دن کی فضلیت پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی "و الشفع و الوتر" (قسم ہے شفع اور وتر کی) دلالت کر رہا ہے۔

ان الفاظ گرامی کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں۔ تاہم ایک قول یہ ہے۔

" عن ابن عباس بأن الشفع الترویۃ وعرفۃ والوتر یوم النحر "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں شفع سے مراد یوم الترویۃ اور عرفہ ہے۔ اور وتر سے مراد یوم النحر ہے۔

☆ عن عبادۃ انه علیه الصلوۃ و السلام قال صیام عشر الاضحی کل یوم منھا کالشھر و لمن یصوم یوم الترویۃ سنة و لمن یصوم یوم عرفۃ سنتان"

عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اضحیٰ کے دس دنوں میں روزہ رکھنا ایسے ہے جیسے ایک مہینہ روزے رکھنے ہیں۔ اور یوم الترویۃ کا روزہ رکھنا ایک سال کے روزوں کی طرح ہے۔ اور یوم عرفہ کا روزہ رکھنا دو سال کے روزوں کی طرح ہیں۔

☆ وروی انس انه علیه الصلوۃ والسلام قال من صام یوم الترویۃ اعطاہ اللہ مثل ثواب ایوب علی بلائه ومن صام یوم عرفۃ اعطاہ اللہ تعالیٰ مثل ثواب عیسی بن مریم علیه السلام"

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے یوم الترویۃ (آٹھ ذی الحج) کو روزہ رکھا تو اس کو اللہ تعالیٰ ایسا ثواب عطاء فرمائے گا جیسا کہ ایوب علیہ السلام کو آزمائش

پرصبر کرنے سے دیا گیا۔اور جس شخص نے یوم عرفہ (نو ذی الحج) کوروزہ رکھا اسے اللہ تعالیٰ ایسا ثواب عطاء فرمائے گا جیسا کہ عیسی علیہ السلام کو (یہود کے مظالم پر صبر سے) عطا فرمایا۔ (از کبیر)

یوم عرفہ کو روزے رکھنے کے متعلق "کتب علیکم الصیام" کی بحث میں دیکھئے۔

یوم عرفہ کی وجہ تسمیہ:

نو ذی الحج کے دن کے دس نام ہیں، پانچ وہ ہیں جو اس کے ساتھ خاص ہیں، اور پانچ وہ ہیں جو اس کے نام بھی ہیں اور اس کے غیر کے بھی نام ہیں۔

وہ پانچ نام جو اس کے ساتھ خاص ہیں ان میں سے ایک نام "**عرفه**" ہے۔

یہ لفظ کس معنی میں استعمال ہے؟ اس میں تین قول ہیں، ایک یہ کہ مشتق ہے معرفۃ سے (پہچانا معنی ہے) دوسرا یہ کہ مشتق ہے عرفۃ سے بمعنی اعتراف، اور تیسرا یہ کہ مشتق ہے عرف سے بمعنی اچھی خوشبو۔

عرفہ بمعنی معرفت میں آٹھ وجوہ ہیں۔ان میں سے **پہلی وجہ** حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

" ان آدم وحواء التقیابعرفة فعرف احدهماصاحبه فسمی الیوم عرفة والموضع عرفات"

بیشک آدم علیہ السلام اور حضرت حواء کی ملاقات نو ذی الحج کو ہوئی۔انہوں نے ایک دوسرے کو پہچانا اس لئے اس کا نام یوم عرفہ (پہچاننے کا دن) اور اس جگہ کا نام عرفات رکھ دیا گیا۔

اصل وجہ یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو جنت سے اتار کر سراندیپ (ہندوستان) میں بھیج دیا گیا اور حضرت حواء کو جدہ میں۔حضرت آدم علیہ السلام کو جب حج کا حکم دیا گیا تو آپ کی ملاقات حضرت حواء سے مقام عرفات میں نو ذی الحج کو ہوئی۔

دوسری وجہ: حضرت آدم علیہ السلام کو جبریل امین نے رب تعالیٰ کے حکم سے مناسک حج سکھائے۔پھر مقامِ

عرفات پرنو ذی الحج کو پوچھا "اعرفت قال نعم" کیا تم نے پہچان لیا؟ آپ نے فرمایا ہاں۔تو اس دن سے اس جگہ کا نام عرفات اورنو ذی الحج کا یوم عرفہ رکھ دیا گیا۔

تیسری وجہ: حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پہلے ایک جگہ کے متعلق بتایا گیا کہ فلاں جگہ حج میں ٹھہرنا فرض ہوگا، آپ جب وہاں پہنچے۔

"عرفهاحين رآهابماتقدم من النعت والصفة"

تو آپ نے اس مقام کو بتائی ہوئی صفات کے مطابق ہی پہچان لیا،اسی وجہ سے اس مقام کا نام عرفات اوردن کا نام یوم عرفہ رکھ لیا گیا۔

چوتھی وجہ: حضرت جبریل نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کورب تعالٰی کے حکم سے مناسک حج سکھائے پھر آپ کونو ذی الحج کو مقام عرفات پر پہنچا کر سوال کیا۔

"اعرفت كيف تطوف وفي اى موضع تقف؟قال نعم"

کیا تم نے پہچان لیا کہ طواف کیسے کرنا ہےاورکس جگہ میں ٹھہرنا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں۔

پانچویں وجہ: حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی زوجہ حضرت ہاجرہ اوراپنے بیٹے کو کعبہ شریف کے پاس رب تعالٰی کے حکم سے چھوڑ کرخود شام کے علاقہ فلسطین میں چلے گئے۔پھر کئی سال کے بعدلوٹے تو "التقيايوم عرفة بعرفات" آپ کی ملاقات ان دونوں (زوجہ اور بیٹے) سےنو ذی الحج مقام عرفات پر ہوئی۔

خیال رہے کہ یہ وجہ اگر چہ بعض کے نزدیک صحیح ہے۔لیکن تحقیق یہی ہے کہ حضرت ہاجرہ سے آپ کی پھر ملاقات ہی نہ ہوسکی۔اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے کعبہ شریف کے قریب ملاقات ہوئی۔ "واللہ اعلم بالصواب"

چھٹی وجہ: "ماذكرناه من امرمنام ابراهيم عليه السلام" پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ آٹھویں رات کو بیٹے کو ذبح کرنے کے خواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کوتردد ہوااورذی الحج کی نویں رات کوخواب دیکھنے پر پہچان لیا کہ یہ اللہ تعالٰی کا ہی حکم ہے۔

ساتویں وجہ: " ان الحاج یتعارفون فیه بعرفات اذاوقفوا" حاجی حضرات جب اس میدان میں کھڑے ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں، یہی وجہ ہے مقام عرفات اور یوم عرفہ کے ناموں کی۔

آٹھویں وجہ: " انه تعالی یتعرف فیه الی الحاج بالمغفرة و الرحمة" جب حاجی حضرات اس مقام میں نو ذی الحج کو جمع ہوتے ہیں تو رب تعالی کی طرف سے رحمت و مغفرت کا اعلان ہوتا ہے تو حاجی حضرات اس دن اس جگہ میں رب تعالی کو اسی کی خصوصی صفات غفور اور رحیم سے پہچانتے ہیں۔

عرفہ بمعنی اعتراف: یوم عرفہ کا نام رکھنے میں دوسرا قول یہ ہے کہ عرفہ اعتراف کے معنی میں استعمال ہے۔

" لان الحاج اذاوقفوافی عرفة اعترفواللحق بالربوبیة و الجلال و الصمدیة والاستغناء و لانفسهم بالفقر و الذلة و المسکنة و الحاجة"

اس لئے کہ حاجی حضرات اس مقام میں جب نو ذی الحج کو وقوف کرتے ہیں تو یہ پہچان لیتے ہیں کہ اللہ تعالی کو صفت ربوبیت (رب ہونے کی صفت) حاصل ہے، اور وہ صاحب جلال ہے، وہ بے نیاز اور مستغنی ہے۔

اور وہ یہ بھی پہچان لیتے ہیں کہ ہم فقیر ہیں۔ہم مقام ذلت و مسکنت میں ہیں اور ہم محتاج ہیں۔درحقیقت اپنے آپ کو ذلت و مسکنت کی حالت میں پہچاننا کامل عجز ہے۔

اس میں دوسری وجہ یہ ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواء نے رب تعالی کے حضور عرض کیا۔ " ربناظلمنا انفسنا" تو رب تعالی نے یوں فرمایا "الآن عرفتماانفسکما" اب تم نے اپنے نفسوں کی جانب سے بھول اور بے توجہی سے پھسلنے کا اعتراف کرلیا ہے۔

عرفہ بمعنی خوشبو: یوم عرفہ کا نام عرفہ رکھنے میں تیسرا قول یہ ہے۔"انه من العرف وهو الرائحة الطیبة" کہ یہ ماخوذ ہے "عرف" سے جس کا معنی ہے اچھی خوشبو۔

رب تعالی کا ارشاد گرامی ہے۔

"یدخلهم الجنة عرفهالهم"ای طیبهالهم.

اللہ تعالیٰ ان کو پاکیزہ اور خوشبو والی جنت میں داخل فرمائے گا۔ ("عرفها" کا یہ ایک معنی ہے)

اور معنی یہ ہے کہ گناہگار لوگ جب مقام عرفات میں رب تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں، تو وہ ڈرتے ہیں اور گناہوں کی نجاست سے چھٹکارا حاصل کرتے ہیں۔"ویکتسبون به عندالله تعالی رائحة طیبة" وہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے ہاں اچھی خوشبو حاصل کریں گے۔ یعنی جنت کی پاکیزہ اور اچھی خوشبو حاصل کریں گے۔

جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔

" خلوف فم الصائم عندالله اطیب من ریح المسک"

روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے ہاں کستوری سے زیادہ خوشبودار ہے۔

اس کا معنی تو مشہور و معروف ہے کہ اللہ تعالیٰ کو روزہ دار کے منہ کی بو کستوری کی خوشبو سے زیادہ پسند ہے۔ اور دوسرا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں روزہ دار کے منہ کی بو کا بدلہ جنت میں کستوری سے زیادہ خوشبو والی ہوا ہے۔

دوسرا نام: نو ذی الحج کا دوسرا نام "یوم ایاس الکفار" کافروں کی ناامیدی کا دن۔

" فامامعنی ایاس المشرکین فهوانهم یئسوا من قوم محمدعلیه الصلوٰة والسلام ان یرتدوا راجعین الی دینهم"

اس کی وجہ یہ ہے کہ کفار و مشرکین اس دن نبی کریم ﷺ کو رب تعالیٰ کی رضاء کے لئے مقام عرفات میں جمع ہونے کو دیکھ کر ناامید ہو جاتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے دین سے پھر کر ہمارے دین کی طرف آنے والے نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ " الیوم یئس الذین کفروا من دینکم"

آج کے دن کفار ناامید ہو گئے تمہارے دین (سے پھر جانے سے)

اس آیۃ کریمہ کے شان نزول میں ایک قول حضرت عمر اور حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہم) کا ہے۔

" ان هـذه الآية نـزلـت عشية عرفة وكان يوم الجمعة والنبى ﷺ واقف بـعرفة فى موقف ابراهيم عليه السلام وذلک فی حجة الوداع وقداضمحل الكفروهدم بنيان الجاهلية"

کہ یہ آیۃ کریمہ جمعہ کونو ذی الحج کی پچھلی پہر کے وقت نازل ہوئی جبکہ نبی کریم ﷺ مقام عرفات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے موقف (ٹھہرنے کی جگہ) میں وقوف فرمار ہے تھے۔ یہ حجۃ الوداع تھا۔ تحقیق کفر پر لرزہ طاری ہو گیا۔ جاہلیت کی بنیادیں منہدم ہو گئیں۔

" فقال عليه الصلوة والسلام لويعلم الناس مالهم فى هذه الآية لقرت اعينهم"

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ ان کے لئے اس آیۃ کریمہ میں کیا (رب تعالیٰ کا فضل وکرم مذکور) ہے تو ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔

" فـقـال اليهـودى لـعـمـر لـوان هـذه الآية نزلت علينالاتخذناذلک اليوم عيدافقال عمر امانحن فجعلناه عيدين كان يوم عرفة ويوم الجمعة"

چونکہ اسی آیۃ کریمہ میں " اليـوم اكـمـلـت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتى " کے الفاظ مبارکہ بھی ہیں۔ ان الفاظ مبارکہ کو دیکھ کر ایک یہودی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کہا اگر یہ آیۃ ہم پر نازل ہوتی تو ہم نزول کے دن کو عید کا دن بنا لیتے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہم نے اس کے نزول کے دن میں دو عیدیں بنائی ہیں کیونکہ وہ نو ذی الحج کا دن تھا اور جمعہ کا دن تھا، یہ دونوں ہمارے لئے عید کے دن ہیں۔

تیسرا نام: ذی الحج کی نو تاریخ کا "یوم اکمال الدین" دین کے مکمل کرنے کا دن۔

چوتھا نام: ذی الحج کی نو تاریخ کا "یوم اتمام النعمۃ" نعمت کے مکمل کرنے کا دن۔

پانچواں نام: ذی الحج کی نو تاریخ کا "یوم الرضوان" اللہ تعالیٰ کی رضاء کا دن۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس دن آیۃ کریمہ "اليـوم يـئس الذين كفروا" مکمل نازل ہوئی۔ اسی سے یہ واضح ہوا کہ اس دن دین کے احکام مکمل کر دیئے گئے، اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد کسی شرعی حکم کو نافذ نہیں فرمایا۔ لہٰذا یہ دین کو مکمل کرنے کا دن ہوا۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے عظیم نعمت دین ہے۔

" لأن بهايستحق الفوز بالجنة و الخلاص من النار"

اس وجہ سے کہ اس نعمت عظمیٰ پر عمل کر کے ہی انسان جہنم کی آگ سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے اور جنت کے مستحق ہونے کی کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔

اس عظیم نعمت کا ذکر وضوء کے فرائض بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ مبارکہ سے ذکر فرمایا۔ "ولیتم نعمته علیکم لعلکم تشکرون" تاکہ وہ اپنی نعمت کو مکمل کرے کہ تم شکر گذار بن سکو۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کو جب حضرت یوسف علیہ السلام کی بشارت دینے والا شخص آیا تو آپ نے اس سے سوال کیا "علی ای دین ترکت یوسف" تم جب وہاں سے چلے تھے تو یوسف کس دین پر قائم تھا؟ اس نے کہا۔ "علی دین الاسلام" وہ دین اسلام پر قائم تھے۔ تو آپ نے فرمایا۔ "الآن تمت النعمة" اب نعمت مکمل حاصل ہوگئی۔

اس بحث سے واضح ہوگیا کہ دین پر قائم رہنے کی توفیق حاصل ہو تو نعمتِ عظمیٰ حاصل ہوتی ہے۔

اس دن کو "یوم الرضوان" کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر راضی ہوتا ہے جو دین اسلام کے مطابق عمل کریں اور اپنی زندگی اسلامی اصولوں کے مطابق گذاریں۔

اللہ تعالیٰ نے نو ذی الحج کو اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا جس میں "الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی" کے الفاظ مبارکہ بھی ہیں تو یہ تینوں نام پتہ چل گئے کہ اس دن دین کو مکمل فرمایا۔ اور اپنی عظیم نعمت یعنی تکمیل دین سے تکمیل نعمت فرمائی اور دین اسلام پر چلنے والوں کے لئے اپنی رضاء کا ذکر فرمایا، اور "ورضوان من اللہ اکبر" (اللہ کی رضاء بڑی چیز ہے) سے سمجھ آیا کہ جب دین اسلام پر عمل کرنے سے اللہ کی رضاء حاصل ہوتی ہے۔ اور اللہ کی رضاء عظیم چیز ہے تو واضح ہوا کہ دین اسلام پر عمل کرنا ہی نعمت عظمیٰ ہے۔

فائدہ: بعض حضرات نے کہا یہ دن "یوم صلة الواصلین" اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کا دن ہے۔

یہ نام "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی" (آج میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کردیا اور تم پر اپنی نعمت کو مکمل فرمایا) سے سمجھ آیا۔

اور یہ دن ''یوم قطیعة القاطعین'' رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے انقطاع کرنے والوں سے بیزاری کا دن ہے۔

یہ نام اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد ''ان اللہ بریء من المشرکین ورسولہ'' (بیشک اللہ اور اس کا رسول بیزار ہیں مشرکوں سے) سے سمجھ آیا۔

مقام افسوس ہے کہ بعض حاجی حضرات حج کرنے کے باوجود کفار اور یہود ونصاری سے روابط قائم رکھتے ہیں ان سے محبت کرتے ہیں، اپنے اپنے اسلامی ممالک کو ان کے اشاروں سے تباہ وبرباد کرتے ہیں۔

اور یہ دن ''یوم اقالة عثر النادمین وقبول توبة التائبین'' (ندامت والوں کی لغزش کے ختم ہونے اور توبہ کرنے والوں کی توبہ قبول کرنے کا دن ہے)۔

یہ نام ''ربنا ظلمنا الخ'' سے سمجھ آیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس دعاء سے (اور نبی کریم ﷺ کے وسیلہ سے)

''تاب برحمته علی آدم فکذلک یتوب علی اولادہ''

آدم علیہ السلام کی طرف نظر رحمت سے رجوع فرمایا تو اسی طرح یہ دعاء کرنے سے ان کی اولاد کی اللہ تعالیٰ توبہ قبول فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے اپنے بندوں سے یہ وعدہ کر رکھا ہے۔ ''وھو الذی یقبل التوبة عن عبادہ'' وہ اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے۔

اور یہ دن ''یوم وفد الوافدین'' رب کے حضور حاضر ہونے والوں کا دن ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''واذن فی الناس بالحج'' اور لوگوں میں حج کا اعلان کردو۔

اور حدیث پاک میں ہے۔ ''الحاج وفد اللہ'' حاجی اللہ کا وفد ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہونے والے ہیں۔

''والحاج زوار اللہ'' اور حاجی اللہ کی زیارت کرنے والے ہیں۔

''وحق علی المزور الکریم ان یکرم زائرہ''

جب کریم شخص کی زیارت کی جائے تو وہ اپنے زیارت کرنے والے کی عزت کرتا ہے اس پر اپنا کرم کرتا ہے۔

پانچ اور نام: نوذی الحج کے پانچ اور نام بھی ہیں، لیکن ان میں اور بھی اقوال ہیں کہ نوذی الحج کے بغیر بھی ان کے مطالب ہیں۔

وہ یہ ہیں۔ "یوم الحج الاکبر. الشفع. الوتر. الشاهد. المشهود"

مزدلفہ کی وجہ تسمیہ:

مزدلفہ کو مزدلفہ کیوں کہا جاتا ہے؟ اس کی چند وجوہ ہیں۔

﴿۱﴾ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ "ازدلاف" کا معنی ہے "قریب ہونا" لوگ چونکہ عرفات سے لوٹ کر مزدلفہ میں جب آتے ہیں تو منی کے قریب ہو جاتے ہیں، اس لئے اس مقام کا نام مزدلفہ رکھ لیا گیا۔

﴿۲﴾ دوسری وجہ یہ کہ ازدلاف کا معنی ہے اجتماع۔ لوگ چونکہ اس جگہ پر جمع ہوتے ہیں تو اجتماع کی وجہ سے اس جگہ کا نام مزدلفہ رکھ لیا گیا۔

﴿۳﴾ " انهم يزدلفون الى الله تعالىٰ اى يتقربون بالوقوف"

تیسری وجہ یہ ہے کہ لوگ اس مقام میں آکر دعا کرتے ہیں اور تسبیح وتہلیل کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتے ہیں، تو بوجہ معنیٔ قربت کے نام مزدلفہ رکھا گیا۔

﴿۴﴾ اور اس میں چوتھی وجہ یہ ہے کہ اس مقام میں مغرب اور عشاء کی نماز کو جمع کیا جاتا ہے تو اس طرح دونمازوں کے اجتماع کی وجہ سے اس کا نام مزدلفہ رکھ لیا گیا۔

﴿۵﴾ "وقيل ان آدم عليه السلام اجتمع فيهامع حواء، وازدلف اليهااى دنامنها"

اور وجہ یہ ہے کہ جنت سے اترنے کے بعد اس مقام میں حضرت آدم علیہ السلام کا حضرت حواء سے اجتماع ہوا۔ یعنی زوجہ کے قریب ہوئے اور وصل حاصل ہوا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۔ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ☆ (سورۃالبقرۃ آیت، ۱۹۹)

﴿۱﴾

پھر بات یہ ہے اے قریشیو تم بھی وہیں سے پلٹو جہاں سے لوگ پلٹتے ہیں اور اللہ سے معافی مانگو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

﴿۲﴾

پھر لوٹو (اے قریش) جہاں سے لوٹتے ہیں لوگ، اور مغفرت طلب کرو اللہ سے، بیشک اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

راقم کی تسکین الجنان سے ایک ورق دیکھئے۔

"ثُمَّ اَفِيْضُوا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ"

پھر طواف کے لئے پھرو جہاں سے سب لوگ پھریں۔ (محمود الحسن صاحب)

پھر طواف کو چلو جہاں سے سب لوگ چلیں۔ (شاہ عبدالقادر صاحب)

پھر بات یہ ہے کہ اے قریشیو تم بھی وہیں سے پلٹو جہاں سے لوگ پلٹتے ہیں۔ (مولانا احمد رضا خان بریلوی)

زمانہ جاہلیت میں قریش کا دستور تھا کہ حج میں یہ عام لوگوں کے ساتھ مقام عرفات پر کھڑے نہیں ہوتے تھے بلکہ تکبر کی وجہ سے یہ مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے۔

رب قدوس نے ان کو اس طریقہ سے روکا کہ تم بھی لوگوں کے ساتھ ہی ٹھہرو اور وہاں سے ہی لوٹو جہاں سے اور لوگ لوٹتے ہیں۔ تم مزدلفہ سے ہی پلٹ کر نہ آجاؤ۔

یہ مفہوم اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان رحمہ اللہ کے ترجمہ سے بہت واضح ہے جبکہ دوسرے تراجم میں اس طرح نہیں۔ کیونکہ دوسرے تراجم سے یہ نہیں پتہ چلتا کہ یہ حکم قریش کو ہے یا اور لوگوں کو۔

جلالین کی عبارت ملاحظہ ہو۔

" (**ثم افیضوا**)یاقریش(**من حیث افاض الناس**) ای من عرفة بان تقفوابهاای بعرفة معهم ای مع سائر الناس و کانو الایقفون بعرفات و کانو ایقفون بالمزدلفة ترفعا عن الوقوف"

اے قریشیوتم بھی وہیں سے (عرفات) سے پلٹو جہاں سے لوگ پلٹتے ہیں ۔یعنی تم بھی لوگوں کے ساتھ مقام عرفات پر ٹھہرو۔کیونکہ قریش مقام عرفات پر نہیں ٹھہرتے تھے بلکہ تکبر کے طور پر مقام مزدلفہ سے ہی لوٹ آتے تھے۔

مدارک میں بھی ایسے ہی ہے۔

"هذا امر قریش بالافاضة من عرفات الی جمع و کانو ایقفون بجمع و سائر الناس بعرفات ویقولون نحن قطان(سكان)حرمه فلانخرج منه"

یہ قریش کو حکم ہے کہ تم بھی عرفات سے پلٹ کر مزدلفہ میں آؤ۔کیونکہ وہ مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے اور دوسرے لوگ عرفات میں ۔ان کا کہنا یہ تھا کہ ہم چونکہ حرم کے رہنے والے ہیں،لہٰذا حرم سے نہیں نکل سکتے۔ (تسکین الجنان،ص۶۴،۶۵)

☆ "عن عائشة قالت كان قریش ومن دان دینهایقفون بالمزدلفة و کانو ایسمون الحمس فکان سائر العرب یقفون بعرفة فلماجاء الاسلام امر اللّٰه تعالی بنبیه ان یأتی عرفات فیقف بهاثم یفیض منهافلذلک قوله عزوجل ثم افیضوامن حیث افاض الناس"

(بخاری و مسلم،مشکوۃ باب الوقوف بعرفة)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں قریش اوران کے دین کی تابعداری کرنے والے لوگ مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے اوراپنے آپ کوشجاع کہتے تھے۔باقی تمام عرب مقام عرفات پر ٹھہرتے تھے۔ جب اسلام آ گیاتو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کوحکم دیا کہ مقام عرفات پرآئیں اور وہاں وقوف کریں پھرلوٹیں،اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا"ثم افیضوامن حیث افاض الناس"

وضاحت حدیث:

”ومن دان دینھم“ جن لوگوں نے ان کی تابعداری کی اوران کے دین کواختیار کیا،یعنی قریش اور بنی کنانہ اور بنوخزاعہ اور کچھ قبائل جوقریش کے دین کو پسند کر تے تھے،وہ تمام مزدلفہ میں ٹھہر کر واپس منی میں آ جاتے تھے۔

”وکانوایسمون الحمس“ حمس جمع ہے احمس کی،حماسہ کامعنی ہے شجاعت۔وہ اپنے آپ کو بہادر کہتے تھے،وہ اپنی شجاعت وبہادری کی وجہ سے فخر کر تے تھے۔اپنی شان دوسرے لوگوں سے امتیازی سمجھتے تھے۔ اسی لئے جہاں دوسرے لوگ وقوف کر تے تھے یہ وہاں نہیں جاتے تھےاوران کادعویٰ یہ تھا۔

”انااھل الحرم المحترم کالحمام فلانخرج منه للوقوف کالعوام“

کہ ہم حرم کے باشندے ہیں اس لئے محترم لوگ ہیں اور جس طرح حرم کے کبوترحرم میں ہی رہتے ہیں باہرنہیں جاتے ہم بھی حرم سے باہرنکل کر وہاں جاکر (عرفات میں)وقوف نہیں کرسکتے جہاں عوام جاکروقوف کر تے (ٹھہرتے) ہیں۔

”فکان سائرالعرب یقفون بعرفة.علی العادة القدیمة والطریقةالمستقیمة“

باقی تمام عرب عرفات میں ٹھہرتے تھے کیونکہ پہلاطریقہ اورسیدھاراستہ ہی یہی ہے۔

یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام اورآپ کے بعدآنے والے تمام انبیاءکرام مقام عرفات پروقوف کر کے مزدلفہ کی طرف لوٹتے اورمزدلفہ سے منی کی طرف لوٹتے تھے۔پھر جب اسلام آ گیاتو نبی کریم ﷺ کومقام عرفات پرآنے کاحکم دیا۔کیونکہ وہی طریقہ تمام انبیاءکرام کاتھا،اسے ہی جاری رکھنے کاحکم دیا گیا کہ مقام عرفات پروقوف کر کےلوٹو۔

باقی لوگ تو پہلے سے ہی مقام عرفات پرآرہے تھے۔صرف قریش یاان کے متبعین عرفات پرنہیں آتے تھے، ان کوبھی حکم دے دیا گیا”ثم افیضوامن حیث افاض الناس“ پھر(اےقریش)تم لوٹو جہاں سےلوگ لوٹتے ہیں۔

دینی طلبائے کرام توجہ فرمائیں:

"ثم" تراخی کے لئے آتا ہے۔ یہاں تراخی کا معنی کیسے پایا گیا ہے؟ اس کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ "ثم" اس مقام میں اپنے حقیقی معنی پر رکھنا بھی درست ہے، کیونکہ منی سے عرفات تک کافی فاصلہ ہے۔ اس لئے معنی یہ ہوا کہ تم اے قریش مزدلفہ سے آگے کا فاصلہ بھی طے کرو اور مقام عرفات تک جا کر بُعد مکانی طے کر کے واپس لوٹو۔ (روح المعانی)

"ثم للتفاوت مابین الافاضتین کمافی قولک احسن الی الناس ثم لاتحسن الی غیر کریم"

قریش چونکہ مزدلفہ سے ہی لوٹ آتے تھے ان کا یہ طریقہ دین ابراہیمی کے خلاف تھا، جو نیا طریقہ دین کے خلاف ہو خصوصاً جس سے فرض کی بھی ترک لازم آ رہی ہو وہ بدعۃ ضلالۃ ہے۔

"ولاشک ان الضلالۃ متراخیۃ عن الھدی بحسب الرتبۃ"

اور یہ بات شک سے دور ہے کہ ضلالت رتبہ کے لحاظ پر ہدایت سے متراخی ہے۔

یعنی اس مقام میں "ثم" تراخی رتبی کے لئے ہے، بُعد مکانی کے لئے نہیں۔ (ازبیضاوی وشیخ زادہ)

یوم عرفہ اور وقوف عرفات کی فضیلت:

☆ "عن عائشۃ قالت ان رسول اللہ ﷺ قال مامن یوم اکثر من ان یعتق اللہ فیہ عبدا من النار من یوم عرفۃ وانہ لیدنو ثم یباھی بھم الملائکۃ فیقول ما اراد ھؤلاء"

(رواہ مسلم، مشکوۃ باب وقوف العرفۃ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یوم عرفہ سے بڑھ کر اور کوئی دن ایسا نہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ زیادہ تعداد میں بندوں کو آگ سے آزاد کرتا ہو۔ بیشک اس دن اللہ تعالیٰ کی رحمت وفضل قریب ہوتے ہیں۔ پھر وہ فرشتوں پر ان کا مرتبہ ظاہر فرماتا ہے۔ پھر کہتا ہے یہ بندے کیا ارادہ رکھتے ہیں (کیا چاہتے ہیں)۔

وضاحت حدیث:

''مباھاۃ'' کا معنی ہے''فخر کرنا''۔

''ثم یباھی بھم الملائکۃ،قال بعضھم ای یظھرعلی الملائکۃ فضل الحجاج وشرفھم''

ایک معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں پرمقام عرفات میں کھڑے ہونے والے حاجیوں کامرتبہ اوران کی شرافت کوفرشتوں پرظاہرکرتا ہے۔

گویا کہ فرشتوں کویاددلائی جاتی ہے کہ تم تخلیق آدم پرمیرے مشورہ کاجواب یہ دے رہے تھے۔

''اتجعل فیھامن یفسدفیھاویسفک الدماء''

کیاتوبنائے گااس میں جوفساد پھیلائیں گےاس میں اورخونریزیاں کریں گے۔اورمیں نے کہاتھا

''انی اعلم مالاتعلمون''بیشک میں جانتاہوں جوتم نہیں جانتے۔

آج اولادآدم کودیکھو،میرے علم کی جلوہ گری دیکھو،یہ لوگ کس طرح اپنی ہستی کومٹاکر(بال بڑھے ہوئے، ناخن بڑھے ہوئے،صرف دوچادروں میں ملبوس)میری رضاکے لئے مقام عرفات میں جمع ہیں۔

''اویحلھم من قربہ وکرامتہ محل الشیٔ المباھی بہ''

یااس کامطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یوم عرفہ کومقام عرفات پرٹھہرنے والے حاجیوں کواپناقرب عطافرماتا ہے۔ اوران کووہ مقام کرامت عطافرماتا ہے جوان کے لئے مقام فخر ہے۔

''فیقول مااراد ھؤلاء''رب تعالیٰ فرماتا ہے یہ کیاچاہتے ہیں؟

یہ جملہ بڑامختصرلیکن عظیم مطالب پرمشتمل ہے۔معنی یہ ہوا۔

''ای شیٔ ارادھؤلاء حیث ترکوااھلھم واوطانھم وصرفواموالھم واتعبواابدانھم''

کہ یہ لوگ کس چیزکاارادہ رکھتے ہیں،کیسے ہیں یہ لوگ جواپنے اہل وعیال کوچھوڑکریہاں جمع ہیں۔اپنے وطنوں کوچھوڑکریہاں آئے ہوئے ہیں۔اپنے مال خرچ کرکے یہاں پہنچے ہیں۔اور

اپنے جسموں کو مشقت میں ڈالے ہوئے ہیں۔

"ای ماارادوا الاالمغفرۃ و الرضاو القرب و اللقاء و من جاء ھذاالباب لایخشی الرد"

یعنی انہوں نے یہاں آ کر سوائے مغفرت اور رب تعالیٰ کی رضاء اوراس کے قرب اوراس کی ملاقات کے کوئی ارادہ نہیں فرمایا۔ جو شخص اس دروازہ پر آئے اسے یہ ڈر نہیں ہوتا کہ اس کی درخواست کو رد کر دیا جائے گا۔

ابھی تک جو بیان کیا ہے وہ استفہام انکاری اور ما نافیہ کے مطابق کلام ہے۔

اور اگر ما موصولہ بنایا جائے تو.....

"او التقدیر ماارادھؤلاء فھو حاصل لھم و درجاتھم علی قدر مراداتھم و نیاتھم"

مطلب یہ ہوگا کہ جو انہوں نے ارادہ کیا ہے وہ انہیں حاصل ہے اوران کے درجات ان کی مراد اور نیت کے مطابق ہوں گے۔

"اوای شیٔ ارادھؤلاء ای شیأسھلایسیر اعندنااذالمغفرۃ کف من التراب لایتعاظم عندرب الارباب"

یا مطلب یہ ہوگا کہ یہ کس چیز کا ارادہ کررہے ہیں، وہ چیز عطا کرنا ہمارے لئے آسان ہے۔ رب تعالیٰ کے نزدیک مغفرت فرمانا (یا اور بڑی سے بڑی نعمت عطاء کرنا اس کی قدرت میں) ایسے ہی ہے جس طرح لوگوں کو مہربانی کرنے والے بڑے لوگوں کے سامنے ایک مٹھی مٹی کی حیثیت ہے۔

(مرقاۃ، ج۵، ص ۳۲۹، ۳۳۰)

☆ "عن عمروبن شعیب عن ابیه عن جدہ ان النبی ﷺ قال خیر الدعاء دعاء یوم عرفة و خیر ماقلت اناوالنبیون من قبلی لااله الااللہ وحدہ لاشریک له الملک و له الحمد و ھوعلی کل شئ قدیر" (رواہ الترمذی، مشکوۃ باب الوقوف علی العرفة)

عمرو بن شعیب اپنے باپ، دادا سے روایت کرتے ہیں کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا بہتر دعاء

عرفہ کے دن کی دعاء ہے اور بہتر ہے جو میں نے اور مجھ سے پہلے انبیاء کرام نے کہا ہے (وہ یہ ہے) لااله الاالله وحده لاشريک له له الملک وله الحمدوهو على كل شئ قدير

وضاحت حدیث:

"دعاء یوم عرفة" کی اضافت میں دو احتمال ہیں۔

ایک یہ ہے کہ اضافت بمعنی لام کے ہو۔ اور لام اختصاص کے لئے ہو۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ بہتر دعاء وہ ہے جو عرفہ کے دن کے ساتھ خاص ہے۔ اور وہ بہتر دعاء یہ ہے جو میں نے اور مجھ سے پہلے انبیاء کرام نے کی ہے۔ وہ دعاء یہ ہے۔

"لااله الاالله وحده لاشريک له له الملک وله الحمدوهو على كل شئ قدير"

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ اضافت بمعنی "فی" کے ہو کہ یوم عرفہ میں دعاء کرنا بہتر دعاء اس معنی کے لحاظ پر دعاء میں عمومی معنی ہوگا۔ یعنی یوم عرفہ کو ہر قسم کی دعاء کرنا بہتر ہے۔ یہ معنی مراد لینا زیادہ بہتر ہے۔

اعتراض: "فان قلت هو ثناء" پہلے احتمال میں جو بیان کیا گیا ہے کہ "لااله الاالله الخ" دعاء ہے حالانکہ یہ ثناء ہے، ثناء کو دعا کیسے کہا گیا ہے۔

جواب: "قلت فی الثناء تعريض بالطلب" اللہ تعالیٰ کی تعریف جب بندہ کرتا ہے تو اشارۃً اس میں طلب خود ہی پائی جاتی ہے۔ گویا یوں کہا جائے "ذکر خدا مستلزم دعا" ہے۔

" لما شارک الذکر الدعاء فی انه جالب للمثوبات ووصلة الى حصول المطلوبات ساغ عده من جملة الدعوات فيكون من قبيل الكنايات التى هى ابلغ فی قضاء الحاجات فان التلويح اولى من التصريح"

جب ذکر کے ساتھ دعاء کو شریک کیا جائے تو اس میں ہر قسم کا ثواب حاصل ہوگا اور مطلوب چیزوں کے حصول تک پہنچنا ہوتا ہے اس لئے اسے دعا میں شمار کرنا جائز ہے۔ لہٰذا یہ کنایۃً (اشارۃً) دعاء

ہے۔اپنی حاجات کواشارہ سے پیش کرنا زیادہ بہتر ہے بنسبت ظاہر کرنے کے۔یہی مشہور ہے کہ "تلویح (کنایہ) تصریح سے بہتر ہے"۔

امیہ بن صلت نے ابن جدعان کو کہا۔

أ أذكر حاجتي ام قد كفاني	حياؤك ان شيمتك الحياء
اذا اثنى عليك المرء يوما	كفاه من تعرضه الثناء
کیا میں اپنی حاجت کو ذکر کروں یا مجھے کافی ہے۔	تمہاری حیاء بیشک تمہاری عادت ہی حیاء ہے۔
جب تم پر کوئی انسان کسی دن تعریف کرے۔	اس کا تعریف کرنے کے درپے ہونا ہی اسے کافی ہے۔

ذکر کو دعاء سے تعبیر کرنے میں اس طرف اشارہ پایا گیا ہے۔

"انه ينبغي للعبدان يشتغل بذكر المولى ويعرض عن المطالبة في الدنيا والاخرى اعتمادا على كرمه واحسانه وانعامه وامتنانه فقدورد من شغله ذكرى عن مسألتى اعطيته افضل مااعطى السائلين"

کہ بیشک بندہ جب مولیٰ کے ذکر میں مشغول ہو تو وہ دنیا اور آخرت میں اپنے مطالبات پیش نہ کرے بلکہ اللہ تعالیٰ کے کرم اور احسان اور انعام اور اس کی مہربانی پر اعتماد کرے، اسی لئے گویا کہ رب تعالیٰ کی طرف سے یہ کہا گیا ہے۔جو میرے ذکر میں مشغول ہونے کی وجہ سے مجھ سے سوال نہیں کرتا میں اسے سوال کرنے والوں سے زیادہ عطاء کرتا ہوں۔

یعنی اس صورت حال میں انسان اپنے آپ کو کامل طور پر اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے کہ اے مولیٰ میں تیری تقدیر پر راضی ہوں۔کیا خوب کسی نے کہا۔

وكلت الى المحبوب امرى كله　　فان شاء احيانى وان شاء اتلفا

میں نے اپنے تمام معاملات اپنے محبوب کے سپرد کر دیئے ہیں۔اگر چاہے تو مجھے زندہ رکھے اور اگر چاہے تو ہلاک کر دے۔

یعنی انسان کواختیار دیا گیا کہ چاہے تو دعاء کر کے رب تعالیٰ کاقرب حاصل کر لے، دعاء کر کے مدارج کی بلندی اورثواب حاصل کرے، دعاء کر کے گناہوں سے اورعذاب سے نجات حاصل کرے۔اور چاہے تو رب تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہوکر، توکل کر کے اپنے معاملات اس پر چھوڑ دے، ہرراہ خوب سے خوب تر ہے۔ (ازمرقاۃ)

☆ ''عن جابر قال قال رسول اللہ ﷺ اذاکان یوم عرفة ان اللہ ینزل الی السماء الدنیا فیباھی بھم الملائکة فیقول انظروا الی عبادی اتونی شعثاغبراضاجین من کل فج عمیق اشھدکم انی قدغفرت لھم فیقول الملائکة یارب فلان کان یرھق وفلان و فلانة قال یقول اللہ عزوجل قدغفرت لھم قال رسول اللہ ﷺ فمامن یوم اکثر عتیقامن النارمن یوم عرفة'' (رواہ فی شرح السنة،مشکوۃ باب الوقوف علی العرفة)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب عرفہ کا دن ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کا نزول آسمان دنیا پر فرماتا ہے، اپنے بندوں سے فرشتوں پر فخر کرتا ہے، تو کہتا ہے میرے بندوں کو دیکھو وہ میرے پاس آئے ہوئے ہیں، ان کے بال بکھرے ہوئے ہیں، غبار آلود ہیں، جو اپنی آواز بلند کررہے ہیں، وہ بڑے دور دراز سے آئے ہیں، میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ میں نے ان کی مغفرت کردی، فرشتے کہتے ہیں اے ہمارے رب فلاں شخص تو بہت بڑے گناہوں کی طرف منسوب ہے، اورفلاں شخص، اورفلاں عورت (اس طرح وہ کئی مردوں اورعورتوں کا ذکر کرتے ہیں) راوی کہتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تحقیق میں نے ان کی مغفرت کردی۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یوم عرفہ سے بڑھ کر کوئی اور دن ایسا نہیں جس میں آگ سے زیادہ لوگوں کو آزاد کیا جاتا ہو۔

مشکل الفاظ کے معانی:

''شعثا'' جمع ہے اشعث کی۔وہ شخص جس کے بال بکھرے ہوئے ہوں۔

''غبرا'' جمع ہے اغبر کی۔وہ شخص جس کے اعضاء غبار آلود ہوں۔

"ضــاجیـن" جیم مشدد ہے۔آواز کو بلند کرنے والے یعنی بلند آواز سے تلبیہ پڑھنے والے،اوراس کا معنی گرمی میں وقوف کرنے والے۔

☆ "عـن طـلـحة بن عبيدالله بن كريز ان رسول الله ﷺ قـال مـارؤى الشـيـطان يوماهو فيه اصـغـر ولاادحـر ولااحـقـر ولااغيـظ مـنـه في يوم عرفة وماذاك الالمايرى من تنزل الـرحـمة وتـجـاوز الله عـن الـذنوب العظام الامارؤى يوم بدرفانه قدرأى جبريل يزع الملائكة" (رواه مالک وفی شرح السنة بلفظ المصابيح ،مشكوة باب وقوف العرفة)

طلحہ بن عبیداللہ بن کریز فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یوم عرفہ کی بنسبت کسی اور دن میں شیطان کو زیادہ ذلیل ہوتے ہوئے اور زیادہ دور کئے جانے اور زیادہ حقیر ہوتے ہوئے اور زیادہ غصہ میں نہیں دیکھا گیا۔اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا (بندوں پر) نزول دیکھتا ہے۔اور اللہ تعالیٰ کا بڑے بڑے گناہوں کو معاف کرنا دیکھتا ہے (تو غصہ میں جل جاتا ہے) ہاں سوائے بدر کے دن کے (یعنی بدر میں بھی اس کی یہی حالت تھی) کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ جبریل فرشتوں کی صفوں کو ترتیب دے رہے ہیں۔

یعنی یوم عرفہ کو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رحمت نازل فرماتا ہے اور بندوں کے بڑے بڑے گناہ معاف کرتا ہے۔شیطان اسے دیکھ کر غصہ میں ہوتا ہے۔یہ اس کے لئے ذلت وحقارت اور دور دھکیلے جانے کی وجہ ہوتی ہے۔کیونکہ وہ تو کبھی نہیں چاہتا کہ بندوں کی اس طرح مغفرت کر دی جائے۔

جنگ بدر میں بھی شیطان کے ارادوں پر پانی پھر گیا وہ تو چاہتا تھا کہ مسلمان صفحہ ہستی سے مٹ جائیں،لیکن جب اس نے دیکھا کہ مسلمانوں کی امداد کے لئے تو جبریل فرشتوں کو لے کر آگئے ہیں اور ان کی صف بندی کر رہے ہیں تو وہ مایوس ہو کر غصہ میں جلنے لگا۔مسلمانوں کو کامیابی سے ہمکنار کر کے شیطان کو ذلیل کر دیا گیا۔

☆ "وعن عباس بن مرداس ان رسول الله ﷺ دعـالامته عشية عرفة بالمغفرة فأجيبَ انى قـدغـفـرت لهـم ماخلاالمظالم فانى آخذللمظلوم منه قال اى رب ان شئت اعطيت

المظلوم من الجنة وغفرت للظالم فلم يجب عشية فلما اصبح بالمزدلفة اعادالدعاء فاجيب الى ماسأل قال فضحک رسول اللهﷺ اوقال تبسم فقال له ابوبكر وعمر بابي انت وامي ان هذه لساعة ماكنت تضحک فيهافماالذى اضحكک اضحک اللهسنک قال ان عدو اللهابليس لماعلم ان اللهعزوجل قداستجاب دعائي وغفر لامتي اخذالتراب فجعل يحثوه على رأسه ويدعوبالويل والثبور فاضحكني مارأيت من جزعه" (رواه ابن ماجه وروى البيهقي في كتاب البعث والنشورنحوه)

حضرت عباس بن مرداس کہتے ہیں بیشک رسول اللہﷺ نے عرفہ کے پچھلے پہر اپنی امت کے لئے مغفرت کی دعاء فرمائی۔ آپ کو جواب دیا گیا کہ بیشک میں نے ان کی مغفرت کردی ہے سوائے مظالم کے۔ کیونکہ میں مظلوم کی وجہ سے ظالم کی گرفت کروں گا۔ نبی کریمﷺ نے عرض کی۔ اے میرے رب اگر تو چاہے تو مظلوم کو جنت عطاء کردے اور ظالم کی مغفرت فرمادے، عرفہ کی شام کو تو اس دعاء کی قبولیت کا آپ سے کوئی وعدہ نہ کیا گیا۔ مزدلفہ میں جب صبح ہوئی تو آپ نے اپنی دعاء کو لوٹایا۔ آپ نے دعاء میں جو سوال کیا تھا اسے قبول کرلیا گیا۔ راوی کہتے ہیں رسول اللہﷺ ہنسے یا مسکرائے (راوی کو شک ہے) حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے عرض کیا یارسول اللہ ہمارے ماں باپ آپ پر قربان، اس وقت میں آپ کے ہنسنے کی وجہ کیا ہے، کس چیز نے آپ کو ہنسایا، اللہ تعالیٰ آپ کو ہنساتا رہے۔ آپ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ کے دشمن ابلیس کو جب پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ نے میری دعاء کو قبول فرمالیا اور میری امت کی مغفرت کردی ہے تو وہ مٹی لے کر اپنے سر پر ڈالنے لگا وہ ہلاکت اور بربادی کو پکارنے لگا۔ (میری ہلاکت، میری بربادی، امت مصطفیٰ تو بخشی گئی) اس کی جزع کو دیکھ کر مجھے ہنسی آئی۔

فائدہ: نبی کریمﷺ نے اکثر اوقات تبسم فرمایا۔ بہت کم شاذ و نادر آپ سے ضحک بھی ثابت ہے۔ اکثر احادیث میں ضحک بمعنی تبسم کے استعمال ہے۔ آپ قہقہہ سے کامل طور پر اجتناب فرماتے تھے۔ تبسم کا معنی مسکراہٹ ہے جس میں

آواز نہیں ہوتی صرف ہونٹ کھلتے ہیں۔ تبسم سے نماز نہیں ٹوٹتی اور وضو بھی نہیں ٹوٹتا۔

ضحک اس ہنسی کو کہتے ہیں جس میں ہلکی آواز ہوتی ہے جو انسان خود ہی سنتا ہے ساتھ والا شخص اس کی ہنسی کی آواز نہیں سنتا۔ ضحک سے نماز ٹوٹ جاتی ہے، البتہ وضو نہیں ٹوٹتا۔

قہقہہ۔ ٹاہ ٹاہ کر ہنسنے کو کہتے ہیں، یعنی اتنی آواز سے ہنسنا جو آواز قریب والا شخص سن لے۔ اگر کوئی شخص رکوع و سجود والی نماز میں قہقہہ لگا کر ہنسے تو اس کا وضو ٹوٹ جاتا ہے اور نماز بھی ٹوٹ جاتی ہے۔ (یہ حکم نماز جنازہ اور سجدہ تلاوت یا خارجِ نماز کا نہیں)

زیادہ ہنسنے سے دل مردہ ہو جاتا ہے:

" عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ من ياخذعني هؤلاء الكلمات فيعمل بهن او يعلم من يعمل بهن قلت انايارسول الله فاخذبيدى فعدخمسافقال اتق المحارم تكن اعبدالناس، وارض بماقسم الله لك تكن اغنى الناس، واحسن الى جارك تكن مؤمنا، واحب للناس ماتحب لنفسك تكن مسلما، ولاتكثرالضحك فان كثرة الضحك تميت القلب". (رواه احمدوالترمذى وقال هذاحديث غريب، مشكوة كتاب الرقاق)

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کون ہے جو مجھ سے یہ کلمات حاصل کرے پھر ان کے مطابق عمل کرے، اور سکھائے ان لوگوں کو جو اس کے مطابق عمل کریں۔ میں نے کہا میں یارسول اللہ (آپ سے یہ کلمات سیکھوں گا) آپ نے میرے ہاتھ کو پکڑا تو پانچ چیزوں کو شمار فرمایا۔ آپ نے فرمایا حرام کاموں سے بچ کر رہو، یعنی تمام لوگوں سے زیادہ عبادت گذار بن کر رہو۔ اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر راضی رہو، یعنی لوگوں سے زیادہ مستغنی ہو کر رہو۔ اپنے پڑوسی سے اچھا سلوک کرو، یعنی کامل مؤمن (امن دینے والا) بن کر رہو۔ اور لوگوں کے لئے وہ چیز پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو، یعنی کامل مسلمان بن کر رہو۔ اور زیادہ ہنسو نہیں، بیشک زیادہ ہنسنا دلوں کو مردہ کر دیتا ہے۔

وضاحت: حرام کاموں سے بچ کر رہو، یعنی لوگوں سے زیادہ عبادت گذار بن کر رہو، اس جملہ کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ عبادت کا اہتمام گناہوں کے اجتناب سے مشروط کیا گیا ہے۔

"یعنی ان العبادة الامتثالية انما يتم ويكمل بالاجتناب عن المحارم"

یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام کو تسلیم کر کے عبادت میں مشغول ہونے کی تکمیل اسی وقت ہو سکتی ہے جب وہ حرام کاموں سے اجتناب کرے گا۔

"فمن لم يستقص فی الامتثاليات النوافل المندوبات ولكن يتق المحارم ويجتنب عنها ويبالغ فی ذلک فهو اعبد من الذی يستقصی فی الامتثال ويقصر فی الاجتناب" (لمعات)

جو شخص زیادہ نوافل تو نہیں پڑھتا، لیکن حرام کاموں سے بچتا ہے اور ان سے اجتناب کرتا ہے، اور حرام کاموں سے بچنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے، وہ بنسبت اس شخص کے زیادہ عبادت گذار ہوتا ہے جو نوافل تو زیادہ پڑھتا ہے لیکن حرام کاموں سے اجتناب نہیں کرتا۔

مقام افسوس: آجکل سڑک پر چلتے ہوئے نوجوانوں کے بیہودہ قہقہے سن کر، اور بسوں میں سفر کرتے ہوئے اور بس سٹاپ پر کھڑے نوجوانوں کے بیہودہ قہقہے سن کر، اور شادیوں کی محافل میں افیسران کو قہقہے لگاتے دیکھ کر یہی سمجھ آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کی دھجیاں بکھیرنے والے واقعی مردہ دل ہیں۔ بیہودہ قہقہوں سے درسگاہیں بھی خالی نہیں۔ دنیاوی درسگاہ ہو یا دینی ان میں بیہودہ قہقہے لگانا یقیناً بیہودہ طریقہ ہے۔

"وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰه": اور بخشش طلب کرو اللہ سے۔

"فالمراد منه الاستغفار باللسان مع التوبة بالقلب"

مراد اس سے یہ ہے کہ زبان سے بھی استغفار کرو اور دل سے بھی توبہ کرو۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی طاعت میں جو تقصیر ہوئی ہو اس پر نادم ہو جائے، اور عزم کرے کہ اس کے بعد کوئی کوتاہی نہیں کرے گا، اور غرض اس میں صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء ہو اور جلدی حاصل ہونے والے (دنیاوی) منافع مقصود نہ ہوں۔

استغفار کا حکم بھی ایسے ہی ہے جس طرح شہادتین کا حکم ہے، جب تک حضورِ قلب سے شادتین کا ذکر نہیں کرے گا اس وقت تک حقیقی ایمان حاصل نہیں ہوگا، کیونکہ منافقین بھی زبان سے شہادتین پڑھتے تھے۔

"واما الاستغفار باللسان من غیر حصول التوبة بالقلب فهو الی الضر اقرب"

صرف زبان سے استغفار کرنا دل سے توبہ نہ کرنا نقصان دہ تو ہوسکتا ہے لیکن نفع مند نہیں۔ نفع مند اسی وقت ہوگا جب حال قال (دلی کیفیت زبان کے) مطابق ہو۔

سوال: یہاں استغفار کا حکم مطلق ہے، یعنی سب لوگوں کو حکم ہے، حالانکہ کئی لوگ گنہگار نہیں ہوتے، ان کو استغفار کا حکم دینے کا کیا مطلب ہے؟

جواب: اگر کوئی شخص گنہگار ہوا تو استغفار کرنا اس پر واجب ہے۔ اگر گنہگار نہ ہوا تو پھر بھی ممکن ہے کہ واجبات کے ادا کرنے میں یا گناہوں سے اجتناب کرنے میں اس سے کوئی کوتاہی ہوگئی ہو۔

"وجب علیه الاستغفار ایضا تدارکا لذلک الخلل المجوز"

تو اسی لئے اس شخص پر بھی استغفار واجب ہوگی تاکہ جن کوتاہیوں کا احتمال پایا گیا ہے ان کا ازالہ ہوسکے۔

اور یہ کہنا کہ کسی شخص سے گناہ صادر ہی نہیں ہوا یقیناً (یہ انبیائے کرام کے بغیر عام) بشر کے لئے تو ممکن ہی نہیں۔ کسی ایک عمل کے متعلق بھی یہ کہنا ممکن نہیں، ساری عمر کے اعمال کے لئے کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ایک شخص نے ساری عمر میں کوئی غلطی نہیں کی۔

اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ کسی نے ساری عمر کوئی گناہ نہیں کیا "فالاستغفار ایضا واجب" استغفار پھر بھی واجب ہے۔

"وذلک لان طاعة المخلوق لاتلیق بحضرة الخالق"

اس لئے کہ مخلوق کو یہ طاقت ہی حاصل نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق اس کی عبادت کر سکے۔

"ولهذا قالت الملائکة سبحانک ماعبدناک حق عبادتک"

اسی وجہ سے ملائکہ نے کہا اے اللہ تیری ذات پاک ہے ہم نے تیری عبادت نہیں کی جیسا کہ تیری عبادت کرنے کا حق تھا۔

" فکان الاستغفار لازمامن هذه الجهة"

اس لئے بھی استغفار لازم ہے کہ انسان اگر گنہگار نہ بھی ہو تو اپنی عبادات کو کم سمجھ کر رب تعالیٰ سے استغفار کرتا رہے جو بلندیٔ مراتب کا ذریعہ ہے۔

" ولهذاقال ﷺ انه ليغان قلبي و اني لاستغفر الله في اليوم والليلة سبعين مرة"

اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک میرے دل پر جب پردہ چھا جاتا ہے تو میں دن رات میں ستر مرتبہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ تبلیغ دین کے لئے بندوں سے بھی تعلق رکھتے اور دنیاوی مشاغل بھی درپیش آتے، اس لئے ان اوقات میں اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ میں آپ کمی سمجھتے، جسے آپ نے پردہ سے تعبیر فرمایا کہ دنیاوی مشاغل کی وجہ سے جب رب تعالیٰ کی طرف توجہ میں کمی محسوس کرتا ہوں تو استغفار کرتا ہوں۔

"اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَحِيْمٌ" بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا بہت رحم کرنے والا ہے۔

غفور اور رحیم دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں۔ یعنی غفور کا معنی بہت زیادہ بخشش کرنے والا۔ اور رحیم کا معنی بہت زیادہ رحم کرنے والا۔

یہ آیۃ دلالت کرتی ہے اس پر کہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والے کی توبہ قبول کرتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے گنہگاروں کو مغفرت طلب کرنے کا حکم دیا۔ پھر اپنی شان بیان فرمائی کہ میں بہت زیادہ بخشنے والا اور بہت زیادہ رحم کرنے والا ہوں۔

" فهذا يدل قطعا على انه تعالى يغفر لذلک المستغفر ويرحم ذلک الذی تمسک بجبل رحمته و کرمه"

اسی سے یقینی طور پر سمجھ آیا کہ اللہ تعالیٰ مغفرت طلب کرنے والے کی مغفرت فرماتا ہے اور اس شخص پر رحم فرماتا ہے جو اس کے جبل رحمت اور جبل کرم کا سہارا لیتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

☆☆☆☆☆

فَاِذَاقَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَ كُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ۔ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَافِي الدُّنْيَاوَمَالَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ☆وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَافِي الدُّنْيَاحَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَاعَذَابَ النَّارِ ☆ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّاكَسَبُوْا ۔ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ☆ (سورۃالبقرۃ آیات ۲۰۰ ۲۰۲)

﴿۱﴾

پھر جب اپنے حج کے کام پورے کر چکو تو اللہ کا ذکر کرو جیسے اپنے دادا کا ذکر کرتے تھے ،بلکہ اس سے زیادہ اور کوئی آدمی یوں کہتا ہے کہ اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں دے اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔اور کوئی یوں کہتا ہے کہ اے رب ہمارے ہمیں دنیا میں بھلائی دے اور ہمیں آخرت میں بھلائی دے اور ہمیں عذاب دوزخ سے بچا۔ایسوں کو ان کی کمائی سے بھاگ ہے اور اللہ جلد حساب کرنے والا ہے۔

﴿۲﴾

پھر جب ادا کر لو اپنے احکام حج تو ذکر کرو اللہ کا جیسے ذکر کرتے تھے تم اپنے باپ دادا کا بلکہ اس سے زیادہ ذکر کرو۔تو کوئی آدمی یوں کہتا ہے کہ اے رب ہمارے عطاء کر ہمیں دنیا میں اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔اور کوئی یوں کہتا ہے کہ اے رب ہمارے ہمیں عطاء کر دنیا میں بھلائی اور ہمیں آخرت میں بھلائی دے اور بچا ہمیں آگ کے عذاب سے ،ان لوگوں کا حصہ ہے اس سے جو انہوں نے کسب کیا اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

ماقبل سے تعلق:

اللہ تعالیٰ نے پہلے حج کے احکام تفصیل سے بیان فرمائے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد "فاذاافضتم من عرفات فاذکرو االلہ" فرما کر ذکر کرنے کا حکم دیا، پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر پر ہی اقتصار کرو، پھر اس کے بعد کیفیت دعا کا ذکر فرمایا۔

کتنی ہی حسین ہے یہ ترتیب:

"فانه لابدمن تقديم العبادة لكسر النفس و ازالة ظلماتها"

عبادت کا سب سے پہلے پایا جانا اس لئے ضروری ہے کہ اس سے نفس میں عجز پایا جاتا ہے، نفس کا تکبر ٹوٹ جاتا ہے اور اسے گناہوں کی تاریکیوں کا ازالہ پایا جاتا ہے۔

"ثم بعد العبادة لابدمن الاشتغال بذكر الله تعالیٰ لتنوير القلب وتجلی نور جلاله"

پھر عبادت کے بعد اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہونا ضروری ہے تاکہ ذکر سے دل منور ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کی نورانی تجلیات کا ظہور ہو۔

"ثم بعدذلک الذكر يشتغل الرجل بالدعاء فان الدعاء انمايكمل اذا كان مسبوقا بالذكر"

پھر ذکر کے بعد انسان دعاء میں مشغول ہو، بیشک دعاء کی تکمیل ہی اس وقت ہوتی ہے جو اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کا ذکر پایا جائے۔

جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا، یعنی کہا۔

"الذی خلقنی فهو يهدين" جس نے مجھے پیدا کیا وہی مجھے ہدایت دینے والا ہے۔ پھر عرض کیا۔

"رب هب لی حكما والحقنی بالصالحين"

اے میرے رب مجھے حکم عطاء فرما اور مجھے اپنے قرب کے لائق لوگوں سے ملا۔ (تفسیر کبیر)

شانِ نزول:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ بیشک عرب کے لوگ جب حج سے فارغ ہوتے تھے تو ایام تشریق کے بعد منی میں مسجد اور پہاڑ کے درمیان ٹھہر جاتے، پھر ہر ایک اپنے آباء واجداد کی سخاوت اور شجاعت اور صلہ رحمی کا ذکر کرتا، اپنے آباء کی تعریف میں اشعار پڑھتے اور نثر میں تقریریں کرتے، اس طرح وہ اپنی شہرت حاصل کرتے اور اپنے اسلاف کے قصیدے پڑھ کر فخر کرتے۔

" فلماانعم اللہ علیھم بالاسلام امرھم ان یکون ذکرھم لربھم کذکرھم لآبائھم "

جب اللہ تعالیٰ نے ان کو نعمت اسلام عطاء کی تو ان کو حکم فرمایا کہ حج ادا کرنے کے بعد تم اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو جیسا کہ تم اپنے آباء واجداد کا ذکر کرتے تھے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ کرو۔

یعنی اب تم اپنے آباء واجداد کے ذکر کو چھوڑ دو صرف اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، اور وہ بھی زیادہ سے زیادہ ذکر کرو۔

(تفسیر کبیر)

" فَاِذَاقَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ " جب تم ادا کرلو احکام حج۔

" ای فرغتم من ارکان الحج ومناسکھا وذلک یوم النحر بعد رمی جمرۃ العقبۃ و الذبح والحلق والطواف والسعی "

یعنی جب تم حج کے ارکان اور دوسرے احکام واجبات وغیرہ سے فارغ ہو جاؤ یعنی جمرات کو کنکریاں مارنے اور ذبح کرنے اور سر منڈانے اور طواف کرنے اور سعی کرنے سے دس ذی الحج کو تم فارغ ہو جاؤ تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو۔

(مظہری)

"قضاء" کے مختلف مطالب ہیں۔ اصل میں اس کا معنی "فیصلہ کرنا" ہے، پھر اس کا تعلق یا قول سے ہوتا ہے یا فعل سے، پھر ہر ایک کا تعلق یا اللہ تعالیٰ سے ہوگا یا انسانوں سے۔

اللہ تعالیٰ کے قول سے تعلق ہو، جیسا رب تعالیٰ نے فرمایا۔

''(وقضی ربک ان لاتعبدو االاایاہ)ای امر بذلک''

اور آپ کے رب نے یہ فیصلہ فرمایا کہ تم اس کے بغیر کسی اور کی عبادت نہ کرو (یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے)۔

اوررب تعالیٰ نے فرمایا۔

''(وقضینا الی بنی اسرائیل فی الکتاب)فھذا قضاء بالاعلام والفصل فی الحکم''

اور ہم نے بنی اسرائیل کی طرف فیصلہ فرمایا کتاب میں (یعنی ان کو بتایا اور حکم دیا)۔

قضاء کا تعلق اللہ تعالیٰ کے فعل سے ہو۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

''واللہ یقضی بالحق''اللہ تعالیٰ حق کا فیصلہ فرماتا ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ کا فعل حق پر مبنی ہوتا ہے۔

قضاء کا تعلق بندوں کے قول سے ہو۔جیسا کہ کہا جاتا ہے۔

''قضی الحاکم بکذا'' حاکم نے اس طرح فیصلہ کیا ہے۔یعنی حاکم نے اس طرح کہا ہے۔

قضاء کا تعلق بندوں کے فعل سے ہو۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

''فاذاقضیتم مناسککم''جب تم حج کے افعال سے فارغ ہو جاؤ۔

قضاء بمعنی موت اور قتل کے بھی استعمال ہے۔ (مفردات راغب)

ذکر کردہ معنی حدیث پاک سے:

'' اخرج ابن ابی حاتم عن عطاء فاذاقضیتم مناسککم قال حجکم'' (درمنثور)

حضرت عطاء کہتے ہیں، رب تعالیٰ کے ارشاد''فاذاقضیتم مناسککم'' کا مطلب یہ ہے کہ جب تم حج سے فارغ ہو جاؤ۔

''فَاذْكُرُوااللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ''

تو ذکر کرو اللہ کا جیسا تم ذکر کرتے تھے اپنے آباءواجداد کا۔

شانِ نزول سے مطلب واضح ہو چکا ہے، تاہم اس تشبیہ سے کئی وجوہ سمجھ آ رہی ہیں۔

﴿۱﴾ "توفروا علی ذکر اللہ کما کنتم تتوفرون علی ذکر الآباء وابذلوا جهدکم فی الثناء علی اللہ وشرح آلائه ونعمائه کمابذلتم جهدکم فی الثناء علی آبائکم"

اللہ تعالیٰ کا ذکر وافر مقدار میں (زیادہ سے زیادہ) کرو، جیسا تم اپنے آباء واجداد کا ذکر وافر مقدار میں کرتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی نعمتوں کی وضاحت کرنے میں پوری پوری کوشش صرف کرو، جیسا کہ تم اپنے آباء واجداد کی تعریف کرنے میں اپنی پوری کوشش صرف کرتے تھے۔

انسان اگر غور کرے تو انسان کی عقل بھی یہ تسلیم کرے گی کہ اللہ تعالیٰ کی تعریف کرنے میں کمال ہے اور اپنے آباء واجداد کی تعریف کرنے میں نقصان ہے۔ اس لئے کہ اگر اپنے آباء واجداد کی تعریف میں جھوٹ بولتا ہے، مبالغہ کرتا ہے تو دنیا میں لوگوں کے سامنے وہ شخص گھٹیا ہو جاتا ہے اور آخرت میں سزا کا مستحق ہوگا۔ اور اگر اپنے آباء واجداد کی سچی تعریف کرتا ہے تو اس سے انسان کو تکبر و غرور حاصل ہوتا ہے۔

"وکل ذلک من امهات المهلکات"

اپنے آباء واجداد کی جس طرح بھی تعریف کرے وہ نقصان کا سبب ہے اور گویا کہ انسان کو برباد کرنے کی جڑ ہے۔

"فثبت ان اشتغالکم بذکر اللہ اولی من اشتغالکم بمفاخرة آباء کم"

تو ثابت ہوا بیشک تمہارا اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہونا بہتر ہے بنسبت اپنے آباء واجداد کے ذکر کے۔

﴿۲﴾ دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن پاک میں زیادہ طور پر مذکر کے صیغے استعمال ہوئے ہیں لیکن وہ مؤنث کو بھی شامل ہیں۔ اور کبھی دو متقابل چیزوں میں سے ایک کا ذکر کیا جاتا ہے اور دوسری خود بخود سمجھ میں آ جاتی ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"سرابیل تقیکم الحر" (اور بنایا تمہارے لئے) لباس جو تمہیں گرمی (اور سردی) سے بچائے۔

یہاں گرمی کا ذکر ہے، سردی کا نہیں اگرچہ مراد گرمی اور سردی دونوں ہی ہیں۔

اس تمہید کے بعد مقصد بیان یہ ہے کہ "کذکرکم آباء کم" سے مراد یہ ہے کہ (اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو) جیسا کہ تم اپنے ماں، باپ کا ذکر کرتے تھے۔ چونکہ بچہ جب سب سے پہلے بولنا شروع کرتا ہے تو ابا، ابا۔ امی، امی کہتا ہے۔ وہ ہر وقت یہ لفظ بولتا رہتا ہے، تو گویا کہ یہ مطلب بھی سمجھ آیا۔

"کونوا مواظبین علی ذکر اللہ کمایکون الصبی فی صغرہ مواظباعلی ذکر ابیہ وامہ"

کہ تم اللہ تعالیٰ کا ذکر ہمیشہ کرو، اللہ اللہ کرتے ہی رہو جیسا کہ تم بچپن میں ابا، ابا۔ امی، امی کرتے رہے۔

﴿۳﴾ تیسری وجہ یہ ہے۔

"ان الرجل کمالاینسی ذکر ابیہ فکذالک یجب ان لایغفل عن ذکر اللہ"

کہ انسان جس طرح اپنے باپ کے ذکر اور اس کی یاد کو نہیں بھولتا اسی طرح اسے چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل نہ رہے۔

﴿۴﴾ چوتھی وجہ یہ ہے۔ "عظموا اللہ کتعظیم آباء کم"

کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت بیان کرو، اس کی تعظیم بجالاؤ جس طرح تم اپنے آباء واجداد کی تعظیم کرتے ہو۔

﴿۵﴾ "اذکروا اللہ بالوحدانیة کذکرکم آباء کم بالوحدانیة"

تم اللہ تعالیٰ کو وحدانیت سے یاد کرو جس طرح تم اپنے والدین کو ایک سمجھتے ہو۔

اگر کوئی شخص کسی کو کہے تمہارے دو باپ ہیں اور تمہاری دو مائیں ہیں تو وہ ماننے کے لئے تیار نہیں بلکہ اسے اس قول سے تکلیف ہوتی ہے اور شرم محسوس ہوتی ہے، تو پھر وہ انسان سمجھ سے کتنا ہی دور ہے جو "کان یثبت لنفسہ آلھة" اپنے نفس کے لئے کئی خدا مانتا ہے۔

﴿۶﴾ چھٹی وجہ یہ ہے۔

"ان الطفل کمایرجع الی ابیہ فی طلب جمیع المھمات ویکون ذکرالہ بالتعظیم فکونوا انتم فی ذکر اللہ کذلک"

بچہ جس طرح ہر مشکل میں اپنے آباء کی طرف رجوع کرتا ہے، اور اپنے والدین کا ذکر تعظیم سے

کرتا ہے تو اسی طرح اسے چاہئے کہ ہر مصیبت میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے، اور نہایت تعظیم سے اور ادب واحترام سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے۔

﴿۷﴾ اور ساتویں وجہ اس میں یہ ہے کہ یہ احتمال پایا گیا ہے کہ وہ اپنے آباء واجداد کے اعمال کو دعاء کی قبولیت کا وسیلہ بناتے ہوں۔

"فعرفهم اللہ تعالی ان آباء هم ليسوا في هذه الدرجة اذ افعالهم الحسنة صارت غير معتبرة بسبب شركهم"

تو رب تعالیٰ نے ان کو یہ پہچان کرائی کہ بیشک ان کے آباء واجداد اس درجہ کے نہیں تھے کہ ان کے اچھے اعمال کو تم دعاء کی قبولیت کا وسیلہ بناؤ، کیونکہ وہ تو مشرک تھے، ان کے شرک کی وجہ سے ان کے اچھے اعمال غیر معتبر تھے۔

"وامروا ان يجعلوا بدل ذلك تعديد آلاء اللہ ونعمائه وتكثير الثناء عليه ليكون ذلك وسيلة الى تواتر النعم في الزمان المستقبل"

ان کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے آباء واجداد کے اعمال کا وسیلہ پیش کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کی نعمتوں اور اس کی ثناء میں کثرت کو پیش کریں جن کے وسیلہ سے زمانہ مستقبل میں تمہیں اور نعمتیں عطاء ہوں۔

زمانہ جاہلیت میں اپنے آباء واجداد کے ناموں کی قسمیں اٹھائی جاتی تھیں تو رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمادیا، یوں ارشاد فرمایا۔

"من كان حالفا فليحلف باللہ او ليصمت"

جو شخص قسم اٹھائے وہ اللہ تعالیٰ (کے نام) کی قسم اٹھائے یا خاموش رہے۔

فائدہ: علامہ رازی رحمہ اللہ نے کیا خوب بیان فرمایا کہ ان لوگوں کے آباء واجداد کے اعمال شرک کی وجہ سے غیر معتبر تھے، اسی سے سمجھ آیا کہ اگر ان کے آباء واجداد مشرک نہ ہوتے تو ان کے نیک اعمال کا وسیلہ یقیناً معتبر ہوتا۔ علامہ

رازی کے ان الفاظ کو غور سے پڑھو تو یہ مسئلہ آپ کو سمجھ آ جائے، آپ فرماتے ہیں۔

" اذا کان ماسوی اللّٰہ فانما ھو للّٰہ و باللّٰہ"

جب اللہ تعالیٰ کے ماسواء کا وسیلہ ہو تو وہ اللہ کی رضاء کے لئے ہو کہ یہ شخص اللہ کا نیک بندہ ہے، اس کے نیک اعمال ہیں، وہ وسیلہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کا ہی ہوگا، کیونکہ اس کی نیک مخلوق کا وسیلہ اس کے قرب کا ذریعہ ہے۔

ہاں البتہ تعظیم کامل اور عبادت صرف رب تعالیٰ کی ہے۔

"فالأولی ان تعظیم اللّٰہ تعالی و لاالہ غیرہ"

زیادہ بہتر یہی ہے کہ تعظیم کامل صرف اللہ تعالیٰ کی پائی جائے کیونکہ اس کے بغیر اور کوئی معبود نہیں۔

﴿۸﴾ آٹھویں وجہ جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیۃ کریمۃ کی تفسیر میں بیان کی وہ یہ ہے۔

" ھو ان تغضب للّٰہ اذا عصی اشد من غضبک لو الدک اذا ذکر بسوء"

کہ جس طرح تمہارے سامنے تمہارے باپ کی کوئی شخص برائی بیان کرے تو تمہیں اس پر غصہ آتا ہے اس طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے نافرمان پر غصہ آنا چاہئے۔

تنبیہ: یہ وجوہ جو بیان کی گئی ہیں ان میں سے پہلی وجہ تو شان نزول کے لحاظ پر بہت واضح اور متعین ہے، لیکن باقی تمام وجوہ بھی پائی گئی ہیں۔

" انہ یجب علی العبدان یکون دائم الذکر لربہ دائم التعظیم لہ دائم الرجوع الیہ فی طلب مھماتہ دائم الانقطاع عمن سواہ"

کہ بندے کو چاہئے کہ وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا رہے، ہمیشہ اس کی تعظیم کرتا رہے، تمام مصائب و آلام میں اور تمام اہم کاموں میں اس کی طرف رجوع کرے، اور اس کے ماسواء اس کا کوئی شریک نہ ٹھہرائے بلکہ اس کے شرکاء سے انقطاع کرے، البتہ اس کے مقبولوں کی طرف اسی کی رضاء کے لئے رجوع کرے۔

" اللهم اجعلنابهذه الصفة یااکرم الاکرمین"

اے اکرم الاکرمین! ہمیں بھی اس صفت سے نواز۔ (ماخوذ از کبیر)

"اَوۡاَشَدَّ ذِكۡرًا" معناه بل اشدذکرا۔

اس کامعنی یہ ہے کہ بلکہ اس کا ذکر آباء کے ذکر سے بھی زیادہ کرو۔

یہ بات واضح ہے کہ انسان کے آباء واجداد کے کمالات قلیل (تھوڑے) ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی صفات کمالیہ غیر متناہی (بے حد) ہیں۔

" فیجب ان یکون اشتغالهم بذکر صفات الکمال فی حق اللّٰہ تعالی اشدمن اشتغالهم بذکرمفاخر آبائهم"

اس لئے واجب ہے کہ اللہ کی صفات کاملہ کے ذکر میں زیادہ سے زیادہ مشغول ہو، بنسبت اپنے اپنے آباء واجداد کے ذکر میں مشغول رہنے سے۔ (ماخوذ از کبیر)

مقام توجہ: اس سے پہلے جن آٹھ وجوہ کا ذکر کیا گیا ہے ان تمام سے "او اشد ذکرا" کا تعلق ہے۔ یعنی اپنے آباء واجداد کے ذکر سے بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر زیادہ کرو، اپنے آباء واجداد کی تعظیم سے اللہ تعالیٰ کی تعظیم زیادہ کرو، اپنے اہم کاموں میں اور مصائب وآلام میں اپنے آباء واجداد کی طرف رجوع کرنے سے زیادہ رجوع اللہ تعالیٰ کی طرف کرو، تمام وجوہ کو اسی کے مطابق طلبائے کرام خود سمجھنے کی کوشش کریں۔ (راقم)

فَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّقُوۡلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنۡيَا وَمَا لَهٗ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنۡ خَلَاقٍ ☆ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّقُوۡلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنۡيَا حَسَنَةً وَّفِى الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ☆

تو کوئی آدمی یوں کہتا ہے کہ اے رب ہمارے عطاء کر ہمیں دنیا میں اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔ اور کوئی یوں کہتا ہے کہ اے رب ہمارے ہمیں عطاء کر دنیا میں بھلائی اور ہمیں آخرت میں بھلائی دے اور بچا ہمیں آگ کے عذاب سے۔

یہاں سے اللہ تعالیٰ نے دعاء کرنے والوں کے دوگروہوں کا ذکر کیا، ایک گروہ وہ ہے۔

" احدهماان یکون دعاؤهم مقصورا علی طلب الدنیا" جوصرف دنیا کی طلب کی دعاء کرتا ہے۔

اس کے متعلق فرمایا۔"ومالہ فی الآخرة من خلاق" اور نہیں ہے اس کا آخرت میں کچھ حصہ۔

پہلا احتمال: اس گروہ سے مراد اگر کفار ہوں جیسا کہ بعض حضرات کا قول ہے تو " ومالہ فی الآخرة من خلاق" کا مطلب ہوگا۔" لانصیب له فیهامن کرامة ونعیم وثواب"

کہ ان کو آخرت میں کوئی عزت حاصل نہیں ہوگی اور نہ ہی نعمتیں حاصل ہوں گی اور نہ ہی ان کو ثواب حاصل ہوگا۔

کفارصرف دنیا کے حصول کی دعاء کرتے تھے۔

" روی عن ابن عباس ان المشرکین کانویقولون اذاوقفوااللهم ارزقنا ابلا و بقرا و غنما وعبیداواماء (وماکانویطلبون التوبة والمغفرة وذلک لانهم کانوامنکرین للبعث والمعاذ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مشرک لوگ عرفات اور مزدلفہ کے وقوف (ٹھہرنے) میں یہ دعاء کرتے تھے۔اے اللہ! ہمیں اونٹ عطاء فرما اور ہمیں گائے اور بھیڑ، بکریاں اور غلام اور لونڈیاں عطا فرما۔(وہ توبہ نہیں کرتے تھے اور مغفرت طلب نہیں کرتے تھے اس لئے کہ وہ قیامت کے منکر تھے)۔

" وعن انس کانوایقولون اسقناالمطرواعطناعلی عدوناالظفر"

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کفارومشرکین کہتے تھے ہمیں بارش عطاء کر اور ہمیں دشمن پر کامیابی عطاء فرما۔

تو اس فریق یعنی کفار کی خبر دیتے ہوئے رب تعالیٰ نے فرمایا۔"ومالہ فی الآخرة من خلاق" اور نہیں اس کے لئے آخرت میں کچھ حصہ۔

دوسرا احتمال: اس فریق سے مراد مؤمنین بھی ہوسکتے ہیں، کیونکہ کئی مومن بھی "یسألون اللہ لدنیاھم لا لأخراھم" اللہ تعالیٰ سے صرف دنیا کا سوال کرتے تھے آخرت کی طلب نہیں کرتے تھے۔

اس عظیم مقام میں صرف فانی دنیا کے متعلق سوال کرنا اور آخرت کی دائمی نعمتوں سے اعراض کرنا ان کے لئے آخرت کے حصہ سے محرومیت کا سبب ہے۔ اس صورت میں "وماله فی الآخرة من خلاق" کا معنی یہ ہوگا۔

"لاخلاق له فی الآخرة کخلاق من سأل اللہ لآخرته"

کہ اس کو آخرت میں وہ حصہ نہیں حاصل ہوگا جو آخرت کی طلب کرنے والے کو حاصل ہوتا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ وہ مومن ہونے کے لحاظ پر آخرت کے حصہ سے محروم تو نہیں ہوگا لیکن اس ثواب میں وہ کمال حاصل نہیں ہوگا جو آخرت کی طلب والے کو حاصل ہوتا ہے۔

یہ مسئلہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے واضح ہورہا ہے، آپ فرماتے ہیں۔

"ان اللہ یؤید ھذا الدین باقوام لاخلاق لھم"

بیشک اللہ تعالیٰ دین کو ایسی قوموں کے ذریعے تائید دے گا جن کا کوئی حصہ نہیں۔

یعنی ان کا کام خلوص پر مبنی نہیں ہوگا، دین کا کام وہ آخرت کے لئے نہیں کریں گے بلکہ دنیا کے لئے کریں گے، خواہ دنیا کا مال حاصل کرنے کے لئے یا مرتبہ حاصل کرنے کے لئے، یا ان کا کام ریاء کاری کے لئے ہوگا تو ان کو اگرچہ اس کا ثواب حاصل نہیں ہوگا لیکن دین کو ان سے تائید حاصل ہوگی۔

اسی طرح دنیا کی دعاء کرنے والا جب مسلمان ہو تو وہ اپنی دعاء میں یہ کہہ رہا ہوگا کہ اے اللہ! دنیا عطاء کر اور عمل سے جھوٹی قسمیں اٹھا کر دنیا کا مال جمع کر رہا ہوگا، اسے آخرت میں کوئی حصہ (یعنی اجر وثواب) حاصل نہیں ہوگا۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا۔

"ان الذین یشترون بعھد اللہ وایمانھم ثمنا قلیلا اولئک لاخلاق لھم فی الآخرة"

بیشک وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور قسموں کے ذریعے تھوڑی قیمت (دنیا کا حقیر مال) حاصل کرتے

ہیں ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔

اس صورت میں مطلب یہ ہوگا۔"انه لاخلاق له فی الآخرة الاان یتوب"

بیشک اس فریق کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہاں مگر یہ کہ توبہ کرلے۔

یا مطلب یہ ہوگا۔"انه لاخلاق له فی الآخرة الاان یعفو اللّٰه عنه"

بیشک اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے معاف فرمادے۔

یا مطلب یہ ہوگا۔"انه لاخلاق لمن اخذ ما لا بیمین فاجرة کخلاق من تورع ذلک"
جس شخص نے جھوٹی قسموں کے ذریعے مال حاصل کرلیا اس کا ایسا حصہ نہیں ہوگا جیسا کہ اس سے بچ کر تقوی حاصل کرنے والے کو حصہ حاصل ہوگا۔

مقصد واضح ہوا کہ کافر مکمل طور پر اخروی حصہ سے محروم ہوگا لیکن مومن خواہ کتنا ہی گنہگار کیوں نہ ہوا پھر اس نے صرف دنیا کو حاصل کرنے کی تمنا کی ہو تو پھر بھی دولت ایمان کا نفع تو اسے آخرت میں حاصل ہونا ہے۔البتہ خصوصی اجروثواب سے بغیر توبہ کے یا بغیر اللہ تعالیٰ کے معاف کرنے کے محرومیت حاصل ہوگی۔ (از کبیر بتصرف)

دنیاوی مشکلات سے بچنے کی بھی دعاء کرتا ہے:

یعنی اپنی دعاء کو صرف آخرت کی بھلائی تک محدود نہ کرے بلکہ دنیا کی بھلائی بھی طلب کرے تا کہ وہ دنیاوی مشکلات سے بچ جائے۔

☆ واخرج ابن ابی شیبة واحمد بن حمید والبخاری ومسلم والترمذی وابویعلی وابن حبان وابن ابی حاتم والبیهقی فی الشعب عن انس ان رسول اللّٰه ﷺ عاد رجلا من المسلمین قد صار مثل الفرخ المنتوف فقال له رسول اللّٰه ﷺ هل کنت تدعو اللّٰه بشیٔ قال نعم کنت اقول اللهم ما کنت معاقبی فی الآخرة فعجله لی فی الدنیا فقال رسول اللّٰه ﷺ سبحان اللّٰه اذن لاتطیق ذلک ولاتستطیعه فهلا قلت "ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة وقنا عذاب النار" (درمنثور)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں میں سے ایک شخص کی عیادت کی جو پرندے کے چھوٹے بچے کی طرح ہو چکا تھا (یعنی اس چوزے کی طرح جس کے جسم پر بال نہیں ہوتے) تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم اللہ تعالیٰ سے کوئی دعاء بھی کرتے رہے، تو اس شخص نے عرض کیا ہاں میں یہ عرض کرتا رہا ''اے اللہ! جو تو نے مجھے آخرت میں سزا دینی ہے وہ جلدی دنیا میں ہی دے دے'' تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''سبحان اللہ'' تمہیں اس کی طاقت حاصل نہیں (کہ دنیا میں سزا کو برداشت کرلو) تم نے یہ دعاء کیوں نہیں کی۔

''ربنااٰتنافي الدنیاحسنة وفي الآخرة حسنة وقناعذاب النار''

اے ہمارے رب عطاء کر ہمیں دنیا میں بھلائی اور آخرت میں بھلائی دے اور بچا ہمیں آگ کے عذاب سے۔

دنیاوی مراتب: ''واعلم ان مراتب السعادات ثلاث روحانية وبدنية وخارجية

سعادت حاصل کرنے کے مراتب تین ہیں۔ (۱) روحانیہ (۲) بدنیہ (۳) خارجیہ

روحانیہ کی پھر دو قسمیں ہیں، ایک قوت نظریہ کی تکمیل علم سے حاصل کرنا، اور دوسری قسم قوت عملیہ کی تکمیل اچھے اخلاق سے حاصل کرنا۔

سعادت بدنیہ کی دو قسمیں ہیں۔ صحت حاصل ہونا اور جمال حاصل ہونا۔

سعادت خارجیہ کی بھی دو ہی قسمیں ہیں۔ ایک مال کا حاصل ہونا اور دوسری مرتبہ کا حاصل ہونا۔

یہ تمام قسمیں دنیاوی مراتب میں آجاتی ہیں، جب ان میں خلوص اور اللہ تعالیٰ کی رضاء کی طلب نہ پائی جائے۔

''فان العلم اذا كان يرادللتزيين به في الدنياوالترفع به على الاقران كان من الدنيا''

بیشک علم جب اس لئے حاصل کیا جائے کہ یہ میرے لئے دنیا میں زینت کا ذریعہ بنے گا اور مجھے یہ اپنے ساتھیوں سے بلند مرتبہ عطاء کردے گا تو یہ علم دنیا سے متعلق ہوگا اگرچہ بظاہر دینی علم ہوگا۔

" والاخلاق الفاضلة اذاکانت ترادللریاسة فی الدنیاوضبط مصالحهاکانت من الدنیا"
اچھے اخلاق اس لئے انسان حاصل کرے کہ اس کے ذریعے مجھے دنیا میں ریاست اور برتری حاصل ہوگی، اور اچھے اخلاق کے ذریعے میرے دنیاوی کام اچھی طرح ہو جائیں گے، تو یہ بھی دنیاوی مرتبہ ہی حاصل ہوا۔

" وکل من لایؤمن بالبعث والمعادفانه لایطلب فضیلة لاروحانیة ولاجسمانیة الا لاجل الدنیا"
ہر وہ شخص جس کا قیامت پر ایمان نہیں وہ جسمانی فضیلت حاصل کرے یا روحانی وہ دنیا کے لئے ہی حاصل کر رہا ہے۔ اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔

ایسے لوگوں کے متعلق ہی رب تعالیٰ نے فرمایا۔

"ومالہ فی الآخرة من خلاق" ای لیس له نصیب فی نعیم الآخرة"۔
کہ اس قسم کے لوگوں کو آخرت کی نعمتوں سے کوئی حصہ حاصل نہیں ہوگا۔

اس کے مطابق رب تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی بھی ہے۔

" من کان یریدحرث الآخرة نزدله فی حرثه ومن کان یریدحرث الدنیانؤته منها وماله فی الآخرة من نصیب" (سورہ شوری آیت، ۲۰)
جو آخرت کی کھیتی چاہے ہم اس کے لئے اس کی کھیتی زیادہ کر دیتے ہیں، اور جو دنیا کی کھیتی چاہے ہم اسے اس میں سے کچھ دیں گے اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔

طالب دنیا کی دعاء قبول ہوتی ہے یا نہیں:

جو شخص آخرت کی بھلائی نہ طلب کرے بلکہ صرف دنیا کو طلب کرے اس کی دعاء اس درجہ کی قبول نہیں ہوتی جس کی تعریف کی جائے۔

" لان کون الانسان مجاب الدعوة صفة مدح فلا تثبت الالمن کان ولیااللہ تعالی مستحقاللکرامة"

کیونکہ کسی شخص کا مستجاب الدعوات ہونا کہ اس کی تعریف کی جائے وہ صرف اللہ تعالیٰ کے ولی کو یہ مقام حاصل ہوتا ہے جو رب تعالیٰ کی طرف سے عزت افزائی کا مستحق ہوتا ہے۔

ہاں البتہ کبھی کبھی ایسے لوگوں کی دعاء کو بھی قبول کرلیا جاتا ہے۔

"لکن تلک الاجابة قدتکون مکرا واستدراجا"

لیکن ان کی دعاء میں قبولیت مکر اور استدراج کے لئے ہوتی ہے۔

کسی غیر مسلم یا آخرت سے دور صرف دنیا کے طالب کو عادت کے خلاف کام کرنے یا اس کی دعاء کو قبولیت عطاء کرنے کو استدراجی قوت کہا جاتا ہے۔

یعنی اس کی دعاء کو کبھی کبھی قبول کر کے اسے آخرت سے اور دور کردیا جاتا ہے کہ وہ یہ کہتا رہے کہ ہم بھی مسلمان ہیں، ہم بھی دین کو سمجھتے ہیں، ہماری دعاء بھی رب قبول کرتا ہے، صرف صوفی یا مولوی ہی دین کو نہیں سمجھتے۔

دنیا اور آخرت کی بھلائی سے کیا مراد ہے؟

دنیا کی بھلائی صحت، امن، کفایت، نیک اولاد، نیک زوجہ، دشمن پر امداد، رزق میں خوشحالی اور وسعت اور جنگ میں کامیابی، اور جنگ میں شہادت کا حاصل ہونا، اور آخرت کی بھلائی یہ ہے کہ ثواب حاصل ہو، جس کی وجہ سے بہت بڑی کامیابی حاصل ہو، اور عذاب سے چھٹکارا حاصل ہو۔

" وبالجملة فقوله تعالی(ربنااتنافی الدنیاحسنة وفی الآخرة حسنة) کلمة جامعة لجمیع مطالب الدنیاوالآخرة"

حاصل کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی "ربنااتنافی الدنیاحسنة وفی الآخرة حسنة" ایسا جامع ارشاد ہے جو دنیا اور آخرت کے تمام اچھے مطالب کو شامل ہے۔

☆ روی حمادبن سلمة عن ثابت انهم قالوا لانس ادع لنا،فقال "اللهم اتنافی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة وقناعذاب النار "قالوا زدنافاعادها،قالوا زدنا،قال ما تریدون؟ قدسألت لکم خیرالدنیاوالآخرة"

حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ کچھ حضرات نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو کہا تم ہمارے لئے دعاء کرو،تو آپ نے دعاء کی''اے اللہ! عطاء کر ہمیں دنیا میں بھلائی اور آخرت میں بھلائی اور بچا ہمیں آگ کے عذاب سے''تو انہوں نے کہا کہ کچھ اور زیادہ دعاء کرو،آپ نے پھر پہلے والے کلمات لوٹا دیئے،انہوں نے پھر کہا کچھ اور زیادہ دعاء کیجئے،آپ نے فرمایا تم کیا چاہتے ہو،میں نے تمہارے لئے دنیا کی بھلائی اور آخرت کی بھلائی طلب کر لی۔

یعنی حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کیا خوب بیان فرمایا کہ بندے کے لئے جب دنیا اور آخرت کے مقامات کے بغیر کوئی اور مقام نہیں تو جب دنیا اور آخرت کی بھلائی طلب کر لی"لم یبق شئ سواہ" تو اس کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔

"وثانیهما ان المرادبالحسنة فی الدنیاالعمل النافع وهو الایمان والطاعة والحسنة فی الآخرة اللذة الدائمة والتعظیم والتنعم بذکر اللہ وبالانس به وبمحبته وبرؤیته"

اور احتمال یہ ہے کہ دنیا میں بھلائی سے مراد نفع دینے والا عمل ہو،وہ ایمان اور طاعت ہے،اور آخرت کی بھلائی سے مراد دائمی لذت اور تعظیم اور اللہ تعالیٰ کے ذکر کی نعمت کا حصول اور اس سے اُنس حاصل کرنا اور اس سے محبت کرنا اور اس کے دیدار سے مشرف ہونا۔

☆ "روی الضحاک عن ابن عباس ان رجلادعاربه فقال فی دعائه "ربنااتنافی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة وقناعذاب النار "فقال النبی ﷺ ماعلم ان هذاالرجل سأل اللہ شیأ من امر الدنیا،فقال بعض الصحابة بلی یارسول اللہ انه قال "ربنااتنافی الدنیا حسنة"فقال رسول اللہ ﷺ انه یقول "آتنافی الدنیاعملاصالحا"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص نے رب تعالیٰ سے دعاء کی تو اپنی دعاء میں یہ کہا "ربنااتنافی الدنیاحسنة وفی الآخرة حسنة وقناعذاب النار" تو نبی کریم ﷺ نے

فرمایا کہ میں جانتا ہوں کہ اس شخص نے دنیا کے متعلق کوئی سوال نہیں کیا، کسی صحابی نے عرض کیا کیوں نہیں یارسول اللہ، اس نے تو کہا ہے "اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھلائی عطا کر" (تو یہ دنیا کی طلب کی ہی دعاء ہے) تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بیشک وہ کہہ رہا تھا اے ہمارے رب ہمیں عطاء کر دنیا میں نیک عمل۔

سبحان اللہ کیا ہی علم ہے میرے پیارے نبی کریم ﷺ کا کہ وہ شخص زبان سے کہہ رہا ہے "ربنا آتنافی الدنیا حسنة" لیکن آپ اس کے دل پر مطلع ہیں، فرمارہے ہیں کہ وہ یہ کہہ رہا ہے۔ "ربنا آتنافی الدنیاعملاصالحا" کہ اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں نیک عمل عطاء فرما۔

اسی سے اور مسئلہ یہ سمجھ آیا کہ جب دنیا کی چیز کو دین کے لئے طلب کیا جائے تو وہ دین کا ہی مسئلہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے نیک لوگوں کی صفات بیان کرتے ہوئے ان کی اس دعاء کا بھی ذکر فرمایا ہے۔

" والذین یقولون ربناھب لنامن ازواجناو ذریاتناقرۃ اعین واجعلناللمتقین اماما"

(سورۃ الفرقان آیت ۷۴)

اور وہ جو عرض کرتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں دے ہماری بیبیوں اور ہماری اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک اور ہمیں پرہیزگاروں کا پیشوا بنا۔

" وتلک القرۃ ھی ان یشاھدوا اولادھم وازواجھم مطیعین مؤمنیں مواظبین علی العبودیة "

آنکھوں کی ٹھنڈک کی جس کی وہ دعا کرتے ہیں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اے اللہ تعالیٰ ہمیں وہ بیبیاں عطاء فرما اور وہ اولاد عطاء فرما جو مومن ہوں اور تیری طاعت کرنے والے ہوں اور ہمیشہ عبودیت پر قائم رہیں تاکہ ان کو دیکھ کر ہماری آنکھوں کو ٹھنڈک حاصل ہو۔

" وثالثھاقال قتادۃ الحسنة فی الدنیاوفی الآخرۃ طلب العافیة فی الدارین"

حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ دنیا اور آخرت میں بھلائی کی طلب کا مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے رب ہمیں دونوں جہانوں میں عافیت عطاء فرما۔

"وعن الحسن الحسنة فی الدنیافھم کتاب اللّٰہتعالی وفی الآخرۃ الجنۃ"

حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، دنیا میں بھلائی سے مراد اللہ تعالیٰ کی کتاب کو سمجھنا ہے اور آخرت میں بھلائی کے حاصل کرنے سے مراد طلب جنت ہے۔ (از کبیر)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد:

" قول علی رضی اللہ عنہ الحسنۃ فی الدنیا المراۃ الصالحۃ وفی لآخرۃالحوراء و عذاب النار امراۃ السوء " (بیضاوی)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں دنیا میں بھلائی سے مراد نیک عورت ہے اور آخرت میں بھلائی سے مراد جنتی حور ہے اور آگ کے عذاب سے مراد بری عورت ہے۔

☆ "عن عبداللہ بن عمر بن العاص عن النبی ﷺ قال الدنیا متاع وخیرمتاعھاالمراۃ الصالحۃ وقیل الحنسنۃ فی الدنیا العلم والعبادۃ وفی الآخرۃ الجنۃ وقیل الحسنۃ فی الدنیا الرزق الحلال والعمل الصالح وفی الآخرۃ المغفرۃ والثواب وقیل من آتا ہ اللہ الاسلام والقرآن واھلا وما لا فقد اوتی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ یعنی فی الدنیا عافیۃ وفی الآخرۃ عافیۃ " (خازن)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا دنیا سامان (نفع مند چیز) ہے، دنیا میں سب سے بہتر نفع مند چیز نیک زوجہ ہے۔ اور بعض حضرات نے کہا دنیا کی بہتر چیز علم اور عبادت ہے۔ اور آخرت کی بہتر چیز جنت ہے اور بعض حضرات نے کہا کہ دنیا کی بہترین چیز رزق حلال اور نیک عمل ہے۔ اور آخرت میں بہتر چیز مغفرت اور ثواب ہے۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اسلام اور قرآن اور اہل وعیال اور مال عطاء کر دیا، اسے دنیا اور آخرت کی بھلائی عطاء کر دی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ دنیا میں عافیت کا حاصل ہونا دنیا میں بھلائی ہے اور آخرت میں عافیت حاصل ہونا آخرت کی بھلائی ہے۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

عقل کا تقاضا یہ ہے کہ " الحسنة"معرفہ ذکر ہوتا اور الف لام استغراقی ہوتا تو ہر قسم کی بھلائی کو شامل ہوتا، یعنی یوں کہا جاتا" آتنا الحسنة فی الدنیا و الحسنة فی الآخرة " (ہمیں عطاء کر دنیا میں ہر قسم کی بھلائی اور آخرت میں ہر قسم کی بھلائی دے) لیکن "حسنة" کو نکرہ ذکر کیا گیا ہے اس کی کیا وجہ ہے ؟

تو اس کا جواب یہ ہے۔

" لیس الداعی ان یقول اللهم اعطنی کذا و کذا بل یحب ان یقول اللهم ان کان کذا و کذا مصلحة لی و مو افقا لقضائک و قدرک فاعطنی ذلک"

دعا کرنے والے کو چاہئے کہ وہ یہ دعا نہ کرے کہ اے اللہ مجھے یہ چیز عطاء کر اور یہ چیز عطاء کر اور اس طرح عطاء کر۔ بلکہ ضروری ہے کہ یہ کہے، اے اللہ اگر اس کام میں میری مصلحت ہے اور یہ تیری تقدیر کے موافق ہے تو مجھے یہ عطاء کر دے۔

اگر دعاء یہ کرے "اللهم اعطنی الحسنة فی الدنیا و الآخرة" اے اللہ مجھے ہر قسم کی بھلائی دنیا اور آخرت میں عطاء کر۔ تو یہ ادب کے خلاف تھا، کیونکہ انسان معین کر کے چیزیں مانگ رہا ہے۔

لیکن جب " حسنة" نکرہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اے اللہ تو دنیا اور آخرت میں وہ بھلائی عطاء کر جو تیری تقدیر اور تیری رضاء اور تیرے حکم اور تیری حکمت کے مطابق ہو۔

" فکان ذلک اقرب الی رعایة الادب و المحافظة علی اصول الیقین"

یہ دعاء ادب کے بہت قریب ہے اور اس کی محافظت اور اس کی رعایت کرنا اصول یقین کے موافق ہے۔

"وقنا عذاب النار": اور بچا ہمیں آگ کے عذاب سے۔

عذاب نار سے مراد جہنم کا عذاب ہے۔ یا اس سے مراد بری عورت ہے، جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ذکر کیا جا چکا ہے۔

(از مدارک)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"وقنا" میں "و" عاطفہ ہے جس کا معنی ہے "اور" اور "ق" امر حاضر کا صیغہ ہے جو "تقی" سے بنا ہے، اور تقی اصل میں "توقی" ہے۔صرفی قوانین کی طرف خود توجہ فرمائیں۔ "ق" کا معنی ہے "بچا" "نا" ضمیر ہے منصوب متصل کی جس کا معنی ہے "ہمیں"۔

"عن انس بن مالک قال کان اکثر دعاء النبی ﷺ اللھم آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار "

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ اکثر اوقات یہ دعا فرماتے تھے " اللھم آتنا فی الدنیاحسنۃوفی الآخرۃحسنۃ وقناعذاب النار "

"عن عبداللہ بن السائب قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول بین الرکنین ربنا آتنا فی الدنیاحسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار" (اخرجہ ابو داؤد)

حضرت عبداللہ بن السائب کہتے ہیں۔میں نے رسول اللہ ﷺ کو دو رکنوں (حجر اسود اور رکن یمانی) کے درمیان یہ دعا کرتے ہوئے سنا " ربنا آتنا فی الدنیاحسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ وقناعذاب النار"۔

طلباء کرام خصوصی طور پر یاد رکھیں کہ رکن اسود اور رکن یمانی میں رکن کا معنی کونہ ہے۔یعنی دیواروں کا وہ کونہ جس میں حجر اسود ہے، اسے رکن اسود کہا جاتا ہے اور اسی دیوار کے جنوبی کونہ کو رکن یمانی کہا جاتا ہے۔ (خازن)

"واخرج ابن ابی شیبۃ والبیھقی فی الشعب عن ابن عباس ان ملکا موکلا بالرکن الیمانی منذ خلق اللہ السماوات والارض یقول آمین آمین فقولوا ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار " (درمنثور)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک ایک فرشتہ کو رکن یمانی پر اس وقت سے مقرر کردیا گیا ہے جب سے اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو پیدا فرمایا ہے، وہ آمین آمین کہتا رہتا ہے، اس

لئے تم رکن یمانی کے پاس یہ دعاء کیا کرو " ربنا آتنا فی الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنة وقنا عذاب النار"

☆ " واخرج احمد والترمذی وحسنه عن انس قال جاء رجل الی رسول الله ﷺ فقال یارسول الله ایّ الدعاء افضل قال تسأل ربک العفو والعافیة فی الدنیا والآخرة ثم اتاه من الغد فقال یا رسول الله ای الدعاء افضل قال تسأل ربک العفو والعافیة فی الدین والدنیا والآخرة ثم اتاه من الغد فقال یارسول الله ای الدعاء افضل قال تسأل ربک العفو والعافیة ثم اتاه من الیوم الرابع فقال یارسول الله ای الدعاء افضل قال تسأل ربک العفو والعافیة فی الدنیا والآخرة فانک اذا اعطیتهما فی الدنیا ثم اعطیتهما فی الآخرة فقد افلحت " (درمنشور)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا تو کہا یا رسول اللہ کون سی دعاء افضل ہے؟ آپ نے فرمایا تم اپنے رب سے دنیا اور آخرت میں عفو و عافیت کا سوال کرو، وہ شخص دوسرے دن پھر آیا تو اس نے کہا یا رسول اللہ کون سی دعاء افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا تم اپنے رب سے دین دنیا اور آخرت میں عفو اور عافیت طلب کرو، تیسرے دن وہ شخص پھر آیا اس نے کہا یا رسول اللہ کون سی دعاء افضل ہے؟ آپ نے فرمایا تم اپنے رب تعالیٰ سے عفو و عافیت طلب کرو، چوتھے دن وہ شخص پھر آیا اس نے کہا یا رسول اللہ کون سی دعاء افضل ہے؟ آپ نے فرمایا تم اپنے رب سے دنیا اور آخرت میں عفو و عافیت کا سوال کرو، بیشک جب تمہیں دنیا میں عفو و عافیت عطاء کردی گئیں، پھر تمہیں آخرت میں عفو عافیت عطاء کردی گئی تو تم کامیاب ہو گئے۔

"اولئک لهم نصیب مما کسبوا والله سریع الحساب":

ان لوگوں کا حصہ ہے اس سے جو انہوں نے کسب کیا، اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

"اولـــئـک" کا اشارہ کس کی طرف ہے۔ اس میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا اشارہ دوسرے فریق کی

طرف ہے یعنی ان کی طرف جولوگ دنیا اور آخرت کی بھلائی طلب کرتے ہیں۔کیونکہ پہلے کا حکم " وما لہ فی الآخرۃ من خلاق " (اور نہیں ہے اس کا آخرت میں کچھ حصہ) میں آچکا ہے۔اور یہ حکم دوسرے فریق کا ہے کہ "ان لوگوں کا حصہ ہے جوانہوں نے کسب کیا"۔

لیکن دوسرقول یہ ہے" انہ راجع الی الفریقین "کہ اس کا اشارہ دونوں فریقوں کی طرف ہے۔یعنی ہر فریق نے جوعمل کیا اور جس عمل کی نیت کی اسے اس کا بدلہ دیا جائے گا۔

اگر قیامت کا انکار کیا اور کسی قسم کا کفروشرک کیا" واللہ مجازیہ "تواللہ تعالیٰ اس کواس کے عمل کے مطابق جزادے گا۔

اوراگر کوئی عمل صرف دنیا کی غرض سے کیا " اعطی نصیب مثلہ فی الدنیا "تواسے اس کے عمل کے مطابق دنیامیں ہی بدلہ دے دیا جائے گا۔

اورجس شخص نے دنیا کی بھلائی طلب کی اورآخرت کی بھلائی بھی طلب کی،اسے اس کے مطابق ثواب عطاء کیا جائے گا،تواس تفصیل کے بعدواضح ہوگیا کہ دونوں فریقوں کی طرف اشارہ کرنازیادہ واضح ہے۔

دینی طلباءکرام توجہ فرمائیں:

"لھم نصیب مما کسبوا" پر بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ نصیب نکرہ ہے اورتنوین حقارت پر دلالت کر رہی ہے،کیونکہ " مما" جواصل میں" من ما" ہے،اس میں" من"تبعیض کے لئے ہے،اس سے بھی حقارت سمجھ آرہی ہے۔اصل کے مطابق معنی یہ ہوگا"انہوں نے جوکسب کیا اس میں سے کچھ کا انہیں کچھ حصہ دیا جائے گا" حالانکہ اللہ تعالیٰ نیکوں کی جزاء میں کوئی کمی نہیں فرمائے گا،بلکہ ایک نیکی کا ثواب دس گنازائد سے لیکر سات سوگناہ زائد،بلکہ اس سے بھی زائدعطاءفرمائے گا۔تو " من"تبعیضیہ بنانا کیسے درست ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ " من"ابتداءغایت کے لئے ہے،تبعیضیہ نہیں۔اب معنی یہ ہوگا"انہوں نے جوکسب کیا اس کا ان کے لئے حصہ ہے"۔

یعنی ہر کسب کا ان کو بدلہ دیا جائے گا، ایسا نہیں ہوگا کہ کسی کسب کا بدلہ دیا جائے اور کسی کا بدلہ نہ دیا جائے، جب کسب صرف دنیا کے لئے ہوا تو اس کا بدلہ بھی عمل کے مطابق ہوگا، اب " نصیب" میں تنوین تقلیل یا تحقیر کے لئے بنانا صحیح ہوگا۔

اور جب ان کا کسب دنیا میں بھلائی اور آخرت میں بھلائی حاصل کرنے کے لئے ہوگا، تو ان کو جزاء بھی اس کے مطابق دی جائے گی، اب " نصیب" میں تنوین تعظیم اور تکثیر کے لئے ہوگی، یعنی ان کے کسب کا بہت زیادہ اور عظیم مرتبہ والا حصہ دیا جائے گا۔ (از کبیر بزیادة)

کسب کیا ہے؟

"ماینالہ المرء بعملہ" انسان اپنے عمل سے جو حاصل کرے اسے " کسب" کہا جاتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس سے نفع حاصل ہو، یا اس سے ضرر (نقصان دہ، باعث تکلیف) کو دور کیا جائے۔

اور اگر عمل ایسا ہو جو باعثِ ضرر ہو، اسے کسب نہیں کہا جاتا، بلکہ اکتساب کہہ لیا جاتا ہے۔ البتہ یہ خیال کیا جائے کہ کسب کبھی اکتساب کے معنی میں اور اکتساب کبھی کسب کے معنی میں استعمال ہوتے رہتے ہیں۔

سوال: "ھل تدل ھذہ الآیة علی ان الجزاء علی العمل"

کیا یہ آیت کریمہ اس پر دلالت کرتی کہ بندہ کو اپنے عمل کی جزاء دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے؟

جواب: "نعم ولکن بحسب الوعد لابحسب الاستحقاق الذاتی"

تو اس کا جواب یہ ہے کہ بندہ اپنے عمل کی جزاء کا ضروری طور پر مستحق ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ پر واجب ہے کہ وہ جزاء عطاء کرے لیکن یہ وجوب رب تعالیٰ نے وعدہ فرما کر اپنے کرم کے ذریعے اپنے ذمہ لے لیا ہے، ورنہ اس پر کوئی چیز واجب نہیں۔ اور بندہ بھی ذاتی طور پر اپنے عمل کی جزاء کا مستحق نہیں، کیونکہ اسے تو پہلے ہی اتنے انعام عطاء کر دیئے گئے ہیں کہ وہ ان کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکتا، چہ جائیکہ اور استحقاق کا دعویٰ کرے، البتہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی اور وعدہ سے بندہ کو اس کے اعمال کی جزاء کا مستحق ٹھہرا دیا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

"واللہ سریع الحساب": اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

" سریع "ماخوذ ہے" سرع یسرع سرعا سرعة" سے، جس کا معنی ہے جلدی کرنا۔

" حساب " مصدر ہے جس طرح محاسبہ مصدر ہے، اس کا لغوی معنی ہے "شمار کرنا" چونکہ حساب کرنے یعنی کسی چیز کو شمار کرنے میں کمی وبیشی نہیں کی جاتی، بلکہ اس میں وہ علم حاصل ہوتا ہے جو کافی ہوتا ہے، اس لئے "حسبک کذا" کفاک کے معنی میں استعمال ہوتا ہے کہ یہ چیز اس طرح تمہیں کافی ہے۔

طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

"حسب یحسب حسابا محاسبة" (حساب کرنا، شمار کرنا) اس صورت میں ماضی اور مضارع دونوں ہی مکسور العین استعمال ہوتے ہیں۔

اور "حسب یحسب حسبانا" (گمان کرنا) اس صورت میں ماضی مکسور العین ہوگی اور مضارع مفتوح العین"

حساب لینے کا کیا مطلب:

اس میں اگرچہ چند اقوال ہیں، لیکن وہ تمام ہی مجموعی طور پر معتبر ہیں۔

﴿۱﴾ اس میں ایک قول یہ ہے۔ " انه تعالٰی یعلمهم ما لهم وعلیهم" کہ بیشک اللہ تعالٰی بندوں کو ان کے ثواب یا عذاب کا علم عطاء کردے گا۔ یعنی اللہ تعالٰی ان کے دلوں میں ان کے اعمال کی مقدار اور تعداد اور کیفیات کا علم پیدا کردے گا، جس کی وجہ سے انہیں اپنے اعمال کے ثواب وعذاب کی مقدار کا پتہ چل جائے گا۔

"عن ابن عباس انه قال انی لاحساب علی الخلق بل یقفون بین یدی الله ویعطون کتبهم بایمانهم فیها سیأتهم فیقال لهم هذه سیأتکم قدتجاوزت عنها ثم یعطون حسناتهم ویقال هذه حسناتکم قدضعفتها لکم "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک مخلوق پر حساب کا یہ مطلب ہے کہ ان کو اللہ کے

حضور کھڑا کیا جائے گا، مومنین کو نامہء اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں پکڑایا جائے گا، جس میں ان کے گناہ بھی درج ہوں گے، ان کو رب تعالیٰ بتائے گا یہ تمہارے گناہ تھے جن کو میں نے معاف کر دیا ہے، پھر ان کی نیکیوں کو سامنے لایا جائے گا اور ان کو بتایا جائے گا کہ تمہاری نیکیاں تو یہی تھی البتہ میں نے اپنے فضل و کرم سے ان کو کئی گناہ زیادہ کر دیا، جس کی وجہ سے تمہیں جنت میں اعلیٰ مقام دیا جارہا ہے۔

﴿۲﴾ دوسرا قول یہ ہے کہ حساب کا مطلب ہے جزاء دینا۔ اصل میں حساب سبب ہے لینے اور دینے کا، سبب کا اطلاق مسبب پر جائز ہے۔ "فحسن اطلاق لفظ الحساب عن المجازاة" اس لئے ذکر حساب کا اور مراد جزاء لینا مستحسن ہے۔

﴿۳﴾ تیسرا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ان کے اعمال کے احوال اور ان اعمال کے مطابق ثواب و عذاب کی کیفیت کے متعلق کلام فرمائے گا " ان کلامہٗ لیس بحرف و لا صوت " البتہ رب تعالیٰ کے کلام کی کیفیت کو بیان کرنا ممکن نہیں، کیونکہ اس کے کلام میں حروف اور آواز نہیں ہوگی۔
اللہ تعالیٰ مکلف کے کانوں میں سماعت پیدا کر دے گا، جس کی وجہ سے وہ کلام قدیم کو سن لے گا، جیسا کہ انسان کی آنکھ میں قوت بصارت پیدا کر دے گا، جس کی وجہ سے ذاتِ قدیم کو دیکھ سکے گا۔
البتہ بعض حضرات نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں آواز ہوگی، البتہ اس کی کیفیت کو بیان کرنا ممکن نہیں۔ وہ آواز مکلّف سن لے گا، اسی کلام کے ذریعے اس کے اعمال کے ثواب و عذاب کو بیان کر دیا جائے گا۔
یہی بندوں کا عذاب ہوگا، غور کرنے سے خود بخود معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تینوں صورتیں حاصل ہوتی ہیں۔

جلدی حساب لینے کا کیا مطلب ہے؟

اس میں بھی چند وجوہ ہیں، جو تمام ہی معتبر ہیں۔

﴿۱﴾ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر مکلف کے دل میں اس کے اعمال کی مقدار اور اس کے ثواب اور

عذاب کی مقدار پیدا فرما دے گا۔ یا ہر مکلّف کو اس کے ثواب کے حق تک پہنچا دے گا۔ یا ہر مکلّف کے کانوں میں قوت سماعت پیدا کر دے گا، جس کی وجہ سے وہ کلام قدیم کو سن لے گا، یا ہر مکلف کے کانوں میں ایک آواز پیدا کر دے گا، جو اس کے ثواب وعذاب کی مقدار پر دلالت کرے گی۔ ان تمام وجوہ کی دارومدار ایک ہی چیز پر ہے کہ وہ کسی نہ کسی چیز کو پیدا کرے گا، یہی اس کا حساب ہوگا، اللہ تعالیٰ کی قدرت تمام ممکنات سے متعلق ہوگی۔ اس کی تخلیق کسی مادہ یا مدت یا آلہ کی محتاج نہیں۔

" و لا يشغله شان عن شان" اسے کوئی حال دوسرے حال سے پھیر نہیں سکتا۔

" لا جرم كان قادرا على ان يخلق جميع الخلق في اقل من لمحة البصر ، وهذا كلام ظاهر "

یقیناً اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کو آنکھ جھپکنے سے بھی کم وقت میں پیدا کرنے پر قادر ہے۔ جلدی حساب لینے کا یہ مطلب بہت واضح ہے۔

" ولذلك وردفي الخبر ان الله تعالىٰ يحاسب الخلق في قدر حلب ناقة"

اسی وجہ سے حدیث شریف میں مذکور ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا حساب اونٹنی کا دودھ دوہنے کی مقدار میں لے لے گا۔

یعنی بہت قلیل مدت میں تمام مخلوق کے دلوں میں ان کے اعمال کے ثواب وعذاب کی مقدار وکیفیت کو پیدا کر دے گا، قلیل مدت بھی صرف لوگوں کو سمجھانے کے لئے نبی کریم ﷺ نے بیان فرمائی، ورنہ وہاں تو "کن فیکون" کی بات ہے۔

﴿۲﴾ " وثانيهاان معنى كو نه تعالىٰ "سريع الحساب" انه سريع القبول لدعاء عباده والاجابة لهم"

دوسری وجہ جلدی حساب لینے کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی دعاء کو جلدی قبول فرماتا ہے۔ ایک وقت میں کتنے سوال کرنے والے ہوتے ہیں۔ ہر ایک مختلف چیز طلب کرنے والا ہوتا ہے، جن کا تعلق امور دنیا سے بھی ہے اور امور آخرت سے بھی، ہر ایک کو اس کا مطلوب عطاء کرتا ہے اور اس پر کوئی چیز مشتبہ

نہیں ہوتی، اگر دنیا والوں سے اتنے لوگ اتنی چیزوں کا سوال کرتے تو ان کولمبا حساب کرنا پڑتا، بلکہ حساب سے عاجز آجاتے، لیکن اللہ تعالیٰ کسی فکر اور کسی چیز کو شمار میں لانے اور حساب رکھنے کا محتاج نہیں۔

﴿۳﴾ "وثالثها ان محاسبة الله سريعة بمعنى آتية لا محالة"

جلدی حساب لینے کا تیسرا مطلب یہ ہے کہ یہ کہنا "اللہ تعالیٰ جلدی حساب لینے والا ہے" اس کا مقصد یہ کہ اس نے یقیناً حساب لینا ہے۔

جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا "ان ما توعدون لصادق وان الدين لواقع" (والداریات، ۵، ۶)

بیشک جس بات کا تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے وہ ضرور سچ ہے، اور بیشک انصاف ضرور ہونا ہے۔

"كل ماهو آت فكأنه قيل ان الساعة التي فيها الجزاء والحساب قريبة"

یعنی ہر وہ چیز جس نے آنا ہے اس نے آنا ہی ہے، گویا کہ یہ کہا گیا ہے کہ وہ گھڑی جس میں حساب ہونا ہے اور جزاء دی جانی ہے وہ قریب ہے۔

فائدہ: "الحساب" سے یہ بھی سمجھ آیا "الحسب ماعدمن مفاخر المرء ويقال حسبه دينه ويقال ماله" انسان جن چیزوں کی وجہ سے فخر کر سکے، وہ اس کا حسب ہیں، اسی وجہ سے انسان کے دین کو حسب کہا جاتا ہے، اور اسی طرح اس کے مال کو بھی اس کا حسب کہا گیا ہے۔

سمرۃ بن جندب کی روایت میں ہے "الحسب المال والكرم التقوى" (رواہ ابن ماجہ)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حسب مال ہے اور کرم تقویٰ ہے۔

☆ وقيل لعلي بن ابي طالب رضي الله عنه كيف يحاسب الله العباد في يوم، قال كما يرزقهم في يوم"

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا حساب ایک دن میں کیسے لے لے گا؟ آپ نے فرمایا جس طرح تمام مخلوق کو ہر دن رزق عطاء فرماتا ہے۔ (از قرطبی)

تنبیہ: "اولئك لهم نصيب مما كسبوا" سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ صرف اپنے اعمال کا ہی ثواب ملتا ہے اور کسی دوسرے کے عمل کا ثواب نہیں ملتا، یہ سوچ غلط ہے۔

"قال ابن عباس فی قولہ تعالٰی "اولئک لھم نصیب مما کسبوا" ھو الرجل یأخذ مالا یحج بہ عن غیرہ فیکون لہ ثواب "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تفسیر میں ذکر فرمایا کہ جو شخص کسی سے مال لے کر اس کی جانب سے حج کر لے تو پیسے دینے والے کو حج کرانے والے کو ثواب حاصل ہوتا ہے اور حج بھی اسی کا ہوگا، حج کرنے والے کو مقامات مقدسہ کی زیارت اور نیک اعمال کا ثواب حاصل ہوگا، تاہم اس کا فرض حج ادا نہیں ہوگا۔

بلکہ یہ بھی خیال رہے کہ خود اپنے خرچ پر حج کر کے کسی کو ثواب پہنچایا جا سکتا ہے، جیسا کہ اسی آیۃ کریمہ کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

" ان رجلا قال یارسول اللہ مات ابی ولم یحج ، افأحج عنہ فقال النبی ﷺ لو کان علی ابیک دین فقضیتہ اما کان ذلک یجزی ؟ قال نعم،قال فدین اللہ احق ان یقضی، قال فھل لی من اجر؟ فانزل اللہ تعالٰی (اولئک لھم نصیب مما کسبوا) یعنی مَن حج عن میت کان الا جربینہ وبین المیت "

ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس نے کہا یا رسول اللہ میرے باپ فوت ہو گئے ہیں لیکن وہ حج نہیں کر سکے، کیا میں ان کی طرف سے حج کرلوں؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، اگر تمہارے باپ پر قرض ہوتا تو تم ادا کر دیتے تو کیا اس کو کافی ہو جاتا؟ اس شخص نے عرض کیا ہاں (کافی ہو جاتا) یا رسول اللہ۔

آپ نے فرمایا اللہ کا قرض زیادہ حق رکھتا ہے کہ اسے ادا کیا جائے۔ اس شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا مجھے بھی اس حج کا اجر حاصل ہوگا؟ تو اس وقت "اولئک لھم نصیب مما کسبوا" الفاظ مبارکہ نازل ہوئے۔ یعنی حج کرنے والے کو بھی اجر حاصل ہوگا اور جس کی جانب سے حج کیا گیا اسے بھی اجر حاصل ہوگا۔ (ازقرطبی)

☆☆☆☆☆

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ ☆ (سورۃالبقرۃ آیت، ۲۰۳)

﴿۱﴾

اور اللہ کی یاد کرو گنے ہوئے دنوں میں، تو جو جلدی کرے دو دن میں چلا جائے تو اس پر گناہ نہیں، اور جو رہ جائے تو اس پر گناہ نہیں پرہیزگار کے لئے، اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ تمہیں اس کی طرف اٹھنا ہے۔

﴿۲﴾

اور یاد کرو اللہ کو چند گنتی کے دنوں میں تو جس شخص نے جلدی کر لیا دو دنوں میں تو نہیں گناہ اس پر اور جو دیر کرے تو نہیں ہے گناہ اس پر (یہ اس کے لئے ہے) جس نے تقوی اختیار کیا اور ڈرو اللہ سے اور جان رکھو بیشک تم کو اس کی طرف جمع کیا جانا ہے۔

ماقبل سے تعلق:

حج کے احکام میں سے ابھی تک رمی (کنکریاں مارنے) کا ذکر نہیں کیا تھا، اس آیۃ کریمہ میں اس کا ذکر کیا جارہا ہے، البتہ رمی کا پہلے نہ ذکر کرنا اس وجہ سے تھا کہ کنکریاں مارنے کا عمل ان کے نزدیک مشہور تھا اور اس میں انہوں نے کوئی تبدیلی نہیں کی تھی، لیکن مشعر حرام کے پاس ذکر کرنا یا عرفات پر جانا بعض لوگوں نے چھوڑ دیا تھا اس لئے ان کا ذکر پہلے کر دیا گیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ کنکریاں مارنے کا ذکر پہلے اجمالی طور پر کر دیا گیا، اب تفصیلی طور پر ذکر کیا جارہا ہے، کیونکہ ہر کنکری کے ساتھ ''اللہ اکبر'' پڑھنا ہے۔ جو اللہ کا ذکر ہے، پہلے اللہ کے ذکر کرنے کا جب حکم دے دیا گیا تو اجمالی طور پر اس میں کنکریاں مارنے کا حکم دے دیا گیا۔ (از کبیر)

مختصر مطلب:

دس ذی الحج کو " یو م النحر " کہا گیا اور گیا رہ، بارہ، اور تیرہ، ذی الحج کو " ایام تشریق " کہا گیا ہے۔
اس آیۂ کریمہ میں یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ دس ذی الحج کے بعد ایام تشریق کے دو دنوں میں یعنی گیارہ اور بارہ ذی الحج کو کنکریاں مار کر اور تکبیریں پڑھ کر اگر کوئی شخص لوٹ آئے تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور اگر تیسرے دن یعنی تیرہ ذی الحج کو بھی کنکریاں مار کر لوٹے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ اگرچہ گناہ نہ ہونے میں تو دونوں برابر ہیں، لیکن زیادہ ثواب اور تقوی اسے ہی حاصل ہوگا جو تیسرے دن یعنی تیرہ ذی الحج کو بھی کنکریاں مار کر اور تکبیریں پڑھ کر لوٹے۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا کہ اللہ سے ڈرو، اور یہ یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف تمہیں اٹھایا جاتا ہے۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی خوبی:

مختصر مطلب کو سمجھنے کے بعد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو ذرا پھر سے دیکھیں۔ مقصد کو سمجھانے کے لئے کیا خوب ترجمہ ہے۔

" فمن تعجل فی یو مین فلا اثم علیہ " "تو جلدی کر کے دو دن میں چلا جائے اس پر کچھ گناہ نہیں"

یعنی گیارہ اور بارہ ذی الحج کو کنکریاں مار کر اور تکبیریں پڑھ کر مکہ میں چلا جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔

"ومن تا خر فلا اثم علیہ" "اور جو رہ جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں"

یعنی جو ایک دن کے لئے مزید منیٰ میں رہ جائے اور تیرھویں تاریخ کو بھی کنکریاں مار کر مکہ میں جائے تو اس پر کچھ گناہ نہیں۔

اسی طرح اعلیٰ حضرت نے " واعلموا " کا ترجمہ کیا ہے "اور جان رکھو" یعنی جانتے پہلے بھی ہو لیکن اس علم اور یقین پر قائم رہو۔

اور اعلیٰ حضرت نے " انکم الیہ تحشرون " کا ترجمہ کیا ہے "تمہیں اس کی طرف اٹھنا ہے"

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے روح المعانی میں بیان کیا ہے کہ اگر چہ حقیقی اور لغوی معنی " حشر " کا جمع کرنا ہے، لیکن یہاں مجازی معنی حساب اور جزاء کے لیے اٹھایا جانا ہے۔

راقم کا ترجمہ اگر چہ اس کمال اور چاشنی سے خالی ہے جو اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں ہے، تاہم طلباء کو لغوی معنی پر مطلع کرنے کے لیے فقط لغوی معنی پر اکتفاء کیا گیا ہے۔

"واذکروااللّٰہ فی ایام معدودات": اور یاد کرو اللہ کو چند گنتی کے دنوں میں۔

اس مقام پر " ایام معدودات " کہا گیا، اور سورۃ الحج میں فرمایا۔

" لیشھدوامنافع لھم ویذکروااسم اللہ فی ایام معلومات "

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ذی الحج کے پہلے دس دن " ایام معلومات " (چند معلوم دن) ہیں اور " ایام معدودات " سے مراد ایام تشریق (گیارہ، بارہ اور تیرہ ذی الحج) ہیں۔

" ایام معدودات " میں تقریباً اہلِ علم کا اتفاق ہے کہ اس سے مراد ایام تشریق ہی ہیں، کیونکہ یہاں کنکریاں مارنے اور ہر کنکری کے ساتھ اللہ اکبر پڑھنے کا ذکر ہے۔

البتہ " ایام معلومات " میں ایک قول وہی ہے جو ذکر کیا جا چکا ہے، تاہم ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد آٹھ، نو، اور دس ذی الحج (تین دن) ہیں۔

اور ایک قول یہ بھی ہے کہ آٹھ ذی الحج سے تیرہ ذی الحج تک دن مراد ہیں۔ تاہم راقم کے نزدیک ان میں کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ ذکر سے مراد اگر تلبیہ ہو اور ذکر کرنے والے سے مراد قران کرنے والا ہو تو وہ اپنے احرام سے لے کر دس ذی الحج تک کنکریاں مارنے تک تلبیہ پڑھے گا۔ اس کے ذکر کے " ایام معلومات " دس دن یا زیادہ ہوں گے۔

اور اگر تمتع کرنے والا ہے یا حج مفرد کرنے والا تو وہ آٹھ ذی الحج کو احرام باندھے گا اور تلبیہ پڑھے گا، اور دس ذی الحج کو کنکریاں مارنے سے تلبیہ چھوڑ دے گا، اس کے لئے " ایام معلومات " تین دن یعنی آٹھ، نو، اور دس ذی الحج ہوئے۔

اور اگر ذکر سے مراد عام ہو یعنی تلبیہ اور تکبیر اور تسبیح وغیرہ سب کو شامل ہو تو احرام سے لے کر آخر ایام تشریق تک وہ اللہ کا ذکر کرے گا، اس طرح دن کچھ زیادہ ہوں گے۔

☆ "واخرج الفریابی وابن ابی الدنیا وابن المنذر عن ابن عمر فی واذکروا اللہ فی ایام معدودات قال ثلاثة ایام ایام التشریق وفی لفظ ھی الثلاثة الایام بعد یوم النحر" (درمنثور)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے "واذکروا اللہ فی ایام معدودات" کی تفسیر میں بیان فرمایا کہ "ایام معدودات" تین دن ہیں، یعنی ایام تشریق، تین دنوں کی وضاحت "بعد یوم النحر" سے بھی کی گئی ہے کہ دس ذی الحج کے بعد تین مراد ہیں۔

☆ "واخرج الطبرانی عن عبداللہ بن الزبیر واذکروا اللہ فی ایام معدودات قال ھن ایام التشریق یذکر اللہ فیھن تسبیح و تھلیل و تکبیر و تحمید" (درمنثور)

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے "واذکروا اللہ فی ایام معدودات" کی وضاحت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ "ایام معدودات" سے مراد ایام تشریق ہیں، ان دنوں میں اللہ تعالیٰ کا ذکر (کثرت سے) کیا جاتا ہے، یعنی ان دنوں میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح پڑھے، اور لا الہ الا اللہ پڑھے اور اللہ اکبر پڑھے اور الحمد للہ پڑھے۔

☆ "واخرج المروزی عن یحیی بن کثیر فی قولہ واذکروا اللہ فی ایام معدودات قال ھو التکبیر فی ایام التشریق دبر الصلوۃ" (درمنثور)

یحییٰ بن کثیر نے "واذکروا اللہ الخ" میں ذکر کیا ہے کہ ذکر سے مراد تکبیر ہے، یعنی ایام تشریق میں نمازوں کے بعد "اللہ اکبر، اللہ اکبر" کا ورد کرے۔

☆ "واخرج ابن المنذر عن ابن عمر انہ کان یکبر ثلاثا ثلاثا وراء الصلوۃ بمنی لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شئ قدیر" (درمنثور)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما منیٰ میں تمام نمازوں کے بعد تین تین مرتبہ "اللہ اکبر" پڑھتے۔ پھر "لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ الملک ولہ الحمد و ھو علی کل شئ قدیر"

☆ "اخرج البیهقی فی سننه عن سالم بن عبدالله بن عمر انه رمی الجمرة بسبع حصیات یکبرمع کل حصاةالله اکبر الله اکبر اللهم اجعله حجا مبرورا وذنبا مغفورا وعملا مشکورا وقال حد ثنی ابی ان النبی ﷺ کا ن کلما رمی بحصاة یقول مثل ما قلت" (درمنثور)

حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہم) نے جمرہ کو منی میں سات کنکریاں ماریں، اور ہر کنکری کے ساتھ آپ "الله اکبر، الله اکبر" پڑھ رہے تھے، اس کے بعد یہ دعا کر رہے تھے "اللهم اجعله حجا مبرورا وذنبا مغفورا وعمله مشکورا" اور آپ نے فرمایا میرے باپ (عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما) نے مجھے حدیث بیان کی کہ بے شک نبی کریم ﷺ نے کنکریاں پھینکتے ہوئے وہی کچھ کہا جو میں نے کہا۔

"ومن تعجلَ في يو مين فلااثم عليه ومن تا خر فلاا ثم عليه":

تو جو شخص جلدی کر کے دو دن میں چلا جائے تو اس پر کچھ گناہ نہیں۔ اور جو رہ جائے تو اس پر گناہ نہیں۔

☆ "واخرج ابن جریر عن علی فی قوله فمن تعجل فی یو مین فلا اثم علیه قال غفر له و من تأ خر فلا اثم علیه قال غفر له"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے "فمن تعجل فی یو مین فلااثم علیه" کی تفسیر میں بیان کیا کہ جو شخص دس ذی الحج کے بعد دو دن کنکریاں مار کر جلدی سے مکہ میں چلا جائے اس پر کوئی گناہ نہیں یعنی اس کی رب تعالیٰ کی طرف سے مغفرت کر دی جاتی ہے۔ اور آپ نے "ومن تأخر فلا اثم علیه" کی تفسیر میں بھی یہی بیان کیا جو تیسرے دن بھی کنکریاں مار کر جاتا ہے اس پر کوئی گناہ نہیں کا مطلب بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔

☆ "واخرج وکیع والفریابی وابن ابی شیبة وعبدبن حمیدوابن جریروابن المنذروابن ابی حاتم والطبرانی عن ابن مسعودفمن تعجل فی یومین فلااثم علیه قال مغفور له ومن تأخرفلااثم علیه قال مغفور له" (درمنثور)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے بھی وہی تفسیر بیان کی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کی۔

"واخرج البیھقی فی سننه عن ابن عباس فی الآیة قال من تعجل فی یو مین غفر له ومن تأ خر الی ثلا ثه ایام غفر له"

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اسی آیۃ کی تفسیر میں بیان فرمایا کہ جو شخص جلدی کر کے دو دنوں میں چلا گیا اس کی مغفرت ہوگئی اور جو دیر سے گیا یعنی تین دن مکمل کر کے گیا اس کی مغفرت کر دی گئی۔

"لمن اتقٰی": جس نے تقویٰ اختیار کیا (جو شخص بچا)۔ اس میں کئی احتمال ہیں۔

(۱) "خبر لمحذوف ای ذلک التخییر المذکور"

ان وجوہ میں سے ایک یہ وجہ بھی ہے کہ "لمن اتقی" خبر ہے متبداء (ذلک) محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اختیار دیا گیا ہے کہ جو دو دنوں میں کنکریاں مار کر چلا جائے یا تیسرے دن بھی مار کر چلا جائے یہ حکم اس لئے کہ وہ شخص متقی ہے۔ یعنی حج کرنے والا تقویٰ سے کام لیتا ہے۔ (روح المعانی)

(۲) دوسرا احتمال یہ ہے کہ دو دنوں میں کنکریاں مار کر جانے والا اگر چہ گنہگار نہیں اور مغفور (بخشا ہوا) ہے اور تین دن کنکریاں مار کر جانے والا بھی گنہگار نہیں اور مغفور ہے لیکن تیسرے دن کنکریاں مارنا تقویٰ کا کام ہے۔

"او ھو مخیر فی التعجیل والتأخر وان کان التأخر افضل فقد یقع التخییر بین الفاضل والا فضل کماخیر المسا فر بین الصوم والافطار وان کان الصوم افضل" (مدارک)

اگر چہ یعنی جلدی کرنے میں اور تاخیر میں اختیار دیا گیا ہے لیکن تاخیر افضل ہے، یعنی اس مقام میں فاضل اور افضل میں اختیار دیا گیا ہے، جس طرح مسافر کو روزہ رکھنے اور افطار کرنے میں اختیار دیا گیا ہے، اگر چہ روزہ رکھنا اس کے لئے افضل ہے۔

(۳) حج کرنے والا شخص مغفور (بخشا ہوا) ہوگا، لیکن شرط یہ ہے کہ باقی عمر گناہوں سے بچ کر رہے، یعنی جو کام باعث عذاب ہیں ان سے اجتناب کرتا رہے، صرف حج کے اعمال پر ہی بھروسہ نہ کرتا رہے، گویا کہ......

" فبین تعالیٰ ان علیهم مع ذلک ملازمة التقوی و مجانبة الاغترار بالحج السابق "
رب تعالیٰ نے بیان فرمادیا ہے کہ حج کرنے والوں پر لازم ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے متقی بن کر رہیں،
صرف اپنے حج پر اپنی مغفرت کی دارومدار قائم کر کے دھوکے میں نہ رہیں۔

(۴) " ان هذه المغفرة انما تحصل لمن کان متقیا قبل حجه "
اور وجہ اس میں یہ پائی گی ہے کہ مغفرت ان کو حاصل ہوگی جو حج سے پہلے بھی متقی تھے۔
جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا " انما یتقبل الله من المتقین " بیشک اللہ تعالیٰ متقین سے ہی قبول کرتا ہے۔
مطلب یہ ہے کہ حج کرنے سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ کا خوف رکھتا ہو، گناہوں پر نادم ہوتا ہو۔
" وحقیقته ان المصر علی الذنب لا ینفعه حجه وان کان قدادی الفرض علی الظاهر "
اس لئے کہ گناہوں پر اصرار کرنے والا حج کرے، حج کرتے ہوئے بھی خیال یہ ہی رہے کہ میرا
فلاں کام چھوٹ رہا، کب گھر پہنچوں اور وہ گناہوں والے کام کروں، تو اس صورت میں اس شخص
کو حج کامل طور پر نفع نہیں دے گا۔ اگر چہ ظاہری طور پر اس کا فرض ادا ہو گیا۔

(۵) " ان هذه المغفرة انما تحصل لمن کان متقیا عن جمیع المحظورات حال اشتغاله بالحج "
اور وجہ اس میں یہ ہے کہ حج سے مغفرت ان کو حاصل ہوتی ہے جو حج میں تمام ممنوع چیزوں سے
اجتناب کرتے رہیں۔

☆ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ پیش فرماتے ہیں۔
" من حج لله ولم یرفث ولم یفسق رجع کیوم ولدته امه " (بخاری و مسلم)
جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے لئے حج کیا اور عورتوں سے صحبت کی باتیں نہ کیں اور گناہ نہ کئے تو وہ
(حج سے) لوٹ کر ایسے آئے گا (گناہوں سے پاک وصاف ہوکر) جیسا کہ وہ آیا جس دن اس کی ماں
نے اسے جنا۔

☆ "وعن ابی ھریرۃ مرفوعا " الحج المبرور لیس له جزاءٌ الا الجنة " (بخاری مسلم)

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حج مبرور کی جزاء نہیں ہے سوائے جنت کے۔

☆ "وعن ابن مسعود قال قال رسول اللہ ﷺ الحج والعمرۃ ینفیان الفقر والذنوب کما ینفی الکیر خبث الحدید" (رواہ الشافعی والترمذی وعن عمر و نحو رواہ احمد)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حج اور عمرہ فقر اور گناہوں کو ایسے مٹاتے ہیں جس طرح آگ کی بھٹی لوہے کے زنگ کو مٹاتی ہے۔ (ماخوذ از کبیر و مظھری وبغوی)

"واتقوا اللہ": اور اللہ سے ڈرو۔

تقوی کا جو یہ حکم دیا گیا ہے اس میں تکرار نہیں، کیونکہ یہ امر ہے، اس کا تعلق مستقبل زمانہ سے ہے، اور "لمن اتقی" میں ماضی کا زمانہ ہے۔

" وان التقوی عبارۃ عن فعل الواجبات وترک المحرمات "

بیشک تقوی کا مطلب یہ ہے کہ واجب کام کرنا اور حرام کاموں کو چھوڑنا۔

" واتقوا اللہ " میں حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالی سے ہمیشہ ڈرتے رہو یعنی واجبات کو ادا کرتے رہو اور حرام کاموں سے اجتناب کرتے رہو۔

"واعلموا انکم الیه تحشرون": اور جان لو بیشک تمہیں اسی کی طرف جمع کیا جانا ہے۔

تقوی کے حکم کے بعد یہ حکم تاکید کے لئے لایا گیا ہے، اور تقوی پر شدت سے قائم رہنے کا حکم دیا گیا ہے،

"لان من تصور انه لابد من حشر ومحاسبة ومسألة وان بعد الموت لا دار الا الجنة او النار صار ذلک من اقوی الدواعی له الی التقوی "

اس لئے کہ جس شخص کو یہ تصور حاصل ہو جائے کہ ہمیں رب کے حضور پیش کیا جانا ہے، ہمارا

حساب ہونا ہے اور ہمارے اعمال کے مطابق ہم سے سوال کیا جانا ہے، اور موت کے بعد جنت یا جہنم کے بغیر اور کوئی مقام نہیں ہوگا تو یقیناً وہ اللہ تعالیٰ کا زیادہ خوف رکھے گا جس کی وجہ سے اسے تقویٰ حاصل ہوگا۔ (از کبیر)

حشر کا مطلب یہ ہے کہ ان کو قبروں سے نکال کر ایک میدان میں جمع کر دیا جائے گا، البتہ حشر کی تکمیل حساب و کتاب اور جزاء سے ہوگی۔ یعنی تمہیں رب تعالیٰ کی طرف اٹھایا جائے گا تا کہ وہ تمہارے اعمال کی تمہیں جزاء دے۔

(از کبیر و روح المعانی)

فائدہ: رب تعالیٰ نے فرمایا" واعلموا انکم الیه تحشرون "اور جان لو بیشک تمہیں اس کی طرف جمع کیا جائے گا۔

" والمراد بقوله (الیه) انه حیث لامالک سواه، و لاملجأ الا ایاه و لایستطیع احد دفعاعن نفسه، کما قال تعالیٰ (یو م لاتملک نفس لنفس شیأ و الأ مر یو مئذللہ)"

اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی "الیه" سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ رب تعالیٰ کے بغیر اور کوئی مالک نہیں رب تعالیٰ کے بغیر اور کوئی جائے پناہ نہیں اور کوئی شخص اپنے آپ سے عذاب کو مندفع نہیں کر سکے گا۔

جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔"یو م لا تملک نفس لنفس شیأ و الأمر یو مئذللہ"

(الانفطار ۱۹)

جس دن کوئی جان کسی جان کا کچھ اختیار نہ رکھے گی اور سارا حکم اس دن اللہ کا ہے۔ (از کبیر)

احادیث مبارکہ:

اگر چہ طریقہ حج کے آخر میں نبی کریم ﷺ کی زیارت کی بحث کو ذکر کیا جا چکا ہے، لیکن اس آیۃ کی تفسیر کے آخر میں علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے چند احادیث درمنثور میں ذکر فرمائی ہیں، جو نبی کریم ﷺ کی زیارت سے متعلق ہیں۔

محبت مصطفیٰ ﷺ کی وجہ سے ہی علامہ سیوطی رحمہ اللہ غیر مقلدین اور ان کے حاشیہ برداروں (چمچوں) کو پسند نہیں آتے۔

پہلی بحث اوراس بحث میں بعض احادیث کے تکرار کو باعث برکت سمجھا جائے تکرار کو بے فائدہ قرار نہ دیا جائے۔

☆ "اخرج ابن حبان فی الضعفاء وابن عدي فی الکامل والدارقطنی فی العلل عن ابن عمر عن النبی ﷺ قال من حج ولم یزرنی فقد جفانی" (در منثور)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے حج کیا اور میری زیارت نہ کی تحقیق اس نے مجھ پر جفاء کی۔(یعنی ظلم کیا)

☆ "واخرج سیعد بن منصور وابو یعلی والطبرانی وابن عدی والدار قطنی والبیهقی فی الشعب وابن عساکر عن ابن عمر قال قال رسول ﷺ من حج فزار قبری بعد وفاتی کان کمن زارنی فی حیاتی" (در منثور)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے حج کیا، پھر میری وفات کے بعد میری قبر کی زیارت کی، گویا کہ اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔

یعنی میری طرف سے اس پر نظر رحمت میں کوئی فرق نہیں آئے گا' اگر چہ اسے مقامِ صحابیت حاصل نہیں ہوگا' کیونکہ صحابیت کا تعلق آپ کی ظاہری حیات سے ہے۔

☆ "واخرج الحکیم الترمذی والبزار وابن خزیمة وابن عدی والدار قطنی والبیهقی عن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ من زار قبری وجبت له شفاعتی" (درمنثور)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لئے میری شفاعت لازم ہوگئی۔

☆ "واخرج الطبرانی عن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ من جاء نی زائرالم تنزعه حاجة الازیارتی کان حقا علی ان اکون له شفیعا یوم القیمة" (در منثور)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص میری زیارت کے لئے آیا' اور وہ اپنے ذاتی کسی کام سے نہیں آیا بلکہ صرف میری زیارت کے لئے آیا تو مجھ پر لازم ہو جاتا

ہے کہ میں قیامت کے دن اس کی (خصوصی) شفاعت کروں۔

☆ "واخرج الطیالسی والبیھقی فی الشعب عن عمر سمعت رسول اللہ ﷺ یقول من زار قبری کنت لہ شفیعا او شھیدا ومن مات فی احد الحرمین بعثہ اللہ فی الآ منین یوم القیمۃ"

(درمنثور)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا' جس شخص نے میری قبر کی زیارت کی میں اس کا شفیع (شفاعت کرنے والا) ہوں گا' اور اس کا گواہ ہوں گا' اور جو شخص حرمین (حرم مکہ اور حرم مدینہ) میں سے کسی ایک حرم میں فوت ہو گیا تو اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن امن میں رہنے والوں میں اٹھائے گا۔ (یعنی اسے اللہ تعالیٰ کا خاص قرب حاصل ہوگا)

☆ "واخرج البیھقی عن حاطب قال قال رسول اللہ ﷺ من زارنی بعد موتی فکأ نما زارنی فی حیاتی ومن مات باحد الحرمین بعث من الآمنین یوم القیامۃ" (درمنثور)

حاطب کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے میری وفات کے بعد میری زیارت کی گویا کہ اس نے میری حیات میں میری زیارت کی اور جو شخص حرمین میں سے ایک میں فوت ہو گیا اسے قیامت کے دن امن میں رہنے والوں میں اٹھایا جائے گا۔

☆ "واخرج العقیلی فی الضعفاء والبیھقی فی الشعب عن رجل من آل الخطاب عن النبی ﷺ قال من زارنی متعمدا کان فی جواری یوم القیامۃ ومن سکن المدینۃ وصبر علی بلا نھا کنت لہ شھیدا وشفیعا یوم القیامۃ ومن مات فی احدالحرمین بعثہ اللہ من الآمنین یوم القیامۃ"

(درمنثور)

آل خطاب میں سے ایک شخص نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے صرف میری زیارت کے ارادہ سے میری زیارت کی وہ قیامت کے دن میرے قریب ہوگا' اور جو شخص مدینہ طیبہ میں رہا اور وہاں کی مصیبتوں کو برداشت کیا تو میں قیامت کے دن اس کا گواہ اور شفیع ہوں گا'

اور جو شخص حرمین میں سے کسی ایک مقام پر فوت ہوا تو اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن امن میں رہنے والے لوگوں میں اٹھائے گا۔

☆ "واخرج ابن ابی الدنیا والبیھقی عن انس بن مالک ان رسول اللہ ﷺ قال من زارنی بالمدینة محتسبا کنت له شھیدا وشفیعا یوم القیامة" (درمنثور)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے مدینہ میں میری زیارت کی، صرف نیکی کی غرض سے، قیامت کے دن میں اس کا گواہ اور شفیع ہوں گا۔

☆ "واخرج البیھقی عن ابن عمر انه کان یاتی القبر فیسلم علی رسول اللہ ﷺ ولا یمس القبر ثم یسلم علی ابی بکر ثم علی عمر" (در منثور)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ کے مزار پر حاضر ہوتے تھے تو قبر کو مس نہیں کرتے تھے پھر ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کو سلام پیش کرتے تھے۔

☆ "واخرج البیھقی عن ابی ھریرة قال قال رسول اللہ ﷺ مامن عبد یسلم علی عند قبری الاوکل اللہ بھا ملکا یبلغنی وکفی امر آخرته ودنیاه وکنت له شھید اوشفیعا یوم القیامة"

(درمنثور)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی شخص ایسا نہیں جو میری قبر کے پاس آکر مجھ پر سلام پڑھے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے ایک فرشتہ مقرر فرما دیتا ہے جو میرے پاس وہ سلام پہنچاتا ہے، اس شخص کو دنیا اور آخرت کے معاملات کے لئے کافی ہوتا ہے اور قیامت کے دن میں اس کا شفیع اور گواہ ہوں گا۔

☆ "واخرج البیھقی عن ابی ھریرة ان رسول اللہ ﷺ قال مامن مسلم یسلم علی الا رداللہ علی روحی حتی ارد علیه السلام" (درمنثور)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی مسلمان ایسا نہیں جو

مجھ پر سلام بھیجے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ میری توجہ اس کی طرف کر دیتا ہے یہاں تک کہ میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔

☆ "واخرج البیهقی عن محمد بن المنکدر قال رایت جابرا وهو یبکی عند قبر رسول الله ﷺ وهو یقول هنا نسکب العبرات سمعت رسول الله ﷺ یقول مابین قبری ومنبری روضة من ریاض الجنة" (در منثور)

محمد بن المنکدر فرماتے ہیں میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کے مزار کے پاس روتے ہوئے دیکھا اور آپ کہہ رہے تھے کہ ہم یہاں آنسو بہاتے ہیں کیونکہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ آپ فرمارہے تھے کہ میری قبر اور میرے منبر کے درمیان جنت کے باغات میں سے ایک باغ ہے۔

☆ "واخرج ابن ابی الدنیا والبیهقی عن منیب بن عبدالله بن ابی امامة قال رایت انس بن مالک اتی قبر النبی ﷺ فوقف فرفع یدیه حتی ظننت انه افتتح الصلوة فسلم علی النبی ﷺ ثم انصرف" (در منثور)

منیب بن عبداللہ ابی امامہ فرماتے ہیں میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو نبی کریم ﷺ کی قبر شریف پر آتے ہوئے دیکھا، آپ آئے، وہاں ٹھہرے تو آپ نے اپنے ہاتھوں کو اٹھایا، یہاں تک کہ میں نے گمان کیا کہ آپ نماز شروع فرمارہے ہیں، تو آپ نے نبی کریم ﷺ پر سلام پڑھا، پھر واپس چلے گئے۔

☆☆☆☆☆

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ☆ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۰۴)

﴿۱﴾

اور بعض آدمی وہ کہ دنیا کی زندگی میں اس کی بات تجھے بھلی لگے اور اپنے دل کی بات پر اللہ کو گواہ لائے اور وہ سب سے بڑا جھگڑالو ہے۔

﴿۲﴾

اور لوگوں میں سے کوئی وہ شخص ہے جو تعجب میں ڈالتا ہے آپ کو اپنی بات سے دنیا کی زندگی میں، اور گواہ لاتا ہے اللہ کو اس چیز پر جو اس کے دل میں ہے حالانکہ وہ بہت زیادہ جھگڑا کرنے والا ہے۔

ماقبل سے تعلق:

"فقد قسم الله الناس على اربعة اقسام الاول من يطلب الدنيا لا غير، ومنهم من يطلب الدنيا والآخرة، ومنهم من يظهر انه من اهل الآخرة مع انه في الواقع من اهل النار ومنهم من هو مو من ظاهرا وباطنا وذكرهم على هذا الترتيب" (صاوی)

تحقیق اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی چار قسمیں بیان کی ہیں۔

پہلی قسم کے وہ لوگ ہیں جو صرف دنیا کو طلب کرتے ہیں آخرت کی کچھ طلب نہیں کرتے، ان کو آخرت میں کوئی ثواب حاصل نہیں ہوگا ان کا ذکر اس آیۃ کریمہ میں فرمایا "فمنهم من يقول ربنا آتنا في الدنيا وماله في الآخرة من خلاق"

دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو دنیا میں بھلائی طلب کرتے ہیں اور آخرت میں بھلائی طلب کرتے ہیں، اور آگ کے عذاب کی پناہ چاہتے ہیں، ان کا ذکر ان الفاظ مبارکہ سے فرمایا "ومنهم من

یقول ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الاخرة حسة وقناعذاب النار "

تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو ظاہر یہ کرتے ہیں کہ ہم آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں حالانکہ ان کا آخرت پر کوئی ایمان نہیں وہ جہنم میں جائیں گے، ان کا ذکر اس آیت میں کیا" ومن الناس من یعجبک " الخ

اور چوتھی قسم کے وہ لوگ ہیں جو ظاہرا اور باطناً مومن ہیں۔ان کا ہر کام اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے مطابق ہوتا ہے۔ان کا ذکر آنے والی آیت مبارکہ میں کیا" ومن الناس من یشری نفسه ابتغاء مرضات الله " الخ

شان نزول:

اس کے شان نزول میں چند وجہ ہیں۔

(۱) ایک وجہ ان میں سے یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی ہے اخنس بن شریق ثقفی کے متعلق۔جس کا نام ابی بن شریق تھا۔ یہ بنی زہرہ کا حلیف تھا۔ نبی کریم ﷺ کے پاس آ کر اسلام کو ظاہر کیا، اور اس پر قسم اٹھا کر کہتا کہ میں مخلص مومن ہوں، نبی کریم ﷺ نے بھی شرعی قانون کا پاس کرتے ہوئے اس کے ظاہر قول کا اعتبار کیا۔

رب تعالیٰ کے ارشادگرامی " یعجبک قوله فی الحیوة الدنیا ویشهد الله علی ما فی قلبه " کا یہی مطلب ہے۔" غیز انه کا ن منا فقاحسن العلا نیة خبیث الباطن "

لیکن حقیقت میں وہ منافق تھا، ظاہری طور پر بڑے خلوص کا اظہار کرتا تھا لیکن باطنی طور پر نفس میں خباثت رکھتا تھا۔

پھر وہ نبی کریم ﷺ کے دربار سے نکل کر مسلمانوں کی کھیتی سے گذرا تو کھیتی کو آگ لگا دی، اور گدھوں کو مار ڈالا، اس کے اس عمل کا تذکرہ آنے والی آیۃ کریمہ میں آرہا ہے۔

تنبیه : بعض حضرات نے " یعجبک قوله " کی وجہ یہ بیان کی کہ اخنس نے بنی زہرہ کو بدر کے دن پیچھے ہٹ

جانے کا مشورہ دیا اور ان کو یہ کہا۔

"ان محمد ابن اختکم فان یک کا ذبا کفا کموہ سائرالناس و ان یک صادقا کنتم اسعد الناس بہ"

کہ بے شک محمد تمہاری بہن کا بیٹا ہے (وہ قبیلہ نبی کریم ﷺ کا ننہال تھا) اگر جھوٹا ہے تو تمہاری جانب سے اور لوگ اسے کافی ہو جائیں گے اور اگر سچا ہے تو تم اس کے نزدیک نیک بخت ہو جاؤ گے۔

سب نے اس کی رائے کو پسند کیا کہ تم ٹھیک کہتے ہو، اس نے اپنے پیروکار تین سو آدمیوں کو پیچھے ہٹ جانے کا حکم دے دیا، اسی وجہ سے اسے اخنس کہا گیا ہے۔ کیونکہ" خنس " کا معنی ہے پیچھے ہٹ جانا، اس کی اس بات کو نبی کریم ﷺ نے بہت عجیب سمجھا۔ لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ نے اس وجہ کو رد کیا' آپ فرماتے ہیں۔

"وعندی ان ھذا القول ضعیف و ذلک لأنہ بھذاالفعل لا یستوجب الذم"

میرے نزدیک یہ قول ضعیف ہے کیونکہ یہ باعث مذمت نہیں' حالانکہ ان آیات میں اس کی مذمت بیان کی گئی ہے۔

(۲) اس آیۃ کریمہ کے شانِ نزول کی اور وجہ یہ ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور ضحاک نے بیان فرمائی ہے کہ کفار قریش نے نبی کریم ﷺ کی طرف پیغام بھیجا کہ بیشک ہم نے اسلام قبول کرلیا ہے' آپ ہماری راہنمائی کے لئے اپنے اصحاب میں سے کچھ علماء کو بھیجیں، نبی کریم ﷺ نے ان کی طرف ایک جماعت کو بھیجا، وہ جب بطن رجیع میں پہنچے تو کفار کو خبر ملی، ستر سواروں نے ان کا احاطہ کرلیا اور ان کو شہید کر کے سولی پر چڑھا دیا۔

" ففیھم نزلت ھذہ الآیۃ ولذلک عقبہ من بعد بذکر (من یشری نفسہ ابتغاء مرضاۃ اللہ) منبھا بذلک علی ھؤلاء الشھداء "

ان لوگوں کی مذمت میں اس آیت کریمہ کو نازل کیا اور آنے والی آیۃ کریمہ میں شہید ہونے والوں کا ذکر ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اپنی جان قربان کردی۔ (از کبیر)

بطن رجیع کے مقام میں شہید ہونے والوں میں حضرت عاصم بن ثابت اور حضرت خبیب رضی اللہ عنہما بھی تھے،

منافقین نے شہید ہونے والے حضرات کے متعلق کہا۔

" ویح ھؤلاء القوم لا ھم قعدوافی بیو تھم و لا ھم ادوا رسالۃ صاحبھم "

یہ لوگ ہلاک ہو گئے نہ گھروں میں بیٹھے اور نہ ہی اپنے صاحب (نبی کریم ﷺ) کا پیغام لوگوں تک پہنچا سکے۔تو اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی مذمت میں اس آیۃ کریمہ کو اور شہداء کی شان میں آنے والی آیۃ کو نازل فرمایا۔ (قرطبی)

(۳) حضرت قتادہ اور مجاہد اور دوسرے اہل علم کی ایک جماعت کا قول یہ ہے۔

"نزلت فی کل مبطن کفرا او نفاقا او کذ با او اضرارا و ھو یظھر بلسانہ خلاف ذلک فھی عامۃ " (قرطبی)

کہ یہ آیۃ کریمہ ہر اس شخص کی مذمت میں نازل ہوئی ہے جو باطنی طور پر کافر ہو،یعنی اوپر سے مسلمان اور اندر سے کافر ہو یا منافق ہو یا جھوٹا ہو،یعنی دعویٰ اسلام میں جھوٹا ہو،یا مسلمانوں کو نقصان پہنچانے والا ہو،یعنی زبان سے جس چیز کو ظاہر کرنے والا ہے وہ اس کے دل میں نہیں پائی گئی۔

شان نزول میں یہ قول ترمذی کی اس روایت کے مطابق ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بعض کتب میں ہے۔

" ان من عباداللہ قو ما السنتھم احلی من العسل و قلو بھم امر من الصبر یلبسون للناس جلو دا لضأ ن من اللین یشترون الدنیا با لدین یقول اللہ تعالی أبی یغترو ن و علی یجترؤن فبی حلفت لأ تیحن لھم فتنۃ تد ع الحلیم منھم حیران " (قرطبی)

کہ بے شک اللہ تعالیٰ کے بندوں میں کچھ ایسی قومیں ہوں گی جن کی زبانیں شہد سے میٹھی ہوں گی، اور ان کے دل مصبر (ایلوا) سے زیادہ کڑوے ہوں گے،وہ لوگوں کے لئے بھیڑ کے چمڑوں سے بھی نرم لباس پہنے ہوں گے،دنیا کو دین کے بدلے حاصل کریں گے،اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ میری وجہ سے دھوکا میں مبتلا ہوں گے اور مجھ پر وہ جرأت کریں گے،مجھے اپنی ذات کی قسم میں ان پر ایسا فتنہ مسلط کروں گا جو بڑے بڑے صابروں کو حیران کر دے گا۔

تمام اقوال میں محاکمہ:

اگر چہ آخری وجہ شان نزول کی ابن کثیر کے نزدیک بھی معتبر ہے اور کبیر میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

" وھو اختیار اکثر المحققین من المفسرین " یہی قول اکثر محققین مفسرین کرام کا ہے۔

تاہم اس میں بہتر محاکمہ یہ پایا گیا ہے جو محمد بن کعب قرظی نے بیان کیا ہے۔

" فلایمتنع ان تنزل الآیة فی الرجل ثم تکون عامة فی کل من کان موصوفا بتلک الصفات " (کبیر)

کہ ہوسکتا ہے آیہ کریمہ نازل تو خاص اخنس بن شریق کی مذمت میں ہوئی ہو لیکن بعد میں الفاظ کی عمومیت کے پیش نظر ہر منافق کو شامل ہو۔

عموم پر دلالت کی وجوہ:

یعنی آیہ کریمہ کا شان نزول اگر چہ خاص بھی مان لیا جائے تو الفاظ کے عموم کے لحاظ پر عام رکھنا زیادہ بہتر ہے۔

(۱) حکم کسی مناسب وصف پر مرتب ہوتا ہے، جس میں علت بننے کی صلاحیت پائی جاتی ہے، جب اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کی مذمت بیان کی ہے اور ان کی وہ صفات بیان کی ہیں جو باعث مذمت ہیں، تو ہمیں واضح طور پر معلوم ہوگیا کہ ان لوگوں کی مذمت کی وجہ ان کی بری صفات ہیں۔

"فیلزم ان کل من کان موصوفا بتلک الصفات ان یکون مستوجبا للذم"

تو ضروری ہے کہ بے شک ہر وہ جو ان صفات سے متصف ہوگا (یعنی جس شخص میں بھی یہ صفات پائی جائیں گی) وہ مذمت کا مستحق ہے۔

(۲) " ان الحمل علی العموم اکثر فائدة" عمومی معنی لینے میں فائدہ زیادہ ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر عاقل و بالغ شخص کو برے طریقے سے روکنا لازم آئے گا۔

(۳) اگر آیۃ کریمہ کو عام معنی پر محمول کریں تو اس میں زیادہ احتیاط ہے، اس لئے کہ جب حکم تمام منافقوں کے متعلق ہوگا تو ان میں وہ خاص شخص یعنی اخنس بن شریق بھی آجائے گا۔ جب حکم اس کے لئے خاص ہوگا تو عام لوگوں کو شامل نہیں ہوگا۔

" فثبت بما ذکر نا ان حمل الآیۃ علی العموم اولی "

جو ہم نے ذکر کیا ہے اس سے یہ ثابت ہوگیا کہ آیۃ کریمہ کو عموم پر محمول کرنا زیادہ بہتر ہے۔

اس سے بھی زیادہ عموم بہتر ہے:

اس آیۃ کریمہ اور آنے والی دو آیتوں میں مجموعی طور پر پانچ بری صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ صفات خواہ منافقوں میں پائی جائیں یا ریاء کاری کرنے والے مسلمانوں میں پائی جائیں، سب ہی مذمت کے مستحق ہوں گے اور سب کو ان سے باز رہنا ضروری ہے۔

ان صفات مذمومہ میں سے ایک صفت یہ ذکر فرمائی گئی۔

" یعجبک قو لہ فی الحیو ۃ الدنیا " تعجب میں ڈالتی ہے تمہیں اس کی بات دنیا کی زندگی میں۔

یعنی دنیا میں وہ بظاہر میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے جو جھوٹی باتیں ہوتی ہیں۔ یہ صفت منافق میں پائی جائے یا مسلمان میں، باعثِ مذمت ہے۔ اس وصف والے شخص کو اس بری صفت سے باز رہنا ضروری ہے۔

اور بری صفت یہ بیان کی گئی ہے۔

" ویشھد اللہ علی مافی قلبہ" اور گواہ بناتا ہے اللہ کو اس چیز پر جو اس کے دل میں ہے۔

اس صفت کو صفتِ مذمومہ (بری) اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ ظاہر طور پر اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر یعنی قسم اٹھا کر اپنے دل کے خلوص اور اپنی سچائی کو پیش کرتا ہے۔ " مع ان قلبہ بخلا ف ذلک " باوجود اس کے کہ وہ سچا نہیں، اس کے دل میں اس کے خلاف ہوتا ہے۔

یہ بری صفت (یعنی جھوٹی قسمیں اٹھا کر دل کے خلوص کو پیش کرنا اور حقیقت میں اس کے خلاف ہونا) خواہ منافق میں پائی جائے یا مسلمان میں وہ قابلِ مذمت ہے، انسان کو اس بری صفت سے باز آنا ضروری ہے۔

اور تیسری بری صفت رب تعالیٰ نے بیان فرمائی۔

" وھو الدالخصام " وہ سخت جھگڑالو ہے۔

لہٰذا شرعی جواز کے بغیر کسی سے جھگڑا کرنا بری صفت ہے اور خصوصاً اس بری صفت میں اور ہی زیادہ مبتلا ہونا زیادہ ہی باعثِ مذمت ہوگا، لہٰذا یہ صفتِ مذمومہ خواہ منافق میں پائی جائے یا مسلمان میں وہ مذمت کا مستحق ہوتا ہے، لہٰذا اس صفت والے شخص کو چاہئے کو وہ اس سے باز آجائے۔

اور چوتھی بری صفت یہ بیان کی گی ہے۔

" واذ اتو لی سعی فی الارض لیفسد "اور جب پیٹھ پھیرے تو زمین میں فساد ڈالتا پھرے۔

لہٰذا سامنے میٹھی میٹھی باتیں کرنا اور بڑے خلوص کا اظہار کرنا اور پیچھے فساد پھیلانا بہت بری صفت ہے، یہ بری صفت خواہ منافق میں پائی جائے یا مومن میں وہ مذمت کے قابل ہے، ایسے شخص کو چاہئے کہ وہ اس بری صفت سے دور رہے۔

اور پانچویں بری صفت کا رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا۔

" واذاقیل له اتق الله اخذته العزة بالاثم "

اور جب اسے کہا جائے کہ اللہ سے ڈرو تو اسے اور ضد چڑھے گناہ کی۔

یعنی جب اسے گناہ سے روکا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈر، تو وہ اپنی دنیاوی عزت کی وجہ سے اور ہی زیادہ ضد میں آجاتا ہے اور ضد کی وجہ سے اور ہی زیادہ گناہ شروع کردیتا ہے۔

لہٰذا یہ صفت مذمومہ خواہ منافق میں پائی جائے یا مسلمان میں وہ مستحق مذمت ہے، ایسے شخص کو چاہئے کہ وہ اس بری صفت سے باز آجائے۔

اس مندرجہ بالا بحث سے واضح ہوا کہ یہ پانچ بری صفات منافق میں ضرور پائی جاتی ہیں، لیکن کبھی یہ صفات بعض مسلمانوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔

" فثبت انا متی حملنا الآیة علی الموصوف بھذہ الصفات الخمسة دخل فیھا المنافق والمرائی "

تو واضح ہوا کہ آیۃ کریمہ کا جب ہم مطلب یہ لیں گے کہ جو شخص بھی ان بری صفات والا ہوگا وہ مستحقِ مذمت ہے تو اس میں منافق اور ریاء کار مسلمان دونوں ہی شامل ہوں گے۔ (از بیہ بتصرف)

نتیجہ واضح ہوا کہ آیۃ کریمہ نازل تو ایک منافق کی مذمت میں ہوئی، لیکن الفاظ کی عمومیت کی وجہ سے یہ منافق کو شامل ہے، بلکہ ریاء کار مسلمان بھی ضمناً اس میں داخل ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہمیں ان صفات مذمومہ سے محفوظ رکھے۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

" ومن الناس من یعجبک قولہ فی الحیوۃ الدنیا" میں " فی الحیوۃ الدنیا " جار مجرور ہیں۔ اس ظرف کا تعلق " یعجب " سے ہے۔ یا " قولہ " سے ہے۔ اس میں دو احتمال ہیں۔

"(فی الحیوۃ الدنیا) متعلق بالقول ای ما یقولہ فی امور الدنیا واسباب المعاش او فی معنی الدنیا فانھا مرادہ من ادعاء المحبة و اظھار الایمان "

جب اس ظرف کا تعلق قول سے ہو تو دو معنی ہوں گے، ایک ان میں یہ ہے کہ لوگوں میں کوئی وہ شخص ہے جس کی دنیا کے معاملات کے متعلق اور اسباب معیشت (دنیا کے گذران کے اسباب) کے متعلق باتیں آپ کو تعجب میں ڈالتی ہیں۔ اور ان معانی میں سے دوسرا معنی یہ ہے کہ اس شخص کی باتیں دنیا کو حاصل کرنے کے متعلق آپ کو تعجب میں ڈالتی ہیں۔ کیونکہ اس کا دعویٰ محبت اور اظہار ایمان دنیاوی مقاصد حاصل کرنے کے لئے ہے۔

خیال رہے تعجب کا معنی کسی چیز کو عمدہ سمجھنا۔ اور اپنے نفس میں کسی چیز کو عظیم سمجھنا' اور جس چیز سے تعجب آرہا ہو اس کی وجہ سے حیران ہونا۔

اگر ظرف کا تعلق " یعجب " سے ہو تو معنی یہ ہے، اس شخص کی باتیں دنیا میں آپ کو تعجب میں ڈالتی ہیں، کیونکہ ان میں چاشنی یعنی مٹھاس پائی جاتی ہے اور ان میں فصاحت پائی جاتی ہے۔ لیکن آخرت میں ان کی باتیں آپ کو تعجب میں نہیں ڈال سکیں گی۔ کیونکہ اس پر دہشت طاری ہوگی اور اس کی زبان میں لکنت ہوگی، وہ باتیں رک رک کرے گا، جن میں تعجب کی کوئی وجہ نہیں ہوگی۔

یا دوسرا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن اس کو رب تعالیٰ کی طرف سے کلام کرنے کی اجازت نہیں ہوگی، اور طلباء کرام یہ بھی خیال کریں کے " قول " بمعنی " مقول " کے ہے۔ (از بیضاوی و شیخ زادہ)

" **ویشهدالله علی ما فی قلبه** " اور گواہ بناتا ہے اللہ کو اس چیز پر جو اس کے دل میں ہے۔

" فالمعنی انه یقرر صدقه فی کلامه و دعواه بالاستشهاد بالله "

معنی یہ ہے کہ وہ اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کو گواہ بناتا ہے کہ میں اپنے کلام میں سچا ہوں۔

اس میں پھر دو احتمال ہیں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کو گواہ بناتا ہو، ساتھ ساتھ قسمیں بھی اٹھاتا ہو کہ میں اپنے دعوی میں سچا ہوں۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ وہ قسمیں تو نہ اٹھاتا ہو لیکن وہ دعویٰ کی سچائی پر فقط اللہ تعالیٰ کو گواہ بناتا ہو۔

تنبیہ : عام قراء نے " یشهد " کو یاء کے ضمہ (پیش) سے پڑھا ہے اور ضمیر قائل کی طرف لوٹ رہی ہے کہ وہ شخص اللہ کو گواہ بناتا ہے اس چیز پر جو اس کے دل میں ہے۔

لیکن ابن محیصن کی قرأت میں " یشهد " یاء کے فتحہ (زبر) سے پڑھا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا۔

" ان الله یعلم من قلبه خلاف ما اظهره "

بیشک اللہ گواہ ہے' یعنی اللہ جانتا ہے کہ اس کے دل میں اور ہے اور ظاہر اور کر رہا ہے۔

یعنی اس کے دل میں وہ چیز نہیں جو زبان سے ظاہر کر رہا ہے۔

"وهو الد الخصام": وہ بہت سخت جھگڑالو ہے۔

" الد ' الشديد الخصومة " سخت جھگڑا کرنا۔" الخصام جمع خصم " خصام خصم کی جمع ہے جس کا معنی جھگڑا کرنا۔" الدالخصام ای اشد الخصوم خصومة " یعنی " الدالخصام " کا معنی یہ ہے کہ بہت زیادہ جھگڑا کرنا۔ مطلب تو یہی ہے، البتہ مفسرین کرام نے اس کی تفسیر میں مختلف الفاظ ذکر فرمائے ہیں۔

" الدالخصام معناه طالب لايستقيم "

حضرت مجاہد نے اس کا معنی یہ بیان کیا ہے ایسی راہ کو طلب کرنے والا جو سیدھی نہ ہو۔

" وقال السدى اعوج الخصام " سدی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا "ٹیڑھی راہ پر چلنے والا"

"وقال قتادة الدالخصام معناه انه جدل بالباطل شديد القسوة فى معصية الله عالم اللسان جاهل العمل "

حضرت قتادہ نے " الدالخصام " کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ باطل طریقہ سے جھگڑا کرنے والا، اللہ تعالیٰ کی معصیت میں سختی سے قائم رہنے والا، زبان سے علم رکھنے والا، عمل سے جاہل۔

مطلب سب معانی کا ایک ہی ہے "بہت زیادہ جھگڑا کرنے والا" (از کبیر)

☆ "وقداخرج البخارى ومسلم عن عائشة رضى الله عنهاعن النبى ﷺ ابغض الرجال الى الله تعالى الألدالخصم "

بخاری اور مسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ذکر کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کو لوگوں میں زیادہ ناپسند وہ شخص ہے جو زیادہ جھگڑالو ہے۔ (روح المعانی)

☆ "واخرج احمد عن ابى الدرداء كفى لك اثماان لاتزال مما رياو كفى بك ظالما ان لاتزال مخاصماو كفى بك كا ذبا ان لا تزال محدثا الاحديث فى ذات الله "

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں تیرے گنہگار ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ تو ریاء کاری

سے باز نہ آئے، اور تیرے ظالم ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ جھگڑے سے باز نہ آئے اور تیرے جھوٹے ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ تو زیادہ باتیں کرنے سے باز نہ آئے، سوائے اس کلام کے جو اللہ تعالیٰ کے متعلق ہو۔

یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی تعریف میں جو کلام کرے گا، یا شریعت کے متعلق جو کلام کرے گا اس کا ثواب حاصل ہوگا، لیکن دنیاوی بے فائدہ باتیں اکثر طور پر جھوٹ پر مبنی ہوتی ہیں۔

" وشدة الخصومة من صفات المنافقين لا نهم يحبون الدنيافيكثرون الخصام عليها "

اور زیادہ جھگڑا کرنا منافقین کی صفت ہے کیونکہ وہ دنیا سے محبت کرتے ہیں اور دنیا کی وجہ سے زیادہ جھگڑا کرتے ہیں۔ (روح المعانی)

"واخرج الطستى عن ابن عباس ان نافع بن الازرق سأله عن قوله وهو الدالخصام قال الجدل المخاصم فى الباطل قال وهل تعرف العرب ذلك قال نعم اماسمعت قول مهللهل "

ان تحت الاحجار حزماوجورا وخصيماالدذامغلاق

نافع بن ازرق نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ " الدالخصام " کا کیا مطلب ہے؟ تو آپ نے فرمایا باطل میں جھگڑا کرنا، نافع نے پوچھا کیا اہل عرب نے یہ معنی لیا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں، کیا تم نے مہلہل کا شعر نہیں دیکھا، اس نے اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔

بے شک پتھروں کے نیچے سختی اور ظلم پایا گیا ہے۔ اور باطل راہ پر چلنے والے پر حق کے دروازے بند ہیں۔ (درمنثور)

"واخرج البخارى ومسلم وابو داؤد والترمذى والنسائى عن عبدالله بن عمروان النبى ﷺ قال اربع من كن فيه كان منافقاخالصا ومن كانت فيه خصلة منهن كانت فيه خصلة من النفاق حتى يدعها اذا ائتمن خان واذاحدث كذب واذاعاهد غدر واذا خاصم فجر"

عبداللہ بن عمرو فرماتے ہیں بے شک نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص میں چار چیزیں پائی جائیں وہ خالص منافق کے قریب ہے اور جس میں ان چار سے ایک پائی جائے اس میں منافقت کی علامت پائی گئی، یہاں تک کہ وہ ان کو چھوڑ دے (وہ چار چیزیں یہ ہیں) اس کے پاس جب امانت رکھی جائے وہ خیانت کرے، اور جب بات کرے تو جھوٹ بولے اور جب معاہدہ کرے تو دھوکا کرے، اور جب جھگڑا کرے تو فجور کرے۔ (گالی گلوچ اور بیہودگی سے کام لے) (در منثور)

☆ " واخرج الترمذی و البیهقی عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ کفی بک اثماان لا تزال مخاصما" (درمنثور)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارا گنہگار ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ تم جھگڑا کرنے سے باز نہ آو۔ (ترمذی، بیہقی)

☆ "واخرج احمد عن ابی الدرداء قال من کثر کلامه کثر کذبه و من کثر حلفه کثر اثمه ومن کثرت خصومته لم یسلم دینه "

حضرت ابوالدرداء فرماتے ہیں جو شخص زیادہ باتیں کرتا ہے وہ زیادہ جھوٹا ہوتا ہے۔ اور جو شخص زیادہ قسمیں اٹھائے وہ زیادہ گنہگار ہوتا ہے اور جو شخص زیادہ جھگڑا کرے اس کا دین سلامتی میں نہیں رہتا۔ (درمنثور)

تنبیه : "وفی هذه الآیة دلیل وتنبیه علی الاحتیاط فیمایتعلق باموررالدین و الدنیا "

اس آیۃ کریمہ میں اس پر دلیل ہے اور اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ دین اور دنیا کے معاملات میں احتیاط سے کام لیا جائے۔

گواہوں کے احوال کو دیکھا جائے کہ یہ سچے ہیں یا جھوٹے، خفیہ طور پر گواہوں کے محلہ میں آدمی بھیج کر ان کے متعلق پتہ چلائے کہ وہ کیسے ہیں، ان کے سامنے علانیہ طور پر ان کے متعلق پتہ چلائے۔ بغیر چھانٹ بینٹ کے صرف ان کے ظاہری احوال کو دیکھ کر کوئی فیصلہ نہ کرے۔

ابتداء اسلام میں تو صرف کسی کا کلمہ طیبہ پڑھ لینا اس کے مؤمن ہونے کے لئے کافی تھا، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ " امرت ان اقاتل حتی یقولوا لا الہ الا اللہ "

مجھے حکم دیا گیا کہ میں کفار سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ کہیں "لا الہ الا اللہ"

لیکن بعد میں جب فساد عام ہو گیا، مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لئے کفار نے کلمہ پڑھنا شروع کر دیا، اور بظاہر مسلمانوں سے محبت کرتے لیکن حقیقت میں وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچاتے۔ ان حالات میں ابن عربی رحمہ اللہ کا قول یہ ہے۔ " قلت والصحیح ان الظاهر یعمل علیه حتی یتبین خلافه "

کہ صحیح یہ ہے کہ ظاہر پر عمل کیا جائے لیکن اگر اس کے خلاف ظاہر ہو تو ضرور تحقیق کرے صرف ظاہر پر عمل نہ کرے۔

☆ اسی کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول بخاری شریف میں مذکور ہے۔

" ایها الناس ان الوحی قد انقطع وانما نأخذکم الآن بما ظهر لنا من اعمالکم، فمن اظهر لنا خیرا امناه وقربناه، ولیس لنا من سریرته شیٔ الله یحاسبه فی سریرته ومن اظهر لنا سوٗا لم نؤمنه ولم نصدقه وان قال ان سریرته حسنة "

آپ نے فرمایا، اے لوگو! بیشک وحی کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے، اب ہم تمہارے ظاہری اعمال کو دیکھیں گے، جس شخص نے ظاہری طور پر بہتر عمل کئے، ہم اسے امن دیں گے اور ہم اسے اپنے قریب کریں گے، ہمیں کسی کے باطن کے متعلق کچھ علم نہیں، اس کے باطنی عقائد و اعمال کا حساب رب تعالیٰ کے ہاں ہو گا، ہاں اگر ہمیں کسی شخص کی برائیوں کے متعلق پتہ چل گیا تو ہم اسے امن نہیں دیں گے اور نہ ہی اس کی تصدیق کریں گے، یہاں تک کہ آپ نے فرمایا کہ اگرچہ کسی شخص کا باطن نیک ہو لیکن ظاہر اس کے خلاف ہو تو وہ شخص امن کا مستحق نہیں ہو گا۔ (از قرطبی)

نتیجہ:

"دعوی المحبة والخلوص بدون المواطأة من فعل الملاحدة والزنادقة والمحب لا یفعل الاما یحب محبوبه"

محبت وخلوص کا صرف زبانی دعویٰ پایا جائے اور دل میں محبت اور خلوص نہ پائے جائیں تو یہ فعل ملحد اور زندیق (بے دین) لوگوں کا کام ہے۔ محب صرف وہی کام کرتا ہے جو اس کے محبوب کو پسند ہو۔

کسی شاعر نے کہا ہے۔

تعصی الاله وانت تظهر حبه   هذا لعمری فی الفعال بدیع

تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے اور اس کی محبت کو ظاہر کرتا ہے۔ مجھے میری عمر کی قسم یہ تو عجیب کام ہے (یعنی یہ تو بہت غلط کام ہے)۔

لو کان حبک صادقا لأطعته   ان المحب لمن احب مطیع

اگر تیری محبت سچی ہوتی تو میں اس کی اطاعت کرتا۔ بیشک محب اپنے محبوب کا مطیع ہوتا ہے۔

حافظ شیرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

بصدق کوش کہ خورشید زاید از نفست
کہ از دروغ سیاہ روے گشت صبح نخست

سچائی میں کوشش کر کہ سچائی کی وجہ سے تیرے نفس کا سورج روشن ہوگا۔ کہ جھوٹ سے تیری صبح صادق بھی سیاہ ہو جائے گی۔ (روح البیان)

☆☆☆☆☆

وَاِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَیُهْلِکَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لَایُحِبُّ الْفَسَادَ☆ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۰۵)

۱

اور جب پیٹھ پھیرے تو زمین میں فساد ڈالتا پھرے اور کھیتی اور جانیں تباہ کرے اور اللہ فساد سے راضی نہیں۔

۲

اور جب پیٹھ پھیرتا ہے تو چلتا ہے زمین میں تا کہ فساد پھیلائے اس میں اور تباہ کرے کھیتی اور جانوں کو اور اللہ نہیں پسند فرماتا فساد کو۔

شانِ نزول:

(۱) یہ آیۃ کریمہ بھی اخنس بن شریق کے متعلق نازل ہوئی، کیونکہ اس کے اور بنی ثقیف کے درمیان جھگڑا تھا، اس نے ایک رات ان کی کھیتی کو آگ لگادی اور ان کے مویشیوں کو ہلاک کردیا۔

(۲) شانِ نزول کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اخنس بن شریق نے طائف کے ایک شخص سے قرض لینا تھا، جب اس کے پاس قرض لینے کے لئے گیا تو اس کی کاٹی ہوئی کھیتی کے ڈھیر کو آگ لگادی اور اس کے گدھوں کی کونچیں کاٹ دیں۔ (خازن)

"واذا تولی": "ای ادبر واعرض عنک بعد الانۃ القول وحلاوۃ المنطق"

جب وہ آپ سے پیٹھ پھیرتا ہے، یعنی آپ سے نرم گفتگو کرنے کے بعد اور میٹھی باتیں کرنے کے بعد جب وہ اعراض کرتا ہے۔ (خازن)

"سعی فی الارض": ای سار و مشی فی الارض، تو زمین میں چلتا ہے۔ (خازن)

"والسعی هنا بمعنی القصد" یہاں سعی کا معنی ہے ارادہ کرنا۔ (صاوی)

یعنی جب وہ پیٹھ پھیرتا ہے تو فساد پھیلانے کا ارادہ کرتا ہے۔

"(سعی) ای اسرع فی المشی اوعمل" یعنی سعی کا معنی ہے چلنے میں جلدی کرنا، یا عمل میں جلدی کرنا۔

یعنی جب وہ پیٹھ پھیرتا ہے تو جلدی جلدی چلتا ہے اور مکمل کوشش کرتا ہے زمین میں فساد پھیلانے کی۔

(روح المعانی)

"لیفسدفیها": تاکہ اس میں فساد پھیلائے۔

"فساد" مختلف معانی میں استعمال ہے۔ مسلمانوں کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا کر کے ان کو اسلام سے دور کرنا۔

اور فساد کا معنی یہ بھی ہے کہ لوگوں کے درمیان اپنے کلام سے اختلاف پیدا کرنا، یعنی ادھر اور ادھر کی باتیں کر کے لوگوں کو لڑانا۔

اور فساد کا معنی قطع رحمی، اور فساد کا معنی خون بہانا۔ اس آیۃ کریمہ میں یہی معنی مراد لینا زیادہ بہتر ہے تاکہ آنے والے الفاظ مبارکہ " ویھلک الحرث والنسل " اس کا بیان بن سکیں۔ (ماخوذ از کبیر)

ایک اور تفسیر:

"وقیل معناه (واذاتولی) ای صار والیاوملک الأمر سعی فی الارض لیفسد فیها یعنی بالظلم والعدوان کما یفعله ولاة السوء والظلمة" (خازن)

اور تفسیر یہ بیان کی گئی ہے کہ (واذاتولی) کا معنی ہے جب وہ والی (حاکم) بن جاتا ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ جب وہ اپنے امور کا والی بن جاتا ہے اور خودمختار ہوتا ہے تو زمین میں ظلم وستم اور لوگوں پر زیادتی کرنے سے فساد پھیلاتا ہے، جیسے برے اور ظالم حکام زمین میں فساد برپا کر کے تباہی اور بربادی پھیلا دیتے ہیں۔

تیسری تفسیر:

" وقیل یظھر ظلمه حتی یمنع الله بشؤم ظلمة القطر (ای المطر) فیھلک الحرث والنسل" (خازن)

جب وہ والی بن جاتا ہے تو زمین میں فساد پھیلاتا ہے تو اس کے ظلم کی نحوست کی وجہ سے بارشیں نہیں ہوتیں، جس کی وجہ سے کھیتیاں اور جانیں برباد ہو جاتی ہیں۔

"واللہ لا یحب الفساد": اور اللہ فساد کو پسند نہیں فرماتا۔

" ای لا یر تضیه فاحذروا غضبه علیه "

اللہ تعالیٰ فساد پر راضی نہیں بلکہ وہ فساد پر غضب فرماتا ہے، اس لئے فساد نہ پھیلا کر اس کے غضب سے بچ کر رہو۔

اعتراض:

یہ کس طرح کہنا صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں فرماتا، حالانکہ اللہ تعالیٰ خود چیزوں کو تباہ و برباد کرتا ہے، کھیتوں کو وہ تباہ کرتا ہے، جانوں کو وہ ہلاک کرتا ہے۔

جواب:

" ان الافساد فی الحقیقة اخراج الشیٔ عن حالة محمودة لالغرض صحیح وذلک غیر موجود فی فعل الله تعالٰی ولاھو آمر به ولا محب له وما نراه من فعله ونظنه بظاھره فسادافھو بالاضافة الینا واعتبارنا له کذلک واما بالنظر الالھی فکله صلاح وحکمة ولھذا قال بعض الحکماء یامن افساده اصلاح یعنی ان ما نظنه افسادا فانما ھو لقصور نظرنا ومعرفتنا وھو فی الحقیقة اصلاح محض "

فساد پھیلانے کا حقیقی معنی یہ ہے کہ ایک چیز کو اچھی حالت (قابل تعریف حالت) سے نکال دینا جبکہ اس میں کوئی صحیح غرض نہ پائی جائے' ایسا فساد پھیلانا اللہ تعالی کے افعال میں نہیں' اور نہ ہی وہ اس کا حکم دیتا ہے' اور نہ ہی وہ اسے پسند کرتا ہے' ہم جو اللہ تعالی کے افعال میں لوگوں اور جانوروں اور دوسری اشیاء کی ہلاکت دیکھتے ہیں اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ فساد ہے وہ درحقیقت ہماری وجہ سے بربادی آتی ہے' اس کا حقیقت میں سبب ہم ہوتے ہیں' (جس کو اللہ تعالی نے خود ہی بیان فرمادیا)

ظهر الفساد فی البر و البحر بما کسبت ایدی الناس لیذیقهم بعض الذی عملوا لعلهم یرجعون (سورة الروم آیت، ۴۱)

ظاہر ہوا فساد خشکی اور تری میں بوجہ اس کے جو کسب کیا لوگوں کے ہاتھوں نے (یعنی لوگوں کے عمل کی وجہ سے) تاکہ چکھائے مزہ ان کو ان کے بعض کرتوتوں کا' تاکہ وہ باز آجائیں۔

وہی کام جب اللہ تعالی کی طرف منسوب ہوتا ہے تو تمام کا تمام کام ہی اصلاح پر مبنی ہوتا ہے اور اس میں حکمت پائی جاتی ہے اسی وجہ سے کسی حکیم (صاحب علم دانا) نے کہا اے اللہ! تو وہ ذات ہے کہ تیرا فساد پھیلانا بھی اصلاح ہے۔ اگر غور فکر کیا جائے تو بات واضح طور پر یہ علم حاصل ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالی کے ہر کام میں اصلاح ہی اصلاح ہے' صرف ہم اپنے علم کی کمی کی وجہ سے اور کوتاہ نظر کی وجہ سے رب تعالی کے افعال کو فساد سمجھتے ہیں۔ (از بیضاوی وشیخ زادہ)

☆ "واخرج ابن جریر و ابن ابی حاتم عن مجاهد انه سئل عن قوله(و اذ تولی سعی فی الارض) قال یلی فی الارض فیعمل فیها بالعدوان و الظلم فیحبس الله بذلک القطر من السماء فهلک بحبس القطر الحرث و النسل' (و الله لا یحب الفساد) ثم قرأ مجاهد ظهر الفساد فی البر و البحر بما کسبت ایدی الناس الخ (درمنثور)

مجاهد رحمہ اللہ سے " واذ تولی سعی فی الارض " آیۃ کریمہ کے متعلق سوال کیا گیا کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ شخص والی (حاکم) بن جاتا

ہے تو وہ لوگوں پر ظلم ستم شروع کر دیتا ہے' جس کی وجہ سے اللہ تعالی بارشوں کو روک دیتا ہے'
آسمانوں سے کوئی قطرہ بارش کا نہیں آتا' بارشوں کے رک جانے کی وجہ سے کھیتیاں اور نسلیں برباد
ہو جاتی ہیں۔ پھر مجاہد رحمہ اللہ نے " واللہ لا یحب الفساد " کا مطلب بیان کرتے ہوئے بطور
دلیل سورۃ الروم کی وہ آیۃ پڑھی جس کا ذکر قریب ہی ہو چکا ہے۔

" ظهر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس "

ظاہر ہوا فساد خشکی اور تری میں بوجہ لوگوں کے اعمال کے۔

معتزلہ کی غلط فہمی اور اس کا ازالہ:

"واللہ لایحب الفساد" سے معتزلہ نے یہ سمجھا کہ محبت اور ارادہ ایک چیز ہے'اس لئے انہوں نے کہا کہ
جب یہ کہا جائے کہ" اللہ پسند نہیں کرتا فساد کو' تو اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ اللہ تعالی فساد کا ارادہ نہیں کرتا۔

لیکن یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ ان کی اس غلط فہمی کا ازالہ یہ ہے۔

" ان الارادة غیر المحبة فان الانسان قد یرید شیأ و لا یحبه وذلک لانه قدیتنا ول
الدواء المرو لایحبه"

کہ بیشک ارادہ اور چیز ہے اور محبت اور چیز ہے، ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے، کیونکہ انسان
کبھی کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے لیکن اس سے محبت نہیں کرتا، جیسا کہ کڑوی دواء انسان اپنے ارادہ
سے پی لیتا ہے، لیکن اس کے پینے میں اسے محبت نہیں ہوتی۔

" وقیل ان المحبة مدح الشی وتعظیمه والارادةبخلاف ذلک "

محبت اور ارادہ میں ایک اور فرق یہ بیان کیا گیا ہے کہ محبت میں ایک چیز کی تعریف کی جاتی ہے اور
اس کی تعظیم کی جاتی ہے لیکن ارادہ میں کسی چیز کی مدح اور تعظیم کا پایا جانا ضروری نہیں۔ (خازن)

تنبیہ:

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے " النسل " کا معنی " جانیں " کیا ہے اور راقم نے بھی وہی نقل کیا ہے، کیونکہ ہر ذی روح چیز کو "النسل" کہا گیا ہے۔

" والنسل ماخرج من کل انثی من ولد "

کسی مونث سے جو بچہ پیدا ہو، خواہ وہ بچہ مذکر ہو یا مونث اسے نسل کہا جاتا ہے۔

اصل معنی اس کا نکلنا اور گرنا ہے کہا جاتا ہے " نسل الشعر " بال گر گئے " نسل ریش الطائر " پرندے کے پر گر گئے، اسی طرح بال نکل آئے، اور پر نکل آئے، بھی ان الفاظ کا معنی ہے۔

فائدہ:

اس آیۃ کریمہ سے ثابت ہو رہا ہے کہ زمین کاشت کرنا، کھیتی باڑی کرنا اور درخت لگانا اور حیوانوں کی پرورش کرنا جن سے نسل کی افزائش (نسل بڑھے) ہو افضل ہے۔

" وبذلک یتم قوام الانسان وهویرد علی من ترک الاسباب "

اسی سے انسان کے قوام (مادہ اور جسم) کی تکمیل ہوتی ہے۔ لہٰذا ان حضرات کا اس آیۃ کریمہ میں رد موجود ہے جو یہ کہتے ہیں کہ صرف توکل سے کام لیا جائے، اسباب کی طرف نہ دیکھا جائے، ان کا یہ کہنا غلط ہے کیونکہ اسباب کا ذکر خود رب تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ (قرطبی)

☆ " عن جابران النبی ﷺ دخل علی ام مبشر الانصاریة فی نخل لها فقال لهارسول الله ﷺ من غرس هذا النخل مسلم ام کا فر فقالت بل مسلم فقال لا یغرس مسلم غرسا ولایزرع زرعا فیا کل منه انسان ولادابة ولاشیٔ الاکانت له صدقة "

(مسلم ج ۲ باب فضل الغرس والزرع)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بے شک نبی کریم ﷺ ام مبشر انصاریہ کے باغ میں داخل ہوئے تو ان سے

پوچھا یہ کھجور کے درخت کس نے لگائے ہیں مسلمان نے یا کافر نے؟ انہوں نے یہ عرض کیا یہ مسلمان نے لگائے ہیں، تو آپ نے فرمایا کہ کوئی مسلمان درخت نہیں لگاتا اور نہ ہی کھیتی باڑی کرتا ہے کہ اس سے انسان کھائیں اور جانور کھائیں اور کوئی چیز بھی (پرندے درندے وغیرہ) کھائے مگر یہ کہ اسے صدقہ کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔

اس حدیث پاک سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ کھیتی باڑی کرنا اور درخت لگانا افضل ہے، جو دانے یا پھل انسان کھائیں گے یا جانور کھائیں گے یا پرندے اور درندے کھائیں گے، تو اس شخص کو صدقہ کا ثواب ملے گا، جس نے فصل کاشت کیا یا درخت لگائے۔

گذشتہ سے پیوستہ:

فساد کا معنی خراب کرنا بھی آتا ہے۔ سعید بن میسب فرماتے ہیں۔

" قطع الدراهم من الفساد فى الارض " درہم کو توڑنا (یعنی خراب کرنا) بھی زمین میں فساد پھیلانا ہے۔

عطاء بن منبہ نے احرام کی حالت میں جبہ پہنا ہوا تھا تو نبی کریم ﷺ نے ان کو جبہ اتارنے کا حکم دیا، تو انہوں نے جبہ اتار دیا۔

" قال قتادة قلت لعطاء انا كنا نسمع ان يشقها فقال عطاء ان الله لا يحب الفساد "

قتادہ کہتے ہیں میں نے عطاء کو کہا ہم تو سنتے تھے کہ جبہ کو پھاڑ کر جسم سے ہٹا دیا جائے، تو عطاء نے کہا بیشک اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ یعنی جبہ کو پھاڑنا جبہ کو خراب کرنا ہے اور کسی چیز کو خراب کرنا فساد ہے، جسے رب تعالیٰ پسند نہیں فرماتا۔ (قرطبی)

☆☆☆☆

وَاِذَاقِيۡلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتۡهُ الۡعِزَّةُ بِالۡاِثۡمِ فَحَسۡبُهٗ جَهَنَّمُ وَلَبِئۡسَ الۡمِهَادُ☆ (سورۃالبقرۃ آیت،۲۰۶)

☆۱☆

اور جب اِس سے کہا جائے کہ اللہ سے ڈرو تو اسے اور ضد چڑھے گناہ کی ایسے کو دوزخ کافی ہے اور وہ ضرور بہت برا بچھونا ہے۔

☆۲☆

اور جب کہا جاتا ہے اسے ڈر اللہ سے، پکڑ لیتی ہے اسے عزت بسبب گناہ کے، تو کافی ہے اسے جہنم اور البتہ وہ برا ٹھکانا ہے۔

مختصر مطلب:

یہ اسی شخص کی ایک اور بری صفت کا ذکر کیا جارہا ہے کہ جب اسے کہا جاتا ہے تو اللہ سے ڈر، اپنے قول وفعل کو رب تعالیٰ کے حکم کے مطابق رکھ، تو وہ اپنے باطل گمان کے مطابق اور اپنے گناہوں کی وجہ سے اپنی توہین سمجھتا ہے، اور ضد میں آکر اور ہی گناہ کرتا ہے کہ میں بڑا عزت والا شخص تھا تو یہ مجھے فسادی کہہ رہے ہیں۔

رب تعالیٰ نے اس شخص کی سزا کا حکم ذکر فرمایا کہ اسے جہنم کافی ہے، اور جہنم اس کا برا بچھونا اور برا ٹھکانا ہے۔

"واذقيل له اتق الله": اور جب کہا جاتا اسے ڈر اللہ سے۔

ماقبل سے تعلق:

هوا عوج المقال سئ الفعال فبين قوله وفعله، كلامه كذب واعتقاده فاسد و افعاله قبيحة، فاذاوعظ هذاالفاجر في مقاله وفعاله وقيل له اتق الله وانزع عن قولك وفعلك وارجع الى الحق امتنع وابى "

یعنی وہ شخص اخنس بن شریق ٹیڑھی باتیں کرنے والا تھا یعنی بظاہر میٹھی باتیں کرتا تھا لیکن حقیقت میں وہ جھوٹا تھا، اور اس کے افعال (کام) برے تھے، کیونکہ وہ لوگوں کی کھیتیوں کو برباد کرتا تھا اور انسانوں اور مویشیوں کو ہلاک کرتا تھا، تو رب تعالیٰ نے پہلے اس کے جھوٹے کلام کا ذکر فرمایا، پھر اس کے برے افعال کا ذکر فرمایا کہ اس کا کلام جھوٹا ہے اور اس کا اعتقاد فاسد ہے کہ وہ بظاہر اللہ کو گواہ بناتا ہے حالانکہ وہ حقیقت میں ایمان دار ہی نہیں بلکہ کافر و منافق ہے اور اس کے افعال بھی برے ہیں۔ اس آیۃ کریمہ میں اس فاسق و فاجر (منافق) کو نصیحت کی گئی کہ تو اپنے اقوال اور افعال کو درست کر اور حق کی طرف آ، یعنی حق راہ پر چل، تو اس نے انکار کر دیا، اپنے اقوال و افعال کو اس نے درست نہ کیا۔ (از صابونی)

"اخذته العزة با لأثم" : پکڑ لیا اس کو عزت نے بوجہ گناہ کے۔

عظمتِ قرآن پر قربان:

بظاہر یہ مختصر جملہ ہے، یعنی تھوڑے الفاظ ہیں لیکن اس کے بہت بڑے مطالب ہیں۔

" العزة ، القوة و الغلبة " عزت کا معنی قوت اور غلبہ ہے۔ " عزہ یعزہ " لفظ استعمال ہوتا ہے جس کا معنی ہوتا ہے وہ شخص اس پر غالب آ گیا۔

" وقيل العزة هنا الحمية" اور بیان کیا گیا ہے کہ عزت کا معنی یہاں حمیت ہے۔

عزتِ نفس کی وجہ سے، اور خاندان کی عزت کی وجہ سے جوش میں آنا حمیت کہلاتا ہے۔

" وقيل العزة هنا المنعة وشدة النفس "

اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہاں عزت کا معنی منع کرنا، طاقت رکھنا اور نفس میں شدت کا آنا۔

(۱) اس جملہ کے مختلف معانی میں سے ایک معنی یہ ہے۔

" اعتزفی نفسه و انتحی فاوقعته تلک العزة فی الاثم حین اخذ ته و الزمته ایا ہ "

اپنے آپ کو وہ عزت والا سمجھتا ہے اور ارادہ رکھتا ہے کہ میں عزت والا رہوں تو اس کا عزت والا ہونے کا باطل گمان اسے گناہوں میں مبتلا کر دیتا ہے، کیونکہ اس کا عزت کو لازم پکڑنا ہی تکبر ہے جو گناہ کبیرہ ہے۔

(۲) ان معانی میں دوسرا معنی جو حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے وہ یہ ہے۔

" اذاقیل له مهلا ازداد اقداما علی المعصیة "

کہ جب اسے کہا جاتا ہے رک جا، یعنی اللہ سے ڈر، گناہوں سے باز آجا، تو وہ اور ہی زیادہ گناہ کرتا ہے۔

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے "اور جب اسے کہا جائے اللہ سے ڈرو تو اسے اور ضد چڑھے گناہ کی"

(۳) ان معانی میں تیسرا معنی یہ ہے۔

" اخذ ته العزة بما یؤثمه ای ارتکب الکفر للعزة وحمیة الجا هلیة "

اسے عزت پکڑتی ہے بوجہ اس چیز کے جو اسے گناہ میں ڈالتی ہے، یعنی وہ کفر کا ارتکاب کرتا ہے بوجہ اپنی عزت کے اور جاہلانہ حمیت کے۔

(۴) ان معانی میں سے چوتھا معنی یہ ہے۔

"الباء فی "بالاثم" بمعنی اللام ای اخذته العزة والحمیة عن قبول الوعظ للا ثم الذی فی قلبه وهو النفاق"

" بالاثم " میں باء بمعنی لام کے استعمال ہے، یعنی اس کو عزت اور حمیت نے پکڑا ہے بوجہ اس گناہ کے جو اس کے دل میں واقع ہے، یعنی نفاق جو اس کے دل میں واقع ہے، اسی وجہ سے وہ نصیحت قبول نہیں کرتا۔

راقم کے ترجمہ پر ذرا پھر سے نظر کریں تو بفضلہ تعالیٰ یہی ترجمہ آپ کو نظر آئے گا۔

(۵) ان معانی میں سے پانچواں معنی یہ ہے۔

" الباء بمعنی مع ای اخذته العزة مع الاثم "

یعنی "بالاثم" میں باء بمعنی "مع" کے ہے، اب معنی یہ ہوگا اس کو عزت نے پکڑا ہے بمع گناہ کے۔

(قرطبی)

"فحسبه جهنم": تو کافی ہے اس کو جہنم۔

" حسبه ای کا فیه معاقبة و جزا ء " یعنی اس کی جزاء اور عذاب کے لئے جہنم اس کے لئے کافی ہے۔

عرب حضرات اسی کے مطابق یہ جملہ استعمال کرتے ہیں۔

"کفاک ماحل بک و انت تستعظم و تعظم علیه ماحل "

جو ذلت تجھے حاصل ہوئی تیرے لئے یہی کافی ہے، تو بڑا بنتا تھا یہ ذلت ہی تیری بڑائی ہے۔ (قرطبی)

"ولبئس المهاد": اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

، ینی طلباء توجہ فرمائیں:

" لبئس " میں لام موطیء للقسم ہے، جواب قسم مقدر ہے اور مخصوص بالذم بھی محذوف ہے۔ (روح المعانی)

اب معنوی طور پہ عبارت یہ بن گئی۔

" واللہ لبئس الفراش جهنم " قسم ہے اللہ تعالیٰ کی برا ہے بچھونا جہنم۔ (روح البیان)

"مهاد " کا معنی فرش بچھانا، اور جائے قرار یعنی ٹھکانا، اور سونے کے لئے بچھونا۔

راقم نے طلباء کو دوسرا معنی ذہن نشین کرانے کے لئے ترجمہ کیا ہے "ٹھکانا"

اور اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا ہے "بچھونا"

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اس عبارت کے مطابق ہے۔

" وقال بعض العلماء المهاد الفراش للنوم فلما کا ن المعذب فی النار یلقی علی نارجهنم جعل ذلک مهاداله وفراشا"

بعض علماء نے کہا ہے کہ " مهاد " کا معنی سونے کا بچھونا ہے اس لئے کہ جب آگ کا عذاب دیا جائے گا تو اسے جہنم کی آگ میں ڈالا جائے گا جو اس کے لئے بچھونا ہوگا، جو برا بچھونا ہوگا۔

(از کبیر)

" جهنم " کے متعلق بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ لفظ عجمی ہے جو بعد میں عربی میں بھی استعمال ہونے لگا، یہ نام ہے اس آگ کا جس سے آخرت میں عذاب دیا جائے گا۔

کچھ اور حضرات نے کہا ہے کہ یہ لفظ شروع سے ہی عربی ہے، آخرت میں عذاب دینے والی آگ کا یہ نام اس لئے رکھ لیا گیا ہے کہ اس آگ کو بہت گہرائی میں رکھا گیا ہے۔ اسی وجہ سے عرب حضرات گہرے کنویں کو " رکیة جهنام " کہتے ہیں۔

(از کبیر)

☆ " قال ابن مسعود رضی الله عنه من اکبر الذنب عندالله ان یقال للعبد اتق الله فیقول علیک نفسک "

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بہت بڑا گناہ ہے اللہ تعالیٰ کے ہاں جب کسی بندے کو کہا جائے " اتق الله " (تو اللہ سے ڈر) تو وہ کہے تو اپنے نفس کو لازم پکڑ (تو اپنا خیال کر مجھے چھوڑ)

(روح البیان)

☆ "وقیل لعمر بن الخطاب رضی الله عنه اتق الله فوضع خده علی الارض تواضعالله تعالی"

ایک دن حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو کسی نے کہا " اتق الله " (اللہ سے ڈر) تو آپ نے یہ الفاظ مبارکہ سنتے ہی اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی سے اپنے رخسار زمین پر رکھ دیئے۔ (روح البیان)

ہارون الرشید کا خوف خدا:

ایک یہودی کو ہارون الرشید سے کوئی کام تھا، اس کا کوئی مطالبہ تھا، لیکن ایک سال میں اس نے کئی چکر لگا دیئے، ہارون الرشید تک اس کی پہنچ نہ ہوسکی اور نہ ہی اس کی حاجت کو پورا کیا گیا، ایک دن وہ یہودی ہارون الرشید کے دروازے پر کھڑا ہوگیا، جو وہ دروازے سے باہر نکلا تو یہ دوڑ کر آگے آگیا اور کہنے لگا۔

" اتق الله يا امير المو منين "

اے امیر المومنین اللہ سے ڈرو۔

ہارون اپنی سواری سے اترا اور سجدہ میں گر گیا۔ جب اس نے سر اٹھایا تو اس کی حاجت کو پورا کرنے کا حکم دیا، تو کچھ درباریوں نے کہا، اے امیر المومنین! ایک یہودی کی بات پر تم سواری سے اتر آئے؟ اس نے کہا اصل وجہ یہ نہیں، چونکہ اس نے جب مجھے کہا "اتق الله "تو مجھے اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی یاد آگیا" و اذاقيل له اتق الله" الخ (قرطبی)

☆☆☆☆☆

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَؤُفٌ بِالْعِبَادِ ☆ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۰۷)

﴿۱﴾

اور کوئی آدمی اپنی جان بیچتا ہے اللہ کی مرضی چاہنے میں اور اللہ بندوں پر مہربان ہے۔

﴿۲﴾

اور جو شخص سودا کرتا ہے اپنی جان کا طلب کرتے ہوئے رضاء اللہ کی، اور اللہ مہربان ہے بندوں پر۔

شانِ نزول میں چند وجوہ:

شانِ نزول میں اگرچہ مفسرین کرام نے چند وجوہ بیان کی ہیں، تاہم راقم کے نزدیک وہ تمام وجوہ پہلے درپیش آئیں اور آیۂ کریمہ کا نزول بعد میں ہوا، جو سب کو شامل ہے۔

(۱) حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ نے جب مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کی طرف نبی کریم ﷺ کی ملاقات کی غرض سے ہجرت کی، تو قریش نے ان کا پیچھا کیا، اسی طرح عمار بن یاسر اور ان کی والدہ سمیہ اور ان کے باپ یاسر اور حضرت بلال اور خباب بن ارت اور حضرت ابوذر اور عابس رضی اللہ عنہم کو کفار نے اپنے گھیرے میں لے لیا اور ان کو عذاب دیا، حضرت ابوذر اور خباب بن ارت تو بھاگ کر نکل گئے اور مدینہ طیبہ میں پہنچ گئے، اور حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو مشرکین نے دو اونٹوں کے درمیان باندھ کر اونٹوں کو ہانک دیا، اس طرح وہ شہید ہو گئیں اور حضرت یاسر کو بھی شہید کر دیا اور دوسرے حضرات نے مشرکین کے مطالبہ پر کچھ مال دے کر اپنے آپ کو چھڑا لیا۔ اور حضرت صہیب رومی......

فنزل عن راحلته ونثر ما في كنانته واخذ قوسه ثم قال يامعشر قريش، لقد علمتم انى من ارماكم رجلا وايم الله لا تصلون الى حتى ارمى بما في كنانتي ثم اضرب بسيفي مابقي في يدى منه شئ ثم افعلوا ما شئتم"

اپنی سواری سے اتر آئے اور اپنے ترکش سے تیر پھیلا دئے اور کمان کو ہاتھ میں پکڑا، پھر قریش کو کہا تمہیں معلوم ہے کہ میں تم تمام سے زیادہ تیراندازی میں ماہر ہوں۔ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی تم مجھ تک نہیں پہنچ سکتے جب تک میرے ترکش میں تیر ہیں، اس وقت تک تو میں تیر پھینکوں گا، پھر تلوار ہاتھ میں لوں گا، جب تک میرے ہاتھ میں تلوار ہوگی، اس وقت تک تلوار سے خوب قتال کروں گا۔ پھر تم جو چاہو کر لینا۔

پھر تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ میں ایک بوڑھا شخص ہوں، میں تم میں رہوں یا تمہارے دشمن کے پاس رہوں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

"فقالوا دلنا علی بیتک ومالک بمکۃ ونخلی عنک"

تو انہوں نے کہا تم ہمیں مکہ میں اپنے گھر اور مال کی راہنمائی کردو تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔

آپ نے کہا ٹھیک ہے تم میرے ساتھ معاہدہ کرو کہ تم مجھے نبی کریم ﷺ کے پاس جانے دو گے، رکاوٹ نہیں بنو گے، تو میں اپنے مال پر تمہیں مطلع کر دیتا ہوں، تم میرا مال لے لو، انہوں نے آپ سے معاہدہ کرلیا، آپ نے ان کو مال کا پتہ بتا دیا۔

اس طرح یہ بھی جان خلاصی کرا کے مدینہ طیبہ پہنچ گئے، جب آپ مدینہ طیبہ پہنچے تو سب سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی، انہوں نے ان کو سودے کی مبارک دی، انہوں نے پوچھا تمہیں کیسے علم حاصل ہوا؟ تو انہوں نے بتایا کہ قرآن پاک کی آیۃ نازل ہوچکی ہے (وہ یہی آیت تھی) پھر ان کی ملاقات نبی کریم ﷺ سے ہوئی تو آپ نے فرمایا" ایا یحیی ربح البیع ربح البیع" اے ابو یحییٰ (یہ صہیب کی کنیت ہے) بڑا نفع مند سودا ہوا، بڑا نفع مند سودا ہوا۔ (از کبیر و روح المعانی)

(۲) شان نزول کی اور وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ آیہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی کہ ہجرت کی رات اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر آپ نبی کریم ﷺ کی چار پائی اور بستر پر سو گئے تا کہ لوگوں کی امانتیں واپس کر کے آپ میں آجائیں، جب آپ نبی کریم ﷺ کی چار پائی اور بستر پر سوئے ہوئے تھے۔

" قام جبرئیل علیه السلام عند رأسه و میکائیل عند رجلیه و جبریل بنا دی بخ بخ من مثلک یا ابن ابی طالب یبا ھی اللہ بک الملا ئکة و نزلت الآیة "

تو جبریل آپ کے سر کے پاس کھڑے ہوگئے اور میکائیل پاؤں کے پاس کھڑے ہو گئے، جبریل آپ کو پکار کر کہہ رہے تھے، اے ابن ابی طالب! تمہارے لئے خوشی کا مقام ہے' اللہ تعالیٰ تمہاری وجہ سے فرشتوں پر فخر کر رہا ہے۔ تو اس واقعہ کے بعد آیۃ کریمہ کا نزول ہوا۔ (از کبیر)

(۳) اس آیۃ کریمہ کی وجہ حضرت عمر' حضرت علی' اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم نے یہ بیان فرمائی کہ یہ آیت ہر اس شخص کے متعلق نازل ہوئی جس کو " امر بالمعروف و نہی عن المنکر " (اچھے کام کا حکم دینا اور برے کام سے روکنے) کی وجہ سے تکالیف دی گئیں۔ (قرطبی)

(۴) تفسیر کواشی میں ہے کہ یہ آیۃ حضرت زبیر بن عوام اور آپ کے دوست مقداد بن اسود کے متعلق نازل ہوئی، اس لئے کے جب حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو اہلِ مکہ نے سولی پر چڑھا دیا تو حضور ﷺ نے فرمایا۔

" من ینزل خبیبا عن خشبة فله الجنة " جو شخص خبیب کو سولی سے اتارے گا اس کے لئے جنت ہے۔

تو حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یا رسول اللہ میں اور میرے دوست مقداد ان کو اتاریں گے، انہوں نے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر ان کو سولی سے اتارا تو ان کے حق میں یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

(روح المعانی)

حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ:

"عن ابی هریرة قال بعث النبی ﷺ سریة عینا و اَمّر علیهم عاصم بن ثابت و هو جد عاصم بن عمر الخطاب فانطلقوا حتی اذا کانوا بین عسفان و مکة ذکروا الحی من هذیل یقال لهم بنو لحیان فتبعوهم بقریب من مائة رام فاقتفوا آثارهم حتی اتوا منزلا نزلوه فوجدوا فیه لجؤا الی فد فدو جاء القوم فاحاطوا بهم فقالوا لکم العهد و المیثاق ان نزلتم الینا ان لا نقتل منکم رجلا فقال عاصم اما انا فلا انزل فی ذمة کافر اللهم اخبر عنا رسولک فقاتلوهم

فرموهم حتی قتلواعاصما فی سبعة نفر بالنبل وبقی خبیب وزید ورجل آخر فاعطوهم العهد و المیثاق فلمانزلوا الیهم فلما استمکنوامنهم حلوااوتارقسیهم فربطوهم بها فقال الرجل الثالث الذی معهم هذا أول الغدر فابی ان یصحبهم فجروه وعالجوه علی ان یصحبهم فلم یفعل فقتلوه وانطلقوا بخبیب وزید حتی باعوهمابمکة فاشترلی خبیبا بنو الحارث بن عامربن نوفل وکان خبیب هو الذی قتل الحارث یوم بدرفمکث عندهم اسیرا حتی اذا اجتمعوا علی قتله استعار موسی من بعض بنات الحارث یستحد بها فاعارته قالت فغفلت عن صبی لی فدرج الیه حتی اتاه فوضعه علی فخذه فلمارأیته فزعت فزعة عرف ذلک منی وفی یده الموسی فقال اتخشین منی ان اقتله ما کنت لأفعل ذلک ان شاء الله تعالی وکانت تقول مارأیت اسیرا قط خیرا من خبیب لقد رأیته یأکل من قطف عنب وما بمکة یومئذ ثمرة وانه لموثق فی الحدید وما کان رزقا الا رزقه الله خبیبا فلما خرجوابه من الحرم لیتقلوه قال دعونی اصلی رکعتین فصلی رکعتین ثم انصرف فقال لو لا ترون ان مابی جزع من المو ت لزدت فکان اول من سن رکعتین عندالقتل وقال اللهم احصهم عددا ، وقال

فلست ابالی حین اقتل مسلما ۔۔۔ علی ای جنب کان فی الله مصرعی

وذلک فی ذات الاله وان یشأ ۔۔۔ یبارک علی اوصال شا و ممزع

ثم قام الیه عقبة بن الحارث فقتله وبعث قریش الی عاصم لیؤتوا بشئ من جسده بعد موته وکان قتل عظیمامن عظمائهم یو م بدرفبعث الله علیه مثل الظلة من الدبر فحمته من رسلهم فلم یقدروامنه علی شئ" (بخاری)

زادفی روایة واخبر یعنی النبی ﷺ اصحابه یو م اصیبوا خبرهم "

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے سریہ (رجیع) کے موقع پر (کفار کے مطالبہ پر کہ ہم نے اسلام قبول کرلیا ہے ہماری رہنمائی کے لئے کچھ اصحاب کو بھیجیں) دس صحابہ کرام کو بھیجا، جن پر

امیر عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا، یہ عاصم بن ثابت عاصم بن عمر بن خطاب کے نانا تھے۔
یہ حضرات چلے جب عسفان اور مکہ کے درمیان پہنچے تو بنی ہذیل کو ان کے متعلق پتہ چلا، بنو ہذیل کو بنی لحیان بھی کہا جاتا ہے اس قبیلہ کے ایک سو تیر انداز (اور ایک سو غیر مسلح) لوگوں نے ان کا پیچھا کیا، ان کے اور ان کی سواریوں کے قدموں کے نشانات کو دیکھتے ہوئے وہ لوگ وہاں پہنچ گئے جہاں یہ ٹھہرے ہوئے تھے، ان لوگوں نے کھجور کی ایک گٹھلی کو اٹھایا تو کہنے لگے کہ یہ گٹھلی تو یثرب (مدینہ طیبہ) کی کھجور کی ہے، یہ مدینہ سے ہی آئے ہیں، آخر کار وہ ان کے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔
جب عاصم اور ان کے ساتھیوں نے ان کفار کو دیکھا تو ایک ٹیلے کی پناہ لی (تو ایک ٹیلے پر چڑھ گئے) کفار نے ان کا احاطہ کرلیا، اور کہا کہ ہم تمہارے ساتھ پختہ عہد کرتے ہیں کہ اگر تم ہماری طرف اتر کر آجاؤ تو ہم تمہیں قتل نہیں کریں گے، حضرت عاصم نے کہا میں تو کسی کافر کا ذمی بن کر (کافر کی پناہ میں آکر) نہیں اترتا، (رب تعالیٰ کے حضور دعاء کی) اے اللہ ہماری طرف سے اپنے رسول کو خبر پہنچادے۔
انہوں نے کفار سے لڑائی کی، تیر مارے یہاں تک کہ حضرت عاصم اور ان دوسرے چھ ساتھی یعنی کل سات کی تعداد میں صحابہ کرام شہید ہوگئے۔ اور حضرت خبیب اور زید اور ایک صحابی باقی رہ گئے۔ ان سے کفار نے پھر وعدہ کی پیش کش کی کہ تم اتر آؤ، ہم تمہیں قتل نہیں کریں گے، انہوں نے ان کے وعدہ کا اعتبار کرلیا، یہاں تک کہ ٹیلے سے اتر آئے، کفار جب ان کو پکڑنے پر قادر ہوگئے تو انہوں نے اپنی کمانوں کے چمڑے کے دھاگے کھول کر ان کو باندھ لیا۔ تیسرے صحابی کہنے لگے یہ ان کا پہلا غدر (دھوکہ) ہے، میں تو ان کے ساتھ نہیں جاؤں گا، انہوں نے گھسیٹا، اور پھر دھوکہ دے کر اپنے ساتھ چلانے کی کوشش کی لیکن انہوں نے انکار کردیا، کفار نے ان کو بھی شہید کردیا۔
خبیب اور زید رضی اللہ عنہما کو ساتھ لے کر چلے اور ان کو مکہ میں جا کر بیچ دیا، حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو حارث بن نوفل کے بیٹوں نے خرید لیا، کیونکہ خبیب نے حارث کو بدر میں قتل کردیا تھا۔ ان کا

خبیب کو قتل کرنے پر اتفاق ہو گیا۔ تو خبیب نے حارث کی ایک بیٹی سے استرہ عاریۃ طلب کیا تاکہ آپ زیر ناف بال صاف کر لیں۔ تو اس نے ان کو استرہ عاریۃ دے دیا۔

وہ حارث کی بیٹی کہتی ہے اس دوران میری غفلت سے میرا چھوٹا بچہ خبیب کے پاس چلا گیا' خبیب نے اسے اپنی ران پر بٹھا لیا' میں خبیب کے ہاتھ میں استرہ دیکھ کر بہت زیادہ گھبراہٹ میں مبتلا ہو گئی۔ خبیب نے میری پریشانی کو دیکھ کر کہا، کیا تم ڈر رہی ہو کے میں بچے کو قتل کر دوں گا' میں انشاء اللہ ایسا کبھی نہیں کروں گا' حارث کی بیٹی کہتی تھی میں نے خبیب جیسا بہتر کوئی نہیں دیکھا (سبحان اللہ کیا شان ہے صحابہ کرام کی، کہ وہ قتل کرنے کی تیاری کر رہے ہیں لیکن خبیب کہتے ہیں میرے نبی کریم ﷺ نے میدان جنگ میں بھی بچوں کو قتل کرنے سے منع کیا ہے تو میں کیوں قتل کروں)

حارث کی بیٹی کہتی ہے کے میں نے خبیب کو انگور کا خوشہ کھاتے ہوئے دیکھا، حالانکہ اس وقت مکہ میں انگور کا پھل موجود نہیں تھا' خبیب کو لوہے کی بیڑیاں لگی ہوئی تھی' کھانے پینے کی کوئی چیز ان کو نہیں دی جا رہی تھی لیکن اللہ تعالی ان کو رزق عطاء کر رہا تھا۔

جب حارث کے بیٹے آپ کو شہید کرنے کی غرض سے حرم سے باہر لے جا رہے تھے تو آپ نے کہا مجھے دو رکعت نماز پڑھ لینے کی اجازت دو انہوں نے اجازت دی، تو آپ نے دو رکعت مختصر طور پر ادا کیں' اور ساتھ یہ کہا کہ اگر مجھے یہ خیال نہ آتا کہ تم کہو گے میں موت سے گھبرا رہا ہوں تو میں نماز کو لمبا کرتا۔

شہادت کے وقت دو رکعت نماز ادا کرنے کو سب سے پہلے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے ہی رواج دیا۔

پھر آپ نے کہا اے اللہ! ان سب کو شمار کر لے (یعنی ان کو تباہ و برباد کر دے' آپ کی دعا کا ہی اثر تھا کہ حارث کے تمام بیٹے جو آپ کو شہید کرنے میں شریک تھے تھوڑے ہی عرصہ میں ذلت کی موت مرے)

پھر آپ نے یہ شعر پڑھے۔

''ترجمہ'' مجھے کوئی پرواہ نہیں میں حالت اسلام میں شہید ہو رہا ہوں۔ جس جانب بھی میں گراوہ

اللہ کی رضا کے لئے ہوگا۔ جب میری شہادت اللہ کی رضاء کے لئے ہے تو ان شاء اللہ وہ میرے جسم کے ٹکڑوں اور جوڑوں پر برکت نازل فرمائے گا۔

پھر عقبہ بن حارث نے آپ کو شہید کر دیا۔

قریش نے چند آدمیوں کو بھیجا کے وہ عاصم کے جسم کا ٹکڑا کاٹ کر لائیں (تاکہ وہ اس سے اپنے دل کی پیاس بجھائیں) کیونکہ عاصم نے بھی ان کے ایک بڑے سرکردہ شخص کو بدر میں قتل کیا تھا۔ لیکن جب وہ لوگ حضرت عاصم کی لاش کے پاس آئے تو اللہ تعالی نے شہد کی مکھیوں اور بھڑ کو ان کی لاش کی حفاظت کے لئے بھیج دیا' جنہوں نے ان کے جسم پر سایہ کر دیا، کفار ان کے جسم کا حصہ کاٹنے میں ناکام رہے۔

ایک اور روایت میں ہے کے نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ میں ان صحابہ کرام سے درپیش آنے والے واقعہ کی خبر دے رہے تھے کہ اب فلاں کو شہید کیا جارہا ہے اب فلاں کو۔

تنبیہ : بخاری شریف کی اس روایت کے بغیر اور روایات میں واقعہ کی تفصیل کچھ مزید بھی ہے۔

بنو حارث جب حضرت خبیب رضی اللہ تعالی عنہ کو حرم سے باہر تنعیم میں لے گئے تو انہوں نے کہا کہ خبیب کو زندہ ہی سولی پر لٹکا دیا جائے تو جب آپ کو سولی پر لٹکا دیا گیا' تو آپ نے رب تعالی کے حضور عرض کیا۔

" اللهم انک تعلم انه ليس لي احد حولي يبلغ سلامي رسولک فابلغه سلامي "

اے اللہ تو جانتا ہے کہ بیشک کوئی شخص میرے ارد گرد ایسا نہیں جو میرا اسلام تیرے رسول ﷺ کو پہنچائے اس لئے تو ہی میرا اسلام پہنچادے۔

تو ابو میسرہ سلامان نے آپ کے سینہ پر نیزہ رکھا تو آپ نے فرمایا "اتق اللہ" اللہ سے ڈر۔

لیکن اس نے کچھ پرواہ نہ کرتے ہوئے آپ کے سینہ میں نیزہ گاڑ دیا۔ ادھر عقبہ بن حارث نے شہید کر دیا۔

نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام کو حضرت خبیب کی شہادت اور سولی پر چڑھائے جانے کی خبر دی، اور یہ فرمایا کہ جو شخص خبیب کو سولی سے اتارے گا، اس کے لئے جنت ہے۔

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ (نبی کریم ﷺ کی پھوپھی کے بیٹے) نے عرض کیا میں اور میرے دوست مقداد بن اسود اتاریں گے۔ یہ چلے گئے، رات کو چلتے تھے اور دن کو چھپ جاتے تھے، ایک رات مکہ مکرمہ کے مقام تنعیم میں پہنچ گئے، سولی کے اردگرد چالیس مشرکین پہریدار موجود تھے، لیکن وہ سب سوئے ہوئے تھے، حضرت زبیر نے خبیب کو سولی سے اتارلیا۔

" فاذاهورطب ينثني ولم يتغير منه شئي بعد اربعين يوما ويده على جراحته وهي تبض دما اللون لو ن الدم والريح ريح المسك "

چالیس دن گزر چکے تھے، لیکن حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کا جسم تر و تازہ تھا، خون رس رہا تھا، حضرت زبیر کا ہاتھ آپ کے زخم پر پڑا تو آپ کا ہاتھ خون آلود ہو گیا۔ اور آپ کے جسم سے کستوری کی خوشبو آرہی تھی۔

حضرت زبیر نے اپنے ساتھ گھوڑے پر حضرت خبیب کے جسم کو سوار کرلیا، ادھر کفار جاگے تو خبیب کو نہ پایا، قریش کو مطلع کیا تو ستر شخص اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر چلے یہاں تک کہ حضرت زبیر کے قریب پہنچ گئے۔

تو حضرت زبیر نے گھوڑے سے اتار کر حضرت خبیب کے جسم کو زمین پر رکھ دیا۔

" فابتلعه الارض فسمي بليع الارض "

تو آپ کو زمین نے نگل لیا، اسی وجہ سے آپ کو " بليع الارض " کہا جاتا ہے۔

پھر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے قریش کو کہا اے قریش کی جماعت! تمہیں ہم پر کیسے جرأت حاصل ہوئی، پھر آپ نے اپنے سر سے پگڑی کو اتارا کہ یہ لوگ مجھے دیکھ لیں، آپ نے فرمایا میں زبیر بن عوام ہوں اور میری ماں صفیہ بنت عبدالمطلب ہیں، اور میرے یہ دوست میرے ساتھ مقداد بن اسود ہیں۔

"(هما)اسدان ضاريان يد فعان عن اشبا لهما فان شئتم نا ضلتكم و ان شئتم نا زلتكم و ان شئتم انصر فتم فانصرفوا الی مکۃ"

پھر آپ نے انہیں کہا زبیر اور مقداد دونوں ہی حملہ آور شکار کرنے والے شیر ہیں، وہ اپنے مقابل بچوں کو بھگا دیتے ہیں، اگر تم چاہتے ہو تو میں تمہیں تیروں سے چھلنی کر دیتا ہوں اور اگر تم چاہتے ہو تو میں مقابلہ کے لئے سواری سے نیچے اتر آتا ہوں تا کہ دو دو ہاتھ کر لئے جائیں۔ اگر اپنے آپ کو بچانا چاہتے ہو تو واپس چلے جاؤ، وہ واپس مکہ چلے گئے۔

جب حضرت زبیر اور حضرت مقداد رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچے تو جبرئیل آئے اور کہنے لگے

"یا محمد ان الملا ئکۃ لتباھی بھذین من اصحابک"

یارسول اللہ بے شک فرشتے آپ کے ان دونوں صحابیوں کی بہادری اور جرأت پر تعجب کر رہے ہیں۔

اس واقعہ کے بعد یہ آیۃ نازل ہوئی۔ (از خازن)

حضرت زید رضی اللہ عنہ کی شہادت:

حضرت زید بن دثنہ رضی اللہ عنہ کو صفوان بن امیہ نے خرید لیا تا کہ آپ کو اپنے باپ کے بدلے میں شہید کر سکے، کیونکہ اس کا باپ امیہ بن خلف بھی قتل کر دیا گیا تھا۔

صفوان نے اپنے غلام نسطاس کے ساتھ زید بن دثنہ کو تنعیم کی طرف بھیجا تا کہ انہیں شہید کر دیا جائے۔ جب آپ کو تنعیم میں لیا جایا گیا وہاں قریش کے کچھ لوگ جمع ہو گئے، جن میں ابوسفیان بن حرب بھی تھا۔ جب زید کو قتل کی جگہ کھڑا کر دیا گیا، تو ابوسفیان نے کہا، اے زید! میں تم سے اللہ کی قسم دلا کر پوچھتا ہوں۔

"اتحب محمدا عندنا الآن مکانک یضرب عنقه و انک فی اھلک"

کیا تم اس وقت میں یہ پسند کرتے ہو کہ تمہاری جگہ ہمارے پاس محمد ہوتے ان کی گردن اڑا دی جاتی اور تم اپنے اہل و عیال میں ہوتے۔

"فقال زید واللہ ماا حب ان محمد الآن فی مکا نہ الذی ہو فیہ تصیبہ شوکۃ تؤذیہ وانا جالس فی اہلی"

حضرت زید بن دشنہ نے کہا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی مجھے تو اتنا بھی پسند نہیں کہ میری جگہ محمد ہوتے اور ان کو کوئی کانٹا چبھ جاتا اور ان کو تکلیف دیتا اور میں اپنے اہل وعیال میں بیٹھ کر بچ جاتا۔

"فقال ابو سفیان مارأیت احد ایحب احد کحب اصحاب محمد محمد ا"

ابوسفیان نے کہا میں نے کسی ایک کو کسی سے ایسی محبت کرتے ہوئے نہیں دیکھا جیسی محبت محمد کے اصحاب محمد سے کرتے ہیں۔

اس مکالمہ کے بعد حضرت زید بن دشنہ رضی اللہ عنہ کو نسطاس نے شہید کر دیا۔

" ومن الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ "

اور جو شخص سودا کرتا ہے اپنی جان کا طلب کرتے ہوئے رضاء اللہ کی۔

شراء کا معنی بیچنا بھی ہے اور خریدنا بھی۔ عام مفسرین کرام اور مترجمین نے "بیچنا" ہی مراد لیا ہے۔

جیسا کہ اللہ کا ارشاد گرامی ہے "وشروہ بثمن بخس "اور انہوں نے بیچا کھوٹے سکوں سے۔

اس مقام میں بھی " شروہ " بیچنے کے معنی میں استعمال ہے۔

"وتحقیقہ ان المکلف باع نفسہ بثواب الآخرۃ وھذا البیع ھو انہ بذلھا فی طاعۃ اللہ من الصلوۃ والصیام والحج والجھاد ثم توصل بذلک الی وجد ان ثواب اللہ، کان مایبذلہ من نفسہ کالسلعۃ وصار الباذل کالبائع واللہ کالمشتری"

تحقیق یہ ہے کہ مکلّف اپنے نفس کو آخرت کے ثواب کے بدلے بیچتا ہے، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرتے ہوئے نماز ادا کرنے میں اور روزہ رکھنے میں اور حج ادا کرنے میں اور جہاد کرنے میں اپنے آپ کو مصروف رکھتا ہے اور اس کے بدلے ثواب حاصل کرتا ہے جس طرح بیچنے والا اپنا سامان دیتا ہے اسی طرح یہ اپنی جان خرچ کر رہا ہے یہ شخص بیچنے والا ہوا اور اللہ تعالیٰ

اسے ثواب عطا کر کے اس کی جان کو خرید نے والا ہوا۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا۔

"ان اللہ اشتری من المو منین انفسھم و امو الھم بان لھم الجنۃ" (التوبۃ، ۱۱۱)

بیشک اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کے مال اور جان خرید لئے ہیں اس بدلے پر کہ ان کے لئے جنت ہے۔ یعنی اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو مشتری کہا ہے اور مومنین کو بائع۔

شراء کا معنیٰ خریدنا:

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔" وعندی انہ یمکن اجراء لفظۃ الشراء علی ظاھرھا"

میرے نزدیک " ومن الناس من یشری "میں شراء کا ظاہری معنیٰ (خریدنا) لینا بھی ممکن ہے۔

کیونکہ انسان جب کفر اختیار کرتا ہے اور فسق میں اور دنیاوی مشاغل اور منافع میں زندگی گزارتا ہے اور آخرت سے اعراض کرتا ہے تو دائمی عذاب کا مستحق ہوتا ہے۔

اور کفر سے باز رہ کر اور نیکیوں میں مشغول ہو کر اور آخرت کے لئے کام کر کے اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچا لیتا ہے۔"وصار کانہ اشتری نفسہ من العذاب والنار"

تو گویا کہ یہ شخص عذاب اور آگ کے بدلے اپنے نفس کو خریدنے والا ہو گیا۔ (تفسیر کبیر)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے جمہور مفسرین کرام کی تحقیق کے مطابق "یشری" کا معنیٰ "بیچنا" کیا ہے۔

لیکن راقم نے علامہ رازی رحمہ اللہ کی تفسیر کو دیکھ کر طلباء کے فائدے کے لئے ترجمہ کیا ہے۔"جو شخص سودا کرتا ہے" تا کہ یہ دونوں معنیٰ کو شامل ہو جائے، کیونکہ جو شخص بیچتا ہے وہ بھی سودا کرتا ہے اور جو شخص خریدتا ہے وہ بھی سودا کرتا ہے۔

"ابتغاء مرضات اللہ،ای طلبا لرضاہ" اللہ تعالیٰ کی رضامندی طلب کرتے ہوئے۔(روح المعانی)

"واللہ روف بالعباد" اور اللہ مہربان ہے بندوں پر۔

'' ای المؤمنین حیث ارشدھم لما فیہ رضاہ ''

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہے، اس کی مہربانی ہے کہ وہ اپنے بندوں کو وہ راہ دکھاتا ہے جس راہ پر چلنے میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی پائی جاتی ہے۔

''وجعل النعیم الدائم جزاء العمل المنقطع''

اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ وہ ختم ہوجانے والے اعمال کی جزاء دائمی نعمتیں عطاء کرتا ہے۔

''واثاب علی شراء ملکہ بملکہ''

یہ بھی اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کے وہ بندوں کی جان خریدتا ہے اور جنت عطاء کرتا ہے جبکہ بندوں کی جان بھی اس کی ملکیت میں ہے اور جنت کا بھی وہی مالک ہے۔ (روح المعانی)

سبحان اللہ! رب تعالیٰ اپنے بندوں پر کتنا مہربان ہے کہ اپنی ملکیت چیز خرید کر اس کے بدلے میں بہت بڑا ثمن عطا کر رہا ہے۔ دنیا میں ایسا کوئی خریدار نہیں کہ اپنی چیز لے کر بدلے میں بھاری رقم ادا کرے۔

'' ومن رأفتہ جوزلھم کلمۃ الکفر ابقاء علی النفس''

یہ بھی اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کے کفار سے کفریہ کلمات سن کر بھی ان کو زندہ رکھتا ہے۔

''ومن رأفتہ انہ لا یکلف نفسا الا وسعھا''

یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کے وہ کسی نفس کو طاقت سے زائد تکلیف نہیں دیتا۔

''ومن رأفتہ ورحمتہ ان المصرعلی الکفر مائۃ سنۃ اذا تاب ولو فی لحظۃ اسقط کل ذلک العقاب واعطاہ الثواب الدائم ''

اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور رحمت ہے کہ سو سال تک بھی کفر پر قائم رہنے والے اور کفر پر اصرار کرنے کے باوجود اگر وہ شخص سچے دل سے توبہ کرے اور ایک لحظہ (آنکھ جھپکنے کی مقدار) میں اس کا عذاب ختم کردے اور اسے دائمی ثواب عطا کردے۔ (کبیر)

آیۃ کریمہ میں عموم:

اگر چہ شانِ نزول کے لئے تو چند واقعات خاص ہیں، لیکن آیۃ کریمہ اپنے الفاظ کی عمومیت کی وجہ سے حکم عام ہی رکھتی ہے۔ اسی وجہ سے علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

" اذا عرفت هذا فنقول يد خل تحت هذ ا كل مشقة يتحملها الانسان فی طلب الدين فيد خل فيه المجاهد ، ويد خل فيه البا ذل مهجته الصابر على القتل كما فعله ابو عمار وامه ويد خل فيه الآبق من الكفار الى المسلمين ويد خل فيه المشترى نفسه من االكفار بماله كما فعل صهيب ويد خل فيه من يظهر الدين و الحق عند السلطان الجابر" (كبير)

جب تمہیں آیۃ کریمہ کی تفسیر کا پتہ چل گیا تو ہم کہتے ہیں کہ اس آیۃ کریمہ میں ہر وہ شخص داخل ہے جو دین کی طلب میں کسی قسم کی مشقت اٹھائے، اس لئے جہاد کرنے والے مومنین بھی اس آیۃ میں داخل ہیں، کفار کے ظلم وستم کو برداشت کرتے ہوئے صبر اور خوشی سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان دینے والے بھی اس آیۃ میں داخل ہیں۔ جیسا کہ ابوعمار اوران کی والدہ نے رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی رضامندی کے لئے جان دے دی۔

اور کفار سے بھاگ کر مسلمانوں کی طرف آنے والے یعنی اللہ کی رضا کی خاطر ہجرت کرنے والے بھی اس آیۃ میں داخل ہیں اور اپنا مال دے کر اپنی جان کو بچا کر مسلمانوں سے جا کر مل جانے والے بھی اس آیۃ کریمہ میں داخل ہیں۔ جیسا کہ حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ نے اپنا مال کفار کے حوالے کر کے اپنی جان بچا کر نبی کریم ﷺ سے مل گئے۔ اور ظالم بادشاہ کے سامنے دین کی بات کرنے والے اور کلمہ حق کہنے والے بھی اس آیت میں داخل ہیں۔

☆ "عن ابی سعيد قال قال رسول الله ﷺ من اعظم الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر اخرجه الترمذی وقال حديث حسن غريب ،،

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ ظالم بادشاہ کے سامنے کلمہ حق کہا جائے۔ (خازن)

"وروی ان عمر رضی اللہ عنہ بعث جیشافحاصروا قصرا فتقدم منهم واحد فقاتل حتی قتل فقال بعض القوم القی بیده الی التهلکه فقال عمر کذبتم رحم اللہ ابا فلان وقرأ "ومن الناس من یشری نفسه ابتعاء مرضات اللہ"

روایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک لشکر بھیجا لشکر نے کفار کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا لشکر میں سے ایک شخص آگے بڑھا، کفار پر حملہ کر دیا، ان سے لڑائی کرتے ہوئے شہید ہو گیا، تو کچھ حضرات کہنے لگے اس نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا ہے، یعنی اکیلا حملہ کرنے میں مقتول ہو جانا واضح تھا۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم جھوٹ کہہ رہے ہو اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے، اس نے تو اپنی جان کا سودا رب تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے رب سے کیا ہے، پھر آپ نے بطور دلیل اسی آیت کریمہ کو پیش کیا۔

"ومن الناس من یشری نفسه ابتغاء مرضات اللہ" (کبیر)

فائدہ جلیلہ:

"واعلم ان المومنین باعوا باختیارهم انفسهم فکان ثمن نفس المومنین الجنة اما الاولیاء فانهم باعوا باختیار هم انفسهم فکان ثمن الاولیاء مرضاة اللہ تعالی، وبینهما فروق کثیرة"

بیشک مومنین جب اپنے اختیار سے اپنی جان کا سودا کرتے ہیں تو اس کی قیمت انہیں جنت حاصل ہوتی ہے اور اولیاء کرام جب اپنی جان کا سودا کرتے ہیں تو ان کو اس کی قیمت اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔ ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔

راہ سلوک کی منازل طے کرنے والے کو چاہئے کہ وہ اپنے بشری وطن سے نکل جائے اور اپنے ساتھیوں کے

شہروں سے نکل کر مسافر ہو جائے۔

"حتی یکون مجاھدا حقیقیا وشہیدا معنویا"

تا کہ حقیقی مجاہد بن جائے اور شہادت معنوی حاصل ہو جائے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا "طوبی للغرباء" مسافرین کے لئے کامیابی اور جنت ہے۔

اور آپ نے ارشاد فرمایا " من مات غریبا فقدمات شہیدا " جو مسافری کی حالت میں فوت ہو جائے وہ شہید ہے۔

اس مسافری سے کیا مراد ہے؟ " الانقطاع من الخلق الی الخالق " اس سے مراد یہ ہے کہ مخلوق سے توجہ ہٹا کر خالص اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جائے۔ یہ مقام اسی وقت حاصل ہو گا جب عام لوگوں کی عادات کو چھوڑ دے اور عام لوگوں کی طرح اس میں خواہشات نہ پائی جائیں۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔

" یا انس ان استطعت ان تکون ابدا علی وضوء فافعل فان ملک الموت اذا قبض روح العبد وھو علی وضوء کتب لہ شہادۃ "

اے انس! اگر تم طاقت رکھو، ہمیشہ وضوء پر رہنے کی تو وضوء پر رہو، کیونکہ ملک الموت (موت کا فرشتہ) جب بندے کی روح قبض کرتا ہے، اس وقت اگر بندہ وضوء میں ہو تو اس کے لئے شہادت کا مرتبہ لکھ دیا جاتا ہے۔

اس حدیث میں بھی نبی کریم ﷺ کا اشارہ اس طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ماسوا سے انفصال ہو، اور رب تعالیٰ سے اتصال ہو۔

"کما ان الصلوۃ اشارۃ الی الاتصال باللہ تعالیٰ"

جس طرح نماز میں انسان باقی تمام چیزوں سے توجہ ہٹا کر اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم کئے ہوتا ہے۔

اور ارشاد مصطفوی ہے۔ " دم علی الطھارۃ یوسع علیک الرزق "

تم ہمیشہ طہارت پر رہو تمہارے رزق میں وسعت پائی جائے گی۔

ظاہری طہارت ظاہری رزق کی وسعت کا سبب ہے اور باطنی طہارت باطنی رزق کی وسعت کا سبب ہے۔

باطنی طہارت یہی ہے کہ دل اور اشیاء (چیزوں) سے ہٹا کر اللہ تعالیٰ کی طرف لگادے، اور معنوی رزق یہ ہے کہ معرفت حاصل ہو، الہام ہو جائے، خواب میں بشارت حاصل ہو جائے، کشف حاصل ہو، وغیرہا۔

"وعند ذلک یحی القلب بالحیوۃ الطیبۃ وتموت النفس عن صفا تھا ولیس ذلک الا اثر الجھاد الحقیقی فمن تخلص من قید النفس ومات بالاختیار فھو حی ابدا"

جس شخص کو یہ مقام حاصل ہو گیا، یعنی اسے معنوی طہارت حاصل ہو گئی، اس کے دل کو حیاتِ طیبہ حاصل ہو گئی اور اس کا نفس صفاتِ ذمیمہ (بری خواہشات وغیرہ) سے بچ گیا، گویا کہ نفس کو موت حاصل ہو گئی اور دل کو حیات مل گئی، یہی جہادِ حقیقی یعنی جہادِ اکبر کے اثرات ہیں، جو شخص نفس کی قید سے چھوٹا اور اپنے اختیار سے نفس کو موت دی وہی حقیقی زندگی پا گیا۔

مولانا رومی رحمہ اللہ مثنوی میں تحریر فرماتے ہیں۔

ای بسا نفس شہید معتمد

مردہ در دنیا وزندہ می رود

کتنے ہی نفوس کے شہید ہونے پر کامل اعتماد ہو سکتا ہے۔ وہ دنیا میں مردہ سمجھے جاتے ہیں اور حقیقت میں زندہ ہو کر جا رہے ہوتے ہیں۔ (از روح البیان)

☆☆☆☆☆

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ☆ (سورۃالبقرۃ آیت نمبر ۲۰۸)

۱

اے ایمان والو! اسلام میں پورے داخل ہو، اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

۲

اے ایمان والو! داخل ہو اسلام میں کامل طور پر، اور نہ تابعداری کرو شیطان کے قدموں کی، بے شک وہ تمہارا دشمن ہے کھلا۔

شانِ نزول:

اس آیۃ کریمہ میں بھی شان نزول کی چند وجوہ ہیں، جو تمام ہی مجموعی طور پر معتبر ہیں۔

(۱) یہ آیۃ کریمہ منافقوں کے متعلق نازل ہوئی، کیونکہ اس سے پہلے " ومن الناس من یعجبک" آیۃ بھی منافق کے متعلق نازل ہوئی۔ اس آیۃ کریمہ میں منافقوں کو نفاق چھوڑنے اور دل سے ایمان لانے کے متعلق کہا گیا۔ اب آیۃ کریمہ کا مفہوم یہ ہو گیا۔

"یایھا الذین امنوا بالسنتکم ادخلوا بکلیتکم فی الاسلام ولا تتبعوا خطوات الشیطن ای آثار تزیینه وغروره فی الاقامة علی النفاق"

اے زبان سے ایمان لانے والو! دل سے بھی ایمان لاؤ، اور مکمل طور پر اسلام میں داخل ہو، شیطان جو تمہارے لئے کفر یہ راہ مزین کرتا ہے اور منافقت پر قائم رہنے کے لئے تمہیں دھوکا دیتا ہے، اس راہ پر نہ چلو، کیونکہ شیطان کے قدموں کے نشانوں پر چلنا بہت برا ہے۔ لہذا شیطان کی پیروی نہ کرو، کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

(۲) یہ آیۃ کریمہ اہلِ کتاب کے لئے نازل ہوئی، جنہوں نے نبی کریم ﷺ پر ایمان نہیں لایا۔
اب آیۃ کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ اے اہلِ کتاب جوتم نے پہلی کتابوں پر ایمان لایا ہے، اسلام میں بھی مکمل طور پر داخل ہو جاؤ، کیونکہ تمہارا اپنی کتابوں پر بھی ایمان اسی وقت مکمل ہوگا جب ان کتابوں کے اس حکم پر ایمان لاؤ گے کہ تمام انبیاء کرام اور تمام آسمانی کتب پر ایمان لاؤ۔
لہٰذا محمد ﷺ پر ایمان لاؤ اور قران پاک پر ایمان لاؤ، تا کہ اسلام میں تم مکمل طور پر داخل ہوسکو۔

" ولا تتبعوا خطوات الشیطن فی تحسینه عند الاقتصار علی دین التوراة"

شیطان جو تمہیں توراۃ پر ہی فقط ایمان لانے کی راہ حسین وجمیل کر کے دکھاتا ہے تم اس کی تابعداری نہ کرو۔

(۳) آیۃ کریمہ کے شانِ نزول کی اور وجہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالی عنہ اور ان کے ساتھی جو یہودیت سے اسلام میں داخل ہوئے وہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے کے بعد بھی موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے چند احکام پر عمل کرتے تھے، یعنی ہفتہ کے دن کی تعظیم کرتے تھے، اونٹ کا گوشت نہیں کھاتے تھے، اور اونٹ کا دودھ نہیں پیتے تھے، اور کہتے یہ تھے ان چیزوں کو چھوڑنا اسلام میں مباح ہے اور توراۃ میں واجب ہے، ہم احتیاطی طور پر ان کو چھوڑتے ہیں۔ اللہ تعالی نے ان کو کہا کہ اسلام میں کامل طور پر داخل ہو جاؤ، جب پہلی شریعتیں اسلام کے آنے کے بعد منسوخ ہوگئیں تو اسلام قبول کرنے کے بعد جاننے کے باوجود ان پر چلنا شیطانی راہ ہے۔ لہٰذا شیطانی راہ پر نہ چلو، یعنی شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو، وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے۔

(۴) اس آیۃ کریمہ کے نزول کا تعلق تمام مسلمانوں سے ہے، کیونکہ اس میں خطاب عام مسلمانوں کو ہے، اس لحاظ پر مفہوم یہ ہوگا۔

" یایها الذین امنو" بالالسنة" "ادخلوا فی السلم کافة" ای دوموا علی الاسلام فیما تستأنفوه من العمر ولا تخرجوا عنه ولا عن شیٔ من شرائعه"

اے زبان سے ایمان لانے والو! اسلام میں کامل طور پر داخل ہو جاؤ، یعنی جس طرح ابتداء میں تم

نے اسلام قبول کیا ہے، اسلام پر پیدا ہوئے ہو، اسی طرح اسلام پر قائم دائم رہو، اسلام سے نہ نکلو اور شریعت کے کسی قانون سے باہر نہ جاؤ۔

"ولا تتبعوا خطوات الشیطان" ای ولا تلتفتوا الی الشبهات التی تلقیها الیکم اصحاب الضلالة والغوایة"

اور گمراہ اور بھٹکے ہوئے لوگ جو شبہات ڈالتے ہیں ان کی طرف توجہ نہ کرو، کیونکہ یہ شیطانی راہ ہے، اس لئے شیطان کی تابعداری نہ کرو اور اس کے نقشِ قدم پر نہ چلو۔ (از کبیر)

اس آخری شانِ نزول کو دیکھیں اور یہود و نصاریٰ کے آلہ کار نام نہاد مسلمانوں کو دیکھیں جو چند روز حکمرانی کے نشہ میں خدا اور اس کے رسول ﷺ سے برگشتہ ہو کر دینی مدارس کے پیچھے پڑے ہوئے، دینی نصاب کو کم کرنے کی فکر میں ہیں کہ جدید علوم پڑھیں اور دینی علوم کم پڑھیں تا کہ ہماری ہاں میں ہاں ملاتے چلے جائیں۔ مجھے امید ہے کہ ان شاء اللہ ان کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوگا، رب تعالیٰ علوم دینیہ کی خود حفاظت خود فرمائے گا۔

" یاایها الذین امنوا ادخلوا فی السلم کافة " اے ایمان والو! داخل ہو اسلام میں کامل طور پر۔

اللہ تعالیٰ نے جب مومنین اور کفار اور منافقین کا ذکر فرمایا تو گویا کہ اس آیۃ میں تمام کو حکم دے دیا کہ جو اسلام نہیں لائے ہو وہ کامل طور پر سلام لے آؤ، اور جو صرف زبان سے اسلام کے دعویدار ہو دل سے ایمان لے آؤ اور جو زبان اور دل سے ایمان لا چکے ہو وہ اسلام پر قائم و دائم رہو۔

راقم نے یہ مفہوم قرطبی کی اس عبارت سے اخذ کیا ہے۔

"لما بین الله سبحانه الناس الی مؤمن و کافر ومنافق فقال کونوا علی ملة واحدة واجتمعوا علی الاسلام واثبتوا علیه" ۔

قبلہ استاذی المکرّم حضرت علامہ محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی کے ارشاد کے مطابق اور علامہ قرطبی رحمہ اللہ کی تحقیق کو دیکھتے ہوئے راقم اسی کا قائل ہے کہ شانِ نزول کی تمام وجوہ مجتمع ہیں۔

"السلم" بفتح السین و کسرها، قراء تان سبعیتان هنا وفی الانفال والقتال لکن

الاکثر ھنا الکسر و ما ھناک العکس و قولہ الاسلام اشارۃ لمعناہ ھنا عن القراء تین و اما فی الانفال و القتال فمعناہ الصلح "

لفظ " السلم " کے سین میں فتحہ اور کسرہ دونوں حرکتیں پڑھی گئی ہیں۔ دونوں قرأتیں قراء سبعہ (سات قاریوں) سے مروی ہیں، اسی طرح سورۃ انفال اور سورۃ قتال میں بھی دونوں حرکتیں پڑھی گئی ہیں۔ البتہ یہاں کسرہ زیادہ مشہور ہے اور وہاں فتحہ زیادہ مشہور ہے۔

دو قرأتوں کے مطابق اس لفظ کا معنی اسلام بھی ہے اور صلح بھی، یہاں جمہور حضرات نے اسلام معنی لیا ہے اور دوسرے دونوں مقاموں میں معنی صلح لیا ہے۔ (از جلالین و صاوی)

☆ "و اخرج ابن جریر و ابن ابی حاتم عن عباس قال السلم الاسلام و الزلل ترک الاسلام"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں " السلم " کا معنی اسلام ہے اور " الزلل " کا معنی ترک اسلام ہے۔ (در منشور)

شاعر کندی نے بھی " السلم " کو اسلام کے معنی استعمال کیا ہے۔ کندہ قبیلہ کے لوگ نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد اشعث بن قیس کندی کے ساتھ " العیاذ باللہ " مرتد ہو گئے تھے۔ تو کندہ قبیلہ کے ایک شاعر نے کہا۔

دعوت عشرتی للسم لما ... رائیتھم تو لو امدبر ینا

میں نے اپنے قبیلہ کو اسلام کی دعوت دی جبکہ میں نے ان کو پیٹھ پھیرتے ہوئے (مرتد ہوتے ہوئے) دیکھا۔

فائدہ: "یا ایھا الذین امنوا ادخلوا فی السلم" کے دو معنی ہیں۔ ایک عام اور ایک خاص۔

<u>عام معنی</u> یہ ہے کہ اس آیۃ میں خطاب عام مؤمنین کو ہے۔

"ادخلوا فی شرائط الاسلام فی الباطن کما فی الظاھر".

اسلام کی شرائط میں جس طرح ظاہرا داخل ہوئے ہو اسی طرح باطنا بھی داخل ہو جاؤ۔

"و من شرائطہ ما قال النبی ﷺ " المسلم من سلم المسلمون من لسانہ و یدہ و المؤمن من امنہ الناس "

اسلام کی شرائط میں نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد یاد رکھا جائے کہ کامل مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان سلامتی میں رہیں اور مومن وہ ہے جس سے لوگ امن میں رہیں۔

خاص معنی یہ ہے کہ یہ خطاب انسان کی ذات اور اس کے ظاہری اور باطنی اعضاء سے ہے۔

" فینبغی ان ید خل ار کانه فی الاسلام با لفعل "

کہ انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے تمام اعضاء کو حقیقی طور پر اسلام میں داخل کرے۔

آنکھ کو حق راہ کے دیکھنے میں لگائے اور کانوں کو حق بات کے سننے میں لگائے، اور منہ کو حلال اشیاء کے کھانے میں لگائے، اور فرج کو جائز شہوت کے پورا کرنے میں لگائے، اور ہاتھ سے جائز چیزوں کو پکڑے، اور پاؤں سے نیکی کی راہ پر چلے۔

یعنی تمام اعضاء کو رب تعالیٰ کے اوامر کے مطابق چلائے اور نواہی سے اجتناب کرے، یعنی لایعنی چیزوں کو چھوڑ دے اور ضروری کاموں پر عمل کرے۔

چونکہ ظاہری طور پر تو منافقین بھی اپنے اعضاء کو اسلام کے مطابق استعمال کرتے ہیں لیکن باطنی طور پر نہیں، اس لئے حکم دیا گیا کہ کامل طور پر یعنی ظاہری طور پر بھی اور باطنی طور پر بھی اسلام میں داخل ہو۔

نفس کو اسلام میں داخل کرنا:

نفس کو اسلام میں داخل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کفر سے باز آجائے، بری صفات کو چھوڑ دے، خواہشات کو چھوڑ دے، اور اپنے آپ کو عبودیت میں مطمئن سمجھے تاکہ اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں میں داخل ہونے کا شرف حاصل ہو جائے، اور اپنے آپ کو رب تعالیٰ کے اس خطاب کا مستحق بنا لے۔ "یاایتھا النفس المطمئنة"

دل کو اسلام میں داخل کرنا:

دل کو اسلام میں داخل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ نفس کو برے اخلاق سے پاک وصاف کرے اور روح کی اچھی عادات سے اپنے آپ کو مزین کرے۔

روح کو اسلام میں داخل کرنا:

روح کو اسلام میں داخل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات سے اپنے آپ کو متصف کرنا اور ازلی حکام کو تسلیم کرنا، اور اللہ تعالیٰ کے ماسواء سے قطع تعلقی کر کے اللہ تعالیٰ سے تعلق جوڑنا، اور روح کو اسلام میں داخل کرنا یہاں تک کہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی محبت میں گم کر کے اور اللہ تعالیٰ سے وصال حاصل کر کے ہمیشہ کی بقاء حاصل کر لینا۔ (روح البیان)

" السلم " بمعنی صلح:

اس آیۃ کریمہ " السلم " کو صلح کے معنی میں بھی لیا جا سکتا ہے، یعنی لڑائی جھگڑا نہ کرو بلکہ آپس میں صلح اور اتفاق و اتحاد سے رہو۔

اب معنوی لحاظ پر تقدیر عبارت کی یہ ہوگی۔

" (یایھا الذین امنوا ادخلوا فی السلم کا فۃ)ای کونوا موافقین و مجتمعین فی نصرۃ الدین و احتمال البلو ی فیہ "

اے ایمان والو! داخل ہو جاؤ صلح میں کامل طور پر، یعنی آپس میں اتفاق رکھو، دین کی امداد کرنے میں سب مجتمع ہو جاؤ، جب کسی قسم کے کفار کی طرف سے حملہ وغیرہ میں مبتلاء ہونے کا خطرہ ہو تو ان کے مقابلہ کے لئے تمام مسلمان متفق اور مجتمع ہو جاؤ۔

" (ولا تتبعوا خطوات الشیطن) بان یحملکم علی طلب الدنیا و المنازعۃ مع الناس "

اور شیطان کے قدموں کی تابعداری نہ کرو، کیونکہ وہ تمہیں دنیا کی طلب اور لوگوں کے ساتھ جھگڑا کرنے پر برانگیختہ کرے گا۔

" ولا تنازعوا فتفشلوا و تذھب ریحکم (الانفال، ۴۵)

اور آپس میں جھگڑا نہ کرو پھر بزدل ہو جاؤ گے تمہاری ہوا چلی جائے گی۔

یعنی آپس میں جھگڑا کرنا بزدلی کا ذریعہ ہے اور کفار کے دلوں پر مسلمانوں کا رعب جو چھایا ہوتا ہے ان کی جرأت اور بہادری کی شہرت کا جو چرچا ہوتا ہے، آپس میں لڑنے سے اس چرچے کی ہوا جاتی رہتی ہے۔

اور رب تعالیٰ نے فرمایا۔ " واعتصموا بحبل الله جميعا ولا تفرقوا " (آل عمران ۱۰۳)

اور اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے تھام لو اور آپس میں تفرقہ نہ پیدا کرو۔

"السلم" بمعنی معرفت وتصدیق قلب:

اس آیۃ کریمہ کا اور مفہوم یہ ہے کہ نیکی کے کاموں پر عمل کر کے اور برائیوں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے مطیع ہو جاؤ، کیونکہ معصیت کے ارتکاب میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی مخالفت لازم ہوتی ہے، معصیت کو چھوڑنے اور طاعت پر عمل کرنے سے ہی رب تعالیٰ کی کامل معرفت لازم آتی ہے اور کامل تصدیق قلبی حاصل ہوتی ہے۔ یعنی اصل ایمان تو گناہوں کے ارتکاب سے بھی باقی رہتا ہے لیکن کمال ایمان کا حصول اسی وقت ہوتا ہے جب معاصی سے دور رہے۔

" السلم " بمعنی رضاء بر تقدیر:

یعنی اس آیۃ کریمہ کا ایک اور مطلب یہ بھی ہے۔ "اے ایمان والو اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی رہو"

یعنی رب تعالیٰ کی قضاء وتقدیر پر صابر و شاکر رہے، کسی قسم کا دل میں کوئی اضطراب نہ ہو۔ قضاء وقدر پر مضطرب ہونے سے شیطان خوش ہوتا ہے، اس لئے شیطان کی پیروی سے منع کیا گیا ہے۔

" السلم " بمعنی ترک انتقام:

یعنی آیۃ کریمہ کا اور مفہوم یہ ہے کہ انتقام لینے سے منع کیا گیا ہے۔ اب مطلب یہ ہوا۔

"اے ایمان والو! داخل ہو جاؤ ترکِ ایمان میں کامل طور پر"

رب تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کی تعریف فرمائی۔ " واذامروا باللغو مروا کراما " (الفرقان، ۷۲)

اور جب بیہودہ پر گذرتے ہیں تو اپنی عزت سنبھالے گزر جاتے ہیں۔

یعنی اللہ کے نیک بندے بیہودہ لوگوں کی بیہودہ باتوں اور ان کی بیہودہ حرکات کا انتقام نہیں لیتے بلکہ اپنی عزت کا پاس کرتے ہوئے ان کی مجالس سے یوں ہی گزر جاتے ہیں جیسا کہ انہوں نے کچھ سنا ہی نہیں۔

اور رب تعالیٰ نے فرمایا۔" خذالعفو وامر بالمعرف واعرض عن الجاهلين "

اے محبوب معاف کرنا اختیار کرو اور بھلائی کا حکم دو اور جاہلوں سے منہ پھیر لو۔ (از کبیر)

"کافة":" معناه جميعا فهو نصب على الحال من السلم اومن ضمير المسلمين "

یعنی " کافة" کا معنی ہے تمام، مکمل وغیرہ، جب یہ " السلم " سے حال ہو تو معنی ہوگا" اے ایمان والو! داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے۔ یعنی مکمل طور پر، ایسا نہیں کہ زبان سے اسلام ہو دل میں نہ ہو۔ یا اسلام کے بعض شعائر پر عمل ہو اور بعض پر نہ ہو۔

اور اگر "امنوا" کی ضمیر سے حال ہو تو معنی یہ ہوگا" اے ایمان والو! تم تمام اسلام میں ثابت قدم رہو"

یا معنی یہ ہوگا" اے زبان سے ایمان لانے والو! تم تمام لوگ دل سے ایمان میں داخل ہو جاؤ"

یا یہ معنی ہوگا" اے اہل کتاب! اپنی کتاب پر ایمان لانے والو! تم تمام لوگ اسلام میں داخل ہو جاؤ۔

" كافة "لیا ہوا ہے " كف "جس کا معنی ہے روکنا۔

" كفة القميص " (کاف کے ضمہ سے) قمیض کو بٹن وغیرہ لگا کر انتشار سے روکنا۔

"كفة الميزان " (بکسر الکاف) ترازو کا پلڑا جس میں اس چیز کو روکا جاتا ہے جس کا وزن کیا جاتا ہے۔

"كف الانسان" انسان کی ہتھیلی جس میں منافع اور نقصان دہ چیزوں کو جمع کر کے روکا جاتا ہے۔

اور ہر گول چیز کو " كفة "(کاف کے فتحہ سے)اور ہر لمبی چیز کو" كفة "(بضم الکاف) کہا جاتا ہے۔

"رجل مكفوف البصر" وہ شخص جس کو نظر کرنے سے روکا جائے۔

اور" کافة "جماعت کو کہا جاتا ہے کہ وہ بھی متفرق ہونے سے روکے جاتے ہیں۔ (از قرطبی)

" کافة " يصح ان يرجع الى المامورين با لدخول اى ادخلوا باجمعكم فى السلم"

یعنی ایک احتمال یہ ہے کہ " کافة " کا تعلق ان لوگوں سے ہو جن کو حکم دیا جا رہا ہے کہ تم تمام اسلام میں داخل ہو جاؤ۔

" ولا تتفرقوا ولا تختلفوا " کہ متفرق نہ ہو اور آپس میں اختلاف نہ کرو۔

قطرب نے کہا، عرب حضرات کہتے ہیں۔

" رأيت القوم كافة وكافين ورأيت النسوة كافات "

میں نے قوم کو مجتمع دیکھا، میں نے عورتوں کو مجتمع دیکھا۔

" ويصح ان يرجع الى الاسلام اى ادخلوا فى الاسلام كله اى فى كل شرائعه "

اور ایک احتمال یہ ہے کہ " کافة " کا تعلق اسلام سے ہو، اب معنی یہ ہوگا کہ اسلام کے تمام شرائع میں داخل ہو جاؤ۔ (از کبیر)

علامہ واحدی رحمہ اللہ نے اس معنی کو ترجیح دی ہے۔ تقریباً عام مترجمین اور مفسرین نے یہی معنی ذکر کیا ہے۔

" ولاتتبعوا خطوات الشيطن ": اور نہ تابعداری کرو شیطان کے قدموں کی۔

یعنی اس راہ پر نہ چلو جس کی شیطان تمہیں دعوت دیتا ہے۔

"فان اتباع السنة اولى بعد ما بعث محمد ﷺ من خطوات الشيطن "

اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے اور اعلان نبوت کے بعد آپ کی اتباع زیادہ بہتر ہے۔ لہٰذا شیطان کی تابعداری نہ کرو، اس کی راہ سے مکمل اجتناب کرو۔ (از قرطبی)

" ولا تتبعوا خطوات الشيطن " اى لا تكونوا على سيرته وصفته وهى الاباء والاستكبار فانه ضد الاسلام "

اللہ تعالیٰ کے ارشادِ گرامی ''ولا تتبعوا خطوات الشیطان'' کا مطلب یہ ہے کہ شیطان کی سیرت اور اس کے طریقہ پر نہ چلو، اور شیطان کی صفات کو حاصل نہ کرو، شیطان کی صفت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا انکار کرنا اور تکبر کرنا، یہ دونوں صفات اسلام کے مخالف ہیں، یعنی جو شخص اسلام میں مکمل طور پر داخل ہوگا اور کامل مومن ہوگا، وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا انکار نہیں کرے گا اور نہ ہی تکبر کرے گا۔ (روح البیان)

''فانه لكم عدو مبين'': پھر بیشک وہ تمہارا دشمن ہے کھلا۔

وہ پیدائشی طور پر ہی تمہارا دشمن ہے، کیونکہ اس کی جبلت (پیدائشی عادت) تمہاری پیدائشی عادت سے مختلف ہے، اور تمہیں اللہ تعالیٰ نے فطرت اسلامیہ پر پیدا کر کے جو نور عطا فرمایا وہ اسے حاصل نہیں۔

''لكونه ناری الخلقة لا يطلب منكم الاان تكونوا ناريين مثله لانوريين فهو عدو فی الحقيقة فی صورة المحب''

وہ چونکہ آگ سے پیدا کیا گیا ہے وہ تمہیں بھی آگ کا مستحق بنانا چاہتا ہے یعنی وہ چاہتا ہے کہ تم بھی میری طرح آگ والے بن جاؤ، تم نوری مخلوق کی طرح جنتی نہ بنو، وہ بظاہر محبت کرتا ہے کہ تم بھی میرے جیسے بنو، لیکن حقیقت میں وہ تمہارا دشمن ہے، کہ تمہیں جہنمی بنانا چاہتا ہے۔ (از روح البیان)

اعتراض: شیطان کا وصف ذکر کیا گیا ہے '' مبین '' کھلا۔ کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

''كيف يمكن وصف الشيطان بانه مبين مع انا لا نری ذاته ولا نسمع كلامه''

شیطان کو کھلا دشمن کہنا کیسے صحیح ہے؟ جبکہ ہم اس کی ذات کو دیکھ نہیں رہے اور اس کے کلام کو سن نہیں رہے۔ اگر وہ کھلا دشمن ہوتا تو ہم اسے دیکھتے اور اس کی باتوں کو سنتے۔

پہلا جواب: ایمان کامل وہی ہے جو ایمان بالغیب ہو، یعنی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اس کے رسول اللہ ﷺ کے ذریعے پہنچے تو اسے تسلیم کر لیا جائے، اپنا دیکھنا یا سننا ضروری نہیں۔

"ان اللہ تعالیٰ لما بین عداوتہ لآدم ونسلہ فلذ لک الأمر صح ان یو صف با نہ عدو مبین وان لم یشاھد"

بیشک اللہ تعالیٰ نے جب بیان فرمایا کہ شیطان حضرت آدم علیہ السلام اوران کی اولاد کا دشمن ہے تو اسی سے اس کی کھلی دشمنی واضح ہوگئی۔ اگرچہ ہم اسے نہیں دیکھ رہے، لیکن اس کی دشمنی چھپی ہوئی نہیں۔

یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ دوسرے علاقہ کا دشمن ہمیں نظر نہ آئے، لیکن جب اس کی عداوت اور ہمیں نقصان پہنچانا واضح ہے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہمارا کھلا دشمن ہے۔

آجکل تمام دنیا کے مسلمانوں کا بچہ بچہ امریکی صدر بش کو اپنا کھلا دشمن سمجھتا ہے، حالانکہ اسے دیکھا نہیں، اس کے کلام کو براہِ راست ہر شخص نے نہیں سنا، لیکن اس کی عداوت ظاہر ہے، اس لئے کہ وہ مسلمانوں کا کھلا دشمن ہے۔

اگر ہم کبوتر کی طرح آنکھیں بند کئے مسلمانوں کو یہ بتائیں۔

" ان فلانا عدو مبین لک وان لم تشاھدہ فی الحال "

کہ بیشک فلاں شخص تمہارا کھلا دشمن ہے اگرچہ تم اسے دیکھ نہیں رہے۔

ہمارا یہ کلام درست ہوگا، دکھ درد رکھنے والے اور اسلام اور اپنے وطن سے محبت کرنے والے بتارہے ہیں کہ دشمن سے خبردار ہوجاؤ۔ افسوس کہ کچھ لوگ اس کی دوستی کا دم بھرنے والے ٹس سے مس نہیں۔

دوسرا جواب " مبین " کے دو معنی ہیں۔ جب یہ لفظ " بیان " سے لیا جائے تو اس کا معنی ہے ظاہر کرنا اور جب یہ " بینونۃ وابانۃ " سے لیا جائے تو اس کا معنی ہے منقطع کرنا۔ بلکہ......

" والبیان انما سمی بیانا لھذاالمعنی فانہ یقطع بعض الاحتمالات عن بعض"

بیان کو بیان بھی انقطاع کے معنی سے ہی کہا جاتا ہے، کیونکہ "بیان" بھی بعض سے بعض احتمالات کو ختم کردیتا ہے۔

شیطان کو مبین کہنے کی وجہ یہ ہے "انه یقطع المکلف بو سوسته عن طاعة الله وثوابه ورضوانه" کہ وہ عاقل و بالغ شخص کو وسوسہ ڈال کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے ثواب اور اس کی رضاء مندی سے منقطع کرتا ہے۔

اس جواب کے لحاظ سے " انه لکم عدو مبین " کا معنی یہ ہے۔ بیشک وہ تمہارا نیکیوں سے منقطع کرنے والا دشمن ہے۔ (از کبیر)

اظہارِ تشکر:

علامہ رازی رحمہ اللہ کے دوسرے جواب سے استاذی المکرم حضرت علامہ محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی کا "سبعہ معلقہ، نفحة الیمن، مقامات حریری، حماسہ اور متنبی" پڑھانے کا انداز یاد آیا کہ آپ آج کی طرح ان کتب کو قصے کہانیوں کے طور پر نہیں پڑھاتے تھے، بلکہ ایک ایک لفظ کی اسی طرح وضاحت فرماتے جیسے علامہ رازی رحمہ اللہ نے "مبین" کی وضاحت کی۔

یقین جانئے کہ میرے ذہن میں پہلے ہی یہ باتیں ثابت تھیں، یہ سب استاذی المکرم کی مہربانیاں ہیں، جن کا میں شکرگزار ہوں، اگرچہ ان مہربانیوں کا کما حقہ شکریہ ادا نہیں کرسکتا۔

اعتراض : شیطان کا دشمن ہونا کیسے؟ اگر یہ کہا جائے کہ وہ ہمیں تکالیف اور دکھ درد پہنچاتا ہے، تو یہ کہنا اس لئے درست نہیں کہ اس کا کبھی دشمنی کرنا اور کبھی دشمنی نہ کرنا تو ممکن نہیں بلکہ وہ تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دشمن ہے۔ حالانکہ ہمیں صحت بھی حاصل رہتی ہے، آرام بھی، ہم تمام اوقات میں تکالیف میں نہیں ہوتے، تو وہ ہمارا کھلا دشمن کیسے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ وسوسہ ڈال کر دین اور ثواب سے دور کرتا ہے تو اس آیۃ کریمہ کا مطلب کیا ہوگا۔

" وما کان لی علیکم من سلطان الا ان دعوتکم فا ستجبتم لی " (ابراھیم، ۲۲)

اور مجھے تم پر کوئی غلبہ حاصل نہ تھا مگر یہ کہ میں نے تمہیں بلایا تو تم نے میری بات قبول کرلی۔

جواب: شیطان کی دشمنی دو وجہ سے مجموعی طور پر پائی جاتی ہے، کیونکہ وہ ہمیں مصائب و آرام میں ہمیشہ مبتلا رکھنے کا ارادہ کرتا ہے۔ "الا ان اللہ تعالٰی منعه عن ذلک" مگر اللہ تعالٰی اسے اس سے روک دیتا ہے، اجازت نہیں عطا فرماتا۔

" ولیس یلزم من کونه مریدا لایصال الضرر الیہا ان یکون قادرا علیها "

اگرچہ وہ نقصان پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن اس کے نقصان پہنچانے کے ارادہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ حقیقۃً نقصان پہنچانے پر قادر بھی ہو۔

اور دوسری وجہ ساتھ ہی یہ پائی گئی ہے کہ وہ وسوسہ ڈالتا ہے۔ یعنی

" ان تزیینه المعاصی والقاء الشبهات کل ذلک سبب لوقوع الانسان فی الباطل "

اس کا گناہوں کو مزین کر کے دکھانا اور شبہات ڈالنا، یہ تمام سبب ہیں کہ انسان کو باطل راہ پر چلایا جائے اور اس کو ثواب سے محروم کیا جائے۔

" فکان ذلک من اعظم جهات العداوة " یعنی اس کی بہت بڑی عداوت ہے۔

جہاں تک قیامت میں شیطان کا یہ کہنا کہ " مجھے تو تم پر غلبہ حاصل نہیں تھا سوائے اس کے کہ میں نے تمہیں بلایا تم نے میری بات مان لی " اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کہے گا میں نے وسوسہ تو ڈالا تھا، تم اپنے اختیار سے میرے داؤ میں پھنس گئے تھے، میرا تم پر زور نہیں تھا۔

اس آیۂ کریمہ سے بھی اس کا وسوسہ ڈال کر گمراہی کی طرف لانا واضح ہے جو باعث عداوت ہے۔

فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِنْ بَعْدِمَا جَاءَ تْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ☆ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۰۹)

﴿۱﴾

اور اگر اس کے بعد بھی پھسلو کہ تمہارے پاس روشن حکم آچکے تو جان لو کہ اللہ زبردست حکمت والا ہے۔

﴿۲﴾

پھر اگر پھسل جاؤ تم اس کے بعد کہ آچکے ہیں تمہارے پاس واضح دلائل تو جان لو بے شک اللہ غالب ہے حکمت والا۔

شانِ نزول:

اس آیۃ کریمہ کے شانِ نزول میں وہ تمام احتمال پائے گئے ہیں جو اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں ذکر کئے گئے ہیں۔

ایک احتمال یہ ہے کہ اس آیۃ کریمہ میں خطاب منافقین کو ہے، یعنی اے منافقو! جب تم ظاہری طور پر زبان سے ایمان لا چکے ہو تو دل سے بھی ایمان لے آؤ، جبکہ نبی کریم ﷺ تمہارے پاس معجزات اور واضح دلائل لا چکے ہیں تو اس کے بعد اگر تم ایمان نہ لائے بلکہ متزلزل رہے تو جان لو اللہ تعالیٰ غالب ہے اور حکمت والا ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس میں خطاب اہلِ کتاب میں سے ایمان لانے والوں کو ہو کہ اے اہلِ کتاب جو ایمان لا چکے ہو۔

"(فان زللتم) فی تحریم السبت و لحم الابل (من بعد ما جاء تکم البینات) محمد ﷺ وشرائعه"

اگر تم ہفتہ کے دن کی تعظیم کر کے اور اونٹوں کے گوشت کو حرام سمجھ کر پھسل گئے جبکہ نبی کریم ﷺ

تمہارے پاس شریعت کے احکام لے آئے ہیں تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ غالب ہے اور حکمت والا ہے۔ (از کبیر)

تیسرا احتمال یہ ہے کہ یہ خطاب اہلِ کتاب کو ہے کہ اے اہلِ کتاب! جب تم نے اپنی کتب پر ایمان لایا لیکن نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے کے بعد اور احکام شرائع لانے کے بعد تم ایمان نہ لا کر اگر پھسل گئے تو جان لو اللہ تعالیٰ غالب اور حکمت والا۔ (از تفسیر ابی السعود)

چوتھا احتمال یہ ہے کہ اس آیۃ کریمہ میں خطاب مسلمانوں کو ہو۔

" یعنی انحرفتم عن الطریق الذی امرتم به "

کہ اگر تم اس راستہ سے پھر گئے جس کا تمہیں حکم دیا ہے تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ غالب ہے اور حکمت والا ہے۔

اس صورت میں ہر قسم کے گناہ مراد ہوں گے خواہ صغائر ہوں یا کبائر۔

" فان الانحراف کمایحصل بالکثیر یحصل بالقلیل "

اس لئے کے سیدھی راہ سے انحراف قلیل سے بھی ہے اور کثیر سے بھی۔

تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعید ہر قسم کے گناہوں پر زجر و توبیخ (ڈانٹ ڈپٹ) کے لئے ہے، تا کہ مومن تھوڑے اور چھوٹے گناہوں سے بھی بچ جائیں اور زیادہ گناہوں سے بھی بچ جائیں اور بڑے گناہوں سے بھی بچ جائیں۔

"لان ما کا ن من جملة الکبائر فلا شک فی وجو ب الاحتراز عنه وما لم یعلم کو نه من الکبا ئر فانه لا یؤمن کو ن العقاب مستحقابه و حینئد یجب الاحترا ز عنه "

اس لئے کہ تمام بڑے گناہوں سے بچنا ضروری ہے، اور جن کے متعلق یہ معلوم نہ ہو کہ یہ گناہ کبیرہ ہے یا صغیرہ تو ان سے بچنا بھی ضروری ہے تا کہ انسان عذاب کا مستحق نہ بن جائے۔ (از کبیر)

پھر یہ ہے کہ صغائر اور کبائر کی حد بیان نہیں کی گئی کہ انسان ہر گناہ کو کبیرہ ہی سمجھ کر اجتناب کرے، خاص کر کے صغائر کو بار بار کرنا اور ان پر قائم رہنا کبیرہ گناہ بن جاتا ہے۔

گویا کہ آیۃ کریمہ میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر تم کبیرہ گناہوں کے مرتکب ہو جاؤ تو توبہ کرو اور اگر صغیرہ گناہوں کا ارتکاب کرلو تو عبادات کے ذریعے ان کو رب تعالیٰ سے معاف کراؤ۔

"فان زللتم" : پھر اگر تم پھسل جاؤ۔

پہلے لام پر فتحہ بھی پڑھا گیا ہے اور کسرہ بھی، یعنی دونوں لغتوں کا اس میں استعمال ہے۔ جس طرح "ضللت" میں دونوں لغتوں کا استعمال ہے۔ معنی دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے۔

" زل یزل زلو لاوزلزالا " اذادحضت قدمه "یعنی قدم کا پھسل جانا۔

" زل فی الطین " کہا جاتا ہے کہ وہ کیچڑ میں پھسل گیا۔

اگر کوئی شخص ایک حال سے پھسل کر دوسرے حال میں آجائے تو اس کے لئے بھی یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔

" زلت به الحال " اور گناہ پر " زلة " کا اطلاق ہوتا ہے۔ " یریدون به الزلة للزوال عن الواجب " واجب سے پھسل جانے کو " زلة " کہا جاتا ہے۔

اب آیۃ کریمہ میں معنی یہ ہو گیا۔ " فان زللتم ای اخطأتم الحق وتعد یتموه "

پھر اگر تم پھسل گئے یعنی تم نے حق سے خطاء کرلی اور حق سے تجاوز کرلیا یعنی باطل راہ کو تم نے اختیار کرلیا۔ (کبیر)

شان نزول کی مختلف صورتوں کو دیکھ کر ہی خازن نے یہ تفسیر کی۔

" (فان زللتم) ای ملتم وضللتم وقال ابن عباس اشرکتم "

اگر تم راہ راست سے ہٹ کر دوسری جانب میلان کرلو، اور اگر تم راہِ راست بھٹک جاؤ، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق اگر تم مشرک ہو جاؤ۔

"من بعد ما جاء تکم البینا ت": اس کے بعد کہ آچکے ہیں تمہارے پاس واضح دلائل۔

" البینات " ای الدلالات الواضحات " (خازن) ای الحجج الواضحة والشواهد اللائحة "

یعنی "بینات" کا معنی ہے واضح دلائل اور ظاہر چمکدار شواہد۔

صاوی نے اعتراض وجواب کی صورت میں ذکر کیا ہے کہ پھسلنا تو ہوتا ہی اس وقت ہے جب دلائل آجائیں تو "من بعدماجاء تکم البینات" کا کیا مطلب ہوگا؟

تو اس کا جواب یہ دیا گیا۔"ان المراد بمجیئها ظهورها ظهورا بینا"

بے شک مراد دلائل کے آنے سے صرف دلائل کا آنا نہیں۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ دلائل کے واضح اور بہت زیادہ ظاہر طور پر آنے کے بعد۔

واضح دلائل کیا ہیں؟

واضح دلائل کا تعلق دلائل عقلیہ سے بھی ہے اور دلائل نقلیہ سے بھی ہے۔

دلائلِ عقلیہ سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کے تسلیم کرنے کے بغیر نبی کریم ﷺ کی نبوت کو ماننا صحیح نہیں ہوسکتا، وہ یہ ہیں کہ" عالم کے حادث ہونے کا علم ہو۔اور یہ معلوم ہو کہ تمام جہان ایک خالق و مالک وصانع کا محتاج ہے۔اور یہ پتہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے،کوئی چیز اس کے احاطہ علم سے باہر نہیں۔اور یہ جانتا ہو کہ اللہ تعالیٰ تمام ممکنات پر قادر ہے،اور خود ہر ایک سے بے پرواہ ہے،یعنی وہ کسی کا محتاج نہیں۔اور یہ علم حاصل ہو کہ جادو اور چیز ہے اور معجزہ اور چیز ہے،ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔(پہلے پارہ میں جادو اور معجزہ کو ذکر کردیا گیا ہے) اور یہ معلوم ہو کہ معجزہ انبیاء کرام کے صدق کی علامت ہے۔

یہ تمام دلائل عقلیہ ہیں۔جن کا علم پہلے حاصل ہوگا،اور نبی کی نبوت پر علم یقین اور ایمان بعد میں حاصل ہوگا۔

دلائل نقلیہ یہ ہیں جو کہ قرآن پاک اور حدیث پاک سے حاصل ہوں۔

"فکل هذه البینات داخلة فی الآیة من حیث ان عذر المکلف لا یزول الاعند حصول کل هذه البینات "

یہ تمام دلائل عقلیہ اور نقلیہ اس آیۃ کریمہ میں داخل ہیں،اس لئے کہ جب تک ان تمام دلائل کا

مکلّف (عاقل و بالغ) کو علم حاصل نہ ہو تو وہ عذر پیش کر سکتا ہے کہ اے اللہ تعالیٰ مجھے تو علم ہی حاصل نہیں تھا، میں راہ راست پر کیسے قائم ہو سکتا۔

مسئلہ: اسی سے یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا کہ بچے اور مجنون (پاگل) سے باز پرس (پوچھ) نہیں ہو گی اور نہ ہی ان کو وعید کی گئی ہے، کیونکہ ان کو قدرت کاملہ ہی حاصل نہیں کہ وہ تمام عبادات پر عمل کریں۔ (از کبیر)

''فاعلموا ان اللہ عزیز حکیم'': پھر جان لو بے شک اللہ غالب ہے حکمت والا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی دو صفتوں کا ذکر فرمایا ایک عزیز اور دوسری حکیم۔ اسی وجہ سے راقم نے ترجمہ میں ''غالب ہے حکمت والا'' لفظ ''ہے'' درمیان میں رکھا تاکہ دو صفتیں علیحدہ علیحدہ سمجھ آ جائیں۔

کیونکہ اگر ترجمہ کیا جائے ''غالب حکمت والا ہے'' تو اس سے عام انسان سمجھتا ہے کہ شائد ایک ہی صفت حکمت غالبہ کا ذکر ہے۔

''فاعلموا'' کہہ کر رب تعالیٰ نے اپنی آگے ذکر ہونے والی صفات پر متنبہ کیا ہے کہ غور کرو، جان لو۔ پھر ''ان'' سے اور تاکید ذکر فرمائی، پھر جملہ اسمیہ سے اور دوام و استمرار کی طرف اشارہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اسے ہمیشہ حاصل ہیں۔

''عزیز ''فان العزیز ھو المنیع القادر علی ان یمنع و لا یمنع لان اصل العزۃ الامتناع''

اللہ تعالیٰ عزیز ہے یعنی منیع و قادر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود منع کرنے پر قادر ہے اور اس کو منع کرنے پر کوئی قادر نہیں، اس لئے کہ اصل میں ''عزۃ'' کا معنی ہی ''روکنا'' ہے۔

اسی وجہ سے کہا جاتا ہے ''الارض عزاز'' یہ اس وقت کہا جاتا ہے جبکہ زمین بہت سخت ہو جسے کھودنا دشوار ہو۔ اور اس میں ہل چلانا مشکل ہو تو گویا کہ وہ روکنے والی ہے کھدائی سے۔ (از جصاص)

یہاں ''عزیز'' کا معنی کیا ہے۔ یہاں معنی یہ ہے۔

''عزیز ''لا یعجزہ شی عن انتقامہ منکم ای لا تفلتون منہ''

یعنی اللہ تعالیٰ تم سے گناہوں کا انتقام لینے والا ہے اور تمہیں عذاب دینے والا ہے، تم اپنے آپ کو اس کے عذاب سے چھڑا نہیں سکتے اور نہ ہی بھاگ سکو گے۔ (جلالین، صاوی)

اسی معنی کی مناسبت سے معنی کیا جاتا ہے" غالب"

"حکیم" کے دو معنی ہیں۔ایک یہ ہے کہ جب" حکمت" سے ماخوذ ہو تو معنی ہوگا "علم" کہ وہ عالم ہے۔

"علم" چونکہ رب تعالیٰ کی صفت ذاتیہ ہے۔اس معنی کے لحاظ پر "جازان یقال لم یزل حکیما" جائز ہے کہ کہا جائے کہ وہ ہمیشہ ہی حکیم ہے۔ (یہاں یہی معنی مناسب ہے کہ وہ ہمیشہ ہی حکمت والا ہے)

البتہ دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ لفظ "حکم" سے مشتق ہو، اور معنی یہ ہو" فعلہ المتقن المحکم" کہ اس کا فعل پختہ اور یقینی ہے۔اس معنی کے لحاظ پر یہ رب تعالیٰ کی صفت اضافیہ ہوگی۔

" واذااريد به ذلک لم يزل ان يقال حکيما کما لايحوزان يقال لم يزل فاعلا "

جب یہ معنی لیا جائے اور صفت اضافیہ ہو تو پھر یہ نہیں کیا جائے گا کہ وہ ہمیشہ حکیم ہے، جیسا کہ یہ نہیں کہا جاتا کہ وہ ہمیشہ کام کرتا ہے۔

پھر مطلب یہ ہوگا کہ وہ جب بھی کوئی کام کرتا ہے تو اس کا کام پختہ اور یقینی ہوتا ہے۔ (از احکام القرآن للجصاص)

دو صفات ذکر کرنے کی وجہ:

پہلی صفت میں وعید پائی گئی ہے اور دوسری صفت میں وعد پایا گیا ہے۔

وعید کا مطلب ہوتا ہے دھمکی دینا اور وعد کا مطلب ہوتا ہے تسلی دینا۔

اپنی صفت "عزیز" بیان کرکے رب تعالیٰ نے کئی دھمکیوں کو اس ایک لفظ میں جمع فرمادیا جو لفظ "عقاب" ذکر کرنے سے بھی حاصل نہ ہوتیں۔یعنی اس کا مطلب یہ ہوا۔

"فاعلموا ان الله مقتدر عليكم،لايمنعه مانع عنكم فلا يفوته ما يريده منكم وهذانهاية في الوعيد "

کہ رب تعالیٰ نے فرمایا، جان لو، متنبہ ہو جاؤ، بے شک اللہ تعالیٰ تم پر قادر ہے۔ جب وہ تمہیں عذاب دینا چاہے تو کوئی اسے روکنے کی طاقت نہیں رکھتا، اللہ تعالیٰ جو ارادہ فرماتا ہے اسے کوئی ٹال نہیں سکتا، یعنی ایسا نہیں ہوسکتا کہ کوئی بھاگ کر اس سے چلا جائے۔

رب تعالیٰ کا یہ ارشاد بہت زیادہ وعید پر مشتمل ہے، رب تعالیٰ کے اس ارشاد کو عام طور پر استعمال ہونے والے الفاظ سے سمجھئے۔ جب باپ اپنے بیٹے کو یہ کہے " ان عصیتنی فانت عارف لی " "اگر تم نے میری نافرمانی کی تو تم مجھے جانتے ہو" اس کا یہ مطلب ہوتا ہے۔ "وانت تعلم قدرتی علیک وشدۃ سطوتی" اور تم جانتے ہو کہ مجھے تم پر قدرت حاصل ہے اور مجھے تم پر دبدبہ حاصل ہے۔

" فیکون ھذاالکلام فی الزجر ابلغ من ذکر الضرب وغیرہ"

اس کلام میں زیادہ دھمکی پائی گئی جو یہ کہنے میں نہیں کہ اگر تم نے میری نافرمانی کی تو میں تمہیں ماروں گا۔

دوسری صفت "حکیم" بیان فرمائی، اس صفت میں رب تعالیٰ نے وعدہ کا ذکر فرمایا۔

"فان اللائق بالحکمۃ ان یمیز بین المحسن والمسیٔ فکما یحسن من الحکیم ایصال العذاب الی المسیٔ فکذلک یحسن منہ ایصال الثواب الی المحسن بل ھذا الیق بالحکمۃ واقرب للرحمۃ "

اس لئے کہ رب تعالیٰ کی حکمت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ نیک اور گنہگار میں فرق کرے۔ اور ساتھ ہی یہ واضح ہوا کہ جس طرح گنہگار کو عذاب دینا اس کے حکیم ہونے کے مناسب ہے، اسی طرح نیک کو ثواب عطاء کرنا بھی اس کی حکمت کے لائق ہے، بلکہ نیک کو ثواب عطاء کرنا زیادہ ہی حکمت کے مناسب ہے اور اس کی رحمت کے زیادہ ہی قریب ہے۔ (از کبیر)

علامہ رازی رحمہ اللہ کی اس تحقیق کے مطابق خلاصہ کلام یہ ہوا۔ "کہ اگر تم عقلی اور نقلی دلائل کے آجانے کے بعد

پھسل گئے تو متنبہ ہو جاؤ کہ اللہ تعالیٰ غالب قدرت کا مالک ہے۔ اس کے عذاب سے تم اپنے آپ کو بچا نہیں سکو گے، کوئی اور بھی رب تعالیٰ پر غالب آ کر تمہیں نہیں چھڑا سکے گا۔ کیونکہ اس پر کسی کے غالب آنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اور ساتھ ساتھ ہی اپنی صفت ''حکیم'' ہونا ذکر فرما کر یہ بھی واضح کر دیا کہ اگر تم نے دلائل کو دیکھ کر رب تعالیٰ کے احکام پر عمل کیا تو اللہ تعالیٰ تمہیں ثواب عطاء فرمائے گا، تم پر رحمت فرمائے گا۔

حکیم ہونے کا ایک اور مطلب:

''حکیم''ای لا یعذب الابحق'' اللہ تعالیٰ حکیم ہے کہ وہ کسی کو ناحق عذاب نہیں دیتا، اور نہ ہی کسی کو جرم سے زیادہ سزا دیتا ہے، اس کے تمام امور حکمت کے مطابق ہیں۔ کوئی کام اس کا حکمت کے خلاف نہیں۔

(مدارک و خازن)

ایمان افروز واقعہ:

ایک قاریٔ قرآن یہی آیۃ کریمہ پڑھ رہے تھے، انہوں نے بھول کر ''فاعلموا ان اللہ غفور رحیم'' پڑھ لیا، ایک عرابی قرآن پاک سن رہا تھا، اس نے قرآن پاک نہیں پڑھا ہوا تھا، لیکن زبان اس کی عربی تھی، وہ سن کر کہنے لگا۔

''لیس ھذا من کلام اللہ اذا الحکیم لایذکر الغفران عند الزلل والعصیان لا نہ اغراء علیہ''

کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہو سکتا، کیونکہ پہلے لغزش کا ذکر ہے اور گناہوں میں مبتلا ہونے کا ذکر ہے، اگر اس کے بعد یہ ذکر ہو ''فاعلموا ان اللہ غفور رحیم'' (تو جان بے شک اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے) تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی گناہ پر ابھارا ہے کہ تم گناہ کرتے رہو اور میں بخشتا رہوں گا اور رحم کرتا رہوں گا۔

یہ تو اللہ تعالیٰ کی حکمت کے ہی خلاف ہے کیونکہ وہ نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے اور گناہوں سے باز رہنے کا حکم دیتا ہے۔

(از مدارک)

مسئلہ : جب تک شریعت کا کوئی حکم نافذ نہ ہو اس وقت تک وہ واجب نہیں ہوتا۔ یہ مسئلہ "من بعد ماجاء تکم البینات" سے واضح ہوا۔ (کبیر بتغیر)

اعتراض: جب رب تعالیٰ "حکیم" ہے تو یہ کہنا کیسے درست ہے کہ کافر کفر کرتا ہے تو اس میں اللہ تعالیٰ کا اردہ پایا جاتا ہے اور سفیہ (بے وقوف) سفاہت کرتا ہے تو اس کے اردہ کے مطابق ہے، حالانکہ یہ کہنا تو اس کی حکمت کے خلاف ہے۔

جواب : یہ ذہنی الجھن اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ارادہ اور رضاء میں فرق نہ کیا جائے، رب تعالیٰ کافر سے کفر اور سفیہ سے سفاہت کو پسند نہیں فرماتا، بلکہ انسان کو ہر کام کا اختیار دے رکھا ہے، انسان جو کام کرتا ہے وہ اس کے دیئے ہوئے اختیار کے مطابق کرتا ہے، یہی اس کا اردہ ہے۔

یہ ارادہ اس کی حکمت کے خلاف نہیں، کیونکہ اس نے ان کاموں سے روک رکھا ہے، وہ تمام امور کو جانتا ہے اور باطل راہ پر چلنے والوں کو عذاب دے گا اور عذاب بغیر جرم کے نہیں دے گا اور عذاب جرم سے زائد نہیں دے گا۔ یہی اس کی حکمت ہے۔ (از کبیر بتغیر)

☆☆☆☆☆☆

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآاَنْ يَّأْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِىْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰئِكَةُ وَقُضِىَ الْاَمْرُ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ☆ (سورة البقرة آیت نمبر ۲۱۰)

○۱○

کاہے کے انتظار میں ہیں مگر یہی کہ اللہ کا عذاب آئے چھائے ہوئے بادلوں میں اور فرشتے اتریں اور کام ہو چکے اور سب کاموں کی رجوع اللہ کی طرف ہے۔

○۲○

وہ نہیں انتظار کر رہے ہیں مگر یہی کہ آجائے ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا عذاب بیچ سائے بادلوں کے اور (آجائیں) فرشتے اور فیصلہ کر دیا جائے کام کا، اور طرف اللہ کے لوٹائے جاتے ہیں تمام کام۔

شانِ نزول:

یہ آیۃ ان لوگوں کے حق میں نازل ہوئی جن کا ذکر پہلے آچکا ہے کہ کچھ لوگ شیطان کے قدموں کی تابعداری کرنے والے ہیں اور اسلام میں مکمل طور پر داخل نہیں ہوتے ان کے متعلق اس آیۃ کریمہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ وہ شیطان کے قدموں کی تابعداری کر کے اور اسلام میں مکمل طور پر داخل نہ ہو کر وہ نہیں انتظار کر رہے ہیں، ہاں مگر اسی کی انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا عذاب آجائے اور وہ عذاب بادلوں کی طرح چھا جائے، اور اس عذاب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے فرشتے بھی آجائیں۔ ان کو ہلاک کر کے ان کا فیصلہ ہی کر لیا جائے، یعنی ان کا کام ہی تمام کر دیا جائے اور سب کام اور سب امور اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹائے جانے ہیں، کیونکہ وہی ان کا خالق و مالک ہے۔

"ھل ینظرون": وہ نہیں انتظار کر رہے ہیں۔

"ھل ینظرون" استفهام فی معنی النفی ولذلک جاء بعده (الا ان یاتیھم اللہ) ای یأتی امره اوبأسه" (بیضاوی)

اس مقام میں " ھــل " استفہام انکاری کے طور پر استعمال ہے جس کا معنی نفی والا ہے۔ اسی وجہ سے اس کے بعد " الا " استثناء کے لئے استعمال ہے۔

مطلب یہ ہوگا کہ وہ نہیں انتظار کررہے مگر یہ کہ ان کے پاس اللہ تعالی کا عذاب آجائے۔

خیال رہے کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ حقیقی ہے جس میں استفہام کا معنی کیا گیا، اور راقم نے مقصد کے مطابق تفسیر بیضاوی کے مطابق مجازی معنی کیا ہے۔

"ینظرون" کا معنی ہے" ینتظرون " وہ انتظار کررہے ہیں۔ اس معنی میں عام استعمال ہے۔ کہا جاتا ہے " نظرتہ " کہ میں نے اس کی انتظار کی۔ اور قرآن پاک میں " انظرونا نقتبس من نورکم" میں بھی "انظرونا " انتظار کے معنی میں استعمال ہے۔ اور "فناظرة بم یرجع المرسلون" میں بھی "ناظرة " انتظار کے معنی میں استعمال ہے۔ (شیخ زادہ)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کے لئے:

"نظر " کے استعمال کے لحاظ سے مختلف معنی ہیں۔

نظر (ن،س) دیکھنا، غور سے دیکھنا۔ نظر (ن) فی الامر، سوچنا، فکر کرنا، اندازہ کرنا، الشیئ، انتظار کرنا، بین الناس حکم کرنا، فیصلہ کرنا، للقوم، رحم کرنا، مدد کرنا، فلانا، متوجہ ہونا، فلانا الدین قرضہ کی مہلت دینا۔ نظر الدھر الی بنی فلان زمانہ نے فلاں کی اولاد کو ہلاک کردیا۔ (المنجد)

"الا ان یاتیھم اللہ ": مگر یہ کہ ان کے پاس اللہ تعالی کا عذاب آجائے۔

اس کا ظاہری معنی یہ ہے" مگر یہ کہ ان کے پاس اللہ آجائے"

لیکن اس پر اتفاق ہے اہل علم کا اللہ تعالی آنے جانے سے پاک ہے، اس لئے ان الفاظ مبارکہ کے دو مطالب مفسرین کرام نے بیان کئے ہیں۔

ایک مطلب یہ ہے کہ اگر ان الفاظ کا ظاہری معنی کیا جائے تو پھر یہ متشابہات کی اس قسم سے ہیں جن کے ظاہری معانی تو معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کی حقیقی مراد اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اس لئے ظاہری معنی ذکر کرنے کے بعد یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ ان کی مراد اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

اسی طرح بعض آثار کا بھی ظاہری معنی تو معلوم ہوگا لیکن ان کی حقیقت صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ ہی جانتے ہیں۔ جیسا کہ تفسیر طبری میں ذکر ہے۔

"عن ابن عباس ان النبی ﷺ قال من الغمام طاقات یأتی اللہ عزوجل فیھا محفوفا"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ بادلوں کے پردے میں لپٹا ہوا آئے گا۔

اس حدیث پاک سے بھی ظاہری معنی سمجھ آرہا ہے لیکن حقیقی مراد وہ نہیں جو ظاہر ہے۔ لہٰذا ظاہری معنی کو دیکھ کر کہنا پڑے گا "اللہ ورسولہ اعلم مرادہ" اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اس کی مراد کو جانتے ہیں۔

ایک عجیب نکتہ حل ہوتا ہے:

خازن رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں کہ آیت صفات اور احادیث صفات یعنی جن آیات اور احادیث میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا ذکر ہو اور ان کی مراد میں اشتباہ ہو جیسا اس آیۃ کریمہ میں ہے تو اس کا حکم یہ ہے۔

"وانہ یجب علینا الایمان بظاھرھا ونؤمن بھا کماجاءت ونکل علمھا الی اللہ تعالٰی والی رسول اللہ ﷺ"

کہ ہم پر واجب ہے کہ ہم اس کے ظاہر پر ایمان لائیں کہ ظاہری معنی تو اس کا یہ سمجھ آتا ہے لیکن حقیقی علم ان آیات واحادیث کا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے سپرد کر دیں کہ حقیقی مراد ہی جانتے ہیں۔

واضح ہوا کہ متشابہات کا علم اللہ تعالیٰ کو بھی حاصل ہے اور اس کے رسول ﷺ کو بھی حاصل ہے۔

خوبصورت اشعار:

ابھی جس عقیدہ کا ذکر کیا کہ آیات صفات اور احادیث صفات کا حقیقی علم اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کو ہے۔ اس کو اہل علم نے نظم کی صورت میں پیش کیا۔

عقید تنا ان لیس مثل صفاته ولا ذاته شئ عقیدة صائب

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ بیشک نہیں مثل اس کی صفات کے۔ اور نہ ہی اس کی ذات کے کوئی چیز، یہی عقیدہ درست ہے۔

نسلم آیا ت الصفات با سر ها واخبارها للظا هر المتقارب

ہم تسلیم کرتے ہیں آیات صفات کو مکمل طور پر۔ اور تسلیم کرتے ہیں ان کی خبروں کو جو ظاہر کے قریب ہیں۔ (سمجھنے کے لحاظ پر)

ونؤیس عنها کنه فهم عقولنا وتاویلنا فعل اللبیب المغالب

اور ہم ناامید ہیں ان سے کہ ہماری عقلیں ان کی حقیقت کو سمجھ لیں۔ اور ہم اپنی تاویلوں سے ناامید ہیں یہی عقلمند مغالب شخص کا فعل ہے۔

ونر کب للتسلیم سفنافانها لتسلیم دین المرء خیر المراکب

اور ہم تسلیم کی کشتیوں پر سوار ہو رہے ہیں، بے شک، کہ انسان کا دین کو تسلیم کرنا بہتر سواریاں ہیں۔

جمہور علماءِ متکلمین کا مذہب:

آیات صفات اور احادیث صفات میں جمہور علماء متکلمین کا مذہب یہ ہے کہ اس میں تمام اہلِ علم کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ آنے، جانے سے پاک، لہٰذا اس قسم کے الفاظ یعنی آنے جانے کی نسبت......

" فیستحیل ذلک فی حقه تعالیٰ فثبت بذلک ان ظاهر الآیة لیس مرادا فلا بد من التا ویل علی سبیل التفصیل "

......اللہ تعالیٰ کی طرف محال ہے۔لہٰذا واضح ہوا کہ آیۃ کریمہ کا جب ظاہری مطلب مراد نہیں تو سیاق وسباق کی تفصیل کے مطابق ان آیات کی تاویل کی جائے۔

اسی وجہ سے مفسرین کرام نے تفسیر میں مختلف الفاظ نکالے ہیں۔

"(الاان یاتیھم اللہ)ای بآیات اللہ. ای بامرہ ، ای یاتیھم عذاب اللہ ، ای بأسہ وغیرھا"

سب کا مطلب یہی ہے کہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا عذاب آجائے۔ (ماخوذ از خازن)

جمہور علماء متکلمین کا مذہب ہی صحیح ہے اور اسی کے مطابق مطلب کو سمجھنا آسان ہے، اور اسی کو سمجھنا آسان، اسی مذہب کے صحیح ہونے کے مطابق راقم کی تسکین الجنان کا ایک ورق دیکھئے۔

تراجم میں تقابلی جائزہ:

"ھل ینظرون الا ان یاتیھم اللہ فی ظلل من الغمام"

کیا وہ اس کی راہ دیکھتے ہیں کہ آوے ان پر اللہ ابر کے سائبانوں میں۔ (محمود الحسن صاحب)

کیا یہ لوگ یہی انتظار رکھتے ہیں کہ آوے ان پر اللہ ابر کے سائبانوں میں۔ (شاہ عبدالقادر صاحب)

یہ لوگ صرف اس امر کے منتظر ہیں کہ حق تعالیٰ اور فرشتے بادل کے سائبانوں میں ان کے پاس آویں۔ (اشرف علی صاحب)

(یہ لوگ) تو بس اسی کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس خدا بادل کے سائبانوں میں آجائے۔ (عبدالماجد صاحب)

نہیں انتظار کرتے مگر یہ کہ آوے ان کے پاس اللہ بیچ سایوں کے بادلوں سے۔ (شاہ رفیع الدین صاحب)

کاہے کے انتظار میں ہیں مگر یہی کہ اللہ کا عذاب آئے چھائے ہوئے بادلوں میں۔

(مولانا احمد رضا خان بریلوی ......)

اس مقام پر بھی اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہے، لیکن دوسرے تراجم میں یہ ذکر ہے کہ اللہ آئے، خود سامنے آموجود ہو، یہ سب تراجم اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں اور تفاسیر کے برخلاف ہیں۔

کسی مفسر نے خود اللہ تعالیٰ کے آنے کا ذکر (بغیر تاویل کے) نہیں کیا، توحید کے دعویدار شانِ الوہیت کو سمجھنے سے قاصر رہے۔

"(الاان یأتیهم الله)ای امره کقوله (اویأتی امر ربک)ای عذابه(فی ظلل)جمع ظلة(من الغمام)السحاب" (جلالین)

مگر یہی کہ اللہ کا امر (عذاب) آئے، جس طرح دوسرے مقام پر "اویأتی امر ربک" ہے۔

وہاں بھی اس کا عذاب مراد ہے، یعنی اللہ کا عذاب آئے چھائے ہوئے بالوں میں۔

"(الاان یا تیهم الله)ای یا تیهم امره اوبأسه" (بیضاوی)

مگر یہی کہ اللہ کا امر اور عذاب آئے۔

مدارک میں بھی بیضاوی کی طرح ہی تفسیر ہے۔ یعنی دونوں تفاسیر کے الفاظ ایک ہی ہیں۔

(از تسکین الجنان صفحہ نمبر ۶۴، ۶۵)

اللہ تعالیٰ آنے جانے سے کیوں پاک ہے؟

اس کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ آنا جانا حادث کا کام ہے، اللہ تعالیٰ قدیم ہے، اس لئے وہ آنے جانے سے پاک ہے۔

حادث اسے کہتے ہیں جس کی ابتداء بھی ہو اور انتہاء بھی ہو، وہ اپنے قیام میں واجب الوجود (اللہ تعالیٰ) کا محتاج ہو۔ اور قدیم وہ ہے کو خود قائم ہو، نہ اس کی ابتداء ہو اور نہ انتہاء۔

تفصیلی جواب میں کئی وجوہ پائی گئی ہیں، جو علامہ رازی رحمہ اللہ نے ذکر فرمائی ہیں، ان کو مختصر طور پر ذکر کیا جارہا ہے۔ سب سے پہلے تو اہلِ علم کا عقیدہ سمجھا جائے۔

"اجمع المعتبرون من العقلاء علی انہ سبحانہ وتعالٰی منزہ عن المجی و الذھاب"

کامل عقل رکھنے والے اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالٰی آنے اور جانے سے پاک ہے۔

(۱) علمِ اصول میں یہ بات ثابت ہے کہ ہر وہ چیز جس کا آنا اور جانا صحیح ہو۔

"لا ینفک عن الحرکۃ والسکون وھما محدثان"

وہ حرکت اور سکون سے جدا نہیں ہوتے اور حرکت وسکون حادث ہیں۔

اور یہ بھی ضابطہ واضح ہے۔ "و امالا ینفک عن المحدث فھو محدث"

کہ جو حادث سے جدا نہ ہو وہ حادث ہے۔

لہٰذا واضح ہو کہ آنے اور جانے والی ہر چیز حادث ہے۔ "والا لہ القدیم یستحیل ان یکون کذلک"

لیکن اللہ تعالٰی قدیم ہے، اس لئے اس کا آنا اور جانا اس کی شان کے لائق نہیں بلکہ محال ہے۔

(۲) آنے جانے والی چیزیں اتنی چھوٹی تو ہو نہیں سکتیں جن کو" جزء لا یتجزی ' (ایسی جز ء جس کی تقسیم نہ ہو سکے) کہا جائے، لازم طور وہ چیزیں بڑی اور مرکب ہوں گی، ہر مرکب چیز اپنے اجزاء کی محتاج ہوتی ہے اور جو چیز اپنے اجزاء کی محتاج ہو وہ ممکن اور حادث ہوتی ہے۔

اور رب تعالٰی اپنے افعال میں فاعل مختار ہے اور قادر مطلق ہے، وہ ممکن محتاج وحادث نہیں۔

"فالا لہ القدیم الازلی یمتنع ان یکون کذلک"

اللہ تعالٰی قدیم ازلی ذات ہے اس لئے وہ آنے جانے سے پاک ہے۔

(۳) ہر وہ چیز جو ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف منتقل ہو وہ محدود ہوتی ہے، اور متناہی ہوتی ہے، یعنی اس کا ایک حد تک اختتام ہوتا ہے۔ لیکن اللہ تعالٰی محدود اور متناہی ہونے سے پاک ہے۔ لہٰذا وہ آنے جانے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ سے منتقل ہونے سے بھی پاک ہے۔

(۴) اگر اللہ تعالٰی کی ذات کے لئے آنا جانا جائز مانا جائے تو کیا وجہ ہے کہ سورج اور چاند کو معبود نہ مانا جائے، اور چاند اور سورج اور ستاروں کو اللہ ماننے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر طعن لازم آئے گا۔ اور ان کی تکذیب

لازم آئے گی، حالانکہ اللہ تعالیٰ کے نبی پر کذب کا گمان کرنا کفر ہے۔ لہٰذا رب تعالیٰ کے متعلق یہ خیال کیا جائے کہ وہ آنے جانے والا ہے تو کفر لازم آئے گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر طعن کیوں لازم آئے گا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے چاند، سورج اور ستاروں کے معبود ہونے کی نفی پر یہ دلیل قائم فرمائی۔ " لا احب الآفلین " " میں پسند نہیں کرتا چھپ جانے والوں کو" یعنی چھپ جانے والے معبود نہیں بن سکتے۔ اسی سے واضح ہوا کہ آنے جانے والا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے والا معبود نہیں بن سکتا۔

(۵) فرعون نے جب موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا "ومارب العالمین" سب جہانوں کا رب کیسا ہے؟ اس کا خیال تھا کہ رب کی ماہیت بیان کی جائے گی۔ اس کا جنس ہونا یا جوہر ہونا اور اس کا جسم ہونا بیان کیا جائے گا لیکن موسیٰ علیہ السلام نے رب تعالیٰ کی صفات بیان کر کے اس کا جواب دیا۔ ارشاد فرمایا "رب السماوات والارض" "وہ آسمانوں اور زمینوں کا رب ہے۔

اور ارشاد فرمایا "ربکم ورب آبائکم الاولین" وہ تمہارا رب ہے اور تمہارے پہلے آباء کا رب ہے۔

اور ارشاد فرمایا " رب المشرق والمغرب " وہ مشرق ومغرب کا رب ہے۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو رب تعالیٰ کی صفات سے جواب دے کر اس کے نظریات باطلہ کا رد کر دیا۔

"علمنا انه تعالی منزه عن ان یکون جسما وان یکون فی مکان ومنزه عن ان یصح علیه المجیٔ والذهاب "

فرعون کے سوال اور موسیٰ علیہ السلام کے جواب سے ہمیں بھی پتہ چل گیا کہ اللہ تعالیٰ جسم سے پاک ہے اور کسی مکان میں ہونے سے پاک ہے اور آنے جانے سے پاک ہے۔

(۶) جو چیز جسم ہو وہ عرض اور اشارہ کے لحاظ سے دو جزؤں کی طرف منقسم ہوتی ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت بیان فرمائی " قل هو الله احد" فرمادو اللہ ایک ہے۔

"فلما کان تعالی احدا امتنع ان یکون جسما او متحیزا فلما لم یکن جسما ولا متحیزا امتنع علیه المجیٔ والذهاب "

جب اللہ تعالیٰ ایک ہے تو اس کا جسم ہونا یا اس کا کسی حیز (مکان) میں ہونا ممتنع ہے۔ جب اس کا جسم ہونا اور کسی مکان میں ہونا ممتنع ہے تو یقیناً اس کا آنا اور جانا بھی ممتنع ہے، کیونکہ آنے جانے والا جسم ہوتا ہے اور مکان میں پایا جاتا ہے۔

پھر جسم دوسرے جسموں کا مشابہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کوئی مشابہ نہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف بیان کرتے ہوئے یوں سوال کیا ہے" (هل تعلم له سميا) ای شبيها " کیا تم اس کی شبیہ کو جانتے ہو؟ یعنی اس کا کوئی مشابہ نہیں۔ وہ مشابہت سے پاک ہے۔ پھر اور فرمایا " ليس كمثله شئ" اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔

" فثبت انه تعالى ليس بجسم و لا متحيز و انه لا يصح المجئ و الذهاب عليه"

ثابت ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ جسم نہیں اور کسی مکان میں نہیں پایا جاتا تو اسی سے واضح ہوا کہ وہ آنے اور جانے سے پاک ہے۔ (از کبیر)

"فی ظلل من الغمام والملٰئكة" :

(مگر یہ کہ ان کے پاس اللہ کا عذاب آجائے) بادلوں کے سائے میں اور فرشتے آجائیں۔

دینی طلباء کی توجہ کے لئے:

" والملا ئكة" کا عطف ہے لفظ "اللہ" پر اس لئے یہ فاعل ہوا " يا تى " کا۔

" والمراد العذاب الذى يا تيهم فى الغمام مع الملا ئكة "

مراد یہ ہے کہ ان کے پاس اللہ کا عذاب بادلوں میں آئے اور اس عذاب کے ساتھ فرشتے بھی آئیں۔

یعنی وہ عذاب لانے کی ذمہ داری فرشتوں کے سپرد کر دی جائے۔

" ظلل " جمع ہے " ظلة " کی۔ جس چیز کے ذریعے کسی پر سایہ کیا جاتا ہے " ظلة " کہا جاتا ہے۔

" والغمام اى السحاب لايكو ن كذلك الااذا كان مجتمعا متراكما "

غمام اس بادل کو کہتے ہیں جو بہت زیادہ مجتمع ہوکر بادل چھا جائیں۔

''ظلل من الغمام'' کا مجموعی معنی یہ ہے کہ بادل کے کئی ٹکڑے آپس میں مل جائیں اور گھتم گھتا ہو جائیں۔
(از کبیر)

اعلیٰ حضرت نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے ''چھائے ہوئے بادل''

راقم نے حقیقی معنی کا اعتبار کرتے ہوئے ''فی ظلل من الغمام'' کا ترجمہ کیا ہے ''بادلوں کے سائے میں''

مطلب اس کا بھی یہی ہے کہ جب گہرے اور گھنے بادل بہت زیادہ چھا جاتے ہیں تو کہا جاتا ہے ''بادلوں نے سایہ ڈال دیا'' بادلوں نے رات ڈال دی۔

بادلوں میں عذاب کرنے کی حکمت:

''ان الغمام مظنة الرحمة'' بادلوں کو دیکھ کر رحمت کا اعتبار کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت کی بارش آرہی ہے۔

شر اور مصیبت کا گمان نہ ہو تو اچانک مصیبت واقع ہو جائے تو وہ زیادہ ہولناک اور پریشان کن ہوتی ہے۔

اسی طرح خیر اور مہربانی کا گمان نہ ہو تو اچانک مہربانی حاصل ہو تو اس سے بہت زیادہ خوشی حاصل ہوتی ہے۔

'' فکیف اذا جاء الشر من حیث یحتسب الخیر ''

جب ایک چیز کو خیر سمجھا جائے اور اس میں رحمت کی امید لگائی گئی ہو وہی جب عذاب بن جائے تو یقیناً وہ بہت ہولناک منظر ہوگا، بہت زیادہ گھبراہٹ کا سبب بنے گا۔

بادلوں میں عذاب کے آنے کو ذکر کر کے اور اس طرف اشارہ کیا گیا کہ جس طرح بارش کے قطرات کو شمار نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے عذاب کی مقدار کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ (از کبیر)

''وقضی الامر'' : اور فیصلہ کر دیا جائے کام کا۔

"قضی" ماضی مجہول کا صیغہ ہے لیکن معنی مستقبل کا ہے۔اس سے اشارہ اس طرف پایا گیا ہے کہ قیامت کے امور دفعۃً واحدۃ (ایک مرتبہ ہی) پائے جائیں گے۔ (از کبیر)

"اتم امر العباد و حسابهم فاثیب الطائع و عوقب العاصی"

بندوں کا معاملہ مکمل کردیا جائے اور ان کا حساب کرلیا جائے مطیع کو ثواب دے دیا جائے اور نافرمان کو عذاب۔

"واتم امر هلاکهم وفرغ منه" ان کی ہلاکت کا معاملہ مکمل کردیا جائے اور اس سے فارغ ہو جائے۔ (روح المعانی)

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ روح المعانی کی اس آخری عبارت کے مطابق ہے "اور کام ہو چکے"

راقم کا ترجمہ بھی تقریباً اسی کے مطابق ہے لیکن لغوی معانی کا ذکر کیا گیا ہے "اور فیصلہ کردیا جائے کام کا"

روح البیان نے ماضی کا معنیٰ کیا ہے۔"(وقضی) فی اللوح (الأمر) امر هلاکهم"

لوح محفوظ میں ان کی ہلاکت کا فیصلہ کردیا گیا ہے۔

"والی اللہ ترجع الامور": اور طرف اللہ کے لوٹائے جاتے ہیں تمام کام۔

مجسمہ فرقہ کی غلط فہمی:

وہ فرقہ جو اللہ تعالیٰ کا جسم مانتا ہے، انہوں نے اس آیۃ کریمہ میں استعمال لفظ "الی" سے دلیل پکڑی ہے کہ "الی" انتہاء غایت کے لئے آتا ہے تو اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مکان میں ہوگا، جس کی طرف تمام امور کو لوٹایا جائے گا۔ جب مکان میں ہوگا تو جسم بھی ہوگا۔

ان کی غلط فہمی کا ازالہ:

یہاں "الی" غایت مکانیہ کے لئے استعمال نہیں بلکہ غایۃ تقرب کے لئے استعمال ہے، دنیا میں بندوں کے

کثیر امور اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں ہیں تو آخرت میں صرف رب تعالیٰ کا حکم بندوں پر چلے گا، جس طرح رب تعالیٰ نے فرمایا "والامر یومئذ للہ" اس دن حکم صرف رب تعالیٰ کا ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ تمام امور اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہوں گے، وہی ان کا بصیر ہوگا' اس کے بغیر کسی کی ملکیت وہاں نہیں ہوگی۔

جس طرح ہم کہتے ہیں " رجع امرنا الی الامیر " ظاہری معنیٰ تو اس کا بھی یہ ہے کہ ہمارا معاملہ امیر کی طرف لوٹ گیا" لیکن مراد اس کی یہ ہے کہ "ہمارا معاملہ امیر کے پاس ہے" یعنی اس کی نظر میں ہے۔

یہی مطلب "والی اللہ المصیر" کا ہے کہ مخلوق کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہوگا " لان الخلق الساعة فی ملکه و سلطانه " کیونکہ ہر گھڑی میں مخلوق اللہ تعالیٰ کی ملکیت اور اس کی بادشاہی میں موجود ہے۔

اس لئے رب تعالیٰ کی طرف پھیرے جانے کا یہی مفہوم ہے۔

دوسرا مطلب "اللہ تعالیٰ کی طرف امور لوٹائے جانے" کا یہ ہے کہ دنیا مقام امتحان ہے، جب یہ سلسلہ امتحان ختم ہو جائے گا تو دار آخرت جو ثواب و عقاب کا مقام ہے وہاں انسان پہنچ جائیں گے۔ " کان الامر کله للہ" تمام معاملات اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہوں گے۔ اس لئے بندے کو چاہئے کہ وہ اللہ سے ڈرے' اور مکمل طور پر اسلام میں داخل ہو جائے' اور رب تعالیٰ کی نہی کے مطابق شیطان کی تابعداری نہ کرے' یعنی اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں تمام امور کا ہونا ہی "اس کی طرف امور کو لوٹائے جانے" کا مطلب ہے۔ (از کبیر)

مجسمہ کی طرح سندھی کی غلط فہمی:

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں جب اہل قریظہ نے سعد بن معاذ کو حکم بنانے پر رضامندی کا اظہار کیا تو رسول ﷺ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی طرف پیغام بھیجا، وہ اپنے گدھے پر سوار ہو کر آئے، جب مسجد کے قریب آئے۔

" قال رسول اللہ ﷺ للانصار قوموا الی سیدکم او خیر کم "

تو رسول اللہ ﷺ نے انصار کو فرمایا اپنے سردار کے لئے کھڑے ہو جاؤ یا آپ نے فرمایا جو شخص تم سے بہتر ہے اس کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔

اس حدیث پر عبداللہ سندھی نے حاشیہ لکھا۔

" **لا دلیل فیه علی قیام التعظیم والتکریم اذلو ارید ذاک لقیل قوموا السید کم واما هذا الحدیث فانما یدل علی القیام للمریض عند النزول او القیام لاستقبال العظیم ونحو ذلک** "

کہ اس حدیث میں کسی کی تعظیم کے لئے کھڑے ہونے پر کوئی دلیل نہیں پائی گئی اگر یہ مقصد ہوتا تو یہ کہا جاتا "**قوموا السید کم**" اپنے سردار کے لئے کھڑے ہو جاؤ" **قوموا الی سید کم**" نہ کہا جاتا کیونکہ اس کا معنی تو یہ ہے کہ اپنے سردار کے پاس جا کر کھڑے ہو جاؤ ہاں البتہ اس سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ سعد چونکہ مریض تھے تو حکم دیا کہ مریض کے اترتے وقت اس کے پاس کھڑے ہو جاؤ (تاکہ اتارنے میں اس کی امداد کرو) یا اس سے ایک بڑے آدمی کے استقبال کے لئے کھڑا ہونا ثابت ہو رہا ہے۔

سندھی کی عجیب غلطی:

سندھی پر تو ایک مشہور مثال سچی آتی ہے۔

" **فرمن المطر وقرتحت المیزاب** " بارش سے بھاگ کر پرنالے کے نیچے کھڑا ہو گیا۔

تعظیم کے لئے کھڑا ہونے کا انکار اور عظیم شخص کے استقبال کے لئے کھڑا ہونے کا اقرار کیسی عجیب غلطی ہے ۔استقبال کے لئے کھڑا ہونے کا نام ہی تو قیام تعظیمی ہے، کیا یہ بھی کسی مسلمان سے سنا گیا ہے کہ وہ کسی بندے کو معبود سمجھ کر اس کے لئے بطور عبادت کھڑا ہوا ہو؟ ایسا ہرگز نہیں۔

سندھی کی دوسری غلطی:

وہی ہے جو مجسمہ نے " الی " کی وجہ سے غلطی کی ہے۔ سندھی کو یہ بات سمجھ نہ آئی کہ اس مقام میں " الی "

غایت مکانی کے لئے نہیں بلکہ غایۃ تقرب کے لئے ہے، جس کا مقصد یہ ہے اپنے سردار کے استقبال کے لئے ان کے قریب ہوکر کھڑے ہو جاؤ، صرف کھڑے ہونے کی بنسبت قریب ہوکر کھڑے ہونے میں اور ہی کمال پایا گیا ہے۔

علامہ نووی رحمہ اللہ کی تحقیق:

" قوله ﷺ " قوموا الی سید کم او خیر کم " فیه اکرام اهل الفضل وتلقیهم با لقیام لهم اذااقبلو اهذا احتج به جما هیر العلماء لا ستحباب القیام "

اس حدیث پاک سے یہ فائدہ حاصل ہورہا ہے کہ فضلیت والے حضرات کی عزت کی جائے اور کھڑے ہوکران سے ملاقات کی جائے، جمہور علماء کرام کی یہی تحقیق ہے اور یہی حدیث ان کی دلیل ہے کہ اہل فضل کے لئے کھڑا ہونا مستحب ہے۔

اس کے بعد علامہ نووی اپنا مختار بیان کرتے ہیں۔

" قلت القیام للقادم من اهل الفضل مستحب وقد جاء فیه احادیث ولم یصح فی النهی عنه شئ صریح " (نووی شرح مسلم ج۲ ص ۱۰۳)

میں کہتا ہوں کہ اہل فضل کے آنے پر کھڑا ہونا مستحب ہے۔ جو احادیث مبارکہ سے ثابت ہے، ممانعت پر کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں۔

استدلال لازوال:

سیدالاولیا، حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی رحمہ اللہ نے اسی حدیث کو بیان فرماتے ہوئے شاندار دلیل قائم فرمائی، آپ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا" قوموا الی سید کم "(اپنے سردار کے لئے کھڑے ہو)

لفظ"سید" مشتق ہے، قانون یہ ہے کہ مشتق میں مبداء اشتقاق علت ہوتا ہے، اس لئے حدیث پاک کا مطلب ہی یہ ہے" قوموالسید کم لسیادته "اپنے سردار کے لئے ان کی سرداری کی وجہ سے کھڑے ہو جاؤ۔

اگر حضرت سعد کو سواری سے اتارنا مقصود ہوتا تو تمام انصار کو حکم نہ دیا جاتا۔ اور یہ کہا جاتا "قوموا الی سعد" سعد کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔

اعتراض: نبی کریم ﷺ نے کسی کے سامنے کھڑے ہونے سے منع فرمایا، ان ممانعت والی احادیث کو دیکھ کر تو یہی پتہ چلتا ہے سندھی کا حاشیہ درست، ممانعت والی احادیث کو دیکھئے۔

☆ "عن ابی امامة قال خرج رسول الله ﷺ متکئا علی عصا فقمنا له فقال لا تقوموا کما تقوم الاعاجم یعظم بعضها بعضا" رواہ ابو داؤد (مشکوۃ باب القیام)

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ عصا پر سہارا لگا کر نکلے، ہم آپ کے لئے کھڑے ہو گئے تو آپ نے فرمایا تم نہ کھڑے ہو جیسے عجمی کھڑے ہوتے ہیں، بعض بعض کی تعظیم کرتے ہیں۔

☆ "عن معاویة قال قال رسول الله ﷺ من سره ان یتمثل له الرجال قیاما فلیتبوأ مقعده من النار" (رواہ ابو داؤد والترمذی مشکوۃ باب القیام)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کو یہ خوش لگے کہ لوگ اس کے سامنے بت کی طرح کھڑے رہیں تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم بنالے۔

جواب: ان احادیث میں مطلقا قیام سے منع نہیں کیا گیا، بلکہ اس میں تفصیل ہے، آیئے علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ کی وضاحت دیکھئے۔ "قیل هذا الوعید لمن سلک فیه التکبر بقرینة السرور للمسئول"

اس وعید کا تعلق اس شخص سے ہے جو تکبر کے طور پر لوگوں کو کھڑے ہونے کا حکم دے، کیونکہ حدیث شریف میں ہے "من سره" جس کو خوش لگے کہ لوگ اس کے لئے کھڑے ہوں۔ تو اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ کھڑا ہونے کا سوال کرے، مطالبہ کرے کہ میرے سامنے کھڑے رہو۔

"وقدروی البیهقی فی شعب الایمان عن الخطابی فی معنی الحدیث هو ان یأمرهم بذلک ویلزمه ایاهم علی مذهب الکبر والفخر" (بیهقی فی شعب الایمان)

علامہ خطابی رحمہ اللہ نے حدیث کا معنی بیان کرتے ہوئے فرمایا "کہ کوئی شخص کسی کو حکم دے کہ تم میرے سامنے کھڑے رہو تو یہ منع ہے کیونکہ اس میں تکبر اور فخر پایا گیا ہے"۔

" واما اذالم يطلب ذلک وقاموا من تلقاء انفسهم طلباللثواب اولارادة التو اضع فلا باس به "
لیکن جب کوئی دوسرے سے کھڑے ہونے کا مطالبہ نہ کرے بلکہ لوگ خود کھڑے ہو جائیں کہ یہ بزرگ ہیں، عالم ہیں ان کے لئے کھڑا ہونا ثواب ہے، یا اس کے لئے کوئی شخص کھڑا ہو جائے کہ میں تو اس بلند ہستی کے سامنے کم درجہ رکھتا ہوں، اس کے کھڑے ہونے کا مقصد اظہار عجز ہو تو یہ جائز ہے اس میں کسی قسم کی کوئی حرج نہیں۔

" وفي حديث سعد دلالة على ان قيام المرء بين يدى الرئيس الفاضل والوالى العادل وقيام المتعلم للمعلم مستحب غير مكروه "
جس حدیث میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے لئے کھڑا ہونے کا حکم دیا گیا ہے اس سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ کوئی انسان اپنی مرضی سے کسی صاحب رئیس کے سامنے کھڑا ہو جائے یا عادل حاکم کے سامنے کھڑا ہو جائے یا شاگرد استاد کے لئے کھڑا ہو جائے یہ قیام مستحب ہے مکروہ نہیں۔

" وقال البيهقى هذا القيام يكون على وجه البر والاكرام كما كان قيام الانصار لسعد وقيام طلحة لكعب بن مالک "
بیہقی نے بیان کیا ہے کہ مشائخ، فضلاء، اساتذہ اور عادلین حضرات کے لئے کھڑا ہونا ان کے اکرام کے لئے ہے اور ثواب حاصل کرنے کے لئے ہے یہ ایسے ہی جائز اور مستحب ہے جیسے انصار حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے لئے کھڑے ہوئے اور طلحہ کعب بن مالک (رضی اللہ عنہما) کے لئے کھڑے ہوئے (جب ان کی توبہ قبول ہوئی)۔

قیام ممنوع پر فیصلہ کن بات:

"ولاينبغى للذى يقام له ان يريد ذلک من صاحبه حتى ان لم يفعل حقدعليه اوشكاه اوعاقبه"
اس شخص کے لئے کھڑا ہونا منع ہے جو چاہے کہ میرے لئے لوگ کھڑے ہو جائیں جو نہ کھڑے ہوں ان کے خلاف کینہ رکھے یا اس پر شکایت کرے تم کیوں کھڑے نہیں ہوئے یا سزا دے۔

(ماخوذ ازمرقاة)

فائدہ: "والی اللہ ترجع الامور" کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق کے امور اور اعمال قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حضور ہوں گے، وہ مطیع لوگوں کو ثواب عطاء فرمائے گا اور نافرمانوں کو عذاب دے گا۔

اس لئے مومن کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مطیع بن کر رہے۔ اور ناجائز خواہشاتِ نفسانیہ سے دور رہے، اور شیطان کی تابعداری نہ کرے۔

"وعن النبی ﷺ انہ قال (ان اللہ تعالٰی اظھر الشکایۃ من امتی) وقال (انی طردت الشیطان لا جلھم فھم یعصو ننی ویطیعون الشیطان"

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں، بے شک رب تعالیٰ نے میری امت کے متعلق شکایت ظاہر کی کہ میں نے شیطان کو انسانوں (آدم علیہ السلام) کی وجہ سے اپنی درگاہ سے راند دیا، لیکن وہ میری نافرمانی کرتے ہیں، اور شیطان کی فرمانبداری کرتے ہیں۔

شیخ سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

کجا سر برآریم ازیں عار و ننگ　　　　که بااو بصلح یم و باحق بجنگ

کب سر اوپر لائیں گے ہم شرم وحیاء کی وجہ سے۔ کہ اس کے ساتھ (شیطان کے ساتھ) ہم صلح رکھیں اور رب تعالیٰ سے جنگ۔

نظر دوست نادر کند سوئے تو　　　　چو در روی دشمن بود روی تو

دوست تیری طرف کم ہی نظر کرے گا، جب تیرا منہ دشمن کے منہ کی طرف ہوگا۔

ندانی کہ کمتر نہد دوست پائے　　　　چو بیند کہ دشمن بود در سرائے

تو نہیں جانتا کہ بہت کم ہی رکھے گا دوست اپنے پاؤں۔ جب تیری سرائے میں دشمن کو دیکھے گا۔

(از روح البیان)

☆☆☆☆☆☆

سَلْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ کَمْ آتَیْنَاهُمْ مِنْ آیَةٍ بَیِّنَةٍ وَمَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِمَاجَاءَ تْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ☆ (سورة البقرة آیت نمبر ۲۱۱)

۱

بنی اسرائیل سے پوچھو ہم نے کتنی روشن نشانیاں انہیں دیں اور جو اللہ کی آئی ہوئی نعمت کو بدل دے تو بیشک اللہ کا عذاب سخت ہے۔

۲

سوال کرو بنی اسرائیل سے کتنی در ہیں ہم نے ان کو نشانیاں کھلی، اور جو شخص تبدیل کر دے اللہ کی نعمت اس کے بعد کہ آچکی ہے (وہ نعمت) اس کے پاس، تو بیشک اللہ سخت عذاب والا ہے۔

ماقبل سے رابطہ:

اللہ تعالی نے پہلے ارشاد فرمایا۔ " یاایھاالذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافة ولا تتبعوا خطوات الشیطن " اس آیۂ کریمہ میں تہدید پائی گئی، یعنی ڈرایا دھمکایا گیا ہے، کیونکہ اس میں اسلام کے احکام پر مکمل طور پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور شیطان کی تابعداری سے منع کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے وہ تمہیں جہنم میں لے جائے گا۔

دوسری آیۂ کریمہ " فان زللتم من بعد ما جاء تکم البینات فاعلموا ان اللہ عزیز حکیم " میں بھی تہدید پائی گئی ہے، کیونکہ اس میں گناہوں میں مبتلا ہونے پر متنبہ کیا گیا ہے کہ اللہ غالب ہے اور حکمت والا ہے، کہ وہ عذاب دے تو کوئی اس کے عذاب کو روکنے والا نہیں۔

اس آیۂ کریمہ میں ظاہر طور پر تہدید پائی گئی ہے کیونکہ فرمایا "فان اللہ شدید العقاب " بیشک اللہ سخت عذاب والا ہے۔ (از کبیر)

شانِ نزول ومختصر مطلب:

جب نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے اہل کتاب کے پادریوں نے آسمانی کتب میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو تبدیل کردیا، کتب میں تحریف کردی تو ان کوڈرانے کے لئے نبی کریم ﷺ اورآپ کی امت کے مسلمان لوگوں کوکہا گیا کہ بنی اسرائیل سے پوچھوان کے آباؤاجداد کوکتنی عظیم نعمتیں دی گئیں، پھران گنت نعمتوں سے ہرانسان کونوازا گیا، حق تو یہ تھا کہ ان نعمتوں کا شکریہ ادا کیا جاتا، لیکن تم نے ان نعمتوں کو بدل ڈالا، کیونکہ نبی کریم ﷺ کے اوصاف کا تمہاری کتب میں ذکرکرنا، تمہارے لئے عظیم نعمت تھی، لیکن تم نے اس نعمت کوتبدیل کر کے عظیم جرم کیا، لہٰذا تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ایک دن فیصلہ کی گھڑی بھی آنے والی ہے، جبکہ تمہیں اس وقت شدید نقصان میں مبتلا ہونا پڑے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ شدید عذاب والا ہے۔ (از خازن)

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

"سل" امر کا صیغہ ہے، اصل میں "اسئل" ہے، ہمزہ کی حرکت نقل کر کے ماقبل کو دی گئی، ہمزہ کو گرادیا، اور شروع میں ہمزہ وصل کو بھی گرادیا گیا "سل" رہ گیا۔

خیال رہے کہ ابتداء کلام میں تخفیف کی ضرورت ہوتی ہے، لہٰذا ابتداء میں یہاں بھی "سل" ذکر کیا گیا۔ اور "سلهم" میں بھی "سل" ذکر کیا گیا لیکن درمیان میں ہمزہ وصل درج کلام کی وجہ سے خود ہی گر جاتا ہے، اس لئے بغیر تخفیف کے استعمال ہوتا ہے جیسا کہ "واسئل القرية" میں، اور "فاسئل الذين يقرؤن الكتاب" میں اور "واسئلوا الله من فضله" میں تخفیف نہیں کی گئی، البتہ کسائی نحوی ہر جگہ پر ہمزہ کو ساقط کر کے تخفیف سے پڑھتے ہیں (تاہم ان کی قرات جمہور کے خلاف ہے)۔ (از کبیر)

"سل بنی اسرائیل":

"اعلم انه ليس المقصود "سل بنی اسرائيل" ليخبروک عن تلک الآيات فتعلمها و

ذلک لان الرسول ﷺ کا ن عالمابتلک الاحوال با علام اللہ تعالیٰ ایاہ "

یہ خطاب براہِ راست نبی کریم ﷺ کو ہے اور آپ کے واسطہ سے آپ کی امت کے مسلمانوں کو بھی ہے۔ بظاہر یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ کو خطاب ہے کہ آپ بنی اسرائیل سے پوچھیں کہ ہم نے ان کو کتنی کھلی نشانیاں دی ہیں۔ اس سے تو پتہ چلتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو علم حاصل نہیں تھا۔

تو اس کا جواب علامہ رازی رحمہ اللہ نے دیا کہ اس کا یہ مقصد نہیں کہ نبی کریم ﷺ ان سے پوچھیں تو آپ کو علم حاصل ہو جائے، بلکہ آپ کو تو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی علم عطاء کر رکھا ہے۔

" بل المقصود منه المبالغة فی الزجر عن الاعراض عن دلائل اللہ تعالیٰ "

بلکہ مقصد ان کو بہت زیادہ زجر و توبیخ کرنا (ڈانٹ ڈپٹ دینا) ہے، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے دلائل سے اعراض کر رہے تھے، یعنی یہاں سوال توبیخ اور تقریع کے لئے ہے۔ (تقریع، کانوں پر کھٹکانا) (از کبیر)

"کم آتینا ھم من آیۃ بینۃ": کتنی دی ہیں ہم نے ان کو نشانیاں کھلی۔

دینی طلباء کرام کے فائدہ کے لئے:

لفظ " کم " میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ کم استفہامیہ ہو۔ اور دوسرا یہ کہ کم خبریہ ہو۔ (مدارک)

کم استفہامیہ کے مطابق زجر و توبیخ پر مبنی سوال ہوگا۔ اور کم خبریہ کے مطابق معنی یہ ہوگا کہ "ان سے پوچھ کر ان کو بتائیں ہم نے ان کو کتنی ہی کھلی نشانیاں دی ہیں۔

کھلی نشانیوں سے مراد کیا ہے:

اس کے معنی میں وسعت پائی گئی ہے۔ اس سے مراد موسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر دلالت کرنے والی نشانیاں ہیں، جیسے آپ کو عصا بطور معجزہ دیا گیا۔ اور ید بیضاء اور دریا کا پھٹ جانا، اور من وسلویٰ اتارنا، جن سے ان کے آباء واجداد نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

کھلی نشانیوں سے اور مراد یہ ہے۔

" هى حجج الله الدالة على نبوة محمد ﷺ و ذلک انهم انکر وها و بد لو ها "

کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو جو دلائل دیئے گئے تھے کہ وہ نبی کریم ﷺ کی نبوت پر دلالت کرنے والے تھے، اسی وجہ سے انہوں نے ان کا انکار کر دیا تھا اور ان کو تبدیل کر دیا تھا۔

کھلی نشانیوں سے اور مراد یہ ہے " عهد ه الذى عهد اليهم فلم يفوا به "

کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے جو عہد لئے تھے کہ ان کو پورا کرنا، لیکن انہوں نے ان کی وفا نہ کی۔

کھلی نشانیوں سے مراد مطلق اللہ تعالیٰ کی وہ آیات ہیں جو ان کو ہدایت دینے والی ہیں اور گمراہی سے بچانے والی ہیں، لیکن انہوں نے ان کو تبدیل کر دیا۔

" ومن يبدل نعمة الله من بعد ما جا ء ته ":

اور جس نے تبدیل کر دیا اللہ کی نعمتوں کو اس کے بعد کہ وہ آگئیں ان کے پاس۔

" فان الله شديد العقاب ": تو بے شک اللہ سخت عذاب والا ہے۔

جن کھلی نشانیوں کا پہلے ذکر کیا ان تمام کو انہوں نے اور ان کے آباء واجداد نے تبدیل کر دیا۔ کیونکہ جا بجا ان کے آباء واجداد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے احکام کی مخالفت کرتے رہے گویا کہ ان کے معجزات کو خاطر خواہ نہ لاتے رہے۔ من وسلویٰ کے کھانے سے انہوں نے انکار کیا، دریا ان کے گذرنے کے لئے پھٹا تھا، حق تو یہ تھا کہ وہ کٹر پختہ ایمان والے ہوتے، لیکن انہوں نے ظاہر دیکھے جانے والے خدا پر ایمان لانے کا اصرار شروع کر دیا، یہ سب نعمتوں کو تبدیل کرنے کے مترادف تھا۔ اور انہوں نے نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو کتب سے بدلا۔ اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے عہد کی وفاء نہ کر کے ایفاء عہد کے حکم کو پس پشت ڈال کر بدل دیا۔ اور انہوں نے نجات دینے والی آیات کو بدل کر گمراہی کو حاصل کر لیا۔ (ازحازن)

نعمت سے اور مراد یہ ہے:

کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جو اسباب صحت اور اسبابِ امن اور اسباب کفایت عطاء فرمائے، جب انہوں نے کفر کیا تو اللہ تعالیٰ نے بطور انتقام ان نعمتوں کو تبدیل کر دیا۔ اگر چہ ان کو تبدیل تو اللہ تعالیٰ نے کیا، لیکن سبب یہی لوگ تھے کہ انہوں نے رب تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کی اس لئے اللہ تعالیٰ نے نعمتوں کو تبدیل کرنے کی نسبت ان کی طرف دی۔ (از کبیر)

مقام توجہ:

جب نعمتوں سے مراد آیات اور دلائل ہو تو "من بعد ماجاء ته" کا معنیٰ ہوگا "من بعد ما تمكن من معرفتها" ان کی معرفت پر قدرت رکھنا، ان کی معرفت کا حاصل ہونا۔ کیونکہ جب تک آیات و دلائل کی معرفت حاصل نہیں ہوگی وہ غائب کے درجہ میں ہوں گے۔

اور اگر نعمتوں سے مراد صحت و امن کفایت ہوں تو پھر ظاہری معنیٰ "آنا" ہی ہوگا۔

"فلا شک ان عند حصول هذه الاسباب یکو ن الشکر اوجب فکان الکفر اقبح"

تو یقیناً ان نعمتوں کے حاصل ہونے پر شکر واجب ہوگا اور کفر قبیح ہوگا۔ (از کبیر)

تنبیہ: علامہ واحدی رحمہ اللہ نے فرمایا" فان الله شدید العقاب" میں لفظ "له" پوشیدہ ہے۔ معنوی لحاظ پر اصل عبارت یہ ہے۔ "فان الله شدید العقاب له" بیشک اللہ کا عذاب سخت ہے۔ یعنی "شدید" صفت ہے "عقاب" کی اصل میں "العقاب الشدید" تھا، صفت کو مضاف بنایا۔ (یہ تمام ضوابط دینی مدارس کے طلباء کرام سے مخفی نہیں، اور یہ بھی خیال رہے کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے)

لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، عبدالقاہر نے "دلائل الاعجاز" میں ذکر کیا" ان ترک هذا الاضمار اولی" بے شک یہ پوشیدہ عبارت مراد نہ لینا زیادہ بہتر ہے۔

" وذلک لأن المقصود من الآیة التخویف یکون فی ذاته وموصوفابأنه شدید العقاب من غیر التفات الی کونه شدید العقاب لهذااو لذلک"

کیونکہ آیۃ کریمہ میں اصل مقصود اللہ تعالیٰ کا اپنی ذات سے ڈرانا ہے، کہ وہ رب تعالیٰ سخت عذاب دینے سے متصف ہے، یہ بیان کرنا مقصود نہیں کہ اس کا عذاب سخت اس کے لئے یا اس کے لئے۔

(از کبیر)

راقم نے ترجمہ علامہ عبدالقاہر کی تحقیق کے مطابق کیا ہے"تو بے شک اللہ سخت عذاب والا ہے"

اصل مقصود طلباء کرام کو مختلف بحثیں ذہن نشین کرانا ہے تاکہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کو دیکھ کر علامہ واحدی رحمہ اللہ کی تحقیق یاد ہو جائے، اور راقم کا ترجمہ دیکھ علامہ عبدالقاہر کی تحقیق کا پتہ چل جائے۔

عقاب کی وجہ تسمیہ:

عقب کا معنی ہوتا ہے پیچھے آنا، اسی وجہ سے ایڑی کو عقب کہا جاتا ہے کہ وہ بھی پاؤں کے پچھلے حصہ میں ہوتی ہے، عذاب کو عقاب اس لئے کہا جاتا ہے" والعقاب عذاب یعقب الجرم" کہ وہ جرم کے بعد پیچھے بطور سزا دیا جاتا ہے۔

(از کبیر)

فائدہ: "والمقصود من ذکر هذه الحکایة ان یعتبروا بغیرهم" اس آیۃ کریمہ سے تمام مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ تم بھی عبرت پکڑو، اگر تم نے بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو تبدیل کیا تو تم بھی اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آؤ گے، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا۔

" لقد کان فی قصصهم عبرة لاولی الالباب "

تحقیق ان کے قصے بیان کرنے میں عقل والوں کے لئے عبرت ہے۔ (کبیر)

☆☆☆☆☆☆

زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ☆ (سورة البقرة آيت نمبر ۲۱۲)

﴿۱﴾

کافروں کی نگاہ میں دنیا کی زندگی آراستہ کی گئی اور مسلمانوں سے ہنستے ہیں اور ڈر والے ان سے اوپر ہوں گے قیامت کے دن اور خدا جسے چاہے بے گنتی دے۔

﴿۲﴾

مزین کردیا ان کے لئے جنہوں نے کفر کیا "دنیا کی زندگی کو"۔ اور وہ ہنسی اڑاتے ہیں ان لوگوں کی جنہوں نے ایمان لایا۔ اور وہ لوگ جنہوں نے تقوی اختیار کیا وہ اوپر ہوں گے ان کے قیامت کے دن، اور اللہ عطاء کرتا ہے جسے چاہے بغیر حساب کے۔

ماقبل سے رابطہ:

پچھلی آیت کریمہ میں ذکر کیا "ومن یبدل نعمة اللہ من بعد ما جاء ته" اور جو شخص اللہ کی نعمتوں کو تبدیل کرتا ہے ان کے آجانے کے بعد تو بے شک اللہ عزیز وحکیم ہے۔ یعنی وہ انتقام لینے والا ہے غالب ہے، کوئی اس کی گرفت سے بچ نہیں سکتا۔ یقیناً اللہ تعالی کی نعمتوں کو تبدیل کرنا کافروں کا وطیرہ تھا۔ اس لئے اس آیۃ کریمہ میں ان کافروں کی تبدیلی کی وجہ بیان کی جارہی ہے کہ وہ دنیا کی مزین زندگی میں مشغول ہو کر اللہ تعالی کی نعمتوں کو بدل دیتے ہیں۔

"ومحصول هذا الكلام تعريف المومنين ضعف عقول الكفار والمشركين في ترجيع الفاني من زينة الدنيا على الباقي من درجات الآخرة"

اس کلام کا مقصد یہ ہے کہ مومنوں کو بتایا جائے کہ کفار ومشرکین کی عقلیں ضعیف ہیں کہ وہ دنیا کی

زندگی اور اس کی زیب وزینت کو باقی رہنے والی اور فضیلت والی اخروی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں۔

(کبیر)

شانِ نزول:

اس آیۃ کریمہ کے شانِ نزول میں چند وجہ ذکر کی گئی ہیں، جو تمام ہی مجموعی طور پر مراد ہیں، کہ چند واقعات کے درپیش آنے کے بعد آیۃ کریمہ کو نازل کیا گیا۔

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ آیۃ کریمہ ابوجہل اور قریش کے رئیس لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی "کانوا یسخرون من فقراء المسلمین" کہ وہ فقیر مسلمانوں سے طنز کرتے تھے اور ہنسی اڑاتے تھے۔ یعنی وہ عبداللہ بن مسعود، عمار، خباب، ابوحذیفہ کے غلام سالم، عامر بن فہیرہ اور ابوعبیدہ بن جراح جیسے غریب صحابہ کرام سے وہ ہنسی اڑاتے تھے۔

(۲) یہ آیۃ کریمہ بنوقریظہ اور بنونضیر اور بنوقینقاع کے متعلق نازل ہوئی، جبکہ انہوں نے مہاجرین صحابہ کرام کا تمسخر (مزاح) اڑایا، کیونکہ مہاجرین صحابہ کرام اپنے گھر اور مال چھوڑ کر آئے، اس لئے وہ غربت کی حالت میں بہت سادہ لباس رکھا کرتے تھے، جس کی وجہ سے یہود کے رئیس اور پادری ان سے ہنسی اڑاتے تھے۔

(۳) یہ آیۃ کریمہ منافقین کے متعلق نازل ہوئی۔ کیونکہ عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی کمزور حال مسلمانوں سے اور فقراء مہاجرین سے ہنسی اڑاتے تھے اور مزاح کیا کرتے تھے۔ (از کبیر)

تمام صورتوں کا مجموعہ ہی شان نزول ہے:

یعنی تمام واقعات کے درپیش آنے کے بعد یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

" واعلم انه لا مانع من نزولها في جميعهم "

جان لو بے شک تمام واقعات کو مجموعی طور پر آیۃ کریمہ کے شان نزول ماننے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ (از کبیر)

''زین للذین کفروا الحیوۃ الدنیا'': مزین کی گئی کافروں کے لئے دنیا کی زندگی۔

" زین " ماضی مجہول ہے، جس کا فاعل ذکر نہیں، اس کا فاعل کیا ہے؟ اس کے فاعل میں دو احتمال ہیں۔ ایک فاعل حقیقی۔ اور دوسرا فاعل مجازی۔

فاعل حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔ اس لئے کہ ہر چیز کا خالق و مالک وہی ہے۔ جب اس کی نسبت حقیقی فاعل یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا۔

" اوجدت حسنة وجعلت محبوبة فی قلوبهم فتهافتوا علیهاتها فت الفراش علی النار واعرضوا عما سواها"

دنیا کی زندگی کو (کفار کے لئے) حسین طور پر ایجاد کیا گیا ہے اور ان کے دلوں میں اسے محبوب بنا دیا گیا، وہ اس پر ایسے گرتے ہیں جیسے پتنگ آگ پر گرتے ہیں اور اس کے ماسواء سے اعراض کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اہل کتاب نے اللہ تعالیٰ کی آیات سے روگردانی کی (منہ پھیرلیا) اور آیات کو تبدیل کرلیا۔ اس معنی کے لحاظ پر فاعل اللہ تعالیٰ ہے، کیونکہ موجد و خالق صرف اللہ تعالیٰ ہے اور کسی کے دل میں کسی چیز کو اثر انداز کردینا بھی اللہ تعالیٰ کا ہی وصف ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ فاعل مجازی مراد ہو۔ وہ شیطان ہے۔

" وان فسر بالتحسین بالقول ونحوه من الوسوسة کما فی قوله تعالیٰ " لا زینن لهم فی الارض ولأغوینهم" کان فاعل ذلک هو الشیطان "

اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ باتوں سے اور وسوسہ سے دنیا کی زندگی کو مزین کرنے والا شیطان ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے شیطان کے قول کا ذکر کیا (ترجمہ) میں ضرور بضرور زمین میں ان کے لئے مزین کروں گا اور ان کو بھٹکاؤں گا۔ (روح المعانی)

راقم کے نزدیک دونوں معانی بیک وقت مختلف حیثیات سے مراد ہیں، اس طرح حقیقت ومجاز کا اجتماع بھی لازم نہیں آئے گا۔

یعنی کفار کے لئے دنیا کی زندگی اقوال اور وسوسہ سے شیطان مزین کرتا ہے جو ظاہری سبب ہے، اور حقیقت میں اس تزین کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔

”ویسخرون من الذین امنوا“: اور ہنسی اڑاتے ہیں ایمان والوں سے۔

"فانهم کانوا یعظمون حالهم من الدنیا ویغتبطون بها ویستخرون من اتباع محمد ﷺ"

بیشک کافروں کو دنیا میں عظیم مال حاصل ہوتا ہے کہ وہ دولت مند ہوتے ہیں، اسی وجہ سے ان کے مال ودولت کو دیکھ کر کمزور ایمان والے ان پر رشک کرتے ہیں اور ان کو دیکھ کر للچاتے ہیں، یہی وجہ تھی نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے مشرکین اور منافقین اور یہود کی بھی کہ وہ اپنے مال ودولت پر ناز کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے متبعین سے تمسخر (ہنسی ومزاح) اڑاتے تھے۔

”والذین اتقوافوقهم یو م القیامة“: اور متقی لوگ ان کے اوپر ہوں گے قیامت کے دن۔

فوقیت حاصل ہونے کی وجوہ:

(۱) متقی لوگوں کو کفار پر فوقیت کی ایک وجہ یہ حاصل ہوگی کہ متقی لوگوں کا مقام علیین ہوگا جو آسمانوں میں ہوگا اور بلند ہوگا۔ اور کفار کا مقام سجین ہوگا جو زمین کی پستی میں ہوگا۔ یعنی یہ بلندی مکان کے لحاظ پر حاصل ہوگی۔

(۲) دوسری وجہ فوقیت کی درجات اور کرامت کے لحاظ پر ہوگی کہ متقی لوگوں کے درجات بلند ہوں گے۔

اعتراض: ”فلان فوق فلان فی الکرامة“ اس وقت کہا جاتا ہے جب دونوں کو کرامت حاصل ہو لیکن ایک کو دوسرے پر زیادہ فوقیت حاصل تو یہ کہا جاتا ہے ”فلان زائدالفوقیة علی فلان فی الکرامة“ کہ فلاں کو فلاں پر زیادہ فوقیت حاصل ہے، لیکن کفار کو تو کرامت حاصل ہوتی ہی نہیں، تو پھر یہ کہنا کیسے درست ہے کہ مومنوں کو کفار پر

کرامت ودرجات کے لحاظ پر فوقیت حاصل ہے۔

جواب: کفار کو دنیا میں مال ودولت کی وجہ سے عزت حاصل ہوتی ہے، لیکن آخرت میں معاملہ الٹ ہوگا کہ مومنین کو عزت حاصل ہوگی، یعنی ان کو ثواب حاصل ہوگا اور درجات بلند ہوجائیں گے۔ اب مطلب یہ ہوا کہ مومنین متقین کو قیامت کے دن کفار کی دنیاوی عزت کی نسبت زیادہ عزت حاصل ہوگی۔

(۳) فوقیت کی تیسری وجہ یہ ہے کہ متقین حجت ودلیل کے لحاظ پر کفار سے اوپر ہوں گے، کیونکہ دنیا میں کفار شبہات ڈالتے ہیں جو مومنین کے دل پر بظاہر اثر انداز ہوتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی توفیق اور امداد سے ان کے دلوں سے ان شبہات کو دور کردیا جاتا ہے، لیکن قیامت کے دن کفار کو شبہات ڈالنے کی طاقت ہی حاصل نہیں ہوگی، ان کے شبہات خود بخود زائل ہوجائیں گے، شیطانوں کے وسوسے اثر انداز نہیں ہوں گے۔

یہ دلائل کی فوقیت مسلمانوں کو حاصل ہوتی ہے جس کے مقابل کفار کو پستی وذلت حاصل ہوگی۔

(۴) فوقیت کی چوتھی وجہ یہ ہوگی کہ مومنین کفار سے قیامت کے دن ہنسی اڑائیں گے جو کافروں کی دنیا میں ہنسی اڑانے سے اوپر ہوگی، کیونکہ کافروں کی مومنین سے ہنسی باطل ہے اور دنیا میں ہی ختم ہوجانے والی ہے، لیکن مومنین کا تمسخر (مزاح ازانا) حق ہوگا اور دائمی ہوگا۔ (از کبیر)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"والذین اتقوا فوقهم یوم القیامة" یہ جملہ معطوفہ ہے جس کا عطف ماقبل پر ہے۔ اور یہ جملہ اسمیہ جو دوام واستمرار پر دلالت کررہا ہے۔ "وفی ذلک من تسلیة المؤمنین ما لا یخفی" اس میں مومنین کی تسلی پائی گی ہے جو پوشیدہ نہیں۔ یعنی اس جملہ سے ہی یہ واضح کردیا گیا ہے کہ قیامت کے دن مومنین کو جو فوقیت حاصل ہوگی وہ دائمی ہوگی، اس میں کسی قسم کا کوئی انقطاع نہیں ہوگا۔ (روح المعانی)

"واللہ یرزق من یشاء بغیر حساب": اور اللہ عطا کرتا ہے جسے چاہے بغیر حساب کے۔

قرآن پاک کی عظمت:

یہ مختصر الفاظ بہت بڑے مطالب کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔

رزق سے مراد دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ متقین کو جو آخرت میں عطاء ہونا ہے، اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ آیۃ کریمہ میں رزق کا مطلب دنیا کی مختلف نعمتیں ہوں، جو مومنین اور کفار سب کو حاصل ہیں۔

رزق اخروی کے چند مطالب:

(۱) ان میں سے ایک مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ آخرت میں مومنوں کو بغیر حساب کے رزق عطاء فرمائے گا، یعنی وہ رزق وسیع ہوگا، اس میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ اور وہ فنا نہیں ہوگا، اور اس نے ختم نہیں ہونا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

" فاولئک ید خلو ن الجنة یرزقو ن فیها بغیر حساب "

تو وہ لوگ (نیک لوگ) جنت میں داخل ہوں گے ان کو اس میں رزق دیا جائے گا بغیر حساب کے۔

جو چیز حساب میں ہو اور شمار میں ہو اور ایک مقدار میں ہو وہ ختم ہو جاتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے جو قیامت کو عطا کرنا ہے اس نے ختم نہیں ہونا۔

" فمالا یکو ن متنا هی کان لامحالة خارجا عن الحساب "

جو چیز ختم نہ ہونے والی ہو وہ حساب سے باہر ہے۔

(۲) دوسرا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں متقین کو جو منافع عطاء کئے جانے ہیں ان کو رزق سے تعبیر کر دیا گیا، وہ منافع ثواب اور فضل ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "فیو فیهم اجو رهم و یزید هم من فضله" تو ان کو پورا پورا اجر عطاء فرمائے اور اپنے فضل سے اور (بھی) زیادہ عطاء فرمائے گا۔

"فالفضل منه بلا حساب" یعنی اللہ تعالیٰ قیامت کے دن متقین پر بغیر حساب کے فضل فرمائے گا۔

(۳) بغیر حساب کے رزق دینے کا اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عطاء میں نہ کمی ہوتی ہے اور نہ ختم ہونا ہے کہ وہ حساب کرے، حساب وہ کرتا ہے جسے یہ خوف ہو کہ میرا خزانہ ختم ہو جائے گا۔تو وہ مقدار سے زیادہ دینے سے ڈرتا ہے کہ میں کہیں محتاج ہو کر نہ بیٹھ جاؤں

" واللہ لایحتاج الی الحساب لأنہ عالم غنی لا نہایۃ لمقدوراتہ "

اللہ تعالیٰ حساب کا محتاج نہیں کیونکہ وہ عالم ہے اور غنی ہے،اس کی قدرت میں جو چیزیں ہیں ان کی کوئی انتہا نہیں۔

(۴) "بغیر حساب " ای بغیر استحقاق " بغیر حساب کے دینے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو بغیر استحقاق کے دے گا ،یعنی کسی کو رب تعالیٰ پر کوئی حق نہیں کہ وہ اپنے حق کا مطالبہ کرے اور اس سے حساب کرے۔

" بل کل ما اعطاہ فقد اعطاہ بمجرد الفضل والا حسان لابسبب الاستحقاق "

بلکہ اللہ تعالیٰ کی ہر عطاء اس کے فضل واحسان سے حاصل ہوتی ہے۔کسی کے مستحق ہونے کی وجہ سے حاصل نہیں ہوتی۔

(۵) "بغیر حساب ای یزید علی قدر الکفایۃ " یعنی اللہ تعالیٰ ضرورت سے زیادہ عطاء فرماتا ہے کیونکہ جب ضرورت کے مطابق کوئی شخص کسی کو دے تو اس وقت کہا جاتا۔ "فلان ینفق بالحساب" فلاں شخص حساب کے ساتھ خرچ کرتا ہے لیکن ضرورت سے زائد کوئی شخص کسی کو عطاء کرے تو اس وقت یہ کہا جاتا ہے۔ "فلا ن ینفق بغیر حساب" فلاں شخص بغیر حساب کے خرچ کرتا ہے۔

(۶) " بغیر حساب " ای یعطی کثیرا لا ن مادخلہ الحساب فھو قلیل "

اللہ تعالیٰ بغیر حساب کے عطاء کرتا ہے اس کا اور مطلب یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ عطا کرتا ہے جو حساب میں نہیں آسکتا' حساب میں وہی چیز آتی ہے جو قلیل ہو۔

یہ تمام احتمالات جن کا ذکر کیا ہے' اللہ تعالیٰ کی عطاء ان تمام کے مطابق ہے' اسی لئے علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔"فیجوز ان یکون المراد کلھا "جائز ہے کہ تمام وجوہ ہی مراد لی جائیں۔

دنیاوی رزق کے چند مطالب:

جب آیۃ کریمہ کا یہ معنی لیا جائے کے اللہ تعالیٰ دنیا میں رزق مومنین کو بھی عطا کرتا ہے اور کفار کو بھی تو اس میں چند مطالب پائے جاتے ہیں۔

(۱) اس میں ایک وجہ تو یہ ہے۔ "وھو الیق بنظم الآیة" کہ وہ آیۃ کریمہ کے باقی مضمون کے بظاہر زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ کفار فقیر مسلمانوں سے مزاح اڑاتے تھے اور وہ یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ ہمیں دنیا کا زیادہ مال حاصل ہے، لہٰذا ہم حق پر ہیں۔ لیکن مسلمان غریب اور فقیر ہیں ان کے پاس مال و دولت نہیں، اس لئے وہ باطل راہ پر ہیں۔

رب تعالیٰ نے ان کی اس دلیل کو رد فرمایا اور ارشاد فرمایا " واللہ یرزق من یشاء بغیر حساب "

اور اللہ عطا کرتا ہے جسے چاہے بغیر حساب کے۔

یعنی دنیا میں رب تعالیٰ کی عطا کا تعلق صرف اس کی مشیت (چاہنے) پر ہے جسے مال دیا گیا وہ خواہ حق پر ہو یا باطل پر ہو، خواہ برا ہو یا نیک۔

"فقد وسع الدنیا علی قارون وضیقھا علی ایوب علیہ السلام "

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں قارون کو بہت مال عطاء فرمایا حالانکہ وہ کافر تھا اور حضرت ایوب علیہ السلام پر مال کی تنگی رکھی حالانکہ وہ نبی تھے۔

لہٰذا واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا کسی کو مال دینا اس کی مقبولیت کی علامت نہیں بلکہ وہ مردودوں کو بھی مال کی وسعت عطاء فرماتا ہے۔

لہٰذا کافروں کی یہ دلیل باطل ہو گئی کہ وہ مال و دولت کی وجہ سے حق پر ہیں۔ اور مسلمان غربت کی وجہ سے باطل پر ہیں۔

" بل الکافر قدیوسع علیه زیادة فی الاستدراج والمؤمن قد یضیق علیه زیادة فی الابتلاوء والامتحان "

بلکہ کافر کوبھی زیادہ مالی وسعت عطاء کی جاتی ہے تا کہ اس کی استدراجی قوت شعبدہ بازی اورزیادہ ہو۔اور مومن کوامتحان میں مبتلاء کرنے کے لئے تھوڑا مال دیا جاتا ہے۔اوراس کے رزق میں تنگی کی جاتی ہے۔

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"ولولاان یکون الناس امة واحدة لجعلنا لمن یکفر با لرحمن لبیو تهم سقفامن فضة ومعارج علیهایظهرون " (سورة الزخرف ، ۳۳)

اوراگر یہ نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک دین پر ہو جائیں تو ہم ضرور رحمٰن کے منکروں کے لئے چاندی کی چھتیں اور سیڑھیاں بناتے جن پر چڑھتے۔

(۲) اور دنیا میں رزق بغیر حساب کے دینے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں اور کافروں میں سے جب چاہے بغیر حساب کے رزق عطاء فرماتا ہے، نہ وہاں طلب کی کوئی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی کسی سائل کا کوئی سوال ہوتا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے بغیر حساب کے عطاء کردے تا کہ کافروں کو یہ کہنے کی جرأت حاصل نہ ہو سکے کہ مومن اگر حق پر ہوتے تو ان کو مال میں وسعت عطاء ہوتی، اسی طرح کوئی ضعیف ایمان والا یہ نہ کہہ سکے کہ اگر کافر باطل راہ پر ہوتے تو ان کو وسیع مال کیوں دیا جاتا۔

"والا مر امره والحكم حكمه (لا یسئل عما یفعل وهم یسألو ن)"

امرامر ہے،اور حکم حکم ہے۔اس سے یہ نہیں پوچھا جا سکتا کہ وہ کیا کرتا ہے اوران لوگوں سے پوچھا جائے گا وہ کیا کرتے رہے۔

(۳) اور وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے دنیا میں اتنا مال عطا کردے جواس کے حساب میں ہی نہ آسکے، جس طرح کسی آدمی کے پاس مال بہت ہوتو وہ کہے۔ " لم یکن هذافی حسابی " یہ میرے حساب میں ہی نہیں۔

یہ کثیر مال اللہ تعالیٰ کافروں کو عطاء کرتا ہے اور مومنوں کو بھی، تاہم مومنین کو کثیر مال دینا درحقیقت ان کا امتحان ہوتا ہے، کچھ لوگوں کو تو مال کی کثرت سے کوئی نقصان نہیں ہوتا بلکہ وہ نیک ہی رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ

کو یاد کرتے رہتے ہیں۔لیکن کچھ لوگ مال و دولت کی ہوس میں گناہوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔(ماخوذ از کبیر)
اس ساری بحث کو دیکھیں تو اعلیٰ حضرت کا ترجمہ خوب تر نظر آئے گا''اور خدا جسے چاہے بے گنتی دے''

مومن کی تذلیل پر وعید:

"روی علیؓ ان النبی ﷺ قال"من استذل مؤمنا اومؤمنة اوحقّره لفقره وقلة ذات یده شهره الله یوم القیامة ثم فضحه ومن بهت مؤمنااو مؤمنة اوقال فیه ما لیس فیه اقامه الله تعالیٰ علی تلّ من نار یوم القیامة حتی یخرج مماقال فیه وان عظم المؤمن اعظم عند الله واکرم علیه من ملک مقرب ولیس شیٔ احب الی الله من مؤمن تائب اومؤمنة تائبة وان الرجل المؤمن یعرف فی السماء کمایعرف الرجل اهله وولده "(بحوالہ قرطبی)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بے شک نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے مومن مرد یا عورت کی تذلیل کی (ذلیل کیا) یا اسے غریب ہونے کی وجہ سے حقیر سمجھا، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے (لوگوں پر) مشہور کرے گا، پھر اسے رسوا کرے گا (عذاب دے گا) اور جس شخص نے کسی مومن مرد یا عورت پر بہتان باندھا یا اس کے متعلق وہ کہا جو اس میں نہیں تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے آگ کے ٹیلے پر کھڑا کرے گا یہاں تک کہ وہ نکل جائے اس سے جو اس نے کہا، اور بے شک مومن کی عظمت اور اکرام اللہ تعالیٰ کے ہاں مقرب فرشتے سے بھی زیادہ عظیم ہوگا، اور توبہ کرنے والے مومن مرد اور مومن عورت سے اللہ تعالیٰ کو کوئی اور چیز زیادہ پسند نہیں، اور بے شک مومن شخص کو اس طرح پہچان لیا جائے گا جیسا کہ انسان اپنے اہل و عیال کو پہچانتا ہے۔

غریب کی شان:

"عن حارثة بن وهب انه سمع رسول الله ﷺ یقول الااخبرکم باهل الجنة کل ضعیف مستضعف لو اقسم علی الله لأبره الااخبرکم باهل النار کل عتل جواظ جعظری مستکبر" (متفق علیه)

حضرت حارثہ بن وھب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں بے شک رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے میں نے سنا، کیا میں تمہیں جنتی لوگوں کی خبر نہ دوں؟ (ہاں جنتی لوگ) وہ غریب جنہوں نے اپنے آپ کو غربت میں رہنا پسند فرمایا، اگر وہ اللہ پر قسم اٹھائیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو پورا فرمادے گا، کیا میں تمہیں جہنمی لوگوں کی خبر نہ دوں؟ (ہاں جہنمی لوگ) وہ ہوں گے جو سخت جھگڑالو ہوں گے، بھلائی کا کوئی کام نہیں کریں گے اور فاجر ہوں گے، نازنخرے سے چلنے والے، اور اپنی جھوٹی تعریف کرنے والے ہوگے۔

(العتل الفظ الغليظ الشديد فى الخصومة الذى لا ينقاد لخبر والجواظ الفاجر المختال فى مشيته وقيل هوالقصير البطين والجعظرى الفظ الغيظ وقيل هوا لذى يتمدح بماليس فيه اوعند)

(ترجمہ حدیث کے ترجمہ میں دیکھیں)

☆ "عن اسامة بن زيد عن النبى ﷺ قال قمت على باب الجنة فكان عامة من دخلها المساكين' واصحاب الجد محبوسون غير ان اصحاب النار قد امر بهم الى النار وقمت على باب النار فاذاعامة من دخلهاالنساء" (متفق عليه)

اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں جنت کے دروازے پر کھڑا ہوا تو (دیکھا) کہ اس میں عام لوگ داخل ہونے والے مسکین (غریب) لوگ ہیں' اور مال داروں کو دروازے پر روک لیا گیا ہے۔ سوائے اس کے کہ ان میں سے جو جہنمی ہیں ان کو آگ میں داخل کر لیا گیا، اور میں جہنم کے دروازے پر کھڑا ہوا تو اس میں زیادہ عورتوں کو داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ (خازن)

عن سهل بن سعد رضى الله تعالى عنه قال مر رجل على رسول ﷺ فقال لرجل عنده جالس ماراٗيك فى هذا ؟ فقال رجل من اشرف الناس هذا والله' حرى ان خطب ان ينكح وان شفع ان يشفع' قال فسكت رسول ﷺ ثم مر رجل فقال له رسول ﷺ

مارأیک فی ھذا فقال یا رسول اللہ ھذا رجل من فقراء المسلمین ھذا حری ان خطب ان لا ینکح وان شفع ان لا یشفع وان قال ان لا یسمع لقولہ فقال رسول ﷺ ھذا خیر من ملأ الارض" (مثل ھذا رواہ البخاری)

سہل بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص رسول کریم ﷺ کے قریب سے گزرا تو آپ نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے ایک شخص سے پوچھا کہ اس کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ تو اس شخص نے کہا یہ بڑے امیر لوگوں سے ہے، قسم ہے اللہ کی یہ شخص ایسی صلاحیت کا مالک ہے کہ کہیں سے اپنے لئے رشتہ پوچھے تو اسے رشتہ دے دیا جائے (اس کی شادی کردی جائے) اور اگر یہ کسی کی سفارش کر دے تو اس کی سفارش کو قبول کرلیا جائے۔ راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ خاموش رہے۔ پھر ایک اور شخص کا گزر ہوا تو آپ نے اس شخص سے پوچھا اس کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے تو اس نے کہا یہ تو ایک غریب مسلمان ہے اس کی صلاحیت تو اتنی ہی ہے کہ اگر رشتہ پوچھے تو رشتہ نہ ملے اور اگر کسی کی سفارش کرے تو سفارش قبول نہ کی جائے اور کوئی بات کرے تو نہ سنی جائے۔ تو (یہ سن کر) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ (فقر) بہتر ہے بھری ہوئی زمین کے خزانوں سے۔ (مظہری)

نصیحت آموز واقعہ:

بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سفر میں ایک یہودی بھی تھا' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس تین روٹیاں تھیں، آپ نے وہ روٹیاں یہودی کو دیں، ان کو اپنی حفاظت میں رکھو' کچھ دیر کے بعد یہودی نے ایک روٹی کھالی۔ جب عیسیٰ علیہ السلام نے روٹیاں طلب کیں تو اس نے آپ کو دو روٹیاں دیں، آپ نے پوچھا تیسری روٹی کہاں ہے؟ وہ کہنے لگا روٹیاں ہی دو تھیں' اس سے زائد کوئی روٹی نہیں تھی۔ (آپ اس کی بات سن کر خاموش رہے) دونوں چلے یہاں تک کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے رب تعالیٰ کی قدرت کے عجائب دیکھے، تو آپ نے اس یہودی سے قسم دلا کر سوال کیا کہ روٹیاں کتنی تھیں؟ خیال کیا شاید یہ اقرار کرلے' لیکن اس نے اقرار نہ کیا۔ آگے چلے تو عیسیٰ علیہ السلام کو

سونے کی تین اینٹیں ملیں' یہودی کہنے لگا ان کو تقسیم کرو۔ آپ نے فرمایا ٹھیک ہے ایک میری اور ایک تمہاری اور ایک جس شخص نے روٹی کھائی' وہ یہودی کہنے لگا، تیسری روٹی تو میں نے ہی کھائی تھی۔ آپ نے فرمایا جا مجھ سے دور ہو جا' رب تعالیٰ کے قدرت کے عجائب دیکھ کر قسم طلب کرنے پر تو نے اقرار نہ کیا' اب دنیا کے مال کو دیکھ کر تو نے اقرار کر لیا۔ آپ نے وہ سونے کی تینوں اینٹیں اس کو دے دیں' اور آپ خود چلے گئے۔

یہودی اپنے ساتھ سونے کی تین اینٹیں لے کر چل رہا تھا، اسے راستے میں تین چور مل گئے' انہوں نے یہودی کو قتل کر دیا اور سونے کی تینوں اینٹیں لے لیں۔

پھر انہوں نے اپنے ایک ساتھی کو کھانا لینے کے لئے شہر بھیجا' جب وہ چلا گیا تو دونوں نے مشورہ کیا کہ جب کھانا لے کر وہ ہمارا ساتھی آئے گا تو ہم اس کو قتل کر دیں گے تاکہ یہ سونا دو حصوں میں تقسیم ہو جائے' تین حصے نہ کرنے پڑیں۔ ادھر کھانا لینے کے لئے جانے والے کے دل میں خیال آیا کہ کھانے میں زہر ملا دیا جائے تاکہ وہ دونوں مر جائیں اور سونا سارا میرے ہاتھ آ جائے' اس نے زہر خرید کر کھانے میں ملا دیا۔ جب وہ کھانا لے کر آیا تو ان دونوں نے اسے قتل کر دیا۔ اور یہ دونوں زہر آلود کھانا کھا کر مر گئے۔

پھر عیسیٰ علیہ السلام کا واپسی میں وہاں سے گزر ہوا، دیکھا کہ یہودی اور تین شخص مرے ہوئے ہیں' آپ نے تعجب فرمایا کہ ان کو کیا ہوا، تو جبرائیل نے آ کر آپ کو اصل تمام واقعہ کی خبر دی۔ (روح البیان)

فوائد:

"فینبغی للعاقل ان لا یغتر بکثرۃ الدنیا و ان لا یھتم فی جمعھا بل یزرع فیھابذر العمل کی یحصد فی الآخرۃ لان الدنیا مزرعۃ الآخرۃ"

عقل مند شخص کو چاہئے کہ وہ زیادہ دنیا کے مال پر دھوکا نہ کھائے' اور نہ ہی زیادہ مال جمع کرنے کا اہتمام کرے، بلکہ دنیا میں نیک عمل کا بیج بوئے تاکہ آخرت میں کاٹ لے' کیونکہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔

" ولا ینبغی للاغنیاء ان یحقروا الفقراء بالغرور بکثرة دنیاهم ولا یسخروا منهم لان هذه الصفة من صفات الکفرة "

غنیوں کو یہ نہیں چاہئے کہ وہ مال ودولت کی کثرت کے نشہ میں غریبوں کو حقیر سمجھیں ، یہ صفت تو کافروں کی ہے۔ (روح البیان)

فائدہ جلیلہ:

آیۃ کریمہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں پر ملکوت کے دروازے کھول دیتا ہے۔اوران کو اپنے ملک وملکوت کی نشانیاں دکھا دیتا ہے، جب بندہ اپنے احوال کو بدل دے اور سب کچھ اپنا ہی مال سمجھنا ہی شروع کردے، اوراپنی خواہشات نفسانیہ کے مطابق عمل کرے، بلکہ اپنی خواہشات کے مطابق اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو بدل دے تو اس کے لئے یہ وعید ہے " فان الله شديد العقاب " بے شک اللہ سخت عذاب والا ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ بھی بندے کے احوال کو بدل دیتا ہے اوراپنی نعمتیں اوراسے دیئے ہوئے کمالات اس سے دور کردیتا ہے۔

" ان الله لا يغير مابقوم حتى يغيروا مابانفسهم "

بے شک اللہ نہیں بدلتا کسی قوم کو یہاں تک کہ وہ خود اپنے آپ کو بدل لیں۔

جب بندہ گناہوں سے توبہ نہیں کرتا، گناہوں پر قائم رہتا ہے۔

" فيعاقبه الله بزوال نعمته في الدنيا ودوام النعمة في العقبى "

تو اللہ تعالیٰ دنیا میں اس سے اپنی نعمتوں کو زائل کرکے اسے عذاب دیتا ہے اورآخرت میں اسے دائمی عذاب دے گا۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ دنیا دار کا دنیا سے محبت کرنا اور دنیا ات مزین کرکے دکھانا اوراس کا غریبوں سے مزاح اڑانا، یہ اس کے لئے شدید عذاب ہے کیونکہ یہ شدید عذاب کے ذرائع ہیں۔ (از روح البیان)

☆☆☆☆☆☆

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَ
اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ
وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا
بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ وَ
اللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ☆ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۱۳)

﴿۱﴾

لوگ ایک دین پر تھے پھر اللہ نے انبیاء بھیجے خوشخبری دیتے اور ڈر سناتے اور ان کے ساتھ سچی کتاب اتاری کہ وہ لوگوں میں ان کے اختلافوں کا فیصلہ کر دے، اور کتاب میں اختلاف انہوں نے ڈالا، جن کو دی گئی بعد اس کے کہ ان کے پاس روشن حکم آچکے آپس کی سرکشی سے تو اللہ نے ایمان والوں کو وہ حق بات سوجھا دی جس میں جھگڑ رہے تھے اپنے حکم سے اور اللہ جسے چاہے سیدھی راہ دکھا دے۔

﴿۲﴾

تھے لوگ ایک گروہ، تو بھیجا اللہ نے نبیوں کو بشارت دینے والے اور ڈرانے والے (بنا کر) اور اتاری ان کے ساتھ کتاب حق کے ساتھ (سچی کتاب) تاکہ فیصلہ کرے درمیان لوگوں کے اس چیز میں جس میں وہ اختلاف رکھتے، اور نہیں اختلاف کیا اس میں سوائے ان لوگوں کے جن کو عطاء کی گئی وہ (کتاب) اس کے بعد جب آگئیں ان کے پاس روشن دلیلیں، آپس میں سرکشی کرتے ہوئے، تو ہدایت دی اللہ نے ایمان والوں کو اس چیز کی جس میں وہ اختلاف کر رہے تھے

(ہدایت دی ان کو) حق کی اپنے حکم سے، اور اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھی راہ کی۔

ماقبل سے تعلق:

اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں ذکر کیا گیا کہ کفار کا اپنے کفر پر اصرار تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ دنیا سے محبت کرتے تھے، یعنی دنیا کی محبت کی وجہ سے وہ ایمان لانے سے دور رہے۔

اب اس آیۃ کریمہ میں ذکر کیا گیا کہ ان لوگوں کا کفر پر قائم رہنا اس زمانہ سے خاص نہیں بلکہ وہ پہلے زمانہ میں بھی یہی کرتے رہے کہ لوگ ایک گروہ تھے، دین حق پر قائم تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کی تبلیغ کے لئے انبیاء کرام کو بھیجا، تاکہ وہ سیدھی راہ پر چلنے اور نیکی پر قائم رہنے والوں کو جنت کی اور جزاء خیر کی بشارت دیں اور ان انبیاء کرام کے ساتھ سچی کتاب نازل فرمائی کہ جب ان کی امتوں کا اختلاف ہو جائے تو وہ کتاب کے احکام سے فیصلہ کریں، لیکن انہوں نے روشن دلائل اور واضح نشانیاں آ جانے کے باوجود آپس میں ایک دوسرے سے اختلاف شروع کر دیا۔

" وما كان اختلافهم الا بسبب البغي والتحاسد والتنازع في طلب الدنيا "

اور ان کا اختلاف صرف سرکشی اور حسد کی وجہ سے تھا، اور ان کا جھگڑا دنیا کی طلب کے لئے تھا۔

البتہ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو اختلاف کرنے کے باوجود اپنی مہربانی اور توفیق سے حق راہ کی ہدایت دی جس کی وجہ سے ان کے وہ اختلافات نہ رہیں جو کفر تک پہنچا دینے والے تھے اللہ تعالیٰ جسے چاہے سیدھی راہ کی ہدایت دیتا ہے۔

یہ بھی خیال رہے جو اختلافات کی وجہ سے کفر تک پہنچے وہ کافر ہی ہوئے ایمان والے رہے ہی نہیں۔

قرآن پاک عظیم کتاب ہے:

"کان الناس امۃ واحدۃ" (لوگ ایک گروہ تھے) یہ جملہ بہت مختصر ہے لیکن بہت بڑے مطالب کو حاوی ہے۔

'' امة '' کالفظ ائتمام سے لیا ہوا ہے جس کا معنی ہے اقتداء کرنا' مطلب یہ ہوا۔

'' القوم المجتمعون علی الشیٔ الواحد یقتدی بعضھم ببعض ''

کہ تمام قوم ایک چیز پر متفق تھی بعض لوگ دوسرے بعض کی اقتداء کرتے تھے۔

(۱) اس کے مختلف مطالب میں سے ایک یہ ہے کہ.....

'' انھم کانوا علی دین واحد وھو الایمان والحق ''

وہ تمام ایک دین یعنی ایمان اور حق پر قائم تھے' پھر انہوں نے آپس میں اختلاف شروع کر لئے۔

ان کے معمولی اختلافات پر اللہ تعالیٰ نے انبیا کرام کو بشیر ونذیر بنا کر بھیجا اور ان کے ساتھ فیصلہ کرنے کے لئے کتاب بھی نازل کر دی لیکن انہوں نے ان واضح دلائل کے آجانے کے بعد زیادہ ہی اختلاف شروع کر دیا۔ وجہ اس کی ان لوگوں کی سرکشی تھی جس کی وجہ سے انہوں نے انبیاء کرام سے حسد شروع کر دیا اور حسد کی وجہ سے ہی وہ کفر تک پہنچ گئے۔ اس وجہ کے مطابق ''فبعث اللہ '' میں ''فا '' کا تعقیب کے لئے ہونا بھی واضح ہو گیا ان کے کچھ اختلافات کے بعد انبیا کرام کو بھیجا گیا۔

(۲) یہ آیۃ اس واقعہ کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہے کہ آدم علیہ السلام کو جب ان کی اولاد کی طرف مبعوث فرمایا تو اس وقت تمام ایک گروہ تھے، دین حق پر قائم تھے، کوئی دین باطل پر نہ تھا' یہاں تک قابیل نے ہابیل کو حسد اور سرکشی کی وجہ سے قتل کر دیا۔ اب آیۃ کریمہ کا مفہوم یہ بھی ہو گیا۔

'' ان الناس وھم آدم واولادہ من الذکور والاناث کانوا امة واحدة علی الحق ثم اختلفوا بسبب البغی والحسد ''

بیشک لوگ یعنی آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد مذکر اور مونث سب ایک گروہ تھے، دین حق پر قائم تھے، پھر انہوں نے آپس میں ایک دوسرے سے سرکشی اور حسد کی وجہ سے اختلاف کیا۔

(۳) اس آیۃ کریمہ کا ایک مطلب یہ ہے۔

'' لما غرقت الأرض بالطوفان لم یبق الا اھل السفینة وکلھم کانوا علی الحق والدین الصحیح ثم اختلفو بعد ذلک ''

کہ جب حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں طوفان آیا تو کافر تمام غرق ہو گئے، صرف کشتی والے باقی رہ گئے وہ تمام ہی ایک دین حق پر قائم تھے، بعد میں انہوں نے ایک دوسرے سے اختلاف شروع کر دیئے۔

ان دلائل سے واضح ہوا کہ تمام لوگ پہلے دین حق پر تھے، اختلاف بعد میں پیدا کئے گئے۔

تنبیہ: آدم علیہ السلام کے وصال کے بعد اور نوح علیہ السلام کی بعثت سے پہلے اکثر لوگ کافر ہو گئے تھے، یہ آیہ کریمہ اپنے مفہوم سے ان کو بھی شامل ہے کہ کسی ایک وقت میں سب لوگ کفر پر متفق ہو گئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو بشیر و نذیر بنا کر مبعوث فرمایا اور ان کے ساتھ کتاب کو نازل کیا، لیکن پھر بھی وہ تمام ایمان نہ لائے بلکہ کچھ لوگ ایمان لائے اور کچھ لوگوں نے سرکشی اور حسد کی وجہ سے اختلاف کیا۔

ایک اور مطلب:

اہل کتاب نے موسیٰ علیہ السلام پر جب ایمان لایا تو تمام ہی ایک گروہ تھے، ایک دین اور ایک مذہب پر قائم تھے۔" ثم اختلفوا بسبب البغی والحسد فبعث اللہ النبین"

پھر انہوں نے سرکشی اور حسد کی وجہ سے اختلاف کیا تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو مبعوث فرمایا۔ (ماخوذ از کبیر)

فبعث اللہ النبیین مبشرین ومنذرین وانزل معھم الکتاب بالحق:

(۱) تو بھیجا اللہ نے نبیوں کو بشارت دینے والے اور ڈرانے والے (بنا کر) اور اتاری ان کے ساتھ کتاب حق کے ساتھ (یعنی کتاب)۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو ایمان والوں کے لئے اور نیک، متقی لوگوں کے لئے بشارت دینے والا بنا کر بھیجا، اور کافروں اور گنہگار لوگوں کے لئے ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔

رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ میں انبیاء کرام کی تین صفات بیان فرمائی ہیں۔

پہلی صفت: " کو نهم مبشرین"

دوسری صفت: " کو نهم منذرین"

یعنی ان کا بشارت دینے والا ہونا، اور ان کا ڈرانے والا ہونا۔

بشارت کو پہلے ذکر کرنے کی وجہ:

انبیاء کرام کے بشیر ہونے کا ذکر پہلے کیا، اس لئے کہ بشارت حفظ صحت کے قائم مقام ہے، اور ''انذار'' (ڈرانا) مرض کو زائل کرنے کے قائم مقام ہے۔

"ولا شک ان المقصود بالذات هو الاول دون الثانی فلا جرم تقدیمه فی الذکر"

اس میں کوئی شک نہیں کہ مقصود بالذات صحت کی حفاظت ہے، اسی کے لئے مریض ہونے کے بعد دوا لینے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

اسی طرح انبیاء کرام کو بھیجنے کا اصل مقصد ہی یہ ہے کہ ان کی دعوت پر لوگ ایمان لے آئیں، اور یہ ان کو بشارت دیں، لیکن اگر وہ اپنے دل کی مرض کی وجہ سے ایمان نہ لا سکیں تو پھر ان کو ڈرانے کی دوا دیں، اگر وہ ڈانے سے بھی اپنی مرض کو زائل نہ کر سکیں تو لا علاج مریض کی طرح ہلاکت کے گڑھے میں پہنچ جائیں۔

تیسری صفت: انبیاء کرام کی تیسری صفت۔

" وانزل معهم الکتاب بالحق " اور نازل کی ان کے ساتھ سچی کتاب۔

اعتراض:

"ظاهر هذه الآیة یدل علی انه لا نبی الا معه کتاب منزل فیه بیان الحق"

اس آیۃ کریمہ کے ظاہری مضمون سے تو یہ پتہ چل رہا ہے کہ ہر نبی کو کتاب دی گئی جو حق و سچ پر مشتمل تھی،

حالانکہ کتابیں کل ایک سو چار نازل ہوئیں، چار مشہور ہیں ۔تورات، حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی ،اور زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر، اور انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر، اور قرآن پاک نبی کریم ﷺ پر، اور ایک سو صحیفے نازل ہوئے جن میں دس حضرت آدم علیہ السلام پر اور تیس حضرت شیث علیہ السلام پر، اور پچاس ادریس علیہ السلام پر اور دس حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات کے نازل ہونے سے پہلے نازل ہوئے ،تو آیت کریمہ کا مطلب کیا ہوگا کہ تمام انبیاء کرام کے ساتھ کتاب نازل ہوئی۔

جواب:

یہاں کتاب سے مراد احکام ہیں کہ ہر نبی کو سچے احکام (اوامر ونواہی) عطاء کئے گئے۔

" والمراد انه طال ذلک الکتاب ام قصر ،ودون ذلک الکتاب اولم یدون وکان ذلک الکتاب معجزا اولم یکن کذلک لان کون الکتاب منزلا معهم لا یقتضي شیأ من ذلک "

یہاں جس کتاب کا ذکر ہے اس سے مراد عام ہے کہ وہ کتاب بڑی ہو یا چھوٹی ہو، اس کی تدوین کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو، وہ کتاب معجز ہو یا نہ ہو۔ کیونکہ کتاب کا نازل کیا جانا ان میں سے کسی چیز کا بھی تقاضا نہیں کرتا۔ لہٰذا واضح ہوا کہ مراد احکام ہیں جو ہر نبی کو عطا کئے گئے ہیں۔

(ماخوذ از کبیر و روح المعانی)

انبیاء کرام کی تعداد کے متعلق عقیدہ:

اگرچہ مشہور روایت یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے، لیکن ایک روایت میں دو لاکھ چوبیس ہزار کا ذکر ہے اور ایک روایت میں آٹھ ہزار کا بھی ذکر ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ عقیدہ یہ ہو کہ جتنے انبیاء کرام رب تعالیٰ کی طرف سے آئے ان پر میرا ایمان ہے، وہ سب برحق تھے، سب ہی سچے نبی تھے۔ لیکن معین تعداد نہ ذکر کی جائے کیونکہ ایسا نہ ہو کہ یہ تعداد کم ذکر کرے اور واقع میں زائد ہوں۔ یا ایسا نہ ہو کہ یہ تعداد زائد ذکر کرے واقع

میں کم ہوں۔

پہلی صورت میں کئی انبیاء کرام پر ایمان نہیں ہوگا اور دوسری صورت جو نبی نہیں ہوں گے ان کو نبی ماننا لازم آئے گا۔

اس لئے دونوں صورتوں میں خرابی لازمی آتی ہے۔لہٰذا یہی صورت بہتر ہے کہ ایمان رکھے،اے اللہ تیری طرف سے بھیجے ہوئے تمام انبیاء کرام پر میرا ایمان ہے کہ وہ برحق تھے۔ (از شرح عقائد)

وہ انبیاء کرام جن کے اسماء گرامی قرآن پاک میں ہیں:

وہ کل چھبیس ہیں۔اٹھارہ کا ذکر ان آیات میں موجود ہیں۔

" وتلک حجتنا ابراهیم علی قومه نرفع درجات من نشاء ان ربک حکیم علیم☆ ووهبنا له اسحاق ویعقوب کلاهدینا ونوحاهدینا من قبل ومن ذریته داؤد وسلیمان وایوب ویوسف وموسی وهارون وکذلک نجزی المحسنین☆ وزکریا ویحیی وعیسی والیاس کل من الصالحین☆ واسمعیل والیسع ویونس ولوطا وکلا فضلنا علی العالمین☆" (سورة الانعام آیات، ۸۳تا ۸۶)

اور آٹھ کا ذکر مختلف آیات میں ہے۔

آدم،ادریس،ھود،صالح،شعیب،ذوالکفل،عزیر اور محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام۔ (از مظہری)

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

"بالحق "حال من الکتاب ای متلبسا بالحق شاهدا به "

یعنی "بالحق " الکتاب سے حال واقع ہو رہا ہے،معنی یہ ہے کہ نازل کی ان کے ساتھ کتاب جو حق کے ساتھ متلبس (ملی ہوئی ہے)،اور حق کی شہادت دیتی ہے۔

اعلیٰ حضرت نے آسان ترجمہ فرمایا ''اتاری ان کے ساتھ سچی کتاب''

ذرا اور توجہ:

'' لیحکم بین الناس '' تاکہ فیصلہ کرے درمیان لوگوں کے۔

''لیحکم '' میں ضمیر فاعل کے مرجع میں تین احتمال ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ ضمیر '' الکتاب '' کی طرف لوٹے جو قریب ہے۔

(۲) دوسرا احتمال یہ ہے کہ ضمیر ''النبین ''میں واحد ''النبی ''کی طرف لوٹے۔

(۳) تیسرا احتمال یہ ہے کہ ضمیر لفظ ''اللہ '' کی طرف لوٹے۔

ہرایک احتمال درست ہے، بلکہ راقم کے نزدیک تمام احتمالات ہی بیک وقت پائے گئے ہیں۔

جب ضمیر '' اللہ '' کی طرف لوٹے تو معنی یہ ہوگا '' تاکہ فیصلہ کرے اللہ تعالیٰ بندوں کے درمیان''

یہ معنی اس لئے بہتر ہے کہ حقیقی حاکم اور فیصلہ کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ کتاب حقیقی طور پر فیصل تو نہیں۔

اور اگر ضمیر ''النبی ''کی طرف لوٹے تو یہ اس لئے بہتر ہے کہ رب قدوس کے فیصلہ کو ظاہر کرنے والے انبیاء کرام ہی ہیں۔

''الکتاب'' کی طرف لوٹے تو یہ بھی بہتر ہے، اگرچہ حقیقی حاکم تو اللہ تعالیٰ ہی ہے، لیکن یہ مجاز بھی زیادہ مشہور ہے، کیونکہ کہا جاتا ہے ''حکم الکتاب بکذا'' کتاب کا فیصلہ اس طرح ہے۔ اور کہا جاتا ہے ''قضی کتاب اللہ بکذا '' اللہ کی کتاب کا فیصلہ اس طرح ہے، اور کہا جاتا ہے '' رضینا بکتاب اللہ '' اللہ کی کتاب کے فیصلہ پر ہم راضی ہیں۔

تنبیہ: راقم نے ترجمہ میں مطابق [illegible] ''تاکہ فیصلہ کرے لوگوں کے درمیان''

اس لئے کہ اگر یوں کہہ دیا جائے تو حسین جمیل مطلب نکھر کر واضح ہو جائے گا، اور ان کے ساتھ کتاب نازل کی تاکہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے لوگوں کے درمیان ان کے اختلافات میں فیصلہ فرما کر انبیاء کرام کے

ذریعے اس فیصلہ کو ظاہر کردے، یعنی انبیاء کرام ان کو مطلع کردیں۔

طلباء کرام راقم کی اس وضاحت کو غور سے پڑھیں تو واضح ہو جائے گا کہ اس مطلب میں حقیقۃ ومجاز کا کوئی اجتماع نہیں، بلکہ معنی فقط حقیقی ہے، البتہ اس کی وضاحت کردی گئی۔

"فیما اختلفوا فیه": (تاکہ فیصلہ کرے لوگوں کے درمیان) اس چیز میں جس میں وہ اختلاف رکھتے۔

"فیه" کی ضمیر میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ "الکتاب" کی طرف لوٹے، وہ کتاب میں اختلاف رکھتے اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ "الحق" کی طرف لوٹے کہ وہ دین حق میں اختلاف رکھتے۔ اس احتمال کو علامہ رازی رحمہ اللہ نے راجح قرار دیا۔

"وما اختلف فیه الا الذین اوتوہ":

اور نہیں اختلاف کیا اس میں سوائے ان لوگوں کے جن کو دی گئی وہ (کتاب)۔

"فیه" کی ضمیر "حق" کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور "اوتوہ" میں ضمیر منصوب "الکتاب" کی طرف لوٹ رہی ہے۔

اب معنی یہ ہوا۔ "وما اختلف فی الحق الا الذین اوتوا الکتاب"

اور نہیں اختلاف کیا دین حق میں سوائے ان لوگوں کے جن کو کتاب دی گئی۔

حالانکہ کتاب کے نازل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اس میں وہ اختلاف نہ کریں اور دین میں جھگڑا ختم کردیں، لیکن انہوں نے مقصد سے ہٹ کر اختلاف شروع کرلیا۔

"من بعد ما جاءتهم البینات": اس کے بعد جب آگئیں ان کے پاس روشن دلیلیں۔

یعنی ان کو دلائل عقلیہ عطاء فرمائے جو ان کے لئے روشن دلیلیں تھیں۔ پھر ان پر کتاب نازل کرکے اور روشن دلائل سمعیہ عطاء فرمائے۔

"بغیابینهم": آپس میں سرکشی کرتے ہوئے۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر کتاب نازل فرما کر دلائل سمعیہ عطاء فرمائے، اور اس سے پہلے ان کو عقلی دلائل عطاء فرمائے، جو ان کے لئے روشن اور واضح دلائل تھے۔ جب رب تعالیٰ نے ان کو واضح اور مکمل دلائل عطاء فرما دیئے۔" ولم یبق فی العدول عذر و لاعلة " تو ان کے لئے اس سے منہ پھیرنے کے لئے کوئی عذر نہ رہا۔ اور نہ ہی ان کے لئے کوئی وجہ رہی کہ وہ کیوں اختلاف کرر ہے ہیں۔

"فلو حصل الاعراض والعدول لم یکن ذلک الا بحسب الحسد والبغی والحرص علی طلب الدنیا "

لیکن ان کا پھر اعراض کرنا اور رب تعالیٰ کے احکام ماننے سے عدول کرنا اور دین حق میں اختلاف صرف حسد اور سرکشی اور دنیا کے مال کے حرص کی وجہ سے تھا۔

"فهدی اللّٰہ الذین آمنوا لما اختلفوا فیه من الحق باذنه":

تو ہدایت دی اللہ نے ایمان والوں کو اس چیز کی جس میں وہ اختلاف کر رہے تھے (ہدایت دی ان کو) حق کی اپنے حکم سے۔

جب اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب اور کفار کا حال بیان کیا کہ وہ کامل اور روشن دلائل حاصل کرنے کے بعد سرکشی اور حسد کی وجہ سے سرکشی اور کفر پر قائم رہے۔

اب ان الفاظ مبارکہ سے نبی کریم ﷺ کی امت کا حال بیان فرمایا جارہا ہے۔

"فان اللہ عصمهم عن الزلل وهداهم الی الحق فی الاشیاء التی اختلف فیها اهل الکتاب "

کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو حق سے عدول کرنے سے بچالیا ہے اور جن چیزوں میں اہل کتاب نے اختلاف کیا تھا ان میں ایمان والوں کو حق کی ہدایت دے دی۔ (ماخوذ از کبیر)

" باذنه " ای بامره اوبتوفيقه وتيسيره "

یعنی اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو ہدایت دی حق کی جس میں وہ اہلِ کتاب اختلاف رکھتے تھے، یہ ہدایت اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے حکم اور اپنی توفیق سے دی، اور مومنوں کے لئے دین حق کی راہ آسان کر کے ان کو ہدایت عطاء فرمائی۔

اہلِ کتاب کے اختلاف کی وجوہ:

اہلِ کتاب کے اختلاف کی چند وجوہ تھیں، ان تمام اختلافات میں ایمان والوں کو حق راہ عطاء فرمائی۔

(۱) ان کا اختلاف تھا جمعہ کے دن کی عظمت میں، یہود نے ہفتہ کو معظم سمجھا، اور نصاریٰ نے اتوار کو معظم سمجھا۔

" فهدى الله تعالى امة محمد ﷺ ليوم الجمعة"

تو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی امت کو جمعہ کے دن کی ہدایت عطاء فرمائی کہ انہوں نے جمعہ کے دن کی عظمت کو سمجھا۔

(۲) اہلِ کتاب کا اختلاف قبلہ کے متعلق تھا۔ "فاستقبلت النصارى المشرق واليهود بيت المقدس "

نصاری نے مشرق کی جانب قبلہ بنایا، اور یہود نے بیت المقدس قبلہ بنایا۔

یعنی اگر چہ قبلہ دونوں فریقوں کا بیت المقدس ہی تھا، لیکن نصاریٰ نے اس کی مشرقی جانب کو قبلہ بنا رکھا تھا۔ اور یہود نے صخرۂ یعقوبی کی جانب کو قبلہ سمجھ رکھا تھا۔

" وهدى الله تعالى امة محمد ﷺ للقبلة "

تو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی امت کو قبلہ کی ہدایت عطاء فرمائی کہ تمہارا قبلہ کعبہ شریف ہے۔

(۳) "واختلفوا في الصلوة فمنهم من يركع ولا يسجد ومنهم من يسجد ولا يركع ومنهم يصلي وهو يمشي"

اہلِ کتاب کا نماز میں اختلاف تھا، ان میں سے کچھ لوگ نماز میں رکوع کرتے تھے اور سجدہ نہیں

کرتے تھے، اور کچھ لوگ سجدہ کرتے تھے، رکوع نہیں کرتے تھے اور کچھ لوگ نماز پڑھتے ہوئے آگے پیچھے چل لیتے تھے۔

" فهدى الله تعالى امة محمد ﷺ للحق من ذلک "

تو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی امت کو نماز کے متعلق حق راہ کی ہدایت فرمائی کہ نماز ادا کرو تو اس میں رکوع کرو اور سجدہ بھی کرو اور نماز اطمینان سے ادا کرو، نماز میں چلنے سے نماز فاسد ہوگی۔ یہ تمام ہدایت مصطفیٰ کریم ﷺ کی زبان مبارک سے دی، کیونکہ نماز کی وضاحت حبیب پاک علیہ التحیۃ والثناء نے فرمائی۔

(۴) "واختلفوا فى الصيام فمنهم من يصوم النهار و الليل و منهم من يصوم عن بعض الطعام"

اہلِ کتاب کا روزوں میں اختلاف پایا جاتا تھا۔ بعض لوگ دن کو بھی روزہ رکھتے تھے اور رات کو بھی، اور ان میں سے بعض لوگ کچھ کھانے کی چیزوں سے روزہ رکھتے تھے کہ یہ چیزیں نہیں کھانی، اور کئی کھانے کی چیزیں روزے میں بھی کھا لیتے تھے ان سے پرہیز نہیں کرتے تھے۔

" فهدى الله تعالى امة محمد ﷺ للحق من ذلک "

تو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی امت کو روزہ کے متعلق حق راہ کی ہدایت دی کہ روزہ صبح صادق سے غروبِ آفتاب تک ہے، اور کوئی چیز بھی نہیں کھانی، ورنہ روزہ ٹوٹ جائے گا۔

(۵) "واختلفوا فى ابراهيم عليه الصلوة والسلام فقالت اليهود كان يهوديا وقالت النصارى كان نصرانيا"

اہلِ کتاب کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق اختلاف پایا جاتا تھا، یہودیوں کا دعویٰ تھا کہ آپ یہودی تھے اور نصرانیوں کا دعویٰ تھا کہ آپ نصرانی تھے۔

" فهدى الله تعالى امة محمد ﷺ من ذلک انه كان حنيفا مسلما "

تو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی امت کو اس میں ہدایت عطاء فرمائی کہ ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ ہی نصرانی تھے، بلکہ ہر باطل سے جدا مسلمان تھے۔

(۲) "واختلفوا فی عیسی علیه السلام فکذبت به الیهود وقالوا الامّه بهتاناعظیماو جعلته النصاری الهاوولدا"

اہلِ کتاب نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اختلاف کیا، یہود نے آپ کی تکذیب کی اور معاذ اللہ آپ کی والدہ پر بہتان لگایا اور نصرانیوں نے آپ کو معبود اور خدا کا بیٹا مانا۔

" فهدی الله امة محمد ﷺ للحق من ذلک انه روح الله و کلمته "

تو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی امت کو اس معاملہ میں حق کی راہ عطاء کی کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے نبی اور روح اللہ اور کلمۃ اللہ تھے۔ ان کو جھوٹا کہنے والے جھوٹے ہیں۔ اور ان کو معبود اور خدا کا بیٹا کہنے والے بھی جھوٹے اور باطل راہ پر ہیں۔ (از روح المعانی)

تنبیہ: زیادہ مناسب یہ ہے کہ "باذنه" کا تعلق "فاهتدوا" محذوف سے ہو جائے، تاکہ ھدایۃ اور اھتداء میں مغایرت ثابت ہو جائے، جس طرح ایمان اور ہدایت دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں اور توفیق ایمان اور ایمان دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں، اسی طرح ہدایت دینا اور ہدایت حاصل کرنا دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔

اب اس تقدیر سے مطلب یہ ہوگا، اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو حق کی ہدایت دی جس میں وہ اختلاف کر رہے تھے تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی توفیق سے ہدایت حاصل کر لی۔ (از کبیر)

"والله یهدی من یشاء الی صراط مستقیم":

اور اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہے سیدھی راہ کی طرف۔

یہ جملہ پہلے جملہ کی تاکید ہے۔ کیونکہ پہلے ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو ہدایت دیتا ہے۔ اب فرمایا کہ اس کے قبضہ اختیار میں ہے جسے چاہے ہدایت دے۔

ایمان والوں کی شان حدیث پاک سے:

"واخرج عبدالرزاق وابن جریر وابن المنذروابن ابی حاتم عن ابی هریرة فی قوله

فهدی الله الذین آمنو الما اختلفوا فیه من الحق با ذنه قال قال النبی ﷺ نحن الاولون والآخرون، الاولون یوم القیامة واول الناس دخولا الجنة بیدانهم اوتوا الکتاب من قبلنا واوتیناه من بعدهم فهدانا الله لما اختلفوا فیه من الحق فهذا الیوم الذی اختلفوا فیه فهدانا الله فالناس لنا فیه تبع فغد للیهود وبعد غد للنصاری "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہم اول بھی ہیں اور آخر بھی ۔ قیامت کے دن ہم اول ہوں گے، کیونکہ سب لوگوں سے پہلے جنت میں ہم داخل ہوں گے، اور لوگ ہمارے پیچھے ہوں گے۔ سوائے اس کے کہ ان لوگوں کو کتاب ہم سے پہلی دی گئی اور ہمیں ان سے بعد دی گئی، اللہ تعالیٰ نے ہمیں حق راہ کی ہدایت کی جس میں وہ اختلاف رکھتے تھے، یہود ایک دن کے وقفہ سے ہمارے پیچھے ہوں گے اور نصاریٰ دو دن کے وقفہ سے پیچھے ہوں گے۔ (درمنثور)

یہ خیال رکھیں کہ یہود ونصاریٰ سے مراد وہ لوگ ہیں جو نبی کریم ﷺ سے تشریف لانے سے پہلے انبیاء کرام پر ایمان لانے والے تھے اور اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے ان کی وفات ہوئی۔

نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے کے بعد پہلی شریعتیں منسوخ ہوگئیں، جن یہود ونصاریٰ نے آپ پر ایمان نہیں لایا وہ کافر ہیں، کافروں کی بخشش نہیں ہوگی، اس لئے ان کا جنت میں داخلہ نہیں ہوگا۔

تنبیہ:

اہل کتاب کے اختلاف کی جو وجوہ بیان کی گئیں روح المعانی کے حوالے سے وہ تمام وجوہ ابن شیخ نے عبدالرحمٰن بن زید کی اپنے باپ کی روایت سے بیان کی ہیں۔

نبی کریم ﷺ دعاء فرماتے تھے:

"عن عائشة ان رسول الله ﷺ کان اذا قام من اللیل یصلی یقول" اللهم رب جبریل

ومیکائیل واسرافیل فاطر السموات والارض عالم الغیب والشهادة انت تحکم بین عبادک فیما کانوا فیه یختلفون اهدنی لما اختلف فیه من الحق باذنک انک تهدی من تشاء الی صراط مستقیم" (بخاری مسلم)

اے اللہ جبریل ومیکائیل واسرافیل کے رب، زمین وآسمان کو پیدا کرنے والے، ہر چھپی ہوئی اور ہر ظاہر چیز کو جاننے والے! تو اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ کرنے والا ہے جس میں وہ اختلاف کرتے تھے، مجھے اپنی توفیق سے ہدایت پر قائم رکھ، بے شک تو جسے چاہے سیدھی راہ کی ہدایت دیتا ہے۔

"اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارناالباطل باطله وارزقنا اجتنابه ولاتجعله متلبساعلینا فنضل واجعلنا للمتقین اماما" (بخاری ومسلم)

اے اللہ ہمیں حق راہ پر قائم رکھ، اور اس کی اتباع کی توفیق عطا فرما، کہ ہم باطل کو باطل سمجھیں، اور ہمیں باطل سے دور رہنے کی توفیق عطا فرما، ایسا نہ ہو کہ ہم باطل پر چل کر گمراہ ہو جائیں، اور ہمیں متقی لوگوں کا امام بنا۔ (ابن کثیر)

یہ دعائیں تعلیم امت کے لئے تھیں، اور بلندی درجات کے لئے تھیں، ورنہ نبی کا مقام بہت بلند ہے، باطل راہ پر چلنے اور گمراہ ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

☆☆☆☆☆

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ☆

(سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۱۴)

﴿۱﴾

کیا اس گمان میں ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے اور ابھی تم پر اگلوں کی سی روداد نہ آئی، پہنچی انہیں سختی اور شدت اور ہلا ہلا ڈالے گئے یہاں تک کہ کہہ اٹھا رسول اور ان کے ساتھ کے ایمان والے کب آئے گی اللہ کی مدد سن لو بیشک اللہ کی مدد قریب ہے۔

﴿۲﴾

کیا گمان کیا تم نے کہ تم داخل ہو جاؤ گے جنت میں، حالانکہ نہیں آئی تمہارے پاس مثل ان لوگوں کی جو گزر گئے تم سے پہلے، پہنچی ان کو شدت اور تکلیف، اور جھنجھوڑے گئے وہ، یہاں تک کہ کہنے لگے رسول، اور جن لوگوں نے ان کے ساتھ ایمان لایا کب آئے گی امداد اللہ کی خبردار (آگاہ ہو جاؤ) بیشک مدد اللہ کی قریب ہے۔

ماقبل سے تعلق:

اس سے پہلے سابقہ انبیاء کرام اور ان کی امتوں کے اختلاف کو ذکر فرمایا، اور ان کے اختلاف کے انجام کو ذکر کیا، ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو گیا کہ جب انبیاء کرام اور ان کے ساتھ والوں کو کفار کی جانب سے مصائب و آلام پہنچے تو انہوں نے صبر سے کام لیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی امداد سے نوازا۔

تو اس آیۂ کریمہ میں نبی کریم ﷺ اور آپ کی امت کو خطاب کیا گیا کہ کفار کی طرف سے پہنچائی جانے والی مصیبتوں اور تکلیفوں میں صبر سے کام لو، اللہ تعالیٰ کی طرف سے فتح و نصرت تمہیں ہی حاصل ہوگی۔ (تفسیر ابی السعود)

شانِ نزول:

نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام کو مشرکین اور یہود اور منافقین کی طرف سے بہت مصائب وآلام کا سامنا کرنا پڑا، پھر جنگوں میں کئی حضرات زخمی ہوئے اور مال اور جان کی قربانیاں پیش کی گئیں۔ جو بظاہر تکلیف دہ چیزیں تھی، اس لئے صحابہ کرام کی تسلی کے لئے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا گیا کہ تم سے پہلے بھی انبیاء کرام اوران کے ساتھ ایمان لانے والوں نے بہت تکالیف برداشت کیں، صبر سے کام لیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی امداد فرمائی، تم بھی صبر سے کام لو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہیں بھی امداد حاصل ہوگی۔

پہلے لوگوں کی تکالیف کے ذکر سے تسلی کیسے حاصل ہوتی ہے؟ "والمصیبة اذاعمت طابت" مصیبت جب عام ہوجاتی ہے تو اس کو برداشت کرنا آسان ہوجاتا ہے۔

اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے قرآن پاک میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آگ ڈالے جانے کا ذکر کیا، اور حضرت ایوب علیہ السلام پر تکالیف کے آنے کا ذکر کیا۔

"ومن امر سائر الانبیاء علیهم السلام فی مصابرتهم علی انواع البلاء ماصار ذلک فی سلوة المومنین"

اور دوسرے کئی انبیاء کرام پر تکالیف کے آنے اوران پر صبر کرنے کا ذکر کر کے مومنوں کو تسلی دی۔

آیۃ کریمہ اپنے مضمون کے لحاظ پر کئی واقعات پر مشتمل ہے:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام جب مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے تو آپ پر وہ بہت سخت مشکل وقت تھا، کیونکہ وہ اپنے مال مکہ مکرمہ میں چھوڑ آئے تھے اوران کے مکانات پر بھی مشرکین قابض ہو گئے تھے اور ادھر (مدینہ طیبہ میں) یہود آپ سے عداوت کر رہے تھے، تو آپ کو اور آپ کے صحابہ کرام کو اس آیۃ کریمہ سے تسلی دی گئی۔

(۲) اسی طرح غزوۂ احد میں مسلمان زخمی ہوئے اور ستر کی تعداد میں شہید ہوئے تو رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی،

نبی کریم ﷺ کے صحابہ کو کہنے لگا۔

"الی متی تقتلون انفسکم و ترجو ن الباطل ولو کان محمد نبیالماسلط اللہ علیکم الأسرو القتل"

کب تک تم اپنے آپ کو قتل کراتے رہو گے اور باطل باتوں پر (معاذ اللہ) کب تک امید لگائے رکھو گے، اگر محمد نبی ہوتے تو اللہ تعالیٰ تم پر قید اور قتل مسلط نہ کرتا۔

اس آیۃ کریمہ میں منافقوں کا بھی رد کیا گیا اور مسلمانوں کو تسلی بھی دی گئی۔

(۳) غزوۂ خندق میں مسلمانوں کو بہت مشقت برداشت کرنا پڑی، سخت سردی، کھانے پینے کی بہت کمی اور خندق کی کھدائی اور تمام کفار کی اتحادی فوجوں سے مقابلہ، اس پریشان کرنے والی حالت سے مسلمانوں کا حال یہ تھا "وبلغت القلوب الحناجر" اور دل گلوں کے پاس آگئے۔

اس آیۃ کریمہ میں اس مشکل حال میں صحابہ کرام کو تسلی دی گئی کہ یہ تمہارے قرب الٰہی کا ذریعہ ہے۔

مختصر مطلب:

مسلمانوں کو تسلی دی گئی اور ساتھ ہی یہ سمجھایا گیا کہ کیا تمہارا گمان یہ ہے کہ جنت جیسی عظیم نعمت تمہیں یوں ہی مل جائے نہیں یہ خیال نہ کریں، بلکہ یہ سمجھ لو کہ جنت کے حصول کے لئے تو بہت بڑی مشکلات سے گذرنا پڑتا ہے، ابھی تک تو تم پر وہ مصیبتیں نہیں آئیں جو تم سے پہلے لوگوں پر آئیں۔ جب وہ شدید مشکلات میں آئے تو اس وقت کے رسول اور ایمان والے کہنے لگے اللہ کی امداد کب آئے گی؟ تو بتایا گیا خبردار اللہ کی مدد قریب ہے۔

"ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ": کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

جلالین میں لفظ "ام" کا معنی "لکن" (لیکن) سے کیا گیا ہے کہ یہ "ام" منقطعہ ہے۔ لیکن علامہ رازی رحمہ

۔۔ نے اس مقام پر ''ام ''کو استفہام کے معنی میں رکھا ہے۔

آپ فرماتے ہیں''ھل''اور''ھمزہ'' استفہام کے لئے استعمال ہوتے ہیں جو ابتداء میں آتے ہیں۔جیسے کہا جائے''ھل عندک رجل'' یا کہا جائے''اعندک رجل'' (کیا کوئی مرد تمہارے پاس ہے)لیکن ''ام'' درمیان میں واقع ہوتا ہے،ابتداء میں نہیں آتا،اس لئے''ام عندک رجل''کہنا صحیح نہیں،ہاں البتہ ''ام'' سے پہلے کبھی استفہام ہوتا ہے اور کبھی نہیں۔

پہلے استفہام ہو جیسا کہ کہا جائے''انت رجل لا تنصف افعن جھل تفعل ھذا ام لک سلطان'' تو وہ شخص ہے کہ انصاف نہیں کرتا کیا جہالت کی وجہ سے یہ (بے انصافی) کرتا ہے یا تجھے بادشاہی حاصل ہے۔

جب پہلے استفہام نہ ہو جیسا کہ قرآن پاک میں'' الم ، تنزیل الکتاب لاریب فیہ من رب العالمین ام یقولو ن افتراہ''یہاں '' ام'' درمیان میں ہے لیکن اس سے پہلے بظاہر استفہام نہیں۔

البتہ بعض حضرات یہاں بھی اس پہلے استفہام مقدر مانتے ہیں،وہ مکمل تقدیر عبارت کی یوں مانتے ہیں۔

'' افیو منون بھذا ام یقولو ن افتراہ''

اس ضابطہ کے مطابق زیر بحث آیت کی وضاحت بھی اس عبارت سے کرنے پڑے گی۔

''(فھدی اللہ الذین امنو الما اختلفو افیہ من الحق باذنہ) فصبر و اعلی استھزاء قومھم، افتسلکون سبیلھم ام تحسبو ن ان تد خلو ا الجنۃ من غیر سلوک سبیلھم''

تو اللہ تعالی نے ایمان والوں کو اپنی توفیق سے حق راہ کی ہدایت کی کہ وہ جس میں اختلاف کر رہے،تو ایمان والوں نے اپنی قوم کے مزاح اڑانے پر صبر کیا،کیا تم ان کی راہ پر چلو گے یا یونہی گمان کرو گے کہ ان کی راہ پر چلنے کے بغیر ہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

البتہ یہ خیال رہے کہ یہاں استفہام انکاری ہے۔جس کا مطلب یہ کہ تمہیں مصائب وآلام کے برداشت کرنے کے بغیر، پہلے ایمان والوں کی راہ پر چلنے کے بغیر جنت میں داخل ہونے کا گمان نہیں کرنا چاہئے۔

ایک اور توجہ:

"حسب" کا جب مصدر "حسبان" (بالکسر) اور محسبة (بفتح المیم وکسر السین) ہوتو ماضی اور مضارع دونوں مکسور العین ہوں گے، اس وقت معنی ہوتا ہے سمجھنا اور گمان کرنا۔

لیکن جب مصدر "حسب" (بفتح الحاء وسکون السین) ہو۔ یا "حسبان" (بالضم) ہوتو اس وقت اس کی ماضی مکسور العین اور مضارع مفتوح العین ہوگا۔ اس صورت میں معنی ہوگا۔ "شمار کرنا، حساب کرنا"۔

لہٰذا طلباء کرام فرق ذہن میں رکھیں تاکہ معنی سمجھنے میں اور تلفظ صحیح کرنے میں آسانی ہو۔

البتہ ترجمہ کرتے وقت مصادر کا لحاظ کیا جائے گا، باب کا نہیں، کیونکہ "علم یعلم" باب سے بھی گمان کرنے کا معنی آتا رہتا ہے۔

"ولما یا تکم مثل الذین خلو امن قبلکم":

حالانکہ نہیں آتی تمہاری پاس مثل ان لوگوں کی جو تم سے پہلے گذر گئے۔

اس مقام میں "لما" نافیہ ہے، جس کا معنی ہوتا ہے "نہیں" یہاں "لما" ظرفیہ نہیں جس کا معنی ہوتا ہے "جبکہ"۔

"مثل" میم کے فتحہ اور کسرہ سے دو لغتیں ہیں، جس طرح "شبہ" شین کے فتحہ سے بھی استعمال ہوتا ہے اور کسرہ سے بھی۔

البتہ "مثل" میم کے فتحہ سے واقعہ عجیبہ کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسا کہ "وللہ المثل الاعلی" میں استعمال ہوتا ہے "ای الصفة التی لھاشان عظیم" یعنی رب تعالیٰ کی صفات کو عظیم حالت حاصل ہے۔

"مستھم البأساء والضراء": پہنچی ان کو شدت اور تکلیف۔

"البأساء" اسم ہے "البؤس" کا جس کا معنی ہے "شدت" یعنی فقر اور مسکینی۔

" والضراء ": اس کا معنی " البأساء " کے معنی کے قریب ہے، یعنی ضرر انداز (نقصان دینے والی) چیزوں کا وارد ہونا، یعنی مصائب وآلام کا پہنچنا اور خوف لاحق ہونا۔

یعنی " البأساء " کا مطلب ہے خیر اور منفعت کی وجوہ میں تنگی کو واقع ہونا، اور " الضراء " کا مطلب شر اور آفات اور تکالیف وغیرہ کے دروازے کھل جانا۔

یہاں تک مطلب:

اے مومنو! کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ صرف مجھ پر ایمان لا کر اور میرے رسول کی تصدیق کر کے تم سب سے پہلے جنت میں داخل ہو جاؤ گے، جبکہ تم ہر قسم کی عبادت بھی نہ کرو، اور پہلے ایمان والے لوگ جس طرح بہت بڑی تکالیف میں مبتلا ہوئے اسی طرح تمہیں کفار سے تکالیف بھی نہ پہنچیں اور تم فقر وفاقہ اور معیشت کی تنگی میں بھی مبتلاء نہ ہو، اور تم پر دشمن کے مقابل تکالیف بھی نہ آئیں۔

نہیں یہ تمہارا گمان درست نہیں، سب سے پہلے جنت میں داخل ہونے کے لئے اور رب تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے تمہیں کفار کی طرف سے پہنچائی جانے والی تکالیف کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان سے تمہیں مال وجان کی بازی لگا کر مقابلہ کرنا ہوگا اور فقر وفاقہ اور معیشت کی تنگی میں مبتلا ہو کر صبر کرنا ہوگا اور ہر قسم کے مصائب وآلام کو برداشت کرنا ہوگا، جب تم اس حال سے گذرو گے پھر تمہارا گمان درست ہوگا کہ ہمیں قرب الٰہی حاصل ہے، اور ہم سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔

" وزلزلوا ": اور وہ جھنجھوڑے گئے۔

" وزلزلوا " ای حرکوا بانواع البلایا والرزایا "

وہ مختلف قسم کی بلاؤں اور مصیبتوں سے حرکت دیئے گئے۔ زلزلہ میں مبتلاء ہوئے ہلا دیئے گئے۔

خیال رہے کہ یہ ہمارے محاورہ میں بھی استعمال ہے کہ فلاں شخص کو مصیبتوں نے ہلا کر رکھ دیا گیا۔

"حتی یقول الرسول والذین آمنوامعه متی نصراللّٰه الا ان نصر اللّٰه قریب":

یہاں یہاں تک کہ کہنے لگے رسول اوران سے ساتھ ایمان والے کب آئے گی اللہ کی مدد، خبردار بیشک اللہ کی مدد قرب ہے۔

یعنی تم سے پہلے ایمان والوں کو شدت اور تکلیف پہنچی اوران کو مصائب وآلام سے جھنجوڑا گیا، ان کو ہلا کر رکھ دیا گیا، یہاں تک کہ اس وقت کے رسول اوران کے ساتھ ایمان لانے والے کہنے لگے، اللہ کی مدد کب آئے گی، توان کو جواب دیا گیا تم آگاہ ہوجاؤ بیشک اللہ کی مدد قریب ہے۔

اعتراض:

"کیف یلیق بالرسول القاطع بصحة وعده ووعیده ان یقول علی سبیل الاستبعاد (متی نصر اللّٰه)"

یہ کس طرح کہنا صحیح ہوگا کہ اللہ کے رسول اس کی امداد کو بعید سمجھ کر یہ کہیں کہ اللہ کی مدد کب آئے گی، حالانکہ اللہ کے رسولوں کو تو یقین کا درجہ حاصل ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس امداد اور اجر و ثواب کا وعدہ کر رکھا ہے اس نے واقع ہونا ہی ہے، اور گناہوں کی وجہ سے اس نے جن سزاؤں کا ذکر کیا ہے اگر اس نے فضل نہ کیا بلکہ عدل کیا تو ان سزاؤں نے واقع ہونا ہی ہے۔

پہلا جواب: کفار کی طرف سے تکالیف کا پہنچایا جانا رسولوں کی شان کے منافی نہیں بلکہ رسول اپنی عظمت شان کی وجہ سے زیادہ ہی تکالیف میں مبتلا ہوتے ہیں۔ رب تعالیٰ نے فرمایا۔

" ولقد نعلم انک یضیق صدرک بما یقولو ن "

اورالبتہ تحقیق ہم جانتے ہیں بے شک آپ کا سینہ تنگ ہوتا ہے اس سے جو وہ کہتے ہیں۔

رسول اللہﷺ کوخطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ کفار کی باتوں سے جوآپ کے دل کوتکالیف پہنچتی ہے وہ ہمارے علم میں ہوتی ہے۔

رسولوں کا سوال اس لئے نہیں تھا کہ وہ مایوس ہو گئے تھے، بلکہ سوال اس لئے تھا کہ امت کے لوگوں کورب تعالیٰ سے جواب ملنے پرتسلی ہوجائے، اوروقت کاتعین ہوجائے، اگر چہ رب تعالیٰ کی طرف سے امداد تو حاصل ہونی ہی ہونی ہے۔ جب رب تعالیٰ کی طرف سے جواب مل گیا " الا ان نصر الله قريب " (خبردار اللہ کی مدد قریب ہے) تووہ لوگ مطمئن ہو گئے، رسولوں کے سوال کا یہی مقصد تھا۔

دوسرا جواب : یہی جواب خوب سے خوب تر اورزیادہ تحقیق پرمبنی یہی جواب ہے۔آیئے جواب سنیئے۔

اللہ تعالیٰ نے خبردی " حتى يقول الرسول والذين امنوا معه " یہاں تک کہ رسول کہنے لگے، اور جو لوگ ان کے ساتھ ایمان لائے وہ کہنے لگے۔ (یعنی رب تعالیٰ نے یہ بتایا کہ رسول بھی کلام فرمارہے تھے اورایمان والے بھی کلام فرمارہے تھے) اس کے بعدرب تعالیٰ نے دوکلاموں کا ذکر فرمایا۔ ایک "متى نصر الله" اوردوسرا کلام "الاان نصر الله قريب" ذکرفرمایا۔

- "فو جب اسناد كل واحدمن هذين الكلامين الى واحد من ذينك المذكورين "

اس لئے ضروری ہے کہ دونوں کلاموں میں ہرایک کاتعلق پہلے جو دوقول ذکر کئے ہیں ان کے ساتھ کیا جائے۔ ایک کاتعلق ایک قول سے ہوجائے اوردوسرے کاتعلق ایک اور سے ہوجائے۔

حاصل کلام یہ ہے۔

"فالذين امنوا قالوا "متى نصر الله " والرسول قال " الاان نصر الله قريب "

ایمان والوں نے کہا" متى نصر الله" اللہ کی مدد کب آئے گی۔ اوررسولوں نے کہا " الا ان نصر الله قريب " خبردار بے شک اللہ کی مدد قریب ہے۔

اسی کے قریب رب تعالیٰ کا ایک اورارشادگرامی ہے۔

" ومن رحمته جعل لكم الليل والنهار لتسكنوا فيه ولتبتغوا من فضله"والمعنى لتسكنوا فى الليل ولتبتغوا من فضله النهار "

یعنی دو چیزوں کا پہلے ذکر کیا، کہ رب تعالیٰ نے اپنی رحمت سے تمہارے لئے رات اور دن بنائے۔
پھر اس کے بعد دو چیزوں کا ذکر کیا ایک کا تعلق رات سے کیا اور ایک کا دن سے، یعنی "لتسکنوا فی اللیل" تم رات کو سکون حاصل کرو، "ولتبتغوا من فضله فی النهار" اور دن کو رب تعالیٰ کا فضل یعنی مال حاصل کرو۔

اسی کے قریب ایک شاعر کا قول ہے۔

کان قلوب الطیر رطبا و یابسا لدی و کرها العناب و الحشف البالی

گویا کہ پرندوں کے دل تر اور خشک۔ ان کے گھونسلوں کے قریب عناب اور پرانی خشک کھجوریں ہیں۔
شاعر نے پہلی دو چیزوں کا ذکر کیا "رطبا" اور "یابسا" کا، پھر دو چیزوں کا ذکر کیا "عناب" اور "الحشف البالی" کا۔

"فالتشبیه بالعناب للرطب و با لحشف البالی للیابس"

یعنی تر دلوں کو تشبیہ دی عناب سے، اور خشک دلوں کو تشبیہ دی خشک پرانی کھجوروں سے۔ (از کبیر)

تنبیہ:

طلباء کرام یہ بات ذہن میں رکھیں کہ زیر بحث آیۃ میں کلام "لف ونشر غیر مرتب" ہے۔ اور دوسری آیۃ اور شعر میں کلام "لف نشر مرتب" ہے۔ اسی لئے "اسی کے قریب" کے الفاظ بڑھائے گئے ہیں۔ (راقم)

ایک حدیث پاک سے تائید:

اسی دوسرے جواب کی تائید میں ایک حدیث پاک بھی راقم کو سمجھ آئی، جو اسی آیۃ کریمہ کی تفسیر میں مفسرین کرام نے ذکر کی۔ اس حدیث پاک سے یہ واضح ہوتا ہے کہ امت کے لوگوں کے کلام میں اور اللہ کے نبی کے کلام میں فرق ہوتا ہے، جیسا کہ مندرجہ ذیل حدیث صحابہ کرام اور رسول اللہ ﷺ کے کلام میں فرق ہے۔

☆ "عن خباب بن الارت قال شکو نا الی رسول اللہ ﷺ وهو متوسد بردةله فی ظل الکعبة فقلنا الا تنتصر لنا الاتد عولنا فقال قد کان من قبلکم یؤخذ الرجل فیحفر له فی الارض فیجعل فیها ثم یو تی با لمنشار فیو ضع علی رأ سه فیجعل نصفین ویمشط بامشاط الحدید مادون لحمه وعظمه مایصد ذلک عن دینه واللہ لیتمن اللہ هذا الامر حتی یسیر الراکب من صنعاء الی حضرموت لا یخاف الااللہ والذئب علی غنمه ولکنکم تستعجلون" (بخاری)

خباب بن ارت کہتے ہیں ہم نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں شکایت کی جبکہ آپ کعبہ شریف کی دیوار کے سایہ میں چادر سر کے نیچے رکھ کر لیٹے ہوئے تھے، ہم نے کہا آپ ہمارے لئے امداد کیوں نہیں طلب کرتے، آپ ہمارے لئے دعاء کیوں نہیں کرتے؟ تو آپ نے فرمایا تم سے پہلے لوگوں کو (دین پر عمل کرنے کی وجہ سے) گڑھے میں کھڑا کرکے آری سے سر سے لیکر قدموں تک چیر کر دو ٹکڑے کر دیئے گئے، اور لوہے کی کنگھیوں سے ان کی ہڈیوں سے گوشت کو اتار دیا گیا، لیکن وہ دین سے نہ ہٹے (بلکہ دین پر ثابت قدم رہے)۔ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اللہ تعالیٰ اس دین کی تکمیل فرمائے گا، یہاں تک کہ سوار (بلاخوف) صنعاء سے حضرموت تک چلا جائے گا، اسے سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور کا خوف نہیں ہوگا، اور بھیڑ بکری کو بھیڑیئے کا ڈر نہیں ہوگا، لیکن تم جلدی کر رہے ہو۔ (خازن)

اس حدیث پاک سے واضح ہو رہا ہے کہ صحابہ کرام نے تکالیف سے بے قرار ہو کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں دعاء کرنے اور امداد طلب کرنے کی درخواست کی، لیکن نبی کریم ﷺ نے ان کو صبر کرنے کی تلقین کی۔ اسی طرح پہلے ایمان والے لوگوں نے بے قراری سے کہا "اللہ کی امداد کب آئے گی" تو رسولوں نے ان کو صبر کرنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا، خبردار اللہ کی امداد قریب ہے۔ واللہ اعلم بالصواب (راقم)

☆☆☆☆☆☆

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ☆ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۱۵)

﴿۱﴾

تم سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں تم فرماؤ جو کچھ مال نیکی میں خرچ تو وہ ماں باپ اور قریب کے رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور راہ گیر کے لئے ہے اور جو بھلائی کرو بیشک اللہ اسے جانتا ہے۔

﴿۲﴾

سوال کرتے ہیں آپ سے خرچ کرنے کے متعلق، فرمادو جو خرچ کرو تم مال نیکی میں تو وہ ہو واسطے ماں باپ کے اور قریبی رشتہ داروں کے لئے اور یتیموں کے لئے اور مسکینوں اور مسافروں (کے لئے ہو) اور جو کرو تم بھلائی تو بیشک اللہ اسے جانتا ہے۔

ماقبل سے تعلق:

اللہ تعالیٰ اس سے پہلے بیان فرمایا کہ ہر مکلف کے لئے واجب ہے کہ وہ دنیا کے جلدی حاصل ہونے والے منافع سے اعراض کریں، اور آخرت کے دائمی منافع میں مشغول ہو جائیں، اور وہ اخروی منافع اللہ کی راہ میں مال اور جان قربان کرنے سے حاصل ہوں گے۔

اب اس آیۃ کریمہ سے لے کر "الم تر الی الذین خرجوا من دیارھم" تک احکام بیان کئے جار ہے ہیں۔ قرآن پاک کا انداز بیان یہ ہے کہ توحید کا ذکر ہوتا ہے اور وعظ و نصیحت کو بیان کیا جاتا ہے اور پھر احکام کو بیان کیا جاتا ہے، وہ احکام مختلف ہوتے ہیں جو آپس میں ملتے جلتے ہوتے ہیں۔

اس انداز بیان سے بعض کو بعض سے تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اور تاکید حاصل ہوتی ہے۔

شانِ نزول:

عطاء کہتے ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہ آیۃ کریمہ ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئی جو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔

"ان لی دینار افقال انفقه علی نفسک،قال ان لی دینارین قال انفقهما علی اهلک، قال ان لی ثلاثة قال انفقها علی خادمک،قال ان لی اربعة قال انفقها علی والدیک، قال ان لی خمسة قال انفقها علی قرابتک ، قال ان لی ستة قال انفقها فی سبیل الله وهو احسنها "

بیشک میرے پاس ایک دینار ہے (میں کہاں خرچ کروں؟) تو آپ نے فرمایا، اپنے آپ پر وہ خرچ کرو، پھر اس شخص نے عرض کیا بیشک میرے پاس دو دینار ہوں تو؟ آپ نے فرمایا وہ دو دینار (اپنے آپ پر) اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کرو، پھر عرض کیا بے شک میرے پاس تین دینار ہوں تو؟ آپ نے فرمایا وہ تین دینار (اپنے آپ پر اور اپنے اہل وعیال پر اور) اپنے خادم پر خرچ کرو۔ پھر عرض کیا بے شک میرے پاس چار دینار ہوں (تو میں کیا کروں؟) آپ نے فرمایا وہ چار دینار (اپنے آپ پر اپنے اہل وعیال پر، اور اپنے خادم پر اور) اپنے والدین پر خرچ کرو، پھر عرض کیا بے شک میرے پاس پانچ دینار ہوں (تو میں کیا کروں؟) آپ نے فرمایا وہ (اپنے آپ پر، اور اپنے اہل وعیال پر، اور اپنے خادم پر، اور اپنے والدین پر اور) اپنے قریبی رشتہ داروں پر خرچ کرو۔ پھر عرض کیا بے شک میرے پاس چھ دینار ہوں (تو میں کیا کروں؟) آپ نے فرمایا وہ (اپنے آپ پر، اپنے اہل وعیال پر، اپنے خادم پر، اپنے والدین پر، اپنے قریبی رشتہ داروں پر اور) اللہ کی راہ میں خرچ کرو، اللہ کی راہ میں خرچ بہت اچھا بھلائی کا کام ہے۔

(۲) شانِ نزول کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ حضرت عمرو بن جموح کے بارے میں نازل ہوئی کہ وہ بہت زیادہ بوڑھے ہو گئے تھے، اور بہت زیادہ مال دار تھے، غزوہ احد میں دوران جنگ حضور ﷺ سے سوال کیا۔

" ماذاننفق من اموالنا واین نضعها " ہم اپنا کتنا مال خرچ کریں اور کن پر خرچ کریں۔

ان کے اس سوال کے بعد یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی جس کا مفہوم یہ ہے کہ ''سوال کرتے ہیں آپ سے خرچ کرنے کے متعلق آپ فرمادیں جو بھی بھلائی کی راہ میں مال خرچ کرو، یعنی جتنا مال تم خرچ کرنا چاہو وہ خرچ کرو، لیکن جائز کاموں پر خرچ ہو، ناجائز کاموں پر نہیں، وہ مال والدین کو، اور قریبی رشتہ داروں کو دو اور یتیموں کو دو، اور مسکینوں کو دو، اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو، اور جو بھی تم بھلائی کا کام کرو گے بے شک اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے۔ یعنی وہ تمہاری نیتوں کو جانتا ہے، اس لئے تم جو مال بھی خرچ کرو اس میں صرف اللہ تعالیٰ رضاء مندی مقصود ہو، اور نیت خالص ہو۔ (از کبیر)

تنبیہ: علمِ معانی میں ایک ضابطہ بیان کیا گیا ہے کہ کبھی سائل کے سوال کو اس کے غیر سوال کے درجہ میں رکھ کر جواب دیا جاتا ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ بہتر یہ تھا کہ سوال اس طرح ہوتا، یا یہ بتانا مقصود ہوتا کہ اہم سوال یہ تھا۔

اس کی ایک مثال یہی آیۃ کریمہ ذکر کی جس کی بحث جاری ہے کہ سوال تھا ''کیا خرچ کیا جائے'' جواب دیا کہ کن پر خرچ کرنا ہے، گویا کہ یہ بتایا گیا کہ وہی خرچ کرنا اللہ کے ہاں معتبر ہوگا جو صحیح مصرف میں خرچ ہوگا۔

لیکن کبیر سے شان نزول کی جو دو وجہ بیان کی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ جواب سوال کے مطابق ہے۔ کیونکہ سوال میں ''کن پر خرچ کرنا ہے'' بھی موجود تھا۔

راقم نے تلخیص المفتاح کے اپنے عربی حاشیہ ''ضوء المصباح'' میں ''تفسیر ابی السعود'' سے ذکر کیا کہ سوال جواب کے مطابق ہے۔ ابوالسعود نے بھی پہلے علم معانی کے قانون کے مطابق بیان کیا لیکن پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے وہی الفاظ ذکر کئے جو کبیر سے نقل کئے جا چکے ہیں، عمرو بن جموح نے حضور ﷺ سے ''ماذا ننفق من اموالنا واین نضعها'' ہم اپنے کون سے مال خرچ کریں اور کن پر خرچ کریں۔

علامہ رازی رحمہ اللہ تفصیل بیان فرماتے ہیں:

(۱) اس میں ایک وجہ یہ ہے کہ سوال کا جواب دے کر پھر اور زیادہ وضاحت کر دی گئی تا کہ مقصد کو حاصل کرنے میں آسانی ہو۔

سوال کا جواب " ما انفقتم من خیر " سے دیا، "ای ای شئی انفقتم من ای خیر کان " یعنی جو چیز بھی تم خرچ کرو، جس طرح بھی اس میں بھلائی پائی جائے۔ یہ بیان ہے اور جواب ہے کہ کیا چیز خرچ کی جائے، اس کی بعد زیادہ وضاحت کردی گئی کہ مال خرچ کرنا اس وقت تک مکمل نہیں ہوگا جب تک صحیح مصرف اور صحیح مستحق پر نہ خرچ کیا جائے۔

" فلهذالماذکر الله تعالٰی الجواب اردفه بذکر المصرف تکمیلا للبیان "

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جب جواب ذکر فرمایا تو اس کے پیچھے مصرف کو ذکر فرمایا کہ مال کن لوگوں پر خرچ کرنا ہے، اس طرح ایک مسئلہ کو مکمل طور پر بیان فرمادیا گیا۔

مال کو خیر کہنے کی وجہ:

"والمال یسمی خیرالان حقه ان یصرف الی جهة الخیرفصاربذلک کأنه نفس الخیر"

مال کو خیر اس لئے کہا گیا ہے کہ حق یہ ہے کہ مال کو بھلائی کی راہ میں خرچ کیا جائے، جب نیکی کی راہ میں مال خرچ کیا جائے گا وہ مال بھی خیر بن جائے گا۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر چہ سوال میں لفظ "ما" واقع ہے، لیکن مقصد سوال یہ ہے کہ کیفیت بیان کی جائے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کو اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ ہے، جب انہیں یہ معلوم تھا تو یہ سوال کرنے کی ضرورت نہ تھی کہ وہ کونسا مال خرچ کریں۔ لہٰذا واضح ہوا۔

"ان المطلوب بالسؤال ان مصرفه ای شئ هو وحینئذ یکون الجواب مطابق للسؤال "

کہ سوال کرنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ یہ بتایا جائے کہ مال کن لوگو پر خرچ کیا جائے۔

" وجب ان یقطع بأن مرادهم من قولهم (ما ذا ینفقون) لیس هو طلب الماهیة بل طلب المصرف "

یہ ضروری بات ہے کہ یقین کیا جائے کہ ان کا سوال " مـا ذا ینـفقون " ماہیت کی طلب کے لئے نہیں تھا کہ کونسا مال خرچ کریں بلکہ مصرف کے متعلق سوال تھا۔

(۳) تیسری وجہ وہی بیان کی گئی جس کا ذکر علم معانی کے ضابطہ میں کیا جاچکا ہے۔ (از کبیر و روح البیان)

رب کے کلام میں حکمت:

مصارف بیان کرتے ہوئے رب تعالیٰ نے جس ترتیب سے والدین وغیرہ کا ذکر کیا وہ عجیب وغریب حکمت پر مبنی ہے۔

والدین کا سب سے پہلے ذکر کیا کیونکہ وہ انسان کے عالم اسباب میں عدم سے وجود کی طرف لانے کا ذریعہ ہیں، پھر والدین ہی اولاد کی تربیت کرتے ہیں اس حال میں جبکہ اولاد بہت کمزور ہوتی ہے۔ جتنا انعام والدین کا اولاد پر ہے اتنا کسی اور کا نہیں، اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے اپنی عبادت کے بعد والدین پر احسان کرنے کا حکم دیا۔

" وقضی ربک ان لا تعبدوا الاایاہ وبالوالدین احسانا"

اور آپ کے رب نے فیصلہ فرمایا کہ تم اس کے سواء کسی اور کی عبادت نہ کرو اور والدین سے احسان کرو۔

والدین کے بعد قریبی رشتہ داروں کا ذکر کیا کیونکہ ایک انسان تمام فقیروں کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتا، اس لئے ضروری ہے کہ کوئی وجہ ترجیح پائی جائے۔ "والقرابة تصلح ان تکون سببا للترجیح "

قریبی رشتہ دار جب محتاج ہوں تو ان پر مال خرچ کرنے کی وجہ ترجیح موجود ہے کہ وہ قریبی رشتہ دار ہیں۔

"وان الانفاق علی القریب اولی من الانفاق علی البعید "

قریبی رشتہ دار پر خرچ کرنا زیادہ بہتر ہے بنسبت دور والے رشتہ دار کے۔

اس کے بعد یتیموں کا ذکر کیا کیونکہ وہ اپنے صغر (چھوٹی عمر) کی وجہ سے کسب (کمانے) پر قادر نہیں۔ چونکہ وہ یتیم ہے اس کا باپ نہیں جو اسے مال حاصل کر کے دے۔

" فالطفل الذی مات ابوہ قد عدم الکسب والکاسب واشرف علی الضیاع "

وہ بچہ جس کا باپ فوت ہو جائے وہ بربادی کے کنارے پر ہوتا ہے کیونکہ اس کا کوئی کسب نہیں اور نہ ہی اس کو کوئی کمانے والا ہے، اس لئے اس کی امداد کرنا ضروری ہے اور باعث اجر وثواب ہے۔

یتیموں کے بعد مسکینوں کا ذکر کیا کیونکہ وہ وقتی طور پر محتاج ہیں، مالی امداد کے مستحق ہیں، لیکن یتیموں کے بعد

ذکر کرنے کی وجہ ہے کہ یہ ان سے کم حاجت مند ہوتے ہیں، کیونکہ ان میں مال کمانے کی صلاحیت ہوتی ہے، وقتی طور پر عوارضات کی وجہ سے وہ محتاج ہو گئے ہیں۔

اسی سے یہ مسئلہ بھی واضح ہو گیا کہ صرف عمر رسیدہ شخص کو حاجت مند سمجھنا اور نوجوان ادھیڑ عمر والے شخص کی اس لئے امداد نہ کرنا کہ یہ کمانے کے قابل ہے، یہ غلط ہے۔ جب وہ وقتی طور پر محتاج ہے تو اس کی امداد کی جائے خواہ وہ کسی عمر میں ہے۔ ہاں البتہ مستحق ہونے کا پتہ ہو تو امداد کی جائے، پیشہ ور بھکاریوں کی امداد نہ کر کے ان کی حوصلہ شکنی ضروری ہے تا کہ ان کی یہ عادت ختم ہو جائے۔

مسکینوں کے بعد اللہ کی راہ میں سفر کرنے والوں کا ذکر کیا کہ کبھی ایسا ہو جاتا ہے جہاد کرنے والے حضرات یا حج کرنے والے بے خرچ ہو جاتے ہیں، اس لئے ان کی وقتی حاجت کو پورا کرنے کے لئے ان کی مالی معاونت کی جائے لیکن ایسی ضرورت بہت کم پیش آتی ہے، اس لئے ان کا ذکر سب سے آخر میں کیا۔

" فهذا هو الترتيب الصحيح الذى رتبه الله تعالى فى كيفية الانفاق "

یہ وہ صحیح ترتیب ہے اور باکمال اور عجیب وغریب ترتیب ہے جس کو رب تعالیٰ نے خرچ کرنے کی کیفیت میں مرتب فرمایا ہے۔

"وماتفعلوامن خيرفان الله به عليم": اور جو کرو تم بھلائی بے شک اللہ اسے جانتا ہے۔

خیال رہے کہ " ما انفقتم من خير " میں " خیر " کا معنی مال ہے، جیسا کہ " وانه لحب الخير لشديد " میں، اور " ان ترك خير الوصية " میں " خیر " سے مراد مال ہے۔ البتہ مال کو خیر کیوں کہا؟ اس کی وجہ پہلے روح البیان کے حوالہ سے بیان ہو چکی ہے کہ مال کو بھلائی کے کاموں میں خرچ کرنے سے مال بھی خیر بن جاتا ہے۔

البتہ " وما تفعلوا من خير " میں " خیر " سے مراد عام ہے صرف مال نہیں، جیسا کہ علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

" (وما تفعلوا من خير) يتناول هذا الانفاق وسائر وجوه البر والطاعة "

اس مقام میں یعنی ''وما تفعلوا من خیر'' میں ''خیر'' سے مراد ہر قسم کی بھلائی ہے۔

والدین اور قریبی رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ضرورت مند مسافرین کی امداد کرنا، ان پر مال خرچ کرنا بھی بھلائی ہے اور نیکی اور اطاعت کے تمام کام ہی خیر ہیں۔ لہٰذا مطلب واضح ہوا کہ جو بھلائی تم کرو بے شک اللہ اسے جانتا ہے۔

مسئلہ: والدین پر اور اصول (دادا، دادی، نانا، نانی وغیرہ) پر، اور فروع (بیٹا، بیٹی، نواسہ، نواسی، پوتا، پوتی وغیرہ) پر زکوٰۃ کا مال خرچ نہیں کیا جا سکتا، اس لئے یہاں خرچ کرنے سے مراد زکوٰۃ کا مال نہیں۔ والدین کے پاس اپنا مال ہے تو ان کی مالی معاونت مستحب ہے، اور اگر ان کے پاس اپنا مال نہیں وہ محتاج ہیں۔ تو ان کی مالی معاونت فرض ہے۔

مسئلہ: مندرجہ بالا رشتہ داروں (یعنی اصول وفروع) کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں کو حاجت مند ہونے کی صورت میں، اور یتیموں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ کے مسافرین کو زکوٰۃ کا مال بھی دیا جا سکتا ہے۔

اس لئے جب ''ماانفقتم من خیر'' سے مراد بھلائی میں مال خرچ کرنا مراد ہو تو عام ہوگا جو صدقات فرضیہ اور نفلیہ دونوں کو شامل ہوگا۔

لہٰذا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کی رضا مندی کے لئے جو مال بھی تم والدین اور قریبی رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ کے مسافروں پر خرچ کر سکتے ہو وہ خرچ کرو۔

اسی سے خود بخود واضح ہو جائے گا کہ والدین اور باقی اصول اور فروع کو زکوٰۃ کے بغیر مال دیا جائے اور باقی حضرات کو خواہ زکوٰۃ کا مال دو یا صدقات نفلیہ دو جائز ہے۔

راقم کی وضاحت کے بعد طلباء کرام آپ تفاسیر کی ان بحثوں کو دیکھ کر یہ آیت منسوخ ہے یا نہیں، اور آیت کا تعلق زکوٰۃ سے ہے یا نہیں، خود سمجھ لو گے کہ راقم کا انداز بیان اگر خوب تر نہیں تو آسان ضرور ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَ
هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَ
اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ☆ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۱۶)

☆۱☆

تم پر فرض ہوا خدا کی راہ میں لڑنا اور وہ تمہیں ناگوار ہے اور قریب ہے کہ کوئی بات تمہیں بری لگے اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو اور قریب ہے کہ کوئی بات تمہیں پسند آئے اور وہ تمہارے حق میں بری اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

☆۲☆

فرض کیا گیا تم پر (اللہ کی راہ) میں لڑائی کرنا، اور وہ شاق ہے تم پر اور قریب ہے تم شاق سمجھو جس چیز کو وہی بہتر ہو تمہارے لئے۔ اور قریب ہے تم پسند کرو کسی چیز کو وہی تمہارے لئے شر (غیر بہتر) ہو۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

احکام بیان کئے جارہے ہیں۔ پہلے ایک حکم خرچ کرنے کے متعلق بیان کیا گیا، اب دوسرا حکم جہاد کے متعلق بیان کیا جارہا ہے۔

"کتب علیکم القتال": "کتب" کا معنی ہے فرض کیا گیا۔

"والمراد بالقتال قتال الاعداء من الکفار" اور "قتال" سے مراد کافر دشمنوں سے جنگ کرنا ہے۔

اسی لئے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے "خدا کی راہ میں لڑنا" ترجمہ کیا ہے۔ راقم نے بھی تقریباً وہی نقل کیا ہے۔

عمرو بن ابی ربیعہ نے کہا۔

کتب القتل والقتال علینا　　　وعلی الغانیات جرّ الذیو ل

فرض کیا گیا ہے ہم پر قتل اور لڑائی کرنا، اور گانے والی عورتوں پر دوپٹے کا دامن کھینچنا۔

جہاد اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے امتحان کے لئے فرض کیا ہے" وجعل وصلة الی الجنة "اور جنت میں جانے کا ذریعہ بنایا۔ نبی کریم ﷺ جب مکہ مکرمہ میں تھے، اس وقت آپ کو کفار سے لڑائی کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ جب مدینہ طیبہ میں آئے تو اجازت دی گئی۔ (مکمل تفصیل پہلے بیان کی جا چکی ہے" وقاتلوا فی سبیل الله الذین یقاتلونکم " آیۃ کی بحث میں دیکھیں) (از قرطبی)

اب جہاد کا حکم یہ ہے۔

" قتال الكفار وهو فرض عين ان دخلوا بلادنا و فرض كفاية ان كونوا ببلادهم "

مسلمانوں کے شہروں اور ملک پر چڑھائی کر دیں تو جہاد فرض عین ہو جاتا ہے یعنی ہر شخص پر جہاد فرض ہو جاتا ہے اور جب تک وہ اپنے علاقہ میں رہیں تو مسلمانوں پر جہاد کرنا فرض کفایہ ہے۔ (روح المعانی)

جب کفار اسلامی ملک پر حملہ کریں تو ان لوگوں پر فرض ہو جاتا ہے کہ کفار سے لڑائی کرکے ان کے شر کو ختم کریں اور اپنے اسلامی ملک اور اسلام کی حفاظت کریں۔

زھری رحمہ اللہ فرماتے ہیں، جب جہاد فرض ہو جائے تو اس کی فرضیت پر عمل جہاد میں شریک ہو کر بھی ہو سکتا ہے اور گھر بیٹھ کر بھی، گھر بیٹھنے والے کو جہاد میں اس وقت شریک سمجھا جائے گا۔

" اذااستعين ان يعين، واذااستغيث ان يغيث واذااستنفران ينفر وان لم يحتج اليه قعد "

جب اس سے امداد طلب کی جائے تو امداد کرے، جو اس سے فریاد کی جائے تو وہ فریاد کو پہنچے، اور اس سے جب مطالبہ کیا جائے کہ اب تم میدان جنگ میں آ جاؤ تو وہ وہاں پہنچ جائے، ہاں جب تک شدید ضرورت نہیں تو اس کا گھر بیٹھنا بھی جائز ہے۔

صحیح بخاری میں ہے "من مات ولم یغزو ولم یحدث نفسه بالغزو مات میتة جاهلية " (رواہ مسلم)

جو شخص اس حال میں فوت ہو گیا کہ اس نے جہاد کیا اور نہ ہی اس کے دل میں جہاد کرنے کا خیال آیا تو جاہلیت کی موت مرا۔

نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا۔"لاهجرة بعدالفتح ولكن جهادونيةواذااستنفرتم فانفروا"
فتح مکہ کے بعد ہجرت فرض نہیں رہی ،لیکن جہاد کرنااور جہاد کی تمنا دل میں رکھنا برقرار ہے۔ جب
تمہیں جہاد کے لئے طلب کیا جائے تو تم جہاد میں شریک ہو جاؤ۔ (ابن کثیر)

"وهو كره لكم": اوروہ ناپسند ہے تمہیں۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"وهو كره لكم" یہ جملہ اسمیہ ہے،اس کا عطف ہے"كتب عليكم القتال" پر جوجملہ فعلیہ ہے "وعطف الاسمية على الفعلية كما نص عليه" نحویوں نے واضح طور پر بیان کیا ہے کہ جملہ اسمیہ کا عطف جملہ فعلیہ پر جائز ہے۔

بعض حضرات نے "وهو كره لكم" کو جملہ حالیہ بنایا ہے لیکن یہ مناسب نہیں اس لئے کہ"حال موکدہ" واؤ سے نہیں آتا،اور "حال منتقله" کا یہاں کوئی فائدہ نہیں۔ (روح المعانی)

"کرہ": میں دولغتیں ہیں،ایک کاف کے ضمہ سے اوردوسری فتحہ سے۔دونوں مختلف معانی میں استعمال ہیں، کسی کام کو باعث مشقت سمجھنا،اور مکروہ سمجھنا، ناپسند کرنا۔

بعض حضرات نے فرق بیان کیا ہے۔" الكره(با لضم) المشقة والكره(بالفتح)مااكرهت عليه .
جب کاف پر پیش ہوتو معنی ہوگا ،مشقت ،اور جب زبر ہوتو معنی ہوگا مکروہ سمجھنا۔ (قرطبی)

اسی طرح جب کاف پر زبر ہوتو معنی ہوگا وہ مشقت جوانسان کو خارج سے حاصل ہو،اور جب پیش ہوتو معنی ہوگا وہ مشقت جوانسان کو اپنی ذات سے حاصل ہو۔ (روح المعانی)

اعتراض:"كتب عليكم القتال" میں خطاب مومنین کو ہو کہ تم پر اللہ کی راہ میں لڑنا فرض کیا گیا ہے تو اس کے بعد "وهو كره لكم" کہنا کس طرح صحیح کہ"وہ تمہیں ناپسند ہے" اس سے تو یہ پتہ چلا کہ مومنوں کو رب تعالیٰ کا حکم

پسند نہیں آیا، حالانکہ "ان المؤمن لایکون ساخطالاوامراللہ وتکالیفہ بل یرضی بذلک ویحبہ" مؤمن کی شان کے لائق تو یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو خوشی اور رضا مندی سے قبول کرتا ہے، ان کو ماننے میں ناراضگی کا اظہار نہیں کرتا۔

جواب اول : یہاں" کـره " کا معنی ہے مشقت اگر چہ مکلف (عاقل وبالغ) کو معلوم بھی ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، لیکن جب وہ کام نفس کو مشکل نظر آئے تو مشقت آمیز کام اسی طرح رہے گا، جبکہ جہاد میں بھی جان اور مال قربان کرنے پڑتے ہیں جو بظاہر مشکل کام ہے تو فرمایا گیا" وھو کرہ لکم " جس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے نفس جہاد کو مشقت آمیز سمجھتے ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کا حکم ہی پسند نہیں۔

جواب دوم : جہاد کے فرض ہونے سے پہلے لڑائی کرنے کا خوف تھا، کیونکہ دشمن کی تعداد بہت زیادہ تھی اس وجہ سے طبعی طور پر جہاد ناپسند تھا۔ رب تعالیٰ نے پہلے ہی متنبہ کردیا کہ تم اگر چہ لڑائی کرنے کو ناپسند کرتے تھے، لیکن "ان الذی تکرھونہ من القتال خیرلکم من ترکہ لئلا تکرھونہ بعدان فرض علیکم" وہ چیز جسے تم ناپسند سمجھتے ہو وہ تمہارے لئے بہتر ہے، لہٰذا جہاد کے فرض ہونے کے بعد جہاد کو ناپسند سمجھ کر نہ چھوڑنا۔ یہ سارا کلام پہلے ہے، اس کے بعد فرمایا" جہاد تم پر فرض کیا گیا"۔

یعنی اعتراض کا دارومدار لفظی ترتیب پر ہے، اور جواب کا دارومدار معنوی ترتیب پر ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

"وعسی ان تکرھواشیأوھوخیر لکم وعسی ان تحبوا شیأوھو شرلکم"

اور قریب ہے کہ تم شاق سمجھو جس چیز کو وہ تمہارے لئے بہتر ہو۔ اور قریب ہے تم پسند سمجھو کسی چیز کو وہ تمہارے لئے شر (غیر بہتر) ہو۔

دینی طلباءکرام توجہ فرمائیں:

"عسی" افعال مقاربہ سے، عام طور پر شک کے معنی میں استعمال ہوتا ہے "عسی ان یخرج" اس کا

نکلنا قریب ہے، یعنی اس کے نکلنے کی امید کی جاسکتی ہے، ہوسکتا ہے وہ نکل جائے۔ البتہ کبھی یقین کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اسی مثال کا یہ معنی بھی آتا ہے کہ اس کے نکلنے کا یقین ہے۔

"عسی" کی نسبت جب بندوں کی طرف کی جائے تو اس وقت معنی "شک" والا ہوتا ہے، اور جب رب تعالیٰ کی طرف نسبت کی جائے تو "یقین" والا معنی ہوتا ہے۔

قرآن پاک میں جہاں بھی لفظ "عسی" استعمال ہوا وہ یقین کے معنی میں استعمال ہوا ہے، صرف "عسی ربہ ان طلقکن الخ" کے وہاں شک کے معنی میں استعمال ہے۔ (از قرطبی و کبیر)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے "قریب ہے" یہ مطلق ہے چاہے تو اس کا معنی شک والا کرلیا جائے اور چاہے تو اس کا معنی یقین والا کرلیا جائے، راقم نے بھی یہی نقل کیا ہے۔

وضاحت: اکثر اوقات ایک چیز کو وقتی طور پر مشقت والا سمجھا جاتا ہے، لیکن مستقبل میں اس پر منافع مرتب ہوتے ہیں، جیسا کہ کڑوی دوا اپنا وقتی طور پر ناپسند سمجھا جاتا ہے، لیکن اس پر صحت حاصل ہونے کی توقع کی جاتی ہے۔ تجارت کی غرض سے سفر کرنا اگرچہ بظاہر مشکل ہوتا ہے اس میں خطرات بھی پائے جاتے ہیں لیکن اس پر نفع حاصل ہونے کی امید ہوتی ہے۔

"وحسن تحمل المشاق فی طلب العلم للفوز بالسعادة العظیمة فی الدنیا و العقبی"

علم دین حاصل کرنے میں اگرچہ مشقت اٹھانی پڑتی ہے جو بظاہر طبیعت پر ناگوار گزرتی ہے لیکن مستقبل میں اس سے سعادت دنیوی اور اخروی حاصل ہوتی ہے، اس لئے تکلیف اٹھانے پر بہتری کا حصول مرتب ہے۔

اسی طرح جہاد کو چھوڑنا وقتی طور پر مفید نظر آتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو قتل کے خطرات سے بچالیتا ہے اور اپنے مال کو بچالیتا ہے لیکن اس پر عظیم نقصان مرتب ہوتا ہے، کیونکہ جب دشمن کو پتہ چلتا ہے کہ مسلمان جہاد چھوڑ بیٹھے ہیں اور سہل پسند ہو چکے ہیں اور عیاش ہو چکے ہیں، تو وہ حملہ آور ہو جاتے ہیں، مسلمانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر دیتے ہیں، ان کے مال لوٹ کر لے جاتے ہیں، ان کے علاقہ پر قبضہ کرلیتے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

راقم کہتا ہے مسلمانوں کی اسی حالت نے فلسطین میں یہودیوں کو ڈیرے جمانے کا موقع عطا کیا ہے اور مسلمانوں کی اسی حالت نے یعنی عیسائیوں سے ڈرنے کی وجہ نے عیسائیوں کو موقعہ ملا کہ وہ سعودیہ میں ڈیرے جما چکے ہیں۔ مسلمانوں کی اسی حالت نے عراق کو تباہ کردیا، آج عراق پر عیسائی قابض ہیں، عراق کے غدار جرنیل اگر نہ بکتے تو امریکہ کو آسانی سے وہاں قبضہ حاصل نہ ہوسکتا۔

" وهذا صحيح لا غبار عليه كما اتفق في بلا دا لا ندلس تركوا الجهاد و جبنوا عن القتال و اكثروا من الفرار، فاستولى العدو على البلاد "

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد روز روشن کی طرح جگمگا رہا ہے۔ جس کی صحت بلا غبار ہے کہ اندلس کے شہروں میں مسلمانوں نے جہاد چھوڑ دیا، بزدلی دکھائی، اور راہ فرار اختیار کی تو دشمن ان کے شہروں پر غالب آ کر قابض ہو گئے۔

کتنے ہی شہروں میں مسلمانوں کا خون بہایا گیا، قید کیا گیا، اور غلامیت کی زندگی بسر کرنے پر مسلمان مجبور ہو گئے۔ "انا للہ و انا الیہ راجعون" ذلک بما قدمت ایدینا و کسبته" یہ سب کچھ مسلمانوں نے اپنے ہاتھوں ہی اپنی بربادی کی۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے آیت کریمہ کا مطلب ان الفاظ سے بیان کیا۔

"لا تكرهوا الملمات الواقعة فلربّ امر تكرهه فيه نجاتك و لرب امر تحبه فيه عطبك "

واقع ہونے والے مصائب کو ناپسند نہ سمجھو، کتنی ہی ایسی چیزیں ہیں جن کو تم نہ پسند سمجھتے ہو وہی تمہاری نجات کا سبب ہیں۔ اور کتنی ہی ایسی چیزیں ہیں جن کو تم پسند کرتے ہو ان میں ہی تمہاری بربادی ہے۔

ابوسعید ضریر نے کہا۔

رب امر تتقيه — جرا مرا ترتضيه

خفي المحبوب منه — و بدا المكروه فيه

کتنے ہی کاموں سے تو بچتا ہے۔ کتنے ہی کاموں کو تو پسند کر کے لاتا ہے۔

محبوب چیز تجھ سے مخفی رہتی ہے۔ اور مکروہ چیز تجھ پر ظاہر ہوتی ہے۔ (از قرطبی)

جہاد کے فوائد:

جہاد کرنے سے امن حاصل ہوتا ہے، کیونکہ مومن کے جذبہ ایمانی اور جنگی شجاعت کو دیکھ کر کافر کے حملہ کر کے مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کے خواب چکنا چور ہو جاتے ہیں۔

یہ مقصد عظیم وقتی سلامتی کے نفع سے زیادہ بہتر ہے۔ اور جہاد سے مال غنیمت حاصل ہوتا ہے۔

اور جہاد سے کافر پر غلبہ حاصل ہونے سے مسلمانوں کو بہت زیادہ خوشی حاصل ہوتی ہے۔ یہ تمام فوائد دنیا میں حاصل ہوتے ہیں۔

اخروی اور دینی فوائد کثیر ہیں، ان گنت ہیں، مختصر یہ کہ جہاد اللہ تعالیٰ کے قرب حاصل کرنے کے لئے کیا جائے تو اس پر عظیم ثواب مرتب ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل ہوتی ہے اور اس انسان کو اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت کا یقین ہو جاتا ہے، رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے "ان اللہ لایضیع اجر المحسنین" بے شک اللہ ضائع نہیں کرتا احسان کرنے والوں کا اجر۔ (از کبیر)

"الشر "السوء، یعنی " شر" کا معنی برائی ہے، اصل اس کا معنی ہے "پھیلانا" کہا جاتا ہے " شررت اللحم والثوب لیجف" میں نے گوشت اور کپڑے کو پھیلایا تاکہ خشک ہو جائے۔

"الشرر "اللهب لانبساطه، آگ کے شعلے بھی چونکہ پھیل جاتے ہیں، اسی لئے ان کو "الشرر "کہا جاتا ہے۔ "الشرر " انبساط الاشیاء المضارة، نقصان دینے والی چیزوں کا پھیلانا "الشر" (برائی) کہلاتا ہے۔

"واللہ یعلم وانتم لا تعلمون": اور اللہ جانتا اور تم نہیں جانتے۔

اس ارشاد گرامی کا مقصد جہاد کی عظیم ترغیب دینا ہے۔ اس لئے کہ جب انسان یہ اعتقاد رکھے کہ میرا علم

ناقص ہے، میں کوتاہ علم ہوں اور کامل علم اللہ تعالیٰ کا ہے، اس کے علم میں نقص کا تصور کرنا بھی کفر ہے۔ اور انسان کو جب یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ان چیزوں کا حکم دیتا ہے جو بہتر ہو اور ان میں مصلحت پائی جائے۔

" علم قطعاان الذی امره الله تعالیٰ به وجب علیه امتثاله سواء کان مکروها للطبع اولم یکن "

تو یقینی طور پر اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کا حکم دیا ہے ان پر عمل کرنا واجب ہے، وہ انسان ان کاموں میں حکمت سمجھ کر ان پر عمل کرتا ہے خواہ اس کی طبیعت پر ناگوار گذریں یا ناگوار نہ سمجھے۔

گویا کہ رب تعالیٰ کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے۔

" یا ایها العبد اعلم ان علمی اکمل من علمک فکن مشتغلا بطاعتی ولا تلتفت الی مقتضی طبعک "

اے بندے میرا علم تیرے علم سے زیادہ کامل ہے، تو میری طاعت میں مشغول ہو جا، اپنی طبیعت کے مطابق کام نہ کر۔ (کبیر)

ذوالنون مصری رحمہ اللہ کا ارشاد:

آپ فرماتے ہیں کہ مخلوق میں چھ چیزوں کی وجہ سے فساد پایا جاتا ہے۔

(۱) آخرت کے عمل میں اس کے ارادہ میں کمی پائی جائے، یعنی عبادات و جہاد کا مشکل سمجھ کر روگردانی کرنا۔

(۲) انسان خواہشات نفسانیہ میں مبتلاء ہو کر رہ جائے۔

(۳) لمبی لمبی امیدیں رکھنا باوجود اس کے کہ اس کی موت کا وقت قریب ہو۔

(۴) رب تعالیٰ کی رضاء پر مخلوق کی رضاء کو ترجیح دینا، یعنی یہ خیال کرنا کہ حاکم راضی رہے، سردار راضی رہے، چوہدری راضی رہے، خدا ناراض ہوتا ہے تو ہو جائے، آجکل اسی چیز نے اسلامی ممالک کو اور اسلامی اداروں کو تباہ کر رکھا ہے، خوشامدی لوگوں نے ہر شعبہ زندگی کو برباد کر رکھا ہے۔

(۵) خواہشات کی تابعداری کرنا اور نبی کریم ﷺ کی سنت کو پس پشت ڈال دینا۔ یعنی اس کی پرواہ نہ کرنا کہ نبی کریم ﷺ نے کیا فرمایا ہے، بلکہ اپنے مفادات کو حاصل کی کوشش میں رہنا۔

(۶) "جعلو اقلیل زلات السلف حجۃ انفسھم و دفنوا کثیر مناقبھم"

سلف صالحین کی معمولی لغزش کو اپنے افعال پر دلیل بنالینا اوران کے کثیر قابل تعریف کاموں کو دفن کر دینا۔

حقیقت میں سب سے زیادہ نقصان اسی میں ہے کہ کسی بزرگ کی لغزش کو اپنے لئے دلیل بنالیا جائے کہ فلاں بزرگ نے بھی وہی کام کیا تھا نہیں نہیں یہ کوئی طریقہ نہیں، راہ راست یہ ہے کہ بزرگ کے کام کو سنت کے مطابق پرکھنا ہوگا۔ اگر سنت کے مطابق ہے تو بہتر، اگر سنت کے خلاف ہے تو اسے چھوڑ دینا ہوگا۔ کیونکہ مشائخ سنت کے تابع ہیں۔ سنت مشائخ کے تابع نہیں۔ (روح البیان مع وضاحت)

عقلمند کو چاہئے:

"فعلی العاقل ان یجاھد مع النفس والطبیعۃ لیر تفع الھوی والشھوات والبدعۃ ویتمکن فی القلوب حب العمل با لکتاب والسنۃ"

عقلمند شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے نفس اوراپنی طبیعت سے جہاد کرے تاکہ اس کی تمنا اور خواہشات اور بدعات اس سے دور ہوسکیں، اوراس کے دل میں قرآن اور حدیث کے مطابق عمل کرنے کی محبت جاگزیں ہوسکے۔ (روح البیان)

ابراہیم خواص رحمہ اللہ کا ارشاد:

آپ فرماتے ہیں میرا ایک جگہ سے گذر ہوا تو میں نے وہاں انار دیکھے، ایک انار میں نے لے لیا، اسے توڑا وہ ترش نکلا، میں نے اسے پھینک دیا۔

آگے چلا تو ایک شخص کو دیکھا جو زمین پر پراگندہ حال (پریشان حال) ہے، اس پر بھڑ جمع ہیں، میں نے کہا"

السلام علیکم "اس نے کہا" وعلیکم السلام یا ابراھیم "اے ابرہیم تم پر بھی سلام ہو۔

میں نے اسے کہا، تم نے مجھے کیسے پہچانا ہے؟ اس نے کہا "من عرف اللہ لایخفی علیہ شی" جو شخص اللہ تعالیٰ کو پہچان لیتا ہے اس پر کوئی چیز مخفی نہیں رہتی۔ پھر میں نے اسے کہا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہیں اللہ تعالیٰ سے قرب حاصل ہے۔ اگر تم اس سے سوال کرو کہ وہ تمہیں بھڑ کی اذیت (تکلیف) سے بچالے تو یہ تمہارے لیا اچھا ہوگا۔

اس شخص نے کہا، میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ تمہیں اللہ تعالیٰ سے تعلق ہے، تم اگر رب تعالیٰ کے حضور عرض کرو کہ وہ تمہیں انار کی خواہش سے بچالے تو تمہارے لئے بہتر ہے۔

" فلدغ الرمان یجدالانسان المہ فی الآخرۃ ولدغ الزنابیر یجدالمہ فی الدنیا "

انار کا ڈسا ہوا شخص آخرت میں درد محسوس کرے گا، کیونکہ اس نے یہ نہیں دیکھا کہ یہ جنگل میں پائے جانے والے اناروں کا کوئی مالک بھی ہے یا نہیں کہ مالک سے اجازت لے لی جائے، پھر خواہش نفسانی کے مطابق وہ شخص چل رہا ہے۔

لیکن بھڑ کا ڈسا ہوا شخص تو صرف دنیا میں محسوس کرے گا، آخرت میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے محفوظ رہے گا۔

اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ نفس سے جہاد کرنا جہاد اکبر ہے۔

شیخ سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

مبر طاعت نفس شہوت پرست　　　　که ہر ساعتش قبلہ دیگر ست

کند مرد را نفس امارہ خوار　　　　اگر ہوشمندی عزیزش مدار

نفس شہوت پرست کی فرمانبرداری نہ کر۔　　کہ ہر گھڑی اس کا قبلہ دوسرا ہے۔

مردِ حق نفس امارہ کو ذلیل رکھتا ہے۔　　اگر تو عقلمند ہے تو اسے عزیز نہ رکھ۔　　(روح البیان)

روحِ جہاد:

تاویلات قاشانیہ میں ہے کہ نفس اور شیطان سے جہاد کرنا بھی فرض کیا گیا ہےاور حقیقت میں جہاد یہ ہے کہ انسان اپنے وجود مجازی کو درمیان سے ہٹادے، فناء فی اللہ کے درجہ میں آجائے، کیونکہ انسان کا وجود اس کے اور رب تعالیٰ کے درمیان حجاب ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے۔

" وجودک ذنب لا یقاس علیه ذنب آخر "

تمہارا اپنا وجود ایسا گناہ ہے کہ اس پر کوئی اور گناہ قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

ابن منصور نے کہا۔

بینی وبینک انی قد یزاحمنی

فارفع بجودک لی انی من البین

اے اللہ میرے اور تیرے درمیان بے شک میرا وجود ہی مزاحم ہے۔

تو اپنی مہربانی سے میرے وجود کو درمیان سے ہٹادے۔

یعنی روحِ جہاد یہ ہے کہ انسان اپنے اور رب تعالیٰ کے درمیان دوئی کو مٹادے، رب تعالیٰ کی تجلیات میں اپنے آپ کو گم کرلے، یہی نفس سے جہاد ہے، جو عظیم جہاد ہے۔ (ماخوذ از روح البیان)

☆☆☆☆☆

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللهِ وَكُفْرٌ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللهِ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاُولٰئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ ☆ (سورة البقرة آیت نمبر ۲۱۷)

﴿۱﴾

تم سے پوچھتے ہیں ماہ حرام میں لڑنے کا حکم تم فرماؤ اس میں لڑنا بڑا گناہ ہے اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اس پر ایمان نہ لانا اور مسجد حرام سے روکنا اور اس کے بسنے والوں کو نکال دینا اللہ کے نزدیک یہ گناہ اس سے بھی بڑے ہیں، اور ان کا فساد قتل سے سخت تر ہے اور ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں اگر بن پڑے اور تم میں جو کوئی اپنے دین سے پھرے پھر کافر ہو کر مرے تو ان لوگوں کا کیا اکارت گیا دنیا میں اور آخرت میں اور وہ دوزخ والے ہیں انہیں اس میں ہمیشہ رہنا ہے۔

﴿۲﴾

سوال کرتے ہیں آپ سے عزت والے مہینے کے متعلق لڑنا اس میں (کیسا ہے) تم فرما دو لڑنا اس میں بڑا (گناہ) ہے، اور روکنا اللہ کی راہ سے، اور کفر کرنا اس کے ساتھ، اور (روکنا) مسجد حرام سے، اور نکالنا اس کے باشندوں کو اس سے بڑا (گناہ)

ہے اللہ کے ہاں، اور فتنہ بڑا (گناہ) ہے قتل سے، اور ہمیشہ لڑتے رہیں کہ تم سے یہاں تک کہ وہ پھیر دیں تمہیں تمہارے دین سے اگر وہ طاقت رکھیں، اور جو شخص پھر گیا تم میں سے اپنے دین سے پھر مرا حالت کفر میں تو ان لوگوں کے ضائع ہو گئے عمل دنیا میں اور آخرت میں، اور وہ لوگ جہنم والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

جن احکام کا ذکر کیا جا رہا ہے ان میں سے یہ تیسرا حکم ہے۔ دو کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

شانِ نزول:

اس آیۃ کریمہ کے نزول کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے غزوۂ بدر سے دو ماہ پہلے اپنے پھوپھی زاد حضرت عبداللہ بن جحش کی زیر قیادت ایک چھوٹا سا لشکر روانہ فرمایا، جو صرف آٹھ آدمیوں پر مشتمل تھا۔ یہ لشکر جمادی الاخری میں بھیجا گیا۔ نبی کریم ﷺ نے ان کو ایک بند خط دیا، اور ارشاد فرمایا کہ خط کو نہ کھولنا، بلکہ دو دن تک چلتے رہنا، پھر خط کو کھول کر پڑھنا، اور اپنے ساتھیوں کو بھی سنانا، پھر جس چیز کا تمہیں حکم دیا گیا ہے اس پر عمل کرنا، اور ساتھیوں کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور نہ کرنا، جو خوشی سے چلے اسے ساتھ لینا، انہوں نے دو دن چلنے کے بعد خط کھولا اس میں لکھا ہوا تھا۔

" بسم اللہ الرحمن الرحیم اما بعد فسر علی برکۃ اللہ تعالی بمن معک من اصحابک حتی تنزل بطن نخلۃ فارصد بھا عیر القریش لعلک تا تینا منھا بخیر "

اللہ کے نام سے شروع جو رحمٰن ورحیم ہے، اس کے بعد (آپ کو حکم دیا جاتا ہے) تم اللہ تعالیٰ کی برکت سے چلو تمہارے ساتھی بھی جو تمہارے ساتھ چلنا چاہیں چلیں، یہاں تک کہ وادی بطن نخلہ میں پہنچ جاؤ، وہاں کفار کے ایک قافلہ کی انتظار کرنا، ہوسکتا ہے کہ تم ہمارے پاس کوئی بہتر خبر لے آؤ۔

آپ نے خط کھولا تو کہا "سمعا و طاعۃ" نبی کریم ﷺ کا ارشاد دل و جان سے قبول ہے۔

پھر انہوں نے اپنے ساتھیوں کو کہا نبی کریم ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا کہ میں تمہیں مجبور کر کے اپنے ساتھ نہ

لے جاؤں۔ جوشخص شہادت کو پسند کرتا ہے وہ میرے ساتھ چلے، اور جوشخص شہادت کو ناپسند کرتا ہے وہ میرے ساتھ نہ چلے، آپ یہ کہہ کر چل پڑے، آپ کے ساتھ تمام ساتھی خوشی سے نبی کریم ﷺ کے ارشاد کے مطابق چلے، جب یہ حضرات نجران میں پہنچے تو سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوان کے اونٹ گم ہو گئے، وہ ان کی تلاش میں نکلے، تو عبداللہ بن جحش اپنے باقی ساتھیوں کو ساتھ لے کر مکہ اور طائف کے درمیان وادی بطن نخلہ میں پہنچ گئے، وہاں سے جب قریش کا قافلہ گزرا جن کے پاس سامان تجارت بھی تھا۔

اس قافلہ میں عمرو بن حضرمی اور حکم بن کیسان اور عثمان بن عبداللہ بن مغیرہ مخزومی اور نوفل بن عبداللہ مخزومی تھے، جب انہوں نے نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام کو دیکھا تو ڈر گئے۔

عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں کو کہا، یہ لوگ تم سے ڈر گئے ہیں (کہیں ڈر کی وجہ سے تم پر اچانک حملہ کر کے تمہیں نقصان نہ پہنچائیں) اس لئے تم میں سے ایک شخص اپنا سر منڈا کر ان کے سامنے ہوتا کہ وہ یہ سمجھیں کہ یہ عمرہ سے واپس آرہے ہیں، اس طرح وہ تمہیں نقصان پہنچانے سے باز رہیں گے۔

صحابہ کرام نے اپنے ہی ایک ساتھی عکاشہ بن محصن کا سر مونڈ دیا، پھر یہ کافروں کے سامنے سر ننگا کئے ہوئے گئے، تو وہ ایک دوسرے کو کہنے لگے، ان سے ہمیں کوئی خوف نہیں، کیونکہ یہ تو عمرہ کر کے واپس آرہے ہیں۔

"وکان ذلک فی آخر یوم من جمادی الآخرۃ وکانوا یرون انہ رجب"

وہ دن جمادی الاخریٰ کی آخری تاریخ تھی، البتہ کفار اس دن کو رجب کی پہلی تاریخ کہہ رہے تھے۔

ادھر حضرت عبداللہ بن جحش نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ آج اگر ان کو قتل نہیں کیا جائے گا، تو کل رجب کی پہلی تاریخ آجائے گی اور یہ لوگ حرم میں داخل ہو جائیں گے، تو ان کو قتل کرنا مشکل ہو جائے گا۔

سب حضرات نے اس پر اتفاق کیا کہ ان پر ہمیں حملہ کر دینا چاہئے، اس طرح ایک صحابی واقد بن عبداللہ سہمی نے تیر چلا کر ایک کافر عمرو بن حضرمی کو قتل کر دیا۔ یہ مشرکوں کا مسلمانوں کی طرف سے پہلا قتل تھا۔

اور دو کافروں یعنی حکم بن کیسان اور عثمان کو قیدی بنالیا گیا۔ اسلام میں یہی پہلے قیدی تھے۔

صحابہ کرام قیدیوں کواوران کا سامان ساتھ لئے مدینہ طیبہ میں آ گئے۔

ادھر کافروں نے یہ شور مچانا شروع کر دیا کہ محمد (ﷺ) نے عزت والے مہینہ میں لڑائی کرنا اورقتل کرنا حلال سمجھ لیا ہے، حالانکہ اس مہینہ میں قتال حرام ہے۔ ہمارے آدمیوں کوقیدی بنالیا گیااور مال لوٹ لیا گیا۔اور مکہ مکرمہ میں جو مسلمان رہ گئے تھے، ہجرت نہیں کر سکتے تھے،ان کوکافر عار دلا تے تھے،اور یہ کہتے تھے۔

''یا معشر الصلوۃ استحللتم الشهر الحرام وقا تلتم فيه''

اے نمازیو!تم نے حرمت والے مہینہ میں لڑائی کرنا حلال سمجھ لیا،اس مہینے کی عزت کے منافی کام کئے۔

نبی کریم ﷺ کو جب پتہ چلاتو آپ نے فرمایا اے عبداللہ بن جحش میں نے تمہیں یہ تونہیں کہا تھا کہ حرمت والے مہینہ میں تم نے لڑائی کرنی ہے، کچھ دیر کے لئے نبی کریم ﷺ نے قیدی اور مال وصول کرنے میں توقف اختیار کیا۔

مسلمانوں نے بھی لشکروالوں پر کچھ سخت الفاظ استعمال کئے،سختی کے انداز میں یہ کہا" لم صنعتم ما لم تؤمروا بــه" تم نے یہ کام کیوں کیا جس کاتمہیں حکم نہیں دیا گیا تھا،یہ سن کرلشکروالے حضرات کافی پریشان ہوگئے کہ شاید ہمارے عمل برباد نہ ہو جائیں۔

''وقالوایارسول الله اناقتلنا ابن الخضرمی ثم امسینا فنظرنا هلا ل رجب فلا ندری افی رجب اصبنا ہ ام فی جمادی واکثر الناس فی ذلک''

انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ ہم نے ابن خضرمی کوقتل کیا،شام بعد میں ہوئی ،پھربھی ہمیں رجب کا چاند نظر نہ آیا،لہٰذا ہمیں معلوم نہیں کہ ہم نے اسے رجب میں قتل کیا ہے یا جمادی میں۔(اکثر حضرات نے یہی وضاحت کی ہے)

اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی تائید میں اور کفار کے رد میں یہ آیۃ کریمہ نازل فرمائی۔

کہ اے محبوب یہ لوگ آپ سے شہر حرام (حرمت والے مہینے) میں لڑائی کرنے کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس مہینے میں جنگ کرنا گناہ ہے کہ نہیں؟ آپ فرمادیجئے کہ ہاں اس میں لڑائی کرنا بڑا گناہ ہے،لیکن اے محبوب آپ ان لوگوں کے کرتوتوں کوبھی دیکھو،اللہ کی راہ سے آپ کواور مسلمانوں کو یہ روکتے ہیں،اللہ تعالیٰ سے کفر یہ کرتے ہیں۔اور

مسجد حرام سے یہ روکتے ہیں، حرم کے باشندوں کو وہاں سے یہ نکالتے ہیں، ان لوگوں کے یہ جرائم اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑا گناہ ہے، پھر ان لوگوں کو یہ تمام کام اور مسلمانوں کو تکالیف پہنچانا فتنہ ہے، اور فتنہ اللہ تعالیٰ کے ہاں حرمت والے مہینے میں کفار کو قتل کرنے سے بھی شدید اور عظیم جرم ہے، اور پھر یہ کفار اے محبوب اور مومنین تم سے اس وقت تک لڑائی کرنے کی کوشش میں رہیں گے کہ ان سے ہو سکے تو تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں یعنی وہ اپنے باطل گمان کے مطابق تمہیں دین سے پھیر دینے تک لڑائی جاری رکھیں گے، ہاں یہ بھی سن لو کہ جو شخص ان کے کہنے پر دین سے پھر گیا، مرتد ہو گیا، اور اس کی موت کفر پر آ گئی، یعنی اس نے پھر توبہ نہ کی اور مسلمان نہ ہوا تو اس کے عمل دین و دنیا میں برباد ہو کر رہ جائیں گے، وہ لوگ جہنم والے ہوں گے اور اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔ (ماخوذ از خازن)

تنبیہ : خازن کی دو عبارتوں کی طرف ذرا پھر سے غور کریں۔

" وكان ذلك في آخريوم من جمادى الآخرة وكانوا يرون انه من رجب "

جس دن ابن حضرمی کو قتل کیا گیا وہ جمادی الاخری کی آخری تاریخ تھی، جسے کفار رجب کی پہلی تاریخ سمجھ رہے تھے۔

" وقالوا يارسول الله اناقتلناابن الخضرمي ثم امسينا فنظر نا هلال رجب فلا ندرى افي رجب اصبناه ام في جمادى "

اور لشکر والے حضرات نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم نے ابن حضرمی کو قتل کیا، شام اس کے بعد ہوئی،

"ثم" کا لفظ تراخی پر دلالت کر رہا ہے جس سے واضح ہو رہا ہے کہ قتل جمادی الاخری کے آخری دن کیا گیا اور شام بعد میں ہوئی پھر **" فاء "** بھی تراخی بلا مہلة پر دلالت کر رہی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ شام ہونے کے بعد ہم نے رجب کا چاند دیکھ لیا، اب ہمیں تو معلوم نہیں کہ ہم نے جمادی الاخری میں قتل کیا ہے یا رجب میں؟

یہ کام تجاہل عارفانہ کے طور پر ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے تو جمادی الاخری میں قتل کیا ہے، کفار اس کو رجب کہہ رہے ہیں۔

راقم کو بھی خازن کی تحقیق سے ہی اتفاق ہے۔ آیۂ کریمہ کا مفہوم واضح ہے کہ آپ سے عزت والے مہینہ میں

لڑائی کرنے کا حکم پوچھتے ہیں آپ وہ ان کو بتا دیں، ان کے کرتوتوں کے متعلق بھی بتا دیں کہ وہ کتنے بڑے جرم ہیں۔
لیکن آیۃ کریمہ میں یہ ذکر نہیں کہ صحابہ کرام کا کافر کو قتل کرنا یا دوسرے کافروں کو قیدی بنانا اور ان کا مال چھیننا حرمت والے مہینہ میں واقع ہوا۔

اس سے تو یہ پتہ چلا کہ مقصد بیان یہ ہے کہ اگر حرمت والے مہینہ میں قتل کیا جاتا تو پھر بھی تمہارے فتنہ کو ختم کرنے کے لئے جائز ہوتا، اگرچہ بغیر فتنہ کے وہ بڑا گناہ ہوتا، لیکن صحابہ کرام نے تو حرمت والے مہینہ میں قتل ہی نہیں کیا۔

بعض مفسرین کرام نے کہا:

بعض تفاسیر میں اس طرح ذکر ہے کہ یہ قتل رات کو ہوا، صحابہ کرام کو پتہ نہ چل سکا کہ رجب کا چاند نظر آ گیا ہے، جبکہ واقع میں چاند نظر آ چکا تھا۔" واللہ اعلم با لصواب "

آیۃ کریمہ کے نزول کے بعد:

نبی کریم ﷺ نے قیدیوں کو بھی اپنے قبضہ میں لے لیا اور لائے ہوئے سامان سے خمس وصول فرمایا، اسلام میں یہ سب سے پہلا خمس تھا، باقی مال لشکر والوں پر بطورِ مالِ غنیمت کے تقسیم کر دیا۔ اسلام میں یہ پہلا مالِ غنیمت تھا۔

قیدیوں کا معاملہ:

کفار نے اپنے قیدیوں کو چھڑانے کے لئے فدیہ بھیجا، لیکن نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر قیدیوں کو چھڑانا ہے تو ہمارے پاس سعد اور عقبہ کو بھیجو، اگر وہ نہ آئے تو ہم ان کو قتل کر دیں گے۔

جب وہ دونوں آئے تو قیدیوں کو ان کے ساتھ بھیجنے کے متعلق حکم فرمایا، لیکن حکم بن کیسان نے اسلام قبول کر لیا، ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور نبی کریم ﷺ کے پاس رہنے کا فیصلہ کر لیا۔

لیکن عثمان بن عبداللہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مکہ میں چلا گیا، اور وہیں حالت کفر میں فوت ہو گیا۔

نوفل جو قید ہونے سے پہلے ہی بھاگ گیا تھا، یہ غزوۂ احزاب میں مسلمانوں کے مخالف کفار کے ساتھ تھا، کیونکہ خود بھی کافر تھا، اس نے اپنے گھوڑے کو تیز دوڑانے کے لئے ایڑی لگائی تا کہ خندق سے پار ہو جائے لیکن یہ اپنے گھوڑے سمیت خندق میں گر کر مر گیا۔ کافروں نے پیسے دے کر اس کی لاش کو حاصل کرنے کی کوشش کی، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ "خذوہ فانہ خبیث الجیفۃ خبیث الدیۃ " اس کی لاش لے لو بے شک یہ خبیث مردار ہے اور اس کی دیت بھی ناپاک ہے۔ (لہٰذا ہمیں ناپاک چیز کے لینے کی کوئی غرض نہیں)۔

سوال کس نے کیا؟

حرمت والے مہینہ میں لڑائی کرنے کا کیا حکم ہے؟ یہ سوال کس نے کیا مسلمانوں نے یا کفار نے؟

اصل میں سوال کافروں نے ہی کیا تھا، اس واقعہ کے بعد تمام ذکر کفار کا ہی آ رہا ہے، جو ان کو جواب دیا گیا ہے۔ لیکن کفار کی باتوں کے بعد مسلمانوں نے بھی پریشان ہو کر سوال کر لیا تھا کہ حرمت والے مہینوں میں لڑائی کا حکم کیا ہے تو، جب جواب دیا گیا تو کفار کا جواب بھی آ گیا اور مسلمانوں کی پریشانی کا اندفاع ہو گیا۔

اس لئے مندرجہ ذیل روایت سے اس غلطی کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں کہ یہ سوال کفار نے نہیں کیا تھا، صرف مسلمانوں نے ہی کیا تھا۔

☆ "عن سعیدبن جبیرعن ابن عباس انه قال مارأیت قوما کانوا خیرا من اصحاب رسول اللہ ماسألوہ الاعن ثلاث عشرۃ مسألۃ حتی قبض کلهن فی القرآن(منها "یسئلونک عن الشهر الحرام)"

حضرت سعید بن جبیر کہتے ہیں حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہم) کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام سے بہتر کسی قوم کو نہیں دیکھا، کیونکہ انہوں نے ہی تو آپ کے وصال سے پہلے تیرہ مسئلے پوچھے۔

یعنی صحابہ کرام کا مسلمانوں پر عظیم احسان ہے کہ انہوں نے تیرہ مسائل پوچھے جو تمام "یسئلونک" سے شروع ہو رہے ہیں۔ ان میں ہی " یسئلونک عن الشهر الحرام " بھی ہے۔

یہ روایت بھی اپنی جگہ درست ہے، کیونکہ کفار کے سوال کے بعد اور ان کے شور وغل کے بعد مسلمانوں نے بھی پوچھ لیا تھا، آیۂ کریمہ بعد میں نازل ہوئی۔ لہٰذا جواب کفار اور مسلمانوں کے سوال کا مشترک تھا۔

" الشهر الحرام " حرمت والا مہینہ، یہاں سے مراد رجب ہے، البتہ کل حرمت والے مہینے چار ہیں۔ رجب، شوال، ذیقعد، ذی الحج۔

حرمت والے مہینوں میں لڑائی کا حکم اب کیا ہے؟

اگرچہ تفصیل پہلے ذکر کردی گئی " وقاتلوا في سبيل الله الذين يقاتلونكم الخ " کی وضاحت کے ضمن میں دیکھیں۔ تاہم مختصر حکم یہ ہے کہ ابتداء میں حرمت والے مہینوں میں لڑائی کرنے کی مطلقاً ممانعت تھی، پھر " واقتلوهم حيث ثقفتموهم " سے پہلا حکم منسوخ کردیا گیا اور حرمت والے مہینوں میں لڑائی کرنے کا حکم جاری کردیا گیا۔ البتہ اگر اشد ضرورت درپیش نہ آئے اور ان مہینوں میں کسی وجہ سے لڑائی ٹل سکے تو لڑائی نہ کرنا بہتر ہے۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

" قل قتال فيه كبير " میں " قتال " مبتداء ہے، اور " كبير " خبر ہے۔ اگرچہ " قتال " نکرہ ہے لیکن " فيه " کے ذریعے اس کی تخصیص کردی گئی، اس لئے مبتداء بنانا صحیح ہے۔ " كبير " کا معنی " عظيم مستنكر " ہے، بہت قبیح یعنی بہت برا، اسی وجہ سے بڑے گناہ کو " كبيرة " کہا جاتا ہے۔

اور نکتہ کی طرف طلباء کرام توجہ فرمائیں:

نکرہ کا جب تکرار آئے تو پہلے نکرہ سے مراد حکم ہوتا ہے اور دوسرے سے مراد اور ہوتا ہے۔ اور معرفہ کا تکرار ہو تو دونوں کا حکم ایک ہوتا ہے۔ اسی لئے "فان مع العسر يسرا ان مع العسر يسرا " کا مطلب یہ ہے کہ ایک مشکل میں دو آسانیاں ہوتی ہیں۔

اس آیۃ کریمہ میں سوال میں بھی " قتـال " نکرہ ہے اور جواب میں بھی نکرہ ہے، دونوں میں فرق یہ ہے کہ سوال عبداللہ بن جحش اور آپ کے ساتھیوں کا ابن حضرمی کو قتل کرنے کے متعلق تھا، جس میں ذکر "قتـال "نکرہ ہے، اور جواب میں ارشاد ہوا۔

"(قل قتال فیه کبیر) " و فیه تنبیه علی ان القتال الذی یکو ن کبیر لیس هوهذا القتال الکبیر الذی سألتم عنه بل هوقتال آخرلان هذاالقتال کان ا لغرض به نصرة الاسلام واذلال الکفر فکیف یکو ن هذا من الکبائر انماالقتال الکبیر هو الذی یکون لغرض فیه هدم الاسلام وتقویة الکفر، فکان اختیار التنکیر فی اللفظین لأجل هذه الدقیقة "

اس میں بیان کرنا یہ مقصود ہے کہ حرمت والے مہینے میں لڑائی کرنا بڑا گناہ ہے' لیکن وہ قتال بڑا گناہ نہیں جس کے متعلق تم نے سوال کیا ہے بلکہ وہ اور قتال ہے، کیونکہ جو قتل عبداللہ بن جحش اور ان کے ساتھیوں نے کیا ہے وہ تو اسلام کی امداد کے لئے تھا اور کافروں کو ذلیل کرنا مقصود تھا' وہ کس طرح بڑا گناہ ہوسکتا ہے؟ بڑا گناہ تو اس قتال (لڑائی) میں ہوتا ہے جس میں اسلام کی بنیادوں کو کمزور کرنا ہوتا ہے اور کفر کو تقویت پہنچانا ہوتا ہے۔ اس بیان کے بعد واضح ہو گیا کے دو جگہ پر " قتال "کو نکرہ ذکر کرنے میں یہی باریک نکتہ ہے۔

اور اگر ایک مرتبہ خازن کی وضاحت جو راقم نے نقل کی ہے اس پر پھر نظر کریں تو " قتـال " کو دو مرتبہ نکرہ ذکر کرنے سے ایک اور عجیب چاشنی پائیں گے۔

"فسبحا ن من له تحت کل کلمة من کلمات هذا الکتاب سر لطیف لایهتدی الیه الا اولوا الا الباب "

وہ ذات پاک جس نے اس کتاب کے ہر کلمہ میں لطیف راز رکھا ہے، اس کی طرف سوائے عقل والوں کے کوئی راہنمائی حاصل نہیں کر سکتا۔ (از کبیر)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"وصد عن سبیل اللہ و کفر بہ والمسجد الحرام" اس مقام میں "المسجد الحرام" کا عطف ہے "سبیل اللہ" پر، لهذا معنوی طور پر عبارت یہ ہوگی "وصد عن المسجد الحرام" اب معنی مکمل یہ ہوگئے، اور روکنا اللہ کی راہ سے، اور کفر کرنا اس کے ساتھ، اور روکنا مسجد حرام سے۔

اللہ کی راہ سے روکنے کا مطلب؟

اس میں چند وجوہ پائی گئی ہیں، تمام کو یہ آیۃ کریمہ شامل ہے۔

(۱) ایک وجہ یہ پائی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایمان لانے سے منع فرماتے تھے۔

(۲) مسلمانوں کو رسول اللہ ﷺ کی طرف ہجرت کرنے سے وہ روکتے تھے، یہ دوسری وجہ ہے۔

(۳) اور اس میں تیسری وجہ یہ پائی گئی ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو حدیبیہ میں عمرہ کرنے سے روک دیا تھا۔

اس تیسری وجہ پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ عبداللہ بن جحش کا واقعہ غزوۂ بدر سے بھی پہلے کا ہے اور حدیبیہ کا واقعہ بہت بعد میں ہجرت کے چھٹے سال درپیش آیا۔ تو کس طرح یہ آیۃ کریمہ اسے شامل ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے۔ "ما کان فی معلوم اللہ تعالیٰ کان کا لو اقع"

اللہ تعالیٰ کے علم میں جب حدیبیہ کا واقع بھی تھا تو وہ اس کے نزدیک ایسا ہی تھا جیسا کہ واقع ہو چکا ہے۔

"وکفربہ": اگرچہ بظاہر معنی تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کفر کرنا، کیونکہ ضمیر لفظ اللہ کی طرف لوٹ رہی ہے، البتہ اللہ سے کفر کرنے والا رسولوں سے بھی کفر کرتا ہے، اور عبادت اور قیامت وغیرہ سے بھی کفر کرتا ہے۔ اس لئے "وکفر بہ" مختصر الفاظ وسیع مضمون کو شامل ہیں۔

تنبیہ: "والمسجد الحرام" کا تعلق "کفر" سے بھی ہو سکتا ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا مسجد حرام سے کفر کرنا،

یعنی وہ لوگ مسلمانوں کو مسجد حرام سے نماز ادا کرنے سے روکتے تھے اور بیت اللہ شریف کا طواف کرنے سے روکتے تھے، جسے وہ اپنا حق سمجھتے اور جائز سمجھتے تھے، جو باعث کفر تھا۔

"واخراج اهله منه": اور اس کے اہل کو اس سے نکالنا۔

یعنی کفار کا اور عظیم جرم یہ تھا کہ مسجد حرام کے باشندوں کو مسجد حرام سے نکال دیتے تھے، بلکہ شہر حرم مکہ مکرمہ سے مسلمانوں کو ہجرت پر مجبور کر دیا۔

"اکبر عنداللہ": بہت بڑا گناہ ہے اللہ کے ہاں۔

ان الفاظ مبارکہ کا تعلق ان کے تمام جرائم سے ہے، یعنی اللہ کی راہ سے روکنا، حرمت والے مہینے میں لڑائی کرنے سے بڑا گناہ ہے۔ اور اللہ کے ساتھ کفر کرنا حرمت والے مہینہ میں لڑائی کرنے سے بڑا گناہ ہے۔ اور مسجد حرام سے روکنا اور مسجد حرام سے کفر کرنا حرمت والے مہینہ میں لڑائی کرنے سے بڑا گناہ ہے۔ (از کبیر)

"والفتنة اکبر من القتل": اور فتنہ بڑا گناہ ہے قتل سے۔

"ان الفتنة عن الدین تفضی الی القتل الکثیر فی الدنیا والی استحقاق العذاب الدائم فی الآخرة فصح ان الفتنة اکبر من القتل"

بے شک دین میں فتنہ دنیا میں کثیر قتل کی طرف پہنچاتا ہے۔ اور آخرت میں دائمی عذاب کا مستحق بناتا ہے۔ لہٰذا واضح ہوا کہ فتنہ قتل سے بھی بڑا گناہ ہے۔

آج ہم اپنے ملک پاکستان میں فتنہ کو دیکھتے ہیں تو سمجھ آتا ہے کہ شائد اس فتنہ کا اصل سبب علماء ہیں؟ لیکن یہ غلط ہے، علماء کے اختلافات قتل وغارت تک نہیں پہنچاتے، اس کی اصل وجہ وقت کے حکام اور ان کے چمچے کڑچھے ہیں، جو پیسہ دے کر جہلاء کو خرید کر فتنہ وفساد برپا کرتے ہیں، بظاہر وہ مولوی نظر آتے ہیں۔ عالم دین بک جائے یہ ممکن نہیں۔ بکنے والے جھکنے والے علماء نہیں جہلاء ہیں۔

”ولا یزالون یقاتلونکم حتی یردوکم عن دینکم ان استطاعوا“

اور وہ ہمیشہ لڑیں گے تمہارے ساتھ یہاں تک تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں اگر وہ طاقت رکھیں۔

یہ کلام فرض کے طور پر ہے۔ جس طرح رب تعالیٰ نے فرمایا۔

”قل ان کان للرحمن ولد فانا اول العابدین“

فرمادو اگر رحمٰن کی اولاد ہوتی تو سب سے پہلے میں اس کی عبادت کرنے والا ہوتا۔

یعنی اس کی کوئی اولاد نہیں کہ اس کی عبادت کی جائے، اگر فرض کیا جاتا کہ اس کی اولاد ہوتی وہ مستحق عبادت ہوتی۔

اسی طرح یہاں مطلب یہ ہے کہ وہ کافر اپنے باطل خیال میں تو یہ چاہتے ہیں کہ تمہارے ساتھ لڑائی جاری رکھیں تاکہ تمہیں دین سے پھیر لیں، لیکن یہ اسی وقت ہوتا جب ان کو طاقت ہوتی۔ ان کو تو اس کی طاقت ہی نہیں کہ تمہیں لڑائی کر کے دین سے پھیر دیں۔

آج بھی کافر اور کافروں کے ہمنوا یہی چاہتے ہیں کہ دینداروں سے لڑائی کر کے اور ان کو قتل کر کے لوگوں کو دین سے پھیر دیں، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ جتنا انہوں نے مساجد میں قتل عام کیا اتنا ہی نمازیوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔

ان شاء اللہ غدار مسلمان اپنے آقاؤں کی طرح ذلیل ہوتے رہیں گے، اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کا ان کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوگا۔

”ومن یرتدد منکم عن دینہ فیمت وھو کافر فاولئک حبطت اعمالھم فی الدنیا والآخرۃ واولئک اصحاب النار ھم فیھا خالدون“

اور جو شخص پھر گیا تم میں سے اپنے دین سے، پھر مرا حالت کفر میں تو ان لوگوں کے ضائع ہو گئے عمل دنیا اور آخرت میں اور وہ لوگ جہنم والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

جب پہلے ذکر فرمایا کہ کافروں کا مسلمانوں سے لڑائی کرنا صرف اس لئے ہے کہ وہ مسلمان کو دین سے پھیر

دیں۔اورضمناً یہ بھی بیان کیا گیا کہ وہ کامل مسلمانوں کو دین سے نہیں پھیر سکیں گے۔اب بیان کیا جارہا ہے کہ اگر وہ ضعیف اعتقاد والے مسلمانوں کو ڈرانے یا لالچ دینے کی وجہ سے دین سے پھیر لیں ،تو جو شخص مرتد ہو گیا اس کے اعمال دین و دنیا میں برباد ہو جائیں گے،اور وہ لوگ جہنم کا ایندھن بنیں گے اور اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

تنبیہ : ایمان اور کفر کی دارومدار وقت وفات پر ہے۔

"الایمان لایکو ن ایمانا الا اذ امات المومن علیه و الکفر لایکو ن کفرا الااذ امات الکافر علیه"

ایمان اس وقت تک ایمان نہیں ہو گا جب تک کہ مومن کی موت ایمان پر نہ آئے۔اور کفر اس وقت تک کفر نہیں ہو گا جب تک کافر کی موت کفر پر نہ آئے۔

یعنی اگر کوئی شخص مومن تھا لیکن "العیاذ باللہ" وہ کافر ہو گیا اور توبہ کر کے دوبارہ اسلام میں داخل نہیں ہوا، حالت کفر میں وہ مر گیا تو اس کے اعمال برباد ہو گئے ،ایمان رائیگاں (ضائع) ہو گیا۔اسی طرح ایک شخص کافر تھا ،لیکن اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور توفیق سے اسے ایمان حاصل ہو گیا ،اور وہ حالت ایمان میں ہی فوت ہو گیا تو" ان الایمان یهدم مامضی "(بے شک ایمان پہلے تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے) کا مصداق بن گیا۔

مختصر مطلب یہ ہے کہ انسان کے ایمان ونجات اور کفر وعذاب کی دارومدار خاتمہ پر ہے۔جس حال میں مرے گا،اسی حال والے احکام بھی مرتب ہوں گے۔

اعتراض:

جب ایک شخص کتنا عرصہ مومن رہا تو وہ ایمان اور اس کے اعمال ضائع کیسے ہو گئے؟

جواب:

"فذلک الایمان السابق و ان کنا نظنه ایمانا الا انه ما کا ن عنداللہ ایمانا فظهر ان المواقاة شرط لکو ن الایمان ایمانا والکفر کفرا"

اس کا ایمان جسے ہم ایمان سمجھتے تھے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں معتبر ہی نہیں تھا اللہ تعالیٰ کے ہاں وہی ایمان مقبول ہے جب اسی ایمان پر خاتمہ ہو، اسی طرح وہی کفر اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے اور اسی کفر پر دائمی عذاب مرتب ہوتا ہے جس پر موت آجائے، اگر ساری عمر کفر کرتا رہا موت ایمان پر آگئی تو وہ کفر مٹ گیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں دارومدار خاتمہ پر ہے۔

مسئلہ:

اگر کوئی شخص (العیاذ باللہ) مرتد ہوگیا، اسے قید کرلیا جائے اور اس کے شبہات کو زائل کیا جائے، اگر وہ تین دنوں تک توبہ کرلے اور پھر اسلام قبول کرلے تو بہتر، ورنہ اسے قتل کرلیا جائے۔ اگر عورت مرتد ہوجائے تو اسے قید کرلیا جائے جب تک وہ توبہ کرکے اسلام قبول نہ کرلے، اس وقت تک اسے قید میں رکھا جائے۔ خواہ تمام عمر ہی اسے قید میں رکھنا پڑے تو اسے قید میں رکھا جائے۔

مسئلہ:

مرتد مسلمان کا وارث نہیں اور مسلمان مرتد کا وارث نہیں ہوسکتا۔

مسئلہ:

اگر کوئی شخص کسی وقت کی نماز ادا کرکے العیاذ باللہ مرتد ہوگیا، پھر اسی نماز کے وقت ختم ہونے سے پہلے توبہ کرکے اسلام قبول کرلیا جائے تو اسے پھر دوبارہ وہ نماز ادا کرنی پڑے گی۔

☆☆☆☆☆

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِیۡنَ هَاجَرُوۡا وَجٰهَدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِکَ یَرۡجُوۡنَ رَحۡمَتَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ☆ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۱۸)

۱

وہ جو ایمان لائے' اور وہ جنہوں نے اللہ کے لئے اپنے گھر بار چھوڑے اور اللہ کی راہ میں لڑے وہ رحمت الٰہی کے امیدوار ہیں اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

۲

بیشک وہ لوگ جنہوں نے ایمان لایا' اور وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی' اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں' وہ لوگ امید کرتے ہیں اللہ کی رحمت کی۔ اور اللہ بخشنے والا' رحم کرنے والا ہے۔

ماقبل سے تعلق:

(۱) جب اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں حضرت عبداللہ بن جحش اور ان کے ساتھیوں کو ابن حضرمی کے قتل کے جرم سے بری قرار دیا کہ وہ گنہگار نہیں، تو انہوں نے پوچھا، یارسول اللہ ﷺ کیا ہمیں اس پر اجر بھی حاصل ہوگا؟ تو اس آیۃ کریمہ کو نازل فرما کر بتادیا کہ وہ اللہ کی رحمت کی امید کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو رحمت عطاء فرماتا ہے۔

(۲) جب پہلے جہاد کا ذکر فرمایا "کتب علیکم القتال وھو کرہ لکم" تو اس میں وعید پائی گئی تھی' اب اس آیۃ کریمہ میں وعد کا ذکر فرمایا گیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عادت شریفہ ہے کے وعید کے بعد وعد کا ذکر فرماتا ہے۔

"ان الذین آمنوا والذین ھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ":

بیشک وہ لوگ جنہوں نے ایمان لایا اور وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں۔

"ھاجروا" وطن اور قبیلہ کو چھوڑا' اصل میں "ھجر یھجر ھجرا" کا معنی ترک کرنا' اور چھوڑنا ہے' جو

وصل کی ضد ہے۔ اسی وجہ سے قبیح کام کو "ھجر" کہا جاتا " لانہ مما ینبغی ان یھجر" کیونکہ مناسب یہی ہوتا ہے کہ برے کلام کو ترک کر دیا جائے۔ "ھاجرۃ" دوپہر کے وقت کو کہا جاتا ہے کہ اس میں ہر قسم کی نماز یعنی فرض، نفل، نماز جنازہ کو چھوڑ دیا جاتا ہے بلکہ سجدۂ تلاوت بھی نہیں کیا جاتا۔

"جاھدوا" ماخوذ ہے "جھد" سے، جس کا معنی ہے مشقت کرنا، محنت کرنا، اسی وجہ سے جہاد اور مجاہدہ کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے " بذل الجھد فی قتال العدو" دشمن کے قتل کرنے میں کوشش کرنا۔

"اولئک یرجون رحمت اللہ": وہ امید کرتے ہیں اللہ کی رحمت کی۔

امید کرنے کا ذکر کیا ہے، یقین کرنے کا ذکر نہیں، اس کی کیا وجہ ہے۔ اس میں چند وجوہ پائی گئی ہیں۔

(۱) ہمارا مذہب یہ ہے کے ایمان پر اور اعمال پر ثواب عطا کرنا عقلاً کوئی واجب نہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے سچے وعدہ کے مطابق اپنے فضل و کرم سے اپنے ذمہ لگا دیا۔ اس لئے امید کا ذکر کیا ہے یقین کا نہیں۔

(۲) اور وجہ یہ ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے وعدہ فرما کر اپنے ذمۂ کرم پر لگایا ہے کہ وہ ثواب عطاء فرمائے گا لیکن گزشتہ آیۃ کریمہ سے واضح ہوا کہ ثواب اس وقت حاصل ہوگا کہ جب موت حالت ایمان پر آئے، انسان کے لئے یہ حالت مشکوک ہے کہ اس نے ایمان پر مرنا ہے یا کفر پر، اس لئے وہ اللہ کی رحمت کی امید کرتے ہیں، یقین نہیں کرتے۔

(۳) اس آیت کریمہ میں تین چیزوں کا ذکر فرمایا گیا، ایمان، ہجرت، اور اللہ کی راہ میں جہاد، لیکن اس کے ساتھ ساتھ " لابدللانسان مع ذلک من سائر الاعمال "انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ تمام اعمال پر عمل کرے۔ یہ صورت انسان کے لئے یقینی نہیں بلکہ امید پر مبنی ہے کہ ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ باقی اعمال کی بھی توفیق عطاء فرمائے گا " فلا جرم علقۃ علی الرجاء "اسی لئے یقیناً اس نے اللہ کی رحمت کو امید کے ساتھ متعلق کرلیا ہے۔

تنبیہ: امید کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں " لیس المراد من الآیۃ ان اللہ شکک العبد فی ھذہ

المغفرة " یعنی آیۃ کریمہ کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو بندے کی مغفرت میں شک ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ نسبت بندوں کی طرف ہے کہ وہ ہجرت کرتے اور جہاد کرتے ہیں، لیکن اپنے نفسوں میں کوتاہی سمجھتے ہیں کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کی عبادت اسی طرح نہیں کی جیسا کہ کرنے کا حق تھا۔ ہم نے دین کی امداد اس طرح نہیں کی جیسا کہ ہم پر لازم تھا۔ اپنی اسی حالت کو دیکھ کر وہ رب تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے اس کی رحمت کی امید تو کرتے ہیں لیکن یقین نہیں کرتے ۔

ایک اور وجہ:

"ان المراد من الرجاء القطع و الیقین فی اصل الثواب ، والظن انما دخل فی کمیته وفی وقته"

ایمان والے لوگ جو ہجرت بھی کرتے ہیں اور جہاد بھی ان کو یہ تو یقین ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ کے مطابق ثواب تو عطا کرنا ہے لیکن انہیں یہ یقین نہیں ہوتا کہ کتنا ثواب عطا کرنا ہے اور کس وقت عطا کرنا ہے، گویا کہ امید کی نسبت مقدار ثواب اور وقت ثواب کی طرف ہے، اصل ثواب کی طرف نہیں۔ (از کبیر)

"واللہ غفور رحیم": اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے بندوں کی امید کو ثابت فرمادیا کہ جب ان کی موت ایمان پر آئی اور اچھے عمل کئے تو بیشک اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے گا اور رحم فرمائے گا۔

اسی سے یہ واضح کردیا کہ عبداللہ بن جحش اور ان کے ساتھیوں کی اللہ تعالیٰ نے اسی وقت مغفرت فرمادی جب وہ اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے نکلے تھے۔ اور اسی وقت ان پر رحم فرمادیا۔ یعنی ان کی اس وقت مغفرت کی اور اس وقت ان پر رحم فرمایا، جب ان کو اس کا علم بھی نہیں تھا۔ (از کبیر)

رحمت کی امید پر اللہ کا کرم:

ابو عمرو ایک دن ایک گلی سے گزر رہے تھے، وہاں دیکھا کہ محلہ کے چند لوگ جمع ہیں جو ایک جوان کو اس کے فساد کی وجہ سے محلّہ سے نکالنا چاہتے ہیں، اس کی ماں رو رہی ہے۔

ابو عمرو کندی کو اس پر رحم آیا۔ آپ نے لوگوں کو کہا اس مرتبہ میری وجہ سے اسے معاف کر دو، اگر پھر اس نے فساد برپا کیا تو تم جو چاہو اس سے سلوک کرنا۔ انہوں نے معاف کر دیا۔

کچھ دنوں کے بعد آپ پھر اس محلہ اور اسی گلی سے گزرے تو دیکھا اس نوجوان کے گھر سے بڑھیا (اس کی ماں) کی رونے کی آواز آرہی ہے، آپ نے سمجھا شاید جوان نے پھر کوئی فساد برپا کیا، تو لوگوں نے اس کو گھر سے نکال دیا ہے، دروازہ کھٹکھٹایا، اس بڑھیا سے اس کے بیٹے کا حال پوچھا، تو اس نے بتایا کہ وہ فوت ہو گیا۔ اس کے متعلق کچھ تفصیل پوچھی تو اس عورت نے بتایا کہ جب اس کی موت کا وقت قریب آیا تو اس نے مجھے کہا اے میری ماں! میری موت کی خبر کسی کو نہ دینا، کیونکہ میں نے اپنے اردگرد کے لوگوں کو ستایا ہے، وہ مجھے گالی دیں گے، میرے جنازہ پر حاضر نہیں ہوں گے، مجھے خود ہی دفن کر دینا، اور میری انگوٹھی پر " بسم اللہ الرحمن الرحیم " لکھا ہوا ہے، وہ انگوٹھی میرے ساتھ دفن کر دینا۔ میں نے اس کی وصیت کے مطابق عمل کیا، جب دفن سے فارغ ہوئی۔

" سمعت صوته یقول انصرفی یا اماه قدمت علی رب کریم "

تو میں نے یہ آواز سنی کہ وہ میرا بیٹا مجھے یہ کہہ رہا ہے کہ اے میری ماں! چلی جا، میں اپنے مہربان رب کے پاس آگیا ہوں۔

یعنی میرے خوف اور میری اس امید پر کہ اللہ تعالیٰ مجھے " بسم اللہ الرحمن الرحیم " کے وسیلہ اور برکت سے معاف فرمائے گا، اس نے مجھے معاف کر دیا ہے۔

کسی نے کیا خوب کہا " بہانہ مید ہد بہا نمید ہد " وہ بہانے سے عطا کرتا ہے، قیمت سے عطا نہیں کرتا۔

(روح البیان)

فائدہ:

"ولا سبیل الی المھا جرۃ الا بعدا لایمان ولا الی جھادالابعد ھجران الشھوات "
جب تک ایمان حاصل نہ ہو اس وقت تک ہجرت کا کوئی فائدہ نہیں اور جب تک انسان خواہشات کو نہ چھوڑے اس وقت جہاد کا کوئی فائدہ نہیں۔ (روح البیان)

ہجرت کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ہجرت کی ایک قسم وہ ہے جسے ہجرت صوریہ کہا جاتا ہے، یعنی ظاہری طور پر اپنے وطن کو چھوڑنا ہے۔ اس ہجرت کی فرضیت فتح مکہ کے بعد ختم ہو چکی ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا "لا ھجرۃ بعد الفتح" فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں۔

ہاں البتہ کسی ملک کے کافر مسلمانوں کو شعائرِ اسلام پر عمل نہیں کرنے دیتے تو اب بھی اس حال میں ہجرت فرض ہوگی۔ لیکن یہ ہجرت بھی اس وقت معتبر ہوگی جب اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہو، دنیاوی مقصد اور دنیاوی منافع پیش نظر نہ ہوں۔ جیسا کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

" فمن کانت ھجرتہ الی اللہ ورسولہ فھجرتہ الی اللہ ورسولہ ومن کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا "

جس نے ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف کی اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف پائی گئی، اور جس نے ہجرت دنیا کی طرف کی اس نے دنیا کو ہی پایا۔

اس کے بعد اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ دیکھیں خوب تر نظر آئے گا۔

"اور وہ جنہوں نے اللہ کے لئے گھر بار چھوڑے"

(۲) ہجرت کی دوسری قسم وہ ہے جسے ہجرت معنویہ کہا جاتا ہے، یہ وہ ہے کہ انسان بت پرستی کو چھوڑ کر اور گناہوں کو چھوڑ کر اور خواہشات نفسانیہ کو چھوڑ کر خالص اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرے، اور اسی ذات کی طرف اس کی توجہ ہو۔

جہاد کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ایک قسم جہاد کی وہ ہے جسے جہادِ اصغر کہا جاتا ہے، یہ کافروں سے جہاد کرنا ہے۔

(۲) دوسری قسم جہاد کی وہ ہے جسے جہادِ اکبر کہا جاتا ہے، یہ نفس سے جہاد کرنا ہے۔

☆ جہاد اصغر میں ظاہر کی اصلاح کرنا ہے اور جہاد اکبر میں باطن کی اصلاح کرنا ہے، اور یہ جہاد بہت مشکل اور بہت قوی ہے۔

☆ جہاد اصغر سے انسان جنت اور رحمت تک پہنچتا ہے۔ اور جہاد اکبر سے انسان رب تعالیٰ کے مشاہدہ اور اس کے جمال مطلق تک پہنچتا ہے۔

☆ جہاد اصغر سے شہادت حاصل ہوتی ہے اور جہاد اکبر سے صدیقیت حاصل ہوتی ہے، صدیقین کا مقام شہداء کے مقام سے بلند ہے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا۔

" فاولئک مع الذین انعم اللہ علیھم من النبیین و الصدیقین و الشھداء "

اس ارشادِ گرامی میں صدیقین کا ذکر انبیاء کے ذکر کے بعد اور شہداء سے پہلے کر کے واضح کر دیا کہ انبیاء کرام کے بعد مقام ہے صدیقین کا اور اس کے بعد مقام ہے شہداء کا۔ (روح البیان بزیادۃ)

اگر تو رب تعالیٰ کی رحمت چاہتا ہے تو مخلوق پر رحم کر:

شیخ سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

مکن تا توانی دل خلق ریش وگر میکنی میکنی بیخ خویش

جب تک تو طاقت رکھتا ہے مخلوق کا دل زخمی نہ کر۔ اگر مخلوق کا دل زخمی کرے گا تو اپنی جڑوں کو اکھیڑ دے گا۔

یعنی مخلوق کو ستانے میں اپنی بربادی ہے۔ اور مخلوق پر رحم کرنے میں اللہ تعالیٰ کی رحمت حاصل ہوتی ہے۔

(روح البیان)

☆☆☆☆☆

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۱۹)

﴿۱﴾

تم سے شراب اور جوئے کا حکم پوچھتے ہیں تم فرمادو کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے کچھ دنیوی نفع بھی اور ان کا گناہ ان کے نفع سے بڑا ہے۔

﴿۲﴾

وہ پوچھتے آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق، فرمادو ان دونوں میں بڑا گناہ ہے، اور (دنیاوی) منافع ہیں لوگوں کے لئے، اور ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے بڑا ہے۔

شراب کو تدریجاً (آہستہ آہستہ) حرام کیا گیا:

سب سے پہلے یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

"ومن ثمرات النخيل والاعناب تتخذون منه سكرا ورزقا حسنا ان فی ذلک لآیة لقوم یعقلون" (سورۃ النحل آیت ۶۷)

اور کھجور اور انگور کے پھلوں میں سے کہ اس سے نبیذ بناتے ہو اور اچھا رزق بے شک اس میں نشانی ہے عقل والوں کو۔

ابھی تک شراب کو حرام نہیں کیا گیا تھا بلکہ "فطفق المسلمون یشربونها وهی لهم حلال یومئذ"
مسلمان (صحابہ کرام) شراب پیتے رہے اور یہ ان کے لئے حلال تھی۔

"ثم ان عمر ومعاذ اونفرا من الصحابة (رضی اللہ عنہم) قالوا افتنا یارسول اللہ فی الخمر فانها مذهبة للعقل ومسلبة للمال"

پھر حضرت عمر اور حضرت معاذ اور چند صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے

اورعرض کیا یارسول اللہ شراب کے متعلق کوئی حکم جاری فرمائیں کیونکہ یہ عقلوں کو زائل کردیتی ہے اور مال کو ضائع کردیتی ہے۔

ان کے عرض کرنے پر یہ آیۃ کریمہ (جس کی وضاحت جاری ہے) نازل ہوئی۔ " یسئلو نک عن الخمر والمیسر " الخ

اس آیۃ کریمہ کے نازل ہونے کے بعد لوگ دوقسم پر منقسم ہو گئے۔

" قوم وقالو انأخذ منفعتها و نترک اثمها" بعض لوگ شراب پیتے رہے کہ ہم اس سے نفع حاصل کرتے ہیں۔ اوراس کے گناہ کو چھوڑ دیتے ہیں۔

"وترکها آخرون وقالو الاحاجة لنافیما فیه اثم کبیر" اور کچھ حضرات نے مکمل طور پر شراب کو چھوڑ دیا کہ جس چیز میں بڑا گناہ ہے اس کی ہمیں حاجت نہیں۔

"ثم ان عبدالرحمن بن عوف رضی الله عنه دعاناسامنهم فشربوا وسکروا قام احدهم فقرأ قل یا ایها الکافرن اعبد ما تعبدون الی آخر السورة بدون لا فی لااعبد "

پھر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کچھ لوگوں کی دعوت کی، تو انہوں نے دعوت میں شراب پیا، نشہ میں آ گئے، ان میں سے ایک صاحب نے نماز پڑھائی، تو نماز کے قیام میں "سورة الکافرون " پڑھی، لیکن "لاا عبد "کی جگہ " اعبد " پڑھا، بلکہ تمام سورة میں جہاں جہاں " لا " مذکور تھا اسے چھوڑ دیا۔

اس واقع کے بعد یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔ "یاایها الذین امنوا لا تقربواالصلوة وانتم سکاری "

اے ایمان والو! نماز کے قریب نہ جاؤ ایسے حال میں جب تم نشہ میں ہو۔

اس آیۃ کریمہ کے نازل ہونے کے بعد زیادہ حضرات نے شراب کو چھوڑ دیا کہ "لاخیر فی شیٔ یحول بیننا وبین الصلوة" اس چیز میں کوئی بھلائی اور بہتری نہیں جو ہمارے اور ہماری نماز کے درمیان میں حائل ہو جائے۔

لیکن کچھ لوگ عشاء کی نماز کے بعد شراب پی لیتے تھے تا کہ صبح کی نماز تک نشہ اتر جائے ،اسی طرح بعض لوگ صبح کی نماز کے بعد شراب پی لیتے تھے تا کہ ظہر تک نشہ اتر جائے۔

''ثم ان عتبان بن مالک اتخذ صنیعا یعنی ولیمة ودعا رجا لا من المسلمین فیهم سعد بن ابی وقاص رضی الله عنه وکان قد شوی لهم راس بعیر فاکلوا منه وشربوا الخمر حتی سکر وامنها ثم انهم افتخر وا عند ذلک وانتسبوا وتنا شد واالا شعار فانشدسعد قصیدة فیها هجاء الانصار وفخر لقومه فاخذ رجل لحی البیعر فضرب به رأس سعد فشجه مو ضحة فانطلق سعد الی رسول الله ﷺ وشکا الیه الانصاری فقال عمر اللهم بین لنا فی الخمر بیانا شافیا فنزل (انما الخمر والمیسر) فی المائدة الی قوله (فهل انتم منتهو ن) فقال عمر انتهینا یا رب ''

پھر عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ نے چند صحابہ کرام کو دعوتِ ولیمہ دی، جب لوگ حاضر ہوئے تو ان میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ اونٹ کا گوشت بھونا گیا، وہ دعوت میں شرکا ، نے کھایا اور شراب پی یہاں تک کہ وہ نشہ میں آ گئے۔ اسی نشہ کی حالت میں انہوں نے اپنی اپنی قوم اور اپنے اپنے نسب کی تعریف میں فاخرانہ اشعار پڑھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ایک قصیدہ پڑھا، جس کے اشعار میں انصار کی ہجو(مذمت) بیان کی گئی اور اپنی قوم پر فخر کیا گیا، تو انصار میں سے ایک شخص نے اونٹ کے جبڑے کی ہڈی حضرت سعد کو اس زور سے ماری کہ ان کے سر اور چہرے پر گہرا زخم ہو گیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں شکایت لے کر آئے، ادھر انصاری نے بھی شکایت پیش کی۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا اے اللہ شراب کے متعلق کوئی واضح حکم نافذ فرما۔ تو رب تعالیٰ نے سورۃ مائدہ میں آیۃ کریمہ ''یاایھاالذین امنوا انما الخمر و المیسر الخ'' نازل فرما کر شراب کو مکمل طور پر حرام کر دیا۔

رب تعالیٰ کے ارشاد " فهل انتم منتهون "(کیا تم رک جاؤ گے) پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا'' انتهینا یا رب ''تو اے ہمارے رب ہم رک گئے۔

(از بغوی ، مظہری ، روح البیان ، خازن)

تنبیہ: حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کی دعوت میں شراب پینے سے جب نشہ میں آ گئے۔

"وحضرت صلوة المغرب فقد موا علیا کرم اللہ وجهه فقرأ (قل یا ایها الکافرون) الخ بحذف لا"

اور مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا تو حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ کو آگے کیا گیا کہ آپ نماز پڑھائیں، تو آپ نے نشہ کی حالت میں سورۃ کافرون پڑھی "لا اعبد" کی جگہ "اعبد" پڑھا۔

(روح المعانی)

عزیز طلباء کرام! تنبیہ سے آپ کو اس بات سے خبردار کرنا مقصود ہے کہ جس طرح اکثر مفسرین کرام نے مبہم طور پر بیان کیا کہ ایک شخص کو آگے کیا گیا، اسی طرح آپ حضرات بھی اپنی تقاریر میں بیان کریں۔

آزاد کشمیر باغ سے ایک مرتبہ ایک مولانا صاحب جو سادات خاندان سے تعلق رکھتے ہیں مجھ سے بذریعہ فون مشورہ طلب کیا کہ کالج میں ایک لیکچرار صاحب نے بیان کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شراب کے نشے میں "لا اعبد" کی جگہ "اعبد" پڑھا تو اس پر ہنگامہ کھڑا ہو گیا، کچھ طلباء لڑائی میں زخمی ہو گئے، معاملہ پولیس کے پاس چلا گیا۔

میں نے شاہ صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ وقتی طور پر یہ کہہ کر ٹال دیں کہ مسئلہ کی تحقیق کریں گے، اگر لیکچرار صاحب نے غلط کہا تو وہ اپنی غلطی کا اعتراف کر کے معافی مانگ لیں گے۔

معاملہ کو رفع دفع کرنے کے لئے اور جذبات کو ٹھنڈا کرنے کا یہ حیلہ ہے ورنہ مسئلہ ٹھیک بتایا گیا ہے۔

اصل میں سمجھانے کا یہ طریقہ اختیار کیا جائے تو لوگوں کے ذہن قبول کر لیں گے، کہ اسلام سے پہلے لوگ بت پرست تھے، مشرک تھے جب اسلام لے آئے، تو کامل مسلمان بن گئے، اسلام سے پہلے سود خوار تھے، اسلام کے بعد متقی بن گئے، اسلام سے پہلے چور تھے، اسلام کے بعد پرہیزگار بن گئے، اسلام سے پہلے جھگڑالو تھے، اسلام کے بعد بھائی بھائی بن گئے، شراب کی حرمت سے پہلے شراب پینا جائز تھا، اس لئے جب تک جائز رہا صحابہ کرام شراب پیتے رہے، جب شراب حرام ہو گیا تو مٹکے توڑ دیے گئے۔

شراب کی حرمت کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تقوی:

"وعن علی کرم اللہ تعالٰی وجہہ لو وقعت قطرة منها فی بئر فبنیت فی مکانها منارة لم اؤذن علیها ولو وقعت فی بحر ثم جف فنبت فیه الکلأ لم ارعه دابتی"

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اگر ایک قطرہ شراب کا کنوئیں میں گر جائے [illegible] (یعنی کنوئیں کو بند کر کے وہاں) مینار بنا دیا جائے تو میں اس مینار پر اذان نہیں دوں گا۔ اور اگر ایک قطرہ دریا میں یا سمندر میں گر جائے تو وہاں گھاس اگ آئے تو میں اپنے کسی جانور کو وہ گھاس نہیں چراؤں گا۔ (روح المعانی)

یہی واقعہ روح البیان اور مدارک التنزیل اور کبیر وغیرہ میں بھی مذکور ہے۔

شراب کب حرام ہوئی؟

"وحرمت الخمر فی السنة الثالثة من الهجرة بعد غزوة الاحزاب [illegible]"

ہجرت کے تیسرے سال میں غزوہ احزاب کے چند دنوں کے بعد شراب [illegible]

شراب کو تدریجاً حرام کرنے میں فائدہ:

شراب کو ایک مرتبہ ہی حرام نہیں کیا گیا [illegible] شراب [illegible] بہت زیادہ محبت کرتے تھے اور وہ اس میں بہت نفع سمجھتے تھے۔ [illegible] دیا گیا تو ان پر مشکل ہوتی۔

"فلاجرم استعمل فی تحریمه هذا التدریج [illegible]"

[illegible] شراب [illegible]

شراب حرام [illegible] شراب [illegible]

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کا کمال:

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا۔

" ما شربت الخمر قط لا نی رائیتها تزیل العقل "

میں نے شراب کبھی نہیں پیا، بے شک میں نے دیکھا کہ یہ عقل کو زائل کر دیتی ہے۔

" وما عبدت صنما قط لأنی رأیته لایضر ولاینفع "

میں نے کسی بت کی عبادت نہیں کی، کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ یہ کوئی نفع ونقصان نہیں پہنچا سکتے۔

" وما زنیت قط لغیر تی علی اهلی "

اور میں نے کبھی زنا نہیں کیا کہ میری زوجہ کو غیرت حاصل نہ ہو۔

" وما کذبت قط لانی رائیته دناءة " میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا کیونکہ میں نے جھوٹ کو گھٹیا سمجھا۔

یعنی یہ تمام اوصاف حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کو زمانہ جاہلیت میں بھی حاصل تھے۔ (ماخوذ از روح البیان)

مومن کی شان کی لائق یہ ہے:

"فینبغی للمسلم ان لایخطر بباله شرب الخمر فضلا عن شربها "

مسلمان کی شان کے لائق یہ ہے کہ اس دل میں یہ نہ آئے کہ میں نے شراب پینا ہے۔ یعنی شراب کا تصور اور خیال آنا بھی غلط کام ہے شراب پینا تو دور کی بات ہے۔ (روح البیان)

شرابی سے قطع تعلقی کی جائے:

"وینقطع عن شاربها فانه اذا خالط شارب الخمر یخاف علیه ان یصیبه من عثاره "

مسلمان کو چاہئے کہ وہ شرابی سے قطع تعلقی رکھے، اس لئے کہ شرابی سے میل جول پر خطرہ ہے کہ اسی طرح یہ بھی اس لغزش میں مبتلا نہ ہو جائے۔ کیونکہ جس طرح کی صحبت اسے حاصل ہوگی وہ ہی اثرات اس پر مرتب ہوں گے۔

شرابی کو رشتہ نہ دیا جائے۔

"وعن بعض الصحابة انه قال من زوج ابنته لشارب الخمر فكأنما ساقها الى الزنا معناه ان شارب الخمر يقع منه الطلاق وهو لا يشعر "

بعض صحابہ کرام سے مروی ہے کہ کوئی شخص اپنی بیٹی کا نکاح شرابی سے نہ کرے۔ کیونکہ شرابی سے نکاح کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی بیٹی کو زانیہ بنانا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ شرابی نشہ کی حالت میں طلاق دے تو وہ طلاق واقع ہو جاتی ہے، لیکن شرابی لوگ اکثر اوقات تین طلاقیں بھی دے دیتے ہیں، پھر وہ میاں بیوی اکٹھے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے، تین طلاق کے بعد ان کا میاں بیوی کی حیثیت میں رہنا زنا کرنے کے مترادف ہے۔ (از روح البیان)

تنبیہ:

" فالذى يجب على الولى ان لا يزوج ابنته ولا اخته من فاسق ولا ممن يتعاطى المنكرات"

اسی سے ایک اور مسئلہ واضح ہو گیا کہ کوئی شخص اپنی بیٹی یا بہن کا نکاح فاسق سے نہ کرے اور ایسے شخص سے نہ کرے جو ناجائز کاموں کا ارتکاب کرنے والا ہو۔ (از روح البیان)

انگوری شراب اور دوسرے شرابوں میں فرق:

انگور کا نچوڑ جسے آگ پر نہ پکایا جائے بلکہ کچا ہی ہو اس پر جھاگ پیدا ہو جائے اور نشہ دے اسے فقہاء کرام کی اصطلاح میں " خمر " کہا جاتا ہے۔ جس کا ایک قطرہ پینا بھی حرام ہے اور زیادہ مقدار پینا بھی حرام ہے۔ ایک قطرہ پینے سے بھی حد لگے گی اور زیادہ مقدار پینے سے بھی حد لگے گی۔

خمر (انگوری شراب) نجاست غلیظہ ہے اور باقی مشروبات نجاست خفیفہ ہیں، بلکہ باقی مشروبات میں طہارت اور نجاست غلیظہ کا بھی قول پایا جاتا ہے۔

ہرنشہ آور مشروب قلیل وکثیر حرام ہے:

"وعن عائشة ان رسول الله ﷺ قال کل مسکر حرام وما اسکر منه الفرق فملؤ الکف منه حرام" (اخرجه ابو داؤد والنسائی)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہرنشہ دینے والی چیز حرام ہے، وہ چیز جس سے ایک فرق پینے سے نشہ آئے وہ چلو بھر پینے میں بھی حرمت ثابت ہے۔

" الفرق با لتحریک مکیال یسع تسعة عشر رطلا بالبغدادی "

فرق کی را پر حرکت فتحہ ہے۔ یہ ایک پیمانہ ہے جس میں انیس رطل (تقریباً نوکلو) سما جائیں۔

واضح ہوا کہ ایسا مشروب جو زیادہ مقدار میں پئیں تو نشہ آئے اور تھوڑی مقدار میں پئیں تو نشہ نہ آئے، وہ حقیقت میں نشہ آور ہی ہے، اس کا تھوڑی مقدار میں پینا یا زیادہ مقدار میں پینا حرام ہے۔ (خازن)

☆ "عن ابن عمر ان رسول الله ﷺ قال کل مسکر خمر وکل مسکر حرام ومن شرب الخمر فی الدنیا وهو بد منها لم یتب منها لم یشهر بها فی الآخرة"

(بخاری ومسلم، واللفظ للمسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہرنشہ آور چیز خمر ہے اور ہر نشہ دینے والی چیز حرام ہے۔ اور جس نے دنیا میں شراب پیا اور اس سے بچنے کا چارہ اس کے لئے تھا اور اس نے توبہ بھی نہیں کی تو وہ آخرت میں "شراب طہور" (جنتی پاکیزہ مشروب) نہیں پئے گا۔

ایک تو یہ خیال کیا جائے کہ لغوی معنی کے لحاظ سے ہرنشہ دینے والا مشروب خمر کہلاتا ہے اور اصطلاح فقہاء میں خمر انگوری شراب کو کہا جاتا ہے، وہ بھی اس وقت تک جب اسے آگ پر نہ پکایا جائے۔

اگر شراب پینے سے کوئی چارہ نہ ہو، یعنی بھوک سے مرنے کا خطرہ ہو، اور کوئی چیز نہ ملے صرف شراب ہی میسر ہو، تو اس حالتِ اضطراری (مجبوری کی حالت) میں شراب پینا جائز ہے۔

کبھی شراب پیا تھا، اس کے بعد توبہ کر لی تو اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا ہے۔ توبہ کے بعد کسی کو عار نہ دلائی جائے۔

☆ "عن جابر ان رجلا قدم من جیشان من الیمن فسأل النبی ﷺ عن شراب یشربو نه بارضهم من الذرة یقال له المزر فقال رسول الله ﷺ او مسکر هو قال نعم قال رسول الله ﷺ کل مسکر حرام وان علی الله عهدا لمن یشرب المسکر ان یسقیه من طینة الخبال قالوا وما طینة الخبال یا رسول الله قال عرق اهل النار او عصارة اهل النار" (مسلم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بے شک ایک شخص جیشان سے آیا، جیشان یمن کا ایک علاقہ ہے، اس نے نبی کریم ﷺ سے ایک شراب کے متعلق پوچھا، جو ان کے علاقہ میں پیا جاتا تھا اور جوار کے دانوں سے بنایا جاتا تھا، جسے مزر (شراب کا نام) کہا جاتا تھا، اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر نشہ دینے والی چیز حرام ہے بے شک اللہ تعالیٰ نے وعدہ کر رکھا ہے کہ جو شخص نشہ والی چیز پئے گا "طینة الخبال" پلایا جائے گا۔ صحابہ کرام نے فرمایا یا رسول اللہ "طینة الخبال" کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا وہ جہنمیوں کا پسینہ اور ان کا نچوڑ یعنی خون اور پیپ ہے۔ (از خازن)

☆ "قال عمر بن الخطاب فی خطبته نزل تحریم الخمر وهی من خمسة اشیاء العنب التمر والحنطة والشعیر والعسل ما خمر العقل" (بخاری و مسلم)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ شراب حرام ہونے کے متعلق قرآن پاک کا حکم نازل ہو چکا ہے، وہ پانچ چیزوں سے بننے والا شراب ہے، انگور اور کھجور اور گندم اور جو اور شہد سے، ہر وہ چیز جو عقل ڈھانپ دے وہ خمر (شراب) ہے۔

آپ کے آخری الفاظ نے یہ واضح کر دیا کہ ہمارے علاقہ میں شراب پانچ چیزوں سے بنتا ہے، کسی اور علاقہ میں ان پانچ چیزوں کے بغیر کسی اور چیز سے بنے تو وہ بھی حرام ہوگا۔

☆ "وعن ابن عمر عن النبی ﷺ من الحنطة خمر ومن الشعیر ومن التمر خمر ومن الزبیب خمر ومن العسل خمر"

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا گندم سے بننے والا خمر ہے، اور جو سے بننے والا خمر ہے، اور کھجور سے بننے والا خمر اور کشمش سے بننے والا خمر ہے اور شہد سے بننے والا خمر ہے۔

☆ "وعن سعد بن ابی وقاص انه ﷺ نهی عن قلیل ما اسکر کثیره"

(رواه النسائی وابن حبان والبزار ورجاله رجال الصحیح)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں بے شک نبی کریم ﷺ نے اس چیز کے قلیل مقدار کو استعمال سے منع فرمایا جس کا کثیر نشہ دے۔

یعنی کثیر مقدار سے نشہ آئے اور قلیل مقدار سے نشہ نہ آئے تو پھر بھی رسول اللہ ﷺ نے قلیل مقدار کے استعمال سے منع فرمایا۔

☆ "وعن دیلم الحمیری قال قلت لرسول ﷺ انا بارض باردة ونعالج فیها عملا شدیدا وانا نتخذ شرابا من هذا القمح نتقوی به علی عملنا وعلی برد بلادنا قال هل یسکر قلت نعم قال فاجتنبوه قلت ان الناس غیر تارکیه قال ان لم یترکوه قاتلوهم"

(رواه ابوداؤد)

دیلم حمیری کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا بے شک ہم ٹھنڈی زمین (ٹھنڈے علاقہ) میں ہوتے ہیں، بہت محنت و مشقت والا کام کرتے ہیں، بیشک ہم گندم سے ایک شراب تیار کرتے ہیں جس سے ہم اپنے کام کے لئے تقویت حاصل کرتے ہیں، اور اس کی حرارت سے علاقہ کی برودت (ٹھنڈک) کو زائل کرتے ہیں۔

☆ "وعن ابی مالک الاشعری انه سمع رسول الله ﷺ یقول لیشربن ناس من امتی الخمر یسمونها بغیر اسمها" (رواه ابوداؤد)

ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے میں نے سنا کہ میری امت میں سے کئی لوگ خمر کا اور نام رکھ کر پئیں گے۔

یعنی نبی کریم ﷺ نے واضح طور پر فرمایا کہ ہر نشہ دینے والی چیز حرام ہے خواہ اسے خمر کہا جائے یا اس کا کوئی اور نام رکھا جائے، کوئی اور نام رکھنے سے اس کی حرمت ختم نہیں ہوگی۔

تنبیہ:

"وفی فتاوی النسفی ان البنج حرام وطلاق البنجی واقع ومن یعتقد حلیته یقتل ویحد شاربه کما یحد شارب الخمر، ویدل علی ان کل مسکر حرام"

فتاوی نسفی میں ذکر ہے کہ بھنگ پینا حرام ہے۔ بھنگ پینے والا نشہ میں طلاق دے تو اس کی طلاق واقع ہو جائے گی (جس طرح ہر نشہ والی چیز سے نشہ میں آنے والے شخص کی طلاق واقع ہو جاتی ہے) اور جو شخص بھنگ کو حلال سمجھنے کا عقیدہ رکھے وہ کافر ہو جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ نہ کرے، ارتداد سے باز نہ آئے، بلکہ بھنگ کے جواز کا ہی قول کرتا رہے تو حاکم وقت اسے قتل کرا دے، اور بھنگ پی کر نشہ میں آ جانے والے شخص کو بھی اسی طرح حد لگائی جائے جس طرح کسی نشہ والی چیز سے نشہ آنے پر حد لگائی جاتی ہے۔ (ماخوذ از مظہری)

شراب کی حرمت پر صحابہ کرام کا شراب انڈیل دینا:

"عن انس بن مالک قال کنت ساقی القوم یوم حرمت الخمر فی بیت ابی طلحة وماشرابهم الاالفضیح البسر والتمر فاذا منادینادی فقال اخرج فانظر فخرجت فاذامنادینادی الا ان الخمر قد حرمت قال فجرت فی سکک المدینة فقال لی ابوطلحة اخرج فاهرقها فهرقتها" الخ (مسلم)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس دن شراب حرام ہوئی اس سے پہلے میں ابوطلحہ کے گھر لوگوں کو شراب پلا رہا تھا، اس وقت شراب بسر (سرخ، پیلی) کھجور اور خشک کھجور سے تیار کی جاتی تھی۔ اچانک آواز دینے کی آواز کو سنا، تو ابوطلحہ نے کہا نکلو، دیکھو (یہ آواز دینے والا کیا آواز دے

رہا ہے اس کی آواز سنو) میں نکلا تو آواز دینے والا یہ آواز دے رہا ہے'' خبردار بے شک شراب بہادو'' (اس کی آواز کو سننے سے ہی) شراب مدینہ کی گلیوں میں بہنے لگی ۔ مجھے ابوطلحہ نے کہا نکلو شراب بہادو، میں نے بہادی۔

نبی کریم ﷺ کا نبیذ پینا:

''عن ابن عباس قال کان رسول اللہ ﷺ ینتبذله اول اللیل فیشربه اذااصبح یو مه ذاک واللیلة التی تجئ والغد واللیلة الآخری والغدالی العصر فان بقی شئ سقاه الخادم اوامر به فصب''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے لئے نبیذ تیار کیا جاتا تھا، جو آپ تین دن پی لیتے تھے۔ تیسرے دن کے ختم ہونے سے پہلے ہی آپ کسی خادم کو دے دیتے تھے، یا انڈیل دیتے تھے۔

یعنی اگر اس میں نشہ نہ ہوتا تو کسی خادم کو دے دیتے اور اگر نشہ اس میں پیدا ہو جاتا تو انڈیل دیتے تھے۔ آپ خود نشہ پیدا ہونے سے پہلے ہی تقویٰ کے طور پر چھوڑ دیتے تھے۔

☆ ''عن ثمامة یعنی ابن خزن القشیری قال لقیت عائشة فسألتها عن النبیذ فدعت عائشة جاریة حبشیة فقالت سل هذه انها کانت تنبذ لرسول اللہ ﷺ فقالت الحبشیة کنت انبذله فی سقاء من اللیل واوکیه واعلقه فاذااصبح شرب منه'' (مسلم)

ثمامہ یعنی ابن حزن قشیری بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ملا، میں نے نبیذ کے متعلق سوال کیا، آپ نے ایک حبشیہ غلامہ کو بلایا کہ اس سے سوال کرو، یہ نبی کریم ﷺ کے لئے نبیذ تیار کرتی تھی۔ اس حبشیہ نے بتایا میں آپ کے لئے چھوٹے مشکیزہ میں نبیذ تیار کرتی تھی، رات کے وقت نبیذ تیار کر کے مشکیزہ کا منہ بند کر کے لٹکا دیتی صبح آپ پیتے۔

ایک روایت میں ہے "نبذ ہ غدوۃ فیشربہ عشاء نبیذہ عشاء فیشربہ غدوۃ"

ہم صبح نبیذ تیار کرتے اور شام کو پیتے اور شام کو تیار کرتے اور صبح پیتے۔

خیال رہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں تیسرے دن تک پینے کا ذکر ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ایک دن کا ذکر ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ گرمیوں میں صبح کا تیار کیا نبیذ شام تک اور شام کو تیار کیا ہوا نبیذ صبح تک پیا جاتا، اور سردیوں میں تین دن تک پی لیا جاتا تھا۔

یا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک کا ذکر ہے، زیادہ وقت کی نفی نہیں۔

نبیذ کیا ہے؟

پانی میں کشمش کو ڈال لیا جاتا ہے، یا کھجوروں کو ڈال لیا جاتا، پانی میں مٹھاس پیدا ہو جاتی اور اس میں تقویت بھی پیدا ہو جاتی، نشہ کی حالت میں پہنچنے سے پہلے نبیذ پینا جائز ہے، اور نشہ کی حالت میں جب نبیذ پہنچ جائے تو اس کا پینا ناجائز ہے۔

اگر چہ نبیذ نشہ نہ دے اس کا پینا بھی صرف تقویت حاصل کرنے کے لئے ہو، ایسا نہ ہو کہ اس لئے نبیذ پیئے کہ یہ شراب کا نمونہ ہے، لہو ولعب کی نیت نہ ہو۔

راقم نے امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مسلک کو اسی طرح سمجھا جیسا کہ قلمبند کر دیا۔

شراب کی خرید وفروخت ناجائز ہے:

اجماع امت ہے اس پر کہ شراب کی خرید وفروخت حرام ہے اور شراب سے حاصل ہونے والی رقم کا استعمال کرنا حرام ہے۔

☆ "عن جابر قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول عام فتح مکة ان اللہ تعالیٰ حرم بیع الخمر والا نتفاع بھا والمیتة والخنزیر والا صنام" (اخرجاہ فی الصحیحین مع زیادۃ اللفظ)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فتح مکہ کے سال فرماتے ہوئے سنا، بیشک اللہ تعالیٰ نے شراب کی خرید وفرخت اور اس سے نفع حاصل کرنا اور مردہ جانور اور خنزیر اور بتوں کی خرید وفروخت اور نفع حاصل کرنا حرام کر دیا ہے۔

☆ ''عن ابن عباس قال بلغ عمر بن الخطاب فلانا با ع خمرا فقال قاتل الله فلانا الم يعلم ان رسول الله ﷺ قال لعن الله اليهود حرمت عليهم الشحوم فحملوها فبا عو ها''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خبر ملی کہ فلاں شخص نے شراب بیچا ہے۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اسے برباد کرے کیا اسے معلوم نہیں کہ بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو یہود پر کہ ان پر چربی حرام کر دی گئی تھی، لیکن انہوں نے پھر اسے اٹھایا اور بیچا۔ (ازخازن)

شراب سے متعلق دس شخصوں پر نبی کریم ﷺ کی لعنت:

''عن انس قال لعن رسول الله ﷺ في الخمر عشرة عاصرها ومعتصرها وشاربها و ساقيها وحاملها والمحملولة اليها وبائعها ومبتاعها وواهبها و آكل ثمنها''

(اخرجه الترمذی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے شراب کے متعلق دس شخصوں پر لعنت فرمائی، شراب کے لئے رس نچوڑنے والے پر، اور جس کے لئے نچوڑا گیا ہے، اور پینے والے پر، اور پلانے والے پر، اور اٹھانے والے پر، اور جن کے لئے اٹھایا گیا ہے، اور بیچنے والے پر، اور خریدنے والے پر، اور ہبہ کرنے والے پر، اور شراب سے حاصل ہونے والی رقم کو استعمال میں لانے والے پر۔ (ازخازن)

شراب (خمر) نجاستِ غلیظہ ہے:

رب تعالیٰ نے شراب کے متعلق فرمایا: "رجس عن عمل الشیطان فاجتنبوہ، والرجس فی اللغۃ النجس"
شراب رجس ہے، شیطانی عمل ہے اس سے اجتناب کرو۔ اور لغت میں رجس کا معنی ہے نجاست۔
(بخاری)

شراب کے مختلف نام اور ان کی حرمت:

"عن عائشۃ ان رسول اللہ ﷺ سئل عن البتع فقال کل شراب اسکر فھو حرام البتع شراب یتخذ من العسل کان اھل الیمن یشربو نہ" (بخاری ومسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں بے شک رسول اللہ ﷺ سے "بتع" کے متعلق سوال کیا گیا آپ نے فرمایا ہر نشہ دینے والا مشروب حرام ہے، "بتع" وہ شراب ہے جو یمن والے لوگ شہد سے بناتے تھے، اور پیتے تھے۔

☆ "عن ابن عباس انہ سئل عن الباذق قال فمااسکر فھو حرام علیک" (بخاری)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے باذق کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا جو چیز بھی نشہ دے تم پر حرام ہے۔

"قال صاحب المطالع الباذق بفتح الذال المعجمۃ ھو الطلاء المطبوخ من عصیر العنب"

صاحب مطالع نے بیان کیا کہ انگور کا نچوڑ جسے پکالیا جائے اسے طلاء اور باذق کہا جاتا ہے۔ (بخاری)

لیکن مظہری نے تفصیل بیان کی ہے۔ یعنی انگور کے نچوڑ کو جب پکایا جائے جب تہائی حصہ سے کم خشک ہو تو اسے طلاء کہا جاتا ہے۔ اگر نصف خشک ہو کر چلا جائے تو اسے "منصف" کہا جاتا ہے۔ تیسرے حصہ سے زائد اور نصف سے کم خشک ہو جائے تو اسے "باذق" کہا جاتا ہے۔ اور اگر کھجور کو پانی میں آگ پر پکایا جائے اس میں نشہ آ جائے اور

جھاگ پیدا ہو جائے تو اسے ''سکر'' کہا جاتا ہے۔اور اگر کشمش کو آگ پر پکایا جائے تو اس میں نشہ آ جائے اور جھاگ پیدا ہو جائے تو اسے '' نقیع الزبیب '' کہا جاتا ہے۔

آیۃ کریمہ میں خمر سے مراد:

قاضی مظہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ جمہور حضرات کا مذہب یہ ہے کہ خمر لغت میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو عقل پر پردہ چھا دے۔فقہاء کرام نے اپنی اصلاح میں خمر صرف انگوری شراب کو کہا۔

'' والتحقیق عندی ان الخمر لفظ مشترک بین الخاص والعام اما حقیقة واما بعموم المجاز والمراد فی الآیة ھوا لمعنی الاعم ''

میرے نزدیک تحقیق یہ ہے کے بیشک لفظ خمر خاص اور عام میں مشترک ہے، حقیقت کے لحاظ پر ہو یا عموم المجاز کے لحاظ پر ہو، آیۃ کریمہ میں بھی عام معنی لیناہی مناسب ہے، جو ہر نشہ آور کو شامل ہے۔

'' قال صاحب القاموس الخمر ماسکر من عصیر العنب اوعام والعموم اصح ''

صاحب قاموس نے کہا ہے خمر اسے کہتے ہیں جو نشہ دے، وہ انگور کا نچوڑ ہو، یا کوئی چیز بھی نشہ دینے والی ہو، یہ عام معنی لیناہی بہتر ہے۔ **(مظھری)**

''والمیسر'': جؤا۔

''واما المیسر فھوا القمار واشتقاقه من الیسر لانه اخذ مالا بسھولة من غیر تعب ''

جوئے کو میسر کہنے کی وجہ یہ ہے کے لفظ '' میسر '' مشتق ہے ''یسر '' سے، یسر کا معنی ہے آسانی، چونکہ جؤا باز بھی بغیر مشقت کے دوسرے کا مال آسانی سے لے لیتا ہے، اس لئے اسے میسر کہا گیا۔

☆ **'' عن ابن عباس کان الرجل فی الجاھلیة یخاطر الرجل علی اھله وما له فا یھما قمر صاحبه ذھب باھله وما له ''**

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں زمانہ جاہلیت میں لوگ جؤا میں اپنی زوجہ اور مال لگاتے تھے۔ جو شخص جؤا جیت جاتا وہ دوسرے کی زوجہ اور مال لے جاتا۔ **(خازن)**

سورۃ مائدہ میں ان شاء اللہ شراب اور جوا کے متعلق مزید تفصیل آئے گی، یہاں صرف ایک ضابطہ سمجھ لیا جائے، ہر ایسا کھیل جس میں ہار جیت ہو، اور ہارنے والے پر مال دینا لازم ہو وہ جوا ہے۔

اگر مال نہ لگایا جائے تو وہ کھیل بظاہر تو جائز ہے لیکن درحقیقت وہ جوا کی طرف قدم بڑھانے کے مترادف ہے۔ تاش کھیلنے والے، لڈو کھیلنے والے وغیرہ ہی جوا باز بنتے ہیں۔

☆ "عن ابن سیرین ومجاهد وعطاء كل شئ فيه خطر فهو من الميسر حتى لعب الصبيان بالجوز"۔

ہر ایسا کھیل جس میں ہارنے اور جیتنے کا خطرہ ہو اور اس پر رقم وغیرہ لگا دی وہ جوا ہی ہے یہاں تک کہ بچوں کا اخروٹوں سے اسی شرط پر کھیلنا بھی جوا ہے۔

☆ "روى عن على عليه السلام انه قال النرد والشطرنج من الميسر"

حضرت رضی اللہ عنہ نے فرمایا نردشیر اور شطرنج جواء کی قسمیں ہیں۔ (اس وقت یہ کھیل جوا بازی تھے)

☆ "وقال الشافعي رحمه الله اذاخلا الشطرنج عن الرهان واللسان عن الطغيان والصلوة عن النسيان لم يكن حراما وهو خارج عن الميسر لان الميسر ما يوجب دفع المال او اخذ مال وهذا ليس كذلك فلايكون قمارا ولاميسرا"۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب شطرنج پر پیسے نہ لگائے جائیں، زبان کو فحش کلامی سے بچایا جائے، نماز کو ترک نہ کیا جائے، تو یہ حرام نہیں۔ اور نہ ہی جواء بازی ہے، کیونکہ جواء بازی میں مال دینا یا مال لینا ضروری ہوتا ہے۔ جس میں مال نہ لگایا جائے وہ کھیل جائز ہے۔ (کبیر)

بہت خوب نتیجہ:

امام شافعی رحمہ اللہ کے قول سے یہ واضح ہوا کہ ہر کھیل جو کسی نہ کسی حرام فعل کو شامل ہو وہ حرام ہوگا۔ ایسا کھیل جس پر ہار جیت اور مال لگایا جائے وہ حرام اور جواء ہے۔

ہر ایسا کھیل جس پر فحش کلامی مرتب ہو۔ لڑائی جھگڑا پایا جائے وہ حرام ہوگا۔ اور ہر ایسا کھیل جس سے نماز ضائع ہو وہ حرام ہوگا۔ ہر ایسا کھیل جس میں مرد کا جسم گھٹنے اور ناف کے درمیان ننگا ہو وہ کھیل حرام ہوگا۔ ہر ایسا کھیل جسے مرد اور عورتیں مل کر دیکھیں وہ حرام ہوگا۔

تنبیہ : بیل دوڑ، گھوڑے دوڑ کے مقابلوں پر جب شرط لگائی جائے جو دو طرفہ ہو، جو ہارے گا وہ اتنا مال دے گا وہ حرام ہے۔ اگر یہ شرط نہ ہو تو حرام نہیں۔ (از کبیر)

”قل فیھا اثم کبیر“: فرما دو ان دونوں میں گناہ ہے بڑا۔

ان مختصر الفاظ مبارکہ میں عظیم مطالب پائے گئے ہیں، یہ عظمت قرآن ہے کہ الفاظ مختصر اور مطالب عظیمہ پائے گئے۔

(۱) انسان کی تمام صفات میں سے اشرف صفت عقل ہے، اور شراب عقل کی دشمن ہے۔

"و کل ما کان عدو الاشرف فھو اخس" ہر وہ چیز جو کسی اعلیٰ اور اشرف چیز کی دشمن ہو وہ خسیس ترین ہوگی۔

اسی سے یہ واضح ہوا کہ شراب پینا تمام امور سے گھٹیا امر (کام) ہے۔

"عقال الناقة "اونٹنی کی رسی کو کہتے ہیں جو اسے روک کر رکھتی ہے۔ اسی سے "عقل" کو لیا ہوا ہے۔

انسان کی طبیعت جب اس کو برائی کی طرف دعوت دیتی ہے تو عقل اسے روکتی ہے۔ شراب پینے والے کی عقل کا زوال ہو جاتا ہے۔ اسے برے کاموں سے روکنے والی کوئی چیز نہیں ہوتی، بلکہ برائیوں کی طرف رغبت دلانے والی طبیعت ہی موجود ہوتی ہے۔

ابن ابی الدنیا رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا کہ ان کا ایک نشئی پر گزر ہوا، دیکھا کہ وہ اپنے ہاتھ پر پیشاب کر کے اپنے چہرے پر مل رہا ہے، جیسا کہ وضو کے لئے پانی چہرے پر ڈالا جاتا ہے، اور وہ یہ پڑھ رہا ہے۔

"الحمدللہ الذی جعل الاسلام نورا والماء طھورا"

حضرت عباس بن مرداس کو زمانہ جاہلیت میں کہا گیا تم شراب کیوں نہیں پیتے کہ اس سے تمہاری جرأت بڑھ

جائے۔توانہوں نے جواب دیا" ما انا آخذ جھلی بیدی فادخله فی جو فی " شراب پینا تو جہالت ہے کیونکہ شرابی کا ہر کام جاہلوں کی طرح ہوتا ہے۔میں جہالت کو اپنے ہاتھ میں پکڑ کر اپنے پیٹ میں داخل نہیں کرنا چاہتا۔

"ولا ارضی ان اصبح سید قوم وامسی سفیھھم"

شراب پینے والا تو ہر قسم کی بے وقوفی کرتا ،اور میں اپنی قوم کا سردار ہوں،،اس لئے میں یہ پسند نہیں کرتا کہ میں صبح کے وقت (نشہ کے بغیر) قوم کا سردار ہوں اور (شراب پی کر) شام کے وقت ان سب سے بے وقوف ہوں۔

(۲) شراب انسان کو دوسروں سے عداوت کرنے والا اور بغض کرنے والا بنا دیتی ہے۔اور شراب انسان کو اللہ تعالیٰ کے ذکر اور نماز سے روکتی ہے۔

(۳) شراب پینا ایسا عظیم جرم ہے کہ جب انسان شراب پینے کا عادی ہو جاتا ہے تو وہ اس برے فعل میں بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔اور اس کی خوشی اور لذت بڑھتی ہی چلی جاتی ہے،اسی وجہ سے شراب تمام برائیوں سے زیادہ بری چیز ہے۔کیونکہ زانی جب زنا کرتا ہے تو اس کی رغبت میں آہستہ آہستہ کمی آتی جاتی ہے،آخر کار وہ زنا کو چھوڑ دیتا ہے۔

"فاذا واظب الانسان علیه صار الانسان غرقافی اللذات البدنية معرضا عن تذکر الآخر والمعاد حتی یصیر من الذین نسوا الله فانساھم"

جب انسان شراب پینے پر ہمیشگی اختیار کرتا ہے تو لذات بدنیہ میں غرق ہو جاتا ہے اور آخرت کی یاد سے اعراض کر لیتا ہے۔تو ان لوگوں میں سے ہو جاتا ہے،جو رب تعالیٰ کو چھوڑ دیتے ہیں اور رب تعالیٰ ان کو چھوڑ دیتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ شراب سے عقل زائل ہو جاتی ہے،جب عقل زائل ہو جاتی ہے تو تمام قسم کی برائیاں اسے حاصل ہو جاتی ہیں،اسی لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا" الخمر ام الخبائث " شراب تمام برائیوں کی اصل ہے۔

(از کبیر)

جوا میں بڑا گناہ:

اس کی وجہ یہ ہے کہ جوا جواریوں کے درمیان عداوت پیدا کرتا ہے، اس لئے کہ جب ایک شخص دوسرے کا مال مفت ہی میں بٹور لیتا ہے تو وہ شخص اس کا دشمن بن جاتا ہے، ان کے درمیان بغض اور عداوت پیدا ہو جاتے ہیں، جو بہت بڑے گناہ کا سبب ہے۔ اسی طرح جوا بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر اور نماز سے روکتا ہے۔ لہٰذا عظیم گناہ کا سبب ہے۔

"ومنافع للناس": اور نفع ہے لوگوں کے لئے۔

شراب میں ان کا نفع یہ تھا کہ وہ اس کی تجارت کرتے تھے، دیہاتوں سے سستا خریدتے تھے اور شہروں میں مہنگا بیچتے تھے۔ اور شراب بظاہر جسمانی طاقت کا سبب بھی بنتا ہے۔ پینے والا چستی اور جرأت محسوس کرتا ہے۔

اور جوا میں ان کو نفع یہ تھا کہ وہ آسانی سے دوسرے کا مال حاصل کر لیتے تھے، جوا باز کبھی کبھی بہت زیادہ مل حاصل کر لیتے تھے، ایک محفل میں سو اونٹ ذبح کر دیتے تھے، کبھی محتاجوں کی امداد بھی کر دیتے تھے۔ (از کبیر)

"واثمهما اكبر من نفعهما": اور ان دونوں کا گناہ زیادہ بڑا ہے ان کے نفع سے۔

اس لئے کہ ان دونوں میں منافع عارضی ہیں، لیکن ان دونوں میں گناہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے لعنت کا مستحق ہونا، اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا ان پر ناراض ہونا، اور شرابی اور جوا باز کا نماز اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے دور ہونا یہ سب بہت بڑے گناہ ہیں؛ معمولی اور عارضی منافع کی کوئی حیثیت نہیں۔ لہٰذا منافع کو لات مار دے اور اپنے آپ کو بہت بڑے گناہ اور رب تعالیٰ کے عذاب سے بچا لے۔

☆☆☆☆☆

يَسْئَلُوْنَکَ مَاذَايُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ☆فِى الدُّنْيَاوَالْاٰخِرَةِ (سورة البقرة آیات ۲۱۹، ۲۲۰)

﴿۱﴾

اورتم سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں تم فرماؤ جو فاضل بچے، اسی طرح اللہ تم سے آیتیں بیان فرماتا ہے کہ کہیں تم دنیا اور آخرت کے کام سوچ کر کرو۔

﴿۲﴾

اور سوال کرتے ہیں تم سے کتنی مقدار خرچ کریں، تم فرماؤ جو آسان ہو، اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تمہارے لئے آیات کو تاکہ تم فکر کرو دنیا میں اور آخرت میں۔

جن تیرہ احکام کو ذکر کیا جارہا ہے، ان میں یہ چوتھا حکم اس آیۃ کریمہ میں بیان کیا جارہا ہے۔ (از کبیر)

شانِ نزول:

"واخرج ابن ابی حاتم من طريق ابان عن يحيٰى انه بلغه ان معاذ بن جبل وثعلبة اتيا رسول الله ﷺ فقالا يا رسول الله ان لنا ارقاء واهلين فما ننفق من اموالنا فانزل الله تعالٰى هذه الآية "

یحیٰی بیان کرتے ہیں کہ مجھے یہ خبر ملی کہ حضرت معاذ بن جبل اور ثعلبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، عرض کیا یارسول اللہ ﷺ ہمارے غلام بھی ہیں اور اہل وعیال بھی ہم کتنی مقدار میں مال خرچ کریں؟ تو ان کے سوال کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا۔

" وقيل نزلت في عمرو بن الجموح كنظير تها "

بعض حضرات نے کہا یہ آیۃ کریمہ حضرت عمرو بن الجموح کے سوال کے بعد نازل ہوئی جبکہ انہوں نے یہ سوال کیا کہ یارسول اللہ ہمارے غلام بھی ہیں اور اہل وعیال بھی ہم کتنی مقدار میں مال خرچ کریں؟۔ (روح المعانی)

تاہم مسئلہ واضح ہے کہ معاذ بن جبل اور ثعلبہ رضی اللہ تعالی عنہما نے بھی سوال کیا، اور حضرت عمرو بن الجموع نے بھی سوال کیا، ان تینوں حضرات کے سوال کے جواب میں آیۃ کریمہ کا نزول ہوا۔

مختصر مطلب:

نبی کریم ﷺ کو خطاب ہے کہ آپ سے صحابہ کرام سوال کرتے ہیں کہ وہ کتنی مقدار میں مال خرچ کریں؟ آپ ان کو فرمادو جتنی مقدار میں مال خرچ کرنے میں تم آسانی سمجھو، اتنی مقدار میں مال خرچ کرو، اسی طرح اللہ تعالی تم سے آیتیں بیان کرتا ہے تاکہ تم دنیا اور آخرت کے معاملات میں فکر کرو۔

"ویسئلونک ماذاینفقون": " ای ما قدره " اور وہ آپ سوال کرتے ہیں وہ کتنی مقدار میں مال خرچ کریں۔

"قل انفقو **العفو** ای الفاضل عن الحاجة": آپ فرمادو خرچ کرو جو تمہاری حاجت سے زائد ہو۔

تمام مال خرچ نہ کردو کہ تم خود محتاج ہو جاؤ، اور اپنے آپ کو ضائع کرلو۔ (جلالین)

اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ تفسیر جلالین کے مطابق ہے۔

" العفو " وهو نقیض الجهد وهو المشقة، ونقیضه الیسر والسهولة "

یعنی عفو نقیض ہے جہد کی۔ جہد کا معنی ہے مشقت اٹھانا، محنت سے کام کرنا، اور اس کے مقابل "یسر اور سہولت" کے الفاظ استعمال ہیں کہ آسانی سے کام کرنا۔

یہی مطلب ہے " العفو " کا، گویا کہ یہ کہا گیا ہے۔

" قل انفق ما سهل و تیسر ولم یشق علیک انفاقه فالعفو من المال ما یسهل انفاقه والجهد من المال ما یسعر انفاقه "

کہ آپ فرمادو اتنی مقدار میں مال خرچ کرو جو تمہیں آسان ہو، جس کا خرچ کرنا تم پر مشکل نہ ہو۔

واضح ہوا کہ " العفو من المال"کا یہ مطلب ہے جس کا خرچ کرنا آسان ہو، اوراس کے مقابل "الجهد من المال" کا مطلب یہ ہوگا جس کا خرچ کرنا مشکل ہوگا، ہاں البتہ مال کا خرچ کرنا آسان اسی وقت ہوگا۔ (روح البیان)

"العفو" کے تمام معانی ایک معنی میں سمٹ کر آ جاتے ہیں۔ وہی معنی جو اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے بیان فرمایا۔

"العفو ، یعنی الفضل" العفو کا معنی ہر چیز میں آسانی کا پایا جانا ہے۔

"وعن الربیع افضل مالک واطیبه"

حضرت ربیع رحمۃ اللہ فرماتے ہیں " العفو "کا معنی ہے تمہارا افضل اور پاکیزہ مال۔

" والکل یرجع الی الفضل " تمام معانی فضل کی طرف لوٹتے ہیں۔

یعنی تم اپنا پاکیزہ مال، حاجت سے زائد مال اللہ کی راہ میں خرچ کرو، جس کا خرچ کرنا تم پر آسان ہو۔ (ابن کثیر)

☆ " عن ابن هريرة قال قال رجل یا رسول الله ﷺ عندی دینار قال انفقه علی نفسک ، قال عندی آخر ،قال انفقه علی اهلک، قال عندی آخر ،قال انفقه علی ولدک ، قال عندی آخر ، قال فانت ابصر " (رواه ابن جریر)

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں ، ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرے پاس ایک دینار ہے، آپ نے فرمایا، اپنے آپ پر خرچ کرلو، اس نے کہا میرے پاس ایک اور دینار بھی ہے، تو آپ نے فرمایا، وہ اپنی زوجہ پر خرچ کرلو، پھر اس نے کہا کہ میرے پاس ایک اور دینار بھی ہے، آپ نے فرمایا، وہ اپنی اولاد پر خرچ کرلو، پھر اس نے کہا میرے پاس ایک اور بھی دینار ہے تو آپ نے فرمایا تم جو بہتر سمجھو، یعنی جس جائز کام میں خرچ کرنا چاہو کرلو۔ (ابن کثیر)

تنبیہ: اس حدیث پاک میں اگرچہ صیغے خبر کے ہیں، لیکن معنی استفہام والا پایا گیا ہے، یعنی اس شخص کا مطلب یہ تھا کہ میرے پاس ایک دینار ہو تو کیا کروں؟ اگر دو ہوں تو پھر کیا کروں؟ اگر تین ہوں تو پھر کیا کروں؟ اور اگر چار ہوں تو پھر کیا کروں۔

☆ "وعن جابر ان رسول الله ﷺ قال لرجل ابدأ بنفسک فتصدق علیها فان فضل شئ فلأهلک فان فضل شئ عن اهلک فلذی قرابتک فان فضل عن ذی قرابتک شئ فهکذا فهکذا" (رواه ابن جریر، ورواه مسلم)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو فرمایا ابتداء اپنے نفس سے کرو، یعنی اپنے نفس پر پہلے خرچ کرو، اگر مال بچ جائے تو اپنے اہل وعیال پر خرچ کرو، پھر اپنے قریبی رشتہ داروں پر مال خرچ کرو، پھر اس طرح اور اس طرح، یعنی رشتہ داروں سے جو مال بچ گیا وہ اللہ کی راہ میں جہاں جہاں سمجھو خرچ کرو۔

☆ "عن ابن هریرة قال قال رسول ﷺ خیر الصدقة ما کان علی ظهر غنی والید العلیا خیر من الید السفلی وابدأ بمن تعول" (رواه مسلم)

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بہتر صدقہ وہ ہے جو غنی ادا کرے (یعنی صدقہ کرنے کے بعد بھی محتاج نہ ہو) اوپر والا ہاتھ (دینے والا ہاتھ) نیچے والے ہاتھ (لینے والے ہاتھ) سے بہتر ہے، ابتداء خرچ کی اپنے اہل وعیال سے کرو۔ (ابن کثیر)

عفو کی تین قسمیں:

عبدالملک بن مروان نے حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف خط لکھا "العفو" کے متعلق سوال کیا گیا کہ "عفو" سے مراد کیا ہے؟

"فقال العفو علی ثلاثة انحاء نحو تجاوز عن الذنب ونحو فی القصد فی النفقة ویسئلونک ماذا ینفقون قل العفو ونحو فی الاحسان فیما بین الناس الا ان یعفو الذی بیده عقدة النکاح" (اخرجه ابن المنذر عن عطاء بن دینار الهذلی) (درمنشور)

تو انہوں نے فرمایا "عفو" کی تین قسمیں ہیں، ایک گناہ معاف کرنا، اور دوسری قسم خرچ میں میانہ روی اختیار کرنا، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا (ترجمہ) اور وہ سوال کرتے ہیں آپ سے کتنی مقدار

میں خرچ کریں، آپ فرماؤ ''العفو'' جتنا آسان ہو، (میانہ روی پر مبنی ہو) اور تیسری قسم ہے احسان کرنا، رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی " الاان یعفو الذی بیدہ عقدۃ النکاح " میں یہی معنی ہے (مگر یہ احسان کرے وہ شخص جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے)۔

☆ " واخرج البخاری والنسائی عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ افضل الصدقۃ ما ترک غنی والید العلیاء خیر من الید السفلی وابدأ بمن تعول تقول المرأۃ اما ان تطعمنی واماان تطلقنی ویقول العبد اطعمنی واستعملنی ویقول الابن اطعمنی الی من تدعنی" (درمنثور)

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بہتر صدقہ وہ ہے جس کے بعد انسان غنی رہے، اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے (دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے) اور ابتداء اپنے اہل وعیال سے کرو (ایسا نہ ہو کہ) عورت کہے یا مجھے خرچ دو یا مجھے طلاق دو، اور غلام کہے کہ مجھے کھانا دو تو مجھ سے کام لو، اور بیٹا کہے مجھے طعام دو تم مجھے کس کی کفالت میں چھوڑ رہے ہو۔

☆ "واخرج ابن سعد وابو داؤد والحاکم وصححہ عن جابر بن عبداللہ قال کنا عند رسول اللہ ﷺ اذ جاء رجل وفی لفظ قدم ابو حصین السلمی بمثل بیضۃ الحمامۃ من ذھب فقال یارسول اللہ اصبت ھذہ من معدن فخذ ھا فھی صدقۃ ما املک غیر ھا فاعرض عنہ رسول اللہ ﷺ ثم اتاہ من خلفہ فاخذھا رسول اللہ ﷺ فخذفہ بھا فلو اصابتہ لاوجعتہ اولعقرتہ فقال یاتی احدکم بما یملک فیقول ھذہ صدقۃ ثم یقعد یستکف الناس خیر الصدقۃ ماکان عن ظھر غنی وابدا بمن تعول " (درمنثور)

حضرت جابر بن عبداللہ کہتے ہیں ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس تھے کہ ایک شخص (ابوحصین سلمی) آپ کے پاس آئے ان کے پاس کبوتری کے انڈے کی مثل سونا تھا، انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ میں نے معدن (کان) سے پایا ہے آپ یہ لے لیں، میں یہ صدقہ کرتا ہوں۔ اور اس کے سوا بھی

میں جس کا مالک ہوں، بعض حضرات نے ما نافیہ کا معنی بھی کیا ہے ''میں اس کے سواء کسی چیز کا مالک نہیں''، تو رسول اللہ ﷺ نے اس شخص سے اعراض فرمایا۔ پھر وہ آپ کے پاس دوسری جانب حاضر ہو کر عرض کرنے لگے کہ یہ صدقہ ہے، تو رسول اللہ ﷺ نے وہ لے کر پھینک دیا، اگر اس شخص کو لگتا تو وہ زخمی ہو جاتا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ تم میں سے ایک شخص آتا ہے اور کہتا ہے میں تمام مال صدقہ کرتا ہوں، پھر بیٹھ جاتا ہے اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے شروع کر دیتا ہے، بہتر صدقہ وہ ہے جو دینے کے بعد بھی انسان غنی رہے۔ اور ابتداء اپنے اہل وعیال سے کرو۔

اعتراض: زیر بحث آیۃ کریمہ اور بیان کردہ احادیث سے یہ واضح ہوا کہ تمام مال خرچ کرنا مکروہ ہے، ناپسندیدہ عمل ہے، اور کم مال والا شخص مال خرچ کر کے اپنے آپ کو مشقت میں نہ ڈالے۔

اور دوسری احادیث (جن کو قریب ہی ان شاء اللہ ذکر کیا جا رہا ہے) سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تمام مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا جائے۔ تو ان احادیث میں تطبیق کیسے ہوگی کہ بعض احادیث میں کل مال صدقہ کرنے کی ممانعت ہے اور بعض میں کل مال صدقہ کرنے کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔

جواب: ''الحکم یختلف باختلاف الاشخاص و الاحوال،، مختلف شخصوں اور مختلف حالات اور مختلف اوقات کے لحاظ پر احکام مختلف ہوتے ہیں۔ ایک شخص کے لئے حکم اور ہوتا ہے اور دوسرے کے لئے اور ہوتا ہے۔

'' فمن کان بعد مایتصدق کل مالہ یتکفف الناس و لا یستطیع الصبر علی الفقر لا یجوز لہ ذلک ''

جو شخص کل مال صدقہ کرنے کے بعد لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا شروع کر دے اور فقر پر صبر کرنے کی طاقت نہ رکھے اس کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنا تمام مال صدقہ کر دے۔

''ومن یقدر علی الصبر ولیس علیہ حق من حقوق الناس فالا فضل فی حقہ البذل فی سبیل اللہ''

اور جو شخص اللہ تعالی کی راہ میں کل مال خرچ کر کے صبر کر سکے، لوگوں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے

اوراس پرلوگوں کے حقوق نہیں، تو اس کے لئے تمام مال اللہ کی راہ میں خرچ کردینا افضل ہے۔

لوگوں کے حقوق سے یہ مراد ہے کہ لوگوں کا قرض ادا کرنا ہے، اور اہل وعیال کا خرچ اور خادم کا خرچ یا رشتہ دار جومحتاج ہوجائیں ان کو اپنی طاقت اور رشتہ کے تعلق کی نسبت کے مطابق مال دینا۔

" (فھذہ الحقوق)مقدم علی التصدق علی الاجنبی لامحالة فان ذلک فریضة وھذہ نافلة "

یہ حقوق اس لئے مقدم ہیں کہ یہ فرض ہیں اور اجنبی لوگوں پر مال خرچ کرنا مستحب ہے، اس لئے اس کا حق بعد میں ہے۔ (از مظہری)

وہ احادیث جن میں تمام مال خرچ کرنے کی فضیلت کا بیان ہے:

" عن ابی امامة سئل عن النبی ﷺ ای الصدقة افضل قال جھد المقل و ابدأ بمن تعول" (رواہ ابوداؤد)

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ کون سا صدقہ افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا تنگدست شخص مشقت سے صدقہ دے، اور ابتداء اپنے اہل وعیال سے کرو۔

☆ "عن ابی ھریرة قال قال رسول اللہ ﷺ لو کان لی مثل احد ذھبا لسرنی ان لا یمر علی ثلاث لیال" (رواہ البخاری)

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر میرے پاس احد پہاڑ کی طرح سونا تو مجھے یہ پسند ہے کہ وہ میرے پاس (تین دن) تین راتیں نہ رہے۔

☆ " وعن اسماء قالتقالرسول اللہ ﷺ انفقی ولا تحصی فیحصی اللہ علیک ولا توعی فیوعی اللہ علیک ارضحی ما استعطت" (بخاری ومسلم)

حضرت اسماء رضی اللہ عنہ فرماتی ہیں، رسول اللہ ﷺ نے (مجھے) فرمایا، مال خرچ کرو، اور گنتی نہ کرو اللہ تعالیٰ بھی تم پر گنتی کرے گا۔ اور جمع کر کے نہ رکھو، اللہ تعالیٰ بھی تم پر روک کر رکھے گا، جتنی طاقت رکھتی ہو (اتنا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر کے لوگوں کو) نفع پہنچاؤ۔ (از مظہری)

☆ ''وعن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قال امرنا رسول اللہ ﷺ ان نتصدق ووافق ذلک مالاعندی فقلت الیوم اسبق ابابکررضی اللہ عنہ فجئت بنصف مالی فتصدقت بہ فقال رسول اللہ ما ابقیت لا ھلک یاعمر قلت نصف مالی یا رسول اللہ ، ثم قال لابی بکرماابقیت لاھلک قال لھم اللہ ورسولہ فقلت لا اسا بقک بشئ بعد ھا،روی ان النبی ﷺ قال عندذلک مابینکما مابین کلامیکما'' (روح البیان)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ہمیں صدقہ کرنے کا حکم فرمایا، اتفاقاً اس دن میرے پاس زیادہ مقدار میں مال تھا، میں نے کہا آج میں ابوبکر (رضی اللہ عنہ) سے سبقت لے جاؤں گا۔ تو میں اپنا آدھا مال لے آیا، وہ صدقہ کردیا۔ مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم نے اپنے اہل وعیال کے لئے کتنا مال باقی رکھا، اے عمر؟ میں نے عرض کیا آدھا مال یارسول اللہ۔ پھر آپ نے حضرت ابوبکر سے پوچھا تم نے اپنے اہل وعیال کے لئے کتنا مال باقی رکھا؟ انہوں نے کہا، اہل وعیال کے لئے تو اللہ اور اس کے رسول کافی ہیں۔ حضرت عمر کہتے ہیں، میں نے ابوبکر کو کہا آج کے بعد میں تمہارے ساتھ مقابلہ نہیں کروں گا۔ ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمہارے درمیان وہی فرق ہے جو تمہارے کلاموں کے درمیان فرق ہے۔

فائدہ:

• ''کان ابو بکر غالب المعرفۃ وعمر غالب الشریعۃ و عثمان غالب الطریقۃ وعلی غالب الحقیقۃ وان کانوا کاملین فی اللہلمراتب الاربع '' (روح البیان)

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر اور حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم معرفت وشریعت وطریقت وحقیقت میں کمال درجہ رکھتے تھے، تاہم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ معرفت میں باقی حضرات پر غالب تھے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر بنسبت باقی حضرات کے شریعت غالب تھی، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ طریقت میں باقی حضرات سے زیادہ کمال رکھتے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ حقیقت میں باقی حضرات سے زیادہ کمال رکھتے تھے۔

غریب کے لئے خوشخبری:

"وحث النبی علیه السلام اصحابه علی الصدقة فجعل الناس یتصدق و کان ابو امامة الباهلی جا لسا بین ید یه علیه السلام وهو یحرک شفتیه فقال له النبی علیه السلام ماذاتقول حیث تحرک شفتیک قال انی اری الناس یتصدقون ولیس معی شیٔ اتصدی به فاقول فی نفسی سبحان الله والحمدلله ولااله الاالله والله اکبر فقال ﷺ هؤ لا ء الکلمات خیر لک من مد ذهبا تتصدق به علی المساکین"

(روح البیان)

نبی کریم ﷺ نے اپنے اصحاب کوصدقہ پر برانگیختہ کیا (ابھارا) لوگوں نے صدقہ دینا شروع کیا۔ ابوامامہ باہلی نبی کریم ﷺ کے سامنے بیٹھ کر اپنے ہونٹوں کوحرکت دے رہے تھے، تو ان سے نبی کریم ﷺ نے پوچھاتم اپنے ہونٹوں کوحرکت دے رہے تھےتو کیا کہہ رہے تھے؟ انہوں نے عرض کیا کہ بیشک میں نے لوگوں کوصدقہ کرتے ہوئے دیکھا، میرے پاس کوئی چیزنہیں تھی کہ میں اس کے درپے ہوتا۔ (یعنی میرے پاس مال نہیں تھا کہ میں صدقہ کرتا) تو میں اپنے دل میں یہ پڑھ رہا تھا" سبحان الله والحمدلله ولااله الا الله والله اکبر" تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ کلمات پڑھنا تمہارے لئے مد (صاع کا چوتھائی حصہ) سونا مساکین پرخرچ کرنے سے بہتر ہے۔

فائدہ: بیشک سب سے پہلے " سبحان الله " جبریل علیہ السلام نے کہا، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا فرمایا ان کی نظرعرش پر پڑی تو عرش کی عظمت کودیکھ کر کہا" سبحان الله"

" فمن قالها نال ثواب جبریل " جس شخص نے " سبحان الله " پڑھا اس نے جبریل علیہ السلام کی سنت پرعمل کرنے کا ثواب حاصل کرلیا۔

حضرت آدم صفی اللہ میں جب روح پھونکی گئی تو سب سے پہلے آپ نے پڑھا "الحمدلله"

"فمن قالهانال نصیبهامن فضل آدم" جس شخص نے "الحمدلله" پڑھا اس نے حضرت آدم علیہ

السلام کی سنت پر عمل کرنے کا ثواب حاصل کرلیا۔

سب سے پہلے حضرت نوح نجی اللہ نے اس وقت " لا الـــہ الا اللہ " پڑھا جبکہ آپ نے طوفان اور شدید مصائب کا مشاہدہ فرمایا۔

" فـمـن قـالهـا اخـذحظاو افر امن ثو اب نو ح " جس شخص نے " لا الہ الا اللہ " پڑھا اس نے حضرت نوح علیہ السلام کی سنت پر عمل کرنے کی وجہ سے ثواب کا کامل اور وافر حصہ پالیا۔

سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت "اللہ اکبر " پڑھا جبکہ انہوں نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی جگہ رب تعالیٰ کی طرف سے دنبہ قربانی کرنے کے لئے بطور فدیہ مشاہدہ فرمایا۔

" فمن قالها نال فيضامن فيض ابراهيم " جس شخص نے "اللہ اکبر" پڑھا اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت پر عمل کرنے کا فیضان حاصل کرلیا۔

"اللهم اجعلنا من الذاكرين الشاكرين آمين يا رب العلمين " (روح البیان)

"كذلك يبين الله لكم الآيات لعلكم تتفكرون فى الدنيا والآخرة :

اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آیات تاکہ تم فکر کرو دنیا اور آخرت میں۔

یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ بتایا ہے کہ مشقت میں پڑ کر خرچ کرنے کی بجائے اتنی مقدار میں خرچ کیا جائے جس میں آسانی ہو اور جو اہل وعیال کی حاجت سے زائد ہو وہ خرچ کیا جائے، اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آیات کو بیان فرماتا ہے جو احکام شریعت پر دلالت کرتی ہیں۔

تنبیہ:

" تبيين الآيات تنز يلها مبينة الفحو ى و اضحة المدلول لا انه تبيينها بعد ان كا نت مشتبهة و ملتبسة"

آیات کو بیان کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ پہلے آیات کو مشتبہ طور پر نازل کیا جاتا ہے اور ان سے مضامین کو خلط ملط کر کے نازل کیا جاتا، پھر ان کی وضاحت کی جاتی ہے اور ان کو بیان کیا جاتا ہے بلکہ بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آیات کریمہ کو واضح طور پر نازل فرماتا ہے جن سے مطالب واضح ہوتے ہیں۔

اعتراض:

"کذلک" میں کاف واحد ہے حالانکہ کاف محل نصب میں صفت ہے مصدر محذوف "تبییناً" کی۔ جب مخاطبین کی تعداد کثیر ہے تو "کذلکم" کیونکہ ذکر نہیں کیا گیا۔

جواب:

"وافراد حرف الخطاب مع تعداد المخاطبین باعتبار القبیل او الفریق او القوم مما هو مفرد اللفظ ومجموع المعنی"

"کذلک" میں حرف خطاب کو مفرد ذکر کیا گیا ہے باوجود اس کے کہ مخاطبین کی تعداد کثیر ہے اس لئے اس سے مراد قبیلہ یا فریق یا قوم ہے، جو لفظاً مفرد ہیں اور معنی جمع ہیں۔

دنیا وآخرت میں فکر کرنے سے مراد کیا ہے؟

اس سے مراد یہ ہے۔

" لکی تتفکروا فی امور الدارین فتأخذوا بما هو اصلح لکم واسهل فی الدنیا وانفع فی العقبی وتجنبوا عما یضمر کم فی العقبی "

کہ تم دنیا اور آخرت کے امور میں فکر وکر و اور سمجھو کہ تمہارے لئے نفع مند کیا ہے اور نقصان دہ کیا ہے، تم اس چیز کو حاصل کرو جو دنیا میں تمہارے لئے نفع مند اور آسان ہو۔ اور آخرت میں نفع مند

ہو۔ جو چیز آخرت میں تمہارے لئے نقصان دے ہو اس سے تم اجتناب کرو۔

"قال البغوی یبین الآیات فی امر الدنیا والآخرۃ لعلکم تتفکرون فی زوال الدنیا وفنائھا فتزھدوا وفی اقبال الآخرۃ وبقائھا فترغبوا فیھا"

علامہ بغوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے، اللہ تعالیٰ تمہارے لئے امور دنیا اور امور آخرت کو بیان کرتا ہے۔ تاکہ تم دنیا کے زوال اور دنیا کے فانی ہونے میں تفکر کرو (سوچو) اور زہد اختیار کرو، یعنی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرو، اور آخرت کے آنے کو سوچو، اور آخرت سے باقی رہنے پر غور فکرو اور آخرت کی طرف رغبت کرو۔

"وھذہ الآیۃ ترغب فی التصدق"

اور یہ آیۃ کریمہ صدقہ ادا کرنے کی رغبت دلاتی ہے، کہ جو تمہارے لئے آسان ہو اتنی مقدار میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرو۔ (روح البیان)

علامہ رازی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں کہ آیۃ کریمہ کا مطلب یہ سمجھ آرہا ہے جب تمہیں معلوم ہو گیا کہ شراب اور جوا دنیا میں بظاہر کچھ نفع کا سبب بھی بنتے ہیں۔ لیکن آخرت میں گناہ اور نقصان کا سبب ہیں۔ جب تم دنیا اور آخرت کے احوال میں غور وفکر کرو گے تو تمہیں سمجھ آجائے گا کہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دینا ضروری ہے۔

اور مطلب یہ ہے کہ جب تمہیں یہ معلوم ہو جائے کہ نیکی کی راہ میں مال خرچ کرنا آخرت میں کامیابی اور ثواب حاصل کرنے کے لئے ہے۔ اور مال کو جمع کر کے رکھنا اور نہ خرچ کرنا دنیا کے لئے ہے، تو تم دنیا اور آخرت کے احوال کو سوچو، خود بخود تمہیں یقین حاصل ہو جائے گا کہ دنیا پر آخرت کو ترجیح حاصل ہے۔ (از کبیر)

☆☆☆☆☆

يَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْيَتَامٰى قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ وَلَوْشَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ☆ (سورة البقرة آيت نمبر ٢٢٠)

﴿١﴾

اورتم سے یتیموں کا مسئلہ پوچھتے ہیں تم فرماؤان کا بھلا کرنا بہتر ہے اور اگر اپنا ان کا خرچ ملالوتو وہ تمہارے بھائی ہیں، اور خدا خوب جانتا ہے بگاڑنے والے کو سنوارنے والے سے اور اللہ چاہتا تو تمہیں مشقت میں ڈالتا، بیشک اللہ زبردست حکمت والا ہے۔

﴿٢﴾

اور سوال کرتے ہیں آپ سے یتیموں کے متعلق ،فرمادو بھلائی کرنا ان سے بہتر ہے۔ اور اگر تم ملالو ان کے (خرچ کو اپنے خرچ سے) تو بھائی ہیں تمہارے ،اور اللہ جانتا ہے فساد پھیلانے والے کو بھلائی کرنے والے سے ،اور اگر چاہتا اللہ تو مشقت میں ڈالتا تمہیں، بے شک اللہ غالب ہے (اور) حکمت والا ہے۔

ماقبل سے رابطہ:

یہاں چند احکام ذکر کئے جارہے ہیں، ان میں سے یہ پانچواں حکم ہے۔ (کبیر)

شانِ نزول:

" اخرج ابو داؤد والنسائی وابن جریر وجماعة عن ابن عباس رضی الله عنهما قال لما انزل الله تعالٰی "ولا تقربوامال اليتيم الابالتی هی احسن". "وان الذين يا كلو ن

اموال اليتا مى ظلما انما يا كلون فى بطونهم نارا وسيصلو ن سعيرا " انطلق من كان عبده يتيم فعزل طعامه من طعامه و شرابه من شرابه فجعل يفضل له الشئ من طعامه فيحبس له حتى يأكله او يفسد فير مى به فاشتد ذلک عليهم فذ كروا ذلک لرسول الله ﷺ فنزلت "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ابوداؤد، نسائی اور جریر نے روایت بیان فرمائی، آپ فرماتے ہیں جب آیۃ کریمہ "ولا تقربو امال اليتيم الابالتى هى احسن " (اور نہ قریب جاؤ یتیم کے مال سوائے احسن طریقہ کے) نازل ہوئی۔

اور آیۃ کریمہ "ان الذين يا كلون اموال اليتامى ظلما انما يا كلون فى بطونهم نارا وسيصلون سعيرا" (بے شک وہ لوگ جو یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں وہ تو اپنے پیٹ میں آگ ہی بھرتے ہیں اور وہ جلیں گے بھڑکتی آگ میں) نازل ہوئی، تو صحابہ کرام جن کی پرورش میں یتیم تھے، انہوں نے یتیموں کا مال یعنی کھانے پینے کی چیزیں اپنی کھانے پینے کی چیزوں سے جدا کر دیں۔ اگر یتیم کے کھانے سے کچھ کھانا بچ جاتا تو اسے علیحدہ ہی رکھ لیا جاتا یا وہ کھانا یتیم کھالے۔ یا وہ گل سڑ جاتا اور اسے پھینک دیا جاتا۔ یہ صورت حال صحابہ کرام پر سخت تکلیف دہ ثابت ہو رہی تھی انہوں نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں اس مشکل کا ذکر کیا تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

مختصر مطلب:

جب وہ آیات پہلے نازل ہوئیں جن میں یتیموں کے مال کھانے سے عذاب سے ڈرایا گیا تو صحابہ کرام نے یتیموں کا کھانا پینا علیحدہ کر دیا، لیکن پھر اسے مشکل سمجھ کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا تو رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا، کہا کہ آپ سے یتیموں کے متعلق سوال کرتے ہیں تو آپ ان کو بتادیں کہ یتیموں کی بھلائی کے لئے جو کام بھی کریں وہی ان کے لئے اور تمہارے لئے بہتر ہے، اور وہ جانتا ہے کہ کون فساد پھیلانے والا ہے اور کون

اصلاح کرنے والا ہے، اور اگران کا خرچ اپنے خرچ سے ان کے فائدہ کے لئے ملالو تو یہ بھی بہتر ہے کیونکہ وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے جس نے تمہارے لئے آسانی پیدا کردی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا کہ تم ان کا خرچ علیحدہ ہی رکھو اور اس وجہ سے مشقت میں پڑے رہو تو اللہ تعالیٰ ایسا بھی کرسکتا تھا۔ بے شک اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمت والا ہے۔

"یسئلونک عن الیتامی":

"یسئلو نک عن القیام بأمر الیتامی او التصرف اموالهم او عن امرهم و کیف یکونون معهم"

آپ سے سوال کرتے ہیں یتیموں کے معاملات قائم کرنے کے متعلق، اور ان کے مالوں میں تصرف کرنے کے متعلق اور ان کے ساتھ معاملات رکھنے کے متعلق کہ وہ کیسے ان کے ساتھ رہیں۔

یتیم کون ہے؟

عام لوگوں کے عرف میں یتیم اسے کہا جاتا ہے جس کا باپ نہ ہو، یا جس کی ماں نہ ہو، لیکن اصطلاح شرع میں......

" ان الایتام هم الفاقدون لآبائهم وهم صغار و لا یطلق ذلک علیهم بعد البلوغ الاعلی وجه المجاز لقرب عهد هم با لیتیم "

یتیم ان کو کہا جائے گا جن کے باپ فوت ہو جائیں، اور وہ نابالغ ہوں، جب بالغ ہو جائیں تو ان کو یتیم نہیں کہا جائے گا، ہاں البتہ بالغ ہونے کے بعد ان کی یتیمی کے وقت کو قریب دیکھ کر مجازی طور پر یتیم کہہ لیا جاتا ہے۔ (احکام القرآن للجصاص)

سوال حال سے یا قال سے:

صحابہ کرام نے نبی کریم ﷺ سے یتیموں کے متعلق سوال کیا، اس سوال میں دو احتمال ہیں۔

" ثم ههنا یحتمل انهم سألوا الرسول عن هذه الواقعة"

ایک احتمال یہ ہے کہ صحابہ کرام نے زبان سے سوال کیا ہو۔

" و یحتمل ان السوال کان فی قلبهم و انهم تمنوا ان یبین الله لهم کیفیة الحال فی هذا الباب "

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ سوال ان کے دل میں تھا، اور ان کے دل میں تمنا تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کے لئے یتیموں کے متعلق مسائل بیان فرمادے۔

یعنی پہلے احتمال میں سوال زبان قال سے تھا اور دوسرے احتمال میں سوال زبان حال سے تھا۔ (از کبیر)

"قل اصلاح لهم خير": فرمادو بھلائی کرنا ان سے بہتر ہے۔

یتیموں کی اصلاح کیا ہے؟

ایک معنی تو یہاں خاص ہے، جو آیۂ کریمہ کے شانِ نزول کے مطابق ہے، وہ یہ ہے کہ تم ان کے خرچ کو اپنے خرچ سے ان کی بھلائی کے لئے ملاؤ کہ ان کے خرچ میں بچت ہو اور اس لئے ان کے مال کو اپنے مال سے ملاؤ کہ تجارت وغیرہ سے ان کا مال بڑھتا رہے، اور ان کے مال کو اپنے مال سے اس لئے ملاؤ کہ ان کا مال محفوظ رہے تو یہ بہتر ہے، کیونکہ ان سب صورتوں میں ان کی بھلائی ہے اور ان پر احسان ہے یتیم کی بھلائی میں اپنی بھلائی ہے۔

(روح المعانی)

دوسرا معنی عام ہے جو ہر قسم کی بھلائی کو شامل ہے، یعنی یتیم پر ہر قسم کی بھلائی کرو یہی تمہارے لئے بہتر ہے۔

" هذا الکلام یجمع النظر فی صلاح الیتیم با لتقویم و التا دیب و غیرهما"

یتیم کی اصلاح اس میں بھی ہے کہ اس کی اچھی طرح پرورش کی جائے تا کہ اس کی جسمانی ساخت مضبوط ہو سکے، بھوک سے بلبلاتا نہ رہے، خوراک کی کمی سے اسے کمزور اور کوتاہ قد نہ کر دیا جائے۔ اور یتیم کی اصلاح یہ ہے کہ اسے ادب سکھایا جائے، اس کی تعلیم کا خصوصی خیال رکھا

جائے، اس کے افعال واقوال پر نظر رکھی جائے، برے دوستوں اور بری مجالس سے اسے بچایا جائے، نیک لوگوں کی محافل میں اسے بھیجا جائے۔

"لکی ینشأ علی علم و ادب و فضل لان هذاالصنع اعظم تاثیرا فیه من اصلاح ماله بالتجارة"

تاکہ وہ بڑا ہو کر عالم بن جائے، مؤدب ہو اور صاحب فضل ہو جائے، یہ تعلیم وتربیت اس کے مال میں تجارت کر کے اصلاح کرنے سے زیادہ موثر اور نفع مند ہے۔

البتہ اس کے مال کی حفاظت اور اسے بڑھانے کی تدبیر بھی یتیم پر احسان ہے۔ حقیقی طور پر آیۃ کریمہ سے مراد وہی ہے۔

"فهذه الکلمة جامعة لجمیع مصالح الیتیم و الو لی"

مندرجہ بالا بحث سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی "قل اصلاح لهم خیر" مختصر جملہ ہے لیکن یتیم اور اس کے ولی کے حق میں ہر قسم کی بھلائی کو شامل ہے۔

اعتراض:

"اصلاح" کے لفظ کے لئے مشہور تو یہ ہے "لا یتناول الاتدبیر انفسهم دون مالهم" کہ یہ صرف جانوں کی تدبیر کو شامل ہے، مال کی تدبیر کو شامل نہیں، تو یہاں "اصلاح" کے ذکر کا کیا مطلب ہے؟

جواب:

"قلنالیس کذلک لأن مایؤدی الی اصلاح ماله بالتنمیة و الزیادة یکون اصلاحاله"

یہ قول جو مشہور ہے درست ہی نہیں، کیونکہ مال کی تجارت سے بڑھانا اور مال کی حفاظت کرنا اگرچہ بظاہر ہر مال کی اصلاح ہے، لیکن حقیقت میں مال والے کا ہی اس میں بھلا ہے، اس طرح مال کی اصلاح بھی جان کی ہی اصلاح ہے۔

یہ جملہ ولی کی بھلائی کو شامل ہے:

"اصلاح اموالھم من غیر عوض ولااجرۃ خیر للولی واعظم اجراله"

یتیموں کی ولیوں کا ان کے مال کی اصلاح کرنا اور اس کا معاوضہ نہ لینا ولی کے لئے بہتر ہے اور عظیم اجر کا سبب ہے۔

"فوجب حملہ علی الخیرات العائدة الی الولی والی الیتیم فی اصلاح النفس و اصلاح المال"

یہ آیہ کریمہ ہر قسم کی بھلائی کو شامل ہے، خواہ وہ بھلائی یتیم سے متعلق ہو یا یتیم کے ولی سے، اسی طرح اس بھلائی کا تعلق مال سے ہو یا جان سے ہو۔ (از کبیر)

یتیم کی اصلاح کے متعلق چند مسائل:

مسئلہ: جب یتیم کے مال کو اپنے مال سے ملانا جائز ہے، بشرطیکہ یتیم کے مال کی اصلاح مقصود ہو، تو اس سے یہ سمجھ آیا کہ اگر یتیم کے مال کی تجارت (خرید وفروخت) نفع مند ہو تو اس کے مال کی خرید وفروخت جائز ہوگی۔

مسئلہ: یتیم کا ولی اس کا مال کسی شخص کو بطور مضاربت دے کہ تم اس مال سے تجارت کرو اور نفع میں اتنا حصہ صاحب مال کا ہوگا، اور اتنا حصہ تمہارا، تو یہ جائز ہے، بلکہ ولی خود بھی مضاربت پر یتیم کے مال میں تصرف کرسکتا ہے۔

مسئلہ: قاضی کو حق حاصل ہے کہ اگر یتیم (نابالغ) کا نکاح اس کے لئے مفید سمجھے، یعنی اب کفول رہی ہے، پھر ہو سکتا ہے نہ ملے۔ اس قسم کا کوئی فائدہ نکاح میں سمجھا جائے تو اس کا نکاح کردینا اس کے حق میں اصلاح ہے۔

مسئلہ: یتیم کی اشیاء میں سے کسی چیز کو کرایہ پر دینا اور یتیم کے لئے کسی چیز کو کرایہ پر لینا اگر مفید ہو تو ولی کے لئے کرایہ کا لین دین جائز ہوگا۔ (احکام القرآن للجصاص)

"وان تخالطوھم فاخوانکم":

اور اگر تم ملاؤ ان (کے خرچ کو اپنے خرچ سے) تو بھائی ہیں تمہارے۔

''المخالطة'' کا مطلب یہ ہے کہ چیزوں کو اس طرح ملا جلا دینا کہ وہ ایک دوسرے سے علیحدہ نہ ہوسکیں۔
''خلاط'' بمعنی جماع بھی آتا ہے، اور خلاط کا معنی جنون بھی ہے، کہ جب کسی شخص کی عقل زائل ہو جاتی ہے، تو اس پر تمام امور خلط ملط ہو جاتے ہیں۔

ان الفاظ مبارکہ کی تفسیر میں چند وجوہ پائی جاتی ہیں:

(۱) ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ان کے طعام، مشروبات، اور مسکن (ٹھہرنے کا مکان) اور خدام میں اختلاط کرلو تو وہ تمہارے بھائی ہیں۔ کیونکہ یتیموں کے مال کھانے پر جب عذاب کا ذکر کیا گیا تو صحابہ کرام نے ان کے مالوں کو اپنے مالوں سے جدا کرلیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے مباح کردیا کہ جس طرح اپنی اولاد کے مال کو اپنے مال سے ملالیا جاتا ہے، اسی طرح یتیموں کے طعام کو اپنے طعام سے اور ان کے مشروب کو اپنے مشروب سے اور ان کے مسکن کو اپنے مسکن سے ملالو، اس سے ان پر مہربانی ہوگی، اور حسن معاشرت پائی جائے گی۔

" والمعنی وان تخالطوھم بما لا یتضمن افساد اموالھم فذلک جائز "

مطلب یہ ہوا کہ ان مال کو اپنے مال سے اس طرح ملاؤ کہ ان کا نقصان نہ ہو تو یہ جائز ہے۔

☆ "واخرج عبد بن حمید وابو حاتم عن ابن عباس المخالطة ان یشرب من لبنک و تشرب من لبنه ویا کل فی قصعتک وتا کل فی قصعته ویا کل من تمر تک وتا کل من تمر ته "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ''مخالطة'' کی تفسیر یوں کی کہ وہ تمہارا دودھ پئے تم اس کا دودھ پیئو، وہ تمہارے پیالہ سے کھائے اور تم اس کے پیالہ سے کھاؤ، اور وہ تمہاری کھجوریں کھائے اور تم اس کی کھجوریں کھاؤ۔

(۲) دوسری وجہ اس میں یہ پائی گئی ہے۔

" المراد بھذہ المخالطة ان ینتفعوا باموالھم بقدر ما یکو ن اجرۃ مثل ذلک العمل "

کہ مخالطة کا مطلب یہ ہے کہ یتیموں کے ولی جوان کے مال کی دیکھ بھال میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں، وہ اتنی اجرت لے سکتے ہیں جتنی عام انسان کسی دوسرے سے ایسے کام کی اجرت لیتا ہے۔

پھر اس میں دو مذہب ہیں۔ایک یہ کہ ولی خواہ امیر ہو یا غریب ہو، یتیم کے مال سے مناسب اجرت لے سکتا ہے۔دوسرا مذہب یہ ہے کہ غریب شخص تو مناسب اجرت لے سکتا ہے۔لیکن غنی شخص اجرت نہیں لے سکتا، کیونکہ یتیموں کی پرورش ان پر واجب ہے اور وہ حاجتمند نہیں اس لئے وہ اجرت نہیں لے سکتے۔

ان حضرات نے اپنے موقف پر دلیل یہ قائم کی کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

" ومن کان غنیا فلیستعفف ومن کان فقیرا فلیا کل با لمعروف "

جو شخص غنی ہو وہ درگزر کرے اور جو شخص فقیر ہو وہ معروف طریقہ سے کھالے۔

بلکہ اس سے بھی ترقی کر کے ان حضرات نے یہ بیان کیا کہ اگر یتیم کے غریب ولی نے اپنی حاجت کے مطابق اس کے مال سے کچھ لے لیا "ویردہ اذاالیسر فان لم یوسر تحللہ من الیتیم" لیکن جب اسے مال لوٹانے کی آسانی ہو تو مال لوٹا دے، ہاں اگر آسانی نہ ہو تو یتیم کا جو مال بقدر حاجت لیا تھا وہ جائز اور حلال ہے۔

فائدہ جلیلہ:

" وروی عن عمر رضی اللہ عنہ انہ قال انزلت نفسی من مال اللہ تعالٰی بمنزلة ولی الیتیم ان استغنیت استعففت و ان افتقرت اکلت قرضابالمعروف ثم قضیت "

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے مجھے جس مال کا محافظ بنا رکھا ہے اس میں میں اپنے آپ کو ایسے سمجھتا ہوں کہ جیسا کہ یتیم کے مال پر ولایت رکھنے والے کو حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اگر میں بے پرواہ ہوں، یعنی مجھے مال کی ضرورت نہ ہو تو میں درگزر کرتا ہوں اور اگر مجھے ضرورت

درپیش آئے تو میں معروف طریقہ سے قرض لے لیتا ہوں، پھر مجھے جب وسعت ملتی ہے تو میں وہ قرض ادا کر دیتا ہوں۔

یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیت المال سے مال بغیر ضرورت کے کبھی نہیں لیا۔ اگر کبھی ضرورت درپیش آجاتی تو آپ بطور قرض مال لیتے، وسعت حاصل ہونے پر وہ مال واپس بیت المال میں دے دیتے۔

"وعن مجاهد اذا كان فقيرا واكل بالمعروف فلا قضاء عليه"

حضرت مجاھد رحمہ اللہ فرماتے ہیں یتیم کے مال کا ولی جب فقیر ہو اور مناسب طریقہ سے مال بطور اجرت لے لے تو واپس لوٹانے کی ضرورت نہیں۔

راقم کے نزدیک تین اقوال میں تعارض نہیں:

اختلاف صرف ظاہری الفاظ تک ہے، ورنہ مطلب سب کا ایک ہے، یعنی یتیم کے مال کا ولی، اس کے مال کی حفاظت کرنے والا، اور اس کے مال میں تجارت وغیرہ کرنے میں اپنا وقت صرف کرنے والا، اپنی جائز حد تک مناسب مقدار میں اجرت لے تو اس کے لئے جائز ہے، خواہ وہ غنی ولی ہو یا غریب۔ اس قول کا تعلق جواز سے ہے، اس سے بہتر یہ ہے کہ غنی اجرت نہ لے اور غریب اجرت لے لے، اور غریب پر کوئی لازم نہیں کہ وہ اجرت واپس لوٹائے اس قول کا تعلق استحباب سے ہے، جو پہلی صورت سے بہتر ہے۔

لیکن زیادہ باعث تقوی یہ صورت ہے کہ غنی یتیم کے مال میں کام کرنے کی اجرت نہ لے، کیونکہ رب تعالی نے اس اپنا مال دے رکھا ہے، جب وہ یتیم کے مال سے اجرت نہیں لے گا، اللہ تعالی اس کے مال میں برکت ڈالے گا۔

اور اگر یتیم کے مال کا ولی فقیر ہے تو وقتی ضرورت کے لئے یتیم کا مال بطور اجرت شرعی جواز کی حد تک لے لے لیکن جب اسے مالی وسعت مل جائے تو وہ مال واپس کر دے۔ (راقم)

(۳) مخالطت کی تیسری صورت یہ ہے۔

"معنى الآية ان يخلطوا اموال اليتامى باموال انفسهم على سبيل الشركة بشرط رعاية جهات المصلحة والغبطة للصبى"

کہ یتیموں کا مال اپنے مال سے شرکت کے لئے ملالو، یعنی ان کے مال اور اپنے مال کو ملا کر تجارت کروتا کہ یتیم کو زیادہ نفع حاصل ہو اور اس کے مال میں ہر طرح کی اصلاح (بھلائی) کی کوشش کرو، اس طرح مصلحت کا لحاظ کیا جائے کہ بچے کو اس پر رشک آئے۔

(۴) مخالطت کی چوتھی وجہ ابو مسلم نے بیان کی جو انکے نزدیک مختار وجہ ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

ان المراد با لخلط المصاهرة" کہ اس مخالطت سے مراد نکاح کی وجہ سے اجتماع اور میل جول حاصل کرنا ہے۔

زمانہ جاہلیت میں لوگ اپنی زیر پرورش یتیم مالدار لڑکی سے خود نکاح کر لیتے، مقصد ان کا صرف مال حاصل کرنا ہوتا، وہ نکاح کرنے کے بعد ان کی طرف رغبت نہ کرتے، اور ان سے محبت نہ کرنے کی وجہ سے انصاف نہیں کرتے تھے۔

رب تعالیٰ نے بے انصافی سے یتیم لڑکیوں سے نکاح کرنے کی ممانعت فرما دی ارشاد فرمایا۔

- "وان خفتم ان لا تقسطوا فی الیتامی فانکحوا ماطاب لکم الخ"

راقم کے نزدیک یہ تمام صورتیں جو ذکر کی ہیں وہ چار صورتیں مجموعی طور پر آیۃ کریمہ کا مفہوم ہیں۔ تاہم چوتھی صورت کے مختار ہونے پر دلائل بھی قائم کئے گئے ہیں۔

"احدھا ان ھذاالقول خلط للیتیم نفسه والشرکة خلط لما له"

ان میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ "خلط" کا مطلب ہی یہ ہے۔ کہ یتیم کو اپنے ساتھ ملانا، یہ صورت نکاح سے ہی حاصل ہوتی ہے، کیونکہ مال کو مال سے ملانے کو شرکت کہا جاتا، مخالطت نہیں کیا جاتا۔

"وثانیھا ان الشرکة داخلة فی قوله"قل اصلاح لهم خیر"والخلط من جهة النکاح"

دوسری دلیل کہ چوتھی وجہ زیادہ بہتر ہے کہ مال کو مال سے ملانے کو ذکر "قل اصلاح لهم خیر" میں آ گیا، کیونکہ "ان کی بھلائی بہتر ہے" کا یہی مطلب ہے کہ ان کے مال کو اپنے مال سے ملا کر فائدہ مند بناؤ۔

لیکن خلط کا تعلق ہی نکاح کی وجہ سے ہے ان کو اپنے ساتھ ملانا ہے، نکاح کی وجہ سے ان کو اپنے ساتھ ملانے کا ذکر بظاہر "قل اصلاح لھم خیر" میں نہیں آیا تھا، اسے " وان تخالطوھم فاخوانکم " سے بیان کردیا۔

" وثالثھا ان قولہ تعالیٰ (فاخوانکم) یدل علی ان المراد بالخلط ھو ھذا النوع من الخلط لان الیتیم لو لم یکن من اولاد المسلمین لوجب ان یتحری صلاح اموالہ کما یتحراہ اذا کان مسلما فوجب ان تکون الاشارۃ بقولہ (فاخوانکم)الی نوع آخر من المخالطۃ"

تیسری دلیل یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے " وان تخالطوھم" کے بعد " فاخوانکم "ذکر فرمایا، اس سے واضح ہوا کہ مخالطت سے یہی مراد ہے کہ اگر تم ان کو نکاح کی وجہ سے اپنے ساتھ ملالو تو وہ تمہارے (دینی بھائی) ہیں، چونکہ نکاح مسلمان سے ہوتا ہے مشرک سے نہیں۔ قانون یہ ہے کہ بچہ ماں باپ کے تابع ہوتا ہے۔ اگر یتیم کافروں کی اولاد سے ہے تو وہ کافر سمجھا جائے گا، اس وقت بھی اس کے مال کو اپنے ساتھ ملاکر اس کے مال کی اصلاح ضروری ہے، حالانکہ وہ مسلمان کا دینی بھائی نہیں۔

خیال رہے قرآن پاک میں اکثر الفاظ مبارکہ مذکر استعمال ہیں، جو مونث کو بھی شامل ہیں۔ یہاں بھی صیغے مذکر کے ہیں، لیکن مونث کو بھی شامل ہیں۔

"ورابعھا انہ تعالیٰ قال بعد ھذہ الآیۃ (ولاتنکوا المشرکات حتی یومن) فکان المعنی ان المخالطۃ المندوب الیھا انما ھی الیتامی الذین ھم لکم اخوان بالاسلام فھم الذین ینبغی ان تناکحوھم لتاکید الألفۃ فان کان الیتیم من المشرکات فلا تفعلوا ذلک "

چوتھی دلیل اس پر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد ذکر فرمایا " ولا تنکوا المشرکات

حتی یو من " (مشرکات سے نکاح نہ کرو یہاں تک کہ ایمان لے آئیں) تو اس پتہ چلا کہ جس مخالطت کی طرف دعوت دی گئی ہے، اس سے مراد نکاح کی وجہ سے ان کو اپنے ساتھ ملانا لیکن جب وہ مسلمان ہوں، اگر یتیم بچے اور بچیاں مومن نہیں تو ان کے نکاح مسلمانوں سے نہیں ہو سکتے۔

(ماخوذ از کبیر و مختصر از روح المعانی)

تنبیہ : علامہ رازی رحمہ اللہ کی بحث کو راقم نے عظیم سمجھ کر ذکر کیا ہے، اور کچھ الفاظ روح المعانی کے قوی نہ سمجھتے ہوئے اعراض کر لیا ہے، اور حضرت علامہ مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ کے مندجہ ذیل اعتراض و جواب کو بھی ضروری نہ سمجھا۔

اعتراض: یہاں یتیموں کو بھائی کہنے سے معلوم ہوا کہ صرف مسلمان یتیموں کے ساتھ ہی سلوک کرنا چاہئے، اگر یہ حکم ہوتا تو انہیں بھائی نہ کہا جاتا۔

جواب: اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ چونکہ یہاں سوال مسلمان یتیموں کے لئے ہی تھا، اس لئے انہیں بھائی فرمادیا گیا، دوسری آیۃ کریمہ میں ہر یتیم کے ساتھ سلوک کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جیسا کہ تفسیر سے معلوم ہو چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہاں خلط سے جانی شرکت یعنی نکاح اور مالی شرکت دونوں ہی مراد ہیں اور کافر یتیموں سے چونکہ نکاح جائز نہیں۔ لہٰذا انہیں بھائی فرمادیا گیا ہے۔ (نعیمی)

اخوت اسلامی اخوت نسبی سے بہتر ہے:

"(فاخوانکم) ای فھم اخوانکم فی الدین الذی ھو اقوی من العلاقۃ النسبیۃ ومن حق الأخ ان یخالط الأخ با لاصلاح والنفع"

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا " فاخوانکم " وہ تمہارے بھائی ہیں، اس سے مراد یہ ہے کہ وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔ دینی بھائی کا مقام نسبی بھائی سے زیادہ ہے، اس لئے ایک بھائی کو دوسرے بھائی سے محبت رکھنی چاہئے تاکہ اس سے بھلائی کر سکے اور اسے نفع پہنچا سکے۔ (روح البیان)

یہ حقیقت ہے کہ اگر ایک بھائی مسلمان ہو اور دوسرا بھائی (العیاذ باللہ) کافر ہو تو یہ نسبی بھائی غیر ہے، وہ

مسلمان کا اپنا نہیں، اور اگر اجنبی ہو لیکن مسلمان ہو تو وہ اپنا ہے، غیر نہیں۔

ایک رخ یوں سمجھئے: لپٹا جو دامنِ مصطفیٰ سے وہ یگانہ ہو گیا
جس کے حضور ہو گئے اس کا زمانہ ہو گیا

دوسرا رخ یہ ہے: جو ان سے یار پھرتے ہیں
یوں ہی در بدر خوار پھرتے ہیں

"واللہ یعلم المفسد من المصلح":

اور اللہ جانتا ہے فساد پھیلانے والے کو بھلائی کرنے والے سے۔

اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ کون سا شخص یتیم کے مال سے اپنے مال سے فساد کی خاطر ملا رہا ہے اور کون سا شخص اصلاح کے لئے ملا رہا ہے، اللہ تعالیٰ پر کچھ مخفی نہیں۔

" فیجازیه علی حسب مداخلته فاحذ روه ولا تحرواغیر الاصلاح "

اس لئے رب تعالیٰ نے ہر شخص کو اس کے فعل کے مطابق جزا دینی ہے اگر اصلاح کی غرض سے کسی نے یتیم کے مال کو اپنے مال سے ملایا تو اللہ تعالیٰ اسے جزاء عطاء فرمائے گا۔ اور اگر کسی نے یتیم کے مال کو اپنے مال سے فساد اور نقصان پہنچانے کی غرض سے ملایا تو اسے رب تعالیٰ عذاب دے گا۔ لہٰذا تم رب تعالیٰ کے عذاب سے ڈر کر رہو سوائے بھلائی کرنے کے اور راستہ نہ اختیار کرو۔

" ویعلم ضمائر من اراد الافساد والطمع فی مالهم بالنکاح من المصلح "

اگر کوئی شخص یتیم کو نقصان پہنچانے کا ارادہ کرے، یا نفع پہنچانے کا ارادہ کرے تو اللہ تعالیٰ ان کے ارادوں پر بھی مطلع ہے، کیونکہ وہ دلوں کی باتوں کو اور سینوں کے رازوں کو جانتا ہے۔ تم ارادے کو ظاہر بعد میں کرو گے، وہ پہلے ہی تمہارے ارادے کو جانتا ہے۔ بلکہ تمہارے دل میں خیال آنے

سے بھی پہلے جانتا ہے۔ کہ اس کے دل میں یہ خیال آئے گا۔ "وھذا تھدید عظیم" اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف شدید خوف دلایا گیا ہے کہ یتیم کے مال کے معاملہ میں رب تعالیٰ کو خوف رکھو۔

(از روح البیان و کبیر)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

بظاہر اس پر اعتراض یہ ہے کہ "علم" کے بعد "من" نہیں آتا۔ یہاں "یعلم" کے بعد "من المصلح" کا استعمال کیسے درست ہے؟

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے۔

"ومن لتضمين العلم معنى التميز اى يعلم من يفسد فى امورهم عند المخالطة ممن يصلح"

کہ یہاں قاعدۂ تضمین پایا گیا ہے۔ کیونکہ "علم" بمعنی "تمییز" استعمال ہے۔ چونکہ "تمییز" کے بعد "من" کا آنا صحیح ہے۔ اس لئے "یعلم" کے بعد "من" لایا گیا ہے۔

اب مطلب یہ ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے یتیموں کے مال کو اپنے مال سے ملا کر ان کے امور میں فساد کون برپا کرنا چاہتا ہے اور کون اصلاح چاہتا ہے۔ لہٰذا رب تعالیٰ ان کو ان کے کردار کی وجہ سے جدا جدا کرنا چاہتا ہے۔

یہی قرآن پاک کی عظمت ہے کہ ایک لفظ سے عظیم مطالب سمجھا دیئے جاتے ہیں۔ (از روح البیان)

قرآن پاک کا کمال:

"وفی تقديم المفسد مزيد تهديد"

صرف اندازِ بیان سے ہی قرآن کتنے مسائل حل کر دیتا ہے، یہی قرآن پاک کا کمال ہے، اس مقام پر "مفسد" کو "اصلاح" سے پہلے ذکر کر کے یہ واضح کر دیا کہ فساد کی غرض سے یتیموں کے مال کو اپنے مال سے ملانے کی وجہ سے تم شدید گرفت میں آؤ گے۔ (از روح البیان)

"ولو شاء اللہ لأعنتکم": اور اگر چاہتا اللہ تو مشقت میں ڈالتا تمہیں۔

" الاعنات " کا معنی ہوتا ہے کسی کو ایسی مشقت میں ڈالنا جس کی وہ طاقت نہ رکھے، اور کبھی کہا جاتا ہے " تعنته تعنتا " میں نے فلاں شخص پر سوال خلط ملط کر کے پیش کیا، یعنی پیچیدہ سوال کیا۔

مشقت میں ڈالنے کا کیا مطلب؟

اس کے تین مطالب ہیں۔

(۱) ایک مطلب یہ ہے جو عام مفسرین کرامؒ نے بیان فرمایا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی وضاحت یوں بیان فرمائی۔

" لوشاء اللہ لجعل ما اصبتم من اموال الیتامی موبقا"

اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمہیں مشقت میں ڈالتا یعنی یتیموں کے مالوں کی وجہ سے تمہیں ہلاکت میں ڈالتا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے یتیموں کے مالوں کے متعلق واضح طور پر بیان فرما کر تمہیں ہلاکت سے بچالیا۔

(۲) " وقال عطاء ولو شاء اللہ لا دخل علیکم المشقة کما ادخلتم علی انفسکم ولضیق الأمر علیکم فی مخالطتهم "

عطاء کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمہیں مشقت میں ڈالتا، یعنی جس طرح تم نے یتیموں کا مال علیحدہ کر دیا تھا، ان کا کھانا پینا جدا کر دیا تھا، تم نے اپنے آپ کو مشقت میں ڈال دیا تھا، اللہ تعالیٰ تمہیں اسی مشقت میں مبتلا رکھتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہیں اصلاح کی غرض سے ان کے مالوں کو اپنے مالوں سے ملانے کی اجازت فرما کر مشقت سے بچالیا۔

(۳) " وقال الزجاج ولو شاء اللہ لکلفکم ما یشتد علیکم "

زجاج نے یہ بیان کیا کہ ان الفاظ مبارکہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم پر مشقت والے احکام نازل کرتا لیکن اس نے تمہاری آسانی کے لئے تم پر مشقت والے احکام نافذ نہیں فرمائے۔ (کبیر)

''ان اللہ عزیز'' بے شک اللہ غالب ہے ''حکیم'' حکمت والا ہے۔

'' ان اللہ عـزیز '' غالب یقدر علی الاعنات '' بے شک اللہ تعالیٰ غالب ہے مشقت میں ڈالنے کی قدرت رکھتا ہے۔

''حکیم''یحکم ما تقتضیه الحکمة '' حکمت والا ہے اس لئے وہ اپنی حکمت کے مطابق حکم فرماتا ہے۔

یعنی وہ اپنی حکمت کے مطابق ہی تمہیں مشقت میں نہیں ڈالتا، ورنہ اس کی طاقت اور غلبہ کو دیکھا جائے تو وہ تمہیں مشقت میں ڈالتا۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

لفظ ''لـــو'' آتا ہے امتناع کے لئے ،یعنی دوسرے کا امتناع اول کے امتناع کا سبب بنتا ہے۔ یا بقول ابن حاجب اول کا امتناع سبب بنتا ہے ثانی کے امتناع کے لئے۔ مفصل بحث مختصر المعانی میں دیکھئے۔

اس ضابطہ کو مدنظر رکھتے ہوئے آیۃ کریمہ کی طرف توجہ فرمائیں ،تو مطلب واضح ہو جائے گا۔

'' ولو شاء اللہ لا عنتکم لکو نه غالبا لکنه لم یشأ لکو نه حکیما''

اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمہیں مشقت میں ڈالتا کیونکہ وہ غالب ہے ،لیکن وہ نہیں چاہتا کیونکہ وہ حکیم ہے۔ (روح المعانی)

یعنی حکمت کے تقاضا کے مطابق اس کا تمہیں مشقت میں نہ ڈالنے کا ارادہ و مشیت سبب ہے ،اس کا تمہیں حقیقت میں مشقت میں نہ ڈالنے کا باوجود اس کے کہ وہ ذات غالب ہے اور وسیع طاقت کا مالک ہے۔

فائدہ:

اس آیۃ کریمہ سے یہ مسئلہ بھی حاصل ہوا کہ تکلیف مالا یطاق ثابت نہیں ،یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ان کی

طاقت سے زائد تکلیف دے کر مشقت میں نہیں ڈالتا، یہی وجہ ہے کہ مریض کا بیٹھ کر یا لیٹ کر اشارہ سے نماز پڑھنا صحیح ہے۔اور دورانِ سفر یا حالتِ مرض کے روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے کہ بعد میں قضاء کر لے۔ (ماخوذ از کبیر)

یتیم پر رحم کرنا:

"واعلم ان مخالطة الایتام من اخلاق الکرام وفی الترحم علیهم فوائد جمة"

یتیموں کے مال اور ان کی ذاتوں کو اپنے ساتھ ملانا اخلاق کریمانہ کا ایک حصہ ہے اور ان پر رحم کرنے پر عظیم فوائد پائے گئے ہیں۔

☆ "قال رسول الله ﷺ من وضع یده علی رأس یتیم ترحما علیه کا نت له بکل شعرة تمر علیها یده حسنة"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے اپنا ہاتھ رحم کرتے ہوئے یتیم کے سر پر رکھا، اس کے ہاتھ کے نیچے یتیم کے جتنے بال آئیں گے، ہر بال کے بدلے اللہ تعالیٰ اسے نیکی عطاء فرمائے گا۔

☆ وفی الحدیث (ثلاثة فی ظل عرش الله یوم القیامة امراة مات عنها زوجها وترک علیها یتامی صغارا فخطبت فلم تتزوج وقالت اقیم علی الیتامی حتی یغنیهم الله اویموت) یعنی الیتیم (اوهی ورجل له مال صنع طعاما فاطاب صنیعه واحسن نفقته فدعا الیه الیتیم والمسکین، وواصل الرحم یوسع له فی رزقه ویمدله فی اجله ویکون تحت ظل عرشه"

حدیث شریف میں آتا ہے کہ تین شخص قیامت کے دن اللہ کے عرش کے سایہ میں ہوں گے۔ (ایک ان میں سے) وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو گیا ہو اور اس کے پاس چھوٹے یتیم بچے چھوڑ گیا ہو، اس عورت کو خطبہ کیا گیا (یعنی پیغام نکاح دیا گیا) تو اس نے نکاح نہ کیا، اور کہا میں یتیموں کی دیکھ بھال کروں گی، ان کی پرورش کروں گی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کو بے پرواہ کر دے یا (یتیم بچے یا بچی کی رضاء الٰہی سے) وفات ہو جائے۔

(دوسرا ان میں سے) وہ شخص جو مال دار اچھے طریقہ سے طعام تیار کرے، اچھی طرح نفقہ تیار کرے

اور پھر یتیموں اور مسکینوں کو دعوت دے (ان کو کھانا کھلائے)

(تیسرا ان میں سے) وہ شخص جو صلہ رحمی کرے اس کے رزق میں وسعت دی جاتی ہے اور اس کی عمر میں برکت ہوتی ہے اور وہ اللہ کے عرش کے سایہ میں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو یہ حکم دیا۔

"یا موسی کن للیتیم کالاب الرحیم و کن للارامل کا لزوج الشفیق و کن للغریب کالا خ الرفیق اکن لک کذلک"

اے موسیٰ تم یتیموں کے لئے رحم کرنے والے باپ کی طرح ہو جاؤ، اور بیوہ عورتوں کے لئے شفیق زوج کی طرح ہو جاؤ، اور غریب کے لئے مہربان بھائی کی طرح ہو جاؤ، تو میں تمہارے لئے اسی طرح (رحیم و شفیق و رفیق) ہو جاؤں گا۔

☆ "وفی الحدیث انا و کافل الیتیم کھا تین فی الجنۃ"

(نبی کریم ﷺ نے اپنی شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی کو اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے فرمایا) میں اور یتیم کا کفیل جنت میں ان دو (انگلیوں) کی طرح ہوں گے۔

یعنی یتیم کے مال اور جان کی حفاظت کرنے والے شخص کو جنت میں میرا قرب حاصل ہوگا اور وہ میرے سامنے ہوگا۔ حدیث پاک میں یہ مطلب نہیں کہ اس شخص کو وہ درجہ حاصل ہوگا جو نبی کریم ﷺ کو حاصل ہوگا۔

حافظ شیرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

تیمار غریباں سبب ذکر جمیل ست   جانا مگر ایں قاعدہ در شہر شما نیست

غریبوں کی تیمارداری اچھا ذکر ہے، اے پیارے مگر یہ قانون تمہارے شہر میں نہیں پایا جاتا۔

شیخ سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

چو بینی تیمی سر افگندہ پیش   مدہ بوسہ بروئے فرزند خویش

الا تا نگرید کہ عرش عظیم   بلرزد ہمی چوں بگرید یتیم

جب تو دیکھے کہ یتیم نے سر آگے جھکایا ہوا ہے۔تو تو اپنے بیٹے کی رخساروں پر بوسہ نہ دے۔

ہاں کہیں یتیم رونہ پڑے، کیونکہ عرش عظیم۔ پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے یتیم کے رونے سے۔

فائدہ: یتیم کو اس طرح ادب سکھائے جس طرح اپنے بچوں کو ادب سکھایا جاتا ہے، کیونکہ قیامت کے دن انسان سے یتیم کے متعلق سوال کیا جائے گا۔لہٰذا وہ اس کی اصلاح کی پوری کوشش کرے۔

" والتا دیب علی انو ا ع منهاو الوعید ومنها الضرب ومنها جس المنافع و العطیة و البر"

ادب سکھانے میں مختلف صورتوں پر عمل کرنے کی ضرورت درپیش آتی ہے، کبھی ڈرانے دھمکانے کی ضرورت ہوتی ہے، اور کبھی ہلکی مار اور سرزنش یعنی ایک یا دو تھپڑ مار دینا، اور اس سے منافع اور عطیات اور مہربانیوں کو روک کرا ہے ادب سکھانے کی ضرورت درپیش ہوتی ہے۔

" فان بین الناس تفاوتا فنفس تخضع با لغلظة و الشدة و لو ا ستعملت معها الرفق و البر لا فسد ها ونفس با لعکس "

لوگ چونکہ مختلف طبیعتوں کے مالک ہوتے ہیں، بعض وہ ہوتے ہیں جو سختی اور شدت کی وجہ سے ہی سدھرتے ہیں اگر ان کے ساتھ نرمی کی جائے اور بھلائی کی جائے تو وہ بگڑ جاتے ہیں، اور کئی لوگ نرمی سے سنور جاتے ہیں۔

لہٰذا ہر انسان کے حال کو دیکھ کر اس کے مطابق تربیت کی جائے، ایسا نہ ہو کہ یتیم اگر سرزنش کے قابل تھا تو اس کی سرزنش نہ کر کے اسے بگاڑ دیا جائے۔

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حدود کو جرائم کے مطابق رکھا، اور تعزیرات کو لوگوں کے مطابق رکھا، ایک قسم کا ہی جرم ہوتا ہے لیکن کسی شخص کو معمولی تعزیر سے تنبیہ حاصل ہو جاتی ہے اور کسی کو سخت تعزیر کی ضرورت درپیش آتی ہے۔

ادب سکھانے پر اجر حاصل ہوتا ہے۔

" فادب الاحرار الی السلطان و ادب المالیک و الاو لاد الی السادات و الآباء وهو ماجور علی التأدیب ومسؤل عنه، قال الله تعالیٰ " قواانفسکم و اهلیکم نارا "وفی الحدیث"کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته "

آزاد انسانوں کا (عوام کا) ادب بادشاہ کے ذمہ ہے۔ اور غلاموں کو ادب سکھانا ان کے مالکوں کی ذمہ داری ہے۔ اور اولاد کو ادب سکھانا والدین پر لازم ہے۔ ہر شخص کو ادب سکھانے پر اجر حاصل ہوگا۔ اور ہر ذمہ دار سے ذمہ داری کے نبھانے کے متعلق سوال ہوگا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے "قوا انفسکم و اھلیکم نارا" اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ۔ اور حدیث شریف میں ہے "کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته" تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے (ہر شخص رعیت رکھتا ہے) اور تم سے ہر شخص سے اس کی رعیت کے متعلق سوال ہوگا۔

فائدہ: "وان تخالطوھم" سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنے کھانے میں اور لوگوں یعنی مسکین غریب فقیر کو ساتھ شریک کرے، کیونکہ اس میں برکت حاصل ہوگی۔

حدیث شریف میں ہے۔ " ان من احب الطعام الی اللہ ماکثرت علیه الایدلی "

بے شک اللہ کو محبوب طعام وہ ہے جس پر ہاتھ کثیر ہوں (یعنی جس مین زیادہ کھانے والے شریک ہوں)

وذکر فی المصابیح ان اصحاب النبی ﷺ قالوا یارسول اللہ ان نا کل ولا نشبع، قال (لعلکم تفترقون) قالوا نعم قال (فاجتمعوا علی طعامکم واذکروا اسم اللہ تعالیٰ"

ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام نے عرض کیا یارسول اللہ! ہم کھاتے ہیں لیکن سیر نہیں ہوتے، آپ نے فرمایا شائد تم علیحدہ علیحدہ کھانا کھاتے ہوگے۔ انہوں نے کہا ہاں، آپ نے فرمایا مل کر کھانا کھایا کرو، اور اللہ تعالیٰ کا نام لے کر کھانا کھاؤ۔

یعنی کھانا کھانے سے بسم اللہ پڑھ لیا کرو اور اپنے کھانے میں غرباء ومساکین کو شریک کیا کرو۔

(روح البیان)

☆☆☆☆☆☆

وَلَاتَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْاَعْجَبَتْكُمْ وَلَاتُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْاَعْجَبَكُمْ اُولٰئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ وَاللّٰهُ يَدْعُوْاِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ☆ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۲۱)

﴿۱﴾

اور شرک والی عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک مسلمان نہ ہو جائیں اور بے شک مسلمان لونڈی مشرکہ سے اچھی ہے اگر چہ وہ تمہیں بھاتی ہو، اور مشرکوں کے نکاح میں نہ دو جب تک وہ ایمان نہ لائیں اور بے شک مسلمان غلام مشرک سے اچھا ہے اگر چہ وہ تمہیں بھاتا ہو، وہ دوزخ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ جنت اور بخشش کی طرف بلاتا ہے اپنے حکم سے اور اپنی آیتیں لوگوں کے لئے بیان کرتا ہے کہ کہیں وہ نصیحت مانیں۔

﴿۲﴾

اور نہ نکاح کرو تم شرک والی عورتوں سے یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔ اور لونڈی ایمان والی بہتر ہے شرک والی عورت سے اگر چہ وہ تمہیں تعجب میں ڈالے، اور نہ دو مشرکوں کے نکاح میں یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں، اور غلام مومن بہتر ہے مشرک سے اگر چہ وہ تمہیں تعجب میں ڈالے، وہ بلاتے ہیں آگ کی طرف، اور اللہ بلاتا ہے طرف جنت اور بخشش کے اپنے حکم سے، اور بیان کرتا ہے اپنی آیتیں لوگوں کے لئے تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔

ماقبل سے تعلق:

اس سے پچھلی آیۃ میں یتیموں کو اپنے ساتھ ملانے کی اجازت فرمائی، جس کے مطالب میں ایک یہ بیان ہوا کہ تم ان کو اصلاح کی غرض سے اپنے نکاح میں لا سکتے ہو۔

اس آیۃ کریمہ میں یہ واضح فرمایا کہ مومن مرد شرک والی عورتوں سے نکاح نہ کریں، اگرچہ ان کا مال دولت اور حسن جمال اور حسب نسب تمہیں تعجب میں ڈالیں، ان سے بہتر ایمان والی لونڈی ہے۔ اگرچہ اس کے پاس مال و دولت نہ ہو جو تمہیں فریفتہ کر سکے۔ اسی طرح اپنی ایمان والی عورتوں کو مشرکوں کے نکاح میں نہ دو، اگرچہ وہ مشرک اپنے مال و دولت وغیرہ سے وہ تمہیں تعجب میں ڈالیں، پھر بھی ان سے نکاح نہ کر کے دو، ان سے تو مومن غلام بہتر ہیں۔ کفار و مشرکین تمہیں دوزخ کی طرف بلاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ اپنے حکم سے تمہیں جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنی آیات کو واضح طور پر لوگوں کے لئے بیان فرماتا ہے تاکہ وہ نصیحت پکڑ لیں۔ (از قرطبی)

شانِ نزول:

(۱) "روی السدی عن ابن عباس رضی الله عنهما ان هذه نزلت فی عبدالله بن رواحة و کانت له امة سوداء و انه غضب فلطمها ثم انه فزع فاتی النبی ﷺ فاخبره خبرها فقال له النبی ﷺ ماهی یا عبد الله ؟ فقال هی یا رسول الله تصوم وتصلی وتحسن الوضوء وتشهد ان لا اله الا الله وانک رسوله فقال یا عبدالله هی مؤمنة قال عبدالله فوالذی بعثک بالحق نبیا لأ عتقنها ولأ تزوجنها ففعل فطعن علیه ناس من المسلمین فقالوا انکح امة وکانوا یریدون ان ینکحوا الی المشرکین وینکحوهم رغبة فی انسابهم فانزل الله تعالیٰ"

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں یہ آیۃ کریمہ عبداللہ بن رواحہ کے حق میں نازل ہوئی، ان کی ایک لونڈی تھی جو سیاہ رنگ کی (حبشیہ) تھی۔ ایک مرتبہ اس لونڈی پر انہیں غصہ آ گیا تو اسے

تھپڑ مار دیا، پھر وہ گھبراہٹ میں مبتلا ہو گئے۔تو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے اور لونڈی کے متعلق خبر دی۔تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے ابوعبداللہ وہ کیسے ہے (یعنی ایمان والی ہے یا کافر ہے)عبداللہ نے کہا یارسول اللہ! وہ روزے رکھتی ہے اور نماز ادا کرتی ہے اور اچھی طرح وضو کرتی ہے اور شہادت دیتی ہے کہ اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں، اور شہادت دیتی ہے کہ بیشک آپ اللہ کے رسول ہیں، تو حضور ﷺ نے فرمایا اے عبداللہ وہ مومنہ ہے۔عبداللہ نے کہا قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو برحق نبی بنا کر مبعوث فرمایا میں اس کو ضرور آزاد کروں گا، اور اس سے ضرور نکاح کرلوں گا، تو انہوں نے ایسا ہی کیا، مسلمان لوگوں نے طعنہ دیا کہ اس شخص نے اپنی لونڈی سے نکاح کرلیا ہے، کیونکہ وہ لوگ زمانہ جاہلیت کے قریب ہونے کی وجہ سے مشرکوں سے حسب ونسب کی وجہ سے نکاح کرنے میں رغبت کرتے تھے۔اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرما کر عبداللہ بن رواحہ کی تائید فرمائی اور باقی لوگوں کا رد کیا۔ (روح المعانی)

(۲) شانِ نزول کی دوسری وجہ۔

" اخرج ابن ابی حاتم وابن المنذر عن مقاتل بن حبان قال نزلت هذه الآية فی ابی مرثد الغنوی استأذن النبی ﷺ فی عناق ان یتزوجها وکانت ذاحظ من جمال وهی مشرکة وابو مرثد یومئذ مسلم فقال یا رسول الله انها تعجبنی فانزل الله ولا تنکحوا المشرکات الخ "

نبی کریم ﷺ نے بنو ہاشم کے حلیف مرثد بن ابی مرثد غنوی کو مکہ میں بھیجا تا کہ وہ مسلمان قیدیوں کو وہاں سے نکال کر لے آئے۔جب وہ مکہ مکرمہ میں آئے تو ان سے ایک عورت عناق (نام ہے) نے ملاقات کی۔زمانہ جاہلیت میں ان کا تعلق عناق سے تھا، اس نے ان سے خلوت چاہی، لیکن انہوں نے کہا کہ اب میرے اور تمہارے درمیان اسلام حائل ہو گیا ہے، میں حرام کام کا مرتکب نہیں ہوسکتا۔

اس نے کہا تم میرے ساتھ نکاح ہی کرلو، انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے نکاح کرلوں گا، لیکن پہلے نبی کریم ﷺ سے اجازت طلب کروں گا، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے عناق کے ساتھ نکاح کرنے کی اجازت طلب کی، وہ بہت خوبصورت تھی، لیکن مشرکہ تھی اور مرثد مسلمان تھے، عرض کیا یارسول اللہ وہ مجھے بہت تعجب میں ڈالتی یعنی میرے دل کو بھاتی ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا کہ شرک والی عورتوں سے نکاح نہ کرو، اگرچہ وہ تمہیں بھلی لگتی ہوں، لیکن شرک کی وجہ سے وہ نجس (ناپاک) ہیں۔ (از درمنثور وروح المعانی)

دوسری وجہ پر گرفت:

"وتعقب ذلک السیوطی بان هذا لیس سببا لنزول هذه الآیة وانما هو سبب فی نزول آیة النور (الزانی لا ینکح الازانیة او مشرکة) (روح المعانی)

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اس دوسری وجہ شان نزول پر گرفت فرمائی کہ یہ واقع اس آیۃ کریمہ کا شانِ نزول نہیں بلکہ سورہ نور کی آیۃ " الزانی لا ینکح الازانی او مشرکة "کا شانِ نزول ہے۔

راقم کا محاکمہ:

جب اکثر مفسرین کرام نے شانِ نزول میں اس واقعہ کو نقل کیا ہے تو رد کرنے کی بجائے اگر یوں کہہ دیا جائے، کہ دونوں واقعات کے درپیش آنے کے بعد اس آیۃ کریمہ کا نزول ہوا اور سورہ نور کی آیت کا بھی نزول ہوا، تو اس وجہ تطبیق میں کوئی مشکل نہیں، لہٰذا یہ قول راقم کے نزدیک بہتر ہے کہ اقوال کو جمع کیا جائے، کسی کو رد نہ کیا جائے۔

اہلِ کتاب عورتوں سے نکاح کا حکم:

اہل کتاب عورتوں سے نکاح جائز ہے، اس مسئلہ میں اتفاق ہے۔ البتہ اس آیۃ کریمہ کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ......

" حرم الله نکاح المشرکات فی سورة البقرة ثم نسخ من هذه الجملة نساء اهل الکتاب فاحلهن فی سورة المائدة"

......اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ میں تمام مشرکات سے نکاح کرنے سے منع فرمایا، اس ممانعت میں اہلِ کتاب عورتیں بھی شامل تھیں۔ لیکن......

" والمحصنات من الذین او تو ا الکتاب من قبلکم "

......سے اہل کتاب عورتوں سے نکاح کی حرمت کو منسوخ قرار دیا ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے۔ " ولم یتناول العموم قط الکتابیات " کہ اس آیۃ کریمہ کا عموم کتابیات کو شامل ہی نہیں۔ اگر چہ ان پر کفر وشرک کا اطلاق ہوسکتا ہے، لیکن عرف عام میں ان پر کفر وشرک کا اطلاق نہیں تھا، بلکہ ان کو اہلِ کتاب ہی کہا جاتا تھا۔ اس طرح یہ آیۃ کریمہ کتابیات سے نکاح کرنے کی حرمت کو شامل ہی نہیں۔ البتہ دوسری آیۃ "والمحصنات الخ" سے اس کی مزید وضاحت کردی گئی۔ (از قرطبی)

کتابیات سے نکاح کرنا صحابہ کرام نے ناپسند فرمایا:

"وروی عن حذیفة ایضا انه تزوج یهو دیة و کتب الیه عمر ان خل سبیلها فکتب الیه حذیفة احرام هی فکتب الیه عمر لا ولکن اخاف ان تو اقعوا المومسات منهن "

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک یہودیہ سے نکاح کرلیا۔ ان کی طرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لکھا کہ تم اس عورت کا راستہ چھوڑ دو۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے آپ کی طرف لکھا کیا وہ حرام ہے؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا وہ حرام تو نہیں لیکن مجھے یہ خوف ہے کہ تم فاحشہ، فاجرہ عورت سے جماع کرو گے۔ (احکام القرآن للجصاص)

سبحان اللہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد جگمگا رہا ہے۔ یہودیہ اور نصرانیہ فاحشہ، فاسقہ اور فاجرہ ہیں، خصوصاً ان کے اثرات اولاد پر پڑتے ہیں، اولاد میں یہودیت ونصرانیت کا رنگ نظر آئے گا۔ اولاد بھی ماں کی طرح بے حیاء اور بے شرم نظر آئے گی۔

☆ ''ان طلحة نكح نصرانية وحذيفة يهودية فغضب عمر رضى الله عنه عليهما غضبا شديدا فقالا نحن نطلق يا امير المؤمنين فلا تغضب فقال ان حل طلاقهن فقد حل نكاحهن ولكن انتزعهن منكم''

حضرت طلحہ نے ایک نصرانیہ سے نکاح کرلیا اور حذیفہ نے یہودیہ سے، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا تو آپ نے بہت غصہ کیا، ان دونوں نے کہا اے امیر المومنین! آپ غصہ نہ فرمائیں، ناراض نہ ہوں ہم طلاق دے دیتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا جب ان کو طلاق دینا جائز ہے تو ان سے نکاح کرنا بھی جائز ہے۔ لیکن میں تم سے ان کو جدا کروں گا۔ (از کبیر بتصرف)

مطلب واضح ہے کہ یہودیہ یا نصرانیہ سے نکاح جائز ہونے کے باوجود مسلمان کی زندگی پر برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ کوئی مسلمان اپنے نکاح میں یہودیہ اور نصرانیہ کو نہ لائے، اگر کسی یہودیہ یا نصرانیہ کو لائے تو اسے جدا کردے تاکہ وہ شخص اور اس کی اولاد بے دینی اور بے حیائی سے محفوظ رہے۔

☆ ''عن مجاهد عن ابن عباس قال لا تحل نساء اهل الكتاب اذا كانوا حربا''

(احکام القرآن للجصاص)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کرنا جائز نہیں جبکہ وہ دارحرب کی ہوں۔

☆ '' وقد روى عن على انه كره نساء اهل الحرب من اهل الكتاب ''

(احکام القرآن للجصاص)

حضرت علی رضی اللہ عنہ دارحرب کی کتابیہ عورتوں سے نکاح کرنا مکروہ سمجھتے تھے۔

ان دونوں حضرات (حضرت ابن عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہم) کے قول کے مطابق صرف دارِاسلام میں رہنے والی کتابیات (یعنی ذمیہ کتابیات) سے نکاح جائز ہے۔ دارِحرب کی کتابیات سے جائز نہیں۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا سخت موقف:

”عن الليث قال حدثني نافع عن ابن عمر انه كان اذا سئل عن نكاح اليهودية والنصرانية قال ان الله حرم المشركات على المسلمين قال فلا اعلم من الشرك شيأ اكبر اوقال اعظم من ان تقول ربها عيسى او عبد من عباد الله“

(احکام القرآن للجصاص)

نافع کہتے ہیں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا کہ یہودیہ اور نصرانیہ سے نکاح کا کیا حکم ہے؟ تو آپ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نے مشرکات سے نکاح کرنا مسلمانوں کے لئے حرام کر دیا، مجھے معلوم نہیں کہ شرک سے بڑا اور گناہ کیا ہوگا کہ وہ عورت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنا رب کہہ رہی ہے یا اللہ کے بندوں میں سے کسی بندے کو اپنا رب کہہ رہی ہے۔ یعنی حضرت عزیز علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہہ رہی ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا موقف یہ تھا کہ رب تعالیٰ نے جب مشرکوں سے نکاح کرنا حرام قرار دیا تو جبکہ یہود و نصاریٰ میں بھی عقائد شرکیہ پائے گئے ہیں، تو ان سے نکاح کیسے جائز ہوسکتا ہے؟

اس حدیث سے یہ واضح ہوا کہ حضرت ابن عمر کتابیات سے نکاح کرنے کو جواز مانتے ہوئے بھی سخت موقف رکھتے تھے کہ جب ان کے عقائد شرکیہ ہیں تو ان سے نکاح ہرگز نہ کیا جائے۔

کفر و شرک میں فرق:

شرك خاص ہے اور کفر عام ہے۔ شرک کا مطلب یہ ہے کہ مجوسیوں کی طرح اللہ تعالیٰ کے غیر کو واجب الوجود سمجھ کر اس میں الوہیت ثابت کرنا، یا بت پرستوں کی طرح اللہ تعالیٰ کے غیر کو مستحق عبادت سمجھنا اور اسے معبود کہنا۔

کفر ضروریات دین کا انکار کرنا، جیسا کہ قرآن پاک کا انکار کرنا، انبیاء کرام کا انکار کرنا، آسمانی کتابوں کا

انکار کرنا، فرشتوں کا انکار کرنا، قیامت کا انکار کرنا، فرائض کی فرضیت کا انکار کرنا، محرمات کی حرمت کا انکار کرنا، دینی شعار کا مزاح اڑانا، خیال رہے کہ مستحب چیزوں کا مزاح اڑانا بھی کفر ہے۔

نتیجہ واضح ہوا کہ ہر شرک کفر ہے، لیکن ہر کفر شرک نہیں، البتہ مجازی طور پر کفر پر شرک کا اطلاق بھی ہوتا رہتا ہے۔

آیۃ کریمہ میں محققین کا موقف:

زیر بحث آیۃ کریمہ میں زیادہ اہلِ تحقیق کا موقف یہ ہے کہ "ولاتنکحوا المشرکات" میں حکم عام ہے، کسی مشرکہ عورت سے نکاح کرنا جائز نہیں، اور کسی کافرہ سے بھی نکاح کرنا جائز نہیں، کیونکہ یہاں مشرکات کا اطلاق کافرات پر بھی ہے۔

"والاکثرون من العلماء علی لفظ "المشرک" یندرج فیه الکفار من اهل الکتاب وهو المختار"

اکثر علماء کرام کا قول یہ ہے کہ "مشرک" کے لفظ میں اہل کتاب کے کفار بھی مندرج ہیں، یہی قول مختار ہے۔

اس قول کے مختار ہونے پر چند وجوہ دلالت کررہی ہیں۔ جو مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ "وقالت الیهود عزیر ابن الله وقالت النصاری المسیح ابن الله"

اور یہود نے کہا عزیز اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ نے کہا مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔

پھر اس آیۃ کریمہ کے آخر میں ذکر فرمایا" سبحانه عمایشرکون" (پاک ہے وہ ذات اس سے جو شریک ٹھہراتے ہیں)

"وهذه الآیة صریحة فی ان الیهودی والنصرانی مشرک"

یہ آیت واضح طور پر دلالت کررہی ہے کہ یہودی اور نصرانی کو بھی مشرک کہا گیا ہے۔

(۲) رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا" ان الله لا یغفر ان یشرک به ویغفر مادون ذلک لمن یشاء"

بے شک اللہ تعالیٰ مشرک کو معاف نہیں فرمائے گا اور اس کے بغیر جس کی چاہے مغفرت کردے۔

اگر یہودیوں اور نصرانیوں کو مشرک کہنا صحیح نہ ہو تو اس آیۃ کریمہ سے یہ سمجھ آئے گا کہ اللہ تعالیٰ اگر چاہے تو یہودیوں اور نصرانیوں کی بھی مغفرت فرمادے۔"ولما کان ذلک باطلا علمنا ان کفرهما شرک" حالانکہ یہ نظریہ باطل ہے تو اس سے واضح ہو گیا کہ یہود و نصاریٰ کا کفر شرک بھی ہے۔

(۳) رب تعالیٰ نے فرمایا" لقد کفر الذین قالوا ان الله ثالث ثلاثة "
تحقیق وہ لوگ کافر ہیں جنہوں نے کہا اللہ تین میں سے ایک ہے۔
" وقول باثبات الآلهة فکانوا مشرکین " وہ متعدد خدا ماننے کی وجہ سے مشرک ہوئے۔

(۴) نبی کریم ﷺ نے عام کافروں کو مشرک کہا، ارشاد فرمایا۔
" واذالقیت عدوا من المشرکین فادعهم الی الاسلام "
جب تم مشرکین دشمنوں کی جماعت سے ملو (یعنی جہاد میں ان سے تمہارا آمنا سامنا ہو) تو ان کو پہلے دعوت اسلام دو۔
اس سے مراد تمام کفار ہیں۔

(۵) ابوبکر اصم رحمہ اللہ نبی کریم ﷺ کے معجزات کے انکار کرنے والے کو بھی مشرک کہتے تھے۔ (ماخوذ از کبیر)

تنبیہ شدید:

"عن جابر بن عبدالله رضی الله عنه عن رسول الله ﷺ نتزوج نساء اهل الکتاب ولا یتزجون نساءنا" (کبیر)

حضرت جابر بن عبداللہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، ہم اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کر سکتے ہیں لیکن وہ ہماری عورتوں سے نکاح نہیں کر سکتے۔

اس لئے واضح ہوا کہ کوئی عورت کسی یہودی یا نصرانی سے نکاح نہیں کر سکتی، نبی کریم ﷺ کا ارشاد یہودیوں اور نصرانیوں کے یاروں نام نہاد مسلمانوں کے منہ پر زوردار طمانچہ ہے، جو مردوں اور عورتوں کی برابری کے قائل ہیں۔ شریعت کے باغی درحقیقت بے حیاء ہیں۔

مشرکین کے ایمان لانے پر ان سے نکاح جائز ہے:

شرک والی عورتیں ایمان لے آئیں تو ان سے نکاح مسلمان مردوں کا جائز ہے۔اور مشرک مرد ایمان لے آئیں تو ان سے مسلمان عورتوں کا نکاح جائز ہے۔

ایمان جو معتبر ہے " الاقرار بالشهادة و التزام احكام الاسلام " زبان سے کلمہ شہادت پڑھنا اور رب تعالیٰ کی وحدانیت کا قرار کرنا اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اقرار کرنا اور اسلام کے احکام پر عمل کرنا۔شریعت ظاہر کو دیکھ کر مسلمان کہے گی ،دل کا اعتقاد رب تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ (از کبیر)

لونڈی سے نکاح کرنا:

انسان اپنی ہی مملوکہ لونڈی سے نکاح نہیں کرسکتا۔ہاں اگر اپنی ہی لونڈی سے جماع کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے تمام جسم کا مالک ہے۔حالانکہ اپنی زوجہ کے فقط فرج کا مالک ہے،جب اپنی زوجہ سے جماع کرنا جائز ہے تو اپنی مملوکہ لونڈی سے جماع کرنا بھی جائز ہے۔

اگر مالک اپنی لونڈی سے جماع کرے،اس کی اولاد پیدا ہو جائے،مالک تسلیم کرے کہ یہ میری ہی اولاد ہے،تو وہ اولاد آزاد ہوگی،اور وہ لونڈی " ام ولد" کہلائے گی۔مالک کی موت پر وہ بھی آزاد ہو جائے گی۔

کسی اور کی لونڈی سے نکاح جائز ہے،جب مالک نے اسے نکاح کرنے کی اجازت دی ہو،لیکن اگر مالک اجازت نہ دے تو لونڈی خود کسی سے نکاح نہیں کرسکتی،لونڈی کی اولاد غلامیت میں ماں کے تابع ہوگی،یعنی لونڈی جس کا نکاح اس کے مالک نے کسی آزاد شخص سے کیا ہو لیکن اس لونڈی کی اولاد بھی لونڈی کے مالک کی غلام ہوگی۔

غلام سے نکاح کرنا:

مالکہ اپنے ہی غلام سے نہ نکاح کرسکتی ہے اور نہ ہی اس سے جماع کرا سکتی ہے۔البتہ غلام کا مالک غلام کو نکاح کرنے کی اجازت دے تو وہ نکاح کرسکتا ہے۔ (از کتب فقه)

مسئلہ: اس زمانہ میں انگریز عورتیں جو دہریئے ہوکر خدا کی ذات اور انجیل شریف اور عیسیٰ علیہ السلام کے منکر ہو چکے ہیں ان سے نکاح جائز نہیں، کیونکہ یہ عیسائی نہیں بلکہ دہریئے ہیں، مسلمان سخت غلطی کرتے ہیں کہ بے تحقیق ولایت سے میمیں بیاہ لاتے ہیں، مجھ سے ایک عیسائی پادری نے جس کا نام پادری ایم سکاٹ تھا بیان کیا کہ عام انگریز قومی عیسائی رہ گئے ہیں، دینی عیسائی نہیں، یہ حضرت مسیح اور انجیل بلکہ رب کے منکر ہو چکے ہیں۔ (نعیمی)

مسئلہ: جس کی بیوی عیسائن یا یہودن ہو وہ اپنے بچوں کی پرورش ماں سے نہ کرائے، بلکہ ان کے ہوش سنبھالتے ہی انہیں ماں سے الگ کر دے، ورنہ بچوں کے ایمان کا اندیشہ ہے۔ (نعیمی)

جیسا کہ مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے بیان فرمایا، یہی موقف خواجہ قمر الاسلام حضرت قمر الدین سیالوی ... کا تھا کہ آج کل کے اہلِ کتاب دہریئے ہیں ان سے نکاح نہ کیا جائے۔

مسئلہ: میاں بیوی کافر تھے، ان کا نکاح کفر میں ہوا تھا، مسلمان ہونے پر ان کو پہلے ہی نکاح پر قائم رہنے دیا جائے گا۔ (ھدایہ)

مسئلہ: مجوسی (آگ پرست) شخص نے اپنے مذہب کے مطابق اپنی ماں یا بیٹی سے نکاح کیا ہوا تھا، پھر ان دونوں نے اسلام قبول کرلیا، تو ان کے درمیان تفریق کر دی جائے گی۔ (ھدایہ)

مسئلہ: اگر خاوند مسلمان ہو اور عورت اہلِ کتاب سے ہو تو نابالغ اولاد باپ کے تابع ہوگی۔ البتہ بالغ اولاد جس دین کو اختیار کرے گی وہی اس کا دین ہوگا۔ (ازھدایہ)

مسئلہ: میاں بیوی دونوں کافر تھے، عورت نے اسلام قبول کرلیا تو مرد پر اسلام پیش کیا جائے، اگر وہ اسلام قبول کر لے تو اس کی زوجہ اس کے نکاح میں رہے گی، اگر وہ اسلام لانے سے انکار کر دے تو قاضی ان دونوں کے درمیان تفریق کر دے، یہ تفریق طلاق ہوگی۔

اگر خاوند نے پہلے اسلام قبول کرلیا تو زوجہ پر اسلام پیش کیا جائے اگر وہ اسلام لے آئے تو ان کا نکاح برقرار رہے گا، اور اگر وہ اسلام لانے سے انکار کر دے تو قاضی ان کے درمیان تفریق کر دے یہ تفریق طلاق نہیں ہوگی بلکہ نکاح فسخ ہوگا۔ (ھدایہ)

مسئلہ: میاں بیوی مسلمان تھے، العیاذ باللہ کوئی ایک ان سے کافر ہو جائے (مرتد ہو جائے) تو ان کا نکاح ختم ہو جائے گا۔ (هداية)

مسئلہ: اگر دونوں ایک ساتھ ہی مرتد ہو گئے، لیکن پھر دونوں ایک ساتھ ہی اسلام کی طرف لوٹ آئے، تو ان کا نکاح برقرار رہے گا۔ اور اگر کوئی ایک پہلے اسلام کی طرف لوٹ آئے تو نکاح فاسد ہو گا۔ (از هداية)

کفار اور مشرکین کا تعجب میں ڈالنے کا کیا مطلب؟

''(ولو اعجبتکم)بحسنها او مالها او حریتها او نسبها ''

اگر چہ مشرکات اپنے حسب جمال اور مال دولت اور اپنی حریت (آزادی) اور حسب نسب کی وجہ سے تمہیں تعجب میں ہی کیوں نہ ڈالیں، بے شک وہ تمہارے دل میں بھاتی ہوں، لیکن مشرکات سے تم نکاح نہ کرو، بلکہ ان سے بہتر مومنہ لونڈی ہے، اس لئے کہ ایمان ہو گا تب ہی دین حاصل ہو گا، اور ایمان و دین کے ہوتے ہی مال و نسب بھی معتبر ہو گا ورنہ اس نسب و مال کا کوئی فائدہ نہیں، جو مشرکین و مشرکات کو حاصل ہے۔

'' فعندالتوافق فی الدین تکمل المحبة فتکمل منافع الدین و الدنیا ''

جب دونوں میاں بیوی کا دین ایک ہو گا یعنی دونوں مومن ہوں گے تو ان میں کامل محبت ہو گی، جب کامل محبت ہو گی تو وہ دونوں دین داری میں کامل ہوں گے، ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر نیکی کے کام کریں گے۔ جب ان دونوں کے درمیان کامل محبت ہو گی کھچاتانی نہیں ہو گی تو ان کو صحت حاصل ہو گی، ان کا مال محفوظ رہے گا اور ان کی اولاد کی تربیت اچھی ہو گی۔

'' وعند الاختلاف فی الدین لا تحصل المحبة ''

جب زوجین دین میں مختلف ہوں تو ان میں محبت نہیں ہو سکتی، جب محبت نہیں ہو گی تو محبت پر مرتب ہونے والے منافع بھی حاصل نہیں ہوں گے، اس لئے مشرکات سے نکاح حرام کر دیا گیا ہے۔ اور کتابیات سے نکاح جائز ہونے کے باوجود بہتر نہ ہونے کا حکم نافذ کر دیا گیا۔

"ولواعجبکم": کا بھی یہی مطلب ہے کہ مشرک اپنے مال و دولت اور حسن و جمال وغیرہ سے اگر چہ تمہیں تعجب میں ہی کیوں نہ ڈالے، اپنی عورتوں (بیٹیوں، بہنوں وغیرہ) کو ان کے نکاح میں نہ دو۔

سب سے بڑا نقصان:

مسلمان غیر مسلم عورت سے نکاح کرے تو اسے اپنا ایمان محفوظ رکھنا بھی ممکن نہیں، اولاد کے ایمان دار ہونے یا نیک ہونے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

"ولواعجبتکم" اسی طرح "ولو اعجبکم" میں دو ترکیبیں پائی گئی ہیں۔

ایک یہ ہے کہ "واؤ حالیہ ہو" اور اس کا عطف مقدر عبارت پر ہو۔ حاصل عبارت یہ ہو۔

" والأمة مومنة خیر من مشرکة علی کل حال ولو فی هذه الحالة "

ایمان والی لونڈی مشرکہ عورت سے ہر حال میں بہتر ہے، خواہ وہ مشرکہ تمہیں تعجب میں ہی کیوں نہ ڈالے۔

دوسری ترکیب جو تفسیر کواشی نے بیان کیا ہے، وہ ایک قانون بیان کی ہے (جو راقم کے نزدیک زیادہ بہتر ہے)

لفظ "لو" یہاں "ان" کے معنی میں ہے، اور واؤ وصل کے لئے ہے، یعنی "ان وصلیه" والا معنی ہوگا۔ جس کا معنی ہوتا ہے "اگر چہ"

قانون یہ ہے کہ "لو" کے بعد جب ماضی ہو تو وہ "ان وصلیه" کے معنی میں ہوگا، اور جواب اس کا مقدم ہوگا۔ اب تقدیر عبارت یہ ہے۔

" وان کانت المشرکة تعجبکم وتحبونها فان المومنة خیر لکم "

اگر چہ مشرکہ تمہیں تعجب میں ڈالے، اور تم اسے پسند کرو، بے شک اس سے ایمان والی لونڈی تمہارے لئے بہتر ہے۔ (روح البیان)

تاہم یہ خیال رہے یہ قاعدہ اکثر یہ ہے کلیہ نہیں۔ کیونکہ "لو کان فیہما آلھۃ الا اللہ لفسدتا" میں "لو" کے بعد ماضی ہے لیکن "لو "امتناعیہ ہے۔

زمخشری معتزلی کی خوبصورت عبارت:

"لاترضی لمجالستک الا اھل مجانستک" تم اپنی ہم نشینی کے لئے سوائے اپنی ہم جنس کے کسی اور کو پسند نہ کرو۔ حقیقت یہی ہے۔

جنس با جنس کند پرواز　　　کبوتر با کبوتر باز با باز

جنس جنس کے ساتھ پرواز کرتی ہے۔ کبوتر کبوتر کے ساتھ اور باز باز کے ساتھ۔

آجکل یہی جھگڑا اور فساد ہے، یہود ونصاریٰ کے یار لوگ نام نہاد مسلمان چاہتے ہیں علماء بھی ہماری طرح ہو جائیں۔ لیکن علماء کرام بھی نامساعد حالات میں اسلام کے باغیوں کا ہمت وجرات سے مقابلہ کررہے ہیں کہ اے یہود ونصاریٰ کے یارو! ہم سے یہ توقع چھوڑ دو کہ ہم بھی تمہاری طرح ہو جائیں۔

"اولئک یدعون الی النار":

اس مقام میں "اولئک" کا اشارہ مشرکین اور مشرکات کی طرف ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ مشرکین ایسے اعمال کی طرف بلاتے ہیں جو تمہارے لئے آگ میں جانے کا ذریعہ ہیں۔

"فان صحبتم ومعاشرتھم توجب الانحطاط فی کثیرمن ھواھم مع تربیتھم النسل"

اگر تم نے مشرکین سے نکاح کے معاملات طے کئے، ان سے میل جول رکھا، ان سے رہن سہن رکھا تو وہ تمہیں غلط خواہشات میں مبتلا کر کے پستی کی طرف دھکیل دیں گے۔ اور وہ تمہاری نسل کی غلط تربیت کر کے تمہاری دنیا اور تمہارا دین برباد کردیں گے۔

"واللہ یدعوالی الجنۃ والمغفرۃ": "ای الی عمل اھل الجنۃ"

اور اللہ تعالیٰ تمہیں ایسے اعمال کی دعوت دیتا ہے جو تمہاری مغفرت کا ذریعہ ہے اور تمہیں جنت میں لے جانے والے ہیں۔

"باذنه": "ای با مره" اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے حکم، اپنی توفیق سے جنت و مغفرت کی دعوت دیتا ہے، اور تمہارے لئے نیک اعمال کے ذریعے جنت میں جانا آسان فرماتا ہے۔ (قرطبی)

مقامِ توجہ:

" واللہ یدعو" میں حذف مضاف بھی مانا گیا، جس کے مطابق معنی یہ بھی کیا جا سکتا ہے، اللہ تعالیٰ کے ولی یعنی اللہ والے تمہیں مغفرت اور جنت کی طرف اللہ کے حکم اور اس کی توفیق سے بلاتے ہیں۔

اس معنی کے مطابق علامہ رازی رحمہ اللہ کی خوبصورت عبارت دیکھی جائے۔ آپ رقمطراز ہیں۔

" اعداء اللہ یدعون الی النار، واو لیاء اللہ یدعون الی الجنة والمغفرة، فلاجرم یجب علی العاقل ان لا یدورحول المشرکات اللواتی ھن اعداء اللہ تعالیٰ وان ینکح المؤمنات فانھن یدعون الی الجنة والمغفرة "

اللہ کے دشمن آگ کی طرف بلاتے ہیں، اور اللہ کے دوست مغفرت اور جنت کی طرف بلاتے ہیں۔ ضروری ہے کہ عقل مند شخص مشرکات کے اردگرد نہ پھرے، وہ اللہ کی دشمن ہیں، وہ آگ کی طرف لے جائیں گی، بلکہ ایمان والی عورتوں سے نکاح کرے، خواہ وہ لونڈیاں ہی کیوں نہ ہوں، اس لئے کہ وہ جنت و مغفرت کی طرف بلاتی ہیں۔

سب سے بڑی خرابی:

" انھم یدعون الی ترک المحاربة والقتال وفی ترکھما وجوب استحقاق النار والعذاب" (کبیر)

بیشک مشرکین تمہیں جہاد سے روکیں گے۔

ہندو، مسلم، عیسائی

ہیں سب بھائی بھائی

کا تصور تمہیں دیں گے، جب تم نے اس نعرہ کو قبول کرلیا تو تم اس آگ کے مستحق ہو جاؤ گے۔

مسئلہ: اگر کوئی شخص ایمان والی آزاد عورت سے نکاح کرنے کی طاقت رکھتا ہو، یعنی اس کا مہر اور نفقہ ادا کرنے کی طاقت بھی رکھتا ہو تو وہ ایمان والی لونڈی سے نکاح کرسکتا ہے۔

”ویبین آیاته للناس لعلهم یتذکرون“:

اور وہ بیان کرتا ہے اپنی آیتیں لوگوں کے لئے تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔

یعنی اللہ تعالیٰ اپنی آیات کو بیان فرماتا ہے جو آیات اعلیٰ احکام پر مشتمل ہیں۔ اور عمدہ حکم ان میں پائے جاتے ہیں، تاکہ لوگ ان سے نصیحت حاصل کریں، اور ایسے اعمال کریں جو ان کی کامیابی کا ذریعہ ہوں اور جنت ومغفرت کی طرف وہ اعمال ان کو لے جائیں۔ (تفسیر ابی السعود)

شادی کرنے کے لئے صرف دین دار عورت کا انتخاب کیا جائے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

"تنکح المراة لأ ربع لمالها ولحسبها ولجمالها ولدينها فاظفر بذات الدين تربت يداک" (بخاری، مسلم، مشکوۃ کتاب النکاح)

عام طور پر عورت سے نکاح چار چیزوں کو دیکھ کر کیا جاتا ہے اس کا مال، اور اس کی خاندانی شہرت، اور اس کی خوبصورتی اور اس کی دینداری کو دیکھا جاتا ہے لیکن تم صرف دیندار عورت کو اپنے پاس لانے میں کامیابی حاصل کرو، تمہارے ہاتھ خاک آلود ہوں۔

وضاحت حدیث:

حدیث پاک میں جو لفظ "تربت یداک" استعمال ہوا ہے، یہ کبھی تو بددعاء کے لئے بھی اہل عرب استعمال کرتے ہیں "کہ تمہارے ہاتھ خاک آلود ہو جائیں، یعنی تم ذلیل ہو جاؤ"

اگر ان الفاظ کا یہاں یہی معنی لیا جائے تو عبارت محذوف ہوگی، اصل عبارت اس طرح بن سکے گی۔

" صرت محروما من الخیر ان لم تفعل ما امرتک "

تم بھلائی سے محروم ہو جاؤ گے اگر تم نے میرے حکم کے مطابق عمل نہ کیا۔

یعنی اگر تم نے دیندار عورت کا انتخاب نہ کیا بلکہ صرف خوبصورت کو تلاش کرتے رہے تو تمہیں دین کی بھلائی حاصل نہیں ہو سکے گی۔

اور کبھی اہل عرب اس لفظ کو ایک محاورہ کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں جس طرح ہم بھی اپنے محاورہ میں "خاک چھاننے" کا مطلب "محنت ومشقت کرنا" لیتے ہیں، ایسے ہی اہل عرب "تربت یداک" کا معنی محنت کرنا، مشقت کرنا، تلاش کرنا لیتے ہیں۔ یعنی تم دیندار عورت کو ہی تلاش کرو، اگرچہ تمہیں اس کے لئے کتنی خاک کیوں نہ چھاننی پڑے۔

" ذات الدین " سے مراد وہ عورت ہے جو مسلمان ہو اور نیک پرہیزگار ہو اور دیندار خاندان کی ہو۔

☆ " قال ابن الهمام اذا لم یتزوج المراۃ الالعزها اومالهااوحسبها فهو ممنوع شرعا"

قال ﷺ من تزوج امراۃ لعزها لم یزده الله الاذلا ومن تزوجها لمالها لم یزده الافقرا ومن تزوجها لحسبها لم یزده الادناءۃ ومن تزوج امراۃ لم یرد بها الا یغض بصره و یحصن فرجه او یصل رحمه بارک الله له فیها وبارک لها فیه "

(رواہ الطبرانی فی الاوسط)

حضرت ابن ہمام رحمہ اللہ صاحب فتح القدیر نے فرمایا کہ صرف مال، عزت اور دنیاوی شہرت کو دیکھ

کر نکاح کرنا منع ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے (دنیاوی) عزت کے پیش نظر کسی عورت سے نکاح کیا تو اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سوائے ذلت کے اضافہ کے کچھ حاصل نہیں ہوگا، اور اگر کسی شخص نے صرف عورت کا مال دیکھ کر نکاح کیا تو اللہ کی طرف سے سوائے غربت کے اضافہ کے اسے کچھ حاصل نہیں ہوگا، اگر کسی شخص نے صرف خاندانی شہرت کی وجہ کسی عورت سے نکاح کیا تو اسے سوائے کمینگی اور گھٹیاپن کے اضافہ کے اللہ تعالیٰ کچھ عطا نہیں کرے گا، اور جو شخص کسی عورت سے نکاح پاکدامنی اور فرج کی حفاظت اور صلہ رحمی کے لئے کرتا ہے، یعنی اپنی رشتہ دار عورت سے صلہ رحمی کا ثواب بھی ملے گا، تو ایسے نکاح میں اللہ تعالیٰ مرد اور عورت کو برکت عطا فرمائے گا۔

اصل مقصد دینداری ہو، اگر دیندار عورت کو جمال، مال اور خاندانی شہرت بھی حاصل ہو تو ایک عظیم نعمت ہوگی۔

"وقال ﷺ لا تتزوجوا النساء لحسنهن فعسى حسنهن ان يرديهن و لا تتزوجوهن لمالهن فعسى اموالهن ان تطغيهن ولكن تزوجوهن على الدين و لامة خرماء سوداء ذات دين افضل" (رواه ابن ماجه)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا عورتوں سے صرف ان کے حسن کی وجہ سے نکاح نہ کرو، ہوسکتا ہے حسن ہی ان کی بربادی کا سبب بنے۔ اور صرف ان کے مال کی وجہ سے نکاح نہ کرو، ہوسکتا ہے ان کا مال ان کو سرکش بنادے، لیکن ان کی دینداری دیکھ کر ان سے نکاح کرو۔ اگر کوئی لونڈی سیاہ رنگ والی ہو اور اس کا کان بھی کٹا ہوا ہو لیکن وہ دیندار ہو تو اس سے نکاح کرنا افضل ہے۔

حسب سے مراد کیا ہے؟

حسب (بفتحتین) کا مطلب یہ ہے کہ کسی انسان میں اس کے آباء واجداد میں اچھی عادات کی شہرت ہو۔

لیکن یہ خیال رہے کہ صرف دنیاداری کے لحاظ سے اچھی عادات اور اچھے خاندان کو دیکھنا شریعت میں کوئی پسندیدہ فعل نہیں، بلکہ دینداری کی اچھی شہرت تقوی ہے، جو شریعت میں پسند ہے۔

(وضاحت حدیث ماخوذ از مرقاۃ جلدنمبر ٦ صفحہ نمبر ١٨٨)

ضروری ہدایت:

اپنی بچیوں کے لئے خوش اخلاق، تندرست، کمانے والے، دیندار خاوند تلاش کرو، صرف مال دیکھ کر لڑکی نہ دے دو، ورنہ بعد میں سخت پریشانی اٹھانا پڑے گی، بچہ کا پہلا اسکول ماں، باپ کی گود ہے، آوارہ، بداخلاق ماں، باپ کی اولاد بھی آوارہ ہی ہوتی ہے۔ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا جیسی ماں ہو تو حضرت امام حسن و امام حسین رضی اللہ عنہما جیسے فرزند ہوتے ہیں۔

علامہ اقبال مرحوم نے بے حجاب پھرنے والی لڑکیوں کو خطاب کرتے ہوئے کیا خوب فرمایا۔

اگر پندے ز درویشے پذیری، جہاں میرد تو نمیری

بتولے باش پنہاں شو ازیں عصر کہ در آغوش شبیرے بگیری

(١) اگر تو درویش کی نصیحت قبول کرلے، تو جہاں مرجائے گا لیکن تو نہیں مرے گی۔ یعنی نیکیوں کی وجہ سے تیرا نام زندہ رہے گا تجھے حیات جاودانی حاصل ہوگی۔

(٢) بتول بن کر رہ، اس زمانے سے پوشیدہ ہوجا، تاکہ تو اپنی آغوش میں شبیر یعنی امام حسین رضی اللہ عنہ جیسا فرزند لائے۔

یعنی تو بے حجاب ہوکر گلی کوچوں میں گشت نہ کر، بازاروں کی رونق نہ بن، اجنبی مردوں کے لئے شمع محفل نہ بن، بلکہ حضرت بتول یعنی حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا جیسی شرم و حیاء کا پیکر بن جا، پھر تیرے فرزند بھی امام حسین رضی اللہ عنہ کی طرح بہادر، حق و صداقت پر قائم رہنے والے، باطل سے ٹکر لینے والے، ظالموں کے پہاڑوں، چٹانوں جیسے لشکروں سے پنجہ آزمائی کرکے پاش پاش کردیں گے۔

حضورﷺ نے اپنی لخت جگر فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے مسکین کو منتخب فرمایا، جن کے گھر میں بجائے دولت کے اللہ اور اس کے رسول کا نام ہی تھا، مگر ان کا سینہ دولت ایمان سے مالا مال تھا۔

نیز حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی بیٹی صفورا کے لئے موسی علیہ السلام کو منتخب کیا جن کے پاس اس وقت نہ گھر تھا نہ در۔ پردیسی مسافر تھے، صرف دین اور قوت ایمانی کو دیکھا تھا۔

گھر میں ایسی بہو لائیں جو قرآن، مصلی اور تسبیح لائیں تا کہ ان کے آنے سے گھر اللہ کے ذکر سے بھر جائے۔ صرف ٹیلی ویژن لانے والی نہ ہوں جو گھر کو سینما بنا دے، سر سے ننگی پھرنے والی، بازو اور گریبان ننگے کر کے گھومنے والی، بے حیائی کو فروغ دینے والی نہ ہوں۔ (از نعیمی بزیادۃ)

☆☆☆☆☆

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَاَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ وَلَاتَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَاِذَاتَطَهَّرْنَ فَأْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ☆

(سورة البقرة آیت،۲۲۲)

﴿۱﴾

اورتم سے پوچھتے ہیں حیض کا حکم تم فرماؤ وہ ناپاکی ہے،تو عورتوں سے الگ رہو حیض کے دنوں میں اوران سے نزدیکی نہ کرو جب تک پاک نہ ہوں، پھر جب پاک ہو جائیں تو ان کے پاس جاؤ جہاں سے تمہیں اللہ نے حکم دیا ہے، بے شک اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے بہت توبہ کرنے والوں کو اور پسند رکھتا ہے ستھروں کو۔

﴿۲﴾

اورسوال کرتے ہیں آپ سے حیض کے متعلق،فرمادیجئے وہ اذیت (ایذاء پہنچانے والی) ہے،تو جداء ہو جاؤ عورتوں سے حیض میں،اور نہ قریب جاؤ ان کے یہاں تک کے وہ پاک ہو جائیں،تو جب وہ پاک ہو جائیں تو آؤ ان کے پاس جہاں سے تمہیں اللہ نے حکم دیا، بیشک اللہ پسند کرتا ہے توبہ کرنے والوں کو اور پسند کرتا ہے پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو۔

لفظی مختصر مطلب:

"ویسئلونک عن المحیض": ھومصدریقال حاضت محیضا کقولک جاء مجیأ "

"محیض" مصدر ہے،جس طرح مجئ،مضئ وغیرہ مصدر ہیں،اوروہ سوال کرتے ہیں آپ

سے حیض کے متعلق یعنی آپ سے حیض کا حکم پوچھتے ہیں۔

”قل ھواذی“: ای المحیض شیٔ یستقذر ویؤذی من یقربہ“

ھوضمیر، محیض کی طرف لوٹ رہی ہے، نبی کریم ﷺ کو خطاب فرمایا کہ آپ فرمادیجئے کہ وہ حیض ایک ایسی چیز ہے جو گندگی ہے۔اس حالت میں جو شخص عورت کے قریب آتا ہے وہ حیض کی گندگی اسے ایذاء پہنچاتی ہے۔

خیال رہے وہ گندگی نجاست ہے۔اسی لئے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ”اذی“ کا ترجمہ ”ناپاکی“ کیا ہے۔اور کئی مترجمین نے ”اذی“ کا معنی گندگی کیا ہے۔اور راقم نے لغوی اور بطور نتیجہ صادق آنے والا ترجمہ کیا ہے ”ایذاء پہنچانے والی چیز“ تمام تراجم کا مقصد ایک ہی کہ حیض ناپاک اور گندی چیز ہے، جوایذاء پہنچاتی ہے قریب آنے والے کو۔

”فاعتزلو االنساء فی المحیض“: فاجتنبوھن ای فاجتنبو امجامعتھن“

عورتوں کو جدا کرو حیض میں، یعنی حیض کے دنوں میں ان کو جماع سے دور کر دو، ان سے جماع کرنے سے اجتناب کرو۔

”ولا تقربوھن“ مجامعین او ولاتقربو امجا معتھن **”حتی یطھرن“** ای یغتسلن“

اور حیض والی عورتوں کے قریب جماع کرنے کے لئے نہ جاؤ، یا یہ مطلب ہے کہ حیض والی عورتوں کو جماع کے لئے اپنے قریب نہ آنے دو، یہاں تک کہ وہ پاکیزہ ہو جائیں یعنی غسل کرلیں۔

”فاذاتطھرن“ اغتسلن **”فاتو ھن“** فجا معوھن **”من حیث امر کم اللہ“** من المأتی الذی امر کم اللہ بہ وحلہ لکم وھو القبل“

جب وہ عورتیں پاکیزہ ہو جائیں یعنی غسل کرلیں تو ان کے پاس آؤ یعنی ان سے تم جماع کر سکتے ہو، البتہ جماع کی اجازت تمہیں قبل (عورت کا اگلا مقام فرج) میں ہے، وہی تمہارے لئے حلال ہے۔

"ان اللّٰہ یحب التوابین": بے شک اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے توبہ کرنے والوں کو۔

یعنی جس کام سے منع کیا گیا ہے، اگر اس کا ارتکاب کسی نے کرلیا، لیکن پھر اس پر نادم ہو کر توبہ کر لی تو اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرے گا اور اسے پسند فرمائے گا۔

"والتواب الذی کلمااذنب جدد توبة وقیل الذی لا یعود الی الذنب"

توبہ کرنے والے کو چاہئے کہ اپنی طرف سے پوری پوری کوشش کرے کہ پھر اس گناہ کی طرف نہ لوٹے، اگر غلطی سے پھر گناہ ہو جائے پھر توبہ کرے، اللہ تعالیٰ پھر معاف فرمائے گا۔

"ویحب المتطھرین": پسند کرتا ہے پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو۔

"یعنی من الاحداث وسائر النجاسات بالماء"

پاکیزگی سے مراد یہ ہے کہ وہ بے وضو ہونے کی صورت میں یا بے غسل ہونے کی صورت میں پانی سے وضو کرتا ہے اور غسل کرتا ہے اور اگر جسم یا کپڑوں وغیرہ پر نجاست (پلیدی) ہو تو اسے پانی سے دھوتا ہے۔

"وقیل المتطھرین من الشرک" اور پاکیزگی اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ شرک سے اپنے آپ کو پاک کرتے ہیں۔

"اوالمتنزھین من ادبار النساء" اور پاکیزگی کا مطلب یہ ہے کہ وہ عورتوں کے پچھلی جانب (دبر کی جانب) آنے سے پاکیزگی اختیار کرتے ہیں۔

"اومن الجماع فی الحیض" اور پاکیزگی کا مطلب یہ ہے کہ وہ حیض کے دنوں میں عورتوں سے جماع کرنے سے دور رہ کر اپنے آپ کو پاکیزہ رکھتے ہیں۔

"اومن الفواحش" اور پاکیزگی کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو گناہوں کی آلودگی سے پاک رکھتے ہیں۔

"وقیل ھم الذین لم یصیبوا الذنوب" اعلیٰ قسم کی پاکیزگی یہ ہے کہ ان کو گناہ پہنچے ہی نہیں۔

(از مدارک وخازن)

شانِ نزول:

"عن انس بن مالک قال ان الیهود کا نوااذاحا ضت المراة فیهم لم یؤا کلوها ولم یجامعوهن فی البیوت فسأل اصحاب النبیﷺ فانزل اللّٰہ تعالٰی ویسئلونک عن المحیض الخ فقال رسول اللّٰہﷺ اصنعوا کل شیٔ الاالنکاح فبلغ ذلک الیهود فقالوا ما یرید هذا الرجل ان یدع من امرناشیأ الاخالفنافیه فجاء اسید بن حضیر و عباد بن بشر فقالا یارسول اللّٰہ ان الیهود تقول کذا و کذ افلا نجامعهن فتغیر وجه رسول اللّٰہﷺ حتی ظننا ان قدوجد علیهما فخرجافاستقبلتهما هدیة من لبن الی النبیﷺ فارسل فی آثار هما فسقاهما فعرفا انه لم یجد علیهما"

(رواہ مسلم، مشکوۃ باب الحیض)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں یہود کی عورتوں کو جب حیض آتا تو وہ ان کے ساتھ مل کر کھانا نہیں کھاتے تھے اور نہ ہی ان کو اپنے ساتھ گھروں میں جمع رکھتے، تو نبی کریم ﷺ سے آپ کے صحابہ کرام نے حیض کے احکام کے متعلق سوال کیا، تو یہ آیۂ کریمہ " **یسئلونک عن المحیض** الخ " نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر چیز تم کر سکتے ہو سوائے جماع کے، یہود کو جب یہ خبر ملی تو وہ کہنے لگے یہ کیسا شخص ہے کہ یہ کسی معاملہ کو نہیں چھوڑتا سوائے ہماری مخالفت کے (یعنی یہ کیسا شخص ہے کہ ہر معاملہ میں ہماری مخالفت کرتا ہے) تو اسید بن حضیر اور عباد بن بشر رضی اللہ عنہما آئے تو ان دونوں نے کہا یا رسول اللہ! یہود اس طرح کہتے ہیں کیا ہم حیض کی حالت میں اپنی ازواج سے جماع بھی نہ کرلیا کریں، تو رسول اللہ ﷺ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ یہاں تک کے ہم نے گمان کیا کہ آپ کو ان پر بہت غصہ آ گیا (آپ ان سے راضی نہیں ہونگے) وہ دونوں حضور ﷺ کی محفل سے نکلے تو انہوں نے کسی شخص کو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں دودھ بطور ہدیہ لاتے ہوئے پایا، نبی کریم ﷺ نے ان کے پیچھے کسی شخص کو بھیجا کہ وہ ان دونوں کو بلا کر لائے۔ (جب یہ دونوں واپس لوٹے) تو

آپ نے دودھ ان کو پلا دیا۔ تو انہوں نے سمجھا کہ آپ کو ان پر بہت زیادہ غصہ نہیں۔

" فعرفا انہ لم یحد ای لم یغضب او ما استمر الغضب بل زال او ذھب و ھذا من مکارم اخلاقہ ﷺ"

نبی کریم ﷺ کو غصہ اس لئے تھا کہ جماع کی خواہش اگر چہ یہود کی مخالفت کی وجہ سے تھی، لیکن رب تعالیٰ کے حکم کی عدولی پر مشتمل تھی۔ لیکن نبی کریم ﷺ کے اخلاق کریمانہ میں یہ بات شامل تھی کہ آپ غصہ پر قائم نہیں رہتے تھے، بلکہ کسی کو متنبہ کرنے کے لئے غصہ کیا، پھر راضی ہو گئے۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

اسید بن حضیر اور عباد بن بشیر کے قول میں "افلانجامعھن" بعض نسخوں میں بغیر ہمزہ استفہام کے استعمال ہے، مرقاۃ میں بغیر ہمزہ کے ہے، لیکن معنی اس صورت میں بھی استفہامیہ ہے۔

اس کا مطلب مسلم شریف کے حاشیہ میں بہتر لکھا گیا ہے، کیونکہ وہ سیاق وسباق کے مطابق ہے۔

"افلانجامعھن ای افلا نباشرھن بالوطی کماجاء فی سنن ابی داؤد " افلا ننکحھن "

یعنی ان کا مطلب یہ تھا کہ ہم جماع نہ کرلیا کریں، یہ معنی اس لئے درست ہے کہ اسے ابوداؤد کی روایت میں "افلاننکحن" سے تائید حاصل ہے۔

اس لئے اس مقام پر ملا علی قاری رحمہ اللہ کی تشریح محل نظر ہے۔ ان کی تشریح مرقاۃ ج ۲، ص ۹۷ میں یہ ہے (جو درست نہیں)

"(فلا) ای افلا کمافی نسخۃ (نجامعھن) ای نساکنھن و التقدیر الانعتزلھن فلا نجتمع معھن فی الاکل والشرب والبیوت " (راقم)

فائدہ:

"قال علماؤنا کانت الیھود والمجوس تجتنب الحائض و کانت النصاری یجامعون الحیض (بضم الیاء وتشدید الیاء جمع الحائض) فامر اللہ بالقصد بین ھذین" (قرطبی)

یہود اور مجوس حیض والی عورتوں سے مکمل دور رہتے تھے، ان کو اپنے پاس کمرے میں بھی نہیں رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ کھانے اور پینے سے بھی دور رہتے تھے، اور نصرانی اپنی عورتوں سے حیض کی حالت میں جماع کرتے تھے، نبی کریم ﷺ کی شریعت میں درمیانی صورت میں عمل کرنے کا حکم دیا گیا۔ یعنی صرف جماع سے منع کیا اور باقی ان سے میل جول کی اجازت دی گئی۔

عورت کو آنے والے خون تین قسم کے ہیں:

(۱) حیض (۲) نفاس (۳) استحاضہ

حیض کیا ہے؟

حیض وہ خون ہے جو بالغ عورت کی رحم (بچہ دانی) سے آتا ہے کسی بیماری وغیرہ کا وہ خون نہ ہو۔ حیض کم از کم تین دن آتا ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ دس دن۔

"عن واثلة بن الاسقع قال قال رسول الله ﷺ اقل الحيض ثلاثه ايام و اكثره عشرة ايام"

واثلہ بن اسقع نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، حیض کی مدت کم از کم تین دن ہے اور زیادہ سے زیادہ دس دن ہے۔ (تبيين الحقائق للزيلعی)

حیض کے خون کے رنگ:

سب سے پہلے آنے والا خون مٹیالا (مٹی کے رنگ والا) ہوتا ہے، حیض کے دنوں میں آنے والا خون سرخ رنگ کا ہو یا زرد رنگ کا ہو، یا سبز رنگ کا ہو، یا مٹیالے رنگ کا ہو، سب حیض ہی کہلائیں گے، سوائے خالص سفید رنگ کے پانی کے، جب خالص سفید رنگ کا پانی آنا شروع ہو جائے تو سمجھا جائے کہ حیض ختم ہو چکا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس عورتیں اپنے کرسف (فرج میں رکھنے والے کپڑے) بھیجتیں کہ ان کو دیکھ کر

بتائیں حیض ختم ہو چکا ہے یا نہیں، تو آپ دیکھتیں اگر ان میں زرد رنگ ہوتا تو فرماتیں " لا تعجلن حتی ترین القصة البیضاء " جلدی نہ کرو یہاں تک کہ خالص سفید رنگ جب دیکھو تو پھر حیض ختم ہوگا۔

حیض کتنے دنوں کے بعد آتا ہے؟

عورت کے پاکیزہ رہنے کی کم از کم مدت پندرہ دن ہے، اگر عورت پندرہ دن پاکیزہ رہے، پھر اسے تین دنوں سے لیکر دس دنوں تک خون آجائے تو وہ حیض کہلائے گا۔ اگر پندرہ دنوں سے کم پاک رہنے کے بعد خون آنا شروع ہوگیا تو وہ حیض کا خون نہیں ہوگا بلکہ بیماری کا خون ہوگا۔ لیکن عورت کے پاک رہنے کی زیادہ سے زیادہ مدت مقرر نہیں، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی عورت کو بہت لمبی مدت حیض نہ آئے۔

نفاس:

وہ خون جو عورت کو بچے کی پیدائش کے بعد آئے اسے نفاس کہا جاتا ہے، بچہ مکمل پیدا ہو، یا نامکمل پیدا ہو، البتہ نامکمل کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے کچھ اعضاء یعنی ہاتھ پاؤں، انگلی، ناخن وغیرہ بن چکے ہوں۔

نفاس کی مدت کم از کم کوئی مقرر نہیں۔ جب خون آنا ختم ہوگیا تو نفاس ختم ہوگیا۔ البتہ زیادہ سے زیادہ مدت نفاس کی چالیس دن ہے۔ اس پر احادیث مبارکہ شاہد ہیں۔

☆ "عن ام سلمة انها سألت النبی ﷺ کم تجلس المرأة اذا ولدت قال اربعین یوما الا ان تری الطهر قبل ذلک"

حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ عورت ولادت کے بعد کتنے دن بیٹھی رہے (یعنی نماز وغیرہ نہ ادا کرے) تو آپ نے فرمایا چالیس دن، سوائے اس کے کہ وہ پہلے ہی پاک ہوجائے۔

☆ "وعن ام سلمة کانت النساء یجلس علی عهد رسول اللہ ﷺ اربعین یوما"

(رواهما احمد وابو داؤد وابن ماجة والترمذی، تبیین الحقائق للزیلعی)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں عورتیں رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں چالیس روز بیٹھ رہتی تھیں۔

☆ ''وقال الترمذی اجمع اهل العلم من اصحاب النبی ﷺ ومن بعد هم علی ان النفساء تدع الصلوة اربعین یوما الا ان تری الطهر قبل ذلک''

ترمذی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام اور آپ کے بعد اہلِ علم کا اس پر اجماع ہے کے نفاس والی عورتیں چالیس دنوں تک نماز ادا نہ کریں، ہاں البتہ اگر وہ پہلے ہی پاک ہو جائیں یعنی خون آنا بند ہو جائے تو اسی وقت نماز شروع کر دیں۔ (تبیین الحقائق للزیلعی)

استحاضہ:

عورت کو جو خون تین دنوں سے کم آئے،، یا دس دنوں سے بڑھ جائے، وہ استحاضہ ہے، اور پیدائش کے بعد آنے والا خون جب چالیس دنوں سے بڑھ جائے، تو چالیس دنوں سے زائد خون استحاضہ ہے۔

حاملہ عورت کو آنے والا خون استحاضہ ہے، کیونکہ دوران حمل رحم (بچہ دانی) کا منہ بند ہو جاتا ہے، اس لئے وہ خون کسی رگ کا ہوسکتا ہے، رحم کا نہیں کہ اسے حیض کہا جائے، اور نفاس بھی نہیں کیونکہ نفاس نے آنا ہی پیدائش کے بعد ہے۔

☆ '' عن انس بن مالک رضی الله عنه ان رسول الله ﷺ قال الحيض ثلاثة ايام واربعة و خمسة وستة وسبعة وثمانية وتسعة فاذاجاوزت العشرة فهواستحاضة ''

(تبیین الحقائق للزیلعی)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حیض تین دن، اور چار دن اور پانچ دن اور چھ دن، اور سات دن، اور آٹھ دن اور نو دن ہوگا، جب دس دن سے تجاوز کر جائے تو وہ استحاضہ ہوگا۔

سبحان اللہ! کیسا فصیح و بلیغ کلام ہے، دس دن کا ذکر بظاہر نہیں، لیکن جب دس دنوں سے تجاوز کرنے کا ذکر فرمادیا، تو خود بخود پتہ چل گیا کہ دس دن آنے والا خون بھی حیض ہی ہے۔

حیض کے احکام:

☆ حیض کے دنوں میں زوجہ سے جماع کرنا حرام ہے، زیر بحث آیۂ کریمہ کے شان نزول سے واضح ہو چکا ہے کہ "قل هو اذى فاعتزلوا النساء في المحيض" کا یہی مطلب ہے کہ عورتوں کو حیض کے دنوں میں جماع سے دور کردو، یعنی ان سے جماع نہ کرو۔

☆ حیض کے دنوں میں عورت کو نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا منع ہے، البتہ روزہ کی قضاء لازم ہے، اور نماز کی قضاء لازم نہیں ہوگی، کیونکہ روزے سال میں ایک ماہ میں لازم ہیں، اگر ایک عورت کو مکمل دس دن رمضان میں حیض آئے، تو پھر بھی سال میں دس دن قضاء کوئی مشکل نہیں، لیکن نمازیں ہر دن، رات میں پانچ مرتبہ فرض ہیں، اگر ایک عورت کو پندرہ دن پاکیزہ رہنے کے بعد ہمیشہ دس دن خون آتا ہے تو اسے کثیر نمازیں قضاء کرنا لازم آئیں گی، اس لئے شریعت نے اس مشکل اور حرج کو عورت سے اٹھا کر عورت پر آسانی کردی۔

سبحان اللہ! اسلام کا عورت پر کتنا احسانِ عظیم ہے کہ عورت کی مشکل کو حل کرنے کے لئے نماز جیسا اہم فریضہ معاف فرمادیا۔

☆ "عن معاذة العدوية قالت سألت عائشة رضي الله عنها فقلت ما بال الحائض تقضي الصوم ولا تقضي الصلوة فقالت احرورية انت قلت لست بحرورية ولكني اسأل قالت كان يصيبنا ذلك فنؤمر بقضاء الصوم ولا نؤمر بقضاء الصلوة"

(بخاری ومسلم، تبیین الحقائق للزیلعی)

معاذہ عدویہ کہتی ہیں میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کے حیض والی عورتوں کا کیا حال ہے کہ روزہ قضاء کرتی ہیں اور نماز قضا نہیں کرتیں، آپ نے فرمایا تم حروریہ ہو (یعنی خارجی فرقہ سے تعلق رکھتی ہو) میں نے کہا میں حروریہ تو نہیں، لیکن میں آپ سے (یہ مسئلہ) پوچھ رہی ہوں، آپ نے فرمایا ہمیں جب حیض آتا تھا تو ہمیں حکم دیا جاتا تھا کہ ہم روزے قضا کریں اور ہمیں نماز قضاء کرنے کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔

مسجد میں داخل ہونا اور طواف کرنا منع ہے:

یعنی حیض والی عورت کا مسجد میں داخل ہونا اور بیت اللہ شریف کا طواف کرنا حرام ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

"انی لااحل المسجد لحائض ولاجنب" (رواہ ابوداؤد، مشکوۃ باب مخالطۃ الجنب)

بیشک میں نہیں حلال کرتا مسجد حیض والی عورت اور جنبی کے لئے۔

طواف کرنا منع ہے۔ اس کی ایک وجہ تو بعض حضرات نے یہ بیان کی ہے کہ بیت اللہ شریف مسجد حرام میں ہے، جب مسجد میں داخل ہونا منع ہے تو طواف کرنا بھی منع ہے، لیکن علامہ چلپی رحمہ اللہ نے بھی اس علت کو ضعیف قرار دیا ہے، اور صاحب عنایہ نے بھی یہ بیان کیا کہ خود بیت اللہ شریف کو یہ شرف حاصل ہے کہ حیض کی حالت میں طواف کرنا منع ہے، اگر بالفرض بیت اللہ شریف مسجد کے باہر ہوتا تو پھر بھی یہی حکم تھا، بلکہ طواف کرنے میں نقص ہو، یعنی بغیر وضو اور بغیر غسل کے طواف کرنے میں صدقہ ودم سے جبیرہ ادا کرنا پڑتا ہے، جبکہ مسجد میں داخل ہونے کا یہ حکم نہیں۔

(تبیین الحقائق للزیلعی، و چلپی)

قرآن پڑھنا منع ہے:

حیض والی عورتوں کو قرآن پڑھنا منع ہے۔

☆ "عن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ لا تقرأ الحائض ولا الجنب شیأ من القرآن"
(رواہ الترمذی، مشکوۃ باب مخالطۃ الجنب)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حیض والی عورت اور جنبی شخص قرآن پاک نہ پڑھیں۔

حیض والی عورت کا قرآن پاک کو ہاتھ لگانا منع ہے:

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا" لایمسہ الا المطھرون"اس کو (قرآن پاک کو) نہ چھوئیں سوائے پاکیزہ لوگوں کے۔

نبی کریم ﷺ نے اپنے عامل عمرو بن حزم کی طرف خط لکھا، اس میں یہ لکھا۔

"ان لا یمس القرآن الا طاهر" (رواه مالک والدار قطنی)

قرآن پاک کو سوائے پاک آدمی کے کوئی نہ چھوئے۔ (مشکوۃ باب مخالطۃ الجنب)

فائدہ: قرآن پاک کو کسی کپڑے سے پکڑے تو جائز ہے۔ لیکن قرآن پاک کی جلد اور جلد کے اوپر چسپاں تہ ــــ یا کپڑے کو بھی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔

تنبیہ: جنبی شخص بھی قرآن پاک کو نہ پڑھ سکتا ہے اور نہ ہی ہاتھ لگا سکتا ہے۔ اور بے وضو شخص قرآن پاک کو ہاتھ تو نہیں لگا سکتا، البتہ زبانی پڑھے تو پڑھ سکتا ہے۔

مقام توجہ:

قرآن پاک پڑھنے کی ممانعت اس وقت ہے جب تلاوت کی غرض سے پڑھا جائے، اگر قرآن پاک کی کوئی آیات بطور دعاء پڑھے تو جائز ہے۔

"هذا اذا قرأه علی قصد التلاوة واما اذا قرأه علی قصد الذکر والثناء نحو بسم الله الرحمن الرحیم او الحمدلله رب العلمین او علم القرآن حرفا حرفا فلاباس به بالاتفاق"

(تبیین الحقائق للزیلعی)

حیض والی عورت کو قرآن پڑھنا منع ہے جبکہ وہ تلاوت کے ارادہ سے پڑھے، اگر وہ ذکر اور ثناء کے ارادے سے "بسم الله الرحمن الرحیم" یا "الحمد لله رب العلمین" پڑھے تو یہ جائز ہے۔ اسی طرح قرآن پاک پڑھانے کی غرض سے ایک ایک حرف کر کے پڑھائے، آگے پڑھنے والے روان خود کریں تو یہ جائز ہے۔

"لو قرأ الجنب الفاتحة علی سبیل الدعاء لاباس به وکذا شیأ من الآیات التی فیها معنی الدعاء"

اگر جنبی نے دعا کے طور پر سورہ فاتحہ کو پڑھا، یا اور وہ آیات پڑھیں جن میں دعا کا معنی نکلتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ جنبی اور حیض والی عورتوں کا حکم ایک ہے۔

نتیجہ واضح ہوا کہ سوائے قرآن پاک کی تلاوت کے عورت حیض کی حالت میں ہر قسم کا ذکر اور دعاء اور وظائف پڑھ سکتی ہے۔

دینی طلبا کرام کی توجہ کے لئے:

زیر بحث آیہ کریمہ میں "حتـی یـطھـرن" میں دو قرأتیں ہیں۔ ایک تخفیف سے اور دوسری تشدید سے، تخفیف والی قرأت کے مطابق ترجمہ ہوگا "یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں"۔

اس سے اس مسئلہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر عورت کو دس دن مکمل حیض آئے تو اس سے وطی حیض کے ختم ہونے پر بغیر غسل کرنے کے جائز ہے۔

اور تشدید والی قرأت سے اس طرف اشارہ پایا گیا ہے "یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو پاکیزہ کرلیں" کہ اگر عورت کو حیض دس دنوں سے کم آکر ختم ہو گیا ہے تو اس سے وطی اس وقت تک نہیں کی جا سکتی جب تک وہ غسل نہ کرے۔ یا اس پر نماز کا وقت گزر جائے، جس کو غسل کے قائم مقام سمجھا گیا ہے۔

خیال رہے کہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے حتی "یـطھـرن" کا ترجمہ کیا ہے (ان سے نزدیکی نہ کرو) جب تک وہ پاک نہ ہوں۔

اور " فاذا تطھرن فاتو ھن "پھر جب پاک ہو جائیں ان کے پاس جاؤ۔

راقم کا ترجمہ بھی اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کی نقل ہے کیونکہ عورت کا پاک ہونا عام ہے کہ مدت حیض مکمل خون آکر وہ پاک ہوگئی۔ یا مدت حیض اگرچہ خون مکمل نہیں آیا، لیکن اس عورت نے حیض کے ختم ہونے پر غسل کرلیا تو وہ پاک ہوگئی۔ یہ ترجمہ بہت خوب ہے۔

اگرچہ بعض مترجمین نے ''وہ اپنے آپ کو خوب ستھرا کرلیں'' بھی ترجمہ کیا ہے، لیکن اس ترجمہ کی ضرورت نہیں۔

حیض کی حالت میں جو کام جائز ہیں:

عورت اپنی شرم گاہ پر کپڑا باندھ لے، پھر اس سے جماع کے بغیر باقی منافع حاصل کیے جاسکیں گے۔

☆ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں '' وکان یامرنی فأتزر فیبا شرنی واناحائض ''
رسول اللہ ﷺ مجھے فرماتے تھے تو میں چادر باندھ لیتی تھی (سلوار پہننے کا بھی یہی حکم ہے) تو حیض کی حالت میں آپ مجھ سے منافع حاصل کرلیتے تھے۔

خیال رہے کہ حدیث شریف میں استعمال لفظ ''فیباشرنی'' کا معنی جماع کرنا نہیں۔ بلکہ اس کا ترجمہ یہ ہے۔

''فیباشرنی ای یضا جعنی فیلا مسنی وتمس بشرتہ فوق الازار''
کہ آپ میرے ساتھ لیٹ جاتے اور آپ مجھے ہاتھ لگاتے اور چادر سے اوپر آپ کا جسم میرے جسم سے مس کرتا۔

☆ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ''وکان یخرج رأسہ الی وھو معتکف فاغسلہ واناحائض''
نبی کریم ﷺ مسجد میں اعتکاف میں ہوتے، مسجد میں رہتے ہوئے آپ متصل میرے حجرے میں کھڑکی سے سر اندر کرتے تو میں آپ کا سر دھو دیتی، حالانکہ میں حالت حیض میں ہوتی۔

☆ '' وعن عائشۃ قالت کنت اشرب واناحائض ثم اناولہ النبی ﷺ فیضع فاہ موضع فی فیشرب واتعرق العرق واناحائض ثم اناولہ النبی ﷺ فیضع فاہ علی موضع فی''

(رواہ مسلم، مشکوۃ باب الحیض)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں حیض کی حالت میں (پانی وغیرہ) پیتی تو حضور ﷺ میرے منہ کے رکھنے کی جگہ منہ رکھ کر پی لیتے۔ اور میں حیض کی حالت میں اپنے دانتوں سے گوشت کو کاٹتی (بوٹی کو دانتوں سے توڑتی) تو نبی کریم ﷺ میرے منہ رکھنے کی جگہ پر منہ رکھ کر گوشت کھا لیتے۔

☆ '' وعن عائشۃ قالت کان النبی ﷺ یتکئ فی حجری واناحائض ثم یقرأ القرآن''
(بخاری، مسلم، مشکوۃ باب الحیض)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی کریم ﷺ کبھی میرے ساتھ سہارا لگا لیتے ,یعنی اپنا سر مبارک میری گود میں رکھ لیتے تھے اور آپ قرآن پاک پڑھ رہے ہوتے جبکہ میں حیض کی حالت میں ہوتی۔

"وفیہ دلالة علی ان الحائض طاهرة حسا نجسة حکما"

اس حدیث پاک سے پتہ چلا کہ حیض والی عورت حسی طور پر یعنی ظاہر جسم کے لحاظ سے پاک ہے اور حکمی طور پر ناپاک ہے۔ (مرقاۃ ج ۲، ص ۹۸)

"عن میمونہ قالت کان رسول اللہ ﷺ یصلی وانا حذاء وانا حائض وربما اصابنی ثوبہ اذا سجد"

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں حیض کی حالت میں ہوتی تو رسول اللہ ﷺ نماز ادا فرمالیتے جبکہ میں آپ کے آگے لیٹی ہوتی، نماز ادا فرماتے ہوئے آپ کا کپڑا بھی میرے کپڑوں کے ساتھ لگ جاتا تھا۔ (بخاری، مرقاۃ ج ۲، ص ۹۹)

"عن عائشة قالت قال لی النبی ﷺ ناولینی الخمرة من المسجد فقلت انی حائض فقال ان حیضتک لیست فی یدک" (رواہ مسلم، مشکوۃ باب الحیض)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں مجھے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مسجد سے مجھے مصلیٰ (جائے نماز) پکڑا دو، میں نے کہا میں تو حیض میں ہوں، آپ نے فرمایا کہ بے شک تمہارا حیض تمہارے ہاتھ میں تو نہیں۔

ان دونوں حدیثوں سے واضح ہوا کہ عورت حالت حیض میں کسی کپڑے کو ہاتھ لگائے یا مصلیٰ کو ہاتھ لگ جائے تو جائز ہے، حیض کی حالت میں اس نے جو کپڑے پہنے ہوئے ہیں، وہ کسی اور وجہ سے اگر ناپاک نہیں تو صرف اس وجہ سے ناپاک نہیں ہوں گے کہ حیض والی عورت نے پہن رکھے ہیں۔

خیال رہے کہ عورت حیض کی حالت میں مسجد میں داخل نہیں ہو سکتی، نبی کریم ﷺ کے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ارشاد "کہ مسجد سے مجھے مصلیٰ پکڑا دو" کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے حجرہ میں کھڑی رہو، دروازہ سے ہاتھ لمبا کر کے دیوار کے ساتھ ہی پڑا ہوا مصلیٰ مجھے دے دو۔

اعتراض:

"عن عائشة قالت کنت اذاحضت نزلت عن المثال علی الحصیر فلم یقرب رسول الله ﷺ ولم تدن منه حتی تطهر" (رواہ ابوداود، مشکوۃ باب الحیض)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں جب حیض میں ہوتی تو بستر سے چٹائی پر آجاتی ،تو رسول اللہ ﷺ (میرے) قریب نہیں ہوتے تھے اور نہ ہی میں آپ کے قریب ہوتی۔

اس حدیث سے تو پتہ چلا کہ عورت جب حیض میں ہو تو اس کا خاوند اس سے دور ہو جائے اور وہ خاوند سے دور ہو جائے تو کس طرح کہنا یہ درست ہے کہ سوائے جماع کے باقی منافع حاصل کئے جا سکتے ہیں؟

جواب:

"ولعله منسوخ الاان یحمل الدنو والقربا ن علی الغشیان"

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ حدیث دوسری احادیث کی وجہ سے منسوخ ہے۔ جن سے یہ ثابت ہے کہ عورت اور مرد ایک دوسرے سے جماع کے بغیر باقی منافع حاصل کر سکتے ہیں۔

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ قریب نہ ہونے سے مراد جماع کے قریب نہ ہونا ،مراد ہے۔ (مرقاۃ ج ۲،ص ۱۰۲)

تنبیہ:

اگرچہ حائضہ عورت سے جماع کے بغیر اس کے ننگے جسم سے مس کرنا اور ذکر (آلہ تناسل) کو اس کے پیٹ یا ران سے لگانا جائز ہے۔ لیکن اگر کسی شخص کو یہ گمان ہو کہ وہ اجتناب نہیں کر سکے گا، تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس سے دور رہے۔

مسئلہ: حیض والی عورت حج عمرہ میں سوائے طواف کے اور تمام مناسک پر عمل کر سکتی ہے، البتہ طواف اس کا مؤخر ہو جائے گا۔

عورتوں کا ناقصات العقل والدین ہونا:

اگرچہ عورت کو حیض کی حالت میں نماز ادا کرنا منع ہے۔ اوران دنوں میں رہ جانے والی نمازوں کی قضاء بھی نہیں، لیکن جو نمازیں رہ جائیں گی، ان کا ثواب نہیں ملے گا، صرف نہ ادا کرنے کی وجہ سے گناہ نہیں ہوتا۔ اسی علت کے پیش نظر نبی کریم ﷺ نے عورتوں کو ناقصات الدین کہا۔

☆ "عن ابی سعید الخدری قال خرج رسول اللہ ﷺ فی اضحی اوفطر الی المصلی فمر علی النساء فقال یا معشر النساء تصدقن فانی اریتکن اکثر اھل النار فقلن وبم یارسول اللہ قال تکثرن اللعن وتکفرن العیشر مارأیت من نا قصات عقل ودین اذھب للب الرجل الحازم من احد کن قلن وما نقصان دیننا وعقلنا یا رسول اللہ قال الیس شھادۃ المراۃ مثل نصف شھادۃ الرجل قلن بلی قال فذالک من نقصان عقلھا قال الیس اذاحا ضت لم تصم قلن بلی ،قال فذلک من نقصان دینھا" (بخاری، مسلم، مشکوۃ کتاب الایمان)

حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ عیدالاضحیٰ یا عیدالفطر کو عید گاہ کی طرف تشریف لے گئے آپ کا عورتوں سے گزرہوا آپ نے فرمایا، اے عورتوں کی جماعت تم صدقہ کیا کرو، تم میں سے اکثر مجھے جہنمی دکھائی گئیں، عورتوں نے عرض کیا یارسول اللہ کیا وجہ ہے؟ آپ نے فرمایا تم لعنت زیادہ کرتی ہو۔ اوراپنے زوج (خاوند) کی نعمتوں کا کفران کرتی ہو، میں نے تم سے زیادہ کسی ایک کونہیں دیکھا جوخود تو ناقص العقل اور ناقص الدین ہو لیکن بڑے بڑے ماہر عقلمندوں کی عقل کو ضائع کردے۔ عورتوں نے عرض کیا یارسول اللہ ہمارے دین اور عقل میں کیا نقصان ہے؟ آپ نے فرمایا کیا عورتوں کی شہادت مردوں کی شہادت کے نصف برابرنہیں، عورتوں نے عرض کیا ہاں یارسول اللہ! ایسا ہی ہے، آپ نے فرمایا یہ ان کی عقل کی کمی ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کیا ایسا نہیں کہ عورت کو جب حیض آئے تو وہ نماز ادانہیں کرتی اور روزہ نہیں رکھتی؟ عورتوں نے عرض کیا ہاں یارسول اللہ! ایسا ہی ہے۔ آپ نے فرمایا یہ ان کے دین کی کمی ہے۔

نفاس کے احکام:

نفاس کے احکام وہی ہیں جو حیض کے ہیں۔ یعنی نفاس کی حالت میں بھی حیض کی طرح جماع کرنا منع ہے۔ عورت کو اس حال میں نماز پڑھنا منع ہے اور روزہ رکھنا منع ہے۔ نماز کی قضا نہیں اور روزہ کی قضا ہے۔ قرآن پاک پڑھنا اور قرآن پاک کو ہاتھ لگانا اس کے لئے جائز نہیں، مسجد میں داخل ہونا اور طواف کرنا منع ہے۔

استحاضہ کے احکام:

جس عورت کو استحاضہ کا خون آتا ہے یعنی تین دنوں سے کم یا حیض کے دنوں میں دس دنوں سے بڑھ گیا یا نفاس میں چالیس دنوں سے بڑھ گیا تو وہ خون استحاضہ ہے۔

استحاضہ کی حالت میں جماع کرنا، نماز ادا کرنا، روزہ رکھنا، مسجد میں داخل ہونا، طواف کرنا، قرآن پاک پڑھنا اور قرآن پاک کو وضو کر کے ہاتھ لگانا جائز ہے۔

مسئلہ:

استحاضہ والی عورت کو اگر لگا تار خون آرہا ہو، اتنا وقت بھی نہ مل سکے کہ وہ ایک وقت کے فرض ادا کر سکے تو ہر وقت کے لئے وضو کر لے، بعد میں بے شک خون جاری رہے۔ جب تک اور کوئی چیز وضو توڑنے والی اسے لاحق نہ ہو تو اسی ایک وضو سے نماز کے وقت کی ابتداء سے لے کر انتہا تک فرض پڑھے نفل پڑھے۔ نماز قضا کرے، قرآن پاک پڑھے اور قرآن پاک کو ہاتھ لگائے، مسجد میں داخل ہو یہ سب کام جائز ہیں۔ جونہی وقت نکلے گا وضو خود بخود ٹوٹ جائے گا۔

مسئلہ:

اگر ایک عورت بالغ ہوتے ہی استحاضہ کے خون میں مبتلا ہوگئی تو وہ ہر مہینہ کے پہلے دس دن حیض سمجھے اور بعد

والے دن استحاضہ۔ حیض والے دنوں میں نماز نہ ادا کرے اور استحاضہ والے دنوں میں نماز ادا کرے۔ یہی حکم نفاس کا ہے کہ اگر پہلے بچہ سے ہی استحاضہ شروع گیا تو چالیس دن نفاس ہوگا باقی استحاضہ۔

مسئلہ:

اگر ایک عورت کی پہلے عادت مقرر ہے کہ اسے معین تاریخوں میں خون آتا ہے اور اس کے دن مقرر ہیں۔ مثال کے طور پر پانچ دن یا سات دن وغیرہ اسے خون آتا تھا، لیکن اب اسے استحاضہ کا خون شروع ہوگیا، اسی طرح نفاس کی عادت مقرر تھی اب استحاضہ شروع ہوگیا، تو عادت کے دنوں میں اس پر حیض اور نفاس کا حکم لاحق ہوگا، باقی دنوں میں استحاضہ ہوگا۔

عورت کے لئے ایک مشکل مسئلہ:

اگر ایک عورت کی عادت مقرر نہیں تھی، بلکہ اسے کبھی اور تاریخوں میں حیض کا خون آتا اور کبھی اور تاریخوں میں آتا اور کبھی کم دن آتا ہے اور کبھی زیادہ۔ اب اسے استحاضہ کی بیماری لاحق ہوگئی تو اس کے لئے حیض کے دن مقرر کرنے مشکل ہیں کہ حیض مہینے کی فلاں تاریخ کو ہوگا۔ اس مشکل کا صرف یہی حل ہے کہ وہ ہر مہینے کی پہلی تاریخوں میں دس دن حیض سمجھ کر نماز ادا نہ کرے، باقی دنوں میں نماز ادا کرے، لیکن ہر نماز کے وقت غسل کرنا پڑے گا، ہوسکتا ہے یہ حیض کے دن ہوں۔

استحاضہ میں نماز ادا کرے پر ارشاد مصطفوی:

"عن عائشة رضی الله عنها قالت جاء ت فاطمه بنت ابی حبیش الی النبی ﷺ فقالت یا رسول الله انی امرأة استحاض فلا اطهر افادع الصلوة قال لا انماذلک عرق ولیس بحیض فاذااقبلت حیضتک فدعی الصلوة واذاادبرت فاغسلی عنک الدم ثم صلی"

(بخاری ومسلم، مشکوۃ باب المستحاضه)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں فاطمہ بنت ابی حبیش آئی، اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں استحاضہ والی عورت ہوں، میں پاک نہیں ہوتی (یعنی میرا خون بند نہیں ہوتا) کیا میں نماز کو چھوڑ دوں؟ آپ نے فرمایا نہیں، یہ تو رگ کا خون ہے، حیض نہیں، جب حیض کے دن ہوں تو نماز چھوڑ دو اور جب حیض ختم ہو جائے تو خون دھولو اور نماز ادا کرو۔

خون دھونے سے مراد غسل کر کے خون کے اثرات کو زائل کرنا ہے، یعنی غسل کرلو، پھر استحاضہ کے دنوں میں نماز ادا کرتی رہو۔

طہر متخلل:

اگر ایک عورت کو خون آئے، پھر پندرہ دنوں سے کم پاک رہے، پھر خون آئے تو اسے لگاتار خون سمجھ کر دس دن حیض کا حکم ہوگا اور باقی استحاضہ، جیسا کہ ایک دن خون آئے چودہ دن پاکیزہ رہے اور ایک دن پھر خون آئے، تو پہلے دس دن حیض اور باقی استحاضہ ہوگا۔ اور اگر ایک دن خون آئے، آٹھ دن پاکیزہ رہے اور پھر ایک دن خون آئے تو تمام دس دن حیض ہوگا۔

طلباء کرام تفصیلی اقوال کتب فقہ میں تلاش کریں۔

☆☆☆☆☆

نِسَآءُ كُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوا لِاَنْفُسِكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ☆

(سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۲۳)

﴿۱﴾

تمہاری عورتیں تمہارے لئے کھیتیاں ہیں تو آؤ اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو اور اپنے بھلے کا کام پہلے کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اور جان رکھو کہ تمہیں اس سے ملنا ہے اور اے محبوب بشارت دو ایمان والوں کو۔

﴿۲﴾

بیبیاں تمہاری کھیتی ہیں تمہارے لئے، تو آؤ کھیتی اپنی میں جیسے چاہو تم، اور پہلے کرو اپنے نفسوں کے لئے (بھلائی کے کام) اور ڈرو اللہ سے، اور جان رکھو بے شک تم نے ملنا ہے اس سے، اور (اے محبوب) بشارت دو ایمان والوں کو۔

شانِ نزول:

اگرچہ تفسیر کبیر میں شان نزول کی تین وجوہ ذکر کی گئی ہیں، البتہ مقصد تینوں کا ایک ہی ہے۔

﴿۱﴾ ایک وجہ نزول کی یہ ہے کہ یہود کہتے تھے جو شخص اپنی عورت کی فرج (اگلے حصہ) میں جماع کرے۔ لیکن الٹا کر پچھلی جانب سے اپنے ذکر (آلہ تناسل) کو عورت کے (اگلے حصہ) میں داخل کرے تو بچہ بھینگا پیدا ہوگا، تو رب تعالیٰ نے اس آیہ کریمہ کو نازل فرما کر ان کی تکذیب کی کہ وہ جھوٹے ہیں تم جس طرح چاہو جماع کرو۔

﴿۲﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے "یارسول اللہ هلکت" یارسول اللہ میں ہلاک ہوگیا، کیونکہ میں نے اپنی عورت

سے جماع اگلے حصہ میں کیا ہے، لیکن پچھلی جانب سے کیا ہے، ان کے کہنے کے بعد آیۃ کریمہ کا نزول ہوا کہ تم اپنی بیبیوں سے جس طرح چاہو جماع کرو۔

﴿۳﴾ انصار صحابہ کرام اپنی بیبیوں سے پچھلی جانب سے اگلے حصہ میں جماع کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے، کیونکہ انہوں نے یہود سے سن رکھا تھا کہ اس طرح بچہ بھینگا پیدا ہوتا ہے۔ اور قریش (مہاجرین صحابہ کرام) اس صورت کو جائز سمجھتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے قریش کی تائید میں اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا۔

تمام وجوہ کا اجتماع:

یعنی یہ تمام وجوہ پہلے درپیش آئیں تو آیۃ کریمہ کا نزول بعد میں ہوا۔ اس لئے یہ آیۃ کریمہ کے شان نزول کی یہ تمام وجوہ پائی گئی ہیں ۔

مختصر مطلب:

تمہاری بیبیاں تمارے لئے کھیتی ہیں۔ یعنی جس طرح کھیتی سے پیداوار ہوتی ہے، اسی طرح ان سے بھی اولاد پیدا ہوتی ہے، تم اپنی بیبیوں کے پاس آؤ جس طرح چاہو، یعنی ان سے جماع تو اگلے حصہ میں کرو، لیکن جماع کرنے کی کیفیت معین نہیں، بلکہ بیٹھ کر یا لیٹ کر، اگلی جانب سے یا پچھلی جانب سے، جس طرح چاہو اسی طرح جماع کرنے کی تمہیں اجازت ہے، اور جماع سے پہلے اپنے لئے بھلائی کے کام کرلو، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور یہ بھی جان رکھو کہ تم نے ایک دن اللہ تعالیٰ سے ملنا ہے، چونکہ وہ دن جزاء (ثواب وعذاب) کا دن ہوگا۔ اس میں کامیابی مومنوں کو ہی حاصل ہونی ہے، اس لئے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ اے محبوب آپ ایمان والوں کو جنت کی اور کامیابی کی اور رب تعالیٰ کی رضاء حاصل ہونے کی بشارت دے دو۔

"نساء کم حرث لکم": تمہاری بیبیاں تمہارے لئے کھیتی ہیں۔

عورتوں (زوجات) کو زمین سے تشبیہ دی گئی، جس طرح زمین میں بیج ڈالا جاتا ہے، اسی طرح عورت کی رحم (بچہ دانی) میں نطفہ جو بیج کی طرح ہے ڈالا جاتا ہے، اور اولاد کو زمین کی پیداوار سے تشبیہ دی گئی۔

طلباء کرام توجہ فرمائیں:

یہ آیۃ پہلے آیۃ کریمہ میں مذکور الفاظ گرامی "فأتوھن من حیث امر کم الله" (تو آؤان کے پاس جہاں سے تمہیں اللہ نے حکم دیا ہے) کا بیان ہے۔ یعنی اللہ تعالی نے جہاں سے آنے کا حکم دیا ہے وہ عورت کی قبل (اگلا حصہ) ہے۔ کیونکہ وہی کھیتی کا ذریعہ ہے، اس لئے کہ پیدائش اگلے حصہ سے ہوتی ہے نہ کہ پچھلے حصہ سے۔

قرآن پاک کی عظمت:

چھوٹا سا جملہ "نساء کم حرث لکم" کتنے عظیم معانی اور مسائل پر مشتمل ہے۔

ایک مسئلہ یہ سمجھ آیا کہ عورتوں سے لواطت حرام ہے، کیونکہ دبر (پچھلا مقام) نتیجۂ اولاد کا مقام نہیں۔

اور یہ سمجھ آیا کہ نکاح کرنے میں اصل مقصد وہی ہو جو نکاح کی حکمت ہے، نکاح کی حکمت ہی یہ ہے کہ اولاد پیدا ہو، اور نسل برقرار رہے۔ یہ خیال رہے کہ شہوت کو اولاد کی پیدائش کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔

"وجعلت شھوۃ النساء اعظم لأن مشقۃ النسل علیھن اعظم من الرجال فتتسلی النساء عن المشقۃ بعظم الشھوۃ"

اور عورتوں میں زیادہ شہوت رکھی گئی ہے جبکہ عورتوں پر بچے کی پیدائش اور پرورش باعث مشقت ہے جو مشقت مردوں کو حاصل نہیں، لیکن عورتوں کو عظیم شہوت عطاء کر کے، تکمیل خواہشات کے پیش نظر ان پر اس مشقت کو برداشت کرنا آسان کر دیا گیا ہے۔ (صاوی)

بعض روایات سے بعض حضرات غلطی کا شکار ہو گئے:

چونکہ بعض روایات میں "ادبار" کا لفظ استعمال ہوا جس کا مطلب یہ ہے کہ تم اگلے حصہ میں پچھلی جانب سے جماع کر سکتے ہو۔ لیکن کچھ حضرات نے اس کا مطلب یہ سمجھا کہ پچھلے حصہ میں جماع کرنا جائز ہے، کیونکہ "ادبار" کا

ایک معنی یہ بھی ہے۔

اس پر ایک حدیث پاک کا مشاہدہ کریں، مسئلہ واضح ہو جائے گا۔

"عن ابی النضر انه اخبره انه قال لنافع مولی ابن عمر انه قد اکثر علیک القول انک تقول عن ابن عمر انه افتی ان تؤتی النساء فی ادبارهن قال کذبوا علی ولکن سأحدثک کیف کان الأمر، ان ابن عمر عرض المصحف یوما وانا عنده حتی بلغ (نساء کم حرث لکم فاتو حرثکم انی شئتم) فقال یا نافع هل تعلم من امر هذه الآیة؟ قلت لا، قال انا کنا معشر قریش نجبی النساء، فلما دخلنا المدینة ونکحنا نساء الانصار اردنا منهن مثل ما کنا نرید فآذاهن فکرهن ذلک واعظمه وکانت نساء الانصار قد اخذن بحال الیهود انما یؤتین علی جنوبهن، فانزل الله تعالی (نسائکم حرث لکم فأتوا حرثکم انی شئتم)" (رواه النسائی)

ابونضر کہتے ہیں میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے غلام حضرت نافع سے پوچھا کہ لوگ تمہاری طرف یہ بات کثرت سے منسوب کرتے ہیں کہ تم کہتے ہو حضرت ابن عمر عورتوں سے پچھلی جانب سے فتوی دینے کو جائز سمجھتے تھے، تو انہوں نے کہا لوگ میری طرف جھوٹ منسوب کرتے ہیں، ہاں البتہ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اصل میں حضرت ابن عمر کی حدیث کیا ہے۔

وہ یہ ہے کہ ایک دن حضرت ابن عمر کے پاس قرآن پاک تھا (آپ پڑھ رہے تھے) جب آپ اس آیۃ (نساء کم حرث لکم فأتو حرثکم انی شئتم) پر پہنچے تو آپ نے فرمایا اے نافع! کیا تم اس آیۃ کے متعلق کچھ جانتے ہو؟ تو میں نے کہا نہیں، آپ نے فرمایا ہم قریش کے لوگ عورتوں سے جماع پچھلی جانب سے (اگلے حصہ میں) کرتے تھے، جب ہم مدینہ طیبہ میں آئے اور ہم نے انصار کی عورتوں سے نکاح کئے، ہم نے ان سے اسی طرح جماع کرنا چاہا جس طرح ہم قریش کی عورتوں سے جماع کرتے تھے، تو انہوں نے اسے اپنے لئے باعث اذیت سمجھا،

اور ناپسند کیا اور اسے عظیم (جرم) سمجھا۔ چونکہ انصار کی عورتوں نے یہود کی عورتوں سے یہ (مسئلہ) حاصل کیا تھا کہ جماع ایک کروٹ کی جانب سے کیا جائے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیۃ کریمہ نازل فرمائی، جس میں انصار کے قول کو رد کیا گیا اور عورتوں کو کھیتی سے تشبیہ دی گئی اور اپنی کھیتی میں ہر طرح آنے کی اجازت فرمائی گئی۔ (صابونی)

حضرت ابن عمر کے اس قول سے واضح ہوگیا کہ آپ نے "نجبی" کا لفظ جو استعمال فرمایا، جو "جبو" سے مشتق ہے، جس کا مطلب پچھلی جانب سے جماع کرنا لیا گیا ہے، لیکن اسی لفظ کا معنی پچھلے حصہ میں جماع کرنا بھی لیا گیا ہے، تو بعض لوگ اسی وجہ سے غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے، خیال رہے کہ بعض روایت میں یہ لفظ جیم سے بھی استعمال ہے جو مجباۃ سے لیا ہوا ہے، معنی ایک ہی ہے۔

☆ "وعن خزیمة بن ثابت ان رسول اللہ ﷺ نهى ان يأتي الرجل امرأته في دبرها" (مسند احمد)

حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا کہ کوئی شخص اپنی عورت سے پچھلے حصے میں جماع کرے۔ (از صابونی)

☆ "قال رسول اللہ ﷺ استحیوا ان اللہ لایستحی من الحق لایحل ان تاتوا النساء فی حشوشهن"

اور ایک روایت میں "فی حشوشهن" کی جگہ "فی اعجازهن" کے الفاظ کا ذکر ہے۔ مطلب دونوں لفظوں کا ایک ہی ہے، یعنی آپ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے۔

حیاء کرو، بیشک اللہ تعالیٰ حق بیان کرنا نہیں چھوڑتا، تمہارے لئے یہ حلال نہیں کہ تم اپنی عورتوں کے پچھلے حصے میں جماع کرو۔

☆ "وقال رسول اللہ ﷺ لاینظر اللہ الی رجل اتی رجلا او امرأة فی الدبر" (رواہ الترمذی والنسائی)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس شخص کی طرف نظر (رحمت) نہیں فرماتا جو کسی مرد یا کسی عورت کے پچھلے حصہ میں جماع کرتا ہے۔

☆ " وعن عكرمة قال جاء رجل الى ابن عباس وقال كنت آتى اهلى فى دبرها، وسمعت قول الله (نساء كم حرث لكم فاتوا حرثكم انى شئتم) فقال يالكع انما قوله (فاتوا حرثكم انى شئتم) قائمة وقاعدة ومقبلة ومدبرة فى اقبالهن لا تعدوا ذلك الى غيره "

حضرت عکرمہ فرماتے ہیں ایک شخص حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس آیا تو کہنے لگا میں اپنی عورت سے پچھلے حصہ میں جماع کرتا ہوں، کیونکہ میں نے اللہ تعالیٰ کا ارشاد (نساء کم حرث لکم فأتوا حرثکم انی شئتم) سنا ہے، جس سے میں نے جائز سمجھا ہے۔ آپ نے فرمایا اے بیوقوف اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی (فأتوا حرثکم انی شئتم) کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی عورتوں سے کھڑے ہوکر یا بیٹھ کر اور اگلی جانب سے اگلے حصہ میں یا پچھلی جانب سے اگلے حصہ میں جماع کرو، اس حکم کے بغیر اور کہیں تجاوز نہ کرو، یعنی پچھلے حصہ میں جماع کرنا اللہ تعالیٰ کے حکم سے تجاوز ہے۔

نکاح کرنے میں اصل مقصد اولاد کی پیدائش ہو:

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں، ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے میں نے ایک عورت کو پایا ہے، جو اچھے نسب اور قدر و منزلت والی ہے، لیکن اس کی اولاد نہیں ہوتی، کیا میں اس سے شادی کرلوں؟ آپ ﷺ نے منع فرمایا، وہ دوبارہ حاضر ہوئے اور اجازت طلب کی۔ آپ ﷺ نے منع فرمایا۔ تیسری مرتبہ پھر حاضر ہوئے (پھر اجازت طلب کی) آپ ﷺ نے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا۔

" تزوجوا الولود الودود فانی مکاثر بکم "

زیادہ بچے جننے والی اور زیادہ محبت کرنے والی سے نکاح کرو بیشک تمہاری کثرت کی وجہ سے ہی مجھے فخر ہوگا۔

یعنی جس خاندان کی عورتوں کی زیادہ اولاد ہوتی ہے اس خاندان سے شادی کی جائے، اور جس خاندان کی عورتیں اپنے خاوندوں سے محبت کرتی ہوں اس سے شادی کی جائے۔ ممکن ہے کہ یہ مطلب بھی ہو کہ جو عورت

سے شادی کی جائے وہ زیادہ محبت کرتی ہے۔

اور آپ کا فرمان کہ مجھے تمہاری کثرت پر ناز ہوگا، یعنی میری امت باقی انبیاء کرام پر کثیر ہوگی، جو میرے لئے خوشی کا مقام ہوگا۔

عزل کے متعلق احادیث:

عزل کا مطلب یہ ہے کہ جماع کرتے وقت جب انزال کے قریب ہو تو اپنا ذکر (آلہ تناسل) عورت کی فرج سے باہر نکال لے تاکہ اولاد پیدا نہ ہو۔

☆ "اخرج وکیع وابن ابی شیبة عن ابی ذراع قال سألت ابن عمر عن قول الله " فاتوا حرثکم انی شئتم " قال ان شاء عزل وان شاء غیر العزل"

ابوذراع کہتے ہیں میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی "فأتو حرثکم انی شئتم " کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا (اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے) کہ تم اپنی کھیتی میں آؤ جس طرح چاہو، اسے سیراب کرو یا نہ کرو، یعنی چاہو تو عزل کرلو اور چاہو تو عزل نہ کرو۔

☆ " واخرج عبدالرزاق وابن ابی شیبة والبخاری ومسلم والترمذی والنسائی وابن ماجه والبیهقی عن جابر قال کنا نعزل والقرآن ینزل فبلغ ذلک رسول الله ﷺ فلم ینهانا عنه "

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں ہم عزل کرتے تھے جب کہ قرآن پاک نازل ہو رہا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے ہمیں منع نہیں فرمایا۔

☆ "واخرج عبدالرزاق والبیهقی عن ابن عباس انه سئل عن العزل فقال ما کان ابن آدم لیقتل نفسا قضی الله خلقها هو حرثک ان شئت عطشته وان شئت سقیته "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے عزل کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ جسے رب تعالیٰ نے پیدا کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے اسے کوئی انسان ختم تو نہیں کرسکتا، تاہم تمہاری زوجہ تمہاری کھیتی ہے، چاہو تو اسے سیراب نہ کرو اور چاہو تو اسے سیراب کرلو۔

☆ "واخرج البزار والبیھقی عن ابی ھریرة قال سئل رسول اللہ ﷺ عن العزل قال ان الیھود تزعم ان العزل ھی المؤدة الصغری قال کذبت یھود"

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے عزل کے متعلق سوال کیا گیا یہ سوال کرنے والے نے یہ کہا یہود گمان کرتے ہیں کہ عزل مودۃ صغریٰ (زندہ دفن کرنے کی ایک چھوٹی قسم) ہے۔ آپ نے فرمایا یہود جھوٹ کہتے ہیں۔

☆ "واخرج عبدالرزاق وابن ابی شیبة ومسلم وابو داؤد والبیھقی عن جابر ان رجلا اتی النبی ﷺ فقال ان لی جاریة وانا اطوف علیھا وانا کرہ ان تحمل فقال اعزل عنھا ان شئت فانھا سیاتیھا ما قدر لھا، فذھب الرجل فلم یلبث الا یسیرا ثم جاء فقال یا رسول اللہ ان الجاریة قد حملت فقال قد اخبرتک انہ سیاتیھا ما قدر لھا"

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آئے، آپ کی خدمت میں عرض کیا، میری ایک لونڈی ہے، میں اس سے وطی کرتا ہوں، لیکن میں اس کے حاملہ ہونے کو پسند نہیں کرتا، (کیا میں اس سے عزل کرلیا کروں) تو آپ نے فرمایا اگر تم چاہتے ہو تو اس سے عزل کرلیا کرو، لیکن جو اس کی تقدیر میں اولاد ہے وہ پیدا ہو کر رہے گی، تو وہ شخص چلا گیا تھوڑا ہی عرصہ گزرا تو وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا، یارسول اللہ! میری لونڈی حاملہ ہوگئی، تو آپ نے فرمایا میں نے تو تمہیں خبر دے دی تھی کہ اس کے مقدر میں جو اولاد ہے وہ پیدا ہو کر رہے گی۔

☆ "واخرج مالک وعبدالرزاق وابن ابی شیبة والبخاری ومسلم وابو داؤد والنسائی وابن ماجة والبیھقی عن ابی سعید قال سئل النبی ﷺ عن العزل فقال او تفعلون لا علیکم ان تفعلوا فانما ھو القدر مامن نسمة کائنة الی یوم القیامة الا وھی کائنة"

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے عزل کے متعلق سوال کیا گیا، تو آپ نے فرمایا کیا تم کرتے ہو؟ تم پر حرج نہیں کہ تم نہ کرو، تقدیر میں جس روح نے قیامت تک آنا ہے وہ آکر ہی رہے گی۔

"واخرج ابن ماجة والبیھقی عن ابن عمرقال نھی رسول اللہ ﷺ ان یعزل عن الحرۃ الاباذنھا"

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا حضور ﷺ نے آزادعورت سے اس کی اجازت کے بغیر عزل کرنے سے منع فرمایا۔

"واخرج البیھقی عن ابن عمر قال تعزل عن الامۃ وتستأمر الحرۃ"

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے کہ لونڈی سے اس کی اجازت کے بغیر عزل کر سکتے ہو اور آزادعورت کی اجازت سے عزل کیا جا سکتا ہے۔

نتیجہ واضح ہے کہ بچوں کی پیدائش پر پابندی عائد نہ کرنا بہتر ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کی کثرت کو پسند فرمایا ہے۔ تاہم اگر عقیدہ یہ ہو کہ جس بچے نے پیدا ہونا ہے اس کو رزق اللہ تعالیٰ نے ہی دینا ہے اور جس بچے نے پیدا ہونا ہے وہ پیدا ہو کر رہے گا، اللہ تعالیٰ کی قدرت سے مقابلہ نہیں۔

اس عقیدہ پر قائم رہتے ہوئے اگر بچوں کی پیدائش میں عزل وغیرہ سے احتیاط سے کام لے کہ بچوں کی تعداد کم ہوگی تو عورت پر مشقت کم ہوگی، اور اس کی صحت بہتر رہے گی، تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ (ماخوذ از درمنثور)

حرث اور زرع میں فرق:

حرث کا معنی ہے زمین تیار کرنا اور بیج ڈالنا، اور زرع کا مطلب ہے بیج کی حفاظت کرنا اور اس سے نباتات کو اگانا۔ یہ فرق رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی سے واضح ہو رہا ہے۔

"افرأیتم ما تحرثون ء انتم تزرعونہ ام نحن الزارعون"

تو بھلا بتاؤ جو بوتے ہو، کیا تم اس کی کھیتی بناتے ہو یا ہم بنانے والے ہیں۔

اس مقام پر حرث کی نسبت بندوں کی طرف کی، لیکن زرع کی نسبت ان کی طرف نہیں کی، بلکہ اپنی طرف کی۔

(روح البیان)

"فأتوا حرثكم انی شئتم": تو آؤ اپنی کھیتی میں جیسے چاہو تم۔

یہاں تراجم کا تقابلی جائزہ پیش کرتے ہوئے راقم نے تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان میں تحریر کیا۔

"فأتوا حرثکم انی شئتم" جاؤ اپنی کھیتی میں جس طرح سے چاہو۔ (محمود الحسن صاحب)

سو جاؤ اپنی کھیتی میں جہاں سے چاہو۔ (شاہ عبدالقادر صاحب)

تو آؤ اپنی کھیتی میں جس طرح سے چاہو۔ (مولانا احمد رضا خان بریلوی)

اس مقام پر ایک فرق تو یہ ہے کہ "فأتوا" ایتان سے بنا ہے، جس کا معنی ہے آنا نہ کہ جانا۔

البتہ اس کے دوسرے معانی میں سے ایک معنی ہے کسی سے گزرنا۔ اس توجیہ سے جانا معنی کیا جائے تو کچھ بات بنتی ہے۔ تاہم یہ وجہ کوئی اتنی نہیں۔

زیادہ جو باعثِ گرفت بات ہے وہ یہ ہے کہ "انی شئتم" کا معنی "جہاں سے چاہو" یہ سراسر غلط ہے اور تمام تفاسیر اور اصولِ فقہ کی جمیع کتب کے مخالف ہے، اس لئے کہ کوئی شخص اردو پر مکمل دسترس رکھنے والا کبھی تائید نہیں کر سکے گا کہ لفظ "جہاں" کیفیت کا معنی دیتا ہے۔

اگر کسی آدمی کو یہ کہنا ہو کہ تو لاہور، کراچی، پشاور، اور اسلام آباد میں سے جس شہر میں جانا چاہے جا سکتا ہے، اسے یہ تو کہا جائے گا "تو جہاں چاہے جا سکتا ہے" لیکن اس کے برخلاف اگر یہ کہنا مقصود ہو کہ تو سبق یاد کر، چاہے بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر یا لیٹ کر۔ یعنی جس حال میں تو چاہے سبق یاد کر سکتا ہے۔

اب اس جملے کو اس طرح بیان کیا جائے "تو سبق یاد کر جس طرح چاہتا ہے" تو یہ ٹھیک ہے، لیکن اگر یوں بیان کیا جائے، جہاں چاہے سبق یاد کر تو یہ غلط ہے۔

اردو زبان کی مشہور لغت کی کتاب "فیروز اللغات" نے بھی لفظ "جہاں" کا استعمال اس طرح کیا ہے۔

جہاں، جس جگہ، جس وقت، جس گھڑی۔

اب اس مسئلہ کو سمجھنے کے بعد اصل آیۃ کے مقصود کی طرف آئیں، آیۃ کریمۃ میں اپنی عورتوں سے جماع کا ذکر ہے، عورتوں کو کھیتی سے تشبیہ دی۔

عربی زبان میں لفظ "انی" بمعنی "این" (جگہ) کے بھی آتا ہے، اور "کیف" (حالت، کیفیت) کے معنی میں بھی آتا ہے۔

صرف لفظ "انی" کو دیکھنے سے تو دونوں معنی صحیح ہیں۔ لیکن جب یہ دیکھا جائے کہ اس آیۃ کریمہ میں "این" کے معنی لینے میں خرابی ہے، تو یقینا یہ ایسی غلطی ہے جس کی توجیہ نہیں ہو سکتی۔

اب اصل مسئلہ دیکھیں "نور الانوار" میں بیان کیا گیا ہے۔

"(مثال المشکل)قوله تعالٰی "فأتوا حرثكم انی شئتم" فان كلمة انی مشكل تجئ تارة بمعنی من این كما فی قوله تعالٰی "انی لک هذا" ای من این لک هذاالرزق الآتی كل یوم، وتارةبمعنی كیف كمافی قوله تعالٰی "انی یكون لی غلام" ای كیف یكون لی غلام، فاشبه ههنا انه بای معنی هو فان كان بمعنی این یكون المعنی من ای مكان شئتم قبلا او دبرا فتحل اللواطة من امرأته وان كان بمعنی كیف فیكون المعنی بایة كیفیة شئتم قائماًاو قاعداًاو مضطجعاًفیدل علی تعميم الاحوال دون المحال فاذا تأملنا فی لفظ الحرث علمنا انه بمعنی كیف لان الدبر لیس بموضع الحرث بل موضع الفرث "

اصول فقہ میں اسی آیۃ مبارکہ کے ان الفاظ کو مشکل کی مثال بنایا گیا ہے، رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی "فأتوا حرثكم انی شئتم" میں کلمہ "انی" مشکل ہے، کیونکہ یہ کبھی "این" کے معنی میں آتا ہے، جیسا کہ قرآن پاک میں ہی استعمال ہے "انی لک هذا" حضرت زکریا نے حضرت مریم سے یہ سوال کیا کہ ہر دن آنے والا رزق تمہارے پاس کہاں سے آتا ہے؟

اور کبھی یہی لفظ "انی" "کیف" کے معنی میں آتا ہے، جس طرح قرآن پاک میں آیا ہے "انی

یکون لی غلام " حضرت زکریا علیہ السلام کو جب بیٹے کی بشارت دی گئی تو آپ نے کہا' میرا بیٹا کیسے ہوگا۔

اب مثال مذکور(انی شئتم) میں جب غور کیا کہ کس معنی میں لیا جائے ، کیونکہ یہ اشتباہ ہوا۔ دیکھا کہ اگر "این" کے معنی میں لیا جائے تو معنی یہ ہوگا" جس مکان سے چاہو وطی کر سکتے ہو" اس طرح قبل اور دبر دونوں مکانوں کا ثبوت ہوگا، جس سے لواطت ثابت ہوگی، حالانکہ لواطت حرام ہے۔ اگر بمعنی" کیف "کے لیں تو معنی یہ ہوگا" جس طرح چاہو، کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر یا لیٹ کر" یہ معنی عموم احوال پر دال ہوگا، لیکن عموم محلیت پر دال نہیں ہوگا۔

اب غور وفکر کیا کہ لفظ حرث کا استعمال بمعنی کھیتی کے ہے تو خود واضح ہوا کہ "کیف "(جس طرح) کے معنی میں لینا ہی درست ہے، اس لئے مقام پیداوار ہی قبل ہے نہ کہ دبر بلکہ دبر تو فقط ایک گندگی کا مقام ہے۔

اسی طرح تفسیر مدارک التنزیل میں ہے۔

"فأتوا حرثكم انى شئتم "جامعوهن متى شئتم او كيف شئتم باركة اومستلقية او مضطجعة "

ان سے جب چاہو جس طرح چاہو جماع کرو، خواہ وہ حالت بروک ہو یا حالت استلقاء یا اضطجاع ہو۔ یعنی گھٹنوں کے بل یا سیدھا لیٹ کر یا کروٹ کے بل لیٹ کر ہو۔

جلالین میں ہے۔

"(فأتوا حرثكم)اى محلة وهو القبل (انى) كيف (شئتم) من قيام وقعود واضطجاع واقبال وادبارنزل ردالقول اليهود من اتى امرأته فى قبلها من جهة دبرهاجاء الولداحول "

جماع فرج میں ہی ہو جس طرح چاہو حالت قیام ہو یا قعود واضطجاع ہو، خواہ آگے کی جانب سے یا پیچھے کی جانب سے ہو، یہود کا رد کیا گیا ہے کہ ان کا گمان تھا کہ اگر پچھلی جانب سے جماع ہو تو بچہ بھینگا ہوگا۔

اب یہاں سے بھی واضح ہوا کہ صحیح معنی "کیف" کا (جس طرح) ہے۔ اگر معنی "ایــــن" کا (جہاں) کیا جائے تو ساری توجیہات باطل ہوں گی۔ حقیقت پسندی سے کام لیا جائے تو ضرور ماننا پڑے گا کہ یہ معنی "جہاں" والا کرنا غلط ہے۔

(تسکین الجنان، ص ۶۶ تا ۶۸)

"وقدموا لانفسکم": اور پہلے کرو اپنے نفسوں کے لئے (بھلائی کے کام)

"مایحب تقدیمه من الاعمال الصالحة" یعنی اپنے نفسوں کے لئے نیک عمل آگے بھیجو۔

یا مطلب یہ ہے، کہ نیک کام پہلے کرو۔

نیک اعمال آگے کرنے سے کیا مراد ہے؟

(۱) نیک اعمال سے مراد جماع سے پہلے "بسم اللہ" پڑھنا۔

"عن ابن عباس قال قال النبی ﷺ لو ان احدکم اذاارادان یاتی اهله قال بسم الله اللهم جنبنا الشیطان وجنب الشیطان مارزقتنافانه ان یقدر بینهما ولد فی ذلک لم یضره الشیطان ابدا" (بخاری ومسلم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم سے کوئی شخص اپنی زوجہ کے پاس (جماع کے لئے) آنے کا ارادہ کرے تو بسم اللہ شریف پڑھے، (پھر یہ دعا کرے) "اللهم جنبنا الشیطان وجنب الشیطان مارزقتنا" تو اللہ تعالیٰ ان کو جو بچہ عطا فرمائے گا شیطان اسے کبھی تکلیف نہیں پہنچا سکے گا۔ (از خازن)

(۲) نیک عمل اپنے لئے آگے بھیجنے کا ایک مطلب یہ ہے کہ اپنی عورتوں سے جماع کر کے اپنے آپ کو گناہوں سے بچاؤ۔

"لان الامور المباحة با قتران النية الصحیحة الصالحة تصیر عبادة"

اس لئے کہ مباح کاموں کے ساتھ جب نیک اور صحیح نیت مل جائے تو وہ مباح کام عبادت بن جاتے ہیں۔

☆ " عن ابی ذرقال قال رسول اللهﷺ وفی بضع احد کم صدقة قالوایارسول الله ایأتی احد ناشهوته ویکون له فیها اجر قال أرایتم لووضعها فی حرام اکان علیه فیه وزر فکذلک اذاوضعها فی حلال کان له اجر" (رواه مسلم)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہﷺ نے فرمایاتم سے ہرایک کی (زوجہ کی) فرج میں صدقہ ہے۔صحابہ کرام نے عرض کیایارسول اللہ! جب ہم میں سے کوئی ایک اپنی شہوت پوری کرنے کے لئے زوجہ کے پاس آتا ہےتواسے اس کا بھی اجر حاصل ہوگا؟ آپ نے فرمایا کیاتم دیکھتے نہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی شہوت کوحرام جگہ پورا کرے تو اسے گناہ حاصل ہوگا؟ اسی طرح جب حلال طریقہ سے اپنی شہوت کو پورا کرے گاتو اسے ثواب حاصل ہوگا۔ (مظہری)

(۳) نیکی کے کام پہلے کرنے سے مراد نیک اولاد کی طلب ہے۔

☆ " عن ابی هریرةان رسول اللهﷺ قال اذامات الانسان انقطع عمله الامن ثلاثة صدقة جاریة اوعلم ینتفع به اوولد صالح یدعوله" (رواه مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہﷺ نے فرمایا جب انسان فوت ہوجاتا ہےتواس کے عمل ختم ہوجاتے ہیں سوائے تین کے،یعنی صدقہ جاریہ،یاوہ علم جس سے نفع حاصل کیاگیاہو،یانیک اولاد جواس کے لئے دعاکرے۔

(۴) بھلائی کے کام آگے بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے نابالغ بچے فوت ہوجائیں جوآگے جاکراس کے لئے منتظم بنیں اورشفاعت کریں۔

"عن ابی هریرة ان رسول اللهﷺ قال لایموت لاحد من المسلمین ثلاثة من الولد فتمسه النار الا تحلة القسم" (باب ما جاء فی من قدم ولدا ترمذی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہﷺ نے فرمایا مسلمانوں میں سے کسی ایک کے تین بچے فوت ہوجائیں تواسے آگ نہیں چھوئے گی سوائے قسم کے پورا کرنے کے۔

قسم کے پورا کرنے کا مطلب یہ ہے کے اللہ تعالیٰ نے فرمایا"وما منکم الا واردھا" تم میں سے کوئی ایک نہیں مگر اسے آگ سے گذرنا ہوگا، یعنی پل صراط سے ہر ایک کو گذرنا ہوگا، جو جہنم پر ہوگا۔

☆ "عن عبد اللہ بن مسعود قال قال رسول اللہ ﷺ من قدم ثلاثۃ لم یبلغوا الحنث کانوا لہ حصنا حصینا قال ابو ذر قدمت اثنین قال واثنین فقال ابی بن کعب سید القراء قدمت واحدا قال واحد ولکن انما ذلک عند الصدمۃ الاولی"

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے نابالغ تین بچے آگے بھیجے (یعنی جس کے نابالغ تین بچے فوت ہوگئے) تو وہ اس کے لئے مضبوط قلعہ بنیں گے۔ (یعنی اس کی شفاعت کریں گے) حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرے دو بچے فوت ہوئے ہیں، آپ نے فرمایا دو ہی (شفاعت کریں گے) سید القراء حضرت ابی بن کعب نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرا ایک بچہ فوت ہوا ہے، آپ نے فرمایا ایک ہی شفاعت کرے گا۔ لیکن انسان کو اولاد کی وفات پر یہ مرتبہ اس وقت حاصل ہوگا جبکہ اس نے صدمہ پہنچتے ہی صبر سے کام لیا۔

(حوالہ مذکور)

☆ "عن ابن عباس یحدث انہ سمع رسول اللہ ﷺ یقول من کان لہ فرطان من امتی ادخلہ اللہ بھما الجنۃ فقالت لہ عائشہ فمن لہ فرط من امتک قال ومن کان لہ فرط یاموفقۃ قالت فمن لم یکن لہ فرط من امتک قال فانا فرط لن یصابوا بمثلی"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ میری امت میں سے جس شخص کے دو چھوٹے بچے فوت ہوگئے جو اس کے لئے منتظم بنیں تو اللہ تعالیٰ اسے ان دو کے ذریعے جنت میں داخل فرمائے گا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ آپ کی امت سے اگر کسی کا ایک بچہ فوت ہوا تو آپ نے فرمایا وہ ایک کے ذریعے ہی جنت میں داخل ہوگا، وہی اس کا منتظم ہوگا۔ اسے نیکیوں کی توفیق دی گئی۔ پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا آپ کی امت میں سے کسی کا ایک بچہ بھی نہ فوت ہوا تو؟ آپ نے فرمایا اس کا میں منتظم ہوں گا، میرے جیسی کسی اور کو مصیبتیں حاصل نہیں ہوئیں۔

(حوالہ مذکور)

" الفرط هنا الولدالذی مات قبله فانه یتقدم ویهئ لوا لدیه منزلا فی الجنة "

حدیث شریف میں جولفظ فرط استعمال ہوا ہے اس کا معنی یہاں ''بچہ جو آگے گیا ہے اور والدین کے لئے جنت میں والدین کے لئے مقام تیار کرنے میں مشغول ہو۔

"یا موفقة ای با لخیرات والاسولة الواقعة مو قعها شفقة علی الامة" (مرقاۃ)

اے بھلائی کی توفیق دی گئی، اور موقعہ محل کے مطابق سوال کرنے کی توفیق دی گئی، تمہارے یہ سوال امت کی بھلائی کے لئے ہیں اور ان پر شفقت ہے۔

"فانا فرط لن یصابو امثلی: ای بمثل مصیبتی لهم فان مصیبتی اشد علیهم من سائر المصائب واکو ن انا فرطهم" (مرقاۃ)

جس کا کوئی بچہ فوت نہ ہوا اس کے آگے میں منتظم ہوں گا، کیونکہ میری جیسی مصیبتیں کسی اور نے نہیں جھیلیں۔ میری مصیبتوں کو سن کر صبر کرنے والوں کا میں آگے جا کر منتظم بنوں گا۔

آسان مفہوم راقم کو یوں سمجھ آتا ہے کہ آپ نے فرمایا جس کا کوئی نہیں ہوگا اس کا میں ہوں گا، میرے جیسا شفاعت کرنے والا اور میرے جیسا آگے جا کر انتظام کرنے والا اور کون ہوگا۔

(۵) ہر قسم کی نیکیاں مراد ہیں، کہ تم اپنے لئے آگے نیکیاں بھیج دو، کیونکہ آگے آنے والے الفاظ ''واتقوا اللہ'' سے یہ مفہوم سمجھنا آسان ہے۔ (ماخوذ از خازن و مظہری)

''واتقوا اللہ'': اور اللہ سے ڈرو۔

ان الفاظ مبارکہ میں تحذیر پائی گئی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ڈرایا ہے، اور ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں جس چیز کا حکم دیا ہے اور جن چیزوں سے منع کیا ہے ان میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ (روح المعانی وقرطبی)

اللہ تعالیٰ کے اوامر (احکام) میں سے یہ بھی ہے کہ عورتوں سے قبل (اگلے حصہ) میں جماع کرو، اور جماع سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کا حکم نبی کریم ﷺ نے دیا، آپ کے ارشادات بھی درحقیقت رب تعالیٰ کے ارشادات ہی ہیں، کیونکہ آپ کے ارشادات رب تعالیٰ کی منشاء کے مطابق ہوتے ہیں۔

اور رب تعالیٰ نے نواہی (جن کاموں سے منع کیا گیا ہے) کے معاملہ میں رب تعالیٰ سے ڈرو، ان نواہی میں سے دبر (پچھلے حصہ) میں وطی کرنا ہے، جو کہ حرام ہے۔ (از صاوی)

"(وتقوا الله)ان تضیعوا بذره بوضعه فیمالا یحل"

اور اللہ سے ڈرو اس معاملہ میں کہ اپنا بیج حرام جگہ پر رکھ کر ضائع کرنے سے۔

یعنی تمہاری ازواج تمہاری کھیتیاں ہیں، اپنا نطفہ مقام پیدائش میں رکھو، جو بیج کی حیثیت رکھتا ہے۔ دبر میں نطفہ ڈال کر اپنا بیج ضائع نہ کرو۔ (تبصیر الرضی)

"وعلموا انکم ملاقوه": اور جان رکھو بے شک تم نے ملنا ہے اس سے۔

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان رحمہ اللہ نے "واعلموا" کا ترجمہ کیا ہے "اور جان رکھو" راقم نے بھی یہی نقل کیا ہے، کیونکہ خطاب مومنین کو ہے جو پہلے سے جانتے اور ایمان رکھتے ہیں کہ انہوں نے رب تعالیٰ سے ملنا ہے۔ اس لئے مطلب یہ ہے کہ جو تم جانتے ہو اس پر قائم بھی رہو۔

ان الفاظ مبارکہ سے ڈرانے میں اور مبالغہ کیا گیا ہے کہ تم نے رب تعالیٰ سے ملنا ہے، اس نے تمہیں نیکیوں کا ثواب اور گناہوں کو عذاب دینا ہے۔ لہٰذا تم اس سے اچھی ملاقات کی تیاری کرلو کہ نیکی کے کام کرلو، برائیاں کر کے اپنے آپ کو رسوا نہ کرو۔

☆ "عن ابن عباس قال سمعت رسول الله ﷺ وهو يخطب يقول انكم ملا قوا الله حفاة عراة مشاة غرلا" ثم تلا رسول الله ﷺ واتقو الله واعلموا انكم ملا قوه"

(اخرجه مسلم بمعناه)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے دوران خطبہ سنا کہ آپ فرما رہے تھے، بے شک تم نے اللہ تعالیٰ سے ایسے حال میں ملنا ہے کہ تمہارے پاؤں میں جوتا نہیں ہو گا، تمہارے جسم پر لباس نہیں ہوگا، تم پیدل چل رہے ہو گے، تم غیر ختنہ شدہ ہو گے۔

(از روح المعانی وقرطبی)

”وبشر المؤمنین“: اور (اے محبوب) بشارت دو مومنوں کو۔

یعنی وہ لوگ جنہوں نے اللہ تعالٰی کے اوامر کے مطابق عمل کیا اور نواہی سے اجتناب کیا، ان کو بشارت دو، کیونکہ اللہ تعالٰی کے فضل وکرم اور اس کی عطاء سے ان کے ایمان نے انہیں گناہوں سے دور رکھا اور نیکیوں میں مشغول رکھا۔ جو لوگ اللہ تعالٰی کی عطاء اور ایمان سے خالی ہوتے ہیں وہ گناہوں سے اجتناب نہیں کر سکتے اور نہ ہی نیکیوں میں مشغول رہ سکتے ہیں۔ (از روح البیان)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

ابھی تک چھ مرتبہ ”یسئلونک“ ذکر کیا گیا ہے۔ پہلے تین مرتبہ کے ساتھ واؤ نہیں اور بعد میں تین مرتبہ واؤ بھی مذکور ہے یعنی ”ویسئلونک“ مذکور ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے تین سوال مختلف مواقع پر کئے گئے، اس لئے ان کے ساتھ واؤ ذکر نہیں، کیونکہ واؤ جمعیت پر دلالت کرتی ہے۔ لیکن بعد والے سوال ایک ہی موقع پر کئے گئے ہیں اس لئے ان کے درمیان واؤ کو ذکر کر دیا گیا ہے تاکہ ان سوالات کی جمعیت کا پتہ چلتا رہے۔ (از مدارک التنزیل)

☆☆☆☆☆

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ☆

(سورة البقرة آیت نمبر ۲۲۴)

☆ ۱ ☆

اور اللہ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بنالو کہ احسان اور پرہیز گاری اور لوگوں میں صلح کرنے کی قسم کرلو اور اللہ سنتا جانتا۔

☆ ۲ ☆

اور نہ بناؤ اللہ (کے نام) کو نشانہ اپنی قسموں کے لئے کہ نیکی نہیں کرو گے اور پرہیز گاری نہیں کرو گے اور صلح نہیں کرو گے لوگوں کے درمیان۔ اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

شانِ نزول:

اس آیۂ کریمہ کے شانِ نزول میں مختلف اقوال ہیں۔ یعنی کئی وجوہ درپیش آنے کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔

(۱) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی، جبکہ مسطح نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے خلاف بہتان میں کلام کیا، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کی کفالت نہ کرنے سے اس پر خرچ نہ کرنے کی قسم اٹھالی۔

(۲) عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بہن کے خاوند بشیر بن نعمان سے کلام نہ کرنے کی جب قسم اٹھائی تو اس وقت یہ آیۃ نازل ہوئی۔ (قرطبی، خازن)

آیۃ کریمہ کے معنی میں دو احتمال:

"الاول وھو الذی ذکرہ ابو مسلم الاصفھانی وھو الاحسن"

پہلا احتمال وہ ہے جو ابو مسلم اصفہانی نے پیش کیا ہے، اور وہ احسن احتمال ہے۔ وہ احتمال یہ ہے۔

"(ولا تجعلوا اللہ عرضۃ لایمانکم) نھی عن الجراۃ علی اللہ بکثرۃ الحلف"

کہ زیادہ قسمیں اٹھا کر اللہ تعالیٰ پہ جرأت کرنے سے منع کیا گیا ہے کہ قسمیں اٹھا کر اللہ تعالیٰ کے نام کو نشانہ نہ بناؤ۔

"لان من اکثر ذکر شئ فی معنی من المعانی فقد جعلہ عرضۃ لہ"

اس لئے کہ جب کسی چیز کے معنی اور صفت کو زیادہ ذکر کیا جائے تو اسے نشانہ بنانا لازم آتا ہے۔

جیسا کہ کوئی شخص کسی کو کہے "قدجعلتنی عرضۃ للومک" تحقیق تو نے مجھے اپنی ملامت کا نشانہ بنایا۔

اسی طرح کسی شاعر نے کہا "ولا تجعلنی عرضۃ للوائم" اپنی ملامتوں کا مجھے نشانہ بناؤ۔

اللہ تعالیٰ نے زیادہ قسمیں اٹھانے کی مذمت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا "ولا تطع کل حلاف مھین" اور نہ اطاعت کرو ہر زیادہ قسمیں اٹھانے والے ذلیل کی۔

اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "واحفظوا ایمانکم" اور حفاظت کرو اپنی قسموں کی۔

یعنی کم قسمیں اٹھاؤ، اگر کہیں قسم اٹھانے کی ضرورت در پیش آجائے تو اس پر قائم رہ کر اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔

عرب حضرات کم قسمیں اٹھانے والے کی تعریف کرتے ہیں، کم قسمیں اٹھانے کی بہتری میں حکمت یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے نام کی قلیل و کثیر قسمیں اٹھانے کی عادات بنالیتا ہے۔

"ولا یبقی للیمین فی قلبہ وقع فلا یؤمن اقدامہ علی الیمین الکاذبۃ فیختل ماھو الغرض الاصلی فی الیمین"

تو اس کے دل میں قسم کی کوئی قدر و منزلت نہیں رہتی، اور وہ جھوٹی قسمیں اٹھانے سے بھی باز نہیں رہتا، اس طرح تو اس کے دل میں قسم کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے یا اس میں خلل واقع ہوتا ہے۔

کیونکہ اصل میں قسم اٹھانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام کی قدر کرتے ہوئے اپنی قسم پر قائم رہے۔

''وایضا کلما کان الانسان اکثر تعظیما لله تعالیٰ کان اکمل العبودیة''

اور یہ ہے جب انسان اللہ تعالیٰ کی زیادہ تعظیم کرے گا، اسے عبادت میں کمال حاصل ہوگا۔

''ومن کمال التعظیم ان یکون ذکر الله تعالیٰ اجل واعلیٰ عنده من ان یستشهد به فی غرض من الاغراض الدنیویة''

رب تعالیٰ کی کامل تعظیم یہ ہے کہ انسان اس کے ذکر کو اعلیٰ اور معظم سمجھے، اس کے نام دنیاوی غرضوں میں بطور قسم اور بطور دلیل نہ پیش کرے۔

اس تمہید کے بعد اصل مقصد کی طرف آئیں وہ یہ ہے۔

''واما قوله تعالیٰ بعد ذلک (ان تبروا) فهو علة لهذا المعنی''

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ''ان تبروا'' قسم اٹھانے کی ممانعت کی علت ہے۔

اب مطلب یہ ہوگا کہ رب تعالیٰ کی طرف سے یہ کہا گیا کہ میں نے تمہیں زیادہ قسمیں اٹھانے سے اس لئے منع کیا ہے تاکہ تم سے نیکی، تقویٰ اور اصلاح فوت نہ ہو جائے۔ اب ان الفاظ گرامی......

''ولا تجعلوا الله عرضة لایمانکم ان تبروا وتتقوا وتصلحوا بین الناس'' کا معنی یہ ہوگا۔

'' فتکونون یا معشر المؤمنین بررة اتقیاء مصلحین فی الارض غیر مفسدین''

اور اللہ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ تاکہ تم نیک اور متقی لوگوں میں صلح کرانے والے بن جاؤ۔

سوال : قسم نہ اٹھانا عبادت کیسے ہے؟

جواب : جب انسان یہ خیال کرتے ہوئے قسم نہیں اٹھائے گا کہ اللہ تعالیٰ کا نام بہت ہی معظم ومکرم ہے، میں اسے دنیاوی گھٹیا مقاصد حاصل کرنے میں کیوں استعمال کروں '' فلاشک ان هذا من اعظم ابواب البر'' تو یقیناً یہ بہت بڑی نیکی کا کام ہوگا۔

قسم کا چھوڑنا تقویٰ کیسے؟ یہ تو واضح ہے، کیونکہ تقویٰ کا معنی ہے بچنا، جب انسان قسم اٹھانے سے اس لئے

بچے گا کہ دنیاوی گھٹیا مقاصد کے لئے اللہ تعالیٰ کے نام کی عظمت میں خلل نہ آئے، تو یہی تقویٰ ہے۔

قسم کو چھوڑنے سے اصلاح بین الناس کیسے حاصل ہوگی؟ وہ اس طرح کہ جب لوگ اس کے تقویٰ اور نیکی پر اعتبار کریں گے تو وہ اس کے متعلق یہ اعتقاد بھی رکھیں گے کہ یہ فساد سے دور ہے اور کسی قسم کی غلط طرفداری نہیں کرتا تو وہ اس سے اپنے جھگڑوں کے فیصلے کرائیں گے، یہ ان کے درمیان اصلاح کرائے گا۔

اس بحث کے بعد:

ابھی تک جو احتمال بیان کیا گیا اس کے مطابق حضرت علامہ مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ کا ترجمہ دیکھیں۔

''اور نہ بناؤ تم اللہ کو نشانہ واسطے قسموں اپنی کے یہ کہ بھلائی کرو اور پرہیزگاری کرو اور درستی کرو درمیان لوگوں کے اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے'' (مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ)

دوسرا احتمال:

''العرضة عبارة عن المانع'' یعنی اس آیۂ کریمہ کی دوسری تفسیر یہ ہے ''عرضة'' کا معنی ہو ''مانع رکاوٹ'' یہ معنی بھی عرب حضرات لیتے ہیں، جیسا کہ کہا جاتا ہے ''اردت افعل کذا فعرض لی امر کذا'' میں نے فلاں کام کرنے کا ارادہ کیا، لیکن اس میں اس طرح رکاوٹ درپیش آگئی۔

اسی طرح کہا جاتا ہے ''اعترض علی'' فلاں شخص نے اعتراض کر کے مجھے کام سے روک دیا۔

اسی طرح راستہ میں کوئی چیز رکھ کر اگر راستہ کو روک دیا جائے تو اسے بھی '' عرضة '' کہتے ہیں۔

اب اس معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوا۔

''ولا تجعلوا ذکر اللہ مانعا بسبب ایمانکم من ان تبروا وفی ان تبروا''

اور تم اللہ کے ذکر کو رکاوٹ نہ بناؤ، بسبب اپنی قسموں کے نیکی کے کام کرنے سے اور تقویٰ کرنے سے اور لوگوں کے درمیان اصلاح کرنے سے۔

اس کی وجہ اصل میں یہ تھی کہ لوگ نیکی کے کام چھوڑنے کی قسم کی اٹھا لیتے تھے کہ صلہ رحمی نہیں کروں گا، یا لوگوں میں صلح نہ کرانے کی قسم اٹھا لیتے تھے، اس طرح کسی پر احسان نہ کرنے کی قسم اٹھا لیتے تھے، پھر کہتے تھے کہ میں یہ کام کر لیتا لیکن میں نے قسم اٹھا رکھی ہے، اس لئے قسم سے حانث ہو جانے کی وجہ سے یہ کام نہیں کرتا۔

اب اس احتمال کے مطابق معنی یہ ہوگا۔

''ولا تجعلوا ذکر اللہ ما نعابسبب ھذہ الایمان عن فعل البر والتقوی''

قسموں میں اللہ تعالیٰ کے نام کو رکاوٹ نہ بناؤ نیکی کے کام کرنے سے اور تقوی کرنے سے اور لوگوں میں اصلاح کرنے سے۔

اسی احتمال کو آسان کرنے کے لئے جلالین میں تفسیر یوں کی گئی۔

''(ولا تجعلوا اللہ)ای الحلف بہ (عرضۃ)علۃ مانعۃ(لایمانکم)(ان)لا(تبروا وتتقوا) (وتصلحوا بین الناس)''

اور اللہ تعالیٰ کے نام کو رکاوٹ نہ بناؤ کہ قسمیں اٹھاؤ کہ تم نیکی کے کام نہیں کرو گے اور تقوی نہیں کرو گے اور لوگوں کے درمیان اصلاح نہیں کرو گے۔ (ماخوذ از کبیر)

حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ کا ترجمہ ضیاء القرآن میں جلالین کی تفسیر کے مطابق ہے۔ آپ فرتے ہیں۔

''اور نہ بناؤ اللہ (کے نام) کو رکاوٹ اس کی قسم کھا کر نیکی نہ کرو گے اور پرہیز گاری نہ کرو گے اور صلح نہ کراؤ گے لوگوں میں اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والا، جاننے والا ہے'' (ضیاء القرآن)

ابو بکر جصاص رحمہ اللہ نے یہ دنوں معنی ذکر کرنے کے بعد فرمایا۔

''واذا کانت الآیۃ محتملۃ للمعنیین ولیسامتضادین فالواجب حملھاعلیھاجمیعا''

آیۃ کریمہ میں جب دو معنوں کا احتمال ہے اور دونوں معنی میں کوئی تضاد (مخالفت) بھی نہیں تو ضروری ہے کہ دونوں معانی جمع کر لئے جائیں۔ (احکام القرآن للجصاص)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ دونوں احتمالوں کا جامع ہے:

پہلے آپ کا ترجمہ پھر سے دیکھئے۔

''اور اللہ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بنالو کہ احسان اور پرہیز گاری اور لوگوں میں صلح کرنے کی قسم کرلو، اور اللہ سنتا جانتا ہے''۔ (کنز الایمان)

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اور مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ کا ترجمہ بظاہر ایک ہی طرح نظر آتا ہے، جبکہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ میں ''کہ'' بیان کے لئے بنایا جائے۔

لیکن اگر راقم کی اس توجیہ کے مطابق دیکھیں تو دونوں احتمالات کا جامع نظر آئے گا۔

یعنی آپ نے فرمایا کہ اللہ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ، زیادہ قسمیں نہ اٹھاؤ کہ ان قسموں کی آڑ میں نیکی کے کام بھی چھوڑ دو، ہاں اگر تمہیں نیکی کا کام کرنے کے لئے قسم اٹھانی پڑے، اور تقوی کے لئے قسم اٹھانے کی ضرورت در پیش آئے اور لوگوں میں صلح کرانے کی ضرورت کے لئے قسم اٹھانا چاہو تو قسم اٹھالو۔

جصاص کی عبارت دیکھو اور اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی توضیح راقم کی دیکھو تو امید غالب ہے کے آپ کو بہت خوب نظر آئے گا۔

ہاں یہ بھی خیال کیا جائے کہ راقم نے ''عرضة'' کا معنی نشانہ کر کے، اور بعد میں '' لا ''مقدر مان کر جو ترجمہ پیش کیا ہے، اس میں بھی جصاص کے قول کے مطابق دونوں احتمالوں کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

''واللہ سمیع علیم'': اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے اقوال اور تمہاری قسموں کو سننے والا ہے، اور تمہاری نیتوں کو اور تمہارے احوال کو جاننے والا ہے، لہٰذا تمہیں چاہئے کے اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے ان پر عمل کرو، اور عمل پر محافظت کرو۔

قسم کے متعلق چند احادیث:

"عن ابن هريرة قال كان رسول الله ﷺ من خلف على يمين فرأى خيرا منها فليكفر عن يمينه وليفعل " وفي رواية فليات الذى هو خير وليكفر عن يمينه " (مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص کسی کام کی قسم اٹھالے اور اس کا غیر کام بہتر دیکھے تو وہ بہتر کام کرے (جو بہتر نہیں اسے چھوڑ دے) اور قسم کا کفارہ ادا کر دے۔

علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

" من حلف على فعل شئ اوتركه وكان الحنث خيرا من التمادى على اليمين استحب له الحنث وتلزمه الكفارة وهذا متفق عليه واجمعوا على ان لا تجب عليه الكفارة قبل الحنث وعلى انه يجوزتا خيرها عن الحنث "

جو شخص قسم اٹھائے کہ میں یہ کام کروں گا، حالانکہ اسے چھوڑنا بہتر ہے تو وہ کام نہ کرے، یعنی قسم کو توڑ دے اور کفارہ ادا کرے، اسی طرح اگر قسم اٹھائی تھی کہ میں یہ کام نہیں کروں گا لیکن وہ کام کرنا بہتر ہے تو وہ کام کرے اور قسم کا کفارہ ادا کرے، یعنی ان صورتوں میں قسم کا توڑنا بہتر ہے اور قسم کے توڑنے کی وجہ سے کفارہ ادا کرے۔

اگر کوئی شخص فرض کام کے چھوڑنے یا حرام کام کرنے کی قسم اٹھادے تو اس قسم کو توڑنا فرض ہو جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا قسم کو توڑنا:

"عن ابى قلابة قال كنا عند ابى موسى فدعابمائد ته وعليها لحم دجاج فد خل رجل من بنى تيم الله احمر شبيه بالموالى فقال له هلم فتلكا فقال هلم فانى قدرأيت رسول الله ﷺ ياكل منه فقال الرجل انى رأيته ياكل شيئا فقذرته فحلفت ان لا اطعمه فقال هلم احد ثك عن ذلك انى اتيت رسول الله ﷺ فى رهط من الاشعريين نستحمله

فقال والله لا احملكم وماعندی احملکم علیه فلبثناماشاء الله فاتی رسول الله ﷺ بنهب ابل فدعابنا فامرلنا بخمس ذودغر الذری قال فلماانطلقناقال بعضنا لبعض اغفلنا رسول الله ﷺ یمینه لا یبارک لنا فرجعنا الیه فقلنا یا رسول الله ﷺ اناا تیناک نستحملک وانک حلفت ان لا تحملنا ثم حملتنا افنسیت یا رسول الله ﷺ قال انی والله ان شاء الله لا احلف علی یمین فاری غیرها خیرامنها الا اتیت الذی هو خیر وتحللتهاافانطلقوا فانما حملکم الله عزوجل" (مسلم کتاب الایمان)

ابوقلابہ کہتے ہیں ہم ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس تھے آپ نے دسترخوان منگوایا اس پر مرغ کا گوشت تھا، ایک شخص بنی تیم اللہ سے وہاں آئے، ان کا رنگ سرخ تھا، غلاموں کے مشابہ تھے، حضرت ابوموسیٰ نے انہیں کہا آؤ (یعنی کھانا کھاؤ) انہوں نے کچھ تاخیر کی، حضرت ابوموسیٰ نے کہا آؤ، بیشک میں نے رسول اللہ ﷺ کو مرغ کا گوشت کھاتے ہوئے دیکھا، وہ شخص کہنے لگے میں نے ایک مرتبہ مرغ کو کوئی چیز کھاتے ہوئے دیکھا تو قسم اٹھا دی کہ اسے نہیں کھاؤں گا۔ انہوں نے کہا آؤ میں تمہیں اس (قسم اٹھانے) کے متعلق حدیث بیان کروں، بیشک میں اشعری قبیلہ کے چند آدمیوں سے مل کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ سے بوجھ اٹھانے والے جانور طلب کرنے لگے، آپ نے فرمایا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں تمہیں کوئی بوجھ اٹھانے والا جانور نہیں عطا کروں گا اور نہ ہی میرے پاس اس قسم کے جانور ہیں۔ ہم وہاں ٹھہرے جتنی دیر رب تعالیٰ کو منظور تھا، تو بیشک رسول اللہ ﷺ کے پاس غنیمت کے اونٹ آ گئے، آپ نے ہمیں بلایا اور ہمیں حکم دیا کہ ان کو پانچ اونٹ سفید بلند کوہانوں والے دے دو، ابوموسیٰ کہتے ہیں جب ہم اونٹ لے کر چلے تو ہم میں سے بعض نے بعض کو کہا، ہم نے رسول اللہ ﷺ کو قسم سے غافل رکھا (کہ آپ کو یاد نہ رہا اور ہم نے یاد نہ دلایا) اللہ تعالیٰ ہمیں برکت عطا نہیں کرے گا، تو ہم آپ کے پاس لوٹ کر آئے ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم آپ کے پاس آئے اور ہم نے آپ سے بوجھ اٹھانے والے جانور

طلب کئے، تو آپ نے قسم اٹھائی تھی کہ میں تمہیں نہیں عطا کروں گا، پھر آپ نے ہمیں عطا کر دیئے۔ کیا آپ بھول گئے یارسول اللہ؟ آپ نے فرمایا بے شک قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو میں کسی کام کی قسم نہیں اٹھاتا مگر میں جب اس سے بہتر کام کو دیکھتا ہوں تو وہ بہتر کام کر لیتا ہوں اور قسم کو توڑ دیتا ہوں، تم چلو اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ عطا کئے ہیں۔

فوائد:

(۱) حدیث پاک سے اصل مسئلہ واضح ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ نے جو قسم اٹھائی تھی کہ ان لوگوں کو سواریاں نہیں عطا کی جائیں گی، پھر جب آپ نے دیکھا کہ ان کو سواریاں دینا بہتر ہے تو آپ نے قسم توڑ دی اور ان لوگوں کو سواریاں عطا کر دیں۔

(۲) اگرچہ نبی کریم ﷺ نے تلذذ والے کھانے زیادہ طور پر استعمال نہیں فرمائے، لیکن کبھی کبھی استعمال کر لئے جیسا کہ مرغ کا گوشت بھی بعض اوقات کھالیا۔

(۳) ان لوگوں کو سواریاں نہ عطا کرنے کے متعلق قسم اٹھانے کی اصل وجہ آپ کا کسی وجہ سے غم و غصہ تھا جس کا ذکر دوسری حدیث شریف میں موجود ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قسم توڑنا:

"عن عبدالرحمن بن ابی بکر قال نزل علینا اضیاف لنا و کان ابی یتحدث الی رسول اللہ ﷺ من اللیل قال فانطلق وقال یا عبدالرحمن افرغ من اضیافک قال فلما امسیت جئنا بقراهم قال فابوافقالوا حتی یجئ ابو منزلنا فیطعم معناقال لهم انه رجل حدید وانکم ان لم تفعلوا خفت ان یصیبنی منه اذی قال فابوافلماجاء لم یبدأ بشیء اول منهم فقال افرغتم من اضیافکم قال قالوا لاواللہ مافرغنا،قال الم آمر عبدالرحمن قال وتنحیت عنه فقال یاعبدالرحمن قال فتنحیت عنه قال فقال

يـاغـنثر اقسمت عليك ان كنت تسمع صوتي الا جئت قال فجئت قال فقلت والله مالي ذنب هؤلاء اضيافك فسلهم قدا تيتهم بقراهم فابوان يطعموا حتى تجئ قال فقال مالكم ان لاتقبلوا عنا قراكم قال فقال ابوبكر فوالله لااطعمه الليلة قال فقالوا فوالله لانطعمه حتى تطعمه قال فقال مارأيت كالشر كالليلة قط ويلكم مالكم الا تقبلوا عنا قراكم قال ثم قال اماالاولى فمن الشيطان هلموا قراكم قال فجئ بالطعام فسمى فاكل واكلوا قال فلما اصبح غداعلى النبی ﷺ فقال يا رسول الله بروا وحنثت قال فاخبره قال بل انت ابرهم واخيرهم قال ولم تبلغني كفارة''

(مسلم، ج۲، ص ۱۹۴، باب اکرام الضیف الخ)

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر فرماتے ہیں ہمارے پاس کچھ مہمان آئے، چونکہ میرے باپ رات کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ باتیں کرتے رہتے تھے، اسی معمول کے مطابق چلے گئے۔ اور کہہ گئے اے عبدالرحمٰن مہمانوں سے (کھانا کھلاکر) فارغ ہو جانا، عبدالرحمٰن کہتے ہیں جب شام ہوئی تو ہم نے ان کے پاس مہمان نوازی کے لئے کھانا پیش کیا، تو انہوں نے انکار کر دیا، اور کہنے لگے گھر کے صاحب جب آجائیں گے اور ہمارے ساتھ مل کر کھائیں گے تو ہم بھی کھالیں گے میں نے ان کو کہا وہ بہت سخت آدمی ہیں اگر تم نے کھانا نہ کھایا تو مجھے ڈر ہے کہ مصیبت مجھے ہی پہنچے گی آپ کہتے ہیں، انہوں نے پھر بھی انکار کر دیا، حضرت ابوبکر جب واپس آئے تو آتے ہی سب سے پہلے سوال یہی کیا، کیا تم مہمانوں کو (کھانا کھلانے) سے فارغ ہو چکے ہو۔ گھر کے حضرات نے بتایا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی ہم فارغ تو نہیں ہوئے، تو آپ فرمانے لگے کیا میں نے عبدالرحمٰن کو حکم نہیں دیا تھا؟ عبدالرحمٰن کہتے ہیں میں وہاں سے ہٹ گیا، آپ نے فرمایا اے عبدالرحمٰن، وہ کہتے ہیں میں ہٹ کر ہی رہا۔ (یعنی آپ سے ڈرنے کی وجہ خاموش رہا) پھر آپ نے فرمایا اے سست وجاہل! میں تمہیں قسم دلا کر کہتا ہوں اگر تم میری آواز سن رہے ہو تو سامنے آجاؤ۔ عبدالرحمٰن کہتے ہیں میں سامنے ہو گیا، میں نے عرض کیا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میرا اس میں کوئی گناہ نہیں، یہ ہیں

آپ کے مہمان، آپ ان سے پوچھ لیں، میں ان کے پاس کھانا لایا، انہوں نے کھانے سے انکار کر دیا کہ آپ آ جائیں پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مہمانوں کو کہا تمہیں کیا ہوا تھا کہ تم نے ہماری مہمان نوازی کو قبول نہیں کیا۔ (بس یہ کہتے ہی غصہ میں) آپ نے کہا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں اس رات کو کھانا نہیں کھاؤں گا، مہمانوں نے کہا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی ہم بھی اس وقت تک کھانا نہیں کھائیں گے جب تک آپ نہیں کھائیں گے۔ آپ نے کہا میں نے اس رات کے شر کی طرح کوئی شر نہیں دیکھا۔ تم پر افسوس تم نے ہماری مہمان نوازی کو کیوں نہیں قبول کیا تھا، پھر آپ نے کہا میرا قسم اٹھانا شیطان کی طرف سے وسوسہ تھا، آؤ اب میں تمہیں کھانا کھلاؤں۔ آپ نے طعام طلب کیا، پہلے خود بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کیا، پھر مہمانوں نے بھی کھایا۔ صبح نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ! وہ لوگ تو اپنی قسموں پر پورے اترے، لیکن میں نے قسم کو توڑ دیا۔ حضور ﷺ کو جب واقع کی خبر دی تو آپ نے فرمایا کہ قسم کو تو تم ان سے زیادہ پورے کرنے والے ہوئے اور تم ان سے زیادہ بہتر ہو۔ حضرت ابوبکر کہتے ہیں قسم توڑنے سے پہلے مجھے کفارہ نے نہیں پایا، یعنی میں نے قسم توڑنے سے پہلے کفارہ ادا نہیں کیا۔

وضاحت حدیث:

حدیث پاک سے مقصود تو آخری حصہ بیان کرنا تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے غصہ سے جب قسم اٹھادی کہ میں اس رات کھانا نہیں کھاؤں گا تو مہمانوں نے بھی قسم اٹھادی کہ ہم بھی اس وقت کھانا نہیں کھائیں گے۔ اب اس صورت حال کے پیش نظر اگر آپ اپنی قسم پر قائم رہتے تو مہمان بھوکے رہتے، جب اس کی غیر صورت زیادہ بہتر تھی کہ آپ قسم کو توڑ کر کھانا کھالیں تا کہ آپ کے مہمان بھی کھانا کھالیں، اسی وجہ سے آپ نے قسم کو توڑ دیا اور نبی کریم ﷺ نے بھی اس کی تعریف فرمائی، جس کا مقصد یہ تھا کہ تمہارا قسم کو توڑنا بنسبت ان کے قسم پر قائم رہنے سے بہتر تھا، تو گویا کہ ان سے زیادہ قسم کو پورا کرنے والے تم ہی ہو، اور تمہیں ہی زیادہ ثواب حاصل ہوا۔ لہٰذا تم ان سے بہتر ہو۔

وہ مہمان کون تھے؟

دوسری روایت میں اس کی وضاحت موجود ہے کہ وہ اصحاب صفہ تھے جو فقیر لوگ تھے۔ایک دن نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس کے گھر دو آدمیوں کا طعام ہے وہ تیسرا شخص ان سے لے جائے ،اس کھانے میں تین آدمی مکمل ہو جائیں گے۔جس کے پاس چار آدمی کا طعام ہے وہ پانچویں اور چھٹے کو لے جائے۔

" وان ابابکر جاء بثلاثه وانطلق نبی اللہ ﷺ بعشرة "

بے شک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تین مہمانوں کو لے کر گئے ،اور خود نبی کریم ﷺ دس آدمیوں کو ساتھ لے کر گئے۔

اس واقعہ میں عجیب کرامت کا ظہور:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب قسم توڑ کر طعام سے لقمہ کھایا،تو حضرت عبدالرحمٰن کہتے ہیں۔

" وایم اللہ ماکنا نا خذ من لقمة الا ربا من اسفلها اکثر منها قال حتی شبعنا وصارت اکثر مما کانت قبل ذلک فنظر الیها ابو بکر فاذاھی کما ھی او اکثر قال لأمراته یا اخت بنی فراس ماھذا قالت لا وقرة عینی لھی الآن اکثر منها قبل ذلک بثلاث مرار قال فاکل منها ابوبکر وقال انما کان ذلک من الشیطان یعنی یمینه ثم اکل منها لقمة ثم حملها الی رسول اللہ ﷺ فاصبحت عنده قال وکان بیننا وبین قوم عقد فمضی الاجل ففرقنا اثناعشر رجلا مع کل رجل منهم اناس اللہ اعلم کم مع کل رجل قال الا انه بعث معهم فاکلوا منها اجمعون او کما قال " (مسلم حوالہ مذکور)

قسم ہے اللہ تعالیٰ کی ہم کوئی لقمہ نہیں اٹھاتے تھے مگر یہ کہ نیچے سے وہ بڑھ جاتا اور پہلے سے زیادہ ہو جاتا یہاں تک کہ ہم سیر ہو گئے ،وہ کھانا پہلے سے زیادہ ہو گیا ،حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جب کھانے کو دیکھا تو وہ پہلے کی طرح تھا ،بلکہ بڑھ چکا تھا ،آپ نے اپنی زوجہ کو کہا اے بنی فراس قبیلہ

کی یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا اے میری آنکھوں کی ٹھنڈک میں تو یہی کہتی ہوں کہ یہ پہلے سے زیادہ ہو چکا ہے۔ تین مرتبہ انہوں نے یہ الفاظ دہرائے، یہ واقعہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قسم کو شیطان کی طرف منسوب کرنے اور قسم کو توڑ کر خود کھانا کھانے کے بعد درپیش آیا۔ صبح وہ کھانا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا، اور ہمارا معاہدہ ایک قوم سے چل رہا تھا ان کے بارہ سرداروں کی طرف ہم نے وہ کھانا بھیجا اور ان کے تحت کتنے ہی اور لوگ تھے وہ کھانا سب لوگوں نے کھایا۔

نبی کریم ﷺ سب سے زیادہ سخی تھے:

آپ نے باقی لوگوں کو حکم دیا کہ جس گھر میں دو شخصوں کا کھانا ہو وہ ایک مہمان لے جائے اور اسے کھانا کھلائے، اور اگر چار آدمیوں کا کھانا ہے تو ایک یا دو مہمان لے جاے، یعنی نسبت دو ایک کی ہی تھی۔ لیکن آپ خود ایک فرد کے کھانے پر ایک مہمان کو لے گئے، کیونکہ آپ کے گھر دس افراد تھے، نو ازواج مطہرات اور آپ خود۔ اس لئے آپ دس افراد کو ساتھ لے گئے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے کامل متبع تھے:

اس دن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی گھر کے تین افراد تھے، آپ خود اور آپ کی زوجہ اور آپ کا بیٹا عبدالرحمٰن۔ آپ بھی گھر کے ایک فرد کے مقابل ایک شخص کو لے کر گئے، یعنی تین مہمان آپ لے کر گئے تھے۔

قسم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفات سے اٹھائی جائے:

''عن ابن عمر قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول من حلف بغیر اللہ فقد اشرک''

(رواہ الترمذی، مشکوۃ، باب الایمان والنذور)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا، جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے غیر کی قسم اٹھائی، تحقیق اس نے اس کے ساتھ غیر کو شریک کر دیا۔

" فقد اشرک ای اشرک غیر الله به فی التعظیم البلیغ فکانه مشرک اشرا کا جلیا فیکون زجرا بمبا لغة " (مرقاۃ)

نبی کریم ﷺ کے ارشاد "فقد اشرک" کا مطلب یہ ہے اس نے اللہ تعالیٰ کے غیر کو رب تعالیٰ کے ساتھ کامل تعظیم میں شریک کر دیا، کیونکہ قسم تو اس کی اٹھائی جاتی ہے جو بہت ہی زیادہ تعظیم کے لائق ہو۔ گویا کہ آپ کے اس کلام سے واضح ہوا کہ وہ شخص شرک جلی (واضح شرک) کا مرتکب ہوا، اور اس میں بہت زیادہ زجر و توبیخ پائی گئی۔

"قال ابن الهمام من حلف بغير الله كالنبى و الكعبة لم يكن حالفا" (مرقاة، فتح القدير)

جس شخص نے اللہ کے غیر کی قسم اٹھائی جیسا کہ کہا "نبی کی قسم" یا یہ کہا "کعبہ کی قسم" تو اس کی قسم درست نہ ہوئی اور نہ ہی اس پر قسم کے احکام مرتب ہوں گے۔

تنبیہ : قدوری میں ذکر ہے۔

" ومن حلف بغير الله عز وجل لم يكن حالفا كالنبى عليه السلام و القرآن و الكعبة "

جس شخص نے اللہ کے غیر کی قسم اٹھائی تو وہ قسم اٹھانے والا نہیں ہوا، جیسا نبی علیہ السلام کی قسم اٹھائی۔ یا قرآن کی قسم اٹھائی یا کعبہ کی قسم اٹھائی۔

"و القرآن" پر راقم نے اپنے عربی حاشیہ "المظهر النورى" میں یوں وضاحت کی۔

"قوله و القرآن " قال فى الفتح ثم لا يخفى ان الحلف بالقرآن الآن متعارف فيكون يمينا كما هو قول الائمة الثلاثة ونقل فى الهندية عن المضمرات وقد قيل هذا فى زمانهم اما فى زماننا فيمين وبه ناخذ ونامر ونعتقد وقال محمد بن المقاتل الرازى انه يمين وبه اخذ جمهور مشائخنا فهذا مزيد لكونه صفة تعورف الحلف بها كعزة الله وجلاله" (شامى افتح القدير عالمگيرى)

فتح القدیر اور شامی اور عالمگیری میں اس کی وضاحت یوں کی گئی ہے کہ پہلے زمانہ میں قرآن بول کر اس سے مراد قرآن پاک کا نسخہ یعنی کتاب لیتے تھے، اب ہمارے زمانہ میں قرآن بول کر مراد اللہ

کا کلام لیتے ہیں، اللہ کا کلام اللہ کی صفت ہے، اس لئے اب ہمارے زمانہ میں قرآن پاک کی قسم اٹھانا متعارف ہے، اس لئے ہمارے جمہور مشائخ نے اسی پر عمل کیا ہے، لہٰذا ہم اس پر عمل کرتے ہیں، اسی کا حکم دیتے ہیں اور اسی کا عقیدہ رکھتے ہیں، یہ قسم ایسی ہی متعارف ہوگئی جیسے اللہ کی عزت کی قسم اور اللہ کے جلال کی قسم متعارف ہے۔ اور قرآن کی قسم واضح ہونے پر امام مالک امام شافعی امام احمد رحمهم الله کا اتفاق ہے۔ (المظهر النوری شرح القدوری)

"واليمين با الله تعالى اوبا سم من اسمائه كالرحمن والرحيم اوبصفة من صفات ذاته كعزة الله وجلاله وكبريائه الاقوله وعلم الله فانه لا يكون يمينا وان حلف بصفة من صفات الفعل كغضب الله وسخط الله لم يكن حا لفا" (قدوری)

قسم اٹھائے اللہ کی یا اللہ تعالیٰ کے ناموں سے کسی نام کی جیسے کہے رحمٰن کی قسم یا کہے رحیم کی قسم یا اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفات ذات کی قسم اٹھائے، جیسے کہے اللہ کی عزت کی قسم، اللہ کے جلال کی قسم، اللہ کی کبریائی کی قسم، تو یہ قسم ہوگی، اس پر تمام احکام قسم والے ہی جاری ہوں گے۔ البتہ اللہ کے علم کی قسم اٹھائے تو یہ قسم نہیں ہوگی۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کی صفات فعل میں سے کسی صفت کی قسم اٹھائے تو قسم نہیں ہوگی۔ جیسا کہ اللہ کے غضب اور اللہ کی ناراضگی کی قسم اٹھائے۔

"وعلم الله" پر راقم نے "المظهر النوری" میں یوں وضاحت کی۔

"قوله وعلم الله "ان المعتبر العرف وعدمه فی اليمن فالتعليل ليسن الابنفی المتعارف واما لو فرع علی القول المفصل بين صفة الذات وغير ها وجب ان يكون يمينا لان العلم من صفات الذات" (فتح القدير)

قسموں میں اعتبار عرف کا ہے، اللہ کے علم کی قسم نہ ہونے کا دارومدار عرف پر ہے۔ چونکہ اس وقت اللہ کے علم کی قسم اٹھانا متعارف نہیں تھا تو یہ کہہ دیا کہ یہ قسم نہیں۔ مطلب صرف یہ تھا کہ یہ قسم متعارف نہیں، یہ مطلب نہیں کہ ان الفاظ سے قسم بنتی ہی نہیں۔ کیونکہ علم صفات ذات سے ہے اور صفات ذات کی قسم اٹھائی جائے تو قسم لازم آتی ہے۔ (المظهر النوری)

صفات ذات اور صفات افعال میں فرق:

وہ صفات جن کی اضداد (ضدیں) اللہ تعالیٰ کی صفات نہ بن سکیں، وہ صفات ذات ہیں۔ جیسا کہ عزت رب تعالیٰ کی صفت ذات ہے، کیونکہ عزت کی ضد ذلت ہے، اللہ تعالیٰ ذلت سے متصف نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح علم رب تعالیٰ کی صفت ذات ہے، کیونکہ علم کی ضد جہالت ہے رب تعالیٰ جہالت سے پاک ہے۔

لیکن وہ صفات جن کی ضدوں سے بھی رب تعالیٰ متصف ہے وہ صفات فعل ہیں۔ رضاء رب تعالیٰ کی صفت فعل ہے۔ کیونکہ کہا جاتا ہے۔

"ان اللہ یر ضی بعباد ہ الایمان و لا یرضی با لکفر"

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ایمان کو پسند فرماتا ہے اور کفر کو پسند نہیں فرماتا۔

تو واضح ہوا کہ وہ رضاء اور عدم رضاء دونوں سے متصف ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کفار پر غضب فرماتا ہے اور کفار پر ناراض ہوتا ہے لیکن مومنوں پر رحم فرماتا ہے اور ناراض نہیں ہوتا۔ لہٰذا غضب اور سخط (ناراضگی) صفات فعل ہیں۔

واضح رہے:

کہ یہ ضابطہ بھی اکثر یہ ہے کہ صفات ذات سے قسم لازم آتی ہے اور صفات فعل سے نہیں، کیونکہ قسم کا دارومدار عرف پر ہے۔ اگر عرف میں صفات فعل سے قسم اٹھائی جاتی ہو تو وہ بھی قسم ہی ہوگی۔

(ماخوذ از مظہری النوری)

مسئلہ:

اگر کوئی شخص کہے اگر میں یہ کام کروں، یا یہ کام نہ کروں تو میں یہودی ہو جاؤں یا نصرانی ہو جاؤں یا کافر ہو جاؤں تو یہ بھی قسم ہے۔ قسم والے تمام احکام جاری ہوں گے۔

☆ "عن ابن عمرقال اکثرماکان النبیﷺ یحلف لا ومقلب القلوب"

(رواہ البخاری ، مشکوۃ باب الایمان والنذور)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اکثر طور پر نبی کریم ﷺ قسم اٹھاتے وقت فرماتے مقلب القلوب (دلوں کو پھیرنے والے) کی قسم۔

☆ "عن ابن عمر ان رسول اللہ ﷺ قال ان اللہ ینھا کم ان تحلفوا بابا ئکم من کان حالفا فلیحلف باللہ اولیصمت" (رواہ البخاری ومسلم ، مشکوۃ باب الایمان والنذرو)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا، بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں منع فرماتا ہے کہ تم اپنے آباء کی قسم اٹھاؤ، جو شخص قسم اٹھانا چاہتا ہے وہ اللہ کی قسم اٹھائے یا خاموش ہو جائے۔

وضاحت:

حدیث شریف میں آباء کی قسم اٹھانے سے ممانعت کی اصل وجہ یہ ہے کہ غیر خدا کی قسم نہ اٹھائے ، آباء کا ذکر اس لئے کر دیا گیا ہے کہ وہ اکثر طور پر آباء کی قسم اٹھاتے تھے۔

اعتراض:

رب تعالیٰ نے دن، رات، سورج، چاند وغیرہ کی قسمیں اٹھائی ہیں، تو کس طرح یہ کہنا صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے غیر کی قسم اٹھانا صحیح نہیں؟

جواب:

یہ قانون بندوں کے لئے ہے۔

"واما اللہ سبحانہ فلہ ان یحلف بما شاء من مخلوقاتہ تنبیھا علی شرفہ"

کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں جس کی چاہے قسم اٹھائے ، رب تعالیٰ کا مخلوق کی قسم اٹھانے کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ اپنی مخلوق کی شرافت پر متنبہ کرتا ہے۔ (از مرقاۃ)

سوال:

نبی کریم ﷺ نے "افلح وابیه" ارشاد فرمایا جس میں آپ کی قسم کا ذکر ہے۔

جواب:

"ان هذه الكلمة تجری علی اللسان لا يقصدبهاالیمن"

بیشک یہ کلمہ زبان پر جاری ہوجاتا تھا جس میں قسم کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا تھا۔ (ازمرقاۃ)

☆ "عن بریدة قال قال رسول الله ﷺ من قال انی بریٔ من الاسلام فان کا ن کا ذبا فهو کما قال وان کان صادقا فلن یرجع الی الاسلام سا لما"

(رواه ابو داؤد والنسائی وابن ماجه . مشکوۃ باب الایمان والنذور)

حضرت بریدہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے کہا، بے شک میں اسلام سے بری ہوں (یعنی اگر میں نے یہ کام نہ کیا، یا یہ کام کیا تو اسلام سے بری ہوں) اگر وہ جھوٹا ہوا تو ایسا ہی ہوگا جیسا اس نے کہا، یعنی وہ اسلام سے بری ہوگا۔ اگر سچا ہوا۔ یعنی اس نے قسم پر عمل کردیا تو پھر بھی اسلام کی طرف کامل نہیں لوٹے گا (کیونکہ اس نے اسلام سے بری ہونے کے الفاظ ذکر کرنے میں جسارت سے کام لیا)

☆☆☆☆☆☆

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ☆ (سورة البقرة آيت نمبر ۲۲۵)

☆۱☆

اللہ تمہیں نہیں پکڑتا ان قسموں میں جو بے ارادہ زبان سے نکل جائے، ہاں اس پر گرفت فرماتا ہے جو کام تمہارے دلوں نے کئے اور اللہ بخشنے والا حلم والا ہے۔

☆۲☆

نہیں پکڑتا تمہیں اللہ تمہاری لغو قسموں سے، اور لیکن پکڑتا ہے تمہیں ان قسموں سے جو کسب کیا تمہارے دلوں نے، اور اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔

''لايؤاخذكم الله'': نہیں پکڑتا تمہیں اللہ۔

''یؤاخذ'' لیا ہوا ہے ''اخذ'' سے، جس کا معنی پکڑنا۔ طلباء کرام یہ خیال رکھیں کہ یہ باب مفاعلہ ہے، اگرچہ اس میں شرکت جانبین ہوتی ہے، یعنی ''مؤاخذہ'' کا معنی ایک دوسرے کو پکڑنا۔ لیکن یہاں ہر جانب سے فاعلیت اور مفعولیت کا معنی مراد لینا ممکن نہیں، فاعلیت کا معنی صرف اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے، اور مفعولیت کا معنی صرف مخاطبین کی طرف منسوب ہے۔

''باللغوفی ایمانکم'': تمہاری لغو قسموں سے۔

یعنی تمہاری قسموں میں سے جو لغو قسمیں ہیں، اللہ تعالیٰ ان قسموں کی وجہ سے تمہاری پکڑ نہیں فرماتا۔

''اللغو ''الساقط الذی لایعتدبه سواء کان کلا ما او غیره''

لغو کا مطلب ہے بے فائدہ چیز، جس کا کوئی اعتبار نہ ہو اور کسی شمار میں نہ ہو خواہ کلام ہو یا غیر کلام ہو۔

'' لغو'' کا لفظ قولِ باطل اور فعلِ باطل دونوں پر بولا جاتا ہے۔

لغو بمعنی فعلِ باطل:

"واذامروا باللغو مروا کراما" جب وہ گزرتے ہیں بیہودہ اور باطل فعل سے تو گذر جاتے ہیں شریفانہ انداز سے۔

لغو بمعنی قولِ باطل:

باطل قول کے لئے لغو کا استعمال قرآن پاک اور حدیث پاک سے ثابت ہے۔ پھر مختلف مقامات میں مختلف حالات کی وجہ سے مختلف معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

لغو بمعنی کلمہ فاحشہ:

"لا یسمعون فیھا لغوا ولا تاثیما" اس مقام میں لغو کا معنی فحش کلمات ہے۔

اسی طرح "لاتسمع فیھا لاغیہ" میں بھی یہی معنی معتبر ہے۔ "لاغیۃ" بھی لغو سے ماخوذ ہے۔

لغو بمعنی باطل کلام:

حدیث پاک میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔

" من قال یوم الجمعۃ مصاحبہ صہ والامام یخطب فقد لغا "

جس شخص نے جمعہ کے دن امام کے خطبہ دینے کی حالت میں (دوسرے ساتھ والے) اپنے صاحب کو کہا خاموش ہوجا (اس کا یہ کہنا) لغو اور باطل ہے۔

لغو بمعنی کفر وکلام قبیح:

جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا۔ "واذا سمعوا اللغو اعرضوا عنہ"

جب وہ کفر یہ کلام اور قبیح کلام سنتے ہیں تو اس سے اعراض کر لیتے۔

اس آیت میں لغو بمعنی کفر اور کلام قبیح کے استعمال ہوا ہے۔

لغو بمعنی آواز بلا مقصد:

جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ "لغا الطائر یلغو لغو اذا صوت"

پرندہ جب آواز نکالتا ہے تو عام انسان اس کی آواز کو بلا مقصد سمجھتے ہوئے کہتا ہے "**لغا الطائر**"

پرندے نے اپنی بولی بولی جس کا بظاہر کوئی مقصد نہیں۔ (ماخوذ از احکام القرآن للجصاص و کبیر)

یمین کو یمین کہنے کی وجہ:

یمین کا معنی اگر چہ یہاں قسم ہے، تاہم قسم کو یمین کہنے کی دو وجہ ہیں۔

ایک وجہ یہ ہے کہ یمین کا معنی دایاں ہاتھ ہے، چونکہ عرب حضرات قسم اٹھاتے وقت ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر وعدہ کرتے ہیں یعنی مصافحہ کرتے اور زیادہ طور پر وہ صرف دائیں ہاتھ سے مصافحہ کرتے، اس لئے قسم کو یمین کہہ دیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یمین کا معنی ہے قوت، جس طرح رب تعالیٰ نے فرمایا "**لاخذنا منه باليمين**" ہم اسے مضبوطی (قوت) سے پکڑیں گے۔ چونکہ قسم اٹھانے والا بھی اپنی بات کو قسم کے ذریعے مضبوط کرتا ہے، اس لئے قسم کو یمین کہہ دیا جاتا ہے۔ (روح البیان)

یمین کی تین صورتیں:

یعنی قسم کی تین اقسام ہیں۔ (۱) منعقدہ (۲) غموس (۳) لغو

یمین منعقدہ:

مستقبل کے متعلق قسم اٹھائی تھی کہ میں یہ کام کروں گا، یا یہ کہ میں یہ کام نہیں کروں گا، تو وہ اپنی قسم کے خلاف کام کردے تو وہ حانث ہو جائے گا، یعنی اپنی قسم کو توڑنے والا بن گیا، اس پر کفارلازم آئے گا۔

یمین منعقدہ کو توڑنے سے گناہ لازم آئے گا یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر معصیت کی قسم اٹھائی تھی یعنی فرض یا واجب کو چھوڑنے یا گناہ کرنے کی قسم اٹھائی تھی، جو معصیت کی قسم تھی تو اسے توڑنے پر ثواب حاصل ہوگا۔ اگر معصیت نہ کرنے کی قسم اٹھائی تو قسم کے توڑنے پر گناہ ہوگا، قسم کا توڑنا علیحدہ گناہ اور معصیت کا کام کرنا علیحدہ گناہ۔ اگر مباح کام کے کرنے یا چھوڑنے کی قسم اٹھائی تھی تو اس کا توڑنا بھی گناہ ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نام کی اس نے تعظیم نہیں کی۔

یمین غموس:

ماضی کے متعلق جان بوجھ کر جھوٹی قسم اٹھائی کہ میں نے یہ کام نہیں کیا تھا، حالانکہ واقع میں اس نے کام کیا تھا، یا قسم اٹھائی کہ میں نے یہ کام کیا تھا، حالانکہ واقع میں اس نے کام نہیں کیا تھا، اس قسم پر گناہ کبیرلازم آتا ہے۔

" ولا کفارة عندابی حنیفة فی الکبائر وعند الشافعی تجب الکفارة فیه "

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یمین غموس میں کفارہ لازم نہیں، کیونکہ کبائر پر کفارہ لازم نہیں بلکہ توبہ ضروری ہے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یمین غموس میں کفارہ لازم ہے۔

(از روح البیان بزیادہ)

یمین لغو اور اہلِ علم کو دعوتِ فکر:

عام طور پر بیان یہ کیا جاتا ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ماضی کی قسم اپنے گمان کے مطابق پکی اٹھائی واقع میں جھوٹی تھی، یعنی قسم اٹھائی میں نے یہ کام نہیں کیا تھا، وہ اپنے آپ کو سچا سمجھ رہا ہے۔ حالانکہ اس نے کام

گیا تھا، لیکن وہ بھولا ہوا ہے، یہ لغو قسم ہے، اس میں وہ شخص گنہگار نہیں، کیونکہ بھولنے پر کوئی مواخذہ (پکڑ) نہیں، اور اس پر کفارہ بھی لازم نہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ اس قسم کو یمین غموس کہتے ہیں، اور وہ فرماتے ہیں اس پر کفارہ لازم ہے۔

یہاں تک تو راقم کو کوئی کلام نہیں۔ البتہ یہ جو بیان کیا جاتا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک یمین لغو یہ ہے کہ بے ارادہ قسم اٹھا دے کہے "لا واللہ" ایسا نہیں قسم ہے اللہ تعالیٰ کی، اور کہے "بلی واللہ" کیوں نہیں قسم ہے اللہ تعالیٰ کی، اس قسم کے الفاظ عام طور پر زبان جاری ہوتے ہیں، یہ لغو قسمیں ہیں، ان پر نہ کفارہ ہے اور نہ ہی گناہ ہے۔

اس بحث سے جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس قسم کو امام اعظم رحمہ اللہ یمین لغو نہیں کہتے، راقم کے نزدیک یہ غلط ہے، کسی فقیہ اور کسی مفسر نے یہ واضح بیان نہیں کیا۔

راقم کا موقف:

اس میں یہ ہے کہ پہلی جو صورت بیان کی، اسے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ یمین لغو کہتے ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ اسے یمین غموس کہتے ہیں۔ یہ اختلاف تو صراحتہً ثابت ہے۔

لیکن یمین لغو کی تعریف جو امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا کوئی اختلاف نہیں، بلکہ عام طور پر بغیر ارادہ کے زبان پر جاری ہونے والے الفاظ بالاتفاق یمین لغو ہیں۔

نہ ہی اس کی تعریف میں کوئی اختلاف ہے اور نہ ہی حکم میں کوئی اختلاف ہے، بلکہ لغو کی اس قسم میں نہ گناہ ہے اور نہ ہی کفارہ لازم ہے۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

ذرا کتب کا مطالعہ فرمائیں تو آپ کا ذہن قبول کرے گا کہ اس صورت کو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ یمین لغو نہ مانیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جبکہ پہلے احادیث میں تعارض کو مٹانے کے لئے ملا علی قاری حنفی رحمہ اللہ کا قول پیش کیا جا چکا ہے کہ "قد افلح وابیہ" حدیث شریف میں باپ کی قسم بغیر ارادہ کے اٹھائی گئی اس میں کوئی مواخذہ نہیں۔ اس سے واضح

ہوا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ بھی اسے یمین لغو ہی قرار دیتے ہیں۔ واضح احادیث کا انکار امام صاحب سے ممکن نہیں۔

☆ "عن ابی هريرة ان رسول الله ﷺ قال من حلف فقال فی حلفه باللات و العزی فليقل لا اله الاالله"

حضرت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص قسم اٹھائے اور اپنی قسم میں یہ کہے "لات کی قسم اور عزی کی قسم" تو اسے چاہئے کہ وہ " لااله الا الله " کہے۔

(بخاری و مسلم)

نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد جس موقع و محل کے مطابق ہے اس کو سمجھئے۔

" فهذاقاله لقوم حديثی عهد بجاهلية قد اسلموا و السنتهم قد الفت ما كانت عليه من الحلف با للات من غير قصد فامروا ان يتلفظوابكلمة الاخلاص كماتلفظوا بتلك الكلمة من غير قصدلتكون هذه بهذه" (ابن کثیر۔ صابونی)

نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد اس قوم کو فرمایا جن کا زمانہ اسلام زمانہ جاہلیت کے قریب تھا۔ یعنی نو مسلم حضرات تھے، چونکہ وہ زمانہ جاہلیت میں لات اور عزی کی قسمیں اٹھاتے تھے، اسلام میں آکر بغیر ارادہ کے لات اور عزی کی قسم اٹھادی، تو نبی کریم ﷺ نے ان پر کوئی کفارہ مقرر نہیں کیا اور نہ ہی ان کو گنہگار کہا، بلکہ حکم یہ دیا کہ اخلاص سے "لا الــــه الاالله" کہو، تاکہ خلوص سے کہے ہوئے یہ الفاظ ان کا بدل بن جائیں جو بغیر ارادہ کے کہے گئے۔ یعنی اگر چہ ان میں کوئی مؤاخذہ تو نہیں، البتہ خلوص سے کلمہ توحید زبان پر جاری کر دیا جائے تاکہ ثواب حاصل ہو جائے۔

☆ "عن عروة عن عائشة فی قوله "لايؤ اخذ كم الله با للغو فی ايمانكم " قالت هم القوم يتدراؤن فی الامر فيقول هذا لا و الله، و بلی و الله و كلا و الله "

حضرت عروہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا رب تعالی کے ارشاد گرامی "لایـؤاخـذکم اللہ باللغو فی ایمانکم" کی وضاحت میں ارشاد فرمایا کہ لغو قسموں سے مراد وہ قسمیں ہیں جو بغیر ارادہ لوگ اٹھاتے ہیں، اور "لا و الله، بلی و الله، کلا و الله" کہہ دیتے ہیں۔

" یتدراؤن فی الامر لا تعقدعلیه قلوبهم" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ارشاد میں "یتدارؤن فی الامر" کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ بغیر ارادہ اور بغیر عقیدہ کے یوں قسمیں زبان پر لے آتے ہیں۔ (صابونی)

☆ "عن عروۃ قال کانت عائشۃ تقول انما اللغو فی المزاحۃ والهزل وهو قول الرجل لا والله وبلی والله، فذاک لا کفارۃ علیه، انما الکفارۃ فیما عقد علیه قلبه ان یفعله ثم لا یفعله"

(صابونی)

حضرت عروۃ کہتے ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں جو قسم مزاح اور ہنسی کھیل سے بلا ارادہ اٹھائی جائے وہ بھی لغو ہے، اس پر کفارہ نہیں۔ کفارہ اس قسم پر ہے جو ارادہ سے اٹھائے کہ یہ کام میں کروں گا پھر وہ کام نہ کرے۔ (صابونی)

راقم کہتا ہے کہ اس ہنسی و مزاح والی قسم میں گناہ لازم آئے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نام کی عظمت کا لحاظ اس میں نہیں پایا گیا۔

☆ "عن عروۃ عن عائشه انها کانت تتاؤل هذه الآیة یعنی قوله تعالیٰ " لایؤاخذکم الله باللغو فی ایمانکم" وتقول هو الشیء یحلف علیه احدکم لا یرید منه الا الصدق فیکون علی غیر ماحلف علیه "

حضرت عروہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس آیۃ کریمہ "لا یؤاخذ کم الله باللغو فی ایمانکم" کے متعلق بیان فرماتی تھیں کہ ایک شخص اپنے خیال میں سچی قسم اٹھائے، لیکن واقعہ میں وہ سچی نہ ہو تو یہ لغو قسم ہے۔ یعنی اس پر گناہ اور کفارہ نہیں۔ (صابونی)

☆ "وعن عطاء عن عائشة قالت هو قوله لا والله وبلی والله وهو یری انه صادق ولا یکون کذلک "

حضرت عطاء کہتے ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ایک شخص اپنے آپ کو سچا سمجھ کر قسم اٹھاتا ہے واقعہ میں ایسا نہیں تو یہ لغو قسم ہے اس پر گناہ کفارہ نہیں۔ (صابونی)

واضح ہوا کہ لغو کی یہ دونوں صورتیں احادیث سے ثابت ہیں، ایک میں امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ کا اختلاف ہے اور ایک میں اختلاف نہیں۔

تفسیر روح المعانی اور تفسیر روح البیان کو گہری نظر سے مطالعہ کرنے سے انشاء اللہ راقم کا موقف طلباء کرام آسانی سے سمجھ لیں گے اور قوی امید کہ انشاء اللہ تائید کریں گے۔

تنبیہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی حدیث ابوداؤد نے مرفوع ذکر کی ہے، بخاری نے موقوف۔

"عن عائشه قالت قال رسول الله ﷺ هو قول الرجل في يمينه كلا والله وبلى والله

(ابو داؤد)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، لغو قسم ہے جبکہ ایک شخص بغیر ارادہ کے قسم اٹھائے۔ (خازن)

اعتراض: کبیر اور خازن میں تو یہ ذکر ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ " لا والله ،بلى والله "میں کفارہ لازم کرتے ہیں، یہ کہنا کیسے صحیح ہے کہ یہ لغو قسم ہے اور اس میں کفارہ نہیں۔

جواب: اس قسم کی قسموں پر اسی وقت کفارہ لازم آئے گا جب وہ ارادہ سے قسم اٹھائے۔ ہاں البتہ قاضی ظاہر الفاظ کو دیکھ کر مستقبل کے متعلق اٹھائی ہوئی قسم پر کفارہ لازم ہونے کا فیصلہ کرے گا۔ البتہ مفتی کہے گا اگر یہ سچا ہے تو عنداللہ کفارہ لازم نہیں۔ والله اعلم با لصواب (راقم)

تین چیزیں ہنسی مزاح سے بھی ثابت ہو جائیں گی:

"عن ابى هريرة قال قال رسول الله ﷺ ثلاث جد هن وهز لهن جد النكاح والطلاق والرجعة" (اخرجه احمد وابو داؤد والترمذى وابن ماجه والحاكم والدار قطنى)

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ فرماتے ہیں تین چیزوں میں حقیقت بھی حقیقت ہے اور مزاح بھی حقیقت ہے، وہ تین چیزیں یہ ہیں۔ نکاح اور طلاق اور رجوع کرنا۔ (مظھری)

اور ایک روایت میں غلام آزاد کرنے کا بھی یہی حکم بیان کیا گیا، اس لئے گویا کہ چار چیزوں میں مزاح بھی

حقیقت ہے، ہنسی ومزاح سے طلاق دینے سے طلاق واقع ہو جائے گی، پھر یہ نہ کہے کہ میرا ارادہ نہیں تھا۔

''ولکن یؤاخذکم بما کسبت قلوبکم'':

اور لیکن پکڑتا ہے تمہیں ان قسموں سے جو کسب کیا تمہارے دلوں نے۔

شیخ احمد المدعو بملا جیون رحمہ اللہ کی علمی تحقیق:

اللہ تعالیٰ نے قسم کا ذکر دو مقامات پر کیا، ایک اسی آیۃ کریمہ میں جو سورۃ بقرہ کی زیر بحث ہے، اور دوسرا مقام سورۃ مائدہ میں ہے۔ دونوں جگہ ذکر کیا۔

''لایؤاخذ کم اللہ باللغو فی ایمانکم'' تمہیں نہیں پکڑتا اللہ تمہاری لغو قسموں میں۔

لیکن یہاں لغو کے مقابل ذکر کیا ''ولکن یؤاخذکم اللہ بما کسبت قلوبکم''

لیکن مواخذہ کرتا ہے تمہارا جو تمہارے دلوں نے کسب کیا۔

اس کے بعد اور کوئی حکم ذکر نہیں کیا، بلکہ اس کے بعد مغفرت کا ذکر کیا ''و اللہ غفور حلیم'' اور اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔

اور سورۃ مائدہ میں لغو قسم کے بعد ذکر فرمایا ''ولکن یؤاخذ کم بما عقدتم الایمان'' کا معنی ہے'' بما قصدت بہ قلوبکم و کسبتہ'' (جس کا تمہارے دلوں نے ارادہ کیا اور کسب کیا) یہ حکم عام ہے یمین غموس اور منعقدہ کو، کیونکہ دونوں میں ارادہ پایا جاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ غموس ماضی کے متعلق قسم ہے اور مستقبل کے متعلق قسم کو منعقدہ کہا جاتا ہے۔

اس آیۃ کریمہ میں ''بما کسبت قلوبکم'' میں مؤاخذہ کا ذکر ہے اور مائدہ میں بھی'' بما عقدتم الایمان'' میں مؤاخذہ کا ذکر ہے جو کہ کفارہ سے مقید ہے، اس لئے سورۃ بقرۃ میں مؤاخذہ اگرچہ مطلق ذکر ہے، لیکن مطلق کو مقید پر محمول کریں گے۔ لہٰذا (بما کسبت قلوبکم) سے بھی کفارہ ثابت جو یمین غموس اور منعقدہ دونوں میں لازم ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور آپ کے متبعین کی تحقیق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی "بما کسبت قلوبکم" سے مراد یہ ہے کہ وہ یمین جس کا تمہارے دلوں نے کسب کیا ہے اس پر تمہارا مؤاخذہ ہوگا، کیونکہ یہ دونوں قسمیں لغو کے مقابل ہیں، لغو میں مؤاخذہ نہیں اور ان دونوں میں مؤاخذہ ہے۔

لیکن مؤاخذہ مطلق ذکر ہے، مطلق سے مراد فرد کامل ہے۔ وہ کامل مؤاخذ اخروی ہے، یعنی گناہ ہوگا۔ اور اس کی اخروی گرفت ہوگی۔ اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے "واللہ غفور حلیم" (اللہ تعالیٰ بخشنے والا بردبار ہے) اس پر دلالت کر رہا ہے، کیونکہ مغفرت آخر میں ہی ہوتی ہے۔

لہٰذا واضح ہوا کہ "بما کسبت قلوبکم" میں غموس اور منعقدہ دونوں آجاتی ہیں، جن پر مؤاخذہ اخروی ہوگا، لیکن کفارہ کا یہاں کوئی ذکر نہیں۔

لیکن سورۃ مائدہ میں "بما عقدتم الایمان" مذکور ہے، جس کا مطلب ہی یہ ہے کہ جب تم قسم کو پورے کرنے کا ارادہ کرلو، پھر حانث ہوجاؤ، یعنی قسم توڑ دو، تو اس پر تمہیں مؤاخذہ ہوگا وہ مؤاخذ یہ ہے کہ تم قسم کا کفارہ ادا کردو۔

منعقدہ کا حقیقی معنی یہ ہے کہ قسم کو پورا کرنے کا عقد باندھ لے۔ اور مجازی معنی ہے ارادہ کرنا۔ قانون یہ ہے کہ جب حقیقی معنی مراد لیا جاسکے تو مجازی معنی مراد نہیں لیا جائے گا۔

جب سورۃ مائدہ میں مؤاخذہ کا مطلب کفارہ ہے، اور مؤاخذہ نہ ہونے کا مطلب کفارہ لازم نہ آنا ہے، اس لئے سورۃ مائدہ میں یمین غموس "لا یؤاخذکم اللہ باللغو فی ایمانکم" میں داخل ہے۔

مطلب یہ ہوگیا کہ منعقدہ میں کفارہ لازم ہے اور لغو اور غموس میں کفارہ لازم نہیں۔ اور غیر لغو میں گناہ ہوگا۔
اس سے یہ واضح ہوگا کہ غموس میں اور منعقدہ کو بلا وجہ توڑنے میں گناہ لازم آئے گا۔ (تفسیرات احمدیہ)

قسم کا کفارہ:

دس مسکینوں کو دو وقت کا طعام کھلانا (یا اس طعام کی قیمت مساکین کو دینا) یا دس مسکینوں کو کپڑوں کا جوڑا جوڑا دینا

یاغلام آزاد کرنا۔اگران چیزوں کے ادا کرنے کی استطاعت نہ ہوتو تین روز لگا تار روزہ رکھنا کہ ان میں کوئی ناغہ نہ ہو۔

(زیادہ تفصیل سورۃ مائدۃ میں ان شاءاللہ آئے گی)

''واللہ غفور حلیم'': اوراللہ بخشنے والا بردبار ہے۔

''غفور'' گناہوں کوڈھانپنے ،معاف کرنے اوران پرعذاب کوساقط کرنے میں مبالغہ پایا گیا ہے،یعنی بہت ہی زیادہ معاف کرنے والا ''الغفور مبالغة في ستر الذنوب وفي اسقاط عقوبتها'' (کبیر)

''حلیم'' کلام عرب میں ''حلم'' کامعنی سکون وآرام،جب اللہ تعالیٰ کی صفت ''حلیم'' ہوتو اس کا معنی یہ ہے۔

'' الذی لا یعجل بالعقوبة بل یؤخر عقوبة الکفار والفجار'' (کبیر)

کہ وہ سزا جلدی نہیں دیتا، بلکہ کافروں اورفاجروں کوسزادینے میں دیرکرتا ہے۔یعنی مہلت دیتا ہے تاکہ یہ لوگ توبہ کرلیں۔

☆☆☆☆☆

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَاءِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ☆ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۲۶)

﴿۱﴾

اور وہ جو قسمیں کھا بیٹھتے ہیں اپنی عورتوں کے پاس جانے کی چار مہینے کی مہلت ہے، پس اگر اس مدت میں پھر آئے تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

﴿۲﴾

ان لوگوں کے لئے جو ایلاء کرلیں اپنی عورتوں سے انتظار ہے چار مہینوں کی۔ تو اگر رجوع کرلیں تو بے شک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ☆ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۲۷)

﴿۱﴾

اور اگر چھوڑ دینے کا ارادہ پکا کرلیں تو اللہ سنتا جانتا ہے۔

﴿۲﴾

اور اگر وہ پختہ ارادہ کرلیں طلاق کا تو بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

مختصر مطلب:

ان دونوں آیتوں میں مسئلہ ایلاء بیان کیا گیا ہے۔ ایلاء کا معنی ہے قسم اٹھانا۔ جب کوئی شخص قسم اٹھائے اور اپنی زوجہ کو کہے ''قسم ہے اللہ تعالی کی میں تمہارے قریب نہیں آؤں گا، یعنی تمہارے ساتھ جماع نہیں کروں گا'' یا یہ کہے قسم ہے اللہ تعالی کی میں چار مہینے تم سے جماع نہیں کروں گا تمہارے قریب نہیں آؤں گا، اسے ایلاء کہتے ہیں۔

ایلاء کا حکم یہ ہے کہ اگر چار مہینے کے اندر زوجہ کے قریب چلا گیا تو قسم ٹوٹ گئی، قسم کا کفارہ ادا کرے، نکاح

اس کا برقرار رہے گا۔ اور اگر چار مہینے زوجہ کے قریب نہ گیا، مجامعت نہ کی، تو اس کی عورت کو طلاق بائن ہو جائے گی۔

اب دونوں آیتوں کا مفہوم واضح ہو گیا کہ اگر کوئی شخص اپنی عورتوں سے ایلاء کر لے تو چار مہینے کی انتظار ہے، اگر اپنی عورتوں کی طرف رجوع کر لیا تو قسم ٹوٹ گئی، اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ اور اگر چار مہینے کے اندر عورت کی طرف رجوع نہ کیا، بلکہ طلاق کا پکا ارادہ کر لیا، تو طلاق واقع ہو جائے گی، اللہ تعالیٰ سننے، جاننے والا ہے۔

تنبیہ : اگر مطلقاً قسم اٹھائی کہ میں تمہارے قریب نہیں آؤں گا، تو ہر چار مہینے کے اندر اندر جماع کرنا ہوگا۔ اور قسم کا کفارہ ادا کرنا ہوگا، اگر چار مہینے کسی وقت بھی بغیر جماع کے گزر گئے تو طلاق بائن ہو جائے گی۔

شانِ نزول:

زمانہ جاہلیت میں لوگ زوجہ کی طرف جب میلان نہیں کرتے تھے، اور انہیں اپنی ازواج کی طرف شوق نہیں رہتا تھا اور وہ یہ بھی غیرت کرتے تھے کہ ہماری ازواج کسی اور شخص کے نکاح میں نہ جائیں تو وہ اپنی ازواج کو معلق رکھتے تھے کہ نہ وہ آزاد ہوں کہ اور ازواج سے نکاح کر لیں اور نہ ہی یہ خود اس کی طرف رغبت کرتے تھے۔ تو رب تعالیٰ نے طلاق اور عدت کے مسائل کو قرآن پاک میں اتنی تفصیل سے بیان کیا، جتنی تفصیل سے کسی اور مسئلہ کو نہیں بیان کیا۔ زیادہ مسائل یہاں ہی سورۃ بقرۃ میں ہیں اور کچھ مسائل سورۃ طلاق میں ہیں۔ (تفسیرات احمدیہ)

”للذین یؤلون من نساءھم تربص اربعۃ اشھر“:

ان لوگوں کے لئے جو اپنی عورتوں سے ایلاء کرتے ہیں چار مہینے انتظار کرنا ہے۔

"یؤلون" ایلاء سے لیا ہوا ہے۔ "آلی یولی ایلاء، تالی یتالی تألیا، ائتلی یأتلی ائتلاء" قسم اٹھانا۔ اگر چہ لغوی معنی کے لحاظ سے مطلقاً قسم اٹھانا ہے۔ تاہم اس کا استعمال ایسی قسموں کے لئے زیادہ ہے کہ جن چیزوں کے متعلق قسم اٹھائی گئی ان میں نقص پایا جائے۔

مفردات راغب میں قرآن پاک کی دوسری آیت سے اسی استعمال کو واضح کیا گیا ہے۔

"لا یألونکم خبالا، ای باطل" وہ تمہارے سامنے باطل قسمیں نہ اٹھائیں۔

"ولا یأتل اولوا الفضل منکم والسعة ان یؤتوا اولی القربی والمساکین والمهاجرین فی سبیل الله"

تم میں سے فضل اور وسعت والے لوگ قسمیں نہ اٹھائیں کہ وہ قریبی رشتہ داروں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو مال نہیں دیں گے۔

یہاں بھی "یؤلون" عورتوں سے جماع نہ کرنے کے معنی میں قسم اٹھانے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ جو عورتوں پر ظلم کی وجہ سے اس میں قباحت اور نقص پایا گیا ہے۔ (ماخوذ از کبیر و روح المعانی)

دینی طلباء کرام کے ذوق کے لئے:

یہاں بظاہر یہ وہم پایا گیا ہے کہ "ایلاء" تو "علی" سے متعدی ہوتا ہے یہاں "من" آیا ہوا ہے۔ اس کا استعمال کیسے صحیح ہے؟

تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں قاعدۂ تضمین جاری ہوا ہے کہ یہ "بعد" کے معنی کو متضمن ہے، جس کے بعد "علی" آتا ہے، جس کا معنی یہ ہے "للذین یبعدون من نساء هم مولین" ان لوگوں کے لئے جو اپنی عورتوں کو قسم اٹھا کر دور ہوتے ہیں چار مہینے انتظار کرنا ہے۔

البتہ ایک اور جواب یہ دیا گیا ہے کہ ابوالبقاء نے یہ بیان کیا ہے کہ "ایلاء، علی" اور "من" دونوں سے ہی متعدی ہوتا رہتا ہے۔ (از روح المعانی)

"من نساء هم" (اپنی عورتوں سے) یعنی ایلاء اپنی ازواج سے ہوتا ہے۔ جب زوجیت کا تعلق ختم ہو جائے تو ایلاء نہیں ہوگا۔ یعنی اگر کسی شخص نے اپنی زوجہ کو طلاق بائن دے دی، پھر اسے کہا "قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں چار مہینے تمہارے قریب نہیں آؤں گا" پھر اس دوبارہ نکاح کر لیا تو وطی کرنے سے کفارہ تو لازم آئے گا، کیونکہ قسم ٹوٹ گئی، لیکن چار مہینے اگر وطی نہ کی تو پھر طلاق بائن لازم نہیں آئے گی، اس لئے کہ وہ زوجہ جس کو طلاق بائن دے کر زوجیت کا تعلق اس سے ختم کر لیا، اس سے ایلاء نہیں ہوتا۔ (تفسیرات احمدیہ)

اگر اپنی عورت کو رجعی طلاق دے دی، پھر قسم اٹھائی کہ قسم اللہ تعالیٰ کی میں تمہارے قریب نہیں آؤں گا تو یہ ایلاء ہوگا، کیونکہ اس کی زوجیت قائم ہے۔ اگر چار مہینے کے اندر وطی کر لی تو رجوع ہو گیا اور قسم کا کفارہ ادا کر دے، اور اگر چار مہینے تک وطی نہ کی تو طلاق بائن ہو جائے گی، جو پہلی صریح طلاق سے ملحق ہو جائے گی۔ (تفسیرات احمدیہ)

جس عورت سے ظہار کر لیا کہ اسے اپنی محرمات میں سے کسی سے تشبیہ دے دی، پھر اس سے ایلاء کر لیا تو ایلاء ہو جائے گا، چار مہینے تک وطی نہ کی تو طلاق بائن ہو جائے گی۔ طلاق سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ظہار کا کفارہ ادا کرے، پھر وطی کرے اور قسم کا کفارہ ادا کرے۔ (تفسیرات احمدیہ)

اگر اجنبیہ عورت کو کہا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں تمہارے قریب نہیں آؤں گا، پھر اسی سے نکاح کر لیا، تو یہ ایلاء نہیں ہوگا کیونکہ وہ محل طلاق نہیں۔ لہٰذا نکاح کے بعد چار ماہ یا اس سے زائد عرصہ تک وطی نہ کرے، تو اسے طلاق بائن نہیں ہوگی۔ ہاں البتہ وطی کرنے پر قسم کا کفارہ ادا کرنا پڑے گا، کیونکہ اس نے اپنی قسم کو توڑ دیا۔ (تفسیرات احمدیہ)

اگر اجنبیہ عورت کو کہا تو مجھ پر ایسے ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ ہے، تو یہ ظہار نہیں ہوگا باوجود اس کے کہ اس سے نکاح بھی کر لے، کیونکہ یہ الفاظ بولتے وقت وہ منکوحہ نہیں تھی۔ (تفسیرات احمدیہ)

"تربص اربعة اشهر": چار مہینوں تک انتظار کرنا ہے۔

تربص کا معنی ہے انتظار کرنا، تربص کی اضافت ظرف یعنی "اربعة اشهر" کی طرف کر کے واضح کر دیا کہ اس میں وسعت پائی گئی ہے کہ چار مہینے تک وطی نہ کرنے کی مہلت دی گئی ہے، لیکن اگر قسم اٹھا کر چار مہینے یوں ہی گذار دیئے تو عورت کو طلاق بائن ہو گی۔ (تفسیرات احمدیہ)

ایلاء کے الفاظ:

"واللہ لا اقربک" قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں تمہارے قریب نہیں آؤں گا۔

"واللہ لا اقربک اربعة اشهر" قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں تمہارے قریب چار مہینے نہیں آؤں گا۔

"وان اقربک فعلی حج او صدقة او صوم او فانت طالق او عبده حر"

اگر میں تمہارے قریب آؤں تو مجھ پر حج لازم ہو جائے اگر میں تمہارے قریب آؤں تو میرے اوپر صدقہ لازم ہو جائے۔ اگر میں تمہارے قریب آؤں تو مجھ پر اتنے روزے رکھنے لازم ہو جائیں، ان سب صورتوں میں ایلاء لازم ہو جائے گا۔

اور اگر یہ کہے میں تمہارے قریب آؤں تو تمہیں طلاق ہو، یہ بھی ایلاء ہے۔ لیکن اس میں عجیب صورت لازم آئے گی، اگر چار مہینے کے اندر جماع کر لیا تو طلاق رجعی واقع ہو جائے گی اور اگر چار مہینے تک وطی نہ کی، تو طلاق بائن ہو جائے گی۔ (تفسیرات احمدیہ)

تنبیہ: ایلاء کے لئے صریح لفظ قریب ذکر کیا جائے، قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں تمہارے قریب نہیں آؤں گا۔ یا میں تمہارے ساتھ جماع نہیں کروں گا، وطی نہیں کروں گا۔

اگر اس نے قسم اٹھا دی، قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں فلاں شہر میں نہیں جاؤں گا، اس شہر میں اس کی زوجہ بھی ہے تو یہ ایلاء نہیں، کیونکہ اس کی زوجہ وہاں سے نکل کر دوسرے شہر میں بھی منتقل ہو سکتی ہے۔ (تفسیرات احمدیہ)

لفظ حرام کا حکم:

"وکذا قوله انت علی حرام ان نوی به الطلاق فبائنة وان نوی به الظهار او الثلاث او الكذب فمانوی وان نوی به التحريم اولم ينوشيا فا يلاء" (تفسیرات احمدیہ)

اگر اپنی زوجہ سے کہے تو مجھ پر حرام ہے تو ان الفاظ سے اگر اس نے نیت طلاق کی تو طلاق بائن واقع ہوگی، اگر ظہار کی نیت کی تو ظہار ہوگا۔ اگر تین طلاقوں کی نیت کی تو تین طلاقیں واقع ہوں گی، اگر نیت جھوٹ کی ہو یعنی ویسے ہی ڈرانے کے لئے یہ لفظ استعمال کئے تو کوئی طلاق وغیرہ واقع نہیں ہوگی۔ اور اگر ان الفاظ سے نیت بھی حرام ہونے کی کی یا کوئی نیت نہیں تو یہ ایلاء ہوگا۔

(تفسیرات احمدیہ)

مسئلہ : جس شخص کی طلاق واقع ہو جاتی ہو، اس کا ایلاء بھی ثابت ہو جائے گا۔ لہٰذا حر ہو یا عبد ہو (آزاد ہو یا غلام) یا نشے میں ان کی طلاق واقع ہو جاتی ہے، ان سے ایلاء بھی واقع ہو جائے گا۔ (قرطبی)

نوٹ: تمام فقہاء کرام نے واضح طور پر بیان کیا ہے کہ سکران (نشے والے) کی طلاق نشے کے حال میں دی ہوئی واقع ہو جائے گی۔

مسئلہ: غصہ کی حالت میں طلاق دے یا خوشی کی حالت میں، ہر حال میں طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ہر حال میں ایلاء بھی لازم آ جائے گا۔ (ماخوذ از قرطبی)

"فان فاء وافان اللّٰہ غفور رحیم":

تو اگر وہ رجوع کر لیں تو بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

یعنی اگر وہ اپنی قسم سے پھر جائیں، عورت سے وطی کر لیں تو ان کی عورت کو طلاق نہیں ہوگی، قسم اٹھا کر جو عورت کو پریشان کیا تھا اور قسم توڑ کر اللہ تعالیٰ کے نام کی عزت کا پاس نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ اسے بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے۔

"وان عزموا الطلاق فان اللّٰہ سمیع علیم":

اور اگر تم نے پختہ ارادہ طلاق کا کر لیا تو بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے۔

یعنی اگر قسم اٹھانے والے شخص نے پختہ ارادہ کر لیا کہ قسم پر قائم رہنا ہے، مجامعت نہیں کرنی تو اللہ تعالیٰ اس کے اس قول کو سننے والا ہے "صار منهم طلاقا بائنا بمضی المدة" مدت گزرنے پر یعنی چار مہینے گزرنے پر طلاق بائن واقع ہو جائے گی، اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے، یعنی ان کے ایلاء کی جو غرض بھی ہوگی، رب تعالیٰ اسے جانتا ہے، اس کی جزاء ان کو نیت کے مطابق ہوگی۔ (از روح المعانی)

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

ایلاء سے رجوع پر مغفرت اور رحمت کو معلق کیا اور عزم طلاق پر سمع اور علم کو تاکہ اہلِ علم کا امتحان لیا جا سکے کہ وہ کتنا سمجھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ مفسرین کرام کو خیر کثیر عطا فرمائے کہ انہوں نے وضاحت فرمائی ہے، خصوصا احناف نے کہ ایلاء کرنے والے جب دوران مدت وطی کرلیں اور قسم کے توڑنے کا کفارہ ادا کر دیں (کیونکہ کفارہ کا تعلق تو قسم توڑنے اور اللہ تعالیٰ کے نام کی تعظیم میں فرق آنے سے ہے) تو ان پر کوئی گناہ نہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمانے والا مہربان ہے کہ اس نیکی پر ان کو ثواب عطا فرمائے گا۔

اور اگر انہوں نے قسم کو نہ توڑنے اور رجوع نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا جو حقیقت میں طلاق کا ہی عزم ہے تو اللہ تعالیٰ ان کے اقوال کو سننے والا ہے، جو وہ اپنے آپ سے بات کر رہے ہیں یا اپنے اقرباء وغیرہ سے کہ میں رجوع نہیں کرتا اور اللہ تعالیٰ ان کی نیات کو جاننے والا ہے کہ وہ کیا ارادہ رکھتے ہیں، ضمناً ان کو دھمکی بھی دے دی گئی کہ اگر وہ رجوع نہیں کرتے اور عورت پر ظلم کا ارادہ ہی کرتے ہیں تو جان لیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے ارادوں کو بھی جانتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی حاصل کر رہے ہیں۔ (تفسیرات احمدیہ)

اگر وطی کرنا ممکن نہ ہو تو پھر کیا کرے؟

اگر ایک شخص نے قسم اٹھادی کہ وہ اپنی زوجہ کے قریب نہیں جائے گا، اس سے جماع نہیں کرے گا، اب وہ رجوع کرنا چاہتا ہے لیکن کسی مجبوری سے وہ ابھی وطی نہیں کرسکتا کہ وہ خود ایسا مریض ہے کہ وطی پر قادر نہیں، اس کی زوجہ اس حال میں ہے کہ اس سے وطی نہیں کی جاسکتی، تو وہ رجوع کرنے کے لئے صرف زبان سے کہہ دے کہ میں اپنی قسم کو توڑ کر رجوع کر رہا ہوں، تو اب طلاق بائن واقع نہیں ہوگی۔ البتہ جب وطی پر قادر ہوگا تو وطی کرنا لازم ہوگا۔

(ماخوذ از تفسیرات احمدیہ)

ایلاء سے متعلق چند احادیث:

"اخرج عبد الرزاق فی مصنفه والبیهقی فی سننه من طرق عن ابن عباس قال الفئی جماع" (درمنثور)

مصنف عبدالرزاق اور بیہقی میں متعدد طرق سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایلاء سے رجوع جماع ہے، یعنی چار مہینے کے اندر جماع کرے۔

☆ "واخرج عبدالرزاق فی المصنف وعبد بن حمید عن الحسن قال الفئی الجماع فان کان له عذر من مرض اوسجن اجزأ ہ ان یفئی بلسانه " (درمنثور)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ایلاء سے رجوع جماع سے ہوگا، ہاں البتہ اگر اسے کوئی عذر لاحق ہو یعنی مرض یا قید میں ہونے کی وجہ سے جماع نہ کیا جاسکے تو زبان سے رجوع کر لینا کافی ہے۔

☆ " واخرج ابن ابی حاتم عن ابن مسعود قال اذا حال بینه وبینها مرض اوسفر اوحبس اوشئی یعذر به فاشهاده فئی" (درمنثور)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب مرد یا عورت سے کوئی مریض ہو جائے، یا مرد اور عورت کے درمیان کوئی سفر حائل ہو، یا کوئی ایک قید میں ہو، کسی قسم کا کوئی عذر ہو جو وطی سے مانع ہو تو زبان سے رجوع کر لے لیکن رجوع پر گواہ بنالے تا کہ کسی قسم کا نزاع نہ ہو۔

چار ماہ میں زوجہ سے ایک مرتبہ وطی کرنا:

" اخرج مالک عن عبد اللہ بن دینار قال خرج عمر بن الخطاب من اللیل یسمع امرأة تقول

تطاول هذا اللیل واسود جانبه   وارقنی ان لا خلیل الاعبه

فو اللہ لولا اللہ انی اراقبه   لحرک من هذا السریر جوانبه

فسأل عمر ابنته حفصة کم اکثر ما تصیر المرأة عن زوجها فقالت ستة اشهر او اربعة اشهر فقال عمر لااحبس احدامن الجیوش اکثر من ذلک " (درمنثور)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک رات کو گشت کر رہے تھے، ایک عورت کی آواز سنی، جو یہ اشعار پڑھ رہی تھی۔

یہ رات لمبی ہوگئی اور اس کی طرفیں تاریک ہوگئیں، میرے دوست (زوج) کا نہ ہونا مجھے بیدار کئے

ہوئے ہے کہ میں اس سے خواہشات کو پورا کرتی، اس سے کھیلتی۔

قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اگر مجھے اللہ کا خوف نہ ہوتا تو میری چار پائی اپنی اطراف سے حرکت کر رہی ہوتی۔ (یعنی میں کسی شخص کو اپنے آپ پر قادر کر لیتی جس کے جماع سے چار پائی حرکت کر رہی ہوتی)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی بیٹی (ام المؤمنین) حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پوچھا کہ ایک عورت اپنے خاوند کے بغیر کتنا عرصہ صبر کر سکتی ہے؟ انہوں نے کہا چار ماہ یا چھ ماہ۔ آپ نے فرمایا کہ میں آئندہ کسی شخص کو چار ماہ سے زائد کسی لشکر میں روکنے کا حکم نہیں دوں گا۔

اسی واقعہ کی تفصیل میں سائب بن جبیر کی روایت میں یہ مذکور ہے کے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس عورت سے پتہ کرایا کہ اس کی بے قراری کی وجہ کیا تھی؟

"وقالت لهانی عمربن الخطاب وحشتی فی بیتی وغيبة زوجه علی وقله نفقتی"

تو اس عورت نے بتایا کہ میری بے قراری کی وجہ یہ ہے کہ مجھے گھر میں اکیلے رہتے ہوئے وحشت ہو رہی ہے، میرا خاوند مجھ سے غائب ہے، یعنی ایک لشکر میں ہے جو بہت دیر سے واپس نہیں آیا، اور میرے پاس خرچ بھی کم ہے۔

"فلما اصبح بعث اليها بنققة وكسوة وكتب الی عامله يسرح اليها زوجها"

صبح ہی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس عورت کے پاس خرچ کے لئے مال اور کپڑے بھیج دیئے اور اپنے عامل کی طرف خط لکھا کہ اس عورت کے خاوند فلاں شخص کو واپس بھیج دے۔ (در منثور)

☆ زبیر بن بکار نے محمد بن معن سے روایت کی کہ ایک عورت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے آکر عرض کرنے لگی،

"یاامیرالمؤمنین ان زوجی یصوم النهارويقوم الليل وانا اكره ان اشكوه اليک وهو يقوم بطاعة الله"

اے امیر المؤمنین بیشک میرا خاوند دن کو روزہ اور رات کو قیام کرتا ہے، یعنی نوافل پڑھتا ہے، اور میں ناپسند سمجھتی ہوں کہ اس کی شکایت آپ تک پہنچاؤں۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے۔

" فقال لها جزاک الله خیرا من مثنیة علی زوجها "

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے خاوند کی تعریف کرنے پر جزائے خیر عطا فرمائے۔

اس عورت نے اپنے خاوند کے متعلق کہے ہوئے الفاظ کئی مرتبہ کہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک ہی جواب کئی مرتبہ دیا۔ (ممکن ہے کہ آپ نے توجہ نہ کی ہو کہ عورت کیا کہنا چاہتی ہے۔ ممکن ہے کہ آپ یہ چاہتے ہوں کہ یہ صراحۃ خاوند کے متعلق کچھ ذکر کرے تو اس کے متعلق کوئی فیصلہ کیا جائے، کنایہ کی وجہ سے کوئی فیصلہ نہ کیا جائے۔ ممکن ہے آپ دیکھنا چاہتے ہوں کہ حاضرین میں سے بھی کوئی اس کی بات کو سنتا ہے یا نہیں)

وہاں حضرت کعب بن سوار اسدی بھی موجود تھے، آپ نے عرض کیا اے امیر المؤمنین اس عورت اور اس کے خاوند کے معاملہ میں کوئی فیصلہ فرمادیں۔ آپ نے فرمایا یہ عورت جو بیان کر رہی ہے کیا اس میں کسی فیصلہ کی بھی ضرورت ہے؟

" فقال انها تشکو مباعدة زوجها لها عن فراشها و تطلب حقها "

انہوں نے کہا یہ اپنے خاوند کے جماع نہ کرنے اس کے بستر سے دور رہنے کی شکایت کر رہی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو کہا جب تم نے اس عورت کے کلام کا مطلب سمجھ ہی لیا تو تم ہی ان دونوں کے درمیان فیصلہ کر دو، کعب نے اس عورت کے خاوند کو طلب کیا اور کہا کہ تمہاری زوجہ تمہاری شکایت کر رہی ہے، اس شخص نے کہا میں اسے خرچ کم دیتا ہوں؟ کعب نے کہا نہیں۔ اس عورت نے کہا۔

یاایهاالقاضی الحکیم یر شده	الهی خلیل عن فراشی مسجده
نهاره و لیله ما یر قده	فلست فی حکم النساء احمده
زهده فی مضجعی تعبده	فاقض القضاء یا کعب لا تر دده

اے دانا قاضی اس کی راہنمائی کرنے والے۔ میرے خاوند کے سجدے میرے بستر سے اسے دور رکھتے ہیں۔

دن رات اس کا علیحدہ ہوکر سونا کام ہے۔ میں بحیثیت زوجہ کے اس کی تعریف نہیں کرسکتی۔
اس کا عبادت کرنا میرے بستر سے اسے دور رکھتا ہے۔ اے کعب فیصلہ فرمادیں کوئی تردد نہ کریں۔
اس کے خاوند نے کہا۔

زهدنی فی فرشها وفی الحجل　　　انی امرؤ ازهد فیما قدنزل
فی سورة النحل وفی السبع الطوال　　　وفی کتاب الله تخویف جلل

میں اس کے بستر اور اس کے پاس لیٹنے والی پالکی سے دور رہتا ہوں۔ کیونکہ میں نیک انسان ہوں اور رب کا حکم نازل ہے سورۃ نحل میں اور سبع طوال میں۔ اور اللہ کی کتاب میں اللہ کا خوف دلایا گیا ہے۔
حضرت کعب نے کہا۔

ان خیر القاضین من عدل　　　و قضی بالحق جهراو فصل
ان لهاحقاعلیک یا رجل　　　تصیبها فی اربع لمن عقل
قضیة من ربها عزوجل　　　فاعطهاذاک ودع عنک العلل

قاضیوں میں بہتر قاضی کا انصاف کا فیصلہ یہ ہے۔ جو فیصلہ حق ہے اور ظاہر اور تفصیلی طور پر کردیا گیا ہے۔
کہ بے شک اس زوجہ کا تم پر حق ہے اے مرد۔ تم چار مہینے میں اس کے پاس پہنچو (جماع کرو) اگر تمہیں عقل ہے۔
یہ فیصلہ رب تعالیٰ کا فیصلہ ہے۔ اس عورت کا حق پورا کرو اس میں کوئی حجت بازی نہ کرو۔ (درمنثور)

☆☆☆☆☆

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ وَّلَايَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَاخَلَقَ اللّٰهُ فِىْ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِىْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْا اِصْلَاحًا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ☆ (سورة البقرة آیت نمبر ۲۲۸)

﴿۱﴾

اور طلاق والیاں اپنی جانوں کو روکے رہیں تین حیض تک، اور انہیں حلال نہیں کہ چھپائیں وہ جو اللہ نے ان کے پیٹ میں پیدا کیا اگر اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتی ہیں، اور ان کے شوہروں کو اس مدت کے اندر ان کے پھیر لینے کا حق پہنچتا ہے اگر ملاپ چاہیں۔ اور عورتوں کا بھی حق ایسا ہی ہے جیسا ان پر ہے شرع کے موافق، اور مردوں کو ان پر فضیلت ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔

﴿۲﴾

اور جن کو طلاق دی گئی وہ روک کر رکھیں اپنے آپ کو تین حیض (تک) اور نہیں حلال ان کے لئے کہ وہ چھپائیں جو پیدا کیا ہے اللہ نے ان کی بچہ دانیوں میں اگر وہ ایمان رکھتی ہیں اللہ پر اور دن آخرت پر، اور خاوندان کے زیادہ حق رکھتے ہیں ان کے لوٹانے کا اس میں اگر وہ ارادہ رکھیں اصلاح کا، اور ان (عورتوں) کا حق ہے مثل اس کے جو ان پر حق ہے شرع کے موافق، اور مردوں کو ان پر فضیلت ہے اور اللہ غالب (اور) حکمت والا ہے۔

ماقبل سے تعلق:

جب اس سے پہلے ایلاء کا ذکر کیا گیا اور ایلا چار مہینے کے اندر وطی نہ کرنے کی وجہ سے طلاق بائن واقع ہو جاتی ہے تو اب اس آیۂ کریمہ میں طلاق کے بعد کا حکم بیان کیا جا رہا ہے۔یعنی عدت کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ (قرطبی)

مختصر مطلب:

جن عورتوں کو طلاق دے دی گئی وہ اپنے آپ کو تین حیض تک روک کر رکھیں ،یعنی ان کی عدت تین حیض ہے، اور اگر ان کا اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان ہو تو وہ اپنی رحموں (بچہ دانیوں) میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو نہ چھپائیں۔ یعنی اگر وہ حاملہ ہوں تو اللہ تعالیٰ اور آخرت کا خوف کرتے ہوئے بتا دیں کہ وہ حاملہ ہیں، کیونکہ حمل کی صورت میں ان کی عدت بچے کی پیدائش ہے، ایسا نہ ہو کہ عدت ختم ہونے سے پہلے ہی اور کسی سے نکاح کر لیں، وہ نکاح نہیں ہوگا۔ اور اگر ان کو رجعی طلاق دی گئی ہو تو ان کے خاوند ان سے رجوع کرنے کا زیادہ حق رکھتے ہیں، ہاں اگر وہ اصلاح کا ارادہ رکھتے ہوں تو۔یعنی اچھی طرح شرع کے مطابق ان کو بسانا چاہیں، ان کی عدت لمبی کرنے کا اردہ نہ ہو ان پر پھر سے مظالم ڈھانے کا ارادہ نہ ہو تو وہ رجوع کرنے کو زیادہ حق رکھتے ہیں۔

عورتوں کے حقوق مردوں پر شریعت کے موافق ایسے ہی ہیں جیسے عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں۔اور مردوں کو عورتوں پر فضیلت حاصل ہے۔اور اللہ غالب ہے اور اللہ حکمت والا ہے۔

قدرے تفصیل:

"والمطلقات" جمع ہے "المطلقة" کی۔مطلقہ اس عورت کو کہا جاتا ہے جسے طلاق دی گئی، طلاق کے لئے ملک یا نسبت ملک ضروری ہے۔اگر اجنبیہ عورت کو یہ کہے تجھے طلاق ہے تو یہ الفاظ اس کے ضائع چلے جائیں گے، کیونکہ وہ اس کی منکوحہ بھی نہیں اور ملک کی طرف طلاق کی نسبت بھی نہیں۔

اگر اجنبیہ کو طلاق دیتے وقت یہ کہے کہ جب میں تمہارے ساتھ نکاح کروں تو تجھے طلاق، اس صورت میں جب نکاح کرے گا تو طلاق واقع ہو جائے گی۔

اگر منکوحہ کو طلاق دے تو پھر دیکھا جائے کہ اس سے نکاح کے بعد وطی کی تھی یا خلوت صحیحہ پائی گئی یا نہیں، اگر وہ عورت غیر مدخول بہا (یعنی اس سے وطی نہیں کی گئی) ہے اور اس سے خلوت صحیحہ بھی نہیں پائی گئی تو اس کی کوئی عدت نہیں، طلاق کے بعد بغیر عدت کے اس کا نکاح کیا جا سکتا ہے۔ اس مسئلہ کو رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ میں ذکر فرمایا۔

"یا ایھالذین امنوا اذا نکحتم المومنات ثم طلقتموھن من قبل ان تمسوھن فمالکم علیھن من عدۃ تعتدونھا" (سورۃ الاحزاب)

اے ایمان والو! جب تم ایمان والی عورتوں سے نکاح کرلو پھر ان کو مس کرنے (وطی، خلوت صحیحہ) سے پہلے طلاق دے دو تو ان پر تمہارے لئے عدت گزارنا لازم نہیں۔

اگر منکوحہ سے وطی کرلی تھی، یا خلوتِ صحیحہ پائی گئی تھی، تو اب دیکھا جائے گا وہ حاملہ ہے یا نہیں۔ اگر حاملہ ہو تو اس کی عدت وضعِ حمل یعنی بچے کی پیدائش ہے، اس مسئلہ کو اس آیۃ کریمہ میں بیان کیا گیا ہے۔

"واولات الاحمال اجلھن ان یضعن حملھن" اور حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل ہے۔ (الطلاق)

اگر حاملہ نہیں تو پھر دیکھا جائے کہ ان کو حیض آتا ہے یا نہیں۔ اگر حیض نہیں آتا بچپن کی وجہ سے یا بڑھاپے کی وجہ سے یا کسی بیماری کی وجہ سے حیض مکمل بند ہو گیا، تو ان کی عدت تین مہینے ہے، اس مسئلہ کو اس آیۃ کریمہ میں ذکر کیا گیا ہے۔

"واللائی یئسن من المحیض من نساء کم ان ارتبتم فعدتھن ثلاثہ اشھر" (الطلاق)

اور تمہاری عورتیں جو حیض سے ناامید ہو جائیں اگر تمہیں کچھ شک ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے۔

اگر ان کو حیض آنا ممکن ہو تو پھر دیکھا جائے وہ لونڈی ہے یا حرہ (آزاد عورت) ہے۔ اگر لونڈی ہو تو اس کی عدت دو حیض ہے، جو اجماع امت سے ثابت ہے، اور نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد سے ثابت ہے۔

"طلاق الامۃ تطلتقیان و عدتھا حیضتان"لونڈی کی (مغلظہ) طلاقیں دو ہیں اور اس کی عدت دو حیض ہے۔

جس عورت کو حیض آتا ہے اور وہ منکوحہ ہے اس سے وطی یا خلوت صحیحہ ہو چکی ہے، اس کی عدت کا ذکر اس زیر بحث آیۃ کریمہ میں موجود ہے کہ اس کی عدت طلاق کے بعد تین حیض ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

دینی طلباء کرام کے لئے:

جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت چار ماہ دس دن ہے، جس کا ذکر ان شاء اللہ قریب ہی آ رہا ہے۔

سوال: لفظ"مطلقات"جمع ہے جو عموم پر دلالت کر رہا ہے۔ قانون یہ ہے کہ عام سے کم چیزوں کی تخصیص کی جاتی ہے، یہاں تو"مطلقات"میں ایک قسم داخل ہے، اور مطلقات کی پانچ قسموں کو اس لفظ عام سے خارج کر دیا گیا ہے، یہ کیسے صحیح ہے؟

جواب: اجنبیہ تو لفظ"مطلقات"میں داخل ہی نہیں کیونکہ اسے"مطلقۃ"نہیں کہا جاتا، لہٰذا نہ لفظ"مطلقات"اسے شامل ہے، اور نہ ہی اسے عام سے نکالا گیا ہے۔

غیر مدخول بہا (جس سے وطی اور خلوت صحیحہ نہیں پائی گئی) قرینہ سے خارج ہے، کیونکہ عدت کا اصل مقصد رحم کا بری ہونے کا پتہ چلانا ہے، اس کے لئے شریعت نے حدود عدت مقرر کر دی ہیں۔ رحم کی برأت کی ضرورت اس وقت درپیش آتی ہے جب پہلے مجامعت پائی جائے یا خلوت صحیحہ پائی جائے جو مجامعت کے شرعاً قائم مقام ہے، جب یہ صورت نہیں تو وہ خود بخود اس حکم سے خارج ہے۔

حاملہ عورت اور حیض سے ناامید لفظ"قروء"سے خارج ہیں، کیونکہ حیض سے عدت وہاں ہوتی جہاں حیض ہو اور جہاں حیض ہی نہ ہو وہاں حیض سے عدت گذارنا متصور ہی نہیں۔

لونڈی سے چونکہ بہت کم ہی نکاح کیا جاتا ہے، کیونکہ وہ مالک کی خدمت گذاری میں رہتی ہے، اس لئے نوادرات وشواذ ویسے ہی خارج ہوتے ہیں۔

" فثبت ان الاعم الاغلب با ق تحت هذا العموم "

تو ثابت ہوا کہ لفظ "مطلقات" کا عموم غالب طور پر باقی ہے۔ (کبیر)

راقم کہتا ہے "والمطلقات" الف لام عہد خارجی ہے، جو معہود یعنی حیض والی مطلقات کے غیر کو شامل ہی نہیں۔ البتہ لفظ جمع کی وجہ سے جن پر اطلاق ہے ان کے تمام افراد کو شامل ہے۔

تنبیہ:

اعلیٰ حضرت نے "یتربصن" کا ترجمہ کیا ہے "روک کر رکھیں" راقم نے بھی یہی نقل کیا ہے، یہ ترجمہ تو امر کا ہے، مضارع کا ترجمہ امر والا کرنا کیسے صحیح ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے۔

"قوله" یتر بصن" لا شک انه خبر والمراد منه الامر"

کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی میں اگر چہ "یتصربصن" مضارع کا صیغہ ہے جو خبر پر دلالت کرتا ہے، لیکن معنی امر کا ہے جو انشاء ہے۔ (از کبیر)

سوال: جب معنی امر کا ہے تو امر کے معنی کو خبر سے تعبیر کرنے کا کیا مطلب ہے؟

پہلا جواب: امر میں کسی کام کو اپنے اختیار اور قصد سے کیا جاتا ہے۔ لیکن خبر میں قصد واختیار کی ضرورت نہیں۔ اس لئے یہاں امر والا معنی لینے کے لئے مضارع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے کہ ایک مسئلہ واضح کر دیا جائے وہ یہ کہ عورت کا خاوند فوت ہو جائے یا اس نے طلاق دے دی، عورت کو پتہ نہیں چل سکا، پتہ اس وقت چلا جب عدت گذر چکی ہے تو وہ دوسری جگہ اس وقت نکاح کر سکتی ہے، اسے قصد واختیار سے عدت گذارنے کی ضرورت نہیں۔

دوسرا جواب: زمخشری نے کشاف میں یہ جواب ذکر کیا ہے کہ امر کو خبر کے صیغہ سے ذکر کرنے کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ظاہر کرنا یہ مقصود ہوتا ہے کہ اس امر پر جلدی سے عمل کر دیا گیا۔ یہاں بھی یہ بتانا مقصود ہے۔

"فکأنهن امتثلن الأمر بالتربص فهو یخبر عنه موجودا "

گویا کہ ان عورتوں نے رب تعالیٰ کے حکم کو جلدی ہی قبول کر لیا ہے اور ان کا انتظار کرنا موجود ہو چکا ہے۔

اس کی اور مثال دعائیہ کلمات میں دیکھی جائے جیسا کہ کہا جاتا ہے "رحمنا اللہ" معنی اس کا یہ ہے "اے اللہ ہم پر رحم کر" لیکن صیغہ ماضی کا ذکر کیا گیا، کیونکہ دعا کی قبولیت پر کامل وثوق کیا گیا ہے۔

"کانھا وجدت الرحمة فھو یخبر عنھا" گویا کہ رحمت پائی گئی ہے اور اس کی خبر دی جا رہی ہے۔ (کبیر)

سوال : "یتربصن" کے بعد "بانفسھن" کے ذکر کا کیا فائدہ ہے، صرف "یتربصن" پر اکتفاء کیوں نہیں کیا۔

جواب: عورتوں کو عدت گذارنے پر برانگیختہ کیا گیا ہے کہ وہ یہ تصور کرتے ہوئے کہ نبی کریم ﷺ کے واسطہ سے ہمیں یہ حکم براہ راست دیا گیا ہے، ہم پر کسی اور کو یہ حکم چلانے کے لئے مسلط نہیں کیا گیا تو اس طرح وہ خوشی سے حکم تسلیم کریں گی۔

دینی طلباء کرام کے ذوق کے لئے:

سوال: لفظ انفس جمع قلت ہے حالانکہ نفوس کثیر ہیں، یہاں جمع کثرت کا صیغہ ہونا چاہیے تھا۔ اور "قروء" جمع کثرت ہے، حالانکہ حیض تین مراد ہیں، یہاں جمع قلت کا صیغہ استعمال ہونا چاہیے تھا، عقل کے خلاف دونوں صیغوں کا استعمال کس حکمت کی وجہ سے ہے؟

جواب : نحوی ضابطہ یہ بھی ہے کہ جمع قلت اور کثرت ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتی رہتی ہیں۔

سوال: قروء کا معنی جب حیض ہے تو حیض مؤنث سماعی ہے، اس کے لئے تو "ثلاث" استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے "ثلاث حیض" تو "ثلاثہ قروء" کیوں کہا گیا۔

جواب : "لانہ اتبع تذکیر اللفظ ولفظ القروء مذکر" یہ اس لئے کہ لفظ "قروء" مذکر ہے اگرچہ اس کا معنی حیض ہے جو مونث سماعی ہے لیکن یہاں لفظ کا اعتبار کیا گیا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

ثلاثہ قروء : تین حیض۔

"قروء" لغوی معنی کے لحاظ پر مشترک ہے۔ حیض پر بولا جاتا ہے اور طہر (پاکیزگی) پر بھی۔

لیکن شرع میں غالب طور پر استعمال اس کا حیض پر ہی ہے، یہاں بھی مراد حیض ہے، یعنی عدت تین حیض ہے، " قروء" کا معنی حیض لیا جائے، کیونکہ اس پر چند وجوہ سے دلائل پائے جاتے ہیں۔

(۱) "روی عن النبی ﷺ انہ قال" دعی الصلوۃ ایام اقراء ک "

نبی کریم ﷺ نے ایک عورت کے مسئلہ پوچھنے پر ارشاد فرمایا تم نماز چھوڑ دو اپنے حیض کے دنوں میں۔

اتنا مسئلہ واضح ہے کہ نماز حیض کے دنوں میں چھوڑی جاتی ہے، پاکیزگی کے دنوں میں نہیں، جب حدیث شریف میں "اقراء" (جو جمع ہے قرء کی) کا معنی حیض ہے۔تو اس آیۃ کریمہ میں بھی "قروء" کا معنی حیض ہی لیا جائے گا۔

(۲) "ثلاثة" لفظ خاص ہے۔جس کا معنی ہے "تین" قرآن پاک میں استعمال ہونے والا لفظ خاص خبر واحد یا قیاس سے تبدیل نہیں ہوسکتا۔ثلاثہ کی تخصیص اسی وقت تک برقرار رہے گی جب معنی حیض لیا جائے، کیونکہ طلاق طہر میں دینی چاہئے، اس کے بعد عدت تین حیض مکمل ہو جائے گی۔ اگر عدت تین طہر ہو تو تین مکمل نہیں ہوتے، بلکہ یا تو بڑھ جائیں گے یا کم رہیں گے، کیونکہ جس طہر میں طلاق دی گئی اگر وہ بھی شمار کیا جائے تو تین طہر مکمل نہیں ہو سکتے، اگر اس کے بغیر تین اور مراد لئے جائیں تو تین سے بڑھ جائیں گے۔

(۳) تین مہینے ان عورتوں کی عدت ہے جن کو حیض نہیں آتا، جب حیض نہ آنے کی صورت میں اس کا بدل تین مہینے مقرر کیا گیا، تو یقیناً اصل عدت حیض ہی ہوں گے۔

(۴) نبی کریم ﷺ نے فرمایا "طلاق الامۃ تطلیقان و عدتھا حیضتان" لونڈی کی طلاقیں دو ہیں اور اس کی عدت دو حیض ہے۔ جب لونڈی کی عدت دو حیض ہے تو یقیناً حرہ کی عدت تین حیض ہیں۔

(۵) عدت میں اصلی غرض رحم کی براءت (بچہ دانی کا حمل سے پاک ہونا) معلوم کرنا ہے، وہ حیض سے ہی معلوم ہو سکتی ہے، طہر سے نہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

"ولا یحل لھن ان یکتمن ما خلق اللہ فی ارحامھن":

اور نہیں حلال ان کے لئے کہ چھپائیں جو پیدا کیا ہے اللہ نے ان کی بچہ دانیوں میں۔

عدت کا ختم ہونا تین حیض کے ختم ہونے پر موقوف ہے، اور حاملہ عورت کی عدت وضعِ حمل سے مکمل ہوتی ہے، اس پر مرد کا مطلع ہونا آسان نہیں، اس لئے عورت کو اس پر امینہ بنایا گیا ہے کہ وہ اپنے حمل کو نہ چھپائے، ایسا نہ ہو کہ عدت ختم ہونے کا دعوی کرے اور درواقع میں اس کی عدت ختم نہ ہوئی ہو تو حرام کی مرتکب ہو۔

"ان کن یؤمن باللہ والیوم الآخر":

اگر وہ ایمان رکھتی ہوں اللہ پر اور آخرت کے دن پر۔

حمل کو چھپانے سے نہی ایمان پر موقوف نہیں۔ بلکہ جس طرح کسی کو کہا جائے "ان کنت مؤ منافلا تظلم" اگر تو مومن ہے تو ظلم نہ کر۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تو ایمان والا ہے تو ایمان تجھے ظلم سے روکے۔ اسی طرح اس آیۃ کریمہ میں عورتوں کے لئے وعید شدید ہے کہ اے عورتو! جب تم ایمان والی ہو تو تمہارا ایمان تمہیں اس سے روکے کہ تم اپنی رحموں (بچہ دانیوں) میں اللہ تعالی کی مخلوق کو چھپاؤ۔

"وبعولتهن احق بردهن فی ذلک ان ارادوا اصلاحا":

اور خاوندان کے زیادہ حق رکھتے ہیں ان کی طرف رجوع کرنے کا اس میں اگر وہ ارادہ کریں اصلاح کا۔

طلاق کا پہلا حکم بیان کیا عدت گذارنے کا، یہ دوسرا حکم بیان کیا جا رہا ہے رجوع کرنے کا۔

"وبعولتهن": "بعولة" میں دو قول ہیں۔

ایک یہ ہے کہ یہ لفظ جمع ہے "بعل" کی، جیسے فحولة، ذکورة، جدودة، عمومة وغیرہ جمع ہیں۔ اور تاء، جو وقفی حالت میں ھاء بن جاتی ہے، یہ زائد ہے اور جمع کی تاکید کے لئے ہے۔ یہ تاء ہر جمع میں نہیں لائی جاسکتی، بلکہ وہاں ہی آئے گی جہاں عرب حضرات نے اسے استعمال کیا ہوگا۔ اسی لئے "کعب" کی جمع "کعوبة" اور "کلب" کی "کلابة" نہیں آئے گی۔

"بعل" کا لفظ مشترک ہے جس طرح "زوج" کا لفظ مشترک ہے۔ مذکر اور مونث دونوں پر یہ دونوں لفظ

بولے جاتے ہیں۔"بعل " کا معنی سردار اور مالک بھی آتا ہے۔جس طرح کہا جاتا " من بعل هذه الناقة "اونٹنی کا مالک کون ہے۔اور"بعل" کا اطلاق بتوں پر بھی کیا گیا،جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد گرامی ہے؟"اتدعون بعلا" کیا تم بت کی پوجا کرتے ہو۔

دوسرا قول " بعولة "مصدر ہے،کہا جاتا ہے "بعل الرجل بعولة "جس کا معنی ہے جماع کرنا۔

جیسا کہ حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ایام تشریق (گیارہ بارہ، تیرہ ذی الحج) کے متعلق یہ ہے۔" انها ایام اکل وشرب وبعال "بے شک یہ دن کھانے اور پینے اور جماع کرنے کے ہیں (یعنی ان دنوں میں روزہ نہ رکھا جائے)

"وامرأة حسنة البعل اذا كانت تحسن عشرة زوجها " جب عورت اپنے خاوند سے اچھی معاشرت رکھے تو اس سے جماع کرنا بھی اچھا لگتا ہے،یعنی وہ اپنے آپ کو اچھی طرح جماع کے لئے پیش کرتی ہے۔

اور حدیث شریف میں ہے " اذااحسنتن يبعل ازواجكن " (اے عورتو) جب تم اپنے آپ کو حسین بنا کر رکھو گی تو تمہارے خاوند تم سے جماع کریں گے۔

اس قول کے مطابق آیہ کریمہ کا ترجمہ ہوگا۔" واهل بعولتهن احق بردهن"ان سے جماع کرنے والے(ان کے خاوند)ان کی طرف رجوع کرنے کا زیادہ حق رکھتے ہیں۔

" فی ذلک ": میں"ذلک"کا اشارہ"تربص"کی طرف ہے۔اب معنی یہ ہوگیا۔"احق برجعتهن فی مدةذلک التربص" ان کے خاوندان سے رجوع کرنے کا حق رکھتے ہیں،اس مدت انتظار میں،یعنی عدت کے دنوں میں۔

"ردیرد،ردا" کا معنی پھیرنا،لوٹانا،رجوع کرنا،جیسا کہ کہا جاتا ہے"ردتها ای رجعتها"میں نے اس کی طرف رجوع کیا۔

" ان حق الرد انما يثبت فی الوقت الذی هو وقت التربص فاذا انقضی ذلک الوقت فقد بطل حق الردو الرجعة "

رجوع کرنے کا حق اسی وقت تک رہے گا جب عدت قائم رہے گی، جب عدت ختم ہو جائے گی تو خود بخود رجوع کا حق بھی ختم ہو جائے گا۔

"ان ارادوا اصلاحا": اگر وہ ارادہ رکھتے ہوں اصلاح کا۔

یعنی ان عورتوں کے خاوند رجعی طلاق کے بعد رجوع کرنے کا زیادہ حق رکھتے ہیں، اگر وہ اصلاح کا ارادہ رکھتے ہوں، ان کو نقصان پہنچانے کا ارادہ نہ رکھیں۔ جس طرح عنقریب "ولا تمسکوھن ضرارا لتعتدوا" میں واضح طور پر ذکر آ جائے گا۔

زمانہ جاہلیت میں لوگ طلاق کے بعد رجوع کر لیتے تھے، پھر طلاق دے دیتے تھے، اس طرح عورت کی عدت لمبی ہو جاتی تھی، اس ظالمانہ طریقہ سے منع کیا گیا اور کہا گیا کہ اصلاح کی غرض سے رجوع کرنا چاہیں تو کریں۔

اعتراض: "ان ارادوا" میں "ان" حرف شرط ہے۔ قانون یہ ہے کہ شرط کے نہ پائے جانے سے حکم نہیں پایا جاتا، اس سے تو یہ لازم آئے گا کہ اصلاح کا ارادہ نہ ہو تو رجوع ہی ثابت نہ ہو، حالانکہ رجوع تو ہر حالت میں ثابت ہو جاتا ہے۔

جواب: ارادہ دل کا فعل ہے، دوسرا کوئی اس پر مطلع نہیں ہو سکتا، اس لئے رجوع کی دادرومدار ظاہری الفاظ یا فعل پر ہے۔ البتہ اگر کسی شخص نے نقصان پہنچانے کے لئے رجوع کیا تو وہ گنہگار ہو گا۔ (ماخوذ از کبیر)

"ولھن مثل الذی علیھن": اور ان عورتوں کے لئے مثل اسی کے ہے جو ان پر ہے۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

اس مقام میں "صنعۃ احتباک" پائی گئی ہے، وہ یہ کہ اول کو حذف کر دیں، دوسرے کے قرینہ سے، یا دوسرے کو حذف کر دیں اول کے قرینہ سے۔

"ولا یخفی لطفہ فیما بین الزوج والزوجۃ" زوج اور زوجہ کے درمیان حقوق کو بیان کرنے میں

"صنعت احتباک" کا طریقہ استعمال عجیب لطف پر مشتمل ہے۔ گویا کہ معنوی طور پر عبارت یوں ہے۔

" ولھن علیھم مثل الذی لھم علیھن " عورتوں کے لئے مردوں پر ایسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں پر ان کے حقوق ہیں۔

" والمراد بالمماثلة، المماثلة فی الوجوب لافی جنس الفعل"

مماثلت سے مراد وجوب میں مماثلت ہے یعنی عورتوں پر بھی مردوں کے حقوق واجب ہیں اور مردوں پر بھی عورتوں کے حقوق واجب ہیں۔

یہ مطلب نہیں کہ جو کام عوررت کرے وہی مرد بھی کرے کہ عورت کپڑے دھوئے اور روٹی پکائے تو مرد بھی یہی فعل کرے۔ البتہ مرد ان کے مقابل اس قسم کے راحت پہنچانے والے کام کرے۔ (روح المعانی)

"بالمعروف": شرع کے موافق

"(بالمعروف) بالوجه الذی لا ینکر فی الشرع وعادات الناس فلا یکلف احد الزوجین صاحبه ما لیس له " (مدارک التنزیل)

یعنی عورتوں کے حقوق مردوں پر ایسے ہی ہیں جیسے مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں، معروف طریقہ سے، معروف طریقہ سے مراد یہ ہے کہ وہ شرع کے موافق ہوں۔ وہ حقوق نہیں جن کا شریعت انکار کرے، حقوق تو ہیں ہی وہ جن کا شریعت انکار نہ کرے اور مسلمان لوگوں کی عادات کے خلاف نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جن کاموں پر زوج قدرت نہیں رکھتا ان پر اسے مجبور نہیں کیا جائے گا، اور جن کاموں پر زوجہ طاقت نہیں رکھتی، ان پر اسے مجبور نہیں کیا جائے گا۔ (مدارک)

" وذلک ان حق الزوجیة لا یتم الااذا کان کل واحد منهما یراعی حق الآخر فیماله وعلیه "

یعنی اس وقت تک زوجیت کی تکمیل نہیں ہوسکتی جب تک ہر ایک زوجین میں سے ایک دوسرے کے حقوق کا لحاظ نہ کریں۔ اگر خاوند چاہتا ہے کہ زوجہ میرے حقوق ادا کرے تو خاوند کو بھی چاہئے

کہ وہ زوجہ کے حقوق ادا کرے، اور اگر زوجہ چاہتی ہے کہ زوج میرے حقوق ادا کرے تو وہ خود بھی زوج کے حقوق ادا کرے۔ (حازن)

خاوند اور بیوی کے حقوق:

حقوق کی دو قسمیں ہیں بعض شرعی اور بعض اخلاقی۔

حقوقِ شرعیہ وہ ہیں جن کے ادا نہ کرنے پر عدالت سے رجوع کیا جا سکتا ہے، حاکم جبراً وہ حقوق دلائے گا یا بعض حقوق کے ادا نہ کرنے پر نکاح فسخ کر دے گا۔

اور حقوقِ اخلاقیہ وہ ہیں جن کے ادا کرنے سے رجوع نہیں کیا جا سکے گا، البتہ خاوند حقوق اخلاقیہ میں کمی کرے گا تو زوجہ کو بھی حق حاصل ہوگا کہ وہ بھی حقوقِ اخلاقیہ میں کمی کر دے تاکہ خاوند کو بھی احساس ہو جائے۔

عورت کے حقوق خاوند پر:

خاوند پر عورت کے حقوق شرعیہ واجبہ چار قسم کے ہیں۔

(۱) کھانا جیسے خود کھائے ایسے زوجہ کو بھی کھلائے۔

(۲) اپنی وسعت اور طاقت کے مطابق لباس مہیا کرنا اور جہاں تک ممکن ہو اسے آرام پہنچانا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے " لینفق ذو سعة من سعة "ہر شخص اپنی وسعت کے مطابق نفقہ دے۔

یعنی مال دار اپنی وسعت کے مطابق خرچ دے اور غریب شخص اپنی وسعت کے مطابق۔ اور ارشاد فرمایا۔

"وعلى المولود له رزقهن وكسوتهن بالمعروف" بچے کے باپ پر ان کی ماؤں کا رزق اور کپڑے لازم ہیں اچھے طریقے سے۔

یعنی اپنی طاقت کے مطابق دے، غنی پر اس کی طاقت کے مطابق رزق اور کپڑے دینے لازم ہیں، اور غریب پر اس کی طاقت کے مطابق لازم ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا۔

"ولهن علیکم رزقهن و کسو تهن بالمعروف " تم پر لازم ہے کہ اپنی بیویوں کو اپنی طاقت کے مطابق کپڑے اور رزق دو۔

خیال رہے کہ اگر عورت کو طلاق بھی دے دی جائے تو پھر بھی خرچہ عدت کے دوران خاوند پر ہی لازم ہے۔ عدت گذرنے کے بعد خاوند کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔

تنبیہ : خاوند اگر خرچ بہت کم دے جو زوجہ اور بچوں کے جائز حقوق کو کافی نہیں ہو سکتا تو عورت خاوند کی اجازت کے بغیر اس کا مال اتنی مقدار میں لے سکتی ہے جس سے اس کی جائز ضروریات پوری ہو سکیں، حضرت ہند بنت عتبہ رضی اللہ عنہا نے حضورﷺ کی خدمت میں عرض کی یا رسول اللہ! میرے خاوند ابوسفیان کنجوس شخص ہیں، مجھے اتنا خرچ نہیں دیتے جو مجھے اور میرے بچوں کو کفایت کر سکے، کیا میں ان کے علم کے بغیر ان کا مال لے لیا کروں؟ تو نبی کریمﷺ نے فرمایا" خذی من ماله با لمعروف ما یکفیک ویکفی بنیک " ہاں اتنا مال تم لے لیا کرو جو تمہیں اور تمہارے بچوں کو اچھے طریقے سے کافی ہو جائے۔

(۳) عورت کو رہنے کے لئے مکان دینا خاوند پر لازم ہے۔

"وعلی الزوج ان یسکنها فی دار مفردة لیس فیها احد من اهله الا ان تختار ذلک " خاوند پر لازم ہے کہ زوجہ کو علیحدہ کمرہ دے جس میں اس کے گھر کا اور کوئی فرد نہ ہو، ہاں اگر زوجہ دوسرے حضرات (ساس، سسر، نند) کو اپنے کمرہ میں رہنے کی اجازت دے تو جائز ہے، کیونکہ یہ اس کا حق ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا" اسکنو هن من حیث سکنتم من وجدکم "عورتوں کو وہاں رکھو جہاں خود رہتے ہو وسعت کے مطابق۔

"والسکنی با لملک او الاجارة او العاریة واجبة اجماعا " ٹھہرنے کے لئے مکان دینا خاوند پر واجب ہے بالاتفاق، البتہ مکان عام ہے کرایہ پر لیا جائے، کسی سے مانگ کر لیا جائے یا ملکیت ہو۔

(۴) مرد پر لازم ہے کہ ایک مرتبہ کم از کم مجامعت کرے، اگر ایک مرتبہ بھی مجامعت نہ کر سکے تو قاضی نکاح کو فسخ کر دے۔

"واذا کان الزوج عنینا اجله الحاکم سنة فان وصل الینا فبها والا فرق بینهما اذا طلب المراة ذلک"

جب خاوند نامرد ہو یعنی وطی نہ کر سکے تو حاکم ایک سال کے لئے اسے مہلت دے، اگر وہ جماع کرنے کے قابل ہو گیا اور عورت سے مجامعت کر لی تو بہتر ورنہ قاضی ان کے درمیان تفریق کر دے لیکن شرط یہ ہے کہ اگر عورت تفریق کا مطالبہ کرے تو تفریق کی جائے گی۔ اور اگر تفریق کا مطالبہ نہ کرے بلکہ اسی حالت میں خاوند کے پاس رہنا چاہے تو قاضی تفریق نہیں کر سکتا کیونکہ یہ عورت کا حق ہے۔

مسئلہ: مرد کو چاہئے کہ کم از کم چار ماہ میں ایک بار اپنی بیوی سے ضرور صحبت کرے، بلا وجہ عورت کو چھوڑ کر بہت دن سفر میں نہ رہے۔ اس مسئلہ کی تفصیل ایلاء کی بحث میں گذر چکی ہے۔

(از ابتداء حقوق تا انتہاء، بخاری، مسلم ھدایہ، فتح القدیر، شامی، درمنثور، نعیمی)

خاوند پر زوجہ کے اخلاقی حقوق:

عورت کے خاوند پر اخلاقی حقوق کثیر ہیں، ہر وہ حق جو حسن اخلاق میں آتا ہو وہ خاوند پر اخلاقاً لازم ہے، اور ہر وہ قول و فعل جو بد مزاجی میں آتا ہے اس سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔ اگر انسان زوجہ کو اپنے گھر کا ایک فرد سمجھے تو یقیناً تمام گھریلو جھگڑے، فساد ختم ہو جائیں گے، لیکن بشرطیکہ وہ زوجہ بھی اپنے آپ کو یہی سمجھے کہ میں یہاں اجنبی نہیں بلکہ اس گھر کا ایک فرد ہوں۔ شریعت نے اسی وجہ سے زوجہ کے ماں باپ کو خاوند کے ماں باپ ہونے کا درجہ دیا ہے اور خاوند کے ماں باپ کو زوجہ کے ماں باپ ہونے کا درجہ دیا ہے۔

جب یہ بات دونوں کو سمجھ آ جائے تو ساس اور بہو کے جھگڑے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی، بہو کو ساس کی اتنی بات برداشت کرنی چاہئے جتنی ماں کی برداشت کرتی ہے۔ اور ساس کو بہو کی اتنی بات برداشت کرنی چاہئے جتنی وہ اپنی بیٹی کی برداشت کرتی ہے۔

مقام تعجب اور مقام افسوس یہی ہے کہ ہمارے معاشرے میں ساس کو ماں نہیں سمجھا جاتا اور بہو کو بیٹی نہیں سمجھا جاتا، بات بات پر دنگا وفساد برپا کر دیا جاتا ہے۔ اکثر وبیشتر ساس اور بہو کی لڑائی سے ہی گھر برباد ہوتے نظر آتے ہیں، کاش آج کی ساس کو اتنا ہوش آئے کہ کل میں بھی کسی کی بہو تھی، اور آج کی بہو کو یہ سمجھ آئے کہ کل میں نے بھی کسی کی ساس بننا ہے۔

شریعت مطہرہ نے تو ساس کو ماں بنا کر شفقت کرنے کا حکم دیا ہے اور بہو کو بیٹی بنا کر عزت واحترام کرنے کا حکم دیا ہے، آج دونوں شریعت کے احکام سے دور ہو کر پریشانیوں کا شکار ہیں۔

خاوند پر اخلاقاً لازم ہے کہ وہ اپنی زوجہ کی ہر قسم کی تکلیف کو دور کرنے کی اپنی طاقت کے مطابق کوشش کرتا رہے، بیمار ہونے پر جتنا ہو سکے علاج کرائے۔ اس کے والدین کو اس کی ملاقات سے نہ روکے، کیونکہ اس میں قطع رحمی ہے۔ جو گناہ ہے، اس کے محرم آدمیوں یعنی چچا، ماموں، بھائی، بھانجوں، بھتیجوں کو اس کے پاس آنے سے نہ روکے۔ البتہ اس کے ماں باپ ہر ہفتے میں ایک دن آ سکتے ہیں، دوسرے رشتہ دار سال میں ایک مرتبہ آئیں تو بہتر لیکن اخلاقی طور پر وقت کا تعین نہیں۔ عام عادت کے مطابق اور ضرورت کے مطابق جب بھی یہ لوگ ملاقات کرنا چاہیں اسی وقت ملیں۔ خاوند کو چاہئے کہ وہ انہیں کشادہ روئی یعنی ہنس مکھ چہرے سے ملے۔

" وینبغی ان یا ذن لھافی زیارتھمافی الحین بعدالحین علی قدر متعارف" (فتح القدیر)

خاوند کو چاہئے کہ وہ اپنی زوجہ کو اتنی دیر بعد اجازت دے کہ وہ اپنے والدین کو ملے، جتنی دیر میں عام طور پر ملاقات کرنے کا رواج ہو یا عورت کی تمنا ہو۔

یقیناً شروع شروع میں عورت جلدی جلدی ملاقات کی تمنا کرتی ہے، عیال میں مشغول ہونے کے بعد خود ہی اس میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔

زوجہ پر خاوند کے حقوق:

زوجہ پر بھی دو قسم کے حقوق ہی ہیں، ایک شرعیہ اور دوسرے اخلاقاً لازم ہیں۔ جن کے نہ ادا کرنے میں عدالت کی طرف رجوع نہیں ہو سکے گا۔

عورت پر حقوق واجبہ تین ہیں۔

(۱) عورت پر واجب ہے کہ مرد کو اپنے آپ پر قدرت دے، یعنی اسے جماع سے نہ روکے، جب تک کوئی شرعی عذر نہ ہو، یعنی حیض و نفاس سے پاک ہو۔ اور ایسی کوئی بیماری بھی نہ ہو جس سے تکلیف ہو یا مرض کے بڑھنے کا خطرہ ہو۔ ہاں اگر کوئی عذر ہو تو اسے روکنے کا حق حاصل ہے، بلا عذر روکنا منع ہے۔

☆ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

"اذا دعا الرجل امراته الی فراشه فابت فبات غضبان لعنتها الملائکة حتی تصبح"

(بخاری و مسلم، مشکوۃ باب عشرۃ النساء)

جب مرد عورت کو اپنے بستر پر بلائے اور عورت (بغیر عذر کے) انکار کرے اور خاوند رات کو ناراضگی میں گذارے، تو اس زوجہ پر فرشتے صبح تک لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔

☆ دوسری روایت میں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، کوئی مرد ایسا نہیں کہ وہ اپنی زوجہ کو اپنے بستر پر بلائے تو وہ انکار کردے، مگر یہ کہ اس عورت پر اللہ تعالیٰ اس وقت تک ناراض رہتا ہے، جب تک وہ اپنے خاوند کو راضی نہ کرے۔

☆ حضرت طلق بن علی سے مروی ہے، آپ نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

"اذاالرجل دعازوجته فلتأ ته و ان کانت علی التنور" (ترمذی، مشکوۃ باب عشرۃ النساء)

جب خاوند اپنی زوجہ کو اپنی حاجت کے لئے بلائے فوراً اس کے پاس آجائے خواہ تنور پر ہی کیوں نہ ہو۔ یعنی اگر وہ روٹیاں پکا رہی ہے اور روٹیوں کے جل جانے کا بھی خطرہ ہو تو کوئی حرج نہیں، روٹیوں کو جلنے دے اس لئے کہ مال بھی خاوند کا ہی ہے اور وہی اپنی حاجت کے لئے بلا رہا ہے گویا کہ وہ اپنے مال کے ضائع ہونے پر رضامند ہے۔ (مرقاۃ)

☆ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں، آپ نے فرمایا کوئی عورت اپنے خاوند کو دنیا میں تکلیف نہیں پہنچاتی مگر یہ کہ جنتی حوریں کہتی ہیں۔

"لا تؤذیه،قاتلک اللہ فانما ھو عندک دخیل یو شک ان یفارقک الینا "

(ترمذی ، ابن ماجه ، مشکوۃ باب عشرۃ النساء)

اللہ تمہیں برباد کرے تم اسے نہ ستاؤ، یہ تمہارے پاس مہمان کی حیثیت سے ہے، عنقریب ہی تمہیں چھوڑ کر ہمارے پاس آنے والا ہے۔

وضاحت حدیث: "قاتلک اللہ" کا معنی ہے "اللہ تم پر لعنت کرے، اللہ تمہیں جنت سے دور رکھے" جو معنی راقم نے تحریر کیا ہے "اللہ تمہیں برباد کرے" یہ معنی دونوں کو شامل ہے۔

جنتی حوروں کا یہ کہنا کہ یہ تمہیں چھوڑ کر ہمارے پاس آکر ہمارا مہمان بننے والا ہے، اسی طرح پہلی حدیث فرشتوں کے لعنت کرنے کا جو ذکر کیا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ آسمانی مخلوق دنیا والوں کے اعمال پر مطلع ہوتی ہے۔ (مرقاۃ)

☆ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

"المرأۃ اذا صلت خمسھا و صامت شھرھا و احصنت فرجھا و اطاعت بعلھا فلتدخل من ای ابواب الجنۃ شاءت" (ابو نعیم ، مشکوۃ باب عشرۃ النساء)

عورت جب پانچ نمازیں ادا کرے اور ایک ماہ (رمضان شریف) کے روزے رکھے اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرے اور اپنے خاوند کی فرمانبرداری کرے، اسے اجازت ہوگی جنت کے جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے۔

اس حدیث پاک سے یہ واضح ہوا کہ مذکورہ بالا صفات رکھنے والی عورت کو جنت میں داخل ہونے سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی، اور جنت میں پہنچنا اور جنت حاصل کرنا اس کے لئے آسان ہوگا۔ (مرقاۃ)

☆ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی یہ ہے۔

" لو کنت آمر احدا ان یسجد لاحد لامرت المرأۃ ان تسجد لزوجھا"

(ترمذی ، مشکوۃ باب عشرۃ النساء)

اگر میں کسی کو حکم دیتا کہ کسی ایک کو (اللہ تعالیٰ کے بغیر) وہ سجدہ کرے تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔

سجدہ بہت زیادہ عاجز ہونے اور مطیع ہونے پر دلالت کرتا ہے، اسی لئے سجدہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی اور کو جائز نہیں۔ حدیث پاک سے یہ واضح ہوا کہ عورت پر خاوند کے بہت حقوق ہیں، جن کا شکر یہ ادا کرنے سے وہ قاصر ہے۔ اور یہ واضح ہوا کہ عورت کو خاوند کی بہت زیادہ فرمانبرداری کا حکم دیا گیا ہے۔

فائدہ: اگر غیر خدا کو معبود سمجھ کر سجدہ کیا گیا تو یہ شرک اور کفر ہے۔ اور اگر معبود سمجھ کر سجدہ نہیں کیا گیا بلکہ تعظیم کے لئے سجدہ کیا گیا تو یہ حرام ہوگا لیکن کفر نہیں ہوگا۔ ایسا سجدہ کرنے والے کو فاسق تو کہا جا سکے گا لیکن مشرک نہیں کہا جا سکے گا۔

" قال قاضیخان ان سجد السلطان ان کان قصده التعظیم و التحیة دون العبادة لا یکون ذلک کفرا" (قاضیخان، مرقاة)

قاضی خان رحمہ اللہ نے بیان فرمایا اگر کوئی شخص بادشاہ کو تعظیم کے ارادے سے سجدہ کرے، وہ سجدہ عبادت کے ارادہ سے نہ ہو تو یہ کفر نہیں، اگرچہ حرام ہوگا، بہت بڑا گناہ ہوگا، ایسا سجدہ کرنے والا فاسق وفاجر ہوگا، البتہ مشرک نہیں ہوگا۔

تنبیہ: عورت کا مہر اگر خاوند نے ادا نہیں کیا تو اس وجہ سے عورت نے خاوند کو اپنے قریب آنے (مجامعت کرنے سے) منع کر دیا تو یہ اس کا حق ہے وہ منع کر سکتی ہے۔

" وللمراة ان تمنع نفسها حتی تاخذ المهر وتمنعة ان یخرجها " (هدایة)

عورت کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے نفس پر خاوند کو قادر ہونے سے منع کر دے یہاں تک کہ وہ اپنا مہر لے لے اور عورت کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ خاوند کے ساتھ کہیں سفر میں جانے سے انکار کر دے کہ پہلے میرا مہر ادا کرو پھر میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔

ہاں اگر مہر ادا کرنے کے لئے ایک خاص وقت تک مہلت طلب کر رکھی ہے، تو اس وقت سے پہلے عورت مطالبہ نہیں کر سکتی۔

(۲) زوجہ پر خاوند کا دوسرا حق یہ ہے کہ شوہر کی اجازت کے بغیر اس کے گھر سے کہیں باہر نہ جائے۔ ہاں اگر زوجہ نے خاوند کی اجازت سے دایہ بننے کے لئے کسی سے معاہدہ کر لیا، یا کسی کے کپڑے وغیرہ دھونے کے لئے

معاہدہ کرلیا، تو اب وہ عورت خاوند کی اجازت کے بغیر وہ کام بجالاسکتی ہے، کیونکہ خاوند پہلے اجازت دے چکا ہے۔ اگر عورت پر حج فرض ہو تو خاوند کی اجازت کے بغیر کسی محرم کے ساتھ حج کے لئے جاسکتی ہے۔ اجنبی لوگوں کی بیمار پرسی کے لئے یا ان کی زیارت کے لئے، ایسے ولیمہ میں جہاں مرد، عورت ایک جگہ جمع ہوں۔ پردے کا کوئی انتظام نہ ہو، ایسی جگہ عورت کا خاوند کی اجازت کے بغیر جانا بھی ناجائز ہے، اور خاوند کا اجازت دینا بھی ناجائز ہے۔

''ولو اذن وخرجت کانا عاصیین'' اگر خاوند نے اجازت دے دی اور عورت اجنبی لوگوں کی محفل میں چلی گئی تو خاوند اور بیوی دونوں گنہگار ہوں گے۔ خاوند غیر شرعی چیز کی اجازت دے کر گنہگار ہوا اور عورت غیر شرعی محافل میں شریک ہوکر اجنبی لوگوں سے گپ شپ لگا کر، ہاتھ ملا کر گناہوں کا پتلا بن گئی۔

(۳) تیسرا حق زوجہ پر خاوند کا یہ ہے کہ کسی اجنبی کو گھر نہ آنے دے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

''لا یخلون رجل با مرأۃ الا کان ثالثھا شیطان'' (ترمذی، مشکوۃ باب النظرالی المخطوبۃ)

کوئی مرد کسی اجنبی عورت سے ہرگز علیحدہ ہوکر نہیں بیٹھے گا مگر وہاں تیسرا شیطان ہوگا۔

یعنی شیطان ان دونوں کے ساتھ ہوگا اور خواہشات پر دونوں کو ابھارے گا، جس کی وجہ سے وہ دونوں بدکاری جیسے عظیم جرم میں مبتلاء ہوں گے۔

آج کے دور میں دل کے صاف ہونے کے دعویدار دفاتر میں اجنبی مرد اور عورت بند کمرے میں ایک دوسرے کے سامنے کرسیوں پر براجمان ہیں، ذرا دل کی گہرائیوں سے سچ تو بتائیں کہ ان کا کیا حال ہوتا ہے، کیا فرمان مصطفیٰ ﷺ جھوٹا ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں ہوسکتا۔ یقیناً دفاتر جہاں مردوں، عورتوں کا اختلاط ہے اور ہسپتال، شیطان کی آماجگاہیں ہیں، جہاں ہمہ وقت شیطان کا بسیرا ہو، وہاں خیر کی توقع کیا ہوسکتی ہے۔

عورت پر خاوند کے اخلاقی حقوق:

عورت پر اخلاقی حقوق بھی خاوند کے اخلاقی حقوق کی طرح ہیں، ہر وہ کام جو عورت کی خوش مزاجی اور خاوند کی تابعداری اور سلیقہ شعار ہونے پر دلالت کرے وہ اخلاقاً اس کے ذمہ لازم ہے۔

کھانا پکانا، کپڑے دھونا، گھر کی صفائی وغیرہ، یہ ایسے کام ہیں جن سے عورت کے سلیقہ شعار ہونے یا ست اور گندہ ہونے کا پتہ چل جاتا ہے۔ یہ اسی وقت ہو سکے گا جب عورت خاوند کے گھر کو اپنا گھر سمجھے، زندگی بھر وہاں رہنے کا پکا ارادہ رکھے۔

☆ "وقال ابن عباس انی لا حب ان اتزین للمرأة كما احب ان تتزين لی المرأة لان الله يقول(ولهن مثل الذی عليهن با لمعروف)"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، میں عورت کے لئے اپنے آپ کو مزین کرنا پسند کرتا ہوں، جس طرح عورت میرے لئے زینت کرتی ہے، کیونکہ رب تعالیٰ نے فرمایا۔ "ولهن مثل الذی عليهن بالمعروف" (ابن ابی حاتم وابن جریر، صابونی)

☆ "عن جابر بن عبدالله قال خطب النبی ﷺ بعرفات فقال اتقوا الله فی النساء فانكم اخذتموهن بامانة الله واستحللتم فروجهن بكلمة الله وان لكم عليهن ان لا يوطئن فرشكم احدا تكرهونه فان فعلن فاضربوهن ضربا غير مبرح ولهن عليكم رزقهن وكسوتهن بالمعروف" (مسلم، صابونی)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے مقام عرفات میں خطبہ دیا تو ارشاد فرمایا عورتوں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو، بیشک تم نے انہیں اللہ تعالیٰ کی امانت کے بدلے حاصل کیا، اور ان کی فرجوں کو تم نے اللہ تعالیٰ کے کلمہ کے بدلے اپنے لئے حلال کیا، اور وہ تمہارے فراش پر آنے کی کسی ایک کو اجازت نہ دیں جن کو تم ناپسند سمجھتے ہو، اگر وہ ایسا کریں تو ان کو مارو غیر واضح مار (ہلکی مار)، ان کے لئے تم پر لازم ہے کہ تم ان کو خرچ دو اور ان کو کپڑے دو شرع کے مطابق۔

☆ "عن ابن عمر قال جاء ت امرأة الی النبی ﷺ فقالت یا رسول اللہ ما حق الزوج علی الزوجة فذکر فیھا اشیاء لا تصدق بشیٔ من بیته الا باذنه فان فعلت کان له الاجر و علیھا الوزر فقالت یا رسول اللہ ماحق الزوج علی زوجته فقال لا تخرج من بیته الا باذنه و لا تقوم یوما الا باذنه" (احکام القرآن للجصاص)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں ایک عورت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، عرض کیا یا رسول اللہ! خاوند کا حق زوجہ پر کیا ہے؟ تو آپ نے چند چیزوں کا ذکر کیا، (ان میں یہ بھی کہا) عورت اپنے خاوند کے گھر سے اس کی اجازت کے بغیر صدقہ نہ کرے، اگر اس نے صدقہ کر دیا تو وہ گنہگار ہوگی، البتہ خاوند کو ثواب حاصل ہوگا۔

(لیکن خیال رہے کہ عام عادت کے مطابق معمولی صدقہ کرنا جائز ہے، زیادہ مقدار میں صدقہ کرنے کے لئے اجازت طلب کرنی پڑے گی)

عورت نے پھر کہا یا رسول اللہ ﷺ خاوند کا زوجہ پر کیا حق ہے؟ آپ نے فرمایا کہ وہ خاوند کے گھر سے اس کی اجازت کے بغیر نہ نکلے اور دن کو (نفلی) روزے خاوند کی اجازت کے بغیر نہ رکھے۔

☆ "عن ابی ھریرة قال قال رسول اللہ ﷺ خیر النساء امرأة اذا نظرت الیھا سرتک و اذا امرتھا اطاعتک و اذا غبت عنھا حفظتک فی مالک و نفسھا ثم قرأ (الرجال قوامون علی النساء) الآیة" (احکام القرآن للجصاص)

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورتوں میں سے بہتر عورت وہ ہے جسے تم دیکھو تو وہ تمہیں خوش کرے اور جب تم اسے حکم دو تو وہ تمہاری فرمانبرداری کرے، اور جب تم غائب ہو تو وہ تمہارے مال کی حفاظت کرے، اور اپنے نفس کی حفاظت کرے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی " الرجال قوامون علی النساء " (مرد عورتوں پر حاکم ہیں)

''وللرجال علیهن درجة'': اور مردوں کو ان پر فضیلت ہے۔

یعنی یہ نظام قدرت ہے اور رب تعالی کا جب فیصلہ ہے کہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت حاصل ہے تو عورتوں یا ان کے ہمنوا اسلام سے دور مردوں کے شور وغل کا کیا مطلب کہ مرد اور عورتیں برابر ہیں۔

"رجال" جمع ہے "رجل" کی، جو ماخوذ ہے "رجلة" سے جس کا معنی قوت و بہادری، جیسا کہ کہا جاتا ہے "رجل بین الرجلة" فلاں شخص کی قوت واضح ہے۔ ''وھو ارجل الرجلین'' وہ دو شخصوں سے بہادر ہے، "فرس رجل" گھوڑا چلنے میں تیز ہے یعنی طاقتور ہے۔ '' الرجل'' (بکسر الراء) پاؤں کو کہا جاتا ہے کیونکہ یہ چلنے میں طاقت دیتا ہے۔ '' ارتجل الکلام'' فی البدیہ کلام کہنا یعنی وہ شخص اس پر قوت رکھتا ہے کہ بغیر سوچنے اور سمجھنے سے کلام کرنے پر قادر ہے کہ وہ فصیح کلام کرتا ہے یا شعر کہہ لیتا ہے۔ ''ترجل النھار'' دن میں روشنی زیادہ ہو۔ اس سے واضح ہوا کہ "رجل" کا معنی مرد کر کے پھر مرد کی بہادری کا اعتراف نہ کرنا عربی زبان سے جاہل ہونے کی علامت ہے۔

''درجة'': مرتبہ، اصل میں کسی چیز کو لپیٹنا اس کا معنی ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے ''ادرجته'' میں نے اسے لپیٹا۔ "درج القوم قرنابعدقرن" قوم نے آہستہ آہستہ اپنی عمر کو طے کر لیا لپیٹ لیا، یعنی وہ فنا ہو گئے۔ '' المدرجة '' راستہ پر چلنا، کیونکہ راستہ بھی منزل کو آہستہ آہستہ طے کر لیتا ہے'' الدرجة'' راستہ کی منزلوں میں سے ایک منزل کو بھی کہا جاتا ہے۔ ''ومنه الدرجةالتی یر تقی فیھا '' اسی سے ہے کسی منزل پر چڑھنا۔ (کبیر)

علامہ راغب اصفہانی فرماتے ہیں۔

'' الدرجة نحوالمنزل لکن تقال اذااعتبرت بالصعود دون الامتدادعلی البسیط''

درجہ کا اگر چہ لغوی معنی منزل ہے لیکن اس کا استعمال خاص ہے یعنی یہ چڑھنے کے معنی میں استعمال ہے اترنے یا پھیلانے کے معنی میں استعمال نہیں۔

'' ویعبر بھا عن المنزلة الرفیعة '' بلند مرتبہ درجہ کہا جاتا ہے۔

دونوں لفظوں کے معانی سے ہی واضح ہو گیا کہ مردوں کو عورتوں پر قوت و بہادری اور بلندی مرتبہ حاصل ہے۔

(اررو ح المعانی)

مردکوعورت پرفضیلت:

مردکوعورت پرفضیلت کا حاصل ہونا روزروشن کی طرح واضح ہے۔البتہ اسے بیان کرنے کےلئے یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس میں دواحتمال پائیں گے ہیں۔

پہلا احتمال: یہ ہے کہ مردکوعورت پرچندوجہ سےفضیلت رکھنے میں واضح امورحاصل ہیں۔

(۱) عقل میں مردکوفضیلت حاصل ہے جوعقل مردکوحاصل ہے وہ عورت کونہیں۔

(۲) دیت مردکی عورت سے دوگنا ہے۔

(۳) عورت کا وراثت میں حصہ کم ہے مرد سے،یعنی بیٹی کا حصہ کم ہے بیٹے سے،بہن کا کم ہے بھائی سے،ماں کا کم ہے باپ سے،وراثت کے مسائل میں ان شاءاللہ تفصیل آئے گی۔

(۴) منصب امامت،قضاءاورشہادت میں بھی مردکوفضیلت حاصل ہے۔

(۵) مردایک عورت کے بعددوسری سے شادی کرسکتا ہے جبکہ عورت ایک خاوند کے بعداس کی زوجیت میں ہوتے ہوئے دوسرے شخص سے شادی نہیں کرسکتی۔

(۶) زوج کا حصہ وراثت میں زوجہ سے زیادہ ہے۔

(۷) زوج طلاق دینے پرقادر ہےاورطلاق رجعی کے بعدرجوع کرنے پرقادر ہے،عورت چاہے یا نہ چاہے۔ جبکہ عورت طلاق دینے پرقادرنہیں اوررجوع کرنے پرقادرنہیں۔اورنہ ہی عورت کو یہ قدرت حاصل ہے کہ مردکورجوع کرنے سے روک دے۔

(۸) مردکا حصہ مال غنیمت میں عورت سے زیادہ ہے۔

واذا ثبت فضل الرجل على المرأة فی هذه الامور ظهران المراءة كالاسير العاجز فی يد الرجل "

جب ان تمام امور میں مردکوعورت پرفضیلت حاصل ہےتوواضح ہواکہ عورت عاجزقیدی کی طرح مردکے ہاتھ میں ہے۔

حقیقت میں وہی عورت کامیاب ہے جو مرد کو اپنا سربراہ سمجھے، اگر عورت اپنے آپ کو مرد سے برتر سمجھنا شروع کردے، تو جلدی ہی ذلت سے خاوند کے گھر سے نکل کر کسی اور کی تلاش میں سرگرداں ہوگی۔

حدیث شریف میں ہے۔

"اتقو االله في الضعيفين اليتيم و المرأة"

دو ضعیف صنفوں میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو، یعنی یتیم اور عورت (کے معاملہ میں)۔

مطلب یہ ہے کہ ان پر رحم کرو، ان کے حقوق کا لحاظ کرو۔ تاہم ان کو ضعیف کہہ کر مرد کی برتری واضح کردی۔

اور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا "استوصوا بالنساء خيرا فانهن عندكم عوان" عورتوں کو بھلائی پہنچانے کی نصیحت قبول کرو بے شک وہ تمہارے پاس قید کی حیثیت میں ہیں۔

تنبیہ:

آیۃ کریمہ میں گویا کہ اس مضمون کو واضح کیا گیا جب اللہ تعالیٰ نے مردوں کو فضیلت دی ہے اور عورتوں پر ان کو اقتدار دیا ہے تو ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ عورتوں کے حقوق پورے کریں، ان میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کریں۔ اور ضمناً اس آیۃ کریمہ میں عورتوں کو ضرر پہنچانے اور ستانے اور تکلیف دینے پر تہدید کی گئی، یعنی ڈرایا اور دھمکایا گیا

"وذلک لان كل من كانت نعم الله عليه اكثر كان صدور الذنب اقبح واستحقاقه للزجر اشد"

یہ اس لئے کہ ہر وہ شخص جس پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں کثیر ہوں اس سے گناہ سرزد ہونا زیادہ برا ہے اور زیادہ زجر و توبیخ کا سبب ہے۔

دوسرا احتمال:

نکاح کرنے کی وجہ سے منافع کا حاصل کرنا، لذت حاصل کرنا مشترک ہے، کیونکہ یہ مقاصد زوجہ کو بھی حا

صل ہیں اور خاوند کو بھی ، شادی کرنے کے مقاصد یہ ہیں کہ دل کو تسکین حاصل ہو، اور الفت ومحبت حاصل ہو اور نسب میں اشتراک ہو، اور زیادہ احباب ومددگار حاصل ہو جائیں۔ اور لذت حاصل ہو، یہ تمام مقاصد دونوں کو حاصل ہیں، بلکہ ممکن ہے یہ کہا جائے ''ان نصیب المرأة فیھا اوفر'' بے شک عورت کا حصہ ان میں زیادہ پایا گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ عورت کو زیادہ شہوت حاصل ہے۔

پھر خاوند پر لازم کیا گیا کہ وہ مہر ادا کرے اور خرچ ادا کرے اور عورت سے آنے والی مشکلات کی مدافعت کرے اور اس کی بھلائی کو قائم کرے۔

یہ تمام وجوہ مرد کی فضیلت پر دلالت کرتی ہیں، خصوصا عورتوں کو مردوں کی تابعداری کا سختی سے حکم بھی مرد کی برتری پر دلالت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''لو امرت احد ابالسجو دلغیر اللہ لأمرت المرأة بالسجو دلزوجھا'' اگر میں کسی کو اللہ کے غیر کے لئے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ (ماخوذ از کبیر)

''واللہ عزیز حکیم'': اور اللہ غالب ہے حکمت والا ہے۔

یعنی غالب ہے، کیونکہ اسے کسی کام سے روکنے کی طاقت نہیں رکھتا اور حکمت والا ہے، کیونکہ اس کا ہر کام درست ہوتا ہے اور اس کا ہر حکم درست ہوتا ہے، اس کا کوئی کام اور کوئی حکم بے مقصد اور بے فائدہ نہیں اور غلط یا باطل نہیں۔ (کبیر)

☆☆☆☆☆

اَلطَّلاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاکٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْتَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ وَ
لَایَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّااٰتَیْتُمُوْهُنَّ شَیْئًا اِلَّا اَنْ یَّخَافَا اَلَّا
یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا
فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ
اللّٰهِ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ☆ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۲۹)

ع ا ہ

یہ طلاق دو بار تک ہے پھر بھلائی کے ساتھ روک لینا یا نکوئی کے ساتھ چھوڑ دینا اور تمہیں روا نہیں کہ جو کچھ عورتوں کو دیا اس میں سے کچھ واپس لو مگر جب دونوں کو اندیشہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی حدیں قائم نہ کریں گے پھر اگر تمہیں خوف ہو کہ وہ دونوں ٹھیک انہی حدوں پر نہ رہیں گے تو ان پر کچھ گناہ نہیں اس میں جو بدلہ دے کر عورت چھٹی لے، یہ اللہ کی حدیں ہیں ان سے آگے نہ بڑھو اور جو اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے تو وہی لوگ ظالم ہیں۔

ہ ۲ ہ

یہ طلاق دو بار تک ہے پھر روکنا ہے بھلائی کے طریقہ سے یا چھوڑ دینا ہے مستحسن (اچھے) طریقہ سے۔ اور نہیں جائز تمہارے لئے کہ تم لو اس سے جو دیا ہے تم نے ان کو مگر یہ کہ خوف کریں دونوں کہ وہ قائم نہیں کر سکیں گے اللہ کی حدیں۔ پھر اگر تم خوف رکھو کہ وہ دونوں نہیں قائم کریں گے اللہ کی حدیں تو کوئی گناہ نہیں ان دونوں پر اس میں جو بدلہ دے عورت اس کا، یہ اللہ کی حدیں ہیں تو نہ تجاوز کرو ان میں، اور جو شخص تجاوز کرے گا اللہ کی حدوں میں تو وہی لوگ ظالم ہیں۔

مختصر مطلب:

طلاق کے بعد رجوع کا حق دو بار تک ہے یعنی ایک طلاق صریح یا دو طلاقیں صریح کے بعد رجوع ہوسکتا ہے۔ یہ حد ہے رجوع کرنے کی، اس کے بعد رجوع نہیں ہوسکتا۔

صریح طلاق کا مطلب یہ ہے کہ لفظ طلاق ہی استعمال کرے کوئی اور لفظ بائن وغیرہ استعمال نہ کرے، ان کا حکم علیحدہ ہے، ایک طلاق یا دو طلاقوں کے بعد اگر بھلائی کے طریقہ سے رجوع کرنا چاہے تو رجوع کرلے۔ یعنی طلاق کے بعد نادم ہوگیا، رجوع کر کے پھر سے تعلقات ازدواجی قائم کرنا چاہے اور شرع کے مطابق اس کے حقوق کو پورا کرنا چاہے تو رجوع کرنے کا خاوند کا حق ہے۔

لیکن یہ حق عدت ختم ہونے سے پہلے تک ہے اور اگر وہ رجوع نہیں کرنا چاہتا تو اچھے طریقے سے عورت کو آزاد کردے، یعنی رجوع نہ کرے، عدت گذرنے پر وہی عورت بائنہ ہو جائے گی، جہاں چاہے نکاح کرلے، اگر پہلے خاوند سے نکاح کرنا چاہے تو اس سے بھی نکاح کر سکے گی۔

مرد کے لئے جائز نہیں کہ وہ عورت سے مہر کے طور پر دیا ہوا مال واپس لے لے۔ ہاں اگر وہ دونوں سمجھتے ہیں کہ ہم شرعی حقوق قائم نہیں کر سکتے اور حکام بھی یہ سمجھتے ہوں کہ یہ دونوں آپس میں حقوق کو پورا نہیں کر سکتے تو اس صورت میں عورت مہر کے طور پر لیا ہوا مال خاوند کو دے کر خلع کرلے، یہ جائز ہے۔

اللہ تعالیٰ نے احکام واضح طور پر بیان فرما دیئے، وہی اس کی حدیں ہیں، ان احکام کو نہ مان کر اللہ تعالیٰ کی حدو سے تجاوز نہ کرو، جو لوگ اللہ کی حدو سے تجاوز کرتے ہیں وہی ظالم ہیں۔

ماقبل سے تعلق:

اس سے پہلی آیۃ میں بیان فرمایا "وبعولتھن احق بردھن" اوران کے خاوندان کی طرف رجوع کرنے کا زیادہ حق رکھتے ہیں۔ تو اس آیۃ میں رجوع کرنے کی حد کو بیان کیا کہ وہ دوبارہ طلاق دینے تک ہے، اس کے بعد طلاق دینے پر رجوع کا حق ختم ہوجاتا ہے۔

شانِ نزول:

"واخرج الترمذی وابن مردویه والحاکم وصححه والبیهقی فی سننه من طریق هشام بن عروة عن ابیه ان عائشة قالت کان الناس والرجل یطلق امرأته ما شاء الله ان یطلقها وهی امرأته اذا ارتجعها وهی فی العدة وان طلقها مائة مرة او اکثر حتی قال رجل لأمرأته والله لا اطلقک فتبینی ولا آویک ابدا قالت وکیف ذلک قال اطلقک فکلما همت عدتک ان تنقضی راجعتک فذهبت المرأة حتی دخلت علی عائشة فاخبرتها فسکتت عائشة حتی جاء النبی ﷺ فاخبرته فسکت النبی نزل القرآن (الطلاق مرتان فامساک بمعروف او تسریح باحسان)"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں لوگوں کا طریقہ یہ تھا کہ ایک شخص ماشاء اللہ اپنی عورت کو جتنی طلاقیں دینا چاہتا اتنی ہی طلاقیں دے دیتا، وہ اس کی عورت ہی رہتی جبکہ عدت کے اندر رجوع کر لیتا۔ خواہ وہ ایک سو یا اس سے زیادہ بھی طلاقیں دے دیتا۔ یہاں تک کہ ایک شخص نے اپنی زوجہ کو کہا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں تمہیں طلاق دے کر اپنے آپ سے جدا نہیں کروں گا اور تمہیں اپنے پاس بھی کبھی نہیں رکھوں گا، عورت نے پوچھا وہ کیسے؟ اس نے کہا جب تمہاری عدت ختم ہونے کے قریب ہوگی تو میں رجوع کروں گا، (یعنی طلاقیں دیتا رہوں گا اور رجوع کرتا رہوں گا) وہ عورت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس حاضر ہوئی اور ان کو واقعہ کی خبر دی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا خاموش رہیں یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ تشریف لے آئے، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو اس عورت کے ساتھ پیش آنے والے معاملہ کی خبر دی، آپ خاموش رہے یہاں تک کہ قرآن پاک کی یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی "الطلاق مرتان فامساک بمعروف او تسریح باحسان" طلاق (میں رجوع کا حق) دو بار تک ہے، پھر بھلائی کے طریقہ سے ان کو روک کر رکھو یا اچھے طریقہ سے آزاد کردو۔ (درمنثور)

"فامساک بمعروف او تسریح باحسان":

پھر روک لو بھلائی کے طریقہ سے یا چھوڑ دو اچھے طریقہ سے۔

"امساک" اطلاق کا خلاف ہے، یعنی "اطلاق" کا معنی ہے "چھوڑنا" اور "امساک" کا معنی ہے "روکنا" "مساک" اور "مسکة" دو اسم ہیں۔ "ذو مسکة" اور "ذو مساک" اسے کہا جاتا ہے جو بخیل ہو، یعنی مال کو روک کر رکھنے والا۔ اور کہا جاتا ہے "مساکة من جبر" قوت وطاقت سے روک دینا۔

"تسریح" کا معنی ہے چھوڑنا، کہا جاتا ہے "تسریح الشعر" بالوں کو کھلا چھوڑنا، لٹکانا، اور کہا جاتا ہے "سرح الماشية" مویشی چرانے والوں نے اپنے مویشیوں کو چرنے کے لئے چھوڑا۔

یعنی دو طلاقوں یا ایک طلاق کے بعد حق یہ ہے کہ اچھی طرح روک لے یعنی رجوع کرے، رجوع کرنے میں غرض اصلاح اور نفع پہنچانا ہے نہ کہ نقصان پہنچانے کا ارادہ ہو، یعنی عدت کو لمبا کرنے کی غرض سے رجوع کرنا گناہ ہے، اسی طرح اس لئے رجوع کرنا کہ میں رجوع کے بعد عورت کو ستاؤں گا، اس پر مظالم ڈھاؤں گا، اس غرض سے بھی رجوع کرنا گناہ ہوگا۔

یا اچھی طرح آزاد کردے، خیال رہے " تسریح با حسان" کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ ہے۔

"ان معناه ان يترك المراجعة حتى تبين بانقضاء العدة"

کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دوران عدت رجوع کرنا چھوڑ دو، رجوع کرنے کے بغیر ہی عدت کو ختم ہونے دو، جب عدت ختم ہو جائے گی تو وہ خود بخود بائن ہو جائے گی۔

اور بائن طلاق کے بعد عورت خود مختار ہو جائے گی، چاہے تو اسی خاوند سے پھر نکاح کرلے یا کسی اور سے نکاح کرلے۔ ضحاک اور سدی رحمہما اللہ سے یہ معنی روایت کیا گیا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ دو طلاقوں کے بعد تیسری طلاق دے کر رجوع کا راستہ بند کرلے اور اچھے طریقہ سے چھوڑ دے، اس معنی پر بھی روایت موجود ہے۔

☆ "واخرج ابن مردویه والبیهقی عن انس قال جاء رجل الی النبی ﷺ فقال یا رسول الله انی اسمع الله یقول "الطلاق مرتان" فاین الثالثة ؟ قال (امساک بمعروف اوتسریح باحسان) هی الثالثة (درمنثور)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یارسول اللہ! دوطلاقوں کا ذکر تو اللہ تعالیٰ کے ارشادگرامی "الطلاق مرتان" میں ہے، تیسری طلاق کہاں ہے؟ آپ نے فرمایا، وہ "امساک بمعروف او تسریح باحسان" میں ہے یعنی (تسریح باحسان) تیسری طلاق ہے۔

☆ "واخرج البیهقی من طریق السدی عن ابی مالک و ابی صالح عن ابن عباس وعن مرة عن ابن مسعود و ناس من الصحابة فی قوله (الطلاق مرتان) قال هو المیقات الذی یکون علیها فیه الرجعة فاذا طلق واحدة اوثنتین فامایمسک ویراجع بمعروف واما یسکت عنها حتی تنقضی عدتها احق بنفسها" (درمنثور)

حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود اور کئی صحابہ کرام نے فرمایا کہ رب تعالیٰ نے (الطلاق مرتان) میں رجوع کی حد بیان کردی کہ جب ایک طلاق دے یا دو طلاقیں دے تو اسے اچھی طرح روک کر رکھنا اور رجوع کرنے کا حق حاصل ہے اور اگر خاموش رہے یعنی رجوع نہ کرے یہاں تک کہ اس کی عدت ختم ہو جائے تو وہ اپنے نفس پر خود مختار ہوگئی، یعنی عدت کے بعد رجوع کا حق ختم ہوگیا۔

واضح ہوا کہ دونوں روایتوں میں تعارض نہیں بلکہ " تسریح با حسان "کی دوصورتیں ہیں، جس پر چاہے عمل کرے۔ (ماخوذ از کبیر)

صراحۃً تیسری طلاق کا ذکر آنے والی آیۃ کریمہ "فان طلقھا" الخ میں آئے گا۔

خلع کے مسائل:

(۱) اگر مرد عورت کے حقوق پورے نہ کر رہا ہو " فلا یحل له الاخذ " تو اسے مال لینا حلال نہیں، ہاں اگر خلع کر لے اور مال لے لے تو باوجود اس کے کہ اس نے مال حرام طور پر لیا ہے، لیکن خلع واقع ہو جائے گا۔

اگر چہ صاحب ہدایہ نے تو مرد کی طرف سے زیادتی اور حقوق کی پاسداری پر مال لینے کو مکروہ (تحریمی) کہا ہے، لیکن "والحق انه یحرم لماتلونا" حق یہ ہے کہ مال لینا اس کے لئے حرام ہے، اس لئے کہ رب تعالیٰ نے واضح طور پر بیان کر دیا "ولا یحل لکم ان تاخذوا مما آتیتموھن شیأ " تمہارے لئے حلال نہیں کہ لو تم اس سے جو تم نے دیا ہے ان کو مال (مہر)۔

(۲) ہاں البتہ رب تعالیٰ نے اس نہی سے یہ حکم مستثنیٰ فرمایا ہے " الاان یخافا الایقیماحدود الله "مگر جب وہ دونوں خوف کریں کہ اللہ کی حدیں قائم نہیں کر سکیں گے۔

ساتھ ہی حکام کو بھی واضح طور پر بتا دیا۔

"فان خفتم الا یقیما حدود الله فلاجناح علیھما فیما افتدت به "

پھر (اے حاکمو!) اگر تم خوف کرو کہ یہ دونوں اللہ کی حدیں قائم نہیں کر سکیں گے تو ان دونوں پر گناہ نہیں اس چیز میں جو عورت فدیہ دے اس کے بدلے۔

یعنی جب زوجہ اور خاوند دونوں ہی ایک دوسرے کے حقوق پائمال کر رہے ہوں تو عورت بدلہ (فدیہ) دے کر خاوند سے اپنی جان چھڑا لے وہ خلع کر لے تو یہ دونوں کے لئے جائز ہے۔

ساتھ ہی حکام کو بھی بتا دیا کہ وہ اس معاملہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کریں کیونکہ رب تعالیٰ کی طرف سے جب اجازت ہے تو عورت کو بدلہ دے کر خلع کا مطالبہ کرنا اور مرد کا خلع کر کے مال لینا جائز ہے، ان پر کوئی گناہ نہیں خلع کرنے میں۔ یعنی......

"تخاف المرأة ان تعص الله فی امرزوجھا ویخاف الزوج اضاعة حقوقھا "

عورت یہ خوف رکھے کہ خاوند کے حقوق کو میں پائمال کر کے میں اللہ تعالیٰ کی نافرمان نہ بن

جاؤں اور خاوند کو یہ خوف ہو کہ میں عورت کے حقوق ادا نہیں کر سکتا تو یہ خلع کر لیں۔

(۳) "وان لم یکن النشوز من جانب ولایخافان ان لا یقیما حدود اللہ فلا یحل اخذ المال للزوج ولا طلب الطلاق وبذل المال للزوجة لکن یقع الخلع ویجب المال للزوج علی الزوجة"

اگر خاوند اور زوجہ کسی ایک کو بھی حقوق پائمال کرنے کا کوئی خوف نہ ہو تو خاوند کو مال لینا حلال نہیں، اور زوجہ کے لئے طلاق طلب کرنا اور مال خرچ کرنا حلال نہیں۔ ہاں اگر خلع کر لیا جائے تو عورت کو مال دینا لازم آجائے گا، اور خلع ہو جائے گا، اس پر خلع کے احکام مرتب ہوں گے۔

(۴) "وان کان النشوز من جانبها یحرم علیها وعصت هی لا هو، ولکن یقع الخلع و یجب المال للزوج علی الزوجة"

اگر صرف عورت حقوق کو پائمال کر رہی ہے مرد حقوق کی پاسداری کر رہا ہے پھر عورت خلع کا مطالبہ کرے تو اس صورت میں عورت گنہگار ہوگی، اس کا خلع کا مطالبہ کرنا حرام ہوگا، مرد کو مال لینا حرام نہیں ہوگا۔ اور نہ ہی خلع کرنا اس کے لئے ناجائز ہوگا۔ یعنی اس صورت میں بھی خلع ہو جائے گا، عورت کو مال دینا لازم ہوگا۔ (ماخوذ از مظہری)

شانِ نزول:

زیر بحث آیۃ کریمہ کے دوسرے حصہ (جس میں خلع کا ذکر ہے) کا شانِ نزول یہ ہے۔

☆ "روی البخاری فی صحیحة عن ابن عباس ان مرأة ثابت بن قیس اتت رسول اللہ ﷺ فقالت یا رسول اللہ ثابت بن قیس ما اعیب علیه فی خلق ولادین ولکنی اکره الکفر فی الاسلام قال رسول اللہ ﷺ تردین حدیقته قالت نعم قال رسول اللہ ﷺ اقبل الحدیقة وطلقها تطلیقة"

بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ذکر کی ہے کہ بے شک ثابت بن

قیس رضی اللہ عنہ کی عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئی، اور اس نے کہا یا رسول اللہ! (میرا خاوند) ثابت بن قیس کے اخلاق میں اور دین داری میں کسی قسم کا میں کوئی عیب نہیں لگاتی، البتہ میں کفر کو اسلام میں ناپسند کرتی ہوں (یعنی ہوسکتا ہے کہ مجھ سے زوج کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی کوئی ایسی نافرمانی ہو جائے جو مجھے کفر کی طرف لے جائے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم اس کا باغ (جو تم نے مہر کے عوض لیا ہے) واپس کر دو گی؟ اس نے کہا ہاں (واپس کر دوں گی) رسول اللہ ﷺ نے (ثابت بن قیس کو) فرمایا تم باغ قبول کرلو اور اسے طلاق دے دو۔

" واخرج ابن جریر عن ابن عباس قال اول خلع کان فی الاسلام امرأة ثابت بن قیس اتت النبی ﷺ فقالت یا رسول اللہ لا یجتمع رأسی ورأس ثابت انی رفعت الخباء فرأیته اقبل فی عدة فاذاهو اشد هم سوادا واقصرهم قامة واقبحهم وجها فقال اتردین حدیقته قالت نعم وان شاء زدته ففرق بینهما "

ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ذکر کی کہ اسلام میں سب سے پہلا خلع ثابت بن قیس کی عورت سے ہوا، وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کرنے لگی یارسول اللہ! میرا سر اور ثابت کا سر ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے، کیونکہ میں نے خیمہ کو اٹھایا تو اسے چند آدمیوں میں متوجہ ہوتے ہوئے دیکھا، وہ سب سے زیادہ سیاہ تھا اور سب سے زیادہ چھوٹا اور سب سے زیادہ بدصورت تھا۔ آپ نے فرمایا کیا تو اس کا باغ واپس لوٹا دے گی؟ تو اس عورت نے کہا ہاں، وہ اگر چاہے تو زیادہ مال بھی دے دوں گی۔ تو نبی کریم ﷺ نے ان دونوں کے درمیان جدائی کر دی۔ (از مظہری)

مسئلہ : خلع طلاق بائن ہے، اس لئے کہ عورت کی طرف سے مطالبہ کے بغیر اور مال کی پیش کش کے بغیر ہی اگر خاوند نے زوجہ کو کہا "خلعتک او خالعتک ونوی الطلاق یقع به الطلاق" میں نے تمہارے ساتھ خلع کیا اور اس پر طلاق کی نیت کی تو طلاق واقع ہو جائے گی، کیونکہ یہ الفاظ کنایات طلاق سے ہیں، اس لئے کہ خلع کا معنی ہے

اتارنا، ہٹانا، جدا کرنا، جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ ''خلع ثوبہ ونعلہ'' اس نے کپڑے اور جوتے اتارے، جب جدا کرنے والا معنی اس میں موجود ہے تو طلاق کی نیت سے بائن طلاق ہوگی، اس لئے کہ کنایات سے طلاق بائن واقع ہوتی ہے۔ (از کفایۃ وفتح القدیر)

تنبیہ: لیکن یہ بھی خیال رہے کہ جب عورت کی طرف سے مال پر خلع کا مطالبہ ہو یا مرد ہی عورت کو کہے تم مجھے مال دو تو میں تمہارے ساتھ خلع کرتا ہوں، اس صورت میں خلع کرنے سے بغیر کسی نیت کے طلاق واقع ہو جائے گی، کیونکہ مال کا ذکر کسی نئی نیت سے بے پروا کر دیتا ہے، یہی مسئلہ ہدایہ کی اس عبارت میں دیکھئے۔

''فاذافعلاذلک وقع با لخلع تطليقة بائنة ولز مهالقوله ﷺ الخلع تطليقة بائنة، ولانه يحتمل الطلاق حتى صارمن الكنايات والواقع بالكناية بائن الان ذكر المال اغنى عن النية هنا''

مقام توجہ: اگر کسی شخص نے پہلے اپنی زوجہ کو ایک طلاق دی، پھر خلع کر لیا، تو اب اسے دو طلاقیں ہوگئیں۔ لیکن خلع طلاق بائن ہونے کی وجہ سے نکاح نیا کرنا پڑے گا۔

اگر پہلے دو طلاقیں دی تھیں اور بعد میں خلع بھی کر لیا تو اب تین طلاقیں ہوگئیں، اور تین طلاقوں کے بعد نہ رجوع ہوسکتا ہے اور نہ ہی تجدید نکاح کافی ہے۔ تفصیل ان شاء اللہ آنے والی آیۃ کریمہ میں آئے گی۔

اصل میں قانون یہ ہے کہ رجعی طلاق رجعی سے اور بائن رجعی سے ملحق ہو جاتی ہے۔

مسئلہ: ایک طلاق کے بعد رجوع کر لیا تھا، پھر کسی وقت ایک طلاق اور دے دی تو اب دو طلاقیں ہوگئیں، پھر رجوع کر لیا، پھر کسی وقت اور طلاق دے دی، تو اب تین طلاقیں ہوگئیں، کیونکہ پہلی طلاق موقوف تھی، ختم نہیں ہوئی تھی۔

مسئلہ: اگر ایک یا دو طلاقوں کے بعد رجوع نہیں کیا تھا، عدت گذر گئی، اب وہ عورت بائنہ ہوگئی، اس سے تجدید نکاح کی ضرورت ہے۔ اس سے پہلے خاوند نے نیا نکاح کر لیا، پھر طلاق دے دی، تو یہ طلاق پہلے ایک سے مل کر دو ہو جائیں گی اور دو سے مل کر تین ہو جائیں گی، یعنی تجدید نکاح سے بھی پہلی طلاقیں ختم نہیں ہوئیں، بلکہ موقوف رہتی ہیں۔

مسئلہ: خلع کے بعد پھر خاوند نے زوجہ سے نیا نکاح کرلیا، پھر دو طلاقیں دے دیں، تو اب تین طلاقیں ہو جائیں گی، کیونکہ خلع بھی طلاق بائن ہے۔

مسئلہ: کسی قسم کی بائن طلاق کے بعد تجدید نکاح کرلیا، پھر دو طلاقیں دے دیں تو تین ہو جائیں گی۔

فائدہ: اگر رجعی طلاق کے بعد رجوع نہیں کیا تھا اور عدت گزر گئی وہ بائن طلاق ہوگی، یا بائن طلاق دی یا خلع کیا اس عورت نے عدت گزرنے پر کسی اور شخص سے نکاح کرلیا، دوسرا خاوند مجامعت کرنے کے بعد فوت ہو گیا یا طلاق دے دی پھر عدت گزار کر عورت نے پہلے خاوند سے نکاح کرلیا تو اب پہلے خاوند کو تین طلاقوں کا حق از سرِ نو مل گیا، کیونکہ دوسرا خاوند جب تین طلاقوں کو ختم کر کے نیا تین طلاقوں کا حق زوجِ اول کو دلا دیتا ہے تو یقیناً تین طلاقوں سے کم کو بھی ختم کرا کے نیا تین طلاقوں کا حق شرع سے دلا دے گا۔ (نور الانوار)

رجوع کیسے ہوتا ہے:

عورت کو یہ کہے کہ میں نے تمہاری طرف رجوع کرلیا۔ یا یہ کہے میں نے اپنی زوجہ کی طرف رجوع کرلیا۔ یا عورت سے جماع کرلیا، یا شہوت سے چھولیا یا شہوت سے بوسہ لیا، تو رجوع ہو گیا۔

رجوع کے لئے عورت کا رضامند ہونا ضروری نہیں۔ اسلام نے کیسا خوب نظام عدل قائم کیا کہ دورانِ عدت مرد کو رجوع کا حق دیا، عورت کو اختیار نہیں دیا۔ اور عدت کے ختم ہونے پر عورت کو خود مختار بنایا، چاہے تو پہلے خاوند سے نکاح کرے چاہے تو انکار کر کے اسے چلتا بنا دے۔

فائدہ: مستحب یہ ہے کہ رجوع پر دو گواہ بنا لے تاکہ جھگڑے کی صورت میں قاضی سے فیصلہ کرانا آسان ہو جائے۔ اگر گواہ نہ بنائے رجوع پھر بھی ثابت ہو جائے گا، مرد نے جب بتا دیا کہ میں نے رجوع کرلیا ہے تو عورت کو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے کسی اور سے نکاح نہیں کرنا چاہئے خواہ گواہ موجود نہ ہوں۔

اعتراض: تم نے خلع کو طلاق کہا ہے، اس طرح تو طلاقیں چار ہو جائیں گی، کیونکہ خلع کے بغیر ہی تین طلاقوں کا ذکر موجود ہے۔

جواب: طلاق کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں، ایک قسم طلاق مال کے بدلے اور دوسری قسم بغیر مال کے طلاق۔ پھر بغیر مال کے دو طلاقوں تک رجوع کرنے کا حق دیا گیا ہے اور تیسری پر رجوع کا حق نہیں دیا گیا مال کے بدلے طلاق بائن ہوگی، یہ علیحدہ قسم ہے، چوتھی طلاق نہیں۔ (تفسیرات احمدیہ و نور الانوار)

مسئلہ: خلع میں صرف وہی مال لینا چاہئے جو مہر کے عوض دیا تھا، زیادہ مال لینا بہتر نہیں۔ لیکن اگر زیادہ مال لے لیا تو خلع ہو جائے گا اور مرد اس مال کا مالک بن جائے گا۔

خلع اور طلاق بالمال میں فرق:

خلع میں وہی الفاظ استعمال ہوں گے جن میں خلع کا ذکر ہوگا، جیسے مرد کہے "خالعتک بالمال، خلعتک بالمال" میں نے اتنے مال کے بدلے تمہارے ساتھ خلع کر لیا ہے۔

خلع میں ائمہ کا اختلاف بھی پایا جاتا ہے کہ خلع طلاق ہے یا فسخ ہے۔

طلاق بالمال میں لفظ طلاق استعمال ہوگا کہ میں نے تمہیں اتنے مال کے بدلے طلاق دے دی، طلاق بالمال میں ائمہ کا کوئی اختلاف نہیں، بلکہ سب کا اتفاق ہے کہ مال کے بدلے دی ہوئی طلاق بائن ہوتی ہے۔

یہ علمی نکتہ ہے ورنہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک خلع اور مال کے بدلے دی ہوئی طلاق کا حکم ایک ہی ہے کہ دونوں صورتوں میں طلاق بائن واقع ہوتی ہے۔

تنبیہ: خلع میں عورت کی جانب سے مرد کو مال دینے کی پیش کش ہوتی ہے اور مرد سے مطالبہ ہوتا ہے کہ وہ خلع کر لے، قبول کرنا یا نہ کرنا مرد کا اختیار ہے، مرد خوشی سے خلع کر لے یا جبراً، اس کی زبان سے خلع کے الفاظ کہلوائے جائیں تو یہ خلع ہے۔ اگر وہ خوشی سے لکھ دے یا کسی سے لکھوا دے تو یہ بھی خلع ہے، جبراً اس سے لکھوایا جائے یا جبراً دستخط کرائے جائیں تو یہ خلع نہیں۔

جج خود ہی خلع کا فیصلہ سنا دے، خاوند کی زبان سے خلع کے الفاظ نہیں کہلوائے گے اور نہ ہی خاوند نے خوشی

سے خلع کے الفاظ لکھ کر یا لکھوا کر دیئے تو یہ خلع کس شریعت کا قانون ہے؟ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ غلط فیصلے کر کے لوگوں کو حرام کاری پر لگانا کون سا انصاف ہے۔

جب صلح کسی طرح ممکن نہ ہو تو جدائی کر لی جائے:

خاوند اور بیوی میں اختلافات پیدا ہو جائیں تو خاوند اپنی زوجہ کو نصیحت کر کے خوش اخلاقی اور خوش طبعی سے راضی کر لے اور اگر اس طرح راضی نہ ہو تو اسے اپنے گھر میں ہی رکھ کر اپنے بستر سے جدا کر دے، ممکن ہے وہ اس طرح راضی ہو جائے، اگر اس سے بھی بات نہ بنے تو معمولی سرزش کر کے راضی کر لے اور اگر معاملہ اس حد سے بھی آگے بڑھ جائے، تو دونوں جانب سے اجنبی نیک پرہیز گار صلح کرانے والے حضرات کو منصف بنالیا جائے یعنی جرگہ سے کام لیا جائے، وہ صلح کرانے والے اپنے نیک ارادہ سے پوری کوشش کریں تاکہ ان کے درمیان صلح ہو جائے، صلح کرانے کا یہ آخری حربہ تھا، اگر اس میں بھی کامیابی نہ ہو تو پھر اس کے بغیر اور کوئی چارہ کار نہیں کہ عورت کو طلاق دے کر اپنے آپ سے جدا کر دے۔

طلاق دینے پر شیطان خوش ہوتا ہے:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک شیطان اپنا تخت پانی پر رکھتا ہے پھر اپنے لشکروں کو بھیجتا ہے، کہ وہ لوگوں کو فتنہ میں ڈالیں (یعنی گناہوں کی طرف راغب کریں) ان میں شیطان کے قریب وہ ہوتے ہیں جو لوگوں کو بڑے فتنے میں مبتلاء کریں، ان میں سے ایک آتا ہے اور کہتا ہے میں نے یہ کام کیا ہے، شیطان اسے کہتا ہے تو نے کیا کیا ہے؟ کچھ نہیں کیا، آپ نے فرمایا پھر ایک اور آتا ہے اور کہتا ہے۔

"ماترکته حتی فرقت بینه وبین امرأته قال فید نیه منه ویقول نعم انت"

(مسلم، مشکوۃ باب الوسوسة)

میں نے اس شخص کو اس وقت تک نہیں چھوڑا یہاں تک کے اس کے اور اس کی عورت کے درمیان جدائی کرادی۔

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں، شیطان اسے اپنے قریب کر لیتا ہے اور کہتا ہے کہ تو نے بہت اچھا کام کیا ہے۔

راوی حضرت اعمش کہتے ہیں کے میرا خیال ہے ابوسفیان طلحہ بن نافع مکی نے یہ بھی کہا کہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی روایت میں یہ بھی کہا ہے " فليلتزمه "وہ اسے گلے لگا لیتا ہے۔

شیطان زوجین کی تفریق پر اس لئے خوش ہوتا ہے کے یہ کئی اور فتنوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے، بدکاری کثیر ہوگی، اولاد حرام کی ہوگی، اولاد کو تربیت دینے والا کوئی نہیں ہوگا، جس کی وجہ سے وہ زمین میں فساد پھیلائیں گے، رذیل کلام کریں گے، اچھے کام وہ کم ہی کریں گے، ایسے نیکیوں سے دور، برائیوں کا ارتکاب کرنے والے، چوری، ڈاکہ، فحش حرکات کا ارتکاب کرنے والے حرامی بچوں کے لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا " لا يدخل الجنة ولد زانية " زانیہ کی اولاد جنت میں داخل نہ ہوگی۔

طلاق دینا اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے:

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کے بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔

" ابغض الحلال الى الله الطلاق " (ابو داؤد، مشکوۃ باب الخلع والطلاق)

حلال چیزوں سے اللہ تعالیٰ کو طلاق بہت ناپسند ہے۔

بعض چیزیں رب کو ناپسند ہونے کے باوجود واقع ہو جاتی ہیں، ان میں سے ہی طلاق بھی ہے، اگر چہ اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے، لیکن اگر کسی نے طلاق دی تو وہ واقع ہو جائے گی، ایسے ہی بغیر عذر کے گھر میں نماز بغیر جماعت کے ادا کرنا اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں، لیکن نماز ادا ہو جائے گی، مغصوبہ (زبردستی چھینی ہوئی، ناحق قبضہ کیا ہوا) زمین میں نماز ادا کرنا اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہے، لیکن نماز ادا ہو جائے گی۔ جمعہ کی اذان کے بعد خرید وفروخت اللہ تعالیٰ کے غضب کا سبب ہے لیکن بیع ہو جائے گی۔

خیال رہے کے عذر کی وجہ سے گھر میں نماز ادا کرنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، اسی طرح کبھی طلاق بھی دینا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، اس کا ذکر ان شاء اللہ آگے آ رہا ہے۔

عورت کا بلا وجہ طلاق کا مطالبہ کرنا عظیم جرم ہے:

حضرت ثوبان کہتے ہیں رسول ﷺ نے فرمایا۔

''ایماامرأۃسألت زوجھاطلاقاغیرمابأس فحرام علیھارائحۃ الجنۃ''

(مسند احمد،ترمذی،ابو داؤد،ابن ماجۃ،دارمی،مشکوۃ،باب الخلع والطلاق)

جوعورت بھی اپنے خاوند سے بلاوجہ طلاق کا مطالبہ کرے اس پر جنت کی بوحرام ہوگی۔

☆ نبی کریم ﷺ کا ارشادگرامی ہے۔

'' ایما امرأۃ اختلعت من زوجھا بغیر نشوز فعلیھالعنۃ اللہ والملائکۃ والناس اجمعین''

(مرقاۃ)

جوعورت اپنے خاوند سے خلع کا مطالبہ کرے بغیر کسی اختلاف کے،اس پر اللہ تعالیٰ اور فرشتے اور سب لوگ لعنت بھیجتے ہیں۔

☆ ''قال رسول اللہ ﷺ المختلعات ھن المنافقات''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خلع کا (بلاوجہ) مطالبہ کرنے والی عورتیں منافقات ہیں، (یعنی ان میں منافقوں والی علامت ہیں) (رواہ الترمذی ، مظھری)

طلاق بحیثیت ثواب وعذاب چار قسم ہے:

طلاق کی چار قسمیں ہیں حرام،مکروہ،واجب،مستحب۔

(۱) **حرام :** حیض کی حالت میں طلاق دینا حرام ہے اگرچہ طلاق واقع ہوجائے گی،حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی زوجہ کو حالت حیض میں طلاق دی تھی،حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا''مرہ فلیراجعھاثم لیطلقھاطاھراوحاملا'' اس کو حکم دو کہ وہ رجوع کرلے پھر پاکیزگی یا حالت حمل میں طلاق دے۔

☆ جس طہر میں جماع ہو چکا ہے اس میں طلاق دینا بھی ناجائز ہے، ہاں اگر حمل ظاہر ہو جائے تو پھر طلاق دینا جائز ہے۔

☆ اگر ایک شخص کی کئی زوجہ ہیں، ان میں سے ایک کو تقسیم کے حساب سے اس کی باری پر اسے اس کے حصہ سے محروم کر کے طلاق دینا ناجائز ہے۔

تنبیہ: ناجائز ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان صورتوں میں طلاق دینا منع ہے، اگر طلاق دے گا تو گناہ ہوگا لیکن طلاق واقع ہو جائے گی۔ یہ مطلب نہ سمجھ لیا جائے کہ ان صورتوں میں طلاق واقع ہی نہیں ہوگی۔

(۲) **مکروہ:** جب زوجین (میاں بیوی) کے درمیان کوئی شدید اختلاف نہ ہوں تو بلا وجہ طلاق دینا مکروہ ہے۔ اسی صورت کے متعلق پہلے حدیث پاک ذکر ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو مباح چیزوں میں طلاق ناپسند ہے۔

(۳) **واجب:** جب مرد اور عورت کے درمیان شدید اختلافات ہوں۔ رضامندی کی کوئی صورت نہ نکل سکے تو ایسی صورت میں قاضی خاوند کو طلاق دینے پر مجبور کرے، کیونکہ اب طلاق دینا واجب ہو چکا ہے۔ ایسی حالت میں طلاق کا حق استعمال کرنا عورت کے لئے بھلائی کا کام ہے تاکہ وہ آزاد ہو کر کہیں اور نکاح کر کے اپنی زندگی آرام سکون سے بسر کر سکے، اگر اسے طلاق بھی نہ دی جائے اور بسایا بھی نہ جائے تو یہ عورت پر ظلم اور اس کے لئے نقصان اور ضرر کا سبب ہے۔

(۴) **مستحب:** جب عورت نیک اور پاک دامن نہ ہو تو طلاق دینا مستحب ہے۔ اسی طرح خاوند اور بیوی دونوں یا ان میں سے ایک خوف رکھتے ہوں کہ ہم ایک دوسرے کے حقوق پورے نہیں کر سکیں گے اور شرعی حقوق کو پورا نہ کرنے کی وجہ سے ہم گنہگار رہوں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"تلک حدود اللہ ومن یتعد حدود اللہ فاولئک هم الظالمون"

یہ اللہ کی حدیں ہیں (اس کے نافذ کردہ احکام اس کی حدود ہیں) جو شخص اللہ تعالیٰ کی حدوں سے تجاوز کریں گے وہی ظالم ہوں گے۔

جب یہ خوف ہو کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل ہم دونوں سے نہیں ہو سکے گی تو ایسی صورت میں طلاق دینا مستحب ہے۔

نبی کریم ﷺ کا حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دینا اسی قسم کا تھا اور پھر ان کے عرض کرنے پر آپ نے رجوع فرما لیا تھا، کیونکہ ایک طلاق دی تھی جو رجعی تھی (ماخوذ از نووی و مدارج النبوہ)

تنبیہ:

"واما ما روی عن الحسن وکان قیل له فی کثرة تزوجه وطلاقه فقال احب اغنی قال الله تعالیٰ (وان یتفرقا یغن الله کلا من سعته) (مرقاۃ)

یعنی حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما بہت شادیاں کرتے تھے اور طلاق دیتے رہتے تھے، جب آپ سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا میں غنی ہونا پسند کرتا ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا کہ (اگر وہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اپنی وسعت سے انہیں غنی کر دے گا)

آپ کی یہ دلیل ظاہری اجتہاد پر تھی اس پر فتویٰ نہیں۔ علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

" فھو رأی منه ان کان علی ظاھرہ " آپ کی یہ رائے ظاہر پر مبنی ہے جو قابل قبول نہیں۔

یعنی قرآن پاک میں غنی کر دینے سے مراد "ایک دوسرے سے بے پروا کر دینا ہے"

بعض علماء کرام سے یہ بھی سنا ہے کہ آپ کی زوجیت میں آنے کو عورتیں باعث شرف و برکت سمجھتی تھیں۔ عورتوں کو یہ معلوم بھی ہوتا تھا کہ آپ طلاق دے دیتے ہیں، لیکن پھر بھی وہ تمنا رکھتی تھیں کہ ہمیں آپ کی زوجیت میں آنے کا شرف حاصل ہو جائے۔ آپ عورتوں کی تمنا اور خواہش پر نکاح کرتے تھے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

لیکن اتنی بات واضح ہوئی کہ طلاق کے ارادہ سے نکاح کرنا منع ہے۔ زیادہ بہتر یہی ہے کہ آپ کے قول کو اجتہادی خطاء ہی کہا جائے۔

☆☆☆☆☆

فَاِنْ طَلَّقَهَافَلَاتَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًاغَيْرَهٗ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَاجُنَاحَ عَلَيْهِمَااَنْ يَّتَرَاجَعَااِنْ ظَنَّااَنْ يُّقِيْمَاحُدُوْدَاللّٰهِ وَتِلْكَ حُدُوْدُاللّٰهِ يُبَيِّنُهَالِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ☆ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۳۰)

﴿۱﴾

پھر اگر تیسری طلاق دے دی تو اب وہ عورت اسے حلال نہ ہوگی جب تک دوسرے خاوند کے پاس نہ رہے۔ پھر وہ دوسرا اگر اسے طلاق دے دے تو ان دونوں پر گناہ نہیں کہ پھر آپس میں مل جائیں اگر سمجھتے ہوں کہ اللہ کی حد نباہیں گے اور یہ اللہ کی حدیں ہیں جنہیں بیان کرتا ہے دانش مندوں کے لئے۔

﴿۲﴾

پھر اگر تیسری طلاق اسے دی تو وہ عورت حلال نہیں اس مرد کے لئے اس (تیسری طلاق) کے بعد یہاں تک کہ وہ عورت رہے کسی دوسرے خاوند کے پاس، پھر اگر وہ (دوسرا) اسے طلاق دے دے تو کوئی گناہ نہیں ان دونوں پر کہ ایک دوسرے کی طرف رجوع کریں اگر سمجھتے ہوں کہ قائم کرسکیں گے اللہ کی حدوں کو اور یہ اللہ کی حدیں ہیں وہ بیان کرتا ہے انہیں اس قوم کے لئے جو علم رکھتے ہیں۔

مختصر مطلب:

تقریباً ترجمہ سے کافی حد تک واضح ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی زوجہ کو تیسری طلاق بھی دے دے تو اب وہ عورت اس شخص کے لئے حلال نہیں یہاں تک کہ وہ عورت کسی اور شخص سے نکاح کرے اور وہ اس سے مجامعت بھی کرے، اس کے بعد دوسرا خاوند اس عورت کو طلاق دے دے یا فوت ہو جائے تو پہلے خاوند سے نکاح کرنا چاہے تو

جائز ہے۔اور ساتھ ساتھ یہ بھی خیال رکھا جائے کہ پہلے خاوند کی طلاق کے بعد عدت گزار کر دوسرے سے نکاح ہو سکے گا، اور دوسرے کی طلاق کے بعد طلاق کی عدت (اور فوت ہونے کے بعد وفات کی عدت) گزار کر پہلے خاوند سے نکاح کرنا جائز ہوگا۔عدت میں نکاح حرام ہوگا۔

طلاق کی تین اقسام:

(۱)احسن (۲)حسن (۳)بدعی

طلاق احسن:

طلاق حسن یہ ہے کہ طہر میں صرف ایک طلاق دی جائے اور اس میں جماع بھی نہیں کیا گیا تھا اور اسے اسی طرح چھوڑ دے تاکہ اس کے عدت گزر جائے جہاں چاہے نکاح کرے۔

☆ **"لما اسند ابن ابی شیبة عن ابراھیم النخعی ان الصحابة رضی اللہ عنھم کانوا یستحبون ان یطلقھا واحدة ثم یترکھا حتی تحیض ثلاث حیض"**

مصنف ابن ابی شیبہ میں اسناد صحیح سے حضرت ابراہیم نخعی رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی گئی ہے کہ صحابہ کرام مستحب یہ سمجھتے تھے کہ عورت کو صرف ایک ہی طلاق دی جائے، پھر اسے اسی طرح چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ وہ تین حیض گزار لے۔

☆ **"وقال محمد بلغنا عن ابراھیم النخعی ان اصحاب رسول اللہ ﷺ کانوا یستحبون ان لایزیدوا فی الطلاق علی واحدة حتی تنقضی العدة"**

حضرت امام محمد رحمہ اللہ نے بھی بیان کیا ہے کہ بے شک رسول اللہ ﷺ کے اصحاب مستحب یہی سمجھتے تھے کہ عورت کو ایک طلاق سے زیادہ طلاقیں نہ دی جائیں، یہاں تک کہ عدت ختم ہو جائے۔

ایک طلاق دینے کا فائدہ:

"ولانه ابعد عن الندامة حيث ابقى لنفسه مكنة للتدارك"

ایک طلاق دینے کا یہ فائدہ ہے کہ ندامت سے دور رہے گا کیونکہ غلطی کا تدارک ممکن ہوگا۔

عدت کے اندر رجوع کر سکے گا اور عدت گزرنے پر نکاح کر سکے گا جبکہ دوسرے خاوند سے نکاح کرنا ضروری نہیں ہوگا۔

عورت کو ضرر کم ہوگا، کیونکہ حلت نعمت ہے۔ دورانِ عدت حلت برقرار رہے گی، اسے امید ہوگی کہ ہوسکتا ہے خاوند رجوع کرلے، اس طرح اسے دہشت حاصل نہیں ہوگی، آہستہ آہستہ عدت گزرنے پر برداشت کی طاقت حاصل ہوگی۔ (از فتح القدیر)

حیض کی حالت میں طلاق ناپسندیدہ لیکن واقع ہوجاتی ہے:

"عن عبدالله ابن عمر انه طلق امرأة له وهي حائض فذكر عمر لرسول الله ﷺ فتغيظ فيه رسول الله ﷺ ثم قال يراجعها ثم يمسكها حتى تطهر ثم تحيض فتطهر فان بداله ان يطلقها فليطلقها طاهرا او حاملا" (بخاری و مسلم، مشکوۃ باب الخلع و الطلاق)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی زوجہ کو حیض کی حالت میں طلاق دے دی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس واقعہ کی نبی کریم ﷺ کو اطلاع دی تو آپ نے ناراضگی کا اظہار فرمایا، پھر کہا اسے کہو وہ رجوع کرلے، پھر اپنی زوجہ کو اپنے پاس روک رکھے، یہاں تک کہ طہر گزر جائے، پھر حیض گزر جائے، پھر اگر طلاق دینا چاہے تو پاکیزگی کی حالت میں یا حمل کی حالت میں طلاق دے دے۔

حدیث پاک سے بہت واضح ہے کہ حیض کی حالت میں طلاق دینے پر نبی کریم ﷺ نے ناراضگی کا اظہار فرمایا، لہٰذا حیض کی حالت میں طلاق دینا شریعت میں ناپسندیدہ عمل ہے۔

اور واضح ہوا کہ حیض کی حالت میں دی ہوئی طلاق واقع ہو جاتی ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے رجوع کرنے کا حکم دیا۔ یہ نہیں فرمایا کہ جو طلاق حیض میں دی جائے وہ واقع ہی نہیں ہوتی۔

طہر (پاکیزگی) میں طلاق دی جائے، وہ بھی اگر ضرورت درپیش آئے لیکن بلا ضرورت طلاق دینا رب تعالیٰ کو ناپسند ہے۔

حدیث پاک سے اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ حاملہ عورت کو طلاق دی جائے تو طلاق واقع ہو جاتی ہے، کیونکہ ضرورت پڑنے پر حمل کی حالت میں طلاق دینے کی اجازت رسول اللہ ﷺ نے فرمائی۔

طلاق حسن:

طلاق حسن یہ ہے کہ جس عورت سے مجامعت کر چکا ہو یا خلوت صحیحہ پائی گئی، اسے تین طہروں (پاکیزگیوں) میں تین طلاقیں دے، یعنی ہر طہر میں ایک طلاق دے اور اس کے بعد رجوع نہ کرے۔

مجامعت یا خلوت صحیحہ کی قید کا یہ فائدہ ہے کہ اگر کسی اور عورت سے نکاح ہوا ہے، ابھی رخصتی نہیں ہوئی، اس مدت میں جماع نہیں کیا گیا اور علیحدگی میں ان کی کوئی ملاقات ایسے وقت اور ایسے حال میں نہیں ہوئی، جو وطی سے مانع تھے، تو اسے ایک طلاق دینے سے وہ بائن ہو جائے گی۔

اس پر بھی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہی شاہد ہے، کیونکہ بعض روایات میں یہ الفاظ گرامی پائے گئے ہیں۔

"ماھکذاامرک اللہ قد اخطات السنة، السنة ان تستقبل الطھر فتطلق لکل قرء"

اے ابن عمر حیض میں طلاق دینے کا حکم تمہیں اللہ تعالیٰ نے نہیں دیا۔ تم نے سنت کی خلاف ورزی کی، سنت یہ ہے کہ طہر کی انتظار کرو، اور پھر طہر میں طلاق دو۔ (فتح القدیر)

تدریجاً طلاق دینے کا حکم رب تعالیٰ کی رحمت ہے:

اس آیۃ کریمہ سے پہلی آیۃ میں ایک اور دو طلاقوں کے بعد رجوع کرنے کی اجازت دی گئی۔ اس سے بھی یہ سمجھ آیا کہ طلاقیں ایک ایک کر کے دینا بہتر ہے۔

انسان جب تک اپنی زوجہ کے ساتھ ہوتا ہے تو اسے معلوم نہیں ہوتا کہ جدائی بہت مشقت آمیز کام ہے۔

" **فاذافارقه فعند ذلک یظهر** " جب زوجہ کو جدا کر دیتا ہے تو پھر اسے پتہ چلتا ہے کہ ہاں جدائی کتنی مشقت آمیز ہے۔ اسی وجہ سے ایک طلاق دینے کا حکم دیا گیا ہے اور ایک طلاق کے بعد رجوع کا حق دیا گیا، اگر رجوع کا حق نہ دیا جاتا۔ "لعظمت المشقة علی الانسان بتقدیران تظهر المحبة بعد المفارقة "

تو انسان کو بہت مشقت میں مبتلا ہونا پڑتا، کیونکہ زوجہ کو جدا کرنے کے بعد محبت واپس لوٹ آتی ہے۔

لیکن ایک مرتبہ کامل تجربہ کامل نہیں ہوتا، انسان پھر طلاق دینے کا بھی ارادہ کر لیتا ہے، پھر بھی ایک طلاق دینے پر رجوع کا حق دیا گیا ہے، کیونکہ انسان کو دو مرتبہ جدائی سے کافی حد تک تجربہ حاصل ہو جاتا ہے۔

" وعرف حال قلبه فی ذلک الباب " وہ اپنے دل کے حال کو پہچان لیتا ہے، اگر رجوع کرنا بہتر سمجھے تو رجوع کر لے، اگر اس کا دل نفرت کرتا ہو تو رجوع نہ کرے، یا تیسری طلاق دے کر اسے مکمل طور پر آزاد کر دے

" وهذا التدریج والترتیب یدل علی کمال رحمته ورافته بعبده "

یہ تدریج اور ترتیب اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر کامل رحمت اور مہربانی پر دلالت کرتی ہے۔ (از کبیر بتصرف)

طلاق بدعی:

تین طلاقیں ایک ہی کلمہ سے دے یا ایک طہر میں تین طلاقیں دے، اسے " **طلاق البدعة** " کہا جاتا ہے۔

" فاذا فعل ذلک وقع الطلاق وکان عاصیا "

جب کوئی شخص طلاق بدعی دے تو طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں، البتہ طلاق دینے والا گنہگار ہوتا ہے۔ (هدایه)

ایک مرتبہ تین طلاقیں دینے پر احناف کا مذہب:

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب یہی ہے کہ ایک مرتبہ تین طلاقیں دینے سے تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں، اگرچہ ایک مرتبہ تین طلاقیں دینے والا گنہگار ہوتا ہے۔

احناف کے دلائل:

ایک مرتبہ تین طلاقیں دینے سے تین طلاقیں ہی واقع ہوتی ہیں، اس کا ثبوت حدیث پاک سے بھی ہے اور اجماع امت سے بھی۔

احادیث مبارکہ سے ثبوت:

"عن ابن عمر انه طلق امرأته وهی حائض ثم ارادان يتبعها بطلقتين اخريين عند القرأين فبلغ ذلك رسول الله ﷺ فقال يا ابن عمر ما هكذاامرك الله قد اخطأت السنة ، السنة ان تستقبل الطهر فتطلق لكل قرء فامرنی فراجعتها فقال اذهی طهرت فطلق عند ذلك او امسك فقلت يا رسول الله ارائيت لو طلقهتا ثلاثاكان يحل لی ان راجعها قال لا كانت تبين منك و كانت معصية" (رواه الدار قطنی)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنی زوجہ کو حیض کی حالت میں طلاق دے دی، پھر ارادہ کیا کہ اس کے پیچھے دو طلاقیں اور دو طہروں میں دے دوں گا، یہ خبر نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچی تو آپ نے فرمایا، اے ابن! عمر اللہ تعالیٰ نے اس طرح تو حکم نہیں فرمایا، تحقیق تم نے سنت سے خطاء کر دی، یعنی سنت کے خلاف کام کیا۔ سنت یہ ہے کہ تم طہر کی انتظار کرو، پھر ہر طہر میں ایک طلاق دو، ابن عمر فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا کہ میں رجوع کرلوں، پھر آپ نے فرمایا جب وہ (حیض سے) پاک ہو جائے پھر طلاق دو یا روک کر رکھو۔

میں نے عرض کیا آپ کی اس میں کیا رائے ہے کہ اگر میں اپنی عورت کو تین طلاقیں دے دیتا تو کیا وہ میرے لئے حلال رہتی، آپ نے فرمایا نہیں وہ تم سے جدا ہو جاتی ہے تمہیں اس سے معصیت لازم آئی۔

"ورواه ابن ابی شيبة فی مصنفه عن الحسن قال حدثناابن عمر قدصرح بسماعه عنه"

یہی مذکور بالا حدیث ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے اپنی مصنف میں حضرت حسن کی روایت حضرت ابن عمر سے نقل فرمائی ہے۔ جس میں صراحۃً ذکر ہے کہ حضرت حسن نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے خود یہ حدیث سنی۔

اعتراض:

"واعلہ البیھقی بعطاء الخراسانی قال انی بزیا دات لم یتابع علیھا وھو ضعیف لا یقبل ما تفردبه"

بیہقی نے اس حدیث کا ضعیف ہونا ثابت کیا ہے کہ اس کے راویوں میں عطاء خراسانی ہے، جو ضعیف ہے کیونکہ وہ زیادہ چیزوں کو پیش کر دیتا ہے جس میں اس کے متابع (موافق) کوئی اور روایت نہیں پائی جاتی، لہٰذا اس روایت میں عطاء خراسانی متفرد (اکیلا) ہے۔ لہٰذا یہ روایت قابل قبول نہیں۔

جواب:

"قال ابن الھمام تعلیل البیھقی مردود حیث تابعه شعیب بن رزیق سندا و متنا"

(رواہ الطبرانی)

حضرت ابن ہمام رحمہ اللہ نے فرمایا کہ بیہقی کا اس حدیث کو ضعیف کہنا ہی مردود ہے اور غلط ہے کیونکہ بیہقی نے اس کی علت علت (وجہ ضعف) یہ بیان کی ہے کہ اس کا راوی عطاء خراسانی متفرد ہے اس روایت کے موافق اور کوئی روایت نہیں، بیہقی کا یہ کہنا غلط ہے، کیونکہ اسی سند اور اسی متن سے طبرانی نے شعیب بن رزیق سے روایت بیان کی ہے، لہٰذا اس حدیث کی متابع حدیث پائی گئی ہے، اس حدیث کو ضعیف کہنا قول ہی ضعیف ہے۔ (از مظھری)

عطاء الخراسانی کے متعلق اصحاب الجرح والتعدیل کی آراء:

(۱) "عطاء ابن ابی مسلم الخراسانی ارسل عن معاذ وطائفة من الصحابة وروی عن عکرمة و یحیی بن یعمر والطبقة وعنه ابنه عثمان والاوزاعی ومالک وشعبة قال ابن جابر کنا نغزومعه فیحیی اللیل صلوة الانومه السحرمات سنة ۱۳۸ھ (از الکاشف للذهبی) قال ابن سعد کان ثقة روی عنه مالک و کان ابن حبان کان ردی الحفظ (الحاشیة علی الکاشف للذهبی)

عطاء ابن ابی مسلم خراسانی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اور کچھ صحابہ کرام سے مرسل روایات بیان کرتے ہیں، عکرمہ اور یحییٰ بن یعمر اور کچھ حضرات سے بھی روایات بیان کرتے ہیں، عطاء سے روایت کرنے والوں میں آپ کا بیٹا عثمان، اوزاعی، حضرت امام مالک اور شعبہ ہیں۔ ابن جابر کہتے ہیں ہم ایک غزوہ میں آپ کے ساتھ تھے، آپ تمام رات نوافل ادا کرتے تھے، تھوڑی دیر پچھلی رات آرام کرتے، آپ کی وفات ۱۳۸ھ میں ہوئی۔ (الکاشف للذهبی)

اس کتاب کے حاشیہ میں ہے کہ ابن سعد نے کہا عطاء خراسانی ثقہ راوی تھے کیونکہ امام مالک آپ سے روایت کرتے ہیں۔ ابن حبان نے کہا آپ کا حافظہ درست نہیں تھا۔

یہاں سے واضح ہوا کہ ابن سعد کے نزدیک عطا ثقہ راوی تھے، یہ ضروری نہیں کہ ابن حبان پر ہی اعتماد کیا جائے۔

(۲) عطاء ابن ابی مسلم الخراسانی روی عن ابی الدرداء ومعاذ وابن عباس مرسلا وروی عن یحی ابن یعمر و نافع و عکرمة وعنه ابن جریج والاوزاعی ومالک وشعبة وحماد بن سلمة قال عبد الرحمن بن یزید کان یحیی اللیل وثقه ابن معین وابو حاتم"

(از خلاصه تذهیب التهذیب الکمال، ج۲، ص ۲۳۱)

عطاء بن ابی مسلم خراسانی حضرت ابو الدرداء حضرت معاذ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مرسل روایات بیان کرتے ہیں اور یحییٰ ابن یعمر اور نافع اور عکرمہ سے بھی روایات بیان کرتے

ہیں اور عطاء سے ابن جریج ، اوزاعی ، امام مالک، شعبہ اور حماد بن مسلمہ روایت کرتے ہیں عبدالرحمٰن بن یزید کہتے ہیں وہ رات کو بیدار رہنے (جاگنے) والے شخص تھے، ابن معین اور حاتم نے آپ کو ثقہ راوی کہا ہے۔

(۳) " وقال احمد یحییٰ والعجلی وغیر هم ثقة وقال یعقوب بن شیبة ثقة معروف بالفتوی والجهاد قال ابو حاتم ثقة محتج به (میزان الاعتدال، ج۳،ص ۷۴)

احمد اور یحییٰ اور عجلی وغیرہ نے ان کو ثقہ کہا ہے، اور یعقوب بن شیبہ نے کہا یہ ثقہ راوی ہیں۔ فتوی اور جہاد میں مشہور ہیں، ابو حاتم نے کہا ثقہ راوی ہیں، ان کی روایت سے دلیل پکڑی جائے۔

واضح ہوا کہ عطاء خراسانی کو زیادہ حضرات نے ثقہ راوی کہا ہے، ایسی کوئی قوی وجہ نظر نہیں آتی کہ عطاء بن ابی مسلم خراسانی کے متعلق صرف ابن حبان کے قول کو ترجیح دی جائے اور ابن سعد، اور ابن معین، ابو حاتم، احمد، عجلی اور یعقوب بن شیبہ کے ثقہ کہنے کا اعتبار نہ کیا جائے۔

مسئلہ نکھر کر واضح ہوگیا کہ دار قطنی کی روایت کو بیہقی کا ضعیف کہنا" عطاء خرسانی کی وجہ سے جن کو صرف ابن حبان نے ضعیف کہا باقی اہلِ علم نے قوی کہا" درست نہیں، پھر ان کی روایات متفرد نہیں، بلکہ اس کے متابع موجود ہے۔ (راقم)

☆ " واخرج عبدالرزاق والبیهقی عن زید بن وهب ان بطالا کان بالمدینة فطلق امرأته الفافرفع ذلک الی عمر بن الخطاب فقال انما کنت العب فعلاه عمر بالدرة وقال ان کان لیکفیک ثلاث " (درمنثور)

حضرت زید بن وہب فرماتے ہیں ایک مسخرہ شخص مدینہ طیبہ میں تھا، اس نے اپنی عورت کو ہزار طلاقیں دے دیں، پھر وہ اپنا معاملہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس لایا، تو اس نے کہا میں تو ہنسی کھیل کر رہا تھا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا درہ اس پر بلند کرتے ہوئے فرمایا، تجھے تین طلاقیں ہی کافی تھیں۔

حدیث پاک سے حاصل ہونے والے فوائد:

جب طلاق کا لفظ استعمال کیا جائے تو طلاق واقع ہو جائے گی، خواہ وہ طلاق مزاح کے طور پر ہی دے رہا ہو۔ لہٰذا طلاق دے کر پھر یہ کہنا کہ میری نیت طلاق دینے کی نہیں تھی، اس حیلے اور بہانے سے شریعت اس کی طلاق واقع ہونے سے اسے بچنے نہیں دیتی۔

اور ایک دفعہ ہی تین طلاقیں دینے سے تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں۔ اس لئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ہی ہزار طلاق دینے پر تین کو نافذ کر دیا۔

☆ "واخرج عبدالرزاق والبیهقی عن علقمة بن قیس قال اتی رجل ابن مسعود فقال ان رجلا طلق امرأته البارحة مائة قال قلتها مرة واحدة قال نعم قال اترید ان تبین منک امرأتک قال نعم قال هو کما قلت" (درمنثور)

حضرت علقمہ بن قیس کہتے ہیں ایک شخص حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آئے وہ کہنے لگے بے شک ایک شخص نے (یعنی میں نے) گذشتہ رات اپنی زوجہ کو ایک سو طلاقیں دے دیں، آپ نے فرمایا سب ایک مرتبہ ہی دے دیں؟ اس نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا تم نے اسی لئے تو یہ طلاقیں دی ہیں کہ وہ تم سے جدا ہو جائے، اس نے کہا ہاں یہی مطلب تھا، تو آپ نے فرمایا، بس وہی ہو گیا جو تمہارا مطلب تھا۔

یعنی تین طلاقیں تو واقع ہو گئیں اور باقی لغو چلی گئیں۔ واضح ہوا کہ ایک دفعہ ہی تین طلاقیں دینے سے تین ہی واقع ہوتی ہیں۔

☆ "واخرج البیهقی عن قیس بن حزم قال سأل رجل المغیرة شعبة وانا شاهد عن رجله طلق امرأته مائة قال ثلاث تحرم وسبع وتسعون فضل" (درمنثور)

حضرت قیس بن حزم کہتے ہیں کہ ایک شخص نے میری موجودگی میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ

سے سوال کیا کہ ایک شخص اپنی زوجہ کو ایک سو طلاقیں دے دے تو اس کا کیا حکم ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ وہ تین سے حرام ہو جائے گی اور ستانوے زائد ہوں گی (یعنی ضائع چلی جائیں گی)

☆ واخرج ابن عدی والبیھقی عن الاعمش قال بان با لکوفة شیخ یقول سمعت علی ابن ابی طالب یقول اذا طلق الرجل امرأته ثلاثا فی مجلس واحد فانه یردالی واحدة والناس عنقاداحدا اذاک یا تونه ویسمعون منه قال فاتیته فقرعت علیه الباب فخرج الی شیخ فقلت له کیف سمعت علی بن ابی طالب یقول فیمن طلق امرأته ثلاثا فی مجلس واحد قال سمعت علی بن ابی طالب یقول اذا طلق الرجل امرأته ثلاثا فی مجلس واحد فانه یر دالی واحدة قال فقلت له انی سمعت ھذا من علی قال اخرج الیک کتابافاخرج فاذ افیه بسم اللہ الرحمن الرحیم قال سمعت علی بن ابی طالب یقول اذاطلق الرجل امرأته ثلاثافی مجلس واحد فقد بانت منه ولا تحل له حتی تنکح زوجاغیرہ قلت ویحک ھذا غیر الذی تقول قال الصحیح ھو ھذا ولکن ھؤلاء ارادونی علی ذلک" (درمنثور)

اعمش کہتے ہیں کہ کوفہ میں ایک بوڑھا شخص ظاہر ہوا جو یہ کہتا تھا کہ میں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو کہتے ہوئے سنا کہ جب کوئی شخص اپنی عورت کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دے دے تو وہ ایک ہی طلاق ہوگی، لوگ اس کے پاس آرہے ہیں گردن اٹھا کر دیکھ رہے ہیں اور اس کی بات کو سن رہے ہیں، اعمش کہتے ہیں میں اس کے پاس آیا، اس کا دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ شیخ میری طرف نکلا، تو میں نے اسے کہا تم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کیسے سنا، اس شخص کے متعلق جو اپنی عورت کو تین طلاقیں دے دے ایک ہی مجلس میں؟ اس نے کہا حضرت علی بن طالب رضی اللہ عنہ سے سنا آپ فرمارہے تھے جب کوئی شخص اپنی عورت کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دے دے تو وہ ایک طلاق شمار ہوگی۔ اعمش کہتے ہیں میں نے اسے کہا یہ تم نے کہاں ان سے سنا ہے؟ اس نے کہا میں تمہیں ایک خط (دستاویز جس پر حدیث لکھی ہوئی ہے) نکال کر دیتا ہوں، تو جب اس نے وہ

خط نکال کر دیا تو اس میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد یہ لکھا ہوا تھا میں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا جب کوئی شخص اپنی زوجہ کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دے دے تو وہ اس سے بائن (جدا) ہو جائے گی اور وہ اس کے لئے حلال نہیں ہوگی، یہاں تک کہ وہ کسی اور خاوند کے پاس رہے۔ میں نے کہا تمہارے لئے بربادی اس میں تو تمہارے کہنے کے خلاف لکھا ہوا ہے۔ اس نے کہا صحیح حدیث یہی ہے، لیکن لوگوں نے مجھ سے مطالبہ کیا تھا کہ میں یوں بیان کروں تو میں نے بھی ان کے کہنے کے مطابق بیان کر دیا۔

واضح ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف یہ منسوب کرنا ہی باطل ہے کہ وہ ایک مجلس میں تین طلاقوں کو ایک شمار کرتے تھے، بلکہ آپ فرماتے تھے ایک مجلس میں تین طلاقیں دینے سے تین ہی واقع ہوتی ہیں، وہ عورت بائن ہو جاتی ہے۔

☆ **" واخرج البیھقی عن مسلمة بن جعفر الاحمس قال قلت لجعفر بن محمد یزعمون ان من طلق ثلا ثا بجها لة ردالی السنة یجعلو نه واحد ة یر دونها عنکم قال معاذ الله ما هذامن قولنا من طلق ثلا ثا فهو کما قال "** (در منثور)

مسلمہ بن جعفر الاحمس کہتے ہیں میں نے جعفر بن محمد کو کہا کہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ کوئی شخص جہالت سے اپنی عورت کو تین طلاقیں دے دے تو ان کو سنت کی طرف لوٹا کر ایک شمار کیا جائے۔ اس روایت کو لوگ تمہاری طرف منسوب کرتے ہیں کہ یہ تم نے بیان کیا ہے انہوں نے کہا معاذ اللہ (اللہ کی پناہ) ہمارا یہ قول نہیں۔ بلکہ جو تین طلاقیں ایک مجلس میں دے گا وہ تین ہی واقع ہوں گی۔

☆ **"واخرج ابن ماجه عن الشعبی قال قلت لفاطمه بنت قیس حدثینی عن طلاقک قالت طلقنی زوجی ثلاثا وهو خارج الی الیمن فاجاز ذلک رسول الله ﷺ"** (درمنثور)

شعبی کہتے ہیں میں نے فاطمہ بنت قیس کو کہا کہ مجھے تم اپنی طلاق کے متعلق بتاؤ، وہ کہنے لگیں مجھے میرے خاوند نے تین طلاقیں دے دیں جب وہ یمن کی طرف جانے لگا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے جائز رکھا۔

یعنی تین طلاقوں کو تین ہی شمار کیا گیا، رسول اللہ ﷺ نے اسے رد نہیں فرمایا۔

مسئلہ: جس عورت کو وطی اور خلوت صحیحہ سے پہلے تین طلاقیں ایک مرتبہ دے دی جائیں، اسے تین طلاقیں ہی واقع ہوں گی، اس سے اس وقت تک دوبارہ نکاح نہیں ہو سکے گا جب تک وہ کسی اور خاوند کے پاس نہ رہے۔

اور اگر عورت کو وطی اور خلوت صحیحہ سے پہلے ایک طلاق دے تو وہ ایک ہی طلاق سے بائن ہو جائے گی، اس سے رجوع جائز نہیں ہوگا، بلکہ دوبارہ نکاح کی ضرورت ہوگی اگر ایک طلاق کے بعد اسے ہی دوسری اور تیسری طلاق دی گئی تو وہ واقع نہیں ہوگی، کیونکہ محل ختم ہو چکا ہے۔

مسئلہ مذکورہ پر احادیث:

" واخرج البیھقی عن ابن مسعود قال المطلقة ثلاثا قبل ان یدخل بھا بمنزلة التی قد دخل بھا" (درمنثور)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جس عورت سے وطی نہ کی گئی ہو (اور خلوت صحیحہ بھی نہ پائی گئی ہو) اسے تین طلاقیں دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ اسے تین طلاقیں دی جائیں جس میں وطی کر لی گئی ہو۔

اس حدیث پاک سے بھی یہ ثابت ہوا کہ تین طلاقیں ایک مرتبہ دینے سے تین ہی واقع ہوتی ہیں۔

☆ "واخرج مالک والشافعی وابو داؤد والبیھقی عن محمد بن ایاس بن البکیر قال طلق رجل امرأته ثلاثا قبل ان یدخل بھا ثم بداله ان ینکحھا فجاء یستفتی فذھبت معه اسأل له فسأل اباھریرة وعبداللہ بن عباس عن ذلک فقالا لا نری ان تنکحھا حتی تنکح زوجا غیرک قال انما کان طلاقی ایاھا واحدة قال ابن عباس انک ارسلت من یدک ما کان لک من فضل " (درمنثور)

محمد بن ایاس بن بکیر کہتے ہیں کہ ایک شخص نے اپنی عورت کو وطی (اور خلوت صحیحہ) سے پہلے تین طلاقیں دے دیں، پھر ارادہ ہوا کہ میں اس سے نکاح کرلوں، وہ شخص مسئلہ پوچھنے کے لئے آیا

میں اس کے ساتھ چلا تا کہ اس کے متعلق پوچھوں، تو اس نے حضرت ابوھریرہ اور حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہم) سے اس کے متعلق سوال کیا تو ان دونوں نے کہا ہم تو جائز نہیں سمجھتے کہ تم اس سے نکاح کرلو، یہاں تک کہ وہ عورت تمہارے بغیر کسی اور خاوند کے پاس رہے۔ اس شخص نے کہا میری طلاق اس کے لئے ایک ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ تم نے اپنے ہاتھ سے باقی کو بھی چھوڑ دیا۔ یعنی تم نے تینوں طلاقوں کا استعمال جب ایک مرتبہ کرلیا تو اب تین طلاقیں واقع ہوگئیں، جو تمہارا خیال ہے کہ ایک ہی طلاق سے وہ بائن ہوگئی اور باقی نہیں واقع ہوئیں یہ اس وقت ہوتا جب تم ایک ایک کر کے دیتے۔

اس حدیث سے بھی واضح ہوا کہ تین طلاقیں ایک مرتبہ دینے سے تین ہی واقع ہوتی ہیں۔

☆ ''واخرج مالک والشافعی عن عطاء بن یسار قال جاء رجل یسأل عبداللہ بن عمرو بن العاص عن رجل طلق امرأته ثلاثا قبل ان یمسها فقلت انما طلاق البکر واحدة فقال لی عبداللہ بن عمرو انما انت قاضی الواحدة بینها والثلاث تحرمها حتی تنکح زوجا غیره'' (درمنثور)

عطاء بن یسار کہتے ہیں ایک شخص حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کے پاس سوال کرنے کے لئے آیا کہ ایک شخص اپنی زوجہ کو چھونے سے پہلے تین طلاقیں دے دے تو اس کا حکم کیا ہے۔ عطاء کہتے ہیں میں نے کہا باکرہ (جسے چھوا نہ جائے) اسے ایک ہی طلاق ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے کہا قاضی تم ہی ہو؟ (ایسا نہیں جیسا تم نے کہا) ایک طلاق سے وہ بائنہ ہو جاتی ہے اور تین طلاقیں ایک دفعہ ہی دی جائیں تو وہ عورت اپنے پہلے خاوند کے لئے حلال نہیں رہتی، یہاں تک کہ وہ دوسرے خاوند کے پاس رہے۔

یہاں تک بیان کی گئی احادیث سے مسئلہ روز روشن کی طرح نکھر کر سامنے آگیا کہ تین طلاقین ایک مرتبہ دینے سے تین طلاقیں ہی واقع ہوتی ہیں۔

شیعہ اور غیر مقلدین کا مسلک:

یہ دونوں فرقے یعنی شیعہ اور غیر مقلدین کہتے ہیں کہ تین طلاقیں ایک مرتبہ دے دی جائیں تو ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہے۔

یہ دونوں فرقے دراصل کم تعداد میں ہیں کہ کسی طرح ہمارا کوئی نہ کوئی ہمنوا بن جائے۔ کئی لوگ تین طلاقیں دے کر غیر مقلدین سے فتویٰ لکھا کر لے آتے ہیں کہ ایک ہی طلاق واقع ہوئی، وہ ہمیشہ کے لئے حرام کے مرتکب ہو جاتے ہیں، لیکن حرام کا مرتکب بنا کر وہ غیر مقلد بنا لیتے ہیں۔

حضرت علامہ الشاہ تراب الحق صاحب مدظلہ العالی نے ایک مرتبہ خطاب میں ارشاد فرمایا کہ تین طلاقوں کے بعد حرام کو حلال سمجھنے والوں نے اور حرام کی اولاد نے گستاخ رسول ہی بننا ہے اور ان سے کیا توقع کی جاسکتی ہے۔

غیر مقلدین کے دلائل اور ان کے جوابات:

اس مسئلہ کو راقم حضرت علامہ محمود احمد رضوی شارح بخاری کے ایک مضمون سے بمع اضافات اور وضاحت سے ذکر کر رہا ہے۔

اس مسئلہ پر صاحب فیض الباری فرماتے ہیں، ابن تیمیہ اور ان کے اصحاب (غیر مقلدین) کا جمہور صحابہ و تابعین اور وائمہ دین کے موقف کے خلاف رائے رکھنا تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے، ہر دور میں دو چار افراد ایسے ہوتے ہیں جو جمہور مسلمین کے خلاف رائے رکھتے ہیں، ابن تمیہ بھی ان میں سے ایک ہے۔ (جو غیر مقلدین کا امام ہے اسی کے نظریات غیر مقلدین کے نظریات ہیں)

ابن تیمیہ (اور اس کے متبعین غیر مقلدین بلکہ مقلدین ابن تیمیہ) کا موقف یہ ہے کہ بیک وقت دی گئیں تین طلاقیں تین نہیں ایک قرار پاتی ہے۔

ظاہر یہ ہے کہ جمہور ائمہ دین کے موقف کو غلط قرار دینا اور ابن تیمیہ کے قول کو حق قرار دینے کا کسی کو کوئی حق

نہیں۔اس لئے کہ ابن تیمیہ کے پاس یکدم دی گئی تین طلاقوں کو ایک قرار دینے کے لئے صرف تین روایتیں ہیں۔ اول صحیح مسلم کی روایت جو طاؤس کا وہم اور شاذ روایت ہے۔دوم مسند احمد کی روایت جو مضطرب، منکر اور ضعیف روایت ہے۔اور سوم ابوداؤد کی روایت جو مجہول، منکر اور متروک روایت ہے۔

یہ ہے ابن تیمیہ کے پاس دلائل کا قابل ذکر سرمایہ، جس کی بنیاد پر وہ تین طلاقوں کو ایک قرار دیتے ہیں۔اس اجمال کی نہایت مختصر توضیح یہ ہے۔

روایت ابوداؤد:

" حدثنااحمدبن صالح اخبر ناعبدالرزاق اخبرناابن جریج اخبر نی بعض بنی ابی رافع مولی النبی ﷺ عن عکرمة مو لی ابن عباس عن ابن عباس قال قال طلق عبد یزید ابو رکانة (الی)قال(النبی ﷺ)راجع امرأ تک ام رکانة واخوته فقال انی طلقتها ثلاثا یارسول اللہ قال قد علمت راجعها وتلا (یاایھاالنبی اذاطلقتم النساء فطلقوھن لعد تھن)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، یزید کے غلام ابورکانہ نے اپنی زوجہ ام رکانہ کو طلاق دے دی تو نبی کریم ﷺ نے انہیں فرمایا تم رجوع کرلو۔تو وہ عرض کرنے لگا یارسول اللہ! میں نے اسے تین طلاقیں دے دی ہیں، آپ نے فرمایا مجھے معلوم ہے، تم اس کی طرف رجوع کرلو۔اور آپ نے یہ آیۃ (بطور دلیل) تلاوت کی یاایھاالنبی اذاطلقتم النساء فطلقوھن لعد تھن

(ابو داؤد باب نسخ المراجعة بعد تطلیقات الثلاث)

اس حدیث سے ابن تیمیہ اور اس کے متبعین نے یہ دلیل پکڑی ہے کہ تین طلاقیں دینے سے ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہے اور اس کے بعد رجوع ہوسکتا ہے۔

دلیل کا رد:

یہ دلیل مختلف وجوہ سے بہت ہی ناقص اور کمزور ہے، جس سے حرام کو حلال ثابت کرنا در حقیقت اپنی عاقبت ہی خراب کرنا ہے۔

رد کی پہلی وجہ:

حدیث کی سند تمام راقم نے ذکر کر دی ہے جس میں راوی ''بعض بن ابی رافع'' ہے، یعنی ابو رافع کے کسی بیٹے نے یہ حدیث بیان کی ہے۔ یہ راوی مجہول ہے۔ راوی کا جب تک نام نہ ذکر کیا جائے وہ مجہول ہوتا ہے، اس کی حدیث بطور دلیل نہیں پیش کی جاسکتی۔

مجہول راوی کا حکم:

"واما جهالة الراوی فانه ایضا سبب للطعن فی الحدیث لانه لما لم یعرف اسمه وذاته لم یعرف حاله وانه ثقة اوغیر ثقه کما یقول حدثنی رجل اواخبرنی شیخ ویسمی هذامبهماوحدیث المبهم غیرمقبول الاان یکون صحابیا لانهم عدول وان جاء المبهم بلفظ التعدیل کما یقول اخبرنی عدل اوحدثنی ثقة ففیه اختلاف والاصح انه لا یقبل" (مقدمہ مشکوۃ)

راوی کا مجہول ہونا حدیث میں طعن کا سبب ہے، کیونکہ جب تک راوی کا نام اور ذات اور حال نہ پتہ چلے کہ وہ راوی ثقہ ہے یا غیر ثقہ، جیسے کوئی کہے کہ ایک شخص نے مجھے حدیث بیان کی، یا یہ کہے کہ مجھے شیخ نے حدیث بیان کی، وہ حدیث مبہم کہلاتی ہے۔ مبہم حدیث مقبول نہیں۔ سوائے اس کے صحابی کا نام وغیرہ ذکر نہ ہو صرف اتنا مذکور ہو کہ ایک صحابی نے مجھے حدیث بیان کی ہے، تو وہ مقبول ہوگی کیونکہ تمام صحابہ کرام عادل اور ثقہ ہیں۔ صحابی کے بغیر کسی اور کے متعلق یہ بھی کہہ دیا جائے مجھے عادل شخص نے حدیث بتائی ہے یا یہ کہے مجھے ثقہ راوی نے حدیث بیان کی ہے تو صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث بھی مقبول نہیں۔

رد کی دوسری وجہ:

اس حدیث پر خود محدث ابوداؤد نے اعتبار نہیں کیا۔ بلکہ اس کے خلاف دوسری روایت کو ترجیح دی ہے جس میں ابورکانہ کی طلاق کا ہی ذکر ہے۔

" قال ابو داؤد وحديث نافع بن عجير وعبدالله بن علي بن يزيد بن ركانة عن ابيه عن جده ان ركانة طلق امرأته البتة فردها اليه النبی ﷺ اصح لانهم ولد الرجل واهله اعلم به ان ركانة انما طلق امرأته البتة فجعلها النبی ﷺ واحدة "

(ابو داؤد حوالہ مذکور)

ابوداؤد کہتے ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے زیادہ صحیح روایت نافع بن عجیر اور عبداللہ بن علی بن یزید بن رکانۃ کی اپنے باپ دادا سے ہے کہ بے شک رکانہ نے اپنی زوجہ کو طلاق البتہ دی تھی، تو رسول اللہ ﷺ نے ان کی زوجہ کو ان پر لوٹا دیا تھا۔ یہ حدیث اس لئے زیادہ صحیح ہے کہ ایک شخص کی اولاد اور اس کے گھر والے حضرات زیادہ اس کے واقعہ کو جانتے ہیں، وہ یہی ہے کہ رکانہ نے اپنی زوجہ کو طلاق البتہ دی، تو نبی کریم ﷺ نے اسے ایک شمار کیا۔

طلاق البتہ یہ ہے کہ زوجہ کو کہا جائے۔ " انت بتة " اس میں نیت طلاق کی ہو تو طلاق واقع ہوتی ہے اور نیت نہ ہو تو طلاق واقع نہیں ہوتی۔ اگر نیت ہو تو ایک طلاق بائن واقع ہوتی ہے، جس میں تجدید نکاح کی ضرورت ہوتی ہے۔ عمرو بن شعیب نافع بن عجیر کی روایت میں یہ الفاظ بھی واضح طور پر موجود ہیں۔

"ان النبی ﷺ ردها عليه بنكاح جديد" بے شک نبی کریم ﷺ نے ان پر ان کی زوجہ کو نکاح جدید سے لوٹا دیا۔

رد کی تیسری وجہ:

ابوداؤد نے عنوان ہی یہ قائم کیا "باب نسخ المراجعة بعد تطليقات الثلاث" (تین طلاقوں کے بعد رجوع کرنے کے منسوخ ہونے کے بیان میں)

اس عنوان کے تحت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا ضعف بیان کیا جائے جیسا کہ رد کی دوسری صورت میں واضح کر دیا گیا ہے۔

مقام افسوس یہ ہے کہ ابوداؤد حدیث کو ضعیف کہیں اور اس کو رد کریں، اور عنوان ہی قائم کریں کہ تین طلاق کے بعد رجوع کرنا منسوخ ہے، لیکن غیر مقلدین اسی حدیث کو اپنی دلیل بنائیں کہ ابوداؤد میں یہ حدیث ہے۔ ابوداؤد کی بات مانیں یا کہ غیر مقلدین کی؟

" ان رکانة طلق زوجته البتة فجعله رسول الله ﷺ انه ما اراد الا واحدة فردها اليه فطلقها الثانية في زمن عمر و الثالثة في زمن عثمان"

(در منثور، مظہری، مشکوۃ باب المطلقة ثلاثا)

بے شک رکانہ نے اپنی زوجہ کو طلاق البتہ دی، اس نے ایک کا ہی ارادہ کیا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے اس پر ایک کا ہی حکم نافذ کیا اور اس پر اس کی زوجہ کو لوٹا دیا۔ پھر دوسری طلاق اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اور تیسری حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں دی۔

واضح ہوا کہ تین کے بعد لوٹانے والی حدیث ضعیف، مبہم، منکر اور شاذ ہے، اس درجہ کی حدیث سے احکام ثابت نہیں۔ حرام کو حلال کرنا کیسے ثابت ہو سکتا ہے؟

حدیث مسند احمد:

ابن تیمیہ اور ان کے ہمنوا حدیث مسند احمد سے بھی استدلال کرتے ہیں۔

" وقال الامام احمد حدثنا سعيد بن ابراهيم قال انبانا ابي عن محمد بن اسحق قال حدثني داؤد بن الحصين عن عكرمة عن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما قال طلق ركانة بن عبد يزيد زوجة ثلاثا في مجلس واحد فحزن عليها حزنا شديدا فسأله النبي ﷺ كيف طلقتها قال طلقتها ثلاثه في مجلس واحد قال انما تلك طلقة واحدة فارتجعها " .

مسند احمد میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ (ابو) رکانہ نے اپنی زوجہ کو ایک ہی

مجلس میں تین طلاقیں دے دیں تو اس پر بہت زیادہ غمزدہ ہوئے (تو نبی کریم ﷺ سے اس کے متعلق سوال کیا) نبی کریم ﷺ نے ان سے پوچھا کے تم نے کیسے طلاق دی؟ تو انہوں نے کہا میں نے ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے دی ہیں، آپ نے فرمایا یہ ایک ہی طلاق ہے تم اس کی طرف رجوع کرلو۔

اس دلیل کا رد:

مسند احمد میں صحیح احادیث کو جمع کرنے کا التزام نہیں کیا گیا، اس میں ضعیف، حسن اور صحیح ہر قسم کی احادیث موجود ہیں اس لئے مسند احمد کو صحاح ستہ میں شمار نہیں کیا جاتا۔

یہ حدیث صحیح نہیں بلکہ ضعیف ہے۔ ضعیف حدیث سے حرام کو حلال نہیں کہا جا سکتا، یہ حدیث ضعیف کیوں ہے؟ اس لئے کے اس کے راویوں میں ایک راوی ابن سحاق ہے جو مجروح ہے اور دوسرا راوی داؤد اس سے بھی زیادہ ضعیف ہے، جیسا کے ابن جوزی نے اس بات کی تصریح کی ہے۔ (العلل المتناھیہ ج ۲، ص ۱۵۱)

امام جصاص نے اس حدیث کا منکر ہونا بیان کیا ہے۔ (احکام القرآن للجصاص)

نیز کتب اسماء الرجال میں محمد بن اسحاق کو کذاب قرار دیا گیا ہے۔

حدیث مسلم:

"اسحاق بن ابراھیم ومحمد بن رافع واللفظ لابن رافع قال اسحق اناوقال ابن رافع ناعبدالرزاق قال انامعمرعن ابن طاؤس عن ابیہ عن عباس قال کان الطلاق علی عھد رسول اللہ ﷺ وابی بکر وسنتین من خلافة عمر طلاق الثلاث واحدة فقال عمر بن الخطاب ان الناس قد استعجلوا فی امر کانت لھم فیہ اناةفلوامضیناہ علیھم فامضاہ علیھم" (مسلم باب طلاق الثلاث)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ کی خلافت کے دوسال تین طلاقوں کو ایک شمار کیا جاتا تھا، پھر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا، بیشک لوگوں نے اس معاملہ میں جلدی شروع کر دی جس کی ان کومہلت تھی، اگر ہم اسے جاری کر دیں تو بہتر رہے گا، پھر آپ نے اسے جاری کر دیا۔

☆ ”حدثنااسحق بن ابراهيم قال انا روح بن عبادة قال انا ابن جريج ح قال وحدثنا ابن رافع فاللفظ له ناعبد الرزاق قال انا ابن جريج قال اخبرني ابن طاؤس عن ابيه ان ابا الصهباء قال لابن عباس اتعلم انما كانت الثلاث تجعل واحدة على عهد النبي ﷺ وابي بكر وثلاثا من امارة عمر فقال ابن عباس نعم“

ابوالصہباء نے حضرت ابن عباس سے پوچھا کیا تم جانتے ہو کہ نبی کریم ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں تین طلاقیں ایک شمار ہوتیں اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں تین کو تین ہی سمجھا گیا؟ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کہاہاں ایسا ہی ہے۔

☆ ”وحدثنا اسحاق بن ابراهم قال انا سلمان بن حرب عن حماد ابن زيد عن ايوب السختياني عن ابراهيم بن ميسرة عن طاؤس ان اباالصهباء قال لابن عباس هات من هناتك الم يكن الطلاق الثلاث على عهد رسول الله ﷺ وابي بكر واحدة فقال قد كان ذلك فلما كان في عهد عمر تتابع الناس في الطلاق فاجاز عليهم“

ابوالصہباء نے حضرت ابن عباس کو کہا تم اپنی عجیب خبر پیش کرو، کیا رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں تین طلاقیں ایک نہیں ہوتی تھیں؟ تو انہوں نے کہا ہاں ایسا ہی ہے۔ البتہ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا زمانہ آیا تو لوگوں نے جلد بازی کر دی تو آپ نے تین کو تین کی ہی اجازت فرما دی۔

یہ تینوں روایات مسلم جلد اول باب طلاق الثلاث سے نقل کی گئی ہیں، ان پر ہی غیر مقلدین زور دے رہے

ہیں اور ضعیف حدیثوں سے حرام کو حلال بنا رہے ہیں، جو سراسر غلط ہے، اور تعجب یہ ہے کے ضعیف حدیث فضائل میں معتبر ہونے کے باوجود نبی کریم ﷺ کے فضائل میں ضعیف بلکہ متعدد طرق سے بیان کردہ ضعیف حدیث جو حسن لغیرہ بن جاتی ہے اسے قبول نہیں کرتے۔

نبی کریم ﷺ کے فضائل کو نہ ماننے کا نتیجہ یہی ہے کہ حرام کو حلال بنا کر ضال اور مضل ہونے کا شرف حاصل کرلیں۔

اس دلیل کا رد:

ابن تیمیہ اور ان کے موافقین نے مسلم کی اس حدیث (جو تین سندوں سے ثابت ہے) سے جو استدلال کیا ہے اس سے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر الزام عائد ہوتا ہے کہ آپ نے واضح طور پر حضور اقدس ﷺ کی شریعت کی مخالفت کی اور تمام صحابہ نے بھی رسول ﷺ کی مخالفت کو قبول کرلیا، معاذ اللہ، اگر یہ بات مان لی جائے تو حضرت ابوبکر کے دور میں وفات پانے والے صحابہ کے علاوہ کوئی صحابی اس قابل نہیں رہے گا کہ اس کے دین اور اس کی روایت کو قبول کیا جائے، ہمارے دور کے غیر مقلد وھابی مولوی بھی تین طلاقوں کو شرعاً ایک طلاق ثابت کرنے کے لئے بڑے فخر سے اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ ان کے اس استدلال باطل سے تو صحابہ کرام کی دیانت و امانت و عدالت سب ختم ہو جاتی ہے، کیا کوئی مسلمان یہ تصور بھی کرسکتا ہے کے حضور اقدس ﷺ کے دور اور حضرت ابوبکر اور خود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں بیک وقت دی گئی تین طلاقوں کو ایک قرار دیا جاتا تھا اور حضرت عمر نے حضور اقدس ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور خود اپنے دور خلافت کے دو سالہ دور کی شریعت کو بدل دیا۔ یہ ممکن نہیں۔

اگرچہ اس کا ایک جواب علامہ نووی رحمہ اللہ نے یہ ذکر فرمایا کہ تین طلاقوں کو ایک شمار کرنے کا حکم منسوخ ہونے کا وقت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمایا جسے تمام صحابہ کرام نے قبول کرلیا۔

اگر علامہ نووی رحمہ اللہ کا یہ جواب تسلیم کرلیا جائے تو پھر بھی غیر مقلدین اس حدیث کو اپنی دلیل نہیں بنا سکتے

کیونکہ منسوخ سے دلیل حاصل کرنا سوائے جہالت کے اور کچھ بھی نہیں۔

یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مؤلفۃ قلوب کا زکوۃ کا مصرف نہ رہنے کا وقت بیان کیا جسے تمام صحابہ کرام نے قبول کرلیا۔

شاذ اور معلل حدیث قابل عمل نہیں:

یہ حدیث قرآن پاک کی اس آیت کے خلاف ہے، جس کی وضاحت جاری ہے، کیونکہ اس میں صراحۃ تیسری طلاق کے بعد عورت کا خاوند کے لئے حلال نہ ہونا ذکر کردیا ہے، پھر بخاری اور مسلم کی صحیح اور متفق علیہ حدیث جن کو صحاح کے دیگر مؤلفین نے بھی روایت کیا ہے کہ حضرت عمیر نے بیک وقت تین طلاقیں دیں تو نبی کریم ﷺ نے ان کو نافذ کردیا۔

وہ طویل حدیث ہے جس کا کچھ حصہ یہ ہے۔ "فطلقها ثلاثه قبل ان یامره رسول الله ﷺ" عمیر نے نبی کریم ﷺ کے لعان کا حکم نافذ کرنے سے پہلے ہی بیک مرتبہ تین طلاقیں دے دیں، ان تینوں کو جاری کردیا گیا۔

نیز متعدد صحیح احادیث اور اور بکثرت آثار صحابہ واقوال تابعین سے ثابت ہے کہ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں نافذ ہو جاتی ہیں، چونکہ مسلم کی یہ روایت قرآن وسنت اور آثار صحابہ وتابعین کے صریح طور پر خلاف ہے اس لئے یہ روایت شاذ اور معلل ہے اور استدلال کے قابل نہیں ہے۔

شاذ اور معلل ہونے کی ایک اور وجہ:

اس روایت کے شاذ اور معلل اور مردود ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کے خود حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما یہ فتوی دیتے تھے کہ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں نافذ ہو جاتی ہیں اور حضرت ابن عباس سے یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ کہ وہ نبی کریم ﷺ سے ایک بات روایت کریں اور فتوی اس کے خلاف دیں۔ حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہم) کا ایک فتوی گزشتہ اوراق میں گزر چکا ہے، اور ایک روایت دیکھیں۔

''عن مجاهد قال کنت عند ابن عباس فجاءہ رجل فقال انہ طلق امرأتہ ثلاثا قال فسکت حتی ظننت انہ رادھا الیہ، ثم قال ینطلق احد کم فیرکب الحموقۃ ثم یقول یا ابن عباس یا ابن عباس وان اللہ قال (ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا) وانک لم تتق اللہ فلا اجد لک مخرجا،عصیت ربک وبانت منک امرأتک وان اللہ قال (یا ایھاالنبی اذاطلقتم النساء فطلقوھن فی قبل عدتھن) '' (ابو داؤد)

حضرت مجاھد کہتے ہیں میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس تھا تو ایک شخص ان کے پاس آیا،اس نے کہا کہ اس نے اپنی عورت کو تین طلاقیں دے دیں۔ میں نے گمان کیا کہ شائد آپ اس کی زوجہ کو اس کی طرف لوٹا دیں گے، پھر آپ نے فرمایا تم میں سے ایک آدمی چلتا ہے تو حماقت پر سوار ہو جاتا ہے، پھر وہ شخص کہنے لگا اے ابن عباس! اے ابن عباس! بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (اور جو اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے نکلنے کی راہ بنا دیتا ہے) آپ نے فرمایا بیشک تم اللہ سے نہیں ڈرے، میں تمہارے نکلنے کی راہ نہیں پاتا،تم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور عورت تم سے جدا ہوگئی ،اور بیشک اللہ تعالیٰ نے فرمایا (اے نبی جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کو طلاق دو ان کی عدت کے لئے)

مسئلہ واضح ہوا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا فتوی تھا کہ آپ تین طلاقوں کو تین ہی سمجھتے تھے۔

خیال رہے لفظ (قبل) حضرت ابن عباس کی قرأت میں ہے۔اس لفظ کے ہونے یا نہ ہونے سے اصل مسئلہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اور یہ بھی خیال رہے کے یہ روایت اس سند کے بغیر سات اور اسناد سے ثابت ہے،ابوداؤد کو دیکھئے۔

واضح ہوا کہ یہ روایت شاذ ہے اور طاؤس کو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی اس روایت کو منسوب کرنے میں وہم ہوا ہے، یہی وجہ ہے ابن عربی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ''ھذا حدیث مختلف فی صحتہ فکیف یقدم علی الاجماع ''اس کی صحت میں ہی اختلاف ہے یہ اجماع امت پر کیسے مقدم ہو سکتی ہے؟

"قال ویعارضه حدیث محمود بن بسید یعنی الذی اخرجه النسائی فان فیه التصریح بان الرجل طلق ثلاثا مجموعة ولم یرده النبی ﷺ بل امضاه "

اور ابن عربی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کے یہ حدیث اس وجہ سے بھی قابل قبول نہیں کہ اس کے معارض نسائی کی روایت محمود بن بسید سے مروی ہے کہ ایک شخص نے بیک وقت تین طلاقیں دے دیں تو نبی کریم ﷺ نے ان کو رد نہیں فرمایا بلکہ تینوں کو جاری فرمادیا۔

(فتح الباری ج ۹، ص ۲۷۶ کتاب الطلاق)

شاذ اور معلل ہونے کی اور وجہ:

طاؤس کی بیان کردہ اس روایت میں حضور اقدس ﷺ کے کسی فرمان کا ذکر نہیں، وہ تو ایک واقعہ بیان کررہے ہیں جو طاؤس کا وہم ہے، اس لئے یہ روایت صحیح نہیں ہے، چنانچہ مشہور غیر مقلد عالم علامہ شوکانی نیل الاوطار ج ۸، ص ۲۲ میں تصریح کی ہے کہ حضرت ابن عباس کے تمام شاگردوں نے آپ سے طاؤس کی بیان کردہ روایت کے خلاف روایت کی ہے۔

اور ایمان ودیانت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ حضرت عمر پر عہد رسالت اور عہد صدیقی کے معمول کی مخالفت اور تمام صحابہ پر مخالفت کی تہمت لگانے سے یہ بہتر ہے کے مسلم کی اس روایت کو غیر صحیح اور مردود قرار دیا جائے، جس کی معقول وجہ اور بنیاد طاؤس کا وہم ہے۔

شاذ اور معلل ہونے کی اور وجہ:

جب راوی کا عمل اپنی بیان کردہ حدیث کے خلاف ہو تو یہ بات حدیث کی صحت میں طعن کا سبب ہوتی ہے، یا اس حدیث کے منسوخ ہونے یا اس حدیث میں تاویل ہونے اور اس کے ظاہری معنی مراد نہ ہونے پر دلیل ہوتا ہے، جیسا کے علامہ عبدالعزیز پرہاروی نے نبراس، ص ۲۳ پر لکھا ہے۔

ان وجوہات کی بنا پر جمہور فقہاء اسلام اول تو طاؤس کی روایت کو فنی سقم کی وجہ سے قبول ہی نہیں کرتے، دوم برسبیل تنزل وہ اس کی تاویل کرتے ہیں اور وہ یہ کے دور نبوی وعہد صدیقی میں لوگ تاکید کی نیت سے تین بار طلاق دیتے تھے، بعد میں حضرت عمر کے دور میں تین طلاق کی نیت سے دینے لگے، حضرت عمر نے ان کی نیات کے مطابق تین طلاق کو تین قرار دیا، یعنی حضرت عمر نے عہد نبوت کے کسی معمول کو بدلا نہیں، بلکہ اسی کو نافذ کیا جو حدیث رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔

راقم کا موقف:

اگر چہ یہ دوسری توجیہ بعض حضرات نے بیان کی ہے جو صاحب فیوض الباری رحمہ اللہ نے بھی نقل فرمادی ہے، لیکن حقیقت یہ ہی ہے کہ یہ حدیث ہی شاذ معلل، منکر اور ضعیف ہونے کی وجہ سے قبول نہیں، گذشتہ بیان کردہ احادیث سے واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں بھی تین طلاقوں کو تین شمار کیا جاتا تھا ان پر رجوع کا حق نہیں دیا جاتا تھا۔

اس توجیہ کو بالفرض قبول کرلیا جائے تو پھر بھی ہمارے زمانے میں اس کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ ہمارے زمانے میں سوائے علماء کے تاکید ومؤکد کے ضوابط سے ہی لوگ بے خبر ہیں، ان کو غلط فتوی سے بدکاری کے ارتکاب پر لگانا ظلم عظیم نہیں تو اور کیا ہے۔

مغالطہ یا غلط استدلال:

ابن تیمیہ اور ان کے ہمنوا قرآن پاک کی اس آیۃ جو زیر بحث ہے اور اس سے پہلی آیۃ سے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ قرآن میں ایسے طریقہ سے طلاق دینے کی ہدایت کی ہے کہ عدت گذرنے سے پہلے رجوع کا حق باقی رہے اور بیک وقت تین طلاق دینا قرآن کے خلاف ہے، اس لئے تین طلاق کو ایک قرار دیا جائے۔

مختصر جواب یہ ہے کہ قرآن نے طلاق دینے کا احسن طریقہ بیان کیا ہے اور قرآن کی کسی آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بیک وقت دی گئی تین طلاقیں واقع نافذ نہ ہوں گی۔

نیز قرآن مجید نے بہت سے کاموں سے منع فرمایا ہے، جس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس فعل کو کرلیا جائے تو فعل ہی باطل ہو جائے گا، یا اس کا وجود وعدم برابر ہو جائیں گے، قرآن نے زناء اور چوری کرنے سے منع کیا ہے، لیکن اگر کوئی شخص زنا یا چوری کرلے تو اس کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وہ فعل وقوع پذیر ہی نہیں ہوا، دیکھئے اذان جمعہ کے وقت خرید وفروخت کی، یا مغصوبہ زمین پر نماز پڑھی تو شرعاً نفس بیع منعقد ہو جائے گی اور نماز فرض بھی ادا ہو جائے گی، تو ایسی ہی بیک وقت دی گئی تین طلاقیں باوجود ممنوع ہونے کے واقع ہو جائیں گی۔

طلاق بدعت اور ثلاثہ کا حکم:

(۱) سیدنا امام اعظم اور امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے نزدیک بیک وقت تین طلاق دینا بدعت و گناہ ہے اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا ایک قول یہ ہے کہ یہ حرام ہے، اور دوسرا قول یہ ہے کہ حرام و گناہ نہیں، سیدنا امام حسن بن علی، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، امام شعبی اور سیدنا امام شافعی رحمھم اللہ کا بھی یہی نظریہ ہے کہ ہر چند کہ ایک دم طلاق دینا مستحب نہیں مگر حرام گناہ بھی نہیں، کیونکہ عویمر عجلانی نے اپنی بیوی کو لعان کیا اور حضور ﷺ کے حکم دینے سے پہلے بحضور نبوت عرض کی، یا رسول اللہ! اب اگر میں اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھوں تو میرا زنا کی تہمت لگانا جھوٹ ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں۔ اور عویمر عجلانی کے ایک دم تین طلاق دینے پر حضور اقدس ﷺ کا انکار منقول نہیں۔

(۲) اور حضرت امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ کا دوسرا قول یہ ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں دینا بدعت و حرام ہے۔ امیر المومنین حضرت عمر، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر، سیدنا امام مالک اور سراج الامۃ امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہم کا بھی یہی نظریہ ہے (المغنی، ج ۷، ص ۲۸۱)

(۳) ایک دم تین طلاقیں دینے کو حضرت عمر، حضرت علی اور دیگر صحابہ کرام و جمہور اہل سنت اور ان کے لاکھوں مقلدین علماء، صلحاء، اولیاء اور عام مسلمان حرام و بدعت اور گناہ سمجھتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی اس امر پر متفق ہیں کہ بیک وقت تین طلاقیں دے دیں تو واقع و نافذ ہو جائیں گی، کیونکہ کسی فعل و عمل کا ناجائز ہونا اور گناہ ہونا اس فعل کی تاثیر کو نہیں روکتا۔

طلاق کے لفظ میں اللہ تعالیٰ نے نکاح کے توڑنے کی تاثیر رکھی ہے، از روئے لغت بھی اس لفظ کے معانی ''نکاح کی گرہ کھولنے'' ترک کرنے، اور چھوڑ دینے کے ہیں۔ طلاق کا تعلق مردوں سے ہے، اور عدت کا تعلق عورتوں سے ہے۔ (تاج العروس)

(۴) قرآن مجید میں غیر مدخولہ کو طلاق دینے کا ''سورہ احزاب آیۃ ۴۹'' میں ذکر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

''یا ایھاالذین امنو اذانکحتم المومنات ثم طلقتموھن من قبل ان تمسوھن فما لکم من عدۃ تعتدو تھا''

اے مومنو! جب تم نکاح کرو ایمان والی عورتوں سے پھر ان کو چھونے سے پہلے طلاق دے دو تو ان پر تمہارے لئے کوئی عدت نہیں۔

اس آیۃ میں اللہ تعالیٰ نے طلاق دینے کو عام رکھا ہے، خواہ بیک وقت تین طلاق دی جائیں یا الگ الگ طلاق دی جائے، تو جس فعل کو اللہ تعالیٰ نے مطلق و عام رکھا ہے اسے تو صحیح احادیث (اخبار آحاد) سے بھی مقید اور خاص نہیں کیا جاسکتا، چہ جائیکہ کچھ لوگوں کی غیر معصوم آراء اور غیر مستند اقوال سے اسے مقید کیا جائے۔

(۵) اور عقل بھی یہی چاہتی ہے کہ ایک عاقل و بالغ انسان اپنے اختیار سے ''تین'' کا عدد استعمال کرتا ہے اور آپ کہتے ہیں ''ایک''

اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کاغذات رجسٹری میں قیمت مکان تین لاکھ لکھی اور رجسٹرار کے ہاں رجسٹری کے موقع پر خریدار کہے کہ بے شک لکھا تو تین لاکھ ہے مگر میں ایک لاکھ دوں گا کیونکہ یک دم ''تین کا اقرار'' ایک ہوتا ہے، کیا رجسٹرار خریدار کی یہ بات تسلیم کرے گا؟ ہرگز نہیں۔

(۶) محمود بن لبید کی روایت کا مضمون یہ ہے کہ بحضور نبوی ﷺ یہ اطلاع دی گئی کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دے دیں تو حضور ﷺ غصہ سے کھڑے ہوگئے اور فرمایا میرے ہوتے ہوئے اللہ کی کتاب کو کھیل بنایا جارہا ہے۔ (نسائی، ج ۲، ص ۱۸۱)

اس حدیث سے واضح ہوا کہ عہد رسالت میں بیک وقت دی گئی تین طلاقیں ایک نہیں قرار پاتی تھیں۔ اگر تین طلاقوں سے ایک طلاق مراد لینے کا عہد رسالت میں معمول ہوتا تو حضور اقدس ﷺ اس قدر ناراض کیوں ہوتے؟ کیونکہ اگر بیک وقت دی گئی تین طلاقیں بھی ایک طلاق کے مترادف ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کہ طلاق دینے والے نے سنت طریقہ اختیار نہ کر کے گناہ کا ارتکاب کیا، اور یہی جمہور اہل سنت کا مسلک ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں دے دیں تو وہ تین طلاق ہی واقع ہوگی۔

(۷) حضرت سہل بن سعید رضی اللہ عنہ کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عویمر نے حضور ﷺ کے سامنے تین طلاقیں دے دیں" فانفذه "تو رسول اللہ ﷺ نے ان تین طلاقوں کو نافذ کر دیا۔ (ابو داؤد، ج ۱، ص ۳۰۶)

اس حدیث میں اس امر کی بالکل واضح طور پر تصریح ہے کہ حضرت عویمر نے حضور ﷺ کے سامنے ایک مجلس میں تین طلاقیں دیں اور آپ نے ان تین طلاقوں کو نافذ کر دیا، اور یہ بھی واضح ہوا کہ عہد رسالت میں ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقوں کا ایک ہونا معمول نہ تھا۔ حضور ﷺ تین طلاقوں کو تین ہی قرار دے کر نافذ کر دیتے تھے۔ اس سے یہ واضح ہوا کہ تاکید والی تاویل درست نہیں، صحیح یہی ہے کہ تین طلاقوں کو ایک قرار دینے والی روایات غیر معتبر ہیں۔

نتیجہ واضح ہوا:

یہ تمام بحث دلالت کرتی ہے اس پر کہ ایک ہی کلمہ سے تین طلاق کے وقوع کی صحت پر علماء اور صحابہ کرام کا اجماع ہے۔ نیز یکدم تین طلاق دینے سے تین طلاقیں واقع ہوتی ہیں، یہ مسئلہ احادیث مبارکہ سے ثابت ہے۔

تنبیہ:

اس مسئلہ کو کنز العمال، ج ۵، ص ۱۶۱۔ ابوداؤد، ج ۱، ص ۳۷۳۔ موطا امام مالک، ج ۲، ص ۱۶۔ دار قطنی، ج ۴، ص ۱۲۔ بیہقی، ج ۷، ص ۳۳۵۔ تفسیر مظہری، ج ۱، ص ۳۰۲۔ دار قطنی ص ۳۰۔ تفسیر درمنثور، ج ۲، ص ۲۳۰۔ عینی شرح بخاری، فتح القدیر میں موجود ہے۔ (رضوان، جنوری، فروری ۱۹۹۶ء مع اضافات وتصرفات کثیرہ)

حرام کو کوئی حلال سمجھے تو ہم کیا کریں:

مسئلہ کو واضح طور پر بیان کر دیا گیا، اب آگے کسی کی مرضی کہ وہ حرام کو حرام سمجھ کر گناہ سے بچ جائے، اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں رکھے یا کہ حرام کو حلال سمجھ کر ساری زندگی گناہوں میں مبتلا رہے اور رب تعالیٰ کے عذاب سے نڈر اور بے خوف ہو کر رہے۔

اے مسلمانو! خدارا گمراہ کن ٹولے سے بچ کر رہو، اپنی عاقبت کو برباد نہ کرو۔ حرام کاری اور حرام اولاد سے بچو۔

"فان طلقها فلا تحل من بعد حتی تنکح زوجا غیرہ":

پھر اگر (تیسری) طلاق اسے دی تو وہ عورت حلال نہیں اس مرد کے لئے اس (تیسری طلاق) کے بعد یہاں تک کہ وہ عورت رہے کسی دوسرے خاوند کے پاس۔

دو طلاقوں کا پہلے ذکر ہے، اور تیسری طلاق کا ذکر اس آیۃ کریمہ میں ہے، اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ "تیسری" طلاق کیا ہے تاکہ مسئلہ واضح ہو جائے، راقم نے بھی وہی ترجمہ نقل کیا ہے بریکٹ میں "تیسری" ذکر کر دیا ہے۔

تیسری طلاق کے بعد وہ عورت پہلے خاوند کے لئے حلال نہیں رہتی، جب تک کسی اور خاوند سے نکاح نہ کرے، پھر وہ وطی بھی کرے۔

اعتراض: آیت کریمہ میں صرف نکاح کا ذکر ہے وطی کی قید کیوں لگائی گئی؟

جواب: اس آیۃ کریمہ کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ وطی کی قید حدیث مشہور سے لگائی گئی ہے، جس کا ذکر ان شاءاللہ قریب ہی آ رہا ہے اور دوسرا جواب یہ ہے کہ نکاح کبھی بمعنی عقد کے آتا ہے اور کبھی بمعنی وطی کے آتا ہے۔ آیۃ کریمہ سے ہی وطی کرنا ثابت ہے۔

راقم کا موقف یہ ہے کہ وطی کرنا تو خود اس آیۃ کریمہ سے ثابت ہے، البتہ حدیث مشہور سے اسے تائید حاصل ہے۔ "انا حملنا النکاح علی الوطی وحملنا قولہ زوجا علی العقد" (الماخوذ من الکبیر)

رب تعالٰی کے ارشادگرامی میں " حتی تنکح " سے ہم وطی ثابت کرتے ہیں اور " زوجا " سے مراد عقد نکاح۔

اب مطلب یہ ہوگا کہ یہاں تک کہ وہ عورت وطی کرائے دوسرے شخص سے جس سے اس کا نکاح ہوا ہے۔

اعلٰی حضرت رحمہ اللہ نے ان دونوں قولوں کا جامع ترجمہ کیا ہے " جب تک دوسرے خاوند کے پاس نہ رہے " راقم نے بھی یہی نقل کیا ہے۔

حدیث مشہور جس سے وطی کا واضح ثبوت موجود ہے، وہ یہ ہے۔

☆ " عن عائشة قالت جاء ت امرأة رفاعة القرظي الى رسول الله ﷺ فقالت انى كنت عند رفاعة فطلقنى فبت طلاقى فتزوجت بعده عبدالرحمن بن الزبير وما معه الامثل هدبة الثوب فقال اتريدين ان ترجعي الى رفاعة قالت نعم قال لاحتى تذوقى عسيلته ويذوق عسيلتك " (بخاری ومسلم، مشکوۃ باب المطلقة ثلاثا)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رفاعہ قرظی کی عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور عرض کرنے لگی، بیشک میں رفاعہ کے پاس تھی، اس نے مجھے تین طلاقیں دے دیں، پھر میں نے عبدالرحمٰن بن زبیر (بفتح الزاء کالامیر) سے نکاح کرلیا، لیکن اس کے پاس سوائے کپڑے کے دھاگہ (ہمبل) کے کچھ نہیں، تو آپ نے فرمایا تو رفاعہ کے پاس لوٹنے کا ارادہ رکھتی ہے؟ اس نے کہا ہاں، آپ نے فرمایا تو اس کے پاس لوٹ نہیں سکتی، یہاں تک کہ تو اس کی مٹھاس چکھ لے او وہ تمہاری مٹھاس چکھ لے۔

حدیث پاک سے واضح ہوا کہ دوسرے خاوند کا جماع ضروری ہے، پھر وہ پہلے خاوند کے لئے حلال ہوتی ہے۔ اس لئے کہ عبدالرحمٰن بن زبیر نامرد تھے، ان کے آلہ میں انتشار نہیں تھا (کپڑے کے دھاگہ کا یہی مطلب ہے) تو نبی کریم ﷺ نے بغیر جماع کرنے کے پہلے خاوند سے نکاح کرنے سے منع فرمادیا۔

البتہ " عسيلة " تصغیر ہے جس سے یہ ثابت ہورہا ہے کہ صرف ذکر کا داخل کرنا کافی ہے، انزال (پانی کا نکلنا) ہونا ضروری نہیں، اور قریب البلوغ جس کا آلہ کھڑا ہوتا ہے، اس سے نکاح کرنا اور اس کا جماع کرنا بھی کافی ہے۔

حلالہ کیا ہے؟

دوطلاقوں تک رجوع کا حق تھا،لیکن خاوند نے اگر تین طلاقیں دیں،خواہ ایک وقت میں یا وقفہ وقفہ سے، اب رجوع کا کوئی حق نہیں۔تمام معاملہ اب عورت کے اختیار میں ہے۔تین طلاقوں کے بعد مرد کا اختیار ختم ہوگیا، کیونکہ شریعت میں طلاق دینے کا جو طریقہ ناپسند تھا،وہ اس نے استعمال کیا ہے،اس لئے اب یہ شخص اس سزا کا مستحق ہے کہ اس کا اختیار چھین لیا جائے۔

دوران عدت عورت کو کہیں نکاح کرنے کی اجازت نہیں۔البتہ عدت گزارنے کے بعد وہ مکمل بااختیار ہے، چاہے تو کسی سے بھی نکاح نہ کرے،اسی طرح مجرد زندگی گذاردے اور چاہے تو کسی اور شخص سے نکاح کرلے، عورت نے اگر اپنی مرضی سے کسی دوسرے سے نکاح کرلیا پھر وہ شخص یعنی دوسرا خاوند بعداز جماع فوت ہوگیا یا اس نے طلاق دے دی،عدت گزارنے کے بعد یہ عورت پہلے خاوند سے نکاح کرنا چاہے تو اسے اختیار حاصل ہے،کسی دوسرے شخص سے نکاح اور مجامعت کے بغیر پہلے خاوند سے نکاح کرنا یا اس کا رجوع کرنا شرعاً ناجائز اور حرام ہے۔ اسی کا نام حلالہ ہے۔

حلالہ کے نام کی وجہ:

اللہ تعالیٰ کا ارشادگرامی یہ ہے" فان طلقها فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجا غيره " پھر اگر اس نے تیسری طلاق دے دی تو اب وہ عورت اس کے لئے حلال نہ ہوگی جب تک دوسرے کے پاس نہ رہے۔(کنزالایمان)

"(فان طلقها)مرةثالثةبعدالمرتين(فلا تحل له من بعد)اى من بعدالتطليقةالثالثة(حتى تنكح زوجاغيره)حتى تتزوج غيره والاصابة شرطت بحديث العسيلة" (مدارک)

اگر مرد نے عورت کو دوطلاقوں کے بعد تیسری طلاق دے دی تو تیسری طلاق کے بعد وہ اس کے لئے حلال نہیں یہاں تک کہ وہ دوسرے زوج سے نکاح کرے اور وطی کی شرط حدیث سے ثابت ہے،جس میں زوجیت سے حاصل ہونے والے منافع کا ذائقہ چکھنا لازم قرار دیا گیا ہے۔

"(فان طلقها)الزوج بعد الثنتين(فلا تحل له من بعد)بعدالطلقةالثالثة(حتى تنكح زوجا) تتزوج (غيره) ويطا كمافي الحديث" "رواه الشيخان" (جلالین)

اگر خاوند نے دوطلاقوں کے بعد طلاق دے دی تو وہ اس کے لئے تیسری طلاق کے بعد حلال نہیں یہاں تک کہ وہ عورت کسی دوسرے شخص سے نکاح کرے اور وہ اس سے وطی بھی کرے جیسا کہ بخاری اور مسلم کی حدیث سے ثابت ہے (وہ حدیث رفاعہ قرظی کی زوجہ کی ابھی قریب ہی بیان کی جا چکی ہے)

" ثم يطلقها قبل ان يد خل بها لا تحل حتى يجا معها الآخر" (نسائی)

(جماع سے پہلے) اگر دوسرے زوج نے طلاق دے دی تو وہ پہلے کے لئے حلال نہیں یہاں تک کہ دوسرا اس سے جماع کرے۔

" اذا طلق الرجل امرأته ثلاثا لا تحل له حتى تنكح زوجا غيره ويذوق كل منهما عسيلة صاحبه" (قرطبی، ج ۱، ص ۹۵۶)

جب مرد نے اپنی عورت کو تین طلاقیں دے دیں تو وہ عورت اس کے لئے حلال نہیں رہی، یہاں تک کہ وہ اور شخص سے نکاح کرے اور ہر ایک میں سے ایک دوسرے کا مزہ بھی چکھ لیں۔

قرآن پاک میں لفظ " فلا تحل له " استعمال ہوا ہے۔ اور حدیث شریف میں بھی "لا تحل حتى يجامعها الآخر" لفظ استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دوسرا خاوند پہلے کے لئے عورت کو حلال کر دیتا ہے، اسی وجہ سے اس کا نام حلالہ رکھ لیا گیا۔

حلالہ کا یہ حکم اجماع امت سے ثابت ہے:

علامہ بدرالدین محمد عینی رحمہ اللہ شارح بخاری فرماتے ہیں۔

" اجمعت الامة على ان الدخول شرط الحل للاول ولم يخالف في ذلك انا سعيد بن المسيب والخوارج والشيعة وداؤد الظاهري والبشر المراسي وذلك اختلاف لا خلاف لعدم اسناد هم الى دليل ولو قضى به القاضي لا ينفذ "

اس مسئلہ پر اجماع امت ہے کہ تین طلاقوں کے بعد پہلے خاوند کے لئے عورت اس وقت حلال ہو گی جب اس کا نکاح دوسرے سے ہو اور وہ بھی جماع کرے اس میں شیعہ اور خارجیوں وغیرہ کا جو اختلاف ہے کہ وہ صرف نکاح شرط قرار دیتے ہیں، اس کا اختلاف بلا دلیل ہے اگر ان کے مذھب کے مطابق کسی قاضی نے فیصلہ کردیا تو وہ نافذ نہیں ہوگا۔

سبحان اللہ علامہ عینی رحمہ اللہ نے عرصہ دراز پہلے ہی کیا خوب فرمادیا کہ اگر رافضیوں اور خارجیوں کے کسی قاضی نے کوئی فیصلہ کیا تو وہ اجماع امت کے خلاف ہونے کی وجہ سے مردود ہوگا۔

دوسرے نکاح اور مجامعت میں حکمت:

''والحکمة من هذا التشریع الردع عن المسارعة الی الطلاق والعود الی المطلقة ثلاثا والرغبة فیها'' (تفسیر ابی السعود)

دوسرے شخص سے نکاح اور مجامعت کو شریعت نے لازم قرار دیا ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ لوگوں کو جلد بازی سے تین طلاقیں استعمال کرنے سے اور پھر مطلقہ کی طرف لوٹنے اور اس کی طرف رغبت کرنے سے روکنا مقصود ہے۔

کیونکہ طبعی طور پر انسان اس کی طرف کم ہی راغب ہوتا ہے کہ کسی اور سے جب عورت شادی کرلے تو پھر بھی یہ اس کا خواشمند رہے، شرعی حدود و قیود حکمت سے کبھی خالی نہیں ہوتیں، کیونکہ مالک الملک حکیم ہے اور یہ نہیں ہوسکتا کہ حکیم ذات کے احکام میں کسی قسم کی حکمت نہ پائی جائے، اس حکم سے تین طلاقوں کے وقوع کی کافی حد تک روک تھام ہوئی۔

بغیر شرط کے حلالہ جائز ہے:

''ویروی عدم الکراهة فیما لم یکن الشرط مصرحا به'' (تفسیر ابی السعود)

جب تک واضح طور پر شرط نہ لگائی جائے تو حلالہ جائز ہے، اس میں کوئی کراہت نہیں۔

یعنی عورت نے دوسرے خاوند سے اپنی مرضی سے شادی کر لی اور وہ فوت ہو جائے یا طلاق دے دے تو یہ پہلے خاوند کی طرف لوٹ سکتی ہے، اس کے لئے حلال ہو گی۔

یہ اصل میں حلالہ ہے جس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں کہ جب تک دوسرے شخص سے نکاح نہ کرے پہلے کے لئے حلال نہیں، البتہ دوسرے کا جماع کرنا ضروری ہے، اس میں رافضیوں اور خارجیوں نے ایک دوسرے کے بھائی بن کر اختلاف کیا ہے، لیکن ان کا اختلاف حدیث نبوی اور اجماع امت کے مخالف ہے، اس لئے اس اختلاف کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ ایسے فیصلے مردود ہی ہوں گے۔

شرط کے ساتھ حلالہ مکرہ ہے:

دوسرے شخص سے نکاح کرتے وقت اگر یہ شرط لگائی گئی کہ میں تم سے نکاح تو کر رہی ہوں لیکن اس شرط پر کہ تم نے مجھے مجامعت کے بعد طلاق دینی ہے تاکہ میں پہلے خاوند سے دوبارہ نکاح کرلوں اور اس کے لئے حلال ہو جاؤں، یہ شرط لگانی مکروہ ہے۔ اگرچہ اس نکاح اور مجامعت کے بعد بھی عورت پہلے خاوند کے لئے حلال ہو جائے گی۔

"والنکاح بشرط التحلیل مکروہ عندنا وفاسد عند الاکثرین لقولہ لعن اللہ المحلل والمحلل لہ" (تفسیر ابی السعود)

حلالہ کی شرط لگا کر دوسرے شخص سے نکاح کرنا ہمارے نزدیک مکروہ ہے اور کئی حضرات کے نزدیک یہ شرط لگانے سے نکاح ہوتا ہی نہیں، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ کی لعنت ہو حلالہ کرنے والے پر اور جس کے لئے حلالہ کیا گیا ہے۔

اصل اختلاف کی وجہ حدیث کی تشریح وتوضیح میں اختلاف ہے:

امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک بشرط تحلیل نکاح تو مکروہ ہے لیکن زوج ثانی کی مجامعت کے بعد پہلے زوج کے لئے عورت حلال ہو جائے گی۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کی حدیث پاک میں "المحلل" ذکر ہے۔

" لما سماه محللادل علی صحة النکاح لان المحلل ھو المثبت للحل فلو کان فاسدالماسماہ محللا" (فتح القدیر)

جب آپ نے اسے محلل کہا ہے تو یہ نکاح کی صحت پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ محلل کہتے ہی اسے ہیں جو حلت ثابت کرنے والا ہو، اگر نکاح فاسد ہوتا تو اسے محلل نہ کہا جاتا۔

امام احمد رحمہ اللہ مشروط نکاح کی حرمت کے قائل ہیں۔ "وظاھرہ التحریم کماھو مذھب احمد" حدیث پاک میں لعنت کا ذکر ہے اس لئے ظاہر طور پر اس سے حرمت سمجھ آتی ہے جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ بھی اس نکاح کو صحیح نہیں مانتے۔

" فانه یصح العقدو تحلل للاول عند عامة العلماء وقال مالک رحمه الله لا یصح" (کفایة)

تحلیل کی شرط کے باوجود عام علماء کے نزدیک نکاح صحیح ہے اور پہلے کے لئے حلت ثابت ہو جائے گی اور امام مالک رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ نکاح صحیح نہیں۔

حضرت امام احمد وامام مالک رحمہما اللہ کی دلیل کا انحصار صرف اس پر ہے کہ حدیث پاک میں لعنت کا ذکر ہے اور لعنت رب کی رحمت سے دوری کا نام ہے، اس لئے نکاح صحیح نہیں بلکہ حرام ہے۔

امام اعظم رحمہ اللہ کی طرف سے جواب:

علامہ ابن ہمام صاحب فتح القدیر امام اعظم رحمہ اللہ کی طرف سے جواب دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

"اماالاعتراض فمنشوہ عدم معرفة اصطلاح اصحابناو ذلک انھم لا یطلقون اسم الحرام الاعلی منع ثبت بقطعی فاذاثبت بظنی سموہ مکروھا وھو مع ذلک سبب للعتاب" (فتح القدیر)

اعتراض کا دارومدار معترضین کی ہمارے اصحاب کی اصطلاح سے بے خبری ہے، کیونکہ ہمارے اصحاب اس وقت تک حرام ثابت نہیں کرتے جب تک قطعی دلیل سے ممانعت ثابت نہ ہو۔ جب ظنی دلیل سے ثابت ہو تو اسے ہمارے اصحاب مکروہ کہتے ہیں، یعنی حرام نہیں کہتے، البتہ اس کو عذاب کا سبب قرار دیتے ہیں۔

لعنت دلیل ظنی کیوں؟

"اللعن فی الاصل الطرد وشرعا فی حق الکفار الابعاد من رحمة الله تعالیٰ وفی حق المؤمنین الاسقاط عن درجة الابرار" (شامی)

لعنت کا اصل لغوی معنی ہانکنا، دھتکارنا۔ اور لعنت جب کافروں کے لئے ذکر کی جائے تو شرعا اس کا معنی ہوگا اللہ کی رحمت سے دور کرنا۔ اور جب مومنوں کے لئے لعنت کا اطلاق ہو تو مطلب ہوگا نیک لوگوں کے درجہ سے کم کرنا۔

"ان المراد باللعن فی مثل ذلک الطرد عن منازل الابرار لا عن رحمة العزیز الغفار"

یعنی اس قسم کے مقاموں میں جب بھی لعنت کا ذکر کیا جائے تو اس سے مراد نیک لوگوں کے مراتب سے دور رکھنا ہوتا ہے۔ کلی طور پر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور رکھنا مراد نہیں ہوتا۔

اس معنی کے لحاظ سے لعنت سے حرمت ثابت نہیں ہو سکتی، اس قسم کے کئی مقاموں پر لعنت کا ذکر ہے لیکن ان میں حرمت مراد نہیں۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا قول:

"وعن ابی یوسف انه یفسد النکاح لانه فی معنی الموقت فیه ولا یحلها علی الاول لفساده" (هدایة)

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک تحلیل کی شرط سے نکاح فاسد ہوگا، اس لئے اس نکاح سے پہلے کے لئے حلت ثابت نہیں ہوگی۔

امام اعظم رحمہ اللہ کی طرف سے جواب دیا جائے گا کہ موقت نکاح وہ ہوتا ہے جس میں وقت مقرر ہوتا ہے۔ کہ میں تمہارے ساتھ اتنے مقرر دنوں کے لئے نکاح کر رہا ہوں، یا عورت کی طرف سے یہی الفاظ ادا ہوں کہ میں تمہارے ساتھ اتنے مقرر وقت کے لئے نکاح کر رہی ہوں۔

لیکن شرط تحلیل میں صرف یہ طے ہوتا ہے کہ تم نے مجھے طلاق دینی ہے۔ اس میں وقت مقرر نہیں کیا جاتا، کیونکہ اس کی مرضی پر منحصر ہے، چاہے تو وہ مجامعت پہلی رات کرے یا ئی دن گزار کر۔

امام محمد رحمہ اللہ کا قول:

" وعن محمد انی یصح النکاح ولا یحلها علی الاول لانه استعجل ما اخره الشرع فیجازی بمنع مقصود کما فی قتل المورث" (ازهدایة)

امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شرط تحلیل سے نکاح تو صحیح ہے لیکن اس نکاح سے وہ عورت پہلے خاوند کے لئے حلال نہیں ہوگی، کیونکہ اس نے جلد بازی سے کام لیا، جس کو شریعت نے موخر کیا تھا، لہٰذا اس مقصد کو حاصل نہیں ہونے دیا جائے گا، جس طرح کوئی شخص اسے قتل کردے جس کا اس نے وارث ہونا تھا، اس قتل کی وجہ سے اسے وراثت سے محروم کردیا جائے گا۔

امام اعظم رحمہ اللہ کی طرف سے جواب دیا جائے گا، اگر مذکر صیغوں سے مراد پہلا خاوند لیا جائے تو یہ قول درست ہی نہیں، کیونکہ اسے کوئی اختیار ہی نہیں کہ وہ شرط لگائے، اس لئے اس کی طرف سے شرط لگانا اور تعجیل کرنا اور مقصود سے محروم ہونے کا کوئی مقصد ہی نہیں اور اگر شخص کی تاویل سے مراد عورت لی جائے تو کسی حد تک ظاہری معنی درست ہوگا، لیکن شریعت نے صرف یہ قید لگائی ہے کہ پہلے خاوند کے لئے عورت اس وقت تک حلال ہوگی جب دوسرے خاوند سے نکاح کرے اور وہ مجامعت بھی کرے، اس میں دوسرے کا طلاق دیر سے دینا یا جلدی دینا مذکور نہیں۔ مورث کے قاتل کو وراثت سے اس لئے محروم کیا جاتا ہے کہ اس نے اس کی طبعی موت کا انتظار نہیں کیا، بلکہ وراثت جلدی حاصل کرنے کے لئے اسے قتل کردیا ہے، اس لئے زجراً اسے محروم کیا جائے گا، یہاں یہ صورت نہیں۔

شرط تحلیل بالاتفاق گناہ ہے:

"فان قلت مامعنی لعنهماقلت معنی اللعن علی المحلل لانه نکح علی قصد الفراق والنکاح شرط للدوام وصار کالتیس المستعار"

حضرت علامہ ملاعلی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں اگر تم کہو کہ محلل اور محلل لہ پر لعنت کا کیا مطلب ہے؟ میں اس کے جواب میں یہ کہوں گا کہ محلل (حلال کرنے والے دوسرے خاوند) پر لعنت اس لئے کی گئی ہے کہ یہ نکاح فراق کی غرض سے ہوا ہے، حالانکہ نکاح کرتے وقت ارادہ یہ ہونا چاہئے کہ یہ نکاح ہمیشہ کے لئے ہوگا، یعنی تاحیات برقرار رکھیں گے، یہ شخص ایسا ہی ہوگیا جس طرح بکریوں کے لئے بکرا مانگ کر لایا جائے۔

"واللعن علی المحلل له لانه صار سببالمثل هذاالنکاح"

محلل لہ (جس کے لئے وہ حلال کر رہا ہے یعنی پہلا خاوند) پر لعنت اس لئے کی گئی ہے کہ وہ اس قسم کے (یعنی فراق والے) نکاح کا سبب بن رہا ہے۔ کیونکہ عورت اس کی طرف لوٹنے کی خواہش کی وجہ سے ہی دوسرے سے نکاح اسی شرط پر کر رہی ہے کہ تم نے مجھے بعد از مجامعت طلاق دینی ہے۔

" والمراد اظهار خسا ستهما لان الطبع السلیم ینفرعن فعلهما لاحقیقة اللعن لانه ما بعث لعانا "

دراصل مراد یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان پر لعنت فرما کر ان کی خساست، رذالت کی ظاہر فرمایا، کیونکہ طبع سلیم ان دونوں کے فعل سے متنفر ہوتی ہے، یہاں حقیقی لعنت (یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور کرنا) مراد نہیں، کیونکہ نبی کریم ﷺ کو لعنت بھیجنے والا بنا کر معبوث نہیں فرمایا گیا۔ (مرقاۃ)

نوٹ: مودودی صاحب نے شرط تحلیل پر نکاح نہ ہونے کا جو قول کیا وہ سراسر باطل ہے۔

اعتراض: جب شرط تحلیل بالاتفاق گناہ ہے تو نکاح کیسے صحیح ہوگا اور پہلے کے لئے عورت کیسے حلال ہوگی؟

جواب: کئی ناجائز، گناہ والے کاموں پر احکام مرتب ہوتے ہیں، جیسے جمعہ کی اذان کے بعد خرید وفروخت ناجائز اور باعث گناہ ہے، لیکن اگر کسی نے بیع کرلی تو اس پر احکام بیع وشراء مرتب ہو جائیں گے، خریدار اس چیز پر قبضہ کرنے کا مالک ہو جائے گا اور اس پر لازم ہوگا کہ وہ ثمن (اس دونوں کے درمیان طے ہونے والی رقم) ادا کرے۔ اسی طرح غصب کی ہوئی زمین پر نماز ادا کرنا ناجائز ہے، لیکن اگر نماز ادا کرلی تو فریضہ ادا ہو جائے گا، اسی طرح یہاں بھی شرط لگانا کہ تم نے طلاق دینی ہے اگرچہ ناجائز ہے لیکن نکاح صحیح ہو جائے گا اور پہلے کے لئے نکاح ومجامعت سے عورت حلال ہو جائے گی۔

امام اعظم رحمہ اللہ کی دلیل کا کوئی جواب ہی نہیں:

ضابطہ یہ ہے کے جب کسی لفظ کا حقیقی معنی مراد لیا جاسکے تو مجازی معنی مراد نہیں لیا جائے گا، جب محلل کہتے ہی اسے ہیں جو حلت ثابت کرے اور اگر نکاح ہی صحیح نہیں اور حلت ہی ثابت نہیں تو وہ محلل کیسے ہوا؟

امام اعظم رحمہ اللہ سے مقابلہ بھی کیسے؟ جبکہ سوائے امام مالک رحمہ اللہ کے باقی تمام ائمہ کرام آپ کے بلاواسطہ یا بالواسطہ شاگرد ہیں، خواہ وہ ائمہ احناف ہوں، جیسے امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ یا وہ مستقل فقہ رکھنے والے ہوں جیسے امام شافعی وامام محمد رحمہما اللہ۔

مقام تفکر:

سیاسی عورتیں یا بعض وہ عورتیں جو آزادی کے نام سے دین اسلام سے بغاوت کرتی ہیں ان کا یہ کہنا ہے کہ عورت کے لئے کیا مصیبت ہے کہ وہ طلاق کا غم بھی برداشت کرے اور پھر حلالہ کی مصیبت سے بھی گزرے۔

کاش کہ ان عورتوں کو یہ سمجھ آجائے کہ ایک یا دو طلاقوں کے بعد عدت گذرنے پر عورت خود مختار ہے، وہ بالکل نکاح نہ کرے ساری عمر اسی طرح گذار دے یہ اس کی مرضی کی بات ہے۔ کسی اور شخص سے نکاح کرے یا اس کا اختیار ہے اور چاہے تو پہلے خاوند سے ہی نکاح کرے یہ اس کا اپنا معاملہ ہے، اسے روکنے کا بھی کسی کو حق نہیں اور اس پر

کوئی جبر بھی نہیں کہ تو پہلے خاوند سے ہی نکاح کر، قرآن پاک، حدیث پاک اور کسی فقہ میں عورت پر جبر کرنے کا کوئی حکم نہیں، اگر پہلے خاوند سے ہی نکاح کر رہی ہے تو اپنی مرضی اور اختیار سے، جب اس کی اجازت کے بغیر نکاح صحیح ہی نہیں تو وہ کیوں اجازت دے رہی ہے، اسے چاہئے نہ اجازت دے، نہ نکاح ہو۔

اگر اسے تین طلاقیں دے دی گئیں تو طلاقوں کے ساتھ ہی مرد کا رجوع کرنے کا حق ختم ہو چکا ہے، عدت گذرنے کے بعد عورت خود مختار ہے، ساری عمر نکاح نہ کرے تو کسی کو حق حاصل نہیں کہ اس کا جبراً نکاح کر سکے، اور کسی دوسرے خاوند سے نکاح کرے یہ بھی اس کی مرضی پر منحصر ہے، اب دوسرا خاوند فوت ہو جائے یا اس نے طلاق دے دی، اب عدت گذرنے کے بعد عورت پھر خود مختار ہے، چاہے تو کسی سے بھی نکاح نہ کرے اور چاہے تو کسی تیسرے شخص سے نکاح کرے اور چاہے تو پہلے خاوند سے نکاح کرے، پہلے سے نکاح کرنے پر کسی نے اس پر جبر نہیں کیا۔

اس طرح تین طلاقوں کے بعد عدت گذر جانے پر اگر دوسرے خاوند سے وہ نکاح اس شرط پر کر رہی ہے کہ تو نے مجھے طلاقیں دینی ہیں اور اس کی طلاقوں اور عدت گذر جانے پر پہلے خاوند کے پاس آ رہی ہے تو یہ سب کام وہ اپنے اختیار سے کر رہی ہے، شریعت اسلامیہ نے اسے مجبور نہیں کیا۔

حلالہ کرنے والی عورت اور اس کے پہلے خاوند سے تو پوچھئے:

انسانی طبیعت حلالہ کی شرط سے متنفر ہے، البتہ کسی دوسرے خاوند سے نکاح ہو جائے اور وہ فوت ہو جائے یا طلاق دے دے، اور پھر اسی طرح پہلے خاوند سے دوبارہ نکاح ہو جائے، اسے طبائع قبول کرتی ہیں۔

حلالہ کی شرط سے دوسرے خاوند سے نکاح کرنے میں عورت کو بھی نفرت ہے اور پہلے خاوند کو بھی نفرت ہے، تو پھر حلالہ کو قبول کرنے میں پتہ نہیں ان کی کیا مجبوری ہے، بچوں کی خاطر اس کڑوی دوا کو پینے پر مجبور ہوئے ہیں تو ان کی مجبوری کو بھی دیکھئے اور یہ سمجھئے کہ اس میں شریعت نے عورت کو مجبور نہیں کیا اور کسی مرد نے بھی مجبور نہیں کیا اور کسی مولوی نے بھی فتویٰ نہیں دیا کہ اس پر لازم ہے کہ وہ ضرور ہی حلالہ کرے، عورت اپنی مرضی اور اختیار اور اجازت سے سب کچھ کر رہی ہے۔ غیر اسلامی عورتیں اگر کچھ کہنا چاہتی ہیں تو عورت کو ہی کہیں، شریعت کا مزاح نہ اڑائیں۔

گناہ سے بچنے کا شاندار حیلہ:

جب عورت پہلے خاوند کی طرف لوٹنے کی خواہش بھی رکھتی ہو، اس کی کوئی مجبوری ہو اور یہ بھی خطرہ ہو کہ دوسرا خاوند ہو سکتا ہے طلاق نہ دے، تو اب عورت کے لئے یہ صورت نکالی گئی۔

"ولو خافت ان لا یطلقها تقول زوجتک نفسی علی ان امری بیدی" (زیلعی)

اگر عورت کو یہ خوف ہو کہ یہ دوسرا شخص مجھے طلاق نہیں دے گا تو وہ نکاح اس شرط پر کرے کہ میں تمہارے ساتھ نکاح اس شرط پر کرتی ہوں کے تم میرا معاملہ میرے ہاتھ کر دو۔ یعنی طلاقوں کا حق مجھے دے دو۔

مرد نے جب طلاقوں کا حق عورت کو دے دیا تو اب عورت کی مرضی ہے چاہے، تو اسی نئے خاوند کے پاس رہے، طلاقوں کا حق استعمال نہ کرے اور چاہے تو اپنا حق استعمال کر کے آزاد ہو جائے، اس شرط پر کوئی گناہ نہیں اور نہ ہی کوئی اختلاف ہے۔

"فان طلقها فلا جناح علیهما ان یتراجعا ان ظنا ان یقیما حدود الله"

پھر اگر وہ (دوسرا) طلاق دے دے اسے تو نہیں گناہ ان دونوں پر کہ وہ آپس میں رجوع کر لیں، اگر وہ دونوں گمان کریں کہ اللہ کی حدیں قائم کر سکیں گے۔

اگر دوسرے خاوند نے طلاق دے دی (بعد از مجامعت) تو پہلا زوج اور زوجہ دونوں ہی ایک دوسرے کی طرف رجوع کا ارادہ کریں تو ان دونوں پر رجوع کرنے میں یعنی دوبارہ نکاح کرنے میں کوئی گناہ نہیں، البتہ جب ان دونوں کو یہ گمان ہو کہ ہم اللہ تعالیٰ کی حدوں کو قائم کر سکیں گے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی حدوں سے مراد حقوق زوجیت ہیں یعنی جب یہ گمان رکھتے ہوں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے وہ احکام جو زوجیت سے متعلق ہیں ان کو بجالائیں گے۔ تو وہ دونوں نکاح کر لیں، لیکن جب نکاح سے پہلے ہی دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت پائی جائے تو وہ ایک دوسرے سے دور ہی رہیں تا کہ دوبارہ ایک دوسرے سے جدا ہونے کی نوبت نہ آئے۔

دینی طلباء کرام کے ذوق کے لئے:

" ظن " کبھی یقین کے معنی میں ہوتا ہے اور کبھی گمان کے معنی میں ہوتا ہے۔ لیکن اس مقام میں " ظن " کو "یقین" کے معنی میں لینا جائز نہیں۔ لفظاً بھی اس معنی میں نہیں لے سکتے اور معنوی طور پر بھی درست نہیں۔

لفظی ممانعت یہ ہے کہ "ان مصدریه" توقع کے لئے آتا ہے، اس لئے یہ صحیح نہیں کہ "ظن" بمعنی "یقین" کے لے کر اس کے ساتھ "ان مصدریه" کو بھی ذکر کیا جائے، یہاں تو اس کے بعد "ان یقیما" میں "ان مصدریه" استعمال ہے۔

معنوی ممانعت یہ ہے کہ کوئی شخص مستقبل کے متعلق یقین نہیں کر سکتا، اسی وجہ سے آیۃ کریمہ میں "ان ظنا" کا معنی ہوگا "اگر وہ دونوں گمان کریں" لیکن یہ معنی نہیں ہوگا "اگر وہ دونوں یقین کریں"

اعتراض: مستقبل کے بعض امور کے متعلق یقین حاصل ہوتا ہے تو اتنی قدر کافی ہے کہ "ظن" کو "یقین" کے معنی میں لے لیا جائے، اور سیبویہ جو کہ علم نحو کا امام ہے اس نے بھی یہی کہا ہے، اور مثال سے واضح کیا " ماعلمت الا ان یقوم زید " مجھے یقین حاصل نہیں سوائے زید کے قائم ہونے کے۔

اس مسئلہ میں اختلاف ابو علی فارسی کا ہے جو سیبویہ کا ہم مرتبہ نہیں۔

جواب: جو یہ کہا جاتا ہے " ان المصدریه للتوقع وهو ینافی العلم " (ان مصدریہ توقع کے لئے آتا ہے وہ یقین کے منافی ہے) اس کا مطلب یہ ہے کہ جب مستقبل کے متعلق کسی طرح بھی علم حاصل نہ ہو وہاں "ان مصدریه" کا استعمال درست نہیں۔ اور اگر کچھ قرائن سے مستقبل کے متعلق یقین ہو تو ان مصدریہ کا وہاں استعمال درست ہے۔ اور اگر مستقبل کے متعلق یقین نہ ہو تو وہاں "ظن" کا معنی گمان ہی کیا جائے، خصوصاً جب اس کے ساتھ "ان مصدریه" بھی استعمال ہو۔

آیۃ کریمہ میں یہی آخر صورت پائی گئی ہے، کیونکہ زوج اور زوجہ کو ایک دوسرے کی طرف رجوع کرنے کے لئے ضروری نہیں کہ وہ یقین کریں کہ اللہ تعالیٰ کی حدیں قائم کر سکیں گے، بلکہ ان کا گمان کرنا کافی ہے۔

(ماخوذ از روح المعانی)

"وتلک حدود اللّٰہ یبینھا لقوم یعلمون": اور یہ اللہ کی حدیں ہیں وہ بیان کرتا ان کو اس قوم کے لئے جو علم رکھتے ہیں۔

یعنی یہ احکام جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں، ان سے تجاوز درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے احکام اس قوم کے لئے بیان کرتا ہے جو علم رکھتے ہیں، یعنی علم کا تقاضا ہے عمل، چونکہ رب تعالیٰ کے بیان کئے ہوئے احکام پر عمل کرنے والے اصحاب علم ہی ہیں، لہٰذا رب تعالیٰ کے بیان سے وہی فائدہ حاصل کرتے ہیں۔

(از مظہری)

"لقوم یعلمون" ای المعاریض ویفھمون الاشارات"

رب تعالیٰ اس قوم کے لئے بیان کرتا ہے جو اشارات کو سمجھتے ہیں، اور تعریض کو جانتے ہیں۔

(تاویلات نجمیہ میں یوں ہی ذکر ہے)

"قال احمد بن خضرویہ الطریق واضح والدلیل لائح والداعی قد اسمع فما التحیر بعد ھذا الامن العمی"

احمد بن خضرویہ رحمہ اللہ نے فرمایا راستہ واضح ہے اور دلیل روشن ہے اور دعوت دینے والے نے سنا دیا ہے، یعنی بات کو مخفی نہیں رکھا، بلکہ واضح کر دیا، اس کے بعد سوائے اندھے کے کوئی بھٹک نہیں سکتا۔

حافظ شیرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

وصف رخسارۂ خورشید ز خفاش مپرس

کہ دریں آئنہ صاحب نظراں حیرانند

سورج کے رخسار کا وصف چمگادڑ سے نہ پوچھ، کہ اس آئینہ میں اصحاب نظر بھی حیران ہیں۔ (از روح البیان)

☆☆☆☆☆☆

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ☆ (سورۃ البقرہ آیت ۲۳۱)

﴿۱﴾

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور ان کی میعاد آ لگے تو اس وقت تک یا بھلائی کے ساتھ روک لو یا نکوئی کے ساتھ چھوڑ دو اور انہیں ضرر دینے کے لیئے روکنا نہ ہو کہ حد سے بڑھو۔ اور جو ایسا کرے وہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے، اور اللہ کی آیتوں کو ٹھٹھا نہ بنا لو اور یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہے اور وہ جو تم پر کتاب اور حکمت اتاری تمہیں نصیحت دینے کو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ سب کچھ جانتا ہے۔

﴿۲﴾

اور جب تم طلاق دو عورتوں کو تو وہ پہنچ جائیں اپنی عدت کے ختم ہونے کے قریب تو روک لو ان کو اچھے طریقہ سے، یا آزاد کر دو ان کو اچھا طریقہ سے، اور نہ رکو ان کو ضرر پہنچانے کے لئے کہ تم تجاوز کرو، اور جو شخص کرے گا یہ، تحقیق ظلم کیا اس نے اپنی ذات پر، اور نہ بناؤ اللہ کی آیات کو ٹھٹھا، اور یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہے، اور (یاد کرو) جو نازل کی اس نے تم پر کتاب و حکمت، وہ نصیحت کرتا ہے تمہیں اس کی، اور ڈرو اللہ سے اور جان رکھو بیشک اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

مختصر مطلب:

جب تم اپنی عورتوں کو رجعی طلاق دے دو تو ان کو بھلائی کے طریقہ سے اپنے پاس روک لو، یعنی اگر تم یہ خیال رکھتے ہو کہ تم حقوق شرع کا پاس کر سکو گے تو رجوع کرلو، اور تم سمجھتے ہو کہ حقوق شرع کا لحاظ نہیں کر سکو گے تو رجوع نہ کرو تا کہ وہ عدت گزار کر آزاد ہو جائیں۔ لیکن ان کی عدت بڑھانے اور ضرر پہنچانے کے لئے رجوع نہ کرو، جو شخص عورت کو نقصان پہنچانے اور تجاوز کرنے کی غرض سے رجوع کرے گا وہ اپنی جان پر ظلم کرے گا، کیونکہ اس کا وبال اسی پر آتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی آیات سے ٹھٹھا نہ کرو، ان کو کھیل نہ بناؤ، اور اللہ تعالیٰ کی جو تم پر نعمتیں ہیں انہیں یاد کرو، اور اللہ تعالیٰ نے جو تم پر کتاب وحکمت کو نازل کیا (اتارا) اسے یاد کرو کہ وہ اس کے ذریعے تمہیں نصیحت کرتا ہے۔ اور اللہ سے ڈرو، اور جان رکھو یعنی علم پر ہمیشہ قائم رہو، بھولو نہیں بیشک اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

شان نزول:

" واخرج ابن جرير وابن المنذر عن السدى قال نزلت هذه الآية فى رجل من الانصار يدعى ثابت بن يسار طلق امرأته حتى اذاانقضت عدتها الايومين اوثلاثة راجعها ثم طلقهافعل ذلك بها حتى مضت لهاتسعةاشهريضارها فانزل الله ولا تمسكوهن ضرارا لتعتدوا"

یہ آیۃ انصار میں سے ایک شخص ثابت بن یسار کے متعلق نازل ہوئی کہ جب انہوں نے اپنی زوجہ کو طلاق دے دی یہاں تک کے عدت کے ختم ہونے سے دو تین دن باقی رہ گئے تو رجوع کرلیا، پھر طلاق دے دی پھر یہی کیا یعنی جب عدت ختم ہونے کے قریب ہوئی تو رجوع کرلیا اور پھر طلاق دے دی اس طرح اس عورت نے نو ماہ میں اپنی عدت ختم کی جو اس کے لئے ضرر کا سبب بنی تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا" ولا تمسكوهن ضرارا لتعتدوا" اوران کو نہ روکو ضرر پہنچانے کے لئے کہ تم حد سے تجاوز کر جاؤ۔ (درمنثور)

بلکہ یہی عام رواج تھا جیسا کہ دوسری روایات میں مطلقاً ذکر ہے۔

" ان الرجل کان یطلق المرأة ثم یراجعها ولا حاجة له بها ولا یرید امساکها الا کیما یطول علیها بذلک العدة لیضارها فانزل الله"

بے شک مرد اپنی عورت کو طلاق دیتا تھا پھر رجوع کر لیتا تھا اسے عورت سے کوئی حاجت نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی وہ اسے بھلائی کے طریقہ سے روکنے کی کوشش کرتا مقصد اس کا صرف عورت کی عدت کو لمبا کرنا ہوتا جس سے عورت کو ضرر پہنچایا جاتا تو رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا۔

(در منثور)

اعتراض: اس مسئلہ کو پہلے 'الطلاق مرتان فامساک بمعروف او تسریح باحسان'' (طلاق دو تک ہیں پھر روکنا ہے بھلائی کے طریقہ سے یا آزاد کرنا ہے احسان سے) میں بیان کر دیا گیا ہے تو پھر اس آیۃ کریمہ میں بیان کرنے کا کیا مقصد ہے؟ یہ تو تکرار ہے۔

جواب: یہ تکرار نہیں بلکہ علیحدہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے جو شان نزول سے ہی واضح ہے، کیونکہ پہلی آیۃ میں بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں طلاق کی کوئی حد نہیں تھی، طلاق دے کر رجوع کر لیا پھر طلاق دے دی وہ عورت عمر بھر ظلم کی چکی میں پستی رہتی تھی یعنی نہ تو وہ آزاد ہوتی اور نہ ہی اسے زوجیت حاصل ہوتی۔ تو رب تعالیٰ نے طلاق کی حد مقرر کر کے اس ظلم کو ختم کر دیا اور اس آیت کریمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ تین طلاقیں مکمل ہونے تک رجوع کرتے رہتے اور اپنی عورت کو عدت کو لمبا کرنے کے لئے رجوع نہ کرو ورنہ رب تعالیٰ کی گرفت میں آ ؤ گے جس سے حقیقت میں نقصان تمہیں ہی ہونا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

"واذا طلقتم النساء": اور جب طلاق دو تم عورتوں کو۔

جب پہلی آیۃ میں رجوع کرنے کی حد بیان کر دی گئی کہ رجوع دو طلاقوں تک ہو سکتا ہے، اور تین طلاقوں کے بعد رجوع کا حق ہو جاتا ہے تو اس آیۃ کریمہ میں بھی مراد رجعی طلاق ہے کیونکہ بعد میں اچھی طرح رجوع کرنے کا حق دیا گیا ہے۔

"فبلغن اجلھن": تو وہ پہنچ جائیں عدت ختم ہونے کے قریب۔

یہاں یہ معنی درست نہیں کہ وہ عدت پوری کرلیں بلکہ معنی یہ ہے۔

" معنی بلغن قاربن باجماع من العلماء ولان المعنی یضطر الی ذلک لانہ بعد بلوغ الاجل لاخیار لہ فی الامساک " (قرطبی)

" کہ عدت ختم ہونے کے قریب ہو" یہ معنی اجماع امت سے ثابت ہے۔ یہ مجازی معنی لینا مجبوری ہے حقیقی معنی " عدت پوری ہوجانا " نہیں لیا جاسکتا کیونکہ عدت کے ختم ہونے کے بعد مرد کورو کنے یعنی رجوع کرنے کا اختیار ختم ہوجاتا ہے۔

" فبلغن اجلھن" کے دو معنی ہیں، ایک حقیقی یعنی عدت کا ختم ہوجانا اور دوسرا مجازی معنی عدت ختم ہونے کے قریب ہو۔ یہاں مجازی معنی مراد ہے جو بیان کیا جاچکا ہے۔

اسی لئے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے " اور ان کی معیاد آ لگے " لیکن راقم نے " فبلغن " کا لغوی معنی بھی ذکر کیا ہے اور ساتھ ساتھ وضاحت بھی کی ہے " تو وہ پہنچ جائیں عدت ختم ہونے کے قریب "

راقم کا ترجمہ روح البیان کی تفسیر کے مطابق ہے۔

" (فبلغن اجلھن) ای آخر عدتھن وشارفن منتھاھا"

وہ عدت کے آخر تک پہنچ جائیں ایسے حال میں کہ عدت کی انتہاء کے قریب ہوں۔ (روح البیان)

تنبیہ:

"وھو فی الآیۃ التی بعدھا بمعنی التناھی ،لان المعنی یقتضی ذلک، فھو حقیقۃ فی الثانیۃ مجاز فی الاولی" (قرطبی)

آنے والی آیۃ کریمہ میں بھی یہی الفاظ " فبلغن اجلھن " آرہے ہیں جن کا معنی یہ ہے کہ وہ پہنچ جائیں عدت کے ختم ہونے کو " کیونکہ وہاں یہی معنی لیا جاسکتا ہے جس کا ذکر ان شاء اللہ قریب ہی

آرہا ہے۔لہٰذا یہ آیۃ جس کی وضاحت جاری ہے اس میں مجازی معنی لیا گیا ہے اور آنے والی آیت میں حقیقی معنی لیا گیا ہے۔

قرآن پاک میں اور مثالیں:

" واذ اطلقتم النساء فطلقو ھن لعد تھن" ومعناه اذا اردتم الطلاق وقاربتم ان تطلقوا فطلقوا للعدة"

بظاہر معنیٰ" واذ اطلقتم النساء "کا یہ ہے"اور جب تم طلاق دو عورتوں کو" لیکن مندرجہ بالا آیۃ میں مراد یہ ہے اور جب تم طلاق دینے کا ارادہ کرو اور طلاق دینے کے قریب ہو تو طلاق دو عدت کے لئے۔

اور ذکر ہے"فاذاقرأت القرآن فاستعذ باللہ"معناه اذا اردت قرأته" بظاہر معنیٰ"فاذاقرأت القران" کا یہ معنی ہے"جب تم قرآن پاک پڑھ لو" لیکن مندرجہ بالا آیۃ میں معنی یہ ہے جب تم قرآن پڑھنے کا ارادہ کرو تو اللہ کی پناہ پکڑو (شیطان مردود سے)۔ (احکام القرآن للجصاص)

"فامسکوھن بمعروف" تو روک لو ان کو اچھے طریقہ سے۔

یعنی عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کرلو،ان الفاظ مبارکہ کی یہی تفسیر حضرت ابن عباس اور حسن اور مجاہد اور قتادہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے۔ (احکام القران للجصاص)

ان کی طرف رجوع کرو لیکن ان کو نقصان پہنچانے کا ارادہ نہ ہو۔

"والمعروف ما الفته العقول واستحسنه النفوس شرعاوعرفاوعادةوالمرادبه هنا حسن المعاشرة"

معروف سے مراد یہ ہے کہ جس سے عقلیں محبت کریں اور لوگ ان کو اچھا سمجھیں ،یعنی شرعا اور عرفا اور عادۃً وہ کام مستحسن ہوں، یہاں مراد ان کا اچھی طرح رہنا ہے۔ (روح البیان)

''اوسرحوهن بمعروف'': یا آزاد کردو ان کو اچھے طریقے سے۔

یعنی رجوع نہ کرو، ان کی عدت گزرنے دو یا ان کو طلاق دے کر آزاد کردو، تا کہ ان کی عدت لمبی نہ ہو جائے۔

''ولا تمسکوھن ضرارالتعتدوا'': اور نہ روکو ان کو ضرر پہنچانے کے لئے کہ تم تجاوز کرو۔

سوال: جب ''فامسکو ھن بمعروف'' (ان کو روک لو اچھے طریقہ سے) ذکر ہو گیا تو ''ولا تمسکو ھن ضرار'' ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے، کیونکہ امر اپنی ضد میں نہی کا تقاضا کرتا ہے۔

جواب: امر میں تکرار نہیں پایا جاتا، بلکہ ایک مرتبہ کو شامل ہے، لیکن نہی کل اوقات کو شامل ہے، اس لئے صرف ''فامسکو ھن بمعروف'' سے یہ سمجھ آ رہا تھا کہ ''ان کو اچھی طرح روک لو'' ہو سکتا ہے کہ وہ ایک مرتبہ تو بھلائی سے روک لیتا لیکن مستقبل میں ضرر پہنچانے کا ارادہ رکھتا ''ولا تمسکو ھن ضرارا'' کہہ کر ہمیشہ کے لئے ضرر پہنچانے سے منع کر دیا۔ (از کبیر)

''ضرار'' کا مطلب ہے ''دشمنی پیدا کرنا، محبت کو زائل کرنا، اور وحشت واقع کرنا، اور ہر قسم کے نفرت کے اسباب پیدا کرنا۔

ضرر پہنچانے کا کیا مطلب:

مختصر الفاظ سے ہر قسم کے ضرر پہنچانے سے منع کر دیا گیا۔

۱ ایک وجہ تو وہی ہے جس کا شان نزول میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ وہ طلاق دے دیتے اور عدت ختم ہونے کے قریب رجوع کر لیتے اس طرح تین طلاقوں تک بار بار رجوع کر کے عدت کو لمبا کرنے کا سبب بنتے جس سے عورت کو ضرر ہوتا اس سے منع کیا گیا۔

۲ معاشرت میں ہر طرح سے نقصان پہنچانے سے منع کیا گیا، کیونکہ بد اخلاقی، بدکلامی، گالی گلوچ، مار کٹائی، ترشروئی وغیرہ سے عورت کو ضرر پہنچتا ہے اس سے منع کیا گیا۔

﴿۳﴾ عورت کوخرچ صحیح نہ دے کرضرر پہنچانے سے منع کیا گیا کہ ان کا خرچ اپنی طاقت کے مطابق ادا کرو، اس میں کمی نہ کرو، ہاں البتہ غریب خاوند سے امیرانہ خرچ کا مطالبہ کرنا منع ہے۔

" واعلم انهم كانوايفعلون فی الجاهلية اكثر هذه الأعمال رجاء ان تختلع المرأة منه بما لها"

زمانہ جاہلیت میں عورتوں کو ہر طرح تنگ کیا جاتا تھا، ان کوضرر پہنچایا جاتا تھا اس امید سے کہ عورت تنگ ہوکر مال دے کرخلع کرلے گی، تورب تعالیٰ نے ان کومنع کیا کہ عورتوں کونقصان نہ پہنچاؤ۔

(از کبیر)

آزادیٔ نسواں (عورتوں کی آزادی) کے دعویدار اپنے گریبان میں جھانک کردیکھیں کہ عورت کے حقوق کا اسلام نے لحاظ کیا ہے یا یہود وانصار نے۔ مغربیت نے عورتوں کو بے حیا تو بنایا ہے لیکن ان کی شایان شان ان کے حقوق کا کوئی لحاظ نہیں کیا۔

"لتعتدوا": (کہ تم تجاوز کرو)

اس میں دواحتمال ہیں۔ایک احتمال یہ ہے" لا تضاروهن فتكونوا معتدين" کہ ان کوضرر نہ پہنچاؤ کہ تم ضرر پہنچانے کی وجہ سے حد سے تجاوز کرجاؤ۔

اس صورت میں" لام" عاقبت کے لئے ہوگا۔یعنی ان کوضرر نہ پہنچاؤ جس کا انجام حد سے تجاوز ہو۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشادگرامی میں ہے۔" فالتقطه آل فرعون ليكون لهم عدوا وحزنا" آل فرعون نے اس کو(حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صندوق) اٹھالیا، جس کا انجام یہ ہوا کہ وہ ان کے دشمن اوران کے غم کا ذریعہ بن گئے۔

دوسرااحتمال یہ ہے۔

"لا تضاروهن على قصد الاعتداء عليهن فحينئذ تصيرون عصاة الله وتكونون متعمدين قاصدين لتلك المعصية ولا شك ان هذااعظم انواع المعاصی "

کہ ان پر تجاوز کرنے کے ارادہ سے ان کو ضرر نہ پہنچاؤ، تم اس سے اللہ تعالیٰ کے نافرمان ہو جاؤ گے، جان بوجھ کر اپنے ارادہ سے اس گناہ کے مرتکب ہو گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ (از کبیر)

"ومن یفعل ذلک فقد ظلم نفسه":

اور جو شخص یہ کرے گا تو تحقیق اس نے ظلم کیا اپنی جان پر۔

یعنی جو شخص اپنی زوجہ کو ضرر پہنچائے گا وہ درحقیقت اپنے آپ پر ہی ظلم کریگا۔

" یعنی عرض نفسه للعذاب لان اتیان ما نهی الله عنه تعرض لعذاب الله " (قرطبی)

یعنی جو شخص عورت کو ضرر پہنچاتا ہے وہ اپنے آپ کو عذاب کے لئے پیش کر رہا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جن کاموں سے روکا ہے ان پر عمل کرنا اپنے آپ کو عذاب کے لئے پیش کر رہا ہے۔

سوال: مقام قریب کا ہے لیکن اشارہ (ذلک) بعید کا کیوں لایا گیا؟

جواب: (ومن یفعل ذلک) المذکور ومافیه من البعد للایذ ان یبعد منزلته فی الشر والفساد"

اگرچہ مراد تو قریب ہی ہے یعنی جس عورت کو ضرر پہنچایا جس کا ذکر ساتھ ہی ہے، لیکن اشارہ بعید کا لاکر یہ بتایا گیا کہ اس کے اوپر عظیم شر اور فساد مرتب ہوگا جو بعید مرتبہ والا ہے۔ (روح المعانی)

" فقد ظلم نفسه" تحقیق اس نے اپنے نفس پر ظلم کیا، یعنی اپنے آپ کو عذاب میں پیش کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا، یا اس نے اپنے دینی اور دنیاوی منافع کو ضائع کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا، کیونکہ اپنی ازواج سے اچھا سلوک رکھنا باعث ثواب ہے، جو دینی نفع ہے عورت کو ضرر پہنچا کر اس نے اسے ضائع کر دیا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص عورتوں سے اچھا سلوک رکھے تو اس کی عورت کے فوت ہو جانے پر یا پہلی زوجہ کے موجود ہوتے ہوئے دوسری شادی کی خواہش پر عورتیں اس کی طرف رغبت کریں گی، اور اگر اس نے عورتوں کو ضرر پہنچایا تو عورتیں اس کی طرف توجہ نہیں کریں گی، اس کے قبیح فعل میں مشہور ہونے کی وجہ سے عورتیں اس کا نام سن کر ہی دور بھاگیں، یہ اس کا دنیاوی نفع میں نقصان ہے۔ (از کبیر و روح المعانی)

"ولا تتخذوا آیات اللّٰہ هزوا": اور نہ بناؤ اللہ کی آیات کو ٹھٹھا (مزاح)

یعنی جب اللہ تعالیٰ نے حلال وحرام اور اوامر ونواہی کو وحی کے ذریعہ بیان فرمادیا ہے، تو تم اللہ تعالیٰ کی بیان کی ہوئی آیات کو کھیل کود، ٹھٹھا و مزاح نہ بناؤ۔ جب تم پر لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو، اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو تو پھر اگر تم نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اطاعت سے اعراض کیا تو تم نے اللہ کی آیات کا مزاح اڑایا۔

تنبیہ شدید:

" فکل من خالف امرا من امور الشرع فهو متخذ آیات اللہ هزوا"

ہر وہ شخص جس نے اللہ تعالیٰ کے احکام میں سے کسی ایک حکم کی مخالفت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی آیات کا مزاح اڑایا۔ اور یہ بھی یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا مزاح اڑانا شدید نقصان کا سبب ہے۔

ایک اور وجہ یہ بیان کی گئی ہے:

" وقیل کان الرجل یطلق ویعتق ویتزوج ویقول کنت لاعبافنهوا عن ذلک "

اس وقت رواج یہ تھا کہ کوئی شخص اپنی عورت کو طلاق دے دیتا تو کہتا کہ میں نے تو یہ مزاح کے طور پر طلاق دی تھی، میرا طلاق دینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اسی طرح کبھی کوئی شخص اپنے غلام کو آزاد کر کے کہتا میں نے تو مزاح کے طور پر آزاد کیا تھا، میرا آزاد کرنے کا حقیقت میں کوئی ارادہ نہیں تھا، اسی طرح کبھی مرد اور عورت نکاح کر لیتے پھر کبھی ایک کہتا کبھی دوسری طرف سے کہا جاتا یہ نکاح مزاح سے کیا گیا تھا کوئی حقیقی نکاح تو نہیں تھا، تو رب تعالیٰ نے اس سے ان کو منع فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو مزاح نہ بناؤ۔

☆ "عن ابی هریرة ان رسول الله ﷺ قال ثلاث جد هن جد وهزلهن جد النكاح والطلاق والرجعة" (اخرج ابوداؤد والترمذی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تین چیزوں میں حقیقت بھی حقیقت ہے اوران میں مزاح بھی حقیقت ہے، وہ یہ ہیں نکاح اور طلاق اور رجوع کرنا۔

(از خازن)

ایک اور روایت میں عتاق (غلام آزاد کرنے) کا بھی ذکر ہے، کہ مزاح سے آزاد کیا ہوا غلام آزاد ہو جائے گا۔

"واذکروا نعمت الله علیکم وما انزل علیکم من الکتاب والحکمة یعظکم به":

اور یاد کرو اللہ کی نعمتوں کو جو تم پر ہیں، اور (یاد کرو) جو نازل کیا تم پر یعنی کتاب وحکمت نصیحت کرتا ہے تمہیں اس کے ذریعے۔

"نعمت اللہ" سے مراد کیا:

"(واذکروا نعمت الله علیکم) بالاسلام" (جلالین)

اللہ تعالیٰ نے جو تمہیں اسلام کی نعمت عطاء فرمائی ہے اسے یاد کرو۔

"ومن جملتها الهداية وانزال آيات القرآن على محمد ﷺ بالشكر والقيام بحقوقها"

یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو اس نے تمہیں ہدایت عطاء فرمائی اور یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو اس نے حضرت محمد ﷺ پر قرآن کی آیات کو نازل کیا، یاد کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس کی نعمت کا شکر یہ ادا کرو، اور اس کے حقوق کو قائم کرو۔ (مظہری)

"(واذکروا نعمت الله علیکم) ای فی ارساله الرسل بالهدی والبینات الیکم" (صابونی)

اور یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہے یعنی اس نے اپنے رسول ﷺ کو ہدایت اور واضح دلائل عطاء کر کے تمہاری طرف بھیجا ہے۔

"(واذ کروا نعمت اللہ علیکم)یعنی بالایمان الذی انعم به الله علیکم فهد اکم له وسائر نعمه التی انعم بها علیکم" (خازن)

اور یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہے یعنی اس نے تمہیں ایمان عطاء کر کے تم پر انعام کیا ہے اور تمہیں اس کی ہدایت دی ہے اور تمام نعمتیں جو اس نے تم پر انعام کی ہیں انہیں یاد کرو۔

مقام توجہ: خازن کے پہلے حصہ کو دیکھیں تو اس کے مطابق اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ نظر آئے گا "اور یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہے"۔

اور آخری حصہ کے مطابق راقم کا ترجمہ ہے "اور یاد کرو اللہ کی نعمتوں کو جو تم پر ہیں"

"وما انزل علیکم من الکتاب والحکمة یعظکم به":

اور (یاد کرو) جو نازل کیا تم پر یعنی کتاب وحکمت نصیحت کرتا ہے تمہیں اس سے۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

واؤ عطف کے لئے ہے، اس جملہ کا عطف "نعمت اللہ" پر ہے، جملہ محل نصب میں ہے، اور "اذکروا" ساتھ ملے گا "ما" موصولہ ہے "من" بیانیہ ہے، جس کا معنی ہوتا ہے، یعنی "به" میں ضمیر "ما انزل" کی طرف لوٹ رہی ہے۔ (تفسیر ابی السعود)

طلباء کرام بیان کردہ ترکیبی ضوابط کو مدنظر رکھتے ہوئے ان شاء اللہ راقم کا ترجمہ بالکل مطابق پائیں گے۔

" الکتاب" سے مراد "قرآن پاک" اور " الحکمة " سے مراد "حدیث پاک" ہے۔

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ " الکتاب" اور " الحکمة" دونوں سے مراد قرآن پاک ہو، اور ان میں دونوں وصفوں کے تغائر کی وجہ سے ہے۔

پہلے مبہم ذکر کیا "وما انزل علیکم" اور جو نازل کیا تم پر، پھر اس کا بیان لایا گیا " من الکتاب

والحکمة " یعنی کتاب وحکمت، اس انداز سے بیان کرنے کو عربی گرائمر میں " تفخیم " کہتے ہیں، یعنی اس میں زیادتی وضاحت اور بلندی شان پائی جاتی ہے۔ (تفسیر ابی السعود)

" واتقوا اللّٰه ": اور اللہ سے ڈرو۔

یعنی اللہ تعالیٰ کا خوف رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے احکام کی حفاظت کرو اور حقوق واجبہ کو ادا کرو۔

" واعلموا ان اللّٰه بکل شئ علیم ":

اور جان رکھو بیشک اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا یہ ترجمہ ہے اور یہی ترجمہ راقم نے بھی نقل کیا، کیونکہ خطاب مسلمانوں کو ہے جو پہلے ہی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے، اس لئے " واعلموا " کا ترجمہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے کیا 'اور جان رکھو' یعنی اپنے علم پر قائم رہو۔

بعض حضرات نے جو یہ ترجمہ کیا ہے ' اور خوب جان لو ' یہ ترجمہ بھی خوب ہے۔

کیونکہ مطلب یہ ہے کہ اگر چہ تم جانتے تو پہلے ہی ہو، لیکن اب خوب جان لو بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

اس میں وعید بھی پائی گئی ہے:

" فلا یخفی علیه شیء مما تا تو ن وما تذرون فیؤاخذکم بأفانین العقاب "

اور جان رکھو کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے جو کام تم کرتے ہو اور جو چھوڑتے ہو وہ اس پر پوشیدہ نہیں وہ تمہیں مختلف عذاب دے کر تمہاری گرفت کرے گا، یعنی اگر تم نے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف کوئی کام کیا اور اس کے حکم کو چھوڑا تو وہ تمہیں عذاب دے گا۔ (تفسیر ابی السعود)

طلاق کا حق مردوں کو دیا گیا:

تمام آیات میں جن میں طلاق دینے کا ذکر ہے ان میں مردوں کو ہی خطاب ہے کہ ''جب تم عورتوں کو طلاق دو،، یہ کہیں ذکر نہیں کہ جب عورتیں مردوں کو طلاق دیں تو اسی سے واضح ہو گیا کہ طلاق دینا مردوں کا حق ہے۔ اگر چہ مرد طلاقوں کا حق عورت کو تفویض کر دے تو عورت کو مرد کی عطاء سے طلاق کا حق تو مل گیا لیکن غور کیا جائے تو قانون قدرت کے خلاف ہے۔

رب تعالیٰ نے طلاق کا حق مردوں کو دیا کیونکہ مرد صبر سے کام لیتا ہے، قوت برداشت مرد میں زیادہ ہے عورت انتقامی کاروائی کرنے میں جلد باز ہے، اس لئے مرد کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ سوچ سمجھ کر مجبوری کی حالت میں اسے استعمال کرے گا۔ لیکن اگر عورت کو یہ حق دیا جاتا تو وہ بہت جلدی استعمال کرتی، آئے دن طلاقیں واقع ہوتی رہتیں۔

ترقی یافتہ ممالک یا انسانیت سے دور، عریانت وفحاشی کے دلدادہ، خدا کے دشمنوں کے ممالک میں جہاں عورت کو طلاق کے حقوق دئے گئے ہیں، خدارا ان سے پوچھ کر تو دیکھئے وہ اس سے کتنے مطمئن ہیں؟

آج عورت کا ایک سے معاشقہ اور کل دوسرے سے اور پرسوں تیسرے سے، اسی وجہ سے طلاقیں واقع ہو رہی ہیں۔ انسان کو انسان سے محبت کم اور نفرت زیادہ ہو چکی ہے، کتوں اور بلیوں سے وہ اپنی محبت پوری کر رہیں ہیں۔ جس قانون سے غیر مسلم بیزار ہیں اسے مسلمان حاصل کرنے کے لئے بے تاب کیوں ہیں؟

اخبارات میں کم از کم ان واقعات میں تناسب تو دیکھئے، یقیناً ایک اور سو کی نسبت نظر آئے گی، وہ کیا واقعات ہیں؟ وہ یہ ہیں کہ فلاں عورت نے اپنے عاشق سے مل کر اپنے خاوند کو قتل کر دیا، ان وقعات کی تعداد کو دیکھئے اور پھر یہ دیکھئے کہ کتنے ایسے واقعات آپ کی نظر سے گزرتے ہیں کہ فلاں مرد نے اپنی زوجہ کو اپنی محبوبہ کی مدد سے قتل کر دیا۔

ان واقعات کو دیکھ کر یہ کہنا پڑھتا ہے کہ رب تعالیٰ اپنے بندوں پر اتنا شفیق ہے جتنی ماں اپنے بیٹے پر شفیق نہیں۔ اس کا ہر حکم حکمت پر مبنی ہے، اس کے ہر حکم میں بندوں پر مہربانیاں ہی مہربانیاں پائی گئی ہیں۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ
اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ
كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ
وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ☆ (سورہ بقرہ آیت: ۲۳۲)

﴿۱﴾

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور اُن کی میعاد پوری ہو جائے تو اے عورتوں کے والیو! انہیں نہ روکو اس سے کہ اپنے شوہروں سے نکاح کر لیں' جبکہ آپس میں موافق شرع رضامند ہو جاویں۔ یہ نصیحت اسے دی جاتی ہے جو تم میں سے اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہو۔ یہ تمہارے لیئے زیادہ ستھرا اور پاکیزہ ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

﴿۲﴾

اور جب طلاق دو تم عورتوں کو تو وہ پہنچ جائیں اپنی معیاد (پوری ہونے) کو تو تم نہ رکو ان کو کہ وہ نکاح کریں اپنے (پہلے) شوہروں سے، جبکہ رضامند ہو جائیں آپس میں بھلائی کے طریقے سے، یہ نصیحت کی جاتی ہے اسے جو شخص تم سے ایمان رکھتا ہو اللہ پر اور آخرت کے دن پر، تمہارے لئے بہتر اور پاکیزہ ہے۔

شانِ نزول:

یہ آیۃ کریمہ جملاء بنت یسار، معقل بن یسار کے حق مین نازل ہوئی۔

بخاری، ابوداؤد، ترمذی وغیرہ نے اس واقعہ کو ذکر کیا۔

" وعن معقل بن یسار قال زوجت اختالی من رجل فطلقها حتی اذا انقضت عد تها جاء یخطبها فقلت له زوجتک وفرشتک واکرمتک فطلقها ثم جئت تخطبها لا واللہ ولا تعود الیک ابدا وکان الرجل لاباس به وکانت المرأة تریدان ترجع الیه فانزل اللہ تعالیٰ (فلا تعضلوھن ان ینکحن ازواجھن) فقلت الآن افعل یا رسول اللہ قال فزجھا ایاہ"

معقل بن یسار کہتے ہیں میں نے اپنی بہن کا نکاح ایک شخص (بداح بن عاصم) سے کیا، پھر اس شخص نے اسے طلاق دے دی یہاں تک کہ عدت ختم ہوگئی (اس کے رجوع نہ کرنے کی وجہ سے وہ بائنہ ہوگئی) وہ شخص پھر اس (میری بہن) سے نکاح پر آمادہ ہونے کی حالت میں آیا تو میں نے اسے کہا میں نے تمہارا نکاح کیا، تمہیں فراش عطاء کیا اور تمہاری عزت کی لیکن تم نے اسے طلاق دے دی، اب پھر اس سے نکاح کرنے کا خطبہ کر رہے ہو، یعنی نکاح پر آمادگی کا اظہار کر رہے ہو، قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اب وہ تمہاری طرف نہیں لوٹے گی۔ وہ مرد نکاح میں کوئی حرج محسوس نہیں کر رہا تھا (یعنی خوشی سے نکاح پر آمادہ تھا) اور وہ عورت (یعنی میری بہن) بھی چاہتی تھی کہ وہ اس سے پھر نکاح کر لے، تو اس وقت یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی (ان کو نہ روکو کہ وہ اپنے خاوندوں سے نکاح کریں) تو میں نے کہا یا رسول اللہ اب میں اس پر عمل کرتا ہوں۔ تو اس طرح معقل بن یسار نے اپنی بہن جملاء کا نکاح اس کے شوہر بداح بن عاصم سے کر دیا۔

☆ ابن جریر نے متعدد اسناد سے روایت کی، پھر سدی سے اس روایت کی تخریج کی۔

" قال نزلت فی جابر بن عبداللہ الانصاری کانت له ابنت عم فطلقها زوجها فانقضت عدتها ثم رجع یرید نکاحها فابی جابر "

کہ یہ آیۃ کریمہ جابر بن عبداللہ الانصاری کے حق میں نازل ہوئی، کیونکہ ان کے چچا کی بیٹی کو اس کے خاوند نے طلاق دے دی، پھر عدت ختم ہونے پر نئے نکاح کی غرض سے اس نے ان کی

طرف رجوع کیا، تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اس شخص سے اپنی چچازاد بہن کا نکاح کرنے سے انکار کر دیا۔

اگر چہ پہلی روایت زیادہ مشہور ہے اور سند کے لحاظ سے زیادہ قوی ہے، لیکن ان میں کوئی تعارض نہیں۔

"ولعلها نزلت في القصتين معا" کیونکہ ہوسکتا ہے یہ دونوں واقعات کے بعد نازل ہوئی ہو۔

اب خطاب عام ہے کہ عورتوں کے والیو! اگر عورتیں اپنے پہلے خاوندوں سے نکاح کرنا چاہیں اور وہ دونوں رضامند ہوں اور حقوق شرع کو بجالانے پر آمادہ ہوں تو تم ان عورتوں کو اپنے شوہروں سے نکاح کرنے سے نہ روکو۔

(از مظهری)

الفاظ مبارکہ کی مختصر وضاحت:

"واذا طلقتم النساء" (اور جب تم طلاق دو عورتوں کو) یعنی تم سے اگر کوئی شخص اپنی عورت کو طلاق دے دے۔ "فبلغن اجلهن" انقضت عدتهن" (تو ان کی عدت ختم ہو جائے)

راقم نے لغوی اور مرادی معنی کو ترجمہ میں یکجا جمع کیا ہے (تو وہ پہنچ جائیں اپنی معیاد پوری ہونے کو)

"فلا تعضلوهن" (تو ان کو نہ روکو) "فلا تعضلو هن" کا معنی "فلا تمنعوهن" تو ان کو نہ روکو

"خطاب للاولیاء ای تمنعوهن من (ان ینکحن ازواجهن) المطلقین لهن" یہ خطاب عورتوں کے ولیوں کو ہے کہ تم ان عورتوں کو اپنے ان خاوندوں سے نکاح کرنے سے منع نہ کرو جنہوں نے ان کو طلاق دی۔

شان نزول سے بھی یہی واضح ہے۔ "(اذا تراضوا) ای الازواج والنساء (بینهم بالمعروف) شرعا" جب شوہر اور بیبیاں آپس میں شرع کا پاس کرتے ہوئے رضامند جائیں۔

خیال رہے کہ "تراضوا" باب تفاعل سے جمع مذکر کا صیغہ ہے، لیکن اس میں مذکر کی شرافت کی وجہ سے قاعدہ تغلیب استعمال کیا ہے۔

"(ذلک) النهی عن العضل (یوعظ به من کان یؤمن بالله والیوم الآخر) لانه المنتفع به

یہ ولیوں کو روکنے سے منع کرنے سے نصیحت کی جاتی ہے ان کو جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، اس لئے کہ اس نصیحت سے فائدہ ایمان والوں نے ہی حاصل کرنا ہے۔

"(ذلکم)ای ترک العضل(ازکی)خیر الکم واطھرلکم ولھم لما یخشی علی الزوجین من الریبۃبسبب العلاقۃ بینھما"

جس چیز سے تمہیں منع کیا گیا ہے، اس سے رکنا تمہارے لئے بہتر اور پاکیزہ ہے، یہ بہتری اور پاکیزگی تمہارے لئے بھی ہے اور ان کے لئے بھی جو زوجین پر خوف رکھتے ہیں کہ ان کا آپس میں اچھا سلوک رکھنا مشکوک ہے۔

"(واللہ یعلم) مافیہ المصلحۃ(وانتم لا تعلمون)ذلک فاتبعوا امرہ"

اور اللہ جانتا ہے جو اس میں مصلحت ہے، اور تم اسے نہیں جانتے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے حکم کی تابعداری کرو۔

بالغہ لڑکی خودمختار ہے:

اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں ذکر ہوا" حتی تنکح زوجا غیرہ" (یہاں تک کہ وہ نکاح کرے اور زوج سے) اور اس آیۃ کریمہ میں ذکر ہوا"ان ینکحن ازواجھن" (یہ کہ وہ نکاح کریں اپنے شوہروں سے)"لان الاصل فی الاسنادحقیقۃ ان تباشر المراۃ" ان دونوں آیتوں میں نکاح کرنے کی نسبت حقیقت میں عورت کی طرف کی گئی، جس سے واضح ہورہا ہے کہ بالغہ عورت کو اپنا نکاح کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔

آیت کریمہ میں عورت کے ولیوں کو جو یہ کہا گیا ہے" فلا تعضلو ھن"(تم ان کو نہ روکو)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت معاشرہ میں یہ رواج تھا کہ عورت نکاح کرنا چاہتی تو اس کے ولی یعنی باپ اور بھائی وغیرہ رکاوٹ بن جاتے کہ تم یہاں نکاح نہیں کرسکتی، آجکل بھی یہی رواج ہے، رواج کے غلط ہونے کی وجہ سے قانون شریعت نہیں بدلتا۔

☆ ”عن ابی ھریرہ قال رسول اللہ ﷺ لا تنکح الثیب حتی تستأذن و لا تنکح البکر حتی تستأمر قالوا یارسول اللہ کیف اذنھا قال اذنھا ان تسکت“ (نسائی، ج ۲، ص ۶۴)

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ثیبہ (یعنی بالغہ) کا نکاح اس سے اس کے معاملات طلب کرنے کے لئے نہ کیا جائے، اور باکرہ (یعنی بالغہ) کا نکاح اس سے اس کے معاملات طلب کرنے کے بغیر نہ کیا جائے (یعنی اس سے بھی اجازت طلب کی جائے) صحابہ کرام نے عرض کیا اس کی طرف سے اجازت ہے۔

یعنی اس کا خاموش رہنا اور اس طرح اس کا مسکرانا یا رونا بھی اجازت متصور ہوں گے، اگر اسے یہ نکاح منظور نہیں تو اسے صراحۃً انکار کر دینا چاہئے۔

☆ ”عن ابن عباس مرفوعاً الایم احق من ولیھا والبکر تستاذن فی نفسھا اذنھا صماتھا“

(رواہ مسلم و مالک و ابوداؤد و الترمذی و النسائی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں غیر شادی شدہ عورت (ثیبہ بالغہ عورت) اپنے آپ پر اپنے ولی سے زیادہ حق رکھتی ہے، اور باکرہ (جو کہ بالغہ ہو) اس کی ذات کے متعلق اس سے اجازت طلب کر لی جائے، اس کا، خاموش رہنا (بھی) اس کی طرف سے اجازت ہے۔

حدیث پاک سے بہت واضح طور پر ثابت ہوا کہ بالغہ عورت خواہ ثیبہ ہو یا باکرہ ہو اپنے نفس پر خود اختیار رکھتی ہے، اس کے ولی کو اس کی اجازت کے بغیر اس کا نکاح کرنا جائز ہے۔

ثیبہ (بیوہ یا مطلقہ) لیکن جب بالغہ ہو وہ زبان سے اجازت دے اور باکرہ جو بالغہ ہے اس کا بول کر اجازت دینا اور خاموش رہنا اور مسکرانا بلکہ نکاح کی اجازت طلب کرنے پر اس کا رونا بھی اجازت متصور ہوگا۔

باپ اپنی بالغہ لڑکی کا نکاح جبراً نہ کرے:

”عن خنساء بنت خدام ان اباھا زوجھا و ھی ثیب فکرھت ذلک فاتت رسول اللہ ﷺ فرد نکاحہ“ (نسائی، ج ۲، ص ۶۴)

خنساء بنت خذام سے مروی ہے کہ بیشک اس کے باپ اس کا نکاح کر دیا کہ وہ ثیبہ (اور بالغہ) تھی، اس نے نکاح کو ناپسند کیا تو نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئی تو آپ نے اس کے باپ کے کئے ہوئے نکاح کو توڑ دیا۔

یعنی بالغہ عورت سے اجازت کے بغیر نکاح کرنا اور اس کا رد کر دینا کہ مجھے یہ پسند نہیں یا پہلے ہی سے اس نے انکار کر دیا ہو، پھر اس کا نکاح جبراً کر دیا ہو یہ نکاح درحقیقت درست نہیں۔

حضور نبی کریم ﷺ کے نکاح کو توڑنے کا مطلب یہی ہے کہ یہ نکاح ہوا ہی نہیں اور "فرد نکاحه" کا معنی یوں کرلیا جائے "آپ نے اس کے باپ کے کئے ہوئے نکاح کو باطل قرار دیا" تو یہ زیادہ آسان اور واضح ہے۔

☆ "عن عائشة ان فتاة دخلت عليها فقالت ان ابی زوجنی ابن اخيه لير فع بی خسيسته وانا كارهة فقالت اجلسی حتی ياتی النبی ﷺ فجاء رسول الله ﷺ فاخبر ته فارسل الی ابيها فدعاه فجعل الأمر اليها فقالت يارسول الله قد اجزت ماصنع ابی ولكن اردت ان اعلم أللنساء من الأمر شئ" (نسائی، ج ۲، ص ۶۴)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ بیشک ایک جوان لڑکی ان کے پاس حاضر ہوئی اور کہنے لگی کہ میرے باپ نے میرا نکاح اپنے بھائی کے بیٹے سے کر دیا ہے تاکہ وہ میرے ذریعے اس کی خساست (گھٹیاپن) کو دور کرے، حالانکہ میں یہ نکاح ناپسند کرتی ہوں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسے کہا، نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے تک بیٹھ جا، نبی کریم ﷺ تشریف لے آئے۔ اس لڑکی نے آپ کو بتایا تو آپ نے اس کے باپ کی طرف پیغام بھیج کر اسے بلایا۔ (اس کے آنے پر) معاملہ لڑکی کے سپرد کر دیا تو اس نے کہا یارسول اللہ جو میرے باپ نے کیا ہے میں اس کی اجازت دے رہی ہوں، لیکن میں صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ کیا عورتوں کا بھی اس معاملہ میں کوئی حق ہے۔

وضاحت حدیث:

"لیرفع بی خسیستہ" کا مطلب یہ ہے کہ میرے باپ کے بھائی کا بیٹا خسیس یعنی گھٹیا ہے جسے کوئی پسند نہیں کرتا میرا نکاح اس سے کر کے میرے باپ نے اسے عزت دینی چاہی کہ وہ اپنے گھٹیا پن سے نکل جائے۔

"انا کارھۃ" حالانکہ میں اس نکاح کو پسند نہیں کرتی ہوں، لڑکی چونکہ بالغہ تھی اور نکاح اس کی اجازت کے بغیر ہو گیا تھا، اس لئے نبی کریم ﷺ نے اسے اختیار دے دیا تھا کہ اگر تو چاہتی ہے تو نکاح کو برقرار رکھ اور اگر تو چاہتی ہے تو نکاح کو توڑ دے۔

واضح ہوا کہ بالغہ لڑکی کی اجازت کے بغیر کیا ہوا نکاح اس کی اجازت پر موقوف ہو جاتا ہے، وہ چاہے تو برقرار رکھے یا توڑ دے، ہاں البتہ اجازت طلب کرنے اور اس کے خاموش رہنے پر نکاح ہو جائے گا، اب اسے توڑنے کا اختیار نہیں ہوگا۔

عورت اپنے نکاح میں بزرگوں سے مشورہ کرے:

فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کو ان کے خاوند ابو عمرو بن حفص نے طلاق دے دی، جب انہوں نے عدت گزار لی تو نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہو کر عرض کیا۔

"ان معاویۃ بن سفیان و اباجھم خطبانی فقال رسول اللہ ﷺ اما ابو جھم فلا یضع عصاہ عن عاتقہ واما معاویۃ فصعلوک لا مال لہ ولکن انکحی اسامۃ بن زید فکرھتہ ثم قال انکحی اسامۃ بن زید فنکحتہ فجعل اللہ فیہ خیرا واغتبطت بہ"

(نسائی باب اذا استشارت المرأۃ رجلا، ج ۲، ص ۶۱)

کہ بیشک مجھے معاویہ بن سفیان اور بوجہم نے پیغام نکاح دیا ہے (میں کس سے نکاح کروں) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ابوجہم تو اپنا عصا اپنے کندھے سے نہیں اتارتا اور معاویہ غریب انسان ہے اس کے پاس کوئی مال نہیں، تم اسامہ بن زید سے نکاح کرلو (یہ کہتی ہیں) میں نے ان سے

نکاح کرنا پسند نہ کیا۔ آپ نے فرمایا اسامہ بن زید سے نکاح کرلو۔ تو میں نے ان سے نکاح کرلیا، اللہ تعالیٰ نے اس میں اتنی برکت عطاء فرمائی کہ مجھ پر رشک کیا جانے لگا۔

وضاحت حدیث:

جب نکاح کے لئے مختلف اطراف سے پیغام ملیں تو بزرگوں سے مشورہ کرلیا جائے کہ کون سا شخص بہتر ہے، جس سے نکاح کیا جائے مشورہ دینے والا اگر ان میں سے کوئی بہتر پائے تو اس کے متعلق مشورہ دے دے اور تیسرے شخص کے متعلق مشورہ دے دے، کہ میرے خیال میں ان تمام سے فلاں شخص زیادہ بہتر ہے، ان میں کوئی ایک بھی بہتر نہیں۔

جب تک کسی ایک سے بات طے نہ ہو جائے اس وقت تک کئی آدمی رشتہ پوچھ سکتے ہیں، جب کسی سے بات طے ہو جائے تو دوسرے کا پوچھنا ناجائز ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا" لایخطب احدکم علی خطبة بعض"

(نسائی باب النهی ان یخطب الرجل علی خطبة اخیه)

تم میں سے کوئی شخص دوسرے کے پیغام نکاح (طے ہو جانے) کے بعد نکاح کا پیغام نہ دے۔

مشورہ دیتے وقت، فتوی دیتے وقت، فتوی پوچھتے وقت کسی کے عیب بیان کرنا غیبت نہیں، بلکہ " المستشار مؤتمن" جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ امین ہوتا ہے، اسے چاہیے کہ بہتر مشورہ دے، ورنہ امانت میں خیانت کرنے کے مترادف ہوگا۔

بزرگوں کے مشورہ میں برکت ہوتی ہے جیسے نبی کریم ﷺ کے مشورہ پر باوجود اس عورت کے ناپسند کرنے کے اللہ تعالیٰ نے نکاح میں اتنی برکتیں عطاء فرمائی کہ دوسری عورتیں رشک کرنے لگیں۔ کاش کہ ہمارا نکاح اسامہ بن زید سے ہوتا تو کتنا بہتر ہوتا۔

ابوجہم اپنا عصا کندھے سے نہیں اتارتا۔ اس کا ایک معنی یہ بیان کیا گیا ہے وہ سفر میں زیادہ رہتا ہے، جس سے حقوق زوجیت ادا نہیں کر پائے گا۔

اس معنی کے لحاظ سے تبلیغی حضرات کے سال سال اور کئی کئی مہینے کے لئے بستر ے اٹھا کر مختلف ممالک کی سیر کرتے رہنا کہاں درست ہوگا؟

دوسرا معنی یہ ہے کہ وہ اکثر اوقات عورتوں پر ظلم کرتا ہے، مار کٹائی سے کام لیتا ہے، اس لئے وہ اس قابل نہیں کہ اس سے نکاح کیا جائے۔

اس معنی کو ہی زیادہ طور پر شارحین نے پسند کیا ہے، اس معنی سے واضح ہوا کہ خاوند کے ظلم مار کٹائی کو نبی کریم ﷺ نے ناپسند فرمایا ایسے شخص سے نکاح نہ کرنے کا مشورہ دیا۔

معاویہ بن سفیان کے متعلق فرمایا کہ وہ غریب ہے اس کے پاس مال نہیں، اس سے واضح ہوا کہ جب کسی شخص کے پاس اتنا مال بھی نہ ہو جس وہ مہر اور نفقہ ادا کر سکے تو اس کے ساتھ نکاح نہ کرنے کا مشورہ دینا بہتر ہے، لیکن کار، بنگلہ کی تلاش میں اپنی بچیوں کی زندگیاں برباد کر دینا بھی عقل و دانش کا کام نہیں۔

نیک مرد پر عورت کا اپنے آپ کو پیش کرنا سنت ہے:

" عن انس ان امرأة عرضت نفسها علی النبی ﷺ فضحکت ابنة انس فقالت ما کان اقل حیا نها فقال انس ھی خیر منک عرضت نفسها علی النبی ﷺ "

(نسائی باب عرض المرأة نفسها علی من ترضی، ج ۲، ص ۶۲)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بے شک ایک عورت نے اپنے آپ کو نکاح کے لئے خود ہی نبی کریم ﷺ پر پیش کیا تو حضرت انس رضی اللہ عنہ کی بیٹی اس پر ہنسنے لگی کہ یہ عورت کتنی کم حیاء والی ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا یہ تم سے بہتر ہے کہ اس نے اپنے آپ کو نبی کریم ﷺ پر پیش کیا۔

حدیث پاک سے واضح ہوا کہ کسی کو نیک سمجھ کر عورت پسند کرے اور اپنے نکاح کا خود ہی اسے پیغام دے تو یہ سنت صحابیہ ہے اس میں بے حیائی نہیں بلکہ یہ بہتر پسند ہے۔

نکاح کے لئے عوت یا اس کے والدین استخارہ کریں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب حضرت زینب بنت جحش کی عدت ختم ہوگئی تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید کو کہا کہ اسے میری طرف سے پیغام نکاح دے دو، حضرت زید کہتے ہیں میں چلا اور زینب کو جا کر کہا تم خوش ہو جاؤ، مجھے تمہاری طرف رسول اللہ ﷺ نے بھیجا ہے، جو تمہیں یاد کر رہے ہیں یعنی پیغام نکاح دے رہے ہیں۔

"فقالت ماانابصانعة شیأحتی استأمر ربی فقامت الی مسجدھا"

(نسائی، ج۲،ص ۶۲ باب صلوۃ المرأۃ اذاخطبت و استخارتھار بہا)

تو حضرت زینب نے کہا میں اس معاملہ میں خود اس وقت تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی یہاں تک کہ میں اپنے رب تعالیٰ سے فیصلہ طلب کرلوں، پھر وہ اپنے نماز پڑھنے کے مقام پر جا کھڑی ہوئیں۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ نکاح سے پہلے عورت نوافل ادا کر کے استخارہ کرلے، یہ اس کے لئے بہتر ہے۔

استخارہ کیسے کرے؟

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ ہمیں تمام امور میں استخارہ کرنا ایسے سکھاتے تھے جس طرح قرآن پاک کی سورت سکھاتے، آپ فرماتے تھے کہ تم میں سے جب بھی کوئی کسی کام کا ارادہ کرے تو دو رکعت نوافل ادا کر کے پھر یہ دعا پڑھے۔

"اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْتَخِیْرُکَ بِعِلْمِکَ وَاَسْتَعِیْنُکَ بِقُدْرَتِکَ وَاَسْأَلُکَ مِنْ فَضْلِکَ فَاِنَّکَ تَقْدِرُ وَلَااَقْدِرُ وَتَعْلَمُ وَلَااَعْلَمُ وَاَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ اللّٰھُمَّ اِنْ کُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ ھٰذَا الْاَمْرَ خَیْرٌ لِّیْ فِیْ دِیْنِیْ وَمَعَاشِیْ وَعَاقِبَۃِ اَمْرِیْ (اوقال)فِیْ عَاجِلِ اَمْرِیْ وَآجِلِہٖ فَاقْدُرْہُ لِیْ وَیَسِّرْہُ لِیْ ثُمَّ بَارِکْ لِیْ فِیْہِ وَاِنْ کُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ ھٰذَاالْاَمْرَ شَرٌّ لِّیْ فِیْ دِیْنِیْ وَمَعَاشِیْ وَعَاقِبَۃِ اَمْرِیْ (اوقال)فِیْ عَاجِلِ اَمْرِیْ وَآجِلِہٖ فَاصْرِفْہُ عَنِّیْ وَاقْدُرْ لِیَ الْخَیْرَ حَیْثُ کَانَ ثُمَّ اَرْضِنِیْ بِہٖ"

(نسائی، ج۲،ص ۶۲)

پھر آپ نے فرمایا اپنی حاجت اور اپنے کام کو ذہن میں رکھے، یعنی جس کام کے لئے استخارہ کر رہا ہے وہ ذہن میں رکھے، استخارہ کے بعد اگر دل اس کام کی طرف راغب ہو رہا تو وہ کام کرے یہ اس کے لئے بہتر ہے، اور اگر دل اس کام کی طرف رغبت نہیں کر رہا تو وہ کام نہ کرے کیونکہ وہ کام اس کے حق میں بہتر نہیں۔

استخارہ کے نوافل کی نیت عام نوافل کی طرح ہوگی، اسی طرح ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد کوئی بھی سورۃ ملا لے تو درست ہے، تاہم اگر پہلی رکعت میں "**سورۃ الکافرون**" اور دوسری رکعت میں "**سورۃ اخلاص**" پڑھ لے تو زیادہ مناسب ہے۔

تنبیہ: دعاء میں الفاظ "او قال" دونوں جگہ نہیں پڑھنے، اسی لئے راقم نے ان کو بریکٹ میں کر دیا ہے۔ دراصل یہ راوی کو شک تھا کہ آپ نے "**وعاقبة امری**" ذکر فرمایا، یا کہ "**فی عاجل امری و آجله**" ذکر فرمایا۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ صرف "او قال" کے لفظ دونوں جگہ چھوڑ دے باقی تمام دعاء پڑھ لے۔

ولی کے بغیر نکاح نہ ہوسکنے پر احادیث اور ان کے جوابات:

"عن عائشة ان رسول الله ﷺ قال ايما امراة نكحت بغير اذن وليها فنكاحها باطل فنكاحها باطل فنكاحها باطل فان دخل بها فلها المهر بما استحل من فرجها فان اشتجر فالسلطان ولي من لاولي له" (رواه السنن وحسنه الترمذی)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو عورت ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرے تو اس کا نکاح باطل ہے۔ تو اس کا نکاح باطل ہے۔ تو اس کا نکاح باطل ہے، اگر اس سے وطی کرے تو فرج کو حلال سمجھنے کی وجہ سے اس پر مہر لازم ہے، اگر اختلاف ہو جائے تو جس کا ولی نہ ہو تو اس کا ولی بادشاہ ہے۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ عورت خواہ بالغہ ہو یا نابالغہ اس کا نکاح ولی کے بغیر درست نہیں۔

جواب:

"قال الطحاوی حدثنا ابن ابی عمران قال اخبرنا یحیی بن معین عن علیة عن ابن جریج انه قال لقیت الزهری فاخبرته عن هذاالحدیث فانکره" (مظہری)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے راوی ابن جریج ہیں وہ روایت کرتے ہیں سلیمان بن موسیٰ سے وہ روایت کرتے ہیں زہری سے وہ روایت کرتے ہیں عروہ سے وہ روایت کرتے ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے۔

طحاوی نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ جریج کہتے ہیں کہ میں، خود زہری کو ملا اور اس حدیث کے متعلق ان سے پوچھا تو انہوں نے اس کا انکار کیا۔ لہٰذا راوی کے انکار کی وجہ سے حدیث ضعیف ہوگئی، ضعیف حدیث سے کسی چیز کا حرام ہونا ثابت نہیں ہوسکتا۔

☆ "وعن عائشة قالت قال رسول الله ﷺ لا نکاح الابولی وشاهدی عدل" (رواہ الدارقطنی)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ولی اور دو عادل گواہوں کے بغیر نکاح صحیح نہیں۔

جواب:

"وفیه یزید ابن سنان وابوه قال الدار قطنی هو وابوه ضعیفان وقال النسائی هو متروک الحدیث وضعفه احمد وغیره" (مظہری)

اس حدیث کے راویوں میں یزید ابن سنان اور اس کا باپ ہیں، دارقطنی نے کہا ہے کہ یزید بن سنان اور اس کا باپ ضعیف راوی ہیں، نسائی نے متروک الحدیث کہا اور احمد وغیرہ نے اسے ضعیف کہا۔

واضح ہوا کہ یہ حدیث بھی ضعیف ہے جس پر حلت وحرمت کو موقوف نہیں کیا جاسکتا۔

"وعن عائشة قالت قال رسول الله ﷺ لابدللنکاح من اربعة الولی والزوج وشاھدین"

(رواه الدارقطنی)

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا نکاح میں چار شخصوں کا ہونا ضروری ہے (وہ یہ ہیں) ولی اور زوج اور دو گواہ۔

جواب:

"وفیه نافع بن میسر ابو خطیب مجھول"

یہ حدیث بھی ضعیف ہے کیونکہ اس کے راویوں میں نافع بن میسر ابوخطیب پایا گیا ہے جو مجہول ہے۔ (مظہری)

"عن ابی بردة عن ابیه ابی موسی عن النبی ﷺ لا نکاح الا بولی" (رواه احمد)

حضرت ابو ہریرہ اپنے باپ حضرت ابوموسیٰ سے روایت کرتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا ولی کے بغیر نکاح نہیں۔

"وعن ابن عباس مرفوعا لا نکاح الا بولی، والسلطان ولی من لا ولی له"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بغیر ولی کے نکاح نہیں، اور بادشاہ اس کا ولی ہے جس کا کوئی ولی نہیں۔

جواب:

"رواه احمد من طریق الحجاج بن ارطاة وھو ضعیف ومن طریق آخر فیه عدی بن الفضل وعبد الله بن عثمان ضعیفان"

یہ دونوں حدیثیں مسند احمد میں حجاج بن ارطاۃ سے روایت کی گئی ہیں جو ضعیف راوی ہیں۔ اور ایک دوسری سند سے بھی روایت ہیں لیکن اس میں عدی بن فضل اور عبداللہ بن عثمان راوی ہیں جو ضعیف ہیں۔

مظہری نے چند اور روایات بھی ذکر کی ہیں، ہر روایت میں کوئی نہ کوئی راوی ضعیف پایا گیا ہے۔

احناف کا فیصلہ کن جواب:

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا یہی مسلک ہے کہ عورت بالغہ خود مختار ہے اس کا نکاح ولی کی اجازت کے بغیر جائز ہے تو آپ کی طرف سے ان احادیث کے متعلق جن میں ولی کے بغیر نکاح جائز نہ ہونے کا ذکر ہے، فیصلہ کن جواب یہ ہے۔

"قالت الحنفية اذا تعارضت النصوص فيحب سلوك طريق التر جيح او الجمع بضرب من التا ويل"

احناف نے یہ بیان کیا ہے کہ جب نصوص (آیات واحادیث) میں تعارض آ جائے تو وجہ ترجیح تلاش کی جائے یا کسی تاویل کے ذریعے ان میں تطبیق دے کر ان کو جمع کیا جائے۔

"فعلى طريقة التر جيح مارواه مسلم اصح واقوى سندا بخلاف ماروو ه من الاحاديث فانها لم تخل من ضعف او اضطراب"

وجہ ترجیح واضح ہے کیونکہ جو روایت مسلم کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے (جو پہلے ذکر دی گئی) وہ زیادہ صحیح اور زیادہ قوی ہے سند کے لحاظ پر اس میں بالغہ کو نکاح کرنے کا اختیار دے دیا گیا، بخلاف اس کے وہ روایت جن میں ولی کے بغیر نکاح صحیح نہ ہونے کا ذکر ہے وہ تمام ضعیف یا مضطرب ہیں جو صحیح حدیث کے مقابل نہیں ہو سکتیں۔ (مظہری)

خیال رہے کہ حدیث مسلم جس کا ذکر کیا گیا ہے وہ مؤطا امام مالک اور ابوداؤد اور ترمذی اور نسائی میں بھی مذکور ہے۔

"وعلى طريقة الجمع فنقول معنى قوله ﷺ لا نكاح الابولي يعني لانكاح على الوجه المسنون او نقول لا نكاح الا بمن له ولا ية لينفي نكاح الكافر المسلمة والنكاح مع المحر مية والنكاح في عدة زوج قبله وغير ذلك من الا نكحة الفاسدة"

احادیث میں تطبیق اس طرح پائی جاسکتی ہے کہ جن احادیث میں ''لانکاح الابولی'' ان کا یہ مطلب نہیں کہ ولی کے بغیر نکاح صحیح نہیں، بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ ولی کے بغیر نکاح سنت کے خلاف ہے۔

اور دوسرا معنی یہ ہے'' لانکاح الابمن له ولایة'' کہ عورت کا نکاح اس شخص سے جائز نہیں جسے اس عورت سے نکاح کرنے کی ولایت (حق) حاصل نہیں۔ یعنی مسلمان عورت کافر مرد سے نکاح نہیں کرسکتی اور کوئی عورت اپنے محرم (باپ، بیٹا، بھائی، چچا، ماموں، بھتیجا، بھانجا وغیرہ) سے نکاح نہیں کرسکتی۔ اور اگر کوئی عورت پہلے خاوند کی عدت گزار رہی ہے تو وہ دوران عدت نکاح نہیں کرسکتی، اسی طرح کسی قسم کا فاسد نکاح نہیں کرسکتی۔ (مظهری)

ان معانی کے لحاظ پر یہ ثابت ہی نہیں ہوتا کہ بالغہ عورت اگر ولی کی اجازت کے بغیر نہیں ہوسکتا۔

''ویحمل حدیث عائشة علی امرأةنکحت نفسهامن غیر کفو،والمرادبالباطل حقیقة علی قول من لم یصح ماباشرته من غیر کفو وحکما علی قول من یصححه ویثبت للولی حق الخصومة فی فسخه'' (مظهری)

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت جس میں ذکر ہے کہ جو عورت ولی کے بغیر نکاح کرے وہ باطل ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ جو عورت اپنی کفو سے گھٹیا کفو میں نکاح کرے تو اس کا نکاح باطل ہے۔

باطل ہونے میں بھی پھر دو قول ہیں ایک یہ کہ عورت جب غیر کفو میں نکاح کرے تو اس کا نکاح خود بخود فسخ ہو جاتا ہے لیکن اس وقت جب کہ اس کے ولیوں کو اعتراض ہو، وہ نکاح حکام سے فسخ کرانے کی ضرورت نہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ولیوں کو اعتراض ہو تو وہ نکاح حکام سے فسخ کرائیں، اس لحاظ پر باطل ہونے کا معنی مجازی ہوگا۔

یہی تحقیق علامہ شامی رحمہ اللہ کی ہے۔

اگر چہ مظہری کی عبارت کا مطلب یہ ہے کہ باطل سے مراد حقیقی طور پر باطل ہونا ہے، جن کے نزدیک عورت کا غیر کفو میں نکاح کرنا صحیح نہیں ان کے نزدیک باطل کا حقیقی معنی مراد ہے اور بعض کے نزدیک نکاح کرنا تو صحیح ہے لیکن ولیوں کو نکاح فسخ کرانے کا حق ہے ان کے نزدیک مجازی معنی مراد ہے۔

نکاح میں گواہوں کا ہونا ضروری:

جب تک نکاح میں گواہ دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں نہ ہوں س وقت تک نکاح فاسد ہوگا۔

☆ "قال رسول اللہ ﷺ لانکاح الابشھود" (رواہ الدار قطنی مرقاۃ، ج۶، ص۲۱۷، کتاب النکاح)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بغیر گواہوں کے نکاح نہیں۔

☆ "عن ابن عباس البغایا التی ینکحن انفسھن بغیر بینۃ" (رواہ الترمذی(مرقاۃ ج۶، ص۲۱۷ کتاب النکاح)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں وہ عورتیں زانیہ ہیں جو بغیر گواہوں کے نکاح کر لیتی ہیں۔

یہ قول باطل ہے:

یہ کہنا کہ لڑکا اور لڑکی کہہ دیں کہ ہمارا نکاح ہے تو گواہوں کی ضرورت نہیں۔ یہ قول لغو اور باطل ہے۔ اگر یہی قول درست ہو تو ہر فاحشہ عورت اپنے پاس آئے ہوئے مرد کے متعلق یہی کہہ دے گی کہ یہ میرا خاوند ہے۔

نکاح مسجد میں مستحب ہے:

" عن عائشۃ قالت رسول اللہ ﷺ اعلنوا ھذا النکاح واجعلوہ فی المساجد واضربوا علیہ بالدفوف" (رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث غریب، مشکوۃ کتاب النکاح)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس نکاح کا اعلان گواہوں (کے ذریعے) کرو اور نکاح مسجد میں کرو اور نکاح کے وقت دف بجاؤ۔

"(اعلنوا ھذا النکاح) ای بالبینة فالامر للوجوب"

اس نکاح کا اعلان گواہوں کے ذریعے کرو، یہ امر وجوب کے لئے ہے۔

مسجد میں نکاح کرو، مسجد میں نکاح کرنے کی وجہ تو یہ ہے کہ نکاح میں لوگ گواہ بن جائیں "اولحصول برکة المکان" یا مکان کی برکت حاصل کرنے کے لئے مسجد میں نکاح کرنے کا حکم دیا گیا۔

" و ینبغی ان یراعی ایضا فضیلة الزمان لیکون نورا علی نور و سرورا علی سرور"

مناسب یہ ہے کہ جس طرح بابرکت جگہ پر نکاح کرنا مستحب ہے اسی طرح دن اور وقت بھی ایسا مقرر کرے جس میں فضیلت پائی جائے تاکہ "نور علی نور" ہو جائے اور خوشی پر خوشی حاصل ہو۔

"قال ابن الھمام یستحب مباشرة عقد النکاح فی المسجد لکونه عبادة و کونه فی یوم الجمعة"

ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں مستحب ہے کہ نکاح مسجد میں کیا جائے کیونکہ نکاح عبادت ہے، اور جمعہ کے دن ہو، کیونکہ جمعہ برکت والا دن ہے۔

نکاح کے اعلان کے لئے دف بجائی جائے لیکن دف مسجد کے باہر بجائی جائے، جیسا کہ دیہاتوں میں رمضان المبارک شریف میں دف (نقارہ) وضوخانہ یا مسجد کے ساتھ ملحق حجرہ کی چھت پر بجائی جاتی تھی۔

نکاح میں خطبہ پڑھا جائے:

الحمدللہ نستعینه و نستغفره و نعوذ باللہ من شرور انفسنا من یھده اللہ فلا مضل له و من یضلل فلا ھادی له واشھدان لا اله الا اللہ و اشھد ان محمدا عبده و رسوله"

اور خطبہ میں یہ تین آیتیں پڑھی جائیں

یا ایھا الذین امنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ ولا تموتن الا وانتم مسلمون ☆

یاایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منھا زوجھا وبث منھما رجالا کثیرا ونساء واتقوا اللہ الذی تساء لون بہ والارحام ان اللہ کان علیکم رقیبا☆

یاایھاالذین امنو اتقو اللہ وقولو اقولا سدیدا یصلح لکم اعمالکم ویغفر لکم ذنوبکم و من یطع اللہ ورسولہ فقد فاز فوزا عظیما ☆

تنبیہ:

ولی کے بغیر نکاح سنت کے خلاف ہے، خطبہ کے بغیر نکاح سنت کے خلاف ہے، گواہوں کے بغیر نکاح فاسد ہے۔ ان مسائل کو واضح کرتے رہیں، آجکل کے معاشرہ میں لڑکیوں کو آزاد کرنے کی وجہ سے اپنی مرضی سے عشق بازی میں مبتلا ہو کر خود بخود نکاح کر رہی ہیں، چند دنوں کے بعد عاشق صاحب منہ موڑ لیتے ہیں اور یہ ذلیل ہو کر دربدر بھٹکتی ہیں۔ نہ والدین منہ لگاتے ہیں اور نہ ہی خاوند صاحب وفا کرتے ہیں۔ اگر والدین کی مرضی سے نکاح کریں بیشک اپنی رائے کا بھی اظہار کریں تو اسی میں کامیابی ہے، اگر خاوند بے وفائی کرے تو کم از کم والدین تو اس کا سہارا بن سکیں۔

☆☆☆☆☆

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ لَاتُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّاوُسْعَهَا لَاتُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَامَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ فَاِنْ اَرَادَافِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَاجُنَاحَ عَلَيْهِمَاوَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْا اَوْلَادَكُمْ فَلَاجُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَاسَلَّمْتُمْ مَاآتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْآ اَنَّ اللّٰهَ بِمَاتَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ☆ (سورہ بقرہ آیت،۲۳۳)

۱

اور مائیں دودھ پلائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس، اس کے لیئے جو دودھ کی مدت پوری کرنی چاہے اور جس کا بچہ ہے اس پر عورتوں کا کھانا اور پہننا ہے حسب دستور کسی جان پر بوجھ نہ رکھا جائے گا مگر اس کے مقدور بھر ماں کو ضرر نہ دیا جائے اس کے بچہ سے اور نہ اولاد والے کو اس کی اولاد سے (یا ماں ضرر نہ دے اپنے بچہ کو، اور اولاد والا اپنی اولاد کو) اور جو باپ کا قائم مقام ہے اس پر بھی ایسا ہی واجب ہے۔ پھر اگر ماں باپ آپس میں رضا اور مشورہ سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر گناہ نہیں۔ اور اگر تم چاہو کہ دائیوں سے اپنے بچوں کو دودھ پلواؤ تو بھی تم پر مضائقہ نہیں۔ جب کہ جو دینا ٹھہرا تھا بھلائی کے ساتھ انہیں ادا کر دو، اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ تمہارے کام دیکھ رہا ہے۔

﴿۲﴾

اور مائیں دودھ پلائیں اپنی اولاد کو دو سال کامل جو ارادہ رکھیں کہ پوری کریں دودھ پلانے کی مدت۔ اور جس کا بچہ ہے اس پر لازم ہے عورتوں کا خرچ اور لباس شرع کے مطابق، نہ تکلیف دی جائے کسی نفس کو سوائے اس کی طاقت کے۔ نہ ضرر دیا جائے ماں کو اس کے بچہ کی وجہ سے اور نہ (ضرر دیا جائے) باپ کو اس کے بچہ کی وجہ سے اور وارث پر مثل اسی کے۔ پھر اگر ارادہ کریں دونوں (ماں باپ) دودھ چھڑانے کا آپس میں رضامندی اور مشورہ سے تو کوئی گناہ نہیں ان دونوں پر، اور اگر ارادہ کرو تم کہ دودھ پلواؤ (دائیوں سے) اپنی اولاد کو تو کوئی گناہ نہیں تم پر جب سپرد کر دو ان کے وہ چیز جو تم نے ان کو دینی تھی، بھلائی کے طریقہ سے، اور ڈرو اللہ سے، اور جان رکھو بیشک اللہ جو تم عمل کرتے ہو دیکھ رہا ہے۔

مختصر مطلب:

مائیں اپنی اولاد کو اگر پوری مدت دودھ پلانا چاہتی ہوں تو دو سال تک دودھ پلائیں اور اگر بچوں کے ماں باپ آپس میں رضامندی اور مشورہ سے دو سال سے پہلے ہی دودھ چھڑانا چاہیں تو چھڑا لیں، اس میں کوئی گناہ نہیں۔ بچوں کے باپ پر لازم ہے کہ ان کی ماؤں کا خرچ اور لباس دیں۔ لیکن کسی نفس کو طاقت سے زائد تکلف نہیں دی جاتی، بلکہ اپنی وسعت کے مطابق وہ رزق اور کپڑے دے، بچے کی وجہ سے ماں کو ضرر نہ دیا جائے یعنی ماں پر دودھ پلانے میں جبر نہ کیا جائے، اور باپ کو بچے کی وجہ سے ضرر نہ پہنچایا جائے کہ وہ وسعت نہیں رکھتا تو اس پر جبر نہ کیا جائے کہ تم دودھ پلانے کے لئے ضرور ہی دایہ طلب کرو، اگر اولاد کے دودھ پلانے کے لئے دائیوں کو حاصل کیا جائے تو اس میں حرج نہیں البتہ یہ ضروری ہے کہ جو اجرت ان سے طے کی گئی تھی وہ ادا کر دی جائے اور اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

"والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین لمن اراد ان یتم الرضاعة":

اور مائیں دودھ پلائیں اپنی اولاد کو دوسال کامل جو ارادہ رکھیں کہ پوری کریں دودھ پلانے کی مدت۔

"والوالدات" میں تین قول ہیں:

پہلا قول:

اس سے مراد عام ہے تمام والدات (ماؤں) کو شامل ہے، خواہ وہ نکاح میں ہوں یا ان کو طلاق دی گئی ہو۔

" والدلیل علیه ان اللفظ عام وما قام دلیل التخصیص فوجب ترکه علی العموم "

اس پر دلیل یہ ہے کہ لفظ عام ہے، اور تخصیص کی کوئی دلیل موجود نہیں، اس لئے ضروری ہے کہ تخصیص کے قول کو چھوڑ دیا جائے اور اس کو عموم پر ہی رکھا جائے۔

دوسرا قول:

کہ اس سے مراد وہ مائیں ہیں جن کو طلاق دے دی گئی ہو۔

اس قول والے حضرات نے اس موقف پر دو دلیلیں قائم کی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو طلاق کے احکام کے بعد ذکر کیا ہے، تو گویا کہ یہ آیت پہلی آیت کا تتمہ (تکمیل کرنے والی) بن گئی۔

اس آیت کو ماقبل (پہلی) آیات سے متصل کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی زوجہ کو طلاق دے دیتا ہے تو ان دونوں کے درمیان بغض اور دشمنی پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے ہو سکتا ہے ماں بچے کو دودھ نہ پلائے، تو بچے کو ضرر پہنچے، اور خصوصاً جب عورت کی رغبت دوسرے خاوند کی طرف ہو جائے تو وہ بچے کی طرف توجہ نہیں کرے گی۔

" فلما کان هذاالاحتمال قائمالا جرم ندب الله الوالدات المطلقات الی رعایة جانب الاطفال والا هتمام بشانهم"

جب یہ احتمال قائم ہے تو یقیناً اللہ تعالیٰ نے ان ماؤوں کے لئے مستحب قرار دیا جن کو طلاق دی جائے کہ وہ اپنے بچوں کی رعایت کریں اور ان کے حالات کا اہتمام کریں۔

ان حضرات کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اس آیۃ کریمہ میں "والدات" سے مراد وہ مائیں ہیں جن کو طلاق دے دی گئی ہو۔ کیونکہ اس کے بعد ذکر ہے "وعلی المولود له رزقهن و کسو تهن "(باپ پر ان کا خرچ اور لباس لازم ہے) زوج پر اسی وقت تک زوجہ کا خرچ اور لباس لازم ہے جب تک زوجیت قائم ہو، صرف دودھ پلانے کی وجہ سے یہ لازم نہیں، لہٰذا یہ علیحدہ حکم ہے۔

ان حضرات کی دلیلوں کا جواب یہ ہے۔

" ان هذه الآية مشتملة على حكم مستقل بنفسه فلم يحب تعلقها بما قبلها"

کہ ضروری نہیں کہ ماقبل آیت سے ضرور ہی تعلق ہو بلکہ یہ آیت مستقل بذاتہ ہے، اس کا ماقبل سے تعلق نہیں۔ چند احکام بیان کئے جارہے ہیں، ان احکام میں سے ایک حکم یہ بھی ہے۔

دوسری دلیل کا جواب یہ ہے۔

" لا يبعد ان تستحق المرأة قدرا من المال لمكان الزوجية وقدرا آخر المكان الرضاع فانه لا منافاة بين الامرين "

یہ بعید نہیں کہ عورت مستحق ہو کچھ قدر مال کی زوجیت کی وجہ سے اور کچھ اور قدر مال مستحق ہو، دودھ پلانے کی وجہ سے، ان دو علیحدہ علیحدہ صورتوں کو ایک جملہ سے بیان کر دینے میں کسی قسم کی کوئی منافات نہیں۔

بلکہ مطلب یوں ہوا کہ زوجہ جب تک زوجیت میں ہو اس وقت تک خرچ اور لباس کی مستحق ہے، اور جب اسے طلاق دے دی جائے اور وہ دودھ پلانے کی مقرر اجرت لے۔

تیسرا قول:

علامہ واحدی نے بسیط میں بیان کیا ہے کہ بہتر یہ ہے کہ اس آیۃ کریمہ میں " والدات" سے مراد وہ عورتیں ہوں جو اپنے خاوندوں کے نکاح میں موجود ہوں، اس لئے کہ بعد میں جو خرچ اور لباس کا ذکر ہے اس کی مستحق صرف وہ بیویاں ہیں جو زوجیت میں ہوں۔ (از کبیر)

پسندیدہ قول:

تفسیر خازن اور کبیر نے پہلے قول کو ہی زیادہ پسند کیا ہے اور بیضاوی کا بھی پسندیدہ قول یہی ہے کہ "والدات" سے مراد عام ہے خواہ زوجیت میں ہوں یا مطلقہ ہوں۔

اعتراض:

جب خرچ اور لباس کا تعلق زوجیت سے ہے تو یہاں دودھ پلانے سے نفقہ ولباس کو کیوں معلق کیا ہے۔

پہلا جواب:

اس کو دودھ پلانے سے معلق نہیں کیا گیا بلکہ احکام میں سے ایک حکم بیان کیا گیا ہے۔

دوسرا جواب:

نفقہ ولباس کا تعلق صرف زوجیت سے نہیں، کیونکہ زوجیت قائم ہو لیکن عورت خاوند کے پاس نہ رہے، باوجود اس کے کہ خاوند اسے اپنے پاس رکھنے کا مطالبہ کرے اور وہ انکار کرے تو اس صورت میں وہ نفقہ ولباس کی مستحق نہیں رہتی۔ وہ مستحق اسی وقت ہوتی ہے جب خاوند کے پاس رہے۔ خاوند کے پاس رہنے کی حالت میں ایک صورت یہ ہے کہ وہ بچے کو دودھ بھی پلائے تو اس وقت بھی وہ مستحق ہے۔ (از کبیر بتصرف)

"یرضعن اولادھن": وہ دودھ پلائیں اپنی اولاد کو۔

بظاہر یہ جملہ خبر یہ ہے لیکن اس کا معنی امر والا ہے۔ اب اس میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ امر استحباب کے لئے ہو اور دوسرا یہ کہ امر وجوب کے لئے ہو۔

اس مسئلہ میں امر اصل میں استحباب کے لئے ہے:

اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر عورت زوجیت میں ہو تو وہ دودھ پلائے یا نہ پلائے اسے اختیار ہے لیکن دودھ پلانے پر وہ اجرت نہیں لے سکتی۔ اور اگر عورت کو طلاق دے دی گئی ہو تو اسے بھی اختیار حاصل ہے، چاہے تو دودھ پلائے اور چاہے تو نہ پلائے لیکن اگر وہ دودھ پلائے تو اجرت لے سکتی ہے۔

رب تعالیٰ نے فرمایا" **فان ارضعن لکم فآتو ھن اجو رھن** "اگر (طلاق دی ہوئی مائیں) تمہاری اولاد کو دودھ پلائیں تو تم ان کو اجرت دو۔

اس آیۂ کریمہ میں اجرت دینے کو دودھ پلانے پر معلق کر کے واضح کر دیا کہ دودھ پلانا ان پر لازم نہیں۔ ہاں اگر وہ تمہاری اولاد کو دودھ پلائیں تو تم پر لازم ہے کہ ان کو اجرت دو۔

اور رب تعالیٰ نے فرمایا" **و ان تعاسرتم فستر ضع لہ اخری**" (اور اگر تمہیں آپس میں مشکل درپیش ہے تو دوسری عورت دودھ پلانے کے لئے طلب کر لی جائے) یعنی اگر طلاق دی ہوئی عورت اور اس کے سابق خاوند کے درمیان بچے کو دودھ پلانے کے معاملہ میں اتفاق مشکل ہو تو کسی اور دایہ سے دودھ پلوالیا جائے۔ اس سے واضح ہوا کہ دودھ پلانا اس پر لازم نہیں۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ ماؤں پر دودھ پلانا لازم نہیں۔

"فھذاالا مر محمول علی الندب من حیث ان تر بیۃ الطفل بلبن الأ م اصلح لہ من سائرالالبان و من حیث ان شفقۃ الام علیہ اتم من شفقۃ غیر ھا "

تو یہ امر استحباب پر محمول ہوگا، اس لئے کہ بچے کی تربیت ماں کے دودھ سے بچے کے لئے جو نفع مند ہوتی ہے وہ دوسری عورتوں کے دودھ سے حاصل نہیں، اور ماں کو بچے پر بہت زیادہ شفقت حاصل ہوتی ہے جو دوسری عورتوں کو حاصل نہیں ہوتی۔

امر وجوب کے لئے ہوسکتا ہے:

ماں خواہ زوجیت میں ہو یا اسے طلاق مل چکی ہو، دودھ پلانا اس پر واجب ہوگا جب کہ باپ کو دایہ کی اجرت دینے کی استطاعت نہ ہو یا دودھ پلانے کے لئے کوئی دایہ نہ ملے یا بچہ کسی اور عورت کا دودھ نہ پئے۔ اس صورت میں امر وجوب کے لئے ہوگا کہ ماں پر واجب ہے کہ وہ دودھ پلا کر بچے کو ہلاکت سے بچائے، جس طرح کوئی شخص بھوک کی وجہ سے نڈھال ہو، اس کی موت کو خطرہ ہو تو اس شخص پر اس کی امداد کرنا، یعنی اسے کھانا کھلانا، موت سے بچانا واجب ہوگا جسے کھانا کھلانے کی طاقت حاصل ہوگی۔ (ماخوذ از کبیر و خازن و روح المعانی)

"حولین کاملین": دو سال مکمل۔

"حولین" تثنیہ ہے اس کا واحد "حول" ہے جس کا معنیٰ "پھرنا" ہے، چونکہ سال بھی پھر پھر کر آتا ہے تو اسے "حول" کہہ لیا جاتا ہے۔ "کاملین" تاکید ہے کہ مراد مکمل دو سال یعنی چوبیس مہینے ہیں، یہ مراد نہیں کہ سال کے اکثر مہینے لئے جائیں۔

عام طور پر اکثر پر حکم کل کا لگایا جاتا ہے جیسا کہ کوئی شخص کہے "اقمت عندہٗ فلان حولا و ان لم تستکمله" میں فلاں شخص کے پاس ایک سال ٹھہرا حالانکہ اس نے سال مکمل نہیں کیا ہوتا، لیکن سال کا زیادہ وقت ٹھہرنے کی وجہ سے سال کہہ دیا۔

"لمن اراد ان یتم الرضاعة" جو ارادہ رکھیں کہ پوری کریں دودھ پلانے کی مدت' اس سے یہ واضح کیا گیا کہ دو سال کو پورا کرنا لازم نہیں' بلکہ باہمی مشاورت سے چاہیں تو دودھ پلانے کی مدت پوری کریں اور چاہیں تو

پہلے ہی دودھ چھڑا دیں۔ ہاں البتہ دو سال مکمل کرنے پر دودھ چھڑانا واجب ہو جائے گا' یعنی انتہاء مدت کا حکم وجوبی ہے اس سے پہلے استحبابی۔ (از خازن)

البتہ یہ خیال رہے کے بچے کی بہتر پرورش کے لئے بغیر کسی عذر کے دودھ نہ چھڑایا جائے، بلکہ مدت رضاعت پوری کی جائے۔

رضاعت کے متعلق بیان:

مدت رضاعت دو سال ہے یہ مذہب صاحبین (امام ابو یوسف و امام محمد رحمہما اللہ) کا ہے اور حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمہا اللہ نے اڑھائی کا قول کیا ہے، لیکن فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے۔ اب یہی مذہب احناف کا ہے۔ تاہم اہل علم کا علمی اختلاف اور دلائل کا ثبوت صحابہ کرام کے زمانہ سے رہا ہے، یہی اختلاف باعث رحمت ہے اور اسی اختلاف سے مسائل روز روشن کی طرح واضح ہوئے۔

صاحبین کی دلیل:

رب تعالی نے ارشاد فرمایا" **وحمله وفصاله ثلاثون شهرا** " حمل کی مدت اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس مہینے ہے۔ جب حمل کی مدت کم از کم چھ ماہ ہے تو دودھ چھڑانے کی مدت دو سال باقی رہ جائے گی۔

اور دلیل ان کی یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہما فرماتے ہیں رسول ﷺ نے فرمایا۔

"**لارضاع الافی حولین** "دودھ صرف دو سال پلایا جا سکتا ہے۔ (دار قطنی، السابقہ)

امام اعظم رحمہ اللہ کا ارشاد:

آپ فرماتے ہیں آیۃ کریمہ میں دو چیزوں کا علیحدہ علیحدہ ذکر ہے۔

" **وحمله وفصاله ثلاثون شهرا** " کا مطلب یہ ہے کے مدت حمل تیس مہینے ہے اور دودھ چھڑانے کی

مدت تیس مہینے ہے۔ یعنی " ثلاثون شهرا" کا حکم ہر ایک پر علیحدہ علیحدہ ہے۔

دینی طلباء کرام بخوبی سمجھتے ہیں کہ امام اعظم رحمہ اللہ نے حمل کا لحاظ پہلے کیا اور ربط کا بعد میں، لیکن صاحبین نے ربط کا لحاظ پہلے کیا اور حمل کا بعد میں۔

لیکن امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مدت حمل کے متعلق ایک حدیث شریف مزاحم ہونے کی وجہ سے حمل کی اکثر مدت دو سال رہ گئی، کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔

"لا يبقى الولد في بطن امه اكثر من سنتين و لو بفلكة مغزل" (اخرجه البيهقي و الدار قطني)

بچہ ماں کے پیٹ میں دو سال سے زیادہ نہیں رہ سکتا، اگرچہ تکلے پر چھلی بنانے کی مقدار ہی کیوں نہ ہو۔

لیکن دودھ چھڑانے کی مدت اپنی جگہ پر اڑھائی سال ہی رہے گی۔

امام اعظم رحمہ اللہ کی طرف سے صاحبین نے جو حدیث پیش کی ہے، اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ حدیث شریف میں استحقاق بیان کیا گیا ہے حرمت بیان نہیں کی گئی۔ حدیث شریف کا مطلب یہ نہیں کہ دو سال سے زیادہ دودھ پلانا حرام ہے، بلکہ حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ دو سال تک دودھ پلانا حق ہے، یعنی بہتر ہے۔

صاحبین کے قول پر فتویٰ کیوں؟

"روى ان رجلا تزوج امرأة فولد لستة اشهر فجى بها الى عثمان رضى الله فشاور في رجمها فقال ابن عباس رضى الله عنه ان خاصمتكم بكتاب الله تعالى خصمتكم قالوا كيف قال ان الله تعالى يقول (وفصاله ثلاثون شهرا) وقال الله تعالى (و الوالدات يرضعن اولادهن حولين كاملين) فحمله ستة اشهر و فصاله حولان فتركها" (البناية)

ایک روایت میں مذکور ایک شخص نے ایک عورت سے نکاح کیا تو اس کا بچہ چھ ماہ بعد پیدا ہو گیا تو وہ شخص اپنی عورت کو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس لایا اور مشورہ کیا کہ اسے سنگسار کیا جائے۔

تو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اگر یہ عورت تمہارے ساتھ اللہ کی کتاب یعنی قرآن

پاک کے ذریعے جھگڑا کرے تو کر سکتی ہے، انہوں نے پوچھا یہ کیسے؟ آپ نے فرمایا رب تعالیٰ نے فرمایا "وحملہ وفصالہ ثلاثون شھرا" مدت حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس مہینے ہے اور دوسرے مقام میں ارشاد فرمایا "والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین" اور مائیں دودھ پلائیں اپنے بچوں کو دو سال مکمل۔

جب دودھ پلانے کی مدت دو سال ہے تو حمل کی مدت چھ ماہ ہے۔ جب اس عورت کا بچہ چھ ماہ بعد پیدا ہوا تو تم اسے سنگسار نہیں کر سکتے اس طرح ان حضرات نے سنگسار کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

راقم کی نظر میں کسی کتاب سے یہ بھی گزرا ہے کہ امام صاحب رحمہ اللہ نے صاحبین کے قول کی طرف رجوع کیا۔

رضاعت سے وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں:

"قال النبی ﷺ یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب"

(اخرجہ البخاری و مسلم من حدیث ابن عباس و من حدیث عائشۃ رضی اللہ عنھما)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا رضاع سے وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں۔

☆ "وعن عائشۃ رضی اللہ عنھا انہ علیہ الصلوۃ والسلام قال ان اللہ حرم من الرضاع ما حرم من الولادۃ" (بخاری و مسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے رضاع (دودھ پلانے) سے وہ رشتے حرام کر دئے ہیں جو ولادت سے حرام کرتے ہیں۔

بخاری و مسلم میں یہ الفاظ بھی پائے جاتے ہیں۔" یحرم من الرضاع ما یحرم من الرحم" رضاع سے وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو رحم سے حرام ہوتے ہیں۔

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔" وامھاتکم اللاتی ارضعنکم واخواتکم من الرضاعۃ" اور حرام ہیں تم پر تمہاری مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا اور حرام ہیں تم پر تمہاری رضاعی (دودھ شریک) بہنیں۔

دودھ قلیل پیئے یا کثیر پیئے حرمت ثابت ہو جائے گی:

ابھی جن احادیث کو ذکر کیا ہے اور آیۃ کریمہ کے جس حصہ کو ذکر کیا ہے ان سے واضح ہو رہا ہے کہ ان میں قلیل وکثیر (تھوڑی مقدار یا زیادہ مقدار) کا کوئی ذکر نہیں۔ اس لئے حکم عام ہی رہے گا۔

تین مرتبہ یا پانچ مرتبہ والی احادیث منسوخ ہیں:

مندرجہ بالا احادیث اور قرآن پاک کی آیۃ کا جو حصہ پیش کیا گیا ہے ان سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ جن احادیث میں ایک مرتبہ یا دو مرتبہ پستان کو منہ میں ڈالنے سے حرمت ثابت نہیں وہ منسوخ ہیں۔ وہ حدیثیں یہ ہیں۔

☆ **"عن عائشة رضی الله عنها قالت قال رسول الله ﷺ لا تحرم المصة والمصتان"**

(رواه مسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک مرتبہ پستان چوسنا یا دو مرتبہ چوسنا حرمت ثابت نہیں کرتا۔

☆ **"عن ام الفضل بنت الحارث قالت دخل اعرابی علی رسول الله ﷺ وهو فی بیتی فقال یا رسول الله انی کانت لی امرأة فتزوجت علیها اخری فزعمت امرأتی الاولی انها ارضعت الحدثی رضعة اورضعتین فقال ﷺ لا تحرم الاملاجة والاملاجتان"**

(رواه مسلم)

حضرت ام الفضل بنت حارث رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ایک اعرابی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے جبکہ حضور ﷺ میرے گھر تشریف فرماتے تھے، وہ اعرابی عرض کرنے لگے یا رسول اللہ! میری ایک زوجہ پہلے تھی اور میں نے ایک اور عورت سے شادی کر لی، میرا گمان یہ ہے کہ میری پہلی زوجہ نے نئی زوجہ کو ایک مرتبہ یا دو مرتبہ دودھ پلا دیا، تو حضور ﷺ نے فرمایا ایک مرتبہ (پستان کو) بچے کے منہ میں ڈالنا یا دو مرتبہ ڈالنا حرمت ثابت نہیں کرتا۔

صحیح ابن حبان میں عبداللہ بن زبیر کی اپنے باپ سے روایت ہے۔

"قال رسول اللہ ﷺ لا تحرم المصة ولا المصتان ولا الاملاجة ولا الاملاجتان"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (بچے کا) ایک مرتبہ چوسنا یا دو مرتبہ چوسنا اور ایک مرتبہ (پستان کو بچے کے منہ میں) ڈالنا یا دو مرتبہ ڈالنے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی۔

- پانچ مرتبہ جب تک دودھ نہ پیا جائے حرمت ثابت نہیں ہوتی، یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے۔

☆ **"عن عائشة قالت كان فيما انزل من القرآن عشر رضعات معلومات يحرمن ثم نسخن بخمس معلومات فتو فى رسول اللہ ﷺ وهى فيما يقرا من القرآن"**

(رواہ مسلم، مشکوۃ باب المحرمات)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں قرآن میں دس مرتبہ واضح طور پر دودھ پینے کی حرمت کو نازل کیا گیا، پھر پانچ مرتبہ واضح طور پر دودھ پینے سے دس مرتبہ والا حکم منسوخ ہو گیا، رسول اللہ ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے وہ (پانچ مرتبہ والا حکم) پڑھا جا رہا ہے۔

اگرچہ بظاہر اس حدیث سے یہ سمجھ آ رہا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ پانچ مرتبہ دودھ پینے سے حرمت ثابت ہوتی ہے، یہ حکم اب بھی باقی ہے، قرآن پاک میں پڑھا جا رہا ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت سے یہ مطلب ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ قرآن پاک میں پانچ مرتبہ دودھ پلانے سے حرمت ثابت ہونے کی کوئی آیۃ اب نہیں پڑھی جا رہی۔

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ "ان نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون" (بیشک قرآن ہم نے نازل کیا اور بے شک ہم ہی اس کے محافظ ہیں) اس سے واضح ہوا کہ اگر یہ حکم باقی ہوتا تو اب بھی وہ آیت پڑھی جاتی۔

" قوله فيما يقرأ القرآن" يعنى ان بعض من لم يبلغه النسخ كان يقرأ على الرسم الاول لان النسخ يكون الا فى زمان الوحى وكيف النسخ بعد موت النبى ﷺ"

جب پانچ مرتبہ دودھ پینے سے حرمت ثابت ہونے والی آیۃ قرآن پاک میں نہیں پڑھی جا رہی تو اسی

سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ حکم بھی منسوخ ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد تو کوئی حکم منسوخ نہیں ہو سکتا۔ یہی کہنا پڑے گا کہ منسوخ آپ کی ظاہری حیات میں ہی یہ حکم ہو چکا تھا۔

پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے۔ "**فیما یقرا القرآن**" اس کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کو اس کے منسوخ ہونے کا علم نہیں وہ ابھی تک پڑھ رہے ہیں۔

حضرت مولانا جلال الدین خوارزمی رحمہ اللہ نے کفایہ میں ذکر فرمایا کہ صریح حدیث سے یہ تمام حدیثیں منسوخ ہیں۔

"**وفی حدیث علی رضی اللہ عنہ الرضاع قلیلہ وکثیرہ سواء یعنی فی ایجاب الحرمۃ**"

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "دودھ قلیل مقدار میں پلائیں یا کثیر حرمت کے ثابت کرنے میں برابر ہے"

دوسال تک دودھ پینے سے حرمت ثابت ہوگی:

یعنی جس بچے کو دودھ پلایا گیا اس بچے کی عمر دودھ پیتے وقت دوسال سے زائد نہ ہو، اگر بچے نے دودھ اس وقت پیا جب اس کی عمر دوسال سے زیادہ تھی تو حرمت ثابت نہیں ہوگی۔

اس مسئلہ پر احادیث مبارکہ:

"**عن ام مسلمۃ قالت قال رسول اللہ ﷺ لا یحرم من الرضاع الا ما فتق الامعاء فی الثدی وکان قبل الفطام**" (رواہ الترمذی ، مشکوۃ باب المحرمات)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دودھ پلانے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ جو چیز پستانوں میں ہے (دودھ) انتڑیوں کو کھولے۔ اور یہ دودھ چھڑانے کی مدت سے پہلے ہے۔

" قولہ" مافتق "ای الذی شق امعاء الصبی کا لطعام ووقع منه الغذاء وذلک انما یکون فی اوان الرضاع" (مرقاۃ)

یعنی حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح غذا سے انتڑیاں بھری جانے کی وجہ سے کھل جاتی ہیں جو پہلے سکڑی ہوئی ہوتی ہیں، اسی طرح بچے کو دودھ پلانے سے حرمت اس وقت ثابت ہوگی جبکہ دودھ یہی اثر کرے، یہ اثر اس کا دودھ پلانے کے وقت تک ہوتا ہے جو غذا کا کام کرتا ہے، اس مدت کے بعد دودھ غذا کے قائم مقام نہیں ہوسکتا۔

☆ عن عائشة رضی اللہ عنھا ان النبی ﷺ دخل علیھا وعندھا رجل فکأنه کرہ ذلک فقالت انه اخی فقال انظرن من اخوانکی فانما الرضاعة من المجاعة"

(بخاری، مسلم، مشکوۃ باب المحرمات)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں بیشک نبی کریم ﷺ ان کے پاس تشریف لائے تو ان کے پاس ایک مرد تھا جسے آپ نے ناپسند فرمایا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ یہ میرا (رضائی) بھائی ہے۔ آپ نے فرمایا تم دیکھو تمہارے کون سے بھائی ہیں، رضاعت تو وہ معتبر ہے جو بھوک کو دور کرے۔

یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سمجھ رہی تھیں کہ یہ میرا رضاعی بھائی ہے، لیکن نبی کریم ﷺ نے بتایا کہ اس نے دودھ چھڑانے کی مدت کے بعد دودھ پیا ہے، لہٰذا وہ رضاعت (دودھ پینا) معتبر نہیں۔

☆ "عن ابن عباس قال قال رسول اللہ ﷺ لا یحرم من الرضاع الا ما کان فی الحولین"

(اخرجه ابن عدی والدار قطنی والبیھقی، درمنثور)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رضاع (دودھ پلانے) سے حرمت ثابت نہیں ہوتی، سوائے اس کے کہ وہ (بچہ دودھ پینے والا) دوسال کے اندر اندر ہو۔

☆ " واخرج الطیالسی والبیھقی عن جابر قال قال رسول اللہ ﷺ لا رضاع بعد فصال ولا یتم بعد الحلم" (درمنثور)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دودھ چھڑانے کی مدت کے بعد دودھ پلانا موثر نہیں اور بالغ ہونے کے بعد یتیمیت نہیں۔

☆ " مالک عن نافع ان عبداللہ بن عمر کا ن یقول لا رضا عة الا لمن ارضع فی الصغر ولا رضا عة لکبیر" (مؤ طا امام مالک)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے تھے رضاعت کا حکم ثابت نہیں سوائے اس کے کہ اسے چھوٹی عمر میں (دودھ چھڑانے کی مدت سے پہلے) دودھ پلایا جائے، بڑی عمر میں دودھ پلانے سے رضاعت ثابت نہیں۔

☆ " مالک عن ابراهیم بن عقبة انه سأل سعید بن المسیب عن الر ضا عة فقال سعید کل ما کان فی الحولین وان کانت قطرة واحدة فهو یحرم وما کان بعد الحولین فانما هو طعام یأ کله قال ابراهیم بن عقبة ثم سألت عروة ابن الز بیر فقال مثل ما قال سعید بن المسیب" (مؤطا امام مالک)

ابراہیم بن عقبہ نے سعید بن مسیب سے رضاعت کے متعلق سوال کیا تو سعید نے فرمایا دو سال کے اندر جو دودھ پیا گیا وہ ایسے ہی ہے جیسے طعام کھالیا گیا۔ ابراہیم بن عقبہ کہتے ہیں پھر میں نے عروہ بن زبیر سے سوال کیا تو انہوں نے بھی سعید بن مسیب کی طرح جواب دیا۔

رسول اللہ ﷺ کا اختیار:

☆ " عن ابی حذیفة بن عقبة بن ربیعة قال جاء ت سهلة بنت سهیل وهی امرأة ابی حذیفة وهی من بنی عامر بن لو ی الی رسول الله ﷺ فقالت یا رسول الله کنا نری سالما ولداو کان ید خل علی وانا فضل لیس لنا الا بیت واحد فما ذا تری فی شانه فقال لهارسول الله ﷺ فیما بلغنا ارضعیه خمس رضعات فیحرم بلبنها و کانت تراه ابنا من الر ضا عة " (موطا امام مالک)

حضرت ابوحذیفہ بن عقبہ بن ربیعہ فرماتے ہیں سہلہ بنت سہیل نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، یہ ابوحذیفہ کی زوجہ ہیں اور عامر بن لوی کے قبیلہ سے ہیں۔ (حجاب کے حکم نازل ہونے کے

بعد) انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ سالم کو ہم اپنا بیٹا سمجھتے تھے، وہ مجھ پر داخل ہوتے ہیں اور میں کام کاج کے کپڑوں میں ہوتی ہوں (یعنی جسم کا بعض حصہ بازو وغیرہ ننگے ہوتے ہیں) ہمارا صرف ایک ہی کمرہ ہے، آپ اس کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جو ہمیں تمہارے متعلق پتہ چلا ہے اس کا حکم یہ ہے کہ تم اسے پانچ مرتبہ دودھ پلا دو تو وہ ان کے دودھ سے ان کے محرم بن گئے اور یہ ان کو اپنا بیٹا سمجھتی تھیں۔

مسلم شریف میں مذکور ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے ابوحذیفہ کی زوجہ کو حکم دیا کہ تم ابوحذیفہ کے غلام سالم جو تمہارے متبنیٰ (منہ بولا بیٹا) ہیں ان کو دودھ پلا دو۔

"قالت كيف ارضعه وهو رجل كبير فتبسم رسول الله ﷺ قال قد علمت انه رجل كبير"

انہوں نے کہا یا رسول اللہ وہ تو بڑا مرد ہے میں اسے کیسے دودھ پلاؤں؟ تو رسول اللہ ﷺ مسکرائے اور فرمایا میں جانتا ہوں کہ وہ بڑا مرد ہے۔

اس حدیث سے واضح ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے مختار بنایا ہے کہ آپ نے بڑی عمر کے شخص کو دودھ پلانے سے رضاعت کا حکم ثابت کر دیا۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دودھ دوہ کر پلایا گیا تھا۔

اس حدیث پاک سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ ثابت کیا کہ بڑی عمر کے شخص کو دودھ پلانے سے احکام رضاعت ثابت ہو جاتے ہیں، لیکن ان کا اجتہاد درست نہیں۔

"وابى سائر ازواج النبى ﷺ ان يدخل عليهن بتلك الرضاعة احد من الناس وقلن لا والله ما نرى الذى امر به رسول الله ﷺ سهلة بنت سهيل الا رخصة من رسول الله ﷺ فى رضاعة سالم وحده" (موطا امام مالک)

لیکن باقی تمام ازواج مطہرات فرماتی تھیں کہ بڑی عمر کے شخص کو دودھ پلانے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی یعنی وہ محرم نہیں بنتا۔ رسول اللہ ﷺ نے سہلہ بنت سہیل کو خصوصی طور پر سالم کے معاملہ میں رخصت دی تھی۔

خاوند اپنی زوجہ کا دودھ پی لے تو کیا حکم ہے؟

عرب میں بعض اوقات چھوٹے دودھ پیتے بچے کا نکاح کسی بالغہ عورت سے کر دیا جاتا تھا، اگر ایسی صورت ہو کہ زوجہ بالغہ ہو، اس کا دودھ بھی ہو اور خاوند کی عمر دو سال سے زائد نہ ہو، بلکہ وہ دو سال کے اندر ہو، اسے دودھ پلا دیا گیا تو حرمت ثابت ہو جائے گی، نکاح ٹوٹ جائے دونوں ماں بیٹا کی حیثیت میں آ جائیں گے۔

لیکن اگر خاوند اور بیوی دونوں بڑے ہیں تو نکاح نہیں ٹوٹے گا، یعنی خاوند خواہ بالغ ہو یا نابالغ، البتہ دو سال سے زائد عمر کا ہو تو زوجہ کا دودھ پی لے تو نکاح نہیں ٹوٹے گا، کیونکہ دودھ چھڑانے کی مدت کے بعد دودھ پینے کی وجہ سے حرمت ثابت نہیں ہوتی۔

☆ **"مالک بن یحیی بن سعید ان رجلا سأل ابا موسی الا شعری فقال انی مصصت عن امرأتی من ثدیها لبنا فذهب فی بطنی فقال ابو موسی الا شعری لا اراها الا قد حرمت علیک، فقال عبدالله بن مسعود انظر ما تفتی به الرجل فقال ابو موسی فما تقول انت فقال وعبدالله بن مسعود لا رضاعة الا ما کان فی الحولین فقال ابوموسی لا تسألونی عن شیء ما کان هذا الحبر بین اظهرکم"** (مؤطا امام مالک)

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں یحییٰ بن سعید روایت کرتے ہیں کہ بیشک ایک شخص نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے سوال کیا اور کہا کہ میں نے اپنی زوجہ کے پستان کو چوسا تو اس کا دودھ میرے پیٹ میں چلا گیا (اب میرے لئے کیا حکم ہے) تو ابو اشعری نے فرمایا میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ عورت تم پر حرام ہو گئی۔ تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا دیکھو تم اس شخص کو کیا فتویٰ دے رہے ہو؟ تو حضرت ابوموسیٰ اشعری نے ان سے پوچھا کہ تمہاری رائے اس کے متعلق کیا ہے؟ تو عبداللہ بن مسعود نے کہا، رضاعت صرف دو سال کے اندر ثابت ہوتی ہے (یہ رضاعت ثابت نہیں اور نہ ہی اس سے حرمت ثابت ہے) تو حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا جب تک یہ محقق و مدقق عالم تمہارے اندر موجود ہیں، مجھ سے سوال نہ کیا کرو۔

سبحان اللہ! صحابہ کرام کا کیا جذبہ ایمانی تھا کہ کسی حق بات کو تسلیم کر لینا اور اپنی غلطی پر اکڑ کر قائم نہ رہنا ان کا مستحسن طریقہ صرف اسی وجہ سے تھا کہ وہ جذبہ ایمانی سے کام لیتے تھے، نہ کہ اپنی عزت نفس سے۔

دودھ پلانے کی مدت میں زوجہ سے جماع کرنا:

"مالک عن محمد بن عبدالرحمن بن نو فل انه قال اخبرنی عروة بن الز بیر عن عائشة ام المومنین عن جدا مة بنت وهب الا سدیة انها اخبر تها انها سمعت رسول الله ﷺ یقول لقد هممت ان انهی عن الغیلة حتی ذکر ت ان الروم وفارس یصنعو ن ذلک فلا یضر اولاد هم شیأ" (مؤ طا امام مالک)

" قال مالک الغیلة ان یمس الرجل امرأته وهی ترضع "

جدامہ بنت وہب اسدیہ کہتی ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا، تحقیق میرا ارادہ ہوا کہ میں مدت رضاعت میں جماع کرنے سے منع کردوں، پھر مجھے یاد آیا کہ روم اور فارس کے لوگ تو ایسا کرتے ہیں تو اولاد کو نقصان نہیں ہوتا۔

یعنی اگر دودھ پلانے کی مدت میں جماع کرنا بچوں کے لئے نقصان دہ ہوتا تو روم اور فارس کے لوگ مدت رضاعت میں جماع نہ کرتے، کیونکہ ان میں کثیر تعداد میں طبیب موجود ہیں۔ اس لئے میں نے بھی مدت رضاعت میں جماع کرنے سے منع کرنے کا ارادہ کو ترک کردیا۔

تنبیہ:

" وهذا الحدیث ممارواه الشخیان فلا یعارضه ما روی ابو داؤد عن اسماء بنت یزید فی النهی عن الغیلة"

یہی مندرجہ بالا حدیث بخاری ومسلم میں بھی ہے، اس حدیث کے معارض وہ حدیث نہیں ہوسکتی جو ابوداؤد نے اسماء بنت یزید سے روایت کی کہ نبی کریم ﷺ نے مدت رضاعت میں جماع کرنے سے منع فرمایا۔

ان دونوں احادیث میں تطبیق اس طرح موجود ہے کہ دودھ پلانے کی مدت کے دوران اگر جماع کرنا بچے کے لئے یا عورت کے لئے نقصان دہ ہو تو جماع کرنا منع ہے اور اگر نقصان دہ نہ ہو تو جائز ہے۔ (حاشیہ موطا امام مالک)

رضاعت کی نسبت مذکر کی طرف:

جس عورت نے بچے کو دودھ پلایا اس کا خاوند بچے کا باپ کا ہوگا، اور رضائی باپ کا بھائی رضاعی چچا ہوگا۔

☆ "مالک عن هاشم بن عروة عن عائشة ام المومنين انها قالت جاء عمي من الرضاعة يستأذن عليَّ فابيت ان آذن له علي حتى اسأل رسول الله ﷺ قالت فجاء رسول الله ﷺ قالت فجاء رسول الله ﷺ فسألته عن ذلك فقال انه عمك فأذني له قالت فقلت يارسول الله انما ارضعتني المرأة ولم ير ضعني الرجل فقال انه عمك فليلج عليك قالت عائشة وذلك بعد ما ضرب علينا الحجاب وقالت عائشة يحرم من الرضاعة ما يحرم من الولادة" (موطا امام مالک)

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میرا رضاعی چچا (جس کا نام افلح تھا) آیا، اس نے میرے پاس آنے کی اجازت طلب کی تو میں نے اجازت دینے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھ لوں، رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو میں نے یہ معاملہ آپ کے سامنے پیش کیا آپ نے فرمایا ہاں درست ہے وہ تمہارا چچا ہے، تم اسے (آنے کی) اجازت دے دو، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے عورت نے دودھ پلایا ہے، مرد نے تو دودھ نہیں پلایا۔ آپ نے فرمایا بیشک وہ تمہارا چچا ہے وہ تم پر داخل ہو سکتا ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں یہ واقعہ پردہ کا حکم آنے کے بعد کا ہے۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رضاعت سے وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو ولادت (نسب) سے حرام ہوتے ہیں۔

"وفي الحديث دليل على ان الفحل يحرم ويثبت الحرمة في جهة صاحب اللبن كما يثبت في جانب المرضعة"

حدیث پاک سے واضح ہوا کے مذکر کی طرف بھی حرمت ثابت ہو جاتی ہے کیونکہ اس کی وجہ سے دودھ عورت کو حاصل ہوا ہے، لہٰذا دودھ پینے والے بچے، بچی کا وہ شخص باپ بن جاتا ہے جس کی مجامعت کی وجہ سے عورت کو دودھ حاصل ہوا، اور عورت جو دودھ پلانے والی ہے وہ ماں بن جائے گی، اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے رضاعی چچا کو نسبی چچا والا حکم دیا، یعنی اس سے پردہ نہ کرایا جائے، کیونکہ دودھ مرد اور عورت دونوں کی طرف منسوب ہے۔ (حاشیہ موطا امام مالک)

اسی مسئلہ پر ایک اور حدیث پاک دیکھئے جس میں واضح طور پر ثابت ہے کہ دودھ کی وجہ سے حرمت مذکر کی طرف بھی منسوب ہے۔

☆ " مالک عن ابن شهاب عن عمرو بن الشريد ان عبد الله بن عباس سئل عن رجل كانت له امرأتان فارضعت احدهما غلاما و ارضعت الاخرى جارية فقيل له هل يتزوج الغلام الجارية فقال لا اللقاح واحد" (موطا امام مالک)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے سوال کیا گیا ایک شخص کی دو بیویاں ہیں، ان میں سے ایک نے ایک لڑکے کو دودھ پلایا ہے اور دوسری نے ایک لڑکی کو دودھ پلایا ہے، کیا اس لڑکے اور لڑکی کا آپس میں نکاح جائز ہے؟ آپ نے فرمایا یہ نکاح جائز نہیں کیونکہ ایک ہی مرد کا دودھ ہے۔

اس لحاظ پر لڑکے اور لڑکی کا رضاعی باپ ایک ہے، وہ دونوں رضاعی بہن اور بھائی بن گئے جن کا نکاح جائز نہیں۔

" اللقاح واحد بفتح اللام و القاف ماء الفحل والمعنى ان سبب العلوق واحد "

لقاح کا معنی مذکر کا نطفہ

رضاعت کے مسائل سمجھنے کے لئے ایک ضابطہ:

از جانب شیر دہ ہمہ خویش شوند — از جانب شیر خوار زوجان و فروع

دودھ پینے والے بچے پر پلانے والی عورت کے وہ تمام رشتے دار حرام ہوں گے جو نسب کی وجہ سے حرام ہیں۔

اس عورت کا خاوند، اس کے خاوند کا بھائی اور اس عورت کی اولاد، دودھ پینے والے بچے یا بچی پر حرام ہیں۔

دودھ پلانے والی عورت یا اس کے خاوند یا اس کی اولاد پر دودھ پینے والا بچہ یا بچی اور ان کی اولاد اور بچہ تھا تو اس کی زوجہ اگر بچی تھی تو اس کا خاوند صرف حرام ہوں گے۔

رضاعی بچے کے بہن، بھائی۔ چچا، ماموں، خالہ پھوپھی حرام نہیں ہوں گے۔

دودھ پلانے والی ماں کا احترام:

"عن ابی الطفیل الغنوی قال کنت جالسا مع النبی ﷺ اذا اقبلت امرأة فبسط ﷺ ردائه حتی قعدت علیه فلما ذهبت قیل هذه ارضعت النبی ﷺ"

(رواہ ابو داؤد، مشکوۃ باب المحرمات)

ابوالطفیل غنوی کہتے ہیں میں نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا جب ایک عورت آپ کے پاس آئی تو نبی کریم ﷺ نے اس کے لئے چادر بچھائی، یہاں تک کے وہ اس پر بیٹھ گئی، جب وہ عورت چلی گئی تو بتایا گیا کے اس عورت (حلیمہ سعدیہ) نے نبی کریم ﷺ کو دودھ پلایا تھا۔

"وعلی المولودله رزقهن و کسوتهن بالمعروف":

اور جس کا بچہ ہے اس پر لازم ہے عورتوں کا خرچ اور لباس شرع کے مطابق۔

یعنی بچے کی ماں جب تک زوجیت میں ہو اس وقت تک اسے خرچ دینا اور کپڑے دینا اس لئے لازم ہیں کہ یہ زوجیت کے حقوق میں سے ہے۔ اور عورت کو اگر طلاق دے دی گئی تو دوران عدت بھی خرچ اور کپڑے دینا لازم ہے، کیونکہ یہ اس کا شرعی حق ہے۔ ہاں اگر اس کی عدت گذر جائے تو وہ اجنبیہ ہو جاتی ہے، اسے خرچ یا کپڑے دینا اس وقت لازم ہوگا جبکہ اسے بچے کو دودھ پلانے پر مقرر کیا گیا ہو اور طے یہ کیا گیا ہو کے بطور اجرت اتنا خرچ اور کپڑے دیئے جائیں گے، اب وہ اجرت دینا لازم ہوگا، جیسا کے رب تعالیٰ نے فرمایا "فآتوهن اجورهن" "تو ان کو ان کا اجر دو۔

(از مظہری)

" المولود له " کا معنیٰ حاصل کرنے کے لئے علیحدہ علیحدہ لفظوں کو دیکھنا پڑے گا، الف لام موصول ہے بمعنیٰ الذی کے، اور " مولود "اسم مفعول کا صیغہ ہے " له "جار اور مجرور مل کر متعلق ہوئے " مولود " سے۔

اب معنیٰ واضح ہو گیا'' وہ جس کے لئے بچہ پیدا کیا گیا'' مراد اس سے باپ ہے، البتہ یہ مسئلہ سمجھ آ گیا کہ "اب "(باپ) ذکر نہیں کیا بلکہ " المولود له "ذکر کیا گیا۔

"ان السبب فیہ ان یعلم ان الوالدات انما ولدن الاولاد للآباء ولذلک ینسبون الیھم لا الی الامھات " (کشاف)

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ معلوم ہو جائے مائیں بچے ان کے باپوں کے لئے جنتی ہیں، اسی وجہ سے بچہ باپ کی طرف منسوب ہوتا ہے ماں کی طرف نہیں۔

مامون بن رشید کے لئے یہ شعر پڑھا گیا۔

وانما امھات الناس اوعیة　　　مستودعات وللآباء ابناء

بیشک لوگوں کی مائیں خزانہ ہیں۔ اور مقام ودیعت (امانت) ہیں، اور باپوں کے بیٹے ہیں۔

" المولد له " کہنے سے اور مسئلہ یہ سمجھ آیا کہ بچہ باپ سے لاحق ہوتا ہے، کیونکہ اس کے فراش پر پیدا ہوا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد یہ ہے "الولد للفراش "جس کا معنیٰ یہ ہے "اذاولدت المرأة الولد للرجل وعلی فراشه وجب علیه رعایه مصالحه " کہ عورت جب بچہ جنے اپنے خاوند کے لئے اور اس کے فراش پر تو اس شخص پر لازم ہے کہ بچے کی رعایت کرے اور اس کی مصلحت کا لحاظ کرے۔

حدیث پاک سے یہ ثابت کر دیا گیا کے نسب ثابت کرنے کے لئے صرف اتنا ثابت ہونا کافی ہے کہ یہ عورت فلاں کی منکوحہ ہے، لہٰذا اس عورت سے پیدا ہونے والا بچہ باپ کی طرف منسوب ہوگا۔

فائدہ:

حضرت ہارون علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہا "یا ابن ام " (اے میری ماں کے بیٹے) اس میں مفسرین کرام نے بیان کیا۔

ان المراد منه ان الام مسفقه على الولد،فكان الغرض من ذكر الام تذكير الشفقة"

بیشک مراد اس سے یہ ہے اور ثابت کرنا یہ مقصود تھا کہ ماں بچے پر شفقت کرنے والی ہے، یعنی "یاابن ام" کہنے کی غرض یہ تھی کہ ماں جب شفقت کرنے والی تو ماں کے بیٹے کو بھی بھائی پر شفقت کرنی چاہئے۔ (از کبیر)

"لہ" میں لام تخصیص کے لئے ،یعنی جس کا بچہ ہے خاص کر کے۔لام تخصیص سے یہ مسئلہ حل ہو گیا کہ بالغہ بٹی اور معذور بالغ بیٹے کا خرچ خاص کر کے باپ پر ہی لازم ہے ماں پر لازم نہیں ،جس طرح چھوٹی اولاد کا خرچ باپ پر لازم ہے ماں پر نہیں۔ (از مظھری)

"رزقهن وکسوتهن با لمعروف": ان کا خرچ اور لباس شرع کے مطابق۔

"(رزقهن)ای طعامهن (وکسوتهن)ای لباسهن(بالمعروف)ای علی المیسرة یعنی بلا اسراف ولا تقتیر"

"رزق" سے طعام یعنی خرچ اور "کسوة" سے مراد لباس "با لمعروف" سے مراد جو طاقت کے مطابق ہو، نہ اس میں کمی کرے اور نہ ہی زیادتی۔یعنی خاوند پر لازم ہے کہ وہ زوجہ کو خرچ اور لباس دے جو شریعت کے مطابق ہو۔ (از خازن و مدارک)

فائدہ:

رب تعالیٰ نے پہلے ماں کو حکم دیا کہ وہ بچے کو دودھ پلائے۔پھر باپ کو حکم دیا کہ وہ بچے کی حفاظت کے لئے دودھ پلانے کے لئے دایہ کا انتظام کرے۔اسی سے یہ واضح ہو گیا کہ بچہ باپ کی نسبت ماں کا زیادہ محتاج ہے،اس لئے کہ بچہ ماں کا براہ راست محتاج ہے اور باپ کا بالواسطہ، کیونکہ باپ دودھ پلانے والی سے دودھ پلوائے گا اور ماں خود دودھ پلائے گی۔

"وذلک یدل علی ان حق الام اکثر من حق الاب"

یہاں سے ہی ایک اور مسئلہ واضح ہوگیا کہ ماں کا حق اولاد پر بنسبت باپ کے زیادہ ہے۔

اس پر احادیث واضح طور پر دلالت کر رہی ہیں۔ تفصیل کے لئے پہلے پارہ " وبالوالدین احسانا " کے تحت مذکور بحث نجوم الفرقان کی دیکھئے۔

اور یہ واضح ہوا کہ ماں کو اولاد پر شفقت حاصل ہے، وہ بچے کو شفقت کی وجہ سے دودھ پلاتی ہے اور دودھ نہیں پلا رہی تو کوئی عذر ہوگا، لہٰذا اس پر لازم نہیں کہ وہ دودھ پلائے، ہاں اگر دودھ پلائے تو اجرت نہیں لے سکتی کیونکہ اس کا حق بھی ہے کہ بچے کی رعایت کرے اور اس کی مصلحت کا لحاظ کرے۔ (از کبیر و تفسیرات احمدیہ)

"لا تکلف نفس الا وسعها": نہ تکلیف دی جائے سوائے اس کی طاقت کے۔

تکلیف کا معنی ہے " الزام " جیسے کہا جاتا " کلفه الامر فتکلف " اس پر حکم کو لازم کیا تو اس نے لزوم کو قبول کرلیا۔ اصل میں "الکلف" کا معنی ہے چہرے پر سیاہ اثرات کا آنا۔ چونکہ کوئی کام جب کسی پر لازم کیا جائے تو وہ اسے مشکل سمجھتا ہے اور اس کے چہرے پر مشکل کی وجہ سے آثار نمودار ہوتے ہیں، جس سے پتہ چل جاتا ہے کہ اس شخص نے اس کام کو مشکل سمجھا ہے۔

" وسعت " کا معنی طاقت، اور " وسعت " کو قدرت کے درجہ میں بھی رکھا جاتا ہے، اسی لئے کہا جاتا ہے " الوسع فوق الطاقة " وسعت طاقت سے زائد درجہ رکھتی ہے۔ (از کبیر)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

لفظ " نفس " بطور لفظ مونث سماعی ہے، لیکن معنوی طور پر یہ مذکر اور مونث دونوں پر بولا جاتا ہے۔ یہاں حکم مذکر کو ہے، یعنی بچے کے باپ کو جو ماقبل حکم کی وضاحت کر رہا ہے۔

" والمعنى ان ابا الولد لا يكلف فى الانفاق عليه و على امه الا قدر ما تتسع به مقدرته ولايبلغ اسراف القدرة" (خازن)

معنی یہ ہے کہ بچے کہ باپ کو خرچ کرنے میں طاقت سے زائد تکلیف نہ دی جائے بلکہ وہ اپنی طاقت کے مطابق بچے اور اس کی ماں پر خرچ کرے، اتنا خرچ بھی نہ ہو کہ حد سے بڑھ جائے اور اتنا خرچ بھی نہ ہو کہ پورا ہی نہ ہو سکے۔

"لا تضار والدة بولدها ولا مولود له بولده:

نہ ضرر دیا جائے ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے اور نہ (ضرر دیا جائے) باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے۔

طلباء کرام توجہ فرمائیں:

" لا تضار" میں دو قرأتیں ہیں، ایک راء کے کسرہ سے معروف کا صیغہ اور ایک راء کے فتحہ سے فعل مجہول کا صیغہ۔ مشہور فعل مجہول ہی ہے، اسی کی مطابق تمام مترجمین کا ترجمہ ہے، فعل معروف کے مطابق ترجمہ اس طرح ہوگا "نہ ضرر دے ماں اپنے بچے کی وجہ سے، اور نہ ضرر دے باپ اپنے بچے کی وجہ سے"۔

ماں کو ضرر نہ دیا جائے بچے کی وجہ سے:

یعنی ماں بچے کو دودھ پلانے پر راضی ہو جائے تو اس سے بچہ لے کر کسی اور کو نہ دیا جائے، ورنہ ماں کو ضرر پہنچانا لازم آئے گا اور ماں دودھ پلانے پر راضی نہیں تو ماں پر دودھ پلانے کے لئے جبر نہ کیا جائے کیونکہ اس پر دودھ پلانا واجب نہیں، ہاں اگر بچہ کسی اور عورت کا دودھ قبول ہی نہیں کرتا، یا کوئی اور دایہ ملتی نہیں یا باپ کسی دایہ کو اجرت دینے کی طاقت نہیں رکھتا تو ماں پر دودھ پلانا واجب ہو جاتا ہے۔

باپ کو ضرر نہ دیا جائے بچے کی وجہ سے:

ماں بچے کو باپ کے سپرد نہ کر دے، کیونکہ چھوٹے بچے کی تربیت جس طرح ماں کر سکتی ہے اس طرح باپ نہیں کر سکتا، اور اسی طرح بچے کی ماں جو حالت نکاح میں ہو اسے طاقت سے زیادہ خرچ دینا بچے کی وجہ سے لازم نہیں۔

اور اگر طلاق دی گئی ہو تو باقی عورتوں سے ماں زیادہ اجرت طلب کرے تو باپ پر لازم نہیں کہ وہ بچہ ماں کے سپرد ہی کرے۔ ورنہ باپ کو ضرر دینا لازم آئے گا۔

تنبیہ:

فعل معروف سے بھی یہی مطالب مراد ہوں گے کہ ماں بچے کی وجہ سے باپ کو ضرر نہ دے کہ اس پر جو واجب نہیں اس کا مطالبہ کرے، اور باپ بچے کی وجہ سے ماں کو ضرر نہ دے کہ جو چیز اس پر واجب نہیں اس کا مطالبہ کرے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ صیغہ فعل معروف کا ہی ہو لیکن " بو لدھا" اور " بو لدہ" میں باء سببیہ نہ ہو بلکہ زائدہ ہو تو اب یہ معنی ہوگا" ماں بچے کو ضرر نہ دے اور باپ بچے کو ضرر نہ دے۔

ماں بچے کو دودھ نہ پلائے بچہ مر جائے تو ماں نے بچے کو ضرر پہنچایا، باپ بچے پر اور دودھ پلانے والی پر خرچ نہ کرے تو باپ نے بچے کو ضرر پہنچایا، والدین کو ضرر دینے سے منع کیا گیا۔ (از خازن)

دودھ طبیعتوں کو بدل دیتا ہے:

" الرضاع یغیر الطباع"

اسی وجہ سے ایک مرتبہ شیخ ابن محمد جوینی اپنے گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ان کا بیٹا (امام) ابو المعالی اپنی ماں کے بغیر کسی اور عورت کا دودھ پی رہا ہے، تو آپ نے بچے کو اس سے ہٹایا اور اس کے سر کو الٹا کیا اور اس کے پیٹ کو ملا اور اس کے منہ میں انگلی ڈالی، یہی فعل آپ کرتے رہے تا کہ اس کا دودھ نکل جائے اور ساتھ ساتھ یہ کہہ رہے تھے۔

" یسھل علی مو تہ ولا تفسد طباعہ بشرب لبن غیر امہ"

کہ مجھ پر بچے کا مر جانا آسان ہے لیکن بچے کی طبیعت نہ فاسد ہو اپنی ماں کے بغیر (گھٹیا خاندان کی) عورت کا دودھ پینے سے۔

وہی بچہ بڑا ہو کر جب علامہ اور امام بن گیا تو ایک مناظرہ میں اسے مشکل درپیش آئی تو باپ نے کہا یہ اسی دودھ کا اثر ہے جو پیٹ میں کچھ نہ کچھ رہ گیا تھا۔ (روح البیان)

• اس لئے ضروری ہے کہ بچے کو اگر کسی دایہ سے دودھ پلانا ہو تو وہ نیک سیرت ہو، اچھے خاندان کی ہو، تا کہ بچے پر اچھے اثرات مرتب ہوں، اسی سے واضح ہوا کہ جیسی ماں ہوگی ایسی اولاد ہوگی" الا ما شاء اللہ "کبھی نیک والدین کی اولاد بری اور کبھی برے والدین کی اولاد نیک بھی ہو سکتی ہے۔

"وعلی الوارث مثل ذلک": اور وارث پر مثل اس کے۔

یعنی بچے کا باپ جب فوت ہو جائے تو اس کے وارث پر لازم ہے اسی کے مثل جو اس کے باپ پر لازم تھا کہ وہ بچے اور دودھ پلانے والی کو خرچ اور لباس دے۔

وارث ہمارے نزدیک ہر ذی رحم محرم ہے کیونکہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ہے۔

" وعلی الوارث ذی الرحم المحرم" اور وارث ذی رحم محرم پر مثل اسی کے۔

اور یہ ضابطہ بھی دینی مدارس میں پڑھنے والے طلباء کرام سے مخفی نہیں کہ وہ قرأت جو خبر واحد سے ثابت ہو اگر چہ اسے نماز وغیرہ میں تو نہیں پڑھا جا سکتا لیکن حکم ثابت کرنے کے لئے اسے بطور تائید پیش کیا جا سکتا ہے۔

(مدارک)

مقام توجہ:

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے " وعلی الوارث مثل ذلک "کا ترجمہ کیا ہے۔

''اور جو باپ کا قائم مقام ہے اس پر بھی ایسا ہی واجب ہے''

آپ کا یہ ترجمہ خازن کی اس عبارت سے لیا گیا ہے۔

" فیلزم وارث الاب ان یقوم مقامه فی القیام بحق الوالد"

باپ کے وارث پر لازم ہے کہ بچے کے حقوق کو پورا کرنے میں وہ اس کے قائم مقام ہو۔

”فان ارادافصالا عن تراض منهما وتشاور فلاجناح علیھما“:

پھر اگر ارادہ کریں دونوں (ماں باپ) دودھ چھڑانے کا آپس میں رضا مندی اور مشورہ سے تو کوئی گناہ نہیں ان دونوں پر۔

یعنی اگر دو سال سے پہلے ماں باپ بچے کا دودھ چھڑانا چاہیں تو آپس میں اتفاق کرلیں تا کہ ان کا نزاع بچے کے لئے نقصان دہ ثابت نہ ہو۔ خصوصاً میاں بیوی کے معمولی نزاع کو خاندان کے لوگ جب زیادہ ہوا دے کر فساد پھیلانے کی تاک میں ہوں تو ضروری ہے کہ آپس میں رضاء مندی سے اور اتفاق سے طے کرلیا جائے کہ دودھ چھڑا لیا جائے اگر چہ دودھ چھڑانے کی مدت ابھی نہیں آئی۔

پھر وہ اہل علم سے مشورہ بھی کرلیں اس معاملہ میں، اگر وہ کہیں کہ دو سال کی مدت سے پہلے دودھ چھڑانے میں بچے کا کوئی نقصان نہیں تو دودھ چھڑا لیں، مشورہ کرنے کا یہ فائدہ ہوگا کہ بہتر رائے سامنے آئے گی۔

جب دو سال سے پہلے دودھ چھڑانے میں بچے کو ضرر نہ ہو اور والدین آپس میں رضاء مند بھی ہوں اور سمجھدار مرد اور عورتوں سے مشورہ بھی کرلیا جائے تو والدین پر کوئی حرج نہیں اور کوئی گناہ نہیں کہ وہ دودھ چھڑائیں۔
(از خازن)

”وان اردتم ان تسترضعوا اولادکم فلاجناح علیکم اذا سلمتم ما آتیتم بالمعروف“:

اور اگر ارادہ کرو تم دودھ پلواؤ (دایوں سے) اپنے اولاد کو تو کوئی گناہ نہیں تم پر جب سپرد کردو ان کے ”وہ چیز جو تم نے ان کو دینی تھی“ بھلائی کے طریقہ سے۔

” استرضع“ منقول ہے ”ارضع “ سے اس لئے یہ بھی متعدی بدو مفعول ہوتا ہے، جیسا ارضع کے دو مفعول ہوتے ہیں۔ لہٰذا مطلب یہ ہوا۔

”وان اردتم ان تسترضوا المراضع اولادکم “اور اگر تم ارادہ کرو کہ دائیوں سے تم دودھ پلواؤ۔
(مدارک)

دائیوں سے بچوں کو دودھ پلوانے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کبھی ماں بچے کو دودھ پلانے سے انکار کردیتی ہے، کبھی ماں کو کوئی عذر لاحق ہوتا ہے جس کی وجہ سے ماں بچے کو دودھ پلا نہیں سکتی اور کبھی اور مقاصد پیش نظر ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ایک شہر کی آب وہوا اچھی نہ ہو اور دوسرے شہر کی آب وہوا اچھی ہو، اس لئے دوسرے شہر کی عورت سے بچے کی پرورش کرائی جائے، یا دوسرے شہر کی زبان اچھی فصیح ہو اس لئے وہاں بچے کو بھیجا جائے۔ تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ دوسری عورتوں سے دودھ پلوایا جائے۔ البتہ یہ شرط ہے کہ ان دائیوں سے جو اجرت مقرر کی تھی وہ بھلائی کے طریقہ سے دے دے۔

خیال رہے کہ " ما آتیتم "کا معنی ہے " **ما اردتم ایتا ہ من الاجرۃ**" جو ارادہ کیا تم نے اجرت دینے کا۔ (مدارک)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے "جبکہ جو دینا ٹھہرا تھا" راقم نے بھی یہی نقل کیا ہے صرف الفاظ مختلف ہیں "وہ چیز جو تم نے ان کو دینی تھی"

" **با لمعروف**" بھلائی کے طریقہ سے ان کے سپرد کردو، بھلائی کے طریقہ سے مراد یہ ہے کہ خوشی اور سرور سے دائیوں کو اجرت دے دو، اجرت میں کمی نہ کرو، اجرت دیتے ہوئے اچھا کلام بھی کرو، اور اجرت دینے میں تاخیر نہ کرو، ٹال مٹول سے کام نہ لو۔ (از مدارک و خازن)

"واتقوا اللہ": اور اللہ سے ڈرو۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے تم پر تمہاری بیویوں اور اولاد کے جو حقوق مقرر فرمائے ہیں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے پورا کرو، ان کو پورا کرنے میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی نہ کرو۔

"واعلموا ان اللہ بما تعملون بصیر":

اور جان رکھو بیشک اللہ جو تم عمل کرتے ہو دیکھ رہا ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ پر تمہارے کوئی اعمال بھی پوشیدہ نہیں، وہ انہیں دیکھ رہا ہے، اور جانتا ہے خواہ وہ تمہارے اعمال ظاہر ہوں یا پوشیدہ ہوں۔

ان الفاظ مبارکہ میں وعدہ بھی ہے اور وعید بھی۔ مطلب یہ ہے کہ وہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔ تمہیں تمہارے اعمال کے مطابق جزا دے گا، اگر تم نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کی تو اللہ تعالیٰ تمہیں ثواب عطاء فرمائے گا یہ وعدہ ہے۔ اور اگر تم نے اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف کام کیا تو وہ تمہیں عذاب دے گا، یہ وعید ہے۔

(از خازن وروح البیان)

آیۃ کریمہ سے حاصل ہونے والے فوائد:

رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی "لَاتُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا" ماں کو اولاد کی وجہ سے ضرر نہ پہنچایا جائے۔

یعنی ماں (مطلقہ) جب دودھ پلانے پر اتنی مقدار میں اجرت لینے پر رضامند ہو جائے جتنی مقدار میں دوسری دایہ لیتی ہیں تو اولاد کا باپ وہ بچہ کسی اور دایہ کو دودھ پلانے کے لئے دے کر ماں کو ضرر نہ پہنچائے۔ کیونکہ رب تعالیٰ نے فرمایا "فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَکُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ" اگر وہ (مائیں) تمہارے لئے (تمہارے بچے کو) دودھ پلائیں تو ان کو ان کی اجرت دے دو۔

"وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗ اُخْرٰی" اور اگر تمہیں مشکل در پیش آئے تو دودھ پلانے والی اور (دایہ) طلب کر لو۔

یعنی ماں کا دودھ پلانے کا حق ختم تو نہیں ہوگا سوائے مشکل در پیش آنے کے۔ مشکل در پیش آنے کا یہ مطلب ہے کہ ماں بنسبت دوسری دایہ کے زیادہ اجرت طلب کرے یا دودھ پلانے سے ہی انکار کر دے۔

اور احتمال یہ بھی ہے کہ جب ماں دودھ پلانے سے انکار کر دے تو اس سے بچہ چھین نہ لیا جائے بلکہ دایہ طلب کی جائے جو بچے کو ماں کے پاس رکھ کر ہی دودھ پلائے۔

تو آیہ کریمہ سے دو فائدے حاصل ہوئے ایک یہ کہ جب ماں مناسب مقدار میں کپڑے اور رزق بطور اجرت لینے پر رضامند ہو جائے تو اس سے بچہ لے کر کسی اور کو دودھ پلانے پر مقرر کرنا منع ہے، کیونکہ اس سے ماں کو ضرر پہنچانا لازم آئے گا۔

دوسرا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ اگر ماں دودھ پلانے سے انکار بھی کردے تو پھر بھی بچہ اس سے مکمل طور پر دور نہ کیا جائے بلکہ دایہ کو مقرر کرلیا جائے جو بچے کی ماں کے پاس رہ کر پرورش کرے، ورنہ ماں کو ضرر پہنچانا لازم آئے گا۔

طلاق کی صورت میں بچے کی پرورش کا حق کسے دیا جائے:

بچہ جب تک چھوٹا ہو یعنی سات سال تک اس کی پرورش کا حق اس کی ماں کو حاصل رہے گا، اگرچہ وہ دو سال پر دودھ پینے کا محتاج نہیں رہتا لیکن ماں کی پرورش کا وہ اسی طرح محتاج ہے جس طرح وہ دودھ پینے کی مدت میں محتاج تھا۔ ماں چونکہ بہت زیادہ شفقت کرتی ہے وہ اس بچے کی پرورش محبت سے کرے گی، اس لئے جب تک وہ اکیلے کھا پی نہ سکے اور اکیلے وضوء نہ کرسکے اس وقت تک وہ ماں کے زیر پرورش رہے گا۔

بچی کو جب تک حیض نہ آئے یعنی بالغہ نہ ہو اس وقت تک وہ ماں کے پاس رہے، کیونکہ وہ امور خانہ داری اور ایسے معاملات جو عورتوں سے متعلق ہوتے ہیں وہ ماں سے ہی سیکھ سکتی ہے۔ باپ سے نہیں سیکھ سکتی۔ اس لئے بلوغ کی مدت تک ماں کے پاس رہے۔

بچہ جب سات سال کا ہو جائے وہ تعلیم و تربیت کا محتاج ہوتا ہے، تعلیم و تربیت کا خیال جس طرح باپ کرسکتا ہے اس طرح ماں نہیں کرسکتی، اس حال میں ماں کے سپرد کرنا بچے کا نقصان ہے، بچے کو ضرر پہنچانے سے بچانا بھی ضروری ہے۔

سات سال کا استدلال حدیث پاک سے:

☆ "قال النبی ﷺ مروھم بالصلوۃ بسبع واضربوھم علیھا لعشر وفرقوا بینھم فی المضاجع"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا اپنے بچوں کو نماز کا حکم دو جب وہ سات سال کے ہو جائیں اور جب وہ دس سال کے ہو جائیں تو ان کو مارو۔ (یعنی نماز نہ پڑھنے پر ان کی سرزنش کرو) اور ان کے لیٹنے کے مقام علیحدہ علیحدہ کردو۔ (یعنی جب دس سال کے بچے ہو جائیں تو بہن بھائی ملکر ایک چارپائی، ایک بستر پر نہ سوئیں)۔

اسی سے واضح ہوگیا کہ سات سال کی عمر میں نماز کا حکم دینا تعلیم و تادیب کے لئے ہے تاکہ ان کو نماز ادا کرنے کی عادت پڑ جائے۔لہٰذا بچہ اس عمر میں ہر قسم کی تعلیم و تربیت کا محتاج ہے۔لہٰذا اس عمر میں بچے کو ماں باپ کے حوالے کردیا جائے۔

لیکن بچی بالغہ ہونے تک تعلیم و تربیت میں ماں کی زیادہ محتاج ہے،اس لئے بلوغ کی مدت تک وہ ماں کے پاس رہے گی،بلوغ کے بعد وہ حفاظت کے محتاج ہے،اس کی حفاظت زیادہ طور پر باپ ہی کرسکتا ہے،اس لئے بچی کو بلوغ کے بعد باپ کے حوالے کردیا جائے۔

☆ "روی عن علی کرم اللہ وجهه و ابن عباس رضی اللہ عنهما ان علیا اختصم هو و زید بن حارثة و جعفر بن ابی طالب فی بنت حمزه و کانت خالتها تحت جعفر فقال النبی ﷺ ادفعوها الی خالتها فان الخالة والدة"

حضرت علی اور حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہم) سے مروی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور زید بن حارثہ اور جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کی پرورش میں ایک دوسرے سے اختلاف کیا (ایک کہتا میرا حق ہے،دوسرا کہتا میرا حق ہے اور تیسرا کہتا میرا حق ہے) اس بچی کی خالہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی زوجہ تھی،تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہ بچی اس کی خالہ کے حوالے کردو،کیونکہ خالہ بھی ماں ہی ہے۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ بچے کی پرورش کا حق ماں کو دیا جاتا ہے کیونکہ ماں زیادہ شفقت کرتی ہے،اسی شفقت کی پیش نظر نبی کریم ﷺ سے بنت حمزہ کی ماں نہ ہونے پر اس کی خالہ کو حق دیا کہ خالہ بھی ماں کی طرح ہی شفقت کرتی ہے۔

اسی سے واضح ہوا کہ بچے کی پرورش کا حق ذی رحم محرم کو دیا جائے گا۔جس میں شفقت زیادہ ہوگی،اسے ہی حق دیا جائے گا۔نانی کا حق دادی سے مقدم ہوگا۔خالہ کا حق پھوپھی سے مقدم ہوگا کیونکہ نانی اور خالہ میں بنسبت دادی اور پھوپھی زیادہ شفقت پائی جاتی ہے۔

☆ "عن عبداللہ بن عمران امرأة جاء ت بابن لهاالی النبی ﷺ فقالت یارسول اللہ حین کان بطنی له وعاء وثديي له سقاء وحجری له حواء ارادابوه ان ينتزعه منی فقالت انت احق به مالم تتزوجی"

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک ایک عورت اپنے بیٹے کو ساتھ لئے ہوئے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کرنے لگی یارسول اللہ! میرا پیٹ اس میرے بیٹے کے لئے ایک برتن کی حیثیت رکھتا ہے، اور میرے پستان اس کے لئے پینے کا ذریعہ ہیں، اور میری گود اس کی حفاظت گاہ ہے، لیکن اس کا باپ مجھ سے یہ چھیننا چاہتا ہے، تو آپ نے فرمایا کہ تیرا زیادہ حق ہے جب تک تو اور نکاح نہ کر لے۔

اس سے اور یہ واضح ہو گیا کہ جب عورت دوسری شادی کر لے تو اس کی شفقت پہلے بچے سے کم ہو جاتی ہے اور بعض اوقات دوسرا خاوند بچے کی تربیت کامل طور پر نہیں کرنے دیتا، ایسی صورت میں بچہ سات سال سے کم بھی ہو تو ماں سے لے کر اس کی نانی وغیرہ کو دے دیا جائے۔ اصل مقصد بچے کی پرورش اچھی طرح کرنی ہے، وہ جس طرح حاصل ہو اس کو شریعت نے مدنظر رکھا۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب:

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بچے کو اختیار دیا جائے گا وہ ماں کے پاس رہنا چاہے تو اس کی ماں کو پرورش کا حق دیا جائے اور اگر وہ باپ کے پاس رہنا چاہے تو باپ کو حق دیا جائے۔ وہ اپنے موقف پر یہ حدیث پیش کرتے ہیں۔

☆ "عن ابی هريرة ان رسول اللہ ﷺ خير غلامابين ابويه فقال له اختر ايهماشئت"

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے ایک لڑکے کو اختیار دیا کہ تو اپنے ماں باپ میں سے جسے چاہے پسند کر لے (اور اسی کے پاس رہ)۔

☆ "وروی عبدالرحمن بن غنم قال شهدت عمربن الخطاب خير صبيابين ابويه"

عبدالرحمٰن بن غنم فرماتے ہیں کہ میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر تھا کہ آپ نے ایک بچے کو اختیار دیا کہ تو اپنے والدین میں سے چاہے پسند کر لے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا شاندار محاکمہ:

آپ فرماتے ہیں کہ جس بچے کو نبی کریم ﷺ نے اختیار دیا تھا وہ بالغ تھا، کبھی بالغ کو غلام (بچہ) بھی کہا جاتا ہے۔

یعنی اصل مسئلہ یہ ہے کہ جب بچہ بالغ ہو تو وہ خود مختار ہے، اس لئے اسے اختیار دے دیا جائے گا تو وہ ماں کے پاس رہنا پسند کرے اور چاہے تو باپ کے پاس رہے۔

نابالغ بچے کے لئے وہی قانون ہے جو ذکر کر دیا گیا ہے کہ اسے اختیار نہیں دیا جائے گا بلکہ وہ سات سال کی عمر تک ماں کے زیر پرورش رہے گا اور اس کے بعد باپ کی زیر پرورش۔

اس پر ایک حدیث پاک شاہد ہے کہ اختیار بالغ کو دیا جاتا ہے نابالغ کو اختیار نہیں دیا جاتا۔

☆ "عن علی انه خير غلاما وقال لوقدبلغ هذايعنى اخاله صغير الخيرته"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک بچے کو اختیار دینے کا ارادہ فرمایا لیکن فرمایا اگر یہ بالغ ہوتا تو میں اسے اختیار دیتا لیکن میرے خیال میں یہ نابالغ ہے۔ (از احکام القرآن للجصاص)

اس حدیث پاک سے امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب روز روشن کی طرح واضح نکھر کر سامنے آ گیا۔

اسلام کے سنہری اصول لیکن معاشرے کا بگاڑ:

آج جب ہم اپنے معاشرے کو دیکھتے ہیں تو صاحب علم بھی ایک مرتبہ سوچ کی گردش میں آ جاتا ہے کہ ماں نے بچے کو پیٹ میں اٹھانے کی تکالیف برداشت کیں، اور بچے کی پیدائش میں بہت بڑی تکالیف اٹھائی ہیں تو بچے کو سات سال کے بعد ماں سے جدا کر لینا کیا انصاف ہے؟

یہ ساری سوچ کی خرابی اسلام کے سنہری اصولوں اور معاشرہ کے بگاڑ پر نظر نہ کرنے کی وجہ سے ہے۔ اصل

میں یہ جاہلانہ رسم ورواج ہے کہ جب عورت کوطلاق دے دی جاتی ہے تو دونوں خاندانوں کاایک دوسرے سے تعلق ختم ہو جاتا ہے، حالانکہ صحابہ کرام کے زمانہ میں خاندانوں کا تعلق نہیں ٹوٹتا تھا بلکہ صرف میاں بیوی کا تعلق ازدواجی ٹوٹتا تھا۔

ذرا غور تو کریں کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دی لیکن نبی کریم ﷺ کے نکاح کا پیغام حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے پاس لے جانے والے بھی حضرت زید رضی اللہ عنہ ہی تھے۔

اسی طرح بچہ ماں کے پاس ہو تو باپ کو نہ ملنے دیا جائے اور باپ کے پاس ہو تو ماں کو نہ ملنے دیا جائے یہ بھی معاشرہ کی خرابی ہے۔

آیئے ذرا معاشرہ کی اس خرابی کو دور کر کے دیکھیں کہ بچہ ماں کے پاس ہو تو باپ کو بھی ملتا رہے اور باپ کے پاس ہو تو ماں کو بھی ملتا رہے۔ پھر سات سال تک ماں پرورش کرے اس کے بعد باپ پرورش کرے، اب اسلام کے اس سنہری ضابطہ کا اندازہ لگائیں کہ بچے کی پرورش کتنے احسن انداز سے ہوگی اور بچے کو ماں اور باپ دونوں کی شفقت بھی حاصل رہے گی۔

مقام افسوس یہ ہے کہ معاشرہ کی خرابیوں کو دور نہیں کیا جاتا اور نہ ہی خرابیوں کو خرابیاں سمجھا جاتا ہے لیکن اپنی جہالت وحماقت سے اعتراض رب تعالیٰ کے عطاء کردہ سنہری اصولوں پر۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسا کہ سورج اور چاند کو دیکھ کر کتے کا بھونکنا۔

☆☆☆☆☆

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ☆ (سورۃالبقرہ آیت ۲۳۴)

﴿۱﴾

اورتم میں جو مریں اور بیبیاں چھوڑیں وہ چار مہینے دس دن اپنے آپ کو روکے رہیں تو جب ان کی عدت پوری ہو جائے تو اے والیو! تم پر مواخذہ نہیں اس کام میں جو عورتیں اپنے معاملہ میں موافق شرع کریں اور اللہ کو تمہارے کاموں کی خبر ہے۔

﴿۲﴾

اور جو لوگ فوت ہو جائیں تم میں سے اور چھوڑ جائیں اپنی بیویاں تو وہ (بیویاں) روک رکھیں اپنے آپ کو چار مہینے دس دن، پھر جب وہ پہنچ جائیں اپنی مقرر مدت کو (یعنی عدت پوری کرلیں) تو گناہ نہیں تم پر جو وہ (بیویاں) کریں اپنے نفسوں کے معاملہ میں شرع کے مطابق اور اللہ جو تم کرتے ہو ان پر خبر دار ہے۔

ماقبل سے تعلق:

جب پہلے طلاق کی عدت کو ذکر فرمایا پھر مدت رضاعت کو بیان فرمایا تو ساتھ ہی عدت وفات کا ذکر فرمادیا تاکہ یہ وہم نہ ہو کہ عدت وفات بھی وہی ہے جو عدت طلاق ہے۔ (قرطبی)

شانِ نزول:

پہلے اس عورت کی عدت جس کا خاوند فوت ہو جائے ایک سال تھی جس کا ذکر آگے قریب ہی آرہا ہے اس

آیۃ کو نازل فرما کر اس حکم کو منسوخ کر دیا۔یعنی اس آیۃ کریمہ کو دوسری آیۃ کے منسوخ کرنے کے لئے نازل کیا۔

اب حکم یہ ہے کہ جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت چار ماہ دس دن ہے۔البتہ وہ حاملہ نہ ہو، حاملہ عورت کی عدت ہر حال میں وضع حمل (پیدائش) ہے۔بچے کی پیدائش کے بعد حاملہ عورت کی عدت ختم ہو جاتی ہے خواہ اسے طلاق دی گئی ہو یا اس کا خاوند فوت ہو گیا ہو۔

اس مسئلہ پر کئی احادیث شاہد ہیں کہ جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے اور وہ حاملہ ہو تو اس کی عدت وضع حمل ہے۔

☆ "قال ابن مسعود من شاء باهلته ان سورة النساء القصری یعنی سورة الطلاق نزلت بعد سورة النساء الطولی یعنی سورة البقرة"

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سورۃ طلاق جسے سورۃ النساء القصری بھی کہا گیا ہے وہ سورۃ البقرۃ کے بعد نازل ہوئی جسے سورۃ النساء الطولی بھی کہا گیا ہے۔

سورۃ بقرۃ میں مطلقاً ذکر ہے کہ جن عورتوں کے خاوند فوت ہو جائیں ان کی عدت چار ماہ دس دن ہے۔جس سے بظاہر پتہ چلتا ہے کہ خواہ عورت حاملہ ہو یا نہ ہو، خاوند کے فوت ہونے پر وہ اپنی عدت چار ماہ دس دن مکمل کرے، لیکن سورۃ طلاق بعد میں نازل ہوئی جس میں ذکر ہے "وَاُولَاتِ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ" حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس مسئلہ میں میرے ساتھ اگر کوئی مباہلہ کرنا چاہے تو میں مباہلہ کرنے کے لئے بھی تیار ہوں۔ (مظهری)

☆ "عن سبیعة الاسلمی انها کانت تحت سعد بن خولة وهو من بنی عامر بن لؤی و کان ممن شهد بدرا فتوفی عنها فی حجة الوداع وهی حامل فلم تلبث ان وضعت حملها بعد وفاته فلما تعلت من نفاسها تجملت للخطاب فدخل علیها ابو السنابل بن بعکک رجل من بن عبد الدار فقال مالی اراک تجملت للخطاب لعلک ترجین النکاح و انک واللہ ما انت بناکح حتی تمر علیک اربعة اشهر و عشر قالت سبیعة فلما قال لی

ذلک جمعت علی ثیابی حین امسیت واتیت رسول اللہ ﷺ فسألته عن ذلک فافتانی بانی قدحللت حین وضعت حملی وأمرنی بالتزویج ان بدالی" (بخاری ومسلم حازن)

سبیعہ اسلمی سے مروی ہے جوکہ بنی عامر ابن لوی کے ایک شخص سعد بن خولہ کی زوجیت میں تھیں، وہ بدر میں بھی حاضر ہوئے تھے، حجۃ الوداع میں وہ فوت ہوگئے، یہ حاملہ تھیں، زیادہ وقت نہ گذرا کہ ان کے بچے کی پیدائش ہوگئی، جب یہ نفاس سے فارغ ہوگئی تو انہوں نے خطبہ کے لئے زیب وزینت کی، ان کے پاس ابوالسنابل آئے جوکہ بنی عبدالدار سے تھے، وہ کہنے لگے میں تمہاری زیب وزینت کو خطبہ کے لئے کیوں دیکھ رہا ہوں، کیا تم نکاح کرنے کا ارادہ رکھتی ہو؟ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی بیشک تم نکاح نہیں کرسکتی جب تک تم پر چار ماہ دس دن نہ گذر جائیں۔ سبیعہ کہتی ہیں انہوں نے جب مجھے یہ کہا تو میں نے شام کے وقت اپنے کپڑوں کو سمیٹا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ آپ سے سوال کیا تو آپ نے مجھے یہ فتویٰ دیا کہ تم بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی حلال ہوچکی ہو (یعنی تمہاری عدت ختم ہوچکی ہے) اور مجھے آپ نے حکم دیا کہ اگر تم نکاح کرنا چاہتی ہو تو نکاح کرلو۔ (حازن)

☆ "عن ابن عباس وروی عن عمر انه قال لو وضعت وزوجها علی السریر حلت"
(رواہ مالک والشافعی وابن ابی شیبۃ)

حضرت ابن عباس فرماتے کہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہم) فرماتے تھے کہ عورت کا جب بچہ پیدا ہو جائے اور اس کا خاوند ابھی تک چارپائی پر ہی ہو تو وہ حلال ہو جاتی ہے۔

یعنی ایک شخص فوت ہو جائے اور اس کے بعد اس کا بچہ، بچی پیدا ہو جائے تو اس کی عورت کی عدت ختم ہو جاتی ہے خواہ ابھی تک اس شخص کو دفن بھی نہ کیا گیا ہو۔ (مظہری)

"وعلیه انعقد الاجماع" اس مسئلہ پر امت کے مجتہدین ارباب علم کا اجماع ہے۔

"وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ" اور وہ لوگ جو تم سے فوت ہو جائیں۔

"اصل التوفی اخذ الشئ وافیا" اصل معنی توفی کا کسی چیز کو مکمل طور پر لے لینا۔

"فمن مات فقداستوفی عمرہ کاملاویقال توفی فلان یعنی قبض واخذ"

جب کوئی شخص فوت ہو جائے تو وہ اپنی عمر کو کامل طور پر پالیتا ہے تو اس کے لئے **توفی** کالفظ استعمال کرلیا جاتا ہے۔ (خازن)

طلبائے کرام یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ "توفی" کا حقیقی معنی مکمل طور پر پالینا، تکمیل کرنا، اور اس کا مجازی معنی "فوت ہونا" ہے۔

طلبائے کرام کو یہ بات ذہن نشین کرلینے کا مشورہ اس لئے دیا ہے کہ تیسرے پارہ میں "وَاِذْقَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسٰی اِنِّی مُتَوَفِّیْکَ" آیۂ کریمہ انہیں سمجھ آجائے۔

"وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا" اور وہ چھوڑ جائیں بیویاں۔

"یذرون" کا معنی ہے "یترکون" وہ چھوڑ جائیں۔ اور "ازواجا" سے مراد بیویاں ہیں۔ کیونکہ عرب حضرات "زوج" کا اطلاق مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے ہی کرتے رہتے ہیں۔

"يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا"

وہ روک کر رکھیں اپنے نفسوں کو چار ماہ دس دن۔

"یتربصن" کا معنی ہے "ینتظرن" وہ انتظار کریں۔ یعنی عدت کے ختم ہونے کا انتظار کریں اور اپنے آپ کو زیب و زینت سے روک کر رکھیں۔ (خازن)

مسئلہ: لونڈیوں کی عدت خاوند کی وفات پر دو ماہ پانچ دن ہے۔ یعنی ان کی عدت سوائے وضع حمل کے بنسبت آزاد عورتوں کے نصف ہوتی ہے۔ اس لئے ان کی دو حیض ہوتی ہے، کیونکہ ایک حیض کے نصف کا شرع میں کوئی اعتبار نہیں۔ اور حیض نہ آنے کی صورت میں آزاد عورتوں کی عدت تین ماہ ہے اور لونڈیوں کی ڈیڑھ ماہ ہے۔

مسئلہ: عدت کا اعتبار چاند کی تاریخوں سے ہوگا جبکہ چاند کی پہلی تاریخ سے ہی عدت شروع ہو۔ اب چار ماہ دس دن چاند تاریخوں کے لحاظ سے جب مکمل ہوں گے تو عدت ختم ہو جائے گی خواہ مہینہ تیس دن کا تھا یا انتیس دنوں کا تھا۔

اگر عدت کسی مہینے کی پہلی تاریخ کو نہیں شروع ہوئی بلکہ درمیان میں شروع ہوئی تو اس میں بھی ائمہ کرام کا ایک قول تو یہی ہے کہ چاند تاریخوں کے اعتبار سے ہی چار ماہ دس دن مکمل کرے، لیکن ایک قول یہ ہے کہ ایک سو تیس دن مکمل کرے۔ (از احکام القرآن للجصاص)

راقم کے نزدیک احتیاطی طور پر ایک سو تیس دن مکمل کرنے والا قول ہی معتبر ہے۔

عورتوں کا اپنے آپ کو روک کر رکھنے سے کیا مراد ہے؟

روک کر رکھنے سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو عدت کے مکمل ہونے تک روک کر رکھیں۔ امر عدت کے مکمل ہونے تک اپنے آپ کو گھر سے نکلنے سے روک کر رکھیں۔ دن کو کسی مجبوری پر دوران عدت گھر سے نکلنا جائز ہوگا لیکن رات وہیں گذارنا لازم ہوگا۔ اور وہ اپنے آپ کو زیب و زینت سے روک کر رکھیں۔ مہندی نہ لگائیں۔ خوشبو استعمال نہ کریں۔ سرمہ نہ لگائیں۔ آنکھوں کی تکلیف کی صورت میں رات کو سرمہ لگالیں صبح آنکھوں کو دھولیں۔ شوخ رنگ کے کپڑے استعمال نہ کریں۔

☆ "عن سعید بن اسحاق بن کعب بن عجرة قال قال النبی ﷺ للفریعة (تصغیر) بنت مالک بن سنان وکانت متوفی عنها (زوجها) امکثی فی بیتک حتی یبلغ الکتاب اجله. قالت فاعتددت فیه اربعة اشهر و عشرا"

سعید کہتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فریعہ بنت مالک بن سنان جن کا خاوند فوت گیا تھا کو فرمایا تو اپنے آپ کو اپنے گھر میں روک کر رکھ یہاں تک کہ عدت مکمل ہو جائے۔ وہ کہتی ہیں میں نے چار ماہ دس دن عدت مکمل کی۔ (رواہ مالک، قرطبی)

☆ "عن ام سلمة قالت دخل علیّ رسول الله ﷺ حین توفی ابو سلمة وقد جعلت علی صبرا فقال ماهذا یا ام سلمة فقلت انما هو صبر یا رسول الله لیس فیه طیب فقال انه یشب الوجه فلا تجعله الا باللیل و تنزعیه بالنهار و لا تمتشطی بالطیب و لا بالحناء فانه خضاب قلت بای شیٔ امتشط یا رسول الله قال بالسدر تغفلین به راسک" (اخرجه ابو داؤد و النسائی)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ ہمارے گھر تشریف لائے جبکہ ان کے خاوند ابوسلمہ فوت ہو چکے تھے، انہوں نے اپنے چہرے پر ایلوا (مصبر) لگایا ہوا تھا، نبی کریم ﷺ نے فرمایا، اے ام سلمہ یہ کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ یہ ایلوا (مصبر) ہے۔ اس میں کوئی خوشبو نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ چہرے کو جلاء عطا کرتا ہے یعنی چہرے میں اس سے چمک دمک آجاتی ہے اس لئے سوائے رات کے یہ استعمال نہ کرو۔ رات کو استعمال کرلو اور دن کو (دھو کر) اتار دیا کرو۔ اور خوشبو لگا کر کنگھی نہ کرو اور مہندی نہ لگاؤ، کیونکہ یہ بھی خضاب ہے۔ انہوں نے پوچھا یارسول اللہ میں کیا چیز لگا کر کنگھی کروں تو آپ نے فرمایا بیری کے پتے لگا کر۔ (خازن)

یعنی بیری کے پتوں سے سر کو دھولو جن سے سر کی میل دور ہو جائے گی، بال نرم ہو جائیں گے، کنگھی کا چلنا آسان ہو جائے گا، خوشبو بھی نہیں ہوگی اور رنگ بھی نہیں ہوگا۔

☆ "عن زينب بن ابى سلمة قالت دخلت على ام حبيبة زوج النبى ﷺ حين توفى ابوها ابو سفيان بن حرب فدعت ام حبيبة بطيب فيه صفرة خلوق اوغيره فدهنت به جارية ثم مست بعارضيها ثم قالت والله مالى بالطيب من حاجة غيرانى سمعت رسول الله يقول على المنبر لايحل لامرأة تؤمن بالله واليوم الآخران تحد على ميت فوق ثلاث الا على زوج اربعة اشهر وعشرا قالت زينب ثم دخلت على زينب بن جحش حين توفى اخوها فدعت بطيب فمست منه ثم قالت والله مالطيب من حاجة غيرانى سمعت رسول الله ﷺ يقول على المنبر لايحل لامرأة تؤمن بالله واليوم الآخران تحد على ميت فوق ثلاث الا على زوج اربعة اشهر وعشرا" (بخارى ومسلم)

حضرت زینب بنت ابی سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہے کہ میں نبی کریم ﷺ کی زوجہ ام المؤمنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئی جب کہ ان کے باپ حضرت ابوسفیان بن حرب فوت ہو چکے تھے۔ حضرت ام حبیبہ نے خوشبو منگائی وہ خوشبو خلوق تھی یا کوئی اور خوشبو تھی، وہ خوشبو آپ کو ایک غلامہ نے تیل کی طرح لگائی پھر آپ نے اپنے رخساروں پر وہ خوشبو لگائی، پھر فرمایا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی

مجھے خوشبو لگانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی سوائے اس کے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو منبر پر ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ کسی عورت کے لئے حلال نہیں جو اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھتی ہو کہ وہ کسی میت پر تین دنوں سے زیادہ سوگ منائے (زینت وغیرہ کو ترک کرے) سوائے اپنے خاوند کے کہ اس کے فوت ہونے پر وہ چار ماہ دس دن سوگ منائے۔

زینب بنت ابی سلمہ کہتی ہے پھر میں ام المؤمنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے گھر داخل ہوئی جبکہ ان کا بھائی فوت ہو چکا تھا، انہوں نے خوشبو منگائی اور وہ لگائی، پھر فرمایا کہ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی مجھے خوشبو لگانے کی کوئی حاجت نہ تھی سوائے اس کے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو منبر پر ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جو عورت اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہو اس کے لئے حلال نہیں کہ وہ کسی میت پر تین دنوں سے زیادہ سوگ منائے سوائے اپنے خاوند کے کہ وہ اپنے خاوند کے کہ وہ اپنے خاوند کا چار ماہ دس دن سوگ منائے۔ (خازن)

☆ "عن عائشة ان النبی ﷺ قال لایحل لامرأة تؤمن باللہ والیوم الآخر ان تحد علی میت فوق ثلاث الا علی زوج اربعة اشھر وعشرا" (مسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو عورت اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھتی ہے وہ کسی میت پر تین دنوں سے زیادہ اپنے آپ کو زیب و زینت سے نہ روکے سوائے اپنے خاوند کے کہ وہ اپنے خاوند کی وفات پر چار ماہ دس دن اپنے آپ کو روک کر رکھے۔

☆ "عن ام عطیة قالت کنا ننھی ان نحد علی میت فوق ثلاث الا علی زوج اربعة اشھر و عشرا ولا نکتحل ولا نتطیب ولا نلبس ثوبا مصبوغا الا ثوب عصب" (بخاری ومسلم)

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ہمیں کسی میت پر تین دنوں سے زیادہ سوگ منانے پر منع فرمایا گیا سوائے اپنے زوج کے، زوج پر چار ماہ دس دن تک سوگ منانے کا حکم دیا گیا کہ ہم سرمہ نہ لگائیں اور خوشبو نہ لگائیں اور زرد رنگ کے شوخ کپڑے نہ پہنیں سوائے اس کے جس کپڑے کا دھاگہ بننے سے پہلے رنگا گیا ہو اور شوخ رنگ نہ ہو (اس کی اجازت تھی)۔ (خازن)

چار مہینے دس دن عدت میں حکمت:

چار ماہ میں بچے میں روح پھونک دی جاتی ہے۔جیسا کہ حدیث پاک میں ہے۔

"عن ابن مسعود قال حدثنا رسول الله ﷺ وهو الصادق المصدوق ان خلق احدكم يجمع في بطن امه اربعين يوما نطفة ثم يكون علقة مثل ذلك ثم يكون مضغة مثل ذلك ثم يبعث الله اليه ملكا يكتب رزقه واجله وعمله وشقي او سعيد ثم ينفخ فيه الروح"

(بخاری و مسلم)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ہمیں بیان فرمایا کہ بیشک تم میں سے ہر ایک اپنی ماں کے پیٹ میں چالیس دن نطفہ کی حیثیت میں رہتا ہے، پھر چالیس دن منجمد خون کی صورت میں رہتا ہے، پھر گوشت کے لوتھڑے کی صورت میں چالس دن رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف فرشتے کو بھیجتا ہے جو اس کا رزق اور موت اور عمل اور بد بخت ہونا اور نیک بخت ہونا لکھ دیتا ہے پھر اس میں روح پھونک دی جاتی ہے۔ (خازن)

یہ کل مدت چار ماہ بنی کہ پتہ چل جائے کہ عورت حاملہ ہے یا نہیں اور وہ بھی کامل طور پر بچے کی حرکت پر پتہ چل جائے ،اگر حاملہ ہوئی تو عدت وضع حمل ہے ورنہ چار ماہ دس دن عدت گذارے۔

البتہ روح جب چار ماہ میں پھونک دی جاتی ہے تو دس دن زیادہ کیوں رکھے گئے؟ اس کی وجہ یہ ہے دس دن اوپر گذر جانے پر بچے کا ماں کے میں حرکت کرنا یقینی ہو جاتا ہے۔ (ماخوذ از خازن)

تنبیہ شدید: تین دنوں کے بعد کسی شخص کی موت پر زمانہ جاہلیت کی طرح سوگ منانا حرام ہے سوائے زوجہ کے خاوند کی موت پر، جو سوگ حرام ہے وہ یہ کہ خوشبو نہ لگانا، سرمہ نہ لگانا، عید اور جمعہ کے کپڑے نہ پہننا، جب آپ پوچھیں کہ تم نے میلا کچیلا لباس کیوں پہنا ہوا ہے، آج تو جمعہ ہے یا عید ہے، وہ کہتا ہے "مات ابی و امی" میرے باپ فوت ہو گئے، یا وہ کہتا ہے کہ میری ماں فوت ہو گئی، حالانکہ ان کے فوت ہوئے کئی مہینے بھی گذر چکے ہوتے ہیں، جب اتنی قدر منع ہے تو یقیناً گریبان پھاڑنا، اور رخساروں پر طمانچے مارنا، بلند آواز سے رونا، چلانا، نوحہ (بین) کرنا،

بالوں کا منڈانا، سیاہ لباس پہننا، یہ کام حرام ہوں گے اور سنت یہی ہے کہ ان سے بچنا ضروری ہوگا۔

اسی طرح رافضیوں کا یوم عاشوراء کو ماتم کرنا اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت پر نوحہ کرنا، پیٹنا، غیر شرعی طریقہ سے تعزیتی پروگرام مرتب کرنا جن میں پیٹنا ہی پایا جاتا ہے اور ساتھ ساتھ صحابہ کرام کو گالیاں دی جاتی ہیں۔ یعنی تبرا، ان کا فروع دین کا حصہ ہے یہ سب کام ناجائز اور حرام ہیں۔

" وهذا عمل اهل الضلال المستوجبين من الله الغزى و النكال كأنهم لم يسمعوا ماورد في النهي عن الحداد ومن الله الرشاد"

مذکورہ بالا اعمال گمراہ لوگوں کے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسوائی اور عذاب کے مستحق ہیں۔ گویا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی راہنمائی کو نہیں قبول کیا اور جن چیزوں سے رکنے کا حکم تھا ان سے نہ رک کر اللہ تعالیٰ کے احکام کی عدولی کی۔ (از روح البیان)

" فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ " پھر جب وہ پہنچ جائیں اپنی مقررمدت کو۔

"اى انقضت عدتهن" یعنی ان کی عدت ختم ہو جائے۔ (خازن، اور دیگر تفاسیر)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ہی تفاسیر کے مطابق ہے "تو جب ان کی عدت پوری ہو جائے" راقم نے لغوی ترجمہ کیا ہے تاہم بریکٹ میں الفاظ بڑھا کر وضاحت کردی۔

"فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ"

تو تم پر کوئی گناہ نہیں جو وہ کریں اپنے نفسوں کے معاملہ میں شرع کے مطابق۔

"فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ" میں خطاب کسے ہے؟ "خطاب للاولياء" یہ خطاب عورتوں کے والیوں کو ہے۔ (خازن)

"فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ. ايها الائمة و الحكام" یہ خطاب ائمہ اور حکام کو ہے، یعنی اے ائمہ اور حکام تم پر کوئی گناہ نہیں۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ تفسیر خازن کے مطابق ہے ''تو اے والیوتم پر مؤاخذہ نہیں''۔لیکن اس میں جب ائمہ اور حکام کو خطاب بھی ہے تو راقم نے مطلق ذکر کیا ہے ''تو گناہ نہیں تم پر'' تاکہ تمام احتمالات کو شامل رہے۔

یعنی جب ان کی عدت ختم ہو جائے تو ان کو اپنے نفسوں کے معاملہ میں زیب و زینت سے نہ روکو۔ وہ جب عدت گذار چکی ہیں تو اس گھر سے منتقل ہونے سے نہ روکو جس گھر میں انہوں نے عدت گذاری ہے۔اور اگر وہ اور کسی شخص سے نکاح کرنا چاہتی ہیں تو ان کو نکاح کرنے سے نہ روکا جائے۔

''بالمعروف'' کا مطلب ہی یہ ہے۔''بالوجه الذی لاینکره الشرع'' یعنی وہ اپنے نفسوں کے معاملہ میں جو کام اس طرح کریں کہ وہ شریعت میں منع نہ ہوں بلکہ شریعت کے مطابق ہوں،تو ان کو شرع کے مطابق کام کرنے سے تم منع نہ کرو۔

''وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ'' اور اللہ تمہارے عملوں پر خبردار ہے۔

جب ''خبیر'' کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام چیزوں کی حقیقتوں کا بلاشک علم رکھتا ہے اور کوئی چیز اس پر مخفی نہیں،اور خبیر کی نسبت جب بندوں کی طرف ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے اجتہاد اور فکر کی وجہ سے علم رکھتا ہے،لیکن اللہ تعالیٰ اجتہاد و فکر سے پاک ہے۔ (خازن)

جب اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے خبردار ہے تو تم اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں رکھو اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف کسی قسم کا کوئی عمل نہ کرو۔ (از روح المعانی)

مسئلہ: ایک عورت کا خاوند فوت ہو جائے وہ کسی دوسرے گھر میں تھی تو اسے خاوند کی موت کی خبر ملی،کیا وہ وہاں ہی عدت گذارے یا کہ خاوند کے گھر آجائے؟ اگرچہ اس مسئلہ میں اختلاف تو ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ اپنے خاوند کے گھر منتقل ہو جائے۔

یاد رکھنے کے قابل:

''وفی المؤطأان عمربن الخطاب کان یردالمتوفی عنهن ازواجهن من البیداء یمنعهن الحج''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ مقام بیداء سے ہی ان عورتوں کو واپس لوٹا دیتے تھے جن کے خاوند فوت ہو چکے ہوتے، ابھی وہ عدت میں ہوتیں تو ان کو حج کرنے سے منع کر دیا جاتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ رات گھر گذارے۔

"وهومقتضى القران والسنة،فلايجوزلهاان تخرج في حج ولاعمرة حتى تنقضي عدتها"

قرآن وسنت کا تقاضا یہی ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے، اس لئے عورت کو اپنی عدت کے ختم ہونے تک حج اور عمرہ کرنے کے لئے گھر سے نکلنا جائز نہیں۔

اعتراض:

"عن عروة قال خرجت عائشة باختهاام كلثوم حين قتل زوجهاطلحة بن عبيدالله الى مكة في عمرة"

حضرت عروہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنی بہن ام کلثوم کو عمرہ کے لئے اپنے ساتھ مکہ مکرمہ لے گئیں جب ام کلثوم کے خاوند شہید کر دیئے گئے تھے، ابھی وہ عدت گذار رہی تھیں۔

اس سے تو معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عورت کے لئے دوران عدت حج اور عمرہ کے لئے جانا جائز سمجھتی تھیں۔

جواب:

"حدثناالثوری عن عبيدالله بن عمرانه سمع القاسم بن محمديقول ابى الناس ذلك عليها"

عبید اللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ میں نے قاسم بن محمد رضی اللہ عنہ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس اجتہاد کو صحابہ کرام نے رد کر دیا تھا، گویا کہ اجماع امت سے ناجائز ہونا ثابت ہے۔ (از قرطبی)

کتابیہ عورت اور عدت:

احادیث میں چونکہ ایمان والی عورتوں کا ذکر ہے کہ وہ اپنے خاوندوں کی وفات کے بغیر کسی اور کی وفات پر اپنے آپ کو تین دنوں سے زائد روک کر نہ رکھیں۔

اس سے ابن کنانہ اور ابن نافع نے یہ استدلال کیا ہے کہ کتابیہ عورت کو زیب و زینت سے رکنا لازم نہیں۔ امام اعظم رحمہ اللہ کا بھی ایک قول یہی ہے۔لیکن ابن قاسم رحمہ اللہ کی روایت میں یہ ہے کہ کتابیہ پر بھی عدت گذارنا اسی طرح لازم ہے جیسا کہ مسلمان عورت پر لازم ہے۔لہٰذا اسے بھی زیب و زینت وغیرہ سے رکنا لازم ہوگا۔ لازم

لانہ حکم من احکام العدۃ فلزمت الکتابیۃ للمسلم کلزوم المسکن و العدۃ

کیونکہ اپنے آپ کو روک کر رکھنا بھی عدت کے احکام میں سے ایک حکم ہے،اس لئے گھر میں ٹھہرنا اور عدت گذارنا کتابیہ کے لئے بھی اسی طرح لازم ہے جیسا کہ مسلمان عورت کے لئے لازم ہے۔و اللہ اعلم بالصواب۔ (ماخوذ از قرطبی)

دینی طلبائے کرام کی توجہ کے لئے:

"اربعۃ" اسم عدد مؤنث ہے،کیونکہ اس کی تمیز "اشھر" ہے جو مذکر ہے،لیکن "عشرا" مذکر ہے اس لئے اس کی تمیز "لیالی" ہے جو مؤنث ہے "ایام" کا ذکر بالتبع ہے۔ (تفسیرات احمدیہ)

مسئلہ: نابالغہ لڑکی یا لونڈی کا خاوند فوت ہو جائے تو ان کو زیب و زینت چھوڑنا لازم نہیں کیونکہ زیب و زینت چھوڑنے کے حکم کا مطلب یہ ہے کہ دوران عدت یہ کسی کو اپنے ساتھ نکاح کی طرف مائل نہ کریں۔چونکہ نابالغہ لڑکی اور لونڈی کی طرف میلان کم ہی ہوتا ہے اس لئے ان پر یہ حکم لازم نہیں۔

تاہم بعض ائمہ نے یہ حکم مطلق رکھا ہے کہ نابالغہ اور بالغہ کا حکم ایک ہی ہے،اس پر علامہ باجی مالکی رحمہ اللہ کا محاکمہ راقم کو بہتر نظر آیا۔آپ فرماتے ہیں اگر وہ لڑکی حکم شرع کو سمجھتی ہے تو اسے چاہئے کہ وہ زیب و زینت سے رک جائے،اور اگر بہت چھوٹی ہے،حکم شرع کو نہیں سمجھتی تو اس پر یہ حکم لازم نہیں۔

وہ حضرات جو حکم کو عام رکھتے ہیں ان کی دلیل یہ ہے۔

"روی ان النبی ﷺ سألته امرأة عن بنت لها توفی عنها زوجها فاشتکت عینها افنکحلها فقال النبی ﷺ لا. مرتین او ثلاثا"

ایک عورت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اس کی بیٹی کا خاوند فوت ہو گیا تھا، اس نے آپ سے پوچھا کہ اس کی بیٹی کی آنکھوں میں تکلیف ہے، کیا اسے سرمہ لگا دیا جائے، تو آپ نے فرمایا، "نہیں" دو یا تین مرتبہ سوال پر آپ نے جواب یہی دیا کہ سرمہ نہ لگایا جائے۔

نبی کریم ﷺ نے چونکہ یہ نہیں پوچھا کہ اس کی عمر کیا ہے تو اس سے پتہ چلا کہ یہ حکم عام ہے بالغہ اور نابالغہ دونوں کو شامل ہے، تاہم اس کا جواب امام اعظم رحمہ اللہ کی طرف سے یہ دیا گیا ہے کہ عورت نے جو اپنی بیٹی کے متعلق سوال کیا تھا اس کے بالغہ ہونے کا نبی کریم ﷺ کو خود ہی علم تھا اس لئے اس کی عمر کا سوال نہ کیا۔

یہ خیال رہے کہ آنکھوں میں تکلیف ہونے کے باوجود سرمہ لگانے سے منع کرنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ سرمہ رات کو لگایا جائے، دن کو نہ لگایا جائے، کیونکہ جب رات کو سرمہ لگانے سے مقصد حاصل ہو سکتا ہے تو دن کو سرمہ لگانے کے متعلق بار بار پوچھنے کا کیا مطلب ہے۔ (قرطبی بتصرف)

تنبیہ:

جب عورتیں عدت پوری کر لیں تو ان کو زیب و زینت سے نہ روکا جائے، گھر سے منتقل ہونے سے نہ روکا جائے اور دوسرا نکاح کرنے سے نہ روکا جائے، یہ حکام عورتوں کے والیوں کو اور حکام اور ائمہ اور اہلِ علم حضرات کو جب ہے تو اسی سے یہ سمجھ آ گیا کہ اگر دوران عدت اس حکم کے خلاف کریں تو سب حضرات ان کو منع کریں۔ (از قرطبی)

☆☆☆☆☆

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِىٓ
اَنْفُسِكُمْ ۚ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا
اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۚ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ
الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِىٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ
وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ☆ (سورۃالبقرۃ آیت ۲۳۵)

﴿۱﴾

اورتم پر گناہ نہیں اس بات میں جو پردہ رکھ کر تم عورتوں کے نکاح کا پیام دو یا اپنے دل میں چھپا رکھو اللہ جانتا ہے کہ اب تم ان کو یاد کرو گے ہاں ان سے خفیہ وعدہ نہ کر رکھو مگر یہ کہ اتنی بات کہو جو شرع میں معروف ہے اور نکاح کی گرہ پکی نہ کرو جب تک لکھا ہوا حکم اپنی میعاد کو پہنچ لے اور جان لو کہ اللہ تمہارے دل کی جانتا ہے تو اس سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ بخشنے والا حلم والا ہے۔

﴿۲﴾

اورنہیں گناہ پر اس میں کہ اشارہ سے پیغام نکاح دو ان عورتوں کو، یا چھپائے ہو تم اپنے دلوں میں، جانتا ہے اللہ کہ بیشک ذکر کرو گے ان کا، لیکن ان سے نہ وعدہ لینا خفیہ طور پر، مگر یہ کہ تم کہو ان سے کوئی بات شریعت کے مطابق، اور نہ پختہ کرو عقد نکاح یہاں تک کہ پہنچ جائے عدت اپنی انتہاء کو، اور جان لو یقیناً اللہ جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے، تو اس سے ڈرو، اور جان لو کہ بیشک اللہ بخشنے والا حلم والا ہے۔

مختصر مطلب:

جن عورتوں کے خاوند فوت ہو جائیں، ان سے نکاح کی بات ظاہر طور پر کرنا منع ہے، اور ان سے نکاح کا پختہ وعدہ لینا بھی منع ہے، ہاں البتہ اشارہ اور کنایہ سے پیغام نکاح پہچانے میں کوئی حرج نہیں، دل میں ارادہ رکھنا کہ میں اس عورت سے عدت گذرنے پر نکاح کروں، اور اس ارادہ کو چھپا کر رکھنا، اور دل ہی دل میں اس عورت کو یاد کرنے میں کوئی حرج نہیں، اللہ تعالیٰ کے احکام سے عدول کرنے میں ڈرتے رہو، اگر غلطی سے کوئی خطاء واقع ہوگئی تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا، بردبار ہے۔

تعریض کیا ہے؟

تعریض ضد ہے تصریح کی، یعنی کسی چیز کو ظاہر طور پر بیان کرنا تصریح ہے، اور کسی چیز کو اشارۃً بیان کرنا تعریض ہے۔ یعنی اس طرح کلام کرنا جس میں مقصود اور غیر مقصود دونوں کا احتمال پایا جائے۔ البتہ مقصود کا احتمال زیادہ راجح اور قوی ہو۔

عام طور پر کہا جاتا ہے۔ "عرض الشیٔ" وہ ایک چیز کے اردگرد گھوما اور ظاہر نہیں ہوا۔

اس کی مثال یہ ہے کہ محتاج شخص اس شخص کو کہے جس نے اس کی حاجت کو پورا کرنا ہے۔ "جئتک لاسلم علیک" بس ویسے ہی میں آپ کو سلام کرنے کے لئے آ گیا۔

اسی وجہ سے تعریض کے طور پر اپنی حاجت کو پیش کرنے کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے۔

"وحسبک بالتسلیم منی تقاضیا" میرا تقاضاءِ حاجت صرف تمہیں سلام پیش کرنا ہی ہے۔

تعریض کو تلویح بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ تلویح کا معنی ظاہر کرنا، تو انسان اپنے ارادہ کو جب اشارہ سے ظاہر کرتا ہے تو اس وقت اسے تلویح بھی کہہ لیا جاتا ہے۔

کنایہ اور تعریض میں فرق:

کنایہ میں لوازمات کا ذکر ہوتا ہے اور مراد ملزومات ہوتے ہیں۔ جیسا کہ کہا جائے۔

"طویل النجاد" فلاں شخص طویل حمائل والا ہے، مراد اس سے طویل قد والا ہے، کیونکہ "طویل النجاد" مستلزم ہے "طویل القامۃ" کو۔

"کثیر الرماد" ذکر کر کے مراد سخی لیا جاتا ہے۔ کیونکہ سخی شخص کے گھر مہمانوں کو کھانا کھلانے کے لئے آگ زیادہ جلتی ہے، آگ زیادہ جلنے سے خاکستر زیادہ ہوتی ہے، تو کثیر الرماد مستلزم ہے سخاوت کو۔ (از کبیر)

خطبہ: (بکسر الخاء) نکاح کا پیغام دینا جس میں قول وفعل میں نرمی پائی جائے۔ اور خُطبہ (بضم الخاء) ہر وہ کام جس کی ابتداء بھی ہو اور انتہاء بھی۔ جس طرح جمعہ کا خطبہ، عید کا خطبہ، نکاح کا خطبہ وغیرہ۔

خطبہ نکاح (پیغام نکاح) کی تین قسمیں:

(۱) ان قسموں میں سے پہلی قسم یہ ہے نکاح کا پیغام ظاہر طور پر دینا بھی جائز ہے اور اشارہ سے بھی پیغام دینا جائز ہے۔ یہ اس وقت ہوگا جبکہ کسی عورت کا نکاح نہیں، اور نہ ہی وہ عدت گذار رہی ہو، اس سے جب نکاح کرنا جائز ہے تو پیغام نکاح دینا بھی ہر طرح جائز ہوگا، خواہ ظاہر طور پر ہو یا اشارہ سے ہو۔

البتہ یہ خیال رہے کہ ایک صورت میں منع ہوگا۔ وہ صورت جس کے متعلق نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی یہ ہے۔

"لایخطبن احدکم علی خطبۃ اخیہ" تم میں کوئی شخص اپنے بھائی کے پیغام نکاح پر پیغام نکاح نہ دے۔

لیکن یہ ممانعت اس وقت ہوگی جب ایک عورت کا رشتہ ایک شخص نے طلب کیا ہو تو صراحۃً اسے قبول بھی کر لیا گیا ہو، پھر دوسرا سبز باغ دکھا کر پہلے شخص کے رشتہ کو توڑنا چاہے تو اس صورت میں پیغام نکاح دینا ناجائز ہوگا۔

اور اگر ایک شخص کے پیغام نکاح کو صراحۃً رد کر دیا گیا ہو تو دوسرا شخص پیغام نکاح دے تو جائز ہے۔ اور اگر کسی

شخص کے ''خطبہ'' (پیغام نکاح) کو صراحۃً نہ رد کیا گیا ہو اور نہ قبول کیا گیا ہو تو اس میں دو قول ہیں۔

ایک یہ کہ صراحۃً رد نہ کرنے سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ اسے یہ نکاح پسند ہے اور نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسے یہ نکاح پسند نہیں۔ اگر بعض اور وجوہ سے اشارہ سے یہ بھی چلتا ہے کہ ہوسکتا ہے یہ نکاح پسند ہو۔ اس لئے دوسرا شخص پیغام نکاح نہ دے۔ (احتیاط اور تقوی اسی صورت میں ہے)

اور دوسرا قول یہ ہے کہ جب صراحۃً پہلے شخص کے قول کو رد بھی نہیں کیا گیا اور قبول بھی نہیں کیا گیا تو دوسرا شخص پیغام نکاح دے سکتا ہے۔ (جواز اسی قول میں ہے)

﴿۲﴾ خطبہ کی دوسری قسم وہ ہے جو ہر صورت میں ناجائز ہے، صراحۃً بھی اور اشارۃً بھی۔ یہ اس وقت ہوگا جبکہ ایک عورت دوسرے شخص کی منکوحہ ہو، اس صورت میں پیغام نکاح کا یہ مطلب ہے کہ وہ اپنے خاوند سے اختلاف شروع کر لے اور حقوق زوجیت کو پائمال کر دے اور میری طرف میلان کر لے۔ یہ صورت بھی ناجائز، کیونکہ اس میں فتنہ وفساد کو ہوا دینا لازم آئے گا۔

جس عورت کو رجعی طلاق دی گئی ہو اسے بھی نکاح کا پیغام دینا منع ہے، کیونکہ وہ ابھی تک حکم نکاح میں ہے۔ اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ اس کا خاوند اس کی طرف رجوع کر لے۔

﴿۳﴾ خطبہ (پیغام نکاح) کی تیسری صورت یہ ہے کہ ظاہر طور پر پیغام دینا تو ناجائز ہو لیکن اشارہ سے پیغام دینا جائز ہو۔ یہ وہ عورت ہے جو عدت گذار رہی ہو لیکن وہ طلاق رجعی کی عدت نہ ہو۔

اس میں پھر تین صورتیں ہیں۔

ان میں سے پہلی صورت یہ ہے کہ عورت کا خاوند فوت ہو چکا ہو، اور وہ عدت وفات میں ہو تو اسے ظاہر طور پر پیغام نکاح دینا جائز نہیں البتہ اشارہ سے نکاح کا پیغام دے دے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ عورت کو تین طلاقیں دے دی گئیں۔ وہ تین طلاقوں کی عدت گذار رہی ہے تو اسے پیغام نکاح دینا جائز ہے یا نہیں، اس میں اہل علم کا اختلاف تو ہے لیکن صحیح قول یہی ہے کہ جب اس سے نکاح کرنا جائز

ہے تو اسے پیغام نکاح دینا بھی جائز ہے، البتہ پیغام نکاح تعریض (اشارہ) کے طور پر ہو، ظاہر نہ ہو۔

تیسری صورت یہ ہے کہ ایک عورت کا نکاح فسخ کر دیا گیا ہے یا اسے بائن طلاق دے دی گئی تو اس صورت میں اگر اس کا اپنا خاوند ہی اس سے پھر نکاح کرنا چاہتا ہے تو وہ دوران عدت خواہ ظاہر طور پر پیغام نکاح دے یا اشارہ سے اس کے لئے جائز ہے۔ لیکن اس صورت میں کوئی اور شخص اس عورت کو دوران عدت کسی طرح بھی پیغام نکاح نہیں دے سکتا، کیونکہ اس عورت سے اس کا خاوند دوبارہ نکاح کر سکتا ہے، اس لئے ابھی انتظار کی جائے ہو سکتا ہے وہ نکاح پر دوبارہ آمادہ ہو جائے تو اسی سے نکاح کرنا بہتر ہے۔ (از کبیر)

تعریض کیسے کرے؟

☆ ”وقال ابن عباس التعریض بالخطبة ان یقول انی اریدان اتزوج امرأة من امرھاو امرھایعرض لھابالقول“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ تعریضاً نکاح کا خطبہ (پیغام) اس طرح دیا جائے کہ اس عورت کے سامنے یہ ذکر کرے کہ میں کسی عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہوں جس میں اس اس طرح صفات ہوں، ان صفات کا ذکر کرے جو اس میں پائی جاتی ہوں لیکن ظاہر طور پر اس سے نکاح کرنے کی بات نہ کرے، بلکہ اشارہ پر ہی اکتفاء کرے۔

☆ ”وقال الحسن ھو ان یقول لھاانی بک بمعجب وانی فیک لراغب ولاتفوتینا نفسک“

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس عورت کو اس طرح کہے بیشک میں تمہیں پسند کرتا ہوں، بیشک میں تم میں رغبت رکھتا ہوں، تم اپنے نفس کے معاملہ میں ہمیں نہ بھلانا یعنی اپنے معاملہ میں ہم سے بھی مشورہ کر لینا۔

☆ ”وقال النبی ﷺ لفاطمة بنت قیس وھی فی العدة لاتفوتینابنفسک ثم خطبھا بعد انقضاء العدة علی اسامة بن زید“

نبی کریم ﷺ نے حضرت فاطمہ بنت قیس کو ان کی عدت کے دوران فرمایا تم اپنے نفس کے معاملہ میں ہمیں نہ بھلانا، یعنی ہم سے مشورہ کر لینا۔ پھر جب ان کی عدت ختم ہوگئی تو نبی کریم ﷺ نے اسامہ بن زید سے نکاح کرنے کے لئے ظاہر طور پر پیغام دے دیا۔ اس طرح فاطمہ بنت قیس کا نکاح اسامہ بن زید سے کر دیا گیا۔

☆ "قال عبدالرحمن بن القاسم عن ابیه قال هو ان یقول لها وهی فی العدة انک لکریمة وانی فیک لراغب وان الله سائق الیک خیرا او نحو هذا من القول"

عبدالرحمن بن قاسم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ عورت کو دوران عدت کہے تم کریم عورت ہو، بیشک مجھے تم سے محبت ہے، بیشک اللہ تعالیٰ نے تمہیں بھلائی سے نوازا ہے، اس طرح کی باتیں اس سے کرے جن سے نکاح کرنے کا اشارہ ملتا ہو لیکن ظاہر طور پر بات نہ کرے۔

☆ وقال عطاء هو ان یقول انک لجمیلة وانی فیک لراغب وان قضی الله شیا کان

عطا کہتے کہ وہ اس طرح کہے بیشک تو خوبصورت ہے اور بیشک میں تم میں رغبت رکھتا ہوں، اگر اللہ تعالیٰ کسی چیز کا فیصلہ کر دے تو بہتر ہوگا۔

نتیجہ واضح کہ تعریض کے لئے الفاظ معین نہیں، بلکہ صرف یہ ضروری ہے۔

"فکان التعریض ان یتکلم بکلام یدل علی فحواه علی رغبته فیها ولا یخطبها بصریح القول"

تعریض یہ ہے کہ اس طرح کلام کرے جس سے مقصد سمجھ آئے کہ وہ اس عورت سے نکاح کرنے میں رغبت رکھتا ہے لیکن ان الفاظ میں بھی غیر مقصد کا احتمال پایا جائے۔ یعنی بات اشارہ سے ہو ظاہر طور پر نہ ہو۔ (از احکام القرآن للجصاص)

"اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِىْ اَنْفُسِكُمْ" یا چھپائے ہو تم اپنے دلوں میں۔

"اکنان" کا معنی ہے "اخفاء وستر" پوشیدہ رکھنا۔ اس میں دو لغتیں ہیں۔ ایک "کننته" اور دوسری "اکننته"

کبھی دونوں کا معنی چھپانا کیا جاتا ہے، کوئی خاص فرق نہیں کیا جاتا۔ اور کبھی دونوں کے استعمال میں فرق کیا جاتا ہے، کہا جاتا ہے۔ "کننت الشئ" میں نے فلاں چیز کو محفوظ کرلیا، آفت سے بچالیا، اس صورت میں اسے چھپانا ضروری نہیں۔ اسی معنی کے مطابق کہا جاتا ہے۔ "درمکنون" موتی سیپ میں محفوظ۔ "جاریة مکنونة" لڑکی جو حفاظت میں ہو۔ "بیض مکنون" انڈہ لڑھکنے سے محفوظ کرلیا گیا۔

"اکننت" کا مطلب ہوتا ہے میں چھپالیا، یعنی "اکننت" میں اخفاء اور ستر ضروری ہے۔ یہ ضد ہے "اعلنت اور اظھرت" کی، جس کا معنی ہوتا ہے ظاہر کرنا۔

الفاظ مبارکہ کا مفہوم:

یعنی عدت وفات میں عورت کو تعریض خطبہ یعنی اشارہ سے پیغام نکاح جس طرح جائز ہے اور اس میں کوئی گناہ نہیں اس طرح دل میں ارادۂ نکاح کو چھپا رکھنا اور اس کا ذکر اشارہ سے بھی نہ کرنا جائز ہے۔

بظاہر یہاں یہ وہم ہوتا ہے کہ جب اشارہ سے نکاح کا پیغام دینا جائز ہے تو دل میں نکاح کے ارادہ کو چھپا کر رکھنے کا جواز خود بخود معلوم ہو جائے گا، تعریض کے جواز کے بعد "اکنان" دل میں چھپانے کا ذکر تو "تحصیلِ حاصل" ہے یا "ایضاح الموضحات" ہے، جو فصاحت کے منافی ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں دو حکم علیحدہ علیحدہ ذکر ہیں۔ پہلے ذکر کیا گیا کہ وفات کی عدت گذارنے والی عورت کو اشارہ سے پیغام نکاح دینا جائز ہے لیکن فی الحال (ابھی) صراحۃً پیغام نکاح دینا جائز نہیں۔

اس حکم کو "وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ" سے بیان کردیا گیا۔

دوسرا حکم یہ ہے کہ دل میں ارادۂ نکاح فی الحال جائز ہے جسے تم نے مستقبل میں ظاہر کردینا ہے۔ اس حکم کو "اَوْ اَكْنَنْتُمْ" سے ذکر کردیا گیا۔ مستقبل میں ظاہر کرنے کا ذکر آنے والے الفاظ مبارکہ میں کردیا گیا۔

"عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا"

اللہ جانتا ہے کہ بیشک ذکر کرو گے تم ان کا لیکن ان سے نہ وعدہ لینا خفیہ طور پر۔

جب انسان کو نکاح کے معاملہ میں شہوت نفس حاصل ہے تو شہوت رکھنے والا شخص عزم اور تمنا بھی یقینا رکھے گا، اللہ تعالیٰ نے جب ان کو اس مشکل کام کا حکم دیا کہ ان کو صراحۃً ابھی پیغام نکاح نہ دو۔ تو پھر آسانی پیدا کرنے کے لئے یہ حکم دیا کہ دل میں ارادۂ نکاح کو چھپا کر رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ تم نے انہیں یاد کرنا ہے، تو ان کو یاد کرو، لیکن ان سے خفیہ وعدہ نہ کرلو۔

''اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا'' مگر یہ کہ تم کہو کوئی بات شریعت کے مطابق۔

ابھی تک بیان کردہ بحث سے یہ حاصل ہوا کہ جو عورت اپنے خاوند کے فوت ہونے پر عدت گذار رہی ہو اسے اشارہ سے پیغام نکاح دینا جائز ہے، ظاہر طور پر پیغام نکاح دینا جائز نہیں۔ اور دل میں ارادۂ نکاح بھی جائز ہے، لیکن ظاہر طور پر اسے ذکر نہ کرے، البتہ اشارہ سے ذکر کرنا بھی جائز ہے، اور عورتوں سے اکیلے اکیلے مخفی طور پر دوران عدت نکاح کا وعدہ لینا بھی ناجائز ہے۔ ہاں البتہ شریعت کے مطابق تعریض کے طور پر ان سے نکاح کا ذکر کرنا بھی جائز ہے۔ (از کبیر)

''وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ''

اور نہ پختہ کرو عقد نکاح یہاں تک کہ پہنچ جائے عدت اپنی انتہاء کو۔

یعنی عدت کے ختم ہونے تک ان سے نکاح کرنا حرام ہے، اس لئے عدت کے ختم ہونے کی انتظار کی جائے۔

''عقدة'' کا معنی ہے گرہ، جس طرح گرہ لگا کر رسی کو مضبوط کرلیا جاتا ہے، اسی طرح نکاح کا بندھن بھی مضبوط ہوتا ہے، لہٰذا اسے عقد سے تعبیر کرلیا جاتا ہے۔

''الکتاب'' بمعنی المکتوب ہے، یعنی لکھی ہوئی چیز اپنی انتہاء کو پہنچ جائے، مراد اس سے عدت ہے۔ اور ''الکتاب'' بمعنی فرض بھی آتا ہے۔ اب اس معنی کے لحاظ پر مطلب یہ ہوگا، یہاں تک کہ فرض اپنی انتہاء کو پہنچ جائے۔ مراد اس سے بھی عدت ہی ہے۔ (قرطبی)

''وَاعْلَمُوْااَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَافِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ''

اور جان لو یقیناً اللہ جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے تو ڈرو اس سے۔

ان الفاظ گرامی سے متنبہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ظاہر اور چھپی ہوئی چیزوں کو جانتا ہے، لہٰذا جب بھی تم کوئی کام کرو تو اللہ تعالیٰ کا ڈر رکھو تاکہ تمہارا کام اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہو۔ (کبیر)

'' وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ''

اور جان لو بیشک اللہ بخشنے والا، حلم والا ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ کسی شخص کو معصیت پر جلدی سزا نہیں دیتا بلکہ اس کے گناہوں کی پردہ پوشی فرماتا ہے۔(خازن)

پہلے وعید فرمائی گئی کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب اور قہر و غضب سے ڈرو، اللہ تعالیٰ کے حکم سے عدولی نہ کرو، اور اب وعدکا ذکر ہوا کہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے اگر تم سے کوئی لغزش ہو جائے تو اس سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کرو تو وہ اپنی رحمت کاملہ سے تمہیں بخش دے گا، اور وہ حلم والا ہے، جلدی کسی کو عذاب نہیں دیتا۔

☆☆☆☆☆

لَاجُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَالَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْتَفْرِضُوْالَهُنَّ فَرِيْضَةً وَّمَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ☆ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۳۶)

﴿۱﴾

تم پر کچھ مطالبہ نہیں تم عورتوں کو طلاق دو جب تک تم نے ان کو ہاتھ نہ لگایا ہو یا کوئی مہر مقرر کرلیا ہو اور ان کو کچھ برتنے کو دو۔ مقدور والے پر اس کے لائق اور تنگدست پر اس کے لائق حسبِ دستور کچھ برتنے کی چیز یہ واجب ہے بھلائی والوں پر۔

﴿۲﴾

تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم طلاق دو عورتوں کو جب تک تم نے ان کو مس نہیں کیا اور نہیں مقرر کیا ان کا مہر اور ان کو نفع پہنچاؤ (وہ نفع پہنچانا) غنی پر اس کی طاقت کے مطابق اور تنگ دست پر اس کی طاقت کے مطابق نفع پہنچانا شرع کے مطابق واجب ہے احسان کرنے والوں پر۔

مختصر مطلب: جن عورتوں کا نکاح کے وقت کسی طرح مہر مقرر کرنا رہ گیا تھا، ان کو جماع اور خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دے دی جائے تو اس میں کوئی گناہ نہیں، البتہ ان کو نفع پہنچانا یعنی تین کپڑوں پر مشتمل (قمیص، شلوار، دوپٹہ) ایک جوڑا دے، یہ کپڑوں کا جوڑا دینا واجب ہے۔

شانِ نزول:

ایک وجہ: شانِ نزول کی یہ بیان کی گئی کہ جب نبی کریم ﷺ نے صرف ذوق اور قضاء شہوت کے لئے نکاح کرنے

سے منع فرمایا اور حکم دیا کہ نکاح کرنے کا مقصد اپنے آپ کو گناہوں سے بچانا ہو، اور اللہ تعالیٰ سے ثواب حاصل کرنا ہو، اور ہمیشہ کی صحبت کا ارادہ ہو، اور نیک اولاد کی طلب ہو، تو صحابہ کرام کے دلوں میں یہ خیال واقع ہوا کہ اگر کسی شخص نے جماع اور خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دے دی تو وہ گنہگار ہوگا، تو اس آیۃ کریمہ کو نازل فرما کر یہ واضح کیا کہ اصل مقصد نکاح میں نیک ارادہ ہو، کسی وجہ سے جماع سے پہلے طلاق دے دی گئی تو اس میں کوئی خاص گناہ اس وجہ سے لازم نہیں کہ اس نے جماع سے پہلے طلاق دی ہے۔ البتہ مطلقاً طلاق دینا اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے۔ (قرطبی، روح المعانی)

دوسری وجہ: انصار میں سے ایک شخص نے بنی حنیفہ کی ایک عورت سے شادی کی، لیکن جماع سے پہلے ہی طلاق دے دی اور مہر بھی مقرر نہیں کیا تھا تو اس کے سوال پر کہ میں اب کیا کروں تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی، تو نبی کریم ﷺ نے اس شخص کو فرمایا۔ "**امتعھا ولو بقلنسوتک**" تم اسے نفع پہنچاؤ خواہ اپنی ٹوپی دے کر ہی۔

حدیث شریف میں ٹوپی دینے کا ذکر عام محاورہ کے مطابق ہے۔ مراد خاص ٹوپی نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ تم اپنی زوجہ کو اپنی طاقت کے مطابق کپڑوں کا جوڑا دے کر نفع پہنچاؤ، خواہ اس کی قیمت تمہاری ٹوپی کی طرح کم ہی کیوں نہ ہو۔

(خازن)

دونوں وجہ کا اجتماع ممکن ہے:

شان نزول کے دونوں وجہ کا اجتماع ممکن ہے، کیونکہ نکاح کے متعلق نبی کریم ﷺ کے ارشادات کے بعد مومنین کے دلوں میں بھی واقع ہوا کہ شائد جماع سے پہلے طلاق دینا خاص گناہ ہو، اور ایک صحابی کا واقع بھی درپیش آیا تو اس کے بعد آیۃ کریمہ نازل ہوئی، لہٰذا دونوں وجہ ہی شان نزول ہیں۔

اعتراض: جب جماع کے بعد بھی طلاق دینا علیحدہ کسی خاص گناہ پر مشتمل نہیں تو طلاق سے پہلے گناہ کی نفی کا کیا مطلب ہے؟ عام گناہ تو ہر طرح طلاق میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ "**ان ابغض الحلال الی اللہ الطلاق**" بیشک حلال چیزوں میں سے اللہ تعالیٰ کو طلاق ناپسند ہے۔

جواب: سوال ہی جماع سے پہلے طلاق کے متعلق تھا، کیونکہ زیادہ وہم اسی میں ہوا تھا کہ یہ نکاح تو نبی کریم ﷺ کے ارشادات کے خلاف ہوگیا، تو صحابہ کرام کے خصوصی سوال کا جواب بھی اسی خاص قسم کے مطابق ہی دیا گیا۔

مسئلہ کی تفصیل:

اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی "ومتعوھن" سے فقہائے کرام نے لفظ "متعہ" اخذ کیا ہے کہ جس عورت کو طلاق دے دی جائے اسے متعہ بھی دیا جائے۔

متعہ کیا ہے؟ متعہ تین کپڑوں پر مشتمل ایک جوڑا ہے۔

البتہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول یہ ہے کہ ایک غلام دینا اعلیٰ قسم کا متعہ ہے، اور تین کپڑوں پر مشتمل ایک جوڑا درمیانی قسم کا متعہ ہے، اور اس سے کم صرف چادر یا دوپٹہ وغیرہ دینا گھٹیا قسم کا متعہ ہے۔ (حازن)

تاہم زیادہ طور پر اہلِ علم کا اتفاق ہی نظر آتا ہے کہ متعہ تین کپڑوں پر مشتمل ایک جوڑا ہی ہے۔

مسئلہ کی چار صورتیں:

﴿۱﴾ عورت کا مہر مقرر نہیں کیا گیا اور جماع اور خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق بھی دے دی گئی تو اسے متعہ دینا واجب ہے۔ اس کا اور کوئی مہر نہیں۔ مسئلہ کی اس صورت کو اس آیۃ کریمہ میں ذکر کر دیا گیا ہے۔

﴿۲﴾ مہر مقرر کیا گیا تھا اور طلاق جماع یا خلوت صحیحہ سے پہلے دی گئی تو نصف مہر دینا لازم ہے اور ساتھ ہی متعہ دینا مستحب ہے۔ اس مسئلہ کا ذکر آنے والی آیۃ کریمہ "وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً" میں ہے۔

﴿۳﴾ عورت کا مہر مقرر کیا گیا تھا اور طلاق جماع یا خلوت صحیحہ کے بعد دی تو ایسی صورت میں مکمل مہر دینا ہوگا، اور متعہ دینا مستحب ہے۔

اس مسئلہ کا ذکر پہلے "وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّا اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا" کے ضمن میں گذر چکا ہے۔

۵۔ مہر مقرر نہیں کیا گیا تھا لیکن طلاق جماع یا خلوت صحیحہ کے بعد دی گئی تو اسے مہر مثل دیا جائے گا اور متعہ دینا مستحب ہے۔

تنبیہ: اگر مہر مقرر کیا گیا تھا اور طلاق جماع یا خلوت صحیحہ سے پہلے دے دی گئی تو نصف مہر دینا لازم ہے۔ لیکن اس صورت کے متعلق فقہی کتب میں متعہ نہ دینے کا جو ذکر ہے وہ نفی وجوب ہے کہ متعہ بطور وجوب دینا لازم نہیں، استحباب کی نفی نہیں۔

دینی مدارس کے طلبائے کرام توجہ فرمائیں:

راقم نے اپنے ترجمہ میں "لَاجُنَاحَ عَلَيْكُمْ" کا ترجمہ کیا ہے "تم پر گناہ نہیں" اور "اَوْتَفْرِضُوْا لَهُنَّ" کا ترجمہ کیا ہے "اور نہیں مقرر کیا ان کا مہر"

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان رحمہ اللہ نے "لَاجُنَاحَ عَلَيْكُمْ" کا ترجمہ فرمایا ہے "تم پر کچھ مطالبہ نہیں" اور "اَوْتَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً" کا ترجمہ کیا ہے "یا کوئی مہر مقرر کر لیا ہو"۔

نوٹ: اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ تاج کمپنی اور ضیاء پبلیکیشنز کے مطبوعہ نسخوں سے نقل کیا گیا ہے۔ اگرچہ مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے تفسیر نعیمی میں اعلیٰ حضرت کا ترجمہ نقل کیا ہے "یا کوئی مہر مقرر نہ کر لیا ہو" لیکن یہ سہو کتابت ہے۔ آپ کا ترجمہ مثبت ہے منفی نہیں۔ خیال رہے کہ یہاں مودودی صاحب کا ترجمہ بھی اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کے مطابق ہے۔

اصل میں مفسرین کرام نے یہاں دو طرح کی تفاسیر بیان فرمائی ہیں۔

ایک قسم کے مطابق اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ہے اور دوسری قسم کے مطابق راقم کا ترجمہ ہے۔

راقم نے دوسری قسم کی تفسیر کے مطابق اس لئے ترجمہ کیا ہے تاکہ دونوں قول طلبائے کرام ذہن نشین کر لیں۔

ابھی تک قرطبی اور خازن سے جو بحث ذکر کی گئی ہے اس سے راقم کے ترجمہ کو تائید حاصل ہے۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ

راقم کے ترجمہ میں "اَوْ" کا ترجمہ "اور" کیا گیا ہے۔

"قال اللہ عزوجل (لاجناح علیکم ان طلقتم النساء مالم تمسوھن اوتفرضوالھن فریضۃ)
تقدیرہ مالم تمسوھن ولم تفرضوالھن"

یعنی آیۂ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ "تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو طلاق دو جب تک ان کو مس نہ کرو اور مہر مقرر نہ کرو۔

"وقدتکون اوبمعنی الواوقال اللہ تعالی "ولاتطع منھم آثمااو کفورا" معناہ ولا کفورا. وقال اللہ تعالی " وان کنتم مرضی اوعلی سفراوجاء احدمنکم من الغائط" والمعنی و جاء احدمنکم من الغائط وانتم مرضی ومسافرون. وقال اللہ تعالی "وارسلناہ الی مائۃ الف اویزیدون" معناہ ویزیدون. وھذاموجودفی اللغۃ وھی فی النفی اظھرفی دخولھا علیہ انھابمعنی الواو" (احکام القرآن للجصاص)

"اَوْ" کبھی بمعنی "واؤ" کے آتا ہے۔ مذکورہ بالا تینوں آیتوں میں یعنی "او کفورا" میں اور "او جاء احدمنکم" میں، اور "اویزیدون" میں، "اَوْ" بمعنی "واؤ" استعمال ہے۔ "او" کا "واؤ" کے معنی میں استعمال لغت میں موجود ہے۔ بلکہ نفی کے مقام میں اس معنی میں استعمال اور زیادہ واضح ہے۔

جلالین میں بھی "تفرضوا" سے پہلے "لم" ذکر کیا گیا ہے۔

"(او)لم(تفرضوالھن فریضۃ)"

اس کی وضاحت کمالین میں یوں کی گئی ہے۔

"قولہ او،لم یشیربتقدیرلم الی انہ مجزوم للعطف علی تمسوھن"

مفسر رحمہ اللہ نے "تفرضوالھن" سے پہلے "لم" مقدر کو ظاہر کر کے اشارہ کیا ہے کہ اس کا عطف "تمسوھن" مجزوم پر ہے۔ جس طرح "تمسوھن" سے پہلے "لم" ہے، اسی طرح "تفرضوالھن" سے پہلے بھی "لم" ہوگا، کیونکہ ضابطہ یہی ہے کہ جو عبارت معطوف علیہ سے پہلے ہوتی ہے وہ معطوف سے پہلے بھی ہوتی ہے۔ (حاشیہ جلالین)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ اور روح المعانی:

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ تفسیر روح المعانی کے مطابق ہے۔ آیئے روح المعانی کو دیکھئے۔

"(لاجناع علیکم) لاتبعه من مهر وهو الظاهر"

یعنی "لاجناح" کا ترجمہ جو زیادہ ظاہر ہے وہ یہ ہے تم پر مہر کا پیچھا کرنا یعنی مہر کا مطالبہ کرنا نہیں۔

"(او تفرضوا لهن) ای حتی تفرضوا لهن، او الاان تفرضوا لهن"

یہاں تک کہ تم ان کا مہر مقرر کرو۔ یا یہ ترجمہ ہے۔ مگر یہ کہ تم ان کا مہر مقرر کرو۔

یعنی اس مقام پر "او" بمعنی "الی ان" یا "اِلاّاَن" کے استعمال ہوا ہے۔

علیحدہ علیحدہ الفاظ کی تفسیر کرنے کے بعد مکمل مسئلہ روح المعانی میں ان الفاظ سے بیان کیا گیا ہے۔

"والمعنی انه لاتبعة علی المطلق بمطالبة المهر اصلا اذا کان الطلاق قبل المسیس علی کل حال الافی حال الفرض فان علیه حینئذ نصف المسمی کماسیصرح به، وفی حال عدم تسمیته علیه المتعة لانصف مهر المثل، واما اذا کان بعدالمساس فعلیه فی صورة التسمیة تمام المسمی، وفی صورة عدمها تمام مهر المثل"

معنی یہ ہے کہ طلاق دینے والے کا مہر کے مطالبہ سے بالکل پیچھا نہ کیا جائے جبکہ طلاق اس نے مس کرنے سے پہلے دی ہو، یہ مطالبہ کسی حال میں بھی نہ کیا جائے سوائے مہر کے مقرر کرنے کے، مس سے پہلے طلاق دی گئی ہو اور مہر مقرر کیا گیا تھا تو نصف مہر دیا جائے گا جس کا صراحۃ عنقریب ذکر آرہا ہے۔ مس سے پہلے طلاق ہو اور مہر مقرر نہیں کیا گیا تو متعہ دینا لازم ہے، کیونکہ مہر مثل کو نصف نہیں کیا جاتا۔ اگر طلاق مس کے بعد دی گئی اور مہر مقرر کیا گیا تھا تو مکمل مہر دینا لازم ہوگا اور اگر مہر مقرر نہیں کیا گیا اور طلاق مس کرنے کے بعد دی گئی تو مہر مثل دینا لازم ہوگا۔

ابھی تک روح المعانی سے بیان کردہ بحث کو دیکھ کر یہ سمجھنا مشکل نہ رہا کہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے۔ تاہم یہ بھی خیال رہے کہ روح المعانی میں دوسرا معنی بھی ذکر کیا گیا ہے۔ "لاجناح" کے متعلق فرماتے

ہیں۔"قیل من الوزر"بعض حضرات نے بیان کیا ہے"تم پر کوئی گناہ نہیں"۔

اور"او تفرضوا لھن" کے متعلق بیان فرماتے ہیں۔

"ومن الناس من جعل کلمة"او"عاطفة لمدخولها علی ماقبلها من الفعل المجزوم.

بعض حضرات"او تفرضوا لھن"کا عطف مجزوم"تمسوھن"پر کیا ہے،اس صورت میں"لم" ساتھ ملے گا،معنی یہ ہوگا" کہ تم نے مہر مقرر نہ کیا ہو"۔

اعتراض: روح المعانی نے پہلے معنی کے بعد خود ہی اعتراض کیا ہے کہ "او"بمعنی"الی ان" کے آنے کے لئے غایة پائی جاتی ہے،جیسا کہ کہا جاتا ہے۔"لالزمنک او تعطینی حقی" میں تمہیں ضرور بر ضرور لازم پکڑوں گا یہاں تک کہ تو میرا حق ادا کردے۔یعنی میرے لازم پکڑنے کی انتہاء تمہارا اعطاء کرنا ہے۔

اس قانون کے لحاظ پر مہر مقرر کرنا غایت بنے گا"عدم مساس"(نہ چھونے کا) نہ کہ عدمِ جناح (گناہ نہ ہونے کا) یہ معنی مقصود نہیں۔

جواب: یہاں فعل مقید معتبر ہے،معنی یہ ہے۔"انتم مالم تمسوھن بغیر جناح وتبعة الا اذا فرضت الفریضة"،تم نہ مس کرو جب تک بغیر گناہ کے اور بغیر مطالبہ مہر کے مگر جبکہ مہر تم نے مقرر کیا ہو۔(یہی معنی مقصود ہے)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ روح البیان،جواہر طنطاوی کی تفسیر کے بھی مطابق ہے،اور قرطبی کی ایک تفسیر کے بھی مطابق ہے اور تفسیر ابی السعود کی دو تفسیروں میں سے ایک کے مطابق ہے۔

"وَمَتِّعُوْهُنَّ" اور ان کو نفع پہنچاؤ۔

یعنی جب تم نے مہر مقرر نہیں کیا اور طلاق جماع یا خلوت صحیحہ سے پہلے دے دی تو تم پر واجب ہے کہ ان کو نفع پہنچاؤ یعنی ان کو متعہ دو جو تین کپڑوں پر مشتمل جوڑا ہے۔

متعہ دینے میں حکمت:

"والحکمة فی ایجاب المتعة جبر ایحاش الطلاق" (تفسیر ابی السعود)

متعہ دینے میں حکمت یہ ہے کہ مرد نے عورت کو طلاق دے کر اسے وحشت میں مبتلاء کر دیا ہے،
جب اسے متعہ دیا جائے گا تو اس کی دلجوئی ہوگی، کچھ نہ کچھ اس کی تسلی ہوگی۔

سبحان اللہ! کیسا خوب معاشرہ تھا کہ بلاوجہ طلاق نہیں دی جاتی تھی، اگر کسی مجبوری کی وجہ سے طلاق دے دی جاتی تو پھر بھی اسلامی تعلق برقرار رکھا جاتا تھا، دونوں خاندان ایک دوسرے کے دشمن نہیں بن جاتے تھے، بلکہ ایک دوسرے سے اخوت اسلامیہ برقرار رہتی۔

خلوتِ صحیحہ کیا ہے؟

خلوت صحیحہ یہ ہے کہ مرد اور عورت علیحدہ ملکر بیٹھیں جہاں وطی کرنے سے کوئی مانع حسی اور مانع طبعی اور مانع شرعی نہ پائے جائیں۔

اگر دونوں میں سے کوئی ایک مریض ہو تو خلوت صحیحہ نہیں پائی گئی، کیونکہ مانع طبعی پایا گیا ہے، اور اگر دونوں میں سے کوئی ایک روزہ دار ہو، روزہ بھی رمضان کا ہو، یا کسی ایک نے حج کا احرام باندھا ہوا ہے، خواہ حج فرضی ہو یا نفلی، یا عمرہ کا احرام باندھا ہوا ہے، یا عورت حیض میں مبتلا ہو تو ان صورتوں میں بھی خلوت صحیحہ نہیں پائی جا سکتی۔ کیونکہ یہاں مانع شرعی پایا گیا ہے۔

اور اگر دونوں کے پاس کوئی شخص ہو، خواہ بچہ ہی اتنی عمر کا ہو جس کے سامنے وطی کرنے میں انسان کو حیاء آتی ہو تو خلوت صحیحہ نہیں۔ کیونکہ مانع حسی پایا گیا ہے۔

خلوت صحیحہ میں اگر چہ جماع تو نہیں پایا جاتا لیکن احکام جماع والے جاری ہو جاتے ہیں۔

”عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ“

غنی پر اس کی طاقت کے مطابق اور تنگ دست پر اس کی طاقت کے مطابق۔ یعنی خاوند پر متعہ دینا واجب ہے لیکن وہ کپڑوں کا جوڑا خاوند کی حیثیت کے مطابق ہو۔

اگر خاوند غنی ہوتو وہ اپنی طاقت کے مطابق وہ اچھے قیمتی کپڑے لے کر دے اور اگر تنگ دست ہوتو وہ اپنی طاقت کے مطابق کپڑے لے کر دے۔

"موسع" وسعت رکھنے والا۔ یعنی مالی وسعت رکھتا ہو۔ "مقتر" تنگی رکھنے والا۔ یعنی تنگ دست۔

قتریقتر۔ کم کرنا، گھٹانا۔ "قدرہ علی قدر الامکان و الطاقۃ" یعنی جہاں تک ممکن ہو اور طاقت ہو۔

"مَتَاعًابِالْمَعْرُوْفِ" نفع پہنچانا شرع کے مطابق۔

یعنی متعہ دینے میں شریعت کا پاس کیا جائے، نہ عورت پر ظلم ہو کہ خاوند اپنی حیثیت سے گھٹیا متعہ دے اور نہ خاوند پر ظلم ہو کہ خاوند سے اس کی حیثیت سے بڑھ کر متعہ کا مطالبہ کیا جائے۔

"حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ" واجب ہے احسان کرنے والوں پر۔

اس پر بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ متعہ دینا جب واجب ہے تو احسان کرنے والوں کے ذکر کا کیا مطلب ہے، کوئی احسان کرنے والا ہو یا نہ ہو، ہر حال میں واجب ہوگا۔

تو اس کے دو جواب دیئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ محسنین بمعنی مومنین ہے۔ یعنی متعہ دینا مومنوں پر واجب ہے، کیونکہ احکام شرع مومنوں پر ہی واجب ہیں نہ کہ کافروں پر۔

دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ محسنین کا معنی احسان کرنے والا ہی ہو، لیکن مطلب یہ ہوگا کہ احکام شرع پر عمل کرنے والے اور اس سے فائدہ اٹھانے والے وہی لوگ ہیں جو احسان و بھلائی کرنے والے ہیں۔ (ماخوذ از خازن و مدارک)

فائدہ جلیلہ: ایک عورت سے نکاح کیا گیا لیکن مہر مقرر نہیں کیا اور وہ جماع اور خلوت صحیحہ سے پہلے فوت ہوگئی تو اسے مہر مثل دیا جائے گا، اور اس پر وفات کی عدت گذارنا لازم ہوگا، اور وہ وراثت کی حقدار ہوگی، اس مسئلہ پر حدیث پاک شاہد ہے۔

☆ "عن ابن مسعود انه سئل عن رجل تزوج امرأة لم يفرض لها ولم يدخل بها حتى مات، فقال ابن مسعود لها مثل صداق نسائها لا وكس و لا شطط، وعليها العدة و لها الميراث، فقام معقل بن

سنان الاشجعی فقال قضی رسول اللہ ﷺ فی بروع بن واشق امرأۃ منامثل الذی قضیت ففرح بھاابن مسعود۔قال الترمذی حدیث ابن مسعود حدیث حسن صحیح"

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص نے ایک عورت سے نکاح کیا اور مہر مقرر نہیں کیا اور جماع بھی نہیں کیا یہاں تک کہ وہ فوت ہوگیا (اس کا حکم کیا ہے؟ آپ نے فرمایا، میں اس مسئلہ میں اجتہاد کر کے بتاؤں گا۔ میرے پاس اس کے متعلق کوئی روایت تو نہیں، آپ نے ایک ماہ اجتہاد کرنے کے بعد بتایا) کہ اس عورت کو اس کی خاندانی عورتوں کے مہر کی طرح مہر (یعنی مہر مثل) دیا جائے، نہ اس میں کمی اور نہ زیادتی۔ اور اس پر عدتِ (وفات) لازم ہے، اور اس کے لئے وراثت بھی ہے۔ معقل بن سنان اشجعی کھڑے ہوئے انہوں نے کہا کہ ہمارے خاندان کی ایک عورت بروع بنت واشق کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے یہی فیصلہ فرمایا تھا، جیسا تم نے اس عورت کے متعلق فیصلہ کیا ہے۔ تو حضرت ابن مسعود بڑے خوش ہوئے۔ (از قرطبی)

خوش ہونے کی وجہ واضح ہے کہ آپ کا اجتہاد نبی کریم ﷺ کے ارشاد کے مطابق ہوگیا۔ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے اجتہاد کے بعد مسئلہ بتانے پر فرمایا ہی یہ تھا کہ یہ میرا اجتہاد ہے اگر یہ درست ہوا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگا اور اگر درست نہ ہوا تو میری طرف سے اور شیطان کی طرف سے ہوگا، جب آپ کے اجتہاد کو رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ سے تائید مل گئی تو آپ نے سمجھ لیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے القاء ہوا۔

تنبیہ: "ومتعوھن" امر وجوب پر دلالت کرتا ہے اور "حقا علی المحسنین" میں "حقا" کا معنی بھی وجوب ہے۔ لیکن وجوب اسی خاص صورت میں ہے جس کا آیۃ کریمہ میں ذکر ہو رہا ہے۔

"المتعۃ واجبۃ للمطلقۃ قبل البناء والفرض ومندوبۃ فی حق غیرھا"

جس عورت کو جماع یا خلوت صحیحہ سے پہلے اور مہر مقرر کرنے سے پہلے طلاق دے دی گئی ہو اسے متعہ دینا واجب ہے۔ دوسری مطلقات کو متعہ دینا مستحب ہے۔ تفصیل پہلے ذکر کر دی گئی۔

(ماخوذ از قرطبی)

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْفَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَافَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْيَعْفُوَالَّذِیْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ . وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى . وَلَاتَنْسَوُاالْفَضْلَ بَيْنَكُمْ . اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ☆ (سورۃالبقرۃ آیت ۲۳۷)

﴿۱﴾

اور اگر تم نے عورتوں کو بے چھوئے طلاق دے دی اور ان کے لئے کچھ مقرر کر چکے تھے تو جتنا ٹھہرا تھا اس کا آدھا واجب ہے مگر یہ کہ عورتیں کچھ چھوڑ دیں یا وہ زیادہ دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے اور اے مردو تمہارا زیادہ دینا پرہیز گاری کے نزدیک تر ہے اور آپس میں ایک دوسرے پر احسان کو بھلا نہ دو بے شک اللہ تمہارے کام دیکھ رہا ہے۔

﴿۲﴾

اور اگر تم نے طلاق دی ان کو پہلے ان کو مس کرنے کے اس حال میں کہ تم نے مقرر کر لیا ہوا ان کا مہر تو نصف (واجب ہے) جو تم نے مقرر کیا مگر یہ کہ وہ (عورتیں) معاف کر دیں، یا زیادہ دے وہ شخص جس کے ہاتھ میں گرہ ہے نکاح کی، اور تمہارا معاف کرنا زیادہ قریب ہے تقوی کے اور نہ چھوڑو فضل (احسان ومہربانی) کو آپس میں، بیشک اللہ جو تم عمل کرتے ہو (انہیں) دیکھ رہا ہے۔

مختصر مطلب: اگر مرد نے عورت کو جماع کرنے سے پہلے طلاق دے دی اور مہر مقرر کیا ہوا تھا تو نصف مہر دینا واجب ہے۔ ہاں اگر عورت اپنا مہر معاف کر دے تو وہ معاف کر دے، اس کا معاف کرنا احسان وفضل ہے۔

اور اگر خاوند مہر زیادہ دے دے تو یہ اس کی طرف سے احسان ہے۔ تمہارا معاف کرنا تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔ تم آپس میں ایک دوسرے پر فضل واحسان کرنے کو نہ چھوڑو۔ بیشک اللہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

''وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ''

اور تم ان (عورتوں) کو طلاق دو ان کو مس کرنے سے پہلے۔

یہاں ''مس کرنا'' جماع اور خلوت صحیحہ دونوں کو شامل ہے۔ یعنی اگر تم اپنی عورتوں کو طلاق دو ان سے جماع کرنے سے پہلے اور اسی طرح ان سے خلوت صحیحہ سے پہلے۔

''وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً'' اس حال میں کہ تم نے مقرر کر لیا ہو ان کا مہر۔

راقم نے جملہ حالیہ کا معنی تفسیر کبیر کے ان الفاظ سے ماخوذ کیا ہے۔

''قوله تعالىٰ ''وقد فرضتم لهن فريضة''حال من مفعول ''طلقتموهن'' والتقدير طلقتموهن حال مافرضتم لهن فريضة''

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ''وقد فرضتم لهن فريضة'' حال واقع ہو رہا ہے ''طلقتموهن'' کے مفعول سے۔ اس لئے حال کی صورت میں معنی یہ ہوگا۔ اگر تم نے ان کو طلاق دی ان کو مس کرنے سے پہلے اس حال میں کہ تم نے مقرر کر لیا ہو ان کا مہر۔

''فريضة'' کا معنی اگرچہ ''مقرر کرنا'' ہے۔ تاہم مراد اس سے ''مہر'' ہے۔ جیسا کہ پہلی آیۃ کریمہ میں گذر چکا ہے۔

''فَنِصْفُ مَافَرَضْتُمْ'' تو نصف (واجب) ہے جو تم نے مقرر کیا۔

یعنی جتنا مہر تم نے مقرر کیا ہے اس کا نصف دینا تم پر واجب ہے جب تم نے ان کو جماع اور خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دے دی۔

''اِلَّاۤ اَنۡ یَّعۡفُوۡنَ'' مگر یہ کہ وہ عورتیں معاف کردیں۔

اگرچہ آیۃ کریمہ میں تو نصف مہر کا ذکر ہے، اس لحاظ پر مفہوم یہ ہوگا کہ عورتیں جب نصف مہر لینے کی مستحق ہوں تو وہ اپنا مکمل حق معاف کردیں یا اس میں سے کچھ حصہ معاف کردیں، یہ ان کا حق ہے۔ بلکہ ان کا معاف کرنا احسان ہے، کیونکہ ''ولاتنسوا الفضل'' سے یہ مفہوم سمجھ آرہا ہے کہ آپس میں احسان کرنے کو نہ بھولو۔ یعنی عورت بھی وہ کام کرے جس میں احسان پایا جائے وہ یہی ہے کہ مہر معاف کردے، اور مرد بھی وہ کام کرے جس میں احسان پایا جائے یعنی وہ مہر زیادہ دے۔

لیکن خیال رہے کہ ''الاان یعفون'' کا مفہوم اور بھی وسیع ہے کہ اگر وہ عورتیں بعد از مجامعت مکمل مہر لینے کی حقدار ہوں تو پھر بھی ان کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنا کل مہر یا بعض مہر معاف کردیں۔

دینی طلبائے کرام توجہ فرمائیں:

''یعفون'' جمع مذکر غایب کا بھی صیغہ ہے، اور جمع مؤنث غائب کا بھی۔ جب جمع مذکر غائب کا صیغہ ہوگا تو اصل میں ''یعفوون'' ہوگا، واؤ پر ضمہ ثقیل ہونے کی وجہ سے ضمہ کو گرادیا اور التقائے ساکنین کی وجہ سے ایک واؤ کو حذف کردیا گیا تو ''یعفون'' ہوگیا۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ جمع مذکر غائب کے صیغہ میں ''نون'' اعرابی ہے جو نواصب و جوازم کے داخل ہوتے وقت حذف ہوجاتا ہے۔ اگر یہ مذکر کا صیغہ ہوتا تو ''ان یعفوا'' ہوتا۔

اور جب یہ ''یعفون'' جمع مؤنث غائب کا صیغہ ہو تو اصل میں یہ لفظ اس طرح تھا، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یعنی جمع مذکر بروزن ''ینصرون'' کے ہوگا، اور جمع مؤنث بروزن ''ینصرن'' کے ہوگا۔

جب ''یعفون'' جمع مؤنث کا صیغہ ہوگا تو اس وقت ''نون'' ضمیر ہوگا، جو مبنی ہے اس لئے نواصب و جوازم کے وقت وہ برقرار رہے گا، حذف نہیں ہوگا۔

آیۃ کریمہ میں ''یعفون'' پر ''ان'' ناصبہ داخل ہے اور نون موجود ہے تو واضح ہوا کہ یہ صیغہ جمع مؤنث کا ہے، اس لئے اس کا معنی یہی ہوگا ''مگر یہ کہ وہ عورتیں معاف کردیں''۔

''**اَوْیَعْفُوَالَّذِیْ بِیَدِہٖ عُقْدَۃُ النِّکَاحِ**'' یا زیادہ دے وہ جس کے ہاتھ میں گرہ ہے نکاح کی۔

جس کے ہاتھ میں گرہ نکاح کی، وہ کون ہے؟

اس میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد ولی ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد خاوند ہے۔

خاوند مراد ہونے کا قول حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت سعید بن میبّب رضی اللہ عنہ اور کثیر صحابہ کرام اور کثیر تابعین کا ہے اور یہی قول حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا ہے۔

خاوند مراد ہونے پر دلائل:

﴿۱﴾ پہلی دلیل یہ ہے کہ ولی کو یہ حق حاصل نہیں کہ اپنی مولیہ (جس کی اسے ولایت حاصل ہے) کا مہر معاف کردے، خواہ اس کی مولیہ صغیرہ (چھوٹی) ہو یا کبیرہ (بڑی)۔

البتہ خاوند کو حق حاصل ہے کہ وہ مہر زیادہ دے دے، اس لئے ولی مراد لینا درست نہیں۔

﴿۲﴾ دوسری دلیل یہ کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ ''الذی بیدہ عقدة النکاح'' یہ نہیں فرمایا 'عقد النکاح'' ولی کے ہاتھ میں عقد نکاح ہے وہ بھی اس وقت جب مولیہ صغیرہ نابالغہ ہو۔

یعنی ولی کو صغیرہ نابالغہ کا نکاح کر کے دینے کا حق ہے جسے عقد نکاح کہا جاتا ہے۔ بعد میں نکاح کی گرہ ولی کے ہاتھ نہیں ہوتی بلکہ خاوند کے ہاتھ ہوتی ہے، خواہ وہ اسے برقرار رکھے یا طلاق وغیرہ کے ذریعے کھول دے۔

واضح ہوا کہ گرہ لگانا عقد ہے اور لگی ہوئی گرہ کو اپنے قبضہ میں رکھنا عقدہ۔ ولی کے ہاتھ عقد ہے اور زوج کے ہاتھ عقدہ۔

﴿۳﴾ تیسری دلیل یہ ہے کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ''الذی بیدہ عقدة النکاح'' کا مطلب یہ ہے کہ جس

کے ہاتھ نکاح کی گرہ ثابت ہے۔ چونکہ نکاح کی گرہ ثابت زوج کے ہاتھ میں ہی ہے لہٰذا آیۃ کریمہ میں وہی مراد ہے۔ یہ ثابت ہونے والا معنی اس آیۃ کریمہ میں بھی پایا گیا ہے۔ ''ونھی النفس عن الھوی فان الجنۃ ھی المأوی''

اس کا معنی یہ ہے ''ونھی النفس عن الھوی الثابت لہ لالغیرہ کانت الجنۃ ثابتۃ لہ فتکون ماواہ'' (اور وہ شخص جس نے) اپنے نفس کو ان خواہشات سے روکا جو اس کے لئے ثابت ہیں نہ کہ اور کسی کے تو جنت اس کے لئے ثابت ہوگی اور اس کا ٹھکانا ہوگی۔

﴿۴﴾ چوتھی دلیل یہ ہے۔

''روی عن جبیر بن مطعم انہ تزوج امرأۃ فطلقھا قبل ان یدخل بھا فاکمل الصداق و قال انا احق بالعفو''

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک عورت سے نکاح کیا، اسے جماع (اور خلوت صحیحہ) سے پہلے ہی طلاق دے دی، انہوں نے عورت کو مکمل مہر دیا، اور کہا کہ میں عفو کا زیادہ حق رکھتا ہوں۔

یعنی انہوں نے آدھا مہر دینا تھا لیکن کل مہر دے کر اسے عفو کہا اور یہ کہا کہ میں عفو کا حق زیادہ رکھتا ہوں۔

''وھذا یدل علی ان الصحابۃ فھموا من الآیۃ العفو الصادر من الزوج''

حضرت جبیر رضی اللہ عنہ کے ارشاد سے واضح ہوا کہ صحابہ کرام نے اس آیۃ کریمہ سے یہی مراد لیا کہ جس کے ہاتھ میں گرہ ہے نکاح کی وہ زیادہ دے۔

نتیجہ واضح ہوا: کہ زوج نے اگر زوجہ کو مس کرنے سے پہلے طلاق دی اور مہر مقرر کیا گیا تھا تو نصف مہر دینا اس پر واجب ہے لیکن مکمل دے تو اسے حق حاصل ہے۔

لیکن یہ بھی خیال رہے کہ یہ حکم بھی عام ہے۔ خاوند عورت کو طلاق دے یا نہ دے، خواہ جماع سے پہلے طلاق دے یا بعد میں، جو مہر مقرر کیا تھا اس سے زیادہ دے دے تو بہتر ہے۔ (از کبیر)

(اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ بھی راقم کو مقصد کے بیان کے لئے خوب نظر آیا، اسی وجہ سے راقم نے بھی وہی نقل کیا" یا وہ زیادہ دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے")

ولی مراد لینا:

جن حضرات نے آیۃ کریمہ میں "الذی بیدہ عقدۃ النکاح "مراد لیا ہے وہ حضرات حسن بصری، مجاہد، علقمہ اور امام شافعی رحمہم اللہ ہیں۔

اگر اس قول کو مقید کیا جائے "مولیہ کی اجازت سے" جیسا کہ تفسیر حقانی میں مقید کہا گیا تو یہ قول بھی درست ہو گا کہ عورت کا ولی عورت کی اجازت سے معاف کر دے تو یہ اسے حق حاصل ہے۔ یہ معاف کرنا بھی اس کا حق ہے۔ لیکن اگر مقید نہ کیا جائے اور مطلب یہ مراد لیا جائے کہ ولی کو خود بخود معاف کرنے کا حق ہے تو یہ قول درست نہیں۔ اس پر دیئے جانے والے دلائل کمزور ہیں۔ زیادہ بحث کوئی دیکھنا چاہے تو کبیر میں دیکھ لے۔

زوج کا زیادہ مہر دینا عفو کیسے ہے؟

اس کی کئی وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ اگر چہ بظاہر معنی معاف کرنا ہے۔

۱۔ اس کی ویک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اس وقت عام رواج یہی تھا کہ نکاح کے وقت ہی تمام مہر ادا کر دیا جاتا تھا۔ جب مہر مقرر کر کے کل مہر ادا کر دیا پھر طلاق جماع اور خلوت صحیحہ سے پہلے دے دی گئی تو خاوند کو حق حاصل ہے کہ وہ آدھا مہر واپس کر لے، لیکن وہ آدھا مہر واپس نہ لے بلکہ معاف کر دے تو اس کے لئے یہ بہتر ہے۔ اس صورت کے لحاظ پر "یعفو" حقیقی معنی میں استعمال ہو رہا ہے۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مشاکلت کے طور پر زوج کے لئے بھی عفو کو استعمال کر لیا گیا ہے، کیونکہ زوجہ جب اپنا مہر معاف کر دے تو اس کا فائدہ زوج کو حاصل ہے یہاں تو عفو حقیقی معنی میں استعمال ہے، لیکن زوج زیادہ مہر دے اور زوجہ کو فائدہ پہنچائے تو مجازاً مشاکلت کے طور پر اسے بھی "عفو" سے بیان کر دیا گیا۔

﴿۳﴾ ''عفو'' کبھی بمعنی تسہیل کے استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے ''فلان وجدالمال عفوا صفوا'' فلاں شخص نے مال آسانی سے حاصل کیا۔

آیۂ کریمہ میں بھی اسی معنی کے لئے استعمال ہوا ہے یعنی اس معنی کے لحاظ پر ترجمہ یہ ہوگا ''او یعفو الذی بیدہ عقدۃ النکاح'' یا آسانی پہنچادے (زیادہ مہر دے کر) وہ شخص جس کے ہاتھ میں گرہ ہے نکاح کی۔

''وَاَنْ تَعْفُوْا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی'' اور تمہارا معاف کرنا زیادہ قریب ہے تقویٰ کے۔

ان الفاظ کا ترجمہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے یوں کیا ہے ''اور اے مردو تمہارا زیادہ دینا پرہیز گاری سے نزدیک تر ہے''۔ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا یہ ترجمہ ظاہری الفاظ کے مطابق ہے، کیونکہ ''ان تعفوا'' مذکر کا صیغہ ہے۔

اور ممکن ہے کہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے تفسیرات احمدیہ کی اس عبارت کو مدنظر رکھا ہو۔

''وفی قرأۃ ابونہیک ''وان یعفوا بالیاء، کماصرح بہ فی الکشاف''

ابونہیک کی قرأۃ میں ''وان یعفوا (یا کے ساتھ) اقرب للتقوی ہے۔ کشاف نے بھی اسی کی وضاحت کی ہے کہ یہ حکم خاوندوں کو ہے کہ اے مردو تمہارا زیادہ دینا پرہیز گاری کے قریب تر ہے۔

راقم نے اپنے ترجمہ میں ''اے مردو'' کا ذکر نہیں کیا۔ اور ''عفو'' کا معنی بھی معاف کرنا کیا ہے۔ اس کی وجہ تفسیر کبیر کی مندرجہ ذیل عبارت ہے۔

''ھذا خطاب للرجال والنساء جمیعا. الا ان الغلبة للذکور اذا اجتمعوا مع الاناث. و سبب التغلیب ان الذکورۃ اصل والتانیث فرع اللفظ وفی المعنی. امافی اللفظ فلانک تقول ''قائم'' ثم تریدالتانیث فتقول ''قائمة'' فاللفظ الدال علی المذکر ھو الاصل. والدال علی المؤنث فرع علیه. وامافی المعنی فلان الکمال للذکور والنقصان للاناث فلھذاالسبب متی اجتمع التذکیر والتانیث کان جانب التذکیر مغلبا. (کبیر)

''وان تعفوا'' میں خطاب مذکر اور مؤنث دونوں کو ہے۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ اے مردو تمہارا زیادہ دینا اور اے عورتو تمہارا معاف کرنا تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔

البتہ صیغہ مذکر کا ذکر ہے تغلیب کے طور پر، یعنی جب مذکر اور مؤنث کا ذکر ایک ہی صیغہ سے کرنا ہو تو وہاں صیغہ مذکر کا ذکر کیا جاتا ہے، کیونکہ مذکر کا صیغہ اصل ہے لفظاً بھی اور معنیً بھی۔

لفظی طور پر اصل ہونے کی وجہ واضح ہے کہ پہلے مذکر کا صیغہ "قائم" ذکر کیا جاتا ہے، جب تانیث کا ارادہ کریں تو مذکر کے صیغہ سے ہی تاء تانیث بڑھا کر "قائمة" بنالیا جاتا ہے۔

واضح ہوا کہ مذکر کا صیغہ لفظ کے لحاظ پر اصل ہے اور مؤنث کا صیغہ اس کی فرع ہے کیونکہ اسی سے بنتا ہے۔ معنوی طور پر بھی مذکر میں کمال پائے جانے کی وجہ سے مذکر اصل ہے اور مؤنث میں نقصان پائے جانے کی وجہ سے وہ فرع ہے۔

اسی وجہ سے مذکر و مونث جب جمع ہو جائیں تو تغلیبی طور پر صیغہ مذکر کا استعمال ہوگا۔ (از کبیر)

تنبیہ: تفسیر کبیر کے مطابق ہی تفسیر قرطبی، روح المعانی اور حسینی میں بھی مذکور ہے۔

تقوی کے قریب ہونے کی دو وجہ:

ایک وجہ یہ ہے کہ جو شخص اپنا حق چھوڑنے کی سخاوت کرے وہ محسن ہے، جو شخص محسن ہے وہ مستحق ثواب ہے، اور جو شخص مستحق ثواب ہوگا وہ یقیناً عذاب سے محفوظ رہے گا۔ یہ وجہ تقوی کے قریب ہونے کی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ایک دوسرے پر احسان کرنا ترک ظلم کا سبب ہے، ترک ظلم ہی حقیقت میں تقوی کا سبب ہے۔ اس لئے کہ جو شخص کسی پر فضل و احسان کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو مان کر ہی احسان کرتا ہے، وہ دوسرے پر ظلم نہیں کرتا، یہی تقرب الٰہی کا سبب ہے۔ (از کبیر)

"وَلَا تَنسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ" اور نہ چھوڑو فضل (احسان و مہربانی) کو آپس میں۔

اس مقام پر اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے "ولا تنسوا" کا حقیقی معنی مراد لیا ہے۔ آپ کا ترجمہ یہ ہے "اور آپس میں ایک دوسرے کو نہ بھلا دو"۔

راقم نے مجازی ترجمہ کیا ہے، جو تفسیر کبیر کی مندرجہ ذیل عبارت سے ماخوذ ہے۔

"ولیس المرادمنه النهی عن النسیان لان ذلک لیس فی الواسع،بل المرادمنه الترک،
فقال اللہ تعالی ولاتترکوا الفضل والافضال فیمابینکم"

یہاں بھولنے سے نہی نہیں پائی گئی۔ کیونکہ نہ بھولنا کسی کے اختیار میں نہیں۔ بلکہ مراد ترک کرنے سے نہی ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ کے ارشادگرامی کا مطلب یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے پر احسان کرنے کو نہ چھوڑو۔

اس حکم کی اصل وجہ یہ ہے کہ جب عورت سے مرد نے نکاح کیا تو عورت کا دل اس سے معلق ہو گیا، پھر جب جماع سے پہلے اسے طلاق دے دی گئی تو اسے اذیت پہنچائی گئی۔

اور مرد کو جب بغیر نفع حاصل کرنے کے آدھا مہر دینے کا حکم دیا گیا تو یہ اس کے لئے اذیت کا سبب بنا اس لئے ہر ایک کو دوسرے پر مہربانی کرنے کا حکم دیا تا کہ قلبی تکلیف دور ہو سکے۔ (از کبیر)

"اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ" بیشک اللہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

یعنی جو تم نیک عمل کرو گے،ایک دوسرے پر فضل واحسان کرو گے وہ ضائع نہیں جائیں گے،تمام کام اللہ تعالیٰ پر کامل طور پر منکشف (واضح) ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو نظر عطا فرمائی ہے تا کہ بندہ یہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے نظر عطا فرمائی ہے،جس کے ذریعے مجھے اس کی نشانیاں دیکھنی چاہئیں،اور ایسے عمل کروں کہ میری نظر میں ملکوت اور سماوات کے عجائب آ جائیں،اور جب انسان یہ سمجھے گا کہ مجھے رب تعالیٰ نے نظر اور کان عطا کئے تو وہ اپنی نظر کو کوتاہ نہیں کرے گا بلکہ اپنے نیک اعمال کے ذریعے اپنی نظر کو بلند کرے گا،اور یہ تصور کرے گا کہ جب رب تعالیٰ بصیر ہے اس پر کوئی چیز مخفی نہیں، تو رب تعالیٰ نے مجھے بھی بصر عطا کی ہے،وہی میری بصارت کو بھی وسعت عطاء کرے گا، جہان کی مخفی چیزیں اسی کی قدرت کاملہ سے مجھے بھی نظر آئیں گی۔ (ماخوذ از روح البیان)

حٰفِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰی وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ☆

(سورۃ البقرۃ آیت ۲۳۸)

﴿۱﴾

نگہبانی کرو سب نمازوں کی اور بیچ کی نماز کی اور کھڑے ہو اللہ کے حضور ادب سے۔

﴿۲﴾

ہمیشہ حفاظت کرو تمام نمازوں کی اور درمیانی نماز کی اور کھڑے ہو اللہ کے لئے اطاعت کرتے ہوئے۔

ماقبل سے رابطہ:

اللہ تعالیٰ نے مکلفین کے لئے دین کے احکام بیان فرمائے، شرعی مسائل کی وضاحت بیان فرمادی پھر ان کو نمازوں کی حفاظت کا حکم دیا، اس میں چند وجوہ بیان کی گئی ہیں۔

پہلی وجہ:

یہ ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ انسان شرعی احکام پر اس وقت عمل کر سکتا ہے جبکہ وہ عجز اختیار کرے اور سرکشی کو دور کردے، نماز میں قراءت وقیام، رکوع وسجود، خضوع وخشوع کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ ان پر عمل اسی وقت کرے گا جب اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا رعب پایا جائے گا، اور اس کی طبیعت سے سرکشی کا زوال ہوگا، اللہ تعالیٰ کے اوامر پر عمل کرنے کے لئے اسے اطاعت حاصل ہوگی اور نواہی سے دور رہے گا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ط" بیشک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔

دوسری وجہ:

یہ ہے کہ نمازی جب نماز میں "مالک یوم الدین" پڑھتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وہ ذات

ہے جسے جلال حاصل ہے، اور وہی باکمال ہے، اسے زوال نہیں کیونکہ جزاء کے دن کا وہی مالک ہے۔ اور جب "ایاک نعبد" پڑھتا ہے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ میں عاجز ہوں، میں اسی کا بندہ ہوں، میں سراپا نقصان ہوں مجھے زوال ہے، اسی لئے تو میں رب تعالیٰ کی عبادت کر رہا ہوں۔

پھر "ایاک نستعین" سے اور ہی زیادہ اسے پتہ چل جاتا ہے کہ میری امداد کرنے والا اللہ تعالیٰ کے بغیر اور کوئی نہیں اگر کسی اور نے امداد کرنی بھی ہے تو رب تعالیٰ کی توفیق سے امداد کرنی ہے۔ پھر "اھدنا الصراط المستقیم" سے لے کر "ولا الضالین" جب پڑھتا ہے تو اسے پتہ چل جاتا ہے کہ ثواب و عذاب اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔

فعندذلک یسھل علیه الانقاد للطاعة ولذلک قال تعالیٰ "استعینوا بالصبر والصلوة"
جب انسان کو علم حاصل ہو جائے گا تو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری پر اسے سر جھکانا آسان ہو جائے گا۔
اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے فرمایا "استعینوا بالصبر والصلوة" صبر اور نماز سے امداد طلب کرو۔

تیسری وجہ:

یہ ہے کہ پہلے جو احکام ذکر کئے گئے ہیں یعنی نکاح، طلاق اور عدت ان مسائل کا تعلق دنیاوی مصلحت سے تھا اب اس آیۃ کریمہ میں نماز کا ذکر فرمایا جس کا تعلق اخروی مصلحت سے ہے۔

گویا کہ پہلے بیان کئے گئے تیرہ احکام کا تعلق دنیا سے ہے اور اس آخری چودھویں حکم کا تعلق آخرت سے ہے۔ جس طرح دنیا کی انتہا آخرت ہے، اسی طرح دنیاوی احکام کے بیان کی انتہا اخروی حکم کے بیان سے کر دی گئی۔

(از کبیر متصرف)

پانچ نمازوں پر شاندار دلیل:

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی "حٰفظوا علی الصلوٰت" (حفاظت کرو نمازوں کی) میں لفظ "صلوٰت" جمع

ہےاورجمع کے تین فرد ہوتے ہیں۔اس کے بعد "والصلوة الوسطیٰ" ذکر کیا ہے، جوتین افراد سے ایک زائد ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اگرتین فردوں سے ایک فرد کے زیادہ ہونے پر دلالت نہ کرے تو تکرار لازم آئے گا، حالانکہ اصل یہی ہے کہ تکرار مراد نہ ہو بلکہ علیحدہ علیحدہ معنی مراد ہو۔ پھر چار نمازیں مراد نہیں ہوسکتیں کیونکہ چار میں ایک درمیانی نہیں ہوسکتی، لہذا جمع میں ایک فرد اور بڑھایا جائے گا، اس طرح پانچ نمازیں ثابت ہوں گی، جن میں سے درمیانی نماز کا ثبوت بھی ممکن ہوگا۔ (از کبیر)

نمازوں کے اوقات کا ثبوت قرآن پاک سے:

تفسیر کبیر میں اسی مقام پر ذکر کیا گیا ہے کہ اگرچہ اس آیۃ مبارکہ سے یہ تو ثابت ہے کہ نمازیں پانچ ہیں، لیکن نمازوں کے اوقات کا ثبوت اس آیۃ سے نہیں بلکہ اور آیات سے اوقات کا ثبوت ہے۔

"فسبحان اللہ حین تمسون وحین تصبحون وله الحمدفی السماوات والارض وعشیا وحین تظهرون"

تو اللہ کی پاکی بولو جب شام کرو اور جب صبح ہو، اور اسی کی تعریف ہے آسمانوں اور زمین میں اور کچھ دن باقی رہے اور جب تمہیں دوپہر ہو۔

اس آیۃ کریمہ میں "تمسون" سے مراد مغرب اور عشاء کا وقت ہے، اور "تصبحون" سے مراد صبح کی نماز ہے، اور "عشیا" سے مراد عصر کی نماز ہے، اور "حین تظهرون" سے مراد ظہر کی نماز ہے۔ "سبحان اللہ" اور "وله الحمد" سے مراد نماز ہی ہے۔

"اقم الصلوة لدلوک الشمس الی غسق اللیل وقرآن الفجران قرآن الفجر کان مشهودا"

نماز قائم رکھو سورج ڈھلنے سے رات کی اندھیری تک، اور صبح کا قرآن، بیشک صبح کے قرآن میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔

اس آیۃ کریمہ میں سورج کے ڈھلنے سے لے کر رات اندھیری ہو جانے تک نماز پڑھنے کا حکم ہوا جس میں چار نمازوں (ظہر، عصر، مغرب اور عشاء) کا ذکر ہو گیا، اور "قرآن الفجر" میں صبح کی نماز (فجر) کا ذکر ہے۔ کیونکہ صبح کی نماز میں رات والے فرشتے کراما کاتبین بھی حاضر رہتے ہیں نماز ادا کر کے جاتے ہیں اور دن والے بھی صبح کی نماز میں آجاتے ہیں وہ بھی نماز ان کے ساتھ ہی ادا کرتے ہیں۔

"اقم الصلوۃ طرفی النھار وزلفا من اللیل"

نماز قائم کرو دن کی دونوں طرفوں میں اور رات کے کچھ حصہ میں۔

دن کی دونوں طرفوں میں تین نمازیں (فجر، ظہر، عصر) آگئیں کیونکہ دن کی ابتدائی طرف میں فجر آ گئی، اور دن کی آخری طرف میں ظہر اور عصر آ گئیں، اس لئے سورج کے ڈھل جانے پر شام کی طرف شروع ہو جاتی ہے۔

"حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ" ہمیشہ نمازوں کی حفاظت کرو۔

یہاں راقم نے اپنے ترجمہ میں لفظ "ہمیشہ" ذکر کیا ہے، یعنی "ہمیشہ نمازوں کی حفاظت کرو"۔ یہ ترجمہ روح المعانی کی اس عبارت سے ماخوذ ہے۔

"حفظوا علی الصلوت" داوموا علی ادائھا لاوقاتھا من غیر اخلال کماینبئی عنہ صیغۃ المفاعلۃ المفیدۃ للمبالغۃ.

ہمیشہ تمام نمازوں کو ان کے اوقات میں ادا کرو، ان میں کوئی خلل واقع نہ ہونے دو، جیسا کہ مفاعلہ کا صیغہ اس معنی کی خبر دے رہا ہے، کیونکہ مفاعلہ مبالغہ کا فائدہ دیتا ہے۔ (روح المعانی)

"حفظوا" ای داوموا و اظبوا "ہمیشہ حفاظت کرو" (خازن)

مفکرِ اسلام، مفسرِ قرآن پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں، یہاں قرآن کے الفاظ غور طلب ہیں "حفظوا علی الصلوات" فرمایا "احفظوھا" نہیں فرمایا، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب مفاعلہ کا صلہ علیٰ آ جائے تو اس وقت اس کے معنی بار بار اور علی الدوام کرنے کے ہوتے ہیں (المنار) یہاں بھی مقصد یہی بتانا ہے کہ بار بار ہمیشہ نماز ادا کرتے رہو یہ نہیں کہ ایک بار نماز ادا کر لی اور ہفتہ بھر کے لئے چھٹی مل گئی۔ (ضیاء القرآن)

محافظت جو معتبر ہے:

نماز کی محافظت کا جو حکم دیا گیا ہے اس سے مراد نماز کی بمع جمیع شرائط کے محافظت کرنا، یعنی بدن اور کپڑے اور نماز کی جگہ کا پاک ہونا، ستر عورت (ننگیز ڈھانپنا) قبلہ کا استقبال، اور نماز کی حفاظت اس کے ارکان کی حفاظت کے ساتھ کرے، اور نماز توڑ دینے والی چیزوں سے بچا کر حفاظت کرنا مقصود ہے، خواہ اعمال قلب ہوں، زبان کے اعمال ہوں یا ظاہری اعضاء کے اعمال ہوں۔

نماز کے اہم امور میں سے نیت ہے، اسلئے نیت کی حفاظت کرنا بھی نماز کا مقصد اصلی ہے، کیونکہ رب تعالیٰ نے فرمایا "واقم الصلوۃ لذکری" (اور نماز ادا کرو میری یاد کے لئے)

"فمن ادی الصلوۃ علی ھذا الوجہ کان محافظا علی الصلوۃ والا فلا"

جس شخص نے نماز اس طرح ادا کی اس نے نماز کی حفاظت کی ورنہ اس نے نماز کی حفاظت نہیں کی

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

"حافظوا" باب مفاعلہ ہے اور مفاعلہ شرکتِ جانبین کو چاہتا ہے، جیسے کہا جائے "خاصم شاھد حامدا" تو اس کا معنی ہے شاہد نے حامد سے اور حامد نے شاہد سے جھگڑا کیا۔

آیۂ کریمہ میں جانبین کا معنی کیسے پایا گیا؟ اس کے کئی جواب دیئے گئے۔

ایک جواب یہ ہے کہ شرکت کا معنی پایا جانا ہمیشہ لازم نہیں کیونکہ کبھی بغیر شرکت کے معنی کے بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے کہا جائے "عاقب الحاکم اللص" حاکم نے چور کو سزا دی۔ یہاں شرکت کا معنی نہیں پایا گیا، یہ کہنا درست نہیں کہ چور نے حاکم کو سزا دی۔

دوسرا جواب یہ دیا گیا کہ یہاں جانبین والا معنی پایا گیا ہے، اس میں پھر دو صورتیں پائی گئی ہیں، ایک یہ ہے کہ محافظت رب تعالیٰ اور بندے کے درمیان مراد ہے گویا کہ یہ کہا گیا ہے۔

" احفظ الصلوۃ لیحفظک اللہ الذی امرک بالصلوۃ"

تم نماز کی حفاظت کروتا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت کرے جس نے تمہیں نماز کا حکم دیا ہے۔

یہ حکم ایسا ہی ہے جیسا کہ "فاذکرونی اذکرکم" (تو تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا) میں پایا گیا ہے، اور جیسا کہ اس حدیثِ پاک میں پایا گیا ہے "احفظ اللہ یحفظک" تم اللہ تعالیٰ کے دین کی حفاظت کرو، وہ تمہاری حفاظت کرے گا۔

دوسری صورت جانبین والے معنی کی یہ ہے کہ نمازی اور نماز کے درمیان محافظت مراد ہے، اس میں تین وجوہ پائی گئی ہیں۔

ایک وجہ یہ ہے کہ تم نماز کی حفاظت کرو اور نماز تمہاری گناہوں سے حفاظت کرے گی، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا "ان الصلوۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر" بیشک نماز روکتی ہے بے حیائی اور برے کاموں سے، یعنی مطلب یہ ہو گیا "فمن حفظ الصلوۃ حفظته الصلوۃ عن الفحشاء" جس شخص نے نماز کی حفاظت کی نماز اسے بے حیائی سے روکنے کی حفاظت کرے گی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ تم نماز کی حفاظت کرو نماز تمہیں مصیبتوں سے بچانے کی حفاظت کرے گی، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ "واستعینوا بالصبر والصلوۃ" اور امداد طلب کرو صبر اور نماز سے۔

اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی یہ ہے۔

"وقال اللہ انی معکم لئن اقمتم الصلوۃ واتیتم الزکوۃ"

اور اللہ نے کہا بیشک میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نے نماز قائم کی اور تم نے زکوٰۃ دی۔

"و معناہ انی معکم بالنصرۃ والحفظ ان کنتم اقمتم الصلوۃ واتیتم الزکوۃ"

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے نماز ادا کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی حفاظت کی تو میں تمہاری امداد کروں گا اور تمہاری حفاظت کروں گا، یعنی تمہیں مصیبتوں اور تکالیف سے محفوظ رکھنے کا ذریعہ

نماز ہوگی، جس کی وجہ سے میں تمہاری حفاظت کروں گا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ تم نماز کی حفاظت کرو، نماز تمہاری حفاظت کرے گی یعنی تمہاری شفاعت کرے گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"واقیموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وما تقدموا لانفسکم من خیر تجدوہ عند اللہ"

اور تم نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور جو تم نے اپنے نفسوں کے لئے بھلائی کو آگے بھیجا تم اسے اللہ کے ہاں پالو گے۔

اور نماز میں قراءت بھی ہے، اور قرآن پاک شفاعت کرے گا اور اس کی شفاعت کو قبول کیا جائے گا، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔

"انہ تجی البقرۃ وال عمران کانھما عمامتان فیشھدان و یشفعان"

بیشک سورۃ بقرہ اور آل عمران (قیامت کے دن) آئیں گی، گویا کہ وہ پگڑیوں کی طرح چھا جائیں گی (پڑھنے والے کے لئے) گواہی دیں گی اور اس کیلئے شفاعت کریں گی۔

اور حدیث شریف میں ہے۔

"سورۃ الملک تصرف عن المتھجد بھا عذاب القبر اتجادل عنہ فی الحشر وتقف فی الصراط عند قدمیہ وتقول للنار لا سبیل لک علیہ"

سورہ ملک رات کو پڑھنے والے کو عذاب قبر سے بچائے گی اور حشر میں اس کی طرف سے جھگڑا کرے گی اور پل صراط سے گذرنے میں اس کی معاونت کرے گی، اور جہنم کی آگ کو کہے گی کہ تمہیں اس شخص سے کوئی واسطہ نہیں۔ (ماخوذ از کبیر بزیادۃ)

ترکِ نماز پر وعید اور اقوال آئمہ:

کوئی شخص جان بوجھ کر نماز چھوڑ دے تو حضرت امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں وہ کافر ہو گیا، اور امام شافعی

امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ کی ایک روایت کے مطابق وہ کافر تو نہیں ہوگا کیونکہ اگر وہ توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول ہوگی، اور اگر توبہ نہ کرے تو اسے قتل کر دیا جائے، امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسے قتل تو نہیں کیا جائے گا البتہ اسے قید کر لیا جائے، یا وہ توبہ کرے یا قید میں ہی مر جائے۔

امام احمد رحمہ اللہ نے احادیث کے ظاہر مطالب کو دیکھ کر کفر کا ایک قول کیا ہے، اور دوسرے آئمہ کرام نے ان احادیث کی تاویل بیان کی ہے۔ وہ احادیث یہ ہیں۔

☆ عن جابر قال قال رسول اللہ ﷺ بین العبد و بین الکفر ترک الصلوۃ۔ (رواہ مسلم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن بندے اور کافر کے درمیان فرق نماز کا چھوڑنا ہے۔

☆ عن بریدہ قال قال رسول اللہ ﷺ العھد الذی بیننا و بینھم ترک الصلوۃ فمن ترکھا فقد کفر۔ (رواہ احمد والترمذی والنسائی و ابن ماجہ)

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ہمارے اور ان کے درمیان عہد ہے نماز کے چھوڑنے تک، جس شخص نے نماز کو چھوڑ دیا وہ کافر ہو گیا۔

☆ عن عبداللہ بن عمرو عن النبی ﷺ انہ ذکر الصلوۃ یوما فقال من حافظ علیھا کانت لہ نورا و برھانا و نجاۃ یوم القیامۃ و من لم یحافظ علیھا لم یکن لہ نور و لا برھان و لا نجاۃ و کان یوم القیامۃ مع قارون و فرعون و ھامان و ابی بن خلف۔ (رواہ احمد)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ایک دن نماز کا ذکر فرمایا، پھر ارشاد فرمایا جس شخص نے نماز کی حفاظت کی نماز اس کیلئے قیامت کے دن نور، برہان اور نجات ہوگی، اور جس شخص نے نماز کی حفاظت نہ کی اسے قیامت کے دن کوئی نور، برہان اور نجات حاصل نہیں ہوں گے، وہ شخص قیامت کے دن قارون، فرعون، ہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ ہوگا۔

جمہور آئمہ کرام، علماء ربانیین نے یہ بیان کیا ہے کہ ایمان کے بعد نماز کا ذکر عطف سے عام آیات کریمہ اور احادیث مبارکہ میں ہے، اور عطف مغائرت کو چاہتا ہے، اس لئے نماز عین ایمان نہیں کہ ترکِ نماز سے ایمان ضائع ہو جائے اور کفر آ جائے، بلکہ گناہ کبیرہ لازم ہوگا۔

ان احادیث کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے۔

''وحاصل هذه الاحاديث ان امر الصلوة اشد من سائر الاحكام والعبادات فمن تركها فكانه كفر اوالمعنى انه من تركها استخفافا فقد كفر والله اعلم''

ان احادیث سے یہ حاصل ہوا کہ نماز کا معاملہ تمام احکام وعبادات سے زیادہ سخت ہے، جس نے نماز کو چھوڑا گویا کہ وہ کافر ہوا، یعنی اگر چہ کافر تو نہیں ہوا لیکن کافروں کے مشابہ ہو گیا، البتہ اس نے نماز کو حقیر اور گھٹیا سمجھ کر ''معاذ اللہ'' چھوڑ دیا تو وہ کافر ہو گیا۔

نماز کی فضیلت:

نماز کی فضیلت بہت سی احادیث سے ثابت ہے، پہلے پارہ میں ذکر کر دیا گیا ہے، البتہ اسی مقام میں قاضی محمد ثناء اللہ رحمہ اللہ نے دو حدیثوں کا ذکر کیا ہے، ان کو ہی بطور تبرک ذکر کیا جا رہا ہے۔

☆ عن ابى هريرة قال قال رسول الله ﷺ ارأيتم لوان نهرا بباب احدكم يغتسل فيه كل يوم خمسا هل يبقى من درنه شئى قالوا لا يبقى من درنه شئى قال فذلك مثل الصلوات الخمس يمحوالله بهن الخطايا. (رواه مسلم و بخارى)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے کہ تم میں سے کسی شخص کے دروازہ کے پاس نہر ہو اور وہ اس میں ہر دن پانچ مرتبہ غسل کرے، کیا اس پر کوئی میل رہ جائے گی؟ صحابہ کرام نے عرض کیا اس پر کوئی میل باقی نہیں رہے گی۔ آپ نے فرمایا پانچ نمازوں کی یہی مثال ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔

☆ وعن عبادة ابن الصامت قال قال رسول الله ﷺ خمس صلوات افترضهن الله تعالىٰ من

احسن وضوء هن وصلاهن لوقتهن واتم رکوعهن وخشوعهن کان له علی الله عهدا ان یغفرله ومن لم یفعل فلیس علی الله عهدان شاء غفرله وان شاء عذابه.

(رواه احمد وابو داود وروی مالک و النسائی نحوه)

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، پانچ نمازیں اللہ تعالیٰ نے فرض کی ہیں جس شخص نے ان کیلئے اچھا وضوء کیا اور ان کو اپنے اپنے اوقات میں ادا کیا، اوران کا کامل رکوع کیا اور خشوع سے ادا کیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ کرم پر وعدہ لازم کرلیا کہ وہ اس کی مغفرت فرمائے گا، اور جس شخص نے ایسا نہ کیا تو اللہ تعالیٰ پر کوئی وعدہ نہیں، ہاں اگر چاہے تو مغفرت فرمادے اور چاہے تو عذاب دے۔

جمہور حضرات نے اسی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ ترک نماز کفر نہیں، ورنہ حدیث شریف میں یہ نہ آتا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو مغفرت فرمادے۔ (از مظہری)

نمازِ وسطیٰ:

(درمیانی نماز) ایک وجہ پہلے کبیر کے حوالہ سے بیان ہوئی کہ "صلوات" سے مراد اور نمازیں ہیں، اور "وسطی" سے مراد اور نماز ہے تاکہ تکرار لازم نہ آئے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ تخصیص بعد از تعمیم پائی گئی، یعنی "الصلوات" میں الف لام استغراقی ہے تمام نمازوں کی حفاظت کرو پھر خصوصی طور پر درمیانی نماز کی حفاظت کا حکم دے کر تخصیص پیدا کی گئی، یعنی خصوصی طور پر درمیانی نماز کی اور ہی زیادہ حفاظت کرو۔ (زیادہ تاکید کی وجہ ان شاء اللہ آگے ذکر ہوگی)

درمیانی نماز سے مراد کون سی نماز ہے؟ اس میں مختلف اقوال ہیں۔

درمیانی نماز سے مراد نمازِ فجر:

"الصلوة الوسطی" سے مراد فجر کی نماز ہے، یہ قول حضرت عمر، حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس،

حضرت معاذ، حضرت جابر، حضرت عطاء، حضرت عکرمہ، حضرت مجاہد، حضرت ربیع بن انس (رضی اللہ عنہم) کا ہے، اور یہی قول امام مالک اور امام شافعی رحہم اللہ کا بھی ہے۔

خیال رہے کہ بعض حضرات کے مختلف اقوال ہیں، دوسری نماز کے متعلق مذکورہ بالا اسماء میں سے پھر کسی کا نام آجائے تو تعارض نہیں ہوگا بلکہ مراد یہ ہوگی کہ درمیانی نماز یہ بھی ہے اور اس کے بغیر اور بھی ہے۔

☆ عن مالک انه بلغه ان علی بن ابی طالب و ابن عباس کانا یقو لان الصلوة الو سطی صلوة الفجر (اخرجه مالک فی المؤطا)

حضرت امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھ تک روایت پہنچی ہے کہ بیشک حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ درمیانی نماز سے مراد نماز فجر ہے۔

ترمذی نے بھی حضرت ابن عباس وابن عمر رضی اللہ عنہما سے تعلیقاً یہی روایت ذکر کی ہے۔

فجر کی نماز کو درمیانی نماز کہنے پر ایک اور دلیل یہ ہے کہ دن کی دو نمازیں یعنی ظہر وعصر جمع ہیں یعنی آگے پیچھے ہیں، اور رات کی دو نمازیں یعنی مغرب اور عشاء جمع ہیں، فجر کی نماز کے ساتھ کوئی اور نماز جمع نہیں تو فجر کی نماز کو درمیانی نماز کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ دو جمع کے درمیان واقع ہے۔

صبح کی نماز کو درمیانی نماز کہنے کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ اس نماز کو ادا کرنا بہت مشکل ہے، سردیوں کا صبح شدید سردی میں وضوء کرنا بہت دشوار ہے۔ اور گرمیوں میں صبح کی نماز کے وقت میٹھی نیند آرہی ہوتی ہے، اعضاء میں سستی طاری ہوتی ہے، اونگھ کی کثرت ہوتی ہے اور لوگ اس سے غافل ہوتے ہیں، اسلئے اس نماز کو ادا کرنے کا خصوصی حکم دیا گیا کہ یہ ضائع ہونے سے بچ جائے۔

اس کے بعد "**وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْن**" ذکر فرمایا، قنوت کے کئی معانی ہیں، ان میں سے ایک لمبا قیام ہے، اور فجر میں بنسبت دوسری نمازوں کے قراءت لمبی ہوتی ہے جس کی وجہ سے قیام بھی لمبا ہوتا ہے، صبح کی نماز کو درمیانی نماز کہنے کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

"وقرآن الفجر ان قرآن الفجر کان مشھودا" اور صبح کا قرآن، بیشک صبح کے قرآن میں فرشتے

حاضر ہوتے ہیں، یعنی صبح کی نماز میں رات اور دن کے فرشتے حاضر ہوتے ہیں، صبح کی نماز رات والے فرشتوں کے دیوان میں بھی لکھی جاتی ہے اور صبح والے فرشتوں کے دیوان میں بھی۔ (خازن)

درمیانی نماز سے مراد ظہر کی نماز:

اقوال صحابہ کرام سے ثابت ہے کہ درمیانی نماز سے مراد ظہر کی نماز ہے، یہ قول زید بن ثابت اور اسامہ بن زید اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہم کا ہے اور ایک روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی اسی کے مطابق آتی ہے، اور یہی قول عبیداللہ بن شداد رضی اللہ عنہ کا بھی ہے، اور یہی روایت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی بھی ہے، اس پر یہ روایات بھی دلالت کر رہی ہیں۔

☆ "عن زید بن ثابت وعائشة قالا الصلوة الوسطى صلوة الظهر"
(اخرجه مالک فی الموطأ عن زید والترمذی عنهما تعلیقا)

حضرت زید بن ثابت اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتے ہیں درمیانی نماز سے مراد ظہر کی نماز ہے۔

ظہر کی نماز ادا کرنے میں مشقت پائی جانے کی وجہ سے اسے درمیانی نماز کہا گیا ہے اور ادا کرنے کی زیادہ تاکید کی گئی ہے۔

☆ "عن زید قال کان رسول الله ﷺ یصلی الظهر بالهاجرة ولم یکن یصلی صلوة اشد على اصحاب رسول الله ﷺ"

حضرت زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ ظہر کی نماز تیز گرمی میں ادا فرماتے تھے، صحابہ کرام پر اس سے زیادہ کوئی نماز شدید مشقت والی نہیں تھی۔

اسی وجہ سے اس نماز کو درمیانی نماز کہا گیا ہے اور اس کے ادا کرنے اور حفاظت کرنے کی خصوصی تاکید کی گئی ہے۔ (خازن)

درمیانی نماز سے مراد نماز عصر:

یہ قول حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابوایوب، حضرت ابوہریرہ، حضرت ابن عمر، حضرت ابن

عباس، حضرت ابوسعید خدری اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم کا ہے۔ اور یہی قول ابوعبیدہ سلمان، حسن بصری، ابراہیم نخعی، قتادہ، ضحاک، کلبی، مقاتل رحمہم اللہ کا ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے، اور امام احمد، داود اور ابن منذر رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے، ترمذی نے کہا کہ یہ قول اکثر صحابہ کرام کا ہے اور ان کے بعد آنے والے اہل علم اکثر حضرات کا بھی یہی قول ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے، اس میں احادیث مبارکہ مروی ہیں۔

" عن ابن مسعود قال حبس المشركون رسول الله ﷺ عن صلوة العصر حتى احمرت الشمس او اصفرت فقال رسول الله ﷺ شغلونا عن الصلوة الوسطى صلوة العصر ملأ الله اجوافهم وقبورهم نارا، او حشا الله اجوافهم وقبورهم نارا" (مسلم)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو عصر کی نماز سے پھیرے رکھا یہاں تک کہ سورج سرخی مائل یا زردی مائل ہوگیا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ان کے پیٹوں اور قبروں کو آگ سے بھر دے انہوں نے ہمیں درمیانی نماز یعنی نماز عصر سے روکے رکھا۔

ایک روایت میں "ملأ" اور ایک روایت میں "حشا" ہے، معنی دونوں لفظوں کا ایک ہی ہے "بھرنا" یہ واقعہ یوم احزاب کا ہے، تمام کفار جمع ہوکر مدینہ طیبہ پر حملہ آور ہو گئے تھے، خندق کھود کر ان کا دفاع کیا گیا، اس موقع پر نماز عصر بھی خندق کھودنے کی مشغولیت کی وجہ سے رہ گئی تھی۔

خیال رہے کہ اسی قسم کی روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے جو بخاری و مسلم نے تخریج کی ہے اور اسی قسم کی روایت ترمذی میں حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کی گئی ہے، ترمذی میں ہی اسی قسم کی روایت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔

"عن ابی یونس مولی عائشة قال امرتنی عائشة ان اکتب لها مصحفا وقالت اذا بلغت هذه الآية فآذنی " حافظوا على الصلوات والصلوة الوسطى " قال فلما بلغتها آذنتها فاملت علی حافظوا على الصلوات والصلوة الوسطى وصلوة العصر وقوموا لله قانتين قالت عائشة سمعتها من رسول الله ﷺ، ويروى عن حفصة نحو ذلك" (مسلم)

حضرت ابو یونس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے غلام فرماتے ہیں کہ مجھ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے قرآن پاک کا ایک نسخہ لکھوایا، اور مجھے فرمایا کہ جب تم "حافظوا علی الصلوات والصلوة الوسطی" آیۃ پر پہنچو تو مجھے بتانا، جب میں اس آیۃ پر پہنچا تو میں نے آپ کو بتایا، تو آپ نے مجھ سے لکھوایا "حافظوا علی الصلوات والصلوة الوسطی وصلوة العصر وقوموا للّٰہ قانتین" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہی سنا ہے، اور اسی طرح حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے۔

خیال رہے کہ خبر واحد سے جو قرأت ثابت ہوتی ہے وہ نماز میں تلاوت نہیں ہو سکتی لیکن مسئلہ پر دلیل بن سکتی ہے، اسلئے اس روایت کو "درمیانی نماز سے مراد نماز عصر" پر دلیل بنایا جا سکتا ہے۔

درمیانی نماز سے مراد نماز عصر ہے اس پر اور دلیل یہ دی گئی ہے کہ یہ نماز دن کی دو نمازوں فجر اور ظہر، اور رات کی دو نمازوں مغرب اور عشاء کے درمیان واقع ہے۔

"اور اس کی زیادہ تاکید اور زیادہ حفاظت کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ یہ وقت دن کے ختم ہونے کا ہے، اس قسم کا کاروبار کرنے والا اپنے کام کو مکمل کرنے کی کوشش میں ہوتا ہے، اس لئے اس نماز کے ضائع ہونے کے خطرہ سے اس کی محافظت کا خصوصی حکم دیا گیا ہے۔" (راقم)

عصر کی نماز کو ضائع کرنے پر احادیث مبارکہ سے وعید ثابت ہے۔

☆ "عن ابی الملیح قال کنا مع بریدة فی غزوة فقال فی یوم ذی غیم بکروا بصلوة العصر فان النبی ﷺ قال من ترک صلوة العصر فقد حبط عملہ. (قولہ بکروا بصلوة العصر ای قدموھا فی اول وقتھا)" (اخرجہ البخاری)

حضرت ابو الملیح رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں ہم ایک غزوہ میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے، ایک دن بادل چھائے ہوئے تھے تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا عصر کی نماز جلدی یعنی اول وقت میں ادا کرلو (کہیں سورج کے غروب ہونے کا پتہ ہی نہ چل سکے) کیونکہ نبی کریم ﷺ نے

فرمایا جس شخص نے عصر کی نماز کو ضائع کر دیا اس کے عمل برباد ہو گئے۔

"عن ابن عمر ان رسول اللهﷺ قال الذی تفوته صلوة العصر فکأنما وتر اهله وماله"

(بخاری، مسلم)

"قوله وتر اهله نقص وسلب اهله وماله فیبقی فردا بلا اهل ولا مال،ومعنی الحدیث لکن حذره من فوت صلوة العصر کحذره من ذهاب اهله وماله"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا بیشک رسول اللہﷺ نے فرمایا وہ شخص جس کی عصر کی نماز فوت ہو گئی (یعنی بغیر عذر کے) گویا کہ اس کے اہل وعیال اور مال ودولت میں نقص واقع ہو گیا۔

یعنی عصر کی نماز کو انسان فوت ہونے سے اس طرح ڈرتا رہے جس طرح اہل وعیال اور مال ودولت کے ضائع ہونے سے ڈرتا ہے۔ (خازن)

درمیانی نماز سے مراد نماز مغرب:

یہ قول قبیصہ بن ذؤیب کا ہے، ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ یہ نماز دن کی سفیدی اور رات کی تاریکی کے درمیان واقع ہے، یہی وجہ ہے کہ اس نماز کو صبح اور عشاء کی نماز کے درمیان بحیثیت تعداد رکعات کے رکھا، کیونکہ صبح کی دو رکعتوں سے اس نماز (مغرب) میں ایک رکعت زائد رکھی گئی اور عشاء کی نماز کی چار رکعتوں سے ایک رکعت کم کی گئی یعنی اس کی تین رکعتیں ہیں۔

یہ نماز سفر میں قصر بھی نہیں کی جاتی جس طرح نماز وتر قصر نہیں ہوتی، گویا کہ یہ دن کی نماز وتر ہے۔

اس نماز کی درمیانی نماز ہونے پر اور دلیل یہ ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حکم سے نبی کریمﷺ کو نماز اوقات بتانے کیلئے سب سے پہلے جو نماز پڑھائی وہ نماز ظہر تھی، اس لحاظ پر پہلی نماز ظہر کی نماز ہے تو واضح ہوا کہ مغرب کی نماز درمیانی نماز ہے۔ (خازن)

اور یہ نماز پڑھنی دشوار ہوتی ہے اس لئے کہ رات کی تاریکی چھا رہی ہوتی ہے، لوگ اندھیرے سے پہلے گھر

پہنچنا چاہتے ہیں وہ نماز کی پرواہ کیے بغیر اپنی منزل طے کر رہے ہوتے ہیں، اس لئے اس نماز کی تاکید کی گئی اور خصوصی طور پر حفاظت کرنے کا حکم دیا گیا۔

درمیانی نماز سے مراد نماز عشاء:

یہ قول متقدمین سلف صالحین (تبع تابعین تک) سے تو منقول نہیں، البتہ متاخرین حضرات سے یہ منقول ہے۔ ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ یہ نماز ان دو نمازوں کے درمیان ہے جن کی قصر نہیں ہوتی یعنی صبح اور مغرب کی نماز سفر میں مکمل ادا کرنی ہوتی ہے ان کو قصر نہیں کیا جاتا، یہ نماز جب ان کے درمیان واقع ہے تو درمیانی نماز ہے۔

اس نماز کی درمیانی نماز ہونے پر اور دلیل یہ ہے کہ یہ نماز منافقوں پر بھاری تھی، وہ اسے ادا نہیں کرتے تھے اس وجہ سے اسے درمیانی نماز کہہ کر اسکی زیادہ حفاظت کرنے کی تاکید فرمائی گئی۔ (خازن)

اس نماز کو جماعت سے ادا نہ کرنے پر نبی کریم ﷺ نے شدید ناراضگی کا اظہار فرمایا تو خود اندازہ کریں کہ مطلقاً اس نماز کو چھوڑنے پر آپ ﷺ کتنے ناراض ہوتے ہوں گے۔

☆ " عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ والذی نفسی بيده لقد هممت ان آمر بحطب فيحطب ثم آمر بالصلوة فيؤذن لها ثم آمر رجلا فيوم الناس ثم اخالف الی رجال وفی رواية لا يشهدون الصلوة فاحرق عليهم بيو تهم والذی نفسی بيده لو يعلم احدهم انه يجد عرقا سمينا او مرماتين حسنتين لشهد العشاء"

(رواه البخاری، والمسلم نحوه، مشكوة باب الجماعة وفضلها)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، میں ارادہ رکھتا ہوں کہ میں کسی کو حکم دوں لکڑیاں جمع کرنے کا، وہ لکڑیاں جمع کر لے، پھر میں نماز کا حکم دوں، تو نماز کے لئے اذان کہی جائے، پھر میں ایک شخص کو حکم دوں کہ وہ امامت کرائے اور میں مردوں کے گھروں میں چکر لگاؤں جو لوگ نماز میں حاضر نہیں ہوتے ان کے گھروں کو جلادوں، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان

ہے اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ (نماز میں حاضر ہونے پر) موٹا تازہ گوشت ملے گا، یا خوبصورت کوہا نوں والی دو اونیاں ملیں گی تو وہ عشاء کی نماز میں ضرور حاضر ہوں۔

یعنی منافقین عشاء کی نماز میں حاضر نہیں ہوتے، اس کی وجہ ہی یہ ہے کہ یہ نماز ان پر بھاری ہوتی تھی، البتہ اگر ان کو دنیا کا لالچ دیا جاتا تو وہ نماز میں حاضر ہوتے، جبکہ دنیاوی مال سے ثواب کہیں زیادہ ملتا تھا لیکن اس کی انہیں کوئی پرواہ ہی نہیں تھی کیونکہ وہ تو درحقیقت کافر تھے بظاہر مومن بن کر کچھ نمازیں ادا کر لیتے تھے۔

تمام اقوال میں شاندار محاکمہ:

اگرچہ درمیانی نماز سے مراد عصر کی نماز ہونے پر زیادہ حضرات کا اتفاق ہے اور نبی کریمﷺ نے بھی نماز عصر کو درمیانی نماز کہا اس لحاظ سے بھی عصر کی نماز کی طرف زیادہ رجحان ہے، لیکن دوسرے اقوال میں بعض اقوال صحابہ کرام کے ہیں، صحابہ کرام کا قول بھی حدیث کا درجہ رکھتا ہے، پھر خاص کر کے جو حکم فقط عقل سے ثابت نہیں اس کے متعلق صحابی کا قول حدیث مرفوع کا درجہ رکھتا ہے، پھر یہ کہ نبی کریمﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ کوئی اور نماز درمیانی نماز نہیں ہو سکتی، اس لئے راقم کو مندرجہ ذیل قول جو محاکمہ کی حیثیت رکھتا ہے پسند آیا۔

"ان الصلوۃ الوسطی ھی احدی الصلوات الخمس لا بعینھا"

درمیانی نماز پانچ نمازوں میں سے کوئی ایک نماز ہے، لیکن وہ معین نہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام (پانچ) نمازوں کا حکم دیا، پھر بطور عطف "**الصلوۃ الوسطی**" (درمیانی نماز) کا ذکر فرمایا، پھر بیان نہیں فرمایا کہ درمیانی نماز سے مراد کون سی نماز ہے، جب معاملہ اس طرح ہے تو ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ پانچ نمازوں میں سے ہر نماز کو درمیانی نماز سمجھا جائے۔

"ابھمھا اللہ علی عبادہ مع ماخصھا بمزید التوکید تحریضالھم علی المحافظۃ علی اداء جمیع الصلوات علی صفۃ الکمال والتمام"

اللہ تعالیٰ نے درمیانی نماز کو ادا کرنے پر ابھارا ہے، اس کی حفاظت کرنے کی خصوصی تاکید فرمائی

ہے، لیکن درمیانی نماز کو مبہم (پوشیدہ) طور پر ذکر فرمایا معین نہیں کیا تا کہ مومنین ہر نماز کو درمیانی نماز سمجھیں اور یہ خیال کریں کہ ہر نماز کی شدید تاکید کی گئی ہے، تا کہ وہ تمام نمازوں کو کامل طریقہ سے مکمل ادا کریں۔

"ولهذا السبب اخفى الله تعالى ليلة القدر في شهر رمضان واخفى ساعة الاجابة في يوم الجمعة واخفى اسمه الاعظم في جميع اسمائه ليحافظوا على ذلك كله"

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے رمضان میں لیلۃ القدر کو مخفی رکھا تا کہ ہر رات کو لیلۃ القدر سمجھ کر عبادت اور ذکر الٰہی میں مشغول رہے، اور اسی وجہ سے جمعہ کے دن میں دعا کی قبولیت کی ساعت کو مخفی رکھا گیا تا کہ تمام دن کی ہر ساعت کو مقبولیت کی گھڑی سمجھ کر ذکر و دعا میں مشغول رہے۔

یہ قول کثیر علماء کرام کا ہے، حضرت محمد ابن سیرین فرماتے ہیں بیشک ایک شخص نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے سوال کیا "الصلوۃ الوسطی" (درمیانی نماز) کون سی ہے؟ آپ نے فرمایا "حافظ على الصلوات كلها تصبها" تمام نمازوں کی حفاظت کرو تو خود بخود درمیانی نماز کو تم پالو گے۔

حضرت ربیع بن خثیم سے درمیانی نماز کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔

"الوسطى واحدة منهن فحافظ على الكل تكن محافظا على الوسطى"

پانچ نمازوں میں ہی درمیانی نماز ہے، سب نمازوں کی حفاظت کرو تو درمیانی نماز کی محافظت بھی پائی جائے گی۔ (خازن)

راقم کو تو یہی قول پسند آیا، تاہم یہ تمام اقوال و مذاہب نقل کرنے کے بعد ناصر الشریعۃ محی السنۃ علاء الدین علی بن محمد بن ابراہیم بغدادی صوفی المعروف بالخازن رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"ان تمام اقوال میں سے دو قول زیادہ معتبر اور صحیح ہیں ایک یہ ہے کہ درمیانی نماز سے مراد صبح کی نماز ہے اور دوسرا قول کہ درمیانی نماز سے مراد عصر کی نماز ہے۔ اس کے بعد ترقی کر کے فرمایا ہے "واصح الاقوال كلها انها العصر" سب اقوال سے زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ درمیانی نماز سے مراد عصر کی نماز ہے کیونکہ اس میں احادیث صحیحہ وارد ہیں"۔ (خازن)

"وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ" اور کھڑے ہواللہ کے لئے اطاعت کرتے ہوئے۔

قنوت کے کئی معانی ہیں جو اس آیہ کریمہ میں متصور ہیں۔

قنوت بمعنی طاعت:

راقم نے یہ معنی تفسیر خازن سے ہی لیا ہے "قانتین ای مطیعین" کھڑے ہواللہ تعالیٰ کے لئے اطاعت کرتے ہوئے یعنی کامل اطاعت کرو اور پوری پوری اطاعت کرو کہ نماز کے ارکان اور سنن میں خلل واقع نہ ہونے دو۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے کبیر میں یہ معنی بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ قول ابن عباس اور حسن اور شعبی اور سعید بن جبیر اور طاؤس اور قتادہ اور ضحاک اور مقاتل رضی اللہ عنہم کا ہے۔

اس پر دو وجہ سے دلیل قائم کی گئی۔

پہلی یہ کہ روایت میں آتا ہے۔"**کل قنوت فی القرآن فھو الطاعة**" قرآن پاک میں جہاں بھی قنوت کا ذکر ہے اس سے مراد طاعت ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات کے متعلق فرمایا گیا "**ومن یقنت منکن للّٰہ ورسوله**" اور جس نے تم میں سے اللہ اور اس کے رسول کی طاعت کی۔ اور ارشاد فرمایا "**فالصالحات قانتات**" نیک عورتیں، طاعت کرنے والیاں۔

جب واضح ہوا کہ مراد کامل طاعت ہے کہ نماز کے ارکان وسنن (سنتوں) میں خلل نہ ہونے دے تو اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ نماز کو کامل طریقہ سے ادا کرنے میں انسان کا اپنا بھلا ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کو لوگوں کی عبادت کی ضرورت نہیں۔ ہاں یہ بھی خیال رہے کہ نماز کو درست ادا نہ کرنا اور یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ کو ہماری عبادت کی حاجت نہیں یہ جہالت ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام اور سلف صالحین جو لوگوں سے زیادہ علم رکھنے والے تھے، انہوں نے خشوع سے نماز ادا کی۔ (کبیر)

قنوت بمعنی خشوع:

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ''اور کھڑے ہو اللہ کے حضور ادب سے''
آپ کا ترجمہ تفسیر کبیر میں مذکور اس قول کے مطابق ہے۔
"القنوت عبارة عن الخشوع وحفض الجناح و سكون الاطراف وترک الالتفات من هيبة الله"
قنوت کا معنی اللہ تعالیٰ کی ہیبت سے خشوع کرنا، عاجزی کرنا، اعضاء کو حرکت نہ دینا بلکہ ساکن رکھنا، اِدھر اُدھر توجہ کو چھوڑ دینا۔
"وكان احدهم اذا قام الى الصلوة يهاب ربه فلا يلتفت ولا يقلب الحصى ولا يعبث بشئ من جسده ولا يحدث نفسه بشئ من الدنيا حتى ينصرف"
اس معنی کے لحاظ سے یہ سمجھ آ گیا کہ جب کوئی شخص نماز کے لئے کھڑا ہو تو اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور اِدھر اُدھر توجہ نہ کرے اور کنکریوں وغیرہ کو نہ پلٹے، اور اپنے جسم اور کپڑوں وغیرہ سے نہ کھیلے، اور اپنے دل میں دنیاوی معلات کی کوئی چیز نہ واقع ہونے دے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے حضور ادب سے کھڑے ہو کر نماز مکمل کرے۔ (کبیر)

قنوت بمعنی دعاء وذکر:

یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ہے۔ اس پر دو وجہ سے دلیل قائم کی گئی ہے۔
ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ''حافظوا علی الصلوات'' سے نماز میں پائے جانے افعال کی حفاظت کا حکم دیا، تو اس کا لحاظ کرتے ہوئے قنوت کا معنی نماز میں پائے جانے والے ذکر ودعاء کیا جائے، اس معنی کا اعتبار کرتے ہوئے آیۃ کریمہ کا ترجمہ یہ ہوگا ''وقوموا للہ ذاکرین داعین منقطعين اليه'' اور کھڑے ہو اللہ تعالیٰ کیلئے ذکر کرتے

ہوئے، دعاء کرتے ہوئے، تمام چیزوں سے منقطع ہوکر صرف اسی کی طرف توجہ کرتے ہوئے۔

دوسری دلیل یہ قائم کی گئی کہ ایک اور آیۃ کریمہ میں قنوت ذکر و دعاء کے معنی میں استعمال ہے۔

"امن هو قانت آناء الليل ساجدا و قائما" الخ

کیا وہ شخص جو رات کی گھڑیوں میں سجدہ کی حالت میں اور قیام کی حالت میں ذکر و دعاء کرتے ہوئے۔

اور صبح کی نماز میں منسوخ ہونے سے پہلے جو قنوت پڑھا جاتا رہا یا وتر میں جو قنوت پڑھا جا رہا ہے اس کا معنی بھی دعاء ہے، اور کہا جاتا ہے "قنت علی فلان" اس سے مراد لیا جاتا ہے "دعاء علی فلان" فلاں پر بددعاء کی۔ (از کبیر)

قنوت بمعنی سکوت:

یہ قول ابن مسعود اور زید بن ارقم رضی اللہ عنہما کا ہے، وہ فرماتے ہیں۔

"كنا نتكلم في الصلوة فيسلم الرجل فيردون عليه ويسألهم كم صليتم كفعل اهل الكتاب فنزل قوله تعالى (وقوموا لله قانتين) فامرنا بالسكوت ونهينا عن الكلام"

اہل کتاب کی طرح نماز میں ہم کلام کرلیا کرتے تھے، سلام دے دیتے تھے، سلام کا جواب دے دیتے تھے، اور نماز پڑھنے والوں سے پوچھ لیا کرتے تھے تم کتنی رکعتیں پڑھ چکے ہو، تو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمادیا "وقوموا لله قانتين" (اور تم کھڑے ہو اللہ کیلئے خاموش ہوکر) تو اس حکم کے نازل ہوتے ہوئے ہمیں نماز میں کلام کرنے سے منع کردیا گیا۔ (از کبیر)

☆ عن عبدالله بن مسعود كنا نسلم على النبي ﷺ وهو في الصلوة فيرد علينا قبل ان نأتي ارض الحبشة فلما رجعت سلمت عليه فلم يرد على فذكرت ذلك له فقال ان الله يحدث من امره ما يشاء وانه قضى ان لا تتكلموا في الصلوة.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم نبی کریم ﷺ کو حبشہ کی ہجرت سے پہلے سلام کرتے جب آپ ﷺ نماز ادا کر رہے ہوتے، آپ ﷺ نماز کی حالت میں ہی جواب دے دیتے

تھے، جب میں حبشہ سے واپس لوٹا تو میں نے آپ ﷺ کو (دوران نماز) سلام کیا، آپ ﷺ نے مجھے سلام کا جواب نہ دیا تو میں نے آپ ﷺ کی خدمت میں اس کا ذکر کیا (کہ آپ ﷺ نے مجھے سلام کا جواب نہیں دیا) تو آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ جو امر دینا چاہتا ہے وہی حکم فرماتا ہے، بیشک اللہ تعالیٰ نے حکم فرمادیا ہے کہ تم نماز میں کلام نہ کیا کرو۔

☆ عن عطاء بن یسار عن ابی سعید الخدری ان رجلا سلم علی النبی ﷺ فرد علیه بالاشارة فلما سلم قال کنا نرد السلام فی الصلوة فنهینا عن ذلک.

عطاء بن یسار کی روایت میں ہے کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کو (دوران نماز) سلام کیا تو آپ ﷺ نے اشارہ سے اسے جواب دیا، آپ ﷺ نے جب نماز کا سلام پھیر لیا تو ارشاد فرمایا ہم نماز میں سلام کا جواب دے دیا کرتے تھے، اب ہمیں اس سے منع کر دیا گیا ہے۔

"وفی حدیث معاویة بن الحکم السلمی ان النبی ﷺ قال ان صلوتنا هذه لایصلح فیها شئ من کلام الناس انما هی التسبیح والتکبیر وقرأة القرآن"

معاویہ بن حکم سلمی کی روایت میں ہے کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک ہماری یہ نماز نہیں صلاحیت رکھتی کہ اس میں لوگوں کا کلام کیا جائے (یعنی دنیاوی کلام کیا جائے) بیشک یہ نماز تسبیح وتکبیر اور قراءت قرآن ہی ہے۔ (از احکام القرآن للجصاص)

معاویہ بن حکم سلمی کی روایت ایک طویل حدیث کا حصہ احکام القرآن میں منقول ہے، وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک صحابی نماز میں حاضر ہوئے ان کو علم نہ تھا کہ نماز میں کلام کرنا منسوخ ہو چکا ہے، انہوں نے حسب معمول سابق (جو پہلے عمل ہو رہا تھا) نمازیوں سے سوال کیا کہ کتنی رکعتیں ہو چکی ہیں (چونکہ نمازیوں کے بتانے پر وہ رکعتیں پہلے ادا کی جاتیں پھر بقیہ نماز ادا کی جاتی) تو وہ اشارہ سے انہیں خاموش رہنے کے متعلق کہہ رہے تھے، یہ کہتے ہیں میں نے اپنے ساتھ کھڑے ہوئے شخص کو کہا تمہاری ماں تمہیں پیٹے تم مجھے بتاتے کیوں نہیں تو انہوں نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا، میں خاموش ہو گیا، نماز سے فارغ ہونے پر نبی کریم ﷺ نے مجھے اپنے پاس بلایا، نہ ڈانٹا، نہ جھڑکا اور (پیار ومحبت

سے) فرمایا کہ نماز میں دنیاوی کلام کی گنجائش نہیں، بلکہ نماز صرف تسبیح وتکبیر (یعنی اللہ کے ذکر) اور قرآن پاک پڑھنے پر مشتمل ہے۔

سبحان اللہ! میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ کا کیا خوب انداز تبلیغ تھا کہ آپ ﷺ پیار ومحبت سے مسائل سمجھاتے تھے جس کی وجہ سے لوگ قریب ہوتے، لیکن آج دیکھتے ہیں کہ کسی سے نماز میں کوئی غلطی واقع ہو جائے تو سمجھانے والے اس طرح سخت لہجہ سے سمجھاتے ہیں کہ وہ شخص دوبارہ مسجد کی طرف رخ نہیں کرتا۔

قنوت بمعنی قیام:

یعنی قانتین بمعنی قائمین کے ہے۔ اس قول والے حضرات نے اپنے مؤقف کو حدیث پاک سے ثابت کیا ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

"سئل النبی ﷺ ای الصلوۃ افضل؟ قال طول القنوت" یریدبه طول القیام.

نبی کریم ﷺ سے سوال کیا گیا کون سی نماز افضل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا "لمبا قنوت" یعنی آپ ﷺ کی مراد لمبا قیام تھا۔

تاہم اس قول کو علامہ رازی رحمہ اللہ نے ضعیف قرار دیا، آپ فرماتے ہیں اگر یہی معنی مراد ہوتا تو تقدیر عبارت کی یہ ہوگی "وقوموا اللہ قائمین" یہ درست نہیں، البتہ اسی معنی کے مطابق یہ کہا جا سکتا ہے کہ مطلب یوں ہو "وقوموا للہ مدیمین کذلک القیام" کھڑے ہو اللہ کیلئے اس قیام میں مداومت (ہمیشگی) کرو، اس صورت میں قنوت کی تفسیر "ادامة" سے ہوگی نہ کہ قیام سے۔ (از کبیر)

فائدہ: "قوموا للہ" سے سمجھ آیا کہ فرض نماز میں قیام فرض ہے، خواہ نماز ادا کرنے والا منفرد ہو یا امام ہو۔

☆ قال ﷺ انما جعل الامام لیؤتم به فاذا صلی قائما فصلوا قیاما.

نبی کریم ﷺ نے فرمایا امام بنایا گیا ہے تاکہ اس کی اقتداء کی جائے، جب وہ نماز کھڑے ہو کر ادا کرے تم بھی کھڑے ہو کر ادا کرو۔

خیال رہے کہ امام مریض ہو کھڑے ہونے کی طاقت نہ رکھتا ہو اور مقتدی تندرست ہوں کھڑے ہونے کی

طاقت رکھتے ہوں تو امام بیٹھ کر نماز پڑھائے اور مقتدی کھڑے ہو کر نماز ادا کریں تو نماز صحیح ہوگی "لان کلا یؤدی فرضه علی قدر طاقته" اس لئے کہ ہر شخص اپنی طاقت کے مطابق فرض ادا کرتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی مرض وصال میں نماز بیٹھ کر پڑھائی، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے ساتھ کھڑے تھے اور لوگ آپ ﷺ کے پیچھے کھڑے تھے "ولم یشر الی ابی بکر ولا الیهم بالجلوس واکمل صلوته بهم جالسا وهم قیام" تو آپ ﷺ نے حضرت ابو بکر اور دوسرے صحابہ کرام کو بیٹھنے کا اشارہ نہیں فرمایا، بلکہ آپ ﷺ نے بیٹھ کر ان حضرات کو نماز پڑھائی اور انہوں نے کھڑے ہو کر نماز ادا کی۔ (از قرطبی)

یہی مؤقف ہے امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا، مالکی اور حنفی مذہب کے متعلق قیل وقال قرطبی میں دیکھی جائے۔

تنبیہ: قانتین کے جتنے معانی بیان کئے ہیں اور جتنے اقوال بیان کئے ہیں ان میں کوئی تعارض نہیں تمام جمع ہو سکتے ہیں اسی کو علی بن عیسیٰ رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے، وہ کہتے ہیں۔

"ان القنوت عبارة عن الدوام علی الشئ والصبر علیه والملازمة له وهو فی الشریعة صار مختصا بالمداومة علی طاعة الله والمواظبة علی خدمة الله تعالیٰ"

قنوت کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز پر ہمیشگی کی جائے اور اسی پر صبر کیا جائے یعنی اس پر قائم رہا جائے، اور اسے لازم پکڑا جائے، اب شریعت میں قنوت اس معنی کے ساتھ خاص ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی طاعت پر ہمیشگی پائی جائے اور اللہ تعالیٰ کے احکام بجالانے میں ہمیشگی پائی جائے۔

"وعلی هذا التقدیر یدخل فیه ماقاله المفسرون" اس معنی کے لحاظ پر مفسرین کرام کے تمام اقوال اس میں داخل ہوں گے۔ (از کبیر)

یعنی مطلب یہ ہو گیا کہ "کھڑے ہو اللہ کیلئے دعاء وذکر کرتے ہوئے اور اس کی طاعت کرتے ہوئے اور خاموش رہتے ہوئے اور خشوع وخضوع کرتے ہوئے اور قیام پر ہمیشگی کرتے ہوئے"

ان تمام پر عمل کرنے سے ہی رب تعالیٰ کی طاعت پائی جائے گی اور اس کے احکام کو بجالا جائے گا۔

☆☆☆☆☆

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّالَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ☆ (سورة البقرة آیت ۲۳۹)

﴿۱﴾

پھر اگر خوف میں ہو تو پیادہ یا سوار جیسے بن پڑے پھر جب اطمینان سے ہو تو اللہ کی یاد کرو جیسا اس نے سکھایا جو تم نہ جانتے تھے۔

﴿۲﴾

پھر اگر تم خوف میں ہو تو پاؤں پر کھڑے یا سوار، پھر جب تم امن میں ہو تو یاد کرو اللہ کو جیسا کہ اس نے سکھایا تمہیں جو تم نہیں جانتے تھے۔

نماز خوف کا ذکر کیا جا رہا ہے یعنی دوران جنگ نماز کیسے ادا کی جائے؟

نمازِ خوف کی دو قسمیں ہیں۔

ایک یہ کہ جنگ نہیں ہو رہی لیکن دشمن سامنے ہو تو ان کو نماز جماعت سے امام پڑھائے، اس کا ذکر انشاءاللہ سورۃ النساء کی آیۃ "واذا کنت فیھم فاقمت لھم الصلوۃ" میں آئے گا۔

دوسری قسم یہ ہے کہ جنگ ہو رہی ہے یعنی تلوار چل رہی ہو تو پھر جیسے ممکن ہو نماز ادا کرے، اس حال میں بھی نماز معاف نہیں ہوگی، بلکہ بغیر جماعت کے اکیلے اکیلے اپنی سواریوں پر نماز ادا کریں، سواری پر نماز یقیناً اشارہ سے ہو گی یعنی رکوع وسجود پر بھی عمل نہیں ہوگا، اسی طرح قبلہ کی طرف منہ کرنا بھی لازم نہیں ہوگا بلکہ جس طرف منہ کر کے نماز ادا کرنا ممکن ہو نماز ادا کر لے۔

اسی طرح کھڑے کھڑے نماز ادا کر سکے تو کھڑے ہو کر اکیلے ہی اشارہ سے نماز ادا کرے جس طرف بھی منہ کرنا ممکن ہو اسی طرف منہ کر کے نماز ادا کرے۔

تنبیہ: امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک جب جنگ جاری ہو تو چلتے ہوئے، مقابلہ کرتے ہوئے، تلوار چلاتے ہوئے، دوڑتے ہوئے ہر حال میں نماز جائز ہوگی۔

"وقال ابو حنيفة لا يصلى الماشي بل يؤخر الصلوة ويقضيها" (خازن)

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں چلتے ہوئے نماز ادا کرنا جائز نہیں۔ اگر کھڑے ہو کر نماز ادا کرنا ممکن نہ ہو اور سواری پر نماز ادا کرنا بھی ممکن نہ ہو تو نماز کو مؤخر کردے اور قضاء کرلے، امام اعظم رحمہ اللہ نے اپنے مؤقف پر یہ دلیل دی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی خندق کے دن چار نمازیں رہ گئیں، جن کو آپ ﷺ نے بعد میں ترتیب وار قضاء کیا، اگر قتال وغیرہ میں مشغول ہوتے ہوئے نماز ادا کرنا جائز ہوتا تو نبی کریم ﷺ کی نمازیں قضاء نہ ہوتیں بلکہ دوران مشغولیت آپ ﷺ ادا فرمالیتے۔ (خازن)

اعتراض: آیۃ کریمہ میں "فرجالا" ذکر ہے، رجال جمع ہے راجل کی جیسے صحاب جمع ہے صاحب کی، رجال کا معنی ہے پیدل چلنا، اس سے پتہ چلا کہ چلتے ہوئے نماز ادا کرنا جائز ہے۔

جواب: "وليس فى الآية دليل على جواز الصلوة حال المسابقة فانه ليس معنى الراجل الماشي بل الراجل القائم على الرجلين"

آیۃ کریمہ سے اس مسئلہ پر دلیل قائم نہیں ہوسکتی کہ مقابلہ کے دوران چلتے ہوئے نماز ادا کرنا جائز ہے، کیونکہ "راجل" کا معنی پیدل چلنا نہیں، بلکہ دونوں پاؤں پر کھڑا ہونا مراد ہے۔ (مظہری)

راقم نے یہی ترجمہ کیا ہے، اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے "پیادہ" اس کا معنی بھی پاؤں پر کھڑا ہونا ہی ہے، چلنا نہیں۔

تاہم تفسیرات احمدیہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ "راجل" کا معنی پیدل چلنا بھی ہے اور پاؤں پر کھڑا ہونا بھی ہے، امام شافعی رحمہ اللہ نے پیدل چلنے والا معنی لیا ہے، اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے پاؤں پر کھڑے ہونے والا معنی لیا ہے۔

امام اعظم رحمہ اللہ کی دلیل حدیث پاک سے:

عن نافع ان ابن عمر كان اذا سئل عن صلوة الخوف وصفها ثم قال و ان كان الخوف اشد من ذلک صلوا رجالا وقيا ماعلى اقدامهم او رکبانا مستقبلی القبلة او غير مستقبليها قال نافع لا اری ابن عمر ذکر ذلک الا عن رسول الله ﷺ.

(رواه البخاری)

حضرت نافع کہتے ہیں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے خوف کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے اس کا طریقہ بیان کیا (کہ جنگ نہ ہو رہی ہو، دشمن سامنے ہو تو امام کس طرح نماز پڑھائے) پھر آپ نے فرمایا کہ اگر خوف زیادہ ہو تو قدموں پر کھڑے ہو کر یا سوار ہو کر نماز ادا کریں قبلہ کی طرف توجہ کر سکیں یا نہ کر سکیں، حضرت نافع کہتے ہیں ابن عمر رضی اللہ عنہما نے یہ قول رسول اللہ ﷺ سے ہی سن کر کیا ہے۔

اس حدیث میں "صلوا رجالا وقيا ماعلى اقدامهم" جوذکر ہے اس میں "رجالا" کی تفسیر عطف تفسیری سے کی گئی، یعنی "رجالا" سے مراد "قياما على اقدامهم" ہے کہ پاؤں پر کھڑے ہونا، یعنی سخت خوف کی حالت میں زمین پر کھڑے ہو کر نماز ادا کرو یا سواری پر۔ (از مظہری)

اعتراض: نماز خوف میں تو ایک یا دو رکعت پڑھ کر لوگ دشمن کے مقابل چلے جاتے ہیں اور دوسرے (لوگ) امام کے پیچھے آجاتے ہیں، پھر یہ چلے جاتے ہیں اور پہلے لوگ آجاتے ہیں اور اپنی نماز مکمل کرتے ہیں، یہ نماز میں چل رہے ہیں تو ان کی نماز صحیح ہے، یہ کہنا کیسے ممکن ہے کہ چلتے ہوئے نماز ادا کرنا درست نہیں۔

جواب: جو کام خلاف قیاس شرع سے ثابت ہو وہ اپنے مورد (مقام) پر موقوف ہو جاتا ہے، اس پر کسی اور کو قیاس نہیں کیا جا سکتا، اسلئے نماز خوف کی ایک یا دو رکعت ادا کر کے دشمن کی طرف جانا نص سے ثابت ہے لہذا یہ جائز رہے گا اس پر کسی اور کو قیاس نہیں کیا جائے گا، البتہ کوئی اور صورت بھی شرع سے ثابت ہو تو وہ بھی جائز رہے گی جیسا کہ نماز میں وضو ٹوٹ جائے تو وہاں ہی نماز کو چھوڑ کر کوئی کام نماز کے منافی (خلاف) کئے بغیر وضو کرنے کے لئے جائے اور وضو کر کے

واپس آئے تو وہاں سے ہی نماز مکمل کرلے جہاں چھوڑ کر گیا تھا، یہ حکم بھی شرع سے ثابت ہے لہذا جائز ہے۔

اسی طرح نماز کی حالت میں سانپ اور بچھو کو قتل کرنا بھی جائز ہے اگر چہ اس میں بھی چلنا پڑتا ہے، لیکن یہ حکم بھی شرع سے ثابت ہے۔

تنبیہ: یہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ نماز میں چلنا جائز ہے جیسے تین مسئلہ اوپر ذکر کئے گئے لیکن ان تمام صورتوں میں نماز موقوف رہتی ہے، چلتے ہوئے نماز ادا نہیں کی جاتی پہلے مسئلہ میں بھی نماز کی ایک رکعت یا دو رکعت ادا کر کے لوگ دشمن کی طرف چلے جائیں، پھر دوسرا گروہ امام کے ساتھ آکر باقی نماز ادا کرے، جب یہ دشمن کی طرف جائیں گے تو پہلے لوگ وہاں ہی یا واپس آکر جہاں پہلے نماز ادا کی تھی وہاں اپنی باقی نماز کو مکمل کریں گے، اگر چلتے ہوئے نماز جائز ہوتی تو یہ لوگ دشمن کی طرف جاتے جاتے نماز مکمل کر لیتے حالانکہ ایسا نہیں کیا گیا۔

وضو کرنے کے لئے جو شخص گیا وہ بھی وضو کر کے واپس آتے ہوئے چلتے چلتے نماز ادا نہیں کر سکتا بلکہ اپنی جگہ ، یعنی مسجد وغیرہ میں واپس آکر نماز مکمل کرے گا۔

سانپ اور بچھو کو قتل کرتے ہوئے بھی نماز میں چلنا تو جائز ہے لیکن اتنی دیر کے لئے نماز موقوف رہے گی یہ نہیں کہ چلتے ہوئے اور سانپ، بچھو کو ضربیں لگاتے ہوئے بھی نماز جاری رکھے گا۔

اس بحث سے یہ مسئلہ روز روشن کی طرح واضح ہو گیا۔

"ان المشی فی الصلوة کالمشی لاجل الوضوء الذی احدث فی الصلوة اھون من الصلوة ما شیا فلا یلحق الا علی بالادنی"

کہ بیشک دوران نماز چلنا آسان ہے بنسبت چلتے ہوئے نماز ادا کرنے کے، جیسا کہ وضو کرنے کے لئے جانا اور وضو کر کے آنا تو جائز ہے لیکن چلتے ہوئے نماز ادا کرنا جائز نہیں، لہذا واضح ہوا کہ ادنیٰ چیز کے ثابت سے اعلیٰ چیز کا ثبوت نہیں ہو سکتا، یعنی نماز میں چلنے کے جواز سے (وہ بھی بحکم شرع) چلتے ہوئے نماز کا جواز ثابت نہیں ہو سکتا۔ (ماخوذ از مظہری بوصاحب)

مسئلہ: سخت خوف میں سواریوں پر نماز رکوع اور سجود کے اشارہ سے جائز ہے خواہ قبلہ کا استقبال کیا جا سکے یا نہ کیا جا سکے لیکن یہ نماز اکیلے اکیلے ادا ہوگی جماعت سے ادا نہیں ہوگی، یہی قول امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ہے، ایک قول امام محمد رحمہ اللہ کی طرف منسوب کیا گیا کہ آپ جماعت سے نماز ادا کرنا جائز مانتے ہیں، لیکن ہدایہ میں اسے رد کیا گیا "ولیس بصحیح لانعدام الاتحاد فی المکان" جب ہر شخص اپنی اپنی سواری پر نماز ادا کر رہا ہے تو امام اور مقتدی حضرات کا مکان متحد نہیں ہوتا لہذا جماعت نہیں ہو سکتی۔

مسئلہ نماز خوف کی رکعتوں کی تعداد کم نہیں ہو سکتی:

اگر جنگ سفر کی مقدار سے کم مسافت پر ہو رہی ہے تو اسی طرح نماز فجر دو رکعت، مغرب تین رکعت، ظہر، عصر اور عشاء چار رکعت ہوگی جس طرح امن کی حالت میں ہوتی ہے۔ اگر مسافر ہو تو اس کے لئے نماز اسی طرح قصر ہوگی جیسے امن کی حالت میں مسافر کے لئے قصر ہوتی ہے۔

اعتراض: حدیث شریف میں تو اس کے خلاف ذکر ہے جس سے سمجھ آتا ہے کہ نماز خوف کی تعداد رکعات میں عام نمازوں سے فرق ہے۔

☆ عن ابن عباس قال فرض اللہ تعالٰی الصلوۃ علی لسان نبیکم فی الحضر اربعا وفی السفرُ رکعتین وفی الخوف رکعۃ. (مسلم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اللہ تعالٰی نے تمہارے نبی کریم ﷺ کی زبان سے حضر (غیر سفر) میں چار رکعت نماز فرض کی اور سفر میں دو رکعت اور خوف میں ایک رکعت۔

جواب: اس حدیث میں جماعت سے نماز پڑھنے کا حکم ہے کہ حضر میں چار رکعت والی نماز چار رکعت ہی امام کے ساتھ ادا ہوگی، اور سفر میں چار رکعت والی نماز دو رکعت ادا کی جائے گی جبکہ امام بھی مسافر ہو، اور سفر میں خوف کی حالت میں ایک رکعت نماز امام کے ساتھ ادا کی جائے گی اور ایک رکعت خود ادا کرے گا۔

☆☆☆☆☆

وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْکُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًاوَّصِیَّةً لِّاَزْوَاجِھِم مَّتَاعًا اِلَی الْحَوْلِ غَیْرَاِخْرَاجٍ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ فِیْ مَا فَعَلْنَ فِیْٓ اَنْفُسِھِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ط وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ☆

(سورۃ البقرۃ آیت ۲۴۰)

﴿۱﴾

اور جو تم میں مریں اور بیبیاں چھوڑ جائیں وہ اپنی عورتوں کے لئے وصیت کر جائیں سال بھر نان ونفقہ دینے کی بے نکالے پھر اگر وہ خود نکل جائیں تو تم پر اس کا مؤاخذہ نہیں جو انہوں نے اپنے معاملہ میں مناسب طور پر کیا اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔

﴿۲﴾

اور وہ جو فوت ہونے کے قریب ہو جائیں تم میں سے اور چھوڑ رہے ہوں بیویاں تو ان پر وصیت (فرض) ہے بیویوں کیلئے تم نفع پہنچاؤ ان کو سال تک سوائے نکالنے کے، پھر اگر وہ نکلیں تو کوئی گناہ نہیں تم پر جو کریں وہ اپنے نفس کے متعلق شرع کے مطابق اور اللہ غالب (اور) حکمت والا ہے۔

مختصر مطلب:

ابتداء اسلام میں بیوہ کی عدت ایک سال کی تھی اور ایک سال کامل وہ شوہر کے یہاں رہ کر نان ونفقہ (روٹی، خرچ) پانے کی مستحق ہوتی تھی، پھر ایک سال کی عدت تو "یتربصن بانفسھن اربعة اشھر وعشرا" سے منسوخ ہوگئی جس میں بیوہ کی عدت چار ماہ دس دن مقرر فرمائی گئی، اور سال بھر کا نفقہ آیۃ میراث سے منسوخ ہوا جس میں عورت کا حصہ شوہر کے ترکہ سے مقرر کیا گیا لہذا اب اس وصیت کا حکم باقی نہ رہا۔

حکمت اس کی یہ ہے کہ عرب کے لوگ اپنے مورث کی بیوہ کا نکلنا یا غیر سے نکاح کرنا بالکل گوارا ہی نہ کرتے تھے، اور اس کو عار سمجھتے تھے اس لئے اگر ایک دم چار ماہ دس روز کی عدت مقرر کی جاتی تو یہ ان پر بہت شاق ہوتی، لہٰذا بتدریج (آہستہ آہستہ، درجہ بدرجہ) انہیں راہ پر لایا گیا۔ (خزائن العرفان)

قدرِ تفصیل:

"وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ" اور وہ جو فوت ہونے کے قریب ہو جائیں تم میں سے۔

"منکم" میں مخاطب ضمیر ذکر کی گئی کہ یہ خطاب مردوں کو ہے، اسی لئے اکثر مفسرین کرام نے "یا معشر الرجال" کے الفاظ ذکر کئے ہیں "اے مردوں کی جماعت"

"والذین یتوفون" کا معنی ملا جیون رحمہ اللہ نے فرمایا "والرجال الذین یقربون الموت منکم" اور وہ مرد جو تم میں سے موت کے قریب ہوں۔ (تفسیرات احمدیہ)

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے اس معنی کی وجہ بیان فرمائی "وفی یتوفون مجاز المشارفة" (یتوفون میں مجاز مشارفت پایا گیا ہے) مجاز مشارفت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک چیز پر قریب چیز کا حکم لگا دیا جائے۔

یعنی یہاں وفات کے قریب لوگوں کو "یتوفون" (جو مر جائیں) سے تعبیر کر لیا گیا، ظاہری معنی وہی ہے جو اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ہے، راقم نے مجاز کو طلباء پر واضح کرنے کیلئے "فوت ہونے کے قریب" والا معنی کیا ہے، وجہ صرف یہ ہے کہ طلباء کرام وسیع تر مطالب حاصل کر لیں۔

"وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا" اور چھوڑ رہے ہوں بیویاں۔

"ازواج" کا اطلاق مذکر اور مؤنث دونوں پر ہے، اسی وجہ سے مفسرین کرام نے "ازواجا" کی تفسیر "زوجات" سے کی، یعنی یہاں مراد مؤنث ہے مذکر نہیں، کیونکہ خطاب مردوں کو ہے کہ جب وہ بیویاں چھوڑ کر جا رہے ہوں فوت ہونے کے قریب ہوں تو ان پر وصیت کرنا فرض ہے۔

"وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ" تو ان پر وصیت (فرض) ہے بیویوں کے لئے۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

یہاں "وصیة" پر نصب بھی پڑھی گئی ہے، اور رفع بھی پڑھا گیا ہے، نصب والی قراءت ابو عامر، ابن عامر اور حمزہ رحمہم اللہ کی ہے جو عاصم رحمہ اللہ سے مروی ہے۔ اس صورت میں تقدیر عبارت کی ہوگی "لیوصوا او یوصون وصیة" وہ وصیت کر جائیں۔ یہی ترجمہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ہے۔ یا تقدیر عبارت یہ ہوگی "کتب اللہ تعالی علیھم وصیة" اللہ تعالیٰ نے ان پر وصیت کرنا فرض کر دیا۔ اس کو عبداللہ رحمہ اللہ کی قراءت سے تائید بھی حاصل ہے، انہوں نے پڑھا "کتب علیکم الوصیة لا زواجکم متاعا الی الحول" تم پر فرض کردی گئی وصیت تمہاری بیویوں کیلئے ایک سال تک نفع پہنچانے کی۔

ایک اور قراءت میں "وصیة" پر رفع ہے، اس صورت میں تقدیر عبارت کی ہو "علیھم وصیة" ان پر وصیت لازم ہے، یا تقدیر عبارت کی یہ ہو "کتب علیھم وصیة" ان پر وصیت فرض کی گئی۔ (از روح المعانی)

راقم نے ان تقادیر کے مطابق ترجمہ کیا جن میں فرض ہونے کا ذکر ہے۔

شانِ نزول:

طائف کے ایک شخص تھے جن کو حکیم بن الحارث کہا جاتا تھا جنہوں نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی ان کی اولاد، ان کے ماں باپ اور ان کی زوجہ بھی ان کے ساتھ تھی وہ فوت ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو نازل فرمایا تو نبی کریم ﷺ نے ان کے والدین اور اولاد کو وراثت سے مال دیا اور ان کی زوجہ کو کوئی چیز نہ عطا کی اور ان کے ورثا کو حکم دیا کہ ان کی زوجہ کو ایک سال گھر میں رہنے دیں اور خرچ دیتے رہیں۔

(ذکرہ البغوی، وکذا اخرج اسحاق بن راھویہ فی تفسیرہ)

شانِ نزول کا قول ضعیف ہے:

یہ واقع اپنی جگہ درست ہے، لیکن یہ واقع آیۃ کریمہ کے نزول کا سبب نہیں قاضی مظہری رحمہ اللہ نے اس شان نزول پر ان الفاظ سے اعتراض کیا۔

"قلت لکن سیاق الآیة ینافی هذا الحدیث لان الآیة تقتضی وجوب الوصیة والحدیث یقتضی وجوب نفقتها من ترکة زوجها من غیر وصیة ولعله مات بعد نزول الآیة واوصی بالانفاق حولا علی حسب تلک الآیة فعمل النبی ﷺ کذالک"

میں کہتا ہوں آیۃ کریمہ کا سیاق یعنی مقصدِ بیان اس حدیث کے منافی ہے کہ یہ واقعہ شانِ نزول بن سکے کیونکہ آیۃ کریمہ وصیت کے وجوب کا تقاضا کرتی ہے، اور حدیث اس کو نفقہ (خرچ) دینے کا تقاضا کرتی ہے کہ اس کی زوجہ کو اس کے ترکہ سے خرچ دیا جائے، حدیث پاک میں وصیت کا کوئی ذکر نہیں۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ آیۃ کریمہ کا نزول پہلے ہوا ہو، وہ صحابی بعد میں فوت ہوئے ہوں (وصیت کا انہیں موقع نہیں ملا جیسا کہ بعض مفسرین کرام نے ذکر کیا کہ ان کی موت اچانک واقع ہوئی) یا بقول مظہری رحمہ اللہ انہوں نے وصیت کر دی ہو اور نبی کریم ﷺ نے اس پر عمل فرمایا ہو۔(واللہ اعلم بالصواب) (مظہری)

آیۃ کریمہ کے منسوخ ہونے کا قول:

اکثر حضرات کا قول یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ منسوخ ہے پہلی آیۃ کریمہ سے وہ یہ ہے "یتربصن بانفسهن اربعة اشهر وعشرا" وہ اپنے آپ کو چار مہینے دس دن روک کر رکھیں) یعنی ایک سال کی عدت منسوخ ہے چار ماہ دس دن کی عدت سے۔

خیال رہے کہ پہلی آیۃ کریمہ نزول کے لحاظ سے بعد میں ہے تلاوت کے لحاظ سے پہلے ہے، جیسے "اقراء باسم ربک" الخ آیات نازل سب سے پہلے ہوئیں حالانکہ تیسویں پارہ میں تلاوت ہوتی ہیں۔

☆ قال ابن الزبیر قلت لعثمان بن عفان "والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا" قد نسختھا الآیة الأخری فلم تکتبھا او تدعھا، قال یاابن اخی لاا غیر شیا منه مکانه"

(رواه البخاری)

حضرت ابن زبیر کہتے ہیں میں نے حضرت عثمان بن عفان (رضی اللہ عنہم) کو کہا جب آیۃ کریمہ "والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا" دوسری آیۃ کریمہ سے منسوخ ہے تو اسے نہ ہی لکھا جاتا بلکہ چھوڑ دیا جاتا، یعنی اس کو قرآن پاک کے نسخہ میں لکھنے کا کیا فائدہ؟ تو آپ نے فرمایا میں کسی آیۃ کو اس جگہ سے نہیں ہٹا سکتا۔

یعنی آیۃ کریمہ اگرچہ حکم کے لحاظ پر منسوخ ہے لیکن تلاوت کے لحاظ پر منسوخ نہیں۔

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے سوال کا اصل مقصد یہ تھا کہ آیۃ کریمہ کا حکم جب منسوخ ہو چکا ہے تو اس کو قرآن پاک میں لکھنے کا کیا فائدہ ہے، بلکہ اس کے لکھنے سے تو یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ شائد اس کا حکم باقی ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ارشاد کا مقصد یہ تھا۔

"ھذاامر توفیقی وانا وجدتھا مثبتة فی المصحف کذلک بعد ھا فاثبتھا حیث وجدتھا"

یہ معاملہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے تقاضا پر موقوف ہے، جب میں نے قرآن پاک کے نسخہ میں اس آیۃ کریمہ کو لکھا ہوا پایا تو بعد میں بھی اسی طرح قرآن پاک میں موجود رہے گا۔

(صابونی، ابن کثیر)

☆ وروی عن ابن عباس قال کان الرجل اذا مات وترک امرأته اعتدت سنة فی بیته ینفق علیھا من ماله ثم انزل اللہ بعد(والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا یتربصن بانفسھن اربعة اشھر وعشرا)فھذه عدة المتوفی عنھا زوجھا الا ان تکون حاملا فعدتھا ان تضع مافی بطنھا،وقال "ولھن الربع مما ترکتم ان لم یکن لکم ولد فان کان لکم ولد فلھن الثمن مماترکتم"فبین میراث المرأة وترک الوصیة والنفقة۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک شخص جب فوت ہو جاتا تھا اور اپنی زوجہ چھوڑ جاتا تو وہ ایک سال اس کے گھر عدت گذارتی اور اس کے مال سے اس عورت کو ایک سال خرچ دیا جاتا تھا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آیۃ کریمہ "والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا

یتربصن بانفسهن اربعة اشهر وعشرا'' نازل فرمائی، اب یہ ''چار ماہ دس دن'' عدت ہے اسی عورت کی جس کا خاوند فوت ہو جائے سوائے حاملہ عورت کے اس کی عدت ہے بچے کی پیدائش خواہ اس کا خاوند فوت ہو جائے یا اسے طلاق دی گئی ہو۔

اور اللہ تعالیٰ نے ''ولهن الربع مما تركتم ان لم يكن لكم ولد فان كان لكم ولد فلهن الثمن مما تركتم'' جب ان عورتوں کا حصہ (مذکورہ بالا) آیۃ کریمہ میں بیان فرمادیا کہ خاوند کی اولاد ہونے کی صورت میں ان کا آٹھواں حصہ ہے اور اولاد نہ ہونے کی صورت میں ان کا چوتھا حصہ ہے۔

تو اس آیۃ کریمہ سے عورتوں کے سال کے خرچ والا حکم منسوخ ہو گیا، اور وراثت والی آیۃ سے ورثاء کیلئے وصیت کا حکم بھی منسوخ ہو گیا۔ (از صابونی و ابن کثیر)

نبی کریم ﷺ کا ارشاد بھی ہے ''لا وصية للوارث'' وارث کے لئے وصیت نہیں۔

عدم منسوخیت کا قول:

مجاہد اور عطاء کا قول یہ ہے کہ یہ آیۃ منسوخ نہیں، بلکہ چار ماہ دس دن عدت گذارنی ان پر واجب ہے، اس مدت کے دوران ان کو خرچ دینا اور رہنے کیلئے مکان دینا واجب ہے۔ اور ان کیلئے ایک سال تک خرچ دینے اور مکان دینے کی وصیت کرنا مستحب ہے، یعنی دونوں حکم علیحدہ علیحدہ ہیں، دونوں ہی برقرار ہیں ایک وجوبی اور ایک استحبابی۔
(ماخوذ از ابن کثیر و کبیر)

تنبیہ: جن حضرات نے منسوخ کا قول کیا ہے کہ پہلے عدت ایک سال واجب تھی ان حضرات کے نزدیک ''غیر اخراج'' کا حکم وجوبی ہے کہ ان کو گھروں سے نہ نکالا جائے، اب ان کے نزدیک ''فان خرجن فلا جناح عليكم فيما فعلن من معروف'' کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر وہ عورتیں سال مکمل کرنے کے بعد خود نکل جائیں اور اپنے نفسوں کے متعلق شرع کے مطابق کام کریں تو تم پر کوئی گناہ نہیں۔ عدت ختم کرنے سے پہلے ان کا گھر سے نکلنا جائز نہیں۔

اگر منسوخ نہ ہونے کا قول مراد ہو تو اب مطلب یہ ہوگا کہ چار ماہ دس دن تک تو ان کا عدت گذارنا واجب ہے اور چار ماہ دس دن کے بعد ان کو خرچ دینا اور مکان میں رہنے دینا واجب نہیں، لیکن چار ماہ دس دن کے بعد اگر وہ نکلنا چاہیں تو ان کی مرضی رہنا چاہیں تو ایک سال تک ان کو نہ نکالا جائے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ منسوخ نہ ہونے والے قول کو پسند فرماتے ہوئے یوں ارشاد فرماتے ہیں "وتنزيل الآيتين على هذا التقديرين اولى حتى يكون كل واحد منها معمولا به" دونوں آیتوں میں سے کسی ایک کو بھی منسوخ نہ ماننا زیادہ بہتر ہے تاکہ ہر ایک آیۃ پر عمل ہو سکے۔ (کبیر)

مسئلہ: عدت کے دوران رہنے کیلئے مکان دینا واجب ہے۔

اعتراض: فاطمہ بنت قیس کی حدیث سے تو یہ سمجھ آرہا ہے کہ دوران عدت رہنے کیلئے مکان دینا واجب نہیں۔

عن فاطمةبنت قيس ان رسول الله ﷺ لم يجعل لها سكنى و لا نفقة. (مسند احمد)

حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے ان کا عدت میں خرچ اور مکان مقرر نہیں فرمایا۔

جواب: "وقد ترك العمل به عمر بن الخطاب بمحضر من الصحابة" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کے سامنے اس حدیث کو چھوڑنے کے متعلق فرمایا "لا ندع كتاب الله وسنة نبينا ﷺ بقول امرأة لاندري احفظت ام نسيت" ہم اللہ تعالیٰ کی کتاب (قرآن پاک) اور نبی کریم ﷺ کی مشہور احادیث کے حکم کو ایک عورت کے قول پر نہیں چھوڑ سکتے، ہمیں معلوم نہیں کہ اسے یاد ہے یا وہ بھول گئی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ارشاد کو کسی نے بھی رد نہیں کیا لہذا اس پر اجماع امت ہو گیا کہ عورت کو دوران عدت خرچ اور رہنے کے لئے مکان دینا واجب ہے۔ (از مظہری)

حضرت امام مالک رحمہ اللہ نے مؤطا میں فریعہ بنت مالک بن سنان جو ابو سعید خدری کی بہن ہیں کی حدیث بیان کی جس میں یہ الفاظ مبارکہ ہیں۔

"فقال ﷺ امكثي في بيتك حتى يبلغ الكتاب اجله،قالت فاعتددت فيه

اربعة اشهر و عشرا، فلما کان (عثمان بن عفان) ارسل الیّ فسألنی عن ذلک فاخبرته فاتبعه و قضی به" (رواه مالک وابوداود و الترمذی وقال الترمذی حسن صحیح)

رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا کہ تم اپنے گھر میں ٹھہرو یہاں تک کہ کتاب اپنی اجل کو پہنچ جائے (یعنی قرآن پاک میں بیان کردہ عدت کی مدت ختم ہو جائے) فریعہ کہتی ہیں میں نے اپنے خاوند کے مکان میں ہی چار ماہ دس دن عدت گذاری، جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ تھے تو آپ نے مجھ سے اس حدیث کے متعلق پوچھا، میں نے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد انہیں بتایا، آپ نے اسی کی تابعداری کی اور اسی کے مطابق فیصلہ فرمایا۔ (از ابن کثیر و کبیر)

تنبیہ: "لاجناح علیکم" کا خطاب میت کے ورثاء کو بھی ہے اور حکام کو بھی۔ "فان خرجن" کے دو مطلب ہیں، وہ خود چار ماہ دس دن مکمل کرنے کے بعد نکل جائیں (عدم منسوخیت کے قول کے مطابق) یا وہ خود نکل جائیں ایک سال عدت گذارنے کے بعد (منسوخیت کے قول کے مطابق) تو تم پر اے حاکمو اور میت کے ورثاء کوئی گناہ نہیں جو وہ اپنے نفسوں کے متعلق شرع کے مطابق کام کریں، یعنی عدت گذار کر اور نکاح کرنے کیلئے شرع کے مطابق اپنی زینت وغیرہ کریں تو انہیں اجازت ہے، تم انہیں منع نہ کرو۔

"وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ" اور اللہ غالب ہے (اور) حکمت والا ہے۔

اس میں وعید بھی ہے اور وعدہ بھی، یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کے حکم سے عدولی کرے گا اللہ تعالیٰ اسے عذاب دے گا، اسے عذاب دینے سے کوئی روک نہیں سکتا کیونکہ وہ غالب ہے (یہ وعید ہے)۔ اور اگر کوئی شخص اس کے احکام کے مطابق عمل کرے گا تو رب تعالیٰ اسے اجر و ثواب عطاء فرمائے گا، وہ غالب ہے اسے ثواب دینے سے بھی کوئی روک نہیں سکتا۔

وہ حکمت والا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا ہر کام حکمت پر مبنی ہے، اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں، اس لئے اس کا اچھے عمل کرنے والوں کو ثواب دینا بھی حکمت کا کام ہے، اور برے کام کرنے والوں کو عذاب دینا بھی اس کی حکمت کا تقاضا ہے۔

☆☆☆☆☆

وَ لِلۡمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ حَقًّا عَلَی الۡمُتَّقِیۡنَ ☆

(سورۃ البقرۃ آیت ۲۴۱)

۱

اور طلاق والیوں کے لئے بھی مناسب طور پر نان ونفقہ ہے یہ واجب ہے پرہیز گاروں پر۔

۲

اور طلاق والیوں کو (بھی) نفع پہنچانا مناسب طور پر واجب ہے مومنوں پر۔

مختصر مطلب اور ماقبل سے تعلق:

پہلی آیۃ میں جن عورتوں کے خاوند فوت ہو جائیں ان کو دوران عدت نان ونفقہ اور رہنے کیلئے مکان دینے کا ذکر تھا۔ اس آیۃ کریمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جن عورتوں کو طلاق دے دی جائے ان کو دوران عدت خرچ دیا جائے۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ مرادی ہے کہ "متاع بالمعروف" سے مراد کیا ہے؟ اور راقم کا ترجمہ لغوی ہے کہ اصل لغت کے مطابق ترجمہ کیا ہے، تاہم راقم کے ترجمہ سے مکان دینا بھی سمجھ آسکتا ہے۔

اتنا واضح ہے کہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ اور راقم کے ترجمہ کا مقصد تقریبا ایک ہی ہے۔

شان نزول:

جب اللہ تعالیٰ نے حکم دیا "ومتعوھن" اور نفع پہنچاؤ انہیں۔ اور آیۃ کریمہ کا اختتام فرمایا "حقا علی المحسنین" سے (کہ یہ واجب ہے احسان کرنے والوں پر) تو ایک شخص کہنے لگے کہ یہ حکم تو احسان کرنے والوں پر واجب ہے، اس سے تو یہ واضح ہوا کہ اس میں اختیار ہے اس لئے میرے لئے تو گویا کہ یوں حکم ہے "ان اردت فعلت وان لم ارد لم افعل" اگر میں چاہوں تو ان کو نفع پہنچاؤں اور اگر میں نہ چاہوں تو نفع نہ پہنچاؤں۔

فقال تعالیٰ "وللمطلقات متاع بالمعروف حقا علی المتقین" یعنی علی کل من کان متقیا عن الکفر۔

تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا جس میں ذکر کیا گیا کہ طلاق والی عورتوں کو دوران عدت نان ونفقہ دینا تمام مومنوں پر لازم ہے، کیونکہ اس مقام میں ''متقین'' سے مراد کفر سے بچنے والے۔ (کبیر)

راقم نے کبیر کی بحث کے مطابق ''متقین'' کا ترجمہ ''مؤمنین'' کر دیا ہے۔ باقی مترجمین کا ترجمہ تقریباً ''پرہیز گار لوگ'' ہی ہے، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ رب تعالیٰ کے حکم کو مان کر اس پر عمل کرنے والے اور ثواب حاصل کرنے والے پرہیز گار لوگ ہی ہیں اگرچہ یہ حکم سب مومنوں کو ہے۔

''متاع'' میں دو قول:

﴿۱﴾ ایک قول یہ ہے کہ ''متاع'' سے مراد ''متعہ'' ہے، یعنی طلاق والی عورتوں کو متعہ (تین کپڑوں پر مشتمل جوڑا) دینا واجب ہے۔ یہ آیۃ کریمہ ظاہری طور پر تقاضا کرتی ہے کہ ہر طلاق والی عورت کو متعہ دیا جائے، بعض حضرات نے اس آیۃ کریمہ کے ظاہر سے دلیل پکڑی ہے کہ متعہ تمام طلاق والی عورتوں کو دینا واجب ہے، یہ قول سعید بن جبیر، ابو العالیہ اور زہری رحمہم اللہ کا ہے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اگرچہ ہر طلاق والی کو متعہ دینا واجب ہے لیکن وہ عورت جس کا مہر مقرر کیا گیا تھا اور اسے جماع اور خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دے دی گئی اسے صرف نصف مہر دینا واجب ہے، متعہ دینا واجب نہیں، یہ مسئلہ ''ومتعوھن علی الموسع قدرہ وعلی المقتر قدرہ'' میں بیان کیا جا چکا ہے۔

اگر کوئی یہ سوال کرے کہ متعہ کا پھر یہاں ذکر کیوں کیا گیا ہے حالانکہ اس کا ذکر پہلے ''ومتعوھن علی الموسع قدرہ وعلی المقتر قدرہ'' میں آ چکا ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے ''ھناک ذکر حکما خاصا وھھنا ذکر حکما عاما'' وہاں خاص حکم کا ذکر تھا جس کا تعلق غنی سے علیحدہ اور تنگدست سے علیحدہ تھا، یہاں عام حکم ہے کہ طلاق والی عورتوں کو متعہ دیا جائے۔

﴿۲﴾ دوسرا قول یہ ہے ''ان المراد بھذہ المتعۃ النفقۃ قد تسمی متاعا، واذا حملنا ھذا المتاع علی

النفقة اندفع التکرار فکان ذلک اولی''اس آیۃ کریمہ میں ''متعة'' سے مراد''خرچ دینا ہے''۔خرچ دینے کوکبھی ''متعة'' کہہ دیا جاتا ہے اور کبھی ''متاع'' کہہ لیا جاتا ہے۔

جب آیۃ کریمہ میں''متـــاع''کامعنی خرچ کیا جائے تو تکرار اٹھ جائے گا،یعنی متعہ معنی کرنے میں تکرار ہے اور''نان ونفقہ''ترجمہ کرنے میں تکرار نہیں۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے اسی معنی کے متعلق بیان فرمایا''فکان ذلک اولی'' یہی معنی بہتر ہے۔ (ار کبیر)

''وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ'' ففی بیان نفقة المطلقات اذالمتاع النفقة وهو المختار لصاحب المدارک فمعنی الآیة ان المطلقة تجب نفقتها علی الزوج ما دامت معتدة سواء کانت مطلقة الرجعی او البائن او غیر ذلک وهذه الآیة باق حکمها الآن غیر منسوخ بالاتفاق.

اس آیۃ کریمہ میں طلاق والی عورتوں کے خرچ کا ذکر ہے،جبکہ ''متاع'' سے مراد ہی''نان ونفقہ''ہے،یہی مختار ہے صاحب مدارک التنزیل کا،آیۃ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ طلاق والی عورتوں کوخرچ دیا جائے جب تک وہ عدت میں ہوں خواہ ان کو طلاق رجعی دی گئی یا بائن وغیرہ،اور یہ آیۃ کریمہ منسوخ نہیں بلکہ محکم ہے اور اس کا حکم ابھی تک باقی ہے۔ (تفسیرات احمدیہ)

متعہ دینے کا وجوبی حکم منسوخ ہے۔منسوخ نہ ہونے والا قول منسوخ ہونے والے قول سے بہتر ہے۔

بیان کردہ تفسیر کے بعد دیکھیں:

علامہ رازی رحمہ اللہ نے جس قول کوترجیح دی ہے،اور علامہ احمد المعروف بملا جیون رحمہ اللہ نے جس قول کوترجیح دی ہے اسی کے مطابق اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ہے،لیکن بعض جہلاء نے اپنی جہالت کی وجہ سے اسے مورد طعن وتشنیع بنایا۔ایسے ہی ایک رسالہ''کنزالایمان پر پابندی کیوں؟''کودیکھ کر راقم نے سب سے پہلے ''تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان'' تصنیف کی،اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے میں نے اپنے تصور سے بھی بالاتر تصنیفی کام کیا۔

معترض کا تفصیلی نوٹ:

طلاق شدہ عورت: البقرۃ میں طلاق کے احکام بیان کرنے کے بعد قرآن کریم نے طلاق شدہ عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور ان کے ساتھ احسان سے پیش آنے کا حکم بطور یاد دہانی کے مکرر فرمایا اور کہا "وللمطلقات متاع بالمعروف حقا علی المتقین" اس جگہ مترجم حضرات نے "متاع بالمعروف" کا ترجمہ......

کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچانا	(تھانوی)
فائدہ دینا ساتھ اچھی طرح کے	(شاہ رفیع الدین)
خرچ دینا ہے موافق دستور کے	(شاہ عبدالقادر)
کپڑے کے جوڑے وغیرہ سے کچھ سلوک کرنا	(ڈپٹی نذیر احمد)

......کیا، تاکہ اس آیۃ میں طلاق شدہ عورتوں کے حقوق واجبہ اور اخلاق حسن سلوک کی تمام صورتیں شامل ہو جائیں، وہ صورتیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ مہر مقرر تھا اور اب خلوت وملاقات کے بعد طلاق دے دی گئی، تو اب عورت کو پورا مہر دیا جائے گا اور تا عدت نان ونفقہ ادا کرنا واجب ہوگا۔

۲۔ مہر مقرر نہ تھا اور خلوت کے بعد طلاق دے دی گئی، تو اب مہر مثل واجب ہوگا اور عدت کا نان نفقہ بھی۔

۳۔ مہر مقرر تھا اور خلوت سے پہلے طلاق دے دی گئی تو اب آدھا مہر واجب ہوگا۔

۴۔ لڑکی صغیرہ اور نا قابل خلوت ہے یا قابل خلوت ہے مگر خلوت نہیں ہوئی تو اب اسے کپڑے ایک جوڑا دینا واجب ہوگا اور اس پر عدت نہ ہوگی۔

ان تمام صورتوں میں عورت کو فائدہ پہنچانا صادق آتا ہے، کہیں پورے مہر کی صورت، کہیں مہر مثل کی صورت میں اور کہیں آدھے مہر کی صورت اور آخری مسئلہ میں صرف ایک جوڑا کپڑے دینے کی صورت میں۔

اس آیۃ مذکورہ میں تمام صورتیں شامل ہیں اور قرآن کریم نے اس کیلئے ایک عام لفظ "متاع بالمعروف" استعمال کیا ہے لیکن مولنا احمد رضا خان صاحب نے "متـاع بـالـمعـروف" کا ترجمہ فرمایا ہے "اور طلاق والیوں کیلئے بھی مناسب نان ونفقہ ہے یہ واجب ہے پرہیزگاروں پر"

خان صاحب کے ترجمہ کے مطابق مذکورہ چوتھی صورت بھی آیۃ کے حکم (نان ونفقہ) میں شامل ہے کیونکہ وہ بھی طلاق والیوں میں شامل ہے، حالانکہ یہ وہ طلاق والی ہے جس پر عدت واجب نہیں تو پھر شرعی نان نفقہ کیا؟ بطور حسن سلوک کے صرف کپڑے کا ایک جوڑا دینا کافی ہے۔

ہوسکتا ہے کہ مولانا بریلوی کے سامنے کوئی ترجمہ ایسا بھی ہو جس کی مرحوم نے پیروی کی ہے، لیکن بقول رضا خانی حضرات کے جس مجتہد وفقیہ بے مثال نے فتاوی رضویہ کے نام سے بارہ ہزار صفحات پر مشتمل فقہی مسائل کا خزانہ امت کے لئے چھوڑا ہو اس کی نظر آیت پاک کی اس باریکی کی صورت کی طرف کیوں نہیں گئی اور آیۃ کے مفہوم کو ایک صورت میں خاص کر کے آیۃ کی حقیقی روح کو بے اثر کر دیا، اس پر تعجب ہوتا ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کا مختصر تفسیری حاشیہ ملاحظہ فرمایئے اور دیکھئے کہ قرآن فہمی کی خداداد صلاحیت کیا چیز ہوتی ہے، لکھتے ہیں پہلے خرچ فرمایا تھا یعنی جوڑا اس طلاق پر کہ مہر نہ ٹھہرا ہو اور ہاتھ نہ لگایا ہو، یہاں سب پر حکم فرمایا، سب طلاق شدہ عورت کو مہر واجب کے ساتھ ساتھ کپڑے کا جوڑا دینا بھی مستحسن ہے تاکہ علیحدگی کے باوجود آپس میں صلح واحسان کے جذبات موجود رہیں، اور پہلی صورت میں یہ جوڑا دینا اور کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچانا ضروری ہے۔

امید کی جاسکتی تھی کہ محشی مرحوم اس آیۃ پر تشریحی نوٹ لکھ کر مسئلہ کو صاف کرتے لیکن مرحوم محشی بھی یہاں سے صاف بچ کر نکل گئے، اور قرآن کریم کی ایک فقہی آیۃ کا ترجمہ تشنہ رہ گیا۔

میں نہیں چاہتا کہ خان صاحب مرحوم کے ترجمہ کا علماء دیوبند کے تراجم اور تفاسیر سے موازنہ کر کے اپنے رضا خانی بھائیوں کو تکلیف پہنچاؤں لیکن جو حضرات علمی مسائل کو علمی مسائل کی نظر سے دیکھتے ہیں ان سے گزارش ہے کہ وہ حضرات شیخ الہند کا تفسیری حاشیہ اور مولانا اشرف علی خان صاحب تھانوی کی بیان القرآن اور مولانا عبدالحق

صاحب حقانی کی تفسیر حقانی کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ ان حضرات نے البقرۃ کی قانونی آیات طلاق کو قانونی اسلوب و انداز میں کس سلیقہ سے واضح کیا ہے اور کنزالایمان ان تفاسیر کے مقابلہ میں ایک سطحی اور طالب علمانہ تفسیر نظر آتی ہے۔ (معترض کی بحث ختم)

راقم کا تبصرہ:

راقم نے تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان میں آج سے کئی سال پہلے یوں تبصرہ کیا، سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ پر یہ اعتراض کرنا کہ آپ فقہ کی باریکیوں سے بے خبر ہیں، لیکن خود معترض صاحب نے جو چوتھی صورت مطلق ذکر کی ہے اس میں مہر کے مقرر ہونے یا نہ ہونے کی کوئی قید نہیں لگائی، وہ محل نظر ہے کیونکہ لڑکی صغیرہ اور ناقابل خلوت ہے اور مہر مقرر تھا تو طلاق کی صورت میں نصف مہر ہے صرف جوڑا کپڑوں کا دینا کافی نہیں ہاں اگر مہر مقرر نہ ہو تو یہ صورت ہے لیکن معترض صاحب نے مہر کے مقرر ہونے یا نہ ہونے کی کوئی قید نہیں لگائی۔

اسی طرح یہی دو صورتیں اس عورت میں بھی ہیں جو قابل خلوت تو ہے لیکن اس کو طلاق قبل از خلوت دی جائے تو مہر مقرر ہونے کی صورت میں نصف مہر اور مہر کے مقرر نہ ہونے کی صورت میں متعہ (کپڑوں کا جوڑا) دیا جائے گا، حالانکہ مہر کے مقرر ہونے کی صورت میں یہ لازم نہیں۔

"وان تزوجها ولم يسم لها مهرا او تزوجها على ان لا مهر لها فلها مهر مثلها ان دخل بها او مات عنها ولو طلقها قبل الدخول فلها المتعة. (بداية المبتدى)

اگر نکاح کیا لیکن مہر مقرر نہیں کیا یا نکاح ہی اس شرط پر کیا کہ مہر نہیں دیا جائے گا، ایسی صورت میں اس عورت کو طلاق دخول کے بعد دی گئی یا اس کا خاوند فوت ہو گیا تو اس عورت کو مہر مثل دیا جائے گا، فوت ہونے کی صورت میں دخول یا عدم دخول کی قید نہیں۔ اگر اسی صورت میں یعنی مہر مقرر نہیں کیا گیا تھا یا مہر کی نفی کر دی گئی تھی تو طلاق دخول سے پہلے دے دی گئی تو کپڑوں کا جوڑا دینا واجب ہے۔

دوسری بات یہ سمجھیں کہ معترض صاحب نے خود اعتراف کیا ہے کہ میں اپنے ہی حضرات کے تراجم اور تفاسیر کو دیکھا جو اردو زبان میں ہیں کیونکہ وہ خود لکھتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ مولانا بریلوی کے سامنے کوئی ترجمہ ایسا بھی ہو جس کی مرحوم نے پیروی کی ہے، یہ اعتراف حقیقت ہے جس کی وضاحت ابھی آتی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اس آیۃ کریمہ کا فقہی مسائل سے تعلق ہے جس کا اعتراف معترض صاحب نے برملا کیا ہے، لہٰذا فقہی مسائل کی تفسیر مدارک التنزیل کو دیکھیں، آپ نے اس طرح تفسیر کی، "وللمطلقات متاع" ای نفقة العدة کہ اس آیۃ کریمہ میں "متاع" سے مراد دوران عدت نان ونفقہ دینا ہے۔

اب یہ کہنا کہ ترجمہ چوتھی صورت کو شامل نہیں کہ وہاں عدت نہیں، یہ فقہی باریکی سے بے خبری ہے۔ یہ غلط ہے، بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ تفسیر مدارک کے عین مطابق ہے تو جب یہ کہا جائے گا کہ کنز الایمان ایک طالب علمانہ تفسیر ہے تو اس سے یہ خود بخود لازم آئے گا کہ صاحب مدارک بھی ایک طالب علم کی حیثیت میں تھے اور ان کی تفسیر بھی طالب علمانہ ہے۔

پھر علامہ رازی رحمہ اللہ نے بھی اسی قول کو اولیٰ (بہتر) قرار دیا ہے تو اس سے لازم آئے گا کہ تفسیر کبیر بھی ایک طالب علمانہ تفسیر ہے، پھر ملا جیون رحمہ اللہ نے بھی یہی معنی پسند فرمایا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تفسیرات احمدیہ بھی ایک طالب علمانہ تفسیر ہے۔

یہ تو سورج کے سامنے منہ چڑھانے کے مترادف ہے، بلکہ اپنی جہالت وحماقت کا اعتراف کرنا ہے۔ پھر اس آیۃ کریمہ میں بھی متعہ معنی لیا جائے تو تکرار لازم آئے، مختصر المعانی میں ایک شاندار ضابطہ مراد لیا گیا ہے "التاسیس اولی من التاکید" نیا معنی لینا بنسبت پہلا معنی لینے کے زیادہ بہتر ہے، تکرار اور تاکید میں پہلا معنی ہی مراد ہوتا ہے، غیر تکرار میں نیا معنی مراد ہوتا ہے۔

تفاسیر کے مطالعہ سے تو اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان رحمہ اللہ کے ترجمہ کی فوقیت واضح ہوتی ہے، کیونکہ اس میں تکرار نہیں اور متعہ والا معنی لینے میں تکرار ہے۔

پھر "حقا" کا معنی وجوب ہے، اور چار صورتوں میں صرف ایک صورت میں وجوب ہے یعنی مہر مقرر نہیں تھا اور طلاق وطی اور خلوت صحیحہ سے پہلے دے دی گئی، اس صورت میں متعہ واجب ہے، باقی تمام صورتوں میں وجوب نہیں ،لہذا متعہ والا معنی کرنے سے وجوب منسوخ ماننا پڑتا ہے لیکن نان ونفقہ والا معنی کرنے سے وجوب منسوخ نہیں ماننا پڑتا۔

یہی وجوہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کو فوقیت عطا کر رہی ہیں، لیکن جس شخص کے علم کا محور شیخ الہند کا تفسیری حاشیہ اور بیان القرآن اور تفسیر حقانی ہو وہ نہ سمجھ سکے تو کوئی اعتراض بھی نہیں، کیونکہ کم علم کو معذور ہی سمجھنا چاہئے، البتہ جہل مرکب کے حامل کو سمجھانا بھی ممکن نہیں، لیکن اگر ضد اور عناد کو چھوڑ کر حقیقت پسندی کی طرف آنا ہو تو معتبر تفاسیر کی عبارات کو اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کی تائید کے لئے پیش کر رہا ہوں تا کہ حق نظر آئے اور محققین کو طالب علمانہ حیثیت دینے کی حماقت کرنے سے اجتناب کیا جائے ،ورنہ ان مفسرین کی شان میں کوئی فرق نہیں آئے گا اور اپنی حماقت ثابت ہو جائے گی۔

البحر المحیط میں ہے "وقيل المراد بالمتاع ههنا نفقة العدة" اس آیۃ کریمہ کی تفسیر میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ "متاع" سے مراد عدت کا نفقہ ہے۔

یہاں سے بھی پتہ چلا کہ "نان نفقہ" ترجمہ اعلیٰ حضرت کا ہی نہیں، بلکہ اس میں اور ارباب تفسیر بھی شریک ہیں الجامع لاحکام القرآن للقرطبی نے بھی اختلاف بیان کرتے ہوئے معترض صاحب کی چوتھی صورت کو ایک قول میں خارج کیا ہے۔ الجامع کی عبارت کو ملاحظہ کریں:

"وقال عطا بن رباح وغيره هذه الآية في الثيبات اللواتي قد جومعهن اذ تقدم في غير هذه الآية ذكر المتعة للواتي لم يدخل بهن". (قرطبی)

عطا بن رباح وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ آیۃ ان عورتوں کے بارے میں ہے جن سے جماع کیا گیا ہو، ثیبہ ہوں، اس لئے کہ جن عورتوں سے دخول نہیں ہوا ان کے متعہ کا پہلی آیۃ میں ذکر آ چکا ہے۔

تفسیر مظہری میں ہے۔

"قیل المراد بمتاع فی هذا الآیة نفقة ایام العدة کماهو المراد فیما سبق من قوله تعالیٰ وصیة لازواجهم متاعا الی الحول بجامع ان المرأة فی کلا الصورتین الموت والطلاق محبوسة لحقوق الزوج فیجب الانفاق فی ماله"

متاع سے مراد زمانہ عدت کا نان ونفقہ مراد ہے، جیسا کہ پہلے اللہ تعالیٰ کے قول "وصیة لازواجهم متاعا الی الحول" میں وفات کی عدت کے نان ونفقہ کا بیان ہے، دونوں صورتوں یعنی موت وطلاق میں وجہ جامع یہ ہے کہ عورت چونکہ دوران عدت اپنے آپ کو حقوق زوج میں پابند رکھتی ہے اس لئے خاوند کے مال سے اس کا نفقہ لازم ہے۔

اس طرح روح المعانی میں ہے۔

"وقیل المراد بالمتاع نفقة العدة"

اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس آیۃ کریمہ میں "متاع" سے مراد دوران عدت نان ونفقہ دینا ہے۔

ناظرین کرام آپ نے مذکورہ بالا معتبر تفاسیر کی عبارات سے سمجھ لیا ہوگا کہ اس آیۃ کریمہ میں "متاع" کا ترجمہ "نان ونفقہ" کرنے میں اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ منفرد نہیں، بلکہ اکابرین مفسرین کرام کے اقوال بھی موجود ہیں، اب مخالفت برائے مخالفت کے اصول پر عمل کرتے ہوئے جوش عناد کی وجہ سے جنبش قلم کی زد میں اکابرین مفسرین کرام کو لپیٹنا کہاں کا انصاف ہے۔

میں یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا، یہ کہنا "کہ ہوسکتا ہے کوئی ترجمہ ایسا ہو" اس سے پہلے تفاسیر کو دیکھ لیا جائے تاکہ بعد میں خود ہی صیاد اپنے دام میں نہ پھنس جائے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ یہ ہے۔

"(طلاق والیوں کو) خرچ دینا ہے موافق دستور کے"

اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ یہ ہے ''اور طلاق والیوں کیلئے بھی مناسب طور پر نان ونفقہ ہے''

دونوں ترجمے ایک جیسے ہیں کیونکہ اعلیٰ حضرت نے ''نفقہ'' کا لفظ استعمال کیا ہے اور شاہ عبدالقادر صاحب نے اسی لفظ کا ترجمہ ''خرچ'' ذکر کیا ہے۔ اور اعلیٰ حضرت نے ''مناسب طور پر'' تحریر فرمایا اور شاہ عبدالقادر صاحب نے ''موافق دستور کے'' تحریر کیا ہے۔

جب ''مناسب نان ونفقہ'' اور ''خرچ دینا ہے موافق دستور کے'' ان میں کوئی فرق نہیں تو شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ کی تعریف اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کو مورد طعن وتشنیع بنانا، یہ کہاں کا انصاف ہے؟ ایسا کوئی منصف شخص کرسکتا ہے؟ ایسا کوئی صاحب علم کوئی صاحب دانش کرسکتا ہے؟ نہیں نہیں ایسا کرنا صاحب انصاف، صاحب علم اور صاحب دانش سے تو نہیں ہوسکتا۔

(تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان)

☆☆☆☆☆

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ☆

(سورۃ البقرۃ آیت ۲۴۲)

☆ ۱ ☆

اللہ یونہی بیان کرتا ہے تمہارے لئے اپنی آیتیں کہ کہیں تمہیں سمجھ ہو۔

☆ ۲ ☆

اسی طرح کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تمہارے لئے اپنی آیات کو تاکہ تمہیں کامل عقل آجائے۔

كَذٰلِكَ: اسی طرح۔

"ای مثل ذلک البیان الواضح للاحکام السابقة"

یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے پہلے احکام واضح طور پر بیان فرمائے۔

يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ:

"الدالة علی ما تحتاجون الیه معاشا و معادا"

اسی طرح اللہ تعالیٰ واضح طور پر تمہارے لئے اپنی آیات بیان کرتا ہے یعنی وہ آیات جن کے تم دنیا اور آخرت میں محتاج ہو۔ (روح المعانی)

"کذلک" اشارة الی ماسبق من احکام الطلاق و العدة (یبین اللہ لکم آیاته) وعدبانه سیبین لعباده من الدلائل و الاحکام ما یحتاجون الیه معاشا و معادا. (مظہری)

اللہ تعالیٰ نے جس طرح طلاق اور عدت کے احکام واضح طور پر بیان فرمائے ہیں اسی طرح اپنے بندوں کے لئے دلائل واحکام بیان فرمائے گا جن کے وہ دنیا اور آخرت کی زندگی میں محتاج ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے واضح طور پر دلائل واحکام بیان کرنے کا وعدہ فرمادیا ہے۔

خیال رہے تفسیر مظہری کے مطابق "کذلک یبین اللہ لکم آیاتہ" کا ترجمہ یہ ہوگا "اسی طرح کھول کر بیان کرے گا اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنی آیات کو۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے طلاق وعدت وغیرہ کے مسائل کو واضح طور پر بیان کر دیا ہے اسی طرح جن کاموں کا تمہیں حکم دیا ہے اور جن کاموں سے تمہیں روکا ہے ان کے حلال ہونے اور حرام ہونے کو اور ان کے فرض ہونے اور ان میں حدود لازم آنے کو واضح طور پر بیان فرماتا ہے، جن احکام کی تمہیں محتاجی ہوتی ہے ان کو رب تعالیٰ واضح طور پر بیان فرما دیتا ہے ان کو مجمل (غیر واضح) نہیں چھوڑتا۔ (صابونی)

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ: تاکہ تمہیں کامل عقل آجائے۔

ان الفاظ مبارکہ کے علامہ شہاب الدین السید محمود احمد آلوسی رحمہ اللہ نے تین معانی بیان فرمائے،

﴿۱﴾ "لکی تکمل عقولکم"

تاکہ تمہاری عقلیں کامل ہو جائیں۔

اسی کے مطابق راقم نے ترجمہ کیا ہے "تاکہ تمہیں کامل عقل آجائے"

﴿۲﴾ "لکی تصرفوا عقولکم الیها"

تاکہ تم اپنی عقلوں کو ان احکام کی طرف پھیر سکو۔

﴿۳﴾ "لکی تفهموا ما ارید منها"

تاکہ تمہیں سمجھ آجائے، ان احکام کی جن پر عمل کرنے یا چھوڑنے کا تم سے ارادہ کیا گیا ہے۔

(روح المعانی)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نجوم الفرقان

من تفسیر آیات القرآن

2421 196

از رشحاتِ قلم

حافظ قاضی [illegible]

جامعہ حنفیہ تعلیم الاسلام

ٹاؤن شکریال راولپنڈی

کتاب لاریب کی توضیحات وتشریحات، علوم عقلیہ ونقلیہ کی روشنی میں
علمی وتحقیقی ذوق رکھنے والوں کے لئے قدیم وجدید احکامات ومسائل پر ابحاث کا حسین مرقع
تفسیر القرآن بالقرآن، ارشادات نبویہ، اقوال صحابہ، تحقیقات اسلاف اور روایات صحیحہ پر مشتمل تفسیر

مسمی بہ

نجوم الفرقان

من تفسیر آیات القرآن

جلد ششم

سورۃ البقرۃ آیات 243 تا 283

از رشحات قلم

محقق اہلسنت

استاذ العلماء حضرت علامہ مولانا

عبدالرزاق بھترالوی ہزاروی

جامعہ جماعتیہ مہر العلوم راولپنڈی

شعبہ نشر و اشاعت

جامعہ جماعتیہ مہر العلوم شکریال راولپنڈی

☆ نام کتاب .... نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن

سورۃ البقرۃ آیات نمبر 243 تا 283

☆ تالیف .... علامہ مولانا **عبدالرزاق** بھترالوی حطاروی

☆ کمپوٹر گرافکس .... محمد اسحاق ہزاروی

☆ کمپوزر .... محمد اکرم رضوی، افتخار احمد ہزاروی

☆ کمپوزنگ سنٹر .... **مہر العلوم کمپوزنگ سنٹر** شکریال راولپنڈی

☆ بار طباعت .... اول

☆ ناشر .... **جامعہ جماعتیہ مہر العلوم رحیم ٹاؤن شکریال راولپنڈی**

ملنے کے پتے

☆ جامعہ جماعتیہ مہر العلوم شکریال راولپنڈی

☆ احمد بک کارپوریشن اقبال روڈ کمیٹی چوک راولپنڈی

☆ فرید بک سٹال، اردو بازار لاہور

☆ نیو مکتبہ ضیائیہ بوہڑ بازار راولپنڈی

☆ جامع مسجد غوثیہ ایف، سکس ون، اسلام آباد

☆ مکتبہ قادریہ نزد دستا ہوٹل گنج بخش روڈ لاہور

☆ مکتبہ برکاتیہ گنج بخش روڈ لاہور

☆ مکتبہ اہلسنت کالج روڈ راولپنڈی

اور ہر اچھے بکسٹال سے خرید فرمائیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْیَاهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَهُمْ لَا یَشْکُرُوْنَ☆

(سورۃ البقرۃ آیت نمبر، ۲۴۳)

﴿۱﴾

اے محبوب! کیا تم نے نہ دیکھا تھا انہیں جو اپنے گھروں سے نکلے اور وہ ہزاروں تھے موت کے ڈر سے تو اللہ نے ان سے فرمایا مرجاؤ پھر انہیں زندہ فرمادیا بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے مگر اکثر لوگ ناشکرے ہیں۔

﴿۲﴾

کیا آپ کو علم نہیں حاصل ہوا ان لوگوں کا جو نکلے اپنے گھروں سے اور وہ ہزاروں تھے موت کے ڈر سے تو فرمایا ان کو اللہ نے مرجاؤ پھر ان کو زندہ کیا، بیشک اللہ فضل کرنے والا ہے لوگوں پر، لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔

مختصر مطلب:

نبی کریم ﷺ کو تعجب دلایا جارہا ہے اور آپ کی امت کو درس عبرت دیا جارہا ہے کہ اے نبی کریم ﷺ اور آپ کی امت کیا تمہیں علم حاصل نہیں؟ یقیناً علم حاصل ہے آپ کو ان لوگوں کا جو اپنے گھروں سے ہزاروں کی تعداد میں نکلے، وہ موت سے ڈر رہے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے ان پر موت کو واقع کردیا، پھر ان کو زندہ کردیا، یہ اللہ تعالیٰ کا ان لوگوں پر فضل تھا، بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں پر فضل فرماتا رہتا ہے، حق تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل کا شکریہ ادا کریں، لیکن اکثر لوگ اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا نہیں کرتے۔

ماقبل سے تعلق:

اللہ تعالیٰ نے پہلے احکام کو بیان فرمایا، اب قصص (واقعات) بیان فرمارہا ہے تاکہ سامعین اس سے عبرت حاصل کریں اور سرکشی اور عناد کو چھوڑ دیں، زیادہ خشوع وخضوع اختیار کریں، اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجالائیں۔ (کبیر)

اللہ تعالیٰ نے پہلے جو احکام بیان فرمائے ان میں وفات کی عدت، اور وفات کی عدت کے دوران زوجہ کو خرچ دینا اور رہنے کا مکان دینا بیان فرمایا، اب یہاں سے عجیب واقعہ کو بیان فرما کر اپنی عظیم قدرت پر متنبہ فرمایا اور یہ واضح کیا کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے تو وہ قیامت میں بھی تمہیں زندہ کرکے تم سے اعمال کا حساب لے گا، لہٰذا قیامت کی تیاری کرلو، اور اپنے اعمال درست کرلو، اور جو حقوق تمہارے ذمہ ہیں ان کو پورا کرو اور مشقت پر صبر کرو۔ (روح المعانی)

اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلی آیت میں ذکر فرمایا۔ " کذلک یبین اللہ لکم آیاته لعلکم تعقلون "

اسی طرح واضح طور پر اللہ تعالیٰ بیان کرتا ہے تمہارے لئے اپنی آیات کو تاکہ تم کامل عقل رکھو۔

" ذکر هذه القصة لانها من عظیم آیاته وبدائع قدرته "

اس کے بعد یہ واقعہ ذکر کرکے اپنی عظیم نشانیوں کو بیان فرمایا اور اپنی عجیب قدرت کا اظہار فرمایا۔ (روح المعانی)

فائدہ: اس واقعہ کو آنے والے حکم "وقاتلوا فی سبیل اللہ" (اور قتال کرو اللہ کی راہ میں) کے لئے تمہید بھی بنایا جس سے مسلمانوں کو جہاد پر شجاعت دلانی مقصود ہے، اور مسلمانوں کو شہادت پر ابھارا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے کا درس دیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے سامنے کوئی تدبیر کارگر نہیں۔ (از روح المعانی)

اس آیۃ کریمہ میں کن لوگوں کا ذکر ہے؟

مفسرین کرام نے تین واقعات کو ذکر کیا ہے، جن میں راقم کا موقف یہ ہے کہ اس آیۃ کریمہ کا تعلق ان تینوں واقعات سے ہے، کیونکہ تمام واقعات نبی کریم ﷺ سے پہلے کے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ سے ان تمام واقعات کی یاد دلا کر اپنی قدرت کا ذکر فرمایا اور مسلمانوں کے لئے اسے درس عبرت بنایا۔

پہلا واقعہ: سدی کی روایت میں ذکر ہے کہ ایک بستی داوردان میں طاعون واقع ہوا، تو وہاں کے کچھ لوگ بستی کو

چھوڑ کر بھاگ گئے اور کچھ لوگ اس بستی میں رہے۔ جو بھاگ گئے وہ طاعون سے بچ گئے، اور جو وہاں ہی رہے ان میں اکثر طاعون میں مبتلا ہو گئے۔ طاعون کے ختم ہو جانے پر بھاگ کر جانے والے جب صحیح وسلامت واپس لوٹ کر آ گئے تو وہاں رہ جانے والے کہنے لگے کہ یہ لوگ تو ہم سے زیادہ عقل والے نکلے ہیں کہ یہ طاعون سے بچ گئے ہیں، اگر ہم بھی بھاگ جاتے تو ہم بھی محفوظ رہتے اور ہمارے مرجانے والے لوگ نہ مرتے۔

اب اگر دوبارہ طاعون واقع ہوا تو ہم بھی بھاگ کر اپنے آپ کو بچا لیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ان کا امتحان لینے کے لئے دوبارہ طاعون واقع ہو گیا، وہ لوگ وہاں سے بھاگ کر اس جگہ چلے گئے جہاں طاعون واقع نہیں تھا۔ یہ بھاگنے والے لوگ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔

جب یہ لوگ اپنے خیال کے مطابق بھاگ کر محفوظ جگہ پر پہنچ گئے تو اللہ تعالیٰ نے دو فرشتے بھیجے، ایک نے وادی کے نیچے کی جانب سے اور دوسرے نے وادی کے اوپر کی جانب سے پکار کر کہا "ان موتو، فھلکوا" مرجاؤ تو وہ مر گئے یہاں تک کے ان کے جسم پرانے ہو گئے یعنی ہڈیاں گل سڑ گئیں۔ وہاں سے اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت حزقیل علیہ السلام گزرے، جب آپ نے ان مرے ہوئے لوگوں کو دیکھا، تو آپ نے کھڑے ہو کر ان کے بارے میں تفکر کیا، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی۔

"اتریدان اریک کیف احییھم؟فقال نعم"

کیا تم چاہتے ہو کہ تمہیں دکھاؤں کہ میں ان کو کیسے زندہ کرتا ہوں، تو وہ اللہ کے نبی کہنے لگے ہاں میرے مولیٰ ان کو میرے سامنے زندہ کرتا کہ میں دیکھوں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو کہا۔

" ناد ایتھاالعظام ان اللہ یأ مرک ان تجتمعی"

تم آواز دو کہ اے ہڈیو! اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ جمع ہو جاؤ۔

بکھری ہوئی ہڈیاں اللہ تعالیٰ کا پیغام سن کر اپنی اپنی ہڈیوں سے مل گئیں، اپنا اپنا ہر ایک شخص کا ڈھانچا مکمل ہو گیا، پھر اللہ کے نبی کو حکم دیا گیا کہ اب تم کہو۔

"یاایتھا العظام ان اللہ یا مرک ان تکتسی لحماودما"

کہ اے ہڈیو! بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ اب اپنے آپ پر گوشت اور خون کو بھی جمع کرلو، اس طرح ان ہڈیوں پر گوشت اور خون جمع ہوگیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو کہا کہ اب تم ان گوشت اور خون والی ہڈیوں کو کہو۔

"ان اللہ یا مرک ان تقومی فقامت" بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ کھڑی ہوجاؤ، وہ حکم سنتے ہی کھڑی ہوگئیں۔ اس طرح وہ لوگ زندہ ہوکر کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے۔

"سبحانک ربنا وبحمدک لا الہ انت" وہ لوگ زندہ ہوکر اپنی بستیوں کی طرف لوٹ کر آئے۔ کچھ مدت تک زندہ رہے، ان کے چہرے کی زردی باقی رہی، پھر وہ زندہ رہے، اپنی اپنی موت کے وقت ان پر موت آئی۔

دوسرا واقعہ: بنی اسرائیل کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ نے اپنے فوجیوں کو جنگ کرنے کا حکم دیا۔ اس کی فوج کے لوگ عیاش تھے، وہ جنگ سے ڈرنے لگے، وہ دشمن کے مقابلہ سے پیچھے ہٹنے کے قائل تھے، آگے بڑھنے کے قائل ہی نہیں تھے، وہ کہنے لگے وہاں تو وباء پھیلی ہوئی ہے۔

"فنحن لا نذھب الیھاحتی یزول ذلک الوباء فاما تھم اللہ باسرھم"

ہم تو وہاں اس وقت تک نہیں جائیں گے یہاں تک کے وہاں سے وباء زائل ہوجائے تو اللہ تعالیٰ نے ان تمام کو ماردیا جو ہزاروں کی تعداد میں تھے۔

آٹھ دن اسی مردہ حالت میں رہے، یہاں تک کہ ان کے جسم سوج گئے اور بدبودار ہوگئے۔ پیچھے گھروں میں رہنے والے بنی اسرائیل کے عوام کو اپنے فوجیوں کے مرنے کے متعلق جب پتہ چلا تو وہ آئے لیکن مرنے والے ہزاروں کی تعداد میں تھے، اس لئے وہ لوگ ان کو دفن تو نہ کرسکے، البتہ ان کے اردگرد کچھ رکاوٹیں کھڑی کردیں کہ درندے ان کے جسموں کا کھا نہ جائیں۔

"فاحیاھم اللہ بعدالثمانیۃ وبقی فیھم شئ ذلک النتن وبقی ذلک فی اولادھم الی ھذاالیوم"

تو اللہ تعالیٰ نے ان کو آٹھ دنوں میں زندہ کردیا، ان کے جسموں میں بو باقی رہی جو آج تک ان کی اولاد کے جسموں میں موجود ہے۔

تیسرا واقعہ: اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت حزقیل علیہ السلام نے اپنی قوم کو جہاد کی طرف بلایا۔ لیکن ان

کی قوم نے جہاد میں جانا ناپسند کیا اور بزدلی دکھائی، تو اللہ تعالیٰ نے ان پر موت کو بھیجنا شروع فرما دیا۔ جب ان میں زیادہ موت واقع ہونے لگی تو وہ موت سے ڈر کر سیانے (عقلمند) بن کر ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھروں کو چھوڑ کر بھاگ گئے کہ وہ موت سے بچ جائیں گے۔ حضرت حزقیل علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ پہلے تو یہ جہاد کے لئے آمادہ نہیں ہوئے، اب اپنے شہروں سے بھاگ کر گویا کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے مقابلہ رہے ہیں تو آپ نے ان الفاظ میں ان کے خلاف دعاء کی۔

"اللهم اله يعقوب واله موسى ترى معصية عبادك فأرهم آية في انفسهم تد لهم على نفاذ قدرتك وانهم لا يخرجون عن قبضتك"

اے اللہ اے حضرت یعقوب علیہ السلام کے معبود اور اے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معبود! تو اپنے بندوں کی نافرمانی کو دیکھ رہا ہے تو ان کو ان کی جانوں میں کوئی ایسی نشانی دکھا کہ انہیں پتہ چل جائے کہ تیری قدرت غالب اور جاری وساری ہے، وہ تیرے قبضہ سے نکل نہیں سکتے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی اس دعاء کو قبول فرمایا "فارسل الله عليهم الموت" تو اللہ تعالیٰ نے ان پر موت کو بھیج دیا، وہ تمام مر گئے۔

لیکن ان کی موت پر حضرت حزقیل علیہ السلام کو پریشانی لاحق ہوگئی، اور ان پر رحم کرتے ہوئے "فدعا مرة اخرى فا حيا هم الله تعالىٰ" ان کے لئے پھر دعاء رحمت کر دی۔ اے رب کائنات ان کو زندہ کر دے، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعاء کو پھر قبول کرتے ہوئے ان کو زندہ کر دیا۔ (ماخوذ از کبیر وخازن وروح المعانی)

علامہ قرطبی رحمہ اللہ کا موقف:

آپ نے بھی مختصر الفاظ میں ان واقعات کو بیان فرمایا، لیکن اس کے بعد اپنا مختار قول یوں بیان فرمایا۔

"وهذه القصص كله لين الا سانيد وانما اللازم من الآية ان الله تعالىٰ اخبر نبيه محمدا ﷺ اخبارا في عبارة التنبيه والتوقيف عن قوم من البشر خرجوا من ديارهم فرارا من الموت فاماتهم الله تعالىٰ ثم احياهم ليروهم وكل من خلف من بعدهم ان الاماتة انما هي بيد

اللہ تعالیٰ لا بید غیرہ،فلا معنی لخوف خائف ولا لاغترار مغتر" (قرطبی)

ان تمام واقعات کی روایت کے اسناد میں نرمی (ضعف) پایا جاتا ہے، آیۃ کریمہ میں مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی امت کو خبر دی جائے کہ اس آیۃ کریمہ میں اس بات پر متنبہ (خبردار) کیا گیا ہے کہ وہ لوگ موت کے ڈر سے بھاگے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر موت کو مسلط کر دیا، وہ مر گئے تو پھر ان کو زندہ کر دیا، تو اے آنے والے لوگو! تم بھی سمجھ لو کہ موت حیات سب اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے، کسی اور کے ہاتھ میں نہیں، لہٰذا نہ ہی کسی کے ڈرانے سے ڈرنا اور نہ ہی کسی دھوکا دینے والے کے دھوکے میں آنا۔

یعنی علامہ قرطبی رحمہ اللہ کا موقف یہ ہے کہ واقعات کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی کسی واقعہ کو معین کرنے کی ضرورت ہے، بلکہ آیۃ کریمہ کے بیان کے مقصد کو دیکھا جائے۔ یہی قول میرے روح جان حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ نے پسند کرتے ہوئے ضیاء القرآن میں ذکر کیا ہے۔

راقم کا موقف:

اس مسئلہ میں راقم کا موقف یہ ہے کہ واقعات اگرچہ ضعیف الاسناد بھی ہوں تو بھی ضروری ہے کہ کچھ لوگوں کا ذکر ہے تو وہ مراد تو ضرور ہیں، اور تینوں واقعات ہی معتبر ہیں اور تینوں ہی اجتماعی طور پر مراد ہیں، اور آیۃ کریمہ کا مقصد بھی ذہن میں ضرور رکھا جائے، صرف واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے مقصد بیان کو ذہنوں سے نہ نکال دیا جائے۔ مقصد درس عبرت ہی ہے۔

"الم ترالی الذین خرجوا من دیارھم":

"کیا آپ کو علم حاصل نہیں ہوا ان لوگوں کا جو نکلے اپنے گھروں سے۔"

" اعلم ان الرؤیۃ قد تجیٔ بمعنی رؤیۃ البصیرۃ والقلب وذلک راجع الی العلم کقولہ وارنا مناسکنا " معناہ " علمنا " وقال " فاحکم بین الناس بما اراک اللہ " ای علمک "

بیشک " رؤیۃ " کا معنی کبھی بصیرت یعنی دل سے دیکھنا، ہوتا ہے۔اور اس کا مطلب علم ہوتا ہے، جیسا کے اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی " وارنا مناسکنا " کا معنی یہ ہے "ہمیں ہماری عبادت کا علم عطا فرما۔

اور رب تعالیٰ نے فرمایا "فاحکم بین الناس بمااراک اللہ" کا معنی یہ ہے " آپ فیصلہ فرمائیں لوگوں کے درمیان اس سے جو اللہ نے آپ کو علم عطاء کیا"۔

رؤیۃ قلبی (دل سے دیکھنا یعنی علم حاصل ہونا) کی پھر دو قسمیں ہیں، کبھی مخاطب کو پہلے علم حاصل نہیں ہوتا بلکہ کلام کا تعلق ابتداء سے ہوتا ہے، جس طرح کوئی شخص دوسرے کو کہے "الم تر الی ماجری علی فلان" کیا تمہیں فلاں شخص کے جاری رہنے والے کام کا علم حاصل نہیں، اس کلام کا مقصد دوسرے کو بتانا ہوتا ہے، جسے پہلے سے علم حاصل نہیں ہوتا۔

رؤیۃ قلبی کی دوسری قسم یہ ہے کے جب کسی کو پہلے سے علم حاصل ہوتا ہے، پھر بات کو پختہ کرنے کے لئے استفہام انکاری کے طور پر یہ کلام کیا جاتا ہے " الم تر " کیا تمہیں علم حاصل نہیں؟ یعنی یقیناً تمہیں علم حاصل ہے۔

دونوں معانی مراد ہو سکتے ہیں:

"فعلی ھذا یجوز ان یکون النبی ﷺ لم یعرف ھذہ القصۃ الا بھذہ الآیۃ"

پہلے معنی کے لحاظ سے اس آیۃ کریمہ یہ احتمال پایا گیا ہے کے نبی کریم ﷺ کو پہلے اس واقعہ کا علم نہ ہو بلکہ اس آیۃ کریمہ کو نازل فرما کر آپ کو علم عطا کیا گیا ہو۔

" ویجوز ان نقول کان العلم بھا سابقا علی نزول ھذہ الآیۃ ثم ان اللہ تعالیٰ انزل ھذہ الآیۃ علی وفق ذلک العلم "

دوسرے معنی کے لحاظ سے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کے نبی کریم ﷺ کو اس آیۃ کریمہ کے نازل ہونے سے پہلے اس واقعہ کا علم حاصل تھا، آپ کے علم کے مطابق آیۃ کریمہ کو نازل کیا گیا۔اب مطلب واضح ہے کے یہ کہا گیا ہے۔کیا آپ کو علم حاصل نہیں؟ یعنی یقیناً آپ کو علم حاصل ہے۔ (از کبیر)

" الم تر " کا خطاب کسے؟

ظاہر تو یہی ہے کے یہ خطاب نبی کریم ﷺ کو کیا گیا، لیکن یہ بھی احتمال ہے کہ یہ خطاب آپ کو بھی ہے اور آپ

کے ساتھ آپ کی امت کو بھی ہو، البتہ ابتداء خطاب کی آپ سے ہو، پھر امت کو خطاب ہو، جیسا کہ "یا ایھا النبی اذا طلقتم النساء" الخ میں خطاب آپ کو بھی ہے اور آپ کی امت کو بھی خطاب کیا گیا ہے۔ (کبیر)

راقم نے یوں سمجھا:

جب اس آیۃ کریمہ میں خطاب نبی کریم ﷺ کو بھی ہے اور آپ کی امت کو بھی، تو اسی سے راقم نے سمجھا کے یوں کہا جائے کے جب نسبت خطاب نبی کریم ﷺ کی طرف ہو تو یوں کہا جائے کیا آپ کو علم حاصل نہیں؟ یقیناً آپ کو تو پہلے سے ہی علم حاصل ہے، اور جب خطاب کی نسبت امت کی طرف ہو تو یہ کہا جائے، کیا تمہیں علم حاصل نہیں؟ ہاں تمہیں اب نبی کریم ﷺ کے واسطے سے علم عطاء کیا جا رہا ہے۔

لفظ "الی" کا مطلب :

"الی" انتہاء کے لئے ہے، جب رویۃ کا معنی علم کیا جائے تو مطلب یہ ہوگا۔

"فمن علم بتعلیم معلم فکأن ذلک المعلم اوصل ذلک المتعلم الی ذلک المعلوم وانهاء الیه"

کہ معلم نے متعلم کو علم عطاء کیا یعنی متعلم تک معلومات پہنچانے میں انتہا کر دی۔ (کبیر)

اب مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ جو معلم حقیقی ہے اس نے اپنے متعلم خاص یعنی نبی کریم ﷺ کو معلومات عطاء کر کے آپ تک علم کی انتہاء کر دی، یعنی آپ کو پہلے ہی علم عطاء فرما دیا تھا، پھر اس آیۃ کریمہ کے ذریعے اس کی مزید وضاحت فرما دی۔

رؤیۃ بمعنی دیکھنا:

ایک اور احتمال یہ ہے کہ "الم تر" کا معنی یہ کیا جائے "کیا آپ نے نہیں دیکھا"۔

"واذا عدی رایت بالی اقتضی معنی النظر المودی الی الاعتبار" (مفردات راغب)

"روية" جب "الی" کے ذریعے متعدی ہو تو دیکھنے والا معنی آتا ہے، جو عبرت حاصل کرنے پر دلالت کرتا ہے۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ تمام کائنات سے پہلے نبی کریم ﷺ کی تخلیق ہوئی اور تمام جہان آپ کے سامنے بنایا گیا، اب یہ کہنا بھی تعجب دلانے اور شوق دلانے کے لئے خوبصورت انداز ہے" کیا آپ نے نہیں دیکھا؟" یقیناً آپ نے دیکھا ہے۔

راقم نے "علم" والا ترجمہ کیا ہے تاکہ طلباء کرام کی نظر تمام مطالب کی طرف ہو۔ اور علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے اس مقام میں" رویة" کا معنی مجازی کہا ہے۔ "والرویة اما بمعنی الا بصار مجازا عن النظر" رویۃ کا معنی دیکھنا یہاں مجازی ہے۔ (روح المعانی)

"وهم الوف": "اور وہ ہزاروں تھے۔"

وہ کتنے ہزار تھے؟ اگرچہ اس میں مختلف اقوال ہیں۔

"والصحیح انهم زادوا علی عشرة آلاف لقوله تعالیٰ (وهم الوف) وهو جمع الکثرة ولا یقال فی عشرة فما دونها الوف" (قرطبی)

لیکن صحیح قول یہی ہے کہ وہ دس ہزار سے زائد تھے، چونکہ "الوف" جمع کثرت ہے جس کا اطلاق دس سے کم پر نہیں ہوتا۔ تاہم تلویح اور حاشیہ عبدالغفور میں یہ بھی آتا ہے کہ جمع کثرت تین سے شروع ہو جاتی ہے اور دس پر رکتی نہیں، اس قانون کے لحاظ سے دوسرے اقوال کو صحیح قرار دیا جا سکتا ہے "واللہ اعلم بالصواب"

"حذر الموت": "موت کے ڈر سے۔"

یعنی ان لوگوں کے گھروں سے نکلنے کا سبب موت کا ڈر تھا، دینی مدارس میں پڑھنے والے طلباء کرام بخوبی یہ مسئلہ جانتے ہیں کہ یہ مفعول لہ ہے، مفعول لہ میں نصب کے آنے کے لئے لام تعلیلیہ کو مقدر مانا جاتا ہے۔ اصل میں "لحذر الموت" تھا۔ (از قرطبی)

"فقال لهم الله موتوا": "تو کہا ان کو اللہ نے مر جاؤ۔"

ان الفاظ مبارکہ کا وہی مطلب ہے جو"انما قولنالشئ اذاار دناہ ان نقول لہ کن فیکون"کا مطلب ہے۔

"یعنی انہ لیس المراد منہ اثبات قول بل المراد انہ تعالٰی متی اراد ذلک وقع من غیر منع و تأخیر"

رب تعالیٰ کو کہنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی، بلکہ جب وہ کسی چیز کے واقع ہونے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ چیز بغیر کسی رکاوٹ کے اور بغیر کسی تاخیر کے واقع ہو جاتی ہے۔

اب مطلب یہ ہو گیا کہ رب تعالیٰ نے ان کی موت کا ارادہ ہی فرمایا تو وہ مر گئے، اسی طرح "انماقولنا لشئ الــخ" کا ترجمہ بھی یوں کیا جاسکتا ہے "بیشک ہمارا ارادہ کسی چیز کا، جب ہم اس کا ارادہ کر لیتے ہیں تو ہمارے ارادۂ کن سے ہی وہ چیز واقع ہو جاتی ہے"یعنی قول بمعنی ارادہ واقع ہو۔

دوسرا احتمال یہ ہے کے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعے کہلایا ہو کے "تم مر جاؤ" تو وہ مر گئے ہوں۔(از کبیر)

لیکن یہ بھی خیال میں رہے کے کبیر میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے "والقول الأول اقرب الی التحقیق" پہلا معنی ہی بہتر ہے کیونکہ وہ تحقیق کے زیادہ قریب ہے۔

"ثم احیا ھم": "پھر ان کو زندہ کیا۔"

یہاں سے دو مسئلے حاصل ہو گئے، ایک یہ کے جب ان کے مرنے کا ارادہ کیا یا ان کو کہا کہ مر جاؤ تو وہ مر گئے، کیونکہ زندہ کرنے کا یہی مطلب ہے کے وہ مر گئے تھے تو ان کو زندہ کیا۔ دوسرا مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ ان کی موت کے بعد کچھ دیر بعد انہیں زندہ کیا گیا، یہ مسئلہ "ثم" سے سمجھ آیا کیونکہ "ثم" تراخی کے لئے آتا ہے، پہلے یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ ان کو موت کے آٹھ دن بعد زندہ کیا گیا۔

مسئلہ: اللہ تعالیٰ جو صادق ذات ہے جب اس نے خبر دی کہ ان کو موت کے بعد زندہ کیا تو اس پر یقین رکھنا اور ایمان لانا ضروری ہو گیا، اور اس پر ایمان رکھنا بھی واجب ہے کہ بکھرے ہوئے اجزاء کو اپنے ہی اجزاء سے ملا دینا ممکن ہے اور پہلی صورت پر واپس لوٹانا ممکن ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو وہی لوگ اپنی اپنی صورتوں اور اپنے اپنے اجزاء یعنی ہڈیوں، گوشت اور

خون سے زندہ نہ ہوتے بلکہ خلط ملط (گڈمڈ) ہوتے، حالانکہ وہ حقیقی طور پر اپنی اصلی حالت میں زندہ ہوئے۔

معتزلہ کہتے ہیں یہ کام خرق عادت (عادت کے خلاف) ہے، خرق عادت کام صرف نبی سے بطور معجزہ سرزد ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت کرنا درست نہیں۔

اہل سنت و جماعت کہتے ہیں کہ خرق عادت کام کو صرف نبی کے معجزہ میں بند کر غلط ہے۔ خرق عادت کام ولی سے بطور کرامت بھی سرزد ہوتا ہے۔ اور جو کام لوگوں کی عادت کے خلاف ہو رب تعالیٰ کے ''ارادۂ کن'' سے واقع ہونا اس کی قدرت عظیمہ ہے، لہٰذا رب تعالیٰ کی طرف موت کے بعد زندہ کرنے کی نسبت کو محال کہنا ہی درحقیقت محال ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

مسئلہ عجیبہ: ان لوگوں پر جو موت واقع ہوئی اس میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ ان پر موت اچانک واقع ہوئی ہو، ان کو موت کی شدت اور ہولناکی کا علم حاصل نہ ہوا، جس طرح سوتے ہوئے کسی کو نیند آ جائے۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ انہوں نے ہولناکیوں اور شدتوں کا مشاہدہ کر لیا، پھر ان پر موت واقع ہوئی ہو اور پھر ان کو زندہ کر لیا ہو۔

''وان عاينوا الاهوال والاحوال التی معها صارت معارفهم ضرورية''

اگر انہوں نے ہولناکیوں اور احوال کی شدت کا مشاہدہ کر لیا تھا تو ان کی معرفت ان لوگوں پر ضروری اور بدیہی درجہ میں آ گئی۔

یہ بات بھی واضح ہے کہ زندہ ہونے کے بعد پھر زندگی بھر ان کو وہ حالات بھولے نہیں ہوں گے۔ ساری زندگی ان کے سامنے وہ ضروری اور بدیہی درجہ میں رہے ہوں۔ اور یہ بھی واضح قانون ہے۔

''وبقاء تلك المعارف الضرورية يمنع من صحة التكليف كما انه لا يبقى التكليف في الآخرة ، واما ان يقال انهم بقوا بعد الاحياء غير مكلفين وليس في الآية مايمنع منه''

جب ان کو ضروری اور بدیہی معرفت حاصل ہونے کا قول کیا جائے تو یہ ماننا بھی لازم ہوگا کہ زندگی کے بعد احکام شرائع کے مکلف نہیں رہے تھے، کیونکہ معرفت بدیہیہ پر تکلیف مرتب نہیں ہو سکتی جس طرح آخرت میں کوئی شخص احکام شرعیہ کا مکلف نہیں ہوگا صراحۃً نہ ذکر کیا گیا اور نہ ہی اس سے منع کیا گیا ہے۔ اور اگر یہ احتمال ہو کہ ان پر اچانک موت واقع ہو گئی تھی جیسے سوتے ہوئے موت واقع ہو جائے تو ان کو موت کی ہولناکی اور شدت کا بدیہی علم حاصل نہیں ہوا ہوگا، بلکہ انہیں پھر جب موت آئے گی تو ان چیزوں کا سامنا کرنے پڑے گا۔ اس احتمال پر وہ زندہ

رہنے کے بعد بھی احکام شرعیہ کے مکلف رہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے فرمایا دونوں احتمال عقل تسلیم کرتی ہیں۔ " واللہ اعلم بحقائق الامور" حقیقی امور اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ (کبیر)

تاہم راقم کا خیال یہ ہے کہ ان کو مارا ہی غلطی پر متنبہ کرنے کے لئے تھا، اس لئے ان پر موت اچانک واقع ہوئی ہوگی اور وہ زندہ رہنے کے بعد مکلّف رہے ہوں گے۔" واللہ اعلم بالصواب"

"ان اللہ لذوفضل علی الناس": "بیشک اللہ فضل والا ہے لوگوں پر۔"

یعنی اللہ تعالیٰ کا تمام لوگوں پر فضل ہے، اس حکم کو مطلق بھی رکھا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کو ان گنت نعمتوں سے نوازا ہے۔ اور اس خاص واقع سے بھی متعلق ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو موت کے بعد زندہ کرکے ان پر خاص فضل فرمایا کیونکہ اگر وہ اسی طرح مرے رہتے تو ان کی موت تو معصیت پر آئی تھی کیونکہ وہ اپنی عقلوں کے مطابق اپنے آپ کو موت سے بچانا چاہتے تھے گویا کہ وہ سمجھتے تھے کہ ہم قدرت باری تعالیٰ سے مقابلہ کر سکتے ہیں یہ عظیم معصیت تھی، ان کو زندہ کرکے توبہ کی توفیق عطاء کردی، یہ ان پر فضل تھا۔ اور دوسرے لوگوں کو ان کے اس واقعہ سے درس عبرت عطاء کرکے ان پر فضل فرمادیا۔ (از روح المعانی و کبیر)

عرب لوگ قیامت کا انکار کرتے تھے، درحقیقت وہ یہود کے اقوال سے دلیل پکڑتے تھے، جب اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ سے یہود کو متنبہ کیا، جو پہلے ہی اس واقعہ کا علم رکھتے تھے، جب یہود نے اس واقعہ کی تصدیق کرتے ہوئے عرب لوگوں کو بتایا تو وہ قیامت کے انکار کو چھوڑ کر قیامت پر ایمان لے آئے، اس طرح انہوں نے اپنے آپ کو عذاب سے بچالیا اور ثواب کے مستحق ہوگئے۔

" فکان ذکر هذه القصة فضلا من الله تعالٰی واحسانافی حق هؤلاء المنکرین"

اس واقعہ کا ذکر منکرین قیامت کے لئے رب تعالیٰ کی طرف بہت بڑا فضل واحسان تھا کہ ان کو توبہ کی توفیق مل گئی وہ قیامت پر ایمان لے آئے۔

اس واقعہ سے یہ پتہ چلا کہ موت سے بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں، اس واقعہ سے انسان کو اللہ تعالیٰ کی طاعت پر قائم رہنے کی شجاعت دلائی گئی اور ان کے دلوں سے موت کے ڈر کو زائل کیا گیا۔ اس واقعہ کے ذکر سے گویا کہ انسان کو معصیت سے دور کیا گیا اور طاعت کے قریب کیا گیا جو ثواب عظیم کا سبب ہے، اس سے یہ واضح ہوا کہ......

" فکان ذکر هذه القصة فضلا واحسانا من الله تعالیٰ علی عبده"

اس واقعہ کا ذکر اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر فضل واحسان ہے۔ (کبیر)

"ولکن اکثر الناس لا یشکرون": لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔

یعنی جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے وہ اس کا شکر نہیں کرتے، کافر لوگ تو مطلقاً شکر نہیں کرتے اور مومن لوگ کامل شکر نہیں کرتے جیسا شکر کرنے کا حق ہے۔ (خازن)

حضرت حزقیل علیہ السلام:

بنی اسرائیل کے موسیٰ علیہ السلام کے بعد تیسرے خلیفہ تھے، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت یوشع بن نون آئے، ان کے بعد کالب بن یوقنا خلیفہ بنے اور ان کے بعد حضرت حزقیل علیہ السلام آئے۔

حضرت حزقیل علیہ السلام کی کنیت:

آپ کی کنیت "ابن العجوز" تھی عجوز بڑھیا عورت کو کہا جاتا ہے۔ آپ کی یہ کنیت رکھنے کی وجہ یہ تھی۔

"لان امه کانت عجوزا فسالت الله تعالیٰ الولد بعدما کبرت وعقمت فوهب الله لها حزقیل"

کہ آپ کی والدہ بڑھاپے کی عمر میں تھیں تو اللہ تعالیٰ سے انہوں نے اولاد کا سوال کیا حالانکہ وہ عمر بانجھ ہونے کی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی دعاء کو قبول فرمایا اور ان کو بیٹا حزقیل عطاء کر دیا۔

اسی وجہ سے ان کی کنیت " ابن العجوز " (بڑھیا کا بیٹا) ہوگئی۔

حضرت حزقیل علیہ السلام کا لقب:

آپ کا لقب ذوالکفل تھا۔" ویقال لہ ذو الکفل سمی بہ لأنہ تکفل سبعین نبیاء انجا ھم من القتل "ان کو ذوالکفل کہا جاتا تھا کیونکہ انہوں نے ستر نبیوں کی کفالت کی اور ان کو قتل سے بچایا۔ (ماخوذ از خازن)

یہ بھی واضح ہے کہ ایک ایک وقت کئی کئی نبی رہے جو مختلف خطوں میں مقرر رہے، اس لئے ستر نبیوں کی کفالت پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہئے۔

تنبیہ: قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک نبی ذوالکفل کا صراحۃً ذکر کیا ہے، لیکن وہ اور نبی ہیں، اس سے مراد حضرت حزقیل علیہ السلام نہیں، کیونکہ آپ نام سے زیادہ مشہور تھے، لقب سے زیادہ مشہور نہیں تھے، مشہور حضرت ذوالکفل علیہ السلام کا ذکر ان شاء اللہ آگے آئے گا۔ راقم کی کتاب تذکرۃ الانبیاء کو دیکھیں۔

طاعون کیا ہے؟

طاعون ایک بیماری کا نام ہے جس کی وجہ سے جسم میں آبلے (چھالے، پھنسیاں) بن جاتے ہیں، وہ آبلے اگر چہ سارے جسم میں ہوتے ہیں لیکن کہنیوں کے اندرونی حصہ میں اور بغلوں میں اور ہاتھوں اور انگلیوں پر زیادہ ہوتے ہیں، ان کے ساتھ ورم ہو جاتا ہے (سوجن ہو جاتی ہے) اور بڑا شدید درد ہوتا ہے، اور ان میں شدید جلن ہوتی ہے، ان آبلوں کا اردگرد سیاہ، سرخ، سبز اور مٹیالا ہو جاتا ہے، دل میں خفقان پیدا ہو جاتا ہے۔

طاعون کا حکم کیا ہے؟

(۱) جس مقام میں طاعون ہو وہاں سے موت کے ڈر کی وجہ سے بھاگے نہیں۔

(۲) جب یہ پتہ چلے کہ فلاں جگہ طاعون کی مرض پھیلی ہوئی ہے وہاں نہ جائے۔

(۳) جس جگہ طاعون واقعہ ہو وہاں سے بھاگنے کی غرض سے نہیں، بلکہ اس عقیدہ سے کہ موت تو ہر جگہ پر آنی ہی آنی ہے، موت کا وقت اور جگہ مقرر ہے، میرے یہاں سے نکلنے کی وجہ سے موت ٹل نہیں سکتی، البتہ میں یہاں سے آب و ہوا بدل لینے کی غرض سے نکل جاؤں تو بہتر ہے، اس عقیدہ سے وہاں سے نکل جانا جائز ہے۔

(۴) اللہ تعالیٰ پر توکل رکھتے ہوئے مقام طاعون میں ہی رہے اور موت واقعہ ہو جائے تو اسے درجہ شہادت حاصل

ہوگا۔ان تمام مسائل پر احادیث ودلائل کو دیکھیں۔

☆ "عن سعدبن ابی وقاص انه سمعه یسأل اسامة بن زید ماذا سمعت من رسول الله ﷺ فی الطاعون فقال اسامة قال رسول الله ﷺ الطاعون رجز ارسل علی بنی اسرائیل او علی من قبلکم فاذااسمعتم به بارض فلا تقدموا علیه واذاوقع بارض وانتم بها فلا تخرجوا افرارامنه وقال ابو النضر لایخرجکم الا فرار منه" (مسلم، ج۲،باب الطاعون)

حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے سنا ایک شخص حضرت اسامہ سے سوال کر رہے تھے کہ تم نے رسول اللہ ﷺ سے طاعون کے متعلق کیا سنا ؟ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا طاعون عذاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر بھیجا یا تم سے پہلے لوگوں پر بھیجا (راوی کو شک تھا) جب تم سنو کہ فلاں زمین میں طاعون ہے تو وہاں تم نہ جاؤ، جب تم کسی زمین پر ہو تو وہاں طاعون واقع ہو جائے تو وہاں سے بھاگ کر نہ نکلو، ابو النضر نے (راوی نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے) کہا کہ تمہیں وہاں سے نہ نکالے سوائے بھاگنے کے۔

"قال العلماء هذاالوباء قدیرسله الله نعمة وعقوبة علی من یشأء من العصاة من عبید وکفر تهم وقد یرسله شهادة ورحمة للصالحین" (قرطبی)

نافرمان اور کافر لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ طاعون کو بطور عذاب بھیجتا ہے۔لیکن وہی طاعون اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کے لئے رحمت ہوتا ہے۔

☆ "قال رسول الله ﷺ الطاعون شهادة والمطعون شهید"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا طاعون شہادت ہے۔اور جو شخص طاعون کی وجہ سے فوت ہو جائے وہ شہید ہے،لیکن یہ مرتبہ اس شخص کو حاصل ہوگا۔

"قوله والمطعون شهید ای الصابر علیه المحتسب اجره علی الله العالم انه لن یصیبه الاما کتب الله علیه"

جس نے طاعون کی مرض پر صبر کیا،اللہ تعالیٰ اسے اجر عطاء فرماتا ہے،وہی مرتبہ شہادت حاصل کرتا ہے جسے

یقین حاصل ہوتا ہے کہ ہرگز کوئی مصیبت نہیں آسکتی اور نہ ہی موت واقع ہوسکتی سوائے اس وقت کے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے مقرر فرمایا ہے۔

" ولذلک تمنی معاذ ان یموت فیه لعلمه ان من مات فهو شهید"

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو جب معلوم تھا کہ طاعون کی وجہ سے واقع ہونے والی موت شہادت کا درجہ رکھتی ہے تو آپ نے طاعون میں موت کی تمنا فرمائی۔

"وامامن جزع من الطاعون وکرهه وفرمنه فلیس بداخل فی معنی الحدیث" واللہ اعلم"

جو آدمی طاعون کی وجہ سے جزع وفزع کرے، صبر نہ کرے اور بیماری کو ناپسند کرے۔ اور وہاں سے بھاگ کر اپنے آپ کو موت سے بچانے کی کوشش کرے وہ حدیث پاک میں بیان کی ہوئی فضیلت کو حاصل نہیں کرسکتا۔ (اقرطبی)

موت سے بھاگنا نفع مند نہیں:

کوئی شخص یہ خیال کرے کہ وہ بھاگ کر اپنے آپ کو موت سے بچالے گا، تو اس کا یہ خیال باطل ہے ارشادات باری تعالیٰ کے مخالف ہے، رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

"قل لن ینفعکم الفرار ان فررتم من الموت او القتل"

اے محبوب! آپ فرمادیں ہرگز تمہیں نفع نہیں دے گا بھاگنا، اگر تم موت یا قتل سے بھاگے۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔" قل ان الموت الذی تفرون منه فانه ملا قیکم "

اے محبوب! فرمادو بیشک موت جس سے تم بھاگ رہے ہو وہ یقیناً تمہیں ملنی ہے۔ رب قدوس کا اور ارشاد یہ ہے۔" اینماتکونوایدرککم الموت ولوکنتم فی بروج مشیده "

تم جہاں کہیں ہو موت تمہیں پالے گی اگرچہ تم مضبوط قلعوں میں ہو۔

اور رب تعالیٰ کا ارشاد ہے" فاذا جاء اجلهم لا یستاخرون ساعة ولا یستقدمون"

توجب ان کی اجل آ گئی تو ایک گھڑی بھی اس سے تاخیر نہیں ہوگی اور نہ ہی تقدیم ۔

نتیجہ واضح ہوا "الفرار من قدر اللہ عزوجل لامحیص لأحدعنه" بھاگنے سے اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے چھٹکارا حاصل نہیں ہوسکتا۔ یہی حکم تمام وبائی امراض کا ہے، کوئی مرض ذاتی طور پر متعدی (ایک سے دوسرے کی طرف تجاوز کرنے والی) نہیں، ہاں اللہ تعالیٰ جسے چاہے مریض کردے جسے چاہے نہ مریض کرے۔

کسی علاقہ میں وبائی مرض کسی قسم کی واقع ہوتو وہاں سے بھاگے نہیں، اور پتہ چل جائے تو وہاں جائے نہیں، بھاگنے کا ارادہ نہ ہو، عقیدہ درست ہوتو وہاں سے نکل سکتا ہے۔

☆ "عن جابر بن عبد الله قال قال رسول الله ﷺ الفرار من الطاعون كالفرار من الزحف والصابر فيه كالصابر فی الزحف"

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں طاعون سے بھاگنا ایسے ہی ہے جیسے جہاد سے بھاگنا ہے، (جنگ سے بھاگنا گناہ کبیرہ ہے، اللہ تعالیٰ اس پر شدید ناراض ہوتا ہے) اور طاعون میں صبر کرنے والا ایسے ہی ہے جیسے کہ جہاد میں صبر کرنے والا ہے، (کیونکہ جہاد میں ثابت قدم رہنا صبر سے کام اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کا سبب ہے اور عظیم مرتبہ حاصل ہونے کا ذریعہ ہے) (ماخوذ از احکام القرآن للجصاص)

مقام طاعون سے ارادۂ فرار کے بغیر نکلنا جائز ہے:

چونکہ حدیث شریف میں جس نکلنے سے منع کیا گیا اس میں "فرارا عنه" کی قید ہے کہ بھاگنے کے ارادہ سے وہاں سے نہ نکلے، اور حدیث شریف کے راویوں میں سے ابوالنضر کی وضاحت بھی اسی پر دلالت کررہی ہے "لایخرجکم الا فرارا منه" یعنی جس سے نکلنے کی ممانعت ہے اس سے وہ نکلنا مراد ہے جو صرف بھاگنے کے ارادہ سے ہو۔

"قوله عليه السلام" اذاوقع الوباء بأرض وانتم بهافلا تخرجوا فرارا منه" دليل على انه يجوز الخروج من بلدة الطاعون على غيرسبيل الفرار منه اذااعتقدان ما اصابه لم يكن ليخطئه"

''نبی کریم ﷺ کا ارشاد کہ جس زمین میں وبائی مرض ہو وہاں سے تم بھاگ کر نہ نکلو'' دلیل ہے اس پر کے طاعون والے شہر سے بغیر بھاگنے کے ارادے سے نکلنا جائز ہے، جبکہ عقیدہ یہ ہو کہ جو مصیبت اسے پہنچنی ہے وہ ٹل نہیں سکتی وہ ضرور پہنچ کر رہے گی۔اسی سے ایک اور مسئلہ حل ہو گیا۔

"وکذلک حکم الداخل اذاایقن ان دخولها لا یجلب الیه قدرا لم یکن الله قدره له، فمباح له الدخول الیه"

ایک جگہ پر طاعون یا کوئی اور وبائی مرض واقع ہو تو ایک شخص وہاں اس پختہ ایمان و یقین سے چلا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اگر میری تقدیر میں وہ مرض میرے لئے مقدر نہیں کی تو میں وہاں چلا گیا تو پھر بھی مجھے وہ مرض کبھی بھی لاحق نہیں ہو سکتی، تو اس صاف وشفاف عقیدہ سے وہاں اس کا جانا جائز ہے

یعنی ان مسائل کی دارومدار اور جائز ہونے یا ناجائز ہونے کا تعلق عقیدہ سے ہے، درست عقیدہ سے مقام طاعون میں جانا بھی جائز ہے اور وہاں سے نکلنا بھی جائز، اور اگر عقیدہ درست نہ ہوا تو وہاں جانا اور وہاں سے نکلنا ناجائز ہوں گے۔ (ماخوذ از قرطبی)

طاعون عمواس اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

شام کے ایک علاقہ میں ایک بستی عمواس میں طاعون واقع تھا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آپ کے ساتھ ایک قافلہ بھی ادھر ہی جا رہا تھا، آپ کو جب طاعون کی خبر دی گئی تو آپ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا، پھر ایک حدیث پاک سے دلیل پکڑتے ہوئے آپ نے واپس ہونے کو ترجیح دی، اس مکمل واقعہ کو مندرجہ ذیل حدیث پاک میں دیکھیں۔

☆ عن عبد الله بن عباس ان عمر بن الخطاب خرج الی الشام حتی اذا کان بسرغ لقیه اهل الاجناد ابو عبیدة بن الجراح واصحابه فاخبروه ان الوباء قد وقع بالشام قال ابن عباس فقال عمر ادع لی المهاجرین الاولین فدعوتهم فاستشار واخبرهم ان الوباء وقع بالشام فاختلفوا فقال بعضهم قد خرجت لامر ولا نری ان ترجع عنه' وقال بعضهم معک بقیة الناس واصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم ولا نری ان

تقدمهم علی ھذاالوباء 'قال ارتفعوا عنی 'ثم قال ادع لی الانصار فدعوتھم له فاستشارھم فسلکوا سبیل المھاجرین واختلفوا کاختلافھم 'فقال ارتفعوا عنی ' ثم قال ادع من کان ھھنا من مشیخة قریش من مھاجرة الفتح فدعوتھم فلم یختلف علیه رجلان فقالوا نری ان ترجع بالناس ولا تقدمھم علی ھذا الوباء 'فنادی عمر فی الناس انی مصبح علی ظھر 'فاصبحوا علیه "فقال ابو عبیده بن الجراح افرارا من قدر الله" فقال عمر لو غیرک قالھا یا ابا عبیدة 'وکان عمر یکرہ خلافه 'نعم نفر من قدر الله الی قدر الله ارأیت لو کانت لک ابل فھبطت وادیا له عدوتان احداھما خَصِیبة والاخری جدبة الیس ان رعیت الخصبة رعیتھا بقدر الله وان رعیت الجدبة رعیتھا بقدر الله 'قال جاء عبدالرحمن بن عوف وکان متغیبا فی بعض حاجته فقال ان عندی من ھذا علما سمعت رسول الله ﷺ یقول اذا سمعتم به بارض فلا تقدموا علیه واذا وقع بارض وانتم بھا فلا تخرجوا فرارا منه قال فحمد الله عمر بن الخطاب ثم انصرف" (مسلم ج ۲ باب الطاعون)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ شام (کے علاقہ عمواس) کی طرف نکلے، جب مقام سرغ پر پہنچے تو آپ کو اہل اجناد (شام وفلسطین وغیرہ کی طرف سے آنے والے) ابوعبیدہ بن جراح اوران کے ساتھی ملے، انہوں نے خبر دی کہ بیشک شام کے علاقہ میں وباء پھیلی ہوئی ہے (یعنی طاعون کی مرض میں لوگ مبتلا ہیں) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میرے پاس اولین مہاجرین کو بلایا جائے، تو میں نے ان کو بلایا، (وہ آگئے) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے مشورہ کیا اوران کو خبر دی شام کے علاقہ میں طاعون کی بیماری پھیلی ہوئی ہے، مہاجرین نے اپنی اپنی رائے دینے میں اختلاف کیا، بعض نے کہا آپ ایک کام (نیک مقصد جہاد) کے لئے نکلے ہیں، ہم یہ رائے نہیں دیتے کہ آپ اس سے لوٹ جائیں (بلکہ اپنے کام کو پورا کرنے کے لئے وہاں ضرور جائیں) اور کچھ حضرات نے کہا کہ آپ کے پاس باقی لوگ ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام آپ کے ساتھ ہیں (یعنی رسول کریم ﷺ کے پیچھے رہنے والے آپ کی یادگار لوگ اور آپ کی

نشانی کے طور پر رہنے والے لوگ آپ کے ساتھ ہیں) ہم یہ رائے نہیں دیتے کہ آپ اس وباء والے علاقے میں جائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان اولین مہاجرین کو فرمایا، آپ تشریف لے جائیں (اختلاف کی وجہ سے آپ نے ان میں سے کسی کی رائے پر کوئی فیصلہ نہ فرمایا)

پھر آپ نے فرمایا میرے پاس انصار حضرات کو بلایا جائے، حضرت ابن عباس ان کو بلا کر لے آئے، آپ نے ان سے مشورہ کیا، وہ بھی مہاجرین کے راستہ پر چلے اور ان کی طرح ان کا بھی اختلاف ہوا، آپ نے ان کو بھی فرمایا کہ تشریف لے جاؤ، پھر آپ نے فرمایا میرے پاس فتح مکہ کے وقت ہجرت کرنے والے بزرگ حضرات یعنی بڑی عمر کے مشائخ کو بلایا جائے، حضرت ابن عباس ان کو بلا کر لے آئے، (ان سے آپ نے مشورہ کیا) تو ان میں سے دو شخصوں نے بھی آپس میں کوئی اختلاف نہ کیا (یعنی اجتماعی اور اتفاقی رائے یہ دی) انہوں نے کہا ہماری رائے یہ ہے کہ آپ یہاں سے لوٹ جائیں طاعون والے علاقہ میں نہ جائیں۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ (مشائخ کی رائے کے بعد) اعلان فرما دیا میں صبح واپس جا رہا ہوں، تم بھی واپس لوٹ جاؤ، حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کیا اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے بھاگ رہے ہو؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اے ابوعبیدہ کاش کہ تمہارے بغیر کوئی اور یہ بات کرتا، یعنی آپ نے کہا (ایک جلیل القدر صحابی) ان کے اختلاف کو پسند نہیں فرمایا، پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا، ہاں، ہم اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے اللہ تعالیٰ کی تقدیر کی طرف بھاگ رہے ہیں، کیا تم دیکھتے نہیں اگر تمہارے اونٹ ہوں اور تم ان کو ایک وادی میں لے جاؤ جس کی ایک طرف سرسبز و شاداب ہو اور دوسری طرف خشک ہو، تو کیا ایسا نہیں کہ اگر تم سرسبز و شاداب طرف اپنے اونٹوں کو چراؤ تو تم نے اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے مطابق چرایا، اور اگر تم خشک طرف چراؤ تو تم نے اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے مطابق چرایا؟

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں اتنی دیر میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف آ گئے جو اپنی حاجت کی وجہ سے کہیں گئے ہوئے تھے، وہاں موجود نہ تھے، انہوں نے کہا میرے پاس اس مسئلہ میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے عطاء کیا ہوا علم موجود ہے، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرما رہے تھے کہ جب تم کسی علاقہ کے متعلق سنو کہ وہاں وباء ہے تو وہاں نہ جاؤ، اور اگر تم کسی جگہ موجود ہو وہاں وباء آ جائے تو تم وہاں سے نکلو نہیں، حضرت ابن عباس کہتے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (فرمان نبوی کو سن کر) اللہ تعالیٰ کی حمد کی، یعنی صحیح فیصلہ کرنے کی توفیق حاصل ہونے پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالایا۔

مختصر وضاحت حدیث:

☆ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مہاجرین انصار اور فتح مکہ کے بزرگوں سے مشورہ لینا اس وجہ سے تھا کہ ان کو ابھی تک اس مسئلہ میں حدیث نہیں پہنچی ہوئی تھی، اس لئے آپ صحابہ کرام کے مشورہ سے فیصلہ کرنا چاہتے تھے۔

☆ اور یہ مسئلہ سمجھ آیا کہ کسی مسئلہ میں اجتہاد کی صورت میں اختلاف رائے سنت صحابہ کرام ہے۔

☆ اتفاق حاصل ہونے پر کوئی فیصلہ کرنا مستحسن ہے۔

☆ حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے خلیفہ وقت امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے اپنی رائے کا اختلاف ذکر کر کے واضح کر دیا کہ دینی مسائل میں اختلاف رائے حاکم کے سامنے کرنا جائز ہے۔

☆ اور حاکم اسے برداشت کرے، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے برداشت کیا، صرف اظہار تمنا تھا کہ کاش اس مسئلہ میں ایک جلیل القدر صحابی کا اختلاف نہ ہوتا۔

☆ اجتہاد کرنا سنت صحابہ ہے، اجتہاد میں خطاء بھی ہو سکتی ہے، اختلاف برائے اختلاف نہ ہو بلکہ تحقیق کا اختلاف رحمت ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر توکل اور اسے تسلیم کرنا بھی ضروری ہے اور ظاہری اسباب کا سہارا لینا بھی درست ہے، جیسا کہ چوروں سے مال کی حفاظت کے لئے چوکیدار یا مکان کو تالہ لگانا توکل کے خلاف نہیں۔ عقیدہ یہ ہو کہ ہونا وہی ہے جو منظورِ خدا ہوگا۔

☆☆☆☆☆

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ☆

﴿۱﴾ اور لڑو اللہ کی راہ میں اور جان لو کہ اللہ سنتا جانتا ہے۔

﴿۲﴾ اور لڑائی کرو اللہ کی راہ میں، اور جان لو اللہ بیشک سننے والا ہے۔

یہ خطاب کسے ہے؟

یہ خطاب ان لوگوں کو بھی کیا گیا تھا جن کا پہلے ذکر کیا گیا کہ وہ جہاد سے منہ موڑ گئے اور کہنے لگے کہ ہم تو وہاں نہیں جائیں گے کیونکہ وہاں طاعون کی بیماری ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو مار دیا، پھر زندہ کر دیا، زندہ کرنے کے بعد ان کو کہا گیا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرو، تم تو موت سے بھاگ رہے تھے، اب تمہیں پتہ چل چکا ہے کہ کوئی شخص موت سے بھاگ نہیں سکتا، موت وحیات رب تعالیٰ کے قبضہ وقدرت میں ہے۔ یہاں ان سے جو ارشاد فرمایا تھا اسی کی حکایت بیان کی گئی، گویا کہ اصل ارشاد گرامی یوں ہے۔ ”وقیل لهم قاتلوا“ (اور ان کو کہا گیا قتال کرو)

اور یہ خطاب نبی کریم ﷺ کی امت کو بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے لطف وکرم سے جہاد کا حکم دینے سے پہلے اس قوم کا ذکر کیا جن پر موت واقع کر کے پھر ان کو زندہ کیا۔

”لئلا ینکص عن امر اللہ بحب الحیاۃ بسبب خوف الموت، ولیعلم کل احدانہ یترک القتال لایثق با لسلامۃ من الموت“

تاکہ اللہ تعالیٰ کے جہاد کے حکم سے یہ لوگ زندگی سے محبت کر کے موت کے خوف کے سبب سے منہ نہ موڑیں، تاکہ ہر ایک معلوم ہو جائے کہ جہاد چھوڑنے سے موت سے بچنا ممکن نہیں۔

جہاد کا حکم دے کر اور جہاد پر برانگیختہ کر کے دو بھلائیوں میں سے ایک کا وعدہ فرما دیا۔

” امافی العاجل الظهور علی العدو وفی الآجل الفوز بالخلود فی النعیم، والوصول الی ماتشتھی الا نفس وتلذ الاعین “

یا تو وہ بھلائی جلدی ہی دشمن پر کامیابی کی صورت میں حاصل کرلو گے، یا کچھ دیر بعد جنت میں ہمیشہ

رہنے کی بڑی کامیابی حاصل کرلو گے، اور وہ نعمتیں عطاء ہوں گی جن کی تمہارے نفوس خواہش کریں گے۔ اور تمہاری آنکھوں کو ٹھنڈک حاصل ہوگی۔ (از کبیر)

اللہ کی راہ سے مراد:

"ای لاعلاء دینه لا لغنیمة ولالا ظهار شجاعته ونحو ذلک" (جلالین وصاوی)

اللہ کے دین کی بلندی کی غرض سے جہاد کرنا اللہ کی راہ ہے، اگر وہ جہاد مال غنیمت حاصل کرنے کے لئے یا اپنی شجاعت و بہادری دکھانے کے لئے یا کوئی اور دنیاوی مقاصد حاصل کرنے کے لئے کرتا ہے تو وہ اللہ کی راہ نہیں بلکہ وہ حقیقت میں شیطانی راہ ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بھی یہی بیان کیا کہ جہاد میں مقصد دین کی بلندی ہو، اس کے بعد آپ نے ذکر فرمایا۔

"سبیل اللہ کثیرة فهی عامةفی کل سبیل" اللہ تعالیٰ کے راستے کثیر ہیں، جو ایک ایک راستے میں کئی کئی راستے ہیں۔

اس کی مزید وضاحت کبیر کے ان الفاظ میں دیکھئے۔

"وسمیت العبادات سبیلاالی اللہ تعالیٰ من حیث ان الانسان یسلکها ویتو صل الی اللہ تعالی بها،ومعلوم ان الجهاد تقویة الدین فکان طاعة فلا جرم کان المجاهدمقاتلا فی سبیل اللہ "

تمام عبادات اللہ تعالیٰ کے راستے ہیں، کیونکہ انسان ان راستوں پر چلتا ہے اور ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ تک پہنچتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتا ہے، یعنی کسی عبادت سے کفار منع کریں تو ان کے خلاف جہاد کیا جائے، کیونکہ جہاد سے دین کو تقویت حاصل ہوتی ہے، اسی سے یقینی طور پر واضح ہوگیا کہ مجاہد اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑائی کرتا ہے، اس کا حکم اس آیت کریمہ میں دیا گیا ہے۔

"واعلموا ان اللّٰہ سمیع علیم":

"اور جان لو بیشک اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔"

ان الفاظ مبارکہ میں وعید بھی ہے اور وعدہ بھی۔ اس لئے کہ اگر کوئی شخص جہاد سے دوسروں کو روکتا ہے، ان کو موت سے ڈراتا ہے، یہ کہتا ہے کہ کافروں کے پاس بڑا جدید اسلحہ ہے وہ تمہیں تباہ و برباد کردیں گے، ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ عذاب دے گا، اس طرح اگر کوئی شخص دین کی بلندی کے لئے جہاد نہیں کرتا بلکہ دنیاوی مقاصد کے لئے جہاد کرتا

ہے تو وہ بھی رب تعالیٰ کی گرفت میں آئے گا، ان لوگوں کے اقوال کو رب تعالیٰ سننے والا ہے اور ان کی نیات کو جاننے والا ہے، یہ وعید ہے، یعنی خوف دلایا گیا۔

اگر کسی نے دوسرے کو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کی ترغیب دلائی، اور جہاد صرف دین کی بلندی کے لئے کیا تو اللہ تعالیٰ ان کے اقوال اور نیات کو جانتا ہے، ان کو ثواب عطاء فرمائے گا، عظیم درجات سے نوازے گا، یہ رب تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہے۔ یہ حکم عام بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اقوال کو سننے والا ہے اور تمہارے ارادوں اور تمہاری نیتوں کو جاننے والا ہے، لہٰذا تمہیں چاہئے کہ تمہارا ہر قول اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہو، ایسی کوئی بات نہ کرو جس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو، اسی طرح تمہارے افعال اور تمہاری نیتیں اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے ہوں، ایسا کوئی فعل نہ پایا جائے جس سے اللہ تعالیٰ تم سے ناراض ہو، کسی ایسے کام کا ارادہ اور کسی ایسے کام کی نیت نہ پائی جائے جس سے رب تعالیٰ ناراض ہو۔

☆☆☆☆☆

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً وَ اللّٰهُ یَقْبِضُ وَ یَبْصُۜطُ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ☆ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۴۵)

﴿۱﴾

ہے کوئی جو اللہ کو قرض حسن دے تو اللہ اس کے لئے بہت گنا بڑھا دے، اور اللہ تنگی اور کشائش کرتا ہے۔ اور تمہیں اس کی طرف پھر جانا ہے۔

﴿۲﴾

کون ہے جو دے اللہ کو قرض حسن تو بڑھا دے اللہ اس قرض کو اس کے لئے کئی گنا، اور اللہ تنگ کرتا ہے (رزق کو) اور فراخ کرتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

راقم کا ترجمہ بھی تقریباً ضیاء القران سے ہی نقل ہے، اس آیۃ کریمہ کا مختصر مطلب بھی حضرت پیر محمد کرم شاہ

رحمہ اللہ کی زبانی سنیں، آپ رقمطراز ہیں۔

لغت عرب میں قرض کا یہ مفہوم نہیں جو ہم اردو میں اس سے سمجھا کرتے ہیں کہ کسی کو کسی چیز کی ضرورت ہوئی اپنے پاس نہ تھی، اس لئے دوسرے سے ادھار لے کر پوری کر لی، کیونکہ اللہ تعالیٰ جو غنی حمید ہے، ضرورت کے تصور سے بھی پاک ہے بلکہ "القرض اسم لکل مایلتمس علیه الجزاء" (قرطبی)

یعنی قرض ہر وہ چیز یا عمل ہے جس پر جزاء اور بدلہ طلب کیا جائے، اب کسی قسم کا خلجان پیدا ہی نہیں ہوگا، پہلے کیونکہ جہاد کا حکم دیا گیا تھا اور جہاد کے لئے روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے اس حسن بیان سے اہل اسلام کو اپنا سرمایہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کرنے کے لئے شوق دلایا جا رہا ہے، یعنی یہ مت سمجھو کہ یہ رقم خرچ کی گئی تو واپس نہیں ملے گی، بلکہ اس کا تمہیں کئی گنا معاوضہ دے گا۔ (ضیاء القرآن)

ماقبل سے رابطہ:

پہلی آیت میں جہاد کا حکم دیا گیا چونکہ جہاد میں مال خرچ کرنے کی ضرورت در پیش آتی ہے۔ اس لئے اس آیۃ کریمہ میں اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی۔ جو لوگ مال خرچ نہیں کر سکتے لیکن جہاد میں شریک نہیں ہو سکتے ان کی دوسرے لوگ امداد کریں، اور جو جہاد بھی کر سکتے ہوں اور مال بھی خرچ سکتے ہوں، وہ جہاد بھی کریں اور اپنے آپ پر ہی اپنا مال خرچ نہ کریں، بلکہ دوسروں کی امداد بھی کریں۔

آیۃ کریمہ میں مطلقاً اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا ذکر بھی موجود ہے، خواہ صدقات نافلہ ہوں یا واجبہ۔ (از کبیر)

☆ "اخرج سعید بن منصور وابن سعد والبزار وابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم والحکیم الترمذی فی نوا درالاصول والطبرانی والبیهقی فی شعب الایمان عن ابن مسعود قال لما نزلت "من ذاالذی یقرض الله قرضاحسنافیضاعفه له" قال ابوالدحداح الا نصاری یارسول الله وان الله لیرید مناالقرض قال نعم یا ابا الدحداح قال ارنی یدک یارسول الله فناوله یده قال فانی قداقرضت ربی حائطی له فیه ستمائة وام الدحداح فیه وعیالها فجاء ابو الدحداح فناداهایاام الداحداح قالت

لبیک قال اخرجی فقد اقرضت ربی عزوجل" (درمنثور)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب یہ آیۃ کریمہ "من ذالذی یقرض اللہ قرضا حسنافیضاعفہ لہ" نازل ہوئی تو ابوالدحداح انصاری نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا یارسول اللہ! کیا اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں مال خرچ کریں تو آپ نے فرمایا ہاں، ابوالداحداح، انہوں نے عرض کیا، یارسول اللہ! آپ اپنا ہاتھ مبارک مجھے دکھائیں، تو آپ نے اپنا ہاتھ ان کے آگے کیا، انہوں نے اپنا ہاتھ حضور کے ہاتھ میں ڈال کر عرض کیا، میں اپنے رب کے حضور اپنا ایک باغ پیش کر رہا ہوں جس میں چھ سو درخت ہیں۔ ان کی زوجہ ام الدحداح اور ان کے بچے اسی باغ میں رہتے تھے، ابوالدحداح آئے، اپنی زوجہ ام الدحداح کو پکارا، اس نے کہا "لبیک" تو وہ کہنے لگے اب اس باغ سے نکل آؤ یہ باغ میں نے اپنے رب کے حضور پیش کر دیا۔

بعض روایات میں ہے کہ ابوالدحداح نے عرض کیا، یارسول اللہ! میرے دو باغ ہیں، اگر ان میں سے ایک میں صدقہ کر دوں تو کیا مجھے ایسا باغ جنت میں حاصل ہوگا؟ حضور نے فرمایا، ہاں، انہوں نے پھر عرض کیا، کیا میری زوجہ ام الدحداح بھی میرے ساتھ ہوگی؟ آپ نے فرمایا، ہاں، انہوں نے پھر پوچھا کیا میرے بچے بھی میرے ساتھ ہوں گے؟ آپ نے فرمایا، ہاں۔ تو انہوں نے ایک باغ صدقہ کر دیا، اس باغ کا نام انہوں نے "حنینہ" رکھا ہوا تھا۔ صدقہ کرنے کے بعد باغ میں آئے تو اپنی زوجہ کو بتایا کہ میں اس باغ کا رب تعالیٰ سے جنت کے بدلے سودا کر لیا ہے، تو آپ کی زوجہ نے کہا "بارک اللہ فیما اشتریت" تمہارے سودے میں اللہ تعالیٰ برکت دے۔

سبحان اللہ! کیسی وہ نیک عورتیں تھیں، رب تعالیٰ کی راہ میں دیئے ہوئے مال پر خوش ہوتی تھیں، آج کی کوئی عورت ہوتی تو خاوند سے لڑائی کرتی "الاماشاء اللہ"۔

تنبیہ: تفسیر کبیر نے دوسری روایت کے مطابق ابوالدحداح کے واقعہ کو آیۃ کریمہ کا شان نزول بنایا ہے کہ انہوں نے پہلے باغ صدقہ کیا، پھر آیۃ کریمہ کا نزول ہوا، لیکن درمنثور، ابن کثیر، خازن اور قرطبی نے پہلی روایت کو ہی نقل کیا ہے کہ یہ آیۃ کریمہ کا نزول پہلے ہوا اور ابوالدحداح نے باغ بعد میں صدقہ کیا۔ راقم کو بھی درمنثور وغیرہ کی روایت سے

ہی اتفاق ہے۔"واللہ اعلم بالصواب"

"من ذالذی یقرض اللہ قرضاحسنافیضاعفه له اضعافا کثیرة" کون ہے جو دے اللہ کو قرض حسن تو بڑھا ے اللہ اس قرض کو اس کے لئے کئی گنا۔

دینی مدارس کے طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

"(من)استفهامية مرفوعة المحل بالابتداء و(ذا) خبره(الذی)صفة له اوبدل منه، ولایجوزان یکون(من ذا)بمنزلة اسم واحد مثل ما تکون ما ذاکذلک کما نص علیه ابوالبقاء لان ماا شد ابهامامن" من "

"من" استفهاميہ ہے مرفوع محلاً مبتداء واقع ہو رہا ہے۔اور"ذا" اس کی خبر ہے "الذی' ذا" کی صفت ہے یا بدل ہے" من ذا"ایک ہی کلمہ نہیں جیسا کہ "ماذا کذلک" میں "ماذا" ایک ہی کلمہ ہے،جیسا کہ ابوالبقاء نے واضح طور پر بیان کیا ہے کہ " ما" میں بنسبت " من" کے زیادہ ابہام پایا گیا ہے،اس لئے " ماذا" ایک ہی کلمہ متصور ہوتا ہے،لیکن" من ذا" ایک ہی کلمہ متصور نہیں ہوتا۔ (روح المعانی)

قرض کا لغوی معنیٰ:

قرض کا لغوی معنیٰ "قطع کرنا" ہے۔ایک دوسرے کو جو مال دیا جاتا ہے اسے بھی اسی وجہ سے قرض کہا جاتا ہے کہ اپنے مال کا کچھ حصہ مال سے کاٹ کر دے دیا گیا۔ (از مظھری)

قرض کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کیسے؟

یعنی اللہ تعالیٰ کو قرض دینے کا کیا مطلب ہے؟اس میں دو قول ہیں۔

ایک یہ کہ حقیقی طور پر قرض کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے،لیکن قرض کا وہ معنیٰ نہیں جو ہم مطلب لیتے ہیں کہ ضرورت اور مجبوری کی وجہ سے کسی سے مال لے لیا جائے بلکہ وہ معنیٰ لیا جائے گا جو قرطبی کے حوالہ سے ضیاء القرآن

سے نقل کر دیا گیا ہے۔اور تفسیر کبیر میں بھی یہ مذکور ہے۔

" قال الزجاج انه حقیقة وذلک لان القرض هو کل مایفعل لیجازی علیه"

زجاج نے کہا یہاں قرض کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف حقیقی ہے، کیونکہ قرض ہر اس فعل کو کہتے ہیں جس پر جزاء دی جائے۔ (کبیر)

اب واضح ہوا کہ رب تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ کون ہے جو مجھے مال دے کر، یعنی میرے حضور مال پیش کر کے اس پر جزاء خیر حاصل کرے اور میرا تقرب حاصل کرے، یعنی تم سے مال خرچ کرنے کا مطالبہ میری مجبوری نہیں، بلکہ تمہاری مجبوری ہے کہ جزاء خیر کے حاصل کرنے کے تم ہر وقت مجبور رہو۔

یہ معنی عرب میں عام مشہور ہے، کہا جاتا ہے "لک عندی قرض حسن وسیٔ والمراد منه الفعل الذی یجازی علیه" تمہارے اچھے یا برے فعل کا میں نے بدلہ دینا ہے۔امیہ بن صلت نے کہا۔

کل امریٔ سوف یجز قرضه حسنا او سیناا او مدینا کا لذی دانا

ہر شخص کو اس کے اچھے یا برے فعل کا بدلہ دیا جائے گا یا اس کے عمل کی طرح عمل پایا جائے گا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ قرض کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف مجازی طور پر ہے، اور حذف مضاف پایا گیا ہے، گویا کہ معنوی طور پر عبارت یہ ہوگی "من ذالذی یقرض عباداللہ قرضاحسنا" وہ کون ہے جو اللہ کے بندوں کو قرض حسن دے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔

☆ " عن ابی هریرة مرفوعاان اللہ یقول یوم القیامة یاابن آدم استطعمک فلم تطعمنی قال یارب کیف اطعمک وانت رب العالمین قال استطعمک عبدی فلان فلم تطعمه اماعلمت انک لو اطعمته لو جدت ذلک عندی" الخ (مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا، اے ابن آدم (انسان) میں نے تجھ سے طعام طلب کیا تھا تو نے مجھے طعام نہیں کھلایا تھا، بندہ کہے گا اے میرے رب میں تجھے کیسے طعام کھلاتا تو تو رب العلمین ہے، رب فرمائے گا

میرے فلاں بندے نے تجھ سے طعام طلب کیا تھا تو نے اسے طعام نہیں کھلایا تھا، کیا تجھے معلوم نہیں اگر تو اسے طعام کھلاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا (یعنی میرے بندے کو طعام کھلانے سے تجھے میری رحمت حاصل ہوتی اور میرا تقرب حاصل ہوتا) (از مظہری)

قرض دینے کی فضیلت:

"عن انس بن مالک قال قال رسول اللہ ﷺ رأیت لیلة اسری بی علی باب الجنة مکتوبا الصدقة بعشر امثالها والقرض بثمانیة عشر فقلت لجبریل مابال القرض افضل من الصدقة قال لان السائل یسأل وعنده والمستقرض لایستقرض الامن حاجة" (ابن ماجه)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے معراج کی رات کو جنت کے دروازے پر لکھا ہوا دیکھا، صدقہ دس مثل ہے اور قرض اٹھارہ مثل (یہ حد کم از کم ہے کہ صدقہ پر دس گنا اجر حاصل ہو اور قرض پر اٹھارہ گنا، زیادہ کی حد اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے) میں نے جبریل کو کہا قرض کے صدقہ سے افضل ہونے کی کیا وجہ ہے؟ انہوں نے کہا سائل سوال کرتا ہے اس کے پاس کچھ نہ کچھ مال ہوتا ہے، اور قرض طلب کرنے والا سوائے حاجت کے قرض طلب نہیں کرتا۔ (از قرطبی)

☆ "عن ابن مسعود عن النبی ﷺ قال کل قرض صدقه" (رواه الطبرانی بسند حسن والبیهقی)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر قرضہ صدقہ ہے۔ (مظہری)

یعنی قرض دینے میں ایسے ہی ثواب حاصل ہوتا ہے جیسے صدقہ سے ثواب حاصل ہوتا ہے، بلکہ قرض دینے میں اور ہی زیادہ ثواب حاصل ہوتا ہے۔

☆ "وعن ابن مسعود قال ان النبی ﷺ قال من مسلم یقرض مسلما قرضا مرة الا کان کصدقة مرتین" (رواه ابن ماجه وصححه ابن حبان واخرجه البیهقی مرفوعا وموقوفا)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا کوئی مسلمان کسی مسلمان کو

ایک مرتبہ قرض نہیں دیتا مگر یہ کہ اسے دومرتبہ صدقہ دینے کا ثواب عطاء کیا جاتا ہے۔(ازمظھری)

دینی مدارس کے طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"قرضا حسنا" میں دواحتمال ہیں، ایک یہ کہ " قرضا " پرنصب مفعول ہونے کی وجہ سے ہو، اور" قرضا" بنی للمفعول ہو، اب مطلب یہ ہوگا"مقرضا حلا لا طیبا " حلال اور طیب قرض دیا گیا، یعنی بغیر سود کے اور بغیر احسان جتلانے کے اور بغیر کسی قسم کی تکلیف دینے کے اس نے مہربانی کرتے ہوئے قرض دیا، وہی قرض حلال اور طیب ہوگا۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ "قـــرضـــا" پرنصب مصدریۃ کے طور پر ہو، یعنی مفعول مطلق ہو، اب مفہوم یہ ہوگا "قرضا مقرونا بالاخلاص و طیب النفس" یعنی قرض حسن کا مطلب یہ ہے کہ وہ قرض دے جو اخلاص اور نفس کی خوشی سے ملا ہوا ہو۔ (از مظھری)

"اضعا فا کثیرۃ" (کئی گنا زیادہ) یہاں کوئی حد بیان نہیں کی گئی کہ رب تعالیٰ کتنے گنا زیادہ عطاء فرماتا ہے، بعض حضرات نے کہا دس گنا سے لیکر سات گنا تک۔ لیکن تفسیر خازن میں یہ ہے۔

"قال السدی هذا التضعیف لایعلمه الا الله تعالیٰ وهذا هو الاصح وانما ابهم الله ذلک لان ذکر المبهم فی باب الترغیب اقوی من ذکر المحدود"

سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ کئی گنا سے مراد کتنے گنا ہے اسے صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا، یہی قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مبہم ذکر کیا ہے، ترغیب کے مقام مبہم کا ذکر کرنا بنسبت محدود کے زیادہ قوی ہے۔

یعنی رب تعالیٰ نے جب کوئی حد بیان نہیں کی بلکہ پوشیدہ ہی رکھا ہے کہ کئی گنا عطاء فرمائے گا، تو اسے پوشیدہ ہی رکھا جائے اور یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ بے حساب اجر عطاء فرمائے گا۔ (از خازن)

حاصل کلام: اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے یا اللہ تعالیٰ کے بندوں کو رب تعالیٰ کی رضاء مندی حاصل کرنے کے لئے قرض دینے کو رب تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا، جس پر وہ بے حساب اجر وثواب عطاء کرے گا، ہمارے ذہنوں پر چھا جانے والا قرض مراد نہیں، اس میں چند وجوہ ہیں، جن کی وجہ سے عام مشہور قرض کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں ہوسکتی۔

(۱) قرض وہ لیتا ہے جو محتاج ہو، رب تعالیٰ کو محتاج تصور کرنا کفر ہے، رب تعالیٰ کا اپنا ارشاد گرامی ہے۔"واللہ الغنی وانتم الفقراء" اور اللہ غنی ہے تم فقیر ہو۔

(۲) قرض میں بدل اسی کی مثل ہوتا ہے، زیادتی مقرر کرنا سود ہے جو نا جائز ہے، یہاں مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اجر وثواب زیادہ عطاء کرے گا، یا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے مال میں خیر و برکت عطاء فرمائے گا جس کی وجہ سے اس کا مال بڑھ جائے گا۔

(۳) بطور قرض مال لینے والا مال کا مالک نہیں ہوتا بلکہ مالک قرض دینے والا ہوتا ہے۔لیکن اللہ تعالیٰ تو تمام مالوں کا مالک ہے، بلکہ تمام جانوں کا بھی مالک ہے۔

مندرجہ بالا تمام بحثوں سے مسئلہ کو بخوبی سمجھ لیا جائے کہ قرض کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف کیسے ہے، یہود کی طرح یہ نہ کہا جائے"ان اللہ فقیر و نحن اغنیاء" بیشک اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔

انہوں نے بھی قرض کا معنی نہیں سمجھا تھا"وھذا الکلام لائق بجھلھم و حمقھم" یہ کلام ان کی جہالت اور حماقت کے مطابق تھا، کیونکہ وہ تو اپنے شیخ کو بھی معبود سمجھتے تھے"من یقول فی معبود مثل ھذا القول لایستبعد منہ ان یصفہ بالفقر" جو شخص معبود کے متعلق یہ قول کرے اس سے یہ بعید نہیں کہ وہ رب تعالیٰ کو فقیر کہہ دے۔

درحقیقت وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ یہاں قرض کا معنی کیا ہے اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کو قرض سے تعبیر کیوں کیا؟

" سماہ اللہ قرضا والحکمۃ فیہ التنبیہ علی ان ذلک لا یضیع عنداللہ فکما ان القرض یجب اداؤہ ولا یجوز الاخلال بہ فکذاالثواب الواجب علی ھذاالانفاق واصل الی المکلف "

اللہ تعالیٰ پر اگرچہ کوئی چیز واجب نہیں لیکن اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے بعض چیزوں کا وعدہ فرما کر اپنے ذمہ کرم میں لے آتا ہے، اسی وجہ سے اس کی راہ میں خرچ کرنے والے مال کو قرض سے تعبیر کر کے واضح فرما دیا کہ جس طرح قرض کا ادا کرنا واجب ہے، اس میں خلل واقع کرنا جائز نہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ اس خرچ پر ثواب عطاء کرتا ہے جو اس کی راہ میں کیا جائے وہ یقیناً

ثواب عطاء کرے گا، اس میں کوئی خلل واقع نہیں ہوگا۔

فائدہ: "من" استفہامیہ ذکر کرنے میں یہ فائدہ حاصل ہوا کہ دعاء میں فعل کے قریب ہونے میں رغبت دلائی گئی ہے۔ کون ہے جو اللہ کی راہ میں قرض حسن دے گا تو اسے کئی گنا ثواب حاصل ہوگا۔ یعنی ہر شخص کو چاہئے کہ وہ اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے۔ (ماخوذ از کبیر)

"و اللہ یقبض و یبسط" اور اللہ تنگ کرتا ہے (رزق کو) اور کشادہ کرتا ہے۔

"(و اللہ یقبض) یمسک الرزق عمن یشاء ابتلاء (ویبسط) بوسعه لمن یشاء امتحانا" (جلالین)

اللہ تعالیٰ رزق کو جس کے لئے چاہے تنگ کرتا ہے، رب تعالیٰ کا رزق تنگ کرنا بندوں کی آزمائش کے لئے ہوتا ہے، کیا میرے بندے صبر کرتے ہیں یا نہیں، کیا وہ شکوہ کرتے ہیں یا نہیں اور رب تعالیٰ جس کے لئے چاہے رزق کشادہ کر دیتا ہے، رب تعالیٰ کا رزق کشادہ کرنا بھی بندوں کا امتحان لینا مقصود ہوتا ہے، کہ رزق کو فراخی کے بعد میرے بندے میرا شکریہ کرتے ہیں یا نہیں، مقصد عظیم ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے حصول کے بعد اس کا شکر بجالایا جائے۔

نعمتوں کے بعد امتحان میں کامیابی بہت زیادہ مشکل ہے، اکثر لوگ عیاش ہو کر سرکش ہو جاتے ہیں، دین اسلام سے بغاوت کرنے والے بن جاتے ہیں۔ دینداروں سے مزاح اڑانا ان کا وطیرہ بن جاتا ہے، کسی شاعر نے اغنیاء اور فقراء کو کیا ہی نصیحت کی ہے جو آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

استغن مااغناک ربک بالغنی　　　و اذا تصبک خصاصة فتحمل

تو اپنے آپ کو بے پروا سمجھ اس چیز سے جو رب تعالیٰ نے تمہیں عطا کر کے غنی (بے پرواہ) کر دیا ہے۔ اور جب تجھے حاجت (فقر) پہنچے تو تو اسے برداشت کر۔

نتیجہ واضح ہوا "فلایشکو ربه فی حال فقره و لا یطغی فی حال غناه" فقر و حاجت کے وقت اللہ تعالیٰ پر کسی قسم کا شکوہ نہ کیا جائے، اور غنی ہونے کی صورت میں کسی قسم کی سرکشی نہ کی جائے۔

اسی سے مقصد عظیم واضح ہو گیا۔

"ان الا نفاق لا یقبض الرزق وعلمه لا یبسطه بل القابض الباسط هو الله"

کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے رزق میں کمی واقع نہیں ہوتی، بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اس میں برکت ہوتی ہے اور مال بڑھتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال نہ خرچ کرنے سے رزق کشادہ نہیں ہوتا، درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی رزق کو تنگ کرنے والا ہے اور وہی رزق کو کشادہ کرنے والا ہے۔

فائدہ: آیۃ کریمہ میں "یقبض" کو پہلے ذکر کیا اور "یبسط" کو بعد میں، اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ رزق کی تنگی کے بعد فراخی ضرور حاصل ہوتی ہے۔ لیکن رزق کی فراخی کے بعد تنگی کا آنا ضروری ہے۔ (از صاوی)

"والیه ترجعون": "اور اسی کی طرف تمہیں لوٹایا جانا ہے۔"

یعنی اللہ تعالیٰ نے قیامت میں تمہیں اٹھا کر (زندہ کرکے) اپنے حضور پیش کرنا ہے اور اس نے تمہیں تمہارے اعمال کی جزاء دینی، اچھے اعمال پر ثواب عطاء کرنا ہے اور اس کے حکم سے عدولی کرنے والوں کو عذاب دینا ہے، لہٰذا واضح ہوا" فیثیب المنفق ویعذب الممسک" کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے والے کو ثواب دیا جائے گا اور اس کی راہ میں مال خرچ کرنے والے یعنی قرض اور واجب صدقات سے منہ پھیرنے والے کو عذاب دیا جائے گا۔

(ماخوذ از جلالین وصاوی)

☆☆☆☆☆

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْ بَنِىْ اِسْرَائِيْلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰى اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا قَالُوْا وَمَا لَنَا اَلَّا نُقَاتِلَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَائِنَا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ ☆ (سورة البقرة آیت نمبر ۲۴۶)

﴿۱﴾

اے محبوب! کیا تم نے نہ دیکھا بنی اسرائیل کے ایک گروہ کو جو موسیٰ کے بعد ہوا جب اپنے ایک پیغمبر سے بولے ہمارے لئے کھڑا کردو ایک بادشاہ کہ ہم خدا کی راہ میں لڑیں، نبی نے فرمایا کیا تمہارے انداز ایسے ہیں کہ تم پر جہاد فرض کیا جائے تو پھر نہ کرو بولے ہمیں کیا ہوا کہ ہم اللہ کی راہ میں نہ لڑیں حالانکہ ہم نکالے گئے ہیں اپنے وطن اور اپنی اولاد سے تو پھر جب ان پر جہاد فرض کیا گیا منہ پھیر گئے مگر ان میں کے تھوڑے اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو۔

﴿۲﴾

کیا آپ کو علم حاصل نہیں ہوا ایک گروہ کا بنی اسرائیل سے بعد موسیٰ کے، جب انہوں نے کہا اپنے نبی سے مقرر کردو ہمارے لئے امیر، ہم لڑائی کریں اللہ کی راہ میں، کہا (نبی نے) کیا تم ایسے نہیں کہ تم لڑائی نہ کرو، انہوں نے کہا ہمیں کیا ہوا کہ ہم نہ لڑائی کریں اللہ کی راہ میں، حالانکہ نکالا گیا ہمیں ہمارے شہروں سے اور اپنی اولاد سے، جب فرض کردیا گیا ان پر جہاد کرنا تو وہ منہ پھیر گئے سوائے تھوڑے ان میں سے، اور اللہ خوب جاننے والا ہے ظالموں کو۔

ماقبل سے تعلق:

اللہ تعالیٰ نے جہاد کے فرض ہونے کا ذکر "وقاتلوا فی سبیل اللہ" آیۃ کریمہ میں کیا، پھر اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا حکم دیا، کیونکہ مال خرچ کرنے سے ہی جہاد میں کامل مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ بغیر اسلحہ اور جنگی تیاری کے نقصان ہی اٹھانا ہے، اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ہر وقت کفار کے مقابل اپنے اپنے آپ کو جہاد میں تیار رکھیں۔

اب اس آیۃ کریمہ میں بنی اسرائیل کا واقعہ بیان کیا جا رہا ہے کہ ان کو جب جہاد کا حکم دیا گیا تو وہ پھر گئے، جہاد سے انہوں نے منہ موڑ لیا، اللہ تعالیٰ کے حکم کی انہوں نے مخالفت کی تو رب تعالیٰ نے ان کی مذمت فرمائی۔ اور ان کو ظالم قرار دیا، اور ساتھ ساتھ اپنے عذاب کی طرف بھی اشارہ فرمادیا کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے کہ وہ اس کے عذاب سے بچ نہیں سکیں گے۔ اور اس واقعہ سے نبی کریم ﷺ کی امت کو یہ سبق دیا گیا۔

"والمقصود منه ان لا يقدم المأ مورون بالقتال من هذه الامة على المخالفة وان يكونوا مستمرين في القتا ل مع اعداء الله تعالىٰ"

کہ اس واقعہ کے بیان کرنے کا مقصد عظیم یہ ہے کہ تمہیں بھی جہاد کا حکم دیا گیا، کہیں تم اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کر کے ظالم نہ بن جانا، اپنے آپ کو عذاب کا مستحق نہ بنا لینا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے دشمنوں سے ہمیشہ ہی جہاد کرنے میں تیار رہنا، دشمن کے سامنے سر جھکا کر نہ رہنا، بلکہ سر اٹھا کر رہنا۔ (از کبیر)

کس نبی اور قوم کا ذکر ہے:

علامہ رازی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کا مقصد تو نبی کریم ﷺ کی امت کو جہاد کی ترغیب دینا اور بزدلی سے ان کو دور رکھنا ہے۔

"سواء علمنا ان ذلک النبی من کان اولئک، ان اولئک الملاء من کانوا، اولم نعلم شیأمن ذلک، لأن المقصود هو الترغیب فی باب الجهاد وذلک لا یختلف"

ہمیں اس کا علم حاصل ہو یا نہ ہو کہ وہ نبی کون تھے اور کس خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اور وہ بنی

اسرائیل کا گروہ کون سا تھا۔ مقصود جب جہاد کی ترغیب تھی تو اس میں یہ علم حاصل ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اخبار متواترہ سے تو یہ واقعہ ثابت نہیں، البتہ اخبار احاد سے ثابت ہے جو ظنی درجہ میں رہے گا۔ (کبیر)

اس کے بعد کبیر میں بھی مختصر واقعہ ذکر کیا گیا ہے، خازن، صاوی وغیرہ نے بھی نقل کیا، تاہم مظہری نے کچھ وضاحت سے ذکر کیا، اسی سے نقل کیا جارہا ہے۔ کہ یہاں جس نبی کا ذکر ہے وہ اشموئیل علیہ السلام ہیں، موسیٰ علیہ السلام کے بعد یوشع علیہ السلام آئے جو اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تبلیغ فرماتے رہے، اور توراۃ کے مطابق عمل کرنے کی تبلیغ فرماتے رہے، ان کے بعد کالب اور ان کے بعد ''حزقیل'' اور ان کے بعد ''الیاس'' اور ان کے بعد ''الیسع'' علیھم السلام آئے۔

ان حضرات کے بعد بنی اسرائیل پر ان کے دشمن جالوت کی قوم عمالقہ غالب آ گئی، اس وقت بنی اسرائیل بحر روم یعنی مصر اور فلسطین کے درمیان تھے، بنی عمالقہ نے ان کے کئی شہروں پر قبضہ کرلیا، اور ان کے بڑے بڑے رئیسوں کے بیٹے چار سو چالیس کی تعداد میں قیدی بنالئے، اور ان پر جزیہ مقرر کردیا، اور ان کی تورات بھی لے گئے، اس وقت ان کے کوئی نبی نہیں تھے جو ان کے معاملات کی تدبیر کرتے۔

خاندان نبوت کے سب لوگ وفات پاچکے تھے، صرف ایک عورت خاندان نبوت سے زندہ تھی جو حاملہ تھی، دعاء کرتی رہتی تھی ''اشموئیل'' (اے اللہ سن) یعنی اے اللہ دعاء قبول کر۔

عبرانی زبان میں ''اشمو'' کا معنی سن، اور ''ایل'' کا معنی اللہ۔

بچہ پیدا ہونے پر یہی نام رکھا، جب بچہ بڑا ہوا تو اس کی ماں نے توراۃ دی اور بیت المقدس کی خدمت پر مقرر کردیا۔

اللہ تعالیٰ نے اسے نبوت عطاء فرمائی، جب وہ نبی بن کر اپنی قوم میں آئے تو قوم نے کہا کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کردو، جس کی زیر قیادت ہم قوم عمالقہ سے جہاد کریں، لیکن اللہ تعالیٰ کے نبی نے کہا تم وعدہ کو پورا نہیں کرسکو گے، انہوں نے کہا کے ہم ضرور جہاد کریں گے، کیا وجہ ہے کے ہم جہاد نہیں کریں گے جبکہ ان لوگوں نے ہمیں ہمارے گھروں سے نکال دیا، اور ہماری اولاد کو قیدی بنالیا۔

اولاد سے مراد ان کے آباء کی اولاد تھی، یا وہ بڑی عمروں کے تھے اور ان کی اپنی ہی اولاد تھی، کیونکہ ان کو گھروں سے نکالنے اور اپنے نبی کو یہ کہنے کے درمیان چالیس سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا، اس لئے کہ چالیس سال کی عمر میں تقریباً تمام انبیاء کرام کو اظہار نبوت کا حکم ملا، (واللہ اعلم بالصواب) (از مظهری وصاوی وخازن)

خیال رہے کہ اس واقعہ میں جس نبی کا ذکر ہے ان کے نام میں اختلاف اگرچہ پایا گیا ہے، تاہم علامہ رازی رحمہ اللہ نے فرمایا۔

"کان اسم ذلک النبی اشموئیل من بنی هارون واسمه بالعبرية اسمعیل وھوقول الاکثرین"

اللہ تعالی کے اس نبی کا نام "اشموئیل" تھا' جو عبرانی زبان میں تھا' اور عبرانی زبان میں ہی "اشموئیل" کو اسماعیل بھی کہا جاتا تھا۔ معنی دونوں کا ایک ہی ہے "اے اللہ سن"

اشموئیل علیہ السلام حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں تھے، اکثر اہلِ علم نے یہی بیان فرمایا ہے۔ (از کبیر)

"الم ترالی الملإمن بنی اسرائیل من بعد موسی":

"کیا آپ کو علم حاصل نہیں ہوا ایک گروہ کا بنی اسرائیل سے بعد موسی کے۔"

"الم تر" کی تحقیق پہلے ذکر ہو چکی ہے، راقم نے ترجمہ کیا ہے "کیا آپ کو علم حاصل نہیں ہوا" یہ صرف طلبہ کرام کے ذہنوں میں وسیع تر مفہوم بٹھانے کے لئے، ورنہ اکثر اہل علم نے "کیا آپ نے نہیں دیکھا" ترجمہ کیا ہے۔

"الملأ" کا معنی "قوم کے سرکردہ لوگ، بادشاہ کے چمچے" عام استعمال ہوتا ہے، اور یہ ایک جماعت پر بھی بولا جاتا ہے، جیسا کے قوم اور رہط اور جیش کا معنی جماعت آتا ہے، یہاں یہی معنی معتبر ہے۔

یہ لفظ لیا ہوا ہے "الملء" سے، جس کا معنی ہے بھرنا، جماعت کو "الملأ" کہنے کی وجہ یہ ہے "وهم الذين يملأون العيون هيبة" کہ جب لوگ متحد اور متفق ہو کر ایک جماعت بن جائیں تو وہ لوگوں کی آنکھوں کو رعب اور ہیبت سے بھر دیتے ہیں۔

اور وجہ یہ ہے "هم الذين يملأون المكان اذا حضروا" کہ جماعت کے لوگ جس جگہ جمع ہو جائیں اس جگہ کو بھر دیتے ہیں۔ قوم کے سرکردہ لوگوں کو "الملأ" کہنے کی وجہ زجاج نے یہ بیان کی۔

"الملأ الرؤ ساء سموا بذلک لأنهم یملأون القلوب بمایحتاج الیه"

رئیسوں کو " الملأ" کہنے کی وجہ یہ ہے وہ اپنے دلوں کوان چیزوں سے بھرلیتے ہیں جن کے وہ محتاج ہوتے ہیں۔(کبیر)

خاص کر کے بادشاہوں کے چمچے، کڑچھے قومی خزانے سے اپنی تجوریاں بھرلیتے ہیں جو درحقیقت اپنے دلوں کو گناہوں سے بھرلیتے ہیں۔

"من بنی اسرائیل من بعدموسی" بنی اسرائیل کی لفظی تحقیق پارہ میں بیان ہوچکی ہے۔یعنی جس قوم کا ذکر ہورہا ہے وہ بنی اسرائیل تھے، اور یہ واقعہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد کا ہے، جس کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے۔

"اذ قالوالنبی لهم ابعث لنا ملکا":

"جب انہوں نے کہا اپنے نبی سے مقرر کرو ہمارے لئے امیر۔"

علامہ آلوسی رحمہ اللہ " ابعث لنا ملکا " کا ترجمہ یوں فرماتے ہیں" ای اقم لنا امیرا "مقرر کرو ہمارے لئے امیر۔

" ابعث " ماخوذ ہے بعث سے، اس کا اصل میں معنی یہ ہے "ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنا"

لیکن اس کے معانی متعلقات کے بدلنے سے بدلتے رہتے ہیں، "بعث البعیر من مبرکه " اونٹ کو بیٹھنے کی جگہ سے اٹھایا۔"بعثته فی السیر" میں نے اسے چلنے پر ابھارا۔"بعث الله تعالٰی المیت" اللہ نے مردہ کو زندہ کیا"ضرب البعث علی الجند "لشکر کو کوچ کا حکم دیا۔ (روح المعانی)

آیۃ کریمہ میں "مقرر کرنا، قائم کرنا، منتخب کرنا" معانی مراد لئے جاسکتے ہیں۔

ہمارے عام محاورہ کے مطابق "امیر بنادو، امیر کھڑا کردو" بھی معانی کئے جاسکتے ہیں، محاورات کو ارباب علم بخوبی جانتے ہیں۔خیال رہے کہ تفسیر تبصیر الرحمٰن میں بھی روح المعانی والا ہی معنی لیا گیا ہے۔

تفسیر ابی السعود میں یہ ترجمہ کیا گیا ہے۔"انهض للقتال معناامیرا نصدر فی تدبیر امر الحرب عن رائیه" جہاد کے لئے ہمارے ساتھ ایک امیر کھڑا کریں جس کی رائے سے ہم لڑائی کے معاملات کی تدبیر کو کام میں لائیں۔

مفردات راغب میں ہے:

"الملک هو المتصرف بالامر والنهی فی الجمهور وذلک یختص بسیاسة الناطقین ولهذا یقال ملک الناس ولا یقال ملک الاشیاء"

ملک (بکسر اللام) کا معنی یہ ہے کہ جمہور میں امر و نہی کا مالک ہو، یہ ذوی العقول کی سیاست سے خاص ہے۔ اسی وجہ سے "ملک الناس" (لوگوں کا متصرف الامور اور مدبر) کہا جاتا ہے "ملک الاشیاء" (چیزوں کا مدبر) نہیں کہا جاتا۔

بیضاوی میں "ابعث لنا ملکا" کی تفسیر ان الفاظ سے بیان کی گئی۔ "اقم لنا امیرا ننهض معه للقتال ید برامره ونصدر فیه رایه" ہمارے لئے امیر قائم کردو جس کی معیت میں ہم لڑائی کریں، وہ ہمارے امور کی تدبیر کرے، اور ہم اس کی رائے کے مطابق کام کریں۔

بیضاوی کی اس عبارت پر خفاجی نے بیان کیا ہے کہ "ونصدر فیه رایه" حدیث پاک کے الفاظ ہیں۔

"نصدر" کا معنی "نرجع" (ہم لوٹیں) ہے، لیکن یہاں مجازی معنی ہے "نفعل ما نفعل برایه" ہم جو کام بھی کریں اس کی رائے کے مطابق کریں۔

اس تمام تحقیق کا مطلب یہ ہے کہ اس مقام پر "ملک" کا معنی "امیر، قائد، سپہ سالار" ہے۔ اگر معنی "بادشاہ" کریں تو پھر بھی "والیٔ امور" اور "مدبر" معنی ہوگا، جو ہمارے ذہنوں میں بادشاہ کا معنی ہے، جو نسل بہ نسل حاکم ہوتے ہیں، وہ معنی مراد نہیں، اور نہ ہی اسلام میں بادشاہت کا تصور ہے، اور نہ ہی اسلام کسی غاصب، لٹیرے کو حاکمیت کی اجازت دیتا ہے اور نہ ہی انگریزوں کی پیروی کرتے ہوئے انگریزی جمہوریت کی اجازت دیتا ہے، اور نہ ہی فوجی جرنیل کی چھتری میں نام نہاد جمہوریت کی اجازت دیتا ہے، اسلام میں نظام خلافت ہے، اس کی تفصیل پہلے پارہ چوتھے رکوع میں دیکھیں۔

تنبیہ: "ملک" کی وضاحت کے بعد مودودی صاحب کی تفسیر بے اثر ہو کر رہ گئی، جو انہوں نے کتاب سموئیل سے نقل کر کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اللہ کے نبی نے ان لوگوں کے مطالبہ کو پسند نہیں کیا تھا کہ بادشاہ بنایا جائے۔

ہمارے تصور والا بادشاہ بنانے کا ان کا مطالبہ ہی نہیں تھا، قرآن پاک میں کسی لفظ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ

اللہ کے نبی نے ان کے ''ملک'' بنانے کے مطالبہ کو ناپسند کیا ہو۔

''نقاتل فی سبیل اللہ'': ''ہم لڑائی کریں اللہ کی راہ میں۔''

یعنی آپ ہمارا امیر اور جنگی قائد، سپہ سالار مقرر کر دیں تا کہ اس کی زیر قیادت اور اس کی رائے اور تدبیر کے مطابق ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔

دینی طلبۂ کرام توجہ فرمائیں:

''نقاتل'' مضارع مجزوم ہے جواب امر میں واقع ہونے کی وجہ سے، اور ایک قرأت میں مرفوع بھی ہے، اس میں پھر دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ یہ جملہ حال مقدرہ ہو، تقدیر عبارت یہ ہو'' **ابعثه لنا مقدرین القتال**'' اور یا جملہ استینافیہ بیانیہ ہو، گویا کہ ان کے نبی نے ان کے مطالبہ کے بعد سوال کیا ہو''**فماذاتفعلون مع الملک**'' تم کیوں امیر مقرر کرانا چاہتے ہو، اس کی معیت میں تم کیا کرو گے؟ تو انہوں نے جواب دیا''**نقاتل فی سبیل اللہ**'' اور ایک قراءت میں ''یاء'' سے بھی پڑھا گیا ہے ''**یقاتل**'' اس میں پھر وہی مجزوم اور مرفوع کے احتمال پائے گئے ہیں۔

''قال هل عسیتم ان لا تقاتلوا'': ''کہا (نبی نے) کیا تم ایسے نہیں کہ تم لڑائی نہ کرو۔''

یعنی اللہ کے نبی نے اپنی قوم کو یہ ارشاد فرمایا جس کا مطلب یہ ہے ''**هل قاربتم ان لا تقاتلوا**'' کیا تم اس کے قریب ہو کہ تم لڑائی نہیں کرو گے، اس کلام کا مطلب یہ ہے'' **اتوقع جبنکم عن القتال**'' میں لڑائی سے تمہاری بزدلی کی توقع رکھتا ہوں۔

'' **هل** '' استفہامیہ داخل کر کے ''توقع'' اور ''ظن'' کے متعلق سوال کیا گیا، یہ استفہام تقریری ہے، جس کا مطلب یہ ہے، کیا تم اس کے قریب ہو کہ تم لڑائی نہیں کرو گے؟ ہاں یقیناً تم لڑائی نہیں کرو گے، یعنی جواب خود ہی اس میں موجود ہے،'' **وثبت ان المتوقع کائن له وانه صائب فی توقعه** '' ثابت ہوا کہ اللہ کے نبی نے بظاہر جوان سے توقع کی تھی اس نے واقع ہونا ہی تھا، اسی لئے وہ ہو کر رہا کہ وہ چند آدمیوں کے بغیر لڑائی سے پھر گئے، بزدلی دکھا

دی، نبی کی توقع درست ہوتی ہے، نبی جو کہے وہ ہو کر رہتا ہے، اسی کا نام علم غیب ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء کرام کو عطاء کیا گیا۔ (از کبیر بزیادۃ)

"قالوا ومالنا ان لا نقاتل فی سبیل اللہ وقد اخرجنا من دیارنا وابناءنا":

انہوں نے کہا ہمیں کیا ہوا ہم نہ لڑیں اللہ کی راہ میں حالانکہ ہمیں نکالا گیا ہمارے شہروں سے اور اپنی اولاد سے۔

انہوں نے اپنے اس کلام سے قوی ضمانت دلائی، اور قوی وجہ بیان کی کہ ہم پر شدت کر کے جب عمالقہ قوم نے ہمیں ہمارے گھروں سے نکال دیا اور ہمارے بچوں کو قیدی بنالیا تو ہم ان سے لڑائی کیوں نہیں کریں گے، ہم ان سے شدید لڑائی کریں اور ان سے بدلہ لیں گے۔

سبحان اللہ! ان کا یقین دلانا اور پختہ دلائل قائم کرنا اور بڑے مضبوط دعوے کرنا، جس سے عام سننے والے کو یقین آ گیا، لیکن اللہ تعالیٰ کے نبی کے منہ سے نکلا ہوا جملہ (کہ ہوسکتا ہے تم لڑائی نہیں کرو گے) ان پر غالب آ گیا۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

بظاہر ایک وہم پیدا ہوتا ہے کہ "وما" کے بعد "ان" نہیں آتا۔ یہ کہا جاتا ہے "مالک تفعل کذا" (تمہیں کیا ہے تم اس طرح کرتے ہو) لیکن "مالک ان تفعل کذا" نہیں کہا جاتا، اللہ تعالیٰ کے کلام "مالکم لا ترجون للہ وقارا" (تمہیں کیا ہوا اللہ سے عزت حاصل کرنے کی امید نہیں کرتے) اور رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی "ومالکم لا تومنون باللہ" (اور تمہیں کیا ہو تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے) میں بھی "وما" کے بعد "ان" ذکر نہیں۔ تو یہاں کیوں ذکر ہے۔

اس کے مختلف جواب دیئے گئے، ایک جواب مبرد نے دیا کہ یہاں "ما" استفہامیہ نہیں جس کے بعد "ان" نہیں آتا، بلکہ یہ "ما" جحد کے لئے آیا ہوا ہے، ان کے کہنے کا یہ مطلب تھا "مالنا نترک القتال" ہم ایسے نہیں کہ لڑائی نہ

کریں یعنی ہم لڑائی کو چھوڑنے والے نہیں۔

ایک اور جواب اخفش نے دیا کہ "ما" تو استفہامیہ ہے البتہ "ان" زائد ہے۔ معنوی لحاظ پر عبارت صرف یہ ہے۔ "مالنا لا نقاتل" ہمیں کیا ہے ہم لڑائی نہیں کریں گے، لیکن اخفش کے اس قول کو علامہ رازی رحمہ اللہ نے رد کر دیا کہ یہ قول ضعیف ہے۔

" لان القول بثبوت الزیادۃ فی کلام اللہ خلاف الاصل"

کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں کسی لفظ کو زائد کہنا خلاف اصل ہے، اس لئے یہ قول ضعیف و باطل ہے۔

ایک اور جواب فراء نے دیا کہ "ما" استفہامیہ کے بعد بھی جہاں "ان" نہیں ہوتا اس کا معنی بھی "ان" والا ہوتا ہے، جیسا کہا جائے "مالک لا تقاتل" اس کا معنی یہ ہے "مایمنک ان تقاتل" تمہیں کیا ہے کہ تم لڑائی نہیں کرتے، یعنی تمہیں لڑائی کرنے سے کیا چیز مانع ہے، مطلب یہ ہے کہ معنوی طور پر "ما" استفہامیہ کے بعد "ان" ہر جگہ معتبر ہوتا ہے، اس لئے لفظوں میں اس کا ذکر ہونا یا نہ ہونا برابر ہے۔ "فلماذھب الی معنی المنع حسن ادخال ان فیہ" جب منع والا معنی پایا جائے تو وہاں "ان" کا داخل کرنا بہتر ہوتا ہے، جیسا کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی میں "ان" کا استعمال ہے، "ما منعک ان تسجد" کس چیز نے تمہیں منع کیا کہ تم نے سجدہ نہیں کیا، "ان تسجد" میں "لا" مقدر ہے جس کا بیان دوسری آیۃ کریمہ میں موجود ہے۔

کسائی اس کا جواب دیتے ہیں "ومالنا ان لا نقاتل" کا معنی لحاظ پر اصل میں مطلب یہ تھا "ای شئ لنا فی ترک القتال" کیا چیز ہے ہمارے لئے لڑائی کے چھوڑنے میں۔

یعنی "فی" کا لفظ کلام میں تھا پھر اسے حذف کر دیا گیا "ان" کا لفظ لایا گیا۔ نحوی قوانین کو مدنظر رکھتے ہوئے ابوعلی فارسی نے کسائی کے قول کو راجح قرار دیا۔

راقم کہتا ہے کیا ہی عظمت قرآن پاک ہے کہ نحو کے ائمہ، علم کے بے کنار سمندر بھی ایک لفظ کے سمجھنے میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ سبحان اللہ! قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت کا کوئی ذی شعور انکار نہیں کرسکتا، کوئی سرپھرا،

دین کا باغی، کافروں کا یار، نام نہاد مسلمان قرآن پاک کے کسی حکم پر اعتراض کرے تو اس کی جہالت روز وروشن کی طرح اہل علم پر واضح ہو جائے گی۔

"فلما كتب عليهم القتال تولوا الا قليلا منهم":

"جب فرض کر دیا گیا ان پر جہاد تو وہ پھر گئے سوائے تھوڑے ان میں سے۔"

یعنی ان کے مطالبہ پر اللہ تعالیٰ کے نبی نے پہلے تو بیان کر دیا کہ تم پر جہاد فرض کر دیا گیا تو تم جہاد نہیں کرو گے۔ لیکن ان کے مطالبہ اور اصرار پر رب تعالیٰ کے حضور دعاء کر دی، اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے امیر مقرر فرمایا (جس کا ذکر اگلی آیۂ کریمہ میں ان شاء اللہ آ رہا ہے) اور جہاد فرض کر دیا لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے نبی کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کے مطابق جہاد سے پھر گئے، منہ موڑ گئے، سوائے چند لوگوں کے، جو لوگ جہاد سے نہیں پھرے، بلکہ اللہ تعالیٰ سے کئے گئے وعدہ کے مطابق خلوص سے جہاد میں شریک ہوئے۔

"كان عدد هذا القليل ثلثماتة عشر عدد اعلى عدد اهل بدر"

وہ بدر میں شریک صحابہ کرام کی تعداد کے مطابق صرف تین سو تیرہ تھے۔

بدر والوں کی تعداد بخاری شریف میں حضرت براء رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ثابت ہے۔ (از کبیر و روح المعانی)

"والله عليم بالظالمين":

"اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو۔"

یعنی لوگ اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کر کے اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں اور رب تعالیٰ سے کئے گئے وعدوں کو پورا نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ انہیں خوب جانتا ہے، یعنی یہ بھی جانتا ہے کہ وہ کس عذاب کے مستحق ہیں، اور وہ کہاں ہیں، اور ان کے دلی ارادے کیا ہیں، وہ کہاں تک روگردانی کرنے والے ہیں، لہٰذا یہ لوگ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچا نہیں سکیں گے، کہیں بھاگ کر نہیں جا سکتے کہ وہ کوئی پناہ حاصل کر لیں۔ (از کبیر بزیادۃ)

فائدہ: "قال النبی ﷺ "لا تتمنوا لقاء العدو واسئلوا الله العافية فاذا لقيتموهم فاثبتوا"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا دشمن سے ملاقات کی تمنا نہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے عافیت کا سوال کرو، ہاں جب تمہاری ملاقات کافروں سے ہو جائے تو پھر ثابت قدم رہو۔ (قرطبی)

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا قَالُوْا اَنّٰى
يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ
سَعَةً مِّنَ الْمَالِ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي
الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ☆

(سورۃ البقرۃ آیت نمبر، ۲۴۷)

﴿۱﴾

اور ان سے ان کے نبی نے فرمایا بیشک اللہ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ بنا کر بھیجا ہے، بولے اسے ہم پر بادشاہی کیونکر ہوگی اور ہم اس سے زیادہ سلطنت کے مستحق ہیں اور اسے مال میں بھی وسعت نہیں دی گئی، فرمایا اسے اللہ نے تم پر چن لیا اور اسے علم اور جسم میں کشادگی زیادہ دی اور اللہ اپنا ملک جسے چاہے دے اور اللہ وسعت والا علم والا ہے۔

﴿۲﴾

اور فرمایا ان کو ان کے نبی نے بیشک اللہ نے مقرر کردیا ہے تمہارے لئے طالوت کو امیر، انہوں نے کہا کیسے ہوگی اس کو سرداری ہم پر، حالانکہ ہم زیادہ حق رکھتے ہیں سرداری کا اس سے، اور نہیں دی گئی اسے وسعت مال سے، فرمایا بیشک اللہ نے چن لیا ہے اسے تم پر، اور زیادہ دی ہے اسے کشادگی علم اور جسم میں، اور اللہ دیتا ہے اپنا ملک جسے چاہے، اور اللہ وسعت والا، علم والا ہے۔

طالوت کا انتخاب کیسے؟

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو بتایا کہ قوم جس امیر کا مطالبہ کررہی ہے اور آپ بھی دعا کررہے ہیں، اس کی دونشانیاں

ہیں، ایک یہ کہ آپ اپنے عصا سے قد کی پیائش کریں جس شخص کا قد اس عصا کے برابر ہوگا وہی ان کا امیر اور سپہ سالار ہوگا۔

دوسری نشانی یہ ہے کہ آپ کے پاس جو سینگ بطور بوتل استعمال ہوتا ہے، اس میں جب تیل خود ہی کسی شخص کے آنے پر چھلک پڑے وہی ان کا امیر ہوگا۔

طالوت کے جانور گم ہو گئے تھے وہ ان کی تلاش میں نکلے، ان کے ساتھ ان کا ایک دوست بھی تھا، اس نے کہا کہ ہم اگر اس نبی کے گھر جائیں اور جانوروں کے ملنے کے لئے دعاء کرائیں یا ان سے راہنمائی طلب کریں تو ہوسکتا ہے ہمیں جانور مل جائیں۔ طالوت نے کہا ٹھیک ہے، جو وہ اللہ کے نبی کے گھر گئے تو سینگ میں تیل خود ہی چھلک پڑا، قد ناپنے پر طالوت کا قد بھی عصا کے برابر پایا گیا۔ اللہ کے نبی نے دونوں نشانیوں کو جب طالوت میں پایا تو قوم میں اعلان کر دیا کہ اللہ نے تمہارا امیر طالوت کو بنا دیا ہے۔ (از خازن و روح المعانی)

قوم کا جواب:

پہلے انہوں نے خود ہی اللہ تعالیٰ کے نبی سے سوال کیا کہ ہمیں کوئی بادشاہ عطاء کریں، جب انہیں بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے بادشاہ اور امیر طالوت کو منتخب کر دیا ہے، تو وہ اس کا انکار کرنے لگے کہ یہ کیسے ہمارا امیر اور سپہ سالار ہوسکتا ہے؟

ان کا اسے بعید سمجھنا دو وجہ سے تھا، ایک یہ کہ بنی اسرائیل میں نبوت لاوی بن یعقوب کی اولاد میں آ رہی تھی اسی خاندان سے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام تھے، اور بادشاہت یہودا کی اولاد میں آ رہی تھی، اس خاندان سے داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام تھے، چونکہ طالوت ان دو قبیلوں میں سے کسی ایک سے بھی نہیں تھے۔

دوسری وجہ یہ تھی کے طالوت ایک غریب شخص تھے، رنگ ساز یا ماشکی تھے، لہٰذا انہوں نے کہا" ولم یؤت سعة من المال" اسے تو مال کی وسعت بھی نہیں دی گئی، وہ ہمارا بادشاہ کیسے بن سکتا ہے؟

ان کا سوال کس قسم کا تھا؟

کیا انہوں نے مطلقاً اپنے نبی کے قول کو رد کرنے کی غرض سے انکار کیا تھا اور یہ کہا تھا" انی یکون له الملک علینا" (اس کو ہم پر کیسے بادشاہی اور سرداری حاصل ہوگی) یا کہ ان کے انکار کی کوئی اور وجہ تھی۔

" ای من این یکون او کیف یکون لہ ذلک ؟ والا ستفھام حقیقی اوللتعجب لا تکذیب نبیھم، والا نکار علیہ فی رأی"

"انی" یا"این" کے معنی میں ہے کہ انہوں نے کہا کہ اسے کہاں سے بادشاہی اور سرداری حاصل ہوگی۔ یا" کیف" کے معنی ہیں کہ اسے کیسے بادشاہی اور سرداری حاصل ہوگی۔

ان لوگوں کا سوال یا تو حقیقی طور پر علم حاصل کرنے کے لئے تھا، ان کا گمان یہ تھا کے قائداور سپہ سالار کے لئے مالدار ہونا ضروری ہے اور بڑا سر کردہ ہونا ضروری ہے، یہ مالدار بھی نہیں غریب شخص ہے، اور بڑا سر کردہ شخص بھی نہیں، ایک معمولی شخص ہے، رنگ ساز یا مشکی ہے، تو اسے کیسے ہمارا قائد بنایا جائے گا۔ یا ان کا سوال بطور تعجب تھا کہ ہم تو نہایت سوچ میں پڑ گئے کہ اسے کس طرح امیر اور سپہ سالار بنا دیا گیا ہے، ان لوگوں نے یہ کلام نبی کے ارشاد کو رد کرنے کے لئے نہیں کیا تھا، ہاں البتہ بعض لوگوں کی یہ رائے بھی ہے کہ انہوں نے اللہ کے نبی کے قول کو رد کرنے کے لئے یہ کہا تھا۔" واللہ اعلم بالصواب" (روح المعانی)

"قال ان اللہ اصطفاہ علیکم": اللہ کے نبی نے فرمایا بیشک اللہ نے چن لیا ہے اسے تم پر۔

یہ ان کے تعجب کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے نبی نے بطور دلیل ارشاد فرمایا، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نبی کی نبوت کا اقرار کر رہے تھے، جب یہ بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ نے طالوت کو تمہارا امیر مقرر فرما دیا ہے، پھر ان کے تعجب کو اس سے زائل کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے تم پر پسند کر لیا ہے، تو یہ ان کے لئے قطعی دلیل قائم ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نبی کو ایمان والے لوگ سچا مانتے ہیں، اگر وہ نبی کو جھوٹا مان لیں تو نبی کے اقوال پر اعتبار ہی اٹھ جائے گا، اور نبی پر عیب لگانے کے مترادف ہوگا، اس لئے نبی کی نبوت کا اقرار کرنے والوں سے یہ مقصود نہیں ہو سکتا۔

"واذا ثبت صدق المخبر ثبت ان اللہ تعالیٰ خصہ بالملک واذا ثبت ذلک کان ملکا واجب الطاعۃ وکانت الا عتراضات ساقطۃ"

جب خبر دینے والے کا سچا ہونا ان کے نزدیک بھی ثابت تھا تو انہیں پتہ چل گیا کہ طالوت واقع ہی ہمارا قائد ہے اور اس کی اطاعت واجب ہے، اس دلیل سے ان کا تعجب والا سوال اٹھ گیا۔ (از کبیر)

"واصطفاه من الصفوة بمعنى الاستخلاص وهوان يأخذ الشئ خالصالنفسه"

اصطفی ماخوذ ہے صفوۃ سے یعنی کسی کو اپنے نفس کے لئے خالص کر لینا، مراد چن لینا، پسند کرنا، اختیار کرنا، اس لئے کہ وہ غیروں سے صاف ہے۔ (از کبیر)

فائدہ جلیلہ: "وهذه الاية تدل على بطلان قول من يقول، ان الامامة موروثة وذلك لان بني اسرائيل انكروا ان يكون ملكهم من لا يكون من بيت المملكة فاعلمهم الله تعالٰى ان هذا ساقط، والمستحق لذلك من خصه الله تعالٰى وهو نظير قوله تعالٰى "تو تى الملك من تشاء وتنزع ممن تشاء"

یہ آیۃ اس پر دلالت کر رہی کہ ان لوگوں کا قول باطل ہے جو موروثی حاکمیت کے قائل ہیں، کیونکہ بنی اسرائیل نے اپنے امیر کا اسی وجہ سے انکار کیا تھا کہ یہ تو اس گھرانے اور اس خاندان کا فرد ہی نہیں جس خاندان میں بادشاہت آرہی ہے، تو اللہ تعالٰی نے ان پر واضح کر دیا کہ تمہارا یہ دعوی ہی باطل ہے بادشاہت کا مستحق تو وہ ہے جسے اللہ تعالٰی بادشاہی عطاء کرے،، رب تعالٰی کا ارشاد ہے (اے محبوب تم کہو اے اللہ) تو جسے چاہے ملک عطاء کرتا ہے اور جس چاہے ملک چھین لیتا ہے۔ (کبیر)

"وزاده بسطة فى العلم والجسم" "اور اسے زیادہ دی ہے کشادگی علم اور جسم میں"۔

یہ دوسری دلیل اللہ تعالٰی کے نبی نے ان کو دی کہ طالوت کو بادشاہی اور سرداری جو دی گئی اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے علم عطاء کیا گیا ہے جو تمہیں عطاء نہیں کیا گیا۔

" ان العمدة وفور العلم ليتمكن به من معرفة الامور السياسة"

بیشک علم کی زیادتی ہی عمدہ چیز ہے، کیونکہ علم سے انسان سیاسی امور میں قدرت حاصل کر لیتا ہے۔

" وجسامة البدن ليكون اعظم خطرافى القلوب"

بدن کا جسیم ہونا دشمن کے دلوں میں رعب ڈالتا ہے، اور انسان دشمن پر دلیر ہوتا ہے اور لڑائی کرنے میں جرأت سے کام لیتا ہے۔ (از روح المعانی)

جواب کی خوبی:

ان لوگوں نے طالوت کی امارۃ پر دو وجہ سے اعتراض کیا کہ یہ مستحق قیادت نہیں، کیونکہ شاہی خاندان کا فرد نہیں، دوسرا یہ کہ مالدار نہیں بلکہ فقیر ہے۔ رب تعالیٰ نے مستحق قیادت کے دو وصف بیان فرمائے، ایک عالم ہونا، اور دوسرا جسیم ہونا، علم اور طاقت کو مال اور مرتبہ پر کئی وجہ سے فضیلت حاصل ہے۔

(۱) علم اور طاقت کمالات حقیقیہ سے ہیں، مال اور مرتبہ کمالات حقیقیہ سے نہیں۔

(۲) علم اور طاقت انسان کے جوہر سے تعلق رکھتے ہیں، جبکہ مال اور مرتبہ انسان سے جدا اوصاف ہیں۔

(۳) علم اور طاقت انسان سے زائل نہیں ہوتے، مال اور مرتبہ زائل ہو جاتے ہیں یعنی یہ آنی جانی چیزیں ہیں۔

(۴) جو شخص جنگی تدابیر کا علم رکھتا ہو اور لڑائی کرنے کی بہت زیادہ قوت رکھتا ہو وہ دشمن کے شر کو مندفع کر سکتا ہے اور شہروں کی صحیح حفاظت کر سکتا ہے۔

صرف مالدار ہونا اور شاہی خاندان کا فرد ہونا ان چیزوں کے لئے کافی نہیں، کیونکہ جب اسے جنگی تدابیر کا علم ہی نہ ہو اور طاقت ہی نہ رکھتا ہو تو اس نے اپنے شہروں اور ملک کی حفاظت کیا کرنی ہے اور اس نے دشمن کے شر کو کیسے دور کرنا ہے۔

☆ "فثبت بماذکرناان اسنادالملک الی العالم القادراولی من اسناده الی النسیب الغنی"

جن وجوہ کا ہم نے ذکر کیا ان سے واضح ہو گیا کہ صاحب علم اور صاحب قدرت وطاقت زیادہ حق رکھتا ہے کہ اسے قائد وامیر اور بادشاہ وسپہ سالا بنایا جائے بنسبت غنی اور کسی خاص نسب سے تعلق رکھنے والے کے۔ (کبیر)

طالوت کا صاحب جسم ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کا قد بھی باقیوں سے لمبا تھا، دوسرے لوگ اس کے کندھے کے برابر تھے، وہ خوبصورت بھی تھا اور طاقت ور بھی تھا، اس کے امیر ہونے کے مستحق ہونے کی زیادہ دارومدار اس کی بہادری پر تھی۔ (کبیربتصرف)

فائدہ: اللہ تعالیٰ نے علم کا ذکر پہلے فرمایا اور جسم کا بعد میں، جس سے اس پر متنبہ فرمایا گیا۔

"ان الفضائل النفسانية اعلى واشرف واكمل من الفضائل الجسمانية"

کہ نفسانی فضائل جسمانی فضائل سے اعلیٰ اور اشرف اور اکمل ہیں۔ (کبیر)

"والله يؤتيه ملكه من يشاء" اور اللہ دیتا ہے اپنا ملک جسے چاہے۔

اللہ کے نبی نے اپنی قوم کے سامنے یہ تیسری دلیل قائم کی، جس کا مطلب یہ ہے کہ سب ملک اللہ کا ہے اور تمام مخلوق اس کی مملوک ہے اور لوگ اس کے عبد ہیں، اللہ تعالیٰ اپنا ملک جسے چاہے عطا کر دے، کسی ایک کو اللہ تعالیٰ پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔

"لان المالک اذا تصرف فی ملكه فلا اعتراض لاحد عليه فی فعله"

اس لئے کہ مالک جب اپنی ملکیت میں تصرف کرے تو کسی کو اس کے فعل پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔ (کبیر)

"والله واسع عليم" "اور اللہ وسعت والا، علم والا ہے۔"

اللہ تعالیٰ کے نبی نے چوتھی دلیل یہ قائم کی ہے، البتہ اس دلیل کو تین طرح بیان کیا گیا ہے۔

(۱) اللہ وسیع فضل، وسیع رزق اور وسیع رحمت کا مالک ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت ہر چیز پر وسیع ہے، تم طالوت کے غریب ہونے پر اعتراض کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ وسیع فضل ورحمت کا مالک ہے اور اسی ذات کبریا نے طالوت کو امیر مقرر کیا ہے۔

"فان علم ان الملک لا يتمشى الا بالمال فالله تعالىٰ يفتح عليه باب الرزق والسعة فی المال"

اللہ تعالیٰ کے علم میں سے تو کوئی بات مخفی نہیں، اگر بادشاہی اور قیادت کی دار و مدار مال پر ہوتی تو یقیناً اللہ تعالیٰ طالوت پر رزق کے دروازے کھول دیتا اور اس کے مال میں وسعت پیدا کرتا۔

جب اسے مال نہیں دیا گیا اور امیر مقرر کر دیا گیا اور رب تعالیٰ کے خزانوں میں کوئی کمی بھی نہیں تو یقیناً واضح ہوا کہ بادشاہت اور قیادت کی دار و مدار مال دولت پر نہیں بلکہ علم و طاقت پر ہے۔

(۲) واسع بمعنی موسع ہو "ای یو سع علی من یشاء من نعمته" اللہ تعالیٰ جسے چاہے وسیع نعمتیں عطا کرتا ہے، طالوت کو جب نعمت قیادت سے نوازا اور نعمت رزق میں وسعت نہیں دی تو اسی سے معلوم ہو گیا کہ قیادت رزق پر موقوف نہیں بلکہ قیامت کا تعلق علم وقدرت (طاقت) سے ہے۔

( ) " والثالث انه واسع بمعنی ذوسعة ویجئ فاعل ومعنا ہ ذو کذا " صرفی قانون یہ ہے کہ فاعل کبھی بمعنی "ذو کذا" کے آتا ہے، اس فاعل کا نام ہی 'ذی کذا' ہوتا ہے، جیسے " تـامر" صاحب تمر، اور " لابن" صاحب لبن کو کہا جاتا ہے۔

اس معنی کے لحاظ پر بھی مطلب وہی ہوگا جو بیان کیا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ صاحب وسعت ہے جس کو خود ہی قائد بنا رہا ہے اسے رزق کی وسعت نہ دینا یقیناً اس کی حکمت پر موقوف ہے۔ (کبیر)

" علیم" اللہ تعالیٰ فقیر کو غنی بنانے کی قدررت کے ساتھ تمام مقادیر کا علم بھی رکھتا ہے، لہٰذا یوں کہا جائے گا۔

"انه عالم بمقادیر مایحتاج الیه فی تدبیر الملک وعالم بحال ذلک الملک فی الحاضر والمستقبل"

کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ شخص ملک کی تدبیر میں کن چیزوں کا محتاج ہے اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ اب اور بعد میں کن چیزوں کی بادشاہت وقیادت میں محتاج ہوگا، وہی چیزیں اللہ تعالیٰ نے طالوت کو عطاء کیں۔

تنبیہ: زیادہ تفصیل تو ان شاءاللہ "قل اللهم مالک الملک الخ" کے ضمن میں آئے گی، لیکن یہاں اتنا سمجھ لیا جائے کہ طالوت کو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے نبی کی طرف وحی بھیج کر منتخب کیا، لہٰذا انہیں تمام ان تدبیروں کا علم دیا اور طاقت دی جس کہ وہ محتاج تھے، ان کو اللہ تعالیٰ منتخب کرنے میں راضی تھا، ہر بادشاہ کو یہ مقام حاصل نہیں، کافر اور ظالم جاہل اور نااہل بھی بادشاہ ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ اَنْ يَّأْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوْسٰى وَآلُ هَارُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ☆

(سورة البقرة آیت نمبر ۲۴۸)

﴿۱﴾

اوران سے ان کے نبی نے فرمایا اس کی بادشاہی کی نشانی یہ ہے کہ آئے تمہارے پاس تابوت جس میں تمہارے رب کی طرف سے دلوں کو چین ہے اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں معزز موسیٰ اور معزز ہارون کے ترکہ کی اٹھاتے لائیں گے اسے فرشتے، بیشک اس میں بڑی نشانی ہے تمہارے لئے اگر ایمان رکھتے۔

﴿۲﴾

اور فرمایا ان سے ان کے نبی نے بیشک نشانی اس کے امیر بننے کی یہ ہے کہ آئے گا تمہارے پاس تابوت (صندوق) اس میں تسکین ہوگی تمہارے رب کی طرف سے، اور اس میں کچھ بقایا چیزیں ہیں اس سے جو چھوڑ گئے معزز موسیٰ اور معزز ہارون، اٹھائے ہوں گے اسے فرشتے، بیشک اس میں نشانی ہے تمہارے لئے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

ماقبل سے تعلق واضح ہے، اور پہلی آیۃ کریمہ سے یہ بھی واضح ہو چکا ہے کہ یہ لوگ اپنے نبی کی نبوت کا اقرار کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کے قول کی حکایت بیان کی "اذقالو النبی لھم ابعث لنا ملکا" (جب کہ انہوں نے اپنے نبی سے کہا مقرر کردو ہمارے لئے امیر) اسی سے ظاہر ہورہا ہے کہ وہ اللہ کے نبی کا اعتراف کرتے تھے اور اقرار کرتے تھے کہ یہ نبی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث (بھیجا ہوا) ہے، پھر اللہ تعالیٰ کے نبی نے ان کو بتایا " ان اللہ قد بعث

لکم طالوت ملکا" (بیشک اللہ نے تمہارے لئے طالوت کو امیر مقرر کر دیا) یہ قطعی دلیل تھی۔

ان کا انکار بطور تعجب تھا یا بطور عادت تھا تاہم بوجہ کفر نہیں تھا۔

"ثم انہ تعالٰی لکمال رحمتہ بالخلق ضم الی ذلک الدلیل دلیلا آخریدل کو ن ذلک النبی صاد قا فی ذلک"

پھر اللہ تعالیٰ نے مخلوق پر کامل رحمت فرماتے ہوئے کہ ان دلوں کو مزید تسکین حاصل ہو جائے اور دلیل پیش فرمادی اور اسی سے نبی کی صداقت پر مزید دلیل بھی قائم فرمادی۔

"ویدل ایضاعلی ان طالوت نصبہ اللہ تعالٰی الملک واکثار الدالائل من اللہ تعالٰی جائز"

تابوت کے نازل ہونے کی دلیل سے بھی یہ واضح کیا کہ طالوت کو امیر خود رب تعالیٰ نے مقرر فرمایا، اللہ تعالیٰ کی یہ خاص مہربانی ہے کہ وہ اپنے بندوں کو کثیر دلائل دے کر مطمئن کرتا ہے کہ یہ اپنے عقل واختیار کی وجہ سے کہیں حد سے تجاوز نہ کر جائیں بلکہ اپنے عقل واختیار کو رب تعالیٰ کے احکام کے تابع کریں ۔

"ولذلک انہ کثرت معجزات موسی علیہ السلام و محمد علیہ السلام"

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہمارے نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ کو کثیر معجزات عطاء کئے گئے، جہاں کثرت معجزات سے ان کو معزز بنایا وہاں ان کی امتوں پر بھی مہربانی کی گئی کہ وہ کثیر معجزات کو دیکھ کر ایمان لے آئیں، اور ایمان لانے کے بعد دین سے پھریں نہیں۔

"وقال لھم نبیھم ان آیۃ ملکہ أن یا تیکم التا بوت":

اور فرمایا ان کو ان کے نبی نے کہ بیشک اس کی بادشاہت وقیادت کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس ایک تابوت آئے گا۔

تابوت کیا تھا؟

"ھو صندوق التو راۃ وقیل وکان موسی علیہ السلام اذا قاتل قد مہ فکانت تسکین

نفوس من بني اسرائیل ولاّ یفرون"

وہ جس میں توراہ کو رکھا جاتا تھا، موسیٰ علیہ السلام جب جہاد کرتے تھے تو اس صندوق کو آگے رکھتے تھے جس سے بنی اسرائیل کے دلوں کو سکون حاصل ہوتا تھا اور وہ میدان جنگ سے بھاگتے نہیں تھے۔

"فیه سکینة من ربکم" "اس میں تسکین ہوگی تمہارے رب کی طرف سے۔"

"فیه سکینة من ربکم" ای فی اتیانه سکون و طمانینة"

یعنی تابوت کے آنے کی وجہ سے تمہارے دلوں کو چین حاصل ہوگا، اور دل مطمئن ہوں گے۔ (روح المعانی)

"کل شئ یسکنون الیه فهو سکینة" ہر چیز جس سے دلوں کو سکون حاصل ہوا سے سکینہ کہا جاتا ہے۔ (خازن)

تابوت کی وجہ تسمیہ:

تابوت کا لفظ "تـوب" سے لیا ہوا ہے، جس کا معنی ہے رجوع کرنا، چونکہ تابوت ایک صندوق تھا، جس میں انبیاء کرام کے تبرکات رکھے ہوئے تھے، جب وہ نکالے جاتے تھے تو پھر ان کو اسی میں لوٹا دیا جاتا تھا، اس لئے اس کا نام تابوت رکھا گیا۔ (کبیر)

راقم کے خیال میں اس مسئلہ کو یوں منقش کر دیا گیا کہ وہ تابوت اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کا سبب بھی تھا کیونکہ جب اس کے آنے سے ان کے دلوں کو چین حاصل ہوا تو اللہ تعالیٰ کی رجوع کی توفیق بھی حاصل ہوگی۔ "واللہ اعلم بالصواب"

تابوت کا آنا معجزہ تھا:

اللہ تعالیٰ کے نبی اشموئیل علیہ السلام کا معجزہ تھا اور طالوت کی کرامت تھی کہ ان کے پاس خرق عادت تابوت آ گیا۔

تابوت کے متعلق یہ بھی کہا گیا:

کہ تابوت حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے آرہا تھا جس میں کئی انبیاء کرام کے تبرکات تھے، جو ان لوگوں کے دلوں کا چین بنے۔

"وبقية مماترک آل موسی و آل هارون":

''اوراس میں کچھ بقایا چیزیں ہیں جو چھوڑ گئے معزز موسی اور معزز ہارون۔''

اس تابوت میں موسی علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کی چھوڑی ہوئی چیزیں تھی۔ آسمانوں سے تورات کی جو تختیاں نازل ہوئی تھیں ان کے ٹکڑے تھے، موسی علیہ السلام کا عصا تھا اور آپ کے کپڑے تھے اور ہارون علیہ السلام کی نعلین تھیں۔ اور ان پر جو رب تعالیٰ کی طرف سے من نازل ہوتا رہا اس میں سے کچھ اس تابوت میں تھا۔ (از کبیر و قرطبی)

آل کا معنی کیا ہے؟

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ''معزز موسی اور معزز ہارون'' ترجمہ کیا ہے۔ راقم نے بھی وہی نقل کیا، اس کی وجہ کیا ہے؟

"قال بعض المفسرين يحتمل ان يكون المراد من آل موسى و آل هارون انفسهما"

بعض مفسرین کرام نے بیان فرمایا کہ اس مقام میں قوی احتمال یہی ہے کہ آل موسی سے مراد موسی علیہ السلام کی ذات ہے اور اسی طرح آل ہارون سے مراد ہارون علیہ السلام کی ذات ہے۔

اس پر دلیل یہ دی گئی کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کے متعلق ارشاد فرمایا۔

" لقد اوتی هذا مزمارمن مزامير آل داؤد" واراد به نفسه لأنه لم يكن لا حد من آل داؤد من الصوت الحسن مثل ما كان لداؤد عليه السلام "

''تحقیق ان کو داؤد علیہ السلام کی طرح اچھی آواز دی گئی، آپ کے ارشاد مبارک میں بھی "آل داؤد" ذکر ہے لیکن اس سے مراد ان کی ذات ہے اولاد نہیں، کیونکہ ان کی اولاد میں کسی کو ان کی طرح خوبصورت آواز نہیں دی گئی تھی۔ (کبیر)

"تحمله الملائكة": ''اٹھائے ہوں گے اسے فرشتے۔''

اس میں دو قول ہیں، ایک یہ کہ نبی اسرائیل کے اختلافات کی وجہ سے وہ تابوت نبی عمالقہ نے ان پر غالب آ

کر چھین لیا تھا اور وہ اس کی بے حرمتی کر رہے تھے، اللہ تعالیٰ کے نبی کی دعاء سے بنی عمالقہ سے وہ تابوت فرشتے لے آئے، جسے بنی اسرائیل دیکھ رہے تھے کہ تابوت کو فرشتے بیل گاڑی پر رکھ کر لا رہے ہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی نافرمانیوں اور مظالم کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تابوت کو آسمانوں پر اٹھالیا تھا اور حضرت اشموئیل علیہ السلام کی دعاء سے اور آپ کا معجزہ ظاہر کرنے کے لئے طالوت کی قیادت پر بطور دلیل آسمانوں سے نازل فرمایا۔

فرشتوں کے اٹھانے میں بھی دو احتمال ہیں کہ انہوں نے تابوت کو اٹھایا ہوا تھا۔ ان کی طرف نسبت اٹھانے کی حقیقی ہے یا اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے یوں ہی تابوت کو نازل فرمایا، فرشتے اس کے ساتھ حفاظت کے لئے نازل ہوئے، اس طرح فرشتوں کی طرف اٹھانے کی نسبت مجازی ہوگی۔ (ماخوذ از کبیر و روح المعانی)

راقم کے ذہن میں ان تمام اقوال کے جمع کرنے کی یہ صورت آئی کہ بنی اسرائیل کے اختلافات اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان پر عمالقہ قوم غالب آگئی، جو ان کا تابوت بھی لے گئی، جس میں کئی انبیاء کرام کے تبرکات تھے اور خاص کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے تبرکات بھی اس میں تھے، عمالقہ قوم نے اس تابوت کی بے حرمتی کی، ناپاک جگہ پر رکھ دیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کرام کے تبرکات کی توہین کو برداشت نہ کیا تو تابوت کو آسمان پر اٹھالیا۔ طالوت کے امیر مقرر کرنے پر بطور دلیل اور خاص کر کے بنی اسرائیل کے دلوں کو چین عطاء کرنے کے لئے تابوت کو رب تعالیٰ نے اپنی قدرت سے بغیر فرشتوں کے اٹھانے کے زمین پر نازل ہوا، جسے بنی اسرائیل دیکھ رہے تھے۔

زمیں پر آکر فرشتوں نے انسانی شکل میں ہو کر اس تابوت کو اٹھایا اور ایک بیل گاڑی پر رکھ دیا، اس طرح وہ تابوت ان بنی اسرائیل پر نازل کر کے ان پر رب تعالیٰ نے اپنی قدرت کا اظہار فرمایا کہ میں جو چاہوں کرتا ہوں، میری اسی مشیت (چاہت) کی وجہ سے طالوت کو تمہارا امیر مقرر کیا گیا۔ اور حضرت اشموئیل علیہ السلام کا یہ معجزہ تھا اور طالوت کی کرامت اور بنی اسرائیل علیہ السلام کے دلوں کا چین بنا۔

”ان فی ذلک لآیة لکم ان کنتم مؤمنین“:

بیشک اس میں نشانی ہے تمہارے لئے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

یعنی تابوت کا تمہارے پاس آنا میرے نبی کا معجزہ ہے جو تمہارے لئے بہت بڑی واضح نشانی ہے، اگر تمہارا ایمان ہوا تو یقیناً تم اسے تسلیم کرلو گے۔

"ولیس المقصود حقیقة الشرطیة اذا کان المخاطب من تحقق ایمانه، وقیل هی بمعنی اذ"

اس آیۂ کریمہ میں " ان "حقیقی طور پر شرط کے لئے استعمال نہیں کیونکہ جن لوگوں کو خطاب کیا جارہا ہے وہ مومن تھے کافر نہیں تھے، اس لئے مطلب یہی ہے کہ اگر تمہارا ایمان کامل ہوگیا تو تم اسے تسلیم کرلو گے۔

"تم اسے تسلیم کرلو گے" یہ جواب ہے جو محذوف ہے، سیاق وسباق سے سمجھ آرہا ہے، اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ "ان "بمعنی" اذ"ہو، یعنی جبکہ تم ایمان رکھتے ہو تو سمجھ جاؤ گے کہ یہ تمہارے لئے نشانی ہے۔ (از روح المعانی)

"(ان فی ذلک لآیة لکم ان کنتم مؤمنین) عظیمة (لکم) دالة علی ملک طالوت او علی نبوة محمد ﷺ حیث اخبر بهذه التفاصیل علی ماهی من غیر سماع من البشر"

بیشک اس میں تمہارے لئے بہت بڑی نشانی ہے جو طالوت کی قیادت پر دلالت کررہی ہے یا محمد مصطفیٰ ﷺ کی نبوت پر دلالت کررہی کہ آپ نے اتنی تفصیل سے خبریں دے دیں جو کسی انسان سے آپ نے نہیں سنیں تھیں۔ (ابو السعود) وہ خبریں یقیناً غیبی تھیں جو رب تعالیٰ کی عطاء تھیں۔

فائدہ: اس آیت سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ وہ اشیاء جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں سے ہوتا ہے ان کی برکت سے دعائیں قبول ہوتی ہیں اور دشمنوں پر غلبہ نصیب ہوتا ہے، صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم حضور ﷺ کے ناخن، بال مبارک تبرک کے طور پر پاس رکھا کرتے، حضرت خالد کے سر پر ایک کپڑے کی ٹوپی تھی جس میں حضور کریم ﷺ کا ایک بال شریف رکھا ہوا تھا، حضرت خالد فرماتے ہیں کہ جس معرکہ میں یہ ٹوپی سر پر رکھ کر جاتا ہوں اللہ تعالیٰ اس بال کی برکت سے مجھے کامیاب وکامران کرتا ہے۔ (ضیاء القرآن)

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ مُبْتَلِیْکُمْ بِنَھَرٍ فَمَنْ
شَرِبَ مِنْهُ فَلَیْسَ مِنِّیْ وَمَنْ لَّمْ یَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّیْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ
غُرْفَةً بِیَدِهٖ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا مَعَهٗ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْیَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالَ الَّذِیْنَ
یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰہِ کَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِیْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً کَثِیْرَةً بِاِذْنِ
اللّٰہِ وَاللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ☆ (سورة البقرة آیت نمبر ۲۴۹)

﴿۱﴾

پھر جب طالوت لشکروں کو لے کر شہر سے جدا ہوا بولا بیشک اللہ تمہیں ایک نہر سے آزمانے والا ہے تو جو اس کا پانی پیئے وہ میرا نہیں اور جو نہ پیئے وہ میرا ہے مگر وہ جو ایک چلو اپنے ہاتھ سے لے لے۔ تو سب نے اس پیا مگر تھوڑوں نے پھر جب طالوت اور اس کے ساتھ مسلمان نہر کے پار گئے بولے ہم میں آج طاقت نہیں جالوت اور اس کے لشکروں کی بولے وہ جنہیں اللہ سے ملنے کا یقین تھا کہ بارہا کم جماعت غالب آئی ہے زیادہ گروہ پر اللہ کے حکم سے اور اللہ صابروں کے ساتھ ہے۔

﴿۲﴾

پھر جب جدا ہوا طالوت لشکروں کے ساتھ، کہا بیشک اللہ آزمانے والا ہے تمہیں ایک نہر سے تو جس شخص نے پیا اس سے تو وہ نہیں ہے میرا، اور جس شخص نے پیا اس سے وہ میرا ہے سوائے اس کے جس نے چلو لے لیا اپنے ہاتھ سے، تو سب نے پی لیا اس سے سوائے تھوڑوں کے ان میں سے، پھر جب گزر گیا اس سے وہ اور

(گزر گئے) اس کے ساتھ ایمان والے انہوں نے کہا نہیں ہے طاقت ہمیں آج کے دن جالوت اور اس کے لشکروں کی، کہا ان لوگوں نے جو یقین رکھتے تھے کہ بیشک انہوں نے ملنا ہے اللہ سے، کتنی ہی تھوڑی تعداد جماعتیں غالب آئی ہیں کثیر تعداد جماعتوں پر اللہ کے حکم سے، اور اللہ ساتھ صبر کرنے والوں کے۔

ماقبل سے تعلق:

"لمااتاهم بآية التابوت اذعنوا له واجابوا الى الميسر تحت رأيته"

پہلی آیۃ میں تابوت کے آنے کا ذکر کیا، ان کے پاس جب تابوت آ گیا تو اس نشانی کو دیکھ کر طالوت کو امیر مقرر کئے جانے کا ان کو یقین ہو گیا اور طالوت کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر وہ چلنے کے لئے تیار ہو گئے، تو اس آیۃ کریمہ میں ان کے چلنے اور ایک امتحان میں ناکام ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔

مختصر مطلب:

طالوت ان کو بیت المقدس سے لے کر عمالقہ قوم کی طرف چلے تو ان کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ آگے ایک نہر آئے گی جس سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں آزمانا ہے، یعنی تم پر پیاس کو غالب کر دینا ہے اور نہر کا پانی بھی تمہیں میسر ہو جانا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا حکم یہی ہے کہ وہاں سے صرف چلو بھر اپنے ہاتھوں سے لے کر پی سکتے ہیں، جنہوں نے اس سے زیادہ نہ پیا وہ تو میرے ساتھ تعلق رکھنے والے ہوں گے، یعنی اللہ تعالیٰ کے دین اور احکام پر چلنے والے ہوں گے، اور جنہوں نے اس نہر سے چلو بھر سے زیادہ سے پی لیا وہ میرے ساتھ تعلق رکھنے والے نہیں ہوں گے۔

وہ جب نہر پر پہنچے تو ان پر پیاس کی شدت غالب ہو گئی تو سوائے چند آدمیوں کے باقی سب نے پی لیا، تو رب تعالیٰ کے حکم سے عدولی کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ لوگ باوجود مومن ہونے کے جب طالوت کے ساتھ نہر سے آگے گزرے ہی تھے تو ان پر بزدلی غالب آ گئی۔

توانہوں نے کہا آج ہم جالوت اوراس کے لشکروں سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے ، کیونکہ وہ ہمارے مقابلہ میں تعداد کے لحاظ سے زیادہ ہیں اوران کے پاس اسلحہ بھی بہت زیادہ ہے، جن لوگوں کواللہ تعالیٰ کے ساتھ ملنے کا یقین تھا، یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے چلوبھر سے زیادہ پانی نہیں پیا تھا، انہوں نے کہا کہ کتنی ہی کم تعداد والی جماعتیں زیادہ تعداد والی جماعتوں پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے غالب آئی ہیں، یعنی جنگ جیتنے کے لئے صرف تعداد کی زیادتی اور اسلحہ کی کثرت کافی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی امداد کا شامل حال ہونا ضروری ہے۔

جواللہ تعالیٰ کی نصرت اوراس کی توفیق اوراس کی مہربانی پریقین رکھتے ہیں اوراسی پر توکل رکھتے ہوئے صبر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت اوراس کی امدادان کے ساتھ ہوتی ہے۔آج کے مسلمان بھی بنی اسرائیل کی طرح کفار کے اسلحہ کودیکھ کرڈرنے کی وجہ سے ذلیل وخوار ہورہے ہیں، کاش کہ رب تعالیٰ کی رحمت پربھی یقین رکھتے۔

"فلمافصل طالوت بالجنود": پھر جب جدا ہوا طالوت لشکروں کے ساتھ۔

"فصل یفصل فصلا" کا اصل میں معنی ہے "قطع کرنا" یہ فعل متعدی ہے، یعنی اصل میں اس کا استعمال اسی طرح ہونا چاہئے تھا "فصل نفسه عن بلده" اس نے اپنے آپ کوشہر سے جدا کیااورنکالا۔لیکن کثرت استعمال کی وجہ سے اسے لازم کے درجہ میں رکھ لیا جاتا ہے اورمفعول کوحذف کرلیا جاتا ہے، اب اس کامعنی یہ ہوتا ہے "انفصل عن بلده" اپنے شہر سے جدا ہوا۔ (مظہری)

"بالجنود" جارومجرور کاتعلق "متلبسابهم ومصاحبالهم" سے ہوکرحال واقع ہورہا ہے۔اب مکمل ترجمہ یہ ہوگیا "جب طالوت اپنے ساتھ اپنے لشکروں کاملاکر (اپنے شہر بیت المقدس سے) نکلا"۔ (ابوالسعود)

"الجنودالاعوان والا انصارجمع جند وفیه معنی الجمع"

جنودجمع ہے جند کی، جس کامعنی ہے مددگار، چونکہ وہ مختلف قبائل پرمشتمل لشکر تھا اس لئے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا۔ (ازروح المعانی)

طالوت کابہت خوب اعلان:

حضرت طالوت نے اپنے ساتھ ملانے کے لئے اورلشکر کوتیار کرنے کے لئے یہ اعلان فرمایا، میرے ساتھ وہ

شخص نہ چلے جو تعمیر میں مشغول ہو تعمیر سے فارغ نہ ہوا ہو، اور ایسا شخص بھی نہ چلے جو تجارت میں مشغول ہو، یعنی اس نے کوئی قرضہ لینا ہے اور کوئی دینا ہے اور مال وغیرہ کی اسے فکر لاحق ہو، اور وہ شخص بھی نہ چلے جس نے شادی کی ہو اور ابھی تک جماع نہ کیا ہو۔ اور میرے ساتھ صرف چست، بہادر، پھر تیلے نوجوان نکلیں جو دنیاوی مشاغل سے فارغ ہوں، کیونکہ دنیاوی کاموں میں مشغول دلجمعی سے جنگ نہیں کرسکیں گے، بلکہ ان کی توجہ اپنے اپنے کاموں کی طرف ہوگی۔

حضرت طالوت کے اعلان پر ستر ہزار سے لے کر اسی ہزار تک لوگ جمع ہو گئے۔ (از روح المعانی)

"قال وهب لم يتخلف عنه الاذو عذر من صغر او كبر او مرض"

وہب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت طالوت کے اعلان کے بعد صرف چھوٹے بچے اور بوڑھے اور مریض لوگ پیچھے رہ گئے تھے، جن لوگوں کو جہاد کرنے کی طاقت حاصل تھی وہ تمام ان کے ساتھ نکل پڑے تھے۔ (قرطبی)

"قال ان اللّٰہ مبتلیکم بنھر": "کہا بیشک اللہ آزمانے والا ہے تمہیں ایک نہر سے۔"

ظاہر یہی ہے کہ یہ کلام حضرت طالوت کا تھا، لیکن طالوت نبی نہیں تھے، ان کا یہ کلام اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت اشموئیل علیہ السلام کے خبر دینے کی وجہ سے تھا۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ طالوت اور ان کے لشکر کو الوداع کرنے کے لئے اللہ کے نبی خود تشریف لائے ہوں اور یہ ارشاد ان کا براہ راست ہو۔ ماقبل اور مابعد کو دیکھنے سے زیادہ قوی احتمال پہلا ہی ہے کہ یہ کلام طالوت کا ہے، اگرچہ انہوں نے اللہ کے نبی سے حاصل کیا۔ (کبیر)

آزمانے میں حکمت:

اللہ تعالیٰ کا ان لوگوں کو آزمانا اور آزمائش سے پہلے خبر دے دینا درحقیقت ان لوگوں پر مہربانی کے لئے تھے، اس آزمائش میں دو وجہ پائی گئی ہیں۔

پہلی وجہ:

"كان مشهور من بني اسرائيل انهم يخالفون الانبياء والملوك مع ظهور الآيات الباهرة"

یہ بات بھی مشہور ومعروف ہے کہ بنی اسرائیل اپنے انبیاء کرام اور اپنے بادشاہوں کی روشن اور واضح نشانیوں سے ظاہر ہونے کے باوجود مخالفت کرتے رہتے تھے۔

(راقم کے خیال میں ان کی یہ مخالفت عادت کے طور پر تھی کفر یہ طور پر نہیں جیسا کہ کبیر کی عبارت کے ترجمہ سے واضح سمجھ آرہا ہے)

تو اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ دشمن سے ملاقات کرنے سے پہلے ہی ان پر آزمائش کا ذکر کر دیا جائے تا کہ لڑائی میں صبر سے کام لینے والے اور صبر نہ کرنے والوں میں فرق واضح ہو جائے۔

"لان الرجوع قبل لقاء العدو لایوثر کتاثیرہ حال لقاء العدو"

اس لئے کہ دشمن کی ملاقات سے پہلے جنگ سے لوٹ آنا اتنا اثر انداز نہیں جتنا دشمن سے آمنا سامنا ہو جانے کے بعد لوٹ آنا اثر انداز ہوتا ہے، کیونکہ جنگ سے دشمن کے مقابلہ سے بھاگ کر آنا گناہ کبیرہ ہے۔ دشمن سے مقابلہ کرنے سے پہلے ہی ان کی اصلاح کے لئے رب تعالیٰ نے اپنے نبی کے ذریعے ان کو اس آزمائش کی خبر دے دی۔

دوسری وجہ:

آزمائش کی دوسری وجہ یہ تھی۔" انه تعالى ابتلا هم ليتعودو الصبر على الشدائد "

کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے ان کو آزمائش میں اس لئے مبتلاء کیا تا کہ وہ شدید تکالیف کو برداشت کرنے کی عادت بنا کر صبر کریں اور صبر پر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کا قرب حاصل کریں۔ (از کبیر)

وہ نہر کون سی تھی:

ایک قول قتادہ اور ربیع رحمہما اللہ کا ہے کہ وہ نہر اردن اور فلسطین کے درمیان تھی اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہ نہر فلسطین تھی۔

" والتو فيق بين القولين ان لنهر الممتدمن بلد الى بلد يضاف الى احدالبلدين"

ان دونوں قولوں کا مطلب ایک ہی ہے کہ وہ نہر اردن اور فلسطین کے درمیان تھی، لیکن جو نہر ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف چلے اس کی نسبت ایک کی طرف کی جا سکتی ہے، اسی وجہ سے اسے نہر فلسطین بھی کہا جاتا تھا۔ (کبیر)

اگر اسے نہر اردن کہہ لیا جائے تب بھی یہی مطلب ہوگا۔

تیسرا قول یہ ہے کہ یہ جنگ سخت گرمی میں تھی انہوں نے کہا کہ ہم سے پانی نہیں اٹھایا جائے گا، بلکہ ہمیں پانی کی کوئی نہر مل جائے تو ان کو بتایا گیا کہ تمہارا نہر سے ہی گزر ہوگا البتہ وہی نہر تمہاری آزمائش بنے گی۔ (از کبیر و قرطبی)

یہ قول بھی پہلے دونوں اقوال سے مختلف نہیں، کیونکہ ان لوگوں کو پتہ نہیں تھا کہ کس راستہ سے جانا ہے اور عمالقہ سے جنگ کرنی ہے، ان کے کہنے کا مقصد ہی یہی تھا کہ نہر کا راستہ اختیار کیا جائے جس نہر سے ان کے مطالبہ پر آزمایا گیا یہ وہی نہر تھی جو فلسطین اور اردن کے درمیان تھی۔ (راقم)

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

"نهر" کے عین کلمہ "ها" پر حرکت بھی ہے اور سکون بھی، کیونکہ قاعدہ یہ ہے۔

"كل ثلاثي حشوه حرف الحلق فانه يجئ على هذين"

ہر ثلاثی جس کا درمیانی حرف، حروف حلقی سے ہو، اس میں یہی دو صورتیں پڑھی جاسکتی ہیں۔

صحر اور شعر میں بھی یہی وجوہ ہیں۔ (بلکہ طلباء کرام صرفی کتب میں دی ہوئی مثال شهد کو مدنظر رکھیں) (کبیر)

آزمائش کیسے تھی؟

"فروى انهم اتوا النهر وقد نالهم عطش وهو فى غاية العذوبة والحسن"

روایت بیان کی گئی کہ وہ جب نہر پر آئے تو ان کو شدید پیاس لگی، اور نہر کا پانی بہت میٹھا اور صاف شفاف تھا۔

اس حالت میں کہ پیاس شدید ہو اور پانی صاف شفاف اور میٹھا ہو، یہ بہت بڑی آزمائش تھی، اسی وجہ سے چلو بھر پینے کی اجازت دی گئی، مطیع لوگوں کو وہ ایک چلو ہی کفایت کر گیا، (لیکن زیادہ مقدار میں پینے والے نافرمان ہو گئے اور مرض میں مبتلا ہو گئے)۔ (قرطبی)

رب تعالیٰ کو آزمائش کی کیا ضرورت تھی؟

جب اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ کون سے لوگ مطیع ہیں اور کون سے نافرمان ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کو کس وجہ سے آزمایا؟

اللہ تعالیٰ کے آزمانے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اسے علم حاصل نہیں ہوتا، بلکہ ایک قانون مرتب مقصود کرنا ہوتا ہے کہ اے انسانو! اپنے علم سے فیصلہ نہ کرنا بلکہ مقدمات میں کسی کے اقرار کرنے اور گواہوں کو دیکھ کر فیصلے کرنا۔

"ولما كان الا بتلاء بين الناس انمايكون لظهورالشئ وثبت ان الله تعالىٰ لا يثيب ولا يعاقب على علمه انما يفعل ذلک بظهورالا فعال بين الناس وذلک لايحصل الا بالتكليف لاجرم سمى التكليف ابتلاء"

آزمائش کا مقصد لوگوں پر ظاہر کرنا ہوتا ہے، اور یہ بھی واضح طور پر ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے علم کے مطابق کسی کو نہ ثواب عطاء کرتا ہے اور نہ عذاب دیتا ہے، بلکہ جب کسی کے افعال لوگوں پر ظاہر ہوتے ہیں تو ان کو ان افعال کے مطابق جزاء دیتا ہے، اور یہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب کسی کو کچھ کاموں کا حکم دے کر اور کچھ کاموں سے روک کر تکلیف دی جائے، اسی تکلیف کا نام آزمائش ہے۔ (از کبیر)

"فمن شرب منه فليس منى ومن لم يطعمه فانه منى":

"تو جس شخص نے پیا اس سے تو وہ میرا نہیں اور جس نے نہ پیا اس سے تو وہ میرا ہے۔"

یہاں پینے سے مراد چلو بھر سے زیادہ پینا ہے، کیونکہ چلو بھر پینے کی اجازت کا ذکر بعد میں آرہا ہے۔

" فليس منى "اور میرا مطیع نہیں ہوگا۔ (کبیر)

"ليس من اشياعى اوليس بمتصل بى و متحد معى" وہ میرے متبعین سے نہیں ہوگا، وہ میرے ساتھ متصل نہیں ہوگا، اور اس کا مجھ سے اتفاق واتحاد نہیں ہوگا۔ (روح المعانی)

ان معانی کو اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے مختصر فصیح و بلیغ الفاظ سے یوں بیان کیا "وہ میرا نہیں"

یعنی جس نہر سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں آزمانا ہے اس سے تم نے چلو سے زائد پانی پی لیا تو تمہارا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہوگا، تم میرے دین پر نہیں ہو گے، تم میرے مطیع نہیں ہو گے، تم میرے متبعین سے نہیں ہو گے، تمہارا میرے

ساتھ اتحاد و اتفاق نہیں ہوگا۔

"ومن لم یطعمه فانه منی" اور جس نے نہ پیا اس سے تو وہ میرا ہے. "طعم الشئ اذا ذاقه ما کولا کان او مشروبا" "طعم" کا لفظ کسی چیز کو چکھنے کے لئے استعمال ہوتا ہے خواہ وہ چیز کھائی جاتی ہو یا پی جاتی ہو۔ جو ہری نے بیان کیا ہے کہ "طعم" اس چیز کو کہتے ہیں جس سے ذوق حاصل ہو۔

"وعلی التقدیر ین استعمال طعم الماء بمعنی ذاق طعمه"

دونوں معنوں کے لحاظ پر یعنی طعم کا معنی چکھنا ہو یا چکھنے والی چیز ہو، اس کا استعمال پانی پینے کے معنی میں بھی ہے۔

البتہ کھانے والا معنی بھی پایا جاتا ہے جیسا کہ زمزم کے پانی کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

"طعام طعم و شفاء سقم" اس پانی میں کھانے کی تاثیر بھی موجود اور بیمار کے لئے شفاء بھی۔

اس حدیث پاک میں " طعام طعم " کا معنی پانی پینا لینا ممکن نہیں۔ یعنی " طعم " کی نسبت پانی کی طرف ہو تو اس وقت معنی " پانی پینا" ہوتا ہے۔ لیکن کبھی پانی کی طرف نسبت ہونے کے باوجود معنی "کھانا" کرنا پڑتا ہے جیسا کہ حدیث پاک سے ثابت ہے۔ (از روح المعانی)

"طعم" کے ذکر کے فوائد:

"من لم یطعمه" فرمایا "من لم یشرب منه" نہیں فرمایا گیا، اس لئے کہ اس میں دو فائدے پائے گئے ہیں۔

(۱) ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ انسان جب بہت زیادہ پیاسا ہوتا ہے، پھر پانی پیتا ہے تو اسے پانی کی مٹھاس اور لذت کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے " کانه الجلاب، وکانه العسل " یہ عرق گلاب میں ڈالا ہوا خوشبودار اور میٹھا شہد سمجھ آتا ہے، یا یہ شہد کی طرح میٹھا اور لذت دار سمجھ آتا ہے، تو وہ شخص شدید پیاس کی حالت میں پانی پینے کو طعام سے تشبیہ دے رہا ہے، کیونکہ شہد خواہ خالص یا عرق گلاب میں ملا ہوا (الجلاب) ہو وہ کھایا جاتا ہے پیا نہیں جاتا، اسے مطعوم کہا جاتا ہے مشروب نہیں کہا جاتا۔

اب اس وجہ کے لحاظ سے " ومن لم یطعمه " ارشاد فرما کر یہ حکم دیا گیا کہ اگر تمہیں بہت پیاس محسوس ہو

یہاں تک کہ تم پانی کو شہد سے تشبیہ دے رہے ہو تو ایسی حالت میں ہی رب تعالیٰ تمہیں آزمائے گا، اس حالت میں بھی "فیحب الاحتراز عنه وان لا یشر به" تم پر اس پانی سے بچنا لازم ہوگا، اور پانی نہ پینا تا کہ تمہیں اللہ تعالیٰ امتحان میں کامیاب فرمائے۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ جو شخص منہ میں پانی ڈالے اور اسے منہ میں گھما کر یعنی کلی کر کے نکال دے اس کے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں " انه ذاقه" بیشک اس نے پانی چکھا لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا " انه شرب" کہ اس نے پانی پیا، اگر " ومن لم یشربه" کہا جاتا تو ممانعت کا تعلق پانی سے ہوتا، لیکن جب ارشاد فرمایا " ومن لم یطعمه" تو اسے پانی پینے سے بھی روک دیا گیا اور لذت حاصل کرنے کے لئے کلی کرنے سے بھی منع کر دیا گیا، ہاں صرف ایک چلو پیاس کو روکنے کے لئے پینے کی اجازت دی گئی، لیکن وہ بھی اس میٹھے اور شفاف پانی سے لذت حاصل کرنے کے لئے نہیں،" ومعلوم ان هذاالتكليف اشق" یہ بات واضح ہے کہ پانی پینے سے بھی ممانعت اور حصول لذت کے لئے کلی کرنے کی بھی ممانعت ان کے لئے شدید مشقت کا سبب تھی، اور یہ آزمائش بہت بڑی مشکل آزمائش تھی۔ (از کبیر)

فائدہ: "فمن شرب منه فليس منى" کے بعد ذکر فرمایا " ومن لم يطعمه فانه منى" اس میں سے ایک عظیم فائدہ حاصل ہو رہا ہے، وہ یہ کہ اگر کوئی شخص کہے " الایشرب من هذا النهر" اس نہر سے نہیں پیئے گا۔ تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس کی قسم اس وقت ٹوٹے گی جب وہ نہر سے منہ لگا کر پانی پیے، اگر اس نے نہر سے کسی برتن میں لے کر پانی پی لیا تو اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی۔ یعنی آپ حقیقی معنی پر عمل کرتے ہیں، اور امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہا اللہ مجاز پر عمل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر اس نے نہر کا پانی برتن میں لے کر بھی پی لیا تو اس کی قسم ٹوٹ جائے گی۔

جب ظاہر یہی ہو رہا ہے کہ " فمن شرب منه" میں نہر سے پینے پر وعید ہے کہ وہ میرا نہیں، نہر کا پانی برتن میں لے کر پینے کی ممانعت نظر نہیں آرہی تھی تو " ومن لم يطعمه" ارشاد فرما کر اس وہم کا ازالہ کر دیا گیا ہے کہ اگر نہر کا پانی کسی شخص نے کسی طرح بھی پی لیا، خواہ منہ لگا کر یا برتن میں لے کر، خواہ اس میں پینے کی غرض پائی گئی یا لذت حاصل کرنے کی غرض پائی گئی، تو وہ میرا نہیں، اور جس نے کسی طرح بھی پانی نہ پیا اور نہ لذت حاصل کی وہ میرا ہے، ہاں البتہ ایک چلو اسے پینے کی اجازت ہوگی۔

(از کبیر)

"الامن اغترف غرفة بیده": "مگر وہ جو ایک چلو اپنے ہاتھ سے لے لے۔"

یہ حکم ماقبل سے مستثنیٰ ہے یعنی اس حکم کو ماقبل حکم سے علیحدہ کر دیا گیا ہے کہ ایک چلو اپنے ہاتھ میں لے کر پینے کا وہ حکم نہیں جو پہلے بیان کیا گیا ہے بلکہ اس کی اجازت ہے۔

"الغرفة" (بالضم) قلیل چیز جو ہتھیلی میں حاصل ہوتی ہے، یعنی چلو۔

"الغرفة" (بالفتح)، قلیل چیز ہاتھ میں لینا، جیسے " اکلة" (بالضم) لقمہ، اور " اکلة" (بالفتح) ایک لقمہ کھانا۔

" الحزة" (بالضم) گوشت کا ایک ٹکڑا۔ " الحزة " (بالفتح) گوشت کا ٹکڑا کاٹنا۔

" الخطوة" (بالضم) دو قدموں کے درمیان فاصلہ یعنی قدم۔ " الخطوة" (بالفتح) قدم اٹھانا۔

☆ قال ابن عباس رضی الله عنهما کانت الغرفة یشرب منهاهوو دوابه وخدمته "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جو لوگ اس آزمائش میں پورے اترے، انہوں نے ایک چلو پانی لیا، اسی سے کچھ قطرات خود پی لئے اور کچھ قطرات اپنے چوپاؤں کو پلا دیئے اور کچھ قطرات اپنے خدام کو پلائے، وہی ایک چلو ان تمام کو کفایت کر گیا۔

ایک چلو پانی ایک شخص کو بمع اس کے خدام اور سواریوں کے کیسے کافی ہوا؟

" ان الله تعالیٰ یجعل البرکة فیه حتی یکفی لکل هؤلاء وهذاکان معجزة لنبی ذلک الزمان کماانه تعالیٰ ان یروی الخلق العظیم من الماء القلیل فی زمان محمد ﷺ"

اللہ تعالیٰ نے ایک چلو پانی میں یہ برکت رکھ دی تھی کہ وہ ان تمام کو کافی ہو گیا، یہ اس وقت کے نبی حضرت اشمویئل علیہ السلام کا معجزہ تھا، جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا معجزہ واقع ہوا کہ تھوڑے پانی سے عظیم مخلوق کو سیراب کر دیا۔ (کبیر)

فائدہ جلیلہ:

عن ابن عمر قال نهی رسول الله ﷺ ان یشرب علی بطو ننا و هو الکرع، ونهانا ان نغترف بالیدالواحد ة قال لا یلغ احدکم کما یلغ الکلب ولایشرب بالیدالواحدة

کما یشرب القوم الذین سخط الله علیهم و لا یشرب باللیل فی اناء حتی یحرکه الا ان یکون مخمّرا ومن شرب بیده وھویقدرعلی اناء یرید به التواضع کتب الله له بعدد اصابعه حسنات وھو اناء عیسی ابن مریم علیھماالسلام اذ طرح القدح فقال اف ھذامع الدنیا"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے پیٹ کے بل ہوکر پانی پینے سے منع فرمایا، یعنی نہر وغیرہ سے پانی منہ لگا کر نہ پیئے، اور آپ نے ہمیں ایک ہاتھ سے چلو لے کر پانی پینے سے منع کیا، اور فرمایا تم میں سے کوئی شخص کتے کی طرح پانی نہ پیئے (یعنی زبان سے پانی نہ پیئے) اور ایک ہاتھ سے پانی نہ پیئے جیسے اس قوم نے پیا جن کے بعض لوگوں پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوا، اور رات کو برتن سے پانی سوائے برتن کے ہلانے کے نہ پیئے ہاں البتہ برتن ڈھانپا ہوا ہو، (تو اسی طرح بغیر حرکت دینے کے پی لے) اور جس نے اپنے ہاتھ سے عاجزی کے طور پر پانی پیا باوجود اس کے کہ وہ برتن استعمال کرنے پر قادر تھا، اللہ تعالیٰ اس کی انگلیوں کی تعداد کے مطابق اس کی نیکیاں لکھتا ہے کیونکہ ہاتھ ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا برتن تھا، آپ نے پیالہ استعمال کرنا اس لئے چھوڑ دیا تھا کہ یہ بھی دنیا کا مال ہے۔ (ابن ماجه، ماخوذ از قرطبی)

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس زمانے میں اگر کوئی شخص شک شبہ سے بچنا چاہتا ہے تو وہ چشموں اور نہروں کا پانی اپنے ہاتھ سے پیئے۔

" مبتغیابذ لک من الله کسب الحسنات ووضع الا وزارواللحوق بالائمة الابرار"

اس کی نیت یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ مجھے نیکیاں عطاء فرمائے اور میرے گناہ معاف کردے اور مجھے نیک ائمہ کرام سے ملاءدے تو اسے اللہ تعالیٰ یہ مقام عطاء کردے گا۔ (از قرطبی)

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اپنے زمانے کے متعلق یہ ارشاد فرمایا لیکن جب ہم اپنے زمانہ کی طرف نگاہ دوڑاتے ہیں تو تصور کرنے سے یوں ہی پتہ چلتا ہے کہ آج کے دور میں کوئی شخص کھانے پینے میں کراہیت کے شک وشبہ سے

بالاتر نظر نہیں آتا، بالواسطہ یا بلاواسطہ ہر طرف رزق حرام ہی نظر آتا ہے۔ " الا مان الحفیظ"

" فشر بوا منه قليلا منهم ":

'' تو سب نے پی لیا اس سے سوائے تھوڑوں کے ان میں سے۔''

یعنی حضرت طالوت کے ساتھ جو اسی ہزار کا لشکر تھا ان میں سے سوائے چند آدمیوں کے سب نے پانی پی لیا تھا، وہ اللہ تعالیٰ کی آزمائش میں کامیاب نہ ہو سکے، ہاں البتہ چند لوگ اس آزمائش میں کامیاب ہوئے، جنہوں نے ایک چلو پانی لیا جو ان کو اور ان کے خدام اور ان کی سواریوں کو کافی ہو گیا۔

قلیل کی تعداد:

تھوڑے حضرات جو آزمائش میں پورے اترے ان کی تعداد یہ تھی۔

" اخرج ابن حميد و ابن حاتم عن سعيد بن جبير "فشربو امنه الاقليلامنهم" قال القليل ثلاث مائة و بضعة عشر عدة اهل بدر" (درمنثور)

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ابن حمید نے ابن حاتم سے نقل کی ہے کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی "فشربو امنه الا قليلامنهم" میں جن قلیل کا ذکر ہے ان کی تعداد بدر میں شریک صحابہ کرام کی تعداد کے مطابق ہی تھی، یعنی وہ بھی تین سو تیرہ ہی، جیسے بدر میں تین سو تیرہ تھے۔

اسی سے واضح ہوا کہ پھر جانے والوں کی تعداد (جو آزمائش میں ناکام ہوئے) چھہتر ہزار چھ سو ستاسی تھی۔

پانی پینے والوں کا انجام:

جن لوگوں نے پانی پی لیا تھا اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کی ان کے ہونٹ سیاہ ہو گئے اور ان پر پیاس غالب آ گئی اور وہ سیراب نہ ہوئے، اور نہر کے کنارے پر ہی رہ گئے اور دشمن سے مقابلہ کرنے میں بزدل ہو گئے۔

اور جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے امر کی اطاعت کی تو ان کے دلوں کو قوت حاصل ہوئی، اور وہ اپنے ایمان کے کامل درجہ پر قائم رہے اور نہر کو سلامتی سے عبور کر لیا۔ (از کبیر)

”فلما جاوزہ ھو والذین آمنوا معہ قالوا لا طاقۃ لنا الیوم بجالوت وجنودہ“

”پھر جب طالوت اور اس کے ساتھ مسلمان نہر سے پار گئے، بولے ہم میں آج طاقت نہیں جالوت اور اس کے لشکروں کی۔“

یہ مندرجہ بالا ترجمہ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ہے۔ راقم نے اسی کے مطابق یوں ترجمہ کیا۔

”اور گزر گیا اس سے وہ اور (گزر گئے) اس کے ساتھ ایمان والے۔ انہوں نے کہا نہیں ہے طاقت ہمیں آج جالوت اور اس کے لشکروں کی“۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ مطلب سمجھانے کے لئے بہت خوبصورت انداز پر پیش کیا گیا ہے، راقم نے لفظی ترجمہ کیا ہے جو مطلب کو سمجھنے کیلئے تقریباً کافی ہے۔

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفسیر ابی السعود کی اس عبارت کے مطابق ہے۔

”(والذین آمنوا معہ) عطف علی الضمیر المتصل المؤکد بالمنفصل و الظرف متعلق بجاوز لا بآمنوا والحال ان الذین آمنوا کائنون معہ“ (ابو السعود)

یعنی ”والذین آمنوا معہ“ کا عطف ہے ”جاوز“ میں ”ھو“ ضمیر مستتر متصل پر اسی لئے پھر ”ھو“ ضمیر بارز منفصل سے تاکید لگائی گئی۔ اور ظرف یعنی ”معہ“ کا تعلق ”جاوز“ سے ہے، ”آمنوا“ سے نہیں۔

یعنی معنی یہ ہے کہ جب طالوت نہر سے پار گزر گئے ایسے حال میں کہ ان کے ساتھ ہی گزر گئے ایمان والے۔ یہ معنی نہیں کہ گزر گئے وہ اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ایمان لائے۔

مقام توجہ: اتنی بات واضح ہے کہ طالوت کے ساتھ جو لوگ بیت المقدس کی بستی سے نکلے تھے وہ اسی ہزار کی تعداد میں تمام کے تمام مومن تھے، کیا وہ آزمائش میں ناکام ہونے کے بعد مومن رہے یا کافر رہے، اس مسئلہ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

" لاخلاف بین المفسرین ان الذین عصوا الله وشربوا من النهر رجعوا الی بلدھم ولم یتوجه معه الی لقاء العدو الا من اطاع الله تعالیٰ فی باب الشرب من النهر "

اس مسئلہ میں مفسرین کا کوئی اختلاف نہیں:

کہ بیشک جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور نہر سے پانی پی لیا وہ اپنے شہروں کی طرف لوٹ کر آ گئے ، دشمن سے مقابلہ کرنے کی ان کو ہمت حاصل نہیں ہو سکی ، دشمن سے مقابلہ صرف وہی لوگ کر سکے جنہوں نے نہر سے پانی کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی۔

ہاں اس مسئلہ میں اختلاف پایا گیا ہے:

کہ وہ نہر سے گزر جانے کے بعد واپس لوٹے یا نہر سے گزرنے کی بھی ان کو طاقت حاصل نہ ہو سکی بلکہ وہ پہلے ہی واپس لوٹ آئے۔

اس میں ایک قول یہ ہے:

"انه ماعبر معه الا المطیع" نہر سے گزرے والے صرف مطیع تھے، جو تھوڑی تعداد میں تھے، زیادہ مفسرین کا اسی طرف رجحان نظر آتا ہے۔

ان حضرات کے دلائل:

(۱) ان کی پہلی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا" الذین امنو امعه" طالوت کے ساتھ نہر سے گذرنے والے ایمان والے تھے، لیکن اس مقام میں ایمان بمقابلہ کفر استعمال نہیں، بلکہ بمقابلہ طاعت استعمال ہے۔

"فالمراد بقوله تعالیٰ (الذین آمنوا معه) الذین وافقوہ فی تلک الطاعة"

اللہ تعالیٰ کے ارشاد "الذین آمنوا معه" کا مطلب یہ ہے پہلے کل لشکر کا ذکر فرمایا ، پھر مطیع لوگوں کا ذکر کیا کہ وہ نہر سے گزر گئے۔

"علمنا انه ماعبر النهر احد الا المطیعون"

اسی سے ہمیں معلوم ہو گیا کہ نہر سے گزرنے والے صرف مطیع لوگ تھے۔

(۲) ان حضرات کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے۔"فمن شرب منه فليس مني" (طالوت نے کہا) میں نے اس سے پی لیا وہ میرا نہیں۔اس کا مطلب یہ ہے۔"ليس من اصحابي في سفري" وہ سفر میں میرا ساتھی نہیں ہو گا۔جس طرح کوئی شخص دوسرے کو کہے" لست انت منافي هذا الامر" اس معاملہ تو ہمارے ساتھ نہیں۔

جب انہوں نے نہر سے پی لیا تو وہ ان کے لوٹ آنے اور نہر کو عبور نہ کرنے کا سبب بن گیا،" وذلك لفساد دينهم وقلبهم" ان کے دین اور دل کے فساد کی وجہ سے ہی پانی پینے کا واقعہ در پیش آیا۔

(۳) ان کو آزمانے کی وجہ ایک یہ تھی کہ مطیع اور نافرمان کو جدا جدا کیا جا سکے تا کہ طالوت نافرمانوں کو دشمن کے مقابل جانے سے پہلے ہی روک دیں۔اس سے پتہ چلا کہ نافرمان لوگ نہر کو عبور نہیں کر سکے۔

دوسرے حضرات کی دلیل:

جن حضرات کا موقف یہ ہے کہ تمام ہی نہر سے گزر گئے، کیونکہ پانی پینے سے وہ گنہگار ہوئے کافر نہیں ہوئے،اس لئے طالوت اور ان کے ساتھ سارے ہی ایمان والے گزر گئے تو ان کے درمیان مکالمہ ہوا۔جنہوں نے پانی پی لیا تھا انہوں نے کہا آج ہم جالوت اور اس کے لشکروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات پر یقین رکھتے تھے (یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے چلو سے زیادہ پانی نہیں پیا تھا اور آزمائش میں پورے اترے تھے) انہوں نے کہا کتنی ہی چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر غالب آئیں۔آیۃ کریمہ کے انداز بیان سے واضح ہے کہ نہر سے پار تمام ہی گزر گئے۔

پہلے حضرات کی طرف سے ایک جواب یہ دیا گیا کہ طالوت کے ساتھ نہر سے گزرنے والے تو صرف مخلصین ہی تھے،البتہ ان کے درمیان مکالمہ نہر کی دو طرفوں سے تھا،مخلصین نہر سے گذر کر دوسری طرف تھے اور دوسرے ناکام لوگ نہر کی اسی جانب تھے جہاں پہلے تھے،بات ادھر ادھر سے ہو رہی تھی۔

دوسرا جواب یہ دیا گیا کہ ہو سکتا ہے کہ نہر سے گزر جانے والے دو فریق ہوں۔

"بعضهم ممن یحب الحیاة ویکر ہ الموت و کان الخوف والجزع غالباعلی طبعه ومنهم من کان شجاعاقوی للقلب لایبالی بالموت فی طاعة الله تعالٰی "

بعض لوگ وہ تھے جو زندگی کو پسند کرتے تھے اور موت کو ناپسند، ان کی طبعیت پر خوف اور جزع و فزع غالب تھے، اور ان میں سے بعض بہادر اور قوی دل والے تھے، جن کے سامنے مقصد عظیم اللہ تعالیٰ کی طاعت تھی، اسی وجہ سے انہیں موت کی کوئی فکر نہیں تھی۔ (از کبیر)

راقم کا موقف:

علامہ رازی رحمہ اللہ نے یہ دوسرا جواب جو دیا ہے راقم کے ذہن نے بھی زیادہ اسی کو قبول کیا کہ نہر کے امتحان سے پہلے تو طالوت کے ساتھ جانے والے تمام ہی مومن تھے، لیکن نہر کی آزمائش کے بعد کئی لوگ کافر ہو گئے اور کچھ لوگ گنہگار ہوئے اور کچھ لوگ پرہیزگار رہے۔ اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول سے تائید حاصل ہے۔

"(فشربوا منه الاقلیلامنهم) قال ابن عباس شربوا علی قدر یقینهم فشرب الکفارو شرب العاصون دون ذلک وانصرف من القوم ستة وسبعون الفا وبقی بعض المؤمنین لم یشرب شیأ واخذ بعضهم الغرفة فامامن شرب فلم یروبل برح العطش واما من ترک الماء فحسنت حاله و کان اجلد ممن اخذ الغرفة "

اللہ تعالیٰ کے ارشاد کہ انہوں نے پی لیا سوائے چند آدمیوں کے، اس کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ انہوں نے یقین کی حد تک پی لیا۔ پھر مزید تفصیل بیان فرمائی کہ کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کے حکم کا انکار کرنے کی وجہ سے معاذ اللہ مرتد ہو گئے۔ ان کافروں نے تو اس نہر کا صاف وشفاف اور لذت دار پانی اتنی کثیر مقدار میں پیا جس طرح اونٹ پیتا ہے کہ ایک دن ہی وہ اتنا پانی پی لیتا ہے کہ کئی دن اسی پر گزارا کر لیتا ہے۔ کچھ لوگ کافر تو نہیں ہوئے لیکن پانی انہوں نے سیر ہو کر پی لیا، اگرچہ کفار سے انہوں نے کم مقدار میں پیا، یہ گنہگار اور فاسق ہوئے، جہاد سے پھر جانے والے چھہتر ہزار تھے۔

وہ مومن جو گنہگار نہیں ہوئے ان میں پھر دو قسمیں ہیں ایک وہ جنہوں نے پانی بالکل ایک قطرہ بھی نہیں پیا، دوسرے وہ تھے جنہوں نے رب تعالیٰ کے حکم کے مطابق صرف ایک چلو پر اکتفاء (گذارا) کیا۔ جن لوگوں نے پانی سیر ہو کر پی لیا تھا ان پر پیاس غالب ہی آتی رہی ان کی پیاس ختم نہ ہو سکی، اور جن لوگوں نے پانی بالکل نہیں پیا تھا ان کو ایک چلو پینے والوں سے بھی زیادہ بہادری حاصل رہی۔ (قرطبی)

اس روایت کے مطابق یوں کہا جا سکتا ہے کہ جو لوگ کافر ہو گئے تھے وہ نہر کو عبور نہیں کر سکے، اور گنہگار اور پرہیز گار نہر کو عبور کر گئے، گنہگار نہر کو عبور کر کے کہنے لگے ہم میں تو آج جالوت اور اس کے لشکروں سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں، پرہیز گاروں نے ان کو سمجھایا کہ کتنی چھوٹی جماعتیں اللہ کے فضل و کرم سے بڑی جماعتوں پر غالب آئیں۔

پھر کفار سے مقابلہ کرتے ہوئے بالکل پانی نہ پینے والوں نے زیادہ بہادری سے مقابلہ کیا اور چلو پینے والے بھی میدان جہاد میں ثابت قدمی سے مقابلہ کرتے رہے۔ " واللہ اعلم بالصواب"

"قال الذین یظنون انهم ملاقوا اللّٰه کم من فئة قلیلة غلبت فئة کثیرة باذن اللّٰه":

"کہا ان لوگوں نے جو یقین رکھتے تھے کہ بیشک انہوں نے ملاقات کرنی ہے اللہ سے کتنی ہی کم تعداد جماعتیں غالب آئیں کثیر تعداد جماعتوں پر اللہ کے حکم سے۔"

"والظن هنا بمعنی الیقین" ظن اس مقام پر بمعنی یقین کے ہے۔ (قرطبی)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے جو راقم نے بھی نقل کیا۔

یعنی مخصصین مومنین کو یقین تھا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرنی ہے، قیامت بھی آنی ہے، اور وہ دن روز جزاء ہے، اس لئے آج رب تعالیٰ کا حکم مانیں گے تب ہی وہاں کامیابی حاصل ہوگی۔

اور ہو سکتا ہے کہ اس مقام میں "ظن" بمعنی شک ہو۔ یہ ثابت کیا گیا ہو کہ اس جنگ میں مومنین کو شہید

ہونے میں شک ہوسکتا ہے شہید ہوجائیں اور ہوسکتا ہے زندہ لوٹ جائیں۔ (قرطبی)

اس طرح یہ ترجمہ بھی درست رہے گا ''کہاان لوگوں نے جوگمان رکھتے تھے اللہ تعالیٰ سے ملنے کی''

حضرت قتادۃ کا قول اسی کے مطابق ہے۔آپ فرماتے ہیں ''ان المرادمن لقاء اللہ الموت'' بیشک اللہ کی ملاقات سے مرادموت ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔

''من احب لقاء اللہ احب اللہ لقاء ہ ومن کرہ لقاء اللہ لقاء ہ''

جوشخص اللہ تعالیٰ سے ملناپسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملناپسند کرتا ہے،اور جوشخص اللہ تعالیٰ سے ملناپسندنہیں کرتا اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملناپسندنہیں کرتا۔(اس ملاقات سے مرادیہی ہے)

یعنی'' یظنون ''کامعنی گمان کرنا بھی صحیح ہے کہ ان کواس میدان جنگ میں شہید ہوجانے میں شک تھا۔

اور وجہ یہ بھی ہے کہ ''ملا قوا اللہ ثواب سبب ھذہ الطاعۃ'' اس مقام میں اللہ کی ملاقات کرنے کا مطلب اس طاعت کی وجہ سے ثواب حاصل کرنا ہو، چونکہ کوئی شخص اپنے انجام کونہیں جانتا اس لئے ان کو'' ثواب حاصل کرنے میں گمان تھا''۔ (از کبیر)

تاہم یہ بھی خیال رہے کہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے بھی، یقین والامعنی زیادہ مفسرین کا پسندیدہ ذکر کیا ہے۔

جالوت اوراس کے لشکر سے مقابلہ نہ کرسکنے کی وجہ:

جب ان لوگوں نے جالوت اوراس کے لشکر کی کثرت اور شدت کودیکھا تو انہوں نے کہا ہم تو اس سے مقابلہ بھی نہیں کرسکتے،کامیابی حاصل کرنا تو دور کی بات ہے۔جالوت کے لشکر کی تعداد ایک لاکھ تھی،جو اسلحہ سے مسلح تھے، بعض نے کہا تین لاکھ کی تعداد میں تھے۔ (روح المعانی)

ان دونوں اقوال میں کوئی تعارض نہیں، کیونکہ ایک لاکھ بہت بہادر اور خصوصی اسلحہ سے مسلح تھے،اور دولاکھ کے پاس بنسبت ان کے کچھ کم اسلحہ تھا۔ واللہ اعلم بالصواب (راقم)

'' فئۃ'' کامعنی ہے جماعت،یا تو یہ لفظ لیا ہو '' فاء بمعنی رجع'' سے لوٹنا، یعنی بعض لوگ دوسرے بعض

کی طرف لوٹتے ہیں اور ایک جگہ جمع ہو کر جماعت بن جاتے ہیں، اس لئے جماعت کو" فـئـة" کہا جاتا ہے۔ اور یا یہ لفظ لیا ہوا ہے "فـأوت رأسه بالسيف" میں نے اس کا سرتلوار سے کاٹا۔ چونکہ ایک جماعت بھی لوگوں سے کٹ کر ایک فرقہ بن جاتا ہے، اس لئے اسے " فئة "کہا جاتا ہے۔ (کبیر)

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

" كم هنا خبرية ومعنا ها كثير، و(من) زائدة وفئة تميز"

اس آیۂ کریمہ میں "کم" خبریہ ہے، اور معنی اس کا کثیر ہے، اور " من" تمیز پر بڑھایا گیا ہے اور " فئة "تمیز ہے۔ یعنی بہت زیادہ مرتبہ یہ ہو چکا ہے کہ چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر اللہ کے حکم سے غالب آئیں۔

" باذن الله" ای بحكمه و تيسيره "اللہ کے اذن کا معنی "اللہ کا حکم" اور اللہ کے آسان کرنے سے حکم کا آسان کرنا۔ (روح المعانی)

"والله مع الصابرين": "اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے صبر کرنے والوں کو امداد حاصل ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ ان پر احسان فرماتا ہے۔ (روح المعانی)

نتیجہ: "والمعنى انه لاعبرة بكثرة العدد انما العبرة با لتائيدالا لهى والنصر السماوى، فاذا جاء ت الدولة فلا مضرة فى القلة والذلة واذاجاء ت المحنة فلامنفعة فى كثيرة العددو العدة" (كبير)

اس آیۂ کریمہ کے بیان سے واضح طور پر نتیجہ سامنے آگیا کہ اعتبار تعداد کی کثرت کا نہیں، بلکہ اعتبار اللہ تعالیٰ کی تائید اور قدرتی امداد کا ہے، جب رب تعالیٰ کے فضل وکرم اور اس کی طرف سے امداد کی دولت میسر ہو جائے تو تعداد کی کمی اور بے سروسامانی سے کوئی نقصان نہیں ہوتا، اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے امداد میسر نہ ہو، اور رب تعالیٰ اسے مشقت میں ڈال دے تو تعداد کی زیادتی اور بہت بڑی جنگی تیاری کا کوئی فائدہ نہیں۔

☆☆☆☆☆

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ

اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ☆ (سورة البقرة آیت نمبر ۲۵۰)

﴿۱﴾

پھر جب سامنے آئے جالوت اور اس کے لشکروں کے عرض کی اے رب ہمارے ہم پر صبر انڈیل اور ہمارے پاؤں جمے رکھ کافروں پر ہماری مدد کر۔

﴿۲﴾

اور جب وہ مقابلہ میں آئے جالوت اور اس کے لشکروں کے، تو انہوں نے عرض کیا اے ہمارے رب بہادے ہم پر صبر، اور ثابت رکھ ہمارے قدموں کو، اور امداد فرما ہماری کافروں کی قوم پر ۔

”ولمابرزوالجالوت وجنوده“:

”اور جب وہ مقابلہ میں آئے جالوت اور اس کے لشکروں کے۔“

”المبارزة فی الحروب“ کا مطلب ہوتا ہے جنگ کے وقت ایک دوسرے کے سامنے اور مقابلہ آجانا، اصل میں اس زمین کو براز کہا جاتا ہے جو کھلی فضاء ہو اور اس میں کوئی حجاب نہ ہو۔

دعاء کرنے والے کون تھے:

ظاہر تو یہی ہے کہ وہ تین سو تیرہ جو آزمائش میں کامیاب ہوئے تھے وہی دعاء کرنے والے تھے، تاہم علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ طالوت کے لشکر میں علماء اور بہادر حضرات عوام کے ساتھ موجود تھے، جو جہاد کرنے کے لئے قائم تھے وہی کمزور دل عوام کو کہہ رہے تھے ”کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله“ کتنی ہی قلیل تعداد جماعتیں غالب آئیں کثیر تعداد جماعتوں پر اللہ کے حکم سے۔

اورعلماء کرام ہی "واوضحواان الفتح والنصرة لا یحصلان الاباعانةاللہ" ان پرواضح کرر ہے تھے کہ کامیابی اورامداد صرف اللہ تعالیٰ کی مہربانی اوراسی کی معاونت سے حاصل ہوتی ہیں۔

علماء کرام نے جب جالوت کے لشکر کی کثرت اوران کی جنگی تیاری کودیکھا اورادھرا پنے لوگوں کی ایک چھوٹی سی جماعت اور بے سروسامانی کودیکھا "لاجرم اشتغلوا بالدعاء والتضرع" تویقیناوہ دعاء کرنے اوررب تعالیٰ کے حضورعاجزی پیش کرنے میں مشغول ہوگئے،اور یہ دعاء "ربناافرغ علینا" الخ بھی علماء کرام کی ہی تھی۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ انبیاء کرام اپنے ساتھ اللہ والوں کے جہاد میں مشغول حضرات کے لئے یہ دعاءفرماتے رہے۔

"ربنااغفرلناذنوبناواسرافنافی امرناوثبت اقدامناوانصرناعلی القوم الکافرین"

اسی طرح نبی کریم ﷺ اپنی امت کے لئے ہرمیدان جنگ میں دعاءفرماتے رہے،بدر میں آپ نمازادا کر کے رب تعالیٰ سے وعدہ پورا کرنے کی دعاءکرر ہے تھے،یعنی اے اللہ! تیرامیرے ساتھ وعدہ ہے کہ تو مومنین کی امداد فرمائے گا،اس لئے یہی وہ وقت ہے جس میں تیری امداد کی ہمیں ضرورت ہے،ہمیں یقین ہے کہ تو ہمارے ساتھ اپنا وعدہ پورا فرمائے گا۔اور نبی کریم ﷺ دشمن کے مقابلہ یہ دعاءفرماتے تھے۔

"اللھم انی اعوذبک من شرورھم واجعلک فی نحورھم"

اور یہ دعاءفرماتے تھے "اللہم بک اصول وبک اجول" (کبیر)

"قالواربناافرغ علیناصبرا": "انہوں نے کہااے ہمارے رب بہادے ہم پرصبر۔"

"ربنا" اصل میں "یاربنا" ہے،حرف نداءمحذوف ہے۔اے ہمارے رب۔دعاءکو"ربنا" سے شروع کرنے میں یہ حکمت تھی۔

"وفی التوسل بوصف الربوبیة المنبئة عن التبلیغ الی الکمال"

کہ "رب" کامعنی ہی یہ ہے "تبلیغ الشیٔ الی کماله بحسب استعداده الازلی شیأفشیأ" (روح المعانی)

کسی چیزکواس کی ازلی صلاحیت کے مطابق درجہ بدرجہ کمال تک پہنچانا۔

تو یہاں بھی "ربنا" سے دعاء کا آغاز کر کے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا گیا تو نے ہی ہمیں درجہ کمال تک پہنچانا ہے، تجھی سے ہی عرض کر رہے ہیں۔ (ماخوذ از تفسیر ابی السعود)

"افرغ علیناصبرا" الا فراغ الصب" افراغ کا معنی انڈیل دینا، بہا دینا، جیسا کہ کہا جاتا ہے "افرغت الاناء" میں نے برتن سے پانی بہا دیا ہے، انڈیل دیا ہے۔ قرآن پاک کا کیا خوب انداز فصاحت ہے صرف یہ نہیں کہا گیا کہ اے اللہ تو ہمیں صبر عطاء کر، بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ تو ہم پر صبر بہا دے، یعنی جس طرح پانی بہایا جاتا ہے اسی طرح ہم پر صبر بہا دے۔

"فمعنی "افرغ علیناصبرا" ای اصبب علینااتم صب و ابلغه"

اب معنی یہ ہوا کہ اے ہمارے رب ہم پر کامل طریقہ پر صبر پانی کی طرح بہا دے اور بہت زیادہ صبر ہمیں عطاء کر۔

تین امور مطلوبہ کے مطابق تین دعائیں:

(۱) جنگ میں انسان دشمن سے جب ہولناک چیزوں کو دیکھے، اور دشمن کی تعداد اور ان کے رعب اور دبدبہ کو دیکھ کر جب یہ خوف میں مبتلا ہو تو اس کے لئے صبر کرنا ضروری ہے۔ جنگ میں یہی چیز سب سے اعلیٰ اور سب سے ضروری ہے "لانہ اذا کان جبانا لایحصل منه مقصودا اصلا" اس لئے کہ جب بزدل ہوگا تو اسے جنگ میں کامیابی کا مقصد حاصل نہیں ہوگا۔

اس مقصد عظیم کو حاصل کرنے کے لئے دعاء کی گئی "ربنا افرغ علیناصبرا" اے ہمارے رب ہم پر صبر بہا دے۔

(۲) جنگ میں اسلحہ کا پایا جانا، ہر قسم کے جنگی آلات مہیا ہونا، پھر اچھا اتفاق حاصل ہونا ایسے مقامات حاصل ہونا جن میں خود چھپ سکے اور دشمن پر چھپ کر حملہ کر سکے، ان چیزوں کے حصول سے انسان اپنے آپ کو مطمئن سمجھتا ہے اور ثابت قدم رہتا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے دعاء کی گئی۔

"وثبت اقدامنا "ای هب لنا کمال القوة والرسوخ عندالمقارعة بحیث لا تزلزل، ولیس المراد بتثبیت الاقدام مجرد تقررها فی حیزواحداذلیس فی ذلک کثیر جدوی"

(روح المعانی)

کہ اے اللہ! ہمیں کامل طاقت عطاء فرما، اور جب دشمن سے مقابلہ ہو آمنے سامنے سے تلواریں چلیں تو ہمیں مقابلہ کرنے میں پختگی عطاء فرما، ہمارے پاؤں ڈگمگائیں نہیں، یعنی جنگ میں ہر وہ چیز عطاء کر جو ہمیں ڈگمگانے سے بچائے اور خصوصا بھاگنے سے بچائے۔

ثابت قدمی کا یہ مطلب نہیں کہ ہم بالکل ہی ایک جگہ جم کر کھڑے ہو جائیں، ہمارے قدم اپنی جگہ سے ہلیں نہیں، کیونکہ اس چیز کے حاصل کرنے کی دعاء میں کوئی خاص فائدہ نہیں۔

(۳) جنگ میں یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ انسان کو دشمن کے مقابل زیادہ قوت حاصل ہو، تا کہ دشمن کو شکست دینے کی طاقت حاصل ہو سکے۔ اس کے لئے دعاء کی۔

"وانصرنا علی القوم الکافرین" اور امداد فرما ہماری کافروں کی قوم پر (ماخوذ از کبیر)

نکتہ: "التعبیر بعلی المشعر بجعل ذلک کالظرف وجعلهم کالمظروفین"

اس مقام میں لفظ "علی" ذکر کیا جو ظرفیت کے معنی کی خبر دے رہا، چونکہ ظرف مظروف پر (جس طرح برتن پانی پر) حاوی ہوتا ہے، نصرت کی دعاء میں لفظ "علی" ذکر کر کے یوں دعاء کی گئی کہ اے ہمارے رب! ہمیں ظرف کی طرح بنا دے اور ہمارے دشمن کو مظروف کی طرح، یعنی ہم ان پر چھا جائیں اور ان پر حاوی ہو جائیں۔ (روح المعانی)

بہت عمدہ ترتیب:

رب تعالیٰ کے کلام کو ہی دیکھ کر فصحاء و بلغاء نے فصاحت و بلاغت کو حاصل کیا یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک کی آیات میں مفسرین کرام نکات بیان کرتے تو بے اختیار کہنا پڑتا ہے "قرآن تیری عظمت پر قربان" پہلے دعاء کی صبر حاصل ہونے کی، پھر دعاء کی ثابت قدمی کی، یعنی دشمن پر قوت حاصل کرنے کی، کیونکہ صبر کا مقام ہی پہلے ہے "لان الصبر قد یحصل لمن لامقاومة له" اس لئے کہ صبر کبھی اسے بھی حاصل ہوتا ہے جسے مقابلہ کرنے کی طاقت حاصل نہیں ہوتی۔

"وثالثا العمدة والمقصود من المحاربة وهو النصرة علی الخصم حیث ان الشجاعة

بدون النصرة طریق عتبة عن النفع خارجة"

اور تیری دعاء دشمن پر کامیابی حاصل کرنے کے لئے رب تعالیٰ سے امداد حاصل کرنے کے لئے کی جو اصل میں بہت بڑا مقصد ہے، یقیناً یہ عمدہ دعاء ہے، کیونکہ بہادری بغیر اللہ تعالیٰ کی امداد کے اور اس کی ناراضگی پائے جانے کے تو نفع سے خارج ہے۔ (از روح المعانی)

بظاہر اس پر یہ عتراض ہوتا ہے کہ جب یہ ترتیب پائی گئی ہے تو "فاء" ذکر ہوتی جو ترتیب پر دلالت کرتی ہے "واو" کو کیوں ذکر کیا گیا ہے؟ تو اس کا یہ جواب دیا گیا ہے۔

"ان الواو ابلغ لانه عول فی الترتیب علی الذهن الذی هو اعدل شاهد کماذکر السکاکی"

کہ "واوٗ" کا ذکر کرنا اس لئے زیادہ بہتر ہے کہ ذہن میں پائی جانی والی ترتیب کا لحاظ کیا گیا، اس لئے کہ جب ایک چیز ذہن میں چھائی ہوئی ہو تو وہ خود بخود حاصل ہو جاتی ہے، اس پر دلالت کرنے والے الفاظ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ (از روح المعانی)

فائدہ: "احتج الأصحاب علی ان افعال العباد مخلوقة لله تعالیٰ"

اسی آیۃ کریمہ سے اہل سنت علماء کرام نے یہ دلیل بیان کی ہے کہ بندوں کے تمام افعال اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے سے حاصل ہوتے ہیں، اس لئے صبر اور ثابت قدمی اور نصرت اسی سے طلب کئے گئے کہ وہی خالق ہے اور وہی مالک ہے اور وہی عطاء کرنے والا ہے۔ (از کبیر مختصراً)

دشمن کے خلاف دعائیں:

یہ دعاء کی جائے اے اللہ مسلمانوں پر مہربانی فرما کہ دشمن کا آپس میں اختلاف پیدا ہو جائے، ایک دوسرے سے متفرق ہو جائیں تا کہ اس کی وجہ سے مسلمانوں کو جرأت حاصل ہو۔ اور یہ دعاء کی جائے اے اللہ ان کے شہروں اور گھروں اور ان کے مالوں میں مصیبت ڈال دے کہ ان میں موت اور موذی مرض واقع ہو تا کہ وہ اپنے آپ میں مشغول ہو جائیں اور جنگ کرنے کی ان کو فراغت ہی نہ مل سکے، یہ بھی مسلمانوں کی جرأت کا سبب بنے گا۔

اور یہ دعاء کرے کہ ان کے عام لوگ مرض میں مبتلاء ہوں، ان کو کمزوری لاحق ہو، ان کا رئیس (صدر، وزیر اعظم) مرجائے تا کہ وہ مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کی ہمت نہ کرسکیں اور مسلمان ان کے خلاف بہادری دکھاسکیں۔

(از کبیر تبصرف)

دشمن کے خلاف اس قسم کی دعائیں جائز ہیں، اگرچہ کفار کے یار مسلمانوں کے غدار نام نہاد مسلمان اسے پسند نہیں کرتے لیکن غدار آخر کار ذلیل ہی ہوا کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

فَهَزَمُوهُم بِإِذْنِ اللهِ وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَٰكِنَّ اللهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ☆

(سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۵۱)

﴿۱﴾

توانہوں نے ان کو بھگا دیا اللہ کے حکم سے اور قتل کیا داؤد نے جالوت کو اور اللہ نے اسے سلطنت اور حکمت عطاء فرمائی اور اسے جو چاہا سکھایا اور اگر اللہ لوگوں میں بعض سے بعض کو دفع نہ کرے تو ضرور زمین تباہ ہو جائے مگر اللہ سارے جہان پر فضل کرنے والا ہے۔

﴿۲﴾

تو شکست دے دی انہوں نے ان کو اللہ کے حکم سے، اور قتل کیا داؤد نے جالوت کو، اور عطاء کی اسے بادشاہی اور حکمت، اور سکھایا اسے جو چاہا، اور اگر نہ دفع کرے اللہ لوگوں کو بعض سے بعض کو ضرور زمین تباہ ہو جائے لیکن اللہ فضل فرمانے والا ہے تمام جہانوں پر۔

ماقبل سے تعلق:

اللہ تعالیٰ نے مومنین کی دعاء کو قبول فرمالیا، یعنی پہلی آیۃ کریمہ میں دعاؤں کا ذکر ہے اور اس آیۃ کریمہ میں

ان دعاؤں کی قبولیت کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو صبر عطاء فرمایا اور ثابت قدم رکھا اور کافروں کی قوم یعنی جالوت اور اس کے لشکر پر امداد عطاء فرمائی، جس کی وجہ سے مومنین نے بہت بڑے لشکر کو شکست دی اور لشکر کے سردار جالوت کو قتل کر دیا۔ پہلے مخلصین کے قول کا ذکر فرمایا کہ انہوں نے کہا کہ کتنی ہی کم تعداد جماعتیں کثیر تعداد جماعتوں کثیر پر غالب آئی ہیں، تو اس آیۃ کریمہ میں ان کے قول کے ثابت ہو جانے اور حق ثابت ہو جانے کا ذکر کیا۔

''فھزموھم باذن اللّٰہ'': ''تو انہوں نے شکست دی ان کو اللہ کے حکم سے۔''

یعنی اللہ کے حکم اور اس کے آسان کرنے اور اس کے فضل و کرم کی وجہ سے مومنین نے کفار کو شکست دے دی، ان کا رعب اور دبدبہ توڑ دیا اور ان کو بھگا دیا۔ ''ھزم'' کا لغوی معنی ہے ''توڑنا'' کہا جاتا ''سقاء منھزم'' پیالہ ٹوٹ گیا اور خشک ہو گیا، ''ھزمت العظم والقصبۃ'' ہڈی ٹوٹ گئی، کانا ٹوٹ گیا۔ پہاڑی میں سوراخ کرنے یا کسی پتھر اور چٹان میں سوراخ کرنے کو بھی ''ھزمۃ'' کہا جاتا ہے۔

سفیان بن عیینہ نے زمزم کے متعلق فرمایا۔ ''ھی ھزمۃ جبریل'' یرید ھزمھا برجلہ فخرج الماء'' یہ جبریل کا ہزمہ ہے، یعنی جبریل نے پاؤں مارا تو پانی نکلا۔

خیال رہے کہ پہلے پارہ میں وضاحت سے ذکر کر دیا گیا کہ زمزم کے پانی نکلنے میں جبریل کے پاؤں کی ٹھوکر کا بھی اثر تھا اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ایڑی رگڑنے کا بھی تھا۔

''سمعت ھزمۃ الرعد'' میں بجلی کی کڑک سنی جو کانوں کو پھاڑ رہی تھی، اور بادل کو بھی '' ھزیم'' کہا جاتا ہے کہ وہ بارش سے پھٹ جاتے ہیں۔ (از کبیر)

تنبیہ: '' ثم اخبر تعالیٰ تلک الھزیمۃ کانت باذن اللہ وباعانتہ وتو فیقہ وتیسیرہ وانہ لو لا اعانتہ وتیسیرہ لماحصل البتۃ''

مومنوں کی اس بڑی کامیابی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کافروں کو یہ شکست اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی امداد اور اس کی توفیق اور اس کے آسان کرنے سے ہی انہوں نے دی، اگر رب تعالیٰ

ان کی امداد نہ فرماتا اوران پر آسان نہ کرتا تو یہ بہت بڑے لشکر کو بھی شکست نہ دے سکتے، جو ہر قسم کے جنگی اسلحہ سے مسلح تھے۔ (از کبیر)

طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

"فھزموھم" میں "فا" فصیحہ ہے۔اس ایک "فا" سے اتنا بڑا فائدہ حاصل ہورہا کہ اصل مفہوم یہ ہو گیا۔

"استجاب اللہ تعالٰی دعاء ھم فصبروا وثبتوا ونصروا فھزموھم"

مومنوں کی دعاء کو اللہ تعالٰی نے قبول فرمالیا، ان کو صبر عطاء کیا اوران کو ثابت قدم رکھا، اوران کی امداد کی گئی۔ توانہوں نے کفار کو شکست دے دی۔ (روح المعانی)

"باذن اللہ" کی باء میں تین احتمال ہیں کہ باء استعانۃ کے لئے ہو، یا سببیۃ کے لئے ہو، یا مصاحبۃ کیلئے ہو۔

استعانت والی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالٰی کے حکم اوراس کے ارادہ سے امداد طلب کرتے ہوئے مومنوں نے کفار کو شکست دی۔

سببیت والی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالٰی کے حکم کے سبب مومنوں نے کفار کو شکست دی۔ مصاحبت والی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالٰی کا حکم اور ارادہ ان کے ساتھ رہا، یعنی ان کا شامل حال رہا جس کی وجہ سے مومنوں نے کفار کو شکست دی۔ (روح المعانی)

"وقتل داؤد جالوت": "اور قتل کردیا داؤد نے جالوت کو"

حضرت داؤد علیہ السلام کے باپ کا نام ایشا (بکسر الھمزۃ) تھا، آپ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے یہودا کی اولاد میں سے تھے۔ آپ کے سات بھائی طالوت کے ساتھ جہاد میں شریک تھے، آپ ان سب سے چھوٹے تھے، بھیڑ بکریاں چراتے تھے، جب جنگ جاری تھی تو آپ کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ میں بھی جنگ ہوتے ہوئے دیکھوں، آپ جارہے تھے تو راستہ میں ایک پتھر نے آپ کو پکار کر کہا "یاداؤد خذنی فبی تقتل جالوت" اے داؤد تم مجھے لے لو میرے ساتھ جالوت کو قتل کروگے۔ پھر آپ آگے چلے، آپ کو ایک پتھر نے کہا مجھے لے لو۔ پھر آپ آگے

چلے، ایک اور پتھر نے آپ کو کہا مجھے اپنے پاس رکھ لو۔ آپ نے وہ تینوں پتھر اپنے تھیلے میں لے لئے، اسی طرح چلتے ہوئے آپ میدان جنگ میں پہنچ گئے، آپ نے میدان جنگ میں پہنچتے ہوئے اپنے بھائیوں کو کہا "امافیکم من یخرج الی هذاالاقلف" تم میں کوئی ایسا نہیں جو اس ختنہ نہ کئے ہوئے کو قتل کر دے۔

ادھر جالوت اپنے مقابلہ کے لئے کسی شخص کو طلب کر رہا تھا، ادھر طالوت اپنے لشکر میں اعلان کر رہے تھے جو شخص جالوت کو قتل کرے گا میں اس سے اپنی بیٹی کی شادی کر دوں گا اور اسے اپنی آدھی سلطنت دے دوں گا۔

" و کان جالوت اشدالناس واقواهم و کان یهزم الجیوش وحده "

جالوت بڑا بہادر شخص تھا جو اکیلے ہی بہت بڑے لشکر کو شکست دے دیتا تھا۔

اسی وجہ سے اس کے مقابلہ کے لئے نکلنے کے لئے کوئی تیار نہیں ہو رہا تھا کہ اس سے کیسے مقابلہ کیا جائے، حضرت داؤد علیہ السلام پتھر پھینکنے والا آلہ چلانے کے ماہر تھے، بکریوں کے ریوڑ میں اگر کوئی بھیڑیا وغیرہ آتا تو آپ اسی آلہ سے بھیڑیئے وغیرہ پر پتھر پھینک کر اسے بھگا دیتے یا مار دیتے۔

ادھر اللہ تعالیٰ کی قدرت سے آپ کے ساتھ تین پتھر کلام کر چکے تھے جو آپ نے اپنے تھیلے میں محفوظ کر لئے تھے، داؤد علیہ السلام نے طالوت کو کہا، جالوت کے مقابلہ میں نکلتا ہوں، لیکن طالوت نے خیال کیا کہ یہ تو بہت چھوٹی عمر کا نوجوان ہے اور اس کا قد بھی چھوٹا ہے، یہ بہت بڑے بہادر سے کیسے مقابلہ کرے گا، لیکن حضرت داؤد علیہ السلام کے بار بار مطالبہ کرنے پر اور لشکر میں سے کسی اور کے جرات نہ کرنے پر آپ کو طالوت نے اجازت دے دی۔ طالوت نے آپ کو سواری کے لئے گھوڑا دیا اور ایک زرہ دی، آپ نے زرہ پہن لی اور گھوڑے کی سواری اختیار کر لی تھوڑا آگے جا کر واپس لوٹ آئے " فقال الناس جبن الفتی "لوگوں نے سمجھا شائد جوان بزدل ہو گیا۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے کہا میں نے جالوت کو اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور اس کی امداد سے قتل کرنا ہے۔

" ان الله ان لم یقتله لی و یعنّی علیه لم ینفعنی هذاالفرس ولا هذاالسلاح "

اگر اللہ تعالیٰ نے میرے سبب سے اسے قتل نہیں کرنا اور میری امداد اس کے خلاف نہیں فرمائی تو مجھے گھوڑا اور ہتھیار کام نہیں آسکتے۔

میں اپنی عادت کے مطابق ہی اس پر پتھر پھینکنے والا آلہ سے اس پر پتھر پھینک کر اسے قتل کر دوں گا جیسا کہ میں بھیڑیئے وغیرہ کو پتھروں سے قتل کر دیتا ہوں۔

خیال رہے کہ آپ کے پتھر پھینکنے والے آلہ کو ''مقلاع'' کہا گیا ہے۔ اگر چہ ''مقلاع'' کا معنی غلیل بھی آتا ہے، لیکن غلیل سے بڑے پتھر نہیں پھینکے جا سکتے، بلکہ رسی کا بنا ہوا ایک آلہ ہوتا ہے جسے پنجابی میں کھبانی کہا جاتا ہے۔ راقم کے خیال میں اس قسم کا کوئی آلہ تھا کیونکہ اس سے بڑے پتھر بھی پھینکے جا سکتے ہیں ''واللہ اعلم بالصواب''

آپ نے اپنا پتھروں والا تھیلا لیا اور پتھر پھینکنے والا آلہ لیا، جالوت کے سامنے مقابلہ کے لئے پہنچ گئے۔ جالوت نے نوجوان کو دیکھ کر بڑے تعجب سے پوچھا ''انت تقاتلنی ؟ قال داؤد'' نعم'' ''کیا تو میرے ساتھ لڑائی کرے گا؟ آپ نے اسے بغیر کسی خوف و خطر کے بڑے اطمینان سے جواب دیا، ہاں میں ہی تمہارے ساتھ مقابلہ کروں گا۔

''قال ویلک ماخرجت الا کما تخرج الی الکلب بالمقلاع والحجارة لأبددن (لأمزقن) لحمک ولأ طعمنه الیوم للطیر والسباع''

جالوت نے حضرت داؤد علیہ السلام کو کہا، تیرے لئے بربادی تجھ پر افسوس ہے، تو تو پتھر لے کر اور پتھر پھینکنے والا آلہ لے کر ایسے نکلا ہے جیسے کسی کتے کو پتھر پھینک کر بھگا دیا جائے، تجھے میری طاقت اور بہادری کا علم نہیں، میں تمہارے گوشت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پرندوں اور درندوں کے سامنے پھینک دوں گا۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے بہت ہی پیارا جواب دیا۔'' بل انت عدو اللہ تعالٰی شر من الکلب'' کہ تو اللہ کا دشمن ہے اس لئے تو کتے سے بھی برا ہے، اسی وجہ سے میں نے کتے کو ہی مارنے کا سامان ساتھ لیا ہے۔ یہ کہتے ہی دونوں ایک دوسرے کے قریب ہو گئے، جالوت جدید اسلحہ سے دندناتا ہوا، غراتا ہوا میدان جنگ میں نکلا، ادھر اللہ کا بندہ سراپاءِ عجز بن کر اللہ تعالٰی پر بھروسہ کرتے ہوئے میدان جنگ میں آ گیا۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنا ہاتھ اپنے تھیلے میں ڈالا تا کہ پتھر نکالیں ''فروی انہ التأمت فصارت حجرا واحدا'' تو بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے جب وہ پتھر باہر نکالنا چاہا ہے تو وہ تینوں پتھر مل کر ایک پتھر بن چکا تھا۔

آپ نے اسے اپنے آلہ میں رکھا "فسمی الله و اداره ورماه" بسم اللہ شریف پڑھ کر اپنے آلہ کو گھمایا اور پتھر جالوت کی طرف پھینک دیا۔

"فاصابت بین عینیه حتی قعدت فی دماغه فصرخ جالوت وانهزم من معه واحتزرأسه"

وہ پتھر اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان جا لگا، جو اس کے دماغ میں گڑ گیا، تو جالوت چیخا چلایا، اس کے مرنے کے ساتھ ہی اس کا بہت بڑا لشکر بھاگ کھڑا ہوا، جالوت کا سر کاٹ لیا گیا۔

"وقتل بعده ناسا کثیرا" حضرت داؤد علیہ السلام نے پتھروں سے ہی جالوت کے بھاگتے ہوئے لشکر کے بہت تعداد میں لوگوں کو قتل کر دیا تھا۔ جالوت کے قتل ہونے پر مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، ہر طرف اللہ اکبر کے نعروں کی گونج تھی، اور حضرت داؤد علیہ السلام کو خراج تحسین پیش کیا جا رہا تھا۔

"لما رجع وفی با لشرط فانکح داؤد ابنة واجری خاتمه فی ملکه"

حضرت داؤد علیہ السلام جب جالوت کو قتل کر کے واپس لوٹے تو طالوت نے اپنے وعدہ کو پورا کر دیا، اپنی بیٹی کا آپ سے نکاح کر دیا، اور اپنی سلطنت میں آپ کو شریک کر دیا، آپ کی بھی بادشاہی مہر خطوط وغیرہ پر لگنی شروع ہوگئی۔

خیال رہے یہ تمام واقعہ، کبیر اور روح المعانی اور قرطبی سے لیا گیا ہے، پختہ باتوں کو نقل کر دیا گیا ہے اور ضعیف روایات کو چھوڑ دیا گیا ہے۔

تنبیہ: تینوں پتھر ایک اب نے قرطبی کی روایت کے مطابق پتہ چلتا ہے کہ تھیلے میں ہی تینوں ایک بن گئے تھے، لیکن نازان نے یوں بیان کیا کہ آپ نے پہلا پتھر "باسم الله ابراهیم" پڑھ کر نکالا، اور دوسرا پتھر "باسم الله اسحق" پڑھ کر تھیلے سے نکالا، اور تیسرا "باسم الله یعقوب" پڑھ کر نکالا، تینوں پتھر جب آپ نے پتھر پھینکنے والے آلہ میں ڈالے تو وہ تینوں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک بن گئے۔

"وآتاه الله الملک والحکمة": اور عطاء کی آپ کو اللہ نے سلطنت اور حکمت۔

حکمت سے مراد نبوت ہے۔

"جمع اللہ لداؤد بین الملک والنبوۃ ولم یکن کذلک من قبل بل کانت النبوۃ فی سبط والملک فی سبط"

اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو دونوں چیزیں یعنی بادشاہی اور نبوت عطاء کیں، حالانکہ اس سے پہلے یہ دونوں چیزیں کسی کو عطا نہیں کی گئی تھیں، نبوت ایک خاندان میں آرہی تھی اور سلطنت دوسرے خاندان میں آرہی تھی۔ اور حکمت کا معنی علم مع العمل بھی ہے، کہ آپ کو بادشاہت بھی عطاء کی گئی اور علم مع عمل بھی عطاء کیا گیا۔ یہ معنی پہلے معنی کے مخالف نہیں کیونکہ ہر نبی عالم باعمل ہوتا ہے۔ (ماخوذ از خازن)

سلطنت کا ذکر نبوت سے پہلے:

اللہ تعالیٰ نے آپ کو سلطنت پہلے عطاء کی اور اعلان نبوت کا حکم بعض میں دیا، اگرچہ نبی پیدائشی طور پر ہی نبی ہوتا ہے، یعنی جو چیز پہلے دی گئی اس کا ذکر بھی پہلے کیا گیا۔ اور وجہ یہ بھی ہے کہ سلطنت گھٹیا چیز ہے "ھذا للترقی من ذکر الادنی الی ذکر الاعلی" اس لئے ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی پائی گئی ہے۔ (از روح المعانی)

فائدہ: حکمت کا اصل معنی یہ ہے کہ تمام امور کو اپنی اپنی جگہ درست طریقہ سے رکھنا۔

"وکمال ھذا المعنی انما بالنبوۃ" حکمت کا کامل درجہ نبوت سے ہی حاصل ہوتا ہے، جس میں کوئی غلطی نہیں پائی جاتی، بلکہ ہر کام درست ہی درست ہوتا ہے۔ (کبیر)

"وعلمہ مما یشاء": "اور سکھایا آپ کو جو چاہا۔"

آپ کو زرہ بنانے کا علم دیا گیا:

"وعلم اللہ داؤد صنعۃ الدروع فکان یصنعھا ویبیعھا وکان لایاکل الا من عمل یدہ"

اللہ تعالیٰ نے آپ کو زرہ بنانے کا علم دیا، آپ زرہ بنا کر بیچتے تھے، اور اپنے ہاتھ کی کمائی سے فقط کھاتے تھے۔

پرندوں کی بولی:

" وقیل علمه منطق الطیر " اور یہ بھی بیان کی گیا ہے کہ آپ کو پرندوں کی بولیاں سمجھنے کا علم بھی عطاء کیا گیا تھا، اس کا ذکر بھی اس آیۃ کریمہ ہے۔

علم زبور: " وقیل علمه الزبور " آپ پر زبور کو نازل کیا گیا، اور زبور کا آپ کو علم عطاء کیا گیا۔ اس کا ذکر بھی اس آیۃ کریمہ میں موجود ہے۔

خوبصورت آواز: آپ کو اللہ تعالیٰ نے خوبصورت آواز عطاء فرمائی جو اس وقت کسی اور کو حاصل نہیں تھی، وہ کیسی پیاری اور خوبصورت آواز تھی؟

"اذا قرأ الزبور تدنو منه الوحوش حتی یؤخذ باعناقها وتظله الطیر مصیخة له ویرکد الماء الجاری وتسکن الریاح عند قراء ته"

جب آپ زبور پڑھتے تو آپ کی خوبصورت آواز کو سن کر وحشی جانور آپ کے قریب آجاتے تھے جنہیں آپ گردن سے پکڑ لیتے تھے، اور پرندے چہچہاتے ہوئے آپ کے سر پر سایہ کر لیتے تھے، پانی چلتا ہوا رک جاتا تھا، اور چلتی ہوا بھی رک کر آپ کے زبور کی تلاوت سنتی۔

ملکی سیاست:

"وقیل علمه سیاسة الملک وضبطه وذلک لا نه لم یکن من بیت الملک حتی یتعلمه من آبائه"

اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس آیۃ کریمہ میں ملکی سیاست کا ذکر عطاء کرنے کا بھی ذکر ہے، کیونکہ آپ کو بادشاہت اور سیاست کا علم آباء واجداد سے نہیں ملا تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے آپ کو یہ علم عطاء فرمایا۔

" ولولا دفع اللہ الناس بعضهم ببعض لفسدت الارض ":

" اور اگر نہ دفع کرے اللہ لوگوں کو بعض سے بعض کو ضرور زمین تباہ ہو جائے۔ "

اللہ تعالیٰ نے جالوت اور اس کے لشکر کے فساد پھیلانے کا ذکر فرمایا اور طالوت اور اس کے لشکر کے ذریعے

فساد کو دور کرنے کا ذکر فرمایا اور حضرت داؤد علیہ السلام کا جالوت کو قتل کرنے کا ذکر فرمایا، اس کے بعد یہ عام ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کے ذریعے بعض دوسرے لوگوں کو فساد سے دور کرتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر یہ مہربانی نہ فرماتا کہ بعض شر پسند لوگوں کا دوسرے لوگوں کے ذریعے دفاع نہ کرتا تو زمین ان کے فساد سے برباد ہو کر رہ جاتی۔

مدافعت کی مختلف صورتیں:

اللہ تعالیٰ انبیاء کرام اور ائمہ کرام اور علماء کرام کے ذریعے کافروں کے کفر کو دور کرکے، انہیں اسلام کی توفیق عطاء کرکے فساد کو دور کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اچھے کاموں کا حکم دینے والے اور برے کاموں سے روکنے والے علماء کے ذریعے گنہگاروں کے گناہوں کو دور کرتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ یہ مدافعت نہ فرماتا تو لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے زمین میں فساد پھیلتا اور زمین میں رہنے والے ہلاک ہو جاتے۔

"وتصديق هذا ماروى ان النبي ﷺ قال يدفع بمن يصلي من امتي عمن لا يصلي، و بمن يزكي عمن لا يزكي، وبمن يصوم عمن لا يصوم، وبمن يحج عمن لا يحج، و بمن يجاهد عمن لا يجاهد، ولو اجتمعوا على ترك هذه الاشياء لما انظرهم الله طرفة عين"

(اخرجه البيهقي، درمنثور)

مندرجہ بالا مسئلہ کی تصدیق اس روایت میں پائی جاتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، نمازی بے نمازی کا دفاع کرتا ہے زکوۃ دینے والا زکوۃ نہ دینے والے کا دفاع کرتا ہے، روزہ رکھنے والا روزہ نہ رکھنے والے کا دفاع کرتا ہے، حج کرنے والا حج نہ کرنے والے کا دفاع کرتا ہے، جہاد کرنے والا جہاد نہ کرنے والے کا دفاع کرتا ہے، اگر سب لوگ ان عبادات کو چھوڑنے والے ہوتے (کوئی ایک دوسرے کی عبادت کرنے کی نصیحت نہ کرنے والے ہوتے) تو اللہ تعالیٰ کسی ایک پر آنکھ جھپکنے کی مقدار میں بھی نظر رحمت نہ فرماتا۔ (از کبیر)

فائدہ: مدافعت کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین میں نیک بندے چالیس کی تعداد میں ابدال قائم رکھتا ہے، ان میں سے جب بھی کسی کا وصال ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسرے کو قائم کر دیتا ہے، ان کے ذریعے

اللہ تعالیٰ لوگوں سے فساد کو دور کرتا ہے۔

"روی عن علی رضی اللہ عنہ قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول ان الا بدال یکونو ن بالشام وھم اربعون رجلا کلما مات منھم رجل ابدل اللہ مکانہ رجلا یسقی بھم الغیث وینصربھم علی الاعداء ویصرف بھم عن اھل الارض البلاء"

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ بیشک ابدال شام میں پائے جاتے ہیں۔ وہ چالیس مرد ہوتے ہیں، جب کوئی شخص فوت ہو جائے تو اس کی جگہ دوسرے کو قائم کر دیا جاتا ہے، ان کے ذریعے رب تعالیٰ بارش عطاء فرماتا ہے اور دشمن پر مسلمانوں کو کامیابی اور امداد ان کے ذریعے ہی عطاء فرماتا ہے اور ان کے ذریعے ہی اللہ تعالیٰ مصیبتوں کو دور فرماتا ہے۔ (ذکرہ الحکیم الترمذی فی نو اد رالاصول)

"وخرج ایضا عن ابی الدرداء قال ان الانبیاء کانو ااوتا د الارض فلما انقطعت النبوۃ ابدل اللہ مکانھم قوما من امۃ محمد ﷺ یقال لھم الابدال لم یفضلو االناس بکثرۃ صوم و لاصلوۃ ولکن بحسن الخلق و صدق الورع حسن النیۃ وسلا مۃ القلوب لجمیع المسلمین والنصیحۃ لھم ابتغاء مرضا ۃ اللہ"

حضرت ابوالدرداء فرماتے ہیں انبیاء کرام زمین میں اوتاد تھے جب نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بدل نبی کریم ﷺ کی امت سے ابدال بنائے' ان کو فضیلت زیادہ (نفلی) نمازوں اور (نفلی) روزوں سے حاصل نہیں، ان کو فضیلت اچھے اخلاق' اور نیکی میں خلوص اور تمام مسلمانوں کے لئے دل میں سلامتی اور اللہ کی رضا مندی حاصل کرنے کے لئے ان کو نصیحت کرنے کی وجہ سے حاصل ہے۔ (از قرطبی)

وعن النبی ﷺ قال ان للہ ملائکۃ تنادی کل یو م لولا عباد رکع واطفال رضع وبھائم رتع لصب علیکم العذاب صبا"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ کے فرشتے ہر دن آواز دیتے ہیں' اگر اللہ کے بندے رکوع والے

نہ ہوتے (یعنی عبادت کرنے والے نہ ہوتے) اور دودھ پینے والے بچے نہ ہوتے اور چرنے والے جانور نہ ہوتے، البتہ تم پر بہت بڑا عذاب نازل ہوتا۔

مطلب واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ مستحقین عذاب مومنوں سے نیک بندوں اور دودھ پینے والے معصوم بچوں اور چرنے والے جانوروں کی وجہ سے عذاب دور فرما دیتا ہے، مستحقین عذاب سے عذاب کو دور کرنا دفاع ہی ہے۔

ایک اور حدیث میں معمولی الفاظ کا فرق ہے، مفہوم تقریباً یہی ہے۔

"عن عبداللہ قال قال رسول ﷺ لولافیکم رجال خشع وبهائم رتع وصبیان رضع لصب العذاب علی المؤمنین صبا"

حضرت عبداللہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم میں خشوع کرنے والے شخص نہ ہوتے (یعنی عبادت میں خشوع کرنے والے نہ ہوتے) اور چرنے والے چوپائے نہ ہوتے اور دودھ پینے والے بچے نہ ہوتے تو البتہ (گنہگار) مومنوں پر عذاب نازل ہوتا۔

یعنی نیک بندوں اور اور معصوم بچوں اور جانوروں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ گنہگار مؤمنین مستحقین عذاب کو عذاب سے نجات دے دیتا ہے۔ان احادیث کا ترجمہ کسی شاعر نے شعر میں پیش کیا، اردو ترجمہ وہی ہے جو دومرتبہ پیش کیا جا چکا ہے۔

لو لا عباد للاله رکع — و صبية من اليتامى رضع

ومهملات فی الفلاة رتع — صب علیکم العذاب الاوجع

"وروی جابر ان رسول اللہ ﷺ قال ان اللہ لیصلح بصلاح الرجل ولدہ وولد ولدہ واھل دویرتہ ودویرات حولہ ولا یزالون فی حفظ اللہ مادام فیھم"

(اخرج ابن جریر، درمنثور)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ایک نیک شخص کی نیکیوں کی وجہ سے اس کی اولاد اور اس کی اولاد کی اولاد اور اس کے گھر والوں اور اس کے گھر کے اردگرد رہنے والوں کو بھی نیک بنا دیتا ہے اور جب تک وہ شخص ان لوگوں میں موجود ہے اللہ تعالیٰ ان کو

اپنی حفاظت میں رکھتا ہے۔

"وقال قتادة يبتلى الله المؤمن بالكافر ويعافى الكافر بالمومن"

حضرت قتادہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ مومن کو کافر کی وجہ سے آزمائش میں مبتلا کر دیتا ہے، اور کافر کو مومن کی وجہ سے معاف کر دیتا ہے۔

یعنی کبھی کافر عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں تو دنیا میں ان کے عذاب کی تکالیف میں مومن بھی مبتلا ہو جاتے ہیں، اگر چہ مومن کے لئے وہ تکالیف باعث راحت بنتی ہیں، کیونکہ ان مدارج بلند ہوتے ہیں، اوران کے گناہ معاف ہوتے ہیں اور کبھی کفار دنیا میں عذاب کے مستحق ہوتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کسی مومن کی وجہ سے انہیں بھی دنیاوی عذاب سے محفوظ رکھ لیتا ہے، تاہم ان کو اخروی عذاب ہونا ہی ہونا ہے۔

"وقال ابن عمر قال الينى ﷺ ان الله ليد فع بالمومن الصالح عن مائة من اهل بيته و جيرانه البلاء"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نیک مومن کی وجہ سے اس کے گھر کے اور پڑوسیوں کے سوافراد سے مصیبتوں سے دور فرماتا ہے۔ (ماخوذ از قرطبی)

گذشتہ سے پیوستہ:

"اخرج الطبرانی عن ابن مسعود قال قال رسول الله ﷺ لا يزال ار بعون رجلا من امتى قلو بهم على قلب ابراهيم عليه السلام يدفع الله بهم عن اهل الارض يقال لهم الابدال انهم لن يدر كو هابصلوة ولا بصوم ولا بصد قة قالوايارسول الله فيم ادر كوها قال بالسخاء والنصيحة للمسلمين"

طبرانی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی وہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت میں چالیس مرد ہمیشہ رہیں گے، جن کے دل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح ہوں گے! ان کی وجہ سے اللہ زمین والوں سے مدافعت فرمائے گا، ان کو ابدال کہا جائے گا، ان کو

یہ مقام (نفلی) نمازوں اور روزوں اور صدقات سے نہیں ملے گا۔ صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ! ان کو یہ مرتبہ کیسے ملے گا؟ آپ نے فرمایا سخاوت اور مسلمانوں کو نصیحت کرنے اور مسلمانوں سے خلوص سے درپیش آنے سے ملے گا۔ (درمنثور)

☆ " واخرج الطبرانی فی الکبیرعن عبادة بن الصامت قال قال رسول اللہ ﷺ الا بدال فی امتی ثلاثون بھم تقوم الارض وبھم تمطر ون وبھم تنصرون "

طبرانی نے معجم کبیر میں عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی وہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت میں تیس ابدال ہوں گے جن کی وجہ سے زمین قائم رہے گی اور ان کی وجہ سے بارش ہوگی، اور ان کی وجہ سے ہی تمہاری امداد کی جائے گی۔ (درمنثور)

نیک لوگوں ہی کی وجہ سے دین قائم ہے:

"عن معاویةبن ابی سفیان سمعت رسول اللہ ﷺ یقول لا تزال طائفة من امتی قائمة بامر اللہ لایضرھم من خذلھم او خالفیھم حتی یاتی امر اللہ وھم علی ذلک"

(بخاری مسلم، ابن ماجة)

حضرت معاویہ ابن ابی سفیان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا، میری امت میں سے ایک گروہ ہمیشہ اللہ کے امر پر قائم رہے گا، ان کو کسی کے رسواء کرنے یا کسی کی مخالفت کی کوئی پرواہ نہیں ہوگی اور ان کو کسی کی مخالفت سے کوئی نقصان نہیں ہوگا، یہاں تک کے اللہ کا امر آجائے (یعنی ان کو موت آجائے) وہ لوگوں پر غالب رہیں گے۔ (درمنثور)

یعنی اللہ کے نیک بندے کسی کی ملامت اور رسوائی کی پرواہ کے بغیر ہی موت تک دین حق پر قائم رہیں گے اور ان کو غلبہ حاصل ہوگا۔

☆ "عن ابی ھریرة ان رسول اللہ ﷺ قال لا تزال طائفة من امتی قوامة علی امر اللہ عزوجل لا یضرھا من خالفھا" (ابن ماجة)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت میں سے ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا، ان کوکسی کی مخالفت سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ (درمنثور)

☆ "عن عمر بن الخطاب قال قال رسول الله ﷺ لا تزال طائفة من امتی ظاهرين على الحق حتى تقوم الساعة " (اخرجه الحاكم و صححه)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت میں ایک گروہ ہمیشہ قیامت تک قائم رہے گا۔ (درمنثور)

☆ " عن جابر بن سمرة قال قال رسول الله ﷺ لا يزال هذا الدين قائما يقاتل عليه المسلمون حتى تقوم الساعة " (اخرجه مسلم والحاكم وصححه)

حضرت جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ دین ہمیشہ قیامت تک رہے گا اور مسلمان دین کی سربلندی کے لئے قیامت تک جہاد کرتے رہیں گے۔ (درمنثور)

☆ " عن عمران بن حصين ان رسول الله ﷺ قال لا تزال طائفة من امتی يقاتلون على الحق ظاهرين على من ناواهم حتى يقاتل آخرهم المسيح الدجال "
(اخرجه ابو داؤد والحاكم وصححه)

عمران بن حصین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت میں سے ایک گروہ ہمیشہ دین حق کی خاطر جہاد کرتا رہے گا اور ان کو دشمنوں پر غلبہ حاصل رہے گا، یہاں تک کے ان کا آخری شخص مسیح دجال کو قتل کرے گا۔ (درمنثور)

☆ "عن عقبة بن عامر قال سمعت رسول الله ﷺ يقول لا تزال عصابة من امتی يقاتلون على امر الله قاهرين لعدو هم لا يفرهم من خالفهم حتى تأتيهم الساعة وهم على ذلک" (اخرجه مسلم)

حضرت عقبہ بن عامر کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا، میری امت میں سے ایک جماعت ہمیشہ اللہ کے دین کی خاطر جہاد کرتی رہے گی، ان کو دشمن پر غلبہ حاصل رہے گا، ان

کو کسی کی مخالفت نقصان نہیں پہنچائے گی، یہ سلسلہ قیامت تک یوں ہی چلتا رہے گا وہ اسی پر قائم رہیں گے۔ (در منثور)

☆ "عن ابی هريرة عن النبی ﷺ قال ان الله يبعث لهذه الامة على رأس كل مائة سنة من يجدد لها دينها" (اخرجه ابو داؤد والحاكم وصححه)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ اس میری (امت) کے لئے ہر سو سال کے بعد ایک شخص کو بھیجتا ہے جو دین (میں واقع ہونے والی رخنہ اندازیوں) کی تجدید فرماتا ہے۔ (در منثور)

"ولكن الله ذو فضل على العالمين":

"لیکن اللہ تعالیٰ فضل فرمانے والا ہے تمام جہانوں پر۔"

یعنی اللہ تعالیٰ کا مؤمنوں کے ذریعے کافروں کے شر کو مندفع کرنا، یہ اس کا فضل اور اس کی نعمت ہے۔ (قرطبی)

رب تعالیٰ نے اپنی صفت " ذو فضل " ذکر فرما کر واضح کر دیا کہ رب تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں، بعض لوگوں کے ذریعے بعض کے شر مندفع (دور) کرنا صرف اس کے فضل کی وجہ سے ہے پھر رب تعالیٰ نے یہ ذکر فرمایا کہ "اللہ تمام جہانوں پر فضل فرمانے والا ہے" واضح کر دیا کہ اس کا فضل صرف کافروں کے شر مندفع کرنے میں بند نہیں، اس کا فضل تو بہت وسیع ہے، جہان والوں کی جو ضروریات بھی درپیش آتی ہیں اللہ تعالیٰ کا فضل ان تمام میں پایا جاتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ کے فضل کا احاطہ کرنا ممکن بھی نہیں۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی "ولولا دفع الله الناس بعضهم ببعض لفسدت الارض" قیاس استثنائی شرطی اتصالی ہے۔ اس مقام میں استثناء نقیض مقدم کا پایا گیا ہے۔ جس سے نتیجہ نقیض تالی آرہا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے بعض سے بعض کو مندفع کر دیتا ہے، استثناء نقیض مقدم اور نتیجہ نقیض تالی کی عبارت یہ بن گئی۔

"(ولولا دفع الله الناس بعضهم ببعض لفسدت الارض)ولکنه تعالٰی یدفع فساد بعضهم ببعض فلا تفسد الارض وینتظم به مصالح العالم و یصلح احوال الامم"

لیکن اللہ تعالٰی بعض کے فساد کو بعض کے ذریعے مندفع کر دیتا ہے، یہ ہے استثناء نقیض مقدم کا، اور اس کا نتیجہ یہ ہے زمین میں بربادی وفساد نہیں ہوتا اور جہان کی مصلحتوں میں نظام پایا جاتا ہے اور قوموں کے احوال درست رہتے ہیں۔

اعتراض : اس مسئلہ پر مفتی دیار رومیہ نے اعتراض کیا ہے کہ قیاس استثنائی شرطی اتصالی کا نتیجہ دو طرح آتا ہے استثناء وضع مقدم نتیجہ وضع تالی۔ اور استثناء نقیض تالی نتیجہ نقیض مقدم، لیکن یہ بیان کرنا کیسے صحیح ہے کہ یہاں استثناء نقیض مقدم نتیجہ نقیض تالی؟

جواب : دو طرح نتیجہ کا آنا جو منطقی حضرات بیان کرتے ہیں وہ قاعدہ کو کلیہ بنانے کے لئے کیونکہ کبھی مقدم اور تالی میں نسبت عموم وخصوص کی پائی جاتی ہے، وہاں نتیجہ دو طرح ہی آتا ہے جو اعتراض میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن جب مقدم اور تالی میں نسبت مساوات کی ہو تو وہاں نتیجہ چار طرح آسکتا ہے، استثناء عین مقدم نتیجہ عین تالی۔ استثناء نقیض مقدم نتیجہ نقیض تالی۔ استثناء عین تالی نتیجہ عین مقدم۔ استثناء نقیض تالی نتیجہ نقیض مقدم۔

طلباء کرام معمولی توجہ سے "کلما کانت الشمس طالعة فالنهار موجود" میں چار نتیجے نکال سکتے ہیں۔

اس مثال کو مدنظر رکھتے ہوئے قرآن پاک کی اس آیۂ کریمہ میں چار نتیجے نکال سکتے ہیں، کیونکہ عدم مدافعت اور فساد میں مساوات پائی گئی ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

فائدہ : " ولکن الله ذو فضل علی العالمین" سے یہ مسئلہ واضح ہو گیا "ان الکل بقضاء الله تعالٰی" سب چیزیں اللہ تعالٰی کی قضاء وقدر میں ہیں اور تمام چیزیں اللہ تعالٰی کی مخلوق ہیں۔

اگر بندے کے افعال اللہ تعالٰی تخلیق میں نہ آئیں، بلکہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہو، معتزلہ کے مذہب کے مطابق تو......

"لم یکن دفع المحققین شر المبطلین فضلا من اللہ تعالیٰ علی اھل الدنیا لان المتولی لذلک الدفع اذا کان ھو العبد من قبل نفسه وباختیاره ولم یکن اللہ تعالیٰ فی ذلک الدفع اثر اصلا البتة"

حق پر قائم لوگوں کے ذریعے باطل لوگوں کے شر کو مندفع کرنا، دنیا والوں پر اللہ تعالیٰ کا فضل نہ ہوتا بلکہ بندے خود اپنے اختیار سے اپنے نفسوں کے والی ہوتے اور اس اندفاع میں اللہ تعالیٰ کا کوئی اثر ہی بالکل نہ پایا جاتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے جب فرمایا کہ یہ اللہ کا فضل ہے اور اللہ تعالیٰ کا ہر طرح کا فضل تمام جہانوں پر پایا جاتا ہے تو واضح ہو گیا کہ معتزلہ کا یہ کہنا کہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے، باطل ہے، صحیح مذہب وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں اہل سنت و جماعت کا ہے کہ ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، وہی بندوں کے افعال کا بھی خالق ہے۔ (از کبیر)

☆☆☆☆☆

تِلْکَ آیَاتُ اللهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْکَ بِالْحَقِّ وَاِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ☆

(سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۵۲)

﴿۱﴾ یہ اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں کہ ہم اے محبوب تم پر ٹھیک ٹھیک پڑھتے ہیں اور تم بیشک رسولوں میں ہو۔

﴿۲﴾ یہ آیتیں ہیں اللہ کی، ہم تلاوت کرتے ہیں ان کو آپ پر حق سے، اور بیشک آپ رسولوں سے ہیں۔

"تلک آیات اللّٰہ": "یہ آیتیں ہیں اللہ کی۔"

"تلک" کا اشارہ ہے ان واقعات کی طرف جن کا ذکر پہلے کیا گیا ہے، ہزاروں لوگوں کا گھروں سے نکلنا اور ان پر موت کا واقع ہونا اور ان کو زندہ کرنا اور طالوت کو قیادت عطاء کرنا، اور طالوت کی قیادت و بادشاہت پر آسمانوں سے تابوت کو نازل کر کے نشانی بنانا، اور جابر بادشاہ اور اس کے لشکر کو ایک فقیر بچے حضرت داؤد علیہ السلام اور بہت قلیل تعداد میں طالوت کے لشکر سے شکست دینا۔

"ولاشک ان ھذه الاحوال آیات باھرة دالة علی کمال قدرة اللہ تعالیٰ وحکمة ورحمة"

یقیناً یہ تمام احوال اللہ تعالیٰ کی واضح اور روشن دلیلیں اور روشن نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی کامل قدرت اور اس کی حکمت ورحمت پر دلالت کر رہی ہیں۔ (کبیر)

دینی طلبہ کرام کی توجہ کے لئے:

بظاہر یہاں اعتراض ہوتا ہے کہ "تلک" کا اشارہ غائب کے لئے ہوتا ہے یہ واقعات تو قریب ہی حاضر کے درجہ میں ہیں، ان کی طرف اشارہ "ھذہ" سے ہونا چاہئے تھا نہ کہ "تلک" سے۔

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کے کبھی کبھی "تلک" کو "ھذہ" اور "ذلک" کو "ھذا" کے درجہ میں رکھ لیا جاتا ہے، اس لئے "تلک" کا معنی "ھذہ" کا ہے۔ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے بھی "تلک" کا معنی "یہ" کیا ہے "وہ" نہیں کیا، یعنی آپ کا ترجمہ اسی جواب کے مطابق ہے، راقم نے بھی یہی ترجمہ نقل کیا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کے یہ واقعات گذر جانے کی وجہ سے درجہ غائب میں چلے گئے، لہٰذا "تلک" اشارہ بعید کا ذکر صحیح ہے۔ لیکن اس جواب کے مطابق "تلک" کا ترجمہ "وہ" ہوگا۔ (از کبیر)

تیسرا جواب یہ ہے کے جب عظیم واقعات کا ذکر ہو تو وہاں اشارہ بعید کا لایا جاتا ہے، اس لحاظ پر ترجمہ یہ ہوگا یہ اللہ کی بہت بڑی نشانیاں ہیں۔ راقم کے نزدیک یہ ترجمہ بھی بہت خوب ہے۔

"نتلوھا علیک بالحق": "ہم تلاوت کرتے ہیں ان کو آپ پر حق سے۔"

"علیک" کا خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے، اگر چہ قرآن پاک آپ پر جبریل کے واسطہ سے نازل ہوا، یہاں بھی مراد یہی ہے۔

"لکنہ تعالیٰ جعل تلاوۃ جبریل علیہ السلام تلاوۃ لنفسہ وھذا تشریف عظیم لجبریل علیہ السلام"

لیکن اللہ تعالیٰ نے جبریل کی تلاوت کو اپنی طرف منسوب کر کے جبریل کو شرف عظیم (بہت بڑا مرتبہ) عطاء فرمایا۔ جیسا کہ...... "ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ"

بیشک وہ لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔...... میں نے نبی کریم ﷺ سے صحابہ کرام کے بیعت کرنے کو اپنی بیعت قرار دے کر نبی کریم ﷺ کا عظیم مرتبہ ذکر فرمادیا۔ (کبیر)

" بالحق " میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ یہ حال واقع ہو " نتلوھا " کی ضمیر منصوب سے، اب معنی یہ ہوگا، ہم تلاوت کرتے ہیں وہ آیتیں جو آیتیں حق ہیں، ان میں نہ اہل کتاب شک کر سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی مورخ شک کر سکتا ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ حال واقع ہو فاعل سے، اب معنی یہ ہوگا کہ ''ہم تلاوت کرتے ہیں آپ پر وہ آیتیں، ہمارا تلاوت کرنا حق ہے۔ (از تفسیر ابی السعود)

فائدہ : "بالحق" ذکر کر کے چند فوائد پر مطلع فرمادیا، ایک یہ کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کی امت پر یہ واضح کیا گیا کہ پہلی امتوں میں سے نیک مخلص مومن حضرات نے جہاد میں شدائد پر صبر کیا اور مصائب کو برداشت کیا، صبر و استقامت سے ثابت قدم رہے، لہٰذا آپ کا اور آپ کی امت کا زیادہ حق ہے کہ تم بھی جہاد کی مشقوں کو برداشت کرو۔

اور "بالحق" سے یہ ثابت کیا گیا کہ آپ پر جو واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ حق ہیں، یقینی ہیں، ان میں کوئی شک نہیں۔

" لا یشک فیہ اھل الکتاب لأنہ فی کتبھم کذلک من غیر تفاوت اصلا "

ان واقعات میں اہلِ کتاب کو بھی شک نہیں ہو سکتا، کیونکہ ان کی کتب میں بھی یہ واقعات اسی طرح ہیں، ان میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں۔

اور یہ فائدہ حاصل ہو رہا ہے کہ یہ آیات نبی کریم ﷺ کی نبوت پر دلالت کر رہی ہیں، کیونکہ ان میں فصاحت و بلاغت پائی گئی ہے، یعنی قرآن پاک میں فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ معیار پایا گیا ہے، ایسا معیار کسی فصیح و بلیغ شاعر اور صاحب علم کے کلام میں نہیں پایا گیا، اسی فصاحت و بلاغت کو دیکھ کر نامور بلغاء قرآن پاک کے معاملہ میں عاجز آگئے۔

اور یہ واضح کیا کہ آپ پر آیات کو حق سے نازل کیا گیا ہے، لہٰذا تمام لوگوں کو یقینی طور پر معلوم ہو جانا چاہئے کہ یہ آیات آپ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں، یہ (معاذ اللہ) شیطان کی طرف سے آپ کے دل میں نہیں ڈالی

گئیں ہیں اور نہ ہی جادوگروں اور کاہنوں کی طرف سے آپ کو عطاء کی گئیں۔ (ماخوز از کبیر)

''وانک لمن المرسلین'': ''اور بیشک آپ رسولوں میں سے ہیں۔''

ان الفاظ مبارکہ کے ذکر کرنے سے چند فوائد حاصل ہوئے، ایک یہ کہ آپ نے ان واقعات کی خبر دی، جبکہ آپ نے کسی انسان سے کوئی تعلیم حاصل نہیں کی اور نہ ہی کسی مکتب و مدرسہ میں پڑھا۔

'' وذلک یدل علی انه ﷺ انما ذکرها وعرفها بسبب الوحی من الله تعالیٰ ''

یہ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ آپ نے یہ واقعات وحی کے ذریعے پہچانے اور ان کو بیان فرمایا۔

ان واقعات کے ذریعے اور یہ ثابت کیا گیا کہ پہلے انبیاء کرام کی امتیں ان کی مخالفت کرتی رہیں، اور ان کے اقوال کو رد کرتی رہیں۔

'' فلا یعظمن علیک کفر من خالف علیک لأنک مثلهم ''

لہٰذا آپ کے ساتھ بھی کفر کرنے والوں کا کوئی عجیب اور عظیم کام نہیں، اور آپ کی بھی مخالفت کریں گے اس لئے کہ نفس نبوت میں آپ بھی پہلے انبیاء کرام کی مثل ہیں۔

تمام انبیاء کرام کو بھیجنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ اپنے منصبِ رسالت کے مطابق اللہ تعالیٰ کے احکام بندوں تک پہنچائیں، اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو خود بھی اپنی خوشی سے بغیر کسی جبر کے تسلیم کریں اور لوگوں کو بھی اسی کی تبلیغ فرمائیں۔

نبی کریم ﷺ کافروں کے کفر اور منافقوں کی منافقت سے بہت پریشان ہوتے تھے، آپ کو تسلی دی گئی کہ آپ بھی اللہ کے رسولوں میں سے ایک برگزیدہ رسول ہیں، انبیاء کرام سے لوگ کفر کرتے رہے اور ان کی مخالفت کرتے رہے، لیکن انبیاء کرام پر کوئی عتاب نہیں ہوا، بلکہ وہ لوگ رب تعالیٰ کے عذاب کے مستحق ہوئے، اسی طرح آپ سے کفر کرنے والے اور مخالفت کرنے والے رب تعالیٰ کی گرفت میں آئیں گے، آپ پر کسی قسم کا کوئی عتاب نہیں ہوگا۔ (از کبیر)

نتیجہ: اللہ تعالیٰ نے ہر سرکش ظالم قوم کے مظالم کو روکنے کے لئے اپنے نیک بندوں کو ان کے مقابل قائم کر دیا، جنہوں نے ظالموں کا قلع قمع کیا، تمام انبیاء کرام باطل کا مقابلہ کرتے آئے، نبی کریم ﷺ کی شریعت کے

قانون جہاد کے خلاف اٹھنے والی زبانیں، یہود ونصاریٰ کے مخالفانہ اور بیہودہ اقوال کو رد کر دیا کہ تم حضرت داؤد علیہ السلام کو نبی مانتے ہو اور ان کے جہاد کو بھی تسلیم کرتے ہو، لیکن نبی کریم ﷺ کے جہاد پر اعتراض کرتے ہو، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نبی مانتے ہو اور ان کا باطل سے یعنی نمرود مقابلہ کرنے کو بھی مانتے ہو، لیکن نبی کریم ﷺ کے جہاد پر اعتراض کرتے ہو۔

اے یہودیو! تم موسیٰ علیہ السلام کو نبی بھی مانتے ہو اور ان کا فرعون اور اس کے ماننے والوں سے مقابلہ کرنا بھی مانتے ہو، لیکن نبی کریم ﷺ کے جہاد پر اعتراض کرتے ہو۔ اس سے تو صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ سوائے ضد اور مخالفت برائے مخالفت کے تمہارا اور کوئی نظریہ نہیں۔

آجکل پاکستان میں بھی یہود ونصاریٰ کے پیروکار نام نہاد مسلمان جہاد کی مخالفت کر رہے ہیں۔ لیکن ان شاء اللہ وہ ذلیل ہوتے چلے جائیں گے، غالب میرے حبیب پاک ﷺ کا ارشاد ہی رہے گا کہ جہاد قیامت تک جاری رہے گا۔ آخری جہاد مسیح دجال کو قتل کرنے سے ہوگا، ان شاء اللہ حق ہی غالب رہے گا، باطل مٹتا چلا جائے گا۔

الحمد للہ آج دوسرے پارے کا ترجمہ اور تشریحات کو مکمل کرنے کی اللہ تعالیٰ نے سعادت نصیب فرمائی۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے یہ توفیق شامل حال رکھے کہ اس سے آگے بھی قرآن پاک کے ترجمہ وتشریحات کا کام جاری رکھ سکوں۔ آمین ثم آمین۔

عبدالرزاق بھتر الوی، حطاروی

ابن قاضی عبد العزیز ابن قاضی فیض احمد ابن قاضی غلام نبی رحمہم اللہ

اتوار، بوقت سحر، ۱۸ جنوری ۲۰۰۴ء ۲۵ ذیقعد ۱۴۲۴ھ

تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ مِنْهُمْ مَّنْ کَلَّمَ اللّٰہُ
وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ، وَاٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَاَیَّدْنٰهُ
بِرُوْحِ الْقُدُسِ، وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِیْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ
الْبَیِّنٰتُ وَلٰکِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ کَفَرَ وَلَوْ شَآءَ
اللّٰہُ مَا اقْتَتَلُوْا وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَفْعَلُ مَا یُرِیْدُ☆ (سورۃالبقرۃآیت،۲۵۳)

﴿۱﴾

یہ رسول ہیں کہ ہم نے ان میں ایک کو دوسرے پر افضل کیا ان میں سے کسی سے اللہ نے کلام فرمایا اور کوئی وہ ہے جسے سب پر درجوں بلند کیا اور ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو کھلی نشانیاں دیں اور پاکیزہ روح سے اس کی مدد کی اور اللہ چاہتا تو ان کے بعد والے آپس میں نہ لڑتے بعد اس کے کہ ان کے پاس کھلی نشانیاں آ چکیں لیکن وہ مختلف ہو گئے ان میں کوئی ایمان پر رہا اور کوئی کافر ہو گیا اور اللہ چاہتا تو وہ نہ لڑتے مگر اللہ جو چاہے کرے۔

﴿۲﴾

یہ رسول ہیں فضلیت دی ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر، ان میں سے بعض وہ ہیں جن سے اللہ نے کلام فرمایا، اور بلند کئے ان میں کسی بعض کے درجے، اور ہم نے عطاء کیں عیسیٰ ابن مریم کو کھلی نشانیاں، اور مدد کی ہم نے اس کی پاکیزہ روح سے اور اگر چاہتا اللہ تو نہ لڑتے وہ لوگ جو ان کے بعد ہوئے اس کے بعد کہ آ گئیں

ان کے پاس نشانیاں لیکن انہوں نے اختلاف کیا تو ان میں سے بعض ایمان پر رہے اور بعض ان میں سے کافر ہو گئے، اور اگر چاہتا اللہ تو نہ لڑتے، لیکن اللہ کرتا ہے جو ارادہ کرتا ہے۔

مختصر مطلب:

یہ رسول ہیں جن کا اے محبوب آپ کو علم عطاء کر دیا گیا، ان میں سے بعض کو بعض پر ہم نے درجات کے لحاظ پر فضیلت دی، یعنی انبیاء اکرام کو ایک دوسرے پر فضیلت دی اور ان میں سے بعض سے اللہ تعالیٰ نے براہ راست بغیر واسطہ جبریل کے کلام فرمایا، وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں اور ان میں کسی شخصیت کے یعنی آپ کے درجات ہم نے سب سے بلند فرمائے، اور عیسیٰ ابن مریم کو کھلی نشانیاں اور ظاہری معجزات عطا فرمائے اور ان کو روح قدس یعنی جبریل سے تائید دی۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو انبیاء کرام کے بعد ان کی امتیں آپس میں نہ لڑتیں جب ان کے پاس کھلی نشانیاں اور دلائل بھی آ چکے تھے، لیکن وہ آپس میں ایک دوسرے کے مخالف ہو گئے، کئی لوگ ان میں سے اپنے ایمان پر قائم رہے اور کئی لوگ ان میں کافر ہو گئے اگر اللہ چاہتا تو وہ نہ لڑتے، لیکن وہی کرتا ہے جو چاہتا ہے۔

ماقبل سے تعلق:

اس سے پہلے ذکر کیا گیا" انک لمن المرسلین" بے شک آپ رسولوں میں سے ہیں۔ اس سے وہم ہو سکتا تھا کہ شائد سارے رسول ایک ہی مرتبہ کے ہوں گے، تو اس آیۃ کریمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ بعض کو بعض پر درجات کے لحاظ پر فضیلت دی گئی اور سب سے افضل نبی کریم ﷺ کو بنایا گیا۔ (ماخوذ از روح المعانی)

"تلک الرسول فضلنا بعضھم علی بعض":

"یہ رسول ہیں فضیلت دی ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر۔"

" تلک " ذکر کیا ہے، جو مونث ہے، مذکر اشارہ نہیں ذکر کیا، اس لئے کہ یہ رسولوں کی جماعت کی طرف

اشارہ ہے۔اس اشارہ میں تین احتمال ہیں۔

ایک یہ کہ اس سے پہلے جن انبیاء کرام کا ذکر ہو چکا ہے ان کی طرف اشارہ ہو، وہ حضرت آدم، حضرت ابراہیم، حضرت اسمٰعیل، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب حضرت اشموئیل اور حضرت داؤد علیہم السلام۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ اشارہ ہو قریب ذکر ہونے والے انبیاء کرام کی طرف، وہ فقط حضرت اشموئیل علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام ہیں۔

تیسرا احتمال یہ ہے کہ اشارہ ہو ان انبیاء کرام کی طرف جو فساد کو دور کرنے کے لئے تشریف لائے، وہ سارے انبیاء کرام ہیں کیونکہ تمام انبیاء کرام تشریف ہی اس لئے لائے ہیں کہ وہ فساد کو دور کریں۔

تنبیہ: قرآن پاک میں چند انبیاء کرام کا ذکر ہے تمام انبیاء کرام کا ذکر نہیں، اس کا ذکر انشاء اللہ " **منهم من قصصنا عليك ومنهم من لم نقصص عليك** " کی وضاحت میں آئے گا۔

انبیاء کرام کی تعداد کا مختلف روایات کی وجہ سے اگر چہ ہمیں یقین نہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نبی کریم ﷺ کو بھی علم نہیں تھا اور تفصیلی طور پر انبیاء کرام کے واقعات کو نہ ذکر کرنے کا بھی یہ مطلب نہیں کہ آپ پر بذریعہ وحی کئی انبیاء کرام علیہم السلام کے حالات ظاہر نہیں کئے گئے اگر بذریعہ وحی آپ کو خبر دی جاتی تو ہمیں بھی علم حاصل ہوتا یہ کہنا درست نہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ کے اپنے علم کا یہ عالم ہے۔

" انه ﷺ يخرج من الدنيا حتى علمه الله بجميع مغيبات الدنيا والآخرة ولكن امر بكتم اشياء منها " (صاوی، حاشیہ جلالین (زیر آیۃ "يسئلونك عن الساعة ايان مرساها")

بیشک نبی کریم ﷺ اس وقت تک دنیا سے تشریف نہیں لے گئے یہاں تک کہ اللہ نے آپ کو دنیا اور آخرت کے تمام غیبی علوم عطاء فرما دیئے، البتہ بعض چیزوں کو چھپانے کا آپ کو حکم دیا گیا تھا۔

اجماع امت:

"اجمعت الأمة على ان بعض الانبياء افضل من بعض، وعلى أن محمد ﷺ افضل من الكل"

اس مسئلہ میں تمام امت کا اتفاق ہے کہ بے شک بعض انبیاء کرام بعض سے افضل ہیں۔ اور اس پر بھی اجماع امت ہے کہ ہمارے نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ تمام انبیاء کرام سے افضل ہیں۔

اعتراض : نبی کریم ﷺ نے فرمایا " لا تفضلوا بین الانبیاء " انبیاء کرام کو ایک دوسرے پر فضیلت نہ دو، اور دوسری حدیث شریف میں آپ کا ارشاد گرامی ہے " لا تخیرونی علی موسی " مجھے موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت نہ دو، ان احادیث کو دیکھ کر یہ کہنا کیسے صحیح ہے کہ نبی کریم ﷺ تمام انبیاء کرام سے افضل ہیں۔

پہلا جواب : نبی کریم ﷺ نے بعض اوقات کلام عاجزانہ فرمایا اور بعض اوقات حقیقت حال کو بیان فرمایا، جن احادیث میں فضیلت نہ دینے کا ذکر ہے وہ آپ کا عاجزانہ کلام ہے۔ اور حقیقت حال کو آپ نے یوں بیان فرمایا۔

"عن ابی سعید قال قال رسول اللہ ﷺ انا سید ولد آدم یوم القیامة ولا فخر وبیدی لواء الحمد ولا فخر ومامن نبی یومئذ آدم فمن سواہ الاتحت لوائی"

(مشکوۃ باب فضائل سید المرسلین)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تمام انسانوں کا قیامت کے دن سردار ہوں گا، اس پر کوئی فخر نہیں اس دن تمام نبی آدم علیہ السلام اور ان کے سوا میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔

وضاحت حدیث:

"سید" جو تمام قوم سے فضیلت و خیریت میں برتر ہو اسے سید کہتے ہیں، اسی طرح اور سید کا مطلب یہ ہے۔

" ھو الذی یفزع الیہ فی النوائب والشدائد فیقوم با مرھم ویتحمل عنھم مکارھھم ویدفعھا عنھم " (نووی شرح مسلم کتاب الفضائل جلد ثانی)

"سید" اسے کہتے ہیں جس کی طرف قوم اپنے مصائب و آلام میں پناہ پکڑے وہ ان کی حاجات کو پورا کرے، خود مشقتیں برداشت کر کے ان کی تکالیف کو دور کرے۔

"ولد آدم"

ظاہر طور پر اس کا معنی "اولاد آدم" ہے یعنی تمام اولاد آدم پر مجھے سیادت وفضیلت حاصل ہے۔ لیکن اس پر بظاہر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اس حدیث پاک سے نبی کریم ﷺ کی افضلیت آدم علیہ السلام پر ثابت نہیں ہوسکتی، ہاں آپ کی اولاد پر جب آپ کی افضلیت ثابت ہوگی تو باقی تمام انبیاء کرام پر افضلیت ثابت ہو جائے گی کیونکہ وہ تمام آدم علیہ السلام کی اولاد میں داخل ہیں۔

تو اس کا ایک جواب یہ دیا گیا " **فانهم يستعملون ولد آدم بمعنى نوع الانسان** " (نبراس)

عربی زبان والے "ولد آدم" بمعنی نوع انسان کے لیتے ہیں۔

یعنی عام محاورہ کے مطابق معنی صرف اولاد آدم نہیں بلکہ معنی یہ ہے کہ میں تمام انسانوں کا قیامت کے دن سردار ہوں گا۔
اس معنی کے لحاظ پر نبی کریم ﷺ کی افضلیت حضرت آدم علیہ السلام پر بھی واضح طور پر ثابت ہوگئی۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ......

" **ان لحديث تتمة موضحة للمطلوب وهو قوله عليه السلام ومامن نبي يو مئذ آدم فمن سواه الاتحت لوائي** "

کہ مطلب کو واضح کرنے کے لئے حدیث پاک کے آخری الفاظ سے تکمیل ہو رہی ہے کہ آدم علیہ السلام اور ان کے سواء تمام انبیاء کرام میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔

جب تمام انبیاء کرام اور خصوصاً حضرت آدم علیہ السلام بھی نبی کریم ﷺ کے جھنڈے کے نیچے پناہ لینے پر مجبور ہوں گے تو اسی سے واضح ہو گیا کہ آپ کو حضرت آدم علیہ السلام پر بھی فضیلت حاصل ہوگی۔ (نبراس)

"یوم القیامة":

نبی کریم ﷺ نے قیامت کے دن کا ذکر فرمایا کہ مجھے قیامت کے دن سرداری حاصل ہوگی۔ حالانکہ آپ کو دنیا میں بھی تمام پر سیادت حاصل ہے، پھر قیامت کے دن کے ذکر کرنے کا کیا مطلب؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قیامت میں آپ کی فضیلت تمام پر ظاہر ہو جائے گی۔

" ان فی یو م القیامة یظهر سو دده لکل احد ولا یبقی مناز ع ولا معا ند " (نو وی)

بے شک قیامت کے دن آپ کی برتری سب پر ظاہر ہو جائے گی، کوئی جھگڑا کرنے والا جھگڑا نہیں کرے گا، اور کوئی شخص عناد نہیں کرے گا۔

دنیا کا ذکر اس لئے نہیں فرمایا کہ دنیا میں کفار اور مشرکین نے آپ کی افضیلت کو تسلیم نہیں کیا، دنیا میں اگرچہ بہت لوگ آپ کے وسیلہ جلیلہ کے بغیر براہ راست خدا تک رسائی حاصل کرنے کے دعویدار ہیں، لیکن قیامت کے دن تمام کو ہی میرے پیارے مصطفیٰ ﷺ کا ہی وسیلہ تلاش کرنا پڑے گا۔

جب تمام امتوں کو انبیاء کرام فرمائیں گے " اذ هبو ا الی غیر ی "کسی اور کے پاس جاؤ اس کا وسیلہ تلاش کرو، اس وقت میرے پیارے حبیب پاک ﷺ کی زبان مبارک پر ہوگا " انا لها " اس شفاعت کا میں ہی حق دار ہوں۔ اس وقت آپ کی شان رسالت کی فوقیت واضح ہو جائے گی، کسی کو انکار کرنے کی گنجائش نہیں ہوگی۔

نبی کریم ﷺ کا قیامت کا ذکر کرنا ایسے ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "لمن الملک الیوم لله الواحد القهار" آج کس کی بادشاہی ہے؟ اللہ واحد قہار کی۔ اگرچہ آج بھی ہر قسم کی بادشاہی اسی کو حاصل ہے، اور تمام چیزیں اس کی ملکیت ثابت کرتی ہیں، اسی طرح مجازاً لوگوں کی طرف ملکیت کا ثبوت پیش کیا جاتا ہے، لیکن قیامت کے دن تمام کی ملکیتیں ختم ہو جائیں گی۔ کوئی شخص بھی کسی چیز کے مالک ہونے کا دعویٰ نہیں کرے گا اور نہ ہی مجازاً کوئی شخص کسی چیز کا مالک ہوگا، صرف اللہ تعالیٰ ہی کی بادشاہی ہوگی۔ نہ کوئی شخص اس کا انکار کرے گا اور نہ ہی اپنی ملکیت کا دعویٰ کر سکے گا۔

"ولا فخر":

"ای ولا اقوله تفاخرا بل اعتدادا بفضله وتحدثا بنعمته وتبلیغا لما امرت به "

یعنی میں اپنی سیادت و برتری اور افضیلت کوئی فخر و تکبر کے طور پر نہیں بیان کر رہا بلکہ اللہ تعالیٰ کے

فضل اور نعمت کو بیان کرنے کے لئے ذکر کر رہا ہوں اور جس چیز کا مجھے حکم دیا گیا ہے میں وہ امت کو پہنچانے کے لئے ذکر کر رہا ہوں کہ امت مجھے پہچان لے۔

یعنی نبی کریم ﷺ نے اپنی سیادت کو دو وجہ کے پیش نظر بیان کیا۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ آپ پر اپنے مراتب بیان کرنے ضروری ہوتے ہیں تا کہ آپ کی امت آپ کو پہچان لے اور آپ پر اعتقاد رکھے اور آپ کی عزت و تکریم کرنے کا جس طرح اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا اسی طرح اس پر عمل کر سکے۔

دوسری وجہ یہ ہے ''امتثالا لا مر اللہ تعالٰی و اما بنعمة ربک فحدث'' آپ نے اپنے مراتب اللہ تعالیٰ کے حکم کی تابعداری کرتے ہوئے بیان فرمائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

'' و اما بنعمة ربک فحدث'' اپنے رب کی نعمتوں کو خوب بیان کرو۔ (از نووی)

تنبیہ : آیۃ کریمہ اور حدیث پاک میں تطبیق ثابت کی جا رہی ہے اور یہ بیان کیا جا رہا کہ نبی کریم ﷺ نے انبیاء کرام کی افضلیت سے کیوں منع فرمایا اور یہ کیوں فرمایا کہ مجھے موسیٰ علیہ السلام پر برتری نہ دو۔

اس کا ایک جواب ذکر کیا جا چکا ہے اس کو علامہ نووی رحمہ اللہ نے ان الفاظ سے بیان فرمایا۔

''قالہ ادبا و تواضعا'' نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد دوسرے انبیاء کرام کے ادب و احترام کے ثابت کرنے کے لئے اور اپنی عاجزی کے اظہار کے لئے فرمایا۔

دوسرا جواب : ''انہ ﷺ قال قبل ان یعلم انہ سید ولد آدم فلماعلم اخبر بہ'' اس کی اور وجہ یہ ہے کہ یہ ارشاد آپ کا ہے کہ مجھے موسی علیہ السلام پر فضیلت نہ دو، اس علم سے پہلے کا ہے جس میں آپ کی تمام انسانوں کی سرداری کا بیان ہے، جب آپ کو یہ علم حاصل ہو گیا تو آپ نے اپنی حقیقت حال کا ذکر بھی فرما دیا۔

اکثر اہل سنت و جماعت کے نزدیک آپ کا علم تدریجی ہے، کیونکہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا'' وللاخرة خیر لک من الاولی '' آپ کی ہر آنے والی گھڑی بہتر ہے پہلی سے۔

آپ کو وقتاً فوقتاً روز بروز علوم غیبیہ پر مطلع فرمایا جاتا رہا یہاں تک کہ آپ کو لوح محفوظ کے تمام علوم عطاء فرما دیئے گئے۔

انبیاء کرام پر فضیلت دینے کی ممانعت کا قول آپ کا پہلے کا ہے، جب آپ کو یہ علم عطا کر دیا گیا کہ آپ کو تمام مخلوق پر سیادت حاصل ہے تو پھر آپ نے دوسرا ارشاد فرمایا" انا سید ولد آدم" میں تمام انسانوں کا سردار ہوں۔

تیسرا جواب:" والثالث ان النهی انماهوعن تفضیل یو دی الی تنقیص المفضول"

آیۂ کریمہ اور حدیث پاک میں تطبیق کے متعلق جو سوال کیا گیا تھا اس کا تیسرا جواب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایسی فضیلت دینے سے منع کیا جس کی وجہ سے دوسرے انبیاء کرام کی شان میں تنقیص لازم آئے۔

اصل میں موسی علیہ السلام پر برتری دینے کی ممانعت کی وجہ ہی یہ تھی کہ ایک یہودی ذمی نے کہا " ان اللہ اصطفی موسی" بے شک اللہ نے موسی علیہ السلام کو برگزیدہ بنایا۔ اس کے ان الفاظ کو سن کر ایک صحابی نے اسے تھپڑ مار دیا کہ نبی کریم ﷺ ہم میں موجود ہیں پھر بھی تو کہہ رہا ہے اللہ تعالیٰ نے موسی علیہ السلام کو اللہ نے برگزیدہ بنایا۔

اس ذمی نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کیا کہ آپ نے ہمارے مال اور جان کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھائی، لیکن آپ کے صحابی نے مجھے تھپڑ مار دیا۔ نبی کریم ﷺ نے جب اس کی وجہ پوچھی اور آپ کو بتایا گیا اس یہودی نے یہ کہا تھا" ان اللہ اصطفی موسی" بے شک اللہ نے موسی علیہ السلام کو چن لیا، برگزیدہ بنایا، تو اس پر صحابی کو طیش آیا۔ تو میرے پیارے مصطفیٰ ﷺ نے اس وقت یہ فرمایا" لا تخیر ونی علی موسی" مجھے موسی علیہ السلام پر برتری نہ دو۔

اس کا مطلب ہی واضح ہے کہ موسی علیہ السلام بھی اللہ کے نبی ہیں۔ اللہ کے نبی باقی مخلوق پر افضل ہوتے ہیں۔ لہٰذا موسی علیہ السلام کی فضیلت بیان کرنے سے غصہ نہ کیا جائے، یہ انداز جو اختیار کیا گیا ہے درست نہیں، کیونکہ ایک نبی کی ایسی فضیلت بیان کرنا جس سے دوسرے نبی کی تنقیص لازم آئے، یہ منع ہے۔

فائدہ: جب اس جواب سے یہ مطلب واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ کی ایسی فضیلت بیان کرنا منع ہے جس سے دوسرے انبیاء کرام کی شان میں کمی لازم آئے اور ان کی توہین کا پہلو نکلے۔

اسی سے یہ فائدہ بھی حاصل ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شان اور وحدانیت اس طرح بیان کرنا جس سے انبیاء کرام اور اولیاء کرام کی شان میں کمی لازم آئے یقیناً وہ منع ہے، بتوں کے حق میں جن آیات کو نازل کیا گیا ہے ان کو اولیاء کرام اور انبیاء کرام پر چسپاں کرنا، اور کافروں کے حق میں نازل ہونے والی آیات کو مومنوں پر چسپاں کرنا ظلم عظیم

ہے، اور اپنے ہی ایمان کو ضائع کرنا ہے۔

اس سے اور یہ فائدہ بھی حاصل ہوا کہ خارجیوں کی طرح صحابہ کرام کی ایسی شان بیان کرنا جس سے اہل بیت اطہار کی شان میں گستاخی کا پہلو نکلے وہ شان صحابہ مردود ہوگی اور رافضیوں کی طرح اہل بیت کی ایسی شان بیان کرنا جس سے صحابہ کرام کی شان میں گستاخی پائی جائے اور صحابہ کرام کی شان میں تنقیص لازم آئے تو وہ شان اہل بیت بھی مردود ہوگی۔ ہاں اگر اہل بیت اور صحابہ کرام کی شان میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے درجہ میں رکھے تو یہی ایمان ہے۔

چوتھا جواب: " والرابع انما نهى عن تفضيل يو دى الى الخصومة والفتنة "

نبی کریم ﷺ نے جس فضیلت دینے سے منع فرمایا اس سے مراد یہ ہے کہ انبیاء کرام کو ایک دوسرے پر ایسی فضیلت نہ دو جو جھگڑے کا سبب بنے۔ جیسا کہ ذمی اور صحابی کے درمیان جھگڑا ہوا، جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

پانچواں جواب : "والخامس ان النهى مختص با لتفضيل فى نفس النبوة فلا تفا ضل فيها وانما التفاضل با لخصائص وفضائل اخرى ولابد من اعتقاد التفضيل فقد قال الله تعالىٰ تلک الرسل فضلنا بعضهم على بعض"

پانچواں جواب یہ ہے کہ جس فضیلت سے منع کیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ نفس نبوت میں ایک دوسرے کو فضیلت نہ دو، کیونکہ تمام انبیاء کرام نفس نبوت میں برابر ہیں۔ البتہ خصائص اور کمالات وغیرہ سے ایک دوسرے پر فضیلت رکھتے ہیں۔ اس طرح انبیاء کرام کا بعض کا بعض پر افضل ہونے کا اعتقاد رکھنا بھی ضروری ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود بعض انبیاء کرام کی فضیلت دوسرے انبیاء کرام پر " تلک الرسل فضلنا بعضهم على بعض" سے بیان کر دی تو اس میں شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ (ماخوذ از نووی و مرقاۃ و قرطبی)

تنبیہ : جب واضح ہو گیا کہ تمام انبیاء کرام نفس نبوت میں برابر ہیں تو یہ کہنا خود بخود باطل ہو جائے گا کہ نبی کریم ﷺ موصوف بوصف نبوت بالذات ہیں اور سوائے آپ کے اور نبی موصوف بوصف نبوت بالعرض

ہیں۔نہیں نہیں! بلکہ سب انبیاء کرام نبوت سے متصف بالذات ہیں۔کسی نبی کی نبوت بالعرض نہیں۔اس مسئلہ کو کوئی تفصیل سے دیکھنا چاہے تو غزالی دوراں حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ کے رسالہ " البتشیر بر التحذیر" کا مطالعہ کرے۔

افضیلت مصطفی ﷺ پر دلائل:

(۱) اللہ تعالیٰ نے آپ کی شان میں فرمایا "وما ارسلناک الا رحمة للعلمین" (پ ۱۷،الانبیاء آیة ۱۰۷)
اور ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر سب جہانوں کے لئے رحمت بنا کر۔
" فلما كان رحمة لكل العالمين لزم ان يكون افضل من كل العالمين "
جب آپ تمام جہانوں کے لئے رحمت ہیں تو یقینی طور پر آپ تمام جہانوں سے افضل ہیں۔
یعنی آپ افضل المخلوقات ہیں۔"بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" یعنی مختصر بات یہی ہے کہ خدا کے بعد سب سے افضل آپ ہی ہیں۔

(۲) رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "ورفعنالک ذکرک" (پ ۳۰،الانشراح آیة ۴)
اور ہم نے تمہارے لئے تمہارا ذکر بلند کیا۔
مالک الملک نے اپنے ذکر کے ساتھ نبی کریم ﷺ کے ذکر کو متصل کیا،کلمہ شہادت میں،اذان میں،اور تشہد وغیرہ میں۔" ولم يكن سائر الانبياء كذلك" اور باقی تمام انبیاء کرام کا ذکر اس طرح نہیں،لہٰذا اس سے ثابت ہوا کہ آپ افضل الانبیاء ہیں۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے آپ کی اطاعت کو اپنی اطاعت کے ساتھ ملایا اور فرمایا۔
"من يطع الرسول فقداطاع الله" (پ ۵ النساء آیتہ ۸۰)
جس نے رسول کا حکم مانا بیشک اس نے اللہ تعالیٰ کا حکم مانا۔آپ کی بیعت کو رب تعالیٰ نے اپنی بیعت قرار دیا اور فرمایا۔
" ان الذين يبايعونک انما يبايعون الله يد الله فوق ايديهم "(پ ۲۶.سورۃ الفتح آیة ۱۰)

بیشک وہ جوتمہاری بیعت کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ سے بیعت کرتے ہیں ان کے ہاتھوں پر اللہ تعالیٰ کا دست قدرت ہے

اور آپ کی عزت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عزت کے ساتھ ذکر فرمایا۔

" وللّٰہِ العزۃ ولرسولہ وللمو منین" (پ۲۸ ,المنافقون آیۃ۸)

اور عزت تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور مسلمانوں کے لئے ہے۔

اور آپ کی رضا کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا کے ساتھ ذکر فرمایا۔

"واللہ ورسولہ احق ان یر ضو ہ" (پ۱۰ ,التوبہ آیۃ۶۲)

اور اللہ اور اس کے رسول کا حق زائد ہے کہ انہیں راضی کریں۔

رب قدوس نے آپ کے بلانے پر حاضر ہونے کو اپنے بلانے پر حاضر ہونے کے ساتھ ذکر فرمایا۔

"یاایھاالذین امنو ااستجیبو اللہ وللرسول" (پ۹ ,الانفال آیۃ۲۴)

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے بلانے پر حاضر ہو۔

یہ عظمت صرف نبی کریم ﷺ کو ہی حاصل ہے دوسرے انبیاء کرام کو حاصل نہیں۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو حکم دیا کہ آپ قرآن پاک کی ہر سورۃ سے چیلنج کریں، کون شخص ہے جو قرآن پاک کی سورۃ جیسی سورۃ بنا کر لائے۔ " فاتو بسورۃ من مثلہ "تو اس جیسی ایک سورۃ تو لے آؤ۔

سب سے چھوٹی سورۃ کوثر ہے جس میں تین آیتیں ہیں تو گویا اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعے ہر تین آیتوں سے چیلنج کیا لیکن وہ مقابلہ کرنے سے عاجز آ گئے تو جب قرآن پاک میں چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ آیات ہیں تو ہر تین تین آیتیں جب معجزہ ہیں تو صرف قرآن پاک ہی دو ہزار بائیس معجزات پر مشتمل ہے، باقی معجزات علیحدہ ہیں اور جب موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نو معجزات عطاء کئے ہیں تو واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ کو کثیر معجزات کی وجہ سے تمام انبیاء کرام پر افضلیت حاصل ہے۔

(۵) نبی کریم ﷺ کا معجزہ یعنی قرآن پاک تمام انبیاء کرام کے معجزات سے افضل ہے۔ لہٰذا ہمارے رسول پاک کا تمام انبیاء کرام سے افضل ہونا بھی ثابت ہے، چونکہ قرآن پاک کو تمام کلاموں میں اولیت حاصل ہے جیسے

آدم علیہ السلام کو تمام انسانوں پر اولیت حاصل ہے (لیکن بحیثیت بشری وجود کے، حقیقت کے لحاظ سے نبی کریم ﷺ کو ہی اولیت بھی حاصل ہے) اور یہ بھی واضح ہے کہ لباس اعلیٰ ہو تو لباس والے کو شان حاصل ہوتی ہے تو ایسا کیوں نہ ہو کہ معجزہ اعلیٰ ہو تو صاحب معجزہ بھی اعلیٰ ہو۔

(۶) باقی تمام انبیاء کرام کے معجزات فانی تھے، انبیاء کرام علیہم السلام جب دنیا سے تشریف لے گئے تو ان کے معجزات بھی ساتھ ہی ختم ہو گئے۔ لیکن حضور ﷺ کا معجزہ قرآن پاک ہمیشہ کے لئے باقی ہے، یقینی بات ہے کہ باقی رہنے والی چیز اعلیٰ ہے فنا ہونے والی سے، لہٰذا جس کو وہ معجزہ ملا جو باقی رہنے والا ہے تو اس ذات کا بھی بلند مرتبہ ماننا ضروری ہے۔

(۷) تمام انبیاء کرام کو جو کمالات انفرادی طور پر حاصل تھے وہ تمام نبی کریم ﷺ کو حاصل تھے اس لئے آپ تمام انبیاء کرام سے افضل ہیں، اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کے احوال ذکر کرنے کے بعد فرمایا، " **اولئک الذین هدی الله فبهد اهم اقتداه** " یہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی تو تم ان کی راہ پر چلو۔

اس آیۃ کریمہ میں نبی کریم ﷺ کو پہلے انبیاء کرام کی اقتداء کا حکم دیا گیا ہے، اب یہ دیکھنا ہے کہ اس کا مطلب کیا ہے؟

اگر یہ کہا جائے کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ پہلے انبیاء کرام کی اصول دین میں اقتداء کریں تو یہ درست نہیں کیونکہ یہ تقلید ہے اور اصول دین میں تقلید نہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ آپ کو پہلے انبیاء کرام کی فروع دین میں اقتداء کا حکم دیا گیا ہے تو یہ بھی درست نہیں، کیونکہ آپ کی شریعت پہلی شریعتوں کی ناسخ ہے تو اقتداء کا اور کوئی مطلب نہیں سوائے اس کے " **فلم یبق الاان یکون المرادمحاسن الاخلاق** " کہ اس سے مراد اچھے اخلاق اور کمالات ہوں۔

گویا کہ رب تعالیٰ نے حضور ﷺ کو فرمایا ہم آپ کو انبیاء کرام علیہ السلام کے احوال و عادات پر مطلع کرتے ہیں آپ ان کے اچھے اور احسن اخلاق و عادات کو اپنے لئے پسند فرمالیں اور ان کی ان عادات میں اقتداء کریں۔

"**وهذا یقتضی انه اجتمع فیه من الخصال المرضیة ماکان متفرقا فیهم فوجب ان یکون افضل منهم**"

اس بحث سے واضح ہوا کہ تمام اچھی عادات جو تمام انبیاء کرام کو متفرق طور پر حاصل تھیں وہ آپ کو اجتماعی طور پر حاصل ہوئیں، لہٰذا آپ تمام انبیاء کرام سے افضل ہیں۔

یہ بھی خیال رہے کہ انبیاء کرام کو حاصل ہی اچھی عادات تھیں، کوئی بری عادت حاصل نہیں تھی، لہٰذا آپ کو تمام انبیاء کرام کے تمام کمالات ہی حاصل تھے۔

(۸) نبی کریم ﷺ کو تمام مخلوق کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا، رب تعالیٰ نے فرمایا۔

"وما ارسلناک الا کافۃ للناس بشیرا ونذیرا" (پ ۲۲، السباء آیۃ ۲۸)

"اور اے محبوب ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام لوگوں کے لئے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا رسول بنا کر"

جتنے زیادہ امتی ہوں اتنی ہی زیادہ مشقت نبی پر ہوتی ہے، نیکیوں کے کاموں میں جتنی مشقت زیادہ برداشت کی جائے اسی قدر مراتب بلند ہوتے ہیں اور خصوصاً جب انسان کو مال حاصل نہ ہو اور دوست، یار، مددگار نہ ہوں اور پھر لوگوں کو کہے " یا ایھا الکافرون" (پ ۳۰، الکافرون) اے کافرو۔

یہ سن کر لوگ دشمن بن جائیں تو یہ کتنا خوف کا مقام ہے جو بہت بڑی مشقت کا ذریعہ ہے، اور یہ بھی خیال رہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو جب نبوت عطاء کر کے بھیجا گیا تو آپ کے دشمن صرف فرعون اور فرعون کی قوم کے لوگ تھے، لیکن بنی اسرائیل آپ کا ساتھ دینے والے تھے۔

لیکن ادھر نبی کریم ﷺ کو دیکھیں آپ کے تمام لوگ ابتدائی طور پر مخالف تھے یہی وجہ کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کرام پر فضیلت دی اور خیال رہے کہ نبی کریم ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آپ اپنی ساری عمر رات دن کے طویل اوقات میں انسانوں اور جنوں کو اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچائیں اور خصوصاً ایسے حالات میں ان کی عادت کے مطابق حالات بالکل واضح تھے کہ یہ تو آپ سے دشمنی کریں گے آپ کو تکالیف پہنچائیں گے، معاذ اللہ آپ کو حقیر سمجھیں گے۔

ان حالات کے ہوتے ہوئے بھی نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے میں کوئی تاخیر نہیں کی، بلکہ جلدی ہی اللہ تعالیٰ کے احکام آپ نے پہنچائے اور عظیم مشقتیں آپ نے برداشت کیں، عظیم مشقت برداشت کرنا افضلیت کا سبب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ سے پہلے ایمان لانے والے صحابہ کرام کی بعد میں ایمان لانے والوں سے افضلیت بیان کی، اس کی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے تکالیف برداشت کیں، اس وجہ سے وہ افضل ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"لایستوی منکم من انفق من قبل الفتح وقاتل" (پ ۲۷، الحدید، آیۃ ۱۰)

تم میں برابر نہیں جنہوں نے فتح مکہ سے قبل خرچ کیا اور جہاد کیا۔

صحابہ کرام جنہوں نے زیادہ مشقتیں برداشت کیں جب وہ دوسروں سے زیادہ افضل ہیں تو یقیناً وہ نبی جنہوں نے سب انبیاء کرام سے زیادہ تکالیف اٹھائیں سب انبیائے کرام سے زیادہ فضیلت کے مالک ہیں۔

(۹) نبی کریم ﷺ کا دین تمام دینوں سے افضل ہے، تو آپ کا سب انبیائے کرام سے افضل ہونا بھی ضروری ہے، چونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے دین کو دوسرے تمام دینوں کے لئے منسوخ کرنے والا بنایا تو یہ ظاہر ہے کہ جو دین دوسرے دینوں کو منسوخ کردے وہ افضل دین ہے۔ اور آپ کے دین کی افضلیت آپ کے اس قول سے بھی ثابت ہے۔

"من سن فی الاسلام سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها الی یوم القیامة"

جس شخص نے اسلام میں اچھا طریقہ ایجاد کیا تو اس کو اس ایجاد پر اجر حاصل ہوگا، اور قیامت تک جتنے لوگ اس پر عمل کریں گے ان کے اعمال کے مطابق اجر بھی اسے ملے گا۔

جب آپ کے دین میں اجر و ثواب زیادہ ہے اور خصوصاً "کان واضعه اکثر ثوابا من واضعی سائر الادیان" آپ کے دین میں اچھا طریقہ ایجاد کرنے والے کو زیادہ ثواب حاصل ہوتا ہے جو دوسرے دینوں میں اس طرح نہیں۔

"فیلزم ان یکون محمد ﷺ افضل من سائر الانبیاء"

تو اس سے ضروری ہوگیا کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو تمام انبیائے کرام پر فضیلت حاصل ہو۔

(۱۰) نبی کریم ﷺ کی امت تمام امتوں سے افضل ہے تو یقیناً آپ کو بھی سب انبیاء کرام پر افضلیت حاصل ہے، آپ کی امت کی شان کو رب تعالیٰ نے ان الفاظ مبارکہ سے بیان فرمایا۔

"کنتم خیر امة اخرجت للناس" تم بہتر ہو ان سب امتوں میں جو لوگوں میں ظاہر ہوئیں۔

آپ کی امت کو بہتری اور فضیلت کیوں حاصل ہے؟ اس لئے کہ یہ نبی کریم ﷺ کے تابع ہیں اور آپ کی تابعداری کی وجہ سے ہی دوسری امتوں سے افضل ہے، اور اللہ تعالیٰ کی محبوب ہے۔

رب تعالیٰ نے فرمایا۔

"قل ان کنتم تحبون اللّٰہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ" (پ ۳، البقرۃ، آیۃ ۳۱)

اے محبوب تم فرماؤ کہ لوگو اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میرے فرمانبردار ہو جاؤ اللہ تعالیٰ تمہیں دوست رکھے گا۔

جب آپ کی امت کو آپ کی تابعداری کی وجہ سے افضلیت اور اللہ تعالیٰ کی محبت اور دوستی حاصل ہوگئی تو آپ کی ذات کا بھی سب انبیائے کرام سے افضل ہونا ثابت ہوگیا۔

نیز نبی کریم ﷺ تمام جنوں اور انسانوں کے نبی بن کر تشریف لائے تو آپ کو اجر وثواب زیادہ حاصل ہوا، انسان کے مدارج کی بلندی اجر وثواب کی زیادتی پر ہے، اسی وجہ سے جتنے لوگ آپ کی دعوت کو قبول کرنے والے زیادہ ہوں گے اسی قدر آپ کے مراتب بلند ہوں گے، یہ شان دوسرے انبیاء کرام کو حاصل نہیں۔

فائدہ: "عن ابن مسعود قال قال رسول اللّٰہ ﷺ اولی الناس بی یوم القیامۃ اکثرھم علیّ صلوۃ" (ترمذی، مشکوۃ باب صلوۃ النبی ﷺ)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگوں میں سے قیامت کے دن میرے نزدیک وہ شخص ہوگا جو مجھ پر زیادہ درود شریف پڑھنے والا ہوگا۔

اس حدیث کی شرح میں علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

" اولی الناس ای اقربھم بی او احقھم بشفاعتی یوم القیامۃ اکثرھم علی صلوۃ لان کثرۃ الصلوۃ منبئۃ عن التعظیم المقتضی للمتابعۃ الناشئۃ عن المحبۃ الکاملۃ المرتبۃ علیھا محبۃ اللّٰہ تعالٰی قال قال تعالٰی" قل ان کنتم تحبون اللّٰہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ ویغفر لکم ذنوبکم" (مرقاۃ ج ۲ ص ۳۴۰)

"اولی" کا معنی ہے " اقرب " ایک تو اس کا ظاہری معنی ہے کہ آپ پر زیادہ درود پڑھنے والے کو بنسبت دوسرے لوگوں کے جنت میں قریب مقام حاصل ہوگا اور دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ شخص میری خصوصی شفاعت کا زیادہ مستحق ہوگا، نبی کریم ﷺ پر زیادہ درود شریف وہی پڑھے

گا جس کے دل میں آپ کی تعظیم پائی جائی گی، اور جس شخص کو آپ کی عظمت کا خیال ہوگا وہ آپ کی تابعداری بھی کرے گا، آپ کی تابعداری وہی شخص کامل طور پر کرتا ہے جسے محبت کاملہ حاصل ہوتی ہے، جسے نبی کریم ﷺ سے کامل محبت حاصل ہوتی ہے وہی درحقیقت اللہ تعالیٰ کا محبوب ہوتا ہے، رب تعالیٰ نے فرمایا ''اے محبوب آپ فرمادیں کہ لوگو اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میرے فرمانبردار ہو جاؤ اللہ تعالیٰ تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا''۔

سبحان اللہ! نتیجہ کتنا واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے محبت کے بغیر رب تعالیٰ سے محبت نہیں ہو سکتی اور نہ ہی رب تعالیٰ کو اس سے محبت ہوگی، صرف نام سے توحیدی کہلانے سے کچھ نہیں بنتا اگر تو نے اپنی عاقبت سنوارنی ہے تو آ، سید الانبیاء کا غلام بن جا تو یہ بھی کہتا رہے کہ نبی کریم ﷺ کو علم غیب حاصل نہیں تھا، وہ دیوار کے پیچھے کا علم نہیں رکھتے تھے، ان کا مرتبہ ہمارے بڑے بھائی جیسا تھا، وہ کسی اختیار کے مالک نہیں تھے، وہ تو ہم جیسے بشر تھے، اس قسم کے لغویات زبان سے نکالتا رہے اور پھر یہ بھی کہے کہ ہمیں نبی کریم ﷺ سے محبت ہے تیری اس بات پر کون اعتبار کرے۔

آج لے ان کی پناہ آج مدد مانگ ان سے
کل نہ مانیں گے قیامت میں اگر مان گیا

(۱۱) نبی کریم ﷺ خاتم النبیین ہیں، جب آپ کے ذریعہ سلسلہ نبوت ختم ہوگیا یعنی آپ کی آمد سے انبیاء کرام کی تشریف آوری منسوخ ہوگئی تو یقینی بات ہے کہ وہ دوسروں کی آمد کا ناسخ بن سکتا ہے جو سب سے افضل ہو یہ عقل کے خلاف ہے کہ کم مرتبہ والا اعلیٰ کی آمد کو منسوخ کردے۔

(۱۲) بعض انبیاء کرام کو بعض پر معجزات کی وجہ سے فضیلت حاصل ہے، کثرت معجزات ان کی صداقت اور بزرگی پر دلالت کرتے ہیں، جب نبی کریم ﷺ کو تمام انبیاء کرام سے زیادہ معجزات حاصل ہیں تو آپ کو فضیلت بھی سب سے زیادہ حاصل ہے، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ حضور ﷺ کا بظاہر ایک معجزہ قرآن پاک ہی تین ہزار سے زائد معجزات پر مشتمل ہے۔

''ومنها ما يتعلق بالقدرة'' پھر بعض معجزات آپ کو وہ حاصل ہیں جو آپ کی قدرت پر دلالت کرتے ہیں جیسے تھوڑے طعام سے کثیر مخلوق کو سیر کر دیا اور تھوڑے پانی سے کثیر لوگوں کو سیراب کر دیا۔

" ومنھا ما یتعلق با لعلوم کالاخبار عن الغیوب'' اور بعض معجزات آپ کے علوم سے متعلق ہیں، جیسے کہ غیبی خبریں۔

کاش کہ میری برادری کے میرے پیارے جہال کو بھی یہ سمجھ آجاتا کہ غیبی خبریں دینا حضور ﷺ کا معجزہ ہے۔آپ کے معجزات کا انکار کافر بھی نہیں کر سکتے تھے۔

"ومنھا اختصاصه فی ذاته بالفضائل" آپ کے بعض معجزات وہ ہیں جو آپ کی ذات سے متعلق ہیں، تمام اشراف عرب سے آپ اعلیٰ حسب ونسب کے مالک ہیں، شجاعت، اخلاق کریمہ، بردباری، وعدہ کی وفاء، فصاحت و بلاغت، اور سخاوت۔ان تمام اوصاف میں نبی کریم ﷺ کا کوئی مثل نہیں، لہٰذا آپ کا سب سے افضل ہونا واضح ہو گیا۔

(۱۳) نبی کریم ﷺ نے فرمایا" **آدم ومن دونہ تحت لوائی یو م القیامة**" آدم علیہ السلام اوران کے ماسوا قیامت کے دن میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔

اس سے واضح ہوا کہ آپ کو حضرت آدم علیہ السلام اوران کی تمام اولاد (جس میں انبیاء کرام بھی ہیں) پر فضیلت حاصل ہے اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد یہ ہے "**انا سید ولد آدم ولافخر**" میں اولاد آدم کا سردار ہوں مجھے اس پر کوئی فخر نہیں۔

اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔

"**لا یدخل الجنة احدمن النبین حتی ادخلھا انا ولا یدخلھا احد من الامم حتی تدخلھا امتی**"

انبیاء کرام میں سے کوئی ایک بھی جنت میں اس وقت تک داخل نہیں ہوگا جب تک میں نہیں داخل ہوں گا اور تمام امتوں میں سے کوئی ایک بھی اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہوگا جب تک میری امت داخل نہیں ہوگی۔

ان احادیث سے روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ تمام انبیاء کرام پر افضل ہیں۔

(۱۴) "**عن انس قال قال رسول الله ﷺ انا اول الناس خروجا اذابعثوا اناخطیبھم اذاوفدوا وانا مبشرھم اذاایسو الواء الحمد بیدی وانا اکرم ولد آدم علی ربی ولافخر**"

جب لوگوں کو (قیامت کے دن) اٹھایا جائے گا تو سب سے پہلے قبر سے باہر میں ہی آؤں گا۔

جب سب لوگ آئیں گے تو میں ہی ان سے خطاب کروں گا، جب لوگ نا امید ہو جائیں گے تو میں ہی ان کو بشارت دوں گا، لواء الحمد (خصوصی عظمت والے جھنڈے کا نام) میرے ہاتھ میں ہو گا، تمام اولاد آدم پر رب تعالیٰ کے ہاں میں ہی مکرم ہوں گا مجھے اس پر کوئی فخر نہیں۔

☆ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ صحابہ کرام میں سے کچھ لوگ بیٹھ کر تذکرہ کر رہے تھے، رسول اللہ ﷺ نے ان کا کلام سنا کہ بعض نے تعجب کرتے ہوئے کہا "ان اللہ اتخذ ابراھیم خلیلا " بیشک اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا، اور بعض نے کہا " ماذا با عجب من کلام موسی کلمه تکلیما" موسیٰ علیہ السلام کے کلام پر اور زیادہ تعجب ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے کلیم بنایا۔ کچھ اور نے کہا "عیسی کلمة اللہ وروحه" عیسیٰ علیہ السلام کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہیں۔ بعض اور حضرات نے کہا" آدم اصطفاہ اللہ" آدم علیہ السلام صفی اللہ ہیں۔

اتنے میں نبی کریم ﷺ تشریف لائے اور فرمایا میں نے تمہارا کلام سنا ہے، اور تمہارے دلائل سنے ہیں، بیشک یہ حقیقت ہے کہ ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ ہیں، موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ ہیں، واقعی ایسا ہی ہے، اور عیسیٰ علیہ السلام روح اللہ ہیں، یقیناً ایسا ہی ہے، اور آدم علیہ السلام صفی اللہ ہیں، ہاں یہی بات ہے۔

"الاوانا حبیب اللہ ولافخر وانا حامل لواء الحمد یوم القیامة ولا فخر واناا ول شافع وانا اول مشفع یوم القیامة ولا فخر وانا اول من یحرک حلقة الجنة فیفتح لی فادخلها ومعی الفقراء المومنین ولا فخر وانا اکرم الا ولین والآخر ین ولافخر"

خبردار میں اللہ تعالیٰ کا حبیب ہوں مجھے اس پر کوئی فخر نہیں، قیامت کے دن لواء الحمد میں ہی اٹھانے والا ہوں گا مجھے اس پر کوئی فخر نہیں، قیامت کے دن سب سے پہلے میں ہی شفاعت کرنے والا ہوں گا اور سب سے پہلے میری ہی شفاعت کو قبول کیا جائے گا مجھے اس پر کوئی فخر نہیں۔ اور قیامت کے دن سب سے پہلے جنت کے دروازے کو میں ہی کھٹکاؤں گا اور میرے لئے دروازہ کھل جائے گا میں اس میں داخل ہوں گا اور میرے ساتھ غریب مسلمان ہوں گے مجھے اس پر کوئی

فخر نہیں، تمام پہلے اور پچھلے لوگوں سے میں ہی زیادہ مکرم ہوں گا مجھے اس پر کوئی فخر نہیں۔

یہ تمام احادیث جن کو ذکر کیا گیا ہے روز روشن کی طرح نبی کریم ﷺ کی افضیلت پر دلالت کر رہی ہیں۔

فائدہ: خلیل وحبیب کے معانی میں فرق کیا ہے؟ اگر خلیل کا اشتقاق خلل سے ہو تو خلیل وہ ہوگا جو یکسو ہو کر خدا کی طرف ہو جائے، مطلب یہ ہے کہ خدا کی طرف یکسوئی اور اس کی محبت میں کوئی خلل ونقصان نہ ہو۔(مدارج النبوۃ)

نبی کریم ﷺ خلیل بھی ہیں اور حبیب بھی، اور رب تعالیٰ آپ کا خلیل ہے، آپ کا ارشاد گرامی یہ ہے۔

"لو کنت متخذا خلیلا غیر ربی لا تحذت ابا بکر خلیلا"

اگر میں اپنے رب کے سوا کسی کو خلیل بناتا تو یقیناً ابو بکر کو اپنا خلیل بناتا، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کامل یکسوئی اور توجہ کا مرکز نہیں۔

اس معنی کے لحاظ سے نبی کریم ﷺ کا اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی خلیل نہیں، لیکن نبی کریم ﷺ خود صحابہ کرام کے خلیل ہیں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے لئے "خلیلی" (میرے خلیل) کا لفظ استعمال فرمایا، اور بعض صحابہ کرام سے بھی اسی طرح ثابت ہے۔

اس کا مقصد یہ ہوا کہ صحابہ کرام کی کامل یکسوئی اور توجہ کا مرکز نبی کریم ﷺ تھے، اسی وجہ سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور دیگر بعض صحابہ کرام نے آپ کو "خلیلی" (میرے خلیل) کہا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ صحابہ کرام کی توجہ کا مرکز نبی کریم ﷺ اور آپ کی توجہ کا مرکز اللہ تعالیٰ۔

" خلیل " اگر مشتق ہو " خلة" (بالفتح) سے تو معنی ہوگا فقر واحتیاج، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس لئے خلیل کہا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی تمام حاجات کو خدا پر چھوڑ دیا تھا اور اپنی تمام صلاحیتوں کو اسی کی طرف پھیر دیا تھا اور خود کو بھی خدا کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا، یہاں تک کہ آپ کو آگ میں ڈالنے کے لئے جب منجنیق میں ڈالا گیا اس وقت جبریل نے آ کر کہا" هل لک حاجة" کیا آپ کو میری امداد کی ضرورت ہے؟

آپ نے فرمایا" اما الیک فلا" لیکن تیری طرف کوئی حاجت نہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جبریل

کی امداد سے انکار دو وجہ سے تھا۔

ایک وجہ یہ تھی کہ آپ نے کامل طور پر اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا، اسی وجہ سے آپ نے اللہ تعالیٰ سے بھی یہ درخواست نہیں کی کہ اے اللہ مجھے آگ سے بچالے، کیونکہ آپ کہہ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ میرے حال سے باخبر ہے، مجھے عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو معلوم تھا کہ اس وقت کائنات عالم میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں مجھے ہی علومرتبت (مرتبہ کی بلندی) حاصل ہے، تو کیا ضرورت تھی کہ آپ جبریل سے امداد طلب کرتے، جبکہ جبریل ابراہیم علیہ السلام سے کم مرتبہ تھے۔

خیال رہے کہ ہر نبی کا ہر فرشتے سے مرتبہ بلند ہوتا ہے، خواہ وہ فرشتے کتنے ہی مقرب ہوں۔

علامہ ملا علی قاری کا رحمہ اللہ نے خلیل وحبیب کے فرق کو تفصیل سے ذکر فرمایا ہے۔ آیئے دیکھئے کیا خوب بیان فرمایا۔

"والحاصل انه يقال محمد حبيب الله والله حبيب محمد ولا يقال والله خليل ابراهيم مع جوازه ابراهيم خليل الله"

حاصل کلام یہ ہے کہ یہ کہا جاسکتا ہے محمد ﷺ اللہ کے حبیب ہیں اور اللہ محمد ﷺ کا حبیب ہے لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اللہ ابراہیم علیہ السلام کا خلیل ہے البتہ یہ کہنا جائز ہے ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے خلیل ہیں۔

اس لئے کہ حبیب بمعنی فاعل ہو تو محب (محبت کرنے والا) ہوگا، اگر بمعنی مفعول ہو تو بمعنی محبوب (جس سے محبت کی جائے) ہوگا۔ ان دونوں معنوں کے لحاظ سے یہ کہنا درست ہوگا کہ نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے اور اللہ تعالیٰ آپ سے محبت کرنے والا ہے۔

یا یوں کہا جائے کہ نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں اور اللہ تعالیٰ آپ کا محبوب ہے۔ اگرچہ حبیب بمعنی فاعل اور مفعول کے آتا ہے لیکن اس مقام میں بمعنی مفعول لینا زیادہ بہتر ہے، کیونکہ "الا انا حبیب الله" کا معنی یہ ہوگا "خبردار میں اللہ کا محبوب ہوں"

"لا شك ان نسبة المفعولية في هذا المقام اتم من نسبة الفاعلية في المرام كما

یشیر الیہ قولہ سبحانہ وتعالی یحبھم ویحبونہ لاسیماومحبۃاللہتعالی کاملۃسابقۃ ذاتیۃ ازلیۃومحبۃالعبدنا قصۃ لا حقۃ عرضیۃ غرضیۃ" (شرح شفاء)

یقیناً اس مقام میں مفعولیت والا معنی لینا بنسبت فاعلیت کے زیادہ بہتر اور کامل ہے، مقصد بیان کو زیادہ واضح کررہا ہے اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی "یحبھم ویحبونہ" (وہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں) میں اسی طرف اشارہ ہے خصوصاً اللہ تعالیٰ کی محبت کامل، سابق، ذاتی، ازلی اور ابدی ہے۔ اور بندے کی محبت ناقص، لاحق، عرضی اور غرضی ہے۔

اگر "خلیل" مشتق ہو "خلۃ" (بالضم) سے تو معنی ہوگا محبت۔

اس معنی کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ ابراہیم علیہ السلام کا خلیل اور ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے خلیل ہوں گے، اللہ تعالیٰ کو نبی کریم ﷺ کا خلیل ہونا پہلے حدیث پاک سے ثابت کیا جاچکا ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کا اللہ تعالیٰ کا خلیل ہونا ان احادیث سے ثابت ہے۔

"ان صاحبکم خلیل اللہ" بیشک تمہارا صاحب (تمہارا آقا) اللہ کا خلیل ہے۔

"وقد اتخذ اللہ صاحبکم خلیل اللہ" بلاشبہ اللہ نے تمہارے آقا کو خلیل بنایا۔

تنبیہ : اگرچہ خلیل کا معنی بھی محبت کے معنی کا حامل ہے لیکن حبیب کے معنی میں زیادتی محبت اور محبت خاصہ ہوگی گویا حبیب خلیل تو ہوگا لیکن خلیل کے لئے حبیب ہونا ضروری نہیں۔

حبیب درجہء مراد میں:

خلیل درجہ مرید میں ہوگا اور حبیب درجہ مراد میں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے امید وطمع کو یوں بیان فرمایا ہے۔

"والذی اطمع ان یغفرلی خطیئتی یوم الدین"

اور (میرا رب) وہ جس کی مجھے آس لگی ہے کہ میری خطائیں قیامت کے دن بخشے گا۔

انبیاء کرام معصوم ہیں گناہ ان سے صادر نہیں ہوتے، ان کا استغفار اپنے رب کے حضور تواضع ہے اور امت

کے لئے طلب مغفرت کی تعلیم ہے۔اور حبیب پاک ﷺ کے متعلق رب تعالیٰ ذوالجلال کا ارشاد گرامی ملاحظہ ہو۔

"لیغفر لک اللہ ماتقدم من ذنبک وما تأخر"

تاکہ اللہ تعالیٰ تمہارے سبب سے گناہ بخشے تمہارے اگلوں اور تمہارے پچھلوں کے۔

☆ مولائے کائنات نے اپنے خلیل کے طلب طریق کا ذکر یوں فرمایا "ولا تخزنی یوم یبعثون" اور مجھے رسوانہ کرنا جس دن سب اٹھائیں جائیں گے۔لیکن اپنے حبیب ﷺ کو بلا مطالبہ ازخود ارشاد فرمایا "یوم لا یجزی اللہ النبی" قیامت کے دن اللہ اپنے نبی کو رسوا نہیں کرے گا۔

یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام طلب کرتے ہیں، اور حبیب ﷺ کو بغیر طلب کے عطاء کیا جاتا ہے، جس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام درجہ مرید میں ہیں اور حضور ﷺ درجہ مراد میں، اسی طرح یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت خلیل علیہ السلام درجہ طالب میں ہیں اور حبیب ﷺ درجہ مطلوب میں۔

☆ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب آگ میں ڈالا گیا آپ نے اگرچہ سوال نہیں کیا لیکن جبریل کے کہنے پر کہ آپ مجھ سے امداد نہیں طلب کرتے تو اللہ تعالیٰ سے ہی امداد طلب کرو اور دعاء کرو وہ تمہیں اس مصیبت سے بچالے، آپ نے فرمایا "حسبی اللہ" مجھے اللہ کافی ہے۔یعنی سوال کرنے کے بغیر ہی وہ میرے حال سے باخبر ہے اور وہی مجھے کافی ہے۔لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کے متعلق ارشاد فرمایا "یا ایھا النبی حسبک اللہ" اے نبی اللہ آپ کو کافی ہے۔ان دونوں قولوں میں وجہ فرق یہ ہے۔

"ان کل احد یدعی انه محب اللہ ولکن الکمال ھو ان یقول اللہ انامحبوبه او محبه"

(شرح شفاء)

بلاشبہ ہر شخص دعوی کرتا ہے وہ اللہ سے محبت کرتا ہے لیکن کمال یہ ہے کہ خود رب ذوالجلال کہے میں فلاں سے محبت کرتا ہوں، یا یہ کہے کہ فلاں مجھ سے محبت کرتا ہے۔

یہاں یہی صورت ہے کہ ابراہیم علیہ السلام خود "حسبی اللہ" کہتے ہیں، لیکن حبیب ﷺ کے متعلق خود رب کائنات کہتا ہے "یا ایھا النبی حسبک اللہ" گویا ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے کہا جارہا ہے کہ اللہ میرے

ساتھ محبت کرتا ہے لیکن یہ کیسا ہی کمال ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب ﷺ کے متعلق فرمارہا ہے کہ میں اپنے پیارے نبی سے محبت کرتا ہوں۔

☆ حضرت ابراہیم علیہ السلام دعاء فرماتے ہیں" **واجعل لی لسان صدق فی الاخرین**" اور میری سچی ناموری رکھ پچھلوں میں۔ یعنی ان امتوں میں میرا ذکر بلند فرما جو میرے بعد آئیں اور ان کے دلوں میں میری محبت ڈال، آپ کی اس دعاء کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا۔ بعد میں آنے والی تمام امتیں آپ سے محبت کرتی رہیں، اور آپ کی طرف منسوب ہونے کی تمنا کرتی رہیں۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کے لئے (آپ کی دعاء کے بغیر) فرمایا" **ورفعنالک ذکرک**" اور بلند کیا ہم نے تمہارا ذکر۔ آپ کا ذکر اس طرح بلند فرمایا کہ اپنے ذکر کے ساتھ آپ کے ذکر کو رکھا، یہاں تک کہ اذان، نماز، مساجد کے منبروں پر جہاں پر بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے گا وہاں مصطفیٰ ﷺ کا بھی ذکر ہوگا۔

"بل مکتو با علی ساق عر شه و اشجار جنته و قصور ها و نحور حورها" (شرح شفاء)

بلکہ آپ کے اسم گرامی کو عرش معلیٰ اور جنت کے درختوں اور جنت کے محلات اور حوروں کے سینے پر تحریر فرمایا ہے۔

جو مرتبہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو بعد از سوال عطاء فرمایا وہی مرتبہ حبیب پاک ﷺ کو بغیر طلب کرنے کے عطاء فرمایا، بلکہ اس سے بلند ترین۔

☆ حضرت ابراہیم علیہ السلام بارگاہ ذوالجلال میں یوں دعاء گو ہیں"**واجنبی وبنی ان نعبد الاصنام**" مجھے اور میرے بیٹوں کو بتوں کے پوجنے سے بچا۔

انبیائے کرام علیہ السلام بت پرستی اور تمام گناہوں سے معصوم ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ دعاء کرنا بارگاہ الٰہی میں تواضع واظہار احتیاج کے لئے ہے کہ باوجودیکہ تو نے اپنے کرم سے معصوم کیا لیکن ہم تیرے فضل ورحمت کی طرف دست احتیاج دراز رکھتے ہیں۔ (خزائن العرفان)

خیال رہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعاء میں جو بیٹوں کا ذکر ہے اس سے مراد آپ کے صلبی بیٹے

ہیں کیونکہ آپ کی اولاد میں سے کئی لوگ کافر بھی ہوئے ہیں، اس لحاظ سے آپ کی یہ دعاء کامل قبول ہوئی کہ آپ کے ذاتی بیٹوں میں سے کوئی کافر نہیں، لیکن خالق کائنات اپنے پیارے حبیب ﷺ کے متعلق ارشاد فرماتا ہے۔

" انما یر ید اللہ لیذ ھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھر کم تطھیرا"

اللہ تو یہی چاہتا ہے اے نبی کے گھر والو کہ تم سے ہر ناپاکی دور فرمادے اور تمہیں پاک کر کے خوب ستھرا کر دے۔

یعنی گناہوں کی نجاست سے تم آلودہ نہ ہو، اس آیت سے اہل بیت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، اور اہل بیت میں نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات اور حضرت خاتون جنت فاطمۃ الزہرا اور حضرت علی مرتضٰی اور حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہم سب داخل ہیں، آیت واحادیث جمع کرنے سے یہی نتیجہ نکلتا ہے اور یہی امام منصور ماتریدی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ ان آیات میں اہل بیت رسول اللہ ﷺ کو نصیحت فرمائی گئی تا کہ وہ گناہوں سے بچیں اور تقوی و پرہیز گاری کے پابند رہیں۔

گناہوں کو ناپاکی سے اور پرہیز گاری کو پاکی سے تعبیر فرمایا گیا ہے، کیونکہ گناہوں کا مرتکب ان سے ایسا ہی ملوث ہوتا ہے جیسا جسم نجاستوں سے۔ اس طرز کلام سے مقصود یہ ہے کہ ارباب عقول کو گناہوں سے نفرت دلائی جائے، اور تقوی و پرہیز گاری کی ترغیب دی جائے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹوں کے گناہوں سے دور رہنے کی دعاء فرماتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو خود ہی بشارت دی کہ آپ کی آل یعنی ازواج مطہرات اور حضرت فاطمۃ الزہراء اور حضرت علی اور امام حسن اور امام حسین، بلکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا گھرانہ گناہوں سے پاک ہیں۔

☆ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی رسائی بالواسطہ اور نبی کریم ﷺ کی بلا واسطہ۔

خلیل اللہ علیہ السلام کے متعلق رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

"وکذ لک نری ابراھیم ملکوت السماوات والارض ولیکون من الموقنین"

اور اسی طرح ہم ابراہیم کو دکھاتے ہیں ساری بادشاہی آسمانوں اور زمین کی اور اس لئے کہ وہ عین الیقین والوں میں ہو جائے۔

یعنی جس طرح ابراہیم علیہ السلام کو دین میں بینائی عطاء فرمائی ایسے ہی انہیں آسمان اور زمین کے ملک دکھائے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا "اس سے آسمان اور زمین کی تمام مخلوق مراد ہے"

مجاہد اور سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ آیات سماوات وارضی مراد ہیں۔ یہ اس طرح کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو صخرہ (پتھر) پر کھڑا کیا گیا، اور آپ کے لئے آسمان منکشف کئے گئے، یہاں تک کہ آپ نے عرش و کرسی اور آسمانوں کے تمام عجائب اور جنت میں اپنے مقام کا معائنہ فرمایا، آپ کے لئے زمین منکشف فرمادی گئی، یہاں تک کہ آپ کے لئے سب سے نیچے کی زمین کشف فرمادی گئی تو آپ نے سب سے نیچے کی زمین تک نظر کی اور زمینوں کے تمام عجائب دیکھے۔

مفسرین کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ روئیت (دیکھنا) بچشم باطن تھی یا بچشم سر۔

(یہ انکشاف یہاں تک تھا) کہ ہر ظاہر و باطن چیز ان کے سامنے ظاہر کر دی گئی اور خلق کے اعمال سے کچھ بھی ان سے نہ چھپا رہا۔ (خزائن العرفان)

لیکن حبیب پاک ﷺ کی رسائی بذاتہ بلا واسطہ ہوئی، صرف میں اس رب تعالیٰ کی عطاء کا دخل ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے حبیب ﷺ کی اس رسائی کو ان الفاظ مبارکہ ذکر فرمایا۔

" ثم دنافتدلی " پھر وہ جلوہ نزدیک ہوا پھر خوب اتر آیا۔ " فکان قاب قوسین او ادنی " تو اس جلوے اور اس محبوب میں دو ہاتھ کا فاصلہ رہا بلکہ اس سے بھی کم۔ " فا وحی الی عبدہ ما اوحی " اب وحی فرمائی اپنے بندے کو جو وحی فرمائی۔

ان آیات مبارکہ میں نبی کریم ﷺ کی ذات باری تعالیٰ سے ملاقات کا تذکرہ فرمایا گیا۔

" وقد اخرج عنه احمد قال قال رسول اللہ ﷺ رأیت ربی " (روح المعانی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مسند احمد میں روایت ذکر کی گئی ہے، آپ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے اپنے رب کو دیکھا۔

" عن عبداللہ قال قلت لابی ذر لو رأیت رسول اللہ ﷺ سألته فقال عن ای شیء کنت تساله قال کنت أساله هل رایت ربک؟ فقال ابو ذر قد سالته فقال رأیت نو را "

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو کہا کہ میں نبی کریم ﷺ کی زیارت کرتا تو آپ سے سوال کرتا، تو انہوں نے کہا تم کون سی چیز کے بارے میں سوال کرتے؟ میں نے کہا میں آپ سے یہ پوچھتا کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا؟ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے یہی سوال آپ سے کیا تھا آپ نے فرمایا میں نے نور کی زیارت کی۔

ابھی تک بیان کردہ بحث سے خلیل وحبیب میں فرق ہو چکا ہے۔ (روح المعانی)

تنبیہ: محبت ماخوذ ہے ''حبۃ القلب'' سے' معنی یہ ہوا کہ محبّ کا اپنی طبعیت کے موافق محبوب کی طرف قلبی میلان اور اس سے تلذذ حاصل کرنا۔

محبت کا نتیجہ یہ ہے کہ محب اپنے محبوب کی مخالفت نہ کرے بلکہ اس کے ہر امر کی اطاعت کرے۔ بندے کا رب سے محبت کرنا بھی بطور نتیجہ ہی معتبر ہے، یعنی بندے کا رب سے محبت کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کا مطیع ہے، اس کے احکام پر عمل پیرا ہے یعنی اس کی مخالفت کرنے والا نہیں۔

حضرت رابعہ رضی اللہ عنہا اسی مقصد عظیم کو ان الفاظ میں پیش فرماتی ہیں۔

تعصی الا له وانت تزعم حبه　　　هذالعمرک فی الضیع بدیع

لو کان حبک صا دقا لا طعته　　　ان المحب لمن یحب مطیع

تو اللہ کی نافرمانی کرتا ہے اور اس کی محبت کا بھی دعوی دار ہے۔ تیری عمر کی قسم تیرا یہ فعل بہت ہی عجیب وغریب ہے۔ اگر تو اپنی محبت کے دعوی میں سچا ہے تو اپنے رب کا مطیع ہو جا۔ بیشک سچا محبّ تو وہی ہے جو اپنے محبوب کا مطیع ہو۔

لیکن یہ معنی تو اس وقت ہو سکتا ہے جب دل کا میلان اور تلذذ اور انتفاع ثابت ہو سکے، لیکن اللہ تعالیٰ ان اسباب حدوث سے پاک ہے اس کے لئے دل کا ثبوت اور اس کے دل کا میلان اور اس کا کسی سے نفع حاصل کرنا ممکن نہیں، کیونکہ وہ اغراض سے پاک ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کا بندے سے محبت کرنے کا مقصد یہ ہوگا کہ وہ اپنے بندے کو طاعت وعبادت کی قدرت عطاء فرماتا ہے اور اس کو گناہوں کے ارتکاب سے محفوظ فرماتا ہے، اور اس کی قربت کے

اسباب یعنی نوافل روزہ، صدقات، تسبیح وتحمید، تکبیر وتہلیل وغیرہ مہیا فرماتا ہے، اور اس پر فیضان رحمت فرماتا ہے جس کی وجہ سے اس کو اپنا مقرب بناتا ہے، سب سے بڑھ کر محبت کا اعلیٰ مقام یہ ہے کہ بندے کے دل سے حجابات کو اٹھا دیتا ہے جس کی وجہ سے بندہ اپنے دل کی آنکھوں سے تجلیات انوار الٰہی کا مشاہدہ کرتا ہے، تو انسان کو رب کی یاد میں محویت اور اللہ کے دربار میں حضوری حاصل ہوتی ہے، بس اللہ تعالیٰ کی بندے سے یہی محبت ہے۔

(۱۵) بیہقی نے فضائل صحابہ کی بحث میں ذکر کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ دور سے نظر آئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" ھذا سید العرب" یہ شخص عربیوں کا سردار ہے۔ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی" الست انت سید العرب" کیا آپ تمام عربیوں کے سردار نہیں؟ تو آپ نے فرمایا" وانا سید العالمین وھو سید العرب" میں تو تمام جہانوں کا سردار ہوں، وہ عربیوں کے سردار ہیں۔

اس سے واضح ہوا کہ تمام جہانوں میں انبیاء کرام بھی ہیں، لہٰذا آپ کو تمام انبیاء کرام پر سیادت، فضیلت اور برتری حاصل ہے۔

(۱۶) نبی کریم ﷺ کی فضیلت کو محمد بن عیسیٰ حکیم ترمذی رحمہ اللہ نے ایک مثال سے اس طرح بیان کیا کہ ہر امیر کو اپنی رعیت کی مقدار پر مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے، اگر ایک شخص ایک بستی کا امیر ہو تو اسے مشقت اس بستی کے رہنے والوں کی مقدار میں اٹھانی پڑے گی اور ان کی ضروریات کا لحاظ رکھنا ہوگا، اور اگر ایک شخص تمام روئے زمین کا مشرق ومغرب تک حاکم بنا دیا جائے تو اسے بنسبت ایک بستی یا ایک علاقے کے حاکم سے زیادہ مال اور ذخائر کی ضرورت ہوگی، کیونکہ اس نے بہت ہی زیادہ لوگوں کی ضروریات کو پورا کرنا ہوگا اور ان کے انتظامات کرنے ہیں۔

اسی طرح اگر ایک رسول کو ایک قوم کی طرف بھیجا جائے تو اسے توحید کے خزانے اور معرفت کے جواہر اسی مقدار میں دیئے جاتے ہیں کیونکہ جتنی مقدار رسالت کی ہے، یعنی جتنے امتی ہوں گے اسی مقدار میں کنوز توحید اور جواہر معرفت کی ضرورت ہوگی۔ اور اگر کسی رسول کو ایک علاقہ میں رسول بنا کر بھیجا گیا تو اس رسول کو اپنے امتیوں کی تعداد کے مطابق کنوز توحید اور جواہر معرفت کی ضرورت ہوگی۔

اگر کسی ذات کو تمام اہل مغرب و مشرق اور تمام جنوں اور انسانوں کا رسول بنایا گیا ہو تو یقیناً اسے اس کی رسالت کی وسعت کے پیش نظر روحانی خزانے یعنی معرفت کے جواہر اور توحید کے خزانے بھی وسیع تر عطا ہوں گے تا کہ ان کی مقدار امت کے مطابق ہو سکے۔

تمام انبیاء کرام کو اتنی وسیع نبوت نہیں عطا کی گئی جتنی کہ نبی کریم ﷺ کو عطا ہوئی کیونکہ ہر نبی کو کسی قوم یا کسی علاقے کا نبی بنایا لیکن حبیب پاک ﷺ کو ساری کائنات کا نبی بنایا گیا۔

" ولما كان كذلک لا جرم اعطى من كنوز الحكمة والعلم مالم يعط احد قبله فلا جرم بلغ فى العلم الى الحد الذى لم يبلغه احد من البشر "

جب یہ واضح ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ کی نبوت وسیع تر ہے تو یقیناً یہ بھی ثابت ہو گیا کہ آپ کو حکمت اور علم کے وہ خزانے عطاء کئے گئے جو آپ سے پہلے کسی کو بھی عطا نہیں کیے گئے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا" فاوحى الى عبده ما اوحى" (پ۲۷ النجم آية ۱۰)

وحی فرمائی اپنے بندے کو جو وحی فرمائی۔

صاحب روح البیان علامہ اسمٰعیل حقی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں حضرت جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو وحی فرمائی جو وحی فرمائی، یہ وحی بغیر واسطہ (شب معراج یا عام اوقات میں بذریعہ القاء) کے تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب ﷺ کے درمیان کوئی واسطہ نہ تھا۔

یہ اس وحی کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے درمیان راز ہیں، ان اسرار پر کسی اور کو اطلاع نہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ تمام راز تمام مخلوق سے مخفی رکھے، کسی کو نہیں بتایا کہ وہ وحی کیا تھی کیونکہ یہ محب اور محبوب کے راز تھے، محب اور محبوب اپنے درمیان مخفی رازوں کو دوسرے پر مطلع نہیں کرتے، صرف اسی ایک مقام پر یہ شعر سچا آتا ہے۔

میان طالب و مطلوب رمزیست
کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب کے درمیان وہ راز تھے جن پر کراماً کاتبین بھی مطلع نہیں تھے، اور فصاحت میں بھی نبی کریم ﷺ کا کوئی ثانی نہیں تھا، نبی کریم ﷺ اپنے خصوصی انعامات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے

ہیں ''اوتیت جوامع الکلم'' مجھے جوامع الکلم عطاء کئے گئے، یعنی مختصر کلام جو کثیر مطالب کو حاوی ہو وہ جوامع الکلم کہلاتے ہیں، یہ نبی کریم ﷺ کا خاصہ ہے جو کسی کو عطاء نہیں ہوا۔

نبی کریم ﷺ کو جو کتاب (قرآن مجید) عطاء کی گئی وہ سب کتابوں سے افضل اور آپ کی امت تمام امتوں سے افضل ہے۔ ان تمام وجوہ کے پیش نظر حضور ﷺ کی افضلیت تمام انبیاء کرام پر ظاہر وعیاں ہوگئی۔

(۱۷) محمد بن حکیم ترمذی رحمہ اللہ نے کتاب النوادر میں ذکر کیا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں بیشک آپ نے فرمایا۔

'' ان اللہ اتخذ ابراھیم خلیلا وموسی نجیا واتخذنی حبیبا ثم قال وعزتی وجلالتی لأوثرن حبیبی علی خلیلی ونجیی ''

بیشک اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا اور موسیٰ علیہ السلام کو نجی بنایا، اور مجھے حبیب بنایا، پھر رب تعالیٰ نے فرمایا (حدیث قدسی) کہ مجھے قسم ہے اپنی عزت کی اور قسم ہے مجھے اپنے جلال کی میں اپنے حبیب کو اپنے خلیل اور اپنے نجی پر ترجیح دے رہا ہوں۔

جب رب تعالیٰ نے قسم اٹھا کر اپنے خلیل اور اپنے نجی پر اپنے حبیب کی برتری کو بیان فرمادیا تو اب سمجھنے میں کوئی مشکل نہیں رہی کہ آپ ہی افضل الانبیاء ہیں۔

(۱۸) بخاری اور مسلم میں عمامہ بن منبہ رحمہ اللہ سے روایت مذکور ہے، انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت بیان فرمائی، رسول ﷺ نے فرمایا میری مثال اور مجھ سے پہلے انبیاء کرام کی مثال ایسے ہے جیسے کسی شخص نے کوئی مکان بنایا بہت حسین وجمیل بنایا اور مکمل بنایا لیکن اس کے کونوں میں سے ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ کو چھوڑ دیا لوگوں نے (اس گھر کو دیکھنے کے لئے) اس میں چکر لگانا شروع کیا اور وہ اس کی تعمیر پر تعجب کرنے لگے (کہ بہت حسین وجمیل اور مکمل طور پر بنایا گیا ہے) اور کہنے لگے کے یہاں تم نے ایک اینٹ کیوں نہیں لگائی کہ یہ گھر مکمل ہو جاتا، حضور ﷺ نے فرمایا'' کنت انا تلک اللبنۃ '' وہ اینٹ میں ہی تھا۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے قصر نبوت شاندار حسین وجمیل بنایا لیکن ایک نبی کے آنے کی جگہ کو چھوڑ دیا لوگ اس کے منتظر تھے کہ وہ خاتم النبیین بھی آجائیں تاکہ قصر نبوت کی باقی جگہ مکمل ہو جائے، (تو اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث فرمایا) تو میں نے آکر اس قصر نبوت کی تکمیل کی۔

اب واضح ہوا کہ جس ذات کے بغیر قصر نبوت نامکمل تھا اور اس ذات نے آکر اسے مکمل کیا وہ ذات ہی سب سے افضل ہے وہ محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں جو سید الانبیاء ہیں۔

(۱۹) اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیھم السلام میں سے اگر کسی کو نداء کی تو ذاتی نام سے پکارا، جیسے فرمایا۔

"یادم اسکن انت وزوجک الجنة" اے آدم تم ٹھہر جاؤ اور تمہاری زوجہ جنت میں۔

"وناديناه ان یاابراھیم" ہم نے اسے پکارا یعنی اے ابراھیم۔

"یا موسی انی انا ربک" اے موسیٰ بیشک میں تیرا رب ہوں۔

لیکن ہمارے نبی کریم ﷺ کو ذاتی نام سے کہیں نہیں پکارا یعنی "یا محمد" نہیں کہا، بلکہ "یاایھاالنبی" (اے نبی) "یاایھاالرسول" (اے رسول) اور اس قسم کے صفاتی نام سے پکارا جو آپ کی افضلیت پر واضح دلیل ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

تنبیہ: راقم بغیر ضرورت شعری کے "یا محمد" کا اسی وجہ سے قائل نہیں کہ اس میں وہ ادب نہیں پایا جاتا جو آپ کے صفاتی ناموں سے آپ کو پکارنے میں ادب پایا جاتا ہے، اس لئے مساجد میں "یا اللہ۔ یا محمد" کے کتبے لگانے کی بجائے "یا اللہ، یا رسول اللہ، یا حبیب اللہ، یا نبی اللہ، یا رحمۃ للعلمین" کے کتبے لگائے جائیں۔

(۲۰) راقم کے نزدیک نبی کریم ﷺ کی تمام انبیاء کرام پر فضیلت کی بیسویں وجہ یہ ہے کے آپ کو جس طرح کے اصحاب ملے ایسے جان نثار صحابہ کسی اور نبی کو نہیں ملے، پھر خاص کر کے نبی کریم ﷺ کے چار یار حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس طرح تھے اس طرح کے بلند مرتبہ یار کسی اور نبی کے نہ تھے، ان چار کو ہی آپ کے خلفائے راشدین ہونے کا شرف ملا۔

اعتراض: انبیاء کرام کو عظیم معجزات ظاہر طور پر عطاء کئے گئے جو نبی کریم ﷺ کو عطاء نہیں ہوئے حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں نے سجدہ کیا آپ کو سجدہ نہیں کیا، اور حضرت ابراھیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا اور آگ آپ پر گلزار بن گئی یہ مقام نبی کریم ﷺ کو حاصل نہیں ہوا، اور حضرت موسی علیہ السلام سے رب تعالیٰ نے براہ راست کلام فرمایا اور حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھ میں لوہا نرم کیا، اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو جنوں، انسانوں اور پرندوں کی بادشاہی عطاء کی گئی، اور حضرت عیسی علیہ السلام کو مردے زندہ کرنے کی طاقت دی گئی، یہ تمام معجزات نبی کریم ﷺ کو عطاء نہیں کئے گئے تو کیسے کہا جا سکتا ہے کے نبی کریم ﷺ کو تمام انبیاء کرام پر افضلیت حاصل ہے؟

جواب: آدم علیہ اسلام کو فرشتوں نے سجدہ کیا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ کو نبی کریم ﷺ پر فضیلت حاصل ہو کیونکہ خود نبی کریم ﷺ کا ارشاد یہ ہے " آدم ومن دونه تحت لوائی یوم القیامة "آدم اور ان کے ماسواء سب ہی قیامت کے دن میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے اور نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں" کنت نبیا و آدم لمنجدل فی طینته" میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدم علیہ السلام کا خمیر تیار کیا جا رہا تھا۔

" ونقل ان جبرئیل اخذ برکاب محمد ﷺ لیلة المعراج ، وهذا اعظم من السجود "

اور بیان یہ کیا گیا ہے کہ معراج کی رات کو جبرائیل نے نبی کریم ﷺ کی رکاب کو پکڑا تو آپ نے اس میں اپنے پاؤں مبارک کو ڈالا، یہ فرشتوں کے سجدہ کرنے سے بھی عظیم مقام ہے۔

" وایضا انه تعالٰی صلی بنفسه علی محمد وامر الملائکة والمؤمنین بالصلوة علیه وذلک افضل من سجود الملائکة "

اور وجہ یہ بھی واضح ہے کہ رب تعالیٰ خود نبی کریم ﷺ پر درود پڑھتا ہے یعنی رحمت خاصہ نازل فرماتا ہے اور فرشتوں کو بھی حکم دیتا ہے دورد شریف پڑھنے کا، نبی کریم ﷺ کو جو یہ مقام حاصل ہے یہ آدم علیہ السلام کو فرشتوں کے سجدہ کرنے سے افضل ہے۔ درود کو سجدہ پر افضلیت چند وجہ سے حاصل ہے۔

" الاول انه تعالٰی امر الملائکة بسجود آدم علیه السلام وامر هم بالصلوة علی محمد ﷺ تقریباً"

ایک وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا ہے اور ادب سکھانے کے لئے لیکن نبی کریم ﷺ پر درود پاک پڑھنے کا حکم دیا کہ اس سے تمہیں رسول اللہ ﷺ کا قرب حاصل ہوگا، ان کے وسیلہ سے میرا قرب حاصل ہوگا۔

" والثانی ان الصلوة علی محمد ﷺ دائمة الی یوم القیامة و اما سجود الملائکة لآدم علیه السلام ما کان الامرة واحدة "

دوسری وجہ یہ ہے کہ بیشک نبی کریم ﷺ پر درود پاک پڑھنے کا حکم ہمیشہ قیامت تک ثابت ہے اور آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم فرشتوں کو صرف ایک مرتبہ تھا۔

" الثالث ان السجود لآدم انما تو لا ہ الملائکة و اما الصلوة علی محمد ﷺ فانما تو لاھا رب العالمین ثم امر بھا الملائکة و المؤمنین "

تیسری وجہ یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا والی صرف فرشتوں کو بنایا، لیکن نبی کریم ﷺ پر درود پڑھنے کی ولایت خود رب العالمین نے اپنے پاس رکھی کہ وہ خود نبی کریم ﷺ پر درود پاک پڑھتا ہے یعنی رحمت خاصہ کا آپ پر نزول فرماتا ہے، پھر فرشتوں اور مومنوں کو بھی حکم دیا کہ وہ بھی آپ پر درود پڑھیں۔

"والرابع ان الملائکة امروا بالسجود لآدم لاجل ان نور محمد ﷺ فی جبھة آدم "

چوتھی وجہ یہ ہے کہ فرشتوں کو آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم ہی اس لئے دیا گیا کہ نبی کریم ﷺ کا نور حضرت آدم علیہ السلام کی پیشانی میں رکھا گیا تھا۔

ان تمام وجوہ سے روز روشن کی طرح واضح ہوگیا کہ آدم علیہ السلام کو فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دینے کے باوجود افضلیت نبی کریم ﷺ کو ہی حاصل رہی۔ (از کبیر)

بظاہر یہ سمجھ آتا ہے کہ آدم علیہ السلام کا علم نبی کریم ﷺ کے علم سے زیادہ ہے کیونکہ ان کے علم کو رب تعالیٰ نے بیان فرمایا" وعلم آدم الاسماء کلھا" آدم کو سکھادیئے تمام چیزوں کے نام۔

پھر یہ کہ آدم علیہ السلام کا معلم خود رب تعالیٰ ہے اور نبی کریم ﷺ کا معلم جبریل ہیں، کیونکہ رب تعالیٰ نے فرمایا" وعلمه شديد القوى" آپ کو شدید طاقت والے (جبریل) نے علم عطاء کیا۔

لیکن جب غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا علم بھی زیادہ ہے اور آپ کا معلم بھی اللہ تعالیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔" وعلمک ما لم تکن تعلم و کان فضل الله علیک عظیما" اور سکھایا آپ کو جو کچھ آپ نہیں جانتے تھے اور ہے فضل اللہ کا آپ پر بہت بڑا۔

اور رب تعالیٰ نے فرمایا "الرحمن علم القرآن خلق الانسان علمه البيان" رحمان نے اپنے محبوب کو قرآن سکھایا، انسانیت کی جان محمد کو پیدا کیا،" ما کان و ما یکون" کا بیان انہیں سکھایا۔

اور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا "ادبنی ربی فاحسن تادیبی" میرے رب نے مجھے اچھا ادب سکھایا۔

جہاں تک جبرائیل کی طرف سکھانے کی نسبت کی گئی وہ مجازی طور پر تھی، حقیقی تعلیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی تھی، جبرائیل رب تعالیٰ کا پیغام پہنچاتے تھے تو تلقین جبرائیل کی جانب سے پائی گئی۔

یہ ایسے ہی ہے جیسا کے رب تعالیٰ نے فرمایا "اللهيتوفى الانفس" اللہ نفسوں کو فوت کرتا ہے۔ لیکن دوسرے مقام میں فرمایا" قل یتو فا کم ملک الموت " فرمادیجئے تمہیں ملک الموت فوت کرتا ہے، یعنی حقیقی طور پر تو موت رب تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہوتی ہے اور مجازی طور پر عزرائیل کی طرف بھی نسبت پائی گئی ہے کہ وہ رب تعالیٰ کے حکم سے روح قبض کرتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

نوح علیہ السلام اور نبی کریم ﷺ کے مقامات میں فرق بھی قرآن پاک کی آیات کو دیکھنے سے واضح ہو جاتا ہے۔ رب تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کے متعلق ارشاد فرمایا۔

"انا ارسلنا نوحا الى قومه ان انذر قومک من قبل ان یا تیهم عذاب اليم"

بیشک ہم نے نوح کو بھیجا ان کی قوم کی طرف کہ تم اپنی قوم کو ڈراؤ ان کے پاس دردناک عذاب آنے سے پہلے۔

اور نبی کریم ﷺ کے متعلق ارشاد فرمایا۔" وما ارسلنک الا رحمة للعلمين" اور نہیں بھیجا ہم نے

آپ کو مگر تمام جہانوں کے لئے رحمت۔ یعنی نوح علیہ السلام کی ابتداء عذاب سے ہوئی اور نبی کریم ﷺ کی رحمت سے۔

اور نوح علیہ السلام کی انتہاء کو رب تعالیٰ کے اس ارشاد میں دیکھئے "رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا" اے میرے رب زمین پر کافروں کی کوئی بستی نہ چھوڑ۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کی انتہاء کے متعلق رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "عسی ان یبعثک ربک مقاما محمودا" قریب ہے کہ تمہیں تمہارا رب ایسی جگہ پر کھڑا کرے جہاں سب تمہاری حمد کریں۔ یعنی آپ کی مقام محمود پر جلوہ گری ہوگی، آپ ہی شفاعت فرمائیں گے، یہ مقام صرف آپ کو ہی حاصل ہوگا کسی اور نبی کو یہ مرتبہ رفیعہ حاصل نہیں ہوگا۔

جب حضرت ابراھیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سب ہی آپ کے لواء الحمد کے نیچے پناہ لئے ہوئے ہوں گے تو یقیناً نبی کریم ﷺ کا مقام ان کے مقامات سے بلند ہے، اور نبی کریم ﷺ کا ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ قرآن پاک تمام انبیاء کرام کے معجزات سے بڑا معجزہ ہے۔ (ماخوذ از کبیر بزیادۃ)

"منھم من کلم اللہ": "ان میں سے بعض وہ ہیں جن سے اللہ نے کلام فرمایا"۔

اس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں، یعنی آپ سے اللہ تعالیٰ نے براہ راست بغیر واسطہ جبرائیل کے کلام فرمایا، "انما الشرف فی ان یکلمہ اللہ تعالیٰ "یعنی آپ کی عظمت کو بیان ہی اس لئے فرمایا کہ رب تعالیٰ نے آپ سے کلام فرمایا۔ رب تعالیٰ بندے سے کلام کرے تو یہی عظمت ہے کیونکہ ہر ایمان رکھنے والا بندہ نماز کی حالت میں رب تعالیٰ سے کلام کرتا ہی ہے، جیسا کے نبی کریم ﷺ نے فرمایا "المصلی مناج ربہ" نمازی اپنے رب سے مناجات کرتا ہے۔

(ماخوذ از کبیر)

دینی طلبہ کرام کی توجہ کے لئے:

علامہ اشعری رحمہ اللہ نے بیان فرمایا، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے جو کلام فرمایا اور آپ نے جو سنا۔

"وھو الکلام القدیم الازلی الذی لیس بحرف ولا صوت ام غیرہ"

وہ کلام ازلی، کلام قدیم تھا نہ اس میں حروف تھے اور نہ ہی اس میں آواز وغیرہ تھی۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کا دیدار مؤمنین کو دار آخرت میں بغیر کسی کیفیت کے حاصل ہوگا، ایسے ہی موسیٰ علیہ السلام نے رب تعالیٰ کا کلام قدیم وازلی بلا کیف سنا۔ اور علامہ ماتریدی رحمہ اللہ نے فرمایا کلام قدیم وازلی کا سننا محال ہے جو کلام موسیٰ علیہ السلام نے سنا وہ حروف اور آواز پر مشتمل تھا۔ (از کبیر)

اشاعرہ اور ماتریدیہ کے اختلافی مسائل میں کئی مسائل . بس راقم کا ذہن اس مسئلہ کی طرح علامہ اشعری رحمہ اللہ کی طرف کیوں منتقل ہوتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فائدہ جلیلہ : اگرچہ موسیٰ علیہ السلام کا رب تعالیٰ کا کلام براہ راست سننا آپ کا درجہ رفیعہ ہے، لیکن اس سے بڑھ کر نبی کریم ﷺ سے معراج کی رات لامکاں پر بلا کیف کلام فرمایا، جسے رب تعالیٰ نے بیان فرمایا۔

" فاوحی الی عبدہ ما اوحی " وحی کی اپنے بندے کی طرف جو وحی کی۔

یہ معراج کی رات کا ہی ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے براہ راست کلام فرمایا نہ وہاں جبریل ہے اور نہ ہی کوئی فرشتہ ہے، صرف رب تعالیٰ کی ذات ہے اور مصطفیٰ کریم ﷺ ہیں، رب تعالیٰ نے کتنے علوم آپ کو عطاء فرمائے اور مصطفیٰ کریم ﷺ نے کتنے علوم حاصل کئے، یہ صرف خدا اور اس کے حبیب ﷺ کو معلوم ہے، دوسرا کوئی نہیں جانتا۔

اعتراض : رب تعالیٰ کا کسی سے کلام کرنا اعزاز کیسے ہے؟ جب کہ رب تعالیٰ نے کلام ابلیس سے بھی فرمایا۔ ابلیس نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا " انظرنی الی یوم یبعثون " مجھے مہلت دے اس دن تک جس دن لوگ اٹھائے جائیں گے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا " قال فانک المنظرین الی یوم الوقت المعلوم " بیشک تمہیں مہلت ہے مقرر دن تک، اس طرح رب تعالیٰ نے ابلیس سے اور بھی کلام فرمایا، اگر رب تعالیٰ کا کلام کرنا اعزاز ہوتا تو یہ اعزاز ابلیس کو بھی حاصل ہوتا۔

جواب: "ان قصة ابلیس لیس فیها ما یدل علی انه تعالیٰ قال تلک الجوابات معه من غیر واسطة فلعل الواسطة کانت موجودة"

ابلیس کے واقعہ میں ایسے کوئی الفاظ نہیں جو اس پر دلالت کریں کہ رب تعالیٰ نے ابلیس سے کلام بغیر کسی واسطہ کے کیا بلکہ یہ کلام فرشتوں کے واسطہ سے تھا۔ (از کبیر)

راقم کہتا ہے کہ اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ رب تعالیٰ نے ابلیس سے بغیر کسی واسطہ کے کلام فرمایا تو پھر بھی ابلیس سے کلام کی انتہاء کو دیکھا جائے جس میں یہ ذکر ہے "فاخرج منها فانک رجیم" نکل جا یہاں سے بیشک تو رانده ہوا ہے۔ یہ کلام زجر و توبیخ پر مبنی ہے، یعنی رب تعالیٰ کا کلام ابلیس سے اسے ذلیل کرنے کے لئے تھا لیکن موسیٰ علیہ السلام سے کلام ان کی عزت افزائی کے لئے تھا۔

تنبیہ: حضرت آدم علیہ السلام سے رب تعالیٰ نے کلام جنت میں فرمایا اور نبی کریم ﷺ پر لامکاں پر۔ دنیا میں کلام کرنے کی فضیلت صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حاصل ہوئی، اس لحاظ پر آپ کی جزوی خصوصیت بن جائے گی۔ لیکن یہ بھی کہنا ممکن ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے رب تعالیٰ نے براہ راست کلام فرما کر آپ کو فضیلت عطاء فرمائی اور حضرت آدم علیہ السلام اور نبی کریم ﷺ سے بھی کلام فرما کر ان کو بھی منازل رفیعہ عطاء فرمائے۔

"ورفع بعضهم درجات": "اور بلند کئے ان میں کسی بعض کے درجے"۔

چونکہ اس سے مراد نبی کریم ﷺ ہیں، اسی لئے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ بہت خوب ہے۔ آپ رقمطراز ہیں "اور کوئی وہ ہے جسے سب پر درجوں بلند کیا" راقم نے بھی اپنے ترجمہ میں اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کا مفہوم پیش کرنے کی کوشش کی۔ تاہم لغوی ترجمہ کو بھی مدنظر رکھنے کی کوشش کی۔

اعتراض: اگر "ورفع بعضهم درجات" سے مراد نبی کریم ﷺ ہوں تو ان الفاظ مبارکہ اور "**فضلنا بعضهم علی بعض**" کا مفہوم ایک ہوگا، یہ تکرار ہوگا، تکرار کا کیا فائدہ ہوگا۔

پھر خود غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ "فضلنا بعضهم علی بعض" حکم کلی ہے، اس کے بعد اس کی جزئیات کی تفصیل بیان کی جارہی ہے، "منهم من کلم الله" اس کے بعد اگر "ورفع بعضهم درجات" بھی حکم کلی ہو تو کس طرح درست ہوگا۔

جواب: قرآن پاک کے الفاظ مبارکہ "فضلنا بعضهم علی بعض" سے صرف یہ ثابت ہے کہ بعض انبیاء کرام کو بعض پر فضیلت حاصل ہے، کچھ درجات بلند ہیں یا کثیر درجات کس شخصیت کے بلند ہیں یہ ذکر

نہیں۔" ورفع بعضهم درجات" سے اس کی تفصیل بیان کردی کہ کوئی ہستی ان میں سے وہ بھی ہے جسے درجوں بلند کردیا۔

ہاں البتہ یہ بات ذہن میں رہے کہ " فضلنا بعضهم علی بعض" سے جب یہ ثابت ہوا کہ بعض انبیاء کرام کو بعض پر فضیلت حاصل ہے تو اہل علم نے قرآن پاک اور احادیث کو دیکھا کہ سب انبیاء کرام پر کسے فضیلت حاصل ہے تو اس پر اجماع امت ہوا کہ سب انبیاء کرام سے افضل ہمارے نبی کریم حضرت محمد ﷺ افضل ہیں۔

رفعت درجات پر چند احادیث مبارکہ کا تذکرہ:

عن انس رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ ان اکثر الانبیاء تبعا یوم القیامة وانا اول من یقرع باب الجنة" (رواه مسلم، مشکوۃ باب فضائل سید المرسلین)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن میں تمام انبیاء سے زیادہ متبعین والا ہوں گا، اور سب سے پہلے جنت کا دروازہ میں ہی کھٹکاؤں گا۔

فائدہ:

" وفیه اشعار بان اکثریة الاتباع توجب افضلیة المتبوع وکذلک الامام العاصم من بین القراء فابو حنیفة رحمه الله له حظ عظیم ونصیب جسیم من ذلک فان غالب اهل الاسلام من اتباعه فی فروع الاحکام"

اور اس حدیث پاک سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ جس ذات کے متبعین (تابعداری کرنے والے) زیادہ ہوں گے وہ ذات بھی افضل ہوگی، اسی وجہ سے قراء میں امام عاصم کے زیادہ متبعین ہیں۔ لہٰذا قراء پر افضل مقام رکھتے ہیں۔ اور ائمہ مجتہدین کے درمیان امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مقام بلند و بالا ہے، کیونکہ فروع احکام میں عالم دنیا میں جتنے مسلمان آپ کی تابعداری کرنے والے ہیں اتنے اور کسی امام کے تابعداری کرنے والے نہیں۔ (ازمرقاۃ ج ۱۱. ص ۷۶)

☆ "عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ ما من الانبیاء من نبی الااعطی من الآیات ما

مثلہ آمن علیہ البشر وانما کان الذی اوتیت وحیا اوحی اللہ الی فارجو ان اکون اکثرھم تابعا یوم القیامۃ" (بخاری ومسلم، مشکوۃ باب فضائل سید المرسلین)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا انبیائے کرام میں سے کوئی نبی نہیں مگر یہ کہ ان کو نشانیاں عطاء کی گئیں جن کی مثل ان پر انسانوں نے ایمان لایا، مجھے اللہ تعالیٰ نے وحی عطاء کی میں امید رکھتا ہوں کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ میری تابعداری کرنے والے ہوں گے۔

حدیث پاک سے واضح ہوا کہ ہر نبی کو معجزات عطاء کیے گئے، جب وہ نبی دنیا سے تشریف لے گئے تو ان کے معجزات بھی ساتھ ہی ختم ہو گئے، لیکن نبی کریم ﷺ کا معجزہ قرآن پاک کا ہمیشہ کے لئے موجود ہے اور باقی رہنے والا ہے جس نے ختم نہیں ہونا، اسی لئے قیامت تک آپ کی امت میں زیادتی ہوتی رہے گی۔

☆ "وعن جابر قال قال رسول اللہ ﷺ اعطیت خمسا لم یعطھن احد قبلی نصرت بالرعب مسیرۃ شھر وجعلت الی الارض مسجد اوطھورا فایما رجل من امتی ادرکتہ الصلوۃ فلیصل واحلت لی المغانم ولم تحل لاحد قبلی واعطیت الشفاعۃ وکان النبی ﷺ یبعث الی قومہ خاصۃ وبعثت الی الناس عامۃ"

(بخاری ومسلم، مشکوۃ فضائل سید المرسلین)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے پانچ چیزیں عطاء کی گئیں جو مجھ سے پہلے کسی کو بھی نہیں عطاء کی گئیں۔ ایک ماہ کی مسافت سے رعب سے میری امداد کی گئی۔ اور تمام زمین کو میرے لئے مسجد اور پاک بنادیا گیا ہے، میری امت میں سے جس شخص پر بھی جہاں نماز کا وقت آجائے وہاں ہی نماز ادا کر لے۔ اور میرے لئے مال غنیمت کو حلال کر دیا گیا جبکہ مجھ سے پہلے کسی ایک کے لئے بھی حلال نہیں کیا گیا۔ اور مجھے شفاعت عطاء کی گئی۔ اور ہر نبی کو کسی خاص قوم کی طرف بھیجا گیا اور مجھے تمام لوگوں کی طرف بھیجا گیا۔

نبی کریم ﷺ کو جن خصوصیات سے نوازا گیا وہ کسی اور نبی کو نہیں عطاء کی گئیں، بعد میں کسی ولی کو عطاء کرنے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا، ہاں نبی کریم ﷺ کے وسیلہ سے آپ کی امت کو بالواسطہ ان انعامات سے نوازا جانا بھی آپ کی خصوصیت ہی رہے گی۔

ایک ماہ کی مسافت سے رعب سے امداد دئے جانے کا یہ مطلب ہے۔

"قد اوقع اللہ تعالٰی فی قلوب اعداء النبی ﷺ الخوف منہ فاذا کان بینہ وبینھم مسیرۃ شھرھابو اوفزعوا منہ"

اللہ تعالٰی نے نبی کریم ﷺ کے دشمنوں کے دلوں میں ایسا خوف ڈال دیا تھا کہ جب آپ کسی قوم پر حملہ کرنا چاہتے تو وہ ایک ماہ کی مسافت سے ڈر کر ہی اکثر اوقات بھاگ جاتے۔

تمام زمین کو مسجد اور پاک بنانے کا مطلب یہ ہے کہ پہلی امتوں پر خصوصی عبادتخانوں میں نماز ادا کرنا لازمی تھا، لیکن نبی کریم ﷺ کو یہ مقام عطاء کیا گیا کہ آپ کی امت کو جہاں بھی نماز کا وقت مل جائے وہیں نماز ادا کرلیں، تمام زمین ہی ان کے لئے مسجد ہے، پہلی امتوں کے لئے تیمم جائز نہیں تھا، لیکن نبی کریم ﷺ کے لئے تمام زمین کو پاکیزہ بنا دیا گیا کہ آپ کی امت پانی نہ ملنے پر یعنی تقریباً پونے دوکلومیٹر پانی دور ہونے پر یا پانی استعمال کرنے پر قادر نہ ہونے پر تیمم کرلیں۔

مال غنیمت کے حلال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ پہلی امتوں میں اگر مال غنیمت میں جانور حاصل ہوتے تو وہ امت کے لوگوں کو دے دیئے جاتے، انبیاء کرام وہ مال نہیں لے سکتے تھے، اور اگر کوئی اور مال ہوتا تو اسے ایک جگہ جمع کرلیا جاتا، قدرتی طور پر آگ آکر اسے جلا دیتی تھی۔

آگ کے جلانے کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ جہاد میں خالص اللہ کو راضی کرنے کی کوشش کریں۔ مال کی طرف ان کی توجہ نہ ہو۔ نبی کریم ﷺ کو ذاتی طور پر مال غنیمت میں حصہ دار بنایا گیا اور آپ کی امت کے غازی حضرات کو بھی مال غنیمت عطاء کیا گیا، آگ آکر مال کو نہیں کھاتی۔

اسی سے ایک اور بات واضح ہوگئی کہ امت مصطفٰی ﷺ کی یہ عظیم شان ہے کہ مال غنیمت عطاء کرنے کے

باوجود ان کی توجہ مال کی طرف نہیں ہوتی بلکہ صرف رب تعالیٰ کی رضاء حاصل کرنے کے لئے یہ جہاد کرتے ہیں۔

شفاعت دیئے جانے کا مطلب یہ ہے " الشفاعة العامة للا راحة من المحشر "کہ آپ نے فرمایا محشر میں حساب وکتاب کے شروع کرنے کے لئے شدید حرات سے راحت حاصل کرنے کے لئے شفاعت کا حق مجھے ہی دیا گیا۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی" وکان النبی یبعث الی قومه خاصة" کا مطلب یہ ہے کہ ہر نبی کو کسی خاص قوم کی طرف بھیجا گیا۔

" لما تقرر فی علم المعانی ان استغراق المفرد اشمل من استغراق الجمع"

چونکہ " النبی "مفرد لفظ پر الف لام جنسی ذکر کیا گیا ہے،علم معانی میں اس مسئلہ کو واضح کیا گیا ہے کہ استغراق مفرد بنسبت استغراق جمع کے زیادہ افراد کو شامل ہے کیونکہ استغراق جمع سے ایک یا دو فرد خارج ہوتے ہیں۔

وبعثت الی الناس عامة:

اور مجھے عام لوگوں کی طرف بھیجا گیا۔یعنی نبی کریم ﷺ کو تمام عرب وعجم کا رسول بنا کر بھیجا گیا، بلکہ دوسری حدیث شریف جو مسلم میں مذکور ہے،اس میں آتا ہے" وارسلت الی الخلق کافة" مجھے تمام مخلوق کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا۔اس کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ ملاعلی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"(وارسلت الی الخلق کافة)ای الی الموجودات باسرها عامة من الجن والانس والملک والحیوانات والجمادات"

نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ مجھے تمام موجودات کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے،خواہ وہ جن ہوں یا انسان ہوں یا فرشتے ہوں،خواہ وہ حیوانات ہوں یا جمادات ہوں۔

(مرقاۃ ج ۱۱ ص ۴۹)

☆ "وعن ثوبان قال قال رسول اللہ ﷺ ان اللہ زوی لی الارض فرائیت مشارقها و مغاربها و ان امتی سیبلغ ملکها ما زوی لی منها" (مسلم، فضائل سید المراسلین)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے میرے لئے زمین کو سمیٹ دیا تو میں نے اس کے مشارق و مغارب کو دیکھ لیا، بیشک میری امت کی ملکیت یعنی سکونت وہاں تک پہنچ جائے گی جہاں تک میرے لئے زمین کو سمیٹا گیا۔

ان آخری الفاظ کی شرح میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے۔

"ای امت من رسید در جمیع ممالک رفتہ برفتہ یعنی اسلام در جمیع ممالک خواہد رسید"

یعنی میری امت آہستہ آہستہ تمام ممالک میں پہنچ جائے گی، مطلب یہ ہے کہ تمام ممالک میں اسلام پہنچ جائے گا۔ (اشعة اللمعات)

ذرا غور کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ کوئی ملک ایسا نہیں جہاں مسلمان موجود نہ ہوں، ہر جگہ اسلام پہنچ چکا ہے تو واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ کو ظاہری حیات میں ہی تمام روئے زمین دکھادی گئی اور اس کا علم دے دیا گیا۔

"وآتینا عیسی ابن مریم البینات":

"اور ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو کھلی نشانیاں دیں۔"

"البینات" سے مراد کھلی نشانیاں اور معجزات ظاہرہ ہیں۔ یعنی مردوں کو زندہ کرنا اور مادرزاد اندھے کو نظر عطاء کرنا، اور برص کی مرض والوں کو شفاء عطاء کرنا" والاخبار بالمغیبات" اور آپ کو غیبی خبریں عطاء کرنا، اور انجیل عطاء کرنا ہے۔ (تفسیر ابی السعود)

"وایدناه بروح القدس": "اور مدد کی ہم نے اس کی پاکیزہ روح سے"۔

روح قدس سے مراد کیا ہے؟

اس سے مراد یا تو عیسیٰ علیہ السلام کی اپنی روح ہے۔ "وانما وصفت بالقدس للکرامة"

اسے کرامت کی وجہ سے قدس سے متصف کر دیا گیا یا اس وجہ سے اسے روح قدس کہا گیا کہ وہ آباء کی صلبوں اور ماؤں کی رحموں (بچہ دانیوں) کی آلودگی سے پاک تھی۔

"وقیل بجبریل" اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ روح قدس سے مراد جبریل ہیں کیونکہ ان کا لقب "روح امین" ہے آپ کو جبریل سے تقویت پہنچائی گئی، جبریل سے اول میں آپ کو تائید دی گئی کہ انہوں نے پھونکا تو آپ ماں کی بچہ دانی میں موجود ہو گئے۔ اور درمیان میں جبریل نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی لا کر علوم پہنچائے اور آپ کو دشمنوں سے محفوظ رکھا، اور آخر میں آپ کو تقویت پہنچائی گئی کہ جب یہود نے آپ کو قتل کرنا چاہا تو جبریل نے ہی آپ کی امداد کی کہ آپ کو آسمانوں پر اٹھا کر لے گئے۔ روح قدس سے مراد انجیل ہے، یعنی جس طرح قرآن پاک کا لقب روح ہے، اسی طرح انجیل کا لقب بھی روح ہے کہ اس سے قوت ایمانی اور حیات جاودانی حاصل ہوتی ہے، روح قدس سے مراد اسم اعظم ہے جس کی وجہ سے آپ مردوں کو زندہ کرتے تھے۔ (ما خوذ از تفسیر ابی السعود و کبیر)

دو انبیاء کرام کے خصوصی ذکر کی وجہ:

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خصوصی طور پر اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ ان کے معجزات زیادہ واضح اور ظاہر تھے اور ان دونوں حضرات کی امتیں نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں موجود تھیں اسی وجہ سے ان کا ذکر خصوصی طور پر کیا گیا اور ان کی امتوں کی ضمناً مذمت بھی کی گئی، گویا کہ یہ کہا گیا ہے۔

" ھذا ان الرسولان مع علو درجتھما و کثرۃ معجزاتھما لم یحصل الا نقیاد من امتھما بل نازعوا و خالفوا، وعن الواجب علیھم فی طاعتھما اعرضوا"

کہ ان دونوں رسولوں کو رب تعالیٰ نے بلند مرتبہ عطاء کیا اور ان دونوں کو کثیر معجزات عطاء کئے گئے، لیکن ان کی امتوں نے ان کی فرمانبرداری نہ کی، بلکہ مخالفت کی اور ان سے نزاع کیا۔ ان کی امتوں پر واجب تھا کہ وہ ان کی طاعت کرتیں لیکن انہوں نے ان سے اعراض کیا۔ (کبیر)

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خصوصی طور پر ذکر اس لئے بھی کیا گیا کہ یہود کی مذمت کی گئی کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ

السلام کے معجزات ظاہر اور واضح دیکھ کر بھی آپ پر ایمان نہ لائے اور منکر ہی رہے گویا کہ عقل کے اندھے ہی رہے۔ (از کبیر)

”ولو شاء اللّٰہ مااقتتل الذین من بعد ھم من بعدماجاء تھم البینات ولکن اختلفوافمنھم من آمن ومنھم من کفر“:

”اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو نہ لڑتے وہ لوگ جو ان کے بعد ہوئے اس کے بعد آ گئی ان کے پاس نشانیاں لیکن انہوں نے اختلاف کیا تو ان میں بعض ایمان پر رہے اور بعض کافر ہو گئے۔“

ان الفاظ مبارکہ کا ماقبل سے تعلق واضح ہے کہ انبیاء کرام نے اپنی اپنی امتوں کے پاس کھلی نشانیاں لائیں، اور دلائل اور براہین ان کے سامنے بیان فرمائے تو قوموں کا آپس میں اختلاف ہوا، بعض نے ان میں سے ایمان لایا اور بعض نے ان میں سے کفر کیا، اسی اختلاف کی وجہ سے ان میں لڑائیاں ہوئیں اور ایک دوسرے کو قتل کیا۔

ہر چیز اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر میں ہے:

اس آیت کریمہ سے واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ اگر چاہتا کہ وہ آپس میں لڑائی نہ کریں تو وہ آپس میں نہ لڑتے، لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت وارداہ سے ان کی آپس میں لڑائیاں ہوئیں۔ حالانکہ لڑائی کرنا معصیت ہے، اسی سے واضح ہوا کہ ہر اچھائی یا برائی کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، اس سے معتزلہ کا رد ہو گیا جو بندے کو اپنے اعمال کا خالق مانتے ہیں۔

" فدل ذلک علی ان الکفر والایمان والطاعة والعصیان بقضاء اللہ وقدرہ ومشیئته وعلی ان قتل الکفار وقتالھم للمومنین بارادة اللہ تعالیٰ"

اس آیۃ کریمہ کے مضمون سے یہ واضح ہو گیا کہ بیشک کفر اور ایمان، طاعت اور نافرمانی سب ہی اللہ تعالیٰ قضاء وقدر میں ہیں، یہاں تک کہ مومنوں کا کفار کو قتل کرنا، اور کافروں کا مومنوں سے لڑنا سب ہی اللہ تعالیٰ کے ارادہ میں ہیں۔ (از کبیر)

لیکن انہوں نے اختلاف کیا، اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ اختلاف نہ کرتے، اگر وہ اختلاف نہ کرتے تو وہ آپس

میں نہ لڑتے، لیکن ان کے اختلاف کی وجہ سے ہی ان میں لڑائیاں واقع ہوئیں۔

"ولوشاء اللہ مااقتتلوا": "اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو وہ نہ لڑائی کرتے۔"

یہ دوبارہ ذکر کیا گیا ہے تاکید کے لئے (کبیر مظہری) لیکن روح المعانی اور تفسیر ابو سعود میں ہے کہ یہ تکرار نہیں بلکہ اس سے نیا مطلب ذکر کیا گیا ہے۔ پہلے یہ ذکر کیا گیا کہ اللہ چاہتا تو وہ نہ اختلاف کرتے اور نہ لڑتے یعنی اختلاف ان کی لڑائی کا سبب تھا، اب یہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ اختلاف کرنے کے باوجود آپس میں نہ لڑتے۔

راقم کا اس میں موقف یہ ہے کہ اس میں قرآن پاک کی عظمت کو بیان کیا گیا کہ کبیر اور مظہری کے مطابق یہ تاکید ہے اور تکرار واعادہ ہے، لیکن روح المعانی اور ابوالسعود کے مطابق تجدید ہے تکرار نہیں۔

سبحان اللہ! قرآن پاک کیسا ہی خوب موجزن سمندر ہے کہ اپنی اپنی وسعت کے مطابق خوب جواہر نکالے گئے ہیں۔

"ولکن اللہ یفعل مایرید": "اور لیکن اللہ کرتا ہے جو ارادہ کرتا ہے۔"

"ای یفعل مایرید من غیر ان یو جبہ علیہ مو جب او یمنعہ منہ ما نع" (تفسیر ابی السعود)

یعنی اللہ تعالیٰ جو ارادہ کرتا ہے وہ کرتا ہے، اس پر کوئی چیز واجب نہیں، اور نہ ہی اسے کوئی منع کر سکتا ہے۔ کسی میں طاقت نہیں کہ وہ اس کے کام میں دخل اندازی کر سکے۔

تنبیہ: رب تعالیٰ جو چاہے وہ کرتا ہے اس کی ذات پر جس طرح اعتراض جائز نہیں۔ اسی طرح اس کے کاموں کی حکمت کی حقیقت کو جاننا بھی ضروری نہیں۔ علامہ بغوی رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا۔

"سأل رجل علی ابن طالب فقال یاامیرالمومنین اخبرنی عن القدر قال طریق مظلم فلا تسلکہ فاعادالسوال فقال بحرعمیق فلا تلجہ فا عاد فقال سر خفی فلا تفتشہ"

ایک شخص نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تقدیر کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا یہ ایک تاریک راستہ ہے اس پر نہ چلو، جب اس نے پھر سوال کیا تو آپ نے فرمایا یہ گہرا سمندر ہے اس میں نہ داخل ہو جب اس نے پھر سوال کو لوٹایا تو آپ نے فرمایا یہ مخفی راز ہے اس کی تفتیش نہ کرو۔

یعنی تقدیر ایک ایسا مسئلہ ہے اس کا عقل سے پالینا ممکن نہیں، اس کی تفتیش سے ہلاک ہو جاؤ گے جس طرح تاریک راستہ میں چلنے اور گہرے سمندر میں واقع ہونے سے ہلاکت واقع ہوتی ہے۔

☆ عن عائشة قالت سمعت رسول الله ﷺ يقول من تكلم في شيء من القدر سئل عنه يوم القيامة ومن لم يتكلم فيه لم يسئل عنه" (رواه ابن ماجة)

حضرت عائشہ رضی عنہ فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا جس شخص نے تقدیر کے متعلق کلام کیا قیامت کے دن اس سے پوچھا جائے گا، اور جس نے تقدیر کے متعلق کوئی کلام نہ کیا اس سے اس کے متعلق کوئی سوال نہ کیا جائے گا۔ (ماخوذ ازمظھری)

☆☆☆☆☆

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ☆

(سورۃ البقرۃ آیت ۲۵۴)

﴿۱﴾

اے ایمان والو! اللہ کی راہ میں ہمارے دیئے میں سے خرچ کرو وہ دن آنے سے پہلے جس میں نہ خرید وفروخت ہے نہ کافروں کے لئے دوستی اور نہ شفاعت اور کافر خود ہی ظالم ہیں۔

﴿۲﴾

اے ایمان والو! خرچ کرو اس سے جو دیا ہم نے تمہیں، اس سے پہلے کہ آ جائے وہ دن جس میں کوئی خرید وفروخت نہیں اور (کافروں کے لئے) نہ دوستی، نہ شفاعت اور کافر ہی ظالم ہیں۔

ماقبل سے تعلق:

انسان کے لئے مشکل یہ ہے کہ وہ جہاد میں اپنی جان قربان کردے، اور اسے طرح انسان کے لئے یہ مشکل ہے کہ وہ اپنا مال خرچ کرے، پہلے رب تعالیٰ نے جہاد کرنے کا حکم دیا اب رب تعالیٰ نے مال خرچ کرنے کا حکم دیا۔

(کبیر)

اس خرچ کرنے سے کیا مراد ہے؟

اس میں تین اقوال ہیں۔

﴿۱﴾ ایک قول حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا ہے کہ اس آیت کریمہ میں جس خرچ کرنے کا ذکر ہے اس سے مراد زکوۃ ادا کرنا ہے کیونکہ اس حکم کے ساتھ وعید پائی گئی ہے کہ اس دن کے آنے سے پہلے خرچ کرو جس دن نہ خرید وفروخت ہے اور نہ کافروں کے لئے دوستی اور نہ شفاعت ہے۔ اس قسم کی وعید صرف واجبات میں پائی جاتی ہے۔

﴿۲﴾ دوسرا قول جمہور حضرات کا ہے کہ یہ حکم عام ہے صدقات واجبہ کو شامل ہے اور صدقات نافلہ کو بھی شامل ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو، فرائض و واجبات بھی ادا کرو اور نفلی طور پر بھی اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے رہو تاکہ تمہیں اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو سکے، جمہور نے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کی دلیل کا جواب یوں دیا۔

"ولیس فی الآیة وعید فکانه قیل حصلوا منافع الآخرة حین تکو نو ن فی الدنیا فانکم اذاخرجتم من الدنیا لا یمکنکم تحصیلها و اکتسا بها فی الآخرة"

آیۃ کریمہ میں وعید نہیں پائی گی، بلکہ صرف اتنا بتایا گیا کہ دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کا منافع حاصل کرلو، اس لئے کہ جب تم دنیا سے نکل جاؤ گے تو تمہارے لئے ممکن نہیں کہ آخرت میں جا کر وہ فوائد حاصل کرسکو۔

﴿۳﴾ تیسرا قول اصم رحمہ اللہ کا ہے کہ اس خرچ کرنے سے مراد جہاد میں خرچ کرنے کا ذکر ہے، کیونکہ اسے جہاد کے حکم کے بعد ذکر کیا گیا ہے۔ (از کبیر)

راقم کا موقف: اس مسئلہ میں راقم کا موقف یہ ہے کہ تمام اقوال میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد مطلقاً خرچ کرنے کا ہے، گویا کہ یہ کہا گیا ہے کہ رب تعالیٰ نے جو مال تمہیں دیا ہے وہ مال اس کی راہ میں خرچ کرو، اگر تم پر خرچ کرنا فرض ہو یعنی زکوۃ ادا کرنی ہو تو زکوۃ ادا کرو، اور اگر صدقہ فطر اور قربانی وغیرہ تم پر واجب ہوں تو واجبات ادا کرو، اور اگر جہاد میں مال کی ضرورت درپیش ہو تو جہاد میں مال خرچ کرو، اور نفلی طور پر بھی صدقات کرتے رہو۔

چونکہ اس صورت پاک میں زکوۃ کا بھی ذکر ہو چکا ہے صدقات واجبہ کا بھی ذکر آ چکا ہے، جہاد میں مال خرچ کرنے کا ذکر بھی آ چکا ہے، صدقات نافلہ کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے، اس لئے اس حکم کو مطلق رکھنے اور تمام معانی کو جمع کرنے سے آیۃ کریمہ کا ماقبل سے ربط قائم رہے گا۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

رزق عام ہے حلال اور حرام دونوں کو شامل ہے لیکن صرف حلال مال کا استعمال جائز ہے اور حرام مال کا استعمال حرام ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں بھی حلال مال خرچ کرنے سے ثواب حاصل ہوگا، اللہ کی راہ میں حرام مال خرچ کرنے کی اجازت نہیں۔

ایک اور توجہ کی ضرورت:

دینی مدارس کے طلباء کرام بخوبی جانتے ہیں کہ لائے نفی جنس کے بعد نکرہ مفردہ یعنی غیر مضاف جب تکرار لا نکرہ مفرد سے آئے تو اس کی پانچ وجہ جائز ہیں جیسا کہ "لاحول ولا قوۃ الا باللہ" میں پانچ وجہ جائز ہیں وہی وجوہ "لا بیع فیہ خلۃ ولا شفاعۃ" میں بھی جائز ہیں اور " لابیع فیہ ولاخلال" میں، اور " لا لغو فیھا ولا تاثیم" میں بھی وہی وجوہ جائز ہیں

(ماخوذ از قرطبی)

فائدہ: آیۃ کریمہ کے ترجمہ سے ہی یہ واضح ہو رہا ہے کہ انسان رب تعالیٰ کے حضور اکیلے حاضر ہوگا اور اس کے ساتھ دنیا کی کوئی چیز نہیں ہوگی، خواہ اولاد ہو یا مال، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا۔

"ولقد جئتمونا فرادی کما خلقناکم اول مرۃ وترکتم ماخولناکم وراء ظھورکم"

اور تحقیق تم ہمارے پاس اکیلے آؤ گے جیسا کہ ہم نے تمہیں پیدا کیا تھا پہلی مرتبہ، اور تم چھوڑ آؤ گے پیٹھ پیچھے جو مال و منافع ہم نے تمہیں دیئے۔(پ ۷ سورۃ الانعام آیۃ ۹۴)

"من قبل ان یاتی یوم لا بیع فیه ولا خلة ولا شفاعة":

''اس سے پہلے کہ آ جائے وہ دن جس میں کوئی خرید و فروخت نہیں اور (کافروں کے لئے) نہ دوستی اور نہ شفاعت۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں مال خرچ کرنے کا حکم دیا ساتھ ساتھ یہ بھی یاد دلایا کہ ایسا نہ ہو کہ تم یہ کہتے رہو کہ کل خرچ کر دیں گے، پرسوں خرچ کر دیں گے کیونکہ تمہیں معلوم نہیں کہ تم پر کب موت آ جائے، پھر موت کے بعد قیامت تم تک عالم برزخ میں تمہیں رہنا ہوگا۔ پھر قیامت نے قائم ہونا ہے تو اس دنیا کی زندگی کے بعد تمہیں مال خرچ کرنے کا وقت نہیں ملے گا اور نہ ہی تم اپنی اس غلطی کا تدارک کر سکو گے، پھر تمہیں یہ کہنا نفع مند نہیں ہو سکے گا۔ "لولا اخرتنی الی اجل قریب فاصدق" تو نے مجھے تھوڑی مدت تک کیوں مہلت نہ دی کہ میں صدقہ کرتا۔ (ماخوذ از قرطبی)

"لا بیع":

کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ بیع بمعنی فدیہ ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا" فالیوم لا یوخذ منکم فدیة" اس دن تم سے کوئی فدیہ نہیں لیا جائے گا، اور فرمایا" ولا یقبل منھا عدل" کسی نفس سے کوئی بدلہ، کوئی فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا، اور ارشاد فرمایا" وان تعدل کل عدل لا یوخذ منھا" اگر کوئی نفس ہر قسم کا بدلہ دے تو اس سے نہیں لیا جائے گا۔ اس معنی کے لحاظ پر یہاں آیۃ کریمہ کا معنی یہ ہوگا۔

" من قبل ان یاتی یوم لا تجارة فیه فتکتسب ما تفتدی به من العذاب"

اے ایمان والو! خرچ کرو اس سے جو ہم نے رزق تمہیں دیا ہے اس سے پہلے کہ وہ دن آ جائے جس میں کوئی تجارت نہ کی جا سکے کہ اس سے مال حاصل کر کے فدیہ دے کر تم عذاب سے چھٹکارا پا سکو۔ یعنی اس دن نہ ہی مال

ہو سکے گا اور نہ ہی فدیہ قبول کیا جائے گا۔ دوسرا معنی یہ ہے۔

"قدموا الانفسکم من المال الذی هو فی ملککم قبل ان یأتی الیوم الذی لا یکون فیه تجارة و لا مبایعة حتی یکتسب شئ من المال"

اپنے نفسوں کے لئے وہ مال آگے بھیج دو جو تمہاری ملکیت میں ہے (یعنی اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو جس کا ثواب تمہیں آگے جا کر ملے) اس دن کے آنے سے پہلے جس دن کوئی تجارت نہیں ہوگی اور نہ ہی خرید و فروخت ہوگی کہ تم مال حاصل کرسکو۔

"ولا خلة": "اور نہیں دوستی ہوگی (کافروں میں)"

"والخلة" (بالضم) خالص المودة" یعنی " خلة" کا معنی خالص محبت ہے، یہ ماخوذ ہے " تخلل الاسرار بین الصدیقین " (دوستوں کے درمیان راز کا واقع ہونا) ہے۔

" خلا لة " خاء کے ضمہ، فتحہ اور کسرہ سے، یعنی تینوں صورتوں میں اس کا معنی دوستی اور محبت ہے۔

خلة (بالفتحة) حاجت اور فقر، "خلة" (بالکسر) تلوار کے نیام کو سونے سے منقش کرنا، اور دانتوں کے درمیان طعام وغیرہ کا رہ جانا۔ (ماخوذ از قرطبی)

دوستی نہ ہونے کا ذکر قرآن پاک میں اس طرح بھی بیان کیا گیا ہے۔

"الاخلاء یومئذ بعضهم لبعض عدو الا المتقین"

اس دن دوست بعض بعض کے دشمن ہوں گے سوائے متقین کے اور ارشاد فرمایا " وتقطعت بهم الاسباب" ان کے درمیان اسباب منقطع ہوجائیں گے اور ارشاد فرمایا" ویوم القیامة یکفر بعضکم ببعض ویلعن بعضکم بعضا" اور قیامت کے دن بعض بعض کا انکار کریں گے اور بعض بعض پر لعنت بھیجیں گے۔

اور ارشاد فرمایا "فمالنا من شافعین ولا صدیق حمیم"

(کفار اس دن کہیں گے) ہمارا کوئی شفاعت کرنے والا نہیں اور نہ ہی کوئی گہرا دوست ہے۔

اور ارشاد فرمایا" وما للظالمین من انصار" ظالموں (کافروں) کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔

"ولا شفاعة" "اور نہ ہی شفاعت (کافروں کے لئے)"

بظاہر طور پر" ولا خلة و لا شفاعة" میں عام نفی نظر آتی ہے کہ کوئی شخص کسی کا دوست نہیں ہوگا اور نہ ہی کوئی کسی کی شفاعت کرے گا، لیکن یہ بات بھی واضح ہے۔

" ان سائر الدلائل دلت علی ثبوت المو دة والمحبة بین المومنین وعلی ثبوت الشفاعة للمومنین"

کہ تمام دلائل سے یہ مسئلہ روز روشن کی طرح ثابت ہے کہ مومنوں کو قیامت کے دن ایک دوسرے سے محبت کام آئے گی اور مومنوں کے حق میں شفاعت بھی ہوگی۔ (از کبیر)

کبیر کی اس وضاحت سے سمجھ آ گیا کہ جس دوستی اور شفاعت کی نفی ہے اس سے مراد کفار ہیں مومنین مراد نہیں۔ آیئے راقم کی تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان سے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ باکمال کو دیکھئے۔

"ولا خلة ولا شفاعة":

اور نہ آشنائی اور نہ سفارش	(محمود الحسن صاحب)
نہ دوستی کام آئے گی نہ سفارش چلے گی	(مودودی صاحب)
اور نہ دوستی نہ سفارش	(عبدالماجد صاحب)
اور نہ آشنائی ہے اور نہ سفارش	(شاہ عبدالقادر)
اور نہ دوستی اور نہ سفارش ہو سکے	(فتح محمد صاحب)
اور نہیں دوستی اور نہیں سفارش	(شاہ رفیع الدین صاحب)
نہ (کافروں کے لئے) دوستی اور نہ شفاعت	(اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ)

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں دوستی اور شفاعت کی نفی کو کافروں کے ساتھ مختص کیا گیا ہے، جبکہ دوسرے تراجم میں عام

طور پر نفی کی گئی ہے جس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ مسلمانوں کی شفاعت ہو سکے گی یا نہیں۔

آیئے تفاسیر کی نظر میں اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کو دیکھیں تو روز روشن کی طرح عیاں ہوگا کہ جس مسئلہ کو تفاسیر نے اعتراضات وجوابات کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اعلیٰ حضرت نے اس کو ایک لفظ کی زیادتی سے بیان فرمادیا ہے۔

"(ولا خلة) صداقة تنفع" (جلالین)

دوستی نہیں ہوگی جو کسی کو قیامت میں نفع پہنچائے۔

" قوله صداقة تنفع لان الخلة لا تنفع يو م القيامة بين الا خلاء الابين المتقين، لقوله تعالىٰ "الاخلا ء يومئذ بعضهم لبعض عدو الاالمتقين" (حاشيه جلالين)

دوستی کسی کے لئے نفع مند نہیں ہوگی قیامت میں سوائے پرہیزگاروں کے، کیونکہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس دن دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوائے متقین کے۔

"(ولا شفاعة) بغير اذنه وهو يو م القيامة" (جلالین)

اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر قیامت کے دن کسی کو شفاعت کرنے کا حق حاصل نہیں ہوگا۔

" قوله بغير اذنه هو جواب سوال كيف يصح نفى الشفاعة على سبيل الاستغراق و قد تثبت شفاعة الانبياء يوم القيامة با لاحاديث كحد يث انس سالت النبى ﷺ ان يشفع لى يوم القيامة فقال انا فاعل، حسنه الترمذى، وايضاحه ان الآية مقيد "الا من اذن له الرحمن ورضى له قولا" والنبى ماذون له اويستأذن فيوذن له" (جمل)

مفسر رحمہ اللہ نے بغیر اذنہ کی قید کا کیوں اضافہ کیا؟ اس لئے کہ یہ ایک سوال مقدر کا جواب ہے، وہ سوال یہ ہے کہ مطلقاً شفاعت کی نفی کیسے کی گئی ہے کہ کسی کو کسی شفاعت کام نہیں آئے گی، حالانکہ حدیث پاک سے انبیاء کرام کی شفاعت کا ثبوت ہے۔ کہ ان کو قیامت کے دن شفاعت کا حق حاصل ہوگا۔ جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا کہ قیامت کے دن میری شفاعت فرمائیں گے؟ آپ نے فرمایا کہ میں شفاعت کروں گا، اس

حدیث کو ترمذی نے حسن کہا ہے۔

واضح ہوا کہ آیت کریمہ میں شفاعت کی نفی اس کی اجازت کے بغیر کرنے سے مقید ہے، جس کو رب تعالیٰ کی طرف سے اجازت ہوگی اور رب تعالیٰ نے جس کی بات کو پسند کیا وہ شفاعت کر سکے گا اسی وجہ سے انبیاء کرام کو شفاعت کی اجازت ہوگی، اسی طرح انبیاء کرام نے اگر اللہ تعالیٰ سے شفاعت کی اجازت طلب کی تو ان کو شفاعت کرنے کی اجازت دے دی جائے گی۔

" لیس لاحد ان یشفع عندہ الاباذنہ وھوبیان لملکوتہ و کبریائہ وان احدالا یتمالک ان یتکلم یو م القیامۃ الااذاذن لہ فی الکلام وفیہ رد لز عم الکفار ان الأصنام تشفع لھم"

کسی ایک کو رب تعالیٰ کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرنے کا حق نہیں ہوگا یہاں اللہ تعالیٰ کی بادشاہی اور کبریائی کا ذکر ہے کہ قیامت کے دن کسی کو اس کی اجازت کے بغیر اس سے کلام کرنے کی اجازت نہیں ہوگی، اور اس آیۃ کریمہ میں کافروں کا رد کیا جارہا ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ ہمارے بت ہماری سفارش کریں گے۔ (مدارک)

یہاں سے بھی واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کوئی شخص کسی کی سفارش نہیں کر سکے گا، لیکن انبیائے کرام، صلحاء اور شہداء کو تو شفاعت کا حق خود رب تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہوگا۔

"والشفاعۃ ثابتۃ للرسول والاخیار فی حق اھل الکبائر بالمستفیض من الاخبار خلافا للمعتزلۃ" (شرح عقائد)

رسولوں اور نیک لوگوں کو کبیرہ گناہوں کے مرتکبین کے لئے شفاعت کا حق حاصل ہونا اخبار متواترہ اور مشہورہ سے ثابت ہے، اس مسئلہ میں معتزلہ کا اختلاف ہے۔

ان کی ذریت معنوی بھی یہ راگ الاپ رہی ہے۔

" قولہ علیہ السلام شفاعتی لا ھل الکبائر من امتی وھو مشھور بل الاحادیث فی باب الشفاعۃ متو اترۃ" (شرح عقائد)

نبی کریم ﷺ کا ارشاد کہ میری شفاعت میری امت کے گناہ کبیر کے مرتکبین کے لئے بھی ہوگی۔ یہ

حدیث مشہور ہے، بلکہ شفاعت والی احادیث متواترۃ المعنی ہیں۔

حدیث شریف میں جو" والا خیار" کا ذکر ہے، اس سے مراد کون لوگ ہیں؟

"والاخیارھم الملائکۃ والصلحاء والشہداء" اخیار سے مراد فرشتے اور نیک لوگ اور شہید لوگ ہیں۔

نیز اسی مقام پر شرح عقائد کے حاشیہ میں ہے۔

" قال الغزالی اعلم انه اذا حق دخول النار علی طوائف من المومنین فان الله تعالی بفضله یقبل فیھم شفاعة الانبیاء والصدیقین بل شفاعة العلماء والصالحین وکل من له عندالله تعالی جاه وحسن معاملة فان له شفاعة فی اھله وقرابته واصدقائه ومعارفه فکن حریصا علی ان تکتب لنفسک عندھم مراتبة الشھداء"

علامہ غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب یہ حقیقت ہے کہ مومنوں کا ایک گروہ یعنی گناہگار لوگ جہنم میں جائیں گے بیشک اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کے لئے انبیاء کرام اور صدیقین کی شفاعت قبول فرمائے گا، بلکہ علماء اور نیک لوگ اور ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کا مقرب ہے اور اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ سے ہے، اسے رب تعالیٰ کی طرف سے یہ حق دیا جائے گا کہ وہ اپنے اہل واقرباء اور احباب اور جان پہچان والے لوگوں کی شفاعت کرسکیں، لہٰذا اے عام مخاطب تو بھی ان کے ہاں اپنی ذات کے لئے مرتبہ شفاعت حاصل کرنے میں حریص ہو جا۔

شفاعت کا ذکر احادیث میں بہت بساطت سے کیا گیا ہے یہاں تو اختصار کے پیش نظر اس پر بحث نہیں کی جا رہی ورنہ یہی باب ایک ضخیم کتاب کو مستلزم ہے، ایک مختصر حدیث پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

"عن عثمان بن عفان قال قال رسول الله ﷺ یشفع یوم القیامة ثلاثة الانبیاء ثم العلماء ثم الشھداء" (رواه بن ماجة)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن تین حضرات انبیاء کرام، علماء اور شہداء شفاعت کریں گے، تین کا ذکر اتفاقی ہے ان تین میں انحصار نہیں۔ (مرقاۃ)

"شافعاو مشفعا" تو آپ نماز جنازہ میں بچوں کے لئے دعاء میں بھی پڑھتے ہیں، جہاں ان کی شفاعت کرنا، اوران کی شفاعت کا مقبول کیا جانا واضح طور پر مذکور ہے۔

اب حقیقت حال واضح ہو چکی ہے کہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ میں کیا خوبیاں موجود ہیں؟ وہ تفاسیر پر نظر رکھنے سے ہی پتہ چلتی ہیں۔ (تسکین الجنان، ج ۷۵. ص ۷۷)

"والکافرون هم الظالمون": "اور کافر ہی ظالم ہیں۔"

"الظلم وضع الشیٔ فی غیر موضعہ" ظلم کا معنی یہ ہے کہ ایک چیز کو اپنی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھنا۔

کافر چونکہ عبادت رب تعالیٰ کی نہیں کرتے تھے بلکہ بتوں کی عبادت کرتے تھے، اور مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کی بجائے باطل راہ میں خرچ کرتے تھے، عیاشیوں اور بے ہودگیوں میں مال خرچ کرتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کے احکام سے منہ موڑ کر وہ اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں اور اپنے آپ کو عذاب کا مستحق بناتے ہیں اور کافروں سے مراد زکوۃ کا انکار کرنے والے بھی ہیں کہ وہ اپنے آپ پر زکوۃ کا انکار کر کے ظلم کرتے ہیں۔

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ اس آیت کریمہ میں کفار سے مراد وہ لوگ ہیں جو زکوۃ نہیں دیتے، اگر چہ زکوۃ نہ دینا گناہ کبیرہ ہے کفر نہیں، لیکن ایک حکم سخت بیان کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے، گویا کہ بتایا گیا ہے کہ "ان ترک الزکوۃ من صفات الکفار" بیشک زکوۃ ادا نہ کرنا کفار کی صفات سے ہے۔

☆ "عن عمربن الخطاب رضی اللہ عنه قال لما قبض رسول اللہ ﷺ ارتدت العرب وقالوا لا نؤدی زکوۃ فقال ابو بکر لو منعونی عقا لا لجا هد تهم علیه فقلت یاخلیفة رسول اللہ ﷺ تألف الناس وارفق بهم فقال لی اجبار فی الجاهلیة وخوار فی الاسلام انه قد انقطع الوحی وتم الدین اینقص وانا حی" (رواہ رزین، مشکوۃ باب مناقب ابی بکر)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہو گیا تو عرب کے کچھ لوگ مرتد ہو گئے اور انہوں نے کہا ہم زکوۃ ادا نہیں کرتے (یعنی انہوں نے زکوۃ کی فرضیت کا انکار کر دیا) تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر یہ اونٹ کی رسی بطور زکوۃ دینے سے انکار

کریں گے تو میں ان سے جہاد کروں گا، میں نے کہا اے اللہ کے رسول کے خلیفہ لوگوں کے ساتھ محبت سے پیش آئیں اور ان پر نرمی کریں، آپ نے فرمایا اے عمر کیا تم زمانہ جاہلیت میں بہادر تھے اور اسلام میں آکر بزدل ہو گئے ہو؟ بیشک وحی کے آنے کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے دین مکمل ہو چکا ہے کیا میری زندگی میں دین میں کمی کردی جائے گی؟ (یہ کبھی نہیں ہوسکتا) (ماخوذ از مظھری)

کیا خوب اظہار تشکر:

"فنقل عن عطاء بن یسار انه کان یقول الحمدلله الذی قال "والکافرون هم الظالمون" ولم یقل "الظالمون هم الکافرون" (کبیر)

حضرت عطاء بن یسار کہتے تھے کہ سب تعریفیں اللہ رب العزۃ کے لئے ہیں جس نے یہ تو فرمایا کہ "کافر ہی ظالم ہیں" لیکن یہ نہیں فرمایا کہ ظالم ہی کافر ہیں۔

یعنی کفار کا عبادت بے محل کرنا، مال بیجا خرچ کرنا اور رب تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی ظلم ہی ہے، لہٰذا کافروں کا ظالم ہونا تو واضح ہے، لیکن مسلمان بھی بے جا مال خرچ کرتے ہیں جو ظلم ہے، اس لئے اگر ظلم کو کفر کہا جاتا تو اکثر مسلمان کافر ہو جاتے لیکن اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہر ظالم کو کافر نہیں کہا۔

☆☆☆☆☆

اَللّٰہُ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا یَئُوْدُہٗ حِفْظُھُمَا وَ ھُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ☆ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۵۵)

﴿۱﴾

اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ آپ زندہ اوراوروں کا قائم رکھنے والا، اسے نہ اونگھ آئے نہ نینداسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں وہ کون ہے جواس کے یہاں سفارش کرے بے اس کے حکم کے جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے اور وہ نہیں پاتے اس کے علم میں سے مگر جتنا وہ چاہے اس کی کرسی میں سمائے ہوئے ہیں آسمان اور زمین اور اسے بھاری نہیں ان کی نگہبانی اور وہی ہے بلند بڑائی والا۔

﴿۲﴾

اللہ ہے نہیں کوئی معبود سوائے اس کے جو ہمیشہ زندہ ہے، قائم رکھنے والا ہے، نہیں پکڑتی اسے اونگھ اور نہ نیند، اسی کا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے کون ہے وہ جو شفاعت کرے اس کے ہاں سوائے اس کی اجازت کے، وہ جانتا ہے جوان کے آگے ہے اور جوان کے پیچھے ہے اور نہیں جانتے کچھ بھی اس کے علم کی حقیقت سے سوائے اس کے جو کچھ وہ چاہے، وسیع ہے اس کی کرسی آسمانوں اور زمینوں کو، اور نہیں بھاری اس پران کی حفاظت، اور وہی ہے بلند بڑائی والا ۔

ماقبل سے تعلق:

اللہ تعالیٰ کی عادت شریفہ یہ ہے کہ علم توحید، علم احکام اور قصص کو ملا جلا کر بیان کرتا ہے تا کہ ایک ہی مضمون سے انسان کا دل اکتا نہ جائے، ایک قسم کے بیان سے دوسری قسم کے بیان کی طرف منتقل ہونا ایسے ہی ہے جیسا کہ کوئی مسافر ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف منتقل ہو جائے اور ایک باغ سے دوسرے باغ کی طرف منتقل ہونا یقیناً باعث لذت ہے، اسی طرح ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی طرف منتقل ہونا بھی باعث سرور ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ قصص کے بیان سے یا تو مقصد دلائل توحید کو پختہ کرنا ہوتا ہے، یا احکام کو لازم کرنا ہوتا ہے اور انسان کو مکلف بنانے میں تاکید مقصود ہوتی ہے۔ پہلے قصص و احکام کو بیان کیا گیا ہے اور اب دلائل توحید کو بیان کیا جارہا ہے۔ (از کبیر)

"اللّٰہ لا الہ الاھو": "اللہ ہے نہیں کوئی معبود سوائے اس کے۔"

اللہ واجب الوجود یعنی خود بخود قائم ہے، اس کا وجود حقیقی ہے، کسی اور نے اسے موجود نہیں کیا اور اس کی صفات کمالیہ میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں اور نہ ہی اس کے بغیر کوئی عبادت کے لائق ہے۔ (تبصیر الرحمٰن)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ تفسیر تبصیر الرحمٰن کے ان الفاظ کے مطابق ہے۔ (اللہ) الواجب الوجود (اللہ ہے) راقم نے بھی اسے پسند کیا۔ تاہم بعض تفاسیر کے مطابق "اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں" ترجمہ بھی درست ہے۔

خیال رہے لفظ "اللہ" کے متعلق تفصیلی بحث سورۃ فاتحہ میں گزر چکی ہے، اور " لا الہ الاھو " کی بحث " انما الھکم الہ واحد" آیۃ کریمہ میں گزر چکی ہے۔

"الحی القیوم": "وہ ہمیشہ زندہ ہے، قائم رکھنے والا ہے (اوروں کو)"

یعنی باقی تمام مخلوق ذاتی طور پر مردہ کی حیثیت سے ہے بلکہ معدومیت کے درجہ میں ہے، رب تعالیٰ کے موجود کرنے سے مخلوق کو وجود حاصل ہوا، بلکہ "حیاۃ الغیر من ظھور حیاتہ فیہ" بلکہ مخلوق کی زندگی رب تعالیٰ کی

حیات کا عکس ہے اور اسی کی تجلیات ان میں موثر ہے۔

(تبصیر الرحمن)

" القیوم " وہ قائم بذاتہ ہے اور اپنے ماسوا تمام کو وہی قائم کرنے والا ہے، تمام چیزوں کا وجود ہی اس لئے ہے کہ رب تعالیٰ کو نور کا ظہور ان میں موجود ہے۔

(تبصیر الرحمن)

طلباء کرام کے فائدہ کے لئے تبصیر الرحمٰن کی عبارت نقل کی جارہی ہے۔

"(الله) الواجب الوجود الذی له الوجود الحقیقی لا لغیره لا یشارکه فی صفات کماله ولا فی استحقاق العبادة غیره اذ (لا اله الاهو) وکیف یستحقها غیره وهو میت لذاته اذهو (الحی) لذاته وحیاة الغیر من ظهور حیاته فیه بل الغیر معدوم فی ذاته اذهو (القیوم) ای القائم بذاته المفهوم لکل ما عداه فوجود الکل من ظهور نور وجوده فیه"

(تبصیر الرحمن)

تبصیر الرحمٰن کی عبارت کو دیکھئے پھر اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کو دیکھئے تو خوب ترین نظر آئے گا۔

راقم نے " الحی " کا ترجمہ خازن سے لیا ہے۔

"(الحی) یعنی الباقی علی الابد الدائم بلا زوال والحی فی صفة الله تعالی هو الذی لم یزل موجودا وبالحیاة موصوفا لم تحدث له الحیاة بعد موت ولا یعتریه الموت بعد حیاة"

(خازن)

" الحی " جب اللہ تعالیٰ کی صفت ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے ہمیشہ موجود، زندہ رہنے والا، اور ایسے حیات اسے حاصل ہے جو موت اور معدومیت کے بعد وہ حیات حاصل نہیں ہوئی اور نہ ہی اس کی حیات کے بعد موت واقع ہونے والی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ازلی اور ابدی طور پر زندہ قائم ودائم ہے۔ نہ ہی اس کی ابتداء ہے اور نہ ہی اس کی انتہاء ہے، باقی تمام مخلوق عدم سے وجود میں آئی اور وجود کے بعد موت طاری ہوتی ہے رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی اس پر شاہد ہے "کل شیٔ ھا لک الا وجهه" ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے۔

یعنی رب تعالیٰ کے بغیر کسی چیز کو بھی دائمی بقاء حاصل نہیں۔

تنبیہ: تفسیر خازن نے "الحی" کے متعلق مختصر اور خوبصورت جو بیان کیا ہے اس سے کبیر اور روح المعانی کی طویل بحثوں کی ضرورت ختم ہوگئی کہ "الحی" اسے کہا جاتا ہے جس میں علم وقدرت اور سمع وبصر اور ارادہ و مثبت کا پایا جانا صحیح ہو۔

پھر اس پر اعتراض کہ یہ صفات تو عام انسان میں بھی پائی جاتی ہیں تو اس کا جواب کہ اللہ تعالیٰ کی صفت حیات سے مراد "لان المفهوم من الحی هو الکامل" اللہ تعالیٰ کے "حی" ہونے سے مراد وہ ان صفات میں کامل ہے۔ اور کامل کا مطلق ذکر کرنے سے یہ فائدہ حاصل ہوگا کہ وہ ہر طرح کامل ہو۔

"والکامل هو ان لا یکون قابلا للعدم لا فی ذاته ولا فی صفاته الحقیقة ولا فی صفاته النسبیة والا ضافیة" (کبیر)

کامل وہی ہے جو ذات اور صفات حقیقیہ اور صفات نسبیہ اور صفات اضافیہ کے لحاظ پر معدوم نہ ہو سکے۔

پھر اس پر روح المعانی کا یہ کہنا کہ "الحی" کا معنیٰ "کامل ہونا" لغت سے ثابت نہیں۔ اس تمام بحث میں الجھنے کے بغیر خازن کی مختصر اور خوبصورت اور اعتراضات سے محفوظ تفسیر پر اکتفاء کیا جائے۔ (راقم)

رب تعالیٰ نے اپنی صفت "الحی" ذکر فرمائی کیونکہ وہی تمام امور کا متصرف (پھیرنے والا) ہے، اور تمام چیزوں کی تقدیر اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔

"وقال قتادة الحی الذی لا یموت" حضرت قتادہ نے کہا "الحی" سے مراد یہاں وہ ذات ہے جس پر موت واقع نہیں ہوتی۔ "وقال السدی المراد بالحی الباقی" سدی رحمہ اللہ نے فرمایا "الحی" سے مراد ہمیشہ رہنے والا۔ (قرطبی)

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

"الحی" اصل "حیی" بر وزن حذر یعنی بکسر العین ہے، اور دو حرف ایک جنس کے جمع ہونے کی وجہ سے ادغام کر لیا گیا، یا اصل "حیو" بسکون العین ہے، "سید" کے قاعدہ کے مطابق واؤ کو یاء کیا گیا اور یاء کو یاء میں ادغام کر لیا گیا۔ (از کبیر)

"القیوم":

میں قائم کے معنی میں مبالغہ ہے۔ مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ "القیوم القائم علی کل شئ" "قیوم" کا معنی ہر چیز پر قائم رہنے والا، پھر اس کا مطلب یہ ہوگا۔ "انه قائم بتدبیر امر الخلق فی ایجادھم وفی ارزاقھم" بیشک اللہ تعالیٰ مخلوق کے امور کی تدبیر میں ہمیشہ کے لئے قائم ہے، وہی ہے جو مخلوق کو موجود کرنے والا ہے اور وہی ہے جو رزق دینے والا ہے۔

"قال الضحاک " القیوم الدائم الوجود الذی یمتنع علیه التغیر"

ضحاک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس ذات کو قیوم کہا جاتا ہے جو ہمیشہ کے لئے قائم ہو، موجود ہو، جس پر کسی قسم کا تغیر واقع نہ ہو۔

اس معنی کے لحاظ پر مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنی ذات اور اپنے وجود میں خود بخود قائم ہو۔

" وقال بعضھم القیوم الذی لا ینام با لسریانیه وھذا القول بعید"

بعض حضرات نے کہا کہ یہ لفظ سریانی زبان کا ہے جس کا معنی یہ ہے کہ وہ سوتا نہیں۔ اس قول کو علامہ رازی رحمہ اللہ نے رد فرمایا کہ یہ قول بعید ہے کیونکہ اس سے " ولا سنة ولا نوم" کا تکرار لازم آئے گا۔ (از کبیر)

راقم کا اس میں موقف یہ ہے کہ تفسیر تبصیر الرحمٰن اور خازن کے مطابق اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ہی مدنظر رکھا جائے۔ "اوروں کو قائم رکھنے والا" جب یہ معنی لیا جائے گا کہ وہ اوروں کو قائم کرنے والا ہے تو یقیناً اس کا خود بخود قائم ہونا لازم ہوگا اور اسے نیند کا نہ آنا بھی لازم ہوگا، جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

فائدہ: "الحی القیوم" اسم اعظم ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب مردوں کو زندہ کرتے تو" قم باذن الله" کہنے سے پہلے " یا حی یا قیوم" پڑھتے۔ اور آصف بن برخیا نے بلقیس کا تخت لانے کا جب ارادہ فرمایا تو انہوں نے بھی "یاحی یاقیوم" پڑھا۔ (از قرطبی)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

" قیوم" اصل میں " قیووم" بروزن فیعول ہے، اس لئے سید کے قاعدہ کے مطابق پہلی واؤ کو یاء کیا اور یاء کو یاء میں ادغام کیا۔

یہ بھی خیال رکھا جائے کہ " قیوم" کا وزن " فعول" عین کی تشدید سے نہیں اس لئے کہ عین کلمہ کو مشدد ماننے اور "فعول" کا وزن ماننے سے یہ کلمہ اجوف یائی ہوگا حالانکہ اجوف واوی ہے۔ (انتھی)

"ان ذاالعرش للذی یرزق الناس، وحی علیھم قیوم"

بیشک صاحب عرش ہی وہ ذات ہے جو لوگوں کو رزق دیتا ہے خود زندہ ہے، اوروں کو قائم کرنے والا ہے۔

امیہ بن الصلت نے کہا۔

لم تخلق السما والنجوم — والشمس معھا قمر یقوم

قدرہ مھیمن قیوم — والحشر والجنة والنعیم

الا لامر شانہ عظیم

آسمان اور ستارے اور سورج اور چاند جن کو رب تعالیٰ یعنی مہیمن اور قیوم ذات نے ایک تقدیر پر قائم کیا اور حشر اور جنت اور اس کی نعمتیں یہ تمام چیزیں نہیں پیدا کی گئیں سوائے اس کے کہ وہ ایک عظیم الشان امر کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ یعنی سب ہی اللہ تعالیٰ جو قیوم ہے اس کے حکم کی پابند ہیں۔ (از قرطبی)

راقم کا مندرجہ بالا ترجمہ (نہیں پکڑتی اسے اونگھ اور نہ نیند) لفظی ترجمہ ہے، ورنہ بامحاورہ ترجمہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ہی ہے "اسے نہ اونگھ آئے نہ نیند" "سنة" نیند سے پہلے آنے والی مستی وفتور ہے جس سے معمولی اعصاب کے تناؤ میں کمی واقع ہوتی ہے۔

مقام توجہ : سنة بھی اونگھ کو کہا جاتا ہے اور نعاس بھی اونگھ کو کہا جاتا ہے، لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے۔

" السنة فی الراس والنعاس فی العین والنو م فی القلب"

سر میں بوجھل پن کا پیدا ہونا "سنة" ہے، اور آنکھوں میں بوجھل پن پیدا ہونا "نعاس" ہے، اور دل پر اثر ہونا "نوم" ہے۔ نوم یعنی دل پر چھا جاتی ہے جیسے پردہ چھا جاتا ہے جو اشیاء کو معرفت سے منع کرتا ہے۔ (از خازن)

اعتراض: جب نیند سے پہلے اونگھ آتی ہے تو اونگھ کی نفی سے نیند کی نفی خود بخود ہو گئی۔ "لا تاخذه سنة" کے بعد "ولا نوم" کا ذکر تو تکرار غیر مفید ہے۔

جواب: آیۃ کریمہ کا معنی یہ ہے " لا تاخذه سنة فضل عن ان یا خذالنوم" اسے اونگھ نہیں آتی چہ جائے کہ اسے نیند آئے۔ (از کبیر)

نیند کے اسباب:

نیند کی وجہ سے دماغی اعصاب ڈھیلے پڑ جاتے ہیں، تر بخارات معدہ سے اوپر چڑھتے ہیں، جس کی وجہ سے حواس ظاہرہ مکمل طور پر موقوف ہو جاتے ہیں، اپنا اپنا کام چھوڑ دیتے ہیں۔ (روح المعانی)

تنبیہ: علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے۔" ان سبب النوم شم ھو اء یھب من تحت العرش"

کہ نیند کا سبب وہ ہوا ہے جو عرش کے نیچے سے چلتی ہے جس کے سونگھنے سے نیند آتی ہے۔

اس سے بظاہر یہ پتہ چلتا ہے کہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ کا موقف نیند کے اسباب میں باقی حضرات سے جداگانہ ہے، لیکن علامہ سید محمود آلوسی رحمہ اللہ سیوطی رحمہ اللہ کے قول کی وضاحت فرماتے ہیں کہ آپ کے قول کا مطلب یہ ہے۔

"ولعله ارادتصا عد الابخرة من المعدة تحت القلب ھو عرش الروح"

کہ معدہ سے بخار دماغ کی طرف چڑھتے ہیں جو نیند کا سبب بنتے ہیں، معدہ چونکہ دل کے نیچے ہوتا ہے اور دل روح کا عرش ہے۔

اس وضاحت کے بعد پتہ چلا کہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ کا موقف بھی وہی ہے جو دوسرے حضرات کا ہے، البتہ ظاہری الفاظ سے غلطی کا امکان ہوتا ہے، یعنی آپ نے عرش کا ذکر کیا، عرش سے مراد عرش الہٰی نہیں بلکہ مراد روح کا

عرش جو دل ہے، جس کے نیچے معدہ سے اٹھنے والی ہوا دماغ تک پہنچتی ہے تو نیند آتی ہے۔ (روح المعانی)

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

" سنة "مثال واوی ہے " عدة" کے وزن پر ہے، جیسا کہ کسی شاعر نے کہا۔

وسنان اقصده النعاس فر نقت　　　فی عینه سنة ولیس بنائم

نیند سے بیدار ہونے والے کا اونگھ قصد کرتی ہے تو خط ملط ہو جاتی ہے اس کی آنکھوں میں اونگھ حالانکہ وہ سویا ہوا نہیں ہوتا۔

"وقال ابن زید"الوسنان الذی یقوم من النوم وهولا یعقل حتی ربماجرد السیف علی اهله"

ابن زید نے کہا وسنان یعنی نیند سے بیدار ہونے والا عقل نہیں رکھتا، یعنی اس کی آنکھوں اور اس کے دماغ پر سستی چھائی ہوتی ہے یہاں تک کہ بسا اوقات وہ اپنے گھر والوں پر ہی تلوار نیام سے نکال لیتا ہے۔ (قرطبی)

☆ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" ان الله لاینـا م ولاینبغی له ان ینام" بیشک اللہ تعالیٰ نہ سوتا ہے اور نہ ہی اس کی شان کے لائق ہے کہ وہ سوئے۔ (مسلم، ابن کثیر، مظهری)

☆ **وعن ابن عباس ان بنی اسرائیل قالوایاموسی هل ینام ربک ؟قال اتقوا الله،فناداه ربه عـزوجل یا موسی سالو ک هل ینام ربک؟خذ ذجاجتین فی یدیک فقم اللیة ففعل مـو سی فلماذهب من اللیل ثلث نعس فوقع لر کبتیة ثم انتعس فضبطها حتی اذا کان آخـر اللیل نـعس فسقطت الزجاجتان فی یدیک،فانزل الله عزوجل علی نبیه آیة الکرسی "** (رواه ابن ابی حاتم عن سعید بن جبیر عن ابن عباس) (ابن کثیر)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک بنی اسرائیل نے ایک مرتبہ موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا، کیا تمہارا رب سوتا ہے؟ آپ نے فرمایا اللہ سے ڈرو، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ندا دی اے موسیٰ یہ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں، کیا تمہارا رب سوتا ہے؟ آپ اپنے دونوں ہاتھوں میں دو شیشے لیں اور پوری رات کھڑے رہیں، موسیٰ علیہ السلام نے ایسے ہی کیا، یہاں تک

کہ جب رات کا تہائی حصہ چلا گیا تو آپ کو اونگھ آئی وہ شیشے آپ کے گھٹنوں سے آ لگے۔ آپ بیدار ہوئے پھر ان کو سنبھالا، یہاں تک کہ جب رات کا آخری حصہ آیا تو آپ کو پھر اونگھ آئی تو وہ دونوں شیشے آپ کے ہاتھوں سے گر کر ٹوٹ گئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ پر نازل فرمایا اے موسیٰ اگر میں سو جاؤں تو آسمان اور زمین گر کر اسی طرح برباد ہو جائیں جس طرح تمہاری اونگھ سے تمہارے ہاتھوں سے شیشے گر کر ٹوٹ گئے۔ (ھکذا فی التفاسیر الاخر)

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ پر آیت الکرسی نازل فرما کر آپ کی امت پر واضح کر دیا کہ اسے اونگھ نہیں آتی چہ جائیکہ اسے نیند آئے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی امت کے دلوں میں شک پیدا ہونے سے پہلے ہی ان کی راہنمائی کر دی۔

”لہ ما فی السماوات ومافی الارض“:

”اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے۔“

یعنی تمام مخلوق اس کی مملوک ہے، اسی کے قہر و سلطنت میں ہے، کوئی چیز بھی اس کی ملکیت سے باہر نہیں۔ (از ابن کثیر)

ان الفاظ مبارکہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے قیوم ہونے کی وضاحت فرمائی کہ وہ اوروں کو قائم کرنے والا ہے، وہی معبود ہے، اس کے بغیر کوئی معبود نہیں، کیونکہ چاند، سورج، ستارے، فرشتے، بت اور شیاطین سب ہی اس کی ملکیت میں ہیں، اور سب ہی اس کی مخلوق ہیں، لہٰذا ان میں سے کسی میں بھی معبود بننے کی صلاحیت نہیں۔ (روح المعانی)

جب یہ واضح ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہے (خود بخود قائم ہے) اور اس کے بغیر تمام چیزیں ممکن الوجود ہیں (اپنے قیام میں غیر کی محتاج ہیں) ہر ممکن کے لئے موثر کا ہونا ضروری ہے، اور جس چیز کا موثر ہو وہ حادث ہوتا ہے تو یقیناً سب کو موجود کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے، ساری کائنات اسی کی ملکیت میں ہے، اسی کے موجود کرنے سے موجود ہے۔ (کبیر)

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ " ما "غیر ذوی العقول کے لئے آتا ہے،اس کا استعمال کیوں کیا گیا؟" من" جو ذوی العقول کے لئے آتا ہےاس کا استعمال کیوں نہیں کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ذوی العقول صرف انسان ،جن اور فرشتے ہیں،تعداد کے لحاظ پر باقی مخلوق زیادہ ہے،اس لئے لفظ''ما''ذکر کیا گیا ہے۔ (از کبیر)

جب یہ واضح ہوا کہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں تو اسی سے واضح ہوگیا کہ بندوں کے اعمال بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں داخل ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی اس مسئلہ کو واضح کرتا ہے۔" واللہ خلقکم وما تعملون" اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا کیا اور جو تم عمل کرتے ہو(ان کا بھی وہی خالق ہے) (از کبیر)

کفار کا رد:

" وفی ذلک رد علی الکفار حیث اثبتوا له شریکا فکأن الله یقول لهم ما اشرکتموه لا یخرج عن السماوات والارض وشأن الشریک ان یکون مستقلا خارجا عن مملکة الشریک الآخر" (صاوی)

رب تعالیٰ نے" له مافی السماوات ومافی الارض" سے کفار کا رد کر دیا کہ انہوں نے رب تعالیٰ کے شریک بنائے تو رب تعالیٰ نے فرمایا کہ زمین وآسمان کی تمام مخلوق اس نے پیدا کی اور اسی کی مملوک ہے،تمہارے شریک آسمانوں اور زمین سے باہر نہیں حالانکہ معبود تو وہ ہوسکتا ہے جو مستقل ہو اور ان سے خارج ہو اور ان کا خالق ہو،لہٰذا واضح ہوا کہ تمہارے بنائے ہوئے شریک باطل ہیں۔

''من ذاالذی یشفع عندہ الا باذنه'':

''کون ہے وہ جو شفاعت کرے اس کے ہاں سوائے اس کی اجازت کے۔''

اس مقام میں استفہام بمعنی نفی اور انکار کے ہے۔اب مطلب یہ ہوا" لا یشفع عندہ احد الا با مرہ" اس کے ہاں کوئی ایک بھی اس کی اجازت کے بغیر شفاعت نہیں کر سکے گا۔اس میں مشرکین کا رد ہے وہ اپنے بتوں کے متعلق کہتے تھے" هؤلاء شفعاؤنا عندالله" یہ اللہ کے ہاں ہماری شفاعت کریں گے اور وہ بتوں کی عبادت

کرنے کے متعلق کہتے تھے "مانعبدھم الالیقربونا الی اللہ زلفی" ہم ان کی عبادت نہیں کرتے سوائے اس کے کہ یہ ہمیں اللہ کے ہاں قریب کریں گے۔ تو رب تعالیٰ نے ان کا رد کردیا کہ رب تعالیٰ کے ہاں اس کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت نہیں کرسکے گا، تمہارے بت تو جہنم کا ایندھن ہوں گے وہ کیسے شفاعت کرسکیں گے۔

"یوم یقوم الروح والملائکة صفا لا یتکلمون الامن اذن له الرحمن"

اس دن روح (الروح الامین جبریل) اور دوسرے فرشتے صف بنا کر کھڑے ہوں گے کوئی کلام نہیں کرسکے گا سوائے اس کے کہ رحمان اسے اجازت دے۔ (کبیر)

"وتقرر فی ھذه الآیة ان اللہ یأذن لمن یشاء فی الشفاعة وھم الانبیاء والعلماء والمجاھدون والملائکة وغیر ھم ممن اکرمھم وشرفھم اللہ ثم لا یشفعون الا لمن ارتضی، کما قال "ولا یشفعون الالمن ارتضی"

اس آیۃ کریمہ سے یہ واضح ہوگیا بیشک اللہ تعالیٰ اجازت دیتا ہے شفاعت کی جسے چاہے، جن کو رب تعالیٰ کی طرف سے اجازت ہوگی وہ انبیاء کرام اور علماء کرام اور مجاھدین اور فرشتے اور ان کے بغیر جن کو رب تعالیٰ نے عزت اور شرافت دے رکھی ہے یعنی نیک لوگ، متقی حضرات اللہ کے ولی ہوں گے۔ چونکہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی کے مطابق اس کے ہاں وہی شفاعت کرسکیں گے جن کو اس نے پسند کررکھا ہوگا۔

"لا یبعد ان یکون للمؤمنین شفاعتان شفاعة فیمن لم یصل الی النار وشفاعة فیمن وصل الیھا ودخلھا اجارنا اللہ منھا"

مومنین کے لئے انبیاء کرام اور علماء صلحا، کو دو قسم کی شفاعتوں کا حق حاصل ہوگا ایک یہ کہ جو لوگ آگ میں داخل نہیں ہوں گے لیکن جنت میں بھی داخل نہیں ہونگے ان کے لئے شفاعت ہوگی کہ ان کو مقام اعراف سے جنت میں داخل کرلیا جائے گا اور دوسرے وہ مومنین جن کو جہنم میں داخل کرلیا ہوگا ان کے حق میں شفاعت ہوگی ان کو جہنم سے جلدی نکال لیا جائے گا ان کی سزا ختم ہونے کی انتظار نہیں کی جائے گی۔

☆ عن انس بن مالک قال قال رسول الله ﷺ یصف الناس یو م القیامة صفوفاوقال ابن نمیر اھل الجنةفیمر الرجل من اھل النارعلی الرجل فیقول یا فلان اما تذ کر یوم استسقیت فسقیتک شربة؟ قال فیشفع له ویمر الرجل علی الرجل فیقول اما تذکر یوم ناولتک طھورا؟فیشفع له ،قال ابن نمیرویقول یا فلان اما تذ کریوم بعثنی لحاجة کذاو کذا فذ ھبت لک فیشفع له"

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن جنت والوں کی صفیں بنی ہوں گی وہاں سے ایک شخص جہنم کا مستحق گذرے گا وہ ایک شخص کو کہے گا کیا تجھے یاد ہے تم نے مجھ سے ایک دن پینے کے لئے مشروب (پانی وغیرہ) طلب کیا تھا تو میں نے تمہیں پلایا تھا؟ وہ جنتی اس کے حق میں شفاعت کرے گا، پھر ایک شخص (جہنم کا مستحق) دوسرے پر گذرے گا وہ کہے گا کیا تمہیں یاد ہے کہ میں نے طہارت کے لئے تمہیں پانی دیا تھا تو وہ جنتی شخص اس جہنمی کے حق میں شفاعت کرے گا، اس طرح کئی شخص جو جہنم کے مستحق ہوں گے جنت کا حق رکھنے والوں کو یاد دلائیں گے ہم نے تمہاری فلاں حاجت کو پورا کیا تھا تو وہ جنتی کے حق میں شفاعت کریں گے۔

یہ واضح ہے کہ جہنم کے مستحقین سے مراد مومنین گنہگار لوگ ہوں گے نہ کہ کفار۔ (ماخوذ از قرطبی)

"یعلم ما بین ایدیھم وماخلفھم":

"وہ جانتا ہے جوان کے آگے ہے اور جوان کے پیچھے ہے۔"

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

ضمیر "ما فی السماوات وما فی الارض" کی طرف لوٹ رہی ہے، ذوی العقول کی شرافت کے پیش نظر ضمیر جمع مذکر غائب کی لائی گئی، واحد مونث نہیں لائی، اگر چہ مراد تمام مخلوق ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ مراد ہی ذوی

العقول کے بلند مراتب اشخاص ہوں جن کو شفاعت کا حق حاصل ہوگا۔ (از کبیر)

ان کے آگے اور ان کے پیچھے سے کیا مراد ہے؟

اس میں کئی احتمال ہیں لیکن تقریباً مفہوم قریب قریب ہی ہے۔

﴿۱﴾ اس میں ایک قول مجاہد، عطاء اور سدی رحمہم اللہ کا ہے کہ " مابین ایدیھم " سے مراد ان کے امور دنیا ہیں کہ وہ ان کے آگے ہیں یعنی پہلے واقع ہیں۔ " وما خلفھم " سے مراد امور آخرت ہیں کہ وہ پیچھے آنے ہیں۔ یعنی " مابین ایدیھم " سے مراد پہلے امور، اور " وما خلفھم " سے مراد بعد والے امور ہیں۔

﴿۲﴾ ضحاک وغیرہ کا قول یہ ہے کہ " مابین ایدیھم " سے مراد امور آخرت ہیں، کیونکہ وہ آگے آنے والے ہیں، اور " ماخلفھم " سے مراد امور دنیا ہیں کہ وہ پیٹھ پیچھے رہ جانے والے ہیں۔

﴿۳﴾ عطاء رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ " مابین اید یھم " سے مراد آسمانوں سے زمین تک، اور " وماخلفھم " سے مراد آسمانوں میں پائی جانے والی مخلوق۔

﴿۴﴾ "مابین اید یھم" سے مراد موت کے بعد کے امور، اور "وماخلفھم" سے مراد موت سے پہلے کے امور۔

﴿۵﴾ "مابین اید یھم" سے مراد جو اچھے یا برے اعمال کر چکے ہیں، اور " وما خلفھم " سے جو اچھے یا برے اعمال ان سے سرزد ہونے ہیں۔ (از کبیر)

تمام احتمالات کا جامع معنی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ زمینوں و آسمان میں رہنے والی تمام مخلوق کے تمام امور خواہ وہ عملیات ہوں یا اعتقادات ہوں، وہ گزر چکے ہوں یا واقع ہونے ہوں، سب کو ہی جانتا ہے۔

چونکہ پہلے یہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت نہیں کر سکتا تو یہاں سے گویا کہ یہ بھی وضاحت کر دی کہ رب تعالیٰ شفاعت کرنے والے کو جانتا ہے اور جس کے حق میں شفاعت کی گئی اسے بھی جانتا ہے کہ یہ ثواب کا مستحق ہے یا عذاب کا کیونکہ وہ تمام معلومات کو جاننے والا ہے اس پر کوئی چیز مخفی نہیں، اور شفاعت کرنے والے ذاتی طور پر نہیں جانتے کہ ان کو رب تعالیٰ کی فرمانبرداری کی وجہ سے اتنا عظیم مرتبہ حاصل ہے کہ وہ رب تعالیٰ

کے ہاں اعلیٰ درجہ کی مقبولیت پر فائز ہیں۔اور پھر انہیں یہ معلوم نہیں ہوگا کہ شفاعت کی ہمیں اجازت ہے یا نہیں۔

" وهذا يدل على انه ليس لأحد من الخلائق ان يقدم على الشفاعة الا باذن الله"

اسی سے پتہ چل گیا کہ مخلوق میں سے کسی ایک کو اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر شفاعت کرنے کا حق حاصل نہیں ہوگا ۔ (از کبیر)

خیال رہے کہ عام شفاعت کرنے والے صلحاء و علماء کے متعلق تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہیں مندرجہ بالا امور کا علم حاصل نہیں ہوگا لیکن انبیاء کرام کو یہ علم حاصل ہوگا، جہاں ان کو اجازت نہیں ہوگی وہ کہیں گے۔"اذ هبوا الى غيرى" میرے بغیر کسی اور کے پاس جاؤ، اور نبی کریم ﷺ کے پاس آئیں گے تو آپ ﷺ ارشاد فرمائیں گے "انا لها" میں ہی اس کا حق رکھتا ہوں۔ یہ ہوگی شفاعت کبری، اور اپنی اپنی امت کے مومنین مستحق شفاعت کے لئے شفاعت صغری اسی علم کے مطابق کریں گے جو رب تعالیٰ نے انہیں پہلے سے ہی عطاء کر رکھا ہوگا۔

" ولا يحيطون بشئ من علمه الا بما شاء" :

" اور نہیں جانتے کچھ بھی اس کے علم کی حقیقت سے سوائے اس کے جو کچھ وہ چاہے"

یہاں علم سے مراد معلوم ہے، جس طرح کہا جاتا ہے "اللهم اغفر لنا علمك فينا الى معلومك " اے اللہ ہمارے متعلق تو اپنی معلومات کے مطابق ہماری مغفرت فرما۔یعنی ہم اپنے اعمال کے مطابق اتنی معلومات نہیں رکھتے جتنی تیری معلومات ہمارے اعمال کے مطابق ہیں۔

اسی طرح "قدرة" کبھی بمعنی "مقدور" کے استعمال ہوتی ہے۔جیسا کہ کہا جاتا ہے "هذه قدرة الله، اى مقدوره" اسی مثال میں قدرة بمعنی مقدور ہے۔آیۃ کریمہ میں مذکورہ الفاظ مبارکہ کا معنی یہ ہوا۔

" انه تعالى عالم بكل معلومات و الخلق لا يعلمون كل المعلومات بل لا يعلمون منها الا قليل"

کہ اللہ تعالیٰ تمام معلومات کو جانتا ہے اور مخلوق تمام معلومات کو نہیں جانتی بلکہ معمولی علم مخلوق کو حاصل ہے۔ (از کبیر)

" والمعنى لايعلم احد من هؤلاء كنه شئ مامن معلو ما ته تعالى"

معنی یہ ہے کہ مخلوق میں سے کوئی ایک بھی اللہ تعالیٰ کے معلومات کی کنہ وحقیقت کونہیں جانتا سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنا کسی کو مطلع کیا ہے۔ (روح المعانی)

فائدہ جلیلہ:

"وجوز ان یراد من علمہ معلومہ الخاص وھو کل ما فی الغیب" فلا یظھر علی غیبہ الا من ارتضی من رسول"

یہاں علم سے مراد اللہ تعالیٰ کی خاص معلومات مراد ہوں جن کو غیب کہا جاتا ہے، تو اب مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی معلومات خاصہ یعنی غیب کوئی نہیں جانتا سوائے اس کے جو وہ چاہے۔

یعنی رب تعالیٰ چاہے تو اپنے رسولوں کو غیب پر مطلع کردے، جیسا کہ رب تعالیٰ نے واضح طور اس آیہ کریمہ میں بیان فرمایا" فلایظھر علی غیبہ احدا الامن ارتضی من رسول" اللہ تعالیٰ اپنی غیب کسی پر ظاہر نہیں فرماتا سوائے اس کہ جس رسول کو وہ پسند کرلے۔

دینی طلبا کرام کے لئے فائدہ عظیمہ:

"وعطفت ھذہ الجملۃ علی ما قبلھا لمغایر تھالہ لان ذلک یشعر بانہ سبحانہ یعلم کل شئ وھذہ تفید انہ لا یعلمہ غیرہ و مجموعھمادال علی تفردہ تعالی بالعلم الذاتی ھو من صفات الکمال التی یجب ان یتصف الالہ تعالی شانہ بھابالفعل"

اس جملہ یعنی" ولا یحیطون...... الخ" کا عطف ہے پہلے جملہ "یعلم ما بین ایدیھم وما خلفھم" پر ہے کیونکہ عطف کے تقاضا کے مطابق دونوں جملوں میں مغائرت بھی پائی گئی ہے، اس لئے کہ پہلے جملہ میں ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے اور اس جملہ میں ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر اور کوئی نہیں جانتا۔

دونوں جملوں کے مجموعہ سے یہ پتہ چل گیا کہ اللہ تعالیٰ اپنے ذاتی علم میں متفرد (اکیلا) ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی یہ صفت کمال ہے اور جو ذات معبود برحق ہو اس کا اس صفت کاملہ سے بالفعل متصف ہونا ضروری ہے۔ (روح المعانی)

اور ''الا بما شاء'' کے استثناء سے واضح ہو گیا کہ '' عطائی علم غیب'' انبیاء کرام کو بھی حاصل ہے، ذاتی غیب رب تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، اور اگر عطائی غیب کو بھی رب تعالیٰ کا خاصہ مانا جائے کہ تو لازم آئے گا کہ رب تعالیٰ کو کوئی اور غیب عطاء کرتا ہے۔ (راقم)

''وسع کرسیه السماوات والارض'':

''وسیع ہے اس کی کرسی آسمانوں زمینوں کو''

'' الکرسی'' کا لغوی معنی بعض چیزوں کا بعض سے مرکب ہونا۔ اور چوپاؤں کا پیشاب اور مینگنیاں کرنا جو بعض بعض سے مل جل جائیں اسے '' الکرس ''کہا جاتا ہے، اور وہ گھر جس میں کثیر مقدار میں پیشاب اور مینگنیاں پائی جائیں جو بعض بعض سے مل جائیں تو اس گھر کے متعلق کہا جاتا '' اکرست الدار'' کہا جاتا ''تکارس الشیئ'' جب کوئی چیز مرکب ہو۔ '' الکراسة'' کاپی کو کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں اوراق بعض بعض سے ملے ہوتے ہیں۔ (از کبیر)

عام اصطلاح میں کرسی مشہور ہے ''اصل الکرسی مایجلس علیه ولا یفضل عن مقعد القاعد''
اصل میں کرسی وہ چیز ہے جس پر بیٹھے تو بیٹھنے والے کی نشست سے زیادہ جگہ نہ ہو۔ (روح المعانی)

آیۃ کریمہ میں کرسی سے مراد کیا ہے؟

'' قال البیضاوی تصویر لعظمته وتمثیل مجرد ولا کرسی ولا قاعد ''
بیضاوی رحمۃ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ کرسی سے مراد حقیقی کرسی نہیں اور نہ ہی اس پر کوئی بیٹھنے والا ہے بلکہ یہ فقط ایک مثال بیان کی گئی ہے اور اس سے مراد رب تعالیٰ کی عظمت ہے۔

'' وروی سعید بن جبیر عن ابن عباس قال اراد با لکرسی علمه وهو قول مجاهد ومنه قیل لصحیفة العلم کراسته ومنه قیل للعماء الکرسی لا نهم المعتمد علیهم کما یقال اوتاد الارض ورجحه الطبری''

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کرسی

سے مراد اللہ تعالیٰ کا علم ہے کہ اس کا علم زمین وآسمان پر وسیع ہے، یہی قول مجاہد رحمہ اللہ کا ہے اسی قول کو طبری نے راجح قول قرار دیا ہے۔ اسی مناسبت سے علم کے صحیفہ، کتابچہ کو کراسۃ کہا جاتا ہے اور اسی مناسبت سے علماء کرام کو کراسی کہا جاتا ہے، کیونکہ ان پر اعتماد کیا جاتا ہے جیسا کہ علماء کو زمین کے اوتاد کہا جاتا ہے۔ (ماخوذ از مظہری و قرطبی)

بعض حضرات نے احادیث کو ظاہر پر رکھا:

"عن ابی ذرانہ سأل النبی ﷺ عن الکرسی فقال یا اباذر ما فی السموات السبع والا رضون السبع عند الکرسی الا کحلقة ملقاة بارض فلاة وان فضل العرش علی الکرسی کفضل الفلاة علی تلک الحلقة" (اخرجہ ابن جریر وابو الشیخ وابن مردویہ)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے کرسی کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا اے ابوذر سات آسمانوں اور سات زمینوں کی تمام چیزوں کو کرسی سے ایسی نسبت ہے، جیسے ایک مندری (انگوٹھی) کو جنگل میں ڈال دیا جائے تو اسے جو جنگل سے نسبت ہے پھر عرش کو کرسی پر اسی طرح وسعت اور فضیلت حاصل ہے جس طرح جنگل کو ایک مندری (انگوٹھی) پر وسعت حاصل ہے۔ (از روح المعانی)

"عن ابن عباس ان السماوات السبع فی الکرسی کدراھم سبعة القیت فی ترس"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے بیشک سات آسمانوں کو کرسی میں ڈال دیا جائے تو ایسے ہی ہوں گے جیسے ایک ڈھال میں سات درہم ڈال دیئے جائیں۔ (از مظہری)

"وقال السدی الکرسی تحت العرش" سدی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کرسی عرش کے نیچے ہے۔

"وقال الضحاک عن ابن عباس لو ان السماوات السبع والارضین السبع بسطن ثم وصلن بعضهن الی بعض ما کن فی سعة الکرسی الا بمنزلة الحلقة فی المفازة"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اگر بیشک سات آسمانوں اور سات زمینیں علیحدہ علیحدہ پھیلا کر ایک دوسرے کے ساتھ ملالئے جائیں تو ان کو کرسی کے مقابل وہی حیثیت حاصل

ہوگی جیسے کہ ایک مندری (انگوٹھی) کو جنگل میں ڈال دیا جائے۔

" وعن عمر رضی الله عنه قال اتت امراة الی رسول الله ﷺ فقالت ادع الله ان یدخلنی الجنة،قال فعظم الرب تبارک وتعالی وقال ان کرسیه وسع السموات والارض وان له أطیطا کأطیط الرحل الجدید من ثقله"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک عورت آئی اس۔نے عرض کیا آپ نے اللہ تعالیٰ سے میرے لئے دعاء کریں کہ مجھے جنت میں داخل کرے،راوی کہتے ہیں تو آپ نے اللہ تعالیٰ کی عظمت بیان فرمائی اور (ساتھ یہ بھی) فرمایا بیشک اس کی کرسی سات آسمانوں اور زمینوں کو وسیع ہے،اور بیشک اس کی ایسے آواز ہوگی جیسے نئے کجاوہ پر بوجھ ڈالنے سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ (ازابن کثیر)

ایک اور قول:

کہ مراد کرسی سے اللہ تعالیٰ کی سلطنت وقدرت ہے،کیونکہ بغیر سلطنت وقدرت اور ایجاد وخلق کے معبود ہونا ممکن نہیں،یعنی کرسی سے مراد کبھی بادشاہ ہوتا ہے،کیونکہ کرسی پر بیٹھتا ہے۔یعنی کرسی کے متعلق کل چار قول ہوئے،کرسی سے مراد جسم،کرسی سے مراد علم،کرسی سے مراد بادشاہ،کرسی سے مراد عظمت وکبریائی۔ (ماخوذازکبیر)

کرسی کہاں ہے:

" عن ابن مسعود قال بین کل سمائین مسیرة خمس مائة عام وبین السماء السابعة وبین الکرسی خمس مائة عام وبین الکرسی وبین العرش مسیرة خمس مائة عام"

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہر دو آسمانوں کے درمیان پانچ سو سال کی راہ ہے اور ساتوں آسمان اور کرسی کے درمیان پانچ سو سال کی راہ ہے اور کرسی اور عرش کے درمیان پانچ سو سال کی راہ ہے۔ (قرطبی)

اس حدیث سے واضح ہوا کہ سات آسمانوں کے اوپر کرسی اور عرش ہے۔ایک اور روایت میں ہے۔

" الکرسی تحت العرش واللہ واضع کرسیه فوق العرش، قال البیهقی فی هذا اشارة الی کرسیین احد هما العرش والآخر موضوع علی العرش"

کرسی عرش کے نیچے ہے اور اللہ تعالیٰ کرسی کو عرش پر رکھنے والا ہے، بیہقی نے کہا اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ کرسیاں دو ہیں ایک عرش کے نیچے ہوگی اور ایک عرش کے اوپر۔ (قرطبی)

راقم کا موقف یہ ہے کہ کرسی ایک ہی ہے اور عرش کے نیچے ہی ہے تاہم اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بعید نہیں کہ اسے عرش کے اوپر رکھ لیا جائے اور یہ عقلاً بھی بعید نہیں کیونکہ چھوٹی چیز بڑی میں سما جاتی ہے۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"واکثر السلف الصالح جعلوا ذلک المتشابه الذی لا یحیطون به علما وفوضوا علمه الی اللہ تعالی مع القول بغایة التنزیه والتقدیس له تعالی شانه"

اکثر سلف صالحین کا قول یہ ہے کہ کرسی کا ذکر متشابہات سے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ بیٹھنے سے پاک ہے، اس کی ذات بلند و بالا ہے اور وہ جسم ہونے سے پاک ہے اس لئے اس کا علم بھی اللہ تعالیٰ کو ہی ہے وہی بہتر جانتا ہے۔

"والقائلون بالمظاهر من ساداتنا الصوفیة قدس اللہ تعالی اسرارهم لم یشکل علیهم شیٔ من امثال ذلک "

ہمارے بزرگ صوفیاء کرام نے کرسی کا ظاہر معنی مراد لیا ہے کہ آسمانوں کے اوپر کرسی ہے آسمانوں کی طرح کرسی کا بھی وجود ہے ان کا قول بھی کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان کی نظر آسمانوں سے آگے تک کام کرتی ہے ان پر اس قسم کی چیزوں کو بیان کرنا مشکل نہیں ہوتا۔

(از روح المعانی ترجمہ بالوضاحت)

راقم کا موقف:

کرسی سے مراد جب بادشاہ لیا جائے تو تمام معانی اس میں سمٹ کر آجائیں گے، یعنی اللہ تعالیٰ تمام زمینوں و آسمانوں اور ان میں پائی جانے والی مخلوق کا خالق وموجد ہے، اسے ہی سلطنت قدرت حاصل ہے، اس کی عظمت و کبریائی اس کی تمام مخلوق پر وسیع وحاوی ہے، اس کا علم تمام اشیاء کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے، اس کی آسمانوں پر پائی جانے والی کرسی جسے انبیاء کرام اور اولیاء کرام کے بغیر کوئی نہیں جانتا اس کو تمام زمینوں اور آسمانوں پر وسعت حاصل ہے، وہ کرسی آسمانوں کے اوپر اور عرش کے نیچے ہے، رب تعالیٰ چاہے تو اسے عرش کے اوپر کردے۔

(واللہ اعلم بالصواب)

"ولا یؤدہ حفظھما": "اور نہیں بھاری اس پر ان کی حفاظت۔"

"ولا یؤدہ" ای لا یثقلہ" اسے بھاری نہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہ مشتق ہے "آد، یؤد، اودا" سے، جس کا معنی ہے ٹیڑھا کردینا، چونکہ بھاری چیز بھی اپنے ماتحت کو ایک طرف جھکادیتی ہے اور ٹیڑھا کردیتی ہے۔

"ولا یؤدہ" میں ضمیر منصوب میں ایک احتمال یہ ہے کہ یہ کرسی کی طرف لوٹ رہی ہو، لیکن زیادہ قوی صورت اور صحیح وجہ یہ ہے کہ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ تمام صفات رب تعالیٰ کی ہی بیان ہورہی ہیں۔

"حفظھما" ای السموات والارض" "ھا" ضمیر کا مرجع "سماوات وارض" ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ پر آسمانوں اور زمینوں کی حفاظت بھاری نہیں۔

جب زمین وآسمان کا ذکر ہوگیا تو ان میں پائی جانے والی اشیاء خود بخود اس میں داخل ہوگئیں۔ اب مطلب یہ ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ پر بھاری نہیں آسمانوں اور زمینوں اور آسمانوں اور زمینوں میں پائی جانے والی چیزوں کی حفاظت۔

اعتراض: زمین وآسمان کا ذکر کیا گیا تو عرش وکرسی کا ذکر کیوں نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ پر عرش وکرسی کی حفاظت بھاری نہیں؟

جواب: زمین وآسمان لوگوں کو نظر آتے ہیں اس لئے ان کا ذکر کردیا اور عرش وکرسی لوگوں کو نظر نہیں آتے اس لئے

ان کا ذکر نہیں کیا کہ درحقیقت مقصد لوگوں کو سمجھانا تھا۔ (از روح المعانی)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کے لئے:

بعض حضرات نے قاعدہ استخدام کے طور پر عرش وکرسی کے ذکر کو تسلیم کیا کہ قاعدہ استخدام کے طور پر اس میں مزید وسعت پائی گئی ہے، اس قانون کے مطابق مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ پر زمین وآسمان اور ان میں پائی جانے والی اشیاء اور عرش وکرسی کی حفاظت بھاری نہیں۔ طلباء کرام اس بات کو نہ بھولیں کہ اس مقام میں استخدام کے قاعدہ کو علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے اس وجہ سے بعید سمجھا کہ ان کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، لیکن راقم کے نزدیک استخدام کے قانون کو اس مقام پر تسلیم کرنے سے معنیٰ میں وسعت آئے گی اور عظمت قرآن سمجھ آئے گی۔ " واللہ اعلم بالصواب "

(راقم)

یعنی اللہ تعالیٰ پر تمام مخلوق کی حفاظت بھاری نہیں اور نہ ہی اسے مخلوق کی حفاظت عاجز کرسکتی ہے، بلکہ اس پر تمام مخلوق کی حفاظت آسان ہے: وہ ہر نفس کے کسب پر قائم ہے، وہ " **غنی حمید** " (بے پرواہ، تعریف کیا ہوا) ہے اور مخلوق اس کی محتاج ہے، اور اس کی صفت "**فعال لمایرید**" (وہ کرتا ہے جو چاہے) ہے۔ اور وہ اس صفت کا مالک ہے " **لا یسال عما یفعل وهم یسالون** " کہ اس سے نہیں پوچھا جاسکتا کہ وہ کیا کرتا ہے اور ان سے پوچھا جائے گا (کہ وہ کیا کرتے ہیں) اور رب تعالیٰ "**هو القاهر لكل شیء**" (وہ ہر چیز قہر وغلبہ رکھنے والا ہے) کا مصداق ہے، اور رب کائنات " **الحسيب علی كل شیئ** " (ہر چیز کا حساب لینے والا) ہے، اور مالک الملک "**الرقيب العلی العظيم**" (نگہبان، بلند، بڑا) ہے اس کے بغیر کوئی معبود نہیں۔ اس کے سواء کوئی رب نہیں۔ (ابن کثیر)

یعنی یہ تمام فوائد " **ولا یؤده حفظهما** " سے حاصل ہوئے۔

"وهو العلی العظيم": "اور وہی ہے بلند، بڑائی والا۔"

"(وهو العلی) ای المتعالی عن الاشباه والانداد والأمثال والاضداد وعن امارات النقص ودلات الحدوث"

اور وہی رب تعالیٰ بلند ہے، یعنی مشابہت، شریک، مثل، ضد اور نقص کی علامات اور حدوث کی دلالات سے بلند ہے۔ یعنی ان صفات سے وہ پاک ہے۔ دراصل یہ تمام صفات نقص ہیں جو رب تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں۔

"وقیل ھو من العلو الذی ھو بمعنی القدرۃ والسلطان والملک وعلو الشان والقھر والاعتلاء والجلال والکبریاء"

اور رب تعالیٰ بلند ہے یعنی اسے قدرت وسلطنت و بادشاہت حاصل ہیں۔ اور بلندی اور قہر وغلبہ اسے حاصل ہیں، اور ہر طرح کی بلندی اور بزرگی اور کبریائی اسے حاصل ہیں۔ (روح المعانی)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

جب "تعالیٰ" متعدی بعن یا بمن ہو تو اس وقت اس کا معنی ہوتا ہے فلاں چیز سے بلند، یعنی اس میں صفت نہیں پائی جاتی، جیسے میں کہوں " **استاذی ابو الحسنات محمد اشرف سیالوی تعالی عن تضییع اوقات الطلباء** " میرے استاذ مکرم حضرت علامہ مولانا ابوالحسنات محمد اشرف سیالوی طلباء کرام کے وقت ضائع کرنے سے بلند ہیں، یعنی اس صفت ناقصہ سے آپ پاک ہیں۔

اور جب "**تعالی**" کے بعد "**عن یا من**" نہ واقع ہوں تو اس کا معنی بلند ہونا یعنی کسی صفت کاملہ سے متصف ہونا ہوتا ہے، جیسے میں کہوں۔ "**استاذی ابو الحسنات محمد اشرف سیالوی تعالی بالتدریس وبالحافظۃ والتحقیق والتدقیق والتبحر**" میرے استاذ مکرم حضرت علامہ مولانا محمد اشرف سیالوی تدریس اور حافظہ اور تحقیق وتدقیق اور تبحر علمی میں بلند وبالا مقام رکھتے ہیں۔

راقم نے جب اس شخصیت کے سامنے زانوئے تلمذ خم کیا تو سمجھا کہ منصب تدریس کے لائق یہی شخص ہو سکتا ہے، رب تعالیٰ نے کمال حافظہ آپ کو عطاء فرمایا ہے، عربی وفارسی عبارات زبانی آپ اس روانگی سے پڑھتے ہیں جیسے میرے جیسا حافظ قرآن پاک کی آیات نہیں پڑھ سکتا۔ تحقیق وتدقیق میں آپ کو وہ کمال حاصل ہے کہ پڑھاتے ہوئے آپ کی نظر حواشی و شرح میں رہتی ہے، اور کبھی کبھی محشی حضرات اور شارحین کے تساھل کو بیان فرماتے رہتے ہیں۔ تبحر علمی کا یہ مقام ہے کہ جن فن

کی جو کتاب بھی آپ کو پڑھاتے ہوئے دیکھا یوں ہی سمجھا کہ آپ اس فن میں اپنی مثال نہیں رکھتے، راقم پر آپ کے بڑے احسانات ہیں۔ "فجزاہ اللہ خیر الجزاء"

"(العظیم) ذو العظمة و کل شیٔ بالا ضافة الیه حقیر"

اسے ہی بڑائی حاصل ہے باقی ساری مخلوق اس کے سامنے چھوٹی ہے۔ (روح المعانی)

تنبیه: مفسرین کرام رب تعالیٰ کی صفت "عظیم" کے مقابل مخلوق کی صفت "حقیر" بیان کرتے ہیں یہ حقیقت ہے کہ شان کے لحاظ پر جسے عظمت حاصل ہو اسے عظیم کہا جاتا ہے اور جسے وہ عظمت حاصل نہ ہو اسے حقیر کہا جاتا ہے۔

عربی زبان میں تو یہی تقابل پایا گیا ہے لیکن اردو میں حقیر گھٹیا کو کہا جاتا ہے۔ عربی اور اردو کے استعمال کے فرق کو نہ سمجھتے ہوئے جہلاء نے انبیاء کرام کو بھی حقیر اور ذلیل کہہ دیا۔ "العیاذ باللہ"

حقیقت یہ ہے کہ علم اور عقل اور رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کے مجموعہ سے ہی انسان کما حقہ کسی مسئلہ کو سمجھتا ہے ورنہ وہ بھٹکتا ہی رہتا ہے۔ (راقم)

فائدہ جلیلہ: رب تعالیٰ کی صفات الوہیت یعنی وحدانیت، حیات، علم، ملک، قدرت اور ارادہ کا اس آیۃ کریمہ میں ذکر ہے، اور سترہ جگہ پر اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے، کہیں صراحۃً، کہیں ضمیر لوٹا کر۔

اور آیۃ کریمہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے، الوہیت میں وہ واحد ہے، اس کی کوئی مثل نہیں، ہمیشہ کیلئے قائم دائم ہے واجب الوجود ہے اور غیروں کو موجود کرنے والا ہے، مکان میں رہنے سے وہ پاک ہے، تغیر و تبدل سے وہ پاک ہے، اس میں کسی قسم کی کوئی سستی نہیں پائی جاتی۔ اس کی کوئی نظیر نہیں کہ اس کے مشابہ ہو سکے، البتہ مخلوق اس کے نور کا عکس ہے، عکس اور عین میں مشابہت کا تصور ہی باطل ہے، جو عوارضات وغیرہ عام نفوس و ارواح کو عارض ہوتے ہیں وہ رب تعالیٰ کو عارض نہیں ہو سکتے۔ ملک و ملکوت کو پیدا کرنے والا وہی ہے، اصول و فروع کا خالق وہی ہے، تمام جہان اس کی شدید گرفت میں ہے، مخلوق میں کوئی چیز بھی اس کی گرفت سے باہر نہیں۔ گرفت سے مراد اس کی ملکیت و حفاظت میں ہونا، عذاب کی پکڑ نہیں ورنہ اس کے اپنے کرم سے انبیاء کرام اور صلحاء عذاب سے محفوظ ہوں گے۔

مندرجہ بالا تمام صفات آیۃ الکرسی سے ہی حاصل ہو رہی ہیں گویا یہ مسائل الٰہیہ کا خزینہ ہے۔ (از روح المعانی)

آیۃ الکرسی کے فضائل میں احادیث مبارکہ:

"قال رسول اللہ ﷺ ان اعظم آیۃ فی القرآن آیۃ الکرسی"
(اخرجہ مسلم واحمد وغیرھما)

قرآن پاک میں عظیم آیۃ (یعنی عظیم المرتبہ آیۃ) آیۃ الکرسی ہے۔

☆ عن انس قال قال رسول اللہ ﷺ من قرأ آیۃ الکرسی فی دبر کل صلوۃ مکتوبۃ حفظ الی الصلوۃ الأخری ولا یحافظ علیھا الا نبی اوصدیق اوشھید" (اخرجہ البیھقی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص فرض نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھتا ہے اسے دوسری نماز تک محفوظ رکھا جاتا ہے اس پر ہمیشگی کرنے والے صرف نبی یا صدیق یا شہید ہیں۔

لیکن یہ خیال رہے کہ آیۃ الکرسی فرض نماز کے بعد متصل پڑھنے کے بجائے سنت مؤکدہ ادا کرنے کے بعد پڑھے۔ یہی علامہ شامی رحمہ اللہ کی تحقیق ہے، جسے راقم نے تفصیلی طور پر اپنے رسالہ "نماز کے بعد ذکر و دعاء مستحب ہے" میں ذکر کیا ہے۔

☆ " اخرج الدیلمی عن علی رضی اللہ عنہ انہ قال اوتعلمون مافیھالماتر کتموھاعلی حال ان رسول اللہ ﷺ قال اعطیت آیۃ الکرسی من کنز تحت العرش لم یؤتھا نبی قبل"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر تمہیں معلوم ہو کہ آیۃ الکرسی میں کیا خیر و برکت ہے تو تم اسے کسی حال میں نہ چھوڑو، بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے عرش کے نیچے خزانہ سے آیۃ الکرسی دی گئی، مجھ سے پہلے کسی نبی کو (اس قسم کی آیۃ) نہیں دی گئی۔

☆ " عن ابی ھریرۃ قال وکلنی رسول اللہ ﷺ قال وکلنی رسول اللہ ﷺ یحفظ زکوۃ رمضان فاتانی آت فجعل یحثومن الطعام فاخذتہ قلت لارفعنک الی رسول اللہ ﷺ قال دعنی فانی محتاج وعلیّ عیال ولی حاجۃ شدیدۃ قال فخلیت عنہ فاصبحت فقال النبی ﷺ یا ابا ھریرۃ مافعل اسیرک البارحۃ ،قال قلت یارسول اللہ شکاحاجۃ

شدیدة وعیالاًفرحمته وخلیت سبیله،قال اما انه قدکذبک وسیعود، فعرفت انه سیعود لقول رسول اللهﷺ "انه سیعود" فرصدته فجاء یحثومن الطعام فاخذته،فقلت لأرفعنک الی رسول الله ﷺ قال دعنی فانی محتاج وعلیّ عیال، لااعود،فرحمته و خلیت سبیله،قال"امانه قدکذبک وسیعود"فرصدته الثالثة فجاء یحثومن الطعام فاخذته فقلت لارفعنک الی رسول اللهﷺ، وهذا آخر ثلاث مرات انک تزعم انک لا تعود ثم تعود ، فقال دعنی اعلمک کلمات ینفعک الله بها، قلت وما هی؟قال اذا اویت الی فراشک فاقرأآیة الکرسی الله لا اله الا هو الحی القیو م'حتی تختم الآیة،فانک لن یزال علیک من الله حافظ ولا یقربک شیطان حتی تصبح، فخلیت سبیله،فا صبحت فقال لی رسول اللهﷺ مافعل اسیرک البارحة؟قلت یارسول اللهزعم انه یعلمنی کلمات ینفعنی الله بها فخلیت سبیله،قال "ماهی؟قال قال لی"اذااویت الی فراشک فاقرأ آیة الکرسی من اولها حتی تختم الآیة " الله لا اله الاهوالحی القیوم"وقال لی لن یزال علیک من الله حافظ، ولایقربک شیطان حتی تصبح،وکانوااحرص شئ علی الخیر،فقال النبی ﷺ امانه صدقک وهو کذوب، تعلم من تخا طب من ثلاث لیال یا اباهریرة قلت لا قال ذاک شیطان"

(بخاری فی فضل آیة الکرسی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مجھے رسول اللہﷺ نے وکیل بنایا، پھر آپ نے وضاحت فرمائی کہ مجھے رمضان کی زکوۃ کے مال کی حفاظت کا وکیل بنایا (یعنی وہ مال میرے سپرد کیا کہ میں اس کی حفاظت کروں) کوئی آنے والا آیا اس نے طعام کو سمیٹنا شروع کیا تو میں نے اسے پکڑ لیا، اور میں نے کہا تمہیں ضرور بضرور رسول اللہﷺ کے پاس پہنچاؤں گا، اس نے کہا مجھے چھوڑ دو بیشک میں محتاج ہوں اور مجھ پر میرے اہل وعیال کی ذمہ داری ہے، اور میں بہت ہی زیادہ ضرورتمند ہوں، حضرت ابوھریرہ کہتے ہیں میں نے اسے چھوڑ دیا صبح میں نبی کریمﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو آپ نے فرمایا

اے ابو ہریرہ تمہارے گذشتہ رات کے قیدی نے کیا کیا؟ تو میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ اس نے شدید حاجت اور عیال داری کی شکایت کی تو مجھے اس پر رحم آیا تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔ آپ نے فرمایا بیشک اس نے تمہارے ساتھ جھوٹ بولا ہے، وہ پھر لوٹ کر آئے گا۔ تو مجھے یقین ہو گیا کہ ضرور لوٹ کر آئے گا کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمادیا ہے وہ لوٹ کر آئے گا۔ تو میں اس کی انتظار میں رہا (دوسری رات) وہ پھر آ گیا، اس نے مال سمیٹنا شروع کر دیا۔ میں نے اسے پکڑ لیا، پھر میں نے کہا میں تمہیں ضرور بر ضرور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر کروں گا۔ اس نے کہا مجھے چھوڑ دو، بیشک میں محتاج ہوں اور عیال دار ہوں، اب میں لوٹ کر نہیں آؤں گا مجھے اس پر رحم آیا اور میں نے اسے چھوڑ دیا، صبح میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے ابو ہریرہ تمہارے گذشتہ رات کے قیدی نے کیا کیا؟ میں عرض کیا یارسول اللہ اس نے حاجتمندی اور عیال داری کی شکایت کی تو مجھے اس پر رحم آیا تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔ آپ نے فرمایا اس نے تمہارے ساتھ جھوٹ بولا ہے، وہ پھر لوٹ کر آئے گا میں اس کی تیسری رات پھر انتظار کرنے لگا، وہ (تیسری رات پھر) آ گیا اور اس نے طعام سمیٹنا شروع کر دیا۔ میں نے اسے پکڑ لیا تو میں نے کہا اب میں تمہیں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ضرور لے کر جاؤں گا، یہ آخری تیسری مرتبہ ہے تو یقین دلاتا ہے کہ اب میں لوٹ کر نہیں آؤں گا لیکن پھر تو آ جاتا ہے اسنے کہا مجھے چھوڑ دو، میں تمہیں کچھ کلمات سکھاتا ہوں جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ تمہیں نفع دے گا میں نے کہا وہ کیا ہیں؟ اس نے کہا جب تم اپنے بستر پر لیٹو تو آیۃ الکرسی پڑھ لیا کرو اس نے "اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم " سے لے کر مکمل آیت پڑھی (کہ یہ تم پڑھ لیا کرو) اللہ تعالیٰ تمام رات تمہاری حفاظت کرے گا اور صبح تک شیطان تمہارے قریب نہیں آئے گا تو میں نے اسے چھوڑ دیا، صبح میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے مجھے فرمایا تمہارے گذشتہ رات کے قیدی نے کیا کیا؟ میں نے کہا یارسول اللہ ﷺ اس نے مجھے چند کلمات سکھا دیئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان کے ذریعے نفع دے گا تو میں نے سے چھوڑ دیا، تو آپ نے فرمایا وہ کلمات کیا ہیں؟ تو میں نے کہا کہ اس

نے مجھے بتایا کہ جب تم بستر پر آ کر لیٹو تو آیۃ الکرسی اول سے آخر تک پڑھ لیا کرو تو تمام رات اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت کرے گا اور صبح تک شیطان تمہارے قریب نہیں آئے گا۔

صحابہ کرام نیکیوں پر بہت زیادہ حریص تھے (اسی وجہ سے تیسری رات کو اس سے آیۃ الکرسی پڑھنے کی برکت سن کر چھوڑ دیا) تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا، خبردار بیشک وہ تمہیں سچ بتا کر گیا ہے اگرچہ وہ بڑا جھوٹا ہے پھر آپ نے فرمایا اے ابو ہریرہ کیا تم جانتے ہو کہ تین راتیں تمہارے ساتھ خطاب کون کر رہا تھا؟ میں نے کہا نہیں، آپ نے فرمایا وہ شیطان تھا۔

(بخاری ، نسائی، ابن مردویہ ، ابو نعیم ،صابونی در منثور)

حدیث پاک سے حاصل ہونے والے فوائد:

نبی کریم ﷺ کو علم غیب حاصل تھا اسی وجہ سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بتانے کے بغیر ہی آپ پوچھ رہے تھے تمہارے گذشتہ رات کے قیدی نے کیا کیا؟ تین راتیں آپ نے یہی پوچھا، دو راتوں پر آپ نے فرمایا وہ پھر لوٹ کر آئے گا ،تو وہ لوٹ کر آیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو نبی کریم ﷺ سے سن کر ہی یقین آ گیا کہ جب آپ نے فرما دیا ہے کہ وہ لوٹ کر آئے گا تو یقیناً وہ لوٹ کر آئے گا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رحم دل تھے اس کی منت سماجت پر اسے چھوڑ دیتے۔

آیۃ الکرسی کی فضیلت سمجھ آ گئی کہ رات کو پڑھنے سے اللہ تعالیٰ انسان کو شیطان سے محفوظ رکھتا ہے جو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ جھوٹا بھی کبھی سچی بات کر دیتا ہے، اس لئے اس کی سچی بات سے فائدہ حاصل کر لیا جائے ،اسی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا " انظر الی ماقال ولا تنظر الی من قال" یہ دیکھو کسی نے کیا کہا ہے، یہ نہ دیکھو کہنے والا کون ہے۔ •

☆ " عن ابی هريرة ان رسول الله ﷺ قال سورة البقرة فيها آية سيدة آی القرآن لا تقرأ فی بيت فيه شيطان الاخرج منه" (رواه الحاكم) وقد رواه الترمذی ولفظه لكل شئ سنام وسنام القرآن سورة البقرة وفيها آية هی سيدة آی القرآن آية الكرسی"

مستدرک حاکم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سورۃ

البقرۃ میں ایک آیۃ ہے جوقرآن پاک کی تمام آیتوں کی سردار ہے، جس گھر میں شیطان ہو اس میں وہ آیت تم نہیں پڑھو گے مگر یہ کہ شیطان اس سے نکل جائے گا اور ترمذی میں اس آیت الکرسی کو واضح طور پر بیان کر دیا گیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہر چیز کی کوہان (بلندی، چوٹی) ہوتی ہے، اور قرآن پاک کی کوہان سورۃ بقرۃ ہے اور اس میں ایک آیت ہے جو قرآن پاک کی تمام آیتوں کی سردار ہے وہ آیت آیۃ الکرسی ہے۔

حدیث پاک سے واضح ہوا کہ جس گھر میں شیطان (جنات) ہوں اس گھر میں آیۃ الکرسی پڑھی جائے تو اس گھر سے شیطان کا نکلنا یقینی ہو جاتا ہے۔

☆ **" واخرج الدارمی عن ایفع بن عبدالله الکلاعی قال قال رجل یا رسول الله ای آیت فی کتا ب الله اعظم؟قال آیة الکرسی " الله لا اله الاهوالحی القیوم"**

ایفع بن عبداللہ کلاعی فرماتے ہیں ایک شخص نے کہا یارسول اللہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں کون سی آیۃ عظیم مرتبہ والی ہے؟ آپ نے فرمایا آیت الکرسی۔ (درمنثور)

" عن اسماء بنت یزیدبن السکن قالت سمعت رسول الله ﷺ یقول فی ها تین الآتین "الله لا اله الا هو الحی القیوم "و" الم ☆ الله لا اله الا هو الحی القیوم" ان فیها اسم الله الاعظم" (رواہ احمد)

اسماء بنت یزید بن سکن فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے فرماتے ہوئے سنا کہ ان دو آیتوں میں یعنی " **الله لا اله الاهو الحی القیوم**" میں اور " **الم☆ الله لا اله الا هو الحی القیوم**" میں اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے۔ (یعنی " الحی القیوم" اسم اعظم ہے) (صابونی)

☆ **"عن ابی امامة یر فعه قال اسم الله الاعظم الذی اذادعی به اجاب فی ثلاث سورة البقرة و آل عمران وطه،وقال هشام اماالبقرة"الله لااله الاهوالحی القیوم"وفی آل عمران"الم☆ الله لا اله الا هوالحی القیوم"وفی طه" وعنت الوجوه للحی القیوم"**

حضرت ابوامامہ نے مرفوع حدیث بیان کی کہ اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ذکر کر کے جب دعاء کی جائے تو اللہ تعالیٰ اسے قبول فرماتا ہے، وہ تین سورتوں میں ہے سورۃ البقرۃ میں اور آل عمران میں اور سورۃ طٰہٰ میں۔ پھر ہشام نے وضاحت فرمائی کہ بقرہ میں ہے۔ " اللہ لا الـه الاهـو الـحی القیوم" اور آل عمران میں ہے۔"الـم ☆ اللہ لا الـه الاهـو الحي القيوم" اور طٰہٰ میں ہے "وعـنت الوجوه للحي القيوم" (یعنی ان تمام آیات میں " الحي القيوم " کا ذکر ہے جو اسم اعظم ہے) (صابونی)

☆ " عـن ابی هريرة قـال قال رسول الله ﷺ من قـرأ "حـم الـمومن الی"اليه المصير" و آية الـكـرسـي حيـن يصبح حفظ بهماحتي يمسي،ومن قرأ هماحين يمسي حفظ بهما حتي يصبح" (رواه التر مذی وقال هذا حديث غريب).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے حـم الـمؤ من کو اليـه الـمـصـيـر تک اور آیۃ الکرسی صبح کے وقت پڑھی تو ان کی برکت کی وجہ سے اسے شام تک محفوظ رکھا جائے گا اور اگر شام کو پڑھیں تو صبح تک اسے ان کی برکت سے محفوظ رکھا جائے گا۔ (صابونی)

"حم المومن،اليه المصير" تک کا مطلب یہ ہے کہ سورۃ المؤمن جو " حم " سے شروع ہو رہی ہے اس کی پہلی تین آیات پڑھیں۔

☆ " واخرج ابو عبيد فی فضائله والدارمی والطبرانی وابو نعيم فی دلائل النبوة والبيهقی عـن ابـن مسـعـود قـال خـرج رجـل مـن الانـس فلقيه رجل من الجن فقال هل لـک ان تـصـارعـنـی فـان صرعتني علمتک آية اذاقرأتها حين تدخل بيتک لم يدخله شيطان فـصارعه فصرعه الانسی فقال تقرأ آية الكرسی فانه لا يقرؤهااحداذا دخل بيته الاخرج الشيطـان لـه خيـج كـخيـج الـحـمارفقيل لابن مسعود اهوعمرقال من عسی ان يكون الاعمر(الخيج الضراط)"

حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں ایک انسان کو ایک جن ملا، اس جن نے کہا کہ کیا تم مجھے (کشتی میں)

پچھاڑ سکتے ہو، اگر تم نے مجھے گرا لیا تو میں تمہیں ایک آیۃ سکھاؤں گا، جب بھی تم وہ آیت پڑھو گے تو تمہارے گھر شیطان داخل نہیں ہوگا، تو اس جن نے انسان سے کشتی کی، انسان نے اسے گرا دیا، تو اس نے بتایا کہ تم آیۃ الکرسی پڑھا کرو جب بھی تم آیۃ الکرسی پڑھو گے تو شیطان گدھے کی طرح اپنی (دبر سے) ہوا نکالتے ہوئے اس گھر سے نکل جائے گا۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ وہ انسان عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے؟ تو انہوں نے کہا کہ عمر کے بغیر اور کون ہوسکتا ہے۔ (درمنثور)

☆☆☆☆☆

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ☆ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۵۶)

﴿۱﴾

نہیں کچھ زبردستی دین میں بے شک خوب جدا ہوگئی ہے نیک راہ گمراہی سے تو جو شیطان کو نہ مانے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اس نے بڑی محکم گرہ تھامی جسے کبھی کھلنا نہیں اور اللہ سنتا جانتا ہے۔

﴿۲﴾

نہیں کچھ زبردستی دین میں، تحقیق خوب ظاہر ہوگئی ہدایت گمراہی سے، تو جس شخص نے نہ مانا شیطان کو اور ایمان لایا اللہ پر تو تحقیق اس نے تھام لیا مضبوط گرہ کو جسے کبھی کھلنا نہیں اور اللہ سننے والا، اور جاننے والا ہے۔

بعض حضرات نے یہ بیان کیا کہ یہ آیۃ اور اس کے بعد والی آیۃ "خالدون" تک آیۃ الکرسی کا حصہ ہیں، لیکن حق یہ ہے کہ یہ دونوں آیتیں آیۃ الکرسی کا حصہ نہیں بلکہ نیا جملہ ہے، پہلے توحید کا ذکر کیا گیا تو اس سے وہم کا گمان تھا کہ شاید اللہ

تعالیٰ پر ایمان لانے کے لئے لوگوں پر جبر کیا جائے تو اس آیۃ کریمہ سے اس کی وضاحت کردی کہ دین میں کوئی جبر نہیں۔

"لانه فی الحقیقة الزام الغیر فعلا لایری فیه خیرا یحمله علیه والدین خیر کله"

اس لئے کہ جبر کرنے کا حقیقی مطلب یہ ہے کہ کسی پر فعل کو لازم کرنا، جس فعل کو وہ اچھا نہیں سمجھ رہا، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی پر جبر کر کے کوئی فعل اس سے کرایا جائے تو وہ کام اس کے نزدیک اچھا نہیں ہوتا حالانکہ دین تمام کا تمام ہی اچھا ہے، تو واضح ہوا کہ دین میں جبر نہیں۔ (از روح المعانی)

شانِ نزول:

اس آیۃ کریمہ کا نزول چند واقعات کے بعد ہوا تمام ہی اس کا شان نزول ہیں۔

﴿۱﴾ ابوداؤد، نسائی اور ابن جریر نے بیان کیا ہے کہ اسلام سے قبل انصار کی جس عورت کی اولاد نہیں ہوتی تھی وہ نذر مانتی تھی کہ اگر میری اولاد ہو تو میں اسے یہودی دین پر قائم کردوں گی۔ جب بنونضیر کو جلاوطن کردیا گیا تو ان میں انصار کے کئی بچے تھے۔

"فقالو لا ندع ابنائنا فانزل الله لا اکراہ فی الدین"

تو انصار نے کہا ہم کسی صورت میں بھی اپنے بچوں کو بنونضیر کے ساتھ جانے کی اجازت نہیں دیں گے، تو رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا لا اکراہ فی الدین" کہ دین میں کوئی زبردستی نہیں۔

ایک روایت میں ہے جب بنونضیر کو جلاء وطن کیا گیا تو انصار نے کہا "یارسول الله ابناؤنا و اخواننا فیھم" یارسول اللہ ہمارے بیٹے اور بھائی ان میں موجود ہیں تو رسول اللہ ﷺ وحی کے انتظار میں خاموش رہے تو رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ " لا اکراہ فی الدین "کو نازل فرمایا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے اصحاب کو اختیار دے دیا گیا ہے "فان اختاروکم فھم منکم و ان اختاروھم فھم منھم" اگر وہ تمہیں پسند کریں تو وہ تمہارے ساتھ رہیں یعنی اسلام لے آئیں، اور اگر وہ یہودیوں کو پسند کریں کہ ان کے دین پر قائم رہیں تو وہ ان کے ساتھ ہو جائیں۔

"فلحق بھم من لم یسلم فاجلوھم معھم" جو یہودیوں کے ساتھ مل گئے اور اسلام نہ لائے تو ان کو

جلاوطن کردیا گیا" وبقی من اسلم "اور جنہوں نے اسلام قبول کرلیا تھا ان کو جلاوطن نہیں کیا گیا۔ انصار نے وجہ بیان کی کہ ہم اپنی اولاد کو یہودیوں کے دین پر قائم رہنے کی اجازت کیوں دیتے تھے۔

"فقالوا انماجعلناھم علی دینھم ونحن نری ان دینھم افضل من دیننا" اس لئے کہ ہم یہودیوں کے دین کو اپنے دین سے اچھا دین سمجھتے تھے تو اپنی اولاد کو بھی ان کے دین میں رہنے کی اجازت دیتے تھے۔ اب جبکہ اسلام آگیا جو تمام دینوں سے افضل ہے تو ہم اپنی اولاد کو کبھی بھی اجازت نہیں دیں گے کہ وہ یہودیوں کے ساتھ رہیں تو رب تعالیٰ نے فرمایا" لا کراہ فی الدین" دین میں زبردستی نہیں۔

﴿۲﴾ انصار کے قبیلہ بنی سالم بن عوف سے ایک شخص تھا جس کا نام حصین تھا، یہ خود مسلمان تھے ان کے دو بیٹے نصرانی ہو گئے جو شام کے علاقہ میں چلے گئے تھے، پھر وہ شام سے مدینہ طیبہ میں تجارتی غرض سے چند اپنے نصرانی ساتھیوں سے مل کر آئے تو ان کے باپ نے ان کو زبردستی پکڑ لیا کہ میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا یہاں تک کہ اسلام لے آؤ لیکن انہوں نے اسلام لانے سے انکار کر دیا، یہ معاملہ نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچا تو حصین نے کہا" یارسول اللہ ﷺ ایدخل بعض النار وانا انظر" یارسول اللہ کیا میرے جسم کے ٹکڑے آگ میں جل رہیں ہوں گے اور میں انہیں دیکھ رہا ہوں گا (یہ منظر میرے لئے ہولناک ہوگا، اس لئے میں ان کو اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک یہ مسلمان نہیں ہو جاتے) تو رب تعالیٰ نے آیۃ کریمہ "لا اکراہ فی الدین" نازل فرمائی تو انہوں نے ان کو چھوڑ دیا۔ (ماخوذ از در منثور)

﴿۳﴾ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ آیۃ اہل کتاب کے حق میں نازل ہوئی کہ وہ جب جزیہ دے دیں تو ان پر کسی قسم کا جبر نہیں البتہ حجاز کے بت پرستوں کے لئے جزیہ مقرر نہیں تھا اس لئے ان سے صرف اسلام قبول کیا جاتا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک نصرانیہ بوڑھی عورت کو کہا" اسلم ایتھا العجوز تسلمی" اے بوڑھی عورت اسلام لے آ تا کہ تو سلامتی میں رہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو حق سے معبوث فرمایا، اس نے کہا میں بہت بوڑھی عورت ہوں موت قریب ہے (گویا کہ اس کا مطلب تھا کہ اس عمر میں اپنے دین کو کیوں چھوڑوں) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا" اللھم اشھد وتلا "لا اکراہ فی الدین" اے اللہ تو گواہ رہ۔

پھر آپ نے " لا اکراہ فی الدین" پڑھا، یعنی تیرا اپنا ہی ارشاد ہے کہ دین میں جبر نہیں۔ (قرطبی)

﴿۴﴾ " وقیل معناها لا تقولوا لمن اسلم تحت السیف مجبرا مکرها"

یعنی آیۃ کریمہ کے شان نزول کی یہ وجہ ہے کہ کہا گیا ہے جو لوگ اسلام لے آئیں ان سے متعلق یہ نہ کہو کہ وہ جبراً تلوار کی وجہ سے اسلام لائے ہیں بلکہ اسلام لانے والوں نے خوشی اور رضا مندی سے اسلام قبول کیا۔ (قرطبی)

قابل توجہ:

بعض حضرات نے بیان کیا کہ یہ آیۃ منسوخ ہے۔ " یا ایها النبی جاهد الکفار والمنافقین واغلظ علیهم" (اے نبی جہاد کریں کفار ومنافقین سے اور ان پر سختی کریں) سے۔

لیکن علامہ بغوی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول سے منسوخیت والے قول کا خوبصورت محاسبہ کیا ہے، آپ کہتے ہیں کہ نسخ وہاں پایا جاتا ہے جہاں تعارض پایا جائے، جہاد اور قتال کے حکم اور " لا اکراہ فی الدین" میں تعارض نہیں پایا جاتا۔

" فان الامر بالقتال والجهاد ولیس لا جل الاکراه علی الدین بل لدفع الفساد من الارض فان الکفار یفسدون فی الارض ویصدون عباداللہ عن الهدی والعبادة "

جہاد اور قتال کا حکم اس لئے نہیں دیا گیا کہ ان سے جبراً اسلام قبول کرایا جائے بلکہ جہاد کا حکم کافر کے فساد کو دور کرنے کے لئے دیا گیا ہے، کیونکہ کفار زمین میں فساد پھیلاتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کو سیدھی راہ اور عبادت سے منع کرتے تھے اس لئے ان کو جہاد میں قتل کرنے کا ایسے ہی حکم دیا گیا جیسے سانپ اور بچھو اور کاٹنے والے کتے کے شر سے بچنے کے لئے ان کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا۔

بلکہ کافروں کا قتل کرنا سانپ اور بچھو اور کاٹنے والے کتے کے قتل سے بھی زیادہ ضروری ہے، اس لئے کہ ان سے صرف جان کا خطرہ ہوتا ہے اور کفار سے جان کو بھی خطرہ ہوتا ہے اور ایمان کو بھی، یہی وجہ ہے کہ کفار اگر فساد سے باز آنے کا معاہدہ کرلیں اور جزیہ دینے کا معاہدہ کرلیں تو ان کو قتل کرنے سے ان الفاظ مبارکہ سے منع کر دیا۔

" حتی یعطوا الجزیة عن ید وھم صاغرون"

اور نبی کریم ﷺ کا کفار کے بچوں اور عورتوں اور بوڑھوں اور راہبوں اور نابینوں اور چلنے پھرنے سے عاجز لوگوں کو قتل کرنے سے منع فرمانا۔ یہ بھی دلیل ہے اس کی کہ جہاد میں جن لوگوں سے فساد کا گمان ہوتا ہو ان کو قتل کیا جائے اور جن لوگوں سے فساد کا گمان نہ ہو ان کو قتل نہ کیا جائے، اگر چہ جبری طور پر ایمان قبول کرانا مقصود ہوتا تو بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو بھی قتل کرنے کا حکم دیا جاتا۔

"وکیف یقال بالنسخ مع ان الا کراہ فی الدین لا یتصور ولا یفید"

منسوخیت کا قول کیسے صحیح ہوسکتا ہے جبکہ دین میں جبر کرنا متصور نہیں، اور نہ ہی جبری طور پر ایمان قبول کرانا نفع مند ہوسکتا ہے۔ (از مظہری)

خوبصورت اقتباس:

اسلام کے دشمنوں نے اسلام پر لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانے کا جو الزام لگا رکھا ہے قرآن نے پہلے ہی اس کا رد کر دیا کہ دین کے معاملہ میں جبر و اکراہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا کیونکہ دین کی بنیاد ہے ایمان اور ایمان کا تعلق ہے دل سے اور دل جبر و اکراہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنا جانتا ہی نہیں، نیز اسلام بحیثیت دین انسان کی باطنی اور قلبی اصلاح اور درستی کرنا چاہتا ہے اگر کسی کے گلے میں آپ جبراً پھندا ڈال دیں تو کیا اس کی روحانی اصلاح ہو جائے گی اور کیا اسلام کا مقصد حاصل ہو جائے گا؟ اور اگر نہیں یقیناً نہیں تو پھر ایسے شخص کو مسلمان کرنے میں اسلام کو کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔ (ضیاء القرآن)

"قد تبین الرشد من الغی": "تحقیق خوب ظاہر ہوگئی ہدایت گمراہی سے"۔

" بان الشیٔ واستبان وتبین اذا ظھر ووضح "

یعنی "بان، استبان" اور "تبین" کا ایک ہی معنی ہے بہت ہی واضح ہونا اور ظاہر ہونا جیسا کہ کہا جاتا ہے۔" قد تبین الصبح لذی عینین" تحقیق صبح خوب واضح ہوگئی دو آنکھوں والے پر۔

عام طور پر تو یہی کہا جاتا ہے کہ "بان" جب بیان سے لیا جائے تو اس کا معنی ظاہر ہونا، اور جب "بینو نة" سے لیا جائے تو اس وقت معنی ہوتا ہے جدا ہونا، لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ کے نزدیک دونوں معنی ایک دوسرے کو متلازم ہیں۔ اسی لئے آپ فرماتے ہیں۔

"وعندی ان الایضاح والتعریف انما سمی بیا نا لأنه یو قع الفصل والبینونة بین المقصو دو غیره"

کہ میرے نزدیک وضاحت اور کسی چیز کی تعریف کرنے کو بیان اس لئے کہا جاتا ہے کہ مقصود اور غیر مقصود کے درمیان فرق کر دیا جاتا ہے۔

"الرشدفی اللغةمعناه اصابة الخیر"

رشد کا لغوی معنی کسی کو بھلائی پہنچانا ہے، اور یہی معنی ارشاد کا بھی ہے " والغنی نقیض الرشد" غیّ نقیض (الٹ) ہے رشد کی، جب کوئی بھلائی کی راہ پر چلے بھٹک جائے گمراہ ہو جائے تو اس وقت یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں" غوی یغوی غیاً، غوایة"

اب مطلب یہ ہوا کہ کثیر دلائل اور واضح آیات وعلامات کی وجہ سے حق باطل سے جدا ہو گیا، اور ایمان کفر سے، اور ہدایت گمراہی سے۔

"المرادانه حصلت البینونةبین الرشدوالغی بسبب قوةالدلائل وتاکیدالبراهین"

مراد یہ ہے کہ دلائل و براہین کی قوت وتاکید سے ہدایت اور گمراہی جدا جدا ہو گئے۔ واضح ہو گیا کہ یہ ہدایت ہے اور یہ گمراہی ہے۔ (از کبیر)

فائدہ: اسی سے یہ فائدہ حاصل ہو گیا کہ جب رب تعالیٰ نے دلائل وعلامات سے ایمان وکفر کی راہوں کو جدا جدا کر دیا اور واضح کر دیا کہ ایمان حق ہے اور کفر باطل ہے تو انسان اپنی عقل اور محبت سے ہی ایمان قبول کرتا ہے کسی کو زبردستی ایمان لانے پر رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اور مومنوں نے مجبور نہیں کیا، گویا کہ " قد تبین الرشد من الغی" سے اور زیادہ" لا اکراہ فی الدین" کی وضاحت کر دی۔

"فمن یکفر بالطاغوت ویؤمن باللہ فقداستمسک بالعروۃ الوثقی"

تو جس شخص نے نہ مانا شیطان کو اور ایمان لایا اللہ پر تو تحقیق اس نے تھام لیا مضبوط گرہ کو جسے کبھی کھلنا نہیں۔

"طاغوت" ماخوذ ہے "طغی یطغی" (ف) سے، اور یا ماخوذ ہے "طغا یطغو طغیانا" (ن) سے "وذلک تجاوز الحدفی العصیان" یعنی گناہوں میں سے حد سے تجاوز کرنے کو "طغیان" کہا جاتا ہے۔

"والطاغوت عبارۃ عن کل متعد وکل معبود من دون اللہ ویستعمل فی الواحد والجمع"
حد سے تجاوز کرنے والے کو طاغوت کہا جاتا ہے اور رب تعالیٰ کے بغیر جس کی عبادت کی جائے اسے بھی طاغوت کہا جاتا ہے۔

"ولماتقدم سمی الساحر والکاھن والماردمن الجن والصارف عن طریق الحق طاغوتا"
جب پہلے بیان کر دیا گیا کہ حد سے تجاوز کرنے والے کو طاغوت کہا جاتا ہے تو اسی سے واضح ہو گیا، جادوگر، کاہن (نجومی وغیرہ) اور جنوں سے سرکش (شیطان اور ہر وہ شخص جو سیدھے راہ سے ہٹ جائے ان کو طاغوت کہا جاتا ہے۔ (مفردات راغب)

طلباء کے لئے:

طاغوت کا وزن فعلوت ہے جبروت اور ملکوت کی طرح اصل میں "طغووت" ہے، پھر اس میں قلب کیا گیا واؤ کو فا کلمہ اور عین کلمہ کے درمیان لا کر الف سے بدل دیا گیا "طاغوت" ہو گیا۔ (مفردات راغب)

"والطاغوت ای الشیطان" اس مقام میں طاغوت سے مراد شیطان ہے۔ (روح المعانی)

قابل توجہ:

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ پر چند اعتراضات ایک رسالہ "کنز الایمان پر پابندی کیوں؟" میں کیے گئے تھے، ان کا جواب دینے کے لئے اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کے مزید محاسن بیان کرنے کے لئے راقم نے سب سے پہلی کتاب "تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان" تصنیف کی، جس کی برکت کی وجہ سے تصنیف کا کام رب تعالیٰ

کے فضل و کرم سے اتنا کیا جو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

اسی معترض کے رسالہ میں اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کو قصابی زبان کہا گیا، اور بیہودہ زبان استعمال کی گئی راقم نے اس کا محاسبہ کرتے ہوئے ''تسکین الجنان'' کی ''ابتداءِ سخن'' میں یوں لکھا۔ اسی طرح اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کو قصابی زبان سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ اس میں فصاحت و بلاحت نہیں لیکن تقابل جائزہ سے معاملہ دگرگوں نظر آتا ہے، آیئے دیکھیے۔

'' وکان من الکافرین ''

اور تھا وہ کافروں میں کا۔	(محمود الحسن صاحب)
اور وہ کافر ہو گیا۔	(اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ)

''ثم بعثنکم من بعد موتکم''

پھر اٹھا کھڑا کیا ہم نے تم کو مر گئے پیچھے۔	(محمود الحسن صاحب)
پھر مرے پیچھے ہم نے تمہیں زندہ کیا۔	(اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ)

''وکل انسان طائرہ فی عنقہ''

اور جو آدمی ہے لگادی ہم نے اس کی بری قسمت اس کی گردن سے (محمود الحسن صاحب)

اور ہر انسان کی قسمت اس کی گردن سے لگادی ہے۔ (اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ)

''واجتنبوا الطاغوت''

اور بچو ہڑ ونگے سے۔	(محمود الحسن صاحب)
اور شیطان سے بچو۔	(اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ)

محمود الحسن صاحب نے ''طاغوت'' کا معنیٰ ''ہڑ ونگے'' کیا ہے، اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے شیطان معنیٰ کیا ہے، جو فصیح بھی ہے اور تفاسیر کے مطابق بھی ہے۔

مذکورہ بالا چند مثالیں صرف بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں، ان سے ہر ذی شعور انسان فصاحت و بلاحت کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ کس ترجمہ میں فصیح زبان کو پیش کیا گیا ہے۔ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کو جو گالیاں دی گئیں ان کی دو تین مثالیں ملاحظہ ہوں، حریفوں کی ذہنیت کا اندازہ لگایا جائے کہ کس طرح پست ذہن رکھنے والے ہیں۔

﴿۱﴾ برصغیر پاک و ہند کے مبتدع اعظم فتنہ تکفیر کے بانی مولانا احمد رضا خان۔

﴿۲﴾ مذکورہ ترجمہ و تفسیر اسی فرقہ ضالہ کے پیشوا مولانا احمد رضا خان بریلوی اور اس کے خلیفہ مفتی نعیم الدین مراد آبادی کی خامہ فرسائی کا نتیجہ ہے۔

﴿۳﴾ مولانا بریلوی کے ترجمہ قرآن پاک پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا انسان مسلمانوں کا رہنما یا عالم اور اہل وسنت کا امام تو کیا ایمان کی نور سے ہی خالی ہے۔

اگر چہ ایسی نازیبا عبارات ہمارے لئے ناقابل برداشت ہیں، حق تو یہ تھا کہ اسی طرح کا جواب دیا جاتا لیکن پھر بھی اخلاق و سنجیدگی کا دامن تھامتے ہوئے فقط اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کے محاسن و کمالات تفاسیر کے آئینہ میں پیش کئے جارہے ہیں، جہاں دیگر مترجمین کی کشتیاں تلاطم امواج میں ہچکولے کھاتی نظر آتی ہیں، وہاں محب رسول کی وسعت علم اور دقّتِ نظر جیسے مضبوط و قوی ناخدا کے سہارے کشتی صحیح وسلامت کنارے پر لنگر انداز نظر آتی ہے۔

(مقدمہ تسکین الجنان)

''ویؤ من باللّٰہ'': (اور ایمان لایا اللہ پر)

''ای بالتوحید و تصدیق الرسل'' (بیضاوی)

یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لایا اور اس کے رسولوں کی تصدیق کی واضح ہوا کہ جب تک اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی نہیں پائی جائے گی اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان بھی مکمل نہیں ہوگا، وہی راہ، راہِ ہدایت ہے جس راہ کو میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ نے واضح فرمایا، اپنی عقل سے توحید کو ماننے والے حقیقت میں توحیدی نہیں، آیئے سمجھئے حقیقت یہ ہے کے صرف محبّ رسول ﷺ ہی توحیدی کہلانے کا حقدار ہے۔

فائدہ: شیطان کو نہ ماننے کا ذکر پہلے کیا اور اللہ پر ایمان لانے کا ذکر بعد میں کیا، جس سے یہ واضح کیا گیا کہ

"انہ لابدللکافرمن ان یتوب اولا عن الکفر ثم یؤمن بعد ذلک"

بیشک کافر کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے کفر سے باز آجائے، توبہ کرلے، پھر اس کا اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا معتبر ہوگا۔ (کبیر)

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ کے کافر اللہ تعالیٰ کو زمین وآسمان کا خالق مانتے تھے لیکن بت پرستی بھی کرتے تھے اور نبی کریم ﷺ کی تصدیق نہیں کرتے تھے اس لئے وہ رب تعالیٰ کو خالق ماننے کے باوجود کافر ہی رہے مومن نہ بن سکے۔

"فقد استمسک بالعروۃ الوثقی": "تو تحقیق اس نے تھام لیا مضبوط گرہ کو"۔

"العروۃ" عری یعری (ض،س) ننگا ہونا، "العراء" اس مکان کو کہتے ہیں جس کے آگے پیچھے کوئی مکان نہ ہو یعنی کھلی جگہ، جنگل وغیرہ میں وہ مکان ہو، جیسے رب تعالیٰ نے فرمایا۔ "فنبذناہ بالعراء وھو سقیم" پھر ہم نے اسے (یونس علیہ السلام کو) میدان میں ڈال دیا اور وہ بیمار تھا۔

"عرا" جب الف مقصورہ سے ہوتو اس کا معنیٰ ہوتا ہے "کنارہ" اور "عروۃ" لوٹے وغیرہ کے کنارے پر لگا ہوا دستہ جس سے لوٹے کو پکڑا جاتا ہے، جیسے رب تعالیٰ نے فرمایا۔ "فقد استمسک بالعروہ الوثقی" وذلک علی سبیل التمثیل"

یعنی اس مقام میں "العروۃ الوثقی" کو بطور تمثیل ذکر کیا گیا ہے، جس کا مجازی معنیٰ لیا گیا ہے وہ ہے "محکم گرہ" اس کی تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی۔

"عروۃ" اس درخت کو بھی کہا جاتا ہے جس کے ساتھ اونٹوں کو باندھا جائے۔ (از مفردات راغب)

طلباء کرام کے فائدے کے لئے:

اسی سے بیع عرایا کو بھی لیا ہوا ہے، یعنی جب کوئی شخص دوسرے کو اپنے باغ سے کچھ درختوں سے پھل حاصل کرنے کی اجازت دے دے، بعد میں دیکھے کہ باغ میں کام کرنے کے لئے اہل وعیال بھی ہوتے ہیں، لہٰذا دوسرے

آدمی کے آنے جانے سے تکلیف ہوگی تو وہ انہیں ان درختوں کے پھل کی مناسب مقدار میں توڑی ہوئی کھجوریں دے دے، یہ درحقیقت عطیہ ہے، جسے بیع سے تعبیر کر دیا گیا ہے جو جائز ہے۔ (نووی شرح مسلم)

" الوثقی "اوثق کی مؤنث ہے، مضبوط پختہ۔اس مقام میں عقلی چیز کو حسی چیز سے تشبیہ دی گئی۔

"لان من اراد امساک شئ یتعلق بعروته فکذا ههنا من اراد امساک هذاالدین تعلق بالدلائل الدالةعلیه"

کیونکہ جو شخص کسی چیز کو پکڑنا چاہے وہ اسے دستہ (ہینڈل) سے پکڑتا ہے، اسی طرح جو شخص دین کو مضبوطی سے پکڑنا چاہے، یعنی مضبوطی سے کامل طریقہ پر اس پر قائم رہنا چاہے تو دلائل کو پکڑتا ہے، یعنی مضبوط دلائل کے ذریعے اس پر عمل کرتا ہے۔اسلام کے دلائل جب قوی، محکم اور واضح ہیں تو ان کو " العروة الوثقی " سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔ (از کبیر)

وہ مجازی معنی کیا ہے؟

وہ مجازی معنی یہ ہے "بالعروة الوثقی" بالعقد المحکم"مضبوط گرہ۔ (جلالین)

طلباء کرام توجہ فرمائیں:

" استمسک " کا معنی جلالین میں " تمسک " کیا گیا ہے تو اس پر صاوی میں وضاحت کی گئی ہے کہ " تمسک " معنی کر کے واضح کر دیا کہ اس مقام میں " استمسک " میں سین اور تاء طلب کے لئے نہیں، بلکہ استفعال بمعنی تفعل استعمال ہے۔

طلباء کرام کی اور کامل توجہ کی ضرورت:

مفسر رحمہ اللہ نے " العروة الوثقی " کا معنی "عقد محکم" کیا ہے، اس پر صاوی میں بیان کیا گیا ہے یا تو اس میں استعارہ مصرحہ پایا گیا ہے، یعنی دین اسلام کو تشبیہ دی گئی " عروة وثقی " سے، یہ رسی کے تھامنے کی جگہ ہے اور وجہ

شبہ یہ ہے کہ جس طرح رسی کو مضبوط گرہ یا لوٹے کے دستہ کو پکڑا جائے تو وہ گرنے سے اور خلل واقع ہونے سے محفوظ رہتا ہے اسی طرح یہ بیان کیا گیا ہے کہ دین اسلام کو مضبوطی سے پکڑا جائے تا کہ اس میں خلل نہ واقع ہو، یعنی "عروۃ وثقی" مشبہ بہ ہے، اور دین اسلام مشبہ ہے، استمساک اور عدم انفصام ترشیح ہیں، کیونکہ مشبہ بہ کے مناسبات سے ہیں اور یا استعارہ تمثیلیہ پایا گیا ہے یعنی اسلام کو مضبوطی سے پکڑنے اور محکم کرنے کا حال کو رسی کی گرہ کو تھامنے کے حال سے تشبیہ دی گئی تا کہ خلل واقع نہ ہو۔ (صاوی)

"لا انفصام لها": "جسے کبھی کھلنا نہیں۔"

الانفصام بالفاء الانقطاع بغیر بینونة والانقصام بالقاف الانقطاع مع بینونة بالانفصام ابلغ"

انفصام (فاء کے ساتھ) کا معنی ہے رسی کے اجزاء کے کھلنے (ادھڑنے یا ادھیڑنے) کے بغیر رسی کا ٹوٹ جانا، اور انقصام (قاف کے ساتھ) کا معنی ہے رسی کے اجزاء کا کھل کر ٹوٹنا، یہاں انفصام ذکر کر کے حکم میں مبالغہ ثابت کیا گیا ہے۔ (صاوی)

اب مکمل معنی یہ ہو گیا۔

"من خلع الانداد والاوثان ومایدعوا الیه الشیطان من عبادة کل مایعبد من دون الله ووحد الله فعبده وحده وشهد ان لا اله الا الله فقد ثبت فی امره واستقام علی الطریقة المثلی والصراط المستقیم"

جس نے اللہ تعالیٰ کے شریکوں اور بتوں اور شیطانی معبودوں سے بیزاری اختیار کر لی، اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت بیان کی اور اس وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کی، اور کلمہ شہادت پر قائم ہوا تو وہ اپنے امر (معاملہ) میں پختہ ہو گیا اور درست راہ اور سیدھی راہ پر قائم ہو گیا۔ (صابونی)

"والله سمیع علیم": "اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔"

یعنی اللہ تعالیٰ اقوال کو سننے والا ہے اور نیتوں اور عقیدوں کو جاننے والا ہے۔ (ابو السعود)

گویا کہ نبی کریم ﷺ کو خطاب کیا آپ جو لوگوں کو دعوت اسلام دے رہیں ہیں اور آپ کے تمام اقوال اور ان لوگوں کے اقوال کو رب سن رہا ہے اور آپ جو حرص ومحبت رکھتے ہیں کہ یہ لوگ ایمان لے آئیں رب تعالیٰ اسے جاننے والا ہے اسی طرح ہر شخص جو اپنے یا دوسرے کے اعمال اور نیات کی تصیح میں اور کفر ونفاق سے ڈرانے کی کوشش میں ہے رب تعالیٰ اسے بھی جاننے والا ہے۔ (مظهری)

فائدہ: "العروۃ الوثقی" سے مراد ایمان بھی ہے اور قرآن بھی ہے اور "الحب فی الله والبغض فی الله" (اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے لئے کسی سے محبت اور اللہ کی رضامندی کے لئے کسی سے بغض) بھی ہے اور اسلام بھی ہے۔

" وقال الامام احمدعن محمدبن قیس بن عبادة قال کنت فی المسجدفجاء رجل فی وجهه اثرمن خشوع،فصلی رکعتین أوجز فیهما،فقال القوم هذارجل من اهل الجنةفلماخرج اتبعته حتی دخل منزله قد خلت معه فحدثته،فلمااستأنس قلت له ، ان القوم لما دخلت المسجد قالوا کذاو کذا،قال سبحان الله ماینبغی لأحد ان یقول مالم یعلم،وساحدثک لِم؟انی رأیت رؤیاعلی عهدرسول الله ﷺ فقصصتهاعلیه، رایت کانی فی روضة خضراء،قال ابن عون فذکرمن خضرتهاوسعتهاعمودحدید اسفله فی الارض واعلاه فی السماء،فی اعلاه عروة، فقیل لی اصعد علیه،فقلت لااستطیع، فجاء فی منصف،قال ابن عون هوا لوصیف،فرفع ثیابی من خلفی،فقال اصعد، فصعدت حتی اخذت با لعروة،فقال استمسک بالعروة،فاستقیظت وانها لفی یدی،فاتیت رسول الله ﷺ فقصصتهاعلیه فقال،اما الروضة فروضة الاسلام، واما العمود فعمود الاسلام،واما العروة فهی "العروة الوثقی" انت علی الاسلام حتی تموت،قال وهوعبدالله ابن سلام"

(رواه احمد واخرجاه فی الصحیین واخرجه البخاری من وجه آخر)

محمد بن قیس بن عبادہ فرماتے ہیں میں مسجد میں تھا، تو ایک شخص آئے جن کے چہرے پر خشوع کے اثرات تھے انہوں نے دو رکعت مختصر طور پر ادا کیں ،تو لوگوں نے کہا یہ شخص جنتی ہیں، جب وہ

نکلے تو میں ان کے پیچھے پیچھے چلا، یہاں تک کہ وہ اپنے گھر میں داخل ہو گئے (ان کی اجازت سے) میں بھی ان کے ساتھ ان کے گھر داخل ہو گیا۔ میں نے ان سے باتیں شروع کر دیں، جب وہ میری باتوں سے مانوس ہو گئے تو میں نے کہا، آپ جب مسجد میں داخل ہوئے تھے تو قوم نے آپ کے متعلق اس طرح کہا تھا (کہ یہ جنتی ہیں) انہوں نے کہا سبحان اللہ کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ ایسی بات کرے جس کا اسے علم نہ ہو، ہاں البتہ میں تمہیں ابھی بتاتا ہوں کہ قوم نے یہ کیوں کہا (وجہ اس کی یہ ہے) کہ میں نے ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں خواب دیکھا، وہ خواب میں نے آپ پر پیش کیا، کہ میں نے خواب میں دیکھا گویا کہ میں ایک سرسبز و شاداب باغ میں ہوں ابن عوف راوی نے خضرۃ سے مراد وسعت لی ہے، یعنی میں ایک وسیع باغ میں ہوں اور اس کے درمیان ایک لوہے کا ستون ہے جس کے نیچے والا حصہ زمین میں ہے اور اوپر والا آسمان میں ہے اور اس ستون کے اوپر (رسی یا کسی چیز کا) دستہ (ہاتھ سے پکڑنے والی چیز ہے)۔ مجھے کہا گیا اس پر چڑھو، میں نے کہا میں طاقت نہیں رکھتا، تو میرے پاس ایک معاون (خادم کی طرح) آ گیا، جس نے پیچھے سے میرے کپڑے کو پکڑ کر مجھے بلند کیا اور کہا اب اوپر چڑھو تو میں اوپر چڑھا یہاں تک کہ میں نے اس دستہ کو پکڑ لیا پھر آپ کہتے ہیں میں نے اس پکڑنے والے آلہ کو مضبوطی سے پکڑ لیا تو میں جاگ گیا، جب میں جاگا تو وہ دستہ یعنی مضبوط گرہ والی رسی میری ہاتھ میں تھی۔ تو میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ پر اپنا خواب بیان کیا تو آپ نے فرمایا باغ سے مراد اسلام کا باغ ہے، اور ستون سے مراد اسلام کا ستون ہے، اور ''عروۃ'' سے مراد "العروۃ الوثقی" ہے (یعنی تم نے اسلام کی مضبوط گرہ کو تھام لیا) تم موت تک اسلام پر قائم رہو گے راوی فرماتے ہیں وہ شخص عبداللہ بن سلام تھے۔

(صابونی)

جنہوں نے یہ خواب دیکھا تھا اور رسول اللہ ﷺ نے ان کو سلام پر مضبوطی سے قائم رہنے کی بشارت دی، اسی وجہ سے قوم نے ان کو جنتی کہا، ان کا یہ کہنا کہ سبحان اللہ کوئی شخص وہ بات نہ کرے جس کا اسے علم نہ ہو، یہ [illegible]

پر کلام تھا ورنہ رسول اللہ ﷺ نے خواب کی جو تعبیر بیان کی وہی حق تھی۔

گذشتہ سے پیوستہ:

"قال ﷺ سید البشر آدم وسید العرب محمد ولا فخر وسید الفارس سلمان وسید الروم صهيب وسید الحبشة بلال وسید الجبال طور وسید الایام یو م الجمعة وسید الکلام قرآن وسید القرآن سورة البقرة وسید البقرة آیة الکرسی" (ابو سعود)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سید البشر آدم علیہ السلام ہیں، سید العرب محمد ﷺ ہیں، سید الفارس سلمان ہیں، سید الروم صہیب ہیں۔ سید الحبشہ بلال ہیں، سید الجبال طور ہیں، سید الایام (تمام دنوں کا سردار) جمعہ کا دن ہے، سید الکلام قرآن پاک ہے، سید القرآن سورۃ البقرۃ ہے، سید البقرۃ آیۃ الکرسی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے یہاں اگر "سید العرب محمد" فرمایا تو اس سے کوئی شخص غلطی کا شکار نہ ہو کہ آپ صرف عرب کے ہی سردار ہیں، کیونکہ دوسری حدیث میں ہے، "ان سید ولد آدم" میں اولادِ آدم کا سردار ہوں، اور آپ کا ارشاد ہے " انا سید الاولین و الآخرین " میں سب اگلے اور پچھلوں کا سردار ہوں۔

(ماخوذ از تفسیر ابی السعود)

☆☆☆☆☆

اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَوْلِیٰٓـٴُـهُمُ الطَّاغُوْتُ یُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ اُولٰٓىٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ☆ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۵۷)

﴿۱﴾

اللہ والی ہے مسلمانوں کا انہیں اندھیروں سے نور کی طرف نکالتا ہے اور کافروں

کے حمایتی شیطان ہیں وہ انہیں نور سے اندھیروں کی طرف نکالتے ہیں یہی لوگ دوزخ والے ہیں انہیں ہمیشہ اس میں رہنا۔

﴿۲﴾

اللہ مددگار ہے ایمان والوں کا، نکالتا ہے ان کو تاریکیوں سے نور کی طرف، اور کافروں کے ساتھی شیطان ہیں، نکالتے ہیں ان کو نور سے تاریکیوں کی طرف، یہی لوگ آگ والے ہیں، وہ ہمیشہ اس میں رہنے والے ہیں۔

"اللہ ولی الذین آمنوا": "اللہ مددگار ہے ایمان والوں کا"۔

" الولی فعیل بمعنی فاعل،قال الخطابی الولی الناصر ینصر عبادہ المومنین،قال اللہ تعالی ذلک بان اللہ مولی الذین آمنوا وان الکافرین لامولی لھم"

(قرطبی بحذف)

"ولی"فعیل کے وزن پر ہے اور فاعل کے معنی میں ہے خطابی نے فرمایا کہ"ولی" بمعنی مددگار ہے، اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کی امداد فرماتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ کہ بیشک اللہ تعالیٰ ایمان والوں کا مددگار ہے اور بیشک کافروں کا کوئی مددگار نہیں، یعنی تمثیل کے طور پر دوسری آیت جو بیان فرمائی اس میں "مولیٰ" بمعنی مددگار استعمال ہے۔

لفظ "ولی" کے معانی:

ولی کا لغوی معنیٰ" اصلہ من الولی الذی ھو القرب" یعنی "ولی یلی ولیا" کا لغت میں معنی ہے "قرب" جس طرح کہا جاتا ہے" داری تلی دارھا" میرا گھر اس کے گھر کے قریب ہے۔

"منہ یقال للمحب المعاون ولی لأ نہ یقرب منک با لمحبۃ والنصر ۃ ولا یفارقک"

اسی معنیٰ کو مدنظر رکھتے ہوئے محبت کرنے والے کو بھی ولی کہا جاتا ہے کیونکہ محبت کرنے والا

تمہارے قریب ہوگا اور تم سے جدا نہیں ہوگا۔ اور مددگار کو بھی ولی کہا جاتا ہے کیونکہ وہ مدد کرنے کے لحاظ سے تمہارے قریب ہوتا ہے، جدا نہیں ہوتا۔

''ومنہ الوالی لأنہ یلی القوم بالتدبیر والأمر والنھی''

اسی معنی کے لحاظ سے ''ولی'' بمعنی ''والی'' کے بھی آتا ہے، کیونکہ وہ قوم کی تدبیر کرنے میں اور قوم کو اچھے کاموں کا حکم دینے میں اور برے کاموں سے روکنے میں ان کے قریب آتا ہے۔

یہ تمام معنی ''مولیٰ'' میں پائے جاتے ہیں یعنی مددگار، محبت کرنے والا اور والی۔

" الولایۃ" کی ضد " العداوۃ" ہے، لہٰذا مدد نہ کرنے والے، اور محبت نہ کرنے والے، اور امور کے والی نہ بننے والے کو ''عدو'' کہا جائے گا، لیکن جب وہ مدد کرنے یا محبت کرنے یا والی بننے کی مخالفت کرے بلکہ دوسرے کی محبت کرنے اور امداد کرنے سے چلے۔ (ماخوذ از کبیر)

اعتراض: ''آمنوا'' ماضی کا صیغہ ہے، اس سے تو پتہ چلتا ہے کہ اس آیۃ کریمہ کے نازل ہونے سے پہلے جو ایمان لا چکے تھے اللہ تعالیٰ صرف ان کا مددگار اور والی تھا اس کے بعد ایمان والوں کا مددگار ہونا اور والی ہونا کیسے ثابت ہے؟ اور جو ایمان لا چکے ہیں ان کو تاریکیوں سے نور کی طرف نکالنے کا کیا مطلب ہے؟

جواب: ''والمراد منھم من اراد ایمانہ وثبت فی علمہ انہ مؤمن'' (بیضاوی)

یہاں سے مراد صرف وہ لوگ نہیں جو ایمان لا چکے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے علم وارادہ میں جتنے لوگوں نے بھی ایمان لانا ہے وہ تمام ہی مراد ہیں، لہٰذا اعتراض مکمل طور پر مندفع ہوگیا۔

''یخرجھم من الظلمات الی النور'':

''نکالتا ہے ان کو تاریکیوں سے نور کی طرف۔''

اکثر مفسرین نے علامہ واقدی کے قول کو اس مقام پر نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں قرآن پاک میں جہاں بھی ظلمات اور نور استعمال ہیں وہاں ہی نور سے مراد ایمان ہے اور ظلمات سے مراد کفر ہے، سوائے سورۃ انعام کے اس میں

ظلمات سے مرادرات نور سے مراددن ہے۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے بھی اس قول کونقل کیا لیکن اس کے بعد اپنا مختار بیان کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں

" والا ولی ان یحمل الظلمات علی المعنی الذی یعم سائر انواعھا ویحمل النور ایضاعلی ما یعم سائر انواعہ"

بہتر یہ ہے کے ظلمات اور نور کا معنی عام مطلقاً تاریکی اور نور مرادلیا جائے تا کہ تمام قسموں کوشامل ہو جائے۔

لہٰذا مطلب یہ ہوگا کے اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو کفر سے ایمان کی طرف نکالتا ہے (ایمان والوں سے مراد جن کا ایمان لانا اس کے ارادہ اور علم میں ہے) اور معاصی سے نیکیوں کی طرف نکالتا ہے۔ اور شبہات سے یقین کی طرف نکالتا ہے۔ اور ظلمت دلیل سے نور عیاں کی طرف نکالتا ہے، اور ظلمت وحشت سے نور وصلت کی طرف نکالتا ہے، اور عالم اشباح (عکس، مثال) سے عالم ارواح کی طرف نکالتا ہے۔ (از روح المعانی)

نکتہ: نور کو واحد اور ظلمات کو جمع ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے حق ایک ہی ہے اور باطل کے کئی راستے ہیں اس لئے نور کو واحد ذکر کیا ہے، اور ظلمات کو جمع ذکر کیا ہے۔ اور اس طرف بھی اشارہ ہے کہ حق پر قائم رہنے والے تھوڑے ہوں گے اور گمراہ زیادہ ہوں گے۔ (روح المعانی)

شانِ نزول میں تین احتمال:

﴿۱﴾ یہ آیۃ بنی اسرائیل کے متعلق نازل ہوئی کے ان میں سے بعض لوگوں نے عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا اور بعض نے کفر کیا۔ جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہیں لایا تھا وہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لے آئے، اور جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا ہوا تھا وہ نبی کریم ﷺ پر ایمان نہ لائے ۔

﴿۲﴾ یہ آیۃ ان نصرانیوں کے حق میں نازل ہوئی جو عیسیٰ علیہ السلام پر اپنے خیال کے مطابق ایمان رکھتے تھے یعنی آپ کو اللہ کا بیٹا یا اللہ کا شریک مانتے تھے، لیکن پھر نبی کریم ﷺ پر ایمان لائے تو ان کو اللہ تعالیٰ نے ظلمت سے نور کی طرف نکال لیا۔

﴿۳﴾ اور تیسرا احتمال یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ آیۃ تمام کافروں کے متعلق نازل ہوئی جنہوں نے نبی کریم ﷺ پر ایمان لایا۔ (از کبیر) تمام وجوہ کے بعد جب آیۃ کریمہ کا نزول ہوا تو تمام ہی شان نزول ہیں، ان میں کوئی تعارض نہیں۔

"والذین کفروااولیاؤهم الطاغوت": "اور کافروں کے ساتھی شیطان ہیں۔"

"والذین کفروا" تین قسم کے کفار کو شامل ہے۔

﴿۱﴾ وہ لوگ جو حقیقۃ کافر تھے۔ ﴿۲﴾ وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور علم میں کافر تھے۔

﴿۳﴾ وہ لوگ جنہوں نے کفر کا ارداہ کیا۔

"اولیاؤهم الطاغوت": "ان کے ساتھی شیطان ہیں"۔

اولیاء سے مراد یا ان کے حقیقی مددگار ہیں، یعنی وہ شیطان ہیں، اور یا اس سے مراد ان کے ارادہ کے مطابق یعنی جن کو یہ اپنا مددگار سمجھتے ہیں وہ شیطان ہیں، یا جادوگر ہیں، یا بت ہیں، اور ہر قسم کے گمراہ کرنے والے، راہ راست سے بھٹکانے والے طاغوت ہی ہیں (واضح ہوا کہ روشن ضمیر اور روشن دماغ عطاء کرنے کے دعویدار اور دین سے برگشتہ کرنے والے درحقیقت طاغوت ہی ہیں، ضال اور مضل کا تاج انہوں نے پہن رکھا ہے) (از روح المعانی)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"الطاغوت" پر الف لام استغراقی ہے، اس وجہ سے بعض قرأتوں میں جمع کا صیغہ "الطواغیت" بھی آیا ہوا ہے، اور "الطاغوت" کا ذکر رب جلیل کے ذکر کے مقابل کر کے ان کے گمراہ کرنے کو مبالغۃً بیان کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تو بندے کو اختیار دے رکھا ہے، لیکن شیاطین گویا کہ اسے دنیا اور شر اور باطل راہ کو اس طرح مزین کر کے دکھاتے ہیں کہ اس کی سوچنے کی قوت کو منسوخ کر دیتے ہیں۔ (از روح المعانی)

"یخرجونھم من النورالی الظلمات":

"نکالتے ہیں ان کونور سے تاریکیوں کی طرف۔"

شیاطین کفارکونور سے تاریکیوں کی طرف کیسے نکالتے ہیں؟ وہ وسوسے ڈال کرنکالتے ہیں، اوران کے دلوں میں شبہات ڈال کران کونور سے تاریکیوں کی طرف نکالتے ہیں۔

اور وجہ یہ ہے کہ کفاراس حال پر تھے کہ ان کاعقیدہ یہ تھا کہ یہ معبودان باطلہ ہمارے نفع ونقصان کے مالک ہیں اور یہ ہمیں اللہ کے قریب کرتے ہیں اس لئے ہم ان کی عبادت کرتے ہیں گویا کہ کفار کی بدعقیدگی اور معبودان باطلہ کی عبادت کرنے کوان کے معبودوں کی طرف منسوب کرتے ہوئے فرمادیا کہ وہ ان کوگمراہ کرتے ہیں۔ (ازروح المعانی)

دینی طلباءکرام توجہ فرمائیں:

"یخرجون" میں ضمیر جمع مذکر کی جوعقلاء کی طرف لوٹ رہی ہے، یاتو اس میں قاعدہ تغلیب جاری کیا گیا ہے کہ ساحروں اور کاہنوں اورگمراہ کرنے والے انسانوں کو بتوں پر غالب سمجھتے ہوئے ذکر کیا گیا ہے اور یا ان کے دلوں کے مطابق ذکر کردیا گیا کہ وہ اپنے معبودان باطلہ یعنی بتوں کوذی العقول سمجھتے تھے تو ان کو بتایا کہ تمہارے عقل رکھنے والے معبودان باطلہ تمہیں بے عقل بنا کر جہنم کے گڑھے میں دھکیل رہے ہیں۔ (از روح المعانی)

اعتراض: کافرتو پہلے ہی تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے ان کو جب نور حاصل ہی نہیں تھا تو ان کونور سے تاریکیوں کی طرف نکالنے کا کیا معنی؟

پہلا جواب: اس نور سے مراد فطری نور ہے، جس کا ذکر رسول اللہ ﷺ نے اپنے ارشاد سے فرمادیا ہے۔

"کل مولود یولد علی الفطرة فابواہ یھودانہ اوینصرانہ اویمجسانہ"

ہر بچہ فطرۃ اسلامیہ پر پیدا ہوتا ہے (یعنی اس میں عادت کے مطابق اسلام لانے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے جونور کی مثال ہے) اس کی ماں باپ اسے یہودی بنادیتے ہیں یا نصرانی بنادیتے ہیں یا مجوسی بنادیتے ہیں۔

واضح ہوا کہ فطری صلاحیت یعنی نور سے گمراہی کی طرف لے جانے میں اس کے ماں باپ جو باطل دین پر ہوتے ہیں ان کا بھی ہاتھ ہوتا ہے اور ہر قسم کے گمراہ کرنے والے بھی اسے گمراہ کر کے تاریکی کی طرف لے جاتے ہیں ، جو سب ہی طاغوت ہیں ۔

دوسرا جواب: کہ نور سے مراد واضح اور روشن دلائل ہیں جن کی حقانیت کو سمجھنے کے باوجود حسد، ضد اور عناد کی وجہ سے ایمان نہ لائے اور گمراہ کرنے والوں نے بھی ان کو گمراہ کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

تیسرا جواب: کہ "اخراج" (نکالنا) کبھی بمعنی روکنے کی بھی استعمال ہوتا ہے اس صورت میں ان کو پہلے نور حاصل ہونا ضروری نہیں۔ اب معنی یہ ہوگا کہ شیطان ان کو نور کی طرف آنے سے روکتے ہیں اور تاریکی میں ہی ان کو رکھتے ہیں۔

چوتھا جواب: مجاہد کا قول یہ ہے کہ یہ آیۃ مرتدین کے متعلق نازل ہوئی، اس لحاظ پر حقیقی نور ایمان مراد ہے کہ جن لوگوں کو نور ایمان حاصل ہوا ان میں سے بعض کو گمراہ کرنے والوں نے مرتد بنا کر تاریکی میں پھر ڈال دیا۔ یعنی مرتد ہونے والوں کے مددگار شیطان ہیں جو ان کو نور ایمان سے نکال کر کفر کی تاریکی میں لے جاتے ہیں۔

(از روح المعانی)

"ظلمات" سے مراد کفر، گمراہی میں منہمک ہونا، آیات و بینات کو دیکھ کر بھی خوف نہ رکھنا اور ہدایت پر نہ ہونا۔

"اولٰئک اصحاب النار": "یہی لوگ آگ والے ہیں۔"

"اولٰئک" کا اشارہ کفار اور ان کے اولیاء کی طرف ہے، یعنی یہی کفار اور ان کو گمراہ کرنے والے آگ والے ہیں کہ آگ کو لازم پکڑنے والے ہوں گے، وجہ اس کی ان کا کفر ہی ہے جو تمام جرائم سے عظیم گناہ ہے ایسا گناہ جو ایمان لانے کے بغیر کسی اور طریقہ سے معاف ہونے والا نہیں۔

"ھم فیھا خالدون": "وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔"

یعنی کافروں کا ٹھکانا جہنم ہے، جس سے ان کو نہیں نکالا جائے گا، اسی میں وہ ہمیشہ رہیں گے، یہ کافروں کے

لئے وعید شدید ہے۔

تنبیه: جیسا کہ " لا اکراہ "الخ کی بحث کے شروع میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ روح المعانی میں (اوراسی طرح صاوی میں) مذکور ہے کہ بعض حضرات نے کہا آیۃ الکرسی " ھم فیھا خالدون " تک ہے، اگر چہ دونوں تفسیروں میں ساتھ یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ حق یہی ہے کہ بعد والی دونوں آیتیں آیۃ الکرسی میں داخل نہیں، تاہم راقم کے نزدیک جب کوئی آیۃ الکرسی پڑھے تو " خالدون " تک پڑھ لے تو یقیناً بہتر ہوگا۔

والدمکرم قاضی عبدالعزیز رحمہ اللہ آیۃ الکرسی عام طور اتنی آواز سے پڑھتے تھے کہ قریب بیٹھا آدمی آسانی سے سن لیتا تھا، آپ " خالدون "تک ہی پڑھتے تھے۔ گاؤں کے اور کئی بزرگوں کو بھی آیۃ الکرسی پڑھتے ہوئے سنا تو وہ بھی " خالدون "تک ہی پڑھتے تھے۔ شائد یہ تربیت والدمکرم کے چچا قاضی رسول احمد المعروف بغلام رسول صاحبِ صرف بھترال کی تھی۔

فائدہ جلیلہ:

حضرت علامہ مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے جاء الحق میں تفسیر نیشاپوری اور روح البیان کے حوالہ سے نقل فرمایا۔

"یعلم مابین ایدیھم وما خلفھم "ای یعلم محمد ﷺ مابین ایدیھم من اولیات الامر قبل الخلائق وماخلفھم من احوال القیامة" (نیشاپوری)

یعنی **" یعلم مابین ایدیھم وما خلفھم "** کی تفسیر یہ ہے کہ حضور ﷺ مخلوق کے پہلے کے اولی معاملات بھی جانتے ہیں اور جو مخلوق کے بعد قیامت کے احوال ہیں وہ بھی جانتے ہیں۔

"یعلم محمد علیه السلام مابین ایدیھم من الامور الاولیات قبل الخلائق وماخلفھم من احوال القیامة وفزع الخلق وغضب الرب" (روح البیان)

حضور ﷺ مخلوق کے پہلے کے حالات جانتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے مخلوقات کو پیدا کرنے کے پہلے کے واقعات اور ان کے پیچھے کے حالات بھی جانتے ہیں یعنی قیامت کے احوال مخلوق کی گھبراہٹ اور رب تعالیٰ کا غضب وغیرہ جانتے ہیں۔

ان تفاسیر کے مطابق ''من ذاالذی یشفع'' سے لے کر '' الا بما شاء ''تک آیۃ الکرسی میں تین وصف رسول اللہ ﷺ کے بیان ہوئے، اور باقی صفات رب تعالیٰ کی بیان ہیں۔

☆☆☆☆☆

اَلَمْ تَرَاِلَی الَّذِیْ حَاجَّ اِبْرَاھِیْمَ فِیْ رَبِّہٖ اَنْ اٰتٰہُ اللّٰہُ الْمُلْکَ، اِذْقَالَ اِبْرَاھِیْمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ قَالَ اِبْرَاھِیْمُ فَاِنَّ اللّٰہَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِھَامِنَ الْمَغْرِبِ فَبُھِتَ الَّذِیْ کَفَرَ وَاللّٰہُ لَایَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ☆

(سورۃ البقرۃ آیت ۲۵۸)

﴿۱﴾

اے محبوب! کیا تم نے دیکھا تھا اسے جو ابراہیم سے جھگڑا اس کے رب کے بارے میں اس پر کہ اللہ نے اسے بادشاہی دی جبکہ ابراہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے کہ جلاتا اور مارتا ہے، بولا میں جلاتا اور مارتا ہوں ابراہیم نے فرمایا تو اللہ سورج کو لاتا ہے پورب سے تو اس کو پچھم سے لے آ تو ہوش اڑ گئے کافر کے اور اللہ راہ نہیں دکھاتا ظالموں کو۔

﴿۲﴾

کیا آپ نے نہیں دیکھا تھا اس شخص کی طرف جس نے جھگڑا کیا ابراہیم سے اس کے رب کے متعلق اس وجہ سے کہ دی اس کو اللہ نے بادشاہی، جب کہا ابراہیم نے میرا رب وہ ہے جو زندگی عطاء کرتا ہے اور مارتا ہے، اس نے کہا میں زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں، کہا ابراہیم نے بیشک اللہ لاتا ہے سورج کو مشرق سے تو تو لے آ اسے مغرب سے تو ہوش اڑ گئے کافر کے، اور اللہ نہیں ہدایت دیتا ظالم قوموں کو۔

ماقبل سے تعلق:

اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنی صفات کو بیان کیا" الحی القیوم" جوخود ہمیشہ کے لئے قائم ودائم ہے اور دوسروں کو قائم کرنے والا ہے، تو اس آیۃ میں ابراہیم علیہ السلام کی دلیل کا ذکر کیا جو آپ نے نمرود کے سامنے پیش کی کہ میرا رب وہ ہے جو زندگی عطاء کرتا ہے اور مارتا ہے۔ اسی طرح پہلی آیۃ میں بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کا مددگار ہے اور کافروں کے ساتھی اور حمایتی شیاطین ہیں۔ تو یہاں اسی کی وضاحت فرمادی کہ ابراہیم علیہ السلام کی امداد رب تعالیٰ فرمارہا تھا اور نمرود کا حمایتی شیطان تھا اسی وجہ سے مبہوت ہو گیا، اس کے ہوش اڑ گئے وہ لاجواب ہو گیا۔

مختصر مطلب:

نمرود نے ابراہیم علیہ السلام سے آپ کے رب کے متعلق جھگڑا کیا اور آپ سے دلیل طلب کی تو آپ نے کہا میرا رب وہ ہے جو زندگی عطاء کرتا ہے اور مارتا ہے، یعنی جسموں میں موت وحیات کو پیدا کرتا ہے، ایک خدا کو نہ پہچاننے والے کے لئے یہ بہترین ہدایت تھی اور اس میں بتایا گیا تھا کہ خود تیری زندگی رب تعالیٰ کے وجود کی شہادت دی رہی ہے کہ تو ایک بے جان نطفہ تھا جس نے اس نطفہ کو انسانی صورت دی اور حیات عطاء فرمائی وہ رب ہے۔ اور زندگی کے بعد جو جسموں کو موت دیتا ہے وہ رب ہے، اس کی قدرت کی شہادت خود تیری اپنی موت وحیات میں موجود ہے اس کے وجود سے بے خبر رہنا کمال جہالت اور بے وقوفی اور بہت زیادہ بدنصیبی ہے۔

نمرود کی بے وقوفی:

نمرود نے دو شخصوں کو بلایا ان میں سے ایک کو قتل کیا اور ایک کو چھوڑ دیا اور کہنے لگا کہ میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں، یعنی کسی کو گرفتار کر کے چھوڑ دیتا ہوں اسے زندہ کرتا ہوں اور کسی کو قتل کر کے مار دیتا ہوں۔ درحقیقت یہ بات اس کی بے وقوفی کو واضح کر رہی ہے کہ خدائی کا دعویدار یہ بھی نہ سمجھا سکا کہ قتل کرنا اور چھوڑنا کیا ہے اور موت و زندگی کو پیدا کرنا کیا ہے ان میں نسبت ہی کیا ہے۔ قتل کیے ہوئے شخص کو زندہ کرنے سے عاجز رہنا اور بجائے اس کے زندہ کے چھوڑنے کو یہ کہنا کہ میں زندہ کرتا ہوں اس کی ذلت کے لئے کافی تھا عقلمندوں پر ظاہر ہو گیا تھا کہ حضرت

ابراہیم علیہ السلام کی دلیل قوی اور قطعی ہے، اس کا جواب ممکن نہیں۔

نمرود نے جو دلیل قائم کی تھی اس میں دعویٰ بھی پایا گیا تھا تو ابراہیم علیہ السلام نے اس پر مناظرانہ گرفت فرمائی کہ اے جھوٹے مدعیٔ الوہیت موت وحیات پیدا کرنا تیری قدرت میں کہاں، بلکہ تو اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا اس سے آسان کام کر کے دکھا یعنی میرا رب تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو مغرب سے نکال کر دکھا تو وہ کافر مبہوت ہوگیا، اس کے ہوش اڑ گئے رب تعالیٰ نے اسے لاجواب کر دیا، حالانکہ وہ اس دلیل میں یہ کہہ سکتا تھا کہ سورج کو مشرق کی طرف سے تو میں نکالتا ہوں، تم اپنے رب کو کہو کہ وہ سورج کو مغرب سے نکالے، لیکن یہ کہنے کی اسے ہمت ہی نہ ہوسکی۔

نمرود کا نسب:

علامہ آلوسی نے بیان کیا ہے، نمرود بن کنعان بن سنجاریب۔ اور قرطبی نے ذکر کیا ہے، نمرود بن کوش بن کنعان بن سام بن نوح۔ ''واللہ اعلم بالصواب'' اسی طرح دال مہملہ سے بھی ذکر آیا ہوا ہے، اور ذال معجمہ سے نمرود بھی آیا ہوا ہے۔

یہ مناظرہ کب ہوا:

کبیر اور روح المعانی میں دو قول نقل کئے گئے ہیں ایک قول مقاتل رحمہ اللہ کا ہے کہ یہ بتوں کو توڑنے کے بعد اور آگ میں ڈالنے سے پہلے واقع ہوا۔ اور دوسرا قول حضرت امام جعفر صادق رحمہ اللہ کا ہے کہ یہ واقعہ آگ میں ڈالنے کے بعد کا ہے جبکہ آپ آگ سے باہر تشریف لے آئے۔

تمام روئے زمین کے چار بادشاہ:

جن کو کل دنیا کی بادشاہت حاصل رہی وہ صرف چار شخص ہیں۔ دو مسلمان اور دو کافر، دو مسلمان تھے ایک حضرت سلیمان علیہ السلام جو نبی بھی تھے اور دوسرے سکندر ذوالقرنین، جو صرف روئے زمین کے بادشاہ تھے لیکن صحیح قول کے مطابق وہ نبی نہیں تھے اور دو کافر یہ تھے، ایک نمرود اور ایک شداد بن عاد جس کا نام بخت نصر تھا۔

شداد نے ہی رب تعالیٰ کے مقابل اپنی خدائی کا دعوی کرتے ہوئے عدن کے جنگلات میں اپنی جنت بنوائی تھی، جنت جب تیار ہوگئی تو دیکھنے گیا ابھی اس کے گھوڑے نے اپنے دونوں پاؤں کو اس کی مصنوعی جنت میں رکھا ہی تھا کہ عزرائیل کو حکم ہوا کہ اس کی روح قبض کرلو۔ (ماخوذ از روح المعانی، وعزیزی۔پ ۱۔ خازن)

سب سے پہلے سر پر تاج نمرود نے ہی پہنا یہ جابر وظالم بادشاہ تھا اور اس نے ربوبیت کا دعوی کیا۔

(خازن)

تسکین الجنان کا ایک ورق:

° راقم نے " فبهت الذی کفر " میں تراجم کا تقابلی جائزہ پیش کرتے ہوئے بیان کیا ہے۔

" فبهت الذی کفر "

تب حیران رہ گیا وہ کافر۔	(محمود الحسن صاحب)
یہ سن کر وہ منکرِ حق ششدر رہ گیا۔	(مودودی صاحب)
اس پر وہ جو کافر تھا دنگ رہ گیا۔	(عبد الماجد صاحب)
اس پر متحیر رہ گیا وہ کافر۔	(اشرف علی صاحب)
تب حیران رہ گیا وہ منکر۔	(شاہ عبد القادر صاحب)
یہ (سن کر) کافر حیران رہ گیا۔	(فتح محمد)
تو ہوش اڑ گئے کافر کے۔	(اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ)

اس مقام میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نمرود کو لاجواب کرنے کا ذکر ہے، کیونکہ جب نمرود کو آپ نے یہ فرمایا کہ میرا اللہ تعالیٰ تو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، اس نے کہا یہ کام تو میں بھی کرسکتا ہوں (آگے واقعہ وہی جو اوپر ذکر ہو چکا ہے) جب ابراہیم علیہ السلام نے اس غبی کی حماقت کو دیکھا کہ سمجھنے کی اہلیت سے محروم ہے تو آپ نے دوسری دلیل پیش فرمادی کہ میرا رب تو سورج کو مشرق کی طرف سے نکالتا ہے اور تو مغرب سے نکال، وہ کافر جواب دینے سے

عاجز آ گیا، اسی بات کو رب قدوس نے " فبهت الذی کفر " سے ذکر فرمایا۔

اب آپ دیکھیں کہ یہ تراجم ''کافر حیران رہ گیا'' ''ششدر رہ گیا'' کیا مقصد واضح کر رہے ہیں؟ نہیں ان سے مقصد واضح نہیں ہو رہا اس لئے کہ اردو زبان میں حیران، ششدر رہنا اور دنگ رہنا مقام تعجب میں بھی بولے جاتے ہیں، جیسے کسی چیز کو خوبصورتی کو دیکھا جائے تو کہا جائے میں اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کسی چھوٹے بچے سے ذہانت کی بات سنی جائے تو کہا جائے میں اس بچے سے یہ بات سن کر ''دنگ رہ گیا'' اور کسی سے الٹی، سیدھی خبر سن کر کہا جائے میں اس کی بات سن کر ''ششدر رہ گیا'' یہاں تو معنی لاجواب ہونا ہے، اس معنی کو اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ زیادہ واضح کر رہا ہے۔ آپ کا ترجمہ یہ ہے ''تو ہوش اڑ گئے کافر کے'' یہ صرف اسی معنی کو شامل ہے کہ وہ جواب دینے کی ہمت نہ کر سکا۔

" تحیر و دهش " (مدارک وجلالین)

یعنی تفسیر مدارک اور جلالین میں بھی متحیر و مدہوش معنی کیا گیا ہے کہ اس کافر کے جواب نہ دے سکنے پر حیرانگی سے ہوش اڑ گئے۔ (تسکین الجنان بتصرف)

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

''الم تر''همزة الاستفهام لا نكار النفى و تقرير المنفى'' (روح المعانی)

یعنی '' الم تر '' میں ہمزہ استفہام انکاری کے لئے اور نفی پر نفی آئے تو ثبوت کا معنی پایا جاتا ہے۔ ''ایسا نہیں کہ آپ نے نہیں دیکھا'' یعنی اے محمد مصطفیٰ آپ نے نمرود کے ابراہیم علیہ السلام کے مناظرہ کو یقیناً دیکھا، (اور یہ وجہ بھی واضح ہے کہ آپ تخلیق میں اول الکائنات ہیں، سارے واقعات آپ کے سامنے گذرے جن کو آپ دیکھ رہے تھے اور یہ بھی احتمال پایا گیا ہے کہ استفہام تعجب کے لئے ہو، جس طرح کہا جاتا ہے۔

''الم ترالی فلان کیف یصنع ''

کیا تم نے فلاں کو نہیں دیکھا کیسا کاریگر ہے یعنی اس کی کاریگری کو دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔

یعنی نبی کریم ﷺ کو تعجب دلایا گیا کہ کیا آپ کو علم حاصل نہیں؟ یقیناً آپ کو ہم نے علم عطاء کر دیا ہے کہ وہ شخص جس کو کوئی ولایت حاصل نہ تھی اور نہ ہی رب تعالیٰ سے اسے امداد حاصل تھی، اس نے اس ذات سے مناظرہ شروع کر دیا جسے رب تعالیٰ کی طرف سے امداد حاصل تھی، اسی وجہ سے رب تعالیٰ کی اسی امداد سے محروم ذلیل وخوار ہوا اور لاجواب ہو گیا اس کے ہوش اڑ گئے گویا کہ رب تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ اے محبوب دیکھیں۔

"کیف خذلت رأس الطاغین و کیف اخذت بالاذناب الارذلین"

میں کیسے سرکشوں کی سرکوبی کرتا ہوں اور ان کا کیسے سرنیچے کرتا ہوں اور کیسے ذلیل لوگوں کو ان کے گناہوں کی وجہ سے گرفت میں لیتا ہوں۔ (از روح المعانی)

فائدہ جلیلہ:

اس واقعہ سے نبی کریم ﷺ کو تسلی دی گئی گویا کہ رب تعالیٰ کی طرف سے آپ کو بتایا گیا۔

"ایھا الحبیب و البشر بالنصر فقد نصرت الخلیل و این مقام الخلیل من الحبیب"

اے حبیب آپ خوش ہو جائیں، میں آپ کی امداد بھی کروں گا جبکہ میں نے اپنے خلیل کی امداد کر دی، حبیب کے مقابل خلیل کا کیا مقام ہے؟ یعنی جب حبیب کا مقام خلیل کے مقام سے بلند وبالا ہے تو حبیب کی امداد بھی خلیل کی امداد سے زیادہ ہوگی، لہٰذا آپ کے مقابل سرکش لوگوں کا بھی سرنیچا ہوگا، ذلیل وخوار ہوں گے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

جھگڑے اور مناظرے کی وجہ:

"الم ترالی الذی حاج ابراھیم فی ربہ"

کیا آپ نے نہیں دیکھا اس کی طرف جس نے جھگڑا کیا ابراہیم سے اس کے رب کے متعلق۔

اس کی وجہ یہ تھی "حاج فی معارضتہ ربوبیۃ ربہ" کہ اس نے ابراہیم علیہ السلام سے اس لئے ان کے رب متعلق جھگڑا کیا کہ یہ خود اپنے رب ہونے کا دعویدار تھا، تو اس کا مطلب یہ تھا کہ تم بیان کرو تمہارا رب کون ہے، کیا وہ مجھ سے بڑا ہے؟

" ان آتاه الله الملک" اس وجہ سے کہ دی اس کو اللہ نے بادشاہی۔

"لان آتا ہ اللہ یعنی ان ایتاه الملک ابطره واورثه الکبر فحاج لذلک"

دوسری وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بادشاہی دی یعنی رب تعالیٰ کی طرف اسے بادشاہی دینے کی وجہ سے وہ اکڑ میں آ گیا، اترانے لگا اور متکبر ہو گیا اور اسی ذات کبریاء کے متعلق جھگڑا شروع کر دیا۔ (از مدارک التنزیل)

"وما حمله علی هذ الطغیان والکفر الغلیظ والمعاندة الشدیدة الا تجبره وطول مدته فی الملک وذلک انه مکث اربع ما ئة سنة فی ملکه "

تیسری وجہ اس کی سرکشی اور کفر اور عناد کی یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بادشاہی لمبی مدت کے لئے دی کہ وہ چار سو سال تک حکمرانی کرتا رہا جس کی وجہ سے وہ متکبر ہو کر خدا بن بیٹھا۔ (صابونی)

مسئلہ: "هذه الآیة تدل علی جو از تسمیة الکافر ملکا اذا آتاه الله الملک والعز والرفعة فی الدنیا"

یہ آیۃ کریمہ اس مسئلہ پر دلالت کر رہی ہے کہ کافر کو بادشاہ کہنا جائز ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کافروں کو دنیا میں بادشاہت اور دنیاوی عزت اور دنیا میں ظاہری طور پر بلند مرتبہ عطاء کرتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں دنیاوی جاہ و جلال کی قدر و منزلت اتنی بھی نہیں جتنی مچھر کے پر کی ہوتی ہے۔ (ماخوذ از قرطبی)

"اذقال ابراهیم ربی الذی یحی و یمیت":

"جب کہا ابراہیم نے میرا رب وہ ہے جو زندگی عطاء کرتا ہے اور مارتا ہے"۔

" یخلق الحیاة والموت فی الاجساد" یعنی وہ جسموں میں موت و حیات کو پیدا فرماتا ہے۔ (بیضاوی)

"قال انااحی وامیت": "اس نے کہا میں زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں"۔

"بالغ من القتل والقتل" یعنی میں قتل کے مستحق کو معاف کر کے زندہ کرتا ہوں اور معافی کے مستحق کو قتل کر کے مارتا ہوں۔ (بیضاوی)

اس پر اس احمق نے عمل کر کے دکھایا، جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

"قال ابراهيم فان الله يأتي بالشمس من المشرق فأت بها من المغرب":

"کہا ابراہیم نے تو بیشک اللہ لاتا ہے سورج کو مشرق سے تو تو لے آ اسے مغرب سے۔"

اہلِ علم کی تحقیقی بحث:

بعض حضرات نے بیان کیا کہ ابراہیم علیہ السلام نے پہلی دلیل سے عدول کر کے یہ دوسری دلیل دی، اور بعض حضرات نے بیان کیا کہ یہ دوسری دلیل نہیں، بلکہ پہلی دلیل کا ہی حصہ ہے، اس مقام پر تفسیر کبیر اور روح المعانی میں بہت طویل بحث ہے اور کئی اعتراضات و جوابات پیش کئے گئے ہیں، لیکن راقم بہت ہی مختصر طور پر ایک حصہ تنویر الابصار سے اور ایک حصہ صاوی سے پیش کر رہا ہے۔

"قال ابراهيم" اريد الاحياء والاماتة بنفخ الروح واخرجه وانت عاجز عن تحريك بعض الاجسام المتحركة الى جهة بتحويلها الى اخرى مع ان اصل التحريك من آثار الحياة فاذا عجزت عن اثر من آثارها مع وجود مثله فانت عنها في غاية العجز (فان الله يأتي بالشمس) بتحريك فلكها على خلاف حركته الخاصة (من المشرق) الى المغرب (فأت بها) بتحريك فلكها على حركته الخاصة (من المغرب) الى المشرق ان قدرت على مقاومته"

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ دلیل دی کہ میرا رب زندگی عطاء کرتا ہے اور مارتا ہے تو اس کے جواب میں جب نمرود نے کہا میں زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا میری مراد زندہ کرنے سے روح پھونکنا ہے یعنی حیات پیدا کرنا، اور موت دینے سے مراد روح کو نکالنا ہے یعنی موت پیدا کرنا ہے، تو حرکت کرنے والے جسموں کو ایک طرف سے دوسری طرف پھیرنے سے عاجز ہے حالانکہ کسی چیز کو حرکت دینا اور پھیرنا زندگی کی علامات میں سے

ایک علامت ہے، جب تو زندگی کی علامات میں سے ایک علامت سے عاجز ہے تو تو بہت بڑا عاجز ہے اگر تیرا خیال ہے کہ تو اجسام متحرکہ کو پھیرنے کی طاقت رکھتا ہے اور مقابلہ کر سکتا ہے، تو اللہ تعالیٰ فلک کی حرکت خاصہ کے خلاف حرکت دے کر سورج کو مشرق سے نکالتا ہے اور مغرب میں غروب کرتا ہے تو تو سورج کو فلک حرکت خاصہ کے مطابق حرکت دے کر مغرب سے نکال۔ (تنویر الابصار)

اس سے پتہ چلا کہ ایک ہی دلیل ہے جس کا اعلیٰ حصہ سے پستی کی طرف رخ کیا گیا ہے، یعنی تو موت وحیات پیدا کرنے سے قاصر تو کم از کم سورج کو مغرب سے ہی نکال کر دکھا دے، لیکن جلالین میں ذکر کیا گیا ہے۔

"فلمار آہ غبیا (قال ابراھیم منتقلا الی حجۃ اوضح"

جب ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ یہ بے وقوف ہے تو آپ نے واضح دلیل کی طرف انتقال فرمایا۔

اس پر صاوی نے بیان فرمایا کہ مفسر رحمہ اللہ نے ان الفاظ سے ایک سوال کا جواب دیا، وہ سوال یہ تھا کہ جب اس کافر نے یہ کہا تھا کہ "میں زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں" تو مناظرہ کا طریقہ یہ تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے اس کا رد کرتے پھر اور دلیل قائم کرتے، آپ نے اس کی دلیل کا جواب دینے سے پہلے ہی اور دلیل کیوں قائم کی۔

"اجاب المفسر بانہ لمار آہ غبیا لم یدقق علیہ فی ذلک وانتقل لحجۃ اخری"

مفسر رحمہ اللہ نے جواب یہ دیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اسے دیکھا کہ یہ تو بیوقوف انسان ہے اس میں دقیق (باریک) دلائل سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں تو آپ نے پہلی دلیل سے واضح دلیل کی طرف انتقال فرمایا۔ (صاوی)

اس سے واضح ہوا کہ مناظر اپنے مقابل کو غبی (کند ذہن) دیکھ کر ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف عدول کر سکتا ہے۔

فائدہ: اس آیت کریمہ سے واضح ہوا کہ حق راہ کو ثابت کرنے کے لئے مناظرہ کرنا اور اپنے موقف پر دلائل دینا جائز ہے، قرآن پاک اور حدیث پاک سے واضح ہے۔ جس طرح قرآن پاک کی اس آیۃ کریمہ سے ثابت ہے، اس طرح اور آیات بھی اسے ثابت کر رہی ہیں۔ مندرجہ ذیل آیات میں یہ مسئلہ واضح ہو جاتا ہے۔

"قل ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین" "ان عندکم من سلطان" "قالوا یانوح قد جادلتنا

فاکثرت جدالنا" وانابریٔ مما تجرمون"

اور نبی کریم ﷺ کا نجران کے عیسائیوں سے مناظرہ کرنا اور مباہلہ کا چیلنج کرنا واضح دلیل ہے۔

پھر صحابہ کرام یوم سقیفہ میں خلافت کے معاملہ میں مناظرہ کرنا پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر متفق ہونا بھی اس مسئلہ پر واضح دلیل ہے۔ (ماخوذ از قرطبی)

تنبیہ: "انا" کا آخری الف لکھنے میں آتا ہے لیکن پڑھنے میں نہیں آتا، جس طرح ہمزہ وصلی درج کلام میں لکھنے میں آتا ہے لیکن پڑھنے میں نہیں آتا۔ لہٰذا "ان" ہمزہ اور نون کے فتحہ (زبر) سے پڑھا جائے گا۔ (از کبیر)

"فبهت الذی کفر": "تو ہوش اڑ گئے کافر کے"۔

"فتحیر وتدهش" یعنی وہ لاجواب ہونے کی حیرانگی میں مبتلاء ہو کر دہشت میں آ گیا اس کے ہوش اڑ گئے۔

(جلالین، مدارک، خازن وغیرہ)

اعتراض: نمرود جب روئے زمین کا بادشاہ تھا تو وہ مبہوت کیوں ہو گیا، اس کے ہوش کیوں اڑ گئے، اور وہ خدائی کا دعویدار بھی تھا تو اس نے یوں کیوں نہ کہہ دیا "فلیأت ربک بها من المغرب" کہ مشرق سے تو سورج میں نکالتا ہوں، تو اپنے رب کو کہہ کہ وہ سورج کو مغرب سے نکالے۔

پہلا جواب: اگر آگ میں ڈالے جانے اور آپ کے صحیح وسلامت باہر آنے کے بعد یہ مناظرہ تھا تو یہ جواب دیا جائے گا۔

"فعلم ان من قدر علی حفظ ابراهیم فی تلک النار العظیمة من الاحتراق یقدر علی ان یاتی بالشمس من المغرب"

کہ نمرود کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے رب کو جب یہ طاقت حاصل ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو بہت بڑی آگ سے اس نے بچالیا ہے تو میں نے اگر یہ مطالبہ کیا کہ وہ سورج مغرب سے لے آئے تو ابراہیم کے کہنے پر وہ سورج مغرب سے لے آئے گا اس میں میری زیادہ ذلت و رسوائی ہوگی، میری خدائی کا بھرم کھل جائے گا، جو بے وقوف مجھے خدا مان

رہے ہیں وہ بھی چھوڑ جائیں گے۔

دوسرا جواب: "ان اللہ خذلہ وانساہ ایرادھذہ الشبھۃ نصرۃ لنبیہ علیہ السلام"

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اور اپنے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امداد فرمائی کہ نمرود کو ذلیل کردیا گیا اور اس کے ذہن سے ہی یہ نکال دیا گیا کہ وہ یہ بھی کہہ سکتا ہے۔ اس قسم کے اعتراضات اس کی عقل میں ہی نہ آسکے۔ (از کبیر)

یہ دوسرا جواب ہی زیادہ قوی ہے، جو دونوں قولوں کو شامل ہے خواہ مناظرہ آگ کے واقعہ کے بعد ہوا ہو یا پہلے، سبحان اللہ! اللہ تعالیٰ کے نبی سے جھوٹے خدا کا مقابلہ کرنا اور غالب آنا ممکن ہی نہ تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی امداد کررہا تھا اور جھوٹے خدا کو ذلیل کررہا تھا، نبی کا مقام تو بہت ہی بلند ہے۔

پھر نبی بھی جلیل القدر اور بلند شان والا اللہ کا خلیل اس کے مقابلے میں کافر نے ذلیل ہونا ہی تھا، جبکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ولی یعنی سید الاولیاء حضرت پیر مہر علی شاہ رحمہ اللہ کے مقابلہ میں آنے سے جھوٹے مدعی نبوت مرزا غلام احمد قادیانی کو جرأت نہ کرسکنے کی ذلت میں مبتلاء کیا۔

"واللہ لایھدی القوم الظالمین": "اور اللہ نہیں ہدایت دیتا ظالموں کی قوم کو"۔

"ظالمین" سے مراد یہاں کافرین ہے، یعنی نمرود اور دوسرے کفار کو رب تعالیٰ یہ توفیق ہی نہیں عطاء کرتا کہ وہ اپنے دلائل اور اعتراضات میں اللہ تعالیٰ کے محبوبوں پر غالب آسکیں۔ (خازن و مدارک)

اور یہ مطلب بھی عموم الفاظ سے لینا زیادہ مناسب نظر آتا ہے کہ جن لوگوں کے دلوں پر کفر کا زنگ لگا ہوا ان کے دلوں میں صلاحیت ہی نہیں کہ وہ اللہ کے مقبول بندوں کی نصیحت کو قبول کرکے راہ راست پر آجائیں۔

اسی مناظرہ میں دلچسپ واقعہ:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملاقات نمرود سے کس طرح ہوئی جب آپ سے اس نے مناظرہ کیا؟ وہ اس

طرح تھی کہ ایک مرتبہ قحط سالی پڑ گئی، لوگ غلہ لینے کے لئے نمرود کے پاس جاتے تھے جو بھی جاتا تھا نمرود اس سے پوچھتا تھا" من ربک" تیرا رب کون ہے؟ اگر وہ جواب دیتا" انت ربی" تو میرا رب ہے تو اسے غلہ دے دیتا تھا ورنہ غلہ نہیں دیتا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اس کے پاس غلہ لینے کے لئے گئے تو اس نے پوچھا" من ربک" تمہارا رب کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا۔"ربی الذی یحی ویمیت" میرا رب وہ ہے جو زندگی عطاء کرتا ہے اور مارتا ہے۔(اس کے بعد تمام مناظرہ کا ذکر آیۃ کریمہ کی وضاحت میں بیان ہو چکا ہے)

آپ کو نمرود نے غلہ نہ دیا، آپ واپس آرہے تھے تو ریت کے ایک ٹیلے سے گذرے تو یہ خیال کیا کہ خالی ہاتھ گھر نہ جاؤں وہاں سے ریت کی ایک بوری بھر لی گھر آکر ریت کو اتار کر رکھ دیا اور خود جا کر لیٹ گئے یہاں تک کہ سو گئے، آپ کی زوجہ نے بوری کو کھول کر دیکھا تو اس میں اعلیٰ قسم کی گندم موجود تھی، انہوں نے کھانا تیار کیا جب حضرت ابراہیم علیہ السلام بیدار ہوئے تو آپ کی زوجہ نے آپ کی خدمت میں کھانا پیش کیا آپ نے پوچھا یہ کھانا کہاں سے آیا ہے؟ آپ کی زوجہ نے بتایا کہ اس غلہ سے تیار کیا ہے جو آپ نے لایا۔

"فعلم ابراھیم ان اللہ قدرزقه فحمداللہ تعالی"

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو معلوم ہو گیا کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ اور رحمت واسعہ سے ہمیں یہ رزق عطاء کیا ہے آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد کی اور شکر بجالایا۔ (از خازن و در منثور وغیرہ)

☆☆☆☆☆

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ وَّهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَاقَالَ اَنّٰی یُحْیٖ

هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَمَوْتِهَافَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ

لَبِثْتُ یَوْمًااَوْبَعْضَ یَوْمٍ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْاِلٰی

طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ یَتَسَنَّهْ وَانْظُرْاِلٰی حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ

اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْاِلَی الْعِظَامِ كَیْفَ نُنْشِزُهَاثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا

فَلَمَّاتَبَیَّنَ لَهٗ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ☆

(سورۃالبقرۃآیت۲۵۹)

﴿۱﴾

یااس کی طرح جوگذراایک بستی پراوروہ ڈھی پڑی تھی اپنی چھتوں پر بولا اسے کیونکر جلائے گا اللہ اس کی موت کے بعد تو اللہ نے اسے مردہ رکھا پھر زندہ کردیا فرمایا تو یہاں کتنا ٹھہرا عرض کی دن بھر ٹھہرا ہوں گا یا کچھ کم فرمایا نہیں تجھے سو برس گذر گئے اوراپنے کھانے اور پانی کو دیکھ کہ اب تک بو نہ لایا اوراپنے گدھے کو دیکھ جس کی ہڈیاں تک سلامت نہ رہیں اور یہ اس لئے کہ تجھے ہم لوگوں کے واسطہ نشانی کریں اوران ہڈیوں کو دیکھ کیونکر ہم انہیں اٹھان دیتے پھر انہیں گوشت پہناتے ہیں جب یہ معاملہ اس پر ظاہر ہوگیا بولا میں خوب جانتا ہوں کہ اللہ سب کچھ کرسکتا ہے۔

﴿۲﴾

یا مثل اس شخص کے جوگذراایک بستی پراوروہ گری ہوئی تھی اپنی چھتوں پر کیااس نے کہا اس نے کیسے زندہ کرے گا اس اللہ موت کے بعد تو موت دی اسے اللہ نے سو سال

تک پھر اسے اٹھایا۔ کہا تم کتنا ٹھہرے ہو، عرض کیا ٹھہرا ہوں گا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ، فرمایا بلکہ تم ٹھہرے ہو ایک سو سال تو دیکھ اپنے کھانے اور پینے کو تبدیل نہیں ہوا اور دیکھ اپنے گدھے کو اور بناتے ہیں ہم تمہیں نشانی لوگوں کے لئے اور دیکھ ہڈیوں کی طرف کس طرح ہم ان کو اٹھان دیتے ہیں پھر ہم انہیں پہناتے ہیں گوشت، تو جب خوب ظاہر ہوا اس پر، کہا میں خوب جانتا ہوں بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

ماقبل سے تعلق:

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا ذکر فرمایا کہ اس نے اپنی قدرت کاملہ سے ابراہیم علیہ السلام کی امداد فرمائی ان کو خدائی کے دعویدار بادشاہ پر برتری دی اور اس کافر کو مبہوت کر کے ذلیل و خوار کر دیا۔ اس آیۃ کریمہ میں مردوں کے زندہ کرنے پر قدرت کا ذکر فرمایا کہ اس نے حضرت عزیر علیہ السلام کے کہنے پر ان کے سامنے مردہ کو زندہ کر کے دکھا دیا تا کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی قدرت پر علم الیقین سے ترقی دے کر عین الیقین کے درجہ پر فائز کر دیا جائے۔

مختصر مطلب:

حضرت عزیر علیہ السلام ایک تباہ شدہ بستی سے گذرے تو بطور تعجب عرض کیا کہ اس بستی والوں کو اللہ تعالیٰ زندہ کرے گا وہ کیسی خوب قدرت ہوگی، وہ کیسے خوب انداز سے ان کو زندہ کرے گا، دل دل میں یہ تمنا تھی کہ اللہ تعالیٰ میرے سامنے کسی مردہ کو زندہ کرے تا کہ میرا علم جو پہلے خبر سے حاصل ہے اب وہ اس سے بڑھ کر آنکھوں دیکھے حال تک پہنچ جائے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک سو سال تک وہاں ہی مردہ حال میں ٹھہرا دیا، یعنی ان پر موت کو مسلط کر دیا، اور اسی حال میں ان کو ایک سو سال وہی ٹھہرائے رکھا، پھر ان کو زندہ کر کے اٹھایا اور ان سے پوچھا تم یہاں کتنی دیر ٹھہرے ہو انہوں نے اندازہ سے عرض کیا کہ ایک دن یا ایک دن سے بھی کم مقدار میں ٹھہرا ہوں گا تو رب تعالیٰ نے فرمایا نہیں بلکہ تم تو یہاں ایک سو سال ٹھہرے ہو، اب میری قدرت کو آنکھوں سے دیکھو، اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو

دیکھو وہ جوں کی توں ہیں، ان میں ذرا بھر بھی تبدیلی واقعہ نہیں ہوئی اور اپنے گدھے کو بھی دیکھو، جس کی ہڈیاں گل سڑ گئیں، اب دیکھو اسے ہم تمہارے سامنے زندہ کرتے ہیں، کس طرح ہم اس کی ہڈیوں کو جمع کر کے جوڑ کر اسے پھر سے اٹھان دیتے ہیں اور کیسے اس پر گوشت چڑھاتے ہیں، ہم نے آپ کو لوگوں کے لئے نشانی بنا دیا ہے، جب عزیر علیہ السلام پر مردہ کو زندہ کرنا خوب واضح ہو گیا تو آپ نے کہا کہ آنکھوں سے دیکھنے کی وجہ سے اب میرے علم میں خوب ترقی ہو چکی ہے میں خوب طور پر جان گیا ہوں کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

فائدہ: راقم کو اس واقعہ سے عجیب نکتہ سمجھ آیا کہ رب تعالیٰ نے حضرت عزیر علیہ السلام کے کھانے اور پینے کی چیزوں کو ذرا بھر بھی نہیں تبدیل ہونے دیا، ان میں نہ بو واقع ہوئی اور نہ ہی سو سال تک وہ خشک ہو کر برباد ہوئیں اس سے اشارہ اس طرف کیا گیا کہ میں انبیاء کرام اور اولیاء کرام، صلحاء کے جسموں کو دفن کے بعد ایسے ہی محفوظ رکھتا ہوں جیسے تمہارے کھانے پینے کی چیزوں کو محفوظ رکھا، صلحاء کے جسموں کو گلنے سڑنے نہیں دیتا اور نہ ہی زمین ان کو کھاتی ہے، اس پر حدیث پاک کے یہ الفاظ شاہد ہیں۔

"ان اللہ حرم علی الارض ان تأکل اجساد الانبیاء"

بیشک اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا کہ وہ انبیاء کرام کے جسموں کو کھائے۔

اور گدھے کی ہڈیوں کو بکھیر کر اور ریزہ ریزہ کر کے یہ واضح کر دیا کہ کفار اور بعض گنہگار مسلمانوں کے جسموں کو ہڈیاں ہڈیاں کر دیا جاتا ہے اور ان کی ہڈیاں گل سڑ جاتی ہیں، لیکن ان کو بھی ایسے ہی زندہ کر لیا جائے گا جیسا کہ تمہارے سامنے تمہارے گدھے کی گلی سڑی ہڈیوں کو جوڑ کر ان پر گوشت چڑھا کر زندہ کیا جا رہا ہے۔ (راقم)

"او کالذی مر علی قریة": "یا مثل اس شخص کے جو گذرا ایک بستی پر"۔

اس کا عطف ہے "الم تر الی الذی حاج ابراهیم" پر، اب مطلب یہ ہوگا کیا آپ نے نہیں دیکھا اس شخص کو جو گذرے ایک بستی پر۔

وہ گذرنے والا شخص کون تھا؟ صحیح قول یہ ہے کہ وہ حضرت عزیر بن شرخیا علیہ السلام تھے۔

یہی روایت مستدرک حاکم میں ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اسحٰق بن بشر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی روایت ذکر کی، یہی قول حضرت عبداللہ بن سلام اور حضرت قتادہ اور حضرت عکرمہ اور حضرت ربیع اور ضحاک اور سدی رضی اللہ عنہم کا ہے۔" و علیه خلق کثیر " یہی قول بہت سے اہل علم حضرات کا ہے اور یہی قول معتبر ہے۔ (از روح المعانی)

وہ بستی کون سی تھی؟"والقریة المذکورة ھی بیت المقدس " جس بستی کا یہاں ذکر ہے وہ بیت المقدس ہے، یہی قول وہب بن منبہ اور قتادہ اور ربیع بن انس رضی اللہ عنہم کا ہے اور بھی کئی حضرات کا یہی قول ہے۔ (قرطبی)

"وھی خاویة علی عروشھا": اور وہ گری ہوئی اپنی چھتوں پر۔

گھر کی چھت کو" عریش" کہا جاتا ہے، اسی طرح ہر خیمہ یا چھت وغیرہ جس سے سایہ حاصل کیا جائے اسے بھی" عریش" کہا جاتا ہے، اور ہر وہ جگہ جہاں آدمی چھپ سکے اسے بھی عریش کہا جاتا ہے، کنوئیں کی ارہٹ کے اوپر چھت کو " عریش الدالیه"کہا جاتا ہے۔چھت پر گرنے کا مقصد یہ تھا" سقطت القطت الحیطان علیھا"بستی کے مکانوں کی چھتیں گری ہوئی تھیں، ان کے اوپر دیواریں گری ہوئی تھیں۔ (قرطبی)

"قال انی یحی ھذہ اللّٰہ بعد موتھا":

" کہا کیسے زندہ کرے گا اللہ اسے بعد اس کی موت کے۔"

حضرت عزیر علیہ السلام نے یا تو دل میں کہا اور یا زبان سے کہا جیسا کہ عام طور انسان کی عادت یہی ہے کہ وہ تعجب کے وقت اکیلا ہو تو پھر بھی بلند آواز سے کہتا ہے یہ کیسے ہوگا؟

دینی طلباء کے لئے:

" ھذہ" کا اشارہ یا بستی کی طرف ہے اس صورت میں "اماتة" اور" احیاء "کا معنی مجازی ہوگا یعنی اللہ تعالیٰ اس بستی کو برباد ہونے کے بعد کیسے آباد کرے گا اور یا خذف مضاف ہے، یعنی" اصحاب ھذہ القریة "اس

صورت میں ''احیاء'' اور'' اماتة ''کا مفہوم حقیقی ہوگا۔اب مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اس بستی والے لوگوں کو کیسے زندہ کرے گا۔ (روح المعانی)

راقم کے نزدیک دونوں کا مطلب ایک ہی ہے کیونکہ بستی کو برباد ہونے کے بعد آباد کرنے کا مطلب بھی بستی کے لوگوں کو ہی زندہ کر کے آباد کرنا ہے۔

حضرت عزیر علیہ السلام کا یہ ارشاد اللہ کی قدرت میں شک کرنے کی وجہ سے نہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک کرنا کفر ہے یہ عام مومن بھی نہیں کرسکتا تو اللہ تعالیٰ کا نبی کیسے شک کرسکتا ہے، پھر اس کا مطلب کیا ہے ؟اس کا مطلب قاضی بیضاوی رحمہ اللہ ان لفظ میں بیان کرتے ہیں۔

''(قال انی یحیی هذه الله بعد موتها) اعترافا بالقصور عن معرفة طریق الاحیاء و استعظاما لقدرة المحی''

حضرت عزیر علیہ السلام برباد شدہ بستی کو دیکھ کر تعجب کرتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو کیسے زندہ کرے گا جبکہ ان کی ہڈیاں بوسیدہ ہوچکی ہیں یہ درحقیقت اپنی معرفت کے قصور کا اعتراف تھا کہ آج تک ایسی حالت سے کسی کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھا نہیں،اور زندہ کرنے والے کی قدرت کو عظیم سمجھتے ہوئے کہا۔ (از بیضاوی)

''فاماته الله مائة ثم بعثه'': ''تو موت دی اسے اللہ نے سو سال تک پھر اسے اٹھایا''۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک سو سال تک مردہ حالت میں ٹھہرایا۔یا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موت عطاء کردی اور آپ ایک سو سال ٹھہرے رہے۔

'' ثم بعثه''یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو زندہ کر کے پھر اٹھایا۔ (ماخوذ از بیضاوی)

کہا جاتا ہے''بعث الشیء''فلاں چیز کو اپنی جگہ سے اٹھالیا۔اسی طرح کہا جاتا ہے'' بعث الناقة '' میں نے اونٹنی کو اس کی جگہ سے اٹھایا،اسی طرح قیامت کے دن قبروں سے اٹھائے جانے کو بھی'' یوم انبعث''کہا جاتا ہے۔

(از شیخ زادہ)

نکتہ: رب تعالیٰ نے فرمایا " ثم بعثہ " پھر اسے اٹھایا، یہ نہیں فرمایا " ثم احیاہ " پھر اسے زندہ کیا۔ اس لئے کہ اس سے یہ اشارہ کیا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے پہلی حالت کی طرف لوٹایا یعنی آپ کو زندہ کیا اور عقل وفہم پہلے کی طرح عطاء کئے، اور نظر واستدلال اور معرفت الٰہیہ عطاء کی۔

" ولو قال " ثم احیاہ " لم تحصل هذه الفوائد "

اور اگر رب تعالیٰ " ثم بعثہ " کہ جگہ " ثم احیاہ " فرماتا تو یہ فوائد حاصل نہ ہوتے۔ (شیخ زادہ)

"قال کم لبثت": " کہا تم کتنا ٹھہرے ہو۔"

یعنی اللہ تعالیٰ نے سو سال کے بعد آپ کو زندہ، صحیح وسلامت اپنی اصلی حالت کی طرف لوٹا کر پوچھا کہ تم کتنی دیر ٹھہرے ہو؟

" کم لبثت " کا معنی ہے " کم مکثت " تم کتنی دیر ٹھہرے ہو؟ (جلالین)

"قال لبثت یوما او بعض یوم": کہا میں ٹھہرا ہوں گا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔

آپ پر جب موت کو مسلط کیا گیا تو وہ چاشت کا وقت تھا اور جب آپ کو اٹھایا گیا تو وہ غروب کے قریب کا وقت تھا، جب آپ سے رب تعالیٰ نے پوچھا تم کتنی دیر ٹھہرے ہو؟ تو آپ کا جواب ایک تو ایسا تھا " کقول الظان " جیسا کہ کوئی گمان کرنے والا اپنے گمان کے مطابق جواب دیتا ہے، یقین سے نہیں۔

اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے خوبصورت ترجمہ کیا " عرض کی دن بھر ٹھہرا ہوں گا یا کچھ کم "

فقال قبل النظر الی الشمس یوما ' حضرت عزیز علیہ السلام نے سورج کی طرف نظر کرنے سے پہلے عرض کیا ایک دن ٹھہرا ہوں گا۔

"ثم التفت فرای بقیۃ منها فقال "او بعض یوم" علی الاضراب"

پھر جب سورج کو دیکھا کہ ابھی تو سورج غروب نہیں ہوا بلکہ دن کا کچھ حصہ باقی ہے تو پہلی بات سے اضراب کر کے (یعنی پہلی بات سے ہٹ کر) کہا کہ " دن کا کچھ حصہ ٹھہرا ہوں " (بیضاوی)

"قال بل لبثت مائة عام": "کہا بلکہ تم ٹھہرے ہو ایک سو سال۔"

یعنی رب تعالیٰ نے فرمایا کہ ایک دن یا کچھ کم ٹھہرنے والی بات نہیں بلکہ تم تو ایک سو سال وفات کی حالت میں ٹھہرے رہے۔

"فانظر الی طعامک وشرابک لم یتسنه":

"تو دیکھ اپنے کھانے اور پینے کو جو تبدیل نہیں ہوا۔"

اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا آپ کو مشاہدہ کرایا اور ارشاد فرمایا کہ اپنے کھانے پینے کی اشیاء یعنی انجیر اور انگور، اور نچوڑ (مشروب) اور دودھ کو دیکھ ایک سو سال گذر جانے کے باوجود ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، نہ ان کی بو بدلی۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"لم یتسنه" اصل میں کیا ہے، اس میں تین احتمال ہیں۔ چونکہ معنی سب صورتوں میں ایک ہی ہے اس لئے سب احتمال اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔

﴿۱﴾ آخر میں "ہا" لام کلمہ ہے، اصل میں "سنه یسنه سنها" ہے، اور "ہاء" پر جزم لم جازمہ کی وجہ سے ہے، عام طور پر استعمال ہوتا ہے "تسنه یتسنه تسنها" "ای تغیر" معنی اس صورت میں بھی تبدیل ہونا ہی ہوتا ہے۔

﴿۲﴾ دوسرا احتمال یہ ہے کہ "ہا" سکتہ کے لئے ہو، اصل میں "ناقص واوی" ہو، اس صورت میں لام کلمہ واو یاء بن کر اور یاء الف بن کر لم جازمہ کی وجہ سے محذوف ہے، اور ہاء سکتہ کے لئے ہے "تسنی یتسنی" کا معنی بھی تغیر وتبدیل ہی آتا ہے۔

جب دو احتمال ہو گئے کہ اصل اس کا "سنه" ہے اور کبھی "سنو" آتا ہے، اسی وجہ سے اس کی تصغیر کبھی "سنیه" بھی آتی ہے جو کہ اس کی اصل "سنه" پر دلالت کرتی ہے اور کبھی اس کی تصغیر "سنیه" بھی آتی ہے جو اس کے اصل "سنو" پر دلالت کرتی ہے۔

﴿۳﴾ کہ اصل میں لام کلمہ نون ہے جیسا کہ " من حمأ مسنون "میں مسنون کا" بدلی ہوئی بو" ہے، پھر نون کو یاء بنایا گیا جیسا کہ " تظنن "میں نون کو یاء بنا کر " تظنی "پڑھا جاتا ہے۔

اس صورت میں ہاء وقف کی ہوگی، وصل کی صورت میں "لم یتسن" پڑھا جائے گا اور وقف کی صورت میں " لم یتسنه "پڑھا جائے گا۔ معنی اس صورت میں بھی بدلنے والا ہی ہے۔

یعنی تینوں صورتوں میں معنی ایک ہی رہے گا" اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی"۔ (بیضاوی از شیخ زادہ)

طلباء کرام ایک اور توجہ فرمائیں:

" ولم یتسنه" افراد الضمیر لان الطعام والشراب کالجنس الواحد"

" ولم یتسنه " میں مرفوع کی ضمیر واحد ہے حالانکہ پہلے دو چیزوں کا ذکر ہے" کھانے اور پینے کا" اس کی وجہ یہ ہے کہ" کھانا اور پینا" ایک ہی جنس ہے اس لئے ضمیر واحد کی لوٹا دی۔ (بیضاوی)

"وانظر الی حمارک": "اور دیکھو اپنے گدھے کو۔"

یعنی اپنے گدھے کو دیکھو اس کی ہڈیاں کیسے بکھر چکی ہیں، گدھے کو اس حال میں اس لئے کیا ہے تاکہ آپ اس کی گلی سڑی ہڈیوں کو بھی دیکھیں، پھر اسے زندہ ہوتے بھی دیکھیں۔ (ماخوذ از جلالین)

"ولنجعلک آیۃ للناس": "اور بناتے ہیں ہم تمہیں نشانی لوگوں کے لئے۔"

یہ مختصر الفاظ عظیم مطالب کو شامل ہیں کیونکہ حضرت عزیز علیہ السلام کو لوگوں کے لئے نشانی بنانے کے کئی مطالب ہیں۔

﴿۱﴾ "(ولنجعلک آیۃ) علی البعث (للناس)

آپ کو سو سال تک وفات عطاء کر کے پھر زندہ کرنا لوگوں کے لئے قیامت پر دلیل ہے اور نشانی ہے، کہ جس ذات نے حضرت عزیر علیہ السلام کو ایک سو سال کے بعد زندہ کیا وہ باقی لوگوں کو بھی زندہ کرنے پر قادر ہے، اور جس ذات نے آپ کے سامنے گدھے کی گلی سڑی ہڈیوں کو جوڑ کر زندہ

فرمادیا وہ قیامت کے دن بھی لوگوں کو بوسیدہ ہڈیوں سے زندہ کردے گا۔ (جلالین مع وضاحت)

یہی معنی تنویر الابصار اور صابونی میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ آپ کو سو سال بعد زندہ کرنا قیامت پر دلیل ہے۔

﴿۲﴾ جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کے متعلق بیان کیا۔

"وجعلناها وابنها آية للعلمين"

اور ہم نے اسے (مریم کو) اور اس کے بیٹے کو جہان والوں کے لئے نشانی بنایا۔

یعنی رب تعالیٰ نے اپنی قدرت کا اظہار فرمایا کہ بغیر باپ کے عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا فرمایا پھر ان کو پنگھوڑے میں بولنے کی طاقت دی جو اللہ تعالیٰ کی قدرت پر عظیم دلیلیں ہیں۔ اسی طرح حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ بھی رب تعالیٰ کی قدرت عظیمہ پر دلیل ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿۳﴾ "(ولنجعلک آية للناس) يدل على التشريف العظيم"

حضرت عزیر علیہ السلام کے واقعہ کو نشانی بنانے کا مطلب یہ ہے کہ آپ بہت شرافت اور بلند مرتبہ والے تھے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ نبی کو لوگوں کی عبرت کے لئے نشانی بنایا۔

"ای لانهم يعتيرون بذلک ويعر فون به قدرة الله تعالى ونبوة نبى ذلک الزمان"

کہ وہ لوگ اس واقعہ سے عبرت پکڑیں اور اللہ کی قدرت کو پہچانیں اور اپنے زمانے کے نبی کی نبوت کو پہچانیں اور ایمان لائیں تا کہ قیامت کے دن کامیابی سے ہمکنار ہوں۔ (از کبیر)

"وانظر الى العظام": "اور دیکھ ہڈیوں کی طرف"۔

اس سے مراد گدھے کی ہڈیاں ہیں پہلے حکم دیا۔" وانظر الى حمارک "اور دیکھ اپنے گدھے کی طرف۔

اس میں مقصد یہ تھا کہ تم اپنے گدھے کو دیکھو ایک سو سال گذر جانے کی وجہ سے کیسے وہ ہڈیاں ہڈیاں ہو گیا، ہڈیاں اس کی بکھر گئیں، پرانی ہو کر گل سڑ گئیں، ریزہ ریزہ ہو گئیں۔ اب جو گدھے کی ہڈیاں دیکھنے کا حکم دیا گیا اس سے مراد یہ ہے کہ اب دیکھو ہم کس طرح ہڈیوں کو جوڑ کر ان پر گوشت چڑھا کر زندہ کرتے ہیں، یہ قول سدی رحمہ اللہ کا ہے

یہ قول معتبر ہے۔

ایک قول اور یہ ہے کہ تباہ شدہ بستی کے لوگوں کی ہڈیوں کو دیکھنے کا حکم دیا گیا اسی طرح ایک اور قول یہ ہے کہ پہلے آپ کو ایک سو سال کے بعد زندہ کرنے کے لئے آنکھیں عطاء کیں، پھر کہا تم اپنی ہڈیوں کو دیکھو۔

ایک اور قول یہ ہے کہ حکم یہ تھا کہ تم اپنی ہڈیوں کو دیکھو اور اپنے گدھے کی ہڈیوں کو دیکھو۔ پہلے قول کے بعد تینوں اقوال کے متعلق علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

" والکل لا یعول علیه" ان تمام اقوال میں سے کسی ایک پر بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ (از روح المعانی)

"کیف ننشزھا": "کس طرح ہم ان کو اٹھان دیتے ہیں۔"

"ننشزھا" انشاز (زاء معجمہ) سے لیا ہوا ہے جس کا معنی ہے "اٹھانا"

"کیف نرفعھامن الارض فنردھاالی اماکنھامن الجسد"

یعنی اپنے گدھے کی ہڈیوں کی طرف دیکھو کس طرح ہم ان کو زمین سے اٹھا کر اس کے جسم کے اپنی اپنی جگہ پر رکھتے ہیں۔

کسائی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے اس کا معنی یہ ہے " کیف نلینھا ونعظھما" ہم کس طرح ان کو نرم کرتے ہیں اور ان کو بڑا کرتے ہیں۔

(روح المعانی)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا کیسا پیارا ترجمہ ہے "کیونکر ہم انہیں اٹھان دیتے ہیں" راقم نے بھی اسی سے نقل کیا ہے۔

"ثم نکسوھا لحما": "پھر ہم انہیں پہناتے گوشت"

" ای نسترھا به کما نستر الجسد با للباس " یعنی تم دیکھو کہ ہم ہڈیوں کو کس طرح گوشت سے چھپاتے ہیں جس طرح لباس سے جسم کو چھپایا جاتا ہے۔

(روح المعانی)

"فلما تبین له": "تو جب خوب ظاہر ہوا اس پر۔"

راقم نے ترجمہ میں خوب کا لفظ بڑھایا ہے، روح المعانی کے ان الفاظ کو دیکھ کر "اتضح اتضاحا تاماله مادل علیه الامر من کیفیة الاحیاء بمادیه" ہڈیوں کو جڑتے ہوئے زمین سے اٹھ کر ایک دوسرے پر اٹھان سے ہی آپ پر کامل طور پر واضح ہوگیا۔ "یعنی خوب ظاہر ہوگیا" کہ اب اسنے زندہ ہونا ہی ہے پھر آپ کی آنکھوں کے سامنے زندہ کیا جانا مزید اس پر دلیل ہے کہ آپ پر معاملہ "بہت خوب ظاہر ہوگیا"۔

"قال اعلم ان اللّٰہ علی کل شئ قدیر":

"کہا میں خوب جانتا ہوں بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

علامہ آلوسی رحمہ اللہ "قال اعلم" کی تفسیر میں بیان فرماتے ہیں' ومن جملته ما شوهد" آپ کو مشاہدہ کرادیا گیا یعنی پہلے فقط علم تھا اب مشاہدہ حاصل ہوگیا۔ (روح المعانی)

تفسیر صاوی میں ذکر کیا گیا ہے کہ آپ کو علم یقین سے عین الیقین حاصل ہوگیا، یعنی اس کا مطلب کوئی غلط نہ سمجھ بیٹھے کہ آپ کو پہلے یہ علم حاصل نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ معاذ اللہ اللہ تعالیٰ کے نبی کے متعلق یہ گمان کرنا ممکن نہیں جبکہ ہر مومن یہ جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے مطلب یہی ہے کہ پہلے علم الیقین تھا، مشاہدہ کے بعد اس میں ترقی ہوگئی اور عین الیقین کا درجہ حاصل ہوگیا۔

حضرت عزیز علیہ السلام کا واقعہ:

بخت نصر نے جب بیت المقدس کو خراب کردیا۔ تو بابل میں بنی اسرائیل کے قیدیوں کو لایا گیا جن میں حضرت عزیر علیہ السلام اور حضرت دانیال علیہ السلام بھی تھے اور حضرت داود علیہ السلام کی اولاد سے بھی ایک جماعت قید ہوکر آئی۔ جب حضرت عزیر علیہ السلام نے نجات پائی تو آپ دجلہ کے کنارے ہرقل کے عبادت خانہ میں آئے بستی کو دیکھا جو تباہ و برباد ہوچکی تھی کوئی شخص نظر نہیں آرہا تھا آپ نے درختوں کے پھل کھائے اور انگور کا نچوڑ پیا، پھر آپ نے کچھ پھل

اپنی ٹوکری میں ڈال لئے اور انگور کا نچوڑ چھوٹے مشکیزہ میں ڈال لیا۔ اس وقت بستی کو تباہ شدہ دیکھ کر رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا" انی یحی ھذہ اللہ بعد مو تھا " کیسے زندہ کرے گا اللہ ان کو موت کے بعد۔ (مظھری)

آپ کو ایک سو سال کے بعد وفات کرنے کے بعد جب اللہ تعالیٰ زندہ کیا اور آپ کے سامنے آپ کے گدھے کو بھی زندہ کیا تو آپ اسی گدھے پر سوار ہو کر اپنے شہر اور محلہ میں آئے لوگ آپ کو نہیں پہچانتے تھے اور آپ لوگوں کو نہیں پہچان رہے تھے، نہ ہی آپ کو اپنے گھر کا یقین آرہا تھا، سو سال میں مکانوں کے نقشے بدل چکے تھے، آپ اپنے گمان کے مطابق اپنے گھر میں گئے، وہاں ایک بوڑھی نابینا عورت تھی جو چل پھر نہیں سکتی تھی جس کی عمر ایک سو بیس سال تھی یہ آپ کی لونڈی تھی جب حضرت عزیر علیہ السلام اپنے گھر سے گئے تھے اس وقت لونڈی کی عمر بیس سال تھی، آپ نے اس سے پوچھا کیا یہی گھر عزیر کا ہے؟ اس عورت نے کہا ہاں، یہ کہتے ہی وہ رونے لگ گئی اور کہنے لگی میں نے اتنے عرصہ سے کسی سے نہیں سنا کہ اس نے عزیر کا ذکر کیا ہو، لوگ اسے بھول چکے ہیں عزیر ہم سے گم ہو گئے، ان ان کا کوئی پتہ نہیں اور نہ ہی ہم نے ان کا ذکر سنا۔ آپ نے فرمایا بیشک میں عزیر ہی ہوں اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک سو سال تک وفات کی حالت میں رکھا، پھر مجھے زندہ کر دیا۔

اس عورت نے کہا بیشک حضرت عزیر تو مستجاب الدعوات تھے، ان کی دعاؤں کو اللہ تعالیٰ قبول فرماتا تھا، وہ کسی مریض کے لئے دعا کرتے تو اللہ تعالیٰ اسے شفاء عطاء فرماتا اور اگر کسی مصیبت زدہ کے لئے دعاء فرماتے تو اللہ تعالیٰ اس کی مصیبت دور فرماتا، اگر تم واقعی عزیز ہو تو میرے لئے دعاء فرماؤ اللہ تعالیٰ میری نظر لوٹا دے تو تاکہ میں دیکھ کر تمہیں پہچان سکوں آپ نے اپنے رب تعالیٰ سے دعاء کی اور جب یقین ہو گیا کہ یہ میری لونڈی ہے تو آپ نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا تو اس کی نظر صحیح ہو گئی، اور حضرت عزیر نے اس کے ہاتھ کو پکڑ کر کہا "قوی باذن اللہ" اللہ تعالیٰ کے حکم سے کھڑی ہو جاؤ، تو اللہ تعالیٰ نے اسے چلنے کی توفیق عطاء فرما دی، وہ اس طرح صحیح وسلامت اور چست ہو کر، پھرتیلی ہو کر چلنے لگی جس طرح جانور کی رسی کو کھولا جائے تو اس کی حالت ہوتی ہے۔

جب اس عورت نے آپ کو دیکھا تو کہنے لگی " اشھد انک عزیر " میں گواہی دیتی ہوں بیشک آپ عزیر ہیں۔ یہ عورت آپ کو ساتھ لے کر بنی اسرائیل کے محلہ میں گئی جہاں ان کے مکانات اور محافل ومجالس قائم ہوتیں،

وہاں آپ کا ایک بیٹا تھا جو ایک سو اٹھارہ سال کا بوڑھا تھا اور آپ کے پوتے بھی بوڑھے تھے، لیکن آپ چالیس سال کے تھے کیونکہ آپ پر جب موت کو مسلط کیا گیا تھا آپ کی عمر چالیس سال تھی، اور جب آپ کو زندہ کیا گیا تو اس وقت بھی آپ کی عمر چالیس سال تھی۔

اس عورت نے لوگوں کو بتایا یہ عزیر ہیں پہلے تو ان لوگوں نے اس کی بات کو نہ مانا لیکن جب اس نے بتایا کہ میں تمہاری لونڈی ہوں میرا نام یہ ہے، مجھے ان کی دعاء سے ہی نظر واپس مل گئی اور مجھے چلنے پھرنے کی طاقت حاصل ہوگئی جبکہ اس سے پہلے میں چلنے پھرنے سے عاجز ہو چکی تھی۔

اس عورت کی بات کو سن کر بنی اسرائیل اٹھے، حضرت عزیر کو دیکھنے لگے، آپ کے بیٹے نے کہا میرے باپ کے کندھوں کے درمیان سیاہ بال ھلال (ابتدائی دو تین تاریخوں کے چاند) کی طرح تھے، جب آپ کے کندھوں کو دیکھا گیا تو ان کے درمیان سیاہ بالوں کا چاند نظر آ گیا، کافی حد تک لوگوں کو اطمینان حاصل ہو گیا کہ یہ عزیر ہیں، مزید یقین حاصل کرنے کے لئے وہ کہنے لگے کہ ہم میں توراۃ صرف عزیر علیہ السلام کو یاد تھی۔ بخت نصر (کافر بادشاہ) نے توراۃ کو جلا دیا ہے، اس لئے اب ہمارے پاس توراۃ نہیں اگر تم واقعی عزیر ہو تو توراۃ سنا دو اور لکھا دو، آپ نے توراۃ لکھا دی۔

بخت نصر کے زمانہ میں توراۃ کا ایک نسخہ آپ کے باپ نے دفن کر دیا تھا جس کی جگہ کو بھی صرف آپ ہی جانتے تھے توراۃ لکھانے کے بعد اس جگہ کی آپ نے نشاندہی کی، وہاں سے توراۃ کا نسخہ نکال لیا گیا۔ آپ کے لکھائے ہوئے توراۃ کے نسخہ اور پہلے کے مدفون تواراۃ کے نسخہ کو نکالنے کے بعد ان دونوں نسخوں کو حرف بحرف پڑھا گیا۔

"فما اختلفا فی حرف واحد" ان دونوں نسخوں کے درمیان ایک حرف کا بھی اختلاف نظر نہ آیا۔

(ماخوذ از روح المعانی و درمنشور)

تنبیہ: دفن شدہ توراۃ کے نسخہ کے متعلق ایک روایت یہ ہے کہ جو لوگ بخت نصر کے قیدی ہوئے تھے ان میں سے ایک نے کہا میرے باپ نے مجھے بتایا تھا کہ میرے دادا نے توراۃ کا ایک نسخہ ایک مٹکے میں بند کر کے اپنے انگور کے باغ میں دفن کر دیا تھا اگر تم مجھے میرے دادا کے انگوروں کے باغ کی نشاندہی کر و تو وہاں سے وہ نسخہ نکالا جا سکتا ہے لوگوں نے اسے بتایا تو جگہ کھود کر وہ نسخہ نکالا گیا، اس سے جب عزیر علیہ السلام کے لکھوائے ہوئے نسخہ

سے موازنہ کیا گیا تو حرف بحرف برابر پایا۔ (تفسیر ابی السعود)

تنبیہ: کئی صدیوں سے جن باطل فرقوں کا مفسرین کرام، شارحین احادیث، علماء ربانیین نے کامل طور پر رد فرمایا آج ان ہی باطل فرقوں کا پھر سے پرچار ہونے لگا، اس لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ اس آیۃ کریمہ کی تفسیر میں بھی جو باطل قول بیان ہوا اسے ذکر کر کے اس کا تفاسیر کی رو سے رد کیا جائے۔

وہ باطل قول یہ ہے کہ اس آیۃ کریمہ میں جس شخص کا ذکر ہے وہ کافر تھا، قیامت کے متعلق اسے شک تھا تو یہ سوال اس کا تھا کہ اس بستی والوں کو کیسے اللہ زندہ کرے گا جو مر کر تباہ ہو چکے ہیں۔ اس قول کا رد علامہ رازی رحمہ اللہ یوں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا: "ولنجعلک آیة للناس" ہم نے آپ کو لوگوں کیلئے نشانی بنایا۔

"ان المراد منه التشریف والتعظیم والوعد بالدرجة العالیة فی الدین والدنیا، وذلک لا یلیق بمن مات علی الکفر والشک فی قدرة اللہ تعالی"

اس سے مراد بزرگی بیان کرنا، اور عظمت کا ذکر کرنا، اور دین ودنیا میں درجات بلند کرنے کا وعدہ کرنا، یہ لائق نہیں اس کے جو کفر پر مر جائے اور اللہ کی قدرت میں شک کرے۔ (کبیر)

اس سے واضح ہوا کہ یہ قول ہی سرے سے باطل ہے کہ اس آیت کریمہ میں کافر کا ذکر ہے۔

☆☆☆☆☆

وَاِذْقَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ
قَالَ بَلٰی وَلٰكِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ
فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ
یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ☆ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۶۰)

﴿۱﴾

اور جب عرض کی ابراہیم نے اے رب میرے مجھے دکھادے تو کیونکر مردے جلائے گا، فرمایا کیا تجھے یقین نہیں عرض کی یقین کیوں نہیں مگر یہ چاہتا ہوں کہ میرے دل کو قرار آجائے فرمایا تو اچھا چار پرندے لے کر اپنے ساتھ ہلالے پھر ان کا ایک ایک ٹکڑا ہر پہاڑ پر رکھ دے پھر انہیں بلا وہ تیرے پاس چلتے آئیں گے پاؤں سے دوڑتے اور جان رکھ کہ اللہ غالب حکمت والا ہے۔

﴿۲﴾

اور یاد کرو جب کہا ابراہیم نے اے میرے رب دکھا مجھے، کیسے زندہ کرتا ہے تو مردوں کو، کہا کیا تمہیں یقین نہیں۔ کہا کیوں نہیں، اور لیکن مطمئن ہوجائے میرا دل کہا تو پکڑ چار پرندے، تو مائل کرلے ان کو اپنی طرف، پھر کر پہاڑ پر ان سے ایک ایک ٹکڑا، پھر بلا ان کو، وہ آئیں گے تیرے پاس تیزی سے، اور جان رکھ بیشک اللہ غالب ہے (اور) حکمت والا ہے۔

مختصر مطلب:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دریا کے کنارے ایک مردہ شخص کو دیکھا جو حبشی دکھائی دے رہا تھا، دریائی

جانور آتے ہیں اس مردہ کا گوشت کھاتے ہیں پھر درندے آتے ہیں وہ گوشت کھاتے ہیں پھر پرندے آتے ہیں وہ اس کا گوشت نوچتے ہیں تو ابراہیم علیہ السلام نے جب یہ ماجرا دیکھا تو رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا اے میرے رب اس مردہ شخص کو مختلف دریائی جانوروں اور درندوں اور پرندوں نے کھا لیا ہے پھر وہ جانور، درندے اور پرندے مر جائیں گے جن کی ہڈیاں بکھر جائیں گی تو تو ان کو کیسے زندہ کرے گا، رب تعالیٰ نے فرمایا کیا آپ کو یقین نہیں آپ نے عرض کیا اے اللہ یقین تو ہے، میں چاہتا ہوں کہ مردوں کو ظاہر طور پر زندہ ہوتے ہوئے دیکھ لوں تاکہ دل کو اطمینان حاصل ہو جائے، تو رب تعالیٰ نے فرمایا کہ تم چار پرندے پکڑ لو، ان کو اپنے ساتھ ہلا ملا لو، تاکہ تم ان کو پہچان سکو کہ یہ وہی پرندے ہیں پھر ان کو ذبح کر کے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے مختلف پہاڑوں پر ان ٹکڑوں کو رکھ دو، پھر ان پرندوں کو بلاؤ وہ تمہارے پاس تیزی سے آ جائیں گے، اور تم اپنے اس علم پر قائم رہو، جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ غالب ہے کوئی چیز اسے عاجز نہیں کر سکتی اور وہ حکمت والا ہے، اس کا ہر کام حکمت پر مبنی ہے۔ (ماخوذ از در منثور)

ماقبل سے تعلق:

پہلی آیۃ کریمہ میں بھی اللہ کے نبی کے سوال پر ظاہر طور پر مردہ کو زندہ کر کے دکھایا گیا اور قیامت پر دلیل قائم کی گئی کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں بھی اسی طرح مردوں کو زندہ فرمائے گا۔ اس آیۃ کریمہ میں بھی اللہ کے نبی کے سوال پر مردوں کو زندہ کر کے قیامت پر دلیل قائم کی گئی۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

اعتراض: جب دونوں آیتوں کا مقصد بیان ایک ہی ہے کہ رب تعالیٰ نے اپنے دونوں نبیوں کے مطالبہ پر مردے زندہ فرمائے اور مردوں کو زندہ کر کے قیامت پر دلیل بنایا گیا ہے تو کیا وجہ ہے کہ عزیر علیہ السلام کا نام ذکر نہیں فرمایا صرف یہ فرمایا۔

"او کالذی مر علی قریۃ وھی خاویۃ علی عروشھا"

یا مثل اس شخص کے جو گزرا ایک بستی پر جو گری ہوئی تھی چھتوں پر۔

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام ذکر فرمایا اور ارشاد فرمایا "واذ قال ابراھیم" (یاد کر اس وقت

کو جب ابراہیم نے کہا) تو وجہ فرق کیا ہے۔

جواب: جیسا کہ اسی پارہ کی پہلی آیہ کریمہ میں گذر چکا ہے کہ انبیاء کرام میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی گئی، اس کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیل بنایا، اور بلند درجہ عطاء فرمایا، جو مقام حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطاء کیا گیا وہ حضرت عزیز علیہ السلام کو عطاء نہیں کیا گیا۔

اسی وجہ سے دونوں حضرات کے کلام میں فرق تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا۔" رب ارنی کیف تحی الموتی" اے میرے رب مجھے دکھا تو کیسے زندہ کرتا ہے مردوں کو۔

ابراہیم علیہ السلام نے پہلے "رب" کہہ کر اللہ تعالیٰ کی تعریف کی اے میرے رب (یہ اصل میں یا ربی ہے) پھر اپنے عجز کا اظہار کیا اور عرض کیا" ارنی " (مجھے دکھا) یعنی اے اللہ میں جانتا ہوں کہ تو مردے زندہ کر لیتا ہے تیری قدرت سے کوئی بعید نہیں، لیکن میں نے مردہ زندہ ہوتے ہوئے نہیں دیکھا، اس لئے چاہتا ہوں تو میرے سامنے مردے زندہ کر دے تا کہ میں دیکھ لوں۔ آپ کے اس کلام میں وہ ادب پایا گیا جو حضرت عزیر علیہ السلام کے کلام میں نہیں کیونکہ انہوں نے تباہ شدہ بستی کو دیکھ کر کہا۔ " انی یحی ھذہ اللہ بعد مو تھا" کیسے زندہ کرے گا اللہ اسے بعد موت کے۔ یہی وجہ تھی کہ عزیر علیہ السلام پر ایک سو سال تک موت کو مسلط رکھا پھر آپ کو زندہ کیا تا کہ آپ اپنی موت وحیات سے بھی میری قدرت کا اندازہ لگا لیں پھر آپ کے سامنے گدھے کو زندہ کر کے آپ کو دکھا بھی دیا، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام پر موت کو مسلط نہیں کیا صرف پرندے آپ کے سامنے زندہ کر کے دکھا دئے۔ (از کبیر وشیخ زادہ)

"واذ قال ابراھیم رب ارنی کیف تحی الموتی":

" اور یاد کرو جب کہا ابراہیم علیہ السلام نے اے میرے رب دکھا مجھے کیسے زندہ کرتا ہے تو مردوں کو۔"

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

"واذ قال الخ" یا تو مفعول فیہ ہے" اولم تؤ من" کا یا عبارت مقدر کا مفعول فیہ ہے، اصل عبارت ہے

"قال له ربه ذلک وقت قول ابراهیم ذلک"

اور یا مفعول فیہ ہے " اذکر "مقدر کا۔ (راقم کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے) (شیخ زادہ)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سوال کرنے کی وجوہ:

﴿۱﴾ ایک وجہ تو وہی ہے جس کا ذکر مختصر مطلب میں ہو چکا ہے کہ آپ نے دیکھا ایک مردہ کو دریائی جانور اور درندے اور پرندے کھا رہے ہیں، تو آپ نے بطور تعجب رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا کہ رب کائنات کتنی ہی تیری عظیم قدرت ہوگی کہ تو ان کو زندہ کرے گا، مجھے بھی دکھا دے کہ میں مردے زندہ ہوتے دیکھ لوں۔

﴿۲﴾ دوسری وجہ یہ تھی کہ جب آپ کا نمرود سے مناظرہ ہوا تو آپ نے جب یہ فرمایا" رب الذی یحی ویمیت" (میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے) تو اس پر نمرود نے کہا کیا تم نے مردے زندہ ہوتے ہوئے دیکھے؟ اس وقت تو آپ بات کو ٹال گئے، کیونکہ آپ نے اس سے پہلے تو مردے زندہ ہوتے ہوئے نہیں دیکھے تھے، لیکن رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا اے میرے رب مجھے دکھا دے تو مردے کیسے زندہ کرتا ہے کہ میں آنکھوں سے ایک مرتبہ دیکھ لوں اس کے بعد اگر کوئی مجھ سے سوال کرے" کیا تم نے مردے زندہ ہوتے ہوئے دیکھے" ؟ تو میں اُسے جواب دے سکوں کہ ہاں میں نے مردے زندہ ہوتے ہوئے دیکھے۔

﴿۳﴾ تیسری وجہ یہ ہے کہ حضرت ابن عباس اور حضرت جبیر اور حضرت سدی رحمہ اللہ کی روایات میں یہ بھی ذکر ہے۔"ان اللہ تعالی اوحی الیه انی متخذ بشرا خلیلا" کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ میں ایک بشر کو خلیل بنانے والا ہوں، تو آپ نے اسے عظیم سمجھتے ہوئے تعجب کیا کہ وہ کتنا عظیم انسان ہوگا جسے اللہ تعالیٰ اپنا خلیل بنائے گا۔

"وقال الهی ما علامة ذلک؟ فقال علامته انه یحی المیت بد عائه"

عرض کی اس بشر کی علامت کیا ہے جسے تو اپنا خلیل بنائے گا؟ رب تعالیٰ نے فرمایا اس کی علامت یہ ہے کہ اس کی دعاء سے میں مردے زندہ کروں گا۔

"فلما عظم مقام ابراهیم علیه السلام فی درجات العبودیة واداء الرسالة خطر بباله

انی لعلی ان اکون ذلک الخلیل فسأل احیاء المیت فقال اللہ تعالی (اولم تو من قال بلی ولکن لیطمئن قلبی) علی انی خلیل لک"

جب ابراہیم علیہ السلام درجہ عبودیت اور ادء رسالت کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہوئے تو آپ کے دل میں یہ خیال کھٹکا کہ ہوسکتا ہے کہ وہ خلیل میں ہی ہوں، جب خلیل کی دعاء سے مردے زندہ ہونے ہیں تو میں ہی دعاء کر کے دیکھ لوں، تو رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا اے میرے رب مجھے دکھا تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے رب تعالیٰ نے فرمایا کیا تمہیں یقین نہیں، عرض کیا یقین تو ہے لیکن چاہتا یہ ہوں کہ میرے دل کو اطمینان حاصل ہو جائے کہ بیشک میں ہی خلیل ہوں۔

﴿۴﴾ چوتھی وجہ یہ ہے کہ آپ کا یہ سوال اپنی قوم کے لئے تھا اس لئے کہ انبیاء کرام سے ان کی امتوں نے مختلف سوال کئے کوئی حق پر مبنی ہوتے اور کئی باطل ہوتے، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے آپ سے باطل مطالبہ یہ کیا" اجعل لنا الها كما لهم آلهة" ہمارے لئے معبود بنا دو جیسا کہ ان لوگوں (گائے کی پوجا کرنے والوں) کا معبود ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سوال کرنے کا مقصد یہ تھا کہ جب مردے ظاہر طور پر زندہ کر دیئے جائیں گے تو میری قوم کے لوگ یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بوسیدہ ہڈیوں کو کیسے زندہ کرے گا؟

﴿۵﴾ ابراہیم علیہ السلام نے نازل ہونے والے صحیفوں میں شائد دیکھ کر یقین کر لیا تھا کہ میری اولاد میں عیسیٰ علیہ السلام کی دعاء سے مردہ کو زندہ کیا جائے گا، تو آپ نے بھی رب تعالیٰ سے دعاء کی کہ اے اللہ تو مجھے دکھا کہ تو کس طرح مردے زندہ کرتا ہے تو رب تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہیں یقین نہیں، عرض کیا یقین تو ہے لیکن یہ چاہتا ہوں کہ میرے دل کو اطمینان حاصل ہو جائے" انی لست اقل منزلة فی حضرتک من ولدی عیسیٰ" بیشک میں تیرے حضور اپنے ولد عیسیٰ علیہ السلام سے درجہ میں کم نہیں ہوں۔

﴿۶﴾ ابراہیم علیہ السلام کو رب تعالیٰ نے حکم دیا کہ آپ اپنے بیٹے کو ذبح کرو تو آپ نے حکم ماننے میں جلدی کی اب آپ نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا کہ اے میرے رب تو نے مجھے حکم دیا کہ میں روح والے کو بے روح کر دوں تو میں نے تیرے حکم پر سر جھکا دیا، اب میں تیرے حضور عرض کرتا ہوں کہ میں مردے زندہ

ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں، اس لئے تو بغیر روح والوں کو روح والا بنا دے۔ (ماخوذ از تفسیر کبیر)

تنبیہ: علامہ رازی رحمہ اللہ نے اس مقام میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سوال کرنے کی سترہ وجوہ بیان کی ہیں۔لیکن علامہ نووی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ معتبر صرف چار وجوہ ہیں، باقی تمام غیر معتبر ہیں۔

سوال کرنے کی چار معتبر وجوہ:

پہلی وجہ: آپ کو علم استدلالی حاصل تھا اب آپ مردوں کو زندہ کرنے کی کیفیت کا مشاہدہ کرنا چاہتے تھے تا کہ علم ضروری بدیہی بھی حاصل ہو جائے، اس لئے کہ امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ علم استدلالی میں کبھی شکوک واقعہ ہوتے ہیں لیکن علم ضروری شکوک سے پاک ہوتا ہے جو علم مشاہدہ سے عیاناً حاصل ہو وہ ضروری ہوتا ہے۔خیال رہے کہ خود نبی کیلئے علم استدلالی یا ضروری میں فرق نہیں ہوتا کیونکہ نبی کا علم شک سے پاک ہوتا ہے، البتہ سوال کرنے کی وجہ یہ تھی کہ کسی کو بھی یہ کہنے کا حق حاصل نہ ہو کہ تم نے مردوں کو زندہ ہوتے دیکھا نہیں تمہارے علم پر کیسے یقین کیا جائے۔

دوسری وجہ: آپ یہ جاننا چاہتے تھے کہ میرا مرتبہ اللہ کے نزدیک کیا ہے اور میری دعاء کی قبولیت کا کیا مقام ہے، اس صورت میں "اولم تومن" کا مطلب یہ ہوگا کیا تمہیں یقین نہیں تمہارا مرتبہ میرے نزدیک عظیم ہے، تم میرے پسندیدہ اور تم میرے خلیل ہو۔

تیسری وجہ: آپ کو پہلے بھی شک نہیں تھا آپ نے سوال اس لئے کیا تا کہ علم الیقین سے عین الیقین کی طرف ترقی ہو جائے کیونکہ ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے اس لئے کہ عین الیقین مشاہدہ کے بعد حاصل ہوتا ہے۔لیکن علم الیقین میں مشاہدہ ضروری نہیں۔

چوتھی وجہ: جب آپ نے مشرکین پر یہ دلیل قائم فرمائی" ربی الذی یحی ویمیت" (میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے) پھر آپ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا اے اللہ تو مجھے دکھا کس طرح مردے زندہ کرتا ہے؟ یعنی ان کو میرے سامنے زندہ کرتا کہ میں دیکھوں اور میری دلیل کافروں پر ظاہر ہو جائے۔ (نووی علی المسلم، ج ا، کتاب الایمان، باب زیادة طمانیة القلب)

اعتراض: حدیث شریف میں تو آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہم ابراہیم علیہ السلام سے شک کرنے میں زیادہ حق رکھتے ہیں، اس سے تو پتہ چلتا ہے کہ آپ نے مردوں کو زندہ کا سوال شک کی وجہ سے کیا تھا یعنی آپ کو یقین نہیں تھا۔

جواب: حدیث پاک کے ترجمہ سمجھنے میں لوگ غلطی کرتے ہیں، حدیث پاک کا یہ مطلب نہیں جو معترضین پیش کرتے ہیں، حدیث پاک کے ترجمہ اور وضاحت کی طرف توجہ کریں خود بخود واضح ہو جائے گا۔

☆ "عن ابی هریرة ان رسول الله ﷺ قال نحن احق بالشک من ابراهیم اذقال رب ارنی کیف تحی الموتی قال اولم تؤ من قال بلی ولکن لیطمئن قلبی"

(مسلم، ج ۱، کتاب الایمان باب زیادة طمانینة القلب)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے بے شک نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر ابراہیم علیہ السلام نے شک کیا ہوتا تو ہم بنسبت ابراہیم علیہ السلام کے شک کرنے کا زیادہ حق رکھتے، جب عرض کی ابراہیم علیہ السلام نے اے میرے رب مجھے دکھادے تو مردے کس طرح زندہ فرمائے گا؟ فرمایا کیا تجھے یقین نہیں۔ عرض کی کیوں نہیں مگر یہ چاہتا ہوں کہ میرے دل کو قرار آجائے۔

اس حدیث پاک کا یہ مطلب نہیں کہ (معاذ اللہ) نبی کریم ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے مردوں کو زندہ کرنے میں شک کیا تھا اور ہمیں ان کی نسبت زیادہ شک ہے، بلکہ اس حدیث پاک کا جو ترجمہ پیش کیا ہے اسی سے مطلب واضح ہو رہا ہے تاہم زیادتی وضاحت کے لئے علامہ نووی رحمہ اللہ نے اس حدیث پاک کی شرح بیان کی ہے اس سے ایک قول بیان کیا جا رہا ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد "نحن اشک من ابراهیم" کے معنی بیان کرنے میں علماء کے بہت اقوال ہیں لیکن سب سے حسین اور صحیح قول وہ ہے جو امام ابو ابراہیم مزنی اور علماء کی کئی جماعتوں نے بیان فرمایا ہے، وہ یہ ہے۔

"معناه ان الشک مستحیل فی حق ابراهیم فان الشک فی احیاء الموتی لو کان

متطرقا الی الانبیاء لکنت انا احق به عن ابراهیم و قد علمتم انی لم اشک فاعلموا ان ابراهیم لم یشک"

اس حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا شک کرنا محال ہے اگر اللہ تعالیٰ کے مردوں کو زندہ کرنے میں انبیاء کرام علیہم السلام سے شک واقع ہوسکتا تو بنسبت ابراہیم علیہ السلام کے شک کرنے میں زیادہ حق رکھتا، اور تحقیق تمہیں یقیناً معلوم ہے کہ مجھے مردوں کو زندہ کرنے میں کوئی شک نہیں، تو تمہیں یقیناً اس امر کا بھی علم ہونا چاہئے کہ بیشک ابراہیم علیہ السلام کو اس میں کوئی شک نہیں تھا۔ (از نووی)

خیال رہے کہ اس حدیث پاک میں نبی کریم ﷺ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فضیلت بیان کی ہے اور عجز وانکساری سے اپنے آپ کو ان سے کم مرتبہ بیان کیا ورنہ دوسرے مقام پر حقیقت بیان کرتے ہوئے تمام کائنات پر اپنی فضیلت بیان کی ہے جس کا ذکر اسی پارہ کے شروع میں ہو چکا ہے۔

"قال فخذ اربعة من الطیر": "کہا تو پکڑ چار پرندے۔"

یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ آپ کی دعاء کو قبول کیا جا رہا ہے اس لئے تم چار پرندے پکڑو، ان کو تمہارے سامنے زندہ کیا جاتا ہے۔

چار پرندے کون سے تھے؟

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے مطابق وہ چار پرندے یہ تھے۔ مور، گدھ، کوا، اور مرغ۔

اور حضرت مجاہد بن جبیر کی روایت کے مطابق گدھ کی جگہ کبوتر تھا۔ (کبیر)

تمام جانداروں سے پرندوں کا انتخاب کیوں؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو چار پرندے مانوس کرنے کا حکم دیا اور حیوانوں کا حکم نہیں دیا اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کی دو وجہ ہیں ایک یہ کہ پرندوں کو اللہ تعالیٰ نے فضاء میں اڑنے اور ہوا میں بلند ہونے کی طاقت عطاء فرمائی ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی علو مرتبت یعنی مراتب کی بلندی اور ملکوت تک پہنچنے کی ہمت عطاء فرمائی ہے اس لئے پرندوں کو ذبح کرنے اور گوشت کو ملا جلا کر رکھنے کا حکم دیا تا کہ آپ کا معجزہ آپ کے مراتب کے مشابہ ہو جائے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب پرندوں کو ذبح کر دیا اور ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور ملا جلا کر پہاڑی کی چوٹی پر رکھ دیا پھر ان کو بلایا تو تمام ٹکڑے ملے جلے گوشت سے جدا ہو کر اپنے اپنے ٹکڑوں سے مل گئے، قیامت کے دن بھی اسی طرح تمام بکھرے ہوئے ذرات جمع ہو جائیں گے اور ان سے جسم معرض وجود میں آئیں گے ان کی روحیں ان سے مل جائیں گی اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی اس کی تائید کر رہا ہے۔

"خشعا ابصارهم يخرجون من الاجداث كانهم جراد منتشر" (پ ۲۷، سورۃ القمر ۷)

نیچی آنکھیں کئے ہوئے قبروں سے نکلیں گے گویا وہ ٹڈی ہے پھیلی ہوئی۔ (تفسیر کبیر)

چار کا حکم دینے کی وجہ:

ابراہیم علیہ السلام نے صرف مردہ کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھنے کی درخواست کی لیکن مالک الملک نے کہا اے میرے خلیل تم نے تو اپنی عبودیت کے پیش نظر ایک مردہ کو زندہ ہوتے دیکھنا چاہا لیکن میں اپنی ربوبیت کی وجہ سے تمہیں چار مردے زندہ کر کے دکھاتا ہوں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ حیوانات وغیرہ عناصر اربعہ یعنی آگ، مٹی، پانی اور ہوا سے مرکب ہیں، اس لئے چار کو ذبح کرنے کا حکم دیا کہ میں جس طرح ان چار کو زندہ کر رہا ہوں ایسے ہی تمام عناصر اربعہ کے مرکبات کو زندہ کروں گا۔ (کبیر)

سب پرندوں میں سے چار کو خاص کرنے کی وجہ:

تمام پرندوں میں سے مور، گدھ، مرغ اور کوے کو منتخب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو زینت اور مرتبہ سے محبت ہے انسان بلند مراتب کرنے کی کوشش میں رہتا ہے اور یہ اوصاف مور میں بھی پائے جاتے ہیں۔

انسان کی زینت سے محبت کو رب تعالیٰ نے بیان فرمایا "زین للناس حب الشهوات" (پ ۳ سورۃ آل عمران ۱۴)

خواہشات کی محبت کولوگوں کے لئے مزین کردیا گیا۔

انسان جس طرح زیادہ کھانے سے شغف رکھتا ہے اسی طرح گدھ کو بھی کھانے سے ہی زیادہ کام ہوتا ہے۔

اسی طرح انسان کو فرج کی خواہشات پوری کرنے سے جس طرح کام ہوتا ہے اس طرح مرغ میں بھی یہ وصف پایا جاتا ہے۔

انسان مال طلب کرنے اور جمع کرنے کا زیادہ حریص ہوتا ہے اسی طرح کوا بھی مال طلب کرنے اور مال جمع کرنے کا حریص ہوتا ہے کیونکہ سوائے کوے کے رات کواڑنے والا کوئی پرندہ نہیں ہے اور سخت سردی میں دن کو صرف کو ہی نکلتا ہے۔

ان چار کو منتخب کرنے میں اس حکمت کی طرف اشارہ ہے کہ انسان جب تک خواہشات نفسانیہ اور خواہشات فرج اور مال کی حرص اور زیب وزینت کو ختم نہیں کرے گا اس وقت تک اس کے دل پر روحانیت کا اثر نہیں ہوگا، اور نہ ہی اسے اللہ تعالیٰ کے جلال کے نور سے راحت حاصل ہوگی اور جہاں گدھ کی جگہ کبوتر کا ذکر ہے اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اے انسان کبوتر کا یہ وصف ہے کہ وہ اپنے گھونسلے میں اور اپنی جگہ زیادہ رہتا ہے۔ اسی اپنی جگہ کبوتری انڈے دیتی ہے اور بچے نکالتی ہے ہاں ضرورت کے مطابق روزی کے لئے بھی اس کی اڑان پائی جاتی ہے تو تو بھی اے انسان اس طبعی جہان سے محبت رکھ، رب تعالیٰ کی یاد میں اللہ تعالیٰ کے گھروں یعنی مساجد میں ہی زیادہ وقت گذار، ضرورت کے مطابق روزی کی طلب میں کسب بھی کر، بلندی کی طرف کم اڑان کر تو تجھے کامیابی حاصل ہوگی، رب تعالیٰ کے حضور تیرا مقرب ہونا ہی تجھے کامیاب کرے گا۔ (از کبیر و شیخ زادہ)

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

"طیر" مصدر بھی ہے جسے کہا جاتا ہے "طار یطیر طیرا" اور اسم جنس بھی ہے اور طائر کی جمع بھی ہے جیسے صاحب کی جمع صحب، اور تاجر کی جمع تجر آتی ہے، اور اسم جمع بھی ہے جیسے رکب، اور سفر، اور مشدد لفظ سے مخفف بھی ہے یعنی طیّر (با تشدید) سے مخفف ہے، جیسا کہ ھیّن اور میّت مشدد سے مخفف کر کے "ھین اور میت" پڑھا جاتا ہے۔

(از شیخ زادہ)

فائدہ: انسان کوے کی طرح حریص نہ ہو، ضرورت کے مطابق روزی کی تلاش میں رہے اللہ تعالیٰ پر توکل کرے۔

☆ "قال رسول اللہ ﷺ لو توکلتم علی اللہ تعالیٰ حق توکلہ لرزقکم کما ترزق الطیر تغدو

خماصاوتروح بطانا"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم اللہ تعالیٰ پر کامل توکل کرلو تو اللہ تعالیٰ تمہیں رزق عطاء فرمائے گا جیسے وہ پرندوں کو رزق دیتا ہے، صبح وہ بھوکے نکلتے ہیں، شام کو سیر ہو کر لوٹتے ہیں۔ (از روح المعانی)

"فصرھن الیک": "تو مائل کرلو ان کو اپنی طرف۔"

ان الفاظ مبارکہ کا معنی علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے ان الفاظ سے بیان کیا۔

"فاملھن واضممھن الیک لتتاملھا" مائل کرلو ان کو اپنی طرف، ان کو مانوس کرلو، ان کو اپنے ساتھ ملا لو تاکہ تم ان میں تامل (سوچ) کرسکو اور ان کی علامات کو پہچان سکو، جب ہم ان کو زندہ کریں تو آپ کو پتہ چل جائے کہ ہاں یہ وہی پرندے ہیں، آپ کو اس میں کوئی اشتباہ نہ ہو۔ "صـــر" میں دو قراٴتیں ہیں، صاد کے ضمہ سے "صـــرا یصرو" اور صاد کے کسرہ سے بھی آیا ہوا ہے۔ صری یصری معنی دونوں صورتوں میں ایک ہی رہے گا کیونکہ اس میں دونوں قراٴتیں ہیں۔ (از بیضاوی)

"ثم اجعل علی کل جبل منھن جزءا":

"پھر کر ہر پہاڑ پر ان سے ایک ایک ٹکڑا۔"

یعنی ان پرندوں کو ذبح کر کے ان کا ایک ایک ٹکڑا ٹکڑا ہر پہاڑ پر رکھ دیں، وہ پہاڑ چار تھے یا سات تھے، جو آپ کے سامنے تھے۔

خیال رہے کہ بعض اہل علم نے بیان کیا ہے کہ چار پرندوں کے جمیع اجزاء ملا کر پہاڑوں پر رکھے گئے تھے، آپ نے جب اللہ کے اذن سے ان کو بلایا تو وہ زندہ ہو کر آپ کے پاس دوڑتے ہوئے آگئے، مانوس کرنے میں حکمت بھی یہی تھی کہ آپ نے ان کے آنے پر پہچان لیں کہ یہ وہی پرندے ہیں جو میں نے اپنے ساتھ ہلا ملا لئے تھے۔ اور بعض نے کہا کے آپ نے ان کے سروں کو اپنے پاس رکھ لیا تھا آپ کے بلانے پر ان کے تمام اجزاء اپنے اپنے اجزاء

سے مل کر اپنے اپنے سروں سے آ کر مل گئے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوئی صورت بھی بعید نہیں جو صورت بھی ہو قدرت کی عجیب نشانی کا ظہور ہے۔ (از کبیر)

"ثم ادعھن یاتینک سعیا": "پھر بلا، وہ ان کو آئیں گے تیرے پاس تیزی سے"۔

اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ نے گوشت کے ٹکڑوں کر پکارا (آپ نے تمام پرندوں کے ٹکڑوں کو ملا جل کر رکھا تھا) اے جدا جدا ہڈیو! اے متفرق گوشت کے ٹکڑو، اے کاٹی ہوئی رگو، ایک دوسرے سے مل جاؤ، تا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری روحوں کو تمہارے اندر لوٹا دے۔ یہ سن کر ہڈیاں اپنی دوسری ہڈیوں کی طرف چلیں یعنی ہر پرندے کی اپنی اپنی ہڈیاں ایک دوسری سے مل گئیں، پر دوسرے پرندوں سے جا ملے، گوشت کے ٹکڑے دوسرے گوشت کے ٹکڑوں سے ملنے لگے، یہاں تک کہ خون خون سے مل گیا۔

اس طرح آپ دیکھ رہے تھے کہ آپ کے سامنے مردوں کو زندہ کر کے آپ کو عین الیقن کا مرتبہ عطاء کر دیا گیا، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی کہ اے ابراہیم تم نے مجھ سے سوال کیا تھا کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے، بیشک میں نے زمین کو پیدا کیا ہے، اس میں چار قسم کی ہوائیں قائم کی ہیں۔

﴿۱﴾ شمالی جانب سے چلنے والی ہوا۔ ﴿۲﴾ جنوبی جانب سے چلنے والی ہوا۔

﴿۳﴾ بادصبا ﴿۴﴾ باددبور۔

یہاں تک کہ جب قیامت کا دن ہوگا تمام مردے اور مقتول صور پھونکنے پر جمع ہو جائیں گے، جیسے ان چار پرندوں کو تمہارے سامنے پہاڑوں سے جمع کر دیا گیا ہے، میرے سامنے تم تمام کا پیدا کرنا اور پھر موت کے بعد زندہ کرنا ایسے ہی ہے جس طرح کسی ایک شخص کو پیدا کرنا یا زندہ کرنا۔ (روح المعانی)

یعنی چار ہواؤں نے چار طرفوں سے گوشت وغیرہ کے ٹکڑے جمع کر دیئے۔

اعتراض: غیر ذوی العقول کو اور خاص کر کے گوشت کے ٹکڑوں کو بلانا عقل میں نہیں آتا۔

جواب: یہی تو اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ اسے صفت خلق وتکوین حاصل ہے، وہ "کن" سے اشیاء (چیزوں) کو

معرض وجود میں لاتا ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے ذبح شدہ پرندوں کے گوشت کے ٹکڑوں کو بلا رہے تھے تو وہی مالک الملک آپ کی آواز کو ان تک پہنچا رہا تھا۔ (از روح المعانی)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا تحقیقی ترجمہ:

راقم نے بیضاوی اور دوسری کئی تفاسیر کو دیکھ کر "سعیا" کا معنی "تیزی سے" لکھا ہے کیونکہ بیضاوی میں ہے۔

"(یاتینک سعیا) ساعیات مسرعات طیرانا اومشیا"

وہ آپ کے پاس تیزی سے اڑتے ہوئے آئیں گے۔ لیکن اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہے "وہ تیرے پاس چلتے آئیں گے پاؤں سے دوڑتے" (کنز الایمان)

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"اما قوله تعالى ثم ادعهن ياتينك سعيا" فقيل عدوا ومشيا على ارجلهن لأن ذلك ابلغ في الحجة وقيل طيرانا وليس يصح لانه لا يقال للطير اذا طار سعى"

اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی "ثم ادعهن ياتينك سعيا" یہ معنی مقصد کو بہت کامل طریقہ سے واضح کر رہا ہے۔ اور بعض حضرات نے بیان کیا ہے "پھر بلاؤ ان کو وہ تمہارے پاس تیز اڑان سے آئیں گے"۔ اس معنی کے متعلق علامہ رازی رحمہ اللہ نے فرمایا "یہ معنی صحیح نہیں" کیونکہ پرندے کی تیز اڑان کے لئے عرب حضرات لفظ "سعی" استعمال نہیں کرتے۔ (از کبیر)

علامہ رازی رحمہ اللہ کا مندرجہ بالا ارشاد جب دیکھتا ہوں تو بلا اختیار یہ لفظ منہ سے صادر ہوتے ہیں، واہ! اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ تو علم کا بحر بیکراں تھا، تحقیق و تدقیق کا موجزن سمندر تھا، کنز الایمان لکھنے میں یعنی قرآن پاک کا ترجمہ کرنے میں تو نے کتنی محنت کی، کتنی ہی تفاسیر کو مدنظر رکھا، تیری قبر پر اللہ تعالیٰ ہزار ہزار بلکہ کروڑوں بلکہ ان گنت رحمتیں نازل فرمائے، تیرا ترجمہ امت مصطفیٰ کریم ﷺ پر احسان عظیم ہے۔ (راقم)

فائدہ جلیلہ:

"وقد احتج اصحابنا بهذه الآية على ان البنية ليست شرطا في صحة الحياة وذلك لانه تعالى جعل كل واحد من تلك الاجزاء والأبعاض حيافاهما للنداء قادرا على السعي والعدو فدل ذلك على ان البنية ليست شرطا في صحة الحياة" (کبیر)

ہمارے اہل سنت احباب نے اسی آیۃ کریمہ سے یہ دلیل پکڑی ہے کہ زندگی حاصل ہونے کے لئے جسم کا مکمل ہونا ضروری نہیں بلکہ جسم کے اجزاء اور ذرات میں بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت سے زندگی آجاتی ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پرندوں کے گوشت کے ٹکڑوں کو بلانے کا حکم دیا جس سے واضح ہو رہا ہے کہ گوشت کے ٹکڑوں میں بھی رب تعالیٰ نے زندگی پیدا کر دی تھی، ان کو سمجھنے پر قادر کر دیا اور ان کو تیز دوڑنے اور چلنے کی طاقت عطاء کر دی، اسی لئے وہ دوڑتے ہوئے اپنے اپنے اجزاء سے مل گئے۔

لہٰذا اس آیۃ کریمہ سے واضح ہو گیا کہ زندگی کے لئے جسم کا مکمل ہونا ضروری نہیں اللہ تعالیٰ اجزاء کو بھی زندگی عطاء فرما دیتا ہے۔

"واعلم ان الله عزيز حكيم": "اور جان رکھ بیشک اللہ غالب ہے اور حکمت والا۔"

یعنی اگرچہ آپ کو علم تو پہلے ہی حاصل ہے لیکن آپ اس علم پر قائم رہیں، بیشک اللہ تعالیٰ تمام ممکنات پر غالب ہے اور تمام امور کے انجام کو وہ جانتا ہے، اور اشیاء کی انتہاء کو وہ جانتا ہے اس لئے اس کا ہر کام حکمت پر مبنی ہے۔

اعتراض: یہ کیسے کہا جاتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے عین الیقین حاصل کرنے کے لئے سوال کیا، حالانکہ انبیاء کرام کو حق الیقین حاصل ہوتا ہے جو علم الیقین اور عین الیقین سے اوپر درجہ رکھتا ہے، حق الیقین کے ہوتے ہوئے علم الیقین حاصل ہونے کی تمنا کا کیا مقصد ہے۔

جواب: یہاں صرف سوال اس کا نہیں کہ تیری ایجاد کو دیکھوں، بلکہ سوال یہ تھا کہ تیرے زندہ کرنے کی کیفیت کو دیکھوں تا کہ تیری ذات و صفات کا مشاہدہ کرلوں، گویا مردے زندہ کرنے کے سوال کے پیچھے رب تعالیٰ کی

ذات وصفات کو دیکھنے کا سوال ہے۔اگرچہ آپ کے سوال کو کیفیت کے دکھانےکی حد تک قبول کیا گیا ہے،
ذات کا مشاہدہ تو بغیر کیفیت کے بیان کے صرف نبی کریم ﷺ کے متعلق کہا جاسکتا ہے۔

اوراس کا جواب یہ بھی ہے کہ آپ کے سوال کا مقصد درحقیقت قوم کو کامل طور پر دلیل پر مطلع کرنا تھا۔

"وانماطلب ذلک لا جل تمام الاستدلال والاحتجاج علی قومه وهذاهو الاتم"

یعنی آپ نے سوال اپنی ذات کے لئے نہیں کیا بلکہ قوم پر حجت قائم کرنے کے لئے تا کہ رب تعالیٰ کی قدرت کا پتہ چل جائے، درحقیقت کامل قوم کے لئے دلیل حاصل کرنے کا مطالبہ تھا۔ (از صاوی)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

آیۃ کریمہ میں " ارنــی " الفاظ گرامی " ار" باب افعال سے امر ہے"اکــرم" کے وزن پر، اصل میں "ارئــی" تھا، امر میں آخر سے حرف علت محذوف ہوگیا، اور ہمزہ کی حرکت ماقبل کو دے کر ہمزہ کو بھی حذف کیا گیا، "نــی" میں نون وقایہ ہے، اور یائے متکلم مفعول ہے۔اور لفظ "بلی" نفی کے بعد ثبوت کے لئے آتا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے یوم میثاق کو فرمایا" الست بربکم" کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انسانوں نے اس کے جواب میں کہا" قالوابلی" انہوں نے کہا کیوں نہیں، یعنی تو ہمارا رب ہے، اسی طرح یہاں بھی" قال اولم تو من "رب تعالیٰ نے کہا کیا تمہیں یقین نہیں؟ اس جملہ میں نفی پائی گئی ہے، اس کے جواب میں ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا، "قال بلی" آپ نے عرض کیا کیوں نہیں، یعنی یقین تو ہے، البتہ سوال کرنے کی وجہ یہ " ولکن لیطمئن قلبی" یہاں لیطمئن " میں لام، لامِ کَیْ ہے، جو حقیقت میں لام جارہ ہوتا ہے، اس کا تعلق فعل محذوف سے ہے تقدیر عبارت کی یہ "ولکن سالت ذلک ارادة طمانينة القلب "لیکن میں نے اس کا سوال اطمینان قلب کے ارادہ سے کیا۔

(ماخوذ از مدارک)

اسی لئے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے مگر یہ چاہتا ہوں میرے دل کو قرار آجائے۔

فائدہ جلیلہ: انبیاء کرام کے دو مقام ہیں، ایک مقام عروج، دوسرا مقام نزول۔

مقام عروج میں ان کی توجہ مخلوق سے ہٹ کر اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے، اس وقت ان سے صفات بشریہ کو ہٹا

لیا جاتا ہے اور فرشتوں والی صفات اور رب تعالیٰ کی صفات کو حاصل ہوتی ہیں، یہی مطلب اس عبارت میں دیکھئے۔

"الاول مقام العروج وھو الانخلاع من الصفات البشر یۃ ولتلبس بالصفات الملکیۃ والصفات القدسیۃ"

اسی مقام پر ہوتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے "صوم وصال" (دن رات کا لگا تار روزہ درمیان میں بالکل افطار نہیں) رکھے، لیکن صحابہ کرام نے جب صوم وصال رکھنے شروع کیا تو آپ نے ان کو منع فرمایا۔ "لست کھیئتکم ابیت عندربی یطعمنی ویسقینی" میں تمہاری طرح نہیں، میں رات اپنے رب کے ہاں گذارتا ہوں وہی مجھے (طعام محبت) کھلاتا ہے اور وہی مجھے (شراب محبت) پلاتا ہے۔ مطلب اس کا یہ تھا کہ مجھے رب تعالیٰ کی صفت حاصل ہے اس لئے میں کھانے پینے سے بے نیاز ہوسکتا ہوں تمہیں یہ مقام حاصل نہیں اس لئے تم جب کھانے پینے سے بے نیاز نہیں ہوسکتے تو صوم وصال بھی نہیں رکھ سکتے۔ یہ مقام عروج ہے جسے "السیر الی اللہ والسیر فی اللہ" کہا جاتا ہے۔

دوسرا مقام، مقام نزول ہے، یعنی انبیاء کرام کی توجہ بندوں کی تبلیغ کی طرف ہوتی ہے اور خالق کی ذات میں مقام استغراق نہیں ہوتا۔

"والثانی مقام النزول وھو التلبس بالصفات البشریۃ ثانیا بعد الانخلاع التّام، وھذا المقام مقام التکمیل ودعوۃ الخلق الی اللہ"

دوسرا مقام، مقام نزول ہے اس وقت انبیا کرام مستغرق فی اللہ (اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے میں غرق ہونے کی کیفیت) سے مکمل طور پر ہٹ کر مخلوق کو رب تعالیٰ کی طرف دعوت دینے اور ان کی تکمیل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اس وقت انبیاء کرام صفات بشریہ سے متصف ہوتے ہیں۔

اس مقام کو "السیر من اللہ والسیر باللہ" کہا جاتا ہے، دراصل اس میں حکمت یہ ہے۔

"انہ لابدبین المفیض والمستفیض من المناسبۃ حتی یتسر بہ الاستفاضۃ علی طریق الصیح"

کہ فیض دینے والے اور فیض لینے والے کے درمیان مناسبہ پائی جائے یہاں تک کہ کامل

طریقہ سے فیض حاصل کیا جا سکے۔

اسی وجہ رب تعالیٰ نے انسانوں کو دعوت ایمان دینے کے لئے انسانوں میں ہی انبیاء کرام بنائے۔

"ولم یتصور للعوام اخذ الفیض من اللہ تعالی لفقد المناسبۃ وھو تعالی غنی عن العلیمن"

عام انسان اللہ تعالیٰ سے براہ راست فیضان حاصل کر نہیں سکتے تھے، کیونکہ بندوں کو اللہ تعالیٰ سے کوئی مناسبت نہیں رب تعالیٰ لطیف ہے بندے کثیف ہیں، اور رب تعالیٰ تمام جہانوں سے بے پرواہ ذات ہے اور بندے فرشتوں سے بھی براہ راست فیض حاصل نہیں کر سکتے تھے، اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے فرمایا۔" ولو جعلناہ ملکا لجعلناہ رجلا" اگر ہم کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے تو اسے انسانی شکل میں بھیجتے۔

ہم روزمرہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ تیرانداز جب بہت بلندی میں ہو اس کا نشانہ پستی میں ہو تو اس کا تیر نشانہ پر صحیح نہیں لگتا۔

حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"انکروا دعوۃ نوح لما کان من الفرقان واجابوا دعوۃ محمد ﷺ لما کان من القران"

نوح علیہ السلام کی قوم نے آپ پر ایمان نہ لایا آپ کی نبوت کا انکار کرتے رہے اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی قوم آپ کے قریب نہ ہوئی، آپ سے جدا رہی، اس کی وجہ بھی یہی تھی۔

" نوح علیہ السلام کان فی مقام العروج لم یتأثر العوام منہ لا جل الفراق بینھما"

کہ حضرت نوح علیہ السلام مقام عروج میں زیادہ رہتے تھے جب آپ کے اور آپ کی قوم کے درمیان جدائی زیادہ رہی تو آپ کے عوام آپ سے فائدہ حاصل نہ کر سکے اور آپ سے زیادہ متاثر نہ ہوئے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کی امت کے لوگ آپ کے قریب ہونے کی وجہ سے زیادہ تعداد میں ایمان لے آئے، اس کی وجہ یہ تھی۔

" ولما نزل محمد ﷺ غایۃ النزول اجابوا دعوتہ محصول مقارنۃ"

نبی کریم ﷺ نے اپنی امت پر مہربانی فرمانے کے لئے مقام نزول کو زیادہ پسند کیا، اور لوگوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ میل جول رکھا اسی لئے آپ پر ایمان لانے والے کثیر تعداد میں ہوتے۔

صحابہ کرام کے ساتھ زرہ پہنے ہوئے نبی کریم ﷺ نظر آتے ہیں اور خندق کھودتے ہوئے بھی آپ اپنے صحابہ

کرام کے ساتھ شریک نظر آتے ہیں۔ جب نبی کا مقام نزول یعنی عوام کے ساتھ ملنے کا وقت ہوتا ہے، اس وقت ہی ظاہر اسباب کا بھی سہارا لیتے ہیں اور عوام کو سمجھانے اور ان کی تسلی کے لئے سوال کرتے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سوال بھی اس مقام میں تھا۔ (مظہری بتصرف قلیل)

تنبیہ: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو یہ عرض کیا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ دل کو اطمینان حاصل ہو جائے اس کا مطلب یہ تھا کہ مردوں کو زندہ کرنے کی کفیت جو مشاہدہ میں آسکتی ہے میں اس کا سوال کر رہا ہوں۔

"وعدم حصول هذه الطمانينة قيل لا ينافي حصول الايمان بالقدرة على الاحياء على اكمل الوجوه"

مردوں کو زندہ کرنے کی کیفیت کا بغیر مشاہدہ کرنے کے اطمینان قلب نہ حاصل ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ کو یہ ایمان حاصل نہیں تھا کہ اللہ مردوں کو زندہ کر سکتا ہے یہ ایمان تو آپ کو کامل طریقہ سے حاصل تھا۔

" ولأرى رؤية الكيفيه زادت في ايمانه المطلوب منه عليه السلام شيا وانما افادت امراً لا يجب الايمان به"

آپ نے مردوں کو زندہ کرنے کی کیفیت کا جو سوال کیا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ کے ایمان میں پہلے کمی تھی اور آپ نے مردوں کو زندہ ہوتے ہوئے جب دیکھا تو آپ کا ایمان زیادہ ہو گیا، معاذ اللہ ثم معاذ اللہ یہ قول باطل ہے کہ آپ کے ایمان میں کمی تھی پھر زیادتی ہو گئی۔ اسی سے ایک اور قول کا لغو اور بیہودہ ہونا واضح ہو گیا۔

"ومن هنها تعلم ان عليا كرم الله تعالى وجهه لم يثبت لنفسه مرتبة في الايمان اعلى مرتبة الخليل فيه بقوله لو كشفت لى انعطاء ماازددت يقينا كماظنه جهلة الشيعة و كثيرمن اصحابنا"

اسی سے یہ معلوم ہو گیا کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا ارشاد کہ" (اگر میرے لئے پردے کھول دئے

جائیں تو میرے یقین میں زیادتی نہیں ہوتی)''اس پر دلالت نہیں کر رہا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایمان (معاذ اللہ) حضرت ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ پختہ تھا کیونکہ ابراہیم علیہ السلام نے زیادتی ایمان کے لئے مردے زندہ کرنے کا مطالبہ کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پہلے سے کامل ایمان تھا، یہ قول بالکل غلط ہے جو جاہل شیعہ اور جاہل سنیوں نے گھڑ لیا ہے، جن کو یہ معلوم ہی نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے زیادتی ایمان کا سوال ہی نہیں کیا اور ان جہلا کو معلوم ہی نہیں کہ غیر انبیاء خواہ کتنے ہی بلند مرتبہ نہ ہوں وہ سارے مل کر نبی کے مرتبہ کو نہیں پا سکتے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

☆☆☆☆☆

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ☆ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۶۱)

﴿۱﴾

ان کی کہاوت جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس دانہ کی طرح جس نے اگائیں سات بالیں ہر بال میں سو دانے اور اللہ اس سے بھی زیادہ بڑھائے جس کے لئے چاہے اور اللہ وسعت والا علم والا ہے۔

﴿۲﴾

مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں مثل اس دانہ کی ہے جس نے اگائیں سات بالیاں ہر بالی میں سو دانے، اور اللہ زیادہ کرتا ہے جس کے لئے چاہے، اور اللہ وسعت والا، علم والا ہے۔

ماقبل سے تعلق:

﴿۱﴾ اس آیۃ سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت عزیر علیہ السلام کا ذکر کیا گیا کہ ان کے سامنے مردے

زندہ کیے گئے جو قیامت قائم ہونے پر واضح دلیل ہے۔اس آیۃ کریمہ میں اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا ذکر کیا جارہا ہے جو قیامت میں نفع مند ہوگا۔ (روح المعانی)

﴿۲﴾ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ذکر فرمایا۔

"من ذالذی یقرض اللہ قرضاحسنافیصاعفہ لہ اضعافاکثیرۃ"

یعنی ان الفاظ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے پر اسے بڑھانے کا ذکر تھا اس میں تفصیل مذکور نہیں تھی، اب اس آیۃ کریمہ میں اس کی تفصیل ذکر فرمائی کہ اللہ تعالیٰ اسے سات سو گنا تک زیادہ فرماتا ہے اور جس کے لئے چاہے اور زیادہ فرماتا ہے۔

ان دونوں آیتوں کے درمیان اللہ تعالیٰ نے زندگی اور موت عطاء کرنے پر اپنی قدرت کا ذکر فرمایا، کیونکہ اگر موت کے بعد حیات نہ ہوتو انسان کو مکلّف بنانے ،یعنی اسے احکام کا پابند کرنے کا کوئی مقصد نہیں رہتا۔

"لولا وجودالالہ المثیب المعاقب لکان الانفاق فی سائر الطاعات عبثا"

اگر رب تعالیٰ جو گناہوں پر عذاب دینے والا ہے اور نیکیوں پر ثواب دینے والا ہے موجود نہ ہوتو نیکی کی راہوں میں مال خرچ کرنا بھی بے مقصد ہوتا۔

گویا کہ رب تعالیٰ نے مال خرچ کرنے کی ترغیب پر یہ اشارہ فرمایا کہ اے انسان تو جانتا ہے بیشک میں نے تمہیں پیدا کیا، اور میں نے تجھ پر موت وحیات عطاء کرنے کی نعمت کی تکمیل کی، اور تو یہ بھی جانتا ہے کہ میں گناہوں پر عذاب دینے اور نیکیوں پر عذاب دینے کی بھی قدرت رکھتا ہوں۔

"فلیکن علمک بھذہ الأحوال داعیاالی انفاق المال فانہ یجازی القلیل بالکثیر"

جب تم ان احوال کا علم رکھتے ہوتو تمہیں اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا چاہئے، تمہارا علم تمہیں اس کی دعوت دیتا ہے وہ رب کریم تھوڑا مال خرچ کرنے پر بہت جزاء دیتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ سے قلیل خرچ کرنے پر جزاء کثیر عطاء کرنے کو ایک مثال سے واضح فرمایا کہ جو رب کائنات ایک دانہ کاشت کرنے پر سات سو دانے پیدا کرنے پر قادر ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ پر قادر ہے تو وہ تمہاری ایک نیکی

کو سات سو گنا تک زیادہ کرنے بلکہ اس سے بھی زیادہ کرنے پر قادر ہے۔ (از کبیر)

﴿۳﴾ اور ماقبل سے تعلق کی وجہ یہ بھی ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کے فضائل ومراتب کا ذکر کیا تا کہ لوگ انبیاء کرام کی تصدیق کریں، اور جہاد کریں جس سے شریعت کی بلندی اور ناموری پائی جائے، اب رب تعالیٰ نے مال خرچ کرنے کی ترغیب دے کر نفس سے جہاد کرنے اور شریعت کی رفعت کی پاسداری کرنے کا حکم دیا۔ (از کبیر)

﴿۴﴾ اس سے پہلے بیان کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کا ولی ہے اور کافروں کے ساتھی شیاطین ہیں، اس آیۃ کریمہ میں یہ بیان کیا جارہا ہے کہ مؤمنوں کا مال اللہ کی راہ میں خرچ ہوتا ہے، اور یہاں سے ضمناً اور آگے صراحۃً پتہ چل رہا ہے کہ کافروں کا مال شیطانی راہ میں خرچ ہوتا ہے۔ (از کبیر)

اللہ کی راہ کون سی راہ ہے:

اس آیۃ کریمہ میں اللہ کی راہ سے مراد عام ہے، جو صدقات فرضیہ اور صدقات واجبہ اور صدقات نافلہ سب کو ہی شامل ہے۔ خواہ وہ مال جہاد میں خرچ کرے اپنی ذات پر یا اور لوگوں پر خواہ وہ مال ہجرت پر خرچ کرے، خواہ وہ اپنے اقرباء پر خرچ کرے یا غیروں پر خرچ کرے مساجد پر خرچ کرے یا دینی مدارس پر خرچ کرے جہاں پانی کی ضرورت ہو ہاں کنواں کھدوانے پر خرچ کرے، غرضیکہ نیکی کی راہ میں مال خرچ کرنے کے ثواب کا اس آیۃ کریمہ میں ذکر ہے، البتہ جہاد میں مال خرچ کرنے کی زیادہ فضیلت بیان کی گئی ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

☆ "عن علی بن ابی طالب و ابی الدرداء و عبداللہ بن عمرو ابی امامة الباهلی و عبداللہ بن عمرو بن العاص و جابر بن عبداللہ وعمران بن حصین کلهم یحدث عن رسول اللہ ﷺ انه قال من ارسل بنفقة فی سبیل اللہ و اقام فی بیته فله بکل درهم سبعما ئة درهم و من غزا بنفسه فی سبیل اللہ و انفق فی وجهه فله بکل درهم سبعما ئة الف درهم ثم تلا (هذه الأیة) و اللہ یضاعف لمن یشاء" (رواه ابن ماجة)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے اپنا نفقہ (مال) اللہ کی راہ میں بھیجا خود کسی عذر کی وجہ سے

اپنے گھر میں ہی مقیم رہا اسے ہر درہم کے بدلے سات سو درہم حاصل ہوں گے اور جس شخص نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور مال خرچ کیا رب تعالیٰ کی رضا کے لئے ،تو اسے ہر درہم کے بدلے سات لاکھ درہم حاصل ہوں گے (سات سو درہم یا سات لاکھ درہم کا ثواب مراد ہے) پھر آپ نے (یہی آیۂ کریمہ) تلاوت فرمائی " واللہ یضاعف لمن یشاء " اور اللہ زیادہ کرتا ہے جس کے لئے چاہے۔ (قرطبی)

☆ " صدقة المؤمن تدفع عن صاحبها آفات الدنيا وفتنة القبر وعذاب يوم القيامة"(الحدیث)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ مؤمن کا صدقہ کرنا اس شخص سے دنیا کی مصیبتوں اور عذاب قبر اور عذاب قیامت کے دن عذاب کو دور کرتا ہے۔ (ازروح البیان)

☆ "الساعی علی الا رملة والمسکین کالمجاهد فی سبیل اللہ "

بیوہ عورتوں کی امداد کرنے والا اور مسکینوں کی امداد کرنے والا ایسے ہی ہے جیسے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا ہو۔ (روح البیان)

☆ "عن عیاض بن غطیف قال دخلنا علی ابی عبیدة نعوده من شکوی اصابه بجنبه وامرأته قاعدة عندرأسه قلنا،کیف بات ابو عبیدة؟ قالت واللہ لقد بات بأجر،قال ابوعبیده مابت بأجر،وکان مقبلا بوجهه علی الحائط فأقبل علی القوم بوجهه وقال الا تسألونی عماقلت،قالوا اما اعجبناماقلت،فنسألک عنه،قال سمعت رسول ﷺ یقول من انفق نفقة فاضلة فی سبیل اللہ فسبعمائة ، ومن انفق علی نفسه واهله اوعاد مریضا او أماط أذی فالحسنة بعشر امثالها،والصوم جنة مالم یخرقها،ومن ابتلاہ اللہ عزوجل ببلاء فی جسده فهو له حطة (ای کفارة لذنوبه) (مسند احمد)

عیاض بن غطیف کہتے ہیں ،ہم ابوعبیدہ کے گھر ان کی عیادت کے لئے گئے ،ان کو ایک پہلو میں (نمونیہ کا) درد لاحق تھا،ان کے سرھانے ان کی زوجہ بیٹھی ہوئی تھی ،ہم نے ان سے پوچھا ابوعبیدہ نے رات کیسے گزاری؟ ان کی زوجہ نے کہا قسم ہے اللہ کی انہوں نے رات اجر میں گذاری (یعنی

شدت تکلیف میں صبر کرنے سے اجر عظیم حاصل کیا) ابوعبیدہ نے کہا میں نے رات اجر میں نہیں گذاری، وہ پہلے دیوار کی طرف (شدید پریشانی کی وجہ سے) دیکھ رہے تھے، پھر قوم کی طرف توجہ کی، اور کہا کیا تم مجھ سے سوال نہیں کرتے اس کے متعلق جو میں نے کہا، لوگوں نے کہا ہمیں تمہاری بات پر کوئی تعجب نہیں ہوا (یعنی انسان عاجزانہ طور پر ایسا کلام ہی کرتا ہے) چلو ہم تم سے سوال کر ہی لیتے ہیں، انہوں نے کہا میں نے رسول ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا جس نے اپنا زائد خرچ اللہ کی راہ میں دے دیا اسے سات سو گنا اجر حاصل ہوگا اور جس نے اپنے آپ پر اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کیا، یا مریض کی عیادت کی یا تکلیف دہ چیز کو دور کیا اسے ایک نیکی کا ثواب دس گنا حاصل ہوگا، اور روزہ ڈھال ہے جب تک اسے نہ توڑا، اور جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے جسمانی تکلیف میں مبتلا کیا، اس کی وہ تکلیف اس کے گناہوں کا کفارہ بنے گی۔ (از صابونی)

ان کے یہ کہنے کہ ''میں نے رات اجر میں نہیں گزاری'' کا مطلب یہ تھا کہ مریض کی عیادت کے لئے تم آئے ہو اجر تم نے حاصل کیا، کیا میں نبی کریم ﷺ کے اقوال پر پورا اترتا ہوں۔ لیکن اگر "ما بت اجرا" میں "ما استفہامیہ" مانا جائے تو سارے تکلفات سے بچ سکتے ہیں، ان کا یہ کہنا تعجب کے طور پر تھا'' کیا میں نے رات اجر میں گذاری؟ ہاں اس کی وجہ میری شدت تکلیف ہوگی۔

☆ " عن ابن مسعود ان رجلا تصدیق بناقة مخطومة فی سبیل الله فقال رسول ﷺ لتأتین یوم القیامة بسعمائة ناقة مخطومة" (اخرجه مسلم واحمد، واللفظ من مسند احمد)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص نے ایک نکیل والی اونٹنی صدقہ کی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن سات سو اونٹنیاں نکیل والی تمہارے پاس آئیں گی، یعنی سات سو اونٹنیوں کا تمہیں اجر وثواب حاصل ہوگا۔

☆ " عن عبد الله بن مسعود قال قال رسول ﷺ ان الله جعل حسنة ابن آدم الی عشر امثالها الی سبعمائة ضعف الا الصوم والصوم لی وانا اجزی به ، وللصائم فرحتان،

فرحة عند افطاره وفرحة یوم القیامة ولخلوف فم الصائم اطیب عند الله من ریح المسک" (رواہ احمد)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے ابن آدم کی ایک نیکی کو دس گناہ سے لے کر سات سو گنا تک کر دیا سوائے روزہ دار کے، (رب تعالیٰ نے فرمایا) روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی جزا دیتا ہوں، اور روزہ دار کو دو خوشیاں حاصل ہیں، ایک خوشی اسے روزہ کے افطار کے وقت حاصل ہوتی ہے، اور ایک خوشی اسے قیامت کے دن حاصل ہوتی ہے، البتہ روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے ہاں کستوری کی خوشبو سے بھی زیادہ پاکیزہ (اور اچھی) ہے۔

☆ "عن ابن عمر لما نزلت هذه الآية" مثل الذین ینفقون اموالهم فی سبیل الله" قال النبی ﷺ رب زدامتی قال فانزل الله "من ذالذی یقرض الله قرضاحسنا" قال رب زدامتی قال فانزل الله "انما یوفی الصابرون اجرهم بغیر حساب"

(اخرجه ابن مردویه درواه ابوحاتم وابن حبان)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب یہ آیۃ کریمہ "مثل الذین ینفقون اموالهم فی سبیل الله" الی آخر الآیۃ" نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا اے میرے رب میری امت کے لئے اور زیادہ کر تو اللہ تعالیٰ نے "من ذالذی یقرض الله قرضاحسنا" آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا، پھر آپ نے عرض کیا اے میرے رب میری امت کے لئے اور زیادہ کر تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیۃ کریمہ نازل فرمائی "انمایو فی الصابرون اجرهم بغیر حساب" صبر کرنے والوں یعنی روزہ داروں کو پورا پورا اجر بغیر حساب کے دیا جائے گا۔ (ماخوذ از صابونی)

☆ "اخرج البخاری فی تاریخه عن انس عن النبی ﷺ النفقة فی سبیل الله تضاعف سبعمائة ضعف"

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے

سے سات سو گنا تک ثواب حاصل ہوتا ہے۔ (درمنثور)

☆ "واخرج احمد والطبرانی فی الاوسط والبیهقی فی سننه عن بریدة قال قال رسول اللہ ﷺ النفقة فی الحج کالنفقة فی سبیل الله الدرهم بسبعمائة ضعف"

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حج میں خرچ کرنے سے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی طرح ہی سات سو گنا تک ثواب حاصل ہوتا ہے۔ (درمنثور)

☆ " واخرج ابو داؤد والحاکم وصححه عن معاذ بن انس قال قال رسول الله ﷺ ان الصلوة والصیام والذکر تضاعف علی النفقة فی سبیل الله بسبعمائة ضعف"

حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک نماز اور روزے اور ذکر اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے پر سات سو گنا زائد ہیں۔ (در منثور)

☆ "عن ابی ذر قال قال رسول الله ﷺ ان بکل تسبیحة صدقة وکل تکبیرة صدقة وکل تحمیدة صدقة وکل تهلیلة صدقة وأمر بالمعروف صدقة ونهی عن المنکر صدقة وفی بضع احدکم صدقة قالوا یا رسول الله ایأتی احدنا شهوته ویکون له فیها اجر قال ارأیتم لو وضعها فی حرام اکان علیه فیه وزر فکذلک اذا وضعها فی الحلال کان له اجر" (رواہ مسلم ، مشکوۃ کتاب الصدقة)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک ہر تسبیح صدقہ ہے، اور ہر تکبیر صدقہ ہے، اور ہر تحمید صدقہ ہے، اور ہر تہلیل (لا الہ الا اللہ کہنا) صدقہ ہے، اور اچھے کام کا حکم دینا صدقہ ہے، اور برے کام سے روکنا صدقہ ہے، اور تم میں سے ہر ایک کا جماع کرنا صدقہ ہے صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا ہم میں سے کوئی اپنی شہوت پوری کرلے تو اسے بھی ثواب حاصل ہوگا آپ نے فرمایا کیا تم دیکھتے نہیں اگر کوئی شخص حرام کا ارتکاب کرے تو وہ گنہگار ہوگا۔ جب حرام سے بچ کر وہ حلال کام کرے گا تو اسے اجر وثواب حاصل ہوگا۔

حدیث پاک سے واضح ہوا کہ ہر نیکی کا کام دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک ثواب رکھتا ہے، اور اللہ تعالیٰ

جس کے لئے چاہے اس سے بھی زیادہ کرتا ہے۔

صدقہ اور ہدیہ میں فرق:

"الصدقة هي منحة لثواب الآخرة والهدية ان يملك الرجل تقربا اليه واكراماله ففي الصدقة نوع ترحم وذل للآخذ ولذلک حرمت على النبي ﷺ بخلاف الهدية"

(مرقاة، ج ۴ ۱۶۴، باب من لا تحل له الصدقة)

صدقہ اس عطیہ کو کہا جاتا ہے جو آخرت کے ثواب کو دیا جاتا ہے صدقہ میں دوسرے شخص پر رحم پایا جاتا ہے اور لینے والے کی ذلت بھی پائی جاتی ہے۔

ہدیہ اس عطیہ کو کہا جاتا ہے جس میں اس شخص کا تقرب حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے اور اس شخص کی عزت مقصود ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کے لئے صدقہ حرام تھا۔ لیکن ہدیہ آپ کے لئے جائز تھا۔ نبی کریم ﷺ نے لوگوں کے لئے صدقہ دینے کی ترغیب دی اور اس پر برانگیختہ کیا (ابھارا) اس کی وجہ غریب و مساکین پر شفقت تھی، یعنی مسلمان غنی لوگوں سے صدقات لے کر مسلمان فقراء کو دینے کا حکم تھا۔ رب تعالیٰ نے آپ کو اغنیاء اور فقراء کے درمیان سفیر بنایا، خود آپ نے صدقہ نہیں لیا تا کہ طمع اور لالچ کا دروازہ مکمل طور پر بند کر دیا جائے۔ (مرقاۃ)

تنبیہ: صاحب ہدایہ نے بیان کیا ہے کہ بنو ہاشم کے لئے فرضی صدقہ کا ہدیہ حرام ہے لیکن نفلی صدقہ جائز ہے، فرض صدقہ کی مثال اس پانی کی ہے جو حدث کو دور کرنے کیلئے استعمال کرے، کیونکہ صدقہ لوگوں کے مالوں کو میل کچیل ہے، لیکن نفلی صدقہ بنو ہاشم کے لئے جائز ہے یہ اس پانی کی طرح ہے جس کو صرف ٹھنڈک حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا جائے۔

"وقال ابن حجر وابن الملک يحرم عليه ﷺ الصدقة الواجبة والمندوبة واما على آله فالمفروضة لا غير"

(مرقاة ج ۴، ص ۱۶۵، ۶۶)

نفلی صدقہ صرف نبی کریم ﷺ کی آل کے لئے جائز ہے، آپ کی اپنی ذات کی بلندی شان کے پیش نظر فرض اور نفلی صدقہ ہر قسم کا حرام تھا۔

وہ بنو ہاشم جن پر صدقات فرضیہ حرام ہیں:

وہ ہیں آل علی، آل عباس، آل جعفر، آل عقیل اور آل حارث بن عبدالمطلب۔ (قدوری)

نبی کریم ﷺ کے آباء واجداد میں سے چوتھے درجے پر عبد مناف ہیں۔ عبد مناف کے چار بیٹے تھے۔

مطلب، نوفل، عبد شمس، ہاشم۔

ہاشم کے چار بیٹے تھے، سب کی نسل منقطع ہوگئی سوائے عبدالمطلب کے، عبدالمطلب کے بارہ بیٹے تھے، باقی تمام اولاد عبدالمطلب کو زکوۃ دینی جائز ہے جبکہ وہ مسلمان ہوں اور مستحق ہوں۔ صرف اولاد عباس اور اولاد حارث بن عبدالمطلب اور اولاد ابی طالب کو زکوۃ نہیں دے سکتے، لیکن اولاد ابی طالب سے مراد بھی صرف اولاد علی، اولاد جعفر اور اولاد عقیل ہے۔

درحقیقت یہ لوگ نبی کریم ﷺ پر ایمان لائے تھے اور آپ کے خدمت گذار ہیں ان کو آپ کی قرابتداری حاصل رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ابولہب کی اولاد سے کوئی مسلمان اور مستحق زکوۃ ہو تو اسے زکوۃ دی جاسکتی ہے، اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "لا قرابة بینی وبین ابی لھب" میرے اور ابولہب کے درمیان کوئی قرابت نہیں، اسی سے واضح ہوا کہ جن کتب میں ذکر ہے کہ بنو ہاشم کو زکوۃ دینا جائز نہیں، اس سے مراد تمام بنو ہاشم نہیں، بلکہ بعض مراد ہیں، جن کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ (از طحطاوی)

سید الاولیاء حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی رحمہ اللہ کا فتوی:

بسم اللہ الرحمن الرحیم، امابعد!

در حرمت صدقات فرضیہ بر بنی ہاشم حدیث بریرہ و حدیث تمرہ دلالت بر عموم دارد، لکن بعض مجتہدین کرام عند الامام الہمام ابا حنیفۃ رضی اللہ تعالی عنہ حرمت را مخصوص بزمان آنحضرت ﷺ داشتہ و امام طحاوی رضی اللہ عنہ کہ از ثقات و مشار الیہ است در تحقیق وتنقید احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوۃ

والسلام همیں را معتقد و معمول به قرار داده قال صاحب تفسیر روح البیان تحت الآیة واعلمو انما غنمتم (الی) وابن السبیل) بعد الترجمة والتحقیق اللفظی کما هورابه شکر الله تعالی سعیه" وفی شرح الآثار عن ابی حنیفة ان الصدقات کلها الی فرضها ونا فلها جائزة علی بنی هاشم والحرمة فی زمان النبی علیه السلام لو صول خمس الخمس الیهم فلما سقط ذلک بمو ته حلت لهم الصدقة قال الطحاوی و با لجواز نأخذ " انتهی" پس نظریه قول امامنا الاعظم در ذهن نا قص همیں جو از است.

فان قلت کیف ذلک والا حا دیث مصرحة بعموم النهی فیستدل بها بعد العلم بصحتها علی تز نیف الروایة المذکورة فی شرح الآثار قلت اولا ان احتمال عدم وصول الاحادیث الی المجتهد ساقط فانه یسلم الحرمة لکن یخصه بعهد النبی ﷺ والحرمة مذکورة فی الا حا دیث فحسب فعلم ان اجتها ده افضا ه الی القول بالجواز فالا ستد لال المذکور با طل وثانیا ان الفقها ء صر حوا بان العجم ضیعوا انسا بهم فکیف یحکم قطعا با لحرمة" ایں است ما حضر والله اعلم وعلمه اتم وما ابرئ نفسی"

(الراقم مهر علی شاه عفی عنه)

خلاصہ ترجمہ:

حضرت نے بحوالہ تفسیر روح البیان زیر آیت۔

واعلموا انما غنمتم من شیٔ فان لله خمسه وللرسول ولذی القربی والیتامی و المساکین وابن السبیل"

(انفال ۴۱)

معانی الآثار امام طحاوی سے نقل فرمایا کہ حضرت امام ابی حنیفہ کے نزدیک بنی ہاشم کے لئے ہر قسم کے صدقات فرضیہ ہوں یا نافلہ جائز ہیں۔ ان کی حرمت بنی ہاشم کے لئے فقط زمانہ نبی علیہ السلام میں تھی کیونکہ اس وقت انہیں مال خمس سے حصہ ملتا تھا جب آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد یہ حصہ ان کے لئے ساقط ہو گیا تو صدقات ان

کے لئے حلال ہو گئے، امام طحاوی فرماتے ہیں ہم جواز پر فتوی دیتے ہیں رہا یہ سوال کہ ہوسکتا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو ان احادیث کا علم نہ ہوا ہو جن سے صدقات فرضیہ کی حرمت بنی ہاشم کے لئے ثابت ہے، تو اس کا جواب حضرت قبلہ عالم رحمہ اللہ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ یہ بات خلاف واقعہ ہے، کیونکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ان احادیث کو جانتے ہوئے یہ فرماتے ہیں کہ یہ حرمت اور منع آنحضرت ﷺ کے زمانہ کے ساتھ مختص تھی لہٰذا ایک محقق مجتہد کے اجتہاد سے یہ ثابت ہوا کہ احادیث نہی اپنی جگہ درست ہیں، لیکن چونکہ آنحضرت ﷺ نے نہی اور حرمت کی علت خمس کا حصہ ملنا قرار دیا، لہٰذا جب یہ حصہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد ختم ہوئی، (نیز ایک الزامی جواب کی طرف بھی اشارہ فرمادیا) کہ جب عجمی لوگوں کے انساب فقہاء کرام کے نزدیک ضائع ہو چکے ہیں یعنی ان کا اعتبار نہیں رہا تو محض شک سے حرمت کیسے ہوگی۔

(فتاوی مهریه ۱۸، ۱۹)

دانہ سے تشبیہ کا مطلب:

اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کو دانہ سے تشبیہ دی گئی کہ جس طرح ایک دانہ کاشت کیا جائے اس سے سات شاخیں نکلیں، ہر شاخ پر ایک بالی ہو اس طرح اس سے سات بالیاں (سٹے، خوشے) اگیں، اور ہر بالی یعنی ہر سٹے میں سو دانے ہوں تو ایک دانے سے سات سو دانے بن گئے، اسی طرح رب تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے سات سو نیکیوں کا ثواب حاصل ہوگا، یعنی خرچ ایک روپیہ کرے گا ثواب سات سو روپے خرچ کرنے کا حاصل ہوگا۔

دانہ سے مراد کونسا دانہ ہے؟

"وهذا التمثيل تصوير للا ضعاف كأ نها ما ثلة بين عينى المناظر والممثل به مو جود فى الدخن والذرة"

اس مثال سے نیکیوں کے بڑھ جانے کی تصویر آنکھوں کے سامنے لائی گئی، کیونکہ انسان عام طور پہ جوار اور باجرے کے دانہ میں دیکھتا رہتا ہے کہ ایک دانہ سے سات سو دانے ہو جاتے ہیں۔

(مدارک)

"واللہ یضاعف لمن یشاء": "اور اللہ زیادہ کرتا ہے جس کے لئے چاہے"۔

"معناہ یضاعف علی ھذا ویزید لمن یشاء من .... سبعمائة الی مایشاء من الاضعاف ممالایعلمه الا اللہ"

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہے سات سو سے زیادہ کر دے اس زیادتی کی حد اور مقدار کو سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی اور نہیں جانتا۔ (خازن)

"فمثل المتصدق کمثل الزارع اذا کان حاذقافی عمله وکان البذر جید وکانت الارض عامرة یکون الزرع اکثر فکذلک المتصدق اذا کان صالحا والمال طیباو وضع فی موضعه یکون الثواب اکثر"

اللہ کی راہ میں صدقہ دینے والے کو جب کھیتی باڑی کرنے والے سے تشبیہ دی گئی تو اس سے مسئلہ بہت واضح ہو گیا کیونکہ کھیتی باڑی کرنے والا جب ماہر ہو، کام کو صحیح سمجھتا ہو، اور بیج (دانہ) عمدہ ہو، اور زمین زرخیز ہو یعنی زمین میں فصل اگانے کی کامل تاثیر پائی جاتی ہو تو کھیتی کی پیداوار زیادہ ہوتی ہے، ایک دانہ سات سو دانوں سے بھی کہیں زیادہ ہو جاتا ہے، اسی طرح صدقہ کرنے والا بھی جب نیک ہو اور مال حلال ہو اور صدقہ مستحقین کو دے اور شریعت کے مطابق عمل کرنے والوں کو دے، حلال کاموں پر خرچ کرنے والوں کو دے تو یقیناً ان لوگوں کے صدقہ کو اللہ تعالیٰ بڑھائے گا یعنی جن کو رب تعالیٰ چاہے انہیں اس کو توفیق عطا فرماتا ہے اور ان کے صدقہ میں ہی اجر و ثواب کو زیادہ کر دیتا ہے۔ اس پر حدیث پاک دیکھئے۔

"عن ابی ھریرة قال قال رسول اللہ ﷺ من تصدق بعدل تمرہ من کسب طیب ولا یقبل اللہ الا الطیب فان اللہ یتقبلھا بیمینه ثم یر بیھالصاحبھا کمایربی احد کم فلوة حتی تکون مثل الجبل" (بخاری ومسلم، مشکوۃ باب فضل التصدق)(ماخوذ از روح البیان)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں رسول ﷺ نے فرمایا جس شخص نے ایک کھجور کے برابر صدقہ کیا کسب حلال سے "اللہ تعالیٰ سوائے حلال مال کے قبول نہیں فرماتا" تو بیشک اللہ تعالیٰ

اس کو اپنے دائیں دست قدرت (جو اس کی شان کے لائق) سے قبول فرماتا ہے، پھر اس صدقہ کرنے والے کے لئے اسے بڑھاتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی ایک اپنے گھوڑی کے بچے کی پرورش کرے تو وہ پہاڑ کی طرح مضبوط بن جائے۔

"بعدل تمرة" (بفتح العین و کسرھا) کھجور کی مقدار صدقہ کرے خواہ وہ صورت کے لحاظ پر کھجور کی مقدار میں ہو، یا قیمت کے لحاظ پر کھجور کی مقدار میں ہو۔

"من کسب طیب" کسب حلال 'خواہ وہ مال حلال طریقہ سے یعنی صنعت سے حاصل کرے یا تجارت سے یا زراعت وغیرہ سے۔ خواہ وہ حلال مال اسے بطور وراثت ملے یا بطور ہبہ ملے، اللہ تعالیٰ اسے قبول فرماتا ہے۔ دائیں ہاتھ سے قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اچھی طرح قبول فرماتا ہے، اور اس کا صدقہ اللہ تعالیٰ کی رضاء کے مطابق واقع ہوتا ہے، اور وہ کامل صدقہ ہوتا ہے، یہ عام عادت کے مطابق محاورہ ہے، یعنی جس طرح پسندیدہ چیز کو دائیں ہاتھ میں لیا جاتا ہے اسی طرح (بلاتشبیہ و تمثیل) کسب حلال سے صدقہ کیا ہوا مال رب تعالیٰ کی رضا کے مطابق پسندیدہ صدقہ ہے جو اچھی طرح مقام قبولیت میں آتا ہے۔

"فلوہ" بفتح الفاء و بضم و بضم اللام و تشدید الواو ای المهر و هو ولد الفرس"

یعنی 'فلو' کا معنی گھوڑے کا بچہ، پہاڑ کی طرح ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ پہاڑ کی طرح مضبوط جسم ہو جائے۔

حدیث کا مطلب واضح ہے کہ رزق حلال سے اللہ کی راہ میں خرچ کیا ہوا مال اللہ تعالیٰ کے حضور قبول ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ صدقہ کرنے والے کو اتنا زیادہ ثواب عطاء کرتا ہے جسے وہ خود ہی جانتا ہے۔ (مرقاۃ)

دانہ سے مثال کے متعلق علامہ آلوسی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں۔

"(انبتت سبع سنابل) ای اخرجت تلک الحبة ساقا تشعب منه سبع شعب لکل واحد منها سنبلة "

یعنی رب تعالیٰ نے اس دانہ سے تشبیہ دی جس سے سات بالیاں اگیں، مطلب یہ ہے کہ ایک دانے سے ایک شاخ پیدا ہوتی ہے، پھر اس سے سات شاخیں پیدا ہوتی ہیں، پھر ہر شاخ پر ایک بالی ایک سٹہ لگتا۔

"فی کل سنبلة مائة حبة" ہر سٹے (بالی) میں سو دانہ ہو۔

"کما نری ذلک فی کثیر من الحب فی الاراضی المغلة بل اکثر من ذلک"

ہم غلہ دینے والی زمین میں دیکھتے ہیں کہ کثیر دانے ایسے ہیں جو ایک ایک سے سات سو بن جاتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ ہو جاتے ہیں۔ (روح المعانی)

روح المعانی کی اس بحث سے وہ اعتراض اٹھ گیا کہ کسی نے دیکھا کہ ایک دانہ سے سات سو دانے بن جاتے ہیں، یہ کلام علیم وخبیر ذات کا ہے جو حقیقت پر مبنی ہے، کوئی فرضی مثال نہیں، جن مفسرین کرام نے زراعت کا پیشہ اختیار نہیں کیا ان سے غلطی کا واقع ہونا باعث تعجب نہیں۔ راقم نے چونکہ تین سال زراعت کا پیشہ بھی اختیار کیا اس لئے روح المعانی سے ہی راقم کے ذہن نے موافقت کی۔

"واللّٰہ واسع علیم" "اور اللہ وسعت والا، علم والا ہے"۔

یعنی اللہ تعالیٰ کسی کو زیادہ ثواب عطاء کرنا چاہے تو اسے کوئی تنگی حاصل نہیں بلکہ وہ وسعت کا مالک ہے، اور وہ خرچ کرنے والے کی نیت اور خرچ کرنے کی مقدار کو جانتا ہے اور جو اس نے خرچ کیا اس پر ثواب حاصل ہونے کی کیفیت کو جانتا ہے۔ (روح البیان)

خرچ کرنے کے مراتب:

" انفاق العامة بالمال فاجرهم الجنة "

عام لوگ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت عطاء فرماتا ہے اسے "انفاق العوام" کہا جاتا ہے۔

" وانفاق الخواص اصلاح الحال بتزکیة النفس وتصفیة القلب فاجرهم یوم القیامة النظر الی وجه الله تعالیٰ"

اور خرچ کرنے کا دوسرا درجہ "انفاق الخواص" ہے، وہ یہ ہے کہ نفس کو پاک کرنے اور دل کو صاف کرنے سے حال کو درست کرے، ان کا اجر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی ذات کا (بغیر کسی کیفیت کے) دیدار حاصل ہونا ہے۔

یہ بھی خیال رہے کہ انفاق کا پہلا درجہ حاصل ہوگا تو اس سے دوسرا درجہ بھی حاصل ہوگا، اسی لئے مومن کو چاہئے کہ اللہ کی راہ میں مال محبت وخلوص سے خرچ کر کے اپنے نفس کو پاکیزہ کرے اور اپنے دل کو صاف کرے تاکہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا اسے قرب حاصل ہو، اعلیٰ مقام حاصل ہو، اور اللہ تعالیٰ کے دیدار سے مشرف ہو، اور انسان بخل سے کام نہ لے تاکہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ خسارہ پانے والوں میں نہ ہو۔ (از روح البیان)

پیشہ زراعت کی فضیلت:

یہ آیۃ کریمہ اس پر دلالت کر رہی ہے کہ کھیتی باڑی تمام پیشوں اور کسبوں سے اعلیٰ پیشہ اور اعلیٰ کسب ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی مثال بیان کی جو فی سبیل اللہ مال خرچ کرتے ہیں۔

☆ "عن النبی ﷺ مامن مسلم یغرس غرسا او یزرع زرعا فیأ کل منه طیر او انسان او بهیمة الاکان له صدقة" (رواه مسلم)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کوئی ایسا مسلمان نہیں کہ درخت لگائے یا کھیتی باڑی کرے تو اس سے پرندے کھائیں، یا انسان کھائیں، یا چوپائے کھائیں مگر یہ کے اسے صدقہ کا ثواب حاصل ہوگا۔

☆ "عن عائشة قال رسول ﷺ التمسو الرزق فی خبا یا الارض" یعنی الزرع" (ترمذی)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کھیتی باڑی میں رزق تلاش کرو۔

☆ "قال رسول اللہ ﷺ (فی النخل) هی الراسخات فی الوحل المطعمات فی المحل"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ (یعنی کھجور کا درخت) نرم تر زمین میں راسخ ہوتا ہے جو قحط کے موقع پر رزق دیتا ہے۔

یعنی کھجور کے درخت کی جڑیں نیچے تر زمین تک پہنچی ہوتی ہیں، بارش نہ ہونے کی صورت میں بھی اللہ تعالیٰ اسے پھل عطا کرتا ہے جو روزی کا ذریعہ ہے۔ ان تمام احادیث مبارکہ سے درخت لگانے اور کھیتی باڑی کرنے کی فضیلت واضح ہو رہی ہے۔

معتضد باللہ نے بیان کیا ہے میں نے خواب میں دیکھا کے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے کندال

(مین کھودنے کا آلہ) عطاء کی، اور فرمایا " خذھا فانھا مفاتیح خزائن الارض " اسے پکڑو بیشک یہ زمین کے خزانوں کی چابی ہے۔ یعنی یہ آلہ کھیتی باڑی میں کام آنے والا ہے، جو رزق کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

(ماخوذ از قرطبی)

☆☆☆☆☆

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَآ اَذًی لَّھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ☆

(سورۃ البقرۃ آیت ۲۶۲)

﴿۱﴾

وہ جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر دیئے پیچھے نہ احسان رکھیں نہ تکلیف دیں، ان کا نیگ ان کے رب کے پاس ہے اور انہیں نہ کچھ اندیشہ ہو نہ کچھ غم۔

﴿۲﴾

وہ جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں، پھر نہیں پیچھا کرتے خرچ کرنے کا احسان جتلانے اور اذیت پہنچانے سے، ان کے لئے اجر ہے ان کا ان کے رب کے ہاں، اور نہیں ہے خوف ان پر اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔

شان نزول:

بیان کیا گیا ہے کے یہ آیۃ کریمہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں نازل ہوئی کہ آپ نے غزوہ تبوک میں مسلمانوں کے لشکر کو تیار کیا ایک ہزار اونٹ بمع پالان وغیرہ کے دے کر، تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

" وعن عبد الرحمن بن سمرة جاء عثمان بالف دینار فی جیش العسرة فصبها فی حجر النبی ﷺ فرأیته یدخل یده فیها ویقلبها ویقول ماضر عثمان ما عمل بعد الیوم

فانزل اللہ الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ الخ"

عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں غزوہ عسرہ (غزوہ تبوک) کے لشکر کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک ہزار دینار لائے اور نبی کریم ﷺ کی گود میں ڈال دیئے، میں نے آپ کو دیکھا کے آپ نے اپنا ہاتھ ان دیناروں میں ڈالا اور انہیں الٹ پلٹ کرر ہے ہیں، اور فرمارہے ہیں آج کے بعد عثمان کو کوئی نقصان نہیں جو عمل کرے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیۃ کریمہ نازل فرمائی۔

اسی طرح حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا واقعہ بھی درپیش آنے کے بعد یہ آیۃ نازل ہوئی۔

" واما عبد الرحمن فجاء باربعة آلاف درهم صدقة الى رسول الله ﷺ وقال عندی ثمانية آلاف فا مسكت لنفسی ولعيالی اربعة آلاف واربعة آلاف اخرجتها لربی عزوجل فقال رسول ﷺ بارک الله لک فيما امسكت وفيما اعطيت "

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم ﷺ کے پاس اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے چار ہزار درھم لائے اور عرض کیا کہ میرے پاس آٹھ ہزار درہم ہیں، میں نے اپنے لئے اور اپنے اہل وعیال کے لئے چار ہزار رکھ لئے ہیں اور چار ہزار اپنے رب کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے آپ کے پاس لے آیا ہوں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تمہیں برکت عطاء فرمائے ان میں جو تم نے رکھ لئے ہیں اور برکت عطاء فرمائے ان میں جو تم نے خرچ کر لئے ہیں۔ (خازن)

فائدہ:

"وقال ابو سعيد الخدری رأيت النبی ﷺ رافعا يديه لعثمان يقول يارب عثمان انی رضيت عن عثمان فأرض عنه ، فما زال يدعو حتى طلع الفجر فنزلت الذين ينفقون اموالهم الخ "

حضرت ابوسعید حدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں جب حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں غزوہ تبوک کے لئے مال پیش کیا تو میں نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ ہاتھ

اٹھائے ہوئے دعا فرمارہے ہیں اور عرض کر رہے ہیں اے عثمان کے رب بیشک میں عثمان سے راضی ہوں، تو بھی اس سے راضی رہ، آپ صبح صادق تک یہی دعا فرماتے رہے یہاں تک کہ یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔ (قرطبی)

تنبیہ: پہلی آیۃ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے اور اس پر ثواب کی زیادتی کا ذکر فرمایا، اور اس آیۃ کریمہ میں وضاحت فرمائی کے وہی مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا ہوا اللہ کے ہاں شرف قبولیت حاصل کرے گا جس پر احسان نہ جتلایا گیا ہو اور نہ ہی اس شخص کو اذیت پہنچائی جائے جسے مال دیا گیا ہے۔ (از قرطبی)

منّ اور اذی کا مطلب:

﴿۱﴾ " منّ " کے لغوی معانی میں سے ایک معنی ہے، انعام کرنا' جس طرح کہا جاتا ہے'' من فلان علی فلان'' فلاں شخص نے فلاں پر انعام کیا۔ جیسا کے ابن عرابی کے شعر میں اسی معنی میں ذکر ہے۔

فمن علینا بالسلام فانما — کلامک یا قوت و درر منظم

ہم پر سلام کا احسان کرو بیشک، تمہارا کلام یاقوت اور پروئے ہوئے موتی ہیں۔

☆ "قال رسول اللہ ﷺ ما من الناس احدا منّ علینا فی صحبته و لاذات یده من ابن ابی قحافة"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگوں میں سے کوئی شخص بھی ایسا نہیں جس کا ہم پر زیادہ احسان ہو بنسبت ابن ابی قحافہ (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے خواہ وہ احسان ساتھ نبھانے کا ہو یا مالی معاونت کا ہو۔

اس حدیث شریف میں بھی " امنّ " کا لفظ استعمال ہے جس کا معنی احسان کرنا ہے، یعنی حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کے ان کا مجھ پر مالی تعاون کا اور سفر و حضر میں میرے ساتھ رہنے کا بہت بڑا احسان ہے۔

راقم نے ایک مرتبہ یہی حدیث تقریر میں بیان کی تو اس پر اس طرح وضاحت کی کہ یہ تو میرے نبی کریم ﷺ کی کرم نوازی ہے کہ آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان بیان کی کہ تمام صحابہ سے آپ نے نبی کریم ﷺ کی مالی معاونت زیادہ کی اور ہر سفر و حضر میں حضور ﷺ کا ساتھ نبھایا، ورنہ حقیقت میں احسان عظیم تو میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ کا

ہی ہے کہ آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کلمہ پڑھا کر دولت ایمان سے نوازا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

اور اللہ تعالیٰ کا وصف بھی ''منان'' ہے، جس کا معنی ہے ''منعم'' انعام کرنے والا، احسان کرنے والا۔

﴿۲﴾ " منّ " کا ایک معنی ہے، کم کرنا، اور ختم کرنا، یہی رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی میں استعمال ہوا ہے " وان لک لأجرا غیر ممنون " اور بیشک تمہارے لئے اجر ہے جس میں کوئی کمی نہیں۔

موت کو بھی منون کہتے ہیں کیونکہ اس سے عمر ختم ہو جاتی ہے، سال، مہینے اور دنوں کے شمار میں اختتام ہو جاتا ہے۔

﴿۳﴾ " من " کا اور معنی ہے احسان جتلانا، یہ کہتے رہنا کہ میں نے تم پر احسان کیا، میں نے تمہاری مالی معاونت کی تم غریب تھے میں تمہاری امداد کرتا رہا، وغیرہ۔

آیۂ کریمہ میں یہ معنی لیا گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کر کے پھر احسان نہ جتلائے۔

" اذی " کا معنی اذیت پہنچانا، تکلیف دینا۔ یعنی صدقہ کر کے پھر اس سے اپنا کام لینا اور اسے تکلیف دینا اذیت پہنچانا ہی ہے، بلکہ اپنے آپ کو اس سے بڑا سمجھنا اور اسے حقیر سمجھنا، اور اپنے دیئے ہوئے مال کو بڑا سمجھنا، اور یہ کہنا کہ تم میرے پاس آتے تھے میں تمہاری مالی امداد کرتا تھا یہ ذہنی اذیت پہنچانے کے مترادف ہے۔ (از شیخ زادہ)

صدقات کی تین قسمیں:

﴿۱﴾ " ان الصدقة یرید بها وجه الله تعالى وثوابه بانفاقه على المتفق عليه "

صدقہ میں صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی حاصل کرنی مقصود ہو، اور جس شخص کو مال دے رہا ہے اس سے مراد صرف ثواب حاصل کرنا ہو، اس کے حال کو نہ دیکھا جائے بلکہ اس کے حق دار ہونے کو دیکھا جائے۔

﴿۲﴾ اگر کوئی شخص کسی کو اس لئے مال دے کہ اس کے مجھ پر احسانات ہیں، لہٰذا میں اسے مال دے دوں تاکہ احسانات کا بوجھ اتر جائے۔

﴿۳﴾ کسی کو مال دے کر اس پر احسان جتلایا جائے اور اسے اذیت پہنچائی جائے۔

ان تینوں قسموں میں پہلی قسم کا صدقہ معتبر ہے کیونکہ وہ اللہ کی رضا کے لئے دیا گیا ہے، دوسری دونوں قسمیں

غیر معتبر ہیں اللہ کے ہاں وہ قبول نہیں، اس لئے کہ ان میں رب تعالیٰ کی رضا نہیں پائی گئی اور احسان جتلا کر اور اذیت پہنچا کر اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی بھی کی گئی۔ (ماخوذ از قرطبی)

احسان جتلانا گناہ کبیرہ ہے:

"عن ابی عمر قال رسول اللہ ﷺ ثلاثہ لا ینظر اللہ الیھم یوم القیامۃ العاق لوالدیہ والمراۃ المترجلۃ تشبہ بالرجال والدیوث، وثلاثۃ لایدخلون الجنۃ العاق لوالدیہ والمدمن الخمر والمنان بمااعطی" (رواہ النسائی)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین شخصوں کی طرف قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نظر رحمت نہیں فرمائے گا، ماں باپ کے نافرمان کی طرف، اس عورت کی طرف جو مردوں کی مشابہت اختیار کرے، اور دیوث کی طرف، (دیوث اس شخص کو کہا جاتا ہے جو اپنی عورت کے ساتھ غیر محرموں کو رنگ رنگلیاں مناتے دیکھ کر برداشت کرتا ہے) اور تین شخص (ابتدائی طور پر) جنت میں داخل نہیں ہوں گے ایک ماں باپ کا نافرمان، اور دوسرا شرابی، اور تیسرا عطاء کرنے پر احسان جتلانے والا۔ (از قرطبی)

☆ "اخرج البخاری و مسلم والترمذی عن عائشۃ قالت دخلت علی امراۃ ومعھا ابنتان لھا تسألی فلم تجد عندی شیأ سوی تمرۃ واحدۃ فاعطیتھا ایاھا فقسمتھما بین ابنیتھا ولم تأکل منھا ثم قامت وخرجت فدخل النبی ﷺ فاخبرتہ فقال من ابتلی من ھذہ البنات بشئ فاحسن الیھن کن لہ ستر امن النار"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ایک عورت میرے پاس آئی، اور اس کے ساتھ اس کی دو بیٹیاں تھیں، اس نے سوال کیا، لیکن اس نے میرے پاس سوائے ایک کھجور کے کچھ نہ پایا وہی ایک کھجور میں نے اسے دے دی اس نے وہ کھجور دونوں بیٹیوں میں تقسیم کر دی اور خود اس نے اس میں سے کچھ نہ کھایا، وہ اٹھ کر چلی گئی، تو نبی کریم ﷺ تشریف لائے تو میں نے آپ کو اس واقعہ کی خبر دی، آپ نے فرمایا جو بیٹوں کے معاملہ میں مبتلاء ہوا اور ان پر احسان فرمایا تو اس کے لئے آگ

سے حجاب بن جائے گا۔ (درمنثور)

واضح ہوا تھوڑا صدقہ خلوص سے دیا ہوا رب کے حضور قبول ہے، اور بیٹیوں پر رحم کرنا جہنم کی آگ سے بچنے کا ذریعہ ہے۔

☆ " واخرج ابن ابی شیبة وابو داؤد والترمذی وابن حبان عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ ﷺ من کان له ثلاث بنات اوثلاث اخوات اوبنتان او اختان فاحسن صحبتهن واتقی اللہ فیهن وفی لفظ فاد بهن واحسن الیهن وزوّ جهن فله الجنة"

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کی تین بیٹیاں یا تین بہنیں ہوں یا دو بیٹیاں یا دو بہنیں ہوں تو یہ شخص ان کو اچھی طرح اپنے پاس رکھے اور ان کے حق میں اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور روایت میں یہ بھی ہے کہ ان کو ادب سکھائے، اور ان پر احسان فرمائے اور ان کا نکاح کر دے تو اس کے لئے جنت ہے۔ (در منثور)

"لهم اجرهم عند ربهم": "ان کا اجر ان کے رب کے ہاں"۔

یعنی یہ مشروط ہے اس سے کہ مال خرچ کرنے والا مومن ہو، اور احسان جتلا کر یا جسے مال دیا اسے اذیت پہنچا کر اپنے صدقہ کو باطل کرنے والا نہ ہو۔

"ولا خوف علیهم ولا هم یحزنون":

"اور نہیں خوف ان کو، اور نہ وہ غم میں ہوں گے"۔

اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا ان کا ضائع نہیں ہوگا اور قیامت کے دن ان کو وافر مقدار میں ثواب حاصل ہوگا، ان کو اس کا کوئی خوف کوئی غم نہیں ہوگا کہ ان کا ثواب کہیں ضائع نہ ہو جائے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔" ومن یعمل من الصالحات فلا یخاف ظلما ولا هضما" (پ١٦، طه ١١٢)

اور جو اچھے عمل کرے اس حال میں کہ وہ مؤمن تو اسے خوف نہیں ہوگا زیادتی کا اور نہ نقصان کا۔

اور دوسرا مطلب یہ ہے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے اور اس کے بعد احسان نہ جتلانے والوں اور اذیت

نہ پہنچانے والوں کو قیامت کے دن عذاب کا خوف نہیں ہوگا جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا۔

" وهم من فزع يومئذ آمنون" اور وہ اس دن گھبراہٹ سے امن میں ہوں گے اور ارشاد فرمایا: "لا يحزنهم الفزع الاكبر" انہیں غم میں نہ ڈالے گی وہ سب سے بڑی گھبراہٹ۔ (از کبیر)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

بظاہر یہاں وہم یہ ہے کہ علم نحو کا قانون یہ ہے کہ "ثم" تراخی پر دلالت کرتا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ " الذين ينفقون اموالهم فی سبيل الله " جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں۔ اس کے بعد ذکر فرمایا۔ "ثم لا يتبعون ما انفقوا منا ولا اذى" پھر وہ پیچھا نہیں کرتے خرچ کرنے پر احسان جتلانے اور اذیت پہنچانے سے۔ مال خرچ کرنے کے بعد کچھ دیر سے احسان جتلانا اور اذیت پہنچانا منع ہے، لیکن اسی وقت احسان جتلانا اور اذیت پہنچانا منع نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے۔

"ثم للتفاوت بين الانفاق وترك المن وا لا ذى" (بیضاوی)

" يعنى انها للتر اخى فى الرتبة لا فى الزمان" (شیخ زادہ)

کہ یہاں لفظ "ثم" تراخی رتبی کے لئے ہے تراخی زمانی کے لئے نہیں۔ یعنی اس سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ خرچ کرنے اور احسان جتلانے اور اذیت پہنچانے کو چھوڑنے میں فرق ہے یعنی "من واذی" کو ترک کرنا فقط خرچ کرنے سے بہتر ہے۔

☆☆☆☆☆

قَوۡلٌ مَّعۡرُوۡفٌ وَّمَغۡفِرَةٌ خَيۡرٌ مِّنۡ صَدَقَةٍ يَّتۡبَعُهَاۤ اَذًى وَاللّٰهُ غَنِىٌّ حَلِيۡمٌ☆ (سورۃالبقرۃ آیت ۲۶۳)

﴿۱﴾

اچھی بات کہنا اور درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے بعد ستانا ہو، اور اللہ بے پرواہ حلم والا ہے۔

﴿۲﴾

اچھی بات کہنا اور درگزر کرنا بہتر ہے اس صدقہ سے جس کے پیچھے اذیت پہنچانا ہو، اور اللہ بے پرواہ حلم والا ہے۔

"قول معروف": "اچھی بات کہنا"۔

اس کی تفسیر میں مفسرین کرام نے مختلف الفاظ پیش کیے ہیں جو تمام ہی معتبر ہیں اور "اچھی بات" میں سمٹ کر آجاتے ہیں۔

" قول معروف،ای کلمة طیبة و دعاء لمسلم" (صابونی)

اچھے کلام سے مراد اچھی بات اور مسلمان بھائی کے لئے دعاء کرنا۔

"(قول معروف) ای کلام جمیل تقبله القلوب ولا تنکر ه یر دبه السائل من غیر عطاء شئ" (ابو السعود)

اچھا کلام وہ ہے جسے دل قبول کریں اور دل اس کا انکار نہ کریں دل اس سے دور نہ ہوں، سائل کو بغیر دینے کے لوٹا دے لیکن کلام اچھا اور نرم ہو، جس سے اس کا دل مطمئن رہے، ایسا سخت کلام نہ کرے جس سے اس کا دل زخمی ہو وہ پہلے ہی تنگدستی کی وجہ سے پریشان حال ہے۔

"(قول معروف) ای کلام جمیل یر دبه السائل مثل یرحمک الله یرزقک الله ان شاء الله تعالی اعطیک بعدهذا"

اچھی بات سے سائل کو لوٹا دے، مثال کے طور پر یہ کہے اللہ تم پر رحم کرے، تمہیں رزق رب تعالیٰ

عطاء فرمائے، پھر کبھی آنا میں بھی ان شاء اللہ تمہیں عطاء کروں گا۔ (روح المعانی)

"والقول المعروف هو الدعاء والتانيس والترجية بماعندالله خير من صدقة هي في ظاهرها صدقة وفي باطنها لاشئ، لان ذكر القول المعروف فيه اجر وهذه لااجر فيه" (قرطبی)

اچھی بات سے مراد دعاء کرنا اور محبت کا کلام۔ ضیا القران میں پیر صاحب نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے "میٹھے بول" اور سائل کو یہ امید دلانا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں رزق عطاء فرمائے گا، اس خوبصورت انداز پر سائل کو لوٹانا بہتر ہے اس صدقہ سے جس کے بعد احسان جتلایا جائے اور اسے اذیت پہنچائی جائے یا صدقہ دے اور جھڑک اور سخت کلامی سے اس کے دل کو زخمی کرے، اس قسم کا صدقہ ظاہری طور پر صدقہ ہے حقیقت میں وہ صدقہ نہیں، واضح ہوا کہ اچھی بات، میٹھے بول سے سائل کو خالی لوٹا دینے میں اجر ہے، لیکن صدقہ دے کر اسے تکلیف پہنچانے میں کوئی اجر ثواب نہیں۔

☆ "قال رسول الله ﷺ الكلمة الطيبة صدقة وان من المعروف ان تلقى اخاك بوجه طلق" (مسلم)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اچھی بات، پیارا کلمہ بھی صدقہ ہے اور اچھا طریقہ یہ ہے کہ تم اپنے (مسلمان) بھائی سے ملو تو ہنس مکھ یعنی مسکراتے ہوئے کھلکھلاتے چہرے سے ملو۔

"فيتلقى السائل بالبشر والترحيب ويقابله بالطلاقة والتقريب ليكون مشكورا ان اعطى ومعذورا ان منع"

سائل کو خوشی سے ملنا اور مرحبا کہنا، اور اس کے سامنے کشادہ روئی (مسکراتے چہرہ) سے آنا اور سے اپنے قریب کرنا ہی بہتر ہے تا کہ سائل کو اگر تم کچھ عطاء کردو تو وہ تمہارا شکر گزار رہے، اور اگر تم کسی وجہ سے نہ عطاء کر سکو تو وہ تمہیں معذور سمجھے۔ (قرطبی)

"ومغفرة": "اور درگزر کرنا"۔

اس مقام میں "مغفرت" کے بھی مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں جو اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ "درگزر کرنا" میں تمام کے تمام ہی آجاتے ہیں۔

"(ومغفرة)ای سترلماوقع من السائل من الالحاف فی المسألةوغیره ممایثقل علی المسؤل وصفح عنه" (روح المعانی)

مغفرت کا لغوی معنی ہے ڈھانپنا، مطلب یہ ہے کہ بعض اوقات سوال کرنے والے چمٹ کر بار بار سوال کرتے ہیں دامن کو نہیں چھوڑتے ایسی صورت میں انسان کی طبعیت پر بوجھ آنا قدرتی امر ہے، لہٰذا اس طبعی بوجھ کو چھپا کر رکھنا اور اچھی طرح اس سے دامن چھڑانا مغفرت ہے، مراد درگزر رہی ہے۔

"(ومغفرة) ای تجاوزعن السائل الملحّ بالردالجمیل"

مغفرت کا معنی ہے چمٹ کر سوال کرنے والے کو اچھی طرح لوٹانا اور اس سے درگزر کرنا۔

"وقال البغوی ای یسترعلی السائل خلته ولایهتک عنه ستره"

علامہ بغوی نے بیان کیا ہے کہ مغفرت کا مطلب یہ بھی ہے کہ سائل کے سامنے اپنی محتاجی کا ذکر نہ کرے، اپنے حال کا پردہ نہ پھاڑے، اپنی مجبوری کو چھپا کر رکھے، یعنی محتاجی کی وجہ سے نہ دے سکنے پر درگزر کرے۔

"وقیل المرادبه نیل مغفرة من الله بالردالجمیل"

اور یہ بھی مراد لی گئی ہے کہ سائل کو اچھی طرح لوٹا کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت حاصل کرنا۔

مطلب تقریباً یہی ہے کہ سائل سے درگزر کرے تاکہ اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے۔

"وقیل المرادمغفرةالسائل المسؤل عنه بان یعذره ویغتفرردہ"

اور معنی یہ بھی لیا گیا ہے کہ جس سے سوال کیا گیا ہے، اس کے عذر پیش کرنے اور سائل کے سوال کو رد کرنے پر سائل اسے معاف کرے۔

مطلب اس صورت میں بھی یہی ہوگا کہ جس سے سوال کیا گیا ہے وہ سائل کی بات سے درگزر کرے اور اچھی طرح اسے جواب دے اور پیار ومحبت سے اسے لوٹائے پھر سائل بھی اسے معذور سمجھتے ہوئے درگزر کرے۔

"وقال الکلبی والضحاک المرادبالمغفرة التجاوزعن من ظلمه"

اصل معنی مغفرت کا یہی ہے کہ جو شخص زیادتی کرے اس سے درگزر کرنا۔ (از مظهری)

"خیر من صدقة یتبعھا اذی" بہتر ہے اس صدقہ سے جس کے پیچھے ستانا پایا جائے۔

یعنی اچھا کلام، میٹھا بول اور سائل کے جھٹ کر سوال کرنے پر درگزر کرنا اور اسے پیار و محبت سے خالی لوٹا دینا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے بعد سائل کو ستایا جائے اور احسان جتلایا جائے۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

بظاہر یہاں اعتراض یہ ہے کہ " خیر "اصل میں" اخیر " ہے جو اسم تفضیل کا صیغہ ہے، اسم تفضیل میں زیادتی بنسبت غیر کے پائی جاتی ہے، اصل فعل دوسرے کو بھی حاصل رہتا ہے جیسا کہ کہا جائے " حامد افضل من محمود" حامد زیادہ فضیلت رکھتا ہے محمود سے، اس کا مطلب یہ ہے کہ محمود کو بھی فضیلت حاصل ہے اس سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ آیۃ کریمہ کا یہ مطلب ہوگا کہ جس صدقہ میں اذیت پہنچائی جائے وہ بھی اچھا ہے لیکن جس میں اذیت نہ پہنچائی جائے وہ زیادہ اچھا ہے۔ حالانکہ یہ معنی درست نہیں کیونکہ جس صدقہ میں اذیت پہنچائی جائے وہ تو مکمل طور پر باطل ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے۔

" عند کم ذلک خیر لکن اعلموا ان ھذا خیر لکم فی الدنیا و الآخرۃ"

کہ یہاں یہ بیان کیا گیا ہے کہ تم اگر چہ اس صدقہ کو بھی اپنے حق میں بہتر سمجھ رہے ہو جس کے بعد اذیت پہنچاتے ہو حالانکہ حقیقت میں تو یہ صدقہ ہی باطل ہے لیکن اگر تم غور کرو تو تم بھی اسے تسلیم کرو گے کہ وہی صدقہ تمہارے لئے بہتر ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے دیا جائے اور اس میں خلوص پایا جائے اور اس کے بعد احسان جتلایا جائے اور نہ ہی اسے ستایا جائے جسے صدقہ دیا جائے۔

(ماخوذ از روح المعانی)

"واللہ غنی حلیم": "اور اللہ بے پرواہ، حلم والا ہے"۔

یعنی اللہ تعالیٰ غنی ہے، اسے بندوں کی کوئی پرواہ نہیں اور اسے بندوں کے صدقات کی ضرورت نہیں، بندوں کو صدقات دینے کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ ان کو ثواب حاصل ہو۔ اور اللہ تعالیٰ حلم والا ہے کہ جو شخص صدقہ دے کر

پھر اس پر احسان جتلائے اور جسے صدقہ دیا اسے ستائے، اذیت پہنچائے اسے رب تعالیٰ جلدی عذاب نہیں دیتا، بلکہ مہلت دیتا ہے کہ وہ اپنی غلطی پر نادم ہو کر سچے دل سے تائب ہو جائے۔ (از قرطبی)

قول معروف بہتر صدقہ:

☆ " اخرج ابن ماجة عن ابی هريرة ان النبی ﷺ قال افضل الصدقة ان يتعلم المرء المسلم علما ثم يعلمه اخاده المسلم"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا افضل صدقہ یہ ہے کہ مسلمان انسان علم حاصل کرے، پھر وہ اپنے دوسرے مسلمان بھائی کو تعلیم دے۔ (در منثور)

☆ " واخرج المرهبی فی فضل العلم والبيهقی فی الشعب عن عبدالله بن عمروان رسول الله ﷺ قال ما اهدی المرء المسلم لا خيه هدية افضل من كلمة حكمة يزيده الله بها هدی اویر ده عن ردی"

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کسی مسلمان بھائی کا دوسرے مسلمان بھائی کے لئے اس سے بہتر اور کوئی صدقہ نہیں کہ یہ اسے کوئی علم کا کلمہ سکھا دے، جس سے اللہ تعالیٰ اس کی ہدایت میں زیادتی کرے اور اسے غلط کاموں سے بچا لے۔ (در منثور)

☆ "واخرج الطبرانی عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ نعم العطية كلمة حق تسمعها ثم تحملها الی اخ لک مسلم فتعلمها اياه"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اچھا عطیہ یہ ہے کہ تم کلمہ حق سن کر دوسرے مسلمان بھائی کو پہنچانے کے لئے یاد کرلو، پھر اپنے مسلمان بھائی کو وہ کلمہ حق سکھا دو۔ (در منثور)

سوال کرنے والا ہو سکتا ہے کوئی اور ہی مخلوق ہو:

"وروی من حديث عمر رضی الله عنه قال قال النبی ﷺ اذا سأل السائل فلا تقطعوا

علیہ مسألته حتی یفرغ منها ثم ردوا علیه بوقارولین اوببذل یسیراورد جمیل فقد یأتیکم من لیس بأنس ولاجان ینظرون صنیعکم فیماخوّ لکم اللہ تعالیٰ"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سائل کے سوال کو ختم ہونے سے پہلے قطع نہ کرو ،تم اسے پروقار طریقہ سے اور نرم لہجہ سے رد کرو، یا اس پر تھوڑا مال خرچ کردو، یا اچھی طرح جواب دے دو، کبھی تمہارے پاس وہ مخلوق آتی ہے جو نہ انسان ہوتے ہیں اور نہ جن (بلکہ وہ فرشتے ہوتے ہیں) وہ تمہیں دیکھنے کے لئے آتے ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں مال عطاء کر رکھا تم اسے میں کیا کرتے ہو، (یعنی کتنا مال تم اس ذات کی راہ میں خرچ کرتے ہوئے جس نے تمہیں وہ مال دیا ہے۔ (قرطبی)

قرطبی نے ایک حدیث کی طرف اشارہ کیا جو مکمل طور پر درج کی جارہی ہے۔

☆ " عن ابی هریرة انه سمع النبی ﷺ یقول ان ثلاثة فی بنی اسرائیل ابرص واقرع واعمی فاراداللہ ان یبتلیهم فبعث الیهم ملکا فاتی الا برص فقال ای شئ احب الیک قال لون حسن وجلد حسن ویذهب عنی الذی قد قذرنی الناس قال فمسحه فذهب عنه قذره واعطی لو ناحسناوجلد احسنا قال فای المال احب الیک قال الابل قال البقرشک اسحاق الاان الابرص اوالاقرع فقال ای شئ احب الیک وقال الآخر البقر قال فاعطی ناقة عشر اء فقال بارک اللہ لک فیها قال فاتی الا قرع فقال ای شئ احب الیک فقال شعرحَسنٌ ویذهب عنی الذی قد قذرنی الناس قال فمسحه فذهب عنه قال واعطی شعراحسنا قال فای المال احب الیک قال البقر فاعطی بقرة حاملاقا ل بارک اللہ تعالی لک فیها قال الاعمی فقال ای شئ احب الیک قال ان یرد اللہ الیّ بصری فا بصربه الناس قال فمسحه فرد اللہ الیه بصره قال فای المال احب الیک قال الغنم فاعطی شاة والدا فانتج هذان وولد هذا،فکان لهذ اوادمن الأبل ولهذاوادمن البقرة ولهذاوادمن الغنم قال ثم انه اتی الابرص فی صورته وهیئته فقال رجل مسکین قدانقطعت بی الجبال فی سفری فلا بلاغ لی الیوم الاباللہ ثم بک اسألک با لذی اعطاک اللون الحسن

والجلد الحسن والمال بعیرا ا تبلغ علیه فی سفری فقال الحقوق کثیرة فقال له کانی اعرفک الم تکن ابرص یقذرک الناس فقیرا فاعطاک الله فقال انما ورثت هذا المال کا براعن کا بر فقال ان کنت کاذبا فصیرک الله الی ما کنت، قال واتی الاقرع فی صورته فقال له مثل ماقال لهذا ورد علیه مثل مارد علی هذا فقال ان کنت کاذبا فصیرک الله الی ما کنت قال واتی الاعمی فی صورته وهینته فقال رجل مسکین وابن السبیل انقطعت بی الجحال فی سفری فلا بلاغ لی الیوم الله الا بالله ثم بک اسألک بالذی ردعلیک بصرک شاة اتبلغ بهافی سفری فقال قد کنت اعمی فرد الله الیّ بصری فخذ ماشئت ودع ماشئت فوالله لا اجهدک الیوم شیأ اخذته لله فقال امسک مالک فانما ابتلیتم فقد رضی عنک وسخط علی صاحبیک" (مسلم، ج ۲ ص ۴۱۶ کتاب الزهد)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ بنی اسرائیل میں تین آدمی تھے برص کی مرض والا، گنجا اور نابینا، اللہ تعالیٰ نے ان کو آزمانا چاہا تو ان کی طرف ایک فرشتہ بھیجا، وہ برص والے کے پاس آیا، اسے کہا تجھے کیا چیز پسند ہے کہا اچھا رنگ، اور اچھی جلد، یعنی میری یہ حالت ختم ہو جائے جس سے لوگ نفرت کرتے ہیں۔ تو اس فرشتے (جو انسانی شکل میں تھا) نے اس کے جسم پر ہاتھ پھیرا تو اس کے جسم کی وہ ناپسندیدہ حالت دور ہو گئی، اسے اچھا رنگ مل گیا، اور اس کا چمڑا حسین ہو گیا کہا تجھے کون سا مال پسند ہے، اس نے کہا مجھے اونٹ پسند ہیں (دوسری روایت بلاشک ہیں) تو اسے دس ماہ کی حاملہ (گابھن) دے دی گئی، اور کہا اللہ تعالیٰ تمہیں اس میں برکت عطاء فرمائے۔ پھر وہ گنجے کے پاس آیا کہا تجھے کیا پسند ہے اس نے کہا اچھے بال یعنی میری یہ حالت چلی جائے جس سے لوگ نفرت کرتے ہیں، اس نے اس پر ہاتھ پھیرا تو اس کی وہ حالت (گنجاپن) کی ختم ہو گئی، اور اسے اچھے بال عطاء کر دیئے گئے پھر اس سے تجھے کون سا مال پسند ہے اس نے کہا گائے، اسے ایک حاملہ گائے دے دی گئی اور کہا اللہ تعالیٰ تمہیں اس میں برکت عطاء فرمائے، پھر وہ نابینا کے پاس آیا اسے کہا تجھے کیا چیز پسند ہے

اس نے کہا اللہ تعالیٰ میری نظر لوٹا دے، جس کے ذریعے میں لوگوں کو دیکھ سکوں، اس پر ہاتھ پھیرا اللہ تعالیٰ نے اس کی نظر لوٹا دی، پھر اس سے پوچھا تجھے کونسا مال پسند ہے اس نے کہا بکری، اسے ایک حاملہ بکری دے دی گئی، اونٹنی اور گائے نے بچے جنے، اور بکری نے بھی بچے جنے اس طرح ہر جانور کی اولاد میں اتنی برکت ہوئی اونٹوں اور گائے اور بکریوں سے وادی بھر گئی پھر وہی شخص پہلی شکل وصورت میں برص والے کے پاس آیا، اس نے کہا میں ایک مسکین شخص ہوں، سفر میں بے خرچ ہو چکا ہوں، آج میں اپنی منزل مقصود تک اللہ تعالیٰ کے سہارے اور تمہارے واسطے کے نہیں پہنچ سکتا، میں تم سے اس ذات کے واسطے سے سوال کرتا ہوں جس نے تمہیں اچھا رنگ اور اچھی جلد دی، اور تمہیں مال یعنی اونٹ دیئے، کہا میں تمہارے اونٹ پر سوار ہو کر اپنا سفر طے کر سکتا ہوں، اس نے کہا حق کثیر ہیں (یعنی میں تمہیں مال نہیں دے سکتا) اس شخص نے کہا گویا کہ میں تمہیں جانتا ہوں تم برص کی مرض میں مبتلاء تھے، لوگ تم سے نفرت کرتے تھے اور تم فقیر تھے اللہ تعالیٰ نے تمہیں مال عطاء کیا۔ وہ کہنے لگا یہ مال تو مجھے بڑوں سے بطور وراثت ملا، اس (سائل) نے کہا اگر تو جھوٹا ہے تو اللہ تعالیٰ تمہیں پہلے حال پر کر دے، پھر وہ اپنی پہلی شکل وصورت میں گنجے کے پاس آیا، اس سے بھی اسی طرح سوال کیا اس نے پہلے کی طرح جواب دیا، تو اس (سائل) نے اسے کہا اگر تو جھوٹا ہے تو اللہ تعالیٰ تجھے پہلے حال پر کر دے پھر وہ شخص نابینا کے پاس اپنی پہلی شکل وصورت میں آیا، تو اسے کہا میں ایک مسکین شخص ہوں میرے پاس سفر کے اسباب ختم ہو چکے ہیں میں آج سوائے اللہ تعالیٰ نہیں پہنچ سکتا پھر میں تم سے اس ذات کے واسطہ سے سوال کرتا ہوں جس نے تمہیں نظر لوٹا دی، کیا میں اس بکری (کی قیمت) کے ذریعے اپنی منزل تک پہنچ سکتا ہوں؟ اس نے کہا ہاں میں اندھا تھا اللہ تعالیٰ نے مجھے نظر لوٹا دی، تم جو مال چاہتے ہو لے جاؤ اور جو چاہتے ہو چھوڑ جاؤ، قسم ہے اللہ تعالیٰ کی جو مال تم لو گے اسے لوٹانے کی مشقت بھی تم پر لازم نہیں رہے گی، اس (سائل) نے کہا تم اپنا مال اپنے پاس ہی رکھو، تم کو آزمایا گیا، اللہ تعالیٰ تم پر راضی ہو گیا، اور تمہارے دونوں ساتھیوں سے ناراض ہو گیا۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے کبھی سائل کی شکل میں آتے ہیں، اس لئے سائل کو ستائے نہیں۔ اس آیۃ کریمہ سے پہلی آیۃ کریمہ کے شان نزول میں ایک روایت روح البیان نے نقل فرمائی، اس سے بھی واضح ہو رہا ہے کہ سائل کبھی فرشتے ہوتے ہیں۔

☆ "روی ان الحسن بن علی رضی اللہ عنہما اشتھی طعا ما فباع قمیص فاطمۃ بستۃ دراھم فسأ لہ سائل فأ عطا ھا ثم لقی رجلا یبیع ناقۃ فا شتر ا ھا بأ جل وبا عھا من آخر فارادان ید فع الثمن الی بائعھا فلم یجدہ فحکی القضیۃ الی النبی ﷺ فقال اما السائل فرضوان واما البائع فمیکا ئیل واما المشتری فجبریل" (روح البیان)

روایت میں آتا ہے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کو طعام کی خواہش ہوئی (بھوک لگی) تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہما کی قمیص چھ درہم پر فروخت کر دی، تو آپ کو ایک سائل مل گیا اس کے سوال کرنے پر آپ نے وہ تمام درہم اسے دے دیئے پھر آپ کی ملاقات ایک شخص سے ہوئی جو اونٹنی فروخت کر رہا تھا آپ نے اس سے ایک وقت مقرر تک ادھار اونٹنی خرید لی، اور دوسرے شخص پر فروخت کر دی ارداہ بنا کہ بیچنے والے کو قیمت دے دی جائے، لیکن بیچنے والا مل نہیں رہا، آپ نے یہ واقعہ نبی کریم ﷺ کے سامنے پیش کیا تو آپ نے فرمایا سوال کرنے والا رضوان فرشتہ تھا اور اونٹنی بیچنے والا میکائیل فرشتہ تھا اور اونٹنی خریدنے والا جبریل فرشتہ تھا۔

پتہ چلا کہ بعض اوقات سوال کرنے والی کبھی اور ہی مخلوق ہوتی ہے، اللہ کے بندوں کی آزمائش کے لئے فرشتے انسانی شکل میں سائل بن کر آتے ہیں، اللہ کے مقبول بندے کامیاب ہو جاتے ہیں اور دوسرے لوگ ناکام ہو جاتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَیْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ" (سورۃ البقرۃ آیت ۲۶۴)

﴿۱﴾

اے ایمان والو اپنے صدقے باطل نہ کر دو احسان رکھ کر اور ایذاء دے کر اس کی طرح جو اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کے لئے خرچ کرے اور اللہ اور قیامت پر ایمان نہ لائے تو اس کی کہاوت ایسی ہے جیسے ایک چٹان کہ اس پر مٹی ہے اب اس پر زور کا پانی پڑا جس نے اسے نرا پتھر کر چھوڑا اپنی کمائی سے کسی چیز پر قابو نہ پائیں گے اور اللہ کافروں کو راہ نہیں دیتا۔

﴿۲﴾

اے ایمان والو نہ ضائع کرو اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور اذیت پہنچا کر، اس شخص کی طرح جو خرچ کرے اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لئے اور نہ ایمان رکھتا ہو اللہ پر اور قیامت کے دن پر، اس کی مثال ایسے ہے جیسے کہ ایک چکنی چٹان ہو، اس پر کچھ مٹی ہو تو پہنچے اسے زوردار بارش چھوڑ دے اسے چٹیل پتھر، نہیں قدرت رکھیں گے وہ کسی چیز پر جو انہوں نے کسب کیا، اور اللہ نہیں ہدایت دیتا کافروں کی قوم کو۔

مختصر مطلب:

اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو خطاب فرمایا کہ تم صدقات دینے کے بعد سائلین، فقراء وغیرہ پر احسان جتلا کر

یا اذیت پہنچا کر اپنے صدقات ضائع اور برباد نہ کرو، کیونکہ ان پر کوئی ثواب مرتب نہیں ہوگا، جس طرح کفار یعنی منافقین جو اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ مال خرچ کرتے ہیں صرف لوگوں کو دکھانے کے لئے، انہیں اس پر کوئی ثواب حاصل نہیں ہوتا بلکہ عذاب ہی ہوتا ہے، جس طرح صاف اور چکنے پتھر پر کچھ مٹی ہو تو سخت بارش اسے دور کردے اور صاف چٹیل پتھر چھوڑ دے، اسی طرح صدقات کی وجہ سے جو ثواب حاصل ہونا تھا اسے دکھلاوے نے تباہ و برباد کردیا، اور یہ لوگ اس کا ثواب کسی وقت بھی حاصل نہیں کر پائیں گے، اور اللہ تعالیٰ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔

"یاایھاالذین امنوا لا تبطلوا صدقاتکم بالمن والاذی":

"اے ایمان والو! نہ ضائع کرو اپنے صدقات احسان جتلا کر اور اذیت پہنچا کر"۔

اعتراض: "ومن العقیدة ان السیآت لا تبطل الحسنات خلافا للمعتزلة"

اہلِ سنت کا عقیدہ یہ ہے کے برائیاں نیکیوں کو برباد نہیں کرتیں اور معتزلہ کا مذہب اس کے خلاف ہے کہ وہ کہتے ہیں برائیاں نیکیوں کو برباد کردیتی ہیں کیا اہل سنت کا مذہب اس آیت کے خلاف نہیں؟

جواب: اللہ تعالیٰ کو جب معلوم ہے کہ یہ شخص صدقہ دے کر احسان جتلائے گا اور اذیت پہنچائے گا تو وہ اس صدقہ کو ابتدائی طور پر ہی قبول نہیں فرماتا، گویا کہ صدقہ باطل کرنے کے مترادف ہے۔

" والا بطال المتنازع فیه انما هوفی عمل صحیح وقع عندالله تعالی فی حیز القبول وماهھنالیس کذلک"

جس عمل میں اہلِ سنت اور معتزلہ کا اختلاف ہے یہ وہ عمل ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول ہو جائے پھر گناہوں کی وجہ سے معتزلہ کے نزدیک باطل ہو جاتا ہے اور اہلِ سنت کے نزدیک باطل نہیں ہوتا۔ لیکن یہاں تو وہ عمل مقام مقبولیت میں نہ آنے کی وجہ سے عمل ہی نہیں بنا۔ (روح المعانی)

"کالذی ینفق ماله رئاء الناس ولا یؤمن بالله والیوم الآخر":

"مثل اس شخص کے جو خرچ کرتا ہے اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لئے اور نہیں ایمان رکھتا اللہ پر، اور نہ ہی آخرت کے دن پر"۔

یہاں جس شخص سے تشبیہ دی گئی اس سے مراد کون ہے؟ "وغالب المفسرین علی ان المراد به المنافق" اکثر مفسرین کا قول یہی ہے کہ اس سے مراد منافق شخص ہے۔

یعنی اے مومنو! تم اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور اذیت پہنچا کر اپنے صدقات کو ضائع نہ کرو اس منافق کی طرح جو لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے، اگر چہ وہ بظاہر ایمان کا دعوی کرتا ہے لیکن حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا نہ ہی اسے ثواب کی امید ہوتی ہے اور نہ ہی اسے اللہ تعالیٰ کے عذاب کا خوف ہوتا ہے، وہ صرف دکھانے کے لئے مال خرچ کرتا ہے جو ضائع ہو جاتا ہے۔ (روح المعانی)

بیضاوی اور مدارک میں بھی منافق ہی مراد لیا گیا ہے۔

"فمثله کمثل صفوان علیه تراب فاصابه وابل فترکه صلدا":

"اس کی مثال ایسے ہے جیسے ایک چکنی چٹان ہو اس پر کچھ مٹی ہو تو پہنچے اسے زوردار بارش، تو چھوڑ دے اسے چٹیل پتھر"۔

"(صفوان) حجر کبیر املس" صاف چکنے بڑے پتھر کو "صفوان" کہا جاتا ہے۔

"(وابل) مطر شدید الواقع" شدید واقع ہونے والی بارش کو "وابل" کہا جاتا ہے۔

"(فترکه صلدا) ای املس لیس علیه شئی من الغبار اصلا"

یعنی "صلدا" کا معنی صاف چکنا پتھر جس پر گرد و غبار بالکل نہ ہو۔

مطلب واضح ہے کہ اسے "چٹیل پتھر" یا "نرا پتھر" کہا جاتا ہے۔

دینی طلبہ کرام کی توجہ کے لئے:

"علیه تراب" میں لفظ "تراب" پر تنوین تنکیر کے لئے ہے اور اس کا استعمال تقلیل کے لئے ہے، اسی وجہ سے اس کا معنی بیان کیا گیا ہے۔ "(علیه تراب) ای شئ یسیر منه" اس پر تھوڑی مٹی ہو۔

مثال کی وضاحت:

منافق کوتشبیہ دی گئی پتھر سے نفع نہ حاصل ہونے کی وجہ سے اور اس کے خرچ کرنے کوتشبیہ دی گئی مٹی سے کہ جس چٹان پر مٹی ہوتو امید ہوتی ہے کہ شائد اس پر پودے پیدا ہو جائیں اس طرح منافق بھی ہوسکتا ہے اجر کی کچھ کچھ امید کرتا ہے اور اس کی ریاءکاری (دکھلاوے) کوتشبیہ دی گئی تیز بارش سے کہ جلدی ہی وہ نفع والی امید کوضائع کردیتی ہے، بارش مٹی کوزائل کر کے اگانے کی امید کوختم کردیتی ہے، اسی طرح ریاءکاری اجر وثواب کی امید کوزائل کردیتی ہے یعنی منافق جو ریاءکاری کی وجہ سے مال خرچ کرتا ہے وہ صاف چکنے بڑے پتھر کی طرح ہے جس پر کچھ مٹی ہوتو اسے زوردار بارش پہنچے اور اس مٹی کوزائل کر کے چٹیل پتھر کردے، اس پر اگانے کی امید کوختم کردے اگر منافق کچھ کچھ اجرو ثواب کی امید رکھتا ہوا اپنے خرچ کرنے میں تو پھر بھی اسے کچھ حاصل نہیں ہوگا، اس لئے کے دکھلاوے نے اس کے خرچ کرنے کوضائع اور برباد کردیا ہے۔

”لا یقدرون علی شئ مما کسبوا“:

”وہ قدرت نہیں رکھیں گے کسی چیز پر جوانہوں نے کسب کیا۔“

یعنی دکھلاوے کے طور پر خرچ کیے ہوئے مال سے انہیں کوئی نفع حاصل نہیں ہوگا، اور نہ ہی انہیں کوئی ثواب ہوگا۔

”واللہ لا یھدی القوم الکافرین“: ”اور اللہ نہیں ہدیت دیتا کافروں کی قوم کو“۔

یعنی اللہ تعالیٰ کافروں کو یہ توفیق نہیں عطاء فرماتا کہ وہ ایسا کام کریں جس سے انہیں قیامت میں نفع ہو اور اجروثواب حاصل ہو، کیونکہ بغیر ایمان کے اعمال کا کوئی فائدہ نہیں۔

تنبیہ:

”وفیہ تعریض بان کلا من الریاء والمن والاذی علی الانفاق من صفات الکفار ولابد للمؤ منین ان یجتنبوھا“

اس سے ایک اور مسئلہ پر اشارہ مل گیا، وہ یہ ہے کہ حقیقت میں دکھلاوے کے لئے کوئی نیکی کا کام کرنا اور خرچ کرنے پر احسان جتلانا اور اذیت پہنچانا کفار کی صفات و عادات ہیں، مومن کو اس سے دور رہنا چاہئے۔ (از روح المعانی)

"فان الصدقة يبطل بالرياء وان كان المنفق مؤمنابالله واليوم الآخرلكن ذكرهذا تنبيها على ان الا نفاق رياء ليس من شان المومن بل هو من سيرةالمنافق"

بیشک صدقہ ریاءکاری سے باطل ہو جاتا ہے اگرچہ خرچ کرنے والا اللہ تعالیٰ اور قیامت پر ایمان رکھنے والا ہی ہو، لیکن یہاں کافروں منافقوں کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ مؤمنوں کو اس بات پر تنبیہ کی جاسکے کہ ریاءکاری منافق کا طریقہ ہے، مؤمن کی شان کے لائق نہیں۔

☆ "عن عبدالله بن عمرو بن العاص قال قال رسول الله ﷺ لايدخل الجنةمنان ولاعاق"

(رواه النسائی والدارمی)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (ابتدائی طور پر) جنت میں نہیں داخل ہوگا احسان جتلانے والا اور ماں، باپ کا نافرمان۔ (مظهری)

☆ "روی عن النبی ﷺ انه قال اياكم والا متنان بالمعروف فانه يبطل الشكرويمحق الاجر"

نبی کریم ﷺ سے روایت کی گئی کہ بیشک آپ نے فرمایا تم اپنے آپ کو اچھے کاموں پر احسان جتلانے سے دور رکھو کیونکہ اس سے شکر ضائع ہو جاتا ہے اور اجر مٹ جاتا ہے۔

ریاءکاری شرک اصغر ہے:

"عن محمود بن لبيد ان النبی ﷺ قال ان اخوف ما اخاف عليكم الشرك الاصغر قالوايارسول الله ﷺ وما الشرك الاصغر قال الرياء" (رواه احمد)

محمود بن لبید کہتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا مجھے تم پر زیادہ خوف شرک اصغر (چھوٹے شرک) کا ہے، صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ شرک اصغر کیا ہے؟ آپ نے فرمایا ریاء (دکھلاوہ)۔ (مظہری)

اسی حدیث کے آخر میں بیہقی شعب الایمان میں یہ الفاظ مبارکہ زائد ہیں۔

"یقول الله لهم یوم یجازی العباد باعمالهم اذهبواالی الذین کنتم تراء ون فی الدنیا فانظرواهل تجدون عند هم جزاء اوخیرا"

جس دن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جزاء دے گا اس دن ریاء کاری والوں کو فرمائے گا تم ان لوگوں کی طرف جاؤ جن کو دنیا میں دکھاتے تھے، اب دیکھو کیا ان سے تمہیں اجر وثواب حاصل ہوتا ہے۔ (مظهری)

☆ "وعن ابی سعید ابن فضالة عن رسول الله ﷺ قال اذا جمع الله الناس یوم القیامة لیوم لاریب فیه نادی مناد من کان اشرک فی عمل عمله لله احدا فلیطلب ثوابه من غیرالله فان الله اغنی الشرکاء عن الشرک" (رواه احمد)

ابوسعید بن فضالہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن لوگوں کو جمع فرمائے گا جس دن میں کوئی شک کی جگہ نہیں، اس دن نداء دینے والا نداء دے گا جس نے اللہ کے لئے عمل کرتے ہوئے کسی ایک کو اس عمل میں شریک کیا، وہ اسی غیر اللہ سے اپنا ثواب طلب کرے بیشک اللہ تعالیٰ شرکاء کے شرک سے بے پرواہ ہے۔ (مظهری)

☆ " وعن شداد بن اوس قال سمعت رسول الله ﷺ یقول من صلی یرائی فقد اشرک ومن صام یرائی فقد اشرک ومن تصدق یرائی فقد اشرک" (رواه احمد)

شداد بن اوس فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے فرماتے ہوئے سنا جس شخص نے نماز ادا کی دکھلاوے کے لئے تحقیق اس نے شرک کیا، اور جس نے روزہ رکھا دکھلاوے کے لئے تحقیق اس نے شرک کیا اور جس شخص نے صدقہ دیا دکھلاوے کے لئے تحقیق اس نے شرک کیا۔ (مظهری)

اس حدیث پاک میں جس شرک کا ذکر ہے اس سے مراد شرک اصغر ہی ہے۔

☆ " عن ابی هریرة ان اول الناس یقضی علیه یوم القیامة رجل استشهد فاتی به فعرفه نعمته فعرفها فقال فما عملت فیها قال قاتلت فیک حتی استشهدت قال کذبت و

لکنک قا تلت لان یقال جری ، فقد قیل ثم امربه فسحب علی وجهه حتی القی فی النار، ورجل تعلم العلم وعلمه وقرأ القرآن فاتی به فعرفه نعمه فعر فها قال فما عملت فیها قال تعلمت العلم وعلمته وقرأت فیک القرآن قال کذ بت ولکنک تعلمت العلم لیقال انک عالم وقرأت القرآن لیقال هو قاری فقد قیل ثم امربه فسحب علی وجهه حتی القی فی النار ورجل وسع الله علیه واعطاه من اصناف المال کله فأتی به فعرفه نعمه فعرفها قال فما عملت فیها قال ما ترکت من سبیل تحب ان ینفق فی سبیل الله الا انفقت فیها لک قال کذبت ولکنک فعلت لیقال هوجواد فقد قیل به ثم امربه فسحب علی وجهه ثم القی فی النار" (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک سب لوگوں سے پہلے قیامت کے دن اس شخص کے متعلق فیصلہ کیا جائے گا جو شہید کر دیا گیا، اسے (رب تعالیٰ کے حضور) لایا جائے گا، رب تعالیٰ اسے اپنی نعمتوں کی پہچان کرائے گا وہ پہچان لے گا، (یعنی تسلیم کرلے گا کہ اے اللہ تو نے مجھے ان گنت نعمتیں عطاء کی تھیں) تو رب تعالیٰ فرمائے گا تو نے ان نعمتوں پر عمل کیا کیا تھا؟ وہ کہے گا میں نے تیری رضاء کے لئے جہاد کیا یہاں تک کہ میں شہید ہو گیا، رب تعالیٰ فرمائے گا تو نے جھوٹ کہا، لیکن تو نے جہاد اس لئے کیا تھا کہ تجھے بہادر کہا جائے وہ کہہ دیا گیا، پھر اس کے متعلق حکم دیا جائے گا اسے منہ کے بل گھسیٹ کر آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ اور ایک اور شخص جس نے علم سیکھا ہوگا اور سکھایا ہوگا اور قرآن پڑھا ہوگا اور پڑھایا جائے گا، اسے لایا جائے گا، رب تعالیٰ اسے اپنی نعمتوں کی پہچان کرائے گا، وہ پہچان لے گا (یعنی تسلیم کرلے گا) رب تعالیٰ اسے فرمائے گا تو نے ان نعمتوں پر کیا عمل کیا؟ وہ کہے گا میں نے علم حاصل کیا اور دوسروں کو پڑھایا اور قرآن پڑھا یہ سب کام تیری رضاء کے لئے کیا، رب تعالیٰ فرمائے گا تو نے جھوٹ کہا، لیکن تو نے علم اسے لئے حاصل کیا تھا کہ تجھے عالم کہا جائے، اور تو نے قرآن اس لئے پڑھا تھا کہ یہ کہا جائے وہ شخص قاری ہے، یہ تو کہہ دیا گیا۔ پھر اس کے متعلق حکم دیا جائے گا اسے چہرے کے بل گھسیٹ کر آگ میں ڈال دیا جائے گا، اور ایک شخص کو اللہ

تعالیٰ نے وسعت دی ہوگی اور اسے ہر قسم کا مال دیا ہوگا، اسے لایا جائے گا رب تعالیٰ اسے اپنی نعمتوں کی پہچان کرائے گا وہ پہچان لے گا، (یعنی تسلیم کرلے گا) رب تعالیٰ فرمائے گا تو نے ان نعمتوں پر کیا عمل کیا تھا؟ وہ کہے گا اے اللہ جو تو پسند کرتا تھا کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا جائے ان راہوں میں سے میں نے کسی راہ کو بھی نہیں چھوڑا یہاں تک کہ ان راہوں میں تیری رضاء کے لئے مال خرچ کیا، رب تعالیٰ فرمائے گا تو نے جھوٹ کہا، لیکن تو نے یہ کام اس لئے کیا تھا کہ تجھے سخی کہا جائے وہ کہہ دیا گیا، تو اس کے متعلق حکم دیا جائے گا، اسے چہرے کے بل گھسیٹ کر آگ میں ڈال دیا جائے گا۔

اس حدیث پاک کو دیکھ کر کئی جہلاء، مکار، جھوٹے، فریبی علماء کو جہنمی کہہ کر اپنی عاقبت خراب کر رہے ہیں کہ یہ ریاء کار ہیں، لیکن ان جاہلوں کو یہ پتہ نہیں کہ ریاء کاری دل کا کام ہے اس پر صرف رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو علم حاصل ہوتا ہے دوسرا کوئی دعویٰ کرے تو وہ کذاب ہے۔

کیا میدان جنگ میں شہید ہونے والے ہر شخص کو ریاء کار سمجھ کر جہنمی کہہ دیا جائے گا؟ کیا اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے والے ہر شخص کو ریاء کار سمجھ کر جہنمی کہہ دیا جائے گا؟ نہیں نہیں، یہ صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو حق پہنچتا ہے وہ کسی کے متعلق فیصلہ کریں۔

فقیر کو غنیمت سمجھا جائے:

☆ "قال رسول الله ﷺ لو لا الفقراء لهلك الاغنياء"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر فقراء نہ ہوتے تو اغنیاء ہلاک ہوجاتے یعنی اغنیاء کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے کے لئے مصرف نہ ملتا۔

☆ "قال رسول الله ﷺ اليد العليا خير من اليد السفلى"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔

اگرچہ زیادہ حضرات نے تو اس کا مطلب یہ بیان کیا کہ دینے والا لینے والے سے بہتر ہے لیکن بعض حضرات

نے عجیب تشریح فرمائی جو راقم کے دل کو بھی بھلی لگی۔

”قیل ان الید العلیا ھی ید الفقیر و السفلی ید الغنی تعلی السفلی وتاخذ العلیا“

کہ اوپر والا ہاتھ فقیر کا ہے اور نیچے والا ہاتھ غنی کا ہے، کیونکہ دینے والا اپنا ہاتھ نیچے رکھتا ہے اور لینے والا اوپر سے اٹھاتا ہے۔ (روح البیان)

☆☆☆☆☆

وَمَثَلُ الَّذِیْنَ یُنفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ وَتَثْبِیْتًامِّنْ اَنْفُسِھِمْ کَمَثَلِ جَنَّۃٍ بِرَبْوَۃٍ اَصَابَھَاوَابِلٌ فَآتَتْ اُکُلَھَاضِعْفَیْنِ فَاِنْ لَّمْ یُصِبْھَاوَابِلٌ فَطَلٌّ وَاللّٰہُ بِمَاتَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ☆

(سورۃ البقرۃ آیت ۲۶۵)

﴿۱﴾

اوران کی کہاوت جو اپنے مال اللہ تعالیٰ کی رضاء چاہنے میں خرچ کرتے ہیں اور اپنے دل جمانے کو اس باغ کی سی ہے جو بھوڑ پر ہو، اس پر زور کا پانی پڑا تو دونے میوے لایا، پھر اگر زور کا مینہ اسے نہ پہنچے تو اوس کافی ہے اور اللہ تمہارے کام دیکھ رہا ہے۔

﴿۲﴾

اور مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ تعالیٰ کی رضاء طلب کرنے کے لئے اور اپنے دلوں کو ثابت کرنے کے لئے۔ (ان کی مثال ایسے ہے) جیسے باغ ہو کچھ بلند اور عمدہ زمین میں پہنچے اس کو زوردار پانی تو وہ دے اپنا پھل دوگنا، اگر نہ پہنچے اسے زوردار پانی تو شبنم ہی کافی ہے اور جو تم عمل کرتے ہو اللہ دیکھنے والا ہے۔

ماقبل سے تعلق:

جب اس آیۃ کریمہ سے پہلی آیۃ کریمہ میں صدقات کے بعد احسان جتلانے اور ایذاء پہنچانے والوں اور

ریاء کاری کرنے والوں کو ایک مثال کے ذریعے سمجھایا، تو اس آیۃ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی حاصل کرنے والوں کو ایک مثال کے ذریعے سمجھایا جارہا ہے۔

مختصر مطلب:

جولوگ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں اس لئے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی حاصل ہو، اوران کے دل ایمان واطاعت پر قائم رہیں تو ان کا وہ مال قلیل ہو یا کثیر ہو ہر مال میں وہ رب کے حضور مقبول ہوگا۔ پھر اس میں زیادہ خلوص ہوا تو زیادہ اجر وثواب حاصل ہوگا اور کم خلوص ہوا تو اجر وثواب کچھ کم ہوگا لیکن وہ خرچ کرنا ضائع نہیں ہوگا، جس طرح باغ زرخیز زمین میں ہو تو اسے زوردار بارش پہنچے تو وہ زیادہ پھل دیتا ہے لیکن اگر اسے تیز بارش نہ پہنچے تو شبنم یا ہلکی پھوار ہی کافی ہے جس سے وہ پھل دیتا ہے پھل سے خالی نہیں رہتا۔

”ومثل الذين ينفقون اموالهم ابتغاء مرضات الله و تثبيتا من انفسهم“:

”اور مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال طلب کرنے کے لئے اللہ کی رضاء اور ثابت کرنے کے لئے اپنے دلوں کو۔“

”ابتغاء“ کا معنی ہے طلب کرنا یہ باب افتعال ہے، مجرد اور مزید دونوں کا ایک ہی معنی ہے اس میں خاصہ موافقت فعل ہے، لہٰذا ”بغیت“ اور ”ابتغیت“ دونوں کا معنی ہے ”طلبت“ میں نے طلب کیا۔

اللہ تعالیٰ نے جن خرچ کرنے والوں کی یہاں تعریف فرمائی ان کی دوغرضوں کو ذکر فرمایا کہ وہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں ان کی ایک غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ اللہ کی رضاء طلب کرتے ہیں اور دوسری ان کی غرض ”تثبیت نفس“ ہوتی ہے۔ ”تثبیت نفس“ کی چند وجوہ ہیں۔

﴿۱﴾ ان وجوہ میں سے ایک وجہ یہ ہے۔

" انهم یو طنون انفسهم علی حفظ هذه الطاعة و ترک مایفسدها"

کہ وہ مال خرچ کرنے کی وجہ سے طاقت حاصل کرتے ہیں وہ اس میں اپنے نفسوں کو قائم رکھتے ہیں اور اس عبادت کو ضائع کرنے والی چیزوں کو چھوڑ دیتے ہیں تا کہ اس عبادت سے حاصل ہونے والا اجر وثواب ضائع نہ ہو، جب وہ تمام مفسدات کو چھوڑتے ہیں تو یقیناً احسان جتلانے اور ایذاء پہنچانے اور ریاء کاری سے بھی دور رہتے ہیں۔

﴿۲﴾ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ مومنوں کے نزدیک اپنے نفسوں کو ثابت کرنے کے لئے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں کہ ان کے نفوس ایمان میں سچے اور مخلص ہیں۔ چونکہ بعض قراتوں میں ہے "و تثبیتا من بعض انفسهم" اس کے لحاظ سے مندرجہ بالا مطلب بہتر ہوگا یہ قول مجاہد کا ہے، تاہم قرطبی میں اس قول کو ناپسند کیا گیا ہے، البتہ علامہ رازی رحمہ اللہ کی بیان کردہ تیسری وجہ تقریباً اسی کا بیان ہے۔

﴿۳﴾ انسان کے نفس کو مقام عبودیت میں کوئی ثبات نہیں اس وقت تک جب تک اسے مجاہدہ سے مقہور نہ کیا جائے یعنی مجاہدہ ومحنت ومشقت سے نفس پر قہر و جبر کیا جائے تو نفس مقام عبودیت میں قائم رہتا ہے اور یہ اس وقت حاصل ہوتا ہے جب نفس کو دو پسندیدہ چیزوں کا زوال پایا جائے وہ دو چیزیں یہ ہیں، کہ انسان کو دنیا کی زندگی سے زیادہ محبت ہے اور مال سے زیادہ محبت ہے جب مال خرچ کرنے کا حکم دیا گیا تو نفس کو بعض وجوہ سے مقہور کر دیا گیا، اور جب جان قربان کرنے کا حکم دیا گیا تو نفس کو مکمل طور پر مقہور کر دیا گیا جب اس آیۃ کریمہ میں مال خرچ کرنے کا حکم پایا گیا ہے تو بعض وجوہ سے نفس پر قہر پایا گیا ہے تو تثبیت (نفس کو ثابت رکھنا) بھی بعض وجوہ سے پائی گئی ہے اسی وجہ سے "من" برائے "تبعیض" داخل کیا گیا ہے، اب معنی یہ ہوا۔

"من بذل ماله لو جه الله فقد ثبت بعض نفسه"

جس شخص نے اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی کے لئے اس نے اپنے بعض نفس کو ثابت کر لیا اور قرار دے دیا۔

"ومن بذل ماله وروحه معافهو الذی ثبتها کلهاوهو المرادمن قوله تعالی وتجاهدون فی سبیل الله باموالکم وانفسکم"

جس شخص نے مال اور جان دونوں ہی اللہ کی راہ میں خرچ کر دیئے وہ کامل طور پر نفس پر کامیاب ہو گیا اور اس نے کامل طور پر اپنے نفس کو قرار دے دیا۔

تنبیه: باقی سب صورتوں میں " من " ابتدائیہ ہے " تبعیضیۃ' صرف اسی صورت میں ہے۔

یہ تفسیر علامہ زمخشری معتزلی نے کشاف میں بیان کی لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ نے اسے پسند کرتے ہوئے فرمایا" وهو كلام حسن و تفسير لطيف" یہی اچھا کلام ہے اور اچھی تفسیر ہے۔

﴿۴﴾ علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسی مقام پر لکھتے ہوئے میرے دل میں خیال آیا کہ دل کو قرار سوائے اللہ تعالیٰ کے ذکر کے حاصل نہیں ہوتا، کیونکہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔" الا بذكر الله تطمئن القلوب" خبردار اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے دل کو قرار کیسے آتا ہے؟ تو اس کا جواب ذہن میں یہ آیا۔

" من انفق ماله في سبيل الله لم يحصل له اطمينان القلب في مقام التجلي الا اذا كان انفاقه لمحض غرض العبودية "

جو شخص اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے بظاہر تو یہ سمجھ آتا ہے کہ اس کے دل کو قرار حاصل نہیں ہوتا لیکن جب وہ مال اپنے آپ کو بندہ سمجھ کر اور رب تعالیٰ کو معبود سمجھ کر خالص اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے خرچ کرتا ہے تو اس کے دل کو قرار حاصل ہوتا ہے رب تعالیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مسکین ویتیم وقیدی پر مال خرچ کرنے کے بعد ان کے قول کی حکایت ان الفاظ مبارکہ سے بیان فرمائی۔

" انما نطعكم لو جه الله لانريد منكم جزاء ولا شكورا" (سورة الدهر)

ہم تمہیں طعام کھلاتے ہیں صرف اللہ کی رضاء کے لئے ہم نہیں چاہتے تم سے کوئی بدلہ اور شکر گزاری۔

اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خرچ کرنے کی تعریف ان الفاظ مبارکہ سے فرمائی۔

"ومالاحدعنده من نعمة تجزى الاابتغاء وجه ربه الاعلى ولسوف يرضى"

اور کسی کا اس پر کوئی احسان نہیں جس کا بدلہ دیا جائے صرف اپنے رب تعالیٰ کی رضاء چاہتا ہے جو

سب سے بلند ہے اور بیشک قریب ہے کہ وہ راضی ہوگا۔

واضح ہوا کہ جب انسان اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا بندہ سمجھ کر اور اپنے آپ پر اللہ تعالیٰ کا حق سمجھ کر رب تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرے، اس میں اپنے نفس کی کوئی غرض نہ ہو، اور اپنے دنیاوی مقاصد اس میں نہ ہوں۔

"فهناک اطمأن قلبه و استقرت نفسه و لم يحصل لنفسه منازعة مع قلبه"

تو اس سے دل کو اطمینان حاصل ہوگا اور اس کے نفس کو قرار حاصل ہوگا اور اس کے نفس کو اس کے دل سے کوئی جھگڑا نہیں ہوگا۔

﴿۵﴾ پانچویں وجہ یہ ہے کہ جب بھی کوئی کام بار بار کیا جائے تو اس سے ملکہ حاصل ہو جاتا ہے۔ ملکہ کیفیت راسخہ کو کہا جاتا ہے یعنی پختہ کیفیت جو انسان کی پکی عادت بن جائے وہ حاصل ہو جاتی ہے۔ لہٰذا جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں بار بار مال خرچ کرتا ہے اور اس کا مقصد بھی صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء حاصل کرنا ہوتا ہے تو اس کی یہ عادت بن جاتی ہے وہ آسانی سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کر لیتا ہے۔ اور دوسری چیز اسے یہ حاصل ہوتی ہے کہ رب تعالیٰ کی رضاء کی طلب اس کے نفس میں قرار پکڑ جاتی ہے۔ اگر کبھی وہ غفلت سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرلے تو اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی طلب کی طرف توجہ کرنا نہ آئے۔

"فرجع القلب الى جانب القدس" تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے، یعنی اس کے دل کی غفلت حضوریٔ قلب سے بدل جاتی ہے۔

" وذلک بسبب ان تلک العبادة صارت كالعادة و الخلق للروح "

کیونکہ عبادت اس کی عادت بن چکی ہے، اور اس کے روح کا حصہ اور اس کی غذا کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

بندہ جب اللہ تعالیٰ کی طاعت اور اس کی رضاء طلب کرنے کے لئے اس کی عبادت کرتا ہے تو اسے ملکہ حاصل ہو جاتا ہے یہی تثبیت نفس (نفس کا قرار پکڑنا) ہے، رب تعالیٰ نے اسی کا ذکر ان الفاظ مبارکہ سے کیا۔

"يثبت الله الذين آمنوا بالقول الثابت" اللہ ثابت رکھتا ہے ایمان والوں کو قول ثابت سے۔

" تصير الروح فی هذا العالم من جوهر الملائكة الروحانية و الجواهر القدسية فصار

العبد کما قاله بعض المحققین غائباحاضرا،ظاعنامقیما"

اس وقت اس شخص کی روح دنیا میں ہی فرشتوں کی روحانیت کا جوہر بن جائے گی، اور جواہر قدسیہ کے درجہ میں آجائے گی، محققین حضرات کے قول کے مطابق بندے کو یہ کیفیت حاصل ہوجائے گی کہ وہ غائب ہوتے ہوئے بھی حاضر ہوگا اور مسافر ہوتے ہوئے بھی مقیم سمجھا جائے گا۔

﴿٦﴾ تثبیت نفس سے مراد یہ ہے کہ وہ مال خرچ کرنے پر یقین رکھتے ہیں اور ان کے نفوس اس پر مطمئن ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس پر اجر وثواب عطاء فرمائے گا اور ان کے عمل کو ضائع نہیں کرے گا ان کی امیدیں محرومیت اور رسوائی کی طرف نہیں جائیں گے لیکن منافق اپنے عمل کو ضائع سمجھتا ہے اور ثواب کی امید نہیں رکھتا۔لہٰذا مؤمن کے ثواب پر یقین رکھنے کو تثبیت نفس کہا جاتا ہے۔

"کمثل جنة بر بوة": (ان کی مثال ایسے ہے) جیسے باغ ہو کچھ بلند اور عمدہ زمین میں۔

"جنة" باغ، یہ زمین کے اس ٹکڑے کو کہا جاتا ہے جس میں درخت اگیں اور اس زمین کو ڈھانپ دیں کیونکہ اس لفظ میں فاء کلمہ میں جیم ہے اور عین کلمہ میں نون ہے یہ قانون جس کلمہ میں پایا جائے گا اسی میں چھپانے کا معنی پایا جائے گا جیسے "جن" وہ بھی نظروں سے پوشیدہ ہوتا ہے، اور "جنین" وہ بھی ماں کے پیٹ میں پوشیدہ ہوتا ہے۔

"ربوة" (بفتح الراء وضمها) عاصم اور ابن عامر کی قرأت میں راء کی زبر سے اور باقی حضرات کی قرأت میں راء کی پیش سے پڑھا گیا۔

"ربا یربو" بڑھنا، بلند ہونا، اسی سے "رابیہ" لیا ہوا ہے، جس کے اجزاء بلند ہوں۔

"واعلم ان المفسرین قالو االبستان اذا کان فی ربوة من الارض کان احسن و اکثر ریعا"

اکثر مفسرین کرام نے اس مقام پر "ربوة" کا بلند مقام لیا ہے، اور وجہ یہ بیان کی ہے کہ بلند جگہ پر جو باغ ہو اس کی پیداوار زیادہ ہوتی ہے اور وہ حسن منظر پیش کرتا ہے۔

لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ اس پر اعتراض کرتے ہیں اور پھر اپنا مختار بیان فرماتے ہیں۔

" ولی فیه اشکال وهو ان البستا ن اذا کان فی مر تفع من الارض کان فوق الماء ولا تر تفع الیه انها ر وتضر به الریاح کثیر فلا یحسن ریعه وذا کان فی وهدة من الأرض انصبت میاہ الانهار ولا یصل الیه اثارة الریاح فلا یحسن ایضاریعه فاذن البستان انما یحسن ریعه اذا کان علی الارض المستویة التی لا تکون ربوة ولا وهدة فاذن لیس المراد من هذه الر بوة ما ذکر وہ،بل المراد منه کون الارض طیناحرابحیث اذا نزل المطر علیه انتفع وربا ونماء، فان الارض متی کانت علی هذه الصفة یکثر ریعهاوتکمیل الاشجارفیها"

عام مفسرین کرام نے مطلقاجو'' ربوۃ'' کا معنی'' بلند جگہ'' کیا ہے مجھے اس پر اعتراض ہے، اس لئے کہ جو زمین کی بلندی پر باغ واقع ہو اس پر نہروں کا پانی نہیں پہنچتا اسکی پیداوار اچھی نہیں ہوتی اور وہ ہواؤں کی زد میں ہوتا ہے اس لئے پھولوں اور پھلوں کا گر جانا بھی یقینی امر ہوتا ہے لہذا اس کی پیداوار کم ہو سکتی ہے زیادہ نہیں۔ اسی طرح جب باغ پست زمین میں ہو تو وہاں نہروں کا پانی کھڑا ہو جاتا ہے اور ہوائیں مناسب مقدار میں نہیں پہنچتیں، اس لئے اس کی پیداوار بھی اچھی مقدار میں نہیں ہوتی۔ وہی باغ زیادہ پھل دیتا ہے جو ہموار زمین میں ہو نہ وہ باغ ٹیلے پر ہو اور نہ ہی پست جگہ میں ہو، لہذا واضح ہوا کہ عام مفسرین کا مطلق'' ربوۃ'' کا معنی بلند جگہ کرنا صحیح نہیں، بلکہ اس سے مراد وہ زمین جس میں نمی بھی ہو اور حرارت (گرمائش) بھی ہو تا کہ بارش کے برسنے پر وہ زمین آٹے کی طرح نرم ہو کر پھول جائے یعنی ابھی ابھر آئے اور اس میں پیداوار زیادہ پائی جائے جس صفت کا میں نے تذکرہ کیا جب زمین اس صفت پر ہوگی تو یقینا اس کی پیدوار بھی زیادہ ہوگی اور درخت بھی مکمل طور پر لہلہاتے ہوئے سرسبز وشاداب نظر آئیں۔

یہ معنی جو میں نے بیان کیا ہے اسے دو وجہ سے تائید بھی حاصل ہے ایک ان میں سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔

"وتری الارض هامدةفاذاانزلناعلیهاالماء اهتزت وربت وانبتت من کل زوج بهیج"

(پ۱۷، الحج ۵)

اور تو زمین کو دیکھے مرجھائی ہوئی پھر جب ہم نے اس پر پانی اتارا تر و تازہ ہوئی اور ابھر آئی اور ہر رونق دار جوڑا اگالائی۔

یہاں " رَبَت "کا معنی زمین کا ابھر آنا، یہ وہی معنی ہے جو ہم نے " ربوۃ "کا بیان کیا ہے۔

دوسری وجہ تائید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ مثال پہلی کے مقابل ذکر فرمائی، پہلی مثال میں ' صفوان " کا ذکر فرمایا جس میں بارش اثر نہیں کرتی "ولا یربو ولا ینمو بنزول المطر علیه" اور بارش اس پر برستی رہے تو پھر بھی اس میں نرمی اور ابھرنے اور پودہ جات بڑھانے کی کوئی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔

"فکان المرادبالربوۃ فی ھذاالمثل کون الارض بحیث تربو وتنمو "فھذاماخطر ببالی واللہ اعلم بمراده"

لہٰذا اس آیۂ کریمہ میں ' ربوۃ '' سے مراد وہ زمین ہے جو نرم ہو کر ابھرے اور پودہ جات کو بڑھائے جو میرے دل میں تحقیق سمجھ آئی تھی وہ بیان کر دی، حقیقت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ (کبیر)

"فالمراد من الربوۃ حینئذ کون الارض لینة جیدة بحیث اذا نزل المطر علیھا انتفخت وربت ونمت"

اس آیۂ کریمہ میں " ربوۃ " سے مراد وہ زمین ہے جو نرم اور عمدہ ہو اس لحاظ پر جب کہ اس پر بارش برسے تو وہ نرم ہو جائے ابھر آئے اور پوداجات بڑھائے۔ (روح البیان)

"لیس المراد من ھذه الربوۃما ذکروه بل المرادمنھا کون الارض طیبة جیدة بحیث اذا نزل المطر علیھا انتفخت وربت فان الارض اذا کانت بھذه الصفة یکثر ریعھا و یکمل اشجارھا"

اس مقام میں ' ربوۃ '' کا معنی بلند جگہ نہیں جو عام مفسرین نے ذکر فرمایا، بلکہ مراد زمین کا اچھا اور عمدہ ہونا ہے۔ اس لحاظ پر کہ جب اس پر بارش برسے تو وہ زمین ابھر آئے اور نرم ہو جائے، جب اس طرح کی زمین ہوگی تو اس کی پیداوار زیادہ ہوگی، اور اس کے درخت مکمل ہوں گے۔ (شیخ زادہ)

اقوال میں تطبیق:

جب بعض مفسرین کرام نے ' ربوۃ ' کا معنی ' بلند جگہ '' کیا ہے، اور بعض محققین مفسرین کرام نے '' اچھی، عمدہ، نرم، زرخیز زمین '' مراد لی ہے، تو ان میں راقم کے خیال میں تطبیق کی صورت وہ نظر آئی

جو ترجمہ میں پیش کردی وہ یہ ہے کہ اس مقام میں ''ربوۃ'' کا معنی کچھ بلند عمدہ زمین ہے۔ یعنی '' بلند جگہ'' سے جو عام تصور آتا ہے کہ اس کا معنی ''بلند ٹیلا'' ہے وہ نہیں، بلکہ بہت معمولی بلند جہاں پانی نہ کھڑا ہو سکے اور نہری پانی وہاں پہنچ سکے اور ہوا کی کمی بھی نہ ہو اور تیز ہوا کی زد میں وہ زمین نہ ہو اور عمدہ زرخیز زمین ہو۔ راقم کے ذہن میں یہ بات قرطبی کی مندرجہ ذیل عبارت دیکھ کر آئی

والربوۃ المکان المرتفع ارتفاعا یسیرا معه فی الاغلب کثافة تراب وما کان کذلک فنباته احسن''

ربوۃ'' اسی جگہ کو (یہاں) کہا گیا ہے جو معمولی بلند ہو اس میں مٹی زیادہ ہو، یعنی نہ ہی خالص ریت ہو اور نہ ہی پتھروں کی کثرت ہو بلکہ عمدہ اور نرم اور زرخیز زمین ہو، جب زمین میں یہ صفات پائی جائیں گی تو اس کی پیداوار زیادہ ہوگی اور اس کے پودا جات اور درخت خوبصورت ہوں گے۔ (از قرطبی)

تنبیہ: اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ''ربوۃ'' کا ترجمہ کیا ہے ''بھوڑ'' یہ لفظ ہماری زبان میں عام استعمال نہیں۔

فیروز اللغات میں ''بھوڑ'' کا معنی ریگستان، ریتلی زمین، کیا گیا ہے۔ اس کا معنی نرم زمین لیا جائے تو کچھ بات بنتی لیکن ذہن مطمئن نہ ہوا۔

راقم اسلام آباد ایف سکس ون میں مسجد غوثیہ میں نماز اور جمعہ پڑھاتا ہے، یہاں اس محلہ میں ہندوستان کے بزرگ مہاجرین سے کئی حضرات تشریف فرما ہیں، میں نے جمعہ کی تقریر کے بعد لاؤڈ سپیکر کے ذریعہ اعلان کیا کہ بریلی کے علاقہ کے کوئی بزرگ ہوں تو مجھے علاقائی زبان میں ''بھوڑ'' کا معنی بتائیں تو ایک بزرگ نے بتایا کہ ''معمولی بلند جگہ'' کو اس علاقہ میں ''بھوڑ'' کہتے ہیں، ان کے ارشاد کو سن کر یہی سمجھا کہ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ بھی قرطبی کی تفسیر کے مطابق ہی ہے۔'' واللہ اعلم بالصواب''

"اصابها وابل فآتت اکلها ضعفین '' پہنچے اس کو زوردار پانی تو وہ دے اپنا پھل دوگنا۔

'' وابل'' کا معنی اگرچہ ''زوردار بارش'' بھی ہے، لیکن یہاں مراد عام ہے کہ پانی باغ کو بارش کے ذریعے پہنچے یا نہروں کے ذریعے پہنچے، اسی لئے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ''زور کا پانی'' ترجمہ کیا ہے، اور راقم نے بھی وہی نقل

کیا ہے۔دوگنا پھل دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ''زیادہ پھل دے'' اگر چہ بعض حضرات نے یہ معنی بھی بیان کیا ہے کہ وہ باغ سال میں دومرتبہ پھل دے، لیکن پہلا معنی ''یعنی مقدار میں زیادتی'' زیادہ بہتر ہے۔

''ان لم یصبھا وابل فطل'': ''اگر نہ پہنچے اسے زوردار پانی توشبنم ہی کافی ہے''۔

یعنی جب باغ نرم اور زرخیز زمین میں ہوتو زوردار پانی کی وجہ سے وہ زیادہ پھل دیتا ہے اور زوردار پانی اسے نہ پہنچے تو اسے شبنم یا معمولی پھوار ہی کافی ہوتی ہے وہ اسی سے پھل دیتا ہے۔

''واللہ بما تعملون بصیر'': ''اور اللہ جو تم عمل کرتے ہو دیکھنے والا ہے''۔

یہاں'' بصیر'' سے مراد' علیم'' ہے، یعنی اللہ تعالیٰ خرچ کرنے کی مقدار اور کیفیت اور نیت کو جانتا ہے ۔اوران امور کو جانتا ہے جو صدقہ کا باعث بنے ہیں، لہٰذا بہتر مقصد کے لئے صدقہ کیا تو رب تعالیٰ بہتر جزادے گا۔اور اگر بہتر ارادہ نہیں تو رب تعالیٰ اسی قسم کا بدلہ دے گا۔ (کبیر)

فائدہ: عقلمند کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے تو اس میں خلوص پایا جائے، خلوص اس وقت پایا جائے گا جب وہ ریاء کاری، احسان جتلانے، اذیت پہنچانے، غرضیکہ شیطان کی ہرراہ سے وہ دور رہے، جسے نبی کریم ﷺ نے شرک اصغر کہا ہے۔"فان الخلاص یبتنی علی الاخلاص" بیشک عبادت میں خلوص کی دارو مدار شرک خفی سے چھٹکارا پانے پر ہے۔

☆ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے۔

''ان الصدقة اذاخرجت من یدصاحبھاقبل ان تدخل فی یدالسائل تتکلم بخمس کلمات اولا ھاتقول کنت قلیلة فکثرتنی و کنت صغیرة فکبر تنی و کنت عدوا فاحبتنی و کنت فانیافابقیتنی و کنت محروساالآن صرت حارسک''

صدقہ دینے والے کے ہاتھ سے جب صدقہ نکلتا ہے اور ابھی تک سائل کے ہاتھ میں نہیں پہنچتا تو وہ صدقہ پانچ باتوں کا تذکرہ کرتا ہے۔

(۱) میں قلیل تھا تو نے مجھے کثیر کر دیا، (۲) میں چھوٹا تھا تو نے مجھے بڑا کر دیا

(۳) میں دشمن تھا تو نے مجھے اپنا محبوب بنالیا، (۴) میں فانی تھا تو نے مجھے باقی بنا دیا،

(۵) میں تیری حفاظت میں تھا اب میں تیرا محافظ بن گیا ہوں۔ (روح البیان)

صدقہ کا ایک ایک حرف کمال پر دلالت کر رہا ہے:

صدقہ کا صاد ''الصد'' پر دلالت کر رہا ہے، صد، یصد کا معنی ہے روکنا، صدقہ صاحب صدقہ کو گناہوں سے روکتا ہے جو دنیا اور آخرت میں وہ شخص گناہوں سے رک کر محفوظ رہتا ہے۔

صدقہ کا ''دال'' دلیل، پر دلالت کر رہا ہے، یعنی صدقہ دلیل ہے اس پر کہ صدقہ دینے والا جنتی ہے۔

صدقہ کا ''قاف'' قرب، پر دلالت کر رہا ہے کہ صدقہ صاحب صدقہ کو اللہ تعالیٰ کا قرب عطاء کرتا ہے۔

صدقہ کی ''ہا'' ہدایت، کی نشاندہی کر رہی ہے کہ صدقہ دینے والے کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت سے نوازا ہے۔ اسی لئے وہ صدقہ دے رہا ہے۔ (از روح البیان)

"وفی الحدیث"من قطع رجاء من التجأالیه قطع اللّٰہ رجاء ہ"

جو شخص اپنی امیدیں اس سے منقطع کر لیتا ہے جسے وہ صدقہ دیتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اسے تمام سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

از سر بنہ ایں کلاہ و دستار جہدی بکن و دلی بدست آر

سر سے یہ پگڑی اور ٹوپی اتار دے۔ کوشش کر کسی کا دل ہاتھ میں لا۔

یعنی صرف اپنی زیب و زینت کا ہی خیال نہ کر بلکہ دوسروں پر مہربانی کرنا سیکھ تاکہ تو کامیاب ہو جا۔ (از روح البیان)

☆☆☆☆☆

اَیَوَدُّ اَحَدُکُمۡ اَنۡ تَکُوۡنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنۡ نَّخِیۡلٍ وَّاَعۡنَابٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ لَهٗ فِیۡهَا مِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ وَاَصَابَهُ الۡکِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّیَّةٌ ضُعَفَآءُ فَاَصَابَهَآ اِعۡصَارٌ فِیۡهِ نَارٌ فَاحۡتَرَقَتۡ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَکُمُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّکُمۡ تَتَفَکَّرُوۡنَ ☆ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۶۶)

﴿۱﴾

کیا تم میں سے کوئی اسے پسند رکھے گا کہ اس کے پاس ایک باغ ہو کھجوروں اور انگوروں کا جس کے نیچے ندیاں بہتیں اس کے لئے اس میں ہر قسم کے پھلوں سے ہے اور اسے بڑھاپا آیا اور اس کے ناتواں بچے ہیں تو آیا اس پر ایک بگولا جس میں آگ تھی تو جل گیا ایسا ہی بیان کرتا ہے اللہ تم سے اپنی آیتیں کہ کہیں تم دھیان لگاؤ۔

﴿۲﴾

کیا پسند کرتا ہے تم میں سے کوئی ایک کہ ہو اس کا باغ کھجوروں اور انگوروں کا، جاری ہو اس کے نیچے نہریں، اس شخص کے لئے اس باغ میں ہر قسم کے پھل ہوں، اور اس حال میں اسے آپہنچے بڑھاپا اور اس کی اولاد کمزور ہو، پھر اس باغ کو پہنچے بگولہ جس میں آگ ہو، وہ جل جائے، اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنی آیتیں تاکہ تم فکر کرو۔

مختصر مطلب:

اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے پر احسان جتلانے سے اور اذیت پہنچانے سے قیامت کے دن انسان اجر و ثواب سے محروم ہوگا جبکہ اس وقت اجر و ثواب کی بہت شدید حاجت ہوگی، شدید حاجت اور ضرورت کے وقت

محرومیت غم اور پریشانی کا سبب ہوگی ، جس طرح انسان کا اچھا باغ ہو جس میں کھجوروں کے درخت اور انگوروں کی بیلیں ہوں اور بھی ہر قسم کے پھل دار درخت ہوں ، اور وہ شخص بڑھاپے کی حالت میں پہنچ جائے اور اس کی اولا د بھی کمزور ہو ، اس شدید حاجت کے وقت اگر اس کے باغ کو بگولہ پہنچے اور اس کے باغ کو جلا دے تو اس شخص کو کتنا غم لاحق ہوگا ؟ انسان یہ خود ہی سمجھ سکتا ہے کہ وہ غم سے نڈھال ہوگا ۔ پریشانیاں اسے لاحق ہوں گی ، یہی حال صدقہ خیرات کو احسان جتلانے اور اذیت پہنچانے سے ضائع کرنے والے کا ہوگا کہ قیامت کے دن سوائے محرومیت کے اسے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ اپنی آیات کو واضح طریقہ سے بیان فرماتا ہے تا کہ انسان تفکر کر کے اپنے آپ کو درست کرلیں۔

☆ "وفی روایة البخاری والحاکم وابن جریر وجماعة عن ابن عباس رضی اللہ تعالی عنھماقال،قال عمریومالا صحاب النبی ﷺ فیم ترون ھذہ الآیة نزلت(ایو داحدکم) الخ قالوا اللہ اعلم فغضب عمر فقال قولوانعلم اولانعلم فقال ابن عباس(رضی اللہ عنھما)فی نفسی منھا شئ یاامیر المؤمنین فقال عمر یا ابن اخی قل ولا تحقر نفسک قال ابن عباس ضربت لرجل غنی عمل بطاعة اللہ تعالی ثم بعث اللہ له الشیطان فعمل با لمعاص حتی احرق اعماله"

بخاری ، مستدرک حاکم ، ابن جریر نے وغیرہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی کہ ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے صحابہ سے پوچھا کہ تم حضرات (ایــو اداحــدکـم) الخ آیت کے متعلق کیا بیان کرتے ہو کہ یہ کس مقصد کے بیان کیلئے نازل کی گئی ، ان حضرات نے کہا "اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے" حضرت عمر رضی اللہ عنہ غصہ میں آگئے (کہ یہ مسئلہ کا جواب نہیں) آپ نے فرمایا یہ کہو ہم جانتے ہیں ، یا یہ کہو ہم نہیں جانتے ، تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا میرے نفس میں اس کے متعلق کچھ ہے ، آپ نے فرمایا اے میرے بھائی کے بیٹے بتاؤ اپنے آپ کو گھٹیا نہ سمجھو (یعنی باقی حضرات سے اپنے آپ کو چھوٹا سمجھ کر کوئی جھجک محسوس نہ

کرو) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ اس مثال سے یہ سمجھایا گیا ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی طاعت میں نیک عمل کرنے کی وجہ سے اعمال میں غنی ہو گیا، پھر اللہ تعالیٰ اس کے لئے شیطان کو بھیج دیتا ہے وہ اسے گناہوں کے عمل پر لگا دیتا ہے جس کی وجہ سے اس کے نیک اعمال برباد ہو کر رہ جاتے ہیں۔ (از روح المعانی، در منثور وغیرہ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس وضاحت سے اور صحابہ کرام کے خاموش رہنے پر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خاموش رہنے پر کسی کے رد نہ کرنے سے واضح ہوا کہ آیۃ کریمہ کا شان نزول عام ہے۔ مثال سے ہر قسم کے نیکیوں کے عمل کرنے کے بعد گناہ کرنے سے عمل برباد ہو جانے اور قیامت میں انسان کے غم زدہ اور پریشان ہونے کا ذکر فرمایا، اسی وضاحت میں خود بخود صدقات وخیرات کے بعد احسان جتلانا اور اذیت پہنچانا، اور ریاء کاری کے طور پر صدقہ کرنے سے اجر وثواب ضائع کرنے کا بھی پتہ چل گیا۔

"ایود": "کیا پسند کرتا ہے۔"

یہ لفظ ماخوذ ہے "ایود" سے، جس کا معنی ہے "الود هو المحبة الكاملة" کامل محبت۔

اور "ایود" میں ہمزہ استفہام انکاری کے لئے ہے کیا کوئی ایک تم سے پسند کرتا ہے؟ یعنی نہیں پسند کرتا ہے

"جنة من نخيل واعناب" میں باغ کی تین صفتیں بیان کی گئیں۔

﴿۱﴾ ایک یہ کہ باغ کھجوروں اور انگوروں پر مشتمل ہو، یعنی اس میں کثیر درخت ہوں جو جگہ کو ڈھانپ لیں، کھجوروں اور انگوروں کا ذکر بالخصوص کیا گیا۔" لا نهما اشرف الفواكه ولا نهما احسن الفواكه مناظر" اس لئے کہ یہ دونوں پھل اشرف ہیں اور یہ حسین منظر پیش کرتے ہیں۔

﴿۲﴾ دوسری صفت یہ بیان کی گئی "تجری من تحتها الانهار" ان کے نیچے نہریں جاری ہوں۔

یقیناً جب باغ میں گھنے درخت ہوں اور ان کے نیچے نہریں جاری ہوں تو وہ حسین منظر پیش کرے گا۔

﴿۳﴾ تیسری صفت یہ بیان فرمائی" له فيها من كل الثمرات" کہ اس باغ میں اور بھی ہر قسم کے پھل ہوں۔

جب یہ تمام صفات باغ میں ہوں تو وہ حسین منظر بھی ہوتا ہے اور اس کی پیداوار بھی زیادہ ہوتی ہے اس سے انسان کو بہت شدید محبت ہوتی ہے، اسے پھلتا پھولتا دیکھنا انسان پسند کرتا ہے، اس کی بربادی کوئی بھی نہیں پسند کرتا۔ (از کبیر)

" واصابه الکبر" اور اس کو بڑھاپا پہنچ جائے، یعنی عمر زیادہ ہو جائے اسباب معاش سے عاجز آ جائے۔

" وله ذرية ضعفاء" اور اس کی اولاد کمزور ہو، یعنی کسب نہ کر سکے ابھی وہ چھوٹی عمر کے ہوں یا کسی بیماری وغیرہ سے کسب معاش سے عاجز آ جائیں۔

" فاصابها اعصار" اعصار اس ہوا کو کہتے ہیں جو جگہ پر گھومتی رہے اور مینار یا ستون کی طرح ہوا سے "زوبعة" بھی کہا جاتا ہے۔"وهي قد تكون هابطة وقد تكون صاعدة " یہ ہوا یعنی بگولہ کبھی نیچے کی طرف آتی ہے اور کبھی اوپر کی طرف چڑھتی ہے۔ یہ ہوا اپنی شدت کی وجہ سے درختوں کو اکھیڑ دیتی ہے اور کشتیوں کو دریا میں ڈبو دیتی ہے۔

"فيه نار" اس میں آگ ہو، یعنی گرم لو ہو جسے '' نار سموم'' کہا جاتا ہے۔

"فاحترقت" وہ باغ جل جائے، یعنی تند ہوا جو بگولہ کی شکل میں ہے اس میں آگ ہو وہ باغ کو جلا دے۔

نتیجہ واضح ہے:

کہ ایک شخص کا کھجور وں اور انگوروں [illegible] قسم کے پھل دار درختوں کا باغ ہو، اس کے نیچے نہریں جاری ہوں پھر وہ بوڑھا ہو جائے اس کی اولاد بھی ذرائع معاش کے حاصل کرنے سے قاصر ہو کیا اس حالت میں وہ شخص یہ پسند کرے گا کہ اس کا باغ آگ بگولہ سے خاکستر ہو جائے، نہیں نہیں وہ کبھی نہیں پسند کرے گا، جس شخص کو ایسے اعلیٰ قسم کے باغ سے شدید محبت ہوگی وہ تو اس کے جل جانے پر اس حالت میں ہوگا۔

"المقصود من هذا المثل بيان انه يحصل في قلب هذا الانسان من الغم والمحنة والحسرة والحيرة ما لا يعلمه الا الله"

مقصد اس مثال سے یہ بیان کرنا ہے کہ وہ شخص اس حالت میں بہت ہی زیادہ غم اور محنت اور حسرت اور حیرت میں مبتلاء ہوگا جسے اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی نہیں جانتا۔

"فکذلک من اتی بالا عمال الحسنة الاانه لا یقصد بها وجه اللہ بل یقرن بها اموراً تخرجها عن کونها موجبة للثواب فحین یقدم یوم القیامة وهو حینئذفی غایة الحاجة و نهایة العجزعن الاکتساب عظمت حسرته وتناهت حیرته"

اسی طرح جس شخص نے اچھے اعمال کئے مگران میں اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی حاصل نہیں کی گئی بلکہ اس کے ساتھ ایسے امور ملائے گئے جنہوں نے ان اچھے اعمال کوثواب کے درجہ سے ہی نکال دیا جب قیامت کادن ہوگا تو وہ شخص اس وقت بہت زیادہ حاجتمند ہوگا، اس وقت عمل کرنے سے عاجز ہوگا تواس کی حسرت بڑھ جائے گی اور بہت ہی زیادہ حیرت میں مبتلاء ہوگا۔ (کبیر)

"کذلک یبین اللہ لکم الآیات لعلکم تتفکرون":

''اسی طرح بیان کرتا ہےتمہارے لئے اللہ تعالیٰ آیات کوتا کہ تم فکرکرو۔''

یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے یہاں مسائل کومثالوں سے واضح طور پر بیان فرمایا ہےاس طرح اللہ تعالیٰ تمام امور دین کوواضح طور پر بیان فرماتا ہے تاکہ تم فکرکرویعنی جن آیات میں عبرت پکڑنے کا ذکر ہےان کو دیکھ کرعبرت پکڑواوران آیات کے مطابق عمل کرو، اورتمہیں یہ بھی معلوم ہوجائے کہ دنیا نےختم ہوجانا ہے آخرت نے ہی باقی رہنا ہے۔لہٰذاتم دنیا میں زہدوتقوی اختیار کرو، اور اللہ کی راہ میں اللہ کی رضاء کے لئے مال خرچ کرواور مال بھی وہ جواسی نےتمہیں دیا ہے،اورآخرت کی طرف رغبت کرواورایسے کام نہ کروجوتمہیں غم میں ڈالیں۔ (از روح المعانی)

دینی طلباءکرام کی توجہ کے لئے:

بظاہر یہاں اعتراض واردہوتا ہے کہ''یود'' مستقبل کاصغیہ ہے،اور''واصابه'' میں''اصاب'' ماضی کا صیغہ ہےتو ماضی کا عطف مستقبل پردرست نہیں۔

تواس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہاں ضروری نہیں کہ ''واؤ ''کوعاطفہ بنایا جائے بلکہ واؤ حالیہ ہےاس صورت میں معنی ہوگاایسے حال میں کہ اسے پہنچے بڑھاپااوراگرواؤ کوعاطفہ بنایا جائے تو پھربھی صحیح ہے کہ یہاں عطف الفاظ پر

نہیں بلکہ معنی پر ہے اس لئے " ایو د " بھی ماضی کے معنی میں ہوگا، " کیا کسی نے پسند کیا ہے " اس طرح " و اصا بہ الکبر " کا معنی ہوگا " اور اسے پہنچا بڑھاپا " (از روح المعانی)

ایک اور توجہ:

" لعلکم تتفکرون " میں " لعل " ترجی کے لئے نہیں، بلکہ " لکی " کے معنی میں ہے اسی لئے روح المعانی میں اس کا ترجمہ کیا گیا " لکی تتفکروا " تا کہ تم تفکر کرو۔

شیطان کے پندرہ دشمن:

﴿۱﴾ انبیاء کرام۔ ﴿۲﴾ انصاف کرنے والے حکام ﴿۳﴾ اور عجز کرنے والے اغنیاء
﴿۴﴾ اور سچے تاجر ﴿۵﴾ خشوع کرنے والے علماء ﴿۶﴾ نصیحت کرنے والے مؤمنین
﴿۷﴾ نرم دل مؤمنین ﴿۸﴾ توبہ پر قائم رہنے والے ﴿۹﴾ اور حرم سے بچنے والے
﴿۱۰﴾ زیادہ صدقہ کرنے والے مؤمنین ﴿۱۱﴾ اور لوگوں سے اچھے اخلاق سے در پیش آنے والے ایماندار
﴿۱۲﴾ وہ مؤمنین جو لوگوں کو نفع پہنچانے والے ہوں ﴿۱۳﴾ ہمیشہ قرآن پڑھنے والے اور اس پر عمل کرنے والے
﴿۱۴﴾ رات کو کھڑے ہو کر نوافل پڑھنے والے جبکہ لوگ سوئے ہوئے ہوں۔
﴿۱۵﴾ ہمیشہ باوضو رہنے والے مؤمنین

شیطان کے دس دوست:

﴿۱﴾ ظالم بادشاہ ﴿۲﴾ تکبر کرنے والا غنی ﴿۳﴾ خیانت کرنے والا تاجر
﴿۴﴾ شراب پینے والا ﴿۵﴾ چغل خور ﴿۶﴾ ریاء کاری کرنے والا
﴿۷﴾ سود کھانے والا ﴿۸﴾ یتیم کا مال کھانے والا ﴿۹﴾ زکوۃ نہ دینے والا
﴿۱۰﴾ اور بڑی لمبی امیدیں باندھنے والا۔ (اس شخص کو چونکہ موت یاد نہیں ہوتی، لہٰذا خوف خدا بھی نہیں ہوتا)۔

(روح البیان)

اس سے واضح ہوا کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے والا اللہ کا دوست ہے اور شیطان کا دشمن، اور جو شخص اللہ کی راہ میں فرض اور واجب مال نہ خرچ کرے وہ شیطان کا دوست ہے اور رب تعالیٰ سے وہ دور ہے۔

مکن تکیہ بر ملک و جاہ و حشم — کہ پیش از تو بو دست و بعد از تو ہم

نہ کر بھروسہ ملک اور مرتبے اور رعب پر۔ کہ تجھ سے پہلے بھی ایسے لوگ تھے، اور تیرے بعد بھی ہوں گے۔

غم و شادمان نماند ولیک — جزائے عمل ماند و نام نیک

غم اور خوشی نہیں رہیں گے لیکن عمل کی جزاء اور نیک نام باقی رہیں گے۔

☆☆☆☆☆

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ لَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَ لَسْتُمْ بِاٰخِذِیْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْهِ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ☆

(سورۃ البقرۃ آیت ۲۶۷)

﴿۱﴾

اے ایمان والو! اپنی پاک کمائیوں میں سے کچھ دو اور اس میں سے ہم نے جو تمہارے لئے زمین میں سے نکالا اور خاص ناقص کا ارادہ نہ کرو کہ دو تم اس میں سے اور تمہیں ملے تو نہ لوگے جب تک اس میں چشم پوشی نہ کرو اور جان رکھو کہ اللہ بے پرواہ سراہا گیا ہے۔

﴿۲﴾

اے ایمان والو! خرچ کرو پاکیزہ مال سے جو تم نے کسب کیا، اور اس سے جو نکالا ہم نے تمہارے لئے زمین سے، اور نہ ارادہ کرو ردی چیزوں کا کہ اس سے خرچ

کرو، حالانکہ تم خود نہیں لیتے سوائے اس کے کہ تم اس میں آنکھیں بند کرلو، اور جان رکھو بیشک اللہ بے پرواہ ہے، حمد کے لائق ہے۔

مختصر مطلب:

تقریبا ترجمہ سے ہی مفہوم واضح ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اچھا، عمدہ، پاکیزہ مال خرچ کرو، اور زمین کی پیداوار میں سے بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرو، اور ردی گھٹیا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا ارادہ نہ کرو حالانکہ تمہیں گھٹیا مال لینا پڑے تو تم نہیں لیتے سوائے اس کے کہ کبھی چشم پوشی (آنکھ بند کر کے) سے مال لے لو، تو لے لو اور جان رکھو اللہ تعالیٰ بے پرواہ ہے اسے تمہارے مال کی ضرورت نہیں وہ تعریف کیا ہوا ہے اسے تمہاری تعریف کی ضرورت نہیں۔

شان نزول:

" قالت ابن جریر رحمه الله عن البراء بن عازب رضی الله عنه فی قول الله(یاایها الذین آمنوا انفقوا من طیبات ماکسبتم)الآیة،قال نزلت فی الانصار، کانت الانصار اذا کانت ایام جذاذا لنخل اخرجت من حیطانها البسر فعلقوه علی حبل بین الاسطوانتین فی مسجد رسول الله ﷺ فیاکل فقراء المهاجرین منه،فیعمدالرجل منهم الی الحشف فیدخله مع اقناء البسر یظن ان ذلک جائز، فانزل الله فیمن فعل ذلک (ولاتیمموا الخبیث منه تنفقون ولستم بآخذیه الاان تغمضوا فیه) (اخر جه ابن ماجة الحاکم)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں آیۃ کریمہ " یا ایها الذین امنوا انفقوا من طیبات ماکسبتم "الخ انصار کے حق میں نازل ہوئی، کھجوروں کے توڑنے کے دنوں میں انصار اپنے باغات سے پکی کھجور لا کر مسجد نبوی کے دوستونوں کے درمیان ایک رسی سے باندھ دیتے (یعنی خوشے رسی سے لٹکا دیتے) مہاجرین سے فقراء صحابہ کرام (اصحاب صفہ) ان سے کھاتے رہتے، ایک شخص نے بسر (جن میں سرخ حصہ زیادہ ہو اور پیلا حصہ کم ہو، یعنی پکی

کھجور) کے ساتھ خشک ردی کھجوریں بھی لٹکا دیں، اس خیال سے کہ یہ جائز ہے، تو اللہ تعالیٰ نے
اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا "ولا تیمموا الخبیث منه تنفقون" ردی چیز خرچ کرنے کا ارادہ نہ
کرو۔ (از صابونی)

"یاایها الذین آمنوا انفقوا من طیبات ما کسبتم":

اے ایمان والو! خرچ کرو پاکیزہ مال سے جو تم نے کسب کیا۔

"من طیبات" من حلاله او جیاده" (بیضاوی)

یعنی "طیبات" کا معنی حلال مال یا عمدہ مال حلال مال "طیب" ہے۔ عقلا اور عمدہ مال ہے "طیب" ہے
حسی طور پر۔ "طیبات" سے مراد حلال مال لینے والوں نے اپنے موقف پر مندرجہ ذیل احادیث پیش کی ہیں۔

"قال رسول الله ﷺ ثلاث اذا کن فی التاجر طاب کسبه لایعیب اذا اشتری ولایمدح
اذا باع ولایکذب، ویری ولا یحلف"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین چیزیں جب تاجر میں پائی جائیں تو اس کا کسب کیا ہوا مال پاکیزہ ہوتا
ہے وہ مال خریدے تو عیب نہ نکالے اور بیچے تو اس مال کی تعریف نہ کرے اور جھوٹ نہ بولے اور
ایک روایت میں ہے کہ قسمیں نہ اٹھائے۔

☆ "قیل علیه الصلوۃ و السلام ای الکسب اطیب فقال عمل الرجل بیده"

رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کون سا کسب پاکیزہ ہے آپ نے فرمایا جو مال انسان اپنے ہاتھ سے کمائے۔

☆ "وقال رسول الله ﷺ اطیب مایاکل الرجل من کسبه"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پاکیزہ مال وہ ہے جو انسان اپنے کسب سے کھائے۔ (شیخ زادہ)

عمدہ مال کا قول کرنے والوں نے چند دلائل پیش کئے۔

ایک یہ کہ شان نزول سے جب یہ ثابت ہو رہا ہے کہ وہ ردی مال خرچ کرے تو اس سے منع کیا گیا ہے، لہٰذا

جب خبیث، کا معنی اس آیۃ کریمہ میں ردی مال لیا گیا ہے، تو ''طیبات'' کا معنی عمدہ مال ہی ہونا چاہئے۔

دوسری دلیل ان حضرات کی یہ ہے کہ خبیث مال خرچ کرنے سے مستثنیٰ کیا ہے ''الا ان تغمضوا فیه'' کہ تم خبیث مال نہیں لیتے سوائے چشم پوشی (آنکھیں بند کرنے) کے۔

اس سے بھی واضح ہو رہا ہے کہ خبیث کا معنی ردی مال ہے کیونکہ صحابہ کرام حرام مال تو کسی صورت میں بھی نہیں لیتے تھے نہ خوشی سے اور نہ ہی چشم پوشی سے۔

تیسری دلیل ان حضرات کی یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا۔

''**لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون**'' تم ہرگز نیکی کو نہیں پا سکتے یہاں تک کہ تم وہ مال خرچ کرو تم پسند کرتے ہو۔ علامہ رازی رحمہ اللہ کا محاکمہ اس پر یہ ہے۔

''**ان المراد من الطیب ههنامایکون طیبا من کل الوجوہ فیکون طیبابمعنی الحلال ویکون طیبابمعنی الجودة**''

طیب سے مراد یہ ہے کہ جو ہر طرح سے پاک ہو وہ کامل طیب اسی وقت ہوگا جب حلال بھی ہو اور عمدہ بھی ہو۔

بظاہر اس پر اعتراض یہ ہے کہ مشترک معانی کا اجتماع لازم آئے گا جو جائز نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں معنی ایک ہی لیا گیا ہے۔

''**الطیب مایستطیبه العقل و الدین**'' طیب وہ ہے جسے عقل اور دین پاکیزہ سمجھے۔

لہٰذا حلال اور عمدہ مال دونوں ہی اس میں خود بخود داخل ہو گئے۔ اور اس میں بھی کوئی مشکل نہیں کہ ''**الا ان تغضموا فیه**'' سے مراد ردی مال ہی ہو، کہ ردی مال تم خود نہیں لیتے سوائے چشم پوشی کے، کیونکہ لفظ ذکر کر کے اور معنی لینا اور ضمیر لوٹا کر اور معنی لینا استخدام ہے، جو حسن معنوی پر دلالت کرتا ہے نہ کہ عدم جواز (جائز نہ ہونے) پر۔

لہٰذا ''**ولا تیمموا الخبیث**'' سے مراد یہ ہے کہ ''ناپاک'' کا ارادہ نہ کرو، نہ حرام مال خرچ کرو اور نہ ہی گھٹیا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔

"الاان تغمضوا فیه" سے مراد یہ ہے کہ ردی مال تم خود نہیں لیتے سوائے چشم پوشی کے۔ (از کبیر مع التصرف)

☆ "عن عبدالله بن مسعود قال قال رسول الله ﷺ ان الله قسم بينكم اخلاقكم كما قسم بينكم ارزاقكم، وان الله يعطى الدنيامن يحب ومن لا يحب ولا يعطى الدين الا لمن احب فمن اعطاه الله الدين فقد احبه، والذى نفسى بيده لايسلم عبدحتى يسلم قلبه ولسانه، ولا يؤمن حتى يأمن جاره بوائقه قالوا ومابوائقه يا نبى الله؟ قال غشه وظلمه، ولا يكسب عبد مالامن حرام فينفق منه فيبارك له فيه ولا يتصدق به فيقبل منه ولا يتركه خلف ظهره الاكان زاده الى النار وان الله لايمحو السئ با لسئ ولكن يمحو السئ بالحسن، ان الخبيث لايمحو الخبيث" (رواه الامام احمد فی مسنده)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے تمہارے درمیان اخلاق کو تقسیم فرمایا جیسے تم اپنا مال تقسیم کرتے ہو، اور بیشک اللہ تعالیٰ دنیا (کامال و دولت) عطاء فرماتا ہے خواہ اس سے محبت کرے یا نہ کرے، اور دین نہیں عطاء فرماتا سوائے اس کے کہ جس سے محبت کرتا ہے تو جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے دین عطاء فرمادیا اس سے وہ محبت کرتا ہے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے بندہ اس وقت تک کامل مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک اس کا دل اور زبان سلامتی پہنچانے والے نہ ہوں اور کوئی شخص اس وقت تک کامل مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک اس کا پڑوسی اس کے بوائق سے محفوظ نہ ہو صحابہ کرام نے پوچھا یا نبی اللہ (اے اللہ کے نبی) اس کے بوائق سے مراد کیا ہے؟ آپ نے فرمایا اس کا کینہ وکھوٹ اور ظلم، اور جب کوئی بندہ حرام مال کسب کر کے خرچ کرتا ہے کہ اس میں برکت ہوگی، اور صدقہ کرتا ہے کہ اس میں قبولیت ہوگی اور اپنے پیچھے (اپنے ورثاء کے لئے) چھوڑتا ہے تو اس کے لئے آگ میں پہنچانے کا ہی یہ زیادہ سے زیادہ ذریعہ ہے بیشک اللہ تعالیٰ گناہوں کو گناہوں سے نہیں مٹاتا، لیکن گناہوں کو نیکیوں سے مٹاتا ہے، بیشک کسی خبیث چیز کو خبیث سے نہیں مٹاتا۔ (از صابونی)

تنبیہ: یہ آیۃ کریمہ زکوۃ اور عشر تمام کو شامل ہے۔

"اخرج ابن جریر عن علی بن ابی طالب قوله یاایھاالذین آمنوا انفقوا من طیبات ما کسبتم قال من الذھب والفضۃ ومما اخرجنا لکم من الارض قال یعنی من الحب والتمرو کل شیٔ علیہ زکوۃ"

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی "یاایھاالذین آمنوا انفقوا من طیبات ما کسبتم" کا مطلب یہ ہے کہ پاکیزہ طور پر حاصل کئے ہوئے سونے اور چاندی سے زکوۃ ادا کرو اور "ومما اخرجنا لکم من الارض" کا مطلب یہ ہے کہ دانوں کھجوروں اور ہر وہ چیز زمین کی پیداوار جس پر زکوۃ لازم ہے اس سے زکوۃ، یعنی عشر ادا کرو۔ (درمنثور)

☆ "واخرج سعید بن منصور وعبد بن حمید وابن جریر وابن المنذر والبیھقی فی سننہ عن مجاھد فی قولہ انفقوا من طیبات ما کسبتم قال من التجارۃ ومما اخرجنا لکم من الارض قال من الثمار"

حضرت مجاھد رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں "انفقوا من طیبات ما کسبتم" سے مراد یہ ہے کہ تجارت کے ذریعے پاکیزہ کمائی سے مال خرچ کرو، اور "ومما اخرجنا لکم من الارض" سے مراد یہ ہے کہ زمین سے پیدوار ہونے والے پھلوں سے مال خرچ کرو۔ (درمنثور)

"ولاتیمموا الخبیث منہ تنفقون":

"اور نہ ارادہ کرو ردی چیز کا کہ اس سے تم خرچ کرو۔"

مسئلہ: مال حاصل کرنا اور کسب کرنا مباح ہے، البتہ شرط یہ ہے کہ وہ مال حلال طریقہ سے حاصل کرے۔

☆ "عن خولۃ الانصاریۃ قالت سمعت رسول اللہ ﷺ یقول ان ھذا المال حضر حلو من اصابہ بحق بورک لہ فیہ ورب متحوض فیماشاء نفسہ من مال اللہ ورسولہ لیس لہ یوم القیامۃ الاالنار" (اخرجہ الترمذی)

حضرت خولہ انصاریہ رضی اللہ عنہما فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا، بیشک یہ

مال خوشنما اور میٹھا ہے، جس شخص نے جائز طریقہ سے حاصل کیا اسے اس مال میں برکت دی جائے گی۔ کتنے ہی لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے مال کو نفس کی خواہشات کے مطابق ناجائز طریقہ سے حاصل کرتے ہیں انہیں قیامت کے دن سوائے آگ کے اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

''المتخوض الذی یأخذالمال غیر وجهه کمایخوض الانسان فی الماء یمیناوشمالا''

متخوض اسے کہتے ہیں جو جائز طریقہ کو دیکھنے کے بغیر ہی جیسے بھی مال حاصل ہو سکے وہ مال حاصل کرلے، جیسے انسان پانی میں دائیں، بائیں غوطے مارتا ہے۔ (خازن)

☆ '' عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ یاتی علی الناس زمان لا یبالی المرأ ما اخذ منه امن حلال او حرام'' (بخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کوئی شخص پروا نہیں کرے گا کہ وہ مال حلال طریقہ سے حاصل کر رہا ہے یا حرام طریقہ سے۔ (خازن)

☆ ''عن المقداد ان رسول الله ﷺ قال ما أکل احد طعاماقط خیرا من ان یأ کل من عمل یده وان نبی الله داؤد کان یأ کل من عمل یده'' (بخاری)

حضرت مقداد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اپنے ہاتھ کی کمائی سے مال کھانے سے بہتر کوئی اور طریقہ مال کھانے کا بہتر نہیں، بیشک اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے۔ (خازن)

☆ '' عن عائشة ان رسول الله ﷺ قال ان اطیب ما اکلتم من کسبکم وان اولا دکم من کسبکم'' (اخرجه الترمذی والنسائی)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک تمہارا پاکیزہ طعام وہی ہے جو تم اپنے کسب سے کھاؤ، اور بیشک تمہاری اولاد بھی تمہارے کسب سے ہے۔ (خازن)

مراد یہ ہے کہ حلال طریقہ کر کے مال کھاؤ تا کہ تمہاری اولاد پر بھی اچھا اثر پڑے وہ بھی حلال مال حاصل کرے۔

مسئلہ : اس آیۃ کریمہ سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ انسان کے مال میں زکوۃ فرض ہے خواہ وہ مال سونا ہو یا چاندی خواہ وہ چوپائے ہوں یا مال تجارت، یعنی مال تجارت پر جب سال گزر جائے اور وہ نصاب تک پہنچ جائے تو اس مال پر زکوۃ فرض ہوگی وہ کسی چیز کی بھی تجارت کرے حکم یہی ہوگا۔ (ماخوذ از خازن)

اونٹوں کا نصاب:

جب اونٹ سال کا اکثر حصہ باہر چر کر گذارہ کریں، گھر چارہ دینے کی ضرورت سال کا کم حصہ در پیش آئے، یا پورا سال ضرورت در پیش نہ آئے تو پھر پانچ اونٹوں سے کم میں زکوۃ نہیں اور جب پانچ اونٹ ہو جائیں تو ان میں ایک بکری، دس میں دو بکریاں، پندرہ میں تین بکریاں، بیس میں چار بکریاں جب اونٹوں کی مقدار پچیس ہو جائے تو ان میں ایک بنت مخاض ایک سالہ اونٹنی یعنی دوسرے سال میں داخل ہو چکی ہو اور جب چھتیس ہو جائیں تو ان میں بنت لبون (دو سالہ اونٹنی ہو یعنی تیسرے سال میں داخل ہو چکی ہو) اور جب چھیالیس ہو جائیں تو ان میں ایک وہ اونٹنی بطور زکوۃ فرض ہے جو چوتھے سال میں داخل ہو، جسے حقہ کہا جاتا ہے اور جب اکسٹھ ہو جائیں ان میں وہ اونٹنی ہوگی جو پانچویں سال میں داخل ہو۔

گائے اور بھینس کا نصاب:

تیس گائے میں سے کم میں صدقہ نہیں جب گائے یا بھینس سال کا اکثر حصہ باہر چر کر گزارہ کریں تو تیس ہو جائیں تو ان میں ایک سال کا بچھڑا یا بچھڑی جو دوسرے سال میں داخل ہو چکے ہوں اور جب چالیس ہو جائیں تو ان میں ایک دو سالہ گائے یا بیل جو تیسرے سال میں داخل ہو جائے۔ پھر ساٹھ پر دو ایک سالہ بچھڑے، پھر ہر دس کے بعد یہی تبدیلی آئے گی۔

بھیڑ بکری کا نصاب:

جب چالیس بھیڑ بکریاں ہو جائیں اور سال ان پر گزر جائے اور سال کا اکثر حصہ باہر چر کر گذارہ کریں تو ان میں ایک بکری، پھر ایک سو بیس میں دو بکریاں، پھر دو سو ایک میں تین بکریاں، پھر چار سو میں چار بکریاں۔ پھر ہر سو میں ایک بکری۔

گھوڑوں میں زکوۃ دینے کا حکم:

گھوڑے جب مذکر مونث ملے جلے ہیں اور سال کا اکثر حصہ باہر چر کر گزارہ کریں تو ہر گھوڑے سے ایک دینار زکوۃ دے یا قیمت کر کے چالیسواں حصہ دے، لیکن صاحبین کے قول کے مطابق گھوڑوں میں زکوۃ نہیں۔

سونے کا نصاب:

بیس مثقال سے کم میں زکوۃ نہیں، جب بیس مثقال، یعنی ساڑھے سات تولے ہو جائے تو پھر چالیسواں حصہ زکوۃ ہے جب نصاب مکمل ہو جائے تو زکوۃ کل میں ہے یہ نہیں کہ ساڑھے سات تولے معاف رہے گا اور اس سے اوپر میں زکوۃ ہو گی۔

چاندی کا نصاب:

دوسو درھم سے کم میں زکوۃ نہیں جب دوسو درھم ہو جائیں تو ان میں چالیسواں حصہ دوسو درھم کا وزن ساڑھے باون تولے۔

سامان تجارت:

تجارت کا مال جب سونے یا چاندی کے نصاب کو پہنچ جائے تو اس میں چالیسواں حصہ زکوۃ ہو گی جب کہ اس پر ایک سال مکمل ہو جائے۔

مسئلہ : جب نصاب مکمل ہو گیا تو اس وقت سے سال کا اعتبار کرنا پڑے گا مختلف اوقات میں حاصل ہونے والے مال کا علیحدہ علیحدہ حساب نہیں ہو گا۔

مسئلہ : اگر قرض ہو تو جتنی مقدار قرض ہے اتنی مقدار مال سے نکال کر حساب کر کے زکوۃ دی جائے گی مثال کے طور پر ایک شخص ایک لاکھ روپے کا مالک ہے اور پچاس ہزار روپے اس نے قرض ادا کرنا ہے تو زکوۃ پچاس ہزار روپے کی ادا کرے گا نہ کہ ایک لاکھ کی۔

تنبیہ : صدقہ فطر اور قربانی کا نصاب تو وہی ہے جو زکوۃ کا ہے لیکن زکوۃ کے مال کے لئے نامی ہونا شرط ہے یعنی وہ مال بڑھنے والا ہو بڑھنے والا مال سونا چاندی، روپے اور مال تجارت ہے لیکن صدقہ فطر اور قربانی کے نصاب

میں نامی ہونے (بڑھنے) کی کوئی شرط نہیں ضرورت سے زائد مال نصاب کی مالیت کو پہنچ جائے تو اس شخص پر صدقہ فطر اور قربانی لازم ہوگی۔

راقم کا تردد اور علماء کرام کی توجہ کی ضرورت:

فقہاء کرام نے اگرچہ بیان کیا ہے کہ جب انسان کے پاس سونا، چاندی (یا روپے) ملے جلے ہیں تو حساب اس نصاب کا کیا جائے جس میں فقیر کا فائدہ ہو، یہ یقینی بات ہے کہ چاندی کا حساب ہوگا تو نصاب جلدی مکمل ہو جائے گا یہی صورت بظاہر صدقہ فطر اور قربانی کے نصاب میں بھی نظر آتی ہے، لیکن علماء کرام دو چیزوں کی طرف توجہ فرما کر مجموعی طور پر مسئلہ کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اکثریتی بلکہ بہتر یہ ہے کہ اجماع سے فیصلہ کریں، ایک تو اس طرف توجہ کی ضرورت ہے کہ نظام حکومت میں خزانہ بنیادی طور پر سونا ہے چاندی نہیں، پھر چاندی کا نصاب نوٹوں کا کیوں مقرر کیا جاتا ہے۔ دوسری چیز قابل توجہ یہ ہے کہ ہمارے اس زمانہ (۲۰۰۴ء) میں چاندی کا نصاب سوا پانچ ہزار روپے پر مکمل ہو جاتا ہے اور بکرا بھی اسی قیمت سے مل رہا ہے تو وہ قربانی کیسے کرے؟

راقم کے خیال میں نوٹوں کا مطلق نصاب سونے کا مقرر کیا جانا چاہئے۔ اگر علماء کرام لکیر کے فقیر بنیں'' اور اس چیز سے ہٹ کر سوچیں کہ فلاں نے یہ بات کہی ہے میں نے نہیں ماننی'' تو مجھے امید ہے کہ تمام علماء کرام کے ذہنوں میں یہ بات آجائے اور قوی امید ہے کہ اس مسئلہ میں تمام مکاتب فکر کا اتفاق ہو جائے۔

''ومما اخرجنا لکم من الارض'':

''اور اس سے جو نکالا ہم نے تمہارے لئے زمین سے۔''

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ ان الفاظ مبارکہ سے زمین کی پیداوار میں سے نفلی صدقہ کا حکم دیا گیا ہے، نفلی صدقہ کی فضیلت پر احادیث دلالت کر رہی ہیں۔

"عن انس ابن مالک قال قال رسول اللہ ﷺ ما من مسلم یغرس غرسا اویزرع زرعا فیاکل منه انسان اوطیر اوبهیمة الا کانت به صدقة" (رواہ احمد والشیخان والترمذی)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی مسلمان ایسا نہیں جو درخت لگائے یا کھیتی باڑی کرے تو اس سے انسان کھائیں یا پرندے یا چوپائے کھائیں مگر یہ کہ اسے صدقہ کا ثواب حاصل ہوگا۔

اس حدیث پاک میں انسان کے کھانے سے مراد نفلی صدقہ ہے کہ انسانوں کو اپنی طرف سے اس میں سے پھل یا غلہ دے کیونکہ بغیر اجازت کے کسی کے باغ سے پھل کھانا یا غلہ حاصل کرنا جائز ہی نہیں۔

" عن ابی امامة قال سمعت النبی ﷺ یقول لا ید خل ھذا یعنی شیأ من آلة الحرث بیت قوم الا ادخله الذل" (رواہ البخاری) یدل علی شومه واللہ اعلم)

حضرت ابو امامہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا نہیں داخل ہوتے کسی کے گھر یہ یعنی کھیتی باڑی کے آلات مگر یہ کہ اس گھر میں ذلت داخل ہوگی۔

اس حدیث پاک کا مطلب بھی یہی ہے کہ جو شخص کھیتی باڑی کا کام کرتا ہے لیکن اس کی پیداوار سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ نہیں کرتا اس کے گھر بے برکتی ہوتی ہے۔ بعض حضرات کا قول اگر نفلی صدقہ کی طرف ہے۔

" والصحیح ان الآیة فی الزکوة لان الامر للو جوب ولا وجه لحملها علی التطوع فھذاامر باخراج العشورمن خارج الارض"

لیکن صحیح یہ ہے کہ آیۃ کریمہ کا تعلق زکوۃ سے ہے کیونکہ امر (انفقوا) وجوب کے لئے بغیر کسی وجہ کے اس سے نفلی صدقہ مراد لینا درست نہیں، لہٰذا زمین کی پیداوار سے خرچ کرنے کا حکم بھی وجوبی ہے، یعنی " ومما اخرجنا لکم من الارض " سے عشر کا حکم دیا گیا ہے۔ (از مظہری)

عشر کا نصاب:

امام ابو یوسف و امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک عشر اس وقت لازم ہوگا جب پیداوار پانچ وسق کو پہنچ جائے، ہر وسق ساٹھ صاع کا ہے، اور صاع چار کلو کا ہے، اگر چہ پندرہ گرام چار کلو سے بڑھائے جاتے ہیں، لیکن راقم کے نزدیک ضروری نہیں کہ پندرہ گرام بڑھائے جائیں۔ اور روئی میں نصاب پانچ گانٹھیں ہیں، اور ہر گانٹھ کا وزن تین سو سیر ہے،

اورزعفران میں نصاب پانچ سیر ہے۔ان حضرات کی دلیل......

" عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ ﷺ لیس فیمادون خمسة اوسق صدقة"

(بخاری،مسلم)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پانچ وسق سے کم میں صدقہ نہیں۔

یہی حدیث مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے،اور مسند احمد میں اور دار قطنی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے اور یہی حدیث بیہقی میں حضرت عمر بن حزم سے مروی ہے اور دار قطنی میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا سے بھی مروی ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک زمین کی پیداوار میں مطلق عشر لازم ہے خواہ وہ پیداوار قلیل ہو یا کثیر ہو، نصاب مقرر نہیں،آپ کی دلیل یہی آیۃ کریمہ ہے کہ اس میں مطلقاً ذکر کیا گیا ہے کہ خرچ کرو جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالا ہے۔ (از مظہری)

عشر اور نصف عشر:

جس زمین کو بارش سے یا قدرتی چشمے (جس پر آبیانہ ادا کرنا لازم نہ ہو) سے سیراب کیا جائے اس کی پیداوار میں عشر،یعنی دسواں حصہ لازم آئے گا،اور جس زمین کو کنوئیں وغیرہ سے سیراب کیا جائے یعنی جس پر مشقت لازم آئے اس میں سے نصف عشر یعنی بیسواں حصہ لازم آئے گا۔

اسی سے نہری زمین جس پر آبیانہ ادا کیا جاتا ہے اس کا حکم راقم کو یہی سمجھ میں آتا ہے کے وہ بھی مشقت کے ضمن میں آتا ہے،لہٰذا اس کا حکم کنوئیں کا حکم ہونا چاہئے یعنی اس میں نصف عشر (بیسواں حصہ) ہوگا۔

کن چیزوں میں عشر ہے؟

اس میں اتفاق ہے کے کھجور اور انگور اور وہ دانے جو ذخیرہ بنائے جاسکیں، یہ خیال رہے کے ایک سال تک جس چیز کو رکھا جاسکے اس کے لئے " یقتات" اور "یدخر" کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں، یہ رکھنا بھی بغیر کسی

ایجادات کے ورنہ آجکل سائنسی ایجادات کی وجہ سے پھلوں کو بھی ایک سال تک رکھا جا سکتا ہے لیکن یہ مراد نہیں۔

اور اس مسئلہ میں بھی اتفاق ہے کے گھاس اور جلانے والی لکڑیوں میں عشر نہیں، کیونکہ ان چیزوں کے لئے زمین کو غلہ حاصل کرنے کے لئے مشغول نہیں کیا جاتا۔

اس کے بغیر سبزیوں اور پھلوں میں اختلاف ہے، امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں ہر قسم کے دانے، پھلوں اور سبزیوں میں عشر ہے، آپ کی دلیل یہی آیۃ ہے کے اس میں مطلق ذکر ہے، سال رہنے کی کوئی قید نہیں، اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی بھی مطلق ہے۔

"قال رسول اللہ ﷺ فیما سقت السماء والعیون او کان عشر یا العشر وفیما سقی بالنضح نصف العشر"

یعنی عشری زمین میں عشر ہے اور جس زمین کو ڈولوں کے ذریعے (اونٹنی کے ذریعے ڈول کھینچ کر) سیراب کیا جائے اس میں نصف عشر ہے یعنی بیسواں حصہ ہے۔

امام ابو یوسف اور امام محمد اور امام احمد رحمھم اللہ کا اس مسئلہ میں ارشاد یہ ہے۔

" یجب فیما یبقی فی ایدی الناس مما یکال او یوزن "

عشر ان چیزوں میں ہے جو لوگوں کے ہاتھوں میں باقی رہ سکیں اور ان کا وزن کیا جاتا ہو یا ان کو صاع (ٹوپے) کے ذریعے کیل کیا (ماپا) جاتا ہو۔

"ان حضرات کے دلائل"

"عن معاذ قال فیما سقت السماء والسیل العشر وفیما سقی بالنضح نصف العشر یکون ذلک من التمر والحنطة والحبوب واما القثاء والبطیخ والرمان والعنب والخضروات فعفو عفا عنه رسول اللہ ﷺ" (رواہ الدار قطنی والحاکم والبیھقی)

حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں جس زمین کو بارش اور ندی نالے سے سیراب کیا جائے اس میں عشر ہے اور جس کو ڈولوں کے ذریعے سیراب کیا جائے اس میں نصف عشر ہے اور

یہ عشر یا نصف عشر کھجوروں میں اور گندم میں اور دانوں میں ہے، اور ککڑی (تر،کھیرا) اور خربوزے، اور گنے اور سبزیوں میں نہیں۔ ان میں معاف ہے، اور یہ خود رسول اللہ ﷺ نے معاف فرمایا ہے۔

تاہم اس حدیث کے متعلق قاضی محمد ثناء اللہ مظہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

" وفیه ضعف "اور اس میں ضعف پایا گیا ہے۔

" وعن معاذ انه کتب الی النبی ﷺ یسئله عن الخضروات وعن البقول قال لیس فیها صدقة " (رواہ الترمذی)

حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کی طرف میں نے خط لکھ کر سبزیوں کے عشر کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا ان میں صدقہ نہیں۔

اس حدیث کے متعلق ترمذی نے کہا " اسناد هذا الحدیث لیس بصحیح "اس حدیث کی سند درست نہیں۔

" ورواہ الدار قطنی بطرق عن موسی بن طلحة عن ابیه مرفوعا " لیس فی الخضروات صدقة "

موسی بن طلحہ اپنے باپ سے مرفوع حدیث بیان فرماتے ہیں "سبزیوں میں صدقہ نہیں" یہ حدیث تین سندوں سے بیان کی گئی ہے، تین سندوں میں کوئی نہ کوئی ایسا راوی ہے جس کی وجہ سے حدیث ضعیف ہے۔

" وعن محمد بن جحش ان رسول ﷺ امر معاذ احین بعثه الی الیمن ان یأ خذ من کل اربعین دینارا دینارا ولیس فی الخضروات صدقة "

محمد بن جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن میں بھیجا تو حکم فرمایا کہ چالیس دیناروں سے ایک دینار (بطور زکوۃ) لینا، اور سبزیوں میں صدقہ نہیں۔

اس حدیث کو بھی ضعیف قرار دیا گیا۔ کچھ اور احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عشر صرف چار چیزوں میں ہے لیکن ان تمام کی توجیہ بیان کی گئی ہے، تا کہ احادیث میں کسی قسم کا تعرض لازم نہ آئے۔

"روی الحاکم والبیهقی من حیث ابی بردة عن ابی موسی ومعاذ حین بعثهما النبی ﷺ الی الیمن یعلمان الناس امرد ینهم لا تا خذ و االصدقة الامن هذه الاربعة الشعیر و ا لحنطة والزبیب والتمر "

ابو بردہ فرماتے ہیں جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ کو یمن میں لوگوں کو امر دین سکھانے کے لئے بھیجا، تو فرمایا سوائے ان چار چیزوں کے اور کسی سے صدقہ نہ لو، وہ چار چیزیں ہیں۔ جو، گندم، کشمش، اور کھجور۔

" قال البیھقی رواتہ ثقات وھو متصل " بیہقی نے کہا اس کے راوی ثقہ ہیں اور سند میں اتصال ہے، یعنی کوئی راوی چھوٹا ہوا نہیں۔

" ورواہ الطبرانی من حدیث موسی بن طلحۃ عن عمر انما سن رسول اللہ ﷺ الزکوۃ فی ھذہ الاربعۃ الشعیر والحنطۃ والزبیب والتمر "

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے چار چیزوں میں یعنی جو، گندم، کشمش، اور کھجور میں صدقہ سنت بنایا ہے۔

وکذا روی الدارقطنی باسنادعن عمر عن النبی ﷺ قال لازکوۃ الافی اربعۃ التمر والزبیب والحنطۃ والشعیر"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا سوائے چار چیزوں یعنی کھجور اور کشمش اور گندم اور جو کے صدقہ نہیں۔

ان احادیث کی توجیہ:

"ولما اجمع العلماء علی عدم حصر الزکوۃ فی ھذہ الاربعۃ وجب تاویلہ بحذف المضاف یعنی لا زکوۃ الافی مثل ھذہ الاربعۃ "

جب علماء کا اس مسئلہ میں اجماع ہے کہ عشر صرف ان چار چیزوں میں بند نہیں، بلکہ اور چیزوں میں بھی عشر واجب ہے، لہٰذا ان احادیث کی توجیہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس میں مضاف لفظ مثل محذوف ہے اس لئے عبارت کا مطلب یہ ہے کہ عشر ان چار چیزوں میں ہے یہ چار چیزیں چونکہ باقی رہنے والی ہیں، لہٰذا باقی رہنے والے غلہ جات میں عشر لازم ہوگا۔ (ماخوذ از مظہری)

مسئلہ: اماا عظم رحمہ اللہ کے نزدیک عشر کے وجوب کے لئے عاقل ہونا اور بالغ ہونا شرط نہیں، امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک زکوۃ عبادت محضہ ہے اس لئے اس میں نیت کا پایا جانا شرط ہے اور نیت عاقل اور بالغ کی معتبر ہے، لیکن عشر عبادت بھی ہے اور مؤنۃ (مشقت) بھی ہے، اس لئے اس میں مسلمان ہونا تو شرط ہے لیکن عاقل اور بالغ ہونا شرط نہیں۔ (ماخوذ از مظہری)

مسئلہ: امام اعظم رحمہ اللہ کا ارشاد۔

" فان العشر عنده زكوة الارض دون الزرع ومن ثم لا يشترط النصاب عنده في الخارج"

عشر زمین کی زکوۃ کھیتی کی نہیں، اسی وجہ سے آپ کے نزدیک پیداوار میں نصاب معتبر نہیں، بلکہ قلیل اور کثیر پیداوار میں عشر لازم ہے (اس قول کے مطابق عشر مالک پر لازم ہے کاشتکار پر نہیں)

" وعند الجمهور ان العشر زكوة الزرع لا زكوة الارض "

جمہور کے نزدیک عشر زمین کی زکوۃ نہیں، بلکہ کھیتی کی زکوۃ ہے، اسی وجہ سے ان کے نزدیک نصاب مقرر ہے، اس قول کے مطابق عشر کاشتکار پر لازم ہے، مالک پر نہیں۔

عشر کے مسئلہ میں راقم کا موقف:

عشر کے ادا کرنے میں نصاب مقرر ہے، یعنی پانچ وسق سے کم میں عشر نہیں اور وسق ساٹھ صاع کا ہے، صاع تقریبا چار کلو کا ہے۔ اور عشر باقی رہنے والے دانوں وغیرہ میں ہے، (اور کھجوروں اور انگوروں میں بھی بالاتفاق عشر ہے) سبزیوں وغیرہ میں عشر نہیں۔

یہ دونوں مسئلے حنفی مسلک کے مطابق امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کے اقوال سے ثابت ہیں، ان دونوں حضرات نے اپنا موقف احادیث سے پیش کیا ہے، اگر چہ احادیث فردا فردا ضعیف ہیں لیکن جب ضعیف حدیث متعدد طرق سے بیان ہو تو وہ حسن بغیرہ بن جاتی ہے جس سے حکم ثابت ہو جاتا ہے۔

اس لئے راقم نے صاحبین کے قول پر بطور فتوی اتفاق کیا ہے، صوفیاء اور اتقیاء حضرات امام اعظم رحمہ اللہ

کے قول کو بطور تقویٰ ترجیح دیتے ہیں، تاہم معتبر فتویٰ ہی ہوگا۔

اسی طرح راقم کے نزدیک عشر زمین کی پیداوار پر ہے جو زمین کی بھی زکوۃ ہے اور کھیتی کی بھی۔

اس لئے مالک اور مزارع پر عشر ان کے حصوں کے مطابق لازم ہے۔

راقم نے اپنا موقف پیش کر دیا ہے راقم کے ذہن وضمیر نے اسے ہی قبول کیا ہے، راقم نے اپنا موقف کسی پر زبردستی ٹھونسنے کی کوشش بھی نہیں کی، اگر کوئی اس مسئلہ میں اختلاف کرے تو یہ اس کا حق ہے جب ہمارے اکابر ائمہ یعنی امام اعظم رحمہ اللہ اور صاحبین کا اختلاف ہے تو آپ کے تبعین میں اختلاف پایا جائے تو اس میں کیا حرج ہے؟

معدنیات کا حکم:

معدنیات کی تین قسمیں ہیں۔

ایک یہ کہ وہ چیز جامد ہو پگھلے نہیں جیسے کچ چونہ اور قلعی چونہ۔ دوسری وہ چیز ہے جو غیر جامد ہو جیسے تارکول اور مٹی کا تیل۔

اور تیسری وہ چیز ہے جو پگھلانے سے پگھل جائے، اور پھر سکڑ بھی جائے جیسے سونا چاندی اور لوہا۔

یہ چیزیں جب تجارت کے لئے ہوں تو سب میں زکوۃ ہوگی اگر تجارت کے لئے نہ ہوں تو صرف سونے اور چاندی میں زکوۃ ہوگی، اس مسئلہ کا تعلق تو خرید وفروخت وغیرہ اور وراثت کے ذریعے مال کے ملنے یا ہبہ کے ذریعے کے مال ملنے سے ہے۔ (از مظہری)

عشری یا خراجی زمین سے جب سونا یا چاندی یا قلعی یا تانبا پیتل مل جائیں تو ان میں خمس (پانچواں حصہ) بیت المال کا ہوگا اور چار حصے اس کے لئے ہوں گے جسے وہ مال ملا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی یہ ہے۔

"العجماء جبار والبیر جبار والمعدن جبار وفی الرکاز الخمس"

جانوروں کا ایک دوسرے کو زخمی کر دینا یا ہلاک کر دینا معاف ہے۔ ان پر کوئی ضمان نہیں، کسی آدمی کی ملکیت میں کنواں ہو اس میں گر کر کوئی مر جائے تو اس پر کوئی ضمان نہیں، معدنیات معاف ہیں یعنی ان میں زکوۃ نہیں، لیکن رکاز میں زکوۃ ہے، رکاز کا معنی زمین میں گا

ڑنا، یہ کنز (خزانہ) کو بھی شامل ہے جو خود دفن کرے، اور معدن کو بھی شامل ہے جو قدرتی طور پر زمین میں پایا گیا تھا تو حاصل ہوا، یہاں رکاز سے مراد معدن ہے جن چیزوں کا ذکر کردیا گیا ہے، وہ جب حاصل ہوں گی تو ان کو غنیمت کا درجہ حاصل ہوگا کیونکہ زمین پہلے کفار کے ہاتھ میں تھی اور مال غنیمت میں خمس ہے۔ (از ہدایہ)

لیکن راقم کا موقف اس میں یہ ہے کہ جو زمین صدیوں سے مسلمانوں کی ملکیت میں آرہی ہے اس سے حاصل ہونے والے سونے، چاندی، قلعی، پیتل وغیرہ میں سال کے گذرنے پر زکوۃ ہی ادا کی جائے، کیونکہ خمس کا حکم ائمہ کرام نے جو بیان فرمایا یا حدیث پاک سے جو ثابت ہے اس کا تعلق اسلام کی ابتدائی دور میں تھا جب اراضی کافروں کے ہاتھوں سے حاصل ہوئی تھی اب تو کئی صدیاں بیت چکی ہیں، اب مال غنیمت کا حکم کیسے؟ (راقم)

اگر مندرجہ بالا چیزیں اپنے گھر ملیں تو ان میں خمس نہیں، اگر اپنی زمین سے ملیں تو ان میں خمس ہوگا۔ اگر زمین سے کوئی سکے ملیں اور ان پر کفر کی علامات، نقش وغیرہ ملیں تو ان میں خمس ہے۔ اور اگر ان میں اسلامی علامت مل جائے تو وہ گری ہوئی چیز ملنے کے حکم میں ہے۔ (از ہدایہ)

صدقات کی تمام قسموں پر تقریباً جامع حدیث:

"اخرج ابن ابی شیبة والدار قطنی عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده عن النبی ﷺ قال لیس فی أقل من خمس ذود شئ ولا فی اقل من اربعین شئ ولافی اقل من ثلاثین من البقر شئ ولافی اقل من عشرین مثقالامن الذهب شئ ولافی اقل من مائتی درهم شئ ولا فی اقل من خمسة اوسق شئ والعشر فی التمر والزبیب والحنطة والشعیر وما سقی سیحا ففیه العشر وما سقی بالغرب ففیه نصف العشر"

عمرو بن شعیب اپنے باپ اور دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا پانچ اونٹوں سے کم میں کچھ چیز (بطور زکوۃ) نہیں، اور چالیس بھیڑ، بکریوں میں سے کم میں کچھ چیز نہیں، تیس گائے میں سے کم میں کچھ نہیں اور بیس مثقال سے کم سونے میں کچھ چیز نہیں، اور دوسو درھم سے کم

چاندی میں کچھ چیز نہیں اور پانچ وسق سے کم میں کچھ چیز نہیں اور کھجور اور کشمش اور گندم اور جو میں عشر ہے، اور جس زمین کو ندی نالے سے سیراب کیا جائے اس میں عشر ہے، اور جس زمین کو ڈولوں سے سیراب کیا جائے اس میں نصف عشر ہے۔ (در منثور)

☆ "واخرج الدار قطنی عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ لیس فی البقر العوامل صدقة ولکن فی کل ثلاثین تبیع وفی کل اربعین مسن او مسنة "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کام کرنے والی گائے (یعنی ہل چلنے والی اور کنواں چلنے والی) میں صدقہ نہیں، البتہ جب تیس گائے ہو جائیں تو ان میں وہ بچھڑا (یا بچھڑی) زکوۃ دی جائے گی جس پر ایک سال مکمل ہو جائے اور دوسرے سال میں داخل ہو، اور جب چالیس گائے ہو جائیں تو ان میں دوسالہ گائے یا بیل بطور زکوۃ دیا جائے گا۔ دوسالہ سے مراد جو تیسرے سال میں داخل ہو چکا ہو۔ (درمنثور)

صدقہ فطر نہ ادا کرنے پر وعید:

" اخرج ابو حفص بن شاهین فی فضائل رمضان عن جریر قال قال رسول الله ﷺ صوم رمضان معلق بین السماء والارض ولا یرفع الابزکوة الفطر، قال ابن شاهین حدیث غریب جید الاسناد "

ابوحفص بن شاہین نے فضائل رمضان میں جریر رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رمضان کے روزے آسمان اور زمین کے درمیان لٹکے رہتے ہیں سوائے صدقہ فطر کے وہ بلند نہیں ہوتے، ابن شاہین فرماتے ہیں یہ حدیث راویوں کی تعداد کے لحاظ پر غریب ہے اور سند کی عمدگی کے لحاظ پر صحیح ہے۔

مسئلہ : جانوروں کی زکوۃ میں نہ اعلیٰ قسم کا جانور لیا جائے اور نہ گھٹیا۔ بلکہ درمیانہ جانور لیا جائے اگر درمیانہ جانور نہ ملے تو گھٹیا لے لیا جائے اور قیمت میں جو فرق ہے وہ مالک سے اتنی رقم لے کر کمی کو پورا کر دیا جائے یا

اعلی لے لے اور زیادہ رقم جو بنتی ہے وہ مالک کو لوٹا دے، اگر مالک اپنی خوشی سے اعلی قسم کا جانور دینا چاہے تو اس کی مرضی کی بات ہے، اسے خلوص نیت کا ثواب حاصل ہوگا۔

البتہ غلہ جات میں جو دانے پیداوار ہیں ان میں سے ہی عشر اور نصف عشر دیا جائے گا۔

مسئلہ : گھٹیا چیز بطور صدقہ نہ دی جائے لیکن اگر دی جائے تو فریضہ ادا ہو جائے گا ثواب میں کمی واقع ہوگی۔ جس چیز سے فقیر فائدہ اٹھا سکے اس میں ثواب ہوگا اور جس چیز سے فقیر فائدہ نہ اٹھا سکے بلکہ بدبودار کھانا اسے کہیں پھینکنے کی تکلیف برداشت کرنی پڑے تو وہ ثواب سے محروم رہے گا۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

"من طیبات" میں "من" کا ذکر کیا، پھر " ومما اخرجنا "میں" من "کا ذکر کیا کیونکہ " مما "اصل میں " من ما" ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ واضح کرنا مقصود ہے۔" ان کلا من المتعاطفین نوع مستقل " بیشک ہر ایک معطوف اور معطوف علیہ مستقل قسم ہیں۔" اولللتاکید" اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ دوبارہ تاکید کے لئے ذکر ہو۔ (روح المعانی)

"ولاتیمموا الخبیث منه تنفقون": "اور نہ ارادہ کرو ردی چیز کا کہ اس سے تم خرچ کرو"۔

شان نزول اور ماقبل بحث سے واضح ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے میں جب کچھ ردی چیزوں کو بھی ملانا شروع کر دیا گیا تھا اس خیال سے کہ یہ جائز ہے تو رب تعالیٰ نے اسے منع فرمایا۔

" امَمته "اور" تیممته "اور" تأممته "سب کا معنی ایک ہی ہے۔" قصدته" میں نے اس کا ارادہ کیا۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

"ولاتیمموا" اصل میں باب تفعل سے ہے" ولا تتیمموا"، یعنی اس میں دو تاء ہیں، صرف ابن کثیر کی قرأت میں تاء کو تاء میں ادغام کیا گیا ہے اور تاء مدغم ہے۔ لیکن باقی حضرات کے نزدیک ایک تاء کو حذف کر دیا گیا ہے اور تاء مفتوحہ ہے۔

یہ مسئلہ ابن کثیر اور جمہور کے نزدیک اس لفظ کے علاوہ اور بائیس الفاظ میں اسی طرح مختلف فیہ رہے گا۔

"لا تفرقوا، توفاهم، تعاونوا، فتفرق بكم، تلقف، تولوا، تنازعوا، تربصون، فان تولوا، لا تكلم، تلقونه، تبرجن، تبدل، تناصرون، تجسسوا، تنابزوا، لتعارفوا، تميز، تخيرون، تلهى، تلظى، تنزل الملائكة" (از کبیر)

اور یہ بھی خیال رہے کہ مضارع پر ہمزہ وصل داخل نہیں ہوسکتا، اس لئے جو لفظ پہلے ہوگا اسی کو ادغام والی صورت میں ساتھ ملایا جائے گا جس طرح یہاں "لا" پہلے موجود ہے۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ دونوں تاء میں سے کون سی تاء کو خذف کیا جاتا ہے؟ سیبویہ کے نزدیک دوسری تاء حذف ہوتی ہے اور باقی حضرات کے نزدیک پہلی تاء خذف نظر آتی ہے، تاہم راقم کو یہ قول زیادہ پسند ہے۔

"والفراء يقول ايهما اسقطت جازلنيابة الباقية عنها"

فراء کے نزدیک دونوں تاء میں سے جسے چاہیں خذف کردیں، جو باقی رہے گی وہی دوسرے کے بھی قائم مقام ہوجائے گی۔ (کبیر)

ایک اور توجہ:

"منه تنفقون" میں ضمیر مجرور کا مرجع "الخبيث" ہے۔ جار اور مجرور کو فعل سے پہلے ذکر کیا گیا جس سے تخصیص کا معنی سمجھ میں آرہا ہے کیونکہ قانون یہ ہے۔

"التقديم ماحقه التاخير يفيد الحصر" لہٰذا اب معنی یہ ہوگا۔

"لا تقصدوا الخبيث قاصرين الانفاق عليه"

ردی چیز کا ارادہ نہ کرو کہ اسی سے تمہارا خرچ کرنا خاص ہو۔

اعتراض: اس سے تو یہ پتہ چلے گا کہ اچھی اور ردی چیز کو ملا کر صدقہ کرنا جائز ہوگا، صرف ردی چیز کا صدقہ منع ہوگا، حالانکہ اچھی اور ردی کو ملا کر صدقہ کرنا بھی منع ہے۔

جواب: اصل میں آیہ کریمہ کا نزول صرف ان لوگوں کی توبیخ (ڈانٹ ڈپٹ) کے لئے ہوا جو صرف ردی چیز

صدقہ کردیتے تھے، ورنہ ردی اور اچھی کو ملا کر صدقہ کرنا بھی ثواب کی کمی کا سبب ہے۔ (از روح المعانی)

"ولستم بآخذیه الا ان تغمضوا فیه":

"حالانکہ تم خود وہ نہیں لیتے سوائے اس کے کہ تم اس میں آنکھیں بند کر لو"

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے: یہ جملہ حال واقع ہو رہا ہے۔

"ای حالکم انکم لا تأ خذ ون الخبیث الردی فی حقوقکم لرد ائته"

حالانکہ (یعنی تمہارا حال یہ ہے) تم خبیث اور ردی چیز اپنے حقوق میں نہیں لیتے کہ یہ گھٹیا اور ردی ہے۔ (مظہری)

"تغمضوا" اغماض سے لیا ہوا ہے جس کا معنی ہے آنکھیں بند کرنا، تقریباً مراد "مسامحت" آسانی کی راہ پکڑنا، درگذر کرنا، تنگدلی نہ کرنا بلکہ فراخدلی کا مظاہرہ کرنا۔ اس کے کئی مطالب ہیں جو سب کو شامل ہے۔

﴿۱﴾ "یعنی لو کان لاحدکم علی رجل حق فجاء ہ بھذالم یأخذہ الاوھو یری انہ قدترک حقه"
یعنی اگر کسی شخص پر تمہارا حق ہو وہ تمہیں ردی چیز دے تو تم خوشی سے تو نہیں لیتے البتہ درگزر کرتے اور یہ کہتے ہوئے لے لیتے ہو کہ اس نے حق ادا نہیں کیا جیسا کہ ادا کرنے کا حق تھا۔

﴿۲﴾ "قال الحسن وقتادہ"لو وجد تموہ یباع فی السوق ما اخذ تموہ بسعر الجید"
حضرت حسن اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اگر تم کسی ردی چیز کو بازار میں دیکھو تو تم اسے عمدہ بھاؤ، اعلیٰ قیمت سے نہیں لیتے، ہاں یونہی چشم پوشی کر کے لے لو تو البتہ لے لو۔

﴿۳﴾ "وروی عن البراء انہ قال لو کان اھدی ذلک لکم مااخذتموہ الااستحیاء من صاحبه وغیظا"

حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اگر تمہیں کوئی شخص ردی

اور گھٹیا چیز بطور ہدیہ دے تو تم اسے خوشی سے نہیں لیتے ہاں البتہ دینے والے سے شرم محسوس کرتے ہوئے اور اس کے غصہ اور اس کی ناراضگی سے بچتے ہوئے چشم پوشی سے لے لیتے ہو۔

جب تمہارا اپنا یہ حال ہے کہ ردی چیز سوائے چشم پوشی کے نہیں لیتے۔"**فکیف ترضون للہ مالاترضون لانفسکم**"تو کس طرح پسند کرتے ہو اللہ کے لئے وہ چیز جو اپنے لئے نہیں پسند کرتے۔

خیال رہے کہ "فکیف ترضون للہ" سے مراد یہ ہے کس طرح تم اللہ کی راہ میں وہ مال خرچ کرنا پسند کرتے ہو جو اپنے لئے پسند نہیں کرتے۔ (مظہری)

فائدہ:

ھذا اذا کان المال کلہ جید فلیس لہ اعطاء الردی، وان کان کل مالہ ردیا فلا بأس باعطاالردی ولو کان بعضہ جیدا و بعضہ ردیا فلیعط من کل جنس بحصتہ "

جب انسان کا کل مال اچھا اور عمدہ ہو تو اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں گھٹیا اور ردی مال خرچ کرے، اور اگر انسان کے پاس کل مال ردی اور گھٹیا ہو تو کوئی حرج نہیں کہ وہ شخص صدقہ بھی گھٹیا مال کرے، اور اگر ایک شخص کے پاس کچھ مال عمدہ اور کچھ گھٹیا ہو تو وہ عمدہ مال کے تناسب سے عمدہ مال صدقہ کرے اور گھٹیا مال کے تناسب سے گھٹیا مال صدقہ کرے۔ (از مظہری)

لیکن راقم کا موقف اس میں یہ ہے کہ جب کسی کے پاس عمدہ مال اور ردی مال ملا جلا ہو تو وہ اللہ کی راہ میں عمدہ مال ہی خرچ کرے، ہاں جب یہ خیال ہو کہ عمدہ مال تو کم ہے دینے کے لئے اور فقیر زیادہ حاجت مند ہیں، اگر ان کو ردی مال بھی دیا جائے تو ان کا فائدہ ہو سکتا ہے تو اس صورت میں ردی مال بھی دے دیا جائے۔

"واعلموا ان اللہ غنی حمید": "اور جان رکھو بیشک اللہ بے پرواہ، حمد کے لائق ہے"۔

"واعلموا" کا معنی "جان رکھو" یعنی تم جانتے تو پہلے بھی ہو، اسی علم پر قائم رہو، اور اس کا معنی یہ بھی ہے کہ تم خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے خرچ کرنے سے بے پرواہ ہے اسے تمہارے خرچ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ اس

نے تمہیں حکم دیا ہے تمہارے فائدہ کے لئے کہ تم اس سے اجر وثواب حاصل کرو، ضمناً ڈانٹ بھی دی گئی کہ جب مال خرچ کرنے میں تمہارا اپنا نفع ہے تو ردی چیز کیوں خرچ کرتے ہو یہ تو اپنے نفع سے بے خبر ہونے کے مترادف ہے، اسی کا نام جہالت ہے۔

" حمید" مستحق للحمد علی نعمه"

اللہ تعالیٰ تعریف کے لائق ہے اپنے انعامات پر وہ حمد کا جب مستحق ہے تو اس کی حمدوں میں سے یہ بھی کہ اس کی نعمتوں میں سے اس کی راہ میں خرچ کرنے میں بہت زیادہ کوشش کی جائے تا کہ اپنی وسعت کے مطابق اس کی تعریف بہتر طریقہ سے کر سکے۔ (از روح المعانی)

"وقیل حامد بقبول الجید و الا ثابة علیه":

اور بعض حضرات نے ''فعیل بمعنی فاعل'' کے قانون کے مطابق ''حمید'' کا معنی تعریف کرنے والا'' کیا ہے کہ وہ اپنے بندوں سے عمدہ مال لے کر اور ان پر ثواب عطاء کر کے تعریف کرنے والا ہے۔ (روح المعانی)

" حمید" ای محمود فی افعاله" اور معنی حمید کا ''فعیل بمعنی مفعول'' کے قاعدہ کے مطابق یہ ہے اپنے افعال میں تعریف کیا ہوا۔ (مظہری)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ مظہری کے مطابق ہے'' سراہا گیا ہے''

اور پیر صاحب کا ضیاء القرآن میں روح المعانی کا پہلا ترجمہ ہے۔ راقم نے بھی وہی نقل کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

اَلشَّیۡطٰنُ یَعِدُکُمُ الۡفَقۡرَ وَیَاۡمُرُکُمۡ بِالۡفَحۡشَآءِ وَاللّٰہُ یَعِدُکُمۡ مَّغۡفِرَۃً مِّنۡہُ وَفَضۡلًا وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ☆ (سورۃالبقرۃآیت۲۶۸)

﴿۱﴾

شیطان تمہیں اندیشہ دلاتا ہے محتاجی کا اور حکم دیتا ہے بے حیائی کا اور اللہ تم سے وعدہ فرماتا ہے بخشش اور فضل کا اور اللہ وسعت والا علم والا ہے۔

﴿۲﴾

شیطان ڈراتا ہے تمہیں محتاجی سے اور حکم دیتا ہے تمہیں بے حیائی کا، اور اللہ وعدہ کرتا ہے تم سے اپنی بخشش کا اور فضل کا، اور اللہ وسعت والا علم والا ہے۔

ماقبل سے تعلق:

اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں عمدہ مال خرچ کرنے کا حکم دیا، اب اس آیۃ کریمہ میں یہ بتایا جارہا ہے کہ مال خرچ کرنے میں تمہیں شیطان ڈرائے گا کہ اگر تم نے مال خرچ کیا تو تم محتاج ہوجاؤ گے لیکن ساتھ ہی بیان کردیا کہ تم فکر نہ کرو، اللہ تعالیٰ تم سے اپنی بخشش اور فضل کا وعدہ فرماتا ہے۔ (کبیر)

"الشیطان یعد کم الفقر": "شیطان ڈراتا ہے تمہیں محتاجی سے"۔

شیطان سے مراد ابلیس ہے، یا جنوں میں سے تمام شیاطین مراد ہیں یا انسانوں اور جنوں سے تمام شیاطین مراد ہیں یا نفس امارہ ہے۔ (کبیر)

راقم کے نزدیک حکم عام ہے جو تمام کو شامل ہے کہ اللہ کی راہ میں عمدہ مال خرچ کرنے سے ابلیس بھی تمہیں احتیاجی کا خوف دلاتا ہے اور انسانوں اور جنوں میں سے تمام شیاطین تمہیں ڈراتے ہیں اور نفس امارہ جو شیطان کی طرح

ہے وہ تمہیں ڈراتا ہے کہ اگر اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو گے تو فقیر ہو جاؤ گے۔

"یعد کم" کا معنی ہے وہ تمہیں ڈراتا ہے، وعدہ کا استعمال جب مقام شر میں ہو تو اس وقت وہ وعید کے معنی میں ہوتا ہے۔

تسکین الجنان کا ایک ورق:

"الشیطان یعدکم الفقر":

شیطان وعدہ دیتا ہے تم کو تنگدستی کا۔	(محمود الحسن صاحب)
شیطان وعدہ دیتا ہے تم کو تنگی کا۔	(شاہ عبدالقادر صاحب)
شیطان وعدہ دیتا ہے تم کو فقر کا۔	(شاہ رفیع الدین صاحب)
شیطان تمہیں اندیشہ دلاتا ہے محتاجی کا۔	(اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ)

اس مقام میں مقصد کے قریب اور تفاسیر کے مطابق اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ نظر آتا ہے۔

" یخو فکم به ان تفتقروا ان تصد قتم فتمسکوا" (جلالین)

وہ (شیطان) تمہیں خوف دلاتا ہے اگر تم نے صدقہ دیا تو محتاج ہو جاؤ گے، لہٰذا اپنا مال اپنے پاس ہی محفوظ رکھو۔

"یعدکم با لانفاق الفقر ویقول لکم ان عاقبة انفاقکم ان تفتقروا والوعد یستعمل فی الخیر والشر" (مدارک)

شیطان تمہیں خرچ کرنے سے ڈراتا ہے محتاجی سے اور تمہیں کہتا ہے کہ تمہارے خرچ کرنے کا انجام تمہارا محتاج ہونا ہے۔ اس سے آگے ایک ضابطہ کی طرف اشارہ کیا کہ وعدہ کا لفظ خیر اور شر دونوں میں استعمال ہوتا ہے۔

یعنی اگر خیر میں استعمال ہو تو ثواب اور اچھائی کی امید دلانا اور شر میں استعمال ہو تو بمعنی وعید ہوگا، یعنی ڈرانا، اس سے پتہ چلا کہ "شیطان تمہیں اندیشہ دلاتا ہے محتاجی کا" یہ معنی بنسبت "وعدہ دیتا ہے" کے زیادہ ادراک (سمجھ)

کے قریب ہے، بلکہ یوں کہا جائے کہ یہ مقام شر ہے، اس لئے اندیشہ دلانا، ڈرانا، کرنا ہی حقیقت ہے۔
(تسکین الجبان فی محاسن کنز الایمان۔ ۹۷،۹۸)

''الفقر سوء الحال وقلة ذات اليد''

نقر کا معنی بدحالی اور ہاتھ میں مال کی کمی، یعنی تنگدستی اور محتاجی۔ (مظهری)

''ویأ مر کم با لفحشاء'': ''اور تمہیں حکم دیتا ہے بے حیائی کا''۔

اس سے مراد یہ ہے۔''یوسوس لکم ویحسن لکم البخل ومنع الزکوة والصدقة''

کہ تمہارے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے اور بخل (کنجوسی) تمہیں حسین کر کے دکھاتا ہے، اور زکوۃ اور صدقات سے تمہیں روکتا ہے۔کلبی رحمہ اللہ نے فرمایا۔قرآن پاک میں'' الفحشاء '' کا لفظ جہاں بھی استعمال ہے اس کا معنی زنا ہے لیکن اس مقام میں یہ معنی نہیں بلکہ یہاں معنی بخل اور کنجوسی ہے۔

شیطان پہلے تنگدستی کا خوف دلاتا ہے انسان جب اس سے خوف رکھنا شروع کر دیتا ہے۔تو شیطان کے لئے آسان ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے دل میں یہ ڈال دیتا ہے کہ بخل اور کنجوسی حسین چیز ہے، حالانکہ سب عقل والے بخل کو بری چیز سمجھتے ہیں، اسی وجہ سے شیطان براہ راست اس پر کامیاب نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ بخل کو حسین کر دکھائے البتہ وہ تنگدستی کا خوف دلا کر بخل کو حسین کر کے دکھانے میں کامیاب ہو گیا۔ (از خازن)

''الفحشاء'' عام گناہوں کو بھی شامل ہے:

شیطان اپنی چال میں کیسے کامیاب ہوتا ہے؟ وہ پہلے انسان کو یہ خوف دلاتا ہے کہ عمدہ مال خرچ نہ کرنا ورنہ خود محتاج ہو جاؤ گے، جب انسان اس کا مطیع بن جاتا ہے تو وہ آہستہ آہستہ اسے اور زیادہ خوف دلانا شروع کر دیتا ہے یہاں تک کہ وہ مکمل طور پر خرچ کرنے سے روکنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

''حتی یمنع الحقوق الواجبة فلا یؤدی الزکوة ولا یصل الرحم ولا یرد الودیعة''

یہاں تک کہ وہ اس شخص کو حقوق واجبہ کے ادا کرنے سے روک دیتا ہے وہ زکوۃ ادا نہیں کرتا، صلہ

رحمی نہیں کرتا اور امانت واپس نہیں لوٹاتا۔

"فاذا اصارھکذا سقط وقع الذنوب عن قلبہ ویصیر غیر مبال بارتکابھا"

جب یہ صورت حاصل ہو جاتی ہے تو انسان کسی گناہ کی کوئی پرواہ نہیں کرتا بلکہ ہر قسم کے گناہ میں دل سے یعنی خوشی سے واقع ہوتا ہے، یہاں تک کہ اسے گناہ ہی حسین چیز نظر آتی ہیں۔

اس تفصیل کے بعد واضح ہوا کہ اس مقام "الفحشاء" کا معنی ہر قسم کا گناہ کرنا بھی صحیح ہے کہ شیطان تمہیں گناہوں میں مبتلاء ہونے کا حکم دیتا ہے۔ (از کبیر)

جب انسان اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے تنگدستی سے ڈرے گا تو اس کے دل میں کئی قسم کے گناہ آجائیں گے ان تمام کو "الفحشاء" شامل ہے۔ وہ دل میں آجانے والی برائیاں یہ ہیں۔

بخل، حرص، اللہ تعالیٰ سے ناامیدی، اور اللہ نے جو اپنے بندوں سے رزق کا وعدہ کر رکھا ہے اور اس کی راہ میں خرچ کرنے پر جزاء دینے کے وعدہ میں اور نیکیوں کا کئی گنا ثواب عطاء کرنے کے وعدہ میں شک کرنا لازم آتا ہے اور "معاذ اللہ" اللہ تعالیٰ پر بدگمانی اور توکل کا چھوڑنا لازم آتا ہے۔ اور رب تعالیٰ کے ارشاد کی تکذیب، اور رب تعالیٰ کے فضل و کرم کو بھولنا، اور رب تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری، اور رب تعالیٰ سے اعراض اور مخلوق کی طرف توجہ، اللہ تعالیٰ سے امید کو منقطع کرنا اور دل کو غیر سے جوڑنا، خواہشات کی تابعداری، دنیوی منافع کی طرف زیادہ توجہ، عفت اور قناعت کو چھوڑنا، یعنی یہ تمام مندرجہ بالا برائیاں شیطان کے خوف دلانے سے کہ تم اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو گے تو تنگدست ہو جاؤ گے، جنم لیتی ہیں۔

"والتمسک بحب الدنیا وھو راس کل خطیئۃ وبذر کل بلیۃ فمن فتح علی نفسہ باب وسوسۃ فسوف یتبلی بھذہ الآفات"

دنیا کی محبت دل میں جما رکھنے سے ہر قسم کے گناہوں میں مبتلاء ہونا لازم آتا ہے، کیونکہ دنیا کی محبت ہر گناہ کی اصل اور سردار ہے اور ہر برائی کا بیج ہے، جس شخص نے اپنے آپ پر وسوسہ کا دروازہ کھولا وہ مندرجہ بالا تمام برائیوں میں واقع ہوگا۔ (روح البیان)

”واللّٰہ یعدکم مغفرۃ منہ و فضلا“:

”اور اللہ وعدہ کرتا ہے تمہارے ساتھ اپنی بخشش اور فضل کا۔“

فائدہ جلیلہ:

یہاں جس مغفرۃ کا ذکر ہے وہ کامل اور عظیم مغفرت ہے، اس مقصد پر دولفظ دلالت کر رہے ہیں ایک ”مغفرۃ“ کا نکرہ ذکر کرنا“ والمعنی مغفرۃ ای مغفرۃ ”ہر طرح کی بخشش کا رب تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے، دوسرا لفظ ہے ”منہ“ جو کمال مغفرت پر دلالت کر رہا ہے، اس لئے کہ تمام عقلاء جانتے ہیں کہ اللہ کا کرم کامل کرم ہے، اور اس کے کامل جود (سخاوت) کو بھی عقلمند انسان جانتے ہیں اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ مغفرت رب تعالیٰ سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

” فلما خص هذه المغفرة بانها منه علم ان المقصود تعظيم حال هذه المغفرة لان عظم المعطى يدل على عظم العطية“

جب رب تعالیٰ نے مغفرت کو ” منہ “ ذکر کر کے اپنی طرف منسوب فرمادیا ” کہ اللہ اپنی مغفرت کا وعدہ فرماتا ہے“ تو واضح ہو گیا کہ مقصد ”مغفرت کے حال کی عظمت بیان کرنا ہے“ کیونکہ جب معطی (عطاء کرنے والا) عظیم ہو گا تو اس کا عطیہ بھی عظیم ہو گا۔ (از کبیر)

وہ مغفرت عظیمہ کیا ہے؟

اس میں کئی احتمال ہے۔ ﴿۱﴾ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دے۔

﴿۲﴾ دوسرا احتمال یہ ہے کہ ” ان يجعله الله شفيعا في غفران ذنوب سائر المذنبين “ اللہ تعالیٰ تمام گنا ہگاروں کی شفاعت کرنے کا اسے حق عطاء کر دے۔

﴿۳﴾ تیسرا احتمال یہ ہے کہ ”ان يكون تلك المغفرة امر الا يصل اليه عقلنا مادمنا في دار الدنيا“ جب تک ہم دنیا میں ہیں ہماری عقلیں اس مغفرت کو نہ پاسکیں، کیونکہ کتنی چیزیں اور کتنے ہی احوال ایسے ہیں جو آخرت سے تعلق رکھتے ہیں وہ ہم سے محجوب (پردے میں) رہتے ہیں جب تک ہم دنیا میں ہیں۔

فضل سے مراد کیا ہے؟

اس میں بھی چند احتمال ہیں، اگرچہ بظاہر احتمال یہ ہے کہ دنیا میں ہی بھلائی عطاء کر دینے کو "فضل" سے بیان کیا گیا ہے۔

﴿۱﴾ ایک احتمال یہ ہے کہ اس فضل سے مراد وہ فضیلت ہو جو نفس کو حاصل ہوتی ہے وہ ہے فضیلت جود و سخاء اس لئے کہ سعادت کے تین مرتبے ہیں، سعادت نفسانیہ، سعادت بدنیہ، سعادت خارجیہ۔

مال کی ملکیت فضائل خارجیہ سے تعلق رکھتی ہے اور جود و سخاء کا حاصل ہونا فضائل نفسانیہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس مسئلہ پر اہل علم کا اتفاق ہے کہ سعادت کے تینوں مراتب میں سے اعلیٰ مرتبہ سعادت نفسانیہ کا ہے۔ اور گھٹیا مرتبہ سعادت خارجیہ کا ہے۔

جب انسان کو اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی توفیق حاصل نہ ہو تو اسے سعادت خارجیہ تو حاصل ہے کیونکہ وہ مال دار ہے، لیکن سعادت نفسانیہ سے محروم ہے کیونکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے حاصل ہونی تھی۔ یعنی اس صورت میں کمال خارجی حاصل ہے اور نقص نفسانی۔

اگر اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی توفیق حاصل ہو جائے تو کمال نفسانی حاصل ہوگا، البتہ نقص خارجی ہوگا اس لئے کہ خارجی سعادت کی دارومدار مال جمع کرنے اور خرچ نہ کرنے پر ہے۔

"ولا شک ان هذه الحالة اکمل"

یہ یقینی بات ہے کہ بیشک سعادت نفسانیہ کا حاصل ہونا ہی کمال ہے۔

"فثبت ان مجرد الانفاق یقتضی حصول ما وعدالله به من حصول الفضل"

تو ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے انسان اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو پا لیتا ہے یعنی جو اس نے فضل عطاء کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

﴿۲﴾ دوسرا احتمال یہ ہے جب انسان کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا ملکہ حاصل ہو جاتا ہے تو

روح کی دنیا کی لذات میں مشغولیت زائل ہو جاتی ہے، اور دنیا کی طلب میں ہی اپنے آپ کو مشغول رکھنے سے انسان باز آ جاتا ہے جب انسان کو یہ کیفیت حاصل ہوتی ہے تو اس کا روح اللہ تعالیٰ کے نور کی تجلیات سے منور ہو جاتا ہے، اس لئے کہ دنیا کی محبت ان تجلیات سے مانع تھی، جب دنیا کی محبت اس کے دل سے جاتی رہی تو بغیر کسی رکاوٹ کے اسے رب تعالیٰ کے نور کی تجلیات حاصل ہو گئیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

"لولاان الشیاطین یوحون الی قلوب بنی آدم لنظروا الی ملکوت السماوات"

اگر لوگوں کے دلوں میں شیاطین وسوسہ نہ ڈالیں تو وہ آسمانوں کی بادشاہیوں کو دیکھ لیں۔

انسان جب انوار تجلیات کو حاصل کر لیتا ہے۔ "فصار کالکوب الدری والتحق بارواح الملائکۃ" تو چمکدار ستارے کی طرح ہو جاتا ہے اور ارواح ملائکہ سے مل جاتا ہے، یعنی اسے ملائکہ کی طرح جہان میں تصرف کا مقام حاصل ہو جاتا ہے "ھذاھو الفضل لاغیر" یہی تو فضل ہے اور کچھ نہیں۔

﴿۳﴾ تیسرا احتمال یہ ہے کہ کسی انسان کے متعلق جب دوسروں کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے تو لوگوں کے دل اس کی طرف مائل ہو جاتے ہیں، وہ اس سے مطالبہ کرنے میں اسے تنگ نہیں کرتے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کے یہ خود ہی اللہ کی راہ میں خوشی سے خرچ کرتا ہے، تو اس پر دنیا اور بھلائی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

" لان اولئک الذین انفق ماله علیهم یعینونه بالدعاء والهمة فیفتح الله علیه ابواب الخیر "

کیونکہ جن لوگوں پر وہ مال خرچ کرتا ہے وہ اس کے لئے دعا کرتے ہیں، اور اس کی ہمت بڑھاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی دعا سے اس کے لئے خیر و برکت کے دروازے کھول دیتا ہے۔ (از کبیر)

شیطان کی دھمکی اور رب تعالیٰ کا وعدہ:۔

﴿۱﴾ اگر صاحب عقل انسان معمولی توجہ کرے تو سمجھ جائے کہ شیطان کی دھمکی کو رب تعالیٰ کے وعدہ سے مقابلہ ہی کیا ہے، جبکہ رب تعالیٰ کی نافرمانی سے وہ خود ہی ذلیل ہو کر جنت سے نکال دیا گیا ہے۔

﴿۲﴾ پھر شیطان کی دھمکی اور ڈرانے کا تعلق دنیا میں محتاجی سے تعلق ہے، اور رب تعالیٰ کے وعدہ کا تعلق آخرت میں

مغفرت سے ہے، جب دنیا فانی ہے اور آخرت باقی تو یقیناً آخرت سے متعلق وعدہ ہی بلند مرتبہ رکھتا ہے۔

﴿۳﴾ دنیا میں احتیاج کا پایا جانا مشکوک ہے اور آخرت میں مغفرت کا حصول یقینی ہے، یہ بات واضح ہے کہ یقین کو شک پر فضیلت حاصل ہے۔

﴿۴﴾ پھر دنیا کا مال باقی رہتا ہے اور کبھی فنا ہو جاتا ہے، لیکن آخرت میں مغفرت رب ذوالجلال کے وعدہ کے مطابق باقی رہنی ہے اس پر فنا نہیں، اس لئے کہ مغفرت کا وعدہ رب تعالیٰ کا ہے اس کا وعدہ سچا ہی سچا ہے اس میں جھوٹ کا تصور وخیال کرنا ہی باطل ہے۔

﴿۵﴾ پھر کنجوس کے پاس مال ہونے کے باوجود نفع نہ حاصل کر سکنا ممکن ہے، کیونکہ ہو سکتا ہے وہ مرض کی وجہ سے یا کسی خوف کی وجہ سے یا کسی اور کام میں مشغول ہونے کی وجہ سے نفع نہ حاصل کر سکے، لیکن اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اس کے فضل واحسان سے یقیناً نفع حاصل ہوتا ہے، اس میں نفع نہ حاصل کر سکنے کا کوئی احتمال نہیں۔

﴿۶﴾ پھر دنیا کے مال سے نفع حاصل کرنے کا تعلق زندگی سے ہے، جب زندگی ختم ہو تو نفع بھی ختم، لیکن اخروی زندگی میں اختتام نہیں اس لئے رب تعالیٰ کی مغفرت اور اس کے فضل واحسان سے نفع حاصل کرنے میں بھی اختتام نہیں۔

﴿۷﴾ پھر دنیا کی لذات کے ساتھ تکالیف بھی ہیں کیونکہ وہ ہزاروں تکالیف برداشت کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہیں، لیکن اخروی نعمتیں نقصانات اور تکالیف سے پاک ہوں گی۔

" ومن تامل فیما ذکرناه علم ان الانقیاد لوعد الرحمن بالفضل والمغفرة اولی من الانقیاد لوعد الشیطان " ہم نے جن وجوہ کو ذکر کیا ہے اگر ان میں کوئی شخص غور وفکر کرے تو اسے پتہ چل جائے گا رب تعالیٰ کے فضل ومغفرت کے وعدہ کی فرمانبرداری ہی بہتر ہے، شیطان کے ڈرانے کی وجہ سے شیطان کی فرمانبرداری ذلت اور رسوائی کا سبب ہے۔ (کبیر)

"واللہ واسع علیم" : "اور اللہ وسعت والا ہے، جاننے والا ہے۔"

اللہ تعالیٰ وسیع مغفرت کا مالک ہے اور تمہیں غنی کرنے پر قادر ہے، اور جو تم خرچ کرتے ہو اس کا بدلہ دینے پر

قادر ہے وہ اس سے کہیں زیادہ تمہیں مال عطاء کر دے۔

اور وہ جاننے والا ہے، جو مال تم اس کی راہ میں خرچ کرتے ہو وہ اس سے مخفی (پوشیدہ) نہیں، اور اس نے تمہیں جو بدلہ عطاء کرنا ہے وہ بھی اس کے علم میں ہے، کیونکہ بدلہ بھی خلوص نیت کے مطابق ہوتا ہے، اور رب تعالیٰ جب دلوں کی باتوں، نیات وخلوص کو جانتا ہے تو یقیناً اسی کے مطابق وہ جزاء بھی دے گا۔ (ماخوذ از کبیر)

آیۃ کریمہ کے متعلق احادیث مبارکہ:

"عن ابن مسعود قال قال رسول الله ﷺ ان للشيطان لمة بابن آدم وللملك لمة فامالمة الشيطان فايعاد بالشر وتكذيب بالحق ، واما لمة الملك فا يعاد بالخير وتصديق بالحق فمن وجد ذلك فليعلم انه من الله تعالى فليحمد الله ومن وجد الأخرى فليتعوذ بالله من الشيطان ثم قرأ الشيطان يعدكم الفقر ويأمركم بالفحشاء"

(اخرجه الترمذی)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، بیشک شیطان وسوسہ ڈالتا ہے انسان کو، اور فرشتہ انسان پر الہام کرتا ہے، شیطان کا وسوسہ یہ ہوتا ہے کہ وہ شر کا خوف دلاتا ہے اور رب تعالیٰ کی تکذیب (جھٹلانے کی طرف مائل کرتا ہے۔لیکن فرشتے کا الہام یہ ہوتا ہے کہ وہ خیر کا وعدہ دلاتا ہے، اور رب تعالیٰ کی تصدیق کی طرف انسان کو لاتا ہے، جسے یہ حاصل ہو جائے وہ جان لے کہ بیشک یہ اسے رب تعالیٰ (کی توفیق) سے حاصل ہوا ہے، تو وہ رب تعالیٰ کی حمد (تعریف) بیان کرے۔ اور جسے دوسری چیز (شیطان کا وسوسہ) حاصل ہوگئی وہ شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ پکڑے، پھر آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی:

" الشيطان يعدكم الفقر ويامركم بالفحشاء "

حدیث شریف میں لفظ" لمة " واقع ہوا ہے، جس کا معنی ہے قریب ہونا، قریب ہونے کی وجہ سے کسی چیز کا کھٹکنا اور خطرہ محسوس ہونا، اور کسی کو چھونا (چک دینا)

اس مقام پر'' لمۃ '' سے مراد وہ چیز ہے جو دل میں خیر، یا شر واقع کرے جس سے اس کام کا عزم پایا جائے۔

" فاما لمة الشيطان فو سوسته واما لمة الملك فالهام من الله تعالى "

شیطان کا ''لُمَّۃ'' وسوسہ ہے۔اور فرشتے کا 'لمۃ' الہام ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور فضل حاصل ہوتا ہے۔ (خازن)

اچھی چیز کو دل میں ڈالنا ''الہام'' ہے۔اور بری چیز کو دل میں ڈالنا ''وسوسہ'' ہے۔

☆ " عن ابى هريرة ان رسول الله ﷺ قال مامن يوم يصبح فيه العباد الا و ملكان ينزلان يقول احدهما اللهم اعط منفقا خلفا ويقول الآخر اللهم اعط ممسكا تلفا"

(بخاری و مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے بندوں پر کوئی صبح نہیں آتی مگر یہ کہ دو فرشتے نازل ہوتے ہیں، ان میں سے ایک یہ کہتا ہے اے اللہ جو (تیری راہ میں) خرچ کرے اسے اس کے بدلے اور مال عطاء فرما، اور دوسرا کہتا ہے اے اللہ جو تیری (راہ میں مال خرچ نہ کرے) روک کر رکھے تو اس کے مال کو برباد کردے۔ (خازن)

☆ "عن ابى هريرة رضى الله عنه ان رسول الله ﷺ قال قال الله تعالى انفق ينفق عليك"

(بخاری و مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے تم خرچ کرو تم پر خرچ کیا جائے گا۔ (خازن)

یعنی اس حدیث قدسی میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ مؤمن جب اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر مہربانی فرماتے ہوئے اس کے بدلے اور مال عطاء فرماتا ہے۔

☆ "عن اسماء بنت ابى بكر الصديق قالت قال لى رسول الله ﷺ انفقى ولا تحصى فيحصى عليك ولا توعى فيوعى عليك "

(بخاری مسلم)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں مجھے رسول اللہ نے فرمایا (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو اور گنو نہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تم پر گنے گا اور مال کو روک کر جمع نہ

کرو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تم پر مال روک دے گا۔

یعنی اگر اللہ تعالیٰ کی راہ میں تم نے مال دینے میں حساب کیا تو تمہیں بھی مال حساب سے ہی ملے گا اور اگر تم اللہ کی راہ میں مال خرچ نہ کیا تو تمہارے رزق میں بھی کمی آئے گی رب تعالیٰ بھی تمہیں مال عطا نہیں کرے گا۔ (خازن)

☆ "عن ابی ذر قال قال رسول اللہ ﷺ هم الاخسرون ورب الكعبة قلت من هم قال هم الا كثرون اموالا الا من قال هكذا وهكذا وهكذا من بين يديه ومن خلفه وعن يمين هو عن شماله وقليل ما هم" (بخاری و مسلم)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ لوگ خسارے میں ہیں قسم ہے رب کعبہ کی۔ میں نے عرض کیا وہ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا وہ لوگ جو زیادہ مال جمع کرنے والے ہیں ہاں مگر وہ شخص، فرمایا "اس طرح اور اس طرح اور اس طرح اپنے آگے اور اپنے پیچھے اور دائیں طرف اور بائیں طرف، یہ لوگ بہت کم ہیں۔

آپ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ مال جمع کر کے رکھتے ہیں اس سے وہ حقوق واجبہ اور فرضیہ بھی ادا نہیں کرتے وہ خسارے میں ہیں، آپ نے اس شدید وعید کو رب کعبہ کی قسم اٹھا کر بیان کیا، پھر آپ نے فرمایا ہاں وہ لوگ اسی خسارے سے محفوظ ہیں جو سامنے سے آنے والے سائلین کو مال دیتے ہیں، اور پیچھے سے آنے والے سائلین کو مال دیتا ہے، اور دائیں جانب سے آنے والے سائلین کو مال دیتا ہے، اور بائیں جانب سے آنے والے سائلین کو مال دیتا ہے یا اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے خواہ وہ راہ آگے کی جانب ہو، یا پیچھے کی جانب ہو، یا دائیں جانب ہو، یا بائیں جانب ہو۔

ایسے شخص خسارے سے بچے ہوئے ہیں لیکن ایسے لوگ بہت تھوڑی تعداد میں ہیں۔ (ماخوذ از مظہری)

☆ "عن ابی هريرة قال قال رسول اللہ ﷺ السخی قريب من الله قريب من الجنة قريب من الناس، بعيد من النار، والبخيل بعيد من الله بعيد من الجنة بعيد من الناس قريب من النار وجاهل سخی احب الی الله من عابد بخيل" (رواه الترمذی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سخی اللہ تعالیٰ کے قریب ہوتا ہے

جنت کے قریب ہوتا ہے لوگوں کے قریب ہوتا ہے آگ سے دور ہوتا ہے اور بخیل اللہ سے دور ہوتا ہے، جنت سے دور ہوتا ہے لوگوں سے دور ہوتا ہے آگ کے قریب ہوتا ہے اور جاہل سخی اللہ کو زیادہ محبوب ہوتا ہے بنسبت عبادت گزار کنجوس و بخیل سے۔ (مظھری)

☆ "عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ السخاشجرۃ فی الجنۃ فمن کان سخیا اخذ بغصا منھافلم یترکہ الغصن حتی یدخلہ الجنۃ، والشح شجرۃ فی النار فمن کان شحیحا اخذ بغصا منھا فلم یترکہ الغصن حتی یدخلہ النار" (رواہ البیھقی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سخاوت جنت میں ایک درخت ہے، جو شخص سخاوت کرتا ہے درخت کی ٹہنیاں پکڑ لیتا ہے وہ ٹہنیاں اسے نہیں چھوڑتی یہاں تک کہ اسے جنت میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ اور بخل و کنجوسی جہنم میں ایک درخت ہے، جو شخص کنجوس ہوگا وہ اس کی ٹہنیاں پکڑے گا اور وہ ٹہنیاں اسے نہیں چھوڑیں گی یہاں تک کہ اسے آگ میں داخل کر دیا جائے گا۔ (مظہری)

☆ "وعن علی مرفوعابادروا بالصدقۃ فان البلاء لا یتخطاھا" (رواہ رزین)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث مروی ہے، یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا صدقہ دینے میں جلدی کرو بیشک مصیبت صدقہ پر قدم نہیں پھیلا سکتی۔ (مظہری)

اقوال صحابہ:

" واخرج ابن المنذر وابن ابی حاتم عن ابن عباس قال اثنتان من اللہ وا ثنتان من الشیطان الشیطان یعدکم الفقرو یأمرکم بالفحشاء یقول لا تنفق مالک وامسک علیک فانک تحتاج الیہ واللہ یعدکم مغفرۃ منہ علی ھذہ المعاصی و فضلا فی الرزق "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں دو چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے پائی گئی ہیں، اور دو شیطان کی طرف سے، شیطان تمہیں محتاجی سے ڈراتا ہے اور تمہیں بے حیائی کا حکم دیتا ہے یعنی وہ کہتا ہے اپنا مال خرچ کر، اور اپنے آپ پر مال روک کر رکھ ورنہ تو محتاج ہو جائے گا، اور اللہ تعالیٰ تم

سے وعدہ کرتا ہے ان معاصی پر اپنی بخشش کا اور رزق میں فضل کا۔ (در منثور)

"واخرج احمد فی الزهد عن ابی مسعود قال انما ابن آدم مثل الشئ الملقی بین یدی الله الشیطان فان کان لله تبارک و تعالی فیه حاجة جاره من الشیطان وان لم یکن لله فیه حاجة خلی بینه و بین الشیطان"

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں انسان اور اس کے مال خرچ کرنے کی مثال بیان کی گئی ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے یا شیطان کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے اگر وہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے شیطان سے محفوظ رکھے گا، اور اگر وہ اللہ کی راہ میں مال خرچ نہیں کرتا تو اس شخص اور شیطان کے درمیان راستے کھلے چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ (درمنثور)

☆☆☆☆☆

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ☆ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۶۹)

﴿۱﴾

(اللہ) حکمت دیتا ہے جسے چاہے اور جسے حکمت ملی اسے بہت بھلائی ملی، اور نصیحت نہیں مانتے مگر عقل والے۔

﴿۲﴾

اللہ دیتا ہے حکمت جسے چاہے، اور جسے دی جائے حکمت تحقیق اسے دی گئی بھلائی بہت، اور نصیحت نہیں قبول کرتے سوائے عقل والوں کے۔

ماقبل سے تعلق:

پہلی آیۃ کریمہ میں بیان فرمایا کہ شیطان تمہیں تنگدستی سے ڈراتا ہے اور بے حیائی کا حکم کرتا ہے اور رب

تعالیٰ تمہارے ساتھ وعدہ کرتا ہے اپنی بخشش کا اور فضل کا، اب اس آیۃ کریمہ میں بیان کیا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ حکمت عطاء فرماتا ہے اور عقل بھی عطاء فرماتا ہے کیونکہ عقل والے ہی نصیحت قبول کرتے ہیں، ضمناً بات خود سمجھ آرہی ہے کہ شیطان خواہشات اور نفسانیت کی طرف لے جاتا ہے۔

خواہشات اور نفسانیت سے وقتی طور پر لذات حاصل ہوجاتی ہیں لیکن احکام کی دارومدار خیال اور وہم پر مبنی ہوتی ہے، لیکن حکمت اور عقل چونکہ رب تعالیٰ سے حاصل ہوتے ہیں اس لئے وہ خلل اور ٹیڑھاپن سے محفوظ رہتے ہیں۔

" فکان حکم الحکمة و العقل اولی با لقبول"

اس لئے زیادہ بہتر یہی ہے کہ حکمت اور عقل کو ہی قبول کیا جائے۔ (از کبیر)

"یؤتی الحکمة من یشاء": "(اللہ) حکمت دیتا ہے جسے چاہے۔"

حکمت کے مختلف معانی:

﴿۱﴾ حکمت کا ایک معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی یہ ہے کہ قرآن پاک میں ناسخ ومنسوخ، متشابہ و محکم، مقدم ومؤخر۔ حلال وحرام وغیرہ کو جاننے کا نام حکمت ہے۔

﴿۲﴾ دوسرا معنی بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے " الفقه فی القرآن " قرآن پاک کو اس طرح سمجھے جس طرح سمجھنے کا حق ہے اس کا نام حکمت ہے۔

﴿۳﴾ ابن منذر کی ایک روایت میں ہے کہ وہ فرماتے ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ''حکمت'' کا ایک معنی نبوت بھی ہے۔

اسے بیہقی کی ایک روایت سے تائید بھی حاصل ہے جو انہوں نے حضرت ابوامامہ سے روایت کی ہے۔

" قال رسول اللہ ﷺ من قرا ثلث القرآن اعطی ثلث النبوة ومن قرأنصف القرا ن اعطی نصف النبوة ومن قرأ ثلثه اعطی ثلثی النبوة ومن قرأ القرأن کله اعطی کل النبوة ویقال له

یوم القیامة اقرأ وارق بکل آیة درجة حتی ینجر مامعه من القرآن فیقال له اقبض فیقبض فیقال له هل تدری ما فی یدیک ؟ فاذافی یده الیمنی الخلد وفی الاخری النعیم"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے قرآن پاک کا تہائی حصہ پڑھا اسے نبوت کی صفات کے تہائی حصہ مظہر بنادیا گیا، اور جس شخص نے نصف قرآن پاک پڑھا اسے نبوت کی نصف صفات کا مظہر بنا دیا گیا، اور جس شخص نے دو تہائی قرآن پاک پڑھا اسے نبوت کی دو تہائی صفات کا مظہر بنادیا گیا، اور جس نے کل قرآن پاک پڑھا اسے نبوت کی تمام صفات کا مظہر بنادیا گیا قیامت کے دن اسے کہا جائے گا قرآن پاک پڑھ، ایک ایک آیت پڑھ کر بلندی کے ایک ایک درجہ پر چڑھتا چلا جا۔ یہاں تک کہ جب وہ قرآن پاک ختم کرلے گا اسے کہا جائے گا اپنے ہاتھ بند کر (مٹھی بند کر) جب وہ مٹھی بند کرے گا تو اسے کہا جائے گا کیا تو جانتا ہے تیرے ہاتھوں میں کیا ہے؟ اچانک وہ دیکھے گا کہ اس کے دائیں ہاتھ میں جنت خلد کی ملکیت حاصل ہوگی، اور بائیں ہاتھ میں جنت نعیم کی ملکیت حاصل ہوگی۔

" ولیس المراد من القراء ۃفی هذاالخبر مجردها اذذلک مما یشترک فیه البرو الفاجر ولکن المراد قراء ۃ بفقه"

حدیث پاک میں مراد قرآن پاک کا صرف پڑھنا ہی نہیں بلکہ قرآن پاک کو اس طرح سمجھ کر پڑھنا جیسا کہ سمجھنے کا حق ہے کیونکہ صرف قرآن پاک پڑھنے میں تو نیک اور برے سب ہی شریک ہیں۔

اس وضاحت کو ابن ابی حاتم کی ایک روایت سے تائید حاصل ہے جو انہوں نے ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کی۔

"الحکمة قراء ۃالقرآن والفکرۃفیه" حکمت کا مطلب یہ ہے "قرآن پاک پڑھنا اور اس میں غور فکر کرنا"

﴿۴﴾ " وعن مجاهد انها الاصابة فی القول والعمل"

حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ حکمت قول اور عمل کے درست کرنے کو کہتے ہیں۔

﴿۵﴾ " وفی روایة عنه انها القرآن والعلم والفقه"

مجاہد کی ایک اور روایت میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ بیشک حکمت کا ایک مطلب یہ ہے، قرآن پڑھنا، علم حاصل کرنا اور سمجھنا۔

﴿۶﴾ "وفی اخری العلم الذی تعظم منفعته و تجل فائدته"

ایک اور روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حکمت سے مراد وہ علم ہے جس میں عظیم نفع ہو اور بہت بڑا فائدہ ہو۔

﴿۷﴾ "وعن عطاء انها المعرفة بالله تعالی"

حکمت کا ایک اور معنی عطاء رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے، یعنی جسے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوگئی اسے حکمت حاصل ہوگی۔

﴿۸﴾ "وقال ابو عثمان هی نور یفرق به بین الوسواس والالهام"

ابوعثمان رحمہ اللہ فرماتے ہیں حکمت اس نور کو کہا جاتا ہے جس سے وسوسہ اور الہام میں فرق کیا جا سکے۔ (از روح المعانی)

حکمت کا لغوی معنی:

حکمۃ کا معنی "اِحکام" سے لیا ہوا ہے، جس کا معنی ہے۔

"هو الاتفاق فی العلم او العمل او القول او فیها کلها"

علم میں یقین اور پختگی حاصل ہونا، یا قول میں یا عمل میں، بلکہ علم و عمل و قول سب میں ہی یقین اور پختگی کا حاصل ہونا حکمت ہے۔ (روح المعانی)

حکمت قرآن پاک میں بظاہر چار معانی میں استعمال ہے:

یہ بات پہلے ذہن نشین کرلیں کہ حکمت کے جو معانی بیان کئے گئے ہیں وہ تمام ہی یہاں معتبر ہیں اگرچہ بظاہر ایک ایک معنی مختلف جگہ میں سمجھ آتا ہے اس لحاظ سے مقاتل رحمہ اللہ نے بیان فرمایا۔

"تفسیر الحکمة فی القرآن علی اربعة اوجه"

حکمت کی تفسیر قرآن میں چار وجہ سے ہے۔ لیکن اس قول سے باقی اقوال کی نفی نہیں ہوسکتی۔

﴿۱﴾ "احدهامواعظ القرآن" ان میں سے حکمت کا ایک معنی قرآن پاک کی نصائح ہیں۔سورۃ البقرۃ میں ہے۔

"ومانزل علیکم من الکتاب والحکمۃ یعظکم بہ" (پ ۲۔ ۱۳، البقرۃ آیۃ ۲۳۱)

اوروہ جوتم پر کتاب وحکمت اتاری تمہیں نصیحت دینے کو۔

اس میں حکمت بمعنی "مواعظ قرآن" (قرآن پاک نصیحتیں) ہے۔

﴿۲﴾ "وثانیھاالحکمۃبمعنی الفھم والعلم" حکمت کا دوسرا معنی "سمجھ اور علم" رب تعالیٰ نے ارشادفرمایا۔

"ولقدآتینالقمان الحکمۃ" (پ ۲۱۔ ۱۱، سورۃ لقمان ۱۲)

اور بیشک ہم نے لقمان کو حکمت عطاء فرمائی۔ یہاں مراد سمجھ اور علم ہے۔

﴿۳﴾ "وثالثھاالحکمۃبمعنی النبوۃ" اور تیسرا معنی حکمت کا نبوت ہے۔رب تعالیٰ نے ارشادفرمایا۔

"وآتیناہ الحکمۃوفصل الخطاب" (پ ۲۳۔ ۱۱۔ سورۃ ص ۲۰)

اوراسے حکمت اورقول فیصل دیا۔(یہاں حکمت کا معنی نبوت ہے)۔

﴿۴﴾ "ورابعھاالقرآن بمافیہ من عجائب الاسرار" حکمت کا چوتھا معنی قرآن پاک کے عجائب اسرار۔ یہی معنی اس آیۃ کریمہ میں ظاہر ہے،اورسورۃ النحل میں "ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ" (بلااپنے رب کی راہ کی طرف حکمت سے) میں بھی یہی معنی معتبر ہے۔ (از کبیر)

تمام معانی کا جامع معنی:

"وجمیع ھذہ الوجوہ عند التحقیق ترجع الی العلم" یہ تمام معانی علم کی طرف لوٹتے ہیں،یعنی حکمت کا معنی "علم" کیاجائے تو تمام معنی اس میں سمٹ کرآجاتے ہیں۔ (کبیر)

"ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیر کثیرا":

"اور جسے دی جائے حکمت تحقیق اسے دی گئی بھلائی بہت۔"

اے انسان ذراتوغورکرکہ رب تعالیٰ نے عام انسانوں کوتھوڑاعلم دیا۔رب تعالیٰ نے ارشادفرمایا۔

"وما او تیتم من العلم الا قلیلا "اور نہیں دیا تمہیں علم مگر تھوڑا۔

پھر رب تعالیٰ نے تمام دنیا کو قلیل کہا۔"قل متاع الدنیا قلیل "اے محبوب آپ فرما دیں دنیا کا متاع (سامان) قلیل ہے۔

" وانظر کم مقدار ھذا القلیل حتی تعرف عظمت ذلک الکثیر"

دیکھو دنیا کو قلیل کہا جو بظاہر بہت کثیر نظر آتی ہے جب قلیل کی یہ حد ہے تو وہ خوش بخت لوگ جن کو حکمت عطاء کر کے کثیر بھلائی عطاء کی گئی تو کثیر میں کتنی عظمت پائی گئی ہوگی۔ (از کبیر)

فائدہ: دنیا کی مقدار متناہی ہے یعنی دنیا کی مقدار کی ایک حد مقرر ہے دنیا کی تعداد متناہی ہے یعنی دنیا کو شمار کیا جا سکتا ہے دنیا کی بقاء متناہی ہے دنیا ختم ہونے والی ہے۔ لیکن علم کے مراتب اور تعداد اور مدت بقاء کی کوئی حد نہیں اس لئے علم سے انسان کو سعادت حاصل ہوتی ہے۔"وذلک ینبئک علی فضیلۃ العلم" اسی سے تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ علم کا مقام بہت بلند و بالا ہے۔ اور علم میں خاص فضیلت پائی گئی ہے۔ (کبیر)

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

"کثیرا" التنوین للتعظیم ای خیرا کثیرا یجمع خیر الدارین"

"کثیـــرا" پر تنوین تعظیم کے لئے ہے مطلب یہ ہے کہ جسے حکمت عطاء کی جاتی ہے اسے بہت ہی زیادہ بھلائی عطاء کی جاتی ہے یعنی دونوں جہانوں کی بھلائیاں اسے عطاء کر دی جاتی ہیں۔

☆ "عن معاویۃ قال قال رسول اللہ ﷺ من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین وانما انا قاسم واللہ یعطی" (بخاری و مسلم)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص سے اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اسے دین کی فقاہت (کامل سمجھ) عطاء فرما دیتا ہے۔ بیشک میں ہی قاسم ہوں اور اللہ عطاء کرتا ہے۔

کامل فقیہ کون؟

"انما الفقیہ الزاھد فی الدنیا الراغب فی الآخرۃ البصیر بأمر دینہ المداوم علی عبادۃ ربہ"

اگرچہ فقیہ وہ ہے جو احکام شریعت وطریقت وحقیقت کی سمجھ رکھتا ہو لیکن کامل فقیہ ہونے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دنیا میں تو زاہد ہو اور آخرت کی طرف رغبت کرے، امر دین میں بصیرت رکھے، رب تعالیٰ کی عبادت پر ہمیشہ کے لئے قائم رہے۔

نبی کریم ﷺ کیا چیز تقسیم فرماتے ہیں:

”و نیستم من مگر قسمت کنندہ و خدا مید ہد ہر کرا میخوا ہد و ہر چہ میخوا ہد ازفقہ و فہم در دین وغیر آں“ (اشعة اللمعات)

وانما انا قاسم واللہ یعطی“ کا شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ معنی بیان فرماتے ہیں۔

اور میں نہیں مگر یہ کہ میں تقسیم کرنے والا ہوں اور خدا دیتا ہے یعنی رب تعالیٰ جسے دیتا ہے اور جو کچھ دیتا ہے خواہ دین کی سمجھ ہو اور یا اس کے بغیر اور نعمتیں ہوں وہ میں ہی تقسیم کرتا ہوں۔

علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

”(واللہ یعطی) ای الفہم فی العلم بمبناہ والتفکر فی معناہ العمل بمقتضاہ“

اللہ عطاء کرتا ہے یعنی الفاظ کے ذریعے علم کی سمجھ عطاء کرتا ہے اور ان کے معانی میں تفکر عطاء کرتا ہے اور اس کے تقاضا کے مطابق عمل عطاء کرتا ہے اسی سے واضح ہو جاتا ہے کہ نبی کریم ﷺ علم، تفکر اور عمل تقسیم فرمانے والے ہیں۔

”وقیل معناہ انا اقسم المال بینکم واللہ یعطیہ“

ایک معنی اس کا یہ بھی ہے کہ میں ہی تمہارے درمیان مال تقسیم کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ عطاء کرتا ہے۔

”والاظہر ان لا منع من الجمع وان کان المقام یقتضی العلم واللہ اعلم“

اگرچہ حدیث پاک علم کی فضیلت میں ذکر ہے لیکن ظاہر بات یہی ہے کہ تمام معنی مراد لینے میں کوئی ممانعت نہیں۔ (مرقاۃ ج ا ص ۲۶۷)

واضح ہوا کہ ہر قسم کی نعمتیں رب تعالیٰ دیتا ہے میرے پاس مصطفیٰ ﷺ تقسیم فرماتے ہیں۔

☆ عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ اذا مات الانسان انقطع عملہ الامن ثلاثۃ صدقۃ

جا ریة او علم ینتفع به او ولد صالح ید عوله" (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے عمل ختم ہو جاتے ہیں سوائے تین اعمال کے، صدقہ جاریہ، اور علم جس سے نفع حاصل کیا جاتا ہو، اور نیک اولاد جو اس کے حق میں دعاء کرے۔

☆ "عن ابی مسعود الانصاری قال قال رسول اللہ ﷺ من دل علی خیر فله اجر مثل اجر فاعله" (رواہ مسلم)

حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص کسی دوسرے کی بھلائی کی راہنمائی کرے اسے عمل کرنے والے کی طرح اجر حاصل ہوتا ہے۔

☆ "عن ابی الدردا ء قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول فضل العالم علی العا بد کفضل القمر لیلة البدر علی سائر الکو اکب وان العلماء ورثة الانبیاء وان الانبیاء لم یو رثوا دینارا ولادرھما وانما و رثو العلم فمن اخذ ہ اخذ بحظ وافر"

(رواہ احمد والترمذی وابو داؤد ابن ماجه والدارمی)

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا عالم کو عابد پر ایسے فضیلت حاصل ہے جیسے چوہدویں کے چاند کو تمام ستاروں پر فضیلت حاصل ہے بیشک علماء انبیاء کرام کے وراث ہیں اور بیشک انبیاء کرام کے دینار و درھم کے وارث نہیں بنائے جاتے، انبیاء کرام کے علم کے وارث ہوتے ہیں، جس نے علم حاصل کرلیا اس نے بہت بڑا حصہ حاصل کرلیا۔

☆ " وعن ابی امامة البا ھلی قال ذکر رسول اللہ ﷺ رجلان احد ھما عابد والآخر عالم فقال رسول اللہ ﷺ فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادنا کم "

حضرت ابو امامہ باہلی فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے پاس دو شخصوں کا ذکر کیا گیا ایک عابد اور دوسرے عالم کا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عالم کو عابد پر ایسے فضیلت حاصل ہے جیسے مجھے تم میں سے ادنیٰ شخص پر فضیلت حاصل ہے۔

ثم قال رسول اللہ ﷺ ان اللہ وملا ئکتہ واھل السماوات والارض حتی النحلۃ فی جر ھا وحتی الحوت فی الماء ولیصلون معلم الناس الخیر" (رواہ الترمذی)

پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ اور اس کے فرشتے اور زمین وآسمان والے یہاں تک کہ چیونٹیاں اپنی بلوں میں اور مچھلیاں پانی میں اس کے لئے دعاء کرتی ہیں جو لوگوں کو خیر کی تعلیم دیتا ہے۔

(ماخوذ از مظہری)

(علم کی فضیلت کی بحث پہلے پارہ میں " وعلم آدم الاسماء" کے تحت تفصیلی طور پر بیان ہو چکی ہے)

فائدہ: حکمت جب فعل صواب (درست کام) کے معنی میں لی جائے تو اس کی حد یہ بیان کی گئی ہے کہ انسان اپنی طاقت بشریہ کے مطابق اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے اخلاق (صفات) سے متصف کرے، یعنی رحمت، رافت (مہربانی) ستاریت (کسی کے عیوب کی پردہ پوشی) جیسی صفات رکھے۔ (کبیر بزیادۃ)

حکمت دو معنوں سے باہر نہیں "ایک علم" اور دوسرا "فعل صواب"

" وذلک لأن کمال الانسان فی شیئین ان یعرف الحق لذاتہ والخیر لأ جل العمل بہ فالمرجع با لأول الی العلم والا دراک المطابق وبا لثانی الی فعل العدل وصواب"

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو کمال دو چیزوں سے حاصل ہوتا ہے ایک اللہ تعالیٰ کی معرفت سے، اور دوسرا اچھے اعمال سے، معرفت باری تعالیٰ تب حاصل ہوگی جب علم اور ادراک حاصل ہو، علم بھی وہ جو نورانی ہو، وہی رب تعالیٰ کی معرفت تک پہنچائے گا ظلماتی علم جو دہریوں، معتزلیوں اور نیچریوں کا ہے وہ مراد نہیں کیونکہ ایسا علم تو رب تعالیٰ سے دور کرتا ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے علم وادراک کے ساتھ "مطابق" کی جو قید لگائی اس کا یہی مطلب تھا جو راقم نے بیان کر دیا۔

اور دوسری چیز یعنی بھلائی حاصل کرنے کے لئے عمل کیا جائے یہ اسی وقت ہوگا جب کام عدل پر مبنی اور درست ہوگا، اسی کام کو "عدل" کہا جاتا ہے جو رب تعالیٰ کی رضاء مندی کے مطابق ہو، جو کام رب تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہو وہ ظلم ہے۔

علم وفعلِ صواب اور انبیاء کرام:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا رب تعالٰی کے حضور یہ عرض کرنا" رب ھب لی حکما " اے میرے رب مجھے حکم عطاء فرما، یہ حکمت نظریہ ہے یعنی علم وادراک ہے، اور " والحقنی با لصالحین "اے اللہ مجھے اپنے مقرب بندوں سے ملا، یہ حکمت عملیہ ہے یعنی عدل اور فعل صواب ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کو رب تعالٰی نے فرمایا " اننی انا اللہ لا الہ الا انا" بیشک میں ہی اللہ ہوں، میرے بغیر کوئی معبود نہیں، یہ ارشاد حکمت نظریہ ہے، پھر ارشاد فرمایا"فا عبدنی" میری عبادت کرو، یہ حکمت عملیہ ہے۔

اور عیسیٰ علیہ السلام نے کہا" انی عبد اللہ آ تا نی الکتا ب و جعلنی نبیا" بیشک میں اللہ کا بندہ ہوں مجھے اس نے کتاب دی اور مجھے اس نے نبی بنایا۔ یہ حکمت نظریہ ہے۔ اور آپ نے کہا"وا وصانی بالصلوۃ والزکوۃ مادمت حیا" اور اس نے مجھے حکم دیا ہے نماز اور زکوۃ کا جب تک میں زندہ ہوں۔ یہ حکمت عملیہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا' فا علم انہ لا الہ الا اللہ" آپ جان رکھیں بیشک اور کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے۔ یہ حکمت نظریہ ہے۔ اور آپ کو ارشاد فرمایا"و استغفر لذ نبک" آپ اپنوں کے گناہوں کی معافی طلب کریں۔ یہ حکمت عملیہ ہے۔

تمام انبیاء کرام کو حکم دیا'' ان انذ رو ا انہ لا الہ الا انا" یہ کہ (میرے بندوں کو) ڈراؤ بیشک میرے بغیر کوئی اور معبود نہیں یہ حکمت نظریہ ہے پھر ان کو حکم دیا" فا تقون "مجھ سے ہی ڈرو۔ یہ حکمت عملیہ ہے۔ (از کبیر)

نتیجہ واضح ہوا کہ انسان اسی وقت کامیاب ہے جبکہ انبیاء کرام کے نقش قدم پر چلے، انبیاء کرام کو جب علم و ادراک اور اچھے اعمال کا وافر حصہ ملا، تو انسان کے کامل مسلمان بننے کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنی طاقت کے مطابق دین کا علم حاصل کرے اور اچھے عمل کرے۔

"وما یذ کر الا اولو الالباب": "اور نصیحت نہیں قبول کرتے سوائے عقل والوں کے"

یعنی نصیحت قبول نہیں کرتے اور آیات میں تفکر (غور وفکر) نہیں کرتے سوائے عقل والوں کے، لیکن عقل بھی وہ معتبر ہے جو وہم سے پاک ہو، اور خواہشات نفسانیہ کی تابعداری کے ظلم سے پاک ہو، تو وہی لوگ ہوں گے جن کو حکمت عطاء کی گئی ہوگی، اور کثیر علم عطاء کیا گیا ہوگا۔

فائدہ جلیلہ :

" اخرج الطبرانی عن ابی موسی قال قال رسول الله ﷺ یبعث الله تعالی العباد یوم القیامة ثم یمیز العلماء فیقول یا معشر العلماء انی لم اضع فیکم علمی لا عذ بکم اذھبو ا فقد غفرت لکم "

حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو قیامت کے دن اٹھائے گا پھر علماء کو جدا کردے گا پھر فرمائے گا اے علماء کی جماعت بیشک میں نے تمہیں اس لئے علم عطاء نہیں کیا تھا کہ میں تمہیں عذاب دوں، جاؤ میں نے تمہیں بخش دیا ہے۔

(از روح المعانی)

☆ " اخرج البخاری و مسلم عن ابی مسعود رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ لا حسد الا فی اثنین رجل آتاه الله مالا فسلطه علی ھلکته فی الحق، ورجل آتا ه الله تعالی الحکمة فھو یقضی بھا و یعلمھا"

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی شخص کسی پر رشک نہ کرے سواء دو کے۔ ایک وہ شخص جس کو اللہ تعالی نے مال دیا پھر اسے حق راہ میں خرچ کرنے پر مقرر فرما دیا، اور وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے علم عطاء فرمایا، وہ اس علم کے مطابق فیصلے کرتا ہے اور دوسروں کو بھی تعلیم دیتا ہے۔

کون سا علم قابل تعریف ہے؟

" وھذا با لنسبة الی حملة العلم الشرعی الذی جاء به حکیم الانبیاء و نبی الحکماء

حضرة خاتم الرسالة ومحدد جهات العدالة والبسالة ﷺ لاماذهب اليه جالينوس و ديمقراطيس وافلاطون وارسطاليس ومن مشى على آثارهم واعتكف فی رواق افكارهم فان الجهل اولى بكثير مماذ هواليه واسلم بمراتب مما عولوا عليه حتى ان كثير من العلماء نهواعن النظر فی كتبهم"

جس علم کی یہاں تعریف کہ گئی اور جسے حکمت کہا گیا اس سے مراد علم شرعی، اور دینی علم جو اس ذات نے عطاء کیا جنہیں تمام انبیاء کرام سے حکمت میں کامل حصہ عطاء کیا گیا، اور وہ ان تمام کے نبی ہیں جن کو حکمت عطاء کی گئی یعنی نبی الانبیاء ہیں اور خاتم النبیین ہیں۔ اور وہ ذات جس پر عدالت و شجاعت ختم ہیں وہ ہیں حضرت محمد ﷺ۔

وہ علم مراد نہیں جو جالینوس دیمقراطیس، افلاطون اور ارسطالیس (ارسطو) نے پیش کیا ہے، یا ان کے نقش قدم پر چلنے والوں جس علم کو پیش کیا ہے وہ بھی مراد نہیں۔ ان لوگوں کی راہ پر چلنے اور ان کے افکار پر سہارا لگانے سے تو جہالت بہتر ہے کیونکہ ان لوگوں نے بہت سے نظریات دین سے برگشتہ کرنے (پھیرنے) کے لئے پیش کئے ہیں، ان کے علوم سے جاہل ان کی بے دینی اور بے روا روی سے بچے رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اکثر علماء نے ان کی کتب کو پڑھنے سے منع کیا ہے۔

ان کی کتب کو نہ پڑھنے والے علماء کرام نے اپنے قول پر مندرجہ حدیث پیش کی۔

☆ " اخرج الامام احمد وابو يعلى من حديث جابر" ان عمر رضى الله عنه استأذن رسول الله ﷺ فی جوامع كتبها من التوراة ليقرأ هاويزدادبهاعلماالى علمه فغضب ولم ياذن به له وقال لو كان موسى حيا لما وسعه الا اتباعی، وفی رواية يكفيكم كتاب الله تعالى"

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اجازت طلب کی کہ وہ یہود کے مدرسہ میں جا کر توراۃ پڑھ لیا کریں تا کہ علم زیادہ ہو، تو رسول اللہ ﷺ نے غصے کا اظہار فرمایا، اور ان کو اجازت نہ دی، اور فرمایا تمہیں اللہ کی کتاب کافی ہے اگر موسیٰ بھی ظاہری حیات میں

ہوتے تو ان کے لئے بھی میری اتباع کے بغیر کوئی چارہ کار نہ ہوتا۔

اس حدیث پاک سے دلیل کی وجہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے جو کتاب لائی اس کی تعریف رب تعالیٰ نے یوں فرمائی۔

"انا انزلنا التوراۃ فیھا ھدی و نور" بیشک ہم نے نازل کیا توراۃ کو اس میں ہدایت اور نور ہے۔

جو کتاب ہدایت اور نور پر مشتمل تھی اس نے منسوخ ہونے اور اس میں تحریف ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے منع فرما دیا حالانکہ آپ غلط اور صحیح وضاحت بھی فرما سکتے تھے لیکن پھر بھی ذہنوں کو انتشار سے بچانے آپ نے توراۃ کو پڑھنے سے منع فرما دیا۔

"' فکیف یباح الا شتغال بما و ضعه المتخبطون من فلا سفة الیونان افکار وو زرا فی وقت کثرت فیه الظنون و عظمت فیه الا وھام وعا د الا سلام فیه غر یبا"

تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ یونانی فلاسفہ کے جھوٹے، من گھڑت افکار و مسائل میں انسان مشغول ہو جائے، جبکہ وہ لوگ دین اسلام کے خلاف زہر اگلنے کی وجہ سے مخبوط الحواس کے درجہ میں ہو گئے تھے آج لوگ بھی کثیر گمانوں اور بہت بڑے وہموں کا شکار ہو چکے ہیں اور اسلام پر چلنے سے لوگوں کی دوری کی وجہ سے اسلام نہایت کمزور حالت میں ہے۔ (از روح المعانی)

ایسی حالت میں عیسائیوں اور ان کے بھائیوں کے نظریات سے دور رہنا ضروری ہے تا کہ انسان گمراہی سے بچ سکے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم اور اپنے پیارے حبیب پاک ﷺ کے واسطہ جلیلہ سے اپنے دین کی حفاظت فرمائے آج دین اسلام کا حلیہ بگاڑنے میں امریکی عیسائیوں اور ان کے یار نام نہاد مسلمان سر توڑ کوشش کر رہے ہیں، رب تعالیٰ دین اسلام کے باغیوں کو تباہ و برباد فرمائے۔

فائدہ: اس آیۃ کریمہ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ تمام افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، کیونکہ خصوصا نظریہ اور افعال حسیہ انسان کو خود حاصل نہیں ہو سکتے وہ یقیناً کسی اور سے ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔

و ذلک الغیر لیس الا اللہ تعالی با لا تفاق، فدل علی ان فعل العبد خلق للہ تعالیٰ "

وہ غیر صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اس مسئلہ پر اتفاق ہے اسی سے واضح کہ بندے کے تمام افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

وَمَآ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ نَّفَقَةٍ اَوۡ نَذَرۡتُمۡ مِّنۡ نَّذۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُهٗ وَمَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ☆

﴿سورۃ البقرۃ ۲۷۰﴾

﴿۱﴾

اور جو تم خرچ کرو منت مانو اللہ کو اس کی خبر ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

﴿۲﴾

اور جو تم خرچ کرو یا نذر مانو تو بیشک اللہ جانتا ہے اسے، اور نہیں ظالموں کا کوئی مددگار۔

ماقبل سے تعلق:

پہلی آیۃ کریمہ میں مال خرچ کرنے کا حکم فرمایا کہ عمدہ، پاکیزہ مال خرچ کیا جائے اور ناپاک، حرام مال خرچ نہ کیا جائے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا ﴿الشیطان یعدکم الفقر﴾ شیطان تمہیں ڈراتا ہے فقر (احتیاج) سے۔

اب آیۃ کریمہ میں بیان کیا گیا ہے کہ جو مال تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اور وہ تمہیں اس پر جزاء عطاء فرمائے گا۔

''وفیہ بیان کونہ وعدا عظیما للمطیعین والوعد الشدید لمن انفق اونذر فی الوجوہ الباطلة والمعاصی''

اس آیۃ کریمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مطیع حضرات کے لئے اجر عظیم کا وعدہ فرمایا۔

ہے، اور جو لوگ باطل راہ، اور گناہوں میں مال خرچ کرتے ہیں اور ناجائز اور باطل نذر مانتے ہیں وہ ظالم ہیں ان کے لئے رب تعالیٰ نے شدید وعید کو ذکر فرمایا۔ (شیخ زادہ)

”وما انفقتم من نفقة“ ”اور جو تم خرچ کرو۔“

”من نفقة“ کی تفسیر علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے ان لفظ سے کی۔

”قليلة او كيژة سرااوعلانية فى حق اوباطل“

تھوڑا خرچ کرو یا زیادہ، چھپا کر خرچ کرو یا ظاہر، راہ میں خرچ کرو یا باطل میں (بیشک اللہ اسے جانتا ہے)

اس کے معنی میں یہ وسعت کیسے پائی گئی؟ اس کی وضاحت شیخ زادہ رحمہ اللہ نے ان الفاظ سے کی۔

”مبنى على ان النكرة الواقعة فى سياق الشرط كالتى تقع فى سياق النفى فى افادة العموم“

اس وسیع معنی کی دارومدار اس پر ہے کہ نکرہ مقام شرط میں جب واقع ہو تو اس کا حکم وہی ہوتا ہے جو مقام نفی میں نکرہ کے واقع ہونے کا ہے، یعنی عموم پایا جاتا ہے۔

”وكلمة ما فى قوله ماانفقتم شرطية فيكون كل واحد من قوله من نفقة ومن نذر شاملا لجميع افراد النفقة والنذر“

”ماانفقتم“ میں کلمہ ”ما“ شرطیہ ہے، اس لئے ہر قسم کے خرچ کرنے اور ہر قسم کی نذر ماننے کو شامل ہے۔

”اونذرتم من نذر“ ”یا تم نذر مانو۔“

”اى بشرط اور بغير شرط فى طاعة او معصية“

نذر مانو جو کسی شرط سے معلق ہو یا بغیر شرط کے ہو، خواہ وہ نذر نیکی کے کام کی ہو یا معصیت کی، (اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے)

”فان الله يعلمه“ ”بیشک اللہ اسے جانتا ہے۔“

یہ جملہ دونوں چیزوں پر مرتب ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جو بھی خرچ کرو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے، جس طرح تم

خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ تمہیں اسی طرح جزا دے گا، نیک راہ میں مال خرچ کرنے سے جزاء خیر عطاء فرمائے گا، اور باطل راہ میں خرچ کرنے سے اسی کے مطابق اسے سزا دے گا، کیونکہ انسان کا ہر عمل اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔

اسی طرح جو نذر تم مانو گے اللہ تعالیٰ اسی کے مطابق اس کا بدلہ دے گا، نذر کا تعلق طاعت سے ہوا تو تمہیں اچھی جزا عطاء فرمائے گا اور نذر کا تعلق معصیت سے ہوا تو وہ تمہیں سزا دے گا۔

دینی مدارس کے طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

جب پہلے دو چیزوں کا ذکر ہے ایک خرچ کرنے اور دوسرا نذر ماننے کا تو "فان الله يعلمه" میں ضمیر واحد کی کیوں ذکر کی، تثنیہ کی ضمیر نہ ذکر کرنے کی وجہ کیا ہے؟ حالانکہ عقل کا تقاضا یہ تھا "يعلمهما" ہونا چاہیے تھا۔ تو اس کا جواب یہ ہے۔

"ان العطف هنا بأو وهي لأحد الشيئين تقول "زيد او عمر واكرمته" ولا يجوز اكرمتهما"

کہ یہاں عطف لفظ "او" کے ذریعے ہے جو دو چیزوں میں سے ایک کا تقاضا کرتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے "زيد او عمرو اكرمته"

زید یا عمر کی میں نے عزت کی۔ اس مقام میں "اکرمتھما" نہیں کہا جاتا کہ میں نے ان دونوں کی عزت کی۔ اسی طرح یہاں بھی ہر ایک پر علیحدہ علیحدہ حکم لگایا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ ضمیر واحد کی لائی گئی ہے تثنیہ کی نہیں لائی گئی یعنی جو تم خرچ کرو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے۔ یا جو تم نذر مانو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے (ماخوذ از شیخ زادہ)

تنبیہ: دینی مدارس کے طلباء کرام ایک اور توجہ فرمائیں کہ لفظ "او" جب ذکر کیا جائے تو ضمیر لوٹانے میں کبھی رعایت اول کی جاتی ہے اور کبھی ثانی کی، جیسے کہا جائے "زيد او هند منطلق" یہاں رعایت اول کی پائی گئی ہے۔ اور اگر کہا جائے "زيد او هند منطلقة" تو یہاں رعایت دوسرت کی پائی گئی ہے۔

قرآن پاک میں بھی یہ دونوں طریقے استعمال ہیں "واذا رأوا تجارة او لهوا انفضوا اليها" میں رعایت پہلے لفظ کی کی گئی ہے۔ اور "ومن يكسب "خطيئة او اثما ثم يرم به بريئا" میں رعایت دوسرے

لفظ کی پائی گئی ہے۔

"و من نذر" کیا ہے؟

"النذر ان توجب علی نفسک مالیس بواجب لحدوث أمر"

اپنے آپ پر کسی چیز کو لازم کر لینا جو پہلے لازم نہ ہو۔یعنی اس کے لازم کرنے سے لازم ہو۔ جیسا کہ اس آیۃ کریمہ میں جس کی بحث جاری ہے"نذر"اسی معنی میں استعمال ہے۔اور رب تعالیٰ کے اس ارشادگرامی میں بھی اسی معنی میں استعمال ہے"انی نذرت للرحمن صوما"

"انذار" کا معنی ڈرانا،قرآن پاک میں کئی جگہ اس معنی میں استعمال کیا گیا ہے،جیسا کہ"فانذرتکم نارا تلظی"

"انذار"مقابل ہے"تبشیر"کا"الانذار اخبار فیہ تخویف کما ان التبشیر اخبار فیہ سرور"

جس خبر میں خوف دلایا گیا ہو اور ڈرایا گیا ہو اسے"انذار" کہتے ہیں،اور جس خبر میں خوشخبری پائی گئی اسے تبشیر کہا جاتا ہے۔نذر کا معنی ہی معتبر ہوتا ہے کیونکہ انسان آپ پر ایک چیز کو لازم کرتا ہے تو اس کے ادا کرنے میں کوتاہی سے ڈرتا رہتا ہے۔

نذر اولیاء بمعنی نذ رانہ:

نذر عرف میں ہدیہ اور پیشکش کو کہتے ہیں اور شرع میں نذر عبادت اور قربت مقصودہ ہے اسی لئے اگر کسی نے گناہ کرنے کی نذر کی تو وہ صحیح نہیں ہوئی،نذر خاص اللہ تعالیٰ کے لئے ہوتی ہے اور یہ جائز ہے کہ اللہ کے لئے نذر کرے اور کسی ولی کے آستانہ کے فقراء کو نذر کے صرف کا محل مقرر کرے،مثلاً کسی نے یہ کہا یا رب میں نے نذر مانی کہ اگر تو نے میرا فلاں مقصد پورا کر دیا تو میں فلاں ولی کے آستانہ کے فقراء کو کھانا کھلاؤں،یا وہاں کے خدام کو روپے پیسے دوں گا،یا ان کی مسجد کے لئے تیل یا بوریا حاضر کروں گا تو یہ نذر جائز ہے(حقیقت میں نذرانہ اور ہدیہ ہے)

(شامی،خزائن العرفان)

اس مسئلہ کی تفصیل دوسرے پارہ"وما اھل بہ لغیر اللہ"کی بحث میں دیکھیں۔

نذر کی دو قسمیں ہیں: نذر مطلق،اور نذر معلق۔

نذر مطلق کو نذر منجز بھی کہا جاتا ہے۔ جو کسی شرط سے مشروط نہیں ہوتی، بلکہ مطلق ہوتی ہے، جیسا کہ کہا جائے "لله علی صوم شهر" مجھ پر اللہ تعالی کے لئے ایک ماہ روزے لازم ہیں۔

نذر معلق یہ ہے کہ کسی شرط سے مشروط کر دیا جائے جیسا کہ کہا جائے "ان قدم غائبی فا لله علی صوم شهر" اگر میرا فلاں غائب شخص آ گیا تو میں اللہ کے لئے ایک ماہ روزے رکھوں گا۔ (شیخ زادہ)

ابھی دو مثالیں ذکر کی ہیں ان میں وقت سے مقید نہیں کیا گیا، بلکہ مطلقا روزہ رکھنے کا ذکر ہے۔ وہ جب چاہے روزہ رکھ لے، اگرچہ عبادت میں جلدی کرنا افضل ہے۔

دوسری قسم جو وقت سے مقید ہو۔ جیسا کہ کہے "لله علی صوم یوم الاثنین" مجھ پر اللہ کے لئے پیر کا روزہ رکھنا لازم ہے۔ یا یہ کہے، "ان قدم غائبی فلله علی صوم رجب" اگر میرا فلاں غائب شخص آ گیا تو میں اس رجب کو روزہ رکھوں گا۔ اس صورت میں معین وقت میں روزہ رکھنا لازم ہوگا، بغیر عذر کے تاخیر کرنے سے گناہ لازم آئے گا۔

نذر کی ایک اور تقسیم:

نذر کی دو قسمیں ہیں۔ نذر مفسر، اور نذر غیر مفسر

نذر مفسر یہ ہے کہ اس میں اپنے آپ پر کسی چیز کو واجب کرنے اور نذر ماننے کی وضاحت موجود ہو، جیسا کہ کہے "لله علی عتق رقبة" اللہ کے لئے مجھ پر غلام آزاد کرنا واجب ہے۔ "لله علی حج" اللہ کے لئے مجھ پر حج لازم ہے، ان مثالوں میں "علی" پایا گیا ہے جو لزوم پر دلالت کرتا ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ نذر مانی گئی۔

اسی طرح اگر یوں کہے "نذرت ان اؤدی النوافل عشر رکعات" میں نے دس رکعت نوافل ادا کرنے کی نذر مانی، تو یہ بھی واضح طور پر نذر ہے۔ اس نذر کا پورا کرنا واجب ہے، اگر نہیں پورا کرے گا تو ترک واجب کی وجہ سے گنہگار ہوگا۔

نذر غیر مفسر یہ ہے کہ یا تو اس طرح کہے "نذرت لله ان لاافعل کذاثم یفعله" میں نے نذر مانی ہے کہ

میں اللہ تعالی کے لئے فلاں کام نہیں کروں گا،

پھر اس نے وہ کام کرلیا۔ یا اس نے یوں کہا "لـلـه عـلـی نـذر" اللہ کے لئے مجھ پر نذر ہے، کیا چیز نذر ہے؟ اس کا کوئی ذکر نہیں۔

اس نذر کا حکم یہ ہے "فیلزمه فیه کفارة یمین" کہ اس میں قسم کا کفارہ لازم آئے گا۔

"لقوله ﷺ من نذر نذر اوسمی فعلیه ما سمی" "ومن نذرولم یسم فعلیه کفارة یمین"

جس شخص نے نذر مانی اور کسی چیز کا نام ذکر کیا (میں حج کروں گا، اتنے روزے رکھوں گا، اتنے نوافل ادا کروں گا)

تو جس چیز کا ذکر کیا اسے پورا کرنا اس پر لازم ہے۔ اور اگر نذر میں کسی چیز کا نام ذکر نہیں کیا (بلکہ صرف یہ کہہ دیا کہ مجھ پر نذر لازم ہے) تو اس میں قسم کا کفارہ اس پر لازم آئے گا۔ (کبیر)

☆ "عن عمران بن الحصین قال قال رسول الله ﷺ النذر نذران فما کان نذر فی طاعة الله تعالی فذلک لله تعالی وفیه الوفاء وما کان من نذر فی معصیة الله تعالی فذلک للشیطان ولا وفاء فیه ویکره ما یکفر الیمین" (اخرجه النسائی)

عمران بن الحصین فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نذر کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو اللہ کی اطاعت کی نذر ہو وہی نذر اللہ تعالی کے لیے ہوگی اور اس کا پورا کرنا لازم ہوگا، اور دوسری قسم نذر کی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالی کی نافرمانی کی نذر ہو وہ نذر شیطان کے لئے ہوگی، اس کا پورا کرنا جائز نہیں، بلکہ منع ہے، اس میں قسم کا کفارہ ادا کرے۔ (روح المعانی)

اعتراض :

نذر کا پورا کرنا واجب ہے، یہ کہنا کس طرح درست ہے؟ جبکہ اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا "ولیوفوا نذورهم" اپنی نذروں کو پورا کرو۔ امر پایا گیا ہے اور دلیل قطعی سے ثابت ہے پھر نذر پورا کرنا فرض کیوں نہیں، واجب کہنے کی کیا وجہ ہے؟

جـــواب: یہ عام مخصوص البعض ہے، جو دلیل ظنی ہے، اس سے وجوب ہی ثابت ہوتا ہے، فرض ثابت نہیں ہو

سکتا، ''عام مخصوص البعض'' کیسے؟ اس لئے کہ نذر عبادت مقصودہ کی ہو تو اس نذر کو پورا کرنا لازم ہے جیسا کہ روزہ رکھنے کی یا حج کرنے کی یا نماز پڑھنے کی نذر مانے تو اس نذر کو پورا کرنا واجب ہے، اگر نذر عبادت غیر مقصودہ کی مانے تو اس کا پورا کرنا لازم نہیں تاہم قسم کا کفارہ لازم آئے گا، جیسا کہ وضوء کرنے کی نذر ماننا مریض کی عیادت کرنے کی نذر وغیرہ یہ عبادات غیر مقصودہ ہیں ان کی نذر ماننے پر نذر لازم نہیں ہوتی۔

اسی طرح معصیت کی نذر ماننے سے نذر کو توڑنا لازم ہو جاتا ہے۔ اسے پورا کرنا جائز نہیں، البتہ نذر کو توڑنے پر قسم توڑنے کا کفارہ ادا کرنا لازم آتا ہے۔

واضح ہوا کہ ''ولیوفوا نذورھم'' میں امر سے فرضیت ثابت نہیں ہوسکتی بلکہ وجوب ہی ثابت ہوگا، کیونکہ یہ عام مخصوص البعض ہے۔ (نورالانوار مع قمرالاقمار)

''وما للظلمین من انصار'' ''اور نہیں ہے ظالموں کا کوئی مددگار۔''

''بالانفاق والنذر فی المعاصی او بمنع الصدقات وعدم الوفاء بالنذر اوبانفاق الخبیث او بالریاء والمن والأذی وغیر ذلک مما ینتظمه معنی الظلم الذی هو عبارة عن وضع الشئی فی غیر موضع الذی یحق ان یوضع فیه''

یہاں ظالموں سے مراد کون لوگ ہیں؟ آیۃ کریمہ کے مضمون سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے جس پر سیاق وسباق (یعنی آیۃ کا بعد والا مضمون اور پہلے والا مضمون) بھی دلالت کر رہا ہے کہ جس شخص نے معصیت (گناہ کی راہ) میں مال خرچ کیا یا معصیت کی نذر مانی وہ ظالم ہے۔ جس نے صدقات واجبہ کو ادا نہ کیا وہ ظالم ہے۔ جس نے نذر کو پورا نہ کیا وہ ظالم ہے، بلکہ ظلم کا معنی عام ہی لیا جائے تو اور زیادہ بہتر ہے، جو ہر قسم کی برائیوں کو شامل ہے، کیونکہ ظلم کا معنی ہے کسی چیز کو اس کے غیر محل میں رکھنا۔

''من انصار'' کا مطلب یہ ہے کہ (اور نہیں ہے ظالموں کا) کوئی مددگار جو ان کی مدد کر کے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ان کو بچائے، یا ان کے لئے خصوصی شفاعت کرے، اور نہ ہی ان کی طرف سے کوئی مدافعت کر سکے گا۔

(تفسیر ابی السعود)

دینی مدارس کے طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

"وایرادصیغة الجمع لمقابلة الظالمین ای وما لظالم من الظالمین من نصیر من الانصار"

"انصار" جمع کا صیغہ ہے۔اور "ظالمین" بھی جمع کا صیغہ ہے۔جمع کا مقابلہ جمع سے ہوتو وہاں حکم احادکا احاد پر ہوتا ہے،اب مطلب یہ ہوگا کہ ظالموں سے کسی ظالم کا مددگاروں میں سے کوئی مددگار نہیں ہوگا۔(تفسیر ابی السعود)

یہ بھی خیال رہے کہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے کبیر میں ذکر کیا ہے کہ اگر چہ جمع کا مقابل جمع سے ہے لیکن ضروری نہیں کہ معنی واحد کے مقابل واحد والا کیا جائے۔

معتزلہ کا مذہب: اس آیۃ کریمہ سے معتزلہ نے دلیل یہ پکڑی ہے کہ کبیرہ گناہوں کے مرتکب لوگوں کے لئے شفاعت جائز نہیں۔کیونکہ ناصر وہ ہے جو انسان سے ضرر اور تکلیف کو دور کرے۔جب ظالموں کا کوئی ناصر نہیں تو اسیسے واضح ہوگیا کہ ان کا کوئی شفیع بھی نہیں۔

جواب اول: ناصر اور شفیع میں فرق خود رب تعالی نے اس آیۃ کریمہ میں کیا ہے۔

"واتقوا یوما لاتجزی نفس عن نفس شیأ ولا یقبل منها شفاعة ولا یؤخذ منها عدل ولا هم ینصرون"

کیونکہ نصرت اور شفاعت کا اگر ایک معنی ہوتا تو کافروں کے حق میں شفاعت کی قبولیت کی نفی کے بعد نصرت کی نفی نہ ہوتی،واضح ہوا "لا یلزم من نفی الانصار نفی الشفعاء" کہ انصار(مددگاروں) کی نفی سیشفاعت کرنے والوں کی نفی نہیں ہوتی۔

جواب دوم: اگر یہ تسلیم کر ہی لیا جائے کہ اس میں شفاعت کی نفی بھی پائی گئی ہے تو شفاعت عامہ کی نفی ہوگی جو عام لوگوں کے لئے عام اوقات میں پائی جاتی ہے۔

"والدلیل مثبت للشفاعة خاص فی حق البعض وفی بعض الأوقات والخاص مقدم علی العام،واللہ اعلم"

کبیرہ گناہوں والے لوگوں کے لئے شفاعت جو ثابت ہے وہ خاص دلیل سے ثابت ہے،وہ

بعض لوگوں کیلئے بعض اوقات میں پائی جاتی ہے۔ وہ دلیل جو مثبت پر دلالت کرے مقدم ہوتی ہے اس دلیل سے جو نفی پر دلالت کرے۔ (ماخوذ از کبیر)

انصار جمع ہے نصیر کی۔ جیسا کہ اشراف جمع ہے شریف کی، اور احباب جمع ہے حبیب کی۔

تنبیہ: ظلم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ ظلم ہے جو اپنی ذات پر ظلم ہو یہ ہر قسم کے گناہوں سے حاصل ہوتا ہے، اور مال خرچ کرنے میں دکھلاوا پایا جائے، اپنا چرچا کرنا مقصود ہو تو یہ بھی اپنی جان پر ظلم ہے، اور گناہوں کی راہ میں مال خرچ کرنا بھی اپنی جان پر ظلم ہے۔

اور ظلم کی دوسری قسم یہ ہے کہ غیر پر ظلم کرنا اگر چہ غیر پر ظلم کرنے کے گناہ سے اپنی جان پر بھی ظلم ہوگا، وہ یہ ہے کہ مال خرچ ہی نہ کرے، یا مال مستحق کو نہ دے بلکہ غیر مستحق کو دے دے۔ (از کبیر بتصرف)

نذر کے متعلق احادیث مبارکہ:

"عن ابی هريرة وابن عمر قالا قال رسول الله ﷺ لاتنذروافان النذر لا يغنی من القدر شيأ وانما يستخرج به من البخيل" (بخاری ومسلم مشکوة باب فی النذور)

حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابن عمر (رضی اللہ عنہم) فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نذر نہ مانو بیشک نذر تقدیر کو نہیں ٹال سکتی، نذر بخیل شخص مانتا ہے۔

وضاحت حدیث: اس حدیث پاک میں مطلقا نذر سے منع نہیں کیا گیا، بلکہ زمانہ جاہلیت کے غلط اعتقاد کو مٹایا گیا ہے۔ "والنهی عن النذر علی اعتقاد انه يرد عن القدر شيأ"

نذر سے روکنے کا یہ مقصد ہے کہ جو زمانہ جاہلیت میں یہ عقیدہ رکھا جاتا تھا کہ نذر تقدیر کو ٹال دیتی ہے، اسی باطل نظریہ کا رد کر دیا گیا ہے کہ اس غرض سے نذر نہ مانی جائے کیونکہ نذر تقدیر کو نہیں ٹال سکتی۔

دوسرا طریقہ زمانہ جاہلیت کا یہ تھا:

"انهم ينذرون لجلب المنافع ودفع المضار وذلك فعل البخلاء نهوا عن ذلك"

کہ وہ نذر مانتے تھے کہ نفع حاصل ہو جائے اور نقصان دور ہو جائے، یہ **کنجوس لوگوں کا کام تھا** اس لئے اس سے منع کیا گیا ہے کہ بخیل لوگوں کی طرح نذر نہ مانے بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے عبادت کی نذر مانی جائے۔ (ماخوذ از لمعات)

☆ **عن عائشة رضی اللہ عنہما ان رسول اللہ ﷺ قال من نذر ان یطیع اللہ فلیطعہ و من ان یعصیہ فلایعصہ**" (بخاری ،مشکوۃ باب النذور)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اللہ تعالیٰ کی طاعت کی نذر مانے اسے چاہئے کہ وہ نذر کو پورا کرے، اور جو شخص معصیت (گناہ) کی نذر مانے وہ نافرمانی نہ کرے (یعنی نذر کو پورا نہ کرے)

☆ **"عن عقبة بن عامر عن رسول اللہ ﷺ قال کفارة النذر کفارة الیمین"**

'رواہ مسلم"(مشکوۃ باب النذور)

عقبہ بن عامر کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نذر کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے۔

اسی حدیث کے پیش نظر محققین حضرات کا یہ فیصلہ ہے **"لانذر فی معصیة و کفارتہ کفارة الیمین"** معصیت کی نذر جائز نہیں، اور معصیت کی نذر کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے۔

☆ **"عن ابن عباس قال بینا النبی ﷺ یخطب اذا ھو برجل قائم فسأل عنہ فقالوا ابو اسرائیل نذران یقوم ولایقعد ولا یستظل ولا یتکلم ویصوم فقال النبی ﷺ مروہ فلیتکلم ویستظل ولیقعد ولیتم صومہ"** (رواہ البخاری،مشکوۃ باب النذور)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ ہم میں موجود تھے اور خطبہ ارشاد فرما رہے تھے، اچانک آپ نے ایک شخص کو کھڑے دیکھا تو پوچھا وہ شخص کون ہے؟ تو صحابہ کرام نے بتایا یہ ابو اسرائیل ہے، اس نے نذر مانی ہوئی ہے کہ وہ کھڑا رہے گا اور نہیں بیٹھے گا، اور نہ ہی سایہ حاصل کرے گا، (یعنی دھوپ میں رہے گا) اور نہ ہی کسی سے کلام کرے گا، اور (ہمیشہ) روزے رکھے گا، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اسے حکم دو کہ وہ کلام کرے اور سایہ حاصل کرے اور بیٹھے، البتہ روزہ مکمل کرے۔

وضاحت حدیث : کھڑا رہنا اور نہ بیٹھنا، سایہ حاصل نہ کرنا اور کلام نہ کرنا کوئی عبادت مقصودہ نہیں کہ ان کی نذر مانی جاسکے، البتہ روزہ رکھنا عبادت مقصودہ ہے اس لئے حضورﷺ نے اس کی نذر ماننے کی اجازت فرمائی اور اس کے مکمل کرنے کا حکم دیا۔"**فان النذر علی الطاعة لازم وصیام الدھر محمود من یقدر علیه**" طاعت کی نذر پورا کرنا لازم ہے، اور شخص ہمیشہ روزہ رکھنے کی قدرت رکھے اس کے لئے ہمیشہ روزہ رکھنا محمود ہے۔

البتہ سال کے پانچ دن خود بخود اس حکم سے علیحدہ ہو جائیں گے ان میں روزہ نہیں رکھا جائے گا اور نہ ہی کفارہ لازم آئے گا کیونکہ نذر ان کو شامل نہیں، وہ پانچ دن ہیں، عید الفطر، عیدالاضحیٰ کے دن اور ایام تشریق (گیارہ، بارہ، تیرہ ذی الحج)۔ ہاں اگر کسی شخص نے ہمیشہ روزہ رکھنے کی نذر مانی اور یہ بھی کہہ دیا کہ میں ان پانچ دنوں میں روزہ رکھوں گا جنمیں شریعت نے منع کیا ہے تو یہ نذر معصیت ہے اسے توڑنا ضروری ہے، لہٰذا ان دنوں میں روزہ نہ رکھے البتہ کفارہ ادا کردے۔

نہ بیٹھنے کی نذر یا کلام نہ کرنے کی نذر یا سایہ حاصل نہ کرنے کی نذر پر عمل کرنا ہی انسان کے لئے مشکل، انسانوں کو اس پر عمل کرنے کی طاقت ہی نہیں، اس لئے نذر کو توڑ دے اور کفارہ ادا کردے۔ (ماخوذ از مرقاۃ)

☆ **"وعن انس ان النبی ﷺ رأی شیخا یهادی بین ابنیه فقال مابال هذا قالوا انذر ان یمشی الی بیت الله قال ان الله تعالی عن تعذیب هذا نفسه لغنی وأمره ان یرکب"**

(بخاری ومسلم(مشکوۃ باب النذور)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریمﷺ نے ایک بوڑھے شخص کو دیکھا جو اپنے بیٹوں کے سہارے چل رہا ہے آپ نے پوچھا اس شخص کا کیا حال ہے تو آپ کو بتایا گیا کہ اس شخص نے نذر مانی ہے کہ بیت اللہ شریف کی طرف وہ پیدل چل کر جائے گا، آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس سے بے پرواہ ہے کہ یہ اپنے آپ کو عذاب دے۔

☆ **"عن ابن عباس ان رسول الله ﷺ قال من نذر نذر الم یسمه فکفارته کفارة یمین ومن نذر نذرافی معصیة فکفارته کفارة یمین ومن نذر الایطیقه فکفارته کفارة یمین ومن**

نذر نذرا اطاقة فلیف" (رواه ابو داؤد ابن مانه"مشکوة)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے نذر مانی اور اس کا ذکر نہیں کیا (صرف یہ کہا میں نذر مان رہا ہوں، کس چیز کی اس کا اس نے ذکر نہیں کیا) تو اس پر نذر کا وہی کفارہ ہوگا جو قسم کا کفارہ ہے۔ اگر معصیت کی نذر مانی (تو اس نذر کو توڑنا ضروری ہے، اس کے توڑنے پر) اس کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے۔ جس نے ایسی چیز کی نذر مان لی وہ طاقت ہی نہیں رکھتا، اس پر وہی کفارہ لازم ہوگا جو قسم کا کفارہ ہے۔

اگر کسی شخص نے ایسی چیز کی نذر مانی جس کی وہ طاقت رکھتا ہے تو اسے پورا کرے۔

☆☆☆☆☆

اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِیَ وَاِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَتُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ فَهُوَ خَیۡرٌ لَّكُمۡ وَیُكَفِّرُ عَنۡكُمۡ مِّنۡ سَیِّاٰتِكُمۡ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ ☆ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۷۱)

﴿۱﴾

اگر خیرات اعلانیہ دو تو وہ کیا ہی اچھی بات ہے اور اگر چھپا کر فقیروں کو دو یہ تمہارے لئے سب سے بہتر ہے اور اس میں تمہارے کچھ گناہ گھٹیں گے، اور اللہ کو تمہارے کاموں کی خبر ہے۔

﴿۲﴾

اگر تم ظاہر کرو صدقات تو وہ کتنی ہی اچھی چیز ہے۔ اور اگر تم اسے چھپاؤ اور دو تم فقراء کو تو وہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ اور وہ مٹاتا ہے تم سے تمہارے بعض گناہوں کو، اور اللہ جو تم عمل کرتے ہو (ان کی وہ) خبر رکھنے والا ہے۔

ماقبل سے تعلق:

اللہ تعالیٰ نے پہلے مال خرچ کرنے والوں کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں، ایک وہ لوگ جو خرچ کرنے کے بعد احسان جتلاتے ہیں یا جسے صدقہ دیا جائے اسے ایذاء (تکلیف) پہنچاتے ہیں۔ اور دوسرے وہ لوگ ہیں جو بغیر احسان جتلانے اور اذیت پہنچانے کے صرف خلوص نیت سے مال خرچ کرتے ہیں۔ پھر دونوں قسموں کے احکام بھی بیان فرما دیئے۔

اس کے بعد عمدہ مال خرچ کرنے اور ردی مال خرچ کرنے کے احکام ذکر فرمائے۔ اب اس آیۃ کریمہ میں مخفی طور پر مال خرچ کرنے اور ظاہر طور پر مال خرچ کے احکام کو بیان کیا جا رہا ہے۔ (کبیر)

شان نزول:

ایک مرتبہ رسول اللہ سے صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ صدقہ چھپا کر دینا افضل ہے یا ظاہر کر کے دینا

افضل ہے تو اس کے جواب میں یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی۔

مختصر مطلب:

مومنین کو خطاب ہے کہ اگر تم صدقات کو ظاہر کر کے فقراء و مساکین وغیرہ کو دیتے ہو تو یہ بھی اچھا ہے مقصد تو رب تعالی کا قرب حاصل کرنا ہے، اس لئے صدقہ میں جب ریاء کاری نہ ہو تو ظاہر طور پر دینا بھی اچھا ہے، اور اگر تم اپنے صدقات کو چھپا کر فقراء کو دو تو یہ اور ہی زیادہ بہتر ہے۔ اور وہ تمہارے گناہوں کو مٹادے گا، اور جو بھی تم عمل کرتے ہو اللہ تعالی کو اس کی خبر حاصل ہوتی ہے، وہ تمہارے اعمال کے مطابق تمہیں بدلہ دے گا۔

صدقہ کیا ہے؟

"الصدقة مايخرجه الانسان من ماله على وجه القربة فيدخل فيه الزكوة الواجبة وصدقة التطوع"

صدقہ کا مطلب یہ ہے کہ انسان نیکی کے لئے اور اللہ تعالی کا قرب حاصل کرنے کیلئے رب کی راہ میں مال خرچ کرے جب مطلقا صدقہ کا لفظ ذکر ہے تو یہ صدقات واجبہ کو بھی شامل ہے اور صدقات نافلہ کو بھی۔ (خازن)

"ان تبدوا الصدقات فنعما هی"

"اگر تم ظاہر کرو صدقات تو وہ کتنی ہی اچھی چیز ہے۔"

"بدا يبد وبدوا" ظاہر کرنا۔ 'بدأيبدأ بدأ' کا معنی شروع کرنا۔ ان دونوں لفظوں کے اصل کا فرق طلباء کرام ذہن میں ضرور رکھیں، کبھی لکھنے میں دونوں ایک جیسے نظر آتے ہیں جس کی وجہ سے ترجمہ کرتے وقت یا پڑھتے وقت بعض اوقات غلطی میں پڑنے کا عام احتمال پایا جاتا ہے۔

"فنعما هی" کا معنی اس کے اصل کے مطابق ہی ہوگا، اصل میں 'فنعم ماهی" ہے 'ما" سے مراد خصلت یا شیء ہے۔

"فنعماهی" ای فنعمت الخصلة هی وقیل الشئی هی"

کتنی اچھی ہے یہ عادت، کتنی اچھی ہے یہ چیز۔ (خازن)

''وان تخفوها وتؤتوها الفقراء فهوخيرلكم''

''اوراگرتم چھپاؤاس کویادوفقراءکوتووہ تمہارے لئے بہتر ہے''

''وان تخفوها''ای تسروا الصدقة ''اوراگرتم صدقہ مخفی رکھو(چھپاؤ)

''وتؤتوها الفقراء''ای وتعطوها الفقراء فی السر''اورتم وہ صدقات فقیروں کودو چھپا کر۔

''فهوخيرلكم''يعنی اخفاء الصدقة افضل من العلانية''

یعنی صدقہ چھپا کر دینا ظاہر کر کے صدقہ دینے سے بہتر ہے۔

''وکل مقبول اذاکانت النية صادقة''خواہ صدقہ ظاہر کر کے دے یا چھپا کر دے جب نیت میں خلوص ہو گا تو ہر طرح کا دیا ہوا صدقہ رب کے حضور قبول ہوگا۔ (خازن)

''ویکفر عنکم من سیآتکم'' ''اور وہ مٹاتا ہے تم سے تمہارے بعض گناہوں کو۔''

''ان من للتبعيض لان الصدقات لاتكفر جميع السيآت بخلاف التوبة فتكفر جميعها''

بیشک آیۂ کریمہ میں''من''تبعیض پر دلالت کر رہا ہے کیونکہ صدقات تمام گناہوں کو نہیں مٹاتے، البتہ صدق دل سے توبہ تمام گناہوں کو مٹا دیتی ہے۔ (حاشیہ جلالین)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے، راقم نے بھی وہی نقل کیا۔

تنبیہ:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے''من''کو زائد مانا ہے اور قرأت''ونکفر''والی ہے۔قال ابن عباس ''جميع سيآتكم'' حضرت ابن عباس فرماتے ہیں تمام گناہوں کے مٹانے کا ذکر ہے۔لیکن تفسیر خازن میں اس کی توجیہ یہ پیش کی گئی''ونكفر عنكم الصغائر منكم السيآت'' ہم تمہارے تمام صغائر گناہوں کو معاف کر دیں گے۔(ماخوذ از خازن)

"واللہ بما تعملون خبیر" "اور اللہ جو تم عمل کرتے ہو خبر رکھنے والا ہے۔"

یعنی اللہ تعالیٰ ظاہر و باطن کو جانتا ہے کوئی چیز اس پر مخفی نہیں، خواہ وہ عمل ظاہر ہو یا باطن ہو۔ اسی سے یہ سمجھ آ گیا کہ عمل میں اصل خلوص نیت اور اعتقاد خالص پر ہے، صرف صدقہ چھپا کر دینا یا ظاہر دینا مقصود نہیں۔

"فاسرار العمل لایدل علی الاخلاص واظھارہ لایدل علی الریاء"

ہر پوشیدہ خلوص پر دلالت نہیں کرتا۔ اور ہر ظاہر عمل دکھلاوے پر دلالت نہیں، اصل دار و مدار خلوص نیت پر ہی ہے۔ (صاوی)

کون سا دن صدقہ مخفی بہتر اور کونسا دن ظاہر بہتر:

"قال الاکثرون المرادبھا صدقة التطوع واتفق العلماء علی ان کتمان صدقة التطوع افضل واخفاء خیر من اظھارھا"

اکثر حضرات نے بیان فرمایا کہ آیۃ کریمہ میں جس صدقہ کا ذکر ہے اس سے مراد نفلی صدقہ ہے۔ اور اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ نفلی صدقہ افضل ہے اور اس کا مخفی رکھنا زیادہ بہتر ہے۔

"واما الزکوة فاظھار اخراجھا افضل من کتمانھا کالصلوة المکتوبة فی الجماعة افضل وصلوة التطوع فی البیت افضل ولکن الزکوة نفی التھمة عن المزکی"

لیکن زکوۃ یعنی صدقات فرضیہ کو ظاہر کرنا افضل ہے بنسبت چھپا کر دینے سے، جس طرح فرضی نماز جماعت سے پڑھنا افضل ہے اور نفلی نماز گھر میں افضل ہے، زکوۃ کو ظاہر کر کے ادا کرنے میں اور یہ فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ زکوۃ دینے والے سے تہمت زائل ہو جاتی ہے، یہ کوئی نہیں کہتا کہ فلاں شخص نے زکوۃ ادا نہیں کی۔ (ماخوذ از خازن)

صدقات فرضیہ کا مخفی رکھنا کب بہتر ہے؟

"اذا کان المزکی ممن لایعرف بالیسار کان اخفاؤھا افضل"

جب زکوۃ دینے والے کے مال کا لوگوں کو نہ پتہ ہو تو زکوۃ بھی چھپا کر دینا افضل ہے کیونکہ اس کے متعلق لوگوں کی تہمت کا خطرہ نہیں کہ لوگ کہیں گے اس نے زکوۃ نہیں دی کیونکہ لوگوں کو اس کے مال کا پتہ ہی نہیں۔ (مدارک)

بیضاوی اور روح البیان نے بھی یہی بیان کیا ہے۔

شان صحابہ کرام:

"وقیل ان الآیة واردة فی زکوة الفرض وکان اخفاء ها خیرا علی عهد رسول الله ﷺ لأنهم کانوا لایظنون بأحدانه یمنع الزکوة"

بعض حضرات نے کہا کہ آیۃ کریمہ وارد ہے فرضی زکوۃ کے متعلق، رسول اللہ ﷺ کے زمانہ اطہر میں زکوۃ چھپا کر دینا بہتر تھا، کیونکہ صحابہ کرام کا ایک دوسرے کے متعلق زکوۃ نہ دینے کی تہمت لگانا تصورر اور خیال میں بھی نہیں آسکتا۔

کیونکہ تمام صحابہ کرام ہی اللہ تعالی اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے احکام کو دل و جان سے بجالانے میں پیش پیش تھے ان سے احکام میں سوائے سہو وخطاء کے حکم عدولی کا کوئی ثبوت نہیں پیش کیا جاسکتا۔ (ماخوذ از خازن)

"وقیل ان الآیة عامة فی جمیع الصدقات الواجبة والتطوع والاخفاء افضل فی کل صدقة من زکوة وغیرها"

ایک قول یہ ہے کہ آیۃ کریمہ تمام صدقات واجبہ اور نفلی کو شامل ہے، ہر صدقہ چھپا کر دینا افضل ہے خواہ زکوۃ ہو یا نفلی صدقہ ہو یا اور صدقات واجبہ ہوں۔ (خازن)

راقم کا موقف:

راقم نے تمام اقوال کو جمع کرنے کی یہ کوشش کی ہے کہ ہر صدقہ فرضی ہو یا نفلی ہو چھپا کر دینا افضل ہے خلوص نیت سے ظاہر طور پر دینا جائز ہے اور مقام مقبولیت حاصل ہوتا ہے۔ ہاں البتہ زکوۃ ادا نہ کرنے کی تہمت کا خطرہ ہو تو اس سے بچنے کے لئے فرضی صدقہ ظاہر طور پر دینا اچھا ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

چھپا کر صدقہ دینے کے فوائد۔

﴿۱﴾ چھپا کر صدقہ دینا ریاء (دکھلاوے) سے دور ہوتا ہے۔

﴿۲﴾ چھپا کر صدقہ دینے میں اکثر طور پر اخلاص پایا جاتا ہے، خلوص ہی دراصل روح عبادت ہے، اور تقرب الٰہی کا ذریعہ ہے۔

﴿۳﴾ چھپا کر صدقہ دینے میں نفس پر قہر ہوتا ہے، کیونکہ نفس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کو دکھا کر صدقہ دیا جائے۔

﴿۴﴾ چھپا کر صدقہ دینے میں فقیر کی عزت کا پاس کیا جاتا ہے کیونکہ ظاہر کر کے دیں گے تو فقیر کو اپنے عاجز ہونے کے خیال سے پریشانی ہوگی اور وہ اپنے آپ کو گھٹیا سمجھے گا، اس طرح اس کی ذلت ہوگی لیکن چھپا کر صدقہ دینے میں فقیر کو یہ پریشانی لاحق نہیں ہوگی۔

صدقہ کو صدقہ کہنے کی وجہ:

''صدقہ'' کا اصل مادہ ''ص، د، ق'' ہے جو سچ اور خلوص پر دلالت کرتا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا:

''رجل صدق النظر'' ایک شخص کی سچی نظر ہے، یعنی اس کی نگاہ حق کی طرف اٹھتی ہے باطل کی طرف نہیں۔

''صدق اللقاء'' اس کے سچی ملاقات کی، یعنی اس کی ملاقات میں خلوص تھا۔

''صدقوهم القتال'' وہ قتال میں سچے ثابت ہوئے، یعنی انہوں نے جہاد کرنے کے وعدہ کو اور بہادری سے جہاد کرنے کے قول کو سچ کر کے دکھایا۔ ''فلان صادق المودة'' فلاں شخص سچی محبت والا ہے، یعنی اس کی محبت میں خلوص پایا گیا ہے۔ ''هذا خل صادق الحموضة'' یہ سرکہ خالص کھٹاس والا ہے، یعنی اس میں مزید ترش پن پایا گیا ہے ''هذا شئی صادق الحلاوة'' یہ چیز خالص مٹھاس والی ہے۔

''صدق فلان فی خبره'' فلاں شخص اپنی خبر میں سچا ہے، یہ اس وقت کہا جاتا جب کوئی شخص صحیح اور کامل خبر دے۔

''الصديق يسمى صديقا لصدقه فی المودة''

جو شخص محبت میں سچا اور مخلص ہو اس کو صدیق (صاد کی زبر اور دال غیر مشدد) کہا جاتا ہے۔

"الصداق سمی صداقالان عقدالنکاح به یتم ویکمل"

مہرکوصداق کہاجاتا ہے کیونکہ نکاح کےخلوص کی مہر کے ذریعے تکمیل ہوتی ہے۔

" وسمی الله تعالی الزکوة صدقة لأن المال بها یصح ویکمل فهی سبب اما لکمال المال وبقاه ،واما لأنه یستدل بها علی صدق العبد فی ایمانه و کماله فیه"

اللہ تعالی نے زکوۃ کو(اوراس کی راہ میں خرچ کرنے کو) صدقہ کہا ہے کیونکہ صدقہ ادا کرنے سے مال صحیح اور باقی رہتا ہے، گویا کہ کمال مال اور بقاء مال پر دلالت کرتا ہے۔ دوسری وجہ اس میں یہ پائی گئی کہ صدقہ بندے کے ایمان میں سچا ہونا اور کمال ایمان پر دلالت کرتا ہے۔ (کبیر)

سوال: اس آیۃ کریمہ میں یہ ذکر کیا گیا ہے "وتوتوھاالفقراء" وہ صدقات فقراءکودواوردوسری آیۃ کریمہ میں "انما الصدقات للفقراء والمساکین "الآیة" صدقات کے مستحقین کی آٹھ قسموں کاذکر کیا تو یہاں صرف فقراء کے ذکر کرنے کی کیا وجہ ہے؟

جواب:"وایتاؤالفقراء متعین ای التعیین بالنسبة للاغنیاء والافالأصناف التی تدفع لهم ثمانیة مذکورة فی سورة براءة"

اصل میں سورۃ براءۃ میں جن آٹھ قسم کے مستحقین زکوۃ کا ذکر ہے وہی مصارف زکوۃ ہیں۔ یہاں فقراءکا ذکر بمقابلہ اغنیاء کے ہے کہ صدقات صرف فقراءکو دیئے جائیں اغنیاءکو نہ دئے جائیں۔

(جلالین مع الصاوی)

"ولعل التصریح بأیتها الفقراء مع انه لابد منه فی الابداء ایضالما ان الاخفاء مظنة الالتباس والاشتباه فان الغنی ربما یدعی الفقر ویقدم علی قبول الصدقة سرا ولا یفعل ذلک عندالناس"

فقراءکوذکر کرنے اورفرضی،واجبی صدقات کوظاہر کر کے دینے کی ایک وجہ یہ ہے کہ مخفی طور پر دینے میں اشتباہ لازم آتا ہے کیونکہ بعض اوقات غنی بھی اپنے آپ کوفقیر ظاہر کر کے صدقات

واجبہ بھی کو قبول کر لیتے ہیں، لیکن جب صدقات واجبہ لوگوں کے سامنے دیئے جائیں گے اور بتایا جائے گا کہ یہ صدقات واجبہ ہیں تو غنی شخص لوگوں کے سامنے نہیں لے گا کہ یہ لوگ میرے غنی ہونے کو سب کے سامنے کہیں بیان نہ کر دیں۔ (روح المعانی)

"وتخصیص الفقراء بالذکر اهتماما بشانهم" کبھی کبھی کسی ایک کا ذکر اس کی شان کی اہمیت کی وجہ سے ہوتا ہے، یہاں بھی فقراء کا ذکر ان کی زیادہ احتیاجی کی وجہ سے اہتمام شان کے لئے ہے۔ (از روح المعانی)

ان تمام جوابات کی ضرورت اس وقت در پیش آتی ہے جب اس آیۃ کریمہ میں صدقات سے مراد عام صدقات ہوں جو نفلی اور واجبی دونوں کو شامل ہوں، صحیح قول بھی یہی ہے کہ یہاں مراد صدقات نفلیہ اور واجبہ دونوں ہی ہیں۔

تاہم ایک قول کے مطابق مراد صرف صدقات نفلیہ ہیں، اس کے مطابق ممکن ہے کہ مراد یہ ہو کہ صدقات نافلہ میں زیادہ لحاظ فقراء کا کیا جائے، ﴿والله اعلم بالصواب﴾ (ماخوذ از روح المعانی بتصرف)

راقم کا موقف: فقر چار معنوں میں قرآن پاک میں استعمال ہے۔

"الاول وجود الحاجة الضرورية وذلک عام للانسان مادام فی دار الدنيا بل عام للموجودات كلها"

ان میں سے پہلا معنی حاجت ضروریہ کا پایا جانا، یہ اس دنیا میں انسان کو شامل ہی رہتا ہے کہ ہر انسان کسی نہ کسی چیز کا محتاج ہوتا ہے۔

بلکہ صرف انسان ہی نہیں بلکہ تمام موجودات ہی کسی نہ کسی چیز کی محتاج ہوتی ہیں۔ "وعلی هذا قوله تعالی "یاایها الناس انتم الفقراء الی الله" 'اللہ تعالی کے اس ارشاد مذکور کا یہی مطلب ہے "اے لوگو تم اللہ کے محتاج ہو" یعنی ان معانی میں سے ایک معنی ہے 'محتاج ہونا' جب یہ معنی آیۃ کریمہ میں بھی لے لیا جائے تو وہ آٹھ قسم کے مستحقین کو شامل ہے۔

یعنی جب "وتؤتوها الفقراء" کا معنی یہ ہو "اور دو تم محتاجوں کو" تو اس میں مساکین' وابن السبیل وغیرہ سب ہی آجائیں گے۔

طلباء کرام کے فائدہ کے لئے دوسرے معانی بھی ذکر کئے جارہے ہیں۔اگر چہ اس بحث کا تعلق اسی معنی سے تھا جوذکر کیا جاچکا ہے۔

"والثانی عدم المقتنیات وهو المذکور فی قوله تعالی "للفقراء الذین احصروا(الی قوله)من التعفف"

دوسرا معنی یہ ہے کہ فقراءان لوگوں کوکہا جاتا ہے جن کا کوئی ذریعہ معاش نہ ہوجیسا کہ"للفقراء الذین احصروا" آیۃ کریمہ میں یہ معنی استعمال ہے۔

"الثالث فقر النفس وهو الشرة" تیسرا معنی فقر کا"نفس کا حریص اورلالچی ہونا" یہ معنی "الغنی غنی النفس" کے مدمقابل ہے جس کا معنی ہے"نفس کا بے پرواہ ہونا" لالچی نہ ہونا۔

اسی معنی میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد استعمال ہے"کاد الفقران یکون کفرا"قریب ہے کہ نفس کا لالچی ہونا انسان کو کفر تک پہنچادے۔

"الرابع الفقر الی الله المشار الیه بقوله ﷺ "اللهم اغننی بالافتقار الیک ولا تفقرنی بالاستغناء عنک"

چوتھا معنی یہ ہے کہ اللہ کی طرف توجہ کرنا جیسا کہ نبی کریم ﷺ فرماتے تھے اے اللہ مجھے اپنی طرف متوجہ کر کے سب سے بے پرواہ کردے، مجھے اپنے آپ سے بے پرواہ کر کے کسی اور کی طرف توجہ کرنے والا نہ بنا۔

یہ معنی اللہ تعالی کے اس ارشادگرامی میں بھی پایا گیا ہے"رب انی لما انزلت الی من خیر فقیر"(مفردات راغب)

مخفی صدقہ دینے کی افضلیت پراحادیث مبارکہ:

"اخرج الحمد والترمذی وابن المنذر وابن ابی حاتم وابن مردویه والبیهقی فی الشعب عن انس عن النبی ﷺ قال لما خلق الله الارض جعلت تمید فخلق الجبال فالقاها علیهافاستقرت فتعجبت الملائکة من خلق الجبال فقالت یا رب هل من

خلقک شئی اشد من الجبال قال نعم الحدید قالت فهل من خلقک شئی اشد من الحدید قال نعم النار قالت فهلمن خلقک شئی اشدمن النار قال نعم الماء قالت فهل من خلقک شئی اشدمن الماء قالنعم الریح قالت فهل من خلقک شئی اشد من الریح قال نعم ابن آدم یتصدق بیمنیهفیبخفیها من شماله"

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالی نے زمین کو پیدا کیا تو وہ حرکت کرنے لگی تو اللہ تعالی نے پہاڑوں کو پیدا کر کے اس پر ڈال دیا تو اسے قرار آ گیا۔فرشتوں نے پہاڑوں کی تخلیق پر تعجب کیا،تو ملائکہ نے عرض کی اے ہمارے رب کیا تو نے پہاڑوں سے بھی زیادہ مضبوط کوئی چیز بنائی ہے؟تو رب تعالینے فرمایاہاں لوہا(ان سے زیادہ مضبوط میں نے بنایا ہے)پھر فرشتوں نے عرض کیا اے ہمارے رب کیا تو نے لوہے سے بھی کوئی مضبوط چیز بنائی ہے تو رب نے فرمایا ہاں پانی۔پھر فرشتوں نے کہا کیا پانی سے مضبوط اور اشد بھی کوئی چیز بنائی ہے؟تو رب تعالی نے کہا ہاں ہوا،پھر فرشتوں نے کہا کیا ہوا سے اشد بھی کوئی چیز تو نے بنائی ہے؟تو رب تعالی نے فرمایا ہاں ابن آدم(انسان)جو اپنے دائیں ہاتھ سے صدقہ دیتا ہے تو بائیں کو بھی پتہ نہیں چلنے دیتا۔ (درمنثور)

☆ "واخرج البخاری ومسلم والنسائی عن ابی هریرة قال سمعت رسول الله ﷺ یقول سبعةیظلهم الله فی ظله یوم لاظل الاظله امام عادل وشاب نشأفی عبادة الله عزوجل ورجل قلبه معلق بالمساجدورجلان تحابافی الله اجتماعا علی ذلک وتفرقا علیه ورجل دعته امرأة ذات منصب وجمال فقال انی اخاف الله ورجلتصدق بصدقة فاخفا ها حتی لاتعلم شماله ماتنفق یمینه ورجل ذکر الله خالیا ففاضت عیناه"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ سات شخصوں کو اللہ تعالی اپنی رحمت کے سائے میں لے گا اس دن جس دن اس کی رحمت کے سائے کے بغیر اور کوئی سایہ نہیں ہوگا،(۱)عدل وانصاف کرنے والا حاکم (۲)اور جوانی میں اللہ تعالی کی عبادت کرنے والا (۳)اور وہ شخص جس

کا دل مسجد سے معلق رہے (لٹکا رہے، لگا رہے)

(۴) اور دو شخص اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے ایک دوسرے سے محبت کریں، اللہ کی رضاء کے لئے ہی جمع ہوں اور اللہ کی رضاء کے لئے ہی جدا ہوں۔

(۵) اور وہ شخص جسے ایک خوبصورت اور ذات منصب عورت دعوت (گناہ) دے تو یہ کہے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔

(۶) اور وہ شخص جو صدقہ کرے تو چھپا کر کرے یہاں تک کہ بائیں ہاتھ کو پتہ نہ چلے کہ دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا ہے۔

(۷) جو شخص تنہائی میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرے کہ اس کے آنکھوں سے آنسو جاری ہوں (درمنثور)

☆ "واخرج الطبرانی عن معاویه بن حیدة عن النبی ﷺ قال ان صدقة السر تطفئی غضب الرب"

معاویہ بن حیدہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا چھپا کر صدقہ کرنا اللہ تعالیٰ کے غضب کو ختم کرتا ہے۔

☆ "واخرج ابن ابی الدنیا والبیهقی فی الشعب عن عائشه ان النبی ﷺ قال قرأة القرآن فی الصلوة افضل من قرأة القرآن فی غیر الصلوة وقرأة القرآن فی غیر الصلوة افضل من التسبیح والتکبیر والتسبیح افضل من السدقة والصدقة افضل من الصوم والصوم جنة من النار"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا نماز میں قرآن پاک پڑھنا افضل ہے بنسبت نماز کے بغیر قرآن پڑھنے کے۔ نماز کے بغیر قرآن پڑھنا افضل ہے تسبیح وتکبیر سے، اور تسبیح افضل ہے صدقہ سے اور صدقہ افضل ہے روزہ سے اور روزہ (جہنم کی) آگ سے ڈھال (بچاؤ کا ذریعہ) ہے۔ (درمنثور)

☆ "واخرج احمد عن سالم بن ابی الجعد قال خرجت امرأة وکان معها صبی لها فجاء الذئب فاختلسه منها فخرجت فی اثره وکان معها رغیف فعرض لها سائل فاعطته الرغیف فجاء الذئب بصبیها فرده علیها"

سالم بن ابی الجعد نے فرمایا ایک عورت (گھر سے) نکلی، اور اس کے ساتھ اس کا بچہ تھا، ایک بھیڑیا آیا جس نے اس کے بچے کو اس سے اچک (چھین) لیا۔ تو وہ عورت اس کے پیچھے دوڑی، اس کے پاس ایک روٹی تھی، راستے میں اسے ایک سائل مل گیا، اس نے وہ روٹی اسے دے دی، (صدقہ کی برکت سے) بھیڑیا اس کے بچے کو واپس لے آیا اور اس عورت پر اس کے بچے کو لوٹا دیا۔ (درمنثور)

☆ "واخرج ابن ماجة عن جابر بن عبد الله قال خطبنا رسول الله ﷺ فقال یاایها الناس توبوا الی الله قبل ان تموتوا وبادروا بالاعمال الصالحة قبل ان تشتغلوا وصلوا الذی بینکم وبین ربکم بکثرة ذکر کم له وکثرة الصدقة فی السرو العلانیة ترزقوا وتنصروا وتجبروا"

جابر بن عبد اللہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خطبہ دیا، اور فرمایا اے لوگو مرنے سے پہلے توبہ کرلو، مشغول ہونے سے پہلے (وقت کے ملنے سے پہلے) نیک اعمال میں جلدی کرلو، اور نماز ادا کرلو اس میں تمہاری طرف سے تمہارے رب کا کثیر ذکر پایا گیا ہے۔ اور زیادہ صدقہ ادا کرو خواہ چھپا کر دو یا ظاہر کر کے تمہیں رزق دیا جائے گا اور تمہاری امداد کی جائے گی اور تمہارا جبیرہ بنایا جائے گا۔ (درمنثور)

یعنی صدقہ ذریعہ بنے گا اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق حلال کا، رزق سے مراد یہاں رزق حلال اور پاکیزہ رزق ہے، کیونکہ حرام مال اور ناپاک رزق تو اللہ تعالیٰ کافروں کو بھی دیتا ہے۔ اور صدقہ ذریعہ بنے گا رب تعالیٰ کی طرف سے تمہاری امداد کا۔ یعنی صدقہ کی برکت سے رب تعالیٰ تمہاری امداد فرمائے گا۔ اور صدقہ تمہارے لئے جبیرہ بنے گا۔ جبیرہ کا معنی ٹوٹے ہوئے عضو پر لکڑیاں رکھ کر پٹی باندھنا۔ چونکہ جبیرہ ٹوٹی ہوئی ہڈی کو جوڑنے کا ذریعہ بنتی ہے تو اس مناسبت سے یہاں مطلب یہ ہوگا صدقہ تمہارے دلوں کو سکون دے گا، یعنی صدقہ بے قرار دلوں کا قرار ہے، بے چین دلوں کا چین ہے۔ پھر صدقہ تمہارے اعمال میں ترقی کا ذریعہ بنے گا۔

☆ "واخرج الطبرانی عن رافع بن خدیج قال قال رسول الله ﷺ الصدقة تسد سبعین بابا من السوء"

رافع بن خدیج کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا صدقہ برائیوں کے ستر دروازے بند کر دیتا ہے۔ (درمنثور)

☆ "واخرج ابن ابی شیبة والبخاری ومسلم عن عدی بن حاتم قال سمعت رسول الله ﷺ یقول ما منکم من احد الاسیکلمه الله لیس بینه وبینه ترجمان فینظر ایمن منه فلایری الاماقدم وینظر أشام منه فلایری الاماقدم وینظر بین یدیه فلایری الاالنار تلقاء وجهه فاتقوا النار ولوبشق تمرة"

عدی بن حاتم فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ تم میں سے ایک نہیں ہوگا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام کرے گا، اس بندے اور رب کے درمیان کوئی ترجمان نہیں ہوگا، وہ دائیں طرف دیکھے تو اسے کچھ دکھائی نہیں دے گا سوائے اس کے کہ اس نے جو آگے بھیجا۔ اور بائیں طرف دیکھے گا، وہ سوائے اپنے اعمال آگے بھیجے ہوئے کے کچھ اور نہیں دیکھے گا۔ اور سامنے دیکھے گا اور اسے صرف آگ نظر آئے گی، تم آگ سے بچ جاؤ اگر چہ کھجور کے ایک حصہ سے۔ (درمنثور)

یعنی صدقہ دے کر اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ خواہ وہ صدقہ قلیل ہی کیوں نہ ہو، اس لئے کہ صدقہ کی مقدار کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ دینے والے کی ہمت اور خلوص کو دیکھا جاتا ہے۔

☆ "واخرج البیهقی عن رجل من اصحاب النبی ﷺ یقال له خصفة بن خصفة قال سمعت رسول الله ﷺ یقول هل تدرون ماالشدید قلنا الرجل یصرع الرجل قال ان الشدید کل الشدید الذی یملک نفسه عند الغضب تدرون ماالرقوب قلنا الرجل لایولدله قال ان الرقوب الرجل الذی له الولدلم یقدم منهم شئی،قال تدرون ماالصعلوک قلنا الرجل لامال له قال ان الصعلوک کل الصعلوک الذی له المال یقدم منه شیأ"

نبی کریم ﷺ کے ایک صحابی جن کو خصفہ بن خصفہ کہا جاتا تھا فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے

سنا، کیا تم جانتے ہو شدید شخص (بہادر) کون سا ہے؟ ہم نے کہا وہ شخص بہادر ہے جو دوسرے کو گرا دے، آپ نے فرمایا کامل بہادر وہ شخص ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر مالک ہو (یعنی اپنے آپ کو غصہ میں قابو رکھے) پھر آپ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ ''رقوب'' (بے اولاد) کون سا شخص ہے؟ ہم نے کہا ''رقوب'' وہ شخص ہے جس کی اولاد نہ ہو تو، ۃ آپ نے فرمایا حقیقت میں رقوب وہ شخص ہے جس کی اولاد تو ہو لیکن (ان میں سے بچپن میں کوئی فوت نہ ہوا ہو جو اس کی شفاعت کرے) اس نے ان میں سے کسی کو آگے نہ بھیجا ہو۔ پھر آپ نے فرمایا ''صعلوک'' (فقیر) کون سا شخص ہے؟ ہم نے کہا وہ شخس ہے جس کے پاس مال نہ ہو۔ آپ نے فرمایا ''صعلوک'' حقیقت میں وہ شخص ہے جس کے پاس مال تو ہو لیکن اس نے آگے نہ بھیجا ہو۔ (درمنثور)

یعنی حقیقت میں غنی وہ شخص ہے جو اللہ تعالی کی راہ میں مال خرچ کرے، جو اللہ تعالی کی راہ میں مال خرچ نہ کرے وہ مال دار ہونے کے باوجود تنگ دست ہے۔

☆ ''واخرج مسلم عن ابی ذر عن النبی ﷺ انه قال یصبح علی کل سلامی من احدکم صدقة فکل تسبیحة صدقة و کل تحمید صدقة و کل تهلیلة صدقة و کل تکبیرة صدقة و أمربالمعروف صدقة ونهی عن المنکر صدقة ویجزئی من ذلک رکعتان یرکعهما عن الضحی''

حضرت ابوذر فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمہارا ہر جوڑ صدقہ دینے والا ہو، اور ہر تسبیح صدقہ ہے۔ اور ہر تحمید صدقہ ہے، اور ہر تہلیل صدقہ ہے۔ اور امر بالمعروف صدقہ ہے، اور نہی عن المنکر (برے کاموں سے روکنا) صدقہ ہے۔ اور دو رکعت چاشت کو ادا کرنا ان سب کی طرف سے کفایت کرتی ہیں۔ (درمنثور)

☆ ''عن عائشة رضی الله عنها ان رسول الله ﷺ قال انه خلق کل انسان من بنی آدم علی ستین وثلاث مائة مفصل فمن کبر الله وحمد الله وهلل الله وسبح الله واستغفر الله وعزل حجرا عن طریق الناس اوشوکة اوعظما عن طریق الناس

وامر بمعروف اونهی عن منکر عدد تلک الستین والثلاث مائة السلامی فانه یمشی یومئذ وقد زحزح نفسه عن النار" (مسلم کتاب الزکوۃ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بنی آدم میں سے ہر انسان کو تین سو ساٹھ جوڑوں پر پیدا کیا، جس شخص نے اللہ کی تکبیر کہی، اور اللہ تعالی کی حمد کی، اور اللہ تعالی کی تہلیل بیان کی یعنی لا الہ الا اللہ پڑھا اور اللہ تعالی کی تسبیح پڑھی، اور اللہ تعالی سے مغفرت طلب کی، اور برے کاموں سے روکا تو یہ تین سو ساٹھ جوڑوں کی تعداد میں صدقہ ہے، وہ اس راہ پر چلا کہ اس نے اپنے آپ کو آگ سے بچالیا۔

☆ "عن جرير قال كنا في صدر النهار عند رسول الله ﷺ فجاء ه قوم عراة مجتابی النمار او العباء متقلدی السیوف عامتهم من مضر بل كلهم من مضر فتمعر وجه رسول الله ﷺ لما رأى بهم من الفاقة فدخل ثم خرج فامر بلالا فاذن واقام فصلى ثم خطب فقال ياايها الناس اتقوا ربكم الذى خلقكم من نفس واحدة "الى آخر الآية "ان الله كان عليكم رقيبا، والآية التى فى الحشر اتقوا الله ولتنظر نفس ماقدمت لغد تصدق رجل من ديناره من درهمه من ثوبه من صاع بره من صاع تمرة حتى قال ولو بشق تمرة قال فجاء رجل من الانصار بصرة كادت كفه تعجز عنها بل قد عجزت ثم تتابع الناس حتى رأيت كومين من طعام وثياب حتى رأيت وجه رسول الله ﷺ يتهلل كانه مذهبة فقال رسول الله ﷺ من سن فى الاسلام سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها من بعده من غير ان ينقص من اجورهم شئى ومن سن فى الاسلام سنة سيئة كان عليه وزرها ووزر من عمل بها من غير ان ينقص من اوزارهم شئى" (رواه مسلم، مشكوة كتاب العلم)

جریر (بن عبداللہ) کہتے ہیں ہم دن کے اول حصہ (دوپہر) میں رسول اللہ ﷺ کے پاس تھے، آپ کے پاس ایک قوم جو ننگے تھے (ان کا لباس نہیں تھا) وہ اونی چادریں اوڑھے ہوئے تھے، گلے میں تلواریں تھیں، ان کے عام لوگ مضر قبیلہ کے تھے، رسول اللہ ﷺ نے جب ان کے فاقہ (غربت) کو دیکھا تو (آپ کے چہرے پر پریشانی کے آثار

نمودار ہو گئے) آپ کا چہرہ مرجھا گیا، آپ گھر تشریف لے گئے (گھر کچھ چیز نہ پا کر) واپس آ گئے۔ پھر آپ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کہنے کا حکم دیا (یہ نماز غالباً ظہر کی تھی) انہوں نے اذان کہی پھر اقامت کہی پھر نماز پڑھی پھر خطبہ دیا پھر یہ آیۃ کریمہ پڑھی۔

"یاایھاالناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدة وخلق منھا زوجھا وبث منھما رجالا کثیر اونساء واتقوا اللہ لذی تسائلون بہ والارحام ان اللہ کان علیکم رقیبا"

(سورۃ انساء آیۃ ۱)

اے لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی میں سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت پھیلا دیئے اور اللہ سے ڈرو جس کے نام پر مانگتے ہو اور رشتوں کا لحاظ رکھو بے شک اللہ ہر وقت تمہیں دیکھ رہا ہے، پھر آپ نے سورۃ حشر کی یہ آیۃ کریمہ پڑھی۔

"یاایھا الذین امنوا اتقوا اللہ ولتنظر نفس ماقدمت لغدو اتقو االلہ ان اللہ خبیر بما تعملون"

(سورۃ الحشر آیۃ ۱۸)

اے ایمان والوں اللہ سے ڈرو اور ہر جان دیکھے کہ کل کے لئے کیا آگے بھیجا اور اللہ سے ڈرو بیشک اللہ کو تمہارے سب کاموں کی خبر ہے۔

(پھر آپ نے فرمایا) ہر شخص کو (اپنی طاقت کے مطابق) صدقہ کرنا چاہئے خواہ درھم ہوں، خواہ کپڑے۔ خواہ گندم کا ایک صاع ہو، خواہ کھجور کا ایک صاع ہو، یہاں تک آپ نے فرمایا اگرچہ کھجور کا کچھ حصہ بھی دے۔ (آپ کے ارشاد کو سن کر صحابہ کرام اپنے اپنے گھروں میں چلے گئے) یہاں تک کہ ایک شخص انصار میں سے ایک (درہم وغیرہ سے بھری ہوئی) تھیلی لے آئے، قریب تھا کہ ان کے ہتھیلی (وہ تھیلی اٹھانے سے) عاجز ہو جائے، بلکہ وہ عاجز ہو رہی تھی، پھر لوگ آگے پیچھے آنے شروع ہو گئے یہاں تک کہ میں نے دو ڈھیر طعام اور کپڑوں کے دیکھے، یہاں تک کہ میں نے دیکھا رسول اللہ ﷺ کا چہرہ چمک اٹھا، یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس پر سونے کا پانی چڑھا دیا گیا ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ

نے فرمایا جس شخص نے اسلام میں اچھا طریقہ جاری کیا اسے اس کا اجر ملے گا، اور اس پر بعد میں آنے والے جتنے لوگ عمل کریں گے ان کے عمل کا ثوب بھی اسے حاصل ہوگا اور ان کے اعمال کے ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ اور جس شخص نے اسلام میں برا طریقہ جاری کیا اسے اس عمل کے ایجاد کرنے کا گناہ حاصل ہوگا اور اس پر عمل کرنے والوں کا گناہ بھی اسے حاصل ہوگا، جبکہ ان عمل کرنے والوں کے گناہوں میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

فائدہ:

"قال العباس بن عبدالمطلب رضی الله عنه لایتم المعروف الابثلاث خصال تعجیله، وتصغیره، وستره، فاذاعجلته هنیته، واذاصغرته عظمته واذاسترته اتممته"

(قرطبی)

حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بھلائی کا کام یعنی اللہ کی راہ میں دیا، ہوا مال سوائے تین چیزوں کے مکمل نہیں ہوتا۔ (۱) جلدی کرنا، (۲) تھوڑا سمجھنا (۳) اور پوشیدہ دینا۔

جب تم اللہ تعالی کی راہ میں جلدی مال خرچ کرو گے تو گویا کہ تم نے اچھا مبارک کام کیا، جو تمہارے لئے خوشگوار ہے۔

جب تم نے رب کے حضور خرچ کئے ہوئے مال کو تھوڑا اور حقیر سمجھا تو وہ اللہ تعالی کے حضور عظیم قدر و منزلت والا ہوگا۔ جب تم صدقہ وخیرات کا مال پوشیدہ طور پر دیا تو تم نے کامل طور پر صدقہ کر دیا۔

کسی شاعر نے کیا خوب کہا۔

زاد معروفک عندی عظما　　　انه عندک مستور حقیر

تتنا ساه کأن لم تاته　　　وهو عند الناس مشهور خطیر

تمہاری بھلائی، تمہارا ہدیہ میرے نزدیک عظیم ہے۔ بیشک وہ تمہارے نزدیک چھپا ہوا حقیر ہے۔ (کیا) ہم بھول گئے کہ وہ آیا ہی نہیں۔ حالانکہ لوگوں کے نزدیک وہ مشہور اور عظیم ہے۔ (قرطبی)

حکمت: "قال بعض الحکماء اذااصطنعت المعروف فاستره واذااصطنع الیک فانشره"

بعض حکماء نے بیان فرمای ہے جوتم بھلائی کا کام کروتو چھپا کر کرو، اور جب تمہیں انتقام لینے پر مجبور کر دیا جائے تو اعلانیہ طور پر انتقام لو، دعبل خزاعی نے کیا خوب کہا:

اذاانتقموا اعلنوا امرهم وان انعموا انعموا باكتتام

جب تم انتقام لوتو اپنے معاملہ کا اعلان کر دو اور جب تم انعام دوتو انعام چھپا کر دو، سھل بن ہارون نے کہا:

خل اذا جئته يوم اتسأله اعطاک ماملکت کفاره و اعتزرا

يخفي صنائعه و الله يظهرها ان الجميل اذا اخفيته ظهرا

جب تو اپنی حاجت لے کر کسی دن اس کے پاس سوال کرنے کیلئے آئے۔ تو وہ تمہیں دے گا جس کے اس کے ہاتھ مالک ہوئے اور عذر پیش کرے گا وہ اپنے بھلائی کے کاموں کو پوشیدہ رکھتا اور اللہ انہیں ظاہر کر دیتا ہے، بیشک اچھے کام کوتم جب پوشیدہ رکھو گے وہ خود ہی ظاہر ہو جائے گا۔

نفلی صدقہ اغنیاء، ذمی اور خود بھی کھا سکتا ہے:

"ولا يجوز ان يدفع الزكوة الى ذمى لقوله عليه السلام لمعاذرضى الله عنه خذها من اغنياء هم وردها فى فقراء هم ويدفع اليه ماسوى ذلک من الصدقة لقوله عليه السلام تصدقوا على اهل الاديان كلها ولو لاحديث معاذ لقلنا بالجوازفى الزكوة"

(ازهداية اولين ص١٨٥)

زکوۃ ذمی یعنی کافر کو دینا جائز نہیں اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ رضی الہ عنہ کو (جب عامل بنایا تو) فرمایا کہ مسلمانوں کے اغنیاء سے زکوۃ کا مال وصول کرو اور مسلمانوں کے فقراء پر تقسیم کرو، زکوۃ اور صدقۂ فطر اور نذر اور کفارات کے ماسواء تمام صدقات نافلہ ذمی یعنی کافر کو دیئے جا سکتے ہیں۔

اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمام دینوں والوں کو صدقہ دو، اگر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ والی حدیث اس کے معارض نہ ہوتی تو اس حدیث کی رو سے ہم ذمی کو زکوٰۃ دینے کا حکم بھی ثابت کر سکتے تھے، لیکن حدیث معاذ کے

معارض ہونے کی وجہ سے صدقات واجبہ کا حکم علیحدہ ہو گیا۔

یہاں سے ہی بہت صراحۃ واضح ہو گیا کہ صدقات واجبہ اور صدقات نفلیہ کا حکم علیحدہ علیحدہ ہے۔ ابن ابی حاتم کی روایت کا تعلق بھی صدقات واجبہ سے ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنھما سے مروی ہے کہ

"ان النبی ﷺ کان یأمرنا ان لانتصدق الاعلی اهل الاسلام" (روح المعانی)

بیشک نبی کریم ﷺ ہمیں حکم فرماتے تھے کہ ہم صدقہ صرف اہل اسلام کو دیں، یعنی صدقات واجبہ صرف مسلمانوں کو دیئے جاسکتے ہیں۔

اور یہی مطلب ہے جو روایت ابن ابی شیبہ نے سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔

"قال رسول الله ﷺ لاتصدقوا الاعلی اهل دینکم"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سوائے اپنے دین والوں کے کسی اور پر صدقہ نہ کریں۔

خیال رہے دونوں روایتیں روح المعانی سے لی گئی ہیں لیکن علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے زیر بحث آیۃ کریمہ کو ان دونوں احادیث کے اطلاق کو منسوخ مانا ہے، لیکن راقم کے نزدیک ان دونوں روایات کا تعلق صدقات واجبہ سے ہے، اس طرح منسوخیت کے قول کی ضرورت درپیش نہیں آئے گی۔

تنبیہ: ذمی سے مراد وہ کافر ہیں جو دار اسلام میں مسلمانوں کے حاکم کی اجازت سے رہتے ہوں اور جزیہ ادا کرتے ہوں۔ ہر کافر ذمی نہیں ہیں۔ راقم کے خیال میں آجکل کوئی ذمی نہیں کیونکہ کوئی جزیہ ادا نہیں کرتا، اور نہ ہی ان کو کافر سمجھ کران پر وہ احکام شریعہ نافذ کیے جاتے ہیں جو ذمیوں پر جاری ہونے چاہیں، اس لئے راقم آجکل مسلمانوں کے ممالک میں رہنے والے یہود ونصاری، ہنود وغیرہ کو صدقات نافلہ دینے کا بھی قائل نہیں۔

صدقات واجبہ غنی کو دینا منع ہے:

"ولا تدفع الی غنی لقوله علیه السلام لاتحل الصدقة لغنی" (هدایة اولین ص۱۸۶)

غنی کو زکوۃ نہ دی جائے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا غنی کیلئے صدقہ (واجبہ) حلال نہیں۔

زوجہ کو صدقات واجبہ دینا جائز نہیں:

"ولا الی امرأته للاشتراک فی النفع عادة ولاتدفع المرأة الی زوجها عند ابی حنیفة لما ذکرنا وقالا تدفع الیه لقوله علیه السلام لک اجران اجر الصدقة واجر الصلة قاله لأمرأة ابن مسعود وقد سألته عن التصدق علیه قلنا هو محمول علی النافلة"

(هدایة اولین ص ۱۲۶)

خاوند اپنی زوجہ کو زکوۃ نہیں دے سکتا کیونکہ زوجین کے منافع مشترک ہیں، زوجہ اپنے خاوند کو بھی زکوۃ نہیں دے سکتی، وجہ اس کی بھی یہی ہے کہ منافع دونوں کے مشترک ہیں، یہ امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک ہے۔ البتہ صاحبین (حضرت امام ابو یوسف اور حضرت امام محمد رحمہما اللہ) کے نزدیک زوجہ اپنے خاوند کو زکوۃ دے سکتی ہے، کیونکہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زوجہ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ میں اپنے خاوند کو صدقہ دے سکتی ہوں؟

تو آپ نے فرمایا تمہیں دو اجر حاصل ہوں گے ایک صدقہ کا اور دوسرا صلہ رحمی کا۔

امام اعظم رحمہ اللہ نے اس حدیث پاک کی وضاحت میں یہ ارشاد فرمایا کہ اس صدقہ سے مراد نفلی صدقہ ہے، اس بحث سے یہ واضح ہوا کہ نفلی صدقہ خاوند اپنی زوجہ کو اور زوجہ اپنے خاوند کو دے سکتے ہیں، لیکن وجوبی صدقہ ایک دوسرے کو نہیں دے سکتے۔

واضح ہوا کہ نفلی صدقہ اور وجوبی صدقہ کا حکم علیحدہ علیحدہ ہے، وجوبی صدقہ کے ممانعت والے اقوال سے نفلی صدقہ کی ممانعت ثابت کرنا درست نہیں۔

رشتہ داروں پر صدقہ افضل ہے:

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مسند احمد میں روایت ذکر کی گئی:

"قال علیه السلام افضل الصدقة علی ذی الرحم الکاشح" (بحوالہ ھدایة اخیرین ص ۲۵۸)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا عداوت رکھنے والے ذی رحم (قریبی رشتہ دار) پر صدقہ کرنا افضل ہے۔

وانما جعل هذاالتصدق افضل لان التصدق على المحب الصديق يميل اليه النفس لمحبته وصداقته وفي القريب الكاشح المنظور اليه هو معنى القرابة لا غير مع مخالفة نفسه لان نفسه لاتدعو الى التصدق (كفاية)

عداوت رکھنے والے رشتہ دار کو صدقہ دینا افضل اس لئے قرار دیا ہے کہ محبّ، صدیق کی طرف تو اس کی محبت اور صداقت کے پیش نظر انسان کا نفس خود ہی مائل ہوتا ہے کہ اس کو صدقہ دیا جائے، لیکن عداوت رکھنے والے رشتہ دار کی طرف انسان کا نفس تو میلان نہیں کرتا اور صدقہ بھی نہیں دینا چاہتا، لیکن وہ رشتہ داری کی وجہ سے جب صدقہ دے گا تو یہ اس کیلئے افضل ہوگا،

"وعن سليمان بن عامر قال قال رسول الله ﷺ الصدقة على المسكين صدقة وهي على ذي رحم ثنتان صدقة وصلة"

(رواه احمد والترمذي والنسائي وابن ماجة مشكوة باب افضل الصدقة)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا مسکین کو صدقہ دینا صرف صدقہ ہی ہے، اور ذی رحم محرم (رشتہ دار) کو صدقہ دینے میں دو چیزیں حاصل ہیں، صدقہ اور صلہ رحمی۔

یعنی عام فقراء اور غرباء کو صدقہ دینے میں ایک ثواب ہے اور رشتہ داروں کو صدقہ دینے میں دو ثواب حاصل ہوتے ہیں۔

فوائد: ابھی تک جو بحث کی گئی ہے اس سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

☆ میت کے گھر والوں کے پڑوسی اگر کھانا پکا کر ان کو اور ان کے مہمانوں کو کھلائیں تو انہیں دو ثواب حاصل ہوں گے ایک صدقہ کا اور دوسرا پڑوسیوں کے حقوق ادا کرنے کا۔

☆ اگر اہل میت کے رشتہ دار انہیں اور ان کے مہمانوں اور غرباء فقراء کو صدقہ کی نیت سے کھانا کھلائیں گے تو انہیں دو ثواب حاصل ہوں گے ایک صدقہ کا اور دوسرا رشتہ داروں سے اچھا سلوک کرنے یعنی صلہ رحمی کا۔

☆ میت کے گھر والے "صدقہ" کی نیت سے کھانا پکا کر کھلائیں ثواب حاصل ہوگا، اس میں ان کے رشتہ دار اور

غرباء، فقراء سب شریک ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ نفلی صدقہ ہے۔

☆ میت کے گھر والے صدقہ کی نیت سے تو کھانا نہ پکائیں، البتہ ہبہ کی نیت سے کھانا کھلائیں باہر سے آئے ہوئے مہمانوں کی مجبوری کو دیکھ کر کھانا کھلائیں کہ یہ اب واپس تو نہیں جا سکتے، اتنے وقت سے بھوکے ہیں تو ایسی صورت میں کھانا کھلانا مباح ہے بلکہ صلہ رحمی کی وجہ سے مستحب کہنا بھی کوئی بعید نہیں۔

☆ وفات کے بعد کھانا کھلانا نفلی صدقہ ہوتا ہے اس میں اہل خانہ خود، اغنیاء اور فقراء غرباء سب شریک ہو سکتے ہیں اغنیاء کے کھانے سے ثواب ضائع نہیں ہوجاتا بلکہ رشتہ داری کی وجہ سے صلہ رحمی کا ثواب ہی حاصل ہوگا۔

☆ میت کے گھر والے ریاء کاری، نام پیدا کرنے اور شہرت حاصل کرنے کیلئے بطور ضیافت کھانا کھلائیں تو یہ منع ہے۔

☆ مباح یا مستحب کو حرام کہنا جرم عظیم ہے اور ظلم عظیم ہے، اللہ تعالیٰ ایسے جہلاء سے بچائے۔

میت کیلئے پہلے دن صدقہ میں اہل سنت وجماعت کا عقیدہ:

قرآن پاک پڑھ کر میت کو ثواب پہنچانا، صدقہ وخیرات کر کے ایصال ثواب، فقراء کو کھانا کھلانا مستحب ہے، اور فقراء کیلئے پکائے ہوئے کھانے میں اہل خانہ اور ان کے اقرباء اور اغنیاء بھی شریک ہو سکتے ہیں۔ اہل میت کے پاس آئے ہوئے رشتہ داروں کیلئے میت والوں کا کھانا پکانا اور کھلانا مباح ہے۔ مستحب کو حرام کہنا، یا مباح کو حرام کہنا جرم عظیم ہے اور ظلم عظیم ہے۔ البتہ نمائشی طور پر، ریاء کاری کی غرض سے کھانا پکانا، یا قرض لے کر وسعت سے زائد کھانا پکانے پر خرچ کرنا منع ہے۔

میت کے ورثاء یتامیٰ (چھوٹے نابالغ یتیم بچے) ہوں تو ان کا حصہ علیحدہ کرنے سے پہلے ہی میت کے مال سے ان کے دوسرے رشتہ دار کھانے وغیرہ پر خرچ کریں اور یتامیٰ کا مال بھی اس میں خرچ کردیں اور ان کو ان کا مکمل حصہ نہ دیا جائے تو ایسی صورت میں کھانے وغیرہ پر خرچ کرنا حرام ہوگا۔ پڑوسی یا میت والوں کو رشتہ دار کھانا پکائیں میت والوں کو کھلائیں ان کے آئے ہوئے مہمانوں کو بھی کھلائیں تو یہ زیادہ بہتر ہے۔

قرآن پاک پڑھنے والے فی سبیل اللہ تلاوت کریں اور میت والے فی سبیل اللہ کھانا کھلادیں تو یہ دونوں

امر (تلاوت، کھانا) مستحب ہوں گے۔ ایصال ثواب کی بحث سورۃ بقرۃ کے پہلے رکوع میں دیکھیں۔

اصل اشیاء میں اباحت ھے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"الحلال ما احل الله فی کتابه والحرام ماحرم الله فی کتابه وماسکت عنه فهو مما عفاعنکم" (ابن ماجة، ترمذی، مشکوة کتاب الأطعمة ص ۳۶۷)

اللہ کی کتاب (قرآن پاک) میں جس چیز کو حلال کیا گیا ہے وہ حلال ہے اور جسے حرام کیا گیا ہے وہ حرام ہے اور جس سے سکوت اختیار کیا گیا ہے وہ تمہیں معاف ہے۔

یعنی حلال و حرام ہونے کیلئے قرآن و حدیث اور اجماع امت سے حرمت کو ثابت کرنا ضروری ہے۔

"ان الاباحة اصل فی الاشیاء ثم بعث نبینا علیه السلام فبین الاشیاء المحرمة بقی ماسواها حلالا مباحا" (نور الانوار مع قمر الاقمار)

بے شک اصل اشیاء میں اباحت ہے (ہر چیز پر عمل کرنا جائز ہے) ہمارے نبی کریم ﷺ مبعوث ہوئے تو آپ نے حرام چیزوں کو بیان فرما دیا، جن کی حرمت بیان نہیں فرمائی وہ حلال و مباح ہیں۔

مستحب کیا ہے:

"مستحبه ویسمی مندوبا وأدبا وفضیلة ونفلاً وتطوعا، وهو ما فعله النبی ﷺ مرة وترکه أخری، وما أحبه السلف" (درمختار)

مستحب، مندوب، ادب، فضیلت، نفل اور تطوع ایک ہی چیز کے نام ہیں، مستحب وہ ہے کہ جس کو نبی کریم ﷺ نے کبھی کیا ہو اور کبھی چھوڑا ہو یا سلف صالحین (بزرگان دین) نے اسے محبوب سمجھا ہو۔

تنبیه: "وما احبه السلف" میں واؤ بمعنی "او" کے ہے۔ بعض فقہاء کرام نے لفظ "او" ہی استعمال کیا ہے۔ جہلاء جو صرف "واؤ" کا معنی اور "او" کا معنی "یا" یاد کر کے علم کے دعویدار ہیں وہ عربی گرامر پڑھیں۔ جہل مرکب کے مرتکب نہ بنیں۔

علامہ شامی مزید لکھتے ہیں:

"وان لهم یفعله بعد مارغب فیه" نبی کریم ﷺ نے ایک کام پسند فرمایا ہو اور اسے خود نہ کیا ہو وہ بھی مستحب ہے۔

بلکہ یہ تعریف زیادہ بہتر ہے کیونکہ علامہ شامی فرماتے ہیں

"وقد یطلق علیه اسم السنة وصرح القهستانی بأنه دون سنن الزوائد"

بسا اوقات اسی (مستحب) پر سنت کا اطلاق بھی کیا جاتا ہے، اور علامہ قہستانی رحمہ اللہ نے صراحت فرمائی ہے کہ مستحب سنت غیر مؤکدہ سے کم درجہ ہے، کیونکہ سنت غیر مؤکدہ نبی کریم ﷺ کے افعال کو کہا جائے گا۔

جو کام آپ نے کبھی کبھی کیے ہوں زیادہ مرتبہ چھوڑے ہوں وہ سنت غیر مؤکدہ ہیں، اسی طرح جو کام نبی کریم ﷺ نے عادت کے طور پر کیے عبادت کے طور پر نہیں جیسے لباس وغیرہ، کھانے کا طریقہ یہ بھی سنت غیر مؤکدہ ہیں۔ مستحب تو وہ بھی ہے جسے سنت غیر مؤکدہ کہا جاتا ہے، مستحب تو وہ بھی ہے جو کام نبی کریم ﷺ نے کیا تو نہیں لیکن پسند فرمایا ہو، اور مستحب وہ بھی جو کام سلف صالحین نے کیا ہو۔

مستحب کا حکم: "وحکمه الثواب علی الفعل وعدم اللوم علی الترک" (شامی ج ۱ ص ۹۱)

مستحب کا حکم یہ ہے کہ اس پر عمل کرنے سے ثواب حاصل ہوتا ہے اور چھوڑنے پر کسی قسم کی کوئی ملامت نہیں کی جائے گی۔

مباح کا حکم: "والمباح غیر مطلوب الفعل وانما هو مخیر فیه" (شامی ج ۱ ص ۷۸)

مباح پر عمل کرنا نہیں پایا جاتا، بلکہ انسان کو اس کے کرنے یا نہ کرنے کا اختیار ہوتا ہے، اس کے کرنے یا نہ کرنے پر نہ ثواب ہوتا ہے اور نہ گناہ، جیسے لباس، کھانا وغیرہ۔ انسان اپنی مرضی جیسا لباس پہنے یا جیسا کھانا کھائے وہ مباح ہے، بشرطیکہ شریعت میں جائز ہو۔

حرام کا حکم:

"وهو مالا یحتمل زیادة ولا نقصانا ثبت بدلیل لاشبهة فیه ویعاقب بفعله ویکفر بجاحد" (ماحصل من نور الانوار ۱۲۵)

حرام یہ ہے کہ جس میں زیادتی اور نقصان کا احتمال نہ پایا جائے دلیل قطعی سے ثابت ہو، اس پر عمل کرنے سے گناہ ہو۔ اور حرام کی حرمت کے انکار سے کفر لازم آئے گا۔

حلال کو حرام سمجھنا:

"ان تحریم الحلال علی وجھین،الاول اعتقاد ثبوت حکم التحریم فیه وھو کا عتقاد ثبوت حکم التحلیل فی الحرام مخظور یوجب الکفر،والثانی الامتناع من الحلال مطلقا اومؤکدا بالیمین مع حله وھذا مباح صرف وحلال محض"

(روح المعانی جلد ۱۴ ص ۱۴۸)

حلال کو حرام بنانے کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم یہ ہے کہ حلال چیز کے متعلق حرام ہونے کا عقیدہ رکھا جائے، یہ ایسے ہی ہے جیسے حرام چیز کو حلال سمجھا جائے یہ مطلقا منع ہے اور باعث کفر ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ حلال سے رک جانا، حلال کو استعمال نہ کرنا یا قسم اٹھا کر اپنے آپ پر حرام کر لینا یہ مباح ہے، بشرطیکہ وہ حلال چیز پر عمل کرنا باعث عبادت نہ ہو،

مکروہ تنزیہی بھی بغیر دلیل کے ثابت نہیں ہوسکتا:

"لایلزم من ترک المستحب ثبوت الکراھة اذالابدلھا من دلیل خاص"

(شامی جلد ا ص ۶۱۸)

صرف مستحب کے ترک سے کراہت ثابت نہیں ہوسکتی بلکہ مکروہ ثابت کرنے کیلئے خاص دلیل کی ضرورت ہے۔

خیال رہے کہ اس مکروہ سے مراد ''تنزیہی'' ہے نہ کہ ''مکروہ تحریمی'' علامہ شامی رحمہ اللہ نے اس پر صراحت کی ہے۔

مقام توجہ: جب مکروہ تنزیہی ثابت کرنے کیلئے بھی خاص دلیل کی ضرورت ہے، صرف زبانی دعوی کافی نہیں تو حرام بغیر دلیل کے کیسے ثابت ہوسکتا ہے؟ اور حلال کو حرام سمجھنے کا عقیدہ رکھنا جب منع ہے اور باعث کفر بھی ہے تو حلال کو حرام کہنے والے کون سے دین کی خدمت کر رہے ہیں؟

وہ تو حقیقت میں دین اسلام کا حلیہ بگاڑ کر خود بھی گمراہ ہو رہے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کر رہے ہیں، اللہ

تعالیٰ ایسے سیاہ دل جن پر ضلالت کا زنگ لگا ہوا ہے سے بچائے، آمین ثم آمین۔

نبی کریم ﷺ کی کھانے میں شرکت:

''عن عاصم بن کلیب عن ابیه عن رجل من الانصار قال خرجنا مع رسول الله ﷺ وهو على القبر يوصى الحاضر فول اوسع من قبل رجليه اوسع من قبل رأسه فلما رجع استقبله داعى امرأته فأجاب ونحن معه فجنى بالطعام فوضع يده ثم وضع القوم فأكلوا فنظرنا الى رسول الله ﷺ يلوك لقمة فى فيه ثم قال ''اجدلحم شاة اخذت بغير اذن اهلها''فارسلت المرأة تقول يا رسول الله ﷺ انى ارسلت الى النقيع وهو موضع يباع فيه الغنم يشترى لى شاة فلم توجد فارسلت الى جارلى قد اشترى شاة ان يرسل بها الى بثمنها فلم يوجد ارسلت الى امرأته فارسلت الى بها فقال رسول الله ﷺ اطعمى هذاالطعام الاسارى''

(رواه ابوداود،والبيهقى فى دلائل النبوة مشكوة باب المعجزات)

عاصم بن کلیب ایک انصاری صحابی سے روایت کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک جنازہ میں نکلے (یعنی گھر سے نکل کر ایک جنازہ میں شریک ہوئے) میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ قبر کھودنے والے کو نصیحت کر رہے ہیں کہ قبر کو پاؤں کی جانب سے وسیع کرو (پھر فرمایا) سر کی جانب سے وسیع کرو،

جب آپ (جنازہ سے فارغ ہو کر) واپس لوٹے تو آپ کو اس میت کی عورت کی جانب سے ایک شخص کھانے کی دعوت دینے کیلئے ملا آپ نے اس کی دعوت کو قبول کیا (راوی کہتے ہیں) ہم بھی آپ کے ساتھ چلے طعام لایا گیا، آپ نے ہاتھ کھانے پر رکھا پھر قوم نے اپنے ہاتھ کھانے پر رکھے، سب نے کھانا تناول کرنا شروع کیا، ہم نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ لقمہ کو اپنے منہ میں ہی گھما رہے ہیں (نگل نہیں رہے) پھر آپ نے فرمایا مجھے اس بکری کے گوشت سے یہ معلوم ہو رہا

ہے کہ یہ مالک کی اجازت کے بغیر لے گئی ہے، (اس عورت کو جب آپ کے اس ارشاد کے متعلق پتہ چلا) تو اس نے پیغام بھیجا کہ یا رسول اللہ ﷺ میں نے نقیع کی طرف ایک آدمی کو بھیجا تھا کہ وہاں سے بکری خرید لائے نقیع بکریوں کے بیچنے، خریدنے کی منڈی تھی وہاں بکری مل نہیں سکی، پھر میں نے اپنے پڑوسی کے گھر پیغام بھیجا کہ مجھے قیمۃً بکری خرید دو وہ گھر میں نہیں تھے پھر میں نے اپنے پڑوسی کی عورت کی طرف پیغام بھیجا تو اس نے بکری میری طرف بھیج دی (یعنی وہ بکری مالک کی اجازت کے بغیر اس کی زوجہ نے دے دی تھی) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ طعام قیدیوں کو کھلا دو۔

حدیث پاک سے حاصل ہونے والے فوائد:

(۱) دفن سے فارغ ہونے کے بعد صحابیہ نے کھانے کی دعوت دی جو خصوصی طور پر اسی میت کے ایصال ثواب کیلئے ہی وہ کھانا تیار کرایا گیا تھا۔

(۲) حضور ﷺ نے اس کی دعوت کو قبول فرما کر جواز کا واضح طور پر ثبوت پیش کر دیا اگر میت کے گھر سے کھانا جائز نہ ہوتا تو آپ دعوت کو رد کر دیتے۔

(۳) جنازہ میں شریک ہونے والے تمام صحابہ کرام کھانے کی دعوت میں شریک ہوئے صحابہ کرام کے اعمال تو ہمارے لئے ضابطۂ حیات ہیں۔

(۴) کھانے میں بکری کا گوشت پیش کیا گیا صرف عام ادام یعنی سرکہ یا گھی یا دال وغیرہ پر اکتفاء نہیں کیا گیا۔

(۵) نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے علم غیب عطاء کیا ہے کسی صحابی کو معلوم نہ ہو سکا کہ یہ بکری مالک کی اجازت کے بغیر خریدی گئی لیکن نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے غیبی امر پر مطلع فرمایا۔

(۶) خاوند کی اجازت کے بغیر خاوند کے مال میں زوجہ تصرف نہیں کر سکتی اگر خاوند کی طرف سے عام اجازت ہو کہ میں گھر ہوں یا نہ ہوں تمہیں میرا مال خرچ کرنے کی عام اجازت ہے تو عورت مال میں تصرف کر سکے گی لیکن پھر بھی واضح طور پر اجازت لینا ہی بہتر ہے عام عرف کے مطابق فقیر کی معمولی معاونت روٹی وغیرہ سے کرنی جائز ہے۔

(۷) کسی کا مال اس کی اجازت کے بغیر اگر لے لیا گیا تو اس کا استعمال کرنا جائز نہیں۔

(۸) قیدیوں کو کھانا کھلانے کا حکم حضور ﷺ نے اس لئے دیا تھا کہ اس وقت قیدی کفار اور غریب تھے ان کیلئے وہ کھانا تناول کرنا جائز تھا اسی لئے آپ نے ان کو کھانا کھلانے کے متعلق ارشاد فرمایا۔

(۹) نبی کریم ﷺ شفیق و رحیم تھے کہ اپنی امت کے لوگوں کے جنازہ میں شرکت فرماتے تھے

(۱۰) کوئی شخص صاحب علم ہو قبر کے متعلق مہارت رکھتا ہو تو اسے چاہئے کہ اگر قبر میں کوئی خامی ہو تو وہ مطلع کرے تا کہ اسے صحیح کر لیا جائے۔

تنبیہ : نبی کریم ﷺ کا کھانا تناول نہ کرنا اس وجہ سے نہیں تھا کہ یہ میت کے دفن ہونے کے بعد اسی دن پکا لیا گیا ہے بلکہ وہ بکری مالک کی اجازت کے بغیر ہی پکا لی گئی تھی اسی لئے آپ نے وہ کھانا تناول نہیں فرمایا آپ کا دعوت کو قبول کرنا اور یہ نہ فرمانا کہ یہ کھانا میت کے گھر کیوں پکایا گیا ہے یہ نا جائز ہے بس یہی اس کے جواز پر دلیل ہے کیونکہ آپ کا نہ روکنا حدیث تقریری ہے

جنازہ میں شریک ہونے والے تمام صحابہ کرام کی کھانے میں شرکت اور نبی کریم ﷺ کے منع نہ کرنے سے بھی یہ واضح ہو گیا کہ کھانے میں تمام حضرات کی شرکت جائز ہے حسب طاقت کھانے میں گوشت وغیرہ کا اہتمام بھی جائز ہے

"قال الاحمد بن حنبل رحمه الله فی کتاب الزهد حدثنا هاشم بن القاسم قال ثنا الاشجعی عن سفیان قال قال طاؤس ان الموتی یفتنون فی قبورهم سبعا فکا نوا یستحبون ان یطعمو اعنهم تلک الایام" (الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۱۷۸)

حضرت طاؤس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بے شک فوت شدہ حضرات اپنی قبروں میں سات دن تک آزمائش میں مبتلاء ہوتے ہیں اسی لیے اہل علم نے ان دنوں میں ان کی طرف سے ایصال ثواب کیلئے کھانا کھلانا مستحب سمجھا ہے۔

فتنة الموتی فی قبورهم سبعة ایاماوردها غیر واحد من الائمة فی کتبهم فاخرجها الامام احمد بن حنبل فی کتاب الزهد و الحافظ ابونعیم الاصبهانی فی کتاب الحلیة

بـالا سـنـاد الی طاؤس احد ائمة التابعین واخرجها بن جریج فی مصنفه بالاسناد الی عبیـد بـن عـمیر وهوا کبرمن طاؤس فی التابعین بل قیل انه صحابی وعزاها الحافظ زیـن الدین بن رجب فی کتاب احوال القبور الی مجاهد وعبید بن عمیر فحکم هذه الروایات الثلاث حکم المراسیل المرفوعة" (الحاوی للفتاوی ج۲ص ۱۷۸)

فوت شدہ انسانوں کا قبر میں سات دنوں تک آزمائش میں مبتلاء ہونا کئی ائمہ کرام نے اپنی کتب میں ذکر کیا ہے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''کتاب الزھد'' میں ذکر کیا ہے (جو روایت اوپر ذکر کی جاچکی ہے) اور حافظ ابونعیم اصبہانی نے ''کتاب الحلیۃ'' میں ذکر کیا ہے ان دونوں حضرات نے تابعین میں سے ایک امام طاؤس سے یہ روایت ذکر کی ہے۔

حضرت ابن جریج نے اپنی تصنیف میں عبید بن عمیر سے یہی روایت ذکر کی ہے جو تابعین میں سے ہیں اور طاؤس سے بڑے ہیں بعض حضرات نے عبید بن عمیر کو صحابی کہا ہے

حافظ زین الدین رجب رحمہ اللہ نے اپنی کتاب احوال القبور میں یہ روایت مجاہد اور عبید بن عمیر سے ذکر کی ہے یہ تینوں روایتیں مرسل ہیں لیکن مرفوع حدیث کے درجہ میں ہیں۔حضرت امام سیوطی رحمہ اللہ ان روایات کے متعلق فرماتے ہیں"هذاله حکم المرفوع اذیستحیل ان یکون مثله رأیا " (الحاوی للفتاوی ج۲ص۱۸۱)

اس روایت کو مرفوع کا حکم حاصل ہے کیونکہ رائے سے ایسا کہنا محال ہے

"ان سـنـة الطعام سبعة ایام بلغنی انها مستمرة الی الأن بمکةوالمدینة فالظاهر انهالم تترک من عهد الصحابة الی الأن وانهم اخذوها خلفا عن سلف الی الصدرالاول "

(الحاوی للفتاوی ج۲ص ۱۹۴)

سات دنوں تک کھانا کھلانے کے متعلق مجھے خبر ملی ہے کہ یہ طریقہ مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ میں آج تک جاری ہے (علامہ سیوطی رحمہ اللہ کی وفات ۹۱۱ھ میں ہے) ظاہر بات یہ ہے کہ صحابہ کرام کے زمانہ سے لے کر آج تک اس پر عمل نہیں چھوڑا گیا سلف صالحین سے یہ طریقہ آرہا ہے مزید

صراحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں

ورأیت فی التواریخ کثیرا فی تراجم الائمة یقولون "واقام الناس علی قبره سبعة ایام یقرء ون القرآن" (الحاوی للفتاوی ج۲ ص ۱۹۲)

علامہ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے تواریخ میں کثیر ائمہ کرام کے حالات زندگی میں یہ دیکھا ہے وہ فرماتے ہیں لوگ میت کی قبر پر سات دن تک قائم رہ کر قرآن پاک پڑھتے تھے۔

اس بحث سے واضح ہو کہ میت کے ایصال ثواب کیلئے کھانا کھلانے کا دستور صحابہ کرام اور تابعین کے زمانہ سے آرہا ہے سلف صالحین اور ائمة کرام اس پر عمل کرتے رہے لھذا اس فعل کے مستحب ہونے میں کوئی شک نہیں رہا۔

پڑوسی اور دور کے رشتہ دار میت کے گھر کھانا بھیجیں تو بہتر ہے:

ویستحب لجیران اهل المیت والاقرباء الاباعد تهیئةطعام لهم یشبعهم یومهم ولیلتهم لقوله ﷺ اصنعوا لآ ل جعفر طعام فقد جاء هم ماشغلهم حسنه الترمذی وصححه الحاکم ولأنه برومعروف ویلح علیهم الأکل لان الحزن یمنعهم من ذلک فیضعفون" (شامی ج ۱ ص ۲۶۴)

میت کے گھر والوں کے پڑوسیوں اور دور کے رشتہ داروں (جو بہت قریبی ہونے کی وجہ سے غمزدہ نہ ہوں) کو چاہئے کہ میت کے گھر والوں کیلئے کھانا تیار کریں ان کو رات دن سیر ہو کر کھانا کھلائیں۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ آل جعفر کیلئے کھانا تیار کرو کیونکہ وہ (جعفر کی شہادت کی وجہ سے) مصیبت میں مبتلا ہو چکے ہیں اس حدیث کو ترمذی نے حسن اور حاکم نے صحیح کہا ہے۔

میت کے گھر والوں کو کھانا کھلانا نیکی اور بھلائی کا کام ہے، بلکہ ان کو ان کے پڑوسی اور دور کے رشتہ دار کھانا کھلانے میں کوشش کریں، کیونکہ وہ غمزدہ ہیں، غم ان کو کھانے سے دور رکھے ہوئے ہے، اس طرح ان کے کمزور ہو جانے کا خطرہ ہے۔

فائدہ: غرباء اور فقراء کیلئے کھانا پکایا جائے اور اغنیاء بھی شریک ہوں تو کوئی حرج نہیں۔

"قد یقصد بالصدقة علی الغنی الثواب وقد حصل" (ھدایۃ اخیرین ص ۲۹۳،فصل فی الصدقة)

کبھی غنی کو صدقہ ادا کرنے میں ثواب کا ارادہ کیا جاتا ہے، وہ حاصل بھی ہو جاتا ہے، لھذا واضح ہوا کہ غنی کا کھانے میں شریک ہونا منع نہیں، کیونکہ یہ صدقات نافلہ ہیں۔

"فان من له نصاب وله عیال کثیرة فالناس یتصدقو ن علیه علی قصد الثو اب" (حاشیه هدایة)

بے شک وہ شخص جو صاحب نصاب (غنی) ہوتا ہے لیکن اس کے اہل وعیال کثیر ہوتے ہیں اس لئے لوگ اس پر ثواب کی غرض سے صدقہ کرتے ہیں۔

یعنی غنی عیال دار، کثیر اولاد والے شخص کو صدقات نفلیہ دینا جائز ہے بلکہ باعث ثواب ہے، کیونکہ صاحب نصاب ہونے کے باوجود وہ اپنی اہل وعیال کا جائز خرچ پورا کرنے سے عاجز ہے۔

وجہ اختلاف کیا ہے؟

اصل میں دو قسم کے لوگ ہیں، ایک وہ جو میت کے لئے صدقہ وخیرات اور دعاء کو جائز سمجھتے ہیں۔

دوسرے وہ حضرات ہیں جو یہ کہتے ہیں صدقات، خیرات یہ سب رسوم ہیں، ان کا کوئی فائدہ نہیں۔ ایک دفعہ نماز جنازہ میں دعاء ہوگئی تو کافی ہے، بار بار دعاء کرنے کا کیا مقصد۔

جائز ماننے والوں کا مقام عجز:

دراصل بات یہ ہے کہ کچھ حضرات یہ کہتے ہیں رب تعالی دعاء قبول کرتا ہے، دعاء کرنے کو پسند کرتا ہے، اور دعاء نہ کرنے کو ناپسند کرتا ہے، اس لئے اس سے زیادہ سے زیادہ مانگو، ہاتھ اٹھا کر اس طرح مانگو کہ پتہ چلے مانگنے والا اپنے عجز کا اظہار کر رہا ہے، اور رب تعالی سے ہاتھ پھیلا کر مانگتے ہوئے یہ اقرار کر رہا ہے اے اللہ ہر چیز کا تو ہی مالک ہے میں تو سائل ہوں، تیری رحمت کا امیدوار ہوں، تجھی سے مانگتا ہوں۔

جواز کا قول کرنے والے حضرات اپنا موقف ثابت کرنے کیلئے یہ دلائل پیش کرتے ہیں۔

"عن سلیمان قال قال رسول الله ﷺ از ربکم حیی کریم یستحی من عبده اذا رفع

یدیه الیه ان یردھما صفر " (ترمذی،ابوداؤد،بیہقی،مشکوۃ کتاب الدعوات)

حضرت سلیمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک تمہارا رب حیاء والا ہے (وہ حیاء جو اس کی شان کے لائق ہے) کریم ہے، اللہ کا بندہ جب اس کی طرف ہاتھ اٹھاتا ہے اللہ تعالی اپنے بندے سے حیاء فرماتا ہے، کہ اس کے ہاتھوں کو خالی لوٹادے۔

"حکمة الرفع الی السماء انها قبلته ومهبط الرزق والوحی والرحمة والبرکة" (مرقاۃ)

ہاتھ اٹھانے میں یہ حکمت ہے کہ آسمان دعاء کا قبلہ ہے، جس طرح نماز کا قبلہ کعبہ شریف ہے نماز میں اس کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے، اسی طرح دعاء کرتے وقت دعاء کے قبلہ یعنی آسمانوں کی طرف ہاتھ اٹھائے، آسمان رزق، وحی، رحمت اور برکت کے نزول کا مقام ہے، اس لئے دعاء ہاتھ اٹھا کر کی جائے۔

"عن ابن مسعود قال قال رسول الله ﷺ سلوا الله من فضله فان الله يحب ان يسئل وافضل العبادة انتظار الفرج" (ترمذی،مشکوۃ کتاب ادعوات)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالی سے اس کے فضل کا سوال کرو بیشک اللہ تعالی فرماتا ہے کہ اس سے سوال کیا جائے افضل عبادت کشادگی کا انتظار ہے۔ (یعنی دعاء سے کشادگی حاصل ہوتی ہے)

"(فان الله)ای لاتصافه بانه کریم منعم وهاب معط غنی مغن باسط " (مرقاۃ)

اللہ تعالی کو کیوں پسند ہے کہ اس سے سوال کیا جائے اس لئے کہ وہ کریم ہے، انعام عطاء کرنے والا ہے، بخشش کرنے والا ہے، عطاء کرنے والا ہے غنی ہے، غنی کرنے والا ہے، کشادہ رزق کا مالک ہے۔

"عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ من فتح له منکم باب الدعاء فتحت له ابواب الرحمة" (ترمذی مشکوۃ کتاب الدعوات)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے جس کیلئے دعاء کا دروازہ کھولا گیا ہے اس کیلئے رحمت کا دروازہ کھولا گیا ہے۔

(باب لدعاء)ای بان وفق لان یدعو الله کثیرا مع وجود شرائطه وآدابه" (مرقاۃ)

جس کیلئے دعاء کے دروازے کھولے جائیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس انسان کو توفیق عطاء فرماتا ہے کہ وہ دعاء کی شرائط اور آداب کو مدنظر رکھ کر دعاء کرے۔

دعاء کے آداب یہ ہیں کہ خشوع وخضوع سے دعاء کی جائے۔ اور دعاء کی شرائط یہ ہیں کہ ہاتھ اٹھا کر دعاء کی جائے۔

"عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ اذا صلیتم فاخلصوا له الدعاء" (مشکوۃ کتاب الجنائز)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میت کی نماز جنازہ پڑھ لو تو بعد میں جلدی ہی اس کیلئے دعاء کرو،

"قال ابن حضر و صححه ابن حبان" اس حدیث کے متعلق ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "اس حدیث کو ابن حبان رحمہ اللہ نے صحیح قرار دیا ہے"

"عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ من لم یسأ ل الله یغضب علیه"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اللہ سے سوال نہیں کرتا اللہ اس پر ناراض ہوتا ہے،

"لان ترک الصلوۃ تکبر واستغناء وهذا لا یجوز لعبد والمراد بالغضب ارادة ایصال العقوبة" (مرقاۃ)

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ سے سوال نہ کرنا علامت تکبر ہے اور رب تعالیٰ سے مستغنی ہونا ہے، یہ بندے کیلئے جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ سے اپنے آپ کو بے پرواہ سمجھے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے غضب یعنی اس کے عذاب کا سبب ہے۔

یہ ہے عقیدہ ان لوگوں کا جو صدقات وخیرات اور دعاء اور قرآن پاک پڑھ کر میت کو ثوب پہنچانا جائز سمجھتے ہیں۔

ناجائز کہنے والوں کی خدا سے بے پرواہی:

جو لوگ ناجائز سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں ایک مرتبہ دعاء ہوگئی اب بار بار دعاء کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ان کے نزدیک رب تعالیٰ سے زیادہ مانگنا اچھا نہیں۔

بس یہ ہے اختلاف اپنے آپ کو رب تعالیٰ کے حضور عاجز سمجھنے والے دعاء کرتے ہیں اور اپنے آپ کو مستغنی (بے پرواہ) سمجھنے والے دعاء نہیں کرتے۔

معاملہ قسمت کا: جن لوگوں کی قسمت میں دعاء، قرآن خوانی اور صدقہ وخیرات کا ثواب لکھا ہوتا ہے انہیں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے یہ توفیق عطاء فرماتا ہے کہ وہ اپنے آباء وجداد اور قرباء کیلئے ایصال ثواب کی محفل کا انعقاد کرتے ہیں، اور ان کی وفات کے بعد ان کی اولاد ان کیلئے صدقات وخیرات کرتے ہیں اور ایصال ثواب کا اہتمام کرتے ہیں، اور جن لوگوں کو رب تعالیٰ ثواب سے محروم کرنا چاہتا ہے اور اپنی رحمت دور رکھنا چاہے ان کے دل میں پختہ طور پر یہ بات ڈال دیتا ہے کہ یہ سارے کام ناجائز ہیں۔ بس ملتا وہی ہے جو قسمت میں ہو۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

لَیۡسَ عَلَیۡکَ هُدٰاهُمۡ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ یَهۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ وَمَاتُنۡفِقُوۡامِنۡ خَیۡرٍ فَلِاَنۡفُسِکُمۡ وَمَاتُنۡفِقُوۡنَ اِلَّاابۡتِغَآءَ وَجۡهِ اللّٰهِ وَمَاتُنۡفِقُوۡامِنۡ خَیۡرٍ یُّوَفَّ اِلَیۡکُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَاتُظۡلَمُوۡنَ☆ (سورۃالبقرۃآیت ۲۷۲)

﴿۱﴾

انہیں راہ دینا تمہارے ذمہ لازم نہیں ہاں اللہ تعالی راہ دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور تم جو اچھی چیز دو تو تمہارا ہی بھلا ہے، اور تمہیں خرچ کرنا مناسب نہیں مگر اللہ کی مرضی چاہنے کے لئے اور جو مال دو تمہیں پورا ملے گا اور نقصان نہ دیئے جاؤ گے۔

﴿۲﴾

نہیں ہے آپ پر ان کی ہدایت کی تخلیق، لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہے۔ اور جو تم خرچ کرو اچھا مال وہ تمہارے نفسوں کے لئے ہی ہے۔ اور تم نہ خرچ کرو سوائے چاہنے اللہ کی رضاء کے۔ اور جو تم خرچ کرتے ہو مال وہ تمہیں پورا پورا دیا جائے گا۔ اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

شانِ نزول:

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اس آیۃ کریمہ کے چند شان نزول ذکر فرمائے ہیں، یعنی کئی واقعات کے بعد آیۃ کریمہ کا نزول ہوا جو تمام ہی شان نزول ہیں۔ ان میں کوئی تعارض نہیں۔

(۱) اس آیۃ کریمہ کے نزول کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان ذمی کافروں کے فقراء کو صدقہ دے دیا کرتے تھے، جب مسلمانوں میں فقراء کی تعداد زیادہ ہوگئی۔ "قال رسول اللہ ﷺ لا تتصدقوا الاعلی اھل دینکم" تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا صدقہ اپنے دین والوں کے بغیر کسی اور پر نہ کرو۔

" فنزلت هذه الآية مبيحة للصدقة على من ليس من دين الاسلام "

تو یہ آیۃ کریمہ نازل کی گئی جس میں ان لوگوں کے لئے بھی صدقہ جائز کر دیا گیا جو دین اسلام پر نہیں تھے۔

(۲) نقاش رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ کی خدمت میں صدقات لائے گئے تو ایک یہودی آپ کے پاس آیا اس نے کہا مجھے بھی صدقہ دیا جائے۔ " فقال النبی ﷺ ليس لک من صدقة المسلمين شئ " تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا مسلمانوں کے صدقات میں سے تمہارے لئے کوئی چیز نہیں۔

" فذهب اليهودی غير بعيد فنزلت " یہودی ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

" فدعاه رسول الله ﷺ فاعطاه " تو رسول اللہ ﷺ نے اس یہودی کو بلا کر صدقہ کا مال دیا۔

(۳) "روی عن ابن عباس انه قال كان ناس من الانصار لهم قرابات من بنی قريظة والنضير وكانوا لايتصدقون عليهم رغبة منهم فی ان يسلموا اذا احتاجوا فنزلت الآية بسبب اولئک "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بیشک انصار کے لوگوں کی بنی قریظہ اور بنی نضیر (یہودی قبائل) سے رشتہ داریاں تھیں وہ ان پر پہلے صدقات وغیرہ کیا کرتے تھے، لیکن اسلام لانے کے بعد انصار نے اپنے صدقات ان پر بند کر دیئے اس طمع سے کہ وہ جب محتاج ہوں گے تو اسلام لے آئیں گے، اس وقت یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

خیال رہے کہ اس صورت کے لحاظ پر خطاب انصار کے حضرات کو انفرادی انفرادی طور پر ہوگا۔ کہ تم میں سے کوئی فرد ان کو ہدایت نہیں دے سکتا لیکن اللہ تعالی ہدایت دیتا ہے جسے چاہے۔

(۴) بعض مفسرین کرام نے بیان کیا ہے۔

" ان اسماء ابنة ابی بكر الصديق ارادت ان تصل جدها ابوقحافة ثم امتنعت من ذلک لكونه كافرا فنزلت الآية فی ذلک "

کہ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما نے ارادہ کیا کہ اپنے دادا ابو قحافہ کو صدقہ عطاء کریں، لیکن صدقہ

کرنے سے رک گئیں خیال کیا کہ وہ تو کافر ہے اسے صدقہ کیوں دوں (ابو قحافہ بعد میں مسلمان ہو گئے تھے رضی اللہ عنہ) تو اس وقت یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی، یعنی حضرت اسماء کو صدقہ اپنے دادا کو دینے کی اجازت دے دی گئی۔

لیکن خیال رہے کہ اس صورت میں بھی " لیس علیک ھداھم " میں خطاب نبی کریم ﷺ کو نہیں بلکہ یہ خطاب عام ہوگا جو ہر سننے والے کو ہوگا۔

شان نزول کی پہلی دو صورتوں میں " لیس علیک ھداھم " میں خطاب نبی کریم ﷺ کو ہوگا۔ جیسا کہ طبری نے بیان کیا ہے۔

" ان مقصد النبی ﷺ بمنع الصدقة انما کان یسلموا ویدخلوا فی الدین فقال اللہ تعالی " لیس علیک ھداھم "

بیشک نبی کریم ﷺ نے غیر مسلموں کو صدقہ دینے سے جو منع فرمایا اس کی وجہ اصل میں یہ تھی کہ آپ چاہتے تھے کہ وہ لوگ اسلام لے آئیں، دین اسلام میں داخل ہو جائیں تو رب تعالیٰ نے فرمایا " لیس علیک ھداھم " آپ پر لازم نہیں ان کو ہدایت دینا۔ (ماخوذ از قرطبی)

تنبیہ : علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے شان نزول کی دوسری وجہ، یعنی یہودی کو صدقہ دینے کا حکم بیان کرنے کے بعد ذکر کیا ہے۔ " ثم نسخ اللہ ذلک بآیة الصدقات " پھر یہ حکم آیۃ الصدقات کے نازل ہونے کے بعد (جس میں آٹھ قسم کے لوگوں کو صدقات دینے کا حکم دیا گیا ہے) منسوخ ہو گیا ہے۔

لیکن راقم کہتا ہے کہ منسوخیت کا قول اس وقت ضروری ہے جب اس زیر بحث آیۃ کریمہ میں غیر مسلموں کو فرضی صدقہ دینے کا حکم ہو، یہاں تو نفلی صدقہ دینے کا ذکر ہو رہا ہے جو ذمی غیر مسلموں کو اب بھی دیا جا سکتا ہے، جس کی وضاحت بیان ہو چکی ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ خود بھی یہ بیان کرتے ہیں۔

" قال علماؤنا ھذہ الصدقة التی ابیحت لھم حسب ما تضمنته ھذہ الآثار ھی صدقة التطوع واما المفروضة فلایجزئ دفعھا لکافر ، لقوله علیه السلام " امرت

ان آخذ الصدقة من اغنیاء کم واردها فی فقراء کم"

علماء کرام نے یہ ذکر فرمایا ہے کہ یہ صدقہ غیر مسلموں کو دینا جائز ہے کہ اس سے مراد نفلی صدقہ ہے جو آثار (احادیث، اقوال صحابہ) سے ثابت ہے، لیکن فرضی صدقہ کافروں کو دینا جائز نہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے اغنیاء سے صدقہ لے کر تمہارے فقراء پر لوٹا دوں"۔

یعنی مسلمانوں کے غنی لوگوں سے ہی لوں اور مسلمانوں کے فقیروں کو ہی دوں۔

"قال ابن المنذر اجمع کل من احفظ عنه من اهل العلم ان الذمی لا یعطی من زکوة الأموال شیأ،ثم ذکر جماعة ممن نص علی ذلک ولم یذکر خلافا"

ابن منذر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ تمام اہل علم کا اس پر اتفاق ہے کہ ذمی غیر مسلم کو اپنے مالوں کی زکوۃ نہیں دی جا سکتی، پھر انہوں نے بہت بڑی جماعت علماء کا ذکر فرمایا کہ ان تمام کا یہی قول ہے کسی کا اس میں اختلاف نہیں۔ (ماخوذ از قرطبی)

مقام توجہ:

" وقال ابو حنیفة تصرف الیهم زکوة الفطر،ابن العربی وهذا ضعیف لا اصل له"

بعض لوگوں نے امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف یہ قول منسوب کر دیا کہ آپ ذمی غیر مسلموں کو صدقہ فطر دینا جائز مانتے ہیں لیکن ابن عربی رحمہ اللہ نے فرمایا امام صاحب رحمہ اللہ کی طرف اس قول کی نسبت کرنا ہی غلط ہے کیونکہ یہ ضعیف قول ہے جس کی کوئی اصل نہیں۔ ایسے ضعیف اقوال آپ کے نہیں ہو سکتے۔ (از قرطبی)

اسی طرح کے بعض اقوال جو امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ یا آپ کے شاگرد امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کی طرف جو اقوال غلط طور پر منسوب کر دیئے گئے ہیں جو دراصل ان حضرات کے اقوال ہی نہیں۔ ان کو دیکھ کر ہی غیر مقلدین بیہودہ بکواس کرتے رہتے ہیں، کبھی توڑ موڑ کر مسائل کو بیان کر کے جھوٹ کے مرتکب ہو کر اپنے آپ کو لعنت کا مستحق بناتے رہتے ہیں۔

اعتراض : اس آیۃ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے ہدایت دینے کی نفی فرمادی "لیس علیک هداهم" آپ پر نہیں ان کو ہدایت دینا، جبکہ دوسری آیات کریمہ میں نبی کریم ﷺ کا ہادی ہونے کا ذکر ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا۔"یا ایها النبی انا ارسلنک شاهدا و مبشرا و نذیرا ، وداعیا الی الله باذنه و سراجا منیرا" (سورۃ الاحزاب آیۃ ۴۵،۴۶)

اے غیب کی خبریں بتانے والے (نبی) بیشک ہم نے تمہیں بھیجا حاظر و ناظر اور خوشخبری دیتا ڈر سناتا اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلاتا اور چمکا دینے والا آفتاب۔

اس آیۃ کریمہ میں نبی کریم ﷺ کی صفت بشیر و نذیر ذکر کی گئی۔ بشیر و نذیر وہی ہوتا ہے جو ہدایت دیتا ہے۔ پھر آپ کی صفت "داعیا الی الله باذنه" بیان فرمائی گئی۔ یہ بھی یقینی بات ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے اللہ کی طرف یعنی اس کے حکم، اس کے دین کی طرف بلائے گا وہ ہدایت دینے والا ہی ہوگا۔ اور ارشاد فرمایا۔ "فلعلک باخع نفسک علی آثارهم ان لم یؤمنوا بهذا الحدیث اسفا" "تو کہیں تم اپنی جان پر کھیل جاؤ گے ان کے پیچھے اگر وہ اس بات پر ایمان نہ لائیں غم سے"

نبی کریم ﷺ لوگوں کو ہدایت دیتے تھے، جب وہ ایمان نہیں لاتے تھے تو آپ بہت زیادہ غمزدہ ہو جاتے تھے رب تعالیٰ نے آپ کو تسلی دی کہ آپ ان لوگوں کے ایمان نہ لانے سے اتنے زیادہ غمزدہ نہ ہوں کہ اپنی جان کو ہی ہلاکت کے خطرہ میں ڈال دیں۔

اس آیۃ کریمہ سے بھی آپ کا ہادی ہونا واضح ہوگیا، اور بھی کئی آیات کریمہ میں آپ کے ہادی ہونے کا ذکر ہے، تو پھر "لیس علیک هداهم" میں آپ کے ہادی ہونے کی نفی کا مطلب ہے؟

جواب : اس مقام میں اس ہدایت کی نفی نہیں جسے راہ دکھانا کہا جاتا ہے، انبیاء کرام کے تشریف لانے کا مقصد ہی تبلیغ دین تھا، اسی طرح رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ "یا ایها الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک"

اے رسول (ﷺ) پہنچادو جو آپ کی طرف آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا۔

" قال الله تعالیٰ (ولکل قوم هاد) بمعنی مبلغ و دال لهم علی طریق الحق "

اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ''ہر قوم کے لئے ہادی ہے، اس ہادی سے مراد مبلغ ہے اور ان کی حق راہ کی طرف راہنمائی کرنے والا ہے۔

یہاں جس ہدایت کی نفی کی گئی ہے اس سے مراد ''لم یکلفک یا محمد ربک بخلق الھدی فیھم'' اے محمد آپ کے رب نے آپ کو یہ تکلیف نہیں دی کہ آپ ان لوگوں میں ہدایت کی تخلیق فرمائیں۔

اس بحث سے یہ واضح ہو گیا کہ ہدایت کے دو معنی ہیں، ایک راہنمائی کرنا اور دوسرا دل میں کسی چیز کو جاگزین کر دینا یعنی دل میں قرار دینا۔

'' فتحصل ان الھدی یطلق بمعنی الد لالۃ وھو مکلف بہ الانبیاء والعلماء ''

حاصل کلام یہ ہے کہ بیشک ہدایت کا ایک معنی یہ ہے، دلالت کرنا، راہنمائی کرنا، اس معنی کے لحاظ سے انبیاء کرام اور علماء کرام کو ہدایت حاصل ہے کہ وہ سیدھی راہ کی راہنمائی کرتے ہیں۔

'' وبمعنی ایصال الخیر للقلب وھو لم یکلف بہ احد ''

ایک اور معنی یہ ہے کہ خیر کو دل تک پہنچانا، یعنی دل میں ہدایت کو پیدا کرنا، اس معنی کے لحاظ سے انبیاء کرام کو ہدایت کا مکلف نہیں بنایا گیا۔

اسی لئے رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ '' انک لا تھدی من احببت ولکن اللہ یھدی من یشاء '' بیشک آپ ہدایت نہیں دے سکتے (منزل مقصود تک نہیں پہنچا سکتے) جس سے آپ محبت کرتے ہیں۔ لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ ہدایت کا خالق ہے اور دل میں خیر کو پہنچانے والا ہے اور منزل مقصود تک پہنچانے والا ہے۔ اور انبیاء کرام اور علماء کرام راہنما ہیں۔ حقیقت میں ہر چیز اللہ تعالیٰ کے نور کا ظہور ہے، اسی کا عکس ہے، اسی کی جلوہ گری ہے، اگرچہ بظاہر اس نے اپنی مرضی سے رحم و کرم کرتے ہوئے اپنی جلیل القدر ہستیوں کو ہادی بنا دیا۔

اذا ما رأیت اللہ فی الکل فاعلا رأیت جمیع الکائنات ملاحا
وان لم تری الا مظاھر صنعہ حجبت فصیرت الحسان قباحا

جب تو اللہ تعالیٰ کو ہر چیز میں فاعل دیکھے گا۔تو تمام کائنات میں اسی کی جلوہ گری دیکھے گا۔اور اگر تو نے صرف ظاہری اسباب کو دیکھا۔تو تو اپنے آپ پر پردہ چھادے گا اور حسین چیزیں بھی تیرے نزدیک قبیح ہوں گی۔

(الماخوذ من الصاوی)

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے " لیس علیک ھداھم " کی تفسیر ان الفاظ سے کی ہے۔

" لا یجب علیک ان تجعل الناس مھدیین "

ان الفاظ کی مزید وضاحت شیخ زادہ رحمہ اللہ نے یوں بیان کی۔

" بان تو فقھم علی الا ھتداء او بأن تخلق فعل الا ھتداء فیھم و انما ذلک فی ید من له الخلق و الأمر "

ان دونوں عبارتوں کا مطلب یہ ہے" کہ آپ پر لازم نہیں کہ آپ لوگوں کو ہدایت کی توفیق عطاء فرمائیں، یا معنی یہ ہے کہ آپ ان کے دلوں میں ہدایت کا فعل پیدا نہیں کر سکتے۔تخلیق کا فعل تو صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے کہ وہی خالق ہے اور تمام امور اسی کے قبضہ ءِ قدرت میں ہیں۔

اب بیضاوی اور شیخ زادہ کی مجموعی عبارات کے مطلب کو بھی سامنے رکھیں اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ اور راقم کے تراجم کو بھی دیکھیں تو انشاء اللہ خوب نظر آئیں گے۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ " لیس علیک ھداھم "انہیں راہ دینا تمہارے ذمہ لازم نہیں راقم کا ترجمہ یوں ہے"نہیں ہے آپ پر ان کی ہدایت کی تخلیق"۔

نبی کریم ﷺ کو جو ہدایت حاصل ہے اسے علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے ان الفاظ سے بیان فرمایا۔

" وانما علیک الارشاد والحث علی المحاسن والنھی عن القبائح کالمن والاذی وانفاق الخبیث "

آپ پر لازم ہے کہ آپ لوگوں کو سیدھی راہ دکھائیں۔اور ان کو اچھے کاموں پر ابھاریں، اور اچھے کاموں کی ان کو رغبت دلائیں، اور برے کاموں سے ان کو روکیں۔خاص کر کے آیۃ کریمہ کے سیاق وسباق سے واضح ہے کہ

آپ کوحکم دیا گیا کی ان کو مال خرچ کر کے احسان جتلانے اوراذیت پہنچانے سے منع فرمائیں،اورخبیث (ناپاک، حرام)مال اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے ان کومنع کریں۔

تنبیہ : شان نزول کی دووجہ سے پتہ چلتا ہے کہ" لیس علیک ھداھم " میں خطاب خاص نبی کریم ﷺ کو ہے اوردووجہ سے پتہ چلتا ہے کہ خطاب عام لوگوں کو ہے،لیکن حقیقت میں خطاب عام ہے۔

"ظاھر قوله (لیس علیک ھداھم) خطاب مع النبی ﷺ ولکن المراد به ھو امته"

اگر چہ بظاہر خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے لیکن حقیقت میں آپ کے ساتھ آپ کی امت بھی مراد ہے۔

کیونکہ"ان تبدوا الصدقات"میں بھی خطاب عام ہے۔اور" وما تنفقوا من خیر فلانفسکم "میں بھی خطاب عام ہے۔" ویفھم من عموم ما قبل الآیة وعموم ما بعد ھا عمومھا ایضا "آیۃ کریمہ کے ماقبل اور مابعد آیات کے عموم سے اس آیۃ کریمہ کا عموم واضح ہوگیا۔ (کبیر)

"ولکن اللہ یھدی من یشاء" "لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہے۔"

" یعنی ان اللہ تعالی یوفق من یشاء فیھدبه الی الاسلام وارادبا لھدایة ھناھدایة التوفیق "

یعنی اللہ تعالی جسے چاہے اسلام کی طرف ہدایت کی توفیق عطاء فرمادیتا ہے، یہاں ہدایت سے مرادتوفیق دینا یعنی ہدایت کی تخلیق فرمانا۔ (خازن)

گنہگار کو صدقہ دینا۔

"عن ابی ھریرة قال قال رسول اللہ ﷺ قال رجل لأتصدقن اللیة بصدقة ، فخرج بصدقته فوضعھا فی یدزانیة فا صبح الناس یتحدثون تصدق علی زانیة ، فقال اللھم لک الحمد علی زانیة ، لا تصدقن اللیلة بصدقة ، فوضعھا فی یدغنی فاصبحوا یتحدثون تصدق علی غنی ، قال اللھم لک الحمد علی غنی ، لا تصدقن اللیلة

بصدقة فخرج فوضعها فی ید سارق فاصبحوا یتحدثون تصدق اللیلة علی سارق فقال اللھم لک الحمد علی زانیة وعلی غنی وعلی سارق فأتی فقیل له اما صدقتک فقد قبلت واما الزانیة فلعلها ان یستعتف بها عن زنا ، ولعل الغنی یعتبر فینفق مما اعطاء اللہ ولعل السارق ان یستعتف بها عن سرقة . (بخاری ومسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ایک شخص نے کہا میں اس رات کو ضرور برضرور صدقہ کروں گا۔ وہ صدقہ (کا مال) لے کر نکلا تو اس نے زانیہ کے ہاتھ میں دے دیا۔ صبح لوگ باتیں کرنے لگے کہ صدقہ ایک زانیہ عورت کو دے دیا گیا ہے۔ تو اس شخص نے کہا اے اللہ سب تعریفیں تیرے لئے ہی ہیں زانیہ پر (یعنی میں نے رات کی تاریکی میں صدقہ تو زانیہ عورت کو دے دیا ہے) پھر اس نے کہا کہ آج رات میں ضرور برضرور صدقہ کروں گا۔ اس نے وہ مال غنی کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ صبح لوگ باتیں کرنے لگے کہ غنی کو صدقہ دے دیا گیا ہے۔ اس شخص نے کہا اے اللہ سب تعریفیں تیرے لئے ہیں غنی پر (یعنی رات کی تاریکی میں، میں نے صدقہ غنی کو دے دیا ہے) پھر اس نے کہا آج رات میں ضرور برضرور صدقہ کروں گا ، وہ رات کو صدقہ (کا مال) لے کر نکلا تو اس نے وہ چور کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ صبح لوگ باتیں کرنے لگے کہ رات کو صدقہ چور کو دے دیا گیا، تو اس نے کہا اے اللہ سب تعریفیں تیرے لئے ہیں زانیہ پر، غنی پر، چور پر (صدقہ کر دیا گیا ہے) تو اسے (غیبی آواز آئی) تیرا صدقہ میں نے قبول کرلیا، ہوسکتا ہے زانیہ اس صدقہ کی وجہ سے آئندہ زنا سے بچ جائے۔ اور ہوسکتا ہے غنی عبرت پکڑے کہ جو مال اللہ تعالیٰ نے اسے دیا ہے وہ اسی کی راہ میں خرچ کرے، اور ہوسکتا ہے کہ چور اسی صدقہ کی وجہ سے چوری سے باز آ جائے۔ (صابونی)

خیال رہے کہ صدقہ سے مراد حدیث پاک میں نفلی صدقہ ہوسکتا ہے کیونکہ فرضی صدقہ غنی کو نہیں دیا جاسکتا۔

تنبیہ : اگرچہ احکام القرآن للجصاص میں ہے کہ جو صدقات امام وصول کرتا ہے وہ ذمی کفار کو نہیں دیئے

جاسکتے اور جو امام وصول نہیں کرتا وہ ذمی کفار کو دیئے جاسکتے ہیں، لہٰذا امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک صدقہ فطر، نذر اور کفارہ کا مال ذمی کفار کو دیا جاسکتا ہے۔ لیکن صحیح قول وہی ہے جو پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ ابن عربی رحمہ اللہ نے اس کی قول کی منسوبیت امام صاحب رحمہ اللہ کی طرف غلط قرار دی ہے۔ لہٰذا صدقات واجبہ کوئی بھی ہوں ذمی کفار کو نہیں دیئے جاسکتے۔ جب ذمیوں کو نہیں دیئے جاسکتے تو حربی مشرکین کو دینا تو یقیناً ناجائز ہے، کیونکہ حربیوں کو تو نفلی صدقات دینا بھی جائز نہیں۔

مسئلہ: ہندوستان دارالاسلام ہے کیونکہ یہ افغانستان سے ملحق ہے اور یہاں روزہ نماز وغیرہ بہت سے ارکان اسلامی کی آزادی ہے مگر یہاں کے کفار سب حربی ہیں انہیں کسی قسم کا صدقہ دینا جائز نہیں خواہ فرضی ہو یا نفلی ہو۔ (نعیمی)

وما تنفقوا من خير فلا نفسكم "

''اور جو تم خرچ کرو اچھا مال تو وہ تمہارے نفسوں کے لئے ہے۔''

" من خير " من نفقه معروفة او المراد بالخير المال" (مظهری) "قليلا كان او كثيرا" (صاوی)

یعنی " خیر " سے مراد پاکیزہ اور اچھا مال ہے۔ یا مطلقاً مراد مال ہے۔ " خیر " پر تنوین تقلیل کے لئے ہے۔ خواہ قلیل ہی ہو کثیر خود بخود سمجھ آرہا ہے " فلانفسکم " (وہ تمہارے نفسوں کے لئے ہے)

" فهو لانفسكم لا ينتفع به غيركم فلا تمنوا به على الناس ولا تؤذوهم بالتطاول عليهم "

یعنی جو مال تم خرچ کرو گے اس کا نفع یعنی اجر وثواب تمہیں ہی حاصل ہونا کسی اور کو تو نہیں حاصل ہونا، اس لئے مال خرچ کر کے لوگوں کو احسان نہ جتلاؤ اور نہ ہی ان پر کسی قسم کی زیادتی کر کے ان کو ایذاء پہنچاؤ۔ (مدارک)

احسان جتلانے اور تکلیف دینے یعنی ایذاء پہنچانے سے صدقہ کا اجر وثواب ضائع ہو جاتا ہے، اس لئے اپنے صدقات ضائع نہ ہونے دے بلکہ نفع حاصل کرے۔

" من خیر " سے اور یہ فائدہ حاصل ہوا گویا کہ رب تعالیٰ نے یہ حکم بھی اسی کے ضمن میں دے دیا " ولا

تنفقوا لخبیث " تم خبیث مال اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو، یعنی حرام مال، ناپاک مال اور ردی مال اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو۔ (ماخوذ از مظہری)

" وما تنفقون الا ابتغاء وجه الله "

"اور تم نہ خرچ کرو سوائے چاہنے اللہ کی رضاء کے۔"

خیال رہے کہ اگر ان الفاظ مبارکہ میں تذکرہ صحابہ کرام کا ہو تو ترجمہ اعلیٰ حضرت اور پیر محمد کرم شاہ رحمھما اللہ کا ہی درست ہے، کیونکہ صحابہ کرام کا ہر عمل اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے تھا، وہ جو بھی کام کرتے تھے اس میں ان کا مقصد یہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہو جائے۔ لیکن راقم کے خیال میں یہ خطاب عام ہے جو تا قیامت آنے والے مؤمنین کو ہے، اس کے مطابق ترجمہ یہ درست ہوگا "اور تم نہ خرچ کرو سوائے چاہنے اللہ کی رضاء کے"

اعلیٰ حضرت اور حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمھما اللہ کا ترجمہ پہلے قول کے مطابق ہے، راقم نے دوسرے قول کے مطابق ترجمہ کیا ہے کیونکہ راقم کا ذہن دوسرے قول کی طرف زیادہ متوجہ ہے۔ کیونکہ زیادہ مفسرین کرام نے جو ذکر فرمایا ہے اسے ذکر کیا جا رہا ہے۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"خبر بمعنی نهی " راجع للجملة الثانية ای فهی خبرية لفظاانشائية معنی "

" وما تنفقون الا ابتغاء وجه الله " بظاہر جملہ خبریہ ہے، لیکن معنیٰ انشائیہ ہے، اس لئے اس کا معنی یہ ہے "نہ خرچ کرو سوائے چاہنے اللہ کی رضاء کے"

چونکہ جلالین میں مطلقاً "خبر بمعنی نہی" تھا، تو صاوی میں اس کی وضاحت کر دی گئی کہ اس کا تعلق دوسرے جملے " وما تنفقون الا ابتغاء وجه الله " سے ہے، پہلے جملہ " وما تنفقوا من خير فلا نفسكم " سے نہیں۔

فائده جلیله :

" وما تنفقون الا ابتغاء وجه الله " میں دو احتمال ہیں، ایک یہ ہے۔

" والمعنی لا تجعلوا انفاقکم الاخالصا لوجه الله لا لغرض آخر لادینوی ولا اخروی وهذا هو المقام الأعلی "

کہ اس سے مراد یہ معنی لیا جائے "تم نہ خرچ کرو سوائے اللہ کی رضاء چاہنے کے، اس میں کوئی اور غرض نہ ہو نہ دنیاوی اور نہ اخروی، یہی مقام اعلیٰ درجہ کا ہے کہ اس میں توجہ صرف رب تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے، نہ یہ مقصد کہ دنیا میں میری تعریف ہو کہ یہ بڑا سخی ہے، اور نہ ثواب حاصل ہونے کی طرف توجہ ہو۔ بلکہ صرف یہ مدنظر ہو کہ اے اللہ تو راضی ہو جا۔ جب یہ مقصد حاصل ہو گیا تو ثواب خود بخود حاصل ہو جاتا ہے۔

دوسرا مقام یہ ہے۔ " او لا تقصدوا لاوجه الله بمعنی ثوابه وهذا ادنی منه "

یہ معنی یہ ہو کہ تم نہ خرچ کرو سوائے رب کی رضاء چاہنے کے یعنی تمہاری نظر میں یہ ہو کہ مجھے اس سے ثواب ہو جائے۔ لیکن یہ مقام پہلے مقام سے گھٹیا ہے کیونکہ اس میں خالص اللہ کی رضاء نہیں پائی گئی بلکہ ثواب حاصل کرنے کی غرض پائی گئی ہے۔

بظاہر اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ جلالین میں تو دوسری صورت کو ہی ذکر کیا گیا ہے کیونکہ " وجه الله " کے بعد " ثوابه " ذکر کیا گیا۔ جب یہ دوسری صورت گھٹیا ہے تو مفسر رحمہ اللہ صرف اسی کو ذکر کیوں کیا ہے۔

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے۔

" وارتکبه المفسروان کانت الآیة محتمله لهما بالنظر لأخلاق العامة "

مفسر رحمہ اللہ نے ادنیٰ صورت کو ہی ذکر کرنے پر اکتفاء کیا ہے حالانکہ دو احتمال تھے اعلیٰ صورت کو ذکر نہیں کیا، عام لوگوں کے اخلاق کو دیکھ کر کیونکہ عام لوگ ثواب کی ہی نیت کرتے ہیں، خواص لوگ تو بہت کم ہوتے ہیں جن کے نزدیک صرف رب تعالیٰ کی رضاء مندی مقصود ہوتی ہے ثواب کی بھی وہ نیت نہیں کرتے۔ (ماخوذ از صاوی)

"وما تنفقوا من خیر یوف الیکم"

"اور جو تم خرچ کرو مال وہ تمہیں پورا پورا دیا جائے گا۔"

اور جو مال تم خرچ کرو وہ تھوڑا ہو یا زیادہ ہو، البتہ پاک اور حلال ہو۔" (یوف الیکم) ثوابه اضعا فا

مضاعفة ''تو تمہیں اس کا ثواب کئی گنا زائد مکمل طور پر دیا جائے گا۔ یہ جملہ پہلے جملہ کی تاکید ہے یعنی'' وما تنفقوا من خير فلانفسكم '' جو مضمون سمجھ آ رہا ہے وہی '' وما تنفقوا من خير يوف اليكم '' میں بیان کر دیا گیا ہے۔

اور یا یہ جملہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ آپ نے یہ دعاء فرمائی '' اللهم اجعل لمنفق خلفا ولممسك تلفا '' اے اللہ خرچ کرنے والے کو اس مال کے بدلے اور مال عطاء فرما اور نہ خرچ کرنے والے کے مال کو برباد کر دے۔تو گویا کہ اس جملہ میں یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ جو مال تم خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ اس کے بدلے تمہیں اور مال عطاء کر دے گا۔ (بیضاوی)

لفظ '' الی ''کا فائدہ

'' یوف ' کے بعد '' الیکم '' ذکر فرمایا اس لئے کہ اس میں '' اداء ' کا معنی پایا گیا ہے جس کے بعد ' الی آتا ہے۔اب معنی یہ ہو گیا کہ وہ تمہیں پورا پورا ادا کر دیا گیا۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

جیسا کہ آپ تلخیص المفتاح اور مختصر المعانی میں پڑھ چکے ہیں کہ تاسیس (یعنی نیا معنی لینا) زیادہ بہتر ہے بنسبت پہلا معنی ہی دوسرے جملہ سے مراد لینے کے جو تاکید پر دلالت کرتا ہے۔اس ضابطہ کو بھی دیکھ کر یہی سمجھ آتا ہے کہ تینوں جملوں کا معنی علیحدہ علیحدہ مراد لینا بہتر ہے۔

اور قاضی محمد ثناء اللہ مظہری رحمہ اللہ نے دوسرا ضابطہ بھی ذکر فرمایا کہ اگر تاکید والا بہتر ہوتا تو تینوں جملوں میں حرف عطف نہ آتا۔حرف عطف جب تینوں جملوں میں آیا ہوا ہے تو یہ مغائرت پر دلالت کر رہا ہے۔لہٰذا ہر جملہ کا علیحدہ علیحدہ مقصد لینا ہی بہتر ہے۔

(۱) '' وما تنفقوا من خير فلانفسكم '' فان الجملة الأولى تدل على ان المنة على الغير بما فيه منفعة لكم قبيح ''

یعنی رب تعالیٰ کے ارشادگرامی' وما تنفقوا من خیر فلا نفسکم "(اور جوتم خرچ کرو اچھا مال وہ تمہارے اپنے نفسوں کے لئے ہے) کا مطلب یہ ہے کہ جب تمہارے مال خرچ کرنے کا نفع تمہیں ہی حاصل ہونا ہے تو احسان جتلانا بہت برا طریقہ ہے۔

(۲) " وما تنفقون الا ابتغاء وجه الله "والثانية على ان المنة على الفقير با لذى يبتغون به وجه الله طلب عوض من غير من هوله "

اللہ تعالیٰ کے ارشادگرامی " وما تنفقون الا ابتغاء وجه الله "(اور تم نہ خرچ کرو سوائے چاہنے رب کی رضاء کے) کا مطلب یہ ہے کہ جب تمہیں یہ حکم دیا جارہا ہے کہ "تم نہ خرچ کرو سوائے چاہنے رب کی رضاء کے" تو پھر اگر تو نے فقیر پر احسان جتلایا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم رب تعالیٰ کے بغیر اوروں سے بدلہ طلب کررہے ہو کہ فقیر پر احسان جتلاؤ اور وہ تمہیں بدلہ دے، یہ بہت حقیر چیز کی طلب ہے۔

(۳) "وما تنفقوا من خير يوف اليكم " والثالثة بأنه منة على الغير بما تأخذون العوض منه اضعافا مضاعفا "

رب تعالیٰ کے ارشادگرامی " وما تنفقوا من خير يوف اليكم " (اور جوتم اچھا مال خرچ کرو وہ تمہیں پورا پورا دیا جائے گا) جب تمہیں رب تعالیٰ نے تمہارے خرچ کئے ہوئے مال کا بدلہ کئی گنا زیادہ عطاء کرنا ہے تو پھر فقیر کو احسان جتلا کر اس سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہو۔ بدلہ تو چیز کا ایک مرتبہ حاصل کیا جاتا ہے بار بار سودے کی قیمت نہیں طلب کی جاتی۔ (مظہری)

ان معانی کے لحاظ پر رب تعالیٰ کے تینوں ارشادگرامی کا علیحدہ علیحدہ مطلب واضح ہوگیا۔ جسے تاسیس کہا جاتا جو تاکید سے بہتر ہے۔

"وانتم لا تظلمون" "اور تم پر ظلم نہ کیا جائے گا۔"

"اى لا تنقصون من ثواب اعمالكم " (مظهرى)

یعنی تمہارے اعمال کے ثواب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا اجر و ثواب تمہیں پورا پورا دیا جائے گا، اس میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ خیال رہے کہ جو معنی تفسیر مظہری سے نقل کیا گیا ہے وہی معنی تقریباً تمام تفاسیر نے بیان کیا ہے یعنی "وانتم لا تظلمون" کا مرادی معنی یہی ہے، اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ تفاسیر کے مطابق بہت خوبصورت ہے" اور نقصان نہ دیئے جاؤ گے"

راقم نے لغوی طور پر ترجمہ کیا ہے اگرچہ مراد وہی ہے جو تفاسیر نے بیان کیا ہے۔ درحقیقت راقم کا ترجمہ تفسیر ضیاء القرآن سے نقل کیا گیا ہے۔

گذشتہ سے پیوستہ:

راقم کی کتاب تسکین الجنان سے گذشتہ آیۃ کے متعلق اقتباس:

" او نذرتم من نذر " یا قبول کرو گے کوئی منت۔ (محمود الحسن صاحب)

" او نذرتم من نذر " یا قبول کرو گے کوئی منت۔ (شاہ عبدالقادر صاحب)

" او نذرتم من نذر " یا منت مانو۔ (اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ)

نذر کا معنی منت کو قبول کرنا کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا "نذر وصول کرنا" لیکن یہاں پورا مفہوم ماقبل کا اور ان الفاظ مبارکہ کا یہ ہے اللہ کی راہ میں جو مال تم خرچ کرو (زکوۃ، صدقات) یا نذر مانو بے شک اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے (تمہیں جزا دے گا) اور ظالموں کے لئے کوئی مددگار نہیں ظالموں سے مراد زکوۃ نہ دینا، نذر کو پورا نہ کرنا، یا مال ناجائز کاموں میں خرچ کرنا، یا معاصی کی نذر ماننا۔ اب اس وضاحت کے بعد تفاسیر کو دیکھیں۔

"(او نذرتم من نذر) بشرط اوبغير شرط فى طاعة او معصية (فان الله يعلمه) فيجازيكم عليه "

یعنی تم کوئی نذر مانو شرط سے معلق ہو یا نہ ہو خواہ نذر نیک کام کی ہو یا بد کی، اللہ تعالیٰ اس کا اسی کے مطابق بدلہ دے گا۔

"(اونذرتم من نذر) فی طاعة الله اوفی معصیته(فان الله یعلمه) لا یخفی علیه وھویجازیکم علیه "(مدارک)

یعنی کوئی نذر تم مانو نیک کام میں ہو یا معصیت میں اللہ پر مخفی نہیں وہ تمہیں اس کا ایسا ہی بدلہ دے گا۔

اب بخوبی واضح ہوگیا کہ ''منت ماننا'' ترجمہ اس مقام کے مناسب ہے، ''منت قبول کرنا'' مناسب نہیں۔

(تسکین الجنان ص ۷۹، ۸۰)

☆☆☆☆☆

درسِ نظامی کے مقاصد:

یہ مقالہ ایڈیٹر نوائے وقت کے ایک اداریہ کے جواب میں ہے۔

۲۷ رجنوری ۱۹۷۵ء کے ''نوائے وقت'' میں مدارس عربیہ کو سرکاری تحویل میں لینے کے متعلق ایڈیٹر صاحب نے جو اداریہ سپرد قلم کیا ہے۔ وہ یقیناً معلومات افزا ہونے کے ساتھ ساتھ کئی افراد کے نہاں خانہ دل کی آواز بھی تھی۔ چند باتوں میں اختلاف کے باوجود میں کہہ سکتا ہوں کہ اس اداریہ میں آپ نے جمہور کی ترجمانی کا حق ادا کیا ہے۔

حقیقت یہی ہے مدارس عربیہ کو تحویل میں لینے کی تجویز (جو زیرِ غور تھی یا اب ہے کیونکہ حکومت کی وضاحت کے باوجود امکان بدستور باقی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ شوشہ چھوڑ کر عامۃ المسلمین کے ردِّ عمل کا جائزہ لینا مقصود ہو) سیاسی مقاصد کی تکمیل کی غمازی کرتی ہے۔ آپ سے زیادہ کون اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ ملک کے سربرآوردہ گروہ علماء، مشائخ، اخبارات اور کارخانہ دار اور جاگیردار ہوتے ہیں۔ زرعی اصلاحات کے تحت جاگیرداروں کو ذلیل کیا گیا اور مالک ومزدور کو باہم دست وگریباں کر کے کارخانوں کی زندگی تہ وبالا کی گئی۔ اگر ان اصلاحات کا مقصد غریبوں اور کسانوں کا معیارِ زندگی بلند کرنا ہوتا اور غربت وافلاس کے ہاتھوں پسے ہوئے انسانوں کی فلاح ونجات پیشِ نظر ہوتی تو آج روزمرّہ کی ضروری اشیاء دُرِّ نایاب نہ بن جاتیں۔

مشائخ کے سر پر محکمہ اوقاف کو مسلط کیا گیا، سچی اور برمحل تنقید کرنے والے اخبارات کے اشتہار بند کر کے انہیں معاشی طور پر مفلوج کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ یہ گروہ مجبور ہو کر تخت نشینانِ اقتدار کی ہم نوائی پر آمادہ ہو جائیں۔

رہے علمائے کرام جن کی اکثریت ملک میں اُٹھنے والی تقریباً کی روح رواں ہوتی ہے جو پُر آشوب اور سنگین ترین حالات وتاریک حجروں میں بھی حق کی قندیل روشن رکھتے ہیں، جو تنگ وتاریک حجروں میں رہ کر اور خستہ وشکستہ چٹائیوں پر بیٹھ کر اپنوں اور بیگانوں کی ملامت کے تیر سہہ کر بھی پرچم اسلام بلند رکھتے ہیں اور قوتِ لایموت پر بسر اوقات کے باوجود حکمرانوں کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر حق کو حق کہتے اور چمکتے ہوئے آفتاب کو شبِ دیجور کہنے والوں کو سرِ عام بے نقاب کرتے ہیں۔ اب بعض مشیرانِ باتدبیر نے اُن کا دانہ پانی بھی سرکار کے ہاتھ میں دینے کا ارادہ کیا ہے۔ تاکہ ان کا وقار بھی ''اوقافیوں'' کی طرح خاک میں مل کر رہ جائے اور عوام میں ان کی حیثیت بھی ایک وظیفہ خوار ملازم کی رہ جائے۔

آپ کے آگے چل کر مدارسِ عربیہ کے موجودہ نصاب کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے اُن سے چونکہ بندہ کو شدید اختلاف ہے، اس لیے چند باتیں گوش گذار کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

آپ نے کہا کہ ''اس وقت پاکستان میں قائم دینی مدارس کا نصاب بغداد کے مدرسہ نظامیہ کے ایک ہزار سالہ پُرانے نصاب کا چربہ ہے'' مجھے حیرت ہے کہ آپ کو یہ شدید مغالطہ کیسے ہوا۔ موجودہ نصاب میں بعض کتب ایسی بھی شامل ہیں کہ جامعہ نظامیہ بغداد کے قیام کے وقت ان کے مصنف پیدا بھی نہیں ہوئے تھے اور مروّجہ نصابی کتب کے مصنفین وشارحین اور ان محشی حضرات کی اکثریت برِصغیر ہندوک پاک سے تعلق رکھتی ہے۔ آخر اہلِ بغداد کو کیا پڑی تھی کہ وہ علماءِ عرب کی تصانیف چھوڑ کر ہندوستان کے علماء کی کتب اپنے نصاب میں شامل کریں۔ دراصل موجودہ نصاب کو مولانا بحر العلوم رحمہ اللہ تعالیٰ (جو ایک جید عالم دین اور میدان منقول کے شاہسوار تھے) کے والدِ ماجد جناب مولانا نظام الدین سہالوی نے مرتب کیا تھا اور اسے تقریباً اڑھائی سو سال کا عرصہ ہوا ہے، آپ لکھنو کے قرب وجور میں رہنے والے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ نصاب کو درسِ نظامی سے موسوم کیا جاتا ہے اور نصاب کو مولانا نظام الدین کی طرف منسوب کیا جاتا تھا۔ شاید فاضل موصوف کو درس نظامی کے نام سے غلط فہمی ہوئی ہے اُنہوں نے سمجھا ''نظامی'' ''مدرسہ نظامیہ بغداد کی طرف منسوب ہے۔

آپ نے درس نظامی کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت کا بھی ذکر کیا ہے۔ کسی مسئلہ پر

اظہارِ خیال کرنے سے پہلے اگر ان لوگوں سے تبادلہ خیال کرلیا جائے جو اُس سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں اور جن کا وہ صبح وشام کا مشغلہ ہے، تو یہ کوئی معیوب بات نہیں ہے۔ مدارس عربیہ کے نصاب پر تبصرہ کرتے وقت اس بات کا ذہن نشین ہونا نہایت ضروری ہے کہ درس نظامی کے مقاصد کیا ہیں؟ کن اغراض کے پیش نظر یہ نصاب مرتب کیا گیا ہے؟ اور مرتبین نے کن ضروریات کو پیش نظر رکھ کر ان کتب کا انتخاب کیا تھا؟ اس کے بعد یہ دیکھنا ہے کہ آیا آج بھی ہمیں ان مقاصد واغراض کی حصول کی ضرورت ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو کیا اس نصاب کے علاوہ بھی کوئی علم معاون ہوسکتا ہے؟ اگر مدارس عربیہ کے نصاب مقصد ایٹم بم بنانا، ہوائی جہاز تیار کرنا اور میزائل ایجاد کرنا ہوتا، تو پھر بلاشبہ یہ کہنا بجا تھا کہ درس نظامی سے فارغ ہونے والے جدید علوم سے ناآشنا ہیں اور یہ اپنے مقاصد کو حاصل نہیں کر پائے لہٰذا اس نصاب کو تبدیل کر کے نئے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے۔ لیکن اگر اس کے مقاصد ہی کچھ اور ہوں اور اس کے اغراض ہی ان کے ماسوا ہوں تو پھر جدّت سے بے خبری کا طعنہ دے کر نصاب کو بدلنے کی تجویز قطعاً نامناسب اور غیر حقیقت پسندانہ ہے۔

درسِ نظامی کو مرتب کرنے کے مقاصد حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) پہلا مقصد تو یہ تھا کہ درس نظامی پڑھنے کے بعد قرآن وحدیث کی پیچیدگیاں اور ان کے مشکلات کو حل کیا جاسکے۔

(۲) دوسرا مقصد یہ تھا کہ درسِ نظامی حاصل کرنے کے بعد علماء میں باریک بینی کی استعداد پیدا ہو جائے اور رقیق ترین مضامین کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جیسا کہ عموماً قرآن وحدیث کے مضامین اسی طرح ہیں۔

(۳) بے لگام عقلاء نے اسلامی معتقدات پر جو اعتراضات کیے تھے ان کا جواب دیا جائے۔

(۴) قیامت تک کے لئے اگر کوئی شخص عقائد اسلامیہ پر اشکال وارد کرے تو درسِ نظامی کے وضع کردہ جامع اصولوں اور مکمل و پختہ فارمولوں کی مدد سے ان اعتراضات کا اندفاع کیا جاسکے۔

(۵) ہمارے علماء اسلاف نے جس طرز و انداز اور نہج وطریق پر تصانیف وتوالیف کی ہیں درس نظامی کے بغیر ان کے مندرجات کو سمجھنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا، لہٰذا ایک غرض تصانیف اسلاف کے طرزِ تحریر کو سمجھنا تھا۔

اب میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں کہ مندرجہ بالا امور کی آج بھی ہمیں ضرورت ہے یا نہیں اور اُن مقاصد کا حاصل کرنا آج بھی ہمارے اوپر لازم ہے کہ نہیں؟ کیا آج ہم قرآن وسنت سے بے نیاز ہوسکتے ہیں یا

اسلاف کی تصانیف کو پس پشت ڈال سکتے ہیں یا اسلامی عقائد پر ہونے والے اعتراضات سے چشم پوشی کی جا سکتی ہے ؟اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو پھر ہمیں بتایا جائے کہ درسِ نظامی کے بغیر وہ کونسا جدید علم ہے جس کے ذریعہ سے ہم ان مقاصد کو بطریق احسن حاصل کر سکتے ہیں۔تاکہ مروجہ نصاب میں ترمیم کر کے اس جدید علم کو نصاب کا حصہ بنا دیا جائے۔تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ادھر اسلام کو مکمل ضابطہ حیات کہا جاتا ہے اور قرآن وسنت کو ایک جامع دستورِ زندگی کی حیثیت سے رہنما تسلیم کیا جاتا ہے اور دوسری طرف ماہرین علوم دینیہ کو دنیاوی تقاضوں سے بے خبر بتایا جاتا ہے اور اس میں جدید علوم داخل کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔آخر وہ کونسا جامع ضابطہ حیات ہے جو ابھی تک جدید علوم کا تقاضا بھی کر رہا ہے اور جب تک اس کے ساتھ جدید علوم نہ ملیں تو وہ مکمل نہیں ہوتا۔

بیشک دنیاوی علوم تغیرات زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں اور ان میں عصری تقاضوں کے مطابق تبدیلی لائی جاتی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیاوی ضروریات روز بروز تغیر پذیر ہیں۔قسم قسم کے ایجادات اور نئی مصنوعات کی وجہ سے علوم میں ترمیم و تنسیخ کر کے انہیں نئے انداز کے مطابق ڈھالا جاتا ہے۔لیکن مدارسِ عربیہ کے نصاب کا تعلق تو خالصۃً دینی ضروریات سے ہے اور دینی ضروریات کو تغیرِ زمانہ سے متغیر نہیں کیا جا سکتا۔قرآن وسنت کی تشریح و تفہیم میں ہم پابند ہیں۔حلت و حرمت کے احکام میں ہم مقلد ہیں۔کسی زمانہ میں بھی کسی آیت یا حدیث کے مفہوم سے سرِ مُو انحراف یا اپنی مرضی کے مطابق ذرّہ بھر بھی تبدیلی لانے کی جرأت نہیں کی جا سکتی۔کوئی نیا نصاب جدید علوم میں خواہ مہارت تامہ کا باعث ہی کیوں نہ بن جائے۔جب تک مذکورۃ الصدر مقاصد کے حصول کا مکمل طور پر ضامن نہیں ہوگا۔کسی صورت میں بھی وہ مسلمانوں کے دینی حوائج و امور کے لیے سُودمند نہیں ہو سکتا۔ہاں اگر یہ نصاب اپنے مقاصد پُورے کرنے سے قاصر ہوتا۔قرآن وحدیث کی تفہیم اور مکمل دینی احکام میں کافی نہ ہوتا تو پھر ترمیم کا مطالبہ اپنے اندر کچھ معقولیت رکھتا ،لیکن جب یہ اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل میں پوری طرح کفیل ہے۔اب اس میں ترمیم کرنا دینی تعلیم سے جاہل کرنے کے مترادف نہیں تو اور کیا ہے؟ عام طور پر یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ دینی تعلیم سے فارغ التحصیل ہونے والے علماء دنیاوی امور سے بے خبر ہوتے ہیں۔اس لئے بھی اس تعلیم میں کچھ تبدیلی ہونی چاہئے۔اس بات کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے۔مکمل طور پر دینی تعلیم حاصل کرنے والا کبھی دنیاوی امور سے بے

خبر و بے شعور نہیں رہ سکتا بلکہ وہ تمام دنیاوی امور سے مکمل طور پر آگاہ و باخبر ہوتا ہے اور اگر دنیاوی امور سے مراد ایجادات اور نئی قسم کی مصنوعات ہیں تو بیشک دینی تعلیم کا یہ مقصد ہے اور ایک عالم دین ان میں ماہر ہے لیکن یہ ضروری کب ہے کہ تمام امور کا ذمہ دار ایک ہی شخص ٹھہرا دیا جائے۔ انسان فطرتاً مدنی الطبع ہے۔ مختلف قسم کے اشخاص کے اختلاط سے معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ اگر فرد واحد کو مختلف کاموں پر مامور کر دیا جائے اور متعدد امور ایک ہی شخص کے سپرد کر دیئے جائیں، تو وہ کسی ایک پر بھی عمل پیرا نہیں ہو سکے گا۔ اگر ایک ہی شخص معمار بنا دیا جائے اور وہی مزدور بھی ہو، پٹواری کا کام بھی اسی کے سپرد ہو۔ تحصیلدار کے فرائض بھی وہی انجام دے ترکھانوں والا کام بھی وہی کرے اور لوہار کے منصب پر بھی وہی فائز ہو تو بتایئے وہ کونسا کام صحیح طور پر مکمل کر سکے گا؟ اس طرح تو کسی صورت بھی معاشرہ کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ بلکہ ہر کام پر الگ الگ آدمی مقرر کیا جائے تو ہر ایک یکسوئی اور یکجہتی سے اپنا فرض سرانجام دے گا۔ اسی طرح اگر آپ دینی علوم کی تحصیل بھی ایک ہی شخص کے ذمہ لگائیں اور جدید علوم کا حصول بھی اسی کے حوالے ہو تو وہ کسی علم میں بھی آپ کی ضروریات سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

اب ''مشتے از خروارے'' کے طور پر چند مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جس سے یہ امر واضح ہو جائے کہ قرآن و حدیث کے اشکالات درسِ نظامی کے علاوہ کوئی جدید علم حل نہیں کر سکتا۔ اور وہ اشکالات اس قسم کے نہیں جنہیں فقط مولویانہ قیل و قال کہہ کر نظر انداز کیا جائے بلکہ ہر مذہب کا اہلِ علم اور کوئی بھی غیر مسلم ان اشکالات کو قرآن و سنت پر وارد کر سکتا ہے۔ مثلاً قرآن پاک میں ہے'' کنتم امواتا فاحیاکم ثم یمیتکم ثم یحیکم '' یعنی تم مردہ تھے، پھر خدا نے تمہیں زندہ کیا پھر وہی مارے گا اور پھر وہی خدائے تعالیٰ تمہیں زندہ بھی کرے گا''

اس آیت مبارکہ میں دو زندگیوں کا اور دو موتوں کا ذکر ہے ''کنتم امواتا'' میں ایک موت کا ذکر ہے '' ثم یمیتکم '' میں دوسری موت کا ذکر ہے۔ اس طرح '' فاحیاکم '' میں ایک زندگی کا ذکر ہے اور '' ثم یحیکم '' میں دوسری زندگی کا ذکر ہے۔ اب یہاں اشکال یہ ہے کہ جہاں دو کا ذکر ہے وہاں محیی (زندہ کرنے والا) کا ذکر بھی ہے '' فاحیاکم '' میں محیی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے کیونکہ اس کا معنیٰ ہی یہی ہے کہ خدائے تعالیٰ نے زندہ کیا۔ اسی طرح ''ثم یحیکم'' میں محی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے کیونکہ اس کا معنیٰ بھی یہی ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ تمہیں مارے گا۔

یہاں ممیت اللہ تعالیٰ کی ذات ہے تو آخراس کی کیا وجہ ہے؟ کہ جہاں دو حیاتوں کا ذکر ہے وہاں محیی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے تو ساتھ محیی کا ذکر ہے لیکن جہاں دو موتوں کا ذکر ہے وہاں ایک جگہ تو ممیت کا ذکر کیا، مگر دوسرے مقام پر نہیں۔ اگر پہلی موت کے ساتھ ممیت کا ذکر ہوتا اور دوسری موت میں اس کا ذکر نہ ہوتا تو پھر تو پہلی عبارت کے لئے قرینہ بن سکتی تھی یعنی جو ممیت پہلی جگہ مذکور تھا۔ دوسری جگہ بھی وہی مراد لیا جاسکتا لیکن یہاں برعکس ہے۔ دوسرے مقام پر ممیت کا ذکر ہے اور پہلی جگہ ممیت مذکور نہیں اور دوسری عبارت تو کبھی پہلی کے لئے قرینہ نہیں بن سکتی۔

اسی طرح دوسرا اشکال ہے کہ قرآن مجید میں ہے "الحمدللہ" اور یہاں اللہ میں جولام مذکور ہے گرائمر کی اصطلاح میں اسے لام جارہ کہا جاتا ہے اور جتنے جار ہوتے ہیں ان کے متعلق قانون ہے کہ ان کا تعلق کسی نہ کسی فعل یا شبہ فعل کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ تعلق کبھی محذوف ہوتا ہے اور کبھی مذکور۔ تو یہ بھی چونکہ لام جارہ ہے اور گرائمر کے لحاظ سے یہاں اس کا تعلق مذکور تو نہیں۔ لہٰذا گرائمر والے اسے محذوف نکالتے ہیں۔ ثبت یا ثابت اب ان دونوں میں سے کسی ایک ساتھ لام کا تعلق ہوتا ہے (اس لیے الحمد للہ کا یہ معنی کیا جاتا ہے کہ تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں) اب اس مقام پر اشکال یہ ہے کہ یہ ("ثبت یا ثابت جو محذوف نکالا جاتا ہے" یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے یا نحویوں کا کلام اگر کہا جائے یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے تو سراسر غلط ہے کہ یہ اللہ جل شانہ کا کلام نہیں ہے کیونکہ اگر یہ اللہ تعالیٰ جل شانہ کا کلام ہوتا تو پھر "ثبت یا ثابت" نکالنے کی ضرورت نہیں تھیں اللہ تعالیٰ کے کلام میں تو شک کی گنجائش نہیں، وہاں تو ایک ہی ہوتا فقط ثَبَتَ یا ثَابِتٌ اور اگر کہا جائے کہ یہ فعل محذوف اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں بلکہ بندوں کا کلام ہے تو پھر لازم آئے گا کہ خدا تعالیٰ کا کلام اپنا مقصد سمجھانے میں بندوں کے کلام کی طرف محتاج ہو، تو پھر وہ کلام بلیغ کیسے رہا جو اپنا مقصد بھی نہ سمجھا سکے۔

اس طرح ایک اشکال حدیث شریف پر وارد ہوتا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد "ماشاء اللہ کان وماشاء اللہ لم یکن" یعنی اللہ تعالیٰ جس چیز کا ارادہ فرماتا ہے وہ موجود ہوتا ہے اور جس کا ارادہ نہیں فرماتا وہ موجود نہیں ہوتی، بلکہ معدوم ہوتی ہے حالانکہ وجود اور عدم کا تعلق مشیت سے ہوتا ہے اللہ تعالیٰ جس کے وجود کا ارادہ کرے موجود ہوتا ہے اور جس کے عدم کا ارادہ کرے وہ معدوم ہوتا ہے۔ لہٰذا یوں کہنا چاہیے تھا کہ "ماشاء اللہ کان وماشاء اللہ لم یکن" یعنی اللہ تعالیٰ جسے چاہے وہ موجود ہوتا ہے اور جسے چاہے تو موجود نہیں ہوتا تا کہ وجود اور عدم

دونوں کا تعلق مشیت الٰہی سے ہوتا ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ وجود کا تعلق تو مشیت سے ہے اور عدم کا تعلق عدم مشیت سے ہے۔ حالانکہ وجود اور عدم دونوں کا تعلق مشیت سے ہوتا ہے۔

ہمارا چیلنج ہے کہ درس نظامی کے بغیر جدید علوم سے ان اشکالات کا جواب دیا جائے، ہمیں یقین ہے کہ جدید علوم میں کوئی کتنا ہی ماہر کیوں نہ ہو قرآن وسنت پر وارد ہونے والے ان اشکالات کا جواب نہیں دے سکتا حالانکہ یہ اشکالات تو عام فہم ہیں۔ اہل علم اگر مطالبہ کریں تو سینکڑوں اشکالات پیش کیے جاسکتے ہیں۔ جنہیں ماہرین علوم جدید شاید سمجھ ہی نہ سکیں۔ اس کے باوجود ہم یہ کہنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے کہ جدید علوم والے جو اشکال پیش کریں انشاء اللہ قرآن وسنت کی روح سے اس کا جواب دیا جائے گا۔

تجربہ شاہد ہے کہ مروجہ درس نظامی کو اس احتیاط وضبط سے مرتب کیا گیا ہے کہ اگر فقط ترتیب ہی بدل دی جائے تو مطلوبہ استعداد کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔ ہماری ناقص فہم اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہے کہ مدارسِ عربیہ کے نصاب کو کِن تقاضائے عصر کے ساتھ ہم آہنگ کرنا مقصود ہے ہاں وہ لوگ نصاب بدل دینے کا دعویٰ کرسکتے ہیں جو اسلاف کی تمام تصانیف کو یکسر بدل کر اُسی انداز میں لکھیں جس طرز پر وہ نصاب تعلیم مرتب کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ایں خیال است ومحال است وجنوں۔

لہٰذا بقول اقبال رحمۃ اللہ علیہ:

زِ اجتہادِ عالمان کم نظر　　　اقتداء بر رفتگاں محفوظ تر

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْ لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ☆

(سورۃ البقرۃ آیت ۲۷۳)

﴿۱﴾

ان فقیروں کے لئے جوراہِ خدا میں روکے گئے زمین میں چل نہیں سکتے، نادان انہیں تونگر سمجھے بچنے کے سبب تو انہیں ان کی صورت سے پہچان لے گا لوگوں سے سوال نہیں کرتے کہ گڑگڑانا پڑے اور تم جو خیرات کرو اللہ اسے جانتا ہے۔

﴿۲﴾

(صدقات) ان فقیروں کے لئے ہیں جو روکے گئے اللہ کی راہ میں، وہ نہیں طاقت رکھتے (روزی کمانے کے لئے) چلنے پھرنے کی زمین میں، گمان کرتا ہے ان کو بے خبر غنی بوجہ درگزر کرنے سوال کے، آپ پہچانتے ہیں ان کو ان کی علامات سے وہ نہیں سوال کرتے لوگوں سے کہ گڑگڑانا پڑے۔ اور جو مال تم خرچ کرتے ہو بیشک اللہ اسے جانتا ہے۔

مختصر مطلب:

رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں چار سو کی تعداد میں مہاجرین صحابہ کرام رہتے تھے، جن کا کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا، وہ مسجد میں ہی رہے تھے، نبی کریم ﷺ ان کے لئے ایک بڑا چبوترہ بنوادیا جس پر کھجور کی لکڑیوں کی چھت تھی، اس چھپر نما چبوترہ کو عربی میں ''صفہ'' کہا جاتا ہے۔ وہاں بیٹھ کر قرآن پاک یاد کرنے اور احادیث نبویہ کو یاد کرنے اور اسی

صفہ میں ان کے رہنے کی وجہ سے ان حضرات کو اصحابِ صفہ کہا گیا۔ رب تعالیٰ نے ان لوگوں کو صدقات کا مستحق قرار دیا کہ ان لوگوں نے اپنے آپ کو رب تعالیٰ کی راہ میں وقف کیا ہوا ہے۔ یہ لوگ روزی کمانے کے لئے زمین میں چلنے پھرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اور یہ لوگ دوسروں سے سوال نہیں کرتے تھے کہ گڑگڑانا پڑے۔ ان کے سوال نہ کرنے یعنی سوال کرنے سے درگزر کرنے کی وجہ سے بے خبر لوگ ان غنی سمجھتے ہیں۔ حقیت یہ ہے کہ وہ خوددار ہیں کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھلاتے۔ اس لئے تم اپنے صدقات ان کو دیا کرو، اور جو مال بھی تم اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے وہ تمہیں جزاءعطاء فرمائے گا۔

شانِ نزول:

مختصر مطلب جو بیان کیا گیا ہے اس سے واضح ہو رہا ہے کہ یہ آیۃ کریمہ اصحابِ صفہ کے حق میں نازل ہوئی کہ ان کو صدقات دیے جائیں، کیونکہ انہوں نے اپنے آپ کو اللہ کی راہ میں روک رکھا ہے۔

تنبیہ: اگرچہ آیۃ کریمہ اصحابِ صفہ کے حق میں نازل ہوئی، لیکن اپنے مضمون کے لحاظ پر اس کا حکم عام ہے۔

"ثم تتناول الآية كل من دخل تحت صفة الفقراء غابر الدهر"

یعنی یہ آیۃ تمام فقراء کا صدقہ کا مستحق ہونا ظاہر کر رہی ہے کہ جو فقیر بھی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں وقف کر دیں وہی صدقات و خیرات کے مستحق ہیں۔ (قرطبی)

صرف مہاجرین فقراء کی تخصیص کیوں؟

بظاہر ذہنوں میں یہ بات آتی ہے کہ آیۃ کریمہ کا نزول صرف مہاجرین فقراء صحابہ کرام کے حق میں کیوں ہوا، انصار کا ذکر کیوں نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے۔

"وانما خص فقراء المهاجرين بالذكر لأنه لم يكن هناك سواهم وهم اهل الصفة وكانوا نحوا من اربع مائة رجل"

صرف فقراء مہاجرین کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ اس وقت ان کے بغیر کوئی فقیر نہیں تھا، یہ اصحابِ

صفہ تھے، ان کی تعداد تقریباً چار سو تھی۔ (قرطبی)

"لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ"

"(صدقات و خیرات) ان فقروں کے لئے ہیں جو روکے گئے اللہ کی راہ میں۔"

چونکہ اس سے پہلے مال خرچ کرنے کا ذکر ہو رہا ہے اس لئے "لـلـفـقـراء" کا تعلق یا فعل محذوف سے ہے معنوی طور پر عبارت اس طرح ہوگی" اجـعـلـوا مـا تـنـفقـونه للفقراء" جو تم خرچ کرو وہ فقراء پر کرو۔ یا عبارت کی تقدیر یہ ہوگی"صدقاتکم للفقراء" تمہارے صدقات صرف فقراء کے لئے ہیں۔

اللہ کی راہ میں روکے جانے کا کیا مطلب؟ اس کا مطلب یہ ہے "حبسهـم الـجـهـاد والـعـمـل فـی مرضاة الله" ان کو جہاد نے روک رکھا ہے کہ وہ ہر وقت جہاد کے لئے اپنے آپ کو تیار رکھتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ ارشاد فرمائیں تو ہم جہاد کے لئے چلے جائیں۔

اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی کے لئے اپنے آپ کو روک کر رکھا ہوا ہے کہ وہ اپنے تمام اوقات کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے میں صرف کرتے ہیں۔ (روح المعانی)

"قال ابوذر کنت من اهل الصفة وکنااذاامسیناحضرنا باب رسول الله ﷺ فیأمر کل رجل فینصرف برجل ویبقی من اهل الصفة عشرة او اقل فیؤتی النبی ﷺ بعشائه ونتعشی معه فاذا فرغنا قال رسول الله ﷺ ناموا فی المسجد"

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں اصحابِ صفہ سے تھا، جب شام ہوتی تو ہم رسول اللہ ﷺ کے دروازے پر حاضر ہوتے، آپ ایک ایک شخص کے ساتھ اصحابِ صفہ سے ایک ایک فرد کو ساتھ بھیجتے جو ان کو کھانا کھلاتے۔ جب اصحابِ صفہ دس آدمی یا دس سے کم رہ جاتے تو وہ نبی کریم ﷺ اپنے ساتھ رکھ لیتے۔ آپ کے پاس شام کا کھانا آتا تو ہم لوگ آپ کے ساتھ کھانا کھاتے۔ اور جب ہم کھانے سے فارغ ہوتے تو آپ ارشاد فرماتے اب مسجد میں سو جاؤ۔ (قرطبی)

تنبیہ: بعض حضرات نے آیۃ کریمہ کا شانِ نزول روایت سعید بن جبیر کے مطابق پیش کیا ہے۔

"عن سعید بن جبیر ھم قوم اصابتھم الجراحات فی سبیل اللہ تعالی فصاروازمنی فجعل لھم فی اموال الناس حقا"

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جن لوگوں کا اس آیۃ کریمہ میں ذکر ہے یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں، یعنی جہاد میں زخمی کر دیا گیا تھا وہ اپاہج ہو گئے تھے، چلنے پھرنے کی ان کا طاقت نہ تھی، ان کو صدقات وخیرات کا مستحق قرار دیا۔

علامہ سید محمود آلوسی رحمہ اللہ اس کا جواب یوں دیتے ہیں۔

"ولعل المقصود فی الروایتین بیان بعض افراد ھذا المفھوم ودخولہ فیہ اذذاک دخولا اولیا لاالخطر اذ ھذا الحکم باق الی یوم الدین"

دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نہیں، کہ آیۃ کریمہ نازل تو اصحابِ صفہ کے حق میں ہوئی ہو، لیکن اپنے مفہوم کے لحاظ ان پر افراد کو بھی شامل ہو جو جہاد میں زخمی ہو کر معذور ہو گئے تھے، بلکہ آیۃ کریمہ اپنے عمومی مفہوم کے لحاظ سے تا قیامت ان لوگوں کو شامل ہے جو اپنے آپ کو دین کے لیے وقف کریں گے اور خرچ کے لیے محتاج ہوں گے، وہ صدقات وخیرات کے مستحق ہوں گے۔ (روح المعانی)

راقم کے نزدیک شانِ نزول کی دونوں روایتوں میں اس لئے بھی تضاد نہیں کہ جہاد میں معذور ہونے والے لوگ بھی اصحاب صفہ میں سے ہی تھے۔

"لَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ ضَرۡبًا فِى الۡاَرۡضِ"

"وہ نہیں طاقت رکھتے (روزی کمانے کے لئے) زمین میں چلنے پھرنے کی۔"

"(لایستطیعون) لاشتغالھم بذلک (ضربا فی الارض) ای مشیافیھاو ذھاباللتکسب والتجارۃ وھم اھل الصفۃ رضی اللہ عنھم قالہ ابن عباس ومحمد بن کعب القرظی وکانوا نحوامن ثلاث مائۃ ویزیدون وینقصون من فقراء المھاجرین یسکنون سقیفۃ

المسجدیستغرقون اوقاتھم بالتعلم والجھاد وکانوا یخرجون فی کل سریۃیبعثھا رسول اللہ ﷺ" (روح المعانی)

ان لوگوں نے اپنے آپ کواللہ کی راہ میں روکے ہوئے تھا،اس لئے وہ کسبِ معاش کے لئے اور تجارت کے لئے کہیں سفرنہیں کر سکتے تھے،وہ اصحاب صفہ تھے،حضرت ابن عباس اورمحمد بن کعب قرظی کہتے ہیں وہ تقریباً تین سو کی تعداد میں تھے،جن میں کمی وبیشی ہوتی رہی۔یعنی تین چارسو کی تعداد میں تھے،یہ لوگ مہاجرین تھے اورفقیر تھے،مسجد کی چھت کے نیچے رہتے تھے،یعنی مسجد کے ساتھ ایک چھپر میں رہتے تھے،ضرورت کے وقت مسجد میں بھی سوجاتے تھے،یہ اپنے تمام اوقات دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے اور جہاد کرنے کے لئے وقف کئے ہوئے تھے،جب بھی رسول اللہ ﷺ کافروں کے کسی قبیلہ کی سرکوبی کے لئے بھیجتے تو یہی حضرات اس سریہ میں جاتے۔

(روح المعانی)

فائدہ: "قال علماؤنا وکانوا رضی اللہ عنھم فی المسجدضرورۃواکلوا من الصدقۃ ضرورۃ فلما فتح اللہ علی المسلمین استغنوا عن تلک الحال وخرجواثم ملکوا وتأمروا"

اصحابِ صفہ مسجد میں ضرورت کی وجہ سے رہتے رہے اورانہوں نے ضرورت کی وجہ سے صدقات کا مال بھی حاصل کیا،جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کوفتوحات سے نوازاتو اس احتیاج سے نکل کرغنی ہوگئے،مال کے مالک بن گئے،بلکہ کئی علاقوں کے ان میں سے امیر(حاکم)بنادئے گئے۔ (قرطبی)

اعادہ: اسی مقام پرعلامہ قرطبی رحمہ اللہ نے ایک حدیث کا اعادہ(دوبارہ تذکرہ)کیاتو ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے راقم بھی اس حدیث پاک کو دوبارہ ذکرکررہا ہے۔

"اخرج الترمذی عن البراء بن عازب (ولاتیمموا الخبیث منہ تنفقون)قال نزلت فینامعشرالانصار کنا اصحاب النخل قال فکان الرجل یأتی من نخلہ علی قدر کثرتہ

وقلتہ،وکان الرجل یأتی بالقنو والقنوین فیعلقه فی المسجد وکان اهل الصفة لیس لهم طعام فکان احدهم اذاجاع اتی القنو فیضربه بعصاه فیسقط من البسر والتمر فیأکل ،وکان ناس ممن لایرغب فی الخیر یأتی بالقنو فیه الشیص والحشف وبالقنو قد انکسر فیعلقه فی المسجد فانزل اللہ تعالی" یاایهاالذین امنوا انفقوا من طیبات"الآیة .

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں آیۃ کریمہ " ولاتیمموا الخبیث منه تنفقون" ہمارے بارے میں نازل ہوئی،ہم انصار کے قبائل کھجوروں کے باغوں کے مالک تھے۔ہم میں سے ہر شخص کھجوریں مناسب مقدار میں لاتا وہ تھوڑی ہوتیں یا زیادہ،اور کوئی شخص ایک یا دو گچھے(خوشے)لاتا اور مسجد کی دیوار کے ساتھ لٹکا دیتا۔اصحابِ صفہ کے پاس کھانے کے لئے طعام نہیں ہوتا تھا،ان میں سے جب کوئی بھوک محسوس کرتا تو وہ ان خوشوں کے پاس آتا،اپنے سوٹے سے ان سے کھجوریں گرالیتا،اور کھالیتا،بعض لوگ بھلائی کے کاموں میں زیادہ رغبت نہیں رکھتے تھے،وہ کھجوروں کا خوشہ لے آتے جس میں ردی اور خشک کھجوریں بھی ہوتیں۔ کوئی ٹوٹا ہوا خوشہ لے آتا وہ مسجد کی دیوار سے لٹکا دیتا،تو اللہ تعالیٰ نے آیۃ کریمہ " یاایها الذین امنوا انفقوا من طیبات الایة" کو نازل فرمایا جس میں اچھی چیز رب تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم دیا اور ردی اور نکمی چیز سے منع فرمایا۔ (قرطبی)

اصحابِ صفہ اور کرامت ابی بکر رضی اللہ عنہ:

"عن عبد الرحمن بن ابی بکر ان اصحاب الصفة کانوا اناسا فقراء وان رسول اللہ ﷺ قال مرة من کان عنده طعام اثنین فلیذهب بثلاثه ومن کان عنده طعام اثنین فلیذهب بثلاثة و من کان عنده طعام اربعة فلیذهب بخامس بسادس او کما قال وان ابا بکر تعشی عند النبی ﷺ ثم لبث حتی صلیت العشاء ثم رجع فلبث حتی نعس

رسول الله ﷺ فجاء بعد ما مضى من الليل ما شاء الله قالت له امرأته ما حبسک عن اضيافک او قالت ضيفک قال او ما عشيتيهم قالت ابوا حتى تجئ قد عرضوا عليهم فغلبوا قال فذهبت انا فاختبأت وقال يا غنثر فجدع وسب قال كلوا لا هنيأ وقال والله لا اطعمه ابدا قال وايم الله ما كنا نأخذ من لقمة الا ربا من اسفلها اكثر منها قال حتى شبعنا وصارت اكثر مما كانت قبل ذلک فنظر اليها ابو بكر فاذا هي كما هي او اكثر، قال لأمراته يا اخت بني فراس ما هذا قالت لا وقرة عيني لهي الآن اكثر منها قبل ذلک بثلاث مرار قال فاكل منها ابو بكر وقال انما ذلک من الشيطان يعني يمينه ثم اكل منها لقمة ثم حملها الى رسول الله ﷺ فاصبحت عنده قال وكان بيننا وبين قوم عقد فمضى الأجل ففرقنا اثناعشر رجلا مع كل رجل منهم اناس الله اعلم كم رجل قال الا انه بعث معهم فاكلوا منها اجمعون او كما قال"

(مسلم،بخاری)

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر فرماتے ہیں، بیشک اصحابِ صفہ فقیر (غریب) لوگ تھے۔اور تحقیق رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ فرمایا جس شخص کے پاس دو آدمیوں کا طعام ہے وہ تیسرے آدمی کو ساتھ لے جائے،اور جس شخص کے پاس چار آدمیوں کا طعام ہے وہ پانچویں اور چھٹے کو ساتھ لے جائے،او کما قال،اور بیشک ابو بکر اپنے ساتھ تین آدمیوں کو لے آئے،اور نبی کریم ﷺ دس آدمیوں کو ساتھ لے گئے،اور ابو بکر کے گھر کے تین افراد تھے،عبدالرحمٰن بن ابی بکر کہتے ہیں ایک میں اور میرے باپ اور میری ماں،راوی ابوعثمان کہتے ہیں مجھے معلوم نہیں کہ عبدالرحمٰن نے اپنی زوجہ یا اپنے گھر کے کسی خادم کا ذکر کیا ہو،حضرت ابو بکر شام کو نبی کریم ﷺ کے ساتھ رہے،پھر وہاں ہی ٹھہرے رہے یہاں تک کہ عشاء کی نماز ادا کی گئی،پھر لوٹ کر حضور ﷺ کے پاس ہی رک گئے،یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ کو اونگھ آنے لگی تو یہ رات کا کچھ حصہ گذرنے کے بعد گھر تشریف لے آئے۔آپ کی زوجہ نے کہا تمہیں اپنے مہمانوں سے کس چیز نے روک رکھا تھا،آپ نے کہا

کیا ابھی تک تم نے ان کو شام کا کھانا نہیں کھلایا؟ آپ کی زوجہ نے کہا انہوں نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا تھا، یہاں تک کہ آپ آ جائیں۔ان پر کھانا پیش کیا تھا لیکن انہوں نے انکار کر دیا تھا،عبدالرحمٰن کہتے ہیں میں چھپنے لگ گیا۔حضرت ابوبکر نے (غصہ سے) فرمایا اے سست، تیری ناک کٹ جائے،اس طرح آپ نے عبدالرحمٰن سے سخت کلام فرمایا، اور آپ نے مہمانوں کو کہا کہ کھانا کھاؤ تم نے خوش گوار طریقہ سے کھانا نہیں کھایا، قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔(دوسری روایت میں ہے کہ مہمانوں نے بھی یہ کہہ دیا" **واللہ ما نطعمہ حتی تطعمہ ثم اکل واکلوا** " قسم ہے اللہ تعالیٰ کی ہم بھی نہیں کھائیں گے یہاں تک کہ تم کھاؤ، پھر آپ نے کھایا اور انہوں نے بھی کھایا)

عبدالرحمٰن کہتے ہیں قسم ہیں اللہ تعالیٰ کی ہم کوئی لقمہ نہیں اٹھاتے تھے مگر وہ نیچے سے اور زیادہ بڑھ جاتا، یہاں تک کہ ہم نے سیر ہو کر کھانا کھالیا، وہ کھانا پہلے سے زیادہ تھا۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کھانے کو دیکھا وہ اسی طرح تھا جس طرح تھا، بلکہ پہلے سے زیادہ تھا۔آپ نے اپنی زوجہ کو کہا اے بنی فراس کی بہن یہ کیا؟ انہوں نے عرض کیا، اے میری آنکھوں کی ٹھنڈک، یہ کھانا تو پہلے سے زیادہ ہے۔یہ کلمات آپ کی زوجہ نے تین مرتبہ کہے۔عبدالرحمٰن کہتے ہیں حضرت ابوبکر نے کھانا کھایا وہ (کھانے سے انکار کی) قسم شیطان کی جانب سے تھی۔پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس کھانے میں کچھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے گئے۔ہمارا ایک قوم سے ان دنوں میں معاہدہ تھا وہ بارہ قبائل تھے، ہر قبیلے کے سردار کی طرف ہم نے کھانا بھیجا، پھر انہوں نے اپنے قبیلہ کے لوگوں میں بانٹا، ایک ایک قبیلہ میں کتنے کتنے لوگ تھے وہ کھانا سب نے کھایا۔

حدیث پاک کی وضاحت:

حدیث پاک سے فائدہ حاصل ہوا کہ ایثار کرنا یعنی اپنی حاجت کے باوجود دوسروں پر رحم کرنا اور مہربانی کرنا افضل ہے۔اور جب مہمان زیادہ ہو جائیں تو لوگوں کو چاہیے کہ وہ ان کو تقسیم کر لیں، ہر شخص اپنی طاقت کے مطابق

مناسب مقدار میں مہمانوں کوساتھ لے جائے۔

اور قوم کے سردار کو چاہیے کہ وہ لوگوں کو کہے اور ان کو حکم دے کہ جتنے مہمان لے جانے کی کسی کی طاقت ہے وہ لے جائے۔اور یہ فائدہ حاصل ہوا کہ واضح ہوا ''کان النبی ﷺ وھو افضل الامور والسبق الی السخاء والجود'' نبی کریم ﷺ تمام معاملات میں سب سے افضل تھے، سخاوت اور جود کی طرف آپ پیش پیش (سب سے آگے) ہوتے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ اتنی تعداد میں اصحاب صفہ کو لے گئے جتنی تعداد آپ کے گھر کے افراد کی تھی۔اس طرح آپ گھر کے ایک فرد کے مقابل ایک فقیر مہمان کو کھانا کھلانے کے لئے ساتھ لے گئے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر آپ کے بیٹے کی زوجہ نہیں تھی بلکہ وہ اپنے ماں باپ کے گھر گئی ہوئی تھی تو آپ نے بھی نبی کریم ﷺ کے طریقہ پر کامل عمل کیا کہ آپ کے گھر کے افراد بھی تین تھے اور مہمان بھی تین ہی لے کر گئے۔اور اگر آپ کی بہو گھر ہی تھی تو پھر بھی آپ ایک دو کی نسبت سے زیادہ مہمان لے کر گئے۔اور باقی لوگوں کو گھر کے دو افراد کے مقابل ایک فقیر مہمان لے جانے کا حکم دیا گیا۔

''وفی ھذا جواز من عندہ ضیفان الی اشغالہ ومصالحہ اذا کان لہ من یقوم بامورھم ویسد مسدہ کما کان لابی بکر ھنا عبد الرحمٰن رضی اللہ عنھما''

اور حدیث پاک سے یہ مسئلہ واضح ہوا کہ اگر کوئی شخص اپنے مہمانوں کو کھانا کھلانے پر کسی کو مقرر کر کے اور اپنا قائم مقام بنا کر خود اپنے کسی کام میں چلا جائے تو یہ جائز ہے جیسا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے بیٹے عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے سپرد اپنے مہمانوں کے معاملات کر کے خود نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

''وفیہ ما کان علیہ ابوبکر من الحب للنبی ﷺ والانقطاع الیہ وایثارہ فی لیلہ ونھارہ علی الاھل والاولاد والضیفان وغیرھم''

اور حدیث پاک سے یہ واضح ہوا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نبی کریم ﷺ سے بہت زیادہ محبت تھی۔یہی وجہ تھی کے آپ نے اپنے اہل وعیال اور مہمانوں پر نبی کریم ﷺ کے بیٹھنے کو ترجیح

دی۔دن رات آپ کا یہی معمول تھا،مہمانوں نے کھانا کھانے سے جوانکار کیا تھا کہ جب تک حضرت ابوبکر نہیں آئیں گے ہم نہیں کھانا کھائیں گے،اس کی وجہ یہ تھی۔

"ھذافعلوہ ادباورفقابابی بکر فیماظنوہ لانھم ظنواانہ لا یحصل لہ عشاء من عشائھم"

کہ مہمانوں نے ادب واحترام کا پاس کیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ رحمت کرنا مقصود تھا کہ ایسا نہ ہو کہ ہم کھانا کھالیں اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لئے کھانا باقی نہ رہے۔

مسئلہ: مہمان کے لئے بہتر یہ ہے کہ مہمان نواز کی مرضی کے مطابق اس کے کہنے پر کھانا کھالے،تا کہ مہمان نواز کو تکلیف نہ ہو اگر چہ مہمان بعض اوقات اپنے خیال کے مطابق بہتر سوچتا ہے لیکن مہمان نواز کی طبیعت سے ناواقف ہوتا ہے جو پریشانی کا سبب بنتا ہے۔

"وفیہ ان من حلف علی یمین فر أی غیرھا خیرا منھا فعل ذلک و کفر عن یمینہ"

اور حدیث پاک سے یہ مسئلہ سمجھ میں آیا کہ جب کوئی شخص قسم اٹھادے اور اس کا غیر کام بہتر دیکھے تو قسم توڑ دے،اور قسم کا کفارہ ادا کردے۔

جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مہمانوں کے لئے اپنی قسم کو توڑ دیا تا کہ نبی کریم ﷺ کے بھیجے ہوئے مہمان کھانا کھانے سے محروم نہ رہ جائیں۔

یہ بھی خیال رہے کہ مہمانوں کی قسم نہیں ٹوٹی تھی کیونکہ ان کی قسم مشروط تھی کہ ہم اس وقت تک کھانا نہیں کھائیں گے جب تک تم نہیں کھاؤ گے،لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی قسم مطلق تھی کہ میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ لہٰذا صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قسم کو توڑا،مہمانوں کی خاطر اور رسول ﷺ کے ارشاد کے مطابق کہ اگر تم قسم اٹھالو تو اس کا غیر بہتر دیکھو تو اس غیر پر عمل کر کے قسم توڑ دو اور کفارہ دے دو۔

"وفیہ کرامۃ ظاھرۃ لابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ وفیہ اثبات کرامات الاولیاء وھو مذھب اھل السنتہ خلافاللمعتزلۃ"

اس حدیث پاک سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی کرامت کا ثبوت واضح طور پر مل گیا۔کیونکہ کھانا

اتنا زیادہ ہوگیا جو کثیر لوگوں نے کھایا۔اسی حدیث سے اولیاء کرام کی کرامت کا ثبوت بھی ملتا ہے، یہی مذہب اہلِ سنت کا ہے جو حق ہے۔معتزلہ کراماتِ اولیاء کے قائل نہیں۔ (نووی شرح مسلم ج۲ص۱۹۳)

''عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال لی رسول اللہ ﷺ الحق الی اھل الصفۃ فادعھم قال واھل الصفۃ اضیاف الاسلام لا یلوون علی اھل ولا مال اذا اتتہ صدقۃ بعث بھا الیھم ولم یتناول منھا شیأ واذا اتتہ ھدیۃ ارسل الیھم وأصاب منھا''

(بخاری ومسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، تم اہلِ صفہ کو ملو، ان کو دعوت دو، پھر آپ نے فرمایا اصحابِ صفہ اسلام کے مہمان ہیں وہ اہل اور مال کی طرف متوجہ نہیں ہوتے (وہ صرف اللہ کی راہ میں اپنے آپ کو وقف کئے ہوئے ہیں) جب حضور ﷺ کے پاس صدقہ آتا تو آپ وہ سارے کا سارا ان کی طرف بھیج دیتے۔آپ خود اس سے کچھ بھی نہیں کھاتے تھے، اور جب آپ کے پاس ہدیہ آتا تو آپ ان کی طرف بھیجتے اور خود بھی اس سے کھالیتے تھے۔ (درمنثور)

''واخرج ابو نعیم فی الحلیۃ عن فضالۃ بن عبید قال کان رسول ﷺ اذا صلی با لناس یخر رجال من قیامھم فی صلاتھم لما بھم من الخصاصۃ وھم اھل الصفۃ حتی یقول الاعراب ان ھؤلاء مجانین''

فضالہ بن عبید فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ جب لوگوں کو نماز پڑھاتے تو کئی شخص بھوک کی وجہ سے نماز میں کھڑے کھڑے گر جاتے، وہ اصحاب صفہ تھے، یہاں تک کہ دیہات سے آئے ہوئے لوگ ان کو پاگل سمجھتے۔ (درمنثور)

یعنی اعرابی لوگ ان کی پریشان حالی سے ناواقفی کی وجہ سے انہیں پاگل سمجھتے، حالانکہ وہ عظیم عقلمند تھے۔

''واخرج ابن سعد وعبد اللہ بن احمد فی الزوائد الزھد وابو نعیم عن ابی ھریرۃ قال کان من اھل الصفۃ سبعون رجلا لیس لواحد منھم رداء''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اصحابِ صفہ میں سے ستر صحابہ کرام وہ تھے جن کے پاس

اوڑھنے والی چادر نہیں تھی۔ (درمنثور)

یعنی صرف تنگیز ڈھانپنے کے لئے ان کے پاس کمر سے باندھنے والی چادر ہوتی، اسی میں ان کی زندگی بسر ہوتی۔

"واخرج ابو نعیم عن الحسن قال بنیت صفة لضعفاء المسلین فجعل المسلمون یو غلون الیها مااستطاعوا من خیر وکان رسول ﷺ یاتیهم فیقول السلام علیکم یااهل الصفة فیقولون وعلیک السلام یا رسول الله فیقول کیف اصبحتم فیقولون بخیر یارسول الله، فیقول انتم الیوم خیرام یوم بعدی علی احدکم بجفنةویراح علیه باخری، ویغدوفی حلة ویروح فی اخری فقالوا انحن یومئذخیر یعطیناالله فنشکر فقال رسول ﷺ بل انتم الیوم خیر"

حضرت حسن سے مروی ہے کہ ضعیف (غریب) مسلمانوں کے لئے ایک چبوترہ (چھپرنما) بنایا گیا، مسلمان اپنی طاقت کے مطابق خیرات سے ان کی امداد فرماتے، رسول اللہ ﷺ ان کے پاس آتے اور فرماتے اے اصحابِ صفہ السلام علیکم، وہ عرض کرتے یارسول اللہ ﷺ "وعلیک السلام،، آپ ان سے پوچھتے تم نے صبح کیسے کی، وہ کہتے یارسول اللہ بہتر پائی ہے۔ آپ نے ان سے پوچھا آج تم بہتر ہو یا اس دن بہتر ہو گے جب صبح تمہارے سامنے کھانے کے برتن رکھے جائیں گے، اور شام کو اور برتن کھانے کے رکھے جائیں گے، اور صبح تمہیں ایک جوڑا پہنایا جائے گا، اور شام کو اور جوڑا دیا جائے گا؟ انہوں نے عرض کیا کہ وہ دن ہمارے لئے بہتر ہوں گے جن میں ہمیں رب تعالیٰ یہ نعمتیں دے گا۔ ہم اس کے شکر گزار رہیں گے۔ آپ نے فرمایا نہیں، آج تم بہتر ہو۔ (درمنثور)

واضح ہوا کہ فقیر صابر غنی شاکر سے بہتر ہے۔ اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے فقر کو پسند فرمایا۔

"واخرج ابن سعد عن محمد بن کعب القر ظی فی قوله "للفقراء الذین احصروا فی سبیل الله" قال هم اصحاب الصفة وکانوا لا منازل لهم بالمدینة ولا عشائرفحث الله علیهم الناس بالصدقة"

محمد بن کعب قرضی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشادگرامی "للفقراء الذین احصروافی سبیل اللہ" اصحابِ صفہ کے حق میں نازل ہوا۔ اصحابِ صفہ وہ لوگ تھے جن کے پاس مدینہ طیبہ میں کوئی گھر نہیں تھا اور نہ ہی ان کے قبائل وہاں موجود تھے۔ (درمنثور)

"واخرج سفیان وعبدابن حمید وابن جریر وابن المنذروابن ابی حاتم عن مجاهد فی قوله "للفقراء الذین احصروافی سبیل الله"قال هم مهاجر وقریش بالمدینة مع النبیﷺ امروا بالصدقة علیهم،،

مجاہد فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشادگرامی "للفقراء الذین احصروافی سبیل الله" (اصحابِ صفہ کے حق میں نازل ہوا) وہ قریش مہاجرین تھے جو نبی کریمﷺ کی معیت میں مدینہ طیبہ میں رہتے ،ان کے متعلق صدقہ دینے کا حکم دیا گیا۔ (درمنثور)

"واخرج ابن جریر وابن ابی حاتم عن السدی "للفقراء الذین احصروافی سبیل الله"قال حصرهم المشرکون فی المدینةلایستطیعون ضربافی الارض یعنی التجارة"

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشادگرامی "للفقراء الذین احصروافی سبیل الله" ان لوگوں کے حق میں نازل ہوا ہے جن کو مشرکین نے مدینہ طیبہ میں روک رکھا تھا، یعنی وہ مشرکین سے جہاد کرنے کی غرض سے مدینہ طیبہ میں ہی رہتے تھے، تجارت کے لئے کہیں جانے کی وہ طاقت نہیں رکھتے تھے۔ (درمنثور)

''طاقت نہ رکھنا' واضح ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اللہ تعالیٰ کی رضاء حاصل کرنے کے لئے اور کافروں کی سرکوبی کے لئے اور دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے مسجد کے ساتھ ملحق چھپر میں ٹھہرے ہوئے تھے، ان پر کوئی جبر نہیں تھا، بلکہ خود ہی انہوں نے اپنے کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں وقف کیا ہوا تھا۔

"واخرج عبدالرزاق وابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم عن قتاده "للفقراء الذین احصروا فی سبیل الله"قال حصروانفسهم فی سبیل الله للغزوة لایستطیعون تجارة"

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی "للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ" ان لوگوں کے حق میں نازل ہوا جنہوں نے اپنے آپ کو غزوات کے لئے روک رکھا تھا، وہ تجارت کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ (درمنثور)

"واخرج عبد بن حمید وابن المنذر وابن ابی حاتم عن سعید بن جبیر "للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ" قال قوم اصابتهم الجراحات فی سبیل اللہ فصار وازمنی فجعل لهم فی اموال المسلمین حقا"

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی "للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ" ان لوگوں کے حق میں نازل ہوا جن کو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کی وجہ سے زخمی کر دیا گیا تھا اور وہ اپاہج ہو کر معذور ہو گئے تھے، رب تعالیٰ نے مسلمانوں کے مالوں سے ان کا حق مقرر فرمادیا کہ صدقات وخیرات ان کو دیئے جائیں۔

تنبیہ: اس آخری روایت اور پہلی روایت میں کوئی تعارض نہیں، ان میں تطبیق گذشتہ اوراق میں اسی آیۃ کی وضاحت میں تفسیر روح المعانی کے حوالہ کے ضمن میں دیکھئے۔

محصرین اوران پر مال خرچ کرنا:

احصار کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کو سفر کرنے، تجارت کرنے، حج کرنے سے مرض یا بڑھاپا یا دشمن یا خرچ کا نہ ہونا روک دیں۔ اصحابِ صفہ کو تجارت کے لئے سفر کرنے سے ان کا اپنے آپ کو وقف کرنا رکاوٹ کا سبب تھا۔ ان کا اپنے آپ کو دینی مشاغل میں وقف کرنے کے ساتھ ساتھ خصوصی طور پر "انهم حصروا انفسهم ووقفوها علی الجهاد،، (بیشک انہوں نے اپنے آپ کو جہاد کے لئے وقف کر رکھا تھا) جہاد کے لئے وقف کرنا تھا۔

"وان قوله "فی سبیل اللہ" مختص بالجهاد فی عرف القرآن،،

بیشک اللہ تعالیٰ کا قول "فی سبیل اللہ" قرآن پاک میں جہاد کے لئے استعمال ہوا ہے۔

"ولان الجهاد کان واجبا فی ذلک الزمان و کان تشتد الحاجة الی من یحبس نفسه

للمجاهدة مع الرسول ﷺ فیکون مستعدالذلک متی مست الحاجة ، فبین تعالی فی هؤلاء الفقراء ان هم بهذه الصفة"

نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں جہاد واجب تھا، اس لئے بہت ضروری تھا کہ کچھ لوگ اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جہاد کرنے کے لئے وقف کردیں، اور اپنے آپ کو تیار رکھیں کہ جب ضرورت در پیش آئے تو یہ میدانِ جہاد میں پہنچ جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان فقراء یعنی اصحابِ صفہ کا حال بیان فرمایا کہ وہ اس صفت پر پورے اترتے تھے۔

ان کے محتاج ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے صدقات مقرر فرمائے۔ ان کو صدقات دینے میں بھلائی کی وجوہ پائی جاتی ہیں۔

(۱) ان فقیروں کی غربت محتاجی کو دور کرنا۔

(۲) ان کے دل کو صدقات کے ذریعے تقویت پہچانا کہ انہوں نے جہاد میں شریک ہونا ہے۔ یہ نہ ہو کہ وہ جسمانی کمزوری اور بھوک کی وجہ سے پریشان نہ ہوں۔

(۳) ان کے لئے صدقات وخیرات کا اس لئے بھی حکم دیا کہ مجاہدین کی تقویت سے اسلام کو تقویت حاصل ہوگی۔

(۴) وہ بہت زیادہ محتاج ہونے کے بھی اپنی محتاجی کا ذکر کسی کے سامنے نہیں کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی احتیاجی کو ذکر کردیا۔ (ماخوذ از کبیر)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"ضرب،، کے مختلف معانی پہلے پارہ "ان یضرب" کی تشریح میں بیان کئے جاچکے ہیں، ان میں سے ایک معنی یہ ہے جو یہاں مراد ہے "یقال ضربت فی الارض اذا سرت فیها" جب کوئی شخص سیر کرے، زمین میں چلے تو وہ کہتا ہے "ضربت فی الارض "میں زمین میں چلا، میں نے سیر کی۔

"لایستطیعون ضربافی الارض " کا معنی یہ ہوگیا،، وہ طاقت نہیں رکھتے زمین میں چلنے کی۔

ان کے طاقت نہ رکھنے کی وجہ کیا تھی؟ وہ یہ تھی۔

"ثم عدم الا ستطاعة اما ان یکون لأن اشتغالهم بصلاح الدین وبأمر الجهاد یمنعهم من الاشتغال بالکسب و التجارة"

کہ وہ دین کی بہتری کے کاموں مشغول رہتے تھے اور اپنے آپ کو ہر وقت جہاد کے لئے تیار رکھتے تھے، اس لئے وہ کسب معاش اور تجارت کے لئے زمین میں سفر کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔

"وکانوا ملازمین المسجد ویتعلمون القرآن ویصومون" وہ ہر وقت مسجد میں رہتے تھے، اور قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرتے تھے، اور روزہ رکھتے تھے جس کی وجہ سے روزی کمانے کے لئے، تجارت کرنے کے لئے زمین میں چلنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے، اگر وہ تجارت کرنے کے لئے سفر کرتے تو ان کے دینی کاموں میں خلل واقع ہوتا۔ (ماخوذ از کبیر)

"یحسبهم الجاهل اغنیاء من التعفف"

"گمان کرتا ہے ان کو بے خبر غنی درگزر کرنے کی وجہ سے"۔

"الحسبان، هو الظن" یحسب لیا ہوا ہے "حسبان" سے جس کا معنی ہے گمان کرنا۔

عاصم، ابن عمر اور حمزہ کی قراءت میں "یحسب" سین کے فتحہ (زبر) سے ہے، اور کچھ باقی حضرات کی قراءت سین کے کسرہ (زیر) سے ہے "وهما لغتان بمعنی واحد" دونوں قراءتوں کے لحاظ پر معنی ایک ہی رہے گا کیونکہ لغتیں دو ہیں "وقرئ فی القرآن ماکان من الحسبان باللغتین جمیعاالفتح و الکسر"، قرآن پاک میں جہاں بھی "حسب یحسب"، استعمال اس دونوں لغتوں کو جائز رکھا گیا ہے کہ ماضی اور مضارع دونوں مکسور العین ہو یا ماضی مکسور العین ہو اور مضارع مفتوح العین ہو۔ (کبیر)

اعتراض: یہاں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان کو جاہل لوگ غنی سمجھتے ہیں کیونکہ وہ سوال کرنے سے درگزر کرتے ہیں۔ یہ صحابہ کرام کے زمانہ کی بات ہے۔ صحابہ کرام ہی ان کو غنی سمجھتے تھے تو صحابہ کرام کو جاہل کیوں

کہا گیا، حالانکہ وہ زمانہ کے امام تھے وہ اصحابِ علم تھے۔

جواب: " وقوله تعالى "الجاهل" لم يرد به الجهل الذى هو ضد العقل و انما اراد الجهل الذى هو ضد الاختبار"

"جاہل"، کبھی "علم وعقل" کی ضد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ فلاں شخص جاہل ہے یعنی عالم وعاقل نہیں۔ اور کبھی "جہل" استعمال ہوتا "اختبار" کی ضد کے طور پر۔ یعنی یوں کہا جائے کہ فلاں شخص جاہل ہے کیونکہ اسے واقع کی خبر ہی نہیں۔ آیۃ کریمہ "جاہل" کا استعمال اس دوسرے معنی میں ہے، پہلے معنی میں نہیں۔ راقم نے اسی وجہ سے "جاہل"، کا معنی "بے خبر" کیا ہے۔ اس لئے صحابہ کرام کو واقع سے بے خبر کہنے میں کوئی حرج نہیں "بے علم" کہنے میں حرج تھی وہ کہا نہیں گیا۔ (ماخوذ از کبیر)

"من التعفف" "تعفف کا لفظ "تفعل" کے وزن پر ہے۔ "عفة" سے لیا ہوا ہے۔

"ومعنى العفة فى اللغة ترك الشئ و الكف عنه" عفت کا لغوی معنی یہ ہے "کسی چیز کو چھوڑ دینا اور اس سے رک جانا" اب مکمل معنی یہ ہو گیا۔

"يحسبهم من لم يختبر امرهم اغنياء من التعفف عن السؤال فتركه للعلم و انما يحسبهم اغنياء لا ظهارهم التجمل و تركهم المسألة"

جو لوگ ان کے حالات کی خبر نہیں رکھتے وہ ان کو غنی سمجھتے ہیں کیونکہ وہ سوال نہیں کرتے بلکہ اپنے ظاہری حال کو سنوار کر رکھتے ہیں تو دوسرے حضرات ان کے ظاہری حال کو دیکھ کر اور سوال کرنے سے درگذر کرنے کو دیکھ کر انہیں غنی سمجھتے ہیں۔ (از کبیر)

تنبیہ: "والتعفف ترك الشئ و الاعراض عنه مع القدرة على تعاطيه"

یعنی "تعفف" کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایک چیز کے حاصل کرنے پر قادر ہو تو پھر چھوڑ دے۔ اگر ایک چیز کی قدرت ہی نہ رکھے تو اسے چھوڑ دینا "تعفف" نہیں۔ (روح المعانی)

مسئلہ: آیۃ کریمہ سے یہ مسئلہ حاصل ہوا کہ ظاہری حالت کو سنوار کر رکھنے سے انسان کا فقر زائل نہیں ہوتا۔

"ان اسم الفقر یجوز ان یطلق علی من له کسوة ذات قیمة ولا یمنع ذلک من اعطاء الزکوة الیه"

اگر ایک شخص نے قیمتی لباس پہنا ہوا ہو لیکن صاحبِ نصاب نہ ہو اور حاجتمند ہو تو وہ فقیر ہے۔ اسے زکوٰۃ دینے سے کسی کو منع نہ کیا جائے، بلکہ وہ مستحق ہے کہ اسے زکوٰۃ دی جائے۔ (قرطبی)

"تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمَاهُمْ" "آپ پہچانتے ہیں ان کو، ان کی علامات سے۔"

یہ خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے کہ آپ ان کو، ان کی علامات سے پہچانتے ہیں، یا ہر اس شخص کو خطاب ہے جو ان کی حالت سے واقف تھا۔ (بیضاوی)

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

"سیما" "سمة" سے لیا ہوا ہے "سمة" کا اصل مادہ "وسم" ہے جس کا معنی ہے علامت، فاکلمہ سے واؤ کو عین کلمہ کی جگہ لے جا کر پھر واؤ ساکن مظہر ماقبل مکسور ہونے کی وجہ سے یا سے تبدیل کر دیا۔ (کبیر)

ان کی علامات کیا تھیں؟ اس میں مختلف اقوال ہیں۔

﴿۱﴾ ایک قول حضرت مجاہد رحمۃ اللہ کا ہے۔ (سیماھم) التخشع والتواضع" ان کی علامتیں یہ تھیں کہ وہ عاجزی اور خشوع سے رہتے تھے۔

﴿۲﴾ ربیع اور سدی رحمہما اللہ کہتے ہیں "اثر الجهد من الفقر والحاجة" کہ فقر اور حاجت کی وجہ سے ان کے چہرے پر مشقت کے اثرات تھے۔ یعنی ان کا ظاہری حال ان کے عجز پر دلالت کرتا تھا۔

﴿۳﴾ ضحاک رحمہ اللہ کہتے ہیں "صفرة الوانهم من الجوع" بھوک کی وجہ سے ان کے چہرے کا رنگ زرد رہتا تھا جو ان کے فقیر ہونے پر دلالت کرتا تھا۔

علامہ رازی رحمہ اللہ کا موقف:

آپ فرماتے ہیں میرے نزدیک یہ تمام وجوہ محلِ نظر ہیں، کیونکہ ان وجوہ سے ان کا ظاہر حال ان کے فقر پر

دلالت کررہا ہے، حالانکہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی "یحسبھم الجاھل اغنیاء من التعفف" (گمان کرتا ہے ان کو بے خبر غنی سوال سے درگذر کرنے کی وجہ) سے تو یہ پتہ چل رہا ہے کہ ان کے فقر کا کسی کو پتہ ہی نہیں چل سکتا تھا۔ آپ فرماتے ہیں۔

"ان المراد شئ آخرھو ان لعباد اللہ المخلصین ھیبة ووقعا فی قلوب الخلق کل من رآھم تأثرمنھم وتواضع لھم وذلک ادراکات روحانیة لا علامات جسمانیة"

ان کی علامات سے مراد، ظاہری علامات نہیں، بلکہ کوئی اور ہی چیز مراد ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں کو قدرتی طور پر رعب حاصل ہوتا ہے، اور مخلوق کے دلوں میں واقع ہو جاتے ہیں، جو بھی ان کو دیکھتا ہے وہ ان سے اثر قبول کرتا ہے اور ان کے سامنے عجز کا اظہار کرتا ہے، یہ روحانی علامات ان میں پائی جاتی تھیں، جسمانی علامات مراد نہیں، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ

"ان الاسد اذا مر ھابته سائر السباع بطباعھا لابالتجربة"

شیر جہاں سے گذرتا ہے تمام درندے طبعی طور پر اس سے ڈر جاتے ہیں، انہیں کوئی تجربہ حاصل نہیں ہوتا کہ یہ شیر ہمیں کھا جائے گا، چیر پھاڑ دے گا۔

"والبازی اذا طار تھرب منه الطیور الضعیفة"

اسی طرح جب باز اڑتا ہے تو کمزور پرندے اسے دیکھ کر ہی بھاگ جاتے ہیں، ان پر قدرتی طور پر رعب طاری ہو جاتا ہے۔

"وکل ذلک ادراکات روحانیة فکذا ھھنا"

درندوں کا شیر کو دیکھ کر ڈرنا اور پرندوں کا باز کو دیکھ کر ڈرنا طبعی اور روحانی طور پر ان پر اثر ہوتا ہے، اس آیۃ کریمہ میں بھی اصحاب صفہ کی روحانی علامات کا ذکر ہے، جسمانی علامات کا ذکر نہیں۔ نماز میں خشوع کرنا بھی روحانی علامات ہیں، جن کو رب تعالیٰ نے یوں ذکر فرمایا "سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود" ان کی علامات ان کے چہروں میں، سجدہ کے اثر سے۔ یعنی ان کا خشوع سے نماز ادا کرنا ہی دلالت کررہا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رضا مندی چاہتے ہیں۔

اصحابِ صفہ کی علامات کا یہ مطلب بھی ہے۔

"ظهور آثار الفكر، روى انهم كانوا يقومون الليل للتهجد ويحتطبون بالنهار للتعفف"

کہ ان کے فکر کی علامات مراد ہیں، جیسا کہ روایت میں آتا ہے کہ وہ رات کو تہجد کی نماز کے لئے قیام کرتے اور دن کو لکڑیاں جمع کر کے لاتے (اور بیچتے) تاکہ کسی سے سوال نہ کرنا پڑے۔ (ماخوذ از کبیر)

راقم کا موقف:

علامہ رازی رحمہ اللہ کی دلیل بھی قابلِ صد تحسین ہے، لیکن باقی بزرگوں کے اقوال کو بھی رد کرنے کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ رب تعالیٰ کے ارشاد "يحسبهم الجاهل اغنياء من التعفف" کا یہ مطلب نہیں کہ ہر شخص بے خبری میں ان کو غنی سمجھتا تھا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ ان کو اپنی بے خبری کی وجہ سے غنی سمجھتے تھے کہ وہ سوال نہیں کرتے تھے، پہلے حدیث پاک بیان ہو چکی ہے کہ اصحابِ صفہ بعض اوقات بھوک کی وجہ سے نماز میں کھڑے کھڑے گر جاتے تھے، لیکن اعرابی ان کو پاگل سمجھتے تھے۔

اس سے واضح ہوا کہ ان کی روحانی علامات کے ساتھ ساتھ ظاہری علامات بھی پائی جاتی تھیں، لیکن ظاہری علامات کو دیکھ کر بھی کئی حضرات ان کے حقیقی حال سے بے خبر تھے۔

ایک اور حدیث بھی بیان کی جا چکی ہے کہ اصحابِ صفہ میں ستر وہ تھے جن کے پاس چادر اوڑھنے کی بھی نہیں تھی، لیکن ان کے اس حال کو بھی دیکھ کر کئی حضرات ان کے حقیقی حال سے بے خبر ہی رہے۔

علامات پر بھی احکام مرتب ہوتے ہیں:

اگر کوئی شخص اسلامی ملک میں فوت ہو گیا لیکن اس کے متعلق یہ معلوم نہیں کہ وہ مؤمن ہے یا کافر، البتہ اس کی علامات کفر والی ہیں، یعنی اس کا ختنہ نہیں کیا ہوا، یا اس نے جنجو باندھا ہوا ہے، یہ ایک دھاگہ ہوتا ہے جو کافر لوگ اپنے وسط (درمیان) میں باندھتے ہیں، یہ ان کا مذہبی شعار ہے، ان علامات کو دیکھ کر اس کی نماز جنازہ ادا نہیں کی جائے گی اور نہ ہی اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا، اگر اس شخص پر مسلمانوں کی علامات پائی گئی ہوں تو اسے مسلمانوں کے

قبرستان میں دفن کیا جائے گا اور اس کی نماز جنازہ بھی پڑھی جائے گی۔ اگر اس پر کفر کی علامات نہیں پائی گئیں اور نہ ہی مسلمان ہونے کی کوئی علامت پائی گئی تو وہ دار السلام میں پایا گیا تو دار السلام کی تابعداری کے لئے اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا، اور اگر وہ دار حرب میں پایا گیا اور اسلام یا کفر کی کوئی علامت نہ پائی گئی تو اسے کافر سمجھا جائے گا اور کفر کے احکام اس پر جاری ہوں گے۔ (ماخوذ از قرطبی واحکام القرآن للجصاص)

یہی حکم ہے لقیط کا، لقیط لاوارث پھینکے ہوئے بچے کو کہتے ہیں، یعنی وہ بچہ دار اسلام سے ملا ہے یا دار حرب سے، اس پر اسلام یا کفر کی علامات ہیں یا نہیں۔ دار اسلام سے ملا علاماتِ کفر اس پر نہیں تو وہ مسلمان سمجھا جائے، علاماتِ کفر پائی جائیں تو کافر سمجھا جائے، لیکن یہ خیال میں رہے نابالغ بچے کا ختنہ نہ ہونا علامتِ کفر نہیں، اگر وہ دار اسلام سے ملا ہے اور اس پر علاماتِ اسلام نہیں تو وہ کافر سمجھا جائے گا اور اگر علاماتِ اسلام پائی گئیں تو مسلمان سمجھا جائے گا۔ (احکام القرآن للجصاص)

علامات پر قرآنی فیصلہ:

حضرت یوسف علیہ السلام کو بھائی جب سیر وسیاحت کے بہانے ساتھ لے گئے اور کنوئیں میں پھینک کر واپس آئے اور ان کی قمیص کو خون آلود کر کے لائے کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا، تو قمیص پر خون لگانے کے باوجود رب تعالیٰ نے اسے جھوٹ کی علامت قرار دیا۔ ارشاد فرمایا "وجاء واعلی قمیصه بدم کذب" اور اس کے کرتے پر ایک جھوٹا خون لگا لائے۔

یعنی قمیص صحیح وسلامت تھی اور خون آلود تھی، قمیص کا صحیح وسلامت ہونا ان کے جھوٹا ہونے کی علامت قرار دیا۔ اور جب عزیزِ مصر کی زوجہ زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ایک کمرے میں بند کر کے اپنی خواہشات طلب کیں اور آپ نے وہاں سے بھاگ کر اپنے پاکیزہ دامن کو بچایا، عورت نے آپ کی قمیص کو پیچھے سے پکڑا تو وہ پھٹ گئی، اس عورت کے رشتہ دار شیر خوار بچہ نے واقعہ کی گواہی دی، اس نے بھی علامات کو سچ اور جھوٹ کا معیار بنایا، درحقیقت رب تعالیٰ کی توفیق اور اس کی تعلیم سے ہی وہ بچہ کلام کر رہا تھا اور گواہی دے رہا تھا۔ اس کی گواہی کو رب تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا۔

"وشهد شاهد من اهلها ان کان قمیصه قد من قبل فصدقت وهو من الکاذبین☆وان کان قمیصه قد من دبر فکذبت وهو من الصادقین☆ (سورہ یوسف آیات،۲۶،۲۷)

اور عورت کے گھر والوں میں سے ایک گواہ نے گواہی دی اگر ان کی قمیص آگے سے پھٹی ہے تو وہ عورت سچی ہے اور انہوں نے غلط کہا، اور اگر قمیص پیچھے سے پھٹی ہے تو عورت جھوٹی ہے اور آپ سچے ہیں۔

"فلما رآ قمیصه قد من دبر قال انه من کیدکن ان کیدکن عظیم"

پھر جب عزیز نے اس کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی دیکھی تو اس نے کہا بیشک یہ تم عورتوں کا مکر ہے، بیشک تمہارا مکر بڑا ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے "ولتعرفنهم فی لحن القول" اور ضرور تم انہیں بات کے اسلوب میں پہچان لو گے۔

مندرجہ بالا تمام آیات سے واضح ہوا کہ علامات پر احکام مرتب فرمائے گئے۔ (ماخوذ از احکام القرآن للجصاص)

"لایسالون الناس الحافا" "وہ نہیں سوال کرتے لوگوں سے کہ گڑگڑانا پڑے"۔

"الحافا" ای الحاحا ومنه استعیر الحف شاربه اذا بالغ فی تناوله وجزه واصله من اللحاف وهو مایتغطی به "یقال الحفته فالتحف" (مفردات راغب)

"الحاف" کا لغوی معنی یہ ہے کہ کسی چیز کو ڈھانپ دینا جس طرح کہا جاتا ہے میں نے اسے ڈھانپا وہ ڈھانپا گیا، "الحف شاربه" کا معنی یہ بھی کیا جاتا کہ وہ سارا ہی مشروب پی گیا۔

ان الفاظ مبارکہ کے دو مطلب

(۱) (لایسالون الناس الحافا) یعنی الحاح قیل اذا کان عنده غداء لا یسأل عشاء واذا کان عنده عشاء لایسأل غداء"

وہ چمٹ کر اور لپٹ کر سوال نہیں کرتے، یعنی جب ان کے پاس صبح کا کھانا ہوتا ہے تو وہ شام کے کھانے کا سوال نہیں کرتے اور جب ان کے پاس شام کا کھانا ہوتا ہے تو وہ صبح کے کھانے کا سوال نہیں کرتے۔

(۲) وقیل لا یسالون الناس اصلا لأ نه قال یحسبهم الجاهل اغنیاء من التعفف وهو ترک المسئلة

فعلم بذلک انهم لا یسألون البتة"

اور اس کا معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ بالکل ہی سوال نہیں کرتے، کیونکہ رب تعالیٰ نے فرمایا'' یحسبهم الجاهل اغنیاء من التعفف" بے خبر ان کو غنی سمجھتے ہیں ان کے درگذر کرنے کی وجہ سے، یعنی وہ سوال نہیں کرتے اس لئے ان کے حال سے بے خبر لوگ ان کو غنی سمجھتے ہیں۔ اس سے سمجھ آیا وہ سوال کرتے ہی نہیں۔ (خازن)

یہی دو معانی مدارک التنزیل میں بھی بیان کئے گئے ہیں اور بھی تفاسیر میں بیان کئے گئے ہیں۔

علامہ رازی رحمہ اللہ کی تحقیق اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ:

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں آیۃ کریمہ میں بظاہر مشکل در پیش آ رہی ہے اسی لئے اس کو مختلف وجوہ سے بیان کیا گیا ہے۔

(۱) **ایک وجہ** یہ بیان کی گئی ہے کہ'' الحاف '' کا معنی ہے ''الحاح''چمٹنا، لپٹنا، گڑگڑانا۔

''والمعنی انهم سألوا بتلطف ولم یلحوا''

معنی یہ ہے کہ بیشک وہ نرمی سے سوال کرتے ہیں چمٹ کر اور لپٹ کر سوال نہیں کرتے، سوال کرنے میں گڑگڑاتے نہیں۔

یہ قول علامہ زمخشری صاحب کشاف کا ہے''وهو ضعیف'' یہ ضعیف قول ہے۔ کیونکہ رب تعالیٰ نے ان کا وصف بیان کیا ہے'' یحسبهم الجاهل اغنیاء من التعفف'' کہ وہ سوال کرنے سے رک جاتے ہیں۔ وہ سوال سے درگزر کرتے ہیں ''وذلک ینافی صدور السؤال عنهم'' اس لئے یہ کہنا کہ وہ نرمی سے سوال کرتے ہیں، چمٹ کر سوال نہیں کرتے، رب تعالیٰ کے ارشاد کے مخالف ہے کہ'' وہ سوال نہیں کرتے''

(۲) **دوسری وجہ** جو اس مقام پر تفسیر لکھنے کے دوران میرے ذہن میں آئی (علامہ رازی رحمہا اللہ کے ذہن میں آئی) وہ یہ ہے کہ مقصد رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی'' یحسبهم الجاهل اغنیاء من التعفف'' کا یہ نہیں کہ ان کا وصف یہ ہے کہ وہ لپٹ کر، چمٹ کر سوال نہیں کرتے کیونکہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ وہ سوال سے درگذر

کرتے ہیں، یعنی سوال کرتے ہی نہیں۔

”واذا علم انهم لايسألون البتة فقد علم ايضاانهم لايسألون الحافابل المرادالتنبيه على سوء طريقة من يسال الناس الحافا“

جب یہ معلوم ہوا کہ وہ بالکل سوال ہی نہیں کرتے تو اسی سے معلوم ہوگیا کہ وہ چمٹ کربھی سوال نہیں کرتے، تو واضح ہوا بیان کا اصل مقصد چمٹ کرسوال کرنے کی مذمت کرنا تھا۔

یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ تمہارے پاس دو آدمی آجائیں، ان میں سے ایک صاحب علم وعقل، پروقار ہو، ایک بات پر ثابت رہنے والا ہو، اور دوسرا بے وقوف ہو، جلدی طیش میں آنے والا ہو، بیہودہ گفتگو کرنے والا ہو۔ تمہارا ارادہ ہو کہ تم عقل مند شخص کی مدح کرو اور بے وقوف کی مذمت کرو تو تم عقل مند کو خطاب کرتے ہوئے بے وقوف کی بھی ضمناً مذمت بیان کرلو، تم یہ کہو۔

” فلان رجل عاقل وقور قليل الكلام لا يخوض فى الترهات ولايشرع فى السفاهات“

فلاں شخص عقل مند، باوقار اور کم گفتگو کرنے والا ہے، بیہودہ باتوں میں نہیں پڑتا، بے وقوفی نہیں کرتا۔

یہ جوذکر کیا ہے کہ وہ بیہودہ کلام اور بے وقوفانہ باتیں نہیں کرتا یہ عقل مند شخص کی صفات نہیں کی گئیں، کیونکہ اس کا عقل مند ہونا، باوقار ہونا، کم کلام کرنا ہی بتا رہا ہے کہ وہ بے وقوف نہیں، بلکہ یہاں دوسرے بے وقوف شخص کی مذمت بیان کی جارہی ہے۔ اس آیۃ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے پہلے ذکر فرمایا” يحسبهم الجاهل اغنياء من التعفف“ اس کے بعد ذکر فرمایا ” لايسألون الناس الحافا“

”الغرض منه التنبيه على من يسال الناس الحافا وبيان مباينة احدالجنسين عن الآخر فى استيجاب المدح والتعظيم“

اس کے بیان میں اس بات پر تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ کوئی شخص چمٹ کرسوال نہ کرے، اور یہ بتانا مقصود ہے کہ قابلِ تعریف وہی لوگ ہیں جوسوال ہی نہیں کرتے، اور جوسوال کرنے میں مبالغہ کرتے ہیں، چمٹ کرلپٹ کرسوال کرتے ہیں وہ قابل مذمت ہیں۔

(۳) **تیسری وجہ:** یہ ہے کہ سائل جب لپٹ کر، گڑگڑا کر سوال کرے " هو الذی یستخرج المال بکثرۃ تلطفه " وہ بہت زیادہ نرم گفتگو کر کے مال حاصل کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی (**لا یسألون الناس**) کا مطلب ہے "**بالرفق والتلطف**" کہ وہ نرمی سے بھی سوال نہیں کرتے کہ تم ہم پر مہربانی کر دو، جب وہ نرمی اور مہربانی طلب کرنے سے سوال نہیں کرتے " فبأن لایوجد علی وجه العنف أولی " تو یقیناً سختی سے بھی وہ سوال نہیں کرتے، جب دونوں قسمیں سوال کی منع ہو گئیں تو مطلقاً سوال کرنا بھی منع ہو گیا۔

"**فعلی هذا یکون قوله(لا یسألون الناس الحافا) کالموجب لعدم صدور السؤال منهم اصلا**"

اسی سے واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی " لایسألون الناس الحافا " کا مطلب یہ کہ وہ سوال ہی نہیں کرتے کہ گڑگڑانا پڑے۔

(۴) **چوتھی وجہ:** اللہ تعالیٰ نے اصحابِ صفہ کے متعلق بیان فرمایا کہ وہ فقراء ہیں، شدید حاجتمند ہیں ایسے حال میں" لا یمکنه ترک السؤال الا بالحاح شدید منه علی نفسه " انسان سوال نہیں چھوڑ سکتا، زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ چمٹ کر سوال نہ کرے، گڑگڑائے نہیں۔

جب شدید حاجت کے وقت انسان سوال ہی نہ کرے تو اس کا اپنے آپ کو روکنا گویا کہ اپنے نفس پر شدید جبر کرنا ہے۔ یہ ان کی زیادہ تعریف اور تعظیم پر دلالت کر رہا ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

ولی نفس اقول لهااذا ما　　　تنازعنی لعلی او عسانی

جب میرا نفس مجھ سے جھگڑا کرتا ہے (یعنی مطالبہ کرتا ہے) تو میں اسے کہتا ہوں شائد ایسا ہو کہ میں تمہاری خواہشات کو پورا کرلوں۔

(۵) **پانچویں وجہ:** یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو سوال کرتا ہے وہ بعض اوقات گڑگڑا کر بھی سوال کرتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ مطلقاً سوال کرتا ہے "فقد أراق ماء وجهه" تو اس کے چہرے کی رونق اور تروتازگی چلی جاتی ہے۔

اب وہ یہ خیال کرتا ہے کہ جب میں نے سوال کرنے کی ذلت برداشت کرلی تو اب میں خالی نہ لوٹوں، بلکہ

مجھے مقصد بھی حاصل ہو جائے "فھذاالخاطر یحملہ علی الالحاف والالحاح" جب اس کے دل میں یہ بات آتی ہے کہ سؤال کرنے کی ذلت کے بعد مجھے خالی نہیں لوٹنا چاہئے تو وہ گڑگڑانا شروع کر دیتا ہے۔ جی حضوری بن کر مانگنا شروع کر دیتا ہے۔

"فثبت ان کل من سأل فلا بد وان یقدم علی الالحاح فی بعض الاوقات"

اسی سے یہ واضح ہو گیا کہ بعض اوقات گڑگڑا کر سؤال کرنے سے پہلے مطلقاً سؤال پایا جاتا ہے ،پھر مقصد کے بغیر لوٹنے کی خطرہ سے گڑگڑا کر سؤال کرتا ہے۔

"فکان نفی الالحاح عنھم مطلقاموجبالنفی السؤال عنھم مطلقا"

ان کے گڑگڑا کر سؤال کرنے کی نفی سے بھی مطلقاً سؤال کی نفی ثابت ہو جائے گی۔

(۶) **چھٹی وجہ:** یہ ہے کہ انسان سوال تو نہ کرے لیکن اپنے پراگندہ حال سے فقر، مسکینی اور محتاجی کو ظاہر کرے وہ اگر چہ زبان سے سوال تو نہیں کر رہا لیکن اپنے حال سے گویا کہ وہ گڑگڑا کر سوال کر رہا ہے۔

"لأن ظھور امارت الحاجۃ تدل علی الحاجۃ وسکوتہ یدل علی أنہ لیس عندہ ما یدفع بہ تلک الحاجۃ ومتی تصور الانسان من غیرہ ذلک رق قلبہ جدا وصار حاملالہ علی ان یدفع الیہ شیأ فکان اظھار ھذہ الحالۃ ھو السؤال علی سبیل الالحاف"

کیونکہ اپنی حاجتمندی کی علامات کو ظاہر کرنا بھی اس کی حاجت پر دلالت کر رہا ہے اور اس کا خاموش رہنا اور سوال نہ کرنا بھی اس پر دلالت کر رہا ہے کہ اس کے پاس کچھ مال بھی نہیں جس سے وہ اپنی حاجت کو دور کر سکے، جب انسان غیر سے یہ تصور کرے کہ وہ میری اس غریبانہ اور فقیرانہ حالت کو دیکھ کر، اور میری حسرت بھری نگاہوں کو وہ اپنی طرف اٹھتا ہوا دیکھ کر خود بخود مجھ پر رحم کرے گا، تو یقیناً اس کا دل نرم ہوگا اور اپنی حالت سے گویا کہ وہ اپنی حاجت کسی کے پاس لے جا رہا ہے، تو اسے بھی گڑگڑا کر سوال کرنے سے ہی تعبیر کیا جائے گا۔

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی "لا یسألون الناس الحافا" کا مطلب یہ ہوگا۔

"انھم سکتوا عن السؤال لکنھم لایضمون الی ذلک السکوت من رثاثۃ الحال

واظهار الانکسار مایقوم مقام السؤال علی سبیل الالحاف بل یزینون انفسم عند الناس ویتجملون بهذاالحلق ویجعلون فقرهم وحاجتهم بحیث لایطلع علیه الاالخالق "

کہ بیشک وہ اصحابِ صفہ سوال نہیں کرتے اور وہ اپنے پراگندہ حال اور شکستہ حال سے بھی اپنی حاجت کو ظاہر نہیں کرتے کہ ان کا فقیرانہ اور غریبانہ حال گڑگڑا کر سوال سمجھ آئے، بلکہ وہ اپنا ظاہری حال سنوار کر رکھتے ہیں اور ظاہر طور پر اپنی شکل وصورت اور لباس وغیرہ سے اپنے آپ کو درست حال میں رکھتے ہیں، اپنی حاجتمندی اور غربت کو اس طرح چھپا کر رکھتے ہیں کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے اس پر کوئی مطلع نہیں ہوتا۔ (ماخوذ از کبیر)

علامہ رازی رحمہ اللہ کی تحقیق کو دیکھنے کے بعد اعلیٰ حضرت موالا احمد رضاء خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ دیکھئے تو خوب ترین نظر آئے گا "لوگوں سے سوال نہیں کرتے کہ گڑگڑانا پڑے" راقم نے بھی یہی ترجمہ نقل کیا ہے۔

دینی مدارس کے طلباء کرام توجہ فرمائیں:

آیۃ کریمہ کے الفاظ مبارکہ " لایسألون الناس الحافا" میں "الحافا" مفعول لہ ہے۔ طلباء کرام اپنے ذہنوں میں مفعول لہ کے چھائے ہوئے ترجمہ کے مطابق یوں ترجمہ کر سکتے ہیں وہ نہیں سوال کرتے لوگوں سے بسبب گڑگڑانے کے۔ مفعول لہ کے مطابق ترجمہ کرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کو دیکھیں تو وہ بہت آسان اور خوبصورت نظر آئے گا۔ (راقم)

حقیقی فقیر کون ہے؟

"واخرج ابن المنذروابن ابی حاتم عن یزید بن قاسط السکسکی قال کنت عند عبداللہ بن عمراذ جاء ہ رجل یسأله فد عا غلامه فساره فقال للرجل اذهب معه ثم قال لی اتقول هذافقیر فقلت واللہ ما سأل الامن فقر ،فقال لیس بفقیر من جمع الدرهم الی الدرهم والتمرة الی التمرة ولکن من انقی نفسه وثیابه لا یقدر علی

شیٔ"یحسبھم الجاھل اغنیاء من التعفف تعر فھم بسیماھم لا یسألون الناس الحافا"
"فذلک الفقیر"

یزید بن قاسط سے مروی ہے کہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس تھا جب کہ آپ کے پاس ایک شخص آیا، جوان سے سوال کرنے لگا، تو آپ نے اپنے غلام کو بلایا اس کے کان میں کچھ کہا (یعنی سائل کو کچھ دینے کے لئے کہا) اور اس شخص کو کہا اس غلام کے ساتھ چلے جاؤ، پھر آپ نے مجھے کہا تم اسے واقعی فقیر سمجھتے ہو، میں نے کہا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اس نے سوائے فقر کے سوال نہیں کیا، آپ نے فرمایا یہ حقیقی طور پر فقیر نہیں، اس کا کام تو صرف دراہم جمع کرنا اور کھجوریں جمع کرنا ہے، لیکن وہ شخص جس کا نفس اور کپڑے صاف ستھرے ہوں، کسی چیز پر قادر نہ ہو، اور رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی کے مطابق "ان کو سوال نہ کرنے کی وجہ سے بے خبر لوگ ان کو غنی سمجھے، ان کو تم ان کی علامات سے پہچان لو (کہ یہ فقیر ہیں) وہ لوگوں سے سوال نہ کریں کہ گڑ گڑانا پڑے، یہ لوگ حقیقی طور پر فقیر ہیں۔ (درمنثور)

حقیقی مسکین کون؟

"واخرج البخاری ومسلم وابو داؤد والنسائی وابن المنذر وابن ابی حاتم وابن مردویہ عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ لیس المسکین الذی تردہ التمرۃ والتمرتان واللقمۃ واللقمتان انما المسکین الذی یتعفف واقرؤا ان شئتم لایسألون الناس الحافا"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ شخص (حقیقی طور پر) فقیر نہیں جو ایک یا دو کھجوروں کے لئے، ایک یا دو لقموں کے لئے در بدر پھرے، مسکین تو وہ ہے جو سوال ہی نہ کرے بلکہ درگذر کرے، اگر تم چاہتے ہو تو یہ پڑھو "لایسألون الناس الحافا" وہ لوگوں سے سوال نہیں کرتے کہ گڑ گڑانا پڑے۔ (درمنثور)

طلباء کرام ایک مرتبہ پھر رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی کو گہری نظر سے دیکھیں، غور وفکر کریں کہ آپ نے

"یتعفف" کے بعد "لایسألون الناس الحافا" کا ذکر فرمایا، آپ کے ارشاد گرامی کو دیکھئے، پھر علامہ رازی رحمہ اللہ کی تحقیق کو دیکھیں، پھر اعلیٰ حضرت حضرت علامہ مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کے ترجمہ کو دیکھیں تو تحقیقی ترجمہ نظر آئے گا اور خوب سے خوب ترین نظر آئے گا۔

"وماتنفقوامن خیرفان اللہ بہ علیم"

"اور جو مال تم خرچ کرتے ہو بیشک اللہ اسے جانتا ہے۔"

یہ الفاظ گرامی کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی "وما تنفقوا من خیر یوف الیکم و انتم لا تظلمون" (وہ جو مال تم خرچ کرتے ہو پورا (اجر) تمہیں دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا) کے مثل ہیں، لیکن تکرار نہیں۔ بلکہ دو وجہ سے فرق ہے۔

(۱) **ایک وجہ**: ان میں سے یہ ہے کہ جب رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "وماتنفقوا من خیر یوف الیکم" تو اس سے معلوم ہوگیا "ان توفیة الأجر من بخس ونقصان" کہ اللہ تعالیٰ نے کامل اجر دینا ہے اس میں کوئی کمی اور نقصان نہیں ہوگا۔ تو اسی سے معلوم ہوگیا کہ پورا پورا اجر دینا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک عمل کی مقدار معلوم نہ ہو، اور ثواب کے مستحق ہونے کی کیفیاتِ مؤثرہ کا علم نہ ہو۔

"لاجرم قررفی هذاالآية كونه تعالى عالما بمقادير الأعمال و كيفياتها"

تو یقیناً اس آیۃ کریمہ سے یہ ثابت ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی مقدار اور ان کی کیفیت کو جانتا ہے کہ کتنا مال خرچ کیا گیا اور اس میں کیا نیت پائی گئی اور کتنا خلوص پایا گیا۔

گویا کہ جو مسئلہ "وما تنفقوا من خیر یوف الیکم" سے ضمناً سمجھ آیا، وہ "وما تنفقوا من خیر فان اللہ بہ علیم" سے صراحۃً سمجھ آ گیا۔

(۲) **دوسری وجہ**: ان میں سے یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے جب صدقہ دینے کی رغبت دلائی اور نفلی صدقات مسلمانوں کو اور ذمی کفار کو بھی دینے کی اجازت فرمائی، پھر یہ فرمایا "وماتنفقوا من خیر یوف الیکم" تو اس

سے واضح ہوگیا" ان اجره واصل لامحالة " بیشک اس کا ثواب تمہیں ملنا ہی ملنا ہے، خواہ مسلمان کو دو یا ذمی کافر کو دو۔ پھر اس آیۃ کریمہ میں بیان فرمایا کہ صدقات وخیرات فقراء کو دو، پھر فقراء کی صفات بھی بیان فرمائیں کہ وہ ان کامل صفات والے ہیں۔

"وکان هذا الانفاق اعظم وجوه الانفاقات، لاجرم اردفه ممایدل علی عظمة ثوابه فقال (وما تنفقوا من خير فان الله به عليم)"

اصحابِ صفہ جیسے فقراء جو بہت کامل صفات والے تھے، سوال نہیں کرتے تھے، اپنے حال کو بھی سنوار کر رکھتے تھے تاکہ ہمارے حال سے کوئی مطلع نہ ہو تو یقیناً ایسے حضرات پر مال خرچ کرنا بھی عظیم درجہ رکھتا ہے اور اس کا ثواب بھی عظیم ہوگا، تو رب تعالیٰ نے اسی عظیم ثواب کا تذکرہ ان الفاظ مبارکہ میں کر دیا" وماتنفقوا من خير فان الله به عليم" اور جو مال تم خرچ کرتے ہو بیشک اللہ اسے جانتا ہے۔ یعنی خرچ کرنے میں جتنا خلوص زیادہ ہوگا، مال پاک وحلال ہوگا، جسے دیا گیا وہ نیک اور مستحق ہوا تو اس پر رب تعالیٰ عظیم ثواب عطا کرے گا، کیونکہ وہ تمہارے خرچ کرنے کو جانتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

فقراء کی فضیلت میں احادیثِ مبارکہ:

"عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ رب اشعث مدفوع بالابواب لو اقسم علی الله لأبره"

(درمنثور)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کتنے ہی پراگندہ بالوں والے اور دروازوں سے ہٹائے ہوئے اگر اللہ تعالیٰ پر قسم اٹھادیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو پورا فرمادیتا ہے۔

وضاحت حدیث: "اشعث ای متفرق شعر راسه "اشعث کا معنی بالوں کا بکھرا ہوا ہونا۔

"قال البيضاوی رحمه الله الاشعث هو المغبر راسه المتفرق الشعر"

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ جس شخص کے بال غبار آلود ہوں اور اس کے بال بکھرے ہوئے ہوں اسے "اشعث" کہا جاتا ہے۔

مدفوع بالابواب۔ کے دو معانی ہیں۔ ایک ظاہری اور ایک حقیقی معنی ہے، وہی معنی لینا زیادہ بہتر ہے، وہ معنی یہ ہے کہ

"یدفع عن الدخول علی الأعیان والحضور فی المحافل فلایترک ان یلج الباب فضلاان یحضر معھم ویجلس فیما بینھم"

کہ ان کو دنیاوی سرداروں اور اربابِ حکومت کے پاس جانے سے منع کر دیا جاتا ہے، اور محافل میں انہیں بیٹھنے نہیں دیا جاتا، انہیں دروازے کے اندر ہی نہیں جانے دیا جاتا، ان فقیروں کا ان امیروں کے پاس حاضر ہونا اور ان کی محافل میں بیٹھنا تو دور کی بات ہے۔

(۲) دوسرا معنی مجازی ہے، وہ یہ ہے۔

"لما اراداللہ سترحالہ عن الخلق لئلایحصل لہ بالغیر شیءمن الاستئناس فیحفظہ من الوقوف علی ابواب الظلمۃ واکلۃ الحرام"

جب اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتا ہے کہ ان میرے بندوں کا حال مخلوق سے چھپا ہوا رہے تاکہ ان کو غیروں کی کسی چیز سے اُنس نہ ہو تو اللہ تعالیٰ ان کو ظالموں کے دوازے پر جانے سے اور حرام کھانے سے اپنی رحمت سے دور رکھتا ہے۔

اس معنی کے لحاظ پر یہ مطلب ہے کہ ان کو دنیاداروں کے دروازوں پر پہنچنے پر دھکیلا نہیں جاتا، کیونکہ یہ اولیاء کرام کی شان کے لائق نہیں۔ یہ تمام بحث علامہ ملاعلی قاری رحمہ اللہ نے کی ہے۔ لیکن راقم کا اس پر موقف یہ ہے کہ دونوں قسم کے فقراء مراد ہیں، مرقاۃ میں بھی ملامتیہ فرقہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

اللہ پر قسم اٹھانے کا کیا مطلب؟

"لو اقسم علی اللہ ای علی فعلہ سبحانہ بلن حلف ان اللہ یفعل کذا اولایفعلہ"

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فعل پر قسم اٹھاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ کرے گا یا یہ نہیں کرے گا، تو اللہ تعالیٰ اس کے قسم کو پورا فرمادیتا ہے۔

جیسا کہ حضرت انس بن نضر نے قسم اٹھائی تھی کہ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی رُبَیّع کا دانت نہیں توڑا جائے گا، جب کہ ربیع سے قصاص لینے کا حکم نافذ ہو گیا کیونکہ جس قبیلے کے شخص کا انہوں نے دانت توڑا تھا، وہ فدیہ لینے پر رضامند

نہیں ہو رہے تھے لیکن انس بن نضر رضی اللہ عنہ نے آخر کار ان کو رضا مند کر لیا کہ وہ فدیہ لے لیں۔

تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بعض لوگ اللہ تعالیٰ پر قسم اٹھاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو پورا فرما دیتا ہے۔

(ماخوذ از مرقات ج ۱۰ ص ۲)

﴿ "وعن مصعب بن سعد قال رأى سعد ان له فضلا على من دونه فقال رسول الله ﷺ هل تنصرون وترزقون الا بضعفائكم" (رواه البخاری، مشکوة باب فضل الفقراء)

حضرت مصعب بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں سعد رضی اللہ عنہ نے گمان کیا کہ ان کو دوسروں (فقیروں) پر فضیلت حاصل ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہاری امداد نہیں کی جاتی ہے اور نہ ہی تمہیں رزق دیا جاتا ہے سوائے کمزور حال لوگوں کے۔

وضاحت حدیث : "رأى سعد اى ظن او توهم" یعنی حدیث شریف میں جو "رأى" استعمال ہوا ہے اس کا معنی گمان کرنا اور وہم کرنا لیا گیا ہے۔ حضرت سعد نے اپنے آپ کو افضل سمجھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کو شجاعت، اور سخاوت حاصل تھی۔

"على من دونه "اى من الفقراء والضعفاء" یعنی حدیث شریف میں "على من دونه" کا معنی ہے اپنے سوا فقراء اور کمزور حال لوگوں پر (انہوں نے اپنے آپ کو افضل سمجھا)

تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت کو جواب دیتے ہوئے اور دوسرے لوگوں کو تبلیغ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

"هل تنصرون وترزقون الا بضعفائكم"

تمہاری (دشمن کے خلاف) امداد نہیں کی جاتی اور نہ ہی تمہیں (مال غنیمت اور ہر طرح کا) رزق دیا جاتا ہے سوائے فقیر یعنی غریب لوگوں کے۔

"فهم بمنزلة الاقطاب والاوتاد لثبات العباد والبلاد"

یعنی فقیر لوگ قطب اور اوتاد کے درجہ میں ہوتے ہیں ان کی وجہ سے ہی اللہ کے بندے اور ان کے شہر قائم ہیں۔ یہ سب فقیر لوگوں کی برکت ہے وہ نہ رہے تو جہاں بھی نہیں رہے گا۔

”وحاصله انه انما جعل النصر علی الاعداء وقدر توسیع الرزق علی الاغنیاء ببرکة الفقراء فاکرموهم ولاتتکبر واعلیهم فانهم اهل سلوک المحبة علی اضیق المحجة وملوک الجنة فی اعلی مراتب المعزة“

نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ مسلمانوں کو دشمنوں پر امداد حاصل ہونا اور اغنیاء کے رزق میں قدرِ وسعت فقراء کی برکت سے ہے، تم ان کی عزت کرو، اور ان پر تکبر نہ کرو، بیشک وہ جحت کی دشوار گذار وادیوں میں محبت کی راہ میں چل رہے ہیں، وہ عزت کے اعلیٰ مراتب میں جنت کے بادشاہ ہیں۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو شجاعت اور کرم اور سخاوت کی وجہ سے فضیلت حاصل تھی تو نبی کریم ﷺ نے جو انہیں ارشاد فرمایا اس کا مطلب یہ ہوا۔

” ان تلک الشجاعة ببرکةضعفاء المسلمین وتلک السخاوة ایضا ببرکتهم“

کہ یہ شجاعت اور کرم جو تمہیں حاصل ہیں وہ غریب وفقیر مسلمانوں کی برکت کی وجہ سے ہی حاصل ہیں۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی ”هل تنصرون وترزقون الابضعفائکم“ میں ”هل“ استفہام انکاری کے طور پر استعمال ہے، البتہ کلام کو استفہام کی صورة میں ظاہر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

”وابرزه فی صورة الاستفهام لیدل علی مزید التعزیر والتوبیخ“

صورتِ استفہام میں ظاہر کرنے کا یہ مقصد تھا کہ مزید تعزیر اور توبیخ (ڈانٹ ڈپٹ) پر دلالت کرے۔

ابونعیم نے حلیہ میں جو روایت نقل کی ہے اس میں اور زیادہ واضح الفاظ موجود ہیں۔

”هل تنصرون الابضعفائکم بدعوتهم واخلاصهم“

تمہاری امداد نہیں کی جاتی مگر تمہارے فقراء وغرباء کی دعاؤں اور ان کے خلوص سے۔ (وضاحت مزید از مرقات ج ۱۰ ص ۳)

☆ ”وعن اسامة بن زید قال قال رسول الله ﷺ قمت علی باب الجنة فکان عامة من دخلها

المساکین واصحاب الجد مخوسون غیر ان اصحاب النار قد امربهم الی النار وقمت علی باب النار فاذاعامة من دخلها النسآء" (بخاری ومسلم ،مشکوۃ باب فضل الفقراء)

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں جنت کے دروازے پر کھڑا ہوا تو اس میں عام داخل ہونے والے مساکین تھے، اور غنی لوگوں کو روکا ہوا تھا سوائے اس کے کہ جہنم والے لوگوں کو جہنم میں بھیجنے کا حکم دیا جائے گا، اور میں جہنم کے دروازے پر کھڑا ہوا تو اس میں عام داخل ہونے والی عورتیں تھیں۔

وضاحت حدیث:

جنت اور جہنم کے دروازں پر آپ کب کھڑے ہوئے؟ چونکہ رسول اللہ ﷺ نے وضاحت نہیں فرمائی، اس لئے اس میں کئی احتمال ہیں۔

"(قمت علی باب الجنة) ای لیلةالمعراج اوفی المنام اوحالة کشف المقام اوبطریق دلالةالمرام"

ایک احتمال یہ ہے کہ آپ معراج کی رات جنت کے دروازے پر کھڑے ہوئے ہوں اور احتمال یہ ہے کہ آپ نے خواب میں دیکھا ہو اور احتمال یہ ہے کہ آپ نے یہاں زمین سے جاگتے ہوئے جنت کے دروازے پر اپنے آپ کو کھڑا پایا ہو۔ اور احتمال یہ ہے کہ آپ کو مقصد کی دلالت حاصل ہوگئی ہو۔

"فکان عامة من دخلها" ای اکثرھا"

یعنی "عامة" کا معنی اکثر ہے، کہ جنت میں داخل ہونے والے زیادہ تعداد میں مساکین تھے۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

" فکان عامة من دخلهاالمساکین " میں دو ترکیبیں ہیں "عامة من دخلها "کو مرفوع پڑھیں اسم کان بنائیں، اور "المساکین" کو منصوب پڑھیں وہ خبر کان ہو۔

اور دوسری ترکیب اس کے برعکس (الٹ) ہے، یعنی "المساکین" کو مرفوع پڑھیں اسم کان ہو، اور "عامة من دخلها" منصوب ہو خبر کان کی وجہ سے۔ "المساکین" سے مراد ضعیف اور فقراء لوگ ہیں۔

"اصحاب الجد" سے مراد مؤمنین میں سے اغنیاء لوگ اور امراء ہیں، کیونکہ 'جد' کا معنی ہے بخت جو غناء کو بھی شامل ہے۔

اغنیاء مؤمنین کو روکے جانے کا کیا مطلب؟

اغنیاء مؤمنین کو قیامت کے دن صحراء میں روک دیا جائے گا، کیونکہ انہوں نے فانی دنیا کا مال جمع کیا، اور دنیاوی مناصب حاصل کئے، اس لئے ان کو میدان قیامت میں روک دیا جائے گا کیونکہ ان کے کثیر مال کی وجہ سے اور وسیع مراتب کی وجہ سے اور ان سے تلذذ حاصل کرنے کی وجہ سے اور خواہشات نفسانیہ کے مطابق منافع حاصل کرنے کی وجہ سے ان کا حساب بھی لمبا ہوگا۔

"فان حلال الدنیاله حساب ولحرامها عقاب"

ان سے دنیاوی حلال مال کا حساب لیا جائے گا، اور حرام مال پر عذاب دیا جائے گا۔

"والفقراء من هذا براء فلایحاسبون ولایحبسون بل قبل الاغنیاء باربعین خریفا فی الجنة یدخلون مکافأة لهم فی العقبی لما فاتهم عن الدنیا"

فقیر لوگ اس سے بری ہوں گے، ان کا اس طرح کا حساب نہیں لیا جائے گا اور نہ ہی ان کو روکا جائے گا بلکہ وہ جنت میں چالیس سال اغنیاء سے پہلے جائیں گے، یہ آخرت میں ان کو رب تعالی کی طرف سے دنیا میں مال و دولت کی وجہ سے محرومی کے بدلے میں بطور انعام دیا جائے گا۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث پاک کا مطلب واضح ہے کہ کفار کو جہنم میں بھیج دیا جائے گا اور اغنیاء مؤمنین کو میدان قیامت میں مال و دولت کے حساب کے لئے روک دیا جائے گا۔ اور فقراء مسلمانوں کو جلدی ہی جنت میں بھیج دیا جائے گا۔ یعنی اصحاب جنت کے دو گروہ ہوں گے، ایک محبوسین (روکے ہوئے) اور دوسرے مدخلین (بغیر رکاوٹ کے جنت میں داخل کئے جانے والے، اور کافروں کا صرف ایک ہی گروہ ہوگا جو جلدی ہی جہنم میں داخل کر دیا جائے گا۔

کثیر عورتوں کے جہنم میں جانے کی وجہ:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں جہنم کے دروازے پر داخل ہوا تو کثیر تعداد میں عورتوں کو جہنم میں داخل ہوتے ہوئے پایا، اس کی وجہ یہ ہے کہ

"لکثرة میلھن الی الدنیاو لمنعھن الرجال عن طریق العقبی"

کہ عورتوں کو دنیا کی طرف کثیر رغبت کرنے کی وجہ سے اور مردوں کو بھی آخرت کی طرف توجہ اور نیکی کے کاموں سے روکنے کی وجہ سے جہنم میں داخل کیا جائے گا۔

خیال رہے کہ یہ حدیث پاک مسند احمد اور نسائی میں بھی ہے۔ (ماخوذ از مرقات، ج۱۰ ص۳)

☆ "وعن عبد اللہ بن عمرو قال قال رسول اللہ ﷺ ان فقراء المھاجرین یسبقون الاغنیاء یوم القیامة الی الجنة باربعین خریفا" (رواہ مسلم، مشکوۃ باب فضل الفقراء)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک مہاجرین فقراء قیامت کے دن اغنیاء سے چالیس سال پہلے جائیں گے۔

☆ "عن ابی ھریرة قال قال رسول اللہ ﷺ یدخل الفقراء الجنة قبل الاغنیاء بخمسمائة عام نصف یوم" (رواہ الترمذی، مشکوۃ باب فضل الفقراء)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا فقراء جنت میں اغنیاء سے پانچ سو سال پہلے داخل ہوں گے، قیامت کے نصف دن کے برابر۔

دونوں حدیثوں کی وضاحت و تطبیق:

پہلی حدیث میں جو لفظ "خریفا" استعمال ہے، اس کا معنی موسم خریف ہی ہے جو مشہور و معروف ہے، یعنی موسم خزاں، پھر اس سے مراد سال ہے کیونکہ یہ موسم سال میں ایک مرتبہ آتا ہے۔

بظاہر دونوں حدیثوں میں تعارض (ایک دوسرے کے مخالف ہونا) نظر آتا ہے، کیونکہ ایک حدیث شریف

میں فقراء کا اغنیاء سے جنت میں چالیس سال پہلے جانے کا ذکر ہے، جبکہ دوسری حدیث میں پانچ سو سال کا ذکر ہے، ان میں تطبیق کیسے؟ اس کا ایک جواب یہ ہے۔

"فأولی حمل الحدیث علی معنی یفهم الحکم عموماوهوان یقال المراد بکل من العددین انما هو التکثیر لاالتحدید فتارة عبربه واخری بغیر ہ تفننا"

کہ دونوں حدیثوں میں جو تعداد کو ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد معین تعداد نہیں بلکہ کثرت مراد ہے کہ فقراء اغنیاء سے جنت میں بہت پہلے مدت چلے جائیں گے۔ یہ ایک خصوصی انداز بیان ہے جس میں کثرت کو کبھی چالیس سے تعبیر کر دیا جاتا ہے اور کبھی پانچ سو سے۔

عربی حضرات کثرت کو کبھی ستر سے تعبیر کرتے ہیں، کبھی چالیس سے، کبھی پانچ سو سے، یہ ان کا انداز بیان ہوا کرتا تھا۔ ہم اگر اپنے محاورہ کو دیکھیں تو واضح ہو جائے گا کہ ہم بھی کثرت کو مختلف الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں "یہ بات میں تمہیں دس مرتبہ سمجھا چکا ہوں پھر بھی تمہیں سمجھ نہیں آتی۔ بیس مرتبہ سمجھا چکا ہوں، سو مرتبہ سمجھا چکا ہوں، ہزار مرتبہ سمجھا چکا ہوں۔ اور دوسرا جواب یہ ہے۔

"اوالتقدیر باربعین خریفا اشارة الی اقل المراتب وبخمس مائة عام الی اکثرها"

ممکن ہے کہ دونوں حدیثوں سے مراد معین تعداد ہی ہو، چالیس سے مراد کم مرتبہ ہو یعنی کم از کم چالیس سال پہلے اغنیاء سے جنت میں جائیں گے۔ اور پانچ سو سال سے مراد زیادہ تعداد ہو کہ فقراء جنت میں اغنیاء سے زیادہ مدت پہلے جائیں گے۔ وہ زیادہ مدت پانچ سو سال ہوگی۔

طبرانی کی ایک روایت مسلمہ بن مخلد سے اس کی تائید بھی کر رہی ہے، اس روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

"سبق المهاجرون الناس باربعین خریفا الی الجنة ثم یکون الزمرة الثانیة مائة خریف "

مہاجرین دوسرے لوگوں سے چالیس سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے، پھر ایک اور جماعت دوسرے لوگوں سے ایک سو سال پہلے جنت میں داخل ہوگی۔

اس روایت سے ممکن ہے کہ بیان کرنا مقصود ہو کہ تیسری جماعت تین سو سال پہلے جائے گی، اور چوتھی

جماعت چار سو سال پہلے جائے گی اور پانچویں پانچ سو سال پہلے جائے گی۔(واللہ اعلم بالصواب)

اور تیسرا جواب یہ ہے۔

" اوالاختلاف باختلاف مراتب اشخاص الفقراء فی حال صبرهم ورضاهم وشكرهم "

کہ فقراء کے مختلف مراتب ہیں کوئی زیادہ صبر کرنے والا اور کوئی کم، کوئی زیادہ رضاء مندی رکھنے والا، کوئی کم۔ کوئی زیادہ شکر کرنے والا، کوئی کم۔ ان مراتب کے فرق کی وجہ سے ہی کوئی دوسرے لوگوں سے زیادہ مدت پہلے جنت میں داخل ہوگا اور کوئی کم مدت پہلے داخل ہوگا۔

فائدہ :"وخلاصته ان الفقراء فی تلک المدة لهم حسن العيش فی العقبى مجازاة لما فاتهم فی الدنيا "

حاصل کلام یہ ہے کہ فقراء جتنی مدت اغنیاء سے پہلے جنت میں جائیں گے اتنی مدت وہ جنت کی نعمتوں کو حاصل کرنے کی وجہ سے عیش وعشرت میں ہوں گے، دراصل یہ ان کو رب تعالیٰ کی طرف سے انعام دیا جائے گا کہ وہ دنیا میں عیش وعشرت کی زندگی گزارنے سے دور رہے، مشقتیں برداشت کیں۔

تنبیہ : دوسری حدیث شریف میں جو لفظ "نصف یوم" کے ہیں، ان کا مطلب یہ ہے۔

"فان اليوم الاخروى مقدار طوله الف سنة من سنى الدنيا لقوله تعالى "وان يوما عندربک کالف سنة مما تعدون "فنصفه خمسمائة "

کہ قیامت کا ایک دن دنیا کے ہزار سالوں کے برابر ہوگا، جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے

بیشک دن تمہارے رب کے ہاں ہزار سالوں کی طرح ہوگا جو تم شمار کرتے ہو۔

مطلب یہ ہے کہ بعض خوش قسمت فقراء، رب تعالیٰ کے مقربین دوسرے لوگوں سے دنیاوی پانچ سو سال کی مقدار پہلے جنت میں جائیں گے جو قیامت کا نصف دن ہوگا۔

بظاہر اس پر وہم یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی دوسری آیۃ کریمہ میں ہے۔ "فی یوم کان مقدارہ خمسین الف سنة " یعنی اس آیۃ میں قیامت کا دن پچاس ہزار سال کا ذکر کیا گیا ہے تو ان دونوں آیتوں میں تطبیق کیسے ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے۔

"فهذا مخصوص من عموم ماسبق"

کہ پہلی آیۃ کریمہ میں اخروی ہر دن پچاس ہزار سال کا ذکر ہے اور اس آیۃ کریمہ میں خاص نشر کا دن بیان کیا گیا ہے، اس طرح دونوں آیتوں میں تطبیق واضح ہوگئی۔ اور دوسرا جواب یہ ہے۔

"او محمول علی تطویل ذلک الیوم علی الکفار کما یطوی حتی یصیر کساعة بالنسبة الی الابرار کما یدل علیه قوله تعالی فاذا نقر فی الناقور فذلک یومئذ یوم عسیر علی الکفارین غیر یسیر"

کہ پچاس ہزار سال کی نسبت کفار کی طرف ہے کہ وہی دن جو درحقیقت ہزار سال کے برابر ہوگا ،وہ کافروں کو مشکل امر کی وجہ سے پچاس ہزار سال کا نظر آئے گا، اور رب تعالیٰ کے مقربین کو ایک گھڑی کے برابر نظر آئے گا، عام لوگوں کو ایک ہزار سال کے برابر نظر آئے گا۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی اس پر دلالت کر رہا ہے" جب ناقور بجائے جائے گا (یعنی صور پھونکا جائے گا) تو وہ دن کافروں پر مشکل ہوگا، آسان نہیں ہوگا۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج ۱۰ص ۴، ص ۱۰، ماخوذ از مرقاۃ ج ۱۰ص ۴، ص ۱۰)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فقر:

" وعن عمر قال دخلت علی رسول الله ﷺ فاذاهو مضطجع علی رمال حصیر لیس بینه وبینه فراش قد اثر الرمال بجنبه متكأ علی وسادة من ادم حشوها لیف قلت یا رسول الله ادع الله فلیوسع علی امتک فان فارس والروم قد وسع علیهم وهم لایعبدون الله فقال اوفی هذا انت یاابن الخطاب اولئک عجلت لهم طیبا تهم فی الحیوة الدنیا ،وفی روایة اما ترضی ان تکون لهم الدنیا ولنا الآخرة"

(بخاری ومسلم ،مشکوة باب فضل الفقراء)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، میں رسول اللہ ﷺ پر داخل ہوا، آپ بان کی چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے اس پر بستر نہیں تھا۔ آپ کے پہلو پر بان کے نشانات پڑ گئے تھے، آپ کا تکیہ چمڑے

کا تھا جس میں کھجور کے پتے بھرے ہوئے تھے، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ آپ کی امت کو وسعت عطاء فرمائے، بیشک فارس اور روم کو اس نے وسعت (مالی کشادگی) دے رکھی ہے حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں کرتے، تو آپ نے فرمایا اے ابنِ خطاب ابھی تم اس میں ہی (تم یہیں) ہو، ان لوگوں کو جلدی دنیا کی زندگی میں دنیاوی نعمتیں عطاء کر دی گئی ہیں۔ ایک اور روایت میں ہے کیا تم پسند نہیں کرتے کہ ان کو دنیا حاصل رہے اور ہمیں آخرت حاصل ہو۔

وضاحت حدیث: رمال (بکسر الراء وضمها) رمال کی راء پر زیر بھی پڑھی گئی ہے اور پیش بھی۔ یہ جمع ہے رمیل کی، اس کا معنی ہے ''مرمول'' والا، یعنی بُنی ہوئی''

اور حصیر سے مراد کھجور کے پتوں سے بُنی گئی ''والمراد انه كان السرير قد نسج وجهه بالسعف'' مراد یہ ہے کہ آپ چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے جو کھجور کے پتوں سے بنائے ہوئے بان سے بُنی گئی تھی۔

''ليس بينه وبينه فراش'' یعنی نبی کریم ﷺ اور چارپائی کے بان کے درمیان کوئی سوتی اور ریشمی بستر یا چادر وغیرہ نہیں تھی۔ اس بان سے نبی کریم ﷺ کے جسم اطہر کے پہلو میں نشان ڈال دیے تھے، جو قمیص کے ہٹانے کی وجہ سے واضح طور پر نظر آ رہے تھے۔

''ادم'' بفتحتين جلد۔ ''أدم'' کے ہمزہ اور دال پر زبر ہے، جس کا معنی ہے چمڑا۔

''ليف'' ليف النخل ''ليف'' کا معنی ہے کھجور کے پتے۔ یعنی آپ کا تکیہ بھی بہت سادہ تھا جو کھجوروں کے پتوں سے بھرا ہوا تھا، اس میں کوئی نرم چیز یعنی روئی وغیرہ نہیں بھری گئی تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عرض کی وجہ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ اپنی امت کے لئے وسعت مالیہ (مال کی کشادگی) کی دعاء کریں، آپ کے عرض کرنے اصل میں وجہ یہ تھی۔

"فانهم لایتطیقون متابعتک فی تحمل محنتک فربما یتنفرون عن المیل الی ملتک"

کہ یارسول اللہ آپ تو اتنی مشقت برداشت کررہے ہیں، آپ کو تو اللہ تعالیٰ نے صبر عظیم عطاء کر رکھا ہے، لیکن آپ کی امت تو اتنی مشقت برداشت نہیں کرسکتی، ایسا نہ ہو کہ کچھ لوگ اس مشقت کو برداشت نہ کرتے ہوئے دین سے ہی نہ پھر جائیں۔

نبی کریم ﷺ کا جواب:

ابتدائی طور پر تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول پر تعجب کرتے ہوئے فرمایا۔

"أوفی هذاانت یاابن الخطاب" بفتح الواو بعداستفهام انکاری والمعطوف علیه مقدرای اتقول هذاالکلام وانت الی الآن فی هذاالمقام ولم یحصل لک الترقی الی فهم المرام"

کیا تم یہ بات کرتے ہو، تم ابھی تک اسی مقام میں ہو، مقصد کے سمجھنے کی طرف تم نے ترقی نہیں کی۔

دینی مدارس کے طلباء کرام توجہ فرمائیں:

أو میں واؤ مفتوحہ ہے، اور ہمزہ استفہام انکاری کے طور پر استعمال ہے اور معطوف علیہ یعنی "اتقول ھذا الکلام" محذوف ہے۔ ایک قول ترکیب میں یہ بھی ہے کہ استفہام صدارت کلام کے لئے ہے، واؤ ماقبل اور مابعد جملہ کے درمیان ربط کے لئے ہے۔

مقصد کلام: نبی کریم ﷺ کے تعجب کرنے کی وجہ یہ تھی، گویا کہ آپ یہ ارشاد فرمارہے تھے۔

"ان الالتذاذبطیبات الدنیا من خصائل ذوی الجهل والعمی"

دنیاوی لذتیں اور دنیاوی نعمتوں کی طرف توجہ کرنا اور آخرت کی طرف توجہ نہ کرنا جاہل لوگوں کا کام اور دین سے اندھاپن ہونے کی علامت ہے۔

اگرچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سوچ بھی عام لوگوں پر رحم کرنے کی حد تک تھی لیکن نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ اے ابن خطاب لوگوں کے بلندی کے مقام پر فائز ہونے کی سوچیں، ان کو دنیاوی مال کی طرف رغبت

کرتے ہوئے نہ دیکھیں۔ نبی کریم ﷺ کا ایک اورارشاداس پر دلالت کررہا ہے،آپ فرماتے ہیں۔

''الدنیا سجن المؤمن وجنة الکافر'' دنیامؤمن کے لئے قید خانہ ہےاورکافر کے لئے جنت ہے۔

یعنی مؤمنین کوکافروں کے دنیاوی مال ومتاع کی طرف توجہ کرنے سے منع کیا گیا، یہ بھی عام مؤمنین کے لئے ہے،ورنہ خاص مؤمنین کے لئے صرف کفار کی طرف توجہ کرنے کی ممانعت نہیں بلکہ

''وان کانت المرتبة العلیابالاضافة الی الخواص من الانبیاء والاولیاء کمال الزهد فی الدنیا والقناعة بأقل مایتصور من متاعها لیکون تمتعهم تامافی العقبی''

انبیاءکرام اور خاص اولیاءکرام جن کو بلند مرتبہ حاصل ہےان کوتو یہ حکم ہے کہ وہ دنیا میں کامل طور پر زاہد(دنیا سے دور) ہوجائیں،اور جو مال بھی ان کوکم سے کم حاصل ہواسی پر قناعت کریں۔ان کی کامل توجہ آخرت کی طرف ہو۔

اوررب تعالی کاارشاگرامی بھی اس پر دلالت کررہا ہے۔

''ولولا ان یکون الناس امةواحد لجعلنالمن یکفربالرحمن لبیوتهم سقفا من فضة ومعارج علیها یظهرون☆ولبیوتهم ابواباوسرراعلیها یتکئون ☆ وزخرفاوان کل ذلک لما متاع الحیوة الدنیاوالآخرة عند ربک للمتقین☆

(سورة الزخرف آیات ۳۳،۳۴،۳۵)

اوراگر یہ نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک دین پر ہوجائیں تو ہم ضرور رحمان کے منکروں کے لئے چاندی کی چھتیں اور سیڑھیاں بناتے جن پر چڑھتے۔اوران کے گھروں کے لئے چاندی کے دروازے اور چاندی کے تخت جن پر تکیہ لگاتے۔اورطرح طرح کی آرائش اور یہ سب کچھ ہے، جیتی دنیا کا ہی اسباب ہےاورآخرت تمہارے رب کے پاس پرہیزگاروں کے لئے ہے۔

''اولئک عجلت لهم طیباتهم فی الحیاةالدنیا''ان لوگوں کودنیا کی نعمتیں دنیامیں ہی دی گئیں۔

یعنی فارس اورروم کے کفار ہوں یااورکسی ملک کے کفارہوں ان کودنیامیں ہی دنیاوی نعمتیں عطاءکردی جاتی

ہیں ۔اور مسلمانوں کو دنیا میں اگرچہ آزمائش میں مبتلاء کیا جاتا ہے کہ یہ کتنا صابر ہے لیکن آخرت میں نعمتوں سے مؤمنین کو ہی نوازا جائے گا، جیسا کہ مندرجہ بالا آیات کے آخر میں مذکور ہے "والآخرۃ عند ربک للمتقین" اور آخرت تمہارے رب کے پاس پرہیزگاروں کے لئے ہے۔کفار کو دنیا میں نعمتیں دے دی جاتی ہیں اور وہ آخرت میں نعمتوں سے محروم ہوں گے، ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"ویوم یعرض الذین کفروا علی النار اذھبتم طیباتکم فی حیاتکم الدنیاواستمتعتم بھا فالیوم تجزون عذاب الھون بماکنتم تستکبرون فی الارض بغیر الحق وبما کنتم تفسقون" (سورت الاحقاف آیۃ نمبر ۲۰)

اور جس دن کافر آگ پر پیش کیے جائیں گے ان سے فرمایا جائے گا تم اپنے حصہ کی پاک چیزیں اپنی دنیا ہی کی زندگی میں فنا کر چکے اور انہیں برت چکے تو آج تمہیں ذلت کا عذاب بدلہ دیا جائے گا سزا اس کی کہ تم زمین میں ناحق تکبر کرتے تھے اور سزا اس کی کہ حکم عدولی کرتے تھے۔

(وضاحت حدیث ماخوذ از مرقات ج ۱۰ ص ۸)

☆ "وعن انس ان النبی ﷺ قال اللھم احینی مسکیناوامتنی مسکیناواحشرنی فی زمرۃ المساکین فقالت عائشۃ لم یارسول اللہ قال انھم ید خلون الجنۃ قبل اغنیائھم باربعین خریفا یاعائشۃ لاتردی المسکین ولو بشق تمرۃ یاعائشۃ احبی المساکین وقربیھم فان اللہ یقربک یوم القیامۃ "

(رواہ الترمذی والبیہقی فی شعب الایمان ورواہ ابن ماجۃ عن ابی سعید الی قولہ فی زمرۃ المساکین) مشکوۃ باب فضل الفقر)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے کہا" اے اللہ مجھے مسکین زندہ رکھ اور مجھے مسکینوں کی جماعت میں اُٹھا" تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی" کیوں یارسول اللہ " آپ نے فرمایا وہ اغنیاء سے چالیس سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے، اے عائشہ مسکین کو خالی نہ لوٹاؤ اگرچہ کھجور کا کچھ حصہ بھی ہو، اے عائشہ مسکینوں سے محبت رکھو، اور ان کو ہی قریب کرو ، بیشک اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمہیں قریب کرے گا۔

وضاحت حدیث :

''اللهم احینی مسکینا'' اے اللہ مجھے مسکین زندہ رکھ۔

نبی کریم ﷺ نے اپنی دعاء میں مسکینی کی زندگی گزارنے کے متعلق عرض کیا، یہ نہیں کہا اے اللہ مجھے فقیر زندہ رکھ ''لئلایتوھم کونہ محتاجاحقیرا'' اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگوں کی نظر میں فقیر گھٹیا اور حقیر نظر آتا ہے، اس لئے آپ نے یہ دعاء نہیں فرمائی کہ آپ کو معاذ اللہ کوئی شخص حقیر اور محتاج سمجھے۔ گویا کہ آپ کی دعاء کا مطلب یہ تھا۔

''اللهم اجعلنی فی نفسی صغیرا وفی اعین الناس کبیرا''

اے اللہ مجھے تو اپنے نزدیک چھوٹا بنادے اور لوگوں کی نظر میں بڑا بنادے۔

''واماالمسکین فھو من مادۃ المسکنة وھو التواضع علی وجه المبالغةولو افضی الی المذلة''

لیکن مسکین کا لفظ یا تو ''مســکـنة'' سے لیا ہوا ہے جس کا معنی بہت زیادہ عجز کا اظہار کرنا، اصل معنی اظہار عجز ہی ہے تاہم کبھی کبھی ظاہری طور پر ذلت کی طرف پہنچنا بھی نظر آتا ہے۔

''او من السکون والسکینة وھو الوقار والاطمئنان والقرار تحت احکام الاقدار رضا بقضاء الجبار''

یا مسکین کا لفظ ''سکون'' اور ''سکینة'' سے لیا ہوا ہے، جس کا معنی ہے اطمئنان اور وقار سے رہنا اور احکام میں تقدیر پر اور اللہ تعالیٰ جبار وقہار کے فیصلہ پر ثابت قدم رہنا۔

''وقال بعضھم ای اجعلنی متواضعا لاجبارامتکبرا''

بعض لوگوں نے کہا کہ نبی کریم ﷺ کے ان دعائیہ کلمات کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ مجھے عاجزی میں زندہ رکھ مجھے جبار ومتکبر نہ بنا۔

''وفیه تعلیم الأمة لیعرفوا افضل الفقراء فیحبوھم ویجالسوھم لینال برکتھم''

اس میں امت کو تعلیم دینا مقصود تھا کہ تم لوگ جو فقراء کو حقیر سمجھتے ہو یہ عقل ودانش کے خلاف ہے، رب تعالیٰ کے ہاں فقیر ومسکین کا ایک ہی درجہ ہوگا، اس لئے تمہیں چاہئے کہ تم فقیروں کی فضیلت کو پہچانو، ان سے محبت کرو، ان سے مل کر بیٹھو تا کہ تمہیں ان کی برکت حاصل ہو۔

"وفیه تسلیة للمسکین وتنبیه علی علو درجاتهم"

نبی کریم ﷺ نے مسکینی حالت میں زندگی گزارنے کی دعاء کر کے مسکینوں کو تسلی دی، اوران کو اس پر خبردار کیا کہ تمہارا مرتبہ بہت بلند ہے۔ یعنی اے مسکین تو اپنی مسکینی کو ہی نہ دیکھ بلکہ یہ دیکھ کہ تجھے رب تعالیٰ نے وہ مقام دیا ہے جو تیرے آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے رب تعالیٰ سے دعاء کر کے حاصل کیا۔

کیا تو صرف عشق محبت کا دعویدار ہے یا کہ اپنے پیارے محبوب ﷺ کی زندگی کو اپنے لئے مشعل راہ بھی بناتا ہے۔

(وامتنی) وفی روایة الحاکم وتوفنی (مسکینا) دل علی انه ﷺ کان علی وصف المسکنة الی آخر العمر " اور آپ نے اپنی دعاء مبارک میں یہ الفاظ مبارکہ ذکر فرمائے "وامتنی مسکینا" اے اللہ مجھے مسکینی کی حالت میں وصال عطاء کر۔

مستدرک حاکم میں "وتوفنی مسکینا" کے الفاظ مذکور ہیں، معنی دونوں روایات کا ایک ہی ہے۔

ان دعائیہ کلمات سے واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے آخری عمر تک مسکینی کی حالت میں وقت گذارا۔ کیونکہ آپ کی دعاء کو اللہ تعالیٰ نے رد نہیں فرمایا بلکہ قبول فرمایا۔ "واحشرنی فی زمرة المساکین" اور مجھے مساکین کی جماعت میں اٹھا۔ اس جملہ میں بہت کمال پایا گیا ہے کہ مصطفیٰ کریم نے یہ عرض کیا کہ اے اللہ مجھے مسکینوں کی جماعت میں اٹھا، یہ نہیں "واحشرهم فی زمرتی" ان کو میری جماعت میں اٹھا۔

"لکان لهم فضل کثیر وعلو کبیر" تاکہ مساکین کو زیادہ فضیلت حاصل ہو، اور بلند مرتبہ حاصل ہو۔ یعنی مساکین بھی یہ کہہ سکیں کہ نبی کریم ﷺ نے مساکین کی جماعت میں اٹھائے جانے کی تمنا کر کے ہمارے سر فخر سے بلند کر دیئے۔ یہ جملہ ایسا ہی جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اہل علم کی فضیلت کو ان الفاظ مبارکہ سے بیان فرمایا۔

"فضل العالم العابد کفضلی علی ادناکم "حیث لم یقل کفضلی علی اعلاکم"

عالم کو عابد پر اس طرح فضیلت حاصل ہے جس طرح مجھے تمہارے ادنیٰ شخص پر فضیلت حاصل ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ جس طرح مجھے تمہارے اعلیٰ شخص پر فضیلت حاصل ہے، تاکہ علماء دین فخر سے سر بلند کر سکیں کہ نبی کریم ﷺ کی کتنی ہی شان کریمی ہے کہ ہماری فضیلت کو عظیم الفاظ سے بیان فرمایا۔

اس سے آگے حدیث مذکور واضح ہے ''اربعین خریفا'' کی وضاحت پہلے کی جا چکی ہے۔

اور نبی کریم ﷺ کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ فرمانا کہ تم مساکین سے محبت رکھو، یعنی دلی طور پر ان سے محبت رکھو، اور مساکین کو اپنی محافل ومجالس میں قریب کرو (کسی کو مسکین سمجھ کر اپنی مجلس سے دور نہ کر دینا) تو اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے قریب کرے گا، اپنا مقرب بنائے گا۔ (ماخوذ از مرقات ج۱۰ص۱۱،۱۲)

☆ "وعن انس انه قال قال رسول الله ﷺ لقد اخفت فی الله ومایخاف احد ولقد اوذیت فی الله ومایؤذی احد ولقد اتت علی ثلاثون من بین لیلة ویوم ومالی ولبلال طعام یأكله ذو كبد الاشئ یواریه ابط بلال رواه الترمذی وقال معنی هذا الحدیث حین خرج النبی ﷺ هاربامن مكة ومعه بلال انما كان مع بلال من الطعام مایحمل تحت ابطه"

(مشکوۃ باب فضل الفقر)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تحقیق مجھے اللہ کے دین کے اظہار میں ڈرایا گیا جتنا کسی ایک کو نہیں ڈرایا گیا، اور تحقیق مجھے اللہ کی راہ میں ایذاء پہنچائی گی جو کسی ایک کو ایذاء نہیں پہنچائی گی۔ اور مجھ پر تیس دن اور راتیں ایسی گزریں کہ میرے اور بلال کے پاس اتنا طعام نہیں ہوتا تھا کہ اسے کوئی انسان یا حیوان کھائے سوائے اس کے کہ اسے بلال کی بغل چھپا لیتی۔ ترمذی نے بیان کیا ہے کہ اس حدیث پاک میں مکہ سے (طائف کی طرف) جانے کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے کہ اس دوران بہت تھوڑا طعام آپ کے پاس تھا جو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اپنی بغل کے نیچے دبا رکھا تھا۔

وضاحت حدیث:

" لقد اخفت فی الله "اخفت" ماضی مجہول ہے باب افعال سے "فی الله "ای فی اظهار دینه "یعنی "فی الله" کا معنی ہے اللہ کے دین کو ظاہر کرنے میں۔

"ومایخاف " میں "ما" نافیہ ہے۔ اور "یخاف "مجہول کا صیغہ ہے۔ "احد"ای غیری "یعنی میرے

سواء، اب مکمل معنی یہ ہوگیا۔ تحقیق مجھے اللہ کے دین کے ظاہر کرنے میں اتنا خوف دلایا گیا (ڈرایا گیا) جتنا میرے سواء کسی ایک کو نہیں ڈرایا گیا۔

(ولقداوذیت فی اللہ وما یؤذی احد) فی اللہ ای فی طریقه ورضاه''

یہاں ''فی اللہ'' کا معنی اللہ کا راستہ اور اس کی رضاء۔ یعنی اللہ کے راستے میں اور اس کی رضاء کو طلب کرنے میں جتنا مجھے ستایا گیا ہے اتنا کسی اور کو نہیں ستایا گیا۔

یعنی دین اسلام کی راہ میں جتنی تکالیف مجھے دی گئیں اتنی کسی کو بھی نہیں دی گئیں۔ پھر غربت اور فقر کی یہ حالت تھی کہ ایک ماہ تک اتنے طعام سے گذارہ گیا جو حضرت بلال رضی اللہ عنہ بغل میں دبا کر لے گئے۔ یہ طائف میں تبلیغ کی غرض سے جانے کا واقعہ ہے۔

مواہب لدنیہ میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے تین ماہ بعد طائف تشریف لے گئے۔ کیونکہ ابو طالب کی وفات بھی ہو چکی تھی، کفار آپ کو ستارہے تھے۔ جب آپ طائف گئے تو آپ کے ساتھ زید بن حارثہ بھی تھے (اور حضرت بلال بھی تھے) ایک مہینہ وہاں آپ نے قیام فرمایا۔ ثقیف قبیلہ کے سرداروں کو دعوت اسلام دی لیکن انہوں نے اسے قبول نہ کیا، بلکہ اپنے بے وقوف لوگوں اور لڑکوں آپ کے پیچھے لگا دیا، جو آپ کو (معاذ اللہ) گالیاں دیتے۔ انہوں نے آپ کو پتھروں سے مارا یہاں تک کہ آپ کی نعلین مبارک خون سے رنگین ہوگئیں۔ وہ لوگ جب آپ کو پتھر مارتے تھے تو آپ بیٹھ جاتے تھے، وہ اوباش لوگ آپ کو بازوؤں سے پکڑ کر پھر کھڑا کرتے اور چلاتے پھر پتھر مارتے اور خود ہنستے تھے۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اپنے آپ کو آگے کرتے اور آپ کو بچارہے تھے یہاں تک کہ ان کا سر بھی پھوڑ دیا گیا اور نہیں بھی شدید زخمی کر دیا گیا۔

بخاری اور مسلم میں ایک حدیث شریف اسی واقعہ پر مذکور ہے۔

''عن عائشة انها قالت للنبی ﷺ هل اتی علیک یوم اشد من یوم احد قال لقد لقیت من قومک وکان اشد مالقیت منهم یوم العقبة اذعرضت نفسی علی عبد یالیل ابن عبد کلال فلم یجبنی الی مااردت فانطلقت وانا مهموم علی وجهی فلم استفق الاوانابقرن

الثعالب فرفعت راسی فاذا بسحابة قد اضلتنی فنظرت فاذا فیها جبرائیل فنادانی ثم قال یا محمد ان اللہ قد سمع قول قومک وما ردواعلیک وقد بعث الیک ملک الجبال لتامرہ بما شئت فنادانی ملک الجبال فسلم علی ثم قال یامحمدان اللہ قدسمع قول قومک واناملک الجبال وقدبعثنی ربک الیک لتامرنی بأمرک ان شئت ان اطبق علیھم الاخشبین قال النبی ﷺ بل ارجو ان یخرج اللہ من اصلا بھم من یعبد اللہ وحدہ لا یشرک بہ شیا"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا، آپ پر احد کے دن سے بھی کوئی سخت دن آیا۔ آپ نے فرمایا ہاں میں تمہاری قوم کو ملا، وہ دن میرے لئے احد کی گھاٹی کے دن سے بھی سخت تھا۔ میں نے اپنے آپ کو عبد یالیل ابن عبد کلال کے پاس پیش کیا، اس نے قبول نہ کیا اسے جو میں (اس کے اسلام لانے کا) ارادہ رکھتا تھا میں چلا اس حال میں کہ میں بہت زیادہ غمزدہ تھا، مجھے غم سے افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ میں قرن ثعالب میں پہنچا تو میں نے سر اٹھایا، اچانک بادل مجھ پر چھا گئے، میں نے دیکھا کہ ان میں جبریل ہیں، انہوں نے مجھے پکارا، پھر کہا اے محمد بیشک اللہ تعالیٰ نے تمہاری قوم کے ساتھ بات کو سنا اور ان کے جواب کو بھی سنا، تحقیق اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف پہاڑوں کے فرشتے کو بھیجا تا کہ آپ جو چاہیں اسے حکم دیں۔ مجھے پہاڑوں کے فرشتے نے پکارا، پھر مجھے سلام کہا، پھر کہا اے محمد بیشک اللہ تعالیٰ نے تمہاری قوم کے قول کو سنا، میں پہاڑوں کا فرشتہ ہوں، تحقیق آپ کے رب نے مجھے آپ کی طرف بھیجا ہے تا کہ آپ اگر چاہیں تو مجھے حکم دیں کہ میں ان پر دو پہاڑوں کو منطبق کر دوں (ملا دوں) نبی کریم ﷺ نے فرمایا بلکہ میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی پشتوں سے ایسی مخلوق پیدا کرے گا جو اس کی عبادت کریں گے اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ (ماخوذ از مرقات ج ۱۰ ص ۱۷)

☆ "وعن ابی طلحة قال شکونا الی رسول اللہ ﷺ الجوع فرفعنا عن بطوننا. عن حجر حجر فرفع رسول اللہ ﷺ عن عن بطنة عن حجرین"

(رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث غریب ، مشکوۃ باب فضل الفقراء)

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم نے نبی کریم ﷺ سے بھوک کی شکایت کی، اور اپنے اپنے

پیٹ سے ایک ایک پتھر باندھے ہوئے کپڑا اٹھایا، تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے پیٹ سے کپڑا اٹھایا تو آپ کے پیٹ سے دو پتھر باندھے ہوئے تھے۔

"فائده شدالحجر علی البطن ان لا ید خل النفخ فی الامعاء الخالیة "

پیٹ پر پتھر باندھنے کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ خالی انتڑیوں میں ہوا نہیں بھرتی، جس کی وجہ سے پیٹھ سخت رہتی ہے اور بھوک کی بے قراری کی وجہ سے پیٹھ نہیں جھکتی۔ (ماخوذ از مرقات ج ۱۰ ص ۱۸)

تنبیہ: " واما حدیث الفقر فخری وبه افتخر فبا طل لا اصل له علی ماصرح به الحفاظ من العسقلانی وغیره " لیکن حدیث کہ فقر میرا فخر ہے اور اس پر میں فخر کرتا ہوں' اس کی کوئی اصل (سند، بنیاد) نہیں۔ حفاظ احادیث نے اس کی وضاحت کی ہے جیسا کہ حافظ عسقلانی وغیرہ نے ذکر فرمایا ہے۔ (مرقاة ج ۱۰ ص ۱۲)

تاہم راقم کے نزدیک اگر مقررین حضرات مندرجہ بالا احادیث سے نتیجہ یہ نکالنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ فقر نبی کریم ﷺ کا مطلوب تھا اور آپ کا مقصود تھا، اور آپ کا مقام فخر تھا۔

"واما حدیث کادالفقر ان یکون کفرا فهو ضعیف جدا وعلی تقدیر صحته فهو محمول علی الفقر القلبی المؤدی الی الجزع والفزع بحیث یفضی الی عدم الرضا با لقضاء"

لیکن حدیث "کادالفقران یکون کفرا" ضعیف ہے، اگر حدیث کا صحیح ہونا ثابت ہو جائے تو اس سے مراد قلبی فقر ہوگا یعنی مال وغیرہ کے نہ ملنے پر اپنے آپ کو دلی طور پر محتاج سمجھ کر جزع وفزع شروع کر دے، اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر راضی نہ رہے۔ (مرقات ج ۱۰ ص ۱۲)

فقیر شخص اپنے سے زیادہ فقیر کو دیکھے:

"عن ابی هریر ة قال قال رسول الله ﷺ اذا نظر احد کم الی من فضل علیه فی المال و الخلق فلینظر الی من هو اسفل منه" (بخاری ومسلم)

"وفی روایة لمسلم قال انظروا الی من هو اسفل منکم ولا تنظروا الی من هو فوقکم فهو اجدر ان لا تزدروا نعمة الله علیکم " (مشکوة باب فضل الفقراء)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو تم میں سے کوئی اس شخص کو دیکھے جسے مال اور صورت میں فضیلت دی گئی ہو تو وہ اس سے نیچے شخص کو دیکھے۔

مسلم کی ایک روایت میں ہے اپنے سے نیچے والے شخص کو دیکھو اوپر والے کو نہ دیکھو یہ زیادہ مناسب ولائق ہے۔اللہ تعالیٰ کی نعمتیں جو تم پر ہیں ان کو حقیر نہ سمجھو۔

وضاحت حدیث:

"فلينظر الى من هو اسفل منه "اى من هو دونه فى الدنيا وأقل رتبه منه مالاو منالاوله فى الآخرة الدرجة العلياماآلا"

نیچے والے شخص کو دیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ جو دنیاوی مال کے لحاظ پر تم سے کم مرتبہ رکھتا ہو اسے دیکھو تا کہ تمہیں سمجھ آجائے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس دوسرے شخص سے تو زیادہ نعمتیں دے رکھی ہیں۔اگر چہ جتنا زیادہ غریب ہوگا اتنا ہی زیادہ مرتبہ اس کا آخرت میں ہوگا۔

اس سے ضمنی طور پر ایک مسئلہ سمجھ آیا کہ جس شخص کو مال و دولت حاصل ہو وہ اپنے سے کم والے کو نہ دیکھے۔

"لئلا يحصل له العجب والغرور والا فتخار والتكبر والخيلاء بل يجب عليه ان يقوم بحق شكره على النعماء"

تا کہ اسے اپنے آپ پر تعجب وغرور،اور فخر وتکبر نہ آئے اور اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھے، بلکہ واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرے۔

اگر انسان بہت ہی زیادہ فقیر وغریب ہو اسے اپنے سے گھٹیا دنیاوی مال کے لحاظ پر اور کوئی نظر نہ آئے تو وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے دنیاوی مال عطاء کر کے کثیر مشقت میں مبتلاء نہیں کیا، پھر دنیا کا مال جلدی ختم ہونے والی چیز ہے،محض دنیادار کا مقام پست ہے، باقی رہنے والی چیز اخروی نعمت ہے، اور جن لوگوں کو اخروی نعمتیں حاصل ہوں وہی اللہ تعالیٰ کے مقرب ہیں۔

علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ جب کسی دنیادار کو دیکھتے تھے تو یہ دعاء فرماتے تھے۔

"اللهم انی أسألک العفو والعافیة فی الدنیا والعقبی"

اے اللہ میں تجھ سے عفو وعافیت کا سوال کرتا ہوں دنیاو آخرت میں۔

ایک ولی اللہ وعظ فرمارہے تھے ان کی محفل میں ایک فقیر اٹھا اس نے کہا میں نے اتنی مدت سے کچھ نہیں کھایا نہ ہی اکیلے اور نہ ہی کسی محفل میں۔ وہ بزرگ کہنے لگے اے اللہ کے دشمن تو جھوٹا ہے، رب تعالیٰ بھوک تو اپنے خاص بندوں کو عطاء کرتا ہے، وہ اپنے انبیاء کرام اور اولیاء کرام کو بھوک عطاء کرتا ہے جو ان کے مقرب ہونے کی علامت ہوتی ہے۔

"ولو کنت منهم لما اظهرت هذه الشکایة ولسترت عن الخلق هذا الغایة"

اگر تو بھی اللہ تعالیٰ کا مقرب ہوتا اور اس کے اولیاء کرام سے ہوتا تو یہ شکایت ظاہر نہ کرتا، اور اپنا یہ حال مخلوق سے چھپا کر رکھتا۔

مسلم شریف کی دوسری روایت میں جو ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں تمہیں عطاء کر رکھی ہیں ان کو حقیر نہ سمجھو، اس کا مطلب واضح ہے کہ رب تعالیٰ نے جو تمہیں سانس جیسی عظیم نعمت عطاء کر رکھی ہے جس سے تمہاری زندگی کی دارومدار ہے اور اس نے تمہیں دیکھنے کے لئے آنکھ اور سننے کے لئے کان اور دوسرے اعضاء دے رکھے ہیں تم ان کا شکریہ ہی ادا نہیں کر سکتے۔ کیا یہ عظیم نعمتیں نہیں، جب عظیم نعمتیں ہیں اور یقیناً عظیم نعمتیں ہیں تو تم ان کو حقیر نہ سمجھو، کوئی حرف شکایت زبان پر نہ لاؤ۔ (ماخوذ از مرقات ج ۱۰ ص ۱۰)

دنیاوی نعمتوں سے کنارہ کشی بہتر:

"عن معاذبن جبل ان رسول الله ﷺ لما بعث به الی الیمن قال ایاک والتنعم فان عبادالله لیسوا بالمتنعمین" (رواه احمد، مشکوة باب فضل الفقراء)

معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے جب انہیں یمن کی طرف بھیجا تو آپ نے فرمایا کہ تم اپنے آپ کو دنیاوی نعمتوں سے بچا کر رکھو، بیشک اللہ کے (مخلص) بندے دنیاوی نعمتیں نہیں رکھتے۔

وضاحت حدیث:

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن میں بھیجنے کی وجہ یہ تھی کہ ان کو قاضی اور حاکم بنا کر بھیجا گیا تھا ان کو دنیاوی

نعمتوں سے بچ کر رہنے کا حکم دینے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ دنیاوی نعمتوں سے نفع حاصل کرنا مطلقاً منع ہے بلکہ مراد یہ ہے۔

"وھو المبالغة فی تحصیل قضاء الشھوۃ علی وجه التکلف فی البغیة بتکثیر النعمة والحرص علی النھمة"

کہ بہت زیادہ دنیاوی نعمتیوں کو حاصل کرنے میں تکلف نہ کرے اور حرص ولالچ نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر شاکر نہ رہنا اور صبر نہ کرنا اور صرف دنیاوی مال ودولت کا حریص ہونا کفار کا کام ہے، اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے اس کی تقدیر پر راضی رہتے ہیں۔ (از مرقاۃ ج ۱۰ ص ۲۴)

تھوڑے رزق پر راضی رہے:

"عن علی قال قال رسول اللہ ﷺ من رضی من اللہ بالیسیر من الرزق رضی اللہ منه بالقلیل من العمل" (مشکوۃ باب فضل الفقراء)

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اللہ تعالیٰ سے تھوڑے رزق پر راضی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے تھوڑے عمل پر راضی ہوتا ہے۔

حدیث پاک کا مطلب تو واضح ہے البتہ اس پر ایک اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اس حدیث پاک میں بندے کی رضاء کا پہلے ذکر ہے اور رب تعالیٰ کی رضاء کا بعد میں ذکر ہے، اسی طرح ابن عساکر کی ایک روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے "من رضی عن اللہ رضی اللہ عنه" (جو اللہ سے راضی ہوا اللہ اس سے راضی ہوا) اس میں بندے کی رضاء کا پہلے ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضاء کا بعد میں ذکر ہے۔

اور قرآن پاک میں ہے "رضی اللہ عنھم ورضوا عنه" اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی ہیں۔

اس آیۃ کریمہ میں رب تعالیٰ کی رضاء کا پہلے ذکر ہے اور بندوں کی رضاء کا بعد میں ذکر ہے ان میں تطبیق کیسے ہوگی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی دو قسم کی رضاؤں میں بندے کی رضاء پائی جاتی ہے۔ ایک رب تعالیٰ کی رضاء اوّلی ہے جو کہ اس کے علم سے متعلق ہے۔ وہ رضاء رب تعالیٰ کی پہلے ہے اور بندے کی رضاء بعد میں ہے اس کا

ذکر "رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ "میں ہے۔

اوررب تعالیٰ کی دوسری رضاء ابدی ہے جو بندے کے عمل پر جزاء کی صورت میں مرتب ہے،اس کی رضاء کے لحاظ پر بندے کی رضاء پہلے ہےاوراس کے عمل پر راضی ہونے اوررب تعالیٰ کی تقدیر پر راضی ہونے کے بعداللہ تعالیٰ کی رضاء پائی جاتی ہے کہ وہ اسے جزاء خیر سے نواز دیتا ہے۔ (ماخوذازمرقاۃ ج۱۰ص۴۴)

احتیاجی کو چھپا کرر کھے:

"عن ابن عباس قال قال رسول اللہ ﷺ من جاع او احتاج فکتمه الناس کان حقا علی اللہ عز وجل ان یرزقه رزق سنة من حلال" (رواهما البیهقی فی شعب الایمان مشکوۃ باب فضل الفقراء)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص بھوکا ہو گیا یا محتاج ہو گیا تو لوگوں سے اسے چھپا کرر کھا تو اللہ تعالیٰ کے کرم کی وجہ سے اس پر حق ہے کہ وہ اس شخص کو ایک سال کا رزق حلال عطاء کرے۔

وضاحت حدیث: بھوکا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ فقر وغربت کی وجہ سے اس کے پاس کوئی چیز کھانے کی نہیں محتاج ہونے کا بھی یہی مطلب ہے کہ اس کے پاس کوئی چیز نہیں جس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو بے پرواہ کر سکے،لوگوں سے چھپا کرر کھنے کا مطلب یہ ہے۔

"والمراد بالجوع جوع یتصور معه الصبر ویجوزفیه الکتمان،والافقد صرح العلماء بأن الشخص اذا مات جوعا ولم یسأل اولم یاکل ولومن المیتة یموت عاصیا"

بھوک سے مراد وہ بھوک ہے جس پر صبر کرنا ممکن ہو اسے چھپانے کا ذکر حدیث شریف میں ہے ،ورنہ اہلِ علم نے واضح طور پر بیان کیا ہے کہ اگر کوئی شخص بھوک کی وجہ سے فوت ہو جائے اور لوگوں سے سوال نہ کرے تو وہ گنہگار ہو کر فوت ہوا ہے،اسی طرح اگر کسی کو کوئی چیز کھانے کی مل گئی (خواہ مردار ہی کیوں نہ ہو) وہ نہ کھائے اور بھوک کی وجہ سے فوت ہو گیا تو گنہگار ہو کر فوت ہوا۔

"اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ وہ ایک سال اسے رزق حلال عطاء فرمائے" خیال رہے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز لازم

نہیں اس پر حق نہیں، اسی وجہ سے علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے یوں وضاحت فرمائی۔

''کان حقا علی اللہ عزوجل ''ای وعدا ثابتا علیه او امرالازمالدیه''

''اللہ تعالیٰ پر حق ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ اس نے وعدہ کر رکھا ہے کہ جو شخص اپنی بھوک اور احتیاجی کو صبر کی حد تک لوگوں سے چھپائے گا اور صبر کرے گا میں اسے ایک سال رزق حلال عطاء کروں گا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں فرماتا تو گویا کہ اس نے اس حق کو اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ یا مراد ہی یہ ہو کہ کسی کو تو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ رب تعالیٰ پر کوئی چیز لازم کرے لیکن رب تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے کسی چیز کو اپنے آپ پر لازم کردے تو وہ ایسا کرنے کا حق رکھتا ہے۔ (ماخوذ از مرقات ج۱۰ص۲۴)

ضمناً ایک اور مسئلہ بھی واضح ہوا کہ نیک اعمال پر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کا نزول فرماتا ہے۔

☆ ''وعن عمران بن حصین قال قال رسول اللہ ﷺ ان اللہ یحب عبده المؤمن الفقیر المتعفف أبا العیال'' (رواه ابن ماجه ،مشکوة باب فضل الفقراء)

عمران بن حصین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندے کو پسند فرماتا ہے جو فقیر ہو اور عیال دار ہو اور سوال کرنے سے درگذر کرے۔

خوبصورت مسجع وضاحت:

اس حدیث پاک کی توضیح وتشریح میں علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے بہت خوبصورت اور مسجع عبارت ذکر کی ہے، خطباء وطلباء اسے خوب یاد کریں۔

''المعنی انه مع کونه صاحب العیال وفقیر الحال و کسیر البال تعفف عن السؤال فهو المؤمن علی وجه الکمال فلذااحبه ذوالجلال و الجمال''

حدیث شریف کا معنی یہ ہے کہ ایک شخص صاحب عیال بھی ہو، اور فقیر الحال بھی ہو، شکستہ دل بھی ہو پھر سوال سے درگذر کرے وہ کامل مؤمن ہے اسی لئے رب تعالیٰ صاحب جلال وجمال اس سے محبت کرتا ہے۔ (مرقات ج۱۰ص۲۵)

فقراء مہاجرین کی برکت سے دعاء:

"عن امیة بن خالد بن عبد الله بن اسید عن النبی ﷺ انه کان یستفتح بصعالیک المهاجرین" (رواه فی شرح السنة) مشکوۃ باب فضل الفقراء)

امیہ بن خالد بن عبداللہ بن اسید روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ مہاجرین کی برکت سے فتح طلب کرتے تھے۔

وضاحت حدیث:

"الصعالیک" جمع ہے "صعلوک" کی عصفور کا وزن ہے، معنی اس کا "فقیر" ہے۔ (قاموس)

" انه کان یستفتح " ای یطلب الفتح والنصرة علی الکفار من الله تعالی (بصعالیک المهاجرین) ای بفقرائهم وببرکة دعائهم "

نبی کریم ﷺ کافروں پر فتح ونصرت (کامیابی اور امداد) اللہ تعالیٰ سے مہاجرین فقراء کی دعاء کی برکت سے طلب کرتے تھے۔

ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ یہ دعاء کرتے تھے۔" اللهم انصرنا علی الاعداء بحق عبادک الفقراء المهاجرین "اے اللہ دشمنوں کے خلاف ہماری امداد فرما اپنے مہاجرین فقراء کی برکت کی وجہ سے۔

" وفیه تعظیم الفقراء والرغبة الی دعائهم والتبرک بوجوههم "

اس میں فقراء کی تعظیم پائی گئی ہے، اوران سے دعاء کرنے کی رغبت دلائی گئی ہے، اوران کی ذاتوں سے تبرک حاصل کرنے کی رغبت دلائی گئی ہے۔

فقراء کے ساتھ مہاجرین کی قید کا کیا فائدہ؟

"ولعل وجه التقیید بالمهاجرین لانهم فقراء غرباء مظلومون مجتهدون مجاهدون فیرجی تاثیر دعائهم اکثر من عوام المؤمنین واغنیائهم "

فقراء کے مہاجرین کی قید کا یہ فائدہ ہے کہ وہ فقراء بھی تھے، بے وطن بھی تھے، مظلوم بھی تھے، مجتہدین (محنت کش) بھی تھے اور مجاہدین بھی تھے اس وجہ سے ان کی دعاء میں تاثیر زیادہ تھی

بنسبت عام لوگوں کے اور بنسبت اغنیاء کے۔ (مرقاۃ ج ۱۰ ص ۱۳)

اسی سے خود بخود واضح ہو جاتا ہے کہ جن فقیروں کو مہاجرین فقراء صحابہ کرام والی صفات اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے حاصل ہو گئیں ان کو بھی یہ شرف حاصل ہوگا کہ ان سے دعاء کرائی جائے اور ان کی برکت سے دعاء کی جائے تو اللہ اس دعاء کو شرف قبولیت عطاء فرمائے گا۔ (راقم)

فاسق کے مال پر رشک کرنا:

"عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ لا تغبطن فاجرا بنعمة فانک لاتدری ماهو لاق بعد موته ان له عندالله قاتلالايموت يعنی النار"

(رواه فی شرح السنة، مشکوة باب فضل الفقراء)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا فاسق وفاجر کی نعمتوں پر رشک نہ کرو بیشک تم نہیں جانتے کہ اسے موت کے بعد کیا حاصل ہونے والا ہے، بیشک اللہ کے ہاں اس کی ہلاکت ہوتی ہے اور وہ آگ میں ہمیشہ رہے گا۔

وضاحت حدیث: فاجر سے مراد کافر یا فاسق ہے، فاسق وفاجر کی نعمتوں سے مراد، اس کو لمبی عمر دیا جانا یا کثیر اولاد دیئے جانا، یا وسعت مال اور رتبہ عطاء ہونا لیکن یہ تمام چیزیں زائل ہونے والی ہیں، پائیدار نہیں جو چیز پختہ نہ ہو اس پر رشک کرنے کا کیا فائدہ۔

پھر بیشک تمہیں معلوم ہی نہیں کہ انہیں قبر وحشر میں کیا ملنے والا ہے؟ ان کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر نہ ادا کرنے کی وجہ سے کفر وفسق وفجور پر قائم رہنے کی مد سے "هو ملاق فی مقابلة تلک النعمة من النقمة والمحنة" عذاب میں ہی مبتلاء ہونا ہے۔

"(ان له) ای للفاجر (عندالله قاتلا) ای مهلكا له او معذباعذابا شديدا من شانه ان يقتل"

حدیث شریف میں قاتل بمعنی مقتول استعمال ہے، یعنی فاجر کو اللہ تعالیٰ شدید عذاب دے گا جو اس کے لئے ہلاکت کا سبب بنے گا گویا کہ یوں کہا گیا کہ وہ اللہ کے ہاں قتل ہونے کے لائق ہوگا۔

"(لایموت) ای لایفنی ولا ینعدم ذلک القاتل بل موجود دائما ولا ینقطع ابدا"

وہ مرے گانہیں، یعنی وہ ہمیشہ اس عذاب میں مبتلاء ہوگا، اس کا عذاب ختم نہیں ہوگا، وہ فنا نہیں ہوگا اور نہ ہی معدوم ہوگا (یعنی النار) یہ حضرت ابو ہریرہ سے روایت کرنے والے عبداللہ بن مریم کی تفسیر ہے۔ (مرقاۃ)

یہ قرآن پاک کی آیۃ" کلما نضجت جلودھم بدلناھم جلودا غیرھا" (جب ان کے چمڑے جل جائیں ان کے اور چمڑے ہم تبدیل کردیں گے) کے مطابق ہے۔ (راقم)

سوال کرنا کب جائز ہے اور کب نا جائز ہے؟

"عن قبیصة بن مخارق قال تحملت حمالة فاتیت رسول اللہ ﷺ اسأ له فیھا فقال اقم حتی تأتینا الصدقة فنأمرلک بھا ثم قال یا قبیصة ان المسئلة لا تحل الالاحد ثلاثة رجل تحمل حمالة فحلت له المسئلة حتی یصیبھا ثم یمسک ورجل اصابته جائحة اجتاحت ماله فحلت له المسئا لة حتی یصیب قواما من عیش او قال سدادا من عیش ورجل اصابته فاقة حتی یقوم ثلاثة من ذی الحجامن قومه لقد اصابت فلانا فاقة فحلت له المسألة حتی یصیب قواما من عیش او قال سدادا من عیش فما سواھن من المسئلة یا قبیصة سحت یأکلھا صاحبھا سحتا"

(رواہ المسلم، مشکوۃ باب من لاتحل له المسئلة ومن تحل له)

قبیصہ بن مخارق کہتے ہیں میں نے ایک بوجھ (ادائیگی مال) اٹھایا ہوا تھا۔ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس، آپ سے اس کے متعلق سوال کرنے لگا، آپ نے فرمایا ٹھہر جاؤ یہاں تک کہ ہمارے پاس صدقہ کا مال آجائے تو ہم تمہارے لئے اس کا حکم دیں گے، پھر آپ نے فرمایا اے قبیصہ بیشک سؤال حلال نہیں سوائے تین شخصوں کے، ایک وہ شخص جس نے (مالی) بوجھ اٹھایا ہوا ہو اس کے لئے سؤال حلال ہے یہاں تک کہ وہ اس بوجھ کو دور کرنے کے لئے مال پالے، پھر سؤال سے

رک جائے ،اور وہ شخص جسے آفت پہنچے اور اس کے مال کو ہلاک کردے تو اس کے لئے سؤال حلال ہے یہاں تک کہ اس کا حال درست ہو جائے ،ایک اور شخص جسے فاقہ پہنچے یہاں تک کہ اس کی قوم میں سے تین شخص دانا یہ کہیں کہ اسے فاقہ پہنچا ہے اسے سؤال کرنا حلال ہے یہاں تک کہ اس کا حال درست ہو جائے ،اے قبیصہ ان کے سواء سؤال کرنا حرام ہے اور سؤال کرنے والا ناجائز طور پر مال کھارہا ہوگا۔

وضاحت حدیث: (قبیصۃ) بفتح القاف و کسر الموحدۃ ، قاف پر زبر اور باء کے نیچے زیر ہے۔(ابن مخارق)بضم المیم و کسر الراء، میم پر پیش اور راء کے نیچے زیر ہے۔

"تحملت حمالۃ " میں نے بوجھ اٹھایا ہوا تھا۔حمالۃ کا معنی بوجھ اٹھانا۔خواہ وہ دیت کی ادائیگی لازم ہو۔ یا کوئی چٹی ادا کرنی ہو، یا قرضہ ادا کرنا ہو، یا لوگوں کے درمیان اختلافات کو دور کرنے کے لئے مال خرچ کرنے کی ضرورت ہو۔اس آدمی کے لئے صدقہ لینا حلال ہے۔لیکن شرط یہ ہے وہ قرضہ ناجائز کاموں کے لئے نہ لیا ہوا ہو۔

فائدہ : ابن الملک رحمہ اللہ نے فرمایا حدیث شریف میں زکوۃ کے مال سے سؤال کرنے کی ممانعت ہے،لیکن نفلی صدقہ لینے کا سؤال کرنا اس جائز ہے جو چلنے پھرنے سے معذور ہو یا کسی بیماری میں مبتلاء ہو اسے ایک دن کی روزی کے لئے سؤال کرنا جائز ہے۔مال ذخیرہ بنا کر نہ رکھے۔

اگر ایک شخص چلنے پھرنے پر اور تجارت وغیرہ پر قادر تو ہے لیکن علم حاصل کرنے کے لئے اس نے ذریعہ معاش کو چھوڑا ہوا ہے اسے زکوۃ دینا جائز ہے اور نفلی صدقہ دینا بھی جائز ہے۔اگر ایک شخص نوافل ادا کرتا رہتا ہے اور نفلی روزے رکھتا ہے اس لئے وہ مال حاصل کرنے کا کوئی طریقہ اختیار نہیں کرتا اسے زکوۃ دینا جائز نہیں اور اسے صدقات نفلیہ دینا بھی مکروہ ہے۔

اگر کوئی جماعت ریاضت کے لئے ،اپنے دلوں کی صفائی کے لئے اور طاعت کی غرض سے کہیں بیٹھ جائے ان کے پاس کھانے کی کوئی چیز نہ ہو تو کوئی شخص ان کو روٹی کے ٹکرے اور ضرورت کے مطابق لباس مانگ کر دے دے۔"فحلت لہ المسالۃ "جس شخص نے قرض وغیرہ کا بوجھ اٹھایا ہوا ہو اسے سؤال کرنا جائز ہے۔

''وجازت بشرط ان یترک الالحاح والتغلیظ فی الخطاب''

جائز تو ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ چمٹ کر اور لپٹ کر سوال نہ کرے، اور سوال کرتے ہوئے سخت کلامی بھی نہ کرے۔

اگر اسے ضرورت کے لئے مال مل جائے "فیمسک" پھر وہ سوال کرنے سے رک جائے کیونکہ اسے ضرورت سے زائد حاصل کرنے کے لئے سوال کرنا بہتر نہیں۔

"ورجل اصابته جائحة اجتاحت ماله" جائحة ای آفة وحادثة مستأصلة من جاحه یجوحه اذا استأصله وهی الآفة المهلكة للثمار والأموال (اجتاحت) ای استأصلت واهلكت "جائحة" کا لفظ "جاحه یجوحه" سے لیا ہوا ہے۔ اس تمام جملہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص سوال کر سکتا ہے جس کے پھلوں کو اور کھیتی باڑی کو اور دوسرے مالوں کو کوئی آفت، کوئی حادثہ تباہ و برباد کر دے تو وہ سوال کر کے اپنی ضروریات پوری کر لے۔

"حتی یصیب قواما من عیش او قال سدادا من عیش"

یہاں راوی کو شک ہے کہ نبی کریم ﷺ نے "قواما من عیش" فرمایا۔ یا "سدادا من عیش" فرمایا۔

معنی دونوں کا تقریبا ایک ہی ہے کہ وہ اپنی گذران کی ضروریات یعنی کھانا اور لباس حاصل کر لے۔

پہلے جملے کا لغوی معنی ہے "یدرک ،ماتقوم به حاجته الضروریة" یہاں تک کہ وہ اتنا مال حاصل کر لے جس سے وہ اپنی ضروری حاجات کو پورا کر لے۔ اور دوسرے جملے کا لغوی معنی یہ ہے "مایسدبه الفقر" ویدفع ویکفی الحاجة" کہ وہ اتنا مال حاصل کر لے جو اس کے فقر و غربت کو بند کر دے اور اس مال کے ذریعہ غربت کا دفاع کر لے اور اس کی حاجت کو پورا کر لے۔ "ورجل اصابته فاقة" اور ایک شخص جس کو فاقہ پہنچے وہ سوال کر کے (زکوٰۃ کا) مال بھی لے سکتا ہے۔ "فاقة ای حاجة شدیدة اشتهر بها بین قومه" فاقہ کا معنی ہے شدید حاجت مند ہونا یہاں تک کہ اس کی حاجتمندی کو اس کی قوم بھی جانتی ہو۔

"حتی یقوم ثلاثة من ذی الحجا من قومه لقد اصابت فلانافاقة فحلت له المسئلة"

یہاں تک کہ اس کی قوم میں سے تین عقلمند آدمی کہیں کہ فلاں شخص کو شدید حاجت کا سامنا ہے تو وہ بھی سوال کر سکتا ہے، تاکہ وہ اپنی حاجت کو پورا کر سکے۔

اعتراض: گواہی تو دو آدمیوں کی مکمل ہو جاتی ہے، تین آدمیوں کے گواہی دینے کا کیا مطلب ہے؟

جواب: " قال ابن الملک وهذا علی سبیل الاستحباب والاحتیاط لیکون ادل علی براءة السائل عن التهمة فی ادعائه وادعی للناس الی سرعة اجابته وخص بکونهم من قومه لأنهم هم العالمون بحاله وهذا من باب التبیین والتعریف اذ لامدخل لعدد الثلاث من الرجال فی شئ من الشهادات عند احد من الائمة "

حدیث شریف میں گواہی کا ذکر نہیں، گواہی تو دو آدمیوں سے ہی مکمل ہو جاتی ہے۔ تین آدمیوں کی گواہی کا تو چار اماموں میں سے کوئی ایک بھی قائل نہیں، اور گواہی کے لئے اس کی قوم سے ہونا بھی ضروری نہیں، حدیث شریف میں ذکر ہے کہ اس حاجتمند کی فاقہ کی حالت کو اس کی قوم کے آدمی بیان کریں اور واضح کریں کیونکہ وہ اس کی حالت کو اچھی طرح جانتے ہیں، اسی وجہ سے تین آدمیوں کا ذکر فرمایا کہ تین آدمی جماعت بن جاتے ہیں۔ یعنی مستحب ہے اور احتیاط اس میں ہے کہ تین شخص اس کی حالت کو بیان کریں تاکہ سؤال کرنے والا اپنے دعوی اور سؤال میں غلط بیانی کی تہمت سے بچ جائے، اور دوسرے لوگ ان کی بات کو جلدی قبول کرلیں۔

واضح ہوا کہ یہ گواہی نہیں بلکہ اس کے حال کا بیان اور وضاحت ہے، کہ اے لوگو ہم اس کی قوم کے افراد ہیں ہم اس کی حالت کو جانتے ہیں تو اس کی حالتِ حاجتمندی کو ہم سے سن کر بغیر کسی بدگمانی کے جلدی ہی قبول کرلو۔

"فما سواهن سحت" ان تین قسم کے سؤالوں کے بغیر سؤال کرنا حرام ہے، اور سؤال سے حاصل کیا ہوا مال حرام ہو گا، اس مال سے نفع حاصل کرنا حرام ہوگا۔

لیکن یہ اس وقت ہوگا جب زکوۃ کا مال ہو اور صدقات واجبہ ہوں، صدقات نفلیہ پر حرام کا اطلاق نہیں ہوگا البتہ بغیر کسی ضرورت وحاجت کے سؤال کرنا مکروہ ہوگا۔ (وضاحت حدیث ماخوذ از مرقات ج ۴ ص ۱۷۲،۱۷۳)

☆ "عن ابی هریرة قال قال رسول اللہ ﷺ من سال الناس اموالهم تکثرا فانما یسأل جمرا فلیستقل او لیستکثر " (رواہ مسلم، مشکوۃ باب من لاتحل له المسئلة ومن تحل له)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص لوگوں سے مالوں کا سوال کرے اپنے مال کو بڑھانے کے لئے تو وہ آگ کی چنگاری کا سوال کر رہا ہے، قلیل سوال کرے یا کثیر۔

حدیث شریف کا مطلب واضح ہے کہ بغیر کسی ضرورت اور عذر کے سوال کرنا کہ میرا مال زیادہ ہو جائے آگ طلب کرنے کا گویا کہ سوال پایا گیا ہے۔

☆ ''وعن عبد الله بن عمر قال قال رسول الله ﷺ ما یزال الرجل یسأل الناس حتی یأتی یوم القیامة لیس فی وجهه مزعة لحم'' (بخاری ومسلم ،مشکوۃ باب من لا تحل له المسئلة ومن تحل له)

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہمیشہ لوگوں سے سوال کرنے والا شخص قیامت کے دن آئے گا اس کے چہرے پر گوشت کا ٹکڑا نہیں ہوگا۔

وضاحت حدیث :

''مـــزعة'' میم پر ضمہ محدثین کے نزدیک زیادہ مشہور ہے۔ اور کسرہ پڑھنا بھی جائز ہے۔ اور بعض حضرات نے فتحہ بھی جائز رکھا ہے۔ زاء معجمہ ساکن ہے، اس کے بعد عین مہملہ پر فتحہ ہے۔ ''ای قطعة یسیرة من اللحم'' گوشت کا چھوٹا ٹکڑا۔ گوشت کا ٹکڑا چہرے پر نہ ہونے کے دو مطلب علامہ طیبی رحمہ اللہ نے بیان فرمائے ہیں، ایک حقیقی اور دوسرا مجازی۔

مجازی معنی یہ ہے:

'' یأتی یوم القیامة ولا جاہ له ولا قدر ''من قولهم لفلان وجه فی الناس ای قدر ومنزلة ''
قیامت کے دن آئے گا اس کا کوئی مرتبہ اور قدر منزلت نہیں ہوگی۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے ''لـفـلان وجـه الـنـاس '' فلان شخص کو لوگوں میں قدر و منزلت حاصل ہے، یعنی وہ شخص وجاہت والا ہے۔

یعنی اس محاورہ میں ''وجہ'' وجاہت (قدر و منزلت) کے معنی میں مجازی طور پر استعمال ہے، ایسے ہی حدیث پاک میں بھی ''چہرے پر گوشت کے ٹکڑے کے نہ ہونے کی خبر سے بھی اس کی قدر و منزلت کی نفی کی گئی۔

حقیقی معنی یہ ہے:

" یاتی فیه ولیس علی وجهه لحم اصلا اما عقوبه له و اما اعلاما بعمله "

کہ وہ شخص جو بغیر ضرورت کے لوگوں سے سوال کرنے والا ہے وہ قیامت کے دن آئے گا اس کے چہرے پر گوشت کا ٹکڑا حقیقۃً نہیں ہوگا، اس کے چہرے کی ہڈیاں نظر آرہی ہوں گے، وجہ اس کی یہ ہوگی کہ یہ اس کے لئے عذاب ہوگا۔ یا لوگوں کو اس کے اس حالت سے اس کے عمل کے متعلق خبر دینی مقصود ہوگی۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

آپ حضرت اصول فقہ میں بیان کیا ہوا "عموم المجاز" کا ضابطہ ذہن میں رکھیں کہ اس میں اگر چہ معنی تو مجازی لیا جاتا ہے لیکن حقیقت اس کا خود بخود فرد بن جاتی ہے۔ یہاں بھی مجازی معنی لیں کہ ان کی قیامت کے دن قدر و منزلت نہیں ہوگی، وجہ اس کی ان کے چہرے پر گوشت کا نہ ہونا اور حقیقی معنی لیں جو ضمناً مجازی معنی کو مستلزم ہو تو یہ بھی جائز ہے۔ علامہ علی قاری رحمہ اللہ کی عبارت سے یہی سمجھ آرہا ہے۔

"وذلک بأن یکون علامة له یعرفه الناس بتلک العلامة انه کان یسأل الناس فی الدنیافیکون تفضیحالحاله وتشهیرا لمآله واذلالاله کمااذل نفسه فی الدنیاواراق ماء وجهه بالسؤال "

بغیر عذر کے سوال کرنے والوں کے چہرے پر گوشت کا نہ ہونا ان کی پہچان کا ذریعہ ہوگا، کہ ان کی علامت سے لوگ انہیں پہچان لیں گے کہ یہ دنیا میں بغیر کسی عذر کے لوگوں سے سوال کرتے رہے، یہ ان کے حال کے لئے شرمندگی اور پریشانی کا سبب ہوگا۔ اسی سے ان کے انجام کو بھی مشہور کر دیا جائے گا۔ اور ان کو اس حالت سے ایسے ہی ذلیل کیا جائے گا جیسا کہ انہوں نے اپنے آپ کو دنیا میں سوال کر کے ذلیل کیا تھا، اور سوال کے ذریعے اپنے چہرے کی رونق اور آب و تاب کو زائل کر دیا تھا۔

خیال رہے حقیقت ومجاز کے اجتماع کی راقم کی اختراع تاہم مرقات کی مندرجہ بالا عبارت کو دیکھ کر امید ہے کہ متوسط طلباء کرام کا ذہن اسے قبول کرلے گا، رد نہیں کرے گا۔
شائد علماء کرام اور منتہی طلباء کرام بھی اس کی تائید کریں، اگرچہ زندگی میں علماء معاصرین سے اس کی زیادہ توقع نہیں۔

حضرت امام محمد رحمہ اللہ کی پیاری دعاء:

حضرت امام محمد رحمہ اللہ اکثر طور پر یہ دعاء فرماتے تھے۔

"اَللّٰهُمَّ كَمَا صُنْتَ وَجْهِيْ عَنْ سُجُوْدِ غَيْرِكَ فَصُنْ وَجْهِيْ عَنْ مَسْئَلَةِ غَيْرِكَ"

اے اللہ جس طرح تو نے میرے چہرے کو غیر کے سامنے سجدہ کرنے سے محفوظ رکھا ہے، ایسے ہی میرے چہرے کو غیروں سے سوال کرنے سے محفوظ رکھ۔ (وضاحت حدیث ماخوذ از مرقاۃ ج ۴ ص ۱۷۴)

☆ "عن معاوية قال قال رسول الله ﷺ لاتلحفوا في المسئلة فوالله لايسئالني احد منكم شيأ فتخرج له مسئلته مني شيأ وانا له كاره فيبارك له فيما اعطيته"

(رواه مسلم ،مشكوة باب من لا تحل له الصدقة ومن تحل له)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ چمٹ کر، لپٹ کر سوال نہ کرو، قسم ہے اللہ تعالیٰ کی تم میں سے کوئی ایک مجھ سے کسی چیز کا سوال نہیں کرے گا کہ اس سوال پر میری طرف سے کوئی چیز نکال کر اسے دی گئی ایسے حال میں کہ میں اسے ناپسند سمجھتا تھا تو جو میں نے اسے دیا اس میں برکت دی جائے گی۔

وضاحت حدیث:

راقم نے جو ترجمہ کیا اس کی وجہ ملا علی قاری رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں۔

"(فيبارك) بالنصب مجهولا اي فان يبارك (له فيما اعطيته) اي على تقدير الالحاف"

"فیبارک" مجہول کا صیغہ ہے، اور اس میں نصب ہے "ان" کے مقدر ہونے کی وجہ سے، معنی اس کا یہ ہے

کہ چمٹ کر سوال کرنے والے کی وجہ اس میں برکت ہوگی اگر چہ وہ مال خوشی سے نہیں دیا گیا۔

"وقال الطیبی علی معنی الجمیعة ای لایجتمع اعطائی کارھا مع البرکة"

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "فیبارک" میں نصب جمیعت کے معنی میں ہے، مطلب یہ ہے کہ کہ میرا عطیہ ناپسندیدگی کے حال میں برکت کے ساتھ جمع نہیں ہوگا۔

راقم کے نزدیک دونوں قول اس طرح جمع کیے جاسکتے ہیں، گویا کہ حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی چمٹ کر سوال کرے تو اسے ناپسند سمجھتے ہوئے کوئی عطیہ دے دیا جائے تو اس میں برکت نہیں ہوگی لیکن اس کے لپٹ کر سوال کرنے کی وجہ سے جو دل تنگی پیدا ہوگی اور اس پر مشقت اٹھانی پڑے گی اس کی وجہ سے برکت حاصل ہوگی۔

تنبیہ: "قال الغزالی من اخذ شیأمع العلم بأن باعث المعطی الحیاء منه او من الحاضرین ولو لا ذلک لما اعطاہ فھو حرام اجماعا ویلزمه ردہ اوردبدله الیه اوالی ورثه"

علامہ غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کوئی شخص دوسرے شخص سے کوئی چیز مانگ کر لیتا ہے یہ جانتے ہوئے کہ اگر میں خود اس سے مانگوں تو وہ شرم سے مجھے دے دے گا، اگر کسی دوسرے شخص کے ذریعہ سوال کروں تو وہ نہیں دے گا، پھر اس نے خود ہی اس سے سوال کر لیا اور اس نے اس کا منصب دیکھتے ہوئے اسے مال دے دیا۔ یا یہ علم ہو کہ اگر اس سے کسی مجلس میں لوگوں کے سامنے مانگا تو وہ دے دے گا، اگر اکیلے مانگا تو وہ نہیں دے گا تو اس سے مجلس میں سوال کر لیا، اس نے مال دے دیا اگر اس سے اکیلے مانگا جاتا تو وہ نہ دیتا۔

ان مندرجہ بالا دونوں صورتوں میں مال لینا حرام ہے، اس سے جو مال لیا گیا ہے وہ اسے واپس کرنا ضروری ہے۔ اگر لیا ہوا مال خرچ ہو گیا تو اس کا بدل کوئی اور مال دے دے، جس سے مال لیا تھا وہ فوت ہو گیا تو وہ مال اس کے ورثاء کو واپس کر دے۔

(آج شائد دینی مدارس میں بے برکتی کی یہی وجہ ہے کہ ہم لوگوں سے چندہ ان دو صورتوں کے مطابق ہی مانگتے ہیں کسی کو محفل کا صدر بنا کر یا مہمان خصوصی بنا کر پھنسا دینا اور کسی کے پاس خود جا کر اس کی تعریف کر کے اور اسے مقام

اس لئے کہ نیک شخص سوائے حلال مال کے نہیں دے گا، اور نیک شخص کرم کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوتا ہے وہ کسی کی بے عزتی کرنے والا نہیں ہوتا، یعنی وہ مال دیتا ہے تو بات بھی اچھے اخلاق سے کرتا ہے، مال دے اور ساتھ ساتھ سخت کلامی بھی کرے بلکہ کتے کی طرح بھونکے تو ایسے شخص سے انسان سوال نہ کرے۔ اور نیک شخص تمہیں مال بھی دے گا اور تمہارے حق میں دعاء بھی کرے گا اس کی دعاء کو اللہ تعالیٰ شرف قبولیت عطاء فرمائے گا، یہی وجہ تھی کہ بغداد کے فقراء حضرت امام احمد رضی اللہ عنہ سے سؤال کرتے تھے۔

"وکان قد تولی القضاء ومن صلاحه وتقواه یرقد عند بابه فی اللیل قائلا لعله احتاج الی"

حضرت امام احمد رضی اللہ عنہ منصب قضاء پر فائز تھے، آپ کی نیکی اور تقوی کا یہ عالم تھا کہ آپ رات کے وقت اپنے دروازے پر سوتے تھے، اس کی وجہ آپ بیان فرماتے تھے کہ ہوسکتا ہے مجھے کوئی ملنا چاہتا ہو۔

سبحان اللہ جب تک مسلمانوں کے حکمران اور قاضی حضرات نیک اور عادل تھے تو وہ اکیلے ہی رات کو گلیوں میں گھوم کر قوم کے حالات کا جائزہ لیتے تھے، جہاں جگہ مل گئی وہیں سو جاتے تھے۔ ان کو کسی سے خطرہ لاحق نہیں ہوتا تھا کیونکہ انہوں نے کسی پر مظالم نہیں ڈھائے ہوئے تھے۔

آجکل حکمران اور قاضی ظالم ہیں، حکومت کا مال ناجائز طور پر خرچ کرنے والے ہیں، یہود ونصاری کے اشاروں پر چلنے والے ہیں، اسی لئے وہ گھر میں ہوں یا دفتر میں ہوں یا کہیں باہر نکلیں تو ان کے ساتھ محافظ ہوتے ہیں، وہ چلتے ہیں تو ان کا دل دھڑکتا ہے ہائے کسی وقت کوئی مار نہ دے اور سوتے ہیں تو ان کا دل دھڑکتا ہے کوئی آنہ جائے جو مار کر بھاگ جائے۔

افسوس کہ مظلوموں سے تو ڈریں، بدمعاشوں سے تو ڈریں، غنڈوں سے تو ڈریں، اپنے تربیت یافتہ لوگوں سے تو ڈریں لیکن شریفوں سے ڈرنے کا کیا مقصد، ہر شریف نمازی، دین کا علم رکھنے والے، اور سنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق داڑھی رکھنے والے سے ڈرنے کا کیا مطلب ہے؟ یہ سمجھ سے دور ہے۔

سوال کرنے سے مزدوری کرنا بہتر ہے:

☆ ”عن انس ان رجلامن الانصار اتی النبی ﷺ یسالہ فقال امافی بیتک شیٔ فقال بلی حلس نلبس بعضہ ونبسط بعضہ وقعب نشرب فیہ من الماء قال ائتنی بھما فاتاہ بھما فأخذھما رسول اللہ ﷺ بیدہ وقال من یشتری ھذین قال رجل انا آخذھما بدرھم قال من یزید علی درھم مرتین او ثلاثا قال رجل آخذھما بدرھمین فاعطاھما ایاہ فأخذالدرھمین فاعطاھماالانصاری وقال اشترباحدھما طعامافانبذہ الی اھلک واشتر بالآخر قدومافأتنی بھافاتاہ بہ فشد فیہ رسول اللہ ﷺ عودا بیدہ ثم قال اذھب فاحتطب وبع ولاارینک خمسۃعشر یوما فذھب الرجل یحتطب ویبیع فجاء ہ وقد اصاب عشرۃ دراھم فاشتری ببعضھا ثوبا وبعضھا طعاما فقال رسول اللہ ﷺ ھذا خیرلک من ان تجیٔ المسئلۃ نکتۃ فی وجھک یوم القیامۃ ان المسئلۃ لاتصلح الالثلاثۃ لذی فقرمدقع او لذی مفظع او لذی دم موجع“

(رواہ ابو داؤدوروی ابن ماجۃ الی قولہ یوم القیامۃ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص انصار قبیلہ سے نبی کریم ﷺ کے پاس آ کر آپ سے سوال کرنے لگا۔ آپ نے فرمایا کیا تمہارے گھر میں کوئی چیز ہے؟ اس شخص نے کہا ہاں ایک اونی موٹا کپڑا ہے، جس کا کچھ حصہ ہم اوپر اوڑھتے ہیں اور کچھ حصہ نیچے بچھا لیتے ہیں۔ اور ایک پیالہ ہے جس سے ہم پانی پیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا وہ دونوں چیزیں لے آؤ، وہ لے آئے۔ نبی کریم ﷺ نے ان دونوں چیزوں کو اپنے ہاتھ میں پکڑا، اور ارشاد فرمایا کون ہے جو یہ دونوں چیزیں خرید لے، ایک شخص نے کہا ”میں یہ دونوں چیزیں ایک درہم سے خرید لیتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کون ہے جو ایک درہم سے زیادہ دے، یہ ارشاد آپ نے دو یا تین مرتبہ فرمایا۔ ایک شخص نے کہا میں یہ دونوں چیزیں دو درہم سے خرید لیتا ہوں، آپ نے وہ دونوں چیزیں اس شخص کو دے دیں اور اس سے دو درہم لے لئے۔ وہ دو درہم انصاری کو دیئے کہ ایک درہم سے طعام خرید کر گھر

کے بغیر لوگوں سے گھٹیا چیز یعنی صبح یا شام کا کھانا طلب کر رہا ہے؟ یعنی بلند مقام میں رب تعالیٰ سے مغفرت اور عافیت کا سؤال کرے، زمانہ قبولیت اور مقام قبولیت میں غیر اللہ تعالیٰ سے دنیا کے متعلق گھٹیا سوال کرنا درست نہیں۔

یہاں سے ہی واضح ہو گیا:

"ویلحق بذلک السؤال فی المساجد اذلم بتن الالعبادة"

کہ مساجد صرف عبادت کے لئے بنائی گئی ہیں ان میں بغیر کسی عذر کے سؤال کرنا گھٹیا فعل ہے۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی قبر پر قبولیت دعاء۔

شیخ ابو العباس مرسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔"انہ خرج من المدینة عازما لزیارة سیدنا حمزة" کہ وہ مدینہ طیبہ سے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی (قبر شریف) کی زیارت کے ارادے سے نکلے، ان کے ساتھ ایک اور شخص بھی چلا، مزار شریف کا دروازہ خود بخود کھل گیا "فرأی رجالا من رجال الغیب" تو آپ نے وہاں کچھ غیبی لوگوں کو دیکھا، تو رب تعالیٰ سے عافیت کا سؤال کیا ابو العباس کہتے ہیں مجھے اپنے ساتھی پر رحم آیا، میں نے اسے کہا یہ دعاء کی قبولیت کا وقت ہے تم اللہ تعالیٰ سے اپنا مقصود طلب کرو، اس نے رب تعالیٰ سے دینار کا سؤال کیا۔ آپ فرماتے ہیں جب میں لوٹا اور مدینہ طیبہ کے دروازے میں داخل ہوا تو اس شخص کو ایک آدمی نے ایک دینار دے دیا۔

جب میں اپنے شیخ سید ابو الحسن شاذلی کے پاس آیا۔

"فقال للرجل قبل نقل القضیة یادنی الهمة ادرکت وقت الاجابة وسألت دینارا لم لاسألت العفو والعافیة مثل ابی العباس"

تو آپ کو ابھی واقعہ بتایا ہی نہیں گیا تھا آپ نے خود ہی اس شخص کو فرمایا اے گھٹیا ہمت والے تو نے دعاء کی قبولیت کا وقت پایا اور تو نے ایک دینار کا سوال کر لیا، تو نے ابو العباس کی طرح معافی کا سؤال کیوں نہیں کیا۔ (ماخوذ از مرقات جلد ۴ ص ۱۸۳)

اسی واقعہ سے راقم کو چند فوائد سمجھ آئے، ایک یہ کہ قبور کی زیارت کے ارادے سے جانا تبع تابعین کا طریقہ ہے۔ "عازما" کے لفظ کو دیکھا جائے جس سے یہ عقدہ حل ہو جائے گا۔ نیک لوگوں کی قبور پر غیبی شخصیات کا ورود (آنا) ہوتا ہے، جن کی وجہ سے وہاں دعاء کی قبولیت ہوتی ہے۔ دعاء کی قبولیت کی گھڑیوں میں خاتمہ بالخیر کی دعاء کرے، یہ اعلیٰ مقصود ہے۔ ایسے اوقات میں دنیاوی مال کی دعاء کرنا گھٹیا دعاء اور مقصد کے خلاف ہے۔

نیک لوگوں کو اللہ تعالیٰ الہام کے ذریعے یا کشف کے ذریعے ان حالات سے مطلع کر دیتا ہے جو بظاہر چھپے ہوئے ہیں جیسا کہ حضرت ابوالحسن شاذلی رحمہ اللہ نے خود بخود اس شخص کی دعاء کا ذکر کیا جو واقعہ آپ کو بتایا نہیں گیا تھا۔ لوگ ابھی تک انبیاء کرام کے علوم غیبیہ اور خصوصاً سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے علوم غیبیہ کے متعلق شک کر رہے ہیں۔

سؤال نیک آدمیوں سے کرے:

☆ "عن ابن الفراسی ان الفراسی قال قلت لرسول اللہ ﷺ أسأل یا رسول اللہ فقال النبی ﷺ لا وان کنت لابد فسل الصالحین"

(رواہ وابو داؤد والنسائی، مشکوۃ باب من لاتحل لہ المسئلۃ ومن تحل لہ)

فراس بن غنم کے قبیلہ کے ایک شخص کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا، یارسول اللہ کیا میں سؤال کر لیا کروں؟ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا، نہیں۔ ہاں اگر تمہیں سؤال کرنے کی ضرورت درپیش آ ہی جائے تو نیک لوگوں سے سؤال کرو۔

وضاحت حدیث: سؤال کرنے کی اجازت طلب کرنے پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا "لا" نہیں اس سے مراد یہ ہے۔

"لاتسأل الناس شیأ من المال وتوکل علی اللہ فی کل حال"

کہ لوگوں سے کچھ مال بھی طلب نہ کرو بلکہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ پر توکل رکھو۔

نیک لوگوں سے سوال کرنے کی کیا وجہ ہے؟

"لان الصالح لایعطی الامن الحلال ولایکون الاکریما ورحیما ولایھتک العرض ولانہ یدعولک فیستجاب ولذا کان فقراء بغداد یسألون الامام احمد"

اسے صبر کی توفیق عطاء کر دیتا ہے، اور جو شخص عطاء کر دیتا ہے وہ افضل ہے، اور زیادہ وسیع ہے (زیادہ کھولنے والا ہے) صبر سے۔

"وذلک لان مقام الصبر اعلی المقامات لأنه جامع لمکارم الصفات والحالات"

اس کی وجہ یہ ہے کہ صبر کو اعلیٰ مقام حاصل ہے، اس لئے کہ وہ اچھی صفات اور اچھے حالات کا جامع ہے۔

☆ "وعن عبد الله بن مسعود قال قال رسول الله ﷺ من سأل الناس وله مایغنیه جاء یوم القیامة ومسئلته فی وجهه خموش او خدوش او کدوح قیل یا رسول الله وما یغنیه قال خمسون درهما او قیمتها من الذهب"

(رواه ابو داؤد والترمزی والنسائی وابن ماجة والدارمی، مشکوة باب من تحل له الصدقة ومن تحل له)

حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص لوگوں سے سوال کرتا ہے حالانکہ اس کے پاس اتنا مال ہے جو اسے بے پرواہ کر دیتا ہے تو قیامت کے دن آئے گا یہاں تک کہ اس کے چہرے پر سوال کی وجہ سے خراشوں کے نشان پڑے ہوں گے، پوچھا گیا یا رسول اللہ اسے کتنا مال سوال سے بے پرواہ کر دیتا ہے، آپ نے فرمایا، پچاس درہم یا اتنی مالیت کا سونا اس کے پاس ہو۔

وضاحت حدیث:

"مایغنیه" "ای عن السؤال ویکفیه بقدر الحال" اس کے پاس اتنا مال ہے جو اسے سوال سے بے پرواہ کر دیتا ہے، اور اس کی ضروریات کو وقتی طور پر کافی ہو سکتا ہے۔

وہ کتنا مال ہوتا ہے جو انسان کو کفایت کر جاتا ہے اور اسے سوال کرنا منع ہوتا ہے؟ صحابہ کرام نے یہ وضاحت طلب کی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ مال جو انسان کے لئے کافی ہوتا ہے (قرض وغیرہ نہ ہو) اس کی مقدار پچاس درہم ہے یا پچاس درہم کی مالیت کا سونا۔

خیال رہے پچاس درہم چاندی کا وزن تیرہ تولے تین ماشے بنتا ہے۔ یعنی اتنی مقدار میں اس کے پاس چاندی ہو یا اس کی مالیت کا کوئی اور مال ہو جو ضروریات کو پورا سکے، جب اس کے پاس اتنا مال ہو تو پھر وہ سوال کرے

تو قیامت کے دن جب وہ آئے گا تو اس کا چہرہ بغیر ضرورت کے سوال کرنے کی وجہ سے زخمی نظر آئے گا گویا اسے خراشیں ماری گئیں اور اسے چھیلا، تراشا گیا ہے۔

یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ حدیث شریف میں تینوں الفاظ کا معنی ایک لیا گیا ہے، صرف راوی کو شک ہے کہ کون سا لفظ بولا گیا ہے وہ ''خموش'' ہے، یا ''خدوش'' ہے، یا ''کدوح'' ہے۔ اگر چہ حدیث شریف میں تو تینوں کا مطلب ایک ہی ہے تاہم لغوی معنی کے لحاظ سے فرق بھی ہے۔ خموش کے معنی میں مبالغہ پایا گیا ہے۔

''الخمش فی الوجه والخدش فی الجلد والكدح فوق الجلد''

چہرے کو زخمی کرنے کو ''خموش'' کہا جاتا ہے۔ اور کہیں سے چمڑے کے اندر تک زخمی کرنے کو ''خدوش'' کہا جاتا ہے۔ اور چمڑے کے اوپر کو زخمی کونے کو ''کدوح'' کہا جاتا ہے۔ (از مرقاۃ)

مقام عرفات پر سوال کرنے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا غصہ:

''عن علی انه سمع یوم عرفة رجلا یسأل الناس فقال أفی هذا الیوم وفی هذا المکان تسأل من غیر الله فخفقه بالدرة'' (رواه رزین، مشکوة باب من لا تحل له المسالة ومن تحل له)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرفہ کے دن ایک شخص کو لوگوں سے سوال کرتے ہوئے سنا، تو آپ نے فرمایا کیا اس دن اور اس جگہ تو اللہ تعالیٰ کے غیروں سے سوال کر رہا ہے، تو آپ نے اسے کوڑے سے مارا۔

وضاحت حدیث:

اس حدیث پاک کے راوی بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں، اور اپنا ہی واقع بیان کیا ہے۔ یعنی بزبان خود بحال خود۔

''(فقال) ای علی (أفی هذا الیوم وفی هذا المکان) ای أفی زمان اجابة الدعاء ومکان قبول الثناء وحصول الرجاء (یسأل من غیر الله) ای شیأ حقیرا مثل الغداء او العشاء''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے کہا کیا آج کے دن جو دعاء کی قبولیت کا وقت ہے اور اس مقام میں جو دعاء کی قبولیت کا مقام ہے، اور رب تعالیٰ کی تعریف کی قبولیت کا مقام اور امید کے حاصل ہونے کا مقام ہے، تو اللہ تعالیٰ

غوثیت کے دربہ پر ... جا کر مال دینے پر مجبور کر دینا، حقیقت یہ ہے کہ جو پہلے لوگوں کے دین کا علم پڑھنے اور پڑھانے میں کمال تھا وہ آج نہیں، اس کی وجہ واضح ہے کہ پہلے لوگوں میں خلوص زیادہ تھا تقویٰ کی وجہ سے وہ ان چیزوں سے اجتناب کرتے تھے جو شریعت میں ممنوع ہیں اور بزرگان دین اور علماء کرام نے ان کو واضح طور پر بیان کر دیا۔)

"قال النووی فی شرحه اتفق العلماء علی النهی عن السؤال لغیر ضرورة"

علامہ نووی رحمہ اللہ نے اسی زیر بحث حدیث کی شرح میں بیان کیا ہے کہ بغیر ضرورت کے سوال کرنا منع ہے۔

ایک شخص کام کرنے، مزدوری کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو لیکن وہ جان بوجھ کر کوئی کام نہ کرے اور سوال کرنے کی عادت بنائے یعنی پیشہ ور بھکاری ہو تو اسے مال لینا حرام ہے۔ احادیث مبارکہ سے ظاہر طور پر مسئلہ یہی سمجھ آ رہا ہے۔ اگر کوئی شخص کام وغیرہ کرنے کی صلاحیت تو رکھتا ہے، کام مل نہیں رہا وہ مجبور ہے، عذر کی وجہ سے سوال کر لے تو اس کے لئے جائز تو ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کر کے سوال نہ کرے، اور نہ ہی چمٹ کر اور لپٹ کر سوال کرے اور نہ ہی اس شخص کو تکلیف دے جس سے سوال کر رہا ہے۔ (تکلیف دینے کی دو وجہ ذکر کی جا چکی ہیں کہ صاحب منصب خود جا کر اس سے سوال کرے یا لوگوں کے سامنے اس سے سوال کر کے مال دینے پر مجبور کر دے)

(وضاحت حدیث ما خوذ از مرقات ج ۴ ص ۱۷۴)

☆ "وعن الزبیر بن العوام قال قال رسول اللہ ﷺ لأن یأخذ احدکم حبله فیأتی بحزمة حطب علی ظهره فیبیعها فیکف اللہ بها وجهه خیر له من ان یسأل الناس اعطوه او منعوه" (رواه البخاری، مشکوة باب من لا تحل له الصدقه من و تحل له)

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ فرمایا تم میں سے کسی ایک کا رسی لے کر لکڑیوں کا گٹھا اپنی پیٹھ پر لانا اور اسے بیچنا کہ اس کی وجاہت کو اللہ برقرار رکھے بہتر ہے اس سے کہ لوگوں سے سوال کرے وہ اسے دیں یا نہ دیں۔

وضاحت حدیث:

"زبیر بن عوام" عوام کی واؤ مشدد ہے، عین اور واؤ دونوں مفتوح ہیں۔ یہ نبی کریم ﷺ کی پھوپھی کے بیٹے

ہیں اور عشرۃ المبشر ۃ سے ہیں۔

رسی لینے کا مطلب یہ ہے کہ "فیجمع حطبا ثم یربط به "وہ لکڑیاں جمع کر کے اسی سے باندھے۔

"(الحزمة) بضم الحاء قدر ما یحمل بین العضدین والصدر ویستعمل فیما یحمل علی الظهر من الحطب"

(حزمۃ) کی حاء پر پیش ہے، اصل میں حزمہ کا معنی یہ ہے کہ دونوں بازؤں میں سینہ کے ساتھ لگا کر کسی چیز کو اٹھانا، پھر عام طور پر پیٹھ پر لکڑیاں کے اٹھانے والے گٹھے کو حزمہ کہا جاتا ہے۔

حدیث پاک کا مطلب واضح ہے کہ سؤال کرنے سے بہتر یہ ہے کہ رسی لے کر جنگل میں چلا جائے وہاں سے لکڑیاں جمع کر کے لے آئے اور بازار میں بیچ کر اپنی ضروریات کو پورا کرے، سؤال کرے گا تو ہوسکتا ہے کوئی دے اور کوئی نہ دے، جب سؤال کرنے پر کچھ نہیں ملے گا تو عزت خاک میں مل جائے گی، چہرہ کی آب وتاب، وجاہت ضائع ہو جائے گی۔ سؤال نہ کرنے پر اور لکڑیاں لا کر بیچنے پر اس کے چہرے کی رونق، آب وتاب اور وجاہت برقرار رہے گی۔

☆ "عن ابی سعید الخدری قال ان اناسا من الانصار سألوا عن رسول الله ﷺ فاعطاهم ثم سألوه فاعطاهم حتی نفد ما عنده فقال مایکون عندی من خیر فلن ادخره عنکم ومن یستعفف یعفه الله ومن یستغن الله ومن یتصبر یصبره الله وما اعطی احد عطاء هو خیر واوسع من الصبر" (بخاری ومسلم، مشکوۃ باب من لا تحل له المسئلة ومن تحل له)

حضرت ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک انصار کے کچھ لوگ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سؤال کیا تو آپ نے ان کو عطاء کیا، پھر انہوں نے سؤال کیا آپ نے ان کو عطاء کیا یہاں تک کہ آپ کے پاس جو مال تھا وہ ختم ہو گیا، تو آپ نے فرمایا میرے پاس جو مال ہوتا ہے میں اسے تم سے ذخیرہ بنا کر نہیں رکھتا (کہ تمہیں نہ دوں) اور جو شخص سؤال کرنے سے درگذر کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے درگذر کرنے کی توفیق عطاء فرما دیتا ہے۔ اور جو شخص اپنے آپ کو غنی ظاہر کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے (یعنی اس کے دل کو) غنی بنا دیتا ہے اور جو شخص صبر کی توفیق طلب کرتا ہے اللہ تعالیٰ

گے۔ البتہ وہ بے حیائی کے کاموں اور ہر قسم کے ناجائز کاموں میں مال خرچ کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ "وزین لهم الشیطان اعمالهم فصدهم عن السبیل فهم لایهتدون" (سورۃ النمل، آیۃ ۲۴) اور شیطان نے ان کے اعمال ان کی نگاہ میں سنوار کر ان کو سیدھی راہ سے روک دیا تو وہ راہ نہیں پاتے۔

اس سے واضح ہوا کہ شیطان لوگوں کے برے اعمال کو ان کی نگاہ میں مزین کر کے دکھاتا ہے کہ یہی راہ سیدھی ہے جس پر تم چل رہے ہو، تو وہ ان کو سیدھی راہ سے روک دیتا ہے، اس طرح وہ ہدایت نہیں پاتے، یعنی شیطانی مدرسہ کی تعلیم کا عظیم کام لوگوں کو راہ راست سے بھٹکانا اور برے کاموں پر لگانا ہے اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی۔

"وزین لهم الشیطان اعمالهم فصدهم عن السبیل و کانوا مستبصرین"

شیطان نے ان کے کوتک (برے اعمال) ان کی نگاہ میں بھلے کر دکھائے اور انہیں راہ سے روکا اور انہیں سوجھتا تھا۔

حضرت صدر الافاضل رحمہ اللہ خزائن العرفان میں "و کانوا مستبصرین" (اور انہیں سوجھتا تھا) کی تفسیر میں بیان فرماتے ہیں۔

(وہ لوگ جن کو شیطان نے بہکایا) صاحب عقل تھے حق و باطل میں تمیز کر سکتے تھے لیکن انہوں نے عقل و انصاف سے کام نہیں لیا۔

ان تمام آیات سے واضح ہو گیا کہ شیطانی مدرسہ کا مہتمم اور صدر مدرس خود شیطان ہی ہے اس کا کام ہی صرف اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکنا ہے، اور اس کی تعلیمات کا کوئی مقصد ہی نہیں۔ ہاں البتہ اس چیز کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ شیطان اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کی راہ سے روکتا کیوں رہا اور تا قیامت روکتا کیوں رہے گا؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان کو جب جنت کا منظر یاد آتا ہے، فرشتوں کے ساتھ مل جل کر رہنا، سہانا یاد آتا ہے پھر جب وہ جنت سے ذلیل کر کے نکالے جانے کو دیکھتا ہے تو اس کا پریشان ہونا اور اس کے سینہ سے ٹیسیں نکلنا عقل میں آنے والی باتیں ہیں۔ جب وہ نبی کی گستاخی کی وجہ سے ذلیل ہو کر نکالا گیا تو اس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی، دل میں ٹھان لی کہ وہ انتقام ضرور لے گا، لیکن یہ بات بھی وہ سمجھ گیا تھا کہ آدم علیہ السلام سے انتقام لینے کی اسے طاقت ہی حاصل نہیں تو اس نے سوچا کہ اولاد آدم سے ہی انتقام لے کر کچھ اپنے دل کی بھڑاس نکال لوں اور غصہ اور انتقام کی آگ کے بھڑکنے کی کیفیت کو کچھ کم کر لوں۔ شیطانی مدرسہ کی تعلیم میں انبیاء کرام اور اولیاء کرام کی گستاخی کا پہلو نمایاں نظر آئے گا۔

رحمانی مدرسہ کی تعلیم:

رب تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی سیدالانبیاء حضرت محمد ﷺ کوتمام کائنات کا معلم بنا کر بھیجا اس معلم کائنات کوحکم دیا"یاایھاالرسول بلغ ما انزل الیک من ربک" (سورۃالمائدۃ آیۃ ۶۷)

اے رسول پہنچادو جو کچھ اتارا گیا تم پر تمہارے رب کی طرف سے۔یعنی اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کوقرآن پاک کی تعلیم دینے اور قرآن پاک کے احکام لوگوں تک پہنچادینے کا حکم دیا۔اور رب تعالیٰ نے فرمایا۔

"یاایھا الذین آمنو الاتتخذوا الیھود والنصاری اولیاء بعضھم اولیاء بعض ومن یتولھم منکم فانه منھم ان اللہ لا یھدی القوم الظالمین . (سورۃالمائدۃ آیۃ ۵۱)

اے ایمان والو یہود ونصاریٰ کو دوست نہ بناؤ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں،اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا تو وہ انہیں میں سے ہے بیشک اللہ بے انصافوں کو راہ نہیں دیتا۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"یاایھاالذین آمنوا لاتتخذوا الذین اتخذوادینکم ھزواولعبامن الذین اوتوالکتاب والکفارا ولیاء واتقواللہ ان کنتم مؤمنین . (سورۃالمائدۃ آیۃ ۵۷)

اے ایمان والو جنہوں نے تمہارے دین کو ہنسی کھیل بنالیا ہے وہ جو تم سے پہلے کتاب دئے گئے اور کافران میں کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو اگر ایمان رکھتے ہو۔

اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔

"والمؤمنون والمؤمنات بعضھم اولیاء بعض" (سورۃالتوبۃ آیۃ ۷۱)

اور مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔"واعبدوا اللہ ولاتشرکوابه شیئا "اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

"انا ارسلناک شاھداومبشرا ونذیرا لتؤمنواباللہ ورسوله وتعزروه وتوقروه وتسبحوه بکرة واصیلا" (سورۃالفتح آیۃ ۹،۸)

واضح ہوا کہ دینی مدارس کے طلباء کرام میں وہ تمام صفات پائی جاتی ہیں جو اصحاب صفہ میں پائی جاتی تھیں۔البتہ فرق اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام جو دین کے طلباء تھے ان میں یہ صفات اعلیٰ درجہ کی تھیں،اب موجودہ زمانہ میں طلباء کرام میں وہ صفات کم درجہ کی ہیں۔اصل اور نقل میں فرق اگرچہ ضرور ہے لیکن صحابہ کرام کی صفات کی ایک جھلک کا پایا جانا بھی بہت بڑا کمال ہے۔

سب سے پہلا دینی مدرسہ:

سب سے پہلے یہ خیال رکھیں کہ دینی مدرسہ کسی عمارت کا نام نہیں، بلکہ جہاں **معلم** اور **متعلم** (استاذ اور شاگرد) پائے جائیں وہی دینی مدرسہ ہے۔اس لئے سب سے پہلے مدرسہ رب قدوس نے خود قائم کیا۔ارشاد باری تعالیٰ کی طرف ذرا دھیان دیجئے،"وعلم آدم الاسماء کلھا" اور (اللہ نے) سکھائے آدم کو تمام چیزوں کے نام۔یعنی آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کے ساتھ ہی دینی مدرسہ قائم ہوگیا، جس مدرسہ میں **معلم** خود باری تعالیٰ ہے اور **متعلم** آدم علیہ السلام ہیں۔

دینی مدرسہ کو دیکھ کر کون خوش ہوئے:

جب رب تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام سکھا دیئے گویا کہ رب تعالیٰ کے دینی مدرسہ سے رب تعالیٰ کا شاگرد ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام جب فارغ ہوئے، جو اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں۔رب تعالیٰ نے اپنے عظیم شاگرد کو سجدہ کرنے کے لئے فرشتوں کو حکم دیا۔تو فرشتوں نے خوشی سے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا۔واضح ہوا کہ فرشتے دینی مدرسہ پر خوش ہوئے، دینی مدرسہ سے فارغ ہونے والے عظیم شخص کی انہوں نے تعظیم کی کہ یہ رب کائنات کا متعلم ہے۔

دینی مدرسہ کو دیکھ کر کون جلا:

دینی مدرسہ کو دیکھ کر سب سے پہلے جلنے والا شیطان تھا۔رب تعالیٰ کے متعلم کے علم دین سے فارغ ہونے پر سجدہ کرنے کا حکم ٹھکرانے والا ابلیس لعین تھا۔وہ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ مدرسہ پر جل اٹھا کہ اس مدرسہ سے فارغ ہونے والا اتنا معظم کیوں ہوگیا جسے سجدہ کرنے کے لئے فرشتوں کو حکم دیا رہا ہے۔

اس نے رب تعالیٰ کے عظیم کی معلم کی فراغت پر اس ذات کی عظمت کا انکار کر کے، سجدہ سے منہ موڑ کر کفر ولعنت کا طوق گلے میں ڈال لیا۔ اور "انا خیر منه" (میں اس سے بہتر ہوں) کہہ کر اپنی جھوٹی برتری کا اعلان کر دیا۔

رب تعالیٰ کے مدرسہ کے مقابل دوسرا مدرسہ قائم ہو گیا:

شیطان نے رب تعالیٰ سے مہلت مانگ لی۔ کس چیز کی مہلت مانگی گئی؟ وہ مہلت لوگوں کو وہ تعلیم دینے کی تھی جو رب تعالیٰ سے دور کر دے۔ آیئے رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی سے شیطان کا مہلت طلب کرنا اور اسے مہلت دیا جانا" دیکھئے۔

"قال انظرنی الی یوم یبعثون .قال انک من المنظرین .قال فبمااغویتنی لأقعدن لهم صراطک المستقیم . ثم لأتینهم من بین ایدیهم و من خلفهم و عن ایمانهم و عن شمائلهم و لاتجد اکثرهم شاکرین" (سورة الاعراف آیة ۱۴ تا ۱۷)

بولا مجھے فرصت دے اس دن تک کہ لوگ اٹھائے جائیں۔ فرمایا تجھے مہلت ہے، بولا قسم اس کی کہ تو نے مجھے گمراہ کیا میں ضرور تیرے سیدھے راستہ پر ان کی تاک میں بیٹھوں گا۔ پھر میں ضرور ان کے پاس آؤں گا ان کے آگے اور ان کے پیچھے اور ان کے داہنے اور ان کے بائیں سے اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گذار نہ پائے گا۔

شیطانی مدرسہ کی تعلیم:

شیطانی مدرسہ کی تعلیم کا مقصد عظیم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی راہ سے روکنا ہے، ابھی جن آیات کو ذکر کیا ہے ان میں واضح طور پر ذکر ہے کہ شیطان نے تا قیامت رب تعالیٰ سے مہلت مانگ لی ہے اور اسے مہلت دے دی گئی، تو اس نے رب تعالیٰ کو کہہ دیا کہ میں سامنے اور پیچھے، دائیں اور بائیں جانب سے آ کر ان کو بھٹکاؤں گا، میری تعلیم کا مقصد عظیم ہی لوگوں کو سیدھی راہ سے بھٹکانا ہوگا۔ اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ "الشیطان یعدکم الفقر ویأمرکم بالفحشاء و المنکر" شیطان تمہیں اندیشہ دلاتا ہے محتاجی کا اور حکم دیتا ہے بے حیائی کا۔

معلوم ہوا کہ شیطانی مدرسہ کی تعلیم یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو گے تو غریب، فقیر محتاج ہو جاؤ

ﷺ نے فرمایا یہ مال تمہارے پاس آ گیا ہے تم لے لو،تم نے اس کی طرف نظر اٹھا کر تو نہیں دیکھا تم نے مانگا تو نہیں تھا،اپنے نفس کو مال کے پیچھے نہ لگاؤ۔(یعنی جو مال خود ملے وہ لے لو، للچاتی نظریں کسی مال پر نہ لگاؤ،کسی سے سوال نہ کرو،حریص بن کے مال کے پیچھے نہ دوڑو)

نسائی شریف میں یہ الفاظ زائد ہیں("خذہ" کے بعد) "فتموله او تصدق به" تم یہ لے لو،اپنے پاس مال رکھ لو یا صدقہ کردو۔ (قرطبی)

مسئلہ: "الالحاح فی المسألة والالحاف فیها مع الغنی حرام لایحل"

ایک شخص غنی ہو کر پھر گڑ گڑا کر،چمٹ کر،لپٹ کر سوال کرے،تو اس کا یہ سوال کرنا حرام ہے۔(قرطبی)

عذر کے ہوتے ہوئے تین مرتبہ سوال کرنا جائز ہے:

سوال کرنے والا جب محتاج ہو تو کوئی حرج نہیں کہ تین مرتبہ عذر کی وجہ سے سوال کر لے،اور اس خوف سے کہ اگر میں نے سوال نہ کیا تو مجھے فاقہ لاحق ہوگا لیکن اس حالت میں بھی اگر سوال نہ کرے تو اس کے لئے بہتر ہے۔
جس سے سوال کیا گیا اگر وہ جانتا ہو کہ سائل واقعی مجبور ہے اور شدید محتاج ہونے کی وجہ سے مانگ رہا ہے تو اسے چاہئے کہ سائل کو حاجت کی اپنی طاقت کے مطابق پورا کرے۔اگر وہ سائل کی حالت کو نہ جانتا ہو تو پھر بھی سائل کو مال دے دے ہو سکتا ہے وہ سچا ہو۔اسی لئے اس کے سوال کو در کرنا مناسب نہیں۔(از قرطبی)

سائل محتاج کو جمعہ اور عید کے ادا کرنے کے لئے کپڑے لے کر دیئے جائیں:

اگر کوئی شخص محتاج ہو اس کے پاس جمعہ اور عید کے لئے اچھے کپڑے نہیں تو ابن عربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسے اچھے کپڑے لے کر دیئے جائیں۔آپ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ بغداد کے حاکم کو جامع مسجد میں یہ کہتے ہوئے سنا کہ اے لوگو یہ شخص تمہارا بھائی ہے،تمہارے ساتھ جمعہ ادا کرتا ہے،اس کے پاس اچھے کپڑے نہیں کہ یہ سنت کے مطابق جمعہ ادا کر سکے،(اس لئے اسے کپڑے لے کر دو)ابن عربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے دوسرے جمعہ کو اسے اچھے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا،مجھے بتایا گیا کہ اسے ابوالطاہر نے برسی نے کپڑے لے کر دیئے ہیں تاکہ اس کی

طرف سے ثناء اور دعاء کو حاصل کر سکے۔ (احکام ابن عربی، قرطبی)

اصحاب صفہ اور دینی مدارس کے طلباء:

زیر بحث آیۃ کریمہ میں اصحاب صفہ کی پانچ صفات بیان کی گئیں جو بفضلہٖ تعالیٰ اس مادی اور خود غرض دور میں بھی دینی مدارس کے طلباء میں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔

(۱) ان پانچ صفات میں سے پہلی صفت یہ ہے "الذین احصروا فی سبیل اللہ "وہ اللہ کی راہ میں روک لئے گئے۔

(۲) دوسری صفت یہ ہے "لایستطیعون ضربا فی الارض "وہ زمین میں (کسب معاش کے لئے) نہیں چل سکتے۔

(۳) تیسری صفت یہ ہے "یحسبھم الجاھل اغنیاء من التعفف" بے خبر لوگ ان کو سوال سے درگذر کرنے کی وجہ سے غنی سمجھتے ہیں۔

(۴) چوتھی صفت یہ ہے "تعرفھم بسیماھم "آپ ان کو چہرے کی علامات سے پہچانتے ہیں۔

(۵) پانچویں صفت یہ ہے "لایسألون الناس الحافا" وہ سوال ہی نہیں کرتے کہ گڑگڑانا پڑے۔

خدارا انصاف کی نظر سے دیکھئے اور خود ہی فیصلہ کریں کہ دینی طلباء میں یہ تمام صفات پائی جاتی ہیں یا نہیں۔
حقیقت کی نظر سے دیکھنے والا یقیناً یہی کہے گا کہ دینی مدارس کے طلباء اپنے آپ کو تعلیم کے حصول کے لئے مدارس میں روکے رکھتے ہیں۔

وہ دینی تعلیم کی مشغولیت کی وجہ سے تجارت نہیں کر سکتے، اور کسی ذریعہ معاش کو حاصل کرنے کے لئے زمین میں نہیں چلتے، وہ خوددار ہوتے ہیں، کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے، سوال نہیں کرتے، سوال سے درگذر کرتے ہیں، ان کے حقیقی حال سے بے خبر لوگ ان کو غنی سمجھتے ہیں۔

جس طرح نبی کریم ﷺ اصحاب صفہ کو ان کے چہرے کی علامت سے ہی سمجھ لیتے تھے کہ یہ غریب ہیں، بھوکے ہیں محتاج ہیں، اسی طرح نبی کریم ﷺ کی امت کے نیک لوگ بھی طلباء کرام کو دیکھ کر ان کی غربت کو ان کے چہرے کی علامات سے پہچان لیتے ہیں۔

والوں کو دے دو، اور ایک درہم سے کلہاڑا خرید کر میرے پاس لے آؤ، وہ کلہاڑا لے آئے، نبی کریم ﷺ نے اپنے ہاتھ مبارک سے اس میں لکڑی کا دستہ لگایا، پھر ارشاد فرمایا جاؤ لکڑیاں لا کر بیچو، پندرہ دن میں تمہیں ہرگز (بیکار پھرتے) نہ دیکھوں۔ وہ شخص چلا گیا لکڑیاں لاتا اور بیچتا، پھر وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آیا جبکہ اس نے دس درہم حاصل کر لئے تھے، بعض درہموں کے ذریعے اس نے کپڑے خرید لئے اور بعض سے طعام خرید لیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے لئے یہ بہتر ہے بنسبت اس کہ تم قیامت کے دن آتے اور تمہارے چہرے پر سوال کی وجہ سے نکتہ پڑا ہوتا بیشک سوال تین آدمیوں کے بغیر کسی کے لئے جائز نہیں۔ (ایک) وہ شخص جو فقر کی وجہ سے بہت زیادہ محتاج ہو، اور (دوسرا) وہ شخص جو بہت بھاری قرض میں مبتلاء ہو (تیسرا) وہ شخص ہے جس پر درد پہنچانے والے خون (یعنی دیت) کی ذمہ داری ہو۔

حدیث سے فوائد حاصل ہوئے:

نبی کریم ﷺ کا صحابہ کرام پر اس شخص کی دونوں چیزوں کو پیش کرنا "فیه غایة التواضع واظهار المرحمة" اس پر دلالت کر رہا ہے کہ آپ بہت عجز وانکساری رکھتے تھے، اور صحابہ کرام پر بہت زیادہ رحیم تھے۔ آپ کو معلوم تھا کہ جب ان لوگوں پر یہ چیزیں پیش کی جائیں گی تو وہ اصل قیمت سے زائد دے دیں گے جس سے اس شخص پر رحم ہوگا۔

اور مسئلہ یہ سمجھ آیا کہ زیادہ قیمت حاصل کرنے کے لئے بولی پر کسی چیز کو بیچنا جائز ہے۔ نبی کریم ﷺ اپنی امت کے لوگوں کو دنیا اور آخرت میں نفع دینے والی چیزوں کا مشورہ دیتے تھے۔ بغیر ضرورت کے سوال کرنے پر قیامت کے دن چہرے پر قبیح (بدنما) اثرات پائے جائیں گے۔

سوال کے بغیر جو مال ملے اسے قبول کر لے:

اگر کوئی شخص کسی کو بغیر سوال کے مال دے تو وہ قبول کر لے رد نہ کرے "اذهو رزق رزقه الله" اس لئے کہ وہ رزق اللہ تعالیٰ نے اسے عطاء کیا ہے۔

☆ "روی مالک عن زید بن اسلم عن عطاء بن یسار ان رسول اللہ ﷺ ارسل الی عمر بن الخطاب بعطاء فردہ فقال لہ رسول اللہ ﷺ لم رددتہ فقال یا رسول اللہ الیس اخبرتنا ان احدن خیرلہ الایاخذ شیأ فقال رسول اللہ ﷺ انما ذلک عن المسألۃ فأما ما کان من غیر مسألۃ فانما ھو رزق رزقکہ اللہ فقال عمر بن الخطاب والذی نفسی بیدہ لا أسأل احدا شیأ ولایأتینی بشیءمن غیر مسألۃ الااخذتہ"

عطاء بن یسار فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی طرف کوئی عطیہ بھیجا تو انہوں نے واپس کر دیا۔تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں کہا تم نے یہ واپس کیوں کر دیا ہے ؟تو انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ نے خود ہمیں یہ خبر نہیں دی" کہ ہم میں سے ہر وہ شخص بہتر ہے جو کسی سے کوئی چیز سے نہ لے،تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ سؤال سے ہے (یعنی اس خبر کا تعلق سؤال کر کے لینے سے ہے) لیکن بغیر سؤال کے (تمہیں کوئی چیز دے) تو وہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں دیا ہے۔حضرت عمر رضی اللہ نے کہا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، میں کسی شخص سے کسی چیز کا سؤال نہیں کروں گا۔اگر مجھے بغیر سؤال کے مل گئی تو وہ چیز میں ضرور لے لوں گا۔

"وھذا نص" یہ حدیث پاک اسی مسئلہ پر نص ہے کہ بغیر مانگنے کے جو چیز مل جائے وہ لے لی جائے۔(قرطبی)

☆ "عن ابن عمر قال سمعت عمر یقول کان النبی ﷺ یعطینی العطاء فأقول اعطہ افقر الیہ منی حتی اعطانی مرۃ مالافقلت اعطہ افقرا لیہ منی فقال رسول اللہ ﷺ خذہ وما جاءک من ھذا المال وانت غیر مشرف ولا سائل فخذہ وما لافلاتبعہ نفسک" (مسلم،نسائی)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ نبی کریم ﷺ مجھے مال عطاء کرتے تھے تو میں کہتا آپ مجھ سے زیادہ کسی محتاج کو دے دو، یہاں تک کہ ایک مرتبہ آپ نے مجھے مال دیا تو میں نے کہا مجھ سے زیادہ کسی محتاج کو دے دو،تو رسول اللہ

بیشک ہم نے تمہیں بھیجا حاضر و ناظر اور خوشی اور ڈر سناتا۔ تاکہ اے لوگو تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور رسول کی تعظیم و توقیر کرو اور صبح و شام اللہ کی پاکی بولو۔

اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ "ولاتمش فی الارض مرحا" (بنی اسرائیل آیۃ ۳۷)

اور نہ چلو زمین میں اکڑ کر۔ خلاصہ کلام یہ ہوا کہ رحمانی مدرسہ یعنی دینی مدرسہ میں قرآن وحدیث پڑھائے جاتے ہیں۔ اور یہی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی مرضی اور پسند ہے۔

دینی مدرسہ میں یہ پڑھایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک لہ ہے اسی کو ایک مانو، اس کے ساتھ کوئی شریک نہ ٹھہراؤ اور اسی کی عبادت کرو۔ دینی مدرسہ میں پڑھایا جاتا ہے کہ رسول ﷺ کی تعظیم و توقیر کرو اور دینی مدرسہ میں پڑھایا جاتا کہ صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی رضاء کی خاطر دلی محبت صرف مسلمان آپس میں ایک دوسرے سے رکھیں۔ اور دینی مدرسہ میں یہ پڑھایا جاتا ہے کہ اے مسلمانو یہود و نصاری اور کفار کو اپنا دوست نہ بناؤ وہ تمہارے دین سے مزاح اڑاتے ہیں، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں وہ کبھی دوستی کی آڑ میں تمہیں برباد کرنا چاہتے ہیں اور کبھی دشمنی کی آڑ میں۔ تم جتنے ان کے قریب جاؤ گے، جتنے ان کے نیچے لگ (تلے لگ) کر رہو گے اتنے ہی برباد ہو گے۔ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ملانا سیکھو۔

اور دینی مدارس میں اچھے اخلاق سکھائے جاتے ہیں کہ تکبر نہ کرو، اکڑ اکڑ کر نہ چلو، عاجزی اختیار کرو ہاں کسی بداخلاق کو نہ معاف کر سکو تو اس کو اسی قسم کا جواب دے دو، حد سے تجاوز نہ کرو یہ بھی منشأ ایزدی ہے۔

کیونکہ رب تعالیٰ نے خود فرمایا۔ "وجزاء سیئة سیئة مثلها" برائی کی جزاء اس کی مثل برائی ہے۔

یہ صرف ایک دو مثالیں پیش کی ہیں ورنہ قرآن وحدیث کی تعلیم ان گنت مسائل پڑھائے جاتے ہیں جو انسانیت کا سبق دیتے ہیں اور مسلمانوں کو حقیقی معنی میں مسلمان بناتے ہیں۔

جن مدارس میں مندرجہ بالا تعلیم دی جاتی ہے وہی راقم کے نزدیک حقیقی دینی مدارس ہیں، اگر کوئی مدرسہ جسے یک فی صد تناسب حاصل ہو جو اخلاقیات سے دور ہو یا کسی قسم کی تخریبی کاروائی میں مبتلاء ہو، یا ملکی قانون کا احترام نہ

کرے تو اس ایک مدرسہ کو بے نقاب کیا جائے، ایک کی آڑ میں تمام دینی مدارس کے طلباء کو دہشت گرد کہہ کر اپنی عاقبت کو برباد نہ کیا جائے، امریکی ڈالر قبر وحشر میں کام نہیں آئیں گے۔

قدیم نصاب کا واویلا:

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ دینی مدارس میں نصاب بہت پرانا ہے، آیئے دیکھئے یہ شور وغل کہاں تک درست ہے؟

جب دینی مدرسہ میں پڑھائے جانے والے علوم کے مقاصد ہی قرآن وحدیث کو سمجھنے میں معاونت حاصل کرنا ہے تو کیا قرآن وحدیث کے علم کو پرانا علم کہہ کر (معاذ اللہ) لوگوں کو دین سے برگشتہ کیا جائے گا؟ وہی علوم علماء دین کے نزدیک معتبر رہیں گے جن سے کماحقہ قرآن وحدیث سمجھ آئیں۔

حقیقت بات یہ ہے کہ جدت پسندی کے رجحان کی وجہ سے دینی مدارس میں نصاب کو کم کرنے، معیاری کتب کو نکال کر غیر معیاری کتب کو شامل کرنے سے تنزل ہوا ہے ترقی نہیں۔

راقم علوم عصریہ کا مخالف نہیں، اسی کتاب نجوم الفرقان میں گذشتہ اوراق میں اپنا ایک مضمون پیش کر چکا ہے لیکن دینی نصاب کے گھٹانے کا بھی قائل نہیں۔

راقم نے اپنے مدرسہ میں دل وجان سے دینی علوم پڑھنے کی رغبت دلانے کا سو فیصد کام ذمہ لیا ہوا ہے میرے مدرسہ (جامعہ جماعتیہ مہر العلوم رحیم ٹاؤن شکریال راولپنڈی کے علوم عصریہ کے اساتذہ میرے ساتھ بھرپور تعاون کر رہے ہیں اور محنت ومحبت سے پڑھا رہے ہیں۔ امید ہے کہ یہ امتزاج یعنی دینی علوم اور دنیاوی کا ایک ساتھ حاصل کرنا طلباء کے لئے مفید ثابت ہوگا اور ان کا مستقبل روشن ہوگا۔

راقم دینی علوم کو فوقیت دینے کا قائل ہے کہ دنیاوی علوم کو تابع سمجھا جائے، کیونکہ دنیاوی علوم صرف روٹی کمانے کا ذریعہ ہیں لیکن آخرت سنوارنے کا ذریعہ صرف اور صرف دینی علوم ہی ہیں۔ راقم قرآن پاک کی آیات کریمہ کی تشریحات جو قلمبند کر رہا ہے اس میں بہت کم بحثیں وہ ذکر کر رہا ہے جن کا تعلق صرف اور نحو اور علم معانی وبیان سے ہے، لیکن پھر مسئلہ کو سمجھانے کی حد تک دینی مدارس کے طلباء کی توجہ مبذول کرانے کے لئے کچھ نہ کچھ اس کے مسائل

ضمن میں لا رہا ہے۔ان کو دیکھ کر ہر ذی شعور انسان سمجھ سکتا ہے کہ قرآن پاک کو حقیقۃً علوم قدیمہ سے ہی سمجھا سکتا ہے، علوم جدیدہ سے تو اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی لفظ ''اللہ'' کے معانی بھی نہیں سمجھ آ سکتے۔

نجوم الفرقان کے پہلے حصہ سورۃ فاتحہ کی تشریحات میں دیکھئے کہ علوم قدیمہ میں قرآن پاک کو سمجھانے کے لئے کس قدر عرض ریزی کی گئی ہے اور کتنی جدو جہد کی گئی ہے۔

استاذ العلماء حضرت علامہ مولانا حافظ عطاء محمد بندیالوی رحمہ اللہ کا عظیم بیان:

استاذی المکرم حضرت علامہ مولنا محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی کے استاذ جو ملک المدرسین کے لقب سے متصف ہیں، حقیقت بات یہی ہے کہ وہ تدریس کے بادشاہ تھے المحققین والمدققین کے استاذ تھے۔آپ کے شاگردوں کو ہی دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جس ہستی کے شاگردوں میں رئیس المحققین والمدققین حضرت علامہ مولنا محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی ہیں اور استاذ العلماء رئیس المدرسین والمصنفین حضرت علامہ عبدالحکیم شرف قادری مدظلہ العالی ہوں اس ہستی کا اپنا مقام کیا ہوگا۔آیئے اس عظیم ہستی کا ایک مضمون دیکھئے کوئی مانے یا نہ مانے لیکن مضمون کی عظمت وحقیقت سے انکار انشاء اللہ منکرین بھی نہیں کر سکیں گے۔یہ مضمون درحقیقت نوائے وقت ۲۸ جنوری ۱۹۷۵ء کے اداریہ کے جواب میں لکھا گیا ہے، جو اگست ۱۹۷۵ء کے ضیاء حرم میں چھپ کر منظر عام پر آ چکا ہے۔مضمون کی افادیت کے پیش نظر اور مضمون کو ضائع ہونے سے بچانے کی غرض سے راقم نے نجوم الفرقان میں شامل کر لیا۔

☆☆☆☆☆

اَلَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ بِالَّیۡلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً فَلَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ☆

(سورۃ البقرۃ آیت ۲۷۴)

﴿۱﴾

وہ جو اپنے مال خیرات کرتے ہیں رات میں اور دن میں چھپے اور ظاہر ان کے لئے ان کا نیک ہے ان کے رب کے پاس ان کو نہ کچھ اندیشہ ہو گا نہ کچھ غم۔

﴿۲﴾

وہ جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال رات میں اور دن میں، پوشیدہ اور ظاہر تو ان کے لئے ان کا اجر ہے ان کے رب کے ہاں اور نہ خوف ہے ان کو اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔

ماقبل سے تعلق:

(۱) جب پہلی آیۃ کریمۃ ان کامل ہستیوں (اصحاب صفہ) کا ذکر کیا جن پر مال خرچ کرنے کا حکم دیا گیا اور ان کو مستحق ٹھہرایا گیا۔ اب اس آیۃ کریمہ میں رب تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے کامل طریقے بیان کئے گئے ہیں۔

(۲) پہلے آیۃ کریمہ "ان تبدوا الصدقات فنعما ھی "الآیۃ، میں صدقات کو ظاہر طور پر دینا یا مخفی دینا بہتر قرار دیا گیا کہ اصل معاملہ نیت کا ہے، اب اس آیۃ میں اسی مضمون کو دوبارہ ذکر کر کے پہلی آیۃ کریمہ کی تاکید بیان کی گئی۔

(۳) رب تعالیٰ نے صدقات کا ذکر کئی آیات میں کیا ہے، اس آیۃ کریمہ کو صدقات خرچ کرنے کے احکام میں آخر میں ذکر کیا ہے "فلاجرم ارشد الخلق الی اکمل وجوہ الانفاقات" تو یقیناً اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو خرچ کرنے کی کامل وجوہ کی طرف راہنمائی کی۔ (کبیر)

شانِ نزول:

کئی واقعات کے نازل ہونے کے بعد یہ آیۃ کریمۃ نازل ہوئی، وہ تمام وجوہ اجتماعی طور پر اس آیۃ کریمہ کا شانِ نزول ہیں۔

"اخرج ابن سعدفی الطبقات والطبرانی عن یزیدبن عبداللّٰہ بن عریب المیکی عن ابیہ عن جدہ عن النبی ﷺ قال نزلت ھذہ الآیۃالذین ینفقون اموالھم باللیل والنھارسراوعلانیۃفلھم اجرھم عندربھم ولاھم یحزنون فی اصحاب الخیل"

ابن سعد نے طبقات میں اور طبرانی مرفوع روایت ذکر فرمائی کہ یہ آیۃ کریمہ ان حضرات کے حق میں نازل ہوئی جو جہاد کے لئے گھوڑے پالتے تھے۔ (درمنثور)

"واخرج ابن المنذروابن ابی حاتم والواحدی عن ابی امامۃ الباھلی قال من ارتبط فرسافی سبیل اللّٰہ لم یرتبطہ ریاء ولاسمعۃ کان من الذین ینفقون اموالھم باللیل والنھارسراوعلانیۃ فلھم اجرھم عندربھم ولاخوف علیھم ولایحزنون"

ابن منذر اور ابن ابی حاتم اور واحدی نے ابوامامۃ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی جس شخص نے اللہ کی راہ میں گھوڑوں کو باندھا (اور پالا) اس میں ریاء نہیں پائی گئی اور نہ ہی اس میں چرچا پایا گیا تو وہ لوگ اس آیۃ کریمہ کا مصداق ہیں۔ (درمنثور)

واخرج عدب بن حمید ابن والمنذر وابن ابی حاتم والو احدی مناطریق حنش الصنعانی ا نہ سمع ابن عباس بقول فی ھذہ الایۃ الذین ینفقون اموالھم بالیل والنھار سرا وعلانیۃ قال ھم الذین یعقون الخلیل فی سبیل اللہ

عبد بن حمید اور ابن المنذ ر اور ابن ابی حاتم اور واحدی نے حنش صنعانی سے روایت ذکر کی کہ وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو اس آیۃ کریمہ کے متعلق ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں رات میں یا دن میں، چھپا کر یا ظاہر طور پر، یہ وہ لوگ ہیں جو جہاد کے گھوڑوں کے چارہ کھلاتے ہیں (درمنثور)

عن جریر بن عبداللہ قال رایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یلوی ناصیۃ فرس با

صبعه وهو بقول الخيل مقصود بنواصيها الخير الى يوم القيامة الاجروا والغنيمة

(رواه مسلم باب اعداد اله الجهاد)

حضرت جریر بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ اپنی انگلیوں سے گھوڑے کی پیشانی کے بالوں کو بل دے رہے ہیں (مروڑ رہے ہیں) اور آپ فرمارہے ہیں کہ گھوڑے کی پیشانی میں قیامت تک خیر رکھ دی گئی ہے یعنی اجر وغنیمت (اس سے حاصل ہوتے ہیں)

(۲) شان نزول کی دوسری وجہ بیان کی گئی:

"اخرج عبد الرزاق والطبرانی وابن عساکر من طريق عبد الوهاب بن مجاهد عن ابيه عن ابن عباس فی قوله الذين ينفقون اموالهم بالليل والنهار سرا وعلانيه قال نزلت فی علی ابی طالب كانت له اربعة دراهم فانفق بالليل درهما وبالنهار درهما وسرا درهما وعلانية درهما"

مصنف عبدالرزاق اور طبرانی اور ابن عساکر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ذکر کی گئی کہ آپ سے پوچھا گیا کہ یہ آیت کس کے حق میں نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا حضرت علی رضی اللہ عنہما کے بارے میں نازل ہوئی کہ آپ سے ایک مرتبہ صرف چار درہم تھے تو آپ نے ایک درہم رات کو خرچ کیا اور ایک دن کو اور ایک درہم پوشیدہ اور ایک ظاہر طور پر خرچ کیا۔ (درمنثور)

(۳) "اخرج ابن المنذر عن ابن المسيب الذين ينفقون اموالهم بالليل والنهار سرا وعلانيه فلهم اجرهم عندر بهم ولا خوف عليهم ولا هم يحزنون كلهافی عبد الرحمن بن عوف وعثمان بن عفان فی نفقتهم فی جيش العسرة"

ابن منذر نے ابن مسیب رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی ہے کہ یہ آیت کریمہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہما کے متعلق نازل جبکہ وہ غزوہ عسرہ یعنی غزوہ تبوک کیلئے لشکر کو تیار کرنے کیلئے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرر ہے تھے۔ (درمنثور)

(۴) "وقال بعضهم انها نزلت فی ابكر الصديق رضی الله تصدق بار بعين الف دربنار عشرة

بالليل وعشرة بالنهار وعشرة بالسر وعشرة بالعلانية''

اور بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ آیۃ کریمہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق نازل ہوئی کہ آپ نے چالیس ہزار دینار اللہ کی راہ میں خرچ کیے جن میں سے دس ہزار رات میں اور دس ہزار دن میں اور دس ہزار پوشیدگی میں اور دس ہزار ظاہر طور پر خرچ کیے۔

''وتعقبہ الامام السیوطی'' اس روایت کا علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے تعاقب فرمایا ہے، یعنی اس سے رد کیا ہے کہ اس کی صحت کا کوئی ثبوت نہیں کیونکہ یہ روایت ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کی ہے لیکن علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے یوں گرفت فرمائی ''لم اقف علیہ'' میں اس پر مطلع نہیں ہوا

جن لوگوں نے اس روایت کو صحیح قرار دیا انہوں نے اس پر ایک روایت ابن منذر کی ابن اسحٰق سے بطور تائید پیش کی ہے وہ روایت یہ ہے:

" اخرج ابن المنذر عن ابن اسحق قال لما قبض ابو بكر رضى الله عنه واستخلف عمر خطب الناس فحمدالله تعالى واثنى عليه بما هوا هله ثم قال ايها ا لناس ان بعض الطمع فقر وان بعض الياس غنى وانكم تجتمعون مالا تا كلون وتوملون مالا تدركون واعلمو ان بعضا من الشح شعبة من النفاق فانفقو خيرا لانفسكم فاين اصحاب هذه الاية وقرار آيه كريمه"

ابن منذر ابن اسحاق سے روایت بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا وصال ہو گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو آپ نے لوگوں کو خطبہ دیا، اللہ تعالی کی حمد بیان فرمائی اور اس کی ثناء بیان کی، پھر کہا اے لوگوں بیشک بعض طمع فقر و احتیاجی ہے، اور بیشک بعض ناامیدیاں غناء ہیں اور تم جمع کرتے ہو جو کھاتے نہیں اور امید رکھتے ہو جو تم پاتے نہیں اور جان لو بیشک بعض کنجوسیاں منافقت کا حصہ ہیں، اس لئے مال وہاں خرچ کرو (یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرو) جو تمہاری جانوں کیلئے بہتر ہو پس کہاں ہیں اس آیۃ کے اصحاب پھر آپ نے یہ آیۃ الکریمہ

پڑھی علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے اس روایت کی سند وغیرہ پر بحث کرنے کے بجائے جن لوگوں نے اس روایت کو پہلی روایت (چالیس ہزار درہم خرچ کرنے والی روایت) کیلئے تائید بنایا ان کی گرفت یوں کی۔

"وانت تعلم انها لا دلالة فيها على المدعى" اورتم جانتے ہو بیشک اس روایت سے ان لوگوں کا دعوی ثابت نہیں ہوتا۔

یعنی اس روایت میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا صراحۃ کوئی ذکر نہیں لھذا اس روایت سے پہلی روایت کی تائید پیش کرنا درست نہیں۔ (روح المعانی)

(۵) شان نزول کی پانچویں وجہ یہ ہے کہ

" ان الاية عامه في الذين يعمون الاوقات والا حوال بالصدقة تحرضم على الخير"

بیشک یہ آیۃ کریمہ عام لوگوں کے حق میں نازل ہوئی جو عام اوقات اور عام احوال میں صدقہ کیا کرتے تھے ان کو مزید (اور زیادہ) بھلائی کی راہ میں خرچ کرنے پر برانگیختہ کیا (ابھارا) گیا۔

یہی وجہ تھی کہ جب بھی وہ کسی حاجتمند کی حاجت کو دیکھتے تو جلدی ہی اسے پورا کرتے تھے، اس میں نہ دیر کرتے اور نہ ہی اسے کسی وقت تک ٹالتے اور نہ ہی کسی حال پر ٹالتے اگر تمہارا یہ حال ہوا تو ہم تمہیں مال دیں گے۔

جبکہ اب وہ حاجتمند ہیں تو دیر کرنے اور ٹالنے کا کیا مقصد ہے۔

شان نزول کی اس وجہ کے متعلق کبیر میں یوں ذکر کیا گیا'' وهذا هو احسن الوجوه اور یہ وجہ اس کی بہتر وجوہ سے ہیں یعنی عام لوگوں کے حق میں اس آیۃ الکریمہ کا شان نزول تسلیم کرنا بہتر ہے (کبیر)

تاہم صاوی میں یوں بیان کیا گیا ہے'' ولكن العبرة بعموم اللفظ لابخصوص السبب'' کہ اگرچہ شان نزول کی وجہ خاص صحابہ کرام کا مال خرچ کرنا ہی مراد ہو لیکن اکثر طور پر جب یہی ضابطہ سچا آتا ہے کہ اعتبار عموم الفاظ کا ہے خصوصی سبب کا تو اس سے واضح ہو گیا کہ آیۃ کریمہ میں قیامت تک آنے والے تمام مسلمان داخل ہیں جو اللہ تعالی کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں ہر حال میں یعنی رات اور دن میں، پوشیدہ اور ظاہر ان کیلئے ان کے رب کے ہاں ان کا اجر ہے اور ان پر نہ خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمناک ہوں گے۔ (صاوی)

واخرج عبد بن حميد وابن جرير وابن المنذر عن قتادة في الاية قال هولا قوم انفقو

فی سبیل الله افتراض علیھم فی غیر سرف ولا اھلاق ولا تبذیر ولافساد.

عبد بن حمید اور ابن جریر اور ابن منذر نے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی ہے کہ یہ آیۃ کریمہ ان تمام حضرات کے متعلق نازل ہوئی جو اللہ تعالی کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں اپنا فریضہ تو پورا کرتے ہیں لیکن اسراف نہیں کرتے اور نہ ہی بھوکا رہتے ہیں اور نہ بیجا مال خرچ کرتے ہیں اور نہ فساد کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں (درمنثور)

ھذا مدح منہ تعالی للمنفقین فی سبیلہ وابتغاء مرضاتہ فی جمیع الاوقات من لیل اونھار والا حوال من سر وجھر "

اس آیۃ کریمہ میں ان لوگوں کی مدح پائی گئی ہے جو اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں اور تمام اوقات یعنی دن اور رات میں اللہ کی راہ میں خرچ کر کے اور تمام احوال میں یعنی پوشیدگی میں اور ظاہر طور پر اللہ کی راہ میں مال خرچ کر کے رب تعالی کی رضا طلب کرتے ہیں۔

اسی مدح میں اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنا بھی آجاتا ہے جیسا کہ احادیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی مرض کی حالت میں عیادت کیلئے آئے تو ارشاد فرمایا۔

وانک لن تنفق نفقۃ تبتغی بھا وجہ اللہ الا ازددت بھا درجۃ ورفعۃ حتی ما تجعل فی فی امراتک (بخاری ومسلم)

بیشک ہرگز تم اللہ کی راہ میں اس کی رضا حاصل کرنے کیلئے کوئی مال خرچ نہیں کرو گے سوائے اس کے کہ اس میں درجات زیادہ ہوں اور رفعت شان حاصل ہوگی یہاں تک کہ جو لقمہ میں تم اپنی زوجہ کے منہ میں ڈالو گے (ابن کثیر) یعنی یہ خیال کرتے ہوئے کہ اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ نے مجھ پر زوجہ سے حسن سلوک کا حکم دیا ہے کہ اس کا خرچ مجھ پر لازم ہے،، زوجہ کے منہ میں لقمہ ڈالا تو اس کا ثواب بھی حاصل ہوگا اور اس سے بھی درجات کی بلندی حاصل ہوگی۔

وعن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال اناالمسلم اذا انفق علی اھلہ نفقۃ یحبتسھا

کانت له صدقة،، (بخاری ،مسلم مسند احمد)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیشک مسلمان جب اپنے اہل وعیال پر مال خرچ کرے کہ وہ اس میں ثواب کی نیت رکھے (اللہ تعالیٰ کی رضا مندی حاصل کرنا مقصود ہو) تو اسے صدقہ کا ثواب حاصل ہوتا ہے (ابن کثیر)

دینی طلبا کرام کی توجہ کیلئے:

اسم موصول کے بعد کبھی فاء آتی ہے اور کبھی نہیں آتی اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اسم موصول کو درجہ شرط میں رکھا جائے یعنی سبب اور مسبب ہوں تو ''فا'' آئے گی اگر سبب ومسبب کا درجہ نہ ہو تو فا نہیں آئی گی۔

جب یہ کہا جائے '' الذی اکرمنی فله درهم،، وہ شخص جس نے میری عزت کی تو اس کیلئے ایک درہم ہے یفید ان الدرهم بسبب الاکرام،، اس سے یہ پتہ چلا کہ مطلب اس کا یہ ہے کہ درہم دینے کا سبب اکرام ہے جو میری عزت کرے گا وہی درہم کا مستحق ہوگا۔

اور اگر یہ کہا جائے ''الذی اکرمنی له درهم،، تو اس مثال میں سبب کا معنی نہیں پایا گیا بلکہ ایک خبر دی گئی کہ میں نے فلاں آدمی کو ایک درہم دیا، وہ کون تھا، وہی جس نے میری عزت کی تھی۔

یہاں آیۃ کریمہ میں ''الذین'' مرفوع محلا ہے جو مبتدا بمعنی متضمن شرط ہے اور ''فاء'' خبر پر داخل ہے جو درجہ جزاء میں ہے۔

''فهمنا الفاء دلت علی ان حصول الاجرا نما کا بسبب الانفاق ،، ﴿واللہ اعلم﴾

یہاں فاء دلالت کر رہی ہے کہ ان لوگوں کو اجر ملے گا لیکن اس کا سبب ان لوگوں کا اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا ہے'' فکان التقدیر ''من انفق فلا یضیع اجره،، گویا کہ عبارت کا مطلب یہ ہوگیا ہے کہ جو اللہ کی راہ میں مال خرچ کرے گا اس کا اجر ضائع نہیں ہوگا۔ (ماخوذ از کبیر)

دن رات خرچ کرنے سے مراد کیا ہے؟

آیۃ کریمہ میں دن رات اور پوشیدگی اور ظاہر میں خرچ کرنے سے مراد یہ ہے ''ای یعمون الاوقات

والا حوال بالخیر والصدقہ" کہ وہ لوگ تمام اوقات میں اور ہر حال میں اللہ کی راہ میں صدقات وخیرات کرتے ہیں۔

"فالمراد باللیل والنہار جمیع الاوقات کما ان المراد بما بعدہ جمیع الاحوال"

دن رات سے مراد تمام اوقات ہیں اور پوشیدگی میں اور ظاہر طور پر خرچ کرنے سے مراد تمام احوال ہیں۔

نکتہ: وقدم اللیل علی النہار والسر علی العلانیۃ ملایذان بمزیۃ الاخفاء علی الاظہار"

رات کو دن سے پہلے اور پوشیدگی کو ظاہر سے پہلے ذکر کر کے یہ بتادیا ہے کہ صدقہ پوشیدگی میں دینا ظاہر کر کے دینے سے افضل ہے ہاں البتہ کبھی ظاہر دینا افضل ہوتا ہے (جس کا ذکر تفصیلی طور "ان تبدو الصدقات" آیۃ میں ذکر کیا جاچکا ہے (ماخوذ از روح المعانی)

دینی طلباء اکرام کے ذوق کیلئے:

سراو علانیۃ پر نصب حال ہونے کی وجہ سے ہے "الی مسرین و معلنین،، یعنی معنی یہ ہوگیا دراں حالیکہ وہ پوشیدگی میں خرچ کرتے ہیں اور ظاہر کر کے خرچ کرتے ہیں۔

اور یا نصب ہے کہ یہ نعت ہیں مصدر محذوف کی اصل عبارت ہے "انفاقا سرا و انفاقا علانیۃ" اس میں ترجمہ یہ ہوگا کہ ان کا خرچ کرنا پوشیدگی میں ہوتا ہے اور ظاہر میں (از روح المعانی)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ اور روح المعانی:

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا بریلوی رحمہ اللہ نے "باللیل والنہار" کا ترجمہ کیا ہے،، رات میں اور دن میں،، راقم نے بھی وہی نقل کیا ہے یہ ترجمہ روح المعانی کی اس عبارت سے لیا گیا ہے (باللیل والنہار) والباء بمعنی "فی" باللیل والنہار،، میں "باء" فی ء کے معنی میں ہے۔ (روح المعانی)

"فلھم اجرھم عندر بھم والا خوف علیھم ولا ھم یحزنون،،

تو ان کیلئے اجر ہے ان کے رب کے ہاں اور ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ ہی وہ غمناک ہوں گے۔

یہ الفاظ مبارکہ اس پر دلالت کرر ہے ہیں کہ ثواب کا کام کرنے والوں کو قیامت کے دن کوئی خوف نہیں ہوگا لیکن یہ مشروط ہے اس سے کہ ان کا خاتمہ ایمان پر ہوا گر وہ ''العیاذ باللہ'' مرتد ہو گئے تو وہ جہنم کا ایندھن ہوں گے۔ (از کبیر)

فائدہ جلیلہ : وہ سادات کرام جو فقراء ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی محبت اور رسول ﷺ کے حرفہ (کسب) کی اقتداء کی خاطر فقر کو غناء پر پسند کیا ہے وہ نفلی صدقات کے زیادہ مستحق ہیں اور سب سے بہتر یہی ہے کہ ان کو ہی اپنی نفلی صدقات دے جائیں اسی پر علماء کا اتفاق ہے اس کی وجہ راقم کے نزدیک یہی ہو سکتی ہے کہ فرضی صدقات ان کو نہیں دیئے جاتے لھذا نفلی صدقات ان کو ترجیحی بنیادوں پر دیئے جائیں۔

وہ رسول اللہ ﷺ کے حرفہ پر عمل کرر ہے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حرفہ کیا ہے؟

وہ آپ کے اپنے ارشاد سے ثابت ہیں'' **فانه ﷺ کان یکون لحرفتاِن الفقر والجهاد** ''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے مجھے دو حرفہ (کسب) حاصل ہیں ایک فقر اور دوسرا جہاد۔ (ماخوذ از روح البیان)

فقیر سادات کرام کو سلام محبت کہے:

جب وہ عام لوگوں سے مال کے نہ ہونے یعنی فقر کی وجہ سے اور مرتبہ کی وجہ سے اور خدمت نفس اور اکرام واعزاز کے لحاظ اور قلبی ارادت کی وجہ سے ممتاز ہیں تو "**فالحق ان السلام علی هولاء السادة استحقاقا واجلاله**،، حق یہی ہے کہ ان کی بزرگی کے پیش نظر ان کو مستحق سمجھ کر سلام محبت پیش کیا جائے۔"**لا استحفافا واذلا لا**'' ایسا سلام نہ پیش کیا جائے جو کفار و جہال پر ذلت اور گھٹیا سمجھ کر پیش کیا جاتا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا"**واذا حاطبهم الجاهلون قالو اسلاما**'' جب نیک لوگوں کو جاہل لوگ خطاب کرتے ہیں تو وہ ان کو سلام کہتے ہیں۔

اس سلام سے مراد سلام اعراض ہے یہ ہمارے روزمرہ کے محاورہ کے مطابق ہے'' تجھے دور سے سلام'' یہ حقیقت میں سلام ہوتا ہی نہیں مطلب یہ ہوتا ہے کہ تمہارا دور رہنا ہی بہتر ہے جب انسان اللہ تعالیٰ کی راہ میں نیک

فقراء لوگوں پر مال خرچ کر کے رب تعالی کے قریب ایک بالشت ہوتا ہوتا ہے وہ اپنی رحمت کے لحاظ سے اس انسان کے ایک ذراع قریب ہوتا ہے جب انسان مال خرچ کرنے کے لحاظ پر اس کے قریب ایک ذراع ھوتا ہے تو وہ اپنی رحمت کے لحاظ پر ایک باع (دو بازوں کے درمیانی فاصلہ کی مقدار) قریب ہوتا ہے۔

یہ خیال رہے کہ ''شبر، ذرائع، باغ،، کے یہاں حقیقی معانی نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ انسان خلوص دل سے جب رب تعالی کے قریب ہوتا ہے تو رب تعالی کی رحمت اس کے زیادہ ہی قریب ہوتی ہے۔

فلا نهاية لفضله ولا غاية لكرمه" رب تعالی کے فضل وکرم کی کوئی انتہا نہیں اور اس ذات کے کرم کی کوئی غایت (انتہاء) نہیں اس کا فضل وکرم اپنے بندوں پر بے حد وحساب ہے۔

فطوبى لمن ترک الدنيا بطيب القلب واختار الله على كل شئى ومن كان لله كان الله له،،

وہ شخص بڑا خوش قسمت ہے جو اپنے دل کی خوشی سے دنیا کو چھوڑ دے اور ہر چیز پر اللہ تعالی کو پسند کرے۔

کیا ہی خوب فرمایا گیا ''جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ اس کا ہو جاتا ہے،، (ماخوذ از روح البیان)

چھ چیزوں کا حسن چھ چیزوں میں ہے:

وہ چھ چیزیں کیا ہیں؟ وہ یہ ہیں: علم، عدل، سخاوت، توبہ، صبر، حیاء ''العلم فی العلم،، علم کا حسن عمل میں ہے ''العلم بلا عمل کبئیت بلا سقف،، علم بغیر عمل کے ایسا ہے جیسا کہ مکان بغیر چھت کے ہو۔

''والعدل فی السلطان،، عدل جب بادشاہوں میں پائے جائے تو وہ حسین نظر آئے گا کیونکہ ''والسلطان بلا عدل کبئر بلاماء،، بادشاہ بغیر عدل کے ایسے ہے جیسے کنواں بغیر پانی کے ہو۔' والسخاوة فی الاغنیا،، اغنیاء میں جب سخاوت پائی جائے وہ حسین نظر آئیگی، کیونکہ ''والغنی بلا سخاوة کسحاب بلا مطر،، غنی کا سخاوت کے بغیر ہونا ایسے ہی ہے جیسے بادل بارش کے بغیر ہو ''والتوبه فی الشباب،، جوانوں میں جب توبہ پائی جائے گی تو وہ حسین نظر آئے گی، کیونکہ 'والشباب بلا توبة کشجر بلاثمر،، جوانوں کو اگر توبہ حاصل نہ ہو تو وہ ایسے ہی ہیں جیسے درخت بغیر پھل کے ہوں۔ ''والصبر فی الفقر ''صبر کا حسن فقر میں ہے، یعنی فقیر کے صبر کرنے میں صبر حسین نظر آئے گا، کیونکہ ''والفقر بلا صبر کقندیل بلاضیاء، فقر بغیر صبر کے ایسے ہیں جیسے

لالٹین بغیر روشنی کے ہو۔"والحیاء فی النساء" حیاء کو عورتوں سے حسن حاصل ہے یعنی جب حیاء عورتوں میں پائی جائے تو حسین نظر آئے گی، کیونکہ "والنساء بلا حیاء کطعام بلا ملح" عورتوں کا بغیر حیاء کے ہونا ایسے ہی ہے جیسے طعام بغیر نمک کے ہو۔ اغنیاء کو چاہیے کہ وہ اپنی غناء کی بارش سے دین ودنیا کی برکات حاصل کر لے، اسلئے کہ جب وہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرے گا تو فقیروں اور محتاجوں کی احتیاطی ختم ہوگی (فان اللہ لا یضیع اجر المحسنین) بیشک اللہ تعالی احسان کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

پسندید رائے کے بخشید وخرود　　　جہان از پے خویشتن گرد کرد

بہتر رائے یہ ہے کہ لوگوں پر بخشش کرے اور کھائے　جہان کو اپنے پیچھے جمع کرے

یعنی لوگ اس کی سخاوت سے فائدہ اٹھائیں اور اسکی تعریف کریں۔　　　(روح البیان)

عقلمند شخص کی علامت:

عقلمند شخص وہ ہے جو مال اپنے لئے جمع کرے، غیروں کیلئے جمع نہ کرے، اس لئے جو مال چھوڑ گیا وہ غیروں کے کام آئے گا اور جو اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا اس کا اجر وثواب اسے حاصل ہوگا

"فان من جمع مالا ولم یا کل منه ولم یعط فهو جامع لغیره فی الحقیقة ازهولوارثه بعده"

جس شخص نے مال جمع کیا نہ خود کھایا اور نہ ہی فقراء وغرباء کو دیا، اس نے درحقیقت وہ مال غیروں کیلئے جمع کیا جبکہ وہ مال اس کے بعد ورثاء نے سمیٹ لینا ہے　　　(روح البیان)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

"اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَايَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِىْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْآ اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَاسَلَفَ وَاَمْرُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ" (آية نمبر ٢٧٥)

﴿١﴾

وہ جو سود کھاتے ہیں قیامت کے دن نہ کھڑے ہوں گے مگر جیسے کھڑا ہوتا ہے وہ جسے آسیب نے چھو کر مخبوط بنادیا ہو یہ اس لئے کہ انہوں نے کہا بیع بھی تو سود ہی کی مانند ہے، اور اللہ نے حلال کیا بیع کو اور حرام کیا سود۔ تو جسے اس کے رب کے پاس سے نصیحت آئی اور وہ باز رہا، تو اسے حلال ہے جو پہلے لے چکا اور اس کا کام خدا کے سپرد ہے اور جو اب ایسی حرکت کرے گا تو وہ دوزخی ہے وہ اس میں مدتوں رہیں گے۔

﴿٢﴾

وہ لوگ جو کھاتے ہیں سود نہیں کھڑے ہوں گے (قیامت کے دن) مگر جیسے کھڑا ہوتا ہے وہ شخص جسے مخبوط الحواس بنادیا ہو شیطان نے چھو کر، یہ اس وجہ سے کہ بیشک انہوں نے کہا بیع (خرید وفروخت) بھی تو سود کی طرح ہی ہے اور حلال کیا ہے اللہ نے بیع کو اور حرام کیا ہے سود کو، تو وہ شخص کہ آئی ہو اس کے پاس نصیحت اس کے رب کی طرف سے تو وہ رک گیا، تو اس کیلئے وہ ہے جو گذر چکا، اور معاملہ اس کا اللہ کی طرف ہے، اور جو شخص لوٹا تو وہ آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

مختصر مطلب:

تقریباً ترجمہ سے ہی واضح ہے کہ وہ لوگ جو سود کا معاملہ کرتے ہیں تو وہ قیامت کے دن ایسے کھڑے ہوں گے جیسے آسیب زدہ بدحواس و پاگل کھڑا ہوتا ہے، یعنی شیطان جیسے چھو کر مخبوط الحواس بنا دے وہ ٹانواں ٹول کھڑا ہوتا ہے، ایسے ہی معاملہ قیامت کے دن سود خوار کا ہوگا۔ یہ سخت گرفت ان پر اس وجہ سے بھی ہوگی کہ وہ کہتے ہیں جس طرح تجارت میں یعنی خرید و فروخت میں نفع ہے اسی طرح سودی کاروبار میں بھی نفع ہے، لہذا دونوں برابر ہیں، بیع حلال ہو سود حرام ہو ایسا نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالی نے ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالی نے بیع کو حلال کیا اور سود کو حرام کیا، جس شخص کے پاس اللہ تعالی کی طرف سے نصیحت آ گئی یعنی رب تعالی کا یہ حکم پہنچ گیا کہ بیع حلال ہے اور سود حرام ہے تو جو شخص رب تعالی کے حکم کو مان کر سودی کاروبار سے رک گیا، سود کا لین دین ترک کر کے تائب ہو گیا تو اس کیلئے وہ مال ہے جو وہ پہلے لے چکا ہے اس کا معاملہ اللہ تعالی کی طرف ہے۔ جو لوگ اللہ تعالی کے حکم کے آ جانے کے بعد بھی سود کے لین دین کی طرف لوٹیں گے یعنی رب تعالی کے حکم کی پرواہ نہ کرتے ہوئے سود کے لین دین سے باز نہ آئیں وہ دوزخی ہیں، وہ دوزخ کی آگ میں ہمیشہ رہیں گے۔

"اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَايَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِىْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ"

"وہ لوگ جو کھاتے ہیں نہیں کھڑے ہوں گے (قیامت کے دن) مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے وہ شخص جس کو مخبوط الحواس بنا دیا ہو شیطان نے چھو کر۔"

خیال رہے کہ "اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا" کا یہاں حقیقی معنی مراد نہیں کہ سود کا مال کھانا تو ناجائز ہو لیکن اس سے کپڑے خرید سکے، گھر بنا سکے اور ضروریات میں صرف کر سکے، یہ مطلب ہرگز نہیں۔ بلکہ اس کا مجازی معنی معتبر ہے جو تفاسیر نے اپنے انداز میں پیش کیا ہے، مقصد تقریباً سب کا ایک ہی ہے۔

"(اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا) اى يأخذونه وعبر عنه بالاكل لأنه معظم من المقصود لمال ولشيوعه فى المطعومات "

یہاں آیۃ کریمہ میں "أکــل " کا مجازی معنی "أخــذ" ہے۔یعنی سود کھانے کا مطلب سود لینا ہے۔البتہ سود کے مال کو لینے سے منع کرنے کو،سود کھانے کی ممانعت سے اسلئے تعبیر کردیا کہ زیادہ مقصد مال کے حاصل کرنے سے طرح طرح کے کھانے حاصل کرنا اوران سے لذات حاصل کرنا ہوتا ہے۔ (روح البیان)

" (اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا) اى يأخذونه فيعم سائرانواع الانتفاع والتعبير عنه بالأكل لأنه معظم ماقصدبه "

یہاں آیۃ کریمہ میں سود کے کھانے سے مرادسود کا لینا ہے، جوانتفاع کی تمام قسموں کوشامل ہے۔ البتہ کھانے کا ذکراس لئے کیا ہے کہ مال حاصل کرنے میں زیادہ، بڑا مقصد کھانا ہی ہوتا ہے۔

(روح المعانی)

" (اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا) فالمراد الذين يعاملون به وخص الأكل لانه معظم الأمر "

سود کھانے سے مرادسودی مال کا معاملہ کرنا،یعنی سود لینا،کھانے کا ذکراسی لئے کیا گیا ہے کہ بیشک مال کے حاصل کرنے کا مقصد عظیم کھانا ہی ہے۔ (کبیر)

"ربوٰا" کا لغوی معنیٰ' زیادتی'' ہے۔"ربـاالشـئـی یربو اذازاد "جب کوئی چیز بڑھ جائے تواس کیلئے "ربالشئی" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

"وفى الشرع عبارة عن فضل مال لايقابله عوض فى معاوضة مال بمال "

اصطلاح شرع میں "ربــوٰا" سے مرادوہ زیادتی ہے جو مال کے لین دین سے حاصل کی جائے جس کے عوض (بدلے) کوئی چیز نہ دی جائے ،(مکمل تفصیل ان شاءاللہ قریب ہی آرہی ہے)

(روح المعانی)

لفظ ربوٰا کارسم الخط اور خوبصورت نکتہ:

''ربوٰا'' کو واوَ سے لکھتے ہیں، جس طرح ''صلوٰۃ'' کو واوَ سے لکھتے ہیں تا کہ اس کو تفخیم سے (پر کر کے) ادا کیا جاسکے۔

''وزیدت الالف بعدھا تشبیھا بواو الجمع فصار اللفظ به علی طبق المعنی فی کون کل منهما مشتملا علی زیادۃ غیر مستحقه''

جب الف کے زائد کرنے کا کوئی حق نہیں تھا، تو پھر الف زیادہ کر کے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ لفظ کی شکل ہی معنی پر دلالت کر رہی ہے کہ ''ربوٰا'' (سود) بھی مال زیادہ لیا جاتا ہے جس کے لینے کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ پھر واوَ کے بعد الف زائد کر کے جمع کے ساتھ مشابہت کر کے ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ ربوا کو بیع سے بظاہر مشابہت حاصل ہے کہ دونوں میں ''معاوضۃ المال بالمال بالرضاء'' مال کو مال کے بدلے حاصل کیا جاتا ہے اور زیادتی بھی حاصل کی جاتی ہے، یعنی مال جمع کرنا اور زیادتی مشابہ ہے واوَ جمع اور الف زائد کے۔ کفار کے بھٹک جانے کی وجہ ہی یہ تھی کہ وہ بظاہر بیع اور ربوٰا کو ایک دوسرے کے مشابہ دیکھ کر حقیقی طور پر ایک سمجھ بیٹھے، فرق نہیں سمجھ سکے۔ (روح المعانی)

اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ کا ترجمہ اور روح المعانی و در منثور:

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ نے ''لایقومون'' کا ترجمہ کیا ہے ''قیامت کے دن نہ کھڑے ہوں گے'' یہ ترجمہ روح المعانی کے مطابق ہے جو یوں بیان کیا گیا۔

''(لَا یَقُوْمُوْنَ) ای یوم القیامة وبه قرئ کمافی الدرلمنثور''

نہیں کھڑے ہوں گے یعنی قیامت کے دن، اور در منثور میں ایک قرأت کو ذکر کیا گیا ہے جس میں ''یوم القیامه'' کے الفاظ کو جزء سمجھا گیا ہے۔ (روح المعانی)

راقم نے بھی اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کو نقل کیا ہے صرف طلباء کی آسانی کیلئے ''قیامت کے دن'' کو

بریکٹ میں لکھ دیا ہے:

"اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطَانُ مِنَ الْمَس"

"نہیں کھڑے ہوں گے (قیامت کے دن) مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے وہ شخص جس کو مخبوط الحواس بنادیا ہو شیطان نے چھوکر۔"

دینی طلباء کرام کی دلچسپی کے لئے:

تخبط باب تفعل ہے، اصل میں اس کا معنی ہے: "ضرب متوال علی انحاء مختلفة" مختلف اطراف میں چلنا، پھرنا، یعنی بغیر ارادہ کے ادھر ادھر، آگے پیچھے، دائیں بائیں پھرنا، جسے عام محاورہ میں "ٹانواں چلنا پھرنا" کہا جاتا ہے۔ "ثم تجوز به کل ضرب غیر محمود" پھر ہر وہ چال جو غیر پسندیدہ ہو اسے مجازی طور پر "تخبط" کہا جاتا ہے۔

قیامت کے دن سود خوروں کا شیطانی آسیب زدہ کی طرح کھڑا ہونا احادیث سے ثابت ہے:

"فقد اخرج الطبرانی عن عوف بن مالک قال رسول الله ﷺ ایاک الذنوب التی لاتغفر الغلول فمن غل شیئا اتی به یوم القیامة وأکل الربوا فمن اکل الربوا بعث یوم القیامة مجنونا یتخبط" ثم قرأ الآیة"

طبرانی نے حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے آپ کو ان گناہوں سے بچا کر رکھو جن کی مغفرت نہیں کی جائے گی، وہ مال غنیمت میں خیانت ہے۔ جس نے مال غنیمت میں خیانت کی قیامت کے دن اسے اس شخص کے سامنے لایا جائے گا، اور جس نے سود کھایا قیامت کے دن اسے پاگل اور مخبوط الحواس کر کے اٹھایا جائے گا، پھر آپ نے یہی آیۂ کریمہ پڑھی۔ (روح المعانی)

مخبوط الحواس کر کے اٹھانے کی وجہ:

"ولعل الله تعالی جعل ذلک علامة له یعرف بها یوم الجمع الاعظم کما جعل لبعض المطیعین امارة تلیق به یعرف بها کرامة له"

ان کو اس حال میں اٹھا کر اللہ تعالی تمام لوگوں کے سامنے ان کے گناہوں کی علامت مقرر فرمائے گا تا کہ لوگ ان کو دیکھ کر خود ہی سمجھ جائیں کہ یہ سود کھانے والے ہیں۔ جیسا کہ بعض نیک لوگوں کی کچھ علامت ہوں گی جن کو دیکھ کر پتہ چل جائے گا کہ یہ رب تعالی کے مطیع ہیں، جیسا کہ احادیث مبارکہ میں اس امت کی شان بیان کی گئی:

"یبعثون یوم القیامة غرامحجلین من آثار الوضوء"

وضو کرنیوالے حضرات (یعنی نمازیوں) کو قیامت کے دن اس طرح اٹھایا جائے گا کہ ان کی پیشانیاں اور اعضاء پانچ کلاں (چار پاؤں اور پیشانی) سفید والے کی طرح چمک رہی ہوں گی۔

(روح المعانی)

تبنیه: اعلی حضرت رحمہ اللہ نے ﴿ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطَانُ مِنَ الْمَسِ﴾ کا اردو ترجمہ کیا ہے "وہ جسے آسیب نے چھو کر مخبوط بنا دیا ہو" اس ترجمہ کو روح المعانی کی اس عبارت کی تائید حاصل ہے "المتخبط المصروع فی الدنیا" متخبط ایسا ہوگا جیسا کہ دنیا میں مرگی والا شخص ہوتا ہے جس کے ہوش حواس صحیح کام نہیں کرتے۔

شیاطین، جنوں کے چھونے سے انسان کی کیفیت میں مرگی والے شخص جیسی کیفیت ہو جائے تو اسے ہماری اردو زبان کی اصطلاح میں "آسیب زدہ" کہا جاتا ہے

ضیاء القرآن میں پیر صاحب نے ترجمہ کیا ہے "وہ جسے پاگل بنا دیا ہو شیطان نے چھو کر"

پیر صاحب کا ترجمہ بھی روح المعانی کی اس عبارت سے لیا ہوا ہے:

"(مِنَ الْمَسِ) ای الجنون یقال مس الرجل فهو ممسوس اذا جن"

یعنی نے چھو کر اسے پاگل بنا دیا ہو، عام طور پر کہا جاتا ہے اسے مس کر دیا گیا (چھو لیا گیا) تو اس کا

مطلب ہوتا ہے اسے شیاطین نے چھو کر پاگل بنا دیا ہے۔

راقم نے ترجمہ کیا ہے وہ شخص مخبوط الحواس بنا دیا ہو شیطان نے چھو کر اگر چہ "مخبوط الحواس" لفظ اردو نہیں لیکن اردو میں اب اتنا زیادہ استعمال ہے کہ اسے بچے بھی سمجھتے ہیں اسلئے طلباء کرام کے فائدہ کیلئے اور ان کے ذہنوں میں مختلف الفاظ اور مطالب ڈالنا راقم کی کوشش ہے تا کہ ان کو خطابات میں مشکل در پیش نہ آئے بلکہ جو لفظ ذہن میں آئے وہی پیش کر دیں۔

اعتراض: آسیب کی کوئی حقیقت نہیں:

"لان الاطباء یقولون من ان ذلک من غلبة مرة السوداء"

کیونکہ طبیب لوگ کہتے ہیں کہ جب سوداء غالب ہوتا ہے تو اس کی کڑواہٹ کے اثرات دماغ تک پہنچتے ہیں تو انسان کے دماغ پر پردہ چھا جاتا ہے وہ پاگلوں کی طرح حرکات کرتا ہے۔

جواب:

"ماذکروه فهو سبب قریب وما تشیر الیه الآیة سبب بعید"

طبیب حضرات نے جو وجہ جنون کی بیان کی ہے وہ قریب ہے۔ اور آیۃ کریمہ میں جس وجہ کا ذکر ہے وہ بعید ہے۔

"لأن الشیطان قد یمس واخلاطه مستعدة للفساد فتفسد ویحدث الجنون"

اسلئے کہ شیطان کبھی چھوتا ہے تو انسان کی اخلاط بھی فساد کیلئے تیار ہو جاتی ہیں، جب خلطوں میں فساد آجاتا ہے تو پاگل پن پیدا ہو جاتا ہے۔ (از روح المعانی)

مقام توجہ: جنون کے اسباب میں سے ایک سبب شیطان کا چھونا ہے، یہ مطلب نہیں کہ شیطان کے چھونے کے بغیر انسان پاگل نہیں ہو سکتا یا شیطان کے چھونے سے ضرور پاگل ہو جاتا ہے۔

"قد یحصل مس ولایحصل جنون کمااذاکان المزاج قویا"

کبھی شیطان کی طرف سے چھونا تو پایا تو جاتا ہے لیکن جنون نہیں پایا جاتا اسکی وجہ یہ ہوتی ہے کہ قوی مزوج والے پر اس کا اثر نہیں ہوتا۔

"وقد یحصل جنون ولم یحصل مس کما اذا فسد المزاج من دون عروض اجنبی"
اور کبھی جنون حاصل ہوتا ہے لیکن شیطان کا مس کرنا نہیں پایا جاتا، اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان کو خارجی طور پر کوئی چیز لاحق نہیں ہوتی بلکہ صرف اس کے مزاج کے بگڑنے اور خلطوں کے فاسد ہونے کی وجہ سے اسے جنون حاصل ہو جاتا ہے۔

"والجنون الحاصل بالمس قد یقع احیاناو له عند اهله الحاذ قین امارات یعرفونه بها"
شیطان کے چھونے سے جو جنون حاصل ہوتا ہے وہ ہمیشہ برقرار نہیں ہوتا، کبھی کبھی اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں ماہرین حضرات کچھ علامات سے سمجھ جاتے ہیں کہ یہ آسیب زدہ ہے یا کسی بیماری میں مبتلاء ہے۔ (روح المعانی)

جنون کی کچھ اور وجوہ:

"وقد یدخل فی بعض الاجساد علی بعض الکیفیات ریح متعفن تعلقت به روح خبیثة تناسبه فیحدث الجنون ایضا علی اتم وجه"
بعض جسموں میں بعض کیفیات سے بدبودار ہوائیں داخل ہو جاتی ہیں ان کے ساتھ روح خبیثہ کا تعلق ہو جاتا ہے، ان ہواؤں اور روح خبیثہ کے خاص تناسب کی وجہ سے کامل جنون پیدا ہو جاتا ہے۔

ع"وربما ذلک البخار علی الحواس وعطلها"
کبھی بخارات اوپر چڑھتے ہیں تو حواس کو معطل کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے جنون پیدا ہو جاتا ہے،

"واستقلت تلک الروح الخبیثة بالتصرف فتکلم وتبطش وتسعی بآلات ذلک الشخص الذی قامت به من غیر شعور للشخص بشئی من ذلک اصلا"
کبھی انسان میں روح خبیثہ مستقل طور پر اثر انداز ہوتی ہے، بظاہر وہ انسان بول رہا ہوتا ہے لیکن میں حقیقت وہ کلام روح خبیثہ کا ہوتا ہے اسی طرح بظاہر وہ انسان پکڑ رہا ہوتا ہے لیکن حقیقت میں وہ روح خبیثہ کی پکڑ ہوتی ہے اسی طرح باقی انسان کے اعضاء وآلات میں بھی اسی روح خبیثہ کو دخل ہوتا ہے۔

"وھذا کالمشاھد المحسوس الذی یکادیعد منکرہ مکابرا للمشاھدات"
یہ صورتیں جو ہم نے بیان کی ہیں خصوصا شیطان کے چھونے سے پاگلوں کی طرح ہو جانا مشاہدات کی طرح ہیں، مشاہدات کا انکار کرنا ضد اور ہٹ دھرمی ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

جنات کے اثرات میں معتزلہ کا مذہب:

معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ شیطان اور جنات کے چھونے سے کسی انسان کا پاگل ہونا ممکن نہیں یہ عقیدہ رکھنا باطل مذہب ہے۔

رب تعالیٰ نے شیطان کے قول کی حکایت ان الفاظ مبارکہ سے کی "وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ" (اور مجھے تم پر کوئی غلبہ حاصل نہیں) جب شیطان خود اعتراف حقیقت کر رہا ہے کہ مجھے تم پر غلبہ حاصل نہیں تو پھر اس کے اثرات کو تسلیم کرنا کس طرح درست ہے۔ (روح المعانی)

معتزلہ کی غلطی کی وجہ:

معتزلہ نے آیۃ کریمہ کا ماقبل اور مابعد دیکھنے کے بغیر دلیل قائم کر دی ان کی دلیل باطل ہے، آیئے معتزلہ نے جو الفاظ مبارکہ تحریر کئے ہیں، ان کا سیاق وسباق (پہلے الفاظ اور بعد والے الفاظ) دیکھئے۔

"وَقَالَ الشَّيْطَانُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطَانٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ" (سورۃ ابراھیم، آیۃ نمبر ۲۲)

اور شیطان کہے گا جب فیصلہ ہو چکے گا، بے شک اللہ نے تم کو سچا وعدہ دیا تھا اور میں نے تو تم کو وعدہ دیا تھا وہ میں نے تم سے جھوٹا کیا اور میرا تم پر کچھ قابو نہ تھا مگر یہی کہ میں نے تم کو بلایا تم نے میری مان لی، تو اب مجھ پر الزام نہ رکھو خود اپنے اوپر الزام رکھو، نہ میں تمہاری فریاد کو پہنچ سکوں نہ تم

میری فریاد کو پہنچ سکو، وہ جو پہلے تم نے مجھے شریک ٹھہرایا تھا میں اس سے سخت بیزار ہوں بے شک ظالموں کیلئے دردناک عذاب ہے۔

اس آیۃ کریمہ سے صاف واضح ہو رہا ہے کہ شیطان کا نفی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ حقیقی طور پر تمہیں گمراہ کرنے پر قادر نہیں تھا بلکہ گمراہی کی دعوت دی وسوسہ ڈالا، جس کے ظاہری اثرات مرتب ہوئے اور تم نے میری بات کو مان لیا جس کی وجہ سے تم گمراہ ہو گئے۔

اس آیۃ کریمہ سے تو شیطان کے وسوسہ کے اثرات کا ثبوت ہو رہا ہے نہ کہ نفی، ہاں حقیقی طور پر اس کے مؤثر ہونے کی نفی ہو رہی ہے، اسی طرح شیطان اور جنات کے چھونے سے ظاہری اثرات مرتب ہوتے ہیں تو انسان پاگلوں کی طرح نظر آتا ہے، اگرچہ حقیقی طور پر اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہی واقع ہوتا ہے۔ (راقم)

جنات کے اثرات کا ثبوت قرآن وحدیث سے:

اہل سنت وجماعت کا مذہب یہ ہے کہ جنات کے چھونے سے انسان مخبوط الحواس نظر آتا ہے۔

ایک تو اسی آیۃ کریمہ میں جو زیر بحث ہے ذکر کر دیا گیا ہے:

"اَلَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطَانُ مِنَ الْمَسِّ" وہ جس کو شیطان چھونے سے مخبوط الحواس بنادے۔

اور حضرت مریم کی والدہ کی دعاء کا ذکر رب تعالیٰ نے فرمایا:

"وَاِنِّیْ اُعِیْذُهَابِکَ وَذُرِّیَّتَهَامِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ"

اور بیشک میں تیری پناہ پکڑتی ہوں اس کیلئے اور اس کی اولاد کیلئے راندے ہوئے شیطان سے۔

اس سے بھی واضح ہوا کہ شیطان اور جنات کے اثرات ہیں ورنہ حضرت مریم کی والدہ کو یہ دعاء کرنے کی ضرورت در پیش نہ آتی، ان کا دعاء کرنا اور قرآن پاک کا ذکر کرنا اور رد نہ کرنا ہی ثبوت کیلئے کافی دلیل ہے، حدیث شریف میں ہے:

"ما من مولود یولد الا یمسه الشیطان فیستهل صارخا" کوئی بچہ نہیں پیدا ہوتا مگر یہ کہ شیطان

اسے چھوتا ہے، جس کی وجہ سے بچہ روتا ہے۔ اور بعض روایات میں ہے جس کی وجہ سے بچہ روتا ہے اور بعض روایات میں ہے:

"الاطعن الشیطان فی خاصرته" (کوئی بچہ نہیں پیدا ہوتا) مگر یہ کہ شیطان اس کے پہلو میں ضرب لگاتا ہے (یعنی اسے چک دیتا ہے)۔

اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"کفوا صبیانکم اولی العشاء فانه وقت انتشار الشیاطین"

اپنے بچوں کو شام کے اول حصہ میں روک کر رکھو کیونکہ وہ وقت شیطانوں کے پھیلنے کا ہے۔

اسی طرح حدیث شریف میں ایک شخص کا واقعہ ذکر ہے جسے جن اٹھا کر لے گئے تھے، پھر واپس لوٹا گئے۔ یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں درپیش آیا جب اس شخص کو جنات نے واپس لوٹایا تو اس نے بتایا کہ مجھے ایک بہت بڑا پرندہ اپنے بڑے بڑے پروں پر اٹھا کر لے گیا تھا جو اونٹ کی طرح تھا نبی کریم ﷺ نے بتایا کہ وہ اٹھا کر لے جانے والے جنات تھے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

"ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا"

"یہ اس وجہ سے کہ بیشک انہوں نے کہا بیع (خرید فروخت) بھی سود کی طرح ہے۔"

"ذلک" کا اشارہ یا تو "اکل" کی طرف ہے یا اشارہ ان پر عذاب کے نازل ہونے کی طرف ہے یہ ان کا سود کھانا اس وجہ سے تھا کہ انہوں نے کہا بیع بھی سود کی طرح ہی ہے۔ یا یہ معنی ہو کہ ان پر عذاب کا نازل ہونا اس وجہ سے تھا کہ انہوں نے کہا بیع بھی سود کی طرح ہی ہے۔ (روح المعانی)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

بظاہر عقل کا تقاضا یہ ہے کہ سود کھانے والوں نے جب سود کو بیع پر قیاس کیا تو انہیں چاہیے تھا کہ وہ یوں

کہتے "انما الربوا مثل البیع " بے شک سود بھی بیع کی طرح ہی ہے، لیکن انہوں نے اپنے موقف کو بھرپور انداز میں ثابت کرنے کیلئے اپنی دلیل میں "القلب للمبالغة" والا ضابطہ استعمال کیا، جس طرح اس ضابطہ کی مثال تلخیص المفتاح میں دی گئی۔

ومهما مغبرة ارجاؤه　　　　كأن لون ارضه سماؤه

کتنے ہی مقام ہمارے گھوڑوں کے میدان جنگ میں دوڑنے کی وجہ سے جن کے کنارے غبار آلود ہو گئے گویا کہ اسکی زمین کا رنگ آسمان ہو گیا۔

حالانکہ اصل میں یہ کہنا چاہئے تھا "كأن لون سمائه ارضه" آسمان کا رنگ زمین کے رنگ کی طرح ہو گیا لیکن قلب میں مبالغہ پایا گیا ہے کہ آسمان اتنا غبار آلود ہو گیا گویا یوں سمجھا گیا کہ زمین کا رنگ آسمان کی طرح ہو گیا۔

یہاں آیۃ کریمہ میں بھی ان کی دلیل کو اسی ضابطہ کے مطابق مبالغہ کیلئے ذکر کیا گویا کہ انہوں کنے بیع کو نفع میں اصل ٹھہرا کر (سود) کو اس پر قیاس کیا ہے کہ "بیشک سود بھی تو بیع ہی کی طرح ہے"۔ (روح المعانی)

"اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا" "اور اللہ نے حلال کیا بیع کو اور حرام کیا سود کو"

پہلے اس مسئلہ کو سمجھا جائے کہ سود کیا ہے؟ اور سود کی کتنی قسمیں ہیں؟ پھر یہ سمجھا جائے کہ سود کھانے والوں نے سود کو بیع کی طرح کیوں سمجھا؟ پھر یہ سمجھا جائے کہ بیع اور سود میں فرق کیا ہے؟ پھر بیع کے حلال ہونے اور بیع کی بھی بعض صورتیں ممنوع ہونے اور سود کے حرام ہونے اور اس پر احادیث مبارکہ سے وعید کو سمجھا جائے۔ اسی ترتیب سے انشاءاللہ آگے آنے والی بحثیں آئیں گی۔

سود کیا ہے؟

"وفي الشرع عبارة عن فضل مال لايقابله عوض في معاوضة مال بمال" (روح المعانی)

شریعت میں "ربوٰا" کا یہ معنی ہے کہ مال کو مال سے تبدیل کیا جائے اور بغیر عوض (بدلہ) کے زیادتی لی جائے۔

یہ بھی خیال رہے کہ ''ربوا'' عربی لفظ ہے، اس کا فارسی میں معنیٰ ''سود'' ہے، اور اردو میں معنی ہے ''زیادتی بغیر عوض کے''۔

سود کی دو قسمیں:

''ربوا النسئیة وربوا الفضل''

ایک کا نام ادھار کا سود ہے جسے عربی میں ''ربوا النسئیة'' کہا جاتا ہے۔ اور دوسرے کا نام زیادتی کا سود جسے عربی میں ''ربوا الفضل'' کہا جاتا ہے۔

(۱) ربا النسیئۃ (ادھار کا سود) کیا ہے؟

سود کی یہ قسم زمانہ جاہلیت میں مشہور و معروف تھی، اس کی تعریف علامہ رازی رحمہ اللہ نے بہت خوب بیان فرمائی:

''وذلک انهم کانوا یدفعون المال علی ان یأ خذوا کل شهر قدرا معینا، ویکون رأس المال باقیا، ثم اذا حل الدین طالبوا المدیون برأس المال فان تعذر علیه الأداء زادوا فی الحق والأجل فهذا هو الربا کانو فی الجاهلیة یتعاملون به''

ربا النسیئہ (ادھار کا سود) جو شریعت میں ناجائز ہے یہ وہ سود ہے جو زمانہ جاہلیت میں اس کا کاروبار زور و شور پر تھا۔ اس کا طریقہ کار یہ تھا کہ مال دار لوگ اپنا مال دوسروں کو بطور قرض دیتے۔ اس کی ایک مدت مقرر کر لیتے کہ یہ اتنی مدت کیلئے قرض دیا جارہا ہے اس کی شرح سود (شرح منافع) ہر ماہ میں یہ ہوگی جب وہ مدت ختم ہو جاتی، چار سال مدت تھی یا پانچ سال تو وہ مطالبہ کرتے کہ ہمارا مال واپس کر دیا جائے، وہ اتنے سال منافع کی رقم لیتے رہتے تھے اور ان کی اصل رقم محفوظ رہتی تھی۔ ان کے مطالبہ پر اگر ان کی اصل رقم ان کو واپس مل جاتی تو لین دین کا معاملہ ختم ہو جاتا۔ اگر مقروض رقم نہیں دے سکتا تھا تو نئی مدت مقرر کی جاتی تھی اور شرح سود بھی بڑھادی جاتی تھی۔ (از کبیر)

بعض اوقات سود ہر ماہ وصول نہیں کیا جاتا تھا بلکہ مقرر مدت کا سود ایک ہی مرتبہ لیا جاتا تھا، اگر مقروض قرضہ اور سود کی ادائیگی نہ کر سکتا تو مدت بڑھادی جاتی اور شرح سود بڑھادی جاتی اور سود کی رقم پر بھی سود لگا دیا جاتا اس طرح

مقروض قرضے کے نیچے دبتا چلا جاتا، یہاں تک اس کی جائیداد پر قبضہ کرلیا جاتا۔

(۲) ربا الفضل (زیادتی کا سود):

"واما ربا النقد فھو ان یباع من الحنطة بمنوین منھا وما اشبه ذلک"

زیادتی کا سود یہ ہے کہ ایک چیز نقد دے کر نقد ہی دوسری چیز لے لی، جس میں زیادتی پائی گئی، مثلا گندم ایک کلو دے کر دو کلو لے لی، ایک من دے کر دو من لے لی۔ (ماخوذ از کبیر)

یہ دو قسمیں رباء کی ہیں دونوں حرام ہیں۔ ان کی پھر کئی وجوہات ہیں جو ان دونوں صورتوں سے باہر نہیں۔

ربوا کو بیع کی طرح سمجھنے میں غلط فہمی کی وجہ:

سود کھانے والوں نے کہا جب ہم دس درہم سے چیز خرید کر گیارہ درہموں سے فروخت کر دیتے ہیں تو یہ جائز رہے اور دس درہم دے کر گیارہ درہم لیں تو یہ ناجائز رہے یہ عقل کے خلاف ہے بلکہ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ "اذا باع العشرة باحد عشر یجب ان یکون حلالا" جب دس درہم دے کر گیارہ درہم لے لئے جائیں تو یہ حلال ہو۔

ان لوگوں کا یہ قیاس 'ربا الفضل" (زیاتی کے سود) میں تھا، اور انہوں نے 'ربا النسیئة" (ادھار کے سود) میں یہ ذکر کیا ہے:

"لو باع الثوب الذی یساوی عشرة فی الحال باحد عشر الی شھر جاز فکذا اذااعطی العشرة باحد عشر الی شھر"

کہ اگر کوئی شخص ایک کپڑا بیچتا ہے جس کی قیمت اب دس درہم ہے، وہ کہتا ہے تم مجھے ایک ماہ کے بعد گیارہ درہم دے دینا یہ چیز خرید ہو لو، خریدار نے دس درہم والی چیز ادھار گیارہ درہم سے خرید لی تو یہ جائز ہے اس میں اہل علم کا اتفاق ہے تو عقل کا یہی تقاضا ہے کہ دس درہم دے کر ایک ماہ کے بعد گیارہ درہم لے لئے جائیں تو یہ بھی جائز ہو۔ "لافرق فی العقل بین

الصورتین" عقل میں دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

سود کھانے والے لوگوں کے اور عقلی ڈھکوسلے:

خرید فروخت میں زیادتی پر دونوں فریق رضا مند ہوتے ہیں اسی طرح سود دینے والا اور لینے والا بھی زیادتی پر رضا مند ہوتا ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ خرید و فروخت میں نفع جائز رہے اور سودی کاروبار میں نفع ناجائز رہے۔ اور ان کی دلیل یہ ہے کہ خرید و فروخت کو حاجت کے پورا کرنے کیلئے جائز رکھا گیا ہے کہ ہوسکتا ہے اگر اسے خرید و فروخت کی اجازت نہ دی گئی تو وہ اور ہی زیادہ حاجتمند ہو جاتے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص اب غریب ہے، اس کا ہاتھ خالی ہے لیکن مستقبل زمانہ میں اسے زیادہ مال ملنے کی امید ہے، اگر اس کیلئے سودی مال لینے کی اجازت نہ ہو تو وہ شدید حاجت میں مبتلا رہے گا، بلکہ اسکی حاجت میں ہر روز اضافہ ہوتا جائے گا۔ جب سودی مال اس کیلئے لینا جائز ہوگا تو مال کا مالک نفع حاصل ہونے کی لالچ و حرص کی وجہ سے بڑی خوشی سے اسے مال دے گا ۔ جب اس شخص کو مال مل جائے گا تو یہ اس کا مال بمع نفع کے اسے دے دے گا۔

" واعطاء تلک الزیادة عند وجد ان المال اسهل علیه من البقاء فی الحاجة قبل وجدان المال "

مال کے ملنے پر کسی کو لئے ہوئے قرض پر نفع دینا یعنی بطور سود زیادہ مال دینا آسانی ہے بنسبت اسکے کہ مال کے نہ ملنے تک وہ شدید حاجت میں مبتلاء رہے۔ یہ ان لوگوں کے عقلی دلائل تھے جو آج اصلی حالت میں جاری ہیں، نہ ہی سودی کاروبار والوں میں فرق آیا اور نہ ہی ان کے خیالات اور دلائل میں کوئی فرق آیا۔ (ماخوذ از کبیر)

رب تعالی نے ان کا رد کیا، اللہ تعالی نے مختصر الفاظ میں ان کے تمام دلائل باطلہ کا رد فرما دیا، ارشاد فرمایا :

" وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا " "اور اللہ نے بیع (خرید و فروخت) کو حلال کیا اور سود کو حرام"۔

ایمان والوں کیلئے تو اتنے الفاظ ہی کافی ہیں:

تاہم حجت بازوں کیلئے مزید جواب علامہ رازی رحمہ اللہ یوں دے رہے ہیں۔

"ان ماذکرتم معارضة للنص بالقیاس وهو من عمل ابلیس"

بیشک جوتم نے رب تعالی اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات کے خلاف صرف اور صرف عقلی دلائل پیش کیے ہیں جن میں کوئی علت قرآن پاک اور اجماع امت سے نہیں پیش کی گئی تو اسے شرعی قیاس نہیں کہا جاتا یہ تو صرف عقلی دلائل ہیں، رب تعالی کے حکم کے مقابل عقلی دلائل کا سہارا لینا ابلیس لعین کا کام ہے۔

ابلیس کو جب اللہ تعالی نے حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو تو اس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا، اور رب تعالی کے حکم کو اپنے عقلی قیاس سے ٹھکرا دیا۔ یوں کہنے لگا:

"اَنَاخَیۡرٌ مِّنۡهُ خَلَقۡتَنِیۡ مِنۡ نَّارٍ وَّخَلَقۡتَهٗ مِنۡ طِیۡنٍ"

میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اس کو تو نے کیچڑ سے پیدا کیا ہے۔

خیال رہے کہ وہ قیاس جو سراسر قرآن پاک اور حدیث پاک کے صراحتہ مخالف ہو وہ مردود ہے، شیطانی قیاس ہے اس پر کوئی عمل نہیں ہوگا۔ ہاں وہ قیاس جو قرآن پاک یا حدیث پاک یا اجماع امت سے حاصل کیا گیا ہو وہ شرعی قیاس ہے اور مقبول ہے۔

اس کے مقبول ہونے کی وجہ واضح ہے کہ جو مسئلہ قرآن پاک یا حدیث پاک یا اجماع امت سے واضح طور پر ثابت نہیں لیکن اس کی حلت و حرمت کو دوسرے مسائل پر قیاس کر کے ثابت کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس کی علت کسی نہ کسی شرعی دلیل سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

بیع اور سود میں فرق:

"من باع ثوبا یساوی عشرة بعشرین فقد جعل ذات الثوب مقابلا بالعشرین"

جب کوئی شخص دس روپے قیمت کا کپڑا بیس روپے سے بیچتا ہے تو بیس روپے کپڑے کے ہی لئے گئے ہیں جو دونوں بائع اور مشتری کے درمیان طے ہوئے ہیں، جب دونوں ایک قیمت (ثمن) پر رضامند ہو گئے، وہی ثمن اس کپڑے کے عوض ہوں گے۔

"اما اذا باع العشرة باحد عشر فقد اخذ العشرة بالعشرة والزائد بغير عوض"

اگر کوئی شخص دس درہم دے کر گیارہ درہم لیتا ہے تو دس درہم کے بدلے اس نے دس درہم لئے ہیں لیکن جو درہم اس نے زائد لیا ہے وہ بغیر عوض (بدلے) کے لیا ہے، اسی وجہ سے وہ زائد درہم حرام ہو گیا، لیکن بیع میں زائد نفع مبیع (جس چیز کو بیچا جا رہا ہے، کا بدل) ہے، لہذا جائز ہے۔

(ماخوذ از کبیر)

اعتراض: جو زائد درہم لیا جا رہا ہے وہ مہلت کا لیا جا رہا ہے کہ اس نے قرض دے کر ایک ماہ یا دو ماہ اسے مہلت دی ہے۔لہذا یہ کہنا درست نہیں کہ زائد نفع کسی چیز کا بدل نہیں۔

جواب: یہ غلط ہے کہ وہ زائد نفع مہلت کا بدل ہے:

"لان الامهال ليس مالا او شيئايشار اليه حتى يجعله عوضا عن العشرة الزائدة"

اسلئے کہ مہلت دینا کوئی مال نہیں۔اور ظاہری طور پر بھی اس کا کوئی وجود نہیں کہ وہ کسی چیز کا عوض بن سکے بلکہ یہ عرض ہے، عرض کی کوئی قیمت نہیں۔اسی سے بیع اور سود میں فرق اور زیادہ واضح ہو گیا۔ (ماخوذ از کبیر)

بیع اور سود میں ایک اور نمایاں فرق:

بیع میں انسان کتنا ہی ماہر تاجر کیوں نہ ہو جہاں نفع کا احتمال ہے وہاں خسارہ کا بھی احتمال ہوتا ہے، کبھی کبھی انسان اپنی اصل رقم یعنی پونجی کو بھی کھو بیٹھتا ہے لیکن سود میں مقرر شدہ نفع ہوتا ہے اس میں خسارہ کا کوئی احتمال نہیں ہوتا۔ اسی وجہ رب تعالی نے بیع کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے۔

(از روح المعانی)

بیع میں توکل اور سود میں فرعونیت ہے:

انسان بیع (خرید و فروخت) کرتا ہے تو رب تعالی پر توکل رکھتا ہے، اسے چونکہ نفع کیساتھ ساتھ خسارہ کا احتمال بھی ہوتا ہے، لیکن سود میں اسے معلوم ہوتا ہے یہ نفع میں نے لینا ہی لینا ہے تو وہ متکبر ہوتا ہے، اسے اللہ تعالی پر

توکل کا حصول نہیں ہوتا۔اسی تکبر کی وجہ سے غریب پر بھلائی کرنا اسے آتا ہی نہیں،وہ تو غریب کا خون چوسنا جانتا ہے۔ غریب کی جائیداد پر سود کے بدلے قبضہ کرنا اس کا طریقہ ہے،گویا کہ غریب کے اہل وعیال کو جیتے جاگتے اندھیری قبر میں جھونکنا اس کا طرۂ امتیاز ہے۔وہ غریب پر مہربانی کے بہانے اس کی دنیاو آخرت برباد کردیتا ہے،غریب نہ دنیا کا رہتا ہے نہ آخرت کا۔ہاں ہاں اسی تکبر،اکڑ اور غرباء کی زندگیوں کو برباد کرنے اور ان کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھانا،غریب کے بچوں کو گلیوں کے تنکوں سے بھی حقیر سمجھنے کا نام ہی فرعونیت ہے۔ (راقم)

"فَمَنۡ جَآءَهٗ مَوۡعِظَةٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ فَانۡتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ"

تو وہ شخص کہ آئی اس کے پاس نصیحت اس کے رب کی طرف سے تو وہ رک گیا تو اس کیلیے وہ ہے جو گذر چکا ہے۔

یعنی جس شخص کے پاس رب تعالی کی طرف سے نصیحت پہنچی،اور زجر و وعید (ڈانٹ) پہنچی کہ سود سے رک جاؤ،تو اس نے نصیحت کو بغیر کسی تاخیر کے قبول کرلیا اور سود لینے سے رک گیا،تو اس کے لئے وہ ہے جو گذر چکا ہے یعنی جو گناہ پہلے ہو چکا ہے اس کی پکڑ نہیں کیونکہ وہ سود کے حرام ہونے سے پہلے لے چکا ہے اور وہ اس کا مالک بن چکا ہے، وہ اس سے لوٹانے کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔راقم کے نزدیک وہ گناہ ہی نہیں کیونکہ تحریم سے پہلے کے عمل گناہ نہیں ہوتے،اوپر روح البیان کے ان الفاظ کا ترجمہ کیا ہے:

"(فَلَهٗ مَا سَلَفَ)ای مضی من ذنبه فلا یؤاخذ به لا نه اخذ قبل نزول التحریم و جعل ملکا له و لا یسترد"

وَاَمۡرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ: "اور معاملہ اس کا اللہ کی طرف ہے"

یعنی اللہ اسے سود لینے سے رک جانے پر جزاء عطاء فرمائے گا کیونکہ وہ رب کی نصیحت کو مان کر اور اس کی نہی کے سامنے سر جھکا کر سودی کاروبار سے رک گیا اور اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ قیامت کے دن اس کے حق میں فیصلہ کیا جائے گا کہ اس سے کوئی مطالبہ نہ کرے کہ اس نے رب تعالی کے ارشاد کے نازل ہونے سے پہلے جو سود لیا تھا وہ لوٹانے کا تم مطالبہ نہیں کر سکتے،یعنی اس کے بدلے تمہیں اس شخص کی نیکیاں نہیں دی جاسکتیں۔

"وَمَنْ عَادَ فَاُولٰئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ"

" اور جو شخص لوٹا تو وہ آگ والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے"

"(وَمَنْ عَادَ) الی الربا مستحلا بعد النھی کما استحل قبله (فَاُولٰئِکَ) اشارة الی من باعتبار المعنی (اَصْحٰبُ النَّارِ) ای ملازموها (هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ) ما کثون ابدا"

جو شخص لوٹا، یعنی اس نے اللہ تعالیٰ کے سود کو حرام کر دینے اور سود کے لین دین سے منع کر دینے کے بعد پھر ایسے حلال سمجھا جیسے کہ وہ اس آیۂ کریمہ کے نازل ہونے سے پہلے حلال سمجھتا تھا، تو وہ لوگ آگ کو لازم پکڑنے والے ہیں، یعنی ان کا آگ سے چھٹکارہ نہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

(روح البیان)

دینی طلباء کرام کی خصوصی توجہ کیلئے:

لفظ "مَنْ" میں دو احتمال ہیں ایک لفظی اور دوسرا معنوی۔ لفظی لحاظ پر مفرد ہے اسی وجہ سے "عَادَ" مفرد کا صیغہ ذکر کیا گیا، لیکن معنوی لحاظ پر عموم پر دلالت کرنے کی وجہ سے جمع ہونے کا درجہ رکھتا ہے، اسی وجہ سے "اُولٰئِکَ" اشارہ جمع ذکر کیا، روح البیان کی تفسیر "(فَاُولٰئِکَ) اشارة الی مَنْ باعتبار المعنی" کا یہی مطلب ہے کہ "اُولٰئِکَ" کا اشارہ "مَنْ" کی طرف باعتبار معنی کے ہے۔

مقام توجہ : راقم نے " هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ " کا ترجمہ کیا ہے "وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے" یہ ترجمہ روح البیان "ماکثون ابدا" سے لیا ہے، بیضاوی میں بھی یہی ہے: "(هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ) لانهم کفروا به"

وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کا انکار کر کے کفر کیا۔

لیکن اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ہے "وہ اس میں مدتوں رہیں گے" یعنی لمبی مدت زیادہ دیر رہیں گے۔ اصل مسئلہ دو شقوں پر مبنی ہے۔ ایک صورت وہی جو روح البیان سے نقل کی گئی "وَمَنْ عَادَ" جو شخص لوٹا یعنی سود کی حلت کی طرف لوٹا تو یقیناً وہ کافر ہو گیا اور کافر نے ہمیشہ جہنم میں رہنا ہے۔

لیکن دوسری صورت یہ ہے کہ "وَمَنْ عَادَ" کا مطلب یہ ہو کہ جو شخص سود کے حرام ہونے کے بعد کھانے کی طرف لوٹا تو وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا، گناہ کبیرہ کا مرتکب اس وقت تک جہنم کی آگ میں رہے گا جب تک رب تعالی چاہے گا یعنی ہمیشہ نہیں رہے گا بلکہ گناہوں کی سزا ختم ہونے پر جہنم سے نکال لیا جائے گا۔ اس صورت کے مطابق اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ صادق آئے گا۔ "وہ اس میں مدتوں رہیں گے"

مختصر مطلب یہ ہے کہ حرام کو حلال سمجھنا کفر ہے۔ حرام کو حرام سمجھ کر استعمال کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ (راقم)

سود کی ممانعت میں احادیث مبارکہ:

"عن ابی سعید الخدری قال قال رسول الله ﷺ الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلا بمثل يدابيدفمن زاد واستزاد فقد اربی الآخذ والمعطی فيه سواء" (مسلم ج۲ ص۲۳ باب الربوا)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سونے کو سونے کے بدلے اور چاندی کو چاندی کے بدلے اور گندم کو گندم کے بدلے اور جو کو جو کے بدلے اور چھوہارے کو چھوہارے کے بدلے اور نمک کو نمک کے بدلے برابر برابر اور ہاتھ بہاتھ بیچو، جو شخص زیادہ دے اور زیادہ لے تو اس نے ربوا پر عمل کیا، لینے والا اور دینے والا برابر ہیں۔

حدیث شریف سے واضح ہوا کہ

" (فمن زاد واستزا د فقد اربی)معناه فقد فعل الربوا المحرم فدافع الزيادة وآخذها عاصيان مربيان"

یعنی جس شخص نے سودی لین دین میں مقرر کر کے مال زیادہ دیا اور زیادہ لیا، اس نے ربوا (سود) کا حرام کام کیا۔ سود لینے والا یا دینے والا دونوں ہی ربوا کے فعل کے مرتکب ہیں لہذا دونوں ہی گناہ گار و نافرمان ہیں۔ (نووی)

☆ "عن ابی قلابة قال كنت بالشام فی حلقة فيها مسلم بن يسار فجاء ابو الاشعث قال-

قالوا ابو الاشعث فقلت ابو الاشعث فجلس فقلت له حدث اخانا حديث عبادة بن الصامت قال نعم غزونا غزاة وعلى الناس معاوية فغنمنا غنائم كثير فكان فيما غنمنا انية من فضةفامر معاوية رجلاان يبيعها في اعطيات الناس فتسارع الناس في ذلك فبلغ عبادة بن الصامت فقام فقال انى سمعت رسول الله ﷺ ينهى عن بيع الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح الاسواء بسواء عينا بعين فمن زاد وازداد فقد اربى فردالناس مااخذوا فبلغ ذلك معاوية فقام خطيبا فقال الامابال رجال يتحدثون عن رسول الله ﷺ احاديث قد كنا نشهد ونصحبه فلم نسمعها منه فقام عبادة فاعادالقصة فقال لنحدثن بما سمعنا من رسول الله ﷺ وان كره معاوية اوقال وان رغم ما ابالى ان لا اصحبه في جنده ليلة سوداء قال حماد هذا اونحوه" (مسلم ج۲باب الربوا ص۳۳)

ابو قلابہ کہتے ہیں میں شام میں ایک حلقہ (مجلس) میں تھا وہاں مسلم بن یسار بھی تھے۔تو ابوالاشعث آئے تو حاضرین مجلس نے کہا (کیا یہ) ابو الاشعث (ہیں)۔میں نے کہا (ہاں) ابوالاشعث ،تو وہ بیٹھے، میں نے کہا ہمارے بھائی عبادہ بن صامت کی حدیث بیان کرو، انہوں نے کہا ہاں ہم نے ایک جہاد کیا، اس میں لوگوں کے قائد (سپہ سالار) حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ تھے۔ہمیں وہاں بہت سا مال غنیمت حاصل ہوا، اس مال غنیمت میں ہمیں چاندی کے برتن بھی حاصل ہوئے ،تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ ان کو لوگوں کے عطیات میں بیچ دو، تو لوگ اس میں (یعنی چاندی کے برتنوں کی خرید وفروخت میں) جلدی کرنے لگے،تو یہ خبر جب حضرت عبادۃ بن صامت رضی اللہ عنہ کو ملی تو آپ کھڑے ہوئے تو آپ نے فرمایا بیشک میں نے رسول اللہ ﷺ کو منع فرماتے ہوئے سنا کہ سونے کی بیع سونے سے اور چاندی کی بیع چاندی سے اور گندم کی بیع گندم سے اور جو کی بیع جو سے اور چھوہارے کی بیع چھوہارے سے اور نمک کی بیع نمک سے کی جائے سوائے برابر برابر کے، ہاتھ بہاتھ کے، تو جو

شخص (مقرر کرکے) زیادہ دے اور زیادہ لے تو اس نے سود کا کاروبار کیا، تو لوگوں نے وہ (برتن) جو لئے تھے واپس لوٹا دئے۔ جب یہ خبر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو ملی تو آپ نے کھڑے ہو کر خطبہ دیا اور فرمایا اس قوم کا کیا حال ہے جو رسول اللہ ﷺ سے احادیث بیان کرتے ہیں حالانکہ ہم بھی آپ کے پاس حاضر ہوتے تھے اور آپ کی مصاحبت میں ہوتے تھے، ہم نے آپ سے نہیں سنا تو عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ پھر کھڑے ہوئے آپ نے واقعہ کو پھر لوٹایا (یعنی دوبارہ حدیث پاک بیان کی) پھر آپ نے کہا ہم ضرور بر ضرور حدیث بیان کریں گے جو ہم نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے خواہ امیر معاویہ اسے ناپسند ہی کیوں نہ کریں مجھے کوئی پرواہ نہیں کہ وہ مجھے تاریک رات میں ہی (اپنے لشکر سے نکال دیں) اپنے لشکر کے ساتھ نہ رکھیں۔

حدیث پاک سے حاصل ہوا:

چاندی کے برتن بغیر وزن کرنے کے دراہم (چاندی کے سکوں) سے بیچنے پر حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے اعتراض کیا اور حدیث پاک بیان کی کہ یہ بیع جنس کی جنس سے ہے جس کا برابر برابر بیچنا ضروری ہے اور برابری بغیر وزن کے نہیں ہوسکتی تھی۔

☆ حدیث پاک کو سنتے ہی سب مسلمان نے خریدے ہوئے برتن واپس کر دیئے۔

سبحان اللہ! کیا ہی شان تھی صحابہ کرام اور تابعین کی کہ ارشاد مصطفوی ﷺ پر سر جھکا دینا ان کا طرۂ امتیاز تھا۔

☆ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا "کہ کیا حال ہے اس قوم کا جو رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں بیان کرتے ہیں جو ہم نے نہیں سنیں۔

یہ بالکل اسی طرح تھا جس طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس کوئی حدیث پیش کرتا تو انہوں نے وہ حدیث اگر نہ سنی ہوتی تو وہ روایت کرنے والے کو کہتے کہ تم اس پر گواہ پیش کرو، مقصد اس کا یہ ہوتا کہ لوگ احادیث بیان کرنے میں احتیاط سے کام لیں۔ یہی مقصد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا بھی تھا

کہ حدیث پاک کے بیان کرنے میں احتیاط کا پایا جانا ضروری ہے۔

جب حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے دوبارہ حدیث کو بیان کیا تو اس پر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے خاموشی اختیار کی، کسی قسم کا کوئی انکار نہیں کیا کیونکہ اب آپ کو یقین آچکا تھا کہ ہاں واقعی یہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ذیشان ہے، جبھی یقین ہوا سر جھکا دیا۔

میرے عزیز طلباء کرام! کہیں ضال ومضل، نام نہاد محقق اعظم، مناظر کفر والحاد کے جھانسہ میں آکر گستاخی صحابہ کا طوق گلے میں ڈال کر اپنی عاقبت برباد نہ کر دینا۔

فائدہ عظمیہ:

"وفی هذا الاهتمام بتبليغ السنن ونشر العلم وان كرهه من كرهه لمعنى"

حدیث پاک سے واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ کی احادیث وسنن کے بیان کرنے اور شرعی علوم کے مسائل بیان کرنے میں اہتمام کیا جائے، خواہ ان کا انکار کرنے والا کسی نیک مقصد کیلئے ہی کیوں نہ انکار کرے، جب انکار کرنے کی وجہ ہی شر ہو، دین اسلام کی بغاوت ہو، یہود ونصاری کی معاونت ہو، ہنود سے یگانگت ہو اور جہاد کی مخالفت ہو تو ایسے بدترین شریر کی پرواہ نہ کیجئے۔"وفيه القول بالحق وان كان المقول له كبيرا"

حدیث پاک سے اور بہت بڑا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ حق بات کہو خواہ جس کے سامنے حق بات کہنی ہے وہ بہت بڑا ہی ہو۔ (ماخوذ از نووی)

عزیز طلباء کرام! موت کا وقت مقرر ہے، موت وقت سے پہلے ایک لمحہ بھی نہیں آسکتی، موت اپنے وقت مقرر سے آگے بھی نہیں جاسکتی، چارپائی پر ٹانگیں رگڑ رگڑ کر بھی مرنا ہے اور شہادت سے جاودانی زندگی بھی حاصل کرنی ہے تو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ مخالفت برائے مخالفت نہ ہو، کسی پر کیچڑ نہ اچھالیں۔ وقتی سیاسی مصلحت کے مسائل نہ بیان کریں۔ حق کو حق سمجھ کر بیان کریں پھر اس پر مرتب ہونے والے نشیب وفراز سے نہ گھبرائیں یہی خیال کریں جب مرنا ہے تو ڈرنا کیا؟

آجکل خبر اڑ رہی ہے حلقہ قادیان میں
مولویوں کے قاتل ہم چھپے ہیں حکومت پاکستان میں

☆ "وعن عمر قال قال رسول الله ﷺ الذهب بالذهب ربا الاهاء وهاء والورق بالورق ربا الاهاء وهاء والبر بالبر ربا الاهاء وهاء والشعير بالشعير ربا الاهاء وهاء والتمر بالتمر ربا الاهاء وهاء" (بخاری ومسلم، مشکوۃ باب الربوا)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سونے کو سونے کے بدلے بیچنا سود ہے سوائے ہاتھ بہاتھ کے اور چاندی کو چاندی سے بیچنا سود ہے سوائے ہاتھ بہاتھ کے اور گندم کو گندم سے بیچنا سود ہے سوائے ہاتھ بہاتھ کے اور جو کو جو سے بیچنا سود ہے سوائے ہاتھ بہاتھ کے، اور چھوہارے کو چھوہارے سے بیچنا سود ہے سوائے ہاتھ بہاتھ کے۔

احادیث سے مسئلہ حاصل ہوا:

مذکورہ بالا چھ چیزیں، جن کا ذکر احادیث مبارکہ میں ہے ان کو برابر برابر بیچنا ضروری ہے، زیادہ مال لینا ناجائز ہوگا، وہ زیادتی خواہ ہاتھ بہاتھ ہو یا ادھار میں۔ اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ برابر برابر بیچنے پر مجلس میں قبضہ ضروری ہے، اگر قبضہ سے پہلے مجلس برخاست ہوگئی تو بیع ٹوٹ گئی۔ اب مزید وضاحت کی جاتی ہے کہ سود میں اصل علت کیا ہے۔ اور ربوا تفاضل کن صورتوں میں ناجائز ہے اور ربوا نسیئہ کہاں ناجائز ہے۔

سود میں علت:

سراج الائمہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رحمہ اللہ نے سود کی علت جنس اور قدر بیان کی ہے، یعنی دونوں طرف سے مال ایک جنس ہو اور موزونی (جس کا وزن کیا جاتا ہو) اور مکیلی ہو (جو چیز کیل میں آئے یعنی ٹوپے، صاع وغیرہ سے اس کا ماپ کیا جائے) قدر کا لفظ وزن اور کیل دونوں کو شامل ہے نبی کریم ﷺ نے جن چھ چیزوں کا واضح طور پر ذکر فرمایا ہے ان میں سونا اور چاندی موزونی چیزیں ہیں اور باقی مکیلی ہیں۔ جنس ایک ہو، سونا سونے کی

جنس ہے۔چاندی چاندی کی جنس ہے،وغیرہ وغیرہ۔یہ بھی خیال رہے کہ جو چیزیں نبی کریم ﷺ کے زمانہ اطہر میں موزونی تھیں ان کوموزونی ہی سمجھا جائے گا۔اور جو چیزیں اس وقت مکیلی تھیں ان میں اب بھی کیل کا ہی اعتبار ہوگا۔

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے سود کی علت جنس اور ثمنیت یا مطعوم ہونا بیان کیا ہے،ان کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے چھ چیزوں کا واضح طور پر بیان فرمایا ہے ان میں سونا اور چاندی ثمن ہیں یعنی سونا اور چاندی دے کر چیزوں کوخریدا جاتا ہے،اور باقی تمام چیزیں کھائی جاتی ہیں چونکہ انہیں طعام بنایا جاتا ہے اسلئے انہیں مطعوم کہا جاتا ہے اور سب چیزوں کی جنس ایک ہے۔لہٰذا واضح ہوا کہ ربوٰا کی علت جنس اور ثمن یا مطعوم ہونا ہے۔امام احمد رحمہ اللہ کا ارشادامام شافعی رحمہ اللہ کی طرح ہی ہے وہ بھی "الطعم مع الجنس" (ایک جنس اور مطعوم) ہی علت مانتے ہیں امام مالک رحمہ اللہ علیہ "جنس اور مطعوم جوقوت بن سکے" سود کی علت مانتے ہیں قوت سے مراد جس طعام کو بغیر کسی حیلہ کے ایک سال ذخیرہ بنایا جا سکے۔

کیونکہ سونے اور چاندی میں تو وہ بھی ثمن ہونا ہی علت مانتے ہیں،لیکن باقی چیزیں کھائی جاتی ہیں اور باقی رہنے والی ہیں اسلئے ان کے نزدیک جنس اور ثمنیت یا جنس اور مطعوم بمع قوت ہونا ہے۔

نتیجہ اختلاف: امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک لوہے اور چونے کی بیع ہاتھ بہاتھ ہواور برابر برابر ہوتو جائز ہے،اگر زیادتی ہوتو ناجائز ہے کیونکہ اگر چہ یہ دونوں چیزیں مطعوم نہیں لیکن مکیلی اور موزونی ہیں اسلئے وہ قدر میں داخل ہیں اور قدر ہی معتبر ہے،نہ کہ مطعوم ہونا امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ لوہے اور چونے میں ربوا نہیں مانتے کہ یہ کھائی جانے والی چیزیں نہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ ہر کھانے کی چیز میں "ربوٰا" مانتے ہیں جبکہ جنس ایک ہو،خواہ وہ ایک سال ذخیرہ بن سکے یا نہ بن سکے۔امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک سال رہنا بھی ممکن ہوتو ربوا ہوگا ورنہ ربوا نہیں ہوگا،لہٰذا پھلوں اور سبزیوں میں ان کے نزدیک ربوا نہیں۔

راقم کا موقف مذاہب ثلاثہ (تین مذاہب) میں:

فقہاء کرام اکثر مسائل میں یہ مؤقف اختیار کرتے ہیں کہ ہوسکتا ہوتو ائمہ کرام کے اختلافات سے ہٹ کر راہ

نکالی جائے تا کہ سب پر عمل ہو سکے۔

پھر دوسرا قانون یہ ہے کہ حلت وحرمت کا جہاں احتمال ہو وہاں احتیاط یہ ہے کہ حرمت کو ترجیح دی جائے اس لئے فتوی تو امام اعظم رحمہ اللہ کے قول پر ہی ہوگا، لیکن تقوی یہ ہے کہ جب جنس ایک ہو زیادتی ہر صورت میں ممنوع سمجھی جائے، مکیلی چیز ہو یا موزونی ہو، مطعوم ہو خواہ سال بغیر کسی حیلہ کے ذخیرہ بن سکے یا نہ بن سکے۔اس مؤقف میں سب مذاہب سمٹ کر آجائیں گے اور احتمالی حرمت سے بھی اجتناب ہوگا۔

ربوا تفاضل (زیادتی کے سود) میں حرمت کی دو وجہ ہیں:

جب جنس بھی ایک ہو اور چیز بھی مکیلی یا موزونی ہو تو ہاتھ بہاتھ زیادتی بھی حرام ہے۔سونا تھوڑا دے کر زیادہ لے لیا جائے یا گندم وغیرہ تھوڑی دے کر زیادہ لے لی جائے تو یہ ربوا ہے جو ناجائز ہے۔اور اس میں یہ صورت بھی ممنوع ہے کہ اب گندم ایک من دے کر ایک ماہ کے بعد زیادہ لے لے یا اب چاندی دس تولے دے کر ایک یا دو ماہ کے بعد بارہ تولے لے لے، یعنی ایک جنس اور قدر کے پائے جانے کی صورت میں ہاتھ بہاتھ زیادتی بھی ممنوع ہے اور تاخیراً زیادتی بھی ممنوع ہے۔

ربوا انسئیۃ (یعنی ادھار کے سود) میں ایک وجہ ناجائز ہے:

جب دو چیزوں میں سے ایک پائی جائے یعنی جنس یا قدر تو ہاتھ بہاتھ زیادتی جائز ہے تاخیراً ناجائز ہے۔مثال کے طور پر گندم ایک من دے کر اسی وقت جو دو من لے لے تو جائز ہے اگر چہ قدر پائی گئی لیکن جنس ایک نہیں، البتہ گندم ایک من دے کر دو ماہ کے بعد دو من لے تو ناجائز ہے۔ ہاں البتہ اس کے جواز کی وجہ یہ ہے کہ گندم رب بیچ دے، دو ماہ کے بعد جو خرید لے، بیشک وہ زیادہ مل جائیں گے لیکن یہ جائز ہے۔

اگر جنس ایک ہو لیکن چیز مکیلی یا موزونی نہ ہو تو اس میں بھی یہی صورت ہے کہ ہاتھ بہاتھ زیادتی جائز ہے لیکن تاخیر ازیادتی ناجائز ہے۔بیس انڈے دے کر اسی وقت تیس لے لے تو جائز ہے لیکن اب بیس انڈے دے ایک

ماہ کے بعد تمیں لے تو ناجائز ہے، البتہ اب بیس انڈے موجودہ قیمت سے دے، ایک ماہ کے بعد اس وقت کی قیمت سے خریدے، خواہ زیادہ ملیں یا کم، یہ جائز ہوگا۔

اعتراض: حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم ہاتھ بہاتھ زیادتی کو جائز مانتے تھے صرف ادھار کی زیادتی کو ناجائز کہتے تھے تو کس طرح ہاتھ بہاتھ زیادتی کو ناجائز کہا گیا ہے؟

جیسا کہ احادیث میں ذکر ہے:

☆ "عن ابی نضرة قال سألت ابن عمر و ابن عباس عن الصف فلم یریابه بأسا"

ابونضرۃ فرماتے ہیں میں نے ابن عمر اور ابن عباس سے بیع صرف، یعنی سونے کی بیع سونے سے اور چاندی کی بیع چاندی سے یا سونے کی بیع چاندی سے کرنے کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے اس میں کوئی حرج محسوس نہیں کی، یعنی جائز ہونے کے متعلق کہا۔

جواب: ابونضرۃ کی حدیث کے آخری الفاظ ہی دلالت کر رہے ہیں جنس کی بیع جنس سے ہاتھ بہاتھ بھی ناجائز ہے کیونکہ حدیث پاک کا آخری حصہ یہ ہے:

"فانی لقاعد عن ابی سعید الخدری فسألته عن الصرف فقال مازاد فهو ربًاانکرت ذلک لقولهما فقال لا احدثک الاماسعت من رسول الله ﷺ جاء ہ صاحب نخلة بصاع من تمر طیب و کان تمرالنبی ﷺ هذا اللون فقال له النبی ﷺ انی لک هذا قال انطلقت بصاعین فاشتریت به هذاالصاع فان سعر هذا فی السوق کذا وسعرهذاکذا فقال رسول الله ﷺ ویلک اربیت اذاردت ذلک فبع تمرک بسلعة ثم اشتر بسلعتک ای تمر شئت قال ابو سعید فالتمر بالتمر احق ان یکون ربًاام الفضة بالفضة قال فایتت ابن عمر بعد فنهانی ولم آت ابن عباس قال فحدثنی ابوا الصهباء انه سأل ابن عباس عنه بمکة فکرهه" (مسلم ج ۲ باب الربوا)

ابونضرہ کہتے ہیں بیشک میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا میں نے ان سے بیع

صرف (ہاتھ بہاتھ ثمن کی بیع ثمن میں زیادتی) کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے فرمایا جو زیادہ مقرر کیا گیا وہ ربوٰا ہے، میں نے حضرت ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کی وجہ سے میں نے ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی بات کا انکار کر دیا، تو انہوں نے فرمایا میں تمہیں صرف وہی حدیث بیان کرتا ہوں جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے، آپ کے پاس ایک عمدہ کھجوروں کا ایک صاع لائے، نبی کریم ﷺ کے پاس بھی اسی رنگ کی کھجوریں تھیں، نبی کریم ﷺ نے اس شخص سے پوچھا تم نے یہ کھجوریں کہاں سے لائی ہیں؟ صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ اپنی دو صاع کھجوریں لے کر گیا ان کے بدلے یہ (عمدہ کھجوریں) ایک صاع خرید لایا، ان کی اور ان کی بازار میں قیمت اسی طرح تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہاری بربادی یہ تو سود ہے تم پہلے اپنی کھجوریں قیمت سے بیچ دو پھر دوسری کھجوریں قیمت سے خرید لو، حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا جب کھجور کو کھجور کے بدلے زیادتی سے بیچنا ربوٰا ہے تو چاندی کی بیع چاندی سے زیادتی سے ربوا کیوں نہیں؟ ابونضرہ کہتے ہیں پھر میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آیا تو آپ نے مجھے ہاتھ بہاتھ زیادہ مال لینے سے منع فرمادیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال کیا تو آپ نے اسے ناپسند سمجھا۔

اسی حدیث کی وضاحت میں علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وھذہ الاحادیث التی ذکرھا مسلم تدل علی ان ابن عمر و ابن عباس لم یکن بلغھما حدیث النھی عن التفاضل فی غیر النسئیة فلما بلغھما رجعا الیه"

یہ احادیث جو مسلم نے ذکر کی ہیں جن میں ایک جنس اور مکیلی یا موزونی چیزیں ہاتھ بہاتھ بیچنا حرام مذکور ہے حضرت ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہما اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس نہیں پہنچیں تھیں صرف ادھار والی زیادتی کے حرام ہونے والی احادیث ان کے پاس پہنچی تھیں، اس وقت تک تو وہ ہاتھ بہاتھ زیادتی کو جائز مانتے رہے، لیکن جب ان تک حرمت کی احادیث پہنچیں تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے سامنے اپنے سر جھکاتے ہوئے اپنے

مؤقف سے رجوع کرلیا۔

اعتراض: ہاتھ بہاتھ کے جواز پر تو رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی شاہد ہے:

"عن اسامة بن زيد ان رسول الله ﷺ قال لا ربوا فی ما کان یدابید"

(مسلم ج۲ باب الربوا)

حضرت اسامۃ بن زید رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہاتھ بہاتھ زیادتی میں ربوا نہیں؟

جواب نمبر ۱:

"فقد قال القائلون بأن منسوخ بهذه الاحادیث وقداجمع المسلمون علی ترک العمل بظاهره وهذا یدل علی نسخه"

اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ حدیث ان احادیث سے منسوخ ہے جن میں ہاتھ بہاتھ زیادتی کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اور مسلمانوں کا اجماع ہے اس پر کہ اس کے ظاہر پر عمل نہیں یہ اجماع امت بھی اس پر دلیل ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے۔

جواب نمبر ۲:

"انه محمول علی الاجناس المختلفة فانه لاربوا فیها من حیث التفاضل بل یجوز تفاضلها یدابید"

ہاتھ بہ ہاتھ زیادتی کے جواز والی حدیث کا تعلق ان چیزوں سے ہے جو مکیلی یا موزونی تو ہوں لیکن ان کی جنس مختلف ہوں، ان کی باعتبار ہاتھ بہاتھ زیادتی ربوا نہیں، بلکہ ہاتھ بہاتھ زیادتی جائز ہے۔

جواب نمبر ۳:

"حدیث عبادة بن الصامت وابی سعید الخدری وغیرهما مبین فوجب العمل بالمبین"

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ والی حدیث مجمل ہے اور عبادہ بن صامت اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما والی احادیث مبین ہیں۔ اس لئے مبین احادیث پر عمل ضروری ہے۔ (ماخوذ از نووی)

تجارتی مال پر سود لینا بھی حرام ہے:

آج کل یہ بیان کیا جاتا ہے کہ تجارتی کاروبار کیلئے سود کا لین دین جائز ہے، صرف نجی ضروریات کیلئے ناجائز ہے۔ اس عذر لنگ کے رد میں ضیاء القرآن کا پیارا اقتباس پیش کیا جاتا ہے مفسر قرآن مفکر اسلام حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

یہاں ایک اور چیز تحقیق طلب ہے، کیا اس وقت کے لوگ صرف نجی ضروریات کیلئے ہی سودی قرض لیا کرتے تھے یا کاروبار کرنے کیلئے بھی سودی قرض کا اس وقت عام رواج تھا۔ بعض لوگ جنہیں عرب کے حالات اور رسم ورواج کے تفصیلی مطالعہ کی فرصت نہیں ملی، کہتے ہیں کہ اس وقت صرف ذاتی ضروریات کیلئے ہی قرض لیا جاتا تھا اور کاروبار کیلئے قرض لینے کا اس قدیم غیر متمدن معاشرہ میں کوئی تصور نہ تھا، لیکن اگر وہ دنیا کا نقشہ ملاحظہ فرمائیں، تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اس وقت جب کہ نہر سویز نہیں کھودی تھی، جب کہ بڑے بڑے بحری جہاز معرض وجود میں نہیں آئے تھے، مشرق و مغرب کی تجارت خشکی کے راستہ سے ہوتی تھی، اس وقت تجارتی کاروانوں کی راہ گزر جزیرۂ عرب تھا۔

عرب کے لوگ عموماً اور اہل مکہ خصوصاً تجارت میں خوب حصہ لیتے تھے، اور اس امر کا تذکرہ تو خود قرآن حکیم میں ہے کہ اہل مکہ کے تجارتی قافلے سردیوں میں یمن وفارس کی طرف اور گرمیوں میں شام وروم کی طرف سے باقاعدگی سے جاتے تھے اور یہی انکا ذریعہ معاش تھا اور تاریخ اس پر اٹل شاہد ہے کہ جو قافلہ شام سے ابوسفیان کی قیادت میں مکہ واپس جا رہا تھا، جس کا مسلمانوں نے مدینہ طیبہ سے نکل کر محاصرہ کرنے کا ارادہ کیا تھا، اس میں تمام اہل مکہ کا سرمایہ تھا مکہ میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جس نے اس میں اپنا حصہ نہ ڈالا ہو اور حصہ کی دونوں مختلف شکلیں رائج تھیں یا تو سرمایہ دینے والا نفع میں شریک ہوتا تھا یا ہوا اپنا مقرر حصہ ٹھہرا لیا کرتا، خواہ قرض لینے والے کو نفع ہو یا نقصان، ان تاریخی حقائق کی موجودگی میں یہ فرض کر لینا کب روا ہے کہ اس وقت کے اہل عرب کاروبار کیلئے سودی قرض نہیں لیا کرتے تھے۔ قرآن پاک نے ہر ربوا کو حرام کیا، کہیں آپ کاروباری سود لینے کی اجازت نہیں دکھا سکتے۔ (ضیاء القرآن)

غیر مسلم ممالک میں سودی کاروبار کے متعلق فتوی:

رئیس المتقین ،فقیہ اعظم حضرت علامہ ابوالخیر محمد نوراللہ رحمہ اللہ بصیر پوری کے پاس ایک استفتاء پہنچایا گیا جس کا جواب آپ نے ارشادفرمایا جو بمع سوالات وجوابات کے درج کیا جارہا ہے۔

الاستفتاء:

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا غیر مسلم ممالک میں مسلمانوں کیلئے سود دینا یا لینا جائز ہے یا نہیں؟ اس وقت انگلینڈ میں آباد لاکھوں مسلمانوں کو یہ مسئلہ مندرجہ ذیل صورتوں میں درپیش ہے:

(۱) ہرایک مسجد کمیٹی مسلم ویلفیئر کمیٹی یا مسلم فیوزل (کفن دفن) کمیٹی وغیرہ اپنے مقاصد کی تکمیل کیلئے اپنے متعلقہ ارکان سے چندہ اکٹھا کر کے ایک فنڈ قائم کرتے ہیں اور حفاظت کی خاطر بنک میں رکھتے ہیں، بنک اس رقم پر سود دیتا ہے جو اس رقم میں جمع ہوتا رہتا ہے۔

(۲) مزدوری پیشہ لوگ اپنے پس انداز اثاثے بنکوں میں جمع کراتے ہیں اور بینک اس میں قانون کے مطابق سود کا اضافہ کرتا ہے۔

(۳) بعض اشخاص کئی ضرورتوں کیلئے بنک یا فنانس کمپنیوں سے قرضے لیتے ہیں اور بنک اس قرض پر سود وصول کرتے ہیں۔

(۴) چوتھا معاملہ بہت سنگین ہے یعنی رہائشی مکانوں کی خریداری، یہاں مکان اتنے مہنگے ہیں کہ کوئی بھی شخص پہلی بار رہائش کیلئے مکان نہیں خرید سکتا لہٰذا اسے بنک فنانس سوسائٹی سے پانچ دس یا پندرہ سال کیلئے قسطوں پر قرضہ حاصل کرنا پڑتا ہے جسے مارگج کہتے ہیں، اس قرضہ پر بنک یا فنانس سوسائٹی سود وصول کرتی ہے حتی کہ کئی مسجد کمیٹیاں بھی نماز روزہ کیلئے کوئی عمارت برائے مسجد خریدنا چاہیں اور اپنے ارکان ودیگر امدادی احباب کے تعاون کے باوجود مطلوبہ رقم مہیا نہیں کرسکتیں تو مجبوراً بنک کی طرف رخ کرتی ہیں اور مارگج کے مرحلہ سے گزرتی ہیں یعنی متعلقہ عمارت کے کاغذات بنک میں رکھ کر مطلوبہ رقم حاصل کرتے ہیں اور اس پر سود ادا کرتے ہیں ۔

(۵) کچھ عرصہ سے پاکستانی بنکوں نے بھی اپنی شاخیں قائم کی ہیں، اگر تو سود ہر حال میں ناجائز ہے پھر بھی

مسلم،اگر غیر مسلم بنک سے جائز ہے تو مسلم یا کمیٹی کے بارے میں کیا حکم ہے،اگر اس کیلئے بھی وہی حکم ہے تو فبہا (بہتر) بصورت دیگر (دوسری صورت میں) مسلمان سود وغیرہ کی جائز سہولت کے پیش نظر پاکستانی بنک سے لین دین نہ رکھیں تو قومی مفاد پر اثر پڑتا ہے۔

(۶) انشورنس جو سود اور جوا کی ترقی یافتہ صورت ہے غیر مسلم ممالک میں بھی کیا اس کے دارالاسلام والے ہی احکام ہیں یا دارالحرب میں کچھ گنجائش ہے اور مسلمان اپنے مال واولاد کے حفظ ماتقدم کے تحت غیر مسلم ممالک میں انشورنس کرا سکتے ہیں؟

امید واثق ہے کہ آپ ائمہ اربعہ کی روشنی میں ہماری رہنمائی فرما کر اجر کے مستحق ہوں گے۔

نوٹ: استفتاء ہذا لندن سے بواسطہ حضرت مولانا علامہ پیر محمد کرم شاہ صاحب مدظلہم بھیرہ شریف مورخہ (۸۰_۵_۲۲) کو موصول ہوا۔

بسم الله الرحمن الرحيم

الجواب:"اللهم اجعل لی النور و الصواب"

مال حربی غیر معصوم مباح ہے،جب مسلم اس پر غدر وخیانت کے سوا اس کی رضاء سے قبضہ کر لے تو مالک ہو جاتا ہے،لہٰذا اس میں ربوا جاری ہی نہیں ہوتی،بدائع صنائع ج ۵ ص ۱۹۲ میں ہے۔

"فمنها ان يكون البدلان معصومين فان كان احدهما غير معصوم لايتحقق الربوا عندنا(الى ان قال)وعلى هذا الاصل يخرج ماااذا دخل مسلم دارالحرب تاجرافباع درهما بدرهمين(الى ان قال)انه يجوز عندابى حنيفة ومحمد رضى الله عنهما"

نیز اسی میں ہے۔

"ولهما ان مال الحربى ليس بمعصوم بل هومباح فى نفسه الاان المسلم المستأمن منع من تملكه من غير رضاه لما فيه من الغدر والخيانة.........الخ"

ترجمہ:سود کی حرمت کی شرائط میں سے یہ بھی ہے کہ دونوں بدل معصوم ہوں(ان پر کسی کو ہاتھ

ڈالنے کی اجازت نہ ہو) اگر دونوں بدل میں سے کوئی ایک بھی معصوم نہ ہو تو ہمارے نزدیک ربوا ثابت نہیں ہوگا۔ اس سے آگے چل کر یوں بیان کیا گیا" اسی قانون کے مطابق یہ مسئلہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ مسلمان جب دارحرب میں تجارت کی غرض سے جائے تو اس کیلئے جائز ہے کہ وہ ایک درہم دو درہم کے بدلے بیچ دے۔ اس سے آگے چل کر مزید وضاحت کر دی گئی کہ یہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کا قول ہے (اور اسی پر فتویٰ ہے) اسی کتاب یعنی بدائع صنائع میں یہ بھی مذکور ہے کہ "امام اعظم ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کا ارشاد یہ ہے کہ حربی کا مال معصوم نہیں بلکہ وہ حقیقت میں مباح ہے (یعنی مسلمان اور اس پر قبضہ کرسکتا ہے) البتہ مسلمان جب کفار سے امن (ویزہ) لے کر جائے تو کسی کا مال اس کی رضاء مندی کے بغیر دھوکا اور خیانت سے لینا جائز نہیں۔ (راقم)

اور یونہی قدوری اور اس کی شرح الجوھرۃ النیرۃ ج ا ص ۲۶۲ میں ہے "بتقریر حسن جدا" الجوھرۃ النیرۃ کی جس عمدہ تقریر کی طرف حضرت نے اشارہ فرمایا، اسے نقل کیا جا رہا ہے۔

(ولابین المسلم والحربی فی دارالحرب)هذا قولهما وقال ابویوسف یثبت بینهما الربا فی دارالحرب لأنه معنی محظور فی دارالاسلام فکان محظورا فی دارالحرب کالزنا والسرقة ولهما ان المسلم اذادخل الیهم بغیر امان یجوزله اخذمال الحربی بغیر طیبة نفسه فاذا اخذه علی هذالوجه بطیبةنفسه کان اولی بالجوازواذا دخل الیهم بامان فاموالهم مباحة فی الاصل الاماخطره الامان وقد خطره علیه الامان ان لایأخذ ماله بطیبة نفسه واذاسلم الیه ماله علی هذاالوجه فقد طابت نفسه فوجب ان یجوز"

مسلمان اور حربی کے درمیان دارحرب میں ربوا نہیں، یہ قول امام اعظم ابوحنیفہ وامام محمد رحمہما اللہ کا ہے، اور فتویٰ بھی اسی پر ہے، تحقیق پر مبنی یہی قول ہے۔ البتہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا قول احتیاط اور تقویٰ پر مبنی ہے وہ فرماتے ہیں کہ مسلمان اور حربی کافر کے درمیان دارحرب میں بھی ربوا ناجائز

ہے جیسے زنا اور چوری ناجائز ہیں۔ امام اعظم ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کی شاندار دلیل یہ ہے کہ مسلمان جب کافروں کے ملک میں بغیر امان کے جائے تو اس کیلئے یہ جائز ہے کہ حربی کافر کا مال اس کی اجازت کے بغیر لے لے خواہ وہ اسے ناپسند ہی کیوں نہ سمجھتا ہو، اور جب ان کا مال اپنے مال کے بدلے زائد لے لے اور وہ اس پر رضامند بھی ہو تو یقیناً یہ جائز ہوگا۔

راقم کا دونوں قولوں کے مطابق موقف یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دار حرب میں حربی کفار سے سود نہ لے تو اس کی مرضی کی بات ہے، لیکن لے لے تو جائز ہے، فتویٰ اور تقویٰ میں بہت بڑا فرق ہے۔ (راقم)

اور یونہی تنویر الابصار، در المختار، طحطاوی علی الدر ج ۳ ص ۱۱۲ میں ہے طحطاوی کے الفاظ یہ ہیں۔

"وقد تقدم ان شرط الربوا عصمة البدلین جمیعا"

اور تحقیق پہلے بیان ہو چکا ہے کہ بیشک ربوا کی شرط دونوں بدلوں کا معصوم ہونا ہے، جب ایک بدل معصوم نہیں ہوگا تو ربوا بھی نہیں ہوگا، حربی کا معلوم معصوم نہیں بلکہ مباح ہے۔ (راقم)

اور یوں ہی ہدایہ اور اس کی شرح عینی ج ۳ ص ۱۶۵ میں ہے، اور فتح القدیر وعنایہ ج ۶ ص ۱۷۸ میں بھی اور یوں ہی غرر الاحکام مع شرح درر الحکام ج ۲ ص ۱۸۹ میں ہے، اور مبسوط ج ۱۴ ص ۵۶ اور ہندیہ (عالمگیری) ج ۳ ص ۶۴ وغیرہ میں یوں ہی ہے۔

عینی علی الھدایۃ اور فتح القدیر، مبسوط وغیرھما میں حدیث مرسل ہے، والنظم للسرخسی علیہ الرحمہ، الفاظ سرخسی سے نقل کئے جارہے ہیں۔

"ذکر عن مکحول عن رسول الله ﷺ قال لاربوا بین المسلمین وبین اھل الحرب"

مکحول رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا مسلمانوں اور حربیوں (دار حرب کے کفار) کے درمیان ربوا نہیں۔ (راقم)

مکحول تابعی ہیں درمیان میں صحابی کا واسطہ چھوٹا ہوا ہے، اسی لئے حدیث مرسل ہے، جب کسی تابعی کے متعلق معلوم ہو کہ وہ صحابی کو ہی چھوڑتا ہے، وہ کسی تابعی سے روایت کرے تو اپنے شیخ (جس سے روایت کرے

اس) کوضرورذکرکرتا ہےتو وہ مرسل حدیث معتبر ہوتی ہے کیونکہ صحابہ تمام ہی ثقہ راوی ہیں۔ (راقم)

جب کوئی مجتہد کسی حدیث سے استدلال کرے تو وہ صحیح حدیث ہے "کمافی کشف الغمة والشامی ج ۴ص ۵۱" جیسا کہ کشف الغمہ اور شامی ج ۴ص ۵۱ میں ہے۔

"والنظم له ان المجتهد اذا استدل بحديث كان تصيحاله كمافي التحرير وغيره"
اور الفاظ شامی کے ہی ہیں" کہ بیشک مجتہد جب حدیث پاک سے دلیل پکڑے تو وہ حدیث اس کے نزدیک صحیح ہوری ہے تب ہی تو وہ اسے دلیل بنا رہا ہے، اگر وہ حدیث صحیح نہ ہوتی قابل استدلال نہ ہوتی تو یقیناً مجتہد اسے دلیل نہ بناتا۔ یہی مسئلہ تحریر وغیرہ کتب میں بھی موجود ہے۔ (راقم)

اور اس میں دونوں صورتیں برابر ہیں مسلمان کو نفع پہنچے یا حربی کو، چنانچہ مبسوط ج ۱۴ص ۵۹ فتح القدیر اور عنایہ ج ۶ص ۱۷۸ طحاوی علی الدرج ۳ میں ہے "والنظم من المبسوط، مبسوط سرخسی سے الفاظ نقل کیے جارہے ہیں۔

"ويستوى ان كان المسلم اخذ الدرهمين بالدرهم او الدرهم بالدرهمين لانه طيب نفس الكافر بما اعطاه قل ذلک او كثر واخذ ماله بطريق الاباحة كماقررناه

ترجمہ ووضاحت:

مسلمان کیلئے دارحرب میں حربی کافر سے سود کا لینا یا دینا ایک ہی حکم رکھتے ہیں، یعنی دونوں صورتیں جائز ہیں، خواہ مسلمان ایک درہم دے کر دو درہم لے لے، یا دو درہم دے کر ایک درہم لے لے، اس کی وجہ یہ ہے کہ کافر نے اپنی خوشی سے وہ مال دیا ہے یا لیا ہے اور مسلمان پر وہ مال لینا مباح ہے اسلئے مسلمان کافر حربی کو دارحرب میں سود دے یا لے دونوں صورتیں جائز ہیں۔

یہ سارا مسئلہ اس وقت ہے جب امن لے کر جائے، امان کے بغیر جائے تو کافر راضی ہو یا نہ ہو اس کا مال لیا جاسکتا ہے کیونکہ وہ مسلمان کیلئے مباح ہے۔ (راقم)

نمبر ۴ تک کے جوابات واضح ہو گئے اور نمبر ۶ کا یہی جواب ہو گیا کہ یہ سب سود نہیں اور جائز ہے، باقی نمبر ۵ کا معاملہ ذرا سنگین ہے مگر چونکہ اب پاکستانی بنک بھی سود نہیں کہتے بلکہ منافع کے نام سے دیتے ہیں تو ظاہر یہی ہے کہ یہ

ایک مضاربت کی صورت ہے، گو فاسد ہی ہو تو قبضے سے ملک ثابت ہو جاتا ہے اور پاکستانی بنکوں کے ہوتے ہوئے غیر مسلم بنکوں کی طرف میلان سے قومی اور ملکی وقار سخت مجروح ہوتا ہے جو اس سے بھی برا ہے، بہر حال مجھے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مضاربت کی بناء پر ہے حالانکہ مبسوط ج ۱۴ ص ۵۷، ۵۸ میں ہے۔

"ان فعل المسلم یجب حمله علی احسن الوجوه ماامكن"

(جہاں تک ممکن ہو سکے مسلمان کے فعل کو بہتر وجوہ پر محمول کیا جائے، یعنی مسلمان کے فعل میں کوئی اچھائی کے پہلو نکلتے ہوں تو اچھائی پر محمول کیا جائے) (راقم)

شامی ج ۳ ص ۳۶۳ میں ہے:

"حمل احوال المسلمین علی الصلاح واجب" مسلمانوں کے افعال میں اگر کوئی اچھائی کا پہلو نکل سکے تو اس اچھائی کے پہلو پر محمول کرنا واجب ہے۔ اور ارشاد رب العلمین ہے ﴿ان بعض الظن اثم﴾ یعنی قرآن پاک میں ذکر فرمایا کہ "بیشک بعض گمان گناہ ہیں" اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض اوقات غلط گمان پایا جاتا ہے صرف بدگمانی کی وجہ سے کسی کو مورد الزام ٹھہرانا گناہ ہے۔

"وقد جاء النهی فی الاحادیث المباركة عن الظن السوء"

"اور تحقیق احادیث مبارکہ میں کسی کے متعلق بدگمانی کرنے سے منع کیا گیا ہے"

واللہ تعالی اعلم صلی اللہ تعالی علی حبیبه الاكرم وآله وصحبه وبارک وسلم

(فتاوی نوریه مع ترجمه ووضاحت ج ۴ ص ۱۷۳ تا ۱۷۵)

تنبیہ: اس تمام مسئلہ کا تعلق دار حرب سے ہے دار اسلام سے نہیں اور راقم کو حضرت کی آخری بیان کردہ وجہ سے بھی اتفاق نہیں کیونکہ بینکاری نظام میں صرف حکومت کے کہنے سے کہ یہ نفع ہے سود نہیں اعتبار کرنا بھی ممکن نہیں، کچھ مزید وضاحت ان شاء اللہ آگے آئے گی۔

سود لینے اور دینے والے پر لعنت:

"عن جابر قال لعن رسول الله ﷺ آكل الربوا وموكله وكاتبه وشاهديه وقال هم سواء"

(مسلم ج ۲ ص ۳۵ باب الربوا)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے اور کھلانے والے اور کاتب (لکھنے والے) اور گواہوں پر لعنت فرمائی اور ارشاد فرمایا یہ سب برابر ہیں۔

(وهم سواء)ای فی اصل الاثم وان كانوا مختلفين فی قدره" (مرقاة ج٦ص٥٩)

وہ اصل گناہ میں برابر ہیں اگر چہ قدر میں مختلف ہیں۔

"هذا تصريح بتحريم كتابة المبايعة بين المترابيين والشهادة عليهماوفيه تحريم الاعانة على الباطل والله اعلم"

حدیث پاک سے واضح ہوا کہ سودی لین دین کو سودی کاروبار کرنے والوں کے درمیان لکھنا حرام ہے، اور سودی کاروبار میں گواہ بننا حرام ہے۔ حرمت کی وجہ اصل میں یہ ہے کہ باطل کام پر معاونت لازم آتی ہے جو جائز نہیں۔ (نووی)

سود پر وعید شدید:

"عن عبدالله بن حنظلة غسيل الملائكة قال قال رسول الله ﷺ درهم ربا يأكله الرجل وهويعلم اشدمن ستة وثلاثين زينةرواه احمد والدارقطنی وروى البيهقی فی شعب الايمان عن ابن عباس وزاد قال من بنت لحمه من السحت فالنار أولى به"

(مشكوة باب الربوا)

حضرت ابن عبداللہ بن حنظلہ غسیل ملائکہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (اگر) کوئی شخص ایک درہم جانتے ہوئے ربوا سے حاصل کر کے کھاتا ہے تو اس کیلئے یہ چھتیس زنا سے سخت (برا) ہے۔

وضاحت حدیث:

حضرت عبداللہ بن حنظلہ کا لقب ہے "غسيل الملائكة" فرشتوں کا غسل دیا ہوا، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انہوں نے نبی کریم ﷺ کی طرف غزوہ احد میں جانے کیلئے نداء دینے والے کی نداء کو سنا تو یہ حکم کی بجا آوری (حکم کے مطابق عمل کرنا) کیلئے جلدی ہی جنگ کی جگہ پہنچ گئے تو فرشتوں نے ان کو غسل دیا، یہ مسئلہ بھی ذہن میں رہے کہ شہید کو

اگرچہ غسل نہیں دیا جاتا لیکن اگر جنبی ہوتو اسے غسل دینا ضروری ہوتا ہے۔

سود کا ایک درہم کھائے جانتے ہوئے، اس کا مطلب کیا ہے؟

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جانتا ہے یہ ربوا ہے اور ربوا کا کھانا حرام ہے، اتنا علم حاصل کرنا ہر شخص کو ضروری ہے۔

"وکذا ان لم یعلم لکنه قصر فی التعلم لان الائمة الحقوا المقصر بترک التعلم الواجب علیه عینا بالعالم فی انه یکون مثله فی الاثم"

یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص سود کو حرام کو نہ جانے اور سود کھائے تو وہ بھی اسی طرح گنہگار ہوگا جیسا کہ جانتے ہوئے سود کھانے والا گنہگار ہوتا ہے، ائمہ کرام نے فرائض اور محرمات (فرض چیزوں اور حرام چیزوں) کا علم حاصل نہ کرنیوالے، اس کے حاصل کرنے میں کوتاہی کرنے والے کو اسی طرح گنہگار ٹھہرایا جیسا کہ اس کا علم رکھنے والا ہوتا ہے۔

سود کا کھانے والا چھتیس بار زنا کرنے والے سے شدید مجرم ہے، یہ ارشاد فرما کر حرام چیزوں کے کھانے پر کامل طور پر زجر کی گئی (ڈانٹ دی گئی) اور حلال اشیاء کے کھانے پر برانگیختہ کیا گیا اور لوگوں کے حقوق سے اجتناب کا حکم دیا گیا، باقی چھتیس کی تعداد صرف مبالغہ اور شدت کیلئے ہے، اگر بالفرض معین تعداد مراد ہوتو اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو اور اس کے رسول ﷺ کو ہوگا۔ بعض صوفیاء کرام نے بیان فرمایا ہے اس سے مراد خاتمہ خیر پر نہ ہونا بلکہ برائی پر خاتمہ ہے۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج۶ ص ۶۷)

اور بیہقی کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ جس آدمی کی حرام مال سے نشو ونما ہو وہ آگ کا مستحق ہوگا۔

☆ "عن ابی هریرة قال قال رسول اللهﷺ الربا سبعون جزأ ایسرها ان ینکح الرجل أمه"
(مشکوة باب الربوا)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سود کھانے میں ستر قسم کے گناہ ہیں ان میں گھٹیا اور آسان گناہ یہ ہے کہ جیسے کوئی شخص اپنی ماں سے مجامعت کرے۔

یہاں بھی حدیث شریف میں "ستر" سے مراد کئی قسم کے گناہ ہیں۔ عام طور پر عرب کے محاورہ میں "ستر" کا لفظ ذکر کیا جاتا ہے، مراد اس سے کثرت ہوتی تھی۔

سود کھانے والے عذاب میں مبتلاء:

"عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ اتیت لیلة اسری بی علی قوم بطونهم کالبیوت فیها الحیات تری من خارج بطونهم فقلت من هؤلاء یا جبریل قال هؤلاء أکلة الربوا"
(رواه احمد وابن ماجة،مشکوة باب الربوا)

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا،معراج کی رات کو میرا ایک قوم پر گزر ہوا جن کے پیٹ مکانوں کی طرح تھے ان میں سانپ ان کے پیٹوں سے باہر سے دیکھائی دے رہے تھے میں نے کہا،اے جبریل! یہ کون لوگ ہیں؟ تو جبریل نے یہ کہا سود کھانے والے ہیں۔

"وفی روایة من امتک" (مرقاة ج٦ ص ٦٨)

ایک روایت میں یہ مذکور ہے کہ یہ لوگ آپ کی امت میں سے سود کھانے والے ہیں،ان کے پیٹوں کا بڑا ہونا اور سانپوں کا نظر آنا اس وجہ سے آپ کو دکھایا گیا

"تشنیه لحالهم وفضیحة مآلهم"

کہ آپ ان کی بدحالی،اور رسوا کر دینے والا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اپنی امت کو سود خواروں کے انجام سے مطلع کریں تا کہ وہ باز آجائیں۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

حدیث شریف میں استعمال ہونے والے ہونے والے الفاظ اور ان کے تراجم کی طرف توجہ کریں تا کہ صحیح مطلب ذہن نشین ہو جائے۔

"اتیت" معروف کا صیغہ ہے، معنی اس کا ہے "مررت" میرا گزر ہوا۔ "علی قوم" جار و مجرور کا تعلق "اتیت" سے ہے، اگر چہ بظاہر وہم یہ ہوتا ہے کہ اس جار و مجرور کا تعلق "اسری بی" سے ہے۔ حالانکہ یہ درست نہیں، "تری" مجہول کا صیغہ ہے، آپ کو دکھائے جا رہے تھے، "الحیات" جمع ہے "الحیة" کی، جس کا معنی

ہے سانپ، ''أکلة'' جمع ہے ''آکل'' کی، کھانے والے۔ (ماخوذ از مرقاۃ بزیادۃ)

گذشتہ سے پیوستہ:

اس سے پہلے فتاوی نوریہ سے ایک فتوی نقل کیا گیا، اسی کی مزید وضاحت شامی سے جس میں احترازی صورتوں سے مزید وضاحت کردی گئی۔ ''ولا (ربوا) بین حربی ومسلم'' حربی اور مسلمان کے درمیان ربوا نہیں۔

''احترز بالحربی عن المسلم الاصلی والذمی''

متن میں جو یہ ذکر کیا گیا ہے کہ حربی اور مسلمان کے درمیان ربوا نہیں اور میں ''حربی'' کہہ کر واضح کردیا کہ کوئی مسلمان دوسرے مسلمان سے سود نہیں لے سکتا، اور ایسے ہی کوئی مسلمان کسی ذمی سے ربوا نہیں لے سکتا۔

''وکذا عن المسلم الحربی اذا هاجر الینا ثم عاد الیهم فأنه لیس للمسلم ان یرابی معه اتفاقا''

حربی مسلمان جو ہماری طرف ہجرت کرکے آئے پھر دار حرب میں لوٹ جائے (لیکن اسلام پر قائم رہے) تو کسی مسلمان کو حق نہیں پہنچتا کہ اس سے ربوا لینے کو جائز قرار دے۔

''وفی المجتبی''مستأمن من اهل دارنا مسلما کان أوذمیا فی دارهم اومن اسلم هناک باشر معهم من العقود التی لا تجوز فیما بیننا کالربویات''

مجتبی میں ذکر کیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص دار اسلام سے دار حرب میں جائے اور ان سے امن لے کر (یعنی اجازت لے کر) جائے خواہ مسلمان ہو یا ذمی ہو، یا کوئی شخص دار حرب میں ہی مسلمان ہو جائے تو یہ حربی کفار سے سود کا لین دین نہیں کرسکتے۔

فقہاء کرام کی صریح عبارات سے عقلی ڈھکوسلے ختم ہوگئے:

''وفی السیر الکبیر وشرحه حیث قال واذا دخل المسلم دارالحرب بامان فلابأس بأن یاخذ منهم اموالهم بطیب انفسهم بایّ وجه کان لأنه انما اخذ المباح علی وجه

عری عن الغدر فیکون ذلک طیباله والأسیر والمستأمن سوا حتی لوباعهم درهما بدرهمین اوباعهم میتة بدراهم اوأخذ مالا منهم بطریق القمار فذلک کله طیب له..........اہ ملخصا''

سیر کبیر اور اس کی شرح میں بیان کیا گیا ہے جسے اختصاراً یہاں بیان کیا گیا ہے، جب مسلمان دارحرب میں امن لے کر داخل ہو تو اس کیلئے کوئی حرج نہیں کہ ان سے مال لے لے جو وہ خوشی سے دیں وہ مال کسی وجہ سے بھی دیں اس کا لینا مباح ہے، البتہ شرط یہ ہے کہ اس میں دھوکا اور وعدہ کہ خلاف ورزی نہ پائی جائے۔ اس مسئلہ میں مسلمان قیدی اور امن لے کر جانے والا برابر ہیں، یہاں تک کہ مسلمان دارحرب میں کافروں کو ایک درہم دے کر دو درہم لے لے تو جائز ہے، ان پر مردہ جانور بیچ دے تو یہ بھی جائز ہے یا ان سے مال دارحرب لاٹری وغیرہ سے حاصل کرلے تو یہ بھی جائز ہے۔

غلط فہمی کی وجہ: فقہاء کرام نے چونکہ الفاظ ''ربوا'' اور قمار'' کے ذکر کئے ہیں تو کچھ لوگ دوسروں کو مغالطہ میں ڈالنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں، دیکھو جی ربوا کو قرآن پاک میں حرام کیا ہے اور جوابازی کو بھی حرام کیا ہے تو یہ دارحرب میں کیسے حلال ہوگئے۔

آیئے دیکھئے شیخ محمد امین المعروف بابن عابدین درمختار کے حاشیہ (شامی) میں کیا خوب بیان فرماتے ہیں۔

''فانظر کیف جعل موضوع المسئلة الأخذ من اموالهم برضاهم فعلم ان المراد من الربوا والقمار فی کلامهم ماکان علی هذاالوجه وان کان اللفظ عاما لان الحکم یدور مع علة غالبا''

حرمت کی دارومدار علت پر ہے، جب علت ہی نہ پائی جائے تو اس پر حرمت کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا، جب دارحرب میں حربی سے مال لینا ان کی رضاء مندی سے جائز ہوا تو وہ اصل میں مباح ہے، نہ اس میں ربوا ہے اور نہ ہی جوابازی، اگرچہ ظاہر کے لحاظ پر الفاظ ''ربوا اور قمار'' ذکر کردیئے

گئے ہیں، حقیقت میں نہ وہ ربوا ہے اور نہ جوا بازی۔

انہ لما دخل دارھم بأمان فقد التزم ان لایغدرھم وھذا القید لزیادۃ الایضاح لأن مآخذہ برضاھم لاغدرفیہ"

مسلمان کیلئے ضروری ہے کہ جب دارحرب میں وہ امن (ویزہ) لے کر جائے تو ان سے دھوکا نہ کرے دھوکا بازی سے مال بٹورنا جائز نہیں، جب ان کی رضاءمندی سے مال لے تو وہ دھوکا بازی نہیں۔ (شامی ج۴ص۲۰۹،۲۰باب الربا)

ہاں البتہ جو گذشتہ اوراق میں بیان کیا جاچکا ہے کہ اگر تقوی کے پیش نظر امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول پر عمل کرے تو ٹھیک ہے کہ امن لے کر جائے تو حربی کافر سے رقم کے بدلے رقم پر بھی نفع نہ لے۔

کیا آجکل کوئی ملک دارحرب نہیں:

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ دارحرب تو وہ ہے جہاں مسلمان اور ذمی کی جان محفوظ نہ ہو لیکن مسلمان آجکل جس ملک میں بھی ویزہ لے کر جائیں تو ان کی جان محفوظ رہتی ہے، ان کو صرف مسلمان سمجھ کر قتل نہیں کیا جاتا تو دارحرب تو کوئی ملک نہ رہا۔

راقم پہلے فتاوی عالمگیری سے مکمل عبارت نقل کرتا ہے، پھر اپنا مؤقف بیان کرتا ہے جس سے دارحرب کا اطلاق سمجھ آجائے گا کہ دارحرب کا لفظ کہاں کہاں بولا جاتا ہے۔

"اعلم ان دارالحرب تصیر دارالاسلام بشرط واحد وھو اظھار حکم الاسلام فیھا قال محمد رحمہ اللہ فی الزیادات انما تصیر دارالاسلام دارالحرب عندابی حنیفۃ رحمہ اللہ بشروط ثلاثۃ احدھا اجراء احکام الکفار علی سبیل الاشتھار وان لایحکم فیھا بحکم الاسلام والثانی ان تکون متصلۃ بدارالحرب لایتخلل بینھما بلد من بلادالاسلام والثالث ان لایبقی فیھا مؤمن ولاذمی آمنا بامانہ الاول الذی

کان ثابتا قبل استیلاء الکفار للمسلم باسلامه والذمی بعقدالذمة وصورة المسئلة علی ثلاثة اوجه اماان یغلب اهل الحرب علی دارمن دورنا أوارتد اهل مصر وغلبوا واجروا احکام الکفر اونقض اهل الذمة العهد وتغلبوا علی دارهم ففی کل من هذه الصور لاتصیر دارالحرب الابثلاثة شروط وقال ابویوسف ومحمدرحمهما الله بشرط واحد لاغیر وهو اظهاراحکام الکفر وهو القیاس"

(فتاوی عالمگیری ج۲ ص ۲۳۲ باب الخامس فی استیلاء الکفار)

تم جانو کہ بیشک دارحرب صرف ایک شرط سے دارالسلام بن جاتا ہے، وہ ایک شرط یہ ہے کہ احکام اسلام کا اظہار کردیا جائے۔

امام محمد رحمہ اللہ نے زیادات میں بیان فرمایا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک داراسلام دارحرب اس وقت بنے گا جب اس میں تین شرطیں پائی جائیں گی

(۱) ان میں سے ایک شرط یہ ہے کہ کفار کے احکام کو مشہور طریقہ سے جاری کیا جائے، یعنی اعلانیہ طور پر اور اشتہاروں کے ذریعہ احکام کفر کا اعلان کیا جائے اور اسلام کا وہاں کوئی حکم جاری نہ کیا جائے۔

(۲) ان میں سے دوسری شرط یہ ہے کہ وہ داراسلام جو دارحرب بنایا جارہا ہے وہ دوسرے دارحرب سے متصل ہو ان کے درمیان کوئی داراسلام نہ ہو۔

(۳) ان میں سے تیسری شرط یہ ہے کہ ان میں مؤمن اور کوئی ذمی امن میں باقی نہ رہے کہ مسلمان کو جو اسلام کی وجہ سے کافروں کے غلبہ سے پہلے جو امان حاصل تھی وہ کافروں کے غلبہ سے اٹھ جائے اور ذمیوں کو مسلمانوں کی طرف سے جو امان بحیثیت ذمہ کے حاصل تھی وہ امان ان کی بھی کافروں کے غلبہ سے جاتی رہے۔

صورت مسئلہ تین وجہ پر ہے:

ایک صورت ان میں سے یہ ہے کہ کافر ہمارے شہروں میں سے کسی شہر پر یا ہمارے ممالک میں سے کسی ملک پر غالب آجائیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہمارے شہر یا ہمارے ملک کے لوگ "العیاذ باللہ" مرتد ہوجائیں اور

مسلمانوں پر غالب آجائیں وہ احکام کفر جاری کریں۔ تیسری صورت یہ ہے کہ اسلامی ملک میں رہنے والے ذمی کفار اپنا وعدہ توڑ دیں اور مسلمانوں پر غالب آجائیں اور ان کے ملک پر اپنا تسلط قائم کرلیں۔

ان تین صورتوں میں دار اسلام دار حرب اسی وقت بنے گا جب مذکورہ بالا تین شرطیں اس میں پائی جائیں گی۔

امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ دار حرب کیلئے صرف ایک شرط ہے، اس کے بغیر کوئی اور شرط نہیں وہ شرط یہ ہے کہ وہاں احکام کفر جاری ہوں قیاس بھی یہی ہے۔ (عالمگیری)

امام صاحب اور صاحبین کے اقوال میں محاکمہ:

اگرچہ عالمگیری کی عبارت سے بظاہر یہی سمجھ آرہا ہے کہ فتوی امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کے قول کے مطابق ہے کیونکہ وہی قیاس کے مطابق ہے۔

لیکن راقم کو ان اقوال میں تطبیق کی ایک وجہ نظر آرہی ہے وہی درحقیقت راقم کا موقف ہے، وہ تطبیق یہ ہے کہ دار اسلام کو دار حرب بنانے کیلئے تین صورتیں ہیں، ان تین میں سے کسی ایک صورت میں دار اسلام دار حرب بن جائے گا لیکن اس میں تین شرطیں پائی جائیں جن کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

مسلمان اور کافر ذمی کی جان کے محفوظ نہ ہونے کا مطلب بھی پھر عالمگیری سے ایک مرتبہ دیکھئے کہ جب کفار یا مرتدین یا ذمی جب باغی ہو جائیں اور مسلمانوں کے علاقہ پر غلبہ حاصل کرلیں تو مسلمانوں کو اسلام کی وجہ سے حاصل ہونے والا امن اٹھ جائے اور ذمی کافروں کا ذمہ کا معاہدہ اٹھ جائے۔

اس سے واضح ہو رہا ہے کہ یہ مراد ہی نہیں کہ وہ کافر کبھی بھی کسی کو امان نہیں دیں گے بلکہ ابتدائی طور پر جب وہ غالب آئیں، ایسی افراتفری چھائیں کہ کسی مسلمان اور ذمی کی جان محفوظ نہ رہے یہ ہر دور میں رہا کہ کافروں سے امان لے کر مسلمانوں کے ملک میں جاتے رہے اسے دار حرب ہی کہا جاتا رہا۔ یہ تو تھا امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے قول کا مطلب کہ دار اسلام کا دار حرب بننا تین شرطوں سے مشروط ہے لیکن صاحبین کے قول کے مطابق اصلی دار حرب کی بات ہے، کہ دار حرب وہ ہے جہاں کافروں کی حکومت ہو اور وہ احکام کفر جاری کریں۔

یہ فرق جب تک نہیں کیا جائے گا اس وقت تک فقہ کی کتابوں میں سینکڑوں جگہ دارحرب کا اطلاق بے معنی ہو کر رہ جائے گا، اور عشر وخراج، جہاد۔ مال غنیمت کے مسائل میں جہاں جہاں دارحرب استعمال ہے اس کو فقہاء کرام نے بیان کیا ہے ان کا بیان غلط ہو جائے گا۔

ایسی جسارت ہمارے جیسا ہیچمدان نہیں کرسکتا کوئی خودساختہ مجتہد ہی کرسکتا ہے۔

ممالک کی تقسیم یوں ہے:

تمام ممالک دو قسم ہیں: (۱) دارِاسلام (۲) دارِکفر

دارِکفر کی پھر دو قسمیں ہیں۔(۱) دارحرب اصلی (۲) دارحرب طاری۔

بالفرض اگر کوئی دو قسمیں مانے تو پھر فتوی صاحبین کے قول کے مطابق ہوگا، دارِاسلام میں وہ ہوگا جس میں مسلمانوں کی حکمرانی ہو اور اسلام کے احکام کا اظہار ہو اور دارحرب وہ ہوگا جس میں کافروں کی حکمرانی ہو اور کفر کے احکام کا اظہار ہو۔

اعتراض: اگر وہ تمام ممالک جن میں کفار حاکم ہوں وہ دارحرب ہوں تو وہاں کے مسلمان کس طرح نماز جمعہ وعیدین ادا کریں گے؟ نیز تم نے خود تفسیر نعیمی سے بیان کیا ہے کہ بھارت دارحرب نہیں۔

جواب: تفسیر نعیمی سے بھارت کے دارحرب نہ ہونے کا تذکرہ بھی اسی حد تک ہے کہ بھارت کو اس درجہ کا دارحرب نہیں کہا جائے گا جس میں جمعہ اور عیدین کی نماز بھی ادا نہ ہو سکے، اسی طرح کئی اور ممالک کا یہی حکم ہے، آیئے علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ کی وضاحت دیکھئے، آپ نے کیا خوب بیان فرمایا۔

"کل مصر فیه وال مسلم من جهة الکفار یجوز منه اقامة الجمع والأعیاد واخذ الخراج وتقلید القضاء وتزویج الایامی لاستیلاء المسلم علیهم واماطاعة الکفرة فهی موادعة ومخادعة واما فی بلاد علیها ولاة کفار فیجوز للمسلمین اقامة الجمع والاعیاد ویصیر القاضی قاضیا بتراضی المسلمین ویجب علیهم طلب وال

مسلم"............اھ

ہر شہر جس میں کفار کی جانب سے مسلمان حاکم مقرر کرلیا جائے تو وہاں کے مسلمان اپنے مسلمان حاکم اور اس کی ولایت یعنی حکمرانی کی وجہ سے جمعہ کی نماز ادا کر سکتے ہیں اور عیدین کی نماز ادا کر سکتے ہیں، اور خراج لینا اور قاضیوں کے فیصلہ کی تقلید کرنا اور بیواؤں کے نکاح کرنے میں وہی حقوق حاصل ہوں گے جو مسلمان باشندوں کی طرف سے مسلمان حاکم مقرر کرنے سے حاصل ہوتے ہیں لیکن وہ شہر جہاں کافر حاکم ہوں وہاں مسلمانوں کیلئے جمعہ اداء کرنا اور عیدین کی نماز ادا کرنا اس وقت جائز ہوگا جب انہوں نے اپنے فیصلے کرنے کیلئے مسلمانوں میں سے قاضی (حاکم) بنا رکھا ہو۔

اسی وجہ سے مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے معاملات کیلئے اپنے والی مقرر کر رکھیں۔

(شامی ج ۴ ص ۲۷۷ فصل فی استئمان الکافر)

مقروض اپنی خوشی سے زیادہ دے تو جائز ہے:

"عن جابر قال اقبلنا من مكة الى المدينة مع رسول الله ﷺ فاعتل جملى وساق الحديث بقصته وفيه ثم قال لى بعنى جملك هذا قال قلت لابل هولك قال لابل بعنيه قال قلت لابل هو لك يا رسول الله قال لابل بعنيه قال قلت فان لرجل على اوقية ذهب فهولك بها قال قد اخذته فتبلغ عليه الى المدينة قال فلما قدمت المدينة قال رسول الله ﷺ لبلال اعطه اوقية من ذهب وزده قال فاعطانى اوقية من ذهب وزادنى قيراطا قال فقلت لاتفارقنى زيادة رسول الله ﷺ قال فكان فى كيس لى فاخذه اهل الشام يوم الحرة" (مسلم ض ۲ باب الربوا ص ۳۷)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم مکہ شریف سے مدینہ طیبہ کی طرف رسول اللہ ﷺ کی معیت میں (آپ کے ساتھ) چلے، میرا اونٹ بیمار ہوگیا، اور آپ نے اپنا واقعہ بیان کیا۔ پھر نبی کریم ﷺ نے مجھے فرمایا یہ اونٹ مجھ پر بیچ دو، میں نے عرض کیا نہیں۔ بلکہ یہ آپ کا ہوگیا۔ آپ نے فرمایا نہیں (مفت نہیں) بلکہ مجھ پر بیچ دو، میں

نے کہانہیں بلکہ یہ آپ کا ہو گیا۔

آپ نے فرمایانہیں بلکہ مجھ پر بیچ دو،تو میں نے عرض کیا مجھ پر ایک شخص کا ایک اوقیہ سونا دینالازم ہے،اسی کے بدلے یہ اونٹ آپ کا ہوگیا۔آپ نے فرمایا ٹھیک ہے میں نے لے لیا ہے،اب تو اس پر سوار ہو کر مدینہ طیبہ پہنچ جاؤ،جب میں مدینہ طیبہ پہنچا تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اسے ایک اوقیہ سونا دے دو اور کچھ زیادہ بھی دے دو،تو حضرت بلال نے مجھے ایک اوقیہ سونا دیا اور ایک قیراط اس پر زیادہ دیا،تو میں نے کہا میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے زیادہ دیا ہوا سونا اپنے آپ سے جدا نہیں کروں گا۔وہ میری تھیلی میں تھا یوم حرہ کو شامیوں (یزیدیوں) نے مجھ سے لے لیا۔

وضاحت حدیث: ایک اورروایت میں یہ ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

"غزوت مع رسول الله ﷺ فتلا حق بی وتحتی ناضح لی قد اعیا ولا یکاد یسیر قال فقال لی مالبعیرک قال قلت علیل قال فتخلف رسول الله ﷺ فزجره ودعاله فما زال بین یدی الابل قدامها یسیر فقال لی کیف تری بعیرک قال قلت بخیر قد اصابته برکتک"

میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ملکر ایک غزوہ کیا (جہاد کیا) نبی کریم ﷺ مجھے ملے میرے نیچے میری سواری ایک اونٹ تھا جو تھکا ماندہ تھا،چل نہیں سکتا تھا۔آپ نے مجھے فرمایا تمہارے اونٹ کو کیا ہوگیا؟ میں نے عرض کیا بیمار ہے،تو رسول اللہ ﷺ اس اونٹ کے پیچھے ہوئے اس پر زجر کیا (اسے ڈانٹا) پھر آپ نے اس کیلئے دعاء کی تو وہ اونٹ سب اونٹوں سے آگے چلنے لگا۔آپ نے پوچھا تم اپنے کو کیسے دیکھتے ہو؟ میں نے عرض کیا بہتر دیکھ رہا ہوں آپ کی برکت اسے پہنچ گئی۔

نبی کریم ﷺ کی دعاء کی برکت اور اس کے اثرات حدیث پاک سے واضح ہوگیا کہ آپ کی دعاء سے لاغر اور بیمار اور سست رفتار اونٹ ٹھیک ہوگیا اور سب اونٹوں سے تیز رفتار ہوگیا۔ایک اور روایت میں ہے۔

"قال فلما قدمت المدینة اتیته به فزادنی اوقیة ثم وهب لی ﷺ"

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میں مدینہ طیبہ پہنچا تو وہ اونٹ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لایا تو آپ نے مجھے ایک اوقیہ پر زیادہ سونا (ایک قیراط) دیا۔ اور وہ اونٹ بھی مجھے ہبہ کر دیا۔

حدیث پاک سے واضح ہوا "**جواز الوکالۃ فی قضاء الدیون واداء الحقوق**" کہ قرض کی ادائیگی میں اور باقی حقوق کے اداء کرنے میں کسی کو وکیل بنانا اور یہ کام اس کے سپرد کرنا جائز ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے سپرد کیا کہ وہ قرض ادا کر دیں۔

اور فائدہ یہ حاصل ہوا "**استحباب الزیادۃ فی اداء الدین وارجاح الوزن**" کہ قرض ادا کرنے میں زیادہ دینا مستحب ہے اور اسی طرح اگر وزن والی چیز ہو تو وزن کرتے ہوئے وزن میں زیادتی کرنا مستحب ہے۔

اب مسئلہ واضح ہو گیا کہ مقروض قرض کے ادا کرتے وقت اپنی مرضی سے زیادہ مال واپس لوٹائے تو یہ جائز و مستحب ہے اسے سود نہیں کہا جائے گا، ہاں اگر زیادتی مقرر کر لی جائے خواہ قرض دینے والے کی طرف سے یا قرض لینے والے کی طرف سے تو یہ "ربوا" ہوگا۔

بینک میں کھلا اکاؤنٹ:

جس کھاتہ کا نام بنک میں مضاربت رکھا ہوا ہے اگرچہ اس میں مضاربت کی تمام شرائط تو نہیں پائی جاتیں، لیکن نفع مقرر نہیں ہوتا بلکہ ہر چھ ماہ کے بعد بنک والے اعلان کرتے ہیں کہ اتنی مقدار میں اس پر نفع لگا دیا گیا ہے۔

اس میں کھلے کھاتے کو قرض کا درجہ ہی دیا جائے کہ قرض دینے والے نے اس پر کوئی نفع مقرر نہیں کیا اور قرض لینے والے بنک نے اپنی مرضی سے اس پر نفع دے دیا۔

اس وقت ایمانداری کی علامت کہیں خال خال نظر آتی ہیں نفع ونقصان کے طور پر مضاربت کا بھی وہی حشر ہوگا جو تجارتی حصص خریدنے والوں کا ہوتا ہے جو آئے دن "مندہ حال ہے" کی خبر سنتے ہیں۔ (راقم)

یہ مسئلہ ضمناً بیان کر دیا گیا ورنہ ابھی حدیث پاک کی وضاحت جاری ہے۔

حدیث پاک میں ذکر ہے "وساق الحدیث بقصتہ" کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اپنے واقعہ کے ساتھ حدیث پاک کو بیان کیا ان کا واقعہ دوسری روایت میں ذکر ہے، کہ جب ان کا اونٹ ٹھیک ہوگیا اور تیز چلنے لگا۔

"قال فقلت لہ یا رسول اللہ انی عروس فاستاذنتہ فاذن لی فتقدمت الناس الی المدینۃ حتی انتھیت فلقینی خالی فسألنی عن البعیر فاخبرتہ بما صنعت فیہ فلامنی فیہ قال وقد کان رسو ل اللہ ﷺ قال لی حین استأذنتہ ماتزوجت ابکرا ام ثیبا فقلت لہ تزوجت ثیبا قال افلا تزوجت بکرا تلاعبھا وتلاعبک فقلت لہ یا رسول اللہ ﷺ توفی والدی اواستشھد ولی اخوات صغار فکرھت ان اتزوج الیھن مثلھن فلاتئودبھن ولا تقوم علیھن فتزوجت ثیبا لتقوم علیھن وتؤد بھن"

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے عرض کیا یارسول اللہ بیشک میری نئی نئی شادی ہوئی ہے (یہ کہہ کر) میں نے آپ سے اجازت طلب کی تو آپ نے مجھے (آگے آگے جانے کی) اجازت دے دی، میں سب لوگوں سے پہلے مدینہ طیبہ میں پہنچ گیا، تو مجھے میرے ماموں ملے تو انہوں نے اونٹ کے متعلق پوچھا تو میں نے انہیں بتایا کہ اونٹ تو میں نے بیچ دیا ہے، تو انہوں نے مجھ پر ملامت کی۔ ان کے ملامت کرنے کی وجہ یہ تھی

"ولم یکن لنا ناضح غیرہ" (اس اونٹ کے بغیر ہماری اور کوئی سواری نہیں تھی)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب میں نے رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کی تھی تو آپ نے مجھ سے پوچھا کیا شادی باکرہ عورت سے کی ہے یا ثیبہ سے؟ میں نے عرض کیا ثیبہ سے شادی کی ہے۔

آپ نے فرمایا باکرہ سے شادی کیوں نہیں کی کہ تم اس سے کھیلتے اور وہ تمہارے ساتھ کھیلتی، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرے والد شہید ہوگئے اور میری بہنیں چھوٹی ہیں، میں نے یہ ناپسند سمجھا (مناسب نہیں سمجھا) کہ میں ان جیسی ہی سے شادی کرلوں جوان کو نہ ادب سکھا سکے اور نہ ہی ان کے معاملات درست کرسکے۔ حدیث پاک سے نبی کریم ﷺ کی سخاوت اور علم بھی واضح ہوگئے کہ آپ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے حقیقی حالات سے مطلع ہوگئے کہ ان کے پاس مال

نہیں، اسی وجہ سے اونٹ خریدا، مقرر قیمت سے زائد قیمت عطاء فرمائی اور اس پر زیادتی بھی دی پھر کمال سخاوت سے اونٹ بھی واپس کر دیا۔

اعتراض: حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے واقعہ کی روایات میں یہ بھی ذکر ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے ان کو کہا کہ یہ اونٹ مجھ پر بیچ دو تو انہوں نے کہا

"فبعته علی ان لی فقار ظهره حتی ابلغ المدينة"

میں نے یہ آپ پر بیچ دیا اس شرط پر کہ مدینہ طیبہ میں پہنچنے تک مجھے اس پر سواری کا حق حاصل ہو۔

(خیال رہے "فقار" کا لغوی معنی "جوڑ اور مفاصل" یہاں "فقار ظهره" کا معنی پیٹھ کے اوپر حصہ") یہ شرط فاسد ہے، شرط فاسد سے بیع فاسد ہو جاتی ہے، تو نبی کریم ﷺ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی اس شرط فاسد کو کس طرح قبول کر لیا۔

جواب: عقد میں کوئی شرط نہیں لگائی گئی بلکہ عقد کے بعد مدینہ طیبہ تک سوار ہونے کی اجازت طلب کی گئی تو آپ نے اجازت دے دی۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ "فقار ظهره" کا معنی "لمعات" میں "عاریت" بیان کیا گیا ہے تو اب مطلب واضح ہو جائے گا کہ میں نے وہ اونٹ بیچ دیا کہ مجھے عاریۃ مدینہ طیبہ تک سوار ہونے کی اجازت عطاء فرمائیں۔

پھر زیر بحث حدیث میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے مطالبہ کا کوئی ذکر نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کے خود اجازت فرمانے کا تذکرہ ہے،

☆ **عن ابی رافع ان رسول الله ﷺ استسلف من رجل بكرا فقدمت عليه ابل من الصدقة فامر ابارافع ان يقضی الرجل بكره فرجع اليه ابو رافع فقال لم اجد فيها الاخيارا رباعيا فقال اعطه اياه ان خيار الناس احسنهم قضاء"**

(مسلم ج۲ ص۳۸ باب الربوٰ)

ابو رافع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص سے ایک اونٹ نوجوان لیا جب آپ کے پاس اونٹ آئے تو آپ نے ابو رافع کو کہا جاؤ اس شخص کو اسی کے اونٹ کے مطابق

نوجوان اونٹ دے دیں، ابورافع اونٹوں کو دیکھ کر واپس آ گئے عرض کیا یا رسول اللہ ان اونٹوں میں ''بکر'' (نوجوان) اونٹ نہیں بلکہ اس سے اعلیٰ رباعی (چار دانت نکلے ہوئے) اونٹ موجود ہیں آپ نے فرمایا وہی ادا کر دو بیشک بہتر لوگ اپنا قرض اچھی طرح ادا کرتے ہیں۔

وضاحت حدیث:

''وفیها انه یستحب لمن علیه دین من قرض وغیره ان یردا جود من الذی علیه وهذا من السنة ومکارم الاخلاق ولیس هو من قرض جر منفعة فانه منهی عنه لان المنهی عنه ماکان مشروطافی عقدالقرض''

اس حدیث پاک سے یہ ثابت ہوا کہ جس شخص نے قرض ادا کرنا ہو وہ اس سے اچھا، عمدہ واپس کرے تو یہ اس کیلئے مستحب ہے، بلکہ یہ طریقہ سنت کے مطابق ہے، اس میں یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس نے قرض سے نفع حاصل کیا ہے۔ قرض سے نفع حاصل کرنا اس وقت منع ہے جب زیادہ لینے کی شرط لگادی جائے اگر قرض دینے والا خوشی سے اپنے اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے قرض زیادہ یا عمدہ ادا کر دے تو یہ جائز ہے۔

اعتراض: نبی کریم ﷺ صدقہ کا مال نہیں لیتے تھے تو آپ نے کس طرح ارشاد فرمایا کہ صدقہ کے اونٹوں سے اس شخص کو اس کے اونٹ کے مطابق دے دو، جبکہ آپ نے قرض اپنی ذات کیلئے لیا ہوا تھا۔

جواب: ''انه رسول الله ﷺ اقترض لنفسه فلماجاء ت ابل الصدقة اشتری منها بعیرا رباعیا ممن استحقه فملکه النبی ﷺ بثمنه واوفاه متبرعا بالزیادة من ماله''

ہاں یہ حقیقت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے وہ قرض اپنی ذات کیلئے لیا تھا، جب صدقہ کے اونٹ آئے تو آپ نے صدقہ کے مستحق شخص سے رباعی اونٹ خرید لیا تھا، قیمت کی ادائیگی سے آپ اس کے مالک بن گئے آپ نے اپنے مال سے قرض دینے والے کو زیادہ دیا۔

براہ راست آپ نے صدقہ کا مال نہیں لیا، بلکہ خریدا، صدقہ کا مال آپ کیلئے خریدنا جائز تھا، اور اگر آپ کو کوئی مستحق شخص صدقہ لے کر بطور ہبہ دیتا تو وہ بھی آپ کیلئے جائز تھا۔

"ویدل علیہ ماذکرنا روایۃ ابی ھریرۃ التی قد مناھا ان النبیﷺ اشتروا لہ سنا"

ہمارے اس جواب کی تائید میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت صراحۃ دلالت کر رہی ہے کہ صحابہ کرام نے آپ کیلئے وہ اونٹ خریدا تھا۔ (نووی)

اعتراض: حیوان کو قرض لینے اور حیوان کی بیع سلم سے نبی کریمﷺ نے منع فرمایا اور آپ نے خود حیوان بطور قرض کیسے لیا؟

جواب نمبر ۱: جیسا کہ علامہ نووی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ آپ نے قرض اپنے لئے لیا تھا، اگر یہی صورت تھی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حکم پہلے کا ہے اور ممانعت والا حکم بعد کا ہے۔ (راقم)

جواب نمبر ۲: "فالمراد بہ انہ علیہ السلام استعجل فی الصدقۃ ثم لم تجب الزکوۃ علی صاحبھا فردھا رباعیا"

اس سے یہ مراد بھی ہوسکتی ہے کہ آپ نے ایک شخص سے صدقہ (زکوۃ) پہلے ہی لے لیا تھا، (مستحقین کی ضرورت کیلئے صدقہ لے لیا تھا) لیکن اس پر زکوۃ فرض نہیں ہوئی تھی تو رباعی اونٹ اسے واپس دیا۔ (زیلعی)

جواب نمبر ۳: "او استقرض لبیت المال لانہ یجوز أن یثبت حق مجھول علی بیت المال کما یجب لہ حق مجھول"

اور ایک احتمال یہ ہے کہ آپ نے بیت المال کیلئے قرض لیا ہو تو بیت المال کیلئے مجہول حق کا ثابت کرنا جائز ہے جیسا کہ اس شخص کا مجہول حق ثابت کیا گیا۔ یعنی حیوان میں تعین نہیں ہوسکتا لیکن بیت المال کی ضرورت کیلئے حیوان بطور قرض لیا جاسکتا ہے اور اس سے اعلیٰ واپس دیا جاسکتا ہے۔ (زیلعی)

بیع کی تعریف:

"مبادلة المال بالمال بالتراضی" مال کا تبادلہ مال سے جب دونوں طرف سے رضاء مندی پائی جائے غصب میں رضاء مندی نہیں لھذا وہ بیع نہیں۔اگر ایک چیز شرعاً مال ہی نہیں تو اس کی بیع جائز نہیں جیسا کہ خنزیر، شراب کی بیع مسلمان کیلئے جائز نہیں کیونکہ شریعت میں مسلمان کیلئے یہ مال نہیں۔

رضاء مندی کیلئے عقل وتمیز بھی ضروری ہے۔اس لئے پاگل کی بیع جائز نہیں، بہت چھوٹے کی بیع جائز نہیں ہاں جب سات سال کا ہو جائے تو وہ اگر بیع کرے اور ولی اجازت دے دے تو جائز ہے اور ولی اجازت نہ دے تو وہ بیع ٹوٹ جائے گی۔مال کا مال سے تبادلہ اسی وقت ہو سکے گا جب ایجاب وقبول پایا جائے۔

پہلا کلام جس کا ہو وہ ایجاب ہے اور دوسرا قبول ہے، جب کوئی یہ کہے یہ چیز میں نے بیچ دی اور دوسرا کہے میں نے خریدی، یا کوئی یہ کہے یہ چیز میں خرید لی اور دوسرا کہے اچھا میں نے یہ چیز بیچ دی۔ان میں سے پہلا کلام ایجاب ہے اور دوسرا قبول ہے۔اگر دلالت سے ایجاب وقبول پایا جائے تو پھر بھی بیع جائز ہوگی، جیسا کہ بیچنے والے نے چیزوں کی قیمتیں مقرر کر رکھی ہیں اور خریدنے والے نے پیسے رکھ دیئے اور چیز اٹھا کر لے آیا یہ بیع جائز ہے، اسے فقہی اصطلاح میں "بیع التعاطی" کہا جاتا ہے۔

فضولی کی بیع:

جس شخص کو بیچنے کا نہ ہی وکیل بنایا گیا اور نہ ہی وہ مالک ہے اور نہ وہ خود خریدار ہے یعنی اجنبی شخص کسی کی چیز بیچ دے اس سے اجازت نہیں لی تو مالک نے اگر اجازت دے دی تو بیع جائز ہے اگر اجازت نہیں دی تو بیع ٹوٹ جائے گی۔یہی حکم ہے کہ اجنبی نے کسی کیلئے کوئی چیز خرید لی تو اس شخص نے کہا ٹھیک ہے مجھے منظور ہے تو بیع ہوگئی اور اگر اس نے کہا مجھے منظور نہیں تو بیع ٹوٹ گئی۔

ایک صحابی کی بیع پر نبی کریم ﷺ کی دعاء:

"عن عروة البارقی ان النبی ﷺ دفع دینارا الیه یشتری به شاة فاشتری شاتین وباع

احدھما بدینار وجاء بشاۃ ودینار فقال بارک اللہ لک فی صفقۃ یمینک فکان لو اشتری ترابا ربح فیہ" (رواہ ابو دؤاد والترمذی وابن ماجۃ والدارقطنی)

حضرت عروہ بارقی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے ایک دینار ان کو دیا کہ اس سے ایک بکری خرید کر لاؤ، تو انہوں نے ایک دینار سے دو بکریاں خرید لیں، پھر ایک بکری ایک دینار سے بیچ دی، نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک بکری اور دینار پیش کیا (آپ نے ماجرا سن کر) فرمایا اللہ تعالیٰ تمہارے دائیں ہاتھ کے سودے میں برکت عطاء فرمائے، اس کے بعد اگر انہوں نے مٹی بھی خریدی تو اس میں بھی ان کو نفع ہوا۔

حضرت عروہ دوسری بکری خریدنے میں اور دو میں سے ایک کو بیچنے میں فضولی کی حیثیت میں تھے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے جب اس کے سودے کو قبول فرمالیا، بلکہ اسے پسند فرماتے ہوئے ان کیلئے دعاء برکت کی تو بیع جائز ہوگئی نبی کریم ﷺ کی دعا کا کیا خوب اثر تھا کہ کسی خوش قسمت کے کے لئے دعاء فرمادی تو زندگی بھر اسے نفع حاصل ہوتا رہا، جیسا کہ حضرت عروہ بارقی کو ہر سودے میں نفع ہوتا رہا۔

مال کی دو قسمیں:

جب یہ واضح ہوگیا کہ بیع میں مال کا تبادلہ مال سے ہوتا ہے تو اس لحاظ پر مال کی دو قسمیں ہوگئیں۔

(۱) ایک قسم وہ جو مقصود بذاتہ ہو، یعنی اس سے اس کی صورت اور مالیت دونوں ہی مقصود ہوں اسے "عین" کہا جاتا ہے

(۲) دوسری قسم وہ ہے جو مقصود بذاتہ نہ ہو بلکہ پیدائشی طور پر غیر کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہو، وہ ہیں نقدین یعنی سونا اور چاندی۔

مال کے لحاظ پر بیع کی چار قسمیں ہیں:

(۱) عین چیز کی بیع نقد سے، عام طور پر جب بھی مطلقاً بیع کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مراد یہی بیع ہوتی ہے۔ اس میں عین چیز مبیع ہوگی (جسے بیچا جارہا ہو اسے مبیع کہا جاتا ہے) اور نقد ثمن ہوں گے۔

مبیع کا موجود اور معین ہونا ضروری ہے، کیونکہ مبیع عین چیز ہے جو صورت اور مالیت کے لحاظ پر مقصود لذاتہ ہے، اس پر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث دلالت کرتی ہے۔

"عن ابن عمر ان النبی نھی عن بیع الکالی بالکالی" (روہ الدارقطنی)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے ادھار کی بیع ادھار سے کرنے سے منع فرمایا، یعنی غیر موجود چیز کی بیع سے منع فرمایا۔

چونکہ ثمن کا موجود ہونا اور معین ہونا ضروری نہیں بلکہ خریدار کے ذمہ ثمن کا ہونا ضروری ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ثمن کی صورت مقصود نہیں ہوتی ہے کیونکہ ثمن غیر مقصود لذاتہ ہے۔

اگر چہ قیاس یہ تھا کہ ثمن کے موجود ہونے کو بھی لازم کیا جاتا کیونکہ معدوم چیز مال نہیں ہوتی، لیکن شریعت نے لوگوں سے حرج کو دور کرتے ہوئے اس شرط کو اٹھا دیا ہے۔ البتہ خریدار کے ذمہ ثمن کو واجب کر دیا گیا ہے، چونکہ عام لوگ ادھار پر کسی چیز کو خریدنے پر مجبور ہوتے ہیں اس لئے ثمن کے موجود ہونے کی شرط کو اٹھانا ضروری کر دیا گیا، سبحان اللہ شریعت نے کتنی آسانیاں پیدا کر دی ہیں، البتہ ثمن کی جنس اور قدر اور صفت کا معلوم ہونا ضروری ہے، درہم یا دینار کو مقرر کرنا، اتنی مالیت اور اتنے وزن کے دراہم یا دنانیر ہوں گے پھر وہ جن کو بیت المال بھی قبول کرے گا، یا صرف تاجر حضرات قبول کریں گے بیت المال قبول نہیں کرے گا۔

پھر اگر کوئی چیز ادھار پر خریدی ہو تو ضروری ہے کہ وقت مقرر کرے کہ فلاں وقت میں رقم ادا کروں گا تا کہ بعد میں کسی قسم کا جھگڑا واقع نہ ہو۔

☆ "عن عائشة رضی اللہ عنھما قالت اشتری رسول اللہ ﷺ من یھودی طعاما الی اجل و رھنہ درعالہ من حدید" (بخاری و مسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے یہودی سے طعام خریدا اسے وقت مقرر پر پیسے ادا کرنے کا وعدہ فرمایا اور اس کے پاس اپنی لوہے کی زرہ بطور رہن رکھی۔

☆ "وعن عائشة قالت توفی رسول اللہ ﷺ و درعہ مرھونة عند یھودی

بثلاثين صاعامن شعير" (رواه البخاری)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ کا جب وصال ہوا تو آپ کی زرہ یہودی کے پاس تیس صاع جو کے بدلے رہن رکھی ہوئی تھی۔

اسی طرح مسند احمد اور ترمذی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی روایت ذکر کی گئی ہے، اور ترمذی نے حدیث کو صحیح کہا ہے۔

"وانعقد الاجماع على اشتراط تعيين المبيع دون الثمن و كون الثمن معروفا"

اجماع منعقد ہے اس پر کہ مبیع کا میں ہونا ضروری ہے اور ثمن کا معین ہونا تو ضروری نہیں البتہ اس کی جنس اور مقدار اور صفات کا معلوم ہونا ضروری ہے۔

(۲) بیع کی دوسری قسم یہ ہے کہ مال کی بیع مال سے کی جائے اس کو فقہی اصطلاح میں ''مقایضہ'' کہا جاتا ہے جب دونوں بدل ذوات القیم سے ہوں تو ہر ایک کو مبیع کا درجہ حاصل ہوگا اس لئے دونوں کا موجود ہونا اور معین ہونا ضروری ہے۔

جب ایک بدل ذاوت امثال سے ہو اور دوسرا ذوات قیم سے ہو تو جو ذوات قسیم سے ہے وہ مبیع ہوگا اس کا موجود ہونا اور معین ہونا ضروری ہے۔ اور جو ذوات امثال سے ہوگا وہ ثمن ہوگا اس کا موجود ہونا اور معین ہونا ضروری نہ ہوگا البتہ جنس اور مقدار اور وصف کا مشہور ہونا ضروری گا۔ اور جب دونوں ہی ذوات امثال سے ہوں تو ایک کو مبیع اگر معین کرلیا تو اس کا موجود ہونا ضروری ہوگا۔ اور اگر کسی ایک کو مبیع معین نہیں کیا تو دونوں کو مبیع کا درجہ دیا جائے گا اور ہر ایک کا موجود ہونا ضروری ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی اس کی تائید کررہا ہے'

'قال رسول الله ﷺ اذا اختلف الجنسان فبيعوا كيف شئتم اذا كان يدا بيد"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب دو جنسیں مختلف ہوں تو جس طرح تم چاہو بیچو جبکہ (سودا) ہاتھ بہاتھ ہو۔

خیال رہے:

ذوات امثال ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جو مکیلی ہوں یا موزونی ہوں مکیلی جیسے گندم، جو وغیرہ اور موزونی جیسے سونا اور چاندی اور لوہا وغیرہ

(۳) تیسری قسم وہ بیع ہے کہ نقد کی بیع نقد سے ہو جسے سونے کی سے، یا چاندی کی بیع چاندی سے، یا سونے اور چاندی کی بیع ایک دوسرے سے۔ اس بیع کو فقہی اصطلاح میں ''بیع صرف'' کہا جاتا ہے۔ اس بیع میں دونوں جہاں ثمن ہیں وہاں مبیع بھی ہیں، لھذا ہر ایک کا مجلس میں موجود ہونا اور معین ہونا ضروری ہے، بلکہ دونوں بدل کا مجلس میں قبضہ ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نقد کا تعین قبضہ کرنے سے ہوتا ہے کیونکہ قبضہ کرنے کے بعد اسے تبدیل کرنا جائز نہیں ہوتا، جو صرف معین کرنے سے ''کہ یہ درہم یا یہ دینار تمہارے ہیں''، معین نہیں ہوتا کیونکہ معین کرنے کے باوجود قبضہ سے پہلے درہم یا دینار کو تبدیل کرنا جائز ہوتا ہے۔

(۴) چوتھی قسم بیع کی یہ ہے ثمن پہلے دے دیئے جائیں اور مبیع بعد میں لیا جائے، اسے فقہی اصطلاح میں بیع سلم کہا جاتا ہے، قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ یہ بیع جائز نہ ہو لیکن شریعت نے مساکین کی حاجت کو دور کرنے کیلئے اسے جائز قرار دیا ہے۔ بیع سلم کی مکمل تعریف اور شرائط انشاء اللہ آنے والے رکوع میں آئیں گی۔ (ماخوذ از مظہری)

ربوا سے بچنے کا طریقہ:

"عن ابی ہریرۃ وابی الخدری قالا قال رسول اللہ ﷺ بعث اخابنی عدی الانصاری استعملہ علی خیبر فقدم بتمر جنیف فقال لہ رسول اللہ ﷺ اکل تمر خیبر ھکذا قال لا واللہ یارسول اللہ انا نشتری الصاع بالصاعین من الجمع فقال رسول اللہ ﷺ لاتفعلوا ولکن مثلا بمثل او بیعوا ھذا واشتروا بثمنہ من و کذا المیزان"

(مسلم ج ۲ ص ۳۴ باب الربوا)

حضرت ابو ہریرہ وابو سعید خدری رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے بنو عدی انصاری کے بھائی کو خیبر میں عامل بنا کر بھیجا تو وہ اعلیٰ قسم کی کھجوریں لائے تو رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کیا خیبر کی

ساری کھجوریں ایسی ہی ہیں؟ انہوں نے عرض کیا ''نہیں'' قسم ہے اللہ کی یارسول اللہ۔ بیشک ہم ایک صاع دو صاع گھٹیا کھجوروں کے بدلے خریدتے ہیں، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایسا نہ کرو، برابر بیچو یا اسے بیچ دو اور اس کے ثمن کے بدلے دوسری خرید لو، وزن وہی ہو جائے گا۔

''الجنیب جبیم مفتوحة ثم مشناة تحت ثم موحدة وھو نوع من التمر من اعلاہ''

''جنیب'' کے لفظ میں جیم مفتوح اور نون مکسور اور اس کے بعد یاء اور اس کے بعد یاء ہے جس کا معنی ہے ''اعلی، عمدہ کھجور''

''والجمع بفتح الجیم واسکان المیم وھو تمر ادی''

لفظ ''الجمع'' میں جیم مفتوح اور نون ساکن ہے جس کا معنی ہے ردی کھجوریں۔

''وقد فسرہ فی المروایة الاخیرة بأنه الخلط من التمر ومعناہ مجموع من انواع مختلفة''

ان روایات میں سے بعد میں آنے والی روایت ''الجمع'' کا معنی کیا گیا ہے مختلف کھجوروں کا مل جل جانا۔ وہ روایت یہ ہے:

''عن ابی سعید قال کنا نرزق تمر الجمع علی عھد رسول اللہ ﷺ وھو الخلط من التمر فکنا نبیع صاعین بصاع فبلغ ذلک رسول اللہ ﷺ فقال لا صاعی تمر بصاع ولا صاعی حنطة بصاع ولا درھم بدرھمین''

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں '' الجمع' (گھٹیا، ردی) کھجوریں حاصل ہوتیں، یہ وہ کھجوریں ہوتیں جو مختلف ملی جلی ہوتیں، ہم یہ گھٹیا کھجوریں دو صاع دے کر ایک صاع عمدہ کھجوریں حاصل کر لیتے تھے، جب یہ خبر نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچی تو آپ نے فرمایا دو صاع کھجور کا سودا ایک صاع کھجور سے اور دو صاع گندم کا سودا ایک صاع گندم اور دو درہم کا سودا ایک درہم سے نہ کیا کرو۔

یعنی اس حدیث میں راوی نے ملی جلی کھجوروں کو ''الجمع'' کہا ہے۔ مطلب واضح ہے کہ خالص گھٹیا کھجوریں ہوں یا ملی جلی ہوں، دونوں پر ہی ''الجمع'' کا اطلاق ہوتا ہے۔ عنوان کے مطابق نتیجہ واضح ہوا کہ ایک جنس کی چیز ایک گھٹیا ہو اور دوسری عمدہ ہو، تو جنس کا جنس سے سودا کرنا ہو تو برابر برابر بیچنا اور خریدنا ہوگا۔ زیادتی ربوا ہوگی جو شرعاً حرام

ہے۔ہاں اس سود سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ گھٹیا چیز قیمت سے بیچ دے اور اعلیٰ چیز اسی رقم سے خرید لے تو یہ جائز ہے۔ جب گھٹیا چیز بیچے گا تو وہ چیز زیادہ جائے گی کیونکہ اس کی قیمت زیادہ ہے۔لھذا تناسب تقریبا ایک دو کا ہی حاصل رہے گا جبکہ قیمتوں میں اتنا ہی فرق ہو، ورنہ کمی وبیشی بھی ہو سکے گی۔ (ماخوذ از نووی)

ہر وہ بیع جس میں ربوا کا شبہ ہو وہ ناجائز ہوگی:

اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے چند قسم کی بیع سے منع فرمایا۔

☆ عن جابر قال نهى رسول الله ﷺ عن المحاقلة والمزابنة والمخابرة والمعاومة وعن الثنيا ورخص في العرايا" (رواه مسلم ومشكوة باب المنهى عنهامن البيوع)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع محاقلہ اور مزابنہ اور مخابرہ اور معاومہ اور استثنا سے منع فرمایا ہے اور عرایا میں رخصت دی

بیع محاقلہ کیا ہے؟

"والمحاقلة ان يبيع الرجل الزرع بمائة فرق حنطة "

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے محاقلہ کی تعریف یہ بیان فرمائی ہے کہ کوئی شخص کھیتی کو مثال کے طور پر ایک سو فرق گندم کے بدلے بیچے۔

یعنی گندم کی کھیتی کو معین مقدار گندم سے بیچنا، جو کی کھیتی کو معین مقدار سے بیچنا، اسی طرح ہر قسم کی کھیتی کو اسی جنس کی معین مقدار سے بیچنا محاقلہ ہے۔اس سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔منع کرنے کی وجہ واضح نظر آرہی ہے کہ ایک جنس کا سودا اسی جنس سے ہو رہا ہے ایک طرف معین مقدار ہے اور دوسری طرف معین نہیں، اس میں ربوا کا احتمال ہے۔

بیع مزابنۃ : "والمزابنة ان يبيع الرجل التمر في رؤس النخل بمائة فرق "

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کھجور کے درخت پر پھل کو ایک سو فرق کے بدلے

بیچنا۔یعنی کسی درخت پر پھل کو اسی جنس معین میں پھل سے بیچنا مزابنۃ ہے جس سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

بیع مخابرۃ :

"والمخابرۃ کراء الارض بالثلث والربع" (رواہ مسلم، مشکوۃ حوالہ مذکور)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مخابرہ یہ ہے کہ زمین تہائی یا چوتھائی کے بدلے کرائے پر دی جائے اسی سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

اگر تہائی یا چوتھائی سے مراد زمین کا تہائی یا چوتھائی حصہ معین ہو تو اب بھی وہ منع ہے جیسے کوئی کہے یہ زمین تم نے کاشت کرنی ہے لیکن زمین کا فلاں تہائی حصہ یا چوتھائی حصہ میرا ہے، اس کی پیداوار میری ہوگی یہ منع ہے، ہوسکتا ہے وہ ہی حصہ اعلی اور زرخیز ہو، دوسرا حصہ ناقص ہو، کاشت کرنے والے کو کچھ حصہ بھی نہ ملے یا بہت ہی کم ملے تو اس لئے مخابرہ سے منع کیا گیا ہے۔ اور اگر تہائی یا چوتھائی حصہ پیدوار ہو جیسے آجکل مزارعت لوگ کر رہے ہیں تو یہ امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک جائز ہے اور امام صاحب رحمہ اللہ نے اس سے منع فرمایا۔

"وصحت عند صاحبیه وبه یفتی لا حتیاج الناس الیها" صاحبین کے قول پر ہی فتوی ہے کیونکہ لوگ اس بیع کے محتاج ہیں۔

بیع معاومہ :

"وھی مفاعلة من العام کا لمسانھة من السنة والمشاھرة من الشھر فی النھایة ھی بیع ثمر النخل او الشجر سنتین اوثلاثا فصاعدا قبل ان تظھر ثمارہ وھذاالبیع باطل لأنه بیع مالم یخلق فھو کبیع الو لد قبل ا ن یخلق"

معاومہ اور مسانھہ کا اطلاق سال کیلئے جیسا کہ مشاہرہ کا اطلاق مہینہ کیلئے ہوتا ہے، یعنی بیع معاومہ یہ ہے کہ کھجور یا کسی اور درخت کے پھل ظاہر ہونے سے پہلے ایک یا دو یا تین سال کیلئے بیع کر دی جائے یہ بیع اسی وجہ سے باطل ہے کہ پیدوار سے پہلے بیع کی جارہی ہے جو منع ہے۔ جس طرح کسی جانور کے بچے کی بیع اس کے پیدا ہونے سے پہلے منع ہے۔

الثنیا:"قال محی السنة الثنیا ان یبیع ثمر حائط ویستثنی منه جزأغیر معلوم القدر فیفسد لجهالة المبیع "

محی السنۃ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ''الثنیا'' کا مطلب یہ ہے کہ باغ کا پھل بیچے اور غیر معلوم حصہ علیحدہ کرلے کہ اس میں سے کچھ حصہ میرا ہے تو یہ منع ہے کیونکہ مبیع کی مقدار معلوم نہیں۔

ہاں اگر یہ کہا جائے کہ اس کا دسواں حصہ، چوتھا حصہ وغیرہ میرا ہے تو یہ جائز ہے، کیونکہ مبیع معلوم ہے۔

یہ بھی خیال رہے کہ باغ کا پھل بیچ کر معین مقدار میں مستثنیٰ بھی نہیں کرسکتا کہ یہ کہے کہ اس باغ کے پھل میں دس من یا بیس من پھل میرا ہے۔ یہ اس لئے ناجائز ہے کہ ہوسکتا ہے پھل ہی اتنا لگے جو اس نے اپنے لئے حکما علیحدہ کرلیا ہے۔

عرایا : یہ جائز ہے حقیقت میں عرایا بیع ہی نہیں بلکہ ایک شخص کسی دوسرے کو اپنے باغ سے کچھ درخت پھل حاصل کرنے کیلئے دیتا ہے کہ ان درختوں کا پھل تم توڑ کر خود استعمال کرلینا۔ پھر اس شخص کے باغ میں اپنے اہل وعیال کی وجہ سے آنے کو باعث تکلیف سمجھ کر اندازہ لگا کر کہ درختوں پر اتنا پھل ہوگا وہ اس شخص کو اتنی معین، مقدار میں پھل دے دیتا ہے۔ پہلے درختوں کا پھل بھی عطیہ ہی تھا، ان کی مقدار توڑا ہوا پھل بھی عطیہ ہی ہے، ظاہر کو دیکھ کر بیع کہہ دیا گیا ہے۔

جس بیع میں دھوکا پایا جائے وہ ناجائز ہے:

"عن ابی هریرة قال رسول الله ﷺ عن بیع الوصاة وعن بیع الغرر "

(مسلم ج ۲ ص ۱۰ کتاب البیوع)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے کنکری پھینکنے اور دھوکے کی بیع سے منع فرمایا۔

زمانہ جاہلیت میں کنکری پھینکنے کی بیع کے تین طریقے تھے:

(۱) "احدهاان یقول بعتک من هذه الاثواب ماوقعت علیه الحصاة التی ارمیها

او بعتک من هذه الارض من هنا الی ما انتهت هذه الحصاۃ "
ایک ان میں سے یہ تھا کہ بیچنے والا یہ کہتا کہ ان کپڑوں میں تم پر ایک کپڑا بیچ رہا ہوں۔ میں کنکری پھینکتا ہوں جس پر میری کنکری لگی وہ کپڑا تمہارا ہوگا یا یہ کہتا کہ میں کنکری پھینک رہا ہوں یہاں سے، جہاں میری کنکری پہنچے گی تو یہاں سے وہاں تک زمین تمہاری ہوگی۔

(۲) " والثانی بعتک علی انک بالخیار الی ان ارمی بھذه الحصاۃ "
ان میں سے دوسری قسم یہ ہے کہ بیچنے والا کہتا کہ بیشک میں تم پر یہ چیز بیچ رہا ہوں اور تمہیں واپس کرنے کا اختیار بھی دے رہا ہوں لیکن یہ اختیار تمہیں اس وقت تک حاصل ہوگا، جس وقت تک میں کنکری نہ پھینکوں، جب میں کنکری پھینک دوں تمہارا اختیار ختم ہو جائے گا۔

(۳) "والثالث ان یجعلا نفس الرمی بالحصاۃ فیقول اذا رمیت ھذا الثوب بالحصاۃ فھو مبیع منک ھکذا"
ان میں سے تیسری قسم یہ تھی کہ وہ دونوں کنکری پھینکنے کو بیع سمجھتے۔ بیچنے والا کہتا جب میں کنکری کے ساتھ یہ کپڑا تمہاری طرف پھینکوں تو یہ تمہارا ہو جائے گا، ان تمام بیوع میں دھوکا پایا جاتا ہے اور احکام شرع سے عدولی پائی جاتی ہے۔ اور نبی کریم ﷺ نے پر اس بیع سے منع فرمایا جس میں دھوکا پایا جائے۔ یہ درحقیقت ایک بہت بڑا ضابطہ ہے جس کے مطابق بہت سی بیوع ناجائز ہو جائیں گی۔ جیسا کہ معدوم کی بیع ناجائز ہے یعنی جو چیز موجود ہی نہیں اس کی بیع ناجائز ہے۔ مجہول چیز کی بیع منع ہے کہ جس چیز کی بیع کرنے ہے اس کی جنس وصفات وغیرہ معلوم ہونا ضروری ہے۔
جانوروں کے تھنوں میں ہی دودھ کی بیع منع ہے، کیوں کہ تھن میں دودھ کتنا ہے معلوم نہیں ہوسکتا۔ کسی جانور کے حمل کی بیع اس کے پیٹ میں ناجائز ہے، اسلئے کہ یہ معلوم نہیں کہ حمل ہے یا نہیں، پھر وہ مذکر ہے یا مؤنث، پھر اس نے زندہ پیدا ہونا ہے یا مردہ۔ مچھلی کی بیع پانی میں ناجائز یہ، اسلئے کہ جب تک مچھلی پانی ہے اس کا کوئی مالک نہیں، ہاں البتہ کسی نے اپنے حوض میں مچھلیاں پال رکھی ہیں تو ان کی بیع جائز ہے۔ اس طرح کی کئی مثالیں فقہی کتب میں دی گئی

ہیں جن میں بیع کو دھوکے کی وجہ سے ناجائز کیا گیا ہے۔ (ماخوذ از نووی)

☆ ''عن ابی ہریرة انه قال نهی عن بیعتین الملامسة والمنابذة اما الملامسة فان یلمس کل واحد منهما ثوب صاحبه بغیر تأمل والمنابذة ان ینبذ کل واحد منهما ثوبه الی الأخر ولم ینظر واحد منهما الی ثوب صاحبه''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں دو قسم کی بیع سے منع کیا گیا ایک ''بیع ملامسہ'' سے اور دوسری ''بیع منابذہ'' سے۔ ملامسہ بیع یہ تھی کہ ہر ایک دوسرے کے کپڑے کو بغیر کسی سوچ کے چھوتا تو وہ بیع ہو جاتی اور بیع منابذہ یہ تھی کہ ہر ایک اپنا کپڑا دوسرے کی طرف پھینک دیتا اور کوئی ایک اپنے صاحب کے کپڑے کو دیکھتا نہیں تھا اسی کو بیع سمجھ لیا جاتا تھا۔ غرضیکہ کہ ملامسہ کی ایک صورت یہ تھی کہ صرف کپڑے کو چھو لینے سے بیع ہو جاتی، یعنی جس کپڑے کو ہاتھ لگ گیا وہی مبیع بن گیا اور دوسری صورت یہ تھی کہ کپڑا لپیٹ کر دوسرے کی طرف پھینکا جاتا تھا جب اس کا ہاتھ لگ جاتا تو یہ بیع ہو جاتی پھر اسے کوئی اختیار نہیں رہتا تھا۔

منابذہ کی بھی دو ہی صورتیں تھیں:

''احدها ان یجعلانفس النبذ بیعا وهوتاویل الشافعی رحمه الله''

ان میں سے ایک صورت یہ تھی کہ کوئی چیز دوسرے کی طرف پھینک دی جاتی تھی کہ یہ میں تم پر بیچ رہا ہوں، صرف چیز کو پھینکنا ہی بیع بن جاتا تھا۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے منابذہ کی یہی تعریف فرمائی، ہمارے احناف کے نزدیک بھی یہ صورت منع ہے۔

''والثانی ان یقول بعتک فاذانبذته الیک انقطع الخیار ولزم البیع''

اور دوسری قسم یہ تھی کہ وہ شخص کہتا یہ چیز میں تم پر بیچ رہا ہوں، جب میں تمہاری طرف پھینک دوں گا تو تمہارا اختیار ختم ہو جائے گا، بیع لازم ہو جائے گی۔ (از نووی)

پہلی اور دوسری صورت میں فرق صرف اتنا ہے کہ پہلی صورت میں اختیار کے ختم ہونے کا ذکر نہیں کیا گیا اور دوسری صورت میں اختیار کے ختم ہونے کا ذکر ہے۔

مسلمان بھائی کی بیع پر بیع کرنا حرام ہے:

"عن ابن عمر ان رسول الله ﷺ قال لا يبيع بعضكم على بيع بعض "(مسلم ج۲ص۱۱کتاب البیوع)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بعض تمہارا بعض کی بیع پر بیع نہ کرے۔

بھائی کی بیع پر بیع کرنے کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص نے کوئی چیز خریدی، خریدار نے تین دنوں کا اختیار رکھ لیا ہے تو دوسرا شخص آکر اسے یہ کہے:

"وانا ابيعك مثله بأرخص من ثمنه أو اجود منه بثمنه ونحو ذلك وهذا حرام"

میں تمہیں ایسی ہی چیز اس قیمت سے سستی دوں گا یا یہ کہے تمہیں اسی قیمت ہر عمدہ چیز دوں گا، تم اس سے بیع کو توڑ دو مجھ سے خریدلو، یہ حرام ہے۔

"ويحرم ايضا الشرى على شرى أخيه" اسی طرح مسلمان بھائی کی خریداری پر خریداری حرام ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ بیچنے والے نے تین دنوں کا اختیار رکھا تو اسے دوسرا شخص آکر کہے تم اس شخص سے یہ چیز واپس لے لو میں تم سے مہنگی خریدلوں گا۔ (نووی)

☆ "عن ابى هريرة ان رسول الله ﷺ قال لايسم المسلم على سوم السلم"

(مسلم ج ۲ ص ۱۱ کتاب البیوع)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کے بھاؤ پر بھاؤ نہ کرے (یعنی سودا نہ کرے)۔

"وهذا حرام بعد استقرار الثمن واما السوم فى السلعة التى تباع فيمن يزيد فليس بحرام"

سودے پر سودا اس وقت حرام ہوگا جب ان دونوں کے درمیان قیمت طے ہوگئی، اگر اس نے قیمت کو بڑھانے کے لیے بیچنے والی چیز کی بول لگادی کہ جو زیادہ قیمت دے گا تو اسے میں یہ چیز

دوں گا تو اس صورت میں ایک شخص کی قیمت لگانے پر دوسرا قیمت زیادہ لگادے تو یہ جائز ہے۔

(نووی)

﴿لَایَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا﴾ کی وضاحت میں حدیث شریف دیکھیں جس میں نبی کریم ﷺ کی بیع کا ذکر موجود ہے۔

کسی چیز کو بیچنے کیلئے دودوھ نہ دوہنا ناجائز ہے۔

"عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ ﷺ نھی عن التصریۃ" (مسلم ج۲ص ۱ ابحذف)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے بیچنے کی غرض سے دودھ نہ دوہنے سے منع فرمایا ہے۔

"التصریۃ ان یربط اخلاف الناقۃ او الشاۃ ویترک حلبھا الیو مین و الثلاثۃ حتی یجتمع لبنھا فیزید مشتر یھا فی ثمنھا بسبب ذلک لظنہ انہ عادۃ لھا"

"تصریۃ" کا مطلب یہ ہے کہ اونٹنی، بکری وغیرہ کا دودھ دو یا تین دن نہ دوہنا تاکہ دودھ تھنوں میں جمع ہوجائے اور خریدار کو زیادہ نظر آئے اور وہ قیمت زیادہ دے دے، یہ زمانہ جاہلیت کی عادت تھی جس سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا۔ (افسوس کہ یہ آج جوں کی توں جاری ہے)

"اعلم ان التصریۃ حرام سواء تصریۃ الناقۃ والبقرۃ والشاۃ والجاریۃ والفرس والاتان وغیرھا لانہ غش وخداع"

اس طرح دودھ نہ دوہنا حرام ہے کیونکہ اس میں خریدار کو دھوکا دیا جاتا ہے، یہ حکم عام ہے خواہ اونٹنی ہو یا گائے یا بکری، بھیڑ یا لونڈی یا گھوڑی ہو یا گدھی ہو، اس لئے کہ بعض جانوروں میں دودھ کے زیادہ ہونے کو اس لئے پسند کیا جاتا ہے کہ زیادہ دودھ حاصل ہوگا جس سے زیادہ گھی حاصل ہوگا اور بعض میں دودھ کی زیادتی اس لئے پسند کی جاتی ہے کہ اس کے بچے موٹے تازے ہوں گے۔

"وان التدلیس بالفعل حرام کا لتدلیس بالقول" کسی کام میں بناوٹ، ملاوٹ اور دھوکا بازی اسی طرح حرام ہے جس طرح بات میں جھوٹ کی آمیزش حرام ہے۔ (از نووی)

دلالی حرام ہے:

"عن ابن عمر ان رسول الله ﷺ نهى عن النجش" (مسلم ج۲ ص ۱ : کتاب البیوع)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے دلالی سے منع فرمایا۔

"واما النجش فبنون مفتوحة ثم جيم ساكنة ثم شين معجمة وهوان يزيد في ثمن السلعة لالرغبة فيها بل ليخدع غيره ولغيره ليزيد ويشتر يها وهذا حرام بالاجماع"

"نجش" کا مطلب ہے کہ ایک شخص صرف قیمت کو بڑھائے، وہ چیز لینا اسی کا مقصود نہیں، وہ خریدار کو دھوکا دینا چاہتا ہے اور بیچنے والے کو نفع پہنچانا چاہتا ہے۔

"وقال ابن قتيبة اصل النجش الختل وهوا الخداع ومنه قيل للصائد نا جش لأنه يختتل الصيد ويحتال له"

ابن قتیبہ کہتے ہیں اصل میں "نجش" کا معنی ہی دھوکا دینا ہے، "نجش" کا مترادف لفظ "ختل" ہے، اسی وجہ سے شکار کرنے والے کو "ناجش" کہا جاتا ہے کہ وہ شکار پکڑنے کا حیلہ کرتا ہے اور اسے دھوکے سے قتل کر دیتا ہے یا پکڑ لیتا ہے۔

"نجش" کو ہماری اصطلاح میں "دلالی" کہا جاتا ہے جو عنوان میں اور ترجمہ میں زکر کیا گیا ہے، عام طور پر منڈیوں میں آڑھتیوں نے کچھ لوگ خریدے ہوئے ہوتے ہیں وہ ان خریدے ہوئے ایجنٹ لوگوں کو دوسروں کو دھوکہ دینے کی وجہ سے پیسے دیتے ہیں۔ ان کا کام بولی میں دوسروں سے رقم بڑھا کر پیش کرنا ہوتا ہے، دوسروں کو پھنسانا ان کا کام ہوتا ہے وہ خود خریدار نہیں ہوتے۔

پراپرٹی ڈیلرز:

ایک طریقہ پراپرٹی ڈیلرز حضرات کا یہ ہے کہ وہ مالک کی بتائی ہوئی رقم کے مطابق ہی خریدار کو بتائے ہیں، اس میں کوئی جھوٹ کی آمیزش نہیں ہوتی۔ وہ خریدار سے بھی کمیشن لیتے ہیں اور بیچنے والے سے بھی۔

وہ حقیقت میں وکیل کی حیثیت میں ہوتے ہیں، اپنی بھاگ دوڑ، دفاتر کے کرائے، گاڑی کا خرچ اور کارندوں کی تنخواہ کیلئے انہوں نے مزدوری کی حد مقرر کررکھی ہے، وہ صاف ستھرا سودا کرتے ہیں، نہ ہی مالک کو دھوکا دیتے ہیں اور نہ ہی خریدار کو دھوکا دیتے ہیں۔ یہ طریقہ تو جائز ہے۔ ایک اور طریقہ یہ ہے کہ مالک کو کہنا کہ یہ مکان پانچ لاکھ کا بیچا جاسکتا ہے اس سے زائد کا کوئی خریدار نہیں ملتا اور خریدار کو کہنا کہ یہ مکان سات لاکھ کا مالک بیچنے پر آمادہ ہوا ہے۔ اس سے کم پر وہ رضاءمند نہیں۔ اس قسم کا سودا کرانا جھوٹ اور دھوکا بازی کیوجہ سے ناجائز ہے۔

ایک تیسرا طریقہ یہ ہے کہ پراپرٹی ڈیلر مالک سے خود خرید لیتا ہے اور خریدار پر بیچ دیتا ہے۔ یہ نفع پر بیچنا جائز ہے جبکہ صحیح خرید وفروخت ہو جائے صرف دھوکا دینے کیلئے زبانی طور پر کلام کا تبادلہ نہ ہو خرید وفروخت کیلئے انتقال یا رجسٹری شرعاً ضروری نہیں۔ یہ ملکی قوانین ہوتے ہیں اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ ہاتھ بہاتھ رقم دینا بھی ضروری نہیں زمیں یا مکان خرید لیا ایجاب وقبول ہو گیا شرعاً سودا ہو گیا، پراپرٹی ڈیلر اسکا مالک ہو گیا۔ رقم دینے کا جو وعدہ کیا اس وعدہ کے مطابق وہ رقم دے دے۔ پراپرٹی ڈیرل کو جب خریدار ملے تو اصل مالک سے بیان دلا کر خریدار کے نام انتقال اور رجسٹری کرادے۔ حقیقت میں سودا پراپرٹی ڈیلر اور خریدار کا ہی ہے کیونکہ پراپرٹی ڈیلر اس کو خرید کر مالک بن چکا تھا۔

اعتراض: نبی کریم ﷺ نے تو کسی چیز کو بغیر قبضہ کرنے کے بیچنے سے منع فرمایا پراپرٹی ڈیلرز مین یا مکان کو اپنے قبضہ میں نہیں کرتا بلکہ قبضہ تو مالک کا ہی ہوتا ہے تو کیسے جائز ہے۔ اس کے متعلق ارشاد مصطفوی ﷺ دیکھئے۔

☆ "وعن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ من ابتاع طعامافلايبيعه حتى يستوفيه وفي رواية ابن عباس حتى يكتاله" (بخاری ومسلم ،مشکوۃ باب المنهی عنهامن البیوع)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے طعام خریدا تو اسے وہ نہ بیچے یہاں تک کہ اسے اپنے قبضہ میں کرلے، اور ایک روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے جس میں ذکر ہے کہ کسی چیز کو اس وقت تک بیچنا منع ہے جب تک اس کا کیل نہ کرے (ماپ نہ لے)۔

طعام کا ذکر تو مثال ہے، مراد تو اس سے ہر چیز کا حکم بیان کرنا ہے۔ لہٰذا کسی چیز کو بھی بغیر قبضہ کے بیچنا منع ہے۔

جواب: "قوله ﷺ حتی یستوفیه ای یقبضه فدل الحدیثان علی عدم جواز البیع مالم یقبض وهو باطلاقه مذهب الشافعی ومحمد وقال مالک لایجوز فی الطعام ویجوز فیما سواه وقال ابو حنیفة وابو یوسف یجوز فی العقار وهو ظاهر مذهب احمد والدلیل لهم ان رکن البیع صدر من اهله فی حمله ولا غرر فیه لان الهلاک فی العقار نادر بخلاف المنقول" (لمعات، حاشیه مشکوة ص۲۴۷)

نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی "حتی یستوفیه" اور دوسری روایت میں "حتی یکتاله" کا مطلب یہی ہے کہ "یہاں تک کہ قبضہ کر لے"

امام مالک رحمۃ اللہ کا تو موقف ہی اس میں یہی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے چونکہ طعام کا ذکر کیا ہے، لھذا مراد طعام ہی ہے کہ طعام کی بیع میں قبض کرنے سے پہلے آگے بیچنا منع ہے۔ لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ اور امام محمد رحمۃ اللہ ان دونوں حدیثوں یعنی ابن عمر اور ابن عباس (رضی اللہ عنہم) کی روایات کو مطلقا عموم پر رکھتے ہیں کہ ہر چیز کی خریداری پر پہلے قبضہ کرنا ضروری ہے، پھر بیچنا جائز ہوگا ورنہ جائز نہیں ہوگا۔ (لیکن امام شافعی رحمہ اللہ کے استاذ امام محمد رحمہ اللہ اور امام محمد کے استاذ امام ابو یوسف رحمہ اللہ۔ اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے استاذ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ) شیخین یعنی امام اعظم ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمھما اللہ فرماتے ہیں کہ غیر منقول چیز یعنی زمین اور مکان میں صرف سودا طے ہو جانا یعنی ایجاب وقبول کر لینا ہی قبضہ کرنا سمجھا جائے گا جب، بیچنے والا بیچنے کی اہلیت رکھتا ہو یعنی عاقل و بالغ ہو اور اس میں کوئی دھوکا نہ پایا جائے تو صرف سودا کر لینا قبضہ سمجھا جائے گا، اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر منقول چیز کے ہلاک ہونے یعنی ضائع ہونے کا خطرہ کم ہوتا ہے، لیکن منقول چیز کے ضائع ہونے کا خطرہ ہوتا ہے اس لئے میں قبضہ کرنا ضروری ہے۔

آج کل کے بیانہ کا طریقہ ناجائز ہے:

مکان یا زمین کا سودا ہوتا ہے، مثال کے طور پر پچاس ہزار روپے بیانہ دے دیا جاتا ہے کہ ایک ماہ تک مالک رجسٹری کرا دے گا اور خریدار رقم دے دے گا۔ اگر خریدار رقم مقرر میعاد تک نہیں دے گا تو بیانہ ضبط کر لیا جائے گا۔ اور

مالک اگر مقرر میعاد تک رجسٹری نہیں کرائے گا تو وہ دوگنا بیانہ واپس کرے گا۔

یہ دونوں صورتیں ناجائز ہے، بغیر کسی عوض کے بیانہ ضبط کرنا یا دوگنا وصول کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں ہو سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ دلیل قائم کی جا سکتی ہے کہ ہم ایک دوسرے کے دھوکے سے بچنے کیلئے ایسا کر رہے ہیں۔ تو اس کے متعلق شرعی قوانین موجود ہیں، یا تو سودا کرے نقد رقم سے، ادھر رقم دے اور ادھر چیز لے۔ یا بیانہ دے اور اس کے بدلے کوئی چیز رہن رکھ لے۔ غیر شرعی قوانین کیلئے کوئی حیلہ کوئی حجت قابل قبول نہیں۔

تلقی جلب منع ہے:

جب شہر کے لوگ غلہ کے محتاج ہوں۔ ایک شخص کو پتہ چلا کہ باہر سے کوئی قافلہ، کوئی تاجر غلہ لا رہا ہے تو یہ آگے بڑھ کر ان سے غلہ خریدے اور شہر کے ضرورتمند لوگوں کو مہنگا بیچے یہ ہے ''تلقی جلب'' جس سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا۔ آپ کے ارشاد کے مختلف الفاظ ہیں، سب کا معنی ایک ہی ہے۔ ایک روایت میں ہے:

☆ عن ابن عمر ان رسول الله ﷺ نهى ان يتلقى السلع حتى تبلغ الاسواق ''

(مسلم ج ۲ ص ۱۲)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے آگے بڑھ کر سامان (غلہ) کی ملاقات کرنے سے منع فرمایا یہاں تک کہ وہ غلہ بازار میں پہنچنے دیا جائے۔

☆ عن عبدالله عن النبی ﷺ انه نهى عن تلقى البيوع ''(رواہ مسلم ج۲ ص ۱۲)

حضرت عبداللہ (بن مسعود) رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے آگے بڑھ کر بیع کرنے سے منع فرمایا:

مراد اس حدیث سے بھی یہی ہے کہ لوگ جب غلہ کے محتاج ہوں، تو جب غلہ تاجر لا رہے ہوں تو آگے آگے جا کر ان سے سودا نہ کرو کہ حاجتمند لوگوں کو مہنگے دام بیچیں، بلکہ تاجروں کو شہر میں آنے دیں۔

☆ عن ابی هريرة قال نهى رسول لله ﷺ ان يتلقى الجلب ''(مسلم ج۲ ص ۱۲)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے آگے بڑھ کر (سودا کرکے) منافع

حاصل کرنے سے منع فرمایا۔

''جلب'' کا معنی کھینچنا ''تلقی جلب'' کا مطلب منافع حاصل کرنے کیلئے آگے بڑھ کر تاجروں کی ملاقات کرنا۔

☆ عن ابن عباس قال نهى رسول الله ﷺ ان يتلقى الركبان وان يبيع حاضر لباد''

(مسلم ج ۲ ص ۱۲)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے سواروں (تاجروں) کو آگے بڑھ کر ملاقات کرنے سے منع فرمایا۔ اور شہری کو دیہاتی سے بیع کرنے سے منع فرمایا۔

مطلب واضح ہے:

یعنی تمام روایات کا مطلب ایک ہی ہے کہ جب شہر کے لوگ غلہ کے محتاج ہوں، تو آنے والے تاجروں اور قافلوں سے آگے بڑھ کر ملاقات کر کے سودا کرنے سے منع کیا گیا، اور شہر والوں کو دیہات میں جا کر غلہ خرید کر حاجتمندوں پر مہنگا بیچنے سے منع فرمایا گیا۔ ہاں اگر شہر میں غلہ مل رہا ہو، لوگ محتاج نہ ہوں تو آگے بڑھ کر تاجروں سے ملاقات کر کے غلہ خریدنا جائز ہے۔ اسی طرح شہری لوگ دیہات سے سستا غلہ خرید لائیں اور شہر میں مہنگا بیچیں تو یہ جائز ہے۔ اسلئے کہ تجارت میں نفع حاصل کرنا منع نہیں۔ البتہ لوگوں کو نقصان پہنچانا منع ہے۔

نتیجہ واضح ہوا:

کہ ہر وہ بیع جس میں سود کا خطرہ ہو وہ بیع ناجائز ہے۔ اور ہر وہ بیع جس میں خریدار کو دھوکا دیا جائے وہ ناجائز ہے۔ اور ہر وہ بیع جس میں ضرورتمندوں اور حاجتمندوں سے ناجائز منافع کمایا جائے وہ ناجائز ہے۔

انعامی بانڈ میں راقم کا موقف:

جب قرض دینے میں لاٹری سسٹم نہ ہو، یعنی جوئے بازی کو دخل نہ ہو، اور سود بھی نہ ہو، اور دھوکہ بازی بھی نہ ہو تو وہ جائز ہے۔ بینک والے لوگوں سے قرض لیتے ہیں جس پر وہ انعامی بانڈز جاری کرتے ہیں۔ قرض دینے والا جب چاہے اپنی رقم مکمل کی مکمل واپس لے لیتا ہے، اس میں کوئی کٹوتی نہیں ہوتی۔

اس صورت سے یہ واضح ہوا کہ یہ لاٹری سسٹم نہیں کہ اسے جوابازی سے تعبیر کیا جائے کیونکہ اس میں رقم ضائع نہیں ہوتی۔ اور قرض دینے والا یا لینے والا اس قرض پر زیادہ رقم مقرر نہیں کرتے، نہ دینے والا کہتا ہے کہ مجھے تم نے اتنی رقم اس قرض پر زیادہ دینی ہے اور نہ ہی لینے والا کہتا ہے کہ تمہیں اس قرض پر اتنی رقم دی جائے گی، لھذا سود کی کوئی وجہ نہ بنی۔ البتہ بینک والے لوگوں کو قرضہ دینے کی طرف راغب کرنے کیلئے قرعہ اندازی کے ذریعہ تمام قرض دینے والوں میں سے چند لوگوں کو انعام دے دیتے ہیں۔ یہ انعام لینا جائز ہے۔ اسے سود کہنا دعوی بلا دلیل ہے اور جوا کہنا بھی غلط ہے۔

ہنڈی کا طریقہ کار:

اگر رقم پہنچانے والے اپنے عملہ کی تنخواہ وغیرہ اور دیگر اخراجات اٹھنے کی وجہ سے مزدوری کی حد مقرر کریں کہ اتنی رقم پہنچانے پر ہم اتنی اجرت لیں گے تو یہ جائز ہے۔ لیکن رقم سے کٹوتی منع ہے۔ اس صورت کو راقم نے ردی کھجوروں کے بدلے عمدہ بیع کے عدم جواز اور قیمت سے ردی کو بیچ کر عمدہ خریدنے کے جواز پر قیاس کیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

گروپ انشورنس اور بینولینٹ فنڈ:

سول سرونٹ ایکٹ ۱۹۷۳ء کی دفعہ ۲۱ کے تحت تمام سول ملازمین اور ان کی فیملی، یعنی گھر کے خاندان کے افراد سنٹرل ایمپلائز بینولینٹ فنڈ اور گروپ انشورنس ایکٹ ۱۹۶۹ء کے تحت جتنے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں کے حق دار ہوں گے۔

(۱) دفعہ نمبر ۲۱ صفحہ نمبر ۱۴ فیڈرل ایمپلائز بینولنٹ فنڈ اور گروپ انشورنس ایکٹ ۱۹۶۹ء کی دفعہ نمبر ۵ کے تحت فیملی سے مراد ملازم کی بیوی اس کے بچے، والدین، چھوٹے بھائی اور غیر شادی شدہ بہنیں ہیں جو کہ مکمل طور پر ملازم کے زیر کفالت ہوں۔ (صفحہ نمبر ۹۱۷)

اسی قانون کی دفعہ نمبر ۱۸ کے تحت ہر ملازم کیلئے ضروری ہے کہ وہ گروپ انشورنس کا زربیشگی جو کہ حکومت وقتاً فوقتاً مقرر کرے اپنی تنخواہ میں سے کٹائے۔ (صفحہ نمبر ۲۹۳،۲۹۷)

اسی قانون کی دفعہ نمبر ۱۴ اشق نمبر ۱، ۲ اور دفعہ نمبر ۱۹ اشق نمبر ۱، ۲ کے تحت بینولینٹ فنڈ اور گروپ انشورنس کی ادائیگی ملازم کی وفات کی صورت میں فیملی کے اس شخص کو کی جاتی ہے جسے ملازم نے مقرر کیا ہو۔ اگر ملازم نے کسی کو بھی مقرر نہیں کیا تھا تو پھر یہ دونوں فنڈ ملازم کی فیملی کا وہ فرد یا افراد لے سکتے ہیں۔ جو یہ ذمہ داری لیں کہ ان دونوں اقوم کو انصاف اور برابری کی بنیاد پر خاندان کے تمام افراد کی پرورش (نان ونفقہ) اور فائدے کیلئے استعمال کرے گا۔

﴿دفعہ نمبر ۱۴(۱،۲) صفحہ ۱۹۶۶ اور دفعہ نمبر ۱۹ (۱،۲) صفحہ ۲۹۴﴾

اس مسئلہ میں دو چیز زیر طلب ہیں، ایک یہ کہ جسے نامزد کیا گیا ہے کہ یہ فنڈ وصول کرے گا، اس کی حیثیت کیا ہے؟ اور دوسری چیز یہ مطلوب ہے کہ بہن، بھائیوں کو حصہ شرعاً مل سکتا ہے یا نہیں۔ نیز یہ بھی خیال رہے کہ حکومتی قانون کے تحت زوجہ اور والدہ کا حصہ برابر ہے۔ کیا شرعاً بھی برابر رہے گا۔ اس کے متعلق راقم کا موقف یہ ہے کہ بینولینٹ فنڈ حکومت اپنے قانون کے تحت کاٹتی ہے جو ملازم نے قانون کو تسلیم کرتے ہی ملازمت شروع کی تھی۔ بینولینٹ فنڈ ملازم کو اپنی زندگی میں ریٹائر ہونے پر نہیں ملتا، اگر گروپ انشورنس فنڈ بھی ملازم کو زندگی میں ریٹائر ہونے پر نہ ملتا ہو تو دونوں کا حکم ایک ہی ہوگا۔

وہ حکم یہ ہے کہ اس فنڈ میں وراثت جاری نہیں کیونکہ ملازم کو زندگی میں اس کا حقدار نہیں سمجھا گیا، بلکہ یہ فنڈ ملازم کے کاٹے ہوئے پیسوں کے برابر نہیں ہوتا بلکہ حکومتی قانون اور ملازم کے سکیل اور مدت ملازمت کے مطابق ہوتا ہے اس لئے حکومت نے جن جن افراد کو حقدار بنایا ہے وہ برابری کے حقدار ہوں گے۔ جس شخص کو نامزد کیا ہے وہ اس فنڈ کا مالک نہیں بنتا بلکہ وہ اس فنڈ کو فیملی کے حقدار افراد کو برابری کے طور پر تقسیم کرنے کا حق رکھتا ہے۔ تقریباً تقریباً نامزد شخص اس درجہ پر ہوتا جسے آدمی وصیت کر جائے (وصی بنا جائے) کہ یہ میرا تہائی حصہ مال فلاں فلاں کو دے دینا وہ تقسیم کا حق رکھتا ہے مالک نہیں بن جاتا۔

جنرل پراویڈنٹ فنڈ، جی۔ پی فنڈ:

سنٹرل گورنمنٹ، جی، پی فنڈ کے قوانین مجریہ ۱۹۶۶ء کی دفعہ ۱۴ کے تحت ملازم اپنی فیملی یا بغیر فیملی کے تین افراد تک کو نامزد کر سکتا ہے۔ اگر ملازم جی، پی فنڈ کی رقم لینے سے پہلے وفات پا جائے کہ اسے قابل ادا تھا تو یہ رقم ان نامزد تین افراد میں سے جو سر فہرست زندہ ہو اسے ادا کی جاتی ہے۔

اس کے متعلق سوال طلب یہ بات ہے کہ جی پی فنڈ کے مستحق کون کون سے افراد ہیں۔اور جن کو نامزد کیا گیا کیا وہ اس فنڈ کے حقدار ہوں گے؟ تو اس کے متعلق شرعی حکم یہ ہے کہ جی پی او فنڈ کا انسان اپنی زندگی میں ریٹائر ہونے پر حقدار ہوتا ہے۔لھذا وفات کی صورت میں اس میں وراثت جاری ہوگی۔ جتنے اس کے وارث رہ گئے ہوں گے وہ شرعی قانون کے مطابق اپنے اپنے حصہ کے حقدار ہوں گے۔اس میں برابری کے حقدار نہیں ہوں گے۔

نامزد اس فنڈ کے مالک نہیں ہوں گے، اگر نامزد کوئی وارث ہوا جیسے بیوہ یا کوئی بچہ یا بچی وغیرہ تو وہ صرف اپنے شرعی حق کے مالک ہوں گے، باقی مال باقی تمام ورثاء میں تقسیم ہوگا۔ نامزد شخص کو تقریباً تقریباً وصی) وصیت کے مطابق مال تقسیم کرنے والے) کا درجہ حاصل ہوگا۔البتہ جی پی فنڈ پر زیادہ رقم کا ملنا جبری ریٹائرمنٹ پر نہیں ملتا اس لئے اسے سود نہیں کہا جاسکتا ورنہ جبری ریٹائرمنٹ پر زائد رقم ملتی، وہ سرکاری ملازمین کی معاونت ہے۔اسی طرح گریجوٹی فنڈ یا میڈیکل وغیرہ کے بقایاجات میں وراثت جاری ہوگی، اور نامزد شخص کی حیثیت صرف کنندہ کی ہوگی۔

البتہ پنشن میں وراثت جاری نہیں ہوگی۔حکومتی قوانین کے مطابق صرف بیوہ ہی حقدار ہوگی۔

"ھذا ماعندی واللہ اعلم بالصواب والیہ المرجع والماب"

انشورنس یعنی بیمہ پالیسی:

ناجائز ہے اس میں سودی کاروبار پایا گیا ہے۔کسی ایک کو نامزد کرنے سے وراثت کے حقداروں کی حق تلفی بھی ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی پیشنگوئی جو حرف بحرف ثابت ہو چکی ہے۔

"عن ابی ھریرة عن رسول للہ ﷺ قال لیاتین علی الناس زمان لایبقی احد الاآکل الربوا فان لم یاکلہ أصابہ من بخارہ ویروی من غبارہ"

(رواہ احمد وابوداود والنسائی وابن ماجہ، مشکوة باب الربوا)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ضرور بر ضرور لوگوں پر ایک وقت آئے گا کہ کوئی ایک بھی باقی نہیں رہے گا سوائے اس کے کہ وہ سود کھانے والا ہوگا، اگر اس نے سود نہ کھایا تو اسے سود کے

بخارات پہنچیں گے۔ایک روایت میں ہے کہ اسے سود کا غبار پہنچے گا۔

''بخار اور غبار سے مراد کیا ہے؟

''والبخار والغبار مستعاران بمايشبه الربوا به من النار والتراب''

اس مقام پر''بخار'' اور''غبار'' کا مجازی معنی لیا گیا ہے کیونکہ ربوا کو آگ اور مٹی سے تشبیہ دی گئی۔جس طرح آگ کے قریب بیٹھنے والا آگ سے محفوظ بھی رہے لیکن اس کے دھوئیں اور اس پر پکنے والے چیز کی بھاپ (بخارات) سے محفوظ نہیں رہ سکتا، ایسے ہی ایک وقت آئے گا جو سود کے اثر سے محفوظ نہیں رہ سکے گا۔یعنی سود کے اثرات کو بخارات سے تشبیہ دی گئی ہے۔

اسی طرح سود کو مٹی سے تشبیہ دی گئی، کہ جس طرح آندھی چل رہی ہو، مٹی اڑ رہی ہو تو کوئی براہ راست مٹی کی زد میں آتا ہے اور کوئی غبار میں مبتلاء ہوتا ہے اسی طرح کوئی براہ راست سود کھائے گا اور کوئی غبار کی طرح سود کے زیر اثر آئے گا۔یعنی سود کے اثر کو غبار سے تشبیہ دی گئی ہے۔حضرت علامہ علی قاری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

''والتقدير ولايبقى احد منهم له وصف الاوصف كونه آكل الربوا فهو كناية عن انتشاره في الناس بحيث يأكله كل احد''

حدیث کے پہلے الفاظ مبارکہ ''ليأتين على الناس زمان لايبقى احدالا آكل الربوا''کا مطلب یہ ہوگے کہ''لوگوں پر ضرور بر ضرور ایک وقت آئے گا جس میں کسی شخص کو اور کوئی وصف حاصل نہیں ہوگا سوائے سود کے کھانے کے وصف کے،اس سے اشارہ کیا گیا ہے اس طرف کہ سود لوگوں میں پھیل جائے گا اس لحاظ پر کہ ہر شخص سود کھانے والا ہوگا۔

''فان لم يأكله اصابه من بخاره ويروى من غباره'' اى يصل اليه أثربأن يكون شاهدا في عقدالربوا أو كاتبا أو آكلا من ضيافته اوهديته والمعنى انه لوفرض ان احداسلم من حقيقته لم يسلم من آثاره وان قلت جدا''

اگر وہ سود کھانے والا نہ ہوا تو اسے سود کے بخارات اور غبار پہنچے گا،یعنی کبھی سودی کاروبار میں گواہ

بن کر سود کے زیر اثر آئے گا اور کبھی سودی لین دین کے لکھنے کا کام کر کے سودی اثرات کی زد میں آئے گا۔ اور کبھی سودی کاروبار کرنے والے کا مہمان بن کر اس کے گھر کھانا کھا کر سود سے متأثر ہوگا۔ اور کبھی سود لینے والے سے ہدیہ قبول کر کے سود کے غبار کی زد میں آئے گا۔ مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی شخص سود کھانے سے محفوظ بھی رہے تو وہ اس کے آثار سے محفوظ نہیں رہے گا، اگر چہ قلیل طور پر ہی اس کی زد میں آجائے۔ (مرقاۃ ج ٦ ص ٦٥)

حدیث پاک اور اس کی وضاحت کو دیکھنے کے بعد اور آجکل کے نظام حکومت کو اور بینکاری کے نظام کو دیکھنے کے بعد ہر باشعور انسان سمجھ لیتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی پیشگوئی حرف بحرف ثابت ہو چکی ہے۔ اس وقت کوئی براہ راست سود لے رہے ہیں اور کوئی سود کی غبار میں اٹے جا رہے ہیں، ''الامان والحفیظ''

بینکاری کا نظام خالص سود پر چل رہا ہے، کبھی قرض دے کر سود لینا، کبھی قرض لے کر سود دینا اور کبھی مکان خریدنے کیلئے قرض دینا اور اس مکان کی خریداری میں بینک کا حصہ دار بننا، پھر اس پر بھی سود مقرر کرنا، البتہ بینک کی ایک صورت جائز نظر آتی ہے جبکہ اس کے جواز کی حد تک عمل کیا جائے اس سے آگے تجاوز نہ کیا جائے وہ یہ ہے کہ بینک کوئی چیز خرید لے۔ نقد رقم دے کر سستی چیز لے لے اور قسطوں پر مہنگی بیچ دے۔ جیسا کہ بینک گاڑیاں خرید کر بیچ رہے ہیں۔ لیکن قسط کی تاخیر میں سود لگانا، یا دی ہوئی رقم کو ضبط کرنا جائز نہیں۔

قسطوں سے مہنگے دام بیچنا، خریدنا جائز ہے:

"یجوز البیع بثمن حال ومؤجل اذا کان الأجل معلوما لأطلاق قوله تعالی واحل الله البیع وعنه علیه السلام انه اشتری من یهودی طعاما الی اجل ورهنه درعه ولا بد ان یکون الأجل معلوما لأن الجهالة فیه مانعة عن تسلیم الواجب بالعقد فهذا یطالب به فی قریب وهذا یسلم فی بعیدها" (هدایۃاخیرین ص ۲۱)

خرید وفروخت نقد قیمت پر بھی جائز ہے اور ادھار سے بھی جائز ہے، البتہ شرط یہ ہے کہ ادھار میں رقم ادا کرنے کا وقت مقرر ہو، ادھار پر بیچنے کے جواز پر دلیل یہ ہے کہ زیر بحث آیۃ کریمہ میں اللہ

تعالیٰ نے مطلقاً ذکر فرمایا ﴿واحل اللہ البیع وحرم الربوا﴾ اور حلال کیا ہے اللہ نے بیع کو اور حرام کیا ہے ربوا کو، مطلق حکم اپنے اطلاق کی وجہ سے دونوں قسموں کو شامل ہے خواہ نقد سے بیچا جائے یا ادھار اور دلیل اس پر یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک یہودی سے طعام خریدا جس کی رقم دینے کا وقت مقرر فرمایا اور اپنی زرہ اس کے پاس رہن رکھی، البتہ ادھار بیچنے کیلئے وقت مقرر ہونا چاہئے، کیونکہ وقت مقرر نہیں ہوگا تو رقم کی ادائیگی کا وقت مجہول ہونے کی وجہ سے جھگڑے کا خطرہ ہوگا بیچنے والا جلدی ادائیگی کا مطالبہ کرے گا اور خریدنے والا دیر سے دینے کا ارادہ کرے گا۔

☆ ”عن الاسود عن عائشة ان رسول اللہ ﷺ اشتری من یھودی طعاما الی اجل ورھنه درعاله من حدید“ (بخاری مسلم)

” وفی لفظ البخاری ثلاثین صاعامن شعیر وھذا لیھودی اسمه ابو الشحم “

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے یہودی سے طعام خریدا ایک وقت مقرر تک اور اپنی زرہ لوہے کی اس کے پاس رہن رکھی، اور بخاری میں یہ بھی ذکر ہے کہ تیس صاع جو آپ نے اس سے لئے تھے اور اس یہودی کا نام ابوالشحم تھا۔

جب ادھار بیچنا جائز ہے اور وقت مقرر ہونا چاہئے تو وہ وقت ادائیگی کا ایک ہی ہو یا مختلف قسطوں میں ادا کرنا ہو اور ہر قسط کی ادائیگی کا وقت مقرر ہو یہ سب صورتیں جائز ہیں۔

☆ ومن باع بثمن حال ثم اجله اجلا معلوما صار مؤ جلا لأن الثمن حقه فله ان یؤخره تیسیرا علی من علیه الایری انه یملک ابرائه مطلقا فکذاموقتا“

(ھدایہ اخیرین ص ۷٦)

جو شخص نقد بیچے پھر اسے وقت مقرر تک ادا کرنے کی اجازت دے دے تو یہ جائز ہے۔ کیونکہ اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ دوسرے شخص کو مہلت دے کر اس کیلئے آسانی پیدا کرے اور یہ بھی واضح ہے جب کوئی شخص اپنا حق مکمل طور پر معاف کردے تو اس کا حق ہے، تو یہ بھی اس کا حق ہے کہ وقت مقرر کر کے ادائیگی میں مہلت دے کر اس کیلئے آسانی پیدا کردے۔

☆ علیه الف ثمن جعله ربه نجوما ان اخل بنجم حل الباقی فالأ مر کما شرط ای جعله ربه نجوما قائلا ان اخل ....(الخ)

ایک شخص پر ہزار روپے ثمن ادا کرنے لازم ہوں تو بیچنے والے نے اس شخص کی آسانی کیلئے قسط وار رقم لینے کا فیصلہ کرلیا اور ساتھ یہ شرط بھی لگادی کہ اگر تم نے کوئی قسط وقت مقرر پر نہ ادا کی تو پھر تمہیں مکمل رقم ایک وقت میں ہی نقد ادا کرنی پڑے گی تو یہ جائز ہے، معاہدہ شرط کے مطابق ہی ہوگا، یعنی کسی قسط کے ادا نہ کرنے کی صورت میں باقی رقم ایک وقت میں نقد ادا کرنی پڑے گی۔ (درمختار وشامی ج۴ص۶۲)

ثمن اور قیمت میں فرق ہی یہ ہے کہ قیمت اسے کہا جاتا ہے جو لوگ خرید وفروخت کرنے والے اس چیز کی قیمت کو سمجھتے ہوں وہ جو کہہ دیں کہ یہ چیز اتنی رقم کی ہے وہ قیمت ہے۔ اور ثمن اسے کہا جاتا ہے جو بیچنے والے اور خریدار کے درمیان طے ہو جائے خواہ کم ہو یا زیادہ یہ جائز ہے۔ قسط وار چیز بیچنے میں زیادہ سے زیادہ چیز مہنگی ہو جائے گی، جب ثمن نام ہی اس رقم کا ہے جو بیچنے والے اور خریدار کے درمیان طے ہو جائے تو یقیناً یہ جائز ہے۔

☆ ویجوز للمشتری ان یزید للبائع فی الثمن ویجوز للبائع ان یزید للمشتری فی المبیع ویجوزان یحط عن الثمن ویتعلق الا ستحقاق بجمیع ذلک فالز یادة والحط یلتحقان بأصل العقد" (هدایة اخیرین ص ۷۵)

خریدار کیلئے یہ جائز ہے کہ وہ ثمن طے ہو جانے کے بعد رقم میں زیادتی کر دے۔ اور بیچنے والے کیلئے جائز کہ رقم طے کرنے کے بعد کم کر دے۔ یہ سب صورتیں اصل عقد سے مل جائیں گی، خریدار نے جب زیادہ رقم دی تو یہ سمجھا جائے گا کہ گویا کہ سودا ہی اتنی زیادہ رقم سے طے ہوا۔

بیچنے والے نے جب رقم کم کردی تو یوں سمجھا جائے گا کہ سودا ہی کم رقم سے ہوا۔ بیچنے والے نے جب چیز زیادہ دے دی تو یہ سمجھا جائے گا کہ سودا ہی زیادہ چیز کا ہوا۔ اس سے واضح ہوا کہ ابتدائی طور پر قسط وار رقم عام نرخ سے زیادہ مقرر کر لینا بھی جائز ہے، ہاں البتہ یہ خیال رہے کہ غبن فحش سے بیچنا منع ہے، کہ کسی کی مجبوری کو دیکھ کر

اتنی قیمت مقرر کر لی جائے جو لوگوں کے ذہن قبول ہی نہ کریں۔ اتنی زیادتی کی جائے لوگوں کے ذہنوں میں سمجھ آسکے کہ ہاں اتنی زیادتی تو ٹھیک ہے، جو نقد اور ادھار میں عام لوگوں کے ذہن میں فرق آسکے وہ تقریباً دس فیصد زیادتی ہے۔ اس سے زیادہ نفع لینا جائز تو ہے لیکن بہتر نہیں۔

اعتراض: ایک حدیث پاک کی تشریح میں حضرت علامہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ کے قول سے قسطوں سے بیع ناجائز نظر آتی ہے۔ کس طرح جواز کا حکم دیا گیا؟ وہ حدیث یہ ہے۔

☆ **"عن ابی هريرة قال نهى رسول الله ﷺ عن بيعتين في بيعة"**

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ایک سودے میں دو سودے کرنے سے منع فرمایا۔ (رواہ مالک والترمذی وابوداؤد والنسائی مشکوۃ باب المنھی عنہا من البیوع)

حضرت علامہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "ایک سودے میں دو سودے" کی دو وجہ بیان کی گئی ہیں۔

"احدهما أن يقول بعتک هذا الثوب بعشرة نقداأو بعشرين نسيئة الى شهر فهو فاسد عنداكثر اهل العلم لأنه لايدرى ايهما جعل الثمن "

ایک وجہ ان میں سے یہ ہے کہ ایک شخص فروخت کرتے ہوئے یہ کہے "میں نے تم پر یہ کپڑا نقد دس درہم پر بیچا اور ایک مہینے کے ادھار پر بیس درہم پر بیچا۔ یہ بیع اکثر اہل علم کے نزدیک فاسد ہے اس لئے کہ وہ نہیں جانتا کہ دونوں میں سے ثمن (قیمت) کسے بنایا جائے۔

"وثانيهما ان يقول بعتک هذا العبد بعشرة دنانير على ان تبيعني جاريتک بكذا فهذا ايضا فاسد لأنه بيع وشرط"

اور دوسری وجہ ان میں سے یہ ہے کہ یہ کہے میں یہ غلام تم پر دس سے دینار سے بیچ رہا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ تم مجھ پر اپنی لونڈی اتنی قیمت سے بیچو گے۔ یہ بھی فاسد ہے کہ اس میں بیع اور شرط کو جمع کر لیا گیا ہے۔

خلاصہ اعتراض یہ ہے کہ حدیث پاک کی وضاحت میں پہلی توجیہ میں ایک چیز کو مہنگے داموں بیچنے سے منع کیا گیا۔

جواب: حدیث پاک میں واضح طور پر یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک سودے میں دو سودے منع ہیں۔ اس کی وجہ بھی واضح

نظر آ رہی ہے کہ ثمن مجہول ہوگا جھگڑا ہوگا۔ پھر وضاحت حدیث میں پہلی وجہ میں مثال سے واضح کیا گیا ہے کہ ایک سودے میں دوسودے اس طرح ہیں کہ یہ کہے کہ اگر تم نے نقد پیسے دینے ہیں تو اتنے دواور ادھار کرنا ہے تو اتنے پیسے دینے ہوں گے، یہ اسی لئے منع ہے کہ اس میں ثمن مجہول ہے جو نزاع کا سبب بنے گا۔

بیع میں ہر وہ صورت ناجائز ہوتی ہے جس میں نزاع کا احتمال ہو۔ مہنگے داموں ادھار یا قسط وار مہنگی چیز بیچنے کی ممانعت نہیں بیان کی گئی، بلکہ گول مول سودا کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ کہ سوادکی صرف ایک صورت معین کرے۔ یا نقد پر بیچے یا ادھار بیچے۔ نقد قیمت پر بیچنا ہے تو وہی قیمت مقرر کرے، اور ادھار بیچنا ہے تو وہی قیمت مقرر کرے یہی حکم حدیث پاک اور اس کی تشریح سے واضح ہے۔ (راقم)

بیع میں عیب چھپانا باعث لعنت ہے:

"عن واثلة بن الاسقع قال سمعت رسول الله ﷺ یقول من باع عیبا لم ینبه لم یزل فی مقت الله أولم تزل الملائكة تلعنه" (رواه ابن ماجة ومشكوة باب مذكور)

حضرت واثلہ بن اسقع فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے میں نے سنا کہ جو شخص عیب والی چیز بیچتا ہے اور عیب پر متنبہ نہیں کرتا وہ اللہ کی ناراضگی میں ہوتا ہے اور فرشتے اس پر ہمیشہ لعنت کرتے رہتے ہیں۔

☆ عن جابر قال ان رسول الله ﷺ مر علی صبرة طعام فادخل یده فیها فنالت اصابعه بللا فقال ماهذا یاصاحب الطعام قال اصابته السماء یارسول الله قال أفلا جعلته فوق الطعام حتی یراه الناس من غش فلیس منی" (رواه مسلم،مشكوة باب مذكور)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ طعام کے ایک ڈھیر سے گذرے (جو بیچا جا رہا تھا) آپ نے اپنے ہاتھ کو اس میں ڈالا تو آپ کی انگلیوں نے اس میں تراوت پائی (یعنی اندر سے وہ غلہ گیلا تھا) آپ نے فرمایا اے شخص طعام کے مالک یہ کیا؟ (یعنی اندر سے گیلا کیوں؟) تو اس نے عرض کیا یا رسول اللہ اسے بارش پہنچ گئی تھی، آپ نے فرمایا تم نے اسے باقی طعام کے اوپر کیوں نہیں رکھا تھا، یہاں تک کہ لوگ اسے دیکھ لیتے، جس شخص نے کھوٹ اور ملاوٹ سے کام لیا وہ مجھ سے نہیں۔

وضاحت حدیث:

صبرة "بضم الصاد المهملة وسکون الموحدة من الطعام بلا کیل ووزن"

غلہ کو بغیر کیل (ماپ) اور وزن کے ایک جگہ جب جمع کر کے ڈھیر لگا دیا جائے تو اسے "صبرة" کہا جاتا ہے۔

"والمراد بالطعام جنس الحبوب المأکول"

حدیث شریف میں جو لفظ طعام استعمال ہے اس سے مراد کھائے جانے والے دانے ہیں خواہ کوئی جنس بھی ہو۔ اسی لئے راقم نے غلہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔

"اصابته السماء" ای المطر لأنها مکانه وهو نازل منها"

حدیث شریف میں استعمال لفظ "السماء" سے مراد بارش ہے، (بارش) کی جگہ لفظ "السماء" استعمال کیا گیا۔

ایک شاعر نے پھر اپنے ایک شعر میں "السماء" کے لفظ کو "بارش" کے معنی میں استعمال کیا ہے

اذا نـــزل الســمــــاء بــارض قــوم
رعيــنـــاه وان كـــانــوا غــضبــانـا

شاعر نے اس شعر میں اپنی بہادری اور دوسروں پر غلبے کا ذکر کیا ہے کہ ہم عدل وانصاف سے ہٹ کر ڈنڈے کے زور سے دوسروں پر غالب رہتے ہیں۔ شعر کا ترجمہ یہ ہے۔

جب کسی قوم کی زمین پر بارش برستی ہے۔ ہم اس چراتے ہیں اگر چہ وہ غضب میں بھی ہوں یعنی جس زمین گھاس اور لہلہاتے ہوئے درخت ہم پاتے ہیں اپنے جانوروں کو چراتے ہیں، زمین کے مالک خواہ غضب میں کیوں نہ ہوں لیکن وہ بولنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔

"من غش ای خان وهو ضد النصح"

یعنی حدیث شریف جو لفظ "غش" کا استعمال ہے اس کا معنی ہے "خیانت کرنا" یعنی "نصح" کی ضد ہے، جس کا معنی ہے "خالص" بغیر کسی ملاوٹ کے۔

"فلیس منی ای لیس هو سنتی وطریقتی"

یعنی اس مقام میں ''لیس منی'' کا معنی ہے، میری سنت پر نہیں اور میرے طریقہ پر نہیں۔

ترمذی شریف میں جمع کا صیغہ استعمال ہے''من غشنا فلیس منا''جس شخص نے ہم سے ملاوٹ کا کام کیا یعنی ہمیں دھوکا دیا وہ ہمارے طریقہ اور ہماری سنت پر نہیں۔

طبرانی نے معجم کبیر میں اور ابونعیم نے حلیہ میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے جو روایت ذکر کی ہے اس کے الفظ مبارکہ یہ ہیں''من غشنا فلیس منا والمکر والخداع فی النار''جس شخص نے ہمارے ساتھ ملاوٹ کا کام کیا وہ ہماری سنت پر نہیں، مکر کرنے والا اور دھوکا دینے والا آگ میں جائے گا۔

مقام افسوس یہ ہے کہ آج تاجروں کی اکثریت کا طریقہ یہ ہے کہ عمدہ قسم کی چیزوں کو سامنے سجا کر رکھتے ہیں اور گھٹیا اور حقیر چیزوں کو پیچھے چھپا کر رکھتے ہیں۔خریدار سامنے والی چیزوں کو دیکھ کر عمدہ سمجھ کر چیز خریدتا ہے لیکن تاجر گھٹیا اور ردی گلی سڑی اشیاء اس کے ہاتھ میں تھما دیتا ہے۔اس طرح وہ تاجر مکروفریب اور دھوکا بازی سے رسول اللہ ﷺ کے طریقہ سے ہٹ کر محبت مصطفیٰ کریم ﷺ کو کھو بیٹھتا ہے۔اس طرح وہ اللہ تعالیٰ اور کے رسول ﷺ کی ناراضگی مول لے لیتا ہے اور اپنے آپ کو فرشتوں کی لعنت کا مستحق قرار دیتا ہے، گویا کہ یوں سمجھا جائے کہ آج تاجروں کی اکثریت اپنے گلے میں لعنت کا طوق ڈالے ہوئے ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

''يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِى الصَّدَقَاتِ وَاللّٰهُ لَايُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ''

(آیۃ نمبر ۲۷۶)

(۱) اللہ ہلاک کرتا سود کو اور بڑھاتا خیرات کو اور اللہ کو پسند نہیں آتا کوئی ناشکرا بڑا گہنگار۔

(۲) مٹاتا ہے اللہ سود کو اور بڑھاتا ہے صدقات کو، اور اللہ نہیں پسند فرماتا کسی کافر (اور) گہنگار کو۔

''محق یمحق محقا''(ف) کا معنی نقص اور چلا جانا، اور اسی سے لیا ہوا ہے''محاق القمر''چاند کی روشنی کم ہوگئی۔

(قرطبی)

یعنی اللہ تعالیٰ سود کی وجہ سے مال کی برکت کو مٹا دیتا ہے اور جس مال میں سودی مال کی آمیزش ہوجائے وہ

مٹ کر رہتا ہے۔اور اللہ تعالی صدقات کو بڑھاتا ہے یعنی ان میں ثواب زیادہ فرماتا ہے اور جس مال سے صدقات ادا کیے جائیں اس مال میں خیر و برکت پائی جاتی ہے وہ مال بڑھتا ہے۔

ماقبل سے تعلق:

اللہ تعالی نے پہلے صدقات دینے پر برانگیختہ کیا،اور صدقات کے کامل مستحقین کا ذکر فرمایا اور صدقات کی خیر و برکت کا ذکر فرمایا۔

اس کے بعد سود کا ذکر کیا اس کی مذمت فرمائی،سود کھانے والوں کا آخرت میں مخبوط الحواس ہونے کا ذکر فرمایا،اب یہاں گویا کہ یہ ذکر فرمایا کہ سود کھانے کی دعوت دینا اور صدقات نہ دینے کی دعوت دینا فساد پر مبنی ہے،اسلئے کہ سودی کاروبار اور سود کے لین دین پر ابھارنے والا اور اس کی دعوت دینے والا بظاہر سبز باغ دکھاتا ہے کہ تمہارا اتنا مال بڑھ جائے گا یہ کاروبا بہت ہی شاندار اور عظیم نفع والا کاروبار ہے۔اور صدقات کو چھوڑنے کی دعوت دینے والا شیطان کی طرح یہ کہتا ہے کہ صدقات سے تمہارا مال کم ہو جائے گا تم اپنا مال کیوں کم کرتے ہو اس طرح تمہارا مال تباہ و برباد ہو کر رہ جائے گا۔تو اللہ تعالی نے گویا کہ بیان فرمایا بیشک سود بظاہر نفع مند نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں نقصان اور خسارے کا سبب ہے یعنی سود آخر کار مال کو تباہ کر دیتا ہے۔

صدقات سے بظاہر مال کم ہوتا نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں وہ مال بڑھتا ہے،اس میں خیر و برکت ہوتی ہے،جس کا انجام ترقی پر مبنی ہے۔جب حقیقت حال یہ ہے عقلمند انسان کو چاہیۓ کہ وہ شیطان اور شیطان کے متبعین اور فقط اپنی طبیعت اور حواس کے مطابق کام نہ کرے کیونکہ یہ تو اسے نیکی کی راہ سے ہٹانے والے ہیں اور برائی کی راہ پر چلانے والے ہیں۔"بل یعول علی ماندبه الشرع الیه من الدواعی و الصوارف" بلکہ انسان کو چاہیۓ کہ شریعت نے جس کام کے کرنے کی دعوت دی ہے وہ کام کرے،اور جس کام سے روکا ہے اس سے رک جائے۔

(کبیر)

سود کا مٹنا کیسے ہے؟

سود کے مٹنے اور برباد ہونے کی دو قسمیں ہیں، ایک دنیا میں مٹ جانا اور برباد ہونا اور دوسرا آخرت میں مٹ جانا اور برباد ہونا۔ (کبیر)

سود کے دنیا میں مٹ جانے کی چند وجوہ:

(۱) سودی کاروبار کرنے والے کا اگر چہ بظاہر مال زیادہ ہوتا ہے "وانه تؤل عاقبته الی الفقر وتزول البرکة عن ماله" لیکن یہ یقینی بات ہے کہ اس کا انجام احتیاجی اور فقر ہوتا ہے۔ اور اس کے مال سے خیر و برکت مٹ جاتی ہے۔ (کبیر)

☆ **عن ابن مسعود عن النبی ﷺ قال "ان الربوا وان کثر فعاقبته تصیر الی قل"**

(اخرجه احمد وابن ماجة وابن جریج والحاکم وصححه)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک سود (کا مال) اگر چہ زیادہ ہو جائے لیکن وہ آخر کار تھوڑا ہو کر رہتا ہے۔

یہ حدیث پاک امام احمد اور ابن ماجہ اور ابن جریج اور حاکم نے بیان کی ہے۔ مستدرک حاکم میں اس حدیث کو صحیح قرار دیا گیا ہے۔ (روح المعانی)

☆ **عن معمر قال سمعنا انه لایأتی علی صاحب الربوا اربعون سنة حتی یمحق"**

(اخرجه عبدالرزاق ولعل هذا مخرج مخرج الغالب)

حضرت معمر فرماتے ہیں ہم نے سنا ہے کہ بیشک سود خوار پر چالیس سال نہیں گذرتے یہاں تک کہ اس کا مال تباہ و برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔ (یعنی غالب حکم یہی ہے، ہوسکتا ہے چالیس سے مراد کثرت ہو کہ آخر کار اس کا مال برباد ہو جاتا ہے۔ (روح المعانی)

(۲) ان لم ینقص ماله فان عاقبته الذم والنقص وسقوط العدالة وزوال الأمانة

وحصول اسم الفسق والقسوة والغلظة"

اگر چہ مال کم نہ بھی ہولیکن ان کا انجام یہ ہوتا ہے کہ سودخواروں کی مذمت کی جاتی ہےاوران کی عزت میں کمی واقع ہوتی ہے، اوران کی امانت زائل ہوجاتی ہے، اوروہ فاسق ہوجاتے ہیں، اوران کے دل میں سختی اورشدت پائی جاتی ہے۔یعنی ان کی عزت وامانت تباہ وبرباد ہوجاتی ہے۔واضح ہوا کہ مال نہ بھی مٹا تو عزت کا تباہ ہونا ان کیلئے باعث ذلت ہوگا۔

(۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ جب فقراءاورحاجتمندلوگ دیکھیں گے کہ انہوں نے ہمارامال سود سے بٹورلیا ہے۔

"فیلعنونه ویبغضونه ویدعون علیه وذلک یکون سببا لزوال الخیر والبرکة عنه فی نفسه وماله"

تو وہ ان پرلعنت بھیجیں گے۔اوران سے بغض رکھیں گےاوران کے خلاف دعاءکریں گے یہ ان کی ہلاکت کی دعاءکریں گے جس کی وجہ سےان کی جان اور مال میں خیروبرکت مٹ جائے گی۔

(۴) چوتھی وجہ یہ ہے کہ جب لوگوں میں مشہورہوگا کہ اس نے سودی کاروبار سے مال جمع کیا ہےتو ظالم، ڈاکو، چورکہیں گے"ان ذلک المال لیس له فی الحقیقة فلایترک فی یده" کہ یہ مال اس نےکوئی محنت کرکے حاصل نہیں کیا ہے، ضرورتمندوں اور حاجتمندوں کی حاجت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مال جمع کیا ہے، جب حقیقت میں اس کا مال ہی نہیں تو اس کا مال لوٹ لیا جائے اس کے ہاتھ میں مال نہ رہنے دیا جائے۔(کبیر)

آخرت میں سودکا مٹ جانا:

اورمراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں سودی مال کومٹادے گا، تباہ وبربادکردے گا، لیکن اس سے مرادکیا ہے؟ اس میں بھی چندوجوہ بیان کی گئی ہیں۔

(۱) ان میں سے پہلی وجہ یہ ہے جوحضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمائی ہے

"قال ابن عباس رضی الله عنهما معنی هذا المحق ان الله تعالی لایقبل منه صدقة ولا جهادا ولا حجا ولاصلة رحم"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اس مٹا دینے کا مطلب یہ ہے کہ بیشک اللہ تعالی اس کا صدقہ اور جہاد اور حج اور صلہ رحمی قبول نہیں فرمائے گا۔ (کبیر)

البتہ یہ خیال رہے کہ اگر صدقہ واجبہ ادا کیا یا جہاد فرض کیا یا صلہ رحمی کی یا اور کوئی عبادت کی تو وہ عبادات ادا ہو جائیں گی، اس شخص کے ذمہ سے فرض دوجوب ساقط ہو جائے گا لیکن کامل ثواب جو ملنا تھا اور ان عبادات کی وجہ سے مراتب ودرجات کی جو بلندی حاصل ہونی تھی وہ اس سے محروم ہو جائے گا اور اللہ تعالی سے جو قرب حاصل ہونا تھا سود کی وجہ سے اس سے محروم ہو جائے گا۔

اب واضح ہوا کہ سود کی وجہ سے اس سے کے صدقات، جہاد، حج اور صلہ رحمی سے حاصل ہونے والے فضائل ودرجات کو مٹا دے گا۔ (راقم)

(۲) ان وجوہ میں دوسری وجہ یہ ہے ''ان مال الدنیا لا یبقی عندالموت ویبقی التبعة والعقوبة ذلک هو الخسار الاکبر '' بیشک دنیا کا مال موت کے وقت باقی نہیں رہے گا، البتہ اس مال کا پیچھا کرنے والے رہ جائیں گے اور اس کیلئے عذاب باقی رہے گا، یہ بہت بڑا نقصان ہوگا۔ (کبیر)

یعنی سودخوار کے مال سے اسے کوئی نفع نہیں حاصل ہوگا، مال خرچ کرنے کی وجہ سے کوئی ثواب حاصل نہیں ہوگا بلکہ اسے عذاب ہوگا۔ جو اس کیلئے بہت بڑے خسارے کا سبب ہوگا۔

واضح ہوا کہ مطلب یہ ہے ربوا کہ وجہ سے اللہ تعالی اس شخص کو مال کی وجہ سے جو ثواب حاصل ہونا اسے مٹا دے گا، یا تو اسے شخص کو اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی توفیق ہی حاصل نہیں ہوگی، اس لئے ثواب وہ محروم ہوگا۔ یا وہ اللہ کی راہ میں سودی مال خرچ کرے گا لیکن حرام مال خرچ کرنے کی وجہ سے اسے ثواب حاصل نہیں ہوگا۔

(۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ حدیث شریف میں ہے "ان الاغنیاء یدخلون الجنة بعد الفقراء بخمسمائة عام '' ''ان الاغنیاء یدخلون الجنة بعد الفقراء بخمسمائة عام'' بیشک غنی لوگ جنت میں فقیر لوگوں سے پانچ سو سال بعد میں داخل ہوں گے،

"فاذا کان الغنی من الوجه الحلال کذلک فماظنک بالغنی من الوجه الحرام المقطوع بحرمته کیف یکون"

حدیث شریف میں تو ان اغنیاء کا ذکر ہے جورزق حلال کی وجہ سے غنی ہوتے ہے ان اغنیاء اور فقراء کے مدارج میں جب اتنا بڑا فرق ہے تو تمہارا کیا خیال ہے ان اغنیاء کے بارے میں جو خالص حرام مال یعنی سودی مال سے غنی بنتے ہیں، یقیناً وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں غیظ وغضب کے مستحق ہوں گے۔"فذلک هو المحق و النقصان" یہی مطلب ہے ابوا کو مٹا دینے کا اور اس میں نقصان پیدا کرنے کا۔ (کبیر)

راقم کے نزدیک یہ تمام وجوہ ہی پائی جاتی ہیں۔یعنی سود خوار کے سودی مال کو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں مٹا دے گا، دنیا میں اس کا مال آخر کار مٹ کر رہے گا، اس کی عدالت و امانت تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ذلت وخواری اسے حاصل ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ فاسق اور سخت دل ہو جاتا ہے۔اور فقراء بددعاء اس کیلئے کرتے ہیں، لعنت اس پر بھیجتے ہیں۔فقراء کو جب یہ خیال آتا ہے کہ اس نے ہمارا مال سود کی وجہ سے حاصل کرلیا ہے تو وہ دل ہی دل میں اس پر غیظ وغضب رکھتے ہیں۔فقراء کی بددعاؤں سے ہی چور اور ڈاکو اس کا مال لوٹ کرلے جاتے ہیں۔

اسی طرح آخرت میں صدقات "حج" جہاد اور صلہ رحمی سے حاصل ہونے والے فضائل سے وہ محروم رہتا ہے اس کے مال کا آخرت میں اسے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہ عذاب کا مستحق ہوتا ہے، فقراء سے اور رزق حلال سے بننے والے اغنیاء سے اس کا گھٹیا مرتبہ ہوگا۔ (راقم)

صدقات کو بڑھانے کی وجوہ:

﴿وَيُرْبِى الصَّدَقَات﴾ "وہ صدقات کو بڑھاتا ہے"۔

اس میں بھی دو وجہ پائی گئی ہیں کہ اللہ تعالیٰ صدقات کو دنیا میں بڑھاتا ہے۔اور صدقات کو آخرت میں بڑھاتا ہے۔

دنیا میں صدقات کو بڑھانے کی وجوہ:

(۱) ان میں سے ایک وجہ یہ ہے "ان من کان للہ کان اللہ لہ" کہ بیشک جو اللہ کا ہو جائے اللہ تعالیٰ اس کا ہو جاتا ہے اس لئے جو شخص اپنی حاجت کے باوجود اللہ کے بندوں پر احسان فرماتا ہے اور ان پر مال خرچ کرتا ہے "فاللہ تعالی لایترکہ ضائعا جائعا فی الدنیا" تو اللہ تعالیٰ اسے دنیا میں نہ ضائع کرتا ہے اور نہ ہی بھوکا رکھتا ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے

"ان الملک ینادی کل یوم "اللھم یسر لکل منفق خلفا و لممسک تلفا"

بیشک فرشتہ ہر دن یہ دعاء کرتا ہے" اے اللہ خرچ کرنے والے کو اس کے پیچھے اور مال عطاء فرما اور کنجوس و بخیل کے مال کو برباد کردے۔

(۲) انہ یزداد کل یوم فی جاھہ و ذکرہ الجمیل ومیل القلوب الیہ وسکون الناس الیہ و ذلک افضل من المال مع اضدا د ھذہ الاحوال"

اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے والے کا ہر دن مرتبہ بڑھتا رہتا ہے، اور اس کا اچھا ذکر آئے دن زیادہ ہوتا رہتا ہے۔ دل اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور لوگوں کے دلوں کو اس کے ذریعے چین حاصل ہوتا ہے۔ یہ کمالات حاصل ہونا اس کے جمع کرنے سے کہیں بہتر ہیں

(۳) ان الفقراء یعینونہ بالدعوات الصالحۃ" انسان جب اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے اور فقراء کو دیتا ہے تو یقیناً فقراء اس کے حق میں دعاء خیر کرتے ہیں جو حقیقت میں اس کیلئے بہت بڑا تعاون ہے۔

(۴) ان میں چوتھی وجہ یہ ہے کہ جب انسان اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے، اسے خود مال کی طمع، حرص، لالچ نہ ہو اور جب یہ مشہور ہو جائے کہ فلاں شخص تو بڑی محنت ومشقت سے فقراء اور ضعیف لوگوں کی حاجات کو پورا کرنے میں لگا ہوا ہے تو دوسرے لوگ بھی اس کے مال میں کوئی طمع نہیں رکھیں گے،

"فکل احد یحترز عن منازعتہ و کل ظالم و کل طماع لایجوز اخذ شیء من مالہ الانادرا"

بلکہ ہر شخص اس سے جھگڑا کرنے سے اجتناب کرے گا۔ اور ہر ظالم اور ہر طمع ولالچ کرنے والا اس

کا مال لینا جائز نہیں سمجھے گا۔ ہاں نادر طور پر ہوسکتا ہے کوئی ظالم اس کا مال بھی لے لے۔

صدقات کا آخر میں بڑھنا:

﴿وَيُرْبِى الصَّدَقٰتِ﴾ ''اور بڑھاتا ہے (اللہ) صدقات کو۔''

اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صدقات کو آخرت میں بڑھائے گا۔

☆ **عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ من تصدق بعدل تمرة من كسب طيب "ولا يقبل الله تعالى الاطيبا" فان الله تعالى يقبلها بيمينه ثم يربيها اصاحبها كما يربى احدكم فلوه حتى تكون مثل الجبل"** (اخرجه البخاری ومسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اپنے حلال کمائی کے مال سے کھجور کا تھوڑا حصہ صدقہ کرے ''چونکہ اللہ تعالیٰ سوائے حلال کمائی کے صدقہ قبول نہیں فرماتا'' تو بیشک اللہ تعالیٰ اسے اپنے دست قدرت میں صدقہ کرنے والے کیلئے بڑھاتا رہتا ہے جیسا تم میں سے کوئی ایک گھوڑی کے بچے (کی پرورش سے اس) کو بڑھائے، یہاں تک کہ اس کا وہ صدقہ پہاڑ کی طرح ہوجائے گا۔

﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ﴾ ''اور اللہ پسند نہیں کرتا ہر کافر (اور) ہر گنہگار کو''۔

'' ای لایحب کفور القلب اثیم القول والفعل'' (ابن کثیر)

یعنی اللہ نہیں پسند فرماتا ہر اس شخص کو جو سود کے حرام ہونے کا دل سے انکار کر کے کافر ہوجائے اور قول وفعل کی وجہ سے گنہگار ہو چونکہ کفور بمقابلہ شکور بھی استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی میں ہے ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِىْ لَشَدِيْدٌ﴾ اگر تم نے شکر کیا تو میں ضرور زیادہ کروں گا، اور اگر تم نے ناشکری کی تو بیشک میری گرفت بہت سخت ہے۔ یعنی اس مذکورہ بالا آیت میں شکر اور کفر ایک دوسرے کی مقابل استعمال ہیں۔ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ بھی اسی کے بمطابق ہے، (اللہ کو پسند نہیں آتا کوئی ناشکرا بڑا گنہگار)

لیکن راقم نے بعض تفاسیر میں ظاہر طور پر ''کفر'' کے معنی میں استعمال کو دیکھ کر ''ہر کافر'' ترجمہ کیا ہے۔ تا کہ طلباء کرام کو مختلف اقوال ذہن نشین ہوتے چلے جائیں۔

﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ﴾ فاعلم ان الكفار فعال من الكفر ومعناه من كان ذلک منه عادة ،والعرب تسمي المقيم على الشي ء بهذا،فتقول "فلان فعال للخير اماربه "والا اثيم فعيل بمعنى فاعل وهوالآثم وهوايضا مبالغة في الاستمرار على اكتساب الآثام والتمادى فيه وذلک لايليق الابمعنى ينكر تحريم الربافيكون جاحد اوفيه وجه آخر وهوان يكون الكفار راجعا الى المستحل والاثيم يكون راجعا الى من يفعله مع اعتقاد التحريم فتكون الآية جامعةللفريقين" (کبیر)

یعنی آیۃ کریمہ میں جو لفظ "کفار" (بفتح الکاف) استعمال ہے اس کا وزن "فعال" ہے یہ ماخوذ ہے ''کفر'' سے اس وزن پر جب لفظ استعمال ہو تو اس کا معنی ہوگا ''عادت بنالینا'' یعنی ناشکری کرنا ان کی عادت ہے جیسا کہا جائے "فعال للخير" تو اس کا مطلب ہوگا کہ وہ نیکی کا کام کرنا اس نے اپنی عادت بنالی ہے، یوں پتہ چلتا ہے کہ نیکی کے ذریعے ہی اسکی پہچان ہوتی ہے، نیکی اسکی علامت بن گئی ہے۔

﴿اَثِيْمٍ﴾ کا لفظ "فعیل" کے وزن پر ہے جس کا معنی فاعل والا ہے جو مبالغہ پر دلالت کررہا ہے کہ وہ شخص ہمیشہ گناہوں کو کسب کرنے والا ہے اور اس میں آگے سے آگے بڑھنے والا ہے۔ لہذا یہ معنی اسی شخص کے لائق ہے جو سود کے حرام ہونے کا منکر ہوگا۔

اس معنی کے لحاظ سے ''کفار'' کا معنی ناشکرا، سود کھانے کا عادی ہونا، اور اثیم کا معنی کافر ہوگا کہ وہ سود کی حرمت کے انکار کی وجہ سے کافر ہو جائے گا۔ (راقم)

اور ایک وجہ اس میں یہ ہے کہ کفار اسے کہا جائیگا جو سود کو حلال سمجھے، یعنی کفار کا معنی کافر، اور اثیم اسے کہا جائے گا جو سود کے حرام ہونے کا اعتقاد رکھے لیکن سود کھائے ، وہ کافر نہیں ہوگا (کیونکہ حرام کو حرام سمجھ کر کھانے والا گنہگار ہوتا ہے کافر نہیں ہوتا، اور حرام کو حلال سمجھ کر کھانے والا اور حرام کی حرمت کا انکار کرنے والا کافر ہوتا ہے) لہذا آیہ کریمہ

دونوں فریقوں یعنی کفار اور گنہگار مؤمنین کو شامل ہوگئی علامہ رازی کے دوتراجم میں سے تقریباً پہلے کے مطابق اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ہے اور دوسرے معنی کے مطابق راقم کا ترجمہ ہے۔

دینی طلباء کرام کے فائدہ کے لئے:

راقم نے اپنے ترجمہ میں " کَفَّارٍ "اور"اَثِیْمٍ " کے ترجمہ کے درمیان بریکٹ میں"اور" بڑھایا ہے یہ ایسے ہے جیسے کہ" حامد عالم حافظ" میں دونوں خبروں کے درمیان" واؤ عاطفہ" مقدر ہوتی ہے معنی یوں ہوگا حامد عالم اور حافظ ہے۔

طلباء کرام ایک اور ضابطہ کی طرف توجہ فرمائیں:

﴿وَاللّٰهُ لَايُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ﴾ والآية لعموم السلب لالسلب العموم اذلافرق بين واحد وواحد"

آیۃ کریمہ میں عموم سلب پایا گیا ہے کہ ہر فرد کی نفی پائی گئی ہے یعنی مراد یہ کہ اللہ تعالیٰ کس ایک کافر اور گنہگار کو بھی پسند نہیں فرماتا آیۃ کریمہ میں سلب العموم نہیں جس کا معنی کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ تمام کافروں اور گنہگاروں کا پسند نہیں فرماتا معاذ اللہ بعض کو پسند فرماتا ہے یعنی معنی کفریہ ہوگا۔

(از روح المعانی)

ہاں ہاں ظالم بادشاہوں کا یہ طریقہ ہے کہ وہ غریبوں کو چاپلوسی نہ کرنے والوں کو قانون سکھاتے ہیں، لیکن اپنے آپ کو اور چاپلوس چمچوں کو قانون سے بے نیاز سمجھتے ہیں۔

اس آیہ کریمہ پر آیت کو ختم کرنے میں حکمت:

اللہ تعالیٰ نے سودخواروں کی صفت کفر اور گناہ کے ذکر سے آیہ کریمہ کو ختم کر کے یہ واضح فرمایا کہ سودخوار اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر راضی نہیں ہوتے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی قسمت میں رزق حلال کو مشروع کیا ہے اور مباح (جائز) طریقہ سے مال حاصل کرنا ان کے لئے جائز قرار دیا ہے لیکن وہ لوگوں کا مال ناجائز اور باطل طریقہ سے

حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور مختلف خبیث طریقے اور باطل ہتھکنڈے سے مال بٹورنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ان کا یہ طریقہ اور یہ فعل درحقیت اللہ تعالی کی نعمتوں کا انکار ہے، اور لوگوں کا مال باطل طریقہ سے کھانے کی وجہ سے وہ ظالم اور بہت بڑے گنہگار ہیں۔ (ابن کثیر)

﴿وَاللّٰهُ لَايُحِبُّ﴾ای یبغض :

اللہ تعالی کے محبت نہ کرنے اور پسند نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی ہر کافر اور گنہگار سے ناراض ہوتا ہے۔رب تعالی قادر وقیوم اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے گویا کہ بندوں کے اچھے افعال ہی اس کی محبت کا تقاضا ہیں۔

"ولا ینتفی المحبة الابعارض یوجب البغض وھو الکفر"

اللہ تعالی کی محبت کرنے کی نفی وزوال نہیں سوائے کسی ایسے عارضہ کے جو بغض اور کفر سے ثابت کریں۔

ومن ثم "قال رسو ل اللہ ﷺ الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ"

(رواہ البیھقی فی الشعب عن عبداللہ)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مخلوق اللہ تعالی کی محبوب ہے جو اللہ تعالی کے محبوب لوگوں سے محبت کرتے ہیں اور ان پر احسان کرتے ہیں وہی اللہ تعالی کو محبوب ہیں۔ (مظہری)

تنبیہ : حدیث شریف میں "عیال اللہ "کا حقیقی معنی مراد نہیں لیا جا سکتا کیونکہ اللہ تعالی "عیال" (اولاد) سے پاک ہے اسلئے مجازی معنی مراد ہے یعنی جس طرح بندے اپنی اولاد سے محبت کرتے ہیں اسی طرح (بلاتشبیہ وتمثیل) اللہ تعالی اپنی مخلوق سے محبت کرتا ہے۔ (راقم)

﴿كُلَّ كَفَّارٍ﴾ "مصر علی تحلیل المحرمات ﴿اَثِيْمٍ﴾ منھمک فی الاثام"

اللہ تعالی پسند نہیں فرماتا یعنی ناپسند کرتا ہے اور بغض رکھتا ہے (جو اس کی شان کے لائق ہے) ہر کافر سے جو حرام چیزوں کے حلال ہونے پر اصرار کرتا ہے اور گنہگار سے جو گناہوں میں منہمک

ہوتا ہے (یعنی گناہوں میں گھرا رہتا ہے)۔ (مظہری)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ☆ (آیۃ نمبر ۲۷۷)

﴿۱﴾

بیشک وہ جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے اور نماز قائم کی اور زکوٰۃ دی ان کا نیک ان کے رب کے پاس ہے اور نہ انہیں کچھ اندیشہ ہو نہ کچھ غم۔

﴿۲﴾

بیشک وہ جنہوں نے ایمان لایا اور عمل کیے اچھے، اور قائم کی نماز، اور دی زکوٰۃ ان کیلئے ان کا اجر ان کے رب کے ہاں ہے، اور نہیں خوف ان پر اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔

ماقبل سے تعلق:

اللہ تعالی نے اس سے پہلی آیۃ میں سود کو حلال سمجھ کر کھانے والے کفار کا ذکر فرمایا اور سود کو حرام سمجھ کر کھانے والے گنہگار ظالموں کا ذکر فرمایا، اب اسی آیۃ کریمہ میں مومنین و مطیعین کا ذکر فرمایا "انما الاشیاء تعرف باضدادھا" کیونکہ چیزوں کی اپنی ضدوں سے پہچان ہوتی ہے، اس آیۃ کریمہ میں ان لوگوں کی مدح فرمائی جو اپنے رب پر ایمان رکھتے ہیں۔ نماز ادا کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں یعنی وہ اپنے رب تعالی کے حکم کے مطیع ہیں اور اس کا شکر ادا کرنے والے ہیں اور اس کی مخلوق پر احسان کرتے ہیں، پھر اللہ تعالی نے قیامت کے دن وہ جس کرامت کے مستحق ہوں گے اس کا تذکرہ فرمایا۔ (از صابونی، ابن کثیر)

"اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" "بیشک وہ جنہوں نے ایمان لایا"

"باللہ ورسولہ ﷺ وبما جاء ھم بہ"

یعنی وہ لوگ جنہوں نے اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لایا اور جو ان کے پاس رسول اللہ ﷺ یعنی قرآن وحدیث پر ایمان لائے۔ (روح البیان)

جب قرآن وحدیث پر ایمان ہوگا تو یقیناً فرشتوں پر بھی ایمان ہوگا، اور تمام انبیاء کرام کے نبی ہونے پر بھی ایمان ہوگا۔ اور تمام آسمانی کتابوں پر بھی ایمان ہوگا، خیر وشر کی تقدیر پر بھی ایمان ہوگا اور قیامت کے دن پر بھی ایمان ہوگا رسول اللہ ﷺ کے خاتم النبیین ہونے پر بھی ایمان ہوگا، رسول اللہ ﷺ کے افضل الانبیاء ہونے پر بھی ایمان ہوگا غرضیکہ الفاظ مبارکہ ﴿ان الذین آمنوا﴾ "بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے" تمام ایمانیات کو شامل ہیں۔ ہاں ہاں یہی وجہ ہے کہ بے ساختہ زبان سے نکلتا ہے "اے قرآن تیری عظمت پہ قربان" (راقم)

﴿وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ "اور اچھے عمل کئے"

ای الطاعات : یعنی وہ اعمال کئے جن میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طاعت (فرمانبرداری) پائی گئی۔

(روح البیان)

اگرچہ روح البیان کی تفسیر "الطاعات" کے الفاظ سے بھی اس پر دلالت کر رہی ہے کہ طاعت وہی ہوتی ہے جس میں اوامر (جن چیزوں کا حکم دیا جائے) پر عمل کیا جائے، اور نواہی (جن چیزوں سے روکا جائے) سے انسان باز آجائے، تاہم قاضی مظہری رحمۃ اللہ نے بہت خوب اور واضح معنی لکھا۔

(وعملو الصالحات) اتوا بما امرھم اللہ علی لسان رسلہ وانتھوا عما نھی عنہ ومنہ الربوا" **(مظھری)**

اور اچھے عمل کرنے سے مراد یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ وہ ان چیزوں پر عمل کریں جو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی زبانی سے سنا ہے۔ تو وہ اس حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں تو یہ ان کے اچھے اعمال ہوئے، اور جن

چیزوں سے اللہ تعالی اوراس کے رسول ﷺ نے روکا ہے وہ اس سے رک کر اچھے اعمال پر عمل کرتے ہیں۔

چونکہ نواہی سے رک جانا بھی اعمال صالحہ میں داخل ہے تو اس آیۃ کا ماقبل اور مابعد سے رابطہ و تعلق بھی واضح ہوگیا نیز ربوا (سود) بھی ان چیزوں میں داخل ہے جن سے روکا گیا ہے اور حرام کیا گیا ہے، گویا کہ ﴿وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾ سود سے ... رک جانے والوں کی شان بیان کی گئی کہ وہ نیک اعمال کرنے والے بن گئے۔

"وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ" "اور انہوں نے نماز قائم کی اور زکوۃ دی"

نماز اور زکوۃ کا ذکر اعمال صالحہ کے بعد کرنے کیا وجہ ہے جبکہ یہ دونوں بھی اعمال صالحہ میں داخل ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے۔

"خصهما بعد التعميم لاظهار شرفهما فانهما رأس العبادات البدنية والمالية"

کہ ان دونون کو اعمال صالحہ کے عموم کے بعد خاص کر کے علیحدہ ذکر کیا گیا ہے کہ ان کو بلند مقام حاصل ہے، اسلئے کہ نماز عبادات بدنیہ کی سردار ہے اور زکوۃ عبادات مالیہ کی سردار ہے۔ (مظہری)

"لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ" "ان کیلئے ان کا اجران کے رب کے ہاں ہے"۔

"لهم اجرهم الموعود لهم حال كونه (عندربهم)"

یعنی ایمان لانے اور نیک اعمال کرنے پر اللہ تعالی کی طرف سے جو وعدہ ان سے کیا گیا ہے وہ اجر وثواب رب کے پاس ہی ہے، یقیناً اس نے اپنے وعدہ کے مطابق عطاء کرنا ہی ہے اس کی شان ہی یہ ہے ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادِ﴾ بے شک اللہ وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

(از روح البیان)

"وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ"

"اور نہ خوف ہے ان پر اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے"۔

"﴿وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ﴾ من مكروه آت ﴿وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ من محبوب فات" (روح البیان)

ان کو کسی مکروہ چیز کے آنے کا کوئی خوف نہیں ہوگا، اور نہ ہی وہ کسی محبوب چیز کے فوت ہونے کی وجہ سے غمگین ہوں گے۔

فقال ابن عباس "لا خوف عليهم "فيمايستقبلهم من احوال القيامة و لاهم يحزنون بسبب ماتركوه فى الدنيا.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایمان والے اور اچھے اعمال والے لوگوں کو قیامت کے آنے والے دن کا کوئی خوف نہیں ہوگا اور وہ دنیا میں جو چیزیں چھوڑ کر جائیں گے، ان کے چھوڑنے پر ان کو کوئی غم نہیں ہوگا۔

عجیب بات یہ ہے انسان فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ جب وہ ایک حال سے دوسرے بلند حال کی طرف منتقل ہوتا ہے تو اس کو پہلے منصب سے ہٹنے کا افسوس ہوتا ہے حالانکہ اس کے بلند مقام کی طرف ترقی پر لوگ شک کر رہے ہوتے ہیں، "لاجل ألفه وعادته" اصل وجہ یہی ہے کہ انسان کو پہلے حال اور منصب سے الفت ہو چکی تھی اور اس کی عادت میں وہ کام رچ بچ چکا تھا جس کی وجہ سے وہ اس کے ترک پر غمزدہ ہوتا ہے،

"فبين الله تعالى ان هذا القدر من الغصة لايلحق اهل الثواب والكرامة"

اس آیۃ کریمہ میں اللہ تعالی نے ایمان والے اور نیک عمل کرنے والے حضرات کا ذکر کیا جو ثواب اور کرامت کے مستحق ہیں، ان کو منصب کی بلندی سے یہ پریشانی لاحق نہیں ہوگی۔

اصم کہتے ہیں کہ انہیں قیامت کے دن کوئی خوف نہیں ہوگا۔ اور نہ ہی انہیں اس کا غم ہوگا کہ ہم نے دینا میں اور زیادہ عبادت کیوں نہیں کی تھی کہ ہمیں بھی فلاں شخص کی طرح منصب حاصل ہوتا، اس لئے کہ قیامت کے دن ایک دوسرے سے برتری حاصل کرنے کا کوئی مقابلہ نہیں ہوگا، اور نہ ہی ایک دوسرے سے کوئی حسد ہوگا۔ نیک لوگ اپنے اپنے کئے ہوئے اعمال کے مطابق حاصل ہونے والے مدارج اور کمالات پر صابر و شاکر ہوں گے۔ "وذلك لأن هذه الخواطر لاتوجد فى الأخرة" اس کی وجہ صرف یہی ہوگی کہ آخرت میں اس قسم کے خیالات نیک لوگوں کے دل میں نہیں کھٹکیں گے۔ (ماخوذ از کبیر)

دینی مدارس کے طلباء کرام توجہ فرمائیں:

احتج من قال بأن العمل الصالح خارج عن مسمى الايمان بهذه الأية فانه قال ﴿ان

الذین امنوا وعملو الصالحات﴾فعطف عمل الصالحات علی الایمان والمعطوف مغایر للمعطوف علیه"

اس آیہ کریمہ سے ایک مسئلہ ثابت ہوا کہ حقیقت میں ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے۔ دل میں ایمانیات کی تصدیق پائی گئی تو ایمان حاصل ہوگیا۔ نیک اعمال ایمان کا جزء نہیں کہ نیک اعمال حاصل نہ ہوں تو ایمان ہی حاصل نہ ہو ہاں البتہ نیک اعمال کمال ایمان کی علامت ہیں اور ظاہری طور پر کسی کو ایماندار سمجھنے کیلئے نیک اعمال کو ہی دلیل بنایا جائے گا۔

یہ مسئلہ کیسے سمجھ آیا، یہ مسئلہ عربی گرائمر کے ایک ضابطہ وقانون سے سمجھ آیا وہ ضابطہ وقان یہ ہے کہ عطف مغایرت کیلئے آتا ہے۔ معطوف اور معطوف علیہ میں مغایرت پائی جاتی ہے، جس طرح کہا جائے "جاء حامد وشاهد" حامد اور شاہد آئے۔ تو اس مثال میں حامد معطوف علیہ ہے اور شاہد معطوف ہے۔ دونوں علیحدہ علیحدہ شخص ہیں، حامد اور شاہد سے مراد ایک ہی شخص نہیں۔

اسی طرح کوئی شخص کہے "حامد صلی وصام" حامد نے نماز ادا کی اور روزہ رکھا، اس مثال میں "صلی" معطوف علیہ ہے، اور "صام" معطوف ہے۔ نماز اور روزہ دو علیحدہ علیحدہ عبادتیں ہیں ایک نہیں۔

آیۃ کریمہ میں بھی "اٰمَنُوْا" معطوف علیہ ہے، یہ اور "وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" معطوف ہے۔ جب عطف مغایرت پر دلالت کرتا ہے تو اسی سے پتہ چل گیا کہ ایمان اور چیز ہے اور اعمال صالحہ اور چیز ہیں۔ اس کی زیادہ تفصیل سورۃ بقرۃ کی ابتداء میں دیکھی جائے۔ (ماخوذ از کبیر)

اعتراض : یہ ضابطہ تو درست نہیں کیونکہ اسی آیۃ کریمہ میں "وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" پھر معطوف علیہ ہے اور "وقاموا الصلوۃ وأتوا الزکوۃ" معطوف ہیں۔

"مع انه لانزاع ان اقامة الصلوۃ وایتاء الزکوۃ داخلان تحت وعملوا الصالحات وکیف ماذکرتم"

حالانکہ ان میں کوئی مغایرت نہیں۔ اور نہ ہی اس میں کسی کا اختلاف ہے کہ نماز کا قائم کرنا اور زکوۃ

دینا اعمال صالحہ کا حصہ نہیں۔ بلکہ بالاتفاق یہ ثابت ہے کہ یہاں معطوف داخل ہے معطوف علیہ میں، تو پھر تمہارا ضابطہ کس طرح درست ہوا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ارشادگرامی "اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَکَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا" میں "معطوف علیہ ہے اور "کَذَّبُوْا" معطوف ہے، ان میں بھی کوئی مغایرت نہیں پائی گئی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانا کفر ہے، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کفر اور چیز ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکنا یا اللہ تعالیٰ کی آیات کی تکذیب اور چیز ہے۔ تو تمہارا ضابط کس طرح درست رہا۔

جواب : عطف کی دو قسمیں ہیں۔ حقیقی معنی عطف کا یہی ہے کہ معطوف اور معطوف علیہ میں مغایرت پائی جائے لیکن عطف کی دوسری قسم یہ ہے کہ عطف پہلے کی وضاحت کیلئے آتا ہے۔ یہ عطف کا مجازی معنی ہے جسے نحو (عربی گرائمر) میں عطف تفسیری کہا جاتا ہے۔

"ان الاصل حمل کل لفظة علی فائدة جدیدة ترک العمل به عند التعذر فیبقی فی غیر موضع التعذر علی الاصل"

اصل قانون وضابطہ یہ ہے کہ ہر لفظ کا حقیقی معنی لیا جائے تاکہ وہ نئے نئے مقاصد پر دلالت کرے، ہاں اگر حقیقی معنی لینا متعذر (مشکل) ہو جائے تو مجازی معنی لے لیا جائے جو پہلے معنی کی وضاحت کرے، تقریباً ضوابط کی طرف نظر کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے "الحقیقة اولی من المجاز" حقیقت پر عمل کرنا مجاز پر عمل کرنے سے بہتر ہے بلکہ جب تک حقیقی معنی لینا ممکن ہو مجازی معنی نہ لیا جائے "التجدید اولی من التفسیر" نیا معنی لینا زیادہ بہتر ہے بنسبت پہلے معنی کی تفسیر (وہی معنی لینے) سے بہتر ہے۔ "التأسیس أول من التاکید" تاکید کی بنسبت نیا معنی لینا زیادہ بہتر ہے۔ (ماخوذ از کبیر تصرف برائے افادہ طلباء)

سوال : اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ میں نیک اعمال پر جزاء خیر اور اجر وثواب کو مرتب فرمایا ہے حالانکہ کبھی بغیر نیک اعمال کے بھی اجر وثواب حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک عورت حالت ایمان میں بالغ ہوئی، یعنی اس کی بلوغت ہی

حیض سے ہوئی حیض کے ختم ہونے کے ساتھ ہی یا حیض کے ختم ہونے سے پہلے اس کی وفات ہوگئی۔تو ہو بالاتفاق اجروثواب کی مستحق ہے۔اسی طرح ایک لڑکا حالت ایمان میں بالغ ہوا، نماز کا وقت پالینے سے پہلے اور زکوۃ کے وجوب سے پہلے ہی فوت ہوگیا تو وہ بھی اجروثواب کا مستحق ہے اس میں بھی اتفاق ہے۔

''وایضامن مذهبنا ان الله تعالی قد یشیب المؤمن الفاسق الخالی عن جمیع الأعمال''

اور یہ بھی ہمارا مذہب وعقیدہ ہے کہ بیشک اللہ تعالی اس مؤمن کو بھی ثواب عطاء فرمادے گا جو فاسق وفاجر ہوگا اور تمام اعمال صالحہ سے خالی ہوگا۔تو اعمال صالحہ پر اجروثواب کو مرتب کرنا کس طرح درست ہے۔

جواب: آیۃ کریمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ نیک اعمال پر اللہ تعالی اجروثواب عطاء فرمائے گا، کسی کے اعمال رب کے حضور ضائع نہیں ہوں گے، یہاں یہ ذکر نہیں کیا گیا کہ اجروثواب اعمال صالحہ سے مشروط ہے۔اللہ تعالی نیک اعمال کے ذریعے اجروثواب عطاء فرمادے یا اپنے فضل وکرم کے ذریعے اجروثواب عطاء فرمادے جیسا کہ رب تعالی کا ارشادگرامی ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰہ لایغفرُ اَن یُشرک بہ ویَغفِرُ مادُونَ ذٰلک لِمنْ یَّشاءُ﴾

بیشک اللہ تعالی شرک کی مغفرت نہیں کرے گا اور اس کے بغیر جس کی چاہے مغفرت فرمادے۔

پھر اگر غور کیا جائے تو یہ بھی واضح ہوجائے گا کہ ایمان سب سے اعلی عبادت ہے، جب ایمان ایک شخص کو حاصل ہوگیا تو وہ صرف ایمان کی وجہ سے ہی قابل بخشش ہوگیا، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

''من قال لاالہ الااللہ دخل الجنة'' جس شخص نے کہا ''لاالہ الااللہ'' وہ جنت میں داخل ہوگیا۔(ماخوذ از کبیر بتصرف)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

'' واقیموا الصّلوۃ واتوا الزّکوۃ '' میں ''اٰتوا'' امر کا صیغہ ہے اصل میں ''اَءْ تِیُوا'' ہے۔ اَکْرِمُوا کے وزن پر۔

''واقاموا الصّلوۃ واٰتوا الزّکوۃ'' میں'' اٰتـوا '' ماضی کا صیغہ، واؤ کو ضمہ دیا گیا ہے التقاء ساکنین کی وجہ سے،

اصل میں "اِءْ تَیُوْا" ہے "اَکْرِمُوْا" کے وزن پر۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ☆ (آیة نمبر ۲۷۸)

(۱) اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا سود اگر مسلمان ہو۔

(۲) اے لوگو جو ایمان لائے ہو ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا ہے سود اگر تم (کامل) ایمان والے ہو۔

شان نزول:

اس آیۃ کریمہ کے شان نزول میں چند وجہ بیان کی گئی ہیں جو حقیقت میں تمام ہی شان نزول ہیں۔

(۱) ابن جریج سے روایت ذکر کی، اور ابن ابی حاتم نے مقاتل سے روایت ذکر کی کہ یہ آیۃ کریمہ عمرو بن عمیر بن عوف ثقفی کے چار بیٹوں کے بارے میں نازل ہوئی، ان چار کے نام یہ ہیں "مسعود بن عمرو، عبد یالیل بن عمرو، ربیعہ بن عمرو، حبیب بن عمرو، یہ لوگ سود کا مطالبہ کرنے والے تھے بنو مخزوم قبیلہ بنو مغیرہ سے کیونکہ یہ دونوں قبیلے زمانہ جاہلیت میں سود کا کاروبار کرتے تھے، بنو ثقیف بنو مخزوم کو سود کے طور پر قرضہ دیا کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے بنو ثقیف سے صلح کر لی تھی۔

فتح مکہ میں عتاب بن اسید کو مکہ مکرمہ کا عامل (گورنر) بنا دیا گیا تھا، سودی مال کثیر تعداد میں بنو ثقیف نے بنو مغیرہ سے لینا تھا۔ اب یہ دونوں فریق اسلام قبول کر چکے تھے۔ بنو ثقیف نے اپنے سابقہ سودی مال کا بنو مغیرہ سے مطالبہ کیا۔

"فقال بنو المغيرة والله لانعطى الر بافى الاسلام وقدووضعه الله ورسول عن المسلمين"

تو بنو مغیرہ نے کہا قسم ہے اللہ تعالی کی ہم مسلمان ہو کر سودی مال نہیں دیتے جبکہ اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ نے مسلمانوں سے سود کو ہٹا دیا ہے۔ یعنی سود کو حرام کر دیا گیا ہے (لهذا اب زمانہ،

جاہلیت کے سود کا بھی مطالبہ نہیں کیا جا سکتا، ہو سکتا تھا کہ دونوں گروہوں کے درمیان لڑائی ہو جائے) اس معاملہ کو دیکھ کر حضرت معاذ بن جبل اور ایک قول کے مطابق عتاب بن اسید نے رسول اللہ ﷺ کی طرف خط لکھا کہ بنو عمرو ثقفی بنوالمغیرہ سے سابقہ سود لینے کا مطالبہ کر رہے ہیں، تو اس وقت یہ آیۃ کریمہ اور آنے والی آیۃ کریمہ نازل ہوئیں۔

فکتب رسول الله ﷺ الی معاذبن جبل ان اعرض علیهم هذه الأیة فان فعلوا فلهم رؤوس اموالهم وان أبوا فأذنهم بحرب من الله ورسوله"

تو رسول اللہ ﷺ نے معاذ بن جبل (یا عتاب بن اسید) کی طرف خط لکھا کہ ان (بنو ثقیف) پر یہ آیات پیش کر دو، اگر وہ اس پر عمل کریں تو اپنا اصلی مال (جو بطور قرض انہوں نے دیا تھا) واپس لے سکتے ہیں اور اگر وہ (حکم ماننے سے) انکار کر دیں تو ان کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کرنے کی اطلاع دے دو۔ (درمنثور)

(۲) یہ آیۃ کریمہ اہل مکہ کے بارے میں نازل ہوئی، جبکہ اہل مکہ کثیر تعداد میں سودی کاروبار کرتے تھے، سود کی حرمت پر انہوں نے خیال کیا کہ یہ حکم آج سے بعد کیلئے ہے، اس سے پہلے کا سودی مال ہم لے لیتے ہیں، تو یہ آیۃ کریمہ نازل فرما کر سابقہ سودی مال لینے سے بھی منع کر دیا گیا، البتہ ان کو اپنا دیا ہوا مال لوٹانے کی اجازت فرما دی۔ (کبیر)

(۳) عطاء او عکرمہ رضی اللہ عنہما کا قول یہ ہے کہ آیۃ کریمہ حضرت عباس اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے متعلق نازل ہوئی کیونکہ ان دونوں نے کھجوریں بطور قرض دی ہوئی تھیں، جب کھجوروں کے توڑنے کا وقت آیا تو انہوں نے کچھ کھجوریں لے لیں اور باقی میں سود بڑھا دیا، سود کی حرمت کے بعد خیال آیا کہ آج سے پہلے جو سود لینا تھا وہ لے لیا جائے، حرام تو اب ہو رہا ہے، تو آیۃ کریمہ کا نزول ہو جس سے ان حضرات کو سابقہ سود لینے سے منع کر دیا گیا۔ (کبیر)

(۴) حضرت سدی رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ سود کے حرام ہونے سے پہلے حضرت عباس اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہما سودی کاروبار کرتے تھے، سود کی حرمت کے بعد ان کو سودی مال (جو حرمت سے پہلے لینا تھا) لینے سے

منع کر دیا گیا۔

"قال النبی ﷺ فی حجة الوداع فی خطبته یوم عرفة الا کل شئی من امر الجاهلية تحت قدمی موضوع ودماء الجاهلية موضوعة وان اول دم اضعه من دمائنا دم ربيعة بن الحارث کان مسترضعا فی بنی سعد فقتله هزیل وربوا الجاهلية موضوعة واول ربوا اضعها ربوا عباس بن عبدالمطلب فانها موضوعة کلها"

نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع میں عرفہ کے دن (۹ ذی الحج) کو دوران خطبہ ارشاد فرمایا خبردار زمانہ جاہلیت کے تمام امور (تمام رسوم، اور تمام طور وطریقے) میرے قدم کے نیچے رکھ دیے گئے (یعنی تمام کو ختم کیا جارہا ہے) زمانہ جاہلیت کے خونوں کے بدلہ کو ختم کیا جارہا ہے، بیشک سب سے پہلے میں اپنے خاندان کے خون کے بدلہ کو ختم کررہا ہوں۔ وہ خون ربیعہ بن حارث کا ہے جو بنی سعد میں دودھ پلانے کیلئے چھوڑا گیا تھا، جسے ہزیل نے قتل کر دیا تھا۔اور زمانہ جاہلیت کے سود کو ختم کیا جارہا ہے، بیشک سب سے پہلے میں عباس بن عبدالمطلب کے سود کو ختم کررہا ہوں، بیشک (زمانہ جاہلیت کے) تمام امور کو ختم کیا جارہا ہے۔

قاضی مظہری رحمۃ اللہ اس حدیث پاک کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ حدیث مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے، تاہم مسلم نے یہ ذکر نہیں کیا کہ آیۃ کریمہ کے نزول کا یہ سبب ہے۔(مظہری)

راقم کے نزدیک اگرچہ حدیث پاک کا تعلق شان نزول سے نہ ہی ہو لیکن آیۃ کریمہ کی وضاحت اور تشریحات میں ذکر کرنا تو ہر حال میں درست ہے۔

مقام توجہ : راقم نے "ان کنتم مؤمنین" کے ترجمہ میں (اگر تم کامل ایمان والے ہو) لفظ "کامل" بریکٹ میں بڑھایا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ شان نزول کی جو وجوہ بیان کی گئی ہیں ان تمام سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ خطاب مومنوں کو ہے۔

مومنوں کو پھر یہ کہنا کہ "اگر تم ایمان والے ہو" کا کیا مطلب ہے۔اسی کے جواب کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے مفسرین کرام نے ''اگر تم کامل ایمان والے ہو'' سے وجہ بیان کی ہے کہ مطلق ایمان کا ذکر نہیں بلکہ کمال ایمان کا ذکر ہے۔''ان کنتم مؤمنین '' کامل الایمان''اگر تم کامل ایمان رکھتے ہو۔(تفسیرات احمدیہ)

ان کنتم مؤمنین '' کامل الایمان فان دلیله کماله امتثال المأ موربه '' (مدارک)

اگر تم کامل رکھتے ہو۔ بیشک کمال ایمان کی یہ دلیل ہے کہ وہ شخص رب تعالی اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کو مانتا ہے۔

''ان کنتم مؤمنین '' یعنی ان کنتم محققین لأ یما نکم قولا وفعلا '' (خازن)

اگر تم اپنے ایمان پر قول وفعل کے لحاظ پر ثابت قدم ہو۔

''ان کنتم مؤمنین '' عن صمیم القلب فان دلیله امتثال ماأ مرتم به ''(روح المعانی ، بیضاوی)

اگر تم صمیم قلب سے ایمان والے ہو،دل کے پکے ارادہ سے ایمان پر یہی دلیل ہے کہ وہ اوامر کے مطابق عمل کریں۔

ایک نظریہ اور اس کا رد، ایک قول یہ پیش کیا گیا ہے کہ جب انسان گناہ کبیرہ پر اصرار کرے تو ہو کامل ایمان والا نہیں ہوتا۔ اسلئے کہ مطلقا ایمان والا وہ شخص ہوتا ہے جو کبائر سے اجتناب کرے اس قول کا رد یوں پیش کیا گیا ہے کہ ﴿الذین یؤمنون بالغیب﴾ کی تفسیر میں کثیر دلائل سے ثابت کیا جاچکا ہے کہ اعمال نفس ایمان سے خارج ہیں۔

''ھذہ الأیة محمولة علی کمال الایمان وشرائعه فکان التقدیر '' ان کنتم عاملین بمقتضی شرائع الایمان ''

کہ''ان کنتم مؤمنین '' کا مطلب یہ ہے اگر تم شرائع ایمان کے تقاضا کے مطابق عمل کرنے والے ہو۔یعنی کریمہ میں مراد کمال ایمان اور شریعت کے تقاضا کے مطابق عمل کرنا۔ (کبیر)

علامہ رازی رحمۃ اللہ کی تحقیق سے بھی پتہ چلا کہ مراد یہاں آیۃ کریمہ میں کمال ایمان ہے۔مفسرین کرام کے ان اقوال کے بعد ایک بات زیر غور ہے کہ اعلی حضرت رحمہ اللہ اس قسم کے مقامات میں کسی نہ کسی لفظ کی زیادتی کرکے اشارہ ضرور فرماتے ہیں، یہاں آپ نے مطلقا ترجمہ یہ کیا''اگر مسلمان ہو'' ہوسکتا ہے آپ نے اس خیال سے اس کی طرف اشارہ نہ فرمایا ہو کہ یہ مسئلہ واضح ہے، ماقبل اور مابعد سے سمجھ آرہا ہے اور ہوسکتا ہے کہ آپ کے نزدیک کبیر اور جصاص کا ایک قول معتبر ہو کہ ﴿ یاایھا الذین امنوا ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جو ظاہر طور پر ایمان لائے تھے اور دل سے ایمان نہیں لائے تھے۔مزید تفصیل ان شاءاللہ آنے والی آیۃ کریمہ کی وضاحت میں آجائے گی۔

"فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَاتَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ" (آیة نمبر ۲۷۹)

(۱) پھر اگر ایسا نہ کرو تو یقین کرلو اللہ اور اللہ کے رسول سے لڑائی کا اور اگر تم توبہ کرو تو اپنا اصل مال لے لو نہ تم کسی کو نقصان پہنچاؤ نہ تمہیں نقصان ہو۔

(۲) پھر اگر نہ کرو تم تو یقین کرلو لڑائی کا اللہ اور اس کے رسول سے، اور اگر تم نے توبہ کرلی تو تمہارے لئے تمہارے اصل مال ہیں۔ نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾

''پھر اگر نہ کرو تم یقین کرلو لڑائی کا اللہ اور اس کے رسول سے''

﴿''فاذنوا''﴾ ایک قراءت میں یہ صیغہ امر حاضر معلوم باب سمع یسمع سے لیا گیا ہے، یہ ماخوذ ہے ''اذن'' سے اس کا معنی ہے ''کونوا علی علم واذن'' تمہیں علم اور خبر حاصل ہو۔ (کبیر)

اسی وجہ سے بعض مفسرین کرام نے ''فاذنوا'' کا ترجمہ ''اعلموا'' سے کیا ہے۔ جان لو، خبر رکھو،

''فاذنوا'' ای فایقنوا وبذلک قرأ الحسن وهو التفسیر المأثو عن ابن عباس رضی الله عنهما''

مذکورہ بالا قراءت کے مطابق ہی 'فاذنوا' کا معنی ہے 'تم یقین کرلو' اس معنی کو حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کی قراءت سے تائید حاصل ہے، کیونکہ ان کی قراءت میں 'فَایقنوا' ہے 'فَاذنوا' کی جگہ پر، جس کا معنی ہی واضح طور پر یہ ہے 'تم یقین کرلو' (روح المعانی)

یہی ترجمہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ہے اور راقم نے بھی یہی نقل کیا ہے۔ چونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی ''فاذنوا'' کا ترجمہ ''فایقنوا'' کیا ہے،

☆ واخرج ابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم عن ابن عباس فی قوله فاذنوا

بحرب قال استیقنوا بحرب "

ابن جریر اور ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ وہ ﴿فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ﴾ کا معنی یہی کرتے تھے تم یقین کرلو لڑائی کا۔

حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمۃ اللہ نے ترجمہ کیا ہے "تو اعلان جنگ سن لو" (ضیاء القرآن)

یہ ترجمہ بھی بہت خوب ہے جو مفردات راغب میں بیان کیا گیا ہے۔

"واذن" استمع نحو قوله تعالى (واذنت لربها حقت) ويستعمل ذلک فی العلم الذی یتوصل الیه بالسماع نحو قوله تعالى ﴿فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ والأذان لما یسمع ویعبر بذلک عن العلم اذهو مبدأ کثیر من العلم فینا "

""اذن" کا معنی ہے اس نے سنا، سننے والا معنی اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿اذا السماء انشقت واذنت لربها حقت﴾ "جب آسمان شق ہو اور اپنے رب کا حکم سنے اور اسے سزاوار ہی ہے" میں استعمال ہے۔ پھر اس معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے کہ اسے سن کر علم حاصل ہوا، جیسا کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ میں استعمال ہے۔ عام طور پر اس معنی میں استعمال ہوتا ہے کہ "سننا" علم کا ذریعہ بن جائے۔ (مفردات راغب)

مفردات راغب کی بحث کو دیکھیں اور ضیاء القرآن کے ترجمہ کو دیکھیں تو یہ ترجمہ بھی خوب ترین نظر آئے گا۔

ایک قراءت میں "فاذنوا" الف ممدودہ سے پڑھا گیا ہے، باب افعال ہے ائذان (ایذان) سے لیا ہوا ہے جس کا معنی ہے "غیر کو خبر دینا" اب اس معنی کے لحاظ پر مطلب یہ ہوا

"فاعلموا من لم ینته عن الربوا بحرب من الله ورسوله، واذا أمروا بأعلام غیرهم ایضاقد علموا ذلک "

کہ تم ان لوگوں کو بتادو جو سود سے نہیں رکتے کہ اللہ اور اس کے رسول اللہ علیہ وسلم سے لڑائی کرنے کو تیار ہو جاؤ، جب انہیں حکم دیا گیا کہ تم اوروں کو بتادو، تو اسی سے پتہ چل گیا کہ ان کو خود بھی یہ علم

حاصل ہو جائے گا کہ سود سے نہ رکنے پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے اعلان جنگ ہے۔

یہ خطاب کسے اور ''اگر تم نہ کرو'' سے مراد کیا؟

ایک قول اس میں یہ ہے کہ یہ خطاب کفار کو ہے اب اس سے پہلی آیۃ اور اس آیۃ کا مفہوم یہ ہو گیا۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا خطاب للكفار وان معنى الأية ﴿وَذَرُوْا مَابَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ معترفين بتحريم الربوا ﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا﴾ اى فأن لم تكونوا معترفين بتحريمه) ﴿فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾

آیۃ کریمہ میں خطاب کفار کو ہے، بیشک آیۃ کریمہ ﴿وَذَرُوْا مَابَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم سود کے حرام ہونے کا اعتراف کرتے ہو تو جو سود تمہارا باقی رہتا ہے اسے چھوڑ دو، اب اس زیر بحث آیۃ کا مطلب یہ ہو گیا، اگر تم نہ کرو یعنی اگر تم سود کے حرام ہونے کا اعتراف نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے لڑائی کرنے کا یقین کر لو۔

جن حضرات کا یہ قول ہے وہ یہ کہتے ہیں شریعت کے کسی ایک حکم سے انکار اسی طرح کفر ہے جسطرح شریعت کے تمام احکام سے انکار کفر ہے، بلکہ شرعی ایک امر کا انکار جمیع امور کے انکار کو مستلزم ہے۔ (کبیر)

☆ وقد روى ان النبى ﷺ كتب الى اهل نجران وكانوا ذمة نصارى امان تذرو الربوا واما ان تأذنوا بحرب من الله ورسوله " (احکام آلقرآن للجصاص)

ایک روایت میں یہ ذکر ہے کہ نبی کریم ﷺ نے نجران کے ذمیوں کی طرف لکھا کہ یا سود کو چھوڑ دو، یا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے لڑائی کا یقین کر لو۔

☆ "عن ابى مليح الهذلى ان رسول الله ﷺ صالح اهل نجران فكتب اليهم كتابا فى آخره على ان لاتأكلوا الربوا فمن أكل الربوا فلمتى بريئة " (احکام القرآن للجصاص)

ابو ملیح ہذلی کہتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے اہل نجران سے صلح کی تو ان کی طرف خط لکھا جس کے

آخر میں آپ نے یہ لکھا کہ سود نہ کھاؤ، جس شخص نے سود کھایا وہ میری ذمہ داری سے بری ہے۔ یعنی اس کے مال اور جان کے ہم محافظ نہیں۔

دوسرا قول: اس میں یہ ہے کہ یہ حکم مسلمانوں کو ہے:

"ان قوله (فأذنوا) خطاب مع قوم تقدم ذکر وهم المخاطبون بقوله (یاایها الذین امنوا اتقوا الله وذروا مابقی من الربوا) وذلک یدل علی ان خطاب مع المؤمنین "

یعنی اللہ تعالیٰ کا ارشادگرامی " فأذنوا " اور "وذروا" کا خطاب ایک ہی قوم کو ہے، اس قوم کا ذکر رب تعالیٰ نے اپنے اس ارشادگرامی میں واضح کردیا "یاایها الذین امنوا اتقو الله " اے ایمان والو اللہ سے ڈرو" اس بحث سے واضح ہوا کہ یہ خطاب مومنوں کو ہے۔

اعتراض : اگر یہ قول درست مان لیا جائے تو مومنوں کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے لڑائی کرنے کا کیا مطلب؟

جواب: **"قلنا هذه اللفظة قدتطلق علی من عصی الله غیر مستحل "**

ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ " حـــــرب " کا لفظ نافرمان مسلمانوں کیلئے بھی استعمال ہے اگر چہ وہ حرام چیزوں کو حلال نہ ہی سمجھیں۔ (کبیر)

وقوله تعالی "فأذنوابحرب من الله ورسوله " لایوجب اکفارهم لان ذلک قد یطلق علی مادون الکفرمن المعاصی "

اللہ تعالیٰ کے ارشادگرامی "فا ذنوابحرب من الله ورسوله " (تو یقین کرلو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ لڑائی کا) سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ خطاب کافروں کو ہی ہو بلکہ لفظ حرب، کا اطلاق (بولا جانا) گنہگاروں پر بھی ہے اگر چہ وہ کافر نہ بھی ہوں۔ (احکام القرآن للجصاص)

وقد جعل کثیر من المفسرین و الفقهاء قوله تعالی "انما جزاء الذین یحاربون الله ورسوله " اصلافی قطع الطریق من المسلمین"

کثیر فقہاء کرام اور مفسرین کرام کا یہی ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشادگرامی ﴿ انمـــا جـــزاء الـذیـن

یحاربون الله ورسوله ﴾ ''بیشک یہ جزاء ہے ان لوگوں کی جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے لڑائی کرتے ہیں'' مسلمان ڈاکوؤں سے متعلق ہے اس آیۃ کریمہ میں سزا کا جو ذکر ہے وہ ڈاکوؤں کی سزا ہے۔ یہی آیۃ کریمہ ڈاکوؤں کی سزا پر دلیل ہے'' کہ ان کو قتل کیا جائے یا سولی چڑھایا جائے یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مختلف طرفوں سے کاٹے جائیں یا ان کو قید کر لیا جائے'' یہ سزا مسلمان ڈاکوؤں کی ہے اور ان کا اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ سے لڑائی کرنا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ (کبیر)

☆ عن زيدبن اسلم عن ابيه ان عمر رأى معاذا يبكى فقال مايبكيك فقال سمعت رسول لله ﷺ يقول اليسير من الرياء شرك ومن عادى اولياء الله فقد بارزالله بالمحاربة ''

زید بن اسلم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ بیشک حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت معاذ (بن جبل) رضی اللہ عنہ کو روتے ہوئے دیکھا، آپ سے ان سے پوچھا تجھے کس چیز نے رلایا ہے۔ انہوں نے عرض کیا،'' میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا معمولی ریاء (دکھلاوا) شرک ہے اور جو شخص اللہ کے ولیوں سے دشمن کرے تو وہ تحقیق اللہ تعالی کے ساتھ لڑائی کرنے کیلئے سامنے آ گیا ہے، (یعنی میدان جنگ میں رب تعالی کے (معاذ اللہ) مقابل آ گیا ہے۔

(احکام القرآن للجصاص)

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا رونا اس وجہ سے تھا کہ کتنے کام ہم کرتے ہیں جن میں دکھلاوا پایا جاتا ہے کہیں ہم رب تعالی کی گرفت میں نہ آجائیں کہ ہم پر مشرک کا اطلاق نہ کیا جا سکے خواہ وہ حقیقی شرک نہیں۔ لیکن شرک خفی اور شرک کی مشابہت کا بھی کسی مؤمن پر سچا آنا بہت خطرناک ہے۔

اور حدیث پاک سے یہ واضح ہے کہ اللہ تعالی کے ولیوں سے دشمن اللہ سے لڑائی کرنا ہے۔ اللہ کے ولیوں سے دشمنی گناہ ہے لیکن کفر نہیں۔

☆ وروى ابوداود عن جابربن عبدالله قال سمعت رسول الله ﷺ يقول من لم

بذر المخابرة فلیؤذن بحرب من الله ورسوله "

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا جو شخص مخابرہ نہیں چھوڑتا تو چاہئے کہ اسے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ لڑائی کرنے کا یقین دلا دیا جائے۔ (قرطبی)

اس مقام پر مخابرہ کے متعلق طویل بحث کی گئی ہے، لیکن مختصر مطلب وہی ہے جو "واحل الله البیع" کی بحث میں راقم نے بیان کر دیا ہے کہ وہ مخابرہ یعنی مزارعت منع ہے جس میں زمین والا زرخیز حصہ نصف یا تہائی یا چوتھائی معین کر دے کہ اس جگہ کی پیداوار میری ہے اور دوسری جگہ کی پیداوار تمہاری ہے۔ اسی طرح وہ مزارعت بھی منع ہے جس میں یہ کہا جائے کہ تم اس میں فلاں چیز کاشت کرو اور اس میں سے مجھے اتنے من وہ چیز دے دینا، یہ اس لیئے منع ہے کہ ہو سکتا اتنی مقدار میں وہ چیز پیدا ہی نہ ہو۔ ہاں البتہ زمین کو کرائے پر دینا کہ تم اس میں فلاں فلاں فصل کاشت کر سکتے ہو البتہ میں نے زمین کا کرایہ لینا ہے، پیداوار کا حصہ نہیں، یہ صورت بھی جائز ہے۔

اس مذکورہ بالا حدیث میں بھی "حرب" کا اطلاق مسلمانوں کیلئے ہے کافروں کیلئے نہیں۔

نتیجہ واضح ہوا:

" والمقیم علی اکل الربوا ان کان مستحلا له فهو کافر وان کان ممتنعابجماعة تعضده سار فیهم الامام بسیرته فی اهل الردة ان کانوا قبل ذلک من جملة اهل الملة وان اعترفوا بتحریمه وفعلوه غیر مستحلین له فاتلهم الامام ان کانوا ممتنعین حتی یتوبوا وان لم یکونوا ممتنعین ردعهم عن ذلک بالضرب والجس حتی ینتهوا "

(احکام القرآن للجصاص)

جو لوگ سود کھانے پر قائم رہیں اور سود کو حلال بھی سمجھیں تو وہ کافر ہیں، اور اگر وہ سود بھی کھاتے ہوں اور اپنی پشت پناہی کیلئے اپنے ساتھ لوگوں کو بھی ملا رکھا ہو تو مسلمان حاکم ان سے وہ سلوک کرے جو مرتد لوگوں سے کیا جاتا ہے۔ یعنی ان سے جنگ کر کے ان کو قتل کر دے۔

اور اگر وہ سود کھاتے ہیں لیکن حلال نہیں سمجھتے تو وہ کافر نہیں بلکہ گنہگار ہیں۔ اور اگر انہوں نے بھی اپنے ساتھ لوگوں کو ملا رکھا ہو اور رب تعالیٰ کے احکام سے عدولی کر رہے ہوں تو ان کو سمجھایا جائے، اگر وہ توبہ کر لیں اور باز آجائیں تو بہتر ورنہ ان کو مارا جائے اور قید کر لیا جائے، جب تک وہ توبہ نہ کریں اس وقت تک ان کو نہ چھوڑا جائے۔ (احکام القرآن)

☆ " وقدروی عن ابن عباس وقتادة والربیع بن انس فیمن اربی ان الامام یستتیبه فان تاب والاقتله "

حضرت ابن عباس اور قتادہ اور ربیع بن انس رضی اللہ عنہم سے سود پر مال دینے والے کے متعلق بیان کیا گیا کہ امام اسے توبہ کرنے کے متعلق کہے اگر وہ توبہ کر لے تو بہتر ورنہ امام اسے قتل کر دے۔

"وھذا محمول علی ان یفعله مستحلاله لأنه لاخلاف بین اھل العلم انه لیس بکافر اذا اعتقد تحریمه "

صحابہ کرام کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص سود کو حلال سمجھے اسے قتل کر دیا جائے کیونکہ وہ کافر و مرتد ہے۔ اس کے کفر میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں، ہاں البتہ اگر اس کا عقیدہ یہ ہو کہ سود حرام ہے پھر وہ سود کھاتا بھی ہے تو گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا، کافر نہیں۔ (احکام القرآن للجصاص)

راقم کے نزدیک یہ ساری صورت اس وقت ہے جب "والا قتله" کا حقیقی معنی لیا جائے، اور اگر مجازی معنی لیا جائے یعنی شدید مارنا، تو اب مطلب یہ ہوگا کہ حاکم سود کھانے والے کو توبہ کرنے کے متعلق کہے اگر وہ توبہ کر لے تو ٹھیک ورنہ اسے شدید مارا جائے اور اگر وہ سود کو حلال بھی سمجھے تو اسے اتنا شدید مارا جائے کہ اسے قتل کر دیا جائے۔

یہی صورت اختیار کرنے سے ﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ میں بھی دونوں قول جمع کیے جا سکتے ہیں" اگر تم نہ کرو یعنی سود کو حرام سمجھ کر سود کھانے سے باز نہ آؤ تو تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے لڑائی کا یقین کر لو، یعنی تمہارے لئے رب تعالیٰ کی طرف سے شدید وعید ہے اور اگر تم نے سود حلال سمجھ کر کھایا تو تم کافر ہو گے، اور رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے لڑائی کرنے کا یقین کر لو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دین و دنیا میں ذلیل

وخوار کردے گا۔ (راقم)

☆ عن زید بن ارقم ان النبی ﷺ قال لعلی وفاطمة والحسن والحسین رضی اللہ عنہم انا حرب لمن حاربتم سلم لمن سالمتم"

(احکام القرآن للجصاص ،ترمذی ، مشکوہ باب مناقب اھل البیت)

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے حضرت علی اور حضرت فاطمہ اور حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہم کو فرمایا جس سے تمہاری لڑائی ہے اس سے میری بھی لڑائی ہے، جس سے تمہاری صلح ہے اس سے میری بھی صلح ہے۔

حضرت ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ نے اس حدیث کو بھی دلیل بنایا ہے کہ مسلمانوں کیلئے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے لڑائی کرنے کا ذکر قرآن وحدیث میں موجود ہے۔ کیونکہ خاندان علی المرتضی رضی اللہ عنہ سے لڑائی کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے ساتھ لڑائی سے تعبیر فرمایا۔

تنبیہ : حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح ہوگئی تھی ، جس معاہدہ میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ بھی شریک تھے، جب حسنین کی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح ہوگئی تو یقیناً نبی کریم ﷺ کے ارشاد کے مطابق آپ کی بھی صلح ہوگئی۔

اب بھی اگر کوئی گمراہ اور گمراہ کن شخص نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کرے تو وہ بدبخت ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی شان میں گستاخی حسنین کریمین کی گستاخی ہے اور حسنین کریمین کی گستاخی نبی کریم ﷺ کی گستاخی ہے۔

اے بدبخت! اس صحابی رسول ﷺ سے حسنین کریمین اور مصطفی کریم ﷺ کی صلح ہے اس سے تیری جنگ؟ ہاں ہاں دشمن صحابہ ہی مسلمانوں کا دشمن ہے، جب تیری صلح صحابہ کرام سے نہیں تو مسلمانوں کی صلح تجھ سے کیسے ہوسکتی ہے۔

☆ عن ابی بکرة قال رأیت رسول اللہ ﷺ علی المنبر والحسن بن علی الی جنبه وھو یقبل علی الناس مرة وعلیه أخری ویقول ان ابنی ھذا سید ولعل اللہ ان

يصلح به فئتين عظيمتين من المسلمين'' (رواه البخاری)

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو منبر پر دیکھا کہ آپ کی ایک جانب حضرت (امام) حسن بن علی رضی اللہ عنھما تھے، رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ لوگوں کی طرف توجہ فرماتے اور دوسری مرتبہ ان کی طرف، اور آپ فرما رہے تھے بیشک یہ مرا بیٹا سردار ہے، اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کو دو بڑی جماعتوں کے درمیان صلح کرائے گا۔ (مشکوۃ باب مناقب اھل البیت)

وضاحت حدیث : ''كفى به شرفا وفضلا فلا اسود ممن سماه رسول الله ﷺ سيدا''

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی شرافت وفضیلت بلا غبار ثابت ہو رہی ہے، وہ کیسا ہی عظیم شخص ہو گا جسے مصطفیٰ کریم ﷺ نے سید (سردار) کہا ہو۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد حرف بحرف ثابت ہو کر رہا۔ آپ نے فرمایا مسلمانوں کی دو بڑی جماعتیں تو اس وقت جبکہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان نزاع ہوا تو اس وقت مسلمانوں کے دو ہی جماعتیں تھیں۔ ایک حضرت امیر معاویہ کے ساتھ اور ایک حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ۔ جو دونوں جماعتیں بڑی جماعتیں ہی تھیں۔

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے حق پر قائم ہونے کے باوجود صلح کی راہ کو پسند فرمایا کہ میں رسول اللہ ﷺ کی امت کا خون بہانا پسند نہیں کرتا۔ آپ کے صلح کرنے پر بعض جب آپ کے پاس گئے تو انہوں نے کہا " السلام عليك يا عار المؤمنين " اے مومنوں کو عار (شرم) دلانے والے! تم پر سلام ہو۔ آپ نے کیا خوب جواب دیا ''العار خير من النار'' عار آگ سے بہتر ہے۔

''وفي شرح السنة في الحديث دليل على ان واحدا من الفريقين لم يخرج بما كان منه في تلك الفتنة من قول اوفعل عن ملة الاسلام لان النبي ﷺ جعلهم كلهم مسلمين'' (مرقاۃ ج ۱۱ ص ۳۷۹)

شرح السنۃ میں ذکر کیا گیا ہے کہ حدیث پاک سے واضح ہوا کہ دونوں طرف کے مسلمانوں کے

اقوال وافعال سے جوفتنہ نمودار ہورہا تھا وہ اس کی وجہ سے ملت اسلامیہ سے نہیں نکلے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ہر فریق کو مسلمان کہا ہے کہ'' مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں کے درمیان اللہ تعالی اس کے ذریعے صلح کرائے گا''

خیال رہے کہ حدیث پاک میں لفظ''لعل'' شک کیلئے استعمال نہیں۔ بلکہ اس کا معنی ''یونہی'' ایسا ہی ہوگا۔ کبھی کبھی ترجی کیلئے آتا ہے جس میں شک پایا جاتا ہے، اس وقت اس کا معنی ہوتا ہے'' امید ہے، شاید، ہوسکتا ہے'' وغیرہ۔

تارکین صلوۃ اور مانعین زکوۃ:

" قال :لبیضاوی ذلک یقتضی ان یقاتل المربی بعد الاستتابة حتی یفئی الی امر اللہ کا لباغی "

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا سود خوار سے توبہ طلب کی جائے کہ وہ اللہ تعالی کے امر کی طرف لوٹ آئے جیسا کہ باغی کو کہا جاتا ہے تو امام کی طاعت کی طرف لوٹ آ، اگر یہ لوٹ آئے تو بہتر ورنہ اسے قتل کر دیا جائے ،قاضی مظہری رحمہ اللہ نے مسئلہ میں تفصیل بیان فرمائی۔

" قلت و الظاهر انه ان لم یکن له منعه یجب علی الامام ان یحبسه حتی یتوب و ان کان له منعه لایقدر الامام علی حبسه فهو الباغی یقاتل معه حتی یفئی الی امر الله "

میں کہتا ہوں کہ ظاہر طور پر مسئلہ کی صورت یہ ہے کہ اگر سود خوار کے ساتھ پشت پناہی کرنے والی کوئی جماعت نہیں جو حاکم وقت کے ساتھ مقابلہ کرنے پر آمادہ ہو تو اسے حاکم قید کر لے یہاں تک کہ وہ اللہ تعالی کے امر کی طرف لوٹ آئے یعنی توبہ کر لے، اور اگر اسے پشت پناہی کی وجہ سے طاقت حاصل ہو حاکم سے لڑائی کرنے پر آمادہ ہوں تو ان کو حاکم باغی قرار دے، ان سے جنگ کرے یہاں تک وہ اللہ تعالی کے امر کی طرف لوٹ آئیں، اگر نہ لوٹیں تو ان کو قتل کر دیا جائے۔

''وهذا هو الحکم فیمن ترک فریضة من الفرائض کالصلو ة و الزکوة و نحو هما اور تکب کبیرة من الکبائر و اصر علیه بالاعلان "

یہی حکم ہے ہر اس شخص کا جو فرض نمازوں کو چھوڑے یا زکوۃ دینے سے انکار کرے، وغیرہ یا گناہ

کبیرہ کا مرتکب ہو اور اعلانیہ طور پر گناہوں پر اصرار کرے۔

یعنی حاکم ان کو قید کرے اور ان کو توبہ کرنے کے متعلق کہے اور اگر بے نمازی اپنے ساتھ جماعت کو ملا لیں اور حاکم سے مقابلہ کریں کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تو نے جو کرنا ہے کر لے، یہی صورت زکوۃ چھوڑنے والے اختیار کریں، کسی قسم کے گناہ کرنے والے یہی صورت اختیار کریں تو حاکم ان سے جنگ کرے یہاں تک کہ وہ اللہ کے امر کی طرف لوٹ آئیں ورنہ حاکم ان کو قتل کرادے۔

☆ روی رزین عن عمربن الخطاب فی مناقب ابی بکر انہ لما قبض رسول اللہ ﷺ ارتدت العرب وقالوا لانؤدی زکوۃ فقال ابو بکر لومنعونی عقالا لجاھد تھم علیہ فقلت یاخلیفۃ رسول اللہ تألف الناس وارفق بھم فقال لی اجبار فی ا لجاھلیۃ وخوار فی الاسلام انہ قد انقطع الوحی وتم الدین اینقص وانا حی"

زرین نے حضرت عمر بن خطاب سے مناقب ابی بکر میں روایت ذکر کی کہ بیشک جب نبی کریم ﷺ کا وصال ہو گیا تو عرب کے بعض لوگ " العیاذباللہ " مرتد ہو گئے اور انہوں نے کہا ہم زکوۃ ادا نہیں کریں گے تو حضرت ابوبکر (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا اگر انہوں نے ایک رسی (یعنی قلیل مال) بھی زکوۃ کے مال ۔سے دینے سے انکار کیا تو میں ان سے جہاد کروں گا ،تو میں نے کہا اے رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ لوگوں سے الفت سے در پیش آئیں اور ان پر نرمی کریں ،تو آپ نے فرمایا کہ زمانہ جاہلیت میں تم جابر تھے اور اسلام میں آکر کمزور (بزدل) ہو گئے ہو، بیشک وحی ختم ہو چکی ہے اور دین مکمل ہو چکا ہے کیا دین میں کمی کی جائے اور میں زندہ ہوں ،یعنی میری زندگی میں ایسا نہیں ہوسکتا، کیونکہ میں اپنی زندگی میں دین اسلام کے فرائض میں رخنہ اندازی کی اور بغاوت کی اجازت نہیں دے سکتا بلکہ ضرور ہی ان سے جنگ کروں گا۔

☆ "وفی الصحیحین من حدیث ابی ھریرۃ قال ابوبکر واللہ لأ قائلن من فرق بین الصلوۃ والزکوۃ فان الز کوۃ حق المال واللہ لومنعونی عنا قاکانوا یؤدونھا الی رسول اللہ ﷺ لقا تلتھم علی متعھا قال فعرفت انہ الحق " (بخاری ومسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضرت ابوبکر (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں ان لوگوں سے ضرور جنگ کروں گا جنہوں نے نماز اور زکوۃ میں تفریق پیدا کی، بیشک زکوۃ اللہ کا مال ہے، قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اگر ان لوگوں نے بکری کا بچہ بھی بطور زکوۃ نہ دیا جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں دیتے تھے تو زکوۃ نہ دینے کی وجہ سے میں ان سے جنگ کروں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے سمجھ لیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حق پر ہیں۔ (ماخوذ از مظہری)

چونکہ وہ لوگ ایک جماعت کی شکل میں زکوۃ دینے سے انکار کر رہے تھے، بلکہ وہ فرضیت زکوۃ کے ہی منکر ہو گئے تھے اسی وجہ بالاتفاق ان کو مرتد کہا گیا ہے۔

آیۃ ربوا میں حرب سے مراد کون سی حرب ہے؟

اس سے مراد ایک تو وہی ہے جس کی ابھی تفصیل گزر گئی کہ اگر وہ جماعت بن کر سود کھانے پر اصرار کریں اور امام سے مقابلہ کیلئے تیار ہوں تو ان کو باغی سمجھ کر قتل کر دیا جائے ورنہ ان کو قید کیا جائے، اسی پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول دلالت کر رہا ہے۔

" من كان مقيما على الربوا لا ينزع عنه فحق على امام السلمين ان تستتيبه فان نزع والا ضرب عنقه "

کہ جو شخص سود کھانے پر قائم رہے اور سود کھانے کو نہ چھوڑے تو مسلمانوں کے حاکم پر یہ حق ہے کہ وہ اسے توبہ کرنے کے متعلق کہے، اگر توبہ کرلے تو بہتر ورنہ اس کی گردن اڑا دے، اور اسی پر حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کا قول دلالت کر رہا ہے۔

"او عد الله اهل الربوا باتقل فجعلهم بهرجا اينما ثقفوا"

کہ اللہ تعالیٰ نے سود خواروں کو قتل کرنے کی وعید فرمائی ہے کہ تم ان کو جہاں بھی پاؤ تو تمہارے لئے مباح ہے۔ کہ ان کو قتل کر دو، لیکن اس سے مراد بھی وہی ہے کہ جب وہ اپنی جماعت بنالیں تو حاکم ان سے جنگ کرے، اس کا

یہ مطلب نہیں کہ جس کا جی چاہے جسے چاہے قتل کرتا پھرے، شریعت نے قوانین اور ضوابط مقرر کر رکھے ہیں۔ ان پر عمل کرنا ضروری ہے، ان قوانین کے انبیاء کرام بھی پابند رہے اور ان کی امتیں بھی۔ شریعت میں معاذ اللہ سیاہ قانون نہیں جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ فوجی جرنیل قوانین کے پابند نہیں بلکہ قوانین پر عمل کرانے والے منصفین بھی ان کے تابع ہیں یہ کیا اندھیر نگری ہے یہ کیا جنگل کے قانون ہیں۔ لاقانونیت کی وجہ سے ایک شخص سیاہ وسفید کا مالک بنا بیٹھا ہے جو چاہتا ہے وہی کر رہا ہے اسے کوئی پوچھنے والا نہیں۔

آیہ کریمہ میں لڑائی سے مراد قیامت کے دن کی لڑائی کا بھی ایک قول ہے وہ حضرات ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد گرامی:

"روی عن ابن عباس رضی الله عنه انه يقال يوم القيامة لآكل الربوا اخذسلاحک للحرب"

کہ قیامت کے دن سود کھانے والے کو کہا جائے گا کہ تو لڑائی کے لئے اپنے ہتھیار لے لے۔ (ماخوذ از قرطبی)

راقم کے نزدیک ان دونوں اقوال میں کوئی تضاد نہیں بلکہ سود خواروں کو دنیا میں اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ سے لڑائی کرنے کا یقین دلایا گیا اور ان کو مطلع کیا گیا کہ قیامت کے دن بھی ان کو حکم دیا جائے گا کہ لڑائی کے لئے تیار ہو جاؤ۔ یعنی دنیا اور آخرت میں سود خواروں کیلئے ذلت وخواری ہوگی۔

"روی انهالمانزلت قال ثقيف لايدی لنا ای لاطاقة لنابحرب من الله ورسوله"

یہی وجہ ہے کہ جب یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی تو بنی ثقیف نے کہا کہ ہمیں اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ سے لڑائی کرنے کی کوئی طاقت نہیں۔

"لایدی" کا معنی "لاطاقة لنا" لیا گیا ہے، کیونکہ کوئی کام کیا جائے یا دفاع کرنا ہو تو ہاتھوں سے ہی کیا جاتا ہے اور اگر انسان دفاع سے عاجز آجائے تو گویا کہ وہ ہاتھوں سے محروم ہو جاتا ہے جب کسی کے ہاتھ معدوم ہو جائیں تو وہ کہتا ہے کہ "لایدی لنا" ہمارے ہاتھ نہیں اور مجازی معنی اس کا لیا جاتا ہے ہمیں کوئی طاقت حاصل نہیں۔

(از بیضاوی وشیخ زادہ)

سود شراب سے برا ہے:

ابن بکیر کہتے ہیں کہ ایک شخص حضرت مالک بن انس رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اس نے کہا اے ابوعبداللہ میں نے ایک شخص کو نشے کی حالت میں دیکھا جو اونٹوں کی کوچیں کاٹ رہا ہے اور چاند کو پکڑنے کا ارادہ کررہا ہے۔

"فقلت امرأتی طالق ان کان یدخل جوف ابن آدم اشر من الخمر"

تو میں نے کہا کہ میری زوجہ کو طلاق ہے اگر انسان کے پیٹ میں شراب سے بھی بری چیز داخل ہو" ان الفاظ سے میری زوجہ کو طلاق ہوئی ہے یا نہیں۔ کیا شراب سے بھی کوئی چیز بری ہے؟ جو انسان کھاتا ہے تو حضرت امام مالک رحمۃ اللہ نے فرمایا" ارجع حتی انظر فی مسالتک " ابھی تم واپس چلے جاؤ، میں تمہارے مسئلہ میں غور وفکر کروں گا، پھر ہی کوئی فیصلہ کرسکوں گا، وہ واپس چلا گیا۔ دوسرے دن پھر حاضر ہوا، اس کے پوچھنے پر پھر وہی جواب آپ نے دیا کہ ابھی واپس چلے جاؤ، میں تمہارے مسئلہ میں غور وفکر کروں گا، تیسرے دن وہ پھر حاضر ہوا اور اپنے مسئلہ کا جواب طلب کیا تو آپ نے فرمایا۔

"امرأتک طالق " انی تصفحت کتاب اللہ وسنۃ نبیہ فلم أرشیئا اشر من الربوا لان اللہ اذن فیہ بالحرب "

تمہاری عورت کو طلاق ہو چکی ہے کیونکہ میں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن پاک اور احادیث نبویہ میں غور وفکر کیا تو مجھے سود سے زیادہ کوئی بری چیز نظر نہیں آئی، اسلئے کہ سود خواروں سے اللہ تعالیٰ نے اعلان جنگ کر رکھا ہے۔

جب سود سب چیزوں سے بری چیز ہے تو لوگ سود کھا رہے ہیں، یعنی شراب سے بری چیز لوگوں کے پیٹوں میں جارہی ہے جس سے تم نے اپنی زوجہ کی طلاق کو مشروط کیا ہے۔ جب شرط پائی گئی تو تمہاری زوجہ کی بھی طلاق ہو چکی ہے۔

(قرطبی بوضاحت)

"وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ"

"اور اگر تم نے توبہ کر لی تو تمہارے لئے تمہارے اصل مال ہیں"

یعنی اگر تم نے سود کا مال کھانے سے توبہ کر لی تو تم اپنا اصلی مال جو بطور قرض دیا تھا وہ واپس لے سکتے ہو البتہ

سود نہیں لے سکتے۔سود کی حرمت سے پہلے دئے ہوئے مال کا سود لینا بھی تم پر اب حرام کردیا گیا ہے۔

سود سے توبہ کیسے کی جائے؟

سود سے توبہ کا یہ طریقہ ہے کہ جو مال سود کے طور پر لیا ہے وہ چونکہ حرام مال ہے اسلئے جس شخص سے مال لیا ہے اسے واپس لوٹا دے، پہلے لئے ہوئے مال کے گناہ پر نادم ہوجائے اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا مصمم ارادہ کرلے، اگر وہ شخص نہ ملے تو پھر بھر پور کوشش کرے کہ وہ شخص مل جائے تو بہتر ہے، تاکہ اس سے سود کے طور پر لیا ہوا مال اسے لوٹا دیا جائے۔

"فان أيس من وجوده فليتصدق بذلك عنه"

اگر وہ شخص نہ ملے یا اس سے نا امید ہوجائے تو یہ مال کسی غریب پر صدقہ کردے، لیکن یہ خیال رہے کہ اس صدقہ میں ثواب کی نیت نہ کرے کیونکہ حرام مال صدقہ کرکے ثواب کی نیت کرنا حرام ہے۔

اگر کسی شخص پر ظلم کرکے مال بٹورلیا تھا تو اس سے توبہ کرنے کا بھی یہی طریقہ ہے کہ ظالمانہ طور پر لیا ہوا مال مظلوم کو واپس کردے، اگر وہ شخص نہ ملے تو سرتوڑ کوشش کرے کہ وہ شخص مل جائے تو اسے مال واپس کردے اگر وہ کسی صورت میں بھی نہ ملے تو مال صدقہ کردے۔

اگر ایک شخص نے مال حاصل کیا لیکن حلال اور حرام کی تمیز نہیں کی، جیسے مال ملتا رہا اسی طرح حاصل کرتا رہا اب اللہ تعالی نے اسے توبہ کی توفیق عطاء کردی، اسے پتہ نہیں کہ میرے پاس کتنا مال حلال ہے اور کتنا حرام ہے تو اس کی توبہ کا یہ طریقہ ہے کہ وہ اپنی سوچ کے مطابق پوری کوشش کرے، جتنا مال اس کی سوچ میں حرام آئے وہ اصل مالکوں تک پہنچائے یا صدقہ کردے۔ (ماخوذ از قرطبی)

"لَا تَظۡلِمُوۡنَ وَلَا تُظۡلَمُوۡنَ" ''نہ تم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے''

یعنی تم اپنے اصلی مال سے زائد لے کر ظلم نہ کرو، اور وہ قرضہ لینے والے جان بوجھ کر دیر کرنے اور ٹال مٹول کرنے یا مال کم دینے کی وجہ سے تم پر ظلم نہ کریں۔اسی سے یہ سمجھ آیا کہ سود خوار اگر توبہ نہ کرے تو وہ اپنا اصلی مال بھی نہیں

لے سکتا۔ یہ کہنا کس طرح درست ہے کہ وہ اپنا اصلی مال بھی نہیں لے سکتا؟

" وهو سديد على ماقلنا اذالمصر على التحليل مرتد وماله فيئى "

ہمارا یہ قول اس لئے درست ہے کہ جو شخص سود کا مال کھانے سے اسلئے باز نہ آئے کہ وہ اسے حلال سمجھنے پر اصرار کرے وہ مرتد ہے اور اس کا مال مال فیٔ ہے۔ (بیضاوی)

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے نزدیک اس مسئلہ میں تفصیل ہے کیونکہ بیضاوی رحمہ اللہ نے جو "علی ماقلنا" کہا ہے اس سے مراد امام شافعی رحمۃ اللہ کا قول ہے۔

"واما عندابی حنيفة رحمه الله فما اكتسبه فی حال الا سلام ينتقل بعد قتله او لحوقه بدار الحرب الی ورثته للمسلمين وما اكتسبه فی حالة الردة كان فيئا"

لیکن امام اعظیم ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں جو اس نے حالت اسلام میں مال حاصل کیا وہ اس کے قتل کے بعد یا دارحرب میں مرتد ہو کر لاحق ہونے سے اس کے مسلمان وارثوں کو ملے گا۔ ہاں البتہ اس نے جو مال مرتد ہونے کے حال میں کسب کیا تھا وہ اس کے مرنے یا دارحرب میں لاحق ہونے کے بعد فیئ بن جائے گا۔ جس میں مسلمان حاکم کو تصرف کا اختیار ہوتا ہے، مسلمان حاکم اس کا مالک نہیں بنتا" (مظہری)

اوردینی طلباء سے یہ مخفی نہیں:

کہ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ کا یہ کہنا "يفهم منه انهم ان لم يتوبوا فليس لهم مالهم" کہ اس آیۃ کریمہ سے یہ سمجھ آرہا ہے کہ اگر وہ توبہ نہ کریں تو ان کیلئے مال نہیں، یہ مفہوم مخالف ہے۔ اصول فقہ کی معتبر کتاب نورالانوار میں جہاں دلائل کی وجوہ فاسدہ بیان کی گئی ہیں ان میں ہی بیان کیا گیا ہے کہ "مفہوم مخالف" امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے نزدیک کوئی دلیل نہیں۔ قاضی مظہری رحمہ اللہ نے علامہ بیضاوی رحمہ اللہ کا رد کیا اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جو مسئلہ میں تفصیل تھی اسے ذکر کیا (جو راقم نے نقل کردی) تو ساتھ ہی ذکر کیا۔

" والمفهوم ليس بحجة عندابی حنيفة على انه اذا كان لورثته لم يكن له "

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک مفہوم (مفہوم مخالف) کوئی حجت نہیں۔ ہاں البتہ اس کا کوئی وارث ہی نہ ہوتو پھراس کا مال فیئ بنے گا۔ (مظہری)

ہر مسلمان شخص کیلئے قانون وراثت یہی ہے کہ جب اس کا کوئی وارث نہیں تو اس کا مال بیت المال میں جمع کرلیا جاتا ہے۔ (راقم)

اپنا اصلی مال مقروض کی مرضی کے بغیر لیا جاسکتا ہے:

جب رب تعالی نے یہ ارشاد فرمایا'' وان تبتم فلکم رؤوس اموالکم'' (اور اگر تم نے توبہ کرلی تو تمہارے لئے ہے) تو اس سے واضح ہوگیا کہ قرضہ دینے والے کا یہ حق ہے کہ مقروض سے اپنے اصلی مال کا مطالبہ کرے " وجواز اخذ رأس المال منه بغیر رضاه " کیونکہ اس کیلئے یہ جائز ہے کہ اپنا اصلی مال اس کی رضامندی کے بغیر ہی حاصل کرلے۔

اسکی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالی نے مقروض کی مرضی کے بغیر ہی اپنا مال واپس لینے کی اجازت فرمائی، مقروض کی مرضی کو ذکر نہ فرما کر حکم کو عام کردیا۔ اسی لئے یہ مسئلہ ثابت ہوگیا کہ صاحب حق اپنا حق، دینے والے کی مرضی کے بغیر لے سکتا ہے چونکہ زوجہ اپنا اور اپنے نابالغ اہل وعیال کا خرچ اپنے خاوند سے لینے کی حقدار ہے لہذا خاوند اگر اسے اتنا خرچ نہ دے جو اسے کافی ہوسکے تو وہ اس کے مال سے اس کی مرضی کے بغیر لے سکتی ہے۔

حضرت ہندہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئی عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ!

''ان اباسفیان رجل شحیح لایعطینی مایکفینی وولدی فقال خذی من مال ابی سفیان مایکفیک وولدک بالمعروف''

بے شک ابوسفیان ایک کنجوس آدمی ہے وہ مجھے اتنا مال نہیں دیتا کہ جو مجھے اور میری اولاد کو کافی ہوسکے تو حضور علیہ السلام نے فرمایا تم (اپنے خاوند) ابوسفیان کے مال سے اتنا مال لے لیا کرو جو حکم شرع کے مطابق تمہیں اور تمہاری اولاد کو کافی ہوسکے۔

واضح ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہندہ رضی اللہ عنہا کو ان کے خاوند ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی مرضی کے بغیر ہی اپنا حق لینے کی اجازت فرمائی۔ (احکام القرآن للجصاص)

بغیر کسی عذر کے قرض ادا نہ کرنا ظلم ہے:

یعنی ایک شخص قرض ادا کرنے کی طاقت رکھتا ہے اور کسی قسم کا اسے کوئی عذر لاحق نہیں تو پھر وہ ٹال مٹول سے کام لے اور قرض ادا نہ کرے تو یہ ظلم ہے۔ آیہ کریمہ اسی پر دلالت کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ''وان تبتم فلکم رؤوس اموالکم''، تو اپنے اصلی مال کا مطالبہ کرنے کا حکم دیا گیا اسی سے مقروض کو قرض ادا کرنے کا بھی حکم دے دیا گیا ''فانہ متی امتنع منہ کان ظالما'' جب وہ قرض ادا کرنے کی طاقت رکھتا ہو لیکن قرض ادا نہ کرے تو وہ ظالم ہے ''واذا کان کذالک استحق العقوبۃ وھی الحبس'' جب وہ ظالم کے درجہ میں ہے تو وہ سزا کا مستحق ہے لہذا حاکم وقت اسے قرض کی ادائیگی تک قید کرنے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ﴾ بھی اس مسئلہ پر دلالت کر رہا ہے کیونکہ اس کا معنی ہے

''واللہ اعلم لاتظلمون باخذ الزیادۃ و لاتظلمون بالنقصان من رأس المال فدل ذلک علی انہ متی امتنع من اداء جمیع رأس المال الیہ کان ظالمالہ مستحقاللعقوبۃ''

اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم زیادہ مال لے کر ظلم نہیں کرو گے اور تمہارے اصلی مال میں مقروض لوگوں کی طرف سے کمی کر کے ظلم نہیں کیا جائے گا اسی سے پتہ چلا کہ جب وہ قرض ادا کرنے کی طاقت رکھتا ہو پھر سارا مال روک کر بیٹھا ہے تو وہ ظالم ہے اور سزا کا مستحق ہے۔

''وعن ابی ہریرۃ عن النبی ﷺ انہ قال مطل الغنی ظلم'' (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ غنی کا قرض ادا کرنے میں تاخیر کرنا یعنی بلاوجہ ٹال مٹول سے کام لینا ظلم ہے۔

حدیث پاک سے بھی واضح ہوا کہ صاحب استطاعت کا قرض ادا نہ کرنا ظلم ہے۔ (احکام القرآن للجصاص)

قرض ادا کرنے والے کو قید کا حکم:

"عن هرماس بن حبيب رجل من البادية عن ابيه عن جده قال اتيت النبی ﷺ بغريم لی فقال لی الزمه ثم قال يااخابنی تميم ماتريد ان تفعلب بأسيرک "

ہرماس بن حبیب کہتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں اپنے قرضہ دینے والے شخص کو لایا (جو قرضہ نہیں دے رہا تھا) تو آپ نے فرمایا کہ اسے لازم پکڑو، پھر آپ نے فرمایا اے بنوتمیم کے بھائی! تم اپنے قیدی سے کیا (سلوک) کرنے کا ارادہ رکھتے ہو۔

حدیث پاک سے بھی واضح ہوا کہ حضور ﷺ نے قرضہ نہ دینے والے کو "الزمہ" (لازم پکڑو) فرما کر قید کرنے کا حکم دیا پھر یہ پوچھ کر کہ " ماتريد ان تفعل باسيرک " (تم اپنے قیدی کے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہو) واضح کر دیا کہ وہ شخص قید کر لیا گیا تھا۔ (احکام القرآن للجصاص)

کتنی دیر قید رکھا جائے؟

فقہائے کرام نے بیان کیا ہے کہ قرض ادا نہ کرنے والے کو دو یا تین ماہ تک قید میں رکھا جائے۔ اگر پتہ چل جائے کہ واقعی وہ غنی ہے، قرضہ دے سکتا ہے لیکن دیتا نہیں تو اسے قرضہ کے ادا کرنے تک قید رکھا جائے اور اگر یہ پتہ چل جائے کہ وہ غریب ہے قرض ادا نہیں کر سکتا تو اسے چھوڑ دیا جائے جب وہ قرض ادا کرنے کی صلاحیت رکھے گا تو قرض ادا کر دے گا۔ (احکام القرآن للجصاص)

مسئلہ: "وذروامابقی من الربوا" سے اور "وان تبتم فلكم رؤوس اموالكم" سے جب یہ سمجھ آرہا ہے کہ جو سود کا مال سود کے حرام ہونے سے پہلے لے لیا گیا ہو وہ تو ٹھیک ہے، لیکن جو نہیں لیا گیا وہ منع کر دیا گیا ہے۔ اسی سے علماء احناف اور اصحاب شافعی نے یہ دلیل پکڑی ہے کہ مبیع کو قبض کرنے سے پہلے کوئی ایسی

چیز لاحق ہو جائے تو بیع باطل (فاسد) ہو جائے گی کیونکہ قبض سے پہلے حکم اور ہے اور قبض کرنے کے بعد حکم اور ہے یعنی قبض کے بعد فاسد کرنے والی صورت کے لاحق ہونے سے پہلے بیع فاسد نہیں ہوگی۔ جیسا کہ کسی مسلمان شکاری نے کوئی شکاری جانور خرید لیا ابھی قبضہ نہیں کیا تھا کہ بائع یا مشتری یا دونوں نے احرام باندھ لیا تو بیع فاسد ہوگئی۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ قبض کرنے سے پہلے اس پر وہ چیز جاری کر دی گئی جو بیع کو ناجائز کر دیتی ہے۔ اسی سے ایک اور مسئلہ سمجھ آیا کہ مبیع کو مشتری نے قبض نہیں کیا تھا بلکہ بائع کے ہاتھ میں ہی ہلاک ہو جائے تو بیع فاسد ہو جاتی ہے مشتری پر ثمن (قیمت) دینا لازم نہیں۔ (ماخوذ از قرطبی)

سود تمام دینوں میں منع رہا:

زمانہ جاہلیت مین جو سود لیا جاتا رہا وہ مشرکین کی عادت تھی کہ جس سے منع کیا گیا یہود پر سود کے منع ہونے پر قرآن پاک کی ظاہر طور پر دلالت پائی گئی ہے۔ "اخذھم الربو وقد نھوا عنه" انہوں نے سود لیا اور حالانکہ ان پر سود حرام کیا گیا تھا۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی شریعت میں بھی سود منع تھا لیکن قوم نے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا تھا:

"قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَایَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَانَشٰٓؤُا اِنَّکَ لَاَنْتَ الْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُ" (سورۃ ھود آیہ نمبر ۸۷)

بولے اے شعیب! کیا تمہاری نماز تمہیں حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے خداؤں کو چھوڑ دیں یا اپنے مال میں جو چاہیں نہ کریں، ہاں جی تمہیں بڑے عقلمند نیک چلن ہو۔

مطلب ان کا یہ تھا کہ ہم اپنے مال کے مالک ہیں چاہیں تو سود پر مال دیں، چاہیں تو کم تولیں، چاہیں تو کم ناپیں تمہیں ہم پر کسی قسم کا کوئی اختیار نہیں۔ اس سے واضح ہوا کہ سود کا لین دین ہر شریعت میں حرام رہا، البتہ لوگ اپنے نبی کے حکم کے خلاف اگر سود لیتے رہے تو وہ کسی شریعت کا قانون نہیں بلکہ شریعت کی اس میں مخالفت پائی گئی۔

(ماخوذ از قرطبی بتصرف)

دین میں غلو جائز نہیں:

بعض اصحاب ورع لیکن دن میں غلو کرنے والوں نے یہ کہا کہ اگر کسی شخص کے حلال مال کے ساتھ حرام مال مل جائے تو یہاں تک کہ وہ اس کے حلال مال سے جدا نہ ہو سکے تو اس نے اتنی مقدار میں مال نکال دیا جتنی مقدار میں حرام مال ملا تھا لیکن پھر بھی تمام مال کا اس کیلئے استعمال جائز نہیں پتہ نہیں کون سا مال اس میں حلال ہے اور کون سا حرام۔

جیسا کہ حلال گندم میں حرام طریقے سے حاصل کی گئی گندم ملالی گئی تو ایک ایک دانے کو جدا تو نہیں کیا جا سکتا اسلئے مثال کے طور پر ایک من گندم حرام طریقے سے حاصل کی گئی جب حلال گندم میں ملائی گئی اور ایک من گندم نکال لی گئی تو پھر باقی ماندہ گندم اسی طرح حرام رہے گی ہو سکتا ہے کہ اسمیں حرام گندم والے دانے باقی ہوں بلکہ یہ یقینی بات ہے کہ اس میں حرام دانوں کی آمیزش ہے

قال ابن العربی وھذاغلوفی الدین فان کل مالم یتمیز فالمقصود منه مالیته لاعینه "

علامہ ابن عربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دین میں غلو (بے جا زیادتی) ہے اسلئے قانون شریعت یہ ہے کہ جب کوئی چیز اس طرح خلط ملط ہو جائے تو جو جدا نہ ہو سکے تو وہاں مقصد یہ ہوگا کہ اسکی مالیت کے مطابق اس چیز کو نکال دیا جائے، عین اسی چیز کا نکالنا ضروری نہیں۔ (ماخوذ از قرطبی بزیادۃ)

لیکن، راقم کہتا ہے کہ جو مثال گندم کی میں نے دی ہے وہ مثال اور اس کی مثالوں کا یہ حکم ہے، کہیں یہ حکم نجس اور طاہر پر بھی نہ لگا دینا۔ کہیں یہ فتوی نہ دیتے پھرنا کہ ایک کلو دودھ دس گرام پیشاب مل جل جائے تو دس گرام دودھ انڈیل دینے سے باقی دودھ پاک ہو جائے گا، نہیں نہیں ایسا نہیں"

بلکہ نجس اور طاہر گندم کے مل جل جانے سے بھی نجس گندم کی مقدار گندم نکالنے سے باقی گندم پاک نہیں ہو گئی۔ نیز یہ بھی خیال رہے کہ اگر کوئی متقی شخص اپنے آپ کو اس سے بچانا چاہے کہ وہ سکتا ہے حرام چیز کی مقدار نکال دینے کے باوجود بھی باقی میں حرام کی آمیزش کا خطرہ ہے، لھذا میں یہ استعمال نہیں کرتا یہ غلو نہیں بلکہ یہ تقوی ہے غلو اس وقت ہوگا جب لوگوں کو فتوی دے کر اس پر مجبور کرے۔ "واللہ اعلم بالصواب"

گندم کا بطور قرض لین دین:

حضرت فقیہ اعظم، رئیس الاتقیاء مولنا نور اللہ بصیر پوری رحمہ اللہ سے فتوی طلب کیا گیا کہ گندم کا قرض شرعا جائز ہے یا ناجائز؟ تو آپ نے مندرجہ ذیل جواب تحریر فرمایا، بلا شک وشبہ وریب قطعا، (بغیر کسی شک وشبہ کے یقینی طور پر یہ ثابت ہے) کہ قرض گندم جائز ہے (عنایہ شرح ہدایہ ج۶ ص۲۷۹، مبسوط امام سرخسی علیہ الرحمۃ ج۱۴ ص۳۰، ۳۱، فتح القدیر ج۶ ص۲۷۹، ''والنظم من المبسوط'' (الفاظ مبسوط کے ذکر کئے جارہے ہیں، وہ یہ ہیں)

''الا قراض جائز فی کل مکیل اوموزون وکذلک فی العدديات المتقاربة''

یعنی قرض دینا جائز ہے ہر ایسی چیز میں جو ماپی جائے اور تولی جائے اور ایسے ہی گنتی کی ان چیزوں میں جن کے افراد میں زیادہ فرق نہ ہو۔ اور ''شامی ج۴ ص۲۳۹'' میں ہے

''وفی الفتاوی الهندية استقرض حنطة فاعطى مثلها بعد ماتغير سعرها يجبر المقرض علی القبول'' (فتاوی هنديه)

یعنی عالمگیری میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ اگر کسی شخص نے گندم بطور قرض لی تو اسی کی مثل گندم واپس کی لیکن اس وقت بھاؤ بدل چکا تھا، پھر بھی قرض دینے والے کو مجبور کیا جائے کہ وہ اتنی مقدار گندم ہی واپس لے۔ (راقم)

فتاوی عالمگیر ج۳ ص۱۰۰'' میں ہے۔

''استقرض رجل من رجل حنطة وامره ان يزرعه فی ارض المتقرض فقد صح القرض'' (ایک شخص نے دوسرے سے گندم بطور قرض لی، قرض لینے والے نے قرض دینے والے کو کہا اسے میری زمین میں کاشت کردو تو یہ قرض لینا جائز ہے۔ (راقم)

البتہ گندم چونکہ شرعا مکیلی ہے لھذا یہ ضروری کہ ماپ کر قرض دیا جائے اور ایسے ہی جبکہ گندم گندم سے فروخت کی جائے ماپنا ضروری ہے اور تول (کر بطور قرض دینے) سے جائز نہیں۔ اور روپیہ وغیرہ سے تول کر فروخت کرنا بھی جائز ہے۔ درمختار صفحہ ۴۵۶ میں ہے کہ

"ومانص الشارع علی کونہ کیلیا کبروشعیر وتمر وملح اووزنیا کذھب وفضۃ فھو کذلک لایتغیر لاابدا فلم یصح بیع حنطۃ بحنطۃ............ الخ

جس کے کیلی ہونے (ماپ کر دینے) پر شارع (حضورﷺ) کی جانب سے نص ہو وہ کیلی ہی رہے گی جیسے گندم اور جو اور کھجور اور نمک، اور جن چیزوں کو حضورﷺ نے وزنی کہا ہے وہ وزنی ہی رہیں گی ان کا حکم کبھی بدلے گا نہیں۔ لہٰذا گندم کی بیع گندم کے وزن سے صحیح نہیں اس میں کمی اور زیادتی کا احتمال ہے جسکی وجہ سے اسمیں سود کا احتمال پایا گیا ہے۔ (راقم)

فتاوی عالمگیری ج ۳ ص ۹۸ میں ہے کہ "لاخیر فی قرض الحنطۃ والدقیق وزنا"

گندم اور گندم کے آٹے کو وزن کر کے قرض دینا بہتر نہیں۔ (راقم)

باقی رہی وہ حدیث جس میں "یدا بید" (ہاتھ بہاتھ) کی قید ہے اس سے قرض کی ممانعت نہایت ہی بے جا ہے کہ اس حدیث شریف میں روایت رفع (پیش والی روایت) میں لفظ "بیــع" مقدر ہے اور روایت نصب (زبر والی روایت) میں "بیــعــوا" مقدر ہے۔ مبسوط ج ۱۲ ص ۱۱۰، ہدایہ مطبوع مع الفتح ج ۶ ص ۱۴۷، فتح القدیر، عنایہ شرح ہدایہ ج ۶ ص ۱۴۷ و النظم من العنایہ (عبارت عنایہ کی نقل کی جارہی ہے)

وروی بروایتین بالرفع مثل بمثل وبالنصب مثلابمثل ومعنی الاول بیع الحنطۃ "الی ان قال "ومعنی الثانی بیعوا"

(حدیث میں دو روایتیں ہیں۔ ایک رفع (پیش) والی یعنی اس میں پڑھا گیا ہے "مثل بمثل" اور دوسری نصب (زبر) والی، جس میں پڑھا گیا ہے "مثلابمثل" پہلی روایت کے مطابق لفظ "بیع" مقدر ہے "الحذف والایصال" کے قانون کے مطابق لفظ "بیع" کو حذف کر کے اس کا اعراب مضاف الیہ کو دے دیا، اور دوسری روایت کے مطابق لفظ "بیعوا" مقدر ہے۔ (راقم)

بحر الرائق ج ۶ ص ۱۴۷ قسطلانی شرح صحیح البخاری ج ۴ ص ۶۴ عینی شرح صحیح البخاری ج ۱۱ ص ۲۵۲ و النظم للعینی (الفاظ عینی کے نقل کیے جارہے ہیں) "قولہ والبر بالبر ای وبیع البر بالبرّ وھکذایقدر فی البواقی"

رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی "والبر بالبر" میں لفظ "بیع" مقدر ہے اصل میں "بیع البر بالبر" ہے اور باقی الفاظ میں بھی اسی طرح لفظ "بیع" مقدر ہے۔ (راقم)

ترمذی شریف ج ۱ ص ۱۴۹ میں حدیث مذکور کے تحت ہے "والعمل علی هذا عند اهل العلم لا یرون ان یباع البر بالبر الا مثلا بمثل" (اہل علم کا اسی عمل پر ہے کہ وہ گندم کو گندم کے بدلے بیچنے کو جائز نہیں سمجھتے۔ (راقم)

چاور ایسے ہی بیع (یعنی لفظ بیع کا ذکر) مؤطا امام مالک ج ۱ ص ۳۴۴ اور اشعۃ اللمعات شرح مشکوۃ ج ۳ ص ۱۹ میں ہے بلکہ اس حدیث شریف کے طرق و روایات میں مادہ بیع موجود ہے۔ حدیث دانی اس کا نام نہیں کہ ایک روایت سے حدیث کو دیکھ لیا اور حکم لگا دیا بلکہ طرق مختلفہ پر نظر کر کے نتیجہ نکالنا لازم ہے۔

صحیح مسلم شریف ج ۲ ص ۲۴ اور سنن الکبری بیہقی ج ۵ ص ۲۷۷ میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے ہے کہ "ینهی عن بیع الذهب بالذهب .... الخ" "سونے کی بیع سونے سے روکا گیا ہے سوائے برابر برابر کے"۔

سنن بیہقی ج ۵ ص ۲۷۶، ۲۷۷ میں انہیں حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے:

"لا تبیعوا الذهب بالذهب" (الحدیث) سونے کو سونے کے بدلے سوائے برابر کے نہ بیچو۔

سنن ابن ماجہ ص ۱۶۴ میں انہیں حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ

"نهی رسول الله ﷺ عن بیع الورق بالورق الحدیث"

کہ رسول اللہ ﷺ نے چاندی کے بیع چاندی کے بدلے سوائے برابر کے منع فرمایا ہے۔

تو روز روشن کی طرح معلوم ہوا کہ "یدا بید" کی قید بیع میں ہے تو خواہ مخواہ قرض کو اس حدیث شریف سے کیوں ممنوع قرار دیا جاتا ہے اور اگر یہی شوق دامنگیر ہے تو صرف گندم کا قرض نہیں بلکہ روپیہ اشرفی وغیرہ کا قرض بھی حرام ہو جائے گا اور کہ اس حدیث شریف میں سونے چاندی کا بھی ذکر ہے یہ عجب بات کہ ایک چیز حرام ہو جائے اور دوسری حلال، حالانکہ دونوں ہی ایک حدیث شریف میں یکساں مذکور ہیں، بیع تو "مبادلة المال بالمال بالتراضی" کا نام ہے (یعنی بیع میں مال کا تبادلہ مال سے ہوتا ہے جبکہ دونوں فریق رضامند ہوں) اور قرض "ما تعطیه من مثلی لتقاضاه" یعنی وہ مثلی شے (چیز) جسے دی جائے اور اسی کا تقاضا کیا جائے۔ اور قرض

کا مطلب یہ ہے کہ مثلی چیز یعنی مکیلی یا موزونی یا عددی متقارب دی جائے تا کہ واپس بھی کر لیا جائے، یعنی قرض دینے والا اپنے قرض کا تقاضا کرنے کا حق رکھتا ہو) اسی سے معلوم ہوا کہ قرض اس خاص قسم کی عاریت (منگوی دینا) کا نام ہے تو جواز خود بخود ہی ثابت ہو گیا۔ مبسوط ج ۱۴ص ۳۱ میں ہے:

"ان القرض فی معنی العاریۃلان مایسترده المقرض فی الحکم کانه عین مادفع اذلولم یجعل کذلک کان مبادلة الشیء بجنسه نسیئة وذلک حرام"

اور ایسے ہی ص ۳۴ میں ہے کہ یعنی معنی قرض عاریۃ میں ہے اور جو چیز قرض دینے والا واپس لیتا ہے حکما ایسا ہے گویا کہ اسی چیز کو واپس لیتا ہے جس کو اس نے دیا ہے اور یہ مبادلہ نہیں۔ ہاں اگر مبادلہ ہوتا تو تمام مکیلات وموزونات میں قرض حرام ہوتا اور صرف گندم کی تخصیص نہ ہوتی، مگر جب حقیقۃ مبادلہ نہیں تو جائز ہے اور صورت مبادلہ کا اعتبار نہیں اور یہی وجہ ہے کہ لفظ عاریہ سے بھی قرض ثابت ہو جاتا ہے۔

مبسوط ج ۱۴ص ۳۴، فتاوی عالمگیری ج ۳ص ۱۰۰ میں ہے والنظم من الہندیۃ (عبارت عالمگیری کی نقل کی جارہی ہے)

"وعاریة کل شیء یجوز قرضه قرض"

ہر وہ چیز جسے قرض دینا جائز ہو اسے عاریۃ (مانگوی) دینا بھی قرض کے حکم میں ہے تو امس وشمس کی طرح اضح ولائح ہوا (تو گذرے ہوکل اور سورج کی طرح واضح اور ظاہر گیا کہ قرض جائز ہے)

(فتاوی نوریہ ج ۴ص ۱۲۷ تا ۱۳۰)

فتاوی نوریہ کے اس فتوی کی تصدیق وتائید حضرت شیخ الحدیث مولانا غلام رسول رضوی صاحب فیصل آبادی رحمہ اللہ نے ان الفاظ میں فرمائی" استقراض الحنطة" (گندم کا قرض لینا قطعا جائز ہے) جو شخص اس کا منکر ہو گویا وہ اقوال السلف اور حدیث شریف کا منکر ہے کیونکہ " استقراض الحنطة" حدیث شریف اور معتبرہ کتب فقہیہ سے ثابت ہے قبلہ مجیب صاحب نے جو جواب فرمایا ہے بالکل ان کے موافق ہے۔ (فتاوی نوریہ ص ۱۳۰)

مسئلہ: گائے کے گوشت کی بیع گائے سے، اسی طرح ہر جانور کے گوشت کی بیع اسی جنس کے زندہ جانور سے

جائز ہے جبکہ ہاتھ بہاتھ ہو کیونکہ گوشت موزونی ہے اور جانور موزونی نہیں لیکن نسیئۃ (لیکن ادھار سے بیع) جائز نہیں۔ (درمختار)

مسئلہ : گندم کی بیع گندم کے آٹے یا گندم کے ستو سے مطلقاً ناجائز ہے خواہ ہاتھ بہاتھ ہو یا نسیئۃ (ادھار بیع) ناجائز ہے کیونکہ اس میں مساوات نہیں پائی جاسکتی لہذا سود کا احتمال اس میں قوی طور پر پایا گیا لہذا ناجائز ہے۔ (ماخوذ از درمختار)

روٹی قرض لینا جائز ہے:

روٹی وزن کے طور پر اور گنتی سے قرض لینا جائز ہے، یہی قول امام محمد رحمہ اللہ کا ہے اسی پر فتوی ہے ابن ملک رحمہ اللہ کا اسی کو کمال رحمہ اللہ نے مستحسن سمجھا ہے اور اسی کو صاحب تنویر الابصار نے آسانی کے لئے مستحسن سمجھا ہے اور علامہ شامی رحمہ اللہ نے بھی یہ فرمایا "وانا أرى قول محمد احسن " میں بھی امام محمد رحمہ اللہ کے قول کو مستحسن بلکہ احسن سمجھتا ہوں۔ (ماخوذ از درمختار وشامی)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وَاِنْ كَانَ ذُوْعُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ☆ (آیۃ نمبر ۲۸۰)

﴿۱﴾

اور اگر وہ تنگی والا ہے تو اسے مہلت دو آسانی تک اور قرض پر بالکل چھوڑ دینا تمہارے لئے اور بھلا ہے اگر جانو۔

﴿۲﴾

اور اگر وہ تنگی والا ہے تو مہلت ہے آسانی تک اور تمہارا صدقہ کردینا تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جان لو۔

مطلب واضح ہے کہ جس شخص کوتم نے قرض دے رکھا ہے اگر وہ تنگدست ہو،قرض ادا کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہوتو اسے آسانی تک مہلت دے دو،یعنی جب اسے قرض ادا کرنے کی طاقت حاصل ہو جائے تو اس سے قرض وصول کرلو،اور اگرتم دیا ہوا قرض اسی پر صدقہ کردو،یعنی تمام قرض وصول ہی نہ کروتو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تمہیں علم حاصل ہو جائے کہ یہ بہتر ہے تو ایسا ہی کرو۔اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ بامحاورہ ہے،مطلب سمجھانے کیلئے بہت خوب ترجمہ ہے،راقم نے صرف لفظی ترجمہ پر اکتفاء کیا ہے۔

یہ مختصر مطلب جو بیان کیا ہے یہ تقریبا روح البیان سے ماخوذ ہے،طلباء کرام کی دلچسپی کے لئے روح البیان کی تفسیر بمع آیہ کریمہ درج کی جارہی ہے،ترجمہ مندرجہ بالا مختصر مطلب ہی سمجھیں۔

﴿وَاِنْ كَانَ ذُوْعُسْرَةٍ"ای وان وقع من غرمائكم ذوعسرة وهی بالاعدام او كساد المتاع (فَنَظِرَةٌ)ای فالحكم نظرة وهی من الانظار والامهال (اِلٰى مَيْسَرَةٍ)ای يسار (وَاَنْ تَصَدَّقُوْا)ای وتصدقكم بأسقاط الدين كله عمن اعسر من الغرماء اوبالتاخير والانظار (خَيْرٌلَّكُمْ)ای اكثرثوابا(اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ)جوابه محذوف ای ان كنتم تعلمون انه خيرلكم عملتموه" (روح البیان)

تنگدست کومہلت دینے کی فضیلت میں احادیث مبارکہ:

"عن ابی سعيد قال اصيب رجل فی عهدالنبی ﷺفی ثمارابتاعهافكثردينه فقال رسول اللهﷺتصدقواعليه فتصدق الناس عليه فلم يبلغ ذلک وفاء فقال رسو ل الله ﷺ لغرمائه خذواماوجدتم وليس لكم الاذلک "

(رواه مسلم ،مشكوة باب الافلاس والانظار)

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایک شخص نے پھل خریدے اوران کوآفت پہنچ گئی جس کی وجہ سے اس پرقرض بہت زیادہ ہوگیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس شخص کوصدقہ دو،لوگوں نے ان کوصدقہ دیا تووہ اس کے قرض کو پورا نہ کرسکا تو رسول اللہ ﷺ نے

اسکے قرض خواہوں کوفرمایا کہ جوتم نے پایا وہ لےلواور نہیں ہے تمہارے لئے سوائے اس کے۔

وضاحت حدیث:

حدیث شریف میں جس شخص کا ذکر ہے وہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہیں۔انھوں نے پھل خریدے تھے،ابھی تک قرض ادانہیں کیا تھا کہ پھلوں مین قدرتی آفت یعنی ژالہ باری یا گرم لو(آگ بگولہ)وغیرہ میں سے کوئی آفت واقع ہوئی جس کی وجہ سے وہ پھل تباہ وبرباد ہوگیا۔ادھر پھل بیچنے والا انے قرض کا مطالبہ کررہاتھا،ادھراورلوگوں نے بھی اپنے اپنے قرض کا مطالبہ کیا۔نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام کوحکم دیا کہ ان کوصدقہ دےدوتا کہ ان میں قرض ادا کرنے کی صلاحیت پیدا ہوجائے۔

سبحان اللہ! کیسا ہی خوب مشورہ تھا ایک طرف حضرت معاذ رضی اللہ عنہ پر مہربانی کی اور دوسری طرف صحابہ کرام کوثواب میں شریک کیا،کیونکہ رب تعالی کا ارشادگرامی ہے ﴿اِنَّ اللّٰہَ یَجْزِی الْمُتَصَدِّقِیْنَ﴾ (بیشک اللہ جزادے گاصدقہ کرنے والوں کو)۔حدیث پاک میں ایک بات سمجھنے کے قابل ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے صدقہ دینے کاارشادفرمایااورصدقہ دینے پرقرض ادانہ ہوسکنے کی صورت میں آپ کا یہ ارشادقرض خواہوں کو''خذوماوجدتم ولیس لکم الاذلک'' کہ تمہیں جول رہا ہے وہ لےلواوراس کے سوا کچھ نہیں۔''

آپ نے قرض خواہوں کوقرض لینے سے کس طرح منع فرمایا جبکہ قرض لیناان کاحق تھا؟

اسکے دوجواب ہیں۔ایک یہ کہ

''لیس لکم زجرۃ وحبسہ لانہ ظھرافلاسہ واذاثبت افلاس الرجل لایجوزحبسہ بالدین بل یخلی ویمھل الی ان یحصل لہ مال فیاخذہ الغرماء ولیس معناہ انہ لیس لکم الاماوجدتم وبطل مابقی من دیونکم لقولہ تعالی''وَاِنْ کَانَ ذُوْعُسْرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیْسَرَۃٍ'' تمہارے لئے مقروض کوڈانٹنے اورقیدکرنے کوکوئی حق نہیں کیونکہ اس نے اپنی غربت اوراحتیاجی کوظاہرکردیااوریہ بات واضح ہے کہ جب کوئی شخص اپناغریب ہوناظاہرکردےتواسےقرض کے

بدلے قید نہیں کیا جاسکتا بلکہ اسے چھوڑ دیا جاتا ہے اور اس کے مال کے حاصل ہونے تک اسے مہلت دی جاتی ہے، جب اسے مال مل جائے تو قرض خواہ اپنا مال لے لیں۔یعنی "لیس لکم الاما وجدتم" کا یہ معنی نہیں کہ "تم اسکے بغیر اپنا قرض نہیں لے سکتے" بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اسے ڈانٹ نہیں سکتے ،قید نہیں کرسکتے کیونکہ رب تعالی نے تنگدست کو مال کے ملنے پر اور قرض کی ادائیگی کی استطاعت حاصل ہونے تک مہلت دینے کا حکم فرمایا ہے۔

(مرقاۃ ج۶ ص ۹۷)

دوسرا جواب راقم کے ذہن میں یہ آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں قرض نہ لینے کا حکم نہیں فرمایا۔البتہ مشورہ دیا ہے کہ تم یہی مال لے لو، باقی نہ لو اور رب تعالی کے ارشاد گرامی کے مطابق تم اعلی مقام کو حاصل کرو یعنی ﴿وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ﴾ "تم صدقہ کردو (قرض نہ لو) تو تمہارے لئے بہتر ہے" پر عمل کرو۔

☆ "عن ابی هریرة ان النبی ﷺ قال کان رجل یداین الناس فکان یقول لفتاه اذااتیت معسرا تجاوزعنه لعل الله ان یتجاوزعنا قال فلقی الله فتجاوزعنه "

(بخاری ومسلم ،مشکوة باب الافلاس والانظار)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک شخص لوگوں کو قرض دیتا تھا پھر اپنے خادم کو کہتا کہ 'جب تنگدست آئے تو اس سے درگزر کیا کر وشاید اللہ تعالی ہم سے درگزر فرمائے ، نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ "اس شخص کی اللہ تعالی سے ملاقات ہوئی تو اللہ تعالی نے اسے درگزر فرمایا۔

وضاحت حدیث:

"یداین الناس " کا ایک معنی یہ ہے کہ وہ لوگوں سے قرض کا معاملہ کرتا یعنی قرض کا لین دین کرتا اور دوسرا معنی یہ ہے کہ وہ لوگوں کو قرض دیتا ہے۔

"فکان یقول لفتاه" وہ اپنے جوان سے کہتا ہے جوان سے مراد یا تو خادم ہے یا لڑکا بلکہ مسلم کی دوسری

روایت میں ''غلمانہ'' کے الفاظ ہیں کہ وہ اپنے لڑکوں کو حکم دیتا۔

''اذاتیــــت مـــعســـرا'' جب تمہارے پاس فقیر وتنگدست آئے ''تجاوزعنہ'' تم اس سے درگزر کرو، درگزر کرنا عام ہے تم اس سے چشم پوشی کرلیا کرو، جب وہ ادا کرسکے گا ادا کردے گا اور اگر وہ مال دے اسمیں سے کوئی عیب ہوتو وہ لے لیا کرو، یا یہ کہ اگر کچھ کم ہو، کم ہی لے لو، یا یہ کہ اسے معاف ہی کردیا کرو۔

علمی نکتہ :اس شخص نے کہا کہ ''لعل اللـه ان یتجاوزعنا'' ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمادے، اس نے ضمیر جمع کی ذکر کی ''عنا'' لیکن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''فلقی اللـه فتجاوزعنه '' (جب وہ فوت ہوا) تو اللہ تعالیٰ نے اس سے درگزر فرمایا۔ رسول اللہ نے واحد کی ضمیر ''عـنـه ''ذکر کی۔ اصل مراد یہ ہے کہ اس شخص نے اپنی ذات ہی مراد لی تھی اور رسول اللہ ﷺ نے بھی اس کی ذات کا ہی ذکر کیا۔

''ارادالقـائـل نـفـسـه ولـکـن جمع الضمیر ارادة ان یتجاوز عمن فعل مثل هذاالفعل لیدخل فیه دخولااولیا''

کہنے والا شخص اپنی ذات مراد لے رہا تھا لیکن جمع کی ضمیر اس نے اسلئے ذکر کی کی جو شخص بھی تنگدست سے درگزر کرے تو اللہ تعالیٰ اس سے درگزر کرے، یعنی وہ بھی میری دعا میں ابتدائی طور پر شامل ہوجائے۔

''ولـذلـک اسـتـحـب لـلـداعـی ان یعم فـی الـدعـاء ولایخص نفسه لعل الله تعالی ببرکتهم یستجیب دعائه ''

اسی وجہ سے مستحب یہ ہے کہ دعا کرنے والا اپنی دعا کو عام رکھے تاکہ باقی لوگوں کو بھی شامل کرے، دعا اپنے لئے خاص نہ کرے، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دوسرے لوگوں کی برکت کی وجہ سے اسکی دعا کو قبول کرلے۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں حدیث پاک سے چندفوائد حاصل ہوئے ہیں کہ تنگدست کو مہلت دینے میں فضیلت پائی گئی ہے۔ کل قرض معاف کرنا یا بعض معاف کرنا افضل ہے۔ قرض کے مطالبہ میں درگزر سے کام لینا اور قرض

خواہ کیلئے آسانی پیدا کرنا افضل ہے خواہ وہ تنگدست ہو یا غنی۔ "ولا یحتقر شئی من افعال الخیر فلعله سبب السعادة " نیکی کے کاموں کو گھٹیا نہ سمجھے ہوسکتا ہے کہ معمولی کام بھی اس کی سعادت کا سبب بن جائے۔

اور یہ فائدہ حاصل ہوا کہ اپنے کام میں کسی غلام کو یا لڑکے کو یا خادم کو وکیل بنانا جائز ہے، بلکہ جسے چاہے وکیل بنالے، غلام یا خادم یا لڑکے کی قید اتفاقی ہے۔ (مرقاۃ ج٦ص٩٨)

☆ "وعن ابی قتادة قال قال رسول الله ﷺ من سره ان ینجیه الله من کرب یوم القیامة فلینفس عن معسر او یضع عنه" (رواہ مسلم، مشکوۃ باب الافلاس والانظار)

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کو خوش لگے کہ اللہ تعالیٰ اسے نجات دے قیامت کی مصیبتوں میں سے تو چاہئے کہ تنگدست سے درگزر رے یا معاف کردے۔

وضاحت حدیث:

(من سره) ای احبه واعجبه" یعنی "من سره" کا معنی یہ ہے کہ جسے وہ پسند آئے، خوش لگے، تعجب میں ڈالے۔

(من کرب یوم القیامة)"بضم الکاف وفتح الراء جمع الکربة وهی المحنة الشدیدة والمشقة الاکیدة"

"کرب" کے کاف پر پیش ہے اور راء پر زبر ہے، یہ "کربۃ" کی جمع ہے جس کا معنی ہے محنت شدیدہ اور سخت مشقت۔

(فلینفس) بتشدید الفاء ای فلیؤخر مطالبته" "یعنی "فلینفس" کی فاء پر شد ہے، اس کا معنی مطالبہ کو مؤخر کرنا۔

الفائدة الجليلة:

"الفرض افضل من النفل بسبعین درجة الافی مسائل الأولی ابراء المعسر مندوب وهوافضل من انظاره الواجب الثانیة ابتداء السلام افضل من جوابه الثالثة الوضوء قبل الوقت مندوب افضل من الوضوء بعد دخول الوقت وهو فرض "

فرض نفل (مستحب) سے ستر درجہ افضل ہوتا ہے لیکن چند مسائل میں مستحب فرض سے افضل ہوتا ہے، ان مسائل میں سے تین بطور مثال پیش کیے جا رہے ہیں۔

(۱) تنگدست کو اس کے مطالبہ اور اپنی تنگدستی ظاہر کرنے سے پہلے مہلت دینا مستحب ہے، لیکن یہ افضل ہے اس مہلت دینے سے جو واجب ہو۔ جیسا کہ وہ اپنی تنگدستی کو ظاہر کر دے اور مہلت طلب کر لے تو واجب ہو جاتا ہے کہ اسے مہلت دی جائے۔

(۲) ایک آدمی دوسرے کو پہلے سلام دے تو یہ مستحب ہے لیکن افضل ہے بنسبت سلام کے جواب دینے کے، حالانکہ سلام کا جواب دینا فرض کفایہ ہے۔

(۳) وضوء کرنا نماز کے وقت سے پہلے نماز کی تیاری کیلئے مستحب ہے لیکن یہ اس وضوء سے افضل ہے جو وقت کے آخر میں کیا جائے، کیونکہ جب نماز کا وقت جا رہا ہو تو وضوء کرنا فرض ہے۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج٦ص٩٨)

☆ "وعن ابی قتادة قال سمعت رسول الله ﷺ يقول من انظر معسرا أو وضع عنه انجاه الله من كرب يوم القيامة" (رواه مسلم، مشكوة باب الافلاس والانظار)

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا جس شخص نے تنگدست کو مہلت دی یا معاف کر دیا تو اللہ تعالیٰ اسے قیامت کی مصیبتوں سے نجات عطاء فرمائے گا۔

☆ "عن ابی اليسر (بفتحتين) قال سمعت رسول الله ﷺ يقول من أنظر معسرا أو وضع عنه اظله الله فی ظله" (رواه مسلم، مشكوة باب الافلاس والانظار)

حضرت ابوالیسر فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوتے سنا جس شخص نے تنگدست کو مہلت دی، یا معاف کر دیا تو اللہ اسے اپنے سایہ رحمت میں رکھے گا۔

"اظله الله فی ظله" کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے قیامت کی گرمی سے بچائے گا یا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے عرش کے سایہ میں رکھے گا یا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنی حمایت وحفاظت میں رکھے گا، جیسے کہا جاتا ہے " فلان فی ظل فلان "فلاں شخص فلاں کے سایہ میں ہے یعنی اس کی حفاظت میں ہے۔

(مرقاۃ ج٦ص٩٨)

☆ "وعن کعب بن مالک انه تقاضی ابن ابی حدر د دینا اله علیه فی عهد رسول الله ﷺ فی المسجد فارتفعت اصواتهما حتی سمعها رسول الله ﷺ وهو فی بیته فخرج الیهمارسول الله ﷺ حتی کشف سجف حجرته ونادی کعب بن مالک قال یاکعب قال لبیک یارسول الله فأشار بیده ان ضع الشطر من دینک قال کعب قدفعلت یارسول الله ﷺ قال قم فاقضه "

(بخاری ، مسلم ، مشکوۃ باب الا فلاس وا لا نظار)

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، میرا قرض تھا ابن ابی حدرد پر، میں نے ان سے اپنے قرض کا مسجد میں مطالبہ کیا یہ رسول اللہ ﷺ (کی ظاہری حیات) کا زمانہ تھا۔ دونوں کی آواز بلند ہوئی، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے گھر میں ان کی آواز کو سنا، تو آپ ان دونوں کی طرف نکلے یہاں تک کہ اپنے حجرہ کے پردہ کو ہٹایا، اور کعب بن مالک کو آواز دی اور فرمایا اے کعب بن مالک رضی اللہ عنہ! وہ کہتے ہیں میں نے عرض کیا حاضر خدمت ہوں یارسول اللہ ﷺ تو آپ نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اپنا آدھا قرض معاف کردو، کعب کہتے ہیں میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میں نے (آپ کے حکم کو مانتے ہوئے ایسا) کردیا۔ آپ نے فرمایا (اے ابن ابی حدرد) اٹھو قرض ادا کردو۔

وضاحت حدیث:

"سجف" کو دو طرح پڑھا گیا ہے" سین کے کسرہ اور سین کے فتحہ سے اور جیم کے سکون سے، البتہ سین کے کسرہ سے پڑھنا زیادہ فصیح ہے، اس کا معنی "پردہ" ہے۔ اور دروازے کی ایک طرف کو بھی "سجف" کہا جاتا ہے۔ علامہ طیبی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث پاک سے یہ فوائد حاصل ہورہے ہیں۔

(۱) "فی الحدیث جواز المطالبة بالدین فی السجد" حدیث شریف سے ثابت ہوا کہ قرض کا مطالبہ مسجد میں جائز ہے۔

(۲) "والشفاعة الی صاحب الحق" اور یہ ثابت ہوا کہ صاحب حق کو اپنا حق کل یا بعض معاف کرنے کی سفارش کرنا جائز ہے۔

(۳) "والاصلاح بین الخصوم وحسن التوسط بینهم "اگر کچھ لوگوں کا آپس میں جھگڑا ہو تو کوئی شخص ان میں صلح کرادے اور خود ان میں واسطہ بن جائے یعنی ثالث کا کردار ادا کرے تو یہ مستحب ہے۔

(۴) وقبول الشفاعة فی غیر معصیة" اور مسئلہ یہ سمجھ آیا کہ ایسی سفارش جس میں کسی کا بھلا ہو اور سفارش نیک کام کی ہو، گناہ کے کاموں کی سفارش نہ وہ تو اس سفارش کو قبول کر لیا جائے۔

(۵) وجواز الاعتماد علی الاشارة واقامتها مقام القول لقوله فاشار بیده ان ضع الشطر" اور مسئلہ یہ سمجھ آیا کہ کوئی بات اشارہ سے کرنا جبکہ دوسرا شخص اشارہ کو صحیح سمجھ رہا ہو اور اشارہ سے بھی کسی کی بھلائی مقصود ہو نقصان پہنچانا نہ ہو تو ایسے اشارہ پر اعتماد کرنا جائز ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حضرت کعب بن مالک رحمہ اللہ کو اشارہ سے نصف قرض معاف کرنے کے متعلق کہا۔ (مرقاۃ ج۴ص۱۰۱)

اور سب سے بڑا مسئلہ یہ سمجھ آیا کہ نبی کریم ﷺ کا صحابہ کرام سے محبت بھرا سلوک اور تعلق تھا جو صحابی کل قرض ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے ان کیلئے سفارش کر کے نصف قرض معاف کرا کے ان پر مہربانی کی اور جو نصف قرض معاف کرنے کی طاقت رکھتے تھے ان کو معاف کرنے کا مشورہ دے کر اجر عظیم کا مستحق بنا دیا۔ دونوں جھگڑے کو ابتدائی طور پر ہی مٹا دیا کہ کہیں جھگڑا طول نہ پکڑ جائے۔ (راقم)

فائدہ:

"عن عمرو بن عوف المزنی عن النبی ﷺ قال الصلح جائز بین المسلمین الاصلحا حرم حلالا او احل حراما والمسلمون علی شروطهم الاشرطا حرم حلالا او احل حراما"

(رواه الترمذی وابن ماجه وابوداؤد وانتهت روایته عند قوله شروطهم ،مشکوة باب الافلاس والانظار)

عمرو بن عوف مزنی کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مسلمانوں کے درمیان صلح

کرانا جائز ہے، ہاں البتہ حلال کو حرام کرنے سے یا حرام حلال کرنے سے صلح کرانا جائز نہیں اور مسلمان اپنی اپنی شرطوں پر قائم رہیں لیکن ایسی شرط پر قائم نہ رہیں جو حلال کو حرام کردے یا حرام کو حلال کردے۔

یعنی اگر ایک شخص کہے کہ میری اس دوسرے شخص سے صلح تو ہوسکتی ہے لیکن وہ شراب پی لے تب۔ تیسرا شخص دوسرے کو مشورہ دے کہ چل یار شراب پی لے اور اس سے صلح کرانا حرام ہے کیونکہ اس میں حرام کو حلال کیا جارہا ہے۔

اسی طرح ایک شخص کی زوجہ کہے کہ میری صلح اپنے خاوند سے ہوسکتی ہے لیکن وہ اپنی دوسری زوجہ سے وطی نہ کرے، تیسرا شخص اسکے خاوند کو مشورہ دے کہ تو ایسا ہی کرتو یہ صلح کرلے یہ صلح کرانا حرام ہے کیونکہ یہاں حلال کو حرام کرنے کا مشورہ دیا جارہا ہے۔ شرط کی بھی تقریباً اسی قسم کی مثالیں ہیں لیکن یہاں تیسرا آدمی درمیان میں نہیں ہوتا جیسا کہ خود ہی اپنے خاوند کو کہے کہ میرا تیرا جھگڑا ختم ہوسکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ تو اپنی دوسری زوجہ سے وطی نہیں کرسکتا، اس شرط کو تسلیم کرنا حرام ہے کیونکہ اس میں حلال چیز کو حرام کرنے سے مشروط کیا گیا ہے۔

اسی طرح اگر ایک عورت کسی مرد کو کہے کہ میں تیرے ساتھ نکاح تو کرتی ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ تو میرے ساتھ میری بہن سے بھی نکاح کر، یہ شرط ماننا حرام ہے کیونکہ اس میں حرام کو حلال کرنے سے مشروط کیا گیا ہے۔

(مرقاۃ ج٦ ص١٠٧)

☆ **"وعن سعد بن الاطول قال مات اخی وترک ثلاث مائة دینار وترک ولدا صغارا فاردت ان انفق علیهم فقال لی رسول الله ﷺ ان اخاک محبوس بدینه فاقض عنه قال فذهبت فقضیت عنه ثم جئت فقلت یارسول الله ﷺ قدقضیت عنه ولم تبق الامراۃ تدعی دینارین ولیست لهابینه قال اعطهافانهاصادقة"**

(رواہ احمد ،مشکوۃ باب الافلاس والانظار)

حضرت سعد بن اطول کہتے ہیں میرا بھائی فوت ہوگیا اور تین سو دینار وہ چھوڑ گیا اور اس کے چھوٹے بچے رہ گئے میں نے ارادہ کے کہ یہ تمام دینار میں ان چھوٹے بچوں کے خرچ کیلئے رکھ لو، لیکن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک تمہارا بھائی قرضوں میں جکڑا ہوا تھا، تم اس کے قرض ادا کرو، وہ کہتے ہیں

میں نے اس کے تمام قرضے ادا کر دیئے، پھر میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں نے اپنے بھائی کے تمام قرضے ادا کر دیئے، سوائے ایک عورت کے جو دو دیناروں کا دعوی کرتی ہے لیکن اس کے پاس کوئی گواہ نہیں آپ نے فرمایا اسے وہ دے دو وہ سچی ہے۔ ''آپ کا یہ ارشاد کہ وہ سچی ہے اس کا قرض بھی ادا کر دو'' کا مقصد یہ ہے کہ آپ کو وحی کے ذریعے بتا دیا گیا ہو تو اس لحاظ پر یہ غیبی خبر ہوگی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کو کچھ ذرائع سے معلوم ہو کہ ہاں اس نے قرض دینا تھا اس عورت کا، اس لحاظ پر یہ مشورہ ہوگا فیصلہ نہیں ہوگا۔ فیصلہ تو گواہوں پر ہوتا ہے، البتہ حاکم اپنے علم کے مطابق فیصلہ کرسکتا ہے جبکہ مدعی علیہ اس پر معترض نہ ہو۔

☆ عن حذیفة قال قال رسول الله ﷺ تلقت الملائکه روح رجل ممن کان قبلکم فقالوا اعملت من الخیر شیأ قال لا قالوا تذکر قال کنت اداین الناس فأمر فتیانی ان ینظروا المعسر ویتجوز واعن الموسر قال قال الله عزوجل تجوزوا عنه''

(رواہ مسلم ج۲ ص ۲۵)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم سے پہلے لوگوں میں سے ایک شخص کی روح سے فرشتوں کی ملاقات ہوئی، تو فرشتوں نے کہا کیا تو نے کوئی نیک عمل بھی کیا تھا؟ اس نے کہا، نہیں۔ فرشتوں نے کہا یاد کر (ہوسکتا ہے تو نے کوئی عمل کیا ہو) اس نے کہا میں لوگوں کو قرض دیتا تھا، تو میں اپنے غلاموں کو حکم دیتا تھا کہ تنگدست کو مہلت دے دیا کرو اور غنی سے بھی چشم پوشی کرلیا کرو، راوی کہتے ہیں، کہ اللہ تعالی فرمائے گا تم اس سے درگذر کرلو۔

☆ ''عن عبادة بن الصامت قال خرجت انا وأبی نطلب العلم فی هذاالحی من الأنصار قبل ان یهلکوا فکان اول من لقینا (ابالیسر) صاحب رسول الله ﷺ ومعه غلام له ضمامة من صحف وعلی ابی الیسر بردة ومعافری وعلی غلامه بردة ومعافری فقال له ابی یاعم انی أری فی وجهک سعفة من غضب قال اجل کان لی علی فلان بن فلان الرامی مال فأتیت أهله فسلمت فقلت اثم هو ؟ قالوا لا، فخرج علی ابن له جفر فقلت این ابوک ؟ فقال سمع صوتک فدخل اریکة أمی فقلت

اخرج الی فقد علمت این انت؟ فخرج فقلت ماحملک علی ان أختبأت منی ؟ قال انـا والـله احد ثک ثم لا اکذبک ، خشیت والله ان أحدثک فأکذبک او أعدک فأخلفک وکنت صاحب رسول الله ﷺ وکنت والله معسرا قال قلت آلله قال آللـه ،ثم قال فاتی بصحیفة فمحاها بیده ثم قال فان وجدت قضاء فاقضنی والا فانت فی حل فأشهد ابصر عینای ها تان ووضع أصبعیه علی عینیه وسمع أذنای هاتان ووعاه قلبی واشار الی نیاط قلبه رسول الله ﷺ وهو یقول من أنظر معسرا أووضع عنه اظله الله فی ظله " (رواہ مسلم)

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اور میرے باپ انصار کے اس قبیلہ میں علم حاصل کرنے کیلئے نکلے کہ ان کی وفات سے پہلے علم حاصل کرلیا جائے۔سب سے پہلے ہماری ملاقات رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی (ابوالیسر) سے ہوئی ان کے ساتھ ان کا ایک غلام تھا، اسکے پاس صحف کا مجموعہ تھا۔ابوالیسر نے ایک چادر اور ایک ہمدانی کپڑا اپنے اوپر لیا ہوا تھا اور ان کے غلام کے پاس بھی یہی دو کپڑے تھے،ان کو میرے باپ نے کہا کہ اے میرے چچا میں آپ کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ رہا ہوں۔انہوں نے کہا کہ ہاں میں نے ایک شخص سے قرض لینا تھا میں اسکے گھر والوں کے پاس آیا میں نے سلام کیا پھر میں نے کہا کیا وہ شخص (صاحب منزل) یہاں ہی ہے؟انہوں نے کہا کہ نہیں۔تو اتنے میں اسکا ایک چھوٹا بچہ باہر نکلا، میں نے اس سے پوچھا کہ تمہارے باپ کہاں ہیں؟اس نے کہا کہ وہ تمہاری آواز سن کر میرے ماں کے سونے والی پالکی میں داخل ہو گئے ہیں (یعنی چارپائی پر چھپ گئے ہیں) میں نے کہا کہ میری طرف نکل آؤ تحقیق مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تم کہاں ہو،وہ شخص نکل آیا۔میں نے کہا کہ تم کس وجہ سے مجھ سے چھپ گئے تھے؟تو اس شخص نے جواب دیا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں تمہیں سچی بات بتا رہا ہوں کہ اس میں کوئی جھوٹ نہیں۔وجہ یہ تھی کہ مجھے یہ ڈر لاحق ہوا کہ میں تم سے وعدہ کرلوں پھر اسکی خلاف ورزی کردوں۔قرض کی ادائیگی کی بات کرلوں پھر جھوٹ بول لوں،تم رسول اللہ ﷺ کا صحابی ہو

قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں تنگدست ہوں۔ میں نے کہا کہ کیا واقعی یہ سچ ہے؟ اسنے کہا ہاں واقعی یہ سچ ہے، پھر انہوں نے بتایا کہ قرض کی دستاویز سے قرض کو مٹا دیا گیا۔ پھر میں نے کہا کہ اگر تمہیں قرض دینے کی صلاحیت حاصل ہوگئی تو قرض ادا کر دینا ورنہ تمہیں معاف ہے تو میں گواہی دیتا ہوں کہ میری ان دو آنکھوں نے دیکھا اور انہوں نے اپنی انگلیوں کو اپنی آنکھوں پر رکھا، اور میرے ان دونوں کانوں نے سنا اور میرے دل نے اسے محفوظ رکھا اور اشارہ اپنے دل کے وسط کی طرف کیا کہ رسول اللہ ﷺ فرمار ہے تھے کہ جس شخص نے تنگدست کو مہلت دی یا اس کا قرض معاف کیا اللہ تعالیٰ اس کو اپنی رحمت کے سایہ میں رکھے گا۔ (ابن کثیر)

ابو الیسر رضی اللہ عنہ کی پریشانی کی وجہ تقریباً واضح طور پر حدیث شریف سے سمجھ آرہی ہے کہ وہ مقروض آدمی کتنی غربت میں تھا، کتنا پریشان حال تھا کہ جس کی وجہ سے وہ مجھ سے چھپ رہا تھا۔

"اظلہ اللہ فی ظلہ" کی وضاحت پہلے بیان کی جا چکی ہے۔

تین قسم کی ضرورتوں کیلئے قرض لینا:

(۱) جب اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہو یعنی جہاد میں مشغول ہو تو ضرورت کیلئے قرض لینا۔

(۲) کوئی شخص غربت کی حالت میں فوت ہوگیا اسے کفن پہنانا ہو لیکن یہ شخص خود بھی غریب ہو کفن نہ پہن سکے تو قرض لے لے۔

(۳) اپنے آپ کو جوانی میں گناہوں سے بچانے کیلئے نکاح کی ضرورت کیلئے قرض لینا۔

یہ تین ضرورتیں بڑی ضرورتیں ہیں۔ البتہ ان تین ضرورتوں کے علاوہ بھی قرض لیا جا سکتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے قرض لینے کیلئے آسانی پیدا فرما دی:

آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

"من ادان ديناوهوينوى قضائه وكل به ملائكة يحفظونه ويدعون له حتى يقضيه"
جس شخص نے قرض لیا اس ارادہ سے وہ ضرور ادا کرے گا تو اللہ تعالی اس کے لئے فرشتے مقرر فرما دیتا ہے جو اسکی حفاظت کرتے ہیں اور اسکے لئے دعاء کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ قرض ادا کر دیتا ہے۔

حدیث پاک سے واضح ہوا کہ..........

"من يستدن متوكلا على الله فالله تعالى يفتح ابواب اسباب القضاء"
جو شخص قرض ادا کرنے کی غرض سے اللہ تعالی پر توکل رکھتے ہوئے قرض لیتا ہے، اللہ تعالی اسکے لئے آسمانوں کے رحمت کے دروازے کھول دیتا ہے تا کہ وہ قرض ادا کر سکے۔

"وكان جماعة السلف يستقرضون من غير حاجة لهذاالخبر ومهماقدر على قضاء الدين فليبادر اليه ولوقبل وقته"
یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین بغیر شدت ضرورت کے بھی قرض لیتے رہے، یہی حدیث ان کی دلیل تھی جب بھی ان کو قرض ادا کرنے کی طاقت مل جاتی تو وہ جلدی ہی قرض ادا کر دیتے خواہ ابھی قرض کے ادا کرنے کا وقت نہ ہو۔یعنی وقت سے پہلے ہی وہ قرض ادا کر دیا کرتے تھے۔

(ماخوذ از روح البیان)

تارک فرائض کو قرض نہ دیا جائے:

اسکی وجہ یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالی کے فرائض ادا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے کوئی پرواہ نہیں کرتا وہ کسی شخص کا قرض ادا کرنے کی کیا پرواہ کرے گا۔اسی وجہ سے کہا گیا ہے۔

وامش مدہ آنکہ بےنماز است ورخود دہنش زفاقہ باز است

کو فرض خدا نمی گزار ازقرض تو نیز غم ندارد

قرض نہ دے اس شخص کو جو بے نماز ہے اگر چہ بھوک کی وجہ سے اس نے اپنا منہ کھلا رکھا ہوا ہو۔جو شخص

خدا کا قرض ادا نہیں کرتا وہ تیرے قرض کا بھی غم نہیں رکھے گا۔ (روح البیان)

دینی طلباء کرام کو توجہ کیلئے:

"وَاِنْ کَانَ ذُوْعُسْرَةٍ" میں دو قرائتیں ہیں ایک میں "ذُوْعُسْرَةٍ" پڑھا گیا ہے اور دوسری میں "ذَاعُسْرَةٍ" پڑھا گیا ہے۔ جس قرأت میں "ذُوْعُسْرَةٍ" پڑھا گیا ہے اسمیں "کان تامہ" ہے جو خبر کا تقاضا نہیں کرتا اور جس قرأت میں "ذَاعُسْرَةٍ" پڑھا گیا ہے اسمیں "کان ناقصہ" ہے "کان" میں ضمیر ہے جو اسم کان ہے اور "ذَاعُسْرَةٍ" اسکی خبر ہے۔

اسی طرح اور ایک خیال رکھا جائے کہ "عُسْرَةٍ" میں عام حضرات کی قرأت میں سین ساکن ہے اور ابو جعفر کی قرأت میں سین پر ضمہ پڑھا گیا ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی ومظہری)

دینی طلباء کرام ایک اور توجہ فرمائیں:

"فَنَظِرَةٌ" فاء جواب شرط کی وجہ سے آئی ہوئی ہے "نَظِرَةٌ" مبتداء ہے اور اسکی خبر محذوف ہے یعنی "فعلیکم نظرة" تم پر لازم ہے مہلت دینا یا فاعل ہے اور فعل مقدر ہے یعنی "فتجب نظرة" مہلت دینا واجب ہے یا خبر ہے مبتداء محذوف کی یعنی "فالأمر نظرة" حکم یہ ہے کہ مہلت دی جائے یا عبارت یوں ہوگی "فالواجب نظرة" واجب ہے مہلت دینا۔

"نَظْرَةٌ" کو ظاء کے سکون سے بھی پڑھا گیا ہے جس کا معنی ہے انتظار کرنا۔ مراد اس سے مہلت دینا اور تاخیر کرنا۔

"مَیْسَرَةٌ" کو سین کے فتحہ سے بھی پڑھا گیا ہے اور ضمہ سے بھی جیسے "مقبرة" کی باء پر فتحہ اور ضمہ دونوں جائز ہیں۔
(روح المعانی)

☆☆☆☆☆☆☆☆

وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ☆ (آیہ نمبر ۲۸۱)

﴿۱﴾

اور ڈرو اس دن سے جس میں اللہ کی طرف پھرو گے اور ہر جان کو اسکی کمائی پوری بھر دی جائے گی اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔

﴿۲﴾

اور ڈرو اس دن سے، لوٹایا جائے گا تمہیں اس میں اللہ کی طرف پھر پورا پورا دیا جائے گا ہر نفس کو (بدلہ اس کا) جو اس نے کسب کیا، اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

ماقبل سے تعلق:

قوم کے بڑے بڑے سردار سودی کاروبار کرتے تھے، وہ اصحاب ثروت تھے اور بظاہر جاہ وجلال کے مالک تھے، لوگوں کے مددگار تھے، اسی وجہ سے وہ لوگوں پر مہربانیاں کرتے تھے تو ان کو لوگوں پر غلبہ حاصل تھا، رب تعالیٰ نے سود کو حرام کر کے، قرض دینے کا شرعی قانون بیان کر دیا اگر مقروض تنگدست ہو تو اسے مہلت دینے یا معاف کر دینے کا حکم دیا اور ساتھ بتا دیا کہ یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ اب اس آیۃ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کے احکام سے عدولی سے ڈرایا گیا ہے کہ قیامت کا ہولناک منظر تمہیں یاد رہے، اس دن سے ڈرو، پھر یہ بھی خیال رکھو کہ اس دن تمہیں رب تعالیٰ کے ہاں حاضر ہونا ہے رب تعالیٰ کے احکام کو نہ ماننے کی وجہ سے وہاں تمہیں ندامت ہوگی۔ اس سے پہلے ہی بچ جاؤ، اس کا واحد ذریعہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو تسلیم کرنا ہے۔ یعنی اس آیۃ کریمہ میں مزید زجر وتوبیخ (ڈانٹ، دھمکی) سے ان کو سود لینے سے منع کیا گیا ہے کہ وہ سود لینے اور لوگوں کا مال باطل طریقے سے لینے سے باز آجائیں۔ (ماخوذ از کبیر)

یہ آیت نزول کے لحاظ پر آخری آیت ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہ آیۃ کریمہ سب سے آخر میں رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی۔

آپ کے حجۃ الوداع کے دوران سورۃ نساء کی آخری آیت ﴿یَسْتَفْتُوْنَکَ قُلِ اللّٰہُ یُفْتِیْکُمْ فِی الْکَلٰلَۃِ﴾ نازل ہوئی۔ پھر اسی حج کے دوران جب آپ مقام عرفات پر تشریف لے گئے تو ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ﴾ آیت نازل ہوئی۔ حج کے بعد ربیع الاول میں آپ کا وصال ہوگیا، آپ کے وصال سے چند دن پہلے یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی اور جبریل نے آپ کو بتایا کہ اس آیۃ کریمہ کو سورۃ بقرۃ کی دوسواسی آیۃ کے بعد رکھیں۔ (ماخوذ از کبیر)

کبیر کے اس واضح بیان سے یہ عقدہ بھی حل ہوگیا کہ ان تینوں آیتوں کے متعلق ذکر ملتا رہتا ہے کہ یہ آیت آخر میں نازل ہوئی۔ چونکہ تینوں ہی وصال کے قریب آخر میں نازل ہوئیں، ان کے نزول میں وقفہ کم ہے، البتہ ترتیب وہی ہے جو کبیر سے بیان کردی گئی۔

دینی طلباء کرام کی خصوصی توجہ کیلئے:

"یَوْمًا" پر نصب مفعول بہ ہونے کی وجہ سے ہے، مفعول فیہ ہونے کی وجہ سے نہیں۔ مفعول فیہ ہوتو معنی یہ ہوگا اور ڈرو اس دن میں یعنی قیامت کے دن جا کر ڈرنا۔ یہ معنی مقصود نہیں بلکہ مقصود، مفعول بہ والا معنی ہے "اور ڈرو اس دن سے" یعنی مراد یہ ہے کہ "تأھبوا للقائه بماتقدمون من العمل الصالح" نیک عمل کر کے آگے بھیج کر ابھی سے قیامت کے دن رب سے ملنے کی تیاری کرلو۔ (کبیر)

دن سے ڈرنے سے کیا مراد ہے:

دن تو ایک مخصوص وقت کو کہا جاتا ہے۔ اس سے ڈرنے کا تو کوئی خاص مقصد نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ

"وانما يتقى مايحدث فيه من الشدة والاهوال واتقاء تلك الاهوال لايمكن الافي دار الدنيا بمجانبة المعاصي وفعل الواجبات فصار قوله ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا﴾ يتضمن الامر بجميع اقسام التكليف"

اور اس دن میں جو شدت اور ہولنا کی (سخت ڈرانے کی کیفیت) جو پائی جائے گی اس سے ڈرے، یہ تب ہی ہوسکتا ہے جب اس دار دنیا میں گناہوں سے بچے اور واجبات پر عمل کرے ،لہذا واضح ہوا کہ اللہ تعالی کا ارشاد گرامی "وَاتَّقُوْا یَوْمًا" اپنے اختصار کے باوجود تمام اقسام تکلیف کو شامل ہے کیونکہ انسان اوامر پر عمل کرنے کا مکلف ہے، اور نواہی سے بچنے کا بھی مکلف ہے، تو مختصر الفاظ وسیع معانی کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہیں کہ اللہ تعالی کے تمام احکام پر اس دنیا میں عمل کر کے اور رب تعالی نے جن کاموں سے منع کیا ہے ان تمام کاموں سے بچ کر قیامت کے دن کے سخت ہولناک منظر اور اس دن کی سخت پریشانیوں سے بچ کر رہو۔ (کبیر)

اللہ تعالی کیطرف لوٹائے جانے سے کیا مراد ہے؟

بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ کسی کی طرف لوٹائے جانے کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ جس جگہ میں ہو اس جگہ کی طرف لوٹایا جائے ،یا جس جہت کی طرف کوئی ہو، اس جہت کی طرف لوٹایا جائے ،لیکن اللہ تعالی تو مکان اور جہت سے پاک ہے، تو پھر رب تعالی کے ارشاد (وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَی اللّٰهِ) ''اور ڈرو اس دن سے جس دن تمہیں لوٹایا جائے گا اس میں اللہ کی طرف'' کا کیا مطلب ہے؟

بعض حضرات کا جواب:

اس سوال کا بعض حضرات نے یہ جواب دیا تھا کہ یہاں حذف مضاف کا قانون جاری ہے اصل میں مراد یہ ہے کہ "ترجعون الی علمه وحفظه تم ڈرو اس دن سے جس دن تمہیں اللہ تعالی کے علم اور اسکی حفاظت کی طرف لوٹایا جائے گا۔

علامہ رازی رحمہ اللہ کا رد:

اس مذکورہ بالا جواب کو علامہ رازی رحمہ اللہ نے پسند نہیں فرمایا آپ فرماتے ہیں کہ

"ولیس المراد منه الرجوع الی علمه وحفظه فانه معهم اینما کانوا"
یہ کہنا درست نہیں کہ مراد یہ ہے کہ ڈرو اس دن سے جس دن میں تمہیں اللہ تعالیٰ کے علم اور حفاظت کی طرف لوٹایا جائے گا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا علم اور حفاظت تو اسے ہر وقت حاصل ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ علیہ کی طرف سے جواب:

آپ فرماتے ہیں کہ آیہ کریمہ کے دو مطلب ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ انسان کی تین حالتیں ہیں ان میں سے پہلی حالت یہ ہے کہ انسان جب ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو وہ خود کسی نفع اور نقصان کا مالک نہیں ہوتا اور نہ ہی اسکے والدین کا اس پر کوئی تصرف ہوتا ہے اگر اس پر کسی کو تصرف حاصل ہوتا ہے تو وہ صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہوتا ہے۔ انسان کی دوسری حالت پیدائش کے بعد ہوتی ہے اگر چہ حقیقی تصرف تو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ کو ہی حاصل ہوتا ہے لیکن بظاہر اس کے کفیل اور اس کے احوال کی اصلاح کرنے والے شروع شروع میں اسکے والدین ہوتے ہیں پھر بعض لوگ بعض کی تربیت وغیرہ کرتے ہیں اور انسان کی تیسری حالت یہ ہے کہ موت کے بعد بظاہر اس پر کسی کو تصرف حاصل نہیں ہوتا بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کو حقیقی طور پر اس پر تصرف حاصل ہوتا ہے۔

"فکانه بعدالخروج عن الدنیاعاد الی الحالة التی کان علیهاقبل الدخول فی الدنیافهذاهومعنی الرجوع الی الله"

یعنی انسان جب دنیا سے نکلتا ہے تو وہ اپنی پہلی حالت کی طرف لوٹ جاتا ہے جو اسے پیدائش سے پہلے حاصل ہوتی ہے یعنی وہ موت کے بعد صرف اللہ تعالیٰ کے تصرف کی طرف لوٹتا ہے۔ لہذا واضح ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنے کا یہی مطلب ہے۔

(۲) دوسرا مطلب یہ ہے کہ "ترجعون الی ماعدالله لکم من ثواب اوعقاب" اور ڈرو اس دن سے جس میں تمہیں اللہ تعالیٰ کے ثواب اور عذاب کی طرف لوٹایا جائے گا۔

"ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ"

''پھر پوراپورادیا جائے گا ہر نفس کو (بدلہ اسکا) جواس نے کسب کیا''۔

ان الفاظ مبارکہ سے دو مطلب حاصل ہوئے۔ پہلا یہ کہ ہر مکلّف (عاقل و بالغ) کو اللہ تعالیٰ کے ہاں رجوع کے وقت مکمل بدلہ عطاء کیا جائے اس میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں کی جائے گی جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

"فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ"

''تو جوایک ذرہ بھرا بھلائی کرے اسے دیکھے گا اور جوایک ذرہ بھر برائی کرے اسے دیکھے گا''۔

"مَا کَسَبَتْ'' میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ اسمیں ''جزاء'' کا لفظ مقدر ہے یعنی ہر نفس کو پوراپورا دیا جائے گا بدلہ اس کا جواس نے کسب کیا۔

راقم نے طلباء کے فائدے کے لئے یہی مطلب مدنظر رکھتے ہوئے بریکٹ میں (بدلہ اس کا) تحریر کیا ہے کہ طلباء کرام کو دونوں مقاصد سمجھ میں آجائیں۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ عمل خود ہی اس کی جزا ہو اب مطلب یہ ہوگا کہ ''توفی کل نفس مکتسبها'' ہر نفس کو پوراپورا اس کا کسب دیا جائے گا۔''وهذا التاویل أولی لأنه مهما امکن تفسیر الکلام بحیث لا یحتاج فیه الی الاضمار کان اولی'' یہ دوسرا احتمال زیادہ بہتر ہے اس لئے کہ جب ممکن ہو کہ کلام کی تفسیر بغیر مقدر الفاظ کے ہو سکے تو وہ بہتر ہوتی ہے۔

علامہ رازی رحمۃ اللہ کی تفسیر کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ (ہر جان کو اس کی کمائی پوری بھردی جائے گی) کو دیکھیں تو آپ کا ترجمہ بہت خوبصورت تحقیق بھرا نظر آئے گا۔

ان الفاظ مبارکہ سے دوسرا مطلب (یعنی دوسرا فائدہ) یہ حاصل ہوا کہ فاسق وفاجر کو عذاب تو دیا جائے گا لیکن وہ جہنم میں ہمیشہ نہیں رہے گا۔

"لا نه لما امن فلا بد وان یصل ثواب الایمان الیه ولایمکن ذلک الا بان یخرج من النار ویدخل الجنة"

اس لئے کہ جب اس نے ایمان لایا تو ضروری ہے کہ اسے ایمان کا ثواب حاصل ہو، یہ اس وقت تک ممکن نہیں کہ وہ جہنم سے نکل کر جنت میں داخل ہو جائے۔

"وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ" ''اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

سوال: (وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ) ''اور ہر نفس کو اس کے کسب کا بدلہ پورا پورا دیا جائے گا'' سے یہی بات سمجھ آ رہی ہے کہ کسی نفس پر ظلم نہیں کیا جائے گا، دوبارہ "وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ" کا ذکر تکرار ہے، بلاوجہ تکرار فصاحت کے خلاف ہے۔

جواب: (وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ) سے تو یہ سمجھ آ رہا ہے کہ فاسقوں اور کافروں کو ان کے کسب کا پورا پورا عذاب دیا جائے گا، تو اس پر وہم ہوتا تھا کہ "کیف یلیق بکرم اکرم الأکرمین ان یعذب عبیدہ" اللہ تعالیٰ "اکرم الأکرمین" ہے تو وہ اپنے بندوں کو عذاب کیسے دے گا؟

تو اس کا ایک جواب معتزلہ نے دیا ہے کہ بندہ خود اپنے آپ کو عذاب میں ڈال دیتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے قدرت واختیار دیا ہے کہ وہ اپنے آپ سے برائیوں کو دور کرے، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کیلئے دلائل حاصل کرنے کی راہ بھی آسان کر دی، پھر اسے مہلت دی جلدی کوئی گرفت نہیں کی، لیکن بندہ اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے اپنے نفس کو برائیوں کی طرف لے جاتا ہے جس کی وجہ سے اسے عذاب دیا جاتا، اللہ تعالیٰ کریم ہے وہ اپنے بندوں کو عذاب نہیں دیتا۔

دوسرا جواب اہل سنت وجماعت نے دیا ہے جو تحقیقی جواب ہے، معتزلہ کا جواب ظاہری جواب ہے۔ اہل سنت وجماعت نے کہا کہ "ان اللہ سبحانہ مالک الخلق والمالک اذا تصرف فی ملکہ کیف یشاء وأراد لم یکن ظلما" بیشک اللہ تعالیٰ مخلوق کا مالک ہے، اور اپنی ملکیت میں جو چاہے، جو ارادہ رکھے وہ اس میں تصرف کرسکتا ہے، اپنی ملکیت میں اپنے ارادہ کے مطابق تصرف ظلم نہیں۔ (از کبیر)

علامہ اسماعیل حقی رحمۃ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ''یہ آیۃ نزول کے لحاظ پر آخری آیۃ ہے'' نقل کرنے کے بعد مندرجہ ذیل بحث ضمناً ذکر فرمائی ہے۔

بیشک رسول اللہ ﷺ پیر کے دن پیدا ہوئے، پیر کو ہی مبعوث ہوئے یعنی پیر کو اعلان نبوت فرمایا، پیر کو ہی مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے، اور پیر کو ہی آپ کا وصال ہوا۔ آپ اٹھارہ دن بیمار رہے، لوگ آپ کی عیادت کیلئے آتے تو آپ فرماتے " الصلو ۃ و ما ملکت ایمانکم الصلو ۃ فانا للہ و انا الیہ راجعون " نماز اور جن کے تم مالک ہو اور نماز، بیشک ہم اللہ کیلئے ہیں اور بیشک ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یعنی آپ آخری مرض کے دنوں میں نماز کی پابندی کرنے کا حکم فرمارہے تھے اور غلاموں سے اچھا سلوک کرنے کا حکم دے رہے تھے اور رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا:

" من اصیب بمصیبة فلیذ کر مصیبته بی فانها اعظم المصائب "

جس شخص کو کوئی مصیبت پہنچے تو وہ میری مصیبتوں کو یاد کرے، مجھے سب سے زیادہ مصیبتیں پہنچائی گئی ہیں۔

چونکہ جتنا مرتبہ بلند ہوتا ہی آزمائشیں زیادہ آتی ہیں۔ جب آپ افضل الانبیاء ہیں تو آپ پر سب سے زیادہ مصیبتوں کا آنا عقل کے مطابق ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

" من کان له فرطان من امتی ادخله الله بهما الجنة فقالت له عائشة فمن کان له فرط من امتک قال ومن کان له فرط یاموفقة قالت فمن لم یکن له فرط من امتک قال ان افرط لامتی لن یصابوا بمثلی "

میری امت میں سے جس شخص کے دو بچے فوت ہو جائیں اس کے لئے آگے جا کر منتظم بنیں تو اللہ تعالی اسے ان کے ذریعے جنت میں داخل کرے گا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے عرض کیا جس کا ایک بچہ فوت ہو جائے تو آپ نے فرمایا وہ ایک ہی اس کیلئے جنت میں داخل کرنے کا ذریعہ بنے گا، اسے توفیق دی ہوئی، پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما نے عرض کیا آپ کی امت میں سے کسی کا ایک بچہ بھی نہ فوت ہوا ہو تو آپ نے فرمایا اس کا آگے منتظم میں ہوں گا یعنی اس کا میں شفیع ہوں گا، میری جیسی تکالیف کسی اور کو نہیں پہنچائی گئیں۔

اگر کوئی اس حدیث پاک کی مزید وضاحت دیکھنا چاہے تو دوسرے پارہ ﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ

الْخَوْفِ ﴾ آیۃ کریمہ کے تحت بحث کو دیکھے۔

اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴾ اور نہیں بھیجا آپ کو مگر سب جہانوں کیلئے رحمت بنا کر۔ "فکانت حیاته ومماته رحمة" جب آپ سب جہانوں کیلئے رحمت بن کر آئے اور سب زمانوں میں آپ کی رحمت نے قائم ودائم رہنا ہے تو اسی سے یہ واضح ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی اور آپ کا وصال رحمت ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"اذا اراد الله بأمة رحمة قبض نبيها قبلها فجعله سلفا وفرطالها"

جب اللہ تعالیٰ کسی نبی کی امت پر رحم فرمانے کا ارادہ کرتا ہے تو اس امت کے نبی کو وصال عطاء کر دیتا ہے جو آگے جا کر اپنی امت کا منتظم بنتا ہے (اور شفاعت کرتا ہے)

نبی کریم ﷺ کے وصال پر بے قراری کا عالم:

اگرچہ نبی کریم ﷺ کا وصال بھی رحمت تھا، لیکن آپ کے وصال پر ظاہری طور پر صحابہ کرام کا بے قرار ہونا بھی قدرتی عالم تھا، کیونکہ آپ کا ظاہری طور پر صحابہ کرام کی نظروں سے پردہ فرما جانا ان کیلئے ظاہری بہت بڑی پریشانی کا سبب بنا۔ ایک انصاری صحابی رسول اللہ ﷺ کے وصال پر ان الفاظ سے مرثیہ کہتے ہیں:

"الصبر يحمد في المواطن كلها (لاعليک فانه مذموم)

صبر تمام مقامات میں قابل تعریف ہے، سوائے آپ پر صبر کے بیشک وہ مذموم ہے۔ (روح البیان)

یعنی بغیر کسی جزع وفزع کے بے قرار بھی نہ ہونا اور صبر کرنا، آپ وصال کے فرمانے اور ہم سے جدا ہونے پر ہم غم سے نڈھال نہ ہوں تو یہ بری بات ہے، البتہ شریعت کا دامن چھوڑ کر واویلا کرنا، بال نوچنا وغیرہ جیسے کام ہم کبھی نہیں کریں گے۔

یہ آیۃ کریمہ تمام قرآن پاک کا خلاصہ ہے:

بیشک اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ میں قرآن کے تمام مضامین کو بطور خلاصہ جمع کر دیا گیا ہے، اسی وجہ سے اس

آیۂ کریمہ کو ''آخرالوحی'' اور'' آخرالانزال'' بنایا گیا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے پہلی آسمانی کتابوں کے مضامین کو قرآن پاک میں بطور خلاصہ جمع کر دیا گیا ہے، اور قرآن پاک کو'' خاتم الکتب'' بنایا گیا، یعنی یہ آسمانی کتب سے آخری کتاب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

" ان النبی ﷺ خاتم الانبیاء علیهم السلام وقد جمع فیه اخلاق الانبیاء "

بیشک نبی کریم ﷺ کو خاتم الانبیاء بنایا گیا، کیونکہ نبی کریم ﷺ کی ذات کو تمام انبیاء کرام کی تمام صفات سے متصف کیا گیا۔

(زیادہ تفصیل تفسیر کبیر سے ان شاء اللہ ﴿ فَبِهُدٰا هُمُ اقْتَدِهْ ﴾ کی وضاحت کے ضمن میں آجائے گی)

بیشک تمام کتابوں کا خلاصہ اور فائدہ بنسبت انسان کے دو معنوں کی طرف لوٹتا ہے، ایک ان میں سے یہ ہے کہ گھٹیا مقام سے نجات، اور دوسرا ان میں سے یہ ہے کہ بلند مقام کی طرف کامیابی۔ چونکہ گھٹیا مقامات کی تعداد سات ہے، ان سے نجات ضروری ہے، وہ یہ ہیں:

(۱) کفر (۲) شرک (۳) جہالت (۴) معاصی (۵) برے اخلاق

(۶) اچھے اوصاف سے جو چیزیں حجاب کا سبب بنیں۔

(۷) نفس کیلئے جو چیزیں حجاب بنیں، یعنی نفس کو اچھائیوں سے ہٹا کر برائیوں کی طرف لے جائیں۔

بلند درجات کی طرف ترقی حاصل کرنا، اور اس پر کامیابی حاصل کرنا آٹھ چیزوں پر موقوف ہے، وہ یہ ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ کی معرفت (۲) اللہ تعالیٰ کی توحید، یعنی اس کو ایک معبود ماننا اس کے ساتھ کوئی شریک نہ ٹھہرانا۔

(۳) علم حاصل کرنا جس میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی معرفت پائی جائے اور احکام شرع کا پتہ چل جائے۔

(۴) طاعت، یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری کی جائے، ان کے اوامر و نواہی کو تسلیم کیا جائے۔

(۵) اچھے اخلاق پائے جائیں۔ (۶) اپنی ذات کو باقی رکھے۔

(۷) جذبات حق پائے جائیں یعنی حق کو حاصل کرنے کی کوشش کامل طور پر پائی جائے۔

(۸) اپنی انا کو فناء کر دے، یعنی اس کی میں ختم ہو جائے، میں یہ ہوں، میں وہ ہوں کو چھوڑ کر عجز و انکساری کا

پیکر بن جائے۔

یہ آیۃ کریمہ ان تمام کے مجموعہ کی طرف اجمالی طور پر اشارہ کررہی ہے۔(وَاتَّقُوْا)'اور ڈرو' یہ لفظ انسانی کوشش کی ان تمام قسموں کو شامل ہے جن کا ذکر کیا جاچکا ہے یعنی حقیقی تقوی (ڈرنا) یہ ہے کہ جو چیزیں اللہ تعالی سے دور کرنے والی ہیں ان سے اجتناب کیا جائے اور جو چیزیں اللہ تعالی کے قریب کریں ان کو حاصل کیا جائے۔اس پر دلیل نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

جماع التقوی قول اللہ تعالی(اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَاۤئِ ذِى الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۤءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ) . (سورۃ النحل، آیۃ ص ۹۰)

کہ تقوی کی تمام قسموں کو اللہ تعالی کے اس ارشاد گرامی میں جمع کر دیا گیا ہے ۔ بیشک اللہ حکم فرماتا ہے انصاف اور نیکی اور رشتہ داروں کو دینے کا اور منع فرماتا ہے بے حیائی اور بری بات اور سرکشی سے تمہیں نصیحت فرماتا ہے کہ تم دھیان کرو۔

گھٹیا مراتب سے نکلنا اور بلند مراتب کو حاصل کرنا تقوی کے تحت درج ہیں۔

عوام کا تقوی : یہ ہے کہ اللہ تعالی کی معرفت کے ذریعے کفر سے نکل آئے اور اللہ تعالی کی توحید کے ذریعے شرک سے نکل آئے اور علم کے ذریعے جہالت سے نکل آئے اور طاعات کے ذریعے معاصی سے نکل آئے اور اچھے اخلاق کے ذریعے برے اخلاق سے نکل آئے۔

یہاں تک عوام کی سیر کی انتہاء ہے،اس لئے کہ انسان کے عمل وکسب کی یہاں انتہاء ہو جاتی ہے اور مجتہدین (کوشش کرنے والوں) کی کوشش کا یہی مقصود ہوتا ہے کہ وہ ان شرائط کو حاصل کرلیں، جو اللہ تعالی کے اس ارشاد گرامی میں پائی گئی ہیں(وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا) ''اور وہ لوگ جو ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستوں کی ہدایت دیتے ہیں''

خواص کا تقوی:

وہ لوگ جو(لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا) کو پانے کا شوق اور محبت اور جذبہ رکھتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ درجہ

مجذوبیت میں آجاتے ہیں، وہی شوق وجذبہ ان کے اوصاف کے حجابات کو ہٹا کر انہیں رب تعالیٰ کی تجلیات سے منور کر دیتا ہے اور رب تعالیٰ کا قرب اسے حاصل ہو جاتا ہے۔ یہاں خواص کی راہ سلوک کی حد آ جاتی ہے، یہ لوگ ''جنۃ الماویٰ'' کے پاس ''سدرۃ المنتہی'' میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سایہ میں ہوتے ہیں اور (اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ مَایَغْشٰی) سے جو چھا جانے والی رحمت کا ظہور ہو رہا ہے اس کے عطیات سے وہ نفع حاصل کرتے ہیں۔

خواص الخواص کا تقویٰ:

یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عنایت ومہربانی سے رفرف کی سواری پر سوار ہوتے ہیں اور جو رب تعالیٰ کی تجلیات کو دیکھ کر (مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَاطَغٰی) ''آنکھ نہ کسی طرف پھری، نہ حد سے بڑھی'' کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ پھر وہ سدرۃ المنتہیٰ سے آگے (قَابَ قَوْسَیْن) کے اوصاف کو پا لیتے ہیں۔ یعنی (ثم دنا فتدلی ☆ فکان قاب قوسین او ادنی) (سورۃ النجم، آیۃ ص ۹۰) ''پھر وہ جلوہ نزدیک ہوا، پھر خوب اتر آیا تو اس جلوے اور اس محبوب میں دو ہاتھ کا فاصلہ رہا بلکہ اس سے بھی کم'' کے درجہ عظیمہ کو پا لیتے ہیں۔ یہاں نفس کے حجابات کی انتہاء آ جاتی ہے اور انوار قدس کی ابتداء ہوتی ہے، یہاں سے ہی یہ پتہ چل گیا کہ ''من عرف نفسہ عرف ربہ'' جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔ (ماخوذ از روح البیان)

راقم کے نزدیک یہ مقام حقیقی طور پر صرف میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ کو حاصل ہے، البتہ آپ کے واسطہ جلیلہ سے مجازی طور پر اس کی جھلک آپ کی امت کے خواص الخواص کو حاصل ہو جائے تو عین ممکن ہے لیکن رب تعالیٰ کی تجلیات کو برداشت کرنا، جب موسیٰ علیہ السلام سے نہ ہو سکا تو غیر انبیاء سے کیسے ممکن ہے۔ بس یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ مجازی طور پر مقام کشف میں ادراک تجلیات ہو جائے۔ راقم نے اپنی سوچ کے مطابق ذکر کر دیا ہے، حقیقی علم رب تعالیٰ کے پاس ہی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ
وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا
عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ
وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا فَاِنْ كَانَ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا
اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ وَاسْتَشْهِدُوْا
شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ
مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا
فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا وَلَا
تَسْئَمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ
عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً
حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ
اَلَّا تَكْتُبُوْهَا وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ص وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ
وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌ بِكُمْ ط وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ
وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ☆ (آیۃ نمبر ۲۸۲)

﴿۱﴾

اے ایمان والو! جب تم ایک مقرر مدت تک کسی دین کا لین دین کرو تو اسے لکھ لو اور چاہیے کہ

تمہارے درمیان کوئی لکھنے والا ٹھیک لکھے اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے جیسا کہ اسے اللہ نے سکھایا ہے، تو اسے لکھ دینا چاہیے تو جس پر حق آتا ہے وہ لکھاتا جائے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے اور حق میں سے کچھ رکھ نہ چھوڑے پھر جس پر حق آتا ہے اگر بے عقل یا ناتواں ہو یا لکھا نہ سکے تو اس کا ولی انصاف سے لکھائے۔ اور دو گواہ کرلو اپنے مردوں میں سے پھر اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ایسے گواہ جن کو پسند کرو کہ کہیں ان میں ایک عورت بھولے تو اس ایک کو دوسری یاد دلا دے اور گواہ جب بلائے جائیں تو آنے سے انکار نہ کریں اور اسے بھاری نہ جانو کہ دین چھوٹا ہو یا بڑا اس کی میعاد تک لکھت کرلو۔ یہ اللہ کے نزدیک انصاف کی بات ہے، اس میں گواہی خوب ٹھیک رہے گی اور یہ اس سے قریب ہے کہ تمہیں شبہ نہ پڑے، مگر یہ کہ کوئی سر دست کا سودا دست بدست ہو تو اس کے نہ لکھنے کا تم پر گناہ نہیں تو جب خرید وفروخت کرو تو گواہ کرلو اور نہ کسی لکھنے والے کو ضرر دیا جائے نہ گواہ کو (یا نہ لکھنے والا ضرر دے نہ گواہ) اور جو تم ایسا کرو تو یہ تمہارا فسق ہوگا اور اللہ سے ڈرو اور اللہ تمہیں سکھاتا ہے اور اللہ سب کچھ جانتا ہے۔

﴿۲﴾

اے ایمان والو! جب تم لین دین کرو کسی دین (قرض) کا ایک مقرر مدت تک تو اسے لکھ لو اور چاہئے کہ لکھے تمہارے درمیان لکھنے والا انصاف سے اور نہ انکار کرے کوئی لکھنے والا لکھنے سے جس طرح سکھایا اسے اللہ نے، تو چاہئے کہ وہ لکھ دے اور چاہئے کہ لکھائے وہ شخص جس پر حق ہو اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے اور نہ گھٹائے اس سے کوئی چیز پھر جس پر حق اس کا ہے، اگر بے عقل یا کمزور ہو یا نہیں طاقت رکھتا لکھانے کی وہ تو چاہئے کہ لکھائے اس کا ولی انصاف سے اور بنالو دو گواہ اپنے مردوں میں سے، پھر اگر نہ ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں ان میں

سے کہ تم پسند کرو انہیں گواہ، یہ کہ بھول جائے ایک (عورت) ان دونوں میں سے تو یاد دلائے ان میں سے ایک کو دوسری اور نہ انکار کریں گواہ جب انکو بلایا جائے اور نہ پریشان ہو لکھنے سے اس دین کو خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا وقتِ مقررہ تک (اسے لکھ لو)۔ یہ تمھارے لئے انصاف کی بات ہے اللہ کے حضور اور درست ہے گواہی کے لئے اور قریب ہے کہ تم شک میں نہ پڑو، مگر یہ کہ تجارت ہاتھ بہاتھ ہو جس کو تم دائر (جاری) کرو اپنے درمیان تو نہیں تم پر کوئی گناہ کہ تم اسے نہ لکھو اور گواہ بنالو جب تم خرید وفروخت کرو اور نہ ضرر پہنچایا جائے لکھنے والے کو اور نہ گواہ کو (یا نہ ضرر پہنچائے لکھنے والا اور گواہ) اور اگر تم نے (ایسا) کیا تو بے شک وہ فسق ہوگا تمہارا، اور ڈرو اللہ سے اور سکھاتا ہے تمہیں اللہ اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

آیہ کریمہ کا مختصر مطلب:

مختصر مطلب تو تقریبًا آیۃ کریمہ کے ترجمہ سے ہی سمجھ آرہا ہے، لیکن اس آیۃ کریمہ میں کئی مسائل مذکور ہیں۔ جن کو انشاء اللہ تفصیل سے ذکر کیا جائے گا، یعنی قرض کا لین دین، پھر اسے لکھنے کا حکم، لکھنے والے کو کہ وہ لکھنے سے انکار نہ کرے، پھر کون لکھائے؟ یعنی صاحب حق لکھائے۔ صاحب حق لکھانے سے عاجز آجائے تو اسکا ولی لکھائے، پھر قانونِ شہادت، گواہی کیا ہے؟ اس کی شرائط کیا ہیں؟ پھر عورت بحیثیت گواہ کے کیا مقام رکھتی ہے، گواہوں کو گواہی کیلئے بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں، لین دین چھوٹا ہو یا بڑا اسے لکھ لیا جائے، لکھنے میں ملال نہ ہو، اس کی مقرر میعاد لکھ دی جائے، لکھانے کا فائدہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالی راضی ہوگا کیونکہ یہ اس کے نزدیک انصاف پر مبنی کام ہے اور گواہی کیلئے سیدھی راہ کا تعین ہو جائے اور شک وشبہ سے بالاتر کام ہوگا۔ اگر تجارت ہاتھ بہاتھ آمنے سامنے ہو تو نہ لکھانے میں کوئی حرج نہیں، لیکن گواہ بنالئے جائیں، لکھنے والے شخص اور گواہ کو کوئی ضرر نہ پہنچایا جائے اور نہ ہی لکھنے والا اور گواہ کسی کو نقصان پہنچائیں۔

ان تمام مسائل پر انشاءاللہ تفصیلی بیان ہوگا اور یہی مسائل اس آیۃ کریمہ میں مذکور ہیں۔

ماقبل سے تعلق:

اللہ تعالی نے پہلے دو قسم کے حکم بیان کیے ہیں، ایک اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا جس کی وجہ بظاہر مال میں کمی واقع ہوتی ہے اور دوسرا حکم یہ دیا گیا کہ سود کا لین دین ختم کر دو، یہ حرام ہے اس میں بھی ظاہری طور پر مال میں کمی واقع ہوتی ہے، پھر رب تعالی سے سخت ڈرنے کا حکم اس آیۃ کریمہ میں دیا گیا ہے۔ ”وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ“
”اور ڈرو اس دن سے جس میں تمہیں اللہ کی طرف لوٹایا جائے گا“۔

اس آیۃ کریمہ میں تقویٰ کا حکم دیا گیا ہے۔ تقویٰ میں بھی انسان پر مال حاصل کرنے کے زیادہ دروازے بند رہتے ہیں۔ اب اس زیر بحث آیۃ کریمہ میں مال کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے، اور مال کو تلف کرنے سے بچانے کا حکم دیا گیا ہے۔

”لا ن القدرة على الانفاق فى سبيل الله وعلى ترک الربو وعلى ملازمة التقوى لايتم ولا يكمل الا عند حصول المال ثم انه تعالى لاجل هذه الدقيقة بالغ فى الوصية بحفظ المال الحلال عن وجوه التوى والتلف“

اس لئے کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ اور سود کے چھوڑنے اور تقویٰ کو لازم پکڑنے کی طاقت حاصل نہیں ہو سکتی اور نہ ہی وہ طاقت تکمیل تک پہنچتی ہے سوائے مال کے حاصل ہونے کے پھر اسی دقیقہ کیلئے اللہ تعالی نے حلال مال کی حفاظت کرنے اور اسے تباہ و برباد ہونے سے بچانے کیلئے نصیحت فرمائی۔ جس میں بہت مبالغہ اور تاکید پائی گئی ہے۔

دوسری وجہ:

ماقبل سے تعلق کی دوسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اس سے پہلے سود کے لین دین کو چھوڑنے کا حکم دیا گیا تو اس سے بظاہر یہ پتہ چلا کہ شاید بیع سلم بھی ناجائز ہوگی، تو اس آیۃ کریمہ میں بیع سلم کے جائز ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ بیع سلم کا مطلب یہ ہے کہ پیسے پہلے دیئے جائیں اور چیز بعد میں لی جائے، بیع مسلم کی تفصیل انشاءاللہ قریب ہی آ رہی ہے۔

(ماخوذ از کبیر)

"یٰآیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْ اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاکْتُبُوْہُ"

"اے ایمان والو! جب تم لین دین کرو کسی دین (قرض) کا ایک مقرر مدت تک تو اسے لکھ لو۔"

شانِ نزول:

اگر چہ آیۃ کریمہ کا تعلق تمام قسم کے دیون (قرضوں) سے ہے، لیکن حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس آیۃ کریمہ میں جس دین کے لین دین کا ذکر ہے اس سے مراد بیع سلم ہے۔

"قال فی الھدایۃ السلم عقد مشروع بالکتاب وھو اٰیۃ المداینۃ"

اسی وجہ سے صاحب ہدایۃ نے بیان کیا ہے کہ بیع سلم جائز ہے۔ اس کا جواز کتاب اللہ (قرآن پاک) سے ثابت ہے، یعنی آیۃ مداینہ (جس میں دین کا ذکر ہے، وہ یہی آیۃ ہے) اس کے جواز پر دلالت کر رہی ہے۔ (تفسیرات احمدیہ)

تفسیر زاہدی میں ہے کہ آیۃ کریمہ عام ہے، بیع سلم کو بھی شامل ہے اور ہر دین کو شامل ہے، سوائے قرض کے۔

قرض اور دین میں فرق:

اصل میں اردو کا دائرہ تنگ ہے، عربی کے کئی الفاظ کا ترجمہ میں حق ادا نہیں ہوتا۔ ہم عام طور پر دین کا معنی قرض کرتے ہیں، جیسا کہ راقم نے طلباء کرام کو سمجھانے کیلئے دین کے بعد بریکٹ میں قرض بڑھایا ہے۔ ورنہ حقیقت میں دین اور چیز ہے، اور قرض اور چیز ہے۔

قرض کی تعریف:

"القرض ما یکون بجنسہ مثل ان یقرضہ درھما علی ان یعطیہ درھما عوضہ غدا ویقرض شعیرا لیعطیہ مثلہ ولا یقبل التاجیل ومعناہ اذا وعد الی مسمی معین فلہ المطالبۃ قبلہ"

قرض وہ ہے جو جنس کے بدلے جنس دی جائے، مثلاً درہم بطور قرض دیئے جائیں کہ کل یا فلاں وقت میں تم مجھے اتنے ہی درہم دے دینا۔ اسی طرح جو یا گندم وغیرہ قرض دینا کہ تم مجھے بعد میں اتنی مقدار میں ہی جو یا گندم دے

دینا۔قرض میں وقت نہیں ہوتا،یعنی اگر کہے کہ تم مجھے ایک ماہ کے بعد قرض ادا کرنا لیکن وہ پہلے ہی مطالبہ کر لے کہ مجھے کوئی اور ضرورت درپیش آ گئی ہے،لہٰذا اذاتم میرا قرض مجھے ادا کر دو،تو یہ اس کا حق ہے،لیکن خیال رہے کہ یہ بھی ضروری نہیں کہ اسے ضرورت ہی درپیش آئے بلکہ مطلقاً وہ مقرر کئے ہوئے وقت سے پہلے مطالبہ کر سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اکثر مقامات میں قرض حسن کا ذکر فرمایا:

"و معنی القرض الحسن ان لایطالبه من عند نفسه و ان اعطاه المستقرض لا یاخذ علیه زیادة و لایجریه نفعا و هو فی معنی التصدق و لهذا قیل القرض سؤال''

قرض حسن یہ ہے کہ وہ اپنے قرض کا مطالبہ ہی نہ کرے،مقروض اپنی مرضی سے جب چاہے ادا کرے۔اگر قرض لینے والا خود قرض ادا کرے تو یہ اس سے زیادہ نہ لے اور کسی قسم کا نفع مقروض سے حاصل نہ کرے ایسا کہ جس سے پتہ چلے کہ یہ قرض کا نفع حاصل کر رہا ہے۔

جب قرض حسن دے گا تو اسے صدقہ کا ثواب بھی حاصل ہوگا۔یہی وجہ ہے کہ کہا جاتا ہے۔'قرض سوال ہے'،یعنی جس طرح سوال پر عطا کرنا صدقہ کا درجہ رکھتا ہے۔اسی طرح قرض حسن میں بھی صدقہ کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔

دین کی تعریف:

"والدین مایکون علی اختلاف الجنس ویکون واجبا فی الذمه ویکون المطالبة حین الأجل مثل ثمن المبیع ونحوه"

یعنی دین اختلاف جنس پر ہوتا ہے۔جیسا کہ مبیع (جس چیز کو بیچا جائے) کا ثمن۔اور فرق یہ ہے کہ دین کا ادا کرنا وقت مقرر پر واجب ہوتا ہے اور مطالبہ بھی وقت مقرر سے پہلے نہیں کیا جاسکتا،دین مدیون کے ذمہ واجب ہوتا ہے لیکن قرض حسن میں جب ادا کرنے والے کی طرف سے اتنا اختیار دے دیا جائے کہ اگر تم ادا کر سکے تو ادا کر دینا اور اگر تم ادا نہ کر سکے تو میں تم سے مطالبہ نہیں کروں گا بلکہ وہ قرض تمہارے لئے صدقہ کا درجہ رکھے گا،ایسی صورت میں قرض حسن کا ادا کرنا مستحب ہوا۔

(ماخوذاز تفسیرات احمدیه بتصرف)

آیۃ کریمہ کے شانِ نزول میں مفسرین کے اقوال:

(۱) ایک قول تو وہی ہے جو پہلے ذکر کر دیا گیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس آیۃ کریمہ میں بیع سلم کے جواز اور اسے لکھنے کا حکم ہے۔

(۲) دوسرا قول بعض حضرات کا ہے کہ اس آیۃ کریمہ میں قرض کا ذکر ہے۔ لیکن علامہ رازیؒ نے اسے یوں رد فرمایا

"وھو ضعیف لما بینا ان القرض لا یمکن ان یشرط فیه الأجل والدین المذکور فی الایة اشترط فیه الأجل"

یہ قول ضعیف ہے اسلئے کہ قرض کی تعریف ہم نے بیان کر دی کہ اس میں وقت مقرر نہیں ہوتا، قرض دینے والا جب چاہے مطالبہ کر لے۔ اور آیۃ کریمہ میں جس دین کا ذکر ہے اس کے ساتھ "اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی" کی قید ہے یعنی جس میں وقت مقرر کر دیا گیا ہو۔

حاصل کلام یہ ہے کہ آیۃ کریمہ میں ذکر دین کا ہے، قرض کا نہیں، اسلئے قرض کا قول ضعیف ہے۔ چونکہ قرض اور دین دو علیحدہ علیحدہ چیزوں کے نام ہیں۔

(۳) تیسرا قول اکثر مفسرین کرام کا ہے، وہی زیادہ معتبر ہے کہ آیۃ کریمہ کا تعلق بیع سلم سے بھی ہے اور دین سے بھی ہے۔ اس مسئلہ کو سمجھنے کیلئے پہلے یہ سمجھا جائے کہ بیع کی چار قسمیں ہیں۔

پہلی قسم: عین چیز کی بیع عین سے، یعنی سودا آمنے سامنے ہاتھ بہاتھ ہو، ادھر مال دیا اور ادھر ثمن۔ اس کے لکھنے کی ضرورت نہیں، وہ اس آیۃ کریمہ کے ان الفاظ "**یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاكْتُبُوْهُ**" میں داخل نہیں کیونکہ اس کے لکھنے کا حکم نہیں بلکہ وہ اسی آیۃ میں آنے والے استثناء میں داخل ہے یعنی "**اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِیْرُوْنَهَا بَیْنَكُمْ فَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا**" مگر یہ کہ تجارت ہاتھ بہاتھ ہو جس کو تم دائر کرو اپنے درمیان تو نہیں تم پر کوئی گناہ کہ تم اسے نہ لکھو۔ جب اسمیں مداینہ (دین کا معاملہ) نہیں تو لکھنے کا بھی حکم نہیں، اسلئے یہ قسم اس سے خارج ہے۔

دوسری قسم: دین کی بیع دین سے، یعنی نہ مبیع دیا جائے اور نہ ہی ثمن، یہ بیع ناجائز ہے۔ یہ بھی آیۃ کریمہ کے اس

حکم میں داخل نہیں۔

تیسری قسم: بیع العین بالدین ، یعنی مبیع پہلے دیا جائے اور ثمن بعد میں وقت مقرر کو لیا جائے، آیۃ کریمہ کا یہ حکم اسے بھی شامل ہے، یعنی جب تم عین کی بھی دین سے بیع کرو تو اس ادھار کی بیع کا معاملہ لکھ لیا کرو تا کہ بعد میں تمہارے درمیان کوئی نزاع پیدا نہ ہو۔

چوتھی قسم: بیع الدین بالعین ، یعنی رقم دے دی جائے اور چیز بعد میں لینے کا وقت مقرر کر دیا جائے تو اسے بیع سلم کہا جاتا ہے۔ آیۃ کریمہ کا حکم اسے بھی شامل ہے کہ جب تم پیسے پہلے دے دو اور چیز بعد میں لینے کا وقت مقرر کرو، تو اسے لکھ لو۔

اعتراض: "تداینتم" تو دلالت کر رہا ہے مشارکت پر جس کا مطلب یہ کہ تم دین دو اور دوسرا شخص بھی دین سے ہی کام لے، یعنی دین کی بیع دین سے۔ اعتراض کا مطلب یہ ہے کہ "تداینتم" کے الفاظ سے پتہ چل رہا ہے کہ ادھار کی بیع ادھار سے جائز ہے حالانکہ اس کے ناجائز ہونے پر اجماع امت بھی ہے اور رسول ﷺ نے بھی "بیع الکالئی بالکالئی" (ادھار کی بیع ادھار) سے منع فرمایا تو "تداینتم" کا استعمال کیسے صحیح ہے؟

"ان المراد من تداینتم تعاملتم و التقدیر اذا تعاملتم بما فیه دین"

بیشک مراد "تداینتم" سے "تعاملتم" ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ جب تم معاملہ کرو جس میں دین پایا جائے۔ (کبیر)

اس معنی سے ہی واضح ہو گیا کہ دونوں قسموں کو آیۃ کریمہ کا حکم شامل ہو گیا کہ تم بیع کا معاملہ کرو ثمن دین ہو یا تم بیع کا معاملہ کرو اور مبیع اس میں دین ہو تو اسے لکھ لو۔

اعتراض: جب دین کا ذکر "تَدَایَنۡتُمۡ" (جب تم معاملہ کرو دین کا) میں آ چکا ہے تو اس کے بعد "بِدَیۡنٍ" ذکر کرنے کا کیا مقصد ہے۔ یہ تو تکرار ہے جبکہ بلا وجہ تکرار درست نہیں؟

پہلا جواب: تداین کبھی مشتق ہوتا ہے دین (بفتح الدال) دال کی زبر سے، جس کا معنی ہوتا مال میں دین کا معاملہ کرنا اور کبھی یہ مشتق ہوتا دین (بکسر الدال) دال کی زیر سے جس کا معنی ہوتا بدلہ دینا، جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ "کما

تدین تدان' جیسے تم بدلہ دو گے ایسے ہی تمہیں بدلہ دیا جائے گا۔ جب تداینتم کے دو معنی تھے تو ایک کو خاص کرنے کیلئے رب تعالی نے اس کے بعد بدین ذکر فرمایا تاکہ پتہ چل جائے کہ اس مقام میں۔ "تداینتم" کا معنی دین کا معاملہ کرنا ہے، بدلہ دینا نہیں۔

دوسرا جواب: قرآن پاک میں فصاحت و بلاغت کا اعلی معیار قائم کیا گیا ہے، اسی وجہ سے نظم قرآن یعنی قرآن پاک کے الفاظ مبارکہ کی ترتیب کو خوبصورت بنانے کیلئے پہلے **بدین** ذکر کیا پھر" **فکتبوہ**" ذکر کیا جس میں ضمیر کا مرجع "دین" ہے اگر پہلے "بدین" ذکر نہ کیا جاتا تو مضمون کو مکمل کرنے کیلئے "**فاکتبو االدین**" کہنا پڑتا، اسمیں وہ خوبصورتی اور فصاحت نہ ہوتی جو قرآن پاک کے الفاظ مبارکہ میں پائی گئی ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ رب تعالی کا کلام بلند مقام رکھتا ہے، جہاں انسانی عقل اس کے اعلی معیار کو سمجھنے سے متحیر (حیران) ہو جاتی ہے۔

تیسرا جواب: بعض اوقات الفاظ تاکید کیلئے ذکر کیے جاتے ہیں ان میں فقط تکرار نہیں ہوتا، جیسا کہ "فَسَجَدَ الْمَلٰئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ" میں تاکید کیلئے "**کلھم، اجمعون**" استعمال کیے گئے ہیں اسی طرح۔ "**اِلَّا طَائِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ**" میں "بجناحیہ" اسی پر دلالت کر رہا ہے ورنہ نحوی قانون کے مطابق حقیقی تاکید نہیں پائی گئی۔

چوتھا جواب: تداینتم ہر قسم کے قرض کو شامل تھا خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، خواہ قرض ہو یا بیع سلم ہو یا ثمن کا ادھار ہو "بدین" ذکر کر کے قرض کو نکال دیا اور حکم دین میں خاص کر دیا۔

پانچواں جواب: صرف" تداینتم "مشارکت کیلئے استعمال ہوتا ہے، لیکن جب" بدین" ذکر کیا تو وہ قرینہ بن گیا جس سے پتہ چل گیا کہ یہاں مشارکت والا معنی نہیں بلکہ دین کا معاملہ کرنا مراد ہے، صرف ایک جانب دین مراد ہے خواہ مبیع کی جانب سے یا ثمن کی جانب ہو۔ (ماخوذ از کبیر)

بیع سلم کا جواز حدیث پاک سے:

" عن ابن عباس قال قدم رسول ﷺ والناس یسلفون فقال لھم رسول ﷺ من اسلف فلا یسلف الا فی کیل معلوم ووزن معلوم " (مسلم، بخاری، مشکوۃ کتاب السلم)

حضرت عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول ﷺ (مدینہ طیبہ میں) آئے، وہاں لوگ بیع سلم

کرتے تھے تو آپ نے فرمایا کہ کوئی شخص بیع سلم نہ کرے مگر کیل معلوم ہو اور وزن معلوم ہو۔

"عن ابن عباس قال قدم النبی ﷺ المدینه وهم یسلفون فی الثمار السنة والسنتین فقال من سلف فی تمر فلیسلف فی کیل معلوم ووزن معلوم الی اجل معلوم"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ میں تشریف لائے وہاں لوگ پھلوں میں ایک سال یا دو سال (کیلئے قیمت ادا کر دیتے پھل بعد میں لیتے) کی بیع سلم کر لیتے تھے تو آپ نے فرمایا جو لوگ کھجور (وغیرہ) میں بیع سلم کریں تو کیل معلوم ہو، وقت مقرر ہو۔

تنبیہ: بیع سلم اور بیع سلف کا ایک معنی ہے، سلم اس لئے دیا جاتا ہے کہ رأس المال (ثمن) پہلے بائع کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اور سلف اس لئے کہا جاتا ہے کہ رأس المال پہلے دیا جاتا ہے، یعنی سلم کا معنی ہے سپرد کرنا اور سلف کا معنی ہے گزرنا۔ پہلے دینے کے لحاظ پر سلف، سپرد کرنے کے لحاظ پر سلم۔ (نووی)

بیع سلم کی مختصر الفاظ میں یہ تعریف حسین اور پسندیدہ ہے:

"انه عقد موصوف فی الذمة یعطی عاجلا"

بیشک یہ عقد ہے کہ ایک چیز کا جس کو واضح طور پر بیان کیا جاتا ہے اور وہ بائع کے ذمہ میں ہوتی ہے کہ وقت مقرر میں ادا کرے اور اس کا بدل یعنی ثمن پہلے دے دیا جاتا ہے۔ (نووی)

بیع سلم کی تفصیلی بحث:

بیع سلم کی تعریف تو علامہ نووی رحمۃ اللہ کے قول سے واضح ہو چکی ہے کہ پیسے پہلے دے دیئے جائیں اور چیز بعد میں لی جائے، اسے بیع سلم کہا جاتا ہے۔

بیع سلم کن چیزوں میں جائز ہے اور کن میں ناجائز:

بیع سلم مکیلی چیزوں میں جائز ہے، یعنی جن چیزوں کو صاع (ٹوپے) وغیرہ سے ماپا جائے، گندم، جو وغیرہ۔ اور بیع سلم موزونی چیزوں میں جائز ہے، یعنی چیزوں کو وزن کر کے بیچا جاتا ہے جیسے لوہا، تانبہ، پیتل، وغیرہ ان کے جواز پر دلیل نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

"من اسلم منکم فلیسلم فی کیل معلوم ووزن معلوم الی اجل معلوم"

جو شخص تم میں سے بیع سلم کرے تو وہ معلوم کیل اور معلوم وزن میں اور وقت مقرر تک بیع سلم کرے۔

تنبیہ: مکیلی یا موزونی چیزوں کی جنس سے بیع سلم جائز نہیں اس میں سود پایا جاتا ہے، البتہ رقم پہلے دے دی جائے اور وہ چیز بعد میں لی جائے، شرط یہ ہے کہ مبیع اور ثمن ایک جنس نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ دراہم اور دنانیر کی بیع سلم جائز نہیں۔ بیع سلم میں ثمن پہلے دیا جاتا ہے اگر دراہم کی بیع سلم جائز ہو جائے تو ثمن میں تاخیر ہوگی اس بیع سلم نہیں کہا جاتا۔

بیع سلم کا جواز:

بیع سلم کے جواز پر ایک تو یہی زیر بحث آیہ کریمہ ہے اور احادیث مبارکہ ہیں جن کو ذکر کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ قیاس کہتا ہے کہ بیع سلم جائز نہ ہو۔ کیونکہ سنن اربعہ میں عمرو بن شعیب کی روایت اپنے باپ، دادا سے ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "لا تبع ما لیس عندک" جو چیز تمہارے پاس نہیں وہ نہ بیچو۔ لیکن بخاری اور مسلم کی احادیث جو قریب ہی ذکر کی گئی ہیں ان سے واضح طور پر جواز ثابت ہو رہا ہے۔ ان دو احادیث سے بطور نتیجہ صاحب ہدایہ نے ذکر کیا:

"و بالسنة وهو مروی انه ﷺ نهی عن بیع ما لیس عند الانسان ورخص فی السلم والقیاس وان کان یأباه ولکنا ترکناه بمارویناه وجه القیاس انه بیع المعدوم"

بیع سلم کا جواز حدیث پاک سے ثابت ہے رسول اللہ ﷺ کی روایت ہے کہ آپ نے اس چیز کی بیع سے منع فرمایا جو انسان کے پاس نہیں اور بیع سلم کی رخصت فرمائی۔ قیاس اگرچہ بیع سلم کے جواز سے انکار کرتا ہے۔ لیکن جب احادیث سے بیع سلم کا جواز ثابت ہو گیا تو ہم نے احادیث کے مقابل واقع ہونے والے قیاس کو چھوڑ دیا۔ قیاس بیع سلم کے جائز نہ ہونے کا تقاضا اس لئے کرتا ہے کہ یہ بیع معدوم کی لازم آ رہی ہے۔

مذروعات اور معدودات متقاربہ میں بیع سلم کا جواز:

کپڑا وغیرہ جو گز سے ناپا جائے اس کی بیع سلم جائز ہے البتہ شرط یہ ہے کہ اس کپڑے وغیرہ کا وصف بیان کر

دیا جائے اور اسکی صنعت (کوالٹی) وغیرہ کا ذکر کر دیا جائے تاکہ بعد میں کوئی نزاع نہ ہو۔ اسی طرح جو چیز گن کر بیچی جائیں لیکن ان میں زیادہ تفاوت (فرق) نہ پایا جائے، جیسے انڈے، اخروٹ وغیرہ ان میں بیع سلم جائز ہے کیونکہ اس میں نزاع کا کوئی خطرہ نہیں۔ یہ معدودات متقاربہ ہیں۔ اگر ان چیزوں میں زیادہ فرق ہو جیسے خربوز یا تربوز وغیرہ ان کو گن کر بیچنے کی صورت میں بیع سلم جائز نہیں کیونکہ یہ کوئی بہت بڑے اور کوئی بہت چھوٹے ہوتے ہیں ان کو معدودات متقاونہ کہا جاتا ہے۔ ان میں نزاع کا خطرہ ہوتا ہے۔

حیوانات میں بیع سلم جائز نہیں:

اس لئے کہ حیوانات کی مالیت میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے، اس میں نزاع کا خطرہ پایا جاتا ہے، یعنی جنس اوصفت بیان کرنے کے باوجود حیوانات میں تعین نہیں ہوسکتا۔

☆ **"عن ابن عباس ان النبی ﷺ نهی عن السلف فی الحیوان"** (اخرجه الحاکم والدار قطنی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے حیوانات میں بیع سلم سے منع فرمایا۔

اس حدیث کے متعلق حاکم نے بیان کیا ہے کہ

" صحیح الاسنادولم یخرجاه " حدیث صحیح الاسناد ہے اگر بخاری ومسلم نے اسے اپنی کتب میں ذکر نہیں کیا۔

بیع سلم میں بیع کا موجود ہونا ضروری ہے:

اصل اس مسئلہ پر دلیل رسول اللہ ﷺ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

☆ **"عن ابی البختری قال سألت ابن عمر عن السلم فی النخل قال نهی رسول الله ﷺ عن بیع النخل حتی یصلح "**

ابوالبختری کہتے ہیں میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کھجوروں میں بیع سلم کرنے کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کھجوروں کی بیع کرنے سے منع فرمایا یہاں تک کہ

ان میں کھائے جانے کی صلاحیت پائی جائے۔ (بخاری)

دوسری حدیث شریف میں ہے۔

" ولاتسلموا فی نخل حتی یبدو صلاحه"

کھجوروں میں بیع سلم اس وقت تک نہ کرو جب تک ان کی صلاحیت ظاہر نہ ہو جائے۔

وجہ اصل میں یہ ہے کہ ابھی کھجوریں کارآمد ہی نہ ہوں تو بیع سلم کرلے تو ہوسکتا ہے وہ کسی آفت کی وجہ سے تباہ ہو جائیں اور یہ ادا کرنے کی صلاحیت ہی نہ رکھے تو نزاع کا خطرہ ہے۔

نمک لگائی مچھلی کی بیع سلم جائز ہے: لیکن شرط یہ ہے کہ وزن معلوم ہو اور قسم معلوم ہو۔ جب قدر اور وصف معلوم ہوں گے تو وقت مقرر پر خریدار کے حوالے کرنے میں آسانی ہوگی، نزاع خطرہ نہیں ہوگا۔

تازہ مچھلی کی بیع سلم: تعداد کے لحاظ پر تو مچھلی کی بیع سلم جائز نہیں کیونکہ کوئی مچھلی بہت چھوٹی ہوتی ہیں اور کوئی بہت بڑی۔ البتہ وزن معلوم ہو اور قسم معلوم ہو تو پھر بیع سلم جائز ہوگی، یہ بھی ان شہروں میں جہاں گرمیوں، سردیوں میں مچھلی ملتی رہتی ہے۔ جہاں کبھی مچھلی ملے اور کبھی نہ ملے ان مقامات میں مچھلی کی بیع سلم جائز نہیں۔

گوشت کی بیع: امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور صاحبین یعنی امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کے اقوال میں اختلاف کو دیکھ کر راقم نے یہ رائے قائم کی ہے کہ شہروں میں صرف چھوٹا گوشت اور بڑا گوشت کہہ کر بیچا اور خریدا جاتا ہے۔ اسلئے کچھ وصف بھی بیان کر دیا جائے تو بیع سلم جائز ہوگی۔ لیکن دیہاتوں میں صرف چھوٹا اور بڑا گوشت نہیں دیکھا جاتا بلکہ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ وہ بکری یا بھیڑ کتنی عمر کی تھی اسی طرح گائے وبھینس کا حکم بھی یہی ہے۔ لھذا دیہاتوں میں جھگڑے کے خوف سے گوشت میں بیع سلم جائز نہیں۔

کسی معین شخص کے کیل یا پیمائش سے بیع جائز نہیں:

اگر یہ طے کرلیا جائے کہ فلاں شخص ہی ماپ کرے گا یا فلاں شخص ہی پیمائش کرے گا تو اس بیع سلم جائز نہیں۔ اسلئے کہ ہوسکتا ہے ادائیگی کے وقت وہ آدمی ہی نہ ملے تو جھگڑے کا سبب بنے گا، لہذا یہ جائز نہیں ہوگا۔

معین شہر کی چیز کی بیع سلم جائز نہیں:

وجہ اس کی بھی یہ ہے سکتا ہے اس معین شہر یا بستی میں ژالہ باری آجائے یا کسی اور آفت سے وہ غلہ وغیرہ تباہ ہو جائے تو بائع اس بستی کا غلہ ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھے گا جس کی وجہ سے جھگڑے کا خطرہ ہے لہذا بیع سلم کو جائز نہیں قرار دیا جاسکتا۔اسی طرح کسی معین درخت کے پھل میں بیع سلم جائز نہیں خطرات وہی ہیں جو معین بستی کی بیع سلم میں بیان کئے جاچکے ہیں۔

بیع سلم کی شرائط:

بیع سلم کی سات شرائط ہیں جن کے بغیر بیع سلم جائز نہیں ہوسکتی:

(۱) جنس معلوم ہو، یعنی یہ واضح کیا جائے کہ بیع گندم کی ہو رہی ہے یا مکی وغیرہ کی۔

(۲) نوع معلوم ہو، یعنی بتایا جائے کہ وہ گندم بارانی زمین کی ہوگی یا نہری زمین کی ہوگی۔

(۳) اسکی صفت معلوم ہو، یعنی جس چیز کا سودا ہو رہا ہے اس کے متعلق واضح کیا جائے کہ وہ عمدہ ہوگی یا گھٹیا۔

(۴) مقدار معلوم ہو۔ مکیلی چیز ہو تو بتایا جائے کہ اتنے صاع گندم وغیرہ اس رقم کے دیئے جائیں گے۔ اگر کوئی موزونی چیز ہو تو بتایا جائے کہ اتنے سیر یا اتنے من اس رقم کے دیئے جائیں گے۔

(۵) اجل معلوم ہو، یعنی یہ بتایا جائے کہ ایک ماہ یا دو ماہ وغیرہ کے بعد یہ چیز ادا کی جائے گی۔

(۶) رأس المال معلوم ہو۔ جب قیمت کے طور پر وہ چیز ہو جو مکیلی یا موزونی یا عددی ہو تو اسکا معین کرنا بھی ضروری ہے

(۷) مکان معین کرنا کہ یہ چیز فلاں جگہ دی جائے گی، یہ اس چیز کیلئے ضروری ہے جو وزنی ہو جب تک سواری اور مزدوری وغیرہ نہ ہو تو وہ چیز لانی مشکل ہو جائے، جب تک جگہ کو معین نہیں کیا جائے گا تو جھگڑے کا خطرہ برقرار رہے گا۔

تنبیہ: جب مختلف جنسوں کی بیع ہو تو دونوں کی مقدار کا معلوم ہونا ضروری ہے جو چیز پہلے دی جائے گی وہ رأس المال ہوگی اور جو بعد میں وقت مقرر پر دی جائے گی وہ مبیع ہوگی۔ بیع سلم میں بیچنے والے کا مجلس سے جدا ہونے سے پہلے رأس المال پر قبضہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔

مسئلہ : بیع سلم میں رأس المال یا مبیع کے قبض کرنے سے پہلے کسی ایک میں تصرف کرنا جائز نہیں۔ رأس المال میں قبض سے پہلے تصرف اس لئے جائز نہیں کہ بیع سلم میں جب رأس المال کا قبض کرنا ضروری ہے تو پہلے تصرف سے قبض کرنا فوت ہو جاتا ہے اور مبیع میں قبض سے پہلے تصرف ہر بیع میں منع ہے۔

ضابطہ : ہر وہ چیز جسکی مقدار وغیرہ معلوم ہو جائے اسکی بیع سلم جائز ہے جیسے اینٹوں وغیرہ کا سانچہ معلوم ہوتا ہے لیکن دیکھنے پر اگر کوالٹی پسند نہ آئے تو واپس کر سکتا ہے، اسلئے کہ ہر بیع میں خیار رؤیۃ (دیکھنے پر پسند آئے تو لے لے نہ آئے تو واپس کر دے) کا حق حاصل رہتا ہے۔ (ماخوذ از ہدایہ)

"اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی" "ایک مقرر مدت تک"

اجل، کا لغوی معنی ہے وہ وقت جس سے ایک چیز کی انتہاء بیان کی جائے اسی وجہ سے انسان کی عمر کے ختم ہونے کے وقت، یعنی موت کے وقت کو "اجل" کہا جاتا ہے۔" اجل الدین" کا مطلب ہے کہ مستقبل میں قرض کی ادائیگی کا وقت معین کر دیا جائے۔ اصل میں "اجل" کا معنی ہے تاخیر کرنا اجل، یأجل، اجولا، کا معنی ہے تاخیر کرنا۔" آجل نقیض ہے "عاجل" کی، یعنی عاجل کا معنی جلدی کرنے والا اور آجل کا معنی ہے دیر کرنے والا۔

سوال : دین تو ہوتا ہی وہ ہے جو دیر سے ادا کیا جائے تو "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی" کے بعد "اِلٰی اَجَلٍ" کے ذکر کا کیا مقصد ہے؟

جواب: "اجل" کی دو قسمیں ہیں "اجل معین" اور "اجل مبہم"

اجل معین: یہ ہے کہ یہ دین ایک ماہ کے بعد ادا کیا جائے گا یا ایک سال کے بعد ادا کیا جائے گا۔

اجل مبہم: یہ ہے کہ گندم کی کٹائی کے وقت حاجیوں کے آنے کے وقت یہ دین میں تمہیں ادا کروں گا، چونکہ دین مطلقا دیر سے ادا کرنے کو کہا جاتا ہے جو اجل معین اور اجل مبہم دونوں کو شامل تھا۔

یہاں "اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ" کے بعد مطلق اجل کا ذکر نہیں بلکہ "اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی" ذکر ہے جس سے یہ حکم بھی واضح کیا گیا ہے کہ جب تم دین کا معاملہ کرو تو اسکا وقت مقرر کرو، وقت مبہم نہ ہو۔ (از کبیر)

"فَاكْتُبُوْهُ" "تو اسے لکھ لو"

جب مسلمان دین کا معاملہ کریں اور اسکی ادائیگی کا وقت مقرر کر دیں تو اس کیلئے رب تعالیٰ نے دو حکم دیئے ہیں۔ایک "فَاكْتُبُوْهُ" تو اسے لکھ لو۔اور دوسرا "فَاسْتَشْهِدُوْا" تو گواہ بنالو" لکھنے اور گواہ بنانے کا فائدہ جب دین دیر سے ادا کرنا ہے۔

(فيتخلله النسيان ويدخل فيه الجحد) تو اس میں بھولنے کا احتمال ہے اور انکار کرنے کا بھی اس میں دخل موجود ہے۔"فصارت الكتابة كالسبب لحفظ من الجانبين "لکھ لینے کا یہ فائدہ حاصل ہوگا کہ دونوں جانب سے مال کی حفاظت کا ذریعہ بن جائے گا اور خصوصا جب لکھنے کے ساتھ گواہ بھی بنا لئے جائیں گے تو قرض دینے والا زیادتی کا مطالبہ نہیں کرے گا اور نہ ہی وقت مقرر سے پہلے مطالبہ کرے گا۔اور جس نے قرض لیا ہے وہ انکار نہیں کر سکے گا، اور جب اسے معلوم ہوگا کہ قرض کی ادائیگی کا وقت لکھ لیا گیا ہے اور اس پر گواہ بھی بنا لئے گئے تو وہ وقت مقرر سے پہلے قرض ادا کرنے کیلئے مال جمع کرنے کی کوشش کرے گا تا کہ بروقت قرض ادا کر سکے۔

"فلما حصل في الكتابة والاشهاد هذا الفوائد لا جرم امر الله به والله اعلم"

جب لکھنے اور گواہ بنانے کے یہ فوائد حاصل ہوئے تو اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے ان دونوں چیزوں کا حکم دیا ہے۔ (کبیر)

لکھنے کا حکم استحبابی ہے:

" واما كتابة الدين التي امرنا الله بها في قوله تعالى فاكتبوه فجمهور المفسرين على انه للندب والاستحباب وليس بشرط واجب لجواز الدين والسلم بدونها "

لکھنے کا حکم جو اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد " فَاكْتُبُوْهُ " (تو اسے لکھ لو) سے دیا ہے۔جمہور مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ حکم مستحب و مندوب ہے۔شرط وجوب نہیں کیونکہ لکھنے کے بغیر ہی قرض اور بیع سلم جائز ہیں۔ (تفسیرات احمدیہ)

علامہ رازی نے اگر چہ یہ بھی ذکر فرمایا ہے کہ بعض حضرات وجوب کے قائل ہیں، لیکن جمہور علماء کرام کا مذہب آپ نے بھی بیان کیا ہے:

''وقال الآخرون هذا الامر محمول على الندب وعلى هذا جمهور الفقهاء المجتهدين''

دوسرے حضرات (یعنی وجوب کے خلاف دوسرے حضرات) نے یہ کہا ہے کہ یہ حکم استحبابی ہے یعنی واجب نہیں یہی جمہور مجتہدین کا قول ہے۔

ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ ہم جمہور مسلمانوں کو دیکھتے ہیں جو دین کا معاملہ کرتے ہیں اور لکھتے نہیں اور نہ ہی گواہ بناتے ہیں:

''وذالك اجماع على عدم وجوبهما ولان في ايجابهما اعظم التشديد على المسلمين''

لہٰذا لکھنے یا گواہ بنانے کا واجب نہ ہونے پر اجماع امت ہے اگر چہ قلیل لوگوں کا وجوب کا قول ہے لیکن وہ اجماع کے منافی نہیں اور اگر وجوب کا قول کیا جائے تو مسلمانوں پر بہت سخت حکم ہو جائے گا۔ اور ترک کرنے والے گناہ گار ہوں گے، حالانکہ نبی کریم ﷺ کی شریعت میں آسانی ہے:

''والنبی ﷺ يقول بعثت بالحنيفية السهلة السمحة'' (کبیر)

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں مجھے دینِ حنیف عطا کر کے بھیجا گیا۔ وہ دین و شریعت آسان ہیں اور اس میں (شریعت کی جہاں تک اجازت ہوگی) درگزر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

دینی طلباء کرام کی توجہ مطلوب ہے:

آیہ کریمہ کا مطلب یہ ہے: ''كلما تداينتم بدين الى اجل مسمى فاكتبوه'' ہر مرتبہ جو تم دین کا معاملہ کرو وقت مقرر تک تو اسے لکھ لو۔ ''کلما'' عموم پر دلالت کرتا ہے۔ ''اذا'' عموم پر دلالت نہیں کرتا تو ''کلما'' کا ذکر نہ کرنا اور ''اذا'' کا ذکر کرنا کس طرح صحیح ہے؟

''الجواب ان كلمة اذا وان كانت لا تقتضى العموم الا انها لا تمتنع من العموم''

تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ کلمہ ''اذا'' اگرچہ عموم کا تقاضا تو نہیں کرتا لیکن عموم کے منافی نہیں۔ اگر 'اذا' کو مقام عموم میں استعمال کیا جائے تو جائز ہے۔ (خاص کر کے عموم کے ساتھ وقت کا معنی بھی نکلتا ہے جس وقت بھی تم دین کا معاملہ کرو وقت مقرر تک تو اسے لکھ لو۔

یہ کیسے پتہ چلا کہ ''اذا تداینتم'' میں عموم پایا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس پر رب تعالیٰ کا ارشادِ گرامی جو اسی آیۃ کریمہ میں آگے آ رہا ہے دلالت کر رہا ہے۔

''ذٰلِکُمْ اَقْسَطُ عِنْدَاللّٰہِ وَاَقْوَمُ لِلشَّھَادَۃِ وَاَدْنٰی اَلَّا تَرْتَابُوْا''

''یہ تمہارے لیے انصاف کی بات ہے اللہ کے حضور اور درست ہے گواہی کے لئے اور قریب ہے کہ تم شک میں نہ پڑو''۔

یہ واضح ہے کہ جب دین کا معاملہ کیا گیا اور اسے نہ لکھا گیا تو اس میں بھول واقع ہوگی، کبھی زیادتی کا مطالبہ کیا جائے گا جو ظلم ہوگا اور کبھی کم کا مطالبہ ہوگا، بھولنے کی وجہ سے اپنے حق کو چھوڑنے پر کوئی اجر و ثواب مرتب نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ فعل قابلِ تعریف ہے۔ جب لکھنے کی وجہ سے ان ممنوعات سے انسان محفوظ ہو جاتا ہے تو پتہ چلا کہ ہر معاملہ کو لکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ (از کبیر)

مقصود حصولِ کتابت ہے:

''فَاکْتُبُوْہُ'' (تو اسے لکھ لو) کا حکم ہر شخص کو نہیں کہ وہ خود ہی لکھے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ دین کا معاملہ لکھا جائے۔ اسی وجہ سے بعد میں یہ ارشاد فرمایا (وَلْیَکْتُبْ بَّیْنَکُمْ کَاتِبٌ بِالْعَدْلِ) ''یعنی کوئی شخص بھی لکھ دے جو لکھنا جانتا ہو اور انصاف سے لکھے''۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا (وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْا اَیْدِیَھُمَا) ''اور چور مرد اور چور عورت کا ہاتھ کاٹو''۔

بظاہر یہ حکم ہر شخص کو ہے لیکن یہاں بھی مقصد چور مرد اور چور عورت کا ہاتھ کاٹنا ہے۔ وہ قاضی کے حکم سے جلاد

کاٹے گا۔ ہر شخص خود ہی نہیں کاٹے گا۔

''وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ''

''اور چاہیے کہ لکھے تمہارے درمیان لکھنے والا انصاف سے''۔

عدل سے لکھنے کا مطلب:

(۱) لکھنے والا قرض اسطرح لکھے کہ نہ اس میں حقیقی دین سے زیادہ لکھے اور نہ ہی کم اور اس طرح صاف لکھے کہ وہ خط پڑھا جا سکے تا کہ بوقت ضرورت وہ لکھی ہوئی دستاویز کام آ سکے ایسا خط نہ ہو جو پڑھا ہی نہ جا سکے۔

(۲) لکھنے والا جب فقیہ ہو تو ضروری ہے کہ اس طرح لکھے کہ دونوں فریق مطمئن ہوں، کسی کا حق باطل کرنا لازم نہ آئے، بلکہ احتیاط سے لکھے کہ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔

اصل میں فقیہ کو یہ حکم خصوصی طور پر دینے کا مقصد یہ ہے کہ بعض اوقات فقہ سے واقف شخص ایک لفظ کے ہیر پھیر سے کسی کو نقصان پہنچا سکتا ہے اور کسی کو فائدہ، لہٰذا صاحب علم کو زیادہ حق پہنچتا ہے کہ وہ انصاف سے کام لے، کسی کو ناجائز نفع پہنچانا اور کسی کو ناجائز نقصان دینا عالم کی شان کے لائق نہیں۔ (راقم)

(۳) بعض فقہاء کرام نے بیان کیا ہے کہ انصاف سے لکھنے کا یہ مطلب ہے کہ اس طرح لکھے جس میں اہل علم کا اتفاق ہو تا کہ قاضی مجتہدین کے اختلاف سے فائدہ اٹھا کر کسی کا حق باطل نہ کر سکے۔

(۴) مجمل الفاظ نہ لکھے جس کی وجہ سے بعد میں نزاع سے بچا جا سکے، کیونکہ مجمل الفاظ باعث نزاع ہوتے ہیں:

''وهذا الامور التی ذكرناها لايمكن رعايتها الا اذا كان الكاتب فقيها عارفا بمذاهب المجتهدين وان يكون اديبا مميزا بين الالفاظ المتشابهة''

عدل کی جو وجوہ ہم نے بیان کی ہیں، ان سے ہی یہ واضح ہو گیا کہ لکھنے والا فقیہ ہو اور مجتہدین کے مذاہب کو جانتا ہو اور ادیب ہو کہ صاف لکھنا جانتا ہو اور مجمل اور متشابہ الفاظ کو پہچانتا ہو تا کہ ان سے اجتناب کر سکے۔

"وَلَا یَاْبَ کَاتِبٌ اَنْ یَّکْتُبَ کَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْیَکْتُبْ"

"اور نہ انکار کرے کوئی لکھنے والا لکھنے سے جس طرح سکھایا اسے اللہ نے تو چاہیے کہ وہ لکھ دے"۔

بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص جو لکھ سکتا ہو اس پر لکھنا واجب ہے، لیکن تفصیلی طور پر اس میں چند اقوال ہیں:

(۱) "الاول ان هذا علی سبیل الارشاد الی الاولی لا علی سبیل الایجاب"۔

اس میں پہلا قول یہ ہے کہ یہ حکم وجوبی نہیں۔ بلکہ بہتری کی طرف راہنمائی کیلئے یہ حکم پایا گیا ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ایک شخص کو لکھنا سکھایا ہے اور احکام شرعیہ کی معرفت سے اسے مشرف کیا ہے تو بہتر یہ ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کے دین کا معاملہ لکھے جو اس کیلئے اہم ہے تا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا کیا جا سکے۔ یہ حکم اسی طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ۔"وَاَحْسِنْ کَمَا اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَیْکَ" اور احسان کر جس طرح اللہ نے تجھ پر احسان کیا ہے۔(زیادہ تفصیل ان الفاظ مبارکہ کی اپنی جگہ پر آئے گی)

مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لکھنے کا حکم استحبابی طور پر دیا ہے کہ اے لکھنے والے جس طرح اللہ تعالیٰ نے لکھنے کا علم عطاء کر کے تجھے نعمت سے نوازا ہے۔ اسی طرح ضرورت مند لوگوں کو ان کے دین کے معاملات لکھ دے تا کہ تیری طرف سے اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکریہ پایا جائے۔

(۲) "القول الثانی وهو قول الشعبی انه فرض کفایة"

دوسرا قول علامہ شعبی رحمہ اللہ کا ہے کہ یہ حکم فرض کفایہ کے طور پر ہے، یعنی مطلب یہ ہے کہ اگر لکھنے والا اور کوئی موجود نہ ہو صرف ایک ہی شخص ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ لکھ دے۔ ہاں اگر اور لکھنے والے بھی ہو تو ان میں سے کوئی ایک بھی لکھ دے تو سب کی طرف سے فریضہ ادا ہو جائے گا۔

(۳) "القول الثالث ان هزا کان واجبا علی الکاتب ثم نسخ بقوله تعالی ولا یضار کاتب ولا شهید"

اور تیسرا قول یہ ہے کہ بیشک یہ لکھنا کاتب (لکھنے والے) پر واجب تھا لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد

گرامی "وَلَا یُضَآرَّ کَاتِبٌ وَّلَا شَهِیْدٌ" (اور نہ ضرر پہنچایا جائے لکھنے والے اور گواہ کو) سے منسوخ کر دیا گیا۔

(۴) "والقول الرابع ان متعلق الا یجا ب هو ان یکتب کما علمه الله"

چوتھا قول یہ ہے کہ لکھنے کے وجوب کا تعلق "کما علمه الله" سے ہے، اب مطلب یہ ہوگا۔

"فالواجب ان یکتب علی ما علمه الله"

کہ واجب ہے لکھنے والے پر کہ وہ لکھے ان شرائط پر جو اللہ تعالیٰ نے اسے لکھنے کا علم دیا ہے، یعنی دین کا معاملہ کرنے والوں نے جن شرائط کو طے کیا ہے، ان میں کسی قسم کا کوئی خلل واقع نہ کرے، اپنی طرف سے کسی قسم کی کوئی قید نہ بڑھائے جس سے کسی انسان کا مال ضائع ہو جائے اور اس کے مقصد میں خلل واقع ہو، گویا کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی کا مطلب یوں ہوگا۔

"ان کنت تکتب فاکتبه عن العدل واعتبار کل الشرائط التی اعتبرها الله تعالی"

اگر تم لکھنا جانتے ہو تو عدل و انصاف سے لکھو، اور ان تمام شرائط کا اعتبار کرو جن کے اعتبار کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

راقم کے نزدیک ان اقوال مین کوئی تعارض نہیں۔ طلباء کرام بغور مندرجہ ذیل عبارت کو پڑھیں تو ان تمام اقوال میں تطبیق نظر آئے گی۔ گویا کہ مطلب یوں ہوا کہ اے لکھنے والے! جب تو ہی موجود ہو اور کوئی لکھنے والا نہ ہو تو تجھ پر فرض ہے کہ دین کے معاملہ کرنے والے اگر تجھ سے لکھنے کا مطالبہ کریں تو تو لکھ دے، اگر اور لوگ بھی لکھنے والے موجود ہوں تو تجھ پر فرض تو نہیں، البتہ مستحب ہے کہ تو سب سے آگے بڑھ کر لکھ دے تا کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کا تو شکریہ ادا کر سکے۔ تجھے ضرر سے بچانے کے لئے وجوب تو تجھ سے اٹھا لیا گیا ہے لیکن جب تو لکھے تو اللہ تعالیٰ نے جس طرح عدل و انصاف کا حکم دیا ہے اس طرح تجھ پر عدل و انصاف سے لکھنا واجب ہے۔ (راقم)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"کَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ" جار مجرور کے متعلق میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ اسکا تعلق ماقبل یعنی "وَلَا یَأْبَ" سے

ہو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا، اور نہ انکار کرے لکھنے والا لکھنے سے جیسا کہ اللہ تعالی نے اسے سکھایا ہے۔
یعنی جب اللہ تعالی نے اسے سکھایا ہے تو وہ لکھنے سے انکار نہ کرے (بلکہ لکھ کر اللہ کی نعمت کا شکریہ ادا کرے)

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس کا تعلق مابعد یعنی "فَلْيَكْتُبْ" سے ہو، اب اس صورت میں تمام الفاظ مبارکہ کا مطلب یہ ہوگا اور نہ انکار کرے لکھنے والا لکھنے سے، جس طرح اسے اللہ نے سکھایا اسے چاہیے کہ وہ اس طرح لکھ دے۔

(از تفسیر کبیر)

"وَلْيُمْلِلِ الَّذِیْ عَلَيْهِ الْحَقُّ"

"اور چاہیے کہ لکھائے وہ شخص جس پر حق ہو۔"

لکھنے کیلئے اگرچہ ضروری ہے کہ ایسے صاحب علم سے لکھوائے جو لکھنے کی تمام شرائط وغیرہ کو جانتا ہو اس کی تحریر سے کسی قسم کی غلط فہمی پیدا نہ ہو اور کسی کی حق تلفی نہ ہو:

"لکن ذلک لا یتم الا باملاء من علیه الحق لیدخل فی جملة املائه اعترافه بما علیه من الحق فی قدره وجنسه وصفته واجله الی غیر ذلک فلاجل ذلک قال تعالی، والیملل الذی علیه الحق،،

لیکن تحریر اس وقت تک مکمل نہیں ہوگی جب تک وہ شخص نہ لکھوائے جس پر حق کا ادا کرنا لازم ہے، اس لئے کہ جب وہ لکھوائے گا تو وہ دین کی قدر (مقدار) اور جنس اور صفت ادائیگی کے وقت کا اقرار کرے گا، تو تحریر پختہ ہو جائے گی، نزاع کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوگی اسی لئے رب تعالی نے ارشاد فرمایا" وَلْيُمْلِلِ الَّذِیْ عَلَيْهِ الْحَقُّ " اور چاہیے کہ وہ شخص لکھوائے جس پر حق ہے۔ (کبیر)

دینی طلباء کرام کیلئے فائدہ مند:

" الاملال" اور " الاملاء" ایک ہی معنی ہے، لکھوانا۔ بنی حجاز اور بنی اسد کی لغت میں "الاملال" استعمال ہے، جیسا کہا جاتا ہے "امللت علیه الکتاب" میں نے اس سے خط لکھوایا اور بنی تمیم بنی قیس

کی لغت میں " الا ملاء " استعمال ہے۔

قرآن پاک میں دونوں لغتوں کو استعمال کیا گیا ہے، یہاں اس آیۃ کریمہ "ولیملل" استعمال ہے جسکا معنی ہے "چاہئے کہ لکھوائے" اور دوسرے مقام میں استعمال ہے۔ "فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا" تو ان پر صبح و شام لکھا جاتا ہے۔ یہاں "املاء" کا معنی ہے لکھوانا۔ یہ بھی خیال رہے کہ "املاء" کا معنی پڑھنا بھی آتا ہے، زیادہ وضاحت انشاء اللہ " فَهِيَ تُمْلٰى "کی وضاحت سے ہی پتہ چلے گی:

"وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا"

"اور چاہیے کہ ڈرے اللہ سے جو اسکا رب ہے اور نہ گھٹائے اس سے کوئی چیز۔"

یہ حکم ہے اس لکھانے والے کو جس پر حق ہے کہ وہ لکھانے میں اللہ سے ڈرے، صحیح لکھائے، اقرار کرے کہ مجھ پر اتنا حق ہے، اس میں کسی قسم کی کمی نہ کرے۔ "بخس" کا معنی ہے گھٹیا چیز اور ناقص، جیسا کہ رب تعالی نے فرمایا " وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ "اور "بخس" کا معنی ہے کسی چیز کو ظلماً کم کرنا، گھٹانا۔ اسی معنی میں رب تعالی کے ارشادات گرامی استعمال ہیں: " وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ "اور " وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَاءَهُمْ "

(مفردات راغب)

اور زیر بحث آیۃ کریمہ میں "وَلَا يَبْخَسْ "اسی معنی میں استعمال ہے کہ جس پر حق ہے وہ اس حق سے کوئی چیز نہ گھٹائے ورنہ جس کا حق ادا کرنا ہے اس پر ظلم ہوگا۔

تنبیہ : ہ آیۃ کریمہ ہر اس عقد کو شامل ہے جس میں دین مؤجل لازم آئے (وقت مقرر پر ادا کرنے والا قرض لازم آرہا ہو) خواہ وہ دین منافع کا بدل ہو یا کسی عین چیز کا، اسلئے ہر قسم کے دین کو لکھنے اور گواہ بنانے کا حکم ہے خواہ مہر ہو یا خلع ہو یا کرایہ ہو، خون بہا ہو (یعنی جان بوجھ کر قتل کرنے والے سے یا مال پر صلح ہو وہ خون بہا کہلاتا ہے)۔

(احکام القرآن للجصاص)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

"وَلْيَتَّقِ" کی ضمیر میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ ضمیر "الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ" کی طرف لوٹے کہ جس پر حق

ہے وہ اللہ تعالی سے ڈرے اور حق میں سے کسی چیز کی کمی نہ کرے، یہ تفسیر حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کی ہے اور جمہور کے نزدیک یہی قول معتبر ہے اور ایک قول یہ ہے، کہ یہ ضمیر ''کاتب'' کی طرف لوٹے کہ کاتب لکھنے میں اللہ تعالی سے ڈرے اور لکھنے میں کسی چیز کی کمی نہ کرے، لیکن یہ قول زیادہ معتبر اس لئے نہیں کہ کاتب لکھنے میں کبھی زیادتی کرتا ہے اور کبھی کمی اسی وجہ سے اسے عدل سے لکھنے کا حکم دیا گیا ہے، لیکن جس پر حق ہے وہ لکھانے میں کمی کرے یہ احتمال پایا گیا ہے لیکن زیادتی کا احتمال نہیں پایا گیا کیونکہ انسان کی پیدائشی عادت یہی ہے کہ وہ اپنا نفع سوچتا ہے نقصان نہیں سوچتا۔ (از روح المعانی)

"فَاِنْ كَانَ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْلَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ"

''اور اگر وہ شخص جس پر حق ہے بے عقل یا کمزور ہو یا طاقت نہیں رکھتا لکھانے کی وہ، تو چاہئے کہ لکھائے اسکا ولی انصاف سے''۔

مطلب واضح ہے کہ اگرچہ لکھانا کام اس شخص کا ہے جس پر حق ہے لیکن وہ اگر بے عقل یا کمزور ہو یا لکھانے کی طاقت نہیں رکھتا تو اسکا ولی عدل وانصاف سے لکھوائے، اسلئے کہ جس پر حق ہے جب اسکا قول غیر معتبر ہوگا تو اسکے ولی کا قول معتبر ہوگا۔

قرآن کی عظمت شان:

قرآن پاک ایک عظیم الشان کتاب ہے جس کا ایک ایک لفظ عظیم معانی پر دلالت کرتا ہے، یہاں تین الفاظ ''سفیھا'' اور ''ضعیفا'' اور ''لایستطیع ان یمل'' کے درمیان لفظ ''او'' ذکر ہے جو دلالت کررہا ہے کہ یہ تینوں علیحدہ علیحدہ مطالب رکھتے ہیں۔ یعنی جس پر حق ہو وہ سفیہ ہو یا ضعیف ہو یا لکھانے کی طاقت نہ رکھے تو اسکا ولی انصاف سے لکھائے، جب یہ ثابت ہوگیا کہ یہ تینوں لفظ ایک دوسرے سے مغائر ہیں تو ضروری ہے کہ ان کی وضاحت کی جائے جس سے ان کے مطالب علیحدہ علیحدہ سمجھ آجائیں۔

''السفیہ ھو الضعیف الرای، نا قص من البالغین'' سفیہ اس شخص کو کہا جاتا ہے کہ بالغ لوگوں میں جس

کی رائے ضعیف ہو اور عقل ناقص ہو۔

"والضعیف ھو الصغیر والمجنون والشیخ الخرف وھم الذین فقدوا العقل بالکلیة"

ضعیف سے مراد یہ کہ یا وہ جس پر حق ہے وہ چھوٹا بچہ ہو یا مجنون (پاگل) ہو اور یا بہت زیادہ بوڑھا ہو، ان کی عقل مکمل طور پر زائل ہوتی ہے۔

"والذی لایستطیع ان یمل ھو من یضعف لسانه عن الاملاء لخرس او جھله بماله وما علیه"

لکھانے کی طاقت نہ رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اسکی زبان میں گنگا پن کیوجہ سے ضعف ہو کہ وہ لکھانے کی طاقت نہ رکھے یا وہ اپنے حقوق اور غیر کے حقوق سے ہی جاہل ہو، جہالت کی وجہ سے یہ علم اسے حاصل نہ ہو کہ میرے لئے کیا حقوق ہیں اور مجھ پر کیا حقوق ہیں۔

یہ لوگ لکھانے کی طاقت نہیں رکھتے اسلئے ان کے لکھانے کا کوئی اعتبار نہیں اور نہ ہی ان کے اقرار کا اعتبار کیا جا سکتا ہے، لہذا ضروری ہے کہ اسکا کوئی متبادل ہو جو صحیح طور پر لکھا سکے اور اسکے انصاف سے لکھانے کا اعتبار کیا جا سکے۔ اور وہ ان کا ولی ہوگا جسے ان پر حق حاصل ہوگا کہ وہ ان کی طرف سے ان کے حقوق لکھائے۔ (کبیر)

عقل میں ضعف پر حدیث پاک:

"عن انس بن مالک ان رجلا علی عھد النبی ﷺ کان یبتاع وفی عقله ضعف فاتی اھله نبی الله و فقالوا یا نبی الله احجر علی فلان فانه یبتاع وفی عقله ضعف فدعاه النبی ﷺ فنھاه عن البیع فقال یارسول الله انی لا اصبر عن ساعة فقال رسول الله ﷺ ان کنت غیر تارک البیع فقال ھا وھا ولا خلابة" (ابوداؤد)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بیشک ایک شخص نبی کریم ﷺ کے زمانے میں خرید و فروخت کرتے تھے اور ان کے عقل میں ضعف تھا، ان کے افراد نبی کریم ﷺ کے پاس آئے کہ ان کو خرید و فروخت سے روکا جائے کیونکہ ان کے عقل میں ضعف ہے، تو نبی کریم ﷺ نے ان کو بلا کر بیع سے منع فرمایا، لیکن وہ عرض کرنے لگے یا رسول اللہ میں خرید و فروخت سے رک نہیں

سکتا (یعنی خرید وفروخت میری عادت بن چکی ہے) تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم خرید وفروخت سے نہیں رک سکتے تو یہ کہا کرو ہاں ہاں مجھے دھوکا نہ دینا۔

نبی کریم ﷺ کی معیت میں یہ ایک غزوہ میں شریک تھے انکے سر پر چوٹ آ گئی تھی جس کی وجہ سے ان کے عقل میں ضعف آ گیا تھا اور زبان میں لکنت آ گئی تھی۔ (قرطبی)

فرشتوں نے لکھی ہوئی دستاویز آدم علیہ السلام کے سامنے رکھ دی:

لکھنے کا فائدہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے مزید اس کو سمجھنے کیلیے ایک حدیث پاک کو مدنظر رکھا جائے کہ لکھنے کا فائدہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص انکار کرے خواہ بھول کر ہی ہو تو اسکے سامنے لکھی ہوئی دستاویز پیش کر دی جائے۔

"عن ابی هریره قال قال رسول الله ﷺ لماخلق الله آدم مسح ظهره فسقط عن ظهره كل نسمة هو خالقها من ذريته الى يوم القيامةوجعل بين عيني كل انسان منهم و بيصامن نور ثم عرضهم على آ دم فقال اى رب من هولا ء قال ذريتک فرأى رجلا منهم فاعجبه و بيص مابين عينيه قال اى رب من هذا قال داؤد فقال اى رب كم جعلت عمره قال ستين سنة قال رب زده من عمرى اربعين سنة قال رسول الله ﷺ فلما انقضى عمر آ دم الاار بعين جاء ه ملک الموت فقال آدم اولم يبق من عمرى اربعون سنة قال اولم تعطها ابنيک داؤد فجحدآدم فجحدت ذريته ونسى آ دم فأكل من الشجرةفنسيت ذريته وخطا آ دم وخطات ذريته"

(رواه الترمذی، مشکوة باب الایمان بالقدر)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا، تو ان کی پیٹھ پر اپنا دست قدرت پھیرا تو ان کی پیٹھ سے تمام ذی روح اولاد جس نے قیامت تک پیدا ہونا ہے اسے نکال کر ظاہر کیا۔

اور ہر انسان کی آنکھوں کے درمیان نور کی چمک کو رکھا، پھر ان کو آدم علیہ السلام پر پیش کیا، تو انہوں

نے کہا اے میرے رب یہ کون ہے؟ رب تعالیٰ نے فرمایا یہ تمہاری اولاد ہے، آپ نے ان میں سے ایک شخص کو دیکھا اسکی آنکھوں کے درمیان نورانی چمک نے آپ کو تعجب میں ڈالا، آپ نے کہا اے میرے رب یہ کون ہے؟ رب تعالیٰ نے فرمایا (یہ) داؤد ہے، آپ نے کہا اے میرے رب اسکی تو نے کتنی عمر بنائی ہے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا ساٹھ سال۔ آپ نے کہا اے میرے رب میری عمر میں سے اس کی عمر چالیس سال زیادہ کر دے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب آدم علیہ السلام کی عمر ختم ہونے میں چالیس سال باقی رہ گئے تو موت کا فرشتہ (عزرائیل) آپکے پاس آیا تو آدم علیہ السلام نے فرمایا کیا میری عمر میں ابھی چالیس سال باقی نہیں؟ تو اس نے کہا کیا آپ نے اپنے بیٹے داؤد کو وہ نہیں دے دیئے تھے، تو آدم علیہ السلام نے انکار کیا تو اسی وجہ سے آپکی اولاد بھی انکار کرتی ہے خطاء ہوئی تو اسی وجہ سے آپکی اولاد سے بھی خطاء واقع ہوتی ہے۔

''(ونسی آدم) اشارة الی ان الجحد کان نسیا نا ایضااذلا یجوز عنادا ''

رسول اللہ ﷺ کے ارشاد ''ونسی آدم'' سے اس طرف اشارہ پایا گیا ہے کہ آدم علیہ السلام کا انکار بھول کی وجہ سے تھا عناد کی وجہ سے نہیں تھا۔

''(خطاء) الی فی اجتهاد ہ من جهة التعیین والتخصیص''

آپکی خطاء اس درخت کی تعیین اور تخصیص میں تھی۔

تفصیل پہلے پارہ ''نجوم الفرقان'' کی ''جلد دوم'' میں دیکھیں۔ ایک روایت میں ہے کہ آدم علیہ السلام نے اپنی عمر میں چالیس سال حضرت داؤد علیہ السلام کو دیئے۔

''فکتب اللہ علیه کتاباً و اشهد علیه ملائکته''

تو اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے قول کو لکھنے کا حکم دے دیا اور فرشتوں کو گواہ بنالیا۔ جب آپ کی عمر سے چالیس سال باقی رہ گئے تو آپ کے پاس فرشتے آگئے کہ تمہاری موت کا وقت آگیا ہے کیونکہ تم نے اپنی عمر سے چالیس سال حضرت داؤد علیہ السلام کو دے دیئے تھے تو آپ نے فرمایا'' ما وهبت لاحد شئیا'' میں نے کسی ایک

کوکوئی چیز (اپنی عمر میں سے) نہیں دی۔

"قال فاخرج الله الکتاب وشهد علیه وملائکته"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالی نے وہ لکھی ہوئی دستاویز ظاہر کرنے کا حکم دے دیا اور فرشتوں نے اس پر گواہی دے دی۔ (قرطبی)

رب تعالی کی کیا خوب رحمت ہے:

"وفی روایة واتم لداؤد مائة سنة والآدم عمره الف سنة"

ایک روایت میں یہ ہے کے رب تعالی نے اپنی رحمت کاملہ سے داؤد علیہ السلام کو سو سال عمر عطا فرمادی اور آدم علیہ السلام کی ہزار سال کو بھی پورا فرمادیا۔ (قرطبی)

"وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَاءُ اِذَا مَا دُعُوْا﴾

"اور بنالو دو گواہ اپنے مردوں میں سے، پھر اگر نہ ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں، ان میں سے کہ تم پسند کرو انہیں گواہ، یہ کہ بھول جائے ایک (عورت) ان دونوں میں سے تو یاد دلا دے ان میں سے ایک کو دوسری۔"

"استشہاد" کا معنی ہے "گواہی طلب کرنا"۔ خیال رہے کہ دین کے معاملہ میں گواہ بنانے میں اگر چہ اقوال تو ہیں کہ گواہ بنانا فرض ہے یا مستحب "والصحیح انه ندب" صحیح یہ ہے کہ دین کے معاملہ میں گواہ بنانے مستحب ہیں تا کہ بعد میں جھگڑا پیدا نہ ہو، لیکن گواہ بنانے فرض نہیں۔

﴿ شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ﴾ سے ایک مسئلہ یہ واضح ہوا کہ دو مردوں کی گواہی تمام حقوق مالیہ میں معتبر ہے بلکہ حقوق بدنیہ اور حدود میں بھی معتبر ہے سوائے حدِ زنا کے، اس کیلئے صرف چار مردوں کی گواہی معتبر ہے، جس کا ذکر انشاء اللہ سورۃ النساء میں آئے گا۔ جب خطاب ایمان والوں کو ہے تو "مِنْ رِجَالِكُم" سے یہ مسئلہ بھی واضح ہوا کہ گواہ مسلمان ہی بنائے جاسکتے ہیں، کفار کو گواہ نہیں بنایا جاسکتا کیونکہ وہ مؤمنوں کے نہیں۔

اور یہ بھی سمجھ میں آیا کہ بچوں کی گواہی معتبر نہیں کیونکہ "رجال" کا اطلاق بالغ مردوں پر ہے بچوں پر نہیں۔ اسی طرح دو گواہوں والا حکم مردوں کو شامل ہے عورتوں کو نہیں، یہ بھی "مِنْ رِجَالِكُم" سے سمجھ آیا اسی کی مکمل تفصیل انشاء اللہ آگے قریب ہی آرہا ہے۔ (تفسیر قرطبی)

☆ "اخرج سعید بن منصور وابن ابی حاتم والحاکم وصححه والبیهقی فی سننه عن ابن ابی ملیکة قال کتبت الی ابن عباس اسئاله عن شهادة الصبیان فکتب الی ان الله یقول ممن ترضون من الشهداء فلیسوا ممن ترضی لا تجوز"

ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف خط لکھا، میں نے آپ سے بچوں کی گواہی کے متعلق سوال کیا تو آپ نے لکھا کہ اللہ تعالی نے فرمایا(مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ) "جو گواہ تم پسند کرو"۔ جب تم بچوں کی گواہی پر راضی نہیں ہوتے، ان کی گواہی کو پسند نہیں کرتے تو بچوں کی گواہی بھی جائز نہیں۔ (درمنثور)

غلاموں کی گواہی بھی جائز نہیں، بلکہ آزاد لوگوں کی گواہی معتبر ہو گی امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا یہی مذہب ہے۔

☆ "اخرج سفیان وسعید بن منصور وعبد بن حمید وابن جریر وابن ابی حاتم والبیهقی عن مجاهد فی قوله واستشهدوا شهیدین من رجالکم قال من الاحرار"

حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے اللہ تعالی کے ارشاد گرامی "وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ" (تم گواہ بناؤ اپنے مردوں میں سے) کی تفسیر "من الاحرار" سے کی ہے کہ وہ آزاد ہوں (غلام

نہ ہوں)۔ (درمنثور)

☆ "واخرج الشافعی و البیھقی عن مجاھد فی قوله ممن ترضون من الشھداء قال عدلان حران مسلمان"

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں "مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ" سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ گواہ دو عادل آدمی ہوں اور مسلمان ہوں کیونکہ ان کی گواہی پر ہی انسان راضی ہوتا ہے فاسق، غلام اور کفار کی گواہی کو پسند نہیں کیا جاتا اس لئے ان کی گواہی جائز نہیں۔ (درمنثور)

☆ "واخرج ابن جریر عن الربیع فی قوله ممن ترضون من الشھداء، قال عدول"

ربیع سے مروی ہے کہ "مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ" سے واضح ہے کہ گواہ عادل ہوں کیونکہ فاسقوں کی گواہی معتبر نہیں۔

شہادت یعنی گواہی کے متعلق تفصیلی بیان:

شہادت کا لغوی معنی یقینی خبر اور شرعی معنی سچی خبر حق کو ثابت کرنے کیلئے۔ (درمختار، فتح القدیر)

یعنی حقیقی معنی کے لحاظ پر شہادت سچی گواہی کو کہا جائے گا، جھوٹی گواہی مجازی طور پر شہادت کہلاتی ہے، حقیقی طور پر شہادت نہیں جیسا کہ جھوٹی قسم حقیقت میں "یمین" نہیں کہلاتی مجازی طور جھوٹی قسم یعنی "یمین غموس" کو یمین کہہ لیا جاتا ہے۔

شہادت (گواہی) کی شرطیں :

گواہی کی شرطیں تین قسم پر ہیں: (۱) شرط مکان (۲) شرائط تحمل (۳) شرائط اداء۔

پھر شرائط اداء کی دو قسمیں ہیں: شرائط عامہ اور شرائط خاصہ۔

شرط مکان یہ ایک ہی شرط ہے کہ مکان ایک ہو، یعنی مجلس قضاء ہو کہ قاضی کے سامنے دی ہوئی

گواہی معتبر ہوگی، دوسرے لوگوں کے سامنے گواہی دی پھر قاضی کے سامنے گواہی نہ دی تو اس گواہی کا کوئی اعتبار نہیں۔

شرائط تحمل یعنی شرائط تحمل تین ہیں:

(۱) عقل کامل ہو جب اس نے گواہی کو حاصل کیا ہو۔

(۲) اور وہ واقعہ اس کے سامنے ہوا ہو اس نے دیکھا ہو۔

(۳) اور معاینہ پایا جائے کہ آمنے سامنے وہ چیز ہو یعنی جس چیز کی گواہی دے رہا ہو وہ اس نے دیکھی ہو، صرف سننا کافی نہیں۔ ہاں واقعہ ہی صرف سننے سے متعلق ہو تو سن کر گواہی دی جا سکتی ہے، مزید تفصیل ان شاء اللہ آگے آئے گی۔

شرائط عامۃ للاداء دس ہیں:

گواہی دینے کیلئے دس شرطیں وہ ہیں جو گواہی کی تمام قسموں کو شامل ہیں، اسی وجہ سے ان کو "شرائط عامہ" کہا جاتا ہے۔ وہ شرائط مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) گواہ آزاد ہو، غلام نہ ہو۔ (۲) گواہ کی نظر صحیح ہو، دیکھ سکتا ہو، اندھا نہ ہو۔

(۳) عدالت پائی جائے یعنی گواہ عادل ہو فاسق نہ ہو۔ خیال رہے کہ یہ شرطیں جب پائی جائیں گی تو قاضی کو فیصلہ کرنا لازم ہو جائے گا۔ اس کو یہ اختیار باقی نہیں رہے گا کہ وہ فیصلہ کرے یا نہ کرے۔

(۴) گواہ "محدود فی القذف" نہ ہو یعنی اسے بہتان لگانے کی وجہ سے حد نہ لگ چکی ہو۔

(۵) گواہ کی اس گواہی میں اپنے منافع نہ پائے جائیں۔

(۶) گواہ گواہی کے ذریعے اپنے آپ سے ضرر دور نہ کر رہا ہو۔

(۷) فروع اصول کیلئے یعنی اولاد اپنے آباؤ اجداد کے حق میں گواہی نہیں دے سکتی البتہ ان کے مخالف گواہی دے سکتی ہے، ان کے حق میں گواہی دینے میں جھوٹ کا احتمال پایا جاتا ہے اس لئے وہ گواہی قابل قبول نہیں اور اسی طرح اصول کی گواہی فروع کے حق میں یعنی آباؤ اجداد کی گواہی اولاد کے حق میں قبول نہیں، البتہ ان

کے خلاف دی جانے والی گواہی قبول ہوگی۔

(۸) زوجین ایک دوسرے کے حق میں گواہی نہیں دے سکتے نہ زوجہ خاوند کے حق میں گواہی دے سکتی ہے اور نہ ہی خاوند زوجہ کے حق میں گواہی دے سکتا ہے، البتہ ایک دوسرے کے خلاف یہ بھی گواہی دے سکتے ہیں۔

(۹) گواہ خصم نہ ہو، یعنی مدعی اور مدعی علیہ میں سے کوئی ایک بھی گواہ نہیں بن سکتا، یہی وجہ ہے کہ یتیم کیلئے جسے وصی بنایا گیا ہو وہ یتیم کے حق میں گواہی نہیں دے سکتا۔

(۱۰) جس چیز کی گواہی دے رہا ہو وہ گواہی کے وقت اسے یاد ہو صرف کسی خط کو دیکھ کر گواہی نہیں دی جاسکتی۔

شرائط خاصہ للاداء سات ہیں:

(۱) مشہود علیہ (یعنی جس کے خلاف گواہی دینی ہو وہ) مسلمان ہو کیونکہ مسلمان کافر کے خلاف گواہی نہیں دے سکے گا جب مدعی مسلمان ہو (لیکن اس کا تعلق معاملات سے ہے دینی مسائل میں کہ اس نے یہ شریعت کے خلاف مسلمانوں کے جذبات کو بھڑکا دینے والی بات کی ہے، اس میں مسلمان کی گواہی کافر کے خلاف قبول ہوگی۔

(۲) گواہ مرد ہو سکتے ہیں عورتیں گواہی نہیں دے سکتیں، لیکن یہ حکم خاص ہے حدود وقصاص کے ساتھ کہ حدود وقصاص میں گواہی صرف مرد ہی دے سکتے ہیں، عورتیں حدود وقصاص میں گواہی نہیں دے سکتیں۔

(۳) پہلے دعویٰ کا پایا جانا ضروری ہے، دعویٰ کے بغیر گواہی معتبر نہیں، لیکن یہ حقوق العباد کے ساتھ خاص ہے حقوق اللہ میں دعوی یا مدعی کا ہونا ضروری نہیں۔

(۴) گواہی دعویٰ کے مطابق ہو تو قبول کی جائے گی اور اگر دعویٰ کے مخالف ہو تو قبول نہیں کی جائے گی، ہاں اگر مدعی نے بھی اس سے اتفاق کرلیا ہو جبکہ وہ کام ممکن ہو تو گواہی قبول کی جائے گی۔

(۵) اگر کسی کے شراب پینے کی گواہی دی جائے تو اس کیلئے شرط یہ ہے کہ شرابی کے منہ سے شراب کی بو آ

رہی ہو، خواہ وہ نشے میں اس وقت نہ ہو پھر بھی گواہی دی جاسکے گی، البتہ مسافت کے دور ہونے کی وجہ سے گواہی میں تاخیر ہوگئی اس صورت میں منہ میں بو نہ ہونے کے باوجود گواہی دی جاسکے گی۔

(٦) حدود و قصاص میں گواہ خود بنفس نفیس گواہی دے سکتا ہے، اپنی جگہ کسی اور کو بطور نمائندہ گواہ نہیں بنا سکتا خواہ اسے کوئی شدید عذر بھی لاحق ہو۔

(٧) اور معاملات وغیرہ میں گواہ اپنی جگہ دوسرا گواہ بنا سکتا ہے، وہ دوسرا گواہ یہ کہے کہ فلاں شخص نے یہ واقعہ دیکھا ہے وہ موقع کا گواہ ہے اس نے مجھے گواہی دینے کے لئے بھیجا ہے، لیکن خیال رہے کہ یہ دوسرا گواہ اس وقت بنایا جاسکتا ہے جب اصل گواہ کو عدالت میں حاضر ہونے سے شدید عذر لاحق ہو اس طرح کا مریض ہو کہ عدالت میں حاضر نہ ہوسکے۔

واضح ہوا کہ شہادت (گواہی) کی کل اکیس شرطیں ہیں۔ شرط مکان ایک، شرائط تحمل تین، شرائط عامہ للاداء دس اور شرائط خاصہ للاداء سات ۔

رکن شہادت:

گواہی کا رکن یہ ہے کہ لفظ "اشھد" (میں گواہی دیتا ہوں) استعمال کرے اور اگر یہ کہے کہ مجھے یہ علم ہے کہ واقعہ ایسے ہے یا یہ کہے میں اس واقعہ کی خبر دیتا ہوں تو یہ گواہی نہیں بن سکتی اور یہ بھی خیال رہے کہ ماضی کا صیغہ "شھدتُ" (میں نے گواہی دی) بھی گواہی کیلئے کافی نہیں۔

تنبیہ: جب تمام شرائط پائی جائیں تو گواہی دینا لازم ہو جاتا ہے، اس حال میں گواہی کا چھپانا گناہ ہے جیسا کہ زیر بحث آیۃ کریمہ میں ہی ان شاءاللہ آگے آجائے گا۔ حقوق اللہ میں شہادت بغیر طلب کرنے کے جائز ہے۔ اگرچہ حقوق اللہ کثیر ہیں تاہم زیادہ درپیش آنے والے چودہ حقوق کا فقہاء کرام نے ذکر کیا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) بغیر دعوی اور بغیر مطالبہ کے عورت کی طلاق میں دو گواہوں کی گواہی معتبر ہوگی۔

(۲) غلامہ کو آزاد کرنے کی گواہی۔ (۳) وقف کے متعلق گواہی۔

(۴) چاند کی گواہی خواہ رمضان کا چاند ہو یا عید فطر کا چاند ہو یا قربانی والی عید کا چاند ہو یا کسی اور مہینے کا چاند ہو۔

(۵) اور حدود کی گواہی سوائے حد قذف (تہمت لگانے کی حد) اور سوائے چوری کی حد کے کیونکہ ان میں دعوی ضروری ہے۔

(۶) نسب کی گواہی، اگرچہ نسب کی گواہی میں اختلاف ہے کہ بغیر دعوی کے قبول ہے یا نہیں لیکن ابن وہبان رحمہ اللہ نے بغیر دعوی کے نسب کی گواہی میں جزم (یقین) کیا ہے۔

(۷) لونڈی کو مدبرہ بنانا، یعنی تو میری موت کے بعد آزاد ہے۔

(۸) خلع (۹) ''ایلاء'' یعنی عورت سے چار ماہ یا اس سے زائد وطی نہ کرنے کی قسم اٹھانا۔

(۱۰) ''ظہار'' یعنی اپنی زوجہ کے پیٹ، پیٹھ، فرج وغیرہ کو اپنی محرمات عورتوں کے ان اعضاء سے ہی تشبیہ دینا۔

(۱۱) غلام کو آزاد کرنا۔ (۱۲) غلام کو مدبر بنانا۔

(۱۳) رضاعت یعنی دودھ پلانے کے متعلق گواہی دینا کہ اس عورت نے فلاں بچے کو دودھ پلایا ہے۔

(۱۴) راویوں کی جرح بیان کرنا کہ یہ راوی ثقہ نہیں ہے، اس کے ثقہ نہ ہونے کی وجہ فلاں ہے۔

خیال رہے کہ غلام کے آزاد کرنے یا مدبر بنانے میں صاحبین کا یہ مسلک ہے کہ بغیر دعوی کے گواہی جائز ہے امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک دعویٰ شرط ہے۔

تنبیہ شدید:

کسی عورت کے متعلق طلاق کی گواہی بغیر دعویٰ کے دینا جائز ہے، لیکن قاضی اس وقت ان گواہوں کی گواہی کے مطابق طلاق کا فیصلہ کرے گا جب عورت تسلیم کرے، اگر عورت تسلیم نہ کرے تو طلاق کا فیصلہ کرنا ممکن نہیں ہوگا اس لئے کہ عورت اس مسئلہ میں مدعیہ ہے، یعنی مرد اور عورت جب یہ تسلیم کرلیں کہ ہاں واقعی اتنی طلاقیں دی گئیں تو اس وقت طلاق کا فیصلہ عدالت دے گی، مرد اور عورت کے انکار پر گواہ عادل بھی ہوں تو پھر بھی عدالت ان گواہوں کے حق میں فیصلہ نہیں کرسکتی، یہ مسئلہ بھی اس وقت ہے جب گواہ یہ گواہی دیں کہ اس شخص نے ہمارے سامنے طلاق دی

ہے۔اگر گواہ یہ کہیں کہ اس شخص نے ہمارے سامنے اقرار کیا ہے، طلاق دینے کا تو پھر بھی نوعیت بدل جائے گی، پھر اس کے اقرار کے الفاظ کو دیکھنا پڑے گا کہ اس نے اقرار کن الفاظ سے کیا ہے۔ان الفاظ کو دیکھ کر کوئی حکم لگایا جائے گا، پھر یہ بھی دیکھا جائے گا کہ وہ اقرار پر قائم ہے یا نہیں۔جب تک ان باریکیوں کی طرف نہ دیکھا جائے اس وقت تک بغیر سوچے سمجھے فتوی ٹھونسنا صرف حماقت ہی حماقت ہے، عقل ودانش کا کام نہیں۔ (راقم)

الانتباہ : "تحمل الشھادۃ فرض علی الکفایۃ کا دائھا والالضاعت الحقوق"

جس طرح گواہی دینا فرض کفایہ ہے اسی طرح واقعہ کو دیکھنا اور گواہ بننا بھی فرض کفایہ ہے ورنہ حقوق ضائع ہو جائیں گے۔

یہی صورت کتابت کی بھی ہے، دین وغیرہ میں اگر لکھنے والا ایک ہی ہو تو اس پر لکھنا فرض ہو جاتا ہے، جب کئی شخص ہوں تو ان میں سے کوئی ایک بھی لکھ دے تو کوئی بھی گنہگار نہیں ہوگا۔شہادت اور کتابت میں یہ فرق ہے کہ کتابت کی اجرت لی جاسکتی ہے لیکن شہادت کی اجرت نہیں لی جاسکتی البتہ گواہ کو عدالت میں لے جانے کا کرایہ دیا جائے گا اور بوقت ضرورت طعام کھلایا جائے گا۔

گواہ پیش کرنا کیوں ضروری ہے؟

اس مسئلہ کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے ارشادات سے واضح کر دیا ہے۔

☆ "عن ابن عباس عن النبی ﷺ قال لو یعطی الناس بدعواھم لا دعی ناس دماء رجال واموالھم ولکن الیمین علی المدعی علیہ" رواہ مسلم" وفی شرحہ للنووی انہ قال وجاء فی روایۃ البیھقی باسناد حسن او صحیح زیادۃ ابن عباس مرفوعا لکن البینۃ علی المدعی والیمین علی من انکر" (مشکوۃ باب الاقضیۃ والشھادات)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر لوگوں کو دعوی کے مطابق دیا جائے تو البتہ لوگ دوسرے اشخاص کے خونوں اور مالوں کا دعوی کریں گے، لیکن مدعی علیہ پر قسم لازم ہے۔ (مسلم)

علامہ نووی رحمہ اللہ نے اسی حدیث کی شرح میں بیہقی سے حدیث بیان کی جو حسن یا صحیح ہے اور وہ

روایت بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی مروی ہے اور حدیث مرفوع ہے یعنی نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:" لکن البینة علی المدعی والیمین علی من انکر "

یعنی حدیث مذکور کے آخر میں یہ بالا الفاظ ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ گواہ مدعی پر لازم ہیں اور قسم منکر پر۔

وضاحت حدیث:

حدیث پاک کا مفہوم بہت واضح ہے کہ اگر لوگوں کو صرف ان کے دعاوی (دعووں) کے مطابق حق دے دیا جائے، ان سے گواہ نہ طلب کئے جائیں اور نہ ہی "مدعی علیہ" ان کی تصدیق کرے تو لوگ دعویٰ کر کے دوسروں کی جان اور مال کو مباح کرالیں، اصل قانون یہ ہے کہ مدعی جب دعوی کرے تو مدعی علیہ سے پوچھا جائے کیا یہ اپنے دعوی میں سچا ہے؟ اگر وہ تصدیق کردے کہ ہاں یہ سچا ہے تو مدعی کے حق میں فیصلہ ہو جائے گا۔ اگر مدعی علیہ تصدیق نہ کرے تو مدعی سے گواہ طلب کئے جائیں گے۔ جب مدعی گواہ پیش کر دے تو پھر بھی فیصلہ مدعی کے حق میں ہوگا۔ اگر مدعی گواہ پیش نہ کر سکے اور مدعی علیہ بھی اسے جھوٹا کہے تو مدعی علیہ سے قسم طلب کی جائے گی جب مدعی علیہ قسم اٹھادے کہ مدعی جھوٹا ہے اس کا دعوی غلط ہے تو فیصلہ مدعی علیہ کے حق میں ہوگا۔

اعتراض : مدعی پر صرف گواہ پیش کرنے ہی لازم نہیں بلکہ ایک گواہ پیش کر دے اور دوسرا گواہ نہ ہونے کی صورت میں وہ اس کی جگہ قسم اٹھادے تو پھر بھی فیصلہ مدعی کے حق میں ہوگا، جیسا کہ حدیث پاک سے واضح ہے۔

☆ "وعن ابن عباس ان رسول اللہ ﷺ قضی بیمین وشاھد" (رواہ مسلم ،مشکوۃ کتاب الاقضیۃ والشھادات)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا بیشک رسول اللہ ﷺ نے ایک قسم اور ایک گواہ سے فیصلہ فرمایا۔

جواب : یہ حدیث جو معترض نے پیش کی ہے خبر واحد ہے، لیکن جو حدیث ہم نے پیش کی ہے وہ خبر مشہور ہے، خبر مشہور کو خبر واحد پر ترجیح دی جائے گی۔ ترمذی شریف میں "خبر مشہور" کے الفاظ یہ ہیں۔

☆ "عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ ان النبی ﷺ قال البینة علی المدعی والیمین علی المدعی علیہ" (رواہ الترمذی ، مشکوۃ کتاب الاقضیۃ والشھادات)

عمرو بن شعیب اپنے باپ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ بیشک نبی ﷺ نے فرمایا مدعی پر گواہ لازم ہیں اور

مدعی علیہ پرقسم۔ مسلم شریف اور بیہقی شریف کے خبر مشہور کے الفاظ مبارکہ پہلے ذکر کیے جا چکے ہیں۔

مدعی علیہ کے قسم اٹھانے پر اس کے حق میں فیصلہ ہوگا:

"عن علقمة بن وائل عن ابيه قال جاء رجل من حضر موت و رجل من كندة الى النبى ﷺ فقال الحضرمى يارسول الله ان هذا غلبنى على ارض لى فقال الكندى هى ارضى وفى يدى ليس له فيها حق فقال النبى ﷺ للحضرمى الك بينة قال لا قال فلك يمينه قال يارسول الله ان الرجل فاجر لا يبالى على ما حلف عليه وليس يتورع من شئى قال ليس لك منه الا فانطلق ليحلف فقال رسول الله ﷺ لما ادبر لئن حلف على ما له ليأ كله ظلما ليلقين الله وهو معرض عنه"

(رواه مسلم، مشكوة كتاب الاقضيه والشهادت)

حضرت علقمہ بن وائل اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص حضر موت سے اور ایک شخص کندہ سے نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے، حضر موت سے آنے والے نے کہا یا رسول اللہ یہ شخص میری زمین پر مجھ پر غالب آ گیا ہے، تو کندی نے کہا یہ زمین میری ہے اور میرا اس پر قبضہ ہے، اس شخص کا اس زمین پر کوئی حق نہیں، تو نبی کریم ﷺ نے حضرمی کو کہا کیا تمہارے پاس گواہ ہیں؟ اس نے عرض کیا میرے پاس گواہ تو نہیں، پھر آپ نے (دوسرے سے) کہا تم قسم اٹھاؤ۔ حضرمی نے کہا یا رسول اللہ بیشک یہ شخص تو فاجر ہے یہ قسم اٹھانے میں کوئی پرواہ نہیں کرے گا یعنی اسکی قسم کوئی معتبر نہیں، کیونکہ اس میں پرہیز گاری کی کوئی چیز موجود نہیں تو حضور ﷺ نے فرمایا تمہارے لئے اس کی طرف سے اس کے سواء اور کچھ نہیں۔ وہ شخص قسم اٹھانے کیلئے چلا اس کے پیٹھ پھیرنے پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر اس نے مال کھانے کیلئے ظلماً قسم اٹھائی تو اللہ تعالیٰ اسے پھینک دے گا۔ تو اس شخص نے قسم اٹھانے سے اعراض کر لیا۔

وضاحت حدیث :

حضرمی سے مراد حضر موت میں رہنے والا، حضر موت یمن کے علاقہ میں ایک شہر کا نام ہے۔ اور کندی سے مراد کندہ سے تعلق رکھنے والا، کندہ ایک قبیلہ کا نام ہے جو یمن کے علاقہ میں پایا جاتا ہے۔ "ان هذا غلبنى على

ارضی“ حضرمی کا یہ کہنا کہ یہ میری زمین پر غالب آچکا ہے، اس کا یہ مطلب ہے کہ اس نے ظالمانہ طریقے سے میری زمین پر تجاوز کر لیا ہے اور اس پر قابض ہو چکا ہے۔ کندی نے کہا یہ زمین تو میری اپنی ملکیت ہے میرے تصرف میں ہے اسکا اس پر کوئی حق نہیں، تو نبی کریم ﷺ نے ان دونوں کی باتوں کو سن کر پہلے مدعی سے گواہ طلب کئے چونکہ یہی قانون شریعت ہے جب اس نے کہا میرے پاس گواہ نہیں۔ تو پھر آپ نے دوسرے شخص یعنی مدعی علیہ سے قسم طلب کی کیونکہ مدعی گواہ پیش کرنے سے عاجز آجائے اور مدعیٰ علیہ اس کے دعویٰ کو قبول نہ کرے تو قانونِ شریعت یہی ہے کہ مدعیٰ علیہ قسم اٹھائے۔ جب حضرمی نے کندی کے متعلق کہا کہ شخص تو فاسق و فاجر ہے۔ یہ قسم اٹھانے میں کوئی پرواہ نہیں کرے گا، یعنی اسکی قسم کا تو کوئی اعتبار ہی نہیں، تو حضور ﷺ نے فرمایا" **لیس منه الا ذلک**" اس شخص کی طرف سے تمہارے لئے اور کچھ نہیں، یعنی قانون شریعت سے ہٹ کر تمہارے لئے اور کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ نبی کریم ﷺ نے کندی کو سمجھایا کہ اگر صرف مال ہتھیانے پر جھوٹی قسم اٹھائی تو "لیلقین اللہ" اللہ تعالیٰ تمہیں پھینک دے گا۔

"**قال الطیبی هو مجاز عن الا ستهانة به والسخط علیه والابعاد عن رحمته نحو قوله تعالیٰ لا یکلمهم الله ولا ینظر الیهم یوم القیامة**"

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مجازی معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے ذلیل کرے گا اور اس پر ناراض ہوگا اور اسے اپنی رحمت سے دور کر دے گا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے (دنیاوی منافع کی وجہ سے وعدہ توڑنے والوں کے متعلق فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ ان سے محبت بھرا) کلام نہیں فرمائے گا اور ان کی طرف نظر (رحمت) نہیں فرمائے گا۔

خیال رہے حضرمی کے قول "**وغلبنی علی ارضی لی**" کا یہ مطلب ہے "**ای شعبا منی قهرا**" کہ یہ شخص میری زمین کے کچھ حصہ پر قہراً قابض ہو چکا ہے۔

فائدہ: مقدمہ کا فیصلہ ظاہر طور پر گواہوں کی گواہی سن کر ہوگا۔ یا مدعیٰ علیہ کے قسم اٹھانے پر ہوگا۔ حقیقت حال اللہ تعالیٰ کے سپرد ہوگی۔ اسی وجہ سے مدعیٰ علیہ فاسق و فاجر ہوا تو پھر بھی اس کی قسم پر ایسے ہی فیصلہ کیا جائے گا جیسا کہ عادل شخص کی قسم پر فیصلہ کیا جاتا ہے اور حدیث پاک سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ دو آدمیوں کا جب جھگڑا ہو تو ایک

شخص دوسرے کے متعلق یہ کہے "انه ظالم او فاجر اونحوه فی حال المخاصمة یحمل ذلک منه" کہ بیشک یہ ظالم ہے یا فاجر ہے یا اس قسم کے اور الفاظ پیش کرنے کا احتمال پایا جاتا ہے کہ جھگڑے میں اس قسم کے الفاظ کا استعمال عام طور پر پایا جاتا ہے۔

جھوٹی قسم سے مال ہتھیانہ جہنم حاصل کرنا ہے:

"عن ابی امامة قال قال رسول الله ﷺ من اقتطع حق امریٔ مسلم بیمینه فقد اوجب الله له النار وحرم الله علیه الجنه فقال له وان کان شیئا یسیرا یا رسول الله قال وان کان قضیبا من اراک" (مسلم، مشکوۃ کتاب الاقضیة والشهادات)

حضرت امامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے مسلمان بھائی کا حق قسم کے ذریعے کاٹ لیا تو اللہ تعالی اس کیلئے (جہنم کی) آگ واجب کردے گا اور جنت اس پر حرام کردے گا، ایک شخص نے عرض کیا خواہ وہ تھوڑی چیز ہی ہو یارسول اللہ ﷺ آپ نے فرمایا ہاں اگر چہ وہ پیلو کے درخت کی ایک چھوٹی سی شاخ ہو (مسواک ہی ہو)۔

حدیث پاک کا مطلب واضح ہے کہ جھوٹی قسم اٹھا کر کسی کا مال ناحق طور پر ہتھیا لینا جہنم کی آگ کا اپنے آپ کو مستحق بنانا ہے اور اپنے لئے جنت کے دروازے بند کرنا لازم آئے گا۔ ناجائز طور پر معمولی سے معمولی مال جھوٹی قسم کے ذریعے ہتھیا لینا بھی باعث عذاب ہوگا خواہ وہ مسواک ہی کیوں نہ ہو۔ بلکہ شریعت جس چیز کو مال نہیں کہتی جیسے مردہ جانور کا چمڑا وغیرہ اس کو بھی جھوٹی قسم کے ذریعے ناحق طور پر کسی سے حاصل کر لینا باعث عذاب ہوگا۔

"وعن ام سلمة ان رسول الله ﷺ قال انما انا بشر وانکم تختصمون الی ولعل بعضکم ان یکون الحن بحجته من بعض فاقضی له علی نحو ما اسمع منه فمن قضیت له بشی من حق اخیه فلا یا خذنه فانما اقطع له قطعة من النار"

(بخاری و مسلم، مشکوۃ کتاب الاقضیة والشهادات)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک میں بشر ہوں اور بیشک تم

اپنے جھگڑے میرے پاس لاتے ہو، ہوسکتا ہے تم میں سے بعض اپنے دوسرے بعض زبان کو پھیر کر اپنی دلیل اسطرح پیش کریں تو میں اس کے حق میں فیصلہ کر دوں اسی طرح جس طرح اس کی بات کو میں سنوں، تو میں نے جس شخص کیلئے کسی چیز کا فیصلہ اس کے بھائی کے حق سے کر دیا تو وہ اسے ہرگز نہ لے بیشک میں نے اسے آگ کا ٹکڑا کاٹ کر دے دیا۔

وضاحت حدیث: "قال الراغب اللحن صرف الكلا م عن سننه الجارى عليه"

"لحن" کا مطلب یہ ہے کہ زبان کو عام جاری طریقہ سے پھیر کر کلام کرنا، یعنی چرب زبانی سے کلام کر کے بظاہر اپنے آپ کو سچا کر کے دکھائے اور واقعہ میں سچا نہ ہو، اس حدیث پاک میں بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کسی شخص کے باطن پر مطلع نہ ہوں اور اس کے ظاہر کے مطابق فیصلہ کر دیں یہ کیسے ہوسکتا ہے جبکہ آپ سے اجتہادی خطاء ہوجائے تو اللہ تعالیٰ آپ کو اس پر بھی مطلع فرما دیتا ہے، تو اسکا جواب یہ دیا گیا

"واما الذى فى الحديث فليس من الا جتها د فى شئى لانه حكم بالبينة او اليمين فلو وقع منه ما يخالف الباطن لا يسمى الحكم خطاء بل الحكم صحيح بناء على ما استقر به التكليف وهو وجوب العمل بشاهدين مثلا فان كا نا شاهدى زور او نحوذالک فالتقصير منهما واما الحا كم فلا حيلة له فى ذلک و لا عتب عليه بسببه بخلا ف ما اذاا خطأ فى الا جتهاد" (مرقاۃ ج۷ ص ۲۵۲)

حدیث پاک میں جو ذکر ہے اس میں اجتہاد کی کوئی بات نہیں، بلکہ یہ حاکم کا فیصلہ ہے گواہوں کی گواہی سن کر یا مدعیٰ علیہ کی قسم کو سن کر، اگر باطن ظاہر کے خلاف ہو تو اس حکم کو خطاء نہیں کہتے بلکہ وہ قانون شریعت کے مطابق حکم صحیح ہے اسلئے کہ مدعی کے دعویٰ کے مطابق دو گواہ جب گواہی دے دیں تو حاکم کیلئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے حق میں فیصلہ کرے خواہ گواہ جھوٹے ہی ہوں کیونکہ جھوٹ کی وجہ سے کوتاہی گواہوں کیطرف سے آرہی ہے نہ کہ حاکم کی طرف سے حاکم کو فیصلہ نہ کرنے یا گواہوں کے جھوٹ کو باطل کرنے کا کوئی حیلہ نہیں، للہذا حاکم پر گواہوں کی گواہی

کے مطابق فیصلہ کرنے کی وجہ سے کوئی عتاب نہیں بخلاف اجتہادی خطاء کے، جب حاکم اپنے فیصلہ میں اجتہادی خطاء پر مطلع ہو جائے تو اسے چاہیے کہ اس فیصلہ کو ختم کر کے صحیح فیصلہ کر دے۔

گواہی طلب کرنے سے پہلے گواہی دینا بہتر ہے:

" عن زید بن خالد قال قال رسول الله ﷺ الا اخبر کم بخیر الشهدا ء الذی یاتینی بشها دته قبل ان یسألها " (رواہ مسلم، مشکوۃ کتاب الاقضیه والشها دات)

حضرت زید بن خالد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں خبر نہ دوں بہتر گواہوں کی کہ یہ وہ ہیں جو اپنی گواہی لاتے ہیں ان سے سوال کرنے سے پہلے۔

اعتراض : نبی کریم ﷺ نے تو اپنے ایک ارشاد گرامی " **یشهدون ولا یستشهدون** " میں گواہی بغیر طلب کے دینے کی مذمت بیان فرمائی ہے تو دونوں حدیثوں میں تطبیق کیسے پائی گئی؟

جواب : ان دونوں حدیثوں میں تطبیق کی تین وجوہ پائی گئی ہیں۔

(۱) خود ہی گواہی دینا اس وقت معتبر ہے جبکہ ایک شخص کو واقعہ کا علم ہے لیکن مدعی کو یہ معلوم نہیں کہ اس کا کون گواہ ہے " فیاتی الیه فیخبره بانه شاهد له لا نها امانة له عنده " تو یہ خود ہی اسکے پاس آئے اور بتائے کہ میں اس تمہارے دعویٰ کا گواہ ہوں اس کا یہ خود ہی بتانا اس لئے بہتر ہے کہ گواہی اس کے پاس امانت ہے حق یہی ہے کہ امانت خود ہی ادا کر دی جائے۔

(۲) جس گواہی کا تعلق حقوق العباد سے نہ ہو بلکہ نظام کو درست کرنے کیلئے گواہی دی جائے تاکہ ان چیزوں کا تدارک (پایا جا سکے) ہو سکے تو احتساب کی غرض سے خود ہی گواہی دینا بہتر ہے جیسے طلاق، عتق، وقف، وصیت عامہ اور حدود وغیرہ کی خود ہی گواہی دینا بہتر ہے:

" ضمن علم شینا من هذا النوع وجب علیه رفعه الی القاضی واعلا مه به قال تعالی واقیموا الشهادة لله"

اس قسم کی چیزوں کا جن کا تعلق حقوق العباد سے نہ ہو، احتساب کیلئے خود ہی گواہی قاضی کو دینا اور اس غرض سے کہ قاضی کو علم حاصل ہو جائے تو یہ بہتر ہے، اس لئے کے رب تعالیٰ نے فرمایا(وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ) ''اور قائم کرو گواہی اللہ کیلئے'' یعنی گواہی دیتے ہوئے صرف یہ تصور ذہن میں لائے کہ میں نے اللہ تعالیٰ کی رضامندی کیلئے یہ گواہی دینی ہے۔ مقصد یہ نہ ہو کہ اس میری گواہی سے فلاں کا فائدہ ہے اور فلاں کا نقصان ہے۔

(۳) تیسری وجہ تطبیق کی یہ ہے کہ جس حدیث پاک میں گواہی طلب کرنے سے پہلے خود ہی گواہی دینے کی تعریف کی گئی ہے اس میں مقصد مبالغہ ہے اور یہ بامحاورہ کلام ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے:

'' الجواد يعطى قبل السؤال اى يعطى سريعا عقيب السؤال من غير توقف''

وہ سخی سوال سے پہلے ہی دے دیتا ہے یعنی سوال کے بعد جلدی ہی دیتا ہے اس میں کوئی توقف نہیں کرتا (یعنی ٹال مٹول سے کام نہیں لیتا) (مرقاۃ ج ۷ ص ۲۵۵)

اس سے واضح ہوا کہ جب مدعی کو گواہ کے متعلق خود ہی علم ہو تو اسکی طلب کے بغیر گواہی دینا بہتر نہیں اور اگر اسے علم نہ ہو تو خود ہی گواہی دینا بہتر ہے۔ جن واقعات کا تعلق حقوق العباد سے نہیں ان کی گواہی خود ہی دینا جب کہ مقصد صرف رب تعالیٰ کی رضا ہو تو بہتر ہے۔

جن واقعات کا تعلق حقوق العباد سے ہے وہاں مدعی کو جب گواہ کا علم ہو تو بغیر گواہی طلب کرنے کے خود ہی گواہی دینا بہتر نہیں البتہ طلب کے بعد گواہی دینا بہتر ہے۔ اور گواہی طلب کرنے کے بعد جلدی گواہی دینا بہتر ہے بغیر کسی عذر کے ٹال مٹول کرنا درست نہیں۔

وہ کون سی گواہی ہے جسے چھپانا بہتر ہے:

حدود کی گواہی کو چھپانا بہتر ہے تا کہ مسلمان بھائی کی پردہ پوشی رہے، ہاں اگر جرائم بڑھ رہے ہوں ان کی روک تھام کیلئے گواہی دی جائے تو بہتر ہے خواہ اسکا تعلق حدود سے ہی کیوں نہ ہو۔

فائدہ: چوری کی گواہی کو مطلقاً نہ چھپایا جائے بلکہ اس طرح گواہی دی جائے کہ مالک کو مال مل جائے

اور چور کا ہاتھ کٹنے سے بچ جائے ،یعنی گواہی یوں دے "اشھد انہ اخذ مال فلان " میں گواہی دیتا ہوں کہ اس شخص نے فلاں کا مال لیا ہے ،اس گواہی سے مالک کو مال مل جائے گا اور چور کا ہاتھ کٹنے سے بچ جائے گا لیکن اس نے اگر گواہی یوں دی' اشھد انہ سرق مال فلان'' میں گواہی دیتا ہوں کہ اس نے فلاں کا مال چوری کرلیا ہے ۔تو اس صورت میں مالک کو مال مل جائے گا چور کا ہاتھ بھی کاٹ دیا جائے گا لیکن یہ گواہی بہتر نہیں ،بہتر وہی ہے جس میں چور کا ہاتھ کٹنے سے بچ جائے لیکن یہ بھی خیال رہے کہ جب چوریاں عام کرائی جارہی ہوں تو چور کی چوری کی گواہی دینا اور اس کا ہاتھ کاٹنا ہی بہتر ہوگا تا کہ ملک کا نظام بہتر رہے اور جرائم کی روک تھام پائی جائے ۔

فاسق کی گواہی پر قاضی کا فیصلہ کرنا:

اگر گواہ فاسق ہوں ،ان کی گواہی سن کر قاضی مدعی کے حق میں فیصلہ کردے تو اس کا فیصلہ نافذ ہوجائے گا البتہ قاضی گنہگار ہوگا ۔اگر قاضی کو حاکم نے فاسق کی گواہی سن کر فیصلہ کرنے سے منع کردیا تھا تو اس صورت میں اسکا فیصلہ بھی نافذ نہیں ہوگا ۔

گواہی کس طرح دی جائے؟

گواہ مدعی کی طرف اشارہ کرکے یہ بتائے کہ ہاں یہ مدعی ہے ،اور مدعی علیہ کی طرف بھی اشارہ کرکے بتائے کہ یہ مدعی علیہ ہے ،جس چیز کا دعوی ہے اگر وہ عین چیز ہے قرض نہیں تو اس عین چیز کی طرف بھی اشارہ کرکے بتائے کہ ہاں اس چیز میں جھگڑا ہے ۔جس کے متعلق گواہی دینی ہے وہ موجود نہ ہو یا فوت ہو چکا ہے تو اس کے متعلق گواہی دیتے وقت اسکا نام لے اور اسکے باپ کا نام ذکر کرے اور اسکے دادا کا نام بھی لے ،صرف اس شخص کا نام لینا اور اسکے باپ کا نام لینا کافی نہیں بلکہ اسکے دادا کا نام بھی لیا جائے تا کہ اسکا صحیح تعین ہو سکے ۔ہاں البتہ اگر کوئی شخص کسی پیشہ میں مشہور ہو ،اس پیشہ والا اس شہر میں اور کوئی نہ ہو تو صرف اس کا نام لینا اور اسکے باپ کا نام لینا اور اس کے پیشے کا نام لینا کافی ہے ۔

گواہوں کے عادل ہونے کا کیسے پتہ چلایا جائے؟

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے ارشاد یہ فرمایا کہ گواہوں کے ظاہری حال کو دیکھ کر اگر سمجھا کہ یہ گواہ عادل

ہیں تو ان کو عادل سمجھ لینا کافی ہے۔ البتہ حدود وقصاص کے گواہوں کے حال کی تفتیش کی جائے اگر پتہ چل جائے کہ یہ عادل ہیں تو ان کی گواہی کا اعتبار کر لیا جائے اور اگر پتہ چلے کہ یہ عادل نہیں تو رد کر دیا جائے۔

"وعندهما یسأ ل فی الکل ان جهل بحالهم سرا وعلنا و به یفتی وهو اختلا ف زمان ،،

لیکن امام ابو یوسف رحمہ اللہ وامام محمد رحمہ اللہ نے زمانہ کے حالات اور گواہوں کے حالات کو بدلتے ہوئے دیکھ کر فرمایا کہ ہر قسم کے مقدمات میں گواہوں کے متعلق تفتیش کی جائے، ظاہر طور پر عدالت میں بھی پوچھا جائے کہ یہ گواہ عادل ہیں یا فاسق اور باطنا یعنی ان کے محلہ کی مسجد میں نمازیوں سے خفیہ طور پر پوچھا جائے کہ یہ گواہ کیسے ہیں۔ جب گواہ کی عدالت (عادل ہونے) کے متعلق وہ بتادیں تو ان کی گواہی کو معتبر مان لیا جائے، امام ابو یوسف وامام محمد رحمھما اللہ کے قول پر ہی فتوی ہے۔

گواہ صرف اپنے خط کو دیکھ کر گواہی نہ دے:

گواہ کو جب واقعہ یاد نہیں آ رہا لیکن اسے اپنا خط مل گیا جس پر وہ واقعہ لکھا ہوا ہے تو اسے یہ حق حاصل نہیں کہ صرف خط کو دیکھ کر گواہی دے دے بلکہ واقعہ کا یاد ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح قاضی اپنے خط کو دیکھ کر کسی پر فیصلہ نہیں ٹھونس سکتا جب تک اسے مدعی کا دعوی اور گواہوں کی گواہی اور اپنا فیصلہ یاد نہ آئے، فیصلہ یاد آجائے تو ٹھیک ورنہ صرف خط کو دیکھ کر کسی کو اپنے فیصلے کا پابند نہیں کر سکتا، اسی طرح راوی صرف اپنے خط پر اعتماد کر کے روایت نہیں بیان کر سکتا ہاں اسے خط دیکھ کر روایت بھی یاد آجائے تو اسے بیان کر سکتا ہے۔

دس چیزوں کی شہادت سوائے دیکھنے کے دے سکتا ہے:

یعنی دس چیزوں کی خبر مشہور ہونے پر گواہی دے سکتا ہے ان میں دیکھنا ضروری نہیں، البتہ گواہی بھی اسی طرح دے کہ لوگوں میں یہی مشہور ہے۔

(۱) نسب کی گواہی دینا کہ یہ فلاں کا بیٹا ہے۔

(۲) عتق کی گواہی دینا کہ اسے مالک نے آزاد کردیا ہے۔

(۳) ولاء کی گواہی کہ فلاں نے اسے آزاد کیا ہے جواسکی جائیداد کا وارث ہے۔

(۴) ولادت کی گواہی کہ فلاں کی عورت کا بچہ یا بچی پیدا ہوئی۔

(۵) مہر کی گواہی کہ فلاں عورت کا اتنا مہر مقرر ہوا ہے۔

(۶) موت کی گواہی کہ فلاں شخص فوت ہوگیا۔

(۷) نکاح کی گواہی کہ فلاں شخص کا نکاح فلاں عورت سے ہوا ہے۔

(۸) زوجہ سے دخول کی گواہی۔

(۹) قاضی کی ولایت کی گواہی۔ (۱۰) وقف کی گواہی۔

تنبیہ: عزیز طلباء کرام! ضرورت کے مطابق شہادت کے مسائل ذکر کردیئے گئے ہیں، جوکہ درمختار، شامی ھدایہ، فتح القدیر، العنایۃ، الکفایۃ، البحرالرائق سے ماخوذ ہیں۔ زیادہ تفصیل فقہی کتب میں دیکھیں۔ عورت کی گواہی کا ذکر قریب ہی انشاء اللہ آرہا ہے۔ (راقم)

فَاِنْ لَّمْ یَکُوْنَا رَجُلَیْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰی"

''پھر اگر نہ ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں، ان میں سے کہ تم پسند کرو انہیں گواہ، یہ کہ بھول جائے ایک (عورت) ان دونوں میں سے تو یاد دلا دے ان میں سے ایک کو دوسری یعنی گواہ جب دو مرد نہ ہو تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بنائے جائیں، دو مردوں کا نہ پایا جانا عام ہے۔''

" (فَاِنْ لَّمْ یَکُوْنَا) ای الشهیدان (رَجُلَیْنِ) الی لم یقصد اشهادهما ولو کا نا موجودین "

(روح المعانی)

دو مرد گواہی کے طور پر موجود نہ ہوں بلکہ واقعہ کا گواہ ایک مرد ہو اور دو عورتیں ہوں تب بھی ان کی گواہی معتبر

ہے اسی طرح واقعہ کے گواہ تو کئی مرد ہیں۔ لیکن مدعی ان میں سے دو مردوں کو گواہ نہیں بنانا چاہتا بلکہ ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنانا چاہتا ہے تو پھر بھی یہ گواہی معتبر ہے۔ ہاں البتہ دو مرد واقعہ کے گواہ ہیں، عادل بھی ہیں، انکو گواہ بنانے میں مدعی کو کوئی عذر لاحق نہیں تو ایسی صورت میں ایک مرد دو عورتوں کو گواہ نہ بنائے تا کہ ''فَاِنۡ لَّمۡ یَکُوۡنَا رَجُلَیۡنِ'' کا مقصد پورا ہو جائے۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

''فَرَجُلٌ وَّامۡرَاَتٰنِ'' میں رفع کی چار وجہ ہیں، چاروں معتبر ہیں جس پر چاہیں عمل کرلیں۔

(۱) ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ اصل عبارت ہو''فَلۡیَکُنۡ فَرَجُلٌ وَّامۡرَاَتٰنِ'' یعنی کان محذوف کا اسم ہوں۔

(۲) ان میں سے دوسری وجہ یہ ہے کہ اصل عبارت ہو''فَلۡیَشۡهَدۡ فَرَجُلٌ وَّامۡرَاَتٰنِ'' یعنی فعل محذوف'' فَلۡیَشۡهَدۡ '' کا فاعل ہوں۔

(۳) ان میں سے تیسری وجہ یہ ہے کہ اصل عبارت ہو''فالشاھد فَرَجُلٌ وَّامۡرَاَتٰنِ'' یعنی مبتداء محذوف کی خبر ہو۔

(۴) اور ان میں سے چوتھی وجہ یہ ہے کہ اصل عبارت ہو ''فَرَجُلٌ وَّامۡرَاَتٰنِ یَشۡهَدُوۡنَ'' یعنی یہ مبتداء ہو اور ان کی خبر''یَشۡهَدُوۡنَ''محذوف ہو۔ (کبیر)

خیال رہے کہ پہلی صورت میں ''فَلۡیَکُنۡ'' تامہ ہے اسی وجہ سے اس کی خبر ذکر نہیں کی۔ (کبیر)

تنبیہ: ہمارے احناف کے نزدیک سوائے حدود و قصاص کے ہر جگہ ایک مرد، دو عورتوں کی گواہی معتبر ہے، لیکن امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک صرف مال کے لین دین کے معاملہ میں عورتوں کی گواہی معتبر ہے۔ اور کسی مقام میں ان کی گواہی کا کوئی اعتبار نہیں اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک حدود و قصاص میں بھی عورتوں کی گواہی معتبر نہیں اور ولاء ثابت کرنے کیلئے (یعنی فلاں شخص نے فلاں غلام یا فلاں لونڈی کو آزاد کیا ہے اسے ولاء حاصل ہے) بھی عورتوں کی گواہی کا کوئی اعتبار نہیں اور احصان ثابت کرنے کیلئے بھی عورتوں کی گواہی معتبر نہیں۔

احصان کا مطلب یہ ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ یہ بالغ ہے، آزاد ہے، عاقل ہے اور اس نے اپنی زوجہ سے

مجامعت کر لی ہے یا خلوت صحیحہ پائی گئی ہے۔ جب اس کا محصن ہونا ثابت ہو جائے گا تو اس کے زانی ہونے کے ثبوت پر اسے سنگسار کیا جائے گا اور باقی وکالت اور وصیت وغیرہ میں عورتوں کی گواہی امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک بھی معتبر ہے۔

دینی طلباء کے فائدہ کیلئے:

" مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ" میں " ممن" اصل میں "مِن مَن" ہے، یہ ظرف مستقر ہے جار مجرور کا تعلق 'کائنون' محذوف سے ہے اور پھر صفت ہے "فرجل و امراتان" کی تقدیر عبارت کی یہ ہوگی" فرجل و امرآتان ممن ترضونهم" یعنی اگر دو مرد گواہ نہیں تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ ہو جائیں جن کو تم پسند کرتے ہو۔"والتصریح بذلک هنا مع تحقق اعتباره فی کل شهید لقلة اتصاف النساء به" اگرچہ صراحۃ (ظاہر طور پر) اس صفت کا تعلق ایک مرد دو عورتوں سے ہے لیکن یہ صفت معنوی لحاظ پر ہر گواہ میں معتبر ہے کیونکہ اسی گواہ کو گواہ سمجھا جائے گا جس کو عدالت وغیرہ کی وجہ سے پسند کیا گیا۔

بعض حضرات نے " مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ" کو "شَهِيۡدَيۡنِ" کی صفت بنایا ہے، لیکن یہ قول ضعیف ہے کیونکہ اس صورت میں موصوف وصفت کے درمیان اجنبی کا فاصلہ لازم آئے گا جو درست نہیں اور بعض حضرات نے "من رجالکم" سے اسے بدل مانا ہے اور یہ کہا کہ یہ تکرار عامل کے حکم میں ہے، لیکن یہ قول بھی ضعیف ہے کیونکہ اس میں بھی فاصلہ پایا گیا ہے جو درست نہیں۔

"واختار ابو حیان تعلقه باستشهدوا لیکون قیدا فی الجمیع"

ابو حیان رحمہ اللہ نے اس کا تعلق "استشهدوا" سے کیا ہے، اس طرح یہ صفت تمام گواہوں کو شامل ہوگی، یعنی وہی گواہ بناؤ جن کو تم پسند کرتے ہو۔ اگرچہ اس قول پر بھی علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے یوں گرفت فرمائی ہے 'ویلزمه الفصل بین اشتراط المرآتین و تعلیله" کہ اس میں "وامراتان" کے ذکر اور ان کے ساتھ" مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ" کی شرط میں فاصلہ آئے گا۔ لیکن راقم کو ابو حیان رحمہ اللہ کا قول زیادہ پسند آیا۔ "والله اعلم بالصواب"

" مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ" میں خطاب مؤمنین کو ہے یعنی اے مومنو گواہ بناؤ جن کو تم پسند کرتے ہو یا یہ خطاب حکام کو

ہے، یعنی اے حاکمو! ان گواہوں کی گواہی کا اعتبار کرو جن کو تم پسند کرو۔ (روح المعانی)

پسند کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ عادل ہوں فاسق نہ ہوں بلکہ ان میں دس قسم کی صفات کا پایا جانا سمجھ آرہا ہو۔

قرآن کی شان بیان:

کیا خوب قرآن پاک کا انداز بیان ہے۔ نہایت مختصر سے الفاظ "مِمَّنْ تَرْضَوْنَ" ذکر کئے گئے ہیں لیکن ان سے یہ پتہ چلا کہ گواہ ان لوگوں کو بنایا جائے جن میں یہ دس صفات پائی جائیں کیونکہ ان صفات کے پائے جانے سے مؤمنین اور ان کے حکام ان کو بطور گواہ قبول کریں گے۔

(۱) گواہ آزاد ہو، غلام نہ ہو، کیونکہ غلام کو گواہ بنانا مومنین کو پسند نہیں اس لئے کہ ہوسکتا ہے گواہی کے وقت وہ مالک کہ حکم کے مطابق کسی اور کام کیلئے چلا جائے گواہی نہ دے سکے یا مالک اسے گواہی دینے سے ہی روک دے۔

(۲) بالغ ہو، بچوں کی گواہی کو پسند نہیں کیا جاتا کیونکہ ان میں عقل کامل نہیں ہوتی۔ ان کی توجہ کامل نہیں ہوتی، وہ واقعہ کو صحیح اور کامل طور پر سمجھ نہیں سکتے۔ لہذا ان کی گواہی معتبر نہیں۔

(۳) مسلمان ہو، اس لئے کہ مومن کافروں کی گواہی کو پسند نہیں کرتے اس لئے کہ خود رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا﴾ اور ہرگز نہیں بنائے گا اللہ کافروں کیلئے مومنوں پر کوئی راستہ۔

(۴) عادل ہو، کیونکہ فاسق و فاجر کی گواہی کو اس لئے مؤمنین اور ان کے حکام پسند نہیں کرتے کہ وہ جب شریعت کا لحاظ ہی نہیں کرتے تو جھوٹی گواہی دینے کو وہ عیب نہیں سمجھیں گے بلکہ اپنا کمال سمجھیں گے فاسق کی گواہی تو دور کی بات ہے فاسق کی خبر بھی معتبر نہیں، رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْۤا﴾

"اے ایمان والو اگر تمہارے پاس فاسق کوئی خبر لائے تو اس کی چھان بین کرلو"۔

(۵) واقعہ اسکے سامنے پایا گیا ہو، یعنی جس دعویٰ کی وہ گواہی دے رہا ہو وہ اس کا چشم دید ہو، صرف سنی سنائی باتوں کا اعتبار کر کے گواہی نہ دے۔

(۶) اس گواہی میں گواہ کا اپنا نفع نہ ہو، جب اس کا اپنا نفع ہوگا تو اس میں بھی جھوٹ کا احتمال قوی طور پر پایا جائے گا۔

(۷) اس گواہی سے گواہ اپنے آپ سے کسی ضرر کو دور نہ کر رہا ہو، اسلئے کہ جب گواہی کی وجہ سے وہ اپنے نقصان کو دور کر رہا ہوگا تو اس میں احتمال پایا جائے گا کہ یہ جھوٹ سے کام لے رہا ہو۔

(۸) وہ گواہ کثیر غلطیوں میں مشہور نہ ہو، یعنی بات کرتے ہوئے توجہ نہ کرنے یا بھولنے وغیرہ کی وجہ سے اکثر طور پر وہ بات غلط کرتا ہو تو اس کی گواہی کا کوئی اعتبار نہیں کرتا۔

(۹) مروّت کے خلاف کام نہ کرے، مروّت کو چھوڑنے والے کی گواہی کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ فقہاء کرام عام طور پر مثال یہ دیتے ہیں کہ راستہ میں پیشاب کرنا یا راستے میں کھانا مروّت کے خلاف ہے، لیکن راقم کے نزدیک اس مسئلہ میں تفصیل ہے یہ حکم مطلق نہیں، اسلئے کہ راستے میں پیشاب کرنے کی عادت بنانا مرووت کے خلاف ہے، اگر کوئی شخص پیشاب کرنے کی حاجت میں شدید مبتلاء ہے، شہری ماحول ہے کوئی باپردہ جگہ نہیں مل رہی، کسی دیوار کے ساتھ وہ پیشاب کرلے تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس کی گواہی معتبر نہیں، اسلئے کہ وہ معذور ہے، اس عادت کا مرتکب نہیں۔ اسی طرح ایک شخص راستہ میں کھانے کی عادت بنالے عام طور پر وہ چلتے پھرتے کھاتا رہے تو یہ مروت کے خلاف ہے اگر کوئی مسافر راستہ میں ریڑی پر کھانا مناسب قیمت کا لے کر کھالے یا کوئی چیز مسافر نے خرید لی اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہ چیز آہستہ آہستہ کھانے والی ہے، سفر بھی طے ہوتا رہے اور آہستہ آہستہ یہ چیز بھی کھالوں تو راقم کے نزدیک یہ مروت اور وقار کے مخالف نہیں۔ تاہم جہاں تک ممکن ہو وہاں تک راستہ میں پیشاب کرنے اور راستہ میں کھانے سے اجتناب کرے تاکہ اس کی مروّت برقرار رہے۔

(۱۰) جو شخص گواہی دینے والا ہو اس کے درمیان اور جس کے خلاف گواہی دے رہا ہو اس کے درمیان عداوت نہ پائی گئی ہو۔ عداوت کے پائے جانے کی صورت میں بھی جھوٹ کا احتمال ہے۔ (ماخوذ از کبیر بالتفصیل)

فائدہ جلیلہ:

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "مِمَّنْ تَرْضَوْنَ" جن کو تم پسند کرو، یعنی تم ان کے ظاہر حال کو دیکھ کر سمجھ لو کہ یہ

عادل ہیں، فاسق نہیں، یعنی گواہی دینے کے قابل ہیں۔ رب تعالیٰ نے یہ ارشاد نہیں فرمایا" مِمَّنْ تَرْضَوْنَ" ان کو گواہ بناؤ جو حقیقت میں ہی پسندیدہ ہوں اس کی وجہ یہ ہے "ولا طریق لنا الی معرفته فان لنا الظاهر واللہ تعالی یتولی السرائر" کہ ہم کسی کی حقیقت اور باطن کو نہیں پہچان سکتے کہ یہ حقیقت میں اور واقعی عادل ہے، نیک ہے، فاسق نہیں کیونکہ ہم تو ظاہر کو جانتے ہیں، باطنی امور کو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ (از روح المعانی)

سبحان اللہ! قرآن پاک کیسی عظیم الشان کتاب ہے جس کے ایک ایک لفظ میں کیسے کیسے عظیم مسائل مذکور ہیں۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"مِنَ الشُّهَدَآءِ" جار مجرور محذوف سے متعلق ہیں، یعنی ظرف مستقر ہے اور حال واقع ہو رہا ہے۔ عائد اس جملہ کا محذوف ہے۔ معنوی لحاظ پر عبارت یوں بن گئی۔

" ممن ترضونهم حال کو نهم کا ئنین بعض الشهداء لعلمکم بعد التهم"

ان میں سے جن کو تم پسند کرو دراں حالیکہ وہ گواہوں میں سے بعض ہوں اور تمہیں ان کی عدالت کا علم ہو۔

اور یہ خیال رہے کہ " الشهداء "جمع مذکر ہے" وادراج النساء فی الجمع بطریق التغلیب" اور عورتوں کا اس میں ذکر قاعدۂ تغلیب کے مطابق ہے۔ (روح المعانی)

"اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى"

"یہ کہ بھول جائے ایک (عورت) ان دونوں میں سے تو یاد دلا دے ان میں ایک دوسری کو"

یہاں سے دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہونے کی وجہ بیان کی جارہی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر ایک ان دونوں میں بھول جائے تو دوسری یاد دلا دے۔

" والمعنی ان النسیا ن غالب طبا ع النساء بکثرة البرد والر طوبة فی امز جتهن"

مطلب یہ ہے کہ عورتوں کی طبیعت میں بھولنا زیادہ ہے کیونکہ ان کے مزاج میں برودت اور رطوبت زیادہ

پائی جاتی ہے، دونوں کے ملنے سے ان میں بھول واقع ہوتی ہے، اسلئے دوعورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر قراردی کہ ایک بھولے تو دوسری اسے یاددلادے۔" واجتماع المرأتین النسیان ابعد فی العقل" دونوں عورتوں کا بیک وقت بھولنا عقل کے بھی خلاف ہے سب سے بڑی دلیل رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ اگر ایک مرتبہ ہی دونوں کا بھولنا پایا جاتا تو رب تعالیٰ یہ ارشاد نہ فرماتا ﴿اَنۡ تَضِلَّ اِحۡدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحۡدٰهُمَا الۡاُخۡرٰى﴾ یہ کہ ان میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاددلادے۔

عورتوں کے بھولنے پر ارشاد مصطفوی ﷺ:

"قال رسول الله ﷺ ما رایت من ناقصات عقل و دین اذهب للب الرجل الحازم من احدا کن قلن یارسول الله ما نقصان عقلنا قال الیس شهادة المرأة علی النصف من شهادة الرجل قلن بلی قال فذلک من نقصان عقلها قلن فما نقصان دیننا یارسول الله قال الیس اذا حاضت لم تصل و لم تصم قال فذلک من نقصان دینها"

(بخاری و مسلم، مشکوٰة کتاب الایمان)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے تم سے زیادہ کسی ایک کو نہیں دیکھا جو خود تو ناقص العقل ہو اور ناقص الدین ہو لیکن بڑے بڑے ماہر عقلمندوں کی عقل کو ضائع کردے۔ عورتوں نے عرض کیا یارسول اللہ ہمارے عقل اور دین میں کیا نقصان ہے؟ آپ نے فرمایا کیا عورتوں کی شہادت مردوں کی شہادت کے نصف کے برابر نہیں۔ عورتوں نے عرض کیا ہاں یارسول اللہ ایسا ہی ہے آپ نے فرمایا یہ ان کے عقل کی کمی ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کیا ایسا نہیں کہ عورت کو جب حیض آئے تو وہ نماز ادا نہیں کرتی اور روزہ نہیں رکھتی، عورتیں نے عرض کیا ہاں یارسول اللہ ایسا ہی ہے۔ آپ نے فرمایا یہ ان کے دین کی کمی ہے۔ (مظہری)

خیال رہے یہ حدیث مکمل حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی دوسرے پارہ میں ﴿یَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡمَحِیۡضِ﴾ کی بحث میں گذرچکی ہے۔

عورت کے بھولنے کی اور وجہ:

عورت اپنی نازک طبع کی وجہ سے قدرتی طور پر ڈرپوک ہے، عدالت میں اس پر رعب کا طاری ہونا اور بھول جانا عین ممکن ہے۔ جب اس کے بھولنے پر دوسری اسے یاددلائے گی تو اس کو کچھ سکون حاصل ہوگی اور ڈھارس بندھ جائے گی۔

تنبیہ: "تضل" کا اصلی معنی "بھٹکنا اور حیران ہونا" بھی ہے۔ لیکن آیۃ کریمہ میں معنی بھولنا ہے، چونکہ بھولنا حیرانگی کی جزء ہے۔ (اور یہ بھی خیال رہے کہ عورت کا بھولنا عام طور پر پایا جاتا ہے) اسی وجہ سے "ومن نسی الشهادة جملة فليس يقال ضل فيها" مطلقاً گواہی کے بھول جانے کو "ضل فیها" (وہ اس میں بھول گیا) نہیں کہا جاتا۔ (ماخوذ از قرطبی)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"ان تضل" میں ایک قراءت میں بفتح الهمزه ہے اور "تضل" پر نصب ہے اور ایک قراءت میں "تضل" پر رفع ہے اور ایک قراءت میں بکسر الهمزه ہے اس صورت میں "ان تضل" شرط ہوگی اور "فتذکر" .... الخ جزا ہوگی۔ (از قرطبی)

جہاں بھی عقل کی کمی ہوگی گواہی قبول نہیں ہوگی:

" فلا يجوز شهادة المجنون والمعتوه ايضا والوجه لعدم قبول شهادتهم نقصان العقل والتميز وعليه انقعد الاجماع لانه فى معنى الصبى بل اولى لعدم القبول"

(مظهری مع تقديم وتاخير)

پاگل اور نیم پاگل کی گواہی معتبر نہیں کیونکہ ان میں عقل وتمیز نہیں پائی گئی، اسی پر اجماع امت پایا گیا ہے اور مجنون اور معتوہ (نیم پاگل) بچے کے حکم میں ہیں، بلکہ بچے سے بھی زیادہ ان کی گواہی قبول نہ کرنے کا حکم ہے۔ (مظہری)

اس لئے کہ بچے کی خبر کا تو اعتبار ہے یہ چیز لے لو میرے گھر والوں نے آپ کیلئے دی ہے اور یہ کہے میرے گھر والوں نے آپ کو دعوت دی ہے آپ کھانا ہمارے گھر کھائیں، دکان سے کوئی چیز خرید لائے لیکن مجنون اور معتوہ

کی خبر میں بھی معتبر نہیں۔ (راقم)

عادل ہونے میں مرد اور عورت کا حکم ایک ہے، مرد ہو یا عورت ہو گواہ تب ہی بن سکیں گے جب ان میں عدالت پائی جائے فسق نہ پایا جائے اس حکم میں مرد اور عورت برابر ہیں۔ کیونکہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی مطلق ہے ﴿وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ﴾ "تم اپنے دو عادل شخصوں کو گواہ بناؤ" اور رسول اللہ ﷺ نے بھی مطلق حکم فرمایا" لا نکاح الا بولی وشاھدی عدل " نکاح بغیر ولی اور دو عادل گواہوں کے نہیں۔

(ولی کا حکم کیا ہے؟ تفصیل نجوم الفرقان دوسرے پارہ میں دیکھیں)

حدود وقصاص میں عورتوں کی گواہی قبول نہ ہونا اور باقی معاملات میں قبول ہونے میں فرق کیوں؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ حدود کے متعلق قانون یہ ہے" الحدود تندرئ بالشبهات "حدود شبہات کی وجہ سے ساقط ہو جاتی ہیں۔ عورتوں کی گواہی میں بھول واقع ہونے کی وجہ سے گواہی میں شبہ پائے جانے کی وجہ سے حدود وقصاص میں ان کی گواہی معتبر نہیں لیکن باقی معاملات میں ایک عورت کے ساتھ دوسری عورت کو شامل کر کے گواہی قبول کرنے کا حکم دیا گیا تاکہ لوگوں کے حقوق ضائع نہ ہوں، اسی وجہ سے مالی معاملات ہوں یا نکاح ہو یا مقام عزت ہو وہاں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہو گی۔

"قال علیه الصلوة والسلام فی خطبته یوم عرفة ویوم النحر فی حجة الوداع ان دمائکم واموالکم واعراضکم حرام"

نبی کریم ﷺ نے عرفہ کے دن (نو ذی الحج) اور دس ذی الحج کے دن دوران خطبہ ارشاد فرمایا بیشک تمہارے خون اور تمہارے مال اور تمہاری عزتیں حرام ہیں۔ یعنی کسی کا ناحق تصرف تمہارے خونوں اور تمہارے مالوں اور تمہاری عزتوں میں حرام ہے اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے"حرمة مالکم کحرمة دمکم" تمہارے مال کی حرمت (عزت واحترام) تمہارے

خون کی حرمت کی طرح ہی ہے۔

وقال علیہ الصلوۃ والسلام من قتل دون مالہ فھو شھید ومن دون قتل دمہ فھو شھید ومن قتل دون دینہ فھو شھید ومن قتل دون اھلہ فھو شھید"

(رواہ احمد وابن حبان عن سعید بن زید)

حضرت سعید بن زید کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص مال کی حفاظت کرتے ہوئے قتل کر دیا جائے وہ شہید ہے اور جو شخص اپنی جان کی حفاظت کرتے ہوئے قتل کر دیا جائے وہ شہید ہے اور جو شخص دین کی حفاظت کرتے ہو قتل کر دیا جائے وہ شہید ہے اور جو شخص اپنی اہل کی حفاظت کرتے ہوئے قتل کر دیا جائے وہ شہید ہے، ان حقوق کی پاسداری کیلئے دو عورتوں کی گواہی کو معتبر قرار دیا گیا ہے۔ (ماخوذ ازمظہری)

اعتراض: رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدلٍ مِّنْكُمْ ﴾ میں "منکم" میں ضمیر مذکر کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ عورتوں کی گواہی معتبر ہی نہیں، تو عورتوں کی گواہی کس طرح معتبر ہے۔

جواب: ایک نص پر دوسری نص سے زیادتی جائز ہے، جب رب تعالیٰ نے خود ہی ارشاد فرمایا ﴿فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ﴾ "پھر اگر نہ ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں" تو اس سے واضح ہو گیا کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے۔ البتہ حدود وقصاص میں گواہی کا معتبر نہ ہونا رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی سے ثابت ہے جس کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ ہاں البتہ ﴿ وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدلٍ مِّنْكُمْ﴾ میں "منکم" کی مذکر ضمیر سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ مردوں کو گواہ بنانا بہتر ہے۔ صرف مرد گواہ نہ ہوں یا کسی مصلحت کی وجہ سے صرف مردوں کو گواہ بنانا مقصود نہ ہو تو دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر قبول ہو رب تعالیٰ کے ارشاد سے واضح ہے۔ (ماخوذ ازمظہری)

بہت مفید:

بعض حضرات نے حدیث "لا نکاح الا بولی وشاھدی عدل" سے بھی اعتراض کیا تھا کہ اس

حدیث میں بھی " وشاھدی عدل " مذکر کا صیغہ استعمال ہے تو عورتوں کی گواہی کس طرح معتبر ہے؟ اسکا ایک جواب تو یہی ہے کہ مردوں کو گواہ بنانا بہتر ہے یہ تو ثابت ہو سکتا ہے، لیکن عورتوں کی گواہی قبول نہ ہونا ثابت نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ حدیث بھی ضعیف ہے جس سے احکام ثابت نہیں ہو سکتے۔ یہ حدیث مختلف راویوں سے ثابت ہے لیکن سب ضعیف ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں راوی "محمد بن یزید بن سنان" اپنے باپ سے روایت کرتا ہے، جسے امام احمد بن مدینی، یحیٰ بن معین، نسائی اور دار قطنی نے ضعیف، غیر ثقہ اور متروک الحدیث قرار دیا اور رافع بن میسر کی روایت جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ثابت ہے۔ ابو خطیب نے نافع بن میسر کو مجہول راوی کہا ہے۔ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں "نہاش" راوی ہے جسے یحیٰ بن معین اور ابن عدی نے ضعیف کہا ہے اور عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں "بکر بن بکار" جسے یحیٰ بن معین نے ضعیف کہا ہے اور اس روایت میں "عبد اللہ بن محرز" ہے، جسے دار قطنی نے "متروک الحدیث" قرار دیا ہے اور عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ثابت بن زھیر ہے جس کی روایات ثقہ راویوں کے مخالف ہونے کی وجہ "منکر" کہلاتی ہیں، اسلئے اس حدیث کو عورت کی گواہی کے قبول نہ ہونے کیلئے دلیل بنانا درست نہیں۔ (ماخوذ از مظہری)

عورت بحیثیت گواہ:

عورت کی گواہی کی چار قسمیں ہیں۔

(۱) عورت کی گواہی مرد کے برابر۔ (۲) دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر۔

(۳) ایک عورت کی گواہی قابل قبول ہے۔ (۴) عورت کی گواہی قبول نہیں بلکہ مرد کی گواہی قبول ہے۔

پہلی قسم: عورت کی گواہی مرد کے برابر کب ہوتی ہے؟

" واذا کان السماء علة قبل الامام شھادة الواحد العدل فی رؤیة الھلال رجلا کان او امرأة"

(ہدایۃ المبتدی)

جب آسمان ابر آلود ہو یعنی مطلع صاف نہ ہو بلکہ بادل چھائے ہوئے ہوں یا گرد و غبار ہو تو رمضان

المبارک کے چاند کی شہادت ایک عادل شخص کی معتبر ہے خواہ وہ شہادت دینے والا مرد ہو یا عورت ہو۔ شہادت دینے والے کیلئے عادل ہونا ضروری ہے کیونکہ فاسق کی شہادت دینی مسائل میں معتبر نہیں۔ البتہ فاسق کا سچا ہونا یقینی طور پر سمجھ آجائے تو اس کی شہادت قابل قبول ہے۔

دوسری قسم: دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے۔ یہ حدود اور قصاص کے علاوہ حقوق مالیہ اور غیر مالیہ میں ہے، حقوق مالی میں جیسے قرض، بیع، شراء اور اجارہ وغیرہ اور غیر مالی میں جیسے طلاق، نکاح اور وقف وغیرہ میں۔

"اما سوی ذلک من الحقوق یقبل فیها شهادة رجلین اورجل وامرأتین سواء کان الحق مالا اوغیرمال مثل النکاح والطلاق والعتاق والعدة والوقف والصلح والوکالة والوصیة والهبة والاقرار والابراء والولد والولاد والنسب ونحو ذلک"

(هدایة کتاب الشهادات)

حدود و قصاص کے ماسواء حقوق میں دو مردوں یا ایک مرد اور دو عوتوں کی گواہی قبول کی جائے گی خواہ وہ حقوق مالی ہوں یا غیر مالی جیسے نکاح، طلاق، عتاق (غلام آزاد کرنا) عدت، حوالہ (کسی کے قرض کو اپنے ذمہ لینا) وقف، صلح، وکالت، وصیت، ھبہ، اقرار، ابراء، (کسی کو قرض وغیرہ سے بری کرنا) ولد (یہ فلاں کی اولاد ہے) ولادت (اس عورت کا بچہ یا بچی پیدا ہوا ہے) نسب وغیرہ میں۔

البتہ قتل خطاء اور جس قتل میں قصاص لازم نہ ہو ان کو ثابت کرنے کیلئے دو مردوں یا ایک مرد دو عورتوں کی شہادت قابل قبول ہے کیونکہ جب قصاص نہیں تو دیت وغیرہ لازم ہوگی جو مال ہے۔

"قال فی الخانیة ولو شهد رجل وامراتان بقتل الخطاء او بقتل لا یوجب القصاص تقبل"

(تکمله شامی ج ۱ ص ۵۰)

علامہ قاضی خان رحمہ اللہ علیہ نے بیان کیا کہ اگر ایک مرد دو عورتیں قتل خطا میں شہادت دیں یا اس قتل میں شہادت دیں جس میں قصاص لازم نہیں آتا (شبہ عمد وغیرہ میں بھی قصاص لازم نہیں آتا) تو ان کی شہادت قبول کی جائے گی۔ دو مردوں یا ایک مرد دو عورتوں کی گواہی پر اللہ تعالی کا ارشاد گرامی شاہد ہے۔ زیر بحث آیہ کریمہ کی ترتیب سے ہی مسئلہ واضح ہے کہ بہتر یہی ہے کہ مردوں کو

گواہ بنایا جائے۔ ہاں اگر دو مرد میسر نہیں یا ان کو کسی مصلحت کی وجہ سے گواہ بنانا مقصود نہ ہو تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنایا جائے۔

تیسری قسم: عورت کی گواہی قابل قبول ہے لیکن عام حالات میں مرد کی گواہی قبول نہیں، یہ وہ مقامات ہیں جن میں مرد کو مطلع ہونے کی طاقت نہیں جیسے ولادت، بکارت (پردۂ بکارت کے قائم ہونے یا نہ ہونے کی گواہی) اور اس قسم کے عورتوں کے حقوق جن پر مرد مطلع نہ ہو سکیں، ان میں صرف ایک عورت کی گواہی قابل قبول ہے۔

"وتقبل فی الولادة والبكارة والعيوب بالنساء فی موضع لايطلع عليه الرجال شهادة امرأة واحدة لقوله ﷺ شهادة النساء جائزة فيما لا يستطيع الرجال النظر اليه"

(هداية كتاب الشهادت)

ولادت اور بکارت اور وہ عیوب جو عورتوں میں پائے جاتے ہوں جن پر مردوں کو مطلع ہونے کی شرعاً طاقت نہ ہو، ان میں ایک عورت کی گواہی قابل قبول ہوگی کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "عورتوں کی گواہی وہاں جائز ہے جہاں مرد انہیں دیکھنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں"۔

لیکن خیال رہے کہ اگر مرد اتفاقی طور پر کسی عورت کے کسی ایسے عیب وغیرہ پر مطلع ہو گیا جہاں اسے قصداً دیکھنا جائز نہیں تھا اس صورت میں وہ گواہی دے سکتا ہے اور اس ایک مرد کی گواہی بھی قابل قبول ہے لیکن اس نے ارادہ سے دیکھا جبکہ کوئی عذر بھی نہیں تھا تو ایسی صورت میں وہ فاسق ہو جائے گا۔ اس کی گواہی قابل قبول نہیں ہوگی۔ ہاں ایک مرد نے عورت کی ولادت کو ارادہ سے دیکھا لیکن دیکھنے کا عذر تھا تو پھر بھی ایک مرد کی گواہی قبول ہوگی، جیسے ڈاکٹر کو مقام مرض دیکھنا جائز ہے۔ اگر کسی عورت کا اپریشن وغیرہ کرنا پڑا جس میں کوئی عورت یہ کام نہ کر سکتی ہو مرد کیلئے ضروری ہو گیا تھا تو ایسی صورت میں بھی مرد کی گواہی قبول ہوگی۔ (از شامی)

"ولو شهد رجل واحد بالولادة يقبل لانه لما قبل شهادة امرأة واحدة فشهادة رجل واحد اولى" (البحر الرائق ج ۷)

اگر علاج وغیرہ کی غرض سے دیکھنے یا اچانک دیکھنے کی وجہ سے ایک مرد نے ولادت کی گواہی دی تو

وہ قبول ہو جائے گی کیونکہ جب ایک عورت کی گواہی قبول ہے تو ایک مرد کی گواہی تو زیادہ بہتر طریقہ سے قبول ہوگی۔

چوتھی قسم: عورت کی گواہی قبول نہیں بلکہ صرف مردوں کی گواہی قبول ہوگی۔اس کی پھر دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ جہاں چار مردوں کی گواہی قبول ہوگی۔ دوسری قسم یہ کہ جہاں دو مردوں کی گواہی قبول ہوگی۔مقدمہ زنا میں چار مردوں کی گواہی ضروری ہے۔زنا کا جرم جس کی وجہ سے حد لازم آتی ہے اسے ثابت کرنے کیلئے چار مردوں کی گواہی ضروری ہے۔اگر مردوں کی تعداد چار سے کم ہو یا صرف عورتیں ہوں یا دو مرد اور دو عورتیں ہوں یا تین مرد اور دو عورتیں ہوں یا تین مرد اور ایک عورت ہو یا ایک مرد اور تین عورتیں ہوں تو اس گواہی سے زنا کا جرم جو حد کا سبب بنتا ہے وہ ثابت نہیں ہوگا۔قرآن مجید میں ہے۔

﴿فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ﴾ ''ان میں خاص اپنے چار مردوں کی گواہی لو''۔ (پ۴النساء)

﴿ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ﴾ ''پھر چار گواہ معائنہ کے نہ لائیں (تو ان کو حد قذف لگا دو)'' (پ۱۸النور)

اور احادیث مبارکہ سے بھی ثابت ہے کہ زنا کی حد ثابت کرنے کیلئے چار گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا زنا کے الزام کو ثابت کرنے کیلئے چار گواہوں کا ہونا ضروری ہے؟ ''قال نعم'' آپ نے فرمایا ''ہاں'' چار گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔ (ابوداؤد ج۲ص۲۶۷)

نیز امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"ولابد ان يكون ذكورالقوله تعالى" منكم" ولاخلاف فيه بين الأمة وان يكون عدولا"
(تفسیر قرطبی ج۵ص۸۷)

یعنی ضروری ہے کہ زنا کے گواہ مرد ہوں اور عادل ہوں اس میں امت کا کوئی اختلاف نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے "فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ" فرمایا ہے جس میں "منکم" میں ضمیر مذکر کی استعمال ہے۔

واضح ہوا کہ زنا کی حد ثابت کرنے کیلئے چار مردوں کا ہونا ضروری ہے۔اگر زنا کو ثابت کرنے میں مقصد حد لگوانا نہ ہو بلکہ کوئی اور مقصد ہو تو اس صورت میں دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی کافی ہے۔مثلاً کسی شخص نے

اپنی بیوی کی طلاق کو زنا سے معلق یا مشروط کیا مثلاً یوں کہا اگر میں زنا کروں تو تجھے طلاق اور بیوی نے دعویٰ کیا ہے کہ میرے خاوند نے زنا کرنے کا ارتکاب کیا ہے لہذا مجھے طلاق ہوگئی اور خاوند انکار کر رہا ہے، یہ کہہ رہا ہے کہ میں نے زنا نہیں کیا تو عورت نے دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتیں گواہ پیش کر دیئے تو اس صورت میں ان کی گواہی سے زنا ثابت ہو جائے گا، عورت کو طلاق ہو جائے گی، لیکن اس گواہی سے حد ثابت نہیں ہوگی بلکہ دو گواہ جب دو اور گواہ نہ پیش کر سکیں تو یہ حد قذف کے مستحق ہوں گے۔ خیال رہے جب زنا ثابت ہو جائے اور حد ثابت نہ ہو تو اس صورت میں قاضی اسے رجم کی حد تو نہیں لگا سکتا البتہ تعزیری سزا لگائے تو لگا سکتا ہے۔

"والشهادة على مراتب منها الشهادة في الزنا يعتبر فيها اربعة من الرجال" (هداية)

گواہی کے مختلف مراتب ہیں ان میں سے زنا کی گواہی کیلئے چار مردوں کا ہونا ضروری ہے۔

اس بغیر کے باقی حدود اور قصاص میں بھی عورت کی گواہی قبول نہیں، البتہ دو مردوں کی گواہی زنا کے سوا باقی تمام حدود میں اور قصاص میں قبول ہوگی۔ زنا کے سوا حدود سے مراد شراب، قذف تہمت لگانے اور چوری کی حدود میں قصاص میں بھی دو مردوں کی گواہی معتبر ہوگی خواہ وہ قصاص نفس (جان کا قصاص) یا قصاص اطراف ہو (یعنی اعضاء کا قصاص ہو) زیر بحث کریمہ میں ﴿فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ﴾ کا حکم بھی عام ہے اگر چہ نازل تو دین وغیرہ کے معاملات سے ہے، ابھی تک جو مسئلہ ذکر کیا ہے اس سے واضح ہو چکا ہے کہ حدود و قصاص میں عورتوں کی گواہی معتبر نہیں، چنانچہ مصنف امام ابن ابی شیبہ میں امام زہری سے مروی ہے:

"مضت السنة من رسول الله ﷺ والخليفتين من بعده ان لا تجوز شهادة النساء في الحدود" (هداية كتاب الشهادات)

رسول اللہ ﷺ اور آپ کے دونوں خلفاء (حضرت ابو بکر صدیق وحضرت عمر رضی اللہ عنہما) سے لے کر یہی سنت چلی آ رہی ہے کہ حدود میں عورتوں کی گواہی جائز نہیں۔

نیز امام ابن ابی شیبہ زہری کے علاوہ امام شعبی وامام نخعی وامام ضحاک رحمہ اللہ علیہم سے بھی روایت کرتے ہیں۔

"لا تجوز شهادة النساء في الحدود" حدود میں عورتوں کی گواہی جائز نہیں۔ (نصب الرایۃ ج۴ ص۷۹)

واضح ہوا کہ زنا کے سواء تمام حدود وقصاص میں دو مردوں کی گواہی ضروری ہے، جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ لیکن اسی صورت میں اثبات حدود وقصاص کے بجائے کسی دوسرے کے حق کا اثبات مقصود ہو تو ایسی صورت میں ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی کافی ہے۔ جیسا کہ کسی شخص نے اپنے غلام کی آزادی کو شراب پینے سے مشروط کر دیا ہو کہ اگر میں شراب پیئوں تو میرا غلام آزاد ہے، تو اس صورت میں جرم ثابت کرنے کیلئے ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت کافی ہوگی۔ اس صورت میں غلام آزاد ہو جائے گا لیکن شراب کی حد اس پر جاری نہیں ہوگی کیونکہ حد لگانے کیلئے مردوں کی گواہ معتبر ہے، عورتوں کی نہیں۔ البتہ حاکم وقت کو اختیار ہوگا اگر وہ تعزیری سزا لگانا مناسب سمجھے تو تعزیری سزا لگا دے۔

"وصورته كما فى البحر عن الو لوالجية رجل قال ان شربت الخمر فمملو كى حر فشهد رجل وامرأتان انه شرب الخمر عتق العبد ولا يحد لان هذا شها دة لا مجال لها فى الحدود" (تكمله شامى ج ١ ص ٤٩)

اس کی صورت البحر الرائق میں ولوالجیہ کے حوالہ سے بیان کی گئی ہے کہ ایک شخص نے کہا اگر میں شراب پیئوں تو میرا غلام آزاد ہے۔ اگر ایک مرد اور دو عورتوں نے اس کے شراب پینے پر شہادت دی تو اس کا غلام آزاد ہو جا گا اور اسے حد نہیں لگائی جائے گی کیونکہ حد میں عورتوں کی شہادت معتبر نہیں۔

(فیوض الباری شرح بخاری ج ۵)

دینی طلباء کرام کے ذوق کیلئے دلچسپ بحث:

علامہ حسین بن علی مغربی نے " ان تضل احداهما " میں " احداهما " کی ضمیر کا مرجع "شہادتین" کو بنایا اور " فتذكر احداهما الاخرى " میں " احداهما " کی ضمیر کا مرجع " مرأتين " کو بنایا۔ حاصل معنی ان کے قول کے مطابق یہ ہے "ان تضل احدى الشهادتين الىٰ تضييع بالنسيان فتذكر احدى المرأتين الاخرى منهما " یعنی عورت جب دو شہادتوں میں سے ایک شہادت کو بھول جائے یعنی بھول کی وجہ سے اس کی گواہی ضائع ہو جائے تو دو عورتوں میں سے ایک دوسری کو یاد دلا دے۔ اس قول کی تائید علامہ طبرسی نے کی کہ یہ قول

درست ہے، اس کی وجہ یہ ہے۔

" لا یسمی نا سی الشها دة ضا لا " کہ صرف گواہی کے بھولنے والے کو ضال نہیں کہا جاتا بلکہ اس وقت "یقال ضلت الشهادة اذا ضاعت" کہا جاتا ہے " ضلت الشها دة " جب کہ گواہی ضائع ہو جائے، لیکن علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے علامہ مغربی کے قول کو رد کیا کہ یہ قول درست نہیں اس لئے کہ ضمیروں کے مختلف مرجع سے مضمون میں نظم ونسق باقی نہیں رہتا۔ اسی طرح آپ نے علامہ طبرسی کی تائید کو بھی رد کرتے ہوئے کہا "وما ذکر فی التا یید ینبئ عن قلة الا طلا ع علی اللغة" علامہ مغربی کے قول کی تائید کرتے ہوئے جو علامہ طبرسی نے دلیل قائم کی ہے وہ حقیقت لغت سے ناواقفی کی وجہ ہے۔ ورنہ نہایۃ ابن کثیر میں اور دوسری کتب میں "اطلا ق الضـال علی الناسی" ضال کا اطلاق بھولنے والے پر مطلق آیا ہوا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس کی عادت اور طبیعت میں بھولنا راسخ ہی ہو تب ہی اسے ضا لکہا جائے۔ عام طور پر اونٹ یا گھوڑے کے گم ہو جانے پر کہا جاتا ہے " ضـل البعیر ،ضـل الـفـرس " جو علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے رد کیا ہے، اسی کے مطابق محققین اہل علم کے اقوال ہیں۔ علامہ خفاجی رحمہ اللہ نے علامہ مغربی کے قول کو ناپسند کرتے ہوئے قاضی القضاۃ شہاب الدین غزنوی سے "احدھما" کے تکرار کے اسرار کے متعلق منظوم طور پر یوں سوال کیا۔

یارأس اهل العلوم السادة البررة	ومن نداه علی کل الوری نشره
ما سر تکرار " حدی " دون " تذکرها "	فی آیة لذوی الا شهاد فیالبقرة
وظاهر الحا ل ایجا زالضمیر علی	تکرار احداهما لو ا نه ذکر ه
احمل الاحدی علی نفس الشها دة فی	اولا هما لیس مر ضیا لدی المهرة
فغص بفکر ک لا ستخراج جو هره	من بحر علمک ثم ابعث لنا درره

اے علوم کے سردار علوم دینیہ کے رئیسو اور ہر زمانے میں علوم کی نشر و اشاعت کی غرض سے اہل علم کے ہم نشینو۔ کیا راز ہے کہ "احـدهـما" کو دو مرتبہ ذکر کیا گیا ہے اور " تـذکر " کو دو مرتبہ نہیں ذکر کیا گیا۔ سورۃ بقرہ کی اس آیۃ میں جس میں گواہ بنانے کا ذکر ہے "احـدهـما" جو پہلے ذکر ہے اس سے مراد گواہی لینا تو ماہر اہل علم کے نزدیک پسندیدہ

نہیں۔تم اپنے علم کے دریا میں یہ موتی نکالنے کیلئے اپنی فکر کو غوطہ زن کردو، پھر موتی ہماری طرف بھیج دینا۔قاضی القضاۃ شہاب الدین غزنوی نے بھی منظوم جواب دیا۔

یا من فوائده بالعلم منتشره ومن فضائله فی الكون مشتهره

یا من تفرد فی كشف العلوم لقد وافی سؤالک والا سرار مستتره

(تضل احداهما) فالقول محتمل كليهما فهی للا ظها ر مفتقرة

ولواتی بضمير كا ن مقتضيا تعيين واحده للحكم معتبرة

ومن رددتم عليه الحل فهو كما اشرتم ليس مرضيا لمن سبره

هذا الذی سمح الذهن الكليل به والله اعلم فی الفحوی بما ذكر ه

اے وہ شخص جس کے علمی فوائد جہان میں پھیلے ہوئے ہیں اور جہان میں فضائل مشہور و معروف ہیں۔اے وہ شخص جو علوم میں یکتا ہے۔تحقیق تمہارا سوال کامل ہے اور اس میں راز پوشیدہ ہیں۔''ان تضل احداھما'' میں دونوں کا احتمال تھا، اسلئے یہ وضاحت کا محتاج تھا۔یہ ضمیر کے لانے کا تقاضا کرتا تھا، تاکہ ایک معتبر حکم متعین ہو جائے اور جس کے حل کا تم نے رد پیش کیا ہے، وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ تم نے اشارہ کیا ہے وہ کسی بھی جانچ پڑتال کرنے والے کو پسند نہیں آیا۔یہی بات میرے تھکے ماندہ ذہن میں آئی ہے۔اور حقیقت میں اللہ تعالی ہی بہتر جانتا ہے اپنے بیان کو جو اس نے ذکر کیا ہے۔لھذا واضح ہوا کہ دونوں "احدھما" کی ضمیر " مرأتان "کی طرف ہی لوٹ رہی ہے، پہلے "احدھما" کا تعلق " ان تضل احداھما " سے ہے۔اور دوسرے "احدھما" کا تعلق " فتذکر ،، سے ہے، لھذا ''تذکر'' کو دو مرتبہ ذکر کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ (ماخوذ از روح المعانی)

﴿وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ إِذَا مَا دُعُوا﴾ ''اور نہ انکار کریں گواہ جب ان کو بلایا جائے۔''

یہاں چند احتمال ہیں۔

(۱) جب صاحب حق کو ضرورت ہو اور وہ گواہوں کا محتاج ہو تو گواہ گواہی دینے سے نہ انکار کریں۔

(۲) گواہ، گواہ بننے سے انکار نہ کریں یعنی واقعات و معاملات میں خود ہی دیکھنے کی دلچسپی پیدا کریں تاکہ گواہ بن سکیں۔

(۳) جب کوئی اور موجود نہ ہو تو جو شخص موجود ہے وہ گواہ بننے سے انکار نہ کرے۔

(۴) دونوں امروں کا مجموعہ مراد ہے کہ وہ گواہ بننے سے انکار نہ کریں اور گواہی دینے سے بھی انکار نہ کریں۔ (کبیر)

راقم کے نزدیک تمام ہی اقوال مجموعی طور پر معتبر ہیں کہ جب واقعہ کے وقت اور لوگ موجود نہ ہوں تو دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تو وہ گواہ بننے سے انکار نہ کریں، کیونکہ ان کا گواہ بننا فرض ہے اور اگر زیادہ لوگ وہاں موجود ہوں تو اس صورت میں گواہ بننا فرض کفایہ ہے۔ گواہی کی تعداد کے مطابق کوئی گواہ بن گیا تو کافی ہے تاہم سب ہی گواہ بن جائیں تا کہ سب کو ثواب مل جائے اور کسی گواہ کے فوت ہونے پر معذور ہونے پر اس کا متبادل اور واقعہ کا چشم دید گواہ پایا جائے۔ پھر جب صاحب حق کو گواہی کی ضرورت ہو تو گواہی دینے سے انکار نہ کریں۔ (راقم)

﴿اِذَا مَا دُعُوْا﴾ سے پتہ چلا کہ جب گواہی دینے کیلئے گواہ کو طلب کیا گیا تو اس پر گواہی دینا، اللہ تعالی نے فرض کر دیا ہے۔ اور اگر گواہی کیلئے اسے نہیں بلایا گیا تو گواہ کا خود بخود گواہی دینا مستحب ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی (جو پہلے بیان کیا جا چکا) ہے ''خیر الشھداء الذی یاتی بشھادتہ قبل ان یسالھا'' بہتر گواہ وہ جو طلب کرنے سے پہلے خود ہی گواہی دیں۔

"والصحیح ان اداءھا فرض وان لم یسألھا اذاخاف علی الحق ضیاعہ اوفوتہ اوبطلاق اوعتق"

صحیح یہ ہے کہ بیشک گواہی دینا فرض ہے اگر چہ اس سے گواہی دینے کا مطالبہ نہ کیا جائے جبکہ اسے صاحب حق کے حق کے ضائع ہونے اور فوت ہونے کا خطرہ ہو، اسی طرح طلاق کی گواہی دینا فرض ہوگا جبکہ یہ خیال کیا جائے کہ عورت تو طلاق کا دعوی کر رہی ہے اور مرد انکار کر رہا ہے تو جس شخص نے طلاق کے الفاظ سنے تھے وہ گواہی دے تا کہ مرد عورت سے ناجائز اور حرام منافع حاصل نہ کرے۔ اسی طرح غلام دعوی کرے کہ میرے مالک نے مجھے آزاد کر دیا ہے لیکن مالک انکار کر رہا ہو تو جن دو شخصوں کے سامنے آزاد کیا گیا تھا وہ خود ہی گواہی دیں تا کہ آزاد کئے ہوئے شخص سے غلام کی طرح خدمت نہ لی جائے اور اسے بیچا نہ جا سکے، اسکے نکاح وغیرہ پر پابندی نہ لگائی جا سکے، وغیرہ۔

مذکورہ بالا گواہوں میں ''ولا یقف اداءھا علی ان تسأل منہ فیضیع الحق'' گواہی کے مطالبہ پر گواہی موقوف نہیں بلکہ خود بخود ہی گواہی دی جائے تا کہ حقوق ضائع نہ ہوں۔

رب تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿وَاَقِیْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ﴾ اور قائم کرو گواہی اللہ کیلئے اور بخاری میں ذکر ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "انصر اخاک ظالما او مظلوما" اپنے (مومن) بھائی کی امداد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ جو حقوق انکار کی وجہ سے ضائع ہو رہے ہوں ان کی گواہی دے کر ان کی حفاظت کی جائے تو یہ مظلوم کی امداد ہوئی کہ اسے اپنے حقوق حاصل ہو جائیں گے، اور ظالم کی امداد ہو گی کہ وہ مدعی کے حقوق ادا کر کے اللہ تعالی کے عذاب سے بچ جائے گا، کیونکہ حقوق العباد رب تعالی نے بھی معاف نہیں کرنے۔

تنبیہ شدید: جہاں گواہی دینا واجب ہو وہاں گواہی نہ دینا گواہ اور گواہی میں عیب ہے خواہ وہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد ہوں، یہ بھی خیال رہے کہ گواہ میں عیب کا مطلب یہ ہے کہ وہ گواہی کے قابل نہیں ہو گا کیونکہ واجب کام کو جو شخص بغیر کسی عذر کے چھوڑتا ہے تو وہ گنہگار رہتا ہے اور فاسق ہوتا ہے، فاسق کی گواہی قبول نہیں۔ (قرطبی)

"وعن ابی موسیٰ عن النبی ﷺ قال من کتم شهادة اذا دعی الیها کان کمن شهد بالزور" (رواہ الطبرانی فی الکبیر والاوسط وفی سندہ عبداللہ بن صالح کاتب لیث احتج بہ البخاری)

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب کسی شخص کو گواہی کیلئے طلب کیا جائے تو وہ گواہی کو چھپائے تو وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ جھوٹی گواہی دینے والا ہے۔ یعنی ضرورت کے وقت گواہی نہ دینے والا اور جھوٹی گواہی دینے والا دونوں ہی گنہگار ہیں۔ بعض لوگوں کا اس حدیث کی سند میں عبداللہ بن صالح پر اعتراض کرنا درست نہیں کیونکہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سے حجت پکڑی ہے یعنی انیس میل تک فاصلہ ہو۔ (مظہری)

مسئلہ: جب گواہ کو حاکم کی مجلس میں بلایا جائے تا کہ وہ گواہی دے تو بیان کیا گیا کہ اگر قاضی کی مجلس قریب ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ گواہی دے، اور اگر قاضی کی مجلس دور ہو تو اس پر گواہی دینا لازم نہیں، کیونکہ رب تعالی نے فرمایا ﴿وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ﴾ "اور نہ ضرر پہنچایا جائے کاتب اور گواہ کو"۔

قرب اور بعید کی حد کیا ہے؟ اس کی حد نصر رحمہ اللہ نے یہ بیان کی کہ اگر ایک دن میں ہی یعنی شام تک واپس اپنے اہل وعیال تک پہنچ جائے تو یہ قریب ہے اسے گواہی دینا لازم ہے اور اگر واپس نہ پہنچ سکے تو بعید ہے گواہی دینا لازم نہیں۔

مسئلہ: اگر گواہ بوڑھا شخص ہو تو اسے مدعی سواری پر سوار کر کے لے جائے تو کوئی حرج نہیں۔ سلیمان کا قول تو مطلق

ہے کہ گواہوں کو سواری پر سوار کر کے لے جانا جائز نہیں، لیکن بعض حضرات نے مسئلہ میں تفصیل بیان کی ہے کہ اگر گواہ سواری کا محتاج ہو تو سوار کر کے لے جائے ورنہ سوار کر کے لے جانا جائز نہیں لیکن ابن ھمام رحمہ اللہ صاحب فتح القدیر نے اس تفصیل کو رد کرتے ہوئے فرمایا ''وفیہ نظر لا ن اکرام الشھود ما مور بہ'' کہ یہ درست نہیں اس لئے کہ گواہوں کی عزت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ (ابن ھمام رحمہ اللہ کا قول ہی زیادہ معتبر ہے)

مسئلہ: اگر گواہوں کو کھانا پیش کیا گیا ہے تو انہوں نے وہ کھانا کھا لیا تو ان کی شہادت قبول کی جائے گی جبکہ کھانا پہلے تیار تھا۔ اگر گواہوں کیلئے ہی کھانا تیار کیا گیا ہو تو وہ کھانا کھالیں تو ان کی گواہی معتبر نہیں، یہ قول امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ہے۔

امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں مطلقا جائز نہیں خواہ کھانا پہلے تیار ہو یا گواہ کیلئے تیار کیا جائے اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں مطلقا جائز ہے کیونکہ عام عادت یہی ہے کہ جو شخص گھر آئے اسے کھانا کھلایا جاتا ہے خواہ وہ گواہ ہو یا کوئی اور ہو کیونکہ گھر آئے ہوئے شخص کی عزت کرنا عادتاً ضروری ہے۔ ہاں اگر گواہ شرط لگائے کہ اگر تم مجھے کھانا کھلاؤ تو میں گواہی دوں گا، ورنہ گواہی نہیں دوں گا۔ تو اس صورت میں اسے کھانا کھلانا جائز نہیں کیونکہ یہ اجرت کے درجہ میں آجائے گی، اجرت دے کر گواہی حاصل کرنا گویا کہ رشوت ہوگی جو جائز نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''الراشی والمر تشی فی النار رواہ الطبرانی فی الصغیر عن عمر باسناد حسن''

رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا جہنمی ہیں اور خاص کر کے گواہی دینا عبادت ہے۔

''ولا یجوز اخذ الا جرۃ علی العباد عندنا'' اور عبادت پر اجرت لینا ہمارے نزدیک جائز نہیں۔ (مظہری)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں.

''اذا'' اور ''اذا ما'' دونوں ہی ظرفیت کیلئے آتے ہیں ان کا معنی ہوتا ہے ''جس وقت'' یعنی ''اذا ما'' میں ''ما'' کا کوئی علیحدہ معنی نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جلالین میں بیان کیا گیا ہے ''اذا ما'' زائدۃ۔ یعنی ''ما'' کسی علیحدہ معنی پر دلالت نہیں کر رہا۔

﴿ وَلَا تَسْئَمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ﴾

''اور نہ پریشان ہو لکھنے سے اس دین کو خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا وقت مقرر تک''

''وَلَا تَسْئَمُوْا'' لیا ہوا ہے ''سآمۃ'' سے جس کا معنی ہوتا ہے ملال اور ضجر (دل تنگی، پریشانی) جیسے کہا جاتا ہے:

" سمت الشی ساما وسامة" میں اس چیز سے ملال میں پڑ گیا اور تنگ ہو گیا۔ (کبیر)

زہیر نے کہا: سمت تکالیف الحیاۃ ومن یعش ثمانین حولا لاابالک یسأم

میں زندگی کی تکالیف سے تنگ آ گیا اور جو شخص اسی سال زندہ رہتا ہے "تمہارا باپ نہ رہے" وہ تنگ ہی آ جاتا ہے۔

"لا یسأم" شعر میں جملہ معترضہ ہے۔ (شرح مائۃ عامل پڑھنے والے طلباء کرام بھی جملہ معترضہ سے بخوبی واقف ہیں) (روح المعانی)

آیۃ کریمہ میں مقصود کتابت پر برانگیختہ کرنا ہے خواہ مال قلیل ہو یا کثیر یعنی قلیل مال کے لین دین میں بھی اسی طرح احتیاط ضروری ہے جس طرح کثیر مال میں احتیاط ضروری ہے۔

" فان النزاع الحاصل بسبب القلیل من المال ربما ادی الی فساد عظیم ولجاج شدید فامرا الله تعالی فی الکثیر والقلیل بالکتابة "

اسکی وجہ یہ ہے کہ قلیل مال میں بھی کبھی نزاع حاصل ہو جاتا ہے جو بہت بڑے فساد اور شدید جھگڑے کا سبب بن جاتا ہے اسی وجہ سے رب تعالی نے لکھنے کا حکم دیا کہ لین دین تھوڑا ہو یا زیادہ اسے لکھ لو۔

(وَلَا تَسْئَمُوْا) ای ولا تملوا فتترکوا ثم تندموا" ملال میں نہ پڑو کہ لکھنے کو چھوڑ کر بعد میں ندامت میں مبتلاء ہو جاؤ۔ (کبیر)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

" سئم یسئم " متعدی بنفسہ بھی ہوتا ہے اور حرف جار یعنی " من " کے واسطہ سے بھی۔ البتہ اسکے بعد آنے والے فعل پر "ان مصدریہ" آتا ہے تاکہ وہ مفعول بن سکے۔ لہذا " من " کے واسطہ سے مفعولیت کے درجہ میں ہو کہ عبارت کا مفہوم یہ ہو" ولا تساموا من ان تکتبوہ" یا بغیر کسی واسطہ کے براہ راست مفعول " ولا تساموا ان تکتبوہ " دونوں طرح جائز ہے۔ "صغیرا او کبیرا" دونوں " تکتبوہ "کی ضمیر سے حال واقع ہو رہے ہیں۔

(ماخوذ از صاوی)

" صغیرا " کو" کبیر ا " پر مقدم کرنے کی وجہ:

"صغیرا " کو اہتمام کیلئے مقدم ذکر کیا ہے کہ لوگ عام طور پر چھوٹے لین دین پر لکھنے کو تردد سمجھتے تھے، یعنی اس میں وہ پریشان ہوتے ہیں کہ اسے لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔"فاکد تعالی التحضیض فی القلیل والکثیر" تو اللہ تعالی نے لکھنے پر برانگیختہ کرنے (ابھارنے) کیلئے تاکیدی طور پر حکم دیا کہ لین دین کے ہر معاملہ کو لکھ لو خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ ہاں البتہ بہت ہی تھوڑی چیز ہو جو عام عرف میں اس کے لین دین کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی اور نہ ہی عرف میں اسے لکھا جاتا ہو تو اس کے نہ لکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ (قرطبی)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"الی اجلہ" (وقت مقرر تک) یہ ظرف مستقر ہے اور " تکتبوہ" کی " ھاء " ضمیر سے حال واقع ہو رہا ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ جو مدیون کے ذمہ دین ہے جس کی ادائیگی کا وقت مقرر کر رکھا ہے اور مدیون اس کا اقرار بھی کر رہا ہو تو اسے لکھ لو۔

" ولیس متعلقا بتکتبوہ لعدم استمرار الکتابة الی الا جل اذھی مما ینقض فی زمن یسیر"

"الی اجلہ" جار مجرور کا تعلق " تکتبوہ" سے نہیں ورنہ مطلب یہ ہوگا کہ وقت تک اسے لکھتے رہو، یہ مطلب درست نہیں کیونکہ لکھنے کا کام تو تھوڑے وقت میں ختم ہو جاتا ہے۔ (روح المعانی)

﴿ذٰلِکُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰۤى اَلَّا تَرْتَابُوْۤا﴾

" یہ تمہارے لئے انصاف کی بات ہے اللہ کے حضور اور درست ہے گواہی کیلئے اور قریب ہے کہ تم شک میں نہ پڑو"۔

"ذالکم" کا اشارہ" ان تکتبوہ" کی طرف ہو جو مصدر کی تاویل میں ہے یعنی تمہارا لکھنا اللہ کے حضور انصاف کی بات ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ "ذالکم" کا اشارہ ماقبل امور کی طرف ہے یعنی جن چیزوں کا تمہیں حکم

دیا گیا ہے ان پر عمل کرنا تمہارے لئے انصاف کی بات ہے اللہ کے حضور۔ وہ حکم لکھنے کا دیا گیا ہے اور گواہ بنانے کا بھی دیا گیا ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ لین دین کے معاملات کو تمہارا لکھنا اور گواہ بنانا تمہارے لئے اللہ کے حضور انصاف کی بات ہے۔ " القسط هو النصيب بالعدم كالنصف و النصفة" قسط کا معنی ہے "عدل وانصاف سے کسی کو حصہ دینا، برابر تقسیم کرنا" وغیرہ۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ﴾

تاکہ وہ جزا دے ایمان والوں اور اچھے عمل کرنے والوں کو انصاف سے" اور رب تعالیٰ نے فرمایا

﴿وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ﴾ "اور قائم کرو وزن کو انصاف سے" یعنی برابر تولو، کمی نہ کرو"۔ (کبیر)

عربی زبان کی چاشنی:

" والقسط هو ان يا خذ قسط غيره وذلک جو روالاقساط ان يعطى قسط غيره وذلک انصاف"

" قسط" کا معنی یہ بھی آتا ہے کہ غیر کی قسط اور حصہ لے لینا یہ ظلم ہے اور اقساط (باب افعال کا مصدر) کا معنی ہے غیر کو قسط دینا، یہ انصاف ہے۔ "ولذلک قیل قسط الرجل اذا جار واقسط اذا عدل" یہی وجہ ہے کہ جب کوئی ظلم کرے تو اس وقت "قسط الرجل" کہا جاتا ہے اور جب کوئی انصاف کوے کو کہا جاتا "اقسط الرجل" رب تعالیٰ کے ارشادات گرامی میں دونوں معنی مذکور ہیں ﴿وَاَمَّا الْقَاسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا﴾ "لیکن ظلم کرنے والے جہنم کا ایندھن ہیں"۔ یہاں "قاسطون" کا معنی ظلم کرنے والے اور ارشاد فرمایا ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ﴾ "بیشک اللہ پسند فرماتا ہے انصاف کرنے والوں کو"۔ یہاں "مقسطین" کا معنی انصاف کرنے والے۔ (مفردات راغب)

"وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ" "اور درست ہے گواہی کیلئے"

یہاں لکھنے کا دوسرا فائدہ بیان کیا جارہا ہے کہ لین دین کے معاملہ کو لکھنے کا یہ فائدہ ہوگا کہ لکھی ہوئی دستاویز کو دیکھ کر گواہی دینے والا درست گواہی دے گا۔ "اقوم" کا معنی ہے زیادہ درست "استقامت" میں مبالغہ پایا گیا ہے۔ یہ

ضد ہے ''اعوجاج'' کی جو سیدھا قائم ہوا سے کہا جاتا ہے ''مستقیم'' اور جو ٹیڑھا ہوا سے کہا جاتا ہے ''معوج'' لکھنے کا حکم دیا گیا "لان الکتابة سبب للحفظ والذکر فکانت اقرب الی الاستقامة" اسلئے کہ کتابت یاد رکھنے اور یاد آنے کا سبب ہے جس کی وجہ سے درست گواہی دی جاسکے گی۔

لکھنے کے پہلے فائدہ ''اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰہِ اور ''وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ'' میں فرق یہ ہے۔

" ان الاولی تتعلق بتحصیل مرضاة الله والثانیة بتحصیل مصلحة الدنیا " بیشک پہلے فائدہ کا تعلق اللہ تعالی کی رضامندی سے ہے، کہ لکھنا اللہ تعالی کے حضور انصاف پر مبنی ہے اور دوسرے فائدہ کا تعلق دنیا کی مصلحت سے ہے کہ گواہی درست دینے کا ذریعہ ہے۔ ''اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ " کو مقدم ذکر کرنے کا یہ فائدہ ہے کہ اس سے یہ مسئلہ سمجھایا گیا ہے۔" ان الدین یجب تقدم علی الدنیا " بیشک دین پر مقدم ہے۔ (کبیر)

آج دنیا بھنور میں پھنسی ہوئی ہے اسکی وجہ ہی یہ ہے کہ مسلمان دین پر دنیا کی مصلحتوں کو ترجیح دیتے ہیں جسکی وجہ سے رب تعالی کی گرفت میں ہیں، کفار ان پر چھائے ہوئے ہیں کاش! کہ یہ دین کا لحاظ پہلے کریں اور دنیا کا لحاظ بعد میں کریں یعنی دنیاوی مصلحتوں کو دین پر قربان کردیں اور دین کو دینی مصلحتوں پر قربان نہ کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ کامیابی مسلمانوں کے قدم نہ چومے۔ (کبیر)

تنبیہ:

لکھے ہوئے خطوط کو دیکھ کر گواہ کو اصل واقعہ یاد آجائے تو گواہی دینے میں آسانی ہوگی، اصل واقعہ یاد نہ آئے تو صرف لکھی ہوئی دستاویز کو دیکھ کر گواہی دینا جائز نہیں کیونکہ خطوط کے ساتھ خطوط مشابہ ہوسکتے ہیں۔ (ماخوذ از قرطبی)

" اقسط " اور " اقوم " اسم تفضیل ہیں اور یہ ماخوذ ہیں " اقساط " اور " اقوام " سے تو ان کا اسم تفضیل بنانا کس طرح درست ہے جبکہ ثلاثی مزید سے " افعل " کے وزن پر اسم تفضیل نہیں آسکتا؟

تو اسکے دو جواب دیئے گئے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ سیبویہ کا مذہب درست ہو وہ غیر ثلاثی مجرد سے ''افعل'' کے وزن پر اسم تفضیل کو جائز مانتا ہے اور دوسرا جواب یہ ہے کہ ہوسکتا ہے " اقسط " ماخوذ ہو " قسط "(بمعنی

انصاف) سے اور " اقوم " ماخوذ ہو " قویم " سے۔ (از کبیر)

﴿ وَاَدْنٰی اَنْ لَّا تَرْتَابُوْا ﴾ "اور قریب ہے کہ تم شک میں نہ پڑو"

یہ تیسرا فائدہ ذکر کیا جارہا ہے کہ تمہارے لکھنے کا یہ فائدہ حاصل ہوگا" فھی اقرب الی زوالی الشک والارتیاب عن قلوب المتدینین" کہ شک کے زوال کے قریب ہوگا اور لین دین کرنے والے شخصوں کے دل مطمئن ہوں اور ان کے دلوں سے شکوک وشبہات زائل ہوں گے۔ لکھنے کے پہلے دو فائدوں اور تیسرے فائدہ میں فرق یہ ہے کہ پہلے اور دوسرے فائدہ میں مصلحت کا ذکر تھا، پہلے میں دینی مصلحت کا ذکر اور دوسرے میں دنیاوی مصلحت کا ذکر۔ اور یہ تیسرا﴿ وَاَدْنٰی اَنْ لَّا تَرْتَابُوْا ﴾ جو ذکر کیا گیا ہے اس اپنے نفس اور غیروں سے ضرر کو دور کرنے کیلئے بیان کیا گیا ہے۔ اپنے نفس سے ضرر دور کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جب لکھی ہوئی چیز سامنے آئے گی تو اسے تمام معاملات یاد آجائیں گے یہ شکوک اس سے زائل ہوجائیں گے کہ یہ معاملہ کیسے تھا۔ یہ جو میں دعوی کر رہا ہوں کیا بالکل سچ ہے یا بھولنے وغیرہ کی وجہ سے اس میں کوئی جھوٹ بھی پایا گیا ہے۔ لیکن غیروں سے ضرر کو دور کرنے کا یہ مطلب ہے کہ وہ دوسرا شخص جب تحریر کو دیکھے گا تو اسے بھی یقین آجائے گا کہ ہاں مدعی سچا ہے۔ اگر تحریر نہ ہوئی تو وہ مدعی کو جھوٹا کہے گا اور یہ کہے گا کہ اس کا قول درست نہیں تو وہ یا تو غیبت کا مرتکب ہوگا یا بہتان کا۔ اسلئے تحریر اسے وثوق دلا کر ان عظیم جرائم یعنی غیبت اور بہتان جیسے کبائر سے بچالے گی۔

"فما احسن هذا الفو ائد وما ادخلها فی القسط وما احسن ما فيها من الترتيب "

کتنے ہی اچھے ہیں یہ فوائد اور کتنے ہی زیادہ انصاف کرنے کی ترغیب دلا رہے ہیں اور ان فوائد کی کتنی ہی اچھی ترتیب ہے۔ (کبیر)

جب یہ کلام ہی رب قدوس کا ہے تو یقیناً اس میں ہر قسم کے فوائد نے پایا جانا ہے۔

فائدہ:

" وهذا حكمة خلق اللوح المحفوظ والكرام الكا تبين مع انه الغنی الكامل عن كل

شئی تعلیما للعباد و ارشادا للحکام"

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی تعلیم وتربیت کیلئے اور حکام کی راہنمائی کیلئے لوح محفوظ کو پیدا کیا اور کراما کاتبین فرشتوں کو کہ ہمارے لکھنے کے نظام سے ہمارے بندوں کو بھی تعلیم حاصل ہوگی، وہ بھی لکھ لیا کریں گے ورنہ رب تعالیٰ کامل غنی ہے اسے لکھنے کی کیا ضرورت ہے، وہ ذات بھولنے اور غلطی سے پاک ہے۔ (روح المعانی)

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی خوب تحقیق:

امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ جب خط تبدیلی سے محفوظ رہا ہو تو صرف خط پر اعتبار کرتے ہوئے گواہی دی جاسکتی ہے۔

"الاترٰی ان الصحابة والتابعین کانوا یعملون علیٰ کتب النبی ﷺ وخلفائه کما کانوا یعملون علی خطابتة"

صاحبین نے اپنے مؤقف پر دلیل یہ قائم کی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی کریم ﷺ کے خطوط پر اعتبار کرکے اسی طرح عمل کیا جس طرح وہ آپ ﷺ کے خطابات کو سن کر کرتے تھے۔ امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک ہے خود عمل کرنا اور ایک ہے گواہی دینا۔ خطوط پر عمل کرکے خود عمل تو کیا جاسکتا ہے لیکن گواہی نہیں دی جاسکتی۔

"لان الشھادة مبنی علی المشاھدة ومن ثم یشترط لفظ الشھادة وقد قال علیه الصلوٰة والسلام اذا رائیت مثل الشمس فاشھد"

کیونکہ شہادت کا دار ومدار مشاہدہ پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گواہی دیتے وقت لفظ شہادت کا ذکر کرنا (یعنی میں گواہی دیتا ہوں) ضروری ہے۔ یہ کہنا کافی نہیں ہوگا کہ میں جانتا ہوں، میں نے سنا ہے ہاں یہ اسی طرح ہے وغیرہ ایسے الفاظ سے گواہی ادا نہیں ہوگی اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی بھی روز روشن کی طرح جگمگا رہا ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو تم سورج کی طرح (واقعہ کو خوب) دیکھ لو تو گواہی دو۔ (از مظہری)

راقم کے نزدیک یہ دلیل قوی نہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے صرف خطوط کو دیکھ کر عمل کیا ہو، کسی صحابی کو بھی خط دیکھ کر آپ ﷺ کے ارشادات یاد نہ آتے ہوں۔ بظاہر یقین اسی بات پر ہے کہ صحابہ کرام کو خطوط دیکھ کر آپ ﷺ

کے ارشادات بھی یاد آ گئے تھے۔اس لحاظ پر ان کا عمل خطوط وارشادات پر مبنی ہے۔

﴿اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا﴾

''مگر یہ کہ ہاتھ بہاتھ ہو جس کو تم دائر (جاری) کرو اپنے درمیان تو نہیں تم پر کوئی گناہ کہ تم اسے نہ لکھو''

یہ حکم ماقبل سے مستثنیٰ ہے۔(لکھنے سے تم ملال میں نہ پڑو) مگر یہ کہ جب تجارت ہاتھ بہاتھ ہو، ادھر سے چیز دی، ادھر سے لے لی اسے نہ لکھا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ جب ادھار نہیں سودا نقد سے ہو رہا ہو تو اس میں بھولنے کا یا نزاع (جھگڑے) کا کوئی خطرہ نہیں۔اگر ہاتھ بہاتھ تجارت پر بھی گواہ بنانے اور لکھنے کا حکم دیا جاتا تو اس میں فریقین کیلئے آسانی کی بجائے مشکلات پیدا ہوتیں۔ (خازن)

''التجارة عبارة عن التصرف فی المال سواء كان حاضرا اوفی الذمة لطلب الربح''

تجارت کا معنی ہے مال میں تصرف کرنا خواہ وہ ہاتھ بہاتھ ہو یا ادھار ہو اسی لئے ''تجارة'' کے ساتھ ''حاضرة'' کی قید بڑھادی تا کہ نہ لکھنے والا حکم تجارت حاضرۃ یعنی نقد خرید وفروخت کو ہی شامل ہو۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ﴾ ''اور گواہ بنالو جب تم خرید وفروخت کرو''۔

حضرت ضحاک رحمہ اللہ اور داؤد رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ یہ امر وجوب کیلئے ہے۔مطلب یہ ہے کہ خرید و فروخت نقد سے ہو یا ادھار اس پر گواہ بنانے واجب ہیں اور ایک قول ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا ہے کہ یہ حکم وجوب کیلئے تھا لیکن بعد میں ﴿فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا﴾ سے منسوخ ہو گیا۔

''وعند الجمهور الامر للندب وكثيرا مالم يشهد النبی ﷺ عند المبايعة''

اور جمہور حضرات کے نزدیک امر استحباب کیلئے ہے کیونکہ اگر امر وجوب کیلئے ہوتا تو نبی کریم ﷺ اس پر عمل

ضرور کرتے حالانکہ کثیر مواقع خرید وفروخت آپ ﷺ کو درپیش آئے لیکن آپ ﷺ نے گواہ نہیں بنائے۔

"روی احمد من حدیث عمارۃ بن خزیمة عن عمه وهو من اصحاب النبی ﷺ ان النبی ﷺ ابتاع فرسامن اعرابی فاسرع النبی ﷺ فی المشی لیؤتی ثمن فرسه وابطأ الاعرابی فطفق رجال یعرضون للاعرابی فیسا ومون بالفرس لا یشعرون ان النبی ﷺ ابتاعه حتی زاد بعضهم الاعرابی فی السوم علی ثمن الفرس فنادی الاعرابی النبی ﷺ ان کنت مبتاعا لهذا الفرس فابتعه والا بعته فقام النبی ﷺ حین سمع نداء الاعرابی فقال اولیس قدابتعته منک فقال لا والله ما بعتک فقال النبی ﷺ بلی قد ابتعته فطفق الاعرابی یقول هلم شهیدا یشهدانی قد بایعتک فطفق الناس یقولون للاعرابی ویلک ان رسول الله ﷺ لم یکن لیقول الا حقا حتی جاء خزیمة فاستمع مراجعه النبی ﷺ ومراجعة الاعرابی و طفق الاعرابی یقول هلم شهیدا یشهدانی بعتک فقال خزیمة انا اشهد انک قد بایعته ، فاقبل النبی ﷺ علی خزیمة فقال بم تشهد قال بتصدیقک یا رسول الله فجعل رسول الله ﷺ شهادة خزیمة بشهادة رجلین"

مسند احمد میں عمارہ بن خزیمہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی گئی جوانہوں نے اپنے چچا سے روایت کی جو رسول اللہ ﷺ کے صحابی ہیں کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے ایک اعرابی سے گھوڑا خریدا تو نبی کریم ﷺ جلدی جلدی چلے تاکہ اعرابی کو گھوڑے کی قیمت ادا کردیں۔ اعرابی آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اسے کئی اور لوگ ملے جو اس سے گھوڑے کا بھاؤ کرنے لگے ان کو معلوم نہیں تھا کہ نبی کریم ﷺ یہ خرید چکے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں نے گھوڑے کی قیمت زیادہ چڑھادی۔ اعرابی نے نبی کریم ﷺ کو پکارا کہ اگر تم گھوڑا خریدنا چاہتے ہو تو خریدلو ورنہ میں بیچ دوں۔ نبی کریم ﷺ اس کی آواز سن کر کھڑے ہوگئے تو آپ نے فرمایا کیا میں نے تم سے یہ خرید نہیں لیا؟ وہ کہنے لگا، نہیں۔ قسم ہے اللہ کی میں نے تم پر نہیں بیچا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں میں نے تو تم سے

خرید لیا ہے۔اعرابی کہنے لگا تم گواہ لاؤ کہ میں نے تم پر یہ بیچ دیا ہے،لوگ اعرابی کو کہنے لگے تمہاری بربادی، بیشک رسول اللہ ﷺ تو کوئی ناحق بات نہیں فرماتے صرف حق بات ہی کرتے ہیں ۔ یہاں تک کہ خزیمہ رضی اللہ عنہ آ گئے انہوں نے نبی کریم ﷺ کے ارشاد اور اعرابی کی بات کو سنا، اعرابی پھر کہنے لگا کوئی گواہ لاؤ جو گواہی دے کہ میں نے یہ تمہیں بیچ دیا ہے۔خزیمہ کہنے لگے میں گواہی دیتا ہوں کہ تم نے یہ گھوڑا حضور ﷺ پر فروخت کر دیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تم نے کیسے گواہی دے دی، انہوں نے کہا آپ کی تصدیق کرتے ہوئے یارسول اللہ ﷺ، تو رسول اللہ ﷺ نے خزیمہ رضی اللہ عنہ اکیلے کی گواہی دو مردوں کے برابر قرار دی۔

اس حدیث پاک سے واضح ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ نے کئی مرتبہ خرید وفروخت پر گواہ نہیں بنائے جیسے اعرابی سے گھوڑے کی خرید پر آپ نے گواہ نہیں بنائے۔

حدیث شریف سے مسائل کے استنباط میں قاضی مظہری رحمہ اللہ کا موقف:

آپ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے لئے گھوڑا خریدنے پر اپنے علم کے مطابق حکم لگایا کیونکہ آپ کو یقین تھا کہ اعرابی جھوٹا ہے صرف خزیمہ رضی اللہ عنہ کے اکیلے گواہی کو دو مردوں کے برابر سمجھنے کی وجہ یہ تھی کہ آپ نے ان کے کمال ایمان اور کامل عقل اور سمجھ کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ فرمایا۔

"ویستنبط من هذا الحدیث ان القاضی لو کان عالما بالحق یسعه الحکم علی وفق علمه لان علمه فوق ما یحصل من الظن بشها دة رجلین"

اور اس حدیث پاک سے یہ ثابت ہوا کہ بیشک قاضی اگر حق کو جانتا ہو اور گواہوں کو یقین نہ ہو۔ بلکہ گمان ہو تو قاضی کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے علم کے مطابق فیصلہ کر دے، کیونکہ اسکا علم بنسبت گواہوں کے گمان کے زیادہ حیثیت رکھتا ہے۔

"کما ان ابا بکر حکم علی فاطمة بمنع الارث بحدیث وسمعه النبی ﷺ نحن معا

شر الا نبیا لا نورث"

جیسا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو وراثت سے منع کرنے کا حکم لگایا بوجہ (اپنے علم پر اعتبار کرتے ہوئے) اس کے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے آپ نے ارشاد سنا ہوا تھا کہ آپ نے فرمایا ہم انبیاء کرام کے گروہ کا کسی کو وراث نہیں بنایا جاتا۔ اسی سے واضح ہو کہ بادشاہ یا قاضی یا ان کا غیر اگر کسی سے کوئی چیز خریدے یا اسکا کسی پر کوئی حق ہو۔

"وھو یعلم ذلک یقینا وسعه ان یا خذ من ذلک الغیر حقه جبرا وان کا ن ذلک الغیر منکر الخقه"

اور اسے یقینی طور پر اسکا علم ہو تو اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس شخص سے اپنا حق جبراً لے لے اگرچہ وہ غیر اسکے حق کا منکر ہو۔ یہ سارا مسئلہ اس وقت ہے جب قاضی نے اپنا حق غیر سے لینا ہو۔ لیکن جب کوئی اور شخص قاضی کے پاس اپنا دعوی لائے تو قاضی اپنے علم کے مطابق فیصلہ نہیں کرے گا بلکہ مدعی سے گواہ طلب کرے گا۔ (مظہری)

احتیاط یہ ہے کہ گواہ بنا لئے جائیں:

"عن النبی ﷺ قال ثلاثه یدعون الله فلا یستجا ب لهم رجل له امراة سیئة الخلق فلم یطلقها ورجل دفع مال یتیم قبل ان یبلغ ورجل ا قرض رجلا مالا فلم یشهد"

(رواہ الحاکم وقال صحیح الاسناد علی شرط الشیخین ولم یخرجاہ)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا تین شخصوں کی دعاء اللہ تعالی قبول نہیں فرماتا، ایک وہ شخص جسکی زوجہ بد خلق، بدمزاج ہو تو یہ اسے طلاق نہ دے اور دوسرا وہ شخص جو یتیم کا مال اسے بالغ ہونے سے پہلے ہی دے دے (وہ بچپن کی وجہ سے مال ضائع کردے) اور تیسرا وہ شخص جو کسی کو مال بطور قرض دے اور گواہ نہ بنائے۔ (صابونی)

یہ خیال رہے کہ یہ وعید وجوب پر ہوسکتی ہے، وجوب اسی وقت ہوگا جب قرض دیتے وقت ہی غالب گمان ہو جھگڑا

پیدا ہونے کا، ورنہ گواہ بنانے مستحب ہیں ترک مستحب پر وعید نہیں اور دعاء کی قبولیت نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی دعاء ان الفاظ سے ہی قبول نہیں ہوگی، ان کو نیکی کی توفیق عطاء کر کے یا گناہوں سے دور کر کے دعا کو قبول کر لیا جائے گا۔ زیادہ تفصیل دوسرے پارہ ﴿اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾ کی وضاحت کے ضمن میں دیکھئے۔ (راقم)

﴿وَلَا یُضَآرَّ کَاتِبٌ وَّلَا شَهِیْدٌ﴾

''اور نہ ضرر پہنچایا جائے لکھنے والے اور نہ گواہ کو'' (یا) ''اور ضرر نہ پہنچائے لکھنے والا اور نہ گواہ۔''

اعلی حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے یہ دونوں ترجمے کئے اور راقم نے بھی دونوں نقل کر دیئے دو ترجمہ کرنے کی وجہ کیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مفسرین کرام نے '' ولا یضار '' کے متعلق بیان فرمایا ہے کہ اس میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ یہ صیغہ مجہول کا ہو، اصل میں '' ولا یضارر '' (بفتح الراء) ہو اس لحاظ پر ،، کاتب ولا شھید ،، مفعول مالم یسم فاعلہ (نائب فاعل) ہوں گے۔ اب معنی یہ ہوگا اور نہ ضرر پہنچایا جائے لکھنے والے کو اور نہ گواہ کو۔

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ اصل میں '' ولا یضارر '' (بکسر الراء) ہو۔ اس صورت میں '' کاتب ولا شھید ،، فاعل ہوں گے۔ معنی یہ ہوگا اور ضرر نہ پہنچائے لکھنے والا اور نہ گواہ۔ لکھنے والے اور گواہ کو ضرر نہ پہنچائے جانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو طلب کیا جائے وہ کہیں ہم مشغول ہیں کسی کام میں یا کہیں ہم مریض ہیں وغیرہ اس قسم کا کوئی عذر پیش کریں کہ اور گواہ بھی ہیں ان کو طلب کر لیا جائے اور لکھنے والے بھی ہیں ان سے لکھوا لیا جائے لیکن مدعی ان کو ہی مجبور کرے تو یہ ان کو ضرر پہنچانا ہے۔ اسی طرح لکھنے والے کو کاغذ اور سیاہی وغیرہ کی اجرت ادا نہ کرنا اور گواہ کو عدالت کے دور ہونے پر سواری کا کرایہ نہ دینا بھی ان کو ضرر پہنچانا ہی ہے۔ '' لکھنے والا ضرر نہ پہنچائے'' کا مطلب کیا؟ اسکا مطلب یہ ہے کہ لکھنے والا زیادہ لکھ کر، یا کم لکھ کر یا لکھنے کی احتیاط کو چھوڑ کر مدعی اور مدعی علیہ کو نقصان نہ پہنچائے بلکہ عدل وانصاف سے حق بات لکھے۔

'' گواہ ضرر نہ پہنچائے'' اسکا مطلب کیا ہے،؟ اسکا مطلب یہ ہے کہ گواہ گواہی نہ دے کر نقصان نہ پہنچائے یا ایسی گواہی دے جس کا کوئی فائدہ ہی نہ ہو یعنی مقدمہ کے فیصلہ کرنے میں اس کی مبہم (غیر واضح) گواہی فائدہ مند نہ ہو

توان صورتوں میں گواہ کو گویا کہ صاحب حق کو نقصان پہنچانے سے منع کیا گیا ہے۔

﴿وَاِنْ تَفْعَلُوْ افَاِنَّهٗ فُسُوْقٌ بِكُمْ﴾

''اور اگر تم نے (ایسا) کیا تو وہ بے شک فسق ہوگا تمہارا''

یعنی جن کاموں سے منع کیا گیا ہے اگر تم نے وہ کام کئے تو یہ گناہ ہوگا، فسق و فجور ہوگا۔ لہٰذا تم ان کاموں سے باز آجاؤ جن سے رب تعالیٰ نے منع فرمایا۔ یعنی لکھنے والا اور گواہ مدعی اور مدعی علیہ کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں اور صاحب حق ان کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔

" فانه فسوق "ای یترتب علیه الفسوق آخر لان من لم بدر العواقب فلیس له فی الدنیا صاحب "

یعنی رب تعالیٰ کے حکم کی عدولی گناہ ہے اور کے اوپر ایک اور فسق مرتب ہوتا ہے، اسلئے کہ جو شخص انجام کو نہ جانے اس کا دنیا میں کوئی دوست و مددگار نہیں ہوتا۔ (صاوی)

خیال رہے کہ " بکم " میں باء معنوی لحاظ پر زائد ہو اور فسوق کے متعلق ہو، ایک احتمال یہ ہے اسی کے مطابق اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ہے ''تو یہ تمہارا فسق ہوگا''۔ راقم نے بھی یہی نقل کیا ہے۔ تاہم جلالین میں " بکم " سے پہلے "لاحق" لفظ ذکر کیا گیا ہے کہ " بکم " کا تعلق "لاحق" سے ہے اور باء الصاق کیلئے ہے، اب ترجمہ یہ ہوگا ''بے شک فسق تمہیں لاحق ہونے والا ہے'' یعنی فسق تمہارے ساتھ ملنے والا ہے۔ (راقم)

"فسوق ای خروج عن الطاعة" فسق کا معنی ہی ''طاعت سے نکلنا'' ہے یعنی جن کاموں سے تمہیں روکا گیا ہے ان کے کرنے سے تم اللہ تعالیٰ کی طاعت سے خارج ہو جاؤ گے۔

تنبیہ:

﴿وَاِنْ تَفْعَلُوْ افَاِنَّهٗ فُسُوْقٌ بِكُمْ﴾ میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ یہاں خاص طور پر جن چیزوں کا ذکر ہے

کہ لکھنے سے ملال میں نہ پڑو، لکھنے والے اور گواہ کو نقصان نہ پہنچایا جائے اور لکھنے والا اور گواہ صاحب حق کو نقصان نہ پہنچائیں، ان کاموں کا کرنا جن سے روکا گیا ہے فسق ہے۔ لیکن عام الفاظ کو دیکھتے ہوئے اور اس ضابطہ کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ خصوص مورد کا لحاظ نہیں عموم الفاظ کا اعتبار ہے تو اسے عام ہی رکھا جائے تو بہتر ہے۔

"یعنی انه عام فی جمیع التکلیف والمعنی وان تفعلو شیئا مما نہیتکم عنه اوتترکو اشیئا مما امرتکم بهٖ فانه فسوق بکم ای خروج عن امر الله وطاعته"

یعنی یہ حکم عام ہے مکلفین کو جن کاموں سے منع کیا گیا ہے ان سب کو شامل ہے بلکہ تمام امور کو بھی شامل ہے اب معنی یہ بنا کہ اگر تم نے وہ کام کئے جن سے رب تعالیٰ نے منع فرمایا، یا تم نے وہ کام چھوڑ دیئے جن کا تمہیں حکم دیا گیا تو یہ تمہارا فسق ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے امر اور اطاعت سے نکلنا لازم آئے گا۔ (کبیر)

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾

''اور ڈرو اللہ سے اور سکھاتا ہے تمہیں اللہ اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے''۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے اوامر اور نواہی میں اسی سے ڈرو اور وہ تمہیں سکھاتا ہے یعنی "ویعلمکم الله ای العلم النافع لان العلم نور لا یھدی لغیر المتقی" اللہ تعالیٰ تمہیں نفع مند علم عطاء کرتا ہے اس لئے کہ علم نور ہے اور نور سوائے متقی کے کسی اور کو ہدایت عطاء نہیں کرتا۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں

شکوت الی وکیع سوء حفظی — فارشدنی الی ترک المعاصی

واعلمنی بان العلم نور — ونور الله لا یھدی لعاصی

میں نے حضرت وکیع رحمہ اللہ سے اپنے حافظہ کی کمی کی شکایت کی تو آپ نے میری گناہوں کو چھوڑ دینے کی راہنمائی کی اور آپ نے مجھے بتایا کہ بیشک علم نور ہے اور اللہ کا نور نافرمانوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

"وقال الامام مالک من عمل بما علما ورثه الله علم مالم یکن یعلم فالتقوی سبب

لا عطاء العلم النافع"

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں جو شخص علم کے مطابق عمل کرتا ہے تو اللہ تعالی اسے وہ علم عطاء فرماتا ہے جو اسے پہلے حاصل نہیں تھا لہذا تقوی سبب ہے نفع مند علم کے حاصل ہونے کا۔ (صاوی)

﴿وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ "اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے"۔

اس پر تمہارا حال مخفی نہیں وہ تمہارے اعمال کی تمہیں جزا دے گا۔ اللہ تعالی کی اپنے بندوں پر کامل رحمت ہے کہ وہ ان کے اعمال کی کیفیات کو جانتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس نے اس آیۃ کریمہ میں اپنے بندوں کو واضح طور پر لین دین کے احکامات بیان فرمائے کہ حقوق کی حفاظت کیلئے لکھنے کا حکم دیا اور گواہ بنانے کا حکم دیا گواہی کو حاصل کرنا یعنی گواہ بننے کا حکم دیا، گواہی دینے کا حکم دیا، پھر عدل وانصاف سے لکھنے کا حکم دیا، ان تمام احکام کی اصل وجہ یہ ہے:

"لئلا یجری من بعضهم علی بعض حیف ولئلا یتخاصموا ویتنازعوا فیحقد بعضهم علی بعض"

کہ بعض لوگ دوسرے پر ظلم نہ کریں، اور ایک دوسرے کوئی جھگڑا اور کوئی تنازع نہ کریں یہ جھگڑے اور فساد ایک دوسرے سے کھوٹ کینہ اور بغض کا ذریعہ ہیں۔ اس لئے رب تعالی نے گویا کہ اس آیۃ کریمہ میں بہت بسیط طریقہ سے وضاحت فرما کر یہ بتا دیا ہے کہ

"ان مراعاة حقوق الخلق واجبة والاحتياط على الاموال التى بها امور الدين والدنيا لازم فمن سعى بالحق فقد نجا والا فقد غوى"

بیشک مخلوق کے حقوق کی رعایت واجب ہے۔ اور امور دین و دنیا میں مال کے معاملہ میں احتیاط لازم ہے۔ جس شخص نے حق کی کوشش کی تحقیق وہ نجات حاصل کر گیا ورنہ بھٹک گیا۔

کسے را کہ سعی قدم بیشتر   بدرگاہ حق منزلش پیشتر

جس کسی نے زیادہ کوشش کا قدم بڑھایا۔ رب تعالی کی بارگاہ میں اس کا مقام آگے ہوگا (یعنی اسے قرب الہی حاصل ہوگا) یعنی جس نے اعمال میں زیادہ سے زیادہ کوشش کی اسے رب تعالی کا قرب حاصل ہوا۔ (از روح البیان)

فائدہ جلیلہ : اس آیۃ کریمہ میں غور وفکر کرنے سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ ایک اللہ تعالیٰ کا حال بندوں سے ہے اور دوسرا حال بندوں کا اللہ تعالیٰ سے ہے۔اور تیسرا حال بندوں کا آپس میں ایک دوسرے سے ہے۔

رب تعالیٰ کا حال بندوں سے یہ ہے:

کہ وہ اپنے بندوں پر اپنی مہربانیوں کو ظاہر فرماتا ہے،ان پر نرمی فرماتا ہے یہی وجہ ہے کہ رب تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دنیاوی معاملات سکھائے تاکہ وہ دنیا کے معاملہ میں خسارہ میں نہ ہوں اور ان کے درمیان عداوت نہ ہو اور کوئی جھگڑا نہ پایا جائے جس کی وجہ سے ان کی دنیاوی زندگی برباد نہ ہو اور آخرت میں عذاب کے مستحق نہ ہوں۔اللہ کے بندوں کو بھی چاہیے کہ وہ ان احکام اور ظاہری تکالیف کو اپنے لئے رحمت سمجھیں ''استعملھم بھا لیفیض بھا علیھم سجال نعمہ'' اور ان احکام پر عمل کریں تاکہ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی نعمتوں کے ڈول بھر بھر کہ بہائے یعنی ان پر بہت زیادہ اپنی نعمتوں کا فیضان کرے،رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

﴿مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ﴾

''اللہ تعالیٰ یہ ارادہ نہیں فرماتا کہ تمہیں حرج میں ڈالے لیکن ارادہ فرماتا ہے کہ وہ تمہیں پاکیزہ کرے اور تم پر اپنی نعمتیں مکمل فرمائے''

بندوں کو یہ علم حاصل ہونا چاہیے کہ وہ دقیق مسائل کی رعایت کریں،وہ یہ جانیں کہ امور دنیوی فانی ہیں اور امور اخروی باقی ہیں بندوں اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کثیر دقائق پائے جاتے ہیں اور بندں کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ان کا حساب لیا جائے گا۔

''وعلی مثقال ذرہ من خیرھامثابون وعلی مثقال ذرہ من شرھامعاقبون''

اور ایک ذرہ بھر نیکی کا انہیں ثواب دیا جائے گا اور ایک ذرہ بھر برائی پر انہیں (اگر رب کا فضل نہ ہوا) عذاب دیا جائے گا اور بندوں کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ امور دنیا کی رعایت زیادہ بہتر اور مناسب ہے کیونکہ رب تعالیٰ نے جس طرح بندوں کو اپنے لین دین کے معاملات کو لکھنے کا حکم دیا اور عدل وانصاف سے لکھنے کا حکم دیا،اسی طرح اس نے اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان ان کی جانوں کو خریدنے کا ایک وعدہ لکھا اور ارشاد فرمایا۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةُ ﴾

''بیشک اللہ نے خرید لیا ہے مؤمنوں سے ان کی جانوں اور مالوں کو بیشک اسکے بدلے ان کیلئے جنت ہے۔''

''وعلی هذا عاهدهم واشهد الملا ئكه الكرام عليه ثم رقم فی الكتا ب ان يا قوته من الجنة وديعة الحجر الاسود''

اسی پر اللہ تعالی نے ان سے وعدہ فرمایا اور ملائکہ کو اس پر گواہ بنایا، پھر یہ معاہدہ لکھ دیا گیا اور بیشک اسکا جنتی یا قوت امانت ہے، وہ حجر اسود ہے یعنی وہ معاہدہ حجر اسود میں محفوظ کر دیا گیا۔

بندوں کا حال آپس میں:

بندوں کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالی کی مہربانیوں کو دیکھ کر اپنے آپ میں وہی صفات لائیں تا کہ بندے رب تعالی کی صفات کا مظہر نظر آئیں، یعنی اللہ تعالی کی مہربانیوں، رحمتوں اور فضل وکرم کو دیکھ کر بندے آپس میں ایک دوسرے پر رحم کریں اور ایک دوسرے سے نرم سلوک کریں، اللہ تعالی کی حدود کی حفاظت کریں، رب تعالی کی رضاء کیلئے ہی کسی سے ناراض ہوں اور اسی کی رضاء کیلئے کسی سے محبت کریں، یعنی'' الحب لله والبعض لله'' کا کامل نمونہ بن کر رہیں۔

''وليتمسک بعروة محبتهم فی الله وجذ بتهم لله ونصحهم بالله ليحرز فی رفقتهم صراطا مستقيما ويفوز من زمر تهم فوزا عظيمافی جميع الاحوال كونوامع الله''

بندوں سے محبت کی رسی کو اللہ تعالی کی رضاء کیلئے ہی مضبوطی سے پکڑے، ان کی محبت کو کھینچ کر اللہ کیلئے ہی اپنے دل میں بسالے اور ان کو اللہ کے دین کی خالص نصیحت کرے اور رب تعالی کی رضاء کیلئے ان سے خالص محبت رکھے، نیک لوگوں کی رفاقت حاصل کر کے سیدھی راہ کو اختیار کرے اور ان کی جماعت سے مل کر بہت بڑی کامیابی حاصل کرے تو ہر حال میں اللہ تعالی کے ساتھ ہو جاؤ اللہ تعالی کے ساتھ ہونے کا یہی مطلب ہے کہ تمہارا ہر کام اللہ کیلئے ہو، کوئی کام کرو تو اللہ کیلئے اور کوئی کام چھوڑ و تو اللہ کیلئے، کسی سے محبت کرو تو اللہ کیلئے کسی سے بغض رکھو تو اللہ کیلئے، نیک لوگوں کی محافل میں بیٹھو تو اللہ کیلئے اور برے لوگوں کی محافل سے کنارہ کشی کرو تو اللہ کیلئے۔

یہ تین احوال جو بیان کئے ہیں ان تمام میں اللہ تعالی سے ڈرو، اللہ تعالی جمیع احوال میں تمہارے اقوال وا

فعال کو جاننے والا ہے، وہ تمہارے دلوں کی باتوں کو جانتا ہے، وہ تمہارے چھپے ہوئے رازوں کو جانتا ہے، وہ تمہارے اچھے اعمال کی تمہارے خلوص کے مطابق اور تمہاری صاف نیتوں کے مطابق جزاء دے گا۔

"فطوبی لمن صفی قلبه عن سفساف الاخلاق وعزم الی عالم السر والاطلاق واحسن المعامله مع الله فی جمیع الحالات ووصل الی الدرجات العالیات"

وہی خوش قسمت انسان ہے جس نے گھٹیا اخلاق سے اپنے دل کو صاف کرلیا اور رب تعالی کے قرب کیلئے اسی ذات کی طرف رجوع کرنے کا عزم کرلیا اور اسی ذات کی طرف چلا، یہی وہ مقام ہے جسے "عالم سر" (رازوں کا جہاں) کہا جاتا ہے۔

"ان عالم الغیب کالبیت المزین والهوی کالنقع المثار فما دام لم یترک المرء هواء لا یری ما یهواه فان الحجاب اذا توسط بین الرائی والمرئی یمنع من الرؤیة فارفع الموانع من البین وتشرف بوصول العین"

جس طرح مزین گھر کی زینت کو برقرار رکھنے کیلئے ضروری ہے کہ اسے گرد وغبار سے صاف رکھے، گرد وغبار کے ہوتے ہوئے زیب وزینت برقرار نہیں رہ سکتی، اسی طرح (بلاتشبیہ وتمثیل) اگر تم اللہ تعالی عالم الغیب کا قرب حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنی خواہشات نفسانیہ کو ترک کردو، اسی کی رضاء حاصل کرو، جب تک تم خواہشات نفسانیہ کو نہیں چھوڑو گے تو اپنے محبوب (یعنی رب تعالی کی ذات) کی تجلیات کو نہیں دیکھ سکو گے، کیونکہ یہ خواہشات حجاب کی حیثیت ہیں، جب تک دیکھنے والے اور جس چیز کو دیکھنا ان کے درمیان حجاب (پردہ) ہو تو دیکھنا ممکن نہیں اسی طرح رب تعالی کی تجلیات کو پانا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک یہ موانع نہ اٹھائے جائیں، خواہشات نفسانیہ کی کدورت اور گرد وغبار کو دور کردو تو رب تعالی کا تمہیں قرب حاصل ہوگا اور اسکی تجلیات کا تمہیں مشاہدہ نصیب ہوگا۔ بیشک تم مکان میں ہو گے وہ لامکان میں لیکن ذات قدیر کی قدرت سے بعید نہیں کہ وہ تمہیں اپنا قرب عطاء کردے بیشک اس قرب کی کیفیت کو بیان کرنا ممکن نہیں لیکن اس سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ (ماخوذ از روح البیان)

☆ "اخرج ابو یعقوب البغدادی فی کتاب روایة الکبار عن الصغار عن سفیان قال من

عمل بمایعلم وفق لما لایعلم"

حضرت سفیان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ شخص علم کے مطابق عمل کرے تو اللہ تعالی اسے مزید علم کی توفیق عطاء فرمادیتا ہے جو علم اسے حاصل نہیں ہوتا۔ (درمنثور)

☆ " اخرج ابو نعیم فی الحلیة عن انس قال قال رسول الله ﷺ من عمل بما علم ورثه الله علما مالم یعلم "

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص علم کے مطابق عمل کرتا ہے تو اللہ تعالی اسے اس علم کا وارث بنادیتا ہے جو وہ نہیں جانتا۔ (درمنثور)

☆ "واخرج الترمذی عن یزید بن سلمة الجعفی انه قال یا رسول الله انی سمعت منک حدیثا کثیرا اخاف ان ینسینی اوله آخره فحد ثنی بکلمة تکون جماعا قال اتق الله فیما تعلم "

یزید بن سلمہ جعفی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا یارسول اللہ بیشک میں نے آپ سے کثیر حدیثیں سنی ہیں، مجھے خوف ہوتا کہ میں آگے پہنچتا ہوں تو پیچھے سے بھول جاتا ہوں۔ اس لئے مجھے کوئی ایسا کلمہ بتائیں جس کی وجہ سے وہ مجھے مکمل طور پر یاد رہیں۔ آپ نے فرمایا جو علم تمہیں حاصل ہے اس میں اللہ تعالی سے ڈرو (یعنی علم کے مطابق عمل کرو) (درمنثور)

☆ " واخرج الدارمی عن عبد الله بن عمر ان عمر بن الخطاب قا ل لعبدالله بن سلا م من ارباب العلم قال الذین یعملون بما یعلمون قال فما ینفی العلم من صدور الرجا ل قال الطمع"

حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب نے حضرت عبداللہ بن سلام (رضی اللہ عنھم) سے پوچھا کہ اصحاب علم کون ہیں؟ تو انہوں نے کہا جو لوگ اپنے علم کے مطابق عمل کرتے ہیں، پھر آپ نے فرمایا کہ علم لوگوں کے سینوں سے کس چیز کو دور رکھتا ہے تو انہوں نے کہا لالچ کو (درمنثور) یعنی حقیقی عالم وہ ہے جو علم کے مطابق عمل کرے اور اس کے دل میں لالچ نہ پائی جائے، رب تعالی کے حضور عرض کناں ہوں کہ اے رب کائنات ہمارے قال کو حال بنا دے اور دینی علوم کی تعلیم اور مسائل کے بیان کرنے اور فتوی لکھنے میں کسی طرح دل میں لالچ نہ آئے، طمع وحرص کے

بغیر علوم دینیہ کی تعلیم دے سکیں۔ (یا اللہ! یہود و نصاریٰ کی سازش سے علماء اور علوم دینیہ کی حفاظت فرما)۔ (درمنثور)

☆ "واخرج البیھقی فی الشعب عن جابر بن عبد اللہ قال تعلموا الصمت ثم تعلموا الحلم ثم تعلموا العلم ثم تعلموا العمل بہ ثم انشروا"

حضرت جابر عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں خاموشی سیکھو، پھر بردباری سیکھو، پھر علم سیکھو، پھر علم کے مطابق عمل کرنا سیکھو، پھر علم کو پھیلاؤ۔ (درمنثور)

یعنی تبلیغ کرنا آخری درجہ ہے، اس سے پہلے یہ تمام چیزیں حاصل ہونا ضروری ہیں، خاموشی،، بردباری، علم اور علم کے مطابق عمل۔

☆ "واخرج ابو الشیخ من طریق جویبر عن الضحاک عن ابن عباس قال قال رسول اللہ ﷺ العلم حیاۃ الاسلام وعماد الایمان ومن علم علما أنمی اللہ لہ الی یوم القیامۃ ومن تعلم علماء فعمل فان حقا علی اللہ ان یعلمہ مالم یکن یعلم"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا علم اسلام کی زندگی ہے (یعنی علم دین اور علماء دین کی وجہ سے ہی اسلام زندہ رہے گا) اور علم ایمان کا ستون ہے اور جس شخص نے علم حاصل کیا اللہ تعالیٰ اسکا اجر قیامت تک بڑھاتا رہے گا اور جس شخص نے علم حاصل کیا پھر اسے مطابق عمل کیا تو بیشک اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ کرم پر یہ لگا لیا ہے کہ وہ بندہ یہ حق رکھتا ہے کہ اسے وہ علم عطاء کردیا جائے جو علم وہ نہیں جانتا۔ (درمنثور)

☆ "واخرج ھناد عن الضحاک قال ثلاثہ لا یسمع اللہ تعالیٰ لھم دعاء رجل معہ امراۃ زناء کلما قضی شھوتہ منھا قال رب اغفرلی فیقول الرب تبارک وتعالیٰ تحول عنھا وانا اغفرلک والافلا ورجل باع بیعا الی اجل مسمی ولم یشھد ولم یکتب فکافرہ الرجل بمالہ فیقول یارب کافرنی فلان بمالی فیقول الرب لا آجرک ولا اجیبک انی امرتک بالکتاب والشھود فعصیتنی ورجل یأکل مال قوم وھو ینظر الیھم ویقول یا رب اغفرلی ما أکل من مالھم فیقول الرب تعالی

ردالیھم مالھم والا فلا“

ضحاک کہتے ہیں تین اشخاص کی دعاء کورب تعالیٰ قبول نہیں فرماتا، ایک وہ شخص جو کسی عورت سے زنا کا مرتکب ہوتا رہتا ہے۔ جب بھی اس سے اپنی شہوت پوری کر لیتا ہے تو کہتا ہے۔ ''رب اغفرلی'' اے میرے رب میری مغفرت فرما رب تعالیٰ فرماتا ہے تو اس فعل سے اور اس عورت سے مکمل طور پر پھر جا، دور ہو جا تو میں تیری مغفرت کر دوں گا ورنہ نہیں (کیونکہ تیری توبہ سچے دل سے نہیں ہوتی صرف زبان سے مغفرت کی دعاء توبہ کیلئے کافی نہیں) اور (دوسرا) وہ شخص جو ایک وقت تک (یعنی ادھار) خرید وفروخت کرتا ہے اور گواہ نہیں بناتا اور لکھتا نہیں وہ خریدار اس کے مال کا انکار کر دیتا ہے کہ میں نے اس کا کوئی مال نہیں دینا تو وہ شخص (یعنی بائع) کہتا ہے اے میرے رب فلاں شخص نے میرے مال کا انکار کر دیا ہے تو رب تعالیٰ فرماتا ہے میں تمہیں کوئی اجر نہیں دوں گا اور نہ ہی تیری دعاء کو قبول کروں گا کیونکہ میں نے تمہیں حکم دیا تھا کہ ادھار لین دین کو لکھ لینا اور گواہ بنالینا تم نے میرے حکم کی نافرمانی کی (خیال رہے کہ یہ وعید اسی وقت ہے جبکہ پہلے ہی معلوم تھا کہ جس سے میں ادھار کی بیع کر رہا ہوں وہ فراڈی، جھوٹا ہے انکار کر دے گا تو لکھنا واجب تھا ورنہ لکھنا یا گواہ بنانا مستحب ہے، ترک مستحب پر گناہ اور وعید نہیں) اور تیسرا وہ شخص ہے جو لوگوں کا مال ناحق طور پر کھاتا رہتا ہے۔ وہ ان کو دیکھ رہا ہوتا ہے (یعنی قوم کا مال ان کے سامنے ظالمانہ طور پر ہڑپ کر جاتا ہے) پھر کہتا اے میرے رب میری مغفرت فرما دے جو مال میں ان کا کھا رہا ہوں، تو رب تعالیٰ فرماتا ہے ان لوگوں کا مال ان پر لوٹا دے تو میں تیری مغفرت کر دوں گا ورنہ نہیں۔ (یعنی بندے جب تک خود اپنے حقوق معاف نہ کریں میں ان کے حقوق (یعنی حقوق العباد) معاف نہیں کرتا۔ (درمنثور)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ☆ (آیة نمبر ۲۸۳)

﴿۱﴾

اور اگر تم سفر میں ہو اور لکھنے والا نہ پاؤ تو گرو ہو قبضہ میں دیا ہوا، اور اگر تم میں ایک کو دوسرے پر اطمینان ہو تو وہ جسے اس نے امین سمجھا تھا اپنی امانت ادا کر دے اور اللہ سے ڈرو جو اس کا رب ہے اور گواہی نہ چھپاؤ اور جو گواہی چھپائے گا تو اندر سے اس کا دل گنہگار ہے اور اللہ تمہارے کاموں کو جانتا ہے۔

﴿۲﴾

اور اگر ہو تم سفر میں اور تم نہ پاؤ لکھنے والا تو رہن ہو قبض کیا ہوا، پھر اگر بعض تمہارا امن میں ہو بعض سے تو ادا کر دے وہ شخص جس کے پاس امانت رکھی گئی اسکی امانت اور چاہیے کہ ڈرے اللہ سے جو اسکا رب ہے اور نہ چھپاؤ گواہی کو اور جو شخص چھپائے گا اسے (گواہی) تو بیشک گنہگار ہوگا اسکا دل اور اللہ جو تم عمل کرتے ہو جاننے والا ہے۔

ماقبل سے تعلق:

بیع کے تین طریقوں کا ذکر فرمایا گیا، پہلی آیۃ میں ذکر فرمایا کہ جب ادھار کی بیع ہو تو اسے لکھ لو اور گواہ بنا لو۔ اب اس آیۃ کریمہ میں ذکر کیا جا رہا ہے کہ اگر سفر میں تمہیں لکھنے والا نہ ملے، یا لکھنے والا ملے لیکن لکھنے کیلئے کاغذ، سیاہی قلم وغیرہ میسر نہ ہوں تو قرض لے کر اسکے بدلے کوئی چیز قرض دینے والے کے پاس رہن رکھ دو تا کہ وہ مطمئن ہو

جائے کہ میرا قرض مجھے مل جائے گا اور تیسری چیز کا بھی اسی آیۃ کریمہ میں ذکر کیا جارہا ہے کہ امانتیں واپس لوٹائی جائیں جب اعتماد بحال ہو۔

یعنی بیع کی تین قسمیں ہوگئیں "بیع بکتاب و شھود، بیع برھان مقبوضہ، بیع امانت" اس آیۃ کریمہ کا ماقبل سے رابطہ بھی سمجھ آگیا اور یہ بھی سمجھ آگیا کہ بنسبت لکھنے کے اور بنسبت گواہ بنانے کے ادھار کی بیع میں یا قرض کے بدل رہن رکھنے میں زیادہ احتیاط پائی گئی ہے۔ (از کبیر)

آیۃ کریمہ کا مختصر مطلب:

آیۃ کریمہ کا مختصر مطلب یہ ہے کہ اے لین دین کا معاملہ کرنے والو! جب تم سفر میں ہو وہاں کوئی لکھنے والا نہ ہو تو تم اپنی کوئی چیز مالک (قرض خواہ) کے پاس رہن رکھ دو اور وہ چیز اس کے قبضہ میں دے دو، یعنی اسے وثوق (پختہ اعتبار) حاصل ہو جائے کہ مجھے اپنا قرضہ مل جائے گا، اگر تم میں سے بعض نے بعض کو امین سمجھ کر اسے بغیر لکھنے اور بغیر رہن کے مال دے دیا جو امانت کے درجہ میں ہے تو اس شخص کو چاہیے کہ وہ قرض جو حکم امانت میں ہے ادا کر دے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو جو تمہارا رب ہے یعنی بلا عذر قرض واپس نہ کرنا اور ٹال مٹول کرنا رب تعالیٰ کے عذاب اور اسکی گرفت کا ذریعہ ہے اسلئے اس سے ڈرو، اور اگر تمہارے پاس گواہی موجود ہے تو اسے چھپاؤ نہیں اور جو شخص گواہی کو بغیر کسی عذر کے چھپائے گا تو وہ اندر سے دلی طور پر گنہگار رہو گا اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو جاننے والا ہے، لہذا تمہیں چاہیے کہ تم اپنے اعمال کو درست رکھو۔

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ﴾ ''اور اگر تم سفر میں ہو''۔

''قال اھل اللغة ترکیب ھذہ الحروف للظھور والکشف''

اہل لغت نے یہ بیان کیا ہے کہ ان حروف سے ترکیب (یعنی س، ف، ر سے بننے والا کلمہ) کشف وظہور پر دال ہے یعنی ان حروف سے بننے والے کلمہ میں معنی پایا جاتا ہے ''ظاہر ہونا اور منکشف ہونا''

''کتاب'' کو ''سفر'' کہا جاتا ہے کیونکہ یہ ایک چیز کو بیان کرتی ہے اور اس کی وضاحت کرتی ہے۔ ''سفر'' کو

''سفر'' کہنے کی بھی یہی وجہ ہے کہ اس سے لوگوں کے اخلاق واضح اور ظاہر ہوتے ہیں یا اس وجہ سے ''سفر'' کو''سفر'' کہنے کی یہ وجہ ہے کہ پہلے وہ شخص اپنے گھر میں رہنے کی وجہ سے مکنون (چھپا ہوا) تھا اب باہر نکلنے کی وجہ سے وہ ظاہر ہو گیا یا اس وجہ سے ''سفر'' کو''سفر'' کہتے ہیں کہ جب بندہ گھر سے نکلتا ہے تو اس کا گھر اس شخص سے خالی ہونے کی وجہ سے منکشف ہو جاتا ہے۔

اور کہا جاتا ہے ''اسفرت المراۃ عن وجھھا ''عورت نے اپنے چہرے سے پردہ ہٹا کر چہرے کو ظاہر و منکشف کر دیا۔

اور کہا جاتا ہے ''سفرت عن القوم ،اسفر سفارۃ '' یعنی سفیر بنا، چونکہ سفیر کچھ اپنی باتیں بتاتا ہے اور ان لوگوں کی دلوں کی باتیں اس پر ظاہر ہوتی ہیں۔ اور''اسفر '' کا معنی جھاڑو دینا بھی آتا ہے، کوڑے کو''سفر'' کہا جاتا ہے ،چونکہ جھاڑو دینے سے کوڑے اور گردوغبار سے جگہ کو صاف کر کے ظاہر کر دیا جاتا ہے،''السفر من الورق ''اس وقت بولا جاتا ہے جبکہ زمین کو پتوں سے صاف کر کے زمین کو ظاہر و منکشف کر دے۔ سورج کے غائب ہونے کے بعد جو کچھ دیر کیلئے روشنی رہتی ہے، اس روشنی کو بھی ظہور کی وجہ سے ''سفر'' کہا جاتا ہے۔ (کبیر)

﴿وَلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا﴾ ''اور نہ پاؤ تم لکھنے والا''

سفر میں لکھنے والے کو نہ پانے کے دو مطلب ہیں، ایک یہ کہ واقعی لکھنے والا ہی کوئی نہ ملے اور دوسرا یہ ہے کہ لکھنے والا تو مل رہا ہو لیکن آلات کتابت میسر نہ ہوں، کاغذ، قلم، دوات نہ مل سکیں تو ان دونوں صورتوں میں لکھنے والے کا نہ ملنا سچا آرہا ہے۔

﴿فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ﴾ ''تو رہن ہو قبض کیا ہو''

''رھن '' کا معنی اردو زبان میں ''گرد'' یا ''گروی'' کیا جاتا ہے، اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ''گرد'' ترجمہ کیا ہے اور ہماری پنجابی زبان میں '' گانڑھے رکھنا'' کہا جاتا ہے۔ آجکل اردو زبان میں بھی عربی لفظ ''رھن ''ہی استعمال ہو رہا ہے، اسی وجہ سے راقم نے اپنے ترجمہ میں بھی ''رھن ''کا لفظ ہی استعمال کیا ہے۔

''رھن '' کا اصطلاحی معنی:

''معنى الرهن احتباس العين وثيقة با لحق ليستوفى الحق من ثمنها او من ثمن منا

فعها عند تعذر اخذه من الغریم"

"رھــــن " کا اصطلاحِ فقہاء میں یہ معنی ہے کہ "عین چیز کو روک رکھنا کہ وہ حق کا وثیقہ بن جائے"، یعنی ایک چیز کا ثمن (قیمت) جو اس نے وصول کرنا ہے وہ وصول ہو سکے یا مقروض (قرض دہندہ) سے منافع کا ثمن حاصل کر سکے جب عین چیز حاصل نہ کر سکے۔ (قرطبی)

لیکن خیال رہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک منافع کی قیمت نہیں، طلباء کرام نورالانوار میں اس مسئلہ کو تفصیلی طور پر دیکھیں۔

رھن کا لغوی معنی : دوام واستمرار (ہمیشہ رہنا) جیسے کہا جاتا "رھنه" اس نے فلاں کو ہمیشہ رکھا" ایک شاعر نے کہا:

الخبز و اللحم للھم راھن　　　　وقھوۃ راو وقھاساکب

روٹی اور گوشت ان کو ہمیشہ حاصل رہا اور قہوہ پلانے والے ان پر انڈیل دیا (وافر مقدار میں دیا)

اور کہا جاتا ہے "ارھنت لھم الطعام و الشراب " میں ان کو ہمیشہ کھانے اور پینے کی اشیاء دیتا رہا۔

ابوعلی نے کہا کہ کسی مہنگی چیز کیلئے "ارھـــــــت" (ثلاثی مزید فیہ) استعمال ہوتا اور بیع یا قرض کیلئے "رھنت" (ثلاثی مجرد) استعمال ہوتا ہے۔ کمزور اونٹوں یا کمزور لوگوں کو بھی "راھنی" کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ کوئی شاعر اپنی زوجہ کو کہتا ہے۔

اما تری جسمی خلا قدرھن　　　　ھز وما مجد الرجال فی السمن

کیا تو میرے جسم کو لاغر و کمزور دیکھ رہی ہے؟ موٹاپے میں تو لوگوں کو بزرگی حاصل نہیں۔ (ماخوذ از قرطبی)

اصطلاحات : جو شخص اپنی چیز کسی کے پاس گرو رکھے اس شخص کو "راہن" کہا جاتا ہے۔ اور جس کے پاس وہ چیز رکھے اسے "مرتہن" کہا جاتا ہے اور وہ چیز "رہن، مرہون، رہین یا رہینہ" کہلاتی ہے۔ (ماخوذ از قرطبی)

دینی طلباء اکرام کے ذوق کیلئے:

"رھــن" کا لفظ کبھی مصدر کے طور پر استعمال ہوتا ہے جس کا معنی ہوگا "رہن رکھنا" مصدری معنی کے لحاظ

پر جب کہا جائے " رهنت رهنا" تو "رهنا" پر نصب مفعول مطلق کے طور پر آئے گی اور معنی ہوگا ''میں نے رہن رکھا رہن رکھنا'' یعنی میں نے یقیناً رہن رکھا اور جب ''رہن'' کا لفظ بطور اسم استعمال ہو تو " رهنت رهنا" میں "رهنا" پر نصب بطور ''مفعول بہ'' کے ہوگی۔ اب معنی ہوگا ''میں نے فلاں چیز رہن رکھی۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے "سقف" کا معنی چھت بنانا بھی ہے اور چھت بھی اور "نشر" کا معنی پھیلانا بھی ہے اور پھیلائی ہوئی چیز بھی اور ''خلق'' کا معنی پیدا کرنا بھی ہے اور ''مخلوق'' بھی اور قلیل طور پر بھی استعمال ہے کہ ''فعل'' کا معنی کرنا بھی ہے اور کیا ہوا کام بھی ہے۔ جب ''رھن'' کا لفظ بطور اسم استعمال ہوگا تو اس کی جمع بھی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض حضرات نے "رهان" کو مصدر کہا ہے اور بعض حضرات نے ''رھن'' کی جمع کہا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

رھن کے جواز پر دلیل:

''وهو مشروع بقوله تعالیٰ فرهان مقبوضه" رہن کے جواز پر ایک دلیل تو رب تعالیٰ کا یہی ارشاد گرامی جس کی بحث جاری ہے۔ "فرهان مقبوضة" تو رہن ہو قبض کیا ہوا۔ اور دوسری دلیل ''وبما روی انه عليه اسلام اشترى من يهودی طعاما ورهنه به درعه '' یعنی رہن کا جواز حدیث پاک سے بھی ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہودی سے طعام خریدا اور اس کے بدلے اپنی زرہ کو رہن رکھا۔ آپ کا یہ فعل یعنی رہن رکھنا رہن کے جواز پر روز روشن کی طرح دلیل ہے۔

اور تیسری دلیل "وقد انعقد علی ذالک الاجماع" یعنی رہن کے جواز پر اور دلیل یہ ہے کہ اجماع امت سے رہن کا جواز ثابت ہے۔ (ہدایہ)

رہن کیلئے قبض کرنا ضروری ہے:

یعنی رہن ایجاب وقبول سے منعقد ہوتا ہے اور قبض کرنے سے مکمل ہوتا ہے جب تک مرتہن رہن کو اپنے قبضہ میں نہیں لے گا اس وقت تک رہن مکمل نہیں ہوگا کیونکہ رب تعالیٰ نے ''فرهان'' کے ساتھ " مقبوضة "کی قید لگائی ہے۔

" لاجل هذا القيد قال ابو حنيفة و الشافعی و احمد رحمهم الله لا يجوز الرهن

ای لا یلزم بدون القبض"

اسی قید کی وجہ سے امام اعظم ابوحنیفہ اور امام شافعی اور امام احمد رحمھم اللہ نے فرمایا کہ رہن بغیر قبض کرنے کے لازم نہیں ہوتا البتہ امام مالک رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ نفس عقود سے ہی رہن مکمل ہو جاتا ہے لیکن راہن کو مجبور کیا جائے کہ وہ مرتہن کو قبضہ دے دے۔

"لنا ان مشروعیته ولزومه ثبت بنص القرآن مقبوضة"

ہماری دلیل یہ ہے کہ جب قرآن پاک کی نص سے ثابت ہے کہ رہن قبض کیا ہوا ہو یعنی رہن میں راہن قبضہ دے دے۔ اور مرتہن قبضہ کر لے۔ اگر چہ قیاس چاہتا ہے کہ رہن میں قبض کرنا خوشی پر موقوف ہونا چاہیے لیکن حکم "فیقتصر علی مور دالنص" نص پر موقوف رہے گا۔ نص کے مقابلہ میں قیاس کو چھوڑ دیا جائے گا۔ (مظہری)

رہن کی تکمیل کے بعد مرھون کا حکم:

جب رہن رکھی ہوئی چیز پر مرتہن نے قبضہ کر لیا اور راہن نے اسے قبضہ دے دیا تو وہ چیز راہن کے قبضہ سے نکل گئی، اور مرتہن کے قبضہ میں آ گئی۔ البتہ ملکیت راہن کی ہی رہے گی مرتہن کو ملکیت حاصل نہیں ہوگی۔ جب راہن کا قبضہ ختم ہو جاتا ہے تو راہن رہن کے طور پر رکھی ہوئی سواری پر سوار نہیں ہو سکتا، اور رہن رکھے ہوئے مکان میں سکونت اختیار نہیں کر سکتا۔ اسی طرح رہن رکھے ہوئے کپڑے کو پہن نہیں سکتا۔ ہاں اگر مرتہن اجازت دے دے تو پھر سواری پر سوار ہو سکے گا، مکان میں رہائش رکھ سکے گا، کپڑا پہن سکے گا۔ اصل وجہ یہ ہے کہ قرض کی ادائیگی تک رہن والی چیز کو اپنے پاس روک کر رکھنے کا اختیار ہے اور قبضہ بھی مرتہن کا ہی ہے، اگر راہن کو مرتہن کی اجازت کے بغیر تصرف کی اجازت دے دی جائے تو مرتہن کے قبضہ کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے، اسلئے راہن باوجود مالک ہونے کے مرتہن میں تصرف نہیں کر سکے گا۔ یہ تمام تفصیل امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ہے۔

طلباء کرام عربی عبارت سے زیادہ محبت رکھتے ہیں، وہ مندرجہ بالا اردو کو مندرجہ ذیل عربی کی عبارت میں دیکھیں ۔

"واذاتم الرهن بالقبض خرج المرهون من ملک الراهن یدا وبقی فی ملکه رقبة و ملکه المرتهن یدا لارقبة فلا یجوز الراهن الانتفاع بالمرهون من رکوب الدابة

المرهونة والسكون في الدار ولبس الثوب و نحو ذلك الابرضاء المرتهن لانه ينافي ما لكية المرتهن يدا سولزعم جسه دائما هذا عند ابی حنيفة رحمه الله"

اور امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں راہن کو جائز ہے کہ وہ اس سے نفع حاصل کرے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا"الرهن مركوب محلوب " رہن کی سواری اختیار کی جاسکتی ہے اور اس کا دودھ دوہا جاسکتا ہے۔

"قلنا هذاالحديث مجمل يحتمل ان يكون مركوبا للراهن ويحتمل ان يكون مركوبا للمرتهن فلا يجوز الاستدلال به"

ہم کہتے ہیں یہ حدیث مجمل ہے اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ راہن کے سوار ہونے کا ذکر ہو، اور یہ بھی ہے کہ احتمال کے مرتہن کے سوار ہونے کا ذکر ہو لھذا اس حدیث سے دلیل پکڑنا درست نہیں لھذا راہن یا مرتہن دونوں میں سے کسی ایک کو بھی سواری پر سوار ہونا جائز نہیں ہوگا۔ راہن کو اس لئے کہ اس کا قبضہ نہیں اور مرتہن کو اس لئے کہ وہ مالک نہیں۔ (ماخوذ از مظہری)

راہن کے مرہون میں تصرفات:

راہن کے مرہون چیز میں تصرفات شرعیہ کی دو قسمیں ہیں۔

ایک وہ جو فسخ کا احتمال رکھتے ہیں اور دوسرے وہ جو فسخ کا احتمال نہیں رکھتے۔ مثال کے طور پر بیع اور ہبہ وغیرہ فسخ کا احتمال رکھتے ہیں۔ اگر راہن نے مرہون چیز کو بیچ دیا یا کسی کو ہبہ کر دیا تو اس کی بیع یا ہبہ کرنا جائز تو ہوگا کیونکہ وہ اپنی چیز کا مالک ہے لیکن اس کی بیع یا ہبہ مرتہن کی اجازت پر موقوف ہوگا یا رہن کے چھڑانے پر موقوف ہوگا۔ اگر مرتہن نے اجازت دے دی تو ٹھیک اور اگر اس نے قرض ادا کر کے اپنی رہن رکھی ہوئی چیز واپس کر لی پھر بھی ٹھیک ورنہ بیع اور ہبہ موقوف رہیں گے اور اگر فسخ کا احتمال نہ رکھے جیسے غلام آزاد کرنا۔ اگر راہن نے اپنے رہن رکھے ہوئے غلام کو آزاد کر دیا تو وہ آزاد تو ہو جائے گا کیونکہ عتق (آزاد کرنے میں) فسخ کا احتمال نہیں، البتہ غلام کے آزاد ہونے کے بعد دیکھا جائے کہ مالک غنی ہے یا تنگدست ہے اگر غنی ہو تو غلام کی جتنی قیمت بنتی ہے اتنی قیمت وہ مرتہن کے پاس بطور

رہن رکھ دے اور اگر مالک تنگدست ہے تو غلام محنت ومزدوری کر کے اپنی قیمت مرتہن کے پاس بطور رہن رکھ دے۔ مالک جب قرض ادا کر دے تو یہ آزاد کردہ غلام اپنی رقم واپس کر لے یا مالک اپنی طرف سے غلام کی قیمت رہن رکھنے کی صلاحیت حاصل کر چکا ہے تب بھی غلام اپنی رقم واپس لے لے گا۔ یہ مذہب امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک عتق بھی بیع کی طرح موقوف رہے گا اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اگر مالک غنی تھا تو عتق نافذ ہو گیا۔ اگر تنگدست ہو تو اس کا عتق نافذ نہیں ہوگا۔ (مظہری)

مرہون کے نفقہ اور اس کے زوائد کا حکم:

"یجب علی الراھن نفقة المرھون بناء علی ملک الرقبة"

رہن رکھی ہوئی چیز کا خرچ ''خواہ غلام یا لونڈی یا کوئی جانور وغیرہ ہوں'' مالک پر ہی لازم ہوگا۔

یعنی اس چیز کا مالک جب راہن ہے تو اسی کے ذمہ خرچ ہوگا۔

رہن رکھی ہوئی چیز کے زوائد یعنی اولاد جیسا کہ گائے، بھیڑ، بکری وغیرہ رہن رکھی ہوئی تھیں، ان کے بچے پیدا ہو گئے تو وہ بچے راہن کے ہی ہوں گے کیونکہ رہن رکھی چیز جب اس کی ہے تو اس کے بچے بھی یقیناً اسی کے ہوں گے۔ اسی طرح بھیڑ وغیرہ کی اون، بکری کے بال راہن کے ہوں گے اور گائے وغیرہ کا دودھ بھی راہن کا ہوگا۔ اور درخت رہن رکھا ہوا تھا تو اس کا پھل بھی راہن کا ہی ہوگا۔ وجہ سب چیزوں کی ملکیت کی ایک ہی ہے کہ جب راہن اصل چیز کا مالک ہے تو اس چیز سے زائد چیزیں جو حاصل ہوں ان کا بھی وہی مالک ہوگا۔

اس مسئلہ پر اجماع منعقد ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "لہ غنمہ وعلیہ غرمہ" رہن رکھی ہوئی چیز کے منافع بھی راہن کو حاصل رہیں گے اور اس کی چٹی یعنی اس کا خرچ، چٹی وغیرہ بھی راہن پر لازم رہیں گے۔ وجہ وہی ہے کہ رہن رکھی ہوئی چیز کا مالک راہن ہے۔ اگرچہ بعض حضرات نے کہا تھا کہ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ زوائد کی ملکیت مرتہن کو حاصل رہے گی، لیکن ابن جوزی کی تحقیق کی عبارت سے یہ واضح ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ کا اس مسئلہ میں مذہب یہ ہے۔

''انہ ملک الراھن عندہ حیث قال للمرتھن استیفاء النفقة من درہ وظھرہ''

کہ رہن والی چیز راہن کے ملک میں ہی رہے گی، کیونکہ راہن مرتہن کو کہے گا کہ تو اس گائے اور بھیڑ وغیرہ کے دودھ اور صوف کی قیمت سے ان کا خرچ پورا کرلے۔ (مظہری)

خیال رہے کہ اس مسئلہ میں تقریباً ہمارا مذہب بھی یہی ہے کہ راہن اپنی مرہون چیز کا خرچ ادا کرلے اور اس کے زوائد خود حاصل کرلے۔ چاہے تو مرتہن کو یہ کہے کہ تو اس کے زوائد سے اس چیز پر خرچ کرلے کمی اور بیشی کا حساب ہو جائے گا۔ اگر دودھ، اون وغیرہ کی قیمت سے خرچ زیادہ ہوا تو میں دے دوں گا اور دودھ، اون وغیرہ کی قیمت خرچ سے زائد ہوئی تو وہ زائد رقم تم مجھے دے دینا۔

مرھون کے زوائد بھی مرھون ہوں گے:

جس چیز کو رہن رکھا گیا" زوائد المرهون يكون مرهونا عند ابی حنيفة رحمه الله "اس کے زوائد یعنی اولاد، اون وغیرہ بھی رہن ہوں گے یہ مذہب ہے امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا کیونکہ جو حکم اصل کا ہے وہی زوائد کا ہوگا، لہٰذا مالک تو راہن ہی ہوگا لیکن قبضہ مرتہن کا رہے گا۔

"وبناء على عدم مالكيته رقبة لا يجوز للمرتهن الا ئتفاع بالمرهون بل يكون ذلك ربا ولا يجوز للمرتهن في المرهون شئی من التصرفات المبنية على الملك"

جب اصل مالک راہن ہی ہے۔ مرتہن مالک نہیں تو رہن رکھی ہوئی چیز سے مرتہن کا نفع حاصل کرنا ربوا (سود) بنے گا اس لئے مرتہن رہن رکھی ہوئی چیز سے کوئی ایسا نفع حاصل نہیں کرسکتا جس کا تعلق ملکیت سے ہو۔ (مظہری)

معاشرہ کا بگاڑ: آجکل زمین عام طور پر رہن رکھ کر قرض لیا جاتا ہے، زمین کا مالک راہن ہوتا ہے لیکن زمین کی پیداوار مرتہن استعمال کرتا ہے اور قرض بھی اسکا جوں کا توں رہتا ہے، یہ نفع حاصل کرنا شرعاً حرام ہے اور سود ہے، جس سے مسلمان کو اجتناب ضروری ہے۔ (راقم)

فقیہ اعظم رحمہ اللہ کا عظیم فتوٰی:

حضرت شیخ کامل، فقیہ اعظم مولانا نور اللہ بصیر پوری رحمہ اللہ ایک سوال کا جواب دیتے ہیں۔

الاستفتاء :

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید نے زمین خرید نے کیلئے بکر سے آٹھ ہزار روپیہ مانگا، تو بکر نے روپیہ اس شرط پر دیا کہ رقم کی ادائیگی تک زمین میرے قبضہ میں رہے گی اور جملہ آمدنی بھی میری ہوگی جب رقم ادا کی گئی تو زمین واپس دے دوں گا مگر وہ آمدنی اس رقم میں شمار نہیں کی جائے گی، تو کیا بکر کی یہ شرط درست ہے اور آمدنی بغیر عوض کے لے سکتا ہے یا نہیں؟

جواب:

بکر نے آٹھ ہزار کے عوض آٹھ ہزار لینا ٹھہرایا اور زمین کی آمدنی مدت مجہول تک بھی مزید برآں کی لینی شرط کی اور یہ صراحۃ سود ہے کہ شریعت غراء (روشن) کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ ایسا قرض جس میں مقرض کی منفعت مشروط ہو ربو ہے۔ تفسیر خازن ج ص ۲۵۲ تفسیر معالم التنزیل ج ا ص ۲۵۲، تفسیر روح البیان ج ا ص ۴۳۷، میں ہے "کل قرض جر منفعة فهو ربوا" (ہر قرض جس میں نفع حاصل کیا جائے وہ ربو ہے) ومثلہ فی المبسوط الامام شمس الائمۃ السرخسی ج ۱۴ ص ۳۵، نیز شامی ج ۴ ص ۲۴۲، شامی ج ۵ ص ۴۲۷ میں جواھر الفتاوی سے ہے۔

"اذا كان مشروط صار قرضا فيه منفعة وهو ربوا" (جس قرض میں نفع حاصل کرنے کو شرط رکھ دیا جائے تو وہ ربوا ہے)

فتح القدیر ج ۶ ص ۱۴۷ میں ہے "القرض بالشرط حرام" (نفع کی شرط پر قرض دینا حرام ہے)

مبسوط ج ۱۴ ص ۳۵، ہدایہ مطبوعہ مع الفتح ج ۶ ص ۳۵۶، فتاوی خیریہ ج ۳ ص ۱۱۸ میں ہے "واللفظ من الخیریۃ"

"وقد نهى عن كل قرض جر منفعة" (ہر اس قرض سے منع کیا گیا ہے جس میں منفعت پائی جائے) فتاوی عالمگیری میں ہے "قال محمد فی کتاب الصرف ان ابا حنیفة كان يكره كل قرض جر منفعة" (امام محمد رحمہ اللہ نے کتاب الصرف میں ذکر فرمایا ہے کہ بے شک امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ہر وہ قرض ناپسند سمجھتے تھے جس میں نفع حاصل کیا جاتا) سنن بیہقی ج ۵ ص ۳۵۰ میں حضرت ابن سیرین سے ہے کہ ایک شخص نے دوسرے کو کچھ روپے قرض دیئے اس شرط پر کہ اس کے گھوڑے پر سواری کرے گا تو حضرت عبداللہ بن مسعود جلیل القدر صحابی نے

فرمایا ''مااصاب من ظهره فهو ربوا'' جوشخص اس پر سواری کرے وہ سود ہے۔

موطاامام مالک ص ۲۸۳ میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''وان کان قبضة عن علف فهو ربوا'' کہ اگر چہ مٹھی بھر گاس ہوتو وہ بھی سود ہے۔ سنن بیہقی کے اسی صفحہ پر حضرت فضالہ بن عبید صحابی سے روایت کہ آپ نے فرمایا ''کل قرض جر منفعة فهو وجه من وجوه الربوا'' (ہر قرض جس سے نفع حاصل کیا جائے، نفع کی وجوہ میں سے کوئی وجہ بھی ہو وہ ربوا ہے) سنن بیہقی ج ۶ ص ۳۸ میں حضرت ابراہیم (نخعی) تابعی سے ہے کہ سلف صالحین (جو سادات تابعین اور صحابہ کرام تھے) رہن سے ذرہ بھر نفع اٹھانے کو بھی ضرور برضرور براجانتے تھے۔

''ان کانوالیکرهون ان یستمتعوا من الرهن بشئی''

(کہ وہ رہن سے کسی طرح کا نفع حاصل کرنا ناپسند سمجھتے تھے) اسی صفحہ پر امام شافعی رحمہ اللہ کا فتویٰ نقل فرماتے ہیں ''لیس للمرتهن منها شئی'' (مرتہن کو نفع حاصل کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں) اور ایسے ہی ص ۳۹ میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ صحابی اور شعبی تابعی سے ہے۔

حضرت شریح جلیل القدر تابعی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ صحابی نے اس کا نام سود رکھا۔ حضرت شریح کا ذکر ان الفاظ میں ہے۔

''سئل شریح عند رجل ارتهن بقرة فشرب من لبنها قال ذالک شربه الربوا''

(حضرت شریح رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص کے پاس گائے کو رہن رکھا گیا تو اس نے اس گائے کا دودھ پی لیا تو اس کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اس کا رہن والی گائے کا دودھ پینا ربوا ہے) اور حضرت مسعود رضی اللہ عنہ کا فتویٰ کنز العمال ض ۳ ص ۲۶۱ میں بھی مذکور ہے ''برمز عب'' والنظم''

''جاء رجل الی ابن مسعود فقال ان رجلارهننی فرسا فرکبتها قال مااصبت ظهرها فهو ربوا''

ایک شخص حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آیا کہ میرے پاس ایک شخص نے ایک گھوڑی رہن رکھی میں اس پر سوار ہو گیا' آپ نے فرمایا سواری کے پیٹھ سے جو تم نے نفع حاصل کیا ہے وہ

ربوا ہے) اور سود سخت ترین حرام ہے اور بدترین کام ہے۔قرآن کریم کی متعدد آیات مبارکہ اور بکثرت احادیث شریفہ اور اجماع امت وجمیع ائمہ اور قیاس شرعی سے خباثت سود اور شقاوت سودخوار ثابت ہے۔قرآن کریم کی صرف ایک آیہ پاک سنئے۔

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ﴾

اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا ہے سود، اگر تم مسلمان ہو، پھر اگر ایسا نہ ہوتو یقین کرلو اللہ اور اللہ کے رسول سے لڑائی کا۔

صرف ایک حدیث شریف بھی سنیں، مشکوۃ شریف ص ۲۴۶ میں بروایت ابن ماجہ وبیہقی فی شعب الایمان سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "الربو اسبعون جزا ایسرھا ان ینکح الرجل امہ "یعنی سود کے ستر ٹکڑے (حصے) ہیں ان ستر کا سب سے ہلکا یہ ہے کہ مرد اپنی ماں کے ساتھ مجامعت کرے۔

"اعاذنا اللہ تعالی من ذالک "ہم اس سے اللہ تعالی کی پناہ مانگتے ہیں۔

فتویٰ کو ذرا طول اس وجہ سے دیا کہ آج یہ "وباء عام" واقع ہے کہ لوگ ایسی صورتوں کو رہن کا نام دے کر اس خالص سود کو شیر مادر (ماں کا دودھ) تصور کئے ہوئے ہیں، حالانکہ ہمارے حضرات فقہائے کرام نے ایسی صورتوں کو اجارہ فاسدہ کے مرتبہ میں قرار دیا ہے۔کہ اگر نفع اٹھائے تو اجر لازم اور رہن نہ ہوگا۔شامی ج ۵ ص ۴۲۸ میں ہے۔

"قال فی التتار خانیة ما نصہ ولو استقرض دراھم وسلم حمارہ الی المقرض یستعملہ الی شھرین حتی یوفیہ دینہ او دارہ یسکنھا فھو بمنزلة الا جارة الفاسدة ان استعملہ فعلیہ اجر مثلہ ولایکون رھنا"

تتارخانیہ میں واضح طور پر ذکر ہے کہ "اگر کوئی شخص کسی سے قرض لے اور اسے اپنا گدھا دے دے کہ تم اس سے نفع حاصل کرتے رہو یہاں تک کہ میں تمہیں قرض واپس کردوں گا (تم مجھے گدھا واپس کردینا) یا کسی سے قرض لے اور اپنا مکان اسے دے دے کہ تم اس سے نفع حاصل کرتے

رہو یاں تک کہ میں تمہیں جب قرض واپس کر دوں گا تو تم مجھے مکان واپس کر دینا یہ اجارہ فاسدہ کے درجہ میں ہے اگر اس شخص نے گدھے یا مکان سے فائدہ حاصل کیا تو اس پر لازم ہے کہ جو اجرت بنتی ہے وہ ادا کر دے اسے رہن نہیں کہا جاتا، کیونکہ رہن سے نفع حاصل کرنا جائز نہیں۔

اور ایسے ہی ص ۵۳ میں ہے:

"مع زيادة التعليل 'لان المستقرض انما اسكنه فى داره عوضا عن منفعة القرض لا مجانا"

(اس کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ جس شخص نے قرض لیا ہے اس نے دینے والے کو اپنا مکان ٹھہرنے کیلئے اس لئے دیا ہے کہ وہ قرض کے بدلے اس سے نفع حاصل کر لے' اس نے مکان مفت عاریۃ (منگوا) تو اس کو نہیں دیا ہے لہذا یہ ربوا ہے حرام ہے، یہ رہن نہیں) بلکہ یہ " لزوم اجر مثل" (جتنا کرایہ بنتا ہے اتنا دینا) حدیث شریف سے مستفاد ہے" کنز العمال ج ۳ ص ۲۴۸، ۲۷۸ میں برمزطب حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے ہے:

"من رهن بدين عليه فانه يقضى من ثمر تها ما فضل بعد نفقتها يقتضى ذالک من دينه ذالک الذى عليه بعد ان يحسب لصاحبها الذى هى عنده عمله ونفقته بالعدل "

الحاصل، اجر مثل دے کر جان چھڑائے اگر کچھ نفع اٹھا چکا ہے تو اور اگر ابھی تک نفع نہیں اٹھا چکا تو شرط کو اٹھا کر معاملہ نیک کر لے ورنہ زمرہ سود خواراں میں داخل اور وعید و عذاب ربوا خواران اسے شامل ہوگا۔ (فتاوی نوریہ ج ۴ ص ۱۷۸ تا ص ۱۹۱ مع تراجم راقم)

مرتہن کا مرہون پر خرچ کرنے کا حکم:

"ما انفق المرتهن على المرهون ان كان باذن الراهن يكون دينا عليه وان كان بغير اذنه يكون متطوعا"

مرتہن نے اگر راہن کی اجازت سے مرہون پر خرچ کیا تو وہ راہن پر قرض ہوگا۔ اگر راہن سے اجازت نہیں لی تو راہن پر قرض نہیں ہوگا بلکہ اپنی خوشی سے خرچ کئے ہونے کا عوض نہیں ہوگا۔

البتہ امام احمد رحمہ اللہ نے مطلقا راہن کے ذمہ قرض قرار دیا ہے خواہ اس کی اجازت سے رہن پر خرچ کیا گیا

یا بغیر اجازت کے۔ ابن جوزی نے امام احمد رحمہ اللہ کے مذہب پر حدیث پاک سے دلیل پکڑی ہے، وہ حدیث یہ ہے "الرهن مركوب و محلوب" رہن والی چیز پر سوار ہو سکتا ہے اور اس کا دودھ دوہ سکتا، تاہم اس حدیث کا جواب پہلے گذر چکا ہے کہ یہ حدیث مجمل ہے اس سے دلیل پکڑنا درست نہیں۔ (مظہری)

اعتراض: حدیث بخاری سے تو یہ سمجھ آرہا ہے کہ مرتہن رہن سے فائدہ بھی حاصل کر سکتا ہے اور نفقہ بھی اسی پر لازم ہے۔

"عن الشعبی عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ الرهن بما فيه يركب بنفقته اذا كان مرهونا و لبن الدر يشرب بنفقته اذا كان مرهونا وعلى الذی يركب و يشرب نفقته"

سواری کو جب رہن رکھا جائے تو اس پر نفقہ کے بدلے سوار ہو جائے، اور دودھ والے جانور کا دودھ اس پر خرچ کے بدلے پی لے، جو سوار ہوگا اور دودھ پئے گا خرچ اسی پر لازم ہوگا۔

جواب: ہو سکتا ہے یہ حکم ربوا کے حرام ہونے سے پہلے کا ہو جب قرض سے نفع حاصل کرنا جائز تھا۔ لیکن قرض سے نفع حاصل کرنے کی ممانعت پر یہ حدیث منسوخ ہوگئی ہو۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ راہن اور مرتہن میں یہ طے پا جائے کہ راہن مرتہن کو یہ کہے تم اس سواری پر سوار ہو سکتے ہو لیکن اس کا کرایہ تمہارے ذمہ ہوگا، اسی کرایہ سے اس جانور کا خرچ پورا کرنا۔ اگر خرچ سے کرایہ زیادہ ہوا تو مجھے دے دینا۔ اگر کم ہو تو مجھ سے لے لینا یا یہ کہے کہ اس جانور کا دودھ تم پی لینا دودھ کی قیمت سے تم اس جانور کا خرچ پورا کرنا، یہ جائز ہے۔ اس صورت میں یہ حدیث منسوخ نہیں۔ (ماخوذ از مظہری)

مرہون چیز مرتہن کی ضمان میں ہوتی ہے:

"واذا سلمه اليه فقبضه دخل فی ضمانه" جب راہن نے مرتہن کے قبضہ میں ایک چیز دے دی تو وہ اس کی ضمان میں آگئی۔

اگر رہن کا مال ہلاک ہو گیا تو مرتہن کا اس کی قیمت کے برابر قرض واپس لینے کا حق ختم ہو گیا۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رہن اس کے ہاتھ میں امانت ہے اس کے ہلاک ہونے پر قرض ساقط نہیں ہوگا۔

"بقوله عليه السلام لا يغلق المرهن قالها ثلاثا لصاحبه غنمه وعليه غرمه" رواه ابن

حبان فی صحیحه والدارقطنی والحکم من طریق ابن سعد عن الزهری عن سعید بن المسیب عن ابی هریرة مرفوعا" (هدایة، مظهری)

"ومعنی قوله علیه السلام لا یغلق الرهن لا یصیر مضمونا بالدین وقوله لصاحبه غنمه ای زوائده یکون له وعلیه غرمه ای لو هلک لهلک علی المراهن" (الکفایة)

امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا رہن کو بند نہ کیا جائے، یہ تین مرتبہ ارشاد فرمایا اسی کے صاحب کے منافع بھی ہیں اور اسی پر تاوان بھی۔ حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ رہن کو بند نہ کیا جائے کہ قرض کو اس کی ضمان بنالیا جائے (تو کوئی قرض دے ہی نہیں) اور آپ کے ارشاد "لصاحبه غنمه" کا مطلب یہ ہے کہ راہن جو اس چیز کا صاحب و مالک ہے اسی کیلئے اس کے زوائد یعنی جانوروں کی اولاد اور اون وغیرہ بھی ہیں۔ "وعليه غرمه" کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ رہن والا مال ہلاک ہوگیا تو راہن کا مال ہی ہلاک ہوا، یہی مطلب ہے کہ اس کے صاحب پر چٹی اور تاوان ہے۔ یعنی مرتہن کے قرض میں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ مرھون چیز کی ہلاکت پر مرتہن پر کوئی ضمان نہیں ہوگی۔ خیال رہے کہ بعض نسخوں میں "لا یعلق الراھن" (یعنی مہملہ ہے) ہے یعنی رہن کو معلق نہ چھوڑا جائے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے عقلی دلیل اس پر یہ قائم کی ہے کہ رہن تو ایک قسم کا وثیقہ وضمان ہے۔ جس طرح دستاویز لکھی جائے وہ وثیقہ وضمان ہوتی ہے۔ جب دستاویز کے ضائع ہونے سے قرض میں کوئی فرق نہیں پڑتا، اسی طرح مرھون چیز کی ہلاکت پر قرض میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

احناف کے دلائل یہ ہیں:

"قال ﷺ بعد ما نفق فرس الرهن عنده ذهب حقک" (هدایة)

اصل حدیث پاک کے الفاظ یہ ہیں:

"عن عطاء بن رباح ان رجلا ارتهن فرسا فمات الفرس فی یدالمرتهن فقال رسول الله ﷺ ذهب حقک رواه الطحاوی" (مظهری)

عطاء بن رباح کہتے ہیں کہ ایک شخص نے ایک گھوڑا اپنے پاس بطور رہن رکھا۔ وہ گھوڑا اسی مرتہن کے ہاتھ

میں ہلاک ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارا حق چلا گیا۔ (یعنی اتنا تمہارا قرض ساقط ہو گیا)۔

خیال رہے "ھذا مرسل والمرسل عند نا حجة" یہ حدیث مرسل ہے اور مرسل حدیث ہمارے نزدیک حجت ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کی دلیل کا جواب یہ ہے کہ حدیث شریف میں "وعلیه غرمه" (اور صاحب رہن یعنی راہن پر چٹی، تاوان ہے) کا یہ مطلب نہیں کہ رہن والی چیز کے ہلاک ہونے پر راہن کے ذمہ سے قرض ساقط نہیں ہوگا اور مرتہن پر کوئی ضمان نہیں ہوگی بلکہ حدیث شریف کا مطلب یہ ہے۔

ومعنى قوله "له غنمه" يعني زوائد المرهون له "وعليه غرمه" يعني عليه نفقته وهذا المعنى مجمع عليه "

حدیث شریف میں "لہ غنمہ" کا مطلب یہ ہے کہ مرہون چیز کے زوائد راہن کیلئے ہیں اور "وعلیه غرمه" کا مطلب یہ ہے کہ مرہون چیز کا خرچ راہن کے ذمہ ہے۔ "وعلیه غرمه" کا جو معنی ہم نے بیان کیا ہے اس پر اجماع ہے۔ (از مظہری)

اور امام شافعی رحمہ اللہ نے حدیث پاک "لا یغلق الرهن" جو پیش کی ہے اس کا مطلب "اقتباس کلی" ہے۔ یعنی مرتہن کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مرہون چیز کا مالک بن جائے، اور نہ ہی راہن کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ قرض کا مالک بن جائے اور قرض واپس ہی نہ کرے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کی عقلی دلیل کا یہ جواب ہے کہ رہن وثیقہ ہے کہ مرتہن کو یہ اعتبار ہے کہ راہن میرے قرض کا انکار نہیں کرے گا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ مرہون چیز کے ہلاک ہونے پر اس پر کوئی ضمان ہی نہ ہو۔ مرہون چیز کی جتنی قیمت ہوگی اس مرہون کے ہلاک ہونے پر اتنی مقدار میں قرض کم ہو جائے گا۔ (ماخوذ از ہدایہ)

"فالقول بالامانة خرق الاجماع ولم يفهم احد من اللغة من قوله عليه اسلام لا يغلق الرهن نفي الضمان عن المرتهن "

یہ کہنا کہ رہن امانت ہے یہ اجماع امت کے خلاف ہے۔ نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی "لایغلق المرهن" کا اہل لغت میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہیں سمجھا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ رہن کے ہلاک ہونے میں مرتہن پر کوئی ضمان لازم نہیں آتی۔

علامہ کرخی رحمہ اللہ نے سلف صالحین یعنی طاؤس اور ابراہیم نخعی وغیرہ سے ذکر کیا ہے کہ اہل علم نے اس پر اتفاق کیا ہے "لا یغلق المرھن "کا معنی یہ ہے:

"لا یحبس الرھن عند المرتھن احتیاسا لا یمکن فکا کہ بان یکون مملو کا للمرتھن "

کہ رہن کو مرتھن اپنے پاس کامل طور پر روک کر مالک ہی نہ بن بیٹھے کہ اس سے رہن والی چیز کو چھڑانا ہی ممکن نہ رہے۔ سلف صالحین کا اس معنی پر اتفاق روائت زہری کی وجہ سے ہے۔

"عن الزھری ان اھل الجاھلیة کا نوا تر تھنون و یشترطون علی الراھن انه ان لم یقض الدین الی وقت کذا فالرھن مملوک للمرتھن فابطل رسول الله ﷺ ذالک بقوله "لا یغلق الرھن "

زہری کہتے ہیں بیشک زمانہ جاہلیت میں لوگ رہن رکھتے تھے، مرتھن راہن پر شرط لگاتا کہ اگر تم نے وقت مقرر پر قرض ادا نہ کیا تو یہ مرہون چیز میری ملکیت ہوگی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے اس طریقہ کو باطل کر دیا اور ارشاد فرمایا "لا یغلق المرھن "(مہملہ سے) کہ رہن کو اس شرط سے معلق نہ کرو کہ اگر وقت مقرر پر تم نے قرض ادا نہ کیا تو مرہون چیز میری ملکیت میں ہوگی۔ اور "لا یغلق الرھن "(غین معجمہ سے ہو) تو معنی یہ ہے کہ اس قسم کی شرطیں لگا کر رہن کو بند نہ کرو۔ جو تمہارے لئے مشکلات کا سبب بن جائے اور قرض کا لین دین ہی ختم ہو جائے۔ (ماخوذ از کفایہ)

رہن سے ہلاک ہونے پر ضمان کا طریقہ:

اگر رہن اور قرض برابر تھے، یعنی جتنی قیمت مرہون چیز کی ہو اتنی مقدار میں قرض بھی دیا گیا ہو تو رہن کے ہلاک ہونے پر قرض ختم ہو گیا۔ اگر رہن کی قیمت کم ہو اور قرض زیادہ ہو تو رہن کے ہلاک ہونے کی صورت میں اتنی مقدار میں قرض کم ہوگا جتنی مقدار رہن کی قیمت تھی باقی قرض ادا کرنا پڑے گا۔ اگر رہن کی قیمت زیادہ تھی اور قرض کم تھا تو رہن کے ہلاک ہونے پر اس کی قیمت کا حساب کر کے قرض ختم کر کے باقی قیمت راہن کو دی جائے گی۔ (ماخوذ از ہدایہ)

مرہون چیز کو روک رکھنے کا حکم:

جب تک راہن قرض ادا نہ کرے اس وقت تک مرتہن کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے پاس مرہون چیز کو روک رکھے۔ مرتہن جب قرض کی ادائیگی کا راہن سے مطالبہ کرے گا تو مرتہن کو بھی حکم دیا جائے گا کہ تو مرہون چیز حاضر کر تا کہ قرض ادا کرتے وقت مرہون چیز مرتہن سے لے کر راہن کے حوالہ کی جائے۔

مرھون چیز سے ہر قسم کا نفع حاصل کرنا منع ہے:

"ولیس للمرتھن ان یشفع بالرھن لا با ستخدام ولا بسکنی ولا لبس الا ان یاذن له المالک لان له حق الحبس دون الا نتفاع"

مرتہن کو یہ حق حاصل نہیں کہ رہن والی چیز سے نفع حاصل کرے، کوئی غلام یا لونڈی رہن رکھے گئے تو ان سے خدمت حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی مکان رہن رکھا گیا ہو تو اس میں وہ سکونت اختیار نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی کپڑا رہن رکھا جائے تو وہ پہن نہیں سکتا۔ ہاں البتہ مالک اسے اجازت دے دے تو جائز ہے۔ مرتھن کو نفع حاصل کرنے کی اجازت اس لئے نہیں کہ اسے مرھون چیز اپنے پاس روکنے کا حق شریعت نے دیا ہے، نفع حاصل کرنے کا حق نہیں دیا۔ (از ہدایہ)

خیال رہے کہ قرض دیتے وقت یہ شرط لگائی جائے کہ تم میرے پاس فلاں چیز رہن رکھو اور جب تک تم قرض ادا نہیں کرو گے تو میں اس چیز سے نفع حاصل کروں گا۔ اس صورت میں نفع حاصل کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح شرط تو نہیں لگائی گئی البتہ مالک کی اجازت کے بغیر نفع حاصل؛ کرنا شروع کر لیا تو یہ بھی منع ہے۔ ہاں البتہ مرتہن نے بغیر کسی شرط کے قرض دے دیا اور راہن نے اس کے پاس کوئی چیز رہن رکھ دی بعد میں مالک نے اسے اجازت دے دی کہ تم میری مرہون چیز سے نفع حاصل کر لیا کرو، تو یہ جائز ہے۔ لیکن تقویٰ کے پھر بھی خلاف ہے۔ تقویٰ یہ ہے کہ مالک کی اجازت ہو یا نہ ہو کسی طرح بھی مرہون چیز سے نفع نہ حاصل کرے، کیونکہ جس طرح ربوا سے بچنا ضروری ہے، اسی طرح جہاں ربوا کا شائبہ بھی پایا جائے اس سے بچنا تقویٰ ہے۔ (راقم)

مرہون چیز کی حفاظت کون کرے گا:

مرتہن خود حفاظت کرے یا اس کی زوجہ حفاظت کرے یا اس کی اولاد جو اس کے ساتھ اس کے گھر میں رہتے

ہوں ان میں سے کوئی حفاظت کرے، البتہ وہ بچے جو بڑے ہوں ماں باپ سے علیحدہ رہتے ہوں وہ اس حکم میں داخل نہیں۔ اسی طرح وہ خادم جو گھر میں رہتا ہو، خواہ ماہانہ تنخواہ لیتا ہو، یا سال کی ایک مرتبہ لیتا ہو، خواہ بغیر تنخواہ کے ہی مستقل طور پر گھر میں رہتا ہو وہ بھی حفاظت کرسکتا ہے۔ لیکن ایسا خادم جو یومیہ مزدوری لیتا ہے اور گھر میں مستقل طور پر نہیں رہتا اس سے حفاظت نہیں کرائی جاسکتی۔

جن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے بغیر کسی اور سے اگر حفاظت کرائی گئی اور رہن والی چیز ہلاک ہوگئی تو ضمان لازم آئے گی۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک دوسرا جو حفاظت کررہا تھا جسے حفاظت کرنے کا حق نہیں تھا اس پر ضمان لازم آئے گی اور امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک ضمان مرتہن پر لازم آئے گی۔

مرتہن کا رہن میں تعدی کرنا:

اگر مرتہن جان بوجھ کر رہن والی چیز میں خود تجاوز کرلے اور اس تجاوز وتعدی کی وجہ سے وہ چیز ہلاک ہوجائے تو اس پر اسی طرح ضمان لازم آئے گی جیسے غاصب پر ضمان لازم آتی ہے۔ یعنی کل قیمت کی ضمان لازم آئے گی، اسلئے کہ جو قرض کی مقدار سے زائد رقم بنتی تھی وہ اس کے ہاتھ میں امانت کے درجہ میں تھی اور امانت میں تجاوز کرنے اور اس کے ہلاک ہونے پر ضمان لازم آتی ہے۔ (از ہدایہ)

مرتہن کا رہن میں تصرف کرنا:

مرتہن کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ رہن کو بیچ دے یا کرایہ پر دے یا عاریۃ (منگوئی) کسی کو دے۔ اسلئے کہ جب اسے خود نفع حاصل کرنے سے منع کیا تو دوسرے کو بھی وہ نفع حاصل کرنے کیلئے نہیں دے سکتا۔ ہاں مالک اسے کہے کہ میری یہ چیز تم بیچ دو تو پھر بیچ سکتا ہے اور بیچ کردہ قیمت بطور رہن رکھ لے۔ (ماخوذ از ہدایہ)

تنبیہ: پھل درخت سے توڑے ہوئے ہوں تو پھل رہن رکھے جاسکتے ہیں۔ لیکن جب پھل درخت پر ہی ہوں، توڑے ہوئے نہ ہوں تو بغیر درخت کے صرف پھل رہن نہیں رکھے جاسکتے۔ کوئی فصل، کھیتی کاٹ لی جائے تو اسے رہن رکھا جاسکتا ہے لیکن کاٹنے کے بغیر زمین میں کاشت شدہ کھیتی بغیر زمین کے رہن نہیں رکھی جاسکتی۔ اسی طرح

کاشت شدہ کھیتی کے بغیر صرف زمین رہن نہیں رکھی جاسکتی، ہاں البتہ اگر زمین پہلے کھیتی سے فارغ کرلی جائے تو صرف زمین رہن رکھی جاسکتی ہے۔ (ماخوذازہدایہ)

زمین کو رہن رکھنے سے اس میں لگے ہوئے درخت خود بخود رہن میں داخل ہو جائیں گے، حویلی اور صحن کو رہن رکھنے سے اس میں بنے ہوئے کمرے خود بخود رہن میں داخل ہو جائیں گے۔ (ہدایہ)

وہ چیزیں جن کا رہن رکھنا منع ہے :

کسی کی امانت کو رہن رکھنا جائز نہیں، کسی سے مانگی ہوئی چیز کو رہن رکھنا منع ہے، کسی کا مال تجارت کی غرض سے (بطور مضاربت) لیا ہوا رہن نہیں رکھا جاسکتا، مال شرکت یعنی جس مال میں دوسرے شرکاء کا بھی حصہ ہو اسے بھی رہن نہیں رکھا جاسکتا، اسی طرح چیز کو بیچ دیا گیا، مبیع (بیچی ہوئی چیز) بیچنے والے کے ہاتھ میں تو وہ رہن رکھنا جائز نہیں۔ البتہ بدل خلع اور مہر اور قتل عمد میں صلح کی وجہ سے حاصل ہونے والے مال کو رہن رکھنا جائز ہے۔ (ماخوذازہدایہ)

نوحہ کرنے والی عورت کی اجرت یا گانا گانے والی عورت کی اجرت کو رہن رکھا نہیں جاسکتا کیونکہ یہ اجرت ضائع ہونے پر کوئی ضمان نہیں جبکہ رہن کے ضائع ہونے پر ضمان ہے۔ مسلمان شراب رہن نہیں رکھ سکتا کیونکہ مسلمانوں کیلئے شراب مال نہیں، اگر کوئی شراب کو ضائع کردے تو اس پر ضمان نہیں، رہن تو وہ چیز رکھی جاسکتی ہے جس کے ضائع ہونے پر ضمان لازم آئے۔ (از ہدایہ)

باپ کا چھوٹے بیٹے، بیٹی کا مال رہن رکھنا:

اگر باپ نے اپنی نابالغ اولاد کا مال اپنی طرف سے رہن رکھا یا نابالغ اولاد کا مال ان کی جانب سے ہی رہن رکھا تو جائز ہے، جس طرح چھوٹی اولاد کا مال باپ کو بیچنے کا حق حاصل ہے، کیونکہ باپ کو کامل شفقت حاصل ہوتی ہے لھذا اس کا رہن رکھنا جائز ہے بلکہ باپ بچے کی جانب سے خود ہی راہن اور مرتہن ہو تب بھی جائز ہے وہ وجہ اسکی شفقت ہی ہے کہ بچے کے حق میں اس کا کام شفقت آمیز ہوگا نقصان دہ نہیں ہوگا۔ (ہدایہ بتصرف)

کسی تیسرے کے پاس رہن رکھنا:

اگر راہن اور مرتہن دونوں رضاء مند ہو جائیں کہ رہن والی چیز کسی عادل کے پاس رکھ دی جائے تو یہ جائز ہے۔ جب مرتہن نے عادل کے پاس رہن رکھنے پر رضاء مندی کا اظہار کرلیا تو اسے اپنا قرض ملنے پر وثوق حاصل ہو گیا۔ عادل شخص رہن والی چیز راہن یا مرتہن میں سے کسی ایک کو دوسرے کی موجودگی کے بغیر نہیں دے سکے گا دونوں موجود ہوں تو واپس کردے، وہ چیز خود بخود مرتہن کے پاس آجائے گی، کیونکہ رہن نے مرتہن کے پاس ہی ہونا تھا۔

راہن کی وفات پر رہن کا حکم:

راہن اگر فوت ہو جائے تو رہن ختم نہیں ہوگا، بلکہ وہ ورثاء کی طرف مستقل ہو جائے گا کہ وہ پہلے اپنے مورث لہ کا قرض ادا کریں اسکے بعد رہن والی چیز واپس کریں۔ بغیر قرض کی ادائیگی کے ان کو رہن کے منسوخ کرنے کا کوئی حق نہیں۔

فائدہ عظیمہ:

" اتفقت الفقها ء اليوم على ان الرهن لا يجو ز الا فى السفر والحضر سواء فى حال وجود الكا تب وعدمه "

فقہاء کرام کا اس مسئلہ میں اتفاق ہے کہ رہن رکھنا ہر صورت میں جائز ہے خواہ سفر میں ہو یا سفر میں نہ ہو بلکہ گھر ہی موجود ہو۔ پھر عام ہے کہ لکھنے والا موجود ہو یا نہ ہو رہن رکھنا جائز ہے، وجہ اس کی واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی زرہ یہودی کے پاس جو کے بدلے جو رہن رکھی تھی وہ بغیر سفر کے رہن تھا اور لکھنے والے بھی موجود تھے۔

" وانما تقيدت الا ية بذكر السفر على سبيل الغالب كقوله تعالى ﴿ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ اِنْ خِفْتُمْ﴾ وليس الخوف من شرط جو از القصر"

آیۃ کریمہ میں جو سفر کا ذکر کیا گیا ہے وہ غالب ضرورت سفر میں واقع ہونے کی وجہ سے مقید کیا گیا

ہے جس طرح قصر نماز کے متعلق رب تعالیٰ نے بیان فرمایا، تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم نماز کو قصر کرو اگر تمہیں خوف ہو، خوف کا ذکر ابتدائی طور پر آیۃ کے نزول کے وقت اکثر واقع ہونے کی وجہ سے کر دیا گیا ہے، ورنہ نماز کا قصر کرنا خوف پر موقوف نہیں۔ سفر کی مقدار پوری ہونے پر نماز قصر کی جا سکے گی، خواہ خوف ہو یا نہ ہو۔ (کبیر بزیادۃ)

﴿فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ﴾

''پھر اگر بعض تمہارا امن میں ہو بعض سے تو ادا کر دے وہ شخص جس کے پاس امانت رکھی گئی، اس کی امانت''۔

بیع کی یہ تیسری قسم ہے:

''وھو بیع الا ما نۃ اعنی ما لا یکون فیہ کتابۃ و لا شھو د و لا یکون فیہ رھن''

جسے بیع امانت سے تعبیر کیا گیا ہے، اس میں نہ لکھنا شرط کیا گیا ہے اور نہ گواہ بنانے اور نہ ہی رہن رکھنے کی اس میں شرط رکھی گئی ہے۔ (کبیر)

قرآن پاک کے ان الفاظ مبارکہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم میں سے کوئی شخص کسی دوسرے پر اعتبار کرے، اسے امین سمجھے کہ یہ میرا قرض واپس لوٹا دے گا تو اسے بغیر لکھنے اور بغیر گواہ بنانے اور بغیر رہن رکھنے کے اسے قرض دے دے، اور اس شخص کو بھی چاہیے کہ وہ وقت مقرر پر یا جس شخص نے اسے قرضہ دیا ہے اس کے مطالبہ پر اسکا قرض واپس دے دے۔

(فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا)ای بعض الدا ئنین بعض المد یو نین و استغنی بامانتہ عن الرھن و الکتابۃ''

''پھر اگر امن میں ہو بعض تمہارا بعض سے'' اسکا مطلب یہ ہے کہ جو حضرات اپنا مال کسی کو بطور قرض دے رہے ہیں یہ قرضہ دینے والے ان لوگوں سے امن میں ہیں، جنہیں یہ قرض دے رہے ہیں تو یہ قرض دے دیں، یہ لوگ اپنے قرض کے بدلے رہن رکھنے یا قرض کو لکھنے سے بے پرواہ ہوں گے، اپنی کوئی ضرورت در پیش نہیں ہوگی۔

(فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ) ای فلیو د المدیون الذی کا ن امینا و مؤتمنافی ظن

الدائن فلا یخلف ظنه فی اداء امانته وحقه الیه ٗ

تو ادا کر دے وہ شخص جس کے پاس امانت رکھی گئی، اسکی امانت کو یعنی مقروض جو قرض دھندہ (قرض دینے والے) کے گمان میں امین سمجھا گیا کہ یہ بڑا امانت دار ہے تو اسے بھی چاہیے کہ وہ اسکے گمان کے خلاف نہ کرے بلکہ اس کا قرض ادا کر دے تا کہ اس کا گمان اس شخص کے حق میں سچا ہو سکے۔ (کبیر)

" امانته ای دینه سماه اما نة لا یتمانه بترک الکتابة والرهن "

یہاں امانت کا جو ذکر ہے اس سے مراد دین (قرض) ہے، قرض کو امانت سے اسی وجہ سے تعبیر کیا گیا کہ قرض دینے والے نے مقروض کو امین سمجھا اس پر اعتبار کیا اور کتابت اور رہن کی بھی ضرورت محسوس نہ کی۔ (مظہری)

"عن انس قال قلما خطبنا رسول ﷺ الاقال لا ایمان لمن لا امانة له ولادین لمن لا عهد له رواه البیهقی فی الشعب"

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول ﷺ نے کم ہی ہمیں خطبہ دیا مگر یہ کہا اس شخص کا ایمان کامل نہیں جس کو امانت کا پاس نہیں اور اس شخص کا دین کامل نہیں جس کو وعدہ کا پاس نہیں۔

(مظھری)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے ارشاد کا مطلب یہ کہ رسول ﷺ نے اکثر اوقات ہمیں خطبہ دیتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا، بہت کم ہی ایسا خطبہ آپ کا پایا گیا ہو جس میں آپ نے یہ ذکر نہ فرمایا ہو۔

اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ کا خوبصورت تحقیق پر مبنی ترجمہ:

(فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ) کی تفسیر جو کبیر اور مظہری سے بیان کی گئی ہے اسے دیکھنے کے بعد اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ کے ترجمہ کو دیکھیں تو آپ کو بہت خوبصورت، تحقیق پر مبنی، مطلب کو سمجھانے والا ترجمہ نظر آئے گا، منصف مزاج کو بے ساختہ کہنا پڑے گا کہ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علم کا بحر بیکراں تھے، فہم و ذکاء کا دریاء رواں تھے آپ کا تر

جمہ یہ ہے اور اگر تم میں ایک دوسرے پر اطمینان ہو تو وہ جسے اس نے امین سمجھا تھا اپنی امانت ادا کر دے راقم نے طلباء کرام کیلئے لغوی معنی تحریر کیا ہے، لیکن راقم کا ترجمہ مطلب کو سمجھانے کے لئے کافی نہیں، البتہ مختصر مطلب جو راقم نے لکھا ہے اس سے مطلب حاصل کیا جا سکتا ہے۔ صرف ترجمہ سے یہ مطلب حاصل کرنے کیلئے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کی طرف ہی رجوع کرنا پڑے گا۔

﴿ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ﴾ ''اور چاہیئے کہ ڈرے اللہ سے جو اس کا رب ہے''۔

یعنی امانت کی رعایت کرنے میں اور قرض ادا کرنے میں ٹال مٹول نہ کرنے میں (اسی وقت عمل کر سکتا ہے) جبکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے، اس کا خوف دل میں رکھے۔ (روح البیان)

☆ " عن سمرة ان رسول اللہ ﷺ قال علی الید ما اخذت حتی تؤدیه" (رواہ احمد واھل السنن)

حضرت سمرہ فرماتے ہیں بے شک رسول ﷺ نے فرمایا ''ہاتھ پر لازم ہے کہ جو لے وہ ادا کرے''۔ (صابونی)

حاصل ارشاد یہ ہے کہ مدیون ''جس سے قرض دینے والے نے اچھا معاملہ کیا، (اسے امین سمجھا) اسے لکھنے کی یا گواہ بنانے کی تکلیف نہیں دی کو بھی چاہئے کہ وہ اللہ سے ڈرے اور قرض دینے والے سے اچھا معاملہ کرے، حق سے انکار نہ کرے اور وقت مقرر پر قرض ادا کر دے، ضمنی طور پر ایک مسئلہ بھی سمجھ آ گیا کہ مرتہن کے ہاتھ میں رہن امانت ہوتا ہے، مال واپس مل جانے پر مرتہن کو چاہیے کہ بغیر ٹال مٹول کے اور بغیر کسی کمی کے رہن راہن کو واپس کر دے۔

(از کبیر)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا :"آیة المنافق ثلاث (و ذکر فیه) اذا ائتمن خان " منافق کی نشانیاں تین ہیں۔ ان میں ایک یہ ذکر فرمائی کہ جب اس کے پاس امانت رکھی جاتے تو خیانت کرے۔ (مظہری)

﴿ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ﴾ ''اور نہ چھپاؤ گواہی''۔

اے گواہو! جب تمہیں حاکم کے پاس گواہی دینے کیلئے بلایا جائے تو گواہی نہ چھپاؤ۔ (روح البیان)

گواہی دینے کی ضرورت پر گواہی نہ دینا بھی گواہی چھپانا ہے اور گواہی میں ردوبدل کرنا بھی گواہی چھپانے کے مترادف ہے۔

﴿وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ اٰثِمٌ قَلْبُهُ﴾

اور جو شخص چھپائے گا اسے (گواہی کو) تو بیشک گنہگار ہوگا اس کا دل۔

گناہ کی نسبت دل کی طرف کرنے کی کیا وجہ ہے؟

"واسند الاثم الی القلب لا ن الکتمان فعل القلب ففی الا سناد الیه تا کید و مبا لغة"

گناہ کی نسبت دل کی طرف اس لئے کی گئی، کہ چھپانا دل کا ہی فعل ہے، جب دل گواہی چھپائے گا تو دل ہی سب اعضاء سے زیادہ گنہگار ہوگا۔ دل کی طرف نسبت کر کے تاکید اور مبالغہ بھی پیدا کردیا۔ عام طور پر یہ الفاظ ذکر کئے جاتے ہیں۔

"رایته بعینی و سمعته باذنی و حفظته بقلبی"

میں نے اسے اپنی آنکھ سے دیکھا اور میں نے اسے اپنے کان سے سنا اور میں نے اسے اپنے دل میں یاد رکھا، حالانکہ سننا کام ہی کان کا ہے اور دیکھنا کام ہی آنکھ کا ہے اور یاد رکھنا کام ہی دل کا ہے، لیکن یہ بطور تاکید اور مبالغہ کیلئے ذکر کئے گئے ہیں۔ ایسے ہی شہادت کا چھپانا دل کا کام ہے اور دل نے ہی گنہگار رہنا ہے پھر گناہ کی نسبت دل کی طرف کر کے تاکید اور مبالغہ ثابت کردیا۔

دل کی طرف منسوب کرنے کی اور وجہ یہ ہے:

" اولأنه رئيس الا عضاء وافعاله اعظم قال رسول الله ﷺ ان فی جسد بنی آدم لمضغة اذا اصلحت صلح الجسد کله و اذا فسدت فسد الجسد کله الا وهی القلب" (رواه البخاری و مسلم عن النعمان بن بشیر)

کہ دل تمام اعضاء کا رئیس و سردار ہے اور دل کے افعال عظیم ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ بیشک بنی آدم (انسان) کے جسم میں ایک ٹکڑا ہے جب وہ صحیح رہے تو تمام جسم صحیح رہتا ہے اور جب وہ فاسد ہو (بگڑ) جائے تو تمام جسم ہی فاسد ہو جاتا ہے، خبردار وہ دل ہے۔

بعض حضرات نے ﴿ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ﴾ کا یہ مطلب بھی بیان کیا ہے "مسخ القلب "اس کا دل مسخ ہو جائے گا۔اس قول کے مطابق شدید وعید (سخت عذاب کی دھمکی) پائی گئی کہ انسان کا دل کسی اور جانور کے دل سے تبدیل کر دیا جائے تو اس کیلئے کتنی ذلت ورسوائی ہوگی۔(ماخوذ از مظہری)

راقم کے نزدیک مسخ کا قول امتِ مصطفیٰ ﷺ کیلئے ضعیف ہے، کیونکہ اس امت کو رب تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک ﷺ کے واسطہ جلیلہ سے مسخ کے عذاب سے محفوظ رکھا ہوا ہے۔تاہم مسخ کا مطلب کسی حد تک یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ دل تو انسان کا ہی رہے اس کی سمجھ جانوروں کی سمجھ کی طرح کر دی جائے اسے پتہ ہی نہ چلے کہ وہ کیا کر رہا ہے، یہ بھی شدید گرفت ہے۔

اعتراض: گواہی دینا یا نہ دینا تو زبان کا کام ہے، زبان کی طرف گناہ کی نسبت نہ کرنے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: مذکورہ بالا حدیث پاک سے واضح ہو گیا کہ دل تمام اعضاء کا رئیس وسردار ہے، جب دل کا گنہگار ہونا ثابت ہوگا تو زبان کا گنہگار ہونا خود ثابت ہو جائے گا۔

"وان افعال القلوب اعظم من افعال سائر الجوارح وهی لها كالاصول التی تتشعب منها الا ترى ان اصل الحسنات والسيات الا يمان والكفر وهما من افعال القلوب"

کیونکہ دل کے افعال تمام اعضاء کے افعال سے عظیم ہیں۔ دل کے افعال اصل ہیں اور باقی افعال ان سے ہی نکلنے والے ہیں۔ اس لئے دل کی طرف گناہ کہ نسبت کی گئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ نیکیوں اور گناہوں، اور ایمان اور کفر کو دل کے افعال ہی سمجھا گیا ہے۔حالانکہ گناہوں میں دوسرے اعضاء کو بھی دخل ہوتا ہے۔

" فاذا جعل كتمان الشهادة من آثام القلوب فقد شهدله بانه من معاظم الذنوب"

جب گواہی کا چھپانا دل کا کام ہے تو واضح ہوا کہ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔کیونکہ دل کے افعال بڑے افعال (کام) ہیں۔

عن ابن عباس رضی الله عنه اكبر الكبائر الا شراک بالله بقوله تعالىٰ ﴿فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ﴾ و شهادة الزور كتمان الشهادة"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سب گناہوں سے بڑا گناہ شرک ہے۔ کیونکہ جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی شریک ٹھہرایا اور اسی شرک کی حالت میں مر گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس پر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جنت کو حرام کر دیا ہے اور جھوٹی گواہی دینا بھی بڑا گناہ ہے اور گواہی چھپانا بھی بڑا گناہ۔ ''نعوذ باالله من الكبائر و الصغائر''

(ماخوذ از روح البیان)

''ان القلب اصل متعلقه و معدن اقترافه و اللسان ترجمان عنه''

بیشک دل اصل ہے یعنی حقیقت میں گناہ دل سے ہی متعلق ہیں اور دل ہی اصل کسب کا معدن ہے، زبان تو صرف اس کی ترجمان ہے۔ (روح المعانی، روح البیان)

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ﴾ ''اور اللہ جو تم عمل کرتے ہو جاننے والا ہے۔''

ان الفاظ مبارکہ سے گواہی کے چھپانے سے ڈرایا گیا ہے کہ تم رب تعالیٰ کی گرفت میں آؤ گے، اسلئے کہ تمہارے ہر عمل کو رب تعالیٰ جانتا ہے۔ تمہارا کوئی عمل اس پر پوشیدہ نہیں۔ انسان کو جب یہ علم ہو جائے کہ رب تعالیٰ میرے تمام اعمال سے باخبر ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی مخالفت نہیں کرے گا۔

''فانه يعلم انه تعالىٰ يحاسبه على كل تلك الافعال ويجازيه عليها ان خيرا فخيرا و ان شرا فشر''

انسان کو بخوبی یہ علم حاصل ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ تمام افعال کا حساب لے گا اور ان کی جزاء دے گا۔ اگر اچھے اعمال ہوئے تو ان کا بدلہ بھی اچھا دے گا، اور اگر انسان کے اعمال برے ہوئے تو اللہ تعالیٰ ان کا بدلہ بھی برا دے گا۔

آیہ کریمہ سے یہ واضح ہوا:

''كتمان الشهادة حرام واداؤها فريضة وان لم يسئله المشهود له''

کہ گواہی کا چھپانا حرام ہے اور گواہی دینا فرض ہے، اگرچہ مدعی گواہ سے گواہی نہ بھی طلب کرے تو پھر بھی یہ گواہی دے۔

''واذا كان المشهود له لا يعلم بشهادة الشاهد يجب على الشاهد ان يعلمه بانه شاهد''

جب مدعی کو علم نہ ہو کہ فلاں شخص بھی میرے دعویٰ کا چشم دید گواہ ہے تو گواہ پر واجب ہو جاتا ہے کہ وہ اسے بتائے کہ یہ واقعہ میرے سامنے کا ہے، میں اس کا گواہ ہوں، جب بھی مجھے طلب کیا گیا تو میں گواہی دوں گا۔ (ازمظہری)

مال و دولت کا جمع کرنا شرعاً منع نہیں:

جب رزق حلال جمع کیا جائے اور اس سے حقوق شرعیہ ''زکوٰۃ صدقات واجبہ'' ادا کئے جائیں تو وہ مال خیر و برکت کا ذریعہ ہے۔ ہاں البتہ مال حلال طریقہ سے نہ جمع کیا جائے بلکہ حرام طریقہ سے حاصل کیا جائے یا حلال طریقہ سے مال تو حاصل کیا لیکن صدقات فرضیہ اور واجبہ ادا نہیں کئے تو یہ مال جمع کرنا مذموم (برا) ہے۔ (راقم)

تقریباً یہی مؤقف علامہ قرطبی رحمہ اللہ کا بھی ہے۔ آپ مال جمع کرنے پر اسی آیۃ کریمہ سے یوں دلیل قائم فرماتے ہیں۔

''لما امر اللہ تعالیٰ بالکتب والاشھاد واخذالرھان کان ذالک نصاقا طعا علی مراعاۃ حفظ المال وتنمیتھا''

جب رب تعالیٰ مال بطور قرض دینے پر لکھنے اور گواہ بنانے یا رہن رکھنے کا حکم دیا تو یہ نص قطعی ہے کہ مال کی حفاظت کی جائے اور مال کو بڑھایا جائے اور نبی کریم ﷺ نے مال کو ضائع کرنے سے منع فرمایا آپ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو ارشاد فرمایا:

''انک ان تذر ورثتک اغنیاء خیر من ان تذرھم عالۃ یتکففون الناس''

بیشک تمہارا اوارثوں کو غنی چھوڑنا بہتر ہے بنسبت اس کے کہ تم ان کو محتاج چھوڑ کر جاؤ، وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہیں۔

اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''ما نفعنی مال کمال ابی بکر'' مجھے ابوبکر نے جیسا نفع پہنچایا ہے ایسا کسی اور مال نے نفع نہیں پہنچایا۔ اور رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرو بن العاص کو فرمایا ''نعم المال الصالح للرجل الصالح'' اچھا مال وہ ہے جو پاکیزہ ہو اور نیک آدمیوں کے پاس ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کیلئے دعاء کی ''اللھم اکثر مالہ وولدہ وبارک لہ فیہ'' اے اللہ! اسے مال زیادہ عطاء کر اور اولاد زیادہ عطاء کر اور اسے برکت عطاء فرما۔ ایک روایت میں ''بارک فی عمرہ'' کے الفاظ ہیں، کہ اے اللہ اسکی عمر میں برکت عطاء فرما۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

"یا رسول الله ان من توبتی ان انخلع من مالی صدقة الی الله والی رسوله"

یارسول اللہ ﷺ بیشک میں اپنا تمام مال اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی رضاء کیلئے صدقہ کرتا ہوں کہ اللہ نے میری توبہ کو قبول فرمایا (یہ غزوہ تبوک میں پیچھے رہنے والوں میں تھے) تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "امسک علیک بعض مالک فهو خیر لک" اپنا کچھ مال اپنے پاس روک رکھو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ یہ تمام احادیث صحاح سے نقل کی گئی ہیں۔ جن میں مال جمع کرنے کی اجازت فرمائی گئی۔ (از قرطبی)

تاہم فقر کی تعریف:

﴿ لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ کی بحث کے ضمن میں گزر گئی۔ محاکمہ وہی ہے کہ کبھی مال جمع کرنا قابل تعریف ہے اور کبھی مال جمع کرنا مذموم ہے، جو پہلے ذکر کیا جاچکا ہے۔ (راقم)

فائدہ جلیلہ: دین دار لوگوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک واقفین اور دوسرے سائرین۔ واقفین وہ ہیں جو صورت یعنی ظاہر کی دہلیز کو لازم پکڑے ہوئے ہیں، ابھی تک ان کیلئے عالم معنی یعنی حقیقت کا دروازہ نہیں کھولا گیا، وہ ابھی چوزے کی طرح ہیں جو انڈے کے خول میں محبوس (روکا ہوا) ہوتا ہے۔ ان کا مشرب یعنی ان کا طور و طریقہ ابھی تک عالمِ معاملات بدنیہ ہوتا ہے ابھی تک ان کی رسائی (پہنچ) عالمِ قلب کی طرف نہیں ہوتی، ان کا معاملہ اس درجہ میں وہی ہے جو چوزہ کو انڈے کے خول میں حاصل ہوتا یہ جسم کے قید خانہ میں محبوس ہوتے ہیں، اور ان پر کراما کاتبین فرشتے مقرر ہوتے ہیں جو ان کے ہر چھوٹے اور بڑے عمل کو لکھتے رہتے ہیں۔ سائرین وہ لوگ ہیں جو کہیں ٹھہرتے نہیں، ان کے رکنے کی کوئی منزل، کوئی مکان نہیں ہوتا، بلکہ وہ چلتے رہتے ہیں، عالم صورت سے عالم معنی کی طرف وہ رواں دواں ہوتے ہیں کیونکہ انکا اصل مقصد ظاہر سے باطن کی طرف جانا ہے، وہ جسم کی تنگی سے نکل کر روح کی وسعت کی طرف جا رہے ہوتے ہیں۔ سائرین کی پھر دو قسمیں ہیں، سیار اور طیار۔

"فالسيار من يسير بقدم الشرع والعقل علی جادة الطريقة"

سیار وہ ہیں جو شریعت اور عقل کے قدموں سے چل کر طریقت کی راہ کو اختیار کرتے ہیں۔

"والطیار من یطیر بجناحی العشق والھمۃ فی فضاء الحقیقۃ وفی رجلہ جلجلۃ الشریعۃ"

اور طیار وہ لوگ ہیں جو عشق و ہمت کے پروں سے فضاء حقیقت کی طرف اپنی اڑان جاری رکھتے ہیں اور ان کے پاؤں میں شریعت کے گھنگرو ہوتے ہیں۔ یعنی وہ شریعت کی بھی پابند ہوتے ہیں وہ لوگ سراسر جھوٹے ہوتے ہیں جو یہ کہتے ہیں ہم طریقت پر چلنے سے شریعت سے آزاد ہیں۔ ہاں اگر ان کو سچا سمجھنا ہو تو یوں سمجھ لیں کہ وہ طریقت ابلیس کے بادشاہ ہیں اور شریعت مصطفوی کے باغی ہیں۔

ہاں یہ درست ہے کہ طریقت شیطانی پر چلنے والے اپنے آپ کو شریعت مصطفوی سے آزاد سمجھتے ہیں۔ وہ طریقت جو سائرین کو حاصل ہے وہ شریعت کے باہر قدم نہیں رکھتے۔ اس آیۃ کریمہ اور اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں ان تینوں قسموں کا ذکر دیا گیا کہ اے اللہ کے بندو جو بھی تم واقفین کے درجہ میں ہو اپنے اعمال کا قدم قدم پر محاسبہ کرو، یہ محاسبہ لکھنے اور گواہ بنانے کے مترادف ہوگا۔ گویا کہ واقفین کو کہا گیا ہے کہ تم اپنے اعمال لکھ لیا کرو اور ان پر گواہ بنالیا کرو۔ پھر سائرین میں سے سیار حضرت کو کہا کہ تمہارا سودا ہاتھ بہاتھ ہو رہا ہے، تم پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے ہو، شریعت کے ضوابط پر عمل کرتے ہوئے طریقت کی منازل کو طے کر رہے ہو، لھذا یہ تمہاری تجارت حاضرہ ہے تمہیں لکھنے کی ضرورت نہیں، یعنی تمہیں اپنا محاسبہ کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ تم پہلے ہی اپنا محاسبہ کیے ہوئے ہو، اللہ تعالی تمہارا محافظ ہے تاہم تمہیں تجارت حاضرہ حاصل ہونے کے باوجود اگر تم اپنے اعمال کو لکھ لیا کرو یعنی اپنا محاسبہ کرتے ہی رہو تو بہتر ہے اور طیار حضرات کو کہا کہ اے طریقت کی راہ کے مسافرو، عشق و محبت اور ہمت کے پروں سے اڑ کر حقیقت کو پانے والو تم اپنے آپ کو ہی رب کائنات کے حضور رہن رکھ دو۔ (ماخوذ از روح البیان بتغیر)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجموعہ الفرقان

من تفسیر آیات القرآن

جلد ہفتم

سورۃ البقرہ آیات ۲۸۴ تا ۲۸۶، آل عمران آیات ۱ تا ۹۲

از رشحات قلم [illegible]

حافظ قاضی عبدالرزاق بھترالوی

جامعہ عربیہ مظہر العلوم

[illegible] راولپنڈی

کتاب لاریب کی توضیحات وتشریحات، علوم عقلیہ ونقلیہ کی روشنی میں
علمی وتحقیقی ذوق رکھنے والوں کے لئے قدیم وجدید احکامات ومسائل پر ابحاث کا حسین مرقع
تفسیر القرآن بالقرآن، ارشادات نبویہ، اقوال صحابہ، تحقیقات اسلاف اور روایات صحیحہ پر مشتمل تفسیر

مسمی بہ

نجوم الفرقان

من تفسیر آیات القرآن

جلد ہفتم

سورۃ البقرۃ آیات ۲۸۴ تا ۲۸۶، آل عمران آیات 1 تا ۶۹

از رشحات قلم

مشفق اہلسنت

شیخ الحدیث والتفسیر حضرت علامہ

مولانا **عبدالرزاق** بھترالوی، حطاروی

مہتمم جامعہ جماعتیہ مہر العلوم راولپنڈی

ناشر: جامعہ جماعتیہ مہر العلوم راولپنڈی

❁ نام کتاب............ نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن
سورۃ البقرۃ ۲۸۴ تا ۲۸۶، آل عمران 1 تا ۶۹

❁ مصنف........... شیخ الحدیث والتفسیر مولانا عبدالرزاق بھترالوی

❁ کمپیوٹر گرافکس ...... محمد اسحاق ہزاروی

❁ خصوصی معاون...... تنویر احمد ہزاروی

❁ کمپوزر........... محمد اکرم رضوی

❁ کمپوزنگ سنٹر...... مہر العلوم کمپوزنگ سنٹر شکریال راولپنڈی

❁ بار طباعت........... اول

❁ ناشر .... جامعہ جماعتیہ مہر العلوم راولپنڈی

ضروری نوٹ

جلد ششم میں بناء برعدم توجہ استاذ العلماء حافظ عطا محمد بندیالوی رحمہ اللہ کا مضمون ''درس نظامی کے مقاصد'' صفحہ 529 کے بجائے 440 پر لگ گیا تھا آئندہ ایڈیشن میں انشاء اللہ اس کی تصحیح کردی جائے گی۔

کمپیوٹر گرافر

کچھ مصنف کے بارے میں

نگاہیں کاملوں پر پڑ ہی جاتی ہیں زمانے کی
کہیں چھپتا ہے اکبر پھول پتوں میں نہاں ہو کر؟

اگر کائنات ارض وسماں کے اندر نظر دوڑائی جائے تو بعض لوگ آپ کو ساری کائنات سے الگ تھلگ نظر آئیں گے لیکن اس کے باوجود اگر ان کو پرچم اسلام کا نور کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا انہی اعلیٰ ہستیوں میں ایک نمایاں ہستی استاذ المدرسین رئیس المحققین والمدققین مشفقی ومحبی ومربی شیخ الحدیث والتفسیر استاذی المکرم حضرت علامہ مولانا قاضی عبدالرزاق بھترالوی متعنا اللہ بطول حیاتہ کی ہے

رب ذوالجلال نے جہاں قبلہ استاذی المکرم کو اور بے بہا خوبیاں عطا فرمائی ہیں وہاں آپ کو طاقت قلم بھی عطا فرمائی اور آپ کا انداز تحریر بڑا ہی نکھرا ہوا سادہ اور دلکش ہے جس کو عوام الناس بھی آسانی کے ساتھ سمجھ سکتی ہے بایں وجہ آپ کی تصنیفات علماء میں مقبولیت کے ساتھ ساتھ عوام الناس میں بھی بے حد مقبول ہیں اور آپ ہی وہ عظیم شخصیت ہیں جو صحیح معنوں میں محسن اہلسنت کہلوانے کے قابل ہیں اور خصوصا درس نظامی کے حوالے سے اہلسنت پر جو احسان عظیم فرمایا وہ شمس وقمر کی طرح سب پر عیاں ہے ان ہی درسی کتب میں سے آپ کی تصنیفات اردو حواشی میں میزان الصرف مراح الارواح اور السراجی فی المیراث جبکہ عربی میں نورالایضاح مختصر القدوری کنزالدقائق اور تلخیص المفتاح قابل ذکر ہیں اور اس کے علاوہ اس کے آپ کے ہاتھ میں موجود روایات مصدقہ وصحیحہ پر مشتمل تفسیر نجوم الفرقان من تفسیر آیات القرآن کی جلد ہشتم بھی آپ کا ایک عظیم علمی شاہکار ہے

میری دعا ہے خالق آپ کو ہمیشہ صحت وعافیت کے ساتھ عمر دراز عطاء فرمائے اور آپ کی تدریسی وتحریری علمی شاہکاروں میں شب وروز ترقی عطاء فرمائے اور آپ کا سایہ اہلسنت وجماعت پر تا دیر قائم رہے تاکہ مجھ جیسے تشنگان علم ومعرفت آپ سے آب رحمت لے کر اپنی پیاس بجھاتے رہیں

اور آپکے سایہ محبت میں علمی وعملی پرورش پاتے رہیں

آتی رہیگی تیرے انفاس کی خوشبو
گلشن تیری یادوں کا مہکتا ہی رہیگا

کیلئے از سگان کوچہ ہتو
فدا حسین

﴿لِلّٰهِ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ وَاِنْ تُبْدُوْامَافِیْ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰهُ فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَاءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَاءُ وَاللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌO﴾ (آیت نمبر ۲۸۴)

(1) اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے جی میں ہے یا چھپاؤ اللہ تم سے اس کا حساب لے گا تو جسے چاہے گا بخشے گا اور جسے چاہے گا سزا دے گا، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

(2) اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اگر تم ظاہر کرو جو تمہارے نفسوں میں ہے یا تم چھپاؤ اسے حساب لے گا تم سے اس کا اللہ، تو بخشش فرمائے گا جس کی چاہے گا اور عذاب دے گا جسے چاہے گا، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

ماقبل سے تعلق میں چند وجوہ:

(۱) ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ میں چند چیزوں کا ذکر کیا ہے جو اصول ہیں، یعنی توحید و نبوت پر دلائل کو ذکر کیا اور شرائع کے احکام اصولیہ کا تذکرہ کیا، یعنی نماز، زکوۃ، قصاص، روزہ، حج، جہاد، حیض، طلاق، عدت، مہر، خلع، ایلاء، رضاع، بیع، ربوا، دین کے معاملہ کی کیفیت کو بیان کیا تو سورۃ کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر کیا ہے، جس میں لوگوں کو ڈرایا گیا ہے، کہ سب چیزیں خواہ آسمانوں میں ہیں یا زمینوں میں وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور اس کی ملکیت میں ہیں اور اسی کی غلامیت میں ہیں۔

(۲) دوسری وجہ جو علامہ رازی رحمہ اللہ نے اپنا موقف بیان کیا، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کا ذکر کیا جو کمالات حقیقیہ یا صفات حقیقیہ ہیں، کیونکہ ﴿لِلّٰهِ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ﴾ سے جب یہ ثابت کیا کہ سب چیزیں اسی کی ملکیت میں ہیں اور سب پر اسی کو بادشاہت حاصل ہے تو اس سے رب تعالیٰ کی قدرت اور اس کے علم کا پتہ چل گیا۔ اور یہ واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا علم تمام کلیات و جزئیات کو محیط ہے کیونکہ ارشاد فرمایا۔ ﴿وَاِنْ تُبْدُوْامَافِیْ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ اور اگر تم ظاہر کرو جو تمہارے نفسوں میں ہے یا تم اسے چھپا رکھو

اس کا اللہ تم سے حساب لے گا۔ جب اللہ تعالی کی قدرت اور علم کا پتہ چل گیا تو اسی سے واضح ہو گیا کہ تمام چیزیں رب تعالی کی مملوک مخلوق ہیں اور اسی کے ربوبیت میں ہیں۔

" کذلک غایۃ الوعد للمطیعین و نہایۃ الوعید للمذنبین فلھذا السبب ختم اللہ ھذہ الصورۃ بھذہ الایۃ"

تو اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اسی آیۃ کریمہ میں مطیع لوگوں کیلئے کامل وعدہ پایا گیا ہے اور گنہگار لوگوں کیلئے کامل وعید پائی گئی ہے۔ اسی وجہ سے ان آیات سے سورۃ کو ختم کیا گیا ہے۔

(۳) جب اس آیۃ کریمہ سے پہلی آیۃ کے آخر میں ذکر فرمایا۔ ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ﴾ اور اللہ تمہارے اعمال کو جانتا ہے تو اس آیۃ کریمہ میں اس پر دلیل قائم کی گئی۔ ﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ کہ تمام چیزیں اللہ تعالی کی مخلوق ہیں جب رب تعالی تمام چیزوں کا خالق اور مالک ہے۔

"لابد وان یکون عالما بھا اذ من المحال صدور الفعل المحکم المتقن عن الجاھل بہ فکان اللہ تعالی احتج بخلقہ السماوات والارض مع ما فیھما من وجوہ الاحکام والاتقان علی کونہ تعالی عالما بھا محیطا باجزا ئھا وجزئیا تھا"

تو ضروری ہے کہ وہ ان تمام کا عالم (جاننے والا) بھی ہو، یہ محال ہے کہ کسی جاہل سے اتنا محکم اور یقینی کام ہو سکے گویا کہ اللہ تعالی نے تمام چیزوں کو محکم طور پر اور یقینی طور پر پیدا کرنے پر دلیل قائم کی ہے کہ وہ ان تمام چیزوں کو جاننے والا ہے۔ اور اس کا علم تمام اجزاء مخلوق اور تمام جزئیات وکلیات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

(۴) جب اللہ تعالی نے دین کے معاملات پر وثیقہ کا ذکر فرمایا کہ اسے لکھ لو، گواہ بنالو، یا اس کے بدلے رہن رکھو، گویا کہ اس بیان سے مقصد مال کی حفاظت اور مال کی حفاظت میں احتیاط ہے، رب تعالی نے ان چیزوں کا ذکر فرمایا جن میں مخلوق کے منافع پائے جاتے ہیں رب تعالی کا ان میں کوئی نفع نہیں، وہ کسی چیز سے نفع حاصل کرنے سے بے نیاز ہے ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ﴾ (بے شک اللہ بے پرواہ اور تعریف کیا ہوا ہے) ان احکام کے بعد ذکر فرمایا: ﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ ای فانہ لہ ملک السما وات والارض " یعنی تمام آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہی رب تعالی کو حاصل ہے، وہ کسی قسم کا تمہارے اعمال سے نفع حاصل کرے یہ ممکن نہیں اسلئے کہ وہ محتاج نہیں اور منافع وہی حاصل کرتا ہے جس کو منافع حاصل کرنے کی محتاجی ہوتی ہے۔

(۵) ان میں سے پانچویں وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالی نے گواہی کو چھپانے سے منع فرمایا اور اس پر وعید فرمائی اس کے بعد ذکر فرمایا: ﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ ای انہ لہ ملک السماوات والا رض فیجازی علی الکتما ن والاظھار " کہ بیشک اسی ذات کو زمین و آسمان کی بادشاہت حاصل ہے اور بادشاہ کو حق حاصل

ہوتا ہے کہ وہ کسی کو حکم عدولی کی سزا دے لھذا رب تعالی حاکم اعلی تمہیں گواہی کے چھپانے پر سزا دے گا اور گواہی کے اظہار پر جزاء خیر عطاء فرمائے گا۔ (ماخوذ از کبیر)

بندوں کے اعمال اللہ تعالی کی مخلوق ہیں:

جب رب تعالی نے فرمایا۔ ﴿لِلّٰہِ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ﴾ (جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے وہ اللہ ہی کا ہے) یعنی زمین و آسمان کی تمام چیزیں رب تعالی کی مخلوق ہیں تو اسی سے پتہ چل گیا کہ بندوں کے اعمال بھی ﴿مَافِی الْاَرْضِ﴾ "جو کچھ زمینوں میں ہے" میں ہی پائے جاتے ہیں تو وہ رب تعالی کی ہی مخلوق ہیں، اسی سے معتزلہ فرقہ کا بھی رد ہو گیا کہ وہ بندوں کو اپنے تمام اعمال کا خالق مانتے ہیں خواہ وہ اعمال خیر ہوں یا شر ہوں۔ اور اسی سے مجوسیوں کا بھی رد ہو گیا جو نیکیوں کا اور خالق مانتے ہیں اور برائیوں کا اور خالق مانتے ہیں۔

"للہ" میں لام کس معنی کیلئے ہے:

"لیس لام الغرض فانہ لیس غرض الفا سق من فسقہ طاعۃ اللہ فلا بد وان یکو ن المراد منہ لام الملک وا لتخلیق"

"لام" غرض کے معنی میں استعمال نہیں، یعنی یہ معنی درست نہیں کہ زمین آسمان کی تمام چیزیں رب تعالی کیلئے ہیں۔ اگر یہ معنی کیا جائے تو لازم آئے گا کہ فاسق کا فاسقانہ عمل بھی اللہ تعالی کی رضاء مندی کیلئے ہوگا۔ حالانکہ یہ غلط ہے کیونکہ فاسق کا عمل فسق اللہ تعالی کی طاعت نہیں بن سکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ لام ملک اور تخلیق کا معنی دے۔ اس لحاظ پر معنی ہوگا اللہ کی ملک میں ہیں تمام چیزیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمینوں میں ہیں یا معنی یہ ہوگا، اللہ کی مخلوق ہیں تمام چیزیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمینوں میں ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ان دونوں صورتوں کو حاوی ہے خواہ لام ملکیت کا ہو یا لام تخلیق کا ہو۔ آپ کا ترجمہ یہ ہے، اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے۔

دینی طلباء کرام کے ذوق کیلئے:

"احتج الاصحاب بھذہ الا یۃ علی ان معدوم لیس بشیء لان من جملتما فی السماوات والا رض حقائق الا شیا ء وما ھیا تھا"

اسی آیۂ کریمہ سے ہمارے اصحاب نے یہ دلیل پکڑی ہے کہ "شیء" موجود کو کہتے ہیں۔معدوم کو "شیء" نہیں کہا جاسکتا۔اسلئے کہ تمام چیزیں زمین وآسمان کی موجود ہیں اور حقائق وماہیات ہیں۔اللہ تعالیٰ کی قدرت میں حقائق وماہیات داخل ہیں، وہی مکون ہیں جو تکوین باری تعالیٰ میں داخل ہیں۔

"فاذا کان کذلک کانت قدرۃ اللہ تعالیٰ مکونۃ للذوات و محققۃ للحقائق فکان القول بان المعدوم شیء باطلا"

جب یہ معلوم ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ذاتوں کی مکون ہے اور حقائق کیلئے محقق ہے، تو معدوم کو شئ کہنے کا قول باطل ہے۔ (کبیر)

﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَافِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾

"اور اگر ظاہر کرو تم جو تمہارے نفسوں میں یا تم چھپاؤ اسے حساب لے گا تم سے اس کا اللہ۔"

بعض حضرات نے بیان کیا کہ یہ آیہ منسوخ ہے:

"واخرج احمد و مسلم و ابو داؤد فی ناسخه و ابن جریر و ابن المنذر و ابن ابی حاتم عن ابی هریرة قال لما نزلت علی رسول ﷺ ﴿لِلّٰهِ مَافِي السَّمٰوٰتِ وَمَافِي الْاَرْضِ وَاِنْ تُبْدُوْا مَافِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ اشتد ذلک علی اصحاب رسول الله ﷺ فاتوا رسول الله ﷺ ثم جثوا علی الرکب فقالوا یا رسول الله ﷺ کلفنا من الاعمال ما نطیق الصلوة والصیام والجهاد والصدقة وقد انزل علیک هذه الایة ولا نطیقها فقال رسول الله ﷺ اتریدون ان تقولوا کما قال اهل الکتابین من قبلکم سمعنا و عصینا بل قولوا سمعنا واطعنا غفرانک ربنا والیک المصیر فلما اقترا ها قوم وذلت بها السنتهم انزل الله فی اثرها امن الرسول الآية فلمافعلوا ذالک نسخها الله فانزل الله ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ الی آخرها"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب رسول اللہ ﷺ پر آیہ کریمہ ﴿لِلّٰهِ مَافِي السَّمٰوٰتِ وَمَافِي الْاَرْضِ﴾ نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَافِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ بہت سخت حکم محسوس ہوا تو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے (تو سخت شدت کی وجہ سے) گھٹنوں کے بل ہو کر عرض کرنے لگے، یا رسول اللہ ﷺ ہمیں (پہلے) ان احکام کی تکلیف دی گئی جن کی ہم طاقت رکھتے تھے یعنی نماز اور روزے اور جہاد اور صدقہ کی، اور اب رب تعالیٰ نے آپ پر یہ آیہ نازل کی ہم اس کی طاقت نہیں رکھتے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کیا تم ارادہ رکھتے ہو کہ تم وہ کہو جو تم سے پہلے اہل کتاب نے کہا ﴿سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا﴾ (ہم نے سنا اور نافرمانی کی) بلکہ تم

کہو ﴿سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ﴾ ''ہم نے سنا اور اطاعت کی تیری مغفرت ہو اے رب ہمارے اور تیری طرف ہی پھرنا ہے''

جب صحابہ کرام نے یہ آیہ (الفاظ مبارکہ) پڑھی تو (شدت خوف کی وجہ سے) ان کی زبانوں میں رکاوٹ سی پیدا ہو رہی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد ﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ﴾ آیہ کریمہ نازل فرمائی یہ، جب انہوں نے یہ کہا تو اللہ تعالیٰ نے آیہ کریمہ: ﴿ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا﴾ نازل فرما کر اسے منسوخ فرما دیا۔ (درمنثور)

"عن ابی هریره ان رسول الله ﷺ قال ان الله تعالیٰ تجاوز لامتی ما حدثت به انفسها مالم یعملو ابه او یتکلموا به وفی روایتما وسوست به صدرها"

حضرت ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں، بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تحقیق اللہ تعالیٰ میری امت سے درگذر فرماتا ہے جو ان کے نفسوں میں واقع ہوں جب تک ان پر عمل نہ کریں یا ان کے ساتھ کلام نہ کریں ایک روایت میں ہے جو چیزیں ان کے سینوں میں بطور وسوسہ واقع ہوتی ہے رب تعالیٰ ان سے درگذر کرتا ہے۔

ابھی تک جو روایت ذکر کی گئی ہیں ان سے یہی پتہ چلتا ہے کہ ﴿ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰہُ ﴾ کا حکم ﴿ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا﴾ سے منسوخ ہو گیا۔ (خازن)

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ یہ آیۃ کریمہ منسوخ نہیں:

"لان النسخ لا یرد الا علی الا مرو النهی ولا یرد علی الاخبار" اسلئے کہ نسخ امر یا نہی پر وارد ہوتی ہے اور خبروں پر نہیں وارد ہوتی، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰہُ﴾ خبر ہے اس پر نسخ وارد نہیں، ان حضرات نے جنہوں نے کہا ہے کہ یہ آیۃ منسوخ نہیں، انہوں نے اس کی تاویل یہ پیش کی ہے کہ دل کے خیال کو کسب کہا جاتا ہے عمل نہیں کہا جاتا، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿بِمَا کَسَبَتْ قُلُوْبُکُمْ﴾ "جو تمہارے دلوں نے کسب کیا"، عمل وہ ہوگا جو اعضاء ظاہرہ سے کیا جائے یا دل اس پر پختہ ارادہ کرے جب دل پختہ ارادہ کر لے تو وہ محاسبہ کے درجہ میں آئے گا اور ﴿فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَاءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَاءُ﴾ رب تعالیٰ جس کی چاہے مغفرت فرمائے اور جس کو چاہے عذاب دے) کا مصداق بن جائے گا۔

کچھ اور حضرات نے اسکی تاویل یہ کی ہے:

کہ آیۃ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کا حساب لیتا ہے جو بھی وہ عمل کریں خواہ ظاہر کریں یا مخفی

رکھیں، یعنی دل میں واقع ہونے والے خطرات کا بھی محاسبہ ہوتا ہے۔

”غیر ان معاقبتهم علی ما اخفوه ما اخف ممالم یعملوا به وهو ما یحدث لهم فی الدنیا من النوائب والمصائب والا مور التی یحزنون علیها“

سوائے اس کے کہ بات یہ ہے کہ جو ان کے چھپے اعمال ہوتے ہیں، رب تعالیٰ بھی ان کو ایسا عذاب دیتا ہے جو پوشیدہ ہوتا ہے، (بظاہر وہ گرفت نظر نہیں آتی لیکن حقیقت میں وہ گرفت ہی ہوتی ہے) یعنی دنیا میں ان کو مصائب وآلام (دکھ، درد) میں مبتلا کر دیا جاتا ہے، اور ان کو غموں میں مبتلا کر دیا جاتا ہے (یہ ایسی گرفت ہوتی ہے جسے وہ خود بھی گرفت نہیں سمجھ سکتے، وہ ظاہری اسباب کی طرف منسوب کریں گے، ایسا ہوا تو یہ مصیبت آگئی، یہ امر واقع ہو گیا جس نے غمزدہ کر دیا) یہ قول حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ہے۔

❁ ”عن امیه انها سالت عائشة عن قول الله عزوجل ﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ وعن قوله ﴿مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ﴾ فقالت ما سالنی عنها احد منذ سالت رسول الله ﷺ فقال هذه معاتبة الله العبد بما یصیبه من الحمی والنكبة حتی البضاعة یضعها فی ید قمیصه فیفقدها فیفزع لها حتی ان العبد لیخرج من ذنوبه كما یخرج التبر الاحمر من الكیر“ اخرجه الترمذی وقال حدیث حسن غریب“

امیہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ کے متعلق اور ارشاد باری تعالیٰ ﴿مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ﴾ کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے فرمایا کہ مجھ سے کسی ایک نے بھی اس کے متعلق سوال نہیں کیا جب سے میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کا سوال کیا، آپ نے فرمایا یہ گرفت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کو عتاب ہوتا ہے وہ یہ کہ بخار ہو گیا کوئی اور مصیبت آگئی، یہاں تک کہ قمیص کی جیب میں ڈالے ہوئے پیسے گم ہو جانے پر جو غم لاحق ہوتا ہے وہ بھی عتاب ہی ہوتا ہے (اس طرح گرفت ہوتی رہتی ہے) یہاں تک کہ بندہ گناہوں سے ایسے نکل آتا ہے جیسے کہ سونے کا ٹکڑا بھٹی سے صاف نکل آتا ہے۔

سبحان اللہ ! اللہ تعالیٰ کی اپنے مؤمن بندوں پر کتنی رحمت ہوتی ہے کہ بظاہر ان کی گرفت ہوتی ہے کہ بخار اور تکالیف میں مبتلاء کرنا بظاہر عتاب، سرزنش اور ڈانٹ ڈپٹ ہے لیکن حقیقت میں رحمت ہی رحمت ہے کہ یہ تکالیف بندے کو گناہوں سے پاک کرنے کیلئے آتی ہیں، اس لئے کہ صغیرہ گناہ تو خود ہی مصائب سے معاف ہو جاتے ہیں اور کبیرہ توبہ سے معاف ہوتے ہیں، لیکن عام طور پر انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ جب اسے کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہے، رب تعالیٰ کی طرف کامل طور پر رجوع کرتا ہے۔

"وعن انس بن مالک ان رسول الله ﷺ قال اذا اراد الله بعبده الخير عجل له العقوبة فی الدنيا واذا اراد الله بعبده الشر امسک عليه بذنبه حتی يوافيه به يوم القيامة" (رواه الترمذی)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے جلدی ہی دنیا میں گرفت میں لے لیا جاتا ہے، اور جب اللہ تعالیٰ بندے پر شر، (عذاب) کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کے گناہ محفوظ کر لئے جاتے ہیں یہاں تک کہ قیامت کے دن اسے پورا پورا بدلہ (عذاب) دیا جائے گا۔

بعض حضرات نے آیۃ کریمہ کا مطلب یوں بیان کیا:

﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ﴾ يعنی مما عزمتم عليه ﴿او تخفوه﴾ ای ولا تبدوه وانتم عازمون عليه ﴿يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ فاما حديث النفس مما لم تعزموا عليه فان ذلک مما لا يکلف الله نفسا الا وسعها ولا يواخذ به"

یعنی بندوں کے دلی ارادوں اور خیالات کی تین قسمیں ہیں، ایک یہ ہے کہ کسی کام کا دل میں پختہ ارادہ پیدا ہو گیا اور اس کے کرنے کو ظاہر بھی کر دیا گیا اس کا بھی مواخذہ ہوگا، یہ حکم ﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ﴾ میں آ گیا اور دوسری قسم وہ ہے کہ دل میں خیال واقع ہوا کہ فلاں برا کام کرنا ہے۔ اس پر پختہ ارادہ کر لیا کہ یہ کام اب ضرور ہی کرنا ہے البتہ اسے کسی کے سامنے ظاہر نہیں کیا بلکہ اس پختہ ارادہ کو دل میں چھپا کر رکھا، اس کا محاسبہ بھی ہوگا یہ حکم ﴿اَوْ تُخْفُوْهُ﴾ میں آ گیا۔ ان دونوں قسموں کا محاسبہ ہونا واضح ہے کہ، ارشاد باری تعالیٰ ﴿يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ ان دونوں قسموں کو شامل ہے۔ اور تیسری قسم یہ ہے کہ دل میں خیال صرف وسوسہ کی حد تک رہا وہ کام کرنے کا پختہ ارادہ نہیں کیا اس کام پر کوئی گرفت نہیں ہوگی اور نہ ہی اس کی تکلیف اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو دیتا ہے۔

بعض اور حضرات نے آیۃ کریمہ کا مطلب یوں بیان کیا:

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ محاسبہ کا معنی ہے خبر دینا اور پہچان کرانا یعنی مشہور و معروف کرنا۔ آیۃ کریمہ میں محاسبہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کی مخفی باتوں کو جانتا ہے خواہ تم ان کو ظاہر کر دو یا مخفی ہی رہنے دو، اب آیۃ کریمہ کا معنی یوں ہوگا:

﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ﴾ لتعملوا به (او تخفوه) مما اضمرتم ونويتم ﴿يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ ای يخبركم به ويعرفكم اياه ثم يغفر للمؤمنين اظهارا لفضله ويعذب الكافرين اظهار العدله"

اور اگر تم ظاہر کرو جو تمہارے نفسوں میں ہے کہ تم اس پر عمل کرو یا تم اسے چھپا کر رکھو، دل میں مخفی ہو اور اس پر ارادہ ہو تو اللہ تعالیٰ تم سے اس کا حساب لے گا، یعنی اس کی تمہیں خبر دے گا اور اسکی تمہیں پہچان کرائے گا یعنی تم پردہ مشہور و معروف کر دے گا، پھر اپنے فضل کا اظہار کرتے ہوئے مؤمنوں کی اس سے مغفرت فرمائے گا۔ اور اپنے عدل کے اظہار کیلئے کافروں کو عذاب دے گا۔

❁ "ویروی عن ابن عباس ویدل علیه انه قال یحاسبکم به الله ولم یقل یؤاخذکم به لان المحاسبة غیر المواخذة"

اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ یہ نہیں فرمایا ﴿یُؤَاخِذُکُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ اس لئے کہ محاسبہ اور چیز ہے اور مؤاخذہ اور چیز ہے، دونوں میں فرق ہے۔

اس پر دلیل وہ روایت ہے جو صفوان بن محرز مازنی سے مروی ہے۔

"قال بینما ابن عمر یطوف اذعرض له رجل فقال یا ابا عبد الرحمن اخبرنی ما سمعت من رسول الله ﷺ فی النجوی قال سمعت رسول الله ﷺ یقول یدنی المو من من ربه حتی یضع علیه کنفه فیقرره بذنوبه تعرف ذنب کذا و کذا فیقول اعرف رب اعرف مرتین فیقول الله سترتها علیک فی الدنیا وانا اغفرها لک الیوم ثم تطوی صحیفة حسابه واما الاخرون وهم الکفار والمنا فقون فینادی بهم علی رؤوس الخلائق هولاء الذین کذبوا علی ربهم الالعنة الله علی الظالمین" (اخرجه البخاری ومسلم)

وہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ طواف کر رہے تھے کہ ایک شخص نے آپ کے پاس آکر پوچھا کہ (فلاں وقت جب تم اکیلے نبی کریم ﷺ کے پاس تھے تو آپ تم سے کوئی گفتگو فرما رہے تھے) وہ اکیلے میں تم نے رسول اللہ ﷺ سے کیا سنا، مجھے بھی اس کی خبر دو، آپ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا، مؤمن اپنے رب تعالیٰ کے قریب ہوگا، یہاں تک کہ وہ اس پر اپنا دست قدرت رکھے گا کہ بندہ اپنا گناہوں کا اعتراف کرے۔ (رب تعالیٰ اس سے پوچھے گا) کیا تو اپنے فلاں فلاں گناہ کو پہچانتا ہے وہ دو مرتبہ عرض کرے گا ہاں میرے رب میں پہچانتا ہوں میں پہچانتا ہوں، تو رب تعالیٰ فرمائے گا میں نے دنیا میں تمہاری پردہ پوشی کی تھی تو آج بھی تمہاری مغفرت کر رہا ہوں۔ اس کے بعد اس کے حساب کا صحیفہ لپیٹ دیا جائے گا (یہ ہے محاسبہ) لیکن دوسرے کفار اور منافقین کو تمام مخلوق کے سامنے بلایا جائے گا، کہ یہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی تکذیب کی، خبردار اللہ کی لعنت ہو ظالموں پر (یہ ہے مؤاخذہ)۔ (ماخوذ از خازن)

راقم کے نزدیک تمام اقوال میں کوئی تعارض نہیں:

طلباء کرام ذرا اپنے روشن ذہن وضمیر کو بیدار کرتے ہوئے راقم کے ساتھ ساتھ چلیں تو آپ کو تمام اقوال مجتمع ہوتے ہوئے نظر آئیں گے، ہاں یوں بیان کیجئے۔

﴿ وَاِنْ تُبْدُوْا مَافِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ﴾ میں اور ﴿ لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ میں کوئی تعارض نہیں، کیونکہ پہلی آیۃ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دل کے خیالات اور وسوسہ پر بھی مؤاخذہ ہو گا، لیکن دوسری آیۃ کریمہ سے پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ کسی نفس کو طاقت سے زائد تکلیف نہیں دیتا۔ جب وسوسہ انسان کی طاقت سے باہر ہے تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔

بظاہر دوسری آیۃ سے پہلی آیۃ منسوخ ہے، لیکن حقیقت میں پہلی آیۃ کریمہ منسوخ نہیں کیونکہ وہ گرفت جو دل کے ارادوں پر ہوتی ہے وہ عتاب دنیا میں ہی بخار، مصائب وآلام اور غموں کی شکل میں ان کو آئے گا اور ان کو گناہوں سے ایسے پاک وصاف کر دیا جائے گا جیسا کہ لوہا یا سونا آگ کی بھٹی میں صاف وشفاف ہو جاتا ہے۔ اور یہ عتاب صرف ان خیالات پر ہوگا جن کو ظاہر کر دیا جائے کہ اس پر ضرور عمل کرنا ہے یا دل میں رکھا جائے کہ ان پر ضرور عمل کرنا ہے، صرف دل کے خیالات اور وسوسہ پر کوئی عتاب نہیں ہوتا۔

رب تعالیٰ چونکہ ہر ظاہر و باطن کو جانتا ہے، اس لئے ان کے دل کے ارادوں پر ان کو بھی مطلع کر دے گا بلکہ ان سے اقرار کرا کے اپنے فضل وکرم سے معاف فرما دے گا، یہ محاسبہ ہوگا، اور کفار ومنافقین کی گردن میں ہمیشہ کیلئے لعنت کا طوق ڈال کر ذلیل وخوار کر دیا جائے گا، یہ ان کا مواخذہ ہوگا، البتہ مؤمنین کو کسی برے کام کے مصمم ارادہ (پختہ ارادہ) پر بطور عدل گرفت فرمانا چاہے تو گرفت بھی فرمائے گا۔ (راقم)

خیال رہے کہ تفسیر خازن سے جو بحث نقل کی گئی ہے، تقریباً تفسیر قرطبی اور کبیر میں بھی وہی بحث ہے، تفسیر کبیر میں ﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَافِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ﴾ کی وضاحت کیلئے ﴿فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ﴾ کو بھی دلیل بنایا گیا ہے، کہ جن لوگوں کے دل میں خطرات ووسوسات واقع ہوتے ہیں، لیکن وہ مجبور ہوتے ہیں ان وسوسوں کو دل سے نکالنے پر قادر نہیں ہوتے وہ تو ﴿فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ﴾ کا مصداق ہوں گے۔ کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے گا۔ اور جو لوگ دل کے ارادوں پر عمل کرنے پر اصرار کریں گے۔ ان کے عمل پر مصمم ارادہ ہو جائے گا وہ ﴿وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ﴾ کا مصداق ہوں گے، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آئیں گے۔

﴿ وَاِنْ تُبْدُوْا مَافِیْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ ﴾ کا وسیع تر مفہوم:

یہ آیۃ کریمہ شامل ہے تمام قسم کے رذیل (گھٹیا قسم کے کام) کاموں کو شامل ہے، جیسا کہ نفاق، ریاء (دکھلاوا) عصبیت (خاندانی حمیت) دنیا کی محبت، غضب، تکبر، اپنے آپ پر تعجب کرنا، بے جا امیدیں باندھنا، حرص، توکل کو چھوڑنا، صبر کو چھوڑنا، حسد کرنا، کھوٹ و کینہ رکھنا، وغیرہ جو بھی دل اور نفس کے افعال ہیں ان تمام کو یہ آیۃ کریمہ شامل ہے۔

❁ "عن جبیر بن مطعم قال قال رسول الله ﷺ لیس منامن دعا علی عصبیة و لیس منا من قاتل علی عصبیة و لیس منا من مات علی عصبیة" "رواہ ابو داؤد" (مشکوۃ باب المفاخرۃ والعصبیۃ، مظہری)

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ شخص ہم سے نہیں جس نے عصبیت کی دعوت دی اور وہ شخص ہم سے نہیں جس نے عصبیت کی وجہ سے کسی سے قتال کیا، اور وہ (بھی) ہم سے نہیں جو عصبیت پر مر گیا۔

وضاحت حدیث : " (**لیس منا**) ای لیس من اہل ملتنا او من اصحاب طریقتنا" رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی، کہ وہ ہم سے نہیں کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دین پر چلنے والے لوگوں سے نہیں، وہ ہمارے طریقہ پر چلنے والے اصحاب سے نہیں۔

" (**من دعا**) ای الناس (الی عصبیة) ای الی اجتماع عصبیة فی معاونة ظالم " جس نے عصبیت کی دعوت دی، کا مطلب یہ ہے کہ جس نے لوگوں کو ظالم کی امداد اور پشت پناہی کیلئے بلایا۔

(**ولیس منا من قاتل عصبیة**) ای بالباطل " اور وہ شخص ہم سے نہیں جس نے عصبیت کی وجہ سے قتال کیا (لڑائی کی) یعنی باطل طریقہ پر صرف عصبیت کی وجہ سے لڑائی کرنے والا ہمارے دین پر چلنے والوں سے نہیں۔

" (**ولیس منا من مات علی عصبیة**) ای علی طریقتهم من حمیة الجاهلیة" اور وہ شخص ہم سے نہیں جس کی موت عصبیت پر آئی، یعنی جو زمانہ جاہلیت کے لوگوں کے طریقہ پر حمیت و جاہلیت پر مر گیا وہ ہمارے دین پر چلنے والوں میں سے نہیں۔ (مرقاۃ ج۹ ص۱۸۸)

عصبیت کیا ہے ؟

"العصبی هو الذی یغضب لعصبته و یحامی عنهم و العصبة الاقارب من جهة الاب لانهم یعصبونه و یعتصب بهم ای یحیطون به و یشتد بهم"

باپ کی طرف سے جو قریبی رشتہ دار ہوتے ہیں ان کو عصبہ کہتے ہیں کیونکہ وہ اسے طاقت پہنچاتے ہیں اس کے پھٹے مضبوط کرتے ہیں، یہ ایک دوسرے کی وجہ سے مضبوطی حاصل کر کے دوسروں پر سختی کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں اور دوسروں سے قتال کرتے ہیں۔

عصبیت یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت کا طریقہ یہ تھا کہ وہ لوگ کہتے تھے ہم نے ہر حال میں اپنے پدری رشتہ داروں کی امداد کرنی ہے خواہ وہ ظالم ہی کیوں نہ ہوں، یعنی حق و باطل کی تمیز کرنے کے بغیر ہر حال میں اپنے ہی پدری رشتہ داروں کی امداد کی وجہ سے دوسروں سے جھگڑا، دوسروں سے لڑائی، اور دوسرے لوگوں کو قتل کرنا اور ان پر ظلم کرنا یہ عصبیت ہے جو شرعاً مذموم چیز ہے۔

" والقواعد الشرعية انهم يكونون قوامين بالقسط شهداء الله ولو على انفسكم او الوالدين والاقربين"

حالانکہ شرعی قوانین یہ ہیں کہ مؤمن انصاف پر قائم رہتے ہیں، انصاف سے گواہی دیتے ہیں۔ گواہی دینے میں وہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء دیکھتے ہیں خواہ ان کو اپنی ذات کے خلاف گواہی دینی پڑے یا والدین کے خلاف گواہی دینی ہو یا اپنے رشتہ داروں کے خلاف گواہی دینی ہو انہیں اسکا کوئی خوف نہیں ہوتا کیونکہ ان کے سامنے مقصد عظیم اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ہوتا ہے، وہ ناجائز طور پر اپنا یا اپنے والدین کا یا اپنے رشتہ داروں کا لحاظ کر کے گنہگار نہیں ہوتے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ناراض کر کے جہنم کا ایندھن بن جائیں۔ (مرقاۃ ج۹ ص ۱۷۸)

تنبیہ: مشکوۃ شریف میں عصبیت کی مذمت اور مفاخرت کی مذمت میں احادیث کو ایک ہی باب میں ذکر کیا گیا ہے، اس کی وجہ حضرت علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں:

" ولعل وجه الجمع بين المفاخرة والعصبية ان بينهما تلازما غالبا"

مفاخرت اور عصبیت کو ایک ہی باب میں اسلئے ذکر کیا گیا ہے کہ ان میں غالبا تلازم پایا گیا ہے زیادہ طور پر دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ انسان اپنے آباؤ اجداد کی تعریف کرتا ہے ان کے کارناموں پر فخر کرتا ہے، خاندانی بلندی بیان کرتا ہے، مال کی زیادتی پر فخر کرتا ہے، یہی فخر اسے خاندان کی پشت پناہی پر مجبور کرتا ہے، وہ یہ دیکھنے سے قاصر ہوتا ہے کہ اس کے رشتہ دار جب ظالم ہیں تو میں ظالموں کی امداد کیوں کر رہا ہوں۔

مفاخرت و عصبیت پر احادیث:

اب جن احادیث کو ذکر کیا جارہا ہے ان کا مختصر مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے حسب و نسب پر اس وقت فخر کرے

جب وہ نیک اور بہتر ہوں۔اسی طرح عصبیت کا ساتھ اس وقت دے جب وہ حق پر ہوں۔ظالموں کا ساتھ نہ دیا جائے۔

❁ عن ابی ھریرۃ قال سئل رسول اللہ ﷺ ای الناس اکرم قال اکرمھم عند اللہ اتقاھم قالو ا لیس عن ھذا نسألک قال فاکرم الناس یوسف نبی اللہ ابن نبی اللہ ابن نبی اللہ ابن خلیل اللہ قالوا لیس عن ھذا نسالک قال فعن معادن العرب تسالونی قالو ا نعم قال فخیارکم فی الجاھلیۃ خیارکم فی الاسلام اذافقھو ا" (بخاری و مسلم، مشکوۃ باب المفاخرۃ والعصبیۃ)

حضرت ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ لوگوں میں سے کون شخص مکرم ہے؟ آپ نے فرمایا ان میں سے مکرم (معظم واشرف) اللہ کے ہاں وہ شخص ہے جوان میں سے زیادہ تقوی رکھنے والا ہے۔انہوں نے کہا ہم آپ ﷺ سے یہ سوال نہیں کرر ہے، آپ نے فرمایا کہ لوگوں میں سے مکرم اللہ کے نبی یوسف ہیں جو اللہ کے نبی کے بیٹے ہیں، وہ (ان کے باپ) اللہ کے نبی کے بیٹے ہیں وہ (ان کے دادؑ) اللہ کے خلیل کے بیٹے ہیں، انہوں عرض کیا ہم آپ سے یہ سوال نہیں کرر ہے، آپ نے فرمایا تم مجھ سے عرب قبائل کے متعلق سوال کرر ہے ہو؟ انہوں نے کہا ہاں (یا رسول اللہ ﷺ) آپ نے فرمایا تم میں سے جو لوگ زمانہ جاہلیت میں بہتر تھے وہ اسلام میں بھی بہتر ہیں جب انہوں نے علم شریعت کو حاصل کیا۔

وضاحت حدیث: سبحان اللہ !رسول اللہ ﷺ کی تبلیغ کا کیا خوب انداز تھا کہ صحابہ کرام نے جب یہ پوچھا کہ لوگوں میں سے مکرم کون ہے، تو آپ نے یہ جاننے کے باوجود کہ یہ سوال کیا کرر ہے ہیں، بغیر کسی تبصرہ کے جواب دیا کہ اللہ کے ہاں مکرم تو وہ ہے جو ان لوگوں میں سے تقوی زیادہ رکھے یعنی اصل عظمت یہ ہے کہ انسان کے اپنے اعمال درست اور اعلی ہوں۔

جب صحابہ کرام نے عرض کیا ہم تو یہ سوال نہیں کرر ہے، یعنی ہم تو کچھ اور پوچھ رہے ہیں۔تو رسول اللہ ﷺ نے پھر بغیر کسی تبصرہ کے دوسرا جواب دے کر بڑے پیارے انداز میں یہ سمجھا دیا کہ دوسرا درجہ عظمت وشرافت کا یہ ہے کہ انسان میں کمال ہو اور اسے حسب ونسب میں بھی کمال ہو، یہی وجہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ہاں لوگوں سے مکرم یوسف علیہ السلام ہیں جو اللہ کے نبی ہیں اور اللہ کے نبی یعقوب علیہ السلام کے بیٹے ہیں اور اللہ کے نبی اسحاق علیہ السلام کے پوتے اور اللہ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پر پوتے ہیں۔

جب صحابہ کرام نے عرض کیا کہ ہم یہ سوال نہیں کرر ہے تو میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ نے یہ نہیں فرمایا اچھا تم ہی بتاؤ کیا سوال کرر ہے ہو؟ یہ بھی نہیں فرمایا تم صاف بات کیوں نہیں کرتے بلکہ آپ نے فرمایا کہ ہاں اب تیسرا درجہ تمہا

رے سوال کے جواب کا یہ ہے کہ تم سوال عرب قبائل کے متعلق کر رہے ہو کہ عرب قبائل میں سے مکرم کون ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ عرب قبائل میں جو بہتر تھے زمانہ جاہلیت میں وہ بہتر ہیں زمانہ اسلام میں بھی بشرطیکہ انہوں نے دین اسلام کا علم حاصل کیا ہو، گویا کہ نبی کریم ﷺ نے بتادیا کہ سوال اصل میں یوں ہونا چاہیے تھا جو پہلا جواب دیا، پھر دوسرا درجہ یہ ہے کہ سوال اس کے مطابق ہو جو دوسرا جواب دیا گیا، تمہارا سوال تو تیسرے درجہ کا ہے یہی وجہ ہے کہ تیسرا جواب سب سے آخر میں دیا جارہا ہے۔ (راقم)

علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ کی شرح حدیث دیکھئے:

" ای الناس اکرم ای من بین انواعھم او اوصافھم اشرف واعظم" صحابہ کرام کا یہ پوچھنا کہ لوگوں میں سے مکرم کون ہے؟ اس کا مطلب لوگوں کی انواع میں سے کون سی قسم کے لوگ اشرف ہیں یعنی کن کو عظمت حاصل ہے یا ان کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ لوگوں کی صفات میں سے کون سی صفات اشرف و اعظم ہیں۔

قال طیبی رحمہ اللہ یحتمل ان یرادبہ اکرم عند اللہ تعالی مطلقا من غیر نظر الی النسب ولو کان عبدا حبشیا وان یراد بہ الحسب مع النسب وان یراد بہ الحسب فحسب "

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ صحابہ اکرام کا سوال ہی اس انداز کا تھا کہ اس میں تینوں احتمال پائے گئے تھے ایک احتمال یہ تھا کہ وہ حسب ونسب سے قطع نظر مطلقا سوال کر رہے تھے کہ لوگوں میں سے مکرم کون ہے؟ خواہ وہ حبشی غلام ہی ہو، رنگ ونسل، ذات پات کا کوئی لحاظ نہ کیا گیا ہو۔ ان کے سوال میں دوسرا احتمال یہ تھا کہ حسب ونسب میں دوسرے لوگوں سے افضل کون ہے؟ اور صحابہ کرام کے سوال میں تیسرا احتمال یہ تھا کہ صرف حسب یعنی خاندانی شرافت کے لحاظ سے کون مکرم و معظم ہے؟

" لما اطلقوا السؤال وکان المناسب صرفہ علیہ الصلوۃ والسلام الی الفرد الا کمل والوصف لا فضل"

جب انہوں نے مطلق سوال کیا تھا تو نبی کریم ﷺ نے مناسب یہی سمجھا کہ وہ جواب دیا جائے جس سے کسی فرد کے کامل ترین ہونے کا پتہ چل جائے اور اس کے اوصاف کے افضل ہونے کا علم حاصل ہو جائے۔

" قال اکرمھم عند اللہ اتقاھم" آپ نے فرمایا ان میں سے مکرم اللہ کے ہاں وہ ہے جو ان سے زیادہ تقوی رکھنے والا ہے، آپ نے اللہ تعالی کے ارشاد گرامی سے اقتباس حاصل کیا ہے، وہ ارشاد گرامی یہ ہے: ﴿اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ﴾ بیشک تم میں سے اللہ کے ہاں مکرم وہ ہے جو تم میں سے زیادہ تقوی رکھنے والا ہے، یہ ارشاد ہی اس ارشاد

کے بعد ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا﴾ (الحجرات آیہ نمبر ۱۳)

اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں شاخیں اور قبیلے کیا کہ آپس میں پہچان رکھو۔

آیۃ کریمہ میں (لِتَعَارَفُوْا) سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ " ان معرفۃ الانساب انما ہو للتعارف بالوصلۃ " بیشک انساب کی معرفت ذریعہ ہے تعلقات کے جوڑنے کا۔ آگے آنے والے الفاظ مبارکہ ﴿اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ﴾ سے واضح ہوگیا کہ " وان الکرم لا یکون الا با لتقوی لا ن العاقبۃ للمتقین والعبرۃ بما فی العقبی " بیشک کرم بغیر تقوی کے حاصل نہیں ہوتا، اس لئے کہ اچھی عاقبت پرہیزگاروں کیلئے ہی ہے۔ اور عظمت وکرم کی دارومدار اخروی فضل وکرم پر ہی موقوف ہے۔

جب صحابہ کرام نے عرض کیا کہ ہم یہ سوال نہیں کررہے تو نبی کریم ﷺ نے حسب ونسب کے اجتماعی کمال کو بیان کرتے ہوئے حضرت یوسف علیہ السلام کو مکرم بیان فرمایا کیونکہ

"فقد اجتمع شرف النبوہ والعلم و کرم الاباء والعدل والریاسۃ فی الدنیا والدین فی یوسف علیہ السلام"

یوسف علیہ السلام کو نبوت کی شرافت، علم کا کمال، آباؤ اجداد کا کرم، عدل اور دین ودنیا کی ریاست حاصل تھی۔

جب صحابہ کرام نے عرض کیا ہم یہ سوال نہیں کررہے تو آپ نے فرمایا، اچھا تم قبائل عرب کے متعلق سوال کے رہے ہو، انہوں نے کہا ہاں یارسول اللہ ﷺ ہم یہی سوال کررہے ہیں، یعنی وہ جن آباء واجداد کی طرف منسوب تھے ان کے متعلق سوال کررہے تھے کہ ان میں سے مکرم کون ہے؟

"وکان جوابھم فسلک علی الطف وجہ حیث جمع بین الحسب والنسب وقال اذافقھوا"

صحابہ کرام کا سوال صرف نسب کے متعلق تھا لیکن نبی کریم ﷺ نے بہت پیارے انداز پر حسب ونسب کو جمع فرما کر جواب دیا، جس پر آپ کے ارشاد گرامی میں "اذافقھوا" کے الفاظ دلالت کررہے ہیں۔

"(اذافقھوا)(یضم القاف ویکسر) ای اذا علموا آداب الشریعۃ واحکام الاسلام بعد دخولھم فیہ "

حدیث پاک میں جو لفظ " اذافقھوا " استعمال ہوا ہے اس کا معنی ہے جوانہوں نے آداب شریعت سیکھ لئے اور اسلام میں داخل ہونے کے بعد احکام اسلام کا علم حاصل کرلیا۔

حدیث پاک سے واضح ہوا کہ جو لوگ زمانہ جاہلیت میں حسب ونسب میں بہتر شمار ہوتے تھے جب وہ اسلام میں داخل ہوکر بھی بہتر رہے یعنی علم دین حاصل کیا اور اس کے مطابق عمل کیا تو یقیناً ان کو شرافت اور عظمت

حاصل ہوئی وہی لوگوں میں بہتر ہیں۔

"واما من زادفی الفقه فهو اعلی ومن لم یفقه فهو فی مرتبة الا دنی والمراد بالفقه هو العلم المقرون بالعمل وهو حاصل التقوی"

جس شخص کو دین میں زیادہ علم حاصل ہوگا وہ اعلیٰ مرتبہ رکھے گا، جسے علم دین نہیں حاصل ہوگا وہ گھٹیا مرتبہ رکھے گا، وہ علم دین تقوی کا ذریعہ بنے گا جس میں اس کے مطابق عمل بھی پایا جائے گا۔

تنبیه: یہ بات بھی واضح ہے کہ جسے تقوی حاصل ہوگا وہ اللہ تعالی کے ہاں مکرم ہوگا، اس پر اللہ تعالی کا ارشادگرامی واضح طور پر دلالت کررہا ہے، ﴿اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاکُمْ﴾ لیکن اپنی بزرگی اور اپنے تقوی کے قصیدے پڑھنا بھی منع ہے، اظہار عجز ہی بہتر ہے رب تعالی کا خوف دامن گیر ہونا ضروری ہے اللہ تعالی نے ارشادفرمایا﴿فَلَاتُزَکُّوْااَنْفُسَکُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی﴾ تم اپنے نفسوں کا تزکیہ بیان نہ کرووہ زیادہ جانتا ہے اسے جوزیادہ تقوی رکھنے والا ہے۔

مکرم ہونے کا کیا مطلب ہے ؟

تقریبا واضح کردیا گیا ہے کہ مکرم ہونے کا مطلب اشرف ہونا اور دوسروں سے زیادہ عظمت حاصل ہونا۔ تاہم علامہ نووی رحمہ اللہ نے مزید وضاحت فرمائی ہے:

" ان اصل الکرم کثرة الخیرومن کان متقیا کان کثیر الخیر و کثیر الفائدة فی الدنیا وصاحب الدرجا ت العلی فی الاخری "

بیشک اصل کرم کثرت خیر ہے، اور جوشخص متقی ہوگا اسے کثیر خیر حاصل ہوگا، اور دنیا میں اسکے بہت فائدے لوگوں کوحاصل ہوں گے، اسکی وجہ سے دین کو بہت زیادہ فائدہ حاصل ہوگا، اور آخرت میں اس کے مدارج بلند ہوں گے۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج ۹ ص ۱۷۸، ۱۷۹)

❁ "وعن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ الکریم بن الکریم بن الکریم بن الکریم یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراهیم" (رواہ البخاری، مشکوۃ باب المفاخرۃ والعصبیۃ)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کریم ابن کریم ابن کریم ابن کریم یوسف ابن یعقوب ابن اسحاق ابن ابراہیم ہیں۔

اس حدیث شریف میں بھی یوسف علیہ السلام کی فضیلت بیان فرمائی کہ وہ خود بھی نبوت وعلم جیسے کمال سے مشرف تھے، اوران کے آباءواجداد بھی کرم اور عدل جیسے رفیع الشان فضائل سے مشرف تھے اور یوسف علیہ السلام کودین ودنیا

کی ریاست حاصل تھی، ساتھ ساتھ حدیث پاک سے یہ مسئلہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ آباء واجداد پر اسی وقت فخر کیا جائے جب ان میں دینی شرافت پائی جائے دینی شرافت سے خالی نسب کی تعریف کا کوئی فائدہ نہیں۔

❁ "وعن البراء بن عازب قال فی یوم حنین کان ابوسفیان بن الحارث آخذا بعنان بغلة رسول اللهﷺ فلما غشیه المشرکون نزل فجعل یقول انا النبی لا کذب انا ابن عبد المطلب قال فما رؤی من الناس اشد منه" (رواه البخاری ومسلم، مشکوٰۃ باب المفاخرة والعصبیة)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حنین کے دن ابوسفیان بن حارث رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی خچر کی رسی کو پکڑا ہوا تھا، جب آپ کو کفار نے گھیرے میں لے لیا تو آپ اتر آئے اور فرما رہے تھے بیشک میں نبی ہوں کوئی جھوٹ کی بات نہیں، میں ابن عبدالمطلب ہوں، براء کہتے ہیں کہ اس دن نبی کریم ﷺ سے بڑھ کر کوئی بہادر معلوم نہ ہوسکا۔

وضاحت حدیث: راوی براء اور ان کے باپ عازب دونوں ہی جلیل القدر صحابی ہیں۔ابوسفیان نبی کریم ﷺ کے چچا حارث ابن عبدالمطلب کے بیٹے ہیں اور یہ رسول اللہ ﷺ کے رضائی بھائی بھی ہیں کیونکہ ان کو بھی حضرت حلیمہ بنت ابی ذؤیب السعد یہ نے دودھ پلایا ہے ابوسفیان شاعر بھی تھے، اسلام لانے سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی شعروں میں ہجو کرتے تھے (اشعار میں کسی کی مذمت بیان کرنا ہجو کہلاتا ہے) اور اس کا جواب حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے اپنے اشعار میں دیا بعد میں انہوں نے اسلام قبول کیا، پھر اسلام پر اچھی طرح قائم رہے۔

" ویقال انه ما رفع راسه الی رسول اللهﷺ حیاء منه "

بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے زندگی بھر رسول اللہ ﷺ کی طرف سر اٹھا کر کبھی نہیں دیکھا کیونکہ ان کو رسول اللہ ﷺ سے حیاء آتی تھی وجہ اس کی واضح ہے کہ یہ آپ کی اشعار میں ہجو کیا کرتے تھے، انہوں نے فتح مکہ کے سال اسلام قبول کیا، حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ نے آپ کو مشورہ دیا کہ تم نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہو کر وہی عرض کرو جو حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان کے سامنے عرض کرتے ہوئے یوں کہا۔﴿لَقَدْ اٰثَرَکَ اللّٰہُ عَلَیْنَا وَاِنْ کُنَّا لَخَاطِئِیْنَ﴾ "بولے خدا کی قسم بیشک اللہ نے آپ کو ہم پر فضیلت دی اور بیشک ہم خطاوار تھے۔"

جب ابوسفیان نے یہ عرض کیا تو رسول اللہ ﷺ نے بھی وہ جواب دیا جو حضرت یوسف علیہ السلام نے دیا تھا۔

﴿قَالَ لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ یَغْفِرُ اللّٰہُ لَکُمْ وَ ھُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ﴾ (سورة یوسف، آیة نمبر ۹۲)

"کہا آج تم پر کچھ ملامت نہیں اللہ تمہیں معاف کرے اور سب مہربانوں سے بڑھ کر مہربان ہے۔"

ان کی وفات کا سبب یہ بنا کہ یہ حج کرنے کیلئے گئے وہاں سر منڈانے پر حجام کے استرہ سے آپ کی رگ کٹ

گئی جس کی وجہ سے آپ بیمار رہے اور ستائیس ہجری میں آپ کا وصال ہو گیا اور عقیل بن ابی طالب کے دار میں دفن ہوئے۔ حضرت عمر ﷺ نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔ حضرت براء بن عازب ﷺ فرماتے ہیں کہ ابوسفیان بن حارث ﷺ نبی کریم ﷺ کی خچر کی باگ پکڑے ہوئے تھے۔ "فلما غشیه المشرکون" ای اتوہ من جمیع جوانبه" تو جب کافروں نے آپ کو ڈھانپ لیا یعنی تمام جانبوں سے آ گئے، مطلب یہ ہے کہ انہوں نے آپ کو گھیرے میں لے لیا تو آپ خچر سے نیچے اتر آئے، اور آپ ارشاد فرما رہے تھے۔

"انا النبی لا کذب، انا ابن عبد المطلب" میں نبی ہوں اس میں کوئی جھوٹ نہیں میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔

نبی کریم ﷺ نے بظاہر یہ اپنی تعریف کی حالانکہ آپ نے لوگوں کو اپنی تعریف کرنے سے منع بھی کیا، تو آپ نے خود اپنی تعریف کیسے کی؟ تو اس کا جواب یہ ہے؟

"وقد نفی نبی الله ﷺ عن نفسه ان یذکر الفضائل التی خصه بها فخرا بل شکرا لا نعمه فقال انا سید ولد آدم ولا فخر"

کہ نبی کریم ﷺ نے جو منع فرمایا ہے اس کا تعلق اپنے کمالات فخریہ طور پر بیان کرنے سے ہے۔ بطور شکر اللہ تعالی کی نعمتوں کو بیان کرنا جائز ہے۔ بلکہ اللہ تعالی کے ارشاد گرامی ﴿وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ﴾ کے عین مطابق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالی کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہوئے فرمایا، میں تمام اولاد آدم کا سردار ہوں مجھے کوئی فخر نہیں۔

اسی طرح حنین میں بھی آپ نے اپنے کمالات کو بیان کیا۔ پھر خاص کر کے (وقد رخص النبی ﷺ الخیلاء فی الحرب مع نهیه عنها فی غیرها) نبی کریم ﷺ نے کفار کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے فخریہ انداز پر اپنے کمالات بیان کرنے کی بھی اجازت عطاء فرمائی ہے، مگر اس کے بغیر عام حالات میں اپنے کمالات صرف اللہ تعالی کی نعمت کا شکر ادا کرتے ہوئے جائز ہیں یا کوئی شخص کسی کے منصب کو نہ جانتا ہو تو یہ اپنی پہچان کرانے کیلئے اپنے کمالات بیان کرے تو یہ بھی جائز ہے یہی وجہ ہے کہ خیبر کے میدان میں مرحب کے سامنے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بہادری کا تذکرہ یوں کیا۔

"انا الذی سمتنی امی حیدره" بیشک میں وہ شخص ہوں کہ میری ماں نے میرا نام، حیدر، (شیر) رکھا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے بھی حنین میں اپنی بہادری کا تذکرہ کیا تا کہ مسلمانوں کو بھی بہادری اور کفار پر دبدبہ حاصل ہو، اور کفار کو

جوش دلانا بھی مقصود تھا کہ تم اپنی بہادری کے کارنامے اور بھی دکھاؤ لیکن تمہارے مقابلہ میں اللہ کا نبی ہے، اللہ کے نبی میدان جنگ میں جم کر رہتے ہیں بھاگا نہیں کرتے۔ حاصل کلام یہ ہے:

"ان المفاخرة نوعان مذمومة ومحمودة فالمذموم منها ما كان عليها الجاهلية من الفخر بالآباء والانساب للسمعة والرياء والمحمود منها ما ضم من النسب الحسب في الدين لا رياء بل اظهار لأنعمه تعالى"

اپنے کمالات بیان کرنے کی دو قسمیں ہیں، مذموم اور محمود۔ مذموم (برا طریقہ) یہ ہے کہ اپنے آباؤ اجداد کے کمالات اور اپنے نسب کی تعریف لوگوں میں اپنا چرچا کرنے کیلئے اور دکھلاوے کیلئے ہو اور صرف فخر کرنا مقصود ہو۔ محمود (اچھا طریقہ) یہ ہے کہ نسب بیان کرنے کے ساتھ ساتھ دینی حسب بھی بیان کرے اور اس میں ریاء مقصود نہ ہو بلکہ مقصد صرف اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اظہار ہو یا اپنی پہچان کرانا مقصود ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے "لا فخر" کہہ کر واضح کر دیا کہ فخر اور تکبر منع ہے کیونکہ آپ نے اپنی پہچان کرانے اور رب تعالیٰ کی نعمت کے اظہار کیلئے فرمایا۔ "انا سيد ولد آدم يوم القيامة لا فخر" قیامت کے دن میں اولاد آدم کا سردار ہوں گا، مجھے اس پر کوئی فخر نہیں یعنی میں فخر اور تکبر کے طور پر یہ نہیں کہہ رہا، فخر کرنا اور تکبر کرنا منع ہے۔ پھر برا طریقہ صرف نسب بیان کرنا اور اچھا طریقہ حسب و نسب دونوں چیزوں کو بیان کرنا یعنی جہاں خاندانی منصب کو بیان کرے وہاں دینی منصب کو بھی بیان کیا جائے۔

اسی کو نبی کریم ﷺ نے اپنے ارشاد سے واضح کر دیا کہ "خيار كم في الجاهلية خيار كم في الاسلام اذا فقهوا" زمانہ جاہلیت میں جو تم میں بہتر لوگ تھے وہ اسلام میں بھی بہتر ہیں جب وہ دین اسلام حاصل کر لیں، نبی کریم ﷺ نے اپنے آپ کو اپنے دادا حضرت عبدالمطلب کی طرف منسوب کیا ہے، اپنے باپ حضرت عبداللہ کی طرف کیوں منسوب نہیں کیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ میدان جنگ میں اپنی پہچان کرانے کے ساتھ ساتھ اپنی بہادری بیان کرنا بھی مقصود تھا وہ اسی وقت حاصل ہو سکتی تھی جب آپ اپنے دادا کا ذکر کرتے کیونکہ ان کی بہادری کے کارنامے مشہور و معروف تھے لیکن آپ کے والد حضرت عبداللہ عین جوانی میں فوت ہو گئے تھے جنگوں میں شریک ہونے کا ان کو موقع نہیں مل سکا تھا اس لئے ان کی بہادری کے کارنامے مشہور نہیں تھے۔

" (فما رؤی) بصيغة المجهول اى ما عرف (من الناس) اى احد منهم (يومئذ اشد منه) اى اقوى واشجع من النبى ﷺ"

حدیث شریف کے آخری الفاظ مبارکہ کا مطلب یہ ہے کہ، اس دن لوگوں میں سے کوئی ایک کو بھی نبی کریم ﷺ سے

زیادہ طاقت وراور زیادہ مضبوط اور زیادہ بہادر نہیں معلوم ہو سکا، آپ کی بہادری آپ کے خچر پر سوار ہونے سے بھی واضح ہو رہی تھی کہ میدان جنگ میں آپ تیز رفتار گھوڑے پر سوار نہیں بلکہ خچر پر سوار تھے جو سست رفتار سواری ہے۔ پھر جب کفار نے آپ کو گھیرے میں لیا تو آپ سواری سے نیچے تشریف لے آئے جو آپ کی بہادری کی عظیم ترین مثال ہے، کہاں سواری پر رہنا اور کہاں سواری سے نیچے اتر کر مقابلہ کیلئے بلانا۔ پھر اتنے خوف کے مقام میں آپ اپنا منصب بیان کر رہے ہیں، آپ کو کفار کے گھیرا ڈالنے کی کوئی فکر نہیں، یہ کام بہادر شخص کا ہی ہو سکتا ہے ورنہ عام انسان تو ڈر کے مارے بات بھی نہیں کر سکتا۔

"وما ذاک الالقوۃقلبه وتوکله علی ربه واعتماده علی عصمته بمقتضی وعده حیث قال تعالی والله یعصمک من النا س وبموجب حکمه حیث قال هو الذی ارسل رسوله بالهدی ودین الحق لیظهره علی الدین کله "

نبی کریم ﷺ کی اتنی بڑی بہادری اسی وجہ سے تھی کہ آپ مضبوط دل والے تھے، اور آپ کو رب تعالی پر توکل حاصل تھی اور آپ کو اللہ کے وعدہ پر کامل اعتماد تھا کہ اللہ تعالی مجھے لوگوں سے محفوظ رکھے گا، وہ اللہ تعالی کا وعدہ یہ تھا ﴿وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ اور اللہ بچائے گا آپ کو لوگوں سے، اور اسی طرح آپ اپنی بہادری کی وجہ سے عین جنگ کے دوران بلکہ گھیرے میں آنے کے باوجود اللہ تعالی کے حکم کے مطابق بڑے اعتماد میں تھے، کیونکہ رب تعالی نے فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾

وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا کہ اسے سب دینوں پر غالب کرے۔

(وضاحت حدیث ماخوذ از مرقات ص۱۷۹ تا ۱۸۱)

❁ **"عن انس قال جاء رجل الی النبی ﷺ فقال یا خیر البریة فقال رسول الله ﷺ ذاک ابراهیم"**

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو کہا اے تمام مخلوق سے بہتر تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ تو ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ (رواہ مسلم، مشکوۃ باب المفاخرۃ والعصبیۃ)

وضاحت حدیث:

"برأ یبرأ" کا معنی ہے پیدا کرنا "بریة" یاء کی شد سے بھی استعمال ہے، اور " بریئة" یاء ساکن اور ہمزہ سے بھی استعمال ہے۔ فعیل بمعنی مفعول کے اس لئے " بریة" کا معنی ہے مخلوق۔

اعتراض : جب نبی کریم ﷺ تمام مخلوق سے بہتر ہیں، جس میں انبیاء کرام بھی داخل ہیں کہ آپ سید الانبیاء اور خیر

الانبیا بھی ہیں، تو آپ نے "یا خیر البریة" کہنے کے جواب میں "ذاك ابراهيم" (وہ تو ابراہیم ہیں) کیوں کہا۔

جواب اول : "احدها انه قال هذا توا ضعا واحتراما لا براهيم لخلته وابوته والا فنبينا ﷺ کماقال ﷺ انا سيد ولد آدم ولا فخر"

علامہ نووی رحمہ اللہ نے اس کے چند جواب ذکر فرمائے ہیں، ان میں ایک یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد رب تعالی کے حضور عاجزی کا اظہار کرنے کیلئے اور ابراہیم علیہ السلام جو اللہ تعالی کے خلیل ہیں اور آپ کے آباؤ اجداد سے ہیں ان کے احترام کے پیش نظر تھا، ورنہ ہمارے نبی کریم ﷺ سب سے افضل ہیں جس پر آپ کا اپنا ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے کہ میں تمام اولاد آدم کا سردار ہوں جس پر مجھے کوئی فخر نہیں، جب آپ کو تمام انسانوں پر فضیلت حاصل ہے جن میں انبیاء کرام بھی ہیں تو آپ کو فرشتوں پر اور باقی تمام مخلوق پر بھی فضیلت حاصل ہے، لھذا آپ افضل الخلق ہیں۔

جواب دوم: " انه قال هذا قبل ان يعلم انه سيد ولد آدم فان الفضائل يمنحها الله تعالى لمن يشاء فاخبر بفضيلة ابراهيم عليه السلام الى ان علم تفضيل نفسه فاخبر به "

دوسرا جواب ان میں سے یہ ہے کہ یہ کلام نبی کریم ﷺ کا "انا سيد ولد آدم ولا فخر" سے پہلے کا ہو کہ آپ کو بعد میں اپنی فضیلت کا علم حاصل ہوا ہو (کیونکہ محققین علما کرام کا یہی مذہب ہے کہ آپ کو تدریجا آہستہ آہستہ تمام لوح محفوظ کا علم عطا کر دیا گیا تھا آپ کے وصال کے وقت تک لوح محفوظ کا تمام علم آپ کو عطاء کر دیا گیا تھا) (صاوی)

کیونکہ اللہ تعالی جب چاہے اور جسے چاہے فضائل سے نواز دے اللہ تعالی نے پہلے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فضائل کی خبر دی، پھر آپ کو اپنے فضائل کی خبر دی یہی وجہ ہے پہلے آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فضائل بیان فرمائے پھر اپنے فضائل بیان فرمائے تاہم یہ جواب حضرت علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے پسند نہیں فرمایا:

"قلت وفيه انه يحتاج الى معرفة تاريخ ليدفع التعارض به"

میں کہتا ہوں یہ جواب اس وقت صحیح ہوسکتا ہے جب دونوں حدیثوں کی تاریخوں کا علم ہو کہ دونوں کے درمیان تعارض کو اٹھایا جائے جب تاریخوں کا علم نہ ہو تو یہ جواب قوی نہیں ہوگا۔

جواب سوم: " ولثالثها ان المراد به انه افضل برية عصره فاطلق العبارة الموهومة للعموم لانه ابلغ فى التواضع " ان جوابات میں سے تیسرا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے اپنے زمانہ میں " خير البرية تمام مخلوق سے بہتر تھے، لیکن جب رسول اللہ ﷺ تشریف لے

آئے تو سب سے زیادہ افضلیت آپ کو حاصل ہوگئی۔ آپ کو فضیلت سب اگلے اور پچھلے لوگوں پر عطاء کردی گئی، لیکن آپ نے کامل عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے مطلقا "خیر البریة" کی نسبت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کردی یہ نہیں فرمایا "ذاك ابراهیم فی زمانه" کہ ابراہیم علیہ السلام اپنے زمانہ میں تمام مخلوق سے بہتر تھے۔ نبی کریم ﷺ کی افضلیت قطعی طور پر ثابت ہے اور اس پر اجماع امت ہے۔ تفصیلی بیان اسی تیسرے پارہ کی ابتدا میں ہو چکا ہے، تاہم دو تین حدیثیں مرقات میں زیر بحث حدیث کے ضمن میں بیان کی گئی ہیں جن کا اعادہ ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

❁ "انا سید ولد آدم یوم القیامة واول من ینشق عنه القبر واول شافع واول مشفع"

(رواہ ابوداؤد ومسلم)

میں تمام اولاد آدم کا سردار ہوں گا قیامت کے دن، سب سے پہلے قبر سے باہر آپ ہی تشریف لائیں گے سب سے پہلے آپ ہی شفاعت فرمائیں گے اور سب سے پہلے آپ کی شفاعت کو ہی قبول کیا جائے گا۔

❁ "عن ابی سعید قال رسول ﷺ انا سید ولد آدم یوم القیامة ولا فخر وبیدی لواء الحمد ولا فخر وما من نبی یو مئذ آدم فمن سواہ الا تحت لوائی وانا اول من تنشق عنه الارض ولا فخر وانا اول شافع واول مشفع ولا فخر" (مسند احمد، ترمذی، ابن ماجة)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں تمام اولاد آدم کا قیامت کے دن سردار ہوں گا یہ کوئی فخر کی بات نہیں۔ اور میرے ہی ہاتھ میں لواء الحمد ہوگا یہ کوئی فخر کی بات نہیں، کوئی نبی بھی اس دن نہیں ہوں گا آدم ہو یا ان کے علاوہ سب ہی میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے، سب سے پہلے میرے لئے ہی زمین پھٹے گی (یعنی قبر سے سب سے پہلے باہر میں ہی آوں گا) یہ کوئی فخر کی بات نہیں سب سے پہلے میں ہی شفاعت کروں گا اور سب سے پہلے میری ہی شفاعت کو قبول کیا جائے گا یہ کوئی فخر کی بات نہیں۔

❁ "عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ انا اول من تنشق عنه الارض فاکسی حلة من حلل الجنة ثم اقوم عن یمین العرش لیس احد من الخلائق یقوم ذلک المقام غیری" (رواہ الترمذی)

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں سب سے پہلے زمین میرے لئے ہی پھٹے گی تو مجھے جنتی جوڑوں میں سے ایک جوڑا پہنایا جائے گا، پھر میں عرش کے دائیں جانب کھڑا ہوں گا، تمام مخلوق میں سے کوئی ایک بھی میرے علاوہ اس مقام پر کھڑا نہیں ہوگا۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج۹ ص۱۸۱)

❁ "عن عمر قال قال رسول الله ﷺ لا تطرونی کما أطرت النصاری ابن مریم فانما انا عبده فقولوا عبدالله ورسوله" (بخاری ومسلم، مشکوۃ باب المفاخرۃ والعصبیۃ)

حضرت عمر ﷛ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میری مدح میں مبالغہ نہ کرو جیسا کہ نصاری نے ابن مریم (عیسی ؑ) کی مدح میں مبالغہ کیا ہے، بیشک میں اللہ کا بندہ ہوں تم (بھی مجھے) کہو اللہ کا بندہ اور اللہ کا رسول۔

وضاحت حدیث:

بعض نصاری نے عیسی ؑ کو مستقل طور پر خدا کہا، اور بعض نے عیسی ؑ کو خدا کا بیٹا کہا، اور بعض نے تین خداؤں میں سے ایک کہا، یہ تھا ان کی تعریف میں مبالغہ۔

"(لاتطرونی)(بضم اولہ) واصلہ لا تطرونی من الا طراء وھو المبالغہ والغلوفی الثناء"

یعنی رسول اللہ کے ارشاد میں (لاتطرونی) کا جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ باب افعال یعنی "اطراء" سے لیا ہوا ہے جس کا معنی ہوتا ہے تعریف میں مبالغہ کرنا اور غلو کرنا اب معنی یہ ہوگا کہ تم میری تعریف میں مبالغہ نہ کرو۔

"(کما اطرت النصاری ابن مریم) ای مثل اطرائھم ایا ہ،مفھومہ ان اطرائہ من غیر جنس اطرائھم جائز"

جیسا کہ نصاری نے ابن مریم کی تعریف میں مبالغہ کیا، نبی کریم ﷺ نے اپنی تعریف میں اس طرح مبالغہ کرنے سے منع فرمایا جیسا کہ عیسائیوں نے عیسی ؑ کی تعریف میں مبالغہ کیا تھا، لھذا رسول اللہ ﷺ کو معاذ اللہ مستقل خدا ماننا، خدا کا بیٹا ماننا، خدا کا شریک ماننا جائز نہیں ہوگا، لیکن اس کے بغیر آپ کی جتنی تعریف کریں وہ جائز ہے۔

قصیدہ بردہ شریف میں کیا خوب بیان کیا گیا۔

"دع ما ادعتہ النصاری فی نبیھم　　　واحکم بما شئت مدحا فیہ واحتکم"

وہ تعریف چھوڑ دے جو نصاری نے اپنی نبی کی اور جتنی تعریف کرنا چاہتا ہے اتنی ہی تعریف کر۔

"وفی شرح السنۃ وذلک ان النصاری افرطوافی مدح عیسی ؑ واطرائہ بالباطل وجعلوہ ولدا للہ تعالی فمنعھم النبی ﷺ ان یطروہ بالباطل"

شرح السنۃ میں بھی یہی وضاحت کی گئی ہے کہ نصرانیوں نے حضرت عیسی علیہ السلام کی تعریف میں مبالغہ کیا تھا اور وہ مبالغہ باطل اور غلط تھا کہ انہوں نے عیسی ؑ کو خدا کا بیٹا کہا تھا، اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے اپنی تعریف میں غلط اور باطل طور پر مبالغہ سے منع فرمایا۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عیسی ؑ کی مدح جو نصرانیوں نے کی ایسی مدح سے منع فرمایا کہ اس طرح کی مدح کوئی شخص میری نہ کرے، اس کی وجہ یہ تھی کہ نصاری نے تعریف میں اتنا زیادہ مبالغہ کیا اور جھوٹی تعریف یہاں تک کر ڈالی کہ عیسی ؑ کو خدا کہا اور کچھ نے خدا کا بیٹا کہا، ان کو یہ بھی سمجھ نہ آسکی کہ عیسی

علیہ السلام تو حضرت مریم کے بیٹے ہیں جو ایک عورت ہے، جسے حیض بھی آتا ہے، مطلقا کسی کی اولاد کا معبود بننا جائز نہیں، کیونکہ اولاد اپنے ماں، باپ کی محتاج ہوتی ہے، جو محتاج ہو وہ خدا نہیں بن سکتا۔

" ولکون الیهود بالغوا فی قدح المسیح والنصاری فی مدحه قال الله تعالی ﴿ يٰأَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ ﴾

چونکہ یہودیوں نے عیسی علیہ السلام پر عیب لگانے (آپ کی شان میں گستاخی کرنے) میں مبالغہ کیا اور نصاری نے آپ کی باطل تعریف میں مبالغہ کیا تو رب تعالی نے فرمایا اے اہل کتاب تم اپنے دین میں ناحق غلو (زیادتی) نہ کرو۔

"فالحق هو الوسط العدل" حق درمیانی راہ کا نام ہے جو عدل وانصاف پر قائم ہو۔

یہی وجہ ہے کہ رب تعالی نے فرمایا: ﴿ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﴾ "سوائے اس کے نہیں کہ مسیح عیسی ابن مریم اللہ کے رسول ہیں" عیسی علیہ السلام کو مریم کا بیٹا بتا کر ہی واضح کر دیا کہ وہ اللہ کا بندہ ہے اللہ نہیں، مخلوق ہے خالق نہیں، پھر اللہ کا رسول کہہ کر واضح کر دیا کہ اللہ کے رسول اللہ کے عبادت گزار ہوتے ہیں خود معبود نہیں ہوتے۔ اور اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: ﴿ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ ﴾ "وہ دونوں طعام کھاتے تھے" یعنی حضرت مریم اور عیسی علیہ السلام معبود نہیں کیونکہ وہ طعام کھاتے تھے، جو طعام کھائے وہ پیشاب، یا پاخانہ کا بھی محتاج ہوتا ہے۔

"فلا یصلحان للالوهية ولا مناسبة لهما لربوبية وانما شانهما العبودية"

لهذا وہ دونوں ماں، بیٹا الٰہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور نہ ہی ان دونوں کی شان کے لائق ہے کہ وہ رب بن سکیں، بس ان کی شان یہی ہے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں اور اسی کے عبادت گزار ہیں۔

(فانما انا عبده) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تو اللہ کا عبد ہی ہوں، "ای الخاص فی مقام الاختصاص" یعنی مقام اختصاص میں، میں اللہ کا خاص بندہ ہوں۔ "وهو فی الحقیقة افضل مدح عند الفاضل الکامل" اللہ کا خاص بندہ ہونا، کامل فضیلت رکھنے والوں کے ہاں یہ کامل مدح ہے، اسی وجہ سے اللہ تعالی نے آپ کے معراج کو بیان کرتے ہوئے آپ کی صفت عبودیت کا ہی ذکر فرمایا ﴿ سُبْحَانَ الَّذِيْ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ ﴾ اور آپ پر قرآن نازل کرنے کے ذکر پر بھی آپ کی یہی کامل صفت "عبودیت" کا ہی ذکر فرمایا، ﴿ تَبَارَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ ﴾ اور ارشاد فرمایا:

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتَابَ ﴾ فقولوا عبدالله ورسوله"

تم کہو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول، یعنی تم مجھے اللہ کا بندہ اور اللہ کا رسول کہہ کر پکارو۔

سب سے امتیازی شان میری ان الفاظ میں ہی ہے "وفی ذکرهما ایضا ایماء الی مبداء حالته

ومنتھی غایته" نبی کریم ﷺ نے اپنے دو وصف "عبودیت" اور "رسالت" ذکر فرما کر اپنی ابتداء اور انتہاء کو بھی بیان فرما دیا۔ کیونکہ " ان العنایة الربوبیة باعتبار غایة العبودیة" جتنا انسان اللہ تعالیٰ کا زیادہ عبادت گزار ہوتا۔ رب تعالیٰ کی اس پر اتنی ہی زیادہ مہربانیاں ہوتی ہیں، یعنی مقام ابتداء عبودیت ہے اور مقام انتہاء رسالت ہے، اس سے اوپر الوہیت ہے جو کسی انسان کو حاصل نہیں، عبودیت افضل ہے، اسی وجہ سے جب کسی کو کہا جائے "یا عبد اللہ" (اے اللہ کے بندے) تو نیک انسان کو جتنا سروران الفاظ سے آتا ہے اتنا کسی اور وصف سے نہیں آتا، کیونکہ یہ قلبی راحت کا ذریعہ ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا:

لا تدعنی الا بیا عبده فانه افضل اسمائیا

مجھے "اسکا بندہ" کے بغیر کسی اور نام سے نہ پکارو بیشک سب ناموں سے یہی میرا نام افضل ہے۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج۹ ص۱۸۲)

فائدہ جلیلہ : "ان العبودیة اجل صفاته ﷺ واشرفها وذلک لان اشرف ما سوی العبودیة من صفاته ﷺ وهی الرسالة وعبودیة الرسول لکونها انصرافا من الخلق الی الحق اجل واشرف من رسالته لکونها بالعکس فانها انصراف من الحق الی الخق لتبلیغ احکام المرسل"

رسول اللہ ﷺ کی صفات میں سے عبودیت آپ کی اعلیٰ اور اجل صفت ہے، کیونکہ عبودیت کے بغیر اور کوئی اعلیٰ صفت ہو سکتی ہے تو وہ رسالت ہے، لیکن نبی کی عبودیت اس کی رسالت سے افضل و اشرف ہے کیونکہ عبودیت میں مخلوق سے توجہ ہٹا کر خالق کی طرف کامل توجہ کی جاتی ہے۔ یہ مرتبہ اس لئے اعلیٰ ہے کہ رسالت میں اسکا معاملہ بالعکس (الٹ) ہے، یعنی رسالت میں مخلوق کی طرف زیادہ توجہ کرنی پڑتی ہے اسلئے کہ رب تعالیٰ کے احکام بندوں تک پہنچانا رسول کی اہم ذمہ داری ہے۔

" ولیس المعنی ان عبودیة غیر الرسول افضل من الرسالة فانه لم یقل به احد "
کوئی یہ مطلب نہ سمجھ بیٹھے کہ عام انسان جو رسول نہیں اس کی عبودیت بھی رسالت سے افضل ہے، اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔ (شیخ زادہ ص۳ ج اول)

میرے عزیز **طلباء کرام**! یہ نازک مقام ہے اللہ کے نبی کو " عبده " سے اپنے جیسا بندہ سمجھنے سے بھی ایمان کا جنازہ نکل جائے گا اور غیر رسول کی عبودیت کو رسولت سے افضل ماننا بھی ایمان کو تباہ و برباد کر دے گا۔ (راقم)

❁ عن ابی هریره عن النبیاقال لینتهین اقوام یفتخرون بابائهم الذین ماتوا انما هم فحم من جهنم او لیکونن اهون علی الله من الجعل الذی ید هده الخراء بانفه ان الله قد اذهب عنکم عبیة الجاهلیة وفخر ها بالآ باء انما هو مو من تقی او فاجر شقی

الناس کلھم بنو آدم و آم من تراب" (رواہ الترمذی وابوداؤد مشکوۃ باب المفاخرۃ والعصبیۃ)

حضرت ابو ہریرہ ﷛ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا ضرور برضرور رک جائیں قومیں اپنے آباء واجداد پر فخر کرنے سے جو مرچکے ہیں، بیشک وہ جہنم کا کوئلہ ہیں یا اللہ کے ہاں وہ اس کیڑے سے بھی زیادہ حقیر ہوں گے جو اپنے ناک سے گندگی لڑھکاتا ہے، بیشک اللہ تعالیٰ جاہلیت کے فخر اور اپنے آباء کے فخر کو تم سے لے گیا (یعنی فخر کو دور کرنے کا اس نے حکم دے دیا ہے) بیشک وہ یا تو مؤمن و پرہیزگار ہوگا یا فاجر و بدبخت ہوگا، لوگ تمام کے تمام آدم ﷤ کی اولاد ہیں اور آدم ﷤ مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں۔

وضاحت حدیث: "**لینتھین**" میں لام مفتوحہ ہے، قسم مقدر کا جواب ہے۔ اصل میں عبارت کا مفہوم یہ ہوگا، "واللہ لیمتنعن عن الافتخار" قسم ہے اللہ تعالیٰ کی قومیں ضرور برضرور فخر کرنے سے رک جائیں، جو لوگ مرچکے تھے ان میں سے اکثریت کی موت کفر پر تھی، اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان رکھتے ہوئے زمانہ فطرت میں فوت ہوئے ان کے آباواجداد سے بھی کئی کفر کی حالت میں مرے تھے، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کہ ان کے آباء جن پر یہ فخر کررہے ہیں اور ان کے تعریفی قصیدے پڑھ رہے ہیں، وہ تو کفر کی وجہ سے جہنم کا کوئلہ ہیں۔ یا اللہ کے ہاں ناک سے گندگی کو لڑھکانے والے کیڑے سے بھی زیادہ ذلیل ہوں گے۔

"**اھون علی اللہ**" کا معنی ہے "اذل عند اللہ" اللہ کے ہاں ذلیل ہوں گے "الجعل" کے جیم پر ضمہ (پیش) ہے، اور عین پر فتحہ (زبر) ہے۔ اسے عربی میں "خنفساء" بھی کہتے ہیں۔ یہ سیاہ رنگ کا کیڑا ہے جو گندگی کی گولیاں بنا کر اپنے ناک سے دھکیل کے لے جاتا ہے۔

"**یدھدہ**" کا وزن بھی "یدحرج" کا ہے اور معنی بھی یدحرج والا ہی ہے، یعنی لڑھکانا۔ "الخرا" خاء پر فتحہ (زبر) ہے اور راء مقصورہ ہے، اسکا معنی ہے گندگی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فخر کرنے والوں کو سیاہ کیڑے سے تشبیہ دی اور ان کے کفار آباء کو گندگی سے اور فخر کو گندگی لڑھکانے سے۔ یعنی اس جملہ کے معنی میں دو احتمال ہو گئے ایک یہ کہ تم اپنے آباء پر فخر کرنا چھوڑ دو وہ تو اپنے کفر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ہاں گندگی کو اپنے ناک سے دھکیلنے، لڑھکانے والے سیاہ کیڑے سے بھی زیادہ ذلیل ہوں گے اور دوسرے معنی کا احتمال اس طرح ہے کہ قوموں کو چاہیے کہ وہ اپنے کفار آباء پر فخر کرنا چھوڑ دیں وہ تو اللہ کے ہاں نجس (گندگی، ناپاکی) ہیں۔ رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿انما المشرکون نجس﴾ "بیشک مشرک نجس ہیں"۔ نجس پر فخر کرنے والے اس کیڑے سے بھی زیادہ ذلیل ہوں گے جو گندگی کو لڑھکاتا ہے یعنی اپنے کفار آباء پر فخر کر کے گندگی

لڑھکانے والے کیڑے سے زیادہ ذلیل نہ ہو۔ تاہم پہلا معنی لینا زیادہ قوی اور صحیح قول وہی ہے کیونکہ عبادت کا مابعد اور ماقبل اسی پہلے معنی کو زیادہ ترجیح دے رہے ہیں۔

" ان الله قد اذهب عنكم عبية الجاهلية " بیشک اللہ تعالیٰ تم سے جاہلیت کا فخر لے گیا۔

" **عبية** " بضم العين المهملة وكسرها وكسر موحدة " عین پر پیش اور زیر دونوں کا پڑھنا جائز ہے اور باء کے نیچے زیر ہے اور یاء مشدد ہے۔ اس کا معنی فخر کرنا، تکبر کرنا ایک اور احتمال اس میں یہ ہے کہ یہ ماخوذ ہو 'عبء' سے جس کا معنی ہوتا ہے 'نور اور ضیاء' کہ اللہ تعالیٰ تم سے زمانہ جاہلیت کی وجہ سے تمہارے چہرے کا نور اور ضیاء دور کر دے گا۔

"انما هو مومن تقي او فاجر شقي" ھو ضمیر کا مرجع " المفتخر " ہے یعنی فخر کرنے والا دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ مؤمن پرہیز ہوگا اور مؤمن کی شان کے لائق ہی نہیں کہ وہ فخر و تکبر کرے کیونکہ "**لان مدار الايمان على الخاتمة والله سبحانه وتعالى اعلم بمن اتقى** " ایمان کی دارومدار خاتمہ پر ہے اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس کا خاتمہ ایمان و تقوی پر ہوگا یا فخر کرنے والا فاجر یعنی منافق و کافر اور بد بخت ہوگا۔ جب وہ نیک بخت نہیں بلکہ بد بخت ہے تو وہ اللہ کے ہاں ذلیل ہے۔

"والذليل لا يناسبه التكبر ولا يلائمه التجبر" ذلیل شخص کے مناسب تکبر نہیں اور نہ ہی وہ اس قابل ہے کہ وہ اپنے آپ کو جابر بن کر دکھائے۔

"**فالتكبر لا يليق بالمخلوق فانه صفة خاصة للخالق ولذا قال الكبرياء ردائي والعظمة ازاري فمن ناز عني فيهما قصمته**"

مخلوق کو تکبر کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اپنی بڑائی بیان کرنا صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے جو سب کا خالق ہے اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے فرمایا کہ کبریائی (بڑائی) میری رداء ہے، اور عظمت میری ازار ہے، جس نے میرے ساتھ کبریائی اور عظمت میں جھگڑا کیا میں اس (کی گردن) کو توڑ دوں گا۔

" **رداء** " اوپر لپٹنے والی چادر کو کہتے ہیں اور ازار کمر سے باندھنے والی چادر کو کہتے ہیں دو چادروں سے تشبیہ دی گئی ہے، یعنی کبریائی اور عظمت میرے ساتھ اس طرح خاص ہیں جیسے لباس انسان کے ساتھ خاص ہوتا ہے۔

" **الناس كلهم بنو آدم و آدم من تراب** " اس جملہ سے رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو فخر سے منع اس طرح فرمایا ہے کہ تم فخر کس چیز پر کر رہے ہو، تم سب ہی تو آدم علیہ السلام کی اولاد سے ہو اور آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنایا گیا

ہے تو تم اپنی اصلیت کو دیکھو کہ تمہیں مٹی سے تو اس لئے بنایا گیا کہ تم عاجزی اختیار کرو گے، مٹی کا حق تکبر کرنا نہیں۔

الناس من جهة التمثال اکفاء ابــــوهـــم آدم والام حـــواء

فان یکن لهم فی اصلهم شرف یـفـاخـرون بـــه فـا لطـين والمـاء

ما الفخر الا لاهل العلم انهم عـلـى الهـدى لـمـن استهـدى ادلاء

لوگ سب اپنے جسموں کے لحاظ پر ایک جیسے ہیں۔ کیونکہ سب کے باپ آدم علیہ السلام ہیں اور سب کی ماں حضرت حواء ہیں۔ اگر ان کی اصل میں کوئی شرافت ہے، جس پر وہ فخر کر سکتے ہیں تو وہ کیچڑ اور پانی ہی ہے۔ کوئی فخر نہیں کر سکتا سوائے اہل علم کے بیشک وہی ہدایت پر ہیں، جو ہدایت پر ہو وہی مقام ناز پر ہے۔

نبی کریم ﷺ کا انداز گفتگو کیا خوب ہے:

رسول اللہ ﷺ نے پہلے ذرا سختی سے کلام فرما کر جھنجھوڑا ہے گویا کہ آپ کے ارشاد کا مقصد واضح ہے گویا کہ آپ کے ارشاد کا مطلب یہ ہوا کہ

" ما ذاک العزیز الکریم عند الله الا رجل تقی وما ذاک الذلیل الدنئی عند ہ الا فاجر شقی "

اللہ کے ہاں سوائے مومن و پرہیز گار کے کوئی عزیز و کریم نہیں۔ اور اللہ کے ہاں سوائے کافر منافق بدبخت کے کوئی گھٹیا اور ذلیل نہیں۔

"ثم رجع ﷺ من ذلک العنف الی اللطف ومن التو بیخ الی اسماع الحق قائلا والناس کلهم بنو آدم"

نبی کریم ﷺ نے جھنجوڑنے اور ذرا سخت کلام کے بعد نرمی کی طرف رجوع فرمایا اور ڈانٹ ڈپٹ کے بعد نرم کلام کا مقصد یہ تھا کہ جو وعید اور سختی سے باز آ گئے تو بہتر اور کچھ دوسرے نرم کلام کو سن کر سوچیں گے اور سمجھیں گے، اس طرح وہ حق کی طرف میلان کریں گے، وہ نرم کلام کیا تھا۔ وہ یہ تھا کہ تم سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اور آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا گیا، جس کا نتیجہ واضح ہے کہ تمہاری اصلیت مٹی ہے تم فخر کس پر کرتے ہو تمہیں تو عاجزی اختیار کرنی چاہیے۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج ۹ ص ۱۸۴)

❁ "عن مطرف بن عبد اللہ بن الشخیر قال انطلقت فی وفد بنی عامر الی رسول اللہ ﷺ فقلنا انت سید نا فقال السید اللہ فقلنا وافضلنا فضلا واعظمنا طولا فقال قولوا او بعض قولکم ولا یستجرینکم الشیطان" (رواہ احمد وابو داود ، مشکوۃ باب المفاخرۃ والعصبیۃ)

مطرف بن عبداللہ بن شخیر فرماتے ہیں کہ میں بنی عامر کے وفد کیساتھ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چلا، (جب ہم آپ کی

خدمت میں حاضر ہوئے) تو ہم نے کہا آپ ہمارے سید (سردار) ہیں تو آپ نے فرمایا سردار تو اللہ تعالیٰ ہے، تو ہم نے کہا آپ ہم تمام سے افضل ہیں اور آپ ہم تمام سے عظیم طاقت کے مالک ہیں تو آپ نے فرمایا تم یہ کہتے رہو، یا اس کا بعض حصہ کہتے رہو، اور شیطان تمہیں اپنی راہ پر نہ چلائے۔

وضاحت حدیث: "**مطرف**" کی راء مکسورہ مشددہ ہے (یعنی راء کے نیچے زیر ہے شد والی) اور "**الشخیر**" میں شین کے نیچے زیر ہے اور خاء کے نیچے بھی زیر ہے اور شد ہے۔ نبی کریم ﷺ کو جب بنی عامر کے وفد نے کہا "انت سیدنا" (تم ہمارے سردار ہو) تو آپ نے فرمایا "السید اللہ" (سردار تو اللہ ہے) اور بعض روایات میں ہے "السید ھو اللہ" (سردار تو صرف اللہ ہے)۔

نبی کریم ﷺ کا اپنے آپ سے سیادت کی نفی کا کیا مطلب؟

اصل اس کی وجہ یہ ہے کہ سید اسے کہا جاتا ہے جس کی طرف مصائب و آلام میں رجوع کیا جائے اور وہ ان مصائب کو دور کرے، یعنی حقیقت میں سید وہ ہے جس کے لوگ محتاج ہوں۔ اس معنی کے لحاظ سے حقیقی طور پر سید رب تعالیٰ کی ذات ہے مجازی طور پر رسول اللہ ﷺ یا اور انبیاء اکرام اور صلحاء ہیں۔

" وفی نسخة السید ھو اللہ بزیادہ ضمیر الفصل لمزیدتاکید افادة الحصر مبالغة فی تعظیم ربہ وتواضع نفسہ فحول الامر فیہ الی الحقیقة مراعاة لا داب الشریعة و الطریقة ای الذی یملک نواصی الخلق ویتولاھم ویسوسھم ھو اللہ سبحانہ وھذا لاینافی سیادتہ المجازیة الاضافیة المخصوصة بالافراد الانسانیة حیث قال انا سید ولد آدم ولا فخر ای لا اقول افتخارا بل تحدثا بنعمةاللہ واخبارا بما امرنی اللہ"

جو بعض روایات میں "السید ھو اللہ" ہے، اس میں حصر پائی گئی ہے کہ سید صرف اللہ تعالیٰ ہے، اس ارشاد گرامی میں آپ نے رب تعالیٰ کی کامل تعظیم کا ذکر فرمایا اور اپنی عاجزی کامل طور پر بیان فرمائی، آپ نے تمام امور بطور حقیقت رب تعالیٰ کی طرف پھیرے ہیں جس میں آداب شریعت وطریقت کا لحاظ کیا گیا ہے، کیونکہ حقیقت میں تمام مخلوق کا مالک اور والی اللہ تعالیٰ ہی ہے وہی ان کو دین ودنیا کی صحیح راہ بتاتا ہے، حقیقی طور پر جو صفت رب تعالیٰ کو حاصل ہو، اور وہی، مجازی طور پر اس کے انبیاء اکرام اور صلحاء کو حاصل ہو تو اس میں کوئی منافات نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ادھر نبی کریم ﷺ نے یوں فرمایا "السید ھو اللہ" سردار صرف اللہ تعالیٰ لیکن دوسرا رخ یوں بیان فرمایا "انا سید ولد آدم ولا فخر" میں اولاد آدم کا سردار ہوں مجھے اس پر کوئی فخر نہیں، یعنی میں اپنا یہ کمال فخر

کے طور پر نہیں بیان کر رہا بلکہ اللہ تعالی کی نعمت کا تذکرہ کر رہا ہوں اور اس چیز کی خبر دے رہا ہوں جو مجھے رب تعالی نے حکم دیا ہے یعنی رب نے تعالی مجھے حکم دیا ہے ﴿وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ﴾ کہ تم اپنے رب تعالی کی نعمت کو بیان کرو۔ واضح ہوا کہ رب تعالی حقیقی طور پر سید ہے اور اس کی مخلوق کے نیک لوگ مجازی طور پر سید ہیں کہ لوگ مجازی طور پر اپنے مصائب و آلام صلحاء کی طرف پیش کرتے ہیں اور ان کے وسیلہ جلیلہ سے رب تعالی کی طرف حقیقۃ پیش کرتے ہیں، اسی پر ایک اور دلیل دیکھئے۔

"عن جابر ان عمر کان یقول ابو بکر سیدنا واعتق سیدنا بلالا" (رواہ البخاری)

حضرت جابر ﷺ فرماتے ہیں بیشک حضرت عمر ﷺ فرماتے تھے کہ ابوبکر ﷺ ہمارے سردار ہیں اور انہوں نے ہمارے سردار حضرت بلال ﷺ کو آزاد کیا۔

یعنی اس حدیث میں جلیل القدر صحابی حضرت عمر ﷺ اعتراف حقیقت کے طور پر حضرت ابوبکر ﷺ کو سردار کہہ رہے ہیں کیونکہ وہ ان سے حقیقت میں افضل ہیں اور عاجزی کے طور پر حضرت بلال ﷺ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سردار کہہ رہے ہیں کیونکہ وہ حضرت بلال ﷺ سے افضل ہیں۔

لیکن اتنا واضح ہوا کہ صحابہ کرام کو بھی سید (سردار) کہا گیا ہے۔ لھذا تمام احادیث میں تطبیق واضح ہوگئی مطرف ﷺ کہتے ہیں، ہم نے کہا "وافضلنا فضلا واعظمنا طولا" آپ ہم سے مراتب کے لحاظ پر بلند مرتبہ رکھتے ہیں اور ہم پر آپ کو افضلیت اور فوقیت حاصل ہے۔ اور آپ ہم پر عظیم طاقت رکھتے ہیں یعنی آپ اپنے احباب پر مہربانیاں فرماتے ہیں ان کو عطیات سے نوازتے ہیں، اور اپنے دشمنوں پر آپ کو بلندی حاصل ہے کہ آپ ان کے سامنے سر نہیں جھکاتے۔ تو نبی کریم ﷺ نے اس کی اجازت فرمادی، ارشاد فرمایا:

"قولوا قولکم ای مجموع ما قلتم او هذاالقول ونحوه" ہاں یہ تم کہہ لو یا اس قسم کے القاب تم دے دو۔

عاجزی کو اختیار فرماتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا۔ "اوبعض قولکم" بلکہ اپنے بعض قول پر اکتفاء کرلیا کرو، یعنی اصل مطلب یہ ہے۔ "قولوا قولکم الذی جئتم لاجله وقصدتموه ودعوا غیر کم مما لا یعنیکم" کہ آپ نے عاجزی اور تواضع کے طور پر یہ فرمایا کہ تم جس مقصد کیلئے آئے ہو وہ بات کرو، میری تعریف کرنے کی کوئی اتنی ضرورت نہیں۔ آپ کا یہ ارشاد اسی طرح ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ کے سامنے بچیاں دف بجا رہی تھیں اور بدر میں شہید ہونے والے اپنے آباء واجداد پر فدیہ (شعروں میں تذکرہ) کر رہی تھیں۔ ان میں سے ایک بچی نے کہا "وفینا نبی یعلم ما فی غد" اور ہم میں نبی کریم ﷺ موجود ہیں جو کل کی باتیں جانتے ہیں۔ اس کی بات کو سن کر رسول اللہ ﷺ نے یہ

نہیں فرمایا کہ یہ تو شرک ہے۔ گناہ ہے، میں تو بالکل کل کی باتیں نہیں جانتا، اگر اس بچی کی بات غلط ہوتی تو آپ کو ضرور یہی کہنا چاہیے تھا، لیکن آپ نے اپنی عاجزی کے طور پر یہ ارشاد فرمایا" دعی هذه وقولی ما کنت تقولین "یہ بات چھوڑ دو، (یعنی میرا تذکرہ نہ کرو) وہی کہو جو تم کہہ رہی تھی (یعنی بدر کے شہداء کا ہی تذکرہ کرو) اور اسکا یہ مطلب ہے:

"اقتصرواعلى احدى الكميتين من غير حاجة الى المبالغة بهما"

کہ چونکہ بنی عامر کے وفد نے آپ کی تعریف میں دو جملے ذکر کئے تھے، ایک "افضلنا فضلا" کہ آپ ہم تمام سے افضل ہیں، اور دوسرا جملہ یہ ذکر کیا،" اعظمنا طولا "کہ آپ ہم تمام سے زیادہ طاقت رکھتے ہیں۔ تو نبی کریم ﷺ نے " او بعض قولکم" فرما کہ یہ واضح کیا کہ تم ایک کلمہ پر ہی اکتفا کرلیا کرو، زیادہ تعریفی کلمات آپ کے سامنے کہنے کو آپ نے پسند نہیں فرمایا، ورنہ حقیقت یہی ہے کہ آپ کو معبود نہ کہا جائے، رب تعالی کا شریک نہ مانا جائے اور آپ کی جتنی تعریف کی جاسکے کرے، آپ کی نعمتوں کے مقابل آپ کی تعریف کا کوئی حق ادا نہیں کرسکتا۔

" **ولا یستجرینکم الشیطان**" اس جملہ میں ایک احتمال یہ ہے کہ ماخوذ ہو "جری یجری جریا" سے اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ تمہیں شیطان اپنی راہ پر نہ چلائے، یعنی نصاری کی طرح تم سے میری ایسی تعریف نہ کرائے کہ معاذ اللہ تم مجھے خدا کا شریک یا خدا کا بیٹا ماننا شروع کردو اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ "جرأ یجرأ جرأة" سے ماخوذ ہو تو اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ شیطان تمہیں جرأت نہ دلائے کہ تم نصاری کی طرح میری مدح میں مبالغہ کر کے کفر تک پہنچ جاؤ۔ علامہ مظہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث پاک کا لب لباب (اصل نچوڑ) یہ ہے:

" لا تبا لغوا فی مدحی بحیث تمد حوننی بشئی یلیق با لخالق ولا یلیق بالمخلوق "

کہ آپ نے گویا کہ یہ ارشاد فرمایا کہ تم میری تعریف ایسی نہ کرو جو صرف خالق کائنات کی ہوسکتی ہو، اور مخلوق کی وہ تعریف نہ ہوسکتی ہو۔ اسی سے نتیجہ یہ بھی نکل آیا کہ مخلوق سمجھتے ہوئے جتنی تعریف کرسکتے ہو کرو، بس خالق نہ سمجھو۔

علامہ خطابی رحمہ اللہ کی خوبصورت وضاحت:

" وقال الخطابی اراد ﷺ بقوله قولوابقول اهل دينكم اوملتكم وادعونی نبيا ورسولا كماسمانی الله فی كتابه ولا تسمونی سيدا كما تسمون رؤسائكم وعظمائكم لا نی لست كاحد منهم اذكانوايسودو نكم فی اسباب الدنيا وانااسودكم بالرسالة والنبوة فسمو نی رسولا ونبيا"

نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ تھا کہ تم مجھے اس طرح پکارو جس طرح اور مسلمان پکار رہے ہیں وہ مجھے رسول اور نبی کہہ کر پکار رہے ہیں تم بھی مجھے نبی اور رسول کہو، اللہ تعالیٰ نے بھی مجھے اپنی کتاب میں رسول و نبی کہا ہے، تم مجھے اس طرح کا سردار سمجھ کر سید نہ کہو جیسا کہ تم اپنے وڈیروں اور چوہدریوں کو سردار کہہ کر پکارتے ہو، وہ تو صرف دنیاوی معاملات میں تمہارے سردار ہیں میں تو تمہارا دین و دنیا میں سردار ہوں، یہ سرداری اللہ کے نبی اور اس کے رسول کو حاصل ہوتی ہے، اسی لئے تم مجھے اللہ کا رسول اور نبی کہو۔

نتیجہ یوں نکلا کہ اگر تم دنیادار سرداروں کی طرح مجھے بھی دنیادار سمجھ کر سید (سردار) کہو تو یہ ناجائز ہے ایسا مت کہو، ہاں اگر تمہیں معلوم ہو کہ سید تو محتاج الیہ ہے اور مصائب و آلام میں اسکی طرف رجوع کیا جاتا ہے تو اس معنی کے لحاظ سے تم مجھے برملا طور پر سید (سردار) کہو، یہ تو میں خود ہی اعلان کر رہا ہوں، ''انا سید ولد آدم ولا فخر'' میں اولاد آدم کا سردار ہوں مجھے اس پر کوئی فخر نہیں۔

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ کا قول بھی اسی کی تائید کر رہا ہے:

''وقال التور بشتی مسلک القوم فی الخطاب معه مسلکهم مع رؤساء القبائل فانهم یخاطبو نهم بنحو هذا الخطاب فکره ذلک لا نه کا ن من حقه ان یخطابوه بالنبی والرسول فانها المنزلة التی لا منزلة وراء ها لا حد من البشر''

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب قوم نے رسول اللہ ﷺ سے گفتگو کرتے ہوئے وہ طریقہ اختیار فرمایا جو وہ اپنے قبیلے کے سرداروں سے اختیار کرتے تھے اور جب انہوں نے آپ کو اپنے قبیلے کے سرداروں والے لقب سے پکارا تو آپ نے اسے ناپسند فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ مجھے نبی اور رسول کہہ کر پکارو، کیونکہ یہ مرتبہ کسی عام انسان کو حاصل نہیں ہوتا بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے انبیاء و رسل کو حاصل ہوتا ہے، اس منصب کے مستحقین کو صرف رب تعالیٰ نے ہی جانا۔

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی اس مسئلہ کو واضح کر رہا ہے ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ اللہ ہی جانتا ہے جہاں اس نے رسالت کو رکھنا ہے۔

(ماخوذ از مرقاۃ ج۹ ص ۱۸۵، ۱۸۶)

☆ ''وعن الحسن عن سمرة قال قال رسول الله ﷺ الحسب الما ل و الکرم التقوی''

(رواہ الترمذی وابن ماجہ، مشکوۃ باب المفاخرۃ والعصبیۃ)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ حضرت سمرہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حسب مال ہے اور کرم تقویٰ ہے۔

وضاحت حدیث: آپ نے فرمایا حسب دنیا کا مال ہے، یعنی اس سے غالبا انسان دنیا کا مرتبہ حاصل کرتا ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ نسب صرف خاندانی کمال بیان کرنا کہ میں فلاں کا بیٹا ہوں، اس سے منع کیا گیا، بلکہ ساتھ ساتھ حسب بیان کرنے کا حکم دیا گیا کہ اس میں انسان اپنے آباء کے اچھے اخلاق کا بھی تذکرہ کرتا ہے۔ لیکن اس حدیث میں حسب کو کرم کے مقابل ذکر کیا گیا ہے۔ اسلئے حسب کا یہاں معنی دنیاوی مال اور جاہ وجلال لیا گیا ہے۔ جیسا کہ خود نبی کریم ﷺ نے فرمایا "الحسب المال" حسب مال ہے۔

"وقال الطیبی الحسب ما یعده من مآثره ومآثر آباء ه " علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حسب یہ ہے کہ انسان اپنے مال ودولت کی ثروت بیان کرے اور اپنے آباء واجداد کی ثروت بیان کرے، اس وقت عرب میں رواج یہ تھا کہ

"لیس ذکر الحسب عند الناس للفقیر حیث لا یوقر ولا یحتفل به بل کل الحسب عندهم من رزق الثروة ووقرفی العیون"

وہ فقیر کو لوگوں کے ہاں صاحب حسب نہیں سمجھتے تھے اور اسی کا لوگوں کی نظروں میں وقار ہوتا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے ان کے ان نظریات کو رد کرتے ہوئے فرمایا "والکرم التقویٰ" کرم تقویٰ ہے۔ اس کرم سے مراد، "الکرم المعتبر فی العقبی المترتب علیه الا کرام بالدرجات العلی هو التقویٰ" وہ کرم ہے جو آخرت میں معتبر ہوگا۔ جس پر درجات کی بلندی مرتب ہوگی یہ کرم صرف تقویٰ سے حاصل ہوتا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ بیشک تم میں سے زیادہ مکرم اللہ کے ہاں وہی ہے جو تم میں زیادہ پرہیز گار ہے۔

"وفیه تنبیه نبیه علی ان الدنیا فانیة والأخریٰ باقیه فآثروا ما یبقی علی ما یفنی"

اس حدیث پاک سے اللہ تعالیٰ کے نبی ﷺ نے اس پر متنبہ کر دیا کہ دنیا فانی ہے، اور آخرت باقی رہنے والی ہے، للہذا باقی رہنے والی چیز اختیار کرو، فانی چیز کو اختیار نہ کرو۔

"وقیل معناه ان الغنی یعظم کما یعظم الحسب وان الکریم هو المتقی لا من یجود بما له ویخطر بنفسه لیعد جوادا شجاعا"

لوگ غنی کی اس طرح تعظیم کرتے تھے جس طرح صاحب حسب یعنی صاحب اخلاق کی تعریف کرتے تھے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے واضح فرمایا کہ اللہ کے ہاں عزت والا وہی ہے جسے تقویٰ زیادہ حاصل ہوگا۔

ایک شخص دنیا میں فقراء وغرباء پر مال بھی خرچ کرتا ہے، جنگوں میں بھی شریک ہوتا ہے، مجاہدین کی بھی امداد کرتا ہے اور اس کا اصلی مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ مجھے "شجاع وجواد" (بہادر وسخی) کہیں وہ دنیا میں تو نام پیدا کر لیتا ہے لیکن اللہ کے ہاں اس کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہوتی۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج۹ ص۱۸۶)

۞ ''وعن ابی بن کعب ﷺ قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول من تعزی بعزاء الجاھلیة فاعضوہ بھن ابیه ولا تکنوا''(رواہ فی شرح السنۃ ،مشکوٰۃ باب المفاخرۃ والعصبیۃ)

ابی بن کعب ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا جس شخص نے زمانہ جاہلیت کی طرف اپنے آپ کو منسوب کیا تو اس کے باپ کی برائیوں کو ظاہر کر کے بیان کرو، ان کے بیان کرنے میں کنایہ سے کام نہ لو۔

وضاحت حدیث:

''تعزی ای انتسب '' یعنی ''تعزی'' کا معنی ہے منسوب کرنا۔'' بعزاء الجاھلیة ای نسب اھلھا وافتخر بابائه واجدادہ'' یعنی جس نے اپنے آپ کو زمانہ جاہلیت کی طرف منسوب کیا کہ اپنے کافر آباء واجداد پر فخر کیا۔''فاعضوہ بھن ابیه ''اس کے باپ کے عیوب اور قبائح بیان کئے جائیں ''اعض '' میں ضاد مشدد ہے اصل معنی'' اعض یعض '' کا کاٹنا ہے۔خواہ دانتوں سے کاٹا جائے یا زبان سے اس کی برائیوں کو بیان کر کے اس کی شہرت کو کاٹا جائے۔''بھن ''میں باء علیحدہ ہے۔''ھن ''علیحدہ ہے۔

دینی مدارس کے ابتدائی طلباء کرام بھی بخوبی جانتے ہیں کہ ''ھن ''اسماء ستہ مکبرہ سے ہے۔جس کا معنی ہوتا ہے شرمگاہ اور ایسی برائیاں جن کا ذکر قبیح (برا) سمجھا جائے۔''ولا تکنوا'' کنایہ سے کام نہ لو، یعنی اس کے باپ کی برائیوں کو اشارہ سے نہ بیان کرو کہ اس کی برائیوں کا پتہ ہی نہ چلے بلکہ واضح طور پر بیان کرو، حدیث شریف کا مفہوم مندرجہ ذیل الفاظ میں دیکھئے۔

''وقیل معناہ من انتسب وانتمی الی الجاھلیة باحیاء سنة اھلھا وابتداع سنتھم فی الشتم واللعن والتعییر ومواجھتکم بالفحشاء والتکبر فاذکروا له قبائح ابیه من عبادة الاصنام والزنا وشرب الخمر ونحو ذلک مما کان یعیر به من لؤم ورذالة صریحا لا کنایة کی یرتدع عن التعرض لأعراض الناس''

حدیث کا مطلب یوں بیان کیا گیا ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو جاہلیت کی طرف اس لئے منسوب کرتا ہے کہ جاہلیت کے طور طریقے زندہ کئے جائیں، جس طرح کافر ایک دوسرے کو گالیاں دیتے تھے مسلمان بھی اسی طرح ایک دوسرے کو گالیاں دیں اور ان کی طرح یہ بھی ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں اور ان کی طرح یہ بھی ایک دوسرے کو عار دلائیں اور ان کی طرح یہ بھی ایک دوسرے کے سامنے بے حیائی کے کام کریں، اور ان کی طرح یہ بھی تکبر کریں اپنی بڑائی بیان کریں، تو ان کے آباء واجداد کی برائیوں کو کھول کھول کر بیان کرو، واضح طور پر ان کی بت پرستی، بدکاری اور شراب پینے اور اس قسم کی برائیوں کو بیان کرو جن کا وہ ارتکاب کرتے تھے۔اسی طرح جن کاموں سے وہ دوسروں کو عار دلاتے تھے

وہ بیان کرو، ان کے رذیل، گھٹیا کاموں کو بہت ظاہر کر کے بیان کرو، ان کی برائیوں کو بیان کرنے میں اشارہ اور کنایہ سے کام نہ لو تا کہ وہ لوگوں کو زمانہ جاہلیت کی برائیوں کی طرف دھکیلنے سے باز آ جائیں۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج۹ ص۱۸۶)

مقام افسوس ہے کہ آج کل لوگ یہود و نصاریٰ اور ہندوؤں سے اپنے رشتے جوڑ رہے ہیں۔ ذلت آمیز نعرے لگا رہے ہیں کہ ہم ایک تھے ایک ہو کر رہیں گے ایسے لوگوں کیلئے مشورہ یہ ہے کہ وہ بھارت چلے جائیں ہندوؤں سے گٹھ جوڑ کر لیں اور وہاں سے جو مسلمان پاکستان آنا چاہیں تو ان کی جگہ ان مسلمانوں کو پاکستان میں آنے دیا جائے۔ بصورت دیگر ان کی زبانوں کو لگام دیا جائے، بلکہ ان کی زبانوں کو گدی سے کھینچ لیا جائے، اور جو لوگ ان کے آباء واجداد کے کرتوتوں سے باخبر ہوں، وہ ان کے کرتوتوں کو بیان کریں کہ یہ ہندوؤں سے روابط رکھنے میں بے تاب کیوں ہیں۔

☆ **"وعن عبد الرحمٰن بن عقبة عن ابی عقبة وكان مولى من اهل فارس قال شهدت مع رسول الله ﷺ احد فضربت رجلا من المشركين فقلت خذها منی وانا الغلام الفارسی فالتفت الی (فقال رسول الله ﷺ هلا قلت خذها منی وانا الغلام الانصاری)** (رواہ ابو داؤد، مشکوۃ باب المفاخرة والعصبية)

عبدالرحمٰن بن عقبہ روایت کرتے ہیں ابوعقبہ سے جو اہل فارس کے (اس سے پہلے) غلام تھے وہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ احد (کے غزوہ) میں حاضر ہوا تو میں نے مشرکوں کے ایک شخص کو ضرب لگائی، تو میں نے کہا یہ لو مجھ سے میں فارسی غلام ہوں، تو رسول اللہ ﷺ نے میری طرف توجہ فرمائی تو ارشاد فرمایا کہ تم نے یہ کیوں نہیں کہا یہ لو مجھ سے میں انصاری غلام ہوں۔

وضاحت حدیث:

راوی عبدالرحمٰن بن ابی عقبہ، جبیر بن عتیق کے غلام تھے، یہ تابعی ہیں۔ اپنے باپ ابوعقبہ سے روایت فرماتے ہیں جو صحابی ہیں، یہ انصار کے غلام تھے، عام طور پر یہ "مولی بن ہاشم" کے لقب سے مشہور تھے۔

"**شهدت**" کا معنی ہے میں حاضر ہوا۔ "**ضربت**" میں نے ضرب لگائی، یہ عام ہے تیر مارنے، تلوار مارنے، نیزہ مارنے کو ضرب ہی کہا جاتا ہے۔ "**خذها منی**" یہ ضرب مجھ سے لے لو، اس وقت مجاہدین کی یہ عادت تھی کہ وہ جنگ میں جسے ضرب لگاتے اسے اپنے نام اور نسب کی خبر دیتے تھے یہ درحقیقت اپنے بہادری کا تذکرہ کیا جاتا تھا۔

ابوعقبہ نے جب اپنے آپ کو فارس کی طرف منسوب کیا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے ناپسند فرمایا اور انصار کی طرف منسوب کرنے کی رغبت دی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ آپ کا مقصد یہ تھا "**فانسب الى الانصار الذين هاجرت اليهم ونصرونی**" کہ تم انصار کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرو، کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی طرف میں

نے ہجرت کی اور انہوں نے میری امداد کی اور خاص کر کے ابوعقبہ اہل فارس سے آزاد ہو کر انصار میں آ چکے تھے، اس لحاظ پر بھی انہیں اپنے آپ کو انصار کی طرف منسوب کرنا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی:

”وکان فارسی فی ذلک الزمان کفارا فکرہ ﷺ الا نتساب الیھم وامرہ بالانتساب الی الا نصار لیکون منتسبا الی اھل الاسلام“

کہ فارسی اس زمانہ میں کافر تھے تو نبی کریم ﷺ نے ان کی طرف منسوب کرنے سے ابوعقبہ کو منع فرمایا کہ تم اپنے آپ کو انصار کی طرف منسوب کرو تا کہ تمہاری نسبت اہل اسلام کی طرف ہو۔

خیال رہے کہ ضمناً ایک اور مسئلہ سمجھ آ گیا کہ اگر چہ زیادہ مشہور یہی ہے کہ مدینہ طیبہ کے صحابہ کرام جنہوں نے مہاجرین مکہ صحابہ کرام کی امداد کی وہ انصار تھے، لیکن اس حدیث پاک سے ایک یہ مسئلہ بھی سمجھ آیا:

”وفیہ اشعار بان الصحابۃ مماعدا المھجرین قد یطلق علیھم الا نصار ولیسوا بمخصوصین باھل المدینۃ کمایتوھم“

کہ مدینہ طیبہ کے صحابہ کرام ﷺ کو ہی انصار کہا جائے اور کسی کو انصار نہ کہا جائے یہ وہم پیش کرنا درست نہیں کیونکہ کبھی کبھی دوسرے صحابہ کرام کو بھی انصار کہا گیا ہے، جیسا کہ ابوعقبہ ﷺ کو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہیں یہ کہنا چاہئے تھا ”خذھا منی وانا الغلام الانصاری“ یہ ضرب مجھ سے لے لو میں ایک انصاری نوجوان ہوں۔ ابوعقبہ حقیقت میں فارسی ہی تھے، مدنی نہیں تھے، لیکن ان کو انصار کی طرف منسوب کرنے کا حکم دیا گیا کہ غیر مدنی کو بھی انصار کہا گیا ہے۔ البتہ غیر مدنی کو انصار کہنے میں قرائن کی ضرورت ہوگی۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج۹ ص ۱۸۷)

❁ ”وعن ابن مسعود عن النبی ﷺ قال من نصر قومہ علی غیر الحق فھو کالبعیر الذی ردی فھو ینزع بذنبہ“ (رواہ ابو داؤد، مشکوٰۃ باب المفاخرۃ و العصبیۃ)

حضرت ابن مسعود ﷺ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص قوم کی ناحق امداد کرے وہ ہلاک ہو جانے والے اونٹ کی طرح ہے جسے دم سے پکڑ کر کھینچا جا رہا ہو۔

وضاحت حدیث:

”(علی غیر الحق) ای علی باطل او مشکوک“ ناحق امداد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسے معلوم ہے کہ وہ جھوٹا ہے باطل راہ پر چل رہا ہے یہ پھر بھی اسے اپنی قوم کا فرد سمجھتے ہوئے اس کی امداد کرے یا اسے اس شخص کے سچا ہونے کا کوئی یقین نہ ہو صرف شک کی بنیاد پر اس کی امداد کرے تو اس کا امداد کرنا باطل ہو گا۔ ”فھو کالبعیر الذی ردی“

لفظ "ردی" کو تین طرح پڑھا گیا ہے دال پر فتحہ (زبر) اور مخفف، دال کے نیچے کسرہ (زیر) اور یاء پر فتحہ (زبر) اور زیادہ مشہور اور صحیح یہ ہے کہ راء پر ضمہ (پیش) اور دال مشدد و مکسور اور یاء پر فتحہ معنی اس کا کنوئیں میں گر جاتا یا مطلق ہلاک ہو جانا یعنی وہ شخص اپنی قوم کی باطل امداد کی وجہ سے ہلاکت میں واقع ہو جاتا ہے۔

تشبیہ میں وجوہ:

نبی کریم ﷺ نے ہلاک ہونے والے اونٹ سے تشبیہ دی جس کو دم سے پکڑ کر کھینچا جائے، اس تشبیہ کی چند وجہ بیان کی گئی ہیں۔

(۱) ایک ان میں سے یہ ہے کہ "اذا اراد الرفعة بنصرة قومه فوقع فی حضیض بئر الاثم وهلک کا لبعیر فلا ینفعه کما لا ینفع البعیر نزعه عن البئر بذنبه"

اس شخص نے اپنی قوم کی باطل طور پر امداد کر کے اپنے آپ کو بلند کرنا چاہا تو وہ گناہوں کے کنوئیں کی گہرائی میں گر کر ہلاک ہو گیا، جیسے کہ اونٹ کنوئیں میں گر کر ہلاک ہو جائے، لہٰذا جس طرح کنوئیں میں گرے ہوئے اونٹ کو دم سے پکڑ کر کھینچنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اسی طرح اپنی قوم کی باطل طور پر امداد کرنے والے کو کوئی فائدہ نہیں۔

یہ بھی طلباء کرام کے ذہن میں رہے کہ "ذنب" کے ذال اور نون دونوں پر فتحہ ہے، جس کا معنی ہے "دم"

(۲) "وقیل شبه القوم ببعیر هالک لان من کان علی غیر حق فهو هالک وشبه ناصرهم بذنب هذا البعیر فکما ان نزعه بذنبه لا یخلصه من الهلکة کذالک هذا الناصر لا یخلصهم عن بئر الهلاک التی وقعوا فیها"

دوسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ قوم جو باطل راہ پر ہے اسے ہلاک ہونے والے اونٹ سے تشبیہ دی گئی کہ وہ باطل راہ پر ہونے کی وجہ سے گویا کہ ہلاکت میں واقع ہو گئے اور یہ ان کا ہم قوم جو ان کی باطل طور پر امداد کر رہا ہے گویا کہ یہ ان کو ہلاکت سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہے ایسے ہی جیسے کنوئیں میں گرے ہوئے اونٹ کو دم سے پکڑ کر کھینچنے والے اسے کوئی نفع نہیں پہنچا سکتے، ایسے ہی یہ شخص جو ان کی باطل راہ پر امداد کرنے والا ہے ان کو کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا۔

اعتراض:

بیہقی نے حضرت انس ﷺ سے ایک مرفوع روایت بیان فرمائی ہے۔

"عن انس مرفوعا من نصر اخاه بظهر الغیب نصره الله فی الدنیا و الاخرة"

حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اپنے بھائی کی غیر موجودگی میں امداد فرماتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی دنیا اور آخرت میں امداد فرماتا ہے۔

یہ حدیث تو مطلق ہے، اس میں صرف امداد کرنے کا ذکر ہے، حق یا باطل کا کوئی تذکرہ نہیں۔ گویا کہ ہر طرح

کی امداد جائز سمجھ آتی ہے۔

جواب : "هذا الحديث محمول على نصرة الحق وان كان اللفظ مطلقا" یہ حدیث جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بیہقی نے روایت کی ہے حق راہ پر جو ہو اس کی امداد پر محمول ہے۔ لفظ اگرچہ عام ہیں، لیکن دوسری احادیث سے واضح ہو جانے پر کہ باطل طور پر امداد نا جائز ہے تو اس حدیث کو بھی حق امداد پر محمول کرنا لازم ہو گیا۔
(ماخوذ مرقاۃ ج۹ ص۸)

آنے والی حدیث سے بھی یہ مسئلہ واضح ہو رہا ہے، اور زیر بحث حدیث سے تو زیادہ ہی واضح ہے۔

❁ "وعن واثلة بن الاسقع قال قلت يارسول الله ﷺ ما العصبية قال ان تعين قومك على الظلم"
(رواہ ابو داود مشکوٰۃ باب المفاخرہ والعصبیہ)

واثلہ بن اسقع کہتے ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ عصبیہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ تم اپنی قوم کی ظلم پر امداد کرو۔

وضاحت حدیث: اس حدیث پاک سے واضح ہو رہا ہے کہ ظالم کی امداد کرنا جب عصبیت و جاہلیت ہے تو "ان الواجب عليك متابعة الحق من غير نظر الى ملاحظة الخلق" واجب ہے تم پر کہ حق کی تابعداری کرو، حق پر چلنے والے کی امداد کرو، مخلوق کی طرف نہ دیکھو کہ یہ تمہارا رشتہ دار ہے یا غیر ہے۔ رشتہ دار ظالم ہو تو اس کی امداد کرنا ظلم عظیم ہے۔ اس پر دارمی اور ابن عساکر کی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت زیادہ واضح طور پر دلالت کر رہی ہے۔

"عن جابر مرفوعا انصر اخاك ظالما او مظلوما ان يك ظالما فاردده عن ظلمه وان يك مظلوما فانصره"

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اپنے بھائی کی امداد کرو، خواہ ظالم ہو یا مظلوم اگر وہ ظالم ہے تو (اس کی امداد یہ ہے کہ) اسے ظلم سے روکو، اور مظلوم کی امداد یہ ہے کہ اس کی امداد کرو، یعنی اسے ظالم کے ظلم سے بچاؤ۔
(ماخوذ مرقاۃ ج۹ ص۱۰)

❁ "عن سراقة بن مالك بن جعشم قال خطبنا رسول الله ﷺ فقال خيركم المدافع عن عشيرته مالم يأثم" (رواہ ابو داود، مشکوٰۃ باب المفاخرہ والعصبیہ)

سراقہ بن مالک بن جعشم فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خطبہ دیا تو فرمایا کہ تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنے قبیلہ سے مدافعت کرے جب تک وہ گناہ نہ ہو۔

وضاحت حدیث: "**سراقه**" سین پر ضمہ ہے۔ "**جعشم**" جیم اور شین پر ضمہ ہےاور عین ساکن ہے۔ "**عشیرۃ**" سے مراد قریبی رشتہ دار ہیں جن کے ساتھ انسان مل جل کر رہتا ہے۔

"**مالم یاثم**" (جب تک گناہ نہ ہو) کا مطلب راقم کو وسیع نظر آتا ہے ایک مطلب تو یہ ہے کہ تم اپنے قبیلہ کی طرف سے مدافعت تو کرو جب تک گناہ نہ ہو یعنی تمہارا رشتہ دار ظالم نہ ہو، باطل راہ پر نہ ہو، اگر باطل راہ پر چلنے والے، ظالم کی تم امداد کرو گے تو تم گنہگار ہو گے یہ امداد ناجائز ہوگی۔ (راقم)

دوسرا معنی حضرت علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں۔

"(مالم یاثم) ای مالم یظلم علی المرفوع فانه حیث یکون جامعا بین نصرة المظلوم ووصلة الا قارب"

"جب تک گناہ نہ ہو" کا مطلب یہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہ اپنے رشتہ دار کی طرف سے مدافعت کرتے ہوئے تم جس سے مدافعت کر رہے ہو اس پر ظلم کر بیٹھو، مقصد بیان یہ ہے کہ تم سے بہتر وہ شخص ہے کہ جو اپنے رشتہ دار سے مدافعت کرے بشرطیکہ دوسرے پر ظلم نہ کرے، جب یہ صورت اختیار کرے گا اپنے مظلوم رشتہ دار کی امداد کا ثواب بھی حاصل ہو گا اور صلہ رحمی کا بھی اسے ثواب حاصل ہوگا۔

تنبیه: "اعلم انه لو قدر علی دفع الظلم عن قومه بکلام لم یجز له الضرب ولو قدر بالضرب لم یجزله القتل لانه من باب الا مر بالمعروف والنهی عن المنکر فیجب مراعاة الترتیب قال تعالی ﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجٰدِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ﴾

اگر ظالم کے ظلم کو صرف زبان سے یعنی کلام کے ذریعے دور کیا جا سکے تو صرف زبانی نصیحت سے کام لے، مارنا جائز نہیں ہوگا۔ اگر زبانی نصیحت سے کام نہ چلے معمولی مارنے کی ضرورت درپیش آئے تو معمولی مار سے کام لے، جب معمولی مار سے کام چل جائے تو لڑائی کرنا جائز نہیں۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ "تم ان کو حکمت سے سیدھی راہ کی طرف بلاؤ اور اچھی نصیحت سے اور اچھی طرح (دلائل سے) جھگڑا کرو" ہاں اگر ظالم کے ظلم کے برابر اس سے بدلہ لیا جائے تو یہ جائز ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ﴾ اور اگر تم سزا دو تو اسی کی مثل سزا دو جو تمہیں سزا دی گئی۔

❁ "وعن ابی الدرداء عن النبی ﷺ قال حبک الشیء یعمی و یصم" (رواہ ابوداؤد، مشکوۃ باب المفاخرۃ والعصبیۃ)

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کسی چیز سے تمہاری محبت، اندھا اور بہرہ کر دیتی ہے۔

وضاحت حدیث: "**حبک الشیء**" میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ نسبت ہو نا فاعل کی طرف اور معنی تمہارا کسی سے محبت کرنا اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ نسبت ہو مفعول کی جانب ہو، اس وقت معنی ہوگا، کسی کا تمہارے ساتھ محبت کرنا اندھا اور بہرہ کرنے کا مطلب کیا ہے، وہ مطلب یوں بیان کیا گیا۔

"یجعلک اعمی عن رؤیۃ معایب الشیٔ المحبوب بحیث لا تبصر فیه عیبا ویجعلک اصم عن سماع قبائحه بحیث لا تسمع فیه کلامه قبیحا لا ستیلاء سلطان المحبة علی فؤادک"

کہ کسی سے محبت تمہیں اندھا کر دے گی کہ تمہیں محبوب کے عیب نہیں دکھائی دیں گے اور تمہیں بہرہ کر دے گی کہ تمہیں محبوب کی کوئی بری بات بری نہیں سنائی دے گی کیونکہ تمہارے دل پر اس کی محبت کا غلبہ چھایا ہوا ہے۔

وعین الرضا عن کل عیب کلیة ولکن عین السخط تبدی المساویا

رضامندی کی آنکھ ہر عیب سے رات کی طرح (پردہ پوشی کرتی) ہے اور ناراضگی کی آنکھ ہر گناہ (عیب) کو ظاہر کر دیتی ہے۔

نبی کریم ﷺ کو جوامع الکلم کا خصوصی وصف حاصل ہے کہ الفاظ مختصر اور مطالب زیادہ، اگر بظاہر دیکھا جائے تو اس حدیث کا تعلق مفاخرت وعصبیت سے نظر نہیں آتا، لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ تم کسی کی محبت میں اتنے گرفتار نہ ہو جاؤ کہ اس کے عیب بھی تمہیں نظر نہ آئیں، اس کی فحش کلامی بھی تمہیں نہ سنائی دے۔ تم اس سے اندھا دھند تعاون کرتے چلے جاؤ۔ اگر وہ حق پر ہو تو تمہارا امداد کرنا درست ہوگا لیکن وہ جب باطل راہ پر چل رہا ہو تو تمہارا اس کی امداد کرنا زمانہ جاہلیت کی عصبیت ہی ہوگی اور گویا کہ محبوب کے عیوب پر فخر ہوگا جو سراسر ناجائز ہے۔ یہ روایت مسند احمد، تاریخ بخاری، خرائطی اور ابن عساکر میں بھی مذکور ہے۔

❁ "عن عبادۃ بن کثیر الشامی من اهل فلسطین عن امرأۃ منهم یقال لها فسیلة انها قالت سمعت ابی یقول سالت رسول الله ﷺ فقلت یا رسول الله امن العصبیة ان یحب الرجل قومه قال لا ولکن من العصبیة ان ینصر الرجل قومه علی الظلم" (رواه احمد وابن ماجه ، مشکوۃ باب المفاخرۃ والعصبیة)

عبادہ بن کثیر شامی جو اہل فلسطین سے ہیں وہ ایک فلسطینی عورت سے روایت کرتے ہیں، جسے "فسیلہ" (مکبر اور مصغر دونوں طرح پڑھا گیا ہے) وہ کہتی ہیں کہ میں نے آپ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ کیا کوئی شخص اپنی قوم سے محبت کرے تو یہ بھی عصبیت ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں لیکن عصبیت تو یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی قوم سے اس کے ظلم پر امداد کرے۔

حدیث پاک کا مفہوم بہت واضح ہے کہ قوم سے مطلقاً محبت کرنا منع نہیں بلکہ اپنے رشتہ داروں سے محبت

رکھنا اور اچھا سلوک رکھنا اچھا کام ہے، البتہ منع عصبیت ہے۔ عصبیت کا مطلب یہ ہے کہ اس کی قوم باطل راہ پر ہو لوگوں پر مظالم ڈھار ہے ہوں تو یہ ان کی ظلم پر امداد کرے۔ اس سے اجتناب ضروری ہے۔

❁ " و عن عقبة بن عامر قال قال رسول الله ﷺ انسابكم هذه ليست بمسبةعلى احد كلكم بنو آدم طف الصاع بالصاع لم تملوه ليس لاحد على احد فضل الا بدين وتقوى كفى بالرجل ان يكون بديا فا حشا بخيلا " (رواه احمد والبيهقي في شعب الايمان مشكوة باب المفاخرة والعصبية)

عقبہ بن عامر کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے یہ نسب کسی ایک کیلئے بھی گالیوں کا سبب نہ بنیں، تم تمام آدم علیہ السلام کی اولاد ہو، اور تم ایک دوسرے سے اسطرح ہو جیسا کہ صاع جو بھرا ہوا نہ ہو وہ دوسرے صاع کے مقابل ہو جو بھرا ہوا نہ ہو، کسی ایک کو دوسرے پر فضیلت حاصل نہیں سوائے دین اور تقوی کے، انسان کے گنہگار ہونے کیلئے کافی ہے کہ وہ بدکلام اور اس کے کام فحش پر مبنی ہوں اور وہ بخیل ہو۔

وضاحت حدیث:

"**انسابکم هذه**" تمہارے یہ نسب جو لوگوں کے سامنے مشہور و معروف ہیں، جو بمنزل محسوس کے ہیں جن کی طرف اشارۃ کیا جا سکتا ہے (اسی وجہ سے ھذہ اشارہ لایا گیا)۔

(**ليست بمسبة**) "مسبة" میں میم اور سین مفتوح ہیں اور باء مشدد ہے۔ "اى محل سب وسبب عار" گالیوں کا سبب بننا اور عار کا سبب بنا۔ اب مکمل معنی یہ ہو گیا کہ یہ تمہارے نسب دوسروں کو گھٹیا سمجھنے، ان کو گالی دینے اور عار دلانے کا سبب نہ بنیں جب تم "طف الصاع بالصاع لم تملوه" کا معنی بیان کیا گیا ہے۔

" كلكم متساوون في النسبة اى أب واحد متقاربون كتقارب ما في الصاع أو تساوية للصاع اذا لم يملأملأ تاماحتى يزداد عليه"

جب تم سب ہی آدم علیہ السلام کی اولاد سے ہو تو تم نسبت میں برابر ہو، ایک دوسرے کے قریب ہو، جیسا کہ دو صاع بھرے ہوئے نہ ہوں تو وہ ایک دوسرے جیسے ہیں کسی ایک کو دوسرے پر برتری حاصل نہیں اسی طرح تمہیں بھی نسب پر فخر کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ تم تمام کا نسب اولاد آدم ہونے کے لحاظ پر ایک ہی ہے۔

اور صاع سے تشبیہ دے کر اور وضاحت یہ فرما دی کہ جس طرح ایک ادھورا صاع دوسرے ادھورے صاع پر فخر نہیں کر سکتا اسی طرح تم بھی نقصان اور خسارے میں ہو تم ایک دوسرے پر کس وجہ سے برتری کا اظہار کر رہے ہو، ہاں بلندی مرتبہ صرف دین اور تقوی سے حاصل ہوگی، جیسا کہ رب تعالی نے فرمایا: ﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ﴾ "بیشک تم

میں سے اللہ کے ہاں عزت والا وہی ہے جسے تم میں سے تقویٰ زیادہ حاصل ہوگا‘‘ اور رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَالْعَصْرِ o اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ o لا اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْ وَعَمِلُو الصَّالِحَاتِ﴾

’’قسم ہے زمانہ کی بیشک تمام انسان ہی خسارے میں ہیں سوائے ایمان والوں اور اچھے عمل والوں کے‘‘

" کفی بالرجل ان یکو ن بذیا فا حشا بخیلا" یہ جملہ تقریباً اس طرح ہے جس طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ’’کفی بالمرء اثما ان یحدث بکل ما سمع‘‘ انسان کے گنہگار ہونے کیلئے کافی ہے کہ ہر بات جو سنے وہ بیان کردے یہاں بھی اگر ’’اثما‘‘ کا لفظ محذوف ہو تو معنی یہ ہوگا۔ کہ انسان کے گنہگار ہونے کیلئے کافی ہے کہ وہ بدکلامی سے کام لے اور اس کے کام فحش پر مبنی ہوں اور بخیل ہو۔ یعنی "جامعا بین اطالۃ اللسان وتقصیر الاحسان" یعنی زبان کو لمبا کرنے اور احسان کو کوتاہ کرنے کو جمع کردے۔ اسی طرح یہاں لفظ ’’نقصانا‘‘ کو بھی محذوف مانا جاسکتا ہے۔ جس کا معنی ہوگا انسان کیلئے یہی نقصان کافی ہے۔ اور لفظ ’’عار‘‘ کو بھی محذوف مانا جاسکتا ہے۔ جس کا معنی ہوگا انسان کو شرمندہ کرنے کیلئے یہی کافی ہے۔ الخ اور لفظ "مسبۃ" بھی محذوف نکالا جاسکتا ہے۔ اس صورت میں معنی ہوگا انسان کا گالی گلوچ میں مشہور ہونے کیلئے یہی کافی ہے کہ وہ بدکلام اور افعال اس کے فحش ہوں اور کنجوس ہو۔

آمدم بر سر مطلب: ذکر ہو رہا تھا کہ ﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ﴾ کا وسیع تر مفہوم ہے۔ اسی کے ضمن میں تفسیر مظہری سے عصبیت کے متعلق ایک ابوداؤد کی حدیث ذکر کی تو طلباء کرام کے فائدہ کیلئے کچھ اور احادیث بمع تشریحات کے ذکر کردیں، مظہری اور یہ ذکر کرتے ہیں۔

❁ "عن حارثۃ بن وھب قال قال رسول اللہ ﷺ الا اخبرکم باھل الجنۃ کل ضعیف متضعف لو اقسم علی اللہ لابرہ الا اخبرکم باھل النار کل عتل جواظ مستکبر" (بخاری و مسلم)

حارثہؓ بن وھبؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں خبر نہ دوں اہل جنت کی؟ اہل جنت وہ لوگ ہوں گے جو ضعیف ہوں گے اور اپنے آپ کو ضعیف سمجھیں گے۔ اگر وہ اللہ پر قسم اٹھا دیں گے تو اللہ ان کی قسم کو پورا کردے۔ کیا میں تمہیں جہنمیوں کی خبر نہ دوں۔ جہنمی سخت مزاج، متکبر، نیکیوں سے روکنے والے ہوں گے۔

وفی روایۃ المسلم" کل جواز زنیم متکبر" جہنمی وہ لوگ ہوں گے جو دوسروں کو روکیں گے اور اپنے آپ کو کسی قوم سے ملائیں گے حالانکہ اس قوم سے نہیں ہوں گے اور وہ متکبر ہوں گے۔

وضاحت حدیث: "ضعیف و متضعف" سے مراد یہ ہے کہ جو غریب وفقیر ہوں اور حقیقت میں عاجز ہوں گویا کہ عجز ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہو وہ حقیقی طور پر ضعیف الحال ہوتا ہے۔ جس کا عجز بغیر کسی تکلف

کے نمایاں ہوتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اتنا مقبول ہوتا ہے کہ اگر وہ قسم اٹھا دے کہ ایسا ہوگا یا ایسا نہیں ہوگا تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس کی قسم کو پورا کر دیتا ہے۔ لیکن وہ لوگ جو سرکش، متکبر، دوسروں کو نیکیوں سے روکنے والے اور کسی قوم کا فرد نہ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو اس قوم میں ملانے والے جہنمی ہوں گے۔

"(**عتل**) شدید الجافی الفظ الغلیظ من الناس" جو شخص لوگوں میں سے سخت مزاج ہو، کسی نیک اور برے میں تمیز نہ کرے، ہر ایک سے یوں درپیش آئے جیسے کتا ہر ایک کو بھونکتا ہے، اسے "عتل" کہتے ہیں۔ "(الجواظ) الجموح المنوع" جو شخص دوسروں کو نیکیوں سے منع کرے خود بھی نیکیوں سے دور رہے اسے "جواظ" کہتے ہیں۔ "المستکبر" متکبر کو کہا جاتا ہے، "الزنیم" الملحق بالقوم لیس منھم" جو شخص اپنے آپ کو قوم سے ملائے وہ اس قوم کا فرد نہ ہو اسے زنیم کہا جاتا ہے۔ (از مظہری)

مقام افسوس یہ ہے کہ آج ہزاروں کی تعداد میں غیر سید اپنے آپ کو سید بنیں نظر آئیں گیں۔ کئی گھٹیا قوموں کے افراد شہروں میں آ کر راجہ، ملک، چوہدری بن کر اپنی نسل کو برباد کرنے کے ساتھ جھوٹ، فراڈ کے مرتکب ہو کر اپنے ایمان کو قینچیوں سے کاٹ رہے ہیں۔

❁ "وعن الحسن مرسلا قال قال رسول اللہ ﷺ حب الدینار رأس کل خطیئۃ"

(رواہ البیھقی فی شعب الایمان)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ جو تابعی ہیں درمیان میں راوی کا واسطہ چھوڑتے ہوئے مرسل حدیث روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دینار کی محبت ہر خطاء کی اصل ہے۔ (مظہری)

یعنی انسان کو جب مال و دولت سے محبت ہوگی تو مال جمع کرنے کی وہ کوشش بھی کرے گا اور مال جمع کرنے میں بھی ضروری نہیں کہ وہ مال حلال طریقے سے ہی جمع کرے گا ہو سکتا ہے کہ وہ مال بھی حرام طریقے سے حاصل کرے پھر جب مال ہوگا تو وہ ہر قسم کے جرائم میں دلیر ہوگا کہ مال دے کر جان چھڑا لوں گا۔ یعنی مال کی حوس بھی ﴿ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰهُ ﴾ کے ضمن میں آتی ہے۔

❁ "عن انس قال قال رسول اللہ ﷺ حب ابی بکر و عمر ایمان و بغضھما نفاق" (رواہ ابن عدی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی محبت ایمان ہے اور ان دونوں سے بغض منافقت ہے۔ (مظہری)

❁ "وعن جابر مرفوعا حب ابی بکر و عمر من الایمان و بغضھما کفر و حب الانصار من الایمان و بغضھم کفر و من سب اصحابی فعلیہ لعنۃ اللہ و من حفظنی فیھم فانا احفظہ یوم القیامۃ"

حضرت جابر ؓ مرفوع حدیث بیان کرتے ہیں ابوبکر اور عمر ؓ کی محبت ایمان کا حصہ ہے اور ان سے بغض رکھنا کفر ہے اور انصار سے محبت ایمان کا حصہ ہے اور ان سے بغض رکھنا کفر ہے اور عرب سے محبت ایمان کا حصہ ہے اور ان سے بغض رکھنا کفر ہے اور جس شخص نے میرے صحابہ کو گالی دیں اس پر اللہ کی لعنت ہو اور جس نے میری حفاظت کی ان میں تو میں اس کی قیامت کے دن حفاظت کروں گا۔ (مظہری)

کیا خوب ارشاد فرمایا کہ صحابہ کرام ؓ کو **گالی دینا** اللہ تعالیٰ کی لعنت کا مستحق ہونا ہے اور آنے والے الفاظ مبارکہ اور دوسری احادیث کی تائید سے یہ بھی سمجھ آ گیا کہ جس نے میرے صحابہ کو گالی دیں اس نے مجھے گالی دی اور جس نے میرے صحابہ کو گالیوں سے بچایا اس نے مجھے گالیوں سے بچایا، جس نے مجھے گالیوں سے بچایا قیامت کے دن میں اسے شفاعت کر کے اللہ کے عذاب سے بچاؤں گا۔

❀ "عن النبی ﷺ قال حب علی عبادة" نبی کریم ﷺ نے فرمایا حضرت علی ؓ کی محبت عبادت ہے۔ (مظہری)

❀ "وعن علی قال والذی خلق الحبة وبرئی النسمة لعهد النبی الأمی ﷺ الی ان لا یحبنی الا مؤمن ولا یبغضنی الا منافق" (رواه مسلم)

حضرت علی ؓ فرماتے ہیں قسم ہے اس ذات کی جس نے دانے کو پھاڑا اور ذی روح مخلوق کو پیدا فرمایا نبی امی ﷺ کا میرے ساتھ عہد ہے کہ میرے ساتھ کوئی محبت نہیں رکھے گا سوائے مومن کے اور میرے ساتھ کوئی بغض نہیں رکھے گا سوائے منافق کے۔ (مظہری)

"**فلق الحبة**" دانے کو پھاڑا یعنی جس ذات نے دانے اور گٹھلیوں کو پھاڑ کر ان سے نباتات کو پیدا کیا۔

"**برأ النسمة**" برأ کا معنی پیدا کیا "بارئی" پیدا کرنے والا "النسمة" ہر ذی روح چیز، حدیث پاک میں جس محبت کا ذکر ہے وہ کون سی محبت ہے؟ وہ محبت یہ ہے۔ "والمعنی لا یحبنی حبا مشروعا مطابقا للواقع من غیر زیادة ونقصان" کہ حضرت علی ؓ کا مقصد یہ ہے کہ میرے ساتھ صرف مومن ہی محبت رکھیں گے لیکن اس محبت سے مراد یہ ہے کہ وہ میرے ساتھ جائز محبت رکھیں گے جو واقع کے مطابق ہوگی۔ نہ ہی میری محبت میں حد سے تجاوز کریں گے اور نہ ہی میرے ساتھ بغض میں حد سے بڑھیں گے۔

❀ "عن علی قال قال رسول الله ﷺ فیک مثل من عیسیٰ ابغضته الیهود حتیٰ بهتوا امه واحبته النصاریٰ حتی انزلوه بالمنزلة التی لیست له ثم قال یهلک فی رجلان محب مفرط یقرظنی بما لیس فی و مبغض یحمله شنانی علی ان یبهتنی" (رواه احمد)

حضرت علی ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہاری مثال عیسیٰ علیہ السلام کی طرح ہے کہ ان سے یہود نے بغض رکھا

یہاں تک کہ ان کی والدہ پر بہتان لگایا اور نصاریٰ نے ان سے محبت کی یہاں تک کہ ان کو ان کے مرتبہ سے اتار کر اس مرتبہ پر پہنچا دیا جو ان کا نہیں تھا۔ پھر حضرت علی ﷺ نے فرمایا میری وجہ سے دو قسم کے لوگ ہلاکت میں پہنچ گئے۔ ایک بہت زیادہ میری تعریف کرنے والا جو مجھ میں نہیں اور میرے ساتھ بغض رکھنے والا جسے میری عداوت مجھ پر بہتان باندھنے پر (یعنی عیب لگانے پر) ابھارتی ہے۔

حدیث پاک میں الفاظ کی وضاحت:

"یقرظنی ای یمد حنی والتقریظه بالظاء المعجمة مدح الحی ووصفه" تقریظ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ زندہ شخص کی تعریف کرنا اور وصف بیان کرنا۔ (لمعات)

"شتان" بفتح النون والسکون والمدالعداوة وقیل شدة البغض "(لمعات) عداوت رکھنا اور سخت بغض رکھنا۔

حدیث پاک کا مفہوم واضح ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے جسطرح یہودیوں نے بغض رکھا اور اس بغض اور عداوت کی وجہ سے آپ کی والدہ مکرمہ پر معاذ اللہ زنا کی تہمت لگائی اسی طرح حضرت علی ﷺ سے بغض رکھنے والے خارجی آپ کے عیوب بیان کر کے گویا کہ آپ پر بہتان باندھتے ہیں اور جس طرح عیسیٰ علیہ السلام سے نصاریٰ نے بظاہر محبت کی لیکن حقیقت میں ان کو مرتبہ رسالت وعبودیت سے ہٹا کر مرتبہ الوہیت تک پہنچا دیا یہ حقیقت میں آپ کے مرتبہ کو کم کرنے کو مستلزم ہے۔ اسی طرح رافضیوں نے بظاہر حضرت علی ﷺ سے محبت کا ڈھونگ رچایا ہوا ہے لیکن درحقیقت وہ آپ کو اپنے مرتبہ سے ہٹا کر اس مرتبہ پر پہنچانے کی ناکام کوشش میں رہتے ہیں جو آپ کو حاصل نہیں۔

"فمن احبه وابغض الشیخین مثلا فما احبه حبا مشروعا" (مرقاۃ)

جس نے حضرت علی ﷺ سے محبت رکھی اور حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بغض رکھا اس نے حقیقت میں حضرت علی ﷺ سے جائز محبت نہیں رکھی۔

ایسے لوگ بظاہر محبت کے دعویدار ہیں لیکن درحقیقت وہ حضرت علی ﷺ کی شان کو گھٹا رہے ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مثال دی اور ان سے بے جا اور حد سے تجاوز کرنے والوں کے متعلق فرمایا "انزلوه بالمنزلة التی لیست له" کہ انہوں نے آپ کو اپنے مرتبہ سے اتار دیا۔ یعنی مطلب واضح ہوا کہ رب تعالیٰ تم سے حساب لے گا اگر تم نے صحابہ کرام کی شان میں گستاخی کی یا حضرت علی ﷺ کی شان میں گستاخی کی۔

❁ "وعن عطیة الساعدی مرفوعا ان الغضب من الشیطان" (رواہ ابو داؤد)

عطیہ ساعدی سے مرفوع حدیث مروی ہے یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا غضب شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔

یعنی غضب ثوران نفس (نفس کے بھڑکنے اور جوش مارنے) کی وجہ سے ہوتا ہے کہ میں فلاں سے انتقام لوں یہ ابھارنے والا جوش دلانے والا شیطان ہی ہوتا ہے۔ (از مظہری)

❁ "عن بهز بن حكيم عن ابيه عن جده مرفوعا ان الغضب يفسد الايمان كما يفسد الصبر العسل"
(رواه البيهقي في الشعب)

بھز بن حکیم اپنے باپ، دادا سے مرفوع حدیث روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک غضب ایمان کو فاسد کر دیتا ہے جیسا کہ ایلوا شہد کو برباد کر دیتا ہے۔

''صبر'' ایک کڑوی دوا ہے جسے ''ایلوا'' کہا جاتا ہے۔ ہماری زبان میں اسے ''مصبر'' کہتے ہیں۔ یہ شہد میں ملائیں تو شہد بھی کڑوا ہو جاتا ہے۔ دونوں حدیثوں کو اس آیۃ کی تفسیر میں قاضی مظہری رحمہ اللہ نے نقل فرما کر مسئلہ واضح کر دیا کہ صبر سے کام لو، غیظ و غضب اور جوش سے انتقام لینا شیطانی عمل ہے، رب تعالیٰ تم سے اس کا حساب لے گا۔

❁ "وعن عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده مرفوعا اول صلاح هذه الامة اليقين والزهد واول فسادها البخل والامل" (رواه البيهقي)

عمرو بن شعیب اپنے باپ دادا سے مرفوع حدیث روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس امت کی پہلی درستگی یقین اور زہد ہے۔

(یعنی ایمان کے ساتھ ایقان ضروری ہے اور دنیاوی حرص و امید سے انقطاع ضروری ہے اور کامل رب تعالیٰ کی طرف توجہ ہو اسی کا نام زہد ہے) اور پہلا فساد کنجوسی اور امیدیں رکھنا (یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدقات فرضیہ اور واجبہ کو نہ ادا کرنے والا اور دنیاوی مال و متاع کا حریص اور لمبی لمبی امیدیں باندھنا یہ اس امت کیلئے فساد (نادرستگی، بگاڑ) ہے۔ (از مظہری)

❁ "عن سعد قال قال رسول الله ﷺ من سعادة ابن آدم رضاؤه بما قضى الله ومن شقاوة ابن آدم سخطه بما قضى الله" (رواه احمد والترمذي)

حضرت سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابن آدم کی سعادت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ اور اس کے حکم پر راضی رہے اور انسان کی بدبختی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلوں اور اس کے احکام کو پسند نہ کرے اور ان پر ناراض ہو۔
(مظہری)

❁ "عن معاذ جبل مرفوعا قال يطلع الله الى جميع خلقه ليلة النصف من شعبان فيغفر لجميع خلقه الا لمشرك او مشاحن" (رواه الدار قطني وصححه ابن حبان)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اپنی تمام مخلوق پر شعبان کی پندرھویں رات کو اپنی جلوہ نمائی فرماتا ہے، (اس رات عبادت کرنے والے توبہ کرنے والے) تمام لوگوں کی

مغفرت فرماتا ہے سوائے مشرک اور سخت کینہ اور دشمنی رکھنے والوں کے۔

تنبیہ: واضح ہوا کہ نفس کے تمام برے کام اور اچھے کام خواہ ظاہر ہوں یا چھپے ہوئے اللہ تعالی کے علم میں ہیں اور اللہ تعالی ان کا حساب لے گا چند احادیث آیۃ کریمہ کا وسیع تر مفہوم ثابت کرنے کیلئے پیش کردیں ورنہ "فسی رذائل النفس ومحامدھا احادیث لا تکاد تحصی" نفس کے رذیل کاموں اور اچھے کاموں کے متعلق بے شمار احادیث ہیں، جن کا ذکر یہاں کئی جلدوں کا تقاضا کرتا ہے۔ (ماخوذ از مظہری)

﴿فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاءُ﴾

"تو بخشش فرمائے گا جس کی چاہے گا، اور عذاب دے گا جسے چاہے گا۔"

یعنی اگر اللہ تعالی اپنے فضل وکرم سے کسی کو معاف فرمانے کا ارادہ فرمائے گا تو معاف فرمادے گا اور اگر اس نے عدل کرتے ہوئے کسی کو اس کے گناہوں کا عذاب دینا چاہا تو اسے عذاب دے گا۔

﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ "اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

یعنی اللہ تعالی عذاب دینا چاہے یا مغفرت کرنا چاہے وہ اس پر قادر ہے "ان شاء عذب علی الصغیرۃ وان شاء غفر الکبیرۃ من غیر توبۃ" اگر چاہے تو چھوٹے گناہوں پر عذاب دے دے اور اگر چاہے تو بغیر توبہ کے کبیرہ گناہوں کو معاف کردے" لا یمکن لا حد الا عتراض علیہ "کسی ایک کو اس ذات پر اعتراض کرنا ممکن نہیں۔

معاصی کے حساب پر اجماع امت ہے:

اہل سنت وجماعت کا اس مسئلہ پر اجماع ہے کہ معاصی پر حساب حق ہے خواہ ان گناہوں کا تعلق جسم سے ہو یا نفس سے ہو یا دل سے ہو۔ اور صغائر گناہوں یا کبائر ان پر عذاب دینا حق ہے لیکن واجب نہیں البتہ اللہ تعالی کی مشیت پر موقوف ہے چاہے تو مغفرت فرمائے، چاہے تو عذاب دے۔

❁ "روی طاؤس عن ابن عباس قال فیغفر لمن یشاء الذنب العظیم یعنی سواء تاب عنہ المذنب اولم یتب ویعذب من یشاء علی الذنب الصغیر لا یسئل عما یفعل"

طاؤس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ﴿فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاءُ﴾ (بخشش فرمائے گا جسے چاہے گا) کا مطلب یہ ہے کہ وہ چاہے تو گناہ کبیرہ کی مغفرت فرمادے خواہ وہ گنہگار توبہ

کرے یا نہ کرے اور چاہے تو صغائر گناہوں پر عذاب دے دے، رب تعالیٰ سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔

معتزلہ وروافض اس کے منکر ہیں:

یعنی معتزلہ اور روافض حساب کا انکار کرتے ہیں اور ان کا قول یہ ہے " یجب العذاب علی العصاة " نافرمانوں، گنہگاروں کو عذاب دینا واجب ہے۔ اہل سنت و جماعت کے مذہب پر یہ آیۃ کریمہ روز روشن کی طرح واضح دلیل ہے کہ مغفرت وعذاب اللہ تعالیٰ کی مشیت میں ہے۔

❁ "عن عائشة رضی الله عنها ان النبی ﷺ قال لیس احد یحاسب یوم القیامة الا هلک قلت اولیس یقول الله تعالی ﴿فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيرًا﴾ فقال انما ذلک العرض ولکن من نوقش فی الحساب یهلک" (بخاری ومسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن کوئی ایک بھی نہیں ہوگا کہ اس کا حساب لیا جائے مگر یہ کہ وہ ہلاک ہوگا۔ تو میں نے عرض کیا کہ کیا رب تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ جلدی سہل حساب لے گا، آپ نے فرمایا یہ اس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، اگر حساب میں گرفت ہوئی تو وہ ہلاک ہو جائے گا۔

یعنی حساب ہونا تو حق ہے کہ رب تعالیٰ کے سامنے نیکیوں اور گناہوں کو پیش کیا جائے گا، لیکن اگر حساب میں کسی کی گرفت ہوگئی تو وہ ہلاک ہو جائے گا، اس سے بھی واضح ہوا کہ گرفت میں واقع ہونے پر اللہ تعالیٰ کی مشیت کا دخل ہوگا، گرفت واقع ہونا لازم نہیں۔

"قال صاحب الفائق یقال ناقشه الحساب اذا عاسره فیه واستقصی فلم یترک قلیلا ولا کثیرا"

مناقشہ یہ ہے کہ مشکل حساب لیا جائے۔ قلیل اور کثیر عمل کو نہ چھوڑا جائے، انتہائی چھانٹ بینٹ کی جائے۔

"والعرض هو ابراز الاعمال واظهارها فیقر صاحبها بذنوبه لم یتجاوز عنها لاظهار الفضل کما ان المناقشة لبیان ظهور العدل عرض الاعمال"

عرض کا مطلب یہ ہے کہ اعمال کو ظاہر کرنا کہ انسان اپنے گناہوں کا اقرار کر لے، پھر اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دے، اس میں اللہ تعالیٰ کا فضل ہوگا، اور مناقشہ میں سخت حساب ہوگا، کسی چھوٹے بڑے عمل سے درگزر نہیں کیا جائے گا یہ اظہار عدل ہوگا۔ (از مرقاۃ ج ۱۰ ص ۲۶۱)

❁ "عن عدی بن حاتم قال قال رسول الله ﷺ ما منکم من احد الا سیکلمه ربه لیس بینه وبینه ترجمان ولا حجاب یحجبه فینظر ایمن منه فلا یری الا ما قدم من عمله وینظر أشام منه فلا یری الا ما قدم

وینظر بین یدیه فلایری الاالنار تلقاء وجهه فاتقواالنار ولوبشق تمرة" (بخاری ومسلم،مشکوۃ باب الحساب)

عدی بن حاتم کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی ایک شخص نہیں ہوگا مگر یہ کہ اس سے اس کا رب کلام کرے گا، اس بندے اور اس کے رب کے درمیان کوئی ترجمان نہیں ہوگا، اور نہ ہی کوئی حجاب ہوگا، تو وہ دائیں جانب دیکھے گا تو اسے اور کچھ نظر نہیں آئے گا سوائے اس کے کہ اس نے جو عمل آگے بھیجے ہوں گے، اور اپنی بائیں جانب دیکھے گا تو اسے کچھ نظر نہیں آئے گا سوائے اس کی جو اعمال اس نے آگے بھیجے ہونگے اور آگے دیکھے گا تو اسے سوائے آگ کے کچھ نظر نہیں آئے گا تو آگ سے بچ جاؤ اگر چہ کھجور کے کچھ حصہ (صدقہ کرنے) سے۔

وضاحت حدیث: رب تعالیٰ کا بغیر ترجمان کے مؤمن بندوں سے کلام کرنا اور بے حجاب ان کو زیارت کرانا، اس کی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی، جو اس کی شان کے لائق ہوگا اسی کے مطابق کلام فرمائے گا اور اسی کے مطابق ان کو اپنی زیارت کرائے گا، اور یہ فائدہ حاصل ہوا کہ مؤمنین اس کے کلام کو خود بخود سمجھیں گے کسی کو درمیان میں ترجمان بنانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

"مامنکم من احد" من مزیدة لاستغراق النفی والخطاب للمؤمنین"

"مـن" زائد ہے، استغراق نفی کیلئے ہے یعنی نکرہ تحت النفی آنے کی وجہ سے عموم کا فائدہ دے رہا ہے اور خطاب مؤمنوں کو ہے یعنی مطلب یہ ہوا" کہ اے مومنو! کوئی ایک بھی تم میں سے نہیں ہوگا مگر یہ کہ اس کا رب تعالیٰ اس سے کلام کرے گا" الخ۔

دینی طلباء کرام کیلئے:

"ترجمان" کو زعفران کے وزن پر بھی پڑھا گیا ہے اور جیم پر پیش اور تاء پر زبر سے بھی اور تاء اور جیم دونوں کے پیش سے بھی پڑھا گیا ہے تا کلمہ کیا ہے۔" ترجم یترجم ترجمة" باب فعللة ہے۔ مترجم کو مدحرج کے وزن پر پڑھا جائے، متصرف کے وزن پر باب تفعلل پر پڑھنا درست نہیں۔

"ولا حجاب" ای حاجز وساتر ومانع بینه وبینه (یحجبه) ای یحجب ذلک العبد من ربه"

اس بندے اور رب تعالیٰ کے درمیان کوئی رکاوٹ، کوئی پردہ، کوئی ممانعت نہیں ہوگی جو اس بندے کو اپنے رب سے دور رکھے اور حجاب بن جائے۔

"أیمن" دائیں جانب "أشأم" بائیں جانب یعنی دائیں جانب دیکھے گا تو اسے اپنے اچھے اعمال نظر آئیں گے اور بائیں جانب دیکھے گا تو اسے اپنے برے اعمال نظر آئیں گے، اس کے بغیر اور اسے کچھ نہیں دکھائی دے گا۔

دائیں بائیں دیکھنے کی وجہ:

"اذا دهمه امران يلتفت يمينا وشمالا لطلب الغوث" جب کوئی معاملہ پریشان کن انسان کو درپیش آتا ہے تو وہ دائیں بائیں دیکھتا ہے کہ کوئی میری فریاد کو پہنچنے والا مل جائے۔

"ويحتمل ان يكون سبب الالتفات انه يترجى ان يجد طريقا يذهب فيها لتحصل له النجاة من النار فلايرى الامايفضى به الى النار"

اور دائیں بائیں دیکھنے کی یہ وجہ بھی ہوتی ہے کہ انسان ایسی گھڑی میں نجات کی راہ تلاش کرتا ہے خصوصا قیامت کی گھڑی میں وہ آگ سے بچنے کی راہ دیکھے گا، لیکن سوائے نار کے راستہ کے اسے اور کوئی راستہ نہیں نظر آئے گا۔

"فاتقوا النار" "اذا عرفتم ذلك فاحذروا منها ولا تظلموا احدا"

آپ کا ارشاد گرامی "تو آگ سے بچو" اس کا مطلب بائیں جانب اعمال ہوں، آگے آگ ہوگی تو اس سے ڈرو اور کسی پر ظلم نہ کرو۔

"ولو بشق تمرة" اى فتصدقوا ولو بشق تمرة اى ولو بمقدار نصفها او ببعضها والمعنى ولو بشيء يسير منها أو من غيرها فانه حجاب وحاجز بينكم وبين النار فان الصدقة جنة ووسيلة الى جنة"

"تو آگ سے بچو اگر چہ کھجور کے کچھ حصہ سے" اگر چہ کھجور کا نصف حصہ دے یا کچھ حصہ دے مطلب صرف کھجور ہی نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ خواہ تھوڑا سا حصہ کھجور کا صدقہ کرے یا کوئی چیز اور تھوڑی مقدار میں صدقہ کر دے تو وہ اس بندے اور آگ کے درمیان حجاب اور آڑ بن جائے گی، بیشک صدقہ ڈھال کی حیثیت رکھتا ہے اور جنت میں جانے کا ذریعہ ہے۔

❁ "عن عدى بن حاتم مرفوعا اتقوا النار ولو بشق تمرة فان لم تجدوا فبكلمة طيبة"

عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آگ سے بچو اگر چہ کھجور کے ایک حصہ کو صدقہ کرنے سے اگر تم نہ پاؤ تو کلمہ طیبہ سے۔ (بخاری، مسلم، مسند احمد)

یعنی تھوڑے سے صدقہ سے جو خلوص نیت سے ہو جہنم کی آگ سے بچا جا سکتا ہے اگر معمولی چیز بھی صدقہ کرنے کی طاقت نہیں تو کلمہ طیبہ سے اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچائے کلمہ طیبہ کا ذکر کر کے اپنے آپ کو بچائے ایک احتمال یہ ہے اور دوسرا اقوی احتمال جو عام شارحین نے لیا ہے وہ یہ ہے کہ اچھا کلام کر کے با اخلاق طریقہ سے لوگوں سے گفتگو کر کے اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچائے اور تیسرا احتمال یہ ہے کہ سائل سے نرم گفتگو کر کے اسے جواب سے کہ میرے پاس اس وقت کوئی مال نہیں کہ میں تمہیں دوں یہ بھی جہنم کی آگ سے بچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ (ماخوذ از مرقاۃ بزیادۃ ج ۱۰ ص ۲۶۲)

❁ "وعن ابن عمر قال قال رسول اللهﷺ ان اللہ یدنی المؤمن فیضع علیه کنفه ویستره فیقول اتعرف ذنب کذا اتعرف ذنب کذا فیقول نعم ای رب حتی قرره بذنوبه ورأی فی نفسه انه قد هلک قال سترتها علیک فی الدنیا وانا اغفرها لک الیوم فیعطی کتاب حسناته واماالکفار والمنافقون فینادی بهم علی رؤس الخلائق هؤلاء الذین کذبوا علی ربهم ألا لعنة الله علی الظالمین"

(بخاری ومسلم مشکوۃ باب الحساب)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالی مؤمن کو اپنے قریب کرے گا اور اس پر اپنا دست قدرت رکھے گا اور اسے ڈھانپ لے گا پھر کہے گا کیا تم اپنے اس طرح کے گناہوں کو جانتے ہو کیا تم اپنے اس طرح کے گناہوں کو جانتے ہو؟ تو وہ کہے ہاں اے میرے رب یہاں تک کہ وہ اپنے گناہوں کا اقرار کرلے گا (کہ ہاں میں اپنے یہ گناہ پہچانتا ہوں کہ میں نے یہ گناہ کئے ہیں) وہ اپنی ذات میں دیکھے گا کہ بیشک وہ ہلاکت میں پڑ گیا تو رب تعالی فرمائے گا میں نے تمھاری دنیا میں پوشی کی اور میں آج تمھاری ان گناہوں سے مغفرت کررہا ہوں تو اسے نیکیوں والا اعمال نامہ دے دیا جائے گا لیکن کفار اور منافقین کو تمام مخلوق کے سامنے پکارا جائے گا (اور کہا جائے گا) یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب تعالی کی تکذیب کی خبردار اللہ تعالی کی لعنت ہو ظالموں پر۔

وضاحت حدیث:

"**یدنی**" کی یاء پر ضمہ (پیش) ہے "ای یقربه کرامة لا قرب مسافة فأنه سبحانه یتعالی عن ذلك" اللہ تعالی بندے کو اپنے قریب کرے گا اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے اپنے رحمت کے قریب کرے گا وہ مقرب ہوگا یعنی رب تعالی کے ہاں مکرم ہوگا قرب مکانی مراد نہیں یہ معنی کرنا باطل ہوگا کہ وہ مسافت کے لحاظ پر بندے کو اپنے مکان کے قریب کرے گا کیونکہ رب تعالی مکان سے پاک ہے مکان کامحتاج جسم ہوتا ہے جب رب تعالی جسم سے پاک ہے تو مکان سے بھی پاک ہے۔

"فیضع علیه کنفه بفتحتین ای یحفظه مستعار من کنف الطائر وهو جناحه لانه یحوط به نفسه ویصون به بیضته"

یعنی "کنف الطائر" لفظ بولا جاتا ہے جس کا معنی ہوتا ہے پرندے نے اپنے پر بچھائے جس کی وجہ سے پرندہ اپنے آپ کو بھی بچاتا ہے اور اپنے انڈوں کو بھی یہاں مجازی معنی لیا جائے گا کہ اللہ تعالی اپنے بندے کو اپنی حفاظت میں لے گا یعنی اس پر اپنا دست قدرت اور اپنا دست شفقت ورحمت رکھے گا۔ "ویستره" اور اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔

"یعنی یستر عن اهل المؤقف کیلا یفتضح وقیل ای یطهر عنایةعلیه ویصونهه عن الخزی بین اهل

المؤقف"

اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو اپنے رحمت کے پردے میں لے گا تاکہ وہ میدان قیامت میں کھڑے دوسروں لوگوں سے رسوا نہ ہو یعنی اللہ تعالیٰ اس پر اپنی عنایت ظاہر فرمائے گا اور اس کو رسوائی سے بچائے گا۔

"فیقول اتعرف ذنب کذا اتعرف ذنب کذا" رب تعالیٰ فرمائے گا کیا تو اپنے فلاں گناہ کو جانتا ہے کیا تو اپنے فلاں گناہ کو جانتا ہے یہ سوال دو مرتبہ کر کے اشارہ کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ تمھارے دلوں کی باتوں کو جانتا ہے۔"فیقول نعم ای رب حتی قررہ بذنوبہ" وہ کہے گا اے میرے رب ہاں میں اپنے گناہوں کو جانتا پہچانتا ہوں یہاں تک کہ وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کرلے گا یعنی اسے اعتراف کرنے کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہوگا کیونکہ جب اسے معلوم ہو جائے گا کہ رب تعالیٰ تو میرے دلوں کے رازوں پر بھی مطلع ہے تو سوائے اقرار کرنے کے اس کیلئے کوئی راہ نہیں رہے گی۔

"ورای فی نفسہ" ای ظن المؤمن فی باطنہ (انہ قد ھلک) ای مع الھالکین ولیس لہ طریق مع الناجین "

یعنی مومن کے دل میں یہ گمان پیدا ہوگا کہ اب میں نے ہلاک ہونے والوں کے ساتھ ہی ہونا ہے نجات حاصل کرنے والوں کا ساتھ اور قرب مجھ جیسے گنہگار کو کیسے نصیب ہوگا؟ یہ تو بہت مشکل ہے۔

"ورای فی نفسہ" کے معنی میں ایک اور احتمال یہ ہے کہ ضمیریں "اللہ" کی طرف لوٹیں تو اب معنی یہ ہوگا "علم اللہ فی ذاتہ انہ ھلک ای المؤمن" اللہ تعالیٰ کو ذاتی علم حاصل ہے کہ مومن اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے از روئے عدل مستحق ہلاکت ہو چکا ہے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے تمھاری دنیا میں پردہ پوشی کی میں آج بھی تمھاری مغفرت کر رہا ہوں تو اسے نیکیوں کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دے دیا جائے گا۔ لیکن کفار اور منافقین کے متعلق تمام مخلوق کے سامنے اعلان کر کے کہا جائے گا کہ یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی تکذیب کی اور اس کے ساتھ شریک ٹھہرائے خبردار اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے ظالموں پر یعنی مشرکین اور منافقین پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اس طرح تمام مخلوق کے سامنے اس کی رسوائی ہوگی۔ (از مرقات ج۱۰ص۲۶۲)

❀ "وعن ابی موسی قال قال رسول اللہ ﷺ اذا کان یوم القیامۃ دفع اللہ الی کل مسلم یھودیا او نصرانیا فیقول ھذا فکاکک من النار" (رواہ مسلم، مشکوۃ باب الحساب)

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب قیامت کا دن ہوگا اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو یہودی یا نصرانی دے گا اور فرمائے گا یہ تمہیں آگ سے بچائے گا۔

وضاحت حدیث: اصل میں ہر شخص کے دو دو ٹھکانے ہیں ایک جنت میں اور ایک جہنم میں

جس شخص نے صدق دل سے ایمان قبول کرلیا تو اللہ تعالی اسکے جہنم کے ٹھکانے کو جنت کے ٹھکانے سے بدل دے گا اور جس نے کفر کیا اللہ تعالی اس کے جنت کے ٹھکانے کو جہنم کے ٹھکانے سے بدل دے گا یعنی کافر مؤمنین کے آگ کے ٹھکانوں میں پہنچ جائیں گے گویا کہ ان کے نائب اور خلیفہ ہوں گے یہی معنی ہے (ھذا فکاکک) ای خلاصک (من النار) کا۔ اس مندرجہ بالا ترجمہ پر مرقاۃ کی عبارت کو طلباء کرام دیکھیں وہ یہ ہے۔

"لما كان لكل مكلف مقعد من الجنة ومقعدمن النار فمن امن حق الايمان بدل مقعده من النار بمقعد من الجنة ومن لم يؤمن فبالعكس كانت الكفر كالخلف للمؤمنين فى مقاعد هم من النار والنائب منا بهم فيها"

یھود ونصاری کی تخصیص کی کیا وجه ؟

"ولعل تخصيص اليهود والنصارى بالذكر لاشتهار هما بمضادة المسلمين ومقابلة هما اياهم فى تصديق الرسول المقتضى لنجاتهم"

یہود نصاری کو ذکر فرمایا حالانکہ تمام کفار کی جنتوں میں سے نشستوں کو بدل کر جہنم میں انہیں نشستیں دے دی جائیں گے گویا کہ وہ مسلمانوں کی جہنم کی نشستوں میں پہنچ جائیں گے، اس طرح ہر کافر مسلمان کا جہنم میں بدل ہوگا، لیکن یہود و نصاری مسلمانوں کے کھلے دشمن تھے، اور مسلمانوں نے جو رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کر کے اپنی نجات حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا یہ ان کو ناپسند تھا، اسی وجہ سے ان کا خصوصی طور پر ذکر کیا گیا۔

تنبیه: مجازی معنی ہی مراد ہے کیونکہ جب ہر شخص کے دو دو ٹھکانے ہوتے ہیں جہنم میں بھی اور جنت میں بھی، تو مسلمان کو جنت میں اپنا مکان بھی ملنا ہے اور کافر کا چھوڑا ہوا بھی اور کافر کو جہنم میں اپنا مکان بھی ملنا ہے اور مسلمان کو جہنم سے نجات حاصل ہونے کی وجہ سے اس کا مکان بھی کافر کو ملنا ہے تو گویا کہ کافر مؤمن کا بدل ہوگا جہنم کے مکان میں۔ یہ بھی خیال رہے بعض روایات میں مطلقا کفار کا بھی ذکر ہے، اور "فکاک" کی جگہ "فداء" کا ذکر ہے۔

❁ "عن ابى موسى قال قال رسول الله ﷺ اذكان يوم القيامة بعث الله تعالى الى كل مؤمن ملكامعه كافر فيقول الملك للمؤمن يامؤمن هاك هذاالكافرفهذا فداؤك من النار"

(رواہ الطبرانی والحاکم)

ابوموسی ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالی ہر مؤمن کی طرف ایک فرشتہ بھیجے گا اس کے ساتھ ایک کافر بھی ہوگا، وہ فرشتہ مؤمن کو کہے گا اے مؤمن یہ کافر ہے، یہ تمہارا آگ سے آزاد کرنے کا فدیہ ہے۔ (از مرقاۃ ج ۱۰ ص ۲۶۳)

❁ "وعن انس قال کنا عند رسول الله ﷺ فضحک فقال هل تدرون مما أضحک قال قلنا الله ورسوله أعلم قال من مخاطبة العبد ربه یقول یارب الم تجرنی من الظلم قال یقول بلی قال فیقول فانی لااجیز علی نفسی الاشاهدا منی قال فیقول کفی بنفسک الیوم علیک شهیدا وبالکرام الکاتبین شهودا قال فیختم علی فیه فیقال لأرکانه انطقی قال فتنطق باعماله ثم یخلی بینه وبین الکلام قال فیقول بعد لکن وسحقا فعنکن کنت اناضل" (رواہ مسلم،مشکوۃ باب الحساب)

حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس تھے رسول اللہ ﷺ مسکرائے، پھر آپ نے فرمایا کیا تم میرے مسکرانے کی وجہ کو جانتے ہو؟ ہم نے کہا اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا (میرے مسکرانے کی وجہ) بندے کا اپنے رب سے خطاب ہے، بندہ کہے گا اے میرے رب! کیا تو نے مجھے ظلم سے پناہ نہیں دی؟ رب تعالی فرمائے گا کیوں نہیں (یعنی ظلم سے تو میں نے تمہیں پناہ دے دی ہے) تو رب تعالی فرمائے گا کہ میں اپنے لئے کوئی فیصلہ کرتا بغیر گواہوں کے جائز نہیں سمجھتا، آج تمہارا اپنا نفس ہی تمہارے خلاف گواہی دینے کیلئے کافی ہے اور "کراما کاتبین" گواہی کیلئے کافی ہیں، پھر اس کے منہ پر مہر لگادی جائے گا، اس کے اعضاء کو کہا جائے گا تم کلام کرو، تو وہ اس کے اعضاء بول کر بتائیں گے کہ اس کے یہ عمل تھے، پھر اس کے اور اس کے کلام کے درمیان رکاوٹ کو ہٹا دیا جائے گا یعنی مہر کو ختم کردیا جائے گا، تو وہ کہے گا ہائے ہلاکت، (اے میرے اعضاء) کیا میں اسی لئے تمہاری طرف سے مدافعت کرتا رہا۔

وضاحت حدیث: یہی مفہوم قرآن پاک کے تیسویں پارہ میں موجود ہے، تفصیلی تذکرہ تو وہاں ہی انشاء اللہ آئے گا، البتہ صرف چند الفاظ مبارکہ اور ان کے ترجمہ کو دیکھ لیا جائے۔

﴿اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ﴾

"آج ہم ان کے منہوں پر مہر لگا رہے ہیں ان کے ہاتھ ہمارے ساتھ کلام کریں گے، اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے"۔

اور دوسری آیۃ میں ذکر فرمایا، ﴿تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ﴾ ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان پر گواہی دیں گے۔

"بعدا" دوری "وسحقا" بضم وسکون ویضم ای هلاکا"

"سحقا" کے سین پر پیش ہے اور حاء ساکن بھی اور پیش سے بھی پڑھی گئی ہے، معنی اس کا ہے "ہلاک ہونا"

"والمناضلة المراماة بالسهام والمراد هنا المحاجة بالکلام"

"مناضلة" کا معنی آمنے سامنے سے ایک دوسرے کو تیر مارنا، لیکن یہاں مراد ہے کلام سے حجت پیش کرنا۔

"بعدا لکن وسحقا" ای فیقول العبد للارکان ای البعدن واسحقن"

یعنی بندہ اپنے اعضاء کو کہے تم دور ہو جاؤ، برباد ہو جاؤ یا کہے گا ہائے ہلاکت، ہائے بربادی۔
"فعنکن کنت اجادل، ای عن قبلکن ومن جھتکن ولأجل خلاصکن اجادل واخاصم وادافع"
میں تمہاری طرف سے "تمہاری وجہ سے" تمہیں بچانے کے لئے جھگڑا کرتا رہا اور مدافعت کرتا رہا۔ یعنی
وہ بطور تعجب یا بطور اضطرار اپنے اعضاء کو کہے گا
"اخاصم لخلاصکن وانتن تلقین انفسکن فیھا"
میں تمہیں بچانے کی غرض سے تمہاری طرف سے مخاصمت کرتا رہا، لیکن مقام افسوس یہ ہے کہ تم خود ہی
اپنے آپ کو ہلاکت و بربادی میں ڈال رہے ہو۔
اسی مضمون کو قرآن پاک میں ان الفاظ مبارکہ سے پیش فرمایا:
﴿وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾
وہ لوگ اپنے چمڑوں کو کہیں گے تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی، وہ کہیں گے ہمیں اس ذات نے بولنے کی طاقت دی جس نے ہر چیز کو بولنے کی طاقت دی، اور اسی نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا اور اسی کی طرف تمہیں لوٹایا جاتا ہے۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج ۱۰ ص ۲۶۵)

بغیر حساب کے جنت میں جانے کا مطلب:

❁ "عن ابی امامة قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول وعدنی ربی ان یدخل الجنة من امتی سبعین الفا لاحساب علیھم ولاعذاب مع کل الف سبعون الفاوثلاث حثیات من حثیات ربی"
(رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ، مشکوۃ باب الحساب)

ابوامامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ میرے رب نے میرے ساتھ وعدہ فرمایا کہ وہ میری امت سے ستر ہزار لوگوں کو جنت میں داخل کرے گا ان پر کوئی حساب نہیں ہوگا اور نہ ان پر عذاب ہوگا اور ہر ہزار کے ساتھ ستر، ستر ہزار اور ہوں گے، میرے رب کے تین قبضوں میں ہوں گے۔

وضاحت حدیث: ستر ہزار کا لفظ کبھی بیان عدد کیلئے آتا ہے کہ یہ معین تعداد ہے لیکن کبھی بیان کثرت کیلئے آتا ہے جسکا مطلب ہوتا کثیر تعداد اس صورت میں تعداد معین نہیں ہوتی بلکہ ستر ہزار سے زائد بھی مراد ہوتے ہیں یہاں بیان کثرت ہی مراد ہے۔ "لاحساب علیھم ای لامناقشة لھم فی المحاسبة" (ان پر کوئی حساب نہیں ہوگا) اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان پر بالکل حساب نہیں ہوگا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان پر حساب میں

مناقشہ نہیں ہوگا، صرف ان کے اعمال ان پر پیش ہوں گا، جن کا ان کو علم حاصل ہوگا، ان پر فضل ہی فضل ہوگا، راقم کہتا ہے "لاحساب علیھم" میں لفظ "علی" سے ہی یہ پتہ چل رہا ہے کہ حساب ان کے خلاف نہیں ہوگا یعنی نفی ضرر رساں حساب کی ہے، مطلق حساب کی نہیں۔ "ثلاث حثیات من حثیات ربی" سے بھی پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہا کی امت کے لوگ کثیر تعداد میں رب تعالی کے فضل سے جنت میں جائیں گے، ان پر حساب میں تنگی نہیں ہوگی۔

"الحثیة والحثوة یستعمل فیمایعطیه الانسان بکفیه دفعة واحدة من غیر وزن وتقدیر ثم تستعار لما یعطی من غیر تقدیر"

جب دونوں ہاتھوں سے بغیر وزن اور بغیر اندازے کسی کو دیا جائے تو اس کیلئے عربی میں "حثیة" اور "حثوة" الفاظ استعمال ہوتے ہیں، پھر مجازی طور پر مطلقاً معنی لیا جاتا "بغیر اندازے کے دینا، بے حساب دینا" یعنی وہ لوگ اتنی تعداد میں ہوں جو رب تعالی کے دو ہاتھوں میں تین مرتبہ سمائیں گے، رب تعالی چونکہ ہاتوں سے پاک ہے، اور اس کے قبضہ قدرت میں آنے کی کوئی حد بیان نہیں ہوسکتی، لہذا آسان معنی یہی ہوگا کہ وہ لوگ جو جنت میں بغیر تنگی حساب کے جائیں گے وہ کثیر تعداد میں ہوں گے، ان کی تعداد کو رب تعالی ہی جانتا ہے۔

علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں "ویمکن حمله علی التجلی الصوری" کہ رب تعالی کے قبضہ میں ہونے کا یہ مطلب لینا بھی ممکن ہے کہ رب تعالی ان کو اپنی ظاہر تجلیات سے مشرف فرمائے گا۔

(ماخوذ از مرقاۃ ج ۱۰ ص ۲۶۸)

❁ "وعن الحسن عن ابی هریرة قال قال رسول اللهﷺ یعرض الناس یوم القیامة ثلاث عرضات فاما عرضتان فجدال ومعاذیر واماالعرضة الثالثة فعندذلک تطیر الصحف فی الایدی فآخذ بیمینه واخذ بشماله" رواه احمد والترمذی" وقال لایصیح هذاالحدیث من قبل ان الحسن لم یسمع من ابی هریرة وقد رواه بعضهم عن الحسن عن ابی موسی"

(مشکوۃ باب الحساب)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، رسول اللہ ا نے فرمایا لوگوں کو قیامت کے دن تین مرتبہ پیش کیا جائے گا، دو مرتبہ تو جھگڑا اور عذر ہوگا، لیکن تیسری مرتبہ اعمال نامے ان کے ہاتھوں میں دے دئے جائیں گے، کسی کے دائیں ہاتھ میں اور کسی کے بائیں ہاتھ میں۔

وضاحت حدیث: قیامت کے دن لوگوں کو اللہ تعالی پر پیش کیا جائے گا تین مرتبہ، لیکن پہلی مرتبہ وہ اپنے نفسوں سے دفاع کریں گے۔ "ویقولون لم یبلغنا الانبیاء ویحاجون الله تعالی" اور کہیں گے ہم تک انبیاء نے تیرے احکام نہیں پہنچائے تھے، اس طرح وہ اللہ تعالی کے حضور حجت بازی سے کام لیں گے اور جھگڑا

کریں گے۔اور دوسری مرتبہ،"یعترفون ویعتذرون بأن یقول کل فعلته سهوا او خطأ او جهلا اور جاء ونحو ذلک" وہ اعتراف کرلیں گے اور عذر پیش کریں گے کہ اے اللہ ہم سے تیری احکام کی عدولی بھول کر ہوئی، یا کہیں گے حکم عدولی خطاء سے ہوئی، یا جہالت سے حکم عدولی کا قول کریں گے، یا کہیں گے تیری رحمت کی امید ہے، اس طرح وہ عذر پیش کریں گے، حیلے بہانے تراشیں گے، تیسر مرتبہ جب بندوں کو رب تعالی کے حضور پیش کیا جائے گا تو سب کے اعمال نامے متفرق کر کے اہل سعادت (نیکوں) کے دائیں ہاتھ میں دے دئے جائیں گے، اور اہل شقاوت (بدبختوں) کے بائیں ہاتھ میں دے دیئے جائیں گے۔

"تطاير الصحف اى تفرقها الى كل جانب" "تطاير الصحف" کا معنی یہ ہے کہ ہر جانب نامہ اعمال کو پھیلا دیا جائے گا، یعنی تیسری مرتبہ جلدی ہی مکمل فیصلہ کر دیا جائے گا، چونکہ بعض روایات میں الفاظ ہی "یسرع وقوعها" کے ہیں کہ جلدی واقع ہو جائے گا۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

ترمذی نے اس حدیث کے متعلق لکھا ہے کہ یہ صحیح نہیں کہ حسن بصری رحمہ اللہ نے حضرت ابو ہریرہ ﷛ سے براہ راست نہیں سنا، اس لئے اس کی سند میں انقطاع ہے، سند متصل نہیں۔

" لكن قال الشيخ الجزرى فى تصحيح المصابيح بيع ان البخارى اخرج فى صحيحه الحسن عن ابى هرير ة ثلاث احاديث"

شیخ جزری رحمہ اللہ نے تصحیح المصابیح میں یہ بیان کیا ہے کہ بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت ابو ہریرہ ﷛ سے تین حدیثیں روایت کی ہیں۔

" اما مسلم فلم يخرج للحسن عن ابى هريرة شيا "

لیکن مسلم نے ایسی کوئی حدیث بیان نہیں کی جو حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کی روایت حضرت ابو ہریرہ ﷛ سے ہو۔ لیکن اس پر خوبصورت تحقیقی تبصرہ حضرت علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ کا دیکھئے، کیا خوب ذکر فرمایا۔

" اقول ولايلزم من عدم اخراج مسلم حديث عنه انه لايصح اسناده اذشرط البخارى وهو تحقق اللقاء ولومرة اقوى من شرط مسلم وهو مجرد وجود المعاصرة "

میں کہتا ہوں کے مسلم نے اگر کوئی حدیث حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کی روایت حضرت ابو ہریرہ ﷛ سے نہیں ذکر کی تو اس سے حدیث کا غیر صحیح ہونا تو لازم نہیں آتا۔ جب بخاری نے تین روایات ذکر کردی ہیں تو ان کی ملاقات تو ثابت ہو

گئی۔ کیونکہ بخاری کے نزدیک تو روایت کیلئے صرف ہم زمان ہونا کافی نہیں بلکہ کہیں ایک مرتبہ ملاقات کا پایا جانا ضروری ہے۔جبکہ مسلم کے نزدیک تو روایت کیلئے صرف ان دونوں یعنی راوی اور مروی عنہ (جس سے روایت کی گئی) کا ہم زمان ہونا ہی کافی ہے ملاقات نہ بھی ثابت ہو تو پھر بھی روایت صحیح ہے جب بخاری کی شرط مسلم کی شرط سے سخت اور قوی ہے تو یقیناً حضرت بصری رحمہ اللہ کی روایت حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے قبول ہوگی، اور ان کی ملاقات بھی ثابت ہو جائے گی۔

اصل میں بعض الفاظ مختلف معانی میں استعمال ہوتے ہیں جن کی وجہ سے لوگوں کو غلط مسئلہ بیان کر کے بتا دیا جاتا ہے۔ترمذی کا یہ کہنا "لایصح هذا الحدیث من قبل ان الحسن لم یسمع من ابی هریرة" کہ یہ حدیث صحیح نہیں اس وجہ سے کہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے براہ راست حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے نہیں سنا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ بلکہ ترمذی کا مطلب یہ ہے کہ یہ حدیث سند کے اتصال کے لحاظ پر صحیح نہیں، بلکہ منقطع ہے "صحیح الاتصال" کی نفی سے "ضعف" ثابت نہیں ہوتا بلکہ انقطاع ثابت ہوتا ہے۔وہ بھی ترمذی نے اپنے خیال سے مطابق بیان کیا ہے۔ ورنہ بخاری کا تین حدیثوں کو روایت کرنا انقطاع کی نفی کر رہا ہے۔

تاہم ترمذی نے بھی آخر میں یہ بیان کر دیا" وقد رواه بعضهم عن الحسن عن ابی موسی " کہ تحقیق یہی روایت بعض حضرت نے حضرت حسن بصری کی حضرت ابوموسی اشعری ﷺ سے بیان کی ہے۔ گویا کہ وہ روایت جو حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کی حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے ہے اسے تائید مل گئی اس روایت سے جو حضرت حسن بصری کی حضرت ابوموسی رضی اللہ عنہ سے ہے۔ بلکہ علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں، مؤلف نے اسماء الرجال میں بیان کیا ہے کہ،

" ان الحسن روی عن الصحابة کابی موسی وانس بن مالک وابن عباس وغیرهم"

بیشک حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے کئی صحابہ سے روایات بیان کی ہیں، یعنی حضرت ابوموسی اور حضرت انس بن مالک اور حضرت ابن عباس ﷺ سے ان کی روایات ملتی ہیں بلکہ ان کے بغیر اور بھی کئی صحابہ سے آپ کی روایات ملتی ہیں۔ (مرقات ج۱۰ص۲۶۹)

طلباء کرام اس قسم کی بحثوں کو ضرور یاد کیا کریں تا کہ ان کو کوئی دھوکا نہ دے سکے کہ یہ حدیث تو صحیح نہیں ضعیف ہے ایسے جاہل کو بتایا جائے یہاں صحیح کی نفی سے انقطاع ثابت کیا گیا ہے ضعف نہیں، وہ بھی ترمذی کا اپنا موقف ہے جو بخاری کی روایات کے مقابل درست نہیں۔

کیساوہ خوش قسمت ہوگا جس پر رب تعالی کا فضل ہوگا:

"عن عبدا لله بن عمرو قال قال رسول الله ﷺ ان الله سیخلص رجلامن امتی علی رؤس الخلائق یوم القیامة فینشر علیه تسعة وتسعون سجلا کل سجل مثل مدالبصرثم یقول اتنکر من هذ ا شیا اظلمک کتبتی الحافظون فیقول لا یارب فیقول أفلک عذر قال لا یارب فیقول بلی ان لک عند نا حسنة وانه لا ظلم علیک الیوم فتخرج بطاقة فیها اشهدان لااله الاالله وان محمد اعبده ورسوله فیقول احضر وزنک فیقول یارب ماهذه البطاقة مع هذا السجلات فیقول انک لا تظلم قال فتوضع السجلات فی کفة والبطاقة فی کفة فطاشت السجلات ولقلت البطاقة فلایثقل مع اسم الله شیء"

(رواہ الترمذی وابن ماجۃ مشکوۃ باب الحساب)

حضرت عبداللہ بن عمرو (بن العاص) رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالی ایک شخص کو میری امت میں سے پسند کرے گا، اسے قیامت کے دن تمام مخلوق کے سامنے لایا جائے گا اس پر (اس کے گناہوں کے) ننانوے دفتر کھول دیئے جائیں گے ہر دفتر انتہاء نظر تک جائے گا، پھر رب تعالی فرمائے گا کیا تو ان میں سے کسی چیز کا انکار کرتا ہے؟ کیا میرے لکھنے والے محافظین (کراما کاتبین) نے تم پر ظلم تو نہیں کیا؟ وہ عرض کرے گا نہیں۔ (یعنی اے اللہ نہ میں انکار کرتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ کراما کاتبین نے مجھ پر ظلم کیا ہے) رب تعالی فرمائے گا، کیا تیرا کوئی عذر ہے؟ وہ کہے گا نہیں، اے میرے رب (یعنی اے میرے رب میں کوئی عذر نہیں پیش کر سکتا) رب تعالی فرمائے گا ہاں کیوں نہیں تمہاری ایک (بہت بڑی) نیکی ہمارے پاس موجود ہے۔ بیشک آج تم پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا، پھر کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا جائے گا جس میں "اشهدان لااله الاالله وان محمد اعبده ورسوله" لکھا ہوگا تو رب تعالی اسے فرمائے گا تو اپنے وزن کرنے میں حاضر ہو جا تو وہ بندہ کہے گا اے میرے رب! یہ کاغذ کا ٹکڑا اتنے بڑے دفاتر کے سامنے کیا حیثیت رکھے گا، تو رب تعالی فرمائے گا بیشک تم پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا، اس کے (گناہوں کے) تمام دفاتر میزان کے ایک پلڑے (طرف) میں رکھ دیئے جائیں گے اور وہ کاغذ کا ٹکڑا دوسرے پلڑا (دوسرے حصہ) میں رکھ دیا جائے گا۔ وہ تمام دفاتر ہلکے ہوں گے، وہ کاغذ کا ٹکڑا بھاری ہوگا، اللہ تعالی کے نام پر کوئی چیز بھاری نہیں ہو سکتی۔

وضاحت حدیث : "**سیخلص** بتشدید اللام ای یختار" "سیخلص" کے لام پر شد ہے۔ معنی یہ ہے کہ پسند کیا جائے گا، منتخب کیا جائے گا۔

"**فینشر** بضم الشین المعجمة ای فیفتح" "فینشر" کے شین پر پیش ہے، جس کا معنی ہے کھولا جانا"

" **سجلا** " بکسر تین فتشدید ای کتابا کبیرا " سجل " ک ے سین اور جیم کے نیچے زیر ہے اور لام پر شد ہے جس کا معنی ہے بڑی کتاب جسے عام محاورہ میں دفتر کہا جاتا ہے۔ " **کل سجل مثل مدالبصر** " ہر بڑی کتاب انتہاء نظر تک ہوگی۔ یعنی اس کے اعمال کی بڑی کتاب، اس کے اعمال کے دفتر کی لمبائی اور چوڑائی وہاں تک ہوگی جہاں تک انسان کی نظر کام کرتی ہے۔

" **کتبتی** " میں " کتبة " کے پہلے تینوں حرفوں پر زبر ہے۔ جمع ہے کاتب کی، رب تعالی کا ارشاد' میرے لکھنے والے'' اس سے مراد " کراما کا تبین ' فرشتے ہیں جو لوگوں کے اعمال لکھتے ہیں۔ لوگوں کے اعمال کی حفاظت کرنے کی وجہ سے ان کو " حافظین " بھی کہا جاتا ہے۔

" **فیقول افلک عذر** " ہمزہ استفہام کا ہے، فاء علیحدہ، لام علیحدہ، کاف علیحدہ ہے۔ یعنی رب تعالی فرمائے گا کیا تیرا کوئی عذر ہے کہ یہ کام تو نے بھول کر کئے تھے، خطاء سے کئے تھے، یا جہالت سے کئے تھے۔ وہ اعتراف حقیقت کرتے ہوئے گا کہے نہیں کوئی عذر نہیں پیش کرسکتا سب کچھ جان بوجھ کر گناہ کئے تھے۔

" **بطاقة** " بکسر الباء ای رقعة صغیرة " کاغذ کے چھوٹے ٹکڑے کو " بطاقة " کہا جاتا ہے۔

" **فیقول احضروزنک** " ای الوزن الذی لک اووزن عملک او وقت وزنک او آلة وزنک وهو المیزان لیظهرلک انتفاء الظلم وظهور العدل وتحقق الفضل "

رب تعالی جب اس کے سامنے کاغذ کا ٹکڑا پیش فرمائے گا تو کہے گا'' تو اپنے وزن میں حاضر ہوجا'' اس کے کئی مطالب ہیں۔ ایک یہ کہ یہ بامحاورہ کلام ہو کہ تو اپنا وزن دیکھ یعنی اپنا مقام دیکھ یا مطلب یہ ہو کہ تو اپنے اعمال کے وزن کے پاس حاضر ہوجا یا مطلب یہ ہو جب تمہارے اعمال کا وزن کیا جائے اس وقت تم حاضر ہو یا مطلب یہ ہو کہ تم آلہ وزن یعنی میزان کے پاس حاضر ہوجاؤ، تاکہ تمہیں معلوم ہوجائے کہ اللہ تعالی کسی پر ظلم نہیں کرتا اور جب وہ عدل فرماتا ہے تو انسان کے گناہوں کے عظیم دفاتر کھل جاتے ہیں۔ بڑی بڑی کتابیں کھل جاتی ہیں۔ جب وہ فضل فرماتا ہے تو ایک نیکی یعنی اس نے جو اپنی زندگی میں کلمہ شھادت پڑھا ہوگا اسی کو رب تعالی اتنا وزن عطا فرمادے گا جو اس کے تمام گناہوں کے دفاتر پر بھاری ہوجائے گا۔

" **طاشت** " ہلکا ہوجانا، خفیف ہوجانا۔ " **ثقلت** " کا معنی بھاری ہوجانا۔ " فلا یثقل مع اسم الله شیء " اللہ تعالی کے نام پر کوئی چیز بھاری نہیں ہوسکتی، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالی انسان پر اپنا فضل فرمائے گا تو اس کا کلمہ شہادت پڑھنا اور رب تعالی کے اسم گرامی کا ذکر کرنا۔ " لایقاومه شئ من المعاصی بل یترجح نکر الله تعالی علی

جمیع المعاصی" سب پر بھاری ہوگا، کوئی گناہ اس کے مقابل نہیں آسکیں گے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا ذکر تمام گناہوں پر راجح ہوگا۔ حدیث پاک کا مطلب تقریباً ترجمہ سے واضح ہے مشکل الفاظ کے معانی ذکر کردیئے گئے۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج ۱۰ص ۲۶۹، ۲۷۰)

اعتراض : زیر بحث آیہ کریمہ میں رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿ وَاِنْ تُبْدُوْا مَافِیْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ﴾ میں نفس میں چھپانے اور ظاہر کرنے پر حساب کا ذکر ہے۔حالانکہ گناہ یا اچھے اعمال تو ظاہری اعضاء سے بھی سرزد ہوتے ہیں تو ظاہری اعضاء کا ذکر نہ کرنے کی کیا وجہ ہے؟

جواب : کہ اصل دارومدار دل کے پاک وصاف ہونے پر ہے "وبعد تزکیة النفس وتصفیة القلب لایصدر المعاصی الانادرا" کیونکہ نفس جب پاکیزہ ہوجائے اور دل صاف ہوجائے تو گناہ بہت کم ہی اس سے صادر ہوتے ہیں۔اس پر رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی شاہد ہے،"اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله" جسم میں ایک ٹکڑا (دل) ہے جب وہ درست رہے تو تمام جسم درست رہتا ہے اور جب وہ بگڑ جائے، فاسد ہوجائے تو تمام جسم بگڑ جاتا ہے، فاسد ہوجاتا ہے۔نفس مطمئنہ سے گناہ کم ہی صادر ہوتے ہیں، نیکی کے کام ہی زیادہ ہوتے ہیں۔

"والقلب المصفی عن الزیغ والکدورات یندم فوراویتوب الی الله متابابحیث یجعل الله سیاٰتهم حسنا ت وکان الله غفورارحیما"

اور دل جب ٹیڑھا پن ہونے سے پاک ہوگا اور کدورت سے پاک ہوگا تو اگر غلطی سے کوئی گناہ سرزد ہوگیا تو وہ انسان فوراً ہی اس پر پریشان ہوجاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسکے گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور اسے توبہ کی وجہ سے نیکیاں عطاء کرتا ہے کیونکہ توبہ خود ہی سب نیکیوں سے بڑھ کر عظیم نیکی ہے۔اللہ تعالیٰ توبہ کے بعد اسکے گناہ معاف کردے گا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

"عن ابی مسعود مرفوعا التائب من الذنب کمن لاذنب له" (رواہ ابن ماجه والبیهقی وعنه فی شرح السنة موقوفا)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے گناہوں سے توبہ کرلی اس کے گناہ ایسے معاف کردیئے جائیں گے گویا کہ اس کے گناہ تھے ہی نہیں۔ (ماخوذ از مظہری)

اب واضح ہوگیا کہ نفس کے اعمال پر حساب کو مرتب کیوں فرمایا گیا۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَانُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَیْكَ الْمَصِیْرُ o﴾ (البقرة، آیة نمبر ۲۸۵)

(1) رسول ایمان لایا اس پر جو اس کے رب کے پاس سے اس پر اترا اور ایمان والے سب نے مانا اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو یہ کہتے ہوئے کہ ہم اس کے کسی رسول پر ایمان لانے میں فرق نہیں کرتے اور عرض کی کہ ہم نے سنا اور مانا تیری معافی ہو اے رب ہمارے اور تیرے طرف پھرنا ہے۔

(2) ایمان لایا رسول نے اس پر جو نازل کیا گیا اس کی طرف اس کے رب کی طرف سے اور ایمان والے سب نے مانا اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو ہم نہیں فرق کرتے کسی ایک کے درمیان اس کے رسولوں میں سے (ایمان لانے میں) اور انہوں نے کہا ہم نے سنا اور فرمانبرداری کی، تو مغفرت فرما ہمارے رب اور تیری طرف ہی پھرنا ہے۔

ماقبل سے تعلق:

(۱) اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں جب اپنی کامل بادشاہی، کامل ملکیت، کامل علم اور کامل قدرت کا ذکر کیا جو کہ کمال صفات ربوبیت کو ثابت کر رہی ہیں۔ اس کے بعد بندے کی صفات بیان کیں کہ مؤمنین کامل طور پر رب تعالیٰ کے احکام پر سر جھکانے والے ہیں اور کامل مطیع ہیں اور اللہ تعالیٰ کے حضور کامل عاجزی کا اظہار کرنے والے ہیں، یہ انسان کی کامل عبودیت کا تذکرہ ہے جیسا کہ پہلی آیۃ کریمہ میں کامل صفات ربوبیت کا تذکرہ ہے۔

" واذا ظهر لنا كمال الربوبية وقد ظهر منا كمال العبودية فالمرجو من عميم فضله واحسانه ان يظهر يوم القيامة فى حقنا كمال العناية والرحمة والاحسان، اللهم حقق هذا الأمل"

اللہ تعالیٰ نے جب ہمارے لئے اپنی کامل ربوبیت کو ظاہر فرما دیا، اور اس نے اپنے فضل وکرم سے ہماری کمال عبودیت کو بھی ظاہر فرما دیا تو ہمیں قوی امید ہے کہ اپنے فضل واحسان کی وجہ سے قیامت کے دن ہمارے حق میں کامل عنایت

اور کامل رحمت اور کامل احسان فرمائے گا۔ **اے اللہ**! ہم نے جو تیری مہربانیوں اور تیرے احسان ورحمت پر امید رکھی ہوئی ہے تو اس کو ہمارے حق میں ثابت فرما، ہماری اس دعاء کو رد نہ فرمانا بلکہ شرف قبولیت عطاء فرمانا۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلی آیۃ میں ذکر فرمایا ﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَافِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْتُخْفُوْهُ یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ اور اگر تم ظاہر کرو جو تمہارے نفسوں میں ہے یا تم چھپا کر رکھو اسے تو اس کا اللہ تم سے حساب لے گا'' تو اس سے واضح ہو گیا۔ ''لا یخفی علیہ من سرنا وجھرنا وباطننا وظاھرنا شئی البتة'' کہ اللہ تعالیٰ پر ہمارے مخفی عمل اور ہمارے اعلانیہ عمل اور ہمارے ظاہری اور باطنی اعمال میں سے کوئی عمل بھی چھپا ہوا نہیں ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہماری مدح اور ثناء کا تذکرہ فرمایا'' کہ ایمان والے اللہ کو اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں۔

''کانہ بفضلہ یقول عبدی انا وان کنت اعلم جمیع احوالک فلااظھر من احوالک ولا اذکر منھا الامایکون مدحالک وثناء علیک حتی تعلم انی کما انا الکامل فی الملک والعلم والقدرة فاناالکامل فی الجود والرحمة وفی اظھار الحسنات وفی الستر علی السیآت''

گویا کہ رب تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے یوں فرما رہا ہے، اے میرے بندے بیشک میں تیرے سارے احوال کو جانتا ہوں لیکن تیرے سارے احوال کو ظاہر نہیں کرتا، بلکہ صرف وہی ذکر کروں گا جن میں تیری مدح اور ثناء پائی جائے، یہاں تک کہ تجھے پتہ چل جائے کہ بیشک میں جس طرح بادشاہت وملکیت میں کامل ہوں اور علم وقدرت میں مجھے ہی کمال حاصل ہے تو اسی طرح جود ورحمت میں بھی مجھے ہی کمال حاصل ہے، اے میرے بندے تیری نیکیوں کو ظاہر کرنے اور تیری برائیوں کی پردہ پوشی کرنے میں بھی مجھے ہی کمال حاصل ہے۔

(۳) رب تعالیٰ نے اس سورۃ (بقرۃ) کی ابتدا میں متقین کی مدح کی اور ان کی صفات بیان کیں۔ ﴿اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ﴾ '' وہ جو بے دیکھے ایمان لائیں اور نماز قائم رکھیں، اور ہماری دی ہوئی روزی میں سے ہمارے راہ میں خرچ کریں'' اب سورۃ کے آخر میں پھر امت مصطفیٰ ﷺ کی تعریف فرمائی جو اول سورۃ کے مطابق ہے، سورۃ کی ابتداء میں بیان فرمایا، ﴿اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ﴾ ''متقین وہ لوگ ہیں جو بے دیکھے ایمان لاتے ہیں'' اب سورۃ کے آخر میں بیان فرمایا:

﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِکَتِهٖ وَکُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَانُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍمِّنْ رُّسُلِهٖ﴾

''ایمان والے سب ہی اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں، اور

وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے تمام رسولوں میں سے کسی ایک پر ایمان لانے میں کوئی فرق نہیں کرتے''

سورۃ پاک کی ابتداء میں متقین کا اور وصف یہ بیان فرمایا: ﴿وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنفِقُونَ ٥﴾ ''اور وہ نماز قائم کرتے ہیں اور جو ہم نے ان کو روزی دی ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں'' اور اب سورۃ کے آخر میں بیان فرمایا، ﴿وَقَالُوا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا﴾ ''اور وہ کہتے ہیں ہم نے سنا اور فرمانبرداری کی، یعنی اے اللہ ہم نے تیرے ارشاد کو سنا'' ﴿وَاَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ ''اور نماز قائم کرو اور زکوۃ دو'' ہم اسے دل و جان سے تسلیم کر رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے رب تعالیٰ کے حکم کو تسلیم کر کے اس پر عمل کیا اور رب تعالیٰ نے بھی ان کی مدح کی کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں اور اللہ کے دیئے ہوئے مال سے اس کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ اور سورۃ کی ابتداء میں ارشاد فرمایا ﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ﴾ ''اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں'' اور یہاں سورۃ کے آخر میں ذکر فرمایا ﴿غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيرُ﴾ ''تو مغفرت فرما اے ہمارے رب اور تیری طرف ہی پھرنا ہے''۔

یہ دلیل ہے کہ وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں اور اسی لئے تو وہ دعاء کرتے ہیں کہ اے اللہ تو ہی مغفرت فرما اور ہم اس کا اقرار کرتے ہیں کہ ہم نے تیری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے اور سورۃ کی ابتداء میں ذکر کیا۔ ﴿اُولٰئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ ''وہی ہدایت پر ہیں اپنے رب کی طرف سے اور وہی کامیاب ہیں'' اور اب سورۃ کے آخر میں بیان کیا جا رہا ہے، ﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا﴾ ''اے ہمارے رب! ہمیں نہ پکڑ اگر ہم بھول جائیں یا ہم خطاء کر لیں'' گویا کہ سورۃ کی ابتداء میں ان کا رب تعالیٰ کی طرف لوٹنے اور عاجزی کرنے کا ذکر ہے اور سورۃ کے آخر میں بھی ان کا رب تعالیٰ کی طرف رجوع اور خضوع کا تذکرہ کیا۔ "فانظر كيف حصلت الموافقة بين اول السورة و آخرها" تو تو دیکھ سورۃ کی ابتداء میں اور سورۃ کی انتہاء میں کیسے موافقت حاصل ہے''

راقم کہتا ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ رب تعالیٰ کا کلام قرآن پاک بے مثال ہے، رب تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مفسرین کرام کو باکمال بنایا جنہوں نے قرآن پاک کے جواہر کو تحقیق کے سمندروں میں غوطہ زن ہو کر نکالا۔ (از کبیر)

شان نزول:

جب اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ " تمہارے ظاہر و باطن کا اللہ تعالیٰ حساب لے گا'' تو اس آیۃ کریمہ سے جب صحابہ کرام نے یہ سمجھا کہ ہمارے دلوں میں واقع ہونے والے وسوسوں اور ارادوں پر بھی گرفت ہوگی تو وہ بہت زیادہ پریشان ہو گئے، تو نبی

کریم ﷺ نے انہیں تسلیم و رضاء کا طریقہ سکھایا، اور نفس مطمئنہ کی صفات کریمہ پر توکل کرنے کا طریقہ سکھایا، تو اللہ تعالی نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرما کر صحابہ کرام کے تسلیم کرنے کی شہادت دی کہ ان کے دلوں سے حساب کے وہ خطرات زائل ہو گئے جو پیدا ہوئے تھے، ان کی نیتیں درست تھیں، انہوں نے اپنے نفسوں کا تزکیہ کیا اور اپنے دلوں کو صاف کیا۔

"فان زوائل رذائل النفس مقتضی الایمان والایمان الحقیقی الکامل لایکون الابعد فناء النفس وزوال رزائلها"

ایمان کا تقاضا ہی یہ ہے کہ نفس کے رذیل کاموں کو دلوں سے زائل کیا جائے، اور کامل وحقیقی ایمان سوائے نفس کے فناء کرنے اور رذیل کاموں کے زائل کرنے کے حاصل نہیں ہوتا۔

آیۃ کریمہ میں اگرچہ مطلق مؤمنین کا تذکرہ ہے لیکن "والمطلق ینصرف الی الکامل" مطلق کامل کی طرف پھرتا ہے۔

" والمراد بالمؤمنین المؤمنون الموجدون فی ذلک الزمان وهم الصحابة ﷺ کما فی قوله تعالی ﴿يَاأَيُّهَاالنَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾

آیۃ کریمہ جن مؤمنین کے بارے میں نازل ہوئی اس سے مراد وہی مؤمنین ہیں جو اس زمانہ میں موجود تھے وہ صحابہ کرام تھے، جس طرح دوسری آیۃ کریمہ میں رب تعالی نے اپنے نبی کریم ﷺ کو خطاب فرمایا اے نبی تمہیں اللہ کافی ہے اور وہ مؤمنین جنہوں نے تمہاری تابعداری کی، اس آیۃ کریمہ میں ﴿وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ سے مراد بھی صحابہ کرام ہی ہیں۔ ہاں البتہ صحابہ کرام کے وسیلہ جلیلہ سے۔

"التحق بهم من کان ایمانهم کایمانهم من اهل السنة والجماعة قال رسول الله ﷺ ان بنی اسرائیل تفرقت علی ثنتین وسبعین ملتو تفترق امتی علی ثلاث وسبعین ملة کلهم فی النار الاملة واحدة قالوا من هی یا رسول الله ﷺ قال ماانا علیه واصحابی" (رواہ الترمذی عن عبد الله بن عمرو)

اہل سنت و جماعت کے لوگوں کو بھی ان کے ساتھ اس آیۃ کریمہ میں ملا لیا گیا جن کا ایمان صحابہ کرام کے ایمان کی طرح ہے، جن کے کامل ایمان کی گواہی خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے ارشاد گرامی سے دی، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بیشک بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ گئے اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی، سب آگ (جہنم) میں جائیں گے سوائے ایک فرقہ کے، صحابہ کرام نے پوچھا وہ فرقہ کونسا ہوگا؟ آپ نے فرمایا وہ جو میرے اور میرے صحابہ کی راہ پر ہوگا۔ (ماخوذ از مظہری)

یہ خیال رہے کہ حدیث شریف میں امت سے مراد امت دعوت ہے، کہ حضور ﷺ کی طرف سے دعوت ایمان قیامت تک آنے والے لوگوں کو دی گئی، پھر جب لوگوں نے عقائد کفریہ رکھے وہ حقیقت میں امت اجابت میں داخل ہی نہیں خواہ وہ یہ دعوی بھی کرتے رہیں کہ ہم مؤمن ہیں، لھذا جن لوگوں کے عقائد کفریہ ہیں وہ سب جہنم کے مستحق ہوں گے، وہ کافر فرقے تہتر ہوں گے۔ صرف وہ فرقہ جن کے عقائد وہی ہوں گے جو عقائد رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے تھے وہ نجات حاصل کرنے والے لوگ ہوں گے، اس ایک ہی فرقہ میں سب حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی داخل ہیں، سب ہی اللہ تعالی کے فضل و کرم سے اہل سنت و جماعت میں داخل ہیں۔

اصولی اور فروعی اختلاف کا فرق ضروری ذہن میں رکھا جائے گا، معمولی فروعی اختلاف کی وجہ سے کسی کو جہنمی نہ کہا جائے، ہاں کفریہ عقائد رکھنے والے لوگوں کو تخصی طور پر نہیں بلکہ مجموعی طور پر یہ کہنا جائز ہوگا کہ جن لوگوں کے عقائد کفریہ ہیں وہ جہنمی ہیں، ان کے جہنمی ہونے پر حدیث مذکورہ شاہد ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

یہ آیۃ کریمہ ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ﴾ رسول اللہ ﷺ پر معراج کی رات براہ راست نازل ہوئی، یہ قول حضرت حسن اور مجاہد اور ضحاک کا ہے، اور بعض روایات میں یہ ہے کہ یہی قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی ہے۔

"وقال بعضهم جميع القرآن نزل به جبريل علیہ السلام على محمد ﷺ الاهذه الأية فان النبي ﷺ هو الذی سمع ليلة المعراج"

بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ تمام قرآن پاک جبریل کے واسطہ سے محمد ﷺ پر نازل ہوا سوائے اس آیۃ کے کہ یہ نبی کریم ﷺ نے معراج کی رات کو خود براہ راست سنی۔

لیکن بعض حضرات نے کہا کہ یہ سورۃ مدنیہ ہے اور معراج کا واقعہ مکہ شریف میں پیش آیا، اس لئے یہ کہنا درست نہیں کہ یہ آیۃ کریمہ معراج کی رات براہ راست رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی۔

راقم کا موقف یہ ہے : کہ اس میں کوئی مشکل درپیش نہیں آرہی کہ یہ کہا جائے کہ یہ آیۃ کریمہ معراج کی رات رسول اللہ ﷺ پر براہ راست نازل ہوئی ہو، لیکن دنیا میں بواسطہ جبریل نازل ہونے تک امت پر آیۃ کریمہ کو پیش کرنے کی اجازت نہ دی ہو، پھر بعد از ہجرت بوقت ضرورت رسول اللہ ﷺ پر جبریل کے واسطہ سے نازل فرمادی تاکہ تمام قرآن پاک کا حکم ایک ہی رہے کہ یہ بواسطہ جبریل علیہ السلام نازل ہوا۔

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ﴾

''ایمان لایا رسول نے اس پر جو نازل کیا گیا اس کی طرف اس کے رب کی طرف'' سے۔

''الــرَّسُوْل'' پر الف لام عہد خارجی ہے، اس سے مراد ہمارے رسول اللہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہی ہیں، قرآن پاک میں آپ کا اسی لفظ سے زیادہ ذکر کیا گیا ہے۔ (البحرالحیط) پھر اکثر کتب میں یہ بھی مذکور ہے کہ ''رسول الله، رسوله'' یہ الفاظ جب مطلق ذکر کیے جائیں تو اس سے مراد ہمارے رسول اللہ ﷺ ہی ہوتے ہیں، کیونکہ مطلق سے مراد فرد کامل ہوتا ہے، آپ کو اس منصب رسالت میں کامل درجہ حاصل ہے۔

''ومـا انـزل الیـه مـن ربـه شامل لجمیع ما انزل الیه من الله تعالی من العقائد، وانواع الشرائع واقسام الاحکام فی القرآن وفی غیره''

رسول اللہ ﷺ نے ایمان لایا اس پر جو نازل کیا گیا آپ پر آپ کی رب کی طرف سے، اس سے مراد عام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن عقائد اور انواع شرائع کو نازل کیا اور قرآن پاک میں جتنے احکام آپ پر نازل کئے گئے اور اس کے علاوہ آپ کے دل پر جو القاء کیے گئے ان تمام پر آپ نے ایمان لایا۔ (البحرالحیط)

رسول اللہ ﷺ کے ایمان لانے کا کیا مطلب؟

''امـن بـان ذلـک وحـی من الله وصل الیه'' ایمان لانے کا یہ مطلب ہے کہ آپ کو یقین آگیا کہ جو کچھ آپ کے پاس پہنچا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہے۔ (البحرالحیط)

علامہ رازی رحمہ اللہ ذرا تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ ''رسول اللہ ﷺ کے پاس جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتہ آیا، تو اس نے آپ کو کہا ''ان الله بعثک رسولا الی الخلق'' بیشک اللہ تعالیٰ نے آپ کو مخلوق کی طرف رسول بنا کر مبعوث فرمایا۔ اس فرشتے کے کلام کو سن کر رسول اللہ ﷺ کیلئے یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ فرشتہ کے کلام کو سن کر بغیر کسی معجزہ کے اسے سچا مان لیں، اس لئے ضروری تھا کہ آپ پر اللہ تعالیٰ معجزہ کو ظاہر فرمائے جس سے آپ کو فرشتہ کی صداقت کا پتہ چل جائے۔

''ولولا ذلک المعجز لجوز الرسول ان یکون ذلک المخبر شیطانا ضالا مضلا''

کیونکہ بغیر معجزہ کے عین ممکن تھا کہ فرشتہ کو نہ پہچانا جاتا اور وہم ہوتا کہ کہیں یہ آواز شیطان کی جانب سے تو نہیں، جو ہے ہی گمراہ، اور دوسروں کو بھٹکانے کی پوری کوشش صرف کرتا ہے، اگرچہ انبیاء کرام سے ناکام اور ذلیل ہو کر ہی لوٹتا ہے۔

''وذلک الـمـلـک ایضا اذا سمع کلام الـلـه تعالی افتقر الی معجز یدل علی ان المسموع هو کلام الله تعالی لاغیر''

بلکہ فرشتے نے جب اللہ کا کلام سنا کہ یہ میرے نبی تک پہنچانا ہے تو فرشتہ بھی کسی نہ کسی معجزہ کا محتاج تھا کہ اسے یقین ہو جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، کسی اور کا نہیں۔

یہ مراتب معتبر ہیں، ان میں سے پہلا یہ ہے کہ معجزہ قائم ہو کہ یہ سنا ہوا اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، کسی اور کا نہیں۔ "فیعرف ذلک الملک بواسطة ذلک المعجز انه سمع کلام الله تعالی" تا کہ فرشتے کو اس معجزہ کے ذریعے یقین ہو جائے کہ ہاں بیشک یہ اللہ تعالیٰ کا ہی کلام ہے۔

اور ان میں سے دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ اللہ کے نبی کو معجزہ عطاء کیا جائے، جس سے فرشتے کو اپنے دعویٰ میں سچا مانا جائے کہ "وانه ملک بعثه الله تعالی ولیس بشیطان" واقعی یہ فرشتہ ہے جس کو رب تعالیٰ نے میرے پاس بھیجا، کوئی شیطان اپنی ناکام کوشش کرنے کیلئے نہیں آیا۔ اور ان میں سے تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کو وہ معجزہ دیا جائے جسے دیکھ کر امت تسلیم کر لے کہ ہاں یقینی بات ہے کہ یہ شخص اللہ کا رسول ہی ہو سکتا ہے، معجزہ صرف اللہ کے رسول کو ہی عطاء کیا جاتا ہے۔

"فاذن لما لم یعرف الرسول کونه رسولا من عندالله لاتتمکن الأمة من ان یعرفوا ذلک"
اس لئے کہ جب تک امت کو یہ پہچان حاصل نہیں ہوگی کہ یہ اللہ کا رسول ہے اس وقت تک وہ ایمان بھی نہیں لائیں گے۔

رسول اللہ ﷺ کے ایمان کا مطلب واضح ہوا:

کہ جب اس سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے شریعت اور اس کے احکام کی مختلف انواع واقسام بیان فرمائی ہیں، تو اس کے بعد ارشاد فرمایا: ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ﴾ "رسول اللہ نے ایمان لایا" جس کا مطلب یہ واضح ہوا ہے کہ "ان الرسول عرف ان ذلک وحی من الله تعالی وصف الیه" بے شک رسول اللہ ﷺ کے دل میں جب القاء کر دیا کہ یہ اللہ کا فرشتہ ہے، یہ تحریف کرنے سے پاک ہے، یہ بھٹکانے والا شیطان نہیں، جب یہ اوصاف اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو عطاء کر دیئے تو آپ نے پہچان لیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہے، اسی کا نام ایمان الرسول ہے۔

قرآن پاک کی ترتیب بھی معجزہ ہے:

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے ایمان کا پہلے ذکر کیا اور مؤمنین کے ایمان کا ذکر بعد میں اسکی وجہ یہ ہے کہ:
"ثم ذکر ایمان الرسول ﷺ بذلک وهو المرتبة المتاخرة وهو المرتبه المتقدمة وذکر عقبه ایمان المؤمنین بذلک المرتبة المتاخرة"

رسول اللہ ﷺ کے ایمان یعنی یہ پہچاننا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہے اس کا مرتبہ مقدم ہے اور امت کے ایمان لانے کا مرتبہ مؤخر ہے اسلئے رسول اللہ ﷺ کے ایمان کا ذکر بھی پہلے کیا اور مؤمنین کے ایمان کا ذکر بعد میں کیا گیا۔

"ومن تامل فی لطائف نظم هذه السورة وفی بدائع ترتیبها علم ان القرآن کما انه معجز بحسب فصاحة الفاظه وشرف معانیه فهو ایضا معجز بحسب ترتیبه ونظم آیاته ولعل الذین قالوا انه معجز بحسب اسلوبه ارادوا ذلک"

جو شخص اس سورۃ پاک کے الفاظ مبارکہ کے لطائف اور اسکی عمدہ ترتیب میں غور وفکر کرے گا اسے یہ معلوم ہو جائے گا کہ جس طرح قرآن پاک الفاظ کی فصاحت اور معانی کی شرافت کے لحاظ سے معجز ہے اسی طرح ترتیب مضامین اور ترتیب آیات سے بھی معجز ہے۔

بعض اہل علم نے بیان کیا ہے کہ قرآن پاک کا اسلوب معجز ہے ان کی مراد بھی یہی نظر آتی ہے جو میں نے بیان کی ہے کہ قرآن پاک الفاظ و معانی اور ترتیب مضامین اور ترتیب آیات میں ہر طرح معجز ہے۔ اگر بعض حضرات کو اس قسم کے نکات کا پتہ نہ چل سکے تو قرآن پاک کی عظمت اور قرآن پاک کے جواہر و یواقیت پر مشتمل ہونے میں کوئی کمی نہیں البتہ آنکھ کا قصور ہو سکتا ہے۔

والنجم تستصغر الابصار رؤیته والذنب للطرف لا للنجم فی الصغر

ستارہ نظروں میں چھوٹا دکھائی دیتا ہے ہاں یہ گناہ آنکھ کا ہو سکتا ہے، ستارہ تو واقع میں چھوٹا نہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

تنبیہ: بعض حضرات نے رسول اللہ ﷺ کے ایمان لانے کے پہلے ذکر کرنے پر ایک روایت ذکر کی ہے کہ جب یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "یحق له ان یؤمن" مجھے زیادہ حق پہنچتا ہے کہ میں اسے سب سے پہلے تسلیم کروں۔ البحر المحیط کے محشی نے بیان کیا کہ یہ حدیث طبری نے تخریج کی لیکن ضعیف ہے البتہ یہی روایت ابوقتادہ سے موقوف طور پر بھی مروی ہے۔ (البحر المحیط مع حاشیہ)

لیکن البحر المحیط کے محشی کا قول درست نہیں کیونکہ یہی روایت ابن کثیر نے مستدرک حاکم سے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ذکر کی ہے اور ذکر کیا ہے کہ "ثم قال الحاکم صحیح الاسناد ولم یخرجاه" حاکم نے کہا ہے کہ یہ صحیح الاسناد ہے اگر چہ بخاری و مسلم نے اسے ذکر نہیں کیا۔ (ماخوذ از صابونی)

"**ایمان الرسول**" کا ذکر خازن نے مختصر مگر خوبصورت الفاظ میں کیا ہے۔

"ومعنی آمن الرسول صدق الرسول یعنی محمد ﷺ والمعنی صدق الرسول ان هذا القرآن وجملة

مافیه من الشرائع ولاحکام منزل من عندالله عزوجل"

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تصدیق فرمائی یہ کہ قرآن پاک اور اس میں تمام شرائع اور احکام اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیے گئے ہیں۔

اجمال میں اجلال:

رب تعالیٰ نے مجمل طور پر ذکر فرمایا﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ﴾ ''ایمان لایا رسول نے اس پر جو نازل کیا گیا ان کی طرف ان کے رب کی طرف سے'' اس میں تفصیل بیان نہیں کی کہ وہ کیا کیا چیزیں تھیں جن کو آپ نے پہچان کر یقین کر لیا اور تسلیم کر لیا۔

"وفی هذاالاجمال اجلال لمحله ﷺ واشعار بان تعلق ایمانه بتفاصیل ماانزل الیه واحاطته بجمیع ماانطوی علیه من الظهور بحیث لاحاجة الی ذکره اصلا"

اس اجمال میں رسول اللہ ﷺ کے مقام کے اجلال (بزرگی، بلندی مرتبہ) کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ آپ کی طرف جو احکام نازل کیے گئے آپ نے ان کی تمام تفاصیل کو پہچان لیا تھا۔ وہ احکام و شرائع جن جن چیزوں پر مشتمل تھے ان تمام کی تفاصیل آپ کے احاطہ علم میں آ گئیں، اسلئے ان کو علیحدہ علیحدہ ذکر نہیں کیا گیا، بلکہ "مَا اُنْزِلَ اِلَیْهِ" کے عموم سے ذکر کر دیا گیا، سب کچھ جو آپ کی طرف نازل کیا گیا آپ نے اسے پہچان لیا، ان کی تفاصیل کو پہچان لیا۔ (تفسیر ابی السعود)

سبحان اللہ! عظمت مصطفیٰ کریم ﷺ عظیم الشان اہل علم نے کیا خوب سمجھی۔ (فجزاهم الله خیرالجزاء)

﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ ''اور ایمان والے''

اعلیٰ حضرت اور مفسرین کرام رحمہم اللہ:

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے اس مقام پر ترجمہ کیا ہے ''اور ایمان والے'' اس کا ماقبل اور مابعد سے تعلق بظاہر معلوم نہیں ہو رہا کہ ترجمہ یوں کیا جائے ''ایمان لایا رسول نے اس پر جو نازل کیا گیا اسکے رب کی طرف سے اسکی طرف اور مؤمنوں نے ایمان لایا اور سب نے مانا......الخ۔ **یا یوں ترجمہ** کیا جائے ''ایمان لایا رسول نے اس پر جو نازل کیا گیا اس کے رب کی طرف سے'' اور سب ایمان والوں نے مانا......الخ۔ اسکی وجہ مفسرین کرام نے خصوصاً کبیر، روح المعانی اور بیضاوی نے یہاں دو احتمال ذکر کیے ہیں، بیضاوی کی عبارت ملاحظہ ہو:

﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ الخ "لایخلومن ان یعطف المؤمنون علی الرسول فیکون الضمیر الذی ینوب عنه التنوین راجعاالی الرسول والمؤمنین اویجعل مبتدأ فیکون الضمیر للمؤمنین وباعتباره یصح وقوع کل بخبره خبر المبتدأویکون افراد الرسول بالحکم امالتعظیمه اولان ایمانه عن مشاهدة وعیان وایمانهم عن نظرواستدلال"

احتمال اول: یعنی ترکیبی لحاظ پر جودواحتمال پائے جاتے ہیں ان میں سے ایک احتمال یہ ہے کہ "وَالْمُؤْمِنُوْنَ" کا عطف ہو ﴿الرَّسُوْلُ﴾ پر، اس صورت میں معطوف اور معطوف علیہ مل کر ﴿اٰمَنَ﴾ کا فاعل بن گئے اور لفظ "کُلٌّ" پر جوتنوین عوض مضاف الیہ وہ ضمیر ہے، یعنی "ہم" عبارت معنوی لحاظ پر یوں ہوگی ﴿کلهم آمن بالله﴾ یہ ضمیر لوٹے گی ﴿الرَّسُوْل﴾ کیطرف اور ﴿الْمُؤْمِنُوْن﴾ کی طرف، اب اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ "ایمان لایارسول نے اس پر جونازل کیا گیااس کے رب کی طرف سے اسکی طرف اور ایمان لایاایمان والوں نے اورسب نے (یعنی رسول اور ایمان والوں نے) مانااللہ کواوراس کے فرشتوں کواوراس کی کتابوں کواوراسکے رسولوں کو۔ بظاہراس میں وہم یہ ہوتا ہے کہ "ایمان والوں کے ایمان لانے کا کیا مطلب؟ تواس کا جواب یہ ہے کہ:

"لماذکر الله عزوجل فی هذه الصورة فرض الصلوة والزکوة والطلاق والایلاء والجهاد ختم السورة بذکرتصدیق النبی ﷺ والمؤمنین بجمیع ذلک"

کہ جب اللہ تعالی نے اس سورۃ میں بہت سے احکام ذکرفرمائے، نماز کی فرضیت، زکوۃ کی فرضیت، طلاق کے مسائل واحکام، ایلاء کے مسائل واحکام اور جہاد کی فرضیت تو یہاں سورۃ کے آخر میں ذکرفرمادیا کہ ان تمام احکام کی تصدیق فرمائی رسول اللہ ﷺ نے اور تمام مؤمنین نے یعنی احکام کی تصدیق کرنے کوایمان سے تعبیر کیا گیا کہ تمام احکام کوقبول کیا۔ (شیخ زادہ)

احتمال دوم: ترکیبی لحاظ پر دوسرا احتمال یہ ہے کہ کہ ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ﴾ علیحدہ جملہ ہواور ﴿اَلْمُؤْمِنُوْنَ﴾ میں واؤاستینافیہ ہواور ﴿اَلْمُؤْمِنُوْنَ﴾ مبتدأ ہواور "کُلٌّ" پھر مبتدأ ہواور ﴿اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِکَتِهٖ وَکُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ﴾ مکمل جملہ خبر ہے "کُلٌّ" کی، مبتدأاور خبرمل کر پھر خبر ہیں، پہلے مبتدأ ﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ کی۔ اس احتمال میں ﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ پروقف صحیح نہیں ہوگا پہلے احتمال میں وقف جائز ہے۔ اب اس دوسرے احتمال میں ترجمہ یہ ہوگا "ایمان لایارسول نے اس پر جونازل کیا گیااسکی طرف اس کے رب کی طرف سے اور ایمان والوں نے، تمام نے مانااللہ کواوراس کے فرشتوں کواوراس کی کتابوں کواوراس کے رسولوں کو۔

اب **اعلیٰ حضرت** مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ علیہ کے ترجمہ کو دیکھیں تو کیا خوب نظر آئے گا کہ دونوں احتمالوں میں جس پر چاہیں منطبق کرلیں۔اگر آپ پہلے احتمال کے مطابق ترجمہ کرنا چاہیں تو اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ علیہ کے ترجمہ ﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ اور ایمان والے کو مدنظر رکھتے ہوئے یوں ترجمہ کریں''ایمان لایا رسول نے اور ایمان والے ایمان لائے اور دوسرے احتمال کے مطابق یوں ترجمہ کرلیں''ایمان لایا رسول نے اور ایمان والے تمام ہی مان گئے۔کیا کوئی صاحب علم اور منصف مزاج اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ علیہ کی علمی بصیرت کا انکار کرسکے گا؟نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔

دوسرے احتمال میں علیحدہ علیحدہ ذکر کرنے کا کیا مطلب:

یعنی دوسرے احتمال میں رسول اللہ ﷺ کے ایمان کو علیحدہ ذکر کیا گیا ہے اور ایمان والوں کے ایمان کو علیحدہ ذکر کیا گیا ہے اس کا کیا مطلب؟اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک وجہ علیحدہ ذکر کرنے کی یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ایمان کی عظمت کا ذکر مقصود تھا،جس کی وجہ سے آپ کے ایمان کو علیحدہ ذکر کیا اور امت کے ایمان کا ذکر بعد میں کیا۔اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ایمان اور آپ کی امت کے ایمان میں فرق پایا گیا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے سب چیزیں تھیں،آپ کا ایمان مشاہدہ سے تھا یعنی آپ دیکھ کر تصدیق فرمارہے تھے اور آپ کی امت کا ایمان نظر واستدلال سے تھا،بلکہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کو سن کر آپ کی امت نے ایمان لایا۔ (ماخوذ از بیضاوی و شیخ زادہ)

یہ فرق کرنا پہلے احتمال میں بھی ضروری ہے:

پہلے احتمال میں جس کا ترجمہ کیا گیا کہ''ایمان لایا رسول نے اور ایمان والوں نے۔اس صورت میں بھی رسول اللہ ﷺ کے ایمان اور آپکی امت کے ایمان میں فرق کرنا ضروری ہے جیسا کہ صاوی نے بیان کیا ہے۔

"(والمؤمنون) فاشترک الرسول والمؤمنون فی اصل الایمان لکن افترقا من جهة اخری وهوان ایمان الرسول من قبیل حق الیقین وایمان المؤمنین من قبیل علم الیقین اوعین الیقین فالافتراق من حیث المراتب لامن حیث اصله"

ایمان لایا رسول نے اور ایمان والوں نے،اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل ایمان میں تو رسول اللہ ﷺ اور ایمان والے مشترک ہیں،لیکن اور وجہ سے فرق پایا گیا ہے۔وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ایمان حق الیقین کے درجہ میں ہے اور مؤمنین کا ایمان علم الیقین یا عین الیقین کے درجہ میں ہے۔لہٰذا واضح ہوا کہ اصل ایمان میں تو اشتراک پایا گیا،لیکن مراتب کے لحاظ پر بہت بڑا فرق پایا گیا۔ (صاوی)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

لفظ "کُل" تاکید کیلئے نہیں کیونکہ معرفہ کی تاکید کیلئے ظاہراً ضمیر کی طرف مضاف ہونا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن ﴿کُلٌّ﴾ کو نکرہ ہونے کے باوجود مبتداء بنایا جاسکتا ہے کیونکہ اس پر تنوین عوض مضاف الیہ ہے۔ اصل میں "کُلُّھُمْ" ہے اسلئے تقدیر مضاف الیہ یعنی ضمیر کی وجہ سے حکم معرفہ میں ہے مبتداء بنانا صحیح ہے۔ (از روح المعانی)

دوسرے احتمال میں رسول اللہ ﷺ کے ایمان کو علیحدہ ذکر کیا گیا ہے اور مؤمنون کے ایمان کو علیحدہ، اگرچہ اس معنی میں بھی رسول اللہ ﷺ کی عظمت کا ہی ذکر ہے، جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے، تاہم علامہ آلوسی رحمہ اللہ پہلے احتمال کو ترجیح دیتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

"ورجح الوجه الاول بانه اقصى لحق البلاغة واولى فى التلقى لان الرسول ا حينئذ يكون اصلافى حكم الايمان بماانزل الله والمؤمنون تابعون له ويافخرهم بذلك"

پہلا احتمال زیادہ راجح ہے کیونکہ اس میں بلاغت کا اعلیٰ معیار پایا گیا ہے اور ذہن بھی جلدی اسے ہی قبول کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ایمان اصل ہوگا اور مؤمنین کا ایمان آپ کے تابع ہوگا، اس تابعداری کی وجہ سے آپ کی امت کے مؤمنین کو کتنا ہی عظیم مقام فخر حاصل ہوگا۔

یعنی امت کی عظمت شان ہی یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ سے کم مرتبہ سمجھیں اور اپنے آپ کو حضور ﷺ کا تابع سمجھیں، بلکہ اپنے آپ کو حضور ﷺ کے اقوال وافعال میں کامل طور پر تابع بنانے کی پوری کوشش کریں۔ (از روح المعانی)

﴿كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ﴾

"سب نے مانا اللہ اور اسے فرشتوں اور اسکی کتابوں اور اس کے رسولوں کو"

ایمان لانے میں ترتیب ذکری کا قدرے تفصیلی بیان:

اللہ تعالیٰ نے چار مراتب کا ضرورۃً ایمان میں ذکر کیا کہ ان چار مراتب کے ایمان کے بغیر ایمان حاصل ہی نہیں ہوگا۔

المرتبة الاولى : ان میں سب سے پہلے مرتبہ پر اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا ذکر فرمایا، اسلئے کہ جب تک انسان کو یہ علم حاصل نہ ہو کہ کوئی ذات وہ بھی ہے جو عالم ہے یعنی تمام معلومات اس کے احاطہ علم میں داخل ہیں کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں اور جب تک یہ علم حاصل نہ ہو کوئی ذات صانع بھی ہے یعنی تمام مخلوقات کا کوئی

خالق بھی ہے اور جب تک یہ علم نہ ہو کہ کوئی قادر بھی ہے جسے تمام مقدورات پر قدرت حاصل ہے۔

"لایمکن معرفة صدق الانبیاء علیھم السلام فکانت معرفة اللہ تعالی ھی الاصل فلذلک قدم اللہ ھذہ المرتبة فی الذکر"

تو اس وقت تک انبیاء کرام کی صداقت کی معرفت حاصل نہیں ہوگی، تو اللہ تعالی کی معرفت جب اصل ہے تو اسے ذکر بھی پہلے مرتبہ پر کر دیا گیا ہے۔

المرتبة الثانیة: ان میں سے دوسرے مرتبہ پر فرشتوں کا ذکر کیا گیا، اسلئے کہ انبیاء کرام پر وحی بواسطہ ملائکہ ہی نازل ہوتی ہے رب تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِکَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِہٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖٓ﴾ فرشتوں کو اتارتا ہے وحی دے کر اپنے امر کی جن پر چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے اور ارشاد فرمایا ﴿وَمَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَہُ اللّٰہُ اِلَّا وَحْیًا اَوْمِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْیُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِہٖ مَایَشَآءُ﴾ کسی بشر سے اللہ تعالی کلام نہیں کرتا سوائے وحی کے یا حجاب کے پیچھے سے یا اس کی طرف اپنا فرشتہ بھیجتا ہے وہ اسکے حکم سے وحی لاتا ہے جو چاہے۔ اسی طرح کئی اور آیات میں مبارکہ میں جبریل علیہ السلام کے وحی لانے کا ذکر ملتا ہے:

"فاذاثبت ان وحی اللہ تعالی انمایصل الی البشر بواسطة الملائکة فالملائکة یکونون کالواسطة بین اللہ تعالی وبین البشر فلھذاالسبب جعل ذکر الملائکة فی المرتبة الثانیة"

یہ بات ثابت ہوگئی کہ بے شک اللہ تعالی کی طرف سے انبیا کرام پر وحی فرشتوں کے ذریعے آتی ہے تو فرشتے اللہ تعالی اور بشر کے درمیان واسطہ بن گئے، اسی سبب سے فرشتوں کا ذکر دوسرے مرتبہ پر کیا۔

اور یہی راز اس آیہ کریمہ میں بھی ملتا ہے کہ ﴿شَھِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَآاِلٰہَ اِلَّاھُوَ وَالْمَلٰٓئِکَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ﴾ اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں نے اور عالموں نے انصاف سے قائم ہو کر۔

المرتبة الثالثة : ان میں سے ذکر کے لحاظ سے تیسرا مرتبہ کتب کا ہے کیونکہ وہ فرشتوں کے ذریعے بشر یعنی انبیاء کرام پر نازل ہوتی ہیں تو یقیناً جن کے ذریعے سے کتابوں نے نازل ہونا ہے ان کا ذکر پہلے ہونا ہے "فذات الملک کالقمر وذات الوحی کاستنارة القمر"، فرشتے کی ذات چاند کی طرح ہے اور وحی کی ذات چاند کی روشنی کی طرح ہے گویا کہ چاند کا ذکر پہلے کیا گیا اور روشنی کا بعد میں"

المرتبة الرابعة : چوتھے مرتبہ پر رسولوں کا ذکر کیا گیا "لان الرسل وھم الذین یقتبسون انوار الوحی من الملائکة فیکونون متاخرین فی الدرجة عن الکتب" کیونکہ فرشتے جب انبیاء کرام پر اللہ تعالی کی طرف

سے وحی لاتے ہیں تو انبیاء کرام ان وحی کے انوار سے اقتباس حاصل کرتے ہیں ،اسلئے رسولوں کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے۔اس تفصیل سے ترتیب ذکری کی کافی حد تک وضاحت بھی حاصل ہوگئی اور فوائد و حکمتیں بھی حاصل ہوگئیں۔
(ماخوذ از کبیر)

تنبیہ: ترتیب حقیقی اور ہے اور یہاں ذکر کے لحاظ پر ترتیب اور ہے۔واقع میں اللہ تعالی اور اسکی صفات مقدم ہیں، کلام نفسی رب تعالی کی صفت ہے اسکے بعد رسولوں کا درجہ ہے اور اسکے بعد فرشتوں کا۔ (راقم)

اللہ تعالی پر ایمان لانے کا مطلب:

"المراد بالایمان بالله عبارة عن الایمان بوجوده وبصفاته بافعاله وباحکامه وباسمائه"

اللہ تعالی پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے وجود اور صفات اور سکے افعال اور اسکے احکام اور اسکے اسماء پر ایمان ہو"

الایمان بوجود الله: اللہ تعالی کے موجود ہونے پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان رب تعالی کے موجود بالذات اور قائم بالذات ہونے پر ایمان رکھے کہ وہ خود بخود قائم ہے اسکو کسی نے قائم نہیں کیا، اور انسان اسی پر ایمان رکھے "ان وراء المتحیزات موجودا خالقالها" کہ بیشک تمام کائنات مکان اور حیز کی محتاج ہے سب مکین اور متحیز اللہ تعالی کی مخلوق ہیں اور اللہ تعالی ان کا خالق ہے اور وہ واجب الوجود ہے۔

"فالمجسم لایکون مقرابوجود الاله تعالی لانه لایثبت ماوراء المتحیزات شیئاآخر فیکون اختلافه معنافی اثبات ذات الله تعالی"

مجسمہ فرقہ اللہ تعالی کو بھی جسم مانتا ہے اور وہ اللہ تعالی کو مکان اور حیز کا محتاج مانتے ہیں کہ وہ بھی مکین اور متحیز ہے۔ان کے نزدیک مکین چیزوں کے بغیر کوئی اور چیز نہیں،اسلئے ان کے نزدیک اللہ تعالی واجب الوجود نہیں بلکہ وہ وجود عارضی جو متحیز کو حاصل ہے، اسکے بغیر اللہ تعالی کو موجود ہی نہیں مانتے،ان کا مسلمانوں سے ذات باری تعالی میں ہی اختلاف ہے۔

آجکل کئی نام نہاد مسلمان بھی اللہ تعالی کا مکان آسمان ثابت کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں "العیاذ بالله" فلاسفہ اور معتزلہ بھی رب تعالی کی صفات میں اہلسنت و جماعت کے خلاف نظریات رکھتے ہیں، جن کا تذکرہ پہلے پارہ میں ہو چکا ہے۔

ایمان بصفات الله: اللہ تعالی کی صفات پر ایمان لانا بھی ضروری ہے، جب تک اللہ تعالی کی صفات پر کسی کو ایمان حاصل نہیں ہوگا تو وہ مؤمن نہیں ہوگا۔اللہ تعالی کی صفات دو قسم کی ہیں،صفات سلبیہ اور صفات ثبوتیہ۔

صفات سلبیہ : یعنی انسان اس پر ایمان رکھے کہ "انہ فرد منزہ عن جمیع جہات الترکیب" کہ بے شک وہ ذات فرد ہے ترکیب کی جہات سے پاک ہے، یعنی صفت ترکیب کی اس سے سلب (نفی) پائی گئی ہے، وہ مفرد (یکتا) ہے۔"فان کل مرکب مفتقر الی کل واحد من اجزائه و کل واحدمن اجزائه غیرہ فھو مرکب" بیشک ہر مرکب اپنی اجزا کا محتاج ہوتا ہے اور جب تک اسمیں اجزاء نہ پائی جائیں تو وہ مرکب نہیں یعنی مرکب کیلئے اجزاء سے مرکب ہونا ضروری ہے اور جو اجزاء سے مرکب ہو وہ محتاج ہوتا ہے۔"و کل مفتقر الی غیرہ ممکن لذاتہ فاذن کل مرکب فھو ممکن لذاتہ" ہر وہ چیز جو غیر کی محتاج ہو وہ ممکن لذاتہ ہوتی ہے۔اور ہر مرکب ممکن لذاتہ ہوتا ہے۔

پتہ چلا کہ جب مرکب اپنی اجزاء کا محتاج ہے تو وہ ممکن لذاتہ ہوگا جبکہ ممکن ہے ہی وہ جسے کوئی موجود کرے، اسکا کوئی خالق ہو تو یقینی طور پر پتہ چلا کہ اللہ تعالی فرد مطلق ہے، مرکب نہیں۔ جو ذات واجب الوجود ہے وہ کسی طرح بھی مرکب نہیں ہوسکتا، بلکہ وہ فرد مطلق ہے۔

"واذاکان فردافی ذاتہ لزم ان لایکون متحیز اولاجسماولاجوھر اولافی مکان ولاحالاولافی محل ولامتغیراولامحتاجابوجہ من الوجوہ البتۃ"

جب یہ ثابت ہوگیا کہ اللہ تعالی واجب الوجود ہے اور وہ اپنی ذات میں فرد مطلق ہے تو اس سے خود بخود واضح ہوگیا کہ وہ متحیز نہیں یعنی مکان وحیز سے پاک ہے اور وہ جسم نہیں اور وہ جوہر نہیں اور وہ کسی مکان میں نہیں اور کسی چیز میں حلول کرنے والا نہیں اور وہ محل نہیں اور اس میں کوئی تغیر وتبدل نہیں یعنی وہ ایک حال سے دوسرے حال کی طرف، ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف، ایک کیفیت سے دوسری کیفیت کی طرف تبدیل نہیں ہوتا اور وہ کسی ذرہ کا بھی محتاج نہیں، احتیاجی کی تمام وجوہ سے وہ پاک ہے۔

صفات ثبوتیہ: یعنی یہ ایمان ہو کہ اللہ تعالی قادر ومختار ہے۔اسلئے کہ جب ہم مخلوقات کو دیکھتے ہیں کہ ان میں مختلف احوال وکیفیات پائی جاتی ہیں "فعلمناان المؤثر فیھاقادر لاموجب بالذات" تو اس سے ہمیں علم حاصل ہوجاتا ہے کہ مخلوق کا خالق اور ان میں مؤثر قادر ومختار ہے، اس پر کوئی کام واجب نہیں، وہ اپنے ارادہ واختیار سے جو چاہے وہی کرتا ہے۔پھر اللہ تعالی کے افعال محکم ہوتے ہیں ان میں یقین پایا جاتا ہے اور ان میں پختگی پائی جاتی ہے، یہ چیزیں دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالی عالم ہے۔

"فحینئذ یعرفہ قادراعالما حیاسمیعابصیرا موصوفامنعوتابالجلال وصفات الکمال"

مندرجہ بالا بحث سے واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ قادر ہے اور عالم ہے اور ہمیشہ کیلئے زندہ ہے اور سننے والا ہے اور دیکھنے والا ہے اور صفات جلالیہ اور صفات کمالیہ سے متصف ہے رب تعالیٰ کی صفات کی بحث نجوم الفرقان کے "**حصہ اول سورۃ فاتحہ**" میں دیکھیں اور "**حصہ ششم آیۃ الکرسی**" کی بحث میں دیکھیں۔

ایمان بافعالہ : اللہ تعالیٰ کے افعال پر ایمان رکھنا ضروری ہے کہ جس کے بغیر ایمان حاصل ہونا ممکن نہیں اللہ تعالیٰ کے افعال پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو یقین ہو جائے کہ رب تعالیٰ کے ماسواء ہر چیز ممکن ہے اور حادث ہے جب اس پر ایمان حاصل ہو جائے گا تو انسان کے عقل میں کامل طور پر یہ بات آجائے گی کی ممکن اور حادث خود بخود موجود نہیں ہو سکتے، بدیہی طور پر یہ سمجھ آجائے گا کہ "**لابدلہ من موجد یوجدہ وھو القدیم**" مخلوق کو موجود کرنے والی ذات کا موجود ہونا ضروری ہے، وہ ذات قدیم ہے۔

"**وھذا الدلیل یحملک علی ان تجزم بان کل ماسواہ فانما حصل بتخلیقہ وایجادہ وتکوینہ**"

یہ دلیل یقین دلاتی ہے کہ سب کائنات اللہ تعالیٰ کی تخلیق (پیدا کرنے) اور اس کے موجود کرنے سے معرض وجود میں آئی ہے۔

اعتراض : جب کوئی انسان یہ کہے کہ میں اپنے نفس میں یہ پاتا ہوں کہ اگر میں چاہوں کہ میں حرکت کروں تو حرکت کرتا ہوں اور اگر میں چاہوں تو حرکت نہ کروں تو نہیں کرتا، "**فکانت حرکاتی وسکناتی بی لابغیری**" تو میری حرکات وسکنات میری وجہ سے پائی جاتی ہیں میرے بغیر کسی اور کی وجہ سے وہ حرکات وسکنات نہیں پائی جاتیں تو کس طرح کہا جائے گا کہ کائنات کی ہر چیز رب تعالیٰ کی قدرت اور اسکے اختیار میں ہے۔

جواب : انسان کی حرکت ارادہ حرکت کے بعد پائی جاتی ہے جب تک وہ حرکت کا ارادہ نہ کرے حرکت نہیں کر سکے گا یہی حال ہے انسان کے سکون کا وہ سکون کا ارادہ کرے گا تو سکون اسے حاصل ہو جائے گا، اگر ارادہ نہیں کرے گا تو سکون حاصل نہیں ہو گا۔

اب بندے کا ارادہ مشیت کو دیکھنا پڑے گا۔ "**وھذہ المشیۃ کیف حدث**" یہ مشیت کیسے پیدا ہوئی؟ کیا وہ بغیر پیدا کرنے والے کے پیدا ہوئی یا کسی پیدا کرنے والے نے پیدا کیا ہے۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی چیز بغیر پیدا کرنے کے خود ہی پیدا ہو جائے یہ ضروری طور پر تسلیم کرنا پڑے گا کہ بندے کی مشیت کا خالق اور موجود کرنے والا کوئی ہے اب یہ دیکھنا ہے کہ وہ کون ہے۔ "**ثم ذلک المحدث اما ان یکون ھو العبد او اللہ تعالیٰ**" یعنی بندے کی مشیت کا خالق اور موجود کرنے والا بندہ خود ہے یا کہ اللہ تعالیٰ۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ بندے کو خالق مانا جائے

کیونکہ بندہ مشیت کو اگر بالفرض موجود کرنا چاہے گا تو ایک اور مشیت کی ضرورت لازم آئے گی تو اس طرح اس میں تسلسل لازم آئے گا کہ ایک مشیت کیلئے دوسری مشیت لائی جائے اور دوسری کیلئے تیسری، اس طرح نہ ختم ہونے والا یہ سلسلہ جاری کردیا جائے یہ عقل ونقل کے خلاف ہے۔ لہذا اسکے تسلیم کرنے کے بغیر اور کوئی راہ نہیں کہ بندے کی مشیت کو موجود کرنے والا اللہ تعالی ہے، اور بندے حرکت وسکون کی مشیت وارادہ کے بعد ہی حرکت وسکون کرسکے گا، لہذا بندے کی حرکت وسکون بھی رب تعالی کی قدرت واختیار میں ہے۔

پہلے **پارہ** میں تفصیلی طور پر بیان کردیا گیا کہ اللہ تعالی تمام افعال کا خالق ہے، بندہ کاسب ہے اور بندے کو کسب کرنے یعنی عمل کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔

الایمان باحکام اللہ : اللہ تعالی کے احکام پر ایمان لانا بھی ضروری ہے ورنہ ایمان حاصل نہیں ہوگا اللہ تعالی کے احکام پر ایمان لانے میں چار امور پائے گئے ہیں، یعنی چار طرح ایمان لانا ضروری ہے۔

(۱) ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایمان رکھا جائے کہ اللہ تعالی کا کوئی حکم کسی غرض پر موقوف نہیں۔

"لان کل ماکان معللابعلة کان صاحبه ناقصا بذاته کاملابغیره وذلک علی الحق سبحانه محال" اسلئے کہ جس کام اور افعال غرضوں پر موقوف ہوں ان کی کوئی وجوہ اور علتیں پائی جائیں وہ خود ناقص ہوتا ہے، غیر کا محتاج ہوتا ہے غیر سے کمال حاصل کرتا، یہ اللہ تعالی کی ذات پر محال ہے کہ وہ "معاذ اللہ" ناقص ہو اور غیر سے کمال حاصل کرے۔

دینی طلباء کرام اصطلاحی الفاظ یاد کرلیں کہ **"اللہ تعالی کے افعال معلل بالاغراض نہیں ہوتے"** اگر اس کے افعال معلل بالاغراض ہوں تو وہ محتاج ہوگا۔ حالانکہ رب تعالی محتاج الیہ ہے یعنی مخلوق اس کی محتاج ہے اور وہ کسی کا محتاج نہیں وہ ﴿غَنِیٌّ حَمِیْدٌ﴾ ہے۔

(۲) اللہ تعالی کے احکام وشرائع پر یہ ایمان ہو کہ **"ان منفعتها عائدة الی العبد لا الی الحق فانه منزه عن جلب المنافع ودفع المضار"** ان احکام پر عمل کرنے میں بندے کا ہی نفع ہے اور نہ عمل کرنے میں بندے کا ہی نقصان ہے، رب تعالی کا ان میں کوئی نفع نقصان نہیں کیونکہ رب تعالی منافع حاصل کرنے سے یا اپنے آپ سے نقصان کو دور کرنے سے پاک ہے۔

(۳) **"ان یعلم له الالزام والحکم فی الدنیا کیف شاء واراد"**

اللہ تعالی کے احکام پر ایمان لانے کی تیسری وجہ یہ ہے کہ انسان کا اس پر ایمان ہو کہ اللہ تعالی جو چاہے وہ حکم

فرماتا ہے۔﴿لایُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ﴾ ''اس سے نہیں پوچھا جاسکتا کہ وہ کیا کرتا ہے'' کا مصداق ہے اور اس کے احکام پر عمل کرنا انسانوں پر دنیا میں لازم ہے، اعمال کی دارومدار دنیا میں ہی ہے، اسی لئے دنیا کا ذکر کیا۔

(۴) احکام پر ایمان لانے میں چوتھی وجہ یہ ہے کہ یہ ایمان ہو کہ بندے کے اعمال افعال کی وجہ سے رب تعالیٰ پر کچھ بھی لازم نہیں ہوتا بلکہ۔ ''انه سبحانه فی الاخرة یغفر لمن یشاء بفضله ویعذب من یشاء بعدله'' اللہ تعالیٰ آخرت میں جسے چاہے اپنے فضل سے اسکی مغفرت کردے اور جسے چاہے اپنے عدل سے عذاب دے دے، اللہ تعالیٰ اس میں فاعل مختار ہے اسلئے کہ

''وانه لایقبح منه شیء ولایجب علیه شیء لان الکل ملکه وملکه والمملوک المجازی لاحق علی المالک المجازی فکیف المملوک الحقیقی مع المالک الحقیقی''

رب تعالیٰ کے کسی فعل اور کسی حکم کو قبیح (برا) نہیں کہا جاسکتا اور رب تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں اسلئے کہ ساری مخلوق دنیا میں ہم دیکھتے ہیں ملکیت میں ہے اور اسی کی بادشاہی میں تمام مخلوق کو رعایا کی حیثیت حاصل ہے، جب ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ مجازی غلاموں کو کوئی حق نہیں ہوتا کہ وہ اپنے مالک پر دعوی کریں کہ یہ کام ہم نے کیا ہے لہذا تجھ پر اس کے بدلے ہمارا حق واجب ہے۔

اسکی وجہ یہ ہے کہ غلام کا ہر کام مالک کا ہی ہوتا ہے وہ مالک سے کسی قسم کی اجرت طلب نہیں کرسکتا جب مجازی مالک پر کوئی چیز لازم نہیں ہوتی تو حقیقی پر کس طرح لازم ہوسکتی ہے۔ ہاں البتہ بغیر کسی لزوم اور بغیر کسی وجوب کے اپنے فضل وکرم سے اس نے اجر وثواب کے جو وعدے کر رکھے ہیں ان کو وہ پورا کرے گا۔

ایمان باسماء اللہ : اللہ تعالیٰ کے اسماء پر ایمان لانا بھی ضروری ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے وہ اسماء گرامی جو قرآن وحدیث میں وارد ہیں، ان کی معرفت حاصل ہو، ان پر یقین اور یہ ایمان ہو کہ رب تعالیٰ کے تمام نام ہی اچھے اور حسین ہیں اس مسئلہ کو قرآن پاک میں کئی جگہ بیان کیا گیا۔ سورۃ اعراف میں ذکر کیا گیا ﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى﴾ ''اور اللہ تعالیٰ کے تمام نام ہی اچھے ہیں۔'' اور سورۃ بنی اسرائیل میں ذکر کیا گیا ﴿اَیًّامَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى﴾ ''جس نام (اللہ یا رحمٰن) سے بھی تم اسے پکارو اس کے تمام نام ہی اچھے ہیں''۔ ''سورۃ طٰهٰ'' میں مذکور ہے: ﴿اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى﴾ ''اللہ، اسکے بغیر اور کوئی معبود نہیں اسکے تمام نام اچھے ہیں''۔ سورۃ حشر کے آخر میں ہے ﴿لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ''اسی کے اچھے نام ہیں زمین وآسمان کی ہر چیز اسی کی تسبیح بیان کرتی ہے''۔

ایمان بالملائکہ : فرشتوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے، فرشتوں پر ایمان لانے کی چار وجوہ ہیں۔

(۱) ان چار وجوہ میں سے پہلی وجہ یہ ہے کہ علماء راسخین پر لازم تھا کہ حکمت قرآنیہ اور برہانیہ میں غور وفکر کرنا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سب چیزوں کو مدنظر رکھ کر وہ فقط روحانی مخلوق ہے یا فقط جسمانی یا جسمانی اور روحانی دونوں کا مجموعہ ہے، کیا وہ اجسام کثیفہ ہیں یا اجسام لطیفہ، پھر وہ اجسام نورانیہ ہیں یا ہوائیہ ہیں۔ ان تمام چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اور قرآن وحدیث میں فرشتوں کی بیان کی ہوئی شان دیکھ کر علماء راسخین نے اتفاقی طور پر فیصلہ کیا ہے کہ،

"الملک جسم نوراني يتشكل باشكال مختلفة الابشكل حقير ولا يذكر ولا يؤنث"

فرشتے نورانی جسم ہیں مختلف شکلیں بدل لیتے ہیں، البتہ کسی حقیر چیز (کتے وغیرہ) کی شکل میں نہیں ہوتے وہ مذکر ومؤنث نہیں ہوتے۔ کھانے پینے سے وہ بے نیاز ہیں، خواہشات نفسانیہ سے وہ پاک ہیں اسی وجہ سے گناہوں سے بھی پاک ہیں، ہر وقت وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہیں۔ ﴿ لَا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَا أَمَرَهُمْ ﴾ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی بھی نافرمانی نہیں کرتے اور وہ نورانی مخلوق ہے اللہ تعالیٰ اور اسکے انبیائے کرام کے درمیان واسطہ بھی ہیں، تمام انبیائے کرام فرشتوں سے بلند شان رکھتے ہیں اور فرشتے باقی لوگوں سے افضل ہیں۔

مندرجہ بالا طریقہ پر ہی ہمارے لئے لازم ہے کہ ہم فرشتوں پر ایمان رکھیں، مشرکین کی طرح فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں نہ تسلیم کرلیا جائے۔

(۲) ان چار وجوہ میں سے دوسری وجہ جس کا اجمالی طور پر ابھی ذکر کیا گیا کہ وہ یہ ہے کہ انسان اس بات پر ایمان رکھے کہ وہ معصوم اور پاک ہیں جیسا کہ رب تعالیٰ نے ان کی شان بیان فرمائی، ﴿ يَخَافُونَ رَبَّهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ﴾ اپنے اوپر اپنے رب کا خوف رکھتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جو انہیں حکم دیا جاتا ہے، اور ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَلَا يَسْتَحْسِرُونَ ﴾ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے اور وہ تھکتے نہیں۔

کیا خوب زندگی :

"كما ان حياة كل واحد منا بنفسه الذي هو عبارة عن استنشاق الهواء فكذلك حياتهم بذكر الله ومعرفته وطاعته"

جس طرح ہماری زندگی کا تعلق سانس سے ہے، سانس آیا تو زندہ، سانس رک گیا تو موت، ایسے ہی فرشتوں کی زندگی اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اسکی معرفت اور اسکی طاعت سے ہے لیکن فرشتوں کا ذکر الٰہی ختم نہیں

ہونا اسلئے ان پر موت نے بھی نہیں آنا، ہاں جب پہلا صور پھونکا جائے گا اس وقت سب کی موت واقع ہوگی "فان لذتهم بذكر الله وانسهم بعبادة الله" بے شک ان کو لذت ہی اللہ تعالی کے ذکر سے حاصل ہوتی ہے اور اللہ تعالی کی عبادت سے ہی ان کو انس حاصل ہوتا ہے۔

(۳) ملائکہ پر ایمان لانے کی تیسری وجہ یہ ہے کہ انسان اس بات پر یقین رکھے کہ ملائکہ اللہ تعالی اور بشر، یعنی اس کے انبیاء کرام کے درمیان واسطہ ہیں اور جہان مختلف کاموں پر ان کو مقرر کیا گیا، جیسا کہ رب تعالی نے ارشاد فرمایا: ﴿وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا o فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا o﴾ قسم ہے ان کی کہ با قاعدہ صف باندھیں پھر ان کی جھڑک کر چلائیں۔ (اس سے مراد ایک تفسیر کے مطابق فرشتے ہی ہیں) اور ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا o فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا o﴾ ''قسم ہے ان کی جو بکھیر کر اڑانے والے ہیں، پھر بوجھ اٹھانے والے ہیں'' (یہاں بھی ایک تفسیر کے مطابق فرشتے ہی ہیں) اور ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا o فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا o﴾ ''قسم ہے ان جماعتوں کی جو بھیجی جاتی ہیں لگا تار، پھر زور سے جھونکا دینے والی جماعتیں (یہاں بھی ایک تفسیر کے مطابق فرشتے ہی ہیں) اور رب تعالی نے ارشاد فرمایا: ﴿وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا o وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا o﴾ ''قسم ہے ان کی کہ سختی سے جان کھینچیں اور نرمی سے بند کھولیں۔ (یہاں بھی فرشتوں کا ہی ذکر ہے) یعنی ان آیات میں فرشتوں کے مختلف کاموں کا تذکرہ ہے، تفصیل انشاء اللہ اپنے اپنے مقامات پر آئے گی۔ بہر حال اتنا ایمان رکھنا ضروری ہے کہ اللہ تعالی کی طرف سے مختلف کاموں پر مقرر ہیں۔

(۴) ان وجوہ میں چوتھی وجہ یہ ہے کہ اس پر ایمان ہو کہ اللہ تعالی کی کتابیں انبیاء کرام پر فرشتوں کے ذریعے ہی پہنچی ہیں۔ جیسا کہ رب تعالی نے فرمایا:

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِیْمٍ o ذِیْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِیْنٍ o مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیْنٍ﴾

''بے شک یہ عزت والے رسول (جبریل) کا پڑھنا ہے، جو قوت والا ہے، مالک عرش کے حضور عزت والا، وہاں اس کا حکم مانا جاتا ہے امانت دار ہے''۔

یعنی ان آیات میں قرآن پاک کا حضور ﷺ کے پاس جبریل کے پڑھنے کا ذکر ہے، "فهذه المراتب لابد منها في حصول الايمان بالملائكة" ملائکہ پر ایمان لانے کی جو چار وجوہ ذکر کی گئیں ہیں ان تمام کے مطابق ایمان لانا ضروری ہے۔ عقل جتنا ان میں زیادہ غور وفکر کرے گی، انکی سوچ میں غوطہ زن ہوگی اتنا ہی ملائکہ پر ایمان اس کا مضبوط ہوگا۔

ایمان بالکتب:

اللہ تعالی کی کتابوں پر ایمان لانے کی بھی چار وجوہ ہیں۔

(۱) ان وجوہ میں سے ایک وجہ تو یہ ہے کہ انسان اس پر ایمان رکھے کہ یہ کتابیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے رسولوں پر وحی کے ذریعے نازل ہوئیں، یہ کسی کاہن کا کلام نہیں یا کسی جادوگر کا کلام نہیں یا کسی شیطان نے القاء نہیں کیں اور نہ ہی ارواح خبیثہ نے ان کو انبیاء کرام پر القاء کیا ہے۔

(۲) ان وجوہ میں سے دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر یہ ایمان ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام وحی کے ذریعے اسکے رسولوں پر نازل کیا گیا اور وحی کے نازل کرنے پر اللہ تعالیٰ نے صرف فرشتوں کو مقرر کیا ہے اور ان کو ہی طاقت دی ہے کہ جو پاک مخلوق ہے شیطان جو خبیث مخلوق ہے ان کو یہ طاقت ہی نہیں دی گئی کہ وہ وحی کو نازل کریں اور نہ ان کو یہ طاقت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں کوئی اپنی طرف سے کلام ملا سکیں۔

اگر کوئی یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں شیطان کا کلام مل گیا تھا تو رسول اللہ ﷺ کو پتہ نہیں چل سکا تھا یہ قرآن پاک پر تہمت ہے اور دین میں طعن ہے اور بہت بڑا عظیم جرم ہے بلکہ اس سے کفر لازم آئے گا۔

(۳) ان وجوہ میں سے تیسری وجہ یہ ہے کہ قرآن پاک کے متعلق یہ عقیدہ ہو اور یہ ایمان ہو کہ "ان ھذا القرآن لم یغیر ولم یحرف" بے شک قرآن پاک میں ذرا بھر بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی کسی قسم کی "معاذاللہ" اس میں کوئی تحریف نہیں کی گئی، تو ان لوگوں کا قول فاسد پر مبنی ہے اور وہ بے دین ہیں جنہوں نے دین میں فساد قائم کرنے کیلئے اور کافروں کو قرآن پاک پر طعن کرنے کا موقع فراہم کرنے کے لئے یہ کہا "ان ترتیب القرآن علی ھذا الوجہ شیٔ فعلہ عثمان ؓ" کہ قرآن پاک کی ترتیب تو حضرت عثمان ؓ نے رکھی تھی اس میں سے تو بعض سورتوں اور بعض آیات کو شامل ہی نہیں کیا گیا، یہ سب اقوال کفریہ ہیں ان سے یہ لازم آئے گا۔ "فان من قال ذلک اخرج القرآن عن کونہ حجۃ" کہ قرآن پاک حجت ہی نہ رہے، قرآن پاک سے کسی مسئلہ پر کوئی دلیل ہی نہ پکڑی جائے۔

حقیقت یہی ہے کہ نام نہاد مسلمانوں نے، بکاؤ مال مسلمانوں نے، منافقین نے، یہود و نصاریٰ نے اور یہود و نصاریٰ کے چمچوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگالیا ہے لیکن قرآن پاک کو مسلمانوں کے دلوں سے نہیں نکال سکے، قرآن پاک کا محافظ اللہ تعالیٰ ہے۔ تا قیامت قرآن پاک میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکے گا۔

(۴) ان چار وجوہ میں سے چوتھی وجہ یہ ہے کہ قرآن پاک کے متعلق یہ ایمان ہو کہ اس میں محکم آیات بھی ہیں جن کی مراد واضح ہے اور متشابہ آیات بھی ہیں جن کی مراد صرف اللہ تعالیٰ ذاتی طور پر جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عطاء سے رسول اللہ ﷺ بھی جانتے ہیں مزید وضاحت انشاء اللہ سورۃ آل عمران میں قریب ہی آرہی ہے اور سورۃ بقرۃ کی ابتدا میں کافی حد تک بحث ہو چکی ہے۔

ایمان بالرسل : اللہ تعالیٰ کے رسولوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے جب تک اللہ تعالیٰ کے رسولوں پر ایمان نہیں ہوگا اس وقت تک انسان مؤمن کہلانے کا حقدار نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے رسولوں پر ایمان لانے میں بھی چار مراتب ہیں، ہر ایک کے مطابق ایمان لانا بھی ضروری ہے۔

پہلا مرتبہ : ان چار مراتب میں سے پہلا مرتبہ یہ ہے کہ "ان یعلم کونهم معصومین من الذنوب" کہ اس پر کامل اور پختہ ایمان ہو کہ انبیاء کرام معصوم ہیں گناہوں سے پاک ہیں، تحقیق پر مبنی کلام یہی ہے کہ انبیاء کرام صغائر گناہوں سے بھی پاک ہیں اور کبائر سے بھی پاک ہیں۔ اس مسئلہ کی تفصیل پہلے پارہ ﴿فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ﴾ کی وضاحت کے ضمن میں "نجوم الفرقان جلد دوم" میں دیکھئے۔

دوسرا مرتبہ : "من مراتب الایمان بهم ان یعلم ان النبی افضل ممن لیس بنبی" یعنی انبیاء کرام پر ایمان لانے کی چار مراتب میں سے دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ اس پر پختہ ایمان ہو کہ کوئی غیر نبی، اللہ کے نبی سے افضل نہیں۔

تیسرا مرتبہ : انبیاء کرام پر ایمان لانے کے چار مراتب میں سے تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ اس پر ایمان اور عقیدہ ہو کہ انبیاء کرام تمام فرشتوں سے افضل ہیں کوئی مقرب فرشتہ کسی نبی سے افضل نہیں اس عقیدہ کے خلاف کسی باطل قول کو تسلیم کر کے فرشتوں کو افضل کہنا جائز نہیں۔

چوتھا مرتبہ : انبیاء کرام کے متعلق یہ ایمان رکھے کہ تمام انبیاء کرام نفس نبوت میں برابر ہیں، تمام کی نبوت اصلی اور حقیقی ہے یہ قول باطل ہے کہ نبی کریم ﷺ کی نبوت اصلی ہے اور باقی انبیاء کرام کی نبوت عارضی ہے البتہ یہ کہنا صحیح ہے، بلکہ اس پر ایمان رکھنے کے بغیر ایمان حاصل ہی نہیں ہوگا کہ انبیاء کرام میں سے بعض حضرات دوسرے بعض سے افضل ہیں، مراتب و درجات کے لحاظ سے انبیاء کرام میں فرق پایا جاتا ہے، اس مسئلہ کی تفصیل نجوم الفرقان کی "جلد ششم" میں ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ کی وضاحت کے ضمن میں دیکھئے۔ (ماخوذ از کبیر)

یوم آخرت کے ذکر نہ کرنیکی وجہ:

اس آیہ کریمہ میں ﴿وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ نہیں ذکر فرمایا حالانکہ ایمان مکمل اسی وقت ہوگا جب آخرت کے دن پر ایمان ہوگا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ "لاندراجه فی الایمان بکتبه" کتب پر جب ایمان کا ذکر ہو گیا تو اسی ضمن میں آخرت کا ذکر بھی آ گیا کیونکہ آخرت پر ایمان کے بغیر اللہ تعالیٰ کی آسمانی کتابوں پر بھی ایمان مکمل نہیں ہوتا اور کتابوں کے ایمان کے ضمن میں ذکر کرنے سے اختصار بھی حاصل ہو گیا۔ (روح المعانی)

﴿ لَانُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍمِّنْ رُّسُلِهٖ ﴾

''ہم نہیں فرق کرتے کسی ایک کے درمیان اسکے رسولوں میں سے (ایمان لانے میں)''

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ایمان افروز ترجمہ:

آپ کا ترجمہ یہ ہے کہ ''ہم اس کے کسی رسول پر ایمان لانے میں فرق نہیں کرتے'' **راقم** نے بھی یہی ترجمہ نقل کیا لیکن راقم کی کوشش ہوتی ہے کہ لفظی ترجمہ کیا جائے تا کہ طلباء کرام اس سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں یعنی اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ میں ایمان لانے میں فرق کرنے کی نفی واضح طور پر ذکر کی گئی ہے، صرف فرق کرنے کی نفی کرنا ممکن نہیں کیونکہ مراتب میں فرق کرنا ضروری ہے بلکہ ایمان کا حصہ ہے کہ بعض انبیاء کرام کو بعض پر فضیلت دے تقریباً اکثر تفاسیر نے اس مسئلہ کو واضح کیا ہے۔جلالین ،مدارک اور مظہری وغیرہ میں واضح طور پر یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے خازن کی عبارت ملاحظہ ہو:

﴿ لَانُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍمِّنْ رُّسُلِهٖ ﴾فنؤمن ببعض ونکفرببعض کمافعلت الیهود والنصاری بل نؤمن بجمیع رسله "

ایمان والوں نے جو یہ کہا کہ ''ہم فرق نہیں کرتے کسی ایک کے درمیان اسکے رسولوں میں سے'' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ایسا فرق نہیں کرتے جیسا کہ یہود و نصاری نے فرق کیا تھا کہ بعض انبیاء کرام پر انہوں نے ایمان لایا اور بعض کے ساتھ کفر کیا، ہم ان کی طرح بعض کے ساتھ ایمان لانے اور بعض کے ساتھ کفر کرنے میں فرق نہیں کرتے بلکہ ہم اللہ تعالیٰ کے تمام رسولوں پر ایمان لاتے ہیں۔ (خازن)

یہاں بھی یہ خیال کیا جائے کہ آیۃ کریمہ میں ﴿ رُسُلْ ﴾ کا لغوی معنی لیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف بھیجے ہوئے تمام انبیاء کرام پر ایمان رکھتے ہیں، اسلئے کہ اصطلاحی معنی کے لحاظ سے ﴿ رُسُلْ ﴾ خاص ہے جو تمام انبیاء کرام کو شامل نہیں۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

یہاں ایک اعتراض وارد ہوتا ہے کہ لفظ ﴿ بَیْنَ ﴾ کا استعمال یہاں کس طرح درست ہے؟

"وهو لایدخل الاعلی اسم یدل علی اکثر من واحد تقول" المال بین القوم" ولاتقول "المال بین زید"

کیونکہ لفظ ﴿ بَیْنَ ﴾ کے متعلق یہ قانون ہے کہ یہ اس اسم پر داخل ہوتا ہے کہ جس میں سے ایک سے زائد کا معنی پایا جاتا ہے، جیسے کہا جائے "المال بین القوم" مال قوم کے درمیان (مشترک یا منقسم) ہے، لیکن جہاں ایک

کا معنی پایا جائے وہاں لفظ "بین" کا استعمال صحیح نہیں، یہ نہیں کہا جا سکتا "المال بین زید" مال ایک فرد واحد زید میں مشترک ہے یا مطلب یہ لیا جائے کہ مال زید میں منقسم ہوا ہے۔ جب لفظ "احد" واحد ہے اسکے معنی میں کثرت نہیں پائی گئی تو اس پر لفظ "بین" کا داخل کرنا کسطرح صحیح ہے؟

تو اس کا **جواب** یہ دیا گیا ہے کہ لفظ "احد" نکرہ ہے جو تحت النفی ہے یعنی ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ﴾ جب کہا گیا تو نکرہ کے تحت النفی آنے کی وجہ سے عموم آگیا۔ "ولهذا احد في معنى الجمع ولذا دخل عليه بين" اسی وجہ سے کہ "احد" میں کثرت کا معنی آگیا اور اس پر "بین" داخل ہونا صحیح ہوگیا۔ (ماخوذ از مدارک)

یہی ضابطہ ﴿فَمَا مِنكُم مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِيْنَ﴾ میں بیان کیا گیا ہے کہ نکرہ تحت النفی آنے کی وجہ سے عموم پر دلالت کر رہا ہے لہذا "اَحَدٍ" میں کثرت والا معنی پایا گیا ہے تو اس کی صفت بھی جمع ﴿حَاجِزِيْنَ﴾ لائی گئی ہے۔ (قرطبی)

مدارک کی عبارت میں سے "الجمع" کا معنی راقم نے کثرت کیا ہے کیونکہ جمع کے اصطلاحی معنی مراد لینے پر علامہ رازی رحمہ اللہ اعتراض کرتے ہیں:

"وعندی انه لايجوز ان يكون احد ههنا في معنى الجمع لانه يصير التقدير لانفرق بين جميع رسله وهذا لاينافي في كونهم مفرقين بين بعض الرسل والمقصود بالنفي هو هذا" (از کبیر)

"احـــــــد" کو جمع کے معنی میں لینا میرے نزدیک درست نہیں کیونکہ پھر معنوی لحاظ پر عبارت یہ ہو جائے گی "لانفرق بين جميع رسله" ہم تمام رسولوں پر ایمان لانے میں فرق نہیں کرتے، اس سے بعض کی تفریق کی نفی نہیں ہوتی، حالانکہ مطلقاً مقصود بعض میں تفریق کی نفی ہے اسلئے یہود و نصاری یا تو رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہ لاکر وہ تفریق کا سبب بنے اور یا یہود عیسی علیہ السلام پر ایمان نہ لاکر اور نصاری موسی علیہ السلام پر ایمان نہ لاکر تفریق کا سبب بنے، جمیع انبیاء کرام پر وہ ایمان نہ لاکر تفریق کے سبب نہیں بنے۔

لیکن راقم نے جو ضابطہ بیان کیا ہے کہ نکرہ تحت النفی آکر عموم کا معنی دیتا ہے اور جمع کا جو معنی کثرت کیا ہے اس سے اعتراض اٹھ گیا۔

اب معنی واضح ہوگیا کہ "ہم فرق نہیں کرتے اس کے رسولوں میں سے کسی ایک پر ایمان لانے میں" یعنی بعض پر ایمان لائیں اور بعض پر ایمان نہ لائیں" ہم ایسا نہیں کرتے۔ علامہ رازی رحمہ اللہ علیہ کا جمع کو بمعنی جمیع لینا بھی راقم کو کچھ عجیب سا لگا، جمع کا اصطلاحی معنی لیکر بھی راقم کے نزدیک ترجمہ وہی رہے گا جو اوپر بیان کر دیا گیا ہے۔

﴿ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ ﴾

''اور انہوں نے کہا کہ ہم نے سنا اور فرمابرداری کی تو مغفرت فرما ہمارے رب اور تیری اطاعت کی، یعنی تیرے امر کی اطاعت کی۔''

"وقالوا سمعنا و اطعنا یعنی سمعنا قولک و اطعنا امرک'' اور انہوں نے کہا کہ ہم نے سنا یعنی اے اللہ! تیرے کلام کو ہم نے سنا اور تیری اطاعت کی یعنی تیرے امر کی اطاعت کی۔

مطلب یہ ہے کہ مؤمنوں نے کہا کہ ہم نے اپنے رب کے کلام کو سنا جو اس نے ہمیں حکم دیا اور ہم نے اس کی اطاعت کی جو اس نے ہم پر لازم کیا یعنی فرائض وغیرہ اور ہم اللہ تعالی کی اطاعت کرتے ہوئے اسی کی عبادت کرتے ہیں، اسی کے حضور سر جھکاتے ہیں جو کام اللہ تعالی نے ہم پر فرض کیے ہیں ان پر ہم عمل کر کے انہیں تسلیم کرتے ہیں اور جو کام رب تعالی نے ہم پر حرام کیے ہیں ہم ان کو چھوڑ کر اللہ تعالی کے ارشاد کو بجالاتے ہیں۔ (ماخوذ از خازن)

بہت شاندار ترجمہ مدارک نے لکھا ہے: ﴿وَقَالُوْا سَمِعْنَا﴾ "اجبنا قولک " اور انہوں نے کہا کہ ہم نے تمہارے قول کو قبول کیا یعنی صرف سننے کا اقرار نہیں کیا کہ ایک کان سے سنا اور دوسرے سے نکال دیا، بلکہ دل و جان سے سننے کا مؤمنین نے اقرار کیا کہ ہمارے رب ہم نے تیرے کلام کو دل و جان سے سن کر قبول کیا۔ ﴿ وَاَطَعْنَا ﴾ کا معنی مدارک نے بھی وہی کیا ہے جو خازن نے کیا ہے۔ "واطعنا امرک" اور تیرے امر کی اطاعت کی۔ (از مدارک)

﴿ غُفْرَانَکَ ﴾ ای اغفر لنا غفرانک فھو منصوب بفعل مضمر" ترکیبی لحاظ پر ﴿غُفْرَانَکَ﴾ منصوب ہے اور پوشیدہ فعل کا مفعول مطلق ہے جسکا مختصر معنی راقم نے لکھا ''تو مغفرت فرما۔ (مدارک)

ایک معنی خازن نے بھی لکھا ہے البتہ ایک معنی اور بھی لکھا ہے۔ ﴿ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا ﴾ ای نسئلك غفرانك ربنا یعنی ی فعل مقدر اگر "نسئلک " ہو اور "غفرانک" مفعول بہ ہو تو معنی یہ ہوگا ''ہم سوال کرتے ہیں تجھ سے تیری مغفرت کا اے ہمارے رب! (خازن)

﴿ وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ ﴾ "یعنی قالوا الیک یا ربنا مرجعنا و معادنا فاغفر لنا ذنوبنا"

یعنی مکمل ﴿ غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ ﴾ کا معنی یہ ہے کہ مؤمنوں نے کہا کہ اے ہمارے رب ہمارا پھرنا تیری طرف ہی ہے یعنی ہم نے تیری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے تو ہمارے گناہوں کی مغفرت فرما۔ علامہ بغوی نے ایک روایت ذکر کی ہے اگرچہ اسکی مکمل سند ذکر نہیں کی تاہم اتنی سند بھی مذکور ہے۔

"عن حکیم بن جابر ان جبریل علیہ السلام قال للنبی ﷺ ان اللہ عزوجل قد اثنی علیک وعلی امتک فسل تعط قال بتلقین اللہ تعالی غفرانک ربنا والیک المصیر"

حکیم بن جابر سے مروی ہے کہ بے شک جبریل علیہ السلام نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا بے شک اللہ تعالی نے آپ کی اور آپ کی امت کی تعریف فرمائی ہے، آپ سوال کریں آپ کو عطاء کیا جائے گا۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالی سے ﴿غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ﴾ کی تلقین کا سوال کرتا ہوں۔ (ماخوذ از خازن)

قرآن پاک کے اسرار عجیبہ:

اس آیہ کریمہ میں ذکر کیے گئے الفاظ مبارکہ خاص نکات ثابت کر رہے ہیں ان کی ترتیب کے فوائد کو سمجھنے کیلئے پہلے تمہیدی مقدمہ سمجھا جائے۔ انسان میں یہ کمال ہے کہ حق کو لذاتہ پہچاننا اور اسے یہ علم ہو کہ اللہ تعالی کیلئے عمل کرنے میں ہی بھلائی ہے اور اسے یہ معلوم ہو کہ قوت نظریہ کا کمال علم سے حاصل ہوتا ہے اور یہ پتہ ہونا چاہیے کہ قوت عملیہ کو کمال اچھے اور نیک اعمال سے حاصل ہوتا ہے۔

"والقوۃ النظرۃ اشرف من القوۃ العملیہ والقرآن مملوء من ذکرھما بشرطان تکون القوۃ النظریۃ مقدمۃ علی العملیۃ"

قوت نظریہ کو قوت عملیہ سے بلند مرتبہ حاصل ہے لیکن شرط یہ ہے کہ نظر وفکر پہلے کرے اور عمل بعد میں کرے یعنی جب قوت نظریہ پہلے پائی گئی قوت عملیہ سے تو اس وقت قوت نظریہ کو بلند مرتبہ حاصل ہوگا۔ قرآن پاک میں دونوں کا ذکر جا بجا موجود ہے جہاں بھی نیک اعمال کا حکم دیا گیا اور برے کاموں سے روکا گیا ہے ان پر عمل کرنا قوت عملیہ ہے اور جہاں تدبر کرنے، تفکر کرنے، عبرت پکڑنے اور نصیحت کرنے وغیرہ کا ذکر ہے وہ قوت نظریہ ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کا ذکر رب تعالی نے فرمایا کہ آپ نے رب تعالی کے حضور عرض کیا: ﴿رَبِّ هَبْ لِیْ حُکْمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ﴾ اے میرے رب! مجھے حکم عطا فرما اور اپنے قرب کے لائق لوگوں میں مجھے ملا۔ "فالحکم کمال القوۃ النظریۃ" حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعاء میں حکم کو پہلے ذکر کیا جو کمال قوت نظریہ ہے اور ﴿وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ﴾ کا ذکر آپ نے بعد میں کیا ﴿وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ﴾ "کمال القوۃ العملیۃ" اس کی وجہ یہ ہے کہ ﴿وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ﴾ کمال قوت عملیہ ہے، اور قوت نظریہ مقدم ہے اور اشرف ہے، قوت عملیہ سے۔

"اذا عرفت ھذا منقول الامر فی ھذہ الایۃ ایضا کذلک فقولہ ﴿کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِکَتِهٖ وَکُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾ اشارۃ الی استکمال القوۃ النظریۃ بھذہ المعارف الشریفۃ وقولہ تعالی

﴿وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا﴾ اشارة الی استکمال القوة العملیة الانسانیة بھذہ الاعمال الفاضلة الکاملة"

جب تمہیں یہ معلوم ہو چکا ہے جو ہم نے تفصیلی طور پر تمہیداً ذکر کیا ہے تو آیۃ کریمہ میں غور کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ﴿کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِکَتِهٖ وَکُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَانُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍمِّنْ رُّسُلِهٖ﴾ میں کمال قوت نظریہ کی طرف اشارہ ہے اسلئے کہ اللہ تعالی اور اس کے فرشتوں اور اسکی کتابوں اور اسکے رسولوں پر ایمان اسی وقت لایا جائے گا جب ان کی معرفت حاصل ہوگی جس کا تفصیلی ذکر پہلے کیا جاچکا ہے اور رب تعالی کا ارشاد گرامی ﴿وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا﴾ قوت عملیہ انسانیہ کے کمال کی طرف اشارہ ہے کہ اعمال فاضلہ وکاملہ سے قوت عملیہ کا کمال حاصل ہوتا ہے۔ (از کبیر)

آیۃ کریمہ میں مبداء، وسط اور معاد کا ذکر ہے:

انسان کا تعلق تین زمانوں سے ہے "ماضی، حال اور استقبال" ماضی سے بحث معرفت مبداء کہلاتی ہے اور حال سے بحث علم وسط کہلاتی ہے اور استقبال سے بحث کا نام علم معاد ہے۔ قرآن پاک میں ان تینوں مراتب کا ذکر پایا گیا ہے جو اس آیہ کریمہ میں (جس کی بحث کی جاری ہے) بھی ذکر پایا گیا ہے اس آیۃ کریمہ کے ذکر سے پہلے دوسرے مقامات میں سے سمجھئے پھر اس آیۃ کریمہ کو سمجھنا آسان ہوگا۔ سورۃ ہود کی آخری آیۃ میں ان تینوں علوم یعنی علم مبداء، علم وسط، علم معاد کا ذکر ہے، ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَلِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَیْهِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ کُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَکَّلْ عَلَیْهِ وَمَارَبُّکَ بِغَافِلٍ عَمَّاتَعْمَلُوْنَ﴾

اور اللہ تعالی ہی کیلئے ہیں آسمانوں اور زمین کے غیب اور اسی کی طرف سب کاموں کی رجوع تو اس کی بندگی کرو اور اس پر بھروسہ رکھو اور تمہارا رب تمہارے کاموں سے غافل نہیں۔

اس آیۃ کریمہ میں ﴿وَلِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَیْهِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ کُلُّهٗ﴾ اشارہ ہے معرفت مبدأ کی طرف اس لئے کمالات حقیقیہ سوائے علم اور قدرت کے حاصل نہیں اور ان دونوں کا ذکر یوں فرمادیا:

﴿وَلِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ اشارة الی کمال العلم وقوله ﴿وَاِلَیْهِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ کُلُّهٗ﴾ اشارة الی کمال القدرة فھذاھو الاشارة الی علم المبدأ"

یعنی ﴿وَلِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ذکر فرما کر کمال علم کی طرف اشارہ کیا، اور ﴿وَاِلَیْهِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ کُلُّهٗ﴾ فرما کر کمال قدرت کی طرف اشارہ کردیا گیا۔

مسئلہ واضح ہے کہ جب یہ فرمایا ''اور اللہ تعالی کیلئے ہی ہیں آسمانوں اور زمینوں کے غیب'' تو اس میں کمال علم کاذکر ہے اور جب یہ فرمایا کہ ''اسی کی طرف تمام امور لوٹتے ہیں'' تو اس میں کمال قدرت کا ذکر ہے۔ یہ علم مبداء کاذکر ہے۔

میرے عزیز طلباء کرام یہاں ٹھوکر نہ کھانا، یہ انسانوں کا علم مبدأ ہے، رب تعالی کے علم میں ماضی ،حال، استقبال کا کوئی اعتبار نہیں۔علم وسط وہ علم ہے جس کا تعلق زمانہ حال میں مشغولیت سے ہے۔اسکے دو مرتبے ہیں ایک کا نام ''بدایة'' ہے اور دوسرے کا نام ''نہایة'' ہے۔"اما البدایة فالاشتغال بالعبودیة" بدایت (ابتدأ) عبودیت میں مشغول ہونا ہے۔

''واما النھایة فقطع النظر عن الاسباب وتفویض الامور کلھا الی مسبب الاسباب وذلک ھو المسمی بالتوکل'' لیکن نہایت (انتہا) اسباب سے قطع نظر ہوکر تمام امور مسبب الاسباب یعنی رب تعالی کے سپرد کردینا اس کا نام توکل ہے۔

یعنی اللہ تعالی پر کامل بھروسہ رکھنا۔ان دونوں مقاموں کاذکر کیا گیا۔یعنی مقام ابتدأ کا تذکرہ ﴿فَاعْبُدْهُ﴾ ''تو اسی کی عبادت کرو'' سے کیا گیا اور مقام انتہاء کا تذکرہ ﴿وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ﴾ ''تو اسی پر توکل کرو'' سے کیا گیا اور علم معاد کاذکر رب تعالی نے ﴿وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝﴾ ''اور تمہارا رب تمہارے کاموں سے غافل نہیں'' سے کیا ہے کہ قیامت کا دن ضرور آنا ہے جس میں تمہیں اپنے اعمال کے نتائج کا علم حاصل ہونا ہے۔یعنی جس آیۃ کریمہ کو بطور مثال پہلی زیر بحث آیۃ کو سمجھانے کیلئے ذکر کیا گیا ہے اس میں تینوں یعنی علم مبدأ، علم وسط اور علم معاد پائے گئے ہیں۔اب اور آیات کریمہ کو بطور مثال پیش کیا جاتا ہے تا کہ زیر بحث آیۃ کریمہ کو سمجھنا آسان ہوجائے، ارشاد ربانی ہے:

﴿سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ ۝ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ ۝ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ ۝﴾

''پاکی ہے تمہارے رب کو، عزت والے کو ان باتوں سے اور سلام ہے پیغمبروں پر اور سب خوبیاں اللہ تعالی کو جو سارے جہان کا رب ہے''۔

ان آیات کریمہ میں بھی تینوں علوم کاذکر موجود ہے ﴿سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ ۝﴾ یہ آیۃ علم مبدأ پر دلالت کررہی ہے، کیونکہ جب مؤمن شخص ماضی کی طرف توجہ کرتا ہے، دیکھتا ہے کہ کفار جو اس کے شریک ٹھہراتے ہیں اور اسکی اولاد مانتے ہیں کیا وہ درست راہ پر ہیں تو مؤمن برملا طور پر کہتا ہے کہ رب تعالی تو ان کے بیان کردہ اوصاف سے پاک ہے، بس اسی کا نام علم مبدأ ہے۔اور ﴿وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ ۝﴾ سے علم وسط کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب تک رسولوں پر ایمان نہیں ہوگا تو قیامت پر ایمان بھی نہیں ہوگا اور قیامت میں کامیابی بھی نہیں

ہوگی اسی کا نام ہے "علم وسط" پھر رب تعالیٰ نے ﴿وَالْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ٥﴾ سے علم معاد کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ جنت والوں کا وصف بھی یوں بیان فرمایا کہ ﴿وَاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ٥﴾ بس اسی کا نام علم معاد ہے۔ مندرجہ بالا مثالوں کو سمجھنے کے بعد اور یہ سمجھنے کے بعد کے علم مبدأ، علم وسط اور علم معاد کیا ہیں۔

اب زیر بحث آیۃ کریمہ کی طرف نظر کریں تو آپ کو واضح طور پر نظر آئے گا کہ اس میں یہ تینوں علوم پائے گئے۔ ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ﴾ سے لیکر ﴿لَانُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾ تک علم مبدأ کا ذکر ہے اور ﴿وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا﴾ میں علم وسط کا ذکر ہے کیونکہ ان الفاظ مبارکہ میں ان احوال کی معرفت پائی گئی جن کا علم رکھنا انسان کیلئے ضروری ہے تاکہ ان کی معرفت حاصل کر کے پھر اس دنیا میں ان پر عمل بھی کر سکے۔ اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ﴾ علم معاد پر دلالت کر رہا ہے کیونکہ اس میں واضح طور پر رب تعالیٰ کی طرف پھرنے اور بخشش طلب کرنے کا ذکر ہے جو امور اخروی ہیں۔

تنبیہ: یہ نکات بے فائدہ نہ سمجھے جائیں بلکہ ان کو نفع مند سمجھ کر وہی فائدہ عظیمہ حاصل کیا جائے جو علامہ رازی رحمہ اللہ یوں بیان فرماتے ہیں۔

"والوقوف علی هذه الاسرار ینورا لقلب ویجذبه من ضیق عالم الاجسام الی فسحة عالم الافلاک وانوار بهجة السماوات"

ان اسرار و رموز پر جو شخص واقف ہوگا اس کا دل منور ہوگا، عالم اجسام کی تنگی سے نکل کر وہ عالم افلاک کی کشادگی اور آسمانوں کی خوبصورتی کے انوار تک پہنچ جائے گا۔ (ماخوذ از کبیر)

حقائق موجودات اور احکام کا ذکر:

جس آیۃ کریمہ کی بحث کی جاری ہے اس میں حقائق موجودات کی بحث بھی پائی گئی ہے اور افعال کے احکام کی بحث بھی پائی گئی کہ وہ احکام واجب ہیں یا جائز یا ممنوع ہیں۔ پہلی قسم یعنی حقائق موجودات کا علم عقل پر موقوف ہے اور دوسری قسم یعنی احکام افعال کا علم سمع پر موقوف ہے کیونکہ وہ عقل سے حاصل نہیں ہوتے بلکہ صرف شرع سے سن کر حاصل ہوتے ہیں۔

پہلی قسم یعنی حقائق موجودات کا ذکر ﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ﴾ میں کر دیا گیا ہے کیونکہ کوئی شخص جنگل میں ہو، پہاڑوں میں ہو وہاں کوئی شخص اسکی راہنمائی کو نہ پہنچے تو پھر بھی رب تعالیٰ کی طرف سے دی ہوئی عقل سے وہ زمین و آسمان، چاند و سورج، ستارے اور دن رات وغیرہ کو دیکھ کر اتنا ضرور تسلیم کرے کہ اس بہت بڑے

نظام کا چلانے والا موجود ہے وہ کوئی انسان نہیں بلکہ وہ محتاجی اور موت سے پاک ذات ہے۔"یہی علم عقلی کہلاتا ہے "اور دوسری قسم یعنی احکام افعال کا علم سمعی وشرعی کا ذکر ﴿وَقَالُوا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا﴾"اور انہوں نے کہا ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی" میں موجود ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

الاعادة بالتفصيل للافادة :

تفسیر مدارک سے ﴿سَمِعْنَا﴾ کا شاندار معنی جو بیان کیا گیا ہے، اگرچہ بظاہر تو اسی کا ذکر نظر آئے گا لیکن کبیر سے تفصیل ذکر کی جارہی ہے جو یقیناً نفع مند ہے۔ علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "اللہ تعالی نے مؤمنین کے ایمان کا پہلے وصف ذکر فرمایا اور اس کے بعد ان کے قول ﴿سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا﴾"اور ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی" کا ذکر کیا۔

"وليس المراد منه السماع الظاهر لان ذلک لايفيد المدح بل المراد اناسمعناه باذان عقولنااى عقلناه وعلمناصحته وتيقناان كل تكليف ورد على لسان الملائكة والانبياء عليهم السلام الينافهوحق صحيح واجب القبول "

اگرچہ بظاہر ﴿سَمِعْنَا﴾ کا معنی صرف "ہم نے سنا" نظر آتا ہے لیکن صرف ظاہری طور پر سننا مراد نہیں کیونکہ صرف سننا قابل تعریف نہیں بلکہ قابل تعریف وہ سننا ہے جو دل کے کانوں سے سنا جائے اور اسے سمجھا جائے اور اس کے صحیح ہونے کا علم حاصل کیا جائے اور یہ یقین کیا جائے کہ بے شک اللہ تعالی نے جن چیزوں کا فرشتوں اور انبیاء کرام کے ذریعے حکم دیا ہے وہ سب حق اور صحیح ہیں ان پر عمل کرنا واجب ہے۔

"سمع بمعنى قبول وفهم" قرآن پاک میں مذکور ہے رب تعالی کا ارشاد گرامی ہے: ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ﴾ "بیشک اس میں نصیحت ہے اس کے لئے جو دل رکھتا ہو یا کان لگائے متوجہ ہو کر"

"والمعنى لمن سمع الذكر بفهم حاضر" معنی اس کا یہ ہے کہ بے شک اس میں نصیحت ہے اس کے لئے جس نے ذہن کو حاضر رکھ کر خوب متوجہ ہو کر نصیحت کو سنا، اور اس کے مقابل بھی ارشاد باری تعالی موجود ہے ﴿کَاَنْ لَّمْ یَسْمَعْهَا کَاَنَّ فِیْۤ اُذُنَیْهِ وَقْرًا﴾ گویا کہ اس نے نہیں سنا گویا کہ اس کے کانوں میں بوجھ ہے۔ ﴿سَمِعْنَا﴾ کے بعد فرمایا ﴿وَاَطَعْنَا﴾"اور ہم نے اطاعت کی" اس لفظ سے مؤمنین نے رب تعالی کے حضور عرض کیا۔ اے رب تعالی تو نے جو احکام ہمیں عطاء کئے ہیں ان کو ہم تسلیم کر رہے ہیں، ہمارا اعتقاد ان کے بارے میں صحیح ہے "فهم مااخلوا بشیء منها" صحابہ کرام نے ان احکام کے بجالانے میں بغیر کسی عذر و خطاء کے کوئی خلل

پیدا نہیں کیا جیسا کہ انہوں نے دل وجان سے سن کر قبول کیا ایسا ہی اس پر عمل کر کے بھی دکھایا۔

"فجمع الله تعالى بهذين اللفظين كل مايتعلق بابواب التكليف علما وعملا" قرآن پاک کی کیا خوب فصاحت وبلاغت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دو لفظوں ﴿سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا﴾ میں مکلفین پر تمام امور ونواہی کا علمی اور عملی ذکر فرمادیا۔ ﴿سمعنا﴾ میں علمی ذکر ہے اور ﴿وَاَطَعْنَا﴾ میں عملی ذکر ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿غُفْرَانَکَ رَبَّنَا﴾ "تو اپنی مغفرت فرما اے ہمارے رب"

یا تو اس کا معنی ہے "اغفر غفرانک" تو اپنی مغفرت فرما۔ فراء نحوی نے کہا ہے کہ "غفران" مصدر ہے، مقام امر میں ہونے کی وجہ سے نصب ہے جیسا کہ " الصلوة، الصلوة کا معنی ہوتا ہے۔ نماز ادا کرو، نماز ادا کرو، یا کہا جاتا ہے "الاسد، الاسد" شیر سے بچ جاؤ، شیر سے بچ جاؤ۔

طلب مغفرت میں دو چیزوں کے ذکر کے فوائد:

یہاں اس آیہ کریمہ میں مغفرت کی طلب کو دو چیزوں سے متصل کیا ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مغفرت کو اپنی طرف منسوب کر کے بندوں کو طریقہ بتایا، جس پر انہوں نے عرض کیا ﴿غُفْرَانَکَ﴾ "تیری مغفرت" یعنی تو اپنی مغفرت فرما اسکے بعد ﴿رَبَّنَا﴾ "اے ہمارے رب"۔ یہ دونوں قیدیں چند فوائد پر مشتمل ہیں۔

(۱) ان فوائد میں سے ایک فائدہ یہ حاصل ہوا کہ جب مؤمن یہ کہتے ہیں ﴿غُفْرَانَکَ﴾ تو اس کے ضمن میں گویا کہ یہ کہتے ہیں کہ " انت الكامل فى هذه الصفة فانت غافر الذنب وانت غفور "اے اللہ تو اس صفت میں کامل ہے تو ہی گناہوں کا بخشنے والا ہے اور تو ہی غفور ہے۔ تو نے اپنے غفور ہونے کو قرآن پاک میں جا بجا ذکر کیا ہے ﴿وَرَبُّکَ الْغَفُوْرُ﴾ اور آپ کا رب بخشنے والا ہے ﴿وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ۝﴾ اور وہی بخشنے والا اپنے نیک بندوں پر پیارا ﴿وَاَنْتَ الْغَفَّارُ﴾ ﴿وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ اِنَّهٗ کَانَ غَفَّارًا ۝﴾ اور مؤمنین گویا کہ ضمناً یہ کہتے ہیں کہ اے اللہ تو غفار ہے تو اپنی مہربانی سے ہماری بخشش فرما تو نے اپنے غفار ہونے کا تذکرہ یوں فرمایا ہے: ﴿وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ اِنَّهٗ کَانَ غَفَّارًا ۝﴾ "اپنے رب سے معافی مانگو وہ بڑا معاف فرمانے والا ہے"

اے اللہ! ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ تواب سے غفار نہیں بلکہ یہ تو تیری صفت قدیمہ ہے، تو اس سے ازلاً ابداً متصف ہے یہ تو تیری صفت خاصہ ہے۔ اب رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿غُفْرَانَکَ﴾ کا مطلب یہ بنا کہ اللہ تعالیٰ

کے بندے ایمان والے رب کے حضور گویا یوں کہتے ہیں:

"اطلب الغفران منک (واغفر غفرانک) وانت الکامل فی ھذہ الصفۃ والمطموع من الکامل فی صفۃ ان یعطی عطیۃ کاملۃ" کہ میں تجھی سے بخشش طلب کرتا ہوں، اے رب تعالیٰ تو ہی بخشش فرما تو ہی اس صفت میں کامل درجہ رکھتا ہے جب یہ تیری ہی صفت کاملہ ہے تو ہم امید کرتے ہیں کہ تو کامل عطیہ عنایت فرمائے گا۔

اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ

(غُفْرَانَکَ) طلب الغفران کامل وماذالک الابان یغفر جمیع الذنوب بفضلہ ورحمتہ ویبدلھابالحسنات کماقال ﴿فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِھِمْ حَسَنَاتٍ﴾

کہ جب مغفرت اس ذات سے طلب کی جارہی ہے کہ جو کامل مغفرت کا حق وہی رکھتا ہے تو کامل امید اس پر رکھی جائے اور اس سے سوال کیا جائے کہ اے اللہ اپنے فضل وکرم سے تو تمام گناہوں کو معاف فرما۔ اور ہم یہی امید کامل رکھتے ہیں۔ کہ تو ہمیں اسی درجہ میں رکھے گا کہ تو ہماری لغزشوں کو، تو ہماری خطاؤں اور کوتاہیوں کو معاف کر کے ان کے بدلے ہمیں نیکیاں عطاء فرمائے گا۔

(۲) ان فوائد میں سے دوسرا فائدہ یہ ہے کہ حدیث صحیح میں یہ مذکور ہے۔ "ان اللہ مائۃ جزء من الرحمۃ قسم جزأ واحدا منھا علی الملائکۃ والجن والانس وجمیع الحیوانات فبھا یتراحمون وادخر تسعۃ وتسعین جزأ لیوم القیامۃ" بیشک اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سو حصے ہیں، ان میں سے ایک حصہ فرشتوں، جنوں، انسانوں اور تمام حیوانوں کو عطاء کیا گیا جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں اور رب تعالیٰ کی رحمت کے ننانوے حصے قیامت کے دن کیلئے ذخیرہ بنا رکھے گئے ہیں۔

جو بندہ رب تعالیٰ کے حضور "غفرانک" کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ، اے اللہ! میں تیری رحمت پر غالب گمان رکھتا ہوں کہ تو مجھے بہت بڑی مغفرت سے نوازے گا۔ "کان العبد یقول ھب ان جرمی کبیر غفرانک اعظم من جرمی" گویا بندہ یوں کہہ رہا ہوتا ہے کہ اے اللہ مجھے اپنی بخشش عطا فرما دے، بیشک میرا جرم تو بہت بڑا ہے لیکن اے اللہ تیری بخشش میرے جرم سے بڑی ہے۔

(۳) ان فوائد میں سے تیسرا فائدہ یہ ہے کہ گویا کہ بندہ یہ کہہ رہا ہو کہ اے اللہ تیری ہر صفت تیری صفات جلالیہ اور صفات الٰہیہ سے ہے اور اس کے اثرات مقام معین میں پائے جاتے ہیں، اگر وہ صفات موجود نہ ہوں تو تیری قدرت

کے آثار ظاہر نہ ہوں، اگر نظام عالم میں یہ عجیب وغریب ترتیب نہ پائی جائے تو تیرے علم کے آثار ظاہر نہ ہوں۔ "فکذا لولا جرم العبد وجنایته وعجزه وحاجته لماظهرت آثار غفرانک" اسی طرح اے مولائے کائنات !اگر بندے کے جرم اورغلطیاں نہ ہوتیں اور بندہ عاجز اورحاجت مند نہ ہوتا تو تیری بخشش کے آثار ظاہر نہ ہوتے ﴿غُفْرَانَکَ﴾ کہہ کر بندہ اپنی امید کا قوی اظہار کرتا ہے کہ مجھے امید واثق ہے کہ تیری مغفرت مجھے بھی حاصل ہوگی اور میرے جیسے اور مجرمین کو بھی حاصل ہوگی۔

﴿رَبَّنَا﴾ "اے ہمارے رب"

مؤمنین نے ﴿غُفْرَانَکَ﴾ کے بعد ﴿رَبَّنَا﴾ ذکر کیا ہے اس میں بھی چند فوائد ہیں۔ وہ فوائد سمجھنے سے پہلے لفظ رب کا یہاں مقصودی معنی سمجھئے۔

لفظ **رب** کے کئی معانی ہیں "خالق، سید، مالک منعم، مصلح، معبود، صاحب" اس مقام پر لغوی معنی ہی معتبر ہے۔ "الرب فی الاصل مصدر بمعنی التربیة وهی تبلیغ الشیء الی کماله شیأفشیأ بحسب استعداده الازلی" رب اصل وضع میں مصدر ہے جسکا معنی "تربیت" ہے یعنی ایک چیز کو آہستہ آہستہ کمال تک پہنچانا اسکی ازلی استعداد کے مطابق یعنی جس طرح کی انسان میں استعداد ہوگی اسی طرح اس پر تربیت کا اثر بھی ہوگا۔ تدریجا کمال تک پہنچنے کا مطلب یہ ہے کہ قوت سے فعل کی طرف نکالنا، جس چیز کے ذریعے سے ایک چیز کو کمال حاصل ہوتا ہے اسکی طرف نکالنا" اب ان فوائد کی طرف توجہ کیجئے جو اس مقام پر "ربنا" کے ذکر سے حاصل ہو رہے ہیں۔

(۱) بندہ گویا کہ رب تعالیٰ کے حضور یوں عرض کر رہا ہوتا ہے کہ اے میرے رب جب میں تیری توحید کا ذکر نہیں کر رہا تھا تو اس وقت بھی تو میری تربیت فرما تا رہا "فکیف یلیق بکرمک ان لاتربیتی عند ماافنیت عمری فی توحیدک" اب تیری شان کریمی کے یہ کس طرح لائق ہوگا کہ تو میری تربیت نہ فرمائے جبکہ میں نے اب تک اپنی عمر کو تیری توحید میں صرف کر دیا یعنی اے اللہ میرا ایمان ہے کہ تو ﴿وحده لاشریک له﴾ ہے لہذا تو ہی مجھ پر کرم فرما۔

(۲) بندہ رب تعالیٰ کے حضور یہ عرض کرتا ہے کہ اے اللہ جب میں معدوم تھا (کچھ نہ تھا) اس وقت تو نے میری تربیت کی ہے اور معرض وجود میں لایا۔ (تو نے مجھے موجود کیا)

"امالآن فلولم تربنی وقعت فی الضرر الشدید فاسئلک ان لاتهملنی"
لیکن اب اگر تو میری تربیت نہ فرمائے گا تو میں شدید ضرر میں مبتلا ہو جاؤں گا اسلئے اب میں تیرے

حضور یہی عرض کرتا ہوں کہ مجھے یوں ہی نہ چھوڑ دینا بلکہ میری تربیت جاری رکھنا۔

(۳) ان فوائد میں سے تیسرا فائدہ یہ ہے کہ: "ربیتنی فی الماضی فاجعل تربیتک لی فی الماضی شفیعی الیک فی ان تربیتنی فی المستقبل" کہ بندہ رب تعالیٰ کے حضور یہ عرض کر رہا ہوا ہے کہ اے میرے اللہ تو نے ماضی میں میری تربیت کی اسی ماضی کی تیری تربیت کو تیرے حضور شفیع بنا کر پیش کر رہا ہوں کہ تو اس کی شفاعت کو قبول فرما کر مستقبل میں میری تربیت فرما"

(۴) ان فوائد میں سے چوتھا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ بندہ اپنے رب کے حضور گویا کہ یوں ذکر کر رہا ہوتا ہے "ربیتنی فی الماضی فاتمام المعروف خیر من ابتدائه فتمم هذه التربیة بفضلک ورحمتک" کہ اے میرے اللہ تو نے ماضی میں میری تربیت کی اب اس تربیت کو جاری رکھ اور اسے اپنے فضل و کرم اور اپنی رحمت سے اسے مکمل فرما اسلئے کہ نعمت اور بھلائی کو مکمل کرنا ہی بہتر ہوتا ہے بنسبت ابتدا کرنے کے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَاِلَیۡکَ الۡمَصِیۡرُ﴾ "اور تیری طرف ہی پھرنا ہے"

ان الفاظ مبارکہ کے ذکر کرنے سے دو فائدے حاصل ہوئے:

(۱) جب ایمان والوں نے "عالم مبدأ" کا اقرار کیا تو اسکے بعد ﴿وَاِلَیۡکَ الۡمَصِیۡرُ﴾ کہہ کر عالم معاد کا اقرار کیا اور ترتیب بھی یہی ضروری تھی کہ "لان الایمان بالمبدأ اصل الایمان بالمعاد" کیونکہ مبدأ پر ایمان لانا، معاد پر ایمان لانے کی اصل و بنیاد ہے۔

"فان من اقر ان الله عالم بالجزئیات وقادر علی الممکنات لابدوان یقر بالمعاد" بیشک وہ شخص جس نے اقرار کیا کہ بے شک اللہ تعالیٰ جزئیات کو جاننے والا ہے اور ممکنات پر قادر ہے اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ معاد کا بھی اقرار کرے۔

(۲) دوسرا فائدہ یہ حاصل ہو رہا ہے کہ جب بندے کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس نے رب تعالیٰ کے حضور لوٹ کر جانا ہے اور اس ذات کی طرف جانا ہے کہ قیامت میں اسکے حکم کے بغیر کسی کا حکم نہیں پایا جانا، دنیا میں مجازی طور پر جو حاکم ہوتے ہیں ان کی مجازی احکام پائے جاتے ہیں۔ قیامت میں وہ سب ختم ہو جانے ہیں صرف رب تعالیٰ "احکم الحاکمین" کا حکم چلنا ہے اور جب آدمی کو یہ پتہ چل جائے کہ رب تعالیٰ کے حضور "ولا یستطیع احدان یشفع الاباذن الله" اسکی اجازت کے بغیر کوئی شخص بھی شفاعت نہیں کر سکے گا۔

"فکان اخلاصہ فی الطاعات اتم ،احترازہ عن السیات اکمل " تو اسکا اخلاص طاعات میں مکمل ہوگا اور برائیوں سے بھی وہ کامل طور پر بچ سکے گا۔ (ماخوذ از کبیر)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"والمصیر اسم مصدر من صار یصیر وھو مبنی علی مفعل بکسر العین "

مصیر اسم مصدر ہے" صار،یصیر "کا اور اس کا وزن" مفعِل" ہے،یعنی اصل میں "مَصْیِرٌ" یاء کی حرکت نقل کرکے ماقبل کو دی "مَصِیْرٌ" ہوگیا۔ (البحر المحیط)

❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋

﴿لَایُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَا لَہَا مَا کَسَبَتۡ وَعَلَیۡہَا مَا اکۡتَسَبَتۡ رَبَّنَا لَاتُؤَاخِذۡنَا اِنۡ نَّسِیۡنَا اَوۡ اَخۡطَاۡنَا رَبَّنَا وَلَا تَحۡمِلۡ عَلَیۡنَا اِصۡرًا کَمَا حَمَلۡتَہٗ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِنَا رَبَّنَا وَلَاتُحَمِّلۡنَا مَالَاطَاقَۃَ لَنَا بِہٖ وَاعۡفُ عَنَّا وَاغۡفِرۡلَنَا وَارۡحَمۡنَا اَنۡتَ مَوۡلٰنَافَانۡصُرۡنَا عَلَی الۡقَوۡمِ الۡکٰفِرِیۡنَ٥﴾ (البقرۃ آیۃ نمبر ۲۸۶)

(1) اللہ کسی جان پر بوجھ نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت بھر، اس کا فائدہ ہے جو اچھا کیا اور اس کا نقصان ہے جو برائی کمائی اے رب ہمارے ہمیں نہ پکڑ اگر ہم بھولیں یا چوکیں، اے رب ہمارے اور ہم پر بھاری بوجھ نہ رکھ جیسا تو نے ہم سے اگلوں پر رکھا تھا، اے رب ہمارے اور ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کی ہمیں سہار نہ ہو اور ہمیں معاف فرمادے اور بخش دے اور ہم پر مہر کر تو ہمارا مولیٰ ہے تو کافروں پر ہمیں مدد دے۔

(2) نہیں تکلیف دیتا اللہ کسی نفس کو سوائے اس کی طاقت کے، اس (نفس کے نفع) کیلئے ہے جو کسب کیا اس نے (خیر) اور اس (نفس) پر (ضرر) ہے، جو کسب کیا اس نے (شر)۔ اے ہمارے رب! نہ پکڑ ہمیں اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے خطاء ہو جائے، اے ہمارے رب! اور نہ ڈال ہم پر بھاری بوجھ جیسا ڈالا تو نے وہ (بھاری بوجھ) ان لوگوں پر جو ہم سے پہلے تھے، اے ہمارے رب! اور نہ اٹھوا ہم سے وہ کہ نہیں طاقت ہمیں اس کی اور معاف کر ہمیں اور بخش دے ہمیں اور رحم کر ہم پر، تو ہمارا مولیٰ ہے، تو امداد فرما ہماری اوپر قوم کافرین کے۔

ماقبل سے تعلق اور شان نزول:

"واخرج احمد ومسلم والترمذی والنسائی وابن جریر وابن المنذر والحاکم والبیهقی فی الاسماء والصفات عن ابن عباس قال نزلت هذه الا﴿اِنۡ تُبۡدُوۡا مَافِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اَوۡتُخۡفُوۡہُ یُحَاسِبۡکُمۡ بِہِ اللّٰہُ﴾ دخل فی قلوبهم منه شئی لم یدخل من شئی فقالوا للنبی ﷺ فقال قولوا سمعنا واطعنا وسلمنا فالقی الله الایمان فی قلوبهم فانزل الله آمن الرسول الآیة﴿لَایُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَا لَہَا مَا کَسَبَتۡ وَعَلَیۡہَا

مَا اکْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَاتُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِیْنَا اَوْاَخْطَاْ نَا)قال قدفعلت﴿ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَا اِصْرًا کَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا﴾قال قدفعلت﴿ رَبَّنَا وَلَاتُحَمِّلْنَا مَالَاطَاقَةَ لَنَا بِهٖ)قال قدفعلت(وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْلَنَا وَارْحَمْنَا﴾ الأیۃ قال قد فعلت"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب آیۂ کریمہ ﴿اِنْ تُبْدُوْامَافِیْ اَنْفُسِکُمْ اَوْتُخْفُوْهُ یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾" اگر تم ظاہر کرو جو تمہارے نفسوں میں ہے یا اسے چھپاؤ تو حساب لے گا تم سے اس کا اللہ" نازل ہوئی، تو صحابہ کرام کے دلوں میں وہ چیز آ گئی جو پہلے ان کے دلوں میں کبھی نہیں آئی تھی، تو انہوں نے آ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں (اپنی اس پریشانی کے متعلق) عرض کیا، تو آپ نے فرمایا تم یہ کہو کہ ہم نے اپنے رب کا کلام دل وجان سے سنا اور اس کی اطاعت کی، اور ہم نے رب کے حکم کو تسلیم کرلیا ہے۔ (جب انہوں نے رب کے حضور عرض کیا) تو اللہ تعالی نے ان کے دلوں میں ایمان کو راسخ کر دیا، (ان کا اضطراب جاتا رہا) تو اللہ تعالی نے اس وقت ان دونوں آیتوں " آمن الرسول "اور ﴿لَایُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَاکَسَبَتْ وَعَلَیْهَا مَااکْتَسَبَتْ﴾کو نازل فرمایا، بندہ جب رب کے حضور عرض کرتا ہے ﴿(رَبَّنَا لَاتُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِیْنَا اَوْاَخْطَاْ نَا﴾ تو رب تعالی کی طرف سے اسے جواب ملتا ہے، " قدفعلت "تحقیق میں نے تمہاری دعاء کو قبول کرلیا، اور بندے جب رب تعالی کے حضور عرض کرتے ہیں ﴿ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَا اِصْرًا کَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا﴾ تو رب تعالی سے جواب ملتا ہے " قدفعلت" میں نے تمہاری دعاء کو قبول کرلیا ہے، جب بندے رب تعالی کے حضور عرض کرتے ہیں ﴿ رَبَّنَا وَلَاتُحَمِّلْنَا مَالَاطَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾ تو رب تعالی سے جواب ملتا ہے "قدفعلت" میں نے تمہاری دعاء کو قبول کرلیا، پھر جب بندہ رب تعالی کے حضور عرض کرتا ہے ﴿ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْلَنَا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰنَافَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکَافِرِیْنَo﴾ تو اللہ تعالی کی طرف سے جواب ملتا ہے "قدفعلت" میں نے تمہاری دعاء کو قبول کرلیا۔ (درمنثور)

صحابہ کرام ﷡ کو کیا پریشانی لاحق ہوئی جس کا ذکر انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کیا؟ اس پریشانی کا ذکر تفصیلا ﴿اِنْ تُبْدُوْامَافِیْ اَنْفُسِکُمْ اَوْتُخْفُوْهُ یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ میں ذکر کیا جاچکا ہے تاہم مختصرا اس کا بیان یہ ہے کہ مسلم، مسند احمد اور ابوداود کی روایت میں ہے کہ حضرت ابوہریرہ ﷛ فرماتے ہیں جب آیۃ "ان تبدوا" نازل ہوئی۔

"اشتد ذلک علی اصحاب رسول اللہ ﷺ فاتوا رسول اللہ ﷺ ثم جثوا علی الرکب فقالوا یا رسول اللہ کلفنا من الاعمال مانطیق الصلوۃ والصیام والجہاد والصدقۃ وقد انزل علیک ھذہ الأیۃ ولانطیقھا فقال رسول اللہ ﷺ اتریدون تقولوا کما قال اھل

الکتابین من قبلکم ﴿سمعنا واطعنا غفرانک ربنا والیک المصیر﴾
تو صحابہ کرام پر بہت شاق گذری، وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے پھر گھٹنوں کے بل ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ہمیں اعمال کی تکلیف دی گئی ہم ان کی طاقت رکھتے تھے، یعنی نماز، روزے، جہاد، صدقہ کی ہمیں طاقت تھی، اب آپ پر آیۃ نازل ہوئی (جس میں دلوں کی ظاہر اور باطن باتوں پر مؤاخذہ کا ذکر ہے) اس کی ہمیں طاقت نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم ارادہ رکھتے ہو کہ ایسے کہو جیسے تم سے پہلے اہل کتاب نے کہا ﴿سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا﴾ (ہم نے سنا اور نافرمانی کی) بلکہ تم یہ کہو ﴿سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ o﴾ (درمنثور)

تنبیہ : ابھی تک جو ذکر کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جب مؤمنین نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اپنی پریشانی کا اظہار فرمایا تو آپ نے انہیں کچھ ڈرایا، کچھ تسلی دی، ڈرایا اس طرح "**اتریدون ان تقولوا کما قال اھل الکتابین من قبلکم سمعنا وعصینا**" (کیا تم ارادہ رکھتے ہو کہ ایسے کہو جیسے تم سے پہلے اہل کتاب نے کہا" ہم نے سنا (اور دل میں کہا ہم نے نافرمانی کی) تو گویا کہ آپ نے دھمکی دی خبردار! اہل کتاب کی طرح تم کوئی ایسا قول نہ کرنا اور دل میں کوئی خیال نہ لانا جیسا انہوں نے دل میں کہا تھا ہم نے نافرمانی کی" ورنہ ان میں اور تم میں کیا فرق رہے گا اور ساتھ ساتھ تسلی بھی دی اور ارشاد فرمایا تم یوں کہو ﴿سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ o﴾ ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی تو مغفرت فرما اے ہمارے رب اور تیری طرف ہی پھرنا ہے، اس میں گویا کہ تسلی دی گئی کہ جب تم نے رب کی اطاعت کی اور اس کے احکام کو قبول کیا اور اسی سے بخشش طلب کی اور قیامت پر تم نے ایمان لایا تو یقیناً رب تعالیٰ تم پر فضل و کرم فرمائے گا۔

مؤمنین نے جب رسول اللہ ﷺ کے ارشاد سے تسلی پاتے ہوئے رب تعالیٰ کے حضور ﴿وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَکَ رَبَّنَا﴾ عرض کیا ہم نے سنا اور اطاعت کی تو مغفرت فرما اے ہمارے رب، تو مؤمنین کی جانب سے

"**ھذا طلب للمغفرة فیما یصدر عنھم من وجوہ التقصیر لا جرم خفف اللہ عنھم ذلک وقال** (لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا)

جب اپنی اس کوتاہی کا ذکر کیا جو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پریشانی کا اظہار کیا تھا۔ اور رب تعالیٰ سے مغفرت طلب کی تو رب تعالیٰ نے اس کے جواب میں یہ خبر دی۔

﴿ لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا لَهَا ﴾

''اللہ تعالیٰ نہیں تکلیف دیتا کسی نفس کو سوائے اس کی طاقت کے۔''

"والمعنی انکم اذا سمعتم واطعتم وماتعمد تم التقصیر فعند ذلک لووقع منکم نوع تقصیر علی سبیل السھو والغفلة فلاتکونوا خائفین منه، فان الله تعالی ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا﴾

مطلب یہ ہوا کہ رب تعالیٰ کی طرف سے گویا کہ یوں کہا گیا کہ جب تم نے سن لیا اور اطاعت کر لی، اور اپنی غلطی اور کوتاہی کا اعتراف کر لیا وہ کوتاہی بھی درحقیقت سہو اور غفلت کی وجہ سے تھی، جب تم اس سے بخشش طلب کر رہے ہو تو کوئی خوف نہ کرو، بیشک میں اللہ ہوں، اپنے بندوں پر مہربان ہوں، میری شان الوہیت کے خلاف ہے کہ میں کسی نفس کو اس کی طاقت سے زائد تکلیف دوں۔

"وبالجملة فھذا اجابة لھم فی دعائھم فی قولھم "غفرانک ربنا"

حاصل کلام یہ ہے کہ بندوں نے رب کے حضور جب یہ عرض کیا "غفرانک" تو بخشش فرما، تو رب تعالیٰ نے ان کی دعاء کو قبول کرتے ہوئے فرمایا﴿ لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا﴾ نہیں تکلیف دیتا اللہ کسی نفس کو سوائے اس کی وسعت کے۔

لیکن خیال رہے کہ اس کی تفسیر میں ایک دوسرا احتمال بھی مفسرین کرام نے بیان کیا ہے، اسی دوسرے احتمال کو بیان کرنے کیلئے راقم نے تنبیہ کے لفظ سے عنوان مقرر کیا ہے۔ وہ دوسرا احتمال یہ ہے،

ویحتمل ان یکون حکایة عن الرسول والمؤمنین علی نسق الکلام فی قوله(وَقَالُوۡا سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا غُفۡرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیۡکَ الۡمَصِیۡرُ ۝)وقالوا(لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا﴾ ویؤید ذلک ماردفه من قوله (ربنا لاتؤاخذنا) فکانه تعالی حکی عنھم طریقتھم فی التمسک بالایمان والعمل الصالح وحکی عنھم فی جملة ذلک انھم وصفوا ربھم بانه(لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا)

ایک اور احتمال یہ ہے کہ جس طرح پہلا کلام رسول اللہ ﷺ اور مؤمنین کا ہے، اور اس کی حکایت رب تعالیٰ نے بیان کی کہ انہوں نے کہا﴿سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا غُفۡرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیۡکَ الۡمَصِیۡرُ ۝﴾ ایسا انہوں نے ہی کہا﴿ لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا ﴾ اس کی تائید بعد والے کلمات کر رہے ہیں﴿ ربنا لاتؤاخذنا﴾ کہ یہ دعاء بھی مؤمنین نے کی۔

گویا کہ اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کے ایمان اور نیک اعمال کا ذکر فرمایا اور ساتھ ہی یہ ذکر بھی فرما دیا کہ ان کو ایمان اور نیک اعمال اور رب تعالیٰ سے مغفرت طلب کرنے کی وجہ سے یہ توفیق حاصل ہوگئی اور ان کے دلوں میں یہ

بات بھی آ گئی کہ رب تعالیٰ جب رحیم وکریم ہے تو وہ کسی نفس کو طاقت سے زائد کیسے تکلیف دے گا۔ یہ دل میں آتے ہی انہوں نے برملا طور پر کہا ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا ﴾ (ماخوذ از کبیر)

اگرچہ پہلا احتمال زیادہ مشہور ہے اور زیادہ مفسرین کرام نے وہی قول لیا ہے، لیکن دوسرے قول میں بھی رب تعالیٰ کی رحمت کا ذکر ہے کہ اسی کی توفیق سے مؤمنین کے دلوں میں یہ بات خود ہی آ گئی کہ رب تعالیٰ کسی نفس کو اس کی وسعت سے زائد تکلیف نہیں دیتا، حقیقت یہ ہے کہ قرآن پاک کا یہ عظیم مقام ہے کہ ایک ایک لفظ یا ایک ایک جملہ میں کئی کئی مطلب پائے جاتے ہیں۔

﴿ لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا ﴾ " کلفة" کا معنی ہے تکلیف دینا جیسے کہا جاتا ہے، "کلفته الشئی فتکلف" میں نے اسے تکلیف دی کسی چیز کی اس نے وہ تکلیف برداشت کرلی۔ تکلیف دینے کا مطلب احکام نافذ کرنا، حکم دینا یہ کام کرو، اسی وجہ سے، عاقل وبالغ شخص کو مکلف کہا جاتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے احکام پر عمل کرنے کا پابند ہے۔

"والوسع مایسع الانسان ولا یضیق علیه ولا یحرج فیه"

جو چیز انسان کی وسعت میں ہو اور اس پر تنگی نہ ہو اور اسے حرج نہ ہو اسے "الوسع" کہا جاتا ہے۔

دینی مدارس کے طلباء کرام یہ بھی مدنظر رکھیں، "قال لفراء هواسم کالوجد والجهد" فراء نحوی نے یہ کہا ہے کہ "الوسع" مصدری معنی کے بغیر بطور اسم بھی استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ "وجد" اور "جهد" اگرچہ مصدری معنی میں بھی استعمال ہوتے ہیں لیکن بطور اسم بھی ان کا استعمال عام ہے۔ "وقال بعضهم الوسع دون المجهود فی المشقة" اور بعض نے کہا جب کوئی شخص بہت زیادہ مشقت میں مبتلاء ہو تو پھر اس مشقت کو کم کر دیا جاتا ہے تو اس وقت "الوسع" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے کہ اس کی مشقت کو کم کر کے اسے وسعت دے دی گئی۔ آسان طور پر اس کا معنی یہ ہے، "وهو مایتسع له قدرة الانسان" کہ انسان کی ذات وطاقت میں جو چیز وسعت پیدا کرے اسے ہی "الوسع" کہا جائے گا۔ (از کبیر)

طاقت سے زائد نہ تکلیف دینے کا مطلب کیا؟

قدرت کی دو قسمیں ہیں جن پر احکام کے فرض وواجب ہونے کی دارومدار ہے۔ ایک قُدۡرَة مُمۡکِنَة اور

دوسری قُدرۃ مُیسّرہ۔ اگر ایک شخص کو قدرت ممکنہ ہی حاصل نہ ہو تو اس پر احکام فرض نہیں ہوتے، یہی وجہ ہے کہ نابالغ بچے کی قدرت ممکنہ ناقصہ ہوتی ہے اور مجنون یعنی پاگل، دیوانہ کو قدرت ممکنہ حاصل ہی نہیں ہوتی، اس لئے نابالغ اور مجنون احکام کے مکلف نہیں۔ جن احکام کا تعلق قدرۃ میسرہ سے ہے وہ قدرۃ میسرہ کے حاصل ہونے کے بغیر فرض نہیں ہوتے، جیسے زکوۃ کے فرض ہونے کیلئے مال کا نامی ہونا اور اس پر سال کا گذرنا اور نصاب مکمل ہونا قدرۃ میسرہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ چیزیں پائی جائیں تو زکوۃ فرض ہوگی ورنہ فرض نہیں ہوگی۔ اسی سے ایک اور مسئلہ حل ہو گیا۔

" وھذا یدل علی عدم وقوع التکلیف بالمحال و لا یدل علی امتناعہ "

کہ آیۃ کریمہ اس پر دلالت کر رہی کہ محال چیزوں کی تکلیف کا وقوع نہیں پایا جاتا۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہو رہا کہ محال چیزوں کی تکلیف ممتنع ہے۔

یہاں قدرۃ سے مراد قدرۃ موہومہ ہے (جس کے پائے جانے پر وہم پایا جائے کہ یہ قدرۃ پائی گئی ہے) وہ قدرۃ ہومہ یہ ہے کہ کام کرنے سے پہلے اسباب وآلات سلامتی میں ہوں اور اس چیز کی فرضیت پر کہ اس کا حکم دیا گیا ہے دلائل وبراہین پائے گئے ہوں۔ خواہ ان اوامر (حکموں) کا تعلق اعتقادات سے ہو، یا عوامل ظاھرہ سے ہو یا عوامل باطنہ سے ہو۔ **یہاں** قدرۃ سے مراد وہ قدرۃ نہیں جو فعل کے ساتھ پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ کام کرلیا جاتا ہے اور نہ ہو تو وہ کام نہیں ہوسکتا۔ اس قدرۃ کا لحاظ کیوں نہیں کیا گیا؟ اس لئے کہ رب تعالی نے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کو ایمان لانے کا حکم دیا، اور فرعون اور ابوجہل وغیرہ کو بھی ایمان لانے کا حکم دیا حالانکہ ان کے متعلق رب تعالی نے یہ خبر بھی دی ہے کہ

﴿ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَعَلٰی سَمْعِھِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ ﴾ اللہ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگادی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔ "واخبر عنھم بانھم لایؤمنون" اور رب تعالی نے ان کے متعلق یہ خبر بھی دے دی ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے، اور ان کے ایمان نہ لانے پر ان کو مستحق عذاب بھی ٹھہرادیا گیا ہے، اس کی وجہ ہی یہ ہے کہ ان کو قدرۃ موہومہ حاصل تھی جو فعل سے پہلے ہوتی ہے، اگرچہ فعل کے ساتھ قدرۃ حاصل نہ تھی اسی طرح رب تعالی نے فرمایا۔

﴿لِمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ۝ وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ۝﴾

جو تم میں سے چاہے درست راہ پر قائم رہے، اور نہیں چاہتے تم مگر وہی جو اللہ رب العالمین چاہتا ہے۔

یہاں بھی یہ کہا جائے گا کہ رب تعالی نے تمہیں اختیار دیا ہے۔ تمہارے اعضاء کو سلامت رکھتا ہے، تمہیں

عقل دی ہے سمجھنے کیلئے اس لئے تم اپنے اختیار سے درست راہ پر قائم ہو جاؤ، اگر تم درست راہ پر قائم نہ رہے تم نے یہی پسند کیا تو رب تعالی نے بھی تمہارے لئے عذاب کو پسند کر رکھا ہے۔ اگر یہ فرق نہیں کریں گے تو

" ومشية الله تعالى غير مقدور للبشر فكذا مشيته التى علقت بمشيته الله تعالى"

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالی کی مشیت انسان کی قدرت سے باہر ہے۔ اسی طرح انسان کی مشیت کا اللہ تعالی کی مشیت سے معلق ہونا بھی انسان کی قدرت میں نہیں۔

"وهذا سر من اسرار الله تعالى يجب الايمان به واسكوت عنه وترك البحث فيه فانه مزلة الا قدام"

یہ اللہ تعالی کے رازوں میں سے ایک راز ہے جس پر ایمان لانا واجب ہے۔ اور اس پر خاموش رہنا ضروری ہے، اور اس میں الٹی بحثوں سے پرہیز کیا جائے ورنہ انسان کے قدم لڑکھڑا جائیں گے، وہ لغزش کی وجہ سے پھسل کر سر کے بل گر کر اپنے ایمان کو تباہ کر کے بیٹھ جائے گا، عاقبت برباد کر دے گا۔ (ماخوذ از مظہری)

ہاں درست بحثیں کرنا، صحیح مطالب پیش کرنا اہل علم کا حق ہے، دین کے باغیوں کے شکوک وشبہات کو زائل کرنا علماء حق کا کام ہے، جس کو بفضلہ تعالی علماء کرام مستحسن طور پر ادا کر رہے ہیں۔ آجکل اگرچہ یہودونصاری وہنود اور قادیانیوں کا گٹھ جوڑ ہو چکا ہے، بظاہر یوں نظر آتا ہے۔

دین نبی دا وانگ یتیماں رووے تے کرلاوے
کتھے هووے عمر بهادر که روندیاں نوں گل لاوے

لیکن حقیقت میں کوئی مایوسی بھی نہیں اس لئے کہ، " لكل فرعون موسى، اى لكل مبطل محق " ہر فرعون کے مقابل کوئی موسی آتا ہی ہے، یعنی باطل راہ پر چلنے والوں کے مقابل حق راہ پر چلنے والے آتے رہے، اور انشاء اللہ ہمیں آتے رہیں گے۔

اس مقام پر اگرچہ علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے معتزلہ کا مذہب اور ان کے دلائل کا ذکر کیا ہے، لیکن راقم کا مشورہ طلباء کرام کو یہ ہے کہ اگر آپ کو کوئی معتزلی اس آیۃ کریمہ ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ سے غلط مطالب میں پھنسانے کی کوشش کرے تو تفسیر مظہری کی بحث میں سے "قدرة موهرمه موجوده قبل الفعل" اور "قدرة متصله بالفعل" کا فرق یاد رکھیں اور ساتھ ساتھ "عدم وقوع فعل محال" اور "غير ممتنع تكليف بالمحال" کا فرق یاد رکھیں تو انشاء اللہ آپ کو باطل راہ پر چلنے کو جواب دینا آسان ہوگا۔ (راقم)

طاقت سے زائد تکلیف نہ دینا: "وهذا من لطفه تعالى بخلقه ورأفته بهم واحسانه اليهم"

اللہ تعالیٰ کا کسی نفس کو طاقت نہ دینا یہ اس کی خاص مہربانی ہے مخلوق پر اور ان سے نرم اور بہتر سلوک ہے اور ان پر اللہ تعالیٰ کا احسان ہے۔

❁ عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ ان الله وضع عن امتی الخطاء والنسیان وما استکرھوا علیه" (رواه ابن ماجه وابن حبان)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے میری امت سے خطاء اور بھول اور جبری طور پر کرائے ہوئے کام کو اٹھالیا ہے۔ یعنی ان تینوں پر کوئی مؤاخذہ نہیں۔ اگر اس پر مؤاخذہ ہوتو وسعت سے زائد تکلیف دینا لازم آئے گا۔

❁ وعن ام الدرداء عن النبی ﷺ قال ان الله تجاوز لامتی عن ثلاث عن الخطاء والنسیان والاستکراه" (رواه ابن ابی حاتم)

حضرت ام الدرداء فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے میری امت سے تین چیزوں سے درگزر فرمایا ہے، خطاء اور بھول اور جبریہ کام کرانے سے۔ (ماخوذ از صابونی، ابن کثیر)

احکام شرعیہ میں غور کیا جائے تو تمام انسانوں کی وسعت کے مطابق ہیں، وسعت سے زائد تکلیف نہیں دی گئی۔

❁ عن عمران بن حصین قال کانت بی بواسیر فسئلت النبی ﷺ عن الصلوة فقال صل قائمافان لم تستطع فقاعدافان لم تستطع فعلی جنب زاد نسائی فان لم تستطع فمستلقیا ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا﴾ (رواه الجماعة الامسلم)

حضرت عمران بن حصین ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ میں بواسیر کی مرض میں مبتلاء ہوں، نماز کیسے ادا کروں؟ تو آپ نے فرمایا "نماز کھڑے ہو کر پڑھو، اگر تمہیں طاقت ہونے کی طاقت نہ ہوتو بیٹھ کر نماز ادا کرلو، اگر تمہیں بیٹھنے کی طاقت نہ ہوتو نماز کروٹ کے بل ادا کرو، نسائی کی روایت میں یہ بھی ہے کہ "اگر تمہیں اسکی طاقت نہ ہوتو سیدھا سہارے پر لیٹ کر نماز ادا کرلو۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے اس پر دلیل قائم فرماتے ہوئے یہی آیت پڑھی ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾

❁ اسی طرح روزے کو دیکھیں، رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾ اگر تم مریض ہو یا سفر میں ہوتو اتنے روزے اور دنوں میں۔ اس سے بھی یہ واضح ہوا کہ مریض جو روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتا ہو۔ یا روزہ رکھے تو مرض کے بڑھنے کا خطرہ ہو یا مرض کے دیر سے ٹھیک ہونے کا خطرہ ہو، تو اس کی طاقت کے مطابق یہ حکم دیا گیا کہ وہ روزہ رمضان شریف میں نہ رکھے بعد میں مرض کے ٹھیک ہونے پر اتنی مقدار جو

روزے چھوڑے تھے قضاء کرلے۔اسی طرح مسافر کو اجازت دی گئی کہ وہ روزہ وقتی طور پر نہ رکھے بعد میں قضاء کرلے یہ سب احکام دیکھ کر واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی نفس کو وسعت سے زائد تکلیف نہیں دیتا۔

بلکہ یہ بھی خیال رہے کہ سفر اگر مشقت آمیز ہو تو روزہ رکھنے میں بہت زیادہ دشواری درپیش آئے تو روزہ رکھنا نیکی کا کام نہیں ہوگا۔رسول اللہ ﷺ نے دوران سفر ایک شخص کو دیکھا کہ بے ہوش پڑا ہے،دوسرے حضرت اس پر کپڑوں سے ہوا چلا رہے رہیں،پوچھا اسے کیا ہوا تو صحابہ کرام نے فرمایا کہ اس نے روزہ رکھا ہوا تھا سفر میں گرمی کی شدت کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا ہے،تو اس وقت آپ نے فرمایا،" لیس من البرا لصیام فی السفر " ایسی حالت میں سفر میں روزہ رکھنا نیکی کا کام نہیں۔مطلب واضح ہے کہ جب رب تعالیٰ طاقت سے زائد کسی نفس کو تکلیف نہیں دیتا تو اپنے آپ کو مشقت میں کیوں ڈالتے ہو۔

❁ زکوۃ کو دیکھئے تو مال پر سال گذر جائے،اور مال بھی بڑھنے والا ہو یعنی تجارتی مال ہو یا سونا،چاندی اور پیسے ہوں تو زکوۃ لازم آئے گی پھر نصاب بھی مکمل ہو۔زکوۃ کی فرضیت کو اتنی چیزوں پر موقوف کرنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی نفس کو وسعت سے زائد تکلیف نہیں دیتا۔

❁ حج کو دیکھئے تو رب تعالیٰ کا ارشاد نظر آئے گا،﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾ اللہ تعالیٰ کیلئے لوگوں پر حج ہے جو شخص اس کی طرف جانے کی طاقت رکھتا ہو۔یعنی آنے جانے کی طاقت ہو،کرایہ ہو۔پھر واپسی تک اہل وعیال کا خرچ ہو۔کوئی رکاوٹ نہ ہو پھر حج فرض ہوتا ہے۔وجہ وہی ہے کہ اللہ تعالیٰ طاقت سے زائد تکلیف نہیں دیتا۔

﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾

''اس (نفس کے نفع) کیلئے ہے جو اس نے کسب کیا (خیر) اور اس (نفس) پر (ضرر ہے) جو کسب کیا اس نے (شر)۔''

راقم چونکہ لفظی ترجمہ کی کوشش کر رہا ہے،لیکن مطلب سمجھانے کیلئے کچھ الفاظ کو بریکٹ میں لانے کی مجبوری بن گئی لیکن اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ کا ترجمہ با محاورہ ہے اس لئے مختصر اور خوبصورت کہ راقم جیسا نقال بھی اس خوبصورتی اور جاذبیت کو اپنے لفظوں میں سمونے قاصر رہا،آپ کا ترجمہ یہ ہے''اس کا فائدہ ہے جو اچھا کیا اور اس کا نقصان ہے جو برائی کمائی'' ان الفاظ مبارکہ میں ترغیب بھی ہے اور ترہیب بھی۔یعنی نیک کاموں کی رغبت دلائی گئی اور برے کاموں سے ڈرایا گیا،کیونکہ جب یہ بیان کیا گیا جب یہ بیان کہ اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی طاقت سے زائد تکلیف نہیں

دیتا، تو اسی سے واضح ہو گیا۔

"ان تکلیف کل نفس مع مقارنته لنعمة التخفیف والتیسیر تتضمن مراعاته منفعة زائدة وانهاتعود الیها لاالی غیر ها ویستتبع الا خلال به مضرة تحق بها لا بغیرها"

کہ اللہ تعالی اپنے فضل وکرم سے بندے کو اپنے احکام کی تکلیف دینے میں تخفیف اور آسانی کو بھی ساتھ رکھتا ہے تاکہ اسے طاقت سے زائد تکلیف نہ دی جائے، پھر اس کے اوپر زائد منفعت یہ رکھی کہ جب بندہ نیک عمل کرے گا تو اس کا ثواب اسی کو دیا جائے گا، اس کا ثواب مکمل طور پر کسی اور کو دے دیا جائے اسے محروم رکھا جائے یا اس کا ثواب کم کر کے کسی اور کو دے دیا جائے ایسا نہیں ہوگا۔

یہ اللہ تعالی کا مزید فضل ہوگا، ہاں اگر کسی نے اللہ تعالی کے احکام کی عدولی کی اور برے کام کیے تو اللہ تعالی کی پکڑ بھی سخت ہے، ان برے کاموں کا عذاب اور وبال بھی اسے ہی حاصل ہونا ہے، ایسا نہیں کہ اس کے گناہوں کا عذاب کسی اور کو دے دیا جائے، کیا خوبصورت انداز میں نیک کاموں کی رغبت دلائی گئی اور برے کاموں سے ڈرا کیا، اسی کا نام "ترغیب وترھیب" ہے۔

مختصر الفاظ میں دعوت عظیمہ:

﴿لهاما کسبت﴾ (اس کا فائدہ ہے جو اچھا کیا) بظاہر یہ کتنے مختصر الفاظ ہیں لیکن ان میں نیکی کے کاموں کی کیسے خوب اندازی میں عظیم دعوت دی گئی، اور اسی طرح مختصر الفاظ "وعلیها ما اکتسبت" (اور اس کا نقصان ہے جو برائی کمائی) سے، کس خوبصورت انداز میں برے کاموں سے روکا، آیئے تفاسیر کے آئینہ میں دیکھیے۔

"فان اختصاص منفعه الفعل بفاعله من اقوی الد واعی الی تحصیله واقتصار مضرته علیه من اشد الزواجر عن مباشرته ای لها ثواب ما کسبت من الخیر الذیکلف فعله لا لغیرها استقلا او اشتر کا ضرورة شمول کلمة ما لکل جزء من اجزاء مکسوبها"

کیونکہ جب یہ پتہ چل جائے کہ اس فعل کا نفع اس پر عمل کرنے والے کو ہی حاصل ہونا ہے، تو یقیناً ہر شخص بڑھ چڑھ کر اس پر عمل کرنے کی کوشش کرے گا، اس انداز پر نیکی کے کاموں کی طرف دعوت دینا دعوت عظیمہ ہے۔

اسی طرح جب یہ بیان کر دیا جائے کہ اگر تم نے شر (برے) کام کیے تو اس کا عذاب تمہیں حاصل ہونا ہے، وہ عذاب کسی اور کو نہیں دیا جائے گا تو اس میں زجروبیخ (ڈانٹ، ڈپٹ، دھمکی) بھی بہت سخت دی گئی ہے۔ مطلب واضح ہوا

کہ نیکی کے ہر کام کا ثواب اس پر عمل کرنے والے کو حاصل ہوتا ہے، اور برائی پر عمل کرنے والے کو اس کے ہر کام پر عذاب دیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ عدل کی بات ہے اگر وہ اپنے فضل وکرم سے بغیر عذاب دینے کے معاف فرمادے تو اس کی مرضی کی بات ہے اس کی رحمت کی بھی کوئی حد نہیں، لیکن اس کے قہر سے بے خوف بھی کوئی نہ رہے، لفظ ''مـــا'' سے پتہ چل گیا کہ ہر نیکی کے کام ثواب یا ہر برائی کے کام کا عذاب اس پر عمل کرنے والے کو ہی حاصل ہوتا ہے۔ (تفسیر ابی السعود)

واہ عظمت قرآن تجھ پر جان قربان:

قرآن پاک کا ایک ایک حرف کیسے عظیم معانی پر دلالت کررہا ہے۔ ابھی تفسیر ابی السعود کے حوالہ سے واضح کیا جا چکا ہے کہ لفظ ''ما'' سے یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ ہر عمل خیر وشر کی جزاء اس عمل کے مطابق دی جاتی ہے، یعنی یہ عموم لفظ ''ما'' سے سمجھ آیا اب دیکھئے ''لام'' اور ''علی'' سے کیا مسئلہ ثابت کیا گیا ہے۔

''وجاء ت العبارة فی الحسنات ب(لها)من حیث هی مما یفرح المرء بکسبه ویسر بها فتضاف الی ملکه وجاء ت فی السیآت ب(علیها)من حیث هی الثقال واوزار ومتحملات صعبة وهذا کما تقول''لی مال وعلی دین''

جب نیکیوں کا ذکر فرمایا تو ان کی جزا کیلئے لفظ ''لام'' لایا، ارشاد فرمایا ﴿لَهَـا مَا كَسَبَتْ﴾ اس لئے کہ ''لام'' انتفاع اور ملکیت کیلئے آتا ہے، جب آدمی کو یہ پتہ چل جائے کہ فلاں چیز کی مجھے ملکیت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ اس سے خوش ہوتا ہے، یقیناً اسے نیک کام کرنے میں فرحت وسرور حاصل ہوتا ہے۔

اور برے کاموں کی جزاء (بدلہ) کیلئے لفظ ''عـــلـــی'' ذکر کیا جو ضرر کیلئے آتا ہے، اس کا استعمال بوجھ اٹھانے، کسی چیز کے لزوم کیلئے ہوتا ہے، جیسا کہا جائے ''لی مال وعلی دین'' میری ملکیت میں میرے نفع کیلئے مال ہے، مجھ پر قرض لازم ہے، یعنی جب تک میں قرض ادا نہیں کروں گا اس کا بوجھ مجھ پر رہے گا، اگر میں قرض ادا کرنے کے بغیر ہی مرگیا تو اس کا وبال مجھ پر رہے گا، اس کا نقصان مجھے ہی ہوگا۔ (از قرطبی)

آیئے قرطبی کی وضاحت کے بعد ایک مرتبہ پھر اعلی حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ دیکھیں (گزشتہ ورق میں) تو خوبصورت اور تحقیق وتدقیق پر مبنی اور تفاسیر کے مطابق نظر آئے گا۔ ﴿وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا﴾ کی تفسیر میں علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''والخواطر ونحوها لیست من کسب الانسان'' انسان کے ذہن وضمیر میں آنے والے خیالات اور وسوسات پر گرفت (پکڑ) نہیں ہوگی، اسلئے کہ جن برے اعمال پر گرفت ہونے ہے، ان کو رب تعالی نے ''اکتسبـــت'' سے بیان فرمایا، چونکہ دل میں آنے والے خیالات وسوسات کسب نہیں لھذا ان کی

گرفت بھی نہیں ہوگی۔ (از قرطبی)

کسب واکتساب میں فرق:

﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ﴾ کے ضمن میں کسب ذکر ہے، اور ''وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ'' کے ضمن میں ''اکتساب'' ذکر ہے۔ کبھی کبھی کسب اور اکتساب ایک معنی میں بھی استعمال ہوتے ہیں، جیسا کہ ذوالرمۃ کے شعر میں ایک ہی معنی میں استعمال ہیں۔ ''الفی اباہ بذاک الکسب یکتسب'' اس کا باپ یہی کسب کرتے ہوئے پایا گیا۔

اور قرآن پاک میں بھی ایک معنی میں استعمال ہیں، جیسا کہ ارشاد ہوا، ﴿كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ﴾ اور ارشاد گرامی، ﴿وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا﴾ اور ارشاد گرامی، ﴿بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْئَتُهٗ﴾ اور ارشاد گرامی ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا﴾ رب تعالیٰ کے ان تمام ارشادات میں کسب اور اکتساب کا استعمال ایک ہی معنی میں کیا گیا ہے کوئی فرق نہیں کیا گیا۔ اور کبھی ان میں فرق بھی کیا جاتا ہے، وہ فرق **دو وجہ** سے کیا جاتا ہے۔

(۱) ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ ''اکتساب'' خاص ہے، اور کسب عام ہے۔ یعنی ہر اکتساب پر کسب ضرور سچا آئے گا اور ہر کسب پر اکتساب کا سچا آنا ضروری نہیں۔ کسب عام ہے کیونکہ ''لان الکسب ینقسم الی کسبہ لنفسہ ولغیرہ'' جو کام انسان اپنے لئے کرے وہ بھی کسب ہے اور جو کام غیر کیلئے کرے وہ بھی کسب ہے۔ اکتساب خاص ہے کیونکہ ''والاکتساب لایکون الامایکتسب الانسان لنفسہ خاصۃ'' جو کام اپنے لئے کیا جائے صرف اسی کو اکتساب کہا جاتا ہے، غیر کیلئے جو کام کیا جائے وہ اکتساب نہیں، اسی وجہ سے یہ کہا جاسکتا ہے ''فلان کاسب لاھلہ'' فلاں شخص اپنی اہل کیلئے مکتسب ہے، کیونکہ صرف اپنی ذات کیلئے کام کرنے والا مکتسب ہے، دوسروں کیلئے کام کرنے والا مکتسب نہیں۔

(۲) دوسری وجہ فرق یہ ہے کہ صاحب کشاف نے کہا ہے:

''انما خص الخیر بالکسب والشر بالاکتساب لان الاکتساب اعتمال فلما کان الشر مما تشتھیہ النفس وھی منجذبۃ الیہ وأمارۃ بہ کانت فی تحصیلہ اعمل واجد فجعلت لھذاالمعنی مکتسبۃ فیہ ولمالم یکن کذلک فی باب الخیر وصفت بما لادلالۃ فیہ علی الاعتمال'' (واللہ اعلم)

خیر کیلئے کسب ذکر کیا گیا ہے اور شر کیلئے اکتساب، کیونکہ اکتساب کا مطلب یہ ہے کہ اپنے لئے کوئی کام کوشش سے کیا

جائے، جب شر کام کرنے کی نفس میں خواہش پائی جاتی ہے، نفس اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے تو یہ علامت ہے کہ اس کام کو حاصل کرنے کیلئے نفس زیادہ سے زیادہ عمل کر رہا ہے اور اپنی پوری کوشش صرف کر رہا ہے لیکن خیر میں یہ کیفیت نہیں، اسی لئے خیر کا کام عمل تو ہے، لیکن کوشش سے کیا ہوا اعتمال نہیں، لھذا اس کیلئے کسب کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ (ماخوذ از کبیر، کشاف)

وقوله تعالی ''لها ماکسبت وعلیها مااکتسبت'' فقد قیل خص الکسب ههنا بالصالح والاکتساب بالسیء وقیل عنی بالکسب مایفعله الانسان من فعل خیر وجلب نفع الی غیره من حیث یجوز وبالاکتساب مایحصله لنفسه من نفع یجوز تناوله'' (مفردات راغب)

اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾ میں کسب کا تعلق نیک کاموں سے ہے اور اکتساب کا تعلق برے کاموں سے ہے۔ کبھی کبھی یہ فرق بھی کیا جاتا ہے کہ نیک کام کرنا کہ اپنے لئے بھی فائدہ اور دوسروں کو بھی جائز طریقے سے نفع پہنچا دیا جائے یہ کسب ہے، لیکن اپنے نفع کیلئے جو کام کیا جائے وہ اکتساب ہے۔ اپنے نفع کیلئے کیا جانے والا کام کبھی بندے کی نظر میں بھی مفید ہوتا ہے اور شریعت میں بھی جائز ہوتا ہے، اور کبھی بندہ سمجھتا ہے کہ یہ کام میرے لئے نفع مند ہے لیکن وہ شریعت میں ناجائز ہوتا ہے، یہاں آیۃ کریمہ میں اکتساب کا یہی معنی لیا گیا ہے، اسی لئے بیان کیا گیا ہے کہ اکتساب کا تعلق شر سے ہے۔

معتزلہ کا استدلال: معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے، اس لئے کہ نیک اور بد کام کی نسبت اس آیۃ کریمہ میں انسانوں کے نفس کی طرف ہے، اگر اللہ تعالی کو خالق مانا جائے تو اس نسبت کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، دوسری خرابی کی وجہ یہ ہوگی کہ بندے کا بے اختیار ہونا لازم آئے گا کہ وہ اپنے اعمال میں بھی ایسے ہی بے اختیار ہو جائے جیسے اپنے رنگ اور شکل اور طوالت وغیرہ میں اسے کوئی اختیار نہیں۔

اھل سنت وجماعت کا قول:

اہل سنت و جماعت نے کہا کہ معتزلہ کا یہ قول ہی غلط ہے۔ ان کی غلطی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ خلق اور کسب میں فرق نہیں کر سکے، اس آیۃ کریمہ میں نیک یا برے اعمال کی نسبت میں ''کسب واکتساب'' کا ذکر ہے، اور کسب میں یقیناً انسان خود مختار ہوتا ہے وہ پتھر کی طرح مجبور محض بھی نہیں اور وہ خالق بھی نہیں، تمام اعمال کا خالق اللہ تعالی ہے، اللہ تعالی نے بندے کو کسب کرنے کا اختیار دیا ہے اور اسے باطل راہ اور حق راہ پر بھی مطلع کر دیا گیا ہے، اس لئے بندہ خیر و شر کو جانتے ہوئے کسی ایک پر عمل کر رہا ہے اور عمل بھی اپنے اختیار سے کر رہا جو اسے رب تعالی نے عطا کر رکھا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

ایک عمل دوسرے عمل کو ضائع نہیں کرتا:

اہل سنت و جماعت کا مذہب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص نیکی کا کام کرے تو اس کا ثواب پائے گا، نیکی کے کام کے بعد اگر برائی کا کام کرے تو وہ عذاب کا مستحق ٹھہرے گا، برا کام نیک کام کو ضائع نہیں کرتا۔ اہل سنت و جماعت کی دلیل یہ ہے کہ اس آیۃ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے دونوں امر جمع کئے ہیں، اور بیان فرمادیا ہے کہ اچھے کاموں میں اسے ثواب دیا جائے گا اور برے کاموں میں وہ مستحق عذاب ہوگا۔

"وهذا صريح فی ان هذين الاستحقاق يجتمعان و انه لايلزم من طريان احدهما زوال الآخر"

اسی سے واضح طور پر معلوم ہوگیا کہ انسان جو عمل بھی کرے اس کے بدلے کا وہ مستحق ہوتا ہے، لہذا اچھے اور برے اعمال جب انسان میں جمع ہو سکتے ہیں تو اس کا مستحق ثواب ہونا اور مستحق عذاب ہونا بھی جمع ہوسکتا ہے، کسی ایک کام کو دوسرا کام باطل نہیں کر سکے گا۔

اس بحث سے جبائی معتزلی کا قول باطل ہوگیا کہ وہ اس کا قائل ہے کہ نیک اعمال کا ثواب تو حاصل ہوتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس کے بعد برے اعمال نہ پائے جائیں، کیونکہ برے اعمال سے نیک اعمال باطل ہوجاتے ہیں جبائی کا یہ قول مردود ہے، اس کے رد پر واضح طور پر رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی موجود ہے ﴿اِنَّ اللّٰـهَ لَايُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا﴾ بیشک اللہ تعالیٰ کسی کے اچھے عمل کا اجر ضائع نہیں فرماتا۔ اور جبائی کا قول رب تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی مردود ہوجاتا ہے ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ○ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ○﴾ کیونکہ جب ذرہ بھر نیکی کا اجر بھی حاصل ہوتا ہے اور ذرہ بھر برائی کا بدلے کا استحقاق بھی سامنے آتا ہے تو یہ کہنا خود بخود باطل ہے کہ برے اعمال سے نیک اعمال برباد ہوجاتے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

"وقيل فی معنى الآية ان الله تعالى لايؤ اخذ احدا بذنب غيره"

بعض حضرات نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾ میں جب نفس کی تخصیص ہے، تو اسی سے پتہ چل گیا کہ کسی انسان کو دوسرے انسان کے گناہوں کی وجہ سے عذاب نہیں دیا جائے گا۔ (خازن)

کثیر متکلمین نے اس آیۃ کریمہ سے یہ مسئلہ ثابت کیا ہے "**ان الله تعالى لايعذب الاطفال بذنوب آبائهم**" بیشک اللہ تعالیٰ بچوں کو ان کے آباء کے گناہوں کی وجہ سے مؤاخذہ نہیں فرمائے گا، کیونکہ کسی نفس کو دوسرے نفس کی وجہ سے گرفت کرنے کا ذکر نہیں فرمایا گیا بلکہ ہر نفس کے اعمال کے مطابق اس کے ثواب و عذاب کا ذکر کیا گیا

ہے کہ ہر نفس نیک اعمال پر ثواب اور برے اعمال پر عذاب دیا جائے گا۔ (ماخوذ از کبیر)

❁ وقال ابن عباس فکانت الوسوسة مما لا طاقة للمسلمین بھا وصار الامر الی ان قضی اللہ ان للنفس ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت من القول والعمل"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جب مسلمانوں کو وسوسہ سے بچنے کی طاقت نہ تھی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے وسوسہ پر مؤاخذہ نہ کرنے کا فیصلہ فرمادیا اور یہ آیۃ کریمہ نازل کر کے واضح کردیا کہ ہر نفس کو اس کے قول اور عمل پر ثواب یا عذاب دیا جائے گا، کسی کو وسوسہ پر مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ (درمنثور)

وسوسہ کے متعلق شاندار قول:

حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، انسان کے دل میں دو طرح کے خیالات آتے ہیں ایک بطور وسوسہ کے ان سے دل کا خالی کرنا انسان کی مقدرت میں نہیں لیکن وہ ان کو برا جانتا ہے اور عمل میں لانے کا ارادہ نہیں کرتا ان کو حدیث نفس اور وسوسہ کہتے ہیں اس پر مؤاخذہ نہیں بخاری ومسلم کی حدیث:

"عن ابی ھریرة ان رسول اللہ ﷺ قال ان اللہ تجاوزلی عن امتی ماحدثت بہ انفسھا مالم تتکلم اوتعمل بہ" اخرجہ ابو سفیان وعبد بن حمید والبخاری ومسلم وابوداود والترمذی والنسائی وابن ماجة وابن المنذر" (در منثور)

حضرت ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت کے دلوں میں جو وسوسے گذرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سے تجاوز فرماتا ہے جب تک کہ وہ انہیں عمل میں نہ لائیں یا ان کے ساتھ کلام نہ کریں یہ وسوسہ اس آیۃ ﴿وَاِنْ تُبْدُوْامَافِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ﴾ "اگر تم ظاہر کرو جو تمہارے نفسوں میں ہے یا اسے چھپاؤ تو اس کا تم سے اللہ حساب لے گا" میں داخل نہیں۔

دوسرے وہ خیالات جن کو انسان اپنے دل میں جگہ دیتا ہے اور ان کو عمل میں لانے کا قصد وارادہ کرتا ہے اور ان پر مؤاخذہ ہوگا اور انہیں کا بیان اس (مذکورہ بالا) آیۃ میں ہے۔ (خزائن العرفان)

مسئلہ: کفر کا عزم کرنا کفر ہے اور گناہ کا عزم کر کے اگر آدمی اس پر ثابت رہے اور اس کا قصد وارادہ رکھے لیکن اس گناہ کو عمل میں لانے کے اسباب اس کو بہم نہ پہنچیں اور مجبوراً وہ اس کو کر نہ سکے تو جمہور کے نزدیک اس سے مؤاخذہ کیا جائے گا شیخ ابو منصور ماتریدی اور شمس الائمہ حلوائی اسی طرف گئے ہیں، ان کی دلیل آیۃ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ﴾ اور حدیث عائشہ ہے، جس کا مضمون یہ ہے کہ بندہ جس گناہ کا قصد کرتا ہے اگر وہ عمل

میں نہ آئے جب بھی اس پر عقاب کیا جاتا ہے۔

مسئلہ: اگر بندے نے کسی گناہ کا ارادہ کیا، (یعنی مصمم ارادہ کیا) پھر اس پر نادم ہوا اور استغفار کیا تو اللہ اس کو معاف فرمادے گا۔ (خزائن العرفان)

اس آیۃ کریمہ ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾ سے واضح ہو گیا کہ احکام کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہے غیر سے نہیں، کسی ایک کا دوسرے پر تصرف جائز نہیں، اور کسی کے گناہوں میں مبتلاء ہونے سے دوسرے کا مؤاخذہ نہیں، اس پر ایک حدیث پاک شاہد ہے:

"قال النبی ﷺ لابی رمثة حین رآه مع ابنه فقال هذاابنک قال نعم قال انک لیجنی علیه ویجنبی علیک"

نبی کریم ﷺ نے ابی رمثہ کو دیکھا، ان کے ساتھ ان کا بیٹا بھی تھا، تو آپ نے فرمایا کیا یہ تمہارا بیٹا ہے تو انہوں نے کہا ہاں، آپ نے فرمایا بیشک تمہاری جنایۃ اس پر نہیں اور اس کی جنایۃ تم پر نہیں۔

"وقال ﷺ لایؤاخذ احد بجریرة ابیه ولا بجریرة اخیه"

کسی شخص کا مؤاخذہ اس کے باپ اور اس کے بھائی کے گناہوں میں مبتلاء ہونے کی وجہ سے نہیں ہوگا۔

طلباء کرام توجہ فرمائیں کہ "جریرة" کا معنی کھینچا ہوا، یعنی گناہوں کی طرف کھینچا ہوا۔ جس کا آسان ترجمہ راقم نے کیا ہے "گناہوں میں مبتلاء" (از احکام القرآن للجصاص)

عزم پرمؤاخذہ: "واخرج ابن جریر من طریق الضحاک عن ابن عباس فی الآیة قال ان الله یقول یوم القیامة ان کتابی لم یکتبوا من اعمالکم الاماظهر منها فاما اسررتم فی انفسکم فانا احاسبکم به الیوم فاغفر لمن شئت واعذب من شئت"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس آیۃ کریمہ کے متعلق ایک روایت بیان کی کہ بیشک اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا کہ میرے لکھنے والوں (کراما کاتبین) نے تو تمہارے ظاہر اعمال کو ہی لکھا ہے، لیکن جو تمہارے نفسوں میں پوشیدہ عزم پایا گیا تھا، اس کا آج میں خود تم سے حساب لیتا ہوں، جسے میں نے بخشنا چاہا اس کی میں مغفرت کردوں گا، جسے میں نے عذاب دینا چاہا اسے عذاب دوں گا۔

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَّسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا﴾

"اے ہمارے رب! نہ پکڑ ہمیں اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے خطاء ہو جائے۔"

اس سورۃ پاک میں بہت مسائل اور علوم عظیمہ کو ذکر فرمایا اور اسے مومنین کی دعاء کے ذکر سے ختم فرمایا

کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "الدعاء مخ العبادة" دعاء عبادت کا مغز ہے، تو گویا کہ احکام پر عمل کرنے کے بعد دعاء کا ذکر کیا گیا، جبکہ دعاء عبادت کا نچوڑ اور مغز ہے اور عبادات کا اختتام دعاء سے کرنا ہی افضل ہے۔

"وان الداعی یشاهد نفسه في مقام الفقر والحاجة والذلة والمسكنة ويشاهد جلال الله تعالى وكرمه وعزته وعظمته بنعت الاستغناء والتعالي وهو المقصود من جميع العبادات والطاعات"

بیشک دعاء کرنے والا اپنے آپ کو فقیر محتاج سمجھتا ہے، اور رب تعالی کے حضور گویا کہ یوں عرض کر رہا ہوتا ہے اے اللہ تعالی میں تیرے سامنے اپنے آپ کو ذلیل و مسکین سمجھتا ہوں، اور اے اللہ میں تیرے کرم، تیری عزت وعظمت اور تیرے جاہ وجلال کا مشاہدہ کر رہا ہوں، اے رب کائنات تو مستغنی (بے پرواہ) ہے، اور تیری شان بلند وبالا ہے، بس محتاج میں ہی ہوں تیرے کرم کا منتظر ہوں۔

تمام عبادات وطاعات میں مقصود ہی یہ ہے کہ انسان اپنے عجز کا اظہار کرے، یہی وجہ ہے کہ اس سورۃ پاک کے احکام کو دعاء سے ختم کیا گیا۔ یہاں چار دعاؤں کا ذکر کیا گیا، تین دعاؤں کو "رَبَّنَا" سے شروع کیا گیا، البتہ ایک دعاء ﴿وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا﴾ کو "رَبَّنَا" سے نہیں شروع کیا گیا، اس کی وجہ انشاء اللہ آگے آئے گی۔

"رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا أَيْ لَا تُعَاقِبْنَا" اے ہمارے رب ہماری بھول اور خطاؤں پر سزا دینے کیلئے تعاقب نہ فرما، یعنی گرفت نہ فرمانے کی دعاء کا مطلب تعاقب نہ فرمانا ہے۔ (از کبیر)

سوال: مؤاخذہ باب مفاعلہ ہے جو شرکت جانبین کو چاہتا ہے، لیکن یہاں دعاء میں بندے کی طرف سے پکڑ کیسے صحیح ہے؟

جواب: کبھی باب مفاعلہ میں شرکت جانبین کا معنی نہیں لیا جاتا، اس مقام میں بھی صرف رب تعالی کے نہ پکڑنے کی دعاء، بندے کے پکڑنے کا ذکر نہیں۔ دوسرا جواب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہاں شرکت جانبین پائی گئی ہو۔

"وهو ان الله تعالى يا خذالمذ نب لعقوبة فالمذنب كأنه يأخذ ربه بالمطالبة بالعفو والكرم"

اللہ تعالی کی پکڑ یہ ہے کہ وہ بندے کو گناہوں پر سزا دیتا ہے، اور گنہگار کی پکڑ یہ ہے کہ وہ رب تعالی کے معاف کرنے اور کرم کرنے کا مطالبہ کر کے اپنے رب کی رحمت کا دامن پکڑے رہتا ہے۔

یہ جواب اگرچہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے دیا ہے جو یقیناً مقتدر ہستی ہے، **لیکن** راقم کے ناقص ذہن نے اسے قبول نہیں کیا، اسلئے کہ دعاء میں نہی پائی گئی، دعاء میں ثبوت نہیں، اگر دونوں جانبوں سے پکڑ نہ کرنے کا ذکر ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ اے اللہ تعالی تو میری بھول اور خطاؤں پر پکڑ نہ فرما، اور میں تجھ سے عفو وکرم کا مطالبہ نہ کر کے تیری رحمت کا دامن نہیں پکڑوں

گا۔ناقص ذہن نے اس لئے اسے نہیں قبول کیا کہ بندے کا رب کے حضور یہ ذکر کرنا تو ٹھیک ہے کہ اے میرے رب تو میری پکڑ نہ فرما لیکن یہ کہنا ٹھیک نہیں کہ میں تجھے نہیں پکڑوں گا بلکہ عفو وکرم کا مطالبہ نہیں کروں گا۔بندہ ہمیشہ رب تعالی کے دامن رحمت کو پکڑے رہے، کبھی نہ چھوڑے، ہر وقت عفو وکرم کا سوال کرتا ہی رہے، علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے بھی اس پر یہ الفاظ تحریر فرمائے "ولا یخفی فساد هذا الابتکلف" بغیر تکلف کے اس قول کا فساد مخفی نہیں۔ [واللہ اعلم بالصواب]

فائدہ جلیلہ: یہاں جن دعاؤں کا ذکر ہے، ان میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ مؤمنین کی دعاؤں کی حکایت اور خبر ہو کہ مؤمنین اس طرح دعاء کرتے ہیں۔لیکن دوسرا احتمال جو علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے وہ خوب ترین ہے۔

سبحان اللہ! اہل علم نے کیا خوب تحقیق کی ہے، کیا خوب علم کے گہرے سمندروں میں غوطہ لگا کر تحقیق کے موتی نکالے ہیں۔

"والمروی عن الحسن ان ذلک علی تقدیر الامر ای قولوا فی دعائکم ذلک فهو تعلیم منه تعالی لعباده کیفیة الدعاء والطلب منه وهذا من غایة الکرم ونهایة الاحسان یعلمهم الطلب لیعطیهم ویرشدهم للسئوال لیثیبهم"

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دعاء میں اللہ تعالی کی طرف سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم اس طرح دعاء کرو، یعنی اللہ تعالی نے اپنے بندوں کو دعاء کرنے کا طریقہ بتایا اور تعلیم دی کہ تم اس طرح دعاء کرو، رب تعالی سے یوں مطالبہ کرو، یہ رب تعالی کا بہت بڑا کرم ہے اور بہت بڑا احسان ہے کہ ان کو طلب کا طریقہ سکھاتا ہے کہ تم مجھ سے اس طرح مانگنا پھر میں تمہیں اپنی عطاء سے نوازوں گا، وہ خود ہی سوال کرنے کے انداز کی راہنمائی فرماتا ہے کہ تم مجھ سے اس طرح سوال کرنا تو میں تمہیں ثواب عطاء کروں گا۔

کیا خوب کہا گیا "لولم ترد نیل ما ارجو واطلبه   من فیض جودک ماعلمتنی الطلبا

اگر تو دینے کا ارادہ نہ کرتا جس کی میں امید کرتا ہوں اور طلب کرتا ہوں، تیرے جود کے فیضان سے، تو تو مجھے طلب کا طریقہ ہی نہ سکھاتا۔ (روح المعانی)

اعتراض: جب رب تعالی نے ارشاد فرمادیا ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ نہیں تکلیف دیتا اللہ کسی نفس کو سوائے اس کی طاقت کے۔اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا "رفع عن امتی الخطاء والنسیان وما استکرهوا علیه" میری امت سے خطاء اور بھول اور جبراً کرائے گئے کام کو اٹھالیا گیا۔فاذا کان النسیان فی محل العفو قطعا فما معنی طلب العفو عنه" جب اللہ تعالی کے ارشاد گرامی، اور رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی سے

قطعی (یقینی) طور پر ثابت ہوگیا کہ نسیان (بھولنے) پر مؤاخذہ نہیں ہوگا تو یہاں بھولنے سے معافی طلب کرنا اور گرفت نہ کرنے کے مطالبہ کا کیا مقصد ہے؟

جواب اول: نسیان کی دو قسمیں ہیں ایک پر پکڑ نہیں اور دوسری قسم پر پکڑ ہے، یہاں دعاء میں دوسری قسم ہے جس میں پکڑ ہوتی ہے، اس میں پکڑ نہ کرنے کی درخواست کی گئی۔ جس بھول پر پکڑ نہیں وہ یہ ہے کہ انسان کا اس سے بچنا ممکن نہ ہو، جس میں بندے کی کوتاہی کو دخل نہ ہو بلکہ قدرتی طور پر اس میں بھول واقع ہو، جیسا کہ کپڑے پر نجاست دیکھی ہی نہیں تو نماز ادا کرلی، تو اس میں وہ شخص گنہگار نہیں ہوا، البتہ نماز کو دوبارہ لوٹانا پڑے گا۔

دوسری قسم یہ ہے کہ انسان کی کوتاہی کا اس میں دخل ہو، جس کی وجہ سے بھولنے کے اسباب پائے جائیں اس میں گرفت ہوتی ہے، جیسا کہ ایک شخص نے قرآن پاک یاد کرنا چھوڑ دیا اور یاد رکھنے کے اسباب سے اعراض کرلیا تو قرآن پاک بھول گیا "فانہ لایکون معذورا ومعفوا عنہ" تو اس صورت میں اسے معذور نہیں سمجھا جائے گا۔ اور نہ ہی یہ قابل معافی بھول ہے۔

اسی طرح ایک شخص نے کپڑے پر نجاست کو دیکھا لیکن اس کو دور کرنے میں تاخیر کردی، کپڑے کو دھویا نہیں اور بعد میں بھول گیا اسی طرح نماز ادا کرلی یعنی نجاست کپڑوں پر رہی تھی **"فانہ یعد مقصرا بترک المبادرة الی ازالتھا"** تو اس شخص کی اس کوتاہی پر گرفت ہوگی کہ اس نے جلدی نجاست کو زائل کیوں نہیں کیا تھا۔ یہ بھول معاف نہیں ہوگی، البتہ اتنی بات واضح ہے کہ کپڑے پر اتنی مقدار میں نجاست لگی ہوئی تھی جس کی وجہ سے نماز ادا نہیں کرسکتا تھا اور نجاست کو دھونے کیلئے پانی موجود تھا یا دوسرا پاک کپڑا موجود تھا، پھر اس ناپاک کپڑے میں جان بوجھ کر نماز ادا کی تو حرام کام کا مرتکب ہوا ہے، لیکن نجاست کو دیکھ کر زائل نہیں کیا تھا پھر بھول کر نماز ادا کی تو یہ حرام نہیں، البتہ جان بوجھ کر نجاست کو جو زائل نہیں کیا تھا اور بعد میں بھول گیا، اس کوتاہی پر سرزنش کا مستحق ہوگیا۔

اسی طرح **"ومن ترک الدراسة والتکرار حتی نسی القرآن یکون مقصرا وملوما"** جس شخص نے قرآن پاک کا تکرار (دور کرنا) چھوڑ دیا اور قرآن پاک پڑھنا چھوڑ دیا یہاں تک کہ وہ بھول گیا تو وہ کوتاہی کرنے والا بن گیا اور ملامت کا مستحق ہوگیا۔ دعاء میں اسی نسیان کو معاف کرنے کی رب تعالیٰ سے درخواست پیش کی جارہی ہے۔ (شیخ زادہ)

اسی جواب کو علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے ان الفاظ سے پیش کیا (جن کی وضاحت شیخ زادہ سے پیش کی گئی)

﴿ربنا لاتؤاخذنا ان نسینا او اخطأنا﴾ ای لاتؤاخذنا بما ادی بنا الی نسیان او خطاء من تفریط وقلة مبالاة"

اے ہمارے رب! ہمیں نہ پکڑ اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے خطاء ہو جائے۔اس دعاء میں جس بھول اور خطاء کا ذکر ہے،اس سے مراد یہ ہے کہ اے اللہ ہمیں کوتاہی اور بے پرواہی پر مؤاخذہ نہ فرما جو ہماری بھول اور خطاء کا سبب بنتے ہیں۔ (بیضاوی)

جواب دوم: کہ انسان رب تعالیٰ سے بھول اور خطاء کے معاف کرنے اور مؤاخذہ نہ کرنے کی جو درخواست کرر ہا ہے اس سے مراد مطلقا نسیان اور خطاء ہیں کیونکہ عقلا ان پر پکڑ منع نہیں جس طرح بادسموم (گرم زہریلی ہوا) انسان کو ہلاکت تک پہنچادیتی ہے ایسے ہی گناہ عذاب تک پہنچانے کا ذریعہ ہیں اگر چہ وہ گناہ خطاء سے ہی کیوں نہ سرزد ہوں ان میں ارادہ نہ ہی پایا گیا ہو۔یعنی مطلقا بھول اور خطاء پر اگر چہ مؤاخذہ منع نہیں۔

"لكنه تعالى وعدالتجاوز عنه رحمة وفضلا فيجوز ان يدعو الانسان به استدامة واعتدادا بالنعمة فيه،ويؤيد ذلك مفهوم قوله ﷺرفع عن امتي الخطاء والنسيان"

لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت اور اپنے فضل وکرم سے اس سے درگزر کرنے اور معاف کرنے کا وعدہ فرمالیا ہے،لھذا انسان کو چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعاء کرتا ہی رہے کہ اس پر یہ نعمت ہمیشہ قائم رہے اور خاص کر کے جب بار بار دعاء کرے گا تو بار بار اسے رب تعالیٰ کی نعمت یاد ہوگی،رب تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرتے رہنا اور ان کا شکر بجالاتے رہنا نعمتوں کی زیادتی کا سبب ہے،جس پر رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی شاہد ہے ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ﴾ اگر تم شکر کروگے تو میں اور نعمتیں زیادہ عطاء کروں گا۔

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ جواب میں نے جوذکر کیا ہے،اسے نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے بھی تائید حاصل ہے کیونکہ آپ نے فرمایا"رفع عن امتي الخطاء والنسيان" میری امت سے خطاء اور بھول کو اٹھالیا گیا ہے،یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے ان کو معاف کرنے اور ان سے تجاوز کرنے کا اعلان فرمادیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ میری امت کو خطاء ونسیان (بھول) پر عذاب دینا عقلا محال ہے۔بلکہ آپ نے یہ فرمایا کہ"میری امت سے بھول اور خطاء"کو اٹھالیا گیا ہے،جس کا مطلب واضح ہے کہ عذاب کو اٹھا لینے میں اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے اور میری امت پر رب ذوالجلال کی خاص مہربانی اور خاص رحمت ہے۔(ماخوذ از بیضاوی وشیخ زادہ،کبیر)

جواب سوم: یہ دعاء تقدیر کے طور پر ہے،کیونکہ دعاء کرنے والے مؤمنین ومتقین ہیں"وكانوا امتقين لله حق تقاته"اور متقین بھی وہ تھے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے تھے جیسا کہ ڈرنے کا حق ہے۔اسی سے یہ سمجھ آرہا ہے:

"فما كان يصدعنهم مالا ينبغي الاعلى وجه النسيان والخطاء"

کہ وہ گویا کہ دعاء یوں کر رہے ہیں کہ اے اللہ ہم تجھ سے ڈرتے ہیں جیسا کہ ڈرنے کا حق ہے، اپنی طرف سے پوری کوشش کرتے ہیں کہ تیرے احکام پر کامل عمل کیا جائے پھر بھی اگر ہم سے کوئی ایسا کام سرزد ہو جائے جو تجھے ناپسند ہو تو وہ بھول اور خطاء کی وجہ سے ہوگا، اسے معاف کر دینا، گویا کہ وہ یوں کہہ رہے ہوتے ہیں۔

"ان کان النسیان مما تجوز المؤاخذة به فلاتؤاخذنا به"

اگر چہ بھول پر بالتقدیر (بالفرض) مؤاخذہ ہونا ہو تو اے رب کائنات ہم تیرے حضور عرض کرتے ہیں کہ تو اسے بھی معاف فرما دے اور اس پر گرفت نہ فرما۔ (از کبیر)

جواب چھارم: "ان المقصود من الدعاء اظھار التضرع الی اللہ تعالی لاطلب الفعل"

بیشک مقصد دعاء سے اللہ تعالی کی طرف عجز کا اظہار ہے، یعنی مقصود خشوع اور خضوع ہے، مقصود طلب فعل نہیں وہ تو اللہ تعالی نے وعدہ فرما ہی دیا ہے کہ وہ دلوں کے وسوسوں پر مؤاخذہ نہیں فرمائے گا۔ جب اصل مقصد دعاء میں بندے کا اظہار عجز ہے اور اللہ تعالی کے استغناء کو ذکر کرنا مقصود ہے اور ساتھ ساتھ یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ اے اللہ بیشک تو مستغنی ہے لیکن اپنے بندوں کی عاجزی کی وجہ سے دعاء کو تو شرف قبولیت عطاء فرماتا ہے، بیشک تو نے مہربانی فرماتے ہوئے ہماری بھول اور خطاء سے درگذر نے کا اعلان فرما دیا ہے، لیکن ہم اپنے اظہار عجز کیلئے تجھ سے دعاء کرتے رہیں گے۔

"ولذلک فان الداعی کثیرا مایدعو بمایقطع بان اللہ تعالی یفعله سواء دعااولم یدع"

یہی وجہ ہے کہ دعاء کرنے والے بہت سی وہ دعائیں کرتے ہیں جن کا عطاء کرنا یقینی ہوتا ہے کیونکہ رب تعالی کا ان چیزوں کے عطاء کرنے کا وعدہ ہے، وہ دعاء کریں یا نہ کریں ان چیزوں نے واقع ہونا ہی ہوتا ہے۔ (از کبیر)

"رَبَّنَا" منادی ہے "حرف ندا" محذوف ہے، معنوی لحاظ پر اصل میں "یَارَبَّنَا" ہے، جس کا معنی ہے "اے ہمارے رب" (ماخوذ از صاوی)

بھولنے اور خطاء کے لحاظ پر احکام کی تین قسمیں:

ایک قسم تو وہی ہے جس کا ذکر پہلے جواب میں کیا جا چکا ہے، پھر اس کی تفصیلی طور پر دو قسموں کا بھی ذکر ہو چکا ہے۔ **دوسری قسم** یہ ہے کہ بھول اور خطاء سے بھی احکام پر عمل کرنا لازم رہتا ہے، جیسا کہ کسی کی غرامۃ (چٹی) ادا کرنی ہو، یا دیت ادا کرنی ہو، یا کوئی قرض ادا کرنا ہو جیسا کہ نماز ادا کرنی ہو تو بھول کر یا خطاء سے نہ ادا کر سکے تو پھر بھی یہ چیزیں لازم رہیں گی معاف نہیں ہوں گی۔

تیسری قسم یہ ہے کہ بھول کر مثال کے طور پر کلمہ کفر زبان پر جاری ہو گیا لیکن ارادہ نہیں تھا تو وہ شخص کافر نہیں ہوگا۔ (ماخوذ از قرطبی)

سہو و نسیان میں فرق:

معلوم چیز سے غفلت در پیش آنا جس کی وجہ سے اس کا علم جاتا رہے لیکن معمولی تنبیہ سے وہ چیز یاد آ جائے اسے ''سہو'' کہا جاتا ہے۔ اور اگر ایک چیز مکمل طور پر ذہن سے زائل ہو جائے، لیکن کافی وضاحت سے یاد دلایا جائے تو یاد آ جائے معمولی تنبیہ سے وہ یاد نہ آئے تو اسے ''نسیان'' کہا جاتا ہے۔ اگر ذہن سے کوئی چیز اس طرح نکل جائے کہ یاد دلانے سے بھی یاد نہ آئے تو اسے ''ذھول'' کہا جاتا ہے۔ حکماء نے بیان کیا ہے کہ اگر کسی چیز کی صورت قوت مدرکہ سے نکل جائے، لیکن حافظہ میں موجود رہے تو اسے ''سہو'' کہا جاتا ہے۔ اگر کسی چیز کی صورت ذہن سے اس طرح نکل جائے کہ نہ وہ قوت مدرکہ میں باقی رہے، اور نہ ہی وہ حافظہ میں باقی رہے تو اسے ''نسیان'' کہا جاتا ہے۔

فقہاء کرام احکام کے لحاظ پر بھی ''سہو، نسیان، شک'' کو ایک معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ راجح جانب کو ظن کہا جاتا ہے اور مرجوح جانب کو وہم کہا جاتا ہے۔ (جمع الجوامع، طحطاوی، شامی)

خطاء سے مراد کیا ہے:

خطاء اس مقام پر صواب کی ضد ہے، یعنی بے احتیاطی کی وجہ سے غلطی ہو جائے اسے خطاء کہتے ہیں، جیسا کہ روزہ دار نے وضوء کرتے ہوئے بے احتیاطی سے کام لیا کہ کلی کرتے ہوئے پانی حلق میں نیچے چلا گیا تو اسے خطاء کہا جاتا ہے، اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا، روزہ کی قضاء لازم آئے گی لیکن کفارہ لازم نہیں آئے گا۔ دعاء میں اسی خطاء کا ذکر ہے کہ اے اللہ اگر خطاء سے کوئی کام درست نہ ہو تو، تو اس پر پکڑ نہ فرما، جان بوجھ کر غلطی کرنا بھی اگر چہ بھی خطاء کہلاتا ہے لیکن آیۃ کریمہ میں وہ خطاء بمعنی گناہ مراد نہیں، بلکہ خطاء کا معنی ''نادرست'' ہے اسی کا مقابل ''صواب'' کا معنی درست ہے۔ (ماخوذ از کبیر بزیادۃ)

چند مسائل ضروریہ:

نماز میں بھول کر کلام کرنے سے امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک نماز ٹوٹ جاتی ہے لیکن امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک نماز نہیں ٹوٹتی، وہ اپنے مؤقف پر ایک حدیث پیش کرتے ہیں۔

"عن ابن سیرین عن ابی هریرة قال صلی بنا رسول اللهﷺ احدی صلاتی العشی قال ابن سیرین قد سماها ابوهریرة ولکن نسیت انا قال فصلی بنا رکعتین ثم سلم فقام الی خشبة معروضة فی المسجد فاتکأ علیها

کانہ غضبان ووضع یدہ الیمنی علی الیسری وشبک بین اصابعہ ووضع خدہ الایمن علی ظہر کفہ الیسری وخرجت سرعان القوم من ابواب المسجد فقالوا قصرت الصلوۃ وفی القوم ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما فھا باہ ان یکلما ہ وفی القوم رجل فی یدیہ طول یقال لہ ذوالیدین قال یارسول اللہ انسیت ام قصرت الصلوۃ فقال لم انس ولم تقصر فقال أکما یقول ذوالیدین فقالوا نعم فتقدم فصلی ماترک ثم سلم ثم کبر وسجد مثل سجودہ اواطول ثم رفع راسہ وکبرثم کبر وسجد مثل سجودہ اواطول ثم رفع راسہ وکبر فربما سالوہ ثم سلم فیقول نبئت ان عمر ان بن حصین قال ثم سلم"
(بخاری ومسلم، مشکوۃ باب السھو)

حضرت ابن سیرین رحمہ اللہ فرماتے ہیں حضرت ابوہریرہ ﷺ نے فرمایا ہمیں رسول اللہ ﷺ نے دوپہر ڈھلنے کے بعد دونمازوں میں سے ایک نماز پڑھائی، ابن سیرین کہتے ہیں ابوہریرہ ﷺ نے بتایا تھا کہ وہ کون سی نماز تھی لیکن میں بھول گیا، حضرت ابوہریرہ ﷺ نے فرمایا آپ نے ہمیں دورکعت پڑھائیں، پھر سلام پھیر دیا، پھر آپ کھڑے ہوئے ایک لکڑی کی طرف جو مسجد میں چوڑائی کے بل رکھی ہوئی تھی، آپ نے اس سے تکیہ لگایا گویا کہ آپ غصے کی حالت میں نظر آرہے تھے، اور آپ نے اپنے دائیں ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھا، اور ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈالا، اور آپ نے اپنے دائیں رخسار کو اپنی بائیں ہتھیلی کی پیٹھ پر رکھا، قوم جلدی سے مسجد کے دروازوں سے نکلنے لگے، اور یہ کہہ رہے تھے نماز چھوٹی ہوگئی، اور اس قوم میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما بھی تھے، جو رسول اللہ ﷺ سے کلام کرنے سے ڈر رہے تھے، اور اس قوم میں ایک اور شخص تھے جن کے ہاتھ لمبے تھے، اسی وجہ سے ان کو ذوالیدین کہا جاتا تھا، انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ کیا آپ بھول گئے ہیں یا نماز چھوٹی ہوگئی؟ آپ نے فرمایا نہ میں بھولا اور نہ ہی نماز چھوٹی ہوئی ہے، پھر آپ نے پوچھا کیا ایسا ہی ہے جیسا کہ ذوالیدین کہتے ہیں؟ صحابہ کرام ﷺ نے عرض کیا ہاں، نبی کریم ﷺ آگے ہوئے جو نماز رہ گئی تھی وہ پڑھا کر آپ نے سلام پھیرا (یہ سلام سہو کا تھا) پھر تکبیر کہی اور سجدہ کیا جیسا کہ پہلے سجدہ کیا تھا یا اس سے لمبا، پھر سر اٹھایا اور تکبیر کہی، پھر تکبیر کہی اور سجدہ کیا پہلے سجدہ کی طرح یا اس سے بھی لمبا سجدہ کیا، پھر سر اٹھایا اور تکبیر کہی۔ کئی مرتبہ صحابہ کرام نے ابن سیرین سے پوچھا، پھر سلام پھیرا (کے متعلق) اب سیرین جواب دینے مجھے یہی خبر دی گئی، بیشک عمران بن حصین نے کہا "ثم سلم" پھر سلام پھیرا۔

امام شافعی رحمہ اللہ نے اس حدیث سے یہ دلیل پکڑی کہ نماز میں بھول کر کلام کرنا جائز ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ذوالیدین اور دوسرے صحابہ کرام سے کلام کرنے کے بعد نماز کو مکمل کیا اور سجدہ سہو کیا، نماز کو نئے سرے سے نہیں ادا کیا، جس سے واضح ہوا کہ نماز میں بھول کر کلام کرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا:

"ھذاالحدیث منسوخ بقولہ تعالیٰ ﴿قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ﴾ وحدیث زیدبن ارقم"

کہ یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے ارشاد" کھڑے ہوئے اللہ کیلئے خشوع سے (خاموش ہوکر) سے منسوخ ہو چکی ہے اور ذوالیدین والی حدیث اس وقت واقع ہوئی جس وقت نماز میں کلام کرنا جائز تھا، جیسا کہ جماعت میں ملنے والا اگر دیر سے پہنچتا تو وہ نمازیوں سے پوچھ لیتا کہ کتنی رکعتیں ہو چکی ہیں، نماز پڑھتے ہوئے اسے بتادیا جاتا، وہ اپنی رکعتیں جو رہ گئی تھیں ان کو پہلے مکمل کرتا پھر باقی نماز ادا کرتا لیکن بعد میں یہ حکم منسوخ ہوگیا، ناسخ قرآن پاک کی آیۃ ﴿وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ﴾ بھی ہے اور حضرت زید بن ارقم کی بیان کردہ حدیث بھی ہے، جس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز میں کلام کرنے سے منع فرمادیا۔

زیادہ تفصیل **نجوم الفرقان** کے پانچویں حصہ ﴿وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ﴾ کے تحت دیکھیں۔

مسئلہ: "الحج یفسد بالجماع ناسیا عند الجمھور خلافاللشافعی"

اگر حج کے احرام کے دوران بلکہ طواف زیارۃ سے پہلے بھول کر جماع کرلیا تو بالاتفاق اس کا حج فاسد ہوجائے گا، صرف امام شافعی رحمہ اللہ کا اس میں اتفاق ہے۔

مسئلہ: "طلاق المکرہ والمخطئی یقع عندنا خلافاللشافعی" کسی شخص سے جبری طور پر طلاق لے لی جائے تو اس کی طلاق واقع ہوجائے گی اور کسی سے خطاء کے طور پر طلاق کے الفاظ صراحۃً سرزد ہوں تو طلاق واقع ہوجائے گی اس مسئلہ میں بھی اتفاق ہے۔

صرف امام شافعی رحمہ اللہ کا اختلاف ہے، امام شافعی رحمہ اللہ کے اختلاف کی وجہ یہ حدیث ہے "رفع عن امتی الخطاء والنسیان" (میری امت سے بھول اور خطاء کو اٹھالیا گیا ہے) امام شافعی رحمہ اللہ اس حدیث کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ خطاء اور نسیان کے ہوتے ہوئے وہ فعل صحیح ہوجائے گا، کیونکہ خطاء اور نسیان کو اٹھالینے کا یہ مقصد ہے کہ ان کا کوئی اعتبار ہی نہیں۔ لیکن امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ میری امت سے بھول اور خطاء کے گناہ کو اٹھالیا گیا ہے، خطاء اور نسیان پر مؤاخذہ (پکڑ) نہیں۔ حدیث پاک کا یہ مطلب نہیں کہ بھول اور خطاء کا حکم ہی اٹھالیا گیا ہے۔

مسئلہ: خطاء سے روزہ کے حال میں کچھ کھالیا اور پی لیا تو روزہ ٹوٹ جائے گا، اگرچہ وہ شخص گنہگار نہیں ہوگا، لیکن

روزہ کی قضاء لازم ہوگی، البتہ کفارہ لازم نہیں ہوگا، جیسا کہ ایک مثال بیان ہو چکی ہے کہ روزہ کی حالت میں کلی کرتے ہوئے لاپرواہی سے پانی حلق میں چلا گیا تو روزہ ٹوٹ گیا، قضاء لازم ہے کفارہ نہیں، اس مسئلہ میں قیاس بھی یہی ہے کہ روزہ ٹوٹ جائے اور اس کے خلاف روزہ نہ ٹوٹنے پر کوئی حدیث بھی موجود نہیں لھذا یہ مسئلہ قیاس پر ہی موقوف رہے گا۔

مسئلہ: بھول کر روزہ کی حالت میں کھالیا یا پی لیا تو روزہ نہیں ٹوٹے گا، اگر چہ قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ روزہ ٹوٹ جاتا لیکن اس کے متعارض (مقابل) حدیث شریف موجود ہے لہذا عمل حدیث پاک پر ہوگا، قیاس کو چھوڑ دیا جائے گا

"عن ابی هریره عن النبی ﷺ قال اذا نسی احدکم فاکل وشرب فلیتم صومه فانما اطعمه الله وسقاه" (بخاری، مسلم)

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی ایک بھول جائے تو کھا، پی لے تو وہ اپنا روزہ مکمل کرے (یعنی اس کا روزہ نہیں ٹوٹا) بیشک اسے اللہ تعالی نے کھلایا ہے اور پلایا ہے۔

مسئلہ: بھول کر ذبح کرتے ہوئے "بسم الله" پڑھنا بھول گیا تو وہ جانور حلال ہوگیا، اگر جان بوجھ کر "بسم الله"، پڑھنا چھوڑ کر جانور کر ذبح کر دیا تو وہ حرام ہوگیا، اس مسئلہ کا مکمل ذکر انشاء اللہ آٹھویں پارہ میں آئے گا۔

فائدہ: "قال الکلبی کانت بنو اسرائیل اذانسوا شیئا مما امروا به او اخطئوا عجلت لهم العقوبة فحرم علیهم شیء من مطعوم اومشروب علی حسب ذلک الذنب"

کلبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں بنو اسرائیل کو جب کسی چیز کا حکم دیا جاتا وہ بھول کر یا خطاء سے اس پر عمل نہ کرتے تو اس کو جلدی ہی (دنیا میں) اس کی سزا دے دی جاتی، یعنی خطاء اور نسیان سے کی گئی غلطی پر اسے سزا دینے کیلئے اس پر کھانے اور پینے کی چیز کو حرام کر دیا جاتا۔ (ماخوذ از مظہری)

سبحان اللہ! رسول اللہ ﷺ کی امت کے لوگو تم اپنی قسمت کو دیکھو رب تعالی کا تم پر کتنا کرم ہے کہ اس نے تم سے بھول اور خطاء کی پکڑ کو ہی اٹھا لیا ہے، یہ سب کرم ہے میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ کا جن کے مقام محبوبیت اور درجہ رفیعہ سے امت کو عظیم فائدہ حاصل ہو رہا ہے۔

تنبیہ: نسیان کبھی ترک کے معنی بھی آتا ہے، اگر کوئی شخص تاویل فاسد سے عمل کو چھوڑے، یا خطاء پر فاسد تاویل پیش کرے تو اسے مؤاخذہ ہوگا، اسی وجہ سے اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: ﴿نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ﴾ "انہوں نے اللہ کو چھوڑ دیا اللہ نے ان کو چھوڑ دیا۔" (ماخوذ از کبیر بتصرف)

اس دعاء کی مقبولیت: واخرج ابن جریر عن السدی قال ان هذه الآیة حین نزلت ﴿ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا﴾ قال له جبریل ان الله قد فعل ذلک یا محمد" (درمنثور)

سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں بیشک جب یہ آیۃ ﴿رَبَّنَا لَاتُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِیْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا﴾ ''اے ہمارے رب ہمیں نہ پکڑ اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے خطاء ہو جائے'' نازل ہوئی، تو جبریل نے رسول اللہ ﷺ کو رب کا پیغام پہنچایا کہ اللہ تعالی نے اس دعاء کو شرف قبولیت پہلے سے ہی عطاء کر رکھا ہے، یعنی بندے اپنے اظہار عجز کیلئے دعاء کرتے رہیں، رب تعالی سے بے نیاز نہ ہو جائیں تاہم رب تعالی نے پہلے ہی بھول اور خطاؤں پر مؤاخذہ نہ کرنے کا وعدہ فرما دیا ہے۔

﴿رَبَّنَا وَلَاتَحْمِلْ عَلَیْنَا اِصْرًا کَمَا حَمَلْتَهُ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا﴾

''اے ہمارے رب اور نہ ڈال ہم پر بوجھ جیسا تو نے ڈالا وہ (بوجھ) ان لوگوں پر جو ہم سے پہلے تھے۔''

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

﴿رَبَّنَا وَلَاتَحْمِلْ عَلَیْنَا اِصْرًا﴾ عطف علی ماقبله وتوسیط النداء بینهما لابراز مزید الضراعة''

(تفسیر ابی السعود)

''وَلَاتَحْمِلْ'' کا عطف ''لَاتُؤَاخِذْنَا'' پر ہے۔ اگرچہ ''لَاتُؤَاخِذْنَا'' سے پہلے والا ''ربنا'' ساتھ مل رہا تھا، دوبارہ ''ربنا'' کے ذکر کی ضرورت تو نہ تھی، لیکن پھر معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان ''ربنا'' کو ذکر کیا جو منادی ہے، حرف ندا محذوف ہے، اصل میں ''یاربنا'' ہے یعنی ''ربنا'' دوبارہ ذکر کر کے بندے کی مزید عاجزی کا اظہار کیا، کہ بندہ بار بار اللہ تعالی کے حضور عرض کر رہا ہے ''اے میرے رب، اے میرے رب'' وہ گویا کہ یوں کہہ رہا ہے، مالک تو ہی ہے میں تو تیرا عاجز بندہ ہوں، اس لئے تجھ سے فضل و کرم کی طلب کی دعاء کر رہا ہوں۔

''اِصْرًا'' کے معانی:

''الاصر العهد والمیثاق الغلیظ'' اخرجه الطبری عن قتادة'' سخت کا وعدہ لینا جس میں بہت مشکلات ہوں اسے ''اصر'' کہا جاتا ہے۔ یہ قول حضرت ابن عباس اور مجاہد، قتادہ، سدی، ابن جریج، ربیع، ابن زید رضی اللہ عنہم کا ہے۔ (البحر المحیط)

''واخرج ابن جریر عن ابن جریج ﴿وَلَاتَحْمِلْ عَلَیْنَا اِصْرًا﴾ قال عهدا لانطیقه و لانستطیع القیام به کما حملته علی الذین من قبلنا الیهود والنصاری فلم یقوموا به فاهلکتهم''

ابن جریج رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ ﴿رَبَّنَا وَلَاتَحْمِلْ عَلَیْنَا اِصْرًا﴾ کا معنی یہ ہے کہ اے ہمارے رب ہم سے سخت وعدہ نہ لینا کہ ہم اس کی طاقت نہ رکھیں اور اس وعدہ کو پورا نہ کر سکیں تو جیسا کہ تو نے ہم سے

پہلے لوگوں یعنی یہود ونصاریٰ سے سخت وعدے لئے لیکن وہ ان وعدوں کو پورا نہ کر سکے تو ان کی بدعہدی اور وعدہ توڑنے کی وجہ سے تو نے ان کو تباہ و برباد کر دیا۔ (درمنثور)

"اصرا" بمعنی ناقابل توبہ گناہ:

"الاصر الذنب الذی لا کفارة فیه و لا توبة منه" "اصرا" کا معنی وہ گناہ جس کا نہ کفارہ ہو اور نہ ہی توبہ ان کی قبول ہو، یہ قول ابن زید کا ہے۔ (البحر المحیط)

واخرج ابن ابی حاتم عن الفضیل فی قوله ﴿وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا﴾ قال کان الرجل من بنی اسرائیل اذا اذنب قیل له ان توبتک ان تقتل نفسک فیقتل نفسه فوضعت الآصار عن هذه الامة" (درمنثور)

فضیل رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ﴿وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا﴾ کا معنی یہ ہے کہ اے ہمارے رب ہم پر گناہوں کا وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا کہ ان کی توبہ بغیر قتل کے قبول نہیں ہوتی تھی، کیونکہ بنی اسرائیل میں سے جب کوئی شخص گناہ کر لیتا تھا تو اسے کہا جاتا تھا کہ تیری توبہ یہ ہے کہ تجھے تیرا قریبی رشتہ دار قتل کر دے، رب تعالیٰ سے یہ دعاء کی گئی کہ اے اللہ ہم پر گناہوں کا بوجھ اس طرح نہ ڈال کہ ان کی توبہ زبان سے اور گناہ پر نادم ہونے سے قبول نہ ہو بلکہ توبہ کیلئے ایک دوسرے کو قتل کرنا پڑے، تو رب تعالیٰ نے ان سے اس بوجھ کو اٹھا لیا ان کی توبہ کو قبول کر لیا۔

"اصرا" بمعنی سخت امر:

"الاصر الامر الغلیظ الصعب" اصر کا معنی ہے سخت اور مشکل امر یہ قول امام مالک رحمہ اللہ کا ہے۔ (البحر المحیط)

"واخرج عبد بن حمید عن قتادة فی قوله ﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا﴾ قال کم من تشدید کان علی من قبلنا ﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ﴾ قال کم من تخفیف ویسر وعافیة فی هذه الامة"

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے جب اس آیۃ کریمہ کے متعلق سوال کیا گیا کہ ﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا﴾ کا کیا مطلب ہے تو انہوں نے کہا کہ کتنی ہی شدت تھی یہود پر تو اسی کے متعلق یہ دعاء کی گئی کہ "اے ہمارے رب ہم پر شدید امروں کا بوجھ نہ ڈال جیسا کہ تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا" اور جب ان سے سوال کیا گیا کہ ﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ﴾ "ہمارے رب ہم سے نہ اٹھوا وہ جن کی ہمیں طاقت نہیں" کا کیا مطلب ہے تو انہوں نے کہا کہ اس امت پر کتنی ہی تخفیف اور آسانی اور عافیت رکھی گئی ہے وہ اسی دعاء کا اثر ہے۔

"اصرا" بمعنی مسخ:

"وقال عطاء الاصر المسخ قردة وخنازير" اصر کا معنی شکلوں کا تبدیل کردینا یعنی کبھی بندر بنا دینا اور کبھی خنزیر بنا دینا، یہ قول عطاء رحمہ اللہ کا ہے۔ (البحر المحیط)

"واخرج الطستی عن ابن عباس ان نافع بن الازرق قال له اخبرنی عن قوله ﴿وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا﴾ قال عهدا كما حملته على اليهود فمسختهم قردة وخنازير"

نافع بن ازرق نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال کیا کہ ﴿وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا﴾ کا کیا مطلب ہے؟ تو آپ نے فرمایا" وہ عہد جو یہود سے لیا گیا اور ان کی بدعہدی پر ان کو بندر اور خنزیر بنا دیا گیا" گویا کہ یہ دعاء کی گئی کہ اللہ ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو ہم نہ اٹھائیں تو، تو ہمیں بندر اور خنزیر بنا دے جیسا کہ تو نے ہم سے پہلے لوگوں کو بدعہدی کی وجہ سے بندر اور خنزیر بنا دیا تھا۔

"اصرا" بمعنی اعمال شاقہ:

"وقيل فرض يصعب اداؤه" بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ "اصرا" کا معنی وہ فرائض ہیں جن کا ادا کرنا بہت مشکل ہو۔ (البحر المحیط)

"اصرا" بمعنی بھاری بوجھ:

"وقال الزمخشری العبء الذی يا صر صاحبه ای يحسبه مكانه لا يستقل به" زمخشری نے بیان کیا ہے کہ "اصرا" کا معنی بھاری بوجھ ہے جو اٹھانے والے کو عاجز کر دے کہ وہ بوجھ کم نہ ہونے کی وجہ سے اسے چلنے سے روک دے۔ (البحر المحیط، الکشاف)

"واخرج ابن جرير عن الضحاك ﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ﴾ قال لا تحملنا من الاعمال مالا نطيق" (درمنثور)

درمنثور کی یہ روایت تائید کر رہی ہے البحر المحیط کے دونوں قولوں کی کہ "اصرا" مشکل اعمال، اور بھاری بوجھ کو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ ضحاک سے پوچھا گیا کہ ﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ﴾ کا کیا مطلب ہے تو انہوں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے رب ہم پر مشکل اعمال کا بوجھ نہ ڈال کہ ہم اسے اٹھانے کی طاقت نہ رکھیں۔ (درمنثور)

تمام معنی کا جامع معنی:

"استعیر للتکلیف الشاق" مجازی طور پر معنی مشقت آمیز تکلیف، یعنی مشکل کام مطلب یہ ہوا کہ "اے ہمارے رب ہمیں مشکل تکالیف یعنی مشکل امور میں مبتلاء نہ فرما جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں کو مشکل امور میں مبتلاء کیا تھا۔ یہ معنی پہلے تمام بیان کئے ہوئے معانی کو شامل ہے کیونکہ سب معنی مشکل اور مشقت آمیز ہونے والے معنی کو شامل ہیں۔

پہلے لوگوں پر کیسے امور شاقہ ڈالے گئے:

"وذلک ان اللہ تعالی فرض علیھم خمسین صلوۃ وامرھم باداء ربع اموالھم زکوۃ ومن اصاب منھم ثوبہ نجاسۃ قطعھا ومن اصاب ذنبا اصبح وذنبہ مکتوب علی بابہ"

اللہ تعالی نے یہود پر پچاس نمازیں فرض کیں اور چوتھا حصہ مال کی زکوۃ دینے کا حکم فرمایا، اگر کہیں نجاست لگ جائے تو وہ کپڑا دھونے سے پاک نہیں ہوتا تھا بلکہ اسے کاٹنا پڑتا تھا۔ اگر کسی نے گناہ کرلیا تو صبح ان کے دروازہ پر قدرتی طور پر لکھا ہوا ہوتا۔ (خازن)

تفسیر خازن سے جو امور شاقہ ذکر کئے ہیں ان پر مزید روح البیان میں یہ بھی مذکور ہیں۔

"وعدم التطھر بغیر الماء وعدم جواز صلوتھم فی غیر المسجد وحرمۃ اکل الصائم بعد النوم ومنع بعض الطیبات عنھم بالذنوب"

بغیر پانی کے ان کو پاکیزگی حاصل نہیں ہوسکتی تھی، یعنی تیمم سے پاکیزگی کا حاصل ہونا نبی کریم ﷺ کی امت پر رب تعالی کا خصوصی انعام واکرام ہے، اوران لوگوں کی نماز مسجد کے بغیر نہیں ہوتی تھی، لیکن نبی کریم ﷺ کو رب تعالی نے خصوصی فضیلت سے نوازا کہ تمام زمین کو مسجد بنادیا گیا۔

اے مؤمن! تو نماز ادا کر، جہاں بھی نماز کا وقت ہوجائے وہیں رب تعالی کے حضور سربسجود ہوجا اور پہلے لوگوں پر روزے کی حالت میں رات کو ایک مرتبہ سو جانے کے بعد بھی کھانا وغیرہ حرام کردیا گیا تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ اور آپ کی امت پر صبح صادق سے غروب آفتاب تک روزہ کی پابندیاں رکھی گئیں، رات کو طعام کھانا اور کسی مشروب کا پینا اور جماع کرنا جائز قرار دیا۔ اور پہلے لوگوں پر بعض گناہوں کی سزا کی وجہ سے کئی حلال چیزوں کو حرام کردیا گیا، جیسا کہ رب تعالی نے فرمایا:

﴿وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ

شُحُوْمَهُمَا اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَا اَوِ الْحَوَايَا اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ﴾
اور یہودیوں پر ہم نے حرام کیا ہر ناخن والا جانور اور گائے اور بکری کی چربی ان پر حرام کی مگر جو ان کی پیٹھ میں لگی ہو یا آنت اور ہڈی سے ملی ہو، ہم نے یہ ان کی سرکشی کا بدلہ دیا۔ (ماخوذ از روح البیان بوضاحت راقم)

مؤمنین کی دعاء قبول کی گئی:

اللہ تعالیٰ نے جب مؤمنین کو دعاء کرنے کا طریقہ سکھایا تو مؤمنین نے رب تعالیٰ کے حضور دعاء کی،
"وقد اجاب الله تعالی دعاء هم برحمته وخفف عنهم بفضله و کرمه فقال تعالی(وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ)"
تو رب تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ان کی دعاء کو قبول کیا، اور ان سے عذاب کی تخفیف فرمائی، رسول اللہ ﷺ کی امت پر یہ خصوصی فضل و کرم ہے، اور رب تعالیٰ نے ان کی دعاء کی قبولیت کو ان الفاظ مبارکہ سے واضح فرمادیا ﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ اور اس نے نہیں کی تم پر دین میں کوئی حرج۔

اور اسی طرح رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ "اور ان پر سے وہ بوجھ اور گلے کے پھندے جو ان پر تھے اتارے گا۔" اس آیۂ کریمہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی امت سے ان بوجھوں اور گلے کے پھندوں (یعنی امور شاقہ) کو اتار دینے کا اعلان فرمایا جو یہود پر بوجھ ڈالے گئے اور امور شاقہ ان کے گلے کا بوجھ تھے۔ (ماخوذ از خازن)

تکلیف مالا یطاق کی دو قسمیں:

"احدهما مالیس فی قدرة العبد احتماله کتکلیف الاعمی بالنظر و الزمن العدو فهذا النوع من التکلیف الذی لایکلف الله به عبده بحال"
ایک قسم یہ ہے کہ جو بندے کی قدرت سے باہر ہو، بندہ اسے اٹھانے کی طاقت نہ رکھے، جس طرح نابینا کو کہا جائے تو دیکھ، اور جو شخص چلنے پھرنے سے عاجز ہو اسے کہا جائے تو دوڑ، اس قسم کی تکلیف جو انسان کی طاقت سے باہر ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے اسے اٹھالیا ہے۔
دوسری قسم تکلیف مالا یطاق کی یہ ہے کہ
"هو مافی قدرة العبد احتماله مع المشقة الشديدة والكلفة العظيمة كتكليف الاعمال الشاقة

والفرائض الثقیلة کما کان فی ابتداء الاسلام صلوة اللیل واجبة ونحوه فهذاالذی سال المؤمنون ربهم لایحملهم مالاطاقة لهم به"

جس کو بندہ اٹھا تو سکے لیکن بہت مشقت اور بہت عظیم تکلیف اٹھانے کے بعد، جیسا کہ مشکل اعمال اور بھاری فرائض کے اٹھانے کا حکم دیا جائے، جیسا کہ ابتداء اسلام میں (اسلام کے شروع شروع میں) تہجد کی نماز تمام مسلمانوں پر واجب تھی، پھر مؤمنوں سے اس کے وجوب کو اٹھالیا گیا البتہ نبی کریم ﷺ پر جوں کی توں واجب رہی۔اس قسم کے مشکل امور کو اٹھا لینے کی مؤمنین نے دعاء کی جسے اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالیا، اور تمام مشکل امور کو ان سے اٹھالیا گیا۔

سبحان اللہ ! رحمة للعلمین کی رحمت عامہ سے آپ کی امت کو کتنا عظیم فائدہ حاصل ہوا۔

کیا خوب استدلال:

"واستدل بهذه الآیة من یقول ان تکلیف مالا یطاق جائز اذلولم یکن جائزا لماحسن طلب تخفیفه بالدعاء من الله تعالیٰ"

اس آیہ کریمہ سے یہ دلیل پکڑی گئی ہے کہ ابھی تکلیف مالایطاق کی جو دوسری قسم بیان کی گئی ہے اس کی تکلیف دینا جائز ہے، اگر جائز نہ ہوتو پھر اللہ تعالیٰ سے تخفیف کی دعاء کرنے کا کیا مطلب ہوگا؟ (ماخوذ از خازن)

"اصرا" کے اور معنی:

"الاصر وقیل القطیعة" اب دعاء کا مطلب یہ ہوگا کہ "اے ہمارے رب ہم پر قطع رحمی کا بوجھ نہ ڈال جیسا کہ تو نے پہلے لوگوں پر قطع رحمی کا بوجھ ڈالا، یعنی اے اللہ تعالیٰ ہمیں تو اپنے فضل وکرم سے اپنے اقرباء سے قطع تعلقی سے بچا۔

"وقیل شماتة الاعداء، روی وهب ان ایوب علی نبینا وعلیه السلام قیل له ما کان اشق علیک فی بلائک قال شماتة الاعداء"

بعض حضرات نے بیان کیا ہے "اصر" کا معنی ہے "شماتت اعداء" جب کسی کو کوئی تکلیف پہنچے تو اس کے دشمن خوش ہوں تو اسے "شماتت اعداء" کہا جاتا ہے۔**اب دعاء** کا مطلب یہ ہوگا اے میرے رب مجھے مصائب وآلام میں مبتلاء کر کے میرے دشمنوں کو خوش نہ کرنا یعنی مجھے ان چیزوں سے بچا کر رکھنا جن کی وجہ سے میرے دشمن خوش ہوں۔وہب کی روایت میں ہے کہ حضرت ایوب علی نبینا وعلیہ السلام سے پوچھا گیا، آپ پر آزمائشوں کے دنوں میں زیادہ شاق کیا گزری؟ تو آپ نے فرمایا "شماتت اعداء" یعنی میرے دشمنوں کا میری آزمائش اور

میرے مصائب وآلام پر خوش ہونا میرے لئے مشقت آمیزامر تھا۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا:

"اشمت بی الاعداء حین هجرتنی والموت دون شماتة الاعداء"

میرے دشمنوں کو بڑی خوشی حاصل ہوئی جب تم نے مجھے چھوڑ دیا، موت کی تلخیاں دشمن کی شماتت سے کم درجہ رکھتی ہے۔تاہم تمام معانی کو شامل معنی پہلے بیان کر دیا گیا، اور یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ پہلے لوگوں پر کیا بوجھ ڈالا گیا تھا۔ (البحرالمحیط)

نبی کریم ﷺ کی رحمت کی وجہ سے دعاء کو شرف قبولیت حاصل ہو گیا:

یعنی مؤمنین کی یہ دعاء اللہ تعالیٰ کے حضور ﴿رَبَّنَا وَلَاتَحۡمِلۡ عَلَیۡنَا اِصۡرًا کَمَا حَمَلۡتَهٗ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِنَا﴾ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ ہمیں اعمال شاقہ (ایسے اعمال جو مشقت آمیز ہوں، بہت مشکل ہوں) کی تکلیف نہ دے اگر چہ ہم ان کی طاقت بھی رکھیں جیسا کہ تو نے پہلے لوگوں پر اعمال شاقہ مقرر کئے جو ان کیلئے بوجھ تھے اور ان کے گلے میں پھنس جانے والے طوق تھے۔اس لئے کہ

"بعثت نبیک محمد ﷺ بنی الرحمة بوضعه فی شرعه الذی ارسلته به من الدین الحنیفی السهل السمح"

تو نے اپنے نبی محمد ﷺ کو نبی رحمت بنا کر بھیجا تا کہ وہ تیرے حکم سے ان بوجھوں کو اٹھا دیں، اسلئے کہ تو نے ان کو دین حنیف عطاء کر کے بھیجا جس میں آسانی ہی آسانی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا، "بعثت بالحنیفیة السمحة" مجھے دین حنیف عطاء کر کے بھیجا گیا، جو دین آسان ہے "یعنی اس میں کوئی افراط وتفریط نہیں" (صابونی)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی بھی اسی پر دلالت کر رہا ہے: ﴿وَمَا کَانَ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمۡ وَاَنۡتَ فِیۡهِمۡ وَمَا کَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمۡ وَهُمۡ یَسۡتَغۡفِرُوۡنَ﴾ اور اللہ کا کام نہیں کہ انہیں عذاب کرے جب تک اے محبوب تم ان میں تشریف فرما ہو، اور اللہ انہیں عذاب کرنے والا نہیں جب تک کہ وہ بخشش مانگ رہے ہیں۔

"والمؤمنون انما طلبوا هذاالتخفیف لأن التشدید مظنة التقصیر والتقصیر موجب للعقوبة ولاطاقة لهم بعذاب الله فلاجرم طلبوا السهولة فی التکالیف"

مؤمنین نے اس تخفیف کی دعاء کی اس لئے کہ تکالیف شدیدہ سے کوتاہی ہو جانے کا گمان پیدا ہوتا ہے اور کوتاہی کی وجہ سے اعمال کو چھوڑ دینا باعث عذاب ہے، اوران کو یہ طاقت حاصل نہیں تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ

کے عذاب کو برداشت کریں تو انہوں نے تکالیف میں آسانی کا مطالبہ کیا۔ (کبیر)

اعتراض: "لقائل ان يقول دلت الدلائل العقلية والسمعية على انه اكرم الاكرمين وارحم الراحمين فما السبب في ان شدد التكليف على اليهود حتى ادى ذلك الى وقوعهم في المخالفات والتمرد"

جب دلائل عقلیہ اور نقلیہ سے یہ واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ "اکرم الاکرمین" اور "ارحم الراحمین" ہے تو کیا وجہ ہے اس نے یہود پر سخت احکام نافذ فرمائے؟ ہوسکتا ہے کہ وہ ان مشکل احکام کی وجہ سے ہی سرکش بنے ہوں اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمائی کی وجہ بھی ان پر سختی ہو۔

جواب ازمعتزله: معتزلہ نے جواب یہ دیا ہے:

"من الجائز ان يكون اشئى مصلحة في حق انسان مفسدة في حق غيره فاليهود كانت الفظاظة والغلظة غالبة على طباعهم فما كانوا ينصلحون الابالتكاليف الشاقة والشدة وهذه الامة كانت الرقة وكرم الخلق غالبا على طباعهم فكانت مصلحتهم في التخفيف وترك التغليظ"

کہ جائز ہے ایک چیز کسی کیلئے بھلائی، درستی اور اصلاح کا ذریعہ ہو اور وہی دوسرے کیلئے فساد کا سبب ہو، نرم طبیعت والے کیلئے آسان احکام اصلاح کا سبب ہیں، لیکن سخت طبیعت والے کیلئے مشکل کا سبب ہیں۔ یہود چونکہ تند مزاج تھے اور ان کی طبیعت پر سختی غالب تھی، ان کی اصلاح بغیر تکالیف شاقہ کے نہیں ہوسکتی تھی اس وجہ سے ان پر سخت احکام نافذ فرمائے۔ نبی کریم ﷺ کی امت نرم مزاج ہے، اور ان کی طبیعت پر اچھے اخلاق اور نرم مزاجی غالب ہے، اسی لئے رب تعالیٰ نے ان پر نرم احکام نافذ فرمائے۔

اہل سنت و جماعت کی طرف سے جواب:

جب اہل سنت و جماعت کے حضرات نے دیکھا کہ یہود پر اگرچہ احکام سخت تھے لیکن ان پر مہربانیاں بھی بہت زیادہ تھیں، من وسلوی ان پر اتارا گیا۔ پتھر سے چشمے ان کیلئے جاری کیے گئے، میدان تیہ میں ان پر بادل سے سایہ کیا گیا۔ ان کو گرمی و سردی سے میدان تیہ میں محفوظ رکھا گیا، ان کے کپڑوں کو میلا ہونے سے محفوظ رکھا گیا، بچہ جس طرح بڑا ہوتا کپڑا خود بخود بڑا ہوتا، ان ان مہربانیوں کو بھی دیکھتے ہوئے اور سخت احکام کو بھی دیکھتے ہوئے یوں کہا جائے

﴿وهو سبحانه تعالى (يَفْعَلُ مَايَشَاءُ وَيَحْكُمُ مَايُرِيدُ "لَايُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ﴾

کہ اللہ تعالیٰ جو چاہے وہ کرتا ہے، اور جو ارادہ فرمائے وہ حکم فرماتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے نہیں پوچھا جاتا جو وہ کرے اور ان سب (لوگوں) سے سوال ہوگا۔ (ماخوذ از کبیر)

راقم کے خیال میں عقلی باتیں بتانے والے، دین کے باغیوں، یہود ونصاری کیلئے جواب معتزلہ والا ہی صحیح ہے "ایسے کو تیسا" محاورہ بہت پیارا محاورہ ہے۔

﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ﴾

''اے ہمارے رب اور نہ اٹھوا ہم سے وہ کہ نہیں طاقت ہمیں اس کی۔''

یہ تیسری دعاء ابھی دوسری دعاء کے ضمن میں تفسیر خازن کے حوالہ سے کچھ بحث تکلیف مالا یطاق کے متعلق بیان کی جا چکی ہے۔ ''طاقة'' نام بن گیا ہے ''اطاقة'' کا، جیسے ''طاعة'' نام ہے ''اطاعة'' کا ''جابة'' نام ہے ''اجابة'' ''وهى توضع موضع المصدر'' اسے مصدر کی جگہ رکھا جاتا ہے۔

اہل سنت وجماعت کا مذہب:

''ان تكليف مالايطاق جائز اذلو لم يكن جائز الماحسن طلبه بالدعاء من الله تعالى'' اہل سنت وجماعت کا مذہب یہ ہے کہ تکلیف مالا یطاق جائز ہے، اگر جائز نہ ہوتی تو دعاء میں اللہ تعالی سے یہ مطالبہ ہی نہ کیا جاتا کہ اے ہمارے رب ہم سے وہ چیز نہ اٹھوا جس کی ہمیں طاقت نہیں۔

معتزلہ کا مذہب:

معتزلہ کہتے ہیں کہ جس کی چیز طاقت نہیں، اس کا حکم نہیں دیا جا سکتا، یعنی ان کا قول یہ ہے کہ تکلیف مالا یطاق جائز نہیں۔

معتزلہ کے دلائل اور ان کے جوابات:

پہلی دلیل: معتزلہ نے کہا ہے یہاں ﴿مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ''مايشق مشقة عظيمة'' جس کام میں مشقت عظیمہ پائی جائے وہ ہم سے نہ اٹھوا۔ ''طاقة'' اس معنی میں استعمال ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے، ''لااستطيع ان انظر الى فلان'' اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے فلاں کو دیکھنا بھاری نظر آتا ہے۔ اور حدیث شریف میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے غلام کے متعلق فرمایا ''له طعامه و كسوته و لايكلف من العمل مالايطيق'' کہ غلام کو طعام اور لباس دو (جیسا کہ خود استعمال کرتے ہو) اور اسے طاقت سے زائد کام کی تکلیف نہ دو، اس مقام پر بھی طاقة کا معنی مشقت ہے، کہ ان سے مشقت والا کام نہ لیا جائے۔

اور حدیث شریف میں مریض کی نماز کے بیان میں ہے "فان لم یستطع فعلی جنب" اگر وہ (بیٹھنے کی) طاقت نہ رکھے تو کروٹ کے بل، یعنی لیٹ کر نماز ادا کرے۔ اس حدیث کے متعلق بھی فقہاء کرام کا اتفاقی فیصلہ ہے کہ "المراد منه اذا کان یلحقه فی الجلوس مشقة عظیمة شدیدة" مراد اس سے یہ ہے کہ اسے بیٹھنے میں مشقت عظیمہ حاصل ہو تو لیٹ کر نماز ادا کرے۔

جواب: تمہاری یہ دلیل دو وجہ سے ناقص ہے، ایک تو یہ ہے کہ اگر ﴿وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ﴾ میں یہ معنی لیا جائے کہ ہم سے "اعمال شدید" نہ اٹھوا، تو اس میں تکرار لازم آئے گا کیونکہ یہی معنی ﴿وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا﴾ میں بھی بیان کیا جا چکا ہے۔ قانون یہی ہے کہ بلاوجہ تکرار درست نہیں "الافادة خیر من الاعادة" نیا فائدہ زیادہ بہتر ہے لوٹانے سے۔ دوسری وجہ تمہاری دلیل کے ناقص ہونے کی یہ ہے، کہ قانون یہ ہے کہ جب لفظ کا حقیقی معنی مراد لیا جا سکے تو مجازی معنی مراد لینا درست نہیں، جب حقیقی معنی "طاقة" کا قدرت اور طاقت رکھنا ہے، تو کیا ضرورت ہے کہ "امور شاقہ اور اعمال شاقہ" معنی کیا جائے جو مجازی معنی ہے۔ جو احادیث تم نے پیش کی ہیں ان کے مجازی معانی لینے پر قرائن موجود ہیں، جو تمہاری دلیل سے ہی واضح ہو رہا ہے کہ فقہاء کرام کا اتفاق ہے کہ "فان لم یستطع فعلی جنب" کا معنی یہ ہے کہ جب بیٹھنا مشکل ہو جائے تو لیٹ کر نماز ادا کرے، فقہاء کرام کا اجماع دلیل ہے اس پر کہ یہاں مجازی معنی ہے۔

معتزلہ کی دوسری دلیل:

یہاں مراد تکلیف سے عذاب ہے، آیۂ کریمہ کا معنی یہ ہوا "لا تحملنا عذابک الذی لا نطیق احتماله" ہم پر عذاب کا بوجھ نہ رکھ جس کے اٹھانے کی ہمیں طاقت نہیں۔

﴿لَا تُحَمِّلْنَا﴾ ماخوذ ہے "**تحمیل**" سے، جس کا معنی ہے، اٹھوانا کسی پر بوجھ رکھ دینا، یہاں یہ ذکر نہیں "لا تکلفنا ما لا طاقة لنا به" کہ ہمیں ان چیزوں کی تکلیف نہ دے جن کی ہمیں طاقت نہیں، بلکہ یہاں تو یہ ذکر ہے ﴿لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ﴾ ہم سے وہ نہ اٹھوا، وہ چیز ہم پر نہ رکھ جس کے اٹھانے کی ہمیں طاقت نہیں۔ اگر "**تحمیل**" کا معنی عذاب اٹھوانا، عذاب کا بوجھ ڈالنا لیا جائے تو یہ معنی حقیقی ہے، اور اگر "تحمیل" کو تکلیف کے معنی میں لیا جائے تو یہ معنی مجازی ہوگا، حقیقی معنی لینا بہتر ہے بنسبت مجازی کے۔

جواب: "ان التحمل مخصوص فی عرف القرآن بالتکلیف" "تحمل" اور "تحمیل" قرآن

پاک میں تکلیف کے معنی میں لیا گیا ہے، یہ مشہور و معروف ہے، جیسا کہ رب تعالی نے ﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ﴾ آیۃ میں ﴿وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ﴾ ذکر فرمایا، جس کا معنی ہی یہ ہے، امانت کی تکلیف کو انسان نے قبول کر لیا۔ پھر اگر یہ کہا جائے کہ "تحمیل" کا معنی بوجھ اٹھانا عرف میں پایا گیا ہے، اور اس کا معنی "تکلیف" عرف میں نہیں پایا گیا تو یہ باطل ہے کیونکہ "تحمیل" کا معنی عرف قرآن میں تکلیف ہی ہے۔

"فوجب اجراؤه علی ظاهره اما التخصیص بغیر حجة فانه لایجوز"

اس کو ظاہر پر جاری رکھنا ضروری ہے کیونکہ جو معنی عرف قرآن میں پایا جاتا ہے وہی ظاہر ہے، لہذا بلاوجہ اس اصطلاح سے ہٹ کر عام عرف اور محاورہ کو دیکھتے رہنا جائز نہیں۔

معتزلہ کی تیسری دلیل:

اگر بالفرض یہ معنی لے بھی لیا جائے کہ انہوں نے یہ سوال کیا کہ اے ہمارے رب ہمیں اس چیز کی تکلیف نہ دے جس کی ہمیں طاقت اور قدرت حاصل نہیں۔ تو اس کی مخالف جانب ثابت نہیں کہ "تکلیف مالایطاق" جائز ہے اسی لئے دعاء کی گئی ہے دعاء میں کئی جگہ مخالف جانب ثابت نہیں، جیسا کہ یہ دعاء ہے "رب الحکم بالحق" "اے میرے رب حق فیصلہ فرما" اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے یہ ثابت ہو جائے کہ معاذ اللہ رب تعالی باطل فیصلے فرماتا ہے، اسی وجہ سے حق فیصلہ کرنے کی دعاء کی گئی اسی طرح ابراہیم علیہ السلام نے دعاء کی ﴿وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ﴾ اور مجھے رسوا نہ کرنا جس دن سب اٹھائے جائیں گے۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالی انبیاء کرام کو رسوا بھی کرتا ہے "معاذ اللہ"

جواب: جب دلائل اور قرائن موجود ہوں کہ یہاں مخالف جانب ثابت نہیں تو یقیناً مخالف جانب نہیں ثابت ہوگی جیسا کہ کوئی کہے "ربنا لاتجمع بین الضدین" اے ہمارے رب دو ضدوں کو جمع نہ کر۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ دو ضدوں کو جمع کرنا جائز ہے، اسی طرح کوئی دعاء کرے "ربنا و لاتقلب القدیم حادثا" اے ہمارے رب قدیم کو حادث نہ بنا، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ قدیم کو حادث بنانا جائز ہے، یہاں مخالف جانب ممتنع لذاتہ ہے، جو چیز ذاتی طور پر ممتنع اور محال ہو اس کا پایا جانا ممکن نہیں۔ جن چیزوں کی مخالف جانب کا پایا جانا ممتنع لذاتہ نہیں، ان کی مخالف جانب ثابت ہوگی۔ جن دعاؤں کا تم نے ذکر کیا ہے ان کی مخالف جانب کا ثابت ہونا محال ہے جو قطعی دلائل سے واضح ہے۔ لیکن جس مسئلہ میں ہم بات کر رہے اس میں کوئی قطعی دلیل ثابت نہیں جس سے یہ واضح ہو اکہ اس کی مخالف جانب ثابت ہے،

هذا هو الاصل فاذا صار ذلک متروکا فی بعض الصور لدلیل مفصل لم یجب ترکه

فی سائر الصور بغیر دلیل "وباللہ التوفیق"

یہ ضابطہ اور قانون ہے جو ہم نے بیان کر دیا ہے، اس لئے بعض صورتوں تفصیل دلائل سے اگر مخالف جانب کو ثابت کرنا محال ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر جگہ محال ہو۔ اللہ تعالیٰ ہی توفیق عطاء فرمائے تو مسائل کی تفصیل سمجھ آتی ہے۔ جس سے مسائل واضح ہو جاتے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

سوال: اس سے پہلی دعاء میں ذکر فرمایا ﴿لاتَحمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا﴾ ہم پر بوجھ نہ ڈال اور اس دعاء میں ذکر فرمایا ﴿وَلاتُحَمِّلْنَا مَا لاطَاقَةَ لَنَابِهِ﴾ اور ہم سے نہ اٹھوا جس کی ہمیں طاقت نہیں۔ ان دونوں دعاؤں میں مختلف الفاظ ذکر کئے، پہلی دعاء میں "لاتحمل" ہے جو ثلاثی مجرد ہے۔ یعنی اس میں "حمل" ذکر ہے۔ دوسری دعاء میں "ولاتحملنا" ہے، جو ثلاثی مزید فیہ ہے، یعنی اس میں "تحمیل" کا ذکر ہے۔ ان میں وجہ فرق کیا ہے؟

جواب: مشکل کاموں کو اٹھانا ممکن ہے، اور جن کاموں کی طاقت ہی نہ ہو ان کو اٹھانا ممکن نہیں، اس وجہ سے تکلیف مالایطاق میں دعاء کی "ہم سے وہ نہ اٹھوا جن کی ہمیں طاقت نہیں، اور مشکل کاموں کیلئے دعاء کی "ہم پر مشکل کاموں کا بوجھ نہ ڈال"

"فالحاصل فیما لایطاق ھو التحمیل فقط اما الحمل فغیر ممکن واما الشاق فالحمل والتحمیل یمکنان فیہ فلھذا السبب خص الآیۃ الاخیرۃ بالتحمیل"

حاصل جواب یہ ہے کہ "مالایطاق" میں صرف تحمیل پائی گئی ہے "حمل" ممکن نہیں، یعنی اٹھوانا ممکن ہے کہ اٹھانے کا حکم دے دیا جائے لیکن اٹھانا ممکن نہیں اور مشکل کام ہوں لیکن اس درجہ کے نہ ہوں کہ ان کو اٹھانے کی طاقت ہی نہ ہو تو ان میں تحمیل اور حمل (اٹھوانا اور اٹھانا) دونوں ہی ممکن ہیں۔ یہاں چونکہ تکلیف مالایطاق نہ دینے کی دعاء ہے اس لئے اس مقام میں "تحمیل" کا ذکر کیا گیا ہے، اور پہلی دعاء میں بوجھ نہ ڈالنے کی دعاء ہے اس لئے اس میں اگرچہ بظاہر صرف "حمل" کو ذکر کیا گیا ہے لیکن ضمناً اس میں تحمیل کا ذکر بھی پایا گیا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾

"اور معاف کر ہمیں اور بخش دے ہمیں اور رحم کر ہم پر، تو ہمارا مولیٰ ہے، تو امداد فرما ہماری اوپر قوم کافرین کے"

سوال: عقل کا تقاضا تو یہ ہے کہ ﴿وَلاتُحَمِّلْنَا مَا لاطَاقَةَ لَنَابِهِ﴾ دعاء پہلے ہونی چاہئے تھی اور ﴿وَلاتَحمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا﴾ دعاء بعد میں ہونی چاہئے تھی کیونکہ جب یہ دعاء کی کہ مشقت آمیز مشکل کاموں کا بوجھ ہم پر

نہ ڈال تو یہ مستلزم ہے اسے کہ وہ تکلیف مالا یطاق کو نہ اٹھوانے کی پہلے دعاء کرے۔یعنی یوں دعاء کرتا کہ اے ہمارے رب ہم سے نہ اٹھوا جن کی ہمیں طاقت نہیں اور ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو مشکل اور مشقت آمیز ہے، جو ترتیب ذکر کی گئی ہے کیا اس میں بھی کوئی حکمت نظر آتی ہے؟

جواب: حقیقی علم تو اللہ تعالیٰ کو ہے،انسان کی رسائی (پہنچ) حقیقی طور پر اللہ تعالیٰ کی حکمتوں تک ممکن نہیں تاہم اپنے خیال سے یوں کہا جا سکتا ہے کہ انسان کے دو مقام ہیں،ایک یہ کہ وہ ظاہری شریعت پر عمل کرے،اور دوسرا یہ کہ مکاشفات کی ابتداء میں شروع ہونا۔

"وذلک هوان یشتغل بمعرفة الله وخدمته وطاعته وشکر نعمته"

اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی خدمت اور اس کی طاعت اور اس کا شکر بجالانے میں مشغول ہونا۔

ظاہری شریعت پر عمل کرنے کیلئے مشکل امور کا بوجھ نہ ڈالنے کی دعاء کی گئی کہ ہم ان پر عمل کر سکیں،عمل تب کر سکیں گے جب وہ مشکل نہ ہو بلکہ آسان ہو لیکن دوسرے مقام یعنی مکاشفات کے حصول کیلئے بندہ رب تعالیٰ کے حضور یوں عرض کر رہا ہے

"ولامعرفة تلیق بقدس عظمتک فان ذلک لایلیق بذکری وشکری وفکری ولاطاقة لی بذلک"

کہ اے میرے رب تیری پاکیزہ عظمت کے مطابق مجھے معرفت حاصل نہیں،اسی وجہ میرا ذکر میرا شکر میرا فکر تیری شان کے لائق نہیں،کیونکہ مجھے اس کی طاقت ہی حاصل نہیں۔

"ولما کانت الشریعة متقدمة علی الحقیقة لاجرم کان قوله ﴿وَلَاتَحۡمِلۡ عَلَيۡنَآ اِصۡرًا﴾ مقدما فی الذکر علی قوله ﴿وَلَاتُحَمِّلۡنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾

جبکہ شریعت پر عمل کرنا پہلے ضروری ہے،شریعت پر عمل کے ذریعے ہی ہے حقیقت تک پہنچنا ہے،شریعت پر عمل کرنے کے بغیر حقیقت تک پہنچنا ممکن نہیں،اسی وجہ سے پہلے دعاء کی ﴿رَبَّنَا وَلَاتَحۡمِلۡ عَلَيۡنَآ اِصۡرًا﴾ اے ہمارے رب ہم پر بوجھ نہ ڈال،پھر دعاء کی ﴿رَبَّنَا وَلَاتُحَمِّلۡنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾ اے ہمارے رب اور ہم سے نہ اٹھوا جس کی ہمیں طاقت نہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

سوال: اس مقام میں تمام دعاؤں میں جمع کے صیغے ذکر کئے گئے ہیں،حالانکہ کبھی دعاء کرنے والا ایک ہی شخص ہوتا ہے،تو جمع کے صیغے ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

جواب: "المقصود منه بیان ان قبول الدعاء عند الاجتماع الکمل،وذلک لان المهم

تاثیرات فاذا اجتمعت الارواح والدواعی علی شیء واحد کان حصوله اکمل"

دعاء کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دعاء قبول ہو جائے، اجتماعی دعاء کرنا زیادہ بہتر اور کامل ہوتا ہے، جب سب لوگ مل کر دعاء کرتے ہیں اور ان کی روحیں جمع ہوتی ہیں تو اس کی بہت بڑی تاثیر ہوتی ہے، اور دعاء کی قبولیت کامل طور پر پائی جاتی ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

تین دعاؤں میں "ربنا" ذکر کیا، ایک میں نہیں:

اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی تین دعاؤں میں بندہ رب تعالی سے ترک کی دعاء کرتا ہے، اے ہمارے رب "مؤاخذہ نہ فرما" اے ہمارے رب ہم پر بوجھ نہ ڈال، اے ہمارے رب ہم سے نہ اٹھوا جس کی ہمیں طاقت نہیں۔ چونکہ ابتداء میں بندہ اپنے آپ کو رب تعالی سے دور سمجھ رہا تھا، جب بندے نے عاجزی اور خشوع وخضوع سے رب تعالی کے حضور چند دعائیں کر دیں تو اب بندہ اپنے آپ کو رب تعالی کے قریب پاتا ہے۔

"ان العبد اذا واظب علی التفرع نال القرب من الله تعالی وهذا سر عظیم یطلع منه علی اسرار اخر والنداء انما یحتاج عندالبعد اما عندالقرب فلا"

بندہ جب اللہ تعالی کو عاجزی سے یاد کرتا رہتا ہے تو اسے قرب الہی حاصل ہو جاتا ہے، اور بندہ یہ خیال کرتا ہے کہ اگرچہ رب تعالی تو پہلے بھی میرے قریب تھا لیکن میں اس سے دور تھا، اس لئے رب کو "یاربنا" "اے ہمارے رب" کہہ کر پکار رہا تھا، اب بندہ اپنے آپ کو رب تعالی کے قریب سمجھتا ہے تو یہ کہتا ہے کہ اب نداء (پکارنے) کی کیا ضرورت ہے، اب پکارنے کے بغیر ہی عرض کر دیتا ہوں، ہمیں معاف فرما اور ہماری مغفرت فرما اور ہم پر رحم فرما تو ہمارا مولی ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

عفو، مغفرت اور رحمت کی ترتیب میں اہم نکتہ:

بندہ تین چیزوں کی دعاء کا محتاج ہوتا ہے۔

(۱) اللہ تعالی اسے معاف فرمائے۔ (۲) اپنی رحمت فرمائے کہ اسے گناہوں پر سزا نہ دے۔

(۳) اللہ تعالی اس کی پردہ پوشی فرمائے کہ اس کے گناہ بندوں سے چھپے رہیں تاکہ اسے دوسروں کے سامنے رسوا نہ کرے۔

"واعف عنا" ای فیما بیننا وبینک مما تعلمه من تقصیر نا وزللنا"

یعنی جو ہمارے اور تیرے درمیان ہیں ان کو معاف فرمادے کیونکہ تو تو جانتا ہے ہماری کوتاہیوں اور لغزشوں کو، اس لئے معافی کی درخواست تجھی سے ہے۔

"واغفرلنا"ای فیما بیننا وبین عبادک فلا تظھر ھم علی مساوینا و اعمالنا القبیحۃ"

اور ہماری مغفرت فرما، یعنی جن کا تعلق ہمارے اور تیرے دوسرں بندوں کے درمیان ہے ان کو ڈھانپ دے، ان کی ستر پوشی فرما، ہمارے گناہ اور ہمارے برے اعمال ہم پر ظاہر نہ فرما۔

"وارحمنا"ای فیما یستقبل فلا توقعنا بتوفیقک فی ذنب آخر"

ہم پر رحم فرما، یعنی آئندہ بھی اپنی توفیق سے تو ہمیں گناہوں سے بچا کر رکھ، اگر ہم سے گناہ ہو جائے تو معاف فرما۔
(ماخوذ از ابن کثیر)

وضاحت: "عفو" کا مطلب ہے کہ اس کے گناہ معاف کردئے جائیں، مغفرت کا مطلب ہے کہ اس کی پردہ پوشی کی جائے کہ وہ خجالت و فضیحت (شرمندگی اور رسوائی) سے محفوظ رہے، گویا کہ بندہ کہتا ہے میں تجھ سے معافی طلب کرتا ہوں، جب تو مجھے معاف کردے تو میری پردہ پوشی فرما۔

"فان الخلاص من عذاب القبر انما یطیب اذا حصل عقیبہ الخلاص من عذاب الفضیحۃ"

کیونکہ عذاب قبر سے خلاصی بھی اس وقت نفع مند ہوگی اور اچھی نظر آئے گی جب کہ محشر میں دوسروں کے سامنے رسوائی نہ ہوئی۔ قبر کا عذاب، جسمانی عذاب ہے اور لوگوں کے سامنے محشر میں رسوائی روحانی عذاب ہے۔

"فلما تخلص منھما اقبل علی طلب الثواب" جب ان دونوں عذابوں یعنی عذاب جسمانی اور عذاب روحانی سے راحت کی دعاء کرلی تو پھر ثواب کی طلب کی بندہ دعاء کرتا ہے، ثواب کی بھی دو قسمیں ہیں ثواب جسمانی اور ثواب روحانی۔

ثواب جسمانی: وہ جنت کی نعمتیں، پاک اور لزیز نعمتیں رب تعالی سے طلب کی جارہی ہیں۔ ثواب روحانی سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالی کے جلال کے نور کی تجلیات حاصل ہوجائیں، اور انسان کو اپنی وسعت کے مطابق اس پر اللہ تعالی کی کبریائی حاصل ہوجائے۔ اور اللہ تعالی کے حضور اس کے نور میں کامل طور پر مستغرق ہوجائے، بندہ جسمانی ثواب کو طلب کرنے کیلئے رب تعالی کے حضور عرض کرتا ہے "وارحمنا" (اور ہم پر رحم فرما) اور ثواب روحانی کی طلب کیلئے عرض کرتا ہے "وانت مولنا" اور تو ہمارا مولی ہے۔

"ان یصیر العبد مقبلا بکلیتہ علی اللہ تعالی لان قولہ تعالی ﴿اَنْتَ مَوْلٰنَا﴾ خطاب الحاضرین"

یعنی بندہ رب تعالی کے حضور ﴿اَنۡتَ مَوۡلٰنَا﴾ کہہ کر کامل طور پر متوجہ ہو جاتا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالی کا ارشاد جو بندوں کی دعاء کی حکایت ہے، بلکہ بندوں کو دعاء کا جو طریقہ بتایا گیا ہے، اس میں جو یہ فرمایا گیا ہے ﴿اَنۡتَ مَوۡلٰنَا﴾ "تو ہمارا مولی ہے" یہ اسی وقت بندہ رب تعالی کے حضور اپنے آپ کو قریب سمجھتا ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ میں خود رب تعالی کے قریب ہو چکا ہوں، اگر چہ وہ تو پہلے ہی میرے قریب تھا۔ بندہ اپنے آپ کو اس درجہ میں دیکھ کر ثواب روحانی کا مطالبہ کرتا ہے کہ میں اللہ تعالی کے نور کی تجلیات میں مستغرق ہو جاؤں۔

تنبیہ: متکلمین روحانیت، مکاشفہ، اور تقرب الہی جو صوفیاء کرام کے مسالک میں چیزیں آتی ہیں ان کے قائل نہیں، وہ صرف طاعت وغیرہ کے قائل ہیں۔ یوں کہیں کہ متکلمین اصحاب ظواہر ہیں۔ اصحاب ظواہر حقائق کو نہیں جانتے بلکہ قرآن وحدیث کے ظاہر الفاظ کا ظاہری ترجمہ جانتے ہیں، جب حقائق کو نہیں جانتے تو بھٹکتے ہی رہتے ہیں، کہیں رب تعالی کی شان میں گستاخی کر دی ﴿نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمۡ﴾ کا ترجمہ یوں کر دیا وہ اللہ کو بھول گئے، اللہ ان کو بھول گیا۔ ان کو یہ بھی پتہ نہ چل سکا کہ اللہ تعالی تو بھولنے سے پاک ہے،

سبحان اللہ ! اصحاب معرفت میں سے اعلی حضرت مولانا الشاہ احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے "حقیقت کو پہچانتے ہوئے کہ اللہ تعالی بھولنے سے تو پاک ہے" کیا خوب ترجمہ فرمایا انہوں نے اللہ کو چھوڑ دیا اللہ نے ان کو چھوڑ دیا۔ پھر اصحاب ظواہر نے کبھی رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کر دی ﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى﴾ کا ترجمہ کر دیا اور پایا تمہیں بھٹکا ہوا تو ہدایت دی۔ لیکن اس کے برخلاف اصحاب معرفت محبان رسول اللہ ﷺ نے کیا خوب ترجمہ فرمایا اور تمہیں اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو اپنی طرف راہ دی۔ (اعلی حضرت)

علامہ رازی رحمہ اللہ متکلمین کے متعلق کیا خوب فرماتے ہیں۔

" ولعل كثيرا من المتكلمين يستبعدون هذه الكمات ويقولون انها من باب الطاعات ولقد صدقوا فيما يقولون فذلك مبلغهم من العلم ان ربك هو اعلم بمن ضل عن سبيله وهو اعلم بمن اهتدى"

چونکہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے ثواب روحانی کا تذکرہ کیا، پھر اس کی وضاحت کی کہ ثواب روحانی کیا ہے، اس کے بعد فرمایا کہ شاید بہت سے متکلمین یہ کہیں کہ یہ عقلا بعید ہے کہ بندہ رب تعالی کے قریب ہو جائے اور اسے رب تعالی کے نور کی تجلیات میں مستغرق کر دے، علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں بات انہوں نے بھی سچ کی کیونکہ انہوں نے بات اپنے علم کے مطابق کی، ان کے علم کی رسائی ہی یہاں تک ہے۔ جو رب تعالی سے دور ہیں وہ رب تعالی کے قرب کو کیا جانیں، لہذا ان کا یہ کہنا کہ ان الفاظ کے معانی سے صرف ظاہر طور پر اطاعت سمجھ آتی ہے، معرفت کی باتیں درست

نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ جو معرفت سے دور ہے اسے معرفت کیا حاصل ہو سکتی ہے؟ رب تعالی کا ارشاد گرامی:

﴿اِنَّ رَبَّکَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى﴾

بیشک آپ کا رب جانتا ہے جو سیدھی راہ سے بھٹک جاتا ہے اور جانتا ہے اسے جس نے ہدایت حاصل کر لی۔

جب رب تعالی نے واضح کر دیا کہ کچھ لوگ بھٹکے ہوئے ہیں، اور کچھ ہدایت پر قائم ہیں تو ہمیں ان پر شکوہ ہی کیا ہے کہ وہ معرفت کیوں انکار کرتے ہیں۔ جسے رب تعالی معرفت سے دور رکھے ہماری کیا مجال کہ ہم اسے معرفت عطاء کر دیں، معاملہ قسمت کا ہے، کسی کو رب تعالی اپنے قریب کر لیتا ہے اور کسی کو دور ہی رکھتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر بوضاحت)

﴿اَنْتَ مَوْلٰنَا﴾ کہنے میں ایک اور فائدہ:

بندہ جب رب تعالی کے حضور ﴿اَنْــتَ مَـوْلٰـنَــا﴾ کہتا ہے تو اپنی عاجزی، بیکسی اور بے بسی کا تذکرہ کرتا ہے۔ "والاعتراف بانه سبحانه هو المتولی لکل نعمة یصلون الیها" اور یہ اعتراف کرتا ہے کہ اللہ تعالی ہی ہر نعمت کا مالک ہے، اسی کی توفیق اور اسی کی عطاء سے وہ ان نعمتوں کو حاصل کر لیتے ہیں، ورنہ وہ ان نعمتوں سے ہی محروم رہیں۔ اور بندہ یہ اعتراف کرتا ہے کہ رب تعالی ہی تکریم عطاء فرماتا ہے، اسی کی عطاء سے کامیابی حاصل ہوتی ہے اسی وجہ سے وہ اپنی دعاء میں اللہ تعالی کے فضل واحسان کا تذکرہ کرتا ہے۔

"فهو بمنزلة الطفل الذی لاتتم مصلحته الابتدبیر قیمه"

جس طرح بچے کی کوئی پرورش کرنے والا نہ ہو، اس کا کوئی مدبر نہ ہو اور اس کا کوئی مصلح نہ ہو تو وہ نہ ہی پرورش پا سکتا ہے، نہ ہی اس کی اصلاح ہوتی ہے، اسی طرح بلاتشبیہ وتمثیل:

"والعبد الذی لاینتظم شمل مهماته الاباصلاح مولاه فهو سبحانه قیوم السماوات والارض والقائم باصلاح مهمات الکل وهو المتولی فی الحقیقة للکل"

بندہ اپنی اصلاح نہیں کر سکتا اور اپنے امور کا خود منتظم نہیں ہو سکتا جب تک اللہ تعالی اس کی اصلاح نہ کرے، وہ ہی مولی ہے، وہی زمین وآسمان کو قائم رکھنے والا ہے وہی تمام اہم کاموں کی اصلاح کرنے والا ہے، وہی مشکلات کو دور کرنے والا ہے، حقیقت میں ہر کام کا وہی متولی ہے۔

اللہ تعالی کے ارشادات گرامی اس پر واضح طور پر دلالت کر رہے ہیں: ﴿نِـعْـمَ الْـمَـوْلٰـى وَنِـعْـمَ النَّـصِيْـرُ﴾ وہی بہتر مولی اور بہتر مددگار ہے۔ ﴿اَللّٰــهُ وَلِــيُّ الَّــذِيْـنَ اٰمَـنُوْا﴾ اللہ تعالی ایمان والوں کا ولی (مددگار) ہے۔ ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰهُ﴾ بیشک اللہ ہی مولی (مددگار) ہے۔ ﴿ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ

اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْکٰفِرِیْنَ لَا مَوْلٰی لَھُمْ﴾ یہ اس وجہ سے کہ بیشک اللہ ایمان والوں کا مولی، اور بیشک کافروں کا کوئی مولی نہیں۔
(ماخوذ از کبیر)

﴿فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ ''تو ہماری امداد فرما کافروں کی قوم پر''

یعنی ان کے ساتھ جنگوں میں ہماری امداد فرما، اور ان کے ساتھ مناظرہ کرنے میں دلائل میں ان پر غالب آنے کی ہماری امداد فرما۔ اور اسلام کی سربلندی کیلئے ان کے ادیان باطلہ (باطل دینوں) کے خلاف ہماری امداد فرما ﴿لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ تا کہ اسلام کا تمام دینوں پر غلبہ ہو جائے۔

"ومن المحققين من قال ﴿فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ المراد منه اعانة الله بالقوة الروحانية الملكية على قهر القوى الجسمانية الداعية الى ماسوى الله"

اصحاب معرفت محققین نے بیان کیا ہے یہاں جس امداد کی دعاء کی جارہی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ اے ہمارے مولی ہمیں قوت روحانیہ عطاء کر کے جسمانی قوتوں کے خلاف ہماری امداد فرما جو جسمانی قوتیں ہمیں تجھ سے پھیر کر اوروں کی طرف لگادیں، یعنی جسمانی قوتیں روحانی قوتوں کی منکر اور کافر ہیں، ان کے خلاف ہماری امداد فرما، تو ہی ہمارا مولی ہے، تو ہی ہمارا مددگار ہے، تو ہی ہمارا پرودگار ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

﴿فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ باقامة الحجة و الغلبة فى قتالهم فان من شان مولى ان ينصر مواليه على الاعداء" (جلالین)

فان من شان المولى ان ينصر مواليه اى عبيده" اشار بهذا الى تقرير السببية المستفادة من الفاء اى طلب النصرة بتسبب عن اتصافه بكونه مولاه" (حاشیہ جلالین)

جلالین میں ﴿فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ کی تفسیر کی کہ ہماری کافروں پر دلائل قائم کرنے اور ان کے ساتھ جنگ کرنے میں امداد فرما اس لئے کہ تو ہمارا مولی ہے، مولی کی شان کریمی کے لائق ہی یہ ہے کہ وہ دشمنوں کے خلاف اپنے غلاموں کی امداد فرماتا ہے، اس پر حاشیہ جلالین میں ذکر کیا گیا ہے کہ یہ مسئلہ "فانصرنا" کی فاء سے حاصل ہوا، جو سببیت پر دلالت کر رہی ہے کہ ہم تجھ سے اس لئے امداد کر رہے ہے کہ تو ''مولی'' کی صفت سے متصف ہے، تیرا مولی ہونا سبب ہے ہمارے مطالبہ کا کہ ہم تیرے حضور دعاء کر رہے ہیں کہ تو ہماری امداد فرما۔ (جلالین مع حاشیہ)

''مولیٰ'' کے معانی:

مولی "مفعل" کے وزن پر ہے "ولی، یلی" سے لیا ہوا ہے، مصدر بھی آتا رہتا ہے اور ظرف بھی۔ مولی کا معنیٰ'' مالک التدبیر'' اور ضرر کو دور کرنے والا اور فائدہ پہنچانے والا، سردار۔ مددگار چچا کا بیٹا۔ "مولی'' اصل میں مصدر ہے پھر بطور اسم بھی استعمال ہوتا رہتا ہے۔ (البحر المحیط)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

طلباء کرام مختصر المعانی کی بحثوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ سمجھیں، ﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ﴾ میں طباق لفظی پایا گیا ہے، اور ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾ میں طباق معنوی پایا گیا ہے۔ کیونکہ ''لها'' میں لام نفع کیلئے ہے۔ اور "علیها" میں "علی" ضرر کیلئے ہے۔ ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾ میں "ما" کا تکرار تنبیہ اور تاکید کیلئے ہے۔ "امن" اور ''مؤمنون'' میں ''تجنیس'' پائی گئی ہے، جسے علم بدیع میں زیادہ طور پر جناس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چونکہ ''امن'' فعل ہے اور ''مؤمنون'' اسم ہے ہے اسلئے تجنیس مغایرۃ مکمل نام ہے۔ (از البحر المحیط)

فضائل سورۃ بقرۃ پر احادیث مبارکہ:

اکثر مفسرین کرام نے سورۃ بقرہ کے آخر میں فضائل والی احادیث کو ذکر کیا ہے اگر چہ بعض کا ذکر سورۃ فاتحہ میں اور بعض کا ذکر سورۃ بقرہ کی ابتداء میں بھی آچکا ہے لیکن حصول برکت کیلئے اختتام بھی احادیث مبارکہ سے۔

❁ **"عن ابن مسعود قال قال رسول الله ﷺ من قرأ بالآيتين من آخر سورة البقرة في ليلة كفتاه"** (بخاری)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے سورۃ بقرۃ کی آخری دو آیتوں کو (ہر) رات میں پڑھا تو وہ دونوں اس کی کفایت کریں گی۔ (از صابونی وابن کثیر)

❁ **"عن ابی ذر قال قال رسول الله ﷺ اعطيت خواتيم سورة البقرة من كنز تحت العرش لم يعطهن نبي قبلي"** (مسند احمد)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے سورۃ بقرہ کی آخری آیتیں عرش کے نیچے خزانہ سے عطاء کی گئی ہیں، جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو عطاء نہیں کی گئیں۔ (از صابونی وابن کثیر)

❁ **عن عبد الله قال لما اسرى برسول الله ﷺ انتهى به الىٰ سدرة المنتهى وهي في السماء**

السابعة. الیها ینتهی مایعرج من الارض فیقبض منها والیها ینتهی مایهبط من فوقها فیقبض منها قال "اذیغشی السدرة مایغشی" قال فراش من ذهب قال واعطی رسول اللہ ﷺ ثلاثا اعطی الصلوات الخمس واعطی خواتیم سورة البقرة وغفرلمن لم یشرک باللہ من امتہ شیئامن المقمحات" (مسلم)

حضرت عبداللہ (بن مسعود) ؓ فرماتے ہیں جب رسول اللہ ﷺ کومعراج کرایا گیا تو آپ کوسدرۃ المنتہیٰ پر لے جایا گیا جوساتویں آسمان میں ہے، زمین سے چڑھنے والے یہاں تک ہی پہنچ سکتے ہیں اور یہاں ہی ان کوروک لیا جاتا ہے اور سدرۃ المنتہیٰ سے اوپر والوں کو نیچے آنے میں بھی یہیں روک لیا جاتا ہے اور نیچے نہیں آنے دیا جاتا، رب تعالیٰ نے خود فرمایا ﴿اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى﴾ سدرہ کوڈھانپ دیا جوڈھانپ دیا۔ یعنی سونے کے فراش سے ڈھانپ دیا گیا، نبی کریم ﷺ کوتین چیزیں عطاء کی گئیں، پانچ نمازیں عطاء کی گئیں، اور سورۃ بقرہ کی آخری آیات عطاء کی گئیں اور آپ کی امت میں سے جس نے شرک نہیں کیا ہوگا اس کے گناہوں کووہ معاف کردے گا۔ (از صابونی وابن کثیر)

خواہ ان کے گناہوں کوان کی توبہ سے معاف کردے یا اپنے فضل وکرم سے معاف فرمادے، زیادہ مناسب یہ دوسرا معنی ہے، کیونکہ توبہ سے تو شرک بھی معاف ہوجاتا اس لئے کہ شرک سے توبہ ہی یہ ہے کہ شرک چھوڑ دے اور ایمان لے آئے۔

❁ "عن عقبة بن عامر الجهنی قال قال رسول اللہ ﷺ اقرأالآیتین من آخر سورة البقرة فانی اعطیتهما من کنز تحت العرش" (مسند احمد)

عقبہ بن عامر جہنی ؓ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سورۃ بقرہ کی آخری دوآیتیں پڑھو (یعنی پڑھا کرو) بیشک یہ دونوں آیتیں مجھے عرش کے نیچے خزانہ سے عطاء کی گئیں۔

❁ عن حذیفةقال قال رسول اللہ ﷺ فضلنا علی الناس بثلاث او تیت هذه الأیات من آخر سورة البقرة من بیت کنز تحت العر ش لم یعطها احد قبلی و لا یعطا ها احد بعدی" (ابن مردویہ)

حضرت حذیفہ ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہمیں تین چیزوں سے فضیلت دی گئی مجھے سورۃ بقرہ کی یہ آخری آیات عرش کے نیچے خزانے سے عطاء کی گئیں نہ مجھ سے پہلے کسی کودی گئیں اور نہ ہی میرے بعد کسی کودی جائیں گی۔

❁ عن الحارث عن علی قال لاأری احداعقل الاسلام ینام حتی یقرأآیة الکرسی وخواتیم سورة البقرة فانهامن کنزاعطیه نبیکم من تحت العرش" (ابن مردویہ)

حضرت علی ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں نہیں دیکھتا کسی شخص کو کہ وہ اسلام کی سمجھ رکھتا ہو وہ سوجائے یہاں تک کہ وہ آیۃ الکرسی پڑھ لے اور سورۃ بقرہ کی آخری آیات پڑھ لے بیشک یہ تمہارے نبی کوعرش کے نیچے خزانہ

سے عطاء کی گئیں۔

❁ "عن النعمان بن بشیر عن النبی ﷺ قال ان اللہ کتب کتابا قبل ان یخلق السماوات والارض بالفی عام انزل منہ آیتین ختم بھما سورۃ البقرہ ولا یقرأ بھن فی دار ثلاث لیال فیقربھا شیطان"
(رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث غریب)

حضرت نعمان بن بشیر ﷺ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالی نے ایک کتاب لکھی زمین وآسمانوں کی تخلیق سے پہلے دو ہزار سال اس سے دو آیتیں نازل کی گئیں جن کے ساتھ سورۃ بقرہ کو ختم کیا گیا وہ نہ پڑھی جائیں گی کسی گھر میں تین راتیں (مسلسل) کہ شیطان اس گھر کے قریب ہو۔ مطلب واضح ہے کہ زمین وآسمان کی تخلیق سے دو ہزار سال پہلے ایک کتاب (لوح محفوظ) لکھی گئی اسی سے سورۃ بقرہ کی آخری دو آیتوں کو نازل کیا گیا جب وہ دو آیتیں کسی گھر میں تین راتیں مسلسل پڑھی جائیں تو اس گھر میں شیطان نہیں آتا۔

❁ "عن ابن عباس قال کان رسول اللہ ﷺ اذا قرأ آخر سورۃ البقرۃ وآیۃ الکرسی ضحک وقال انھما من کنز الرحمن تحت العرش واذا قرا ﴿مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءً یُّجْزَ بِہٖ﴾ ﴿وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰیO وَاَنَّ سَعْیَہٗ سَوْفَ یُرٰیO ثُمَّ یُجْزٰہُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰیO﴾ استرجع واستکان" (ابن مردویہ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جب رسول اللہ ﷺ نے سورۃ بقرہ کی آخری آیات اور آیۃ الکرسی پڑھی تو آپ مسکرائے آپ نے فرمایا بیشک یہ دونوں عرش کے نیچے رحمان کے خزانے سے نازل کی گئیں اور آپ نے جب ﴿مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءً یُّجْزَ بِہٖ﴾ اور ﴿وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی ☆ وَاَنَّ سَعْیَہٗ سَوْفَ یُرٰی ☆ ثُمَّ یُجْزٰہُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰی﴾ پڑھا تو آپ نے ﴿اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ﴾ اور اظہار عجز کیا۔ چونکہ ﴿مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءً یُّجْزَ بِہٖ﴾ کا معنی یہ ہے اور جس شخص نے برا عمل کیا تو اسے اس کا بدلہ دیا جائے گا اور ﴿وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰیO وَاَنَّ سَعْیَہٗ سَوْفَ یُرٰیO ثُمَّ یُجْزٰہُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰیO﴾ کا معنی یہ ہے اور بیشک انسان کیلئے نہیں مگر وہی جو اس نے کوشش کی اور بیشک اس کی کوشش کا بدلہ) کو اسے دکھا دیا جائے گا (یعنی اس کی کوش اس کے سامنے آجائے گی) پھر اسے پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

یہی وجہ تھی آپ کے ﴿اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ﴾ ان آیات کے بعد پڑھنے کی اور عجز کے اظہار کی کیونکہ آپ نے اپنی امت کو تعلیم دی کہ وہ اپنے حساب وکتاب سے ڈرتے رہیں۔

❁ عن معقل بن یسار قال قال رسول اللہ ﷺ اعطیت فاتحۃ الکتاب وخوایتم سورۃ البقرۃ من تحت العرش" (ابن مردویہ)

معقل بن یسار ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے کتاب اللہ کی سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ کی آخری آیات عرش کے نیچے سے دی گئی ہیں۔

❁ عن ابن عباس قال بينا رسول الله ﷺ وعنده جبريل اذ سمع قيضا فوقه فرفع جبريل بصره الى السماء فقال هذا باب قد فتح من السماء ما فتح قط قال فنزل منه ملك فآتى النبی ﷺ فقال له البشر بنورين قد اوتيتهما لم يؤتهما نبی قبلك فاتحه الكتاب وخواتيم سورة البقرة لن تقرأ حرفا منهما الااوتيته" (رواه مسلم والنسائی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے اور آپ کے پاس جبریل تھے اسی دوران انہوں نے اپنے اوپر (آسمانوں میں) ایک چرچراہٹ سنی تو جبریل نے اپنی نظر کو آسمانوں کی طرف اٹھایا تو کہا آسمانوں میں ایک دروازہ کھلا ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں کھلا فرمایا اس سے ایک فرشتہ نازل ہوا جو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آیا تو اس نے کہا آپ خوش ہو جائیں دو نوروں سے تحقیق وہ دونوں میں لے کر آیا ہوں جو آپ سے پہلے وہ دونوں نور کسی نبی کو عطاء نہیں کیے گئے وہ فاتحہ الکتاب ہے اور سورۃ بقرہ کی آخری آیات ہیں ہرگز ان سے تم کوئی حرف نہیں پڑھو گے مگر میں اسے (اس کا بدلہ) دوں گا۔ (تمام احادیث ابن کثیر اور صابونی سے حاصل کی گئی ہیں)

آخر میں قرطبی سے اقتباس:

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ کے تحت لکھا ہے۔

" وفی معنی هذه الاية ما حكاه ابوهريرة رضی الله عنه قال ما وددت ان احدا ولدتنی امه الاجعفر بن ابی طالب فانی تبعة يو ما وانا جائع فلما بلغ منزله لم يجد فيه سوی نحی سمن قد بقی فيه الارة فشقه بين ايدينا فجعلنا نلعق مافيه من السمن والرب وهويقول:

ما كلف الله نفسا فوق طاقتها ولا تجود يد الا بما تجد

حضرت ابوہریرہ ﷺ فرماتے ہیں میں نے کسی ایک کے متعلق اس کی خواہش نہیں کی کہ کاش اس شخص کی ماں مجھے بھی جنتی سوائے جعفر بن ابی طالب کے (آگے واقعہ بیان کرتے ہیں) بیشک ایک دن میں ان کے ساتھ چلا میں بھوکا تھا جب وہ اپنے گھر پہنچے تو انہوں نے سوائے گھی کے ایک چمڑے کے برتن کے کچھ نہ پایا اس میں بھی گھی کے کچھ آثار تھے آپ نے اسے ہمارے سامنے نچوڑا ہم گھی اور کھجور کا شیرازہ اس میں سے چاٹنے لگے آپ فرما رہے تھے۔

اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی طاقت سے زائد تکلیف نہیں دیتا کوئی ہاتھ سخاوت نہیں کرتا سوائے اس کے کہ جو وہ پاتا ہے راقم نے بھی حضرت جعفر بن ابی طالب ﷺ کے اس شعر کے مطابق اپنی وسعت کے مطابق سورۃ بقرہ کی توضیحات وتشریحات معتبر تفاسیر سے نقل کر دیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور رسول اللہ ﷺ کی رحمت اور میرے والدین مرحومین اور میرے شیخ حضرت غلام محی الدین المعروف **بابو جی** گولڑوی رحمہ اللہ کی غیبی امداد اور استاذی المکرم حضرت علامہ ابوالحسنات **محمد اشرف** سیالوی مدظلہ العالی کی شفقت ودعاء سے یہ کام ہوا اور "**نہ من آنم کہ من دانم**" کہاں رب تعالیٰ کا کلام کہاں میرے جیسا ہیچمدان"

عبد الرزاق بھترالوی حطاروی ابن قاضی عبد العزیز ابن قاضی فیض احمد ابن قاضی غلام نبی رحمہم اللہ"

اختتام بروز اتوار بعد از نماز فجر ۱۲ ذوالحجۃ ۱۴۲۵ھ ۲۳ جنوری ۲۰۰۵ء

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورة آل عمران:آج پیر بوقت سحر ۱۳ ذوالحج ۱۴۲۵ھ ۲۴ جنوری ۲۰۰۵ء کوترجمہ وتشریحات کا آغاز کررہا ہوں۔اللہ تعالیٰ فضل وکرم فرمائے کہ تفاسیر کے اقوال نقل کرنے میں کوئی غلطی سرزدنہ ہو،اوررسول اللہ ﷺ کے وسیلہ جلیلہ سے اختتام کی توفیق عطاء فرمائے۔آمین یا رب العلمین بحرمة سید المرسلین وببرکة عباده الصالحین المقربین۔

سورۃ آل عمران کی وجہ تسمیہ:

جیسا کہ سورۃ بقرہ میں بیان کیا جاچکا ہے کہ کسی ایک مضمون کی وجہ سے سورۃ کا نام رکھ لیا گیا۔اس سورۃ پاک میں آل عمران کو چن لینے اور برگزیدہ کرنے کا تذکرہ کیا گیا ہے،اس لئے اس کا نام ہی آل عمران رکھ دیا گیا۔عمران حضرت مریم کے والد کا نام ہے۔اس سورۃ پاک میں عمران کی زوجہ یعنی حضرت مریم کی والدہ،اور حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے برگزیدہ کرنے کا ذکر ہے،اوراتنی تفصیل سے جتنا کسی اورسورۃ پاک میں نہیں

"وقد جعل هذا الاصطفاء دليلا على اصطفاء نبينا محمد ﷺ وجعله متبوعا لكل محب لله ومحبوب له"

آل عمران کے برگزیدہ بنانے کورسول اللہ ﷺ کے برگزیدہ بنانے پردلیل بنایا گیا ہے۔یعنی جب آل عمران رب تعالیٰ کے چنے ہوئے پسندیدہ لوگ ہیں تو یقیناً سیدالانبیاء وسیدالکائنات بھی رب تعالیٰ کے چنے ہوئے پسندیدہ رسول ہیں۔اوراللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے اوراللہ تعالیٰ کے محبوب لوگوں میں سے ہر شخص رسول اللہ ﷺ کا تابع بنایا اورآپ کوتمام کا متبوع بنایا گیا۔

سورۃ آل عمران کے اورنام:

﴿الزهراء﴾ "زہرا" کا معنی ہے آب وتاب والی کلی۔جس طرح پودے کی کلی پودے سے نمایاں نظر آتی ہے اورواضح ہوتی ہے اسی طرح اس سورۃ پاک میں عیسیٰ علیہ السلام کی شان واضح طور پر بیان کردی گئی جس سے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق شکوک وشبہات کودورکردیا گیا۔

﴿الامان﴾ **"لان من تمسک بما فيها أمن من الغلط فی شأنه"** اس سورۃ کا نام امان رکھا گیا،اس لئے کہ جس شخص نے اس سورۃ پاک کے مضامین سے دلائل حاصل کئے اوران پرایمان رکھا تووہ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق

شکوک وشبہات سے بچ جائے، اور غلطی سے محفوظ ہو کر امن میں رہے گا۔

(مجادلۃ) اس سورۃ پاک میں اہل نجران کا رسول اللہ ﷺ سے محبت ومباحثہ کی وجہ سے جدال کرنا بھی مذکور ہے، اسی وجہ سے اس سورۃ پاک کا نام مجادلہ بھی رکھا گیا ہے۔ (ماخوذ از تنویر الابصار)

سورۃ پاک میں کلمات وحروف کی تعداد:

یہ سورۃ مدنی ہے، علماء کرام کا اتفاق ہے کہ یہ مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی۔ اس کے بیس رکوع دوسو آیتیں ۳۵۴۲ الفاظ اور ۱۵۳۳۶ حروف ہیں۔

اس سورۃ پاک کے مضامین:

محکمات اور متشابہات کا ذکر کیا گیا، کہ محکمات کو سمجھیں اور ان پر عمل کریں لیکن متشابہات پر ایمان رکھیں اور ان کی تاویلوں کو تلاش نہ کریں۔ ان کی تاویلوں کو اللہ تعالی ہی بہتر جانتا ہے۔

❁ اور بیان کیا گیا کہ دنیا کا مال ودولت اور آسائش ناپائیدار چیزیں ہیں، حقیقی نفع مند تقوی ہے جس سے انسان کو ہی کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

❁ اور دین اسلام کی حقانیت کو بیان کیا گیا ہے کہ اسی پر چل کر انسان کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔ کیونکہ یہ ضابطہ حیات ہے، یہ اللہ تعالی کا دین ہے جو حق ہے۔ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین میں تو حق ہونے یا باطل ہونے کا احتمال پایا جاتا ہے، لیکن اللہ تعالی کا دین تو حق ہی ہے، اس میں معاذ اللہ باطل ہونے کا وہم وگمان بھی نہیں کیا جاسکتا۔

دین اسلام میں کوئی تغیر وتبدل نہیں، زمانہ کے حالات بدلنے سے دین اسلام کے فرائض وواجبات وسنن ومستحاب میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی اور اس طرح محرمات ومکروہات ہمیشہ حرام اور مکروہ ہی رہیں گے، ہاں صرف مباحات میں اپنی مرضی کے مطابق کام کیا جاسکتا ہے۔

❁ اسی سے لسانی، علاقائی، وطنی گروہ بندیوں کو ختم کرنے کا ثبوت ملتا ہے کہ جب تم سب مسلمان ہو تو تمہیں چاہئے کہ تم سب اپنے آپ کو مسلمان سمجھ کر متحد ومتفق ہو کر رہو، چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ کر، آپس میں اختلاف پیدا کر کے، ایک دوسرے سے لڑ کر اپنے آپ کو تباہ وبرباد نہ کرو، پہلے اپنے آپ کو مسلمان سمجھو، پھر پاکستانی، ایرانی، افغانی، کا فرق کرو، ایک وطن والو پہلے اپنے آپ کو پاکستانی سمجھو پھر سندھی، بلوچی، سرحدی اور پنجابی

سمجھو،اسی میں تمہاری کامیابی کا راز ہے۔

❁ اور بیان کیا گیا کہ بادشاہت عطاء کرنا یا بادشاہت واپس لے لینا رب تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے۔اسی طرح کسی کو عزت دینا اور کسی کو ذلیل کرنا رب تعالیٰ کے ملک واختیار میں ہے۔

❁ اس سورۃ پاک میں آل عمران کا ذکر تفصیلی طور پر بیان ہوا،حضرت مریم کی کفالت کرنے والے ان کے خالو حضرت زکریا علیہ السلام کا ذکر بھی کیا گیا اور ان کی دعاء سے جو اللہ تعالیٰ نے ان کو بیٹا عطاء کیا جس کا نام بھی خود اللہ تعالیٰ نے ''یحییٰ'' رکھا۔ان کا ذکر بھی اس سورۃ پاک میں موجود ہے۔''البتہ ان کا نام اللہ تعالیٰ نے رکھا''اس کا ذکر سورۃ مریم میں ہے۔

❁ اہل نجران کا نبی کریم ﷺ سے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق مجادلہ،مباحثہ اور نبی کریم ﷺ کے دلائل اور مباہلہ کا ذکر بھی اسی سورۃ میں ہے۔

❁ ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہودیوں کے دعویٰ کہ وہ یہودی تھے اور عیسائیوں کے دعویٰ کہ وہ عیسائی تھے کا رد کیا گیا ہے کہ یہ تمہارے نظریات باطل ہیں وہ نہ یہودی تھے اور نہ ہی نصرانی تھے، بلکہ وہ دین حنیف پر قائم تھے۔

❁ کوئی شخص فدیہ دے کر اپنے آپ کو رب تعالیٰ کے عذاب سے نہیں چھڑا سکے گا،خوہ وہ زمین کی پرائی کے برابر بھی فدیہ کیوں نہ دے،اس کا فدیہ قبول نہیں کیا جا سکے گا۔

❁ اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا جائے جو اپنے آپ کو پسند ہو،ردی اور نکما مال نہ خرچ کیا جائے۔

❁ مکہ میں سب سے پہلے بننے والے گھر کعبہ شریف،جو برکت والا اور ہدایت ہے،یہ بھی اسی سورۃ میں مذکور ہے۔

❁ اللہ تعالیٰ کے دین کی رسی کو متفق اور متحد ہو کر تھامنے اور تفرقہ پیدا نہ کرنے کا ذکر بھی اسی سورۃ پاک میں موجود ہے۔

❁ اور اس سورۃ پاک میں اچھے کاموں کا حکم دیا گیا اور برے کاموں سے روکنے کا حکم دیا گیا۔

❁ اور جنگ بدر اور جنگ بدر میں فرشتوں کی امداد کا ذکر کیا گیا ہے۔

❁ جنگ احد اور اس میں نبی کریم ﷺ کے زخمی ہونے اور صحابہ کرام کے زخمی ہونے اور شہید ہونے اور شہید ہونے والوں کی جاودانی زندگی کا ذکر کیا گیا۔یہ مختصر خاکہ تھا جو پیش کیا گیا۔تفصیل انشاء اللہ آیات کے تحت ہی آئے گی۔

تنبیہ: بعض حضرات نے اس سورۃ کی دوسو آیتیں بیان کی ہیں،انہوں نے ''بسم اللہ'' کو بھی سورۃ

کی آیۃ کہا ہے بعض حضرات نے اس سورۃ کی آیتیں ایک سوننانوے بیان کی ہیں، ان کے نزدیک ''بسم اللہ'' صرف دوسورتوں میں فرق کے لئے آئی ہوئی ہے، سورۃ کی جزء نہیں۔ (صاوی)

فائدہ جلیلہ: وردفی فضل هذه السورة انها امان من الحيات و كنز للفقير وانه يكتب لمن قرأمنها ان فى خلق السماوات والارض الى آخرها آخر الليل ثواب من قام الليل كله"

اس سورۃ پاک کی فضیلت کا ذکر کیا گیا ہے کہ جو یہ سورۃ پڑھتا ہے وہ سانپوں سے محفوظ رہتا ہے۔ اور فقیر کیلئے یہ خزانہ ہے۔ یعنی فقیر پڑھے تو فقر سے اسے نجات حاصل ہوتی ہے۔ اور رات کے آخری حصہ میں یعنی سحر کے وقت اس سورۃ کی آخری آیات (اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ) سے لے کر سورۃ کے آخر تک پڑھتا ہے اسے ایک سال کی رات کی نفلی عبادت کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔ (صاوی)

زہراء نام پر حدیث پاک:

عن ابى امامة الباهلى قال سمعت رسول الله ﷺ يقول اقرء واالقرآن فانه ياتى يوم القيامة شفيعا لأصحابه اقرء والزهراوين البقرة وسورة آل عمران فانهما يأتيان يوم القيامة كانهما غمامتان او كانهما غيايتان او كانهما فرقان من طير صواف تحاجان عن اصحابهما اقرء وا سورة البقرة فان اخذها بركة وتركها حسرة ولا يستطيعها البطلة"

(رواہ مسلم)

ابوامامہ باہلی کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے میں نے سنا کہ قرآن پڑھو، بیشک قیامت کے دن یہ پڑھنے والوں کی سفارش کرے گا، پھر فرمایا دوسورتیں جن کے نام زہرا ہیں وہ پڑھو، وہ سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران ہیں۔ بیشک یہ دونوں قیامت کے دن (پڑھنے والے کے سر پر) بادل کی طرح سایہ کئے ہوں گی، یا صف بنا کر اڑنے والے پرندوں کی دو جماعتوں کی طرح پڑھنے والے پر سایہ کئے ہوں گی، اور پڑھنے والوں کیلئے رب تعالی سے بخشش کیلئے جھگڑا کریں گی۔ سورۃ بقرۃ پڑھو، بیشک اس کا پڑھنا برکت ہے، اور اس کا چھوڑنا حسرت ہے اور اس پر جادوگر جادو کی طاقت نہیں رکھتے۔

"الغمام" اسحاب الملتف" گھنے بادلوں کو غمام کہا جاتا ہے۔ "الغياية" اذا كانت قريبا من الراس" جب گھنے بادل سر کے قریب سائبان کی طرح سایہ کئے ہوئے ہوں تو ان کو "غیایۃ" کہا جاتا ہے۔

"والمعنى ان قارئهما فى ظل ثوابهما" معنی یہ ہے کہ سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران کو پڑھنے والا شخص

ان کے ثواب کے سایہ میں ہوگا۔ "وقال معاوية وبلغنى ان البطلة السحرة" حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مجھے یہ خبر ملی ہے کہ حدیث شریف میں جو لفظ "البطلة" استعمال ہوا ہے اس کا معنی ہے جادوگر۔ یعنی سورۃ بقرۃ کی تلاوت کرنے والے پر جادوگر اثر انداز نہیں ہوسکتے۔

زہراء نام رکھنے کی تین وجوہ:

(۱) "زہراء" کا لفظ زهر اور زهرة سے ماخوذ ہے، جس کا معنی آب و تاب والا ہونا، روشن ہونا۔

"انهما النير تان ولهدايتهما قارئهما بما يزهرله من انوارهما اى من معانيهما"

یہ دونوں سورتیں بھی منور ہیں اسی لئے ان کو زہراء کہا گیا ہے کیونکہ یہ اپنے معانی "جو انوار کی حیثیت رکھتے ہیں" سے ہدایت دیتی ہیں۔

(۲) ان وجوہ میں سے دوسری وجہ یہ ہے "ويترتب على قراء تهما من النور التام يوم القيامة"

ان دونوں سورتوں کو پڑھنے والے شخص کو قیامت کے دن کامل نور حاصل ہوگا۔

(۳) ان دونوں سورتوں کو زہراء کہنے کی یہ وجہ بھی ہے کہ ان دونوں میں اسم اعظم کا ذکر ہے (جو نور اعظم ہے) جیسا کہ ابوداود وغیرہ نے ذکر کیا ہے، اور ابن ماجہ نے ذکر کیا ہے۔

عن اسماء بنت يزيد ان رسول الله ﷺ قال ان اسم الله الاعظم فى هاتين الآيتين والهكم اله واحد لااله الاهوالرحمن الرحيم" والتى فى آل عمران "الله لااله الاهوالحى القيوم"

اسماء بنت یزید کہتی ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، بیشک اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ان دو آیتوں میں ہے۔ ایک آیۃ ﴿وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ﴾ میں، (یعنی یہ آیۃ سورۃ بقرہ کی ہے) اور وہ آیۃ جو سورۃ آل عمران کی ہے ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ (اس میں بھی اسم اعظم پایا گیا ہے، اس وجہ سے دونوں کا نام زہراء رکھا گیا ہے) (قرطبی)

فضائل سورۃ آل عمران:

"عن ابن عباس قال نزلت سورة آل عمران بالمدينة" (اخرج البيهقى فى الدلائل)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سورۃ آل عمران مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی۔

❁ واخرج الطبرانی فی الاوسط بسند ضعیف عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ من قرأ السورة التی یذکر فیھا آل عمران یوم الجمعة ﷺ وملائکته حتی تغیب الشمس"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے وہ سورۃ جمعہ کے دن پڑھی جس میں آل عمران کا ذکر ہے تو اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے سورج کے غروب ہونے تک اس پر رحمتیں بھیجتے ہیں۔

❁ واخرج سعید بن منصور والبیھقی فی شعب الایمان عن عمر بن الخطاب من قرأالبقرة وآل عمران والنساء کتب عند الله من الحکماء"

حضرت عمر بن الخطاب ﷺ فرماتے ہیں جس شخص نے سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران اور سورۃ نساء کو پڑھا وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں حکماء میں لکھ دیا جاتا ہے۔

❁ واخرج الدارمی ومحمد بن نصر والبیھقی فی شعب الایمان عن ابن مسعود قال من قرأ آل عمران فھو غنی والنساء محبرة یعنی مزینة"

حضرت ابن مسعود ﷺ فرماتے ہیں جس شخص نے سورۃ آل عمران پڑھی وہ غنی ہے، اور سورۃ نساء مزین ہے، (زینت دینے والی)

اس روایت میں "محبرة ای مزینة "کو اسم فاعل اور اسم مفعول کے صیغے بنائے جاسکتے ہیں، اسی وجہ سے راقم نے دونوں معانی تحریر کردیئے ہیں۔

❁ واخرج الدارمی وابو عبید فی فضائله والبیھقی فی شعب الایمان عن ابن مسعود قال نعم کنزالصعلوک سورة آل عمران یقوم بھا الرجل من آخر اللیل"

حضرت ابن مسعود ﷺ فرماتے ہیں فقیر کا بہتر خزانہ سورۃ آل عمران ہے کہ اس نے رات کے آخری حصہ میں (بوقت سحر) اس کی تلاوت کو جاری رکھا۔

❁ واخرج سعید بن منصور عن ابی عطاف قال اسم آل عمران فی التوراة الطیبة"

ابوعطاف کہتے ہیں تو راۃ میں سورۃ آل عمران کا نام طیبہ ہے۔

❁ واخرج ابن ابی شیبة فی المصنف عن ابن عباس ان الشمس انکسفت وھوامیر علی البصرة فصلی رکعتین قرأفیھما بالبقرة وآل عمران"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ وہ بصرہ کے جب امیر (حاکم) تھے تو سورج کو ایک مرتبہ گرہن لگ گیا تو آپ ایک رکعت میں سورۃ بقرہ اور دوسری رکعت میں سورۃ آل عمران پڑھ کر نماز کسوف پڑھائی۔

❁ واخرج ابن ابی شیبة عن عبدالملک بن عمیر قال قرأ رجل البقرة وآل عمران

فقال کعب قد قرأ سورتین ان فیهما للاسم الذی اذا دعی به استجاب"

عبدالملک بن عمیر کہتے ہیں ایک شخص نے سورۃ البقرۃ اور سورۃ آل عمران پڑھی، تو حضرت کعب نے کہا اس شخص نے وہ دو سورتیں پڑھی ہیں جن میں وہ اسم (اسم اعظم) جب وہ پڑھ کر دعاء کی جائے تو اللہ تعالیٰ اس دعاء کو شرف قبولیت عطاء فرماتا ہے۔ (روایات فضائل ماخوذ از در منثور)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ﴾

(1) اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم والا۔

(2) اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر تبصیر الرحمٰن نے ہر سورۃ کی ابتداء میں بسم اللہ کا معنی اسی سورۃ کے مناسبت سے لکھا ہے۔

(بسم الله)لجامع للکمالات اللطفية والقهرية اذلطف بعيسى قوما آمنوا برسالته وقهربه قوما كذبوه او جعلوه الها اوولده(الرحمن)بافاضة الحياة وافادة القوام وارسال الرسل وانزال الكتب(الرحيم)بافاضة العلم والتوفيق للايمان بالكل والعمل بالمتأخر" (تبصیر الرحمن)

شروع اللہ کے نام سے جو صفات لطفیہ اور قہریہ کا جامع ہے۔ جنہوں نے عیسی علیہ السلام کی رسالت پر ایمان لایا ان کو اپنی مہربانی اور لطافت کا مستحق ٹھہرایا۔ اور جنہوں نے عیسی علیہ السلام کی تکذیب کی یا ان کو معبود مانا، یا ان کو خدا کا بیٹا مانا ان کو اپنے قہر کا مستحق ٹھہرایا، (وہ رحمٰن ہے) یعنی نہایت مہربان ہے کہ اس نے زندگی عطاء کی اور انسان کی جسمانی ساخت کو درست منایا اور رسولوں کو بھیج کر اور کتابیں نازل فرما کر انسانوں کو ہدایت دی (اور وہ رحیم ہے) یعنی رحم کرنے والا ہے کیونکہ علم اسی نے عطاء کیا ہے اور ایمان کی توفیق اسی نے عطاء کی ہے کہ بندے نے تمام ایمانیات پر ایمان لایا پھر عمل کی بھی اسی نے توفیق عطاء کی۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿الٓمٓ o﴾ (آل عمران آیۃ نمبر ۱)

یہ حروف مقطعات جن کی مراد اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ ہی بہتر جانتے۔ یہ اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ کے درمیان راز ہیں۔ زیادہ تفصیل دیکھنا چاہیں تو نجوم الفرقان جلد دوم سورۃ بقرہ کی ابتداء میں دیکھیں۔

﴿الٓمٓ o اللّٰہُ﴾ کو ایک قراءت میں علیحدہ علیحدہ کر کے پڑھا گیا ہے۔ یعنی میم کو ساکن کر کے اور لفظ اللہ کے ہمزہ کو نصب دے کر پڑھا گیا ہے۔ اور دوسری قرائت میں ملا کر بھی پڑھا گیا ہے، کہ میم کو فتحہ دے کر اور لفظ اللہ کے ہمزہ وصل کو ساقط کر کے پڑھا گیا ہے۔ (از صاوی)

ماقبل سے تعلق:

سورۃ بقرہ میں بعض چیزوں کو مجمل طور پر ذکر فرمایا تھا، اور اس سورۃ آل عمران میں ان کی تفصیل بیان کر دی گئی۔ سورۃ بقرہ حجت قائم کرنے کے درجہ میں ہے اور سورۃ آل عمران شبہات کو زائل کرنے کے درجہ میں ہے۔ اسی وجہ سے کئی مضامین کا تکرار پایا گیا۔ کتاب اللہ کا ذکر سورۃ بقرہ میں بھی ہے اور سورۃ آل عمران میں بھی ہے اور دونوں سورتوں میں پہلی کتابوں اور ان کی تصدیق اور سیدھی راہ کی ہدایت کا ذکر موجود ہے۔ اور آیہ کریمہ ﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَآ اُنْزِلَ﴾ سورۃ بقرہ میں بھی ہے اور سورۃ آل عمران میں بھی۔ بہت معمولی الفاظ کا فرق جو ان شاء اللہ آگے آ جائے گا۔ سورۃ بقرہ میں انسانوں کی تخلیق کا ذکر کیا گیا ہے اور سورۃ آل عمران میں ان کو ماؤں کی رحموں (بچہ دانیوں) میں صورتیں عطاء کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔

سورۃ بقرہ میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کی ابتداء کا ذکر کیا گیا، یہاں آپ کی اولاد خصوصا حضرت مریم اور حضرت عیسی علیہ السلام اور حضرت یحیی علیہ السلام کی تخلیق کی ابتداء کو ذکر کیا گیا۔ سورۃ بقرہ میں آدم علیہ السلام کی تخلیق کا ذکر کیا گیا جو بغیر باپ اور بغیر ماں کے پیدا ہوئے اور سورۃ ال عمران میں حضرت عیسی علیہ السلام کی پیدائش کا بیان ہے جو بغیر باپ کے پیدا ہوئے، ان دونوں میں کامل مناسبت پائی جانے کی وجہ سے ہی رب تعالی نے عیسی علیہ السلام کی پیدائش کا آدم علیہ السلام کی پیدائش کی مثل قرار دیا۔ ارشاد فرمایا ﴿اِنَّ مَثَلَہٗ کَمَثَلِ اٰدَمَ﴾ بیشک ان (عیسی) کی مثال، آدم علیہ السلام کی ہی مثال ہے۔

آدم علیہ السلام ظاہری جسم کے لحاظ پر سب سے پہلے ہیں اور آپ کی اولاد آپ کی فرع ہے اور بعد میں، اسی وجہ سے سورۃ بقرہ میں آدم علیہ السلام کا ذکر ہے اور سورۃ ال عمران میں آپکی اولاد کا ذکر ہے، آدم علیہ السلام کا ذکر پہلے کر کے لوگوں

کو سوچنے کا موقع فراہم کر دیا گیا کہ وہ ذات باری تعالیٰ جس کو یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ بغیر باپ اور ماں کے کسی کو پیدا کر سکتا ہے تو یہ کیسے نہ ہو سکے کہ وہ بغیر باپ کے کسی کو پیدا کر دے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

حق تو یہ تھا کہ آدم علیہ السلام کی پیدائش سے نصیحت حاصل کی جاتی اور عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش پر ایمان لایا جاتا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا کرشمہ ہے، لیکن افسوس کی بدبخت یہود نے پھر بھی طعنہ زنی کی یہاں تک کہ عیسیٰ علیہ السلام کو معاذ اللہ "ولد الزنا" کہہ دیا۔ **تعجب ھے** یہود و نصاریٰ کے گٹھ جوڑ پر کہ وہ یہودی جو آج تک عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کو نہیں تسلیم کر پائے، عیسائی ان کے یار بنے بیٹھے ہیں، لیکن حقیقت یہی ہے "الکفر ملۃ واحدۃ" مسلمانوں کے خلاف سب کافر ایک ہی ہیں۔ (راقم)

بعض محققین نے بیان کیا ہے کہ ان دونوں سورتوں کے مضامین میں تلازم پایا گیا ہے کہ سورۃ بقرہ میں آگ کا ذکر کیا گیا ﴿اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ O﴾ کہ وہ کافروں کیلئے تیار کی گئی، اور اس میں متقین کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اور سورۃ آل عمران میں ﴿وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ O﴾ ذکر فرمایا، جس میں متقین کیلئے جنت کا ذکر کیا گیا ہے۔ سورۃ بقرہ کی ابتداء اور سورۃ آل عمران کی انتہاء میں بھی مناسبت پائی گئی ہے، کیونکہ سورۃ بقرہ میں متقین کا ذکر کیا پھر فرمایا ﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ O﴾ وہی ہیں کامیاب ہونے والے۔

اور سورۃ آل عمران کو ختم کیا گیا ہے ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ O﴾ اور ڈرو اللہ سے تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ اور سورۃ بقرہ کی ابتدائی آیات میں ذکر کیا گیا ہے ﴿اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ اور سورۃ آل عمران کی آخری آیات میں ذکر کیا گیا ﴿وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ﴾ اور سورۃ بقرہ میں جب آیہ کریمہ نازل ہوئی ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ (جو شخص اللہ تعالیٰ کو قرض حسن دے گا) تو یہودیوں نے کہا۔ "یا محمد (ﷺ) افتقر ربک یسال عبادہ القرض" (اے محمد! تمہارا رب مقروض ہو گیا جو اپنے بندوں سے قرض طلب کر رہا ہے)

تو ان کا رد آل عمران میں کیا ﴿لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ﴾ (تحقیق سنا ہے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی باتوں کو جنہوں نے کہا بیشک اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں) اور سورۃ بقرہ میں ابراہیم علیہ السلام کی دعاء ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾ کا ذکر کیا گیا، اور سورۃ آل عمران میں اس کی قبولیت کا ذکر کیا گیا ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ دونوں سورتوں مین رابطہ و تعلق کافی حد تک واضح ہو گیا۔

(ماخوذ از روح المعانی)

﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ (آل عمران آیۃ نمبر ۲)

(1) اللہ ہے جس کے سواء کسی کی پوجا نہیں آپ زندہ ہے اوروں کو قائم رکھنے والا۔

(2) اللہ ہے کوئی عبادت کے لائق نہیں سوائے اس کے، وہ خود (ہمیشہ کیلئے) زندہ ہے۔ اوروں کو قائم رکھنے والا ہے۔

شان نزول:

اس آیۃ کریمہ کو نصاریٰ کا رد کرنے کیلئے نازل کیا گیا کیونکہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو رب مانا تھا، تو رب تعالیٰ نے فرمایا "اللہ وہ ہے جو خود ہمیشہ کیلئے زندہ ہے اور دوسروں کو قائم کرنے والا ہے" عیسیٰ علیہ السلام میں یہ صفات نہیں پائی گئیں، وہ تو اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ اس سورۃ پاک میں کئی آیات کا شان نزول نجران کے وفد کا آنا اور بحث ومباحثہ کرنا اور نبی کریم ﷺ کا ان کے جوابات دینا ہے۔ نجران قبیلہ کا وفد نبی کریم ﷺ کے پاس آیا، جو ساٹھ سواروں پر مشتمل تھا، چودہ ان کے سردار تھے، اور تین ان میں سے سرکردہ حکام تھے،

"احدھم امیر وصاحب مشورتھم العاقب واسمہ عبدالمسیح" ان میں سے ایک شخص ان کا حاکم اور صاحب مشورہ تھا، جس کا نام عبدالمسیح تھا اور لقب عاقب تھا۔ "وثانیھم وزیرھم ومشیرھم السید واسمہ الایھم" اور دوسرا ان میں سے ان کا وزیر اور مشیر اور سردار تھا جس کا نام ایہم تھا۔ "وثالثھم حبرھم واسقفھم وصاحب مدارسھم ابو حارثۃ بن علقمۃ احد نبی بکر بن وائل" اور تیسرا ان میں سے ان کا صاحب علم، سردار، ان کے مدارس کا نظام چلانے والا ابو حارثہ بن علقمہ تھا جو بکر بن وائل قبیلہ سے تھا۔

آجکل کی اصطلاح میں ان تینوں کے درجے یہ تھے، (۱) وزیر اعظم (۲) وزیر مالیات (۳) وزیر تعلیم۔

جب وہ لوگ نجران سے اپنی سواریوں پر سوار ہو کر چلے، تو ابو حارثہ کی خچر چلتے چلتے پھسل گئی، اس کے ساتھ ہی ایک طرف اس کا بھائی کرز بھی اپنی سواری پر چل رہا تھا "فقال کرز تعسا للابعد" کرز نے کہا دور رہنے والے کی ہلاکت ہو، اس نے معاذ اللہ اس سے مراد رسول اللہ ﷺ لئے "فقال لہ ابو حارثۃ بل تعست امک" ابو حارثہ نے کہا بلکہ تمہاری ماں ہلاک ہو جائے، تباہ و برباد ہو جائے، کرز نے بڑی حیرانگی سے پوچھا اے میرے بھائی! یہ کیا؟ قال انہ واللہ النبی (ﷺ) الذی کنا ننتظرہ" تو ابو حارثہ نے کہا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی وہ آخری نبی ہیں جن کی

ہم انتظار کررہے تھے۔ فقال لہ کرز فما یمنعک عنہ وانت تعلم ھذا" کرز نے ابوحارثہ کو کہا کہ پھر کیا وجہ ہے کہ "جب تو مانتا بھی ہے کہ وہ سچے نبی ہیں اور وہی نبی ہیں جن کا ہم انتظار کررہے تھے" تم ایمان نہیں لاتے؟ ابوحارثہ نے کہا تمہیں معلوم ہے کہ ہماری قوم کے مال دار لوگ ہمیں ٹیکس دیتے ہیں، اور ہماری عزت کرتے ہیں، اگر ہم ایمان لے آئے تو وہ لوگ ہمیں چھوڑ جائیں گے، اس سے ہمارا بڑا نقصان ہوگا۔ "فوقع ذلک فی قلب کرز واضمرہ الی ان اسلم" کرز کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی اس نے دل ہی دل میں یہ سوچ لیا کہ میں اسلام قبول کرلوں گا۔ یہ لوگ عصر کی نماز کے بعد مدینہ طیبہ میں مسجد نبوی میں داخل ہوئے، ان لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں نماز پڑھنے کا ارادہ کیا تو آپ نے صحابہ کرام کو فرمایا ٹھیک ہے ان کو نماز پڑھنے دو، یہ لوگ بہت فاخرانہ لباس پہنے ہوئے تھے، یعنی یمنی کپڑا جو بہت قیمتی تھا اس کی قمیصیں اور چادریں ان کی تھیں۔

"یقول بعض من رآھم من اصحاب النبی ﷺ ما رأینا وفدا مثلتھم"

اسی وجہ سے ان کی شان وشوکت اور فاخرانہ لباس کو دیکھ کر صحابہ کرام میں سے کسی صحابی نے کہا کہ آج تک آنے والے وفود میں سے کوئی وفد ان جیسا ہم نے نہیں دیکھا، وہ لوگ جب نماز ادا کرچکے تو رسول اللہ ﷺ سے ان کے تین سرکردہ لوگوں نے کلام شروع کیا۔ "فقالوا تارۃ عیسی ھو اللہ" کبھی وہ کہتے عیسیٰ ہی اللہ ہے۔ کیونکہ وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے، مادرزاد اندھے کو نظر دیتا ہے، بیماروں کو شفا دیتا ہے۔ اور غیبی خبریں دیتا ہے، کیچڑ سے پرندہ بنا کر اس میں روح پھونک کر اسے اڑا دیتا ہے یہ سب صفات دلالت کرتی ہیں کہ وہی اللہ ہے۔ "وتارۃ اخری ھو ابن اللہ" کبھی وہ کہتے عیسیٰ اللہ کا بیٹا ہے، کیونکہ اس کا جب کوئی باپ نہیں تو "معاذ اللہ" اس کا باپ اللہ ہے اس لئے وہ "ابن اللہ" (اللہ کا بیٹا) ہے۔ "وتارۃ اخری انہ ثالث ثلاثۃ" اور کبھی وہ کہتے کہ تین خداؤں میں سے ایک خدا عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ اسلئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے لئے جمع کے صیغے ذکر کرتا ہے۔ "قلنا" "نعلم" "فعلنا" وغیرہ، اگر صرف ایک خدا ہوتا تو رب تعالیٰ اپنے لئے واحد کے صیغے استعمال فرماتا، یوں ذکر ہونا چاہئے تھا، قلت، فعلت، اعلم، وغیرہ۔

نبی کریم ﷺ نے ان کے کلام کو سن کر ارشاد فرمایا "اسلموا" "تم اسلام لے آؤ۔" "قالوا اسلمنا قبلک" انہوں نے کہا ہم تم سے پہلے ہی اسلام لاچکے ہیں۔ آپ نے فرمایا تم جھوٹے ہو، اگر تم سچے ہوتے، تمہارا ایمان ہوتا تو رب تعالیٰ کی اولاد تم نہ مانتے۔ "قالوا ان لم یکن ولد اللہ فمن ابوہ" وہ کہنے لگے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی اولاد نہیں تو عیسیٰ علیہ السلام کا باپ کون ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے ان سے کہا، تم یہ بتاؤ کہ اولاد کو والدین سے مشابہت حاصل ہوتی ہے یا نہیں؟ وہ کہنے لگے ہاں اولاد کو والدین سے مشابہت تو حاصل ہوتی ہے۔

"قال الستم تعلمون ان ربنا حی لایموت وان عیسی یأتی علیه الفناء قالوا بلی"

آپ نے فرمایا کیا تم جانتے نہیں ہو کہ بیشک ہمارا رب زندہ ہے وہ مرے گا نہیں۔ اور عیسیٰ علیہ السلام پر وفات آئی ہے، انہوں نے کہا ہاں ایسا ہی ہے۔

"قال علیہ السلام الستم تعلمون ان ربنا قیوم علی کل شیٔ یحفظه ویرزقه قالوا بلی، قال علیہ السلام فهل یملک عیسی من ذلک شیأ قالوا لا"

آپ نے فرمایا کیا تم جانتے نہیں ہو کہ ہمارا رب تو ہر چیز کو قائم کرنے والا ہے، اور ہر چیز کی حفاظت کرتا ہے اور ہر ایک کو رزق دیتا ہے؟ انہوں نے کہا ہاں ایسا ہی ہے، آپ نے فرمایا کیا عیسیٰ علیہ السلام میں یہ صفات پائی جاتی ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ نہیں۔ ان میں تو یہ صفات نہیں پائی جاتیں۔

فقال علیہ السلام الستم تعلمون ان الله تعالی لایخفی علیه شیٔ فی الارض ولا فی السماء قالوا بلی قال علیہ السلام فهل یعلم عیسی من ذلک الاماعلم قالوا بلی"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا تم جانتے نہیں کہ بیشک اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں، نہ ہی زمین میں اور نہ ہی آسمانوں میں؟ انہوں نے کہا ہاں ایسا ہی ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کیا ایسا نہیں کی عیسیٰ علیہ السلام بغیر اللہ تعالیٰ کے عطاء کئے ہوئے علم کے خود ذاتی طور کچھ نہیں جانتے؟ انہوں نے کہا ایسا ہی ہے۔

"فقال علیہ السلام الستم تعلمون ان ربنا صور عیسی فی الرحم کیف شاء وان ربنا لایأکل ولا یشرب"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ بیشک ہمارے رب نے عیسیٰ علیہ السلام کو رحم (بچہ دانی) میں صورت عطاء فرمائی جیسے چاہا؟ انہوں نے کہا ہاں ایسا ہی ہے، پھر آپ نے فرمایا کیا ایسا نہیں کہ ہمارا رب نہ کھاتا ہے اور نہ پیتا ہے؟ تو انہوں نے کہا ہاں ایسے ہی ہے۔

پھر آپ نے فرمایا کیا ایسا نہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام اپنی ماں کے پیٹ میں اسی طرح رہے جس طرح دوسرے بچے اپنی ماؤں کے پیٹوں میں رہتے ہیں اور آپ کو آپ کی ماں نے اسی طرح جنا جس طرح اور عورتیں اپنے بچوں کو جنتی ہیں، کیا عیسیٰ علیہ السلام کو باقی بچوں کی طرح غذا نہیں دی گئی، کیا آپ نے کھایا، پیا نہیں؟ انہوں نے کہا ہاں ایسے ہی ہے۔ "قال علیه السلام فکیف یکون هذا کما زعمتم فسکتوا" نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیسے ہے یہ جو تم نے گمان کیا (عیسیٰ علیہ السلام خدا ہیں یا خدا کے بیٹے) تو وہ خاموش ہو گئے۔ نبی کریم ﷺ نے ان کے دلائل کے جوابات دئے اور ان کا رد کیا، اس سورۃ پاک میں اسی سے زائد آیات کریمہ میں ان کا ذکر کیا گیا ہے، جو تفصیلاً ان شاء اللہ مذکور ہوں گی۔ (تفسیر ابی السعود، معالم التنزیل للبغوی، بیر)

فائدہ: واعلم ان هذه الرواية دالة على ان المناظرة في تقرير الدين وازالة الشبهات حرفة الانبياء عليهم السلام"

ابھی جو روایت ذکر کی کہ نبی کریم ﷺ نے نجران کے اہل کتاب کے وفد کو دلائل دے کر ثابت کیا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا بندہ اور مخلوق ہیں، نہ خدا ہیں اور نہ خدا کا بیٹا۔

تو اسی سے یہ ثابت ہو گیا کہ باطل راہ پر چلنے والوں کے شبہات کو زائل کرنا اور دین اسلام کی حقانیت پر دلائل قائم کرنا سنت انبیاء کرام ہے، اسی کا نام مناظرہ ہے۔ صرف اپنی برتری ثابت کرنے کیلئے اپنی غلط راہ پر بھی جھوٹے دلائل قائم کرنا اہل کتاب کا طریقہ ہے، یہی مجادلہ ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

خوبصورت انداز پر دلیل:

"الحی القیوم" سے دلیل اس پر قائم کی گئی کہ اے نصاریٰ کیا تم اللہ تعالیٰ کی معرفت میں تنازع کرتے ہو یا کہ معرفت نبوت میں تمہارا جھگڑا ہے۔

"فان كان النزاع في معرفة الاله وهو انكم تثبتون له ولدا وان محمد الايثبت له ولدا"

اگر تمہارا جھگڑا اللہ تعالیٰ کی معرفت میں ہے کہ تم اس کی اولاد ثابت کرتے ہو، تو بیشک محمد ﷺ اس کی اولاد نہیں ثابت کرتے قطعی طور پر عقلی دلائل سے یہ بات ثابت ہے کہ وہ اولاد سے پاک ہے۔

"فانه قد ثبت بالبرهان انه حي قيوم والحي القيوم يستحيل عقلا ان يكون له ولد"

بیشک یقینی دلیل سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ حی و قیوم ہے، اور وہ ذات جو ہمیشہ کیلئے زندہ ہے، اور تمام مخلوق کو قائم رکھنے والا ہے، اس کی اولاد کا ہونا عقلاً محال ہے۔ اور اگر تمہارا جھگڑا ہے نبوت میں تو وہ بھی باطل ہے (آنے والی آیۃ میں توراۃ وانجیل کے نازل ہونے کا ذکر ہے)

اسلئے کہ تم یہ تسلیم کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے توراۃ اور انجیل کو نازل فرمایا

"فهو بعينه قائم في محمد ﷺ وماذاك الابالمعجزة وهو حاصل ههنا فكيف يمكن منازعته في صحة النبوة"

تو اسی ذات نے محمد ﷺ پر قرآن پاک کو نازل فرمایا ہے، آسمانی کتب کا نازل ہونا انبیاء کرام کا معجزہ ہے، وہ حضور ﷺ کو بھی حاصل ہے۔ تو صحت نبوت میں تمہارا جھگڑا کرنا کیسے ممکن ہے؟

"فهذا هو وجه النظم وهو مضبوط حسن جدا" یعنی کتنی خوبصورت اور کتنی مضبوط دلیل رب تعالیٰ نے اپنی الوہیت

اور وحدانیت پر قائم فرمائی اور رسول اللہ ﷺ کی نبوت کو کتنے خوبصورت انداز پر اور پختہ دلیل سے ثابت کیا گیا ہے۔

(ماخوذ از کبیر)

حی قیوم کی اولاد کیوں نہیں ہو سکتی؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ حی قیوم کیلئے ضروری ہے کہ وہ واجب الوجود ہو۔"وکل ماسواہ ممکن لذاتہ محدث حصل تکوینہ وتخلیقہ وایجادہ" اور جو بھی اللہ تعالیٰ کے ماسواء ہیں وہ سب ممکن لذاتہ ہیں۔ حادث ہیں اللہ تعالیٰ کے موجود کرنے اور اس کی تخلیق اور موجود کرنے سے ہی مخلوق موجود ہوئی ہے۔ واجب لذاتہ وہ ہے جو خود بخود موجود ہو، اور غیروں کو موجود کرے، اور ممکن لذاتہ وہ جو اپنے وجود میں غیر کا محتاج ہو خود بخود موجود نہ ہو۔ جب ہر چیز حادث ہے اور مخلوق ہے اور اس کے موجود کرنے سے موجود ہوئی ہے تو "امتنع کون شئی منھا ولدالہ والھا" مخلوق میں کوئی چیز نہ تو اللہ تعالیٰ کی اولاد ہو سکتی ہے اور نہ ہی خود الہ ہو سکتی ہے، حادث کا واجب لذاتہ ہونا ممکن ہی نہیں۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔

﴿اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا﴾ (مریم آیۃ نمبر ۹۳)

آسمانوں اور زمینوں میں جتنے ہیں سب اس کے حضور بندے ہو کر حاضر ہوں گے۔

"حی قیوم" کی اولاد نہ ہونے پر دلیل یہ ہے کہ "الٰہ (معبود) کیلئے جب ضروری ہو گیا کہ وہ حی قیوم ہو، تو "وثبت ان عیسی ما کان حیا قیوما لانہ ولد و کان یأکل ویشرب ویحدث" اسی سے ثابت ہو گیا کہ عیسیٰ علیہ السلام "حی قیوم" نہیں تھے، اسلئے کہ جو ان کو خدا کا بیٹا کہتے تھے وہ یہ مانتے تھے کہ عیسیٰ علیہ السلام کھاتے اور پیتے تھے، اور حادث تھے کیونکہ وہ پیدا ہوئے تھے "وزعموا انہ قتل" اور ان کے گمان کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام کو شہید بھی کر دیا گیا تھا، وہ اپنے آپ کو قتل سے نہیں بچا سکے تھے "فثبت انہ ما کان حیا قیوما" ثابت ہوا کہ وہ "حی قیوم" نہیں تھے، کیونکہ "حی قیوم" کیلئے ضروری ہے کہ وہ واجب الوجود ہو، کھانے، پینے سے پاک ہو، نہ اس کی ابتداء ہو اور نہ انتہاء ہو لھذا کھانے، پینے والا اور پیدا ہونے والا اور فنا ہونے والا نہ "حی قیوم" ہے اور نہ ہی خدا کا بیٹا ہے اور نہ ہی مستقل خدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی خدا کا شریک ہو سکتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

نبی کریم ﷺ کی نبوت اور قرآن پاک کی حقانیت پر دلیل:

"وھو مایتعلق بالنبوۃ فقد ذکرہ اللہ ھھنا فی غایۃ الحسن ونھایۃ الجودۃ"

نبوت سے متعلق اللہ تعالی نے نہایت خوبصورت اور عمدہ دلیل پیش فرمائی، پہلے یہ ارشاد فرمایا﴿نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ﴾ آپ پر کتاب حق سے نازل فرمائی۔ یہ ایک دعوی کی حیثیت رکھتا ہے۔ پھر اپنے دعوی کے صحیح ہونے اور یہود و نصاری کو سوچنے کا موقع فراہم کرنے کیلئے ارشاد فرمایا﴿وَأَنْزَلَ التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِلنَّاسِ﴾ اس نے اس سے پہلے توراۃ اور انجیل اتاری لوگوں کو راہ دکھائی'' جب تم یہ تسلیم کرتے ہو کہ توراۃ اور انجیل دونوں آسمانی کتابیں ہیں، ان کو اللہ تعالی نے نازل کیا، اور اللہ تعالی نے توراۃ وانجیل کو معجزہ بنایا ہے کہ وہ حق اور باطل میں فرق کرنے والی ہیں۔

''والمعجز لما حصل به الفرق بين الدعوى الصادقة والدعوى الكاذبة كان فرقالامحالة''
معجزہ کے ذریعے سچے اور جھوٹے دعوی میں فرق کیا جاتا ہے، اسی وجہ سے معجزہ کو'' حق و باطل میں فرق کرنے والا'' کہا جاتا ہے،
''ثم ان الفرقان الذی هو المعجز كما حصل فی كون التوراة والانجيل نازلين من عندالله فكذلك حصل فی كون القرآن نازلامن عند الله''

پھر فرقان (یعنی حق و باطل میں فرق کرنے والا) جب معجزہ ہے جو توراۃ وانجیل میں پایا گیا ہے کہ اللہ تعالی کی طرف سے نازل ہوا، اسی قرآن پاک بھی اللہ تعالی کی طرف سے نازل ہوا، جو معجزہ ہے اور حق و باطل میں فرق کرنے والا ہے۔

جب توراۃ وانجیل اور قرآن پاک کے نازل ہونے کی وجہ ایک ہے تو اے یہود و نصاری یا تو براہمہ فرقہ کی طرح تم سب کتابوں کا انکار کرو، یا مسلمانوں کی طرح سب کی تصدیق کرو کہ سب ہی آسمانی کتابیں ہیں جو اللہ تعالی نے نازل فرمائی ہیں۔ ''واما قبول البعض وردالبعض فذلك جهل وتقليد'' لیکن بعض کو قبول کرنا اور بعض کو رد کرنا جہالت وتقلید ہے، (یہ خیال کریں کہ اس مقام پر باطل کی تقلید سے علامہ رازی رحمہ اللہ نے منع فرمایا ہے، نہ کہ حق کی اور وہ بھی فروعی مسائل میں۔ علامہ رازی رحمہ اللہ کہیں اصول میں تقلید کی ممانعت پر اشارہ کرتے ہیں، اور کہیں باطل کی تقلید کی طرف اشارہ فرماتے ہیں، اس قسم کے الفاظ سے غیر مقلدین لوگ دوسرے جاہل لوگوں کو بھٹکاتے رہتے ہیں اسلئے تقلید باطل اور تقلید حق، اور تقلید اصول اور تقلید فروع کو مدنظر ضرور رکھا جائے، باطل کی تقلید ناجائز ہے اور اصولی عقائد کی تصدیق ناجائز ہے۔ اور حق کی تقلید اور وہ بھی فروعی مسائل میں جائز ہے، بلکہ ضروری ہے) (راقم)

پھر رب تعالی نے جب عمدہ اور مستحسن طریقہ سے اپنی معرفت اور اپنے نبی کریم ﷺ کی معرفت اور قرآن پاک کے سچے ہونے کی معرفت کرادی۔

"ولم یبق بعد ذلک عذر لمن ینازعه فی دینه فلاجرم اردفه بالتهدید والوعید فقال(ان الذین کفروا بآیات الله لهم عذاب شدید والله عزیز ذوانتقام")

تو اس کے بعد ان لوگوں کا کوئی عذر باقی نہ رہا جو اس کے دین میں جھگڑا کرتے تھے، تو اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے اس کے بعد کفار کو سخت عذاب کی دھمکی دی اور بتایا کہ اسے عذاب دینے سے کوئی روک نہیں سکتا کیونکہ وہ غالب انتقام لینے والا ہے۔

"فقد ظهر انه لا یمکن ان یکون کلام اقرب الی الضبط والی حسن الترتیب وجودة التالیف من هذاالکلام"

ابھی تک جو بیان کیا ہے اسی سے واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں ہی یہ کمال پایا گیا ہے کہ اس میں عمدہ ترتیب رکھی گئی اور خوبصورت انداز پر کلام کو پیش کیا گیا جو آسانی سے یاد بھی ہوتا ہے اور ذہن میں محفوظ ہوتا ہے۔ دنیا میں کوئی ایسا کلام نہیں جو رب تعالیٰ کے کلام جیسا حسین وعمدہ ہو۔

علامہ رازی رحمہ اللہ یہ بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں "والحمد لله علی ماهدی هذاا لمسکین الیه وله الشکر علی نعمة التی لاحد لها ولاحصر" سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کی ہیں جس نے اس بندہ مسکین کو قرآن پاک کی عمدہ ترتیب سمجھنے کی توفیق عطاء فرمائی اور اس کی ان گنت نعمتوں کا شکرادا کرتا ہوں۔ (ماخوذاز کبیر)

راقم بھی علامہ رازی رحمہ اللہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے یوں کہہ رہا ہے، سب تعریفیں اس ذات کی جس نے سلف صالحین کی تفاسیر اور شروح احادیث کی سمجھنے کی توفیق عطاء فرمائی جو میں قلمبند کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ کی ان گنت نعمتوں پر شکر گذار ہوں دعاء ہے کہ آخری سانس تک رب تعالیٰ مجھ سے دین کا کام لے۔ (آمین ثم آمین)

اب مختصر طور پر آیۃ کریمہ کے علیحدہ علیحدہ الفاظ کو بیان کیا جاتا ہے، تفصیل آیۃ الکرسی میں دیکھیں۔

﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ اللہ ہے نہیں کوئی معبود سوائے اس کے۔

ان الفاظ مبارکہ سے نصاریٰ کا رد کیا گیا ہے، کیونکہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کو معبود مانتے تھے، تو اللہ تعالیٰ کے اس بیان کے بعد واضح ہوا "ان احدالایستحق العبادة سواه" بیشک اللہ ایک ہے اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔

﴿اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ﴾ وہ زندہ ہے (ہمیشہ کیلئے) (اور) اوروں کو قائم کرنے والا ہے۔

جب وہ ہمیشہ کیلئے زندہ ہے تو ﴿فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ o﴾ (کرتا ہے جو ارادہ کرتا ہے) بھی وہی ہے۔ اور ہر چیز

کا علم رکھنے والا بھی وہی ہے۔

"واما القیوم فھو القائم بذاته والقائم بتدبیر الخلق والمصالح لما یحتاجون الیه فی معاشهم"

اللہ تعالیٰ قیوم ہے، کہ وہ خود قائم ہے، اسے کوئی موجود کرنے والا نہیں، وہ مخلوق کی تدبیر کو قائم کرنے والا ہے، اور لوگ جن مصلحتوں کے محتاج ہیں اپنی زندگی کی گذران میں، ان تمام کا خالق بھی وہی ہے۔

رات ہو یا دن، گرمی ہو سردی، ہوائیں ہو یا بارشیں سب اسی کے دست قدرت میں ہیں وہی ان کا خالق ہے، اسی کے تصرف میں یہ چیزیں ہیں۔ اور مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے اتنی نعمتیں عطاء کر رکھی ہیں جو شمار میں نہیں آسکتیں۔ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ اور اگر تم شمار کرو اللہ کی نعمتوں کو تو تم شمار نہیں کر سکو گے۔

"وقال قتادة "الحی الذی لا یموت والقیوم القائم علی خلقه بأعمالهم وآجالهم وارزاقهم"

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ "حی" ہے کہ اس پر موت نہیں آنی، اور وہ "قیوم" ہے کہ مخلوق کے اعمال اور ان کی عمروں اور ان کے رزق کو قائم کرنے والا ہے۔

"وعن سعید بن جبیر الحی قبل کل حی والقیوم الذی لاندله"

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ "حی" ہے اس لئے کہ وہ ہر زندہ مخلوق سے پہلے زندہ ہے اور وہ "قیوم" ہے کہ اس کی کوئی مثل نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں۔ (کبیر)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿نَزَّلَ عَلَیْکَ الْکِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرَاةَ وَالْاِنْجِیْلَ o مِنْ قَبْلُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ط اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِآیَاتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ط وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ ذُوانْتِقَامٍ o﴾ (آل عمران آیۃ نمبر ۳،۴)

(1) اس نے تم پر یہ سچی کتاب اتاری، اگلی کتابوں کی تصدیق فرماتی اور اس نے اس سے پہلے توریت اور انجیل اتاری لوگوں کو راہ دکھائی اور فیصلہ اتارا بیشک وہ جو اللہ کی آیتوں سے منکر ہوئے ان کیلئے سخت عذاب ہے اور اللہ غالب بدلہ لینے والا ہے۔

(2) اس نے اتاری تم پر کتاب (کامل وجامع) حق کے ساتھ، جو تصدیق کرنے والی ہے ان کی جو اس سے پہلے ہیں اور اس نے اتارا توراۃ وانجیل کو۔ اس سے پہلے، ہدایت ہیں وہ لوگوں کیلئے، اور اس نے اتارا فرقان (حق و باطل میں فرق کرنے والا) بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اللہ کی آیات سے، ان کیلئے عذاب ہے سخت، اور اللہ غالب ہے بدلہ لینے والا۔

﴿نَزَّلَ عَلَیْکَ الْکِتَابَ بِالْحَقِّ﴾

''اس نے اتاری تم پر کتاب (کامل وجامع) حق کے ساتھ''

"الکتاب" ای القرآن الجامع للاصول والفروع" کتاب سے مراد قرآن پاک ہے جو اصول وفروع کی جامع کتاب ہے۔ (روح المعانی)

اسی وجہ سے راقم نے بریکٹ میں (کامل وجامع) کے الفاظ بڑھائے ہیں، اور علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "ولما کان ومایکون الی یوم القیامة" یہ کتاب یعنی قرآن پاک ماکان (جو ہو چکا ہے) اور قیامت تک ''مایکون'' جو کچھ ہونا ہے کو شامل ہے۔ "کتاب" ذکر کیا ہے، یعنی اسم جنس ذکر کیا اسم علم "قرآن" نہیں ذکر کیا۔

"ایذانا بتفوقه علی بقیة الافراد فی الانطواء علی کمالات الجنس کانه هو الحقیق بان یطلق علیه اسم الکتاب دون ماعداه"

اس کی وجہ یہ ہے کہ بتانا مقصود ہے کہ یہ کتاب ہی حقیقت میں وہ کتاب ہے کہ جب مطلق کتاب ذکر کیا جائے تو اس سے

مرادقرآن پاک ہی ہوتا ہے کیونکہ یہ کتاب ان کمالات پر مشتمل ہے جن پر دوسری آسمانی کتب مشتمل نہیں، اسی لئے توراۃ اورانجیل کے نام ذکر کئے ہیں صرف ''کتاب'' ان کو نہیں کہا گیا۔ (روح المعانی)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

''علیک'' ظرف ذکر کی گئی، پھر ''الکتاب'' مفعول بہ ہے اس سے پہلے ظرف کو ذکر کیا گیا، پھر مخاطب کی ضمیر ذکر کی گئی، نبی کریم ﷺ کا اسم گرامی ذکر نہیں کیا گیا، پھر لفظ ''علی'' ذکر کیا گیا ''الی'' نہیں ذکر کیا گیا، یعنی ''علیک'' ذکر ہے، ''الیک'' نہیں، ان تمام کی وجہ یہ ہے۔

''لا یخفی من تعظیمه ﷺ والتنویه برفعة شانه علیه الصلوة والسلام''

کہ اس سے مراد نبی کریم ﷺ کی تعظیم اور رفعت شان بیان کرنا مقصود ہے جو مخفی نہیں۔ (روح المعانی)

یعنی رب تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ عظیم کتاب جس کا یہاں تذکرہ کیا جارہا ہے وہ صرف آپ پر نازل کی گئی اور اس کو آپ کے دل پر ڈال دیا گیا۔ (راقم)

قرآن پاک کے اتارنے کا ذکر ''نَزَّلَ'' سے، اور ''توراۃ وانجیل'' کا ذکر ''اَنْزَلَ'' سے کیا۔

''لان التنزیل لتکثیر والله تعالی نزل القرآن نجما نجما فکان معنی التکثیر حاصلافیه واما التوراة والانجیل فانه تعالی انزلهما دفعة واحدة فلهذا خصهما بالانزال''

اس لئے کہ تنزیل کثرت پر دلالت کرتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو آہستہ آہستہ نازل کیا، اس میں کثرت کا معنی پایا گیا ہے، لیکن توراۃ اور انجیل چونکہ ایک ہی مرتبہ نازل ہوئیں، اس لئے ان کے ساتھ لفظ انزال کو خاص کیا۔ (از کبیر)

ہاں البتہ یہ خیال رہے کہ قرآن پاک لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر ایک مرتبہ ہی نازل ہوا اس لئے قرآن پاک کے نزول کیلئے تنزیل بھی ذکر کیا گیا اور انزال بھی۔

''بالحق'' یا تو حال ہے فاعل سے، اس صورت میں معنی یہ ہوگا ''**نزله محقا فی تنزیله علی ماهو علیه**'' اس نے اتاری کتاب اس حال میں کہ وہ حق رکھتا ہے اس کتاب کو نازل کرنے کا، اور اگر یہ حال ہو مفعول سے تو معنی یہ ہوگا ''**نزله ملتبسا بالعدل فی احکامه**'' اس نے کتاب نازل کی اس حال میں کہ وہ اپنے احکام میں عدل پر مبنی کتاب ہے۔ یا یہ معنی ہوگا

''نزله بالصدق فی اخباره التی من جملتها خبرالتوحید وما یلیه وفی وعده ووعیده''

کہ اس نے اتاری کتاب اس حال میں کے وہ سچ سے ملی ہوئی ہے۔ یعنی اس کی تمام خبریں خواہ توحید کی خبریں ہوں یا اس کی صفات کی خبریں ہو، اس کے وعدہ کی خبریں ہوں یا وعید کی خبریں ہوں تمام ہی سچی ہیں۔

یا معنی یہ ہے "نزله بالحق ای بما يحقق انه من عند الله تعالى من الحجج البينة"
کہ اس نے کتاب اتاری ہے حق کے ساتھ، یعنی وہ کتاب خود ہی ثابت کر رہی ہے کہ اس کے دلائل واضح ہیں اور وہ اللہ تعالی کی طرف سے ہیں (تفسیر ابی السعود)

حق سے مراد کیا ہے:

احکام میں عدل (میانہ روی، افراط اور تفریط کے درمیان اعتدال) پایا جائے، اور خبروں میں سچ پایا جائے۔ (روح البیان)

"بالحق ای بالصدق وقيل بالحجة الغالبة" حق کا معنی "سچ" ہے۔ یا غالب دلیلیں ہیں۔ (قرطبی)

"حق" كاصل الحق المطابقة والموافقة كمطابقة رجل الباب فى حقه لدورانه على استقامة"
حق کا اصلی معنی "مطابقت اور موافقت" ہے۔ جس طرح دروازہ سیدھا اپنے پاؤں پر چلتا ہے۔

پھر حق کا لفظ کئی معانی میں استعمال ہے:

(۱) "الاول يقال لموجد (بكسر الجيم) بسبب ماتقتضيه الحكمة" ان معانی میں سے پہلا معنی یہ ہے کہ وہ ذات جو حکمت کے تقاضا کے مطابق کسی چیز کو ایجاد کرے۔ اس ایجاد کرنے والی ذات کو حق کہا جاتا ہے۔ یعنی اس معنی کے لحاظ سے "اللہ تعالی حق" ہے۔ رب تعالی نے اسی معنی کے مطابق ارشاد فرمایا "هو الحق" وہی (اللہ تعالی) حق ہے۔ اور ارشاد فرمایا ﴿ثُمَّ رُدُّوْا اِلَى اللّٰهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقُّ﴾ پھر وہ لوٹائے جائیں اللہ کی طرف جو ان کا مولی حق ہے۔

(۲) "والثاني يقال للموجد (بفتح الجيم) بحسب مقتضى الحكمة" ان معانی میں سے دوسرا معنی یہ ہے کہ وہ چیز جس کو حکمت کے مطابق ایجاد کیا جائے وہ چیز حق ہے۔ یہ معنی بھی قرآن پاک میں کئی جگہ واقع ہے ﴿مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ﴾ نہیں پیدا کیا اللہ نے یہ مگر حق کے ساتھ۔ ﴿وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ﴾ اور بیشک یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے۔

(۳) "والثالث في الاعتقاد للشئى المطابق لما عليه ذلك الشئ فى نفسه" ان معانی میں سے تیسرا معنی یہ ہے کہ ایک چیز کا واقع کے مطابق ہونے کا اعتقاد رکھا جائے، یعنی قیامت، ثواب، عذاب، جنت، اور جہنم کے حق

ہونے کا اعتقاد رکھا جائے۔ یہی معنی قرآن پاک کے ان الفاظ مبارکہ میں استعمال ہے۔

"فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ"

تو اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو وہ حق بات سوجھادی جس میں جھگڑ رہے تھے، اپنے حکم سے۔

(۴) "والرابع للفعل والقول الواقع بحسب مایجب وبقدر ما یجب وفی الوقت الذی یجب"

ان معنی میں سے چوتھا معانی یہ ہے کہ حق اس فعل یا قول کو کہتے ہیں جو جس طرح واجب ہوا اسی طرح وہ پایا جائے۔ اور اس اندازے کے مطابق پایا جائے جس اندازے کے مطابق وہ واجب ہوا۔ اور اس وقت میں پایا جائے جس وقت میں واجب ہوا۔ اسی کے مطابق کہا جاتا ہے "قولک حق وفعلک حق" تمہارا قول حق ہے اور تمہارا فعل حق ہے۔

رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ﴾ اسی طرح ثابت ہے تمہارے رب کا کلمہ۔ اسی طرح اور ارشاد فرمایا "حق القول منی لأملئن جهنم" میرا قول حق ہے کہ میں ضرور بر ضرور جہنم بھر دوں گا۔

احقاق حق کی دو قسمیں:

(۱) "احدهما باظهار الادلة والآیات" ان دو معنوں میں سے ایک یہ ہے کہ دلائل اور آیات کو واضح طور پر بیان کر کے حق کو ثابت کیا جائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿اُولٰئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا مُّبِيْنًا﴾ اور یہ ہیں جن پر ہم نے تمہیں واضح غلبہ عطاء کیا۔ اس مقام میں "سُلْطَانًا مُّبِيْنًا" سے "حجة قوية" قوی دلائل ہیں۔ جن کی وجہ سے ثابت کیا کہ مسلمان حق پر ہیں "والثانی باکمال الشریعة وبثها فی الکافة" ان معانی میں سے دوسرا معنی "احقاق حق" کا یہ ہے کہ شریعت کو مکمل کر کے اور اس کو تمام لوگوں میں پھیلا کر حق ثابت کیا جائے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا۔

"وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ ○ هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ" (سورة الصف آیة نمبر ۸،۹)

اور اللہ تعالیٰ مکمل کرنے والا ہے اپنے نور کو اگرچہ کافر ناپسند سمجھیں، وہی جس نے بھیجا اپنے رسول ﷺ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ تاکہ غالب کرے اسے سب دینوں پر۔ (ماخوذ از مفردات راغب)

زیر بحث آیۃ کریمہ میں حق سے مراد کیا ہے؟:

اس میں بھی چند وجوہ بیان کی گئی ہیں جو راقم کے نزدیک سب ہی معتبر ہیں۔

"احدها انه صدق فیما تضمنه من الاخبار عن الامم السالفة" ان وجوہ میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ کتاب کو حق

کے ساتھ نازل کرنے کا یہ مطلب ہے کہ اس میں گذری ہوئی امتوں کی جو خبریں ہیں وہ سچی ہیں۔

"وثانیها ان مافیه من الوعد والوعید یحمل المکلف علی ملازمة الطریق الحق فی العقائد والأعمال ویمنعه عن سلوک الطریق الباطل"

ان وجوہ میں دوسری وجہ یہ ہے کہ کتاب کو حق کے ساتھ نازل کرنے کا یہ مطلب ہے کہ اس میں جو وعدو وعید کا ذکر ہے وہ جن احکام پر مرتب ہیں، ان احکام پر اسی وقت عمل کیا جاسکے گا جبکہ مکلف اپنے عقائد اور اعمال میں حق راہ پر قائم ہو، باطل راہ سے دور ہو۔

یعنی اس کتاب (قرآن پاک) میں حق راہ دکھائی گئی ہے کہ اس پر چل کر اپنے عقائد و اعمال کو درست رکھا جائے۔

"وثالثها انه حق بمعنی انه قول فصل ولیس بالهزل" اور تیسری وجہ ان میں سے یہ ہے کہ یہ حق ہے یعنی یہ وہ کلام ہے جو حق و باطل میں فرق کرنے والا ہے، اور حق بات ہے کوئی مزاح کی بات نہیں۔

"ورابعها قال الاصم المعنی انه تعالی انزله بالحق الذی یجب له علی خلقه من العبودیة وشکر النعمة واظهار الخضوع وما یجب لبعضهم علی بعض من العدل والانصاف فی المعاملات"

اور ان وجوہ میں سے چوتھی وجہ یہ ہے جو اصم رحمہ اللہ نے بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن پاک کو حق سے نازل فرمایا یعنی مخلوق پر اس کی عبودیت اور اس کی نعمتوں کا شکریہ ادا کریں، اور خشوع وخضوع کا اظہار کریں، اور آپس میں ایک دوسرے سے معاملات میں عدل وانصاف سے کام لیں۔

"وخامسها انزله بالحق لابالمعانی الفاسدة المتناقضة"

اور پانچویں یہ ہے کہ اس نے اپنی کتاب کو حق سے نازل فرمایا، اس میں معانی ایک دوسرے کے متناقض (مخالف) نہیں، اور نہ ہی اس کے معانی فاسد ہیں۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا﴾ سب خوبیاں اللہ کو جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری اور اس میں کجی نہیں رکھی (بالکل اسمیں ٹیڑھے پن نہیں رکھا) اور ارشاد فرمایا ﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا﴾ تو کیا غور نہیں کرتے قرآن میں اور اگر وہ غیر خدا کے پاس سے ہوتا تو ضرور اس میں بہت اختلاف پاتے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ﴾ "اور جو تصدیق کرنے والی ہے ان کی جو اس سے پہلے ہیں"

"والمعنی انه مصدق لکتب الانبیاء علیهم السلام" مطلب یہ ہے کہ پہلے انبیاء کرام پر جو

کتابیں نازل کی گئیں قرآن پاک ان کی تصدیق کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتابیں ہیں جو اس نے انبیاء کرام پر نازل کی ہیں۔تو راۃ موسیٰ علیہ السلام پر، انجیل عیسیٰ علیہ السلام پر، اور زبور داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئیں۔اور قرآن پاک نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل ہوا جو پہلی آسمانی کتب کی تصدیق کرتا ہے۔

خیال رہے کہ "بین یدیه" کا معنی ہے "ہاتھوں کے درمیان" لیکن یہاں مجازی معنی استعمال ہے "اگلی کتابیں" کیونکہ وہ لوگوں کے ہاتھوں میں موجود تھیں، اگر چہ ان میں تحریف کردی گئی تھی، نام ان کے وہی تھے، قرآن پاک نے ان کی اصلی حالت کی تصدیق کی نہ کہ تحریف شدہ (تبدیل کی گئی) کی۔

قرآن پاک کے مصدق ہونے سے نبی کریم ﷺ کا صادق ہونا سمجھ آیا:

رب تعالیٰ نے جب یہ بیان فرمایا کہ قرآن پاک پہلی کتب کی تصدیق کرتا ہے، یہ دلیل قرآن پاک کی حقانیت پر کہ یہ اللہ تعالیٰ کی سچی کتاب ہے "لانه لو كان من عند غير الله لم يكن موافقا لسائر الكتب" اس لئے کہ اگر یہ اللہ تعالیٰ کے غیر کی طرف سے ہوتا تو باقی آسمانی کتب کے موافق نہ ہوتا۔

اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا "انه كان اميالم يختلط باحد من العلماء ولا تتلمذ لأحد" کہ نبی کریم ﷺ جب امی تھے، اس وقت کے علماء سے کبھی ملتے جلتے نہیں تھے، اور نہ ہی آپ کسی کے شاگرد بنے، تو پھر آپ کا وہ کتاب پیش کرنا جو پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے، اور ان کتابوں کے مضامین کو بھی اس کتاب میں سمو دیا گیا ہے "فانما عرف هذه القصص بوحي الله تعالى" تو بیشک اسی سے واضح ہو گیا کہ قرآن پاک میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی وحی سے نازل ہوئے ہیں۔لھذا نبی کریم ﷺ کا صادق ہونا واضح ہو گیا۔ ہر نبی نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی دعوت دی، اور اس پر ایمان لانے کا حکم دیا، اور اللہ تعالیٰ کی شان کے جو لائق نہیں ان سے دور رہنے کی تبلیغ کی۔عدل اور احسان کا حکم دیا، اور ہر شریعت میں اس زمانے کے فسادات کو ختم کرنے اور اصلاح کرنے کا حکم دیا گیا "فالقرآن مصدق لتلك الكتب في كل ذلك" قرآن پاک ان تمام چیزوں میں پہلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

سوال: "بین یدیه" کا معنی ہے۔دو ہاتھوں کے درمیان، یہ تو اس چیز پر بولا جاتا ہے جو سامنے ہو، قرآن پاک سے پہلے نازل ہونے والی کتابوں کو "بین یدیه" سے تعبیر کرنا کس طرح صحیح ہے؟

جواب: "ان تلك الاخبار لغاية ظهورها سماها بهذا الاسم" یہ خبریں بہت واضح ہیں، اس لئے

ان کو "بین یدیه" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ گویا کہ توراۃ وانجیل سامنے تھیں اور قرآن پاک کی تصدیق واضح تھی۔ (از کبیر)

پہلا سوال: قرآن پاک کو پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والا کیسے کہا؟ حالانکہ قرآن پاک نے تو پہلی کتابوں کے اکثر احکام کو منسوخ کر دیا ہے۔؟

جواب: "اذا كانت الكتب مبشرة بالقرآن وبالرسول، ودالة على ان احكامها تثبت الى حين بعثته، وانها تصير منسوخة عند نزول القرآن كانت موافقة للقرآن فكان القرآن مصدقالها"

جبکہ پہلی کتابوں میں قرآن پاک کے نازل ہونے اور رسول اللہ ﷺ کے تشریف لانے کی بشارت دی گئی اور پہلی کتب میں ہی بیان کر دیا گیا کہ قرآن پاک کے نازل ہونے پر یہ کتابیں منسوخ ہو جائیں گی، تو قرآن پاک پہلی کتابوں کے موافق نازل ہا اور ان کی تصدیق کرنے والا ہوا کہ ان میں جب ذکر ہی یہ تھا کہ قرآن پاک ان کا ناسخ ہے تو قرآن پاک کا ناسخ ہونا ان کی تصدیق کرنے والا ہوا۔ (ماخوذ از کبیر)

دوسرا جواب: مصدقا لما بين يديه "اى فى حال كونه مصدقا للكتب قبله فى التوحيد والنبوات والاخبار وبعض الشرائع قبله" (روح البیان)

قرآن پاک کا پہلی کتب کی تصدیق کرنے کا یہ مطلب ہے کہ پہلی کتب میں توحید اور نبوت کا جو ذکر ہے، اور ان میں جو خبریں پائی گئی ہیں اور ان کے بعض احکام جو قرآن پاک نے منسوخ نہیں کئے، قرآن پاک کو ان کی تصدیق کرنے والا بنایا۔ **راقم** کے نزدیک پہلا جواب قوی جواب، بلکہ عظیم جواب ہے جو کبیر سے ماخوذ کیا گیا ہے۔

﴿وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝﴾ ''اور اتارا اس نے توراۃ وانجیل کو''

"والتوراة والانجيل اسمان اعجميان الاول عبرى والثانى سريانى"

توراۃ اور انجیل دونوں عجمی نام ہیں۔ عربی لفظ نہیں۔ بلکہ توراۃ عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ اور انجیل سریانی زبان کا لفظ ہے (روح البیان) یہی قول درست ہے۔

تاہم بعض حضرات نے ان الفاظ کو عربی بھی کہا ہے اور انہوں نے لغوی معنی اور ان کتب کے نام رکھنے میں مناسبت بھی بیان کی ہے۔

عربیت کا قول اور دینی طلباء کرام کی توجہ کی ضرورت:

''توراۃ'' بصری نحویوں کے نزدیک اصل

میں ''وورية'' بروزن ''فوعلة'' ہے، جیسے ''دوخلة'' اور ''حوقلة'' ہے۔ پہلی واؤ کو ''تاء'' بنالیا گیا، پھر یاء مفتوحہ کو ماقبل بھی فتحہ ہونے کی وجہ سے الف بنالیا گیا، ''فصارت توراة وكتبت بالياء على اصل الكمة'' پڑھنے میں الف سے ہی پڑھا گیا ''توراة'' اور لکھنے میں البتہ اصل کا اعتبار کر کے یاء سے ان حضرات نے لکھا ''توریت'' اور کوفی اہل علم نے بیان کیا ہے، توراۃ اصل میں ''تورية'' ہے۔ تفعلة کا وزن ہے جیسے ''توصية اور توفية'' ہے پھر یاء کو الف سے تبدل کر دیا گیا، کیونکہ ان کی لغت میں ''جارية'' کو جاراۃ پڑھتے ہیں اور ناصیۃ کو ناصاۃ، یعنی ان حضرات کے نزدیک لکھنے اور پڑھنے میں ''توارة'' ہی ہے۔

بصریوں اور کوفیوں کے نزدیک یہ لفظ لیا ہوا ہے ''وری الزند'' سے، یعنی چقماق سے آگ نکالنا، جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿اَفَرَءَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ﴾ بھلا بتاؤ تو وہ آگ جو تم روشن کرتے ہو، اب اس معنی کے لحاظ پر توراۃ کو توراۃ کہنے کہ وجہ یہ ہے ''فسمى التوراة لانها نور وضيا'' قال اللہ تعالیٰ ﴿وَضِیَآءً وَّذِکْرًی لِّلْمُتَّقِیْنَ﴾ کہ توراۃ میں نور وضیاء کے پائے جانے کی وجہ سے اس کا نام ہی توراۃ رکھ دیا گیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود توراۃ کو متقین کیلئے ضیاء اور نصیحت قرار دیا۔ بعض حضرات نے اور وجہ بیان کی ہے

''هى من التورية وهى كتمان السر والتعريض بغيره وكان فى التوراة معاريض من غير تصريح''

کہ ''توراۃ کا لفظ ''توریۃ'' سے لیا ہوا ہے، جس کا معنی راز چھپانا اور اشارہ سے بات کرنا، ظاہر نہ کرنا، چونکہ توراۃ میں کچھ اشارات پائے گئے ہیں جو ظاہر نہیں تو اس مناسبت سے اس کا نام بھی ''توراۃ'' رکھ لیا گیا۔

''انجیل'' کو انجیل کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ ''لفظ ''افعیل'' کے وزن پر ہے اور ''انجیل'' سے ماخوذ ہے، جس کا معنی ہے ''نکلنا'' بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اسے ''نجل'' کہا جاتا ہے۔ انجیل کو انجیل کہنے کی وجہ واضح ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حق بیان کرنے کیلئے نکالا ہے تو نام انجیل رکھ دیا گیا، بعض حضرات نے بیان فرمایا ہے کہ یہ لفظ ماخوذ ہے ''هو من النجل وهو سعة العين'' نجل سے جس کا معنی ہے آنکھ کی وسعت اور آنکھ کی نورانیت، انجیل کو بھی لوگوں کی ہدایت کیلئے وسعت دی گئی اور نور بنایا گیا، تو اس مناسبت سے نام انجیل رکھنا واضح ہوگیا۔ عبرانی زبان میں ''توراۃ'' کا معنی شریعت ہے، اس لئے کہ اس میں شرعی مسائل کا ذکر ہے، لھذا نام ہی توراۃ رکھ لیا گیا۔ سریانی زبان میں ''انجیل'' کا معنی ہے موتیوں کا جڑاؤ چونکہ انجیل شرعی مسائل کو موتیوں سے تشبیہ دے کر نام ''انجیل'' رکھ دیا گیا کہ اس میں موتیوں کو جوڑ دیا گیا ہے۔ (ماخوذ از معالم التنزیل للبغوی)

تنبیہ: عربیت والے قول کو علامہ رازی رحمہ اللہ ان الفاظ سے رد کرتے ہیں۔

"التوراة والانجيل اسمان اعجميان احدهما بالعبرية والآخر بالسريانية فكيف يليق بالعاقل ان يشتغل بتطبيقهما على اوزان لغة العرب فظهر ان الأولى بالعاقل ان لايلتفت الى هذه المباحث (کبیر)

توراۃ اورانجیل جب عجمی لفظ ہیں ایک عبرانی اور دوسرا سریانی تو عقلمند آدمی کیلئے کس طرح لائق ہے کہ وہ ان کو عربی الفاظ کے وزنوں سے تطبیق دے، ظاہر بات یہی ہے کہ ان الفاظ کو عجمی ہی سمجھا جائے اور عربی والے اقوال کی طرف توجہ نہ دی جائے۔

﴿مِنْ قَبْلُ﴾ اس سے پہلے ﴿مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے توراۃ اور انجیل کو قرآن پاک سے پہلے نازل کیا۔

﴿هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ ہدایت ہیں وہ لوگوں کیلئے اب مکمل ﴿مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ کا مطلب یہ ہوگیا یعنی "ان انزال التوراة والانجيل قبل القرآن كان هدى للناس" توراۃ اور انجیل کو قرآن پاک سے پہلے نازل کیا، اور لوگوں کیلئے ہدایت بنایا۔

اعتراض: قرآن پاک کو "هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" (پرہیزگاروں کیلئے ہدایت ہے) کہا گیا ہے، اور توراۃ و انجیل کو "هُدًى لِّلنَّاسِ" (لوگوں کیلئے ہدایت ہیں) کہا گیا ہے اس کی وجہ کیا ہے۔

جواب: قرآن پاک کو "هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" کہا گیا ہے کیونکہ "هم الذين انتفعوا به وتبعوه" پرہیزگاروں نے ہی قرآن پاک کی ہدایت سے نفع حاصل کیا ہے اور انہوں نے ہی قرآن پاک کی تابعداری کی ہے، البتہ مطلقاً قرآن پاک کی ہدایت (راہنمائی) کو بھی ﴿هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ سے ذکر کیا گیا، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اترا لوگوں کی ہدایت کیلئے۔ یہاں چونکہ نجران کے نصاریٰ سے مناظرہ ہو رہا تھا، وہ قرآن پاک کے ہادی ہونے کے قائل نہیں تھے کیونکہ وہ تو قرآن پاک کو اللہ کی کتاب ہی نہیں مانتے تھے، لیکن توراۃ اور انجیل کی ہدایت کو مانتے تھے اس لئے توراۃ اور انجیل کا وصف بیان کیا گیا "هُدًى لِّلنَّاسِ" قرآن پاک کا وصف "حق" بیان کیا گیا ﴿نَزَّلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ﴾ (اس نے کتاب اتاری حق کے ساتھ) گویا کہ یوں بیان کر دیا گیا "انه حق في نفسه سواء قبلوه اولم يقبلوا" کہ قرآن پاک حقیقت میں حق ہے کوئی قبول کرے یا نہ کرے قرآن پاک کی حقانیت میں کوئی فرق نہیں آ سکتا۔ (ماخوذ از خازن وکبیر)

"وقيل ان قوله هدى للناس يعود الى الكتب الثلاثة يعني القرآن المتقدم ذكره والتوراة والانجيل"

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قول "هُدًى لِّلنَّاسِ" کا تعلق تینوں کتابوں سے ہے۔ قرآن پاک جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور توراۃ اور انجیل (تاہم راقم کے نزدیک پہلا جواب ہی قوی ہے)

"وانما وصف هذه الکتب بانها هدی للناس لما فیهامن الشرائع والاحکام"
ان کتب کو"هُدًی لِّلنَّاسِ" (لوگوں کیلئے ہدایت ہیں) کہا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں شرائع اور احکام پائے گئے ہیں۔ (خازن)

توراۃ وانجیل تمام لوگوں کیلئے ہدایت کیسے ہیں؟

هدی للناس لقول موسی وعیسی اولجمیع الناس" اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ توراۃ ہدایت ہے موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے لوگوں کیلئے اور انجیل ہدایت ہے عیسیٰ علیہ السلام کی قوم کے لوگوں کیلئے۔ یعنی "الناس" پر الف لام عہد خارجی ہو۔ معہود لوگ مراد ہوں وہ قوم موسیٰ وعیسیٰ (علیہما السلام) کے لوگ مراد ہیں۔ اور **دوسرا مطلب** یہ ہے کہ توراۃ وانجیل تمام لوگوں کیلئے ہدایت ہیں، کیونکہ توراۃ وانجیل میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف پائے گئے ہیں اور آپ پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے، اس طرح توراۃ وانجیل تحریف سے پہلے اپنی اصلی حالت میں لوگوں کیلئے ہدایت ہیں۔
(ماخوذ از مدارک)

﴿وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ﴾ "اور نازل کیا فرقان (حق وباطل میں فرق کرنے والا)"

فرقان سے مراد کیا ہے؟ اس میں چند اقوال ہیں۔

(۱) الاول ان المرد هو الزبور" ان میں سے پہلا قول یہ ہے کہ فرقان سے مراد زبور ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "وآتینا داود زبورا" اور ہم نے عطاء کیا ہے داود کو زبور۔

(۲) "والثانی ان المراد هو القرآن وانما اعاده تعظیما لشانه ومدحایکونه فارقا بین الحق والباطل"
دوسرا قول یہ ہے کہ فرقان سے مراد قرآن پاک ہے۔ اب اس قول پر بظاہر وہم ہوتا تھا کہ قرآن پاک کا ذکر تو پہلے کیا جا چکا ہے پھر دوبارہ ذکر کرنے کا کیا مطلب ہے؟ تو اس کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ دوبارہ ذکر کیا گیا ہے قرآن پاک کی عظمت شان بیان کرنے کیلئے اور قرآن پاک کی تعریف کرنے کیلئے اور واضح طور پر بیان کرنے کیلئے کہ قرآن پاک حق وباطل میں فرق کرنے والا ہے۔ **فرقان** سے مراد قرآن پاک ہی ہو، لیکن اس کا مطلب یہ ہو کہ قرآن پاک کا اگر چہ ذکر دوبارہ کیا گیا ہے لیکن اس میں تکرار نہیں بلکہ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ قرآن پاک توراۃ وانجیل سے بعد نازل ہوا۔

"لیجعله فرقا بین مااختلف فیه الیهود والنصاری من الحق والباطل"

اور یہود ونصاری جن چیزوں میں اختلاف کرتے تھے ان کے اختلافات میں حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والا بنایا۔

اس صورت میں تکرار نہ ہونے کی وجہ واضح ہے کہ پہلے یہ بیان کیا کہ قرآن پاک اترا حق سے۔ اب یہ بیان کیا کہ قرآن پاک نے یہود ونصاری کے درمیان واقع ہونے والے اختلافات کے حق و باطل میں بھی فرق کیا۔ یہ نیا مطلب ہے۔ تکرار نہیں کیونکہ تکرار کا مطلب ہوتا ہے پہلی چیز کو دوبارہ لوٹا دیا جائے۔

(۳) والقول الثالث وهوقول الأكثرين ان المراد انه تعالى كما جعل الكتب الثلاثة هدى للناس ودلالة فقد جعلها فارقة بين الحلال والحرام وسائر الشرائع"

تیسرا قول اکثر حضرات کا ہے کہ جس طرح ایک قول کے مطابق تینوں کتابیں "قرآن پاک، توراۃ اور انجیل" لوگوں کیلئے ہدایت ہیں اسی طرح یہ تینوں ہی حلال وحرام اور تمام شرائع میں فرق کرنے والی ہیں۔ یعنی اس قول کے مطابق فرقان سے مراد قرآن پاک، توراۃ وانجیل تینوں ہی ہیں۔ (از کبیر)

علامہ رازی رحمہ اللہ کے نزدیک تینوں قول مرجوح، مختار چوتھا قول:

آپ فرماتے ہیں: "اما حمله على الزبور فهو بعيد لان الزبور ليس فيه شيء من الشرائع والاحكام بل ليس فيه الا المواعظ" فرقان سے مراد زبور لینا عقل سے بعید ہے کیونکہ زبور میں شرائع اور احکام کا ذکر نہیں، بلکہ اس میں فقط وعظ ونصیحت پائے گئے ہیں۔

اور دوسرا قول "کہ فرقان سے مراد قرآن پاک ہے" درست نہیں، کیونکہ "وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ" کو عطف سے ذکر کیا گیا ہے، جبکہ حقیقت میں معطوف اور معطوف علیہ میں مغائرت پائی جاتی ہے "فهذا يقتضي ان يكون هذا الفرقان مغاير اللقرآن" تو اسی قانون وضابطہ کے تقاضا کے مطابق فرقان مغائر ہوگا قرآن پاک کے۔

تیسرا قول بھی مرجوح ہے کیونکہ، اگر یہ کہا جائے کہ تینوں کتابیں حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی ہیں۔ تو یہ ان کی صفت ہوگی۔

"وعطف الصفة وان كان قدورد في بعض الاشعار لنا درة الاانه ضعيف بعيد عن وجه الفصاحة اللائقة بكلام الله تعالى"

اور صفت کا عطف موصوف پر اگر چہ بعض نادر اشعار میں پایا گیا ہے۔ لیکن فصاحت سے دور ہے، اللہ تعالی کے فصیح کلام کی شان کے لائق نہیں کہ صفت کا عطف موصوف پر ہو، کیونکہ صفت اور موصوف میں

موافقت پائی جاتی ہے اور معطوف اور معطوف علیہ میں مغایرت پائی جاتی ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ کا مختار:

آپ فرماتے ہیں میرے نزدیک مختار چوتھا قول ہے۔یعنی یہ تینوں قول مرجوح ہیں وہ چوتھا قول یہ ہے

"وھو ان المراد من ھذاالفرقان المعجزات التی قرنھا اللہ تعالی بانزال ھذہ الکتب"

کہ فرقان سے مراد معجزات ہیں، چونکہ اللہ تعالیٰ نے جب کتابوں کو نازل فرمایا تو ان کے ساتھ ہی انبیاء کرام کو معجزات عطاء فرمائے۔انبیاء کرام نے جب اپنی قوموں کے سامنے کتابیں پیش کیں، اور دعویٰ کیا کہ یہ کتابیں اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائیں تو ان کو اپنے دعوی پر دلیل قائم کرنے کی ضرورت درپیش آئی تاکہ انبیاء کرام کے دعوی اور کذاب (جھوٹے) لوگوں کے دعوی میں فرق واضح ہو جائے۔

"فلما اظھر اللہ تعالی علی وفق دعواھم تلک المعجزات حصلت المفارقة بین دعوی الصادق وبین دعوی الکاذب فالمعجزة ھی الفرقان"

جب اللہ تعالیٰ نے ان کے دعوی کے مطابق انہیں معجزات عطاء فرمائے تو سچے حضرات کے دعوی اور جھوٹے لوگوں کے دعوی میں فرق واضح ہو گیا، لھذا معجزہ فرقان ہے کہ حق اور باطل میں فرق کرنے والا ہے، جب اللہ تعالیٰ نے ذکر فرما کہ اس نے کتاب (قرآن پاک) کو حق سے نازل فرمایا پھر بیان کیا کہ توراۃ وانجیل کو قرآن پاک سے پہلے نازل کیا۔

"بین انہ تعالی انزل معھا ماھو الفرقان الحق وھو المعجز القاھر الذی یدل علی صحتھا ویفید الفرق بینھا وبین سائر الکتب المختلفة"

تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد ذکر فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے فرقان نازل کیا" فرقان سے مراد معجزہ ہے جو کتابوں کے صحیح ہونے اور اللہ تعالیٰ کے کلام ہونے پر دلالت کرتا ہے۔اور عطف جو مغایرت کا تقاضا کرتا ہے وہ بھی ثابت ہو گیا۔ (ماخوذ از کبیر)

علامہ رازی و اعلیٰ حضرت رحمھما اللہ:

علامہ رازی رحمہ اللہ کے تحقیق کے بعد اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضاء خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ دیکھئے خوب ترین، حسین وجمیل، تحقیق پر مبنی نظر آئے گا، آپ کا ترجمہ یہ ہے "وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ" اور فیصلہ اتارا، یعنی وہ چیز اتاری جو حق و باطل میں فیصلہ کرنے والی ہے، وہ علامہ رازی رحمہ اللہ کی تحقیق کے مطابق معجزہ ہے۔

راقم نے بھی اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی، لیکن کہاں اصل اور کہاں نقل، آپ نے "فرقان" کا معنیٰ "فیصلہ" کر کے دریا کوزے میں بند کر دیا، راقم نے لکھا "وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ" "اور نازل کیا فرقان (یعنی حق وباطل میں فرق کرنے والا) راقم کے ترجمہ میں حق ترجمانی بھی ادا نہیں ہوا، تطویل بھی ہے، خوبصورت بھی نہیں اور جامعیت بھی نہیں۔ لیکن مشابہت ضرور پائی گئی ہے۔ خیال رہے کہ روح المعانی میں پہلی تین توجیہات کو بھی صحیح کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن راقم کو علامہ رازی رحمہ اللہ کی تحقیق عظیم نظر آئی، تاہم راقم کی کوشش ہوتی ہے کہ سب اقوال کو جمع کیا جا سکے تو جمع کر لیا جائے۔ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کے مطابق "اور فیصلہ اتارا" اور راقم کے ترجمہ کے مطابق "اور نازل کیا فرقان (حق وباطل میں فرق کرنے والا) سب اقوال کو جمع کیا جا سکتا ہے کہ وہ فیصلہ جو حق وباطل میں فرق کرنے والا ہے وہ قرآن بھی ہے، اور قرآن وتوراۃ وانجیل تینوں بھی ہیں، اور وہ زبور بھی ہے اگر چہ زبور میں احکام وشرائع نہیں مواعظ ہیں "ولكن فيها من الزجر والترغيب فارقة ايضا" لیکن ان مواعظ میں گناہ کرنے پر ڈانٹ دی گئی اور نیکی کی طرف رغبت دلائی گئی ہے اسلئے وہ مواعظ حق وباطل میں فرق کرنے والی ہیں۔ اور فرقان سے مراد معجزہ بھی ہے۔

راقم کے بیان میں چار اقوال جمع ہو گئے، امید ہے طلباء کرام اس کوشش کو پسند کریں گے اور راقم کے حق میں دعاء کریں گے۔ ان چار اقوال کے بغیر دوسرے چار اقوال بھی اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ اور راقم کے ترجمہ میں سموئے جا سکتے ہیں وہ یہ ہیں۔

"قال محمد بن جعفر فرق بين الحق والباطل في امر عيسى عليه السلام الذى جادل فيه الوفد"

حضرت محمد بن جعفر فرماتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں جو نجران کا وفد آپ سے جھگڑا کر رہا تھا عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق تو رب تعالیٰ ان کے متعلق حق فیصلہ نازل کر دیا، جس نے حق وباطل میں فرق کر دیا، وہ یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے پنگھوڑے میں ماں کا دودھ پینے کی عمر میں اپنی ماں سے بہتان دور کرنے کیلئے جو اپنا تعارف کرایا وہی آپ کے حق میں حق فیصلہ ہے۔ وہ تعارف آپ نے یوں کر دیا

"قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ آتَانِیَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِیْ نَبِيًّا"

آپ نے فرمایا بیشک میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب عطاء فرمائی اور اس نے مجھے نبی بنایا۔ اس معنیٰ کے لحاظ پر قرآن پاک کی بعض آیات کو فرقان کہا گیا ہے۔

"وقال قتادة والربيع وغيرهما فرق بين الحق والباطل في احكام الشرائع وفي الحلال والحرام ونحوه"

قتادہ اور ربیع وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ فرقان سے مراد یہ ہے کہ احکام شرائع میں حق و باطل اور حلال وحرام کے درمیان فرق کرنے والی چیز کو اتارا۔

"وقیل الفرقان کل امر فرق بین الحق والباطل فیما قدم وحدث فدخل فی هذا التأویل طوفان نوح وفرق البحر لغرق فرعون ویوم بدر وسائر افعال الله المفرقة بین الحق والباطل"

فرقان سے مراد ہر وہ چیز ہے جس نے حق و باطل میں فرق کیا ہو، خواہ وہ قدیم ہو یا حادث ہو، لھذا کلام الٰہی تفسی جو قدیم ہے وہ بھی حق و باطل میں فرق کرنے والی ہے، اور طوفان نوح علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے قوم کیلئے دریا کا پھٹ کر جگہ دینا کہ یہ دریا سے گزر جائیں، اور فرعون کیلئے پانی کو ملا دینا اور اسے غرق کر دینا، اور بدر میں مسلمانوں کی کامیابی اور کافروں کو شکست فاش حاصل ہونا، اور اس قسم کے رب تعالیٰ کے تمام افعال جو حق و باطل میں فرق کرتے ہیں وہ سب ہی فرقان میں آتے ہیں۔

"وقیل الفرقان، النصر" بعض حضرات نے بیان کیا کہ فرقان سے مراد 'امداد کرنا' ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ کی رب تعالیٰ نے امداد فرمائی، جبکہ کافر کثیر تعداد میں تھے، آپ کے ساتھ ابتدائی طور پر مسلمانوں کی تعداد بہت ہی قلیل تھی، پھر کافر "معاذاللہ" آپ کو مٹانے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے، لیکن رب تعالیٰ نے حضور ﷺ کی امداد فرما کر کافروں کے ارادے خاک میں ملا دئے، یہ امداد حق و باطل میں فرق کرنے والی تھی۔ (آخری چار اقوال ماخوذ از البحر المحیط)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"الفرقان فی الاصل مصدر کالغفران اطلق علی الفاعل مبالغة" فرقان اصل میں مصدر ہے، غفران کے وزن پر ہے، لیکن یہاں فاعل کے معنی میں استعمال ہے اور مبالغہ کا معنی ہے، یعنی "حق و باطل میں بہت زیادہ فرق کرنے والی چیز کو اتارا" (تفسیر ابی السعود)

اسی طرح طلباء کرام کے فائدہ کیلئے ایک اور ترکیب پیش خدمت ہے۔

"هدی للناس "فی حیز النصب علی انه علة للانزال ای انزلهما لهدایة الناس اوعلی انه حال منهما ای انزلهما حال کونهما هدی لهم والافراد لما انه مصدر جعلا نفس الهدی مبالغة او حذف منه المضاف ای ذوی هدی"

"هدی للناس" پر نصب کی چند وجہ ہیں، ایک یہ ہے کہ مفعول لہ ہو لیکن لام انتفاع کا ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کے افعال کا معلل بالاغراض ہونا لازم نہ آئے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا اس سے پہلے اس نے توراۃ وانجیل کو نازل کیا لوگوں کو ہدایت سے نفع

پہنچانے کیلئے۔ یا یہ حال ہو مفعول سے وہ، توراۃ وانجیل ہیں، یعنی اس صورت میں معنی یہ ہوگا ''اس سے پہلے اس نے توراۃ وانجیل کو اتارا دراں حالیکہ وہ ہدایت ہیں لوگوں کیلئے۔ بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ جب ''ھــدی'' حال ہے چیزوں سے تو اسے تثنیہ نہیں لایا گیا، مفرد لایا گیا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہ مصدر ہے جو تثنیہ نہیں ہوتا، مبالغہ کیلئے ہر ایک پر علیحدہ علیحدہ مرتب ہوگا۔ تیسری ترکیب اس میں یہ ہے کہ اس میں مضاف کو حذف کیا گیا ہے، اور مضاف الیہ کو مضاف کی جگہ رکھا گیا ہے، ''الحذف والایصال'' کے قاعدہ کے مطابق مضاف الیہ کو مضاف کی جگہ رکھ کر نصب دے دی گئی، اس صورت میں معنی یہ ہوگا اس سے پہلے توراۃ وانجیل ہدایت والا بنا کر اتارا۔ (ماخوذ از تفسیر ابی السعود)

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ لَھُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ﴾

''بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اللہ کی آیات سے ان کیلئے عذاب ہے سخت۔''

کافروں سے مراد کون سے لوگ ہیں؟ بعض حضرات نے کہا اس سے مراد اہل کتاب یعنی نصاری ہیں، کیونکہ آیۃ نازل نجران کے وفد کے متعلق ہوئی، وہ نصاری تھے۔

''وقال المحققون من المفسرین خصوص السبب لایمنع عموم اللفظ فھو یتناول کل من اعرض عن دلائل اللہ تعالی''

محققین مفسرین کرام نے یہ بیان کیا ہے کہ بیشک آیۃ کریمہ نصاری کے وفد کے متعلق نازل ہوئی، لیکن خصوص سبب عموم لفظ سے منع نہیں کرتا۔ یعنی شان نزول کے لحاظ پر آیۃ کریمہ خاص ہو، اس کے الفاظ عام ہوں تو اس میں عموم کا اعتبار کرنا بھی موقع ومحل کے نشانیوں سے انکار کرتے ہیں، ان تمام کیلئے شدید عذاب ہوگا۔ (از کبیر)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

''بـآیات اللــہ'' میں یا تو اضافۃ عہدیہ ہے، اس صورت میں اللہ کی آیات سے مراد ''قرآن پاک، توراۃ وانجیل کی آیات ہوں گی'' کیونکہ پہلے ان کا ہی ذکر کیا گیا ہے لہذا معہود (معین ومقرر) آیات ان تینوں کتابوں کی آیات ہی ہوں گی۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ اضافۃ جنسیہ ہو۔

''فتصدق الآیات علی مایتحقق فی ضمن ما تقدم وعلی غیرہ کا لمعجزات''

تو اس صورت میں آیات سے مراد جنس آیات ہوں گی، لھذا، قرآن پاک، توراۃ وانجیل کی آیات کو بھی شامل رہیں گی اور معجزات کو بھی، بلکہ ہر وہ نشانی جو اللہ تعالی کی قدرت اور اس کے معبود اور اس خالق وغیرہ ہونے پر دلالت کرتی

ہو، اس کا انکار کفر ہی ہے، وہ سب منکرین اس آیۃ میں داخل ہیں کہ ان کیلئے شدید عذاب ہوگا۔

آیات کی اضافت ''اللہ تعالیٰ'' کی طرف کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

واضافها الى الاسم الجليل تعيينا لحيثية كفرهم وتهويلالأمرهم وتاكيدالاستحقاقهم العذاب''

آیات کی اضافت رب قدوس کے اسم گرامی ''اللہ کی طرف کی تا کہ کافروں کے کفر کی حیثیت واضح ہو جائے، معین ہو جائے اور پتہ چل جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرنے والے ہیں کیونکہ کفر کی کئی صورتیں ہیں، جب یہ واضح ہوگیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرنے والے ہیں تو ان کا معاملہ ہولناک ہوگیا، یعنی یہ بھی خود بخود سمجھ آ گیا کہ وہ شدید عذاب کے مستحق ہیں۔

یعنی ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْابِآيَاتِ اللّٰهِ ﴾ سے ہی ان کا شدید عذاب کا مستحق ہونا سمجھ آ گیا، پھر ﴿ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴾ کو تاکید کیلئے ذکر کر دیا گیا، کہ ان کا شدید عذاب کا مستحق ہونا یقینی ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے ایک اور بحث:

''لھم'' خبر مقدم ہے اور ''عذاب شدید'' مبتداء مؤخر ہے۔ پھر تمام جملہ خبر ہے ''ان'' کی، اور یہ بھی جائز ہے کہ ''لھم ظرف کا تعلق جس عامل سے اسی کا ''عذاب شدید'' فاعل ہو، '' رفع بوجہ فاعلیت بناء برظرفیت لازم آرہا ہو'' والتنكير للتفخيم ففيه اشارة الى انه لايقدر قدره''عذاب شدید'' کو نکرہ ذکر کیا گیا ہے، تنکیر فخامت (زیادتی) پر دلالت کر رہی ہے، جس سے یہ اشارہ مل رہا ہے کہ وہ عذاب اتنا شدید ہوگا کہ اس کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکتا، اس سخت عذاب کو رب تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ وہ کتنا زیادہ سخت ہوگا۔ ''وهو مناط الحصر ولا معنی (کہ وہ عذاب صرف کافروں کو حاصل ہوتا ہے)''لھم'' ظرف کے مقدم کرنے سے حاصل ہوا، جیسا کہ دینی مدارس کے چھوٹی کلاسوں والے طلباء کرام بھی یہ ضابطہ زبانی یاد کئے ہوتے ہیں۔

''والتعليق بالموصول الذى هو فى حكم المشتق يشعر بالعلية وهو معنى تضمنه الشرط''

موصول سے متعلق کیا ہے جو حکم مشتق میں ہے اس سے پتہ چل رہا ہے کہ ان کا کفر علت (سبب) ہے عذاب شدید کی، گویا کہ شرط کے معنی کو متضمن ہے۔

یعنی یہ پتہ چل گیا کہ اگر وہ کفر کریں گے تو شدید عذاب کے مستحق ہوں گے، اگر کفر نہیں کریں گے بلکہ اسلام لے آئے تو ان کو شدید عذاب نہیں ہوگا، اگر گناہوں کی وجہ سے گرفت ہوگئی اور جہنم میں داخل ہونا پڑا (العیاذ باللہ) تو وہ

گرفت سرزنش کی حد تک ہوگی، مؤمن کو گناہوں کے زنگ سے پاک وصاف کر کے جنت میں داخل کرنا مقصود ہوگا۔ طلباء کرام یہ بھی خیال کریں کہ جب مبتداء معنی شرط کو متضمن ہوتو خبر پر فاء کا لانا واجب ہوجاتا ہے تو یہاں "لھم" پر فاء نہیں آئی، اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے یوں دیا ہے "وترک فیه الفاء لظهوره فهو ابلغ اذااقتضاه المقام" فاء کو ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ یہ مسئلہ واضح ہے کہ جب مقام تقاضا کرے کہ یہاں فاء کو اس لئے نہ ذکر کیا جائے کہ فاء کا مقام ہونا اس کا ظاہر ہے تو اس صورت میں فاء کا ذکر نہ کرنا بلاغت ہے۔
(از روح المعانی)

﴿وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُوانْتِقَامٍ﴾ اور اللہ غالب ہے بدلہ لینے والا۔

"عزیز ای لایغلب" اللہ تعالیٰ عزیز ہے یعنی غالب ہے، اس پر کوئی غالب نہیں ہوسکتا۔ (خازن)

"ای غالب امره یفعل مایشاء ویحکم مایرید" یعنی وہ اپنے حکم اور ارادہ پر غالب ہے، جو چاہے وہ کرتا ہے، اور جو ارادہ کرے اس کا وہ فیصلہ کرتا ہے۔ (روح المعانی)

"ذوانتقام" (بدلہ لینے والا) "نقمت الشئ وقمته اذانکرته اما باللسان واما بالعقوبة"
نقم کا معنی ہے انکار کرنا، خوہ وہ زبان سے انکار کرے یا سزا دے کر انکار کرے۔ زبان سے انکار کرنا ان آیات میں پایا گیا ہے۔ ﴿وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّاۤ اَنْ اَغْنَاهُمُ اللّٰهُ﴾ ﴿وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّاۤ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ﴾ ﴿هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّاۤ﴾ اور نقمۃ بمعنی عقوبت ان آیات میں پایا گیا ہے ﴿فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ﴾ ﴿فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا﴾ ﴿فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فانظر كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ﴾ (مفردات راغب)

یہاں مراد عذاب دینا ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ انتقام لینے والا ہے، یعنی وہ تسلط رکھتا ہے عذاب دینے کا۔

"والعزیز اشارة الی القدرة التامة علی العقاب وذوالانتقام اشارة الی کونه فاعلا للعقاب والاول صفة الذات والثانی صفة الفعل" (والله اعلم)

"عزیز" سے اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو عذاب دینے کی قدرت کاملہ حاصل ہے، اور "ذوانتقام" سے اس طرف اشارہ ہے کو وہ عذاب کا فعل کا فاعل ہے۔ اسطرح یہ واضح ہوگا کہ "عزیز" رب تعالیٰ کی صفت ذات ہے، اور "ذوانتقام" صفت فعل ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَخْفٰی عَلَیْهِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَاءِ ۝ هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ کَیْفَ یَشَاءُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۝﴾ (آل عمران آیت نمبر ۵،۶)

(1) اللہ پر کچھ چھپا نہیں زمین نہ آسمان میں ۝ وہی ہے کہ تمھاری تصویر بناتا ہے ماؤں کے پیٹ میں جیسی چاہے اس کے سوا کسی کی عبادت نہیں عزت والا حکمت والا۔

(2) بیشک اللہ نہیں چھپی اس پر کوئی چیز زمین میں اور نہ آسمانوں میں ۝ وہی ہے جو تمیں صورتیں عطاء کرتا ہے بچہ دانیوں میں جس طرح وہ چاہتا ہے نہیں کوئی عبادت کے لائق سوائے اس کے جو غالب ہے حکمت والا ہے۔

ماقبل سے تعلق : اللہ تعالی نے اپنی صفت بیان فرمائی "القیوم" وہ حی وقیوم ہے۔

"والقیوم هو القائم باصلاح مصالح الخلق ومهما تهم وكونه كذلك لا يتم الا بمجموع امرين احدهما ان يكون عالما بحاجا تهم على جميع وجوه الكمية والكيفية والثانی ان يكون بحيث متى علم جهات حاجا تهم قدر على دفعها"

قیوم کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی مخلوق کی مصلحتوں کے مطابق اصلاح فرماتا ہے اوران کی مشکلات کو دور فرماتا ہے یہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک دو چیزیں نہ پائی جائیں۔ایک یہ ہے کہ وہ حاجتمندوں کی تمام حاجات کو جانتا ہو کمیت (مقدار) کے طور پر اور کیفیت کے طور پر بھی اور دوسری چیز یہ ہے کہ ان کی حاجات کی وجوہ مکمل طور پر معلوم ہوں تاکہ ان کی مشکلات کو دور کیا جاسکے اوران کی حاجات کو پورا کیا جاسکے

پہلی چیز اس وقت تک مکمل نہیں جب تک تمام معلومات کا علم حاصل نہ ہو اور دوسری چیز اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ تمام ممکنات پر قدرت حاصل نہ ہو۔

فقوله "ان الله لا يخفى عليه شئ فی الارض ولا فی السماء" اشارة الى كمال علمه المتعلق بجميع المعلومات"

اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَخْفٰی عَلَیْهِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَاءِ﴾ دلالت کررہا ہے اس پر کہ اس ذات کبریاء کو تمام مخلوقات کی تمام ضروریات و حاجات کا مکمل علم حاصل ہے معلومات میں سے کوئی چیز

اس کے احاطہ علم سے باہر نہیں خواہ وہ معلومات زمین سے متعلق ہوں یا آسمانوں سے اللہ تعالیٰ کو حاجات کی مقدار کا علم حاصل ہے اور ضروریات کے مراتب کا علم حاصل ہے کسی کے سوال سے وہ اعراض نہیں فرماتا بہت سوال کرنے والے لوگوں کے کثیر سوالات کی وجہ سے اسے کوئی اشتباہ نہیں ہوتا کہ فلاں نے کیا سوال کیا تھا اور فلاں نے کیا بلکہ اسے ہر ایک کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ فلاں شخص کا فلاں سوال تھا اور دوسرے فلاں کا فلاں سوال تھا۔

"ثم قوله هو الذی یصورکم فی الارحام کیف یشاء" اشارة الی کونه تعالی قادرا علی جمیع الممکنات وحینئذیکون قادرا علی تحصیل مصالح جمیع الخلق ومنافعهم"

پھر اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿هُوَ الَّذِی يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ﴾ دلالت کر رہا ہے اس پر کہ وہ تمام ممکنات پر قادر ہے کہ تمام مخلوقات کی تمام مصلحتوں کو پورا کرے اور ان کے منافع انہیں پہنچائے۔ (ماخوذ از کبیر)

دوسری آیت کریمہ پہلی پر دلیل ہے:

عقلی دلائل سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمام معلومات کا علم حاصل ہے کیونکہ

"ان افعال الله تعالی محکمة متقنة والفعل المحکم المتقن یدل علی کون فاعله عالما"

ہر شخص عقل شعور رکھنے والا جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام افعال محکم اور یقینی ہیں۔ فعل کا محکم اور یقینی ہونا دلالت کرتا ہے کہ اس فعل کا فاعل (اس کام کو کرنے والا) کامل علم رکھتا ہے۔

جب عقلی دلیل سے واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ تمام معلومات کا علم رکھنے والا ہے تو اب پتہ چلا کہ پہلی آیت ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ﴾ دعویٰ کے درجہ میں ہے کہ "بیشک اللہ پر کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں زمین میں اور نہ آسمانوں میں۔ پھر اس پر عقلی دلیل قائم کی اور ارشاد فرمایا ﴿هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ﴾ (رب تعالیٰ کی) وہ ذات ہے جو تمہیں صورتیں عطاء کرتا ہے بچہ دانیوں میں جسطرح چاہتا ہے۔ یعنی وہ ماں کے پیٹ میں بچہ دانی کی تاریکی میں عجیب صورت اور عجیب جسم کی تخلیق فرماتا ہے، اور انوکھے انداز سے جسم کو مرکب کرتا ہے۔ مختلف شکلیں، مختلف طبیعتیں، مختلف صفات عطاء کرتا ہے، پھر جسم میں سخت ہڈیاں، نرم ہڈیاں، پھر موٹی رگیں یعنی شریان اور چھوٹی رگیں، اور پٹھے رکھے گئے۔

"ثم انه ضم بعضها الی بعض علی الترکیب الاحسن والتالیف الاکمل"

پھر ان تمام چیزوں کو اچھی خوبصورت ترکیب سے مرکب کیا اور جسم کی ساخت کو مکمل کیا۔

"وذلک یدل علی کمال قدرته" انسان کے جسم کی اس خوبصورت انداز میں تخلیق دلالت کر رہی ہے کہ اسے کامل قدرت حاصل ہے اس نے اپنی کامل قدرت کے ذریعے ہی تو نطفہ کے ایک قطرہ سے مختلف اعضاء بنائے، مختلف طبیعتیں بنائیں، اور مختلف شکلیں عطا فرمائیں، اور مختلف رنگ عطاء کیے۔

"ویدل علی کونه عالما من حیث ان الفعل المحکم لایصدر الاعن العالم"

تو اسی سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ وہ تمام معلومات کا عالم ہے، کیونکہ اس طرح کا محکم (پختہ) فعل صرف وہی کر سکتا ہے جس کا علم وسیع ہو۔

"فکان قوله هو الذی یصورکم فی الارحام کیف یشاء" دلا علی کونه قادرا علی کل المکنات روالا علی صحة ما تقدم عن قوله" "ان الله لایخفی علیه شئ فی الارض ولا فی السماء"

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ﴾ دلالت کر رہا ہے اس پر کہ وہ تمام ممکنات پر قادر ہے، اور اللہ تعالیٰ کے پہلے ارشاد گرامی ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ﴾ جو دعوی پایا گیا ہے کہ رب تعالیٰ کو تمام معلومات کا علم حاصل ہے، اور وہ تمام مخلوقات کی حاجات کو جانتا ہے کیونکہ اس پر زمین اور آسمان کی کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں، اس پر بھی یہ دوسری آیۃ دلیل بن گئی، کیونکہ عقل اسے تسلیم کرتی ہے کہ بغیر علم کے عجیب وغریب صورت ممکن نہیں۔

"واذاثبت انه تعالی عالم بجمیع المعلومات وقادر علی کل الممکنات ثبت انه قیوم المحدثات والممکنات"

جب یہ ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کو تمام معلومات کا علم حاصل ہے، اور اسے تمام ممکنات پر قدرت حاصل ہے تو اسی سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ وہ تمام حادث اور ممکن چیزوں (یعنی تمام مخلوق) کا قیوم ہے، کہ وہی ان کی مصلحتوں کو قائم کرنے والا ہے، وہی ان کی حاجات کو پورا کرنے والا ہے، وہی ان کی مشکلات کو دور کرنے والا ہے۔

زیر بحث یہ دونوں آیتیں رب تعالیٰ کے "حی وقیوم" ہونے پر دلیل ہیں۔ اور اسی سے ان دونوں آیتوں کا ماقبل سے رابطہ اور تعلق بھی واضح ہو گیا۔ جس شخص نے بھی ان لطائف میں توجہ کر لی وہ سمجھ جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کا کلام کتنا ہی زیادہ فائدہ مند ہے، اور کتنی ہی اچھی ترتیب اس میں پائی گئی ہے، اور کتنا ہی زیادہ دلوں پر اثر کرنے والا ہے۔

شان نزول: نصاریٰ کے وفد نے عیسیٰ علیہ السلام کے الٰہ (معبود) ہونے میں دو دلیلیں قائم کیں، ایک کا تعلق عیسیٰ علیہ السلام کے علم سے تھا اور دوسری کا تعلق قدرت سے تھا۔

نصاری کی پہلی دلیل : جو علم سے متعلق تھی وہ یہ تھی

"ان عیسی علیہ السلام کان یخبر عن الغیوب و کان یقول لھذا انت اکلت فی دارک کذا ویقول لذلک انک صنعت فی دارک کذا"

بیشک عیسی علیہ السلام غیبی خبریں دیتے تھے، کہ کسی کو کہتے تھے تم نے آج گھر میں یہ کھایا ہے، اور کسی کو کہتے تم نے اپنے گھر میں یہ کیا ہے یعنی فلاں چیز جمع کر کے رکھی ہے۔

قرآن پاک نے اسی کو بیان کیا ﴿وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِيْ بُيُوْتِكُمْ﴾ (عیسی علیہ السلام نے کہا) اور تمہیں بتاتا ہوں جو تم کھاتے اور جو تم اپنے گھروں میں جمع کر رکھتے ہو۔ نصاری کی دلیل کا یہ مطلب تھا کہ علم غیب صرف معبود کو حاصل ہوتا ہے، لھذا عیسی علیہ السلام خدا تھے۔

نصاری کی دوسری دلیل: عیسی علیہ السلام کے معبود ہونے پر ان کی دوسری دلیل کا تعلق قدرت سے تھا۔

"وھو ان عیسی علیہ السلام کان یحیی الموتی ویبرء ی الأکمه والابرص ویخلق من الطین کھیئة الطیر فینفخ فیه فیکون طیرا"

کہ عیسی علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے، اور مادرزاد اندھے کو نظر عطا کرتے تھے، اور مرض والے کو تندرست کر دیتے تھے، اور کیچڑ سے پرندے کی شکل بناتے اس میں روح پھونکتے وہ پرندہ بن جاتا۔ قرآن پاک میں بھی آپ کے ان معجزات کا ذکر ہے"

اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًاۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ" (آل عمران، آیۃ نمبر ۴۹)

بیشک میں تمہارے لئے مٹی سے پرند کی سی مورت بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ فوراً پرند ہو جاتی ہے اللہ کے حکم سے۔ اور میں شفاء دیتا ہوں مادر زاد اندھے اور سفید داغ والے کو اور میں مردے جلاتا ہوں اللہ کے حکم سے، اس سے پتہ چلا کہ جب عیسی علیہ السلام کو یہ قدرت حاصل ہے تو آپ (معاذ اللہ) معبود ہی تھے۔

یہ دونوں دلیلیں جب نصاری نے پیش کیں تو رب تعالی نے ان کا رد کرنے کیلئے ان دو آیتوں کو نازل کیا۔

ان کی پہلی دلیل کا رد:

پہلی آیۃ کریمہ سے فرمایا ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ﴾ بیشک اللہ تعالی

پر کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں زمین میں اور نہ آسمانوں میں۔ یعنی اللہ تعالیٰ تو وہ ہے جو تمام مخلوق کا خالق ہے، "والخالق لابدوان یکون عالما بمخلوقه" اور خالق کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنی تمام مخلوق کا علم رکھے۔

"ومن المعلوم بالضرورة ان عیسی علیه السلام ماکان عالما بجمیع المعلومات والمغیبات"

اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو تمام مخلوق کا علم نہیں تھا اور تمام چیزوں کا علم غیب حاصل نہیں تھا تو واضح ہوا کہ آپ الہ (معبود) بھی نہیں تھے، آپ کو اگرچہ بعض علوم غیبیہ حاصل تھے۔

"انه لایلزم من کونه عالما ببعض المغیبات ان یکون الها"

لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ بعض علوم غیبیہ جسے حاصل ہوں وہ معبود بھی ہو۔

اور عیسیٰ علیہ السلام کو جو بعض علوم غیبیہ حاصل تھے وہ بھی اللہ تعالیٰ کی عطاء اور اس کی تعلیم اور وحی کے ذریعے حاصل تھے۔ "ولکن عدم احاطته ببعض المغیبات یدل دلالة قاطعة علی انه لیس باله" اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ بعض غیبی چیزوں کا علم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حاصل نہیں تھا جسے بعض علوم غیبیہ حاصل ہوں اور بعض حاصل نہ ہوں وہ الہ (معبود) نہیں ہوسکتا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ نصاریٰ کہتے تھے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا گیا تھا اور انہوں نے موت کے وقت جزع وفزع کی اگر آپ کو تمام علوم غیبیہ حاصل ہوتے تو آپ کو یہ معلوم ہوتا کہ ایک قوم میرے قتل کا ارادہ رکھتی ہے اور مجھے پکڑنا چاہتی ہے جس سے مجھے ایذاء اور درد حاصل ہوگا۔ "فکان یفر قبل وصولهم الیه" آپ ان لوگوں سے بھاگ کر اپنی جان بچا لیتے جب آپ نصاریٰ کے قول کے مطابق اپنی جان نہیں بچا سکے تو آپ جو تمام علوم غیبیہ بھی حاصل نہیں تھے۔

"فثبت ان الاستدلال بمعرفة بعض الغیب لایدل علی حصول الالهیة واما الجهل ببعض الغیب یدل قطعا علی عدم الالهیة"

تو ثابت ہوا کہ بیشک بعض علوم غیبیہ کے حاصل ہونے سے معبودیت پر دلیل نہیں پکڑی جاسکتی اور خاص کر کے یہ اقرار بھی کرنا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو بعض علوم غیبیہ حاصل نہیں تھے یہ تو بہت پختہ قطعی دلیل ہے کہ وہ الہ (معبود) نہیں تھے۔

خیال رہے کہ یہ الزامی جواب ہے کہ جب تم عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے ہو کہ ان کو قتل کر دیا گیا، اور انہوں نے موت کے وقت چیخ وپکار کی تو تمہارا یہ عقیدہ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ ان کو تمام علوم غیبیہ حاصل نہیں تھے کیونکہ وہ اپنے آپ کو ان لوگوں سے بھاگ کر نہیں بچا سکے ورنہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا گیا بلکہ آپ کو زندہ اٹھالیا گیا جس کا تذکرہ انشاء اللہ آگے تفصیلی طور پر آئے گا۔ واضح ہو کہ نصاریٰ کا عقیدہ بھی باطل ہے اور ان کے دلائل باطل ہیں

عیسیٰ علیہ السلام کو معبود ماننا سراسر کفر ہے۔

نصاریٰ کی دوسری دلیل کا رد:

نصاریٰ نے جب یہ دلیل پکڑی کہ عیسیٰ علیہ السلام کو قدرت حاصل تھی مردہ کو زندہ کرنے کی اور وہ مٹی کی مورتی میں روح پھونک کر پرندہ بنا لیتے تھے، تو رب تعالیٰ نے ان کے رد کیلئے زیر بحث دو آیتوں میں سے دوسری آیت کریمہ کو نازل کیا اور ارشاد فرمایا ﴿هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ﴾ (وہ صورتیں عطاء کرتا ہے تمہیں بچہ دانیوں میں جیسے چاہتا ہے) اس سے پتہ چلا کہ "حصول الاحیاء والاماتة علی وفق بعض الصور لا یدل علی کونه الھا" بعض صورتوں کو زندہ کرنے یا موت دینے کی قدرت حاصل ہونے سے الوہیت (معبودیت) حاصل نہیں ہوتی۔ اور خاص کر کے قدرت بھی وہ جو رب تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عزت افزائی کیلئے انہیں عطاء کی ہو اور آپ کو بطور معجزہ عطاء کی ہو اسے دلیل ماننا "کہ آپ معبود تھے" باطل ہے۔

"اما العجز عن الاحیاء فی بعض الصور یدل علی عدم الالھیة وذلک لا ن الاله ھو الذی یکون قادرا علی ان یصور فی الارحام من قطرة صغیرة من النطفة ھذا الترکیب العجیب والتالیف الغریب"

لیکن نصاریٰ کا بھی یہ تسلیم کرنا کہ بعض صورتوں (مورتیوں) کو زندہ کرنے کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو طاقت حاصل نہیں تھی اسی سے پتہ چلا کہ آپ کو الوہیت بھی حاصل نہیں تھی اس لئے کہ الٰہ تو وہ ہے جو ماؤوں کے پیٹوں میں بچہ دانیوں میں نطفہ کے ایک چھوٹے سے قطرہ سے عجیب و غریب صورت انسان کی شکل میں معرض وجود میں لاتا ہے۔

"ومعلوم ان عیسی علیه السلام ما کان قادرا علی الاحیاء والاماتة علی ھذا الوجه"

یہ بات یقیناً معلوم ہوگئی کہ عیسیٰ علیہ السلام کو رب تعالیٰ کی طرح زندہ کرنے کی طاقت حاصل نہیں تھی بعض مردوں کو زندہ کرنے کی رب تعالیٰ کی طرف سے قدرت دیا جانا یا بعض مورتیوں کو زندگی عطاء کرنے سے ان کا معبود ہونا لازم نہیں آتا۔

اور خاص کر کے نصاریٰ کے باطل عقیدہ کے مطابق جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا گیا تو آپ کو اگر قدرت حاصل ہوتی تو اپنے قاتلین کی روحیں قبض کر لیتے، جب آپ یہ نہیں کر سکتے تو اس سے خود بخود لازم ہو گیا کہ آپ کو جمیع قدرتیں حاصل نہیں تھیں۔

"اما م عدم حصول الاماتة والا حیاء علی وفق مراده فی سائر الصور یدل علی انه ما کان الھا"

جب آپ کو اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق زندہ کرنے اور مارنے کی تمام قدرت حاصل نہیں تھی، بلکہ صرف رب تعالیٰ

کی طرف سے دی گئی کچھ قدرت وطاقت حاصل تھی تو واضح ہو گیا کہ آپ الٰہ (معبود) نہیں تھے۔

اللہ کا بیٹا کہنے والوں کی دلیل اور اس کا رد:

نصاریٰ کے دوسرے فرقہ نے مسلمانوں سے یہ کہا۔"ایها المسلمون انتم انتم توافقونا علی انه ما کان له اب من البشر فوجب ان یکون ابناله" اے مسلمانو جب تم بھی اس میں ہمارے ساتھ اتفاق رکھتے ہو کہ عیسیٰ علیہ السلام کا کوئی انسان باپ نہیں تھا تو اسے بھی تسلیم کرلو کہ وہ خدا کا بیٹا ہے،ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ بغیر باپ کے بیٹا پیدا ہو۔تو رب تعالیٰ نے ان کے رد میں اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا ﴿هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ﴾ اس آیۃ کریمہ سے جب یہ پتہ چل گیا کہ بچہ دانیوں میں صورتیں تو اللہ تعالیٰ ہی عطاء کرتا ہے جس طرح چاہے،تو اسی سے یہ بھی واضح ہوگیا"فان شاء صوره من نطفة الاب وان شاء صوره ابتداء من غیر الاب" کہ اگر چاہے تو باپ کے نطفہ سے کسی کو صورت عطاء کردے اور اس کے جسم کی تخلیق کردے،اور اگر چاہے تو بغیر باپ کے ابتدائی طور پر ہی کسی کو صورت عطاء کردے اور اسکے جسم کی تخلیق کردے۔باپ کے بغیر پیدا ہونے کو اللہ کا بیٹا ہونے پر دلیل بنانا جہالت وحماقت ہے اور رب تعالیٰ کی قدرت"کن فیکون"کا صراحۃ انکار ہے۔

نصاریٰ کی ایک اور دلیل کا رد اگلی آیۃ کریمہ میں:

نصاریٰ نے جب رسول اللہ ﷺ کو یہ کہا۔"الست تقول ان عیسی روح الله و کلمته فهذا یدل علی انه ابن الله" کیا تم نہیں کہتے ہو کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کی روح اور اس کا کلمہ ہیں؟ جب یہ کہتے ہو تو اسی سے واضح ہو گیا کہ وہ اللہ کا بیٹا ہیں۔تو ان کے رد میں آنے والی آیۃ کریمہ کو نازل کیا ﴿هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ﴾ (وہی ہے جس نے تم پر یہ کتاب اتاری،اس کی کچھ آیتیں صاف معنیٰ رکھتی ہیں وہ کتاب کی اصل ہیں اور دوسری وہ ہیں جن کے معنی میں اشتباہ ہے) اور اس آیۃ کریمہ سے واضح کہ"روح اللہ اور کلمة الله" سے خدا کا بیٹا ہونے پر تمہارا استدلال باطل کیونکہ روح اللہ اور کلمۃ اللہ کے مطالب کو سمجھنے سے ہی قاصر ہو،مکمل تفصیل ہر ایک کی انشاء اللہ اپنے اپنے مقام پر آئے گی۔

ابتداء سے لے کر آنے والی آیۃ کریمہ تک نصاریٰ کا رد:

رب تعالیٰ نے اپنی صفت"الحی القیوم" سے اس طرف اشارہ فرمادیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہ خدا تھے اور

نہ خدا کا بیٹا اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَخْفٰی عَلَیْہِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ﴾ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ اے نصاریٰ تمہارا یہ کہنا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو بعض علوم غیبیہ حاصل تھے اس لئے وہ معبود ہیں" غلط اور باطل ہے، الہ تو وہ ہے جس پر زمین و آسمان کی کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں۔ اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿ھُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ کَیْفَ یَشَآءُ﴾ نصاریٰ کے اس استدلال کا رد ہے۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام کو مردوں کو زندہ کرنے اور مٹی کی مورتی بنا کر روح پھونک کر پرندہ بنانے کی طاقت حاصل تھی جو ان کے معبود ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ ان کے اس قول کا رد یوں کیا گیا کہ بعض چیزوں کی قدرت رب تعالیٰ کی طرف سے کسی کو عطاء ہونے سے اسے معبودیت حاصل نہیں ہوتی، اور اسی سے ان کی اس دلیل کا بھی رد کر دیا گیا کہ عیسیٰ علیہ السلام کا کوئی انسان جب باپ نہیں تھا تو وہ خدا کا بیٹا ہیں، اور رب تعالیٰ نے ﴿ھُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتَابَ﴾ سے ان کی اس دلیل کا رد کیا کہ عیسیٰ علیہ السلام کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہیں لھذا خدا کا بیٹا ہیں۔ ان کا رد کیا کہ تم اپنی جہالت کی وجہ سے ان الفاظ کے مطالب سمجھنے سے قاصر ہو۔ اور "لاالہ الاھو العزیز الحکیم" کلمہ توحید سے نصاریٰ کے تمام فرقوں کا رد بھی کر دیا گیا اور ان پر زجر بھی کر دی گئی۔ کہ اس کے بغیر اور کوئی معبود نہیں لھذا عیسیٰ علیہ السلام معبود بھی نہیں اور معبود کا بیٹا بھی نہیں اور معبود کے ساتھ شریک بھی نہیں۔ اس سے نصاریٰ کے تینوں فرقوں کا رد ہو گیا، عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کہنے والوں کا بھی، اور خدا کا بیٹا کہنے والوں کا بھی، اور خدا کے ساتھ تیسرا معبود کہنے والوں کو بھی۔ "فالعزیز اشارۃ الی کمال القدرۃ" رب تعالیٰ نے اپنی صفت عزیز ذکر فرما کر اپنی کامل قدرت کا ذکر فرما دیا کہ وہ غالب ہے، اس پر کوئی غالب ہیں، لھذا رب تعالیٰ کو وحدہ لا شریک لہ نہ ماننے والوں کو اور اس کو اولاد سے پاک نہ ماننے والوں کو وہ اپنی گرفت میں لے گا، اس کی گرفت سے کوئی بچ نہیں سکے گا۔ "والحکیم اشارۃ الی کمال العلم" اور رب تعالیٰ نے اپنے صفت "حکیم" ذکر کر کے اپنے کامل علم کی طرف اشارہ فرما دیا۔

ساری بحث کا خلاصہ:

قرآن پاک میں یہ عظمت پائی گئی ہے کہ "لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ" میں پہلی تمام آیات کا مفہوم سمیٹ کر رکھ دیا گیا ہے۔

"وھو تقریر لما تقدم من ان علم المسیح ببعض الغیوب وقدرتہ علی الاحیاء والاماتۃ فی بعض الصور لایکفی فی کونہ الھا فان الالہ لا بد وان یکون کامل القدرۃ وھو العزیز و کامل العلم وھو الحکیم"

رب تعالی کا ارشادگرامی "لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ" پچھلے تمام مضمون کو حاوی ہے اور اس کی تاکید اور وضاحت اس میں موجود ہے کہ عیسی علیہ السلام کو بعض علوم غیبیہ حاصل تھے اور زندہ کرنے اور مارنے کی کچھ قدرت حاصل تھی یہ معبود بننے کیلئے کافی نہیں۔ معبود تو وہ ہے جو کامل قدرت کا مالک ہے، کامل قدرت کا تو وہی مالک ہے جو عزیز ہے، اور معبود تو وہ ہے جو کامل علم رکھتا ہو، کامل علم اسے ہی حاصل ہے جو حکیم ہے۔

جب عزیز بھی رب تعالی ہی ہے اور حکیم بھی رب تعالی ہی ہے تو یقیناً معبود بھی صرف وہی ہے، اس کے بغیر کوئی معبود حقیقی نہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

اللہ تعالی نے اپنے علم کی خبر دی کہ اس پر کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں زمین میں اور نہ ہی آسمانوں میں۔ اس سے یہ پتہ چل گیا "فهو العالم بما كان ومايكون ومالايكون" کہ اللہ تعالی کو "ما کان" اور "مایکون، ما لایکون" جو کچھ ہو چکا ہے، جو کچھ ہونا ہے، جو کچھ نہیں ہونا سب کا علم ہے۔ اسی سے ضمناً یہ بات سمجھ آگئی "فكيف يكون عيسى الها اوابنا له وهو تخفى عليه الاشياء" کہ عیسی علیہ السلام کس طرح "اله" بن سکتے ہیں، یا اللہ کا بیٹا کیسے بن سکتے ہیں، ان پر تو بہت سی چیزیں پوشیدہ رہیں، "اله" تو وہ ہے جس پر زمین وآسمان کی کوئی چیز پوشیدہ نہ رہے۔ (ماخوذ از قرطبی)

صرف زمین وآسمان کے ذکر کا کیا مطلب؟

بظاہر وہم ہوتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالی پر زمین وآسمان کی کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں، اسی طرح زمین وآسمان کے درمیان فضاء میں بھی کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں، اور آسمانوں سے اوپر بھی کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں، صرف آسمانوں اور زمین کے ذکر کا کیا مطلب ہے؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے "وانما عبر عن العالم بهما لان الحس لايتجاوزهما" کہ اصل مقصید بیان یہ ہے کہ لوگوں کو سمجھایا جائے کہ عیسی علیہ السلام معبود نہیں اس پر دلیل جو قائم کی گئی تھی کہ وہ علوم غیبیہ جانتے ہیں لھذا معبود ہیں اس کا رد کیا گیا کہ وہ تو بہت چیزوں کو نہیں جانتے تھے الہ تو وہ ہے جس پر کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں صرف زمین وآسمانوں کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ جن لوگوں کو سمجھانا مقصود تھا ان کی حس اور سمجھ کا تعلق زمین اور آسمانوں سے ہی فقط تھا اس لئے ان دونوں چیزوں کا ذکر کر دیا گیا۔ (مظہری)

راقم کے نزدیک "فضاء یا آسمانوں سے ماوراء بھی زمین آسمان کے ذکر میں آجاتے ہیں اس لئے کہ فضاء تو زمین وآسمان کے تابع ہے لیکن "سماء" کا معنی "علا" (بلند ہونا) جب لیا جائے تو خود لفظ "سماء" آسمانوں اور آسمانوں سے ماوراء کو شامل ہے۔ زمین کو مقدم ذکر کیا گیا اور آسمانوں کا بعد میں ذکر کیا گیا ہے "ان المقصود

بالذکر انه تعالی یعلم اعمال العباد فیجاز یهم علیه " کیونکہ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس سے یہ بھی واضح کردیا جائے کہ اللہ تعالی بندوں کے اعمال کو جانتا ہے۔ اوران کو اس کا بدلہ دے گا بندوں کے اعمال کا تعلق زمین سے ہی ہے اس لئے پہلے زمین کا ذکر دیا گیا۔ (مظہری)

"لا یخفی علیه شئ "تحذیر من مخالفته سرا وجهرا ووعید علیه با لمجازاة"

اللہ تعالی نے اپنی صفت بیان کردی کہ اس پر کوئی چیز چھپی نہیں لھذا جس نے اس کی مخالفت کی خواہ پوشیدگی میں یا ظاہر طور پر اللہ تعالی ان کو اسی طرح بدلہ دے گا یعنی "اِنَّ اللّٰهَ لَا یَخْفٰی عَلَیْهِ شَیْ ءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَافِی السَّمَآءِ " سے لوگوں کو بداعمالیوں پر گرفت کی دھمکی دی گئی۔ اسی سے عیسی علیہ السلام کو الہ یا اللہ کا بیٹا یا اللہ کا شریک ماننے والوں کو بھی دھمکی دے دی گئی کہ جب اللہ تعالی پر زمین اور آسمانوں کی کوئی چیز چھپی نہیں لھذا وہ تمھارے باطل عقیدہ کو جانتا ہے وہ تمیں اپنی گرفت میں لے گا زمحشری نے کہا اسی سے یہ پتہ چل گیا "هو مطلع علی کفر من کفر وایمان من آمن وهو مجاز یهم علیه " کہ اللہ تعالی کافروں کے کفر پر مطلع ہے اور ایمان والوں کے ایمان پر لھذا ان کو جزاء دے گا۔ ماتریدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اسی آیۃ کریمہ سے یہ واضح ہو گیا "لا یخفی علیه شئی من الامور الخفیة عن الخلق فکیف تخفی علیه اعمالکم التی هی ظاهرة عندکم " کہ جب اللہ تعالی پر وہ چیزیں بھی مخفی نہیں جو مخلوق پر مخفی ہیں تو اس پر اے انسانو تمھارے اعمال کیسے پوشیدہ رہ سکتے ہیں وہ تمیں ضرور جزاء دے گا۔ ان تمام اقوال سے یہ واضح ہو گیا کہ آیۃ کریمہ میں ضمناً وعید (دھمکی) پائی گئی۔

وقال الراغب لا یخفی علیه شئی ابلغ من یعلم فی الاصل وان کان استعمال اللفظین فیه یفید ان معنی واحدا "المفردات "

علامہ راغب اصفہانی فرماتے ہیں کہ رب تعالی نے یہ بیان فرمایا ہے ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَایَخْفٰی عَلَیْهِ شَیْءٌ﴾ (بیشک اللہ پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں) اور یہ نہیں فرمایا ﴿اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ کُلَّ شَیْءٍ﴾ بیشک اللہ تعالی ہر چیز کو جانتا ہے اگر چہ دونوں کا بظاہر مطلب ایک ہی نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَایَخْفٰی عَلَیْهِ شَیْءٌ﴾ میں زیادہ مبالغہ پایا گیا ہے۔ (البحر المحیط)

راقم کے نزدیک دونوں جملوں کو جب رب تعالی کی طرف منسوب کی جائے تو فرق واضح نہیں البتہ بندوں کی طرف منسوب کرنے میں فرق ہے بعض لوگوں نے رب تعالی کو بندوں کی طرح ہی سمجھا تھا اس لئے ان کو سمجھانے کیلئے علامہ راغب کا قول صحیح ہے۔ کیونکہ بندوں کے متعلق جب یہ کہا جائے کہ فلاں بندہ اس چیز کے متعلق

سب کچھ جانتا ہے تو اس میں یہ وہم ہوتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ کسی چیز کی طرف توجہ نہ کی ہو تو جاننے کے باوجود علم حاصل نہ ہو اور جب کسی چیز کے متعلق یہ کہا جائے کہ فلاں پر یہ کسی طرح پر پوشیدہ نہیں تو اس میں یہ وہم نہیں ہوگا کہ اس نے اس طرف توجہ نہ کی ہو۔ اللہ تعالی کی طرف توجہ یا عدم توجہ کی نسبت نہیں ہو سکتی (**واللہ اعلم بالصواب**) (راقم)

﴿هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ کَیْفَ یَشَآءُ﴾

''وہی ہے جو صورتیں عطاء کرتا ہے تمہیں بچہ دانیوں میں جس طرح چاہے''

''ھو'' وہ ''الذی'' جو کہ ''اصل میں ترجمہ یہ ہے ''وہ ذات وہ ہی جو'' لیکن مختصر ترجمہ یہ ہے ''وہی ہے'' اعلی حضرت رحمہ اللہ کا یہی ترجمہ ہے ناقل نے بھی وہی نقل کیا ہے

''یصورکم ''التصویر جعل الشئ علی الصورۃ والصورۃ ھیئتیکون علیھا الشئی بالتالیف ''

''تصویر'' کا معنی یہ ہے کہ کسی چیز کو صورت پر بنانا، صورت اس شکل کو کہتے ہیں جس پر کسی چیز کو بنایا گیا ہو۔

''**صور یصور**'' کا معنی تصویر بنانا بھی ہے، اور شکل وصورت عطاء کرنا بھی ہے (خازن)

''**فی الارحام**'' رحم (راء کے کسرہ سے) ماں کے پیٹ میں بچہ دانی کو کہتے ہیں، جس میں بچہ قرار پکڑتا ہے۔ جس عورت کے رحم میں درد ہو اس کیلئے لفظ استعمال ہوتا ''امراۃ رحوم'' قریبی رشتہ داروں کو بھی رحم کہا جاتا ہے، اس وجہ سے کہ وہ بھی ایک رحم سے پیدا ہوتے ہیں۔ (ماخوذ از مفردات راغب)

''**کیف یشـــاء**'' جس طرح چاہے، یعنی تمہیں ماؤں کے پیٹ میں بچہ دانیوں میں صورتیں عطاء کرتا ہے، یعنی تمہاری صورتیں بناتا ہے جس طرح چاہے۔ تخلیق میں رب تعالی مختلف صورتیں بناتا ہے، کوئی مذکر، کوئی مونث، کوئی سفید، کوئی سیاہ، کوئی خوبصورت، کوئی بدصورت، کوئی کامل، کوئی ناقص۔

''والمعنی انه الذی یصورکم فی ظلمات الارحام صورا مختلفة فی الشکل والطبع واللون وذلک من نطفة''

مطلب اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالی نطفہ سے تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تاریک بچہ دانیوں میں تمہاری مختلف صورتیں بناتا ہے۔

❁ **عن ابن مسعود قال حدثنا رسول اللہ ﷺ وھو الصادق المصدوق ان خلق احدکم یجمع فی بطن امه اربعین یوما نطفة ثم یکون علقة مثل ذلک ثم یکون مضغة مثل ذلک ثم یبعث اللہ ملکا باربع کلمات فیکتب عمله واجله ورزقه وشقی او سعید**

ثم ینفخ فیه الروح فوالذی لااله غیر ہ احدکم لیعمل بجمل اھل الجنة حتی مایکون بینه وبینھا الاذراع فیسبق علیه فیعمل بعمل اھل النار فید خلھا وان احدکم لیعمل بعمل اھل النار حتی مایکون بینه وبینھا الاذراع فیسبق علیه الکتاب فیعمل اھل الجنة فیدخلھا" (بخاری ومسلم مشکوۃ باب الایمان بالقدر)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہمیں رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا، وہ جو صادق ومصدوق ہیں بیشک تم میں سے ہر ایک ماں کے پیٹ میں چالیس دن نطفہ کی حیثیت میں جمع رہتا ہے، پھر اسی کی مثل (چالیس دن) گاڑھا خون بن کر رہتا ہے، پھر اسی کی مثل (چالیس دن) گوشت کا ٹکڑا (لوتھڑا) بن کر رہتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس کی طرف فرشتہ بھیجتا ہے چار کلمات کے ساتھ، یعنی وہ فرشتہ اس کا عمل، اور اس کی موت کا وقت اور اس کا رزق اور بد بخت ہونا یا نیک بخت ہونا لکھ دیتا ہے۔ پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے، قسم ہے اس ذات کی جس کے بغیر کوئی معبود نہیں، بیشک تم میں سے کوئی ایک جنت والے عمل کرتا رہتا ہے۔

یہاں تک کہ اس شخص اور جنت کے درمیان صرف ایک ذراع کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو کتاب سبقت کر جاتی ہے تو وہ آگ والوں (جہنم والوں) کا عمل شروع کر دیتا ہے تو وہ آگ میں داخل ہو جاتا ہے تو کتاب سبقت کر جاتی ہے تو وہ آگ والوں (جہنم والوں) کا عمل شروع کر دیتا ہے تو وہ آگ میں داخل ہو جاتا ہے، اور بیشک تم میں سے کوئی ایک آگ والوں کا عمل کرتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور آگ کے درمیان صرف ایک ذراع کا فیصلہ رہ جاتا ہے تو کتاب اس پر سبقت کر جاتی ہے تو وہ جنت والوں کا عمل شروع کر دیتا ہے تو وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔

وضاحت حدیث:

"وھو الصادق المصدوق" نبی کریم ﷺ صادق ومصدوق ہیں۔ "وان یکون من عادته ذلک "یعنی آپ کی یہ عادت شریفہ تھی کیونکہ آپ کے یہ اوصاف حمیدہ آپ کو ہمیشہ کیلئے حاصل تھے اسی وجہ سے یہ جملہ حالیہ نہیں بلکہ معترضہ ہے تاکہ آپ کے تمام احوال کو شامل رہے

"الصادق فی جمیع افعاله حتی قبل النبوۃ لما کان مشھورا فیما بینھم بمحمدالامین الصادق" نبی کریم ﷺ تمام افعال میں سچے تھے، نبوت سے پہلے بھی آپ کی صداقت مشہور ومعروف تھی، اسی وجہ سے آپ امین اور صادق کے لقب سے مشہور تھے۔

"المصدوق فی جمیع ماأتاہ من الوحی الکریم" آپ کے پاس جو وحی کریم آئی اس نے آپ کو سچا

کہا، یعنی نبی کریم ﷺ کی صداقت کی وحی کے ذریعے تصدیق کردی گئی۔ "المصدوق" کا استعمال اسی طرح ہے جیسا کہ ان جملوں میں "صدق" استعمال ہوا، جیسا کہ کہا جاتا ہے "صدقہ زید" زید نے اس سے سچ کہا، اور رسول اللہ ﷺ نے ابوالعاص بن ربیع رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا "فصدقنی" زید نے مجھ سے سچ کہا، اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو جب ابلیس نے بتایا کہ تم رات کو آیۃ الکرسی پڑھ لیا کرو، تو چوروں سے محفوظ رہو گے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "صدقک وھو کذوب" اس نے تمہیں سچ کہا ہے، وہ خود جھوٹا ہے۔ چالیس دن تک نطفہ رحم میں رہتا ہے، اس کی تفسیر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک اور روایت میں پائی گئی ہے۔

"عن ابن مسعود ان النطفة اذا وقعت فی الرحم فاراد الله ان یخلق منها بشرا طارت فی بشرة المراة تحت کل ظفر وشعر ثم تمکث اربعین لیلة ثم تنزل دما فی الرحم فذلک جمعها"

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نطفہ ماں کے پیٹ میں جب پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتا ہے کہ اس سے انسان پیدا کرے تو وہ نطفہ اس عورت کے تمام چمڑے میں سرایت کر جاتا ہے یہاں تک کہ ناخنوں اور بالوں کے نیچے بھی پہنچ جاتا ہے۔ پھر چالیس راتوں تک اسی کیفیت میں وہ نطفہ ہی رہتا ہے، پھر وہ خون کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اور ماں کے پیٹ میں بچہ دانی میں اسی طرح یعنی چالیس راتیں رہتا ہے۔

"قال ﷺ ان الله اذا اراد خلق عبد فجامع الرجل المراة طار ماؤه فی کل عرق وعضو منها فاذا کان یوم السابع جمعه الله ثم احضره فی ای صورة ماشاء رکبک"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ جب ارادہ فرماتا ہے کسی بندے کی تخلیق کا تو مرد عورت سے جماع کرتا ہے، وہ نطفہ عورت کے ہر عضو اور ہر رگ میں جاتا ہے، جب ساتواں دن ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ایک جگہ (رحم میں) کر دیتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ جس صورت میں چاہے اسے مرکب کر کے ظاہر کر دیتا ہے، یعنی اچھی یا بری صورت میں سفید یا سیاہ رنگ میں انسان کو رب تعالیٰ پیدا فرما دیتا ہے۔

چالیس دنوں میں خصوصی حکمت:

"قال الصوفیة خصوصیة الاربعین لموافقته تخمیر طینة آدم ومیقات موسی ثم انه یعجن النطفة بتراب قبره کما ورد فی تفسیر "منها خلقنا کم" ان الملک یاخذ من تراب مدفنه فیبذ دها علی النطفة ولکونه سلالة من الطین"

صوفیاء کرام نے بیان فرمایا ہے کہ ماں کے پیٹ میں نطفہ کا چالیس دن رات ٹھہرنا، پھر خون بن کر چالیس دن ٹھہرنا پھر

گوشت بن کر چالیس دن ٹھہرنا اس میں حکمت یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا خمیر بھی چالیس دن تک رہا پھر اس میں روح پھونکی گئی، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر بلا کر چالیس راتوں کے مکمل ہونے پر توراۃ عطاء کی گئی، اسی طرح انسان کی تخلیق میں بھی چالیس چالیس راتوں کے بعد تبدیلی کی جاتی ہے تا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کی جھلک بھی اس میں پائی جائے، اور موسیٰ علیہ السلام کو توراۃ ملنے کی جھلک بھی پائی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب انسان کو یہ پتہ چلے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چالیس راتیں اللہ تعالی کی عبادت کی اس پر آپ کو بطور انعام اللہ کی کتاب توراۃ عطاء کی گئی، تو اسی سے پتہ چل جائے گا کہ چالیس دن تک قرآن پاک کی تلاوت کر کے اور کلمہ شریف پڑھ کر اور درود شریف پڑھ کر جب میت کیلئے دعاء کی جائے گی تو اللہ تعالی سے قوی امید رکھی جائے کہ اس دعاء کو شرف قبولیت حاصل ہوگا، فوت شدہ انسان کی مغفرت ہوگی اور پڑھ کر دعاء کرنے والا اجر و ثواب پائے گا۔ (راقم)

پھر نطفہ کو قبر کی مٹی سے ملا کر، مٹی کو گوندھ دیا جاتا ہے، جیسا کہ مفسرین کرام نے رب تعالی کے ارشاد گرامی ﴿مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ﴾ کی تفسیر میں ذکر کیا ہے، کہ فرشتہ اس کی قبر سے مٹی لیتا ہے اور اسے نطفہ پر بکھیر دیتا ہے، اسی وجہ سے رب تعالی نے انسان کی تخلیق میں بیان کیا ہے ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ﴾ اور بیشک ہم نے آدمی کو چنی ہوئی مٹی سے بنایا۔ (المومنون، آیۃ نمبر ۱۲)

انسان کے مختلف رنگوں اور اخلاق کی وجہ:

"جاء مختلف الالوان والاخلاق حسب اختلاف اجزاء الطين بل بحسب اخلاق المركبات من الطين فيه حرص النملة والفارۃ وشهوة العصفور وغضب الفهد وكبر النمر وبخل الكلب وشره الخنزير وحقد الحية وغير ذلك من ذمائم الصفات وفيه شجاعة الاسد وسخاوة الديك وقناعة البوم وحلم الجمل وتواضع الهرة ووفاء الكلب وبكور الغراب وهمة البازى ونحوها من محاسن الاخلاق"

چونکہ مٹی کے مختلف رنگ ہیں، جس طرح کی مٹی کا ذرہ اس کی قبر کی جگہ سے لے کر اس کے نطفہ سے ملایا جائے گا وہی رنگ اسے حاصل ہوگا، سیاہ ہو یا سفید ہو۔ جس طرح مٹی کے اوصاف ہوں گے اسی طرح کے اوصاف بھی انسان کو حاصل ہوتے ہیں۔ بلکہ مٹی سے مرکبات باقی مخلوق کی صفات بھی انسان میں پائی جاتی ہیں، خواہ وہ بری صفات ہوں یا اچھی صفات ہوں۔ چھینوٹی اور چوہیا کی حرص، اور چڑے کی شہوت، اور تیندوے کا غضب'' اور چیتے کا تکبر، اور کتے کا بخل، اور خنزیر کی شرانگیزی، اور سانپ کا کینہ (کھوٹ، انسان کی دشمنی) وغیرہ حیوانوں کی بری صفات مجموعی طور پر

انسان میں پائی جاتی ہیں۔اور حیوانوں کی اچھی صفات کا مجموعہ بھی انسان کو حاصل ہے جیسا کہ شیر کی شجاعت وبہادری، مرغ کی سخاوت، اور الو کی قناعت، اور اونٹ کا حلم (حوصلہ وبردباری) اور بلی کی تواضع، اور کتے کی وفا، اور کوے کا احتیاط (چوکنا رہنا) اور باز کی ہمت انسان کو حاصل ہیں۔

(**الفھد**، درندہ کی ایک نوع جو کہ کتے سے بڑا اور چیتے سے چھوٹا ہوتا ہے، اس کے بدن پر چھوٹے چھوٹے سیاہ داغ ہوتے ہیں، اس کو تیندوا کہتے ہیں، (جمع) فھود و افھد، "الفھدۃ" فھد کا مؤنث تیندوے کی مادہ، (جمع) فھدات، "المنجد"

انسان کی آہستہ تخلیق میں فوائد:

(۱) اگر انسان کی ایک مرتبہ ہی (دفعۃ واحدۃ) تخلیق کردی جاتی تو ماں پر مشکل درپیش آتی اور عادت نہ ہونے کی وجہ سے اس پر بیماری آتی، اس لئے چالیس دن تک نطفہ رکھا تاکہ اس کو برداشت کی عادت ہوجائے، پھر گاڑھا خون بنا کر بھی چالیس دن تک رکھا تاکہ اس کی عادت ہوجائے، پھر چالیس دن تک گوشت بنا کر رکھا، اسی طرح ولادت تک آہستہ آہستہ اس میں تبدیلی کی گئی تاکہ عورت ان مختلف حالات کو برداشت کرسکے۔

(۲) آہستہ آہستہ مختلف حیثیات وکیفیات میں تبدیلی کی طرف اگر انسان غور کرے کہ نطفہ وخون سے اسے کیسے حسین صورت عطاء کی گئی تو وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ونعمت کو دیکھ کر رب تعالیٰ کی عبادت کرے گا اور اس کا شکریہ ادا کرے گا۔

(۳) "وعنھا ارشاد الناس وتنبیھھم علی کمال قدرتہ علی الحشر" آہستہ آہستہ مختلف حالات کے بعد کرنے میں جس ذات کو یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ نطفہ سے گاڑھا خون اور گاڑھے خون سے گوشت کا لوتھڑا بنالیتا ہے اور اس میں روح پھونکتا ہے اور اسے انسانی شکل میں معرض وجود میں لے آتا ہے وہ حشر میں سب کو جمع کرنے اور زندہ کرنے پر قادر ہے۔

(۴) "**ومنھا بل اظھرھا تعلیم العباد فی تدریج الامور وعدم تعجیلھم فیھا فانہ تعالیٰ مع کمال قدرتہ وقوتہ علی خلقہ دفعۃ واحدۃ حیث خلقہ مدرجا فان الانسان اولی بہ التانی فی فعلہ**"

زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ بندوں کو تعلیم دینا مقصود ہے کہ تم کام کرو تو آہستہ آہستہ درجہ بدرجہ، کیونکہ اللہ تعالیٰ جس کو کامل قدرت اور قوی طاقت حاصل ہے کہ وہ ایک ہی مرتبہ سب کو "کن" کہے تو تمام مخلوق "فیکون" ہوجائے (معرض وجود میں آجائے) یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ﴾ "آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں پیدا کیا"۔

(۵) "ومنها تنبیههم اصلهم وفرعهم فلایغتروا بقوة ابدانهم واعضائهم وحواسهم ویعرفوا انها کلها عطایا وهدایا بل علی وجه العاریة موجودة عندهم لینظروا فی مبدئهم"

اور آہستہ آہستہ انسان کی تخلیق سے لوگوں کو اس پر خبردار کرنا اور سمجھانا مقصود ہے کہ تم اپنی اصلی، ابتدائی حالت کو دیکھو اور اب موجودہ حالت کو دیکھو، اسلئے تم اپنے بدن کی طاقت اور اعضاء کی طاقت اور اپنے حواس کو دیکھ کر دھوکے میں نہ پڑو کہ تم اسی طرح تھے، نہیں نہیں، تم کمزور پانی (نطفہ) سے بنے ہو یہ طاقت، اور حواس تو اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور عطاء سے حاصل ہوئے ہیں۔ بلکہ اے انسان اگر تو یہ خیال کرے کہ تیرے حواس اور اعضاء تو تجھے حاصل ہیں جیسے کسی کو (عـــاریة) (منگوی) کوئی چیز دی جائے، پھر اس سے واپس لے لی جائے، تجھ سے بھی سب کچھ واپس لے لیا جائے گا، اس لئے انسان اپنی ابتداء کو دیکھے گا تو اسے موت بھی یاد آئے گی، جسے موت یاد ہو اسی کے اعمال بھی اچھے ہوں گے وہی دین و دنیا میں کامیاب رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ﴾ انسان کو دیکھنا چاہئے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا۔ اور حدیث شریف میں ہے "من عرف نفسه عرف ربه"، جس شخص نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

"ثم یبعث الله الیه ملکا باربع کلمات فیکتب عمله واجله ورزقه وشقی اوسعید ثم ینفخ فیه الروح"

جس حدیث شریف کی وضاحت کی جارہی ہے یہ الفاظ مبارکہ اس کے ہیں، یعنی جب چالیس دن کے اس پر تین دور گزر جاتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ فرشتے کو بھیجتا، فرشتے کو بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ فرشتے کو حکم دیتا ہے "باربع کلمات ای بکتابتها وکل قضیة تسمی کلمة قولا کان اوعملا" کہ اس کیلئے چار فیصلے لکھ دو، ہر فیصلہ کو کلمہ سے تعبیر کردیا گیا خواہ وہ فیصلہ زبانی ہو یا عملی ہو۔

"(فیکتب عمله) من الخیر اوشر" تو وہ فرشتہ اس کے عمل لکھ لیتا ہے خواہ اس کے عمل اچھے ہوں یا برے۔

"(واجله) مدة حیاته اوانتهاء عمره" اور اس کی "اجل" یعنی اس کی زندگی کی مدت اور عمر کی انتہاء لکھ لیتا ہے۔

"(ورزقه) یعنی انه قلیل او کثیر وغیرهما مما ینتفع به حلالا کان اوحراما ماکولا اوغیره فیعین له وینقش فیه"

اور اس کا رزق لکھ لیا جاتا ہے، خواہ اسے تھوڑا ملنا ہو یا زیادہ، ہر وہ چیز جس نے اسے نفع پہنچانا ہو وہ رزق ہی ہے، وہ لکھ دیتا ہے خواہ حلال ہو یا حرام، کھانے والی چیز ہو یا نہ کھانے والی، وہ تمام چیزیں جو اس نے تمام عمر میں حاصل کرنی ہیں ان کو معین کردیا جاتا ہے اور لکھ لیا جاتا ہے۔

یہ بھی خیال رہے کہ یہ تمام چیزیں لوح محفوظ میں پہلے ہی لکھی ہوئی ہیں، دوبارہ لکھنا اس لئے ہوگا کہ انسان

کو اس پر خبردار کیا جائے کہ تو خود مختار ہے اپنے اچھے اعمال میں کوشش کرتا رہ، اور برے اعمال سے بچ کر رہ، اگرچہ تیرے اعمال سے رب تعالی خبردار ہے۔

"وشقی وسعید" اور اس کا شقی ہونا یا سعید ہونا لکھ لیا جاتا ہے کہ یہ نیک بخت ہے یا بد بخت ہے، نیک ہے یا گنہگار، اللہ تعالی کے فیصلے حکمت پر مبنی ہوتے ہیں، ان کی حکمتوں پر وہی خبر رکھتا ہے، انسان کو ان پر شاکر رہنا چاہئے۔

کم من ادیب فهم قلبه　　مستكمل العقل مقل عديم

وكم جهول مكثر ماله　　ذلك تقدير العزيز العليم

کتنے ہی ادیب اور سمجھ رکھنے والے، کامل عقل رکھنے والے، مال کم رکھتے ہیں بلکہ ان کے پاس مال ہوتا ہی نہیں اور کتنے ہی جاہل بہت زیادہ مال رکھتے ہیں، یہ فیصلے ہیں اس ذات کے جو غالب، علم رکھنے والا ہے۔

فائدہ: اللہ تعالی کی دو صفتیں ہیں۔(۱) لطف و مہربانی　(۲) قہر و غضب

یہ دونوں صفات جسے حاصل ہوں وہ بادشاہ ہے بلکہ بادشاہوں کا بادشاہ، یہ دونوں صفتیں صرف رب تعالی کو ہی کامل درجے کی حاصل ہیں، جو اس ذات باری تعالی کے کمال پر دلالت کرتی ہیں۔ ہر ایک صفت کا اپنا اپنا مقام کوئی ایک بھی دوسری کی جگہ قائم نہیں ہو سکتی۔"ولا يتحقق كل منهما الا بوجود الآخر كما لاتتبين اللذة الابالألم" اور نہ ہی یہ دونوں صفتیں ایک دوسری کے بغیر محقق ہوتی ہیں۔ جس طرح لذت کا درد کے بغیر پتہ نہیں چلتا، اسی نیک بختی کا بد بختی کے بغیر پتہ نہیں چلتا، اس لئے ہر صفت کا ظاہر ہونا ضروری ہے۔

"فالسعداء واعمالهم مظاهر اللطف وفائدة بعثة الانبياء والكتب ترجع اليهم انما انت منذر من يخشاها كما ان فائدة نورالشمس لاهل البصر"

نیک بخت لوگ اور ان کے اعمال رب تعالی کی صفت لطافت کا مظہر ہیں۔ اور انبیاء کرام کے تشریف لانے اور رب تعالی کی کتابوں کے اترنے سے انہوں نے ہی فائدہ حاصل کیا، اس لئے کہ اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا﴾ بیشک آپ ڈرانے والے ہیں انہیں جو قیامت کا خوف رکھتے ہوں، یعنی وہی لوگ رب تعالی کے قہر و غضب سے ڈریں گے جن کا ایمان قیامت پر ہوگا۔ جو لوگ قیامت کا خوف نہیں کریں گے وہ رب تعالی سے بھی نہیں ڈریں گے۔

یہ ایسا ہی ہے کہ جیسا کہ سورج کی روشنی سے فائدہ وہی حاصل کرتا ہے جس کی نظر صحیح ہو، نابینا کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا، کیونکہ اس کے سامنے رات دن ایک جیسے ہوتے ہیں۔

"والاشقیاء وافعالهم مظاهر القهر وفائدة البعثة لهم الزام الحجة لئلا یکون للناس علی الله حجة بعدالرسل وهی فی الحقیقة نعی علیهم بالشقاوة"

بد بخت اور ان کے افعال اللہ تعالیٰ کی صفت قہر کے مظہر ہیں۔ ان کی طرف اللہ تعالیٰ کے رسولوں کو بھیجنے کا یہی فائدہ ہے کہ ان پر حجت (دلیل) قائم کی جا سکے کہ ہم نے تو تمہاری طرف رسول بھیج دیئے تھے، تم نے اگر ایمان نہیں لایا تو آج تم عذاب کے مستحق ہو، اسی لئے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ تاکہ نہ رہے لوگوں کیلئے کوئی حجت اللہ پر رسولوں کے بھیجنے کے بعد۔

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد حقیقت میں بد بختوں کی شقاوت و بد بختی کی خبر ہے، (خیال رہے کہ "نعی" اصل میں موت کی خبر کو کہا جاتا ہے، علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے نعی کا لفظ استعمال کر کے اشارہ فرمایا کہ بد بخت لوگ حقیقت میں مردہ ہیں، ان کی بد بختی موت ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے بد بختوں کی شقاوت یعنی موت کی خبر دی ہے)۔ (راقم)

"ثم ینفخ فیه الروح" پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔ یعنی ماں کے پیٹ میں بچہ دانی میں جب ایک سو بیس دن گزر جاتے ہیں تو روح پھونکی جاتی ہے، (ایک سو بیس دن کے بعد روح پھونکی جاتی ہے لھذا اس کے بعد اسقاط حمل جرم قتل ہے۔ اس سے پہلے کسی عذر شدید کی وجہ سے جائز، بغیر عذر شدید کے مکروہ ہوگا) (راقم)

"فوالذی لا اله غیره" قسم ہے اس ذات کی جس کے بغیر کوئی معبود نہیں، قسم اٹھا کر آنے والے مسئلہ کی تصدیق و تحقیق فرمائی، یعنی جب سعادت و شقاوت عند اللہ مکتوب ہیں (لوح محفوظ پر لکھی گئیں ہیں) تو انسان اس تقدیر کو بدل تو نہیں سکتا لیکن اس نے اپنے اختیار سے نیکی یا برائی کا عمل کیا ہوگا لھذا نیکی پر ثواب اور برائی پر عذاب کا مستحق ہوگا۔

"ان احدکم لیعمل بعمل اهل الجنة حتی مایکون بینه وبینها الاذراع فیسبق علیه الکتاب فیعمل بعمل اهل النار فید خلها"

(قسم ہے اس ذات کی جس کے بغیر کوئی معبود نہیں) بیشک تم میں سے کوئی ایک جنت والوں کا عمل کرتا ہے یہاں تک کہ نہیں رہتا اس کے درمیان اور جنت کے درمیان سوائے ایک ذراع کے تو کتاب سبقت کر جاتی ہے تو وہ آگ والوں کا عمل کرنے لگ جاتا ہے تو آگ میں داخل ہو جاتا ہے۔

ذراع کا لفظ تمثیل کیلئے استعمال ہے، یعنی اس بندے اور جنت کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں رہے گا، بلکہ قرب حاصل ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی "فیعمل بعمل اهل النار" سے یہ پتہ چل گیا۔

"ان دخول النار لایکون بمجرد تعلق العلم الالهی بل لابد من ظهور العمل

المخلوقی فلایکون جبرا محضا ولا قدرابحتا"

کہ آگ میں داخل ہونے کی وجہ صرف اللہ تعالی کا علم نہیں ہوگی، بلکہ مخلوق کی بداعمالیاں آگ میں داخل ہونے کی وجہ ہوگی۔ یعنی انسان کو صرف جبری طور پر جہنم میں داخل نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی تقدیر محض کی وجہ سے وہ جہنم میں داخل کیا جائے گا بلکہ وہ خود بخود عمل ایسے کرے گا جو اسے جہنم میں داخل کردیں گے۔

❁ وان بذر الشقاوة والسعادة قد اختفى في الاطوار الانسانية لايبرز الااذاانتهى الى الغاية الايمانية او الطغيانية"والله اعلم"

انسان کی پیدائش میں جو مختلف دورر کھے گئے ہیں ان میں بدبختی اور نیک بختی کا بیج بھی چھپا کر رکھ دیا جاتا ہے جس کا خاتمہ ایمان پر ہو اس میں سعادت کا بیج ظاہر ہو گیا، اور جس کا خاتمہ "العیاذ باللہ" بدبختی پر ہو اس میں کفر و بدبختی کا بیج ظاہر ہو گیا۔

❁ وان احدكم ليعمل بعمل اهل النار حتى مايكون بينه وبينهما الاذراع فيسبق عليه الكتاب فيعمل بعمل اهل الجنة فيدخلها"

اور بیشک تم میں سے کوئی ایک جہنم والوں کے عمل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کے درمیان اور جہنم کے درمیان سوائے ایک ذراع کے فاصلہ نہیں رہتا تو کتاب سبقت کر جاتی ہے تو وہ جنت والوں کا عمل کرنے لگ جاتا ہے تو جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔

یعنی کوئی شخص کفر و معاصی میں مبتلاء رہتا ہے جو اسے جہنم میں پہنچانے کا ذریعہ بنتے ہیں، لیکن رب تعالی اسے ایسے اعمال کی توفیق عطاء فرما دیتا ہے کہ وہ جنت میں چلا جاتا ہے، واضح ہوا کہ اصل میں اعمال ہی جنت اور جہنم میں جانے کا ذریعہ ہیں اگرچہ رب تعالی کو معلوم ہے کہ کسی نے جنت میں جانا ہے یا کسی نے جہنم میں۔

فائدہ: "ان السالك ينبغي ان لايغتر باعماله الحسنة ويجتنب العجب والتكبر والاخلاق السيئة ويكون بين الخوف والرجاء ومسلما بالرضاء تحت القضاء وكذااذاصدرت منه الاعمال السيئة فلايأس من روح الله الطيبة فانها اذابدت عين العناية الحقت الآخرة بالسابقة"

حدیث پاک سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ نیکی کی راہ پر چلنے والا شخص اپنے نیک اعمال پر ناز نہ کرے اور اپنے اچھے اعمال پر اترائے نہیں تکبر اور بداخلاقی سے دور رہے، خوف اور امید کے درمیان رہے، اور تقدیر پر راضی اور شاکر رہے، اسی طرح اگر کسی شخص سے برے اعمال سرزد ہوں تو وہ اللہ تعالی کی رحمت و مہربانی سے مایوس نہ ہوا سلئے کہ جب رب تعالی کسی پر مہربانی فرماتا ہے تو اسے نیک اعمال کی توفیق عطاء فرما دیتا ہے، وہ گناہوں سے توبہ کر لیتا ہے تو رب

تعالیٰ اسے گناہوں سے پہلے حال کی طرف پہنچا دیتا ہے کہ جس طرح وہ ابتداء میں گناہوں سے پاک تھا وہ انتہاء میں بھی گناہوں سے پاک ہو کر جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔

تنبیہ: "وان العبرة بخواتيم الحالات ولايطلع عليها غير عالم الغيب والشهادة"

اعتبار خاتمہ کے حالات پر ہے، اس پر صرف اللہ تعالیٰ مطلع ہے جو عالم غیب وشہادت ہے (ظاہر اور چھپی ہوئی سب چیزوں کا جاننے والا ہے)

لھذا کسی شخص کو یقینی طور پر جنتی یا جہنمی نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ جنتی ہونے یا جہنمی ہونے کی دارومدار خاتمہ پر ہے ہم کسی کے خاتمہ کو نہیں جانتے، البتہ کسی کے نیک اعمال کو دیکھ کر یوں کہا جا سکتا ہے، اس کے یہ اعمال جنتیوں کے اعمال ہیں، اور کسی کے برے اعمال کو دیکھ کر یوں کہا جا سکتا ہے، اس کے اعمال جہنمیوں کے اعمال ہیں۔

(وضاحت حدیث ماخوذ از مرقات ج۱ص۱۴۹تا۱۵۲)

﴿لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ٥﴾

"نہیں کوئی عبادت کے لائق سوائے اس کے جو غالب ہے حکمت والا"۔

شروع میں ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ ذکر فرمایا، اب دوبارہ ﴿لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ٥﴾ ذکر ہے، تا کہ ماقبل جملہ کی تاکید ہو جائے اور واضح طور پر اللہ تعالیٰ کے بغیر معبودان باطلہ کی نفی ہو جائے اور الوہیت کا رب تعالیٰ میں انحصار ہو جائے۔ اور عیسائیوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جو مناظرہ ہو رہا تھا اس میں عیسائیوں کا رد کرنا بھی مقصود تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو تمہارا معبود ماننا باطل ہے معبود تو صرف رب تعالیٰ ہے جو عزیز وحکیم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنے دو وصف بیان فرمائے "علم اور قدرت" تو اس سے یہ بھی واضح کر دیا "اذ من هذان الوصفان له هو المتصف بالالهية لاغيره" کہ جس میں یہ دونوں وصف کامل درجہ کے پائے جائیں گے وہی معبود ہوگا، اس کے بغیر کوئی اور معبود نہیں، کیونکہ کسی اور کو یہ دونوں وصف اعلیٰ درجہ کے حاصل ہی نہیں۔

ثم اتى بوصف العزة الدالة على عدم النظير، والحكمة الموجبة لتصوير الاشياء على الاتقان التام"

پھر رب تعالیٰ نے اپنا وصف عزیز ہونا ذکر فرمایا جس سے واضح کیا کہ اس کا کوئی مثل نہیں۔ اور پھر اپنا وصف حکیم ہونا ذکر فرمایا کہ وہ مخلوق کو صورتیں عطاء فرماتا ہے جو اس کی حکمت کے تقاضا کے مطابق ہیں اور اس پر اسے قدرت کاملہ حاصل ہے۔ (البحر المحیط)

اعلیٰ حضرت وعلامہ محمد علی صابونی رحمہ اللہ:

اس مقام پر زیادہ مفسرین کرام رحمہ اللہ نے "العزیز" کا ترجمہ کیا ہے"غالب" اور راقم نے بھی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے یہی نقل کر دیا کہ طلباء کرام کو مختلف معانی ذہن نشین ہوتے رہیں۔لیکن اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضاء خان بریلوی رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے"عزت والا" یہی ترجمہ علامہ صابونی رحمہ اللہ نے بھی کیا ہے"ولہ العزۃ التی لاترام" اور اسے عزت حاصل ہے وہ جس کا قصد نہیں کیا جاسکتا۔ (صابونی)

البحر المحیط میں ایسا ترجمہ ذکر کیا گیا ہے جس میں دونوں احتمال ہیں"ثم اتی بوصف العزۃ الدالۃ علی عدم النظیر" پھر اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف 'عزۃ' ذکر فرمایا جو دلالت کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی نظیر نہیں۔چاہے تو اردو میں "البحر المحیط" کا ترجمہ یوں کر لیا جائے"پھر اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف"عزت والا ہونا' ذکر کیا ہے کہ اس کی کوئی نظیر نہیں۔یا یوں ترجمہ کر لیا جائے"پھر اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف"غالب ہونا" ذکر کیا ہے کہ اس کی کوئی نظیر نہیں۔

تنبیہ: یہ تو واضح ہے کہ العزیز کا معنیٰ"غالب" بھی ہے، اور"عزت والا" بھی ہے، اس میں کسی کو کوئی کلام نہیں۔بات تو یہ ہے کہ زیر بحث آیۃ کریمہ میں"العزیز" کا معنیٰ کیا ہے، وہ بھی تفاسیر سے واضح ہو رہا ہے کہ دونوں معانی لئے گئے ہیں، بعض نے معنیٰ کیا ہے"غالب" ہونا، اور بعض نے معنیٰ کیا ہے"عزت والا"

"مطلقاً العزۃ" کے معانی علامہ راغب بیان کرتے ہیں"العزۃ حالۃ مانعۃ للانسان من ان یغلب من قولھم ارض عزازۃ ای صلبۃ" عزت کا معنیٰ ہے کہ انسان کو وہ حالت حاصل ہو جو اس کے مغلوب ہونے سے مانع ہو، یہ معنیٰ ماخوذ ہے"ارض عزازۃ" سے، جس کا معنیٰ ہے"سخت زمین""والعزیز الذی یقھر ولا یقھر" اور عزیز وہ ہے جو قہر کرے، اس پر قہر نہ کیا جاسکے، یعنی غالب ہو اور مغلوب نہ ہو،"فقد یمدح بالعزۃ تارۃ کما تری ویلم بھا تارۃ کعزۃ الکفار" کبھی عزت کا لفظ ذکر کر کے کسی کی تعریف کی جاتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا﴿وَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ﴾ اور اللہ کیلئے ہی عزت ہے اور اس کے رسول کیلئے اور مؤمنوں کیلئے۔عزت ذکر کر کے کافروں کی مذمت کی، ارشاد باری تعالیٰ ہے﴿بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ عِزَّۃٍ وَّشِقَاقٍ﴾ بلکہ کافر عزت اور بدبختی میں ہیں، (یعنی وہ اپنے آپ کو عزت والا سمجھتے ہیں، واقع میں وہ بدبخت ہیں) اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے﴿بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ عِزَّۃٍ وَّشِقَاقٍ﴾ کا خوبصورت ترجمہ کیا ہے"بلکہ کافر تکبر اور خلاف میں ہیں" اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اور مومنوں کی عزت ہی حقیقی عزت ہے۔"وھی الدائمۃ الباقیۃ التی ھی العزۃ الحقیقیۃ" اسلئے کہ وہ دائمی عزت ہے، جو ہمیشہ

اپنے والی عزت ہو وہی حقیقی عزت ہے۔

کفار کی عزت حقیقت میں "تعزز" جو دنیاوی مال و دولت کی وجہ سے وقتی طور پر ان کو یہ عزت حاصل ہوتی ہے جب مال و دولت جائے اور عہدے جائیں تو ظاہری عزت بھی ختم ہو جاتی ہے "و وفی الحقیقة ذل" یہ حقیقت میں ذلت ہے، عزت نہیں، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "کل عز لیس باللہ فھو ذل" اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق نہ رکھنے کی وجہ سے جو عزت حاصل ہو وہ ذلت ہے، "یقال عز علی کذا صعب" "عزت کا معنی بھی "مشکل" آتا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے "عز علی" فلاں چیز مجھ پر مشکل ہے، اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ میں بھی یہی معنی لیا گیا ہے، "گراں ہے (مشکل ہے) ان (رسول اللہ ﷺ) پر تمہارا مشقت میں پڑنا۔ عزت کا معنی بھی "قلت" بھی آتا ہے، جیسا کہ کہا جاتا "شاة عزوز قل درھا" یعنی جس بکری کا دودھ قلیل (تھوڑا) ہو اسے شاۃ عزوز کہا جاتا ہے۔ تھوڑی چیز کو عزیز کیوں کہا جاتا ہے؟ "وعز الشئ قل اعتبارا بما قیل کل موجود مملول و کل مفقود مطلوب" تھوڑی چیز کو عزیز کہنے کی وجہ اس محاورہ کے مطابق ہے "جو چیز موجود ہے اس سے دل اکتا جاتا ہے اور جو موجود نہیں اس کو طلب کیا جاتا ہے۔ یعنی جس چیز میں دل نہ لگے وہ بھاری اور گراں ہوتی ہے، زیادہ ہونے کے باوجود تھوڑی نظر آتی ہے۔ (ماخوذ از مفردات راغب)

سبق حاصل ہوا:

"فعلی العاقل ان لایتکاسل عن الاعمال فی جمیع الاحوال ولا یفوت ایام الفرصة واللیال"

عقلمند آدمی پر یہ لازم ہے کہ وہ ہر حال میں نیک عمل کرنے میں سستی نہ کرے اور زندگی کے دن رات جو اسے حاصل ہیں، ان کو غنیمت سمجھے، ان کو ہاتھ سے نہ جانے دے، اے انسان موت سے پہلے جا فرصت تجھے ملی ہے، اس میں نیکی کا عمل کر لے، موت کے بعد کچھ نہیں ہوگا۔

خبر داری ای الستخوانی قفس — کہ جان تو مرغیست نامش نفس
چو مرغ از قفس رفت وبگسست قید — دگر رہ نگر ددبسعی تو صید
نگہ دار فرصت کہ عالم دمیست — دمی پیش دانا بہ از عا لمیست

اے ہڈیوں کے پنجرے تو خبر رکھ، کہ جان تیری پرندے کی طرح ہے جس کا نام نفس ہے۔ جب پرندہ پنجرے سے اڑ جائے اور قید کے بند کھول دے۔ دوبارہ تیری کوشش کے باوجود تیرے شکار میں نہیں آئے گا۔

(از روح البیان)

فائدہ جلیلہ: جس ماں کی رحم (بچہ دانی) میں نطفہ ہر چالیس دن کے بعد حالت بدلتا ہے، اور رحم میں اللہ تعالی اسے صورت عطاء کرتا ہے جس طرح چاہتا ہے، اسی طرح مرید خاص کا قلب رحم کی طرح ہوتا ہے، جس میں شیخ کامل کے تصرفات ہوتے ہیں وہ چالیس دنوں کے چلے کٹواتا ہے۔ جس سے اس کے ظاہر و باطن پر شیخ کا تصرف پایا جاتا ہے، چلہ کاٹنا اور کچھ دیر کیلئے لوگوں سے علیحدہ ہونے کا مقصد یہ ہوتا ہے۔

"ویختار الخلوة و العزلة کیلا یصدر منه حرکة عنیفة اویجدرائحة غریبة یلزم منها سقوط النطفة وفسادها"

کہ اس سے کوئی حرکت خلاف شرع سرزد نہ ہو، اور اس کی بداعمالیوں کی بدبو کسی اور کو نہ پہنچے، کیونکہ خلاف شرع حرکات اور بداعمالیوں کی وجہ سے شیخ کے تصرفات فاسد ہو جاتے ہیں۔ جب انسان چالیس دن علیحدہ ہو کر عبادت کرتا ہے، اور ریاضت کرتا ہے۔

"فالله تعالى يصرف ولاية الشيخ المنويد بتائيد الحق بمرور ذل اربعين عليه بشرائطها يحولها من حال الى حال وينقلها من مقام الى مقام الى ان يرجع الى حظائر القدس"

تو اللہ تعالی اس کے شیخ کے تصرفات کی وجہ سے اس کی صحیح چلہ کشی کی برکت سے اسے ایک حال سے دوسرے حال تک پہنچا دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ مقام قدس تک پہنچ جاتا ہے، جب اس مقام پر پہنچتا ہے تو پھر حقیقی طور پر آدمی بنتا ہے، ورنہ اس سے پہلے وہ بصورت آدم ہے بسیرت آدم نہیں۔

آدم علیہ السلام کے جسم کے مٹی کے خمیر پر جب چالیس دن گزرے تو ان میں روح پھونکی گئی تو ان کو مسجود ملائکہ بنایا گیا (فرشتوں سے آپ کے سامنے سجدہ کرایا گیا) یہی وہ درجہ ہے حقیقی طور پر آدمی بننے کا شکل انسانی کی وجہ سے تو ہم بھی آدمی ہیں، اگر چہ مقام رفیع حاصل نہیں، لیکن اللہ تعالی سے دعاء ہے کہ اے مولائے کریم! بحرمت نبی کریم ﷺ وبتصرف شیخی حضرت سید پیر غلام محی الدین المعروف **بابو جی** گولڑوی رحمہ اللہ مجھ گنہگار کے گناہ معاف فرما، تیری وسعت رحمت پر قوی امید رکھتا ہوں کہ تو اپنے پیارے نبی کریم ﷺ کے محب صادق کو مقام روح قدس تک پہنچائے گا۔

جس طرح ماں کی رحم میں چالیس چالیس دن کے تین دور گزرتے ہیں تو اس میں روح کو پھونکا جاتا ہے، اسی طرح شیخ کے تصرف سے چلہ کشیوں کی وجہ سے، ریاضت و عبادت کی وجہ سے انسان کو خصوصی قدس حاصل ہو جاتی ہے یہی وہ روح ہے جو دل کو زندہ رکھنے کا ذریعہ ہے، یہی وہ روح ہے جس کا تذکرہ اللہ تعالی نے یوں فرمایا۔

"علقى الروح من امره على من يشاء من عباده" اور اسی روح کا تذکرہ یوں بیان فرمایا "کتب فی قلوبهم الایمان و ایدهم بروح منه" (ماخوذ از روح البیان)

شیر خدا کا پیارا ارشاد:

کسی نے حضرت علی ﷛ سے کہا کہ موجد شطرنج کا کمال تو دیکھو کہ اس نے گز بھر کپڑے پر چونسٹھ خانے بنائے مگر جب کھیلو تب اس کی نئی چال ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ خالق کا کمال تو دیکھو اس نے بالشت بھر چہرہ میں پانچ سوراخ کئے دو آنکھوں کے، دو ناک کے ایک منہ کا، مگر اس پر کروڑں نقشے کھینچ دیئے ان میں کوئی دوسرے سے نہیں ملتا حضرت علی المرتضی ﷛ کا یہ پیارا ارشاد گویا کہ رب تعالی کے ارشاد گرامی ﴿هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ کَیْفَ یَشَآءُ﴾ کی تفسیر ہے۔ (ماخوذ از نعیمی)

(هو الذی یصور کم فی الارحام)صورا جامعة للاسرار الارضیة والسماویة تارة وغیر جامعة اخری)

وہ جو صورتیں عطاء کرتا ہے تمہیں بچہ دانیوں میں" کبھی وہ صورتیں عطاء کرتا ہے جو زمین اور آسمانوں کے رازوں کی جامع ہوتی ہیں اور کبھی وہ ایسی صورتیں عطاء کرتا ہے جو ان رازوں کی جامع نہیں ہوتیں۔

(کیف یشاء)وقد جعل آیات کتابه صورا جامعة لمعانی صفة کلامه فی ارحام الالفاظ وصورا فی ارحام المعانی معانی اخروهلم جرا"

وہ صورتیں عطاء کرتا ہے بچہ دانیوں میں جس طرح چاہتا ہے، تحقیق اس نے اپنی کتاب کی آیات کی صورتیں بنائیں جو کہ الفاظ کی رحموں میں (الفاظ کے ضمن میں) اس کے کلام کی صفات کے معانی کی جامع ہیں۔

اوران معانیوں کے ضمن میں اور معانی رکھ دیئے گئے۔ اس طرح سلسلہ جاری رہتا ہے اگر چہ کمال عیسوی بھی اس حد تک پہنچے ہوئے ہیں، لیکن ان کمالات کی وجہ سے آپ میں الوہیت نہیں ثابت ہوسکتی۔ جس طرح رحم میں جو صورتیں عطاء کی جاتی ہیں وہ اعضاء کے لحاظ سے ایک دوسرے کے مشابہ ہوتی ہیں، ان میں گویا کہ دوسرے بھی شریک ہوتے ہیں، اسی طرح کمالات معنویہ میں بھی دوسرے شریک ہوتے ہیں، جن کے شرکاء پائے جائیں وہ معبود نہیں بن سکتے۔

واضح ہوا کہ معبود صرف اللہ تعالی ہے "**هو الجامع لکمالات**" وہی تمام کمالات کا جامع ہے، اس کا کوئی شریک جو "**وحده لاشریک له**" ہے وہی معبود حقیقی ہے۔ (ماخوذ از تبصیر الرحمٰن)

❊❊❊❊❊❊❊❊❊❊

﴿هُوَ الَّذِیٓ اَنۡزَلَ عَلَیۡکَ الۡکِتَابَ مِنۡهُ آیَاتٌ مُّحۡکَمَاتٌ هُنَّ اُمُّ الۡکِتَابِ وَاُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ زَیۡغٌ فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَهَ مِنۡهُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَةِ وَابۡتِغَآءَ تَاۡوِیۡلِهٖ وَمَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ یَقُوۡلُوۡنَ آمَنَّا بِهٖ کُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ٥﴾ (آیۃ نمبر ۷)

(1) وہی ہے جس نے تم پر یہ کتاب اتاری، اس کے کچھ آیتیں صاف معنی رکھتی ہیں، وہ کتاب کی اصل ہیں اور دوسری وہ ہیں جن کے معنی میں اشتباہ ہے، وہ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ اشتباہ والی کے پیچھے پڑتے ہیں گمراہ چاہنے اور اس کا پہلو ڈھونڈنے کو، اور اس کا ٹھیک پہلو اللہ ہی کو معلوم ہے، اور پختہ علم والے کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے، سب ہمارے رب کے پاس سے ہے، اور نصیحت نہیں مانتے مگر عقل والے۔

(2) وہی ہے جس نے اتاری تم پر کتاب، اس کی بعض آیات محکم ہیں (صاف معنی رکھتی ہیں) وہ اصل کتاب ہیں اور کچھ دوسری متشابہات ہیں (جن کے معنی میں اشتباہ ہے) وہ لوگ جن کے دلوں میں ٹیڑھا پن ہے وہ پیچھا کرتے ہیں ان کا جو اشتباہ والی ہیں، اس سے وہ تلاش کرتے ہیں فتنہ اور تلاش کرتے ہیں اس کی تأویلیں اور نہیں جانتا اس کی تاویل کو سوائے اللہ کے، اور وہ لوگ جو پختہ ہیں علم میں وہ کہتے ہیں ہم ایمان لائے اس کے ساتھ، سب ہمارے رب کی طرف سے ہے، اور نصیحت نہیں قبول کرتے سوائے خالص عقل والوں کے۔

شان نزول:

(۱) نزول کی ایک وجہ یہ ہے کہ نجران کے عیسائیوں کے وفد میں جو عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے تھے، انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے دوران مناظرہ کہا۔

"الست تقول ان عیسی روح الله و کلمتة فقال نعم فقالوا حسبنا ای یکفینا ذلک فی کونه ابن الله"

کیا تم خود نہیں کہتے ہو کہ بیشک عیسیٰ علیہ السلام "اللہ کی روح اور اللہ کا کلمہ" ہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں ہم یہی

کہتے ہیں کہ عیسی علیہ السلام روح اللہ" و کلمة الله "ہیں۔

اس وقت یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی کہ قرآن پاک کی کچھ آیتیں محکم ہیں جن کے معانی واضح اور ظاہر وصاف ہیں، جن کو سمجھنا آسان ہے، اور کچھ آیتیں متشابہات ہیں جن کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا۔

"وقوله تعالی "روح الله و کلمته "من المتشابه الذی لایعرفون معناه و لا یفهمون تاویله"

اللہ تعالی کا ارشاد گرامی کہ عیسی علیہ السلام روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں۔ یہ متشابہات سے ہے، جس کا ظاہری معنی مراد نہیں (البتہ مجازی معانی معتبر ہیں جن کا ذکر آگے انشاء اللہ آئے گا) اور ان کی تاویلوں کو یہ عیسائی نہیں سمجھ سکتے لھذا ان کا "روح اللہ وکلمۃ" سے عیسی علیہ السلام کے خدا کا بیٹا ہونے پر دلیل بنانا باطل ہے۔

(۲) نزول کی دوسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ آیۃ یہود کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ ایک مرتبہ ابو یاسر بن اخطب یہود کے چند آدمیوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے قریب سے گذرا تو آپ سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرۃ کی ابتدائی آیات تلاوت فرما رہے تھے، وہ اپنے بھائی حیی بن اخطب کے پاس آیا، اس کے پاس بھی یہود کی محفل لگی ہوئی تھی، ابو یاسر نے کہا کیا تم جانتے ہو کہ قسم ہے اللہ تعالی کی میں نے محمد ﷺ سے تلاوت سنی ہے جو ان پر آیۃ نازل ہوئی ﴿آلمٓ0 ذٰلِکَ الْکِتَابُ﴾ حیی ابن اخطب نے کہا کیا واقعی تم نے یہ آیۃ محمد ﷺ سے سنی ہے؟ وہ کہنے لگا ہاں میں نے یقیناً سنی ہے حیی اپنے ساتھ چند یہود کے لے کر نبی کریم ﷺ کے پاس آیا، اور پوچھنے لگا کیا تم پر یہ آیۃ نازل ہوئی ﴿آلمٓ0 ذٰلِکَ الْکِتَابُ﴾ ؟ آپ نے فرمایا ہاں یہ مجھ پر اللہ تعالی کی طرف سے نازل ہوئی۔ اس نے کہا ہم اس دین پر کیسے ایمان لائیں جس کی مدت اکہتر سال ہے، کیونکہ الف کا ایک عدد ہے اور لام کے تیس اور میم کے چالیس، اس کی بات کو سن کر نبی کریم ﷺ مسکرائے، اس نے پوچھا کیا اور بھی کوئی آیۃ ہے؟ آپ نے "آلمٓصٓ" تلاوت کی۔ تو وہ کہنے لگا کہ اس کے تو ایک سو اکسٹھ عدد بنتے ہیں۔ الف کا ایک، لام کے تیس اور میم کے چالیس اور صاد کے نوے عدد ہیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے "آلرٰ" اور "آلمٓرٰ" تلاوت کیں تو وہ کہنے لگا ہم پر اشتباہ ہو گیا ہم معلوم نہیں ہو رہا کہ تمہیں تھوڑی مدت کیلئے دین دیا گیا یا زیادہ مدت کیلئے۔

"ثم قال ابو یاسر لاخیه ومن معه وما یدریکم لعله لقد جمع هذا کله لمحمد، فقالوا لقد تشابه الامر علینا"

پھر ابو یاسر نے اپنے بھائی اور اس کے ساتھ والے لوگوں کو کہا، کیا تم یہ نہیں سمجھ رہے کہ ہو سکتا ہے ان تمام آیات کے مجموعی عددوں کے مطابق محمد کے دین کی مدت ہو، وہ کہنے لگے معاملہ ہم پر متشابہ ہو گیا۔

اس وقت یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی کہ اس کتاب کی بعض آیتیں محکم ہیں اور بعض آیتیں متشابہ ہیں۔
(ماخوذ از روح المعانی وصاوی)

شان نزول کی وجوہ مجتمع ہیں:

دونوں واقعات در پیش آنے کے بعد یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی، اس لئے دوسری وجہ شان نزول پر یہ اعتراض درست نہیں کہ وہ سیاق وسباق سے ہٹ کر ہے، اور پہلی وجہ زیادہ بہتر ہے کیونکہ اسی (۸۰) سے زیادہ آیات نجران کے وفد کے متعلق نازل ہوئیں۔ اس کا تو کوئی انکار نہیں کہ اسی (۸۰) سے زیادہ آیات نجران کے وفد کے متعلق نازل ہوئیں اور ماقبل اور مابعد سے تعلق بھی پہلی وجہ شان نزول کا زیادہ نظر آتا ہے۔ لیکن اکثر آیات کے شان نزول کے چند واقعات مجموعی طور پر ہیں، یہاں بھی مراد دونوں واقعات کا مجموعی طور پر در پیش آنا اور پھر آیۃ کریمہ کا نازل ہونا ہے۔

سؤال: یہاں ارشاد ہوا" مِنهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ" کہ قرآن پاک کی بعض آیات محکم ہیں جن کے معانی واضح ہیں وہ اصل کتاب ہیں، اور بعض میں اشباہ ہے۔ لیکن دوسرے مقام میں فرمایا ﴿الٓرٰ O كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ﴾ اس کتاب کی آیات محکم ہیں اور تیسرے مقام میں فرمایا ﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا﴾ اللہ نے اتاری سب سے اچھی کتاب کہ اول سے آخر تک ایک سے ہے۔

ان آیات میں تطبیق کیسے ہے کہ ایک میں کل آیات کو محکم قرار دیا۔ دوسری میں کل آیات کو متشابہ قرار دیا، اور تیسری آیات میں بعض کو محکم اور بعض کو متشابہ قرار دیا۔

جواب: محکم اور متشابہ مختلف معانی میں استعمال ہیں، جس کی وجہ سے یہ اشتباہ پیدا ہوتا ہے۔"قيل حيث جعل الكل محكما اراد ان الكل حق ليس فيه عبث ولا هزل" جس آیات کریمہ میں تمام آیات کو محکم کہا ہے وہاں محکم کا یہ معنی ہے کہ قرآن پاک کی تمام آیات حق ہیں۔ ان میں کوئی بے فائدہ اور حقیقت کے خلاف نہیں۔

"وحيث جعل الكل متشابها اراد ان بعضه يشبه بعضا فى الحق والصدق وفى الحسن"

اور جس آیت کریمہ میں تمام آیات کو متشابہ قرار دیا اس سے مراد یہ لیا کہ بیشک بعض آیات بعض کے ساتھ حق وصداقت میں اور حسن میں مشابہ ہیں۔

وجعل ههنا بعضه محكما وبعضه متشابها (يعنى ان القرآن منه محكم العبارة قد صينت من الاحتمال ومنه متشابه وهوما احتمل وجوها)

زیر بحث آیۃ کریمہ میں بعض کو محکم کہا اور بعض کو متشابہ، محکم سے مراد یہ ہے کہ ان کے مطابق واضح

ہیں۔ان میں مختلف احتمالات نہیں پائے جاتے،اور بعض آیات کو متشابہ بنایا یعنی ان کے معانی میں اشتباہ پایا جاتا ہے،ان کے معنی واضح نہیں بلکہ ان میں کئی احتمالات پائے جاتے ہیں۔ (ماخوذ از معالم التنزیل)

علامہ بغوی رحمہ اللہ کی تفسیر کو سمجھنے کے بعد اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ تینوں آیات کا دیکھیں،آپ کو بہت ہی حسین وجمیل ترجمہ نظر آئے گا،انصاف کی نگاہ سے دیکھنے والا کنز الایمان کی تعریف کئے بغیر رہ نہیں سکتا''

(۱) ﴿آلر O کِتَابٌ اُحْکِمَتْ آیَاتُه﴾ یہ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں حکمت بھری ہیں۔(کنز الایمان)

(۲) ﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتَابًا مُّتَشَابِهًا﴾ اللہ نے اتاری سب سے اچھی کتاب کہ اول سے آخر تک ایک سی ہے۔ (کنز الایمان)

(۳) هُوَ الَّذِی اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتَابَ مِنْه آیَاتٌ مُّحْکَمَاتٌ هُنَّ اُمُّ الْکِتَابِ وَاُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ'' وہی ہے جس نے تم پر یہ کتاب اتاری اس کی کچھ آیتیں صاف معنی رکھتی ہیں وہ کتاب کی اصل ہیں،اور دوسری وہ ہیں جن کے معنی میں اشتباہ ہے۔(کنز الایمان)

ماقبل سے تعلق:

اس سے پہلی آیت میں ذکر فرمایا''هُوَ الَّذِی یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ کَیْفَ یَشَاءُ''وہی ہے جو صورتیں عطاء کرتا ہے تمہیں (ماؤں کے پیٹوں میں) بچہ دانیوں میں جسطرح چاہتا ہے۔''وهذا امر جسمانی'' یہ انسان کی تخلیق کی جسمانی صورت کا تذکرہ ہے،اور اس آیۃ کریمہ میں ذکر فرمایا کہ قرآن پاک کی بعض آیات محکم ہیں جو اصل کتاب ہیں اور بعض متشابہ ہیں،''استطرد الی العلم وھو امر روحانی''امر جسمانی کے تذکرہ کے بعد علم کا تذکرہ کیا یہ روحانی معاملہ کا تذکرہ ہے،یہ نجران کے عیسائیوں کے اس اشتباہ کو زائل کرنے کیلئے نازل کی گئی جو انہیں عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق قرآن پاک کے''وروح منہ'' سے پڑا تھا۔جس کی تفصیل شان نزول کی وجوہ میں بیان کر دی گئی۔

محکم کے معانی:

''اما المحکم فالعرب تقول حاکمت وحکمت واحکمت بمعنی رددت ومنعت''

عرب حضرات حاکمت اور حکمت اور احکمت کا معنی کرتے ہیں،پھیرنا اور روکنا۔اور حاکم کو حاکم اس لئے کہا جاتا''هو یمنع الظالم عن الظلم'' کہ وہ ظالم کو ظلم سے روکتا ہے۔(اسی سے یہ پتہ چلا جو حاکم ظالم کو ظلم سے نہ روکے بلکہ اپنے آپ کو ظلم سے نہ روکے،بدترین ظالم ہو تو وہ حاکم کہلانے کا حقدار نہیں البتہ وہ غاصب اور لٹیرا ہو سکتا

ہے) اور لگام کو (حکمۃ بفتحتین) کہا جاتا ہے کہ وہ گھوڑے کو ادھر ادھر مضطرب ہونے سے (ادھر ادھر پھرنے سے) روکتا ہے، حدیث نخعی رحمہ اللہ میں ہے "احکم الیتیم کم تحکم ولدک ای امنعہ عن الفساد" یتیم کو (فساد وغیرہ سے) اسی طرح روکو جس طرح اپنی اولاد کو روکتے ہو۔

"وقال جریر احکموا اسفھاء کم ای امنعوھم" تم اپنے بے وقوفوں کو فساد وغیرہ سے روکو، اسی طرح کہا جاتا ہے "بناء محکم" ولیق یمنع من تعرض لہ' یعنی محکم تعمیر وہ ہے دوسرے کو اپنے آپ میں تصرف کرنے سے منع کرے۔ "وسمیت الحکمۃ حکمۃ لانھا تمنع عما لاینبغی" حکمت کو بھی حکمت اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ غیر مناسب چیزوں سے روکتی ہے (از کبیر)

محکم کی دو قسمیں: جب یہ واضح ہو گیا کہ محکم وہ ہے جس کے معانی میں اشتباہ نہ ہو، عبارت اس طرح واضح ہو کہ عربی زبان جاننے والے کو الفاظ اور مفہوم اور آیۃ کریمہ کے تقاضا میں کوئی اشتباہ نہ ہو۔ اب محکم کو دو قسموں کو سمجھا جائے (۱) جو بلا تامل (بغیر غور وفکر کے) حاصل ہو جائے، (۲) دوسری قسم وہ ہے جو تامل (غور وفکر) کے بعد حاصل ہو۔

بلا تامل حاصل ہو: جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ہے ﴿قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَاحَرَّمَ رَبُّکُمْ عَلَیْکُمْ﴾ فرمادو آؤ میں بیان کروں تم پر جو حرام کیا ہے تمہارے رب نے تم پر اور رب تعالی کا ارشاد گرامی ہے ﴿وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّاتَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہُ﴾ اور حکم دیا ہے تمہارے رب نے یہ کہ تم نہ عبادت کرو سوائے اس کے۔ اور ارشاد باری تعالی ہے ﴿لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ﴾ اور اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔ ان تمام آیات کے مطالب بغیر تامل (سوچ وبچار، غور وفکر کے بغیر) حاصل ہیں، ان کے معانی میں کوئی اشتباہ نہیں۔

تامل کے بعد حاصل ہوں: یعنی انسان خود ہی غور فکر کرے تو اسے مطلب سمجھ آجائے، یہ ضرورت درپیش نہ آئے کہ اس کا مطلب اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ ہی سمجھائیں۔ اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ﴿اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْا اَیْدِیَھُمَا﴾ چور مرد ہو یا عورت ان کے (دائیں) ہاتھوں کو کاٹو۔ اس آیت کریمہ میں معمولی تامل کرنے کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ جیب کاٹنے والے کے ہاتھ کاٹے جائیں گے، اور کفن چوری کرنے والے کے ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے۔

سرقہ کیا ہے؟: "السرقۃ اخذ مال مملوک لغیرہ علی سبیل الخفیۃ" سرقہ یہ ہے کہ کسی کا

مال جو حفاظت میں ہو اسے پوشیدہ طور پر لے لینا، یعنی مال کے محافظ کی غفلت سے اس کا مال اس طرح لے لینا کہ اسے پتہ نہ چلنے دیا جائے۔ جب سرقہ کا معنی معلوم ہو تو معمولی تأمل سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ حکم جیب کاٹنے والے کو شامل ہے، کیوں؟ "لوجود معنی السرقة فيه مع زيادة" اس لئے کہ سرقہ کا معنی بھی "طرار" (جیب تراش) میں پایا گیا ہے اور زیادتی بھی۔ کیونکہ یہ غیر کا مال اس کی حفاظت میں ہوتے ہوئے، اس کے ذرا بھر توجہ ہٹنے سے یہ اس کی جیب کاٹ لیتا ہے، اس لئے جیب کاٹنے والوں کے ہاتھ بھی کاٹے جائیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کفن کسی کی ملکیت میں نہیں رہتا، اسلئے کہ میت کو دنیاوی مال ومتاع سے کوئی غرض نہیں رہتی، اور میت کے ورثاء بھی کفن کے مالک نہیں ہوتے، اس لئے کہ وراثت ہی کفن پہنانے کے بعد حاصل ہوتی ہے میت کے مال میں سب سے پہلے میت کا حق کفن ہی ہے۔

دینی طلباء کرام کیلئے:

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾ ان الفاظ مبارکہ میں اور اس سے پہلے الفاظ مبارکہ میں تأمل کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے "انه معطوف على المغسولات لضرب الغاية فيه" کہ اس کا عطف ﴿وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ﴾ پر ہے، کیونکہ غایۃ کا ذکر دونوں میں ہے، ہاتھوں کے دھونے کا ذکر کیا کہ "ہاتھوں کو دھوئے کہنیوں تک" اور پاؤں کے دھونے کا ذکر کیا کہ "پاؤں کو دھوئے ٹخنوں تک" ان دونوں میں غایۃ (یعنی ایک حد) کا ذکر ہے، یہ معطوف اور معطوف علیہ میں وجہ مناسبت ہے۔ اس کا عطف ﴿وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ﴾ پر نہیں کہ پاؤں پر مسح کرنا ثابت ہو، کیونکہ ﴿وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ﴾ میں غایت کا ذکر نہیں اور ﴿وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾ میں غایت کا ذکر ہے، ان دونوں میں عطف کیلئے مناسبت نہیں پائی گئی۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿ثَلٰثَةَ قُرُوْۤءٍ﴾ اس میں معمولی سوچ، غور وفکر سے پتہ چل جاتا ہے کہ "قُرُوْۤءٍ" سے مراد طہر (پاکیزگی) ہے، حیض (ماہواری خون) نہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ عدت طلاق کے بعد شروع ہوتی ہے، اور طلاق طہر میں دینے کا حکم ہے، جب طہر میں طلاق دی جائے گی، اس کی بعد تین حیض عدت گذاری جائے گی، تین میں کمی اور زیادتی نہیں ہوگی، اگر "قُرُوْۤءٍ" کا معنی "طهر" کیا جائے، تو تین مکمل نہیں ہوتے کم ہوں گے یا زیادہ، کیونکہ جس طہر میں طلاق دی گئی اگر وہ عدت میں شمار کیا جائے تو تین میں کمی واقع ہوگی، اور اگر اسے نہ شمار کیا جائے تو تین سے زیادتی لازم آئے گی۔ حالانکہ "ثلاثة (تین)" لفظ خاص ہے جو کمی اور زیادتی کا احتمال نہیں رکھتا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿قَوَارِيْرَا مِنْ فِضَّةٍ﴾ اس میں جنتی پیالوں کا ذکر ہے کہ وہ شیشے کی طرح

ہوں گے وہ شیشے چاندی کے ہوں گے، اس میں بظاہر وہم ہے کہ چاندی کے شیشے تو نہیں ہوتے بلکہ وہ تو گنج کے ہوتے ہیں، لیکن معمولی تامل سے سمجھ آجاتا ہے کہ وہ برتن چاندی کے ہوں گے، ان میں چمک، دمک چاندی کی طرح ہوگی۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

محکم کی قسمیں اور مثالیں جو بیان کی گئی ہیں ان سے واضح ہوگیا کہ اصول فقہ میں جن کو ظاہر، نص، مفسر، محکم، خفی اور مشکل کہا گیا ہے وہ سب ہی اس آیۃ کریمہ میں مذکور محکم میں داخل ہیں۔

واضح ہوا: والمحکم مالا یحتمل من التأویل غیر وجه واحد" محکم وہ ہے جس کا ایک ہی مطلب ہوا اور اس میں کوئی تاویل نہ پائی جائے۔"وماقیل المحکم مایعرف معناه ویکون حجة واضحة ودلائله لائحة" اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ محکم وہ ہے جس کا معنی پہچانا جاتا ہو، اور حجت واضح ہو، اور دلائل ظاہر ہوں۔ (ماخوذ از مظہری)

راقم کے نزدیک دونوں معانی مجموعی طور پر معتبر ہیں "محکم وہ ہے جس کے معانی واضح ہوں، کسی قسم کی تاویل کی ضرورت نہ ہو" الحمد للہ راقم کی ذہنی اختراع کو روح المعانی سے تائید حاصل ہوگئی، علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

(محکمات) صفة آیات ای واضحة المعنی ظاهرة الدلالة محکمة العبارة محفوظة من الاحتمال والاشتباه"

اس مقام میں "محکمات" کا لفظ "آیات" کی صفت واقع ہو رہا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ محکم وہ ہے جس کا معنی ظاہر ہو الفاظ محکم ہوں، احتمال اور اشتباہ سے محفوظ ہو۔ (روح المعانی)

محکم کے کئی مطالب:

(۱) احناف کا قول یہ ہے "**المحکم الواضح الدلالة الظاهر الذی لایحتمل النسخ**" محکم وہ ہے جو واضح ہے اور الفاظ کی دلالت معنی پر ظاہر ہو اور نسخ کا احتمال نہ پایا جائے۔

"والمتشابه الخفی الذی لایدرک معناه عقلا ولانقلا وهو مااستأثر الله تعالی بعلمه کقیام الساعة والحروف المقطعة فی اوائل السور"

اور متشابہ وہ خفا ہے کہ جس کا معنی عقلا اور نقلا نہ پایا جاسکے، یعنی اس میں عقل کو دخل نہ ہو اور نہ ہی اس کے معنی قرآن وحدیث سے واضح ہوں، متشابہات کا علم صرف اللہ تعالی کو حاصل ہے، کسی اور کو ذاتی طور پر علم حاصل نہیں، جیسا کہ

قیامت کا علم اور حروف مقطعات جو سورتوں کی ابتداء میں ان کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔

ھاں اللہ تعالیٰ کی عطاء سے قیامت کا علم حضور ﷺ کو دیا گیا اور حروف مقطعات کا علم آپ کو اور آپ کی امت کے نیک لوگوں کو آپ کے وسیلہ سے عطاء کیا گیا۔(نجوم الفرقان کی جلد دوم سورۃ البقرہ کی ابتداء میں حروف مقطعات کے متعلق تفصیلا ذکر کر دیا گیا۔قیامت کا علم بھی ضمنا کر دیا گیا البتہ مکمل ذکر ﴿وَعِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾ کے ضمن میں آئے گا "ان شاء الله"

(۲) دوسرا قول درحقیقت روایت ابن عباس ہے جو ابن ابی طلحہ سے ابن ابی حاتم نے ذکر کی ہے، وہ یہ ہے "المحکمات ناسخه و حلاله و حرامه و حدوده و فرائضه و المتشابهات مایؤمن به و لا یعمل به" محکمات سے مراد وہ آیات ہیں جو ناسخ ہیں اور وہ جن میں حلال و حرام، حدود، اور فرائض کا ذکر ہے۔اور متشابہات سے مراد وہ جن پر ایمان رکھا جائے، لیکن ان کی مراد واضح نہ ہونے کی وجہ سے ان پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) "وقیل المحکم الفرائض و الوعد و الوعید، و المتشا به القصص و الامثال" بعض حضرات نے بیان کیا محکم سے مراد فرائض اور وعد اور وعید ہے۔اور متشابہ سے مراد قصص و امثال ہیں۔

(۴) فریابی نے مجاہد سے روایت کی "المحکمات ما فیه الحلال و الحرام و ماسوی ذلک متشابه"
محکمات وہ ہیں جن میں حلال و حرام کا ذکر پایا جائے، اور متشابہ وہ ہیں جن میں حلال و حرام کا ذکر نہ پایا جائے۔

(۵) "و اخرج عبید بن عمیر عن الضحاک قال المحکمات مالم ینسخ و المتشابهات ماقد نسخ"
عبید بن عمیر نے ضحاک سے روایت کی کہ محکمات وہ ہیں جو منسوخ نہیں ہوئیں، اور متشابہات میں سے کچھ منسوخ بھی ہوئیں

(۶) "وقیل المحکم مالم یتکرر الفاظه و المتشابه مایقابله" اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ محکم وہ ہے جس کے الفاظ میں تکرار نہ ہو، اور متشابہ وہ ہے جس کے الفاظ میں تکرار پایا جائے۔

(۷) "وقال الماوردی المحکم ماکان معقول المعنی و المتشابه بخلافه کاعداد الصلوات و اختصاص الصیام بر مضان دون شعبان"

ماوردی نے بیان کیا ہے کہ محکم وہ ہے جس کا مطلب واضح ہو، اور متشابہ وہ ہے جس کا مطلب واضح نہ ہو، جس طرح نمازوں کی تعداد، اور روزوں کا رمضان میں فرض ہونا اور شعبان میں فرض نہ ہونا۔ان کی حکمت اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم

ہے، بندے کو اس کا علم نہیں۔ (ماخوذ از روح المعانی)

راقم کا موقف: محکم اور متشابہ کے معانی تفسیر مظہری سے بیان کیے جا چکے ہیں، اور ایک سؤال کا جواب معالم التنزیل سے بیان کیا جا چکا ہے کہ تین آیات میں تطبیق کیسے ہے۔ اسی سے واضح ہو جاتا ہے کہ محکم اور متشابہ کے مختلف معانی کی وجہ سے مختلف اقوال ہیں ورنہ محکم وہی ہے جس کے معانی واضح ہوں ان میں احتمال واشتباہ وہ ہے جس کے معنی میں احتمال واشتباہ پایا جائے، اور اس کے معانی ومطالب واضح نہ ہوں۔

﴿هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ﴾ ''وہ اصل کتاب ہیں''۔

یعنی آیات محکمات اصل کتاب ہیں، "**یعنی هن اصل الکتاب الذی یعول علیه فی الاحکام ویعمل به فی الحلال والحرام**" یعنی وہ آیات اصل کتاب ہیں کیونکہ ان کی مراد واضح ہونے کی وجہ سے ان پر کامل اعتماد پایا جاتا ہے اور ان سے احکام واضح طور پر ثابت ہوتے ہیں، اور محکم کے ذریعے ہی حلال وحرام پر عمل کیا جائے گا۔

ام الکتاب کے مرادی اور لغوی معنی میں مناسبت:

"**الام**" **الوالدة وام کل شیء اصله وعماده وللقوم رئیسهم وکل شیء انضمت الیه اشیاء**" (القاموس)

''الام'' کا معنی والدہ، ہر چیز کی اصل اور ستون کو "الام" کہا جاتا ہے، اسی طرح قوم کے رئیس اور سردار کو "ام القوم" کہا جاتا ہے۔ بلکہ ہر چیز جس کے تابع دوسری چیزیں ہوں وہ ان کی "ام" کہلاتی ہے۔

"**الکتاب**" کا یا تو معنی "**مکتوب**" ہے، جس کا مطلب مفروض ہے، جیسا کہ اللہ تعالی کے ارشاد گرامی ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ میں ''كُتِبَ'' کا معنی ''فُرِضَ'' ''کیا جائے'' اسی صورت میں اضافت بمعنی "لام" کے ہوگی، اور "ام" کا معنی ''ماں'' یا ''اصل'' ہوگا، اب عبارت کا معنی یوں ہوگا "**هن والدات واصول لما کتب علینا اتیانه او الکف عنه من الفرائض والمحرمات**" آیات محکمات والدہ کی طرح ہیں، یعنی اصل ہیں ان کیلئے جو ہم پر فرض کردی گئی ہیں، خواہ ان کا تعلق عمل کرنے سے ہو جیسا کہ فرائض یا ان کا تعلق ترک سے ہو جیسے محرمات، یعنی وہ آیات جن میں فرائض اور محرمات کا ذکر کیا گیا ہے وہ ان فرائض وحرمات کی اصل ہیں۔

اور اگر "الکتاب" سے مراد قرآن پاک ہو تو اس وقت اضافت بمعنی "من" کے ہوگی۔ "**یعنی انها ام للاحکام من الکتاب یؤخذ منها الاحکام بلاحاجة بیان من الشارع**" یعنی آیات محکمات قرآن پاک کے

احکام کی اصل ہیں، کہ ان آیات سے ہی واضح طور پر احکام سمجھ میں آجاتے ہیں شارع (اللہ تعالی اور رسول اللہ ﷺ) کی طرف سے مزید وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں درپیش آتی۔

"واما بمعنى اللام" اور یا تو اضافت بمعنی لام کے ہو، تو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا۔

"والمعنى انها عمادالقرآن وبمنزلة رئيس القوم سائر الايات يحتاج اليها غيرها ويضم اليها حتى يستفاد من غيرها المراد منها يردها الى المحكمات"

کہ آیات محکمات قرآن پاک کی اصل یعنی ستون کی طرح ہیں، اوران کو باقی آیات پر وہ حیثیت حاصل ہو جو قوم کے رئیس کو قوم پر حیثیت حاصل ہوتی ہے، یعنی دوسری آیات ان محکم آیات کی محتاج ہوتی ہیں کہ ان کے ساتھ محکمات کو ملایا جائے تو ان دوسری آیات سے مطالب حاصل کئے جاتے ہیں۔ تقریبا مطلب یوں ہو گیا کہ دوسری آیات کو ان محکم آیات کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔ (مظہری)

سؤال: آیات محکمات، جمع ہے، پھر ضمیر "هُنَّ" جمع ہے۔ لیکن خبر مفرد ہے "اُمُّ الْكِتَابُ" حالانکہ "امہات الکتاب" ہونا چاہئے تھا، "ام" کو مفرد لانے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: **اورد لفظ المفرد ليدل على ان المحكمات كلها بمنزلة ام واحدة لان الاحكام المفروضة تؤخذمن جميعها لامن كل واحدة منها"**

واحد لانے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ بیشک تمام محکم آیات ایک دلیل کی طرح ہیں، ان تمام سے احکام مفرضہ ثابت ہوتے ہیں، ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ اصل نہیں بنایا گیا۔

دوسرا جواب یہ ہے "ان **مجموع المحكمات في تقدير شئ واحد ومجموع المتشابهات في تقدير شئ آخر واحدهما ام للآخر**" کہ بیشک محکم آیات تمام ہی ایک چیز کی حیثیت میں ہیں اور متشابہات تمام ایک چیز کی حیثیت میں ہیں۔ محکم متشابہات کیلئے ایک ہی اصل کی طرح ہیں۔ یہ اسی طرح ہے جیسا کہ اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً﴾ (اور بنایا ہم نے ابن مریم اوران کی ماں کو نشانی) کیونکہ عیسی علیہ السلام اور ان کی والدہ مکرمہ ایک نشانی کی طرح تھے۔ اسی طرح تمام محکم آیات کو ایک ہی آیۃ (نشانی) کہا گیا ہے۔ (مظہری، کبیر)

﴿وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ﴾ **"اور کچھ دوسری متشابہات ہیں** (جن کے معانی میں اشتباہ ہے)"

متشابہات کا ذکر محکمات کے ساتھ ساتھ ہی کافی حد تک کر دیا گیا ہے، (متشابہات) محتملات، یعنی متشابہات کا معنی یہ ہے کہ ان میں احتمال پایا جائے جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ہے ﴿الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ فلا

ستواء بمعنى الجلوس وبمعنى القدرة والاستيلاء ولا يجوز الاول على الله تعالى بدليل المحكم وهو قوله ليس كمثله شيء" استواء کا معنی بیٹھنا، اور قدرت رکھنا، اور غلبہ حاصل کرنا، ان معانی میں سے پہلا معنی اللہ تعالی کی شان کے لائق نہیں کیونکہ رب تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔ جو بیٹھے وہ جسم ہے، حادث ہے وہ بے مثل نہیں۔ اسی وجہ سے یہ آیۃ متشابہات کی ان اقسام میں سے ہے جن کے معانی کا تو علم ہے مگر مطالب کا علم نہیں۔ (مدارک)

سوال: قرآن پاک تو نازل کیا گیا ہے بندوں کی رہنمائی کیلئے اور دین کے بیان کیلئے اور بندوں کی ہدایت کیلئے متشابہات کے جب مطالب ہی واضح نہیں تو ان کے نازل کرنے کا کیا فائدہ؟

پہلا جواب: قرآن پاک نازل کیا گیا عرب کے الفاظ اور لغات کے مطابق۔ کلام عرب کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) ایک ان میں سے ''ایجاز'' ہے، جو اختصار کیلئے ذکر کیا جاتا ہے، "والموجز الذی لایخفی علی سامعه ولا یحتمل غیر ظاهره" کلام موجز وہ ہے جس میں اختصار تو ہو لیکن سننے والے پر مخفی نہ رہے اور غیر کا احتمال نہ رکھے کیونکہ کلام کو لمبا ذکر کرنے کی وجہ تاکید اور مراد کی وضاحت مقصود ہوتی ہے۔ جب مراد مخفی نہ ہو، غیر کا احتمال نہ رکھے تو اختصار بہتر ہوتا ہے، طوالت کی ضرورت نہیں۔

(۲) دوسری قسم یہ ہے کہ مجاز، کنایات، اشارات، تلویحات (کسی کے کلام کو اپنے کلام میں سمو کر اپنے کلام کا حصہ بنانا) کا ذکر کرنا، اور بعض معانی کو پوشیدہ رکھنا، "وهذا الضرب هو المستحسن عند العرب والبديع في كلامهم" یہ قسم عرب حضرات کے نزدیک مستحسن ہے اور ان کے کلام میں بدیع ہے۔

اللہ تعالی نے قرآن پاک کو ان دونوں قسموں کے مطابق نازل کیا، صرف محکم آیات ہی تمام کی تمام ہوتیں "لقالوا هلا انزل بالضرب المستحسن" تو وہ کہتے کہ قرآن پاک اسی طرح کیوں نازل نہیں جو ہمارے کلام میں مستحسن صورت سمجھی جاتی ہے۔ کلام عرب کے ہر پہلو کے مطابق قرآن پاک کو نازل فرما کر "فكانه قال عارضوه بای الضربين شئتم" گویا کہ یوں کہا گیا کہ قرآن پاک کا مقابلہ کرو دونوں قسموں میں جس طرح تم چاہتے ہو، لیکن وہ معارضہ سے عاجز آ گئے۔

دوسرا جواب: اللہ تعالی نے متشابہات کو فائدہ عظیمہ کیلئے نازل کیا وہ یہ کہ اہل علم متشابہات کو محکمات کی طرف لے جانے میں مشغول ہوں اور آیات میں زیادہ تفکر کریں، جب وہ معانی کے حاصل کرنے میں محنت

ومشقت کریں گے "فیثیون علی تعبهم کما اثیبوا علی عباداتهم" تو ان کو اس مشقت پر اسی طرح ثواب دیا جائے گا جس طرح عبادت کرنے پر ثواب دیا جاتا ہے۔

"ولو انزل القرآن کله محکما لاستوی فی معرفته العالم و الجاهل ولم يفضل العالم علی غیره"

اگر تمام قرآن پاک محکم نازل ہوتا، اس میں متشابہات آیات نہ ہوتیں تو عالم اور جاہل برابر ہوتے، اور عالم کو دوسرے لوگوں پر فضیلت حاصل نہ ہوتی کیونکہ معانی میں جب تفکر کی ضرورت ہی درپیش نہ آتی تو غور و فکر کا مقام ختم ہو جاتا تو جاہل اور عالم برابر ہو جاتے۔

قرآن پاک کی متشابہات میں تفکر کرنے والا فقیر اور محتاج کی طرح ہے اور نہ فکر کرنے والا غنی اور بے پرواہ کی طرح ہے "وقد قیل فی عیب الغنی انه یورث البلادة وفی فضیلة الفقر انه یورث الفطنة" غنی کا عیب ہی یہ ہے کہ اسے بے پرواہی کی وجہ سے بے وقوفی حاصل ہوتی ہے، اور فقیر کا کمال ہی یہ ہے اسے احتیاجی کی وجہ سے عقلمندی حاصل ہوتی ہے۔

تیسرا جواب: علم والے حضرات علم میں کچھ پوشیدہ نکات رکھتے ہیں تا کہ طلباء کے ذہنوں کو پہچانیں کہ وہ ان کو سمجھ سکتے ہیں یا نہیں، پھر ان کا وہ کیا جواب دیتے ہیں، جب وہ پوشیدہ نکات کا جواب دینے پر قادر ہوں تو ان کو ذہین سمجھ لیا جاتا ہے کہ ان کو علمی دسترس (قدرت) حاصل ہے۔

"فلما کان ذلک حسنا عند العلماء جاز ان یکو ن ما انزل الله تعالی من المتشابه علی هذا النحو"

جب یہ اہل علم کے نزدیک جائز ہے تو اللہ تعالی کا متشابہات کو نازل کرنا بھی جائز ہے۔

چوتھا جواب: ان الله تعالی انزل المتشابه فی کتابه مختبرا به عباده لیقف المؤمن عنده ویردعلمه الی عالمه فیعظم بذلک ثوابه ویرتاب به المنافق فید اخله الزیغ فیستحق بذلک العقوبة کما ابتلی بنو اسرئیل بالنهر والله اعلم بمراده"

تحقیق اللہ تعالی نے متشابہات کو اپنی کتاب میں نازل کیا ہے اپنے بندوں کو آزمانے کیلئے، مومن کی آزمائش یہ ہے کہ بیشک وہ ان آیات میں غور فکر کرے، اپنے ذہن کی آزمائش کرے، معانی و مطالب کو حاصل کرنے میں غور فکر کر کے ثواب حاصل کرے لیکن آخر کار رک جائے، توقف کرے، اور یہی کہے کہ ان کی حقیقی مراد اللہ تعالی ہی جانتا

ہے تو اسے عظیم ثواب حاصل ہوگا۔

آیات متشابہات سے منافقوں کی بھی آزمائش پائی جاتی ہے کہ وہ ان میں شک کریں گے، ان کو دلوں میں ٹیڑھا پن پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ غلط تاویلیں کر کے گمراہ ہوجاتے ہیں، اور عذاب کے مستحق ہو جاتے ہیں، آیات متشابہات سے آزمائش ایسے ہی ہے جیسے بنی اسرئیل کو ایک نہر سے آزمایا گیا، جن لوگوں نے اس سے پانی پی لیا وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمان ہوئے، جنہوں نے پانی نہیں پیا ہاں البتہ ایک چلو بھر جس کی اجازت تھی اسی پر اکتفاء کیا وہ اللہ تعالیٰ کے مطیع ہوئے۔ واللہ اعلم (ماخوز از خازن)

تنبیہ: حقیقی مراد متشابہات کی اللہ تعالیٰ ہے جانتا ہے ظاہری مطالب بیان کرنا کہ ان الفاظ کے یہ مطالب لئے جا سکتے ہیں جو شریعت کے منافی نہیں۔ یہ صحابہ کرام اور تابعین سے ثابت ہے۔ ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی﴾ کے متعلق ابھی قریب ہی ذکر کیا گیا کہ استواء کا معنی ہے "بیٹھنا" "غلبہ حاصل کرنا، قدرت حاصل کرنا" ان معانی میں "بیٹھنا" اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں لیکن جب یہ معنی کیا جائے کہ "رحمٰن کو عرش پر غلبہ حاصل ہے" یا معنی یہ کیا جائے "رحمٰن کو عرش پر قدرت حاصل ہے" تو یہ معانی اللہ تعالیٰ کی شان کے منافی نہیں، لیکن احتمال پائے جانے کی وجہ سے متشابہ کہا گیا ہے، کہ حقیقی مراد صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ (راقم)

﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَاتَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ﴾

"لیکن وہ جن کے دلوں میں ٹیڑھا پن ہے وہ پیچھا کرتے ہیں ان کا جو اشتباہ والی ہیں، اس سے وہ تلاش کرتے ہیں فتنہ اور تلاش کرتے ہیں اس کی تاویلیں۔"

بیشک اللہ تعالیٰ نے کتاب کو دو قسموں پر منقسم فرمایا کہ قرآن پاک کی بعض آیات محکم ہیں اور بعض متشابہ ہیں۔ اب یہاں پر بیان فرمایا کہ جن لوگوں کے دلوں میں کجی (ٹیڑھا پن) ہے وہ متشابہات سے ہی دلائل پکڑتے ہیں، "والزیغ المیل عن الحق یقال زاغ زیغا ای مال میلا" زیغ کا معنی ہے حق سے پھر جانا، کہا جاتا ہے "زاغ زیغا" اس کا معنی کیا جاتا ہے میلان کرنا، پھر جانا۔ (کبیر)

جن کے دلوں میں کجی ہے وہ کون لوگ ہیں:

"فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ "میل عن الحق وھم اھل البدع" "جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھا پن

ہے" اس سے مراد اہل بدعت ہیں جو حق سے اعراض کئے ہوئے ہیں۔ (مدارک)

اسی معنی کو قاضی ثناء اللہ مظہری رحمہ اللہ نے پسند فرمایا ہے۔

"وقیل ھم جمیع المبتدعة والصحیح ان اللفظ عام لجمیع من ذکر وجمیع اصناف البدعة"
بعض حضرات نے کجی والوں کے متعلق بیان کیا ہے کہ وہ بدعتی لوگ ہیں۔ صحیح یہی ہے کیونکہ لفظ عام ہے جو سب اقوال کو شامل ہے (جن کا ذکر عنقریب ہی انشاء اللہ آرہا ہے) یعنی تمام ہی بدعتی لوگوں کو یہ شامل ہے کہ ان کے دلوں میں ٹیڑھا پن ہے۔

مختلف اقوال: اگر چہ بظاہر یہ سمجھ آرہا ہے کہ "زیغ" میں مختلف اقوال ہیں۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ تمام بدعتی لوگ "اھل زیغ" (کجی والے) ہیں۔ اسی معنی کے لحاظ پر مختلف لوگوں کو مختلف اوقات میں اہل زیغ کہا گیا ہے، یہ اقوال کا اختلاف بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اہل زیغ ہیں۔

"قال الربیع ھم وفد نجران خاصموا النبی ﷺ فی عیسی علیه السلام"
ربیع رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ آیۂ کریمہ میں جو مذکور ہے "کہ جن لوگوں کے دلوں میں کجی ٹیڑھا پن ہے وہ پیچھا کرتے ہیں متشابہات کا فتنہ تلاش کرنے کیلئے اور تاویلیں تلاش کرنے کیلئے"

اس سے مراد نجران کے عیسائیوں کا وفد ہے، جنہوں نے "کلمة الله وروح منه" کا مطلب نہ سمجھا اور ظاہر الفاظ سے غلط مطلب لے کر عیسی علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا۔ "وقال الکلبی ھم الیھود وطلبوا علم اجل ھذه الامة واستخراجه بحساب الجمل" کلبی رحمہ اللہ نے فرمایا اس سے مرد یہودی ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی امت کا حساب حروف مقطعات سے باعتبار ابجد کے حساب لگایا، لیکن وہ خود ہی اعتراض کرنے لگے "ولقد خلطت علینا فلاندری أبکثیرة ناخذ ام بقلیلة ونحن مما لانؤمن بھذا" کہ تم نے ہم پر خلط ملط کر دیا ہے، یعنی مختلف حروف مقطعات پیش کر کے معاملہ ہم پر مشتبہ کر دیا ہے ہمیں معلوم نہیں ہو رہا کہ ہم ان حروف پر عمل کریں جن کے عدد کم ہیں یا ان پر عمل کریں جن کے عدد زیادہ ہیں۔ انہوں نے اس سے بہانہ وحیلہ تراشا کہ ہم ایمان ہی نہیں لاتے۔

خیال رہے جو قول کلبی رحمہ اللہ کہ ہے وہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔ "وقال ابن جریج ھم المنافقون" ابن جریج رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ آیۂ کریمہ میں مذکور اہل زیغ سے مرد منافقین ہیں۔ جنہوں نے متشابہات کی غلط تاویلیں کیں۔ "وقال الحسن ھم الخوارج" حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے بیان فرمایا وہ اہل زیغ خارجی لوگ ہیں۔ "کذا اخرج احمد وغیره عن ابی امامة عن النبی ﷺ" اسی طرح یعنی خارجی مراد

ہونے پر مسند احمد وغیرہ میں ابوامامہ کی روایت نبی کریم ﷺ سے بھی ملتی ہے۔

"وکان قتادة اذاقرا هذه الآية "فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِي قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ" قال ان لم يكونوا الحرورية والسابية فلاادرى من هم"

قتادہ ﷺ جب یہ آیۃ کریمہ "فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِي قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ" تلاوت فرماتے تو فرماتے اگر حرور یہ قبیلہ کے خارجی اور سابیہ قبیلہ کے لوگ نہ ہوتے تو مجھے معلوم نہ ہوتا کہ جن لوگوں کے دلوں میں زیغ (ٹیڑھا پن) ہے وہ کون ہیں۔

"وقيل هم جميع المبتدعة" بعض حضرات نے کہا اس سے مرد تمام بدعتی لوگ ہیں۔ نتیجہ وہی جس کو شروع میں ذکر کر دیا گیا "والصحيح ان اللفظ عام لجميع من ذكر وجميع اصناف المبتدعة" صحیح یہی ہے کہ لفظ عام ہے، اس لئے جتنے اقوال اہل زیغ (کجی والوں) کے متعلق ذکر ہیں، وہ سب ہی مراد ہیں کیونکہ وہ سب ہی دلوں میں ٹیڑھا پن رکھتے ہیں۔ اور بدعتی لوگوں کی سب قسمیں ہی اس میں داخل ہیں۔ (ماخوذ از مظہری)

❁ عن عائشة قالت تلارسول الله ﷺ هذه الآية هو الذى انزل عليك الكتاب منه آيات محكمات هن ام الكتاب واخرمتشابهات ،الى قوله اولوا الالباب،قالت قال رسول الله ﷺ قالت قال رسول الله ﷺ فاذا رأت الذين يتبعون ماتشابه منه فاولئك الذين سمى الله فا حذروهم" (رواه البخارى)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے یہ آیۃ تلاوت فرمائی۔ "هُوَ الَّذِىْ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتَابِ وَاُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ .... اُولُوا الْاَلْبَابِ" (یعنی مکمل آیۃ تلاوت فرمائی) تو ارشاد فرمایا جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو متشابہات کا پیچھا کرتے ہیں۔ (تو ان سے بچ کر رہو) یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق رب تعالیٰ نے فرمایا "فاحذروهم" ان سے بچ کر رہو۔ (مظہری)

❁ وروى احمد عن ابى امامة عن النبى ﷺ فى قوله تعالى "فاما الذين فى قلوبهم زيغ فيتبعون ماتشابه منه" قال هم الخوارج،وفى قوله تعالى "يوم تبيض وجوه وتسود وجوه" قال هم الخوارج"

نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِي قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَاتَشَابَهَ مِنْهُ﴾ کے متعلق فرمایا کہ اس کا مصداق "خارجی لوگ ہیں" اور رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی "يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ" کا مصداق بھی آپ نے خارجیوں کو قرار دیا۔

یہ حدیث صراحۃ (ظاہر طور پر) مرفوع ہے، اور عقل کا بھی تقاضا یہی ہے کہ یہ کسی صحابی پر موقوف نہیں، اور

اس کا معنی بھی صحیح ہے "فان اول بدعة وقعت فی الاسلام فتنة الخوارج" کیونکہ اسلام میں سب سے پہلا فتنہ اسلام میں خارجیوں نے پیدا کیا۔ان کا مقصد ہی اصل میں دنیاوی مال ہوتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ حنین کے مال غنیمت میں ذوالخویصرۃ نے کہا "اعدل فانک لم تعدل" انصاف کرو تم نے انصاف نہیں کیا۔"فقال رسول الله ﷺ لقد خبیت وخسرت ان لم اکن اعدل ایأمننی علی اهل الارض ولا تأمنونی" تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تو ذلیل وخوار ہو گیا (جب تو نے کہا) میں نے عدل نہیں کیا۔میرے انصاف پر تو تمام زمین والے یقین رکھتے ہیں۔اور تم اس پر یقین نہیں رکھتے۔"استاذن عمر بن الخطاب فی قتله" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے قتل کی اجازت طلب کی کہ یارسول اللہ مجھے اجازت دو کہ میں اس منافق کا سر قلم کر دوں۔

"فقال دعه فانه یخرج من ضنضئی هذا (ای من جنسه) قول یحقر احدکم صلوته مع صلوتهم وقراءته مع قراءتهم بمرقون من الدین کما یمرق السهم من الرمیة فاینما لقیتموهم فاقتلوهم فان فی قتلهم اجرالمن قتلهم"

تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے چھوڑ دو،اس کی جنس (نسل) سے ایسی قوم نکلے گی جن کی نمازوں کے سامنے تم اپنی نمازوں کو گھٹیا سمجھو گے،اور ان کے قرآن پڑھنے کے سامنے تم اپنا قرآن پاک پڑھنا گھٹیا سمجھو گے (یعنی تم یہ خیال کرو گے کہاں ہماری نمازیں کہاں ان کی نمازیں،وہ بڑے لمبے رکوع وسجود کر کے بڑی اعلی نماز پڑھ رہے ہیں۔کہاں ان کا قرآن پاک پڑھنا اور کہاں ہمارا قرآن پڑھنا وہ تو بڑی عمدگی سے تجوید اور خوش الحانی سے قرآن پڑھ رہے ہیں) وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔جہاں بھی ان کو پانا ان کو قتل کر دینا،ان کے قتل میں تمہیں اجر حاصل ہو گا۔

پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں خارجیوں کا سردار قتل کر دیا گیا۔پھر مختلف نظریات وخواہشات رکھنے والے لوگ پیدا ہوتے رہے،مختلف عقائد ان کے ہوئے،کوئی قدریہ فرقہ بن گیا،کوئی معتزلہ فرقہ بنا،کوئی جہمیہ فرقہ بنا،یہ سب بدعتی فرقے ہیں،یہ سب ہی "اہل زیغ" دل میں کجی،ٹیڑھا پن رکھنے والے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی جگمگا رہا ہے "وستفترق هذه الامة علی ثلاث وسبعین فرقة کلها فی النار الاواحدة" کہ میری امت میں تہتر فرقے ہوں گے،سوائے ایک فرقہ کے باقی سب جہنمی ہوں گے۔صحابہ کرام نے پوچھا "ومن یا رسول الله" وہ نجات پانے والا فرقہ یارسول اللہ کونسا ہو گیا؟ "قال "ومن کان علی ما انا علیه واصحابی" آپ نے فرمایا جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں" (اس پر قائم رہنے والا فرقہ نجات پانے والا ہو گا)۔ (ماخوذ از ابن کثیر وصابونی)

❁ واخرج الطبرانی عن ابی مالک الا شعری انه سمع رسول اللهﷺ یقول لا اخاف علی امتی الآثلاث خلال ان یکثرلهم المال فیتحا سدوا فیقتتلوا وان یفتح لهم الکتاب فیاخذه المؤمن یبتغی تاویله (وما یعلم تاویله الاالله والراسخون فی العلم یقولون آمنابه کل من عندربنا وما یذکر الااولوا الالباب) وان یزداد علمهم فیضیعوه ولا یبالون به"

طبرانی نے ابومالک اشعریؓ سے روایت کی کہ انہوں نے رسول اللہﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا مجھے اپنی امت پر سوائے تین خصلتوں کے کوئی خوف نہیں۔(ایک یہ کہ) ان کے پاس مال زیادہ ہو جائے گا، وہ ایک دوسرے پر حسد کریں گے اور آپس میں لڑیں گے۔(دوسری یہ کہ) اور ان کے سامنے قرآن پاک کھولا جائے گا وہ اس میں تاویلیں تلاش کریں گے، حالانکہ (متشابہ کی) تاویلیں رب تعالیٰ کے بغیر کوئی نہیں جانتا، اور جو علم میں پختہ ہیں وہ کہیں گے ہم ایمان لائے ہر چیز ہمارے رب کی طرف سے ہے، اور نہیں نصیحت کرتے سوائے عقل والوں کے۔(اور تیسری یہ کہ) ان کو علم زیادہ عطاء کیا جائے گا وہ اسے ضائع کردیں گے اور اس کی کوئی پرواہ نہیں کریں گے۔ (درمنثور)

❁ واخرج الحاکم وصححه عن ابی هریرة قال قال رسول الله ا مما اتخوف علی امتی ان یکثر فیهم المال حتی یتنافسوا فیه فیقتتلوا علیه وان مما اتخوف علی امتی ان یفتح لهم القرآن حتی یقرأه المؤمن والکافر والمنافق فیحل حلاله المؤمن"

مستدرک حاکم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ذکر کی جسے صحیح قرار دیا، رسول اللہﷺ نے بیان فرمایا مجھے اپنی امت پر یہ خوف ہے کہ ان کے پاس مال کثیر ہو جائے گا، یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے سے اپنے آپ کو برتر اور نفیس سمجھیں گے جس کی وجہ سے ان میں قتال واقع ہوگا، اور مجھے اپنی امت پر یہ خوف ہے کہ ان کے سامنے قرآن کھولا جائے گا یہاں تک کہ مؤمن اور کافر اور منافق قرآن پڑھیں گے، حلال کو حلال صرف مؤمن سمجھیں گے۔ (درمنثور)

یعنی قرآن پاک سے دلیل کافر بھی پکڑیں گے اور منافق بھی، لیکن معاذ اللہ ان کے دلائل دھوکے پر مبنی ہوں گے، وہ اپنے دلوں میں کجی رکھنے کی وجہ سے قرآن کی غلط تاویلیں کریں گے۔ صرف مؤمنین ہی قرآن پاک کو صحیح سمجھ کر حلال کو حلال سمجھیں گے، اور حرام کو حرام سمجھیں گے۔

❁ اخرج ابو یعلی عن حذیفة عن رسول اللهﷺ قال ان فی امتی قوما یقرؤن القرآن ینثرونه نثر الدقل یتاولونه علی غیر تاویله"

مسند ابی یعلی میں حضرت حذیفہؓ سے روایت ذکر کی گئی ہے، رسول اللہﷺ نے فرمایا بیشک میرے امت میں ایک

قوم ایسی آئے گی جو قرآن پاک اس طرح بکھیر دیں گے جیسا کہ ردی کھجوروں کو بکھیر دیا جاتا ہے۔ اور وہ ایسی تاویلیں پیش کریں گے جو قرآن پاک کے مطالب کے خلاف ہوں گی۔ (درمنثور)

❁ واخرج ابن سعد وابن الضريس في فضائله وابن مردويه عن عمر بن شعيب عن ابيه عن جده ان رسول الله ﷺ خرج على قوم يترا جعون في القرآن وهو مغضب فقال بهذا ضلت الامم قبلكم باختلافهم على ابنيائهم وضرب الكتاب بعضه ببعض قال وان القرآن لم ينزل ليكذب بعضه بعضا ولكن نزل ان يصدق بعضه بعضا فما عرفتم منه فاعملو ابه وما تشابه عليكم فآمنوا به"

ابن سعد اور ابن ضریس اور ابن مردویہ نے عمرو بن شعیب کی روایت اپنے باپ، دادا سے بیان کی بیشک رسول اللہ ﷺ ایک قوم پر نکلے جو قرآن میں جھگڑا کر رہے تھے، آپ بہت زیادہ ناراض ہوئے آپ نے فرمایا تم سے پہلے لوگ اسی وجہ سے گمراہ ہوئے کہ انہوں نے اپنے انبیاء کرام پر جھگڑا کیا اور آسمانی کتابوں کی بعض آیات کو بعض پر پیش کیا (یعنی یہ کہا کہ یہ آیت فلاں آیۃ کے مخالف ہے) آپ نے فرمایا بیشک قرآن اس لئے نہیں نازل ہوا کہ بعض آیات بعض دوسری آیات کی تکذیب کریں (جھٹلائیں) لیکن قرآن تو اس لئے نازل ہوا کہ بعض قرآن دوسرے بعض کی تصدیق کرے جو تمہاری سمجھ میں آجائے اس پر عمل کرو، اور جو تمہاری سمجھ میں نہ آئے اس پر ایمان رکھو۔ (درمنثور)

❁ واخرج ابن ابي شيبة في المصنف عن ابي قال كتاب الله ما استبان منه فاعمل به وما اشتبه عليك فآمن به وكله الى عالمه"

مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت ابی بن کعب ؓ سے روایت نقل کی گئی ہے کہ اللہ کی کتاب سے جو تم پر ظاہر ہو اس پر عمل کرو اور جو تم پر مشتبہ ہو اس پر ایمان رکھو اور صاحب علم کے سپرد اسے کر دو۔ (درمنثور)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿وَمَا يَعْلَمُ تَاوِيْلَهُ اِلَّا اللّٰهُ وَالرَّاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ آمَنَّا بِه كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّا اُوْلُوا الْاَلْبَابِ٥﴾

(1) ''اور نہیں جانتا اس کی تاویل کو سوائے اللہ کے، اور پختہ علم والے کہتے ہیں ہم ایمان لائے اس پر، سب ہمارے رب کی طرف سے ہے، اور نصیحت نہیں قبول کرتے سوائے عقل والوں کے۔''

وقف کس پر ھے: اس میں ایک مذہب احناف کا ہے کہ وقف ''الا اللہ'' پر ہے۔ اس لحاظ پر معنی یہ ہے ''اور نہیں جانتا اس کے تاویل کو سوائے اللہ کے۔ اور پختہ علم والے کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے'' اور دوسرا مذہب اس میں امام شافعی رحمہ اللہ کا ہے کہ وقف ''والراسخون فی العلم'' پر ہے اس لحاظ پر معنی یہ ہے کہ نہیں جانتا اس کی تاویل کو سوائے اللہ اور پختہ علم والوں کے، حال یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے۔

وجه فرق: دونوں مذہبوں میں فرق یہ ہے کہ پہلے مذہب کے متعلق متشابہات کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور دوسرے مذہب کے مطابق متشابہات کا علم اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اور پختہ علم والوں کو بھی حاصل ہے۔

سؤال: جب احناف کا مذہب یہ ہے کہ وقف ''الا اللہ'' پر ہے تو پھر یہ کہنا کیسے صحیح ہے کہ متشابہات کا علم رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہے، اور اولیاء کرام کو بھی متشابہات کا علم حاصل ہے یہ تو ''الا اللہ'' پر وقف کے منافی ہے۔

اجمالی جواب: اللہ تعالیٰ جب کسی کو علم عطاء نہ کرے تو اس کے بغیر متشابہات کا علم کسی کو حاصل نہیں، اور اگر اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ یا اولیاء کرام کو علم عطاء کردے تو وہ اس کے عطاء سے علم رکھتے ہیں۔

تفصیلی جواب: متشابہ کی چند قسمیں ہیں ان میں سے **ایک قسم** یہ ہے کہ اسے علماء جانتے ہیں یہ قسم کون سی ہے؟ ''وقسم للانسان سبیل الی معرفته کالالفاظ الغریبة والاحکام الغلقة'' یہ قسم وہ ہے کہ الفاظ غریبہ ہوں یعنی کم استعمال ہوتے ہوں اور احکام ان کے پیچیدہ اور پوشیدہ ہوں، ان کی تنگ و دو کی جائے یعنی ان کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ حاصل ہو جاتے ہیں۔

پھر اس قسم کی پانچ قسمیں ہیں:

(۱) ایک یہ ہے کہ کمیت (تعداد، مقدار) کے لحاظ پر اشتباہ حاصل ہو جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ''اقتلوا المشرکین'' اس میں دو احتمال ہیں کہ تمام مشرکین کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا یا بعض کو، لیکن جب دوسرے

احکام کو دیکھا تو پتہ چل گیا کہ وہ کفار جن کو مسلمانوں کے حاکم نے اپنے ملک میں رہنے کی اجازت دے دی اور ان پر جزیہ مقرر کر دیا، وہ ذمی ہو گئے، ذمی لوگوں کے مال اور ان کی جانوں کے مسلمان محافظ ہوتے ہیں، لھذا ان کو قتل نہیں کیا جا سکے گا۔ جنگ میں کسی مسلمان نے کسی کافر کو پناہ دے دی تو اسے اس معاہدہ کی وجہ سے قتل نہیں کیا جا سکے گا۔ دار حرب سے کوئی کافر مسلمانوں کے ملک میں اجازت طلب کر کے آئے تو اسے قتل کرنا منع ہوگا اسے آنے کی اجازت دے کر اس کی جان اور مال کی حفاظت مسلمانوں نے اپنے ذمہ لے لی لھذا جتنے دنوں کی اسے اجازت دی ہے اتنے دنوں تک اسے قتل کرنا منع ہے۔

واضح ہوا کہ اس قسم میں بظاہر اشتباہ تھا، لیکن احکام شرع میں غور و فکر سے پتہ چل گیا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔

(۲) دوسری قسم یہ ہے، "والثانی من جهة الكيفية كالوجوب والندب فی نحو "(فَانْكِحُوْا مَاطَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَآءِ) کہ کیفیت کے لحاظ پر اشتباہ ہو کہ یہ امر (حکم) وجوبی ہے یا استحبابی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿فَانْكِحُوْا مَاطَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَآءِ﴾ میں یہ بظاہر واضح نہیں کہ نکاح کرنا واجب ہے یا مستحب ہے۔ جب احکام شرع میں غور کیا تو پتہ چلا کہ نکاح کرنا سنت ہے، اگر غلبہ شہوت ہو تو واجب ہے۔

(۳) "والثالث من جهة الزمان كالناسخ والمنسوخ نحو "اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ" (ڈرو اللہ تعالیٰ سے جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے) یعنی تیسری قسم یہ ہے کہ زمان کے لحاظ پر اس میں اشتباہ ہو کہ یہ ناسخ ہے یا منسوخ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ﴾ میں اشتباہ پایا گیا، لیکن غور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ حکم منسوخ نہیں ہوا رسول اللہ ﷺ کے بعد منسوخ ہونے کا احتمال ہی اٹھ گیا۔

(۴) "والرابع من جهة المكان والامور التی نزلت فيها الآية نحو "وليس البر بأن تأتوا البيوت من ظهورها" "وانما النسئى زيادة فی الكفر "فان من لا يعرف عادتهم فی الجاهلية يتعذر عليه تفسير هذه"

چوتھی قسم یہ ہے کہ مکان کے لحاظ پر اشتباہ ہو اور امور جن کا ذکر آیۃ کریمہ میں اشتباہ ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا﴾ اور نیکی یہ نہیں کہ تم گھروں میں ان کی پیٹھوں کی طرف سے آؤ۔

اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِيَادَةٌ فِی الْكُفْرِ﴾ ان کا مہینے پیچھے ہٹانا نہیں مگر اور کفر میں بڑھنا۔ جس شخص کو کافروں کی عادات کا پتہ نہ ہو اس پر ان آیات کا سمجھنا مشکل ہے، اور اسے اشتباہ حاصل ہوتا ہے کہ ان کا مطلب کیا ہے، جب ان کی عادت کا پتہ چل گیا کہ وہ جب احرام باندھ لیتے تو واپس گھر نہیں لوٹتے تھے، اگر گھر

آنے کی کوئی مجبوری درپیش آجاتی تو گھروں کے دروازوں سے نہیں آتے تھے بلکہ پچھلی دیوار میں سوراخ کر کے گھر داخل ہوتے، رب تعالی نے ان کے اس فعل کا رد فرمایا کہ یہ کوئی نیکی کا کام نہیں۔ اسی طرح ان کا مہینوں کا پیچھے ہٹانے کا کیا مطلب ہے؟ واضح نہیں تھا، اس میں اشتباہ پایا گیا، لیکن جب ان کی عادت کا پتہ چلا تو مطلب بھی واضح ہوگیا کہ ان کی زمانہ جاہلیت میں یہ عادت تھی کہ حج صرف موسم بہار میں کرتے تھے اس لئے وہ ہر تین سال کے بعد ایک مہینہ بڑھا دیتے تھے یعنی سال تیرہ مہینوں کا کر دیتے تھے، اب واضح ہوگیا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔

(۵) والخامس من جهة الشروط التی یصح بها الفعل ویفسد کشرط الصلوة و النکاح"

اور پانچویں قسم شرطوں کے لحاظ پر اشتباہ کا پایا جانا ہے کہ وہ کون سی چیزیں ہیں جو شرطیں ہیں کسی فعل کیلئے کہ ان کے پائے جانے سے وہ فعل صحیح ہو، اور نہ پائے جانے سے وہ فعل فاسد ہو، جیسا کہ نماز کی شرطوں یا نکاح کی شرطوں میں اشتباہ تھا، جب احکام شرع کی طرف غور کیا تو پتہ چل گیا کہ طہارت بدن اور کپڑوں اور مکان کی جس میں وہ نماز ادا کر رہا ہے ضروری ہے، بدن کی طہارت عام ہے، حدث سے بھی پاک ہو اور نجاست سے بھی پاک ہو۔ اور نیت کا پایا جانا ضروری ہے اور قبلہ شریف کی طرف منہ کرے، اور ستر عورت پایا جائے۔ اسی طرح نکاح میں جب غور کیا تو پتہ چلا کہ اس میں ایجاب وقبول ضروری ہے، اور دو مردوں کا گواہ ہونا، یا ایک مرد اور دو عورتوں کا گواہ بنانا ضروری ہے۔

اسی طرح نکاح میں جب غور کیا تو پتہ چلا کہ اس میں ایجاب وقبول ضروری ہے، اور دو مردوں کا گواہ ہونا، یا ایک مرد اور دو عورتوں کا گواہ بنانا ضروری ہے۔ متشابہ کی یہ تمام اقسام غور وفکر کے بعد حاصل ہو جاتی ہیں۔

دوسری قسم: "وضرب متردد بین الأمرین یختص بمعرفته بعض الراسخین فی العلم ویخفی علی من دونهم"

یعنی متشابہ کی اقسام میں سے دوسری قسم یہ ہے کہ دو امروں میں تردد ہو کہ اس کا یہ مطلب ہو سکتا ہے یا یہ مطلب ہو سکتا ہے، اس کا وہ علم ان علماء کو حاصل ہوتا ہے جو پختہ علم رکھنے والا ہوتے ہیں، اور جن کا علم پختہ نہیں ہوتا ان کو اس قسم کا علم حاصل نہیں ہوتا۔

"وهوا لمشار الیه بقوله ﷺ لابن عباس رضی الله عنهما "اللهم فقهه فی الدین وعلمه التاویل"

اسی کی طرف اشارہ ملتا ہے رسول اللہ ﷺ کی اس دعاء سے جو آپ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کیلئے فرمائی "اللهم فقهه فی الدین وعلمه التاویل" اے اللہ اسے دین کی سمجھ عطاء فرما اور تاویلوں کا علم عطاء فرما۔ حدیث شریف میں تاویلوں کے علم کا یہی مطلب ہے کہ متشابہات کی صحیح تاویلوں کا علم عطا فرما۔

تیسری قسم: "ضرب لاسبیل للوقوف علیه کوقت الساعة وخروج الدابة وغیر ذلک"
متشابہات کی تیسری قسم یہ ہے کہ جن پر انسان واقف نہیں ہوسکتا جیسا کہ قیامت کا وقت اور قیامت کے قریب دابہ کا نکلنا، وہ دابہ (جانور) کیسا ہوگا اس کی حقیقت کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

تنبیہ: ابھی جس تیسری قسم کا ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر بعض متشابہات کا علم کسی کو حاصل نہیں اس سے مراد ذاتی علم ہے، کہ ان کا ذاتی طور پر علم صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ لیکن عطائی علم انبیاء کرام اور اولیاء عظام کو حاصل ہے، جو وحی اور الہام کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔

آیئے اس مسئلہ کی تفصیل دیکھئے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو آزماتا ہے، لیکن ہر ایک کی آزمائش اس کی شان کے مطابق ہوتی ہے۔ جاہل کی آزمائش اس میں ہے کہ اسے علم حاصل کرنے کے متعلق کہا گیا ہے۔ اور علماء کی زمائش اس میں ہے کہ وہ متشابہات کی طرف عقلی گھوڑے نہ دوڑائیں

"والسر فی هذا الابتلاء قص جناح العقل و کسر سورة الفکر، واذهاب عجب طاؤس النفس لیتوجه القلب بشراشره تجاه کعبة العبودیة ویخضع تحت سرادقات الربوبیة ویعترف بالقصور ویقر بالعجز عن الوصول الی ما فی هاتیک القصور وفی ذلک غایة التربیة ونهایة المصلحة هذا اذا ارید بما لا سبیل لاحد من الخلق الی معرفته من طریق الفکر"

علماء کی اس آزمائش کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی عقل کے پروں کو کاٹ دیں، اور اپنی فکر کی تیزی اور دبدبہ کو توڑ دیں، اور اپنے نفس پر مور کی طرح تعجب کرنا چھوڑ دیں، اور دل کو مکمل طور پر کعبہ عبودیت کی طرف متوجہ کرلیں، اور ربوبیت کے پردوں میں اپنے آپ کو نہایت عجز وانکساری سے چھپالیں، اور وہ اپنے قصور، یعنی کم علمی کا اعتراف کرلیں۔ اور اقرار کرلیں کہ متشابہات کے ان محلات میں پہنچنا ان کے لئے دشوار ہے، ہاں کان کی تربیت و مصلحت کی انتہاء اسی میں ہے کہ وہ یہ سمجھ لیں کہ متشابہات کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے وہ اپنی فکر ورائے سے ان کا علم حاصل نہیں کرسکتے۔

اعتراض: یہ کہنا کس طرح صحیح ہے کہ متشابہات کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے کسی اور کو حاصل نہیں، اس سے تو وحی اور الہام کا دروازہ مکمل طور پر بند ہوجائے گا، حالانکہ انبیاء کرام کو اللہ تعالیٰ وحی اور الہام کے ذریعے علم عطاء کرتا ہے اور اولیاء کرام کو بھی الہام کے ذریعے علم عطاء کیا جاتا ہے۔

جواب: "وانما المنع من الاحاطة ومن معرفته علی سبیل النظر والفکر" متشابہات کا علم کسی انسان کو حاصل نہیں، اس کا یہ مطلب ہے کہ کوئی شخص نظر وفکر سے ان کی معرفت حاصل نہیں کرسکتا، جہاں تک وحی اور

الہام کا تعلق ہے اس کا مطلب یہ ہے

"وان المتشابه مما استأثره الله تعالی بعلمه لایمنع تعلیمه للنبی ﷺ بواسطة الوحی مثلا ولا القائه فی روع الولی الکامل مفصلا لکن لا یصل الی درجة الاحاطة کعلم الله تعالی"

متشابہات کا علم ذاتی طور پر صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کرام کو وحی کے ذریعے یہ علم عطاء نہیں کرتا، اور نہ ہی یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کاملین کو الہام کے ذریعے یہ علم عطاء نہیں کرتا، حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء کرام کو بذریعہ وحی اور اولیاء کرام کو بذریعہ الہام متشابہات کا علم تفصیلی طور عطاء فرماتا ہے تفصیلی علم عطاء کرنے کے باوجود بندوں کا علم اس طرح احاطہ نہیں کرتا جسطرح اللہ تعالیٰ کا علم احاطہ کرتا ہے۔

"ومنع هذا وذاک مما لایکاد یقول به من یعرف رتبة النبی ﷺ ورتبة اولیاء امته الکاملین"

متشابہات کا علم ذاتی طور پر صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اور رب تعالیٰ کی عطاء سے انبیاء کرام اور نبی کریم ﷺ کی امت کے اولیاء کاملین کو بھی حاصل ہے۔ ان دونوں چیزوں کا وہ شخص انکار نہیں کرسکتا جو نبی کریم ﷺ کے مرتبہ کو جانتا ہے اور آپ کی امت کے اولیاء کاملین کے مراتب کو جانتا ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی بالتفصیل)

ھاں جو شخص مقام نبی کریم ﷺ اور مقام اولیاء کرام کو نہیں جانتا تو اس کا یہ کہنا "کہ متشابہات کا علم نبی کریم ﷺ اور اولیاء کرام کو حاصل نہیں" صحیح ہے، کیونکہ وہ جاہل ہے جاہل کو جہالت کی وجہ سے معذور ہی سمجھا جائے۔ (راقم)

ان کا فتنہ کیا ہے؟

یعنی رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿اِبْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ﴾ جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھا پن ہے وہ متشابہات کا پیچھا کرتے ہیں فتنہ تلاش کرنے کیلئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ فتنہ کسے کہا جاتا ہے اور متشابہات کا پیچھا کرنے والوں کا فتنہ کیا ہے۔

"الفتنة فی اللغة الاستهتار بالشیء والغلوفیه" فتنہ کا لغوی معنی یہ ہے "کسی چیز پر فریفتہ ہوجانا اور اس میں غلو کرنا، حد سے بڑھ جانا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے "فلان مفتون بطب الدنیا" فلاں شخص دنیا کی طلب میں حد سے بڑھ گیا، قدر سے تجاوز کر گیا۔

مفسرین کرام نے متشابہات کا پیچھا کرنے والوں کے فتنہ میں چند وجوہ بیان کی ہیں جو سب ہی مراد ہیں۔

(۱) پہلا قول ہے اصم رحمہ اللہ کا کہ جب وہ دین میں متشابہات کا پیچھا کرتے ہیں تو بعض لوگ بعض کے مخالف ہوجاتے ہیں "وذلک یفضی الی القتال والهرج والمرج فذاک هو الفتنة" ان کا ایک دوسرے کے مخالف

ہونا ان کے درمیان لڑائیوں کا اب بنتا ہے، جس پر قتل وغارت مرتب ہوتے ہیں، یہی تو فتنہ ہے۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے 'ان التمسک بذلک المتشابہ یقرر البدعة و الباطل فی قلبه فیصیر مفتونا بذلک الباطل عاکفا علیه لاینقلع عنه بحیلة البتة" کہ متشابہات کا پیچھا کرنے سے انسان بدعات کا مرتکب ہو جاتا ہے، اور اس کے دل میں باطل نظریات گھر کر جاتے ہیں وہ اسے باطل پر سہارا لگانے کی وجہ سے فتنہ میں مبتلاء ہو جاتا ہے، وہ اس درجہ تک فتنہ میں مبتلاء ہو جاتا ہے کہ کسی حیلہ سے بھی اسے ان باطل نظریات سے ہٹایا نہیں جا سکتا۔

(۳) ان الفتنة فی الدین هو الدین هو الضلال عنه و معلوم انه لافتنة و لافساد اعظم من الفتنة فی الدین و الفساد فیه"

تیسرا قول یہ ہے کہ متشابہات کا پیچھا کرنے والا اور ان کے غلط مطالب نکالنے والا گمراہ ہو جاتا ہے، اور یہ یقینی بات ہے دین میں فتنہ وفساد سب فتنوں سے بڑا فتنہ ہے۔ (از کبیر)

﴿وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ﴾ "اور وہ تاویلیں تلاش کرتے ہیں۔"

"التاویل فی اللغة المرجع والمصیر" تاویل کا لغوی معنی ہے "لوٹنا، پھرنا" جیسا کہ کہا جاتا ہے "آل الامر کذا" یہ معاملہ اس طرف پھیر دیا۔ اسی طرح کہا جاتا ہے "اولته تاویلا" میں نے اس کو اس طرف پھیر دیا۔ پھر کسی چیز کی وضاحت کرنے کو بھی تاویل کہا جاتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالی کا ارشاد گرامی اس پر دلالت کر رہا ہے ﴿سَأُنَبِّئُكَ بِتَأْوِيلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا﴾ اب میں باتوں کی وضاحت کروں گا جن پر تم سے صبر نہ ہو سکا" اسی طرح ارشاد باری تعالی ہے ﴿ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا﴾ یہ بہتر ہے اور اس کا انجام اچھا ہے۔

متشابہات کا دو طرح پیچھا کرنا منع ہے:

جن کے دلوں میں کجی (ٹیڑھا پن) ہوتی ہے وہ متشابہات کا دو طرح کا پیچھا کرتے ہیں، جس کی رب تعالی نے مذمت بیان فرمائی ہے۔

(۱) "احدهما علی غیر الحق وهو المراد من قوله تعالی (ابتغاء الفتنة) ایک ان کے پیچھا کرنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ ان متشابہات کے غلط مطالب نکالتے ہیں، ان کے اپنی مرضی سے غلط مطالب نکالنے کو ہی رب تعالی نے ﴿ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ﴾ سے تعبیر فرمایا کہ وہ فتنہ تلاش کرتے ہیں۔

(۲) والثانی ان یحکموا بحکم فی الموضع الذی لادلیل فیه وهو المراد من قوله

تعالی(وابتغاء تاویله)

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ متشابہات سے حکم لگاتے ہیں جس پر ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی،اسی کو رب تعالی نے ﴿وَابْتِغَاءَ تَاْوِیْلِهٖ﴾ سے تعبیر فرمایا کہ متشابہات کا پیچھا کرنے والے تاویلیں تلاش کرتے ہیں۔ (کبیر)

شوافع کے دلائل:

چونکہ امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ وقف ﴿وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ﴾ پر ہے۔لھذا ﴿وَمَایَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ نہیں جانتا کوئی اس کی تاویل کو سوائے اللہ تعالی اور پختہ علم والوں کے۔یعنی متشابہات کا علم اللہ تعالی کو حاصل ہے اور پختہ علم والوں کو بھی حاصل ہے،امام شافعی رحمہ اللہ اور آپ کے متبعین نے اپنے موقف پر یہ دلائل قائم کئے ہیں۔

(۱) اگر پختہ علم والوں کا ذکر دل میں ٹیڑھا پن کے ذکر کے بالکل مقابل ہو،کہ دل میں کجی رکھنے والا متشابہات کا پیچھا کرتے ہیں اور دل میں کجی نہ رکھنے والے متشابہات کو حاصل کرنے کی بالکل کوشش نہیں کرتے تو مناسب یہ تھا کہ یوں کہا جاتا"واما الراسخون فیقولون"علامہ آلوسی رحمہ اللہ کی عبارت کو بھی طلباء کرام مدنظر رکھ لیں۔

"ورجح الاول(ای قول الشافعی)بوجوہ اما اولا فلانہ لو ارید بیان حظ الراسخین مقابلا لبیان حظ الزائغین لکان المناسب ان یقال واما الراسخون فیقولون"

(۲) "واما ثانیا فلأنہ لا فائدۃ حنیئذ فی قیدالرسوخ بل ھذا حکم العالمین کلھم"

دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر صرف ایمان لانے کی بات ہو تو اس میں پختہ علم والوں کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ متشابہات کے متعلق یہ ایمان کہ"یہ ہمارے رب کی طرف سے ہیں"سب اہل علم کو حاصل ہے خواہ وہ ﴿وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ﴾(پختہ علم والے)ہیں یا نہیں۔

(۳) واما ثالثا فلأنہ لا ینحصر حینئذ الکتاب فی المحکم والمتشابہ علی ماھو مقتضی ظاھر العبارۃ حیث لم یقل "ومنہ متشابھات"لان مالایکون متضح المعنی ویھتدی العلماء الی تأویلہ وردہ الی المحکم لا یکون محکما ولا متشابھا بالمعنی المذکور وھو کثیر جدا"

تیسری دلیل یہ ہے کہ قرآن پاک کی آیات صرف محکم اور متشابہ میں منحصر(بند)نہیں۔کیونکہ ﴿مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ﴾ تو کہا ہے،لیکن"ومنہ متشابھات"نہیں کہا تو اس سے پتہ چلا کہ جن آیات کا معنی واضح نہ ہو اور علماء کرام ان کو حاصل کرنے کیلئے محکم کی طرف لوٹائیں،یعنی محکم آیات سے ان کے معنی کو حاصل کریں تو وہ آیات نہ محکم

ہیں اور نہ ہی متشابہات ہیں، اس طرح کی آیات بھی قرآن پاک میں بہت ہیں۔ لھذا مسئلہ صرف کجی رکھنے والوں میں اور پختہ علم والوں میں بند نہیں، بلکہ اور قسم بھی ہے۔

(۴) واما رابعا فلأن المحکم حینئذ لا یکون ام الکتاب بمعنی رجوع المتشابه الیه اذ لا رجوع الیه فیما استأثر الله تعالی بعلمه کعدد الزبانیة"

چوتھی دلیل یہ ہے کہ محکم آیات اس وقت تک "ام الکتاب" (اصل کتاب) نہیں ہوسکتیں جب تک ان کو محکم کی طرف نہ لوٹایا جائے، اور یہ بھی واضح ہے کہ ان متشابہات کو محکم کی طرف نہیں لوٹا سکتے جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے جیسا کہ "زبانیہ فرشتوں کی تعداد کا علم اللہ تعالیٰ کو ہی حاصل ہے۔

لھذا واضح ہوا کہ بعض متشابہات کو محکم کی طرف لوٹایا جائے گا، ان کا علم پختہ علم والوں کو حاصل ہوگا، یہ چوتھی دلیل دراصل راقم کو محاکمہ نظر آتی ہے جس کا ذکر ان شاء اللہ احناف کی طرف سے جوابات کے بعد آئے گا۔

(۵) "واما خامسا فلأن ابن عباس رضی الله عنه کان یقول "انا ممن یعلم تاویله"

پانچویں دلیل یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے تھے میں بھی ان لوگوں میں سے ہوں جو متشابہ کی تاویلیں جانتے ہیں۔ حضرت ابن عباس ﷺ کا یہ کہنا درحقیقت نبی کریم ﷺ کی دعاء کا اثر تھا، جس کا ذکر متصل ہی آرہا ہے۔

(۶) واما سادسا فلأنه قد ثبت فی الصحیح انه ﷺ دعا لابن عباس فقال "اللهم فقهه فی الدین وعلمه التاویل" ولو کان التاویل مما لایعلمه الا الله تعالی لما کان للدعاء معنی"

لیکن چھٹی دلیل یہ ہے کہ صحیح میں ثابت ہے کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کیلئے دعاء کی "اے اللہ اسے دین کی سمجھ اور تاویل کا علم عطاء فرما" اگر اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی اور تاویل کا علم نہیں رکھتا تو نبی کریم ﷺ کی دعاء کا کیا مقصد رہ جاتا ہے۔

(۷) واما سابعا فلأنه سبحانه وتعالی مدح الراسخین بالتذکر فی هذا المقام وهو یشعر بان لهم حظ الأوفر من معرفة ذلک"

ساتویں دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس مقام میں پختہ علم والوں کی تعریف کی ﴿وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّا اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ (اور نہیں نصیحت حاصل کرتے مگر عقل والے) اللہ تعالیٰ نے جب اس مقام میں یعنی متشابہات کے ذکر میں ان کے تذکرہ (نصیحت حاصل کرنے) کا ذکر فرمایا تو اسی سے پتہ چل گیا کہ ان کو کافی حد تک متشابہات کا علم عطاء کردیا گیا۔

(۸) آیات میں جمع، تقسیم، تفریق پائی گئی ہے۔ ﴿اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ﴾ میں جمع پائی گئی ہے کہ مطلقاً تمام

کتاب (قرآن پاک) کے نازل کرنے کا ذکر فرمایا گیا" ﴿مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ﴾ میں تقسیم پائی گئی ہے کہ قرآن پاک کی بعض آیات محکم ہیں اور دوسری وہ ہیں جن کے معنی میں اشتباہ ہے، اور ﴿فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ﴾ میں تفریق پائی گئی کیونکہ جب دو قسموں کو ایک دوسرے کے مقابل ذکر کیا جائے تو اسے تفریق کہا جاتا ہے، یہاں بھی جب ذکر کیا گیا ﴿فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ﴾ تو اس کے مقابل ذکر کیا گیا ﴿وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ﴾ کو، یہ بھی "اما" اور "فا" پر مشتمل ہونا چاہئے تھا، یعنی "واما الراسخون فی العلم فیقولون" ہونا چاہئے تھا لیکن قرائن سے پتہ چل جانے پر "اما" اور "فا" کو حذف کر دیا گیا۔ اس ترتیب سے واضح ہو گیا کہ پختہ علم والوں کو متشابہات کا علم حاصل ہے۔

احناف کی طرف سے جوابات:

(۱) پہلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ اگر چہ پختہ علم والوں کا ذکر دل میں کجی رکھنے والوں کے مقابل ذکر کیا، لیکن "والراسخون" کہا ہے "واما الراسخون" نہیں کہا، کیونکہ اس میں پختہ علم والوں کی شان بیان کرنے میں مبالغہ کیا گیا ہے

"ولم یسلک بهم سبیل المعادلة اللفظیة هئولاء الزائغین وصینوا عن ان یذکروا معهم کما یذکر المتقا بلان فی مثل هذاالمقامات"

کہ لفظی طور پر بھی دونوں کو ایک دوسرے کے برابر نہیں کیا کہ لفظی فرق برابر ہے "زیغ" (کجی) والوں کا ذکر اور انداز سے کیا اور "راسخون" (پختہ علم والوں) کا ذکر اور انداز سے کیا تا کہ پختہ علم کا ذکر، دل میں ٹیڑھ پن رکھنے والوں کے مقابل ایک ہی انداز سے نہ کیا جائے۔

یہ اسی طرح ہے جیسا کہ ایمان والوں اور کافروں کے ذکر میں ﴿اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ﴾ میں فرق کیا گیا ہے۔

"لم یقل والطاغوت اولیاء الذین کفروا ولا الذین آمنوا ولیهم الله، تعظیما لشانئه تعالی ورعایة للاعتناء بشان المؤمنین"

کیونکہ "وَالطَّاغُوتُ أَوْلِيَاءُ الَّذِينَ كَفَرُوا" نہیں ذکر کیا جیسا کہ ایمان والوں کا ذکر "اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا" سے کیا گیا ہے۔ اور جس طرح کافروں کا ذکر "وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ" سے کیا اس طرح مؤمنین کا ذکر "الَّذِينَ آمَنُوا وَلِيُّهُمُ اللَّهُ" سے نہیں کیا اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ رب تعالیٰ نے

اپنی عظمت کا بھی لحاظ رکھا اور مؤمنین کی شان کی بلندی کی رعایت بھی رکھی ہے۔

(۲) دوسری دلیل کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ﴿وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ﴾ کہا ہے۔یعنی علم والوں کے ساتھ رسوخ کا ذکر کیا ہے، جس سے مبالغہ کے طور پر ثابت کیا ہے کہ متشابہ کی تاویل صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے کیونکہ پختہ علم والے بھی اپنے علم میں کمی کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں "آمَنَّا بِهِ" ہمارا اس پر ایمان ہے تو عام علم والے متشابہات کا علم کیسے رکھتے ہوں گے۔تو یقیناً واضح ہو گیا کہ متشابہات کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔

(۳) تیسری دلیل کا جواب یہ ہے کہ قرآن پاک کی آیات کا انحصار متشابہات اور محکمات میں نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ اکہ آپ بیان فرمائیں لوگوں کیلئے جو نازل کیا گیا ان کی طرف (یعنی ان کیلئے) محکمات کے بیان کی ضرورت نہیں، ان کا معنی واضح ہوتا ہے، اور متشابہات کو بیان کرنا مقصود نہیں، تو پتہ چلا کہ بعض آیات محکمات ہیں اور بعض متشابہات ہیں، اور بعض نہ ہی محکم ہیں اور نہ متشابہ ہیں، ان کے وضاحت کرنے اور بیان کرنے کا حکم نبی کریم ﷺ کو دیا گیا۔

(۴) چوتھی دلیل کا جواب یہ ہے کہ "ام الکتاب" میں دو احتمال ہیں، ایک یہ ہے کہ اضافت "فی" سے ہو اب مطلب یہ ہوگا "والمحکم ام فی الکتاب" محکم آیات قرآن پاک میں اصل ہیں۔لیکن متشابہ آیات جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے ان کیلئے محکم نہیں، اور "ام الکتاب" نہیں البتہ یہ کہا جائے کہ "هو ام ای اصل فی فهم العبادات الشرعية کو جوب معرفته وتصديق رسله وامتثال اوامره واجتناب نواهيه" وہ عبادات شرعیہ کے سمجھنے میں اصل ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کا واجب ہونا، اور اس کے رسولوں کی تصدیق اور اس کے امر کی فرمانبرداری اور اس کی نواہی سے اجتناب' اور اگر اضافت بمعنی لام کے مانی جائے تو معنی یہ ہوگا "هن ام للکتاب" وہ کتاب کیلئے اصل ہیں۔

ولكنه باعتبار بعضه وهو الواسطة بين القسمين لان متضح الدلالة كثيرا ما يرجع اليه في خفيها ممالم يصل الى حد الاستتار"

لیکن بعض آیات کیلئے جن آیات کیلئے اصل ہیں وہ آیات دونوں قسموں (محکم ومتشابہ) کے درمیان واسطہ ہیں اس لئے کہ جن کی دلالت واضح ہے یعنی محکم کی طرف وہ آیات لوٹتی ہیں جن میں کچھ معمولی خفاء ہو، اور جن میں زیادہ خفاء ہو یعنی متشابہات ہوں وہ محکم کی طرف نہیں لوٹائی جاتیں کیونکہ ان کا علم ہی حاصل نہیں ہوتا۔

(۵) پانچویں دلیل کا جواب کہ حضرت ابن عباس ﷺ نے یہ فرمایا"انا ممن یعلم تاویلہ" میں ان سے ہوں جو اس کی تاویلیں جانتے ہیں، یہ قول آپ کا صحیح روایات (جن میں متشابہات کی تاویلیں نہ جاننے کا ذکر ہے) کے مخالف ہے،اس لئے اس کا اعتبار نہیں۔اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ یہ قول معتبر ہے تو اس کا مطلب یہ ہے"وھو متشابہ لکنہ فی الحقیقۃ واسطۃ بین المحکم والمتشابہ بالمعنی المراد" کہ اگرچہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباس ﷺ کو متشابہات کی تاویلوں کا علم ہے،لیکن درحقیقت آپ کے ارشاد سے مراد وہ آیات ہیں جو محکمات اور متشابہات کے درمیان واسطہ ہیں۔

(۶) چھٹی دلیل کا جواب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جو دعاء فرمائی ہے"وعلمہ التاویل" کہ اسے (ابن عباس کو) تاویل کا علم عطاء فرما۔

"لایتعین حملہ علی تاویل ما اختص علمہ بہ تعالی بل یجوز حملہ علی تفسیر ما یخفی تفسیرہ من القسم المتردد بین الامرین"

اس تاویل سے مراد وہ تاویل نہیں جو متشابہات کا علم صرف اللہ تعالی کو حاصل ہے اس کی تاویل جاننے کیلئے دعاء کی ہو بلکہ اس تاویل سے مراد تفسیر ہے۔یعنی وہ آیات جو محکمات اور متشابہات کے درمیان ہیں جن کے معانی میں احتمال پایا جاتا ہو،اس کے تفسیر جاننے کیلئے آپ نے دعاء فرمائی۔

(۷) ساتویں دلیل کا جواب یہ ہے کہ رب تعالی نے ﴿اَلرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ﴾ (پختہ علم والوں) کے متعلق جو یہ ارشاد فرمایا﴿وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ (اور نہیں نصیحت حاصل کرتے سوائے عقل والوں کے) اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کو متشابہات کا بھی علم حاصل ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے

"الھم اتعظوا فخالفوا اھواھم ووقفوا عندما حدلھم مولاھم ولم یسلکوا مسلک الزائغین ولم یخوضوا مع الخائضین"

کہ پختہ علم والے نصیحت حاصل کرتے ہیں وہ اپنے خواہشات کے خلاف کام کرتے ہیں کیونکہ علم والوں کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ متشابہ کا بھی علم حاصل کریں لیکن اللہ تعالی نے ان کیلئے جو حد مقرر کی ہے وہ وہاں رک جاتے ہیں اور دل میں کجی رکھنے والوں کی راہ پر وہ نہیں چلتے اور متشابہات میں غور خوض نہیں کرتے۔

(۸)"لابعد فی ان یخاطب اللہ تعالی عبادہ بمالاسبیل لأحدمن الخلق الی معرفتہ ویکون ذلک من باب الابتلاء" متشابہات کو نازل فرما کر بندوں کا امتحان لیا گیا کہ جس کی معرفت وہ حاصل نہیں کرسکتے اس کو حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں،اس آزمائش کی یہی وجہ ہے کہ وہ عقلی گھوڑے دوڑانے بند کردیں۔واضح ہوا

کہ ﴿وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ﴾ کو متشابہات کا علم حاصل نہیں، وقف ﴿اِلَّا اللّٰہُ﴾ پر ہے۔

محاکمہ: اگر غور کیا جائے تو احناف اور شوافع کا اختلاف نہیں۔ کیونکہ شوافع نے بھی ان آیات کے متعلق یہ نہیں کہا جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے (جیسے حروف مقطعات اور قیامت کا علم) کہ پختہ علم والے بھی ان کو جانتے ہیں بلکہ بعض آیات جن کے معانی میں احتمال پایا جاتا ہے ان کا علم انہیں حاصل ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ شوافع نے ان کو متشابہات کہا اور احناف نے ان کو محکمات اور متشابہات کے درمیان فاصلہ مانا کہ یہ نہ محکمات ہیں اور نہ متشابہات ہیں۔

اب نتیجہ واضح ہو گیا کہ جن آیات کے معانی میں احتمال پایا گیا ہے جب ان کو متشابہ کہا جائے تو ان کا علم پختہ علم والوں کو حاصل ہے۔ ان کو حاصل کرنے کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ جن متشابہات کے ظاہر معنی معلوم ہیں جیسا کہ ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ ان کے معانی میں صحیح تاویل کرنا ٹھیک ہے، باطل تاویلیں کرنا جائز نہیں۔ جن کا علم اللہ تعالیٰ سے خاص ہے ان کے تاویلیں تلاش نہ کی جائیں اگر کچھ مطالب مراد لئے جائیں تو یہی کہا جائے کہ حقیقی مراد اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ متشابہات کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ اور اولیاء کاملین کو بھی بذریعہ الہام وکشف عطاء کر رکھا ہے جیسا کہ روح المعانی کی عبارت نقل کی جا چکی ہے لیکن اس مقام میں تفسیر مظہری کی عبارت بہت خوب ہے طلباء کرام اسے بھی مدنظر رکھ لیں۔

فهذه الآية لاتدل على ان النبی ﷺ وبعض الكمل من اتباعه لم يكونوا عالمين بمعانی المتشابهات كيف وقد قال الله تعالى(لم ان علينا بيانه)فانه يقتضی ان بيان القرآن محكمه ومتشابه من الله تعالى للنبی ﷺ واجب ضروری،لايجوز ان يكون شئی منهاغير مبين له عليه السلام والا يخلو الخطاب عن الفائدة ويلزم الخلف فی الوعدوالحق ماحققنا فی اوائل سور البقرة ان المتشابهات هن اسراربين الله تعالى وبين رسول الله ﷺ لم يقصد بها افهام العامة بل افهام الرسول ومن شاء افهامه من كمل اتباعه بل هی ممالايمكن بيانها للعامة وانما يدركها اخص الخواص بعلم لدنی مستفادبنوع من المعية الذاتية اوالصفاتية الغيرالمتكيفة" (مظهری)

اس آیۂ کریمہ سے یہ دلیل نہیں پکڑی جا سکتی کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کی امت کے کامل متبعین کو بھی متشابہات کا علم حاصل نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝﴾ (پھر بیشک ہم نے اپنے ذمہ کرم پر لازم کر لیا ہے اس کا بیان کرنا) قرآن پاک کی خواہ محکم آیات ہوں یا متشابہات اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کیلئے ان کو بیان کرنے کا وعدہ فرما لیا، رب تعالیٰ کے وعدہ کے مطابق یہ نہیں ہو سکتا کہ قرآن پاک کا کچھ حصہ آپ پر بیان نہ کیا گیا ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ نے بعض آیات نبی

کریم ﷺ پر نہ بیان کی ہوں تو وعدہ کی خلاف ورزی لازم آئے گی، اور خطاب کا کوئی مقصد نہیں نکلے گا کیونکہ جسے خطاب کیا جا رہا ہے اسے تو پتہ ہی نہیں۔

اس لئے حق بات یہی ہے جو ہم نے سورۃ بقرہ کی ابتداء میں بیان کردی ہے کہ متشابہات اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے درمیان راز ہیں، ان کے مطالب عام لوگوں کو نہیں سمجھائے گئے، لیکن رسول اللہ ﷺ کو ان کا علم عطاء کردیا گیا، اور آپ کے کامل متبعین کو بھی اس کا علم عطاء کردیا گیا۔ یہ علم عوام حاصل ہی نہیں کرسکتے، بلکہ صرف خواص کو ہی یہ علم لدنی حاصل ہوتا جو ان کو رب تعالیٰ کی ذات کے تقرب اور صفات کا مظہر ہونے کہ وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔

﴿وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ﴾

اور وہ لوگ جو پختہ ہیں علم میں وہ کہتے ہیں ہم ایمان لائے اس کے ساتھ۔

پختہ علم والے کون ہیں:

وهم اهل السنة والجماعة الذين عضوابالنواجذعلى محكمات الكتاب والسنة" پختہ علم والے اہلسنت وجماعت ہیں جنہوں نے قرآن پاک کی محکم آیات اور احادیث مبارکہ پر مضبوطی سے عمل کیا اور ان کی وہی تفاسیر بیان کیں اور ان مطالب پر ایمان رکھا جو سلف صالحین یعنی صحابہ کرام اور تابعین اور تبع تابعین نے بیان کئے 'چونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو امت میں بہتر ہیں جب کہ بہتر ہونے کے متعلق خود رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمادیا۔ صوفیاء کرام کے نزدیک پختہ علم والے وہ لوگ ہیں جو اپنی خواہشات کو مکمل طور پر ختم کردیں تا کہ ان کے دل اور نفس میں تجلیات ذات ہی کو جگہ مل سکے۔

اخرج الطبرانی وغیرہ عن ابی الدرداء ان رسول الله ﷺ سئل عن الراسخين في العلم قال من برت يمينه وصدق لسانه واستقام قلبه وعفف بطنه وفرجه فذلك من الراسخين في العلم "

طبرانی وغیرہ نے حضرت ابوالدرداء ؓ سے روایت کی کہ بیشک رسول اللہ ﷺ سے پختہ علم والوں کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا جس شخص نے اپنی قسم کو پورا کیا' اور بات سچی کی اور دل کو (ایمان وعقائد واعمال پر) سیدھا قائم رکھا اور اپنے پیٹ اور شرمگاہ کو پاک رکھا (یعنی کھانے میں اور خواہشات میں اپنے آپ کو حرام سے بچا کر رکھا) تو وہ ﴿وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ﴾ (پختہ علم والوں) سے ہے۔

یہ بلند مقام صوفیاء کرام کو ہی حاصل ہے اسی وجہ سے قاضی مظہری رحمہ اللہ نے حدیث پاک کو بیان کرنے

کے بعد فرمایا "قلت هذا شان الصوفية" میں کہتا ہوں یہ مقام صرف صوفیاء کرام کو ہی حاصل ہے۔ (مظہری)

یہی حدیث علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ابن عساکر سے عبداللہ بن یزید ازدی سے روایت ذکر کرنے کے بعد فرمایا" ولعل ذلک بیان علاماتهم" شائد یہ ان لوگوں کی علامات بیان کی گئی ہوں کہ نبی کریم ﷺ کی امت میں کامل متبعین پختہ علم والے ہیں جن کی یہ علامات ہوں گی۔

"والمراد بالعلم العلم الشرعی المتقبس من مشكاة النبوة فان اهله هم الممدوحون" علم سے مراد شرعی علم ہے جو رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات سے حاصل ہوا اسی علم والوں کی رب تعالیٰ تعریف فرماتا ہے۔ (روح المعانی)

"الرسوخ فی اللغة الثبوت فی الشئی" رسوخ کا لغوی معنی یہ ہے کہ "کسی چیز کا ثابت رہنا' قائم رہنا" پختہ علم والے وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات رکھتے ہوں دلائل یقینیہ سے اور ان کو یقینی دلائل سے یہ معلوم ہو کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ اسی طرح جب ان کو پتہ چل جائے کہ یہ متشابہ ہے تو وہ اس پر کامل یقین رکھتے ہیں کہ اس کی ظاہری مراد نہیں بلکہ حقیقی مراد وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ (از کبیر)

﴿كُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا﴾ "سب ہمارے رب کی طرف سے ہے"

والمعنى ان كل واحد من المحكم والمتشابه من عند ربنا" یعنی پختہ علم والے یہ کہتے ہیں کہ محکم آیات ہوں یا متشابہ، ہوں سب رب تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔

سؤال : لفظ "عند" بڑھانے کا کیا فائدہ ہے؟ جبکہ "کل من ربنا" کہنا صحیح تھا۔

جواب : متشابہات پر ایمان زیادتی تاکید کا محتاج تھا اس لئے "فذكر كلمة "عند" لمزيد التاكيد" کلمہ عند زیادہ تاکید کیلئے بڑھایا گیا ہے۔ (از کبیر)

سؤال : جب "کل من عند ربنا" کا معنی یہ ہے "کل واحد من المحکم والمتشابه من عند ربنا" تو مضاف الیہ کو حذف کیوں کیا گیا؟

جواب : لان دلالة المضاف عليه قوية فبعد الحذف الأمن من اللبس حاصل" مضاف کی دلالت مضاف الیہ پر قوی پائی گئی۔ مضاف الیہ کے حذف ہونے کے باوجود التباس سے امن حاصل تھا تو اسی وجہ سے مضاف الیہ کو حذف کر دیا گیا۔ (از کبیر)

﴿وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ﴾ "اور نصیحت نہیں قبول کرتے سوائے خالص عقل والوں کے"۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی تعریف فرمائی جو یہ کہتے ہیں ﴿اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا﴾ (ہمارا اس پر ایمان ہے، سب ہمارے رب کی طرف سے ہے)

"انهم يستعملون عقولهم فی فهم القرآن فيعلمون الذلی يطابق ظاهره دلائل العقول فيكون محكما واما الذی يخالف ظاهره دلائل العقول فيكون متشابها "

کیونکہ وہ لوگ اپنی عقلوں کو قرآن پاک کے سمجھنے میں صرف کرتے ہیں جن کے معانی ومطالب ظاہر ہوتے ہیں ان کو وہ جانتے ہیں کہ یہ محکم ہیں اور جن کے معانی ظاہر نہیں اور ان تک عقل کی پہنچ نہیں ان کو وہ سمجھتے ہیں کہ یہ متشابہ ہیں یعنی یہی لوگ کامل ہیں کیونکہ "مايتعظ بما فی القرآن الاذووا العقول الكاملة" قرآن پاک سے وہ لوگ نصیحت حاصل کرتے جو کامل رکھتے ہیں۔اور یہی لوگ ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام تناقض اور باطل ہونے سے پاک ہے یعنی ایسا نہیں کہ بعض آیات دوسری بعض کے مخالف ہوں اور ایسا بھی نہیں کہ قرآن پاک کی کچھ آیات بے مقصد، اور بے فائدہ ہوں۔"فيعلمون ان ذلك المتشابه لا بد وان يكون له معنى صحيح عند الله تعالى" یہی وہ لوگ ہیں جن کو یہ علم حاصل ہے کہ متشابہات بھی بے مقصد نہیں، بلکہ ان کے معانی اللہ کے ہاں صحیح ہیں یعنی، جو مقاصد پر دلالت کرر ہے ہیں۔ (از کبیر)

متشابہات کا علم جو اللہ تعالیٰ کو ذاتی طور پر حاصل ہے وہی علم رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو عطاء فرمایا ہے۔

فائدہ: اس آیۃ کریمہ سے متکلمین کی شان سمجھ میں آئی کہ وہ عقلی دلائل سے بحثیں کرتے ہیں اور ان عقلی دلائل کے ذریعے وہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کے افعال کی معرفت حاصل کرتے ہیں "ولا يفسرون القرآن الابمايطابق دلائل العقول ويوافق اللغة والاعراب" اگرچہ متکلمین قرآن پاک کی تفسیر عقلی دلائل سے پیش کرتے ہیں لیکن ان کے عقل دلائل الفاظ کے لغوی معانی اور الفاظ کے اعراب (حرکات وسکنات) سے حاصل ہوتے ہیں وہ شریعت کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ (از کبیر)

یقینی بات ہے کہ محض عقلی ڈھکوسلے جو شریعت کے مخالف ہوں گے ان کو یکسر ٹھکرا دیا جائے گا۔

انتباہ شدید: واعلم ان الشئی کلماکان اشرف کا ن ضده اخس " ضابطہ وقانون یہ ہے کہ ایک چیز جتنی بلند مرتبہ ہوتی ہے اس کی ضد اتنی ہی زیادہ گھٹیا ہوتی ہے۔قرآن پاک کی تفسیر جب کوئی شخص دلائل

نقلیہ سے کرے یا دلائل عقلیہ سے لیکن ان کی دارومدار لغوی معانی یا حرکات وسکنات سے مطالب حاصل کرنے تک محدود ہو "فکانت درجته هذه الدرجة العظمى التي عظم الله الثناء عليه" تو اسے وہ عظیم درجہ حاصل ہوتا ہے جس کی رب تعالیٰ بھی تعریف فرماتا ہے ﴿وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّا اُولُو الْاَلْبَابِ﴾ (اور نہیں نصیحت حاصل کرتے سوائے عقل والوں کے)

"ومتى تكلم في القرآن من غير ان يكون متبحرا في علم الاصول وفي علم اللغة والنحو كان في غاية البعد عن الله تعالى"

جس شخص کو شرعی اصول معلوم نہیں، وہ عربی لغت کو نہیں جانتا، گرائمر اسے نہیں آتی، وہ صرف اور نحو سے بے خبر ہے ایسا شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بہت ہی دور ہے (ایسا شخص حقیقت میں اپنے باطل نظریات کو قرآن پاک کے مطالب غلط بیان کر کے ثابت کرنے کی ناپاک کوشش کرتا ہے، جیسا کہ نیچری وغیرہ مذاہب باطلہ کی تفاسیر میں یہ ناکام کوشش کی گئی) ولهذا قال النبی ﷺ "من فسر القرآن برأيه فليتبوأ مقعده من النار" اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے قرآن پاک کی تفسیر اپنی رائے سے کی اسے چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنائے۔ (ماخوذ از کبیر)

یعنی اپنی رائے سے باطل نظریات کو قرآن پاک کی تفسیر میں لانے والا جہنمی ہے ہاں البتہ وہ اپنے نظریات کو احادیث مبارکہ سے یا عقلی دلائل صحیحہ سے بیان کرے تو یہ جائز ہے۔ ہاں اپنی طرف سے پوری کوشش کی کہ مطالب صحیحہ بیان کرے لیکن پھر بھی کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا ہے۔

کوزے میں سمندر:

ابھی تک جو بحث کی گئی جو کئی اوراق پر مشتمل ہے وہ تمام اس ایک روایت میں سمٹ کر آجاتی ہے اس ایک روایت کو یوں سمجھا گیا کہ سمندر کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے وہ روایت یہ ہے۔

نقل عن ابن عباس رضي الله عنهما انه قال تفسير القرآن على اربعة اوجه تفسير لا يسع احدا جهله وتفسير تعرفه العرب بالسنتها وتفسير تعلمه العلماء وتفسير لا يعلمه الا الله تعالى" (کبیر)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں قرآن پاک کی تفسیر چار قسموں پر مشتمل ہے۔

(۱) ایک یہ کہ اس سے کوئی بھی جاہل نہیں ہوتا یعنی اس کی مراد واضح ہوتی ہے۔

(۲) دوسری قسم یہ ہے کہ اسے عرب حضرات اپنی زبان سے ہی سمجھ جاتے ہیں کہ اس کا مطلب کیا ہے۔

(۳) تیسری قسم یہ ہے کہ ان مطالب ومقاصد کو صرف علماء ہی سمجھ سکتے ہیں۔

(۴) چوتھی قسم یہ ہے کہ اسے صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور کوئی نہیں جانتا۔

امام مالک رحمہ اللہ کا خوب ارشاد:

جب امام مالک رحمہ اللہ سے کسی شخص نے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی "**الرحمن علی العرش استوی**" میں "استواء" کا کیا مطلب ہے؟ تو آپ نے جواب دیا "**الاستواء معلوم والکیفیة مجهول والایمان به واجب والسؤال عنه بدعته**" "استواء" کا معنیٰ تو معلوم ہے (سیدھا ہو کر بیٹھنا، غالب ہونا، قدرت حاصل کرنا) لیکن اس کی کیفیت معلوم نہیں۔ یعنی یہ پتہ نہیں کہ اس سے رب تعالیٰ کی مراد کیا ہے، اور اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کے متعلق سوال کرنا بدعت ہے۔ (یعنی یہ سوال نہ کرے کہ اس کی حقیقی مراد کیا ہے حقیقی مراد تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے) (کبیر)

تنبیہ: ﴿وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ﴾ پختہ علم والے کون لوگ ہیں؟ ایک قول پہلے ذکر کر دیا گیا جو معتبر ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس سے مراد اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے ایمان قبول کیا تھا جیسے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی، (لیکن اس قول کو مظہری میں رد کیا گیا ہے کہ اس تخصیص کی ضرورت نہیں)

حضرت امام مالک رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ ﴿وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ﴾ کون لوگ ہیں؟ تو آپ نے فرمایا "**العالم العامل بما علم المتبع لما علم**" عالم باعمل یعنی جس نے اپنے علم کے مطابق عمل کیا۔ بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ "الراسخ فی العلم" وہ شخص ہے جس میں چار چیزیں پائی جائیں۔

(۱) "**التقوی بینه وبین الله تعالیٰ**" ان میں سے ایک چیز یہ ہے کہ اس شخص کے درمیان اور اللہ تعالیٰ کے درمیان تقویٰ پایا جائے۔

(۲) "**والزهد بینه وبین الدنیا**" اس کے درمیان اور دنیا کے درمیان زہد پایا جائے،

(۳) یہ تیسری چیز ہے، یعنی بندے کو دنیا سے محبت نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ سے محبت ہو۔

(۴) "**والمجاهدة بینه وبین نفسه**" چوتھی چیز یہ ہے کہ اس کے درمیان اور اس کے نفس کے درمیان مجاہدہ

پایا جائے یعنی اپنے نفس کو گناہوں سے بچانے کیلئے پوری کوشش سے اس پر قہر کرے۔(از معالم التنزیل للبغوی)

اولیاء کرام کا علم:

حضرت امام شعرانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت علی خواص رحمہ اللہ نے بیان فرمایا "ان اللہ تعالی اطلعہ اللہ علی معانی سورۃ الفاتحۃ فخرج منھا مائتی الف علم واربعین الف علم وتسعمائۃ وتسعین علما" کہ بیشک اللہ تعالی نے انہیں (مجھے) سورۃ فاتحہ کے اتنے معانی پر مطلع فرمایا کہ ان کی وجہ سے سورۃ فاتحہ سے انہوں نے دو لاکھ چالیس ہزار نو سو ننانوے علوم (مسائل) نکالے۔

"وکان یقول لایسمی عالما ای عنداھل اللہ الامن عرف کل لفظ جاء ت بہ الشریعۃ"
حضرت علی خواص فرماتے تھے کہ اولیاء کاملین کے نزدیک عالم وہی شخص ہے جو قرآن پاک کے ہر لفظ کے متعلق یہ جانتا ہو کہ اس میں شرعی مسئلہ کیا ہے۔

"وقال فی الکشف فی نحو "،ق،ص،حم، طس،لعل ادراک ماتحتہ عند اھلہ کادراکنا للاولیات ولا یستبعور ففیض الباری عم نوالہ غیر محصور،واستعدادالانسان الکامل عن القبول غیر محسور"
اہل کشف حروف مقطعات کا علم اس طرح رکھتے ہیں جیسا ہمیں بدیہی چیزوں (ظاہر چیزوں) کا علم حاصل ہوتا ہے،اللہ تعالی کی عطاء عام ہے،اس کے فیضان میں کوئی کمی نہیں اور کامل انسان کے اس قبول کرنے کی استعداد میں کوئی کمی نہیں (از روح المعانی)

عبداللہ صبیغ اور حضرت عمر ﷺ:

عن سلیمان بن یسار ان صبیغ بن عسل قدم المدینۃ فجعل یسئال عن متشابہ القرآن وعن اشیاء،فبلغ ذلک عمر ﷺفبعث الیہ عمر فاحضرہ وقد اعدلہ عراجین من عراجین النخل فلما حضر قال لہ عمر من انت؟قال انا عبد اللہ صبیغ فقال عمر ﷺ وانا عبد اللہ عمر ثم قام الیہ فضرب رأسہ یعرجون فشجہ ثم تابع ضربہ حتی سال دمہ علی وجھہ فقال حسبک یا امیر المؤمنین فقدواللہ ذھب ماکنت اجد فی راسی"

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے ایک عنوان قائم کیا"اذ اوجد للمنا فقین الملحدین فی ذلک الوقت سبیلا الی ان یقصدوا ضعفۃ المسلمین بالتشکیک والتضلیل فی تحریف القرآن عن مناھج

التنـزیل وحقائق التاویل'' کہ منافق اور بے دین لوگوں کو جب بھی کوئی موقع ملتا تو نئے نئے اسلام قبول کرنے والے دین میں ناپختہ لوگوں کو شک میں ڈالنے کی سرتوڑ کوشش کرتے ،قرآن پاک کے نزول کے طریقہ میں یا متشابہات کی غلط تاویلوں کا سہارا لے کر مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی ناپاک کوشش کرتے ۔ان میں سے ہی ایک شخص صبیغ بن عسل تھا جو مدینہ طیبہ میں آیا اور لوگوں سے متشابہات وغیرہ کے متعلق سوال کرنے لگا، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا تو آپ نے اسے بلوایا، ساتھ ہی کھجور کی چھڑیوں کو تیار رکھا، وہ جب آیا تو اس سے پوچھا تم کون ہو، اس نے کہا میں ''عبد الله صبیغ'' ہوں، تو حضرت عمر ﷺ نے فرمایا میں عبد اللہ عمر (اللہ کا بندہ عمر) ہوں، آپ نے اس کے سر پر اتنی چھڑیاں ماریں کہ اس کا خون سر سے نکل کر اس کے چہرے پر آ گیا، تو اس شخص نے حضرت عمر ﷺ کو کہا اے امیر المؤمنین اب کافی سزا مل چکی ہے اور میرے سر سے فتنہ وفساد بھی دور ہو گیا۔ (از قرطبی)

خیال رہے کہ قرطبی میں ''صبیع'' صاد مہملہ سے ہے اور روح المعانی میں ضاد معجمہ سے ہے۔ (راقم)

تفہیم القرآن کی ناقص لفاظی:

مودودی صاحب متشابہات کے متعلق تحریر فرماتے ہیں ''لیکن اسی زبان کا زیادہ سے زیادہ فائدہ بس اتنا ہی ہوسکتا ہے کہ آدمی کو حقیقت کے قریب تک پہنچا دے یا اس کا ایک دھندلا سا تصور پیدا کر دے، (تھوڑا آگے جا کر لکھتے ہیں) پس جو لوگ طالب حق ہیں اور ذوق فضول نہیں رکھتے وہ تو متشابہات سے حقیقت کے اس دھندلے تصور پر قناعت کر لیتے ہیں جو کام چلانے کیلئے کافی ہے۔ (تفہیم القرآن)

وہ قرآن جو نور ہے اور ﴿تِبۡيَـٰنٗا لِّكُلِّ شَيۡءٖ﴾ ہے (ہر چیز کا بیان ہے) اس کی آیات کے متعلق "دھندلا تصور" کے الفاظ کا استعمال راقم کی سمجھ میں نہیں آیا، بلکہ گھٹیا اور ناقص لفاظی کا تصور ذہن میں آیا، جسے دیکھ کر ایک مرتبہ ذہن وضمیر چونک گئے کہ یہ کیا کہا گیا ہے۔ (راقم)

تنبیہ: ﴿وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّآ أُوْلُواْ ٱلۡأَلۡبَٰبِ﴾ کا راقم نے ترجمہ کیا ہے ''اور نصیحت نہیں قبول کرتے سوائے خالص عقل والوں کے'' ''خالص'' کا لفظ روح البیان سے لیا گیا ہے،

(اولوا الالباب) ای العقول الخالصة عن الرکون الی الاهواء الزائغة''

''اولوا الالباب'' سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی عقلیں ٹیڑھی، (باطل، غلط) خواہشات کی طرف میلان کرنے سے خالص ہیں۔اور تفسیر مظہری میں ہے'

'اولوا الالباب" ذووا العقول السلیمة فان سلامة العقل یقتضی ان یفوضوا مالاعلم لهم به الی المتکلم العلیم الحکیم ولا یقعوا فی الجهل المرکب وهم فی کل وادیهیمون، قالت الاکابر لاادری نصف العلم'

"اولوا الالباب" سے مراد وہ لوگ جن کی عقلیں سالم ہوں، کیونکہ جن لوگوں کی عقلیں سالم و درست ہوں وہ جن چیز کا علم نہیں رکھتے ان کو ذات باری تعالیٰ کی طرف سپرد کرتے ہیں کہ وہ علیم و حکیم ہے، وہ ٹیڑھی عقل والے جاہل مرکب کی طرح جہل مرکب میں نہیں واقع ہوتے جو کہ ہر وادی میں بھٹکتے رہتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اکابر (بڑے اصحاب علم) حضرات نے کہا ہے جب کوئی شخص مسئلہ نہ جانتا ہو تو اس سے وہ مسئلہ پوچھا جائے تو وہ یہ کہے "لاادری" میں نہیں جانتا تو اس کا یہ جواب دینا "نصف علم" ہے۔

❋❋❋❋❋❋❋❋❋

﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ﴾ (آیۃ نمبر ۸)

(1) اے رب ہمارے دل ٹیرھے نہ کر بعد اس کے کہ تو نے ہمیں ہدایت دی اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطاء کر بیشک تو ہے بڑا دینے والا۔

(2) اے ہمارے رب نہ پھیر ہمارے دلوں کو (حق سے) اس کے بعد جب تو نے ہدایت عطاء کی ہمیں۔ اور عطاء کر ہمیں اپنی طرف سے رحمت، بیشک تو ہے بڑا دینے والا۔

راقم نے ترجمہ حاصل کیا ہے مظہری، روح المعانی اور بحر المحیط سے، تقریبا سب کے الفاظ قریب قریب ہیں مظہری کی عبارت یہ ہے

"(ربنا لاتزغ قلوبنا) ولا تملها عن الحق كما ازغت قلوب الذين فى قلوبهم زيغ"

اے ہمارے رب نہ پھیر ہمارے دلوں کو حق سے جیسا کہ تو نے پھیر دیا ان لوگوں کے دلوں کو جن کے دلوں میں ٹیڑھا پن ہے۔

یہاں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ پختہ علم والوں کی ہی یہ دعاء بھی ہو، کہ وہ یہ کہتے ہیں "اے ہمارے رب ہمارے دلوں کو نہ پھیر (حق سے) اس صورت میں "یقولون" اس سے پہلے ہوگا اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ اللہ تعالی کی طرف سے مؤمنین کو تعلیم دی گئی ہو کہ تم یہ دعاء کرو، اس صورت میں اس سے پہلے "قولوا" ہوگا۔ (از روح المعانی)

﴿بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا﴾ "بعد اس کے کہ تو نہ ہدایت دی ہمیں"۔

یعنی اے ہمارے رب تو نے ہمیں کتب کے نازل کرنے اور رسولوں کو بھیج کہ جب ہدایت عطاء فرمادی اور تو نے ہمیں توفیق عطاء فرمادی کہ ہم نے محکم اور متشابہ پر ایمان لایا تو اس کے بعد ہمیں گمراہ نہ کر۔ (مظہری)

حق سے پھرنا گمراہی ہے:

"ويؤل المعنى الى لاتضلنا بعد الهداية لأن زيغ القلوب فى مقابلة الهداية ومقابلة الهداية الاضلال"

﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا﴾ کا مفہوم یہ بن گیا ''اے ہمارے رب ہمیں ہدایت کے بعد گمراہ نہ کر'' کیونکہ دلوں کو حق سے پھیرنے کو ہدایت کے مقابل ذکر کیا، ہدایت کا مقابل گمراہی ہے۔ (روح المعانی)

حق راہ سے ہٹ کر گمراہ ہونے کی مثال دیکھئے ''محمد علی لاہوری مرزائی'' نے اپنی تفسیر ''بیان القران'' میں اس جگہ (متشابہات کی بحث میں) لکھا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کا دعوی نبوت یا دعوی خدائی مثل متشابہات کے ہے۔ نہ انہیں نبی کہو اور نہ انہیں برا جانو۔

یہ قول اس کا گمراہی ہے کیونکہ وہ حق راہ سے ہٹ گیا، حالانکہ متشابہ ہونے کی تین علامتیں ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ بولنے والا وہ شخص ہو جس کی ولایت پر سارے مسلمانوں کا اتفاق ہو ورنہ پھر تو ابلیس بھی کہہ سکتا تھا کہ میرا کلام متشابہ ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ اس عبارت کو عقیدہ نہ بنایا گیا ہو نہ بولنے والے نے اس کی تبلیغ کی ہو نہ اس کے ماننے والوں نے، منصور الحق نے ''انا الحق'' تو جوش میں کہہ دیا، لیکن نہ اس کی طرف کسی کو دعوت دی اور نہ کسی نے اس کی تبلیغ کی۔

(۳) تیسری یہ کہ اس کلام میں کسی نبی کی توہین نہ ہو، توہین نبی مثل متشابہ نہیں بن سکتی۔

❁ مرزا جی عمر پھر دعوی نبوت پر مناظرے کرتے رہے، اپنے پیروکار بناتے رہے، خود تو گمراہ تھے، لیکن لوگوں کو بھی گمراہ کر دیا، آجکل ملک پاکستان میں تباہی کے جال وہی پھیلا رہے ہیں۔

❁ پھر یہ کہ بعض اولیاء کو علماء نے بے اختیاری عبارات کی وجہ سے قتل کر دیا، جیسے حضرت منصور کا واقعہ مشہور معروف ہے۔

انہوں نے بھی شریعت کے سامنے سر جھکا دیا کہ ان کی بے اختیاری عبارت کی وجہ سے دین میں فتنہ نہ پڑے،

❁ کسی ولی نے بارگاہ نبوی میں گستاخی کرنے کی جرأت نہیں کی، جوش میں ''انا اللہ''

تو کہہ گئے مگر ''انا محمد'' (ﷺ) کسی نے نہ کہا، کیونکہ دربار الٰہی بارگاہ ناز ہے، اور آستانہ مصطفیٰ مقام نیاز، یہاں اونچی آواز سے بولنے پر نیکیاں برباد ہوتی ہیں۔ (از نعیمی)

معتزلہ اور اہلسنت کا اختلاف:

''زیغ'' کی نسبت رب تعالی کی طرف کرنی درست نہیں، یہ مذہب ہے معتزلہ کا جو اس آیۃ کی تاویلیں کرتے ہیں، ان

کی تاویلیں مع جوابات کے انشاء اللہ آگے آرہی ہیں۔

اہل سنت و جماعت کا مذہب یہ ہے کہ زیغ کی نسبت رب تعالی کی طرف کرنی کہ دل اس کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ چاہے تو دلوں میں کجی پیدا کردے، یا دلوں کو سیدھا رکھے، اس لئے رب تعالی سے دعاء کرنی کہ "اے ہمارے رب ہدایت کے بعد ہمارے دلوں کو حق سے نہ پھیر، دلوں کو ٹیڑھا نہ کر" درست ہے۔

اہل سنت و جماعت کا مذہب ظاہر و حق ہے:

انسان کے دل میں یہ صلاحیت رکھ دی گئی ہے اور اسے اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ ایمان کے طرف میلان کرے، یا کفر کی طرف میلان کرے۔

خذلان، ازاغة، صد، ختم، طبع، رین، قسوة، وقر، کنان وغیرھا، (رسوائی، کجی، روکنا، مہر لگانا، پختہ بند کردینا، زنگ آلود کردینا، دلوں کو سخت کردینا، دل میں بوجھ پیدا کردینا اور دلوں پر پردہ چھاجانا، وغیرہ) اور انسان کا دل ایمان کی طرف میلان کرے اور اللہ تعالی کا ارادہ بھی پایا جائے تو اسے جو کیفیت حاصل ہوتی ہے اس کیلئے قرآن پاک میں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ توفیق، رشاد، ھدایت، تسدید، تثبیت، عصمة و غیرھا، (اللہ تعالی نے ایمان کی توفیق عطاء فرمائی، اللہ تعالی نے رشد و ہدایت عطاء کئے، اللہ تعالی نے درست راہ پر چلایا، اللہ تعالی نے ایمان پر ثابت رکھا، اللہ تعالی نے کفر سے بچایا، وغیرہ۔ (کبیر)

اہل سنت اپنے موقف پر احادیث پیش کرتے ہیں:

❁ اخرج ابن جریر و ابن حاتم عن ام سلمة ان النبی ﷺ کان یقول یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک ثم قرأربنا لاتزغ قلوبنا بعد اذھدیتنا"

ابن جریر اور ابن حاتم نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ذکر کی کہ بیشک نبی کریم ﷺ یہ دعاء کرتے تھے "یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِکَ" (اے دلوں کو پھیرنے والے میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ) پھر آپ یہ آیۂ کریمہ پڑھتے ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا﴾ (درمنثور)

❁ واخرج ابن ابی شیبة و احمد و الترمذی و ابن جریر و الطبرانی و ابن مردویه عن ام سلمة ان رسول الله ﷺ کان یکثرفی دعائه ان یقول اللھم مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک قلت یا رسول الله وان القلوب لتتقلب قال نعم ما من خلق الله من

بشـر مـن بـنـی آدم الا و قلبه بین اصبعین من اصابع الله فان شاء الله اقامه و ان شاء ازاغـه فـنـسـأل الـلـه ربـنا ان لا یزیغ قلوبنا بعداذ هدانا و نسأله ان یهب لنامن لدنه رحـمة انـه هو الوهاب قلت یا رسول الله لاتعلمنی دعوة ادعوبها لنفسی قال بلی قـولـی "الـلهـم رب الـنبـی مـحـمـد اغـفرلی ذنبی و اذهب غیظ قلبی و اجرنی من مضلات الفتن ما احییتنی "

ابن ابی شیبہ اور احمد اور ترمذی اور ابن جریر اور طبرانی اور مردویہ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی بیشک رسول اللہ ﷺ اپنی دعاء میں اکثر طور پر کہتے تھے (اَللّٰھُمَّ مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِکَ) اے اللہ دلوں کو پھیرنے والے میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ میں نے عرض کیا، کیا دلوں کو بھی پھیرا جاتا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں، اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں انسانوں میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں کہ اس کا دل اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان نہ ہو (انگلیوں کی حقیقی مراد اللہ اور اس کے رسول ہی جانتے ہیں) اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ان کو قائم کرتا ہے اور اگر چاہے تو ان کو ٹیڑھا کرتا ہے تو ہم اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں کہ ہمیں اپنی طرف سے رحمت عطاء کرے، بیشک وہی بڑا عطاء کرنے والا ہے میں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ مجھے کوئی دعاء نہیں سکھا دیتے جو میں اپنے لئے کیا کروں، آپ نے فرمایا کیوں نہیں (ہاں میں تمہیں دعاء سکھاتا ہوں) تم یہ دعاء کیا کرو [اَللّٰھُمَّ رَبَّ النَّبِیِّ مُحَمَّدٍ اِغْفِرْلِیْ ذَنْبِیْ وَاَذْھِبْ غَیْظَ قَلْبِیْ وَأَجِرْنِیْ مِنْ مُضِلَّاتِ الْفِتَنِ مَاأَحْیَیْتَنِیْ] اے اللہ اپنے نبی محمد کے رب میری گناہوں سے مغفرت فرما اور میرے دل کی سختی کو دور فرما، اور مجھے جب تک تو زندہ رکھے فتنوں میں بھٹکنے سے محفوظ رکھ) (درمنثور)

❁ واخـرج ابـن ابـی شیبـه واحـمـد وابـن مـردویـه عـن عـائشة قـالـت كـان رسول الـلـه ﷺ كثيـرامـايـدعـو يـا مـقـلـب الـقـلـوب ثبـت قـلبی علی دینک قلت یا رسول الله ﷺ مـااكثـر مـاتـدعـو بهذاالدعاء فقال لیس من قلب الا وهوبین اصبیعن من اصابع الـرحـمـن اذا شاء ان یقیمه اقامه و اذاشاء ان یزیغه ازاغه اماتسمعین قوله تعالی "ربنا لا تـزغ قلوبنا بعد اذهدیتنا وهب لنا من لدنک رحمة انک انت الوهاب" ولفظ ابن ابی شیبة اذاشاء ان یقلبه الی هدی قلبه و اذاشاء ان یقلبه الی ضلال قلبه"

ابن ابی شیبہ اور احمد اور ابن مردویہ رحمہم اللہ نے روایت ذکر کی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ اکثر اوقات یہ دعاء فرماتے "یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِکَ" (اے دلوں کو پھیرنے والے میرے

دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ اکثر اوقات یہ دعاء کرتے ہیں (اس کی وجہ کیا ہے) آپ نے فرمایا کوئی دل ایسا نہیں مگر یہ کہ وہ رحمٰن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں (جو اس کی شان کے لائق ہیں) کے درمیان ہے، جسے سیدھا رکھنا چاہے سیدھا رکھ دیتا ہے، اور جسے ٹیڑھا کرنے چاہے اسے ٹیڑھا کر دیتا ہے، کیا تم اللہ تعالیٰ کا ارشاد نہیں سنتی ہو ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ۝﴾ اے ہمارے رب نہ پھیر (حق سے) ہمارے دلوں کو اس کے بعد کہ تو نے ہدایت دی ہے ہمیں، عطاء کر ہمیں اپنی طرف سے رحمت بیشک تو بڑا عطاء کرنے والا ہے۔

ابن ابی شیبہ کے الفاظ یہ ہیں "اذا شاء ان يقلبه الى هدى قلبه و اذاشاء ان يقلبه الى ضلال قلبه" جب چاہے اسے ہدایت کی طرف پھیرنا تو اسی کی طرف پھیر دیتا ہے، اور جب چاہے گناہوں کی طرف پھیرنا تو اسی طرف پھیر دیتا ہے۔

❁ **واخرج البخاری فی تاریخه وبن جرير و الطبرانی عن سيرة بن فاتک قال قال النبی ﷺ قلب ابن آدم بين اصبيعن من اصابع الرب فاذا شاء اقامه و اذاشاء ازاغه"**

تاریخ بخاری، ابن جریر، طبرانی میں سبرۃ بن فاتک سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ابن آدم (انسان) کا دل رب کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہے جب سیدھا رکھنا چاہے تو سیدھا رکھتا ہے، اور جب ٹیڑھا کرنا چاہے تو ٹیڑھا کر دیتا ہے۔ (درمنثور)

❁ **واخرج ابن ابی الدنيا فی الاخلاص والحاكم وصححه والبيهقی فی شعب الايمان عن ابی عبيدة بن الجراح ان رسول الله ﷺ قال ان قلب ابن آدم مثل العصفور يتقلب فی اليوم سبع مرات"**

ابن ابی الدنیا نے باب الاخلاص میں اور حاکم نے صحیح حدیث اور بیہقی نے شعب ایمان میں عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی ہے بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابن آدم کا دل چڑیا کی طرح ہے ایک دن میں سات مرتبہ اس کا دل پھرتا ہے۔ (درمنثور)

❁ **واخرج احمد وابن ماجه عن ابی موسی الاشعری عن النبی ﷺ قال ان هذا القلب كريشة بفلاة من الارض تقيمها الريح ظهر البطن"**

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک یہ دل ایک پر کی طرح ہے جو کھلی زمین (جنگل) میں ہو تو ہوائیں اسے الٹ پلٹ کرتی رہتی ہیں۔ (مسند احمد، ابن ماجہ، درمنثور)

❁ **واخرج احمد النسائی وابن ماجه وابن جرير والحاكم وصححه والبيهقی فی الاسماء**

والصفات عن النواس بن سمعان سمعت رسول الله ﷺ یقول المیزان بید الرحمن یرفعَ اقواما ویضع آخرین الی یوم القیامة وقلب ابن آدم بین اصبعین من اصابع الرحمن اذاشاء اقامة واذاشاء ازاغه وکان یقول یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک"

نواس بن سمعان فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کوفرماتے ہوئے سنا میزان رب تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے کچھ قوموں کو بلند کرتا ہے کچھ کو پست، یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا اور ابن آدم کا دل رحمٰن کی انگلیوں میں سے دوانگلیوں کے درمیان ہے جب چاہے اسے سیدھا کر دیتا ہے اور جب چاہے اسے ٹیڑھا کر دیتا ہے اور آپ یہ دعاء فرمارہے تھے "یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِکَ" (مسند احمد، نسائی، ابن ماجہ، ابن جریر، مستدرک حاکم، بیہقی، درمنثور)

❁ واخرج الحاکم وصححه عن المقداد سمعت رسول الله ﷺ یقول لقلب ابن آدم اشدانقلابا من القدر اذااجتمع غلیانا "

حاکم نے اپنی مستدرک میں ایک حدیث بیان کی جسے صحیح کہا ہے کہ حضرت مقداد ؓ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کوفرماتے ہوئے سنا ہے کہ ابن آدم کا دل ہنڈیا کے جوش مارنے (کی وجہ سے پانی کے پھرنے) سے بھی زیادہ پھرتا (بدلتا) رہتا ہے۔ (مستدرک حاکم، درمنثور)

❁ واخرج ابن سعد فی طبقاته عن ابی عطاف ان ابا هریرة کان یقول ای رب لاازنین ای رب لااسرقن ای رب لا اکفرن قیل له او تخاف قال آمنت بمحرف القلوب ثلاثا"

ابن سعد نے اپنی طبقات میں روایت نقل کی کہ ابوعطاف کہتے ہیں حضرت ابو ہریرہ ؓ عرض کر رہے تھے اے میرے رب (میری حفاظت فرما) میں بدکاری نہ کروں اے میرے رب میں چوری نہ کروں، اے میرے رب میں کفر نہ کروں ، آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا آپ ڈرتے ہو (کہ یہ چیزیں بھی آپ میں آسکتی ہیں) آپ نے فرمایاہاں میں اس ذات پر ایمان رکھتا ہوں جو دلوں کو پھیرنے والا، تین مرتبہ آپ نے یہ ارشاد فرمایا۔ (طبقات سعد، درمنثور)

❁ واخرج الحکیم الرمذی من طریق عتبة بن عبدالله خالد بن معدان عن ابیه عن جده قال قال رسول الله ﷺ انما الایمان بمنزلة القمیص مرة تقمصه ومرة تنزعه "

حکیم ترمذی نے بیان کیا ہے کہ عتبہ بن عبد اللہ بن خالد بن معدان نے اپنے باپ دادا سے روایت بیان کی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک ایمان قمیص کی طرح ہے، جس طرح انسان کبھی قمیص پہن لیتا ہے اور کبھی اتار دیتا ہے۔ (درمنثور)

ایسے ہی انسان کبھی ایمان پر قائم رہتا ہے، کبھی "العیاذ بالله" مرتد ہوجاتا ہے "الامان والحفیظ"

❁ واخرج ابوداود والنسائی والبیهقی فی الاسماء والصفات عن عائشة ان رسول

اللہ ﷺ کان اذا استیقظ من اللیل قال لا الہ الا انت سبحانک اللھم انی استغفرک لذنبی واسالک رحمتک اللھم زدنی علما ولا تزغ قلبی بعد اذ ھدیتنی وھب لی من لدنک رحمة انک انت الوھاب"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ رات کو جب بیدار ہوتے تھے تو یہ پڑھتے تھے، "لَآ اِلٰــــہَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَکَ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْتَغْفِرُکَ لِذَنْبِیْ وَاَسْاَلُکَ رَحْمَتَکَ اَللّٰھُمَّ زِدْنِیْ عِلْمًا وَّلَا تُزِغْ قَلْبِیْ بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنِیْ وَھَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَةً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ" کوئی معبود نہیں سوائے تیرے تیری پاک ذات ہے اے اللہ بیشک میں تجھ سے ہی بخشش طلب کرتا ہوں اس کیفیت سے جو دنیا کی طرف مشغول ہونے اور تجھ سے توجہ ہٹنے کی وجہ سے طاری ہوتی ہے، اور تجھ سے تیری رحمت کا سوال کرتا ہوں، اے اللہ میرا علم زیادہ کر، اور میرا دل ٹیڑھا نہ کر ہدایت دینے کے بعد" اور عطاء کر مجھے اپنی طرف سے رحمت بیشک تو بڑا بخشنے والا ہے۔
(در منثور، ابو داؤد، نسائی، بیھقی باب الاسماء والصفات، درمنثور)

❁ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ یہ دعا فرماتے تھے "اَللّٰھُمَّ یَا مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا اِلٰی طَاعَتِکَ" اے اللہ دلوں کو پھیرنے والے ہمارے دل کو اپنی طاعت کی طرف پھیر دے"
(مسلم، نسائی، ابن جریر، بیہقی، درمنثور)

معتزلہ کا مذہب:

معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ "زیغ (کجی) کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف درست نہیں، یعنی یہ کہنا درست نہیں کہ اللہ تعالیٰ دلوں کو ٹیڑھا کرتا ہے "فوجب صرف ھذہ الآیة الی التاویل" اس لئے ضروری ہے کہ اس آیۃ کی تاویل کی جائے۔

معتزلہ اور اہل سنت کا اصل اختلاف اس میں ہے کہ مذہب یہ ہے کہ ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہے یہاں تک کہ بندوں کے اچھے اعمال یا برے اعمال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، قرآن پاک سے یہ مسئلہ روز روشن کی طرح واضح ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا کیا اور (پیدا کیا) جو تم عمل کرتے ہو۔

معتزلہ کہتے ہیں نیکیوں کو پیدا کرنے والا تو اللہ تعالیٰ ہے اور برائیوں کا پیدا کرنے والا انسان خود ہے، کیونکہ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ برائیوں کو پیدا کرنے والا بھی اللہ تعالیٰ ہے قبیح (بری) چیزوں کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوگی، جو جائز نہیں۔

اہلسنت کا موقف یہ ہے کہ خلق قبیح قبیح نہیں (یعنی بری چیز کو پیدا کرنا برا نہیں) بلکہ "کسب قبیح قبیح" ہے یعنی

برائیوں پر عمل کرنا برا ہے۔اس لئے رب تعالی کی طرف نسبت خلق کی ہے اس نسبت میں کوئی برائی نہیں بندے کی طرف اس کے برے اعمال منسوب ہیں۔

اس آیۃ میں معتزلہ کی تاویلات:

(۱) ان میں سے ایک تاویل جبائی نے کی ہے، وہ یہ کہتا ہے کہ ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا﴾ کا معنی یہ ہے "لاتمنعها الالطاف التی معها یستمر قلبهم علی صفة الایمان" اے ہمارے رب ہم سے اپنی مہربانیوں کو دور نہ کر جن مہربانیوں کی وجہ سے ہمارے دل صفت ایمان پر قائم رہتے ہیں۔

"وذلک لانه تعالی لما منعهم الطافه عنداستحقاقهم منع ذلک جاز ان یقال ازاغهم"

اس لئے کہ جب اللہ تعالی نے اپنی مہربانیوں کو مستحقین سے روک لیا تو اس روکنے کو "زیغ" سے تعبیر کر دیا گیا، اس لئے اردو میں ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا﴾ کا یہی معنی کیا جائے گا "ہم سے اپنی مہربانیوں کو دور نہ کر"

اس تاویل کا رد: معتزلہ کا یہ قول باطل ہے کیونکہ ان کا مذہب یہ ہے۔

"کل ما صح فی قدرة الله تعالی ان یفعل فی حقهم لطفا وجب علیه ذلک وجوبا لوترکه لبطلت الهیته ولصار جاهلا ومحتاجا"

کہ ہر وہ چیز جو رب تعالی کی قدرت میں داخل ہو سکتی ہو کہ یہ مخلوق پر مہربانی ہو تو وہ رب تعالی پر واجب ہو جاتی ہے اگر رب تعالی اس چیز کو موجود نہ کرے اور مخلوق کو وہ عطاء نہ کرے تو رب تعالی کی الوہیت باطل ہو جاتی ہے۔اور اسکا جاہل ہونا اور محتاج ہونا لازم آتا ہے۔"والشیء الذی یکون کذلک فای حاجة الی الدعاء فی طلبه" جو چیز اس طرح ہو، یعنی اللہ تعالی پر واجب ہو کہ وہ اپنی مہربانیاں بندوں پر کرے تو پھر دعاء کا کیا مطلب ہے کہ "ہم سے اپنی مہربانیاں دور نہ کر" یہ دعاء تو اہل سنت ہی کر سکتے ہیں کیونکہ وہ اللہ تعالی پر کوئی چیز واجب نہیں کرتے۔

معتزلہ کی دوسری تاویل:

اصم نے یہ کہا کہ اللہ تعالی کے ارشاد ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا﴾ کا معنی یہ ہے "لا تبلنا ببلوی تزیغ عندها قلوبنا" ہمیں مصیبتوں میں گرفتار نہ کر جن کی وجہ سے ہمارے دل ٹیڑھے ہو جائیں یعنی "زیغ" کی نسبت مصائب و آلام کی طرف ہے، اللہ تعالی کی طرف نہیں یہ ایسے ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے "لا تحملنی علی ایذائک ای لاتفعل ما اصبر عنده مؤذیا لک" مجھے اپنی ایذاء پر نہ ابھارو، یعنی ایسا کام نہ کرو کہ میں صبر نہ کر سکوں جو تمہیں ایذاء

پہنچانے کا سبب بن جائے۔

اس تاویل کارد: معتزلہ کا یہ کہنا درست نہیں کیونکہ اللہ تعالی کو جب یہ معلوم ہو کہ اس تکلیف کی شدت کی وجہ سے اس کا دل ٹیڑھا ہو جائے گا، تو دل کا ٹیڑھا ہونا تکلیف کی وجہ سے ہوگا اور تکلیف رب تعالی کی طرف سے جب حاصل ہوگی تو یقیناً "زیغ" (دل کا ٹیڑھا پن) رب تعالی کی طرف ہی منسوب ہوگا۔ اور اللہ تعالی کو جب یہ علم حاصل ہے کہ فلاں فلاں بندوں کو تکلیف پہنچائی گئی تو تکلیف ان کے دلوں کو ٹیڑھا نہیں کرے گی ان لوگوں کو تکلیف پہنچانا یا نہ پہنچانا برابر رہے گا، اس تکلیف کی وجہ بندہ عاصی ہوگا تو اس صورت میں دعاء کا کوئی مطلب نہیں ہوگا یعنی اس دعاء کا کوئی فائدہ نہیں کہ ہمیں تکلیف نہ پہنچا جس کی وجہ سے ہمارے دل ٹیڑھے ہو جائیں، وہ تو رب تعالی جانتا ہے کہ تکلیف ان میں اثر انداز ہی نہیں۔

معتزلہ کی تیسری تاویل:

کعبی نے اور تاویل یہ کی ہے کہ ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا﴾ کا معنی یہ ہے "لاتسمنا باسم الزائغ" اے ہمارے رب ہمارا نام ٹیڑھے دلوں والا نہ رکھ، یہ اسی طرح ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے "فلان یکفر فلانا" فلاں شخص نے فلاں کا نام کافر رکھ دیا۔

اس تاویل کا رد: کسی کا نام "زائغ" (ٹیڑھے دل والا) اسی وقت رکھا جاتا ہے جب اس کے دل میں ٹیڑھا پن پایا جائے، اسی طرح کسی کا نام "کافر" اسی وقت رکھا جاتا ہے جب اس میں کفر پایا جائے جب بندہ اپنے اختیار سے وہ کام کرے جن کی وجہ سے اس کا دل ٹیڑھا ہو جائے اور رب تعالی بھی اس کے دل میں کجی پیدا کر دے تو اب وہ یہ دعاء کرے کہ اے ہمارے رب ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر، یا یہ دعاء کرے ہمارا نام "ٹیڑھے دلوں والا نہ رکھ" برابر ہی ہے کوئی فرق نہیں نکلا۔

معتزلہ کی چوتھی تاویل:

جبائی نے ہی اور تاویل یہ کی ہے کہ ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا﴾ کا مطلب یہ ہے "لا تزغ قلوبنا عن جنتک وثوابک بعد اذھدیتنا" اے ہمارے رب ہمارے دلوں کو اپنی جنت اور اپنے ثواب سے دور نہ رکھ ۔یعنی جب تو جانتا ہے کہ میرے اس سال کے عمل جنتی لوگوں والے ہیں اور آئندہ سال اگر میں زندہ رہا تو میرے عمل

جہنمی لوگوں والے ہوں گے تو وہ اعمال مجھے جنت سے ہٹانے کا ذریعہ ہوں گے اس لئے دعاء یہ کر رہا ہوں کہ مجھے "جنت سے دور نہ رکھ"۔

اس تاویل کا رد : معتزلہ کے مذہب کے مطابق تو رب تعالیٰ پر واجب ہے کہ بندے کو فائدہ پہنچائے، جب رب تعالیٰ کو معلوم ہے کہ اس شخص نے آنے والے سال میں جہنمیوں والے کام کرنے ہیں تو معتزلہ کے مذہب کے مطابق رب تعالیٰ پر واجب ہوگا کہ وہ اسے آنے والے سال پہلے ہی مار دے اس لئے معتزلہ کے نزدیک اس دعاء کا کوئی مقصد نہیں نکلتا کہ "ہمیں جنت سے دور نہ رکھ"

معتزلہ کی پانچویں تاویل:

یہ پانچواں قول بھی اصم کا ہے اس نے کہا "**لاتزغ قلوبنا بعد اذهديتنا**" کا معنی یہ ہے (**لاتزغ قلوبنا**) **عن كمال العقل بالجنون (بعداذهديتبا) بنور العقل** "اے ہمارے رب ہمارے دلوں کو جنون (پاگل پن) کی وجہ سے کامل عقل سے نہ پھیر، نور عقل کی ہدایت دینے کے بعد۔

اس دلیل کا رد: یہ قول بھی درست نہیں کیونکہ جنوں بھی رب تعالیٰ ہی پیدا کرنے والا ہے، جنون کی وجہ سے عقل کا زوال بھی قبیح چیز ہے جو رب تعالیٰ کی طرف منسوب ہے۔

معتزلہ کی چھٹی تاویل:

ابو مسلم معتزلی کا قول یہ ہے کہ ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا﴾ امعنی یہ ہے "**احرسنا من الشيطان ومن شرور انفسنا حتى لا نزيغ**" اے ہمارے رب ہمیں شیطان سے اور نفس کے شر سے محفوظ رکھ تا کہ ہمارے دل ٹیڑھے نہ ہوں۔ اس صورت میں نسبت شیطان اور نفس کے شر کی طرف ہوگی۔

اس تاویل کا رد : معتزلہ کے مذہب کے مطابق اگر شیطان سے اور نفس کے شر سے بچانا اللہ تعالیٰ کی قدرت میں داخل ہے تو اللہ تعالیٰ پر واجب ہے کہ وہ بچائے، اور اگر اس کی قدرت میں ہی داخل نہیں تو بچانا ممکن ہی نہیں۔ پھر معتزلہ کے مذہب کے مطابق اس دعاء کا کیا فائدہ؟ (ماخوذ از کبیر)

یہ دعاء تو اہل سنت کے مذہب کے مطابق ہی درست ہے کہ اللہ ہماری بداعمالیوں کی وجہ سے ہمارے دلوں میں کجی نہ پیدا فرما، اگر چہ تجھ پر کوئی چیز واجب تو نہیں لیکن تو ہم پر اپنے فضل و کرم سے مہربانی فرما۔

﴿بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا﴾ ''بعد اس کے کہ تو ہدایت دی ہمیں''

یعنی اے ہمارے رب جب تو نے ہمیں ہدایت عطاء فرما دی تو ہمارے دلوں کو راہ حق سے نہ پھیر، ان میں کجی (ٹیڑھ پن) پیدا نہ فرما، ''اهذا ایضا صریح فی ان حصول الهدایة فی القلب بتخلیق الله تعالی'' اس سے یہ بھی واضح طور پر پتہ چل گیا کہ دل میں ہدایت کا حاصل ہونا اللہ تعالی کی تخلیق سے ہے۔ (کبیر)

﴿وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً﴾ ''اور عطاء کر ہمیں اپنی طرف سے رحمت''۔

عطاء کرنے کو ھبہ سے تعبیر کرنے میں حکمت:

سالوا بلفظ الهبة المشعرة بالتفضل والاحسان الیهم من غیر سبب ولا عمل معاوضة لان الهبة کذلک فکون وخصوصا بانها من عنده''

مؤمنین نے رب تعالی سے رحمت کا سؤال کیا تو ''وھب'' کہا (اور عطاء کر) ''وهب یهب هبة'' کا معنی ہے ''ھبہ کرنا'' یعنی دعاء کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ''اے ہمارے رب تو ہمیں اپنے فضل واحسان سے بغیر کسی سبب کے اپنی رحمت عطاء کر، ہمارے اعمال کو نہ دیکھ، اور تیری عطاء کا ہمارے پاس اعمال کا کوئی معاوضہ بھی نہیں، چونکہ ہبہ اسے ہی کہا جاتا ہے جو بغیر کسی سبب اور بغیر کسی عمل اور بغیر معاوضہ کے عطاء کر دیا جائے خاص کر کے جب رب تعالی کی طرف سے عطاء ہوگی تو اس میں فضل واحسان ہی پایا جائے گا، اسی فضل واحسان کی رب تعالی سے دعاء کی گئی۔

سؤال: رحمت تو صفت ذات ہے، صفت ذات کسی کو عطاء نہیں کی جاتی، تو ''رحمت'' عطاء کرنے کے سؤال کا کیا مطلب ہے؟

پہلا جواب: یہاں رحمت سے مراد نعمتیں اور ثواب ہے جو رحمت سے صادر ہوتا ہے، لھذا سؤال کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے رب تو اپنی رحمت سے ہمیں اپنی نعمتیں اور ثواب عطاء فرما اور ہمیں توفیق عطاء فرما کہ ہم تیری رحمت سے ایمان و ہدایت پر قائم رہیں۔

دوسرا جواب: یہاں مجاز استعمال ہے ''صح ان یسالوا الرحمة اجراء للسبب مجری المسبب''

یعنی ذکر سبب ہے اور مراد مسبب ہے مطلب پہلے جواب کے قریب ہی ہے انداز بیان مختلف ہے پہلے جواب میں رحمت کا معنی نعمتیں اور ثواب کیا گیا ہے دوسرے میں ذکر رحمت اور مراد نعمتیں اور ثواب ہے

اسے مجاز مرسل کہا جاتا ہے۔ (ماخوذ از البحر المحیط)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے: (رحمة) مفعول "لهب" وتنوينه للتفخيم "رحمة" مفعول ہے "هب" کا اور تنوین اس پر بلندی شان کیلئے ہے۔ (روح المعانی)

"لاینبغی" سے "تطهیر" مقدم ہے ینبغی کی تنویر پر:

"واعلم ان تطهير القلب عمالا ينبغي مقدم على تنويره مما ينبغي" جان تو کہ بیشک غیر مناسب کاموں سے پہلے دل کا پاک ہونا ضروری ہے پھر مناسب کاموں سے دل منور ہوگا۔ مومنوں نے پہلے سوال کیا اے اللہ تو ہمارے دلوں کو حق سے نہ پھیر اور باطل کی طرف مائل نہ کر اور عقائد فاسدہ سے ہمیں دور رکھ" یہ غیر مناسب چیزوں سے دل کو پاک رکھنے کا سوال کیا گیا" پھر مناسب چیزوں سے دل کو منور کرنے کا سوال کیا گیا یعنی گویا کہ انہوں نے سوال کیا "طلبوا من ربهم ان ينور قلوبهم بانوار المعرفة وجوارحهم واعضائهم بزينة الطاعة" کہ ہمارے رب ہمارے دلوں کو انوار معرفت سے منور فرمادے اور ہمارے اعضاء ظاہرہ کو اپنی طاعت سے مزین فرمادے۔

رحمت کا وسیع مفہوم:

"وانما قال رحمة ليكون ذلك شاملا لجميع انواع الرحمة" رحمت کا ذکر کیا گیا ہے تا کہ جمیع انواع رحمت (رحمت کی قسموں) کو شامل ہو جائے یعنی رحمت کا ذکر کر کے گویا کہ چھ چیزوں کا ذکر کر دیا گیا۔

(۱) "اولها ان يحصل في القلب نور الايمان والتوحيد والمعرفة" ان میں سے پہلی چیز یہ ہے کہ رحمت کی طلب کر کے گویا کہ یہ مطالبہ کیا گیا ہے اے ہمارے رب ہمارے دلوں کو نور ایمان، نور توحید اور نور معرفت سے منور کر دے۔

(۲) "وثانيها ان يحصل في الجوارح والاعضاء نور الطاعة والعبودية والخدمة" اور رحمت طلب کر کے دوسری چیز یہ طلب کی گئی اے ہمارے رب ہمارے ظاہری اعضاء کو نور طاعت نور عبودیت اور نور خدمت عطاء فرما۔

(۳) "وثالثها ان يحصل في الدنيا سهولة اسباب المعيشة من الأمن والصحة والكفاية" اور رحمت کی طلب کر کے تیسری چیز یہ طلب کی گئی کہ اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں اسباب معیشت کی وہ سہولت عطاء

فرما جس سے ہمیں امن، صحت اور کفایت حاصل ہو جائے۔

(۴) ''ورابعھا ان یحصل عند الموت سھولۃ سکرات الموت'' رب کے حضور یہ عرض کر کے اپنی طرف سے رحمت عطاء فرما گویا کہ یوں عرض کیا گیا کہ اے ہمارے رب ہمیں موت کے وقت سکرات موت میں آسانی عطاء فرما۔

(۵) ''وخامسھا ان یحصل فی القبر سھولۃ السؤال وسھولۃ ظلمۃ القبر''، رحمت کی طلب سے پانچویں چیز یہ طلب کی گئی کہ اے ہمارے رب ہمیں قبر میں سوالوں کے جواب دینے میں آسانی عطاء فرما اور ہمیں قبر کی تاریکی سے آسانی عطاء فرما۔

(۶) ''وسادسھا ان یحصل فی القیامۃ سھولۃ العقاب والخطاب وغفران السیأت وترجیح الحسنات'' اور رحمت کی طلب کر کے چھٹی چیز یہ طلب کی گئی کہ اے ہمارے رب ہمیں قیامت میں آسانی عطاء فرما، جس کی وجہ سے ہم عذاب سے محفوظ رہیں اور تیرے غضبناک خطاب سے محفوظ رہیں اور ہمارے گناہوں کی مغفرت فرما اور ہماری نیکیوں کو ترجیح عطاء فرما، یعنی دنیا میں توفیق عطاء فرما کہ ہم زیادہ سے زیادہ نیکیاں کر سکیں اور قیامت میں ہماری نیکیوں میں برکت عطاء فرما کر ان کا وزن بڑھادے۔

قرآن تیری عظمت پر قربان:

سبحان اللہ! قرآن پاک کی کیا ہی عظیم شان ہے کہ ایک ایک لفظ کتنے کتنے معانی کو شامل ہوتا ہے ''فقولہ (من لدنک رحمۃ) یتناول جمیع ھذہ الاقسام'' اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً﴾ ان تمام قسموں کو شامل ہے جب کو ابھی ذکر کیا گیا ہے۔

مقصود اعظم : جب روشن اور غالب پختہ دلائل سے یہ ثابت ہے ''انہ لا رحیم الا ھو ولا کریم الا ھو لا جرم اکد ذلک بقولہ ''من لدنک'' تنبیھا للعقل والقلب والروح علی ان ھذا المقصود لا یحصل الا منہ سبحانہ'' کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی رحیم نہیں اور اس کے بغیر کوئی کریم نہیں تو اسی وجہ سے رحمت کی طلب کو ''من لدنک'' (اپنی طرف سے) کے ساتھ ذکر کیا تا کہ عقل اور دل اور روح کو بھی تنبیہ کر دی جائے کہ مقصود اعظم صرف اللہ تعالیٰ سے ہی حاصل ہوگا۔ (انبیاء کرام اور اولیاء کرام کے واسطہ سے جو مقصد حاصل ہوگا وہ بھی رب تعالیٰ سے ہی حاصل ہوگا)

ولما كان هذا المطلوب في غاية العظمة بالنسبة الى العبد لا جرم ذكر ها على سبيل التنكير كأنه يقول اطلب رحمة واية رحمة اطلب رحمة من لدنک وتليق بک وذلک يوجب غاية العظمة"

جب بندے کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے یہ مطلوب عظیم تھا کہ بندہ اپنے رب سے رحمت طلب کر رہا ہے تو اسی وجہ سے "رحمة" نکرہ ذکر کیا گیا جس کی تنوین عظمت شان کو بیان کر رہی ہے گویا کہ بندہ یوں کہتا ہے کہ اے ہمارے رب ہم رحمت طلب کرتے ہیں وہ کون سی رحمت ہم طلب کرتے ہیں وہی جو تیری طرف سے عطاء ہوگی اور تیری شان کے لائق ہوگی، یقیناً جو رحمت تو اپنی شان کے لائق عطاء کرے گا وہ عظیم ہوگی۔ (کبیر)

﴿اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ﴾ "بیشک تو ہے بڑا دینے والا"۔

"وھاب" کا معنی اعلی حضرت رحمہ اللہ نے کیا ہے "بڑا دینے والا" راقم نے بھی یہی نقل کیا ہے یہ ترجمہ البحر المحیط کی اس عبارت کے مطابق ہے "واتى بصيغة المبالغه التي على فعال وان كانوا قد قالوا وهوب لمناسبة رؤوس الأى" "وھاب" مبالغہ کا صیغہ ہے جس کا وزن "فعال" (عین مشدد) کا ہے اور معنی ہے بڑا دینے والا اگرچہ "وھوب" کا بھی یہی معنی ہے لیکن آیات کے آخری الفاظ کو ایک وزن پر رکھنے کیلئے "وھاب" ذکر کیا گیا ہے۔ (البحر المحیط)

بہت خوب: علامہ رازی رحمہ اللہ کی خوبصورت عبارت کو طلباء کرام یاد کرنا چاہیں تو یاد کرلیں" گویا کہ بندہ رب کے حضور یہ عرض کرتا ہے

"الهي هذا الذي طلبته منک في هذا الدعاء عظيم بالنسبة الى لكنه حقير بالنسبة الى كمال كرمک وغاية جودک ورحمتک فانت الوهاب الذي من هبتک حصلت حقائق الاشياء وذواتها وماهياتها ووجوداتها فكل ما سواک فمن جودک واحسانک وكرمک"

اے میرے اللہ! میں نے اپنی دعاء میں جس چیز کی طلب کی ہے وہ میرے نزدیک تو بہت بڑی چیز ہے لیکن وہ تیرے کرم اور تیرے عظیم جود اور تیری وسیع رحمت کے مقابل بہت چھوٹی چیز ہے اے باری تعالی تیرے بغیر ہر چیز تیرے جود و تیرے احسان اور تیرے کرم سے معرض وجود میں آئی ہے۔

اس کے بعض علامہ رازی رحمہ اللہ نے دعاء فرمائی وہی دعاء میں اپنے لئے بھی کر رہا ہوں، علامہ رازی رحمہ اللہ کے مفرد الفاظ سے ہی میں ہر ایک کی طرف منسوب کرتے ہوئے تمام مؤمنین کیلئے بھی دعاء کر رہا ہوں

"یا دائم المعرف یا قدیم الاحسان لاتخیب رجاء هذاالمسکین ولا ترد دعاءہ
واجعله بفضلک اهلالرحمتک یا ارحم الراحمین واکرم الاکرمین" (کبیر)

(آمین بحرمة النبی الکریم الامین)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿رَبَّنَااِنَّکَ جَامِعُ النَّاسِ لِیَوْمٍ لَّارَیْبَ فِیْهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَO﴾(آیۃ نمبر ۹)

(1) اے رب ہمارے بیشک تو سب لوگوں کو جمع کرنے والا ہے اس دن کیلئے جس میں کوئی شبہ نہیں بے شک اللہ کا وعدہ نہیں بدلتا۔

(2) اے ہمارے رب بیشک تو جمع کرنے والا ہے لوگوں کو اس دن کہ نہیں شک اس میں بیشک اللہ نہیں خلاف کرتا وعدہ میں۔

یہ آیۃ کریمہ بظاہر دعاء ہے لیکن حقیقت میں خبر ہے کیونکہ ﴿الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ﴾ پختہ علم والوں نے جب دعاء کی "اے ہمارے رب ہمارے دلوں کو حق سے نہ پھیر اور ان میں ٹیڑھا پن نہ پیدا کر ہدایت دینے کے بعد" پھر عرض کیا اے ہمارے رب ہمیں اپنی طرف سے رحمت عطاء فرما اس کے بعد یہ عرض کیا

(ربنا انک جامع الناس لیوم لاریب فیه) "ومعناه انا نعلم انک جامع الناس للجزاء فی یوم القیامة ونعلم ان وعدک حق وانک لا تخلف المیعاد"

یعنی اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿رَبَّنَـااِنَّکَ جَامِعُ النَّـاسِ لِیَوْمٍ لَّارَیْبَ فِیْهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادُ﴾ کا معنی یہ ہے کہ ہم یقین سے جانتے ہیں کہ بیشک تو لوگوں کو قیامت کے دن جزاء کیلئے جمع کرنے والا ہے، اور ہم یقیناً جانتے ہیں کہ بیشک تیرا وعدہ حق ہے اور بیشک تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔ یعنی اے اللہ اگر تو نے ہمارے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا تو ہم ہلاک ہو جائیں گے، اگر تو نے ہمیں ہدایت ورحمت نہ عطاء کی تو ہم عذاب کے مستحق ہوں گے، اسلئے اے رب کریم ہمیں ہلاکت اور عذاب سے بچالے۔ (ماخوذ از خازن)

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ دعاء ہی ہو، اگرچہ بظاہر یہ سمجھ نہیں آرہا کہ اس دعاء میں کیا طلب کیا گیا

ہے لیکن حقیقت میں غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ کسی چیز کی طلب ہے علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "واعلم ان ھذا الدعاء من بقیة کلام الراسخین فی العلم " یقین سے جان لو کہ بیشک یہ دعاء ﴿الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ﴾ (پختہ علم والوں) کے کلام کا باقی حصہ ہے کیونکہ جب انہوں نے رب تعالی کے حضور عرض کیا کہ ان کو کجی (ٹیڑھ پن) سے بچا اور ہدایت و رحمت عطاء کر تو اس آیۃ میں گویا کہ ان کی عرض کا مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے رب اس سؤال سے ہمارا مقصد دنیاوی چیزوں کا حصول نہیں بلکہ ہمارا مقصد اخروی نعمتوں کا حصول ہے۔

"فانا نعلم انک یا الھنا جامع الناس للجزاء فی یوم القیامة ونعلم ان وعدک لایکون خلفاو کلامک لا یکون کذبا فمن زاغ قلبه بقی ھناک فی العذاب ابد الأ باد ومن اعطیته التوفیق و الھدایة و الرحمة وجعلته من المؤمنین بقی ھناک فی السعادة و الکرامة ابد الأباد فا لغرض الاعظم ما یتعلق بالأخرة ،،

بیشک ہم یقیناً جانتے ہیں اے ہمارے رب کہ تو قیامت کے دن لوگوں کو جزاء کیلئے جمع کرنے والا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ بیشک تیرا وعدہ حق ہے تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا اور اے ہمارے رب تیرا کلام جھوٹا نہیں ہوتا، جس شخص کا دل ٹیڑھا ہو گیا وہ دائمی (ہمیشہ کے) عذاب میں مبتلاء ہوگا اور جن کو تو نے توفیق عطاء فرمائی اور ہدایت عطاء کی اور رحمت عطاء کی اور تو نے ان کو مومن بنایا وہ ہمیشہ کیلئے سعادت اور کرامت میں رہیں گے، یعنی اس دعاء کا تعلق آخرت سے ہو کہ اے اللہ ہمیں آخرت کے عذاب سے بچانا اور ہمیں آخرت میں اپنی ہدایت و رحمت کے ذریعے اجر عظیم عطاء فرمانا، حقیقت میں سب سے بڑا اجر تیری رضاء ہے اس لئے اے رب کائنات قیامت کے دن تو ہم سے راضی رہے۔ (ماخوذ از کبیر)

دینی طلباء کرام کیلئے چند مسائل:

﴿لِیَوْمٍ لَّا رَیْبَ فِیْهِ﴾ میں یا حذف مضاف ہو یعنی اصل عبارت یہ ہے "لحساب یوم لاریب فیه " یا لفظ جزاء محذوف ہو یعنی اصل عبارت یہ ہو "لجزاء یوم لاریب فیه " اب مطلب یہ ہوا کہ "اے ہمارے رب بیشک تو لوگوں کو حساب اور جزاء کے دن جمع کرنے والا ہے جس میں کوئی شک نہیں۔

وقیل اللام بمعنی الی ای جامعھم فی القبور الی یوم (لاریب فیه) الی لاینبغی ان یرتاب فی وقوعه ووقوع مافیه من الحشر و الحساب و الجزاء "

اور بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ "لیوم "میں لام بمعنی "الی " کے ہے اب مطلب یہ ہوگا کہ اے ہمارے رب بیشک تو لوگوں کو قبروں میں اس دن تک جمع کرنے والا ہے جس میں شک نہیں بظاہر یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ

قیامت کے منکرین نے تو اس میں شک کیا ہے شک نہ ہونے کا کیا مطلب؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس دن میں شک کرے اور اس دن میں حشر اور حساب اور جزاء کے واقع ہونے میں شک کرے۔ اس ترکیب کے لحاظ پر ﴿لِیَوْمٍ لَّارَیْبَ فِیْہِ﴾ جملہ صفت ہے "یوم" کی "وقیل الضمیر المجرور للحکم ای لاریب فی ھذا الحکم" بعض حضرات نے اس کی ترکیب یہ بیان کی ہے کہ "فیہ" میں ضمیر مجرور "حکم" کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی اس دن میں واقع ہونے والے حکم میں کوئی شک نہیں اس ترکیب کے لحاظ پر یہ جملہ تاکید کیلئے ہے یعنی اے ہمارے رب ہمیں اپنی کامل رحمت وہدایت سے قیامت کے دن بھی نوازنا۔ پہلے دعاؤں میں دنیا میں کجی سے بچانے اور رحمت وہدایت دینے کی دعاء تھی اب قیامت کے دن ان چیزوں کی عطاء کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

"جَامِعُ النَّاسِ" میں ایک ترکیب مضاف الیہ والی ہے اور دوسری ترکیب یہ ہے کہ "جامع" پر تنوین ہو اور "النَّاس" منصوب ہو۔ (ماخوذ از روح المعانی)

﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ﴾ "بیشک اللہ نہیں خلاف کرتا وعدہ میں۔"

یعنی جب رب تعالیٰ کے حضور اپنے مطالبات پیش کردئے اور رب تعالیٰ کی الوہیت (معبود ہونے) کا اقرار کرلیا تو خود بخود یہ لازم آگیا، "فان الالوھیۃ منافیۃ للاخلاف" کہ اقرار کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا کیونکہ وہ معبود حقیقی ہے، معبود حقیقی کی شان کے یہ خلاف ہے کہ وہ وعدہ کی خلاف ورزی کرے۔ (از روح المعانی)

عجیب نکتہ: اس مقام میں ذکر فرمایا ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ﴾ (بیشک اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا) اور اس سورۃ کے آخر میں ایک دعاء آرہی ہے ﴿رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ﴾ اس دعاء میں خطاب پایا گیا ہے "بیشک اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا" یہاں غائب کے صیغہ سے اور وہاں خطاب سے ذکر کرنے میں وجہ فرق کیا ہے؟ وجہ فرق یہ ہے کہ اس آیۃ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی الوہیت (معبودیت) کا تذکرہ کیا گیا ہے جس سے حشر ونشر کا پتہ چل رہا کہ وہ معبود برحق ظالموں سے مظلوموں کو انصاف دلائے گا۔

یہ مقام ہیبت ہے لھذا ہیبت کے مقام پر رب تعالیٰ کے اسم ظاہر کو ذکر کیا گیا جسے علم صرف میں درجہ غیب میں رکھا جاتا ہے۔ اور دوسری آیۃ کریمہ جو اس سورہ کے آخر میں آرہی ہے اس میں براہ راست انسان رب تعالیٰ سے

مخاطب ہو کر عرض کر رہا ہے ﴿اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ﴾ (بیشک تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا) اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں انسان رب تعالیٰ سے یہ طلب کر رہا ہے کہ اے میرے رب اپنے فضل و کرم سے مجھ پر انعام فرما اور میرے گناہوں کو معاف فرما یہ مقام ہیبت نہیں بلکہ مقام امید ہے تو رب تعالیٰ کے حضور خطاب کے صیغہ سے عرض کیا ﴿اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ﴾ (از کبیر)

خلف فی الوعید:

اس مسئلہ سے پہلے یہ سمجھا جائے کہ وعد اور وعید میں فرق کیا ہے، پھر یہ مسئلہ سمجھ آئے گا کہ وعد کی مخالفت کیا ہے اور وعید کی مخالفت کا حکم کیا ہے۔ اگر چہ لغوی معنی کے لحاظ پر وعد اور وعید قریب قریب معنی رکھتے ہیں لیکن اصطلاح میں ان دونوں میں فرق پایا جاتا ہے۔ اچھی چیز کا ذکر یعنی ثواب و انعام عطاء کرنے کا ذکر کرنا ''وعد'' ہے جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔

"مَنْ عَمِلَ صَالِحًامِّنْ ذَکَرٍ اَوْاُنْثٰی وَھُوَمُؤْمِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّہٗ حَیٰوۃً طَیِّبَۃً وَّلَنَجْزِیَنَّھُمْ اَجْرَھُمْ بِاَحْسَنِ مَاکَانُوْایَعْمَلُوْنَ"

جو اچھا کام کرے مرد ہو یا عورت اور ہو مسلمان تو ضرور ہم اسے اچھی زندگی جلائیں گے اور ضرور انہیں ان کا نیک (اچھا اجر) دیں گے جو ان کے سب سے بہتر کام کے لائق ہوں۔

اور عذاب وغیرہ کی دھمکی وعید ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"وَمَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًامُّتَعَمِّدًافَجَزَآؤُہٗ جَھَنَّمُ خَالِدًا فِیْھَا وَغَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَلَعَنَہٗ وَاَعَدَّلَہٗ عَذَابًاعَظِیْمًا"

اور جو کوئی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے اسکا بدلہ جہنم ہے کہ مدتوں اس میں رہے اور اللہ نے اس پر غضب کیا اور اس پر لعنت کی اور اس کیلئے تیار رکھا بڑا عذاب۔

وعد اور وعید میں فرق سمجھنے کے بعد یہ سمجھئے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ وعد کی مخالفت جائز نہیں لیکن وعید کی مخالف کے جائز ہونے یا نہ ہونے میں اختلاف پایا گیا ہے۔ جبائی معتزلی نے اسی زیر بحث آیۃ کریمہ سے دلیل پکڑی ہے کہ وعید کی مخالفت جائز نہیں اسلئے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں ذکر فرمایا ﴿اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ﴾ (بے شک اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا) وعد، اور موعد اور میعاد ایک چیز ہے اور رب تعالیٰ نے ''وعید'' پر بھی وعد کا اطلاق کیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ﴿اَنْ قَدْ وَجَدْنَامَاوَعَدَنَارَبُّنَاحَقًّا فَھَلْ وَجَدْتُّمْ مَّاوَعَدَرَبُّکُمْ حَقًّا﴾ کہ ہمیں تو مل گیا جو سچا وعدہ ہم سے ہمارے رب نے کیا تھا تو کیا تم نے بھی پایا جو تمھارے رب نے سچا وعدہ تمہیں دیا تھا۔ یہ کلام جنت والے دوزخیوں سے کریں گے۔ جنت والوں کے انعامات کو بھی ''وعد'' سے ذکر کیا اور جہنم والوں کے عذاب کو بھی

''وعد'' سے ذکر کیا۔

واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ ''وعد'' کے خلاف نہیں کرتا اور وعید کے خلاف بھی نہیں کرتا۔ اہل سنت کا اس مسئلہ میں مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز لازم تو نہیں البتہ وہ اپنے فضل وکرم سے کسی چیز کو اپنے ذمہ کر لیتا ہے جو بظاہر واجب کے درجہ میں ہوتی ہے رب تعالیٰ نے ''وعد'' اپنے ذمہ کرم پر لیا اسی وجہ سے وہ اپنے فضل وکرم کے مطابق اپنے ''وعد'' کے خلاف نہیں فرماتا'' لیکن وعید چونکہ عذاب کی ہوتی ہے اس لئے اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے عذاب کو دور کر دے تو بظاہر یہ وعید کی مخالفت نظر آتی ہے لیکن درحقیقت اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر احسان عظیم ہے۔ اہل سنت وجماعت کی دلیل اور قول یہ ہے'' وعید الفساق کما ھو مشروطة بعدم التوبة باتفاق بیننا وبینکم کذلک مشروطة بعدم العفو'' فاسقوں کو جو وعید فرمائی ہے اور اس کے گناہوں کو معاف فرما کے اسکی مغفرت (بخشش) فرماتا ہے۔

اس مسئلہ میں اہلسنت کے ساتھ معتزلہ بھی اتفاق رکھتے ہیں اور اہل سنت کا قول یہ ہے کہ جس طرح فاسقوں کو عذاب دینا مشروط ہے توبہ نہ کرنے سے اسی طرح ان کا عذاب مشروط ہے رب تعالیٰ کے معاف نہ کرنے سے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ارشادات شریفہ اس پر دلالت کر رہے ہیں ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِکَ﴾ بیشک اللہ نہیں مغفرت فرماتا کہ اس کا کوئی شریک ٹھہرایا جائے اور اس سے نیچے جو کچھ ہے جسے چاہے معاف فرما دیتا ہے۔ اور ارشاد فرمایا ﴿یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ﴾ بخشش فرماتا ہے جس کی چاہے اور عذاب دیتا ہے جسے چاہے۔ اور ارشاد فرمایا ﴿وَمَنْ یَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّہٖ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ﴾ اور نہیں ناامید ہوتے اپنے رب کی رحمت سے سوائے گمراہ لوگوں کے۔ اور ارشاد فرمایا ﴿لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰہِ﴾ نہ ناامید ہو اللہ کی رحمت سے۔ اسی طرح اس مسئلہ میں بے شمار احادیث مبارکہ ہیں جس سے پتہ چلا کہ وعید کی مخالفت درحقیقت احسان عظیم ہے جو جائز ہے۔ (ماخوذ از کبیر، مظہری وحاشیہ مسلم الثبوت لمولانا غلام رسول فیصل آبادی رحمہ اللہ)

راقم کا موقف: اللہ تعالیٰ کے وعد کا بھی تعلق خاتمہ بالایمان پر ہے اگر کوئی شخص العیاذ باللہ مرتد ہو جائے تو اسے اجر وثواب عطا نہیں ہوگا بلکہ وہ ہمیشہ کیلئے جہنم میں رہے گا۔ اور اگر گنہگار رہا تو اللہ تعالیٰ نے وعدہ ہی یہ فرما رکھا ہے کہ چاہے تو معاف فرما دے اور چاہے تو عذاب دے دے اسی طرح گنہگار نے توبہ کر لی تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دے گا توبہ نہ کرے تو اللہ تعالیٰ کی مرضی پر موقوف ہے چاہے تو معاف فرما دے اور چاہے تو عذاب دے دے۔ اسی لئے خلف فی الوعید کا تعلق ظاہر سے ہے حقیقت سے نہیں حقیقت میں نہ خلف فی الوعد ہے اور نہ خلف فی الوعید ہے۔

طلباء کرام اسلاف کو یاد رکھیں:

ابھی میں نے حاشیہ " مسلم الثبوت" کا حوالہ دیا ہے۔ یہ حاشیہ عربی میں ہے اگرچہ مختصر ہے لیکن سمجھانے کے لحاظ پر بہت سہل اور اچھا انداز رکھا گیا ہے۔ یہ حاشیہ حضرت علامہ مولنا غلام رسول رضوی (شیخ الحدیث) کا ہے، جن کی بخاری شریف کی شرح اردو" تفہیم البخاری "علماء وطلباء کے حلقہ میں مشہور ومعروف ہے۔ اور آپ حضرت شیخ الحدیث مولنا **سردار احمد** رحمہ اللہ کے داماد ہیں، جنگ اخبار میں لکھنے والا پیر فضل حق آپ کا ہی بیٹا ہے۔ اگرچہ علمی مقام میں اپنے والد مکرم سے بہت پیچھے رہ گیا لیکن سیاست میں ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے۔ حضرت کا وصال دوسال قبل ہوا، "یَرحَمُ اللّٰہُ عَلَیہِ" آپ ہزاروں علماء کے استاذ تھے، خصوصاً مفتی **عبدالقیوم** ہزاروی اور مفتی **محمد سلیمان** رضوی آپ کے شاگرد ہیں۔ اور حضرت مولنا غلام رسول رضوی حضرت علامہ مولنا حافظ **عطاء محمد بندیالوی** کے شاگرد تھے، جبکہ میرے استاذ مکرم حضرت علامہ مولنا محمد اشرف سیالوی بھی حضرت بندیالوی رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ میرے استاذ مکرم حضرت علامہ مولنا **محب النبی** رحمہ اللہ حضرت مولنا حافظ عطاء محمد بندیالوی رحمہ اللہ کے بھی استاذ ہیں۔ (راقم)

اہل سنت اور معتزلہ کے درمیان مناظرہ:

ایک مرتبہ ابوعمرو بن علاء کا ایک معتزلہ عمر بن عبید سے مناظرہ ہو گیا۔ ابوعمرو بن علاء نے عمرو بن عبید سے پوچھا تو کبیرہ گناہ والوں کے متعلق کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا میں یہ کہتا ہوں کہ بیشک اللہ تعالی نے اپنے بندوں سے وعدہ بھی فرمایا اور وعید بھی "**فهو منجز ايعاده كما هو منجز وعده**" وہ وعید کو بھی اسی طرح ضرور بر ضرور پورا کرے گا جیسا کہ وعدہ کو پورا کرے گا۔ ابوعمرو بن علاء نے عمرو بن عبید کو کہا، تو ایک عجمی شخص ہے "**لا اقول اعجم اللسان ولكن اعجم القلب**" میں یہ نہیں کہتا تو زبان کے لحاظ پر عجمی ہے، بلکہ تو اپنی ناسمجھی کی وجہ سے دل کا عجمی ہے، تجھے پتہ نہیں کہ عرب حضرات کیا کہتے ہیں؟ وہ یہ کہتے ہیں "**ان الرجوع عن الوعد لؤم وعن الايعاد كرم**" وعد سے رجوع ملامت ہے، اور وعید سے رجوع کرم ہے۔ پھر ابوعمرو بن علاء نے ایک شعر پڑھا:

وانی وان اوعدته او وعدته　　لمكذب ايعادى ومنجز وعدى

بیشک میں اگر اس سے وعید کروں یا اس سے وعد کروں تو اپنے وعید کو چھوڑ دیتا ہوں اور وعد کو پورا کر دیتا ہوں۔

اگرچہ عمرو بن عبید لاجواب ہوگیا، لیکن کچھ عرصہ کے بعد معتزلیوں نے "لمکذب ایعادی" پر غور کر کے حقیقی معنی کا اعتبار کر کے، مجازی معنی کو نہ سمجھتے ہوئے بات یہ گھڑی کہ عمرو بن عبید نے ابوعمرو بن علاء کو یہ کہا "هل یسمی الله مکذب نفسه" کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ذات کی تکذیب کرتا ہے؟ تو ابوعمرو نے کہا نہیں۔ تو عمرو بن عبید نے کہا تمہاری حجت ختم ہوگئی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وعد اور وعید میں فرق ہے "ان الوعد حق علیه والوعید حق له" وعد، اللہ تعالیٰ اپنے ذمۂ کرم پر لے کر بظاہر درجہ وجوب پر لے آتا ہے۔ اگرچہ اس پر حقیقی طور پر کوئی چیز واجب نہیں لیکن وعید کو وہ اپنے آپ پر لازم نہیں کرتا بلکہ اپنا حق ظاہر کرتا ہے کہ وعید بھی میرا حق ہے۔

"ومن اسقط حق نفسه فقداتی بالجود والکرم ومن اسقط حق غیره فذلک هو اللؤم"

جو اپنا حق چھوڑ دے وہ جود و کرم ہے، اور جو غیر کا حق ساقط کر دے یہ ملامت ثابت کرتا ہے۔ تو واضح ہوگیا کہ وعید رب تعالیٰ کا اپنا حق ہے، وہ چھوڑ دیتا ہے، اور وعد میں بندوں کا حق پایا جاتا ہے، لھذا وعد کو وہ نہیں چھوڑتا۔

"واذا جمیع الوعیدات مشروطة بعدم العفو فلایلزم من ترکه دخول الکذب فی کلام الله تعالی"

جب تمام وعیدیں مشروط ہیں اللہ تعالیٰ کے معاف نہ کرنے سے تو وعید کو چھوڑنے میں اللہ تعالیٰ کے کلام میں کذب لازم نہیں آتا۔

اصل ساری غلطیوں کی وجہ یہ ہے کہ حقیقی معانی اور مجازی میں فرق نہیں کیا جاتا اور نہ ہی موقع و محل سمجھا جاتا ہے کہ یہاں کون سا معنی لیا جائے اور دوسری جگہ کون سا معنی لیا جائے۔ بعض اوقات ایک ہی لفظ بندوں کی طرف منسوب ہو کر اور معنی دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو کر اور معنی دیتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ خلف الوعید کرم ہے اور قابل تعریف ہے، اور خلف الوعد دوسروں کی حق تلفی ہے لھذا وہ باعث ملامت ہے۔ اصل میں لفظ خلف کا معنی "مخالفت اور جھوٹ" لے کر لوگ غلطی کا شکار ہوتے ہیں، حالانکہ خلف کا معنی "چھوڑنا" بھی آتا ہے، لھذا "خلف الوعید کرم عن العرب" کا معنی "ترک الوعید کرم عندالعرب" لیا جائے تو کوئی خرابی نہیں، کیونکہ مطلب یہ ہے کہ وعید کو چھوڑ دینا کرم ہے عرب حضرات کے نزدیک، ایک شاعر نے کیا خوب بیان کیا ہے، جسنے "خلف یا کذب" کے الفاظ نہیں استعمال کئے۔

اذاوعد السراء انجز وعده　　　　وان اوعد الضراء فالعفو مانع

جب وہ خوش کرنے (بھلائی پہنچانے) کا وعدہ کرتا ہے تو وہ اپنا وعدہ پورا کرتا ہے۔ اور اگر وہ تکلیف

دینے کی وعید کرتا ہے (دھمکی دیتا ہے) تو اس کا معاف کرنے کا وصف اسے روک دیتا ہے۔

دینی طلباء کرام کیلئے: میعاد اصل میں "موعاد" ہے واؤ ساکن مظہر ماقبل مکسور اسلئے واؤ کو یاء سے بدل دیا۔ "میعاد" مصدر میمی ہے تمام مصادر کی طرح اس میں حدثی معنی پایا گیا ہے۔ یہ ظرف زمان اور مکان نہیں۔ (روح المعانی)

فائدہ جلیلہ: "اخرج ابن النجار فی تاریخه عن جعفر بن محمد الخلدی قال روی عن النبی ﷺ انه قال من قرأ هذه الأية علی شئی ضاع منه رده الله علیه "ربنا انک جامع الناس لیوم لاریب فیه ان الله لا یخلف المیعاد اللهم یا جامع الناس لیوم لا ریب فیه اجمع بینی وبین مالی انک علی کل شئی قدیر"

ابن نجار نے اپنی تاریخ میں جعفر بن محمد خلدی سے راویت بیان کی کہ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے جس کا مال گم جائے وہ یہ آیۃ (اور دوسرے آنے والے الفاظ) پڑھے تو اللہ اس کا مال اس پر لوٹا دے گا۔ (یعنی یہ پڑھے) "رَبَّنَا اِنَّکَ جَامِعُ النَّاسِ لِیَوْمٍ لَّارَیْبَ فِیْهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ) اَللّٰهُمَّ یَاجَامِعَ النَّاسِ لِیَوْمٍ لَّارَیْبَ فِیْهِ وَاجْمَعْ بَیْنِیْ وَبَیْنَ مَالِیْ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ" (درمنثور)

تنبیہ: جب بے دینوں کی یلغار ہو تو دین کو بچانے کیلئے لوگوں سے علیحدہ ہو کر عبادت میں مشغول رہنا مستحسن کام ہے "قال الجنید رحمه الله من اراد ان یسلم له دینه ویستریح فی بدنه وقلبه فلیعتزل الناس فان هذا فی وحشة والعاقل من اختار الوحدة" حضرت جنید رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جو شخص ارادہ رکھتا ہو کہ وہ اپنے دین کو سلامتی میں رکھے اور اپنے بدن اور دل کو راحت پہنچائے تو وہ لوگوں سے جدا ہو جائے اس لئے کہ جب بے دین لوگوں میں رہنے سے وحشت حاصل ہو اور دینی احکام پر عمل سے روکیں تو عقلمند شخص اکیلے رہنے کو پسند کرتا ہے۔ (از روح البیان)

فائدہ: جس طرح دانہ زمین میں دفن کرنے سے اگتا ہے اسی طرح محبت اور وجود کا دانہ خاموشی کی زمین میں دفن کرنے سے دل میں حکمت اگتی ہے جب تک وہ اپنے وجود کے دانہ کو دفن نہیں کرے گا یعنی میں ہوں کا دعوی کرے گا اور دنیا سے یا اغیار سے محبت رکھے گا تو حکمت اس کے دل میں نہیں اگے گی اپنے آپ کو عجز سے مٹا دے یوں کہے میں کچھ نہیں محبت کا محور صرف رب تعالی ہو انبیاء کرام اور اولیاء کرام کی محبت بھی رب تعالی کی طرف پہنچانے والی ہے لھذا ان سے محبت ہو تو حکمت اسی کے دل میں اگے گی۔ (از روح البیان)

حکمت: "فعلیک بتزکیة النفس واصلاح الوجود کی تدرک نور الشهود وتقبل الی

الاستقامة وتخلص من الزیغ والضلال فی جمیع الاحوال"
تم پر لازم ہے کہ نفس کو پاکیزہ رکھو اور وجود کی اصلاح کرو تا کہ تمہیں نور حاصل ہو جائے جس کی وجہ سے تمہیں مقام شہود (رب کے ہاں حضوری) حاصل ہو جائے اور تمہیں استقامت حاصل ہو جائے اور تمام احوال میں ٹیڑھ پن اور گمراہی سے تمہیں چھٹکارا حاصل ہو جائے۔

❁ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ان اللہ لا ینظر الی صورکم بل الی قلوبکم واعمالکم" بیشک اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتا، بلکہ تمھارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے۔"والقلب ھو محل النظر لا الصورة" اس لئے کہ دل ہی محل نظر ہے صورت کو دیکھنے سے حقیقی فائدہ حاصل نہیں۔ (از روح البیان)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْھُمْ اَمْوَالُھُمْ وَلَآ اَوْلَادُھُمْ مِّنَ اللّٰہِ شَیْئًا وَّاُولٰٓئِکَ ھُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۝ کَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا فَاَخَذَھُمُ اللّٰہُ بِذُنُوْبِھِمْ وَاللّٰہُ شَدِیْدُ الْعِقَابِ﴾ (آیۃ نمبر ۱۰، ۱۱)

(1) بیشک وہ کافر ہوئے ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ سے انہیں کچھ نہ بچا سکیں گے، اور وہی دوزخ کے ایندھن ہیں ○ جیسے فرعون والوں اور ان سے اگلوں کا طریقہ انہوں نے ہماری آیتیں جھٹلائیں تو اللہ نے ان کے گناہوں پر ان کو پکڑا اور اللہ کا عذاب سخت"

(2) بیشک وہ جنہوں نے کفر کیا ہرگز نہیں بچا سکیں گے ان کو ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ سے کچھ (بھی) اور وہی ایندھن ہیں آگ کا ○ جیسے طریقہ فرعون والوں اور ان سے پہلے لوگوں کا تھا انہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو تو پکڑ لیا انہیں اللہ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے اور اللہ سخت عذاب والا ہے۔

ماقبل سے رابطہ : پچھلی آیات میں مؤمنین کی دعاؤں کا ذکر کیا کہ وہ اپنے آپ کو رب تعالیٰ کا محتاج اور نیاز مند سمجھتے ہیں اب اس آیۃ کریمہ میں کفار کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے مال اور اپنی اولاد پر ناز کرتے ہیں اللہ

تعالی سے اپنے آپ کو بے پرواہ سمجھتے ہیں۔

شان نزول کے لحاظ پر خاص:

کہ یہ آیۃ کریمہ نجران کے وفد میں سے ایک شخص کے ایک قول کے بعد نازل ہوئی وہ یہ ہے کہ ان کے ایک شخص ابوحارثہ بن علقمہ نے اپنے بھائی کو کہا کہ بیشک میں جانتا ہوں کہ وہ اللہ تعالی کے سچے رسول ہیں لیکن میں اسے ظاہر نہیں کرتا کیونکہ اگر میں نے اسے ظاہر کیا تو رومی لوگوں نے مجھے جو عزت و مرتبہ عطاء کر رکھا ہے اور میرا مالی وظیفہ مقرر کر رکھا ہے وہ سب مجھ سے چھین لیں گے، حالانکہ میری اور میری اولاد کی آسائش اسی مال پر ہے تو اس وقت یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی کہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد تمہیں کوئی نفع نہیں پہنچا سکیں گے۔ (کبیر)

حکم کے لحاظ پر آیۃ کریمہ عام ہے:

"ان اللفظ عام وخصوص السبب لا یمنع عموم اللفظ" آیۃ کریمہ کے الفاظ مبارکہ عام ہیں شان نزول کے لحاظ پر کوئی خصوصی واقعہ الفاظ کو اپنے عموم پر جاری ہونے سے منع نہیں کرتا اسلئے آیۃ کریمہ تمام کفار کو شامل ہے کہ بیشک کافروں کو ان کا مال اور ان کی اولاد نفع نہیں پہنچا سکیں گے۔ (کبیر)

"وهی عامة تتناول کل کافر" یہ آیۃ کریمہ الفاظ کے عموم کی وجہ سے ہر کافر کو شامل ہے۔ (البحر المحیط)

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْــٴًـا﴾

بیشک وہ جنہوں نے کفر کیا ہرگز نہیں بچا سکیں گے ان کو ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ سے کچھ بھی۔

راقم کا یہ ترجمہ اعلی حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ سے ہی نقل ہے صرف فرق یہ ہے کہ راقم کا ترجمہ الفاظ کی ترتیب کے مطابق ہے اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ مضمون کو سمجھانے کے لحاظ پر خوب ہے۔ یہ ترجمہ البحر المحیط کی اس عبارت کے مطابق ہے۔

"ومعنی من الله ای من عذابه الدنیوی والاخروی ومعنی اغنی عنه دفع عنه ومنعه"

آیۃ کریمہ میں "من اللہ" سے مراد اللہ تعالی کے دنیاوی اور اخروی عذاب سے بچانا اور "اغناء" کا معنی مندفع (دور) کرنا اور روکنا۔ البحر المحیط کی عبارت کو دیکھ کر طلباء کرام اعلی حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کو ایک بار پھر دیکھیں خوب ترین نظر آئے گا۔

رب تعالیٰ نے کافروں کیلئے اپنے کامل عذاب کا ذکر کیا:

اعلم ان کمال العذاب هو ان یزول عنه کل ماکان منتفعابه ثم یجتمع علیه جمیع الاسباب المؤلمة" کامل عذاب یہ ہے کہ ہر نفع مند چیز کا نفع زائل ہو جائے پھر یہ کہ اس پر تمام درد پہنچانے والے اسباب جمع کر لئے جائیں۔

کفار سے نفع مند چیزوں کے نفع کا زوال:

اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ کافروں کو قیامت کے دن مال اور اولاد نفع نہیں پہنچائیں گے کیونکہ "صفة ذلک الیوم مخالفة لصفة الدنیا" قیامت کے دن کی صفات دنیا کی صفات سے مختلف ہوں گی دنیا میں تو کافر بعض اوقات مال اور اولاد سے نفع حاصل کر لیتا ہے لیکن قیامت میں کفار کو مال واولاد کچھ نفع نہیں پہنچا سکیں گے حالانکہ دنیا میں مصائب والام میں ان دو چیزوں کو ہی قریب ترین نفع مند سمجھا جاتا ہے لیکن قیامت کے دن "اقرب الطرق الی دفع المضار اذالم یتاب فی ذلک الیوم فما عداہ بالتعذر اولی" جب قریب ترین اسباب کام نہیں آئیں گے تو اور کیا کام آئے گا؟ یعنی کوئی عذر قبول نہیں کیا جائے گا۔ اسی مضمون کو رب تعالیٰ کے دوسرے ارشادات گرامی میں دیکھئے ﴿یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَابَنُوْنَ o اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ﴾ جس دن نہ مال کام آئے گا نہ بیٹے مگر وہ جو اللہ کے حضور حاضر ہوا سلامت دل لے کر۔

﴿اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ﴾ سے مراد جو شرک کفر ونفاق سے پاک ہے اس کو اس کا مال بھی نفع دے گا جو راہ خدا میں خرچ کیا ہو اور اولاد بھی جو صالح ہو جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ جب آدمی مرتا ہے اس کے عمل منقطع (ختم) ہو جاتے ہیں سوا تین کے ایک صدقہ جاریہ اور دوسرا وہ مال جس سے وہ لوگ نفع اٹھائیں تیسری نیک اولاد جو اس کیلئے دعاء کرے۔ (خزائن العرفان)

اسی طرح اور ارشاد گرامی یہ ہے ﴿اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِیْنَةُ الْحَیَاةِ الدُّنْیَا وَالْبَاقِیَاتُ الصَّالِحَاتُ خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّکَ ثَوَابًا وَّخَیْرٌ اَمَلًا o﴾ مال اور بیٹے یہ جیتی دنیا کا سنگار ہیں اور باقی رہنے والی اچھی باتیں ان کا ثواب تمہارے رب کے ہاں بہتر اور وہ امید میں سب سے بھلی۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَنَرِثُهٗ مَا یَقُوْلُ وَیَاْتِیْنَا فَرْدًا o﴾ اور جو چیزیں کہہ رہا ہے ان کے ہمیں وارث ہوں گے اور ہمارے پاس اکیلا آئے گا۔ یعنی کافروں کا یہ کہنا کہ قیامت کے دن بھی ہمیں ہی مال اور اولاد نفع دیں گے باطل ہے ان کے مال وغیرہ کے تو ہم ہی مالک ہیں وہ تو اکیلے ہمارے پاس

آ ئیں گے نہ ان کی اولاد اور نہ ہی مال ان کو نفع دیں گے اور ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ﴾ اور بیشک تم ہمارے پاس اکیلے آئے جیسا ہم نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا اور پیٹھ پیچھے چھوڑ آئے جو مال ومتاع ہم نے تمہیں دیا تھا۔

کفار کے عذاب کا ذکر:

یعنی کامل عذاب کے اسباب کی دوسری قسم "فهو ان يجتمع عليه اسباب المؤلمة" یہ ہے کہ درد پہنچانے والے اسباب ان کیلئے جمع کر لئے جائیں اسی طرف رب تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ﴾ اور وہی ایندھن ہیں آگ کا یہ بہت بڑا عذاب ہوگا۔ "فانه لاعذاب ازيد من انت تشتعل النار فيهم كا شتعالها في الحطب اليابس" بیشک اس سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں ہوگا کہ آگ ان پر ایسے شعلے مار رہی ہوگی جیسے خشک لکڑی سے وہ شعلے مارتی ہے۔

دینی طلباء کے فائدہ کیلئے:

"وقود" کی واؤ پر فتح ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے 'ایندھن' اور جب واؤ پر ضمہ ہو تو اس کا مصدری معنی ہوتا ہے "جلانا" "وقدت النار وقودا" اسی طرح استعمال ہوتا ہے جیسا کہ "وردت ورودا" استعمال ہوتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

مال کا ذکر اولاد کے ذکر سے پہلے کیوں:

"قدم الاموال على الا ولا د لانها اول عدة يفزع اليها عند نزول الخطوب" مال کا ذکر اولاد سے پہلے اس لئے کیا کہ انسان تکالیف میں سب سے پہلے مال کی طرف ہی رجوع کرتا ہے اولاد سے بعد میں امداد لیتا ہے۔ (روح البیان)

اولاد بھی نفع نہیں دے گی حالانکہ دنیا میں انسان اپنی مشکلات میں اولاد کا سہارا بھی لیتا ہے لیکن قیامت کے دن صرف اعمال نے کام آنا ہے ایمان ہو تو مال اور اولاد بھی نفع مند ہوں گے جیسا کہ قریب ہی خزائن العرفان سے ذکر کیا جا چکا ہے اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم بھی ضروری ہے۔

❁ "قال رسول الله ﷺ ولا ينفع ذاالجد منك الجد" کسی کوشش کرنے والے کو تمہاری کوشش نفع نہیں پہنچا سکتی۔

والمعنی لن تغنی عنهم بدل رحمة الله او بدل طاعته سبحانه اموالهم ولا اولادهم"

آیہ کریمہ کا مفہوم واضح ہو گیا کہ جو نفع اللہ تعالیٰ کی رحمت سے حاصل ہونا تھا اسکے مقابل رب تعالیٰ سے دور ہو کر کوئی اپنے مال اور اولاد سے نفع حاصل کرنا چاہے تو یہ اسے نفع نہیں دے سکیں گے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طاعت و فرمانبرداری سے جو نفع حاصل ہونا تھا، اس کی نافرمانی کرتے ہوئے مال و اولاد سے نفع کی امید کرنی باطل ہے یعنی کفار کو ان کے مال و اولاد نے اللہ تعالیٰ کی طاعت و رحمت سے دور کر دیا ہے لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی رحمت مال اولاد کے ذریعے حاصل کر لیں گے جو چیزیں رب تعالیٰ سے دور کرنے والی ہیں وہ رب تعالیٰ کے قریب کیسے کریں گی؟ (ماخوذ از روح البیان)

تکبر پر وعید:

"وخرج ابن المبارک من حدیث بن عبد المطلب قال قال رسول الله ﷺ یظهر هذا الدین حتی یجاوز البحار وحتی تخاض البحار بالخیل فی سبیل الله تبارک وتعالی ثم یأتی اقوام یقرء ون القرآن فاذا اقرء وه قالوا من اقرء منا من اعلم منا ؟ثم التفت الی اصحابه فقال هل ترون فی اولئکم من خیر ؟قالوا لا قال اولئک منکم واولئک من هذه الامة واولئک هم وقود النار"

ابن مبارک رحمہ اللہ نے حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل فرمائی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ دین پھیل جائے گا یہاں تک کہ سمندروں سے پار ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں (جہاد میں) اپنی سواریوں کو سمندروں میں ڈال دیا جائے گا پھر کچھ قومیں آئیں گی قرآن پڑھیں گی جب وہ قرآن پڑھیں گے تو کہیں گے ہم سے بڑا قاری کون ہے؟ ہم سے بڑا عالم کون ہے؟ پھر حضور ﷺ نے صحابہ کرام کی طرف توجہ فرمائی اور فرمایا کیا ان لوگوں میں تم کوئی بھلائی دیکھتے ہو؟ صحابہ کرام نے عرض کیا نہیں (یعنی ان میں ہم بھلائی نہیں دیکھتے) آپ نے فرمایا وہ لوگ تم سے ہی ہوں گے (یعنی ایمان والے ہوں گے) اور اس امت سے ہی ہوں گے اور وہ لوگ آگ کا ایندھن ہوں گے۔ (ماخوذ از قرطبی)

آگ کے ایندھن ہونے سے مراد یہ ہے کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے محروم ہوئے اور عدل کی بات آئی تو وہ عذاب میں مبتلاء ہوں گے اور عذاب کی مدت پوری کر کے جنت میں آجائیں گے، اس پر فرمان مصطفوی واضح طور پر موجود ہے "من قال لا اله الا الله دخل الجنة" جس نے "لا اله الا الله" کہا وہ جنت میں داخل ہو گا۔ **یا** آگ کا ایندھن کا مطلب یہ ہے کہ وہ آگ میں جانے کے مستحق تو ہوں گے لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت میں ہوں گے وہ چاہے تو معاف کر دے اور چاہے تو عذاب دے ورنہ حقیقت میں آگ کا ایندھن ہمیشہ آگ میں رہنے کیلئے اور ذلت

ورسوائی کیلئے صرف کافر ہی ہوں گے۔ مؤمنوں کو آگ میں اس طرح ڈالا جائے گا جسطرح زرگر سونا آگ کی بھٹی میں ڈالتا ہے جو وہ میل کچیل سے صاف ہوتا ہے اسے نکال لیتا ہے ایسے ہی مؤمن جب گناہوں کی میل کچیل سے صاف ہو جائے گا تو اسے جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ (راقم)

﴿كَدَأْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا﴾

''جیسے طریقہ والوں اوران سے پہلے لوگوں کا تھا انہوں نے جھلایا ہماری آیتوں کو''۔

''دأب'' کا معنی ہے کوشش کرنا، محنت ومشقت کرنا ''دا بت الشئی ای اجتهدت فی الشئ وتعبت فيه'' یعنی ''دأبت الشئ'' کا معنی یہ ہے کہ میں نے اس چیز میں کوشش کی اور تھکن سے کام کیا، جب کوئی شخص سارا دن چلتا رہے تو کہا جاتا ہے ''سار فلان يوما دائبا'' پھر عام استعمال میں ''دأب'' دام اور ہمیشگی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔اسی طرح ''دأب'' کا معنی عام محاورہ میں ''شان، معاملہ، عادت، بھی آتا ہے۔کہا جاتا ہے ''هذا دأب فلان'' یہ فلاں کی عادت ہے یہ فلاں کی حالت ہے یہ فلاں کا معاملہ ہے۔

وجوہ تشبیہ : نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے کفار کے فرعونیوں اوران سے پہلے انبیاء کرام کی تکذیب کرنے والوں سے تشبیہ دی گئی ہے، تشبیہ دینے کی کئی وجوہ ہیں۔

(۱) ''الاول ان يفسر الداب بالا جتهاد كما هو معناه فی اصل اللغة'' ان میں سے پہلی وجہ یہ ہے کہ ''دأب'' کا معنی لغوی محنت ومشقت لیا جائے، اب تشبیہ اس طرح ہوگی کہ یہ کافر رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کرنے اور آپ کے دین کا انکار کرنے اور کفر کرنے میں ایسے ہی ہیں جیسا کہ فرعون اوراس کی تابعداری کرنے والے لوگوں نے اوران سے پہلے انبیاء کرام کی تکذیب کرنے والوں نے بڑی محنت وکوشش سے تکذیب کی، اسی طرح یہ بھی پوری محنت ومشقت کررہے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے دین کو جھٹلانے میں۔''ثم انا اهلكنا اولئك بذنوبهم فكذا انهلك هؤلاء'' پھر بیشک ہم نے ان لوگوں کوان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیا تو ان کو بھی ہلاک کر دیں گے، یہی مطلب ہے ﴿فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۝﴾ (اور پکڑ لیا ان کو اللہ نے ان کو گناہوں کی وجہ سے اور اللہ سخت عذاب والا ہے) کا۔

(۲) ''اوجه الثانی ان يفسر الداب بالشان والصنع'' (تشبیہ کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ''دأب'' کا معنی'' حالت اور فعل'' لیا جائے اب اس میں چند وجہ ہوں گی، ایک یہ کہ ان لوگوں کی شان یعنی حالت نبی کریم ﷺ کی تکذیب میں ایسے

ہی تھی جیسے فرعون اوراس کے متبعین اوراس سے پہلے انبیاء کرام کی تکذیب کرنے والوں کی حالت تھی۔

و لا فرق بین هذا الوجه وبین ما قبله الا انا حملنا اللفظ فی الوجه الاول علی الاجهتاد فی هذا الوجه علی الصنع و العادة "

اور کوئی فرق نہیں اس وجہ میں اور پہلی وجہ میں جو ہم نے بیان کی ہاں صرف لفظوں کا فرق ہے پہلی وجہ میں "دأب" کا معنی محنت ومشقت لیا گیا ہے اور اب جو وجہ بیان کی گئی ہے اس میں معنی "حالت اور عادت" لیا گیا ہے "دأب" کا معنی شأن (حالت) اور عادت لے کر تشبیہ کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ تقدیر عبارت کی یہ ہو:

"ان الذین کفروا لن تغنی عنهم اموالهم ولااولادهم من الله شیأ ویجعلهم الله وقود النار کعادته وصنعه فی آل فرعون ،،

بیشک کافروں کو ہرگز نہیں بچاسکیں گے ان کے مال اوران کی اولاد اللہ کے کسی عذاب سے اور اللہ ان کو آگ کا ایندھن بنائے گا جیسا کہ اللہ تعالی کی عادت فرعون والوں کو عذاب دینے کی ہوئی۔یعنی جب انہوں نے اپنے رسول موسی علیہ السلام کی تکذیب کی اوران سے پہلے لوگوں نے اپنے اپنے رسولوں کی تکذیب کی تو اللہ تعالی نے ان کوان کے گناہوں کی وجہ سے گرفت (پکڑ) میں لے لیا۔

دینی طلباء کرام کیلئے:

"والمصدر تارة یضاف الی الفاعل وتارة الی المفعول والمراد ههنا کدأب الله فی آل فرعون فانهم لما کذبوا برسولهم اخذهم الله بذنوبهم"

"داب" مصدر ہے، مصدر کبھی فاعل کی طرف مضاف ہوتا ہے اور کبھی مفعول کی طرف، یہاں یہی مراد ہے۔اب مطلب یہ ہوگا کہ جیسے اللہ تعالی کی عادت آل فرعون میں ہوئی، کیونکہ انہوں نے جب اپنے رسول کی تکذیب کی تو اللہ تعالی نے ان کوان کے گناہوں کی وجہ سے گرفت میں لے لیا۔ایسا ہی استعمال ﴿یُحِبُّوْنَهُمْ کَحُبِّ اللّٰهِ﴾ میں ہے، کیونکہ اصل معنوی اعتبار پر "کحبهم الله" ہے اوراسی طرح ﴿سُنَّةَ مَنْ قَدْاَرْسَلْنَاقَبْلَکَ مِنْ رُّسُلِنَا﴾ بھی معنوی لحاظ پر اصل میں "سنتی فیمن ارسلنا قبلک" ہے۔**دوسری** وجہ جو بیان ہورہی تھی کہ "دأب" کا معنی عادت، حالت، کیفیت مراد ہو، تو اس کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں، اوراس کی **تیسری** وجہ یہ ہے

"یحتمل ان تکون الآیة جامعة للعادة المضافة الی الله تعالی و العادة المضافة الی الکفار، کأنه قیل ان عادة هؤلاء الکفار ومذهبهم ایذاء محمد ﷺ کعادة من قبلهم فی ایذاء رسلهم وعادتنا ایضا فی اهلاک هؤلاء کعادتنا فی اهلاک اولئک الکفار المتقدمین"

کہ اس میں احتمال یہ ہے کہ ”دأب بمعنیٰ “عادت” ہو۔ اور اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف بھی ہو اور کفار کی طرف بھی ہو، گویا کہ یوں کہا گیا ہو کہ ان لوگوں کی عادت اور مذھب نبی کریم ﷺ کو ایذاء (تکلیف) دینے میں ایسے ہی ہے، جیسے ان سے پہلے لوگوں کی عادت اپنے رسولوں کو تکلیف دینے کی تھی، اور گویا کہ رب تعالیٰ کی طرف سے یوں کہا گیا کہ ہماری عادت بھی ان لوگوں کو ہلاک کرنے میں ایسے ہی ہے جیسے کہ ان سے پہلے لوگوں (رسولوں کی تکذیب کرنے والوں) کو ہم نے ہلاک کیا۔

”والمقصود علی جمیع التقدیرات نصر النبی ﷺ علی ایذاء الکفرۃ وبشارتہ بان اللہ سینتقم منھم“

تمام مطالب میں مقصد بیان کرنے کا یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو بشارت دی کہ کفار آپ کو ایذاء (تکلیف) پہنچائیں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کی امداد فرمائے گا، اور کافروں سے انتقام لے گا۔

(۳) ”الوجہ الثالث فی تفسیر الدأب والدؤب وھو اللبث والدوام وطول البقاء فی الشیٔ“

تیسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ ”دأب“ اور ”دؤب“ کا معنیٰ زیادہ دیر ٹھہرنا، یا ہمیشہ ٹھہرنا بھی آتا رہتا ہے، اس معنیٰ کے لحاظ پر مطلب یہ ہوگا کہ نبی کریم ﷺ کی تکذیب کرنے والے بھی آگ میں ہمیشہ رہیں گے جیسا کہ آل فرعون اور ان سے پہلے رسولوں کی تکذیب کرنے والے آگ میں ہمیشہ رہیں گے۔

(۴) ”والوجہ الرابع ان الدأب ھو الاجتھاد کما ذکرناہ ومن لوازم ذلک التعب والمشقۃ“

چوتھی وجہ یہ ہے کہ ”دأب“ کا معنیٰ ”اجتہاد“ محنت، جدوجہد ہے، لیکن جب کسی کام میں جدوجہد پائی جائے تو اس میں تھکن اور مشقت بھی پائی جاتی ہے،

”فیکون المعنی ومشقتھم وتعبھم من العذاب کمشقۃ آل فرعون بالعذاب وتعبھم“

اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ان کفار کو عذاب کی وجہ سے مشقت وتکلیف ایسے ہی ہوگی جیسے آل فرعون کو مشقت وتکلیف حاصل ہو چکی ہے اور ہمیشہ کیلئے ان کو تکلیف حاصل رہے گی۔

آل فرعون سے تشبیہ دے کر ضمناً یہ بھی سمجھا دیا گیا ”ان عذابھم حصل فی غایۃ القرب وھو قولہ تعالی ’اغرقوا فادخلوا نارا“ کہ ان کا عذاب بہت قریب ہے، جیسا کہ آل فرعون کو ادھر غرق کیا اور ادھر ساتھ ہی آگ میں داخل کر دیا گیا۔ اور ان کو شدید عذاب دیا جائے گا جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْا آلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ﴾ آگ جس پر صبح وشام پیش کئے جاتے ہیں اور جس دن قیامت قائم ہوگی، حکم ہوگا فرعون والوں کو سخت تر عذاب میں داخل کرو۔

(۵) "الوجه الخامس ان المشبه هو ان اموالهم واولادهم لا تنفعهم فی ازالة العذاب"

پانچویں وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو یذاء پہنچانے والے اور تکذیب کرنے والے کافروں کو آل فرعون سے اور ان سے پہلے انبیاء کرام کی تکذیب کرنے والوں سے اس چیز میں تشبیہ دی گئی کہ جس طرح پہلے کفار عذاب میں مبتلاء ہوئے تو ان کو ان کے مال اور اولاد نفع نہ پہنچا سکے بلکہ وہ عذاب کے نازل ہونے پر مضطر و مجبور ہو گئے یعنی اس طرح پریشان ہوئے کہ ان کی پریشانی کو کوئی دور کرنے والا نہ تھا، نہ مال، نہ اولاد۔

"فکذلک حالکم ایھا الکفار المکذبون بمحمد ﷺ فی انہ ینزل بکم مثل ما نزل بالقوم تقدم او تاخر ولا تغنی عنکم الاموال والاولاد"

اے کافرو نبی کریم ﷺ کی تکذیب کرنے والو تم پر اسی طرح عذاب نازل ہوگا جیسا کہ پہلے قوموں پر عذاب نازل ہوا، خواہ وہ عذاب جلدی آ جائے یا دیر سے آئے، جس طرح ان لوگوں کو ان کے مال اور ان کی اولاد نہ بچا سکے ایسے ہی تمہارے مال اولاد تمہیں بھی نہیں بچا سکیں گے۔

(۶) الوجہ السادس "یحتمل ان یکون وجہ التشبیہ انہ کما نزل بمن تقدم العذاب المعجل بالاستئصال فکذلک ینزل بکم ایھا الکفار بمحمد ﷺ وذلک من القتل والسبی وسلب الأموال"

چھٹی وجہ یہ ہے کہ اس تشبیہ میں یہ احتمال بھی پایا جاتا ہے کہ جس طرح پہلی قوموں پر جلدی عذاب آیا، یعنی ان کو دنیا میں عذاب دے کر تباہ و برباد کر دیا گیا پھر آخرت میں ان کو عذاب دیا جائے گا، اسی طرح نبی کریم ﷺ کی تکذیب کرنے والے کافرو تمہیں بھی دنیا میں جلدی عذاب دیا جائے گا یعنی مسلمانوں کے ہاتھوں تمہیں قتل کرا دیا جائے گا، اور قید کرا دیا جائے گا اور تمہارا مال چھین لیا جائے گا، پھر تمہیں اخروی عذاب میں مبتلاء کر دیا جائے گا، دنیاوی اور اخروی عذاب کا تذکرہ آنے والی آیۃ کریمہ میں موجود ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

فائدہ جلیلہ: مسلمان کے مال و اولاد قرب الٰہی کا ذریعہ ہیں، اور اس کیلئے باعث ثواب ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ بیوی بچوں کو پالنا عبادت ہے حتی کہ بیویوں کے منہ میں لقمہ دینا عبادت ہے، اس سے صحبت کرنا ثواب میں آتا ہے۔ کیونکہ مسلمان کو ان سے دلی تعلق ہوتا ہے، وہ ان کی خدمت اس لئے کرتا ہے کہ رب تعالیٰ کا حکم ہے، لھذا یہ تمام چیزیں اس کیلئے جمال الٰہی کا آئینہ ہوتا، وہ ان کی خدمت اس لئے کرتا ہے کہ رب تعالیٰ کا حکم ہے، لھذا یہ تمام چیزیں اس کیلئے جمال الٰہی کا آئینہ ہیں، لیکن کفار کی اولاد اور ان کے مال ان کیلئے حجاب کا سبب ہیں، اور رب تعالیٰ سے دوری کا ذریعہ ہیں۔ کیونکہ کفار کو ان چیزوں سے دلی تعلق ہوتا ہے۔ اور یہ ہی اس کے

حقیقی محبوب ہیں۔لہذا یہ چیزیں اسے عذاب سے کیا بچائیں گی، یہ تو اس کیا عذاب کو بڑھانے کا ذریعہ ہیں۔فرعون اوراس کے متبعین نے مال واولاد پر ہی ناز کرتے ہوئے ایمان نہ لایا تو وہ غرق کردیئے گئے اوراخروی عذاب میں بھی مبتلاء کردیئے گئے، گویا کہ ان کا مال اوران کی اولاد عذاب کا سبب بنے۔ (ابن عربی،ازنعیمی)

عظمت قرآن اور مفسرین کا خوبصورت بیان:

(بآیاتنا) یحتمل ان یرید الآیات المتلوة ویحتمل ان یرید الآیات المنصوبة للدلالة علی الوحدانیة"

اللہ تعالیٰ نے جو یہ ارشاد فرمایا﴿وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا﴾ (اوروہ لوگ جو ان سے پہلے ہوئے جھٹلایا ہماری آیات کو۔ (قرطبی)

اس میں "بآیاتنا" ذکرفرماکرعظیم مطالب کو بیان کردیا گیا جس سے عظمت قرآن واضح طور پر سمجھ آرہی ہے، کیونکہ "آیات" سے مراد عام ہیں خواہ "متلو" (پڑھی جانے والی) ہوں یا غیر متلو (نہ پڑھی جانے والی) ہوں یعنی جن لوگوں نے ہماری کتابوں کی آیات کو جھٹلایا ان کو ان کے مال اولاد نفع نہ پہنچا سکے، اوروہ اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آئے اور"غیر متلو" سے مراد انبیاءکرام کے معجزات بھی ہیں کہ ان سے انبیاءکرام کی صداقت واضح ہوگئی، اوراللہ تعالیٰ کی قدرت پر بھی وہ دلیل ہیں، کہ یہ معجزات صرف اسی ذات سے حاصل ہیں جو"وحدہ لاشریک له" ہے اور تمام چیزیں جو اللہ تعالیٰ کی وحدت (ایک ہونے) پردلالت کررہی ہیں وہ "آیات غیر متلو" میں داخل ہیں۔لھذا سورج، چاند، آسمان، ہوا اور ستارے، روشنی وتاریکی، بارشیں وغیرہ سب ہی اللہ تعالیٰ کی وحدت پر دلالت کررہی ہیں۔ان میں سے کسی ایک کو بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق نہ تسلیم کرنا اوراللہ تعالیٰ کی قدرت وحدت پردلیل کا انکار باعث عذاب ہے۔

دوگناہوں کا ذکر:

(کذبوا بآیاتنا)فصرفوهافی غیر مصارفهافا فتمعت علیهم معاصی الکفر ومعاصی صرف النعم فی غیر مصارفها"

آیات کی تکذیب کرنے کا یہ مطلب ہے کہ انہوں نے آیات کو پھیر کر مطالب غلط بیان کئے، اوراللہ تعالیٰ کی قدرت وحدت پردلالت کرنے والی نشانیوں کی بھی غلط تاویلیں کیں، لھذا ان میں کفر کے معاصی۔(گناہ) اورآیات کو پھیر کر غلط مطالب بیان کرنے کے معاصی جمع ہوگئے۔ (تبصیر الرحمن)

﴿فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾

''تو پکڑلیاانہیں اللہ تعالی نے ان کے گناہوں کی وجہ سےاوراللہ تعالی سخت عذاب والا ہے''۔

(فاخذهم الله بذنوبهم)ان رحمهم بالاموال والاولاد اولا اذ(الله) كما هوالرحمن الرحيم فهو ايضا شديد العقاب''

اللہ تعالی نے انسانوں کو مال واولادعطاء کرکے ان پر پہلے رحم بھی فرمایا،لیکن اللہ تعالی کے رسولوں کی تکذیب کرنے پران کے مال واولادکونفع نہ پہنچانے والا بلکہ ضرر پہنچانے والا کردیا۔

اللہ تعالی رحمٰن ورحیم بھی ہےلیکن جب اللہ تعالی کے رسولوں کی لوگوں نے تکذیب کی تو رب تعالی نے ان کو گرفت میں بھی لے لیا، کیونکہ اللہ تعالی سخت عذاب والا ہے۔ (تیسیر الرحمٰن)

فائدہ: آیۃ کریمہ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ اللہ تعالی کے رسولوں کے تکذیب باعث کفر ہے،اور باعث عذاب ہے،اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ مؤمن کا مال اوراولاداس کیلئے نفع مند ہے لیکن کافرکیلئے نفع مند نہیں بلکہ نقصان دہ ہے۔اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ اللہ تعالی رحمٰن ورحیم ہےاسکی رحمت کی امید بھی کی جائے،لیکن رب تعالی قہارو جبار بھی ہےاس لئے اس کے قہر وجبر سےانسان ڈرتا بھی رہے۔

باءمیں دواحتمال:

والباء في قوله بذنوبهم يحتمل ان تكون للملا بسة والمعنى اخذهم الله والحال انهم ملتبسون بذنوبهم يعني من غير توبة''

''بذنوبهم'' کی باءمیں دواحتمال ہیں،ایک یہ ہے کہ باءملابست کیلئے ہو،اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالی نے ان کوگرفت میں لیا حال یہ ہے کہ وہ گناہوں میں متلبس (مبتلاء) ہیں،اورتوبہ بھی نہیں کررہے۔

''ويحتمل ان تكون للسببية والمعنى اخذهم الله بسبب ذنوبهم'' اوردوسرااحتمال یہ ہے کہ باءسببیت کیلئے ہو،اس صورت میں معنی یہ ہوگا اللہ تعالی نے ان کوگرفت میں لے لیابوجہ ان کے گناہوں کے۔''والاول ابلغ لان فيه دفع توهم ان موتهم كفارة لما وقع منهم'' ان دونوں احتمالوں میں سے پہلا زیادہ قوی ہے، کیونکہ اس میں یہ وہم نہیں پایا جاتا کہ ہوسکتا ہے کہ موت ان کے گناہوں کا کفارہ بن جائے،پہلے احتمال میں اس وہم کا ازالہ ہو جاتا ہے،کیونکہ پہلے معنی میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ چونکہ گناہوں میں مبتلاء رہتے ہیں،بغیرتوبہ کے مرجاتے ہیں،اس لئے

رب تعالیٰ کی گرفت میں آجاتے ہیں۔ (صاوی)

تفنن: ایک مضمون کو مختلف عبارات سے پیش کرنا عرب حضرات کے نزدیک تفنن (اظہار فن) کہلاتا ہے۔قرآن پاک میں عرب حضرات کے تمام اسلوب کو بیان کیا گیا ہے، اسی لئے ایک مقام میں بیان ہوا ﴿كَذَّبُوْا بِآيَاتِنَا﴾ اور دوسری آیۃ کریمہ میں استعمال ہوا ﴿كَفَرُوْا بِآيَاتِ اللّٰهِ﴾ اور تیسری آیۃ کریمہ میں استعمال ہوا ﴿كَذَّبُوْا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ﴾ (صاوی)

اعتراض: اس آیۃ کریمہ سے معلوم ہوا کہ کفار سے عذاب دفع نہ ہوگا، اور بخاری شریف کی حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ کی خدمت کی باعث ابوطالب کا عذاب ہلکا ہے۔اور ابولہب کا عذاب حضور ﷺ کی ولادت کی خوشی کی وجہ سے سوموار کو ہلکا ہوتا ہے۔اس آیۃ کریمہ اور احادیث مبارکہ میں مطابقت کیسے؟

جواب: ان احادیث میں عذاب کے ہلکا ہونے کا ذکر ہے، اور اس آیۃ میں عذاب کے دفع ہونے کی نفی کا ذکر ہے۔تخفیف عذاب اور ہے، اور دفع عذاب کچھ اور ہے۔تخفیف کا ثبوت ہے، دفع کی نفی، لھذا آیۃ کریمہ اور احادیث مبارکہ میں کوئی تعارض نہیں۔ (از نعیمی)

❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀

﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وَبِئْسَ الْمِهَادُ۝﴾

(آیۃ نمبر ۱۲)

(1) فرمادو کافروں سے کوئی دم جاتا ہے کہ تم مغلوب ہوگے، اور دوزخ کی طرف ہانکے جاؤ گے اور وہ بہت ہی برا بچھونا۔

(2) فرمادو انہیں جنہوں نے کفر کیا، عنقریب تم مغلوب ہو جاؤ گے اور ہانکے جاؤ گے تم جہنم کی طرف، اور برا ہے وہ ٹھکانا۔

طلباء کرام کی توجہ کی ضرورت:

﴿سَتُغْلَبُوْنَ﴾ کا اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے بامحاورہ ترجمہ کیا ہے کوئی دم جاتا ہے کہ تم مغلوب ہوگے راقم نے "سین" کا لغوی معنی تحریر کیا ہے عنقریب تم مغلوب ہو جاؤ گے۔﴿وَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾ میں "مہاد" کا معنی اعلی

حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ روح المعانی کے مطابق ہے (بچھونا) "ومھاد" کفراش لفظا ومعنی "والمخصوص بالذم مقدر وھو جھنم" (روح المعانی)

"مھاد" کا وزن بھی فراش کی طرح ہے اور معنی بھی فراش (بچھونا) ہے مخصوص بالذم مقدر ہے وہ جہنم ہے اب مکمل مطلب یہ ہو گیا اور وہ بہت ہی برا بچھونا ہے وہ جہنم ہے۔ راقم نے "مھاد" کا معنی کیا ہے "ٹھکانا" چونکہ روح البیان میں یوں بیان کیا گیا ہے "وبئس المھاد ای بئس الفراش والمقر جھنم" برا ہے بچھونا اور برا ٹھکانا وہ جہنم ہے یوں سمجھئے کہ راقم کا ترجمہ ضیاء القرآن سے منقول ہے البتہ روح البیان کے دونوں تراجم سے ایک کے مطابق اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ اور دوسرے کے مطابق راقم کا۔ کوشش یہ ہوتی ہے کہ طلباء کرام کو مختلف معانی یاد ہو جائیں اور وسعت علمی حاصل ہو جائے۔ (راقم)

شان نزول : (۱) محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ اس کے نزول کی وجہ یہ ہے کہ بدر سے فارغ ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ میں جب واپس آئے تو آپ نے یہود کو بنی قینقاع کے بازار میں جمع کر کے فرمایا "یا معشر الیھود اسلموا قبل ان یصیبکم اللہ بما اصاب قریشا" اے یہود یو تم اسلام لے آؤ اس سے پہلے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ وہ مصیبت پہنچائے جو قریش کو پہنچائی۔

فقالوا یا محمد لا یغرنک من نفسک ان قتلت نفرا من قریش کانوا اغمارا لا یعرفون القتال انک واللہ لو قاتلنا لعرفت انا نحن الناس وانک لم تلق مثلنا"

(اخرجہ محمد بن اسحاق عن عکرمۃ عن ابن عباس)

تو وہ کہنے لگے اے محمد تم دھوکے میں مبتلاء نہ ہو اگر تم نے قریش کے چند آدمیوں کو قتل کر دیا ہے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ناتجربہ کار تھے، جنگ کرنا نہیں جانتے تھے قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اگر تمہیں ہمارے ساتھ واسطہ پڑا تو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ ہم کتنے بہادر اور تجربہ کار ہیں، تم خود ہی کہو گے کہ ہمیں آج تک ایسے لوگوں سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔

ان کی اس ڈینگ پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیۃ کریمہ نازل فرمائی کہ بظاہر تم اپنی بہادری اور تجربہ کاری کے دعوے کر رہے ہو لیکن جلدی ہو تمہیں مغلوب کر دیا جائے گا پھر تمہیں جہنم کی طرف ہانک دیا جائے گا وہی جہنم تمہارا ٹھکانا ہو گی یہ ٹھکانا برا ٹھکانا ہو گا۔ (ماخوذ از صابونی وابن کثیر)

(۲) شان نزول کی دوسری وجہ یہ بیان کی گئی یہ آیۃ کریمہ بدر کے واقعہ سے پہلے نازل ہوئی اس آیۃ کریمہ میں خطاب مشرکین مکہ کو ہے کہ عنقریب ہو جاؤ گے رب تعالیٰ نے اپنے وعدہ کے مطابق مشرکین کو بدر میں مغلوب

کردیا۔رسول اللہ ﷺ نے بدر میں مشرکین کو کہا"ان اللہ غالبکم و حاشر کم الی جھنم " بیشک اللہ تعالی تم پر غالب ہےاوروہ تمہیں جہنم کی طرف ہانکنے والا ہے۔ (خازن)

(۳) شان نزول کی تیسری وجہ یہ بیان کی گئی کہ جب بدر میں رسول اللہ ﷺاور صحابہ کرام کو کامیابی حاصل ہوئی اور مشرکین کوشکست حاصل ہوئی تو مدینہ کے کئی یہود ایک دوسرے کو کہنے لگے "واللہ النبی الذی بشربہ موسی لا ترد لہ رایۃ وارادوا اتباعہ " قسم ہے اللہ تعالی کی یہی وہ آخری نبی ہیں جن کی بشارت موسی علیہ السلام نے اپنی ظاہری حیات میں دی تھی اسی لئے تو میدان جنگ میں کثیر تعداد دشمن کے مقابلہ میں ان کے جھنڈے کو سرنگوں نہیں ہونے دیا،ان میں سے کئی لوگوں نے ایمان لانے اور نبی کریم ﷺ کی اتباع کا ارادہ کرلیادوسرے سال غزوہ احد میں صحابہ کرام شہید ہوئے اورزخمی ہوئے تو "وغلب علیھم الشقاء فلم یسلموا" ان پر بدبختی غالب آگئی وہ اسلام نہ لائے۔اورانہوں نے مسلمانوں سے کیا ہواوعدہ (کہ تمہارے ساتھ جنگ نہیں کریں اور تمہارے مخالفین کا ساتھ نہیں دیں گے)توڑدیا،یہاں تک کہ کعب بن اشرف ساٹھ شخصوں کی جماعت کواپنے ساتھ لے کرمکہ مکرمہ میں گیا،تاکہ وہاں سے امدادطلب کرکے نبی کریم ﷺاور صحابہ کرام کو(معاذ اللہ)ختم کردیا جائے،تورب تعالی نے نبی کریم ﷺ سے وعدہ کردیا کہ بیشک یہ لوگ آپ کے خلاف جمع ہوجائیں گے،ایک دوسرے کی امداد کریں گے،لیکن مغلوب ہوں گے(شکست کھائیں گے)۔ (خازن)

جنگ احزاب میں سارے کفار جمع ہوکر نبی کریم ﷺ کو معاذ اللہ مٹانے کیلئے آئے لیکن ذلیل وخوار ہوئے۔یہ بھی ممکن ہے کہ تمام واقعات کے بعدآیۃ کریمہ کا نزول ہو،پہلے صرف نبی کریم ﷺ کے دل میں القاء کیا گیا ہو،یعنی دل میں ڈال دیا گیا ہو۔

"ان ھذہ الآیۃ واردۃ فیجمع من الکفار باعیانھم علم اللہ تعالی انھم یموتون علی کفرھم ولیس فی الآیۃ مایدل علی انھم من ھم"

مختلف اقوال میں سے ایک قول یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ تمام کفار کے متعلق نازل ہوئی،اللہ تعالی کے علم مطابق تمام وہ کافر جن کی موت کفر پرآنی ہے،ان کو بتایا کہ وہ مغلوب ہوں گے۔(کبیر)

﴿قُلْ لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ﴾ "فرمادوانہیں جنہوں نے کفرکیا،عنقریب تم مغلوب ہوجاؤ گے"۔

(ستغلبون)البتۃ عن قریب فی الدنیا وقد صدق اللہ وعدہ بقتل بنی قریظۃ واجلاء بنی النضیر وفتح خیبر وضرب الجزیۃ علی من عداھم وھو من اوضح

شواھدالنبوۃ"   (روح البیان)

مطلب یہ ہے کہ عنقریب دنیا میں تم یقیناً مغلوب ہو جاؤ گے، اللہ تعالیٰ نے اپنے اس وعدہ کو پورا فرمادیا کہ بنی نضیر کو جلاء وطن کر دیا گیا، بنی قریظہ کو قتل کر دیا گیا، اور خیبر فتح کر لیا گیا، اور ان کے سواء باقی لوگوں پر جزیہ مقرر کر دیا گیا، یہ تمام واقعات نبی کریم ﷺ کی نبوت پر واضح دلائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جو آپ نے بتادیا وہ ہو کر رہا۔

غیب انبیاء کرام کا معجزہ ہے:

(ستغلبون)اخبار عن امر یحصل فی المستقبل وقد وقع مخبرہ علی موافقته فکان ھذا اخبارا عن الغیب وھو معجز ونظیرہ قوله تعالی غلبت الروم فی ادنی الارض وھم من غلبھم سیغلبون"آلایة ونظیرہ فی حق عیسی علیه السلام وانبئکم بما تاکلون وما تدخرون فی بیوتکم"

رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو فرمایا کہ آپ کافروں کو کہہ دیجئے کہ "عنقریب تم مغلوب ہو جاؤ گے" یہ مستقبل کی خبر ہے، جو واقع ہو کر رہی، یہ غیبی خبر ہے جو نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے۔ اسی کی مثل سورۃ روم کی ابتداء میں جو مسلمانوں کی فتح و نصرت کی خبر دی گئی وہ بھی ثابت ہوئی، اور عیسیٰ علیہ السلام کا اپنی قوم کو یہ کہنا کہ "میں تمہیں خبر دیتا ہوں جو تم کھاتے ہو اور جو تم گھروں میں ذخیرہ بنا کر آتے ہو۔ یہ سب ہی غیبی خبریں ہیں جو انبیاء کرام کا معجزہ ہیں۔ یعنی غیب کا اقرار معجزہ کا اقرار ہے، اور غیب کا انکار معجزہ کا انکار۔   (ماخوذ از کبیر)

فائدہ: ﴿وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰی جَهَنَّمَ﴾ "تمہیں جہنم کی طرف ہانکا جائے گا"

ان الفاظ مبارکہ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ قیامت آنی ہے، حشر و نشر پایا جاتا ہے۔ اور کافروں کو آگ کی طرف دھکیلا جاتا ہے۔   (کبیر)

﴿وَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾ "اور برا ہے وہ ٹھکانا"۔

اللہ تعالیٰ نے جب یہ ذکر فرمایا کہ کافروں کو جہنم کی طرف ہانکا جائے گا تو اس کے بعد کافروں کے برے ٹھکانے کا ذکر فرمایا، کیونکہ "بئس" ماخوذ ہے "باساء" جس کا معنی ہوتا ہے شر اور شدت، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَاَخَذْنَا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍ بَئِیْسٍ﴾ اور ہم نے ظالموں کو پکڑا سخت عذاب سے، یا "برے عذاب سے"۔   (کبیر)

"مہاد" کا معنی بچھونا بھی ہے، اور ٹھکانا بھی، پہلے تفصیلا بیان ہو چکا ہے۔

تشبیه کا امکان:

اس آیۃ کریمہ میں بھی اس سے پہلی آیۃ کریمہ کہ طرح تشبیہ پائی گئی ہو،ایک تفسیراس کے مطابق بھی ہے،

(قل للذین کفروا)بھذا الدین کفرکم به ککفر آل فرعون بموسی وقد فعل بقریش لکفرھم به مارأیتم فسیفعل بکم مافعل بھم"

(فرمادیجئے انہیں جنہوں نے کفرکیا) اس دین سے کہ تمہارا کفر بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ فرعون والوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کفرکیا، قریش کو کفر کی سزا (بدر میں) مل چکی ہے، جسے تم نے دیکھ لیا ہے، عنقریب تمہارے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جانا ہے جوان سے کیا گیا، یعنی تمہیں بھی شکست فاش دی جائے گی،

(ستغلبون) کما غلبو وقد صدق الله وعده بقتل قریظة واجلاء بنی النضیر وفتح خیبر وسیفعل بکم ما فعل بآل فرعون آخر(و)ھو انکم(تحشرون الی جھنم) ولا تتخلصون بایام قلائل بل مھدت لکم علی الابد کما مھدت لھم(وبئس المھاد)لکم کما انھا بئس المھاد لھم اذکان کفرکم بآیات محمد علیہ السلام ککفرھم بآیات موسی" (تبصیر الرحمن)

عنقریب تم مغلوب ہو جاؤ گے جیسا کہ آل فرعون مغلوب ہوئے، تحقیق اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ مکمل فرمادیا کہ بنی قریظہ کوقتل کرادیا، بنی نضیر کو جلاء وطن کردیا، اور خیبر فتح کرادیا، اور عنقریب تمہارے ساتھ بھی وہی کیا جائے گا جو آل فرعون سے آخر کار کیا گیا، یعنی جس طرح انہیں جہنم کی آگ کی طرف دھکیل دیا گیا ایسا ہی تمہیں بھی آگ کی طرف ہانک دیا جائے گا، اور تمہیں اس آگ سے چند دن کی بھی خلاصی نہیں ملے گی بلکہ جہنم ہمیشہ کیلئے تمہارا ٹھکانا ہوگی جیسا کہ آل فرعون کیلئے وہ ٹھکانا ہے، ''اور یہ برا ٹھکانا ہے'' یعنی جس طرح آل فرعون کیلئے جہنم برا ٹھکانا ہے، اسی طرح تمہارے لئے بھی جہنم برا ٹھکانا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہارا نبی کریم ﷺ کے معجزات اور آپ کی صداقت کی نشانیوں سے کفر کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ آل فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کی صداقت کی نشانیوں اور معجزات سے انکار کیا تھا۔

فائدہ: فقتل من فحول قریظة ستمائة حول الخندق وکان لھم علی بن ابی طالب"

خندق کے اردگرد قریظہ کے چھ سو بہادر آدمیوں کو قتل کردیا گیا تھا، جن کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قتل کیا۔ (صاوی)

یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قیادت میں قریظہ کے چھ سو بہادر آدمیوں کو قتل کردیا گیا تھا۔

❊❊❊❊❊❊❊❊❊❊❊❊❊

﴿قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَافِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَأُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُبِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْاَبْصَارِo﴾ (آیۃ نمبر ۱۳)

(1) بے شک تمہارے لئے نشانی تھی دو گرہوں میں جو آپس میں بھڑ پڑے ایک جتھا اللہ کی راہ میں لڑتا اور دوسرا کافر کہ انہیں آنکھوں دیکھا اپنے سے دونا سمجھیں، اور اللہ اپنی مدد سے زور دیتا ہے جسے چاہتا ہے، بیشک اس میں عقلمندوں کیلئے ضرور دیکھ کر سیکھنا ہے۔

(2) تحقیق تھی تمہارے لئے نشانی دو گرہوں میں جو ایک دوسرے سے ملے، (لڑائی کیلئے) ایک گروہ لڑ رہا تھا اللہ کی راہ میں، اور دوسرا کافر تھا، وہ دیکھ رہے تھے انہیں اپنی دو مثل آنکھوں سے دیکھنا، اور اللہ تعالیٰ طاقت پہنچاتا ہے، اپنی مدد سے جسے چاہتا ہے، بیشک اس میں عبرت ہے عقل والوں کیلئے۔

ماقبل سے تعلق:

پہلی آیۃ کریمہ میں ایک شان نزول بیان کیا گیا ہے کہ بدر میں قریش کے بڑے بڑے سرکردہ لوگوں کے قتل ہو جانے کے بعد مدینہ طیبہ لوٹ کر نبی کریم ﷺ نے یہود کو دعوت اسلام دی "ولکن اظهروا التمرد" لیکن انہوں نے سرکشی کو ظاہر کیا، اور اپنی طاقت اور تجربہ کاری کا ذکر کیا اور کہا کہ قریش نا تجربہ کار تھے، ہمارے ساتھ تمہیں واسطہ پڑا تو تمہیں سمجھ آجائے گا جنگ کسے کہتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا "ستغلبون" تم عنقریب مغلوب ہو جاؤ گے۔

اب اس آیۃ کریمہ میں بتایا جا رہا ہے کہ قریش مسلمانوں سے تعداد میں زیادہ تھے، اسلحہ بھی ان کے پاس کثیر تعداد میں تھا، لیکن "ان الله تعالى قهر الكفار وجعل المسلمين مظفرين منصورين، وذلك يدل على ان تلك الغلبة كانت بتاييد الله ونصره" اللہ تعالیٰ نے کافروں پر قہر کیا اور مسلمانوں کو کامیاب کیا اور ان کو اپنی امداد سے نوازا، جس سے پتہ چل گیا کہ جنگ میں فتح اللہ تعالیٰ کی تائید اور امداد سے حاصل ہوتی ہے۔ (کبیر)

اسلحہ اور کثرت تعداد عارضی چیزیں ہیں، مسلمان جب اپنی قوت ایمانیہ اور رب تعالیٰ کی امداد سے جنگ کرتا ہے تو کفار

بفضلہ تعالیٰ مغلوب ہی ہوتے ہیں۔

﴿قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا﴾

''تحقیق تھی تمہاری لئے نشانی دو گرہوں میں جو ایک دوسرے سے ملے (لڑائی کیلئے)''

(فئتین) فرقتین، واصلها افئی الحرب لان بعضهم الی بعض '' یعنی اصل میں ''فاء یفئی'' اور فاء یفئو کا معنی ہے لوٹنا، لڑائی میں بعض لوگ بعض کی طرف لوٹتے ہیں، اس لئے گروہ، فرقہ، جماعت کو ''فــــــــئة'' کہتے ہیں۔ ''فئتین'' تثنیہ ہے، یعنی دو گروہ۔ (معالم التنزیل للبغوی)

اور کبھی ''فأوت رأسه بالسیف'' اور کبھی ''فأیت رأسه بالسیف'' کہا جاتا ہے، جس کا معنی ہوتا ''فلقت رأســه بــالسیف'' میں نے تلوار سے اس کے سر کے دو ٹکڑے کر دیئے، چونکہ لڑائی میں ہر فرقہ ایک دوسرے کے ٹکڑے کرنے کے درپے ہوتا ہے، اسلئے لڑائی میں ہر گروہ، ہر فرقہ کو ''فئة'' کہا جاتا ہے (قرطبی)

''التقتا'' یوم بدر للقتال جب وہ دونوں بدر کے دن ملے لڑائی کیلئے۔ (جلالین)

﴿فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ﴾ ''ایک گروہ لڑ رہا تھا اللہ کی راہ میں''

یعنی ایک گروہ اللہ کی فرمانبرداری کرتے ہوئے اللہ کے حکم سے لڑ رہا تھا، اس گروہ سے مراد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام ہیں جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑ رہے تھے۔

﴿وَأُخْرَىٰ كَافِرَةٌ﴾ ''اور دوسرا کافر تھا''۔

اس جملہ کو جب ﴿فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ﴾ کے مقابل ذکر کیا تو اس سے پتہ چل گیا کہ یہ مختصر الفاظ اس پر دلالت کر رہے ہیں ''واخری کافرة یعنی تقاتل فی سبیل الطاغوت'' اور دوسرا گروہ کافر تھا جو شیطان کی راہ میں لڑ رہا تھا۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

ففیه شبه احتباک حیث حذف من کل نظیر ما اثبته فی الآخر'' اس میں ''احتباك'' کے پائے جانے کا احتمال واشتباہ ہے۔ یعنی دونوں جملوں سے مذکورہ کے مدمقابل کو حذف کیا گیا ہے۔ اصل میں مطلب یہ ہے ''کہ ایک گروہ مؤمن تھا اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا، اور دوسرا کافر تھا جو شیطان کی راہ میں لڑ رہا تھا۔ (صاوی)

اسی طرح طلباء کرام یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ ﴿قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ﴾ میں "آیة" پر تنوین تعظیم کیلئے ہے اسی وجہ سے علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا "آیة" "ای علامة عظیمة" اس میں تمہارے لئے بہت بڑی نشانی، بڑی علامت ہے۔ (روح المعانی)

اور طلباء کرام یہ بھی خیال کریں کہ "کان" اور "آیة" کے درمیان "لکم" کا فاصلہ ہے، اسی لئے فعل مذکر ہے۔

نکتہ: (فئة تقاتل فی سبیل اللہ) فھو فی اعلی درجات الایمان ولم یقل متومنة مد حالھم بما یلیق بالمقام ورمزا الی الاعتداد بقتالھم" (روح المعانی)

"ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑتا ہے" یہ لوگ ایمان کے اعلی درجہ پر فائز تھے، ان کے متعلق "مومنة" کا لفظ نہیں ذکر کیا، جیسا کہ "واخری کافرة" میں دوسرے گروہ کو کافر کہا" اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان والوں کی اس میں کامل مدح پائی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالی کی راہ میں لڑنے کیلئے ہر وقت تیار رہتے ہیں وہ اعلی درجہ کے مؤمن ہیں، ان کا ایمان سب پر عیاں ہے۔

﴿يَرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ﴾ "وہ دیکھ رہے تھے ان کو اپنی دو مثل آنکھوں سے دیکھنا"۔

وہ دیکھنے والے کون تھے اور دو مثل نظر آنے والے کون تھے؟ اس میں چار احتمال پائے گئے ہیں۔

(۱) پہلا احتمال یہ ہے کہ مراد یہ ہو کہ "کافروں کا گروہ مسلمانوں کو اپنی تعداد کے دو مثل سمجھ رہا ہو، انہیں یہ دکھائی دے رہا ہو کہ مسلمان دو ہزار کے قریب ہیں، اس معنی کے لحاظ پر کافروں کے دلوں پر رعب طاری کر دیا گیا کہ مسلمان تو ہم سے دوگناہ ہیں، ہم ان سے کیسے مقابلہ کریں گے، وہ تو ہم سے کم تعداد میں بھی ہو تو ہمارے لئے خطرہ ہی خطرہ ہیں، جب تعداد میں زیادہ ہوں تو پھر ہم نے مرنا ہی ہے، اس کے بغیر اور کیا ہونا ہے۔

(۲) "والاحتمال الثانی ان الفئة الکافرة رأت المسلمین مثلی عدد المسلمین ستمائة ونیفا وعشرین"

دوسرا احتمال یہ ہے کہ کافر مسلمانوں کو مسلمانوں کی تعداد کے دو مثل سمجھ رہے ہوں، کہ مسلمان تو تقریبا چھ سو پچیس، چھبیس کی تعداد میں ہیں۔ اس احتمال میں بھی کافروں کو مسلمان زیادہ کر کے دکھائے، وجہ اس میں بھی وہی جو ذکر کردی گئی، یعنی "والحکمة فی ذلک انه تعالی کثر المسلمین فی اعین المشرکین مع قلتھم لیھابوا فیحترزوا عن قتالھم" مسلمانوں کو کافروں کی آنکھوں میں زیادہ کر کے دکھانے میں حکمت یہ تھی کہ کافروں کے دلوں پر رعب طاری ہو جائے اور وہ لڑائی سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کریں۔

اعتراض: یہ دونوں احتمال درست نظر نہیں آتے کیونکہ سورۃ انفال میں تو یہ ذکر ہے۔"ویقللکم فی اعینھم" اور تمہیں ان کی نگاہوں میں تھوڑا کیا۔اس آیۃ کریمہ سے تو واضح طور پر یہ سمجھ رہا ہے کہ کافر مؤمنوں کو تھوڑا دیکھ رہے تھے، پھر زیادہ دکھانے کا کیا مطلب؟

جواب: "انہ کان التقلیل والتکثیر فی حالین مختلفین فقللوا اولا فی اعینھم حتی اجترؤا علیھم،فلما تلاقوا کثرھم اللہ فی اعینھم صاروا مغلوبین"

قلیل تعداد میں دکھانا اور کثیر تعداد میں دکھانا دو مختلف حالتوں میں تھا، پہلے کافروں کو مسلمان تھوڑے دکھائے گئے تا کہ وہ لڑنے پر جرأت پیدا کرلیں کہ یہ تو تعداد میں تھوڑے ہیں،ہم ان کو جلدی ہی ختم کر دیں گے۔جب کافر اور مسلمان لڑنے کیلئے ایک دوسرے کے آمنے سامنے آگئے تو کافروں کو مسلمان زیادہ تعداد میں دکھائے گئے تا کہ وہ خوف زدہ ہو کر مغلوب ہو جائیں (انہیں شکست ہو جائے) پھر اللہ تعالی کا ابتدائی طور پر کافروں کو مسلمانوں کی تعداد کم دکھانا اور آخر میں زیادہ دکھانا"ابلغ فی القدرۃ واظھار الآیۃ" رب تعالی کی کامل قدرت پر دلالت کر رہا ہے اور اس کی نشانی کا کامل اظہار پایا گیا ہے۔

(۳) "والاحتمال الثالث ان الرائین ھم المسلمون والمرئیین ھم المشرکون فالمسلمون راوا المشرکین مثلی المسلمین ستمائۃ وازید"

تیسرا احتمال یہ ہے کہ دیکھنے والے مسلمان ہوں،اور جن کی تعداد کو اپنی دو مثل دیکھا ہو وہ کافر ہوں، یعنی مسلمانوں نے کافروں کو چھ سو سے کچھ زائد مقدار میں دیکھا ہو۔اس کی وجہ یہ ہے کہ رب تعالی نے مسلمانوں کو اپنے سے دوگنا سے لڑنے کا حکم دیا ہے،یعنی ایک مسلمان دو کافروں سے مقابلہ کرے پیچھے نہ ہٹے۔

ارشاد باری تعالی ہے ﴿اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَۃٌ صَابِرَۃٌ یَّغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ﴾ اگر تم میں سے ایک سو صبر کرنے والے ہوں تو دو سو پر غالب ہوں گے۔جب مسلمانوں کو کافر مسلمانوں کی تعداد کی دو مثل دکھائے گئے ہوں تو اس میں دو فائدے حاصل ہو گئے،ایک یہ کہ مسلمان سست نہیں ہوئے کیونکہ وہ سمجھ رہے تھے کہ ہم نے اپنے سے دوگنا سے مقابلہ کرنا ہے۔اور دوسرا یہ کہ ان کے دل میں خوف پیدا نہیں ہوا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ہم نے اپنی دو مثل سے تو مقابلہ کرنا ہی ہے ان سے پیچھے تو ہم ہٹ ہی نہیں سکتے،دو مثل سے لڑنا تو رب تعالی کا حکم ہے۔

اعتراض: کافروں کی تعداد تو مسلمانوں سے تین گنا تھی،دوگنا وہ کیسے دکھائے گئے؟

جواب: دوگنا دکھانے کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان بہت زیادہ تعداد دیکھ کر خوف زدہ بھی نہ ہوں،اور مسلمانوں سے کم

تعداد نہ دکھانے کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان کافروں کو کم تعداد میں دیکھ کر جہاد میں سستی سے کام نہ لیں۔

(۴) "والاحتمال الرابع ان الرائین هم المسلمون وانهم رأوا المشركين على الضعف من عدد المشركين، چوتھا احتمال یہ ہے کہ دیکھنے والے مسلمان ہوں، اور انہیں نے مشرکوں کو ان کی اصل تعداد سے دوگنا دیکھا ہو، وہ سمجھ رہے ہوں کہ مشرکین دو ہزار کے قریب ہوں گے۔ لیکن اس احتمال کو ان الفاظ سے رد کیا گیا

"فهذا قول لايمكن ان يقول به احد، لان هذا يوجب نصرة المشركين بايقاع الخوف في قلوب المؤمنين تنافي ذلك"

یہ قول درست نہیں اس لئے کہ اس قول کے مطابق تو مشرکین کی امداد ہوگی اور مؤمنین کے دلوں میں رعب ڈالا گیا ہوگا، حالانکہ آیۃ کریمہ میں تو مؤمنین کو رب تعالیٰ کی طرف سے امداد حاصل ہونے اور کافروں کے مغلوب ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

اس آخری قول پر راقم کا موقف یہ ہے کہ اسے رد کرنے کی ضرورت نہیں، ہوسکتا ہے کہ رب تعالیٰ نے مؤمنین کو مشرکین ان کی تعداد کی دومثل دکھادئے ہوں اور ساتھ ساتھ جرأت بھی عطاء کردی ہو، ہر مؤمن یہی خیال کررہا ہو کہ بیشک یہ ہم سے تعداد میں چھ گنا ہیں لیکن ہم ان کے ناپاک ارادوں کو خاک میں ملادیں گے۔ بیشک رب تعالیٰ نے ایک مسلمان کو دو کافروں سے لڑنے کی اجازت تو فرمائی، لیکن رب تعالیٰ کا اس سے پہلے ارشاد یہ تھا ﴿وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ﴾ اگر تم میں سے بیس صبر کرنے والے ہوں تو وہ دوسو (کافروں) پر غالب رہیں گے" (واللہ اعلم بالصواب)

ایک اور احتمال: اس احتمال کا تعلق دوسری قراءت سے ہے جس میں تاء سے "ترونهم" پڑھا گیا ہے۔ اس صورت میں خطاب یہود کو ہوگا، کیونکہ پہلے خطاب "انكم ستغلبون" یہود کو ہی ہے۔ "فيكون المراد ترون ايها اليهود المشركين مثلي المؤمنين في القوة والشوكة" اب مطلب یہ ہوگا کہ "اے یہود یو تم مشرکوں کو مؤمنوں کے مقابل تعداد میں، قوت میں، دبدبہ میں دومثل دیکھ رہے ہو، لیکن کامیابی اسے ہی حاصل ہوتی ہے جسے رب تعالیٰ کی طرف سے امداد حاصل ہوتی ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

راقم کا موقف:

راقم کے نزدیک یہ تمام اقوال مجتمع ہو سکتے ہیں، یوں بیان کر کے دیکھا جائے، یہود جو دور سے مؤمنین اور مشرکین کو دیکھ رہے تھے وہ مشرکوں کی تعداد زیادہ دیکھ کر خوش ہورہے تھے کہ مؤمن مغلوب ہو جائیں گے، ان کا رد کیا کہ کامیابی

اللہ تعالیٰ کی نصرت سے حاصل ہوگی۔مشرکین نے ابتدائی طور پر مسلمانوں کو مسلمانوں کی تعداد کے دوگنا سمجھ کر جرأت وبہادری دکھائی، عین جنگ کے موقع میں ان کو مسلمان اپنے سے دوگنا دکھائی دینے لگے اس طرح وہ خوف زدہ اور بزدل ہوکر مغلوب ہوگئے۔مؤمنین کو ابتدائی طور پر مشرکین اپنے سے دوگنا دکھائی دیئے،مؤمنین نے سمجھا کہ ایک دو کا مقابلہ ہے،لیکن بعد میں مؤمنین نے مشرکین کو مشرکین کی دو مثل سمجھ کر جرأت وبہادری سے مقابلہ کیا، کفار کو ذلیل وخوار کردیا،اس طرح کافر مغلوب ہوگئے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

اصل ان احتمالات کی وجہ ضمائر کے مرجع کی وجہ سے ہے، کہ ضمائر کے مراجع کیا ہیں،﴿يَرَوْنَهُم مِّثْلَيْهِمْ﴾ میں تین ضمیریں استعمال ہوئی ہیں، ایک واؤ ضمیر، دوسری "یرونھم" میں "ھم" ضمیر منصوب متصل، اور تیسری "مثلیھم" میں "ھم" ضمیر مجرور متصل۔

(۱) جب واؤ ضمیر کفار کی طرف لوٹے، اور منصوب اور مجرور کی دونوں ضمیریں مؤمنین کی طرف لوٹیں، تو معنی یہ ہوگا، وہ کفار مؤمنین کو مؤمنین کی دو مثل دیکھ رہے تھے۔

(۲) جب واؤ ضمیر کفار کی طرف لوٹے اور منصوب ضمیر مؤمنین کی طرف اور مجرور ضمیر کفار کی طرف لوٹے، تو معنی یہ ہوگا "وہ کفار مؤمنین کو اپنی دو مثل دیکھ رہے تھے"۔

(۳) جب واؤ ضمیر مؤمنین کی طرف لوٹے اور منصوب ضمیر کفار کی طرف لوٹے اور مجرور ضمیر مؤمنین کی طرف لوٹے، تو معنی یہ ہوگا "وہ مؤمنین کفار کو اپنی دو مثل دیکھ رہے تھے"۔

(۴) جب واؤ ضمیر مؤمنین کی طرف لوٹے اور منصوب ضمیر اور مجرور ضمیر کفار کی طرف لوٹیں، تو معنی یہ ہوگا "مؤمنین کفار کو کفار کی دو مثل دیکھ رہے تھے۔ (ماخوذ از صاوی)

واقعہ بدر عظیم نشانی کیسے؟

اس میں چند وجوہ پائی گئی ہیں، جن سے اس واقعہ کا عظیم نشانی سمجھ آنا واضح ہے۔

پہلی وجہ: ان المسلمین کان قداجتمع فیھم من اسباب الضعف عن المقاومة امور"

مسلمان کو کفار کے ساتھ مقابلہ کرنے میں ضعف کے چند اسباب حاصل تھے، باوجود ضعف کے مسلمانوں کو فتح حاصل

ہونا اور کفار کو شکست حاصل ہونا بہت بڑی نشانی ہے۔

وہ اسباب ضعف کیا تھے: اسباب ضعف یہ تھے (۱) مسلمان کم تعداد میں تھے، اور کفار زیادہ تعداد میں تھے۔ کفار بدر میں ایک ہزار کے قریب تھے، نو سو سے زیادہ تھے اور ہزار سے کچھ کم تھے، اس وقت کسور کو بیان نہیں کیا جاتا تھا، اس لئے کہیں کفار کی تعداد ایک ہزار بیان کی گئی، اور کہیں نو سو بیان کر دی گئی۔ بعض اوقات کسور کو بیان کر دیا جاتا تھا، اس لئے ساڑھے نو سو کا ذکر بھی ملتا ہے۔ (کبیر بزیادۃ)

مسلمان ان کے مقابل تین سو تیرہ تھے۔ ستتھر (۷۷) مرد مہاجرین، اور دو سو چھتیس (۲۳۶) مرد انصار سے تھے۔ مہاجرین کا جھنڈا حضرت علی ﷺ کے پاس تھا اور انصار کا جھنڈا عبادہ بن صامت کے پاس تھا۔ (معالم التنزیل للبغوی)

کفار کے رئیس عتبہ بن شیبہ، ربیعہ بن عبد الشمس، ابوسفیان اور ابوجہل وغیرہ تھے۔ (روح البیان)

(۲) "ومنها انهم اخرجوا غير قاصدين للحرب فلم يتاهبوا" اسباب ضعف میں سے اور یہ تھا کہ مسلمان جنگ کے ارادہ سے نہیں نکلے تھے اور نہ ہی جنگ کی انہوں نے کوئی تیاری کی ہوئی تھی۔ (کبیر)

کیونکہ مسلمان صرف ایک قافلہ کی سرکوبی کیلئے نکلے تھے، اس کی وجہ اصل میں یہ تھی کہ وہ قافلہ ابوسفیان کی زیر قیادت تجارت کیلئے گیا ہوا تھا جس نے بدر سے گذرنا تھا، اور تجارتی نفع تمام کا تمام مسلمانوں کے خلاف جنگوں میں خرچ کرنا تھا، اس لئے رب تعالی نے نبی کریم ﷺ کو مطلع فرمایا، اور رب تعالی کے حکم سے ہی آپ نے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ چلو قافلہ کو روکنا ہے۔ (بدر کا تفصیلی واقعہ چوتھے پارہ ﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ﴾ کی وضاحت کے ضمن میں انشاء اللہ آئے گا)

(۳) "ومنها قلة السلاح والفرس" اور اسباب ضعف میں سے یہ تھا کہ مسلمانوں کے بہت ہی تھوڑے ہتھیار کے پاس ستتھر اونٹ تھے، اور دو گھوڑے، ایک گھوڑا حضرت مقداد بن عمرو ﷺ کا تھا، اور دوسرا گھوڑا حضر مرثد بن ابی مرثد ﷺ کا تھا، زیادہ حضرات پیدل ہی تھے۔ اور مؤمنین کے پاس صرف چھ زرہ اور دو تلواریں تھیں، (باقیوں کے پاس کھجور کی چھڑیاں تھیں) کافروں کے پاس ایک سو گھوڑے تھے، ہر شخص مسلح تھا، پھر کافروں کو شکست ہونا اور مسلمانوں کو فتح حاصل ہونا صرف اللہ تعالی کی مہربانی اور اس کے فضل سے تھا اس لئے یہ بہت بڑی نشانی ہے۔ (از معالم التنزیل للبغوی)

(۴) "ومنها ان ذلك ابتداء غارة في الحرب لانها اول غزوات رسول الله ﷺ"

اسباب ضعف میں اور یہ تھا کہ مسلمانوں کی یہ پہلی جنگ تھی، جنگی تجربہ نہیں تھا، لیکن مسلمانوں کو بہت بڑی کامیابی کا حاصل ہونا بہت بڑی نشانی ہے۔ کافر مسلمانوں کے مقابل تعداد میں زیادہ تھے۔ وہ جنگ کی تیاری کر کے آئے

تھے۔ان کے پاس ہتھیار اور گھوڑے زیادہ مقدار میں تھے۔وہ لوگ جنگ کے ماہر تھے،کئی مرتبہ لڑائیاں کر چکے تھے۔ان اسباب کے ہوتے ہوئے،یعنی مسلمانوں کو اسباب ضعف حاصل تھے،اور کافروں کو اسباب قوت حاصل تھے لیکن مسلمانوں کو ہی فتح حاصل ہوئی، یہ بہت بڑی نشانی تھی۔"ولما كان خارجا عن العادة كان معجزا" جب یہ عادت کے خلاف تھا،ظاہری اسباب کا اس میں کوئی دخل نہیں تھا،صرف نبی کریم ﷺ کی دعاء اور برکت سے اتنی بڑی کامیابی ہونا درحقیقت نبی کریم ﷺ کا معجزہ تھا۔

دوسری وجہ: نبی کریم ﷺ نے جنگ سے پہلے ہی خبر دے دی تھی کہ اللہ تعالیٰ مؤمنین کو فتح نصیب کرے گا اور قریش کو شکست دے گا،اور ساتھ ساتھ زمین پر نشان لگا کر بتا دیا تھا"هذا مصرع فلان"هذا مصرع فلان" یہ فلاں کے قتل ہونے کی جگہ ہے یہ فلاں کے قتل ہونے کی جگہ ہے۔

"فلما وجد مخبر خبره في المستقبل على وفق خبره كان ذلک اخبارا عن الغيب فكان معجزا"

جب نبی کریم ﷺ کی مستقبل کی خبر مکمل طور پر سچی ثابت ہوئی تو یہ بہت بڑی نشانی ہے اور نبی کریم ﷺ کی غیبی خبر کا کامل طور پر سچا ہونا آپ کا معجزہ ہے۔ (کبیر)

سبحان اللہ! علامہ رازی رحمہ اللہ نے کیا خوب مصطفےٰ کریم ﷺ کا علم غیب ثابت کیا ہے، بلکہ واضح کر دیا آپ کا علم غیب آپ کا معجزہ ہے،آپ کے علم غیب کا انکار آپ کے معجزہ کا انکار ہے،اور اللہ تعالیٰ کے نبی کریم ﷺ معجزہ کا انکار دراصل نبوت کا انکار ہے۔ (راقم)

تیسری وجہ: کہ واقعہ بدر بہت بڑی نشانی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا﴿يَرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ﴾ وہ ان کو اپنی دومثل دیکھ رہے تھے آنکھوں سے دیکھنا۔

"والاصح في تفسير هذه الآية ان الرائين هم المشركون والمرئيين هم المؤمنون"

اس آیۃ کریمہ کی تفسیر میں زیادہ صحیح قول یہی ہے کہ بیشک دیکھنے والے مشرک تھے جو مؤمنوں کو دیکھ رہے تھے،دومثل سے مراد دو احتمال ہیں،ایک یہ کہ مشرک مسلمانوں کو اپنی دومثل سمجھ رہے تھے،یعنی دو ہزار کے قریب۔اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ مشرکین مسلمانوں کو مسلمانوں کی دومثل سمجھ رہے تھے،یعنی چھ سو کے قریب۔مشرکین کے دلوں میں خوف ڈال دیا گیا کہ وہ مسلمانوں کو زیادہ تعداد میں دیکھ کر ڈر رہے تھے"وذلک معجز"یہ بھی نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے۔ (کبیر)

چوتھی وجہ: اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی پانچ ہزار فرشتوں سے امداد فرمائی،جس کی وجہ سے

مسلمانوں کو فتح نصیب فرمائی، اس لحاظ پر یہ بہت بڑی نشانی ہے۔ (از کبیر)

﴿رَأْیَ الْعَیْنِ﴾ ''آنکھوں سے دیکھنا۔''

''نصب علی المصدر یعنی رؤیة ظاهرة مکشوفة لالبس فیها معاینة کسائر المعاینات''(روح البیان)

مصدریت کی وجہ سے ''رای'' پر نصب ہے۔ یعنی مفعول مطلق ہے، جس کا معنی ہے، دیکھنا، واضح منکشف ہونا۔ اب مطلب یہ ہو گیا (وہ انہیں دو مثل دیکھ رہے تھے آنکھوں سے دیکھنا، یعنی ان پر دو مثل واضح اور ظاہر تھیں، کسی قسم کا اس معاینہ میں اشتباہ نہیں تھا، نہ ہی وہ کسی چیز سے خلط ملط تھا۔

﴿وَاللّٰهُ یُؤَیِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ طاقت پہنچاتا ہے اپنی مدد سے جسے چاہتا ہے''۔

''یـؤیـد ای یـقـول'' یعنی ''یـؤیـد'' کا معنی طاقت دینا، تقویت پہنچانا، مضبوط کرنا، زور پہنچانا، زور دینا۔ ''بنصره'' اپنی مدد سے ''من یشاء' جسے چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اشیاء (چیزوں) کو اسباب پر مرتب فرمایا ہے، لیکن بعض اوقات اپنی قدرت کاملہ کا اظہار فرماتا ہے، بغیر اسباب کے اپنی نعمتیں عطاء فرماتا ہے۔

''(بنصره من یشاء)ای یرید من غیر توسیط الاسباب العادیة کما ایدالفئة المقاتلة فی سبیله''

اللہ تعالیٰ طاقت پہنچاتا ہے جسے چاہتا ہے، یعنی بغیر اسباب عادیہ کے طاقت پہنچاتا ہے، جیسا کہ اس نے اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کی امداد فرمائی کہ قلیل تعداد والوں کی بے سروسامانی میں امداد فرمائی کہ کافروں کے دلوں میں رعب وخوف ڈال دیا۔ فرشتوں سے مسلمانوں کی امداد کی، کفار کو شکست فاش دی۔ (از روح البیان)

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ﴾ ''بیشک اس میں عبرت ہے عقل والوں کیلئے''

''ذلک'' کا اشارہ ہے، ''قلیل کو کثیر دکھانے'' کی طرف، یعنی عقل والوں کو اس سے عبرت حاصل ہوتی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے قلیل تعداد والوں کو کثیر کر کے دکھایا، اور قلیل تعداد والوں کو کثیر تعداد پر فتح عطاء کی، نا تجربہ کاروں کو جنگی ماہرین پر فتح عطاء کی، جن کے پاس ہتھیار نہیں تھے ان سے ہتھیاروں والوں کو شکست دلادی۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت تھی، جس کی وجہ سے مسلمانوں کو عظیم کامیابی حاصل ہوئی، اور اس میں عقل والوں کیلئے عبرت ہے۔

''عبرة'' اور ''عبور'' کا ایک ہی معنی ہے ''گذرنا'' جیسا کہ ''جلسة' اور 'جلوس' کا ایک ہی معنی ہے 'بیٹھنا' عبر کا معنی ہے ''نصیحت پکڑنا'' اس میں بھی ''کسی کام سے گذر کر نصیحت حاصل کی جاتی

ہے،لھذا ''گذرنے والا معنی'' نصیحت پکڑنے، میں موجود ہے۔

''لاولی الابصار''لذوی العقول والبصائر''یعنی''اولی الابصار''کا معنی ہے''عقل وبصیرت رکھنے والے''

تنبیہ: ''فعلی العاقل ان یعتبر بالآیات ولایغتر بکثرة الاعدادمن الاموال والاولاد وعدم اجتهاده لمعاده فان الله یمتعه قلیلا ثم یضطره الی عذاب غلیظ''

عقل والوں کو چاہئے کہ اللہ تعالی کی نشانیوں سے عبرت پکڑیں، مال اور اولاد کی کثرت پر ناز نہ کریں بلکہ قیامت کیلئے تیاری کریں، اس لئے کہ جو قیامت کی تیاری نہیں کرتے، صرف دنیا کے مال ودولت پر فخر کرتے ہیں، انہیں رب تعالی دنیا میں کچھ دیر کیلئے مہلت دے دیتا ہے، لیکن قیامت میں انہیں شدید عذاب دے گا، بلکہ بعض اوقات دنیا میں بھی انہیں عذاب میں مبتلاء کر دیا جاتا ہے۔ جو شخص کفر میں مبتلاء ہوتا ہے وہ ازلی طور پر بد بخت ہوتا ہے، اس پر خواہشات، نفس، شیطان اور دنیا کی لذتوں کا غلبہ ہوتا ہے، جب اس پر خواہشات اور نفس کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ اس کافر کو''اسفل السافلین''میں پہنچا دیتے ہیں۔

''فیعیش فیها ثم یموت علی ماعاش فیه ویحشر علی مامات علیه فی قعر جهنم وبئس المهاد''

وہ کافر رب تعالی سے دوری کی ذلت میں زندگی بسر کرتا ہے، پھر اسی پر وہ مرجاتا ہے، پھر اسے جہنم کے گہرے گڑھے میں پہنچا دیا جاتا ہے، یہ اس کا برا ٹھکانا ہے۔ (روح البیان)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ o﴾ (آیۃ نمبر ۱۴)

(1) لوگوں کیلئے آراستہ کی گئی ان خواہشوں کی محبت عورتوں اور بیٹے اور تلے اوپر سونے چاندی کے ڈھیر اور نشان کئے ہوئے گھوڑے اور چوپائے اور کھیتی یہ جیتی دنیا کی پونجی ہے، اور اللہ تعالیٰ ہے جس کے پاس اچھا ٹھکانا۔

(2) آراستہ کی گئی لوگوں کیلئے محبت خواہشات کی یعنی عورتوں اور بیٹوں کی اور کثیر مال جمع کیا ہوا یعنی سونے اور چاندی کی اور خوبصورت گھوڑوں کی اور چوپاؤں اور کھیتی کی۔ یہ سامان ہے دنیا کی زندگی کا، اور اللہ کے ہاں اچھا ٹھکانا ہے۔

ماقبل سے تعلق:

اس سے پچھلی آیۃ کریمہ میں بدر کا ذکر فرمایا، جس سے واضح ہو رہا تھا کہ کفار اپنے مال و دولت اور اپنی اولاد اور ظاہری اسباب پر سہارا لگائے ہوئے تھے، لیکن مؤمنین رب تعالیٰ پر بھروسہ کئے ہوئے تھے، فتح ان کو ہی حاصل ہوئی جن کا سہارا اللہ پر تھا اس آیۃ کریمہ میں بیان کیا جا رہا ہے کہ لوگوں کیلئے خواہشات کی محبت مزین (آراستہ) کر دی گئی، یعنی لوگوں کی عورتوں اور بیٹوں سے محبت کو مزین کر دیا گیا، اور لوگوں کی کثیر جمع ہوئے مال یعنی سونے اور چاندی سے محبت کو آراستہ کر دیا گیا، اور لوگوں کیلئے خوبصورت گھوڑوں اور چوپاؤں اور کھیتی سے محبت کو آراستہ کر دیا گیا لیکن یہ سب دنیا کا سامان ہے اصل یہ ہے کہ رب تعالیٰ کو راضی کیا جائے اسی پر بھروسہ کیا جائے کیونکہ اسی کے ہاں حاضر ہونا ہے اور اسی نے اجر و ثواب عطاء کرنا ہے اور اسی کے ہاں اچھا ٹھکانا ہے۔

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ﴾ ''آراستہ کی گئی لوگوں کیلئے محبت خواہشات کی۔''

آراستہ کرنے والا کون ہے؟ یعنی ''زین'' کا فاعل کون سا ہے؟ اس میں دو قول ہیں ایک یہ ہے کہ اس کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے، کیونکہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ

عَمَلاً﴾ بیشک ہم نے بنایا جو کچھ زمین پر ہے اس کیلئے زینت، تاکہ ہم ان کو آزمائیں، کون سا ان میں اچھے عمل کرنے والا ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ نے خواہشات کی محبت کو آراستہ کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مقصود لوگوں کا امتحان ہے کہ زوجہ بھی حاصل ہو اور بیٹے بھی، اور سونے اور چاندی کا کثیر مال بھی جمع ہو، اور خوبصورت گھوڑے بھی حاصل ہوں، اور چوپائے اور کھیتی بھی حاصل ہو، تو پھر دیکھا جائے کہ ان چیزوں سے کوئی شخص محبت کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے دور ہو جاتا ہے، یا کہ ان چیزوں کے حاصل ہونے کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا رہتا ہے، اور اچھے عمل کرتا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ "زین" کا فاعل شیطان ہے، یعنی شیطان نے ان چیزوں کو لوگوں کی نظر میں آراستہ کر دیا ہے کہ وہ ان چیزوں سے محبت کرنے کی وجہ سے رب تعالیٰ سے دور ہو جائیں۔جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا﴿وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ﴾ اور آراستہ کیئے ہیں ان کیلئے شیطان نے ان کے اعمال۔ (ماخوذ از روح البیان)

دونوں قولوں میں خوبصورت محاکمہ:

"ویصح اسناد التزیین الی اللہ تعالی بالایجاد والتهیئة للانتفاع ونسبته الی الشیطان بالوسوسة"

مزین کرنے آراستہ کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف اس لحاظ پر ہے کہ ہر چیز کا خالق وہی ہے اور ہر چیز کو نفع مند اسی نے بنایا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے خواہشات کی محبت کو لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دیا ہے۔اور شیطان کی طرف نسبت اس طرح کرنی صحیح ہے کہ وہ ان چیزوں کی محبت کو آراستہ کر کے لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے، اور لوگوں کو رب تعالیٰ سے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

"حب الشهوات" ذکر شہوات کا ہے اور مراد اس سے وہ چیزیں ہیں جن کی خواہش کی جائے۔اس طرح کا استعارہ عام طور پر پایا جاتا ہے جیسا کہ "قدرة" ذکر کر کے مراد "مقدور" لیا جاتا ہے اور "رجاء" ذکر کر کے مراد "مرجو" لیا جاتا ہے اور "علم" ذکر کر کے مراد "معلوم" لیا جاتا ہے۔"یقال هذه شهوة فلان" ای مشتهاه" عام طور پر کہا جاتا ہے یہ فلاں شخص کی شہوت ہے، یعنی یہ چیز فلاں کی پسندیدہ ہے اس چیز کی طرف اس کی خواہش پائی جاتی ہے۔

اس استعارہ میں (ذکر شہوت مراد مشتہاۃ) دو فائدے ہیں، **ایک فائدہ** یہ ہے کہ عین چیزیں جن کی خواہش پائی جاتی ہے، ان کو خواہش سے ذکر کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ ان چیزوں کی انہیں بہت خواہش ہوتی ہے، اور ان کے یہ بہت حریص ہیں کہ ہم ان سے نفع اٹھائیں۔**دوسرا فائدہ** یہ حاصل ہوا کہ حکماء کے نزدیک شہوت گھٹیا

اوررزیل صفت ہے، شہوت (خواہش) کے پیچھے ہی چلنا مذموم (برا) فعل ہے، کیونکہ صرف خواہشات کی پیروی چوپاؤں کا کام ہے۔ یہاں مشتہاۃ چیزوں (جن چیزوں کی خواہش کی جائے) کو "شھوت" سے تعبیر کر کے ان سے نفرت دلائی گئی ہے کہ اصل چیز یہ ہے کہ اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ کو راضی رکھا جائے، صرف خواہشات کے پیچھے چل کر انسان اپنے آپ کو چوپاؤں سے کیسے ممتاز کر سکتا ہے (ماخوذ از کبیر)

متکلمین کا استدلال:

متکلمین حضرات نے بیان فرمایا ہے کہ محبت اور شہوت، دونوں علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں کیونکہ "حــب" اور "شھــوات" میں اضافت پائی گئی ہے مضاف اور مضاف الیہ میں مغایرت پائی جاتی ہے، تو پتہ چلا کہ "حب" اور چیز ہے، اور "شھوت" اور چیز ہے۔ خواہش کی نسبت اللہ تعالی کی طرف زیادہ طور پر پائی جاتی ہے، کہ اس نے لوگوں کے دلوں میں شہوت کو پیدا کیا اس ظاہری نسبت کی وجہ سے ہی یوں کہہ لیا جاتا ہے "والشھوۃ من فعل اللہ" شہوت اللہ کے افعال سے ہے۔ اور محبت بھی اگرچہ رب تعالی کی ہی تخلیق ہے، لیکن بظاہر بندوں کی طرف یہ زیادہ طور پر منسوب ہوتی ہے، اسلئے کہا جاتا ہے "والمحبۃ من افعال العباد" محبت بندوں کے افعال سے ہے۔

"وھی عبارۃ عن ان یجعل الانسان کل غرضہ وعیشہ فی طلب اللذات والطیبات"
محبت کا بندوں کی طرف منسوب ہونے کا یہ مطلب ہے کہ بندہ اپنی محبت سے ہر غرض اور زندگی کی گزران کے ہر شعبہ میں لذتوں اور پسندیدگی کو طلب کرتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

حکماء کی خوبصورت بحث:

"قالت الحکماء" "الانسان قد یحب شیئا ولکن یحب ان لایحبہ" حکماء حضرات نے بیان فرمایا ہے کہ انسان کبھی کسی چیز سے محبت کرتا ہے، لیکن وہ یہ بھی چاہتا ہے کاش کہ اس سے میری محبت نہ ہو۔ جیسا کہ مسلمان کبھی حرام چیزوں کی طرف میلان کرتا ہے، بظاہر اسکی ان حرام چیزوں سے محبت ہوتی ہے "ولکنہ یحب ان لایحب" لیکن چاہتا وہ یہی ہے کہ کاش ان حرام چیزوں سے میری محبت نہ ہو۔ یہ محبت حقیقت میں محبت نہیں، وہ اپنی طبعی کمزوری کی وجہ سے بظاہر گناہوں سے محبت کر رہا ہے، لیکن وہ گناہوں سے دور رہنے کی تمنا بھی رکھتا ہے۔

"واما من احب شیئا واحب ان یحبہ فذاک ھو کمال المحبۃ" ایک چیز سے محبت ہو، اور تمنا بھی یہی ہو کہ میری محبت اس سے برقرار رہے، بس یہی کام محبت ہے۔ "فان کان ذلک فی جانب الخیر فھو

کمال السعادة'' اگر کامل محبت نیکیوں سے ہو، یعنی نیکیوں سے وہ محبت رکھتا ہے، اور اس کی تمنا بھی یہ ہے کہ اس کی نیک کاموں سے محبت برقرار رہے تو یہ کامل سعادت (نیک بختی) ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق ارشاد فرمایا ﴿فَقَالَ اِنِّیْ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَیْرِ عَنْ ذِکْرِ رَبِّیْ﴾ تو سلیمان نے کہا مجھے ان گھوڑوں کی محبت پسند آتی ہے اپنے رب کی یاد کیلئے۔ ''ومعناه احب الخير واحب ان اكون محبا للخير'' معنی اس کا یہ ہے کہ آپ نے کہا میں اس بہتر مال سے محبت کرتا ہوں اور چاہتا بھی ہوں یہی ہوں کہ اس بہتر مال سے محبت کرتا ہی رہوں، کیونکہ گھوڑے جہاد میں کام آنے والے ہیں، تو آپ کی یہ محبت کامل محبت تھی۔

اگر محبت کا تعلق شر (برائیوں) سے ہو، تو وہی محبت بدبختی ہے، جیسا کہ اسی زیر بحث آیۃ کریمہ میں ذکر کیا گیا ہے ''زين للناس حب الشهوات'' یہاں بھی بری خواہشات ہی مراد ہیں کہ ان سے محبت بری ہے اور بدبختی ہے، ورنہ اچھی اور نیک خواہشات سے محبت کس طرح بری ہو سکتی ہے؟ یقیناً وہ اچھی ہو گی، بری نہیں ہو گی۔ (از کبیر)

محبت راسخہ کا دل سے زوال ممکن نہیں:

جب شہوت (خواہش) میں تین چیزیں پائی جائیں تو وہ محبت شدید قوی ہو جاتی ہے ''ولا يكاد ينحل الابتوفيق عظيم من الله تعالى'' اس درجہ کی محبت کا زوال سوائے اللہ تعالیٰ کی عظیم توفیق کے ممکن نہیں۔ وہ تین چیزیں یہ ہیں:

(۱) جن چیزوں کی طرف خواہش کی جا سکتی ہو ان کی خواہش بھی پائی جائے۔

(۲) ان چیزوں کی خواہش سے انسان محبت بھی رکھتا ہو یعنی ایسا نہ ہو کسی چیز کی خواہش بھی ہو اور دل میں اس کی محبت نہ ہو، بلکہ دل چاہتا ہو کہ کاش یہ چیز مجھے حاصل نہ ہوتی۔

(۳) وہ انسان اپنی خواہش والی چیز سے محبت کو حسین اور فضیلت والا سمجھے۔

''انه يعتقد ان تلك المحبة حسنة وفضيلة'' یعنی جس چیز کے حصول کی تمنا اور محبت پائی جائے وہ اچھی ہو یا بری ہو لیکن انسان کا عقیدہ یہ ہو کہ یہ اچھی خواہش محبت ہے، اس کے حاصل کرنے میں تو بہت فضیلت پائی گئی ہے۔ (از کبیر)

جسمانی لذتوں کی طرف زیادہ میلان کیوں؟

اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ لذیذ چیزوں کی دو قسمیں ہیں، ایک جسمانی، دوسری روحانی۔ جسمانی لذیذ چیزیں ہر شخص کو ابتدائی طور پر پیدائش کے وقت سے ہی حاصل ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ روحانی لذیذ چیزیں بہت کم شخصوں کو

حاصل ہوتی ہیں۔ یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جن پر خصوصی فیضان باری تعالی ہوتا ہے۔

"ثم ذلک الانسان انما یحصل له تلک اللذة الروحانیة بعد استئناس النفس باللذات الجسمانیة"

پھر وہ انسان جو روحانی لذتیں حاصل کرتا ہے، اسے بھی پہلے جسمانی لذتیں حاصل ہوتی ہیں، کیونکہ ہر انسان خواہ کتنا ہی نیک اور متقی ہو اسے نفس سے انس ہوتا ہی ہے۔

یوں سمجھا جائے کہ جسمانی لذتیں "ملکہ" کی حیثیت میں ہوتی ہیں، "ملکہ" وہ کیفیت جو پختہ ہو، اور راسخ ہوں، وہ زائل نہیں ہوتیں بلکہ وہ عادت کے درجہ میں ہوتی ہیں "وانجذاب النفس الی اللذات الروحانیة کالحالة الطارئة التی تزول بادنی سبب" نفس کا روحانی لذتوں کی طرف کھنچنا "حالة طارئة" کی طرح ہوتا ہے، (یعنی وہ کیفیت جو کبھی کبھی حاصل ہو وہ حالت "حالة طارئة" کہلاتی ہے) جو معمولی سبب سے زائل ہو جاتی ہے۔

"فلا جرم کان الغالب علی الخلق انما هو المیل الشدید الی اللذات الجسمانیة"

یقیناً مخلوق پر غالب طور پر جسمانی لذتوں کی طرف ہی زیادہ میلان پایا جاتا ہے۔

روحانی لذتوں کی طرف میلان بہت ہی کم، خوش بخت لوگوں کو حاصل ہوتا ہے، اور ان کو بھی کبھی کبھی حاصل ہوتا ہے۔ لیکن جسمانی لذتوں کی طرف توجہ اور خواہش ہر شخص کی ہوتی ہے، کسی کی توجہ زیادہ اور کسی کی توجہ کم۔ (ماخوذ از کبیر)

جنت کا حصول مشکل اور جہنم کا آسان:

❁ عن انس عن النبی ﷺ حفت الجنة بالمکاره وحفت النار بالشهوات" (مسلم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت کو مشکلات سے ڈھانپ دیا گیا اور جہنم کو خواہشات سے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ جنت کا حصول سوائے مشکلات کے جنگل کے طے کرنے اور ان مشکلات پر صبر کرنے کے سوا نہیں۔

وجہ واضح ہے کہ بظاہر نیکی کے کام مشکل نظر آتے ہیں، نماز ہو یا زکوۃ، روزہ ہو یا حج، قربانی ہو یا دوسرے صدقات واجبہ، سب ہی انسان کی طبیعت میں مشکل چیزیں ہیں، ان پر عمل کرنا انسان کی طبیعت کے بظاہر خلاف نظر آتا ہے، اور یہی چیزیں ہیں جن پر عمل کرنے کی وجہ سے جنت میں جانا نصیب ہوگا،

حاصل کلام یہ ہے کہ مومن شخص نیکی کے کاموں کے ظاہری مشکلات کو برداشت کر کے نیکی کے کام کرے اور اپنے لئے جنت کی راہ آسان کرے اور ساتھ ساتھ اللہ تعالی کے فضل کی دعاء بھی کرتا رہے، حقیقی کامیابی اللہ تعالی کے فضل سے حاصل ہوتی ہے اور آگ کو حاصل کرنا آسان ہے کہ انسان خواہشات کی پیروی کرے، حرام کو حلال سمجھے تو وہ کافر ہو

جائے گا یہی راہ ہے جہنم میں جانے کی۔ "العیاذ باللہ من النار" "وان النار لا ینجی منھا الا بترک الشھوات وفطام النفس عنھا" آگ سے نجات اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک ان خواہشات کو نہ چھوڑ دے جو اسے حرام کاموں کا مرتکب بنا دیتی ہیں اور حرام کو حلال سمجھنے کی طرف لے جاتی ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ اپنے نفس کو ان چیزوں سے ہٹا لے۔

❁ "روی عنہ ﷺ انہ قال طریق الجنۃ حزن بربوۃ وطریق النار سھل بسھوۃ"
نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا جنت کی راہ سخت گھائیوں کو عبور کرنا ہے اور جہنم کی راہ آسان نرم زمین کو عبور کرنا ہے۔

"حزن" (حاء پر فتح اور نون ساکن) سخت جگہ، اور "ربوۃ" بلند جگہ، دونوں لفظوں کا مجموعی معنی "سخت بلند جگہ" (سخت گھائیاں) "السھل" آسان "السھوۃ" نرم مٹی والی زمین، "سھل بسھوۃ" کا مجموعی معنی "آسان نرم زمین" کو عبور کرنا۔

حدیث پاک سے واضح ہوا کہ جنت کی راہ مشکل اور بلند گھاٹیوں کو عبور کرنے کے مترادف ہے۔ اور جہنم کی راہ آسان ہے اس میں کوئی مشکلات نہیں، کوئی رکاوٹ، کوئی پابندی نہیں۔ (ماخوذ از قرطبی)

اعتراض: ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ﴾ میں تو انبیاء کرام بھی داخل ہو جائیں گے، کیونکہ "الناس" تو سب لوگوں کو شامل ہے، حالانکہ "والانبیاء مع انھم معصومون من ذلک" انبیاء کرام شہوات نفسانیہ وغیرہ میں مبتلاء ہونے سے پاک ہیں، تو مطلقاً "الناس" ذکر کرنا کس طرح صحیح ہے؟

جواب: "انہ عام مخصوص بما عدا الانبیاء واماھم فھم معصومون من المیل الی ماسوی اللہ" کہ اس مقام میں "الناس" کی عمومیت سے انبیاء کرام کو خارج کیا ہوا ہے، ان کی توجہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کے سواء اور چیزوں کی طرف میلان نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ واضح ہے کہ شہوات کی زیب و زینت کو دیکھ کر ان سے محبت کرنے والا اللہ تعالیٰ سے غافل ہو جاتا ہے، لیکن انبیاء کرام تو ہر وقت رب تعالیٰ کی طرف مشغول رہتے ہیں، ان کے غافل ہونے کا تصور ہی ممکن نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "حبب الی من دنیا کم ثلاث" مجھے تمہاری دنیا سے تین چیزیں پسند ہیں۔ لیکن یہ ارشاد نہیں فرمایا "من دنیانا" مجھے اپنی دنیا سے تین چیزیں پسند ہیں۔

واضح ہوا کہ عام لوگوں پر دنیا غالب رہتی ہے جو غفلت کا سبب بنتی ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "دنیا کم" تمہاری دنیا، یعنی تم پر غالب آنے والی دنیا۔ لیکن نبی کریم ﷺ پر دنیا غالب نہیں تھی، بلکہ آپ دنیا پر غالب تھے، اسی وجہ سے آپ نے اپنی طرف دنیا کو منسوب نہیں فرمایا۔ ایک اور حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ کا

ارشادگرامی ہے "لست من الدنیا ولا الدنیا منی" نہ میں دنیا سے ہوں اور نہ دنیا مجھ سے۔ یعنی دنیا سے مجھے اتنی محبت نہیں کہ وہ مجھے رب تعالیٰ سے دور کر دے، اور دنیا مجھ پر چھا جانے والی نہیں۔ اگر دنیا مجھ پر غالب آسکتی تو مجھ سے محبت کرتی، جب وہ مجھ پر غالب نہیں ہو سکتی تو اسے مجھ سے محبت بھی نہیں۔ (ماخوذ از صاوی)

شہوات سے کون سی محبت بری ہے؟

(زین للناس) فرجح عند نفوسهم علی مقتضی العقل من الابصار (حب الشهوات)
ای المیل الی اخذها لتنجز ها مع الجهل بعواقبها. (تبصیر الرحمن)

شہوات سے وہ محبت بری ہے جس کی ظاہر زیب وزینت انسان کی عقل پر غالب آ جائے، وہ انجام کو نہ دیکھے، یعنی اس کے برے انجام پر نظر کرنے کے بغیر اسے حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

اسی سے واضح ہو گیا کہ شہوات سے محبت جب تک رب تعالیٰ سے غافل نہ کرے، انجام برا نہ ہو تو وہ جائز ہے۔ (راقم)

"(زین للناس) کلام مستانف سیق لبیان حقارة شان الحظوظ الدنیویة باصنافها وتزهید للناس فیها وتوجیه رغباتهم الی ما عنده تعالی" (تفسیر ابی السعود)

زینت دی گئی لوگوں کیلئے شہوات کی محبت، اس کلام کو ذکر کرنے کا یہی مقصد ہے کہ دنیاوی منافع اور دنیاوی چیزوں پر محبت اتنی غالب آ جائے کہ رب تعالیٰ کی رغبت اور توجہ دور ہو جائے۔ گویا کہ شہوات سے محبت مذمومہ وہ ہے جو رب تعالیٰ سے دور کرے، جو رب تعالیٰ کے قریب کرے وہ محبت محمودہ ہے۔

❁ "واخرج ابن ابی شیبة عن اسلم قال رایت عبد الله بن ارقم جاء الی عمر بن الخطاب بحلیة آنیة وفضة فقال عمر اللهم انک ذکرت هذا المال فقلت "زین للناس حب الشهوات" الآیة وقلت "لاتاسوا علی مافاتکم ولا تفرحوا بما آتاکم" وانا لانستطیع الاان نفرح بما زینت لنا اللهم فاجعلنا ننفقه فی حق واعوذبک من شره"
(نقل از در منشور)

حضرت اسلم کہتے ہیں میں نے عبداللہ بن ارقم کو دیکھا جو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس سونے اور چاندی کے برتن لائے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا "اے اللہ تو نے اس مال کا ذکر کیا، تو نے فرمایا ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ﴾ آپ نے یہ آیۂ کریمہ مکمل پڑھی، پھر عرض کیا اے اللہ تو نے یہ بھی فرمایا ﴿وَلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَافَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتٰكُمْ﴾ جو (مال) تم سے فوت ہو جائے اس پر غم نہ کرو، اور جو تمہیں وہ عطاء کر دے اس پر خوش نہ ہو۔ (اے اللہ تعالیٰ) ہم نہیں طاقت رکھتے مگر یہ کہ ہم خوش ہوتے ہیں ان چیزوں پر جن کو تو نے مزین

کیا (سنوارا) ہے۔اے اللہ تو ہی ہمیں توفیق عطاء فرما کہ ہم دنیا کا مال حق راہ میں خرچ کریں۔اے باری تعالی تیری پناہ شر (بری) راہ میں مال خرچ کرنے سے۔

"ان الشهوة مسترذلة عند الحكماء مذموم من اتبعها شاهد على نفسه بالبهيمة،قالوا خلق الله الملائكة عقولا بلاشهوة والبها ئم ذات شهوات بلا عقل وجعلهما في الانسان فمن غلب عقله شهوته فهوافضل من الملائكة ومن غلب عليه شهوته فهوارذل من البهائم" (روح البیان)

حکماء نے بیان فرمایا ہے کہ وہ شہوت رزیل (گھٹیا) ہے، جس کی وجہ سے انسان چوپاؤں کی طرح نظر آئے، اللہ تعالی فرشتوں کو صرف عقل عطاء فرمائی، شہوت ان کو عطاء نہیں کی، اور جانوروں کو پیدا کیا انہیں صرف شہوات عطاء کیں، عقل عطاء نہیں کی۔انسان کو رب تعالی نے عقل بھی عطاء کی اور شہوت بھی۔جب انسان کی عقل شہوت پر غالب ہو تو وہ فرشتوں سے افضل ہے، کیونکہ اس کے کام اللہ تعالی کی رضاء مندی حاصل کرنے کیلئے پائے جائیں گے، شہوات اس پر اثر انداز نہیں ہوں گی۔

اور اگر انسان پر شہوات غالب آجائیں اور عقل مغلوب ہو جائے تو وہ جانوروں سے بدتر (زیادہ برا) ہوگا، اسلئے کہ اس کے کام شیطان کو خوش کرنے والے ہوں گے اور رب تعالی کو ناراض کرنے والے ہوں گے۔

﴿مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِیْنَ﴾ "یعنی عورتوں اور بیٹوں کی"

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے: یہاں دو ترکیبیں پائی گئی ہیں، ایک یہ کہ "مـــن" بیانیہ ہو، اس صورت میں "من" کا معنی ہوگا "یعنی" راقم نے یہی معنی ذکر کیا ہے۔آراستہ کی گئی لوگوں کیلئے محبت خواہشات کی یعنی عورتوں اور بیٹوں کی "الخ" (یہ راقم کا ترجمہ ہے) دوسری ترکیب یہ ہے کہ یہ "حال ہے شہوات سے" اس صورت میں معنی یہ ہوگا۔آراستہ کی گئی لوگوں کیلئے محبت خواہشات کی حال یہ ہے کہ عورتوں اور بیٹوں کی "الخ" (ماخوذ از روح المعانی)

اعلی حضرت رحمہ اللہ نے لفظ "یعنی" اور لفظ "حال یہ ہے" نہیں ذکر کیا، اسلئے آپ کا ترجمہ دونوں ترکیبوں کو شامل ہے آپ کا ترجمہ یہ ہے "لوگوں کیلئے آراستہ کی گئی ان خواہشوں کی محبت عورتیں اور بیٹے" "الخ"

عورتوں اور بیٹوں سے محبت کی دو قسمیں: "محبت مذمومہ" اور "محبت محمودہ"

عورتوں سے محبت مذمومہ: وہی ہے جس کا ذکر اس آیۃ کریمہ میں کیا گیا ہے، کیونکہ اپنی عورتوں سے ایسی محبت کرنا جو اللہ تعالی اور رسول اللہ ﷺ سے دور کردے۔عورت کے کہنے پر حرام مال حاصل کرتا ہے، عورت کے

کہنے پر اور برائیوں کا مرتکب ہوتا ہے تو یہ بری محبت ہے۔

"ثبت فی الصحیح انه ﷺ قال ما ترکت بعدی فتنة اضر علی الرجال من النساء"

صحیح بخاری اور مسلم میں ہے بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں نے اپنے بعد مردوں کیلئے عورتوں سے زیادہ کوئی ضرر انداز فتنہ نہیں چھوڑا۔ (صابونی ابن کثیر)

حدیث پاک کا مفہوم واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا میری امت میرے بعد کئی فتنوں میں مبتلاء ہوگی، ان فتنوں میں سے سب سے زیادہ فتنہ عورتوں کا ہوگا۔

عورتوں میں زیدہ فتنہ کیوں:

عورتوں میں دو فتنے ایسے پائے جاتے ہیں جو بہت سی خرابیوں کا سبب ہیں۔

"فاحداهما ان تؤدی الی قطع الرحم لان المراة تأمر زوجها بقطعة عن الامهات والا خوات"

ان دو فتنوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان کو اپنی عورت سے محبت قطع رحمی (اپنے اقرباء سے قطع تعلق) تک پہنچا دیتی ہے، کیونکہ عورت اپنے خاوند کو ماں سے اور بہنوں سے دور کر دیتی ہے۔

ہر وقت **خاوند** کے کان بھرتے رہنا تمہاری ماں نے مجھے یہ کہا ہے، تمہاری بہنوں نے مجھے یہ کہا ہے، آخر کار خاوند تنگ آکر کبھی ماں اور بہنوں سے تعلق توڑ بیٹھتا ہے، اور کبھی عورت کو طلاق دے دیتا ہے، اس طرح عورت کے فتنہ سے ایک گھر کا اتفاق واتحاد برباد ہو کر رہ گیا، اور ایک گھر کا سکون و چین ختم ہو گیا، اس سے بڑھ کر اور فتنہ کیا ہو سکتا ہے؟

"والثانية يبتلی المال من الحلال والحرام" عورت کا دوسرا فتنہ یہ ہے کہ اس کا ہر وقت مطالبہ مال جمع کرنے کا ہوتا ہے۔ خاوند عورت کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا کہ وہ مال جمع کرے، یہاں تک کہ وہ عورت کے مطالبات پر حلال اور حرام طریقے سے مال جمع کرنے میں مبتلاء ہو جاتا ہے، یعنی عورت کے فتنے کی وجہ سے حرام طریقے سے مال جمع کرنے میں مبتلاء ہونے سے بڑھ کر اور فتنہ کیا ہوگا؟ (ماخوذ از قرطبی)

عورتوں سے محبت محمودہ:

"واما اذا کان القصد بهن الاعفاف و کثرة الاولاد فهذا مطلوب مرغوب فيه مندوب اليه"

جب عورتوں سے نکاح کرنے کی محبت میں مقصد پاکدامنی کو حاصل کرنا ہو، یعنی ارادہ یہ ہو کہ نکاح کرلوں تا کہ نگاہ کی

اور کی طرف نہ اٹھے اور مقصد یہ ہو کہ کثیر اولاد ہوگی، ان مقاصد کے پیش نظر عورت سے محبت کرنا مطلوب ہے اور پسندیدہ عمل ہے اور مستحب ہے۔ اسی وجہ سے **راقم** نے اس محبت کا محبت محمودہ پیش کیا ہے۔

❁ **"قال رسول اللهﷺ الدنیا متاع و خیر متاعها المرأة الصالحة ان نظر الیها سرته و ان امرها اطاعته و ان غاب عنها حفظته فی نفسها و ماله"** (اخرجہ النسائی، وروی بعضہ مسلم فی صحیحہ)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "دنیا سامان ہے، اس کے سامان میں سے بہتر نیک عورت ہے، اگر اس کی طرف وہ (اس کا خاوند) دیکھے تو وہ اسے خوش کردے، اور اگر اسے کوئی حکم دے تو وہ اس کی حکم کی فرمانبرداری کرے اور اگر وہ غائب ہو (یعنی اس کا خاوند گھر میں موجود نہ ہو) تو وہ اپنی اور خاوند کے مال کی حفاظت کرے (یعنی عورت مرد کی غیر موجودگی میں پاکدامن رہے، کسی اور کی طرف راغب نہ ہو اور اس کے مال میں خیانت نہ کرے)

❁ **"قال رسول اللهﷺ حبب الی النساء والطیب وجعلت قرة عینی فی الصلوة"**

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری عورتیں میرے لئے محبوب بنادی گئیں، اور خوشبو سے مجھے محبت کرنے والا بنادیا گیا، اور میری آنکھوں ٹھنڈک نماز میں رکھ دی گئی۔

حدیث پاک سے واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ میرے دل میں اللہ تعالیٰ نے میری ازواج کی محبت ڈال دی تاکہ نگاہ ان پر جمی رہے، کسی اور کی طرف نہ اٹھے۔ خیال رہے کہ رسول اللہ ﷺ تو معصوم ہیں، مقصد تعلیم امت تھا کہ اپنی بیبیوں سے محبت رکھو، یہی محبت جس میں پاک دامنی ہو "محبت محمودہ ہو محبت محمودہ ہے۔ (ماخوذ از صابونی وابن کثیر)

بیٹوں سے محبت کی دو قسمیں: بیٹوں سے محبت کی بھی دو ہی قسمیں ہیں، ایک محبت مذمومہ اور ایک محبت محمودہ۔

بیٹوں سے محبت مذمومہ:

"وحب البنین تارةیکون للتفاخر و الزینة فهو داخل هذا" اگر بیٹوں سے محبت فخر و تکبر کے طور پر ہو، یا زیب و زینت حاصل کرنے کیلئے ہو تو یہ محبت مذمومہ ہے۔ جو بری محبت ہے اور رب تعالیٰ کو ناپسند ہے، ایسی ہی محبت کا ذکر اس آیۃ کریمہ میں ہے۔ اور بیٹوں کی محبت میں فتنہ یہ ہے "وهو ما ابتلی بجمع المال لأجلهم" کہ انسان بیٹوں کی محبت کی وجہ سے اور ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت پر مال خرچ کرنے کی وجہ سے، مال جمع کرنے میں مبتلاء ہو جاتا ہے حلال و حرام کی کم ہی پرواہ کرتا ہے، مقصد اس کا مال جمع کرنا ہوتا ہے خواہ کسی قسم کا مال بھی اسے مل جائے۔ (از قرطبی)

بیٹوں سے محبت محمودہ:

"وتارة يكون التكثير النسل وتكثير النسل وتكثير امة محمد ﷺ ممن يعبد الله وحده لاشريك له فهذا محمود ممدوح كما ثبت في الحديث "تزوجوا الودود الولود فاني مكاثر بكم الأمم يوم القيامة"

بیٹوں سے کبھی محبت اس لئے ہوتی ہے کہ ان سے نسل بڑھے گی اور نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی امت زیادہ ہوگی جو اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک کی عبادت کرے گی۔ بیٹوں سے محبت ان وجوہ کے پیش نظر اچھی ہے اور قابل تعریف ہے کیونکہ یہ محبت درحقیقت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ سے محبت کا ذریعہ ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا 'تم محبت کرنے والی اور بچے جننے والی عورتوں سے نکاح کرو، بیشک میں قیامت کے دن تمہاری وجہ سے امت کی کثرت کو پالوں گا۔ (ماخوذ از صابونی وابن کثیر)

عورت سے محبت سب سے زیادہ:

اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ میں سات چیزوں کا ذکر فرمایا کہ ان سے انسان کو زیادہ خواہش اور زیادہ محبت ہوتی ہے، لیکن ان تمام چیزوں میں سے زیادہ محبت عورت سے ہوتی ہے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر سب سے پہلے کیا ہے۔ "لان الالتذاذ بهن اكثر والاستئناس بهن اتم" کیونکہ ان سے انسان زیادہ لذت حاصل کرتا ہے، اور کامل محبت اور انس بھی ان سے ہی زیادہ ہوتا ہے۔

اسی پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی واضح طور پر دلالت کر رہا ہے ﴿خَلَقَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوْا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَّرَحْمَةً﴾ " اس (رب تعالیٰ) نے تمہارے لئے تمہارے ہی نفسوں سے بیبیاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے سکون وچین حاصل کرو اور اس نے تمہارے درمیان محبت ورحمت پیدا کردی" بلکہ غور کیا جائے تو پتہ چل جاتا ہے کہ اتنا زیادہ عشق اور اندھا دھند محبت عورتوں سے ہی انسان کو حاصل ہے، عورت کی محبت ہی انسان کو کبھی ہلاکت کی طرف پہنچا دیتی ہے، اسی مضمون کو علامہ رازی رحمہ اللہ کے ان الفاظ میں دیکھئے

"ومما يؤكد ذلك ان العشق الشديد المفلق المهلك لا يتفق الا فى هذاالنوع من الشهوة" (کبیر)

بیٹوں کا ذکر کیا گیا بیٹیوں کا نہیں اس کی وجہ کیا ہے؟

بیٹے سے محبت زیادہ ہوتی ہے بنسبت بیٹی کے، اس کی وجہ یہ ہے کہ نفع بیٹوں سے زیادہ حاصل ہوتا ہے، اسلئے بیٹوں کی

کثرت پر انسان خوش ہوتا ہے۔ (کبیر)

بیٹیوں کی حفاظت، پھر دوسرے گھروں میں جا کر آباد ہونا، وہاں کیسے آباد ہوگی، ان لوگوں کا اس سے کیسا سلوک ہوگا وغیرھا اس قسم کے تفکرات کی وجہ سے قدرتی طور پر بیٹیوں سے وہ محبت نہیں ہوتی جو بیٹوں سے ہوتی ہے اور انسان اپنا بازو بیٹوں کو ہی سمجھتا ہے کہ وہ دشمن کے مقابل اس کا ساتھ دیتے ہیں، بیٹیاں اس سے عاجز ہوتی ہیں، اور جہاد میں جو کام بیٹے کر سکتے ہیں وہ بیٹیاں نہیں کر سکتی، لیکن اصل وجہ راقم کے نزدیک یہ ہے کہ قرآن پاک کا نزول عرب میں ہوا، اس وقت کے معاشرہ میں قرآن پاک کے نزول سے قبل بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے کا رواج تھا، اسلئے بیٹوں کا ہی ذکر کیا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ "بنین کا ذکر کر کے "بنات" کو بھی ضمناً شامل کر لیا ہو، قاعدہ تغلیب جاری کیا گیا ہو، اکثر طور پر قرآن پاک میں مذکر کے صیغے استعمال ہیں جو مؤنث کو شامل ہیں "واللہ اعلم بالصواب" (راقم)

حکمت: اولاد و ازواج کی محبت انسان کے دل میں رب تعالیٰ نے پیدا فرما دی، یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی حکمت کاملہ ہے "فانہ لولا ھذا الحب لما حصل التوالد والتناسل، ولأدی ذلک الی انقطاع النسل" اسلئے کہ اگر یہ محبت نہ پائی جاتی تو پیدائش کا سلسلہ اور نسل کی بقاء کا سلسلہ حاصل نہ ہوتا، اس طرح تو نسل ختم ہو کر رہ جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سلسلہ محبت حیوانوں کے درمیان بھی رکھ دیا ہے، تا کہ ان کی نسل بھی برقرار رہے۔ (ماخوذ از کبیر)

اولاد سے محبت کی وجہ بھی اصل میں نسل کو ہی باقی رکھنا ہے، چھوٹے بچوں کو پالنا بہت مشکل کام ہے، یہ ماں ہی جانتی ہے کہ وہ کتنی تکالیف برداشت کر کے اولاد کو پالتی ہے، اور باپ اولاد کے اخراجات کو پورا کرنے کیلئے دن رات مزدوری کرنے میں مشغول ہے، بغیر محبت کے یہ کام کرنا بہت مشکل ہوتا۔ (راقم)

﴿وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ﴾ اور کثیر مال جمع کیا ہوا یعنی سونے اور چاندی کی۔

یعنی لوگوں کے دلوں میں کثیر جمع کئے ہوئے مال کی محبت رکھ دی گئی، یعنی سونے اور چاندی سے محبت ان کے دلوں میں رکھ دی گئی۔

(القناطیر) الاموال الکثیرۃ (المقنطرۃ) المجمعۃ (جلالین) "قناطیر" کا معنی ہے "کثیر مال" اور "مقنطرۃ" میں دو قول ہیں، ایک یہ ہے کہ نون اصلی ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس میں نون زائد ہے، ان حضرات کے نزدیک اس کا وزن "مفنعلۃ" ہوگا۔ (صاوی)

مفردات راغب میں بھی ان کو "قطر" کے ضمن میں نقل کیا گیا ہے علامہ راغب اصفہانی کے نزدیک بھی نون

زائد نظر آتا ہے "واللہ اعلم بالصواب"

"القنطار" کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ گرہ لگا کر پختہ کر دیا جائے، اور مقنطرة کا معنی ہے، رسی میں کئی تہہ ملا کر مضبوط کر دیا جائے، انسان کے پاس جب کثیر مال ہو تو اسے وثوق (بھروسہ) ہوتا ہے کہ یہ مال مجھے ہر قسم کی مصیبتوں سے بچا لے گا۔ "القناطیر المقنطرة" کا صحیح مطلب یہی ہے کہ "کثیر مال جمع کیا ہوا" اس کی کوئی حد مقرر نہیں، اسی قول کے مطابق علامہ رازی رحمہ اللہ نے بیان کیا "واعلم ان ھذا ھو الصحیح" یقین کر لے کہ بیشک یہی قول درست ہے۔ بعض روایات میں مختلف حدود اور تعداد بیان کی گئی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہے کہ اتنے مال کو بھی "القناطیر المقنطرة" کہا جاتا ہے، اور اتنے کو بھی۔ مختلف روایات میں مختلف حدود اور تعداد کا یہی مطلب ہے نہ ہی روایات میں تعارض ہے اور نہ ہی حد معین ہے۔

"روی ابوھریرة عن النبی ﷺ انه قال "القنطار اثنا عشر الف اوقیة" حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا "بارہ ہزار اوقیہ قنطار ہے" "اوقیہ" "چالیس درھم کا وزن" ہے۔

"وروی انس عن النبی ﷺ ان القنطار الف دینار" حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ قنطار ہزار دینار ہیں۔

"وروی ابی بن کعب انه علیه السلام قال القنطار الف ومائتا اوقیة" ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی روایت میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ایک ہزار دو سو اوقیہ قنطار ہے۔

"قال ابن عباس القنطار الف دینار او اثناعشر الف درھم" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں قنطار ہزار دینار ہیں، یا بارہ ہزار درہم ہیں۔

"وقال الکلبی القنطار بلسان الروم ملء مسک ثور من ذھب او فضة" کلبی کہتے ہیں رومی زبان میں قنطار کا یہ مطلب ہے کہ بیل کی کھال کو سونے اور چاندی سے بھر دیا جائے۔

سب روایات کا مطلب وہی ہے جو بیان کر دیا گیا ہے۔ کلبی کا ایک قول یہ بھی ہے کہ "مقنطرة" کا لفظ "القناطیر" کی تاکید ہے، قناطیر کی کم از کم مقدار تین ہے۔ اور مقنطرة کا مطلب تین کو دو گناہ کرنا، "القناطیر المقنطرة" کی مجموعی مقدار کم از کم چھ ہوگی، زیادہ کی کوئی حد نہیں (ماخوذ از کبیر)

﴿من الذھب والفضة﴾ یعنی سونا اور چاندی، مطلب یہ ہے کہ سونے اور چاندی کے کثیر مجتمع مال کی محبت لوگوں کے دلوں میں ڈال دی گئی کہ یہ چیزیں اسے مزین کر کے دکھائی گئی ہیں۔

سونے اور چاندی سے محبت کیوں؟

چونکہ سونے اور چاندی سے ہر چیز کو خریدا جا سکتا ہے، اس لئے جو سونے اور چاندی کا مالک ہوتا ہے اسے ہر چیز کا مالک تصور کیا جاتا ہے۔"وصفة المالکیة هی القدرة والقدرة صفة کمال والکمال محبوب لذاته"صفت مالکیت حاصل تو قدرت حاصل ہوتی ہے، قدرت صفت کمال ہے، لھذا صفت مالکیت سے صفت کمال حاصل ہوگی، کمال ذاتی طور پر محبوب ہے۔لھذا صفت مالکیت انسان کو ذاتی طور پر محبوب ہے، کیونکہ اسی میں انسان اپنا کمال سمجھتا ہے، جب سونا اور چاندی اس کمال کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں تو وہ بھی ذاتی طور انسان کو محبوب ہوں گے۔

"وما لا یوجد المحبوب الابه فهو محبوب، لاجرم کانا محبوبین"

جس چیز کے بغیر محبوب حاصل نہ ہو وہ چیز بھی محبوب ہوتی ہے۔جب سونے اور چاندی کے بغیر صفت مالکیت وقدرت اور صفت کمال حاصل نہیں تو یقیناً سونا اور چاندی ذاتی طور پر محبوب بن گئے (ماخوذ از کبیر)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

(من الذهب والفضة) بیان للقناطیر وهو فی موضع الحال منها""من الذهب والفضة" میں "من" بیانیہ جو "القناطیر" کا بیان ہے، یہ محل حال میں واقع ہے۔ (روح المعانی)

اس لئے راقم نے "یعنی سونے اور چاندی کی (محبت) ترجمہ کیا ہے۔لیکن اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ بامحاورہ ہے، جس سے تفاسیر کی طویل بحثوں کو سمولیا جاتا ہے، آپ نے بہت خوبصورت اور تمام اقوال کو حاوی وشامل ترجمہ کیا ہے، آپ کے ترجمہ پر ایک مرتبہ پھر نظر کیجئے ﴿اَلْقَنَاطِیْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ﴾ اور تلے اوپر سونے اور چاندی کے ڈھیر۔ (کنز الایمان)

فائدہ جلیلہ: "عن ابی سعید الخدری قال من قرأ فی لیلة عشر آیات کتب من الذاکرین، ومن قرأ بمائة آیة کتب من القانتین، ومن قرأ بخمسمائة آیة الی الالف اصبح وله قنطار من الاجر"
(مسند ابی محمد الداری)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جس شخص نے رات کو دس آیتیں تلاوت کیں، اسے ذاکرین کے درجہ میں لکھ دیا جائے گا، اور جس نے ایک سو آیات کی تلاوت کی اسے قانتین (خشوع کرنے والوں) کے درجہ میں لکھ دیا جائے گا، اور جس نے پانچ سو آیات سے لیکر ایک ہزار تک پڑھیں تو وہ اجر وثواب کے ڈھیر حاصل کرنے والا ہوگا (از قرطبی)

مال کی محبت کی دو قسمیں: محبت مذمومہ اور محبت محمودہ

"اذا کانت للفخر والخیلاء والتکبر علی الضعفاء والتجبر علی الفقراء فهذه مذمومة"
مال سے محبت جب تکبر، فخر، نازنخرے کے طور پر ہو، ضعیف لوگوں پر تکبر کرنے کے طور پر ہو، اور فقیروں پر جبر کرنا مقصود ہو تو یہ محبت مذمومہ ہے۔

اسی کا ذکر اس زیر بحث آیۃ کریمہ میں کیا گیا ہے، مال سے یہ محبت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے دور کرنے کا ذریعہ ہے۔

"واذا کانت للنفقه فی القربات وصلة الارحام والقرابات ووجوه البر والطاعات فهذه ممدوحة محمودة شرعا"
جب مال سے محبت اس لئے ہو کہ اسے نیکی کی راہ میں خرچ کیا جائے گا، صلہ رحمی کیلئے، قریبی رشتہ داروں سے تعلق جوڑنے کیلئے خرچ کیا جائے گا، اور ہر طرح کی نیکی کے کاموں میں مال خرچ کیا جائے گا تو مال سے محبت قابل تعریف ہوگی اور محبت محمودہ (یعنی اچھی محبت ہوگی) شریعت میں مال کی اس محبت کی تعریف کی گئی ہے، اور اسے جائز قرار دیا گیا۔ (از ابن کثیر، صابونی)

یہ یقینی بات ہے مال کے بغیر نظام دنیا کا چلنا ممکن نہیں، اسلئے مال سے محبت اسی وقت شریعت میں ناپسند ہوگی جب کہ وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ سے غافل کر دے گی۔ اور مال سے وہ محبت جو اللہ تعالیٰ اور نبی کریم ﷺ کے قریب کرے وہ شریعت میں بھی پسندیدہ ہے اور قابل تعریف ہے۔ (راقم)

﴿وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ﴾ "اور خوبصورت گھوڑوں کی"

یعنی خوبصورت گھوڑوں کی محبت کو مزین کیا گیا ہے، جو ان کے دلوں میں ڈال دی گئی۔

"والخیل المسومة" "ای الحسان" (جلالین) المسومة کا ترجمہ جلالین میں "خوبصورت" کیا گیا ہے، اس پر محشی نے یوں بیان کیا۔

"الحسان ای المحسنة المضمرة لان المسومة علی هذا ماخوذ من السماو وهی الحسن فمعنی مسومة ذات حسن وجمال"

"الحسان" جو ترجمہ کیا ہے مفسر نے اسی کا مطلب یہ ہے کہ (گھوڑے) حسین جن کو اضمار کیا گیا ہے، مضمر گھوڑے وہ ہوتے تھے جنہیں پہلے زیادہ کھلا کر موٹا کیا جاتا تھا، پھر ان کا چارہ کم کر کے ان کے گوشت کو کم کیا جاتا، اس طرح ان کا

جسم مضبوط ہوتا وہ تیز دوڑتے تھے، ''مسومة'' کا معنی ہوگیا ''حسین وجمیل'' (جلالین مع حاشیہ)

''قال ابو مسلم الاصفهانی وهو ماخوذ من السیما بالقصر والسیماء بالمد ومعناه واحد وهو الهیئة الحسنة''

ابومسلم اصفہانی بیان کرتے ہیں کہ ''المسومة'' ماخوذ ہے 'سیما' (بغیر مد کے) اور ''سیماء'' (مد کے ساتھ) سے، دونوں صورتوں میں معنی ایک ہی ہے ''خوبصورت شکل'' ''وقول ابی مسلم احسن لان الاشارة فی هذه الآیة الی شرائف الاموال'' ابومسلم کا قول اچھا ہے کیونکہ آیۃ کریمہ میں عمدہ مال کی طرف اشارہ پایا گیا ہے کہ ان کو عمدہ مال سے محبت ہے، وہ ہیں حسین وجمیل گھوڑے۔

''انها الخیل المطهمة الحسان'' وهو قول مجاهد وعکرمة، قال القفال المطهمة المرأة الجمیلة''

''والخیل المسومة'' کا معنی ہے خوشنما، حسین وجمیل گھوڑے، یہ قول ہے مجاہد اور عکرمہ کا۔ ان حضرات نے لفظ ''المطهمة'' استعمال کیا، تو قفال نے اس کی وضاحت کی کہ اصل میں خوبصورت عورت کو ''المطهمة'' کہا جاتا ہے، یہاں خوبصورت گھوڑوں کیلئے یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ''والخیل المسومة'' کا ترجمہ کیا ہے 'اور نشان کئے ہوئے گھوڑے'' یہی ترجمہ اکثر مترجمین نے کیا ہے۔ جلالین کے محشی نے بیان کیا ہے ''وفسر اکثر المفسرین قوله المسومة بالمعلمة من السومة وهی العلامة'' اکثر مفسرین نے رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ''المسومة'' کا معنی کیا ہے ''نشان لگائے ہوئے''، کہ ''المسومة'' ماخوذ ہے ''سومة'' سے، جس کا معنی ہے 'علامت'' نشان لگانا۔ جب ''المسومة'' کا معنی کیا جائے ''نشان لگائے ہوئے'' تو اس کے تین مطلب ہیں۔

(۱) ''اختلفوا فی تلک العلامة فقیل هی الغرة والتحجیل'' ''علامت لگائے ہوئے'' کے مختلف مطالب بتائے گئے ہیں، بعضوں نے کہا اس کا معنی ہے 'غر محجلة'' گھوڑے، وہ گھوڑے جن کا وصف بیان کیا گیا ہے 'غر محجلة'' یہ وہ اس جن کی پیشانیاں سفید ہوتی ہیں، اور ان کے چار پاؤں بھی سفید ہوتے ہیں۔

(۲) ''وقیل هی الخیل البلق'' بعض حضرات نے ''نشان لگائے ہوئے'' کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ''چتکبرے گھوڑے'' مراد ہیں، یعنی جن کا رنگ سرخ ہوتا ہے اور ان میں چھوٹے چھوٹے سفید نشان ہوتے ہیں، وہ بھی چونکہ جنگ میں خوشنما نظر آتے ہیں جو دشمن کے دلوں پر رعب ڈال دیتے ہیں۔

(۳) ''وقیل هی المعلمة بالکی'' بعض حضرات نے بیان کیا ہے، ''نشان لگائے ہوئے'' کا مطلب یہ

ہے ''داغ دئے ہوئے'' یعنی جہاد والے گھوڑوں کو خاص کرنے کیلئے ان کی سرین کے قریب پچھلے حصہ کو داغ دیا جاتا تھا تا کہ پتہ چل جائے کہ یہ ''جنگی گھوڑے'' ہیں۔ (ماخوذ از خازن)

گھوڑے کو عربی میں ''خیل'' کہنے کی وجہ:

عربی میں الفاظ کے لغوی معنی کے مطابق ہی کسی چیز کا نام رکھا جاتا ہے۔ ''خیل'' اگر چہ جمع ہے اس کا واحد نہیں، جس طرح قوم، نساء، رھط'' کا واحد ان لفظوں سے نہیں (ہاں کبھی کبھی ''خیل'' واحد پر بول لیا جاتا ہے)''وسمیت الافراس خیلا لخیلانها فی مشیها'' گھوڑوں کو ''خیل'' کہا جاتا ہے کیونکہ یہ فاخرانہ انداز پر چلتے ہیں، چونکہ ''خیل'' لیا ہوا ہے ''خیلاء'' سے جس کا معنی ہے تکبر کرنا، فخر کرنا، انسان بھی جب فاخرانہ انداز پر ادھر ادھر چکر کاٹے تو اس کی اس حرکت کو بھی ''اختیال'' کہا جاتا ہے۔ ''خیال اور تخیل'' کو بھی ایک صورت کے ذہن میں آنے کی وجہ سے ''خیل اور تخیل'' کہا جاتا ہے۔ (از کبیر)

فائدہ: خیلاء کا لفظ حدیث پاک میں بھی استعمال ہے، جس کا معنی تکبر اور فخر ہی ہے۔ ضمناً ایک مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔

❁ ''عن ابن عمر ان النبی ﷺ قال من جر ثوبه خیلاء لم ینظر الله الیه یوم القیامة''
(بخاری، مسلم، مشکوۃ کتاب اللباس)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے فاخرانہ طور پر کپڑا کھینچا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی طرف رحمت نہیں فرمائے گا۔

وضاحت حدیث:

(من جرثوبه) وھو شامل لازاره وردائه وغیرھا'' کپڑا کھینچے کا مطلب عام ہے خواہ کمر سے باندھنے والی چادر لمبی ہو، نیچے زمین سے گھسٹ رہی ہو یا سلوار لمبی ہو، یا اوپر لپیٹنے والی چادر حد سے زائد لمبی ہو۔

''(خیلاء) بضم العجمة وفتح التحتیة وبالمد، وقال النووی وھو والمخحیلة والبطر والکبر والزھو والتبختر کلها متقاربة''

"خیلاء" کے لفظ میں خاء پر ضمہ (پیش) ہے، اور یاء پر فتحہ (زبر) ہے، اور اس میں مد ہے، اس کا معنی ہے تکبر کرنا، علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "خیلاء" مخیلة، بطر، کبر، زھو، تبختر سب ہی معنوی لحاظ سے ایک دوسرے کے قریب ہیں، یعنی سب کا ہی معنی یہ ہے تکبر کرنا، فخر کرنا، نازنخرہ کرنا۔

(لم ینظر الله الیه یوم القیامة) ای لا یرحم علیه ولم یلتفت الیه" اللہ تعالیٰ اس کی طرف قیامت کے دن نظر نہیں فرمائے گا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس پر رحم نہیں فرمائے گا اور اس کی طرف توجہ نہیں فرمائے گا۔
یہ خیال رہے کہ اس مقام پر نظر رحمت کی نفی ہے غضب کی نفی نہیں، غیظ وغضب کی نظر وہ فرمائے گا۔ (از مرقاۃ ج ۸ ص ۱۳۸)

❁ "وعن ابی هريرة ان رسول اللهﷺ قال لاینظر الله یوم القیامة الی من جرازاره بطرا"
حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں، بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس شخص کی طرف نظر رحمت نہیں فرمائے گا جس نے اپنا کپڑا کھینچا۔ (بخاری ومسلم، مشکوۃ کتاب اللباس)

وضاحت حدیث:

"(لا ینظر الله یوم القیامة) ای نظر رحمة فیکون الحدیث محمولا علی المستحل اوعلی الزجر اومقیدا بابتداء الامر ویجوز ان یراد لا ینظر نظر لطف وعنایة"

''اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نظر نہیں فرمائے گا'' اس کا مطلب یہ ہے کہ نظر رحمت نہیں فرمائے گا۔ حدیث پاک میں لمبا کپڑا ڈھلکا کر پہننے والے پر جو وعید (سخت دھمکی) پائی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لمبا ڈھلکا کر کپڑا پہننا بلا کراہیت حلال سمجھے یا مطلقا زجر وتوبیخ (ڈانٹ ڈپٹ) پائی گئی ہے یا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ابتدائی طور پر نظر رحمت نہیں فرمائے گا۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لطف ومہربانی کی نظر نہیں فرمائے گا یعنی نفی نظر رحمت کی ہے۔ (مرقاۃ، ج ۸، ص ۱۳۸)

طلباء کرام توجہ فرمائیں:

کہ میں نے یجوز کا معنی کیا ہے ''صحیح یہ ہے'' جیسا کہ کافیہ اور جامی میں آپ یقیناً پڑھ چکے ہیں، یجوز بمعنیٰ ''یصح'' کے بھی آتا ہے، اور یصح بمعنی امکان کے آتا ہے، امکان اپنی جانب مخالف میں وجوب اور امتناع کو شامل ہوتا ہے۔ تفصیل جامی اور اس کی شروح میں دیکھیں۔ (راقم)

(الی من جرازاره بطرا) بفتحتین ای تکبرا اوفرحا وطغیانا بالغنی'' ''بطرا'' کی باء اور تاء پر فتحہ (زبر) ہے۔ اس کا معنی ہے، تکبر کرنا، اترانا، اور مال ودولت کی وجہ سے سرکش ہونا۔

اب مکمل ترجمہ بمع شرح کے یہ ہوگیا ''جو شخص تکبر کے طور پر خوش ہو کر اتراتے ہوئے، مال ودولت کی کثرت کی وجہ سے حد سے بڑھتے ہوئے اپنی چادر یا سلوار لمبی رکھتا ہے، اسے کھینچ کھینچ کر ڈھلکا ڈھلکا کر چلتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس پر لطف ومہربانی اور رحمت کی نظر نہیں کرے گا۔

مقصد عظیم: قال ابن الملک ویفهم منه ان جره لغیر ذلک لایکون حراما لکنه مکروه کراهة تنزیه" (مرقاة ج ۸ ص ۱۳۸)

ابن ملک رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ حدیث پاک اور اس کی شروح سے یہ مسئلہ واضح ہو جاتا ہے کہ لمبا کپڑا ڈھلکا کر چلنا اسی وقت منع ہے جب اس میں مال و دولت کی کثرت کی وجہ سے حد سے بڑھتے ہوئے تکبر کے طور پر یہ عادت ہو۔ اگر یہ صورت حال نہیں، یعنی تکبر نہیں، حد سے متجاوز نہیں غریب شخص ہے یا مال دار تو ہے لیکن مال نے اسے متکبر نہیں بنایا تو اس صورت میں لمبا کپڑا ڈھلکا کر چلنا مکروہ تنزیہی ہے۔

مقام افسوس: آج کل پائنچے ذرا ٹخنے سے نیچے ہوں تو یار لوگ نماز نہ ہونے کا فتویٰ لگا دیتے ہیں جو تکبر اور غیر تکبر کا فرق نہیں کرتے، پھر مکروہ تنزیہی کی تعریف نہیں جانتے۔ کاش کہ وہ یہ جانتے کہ مکروہ تنزیہی وہ ہے کہ جس سے بچنے پر ثواب اور نہ بچنے پر کوئی پکڑ نہیں۔ جب شریعت میں کوئی گرفت نہیں تو دوسرا کون ہے جو نماز کے نہ ہونے کا فتویٰ دے، درحقیقت وہ اپنے قول سے اپنی جہالت کا اعلان کر رہا ہے۔

❁ "وعن ابن عمر قال قال رسول اللهﷺ بینما رجل یجر ازاره من الخیلاء خسف به فهو یتجلجل فی الارض الی یوم القیامة" (رواہ البخاری، مشکوۃ باب اللباس)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ایک شخص چادر کو تکبر کی وجہ سے کھینچتا یعنی لمبی چادر ڈھلکا کر چلتا اس کو زمین میں دھنسا دیا گیا وہ قیامت کے دن تک اسی طرح دھنستا چلا جائے گا۔

وضاحت حدیث:

"قیل یحتمل ان یکون الرجل من هذه الامة فاخبر بهﷺ انه سیقع وعبر عنه بالماضی لتحقق وقوعه وان یکون اخبارا عمن قبل هذه الامة وهو الصحیح ولذلک ادخله البخاری فی باب ذکر بنی اسرائیل ثم الظاهر من سیاق الحدیث وابهام الرجل انه غیر قارون" (مرقاۃ ج ۸ ص ۱۳۸)

حدیث پاک میں جس شخص کا ذکر کیا گیا ہے اس میں ایک احتمال یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کے کسی شخص کا ذکر کیا ہو۔ واقعہ مستقبل (آنے والے وقت) کا ہو، صیغہ ماضی (گذرے ہوئے زمانے) کے ذکر فرمائیں ہوں کہ جس کا واقع ہونا یقینی ہو اسے ماضی سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ نبی اسرائیل کے ایک شخص کا واقعہ ہے۔ کیونکہ بخاری نے اس کا جو عنوان ذکر کیا ہے وہ یہ ہے "باب ذکر نبی اسرائیل" نبی اسرائیل کے ذکر کے بیان میں۔ حدیث پاک کے سیاق و سباق سے اور جس شخص کا ذکر ہے اسے مبہم ذکر کیا گیا ہے تو اس سے پتہ چلا کہ

قارون کے بغیر کسی اور بنی اسرائیلی کا یہ ذکر ہے۔

❁ "عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ ما اسفل من الکعبین من الازار فی النار
(رواہ البخاری، مشکوٰۃ کتاب اللباس)

حضرت ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جو ٹخنوں سے نیچے چادر ہو، وہ آگ میں ہے۔

وضاحت حدیث: "فی النار" کا کیا مطلب ہے؟ اس میں تین احتمال ہیں۔

(۱) ایک احتمال یہ ہے کہ یہ خبر ہو مبتداء محذوف کی "اصل میں معنوی طور پر عبارت یوں ہو جائے "فھو ای صاحبہ فی نار جھنم بسبب الاسبال الناشئ عن التکبر والاختیال" وہ شخص آگ میں جائے گا جس نے تکبر اور فخر سے چادر، سلوار اور دوسرے کپڑوں کو لسبا رکھا اور مال و دولت کی وجہ سے حد سے بڑھ گیا۔

(۲) "قال الخطابی یتناول ھذا علی وجھین احدھما ان مادون الکعبین من قدم صاحبہ فی النار عقوبۃ لہ علی فعلہ" اس کا ایک اور معنی جو علامہ خطابی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ ٹخنوں کے نیچے اس شخص کے قدموں کو آگ میں جلایا جائے گا، یہ اسے اس کے فعل کی سزا دی جائے گی۔

(۳) "والآخر ان فعلہ ذلک فی النار الی ھو معدود ومحسوب من افعال اھل النار" اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص تکبر کے طور پر اپنی چادر وغیرہ کو ٹخنوں کے نیچے ڈھلکائے گا تو اس کا یہ فعل ان لوگوں کے افعال کی طرح شمار ہوگا جو آگ میں جائیں گے۔

وعید کا تعلق کس سے ہے؟

"وقد نص الشافعی علی ان لتحریم مخصوص بالخیلاء لدلالۃ ظواھر الاحادیث علیھا فان کان لخیلاء فھو ممنوع منع تحریم والا فمنع تنزیہ"

امام شافعی رحمہ اللہ نے واضح طور پر ذکر فرمایا کہ تحریم (حرام ہونے) کا تعلق تکبر سے ہے ظاہر احادیث اسی پر دلالت کر رہی ہیں، اسی سے بہت واضح طور پر یہ ثابت ہو گیا کہ اگر کپڑا لسبا ہو اور انسان ڈھلکا کر چلے اس کی وجہ جب تکبر ہو، اکڑ ہو، نازنخرہ ہو، فاخرانہ انداز ہو، یعنی مال و دولت کی وجہ سے اس میں تکبر آ گیا ہو، تو اس صورت میں اس کا یہ فعل حرام ہے، اگر تکبر نہیں، ایک شخص عاجز ہے، پرہیزگار ہے، صاحب علم ہے اس کے لمبے کپڑے میں کراہت تنزیہی ہے۔
(مرقاۃ ج۸ص۱۳۹)

صرف سلوار کا یہ مسئلہ نہیں بلکہ ہر کپڑے کا یہی حکم ہے:

"قال النووی الاسبال یکون فی الازار والقمیص والعمامة" علامہ نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم شریف میں ذکر فرمایا "جو کپڑے کے لمبا کرنے اور ڈھلکا کر چلنے کی ممانعت ہے" وہ چادر میں بھی ہے اور قمیص میں بھی اور پگڑی میں بھی۔ نووی رحمہ اللہ کے ارشاد کے مطابق تکبرانہ انداز پر لمبی قمیص پہننا بھی منع ہے اور پگڑی کے لمبے لمبے شملے رکھنا بھی منع ہے۔ (از مرقاۃ ج۸ص۱۳۹)

قمیص ٹخنوں تک پہننا اور پگڑی لمبی رکھنا بغیر کسی کراہیت کے جائز سمجھنا اور صرف سلوار پر زور دینا سوائے جہالت وحماقت کے اور کچھ نہیں۔ آیئے اسی مسئلہ کو حدیث پاک سے بھی دیکھتے چلے جائیں تا کہ مسئلہ صرف علامہ نووی کے قول پر بند نہ ہو۔

❁ **"وعن سالم عن ابیه عن النبی ﷺ قال الاسبال فی الازار والقمیص والعمامة من جر منها شیئا خیلاء لم ینظر الله الیه یو م القیا مة"**

(رواہ ابوداود والنسائی وابن ماجة،مشکوۃ کتاب اللباس)

حضرت سالم اپنے باپ (عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کپڑا لمبا ڈھلکانا چادر اور قمیص اور پگڑی میں بھی ہے، جس نے ان کپڑوں کو تکبر کے طور پر کھینچا یعنی لمبا رکھا اور ڈھلکا کر چلا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس پر نظر رحمت نہیں فرمائے گا۔

حدیث پاک سے بہت واضح ہوا کہ تکبر کے طور پر کسی کپڑے کو بھی لمبا رکھنا منع ہے خواہ وہ سلوار یا چادر ہو یا قمیص ہو یا پگڑی ہو۔ تکبر کی نیت نہ ہوں تو سب جائز ہیں کراھت تنزیھی جواز کے درجے میں ہی ہے یا رلوگ لمبی لمبی قمیصیں پہن کر چلیں، لمبی لمبی پگڑیاں باندھ کر چلیں تو ہم ان پر فتوی نہیں لگاتے، اس لئے کہ تکبر دل کی نیت سے پتہ چلتا ہے، ویسے ہی کسی کو متکبر کہنا دیوانگی ہے۔

❁ **"عن ابی سعید الخدری قال سمعت رسول الله ﷺ یقول ازرة المئومن الی الصاف ساقیه لاجناح علیه فیما بینه وبین الکعبین ما اسفل من ذلک ففی النار قال ذلک ثلاث مرات ولاینظر الله یوم القیامة الی من جر ازاره بطرا"**

(رواہ ابوداؤد وابن ماجه،مشکوۃ کتاب اللباس)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا مومن کی چادر پنڈلیوں کے نصف تک ہوتی ہے، پنڈلی اور ٹخنے کے درمیان چادر کے ہونے میں کوئی گناہ نہیں جو اس سے نیچے ہو وہ آگ میں ہوگا۔ یہ آپ

نے تین مرتبہ فرمایا، اللہ تعالی قیامت کے دن نظر رحمت اس پر نہیں فرمائے گا جس نے تکبر کے طور پر چادر کو ڈھلکایا۔

تکمیل مسئلہ :

"واما القدر المستحب فیما ینزل الیہ طرف القمیص والازار فنصف الساقین والجائز بلا کراھة ماتحتہ الی الکعبین وبالجملة یکرہ مازاد علی الحاجة والمعتادفی اللباس من الطول والسعة والظاھر ان المعتبرھو المعتاد الشرعی لاالمعتاد العرفی" (مرقاۃ ص ۱۳۹)

مستحب یہ ہے کہ قمیص یا چادر نصف پنڈلیوں تک ہو۔ بغیر کراہیت کے جائز ہے کہ چادر وغیرہ ٹخنوں تک ہو۔ حاصل کلام یہ ہے کہ جو لباس عادت اور حاجت سے زائد ہو لمبائی اور وسعت میں وہ مکروہ ہے، عادت سے مراد عادت شرعیہ ہے، عادت عرفیہ مراد نہیں۔

فیصلہ کن بات حدیث پاک سے:

"عن ابن عمر ان النبی ﷺ قال من جرثوبہ خیلاء لم ینظر اللہ الیہ یوم القیامة فقال ابوبکر یارسول اللہ ازاری یسترخی الاان اتعاھدہ فقال لہ رسول اللہ ﷺ انک لست ممن یفعلہ خیلاء"

(رواہ البخاری، مشکوۃ کتاب اللباس)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے تکبر کی وجہ سے کپڑا کھینچا (لمبا کپڑا رکھا اور اسے ڈھلکایا، زمین پر گھسیٹ کر چلا) قیامت کے دن اللہ تعالی اس پر نظر رحمت نہیں فرمائے گا، تو حضرت ابوبکر ﷛ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میری چادر ڈھلکتی رہتی ہے مگر یہ کہ میں اس کی حفاظت کروں، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بیشک تم ان میں سے نہیں ہو جو تکبر کے طور پر ایسا کرتے ہیں۔

وضاحت حدیث: "(لم ینظر اللہ الیہ یوم القیامة) الی نظر رحمة اوبعین عنایة" نظر نہ فرمانے کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالی اس شخص کی طرف قیامت کے دن نظر رحمت نہیں فرمائے گا، یا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی قیامت کے دن اس شخص پر خصوصی مہربانی نہیں فرمائے گا۔

"فقال ابو بکر یا رسول اللہ ازاری یسترخی" "ای قد یسترخی بنفسہ من غیر اختیاری وربما یصل الی کعبی وقدمی"

حضرت ابوبکر ﷛ کا یہ عرض کرنا یارسول اللہ ﷺ میری چادر ڈھلکتی رہتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ بغیر میرے اختیار کے میری چادر نیچے آجاتی ہے، کئی مرتبہ وہ ٹخنوں تک آجاتی ہے، اور کئی مرتبہ (ٹخنوں کے نیچے) قدم تک آجاتی ہے۔

الاان اتعاهده"من التعاهدوهوعلى فى النهاية بمعنى الحفظ والرعاية يعنى وربما يقع منى عدم التعاهد لمانع شرعى اوعرفى فما الحكم فى ذلك"

''مگر یہ کہ میں اس کی حفاظت کروں''اس کا مطلب یہ ہے کہ میں حفاظت تو کرتا ہوں، چادر کو اوپر تو اٹھاتا رہتا ہوں، لیکن بہت مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ میں توجہ نہیں کرسکتا، چادر کو اوپر رکھنے کی حفاظت نہیں کرسکتا کسی شرعی مانع یا عرفی مانع کی وجہ سے تو میرے لئے کیا حکم ہے؟

"تعاھد" کا معنی ہے حفاظت کرنا اور رعایت کرنا۔(اتعاھدہ، مضارع متکلم بمع ضمیر منصوب متصل کے ہے)

("فقال له رسول الله ﷺ انک لست ممن يفعله خيلاء)والمعنى ان استر خاه من غير قصد لايضر لاسيما ممن لايكون شيعته الخيلاء ولكن الافضل هو المتابعة وبه يظهر ان سبب الحرمة فى جر الازار هو الخيلاء كما هو مقيد فى الشرطية من الحديث المصدربه"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک تم ان میں سے نہیں ہو جو تکبر کے طور پر کرتے ہیں''اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری چادر کا ٹخنوں پر پہنچ جانا، یا ٹخنوں سے نیچے آجانا وعید کے ضمن میں نہیں آتا، کیونکہ وہ بلا اختیار فعل ہے۔غیر اختیاری فعل پر کوئی مؤاخذہ(پکڑ) نہیں۔خصوصا جب ایک انسان کی عادت ہی نہیں کہ وہ تکبر کرے تو اس کے کپڑے کا گھسٹنا گناہ نہیں۔البتہ نبی کریم ﷺ کی تابعداری کی کوشش کرے تو افضل ہے۔اسی سے ظاہر ہوگیا کہ بیشک سبب حرمت کپڑے کو زمین پر گھسیٹ کر چلنے میں تکبر ہے، اگر تکبر نہیں تو یہ مکروہ تنزیہی ہے۔حدیث شریف میں جملہ شرطیہ استعمال ہے، جملہ شرطیہ کا یہ حکم ہے کہ شرط پائی جائے تو جزاء پائی جاتی ہے۔شرط نہ پائی جائے تو جزاء نہیں پائی جاتی۔

ایک مرتبہ حدیث پاک کے الفاظ مبارکہ کو پھر دیکھیں"**من جر ثوبه خيلاء لم ينظر الله اليه يوم القيامة**'' جس شخص نے کپڑا تکبر کے طور پر کھینچا، گھسیٹ کر چلا اللہ تعالی قیامت کے دن اس کی طرف نظر رحمت نہیں فرمائے گا۔جس طرح ایک شخص کپڑا کھینچے ہی نہیں وہ اس وعید کے ضمن میں نہیں آتا، اسی طرح اگر کسی کا کپڑا تو لمبا ہے لیکن وہ شخص متکبر نہیں تو وہ بھی اس وعید کے ضمن میں نہیں آتا، اور اسی حدیث کی شرح میں علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ کے الفاظ کی طرف بھی ایک مرتبہ پھر نظر کرلیں۔

"وربما يقع منى عدم التعاهد لمانع شرعى اوعرفى فماالحكم فى ذلك"

بہت ہی مرتبہ مجھ سے چادر کی حفاظت کسی شرعی یا عرفی مانع کی وجہ سے نہیں ہوسکتی تو اس کا کیا حکم ہے؟

اگر چہ پہلے ایک حدیث پاک کی وضاحت میں علامہ ملاعلی قاری رحمہ اللہ کا قول گذرا کہ، عادت شرعیہ کا

اعتبار کرنا چاہئے، عادت عرفیہ کا اعتبار نہ کیا جائے، لیکن اس کا تعلق افضلیت سے ہے۔ یعنی جب ایک کام مکروہ تنزیہی ہو، لیکن لوگوں کی عادت کے مطابق ہو تو افضل یہ ہے کہ اسے چھوڑ دیا جائے۔ اب اس حدیث کی وضاحت میں جو یہ بیان کیا ہے، کہ مانع شرعی یا مانع عرفی کی وجہ سے بہت اوقات میں مجھ سے چادر کی حفاظت نہیں ہو سکتی، یہ بیان جواز ہے۔ مطلب واضح ہے کہ اگر مکروہ تنزیہی ہو لیکن وہ عرف کے مطابق ہو، تو اس پر عمل کرنا جائز ہے، اگر چہ بہتر یہ ہے کہ مکروہ تنزیہی پر عمل کرنے سے بچ جائے، جب مکروہ تنزیہی کہتے ہی خلاف اولی (جو بہتر صورت کے خلاف ہو) کو کہتے ہیں، اگر اس پر عمل کرلیا جائے تو اس پر شریعت کی طرف سے کوئی پکڑ نہیں، اور اگر اس سے بچ جائے تو یہ اس کیلئے بہتر ہے، اس کا اسے ثواب ملے گا۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج ۸ ص ۱۶۴، ۱۶۵)

فعل میں جو حکم مستحب کا ہے وہی عدم فعل میں مکروہ تنزیہی کا ہے یا لوگ مسائل کو سمجھنے سے قاصر ہیں یا ضد اور عناد کی وجہ سے فساد پھیلاتے رہتے ہیں، ہزاروں مستحبات پر کوئی عمل نہ کرے تو اس سے کوئی نہ پوچھے اور کسی ایک مکروہ تنزیہی پر پہاڑ کھڑے کر دیئے جائیں، یہ عقل سے بعید ہے، یہ دین کی خدمت نہیں بلکہ فساد پھیلانا ہے، لوگوں کو دین سے دور کرنا ہے۔

مستحبات کی ترک پر کبھی جھگڑا، کبھی مباح پر عمل کرنے میں جھگڑا، کبھی مستحبات پر عمل کرنے میں جھگڑا، کبھی مکروہ تنزیہی پر عمل کرنے میں جھگڑا یہ سب جاہلوں کا کام ہے، علماء جب سمجھتے ہیں کہ مستحب کا حکم کیا ہے تو وہ اس میں جھگڑا نہیں کرتے، بلکہ وہ یہ کہتے ہیں جو عمل کر رہے ہیں ان کو ثواب ہو رہا ہے، جو عمل نہیں کر رہے وہ گنہگار نہیں، شریعت ان سے ترک مستحب پر مؤاخذہ نہیں کرتی، اسی طرح علماء کرام مباح پر عمل کرنے یا نہ کرنے والے پر کوئی جھگڑا نہیں کرتے انہیں معلوم ہے کہ مباح پر عمل کرنے یا نہ کرنے میں نہ کوئی گناہ ہے، نہ ثواب، لھذا جھگڑا کیا؟

اسی طرح علماء کرام مکروہ تنزیہی کو جھگڑے کا سبب نہیں بناتے وہ جانتے ہیں مکروہ تنزیہی کو چھوڑنا افضل ہے، اس پر عمل کرنے میں کوئی گرفت نہیں (راقم)

گھوڑوں سے محبت کی تین قسمیں:

(۱) ان میں سے ایک قسم وہ ہے جس میں ثواب ہے "یکون ربطھا اصحابھا معدۃ لسبیل اللہ متی احتاجوا الیھا علیھا فھؤلاء یثابون" کبھی گھوڑوں کو پالنے سے اس لئے محبت ہوتی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیلئے کام آئیں گے، اس محبت میں اور گھوڑوں کو اس نیت سے پالنے میں ثواب ہوگا، چونکہ رب تعالیٰ نے گھوڑے

پالنے کا حکم دیا ہے۔

﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ﴾ (الانفال، آیۃ نمبر ۶۰)

اوران کیلئے تیار رکھو جو قوت تمہیں بن پڑے اور جتنے گھوڑے باندھ سکو کہ ان سے، ان کے دلوں میں دھاک بٹھاؤ جو اللہ تعالیٰ کے دشمن اور تمہارے دشمن ہیں۔

گھوڑے پالنے کی فضیلت میں احادیث ان شاءاللہ سورۃ الانفال میں ہی آئیں گی۔

(۲) گھوڑے پالنے اور ان سے محبت کرنے کی دوسری قسم وہ ہے جس میں گناہ ہے۔"وتارة تربط فخرا ونواء لاهل الاسلام فهذه على صاحبها وزر" یعنی کبھی لوگ فخر کے طور پر گھوڑے پالتے ہیں اور مسلمانوں سے مقابلہ کیلئے گھوڑے پالتے ہیں، گھوڑوں سے اس قسم کی محبت گناہ کا ذریعہ ہے۔

(۳) تیسری قسم گھوڑوں سے محبت کی یہ ہے کہ انسان گھوڑے اس لئے پالیں کہ ان کی نسل باقی رہے، یہ سواری کے کام آئیں گے، اور ان کو بیچ کر اپنی ضروریات میں خرچ کریں گے، اس میں پھر دو صورتیں ہیں اگر انسان گھوڑوں کے پالنے میں رب تعالیٰ سے غافل نہیں ہوتا تو یہ جائز ہے، کیونکہ کسب معاش ضروری ہے، کسب معاش کے ساتھ ساتھ رب تعالیٰ کو بھی یاد کرتا رہے۔

اگر گھوڑوں کے پالنے میں ہی سارا وقت صرف کردے اور نماز نہ ادا کرے اور رب تعالیٰ سے غافل رہے تو یہ محبت گھوڑوں سے محبت مذمومہ ہے۔ (ماخوذ از صابونی وابن کثیر مع وضاحت)

﴿وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ﴾ "اور چوپاؤں اور کھیتی کی"

یعنی چوپاؤں اور کھیتی کی محبت کو ان کیلئے مزین کردیا گیا۔

"الانعام" سے مراد "اونٹ، گائے، بھیڑ، بکریاں ہیں""سميت بذلك لنعومة مشيها ولينه" ان جانوروں کے چلنے میں نرمی اور آہستگی پائی جاتی ہے، اس وجہ سے ان کو "الانعام" کہا جاتا ہے۔"والنعم فختصة بالابل" اور "نعم" کا لفظ عام استعمال میں اونٹوں کے ساتھ خاص ہے۔ یہاں مراد تمام جانور ہیں یعنی اونٹ، گائے، بھیڑ، بکریاں وغیرہ۔"والحرث" مصدر ہے، لیکن معنی مفعول والا ہے، مراد اس سے مزروعات ہیں۔"سواء كان جبوبا ام بقلا ام ثمرا" خواہ دانے ہوں، یا سبزیاں ہوں، یا پھل ہوں۔ (از روح المعانی)

چوپاؤں اور کھیتی سے محبت کی دو قسمیں:

(۱) ایک قسم جو جائز ہے وہ یہ ہے کہ جانوروں کے پالنے میں وقت گزارتا ہے اور کھیتی باڑی کا کام کرتا ہے، لیکن نماز بھی بروقت ادا کرتا ہے، اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت بھی کرتا ہے، چوپاؤں اور کھیتی سے صرف اس لئے محبت ہے کہ یہ ذریعہ معاش ہیں، جب تک یہ مال حاصل نہیں ہوگا اس وقت تک اہل وعیال کے حقوق ادا نہیں ہوں گے، تو یہی محبت جائز ہے اور محمود ہے۔

(۲) اگر چوپاؤں اور کھیتی سے ایسی محبت ہو جو اللہ تعالی سے ہی دور کردے، نہ نماز کی فکر ہو، اور نہ ہی اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ کے اوامر ونواہی کا خیال ہو تو یہ محبت ناجاز ہے، قابل مذمت ہے، اسی کا تذکرہ اس آیۃ کریمہ میں ہے۔

﴿ذٰلِکَ مَتَاعُ الْحَیَاۃِ الدُّنْیَا﴾ ''یہ سامان ہے دنیا کی زندگی کا۔''

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

بظاہر یہاں وہم یہ ہوتا ہے کہ پہلے سات چیزوں کا ذکر ہے، اور ''ذلک'' کا اشارہ واحد مذکر کی طرف ہوتا ہے، واحد کا اشارہ جمع کی طرف کس طرح صحیح ہے؟ ضابطہ کے مطابق ''تلک'' یا ''ھؤلاء'' ذکر ہونا چاہئے تھا، تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے۔ ''اراد ذلک المذکور او المتقدم ذکرہ'' کہ ''ذلک'' کا اشارہ ''مذکور'' کی طرف ہے یا ''المتقدم ذکرہ'' (جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے یہ دنیا کی زندگی کا سامان ہے) اب اشارہ درست ہو گیا۔
(ماخوذ از البحر المحیط)

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ''ذلک'' بعید کی طرف اشارہ کیلئے آتا ہے، یہ چیزیں تو ساتھ ہی متصل مذکورہ ہیں ان کی طرف ''ذلک'' کا اشارہ کس طرح صحیح ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ کبھی گھٹیا چیز کی طرف اشارہ بعید کا ہوتا ہے کہ یہ مقام حضور سے دور ہے۔ ''والمعنی تحقیر امر الدنیا والاشارۃ الی فنائھا وفناء مایستمتع بہ فیھا'' یہاں بھی اشارہ یہ کیا گیا ہے کہ جن چیزوں کی محبت کا ذکر کیا گیا ہے وہ دنیا کی زندگی کا سامان ہیں، دنیا نے اور دنیا کے سامان نے فنا ہو جانا ہے، جو چیزیں فناء ہو جاتی ہیں وہ گھٹیا ہیں، بہتر وہی چیز ہے جس نے ہمیشہ کیلئے باقی رہنا ہے، وہ ہے اخروی زندگی، اور اس اخروی زندگی کی نعمتیں۔ (الماخوذ از البحر المحیط بختصر معانی)

❁ ''عن عبد اللہ بن عمر ان رسول اللہ ﷺ قال انما الدنیا متاع ولیس من متاع الدنیا شئ افضل من المرأۃ الصالحۃ'' (رواہ ابن ماجۃ)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک دنیا سامان ہے، دنیا کے سامان میں سے نیک عورت (نیک زوجہ) سے افضل اور کوئی چیز نہیں۔

حدیث پاک سے بھی واضح ہوا کہ دنیا کی زندگی سامان ہے، دنیا کے سامان میں سے زیادہ افضل نیک زوجہ ہے لیکن اسی آیۃ سے واضح ہو گیا کہ زوجہ سے محبت بھی اگر رب تعالیٰ سے غافل کر دے تو وہی محبت بری ہے۔ (از قرطبی)

دنیا سے محبت رب تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ:

"قال رسول الله ﷺ "ازهد فی الدنیا یحبک الله" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "دوری اختیار کرو تو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔

وضاحت حدیث:

"ازهد فی الدنیا ای فی متاعها من الجاه و المال الزائد علی الضروری" حدیث شریف میں "دنیا سے دور رہنے" کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے مال سے محبت اس لئے کرنا کہ اس سے مجھے دنیا میں مرتبہ حاصل ہو گا، یا انسان ضرورت سے زائد مال جمع کرنے میں مشغول رہ کر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے غافل رہے۔ جب انسان ضرورت کے مطابق مال سے محبت رکھے، مال اگر مل جائے تو پھر بھی اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہ رہے تو اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرتا ہے، یعنی اسے اپنا قرب عطاء کر دیتا ہے۔

❁ **"عن المقدام بن معدیکرب قال قال رسول الله ﷺ لیس لا بن آدم حق فی سوی هذه الخصال بیت یسکنه وثوب یواری عورته و جلف الخبز و الماء"** (اخرجه الترمذی)

مقدام بن معدیکرب کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ انسان کا حق سوائے ان چیزوں کے نہیں یعنی رہنے کیلئے گھر، اور ستر ڈھانپنے کیلئے کپڑا اور روٹی کا ٹکڑا اور پانی یعنی ان ضرورت کی چیزوں کی علاوہ دنیا میں مشغول نہ ہو۔

"وسئل سهل بن عبد الله بم یسهل علی العبد ترک الدنیا و کل الشهوات؟قال بتشاغله بما امر به"

حضرت سہل بن عبداللہ رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ بندے کیلئے دنیا کی محبت اور تمام خواہشات سے محبت کو چھوڑنے کا آسان طریقہ کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ بندہ ان کاموں میں مشغول ہو جائے جن کا حکم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے دیا ہے، تو خود بخود اس سے دنیاوی خواہشات چھوٹ جائیں گی، اور دنیا کے سامان سے

محبت اسے ضرورت کی حد تک رہ جائے گی، حلال و حرام میں وہ تمیز کر سکے گا۔ (ماخوذ از قرطبی)

﴿وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَآبِ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اچھا ٹھکانا ہے۔''

''مـآب'' کا معنیٰ ''مرجع'' لوٹنے کی جگہ۔ یہ لفظ لیا ہوا ہے ''آب یـئـوب أوبـا'' سے جس کا معنی ہے لوٹنا۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

وکل ذی غیبة یئوب وغـائـب الـمـوت لایـئـوب

''ہر غیب ہونے والا شخص لوٹ آتا ہے موت سے غائب ہونے والا لوٹتا نہیں'' (قرطبی)

وهو اشارة الی نعیم الأخره الذی لا یفنی و لا ینقطع " ان الفاظ مبارکہ سے اس طرف اشارہ پایا گیا ہے کہ اخروی نعمتیں فنا نہیں ہوں گی اور نہ ہی ختم ہوں گی (البحر المحیط)

یعنی بندے کو چاہئے کہ وہ فانی چیزوں سے محبت نہ کرے بلکہ باقی رہنے والی چیزوں سے محبت کرے وہ اخروی نعمتیں ہیں۔

خوبصورت بیان :

"ذکر اللہ تعالی اربعة اصناف من المال کل نوع من المال یتمول به صنف من الناس اما الذهب والفضه فیتمول بها التجار واما الخیل المسومة فیتمول بها الملوک واما الانعام فیتمول بها اهل البوادی واما الحرث فیتمول بها اهل الرساتیق فتکون فتنة کل صنف فی النوع الذی یتمول فاما النساء والبنون ففتنة للجمیع"

سونے اور چاندی کو تاجر لوگ اپنا مال بناتے ہیں کہ وہ ان سے تجارت کرتے ہیں خوبصورت گھوڑے بادشاہوں کا مال ہے کہ وہ ان سے محبت کرتے ہیں اور شاہانہ انداز پر ان پر سوار ہوتے ہیں یعنی بادشاہوں کی ناز نخرے میں گھوڑے کی سواری بھی ہے چوپاؤں سے محبت باہر جنگل میں رہنے والوں کو ہوتی ہے یعنی ان کا مال چوپائے ہیں اس لئے کہ باہر جنگل میں خیموں میں رہنے والوں کو جانور پالنے آسان ہیں۔

دیہاتیوں کا مال کھیتی باڑی ہے یعنی ان کا زیادہ طور پر ذریعہ معاش کھیتی باڑی ہے آیۃ کریمہ میں ہر قسم کے مال کا ذکر کر کے یہ واضح کر دیا ہے کہ جن لوگوں کو جس مال سے محبت ہو گی اور جس مال کو حاصل کرنے کی وہ زیادہ کوشش کریں گے وہی ان کیلئے فتنہ ہوگا۔ عورتیں اور بیٹے سب لوگوں کیلئے ایک جیسے فتنہ ہیں کیونکہ تاجر ہوں یا بادشاہ جنگل میں رہنے والے ہوں یا دیہات میں سب ہی عورتوں اور بیٹوں سے محبت کرتے ہیں (از قرطبی)

کھیتی جب رب تعالی سے غافل نہ کرے قابل تعریف ہے:

❁ عن انس بن مالک قال قال النبی ﷺ ما من مسلم غرس غرسا اوزرع فیاکل منه طیر او انسان اوبهیمة الاکان له به صدقة" (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کوئی مسلمان درخت نہیں لگاتا یا کھیتی نہیں کاشت کرتا کہ اس سے پرندے یا انسان یا چوپائے کھائیں مگر یہ کہ اس کیلئے یہ صدقہ ہے۔

یعنی جب کوئی انسان درخت لگاتا ہے اور فصل کاشت کرتا ہے اس سے پرندے کھالیں یا جانور کھالیں یا نیچے گرا ہوا پھل وغیرہ انسان کھالیں تو اس کو صدقہ کا ثواب حاصل ہوگا۔

کھیتی رب تعالی سے دور کرے تو قابل مذمت ہے:

❁ "عن ابی امامة الباهلی قال وقدرای سکة وشیئامن آلة الحرث فقال سمعت رسول الله ﷺ یقول لا یدخل هذا بیت قوم الادخله الذل" (رواہ البخای)

ابوامامہ باہلی نے "ہل اور کھیتی باڑی کے آلات میں سے کوئی آلہ" دیکھا تو کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ یہ (کھیتی کے آلات) کسی قوم کے گھر داخل نہیں ہوئے مگر یہ کہ اس گھر میں ذلت داخل ہو جاتی ہے۔

وضاحت حدیث:

" قیل ان الذل هناما یلزم اهل الشغل بالحرث من حقوق الارض التی یطالبهم بها الائمه والسلاطین "

حدیث پاک میں جو یہ ذکر کیا گیا ہے کہ کھیتی باڑی کے آلات کا کسی گھر میں داخل ہونا اس گھر میں ذلت کا داخل ہونا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ وقت کے حکام اور بادشاہوں کے کہنے پر فقط وہ کھیتی باڑی میں مشغول رہے اور اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی بجا آوری سے غافل رہے۔

وقال المهلب معنی قوله فی هذا الحدیث والله اعلم الحض علی معالی الاحوال وطلب الرزق من اشرف الصناعات وذلک لمن خشی النبی ﷺ علی امته من الا شتغال با لحرث وتضییع رکوب الخیل والجهاد فی سبیل الله "

مہلب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب اپنے مالی حالت کو سنوارنے اور بلند کرنے کا حکم بھی موجود ہے اور رزق طلب کرنے کو سب سے اشرف صنعت قرار دیا گیا تو پھر حدیث پاک میں کھیتی باڑی کے آلات کو ذلت سے تعبیر کرنے کا کیا مطلب؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی صرف کھیتی باڑی میں مشغول رہے اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ سے

غافل رہے جہاد سے غافل رہے جہاد کیلئے گھوڑے نہ پالے اس طرح کھیتی باڑی میں مشغول رہنے کی حدیث شریف میں مذمت کی گئی ہے۔ (ماخوذ از قرطبی)

مسئلہ واضح ہوا : کہ اس آیۃ کریمہ میں جن چیزوں کا تذکرہ ہے اگر ان کی محبت رب تعالی اور اس کے رسول ﷺ سے دور کرنے کا ذریعہ ہو تو قابل مذمت ہے۔اگر یہی چیزیں رب تعالی کے قریب کرنے کا ذریعہ بن جائیں تو قابل تعریف ہیں البتہ اکثر طور پر ان چیزوں کی محبت غفلت کا ذریعہ ہی ہوتی ہے اسی وجہ سے ان کو دینا کا سامان اور فانی قرار دیا اسی آیۃ کریمہ کے آخری الفاظ اور آنے والی آیۃ کریمہ میں باقی رہنے والی اخروی نعمتوں سے محبت کرنے کا ذکر کیا۔ (راقم)

❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀

﴿قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ o﴾ (آیۃ نمبر ۱۵)

(1) تم فرماؤ کیا میں تمہیں اس سے بہتر چیز بتا دوں پرہیزگاری کیلئے ان کے رب کے پاس جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں رواں ہمیشہ ان میں رہیں گے اور ستھری بیبیاں اور اللہ تعالی کی خوشنودی اور اللہ تعالی بندوں کو دیکھتا ہے۔

(2) آپ فرمادو" کیا میں تمہیں خبر دوں اس سے بہتر کی" ان لوگوں کیلئے جنہوں نے تقوی اختیار کیا، جنتیں ہیں جاری ہیں ان کے نیچے نہریں، ہمیشہ رہیں گے ان میں اور پاکیزہ بیبیاں ہیں اور رضا مندی ہوگی اللہ تعالی کی طرف سے اور اللہ تعالی علم رکھنے والا ہے بندوں کا۔

پچھلی آیۃ کریمہ سے تعلق:

(۱) پچھلی آیۃ کریمہ میں ذکر فرمایا ﴿وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ﴾ (اور اللہ تعالی کے ہاں اچھا ٹھکانا ہے) اور گویا

کہ یہ بیان فرمادیا"ان ذلک المآب کما انه حسن فی نفسه" تو وہ احسن اور افضل ہے اس دنیا سے، لیکن جب اس کا تقابل دنیا کی نعمتوں اور دنیا کے ٹھکانوں سے کیا جائے"فهو احسن وافضل من هذه الدنیا" تو وہ احسن اور افضل ہے اس دنیا سے، یعنی اس دنیا سے وہ ٹھکانا زیادہ حسن رکھنے والا ہوگا اور زیادہ بہتر ہوگا۔ پہلے مطلق اخروی ٹھکانے کا حسن ہونا ذکر کیا، اب اس کا احسن ہونا ذکر کیا اور ارشاد فرمایا ﴿قُلْ أَؤُنَبِّئُكُم بِخَيْرٍ مِّن ذَٰلِكُمْ﴾ "خیر" اسم تفضیل ہے۔اسم تفضیل میں زیادتی بنسبت غیر کے ہوتی ہے۔

(۲) پچھلی آیۃ کریمہ میں دنیا کی نعمتوں کا ذکر کیا، انسان عام طور پر دنیا کی نعمتوں کو ہی نفع مند سمجھتا ہے، کیونکہ وہ اس نے دیکھی ہوتی ہیں"فبین فی هذه الآیة ان منافع الآخرة خیر منها" تو اس آیۃ کریمہ میں یہ ذکر فرمایا کہ بیشک آخرت کے منافع دنیا کے منافع سے زیادہ بہتر ہیں۔ جس طرح ایک اور آیۃ کریمہ میں بیان فرمایا ﴿وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ﴾ اور آخرت بہت ہے اور باقی رہنے والی ہے۔ اس آیۃ میں لفظ "خیر" ہے جو بنسبت غیر کے افضلیت کا تقاضا کرتا ہے۔ لھذا مطلب اس کا بھی یہ ہے کہ آخرت دنیا سے زیادہ اچھی ہے، اور آخرت ہمیشہ کیلئے باقی رہنے والی ہے اور دنیا فنا، ہونے والی ہے۔

(۳) پچھلی آیۃ کریمہ میں دنیا کی نعمتوں کا ذکر کیا، جن میں بظاہر منافع اور حسن انتظام پایا جاتا ہے، یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ آخرت دنیا سے بہتر و افضل ہے۔"والمقصود منه ان یعلم العبد انه کما ان الدنیا اطیب واوسع وافسح من بطن الام فکذلک الآخرة اطیب واوسع وافسح من الدنیا" مقصد اس بیان کا یہ ہے کہ بندے کو معلوم ہو جائے کہ جس طرح دنیا کی نعمتیں ماں کے پیٹ سے اچھی اور وسیع ہیں، اسی طرح آخرت کی نعمتیں دینا سے اچھی اور وسیع ہیں۔ (کبیر)

در حقیقت انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ ایک جگہ سے دل لگالیتا ہے دوسری جگہ منتقل ہونے سے ڈرتا ہے، جب ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے وہاں ہی اس کا دل لگا ہوتا ہے، پیدا ہونے پر روتا ہے کہ وہ کہاں آگیا۔ پھر دینا سے اس کا دل ایسا لگ جاتا ہے کہ یہاں سے منتقل ہونے سے ڈرتا ہے لیکن یہاں سے جب قبر میں منتقل ہو جاتا ہے تو آخرت کی طرف منتقل ہونے سے ڈرتا ہے۔ جب قبر سے اٹھایا جائے گا تو خوف کی وجہ سے اس کے بال سفید ہو جائیں گے۔ تو رب تعالی نے اس آیۃ کریمہ میں دنیا سے آخرت کی طرف منتقل ہونے کی رغبت دلائی ہے کہ اخروی نعمتیں دنیا کی نعمتوں سے بہتر ہیں، اس لئے اے انسان اخرت کی طرف منتقل ہونے سے نہ ڈر۔

اخروی نعمتیں دنیا کی نعمتوں سے بہتر کیوں؟

(۱) دنیا کی نعمتیں اگر چہ نفع مند ہیں لیکن ان میں نقصانات بھی پائے جاتے ہیں۔اور تکالیف بھی پائی جاتی ہیں لیکن اخروی نعمتیں نقصانات سے پاک ہوں گی اور ان میں کسی قسم کی تکالیف نہیں ہوں گی۔

(۲) دنیا کی نعمتیں فانی ہیں،اور اخروی نعمتیں باقی ہیں،یقیناً باقی رہنے والی نعمتیں باقی رہنے والی نعمتوں سے بہتر ہیں۔ (از کبیر)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

﴿قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ﴾ میں ہمزہ استفہام کیلئے استعمال ہے۔اس استفہام میں تین احتمال ہیں۔

(۱) ایک احتمال ان میں سے یہ ہے کہ جملہ استفہامیہ ہو ﴿قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ﴾ اس کے مطابق ترجمہ یہ ہوگا آپ فرمادیں کیا میں تمہیں خبر دوں اسے سے بہتر چیز کی؟ اس سے آگے جملہ علیحدہ ہے پرہیزگاروں کیلئے ان کے رب کے ہاں جنتیں ہیں ان کے نیچے نہریں جاری ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے،اور (ان جنتوں میں ان پرہیزگاروں کیلئے) پاک بیبیاں ہوں گی،اور (ان پرہیزگاروں کو) اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل ہوگی۔

(۲) جملہ استفہامیہ ہو ﴿قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا﴾ اس کے بعد نیا جملہ ہو۔اس ترکیب کے لحاظ پر معنی ہوگا"کیا میں تمہیں خبر دوں اس سے بہتر چیز کی جو پرہیزگاروں کیلئے ہے ان کے رب کے ہاں؟ بعد والا جملہ اس کا بیان ہوگا ﴿جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ راقم کا ترجمہ پہلے قول کے مطابق ہے۔

﴿لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ "پرہیزگاروں کیلئے ہے ان کے رب کے ہاں۔"

تقوی کی مکمل وضاحت تو سورۃ بقرۃ کی ابتداء میں کردی گئی کہ تقوی کیا ہے اور اس کی کتنی قسمیں ہیں، مختصر طور پر یہاں ذکر کیا جارہا ہے۔

(۱) "التقوی عبارۃ عن اتقاء الشرک" تقوی کی ایک قسم یہ ہے کہ شرک سے بچنا۔

(۲) "ان الانسان لایکون متقیا الااذا کان آتیا بالواجبات محترزا عن المحظورات" انسان متقی صرف اس صورت میں ہوگا جب وہ واجبات پر عمل کرے گا اور ممنوع چیزوں سے بچے گا۔

(۳) "التقوی ھو التبتل الی اللہ تعالی والاعراض عما سواہ"

تقوی کا مطلب یہ ہے کہ کامل اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو اور اس کے سوا تمام چیزوں سے اعراض پایا جائے، یہاں

تقوی کی کون سی قسم مراد ہے؟ روح البیان نے تقوی کی تیسری قسم مراد لی ہے، لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ نے تقوی سے مراد عام لیا ہے کہ شرک سے بچنے والے کو بھی یہ نعمتیں حاصل ہوں گی۔

راقم کا موقف اس میں یہ ہے کہ شرک سے بچنے والے خواہ وہ گنہگار ہی کیوں نہ ہوں وہ بھی جنت میں جائیں گے اگر چہ نظام عدل پر وہ عتاب کے بھی مستحق ہوں گے۔اور اوامر پر عمل کرنے والے اور نواہی سے بچنے والے ابتداء طور پر ہی جنت میں داخل کر دئے جائیں گے،اور اللہ تعالی کی طرف کامل طور پر توجہ کرنے والے اور غیروں سے اعراض کرنے والے اس کے خصوصی تقرب کے مستحق بھی ہوں گے۔ (راقم)

﴿جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ﴾ ''جنتیں جاری ہوں گی ان کے نیچے نہریں''

جنت پاکیزہ مقام ہے، اس میں ہر قسم کا طعام صاف ستھرا، اور پاکیزہ ہوگا، اور اس میں پاکیزہ مشروب ہوں گے، اور اچھا لباس اور اچھے فراش اور حسن منظر پایا جائے گا جیسا کہ رب تعالی کا ارشاد گرامی ہے ﴿فِیۡہَا مَا تَشۡتَہِیۡہِ الۡاَنۡفُسُ وَ تَلَذُّ الۡاَعۡیُنُ﴾ ان (جنتوں) میں وہ چیزیں ہوں گی جن کی نفوس خواہش کریں گے اور آنکھوں کو لذت حاصل ہوگی۔

﴿خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا﴾ ''ہمیشہ رہیں گے ان میں۔''

اس سے مراد یہ ہے کہ جنت کی نعمتیں دائمی ہیں، یعنی ان میں بقاء ہے فنا نہیں کیونکہ کوئی نعمت بھی خواہ کتنی بڑی ہو جب اس پر فنا آئے تو اسے بڑی نعمت نہیں سمجھا جائے گا۔

﴿وَ اَزۡوَاجٌ مُّطَہَّرَۃٌ﴾ ''اور پاکیزہ بیبیاں۔''

یعنی جنت کی نعمتوں میں بہت بڑی نعمت یہ ہوگی کہ ان متقی لوگوں کو پاکیزہ بیبیاں حاصل ہوگی۔ "وتحقیق القول فیه النعمة وان عظمت فلن تتکامل الابالازواج اللواتی لایحصل الانس الابهن" تحقیق قول کی اس میں یہی ہے کہ بیشک نعمت اگر چہ عظیم ہو وہ ہرگز کامل نہیں ہوتی سوائے بیبیوں کے، کیونکہ ان کے بغیر کامل انس ومحبت حاصل نہیں۔

قرآن پاک کا ایک لفظ کتنے مطالب کو حاوی (شامل) ہے:

اللہ تعالی نے جنتی بیبیوں کی صفت بیان فرمائی "مطھرة" وہ پاکیزہ ہوں گی۔ اس ایک لفظ "مطھرة" میں عظیم بیان موجود ہے۔

"ویدخل فی ذلک الطھارة من الحیض والنفاس وسائر الاحوال التی تظھر عن

النساء فی الدنیا مما ینفر عنه الطبع ویدخل فیه کونهن مطهرات من الاخلاق الذمیمة ومن القبح وتشویه الخلقة ویدخل فیه کونهن مطهرات من سوء العشرة"
یعنی وہ جنتی بیبیاں حیض اور نفاس سے پاک ہوں گی۔اور ان کے چہرے پر کوئی بدنما داغ نہیں ہوں گے۔خوبصورت صاف، ستھرا چہرہ ہوگا۔معاشرتی برائیوں سے وہ پاک ہوں گی،یعنی دنیاوی عورتوں کی طرح جھگڑا کرنے والی نہیں ہوگی،وہ جھگڑے،،فساد سے پاک ہوں گی۔ (کبیر)

﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ﴾ اور رضاءمندی ہوگی اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔

یعنی پرہیزگاروں کو اللہ تعالیٰ کی رضاءمندی حاصل ہوگی۔یہ بہت عظیم نعمت ہوگی اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام میں بیان فرمایا﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ اللہ تعالیٰ کی رضاءمندی سب چیزوں سے بڑی چیز ہے۔

دینی طلباءکرام کی توجہ کیلئے: "رضوان"عام قراءت بضم الراء ہے،یہ قیس اور تمیم کی لغت ہے،اس قراءت کے مطابق"طغیان،رجحان،کفران،شکران"کے وزن پر ہے اور باقی قراء کی قراءت میں بالکسر استعمال ہے۔اس صورت میں"حرمان اور قربان کے وزن پر ہے۔ (کبیر)

متکلمین کا قول:

ثواب کے دو رکن ہیں۔ایک منفعت جس کا ذکر ہو چکا ہے یعنی ان کو جنتیں حاصل ہوں گی ان کے نیچے نہریں جاریں ہوں گی وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے،اور ان کو پاکیزہ بیبیاں حاصل ہوں گی۔ثواب کا دوسرا رکن تعظیم ہے،رضوان سے وہی مراد ہے۔اس لئے کہ جنت والوں کو جب یہ معلوم ہوگا کہ منفعت والی نعمتوں کے ساتھ ساتھ ان کو اللہ تعالیٰ کی رضاء بھی حاصل ہوگی،اللہ تعالیٰ ان کی تعریف بھی کرے گا۔"فھو ازید فی ایجاب السرور من تلک المنافع"تو ان کو منفعت سے بڑھ کر اس سے سرور حاصل ہوگا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی رضاءمندی حاصل ہونی ہے۔

حکماء کا قول:

جنات کا جو ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد جنت جسمانیہ ہے،اور رضوان کا ذکر کر کے جنت روحانیہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔اعلیٰ مقام جنت روحانیہ ہے۔

"وھو عبارة عن تجلی نور جلال الله تعالی فی روح العبد واستغراق العبد فی

معرفته،لم بصیر فی اول هذه المقامات راضیا عن الله تعالی وفی آخرها مرضیا عند الله تعالی والیه اشار بقوله "راضیة مرضیة"

رضوان کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نورانی تجلیات بندے کی روح میں آجاتی ہیں، اوران کی وجہ سے بندہ اللہ تعالیٰ کی معرفت میں مستغرق ہو جاتا ہے، پھراس کو پہلا مقام یہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوتا ہے اور دوسرا مقام یہ حاصل ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہوتا ہے، اسی کو رب تعالیٰ نے اپنے ارشاد گرامی ﴿رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً﴾ سے تعبیر فرمادیا۔

جب اللہ تعالیٰ کی رضاءمندی حاصل ہوگئی تو سب کچھ حاصل ہوگیا۔ اسی کا پتہ چلا ﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ سے کہ اللہ تعالیٰ کی رضاءمندی سب چیزوں سے بڑی چیز ہے۔ (ازکبیر)

❁ عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ ﷺ ان اللہ تبارک وتعالی یقول لا هل الجنة یا اهل الجنة فیقولون لبیک ربنا وسعدیک والخیر فی یدیک فیقول هل رضیتم فیقولون ومالنا لانرضی یا رب وقداعطیتنا مالم تعط احدا من خلقک فیقول الااعطیکم افضل من ذلک فیقولون یا رب وای شئ افضل من ذلک فیقول احل علیکم رضوانی فلا اسخط علیکم بعده ابدا" (بخاری ومسلم)

حضرت ابوسعید خدری ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ جنت والوں کو فرمائے گا''اے جنت والو'' وہ کہیں گے''لبیک ربنا وسعدیک''تمام بھلائیاں تیرے قبضۂ قدرت میں ہیں، رب تعالیٰ فرمائے گا، کیا تم راضی ہو؟ وہ عرض کریں اے ہمارے رب ہم کیوں راضی نہ ہوں، تحقیق تو نے ہمیں وہ نعمتیں عطاء کیں جو تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو نہیں عطاء کیں، رب تعالیٰ فرمائے گا کیا میں تمہیں اس سے زیادہ بہتر چیز عطاء نہ کروں، وہ عرض کریں گے اے ہمارے رب! اس سے بہتر اور کیا چیز ہوگی؟ تو رب تعالیٰ فرمائے گا''میں تمہیں اپنی رضاءمندی عطاء کررہا ہوں اس کے بعد تم پر کبھی ناراض نہیں ہوں گا۔

حدیث پاک سے یہ بھی واضح ہوا کہ جنت کی نعمتیں اگرچہ عظیم نعمتیں ہیں، باقی رہنے والی ہیں، فنا ہونے والی نہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی رضاءمندی سب نعمتوں سے بڑی ہے، اعلیٰ اور افضل ہے۔ (ازمظہری)

شاندار ترتیب:

"وقد نبه تعالی فی الآیتین علی مراتب نعمائه فادناها متاع الحیاة الدنیا واعلاها رضوان الله لقوله تعالی(ورضوان من الله اکبر)واوسطها الجنة ونعیمها"

رب تعالی نے پہلی آیۂ کریمہ ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ﴾ میں دنیا کی نعمتوں کا ذکر فرمایا، جو گھٹیا ہیں ان کو دنیا کا سامان قرار دیا، جس سے ان کے فانی ہونے کی طرف اشارہ کر دیا۔ اس کے بعد جنت اور جنت کی نعمتوں کا ذکر فرمایا، اگر چہ یہ باقی رہنے والی نعمتیں ہیں، لیکن اللہ تعالی کی رضاء کے مقابل ان کا مقام بھی کم ہے، لھذا ان کو وسط میں ذکر کیا۔ پھر اعلی درجہ کی نعمت کا ذکر کیا کہ ان کو اللہ تعالی کی رضاء مندی حاصل ہو گی، اسے ﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ﴾ سے ذکر فرمایا۔ اللہ تعالی کی رضاء مندی تمام چیزوں سے اعلی ہونے کا تذکرہ ﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ میں ہے۔ (ماخوذ از سراج منیر حاشیہ جلالین)

﴿وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ﴾ ''اور اللہ علم رکھنے والا ہے بندوں کا۔''

بصیر کو جب "بصر" "بصارت" سے لیا جائے تو اس کا معنی ہوتا ہے'' دیکھنے والا'' اعلی حضرت رحمہ اللہ نے اسی کے مطابق ترجمہ فرمایا'' اور اللہ تعالی بندوں کو دیکھتا ہے'' اور جب "بصیرت" سے لیا جائے تو اس کا معنی ہوتا ہے'' دل سے دیکھنا'' یعنی علم رکھنا'' راقم کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے'' اور اللہ علم رکھنے والا ہے بندوں کا'' راقم نے ترجمہ'' جلالین اور کبیر'' سے لیا ہے، (**والله بصير**) **عالم** (**بالعباد**)**فيجازى كلامنهم بعمله**'' ''اور اللہ جاننے والا ہے بندوں کو'' تو ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا دے گا۔ (جلالین)

(والله بصير بالعباد)اى غالم بمصا لحهم،فيجب ان يرضوا الانفسهم مااختاره لهم من نعيم الآخرة وان يزهدوا فيما زهدهم فيه من امور الدنيا'' (کبیر)

''اور اللہ جاننے والا ہے بندوں کو'' یعنی ان کے مصالح (بہتر کاموں) کو جاننے والا ہے، اس لئے بندوں کو چاہئے کہ وہ اپنے نفسوں کیلئے وہ کام پسند کریں جو اللہ تعالی نے ان کیلئے پسند کئے ہیں اور ان پر آخرت میں نعمتیں عطاء کرنے کا وعدہ فرمایا ہے اور بندے صرف دنیاوی کاموں سے دور رہیں جن سے رب تعالی نے دور رہنے کا حکم دیا ہے یا اتنی حد تک ان کو حاصل کرنے کا حکم دیا ہے جو اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ سے غافل نہ کریں۔ ورنہ وہ انسان اللہ تعالی کی خصوصی رحمت سے دور رہیں گے۔

خیال رہے کہ اس آیۂ کریمہ میں وعدہ پایا گیا ہے کہ اچھے عمل کرنے والوں کو اخروی نعمتیں حاصل ہوں گی۔ اور وعید بھی پائی گئی ہے کہ برے اعمال کرنے والے نظام عدل کے مطابق عذاب وعتاب کے مستحق ہوں گے، کیونکہ اللہ تعالی اپنے بندوں کے اعمال کو جاننے والا ہے۔ (از قرطبی)

❁ **''وذكر الله سبحانه مازاد على نعماء الدنيا ولا مزيد عليه وهو رضون الله فانه هو**

الفارق البائن بین نعماء الدنیا ونعماء الجنة فان الدنیا ملعونة وملعون ما فیها الاما ابتغی به وجه الله عزوجل وجی روایة الاذکر الله وما والاہ وعالما ومتعلما"
"رواہ الطبرانی فی الاوسط عن ابن مسعود"

اللہ تعالیٰ نے دنیا کی نعمتوں سے بڑھ کر ایسی نعمت کا تذکرہ فرمایا، جس سے بڑھ کر اور کوئی نعمت نہیں ہو سکتی وہ ہے "رضوان من الله" (اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی) بیشک اس سے دنیا کی نعمتوں میں اور جنت کی نعمتوں میں واضح طور پر فرق کو بیان کر دیا گیا۔ دنیا ملعون (لعنت کی مستحق) ہے اور دنیا کا ساز و سامان ملعون ہے، سوائے اس کے کہ دنیا کے سامان سے اللہ تعالیٰ کے رضامندی کو حاصل کیا جائے۔

ایک روایت میں ہے سوائے اس کے کہ (یعنی دنیا کا مال ملعون نہیں جبکہ) وہ دنیا کا مال اللہ تعالیٰ کی یاد کا ذریعہ بنے اور اس سے اللہ تعالیٰ کے ولیوں کی یاد آئے اور اس کے ذریعے علماء اور متعلمین (طلباء کرام) کو یاد کرے۔ (از مظہری)

❁ "عن ربیعة الحرسی قال قال رسول الله ﷺ قیل لی فی المنام سید بنی دارا وصنع مادبة وارسل داعیا فمن اجاب الداعی دخل الدار واکل من المأدبة ورضی عنه السید ومن لم یجب الداعی لم یدخل الدار ولم یاکل من المادبة وسخط علیه السید قال والله سید ومحمد الداعی والدار الاسلام والمادبة الجنة" (رواہ الدارمی)

ربیعہ حرسی فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے خواب میں بتایا گیا کہ مالک نے ایک گھر بنایا، اس میں دسترخوان بچھایا اور ایک شخص کو دعوت دینے کیلئے بھیجا، جس شخص نے دعوت دینے والے کی دعوت کو قبول کر لیا، گھر میں داخل ہو گیا، اس نے دسترخوان سے کھالیا اور مالک مکان بھی اس پر راضی ہو گیا اور جس نے دعوت دینے والے کی دعوت کو قبول نہیں کیا، گھر میں داخل نہیں ہوا، اس نے دسترخوان سے کھانا نہیں کھایا اور مالک مکان اس پر ناراض ہو گیا۔ (اس خواب سے یہ بتایا گیا کہ) اللہ تعالیٰ مالک ہے، اور دعوت دینے والے محمد ﷺ ہیں اور گھر سے مراد "دار اسلام" ہے اور دسترخوان سے مراد جنت اور اس کی نعمتیں ہیں۔ (از مظہری)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿اَلَّذِیۡنَ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اِنَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝﴾ (آیۃ نمبر ۱۶)

(1) وہ جو کہتے ہیں اے رب ہمارے ہم ایمان لائے تو ہمارے گناہ معاف کر اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔"

(2) وہ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب بیشک ہم نے ایمان لایا تو بخش دے ہمارے لئے ہمارے گناہوں کو اور بچا ہمیں آگ کے عذاب سے۔

ماقبل سے تعلق:

اس سے پچھلی آیۃ کریمہ میں ذکر فرمایا کہ جنت متقین (پرہیزگاروں) کیلئے ہے اب اس آیۃ کریمہ میں متقین کی عظیم صفت کو ذکر کیا جا رہا ہے جو سب نیکیوں کی اصل ہے وہ ہے ایمان "فبدأ بالایمان الذی ھو رأس التقوی" ایمان سے ابتداء کی کیونکہ وہ تقوی کی اصل ہے پھر ان کی دعاء کا ذکر کیا اور ساتھ ہی یہ ذکر فرمادیا کہ انہوں نے اپنے ایمان لانے کی خبر دی۔ "واکد الجملة بان مبالغة فی الاخبار" اپنی خبر میں مبالغہ ثابت کرنے کیلئے اور زور دینے کیلئے دعائیہ جملہ کو تاکید سے ذکر فرمایا "اننا آمنا" بیشک ہم ایمان لائے" ایمان کے ذکر کے بعد انہوں نے مغفرت کی دعاء کی آگ کے عذاب سے بچانے کی دعاء کی۔ (البحر المحیط)

"آمنابک وبکتابک وبرسولک" متقین کا یہ کہنا کہ" بیشک ہم ایمان لائے" اس کا یہ مطلب ہے کہ اے ہمارے رب ہم نے تجھ پر ایمان لایا، اور تیری کتاب پر ایمان لایا' اور تیرے رسول پر ایمان لایا۔ "فاغفر لنا ذنوبنا" ای بایماننابک وبما شرعته لنا فاغفر لنا ذلوبنا بفضلک ورحمتک" "بخش دے ہمارے لئے ہمارے گناہوں کو" اس کا مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے رب بیشک ہم نے تجھ پر ایمان لایا اور جو تو نے ہمارے لئے کام مشروع فرمائے ان پر ہم نے ایمان لایا، اسلئے اے ہمارے رب تو ہمارے ایمان کی وجہ سے ہماری مغفرت فرما لیکن اے اللہ ہم ایمان لانے کے باوجود تجھ سے تیرے فضل اور رحمت کا سوال کرتے ہیں کہ تو اپنے فضل اور اپنی رحمت سے ہمارے گناہوں کو معاف کردے۔ (صابونی)

"(ربنا اننا آمنا) اجابة لدعوتک (فاغفر لنا ذنوبنا) انجاز الوعدک" (مدارک)

اے ہمارے رب بیشک ہم نے ایمان لایا تیری دعوت کو قبول کرتے ہوئے تو بخش دے ہمارے لئے

ہمارے گناہوں کو اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہوئے۔

امید ہے کہ طلباء کرام کو راقم کا ترجمہ "لنا" کا ہمارے لئے'' سمجھ آ گیا ہوگا کیونکہ راقم کا ترجمہ اس چیز کو ظاہر کر رہا کہ اس میں حذف مضاف ہے اصل مطلب یہ ہوگیا (فاغفر لنا) ای لایماننا (ذنوبنا) ہمارے لئے ہمارے گناہوں کو معاف فرما'' کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ایمان کی وجہ سے اپنے فضل و کرم سے ہماری مغفرت فرما۔

﴿وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ ''اور بچا ہمیں آگ کے عذاب سے''

"وقنا" میں ''واؤ'' علیحدہ لفظ ہے جس کا معنی ہے ''اور'' اور "ق" علیحدہ لفظ ہے جس کا معنی ہے ''بچا'' یہ لفظ لیا ہوا ہے "وقی یقی وقیا" سے اور "نا" علیحدہ لفظ ہے جس کا معنی ہے ''ہمیں''۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"الذین یقولون" جملہ کی حرکات کیا ہیں اس میں چند وجوہ پائی گئی ہیں۔

(۱) ایک وجہ یہ ہے کہ یہ جملہ مجرور محلا ہو اور صفت ہو ﴿لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا﴾ کی اس صورت میں معنی یہ ہوگا پرہیزگار لوگ (جن کا ذکر پہلے آ رہا ہے وہ) یہ کہتے اے ہمارے رب ہم نے ایمان لایا۔

(۲) ان میں دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ جملہ صفت ہو "بالعباد" کی اب تقدیر عبارت کی یہ ہوگی ﴿وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ﴾ واولئک هم المتقون الذین لهم عندربهم جنات هم الذین یقولون ربنا اننا آمنا'' اور اللہ جاننے والا ہے بندوں کو وہ متقی لوگ ہیں ان کیلئے ان کے رب کے ہاں جنتیں ہیں، اور وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب بیشک ہم نے ایمان لایا، الخ۔ خیال رہے کہ اس صورت میں بھی جملہ مجرور محلا ہی رہے گا، کیونکہ "بالعباد" مجرور ہے

(۳) ان میں تیسری وجہ ہے کہ یہ جملہ منصوب محلا ہو اور نصب ہو مدح کے طور پر، اس صورت میں معنی یہ ہوگا وہ لوگ قابل تعریف ہیں جو یہ کہتے ہیں ''اے ہمارے رب بیشک ہم نے ایمان لایا'' الخ

(۴) ان میں سے چوتھی صورت یہ ہے کہ جملہ مرفوع محلا ہو اور رفع تخصیص پر دلالت کرے تقدیر عبارت کی اس طرح ہو "هم الذین یقولون ربنا اننا آمنا" الخ یعنی اللہ کے بندوں سے خاص لوگ وہ ہیں جو یہ کہتے ہیں اے ہمارے رب بیشک ہم ایمان لائے۔ (ماخوذ از کبیر)

فائدہ عظیمہ: اللہ تعالیٰ نے پہلے یہ ذکر فرمایا ﴿اَلَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا﴾ (وہ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب بیشک ہم ایمان لائے) اس کے بعد ذکر فرمایا ﴿فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا﴾ (تو بخش دے ہمارے لئے گناہوں کی)

"وذلک یدل علی انهم تو سلوابمجرد الایمان الی طلب المغفرة و الله تعالی حکی ذلک عنم فی معرض المدح لهم و الثناء علیهم ،فدل هذاعلی ان العبد بمجرد الایمان یستوجب الرحمة والمغفرة من الله تعالی" (کبیر)

اسی سے واضح ہوگیا کہ صرف ایمان کو وسیلہ بنانا مغفرت طلب کرنے کیلئے کافی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی تعریف فرمائی جنہوں نے ایمان کے بعد اللہ تعالیٰ سے مغفرت کا سوال کیا، اسی سے پتہ چل گیا کہ بندہ صرف ایمان لانے سے رب تعالیٰ کی رحمت اور مغفرت کا مستحق ہو جاتا ہے۔ (از کبیر)

"الفاء للسببیة وفیه دلیل علی ان مجرد الایمان سبب لاستحقاق المغفرة "

"فاغفرلنا ذنوبنا" پر فاء سببیت پر دلالت کر رہی ہے جو دلیل ہے اس پر کہ فقط ایمان سبب ہے مستحق مغفرت ہونے کا۔

یہ عام ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو صرف ایمان کی وجہ سے اپنے فضل و کرم سے بخش دے، یا اسے نظام عدل کے مطابق سزا دے پھر وہ سزا کاٹنے کے بعد جنت میں داخل کر دیا جائے، آیئے اسی مسئلہ پر میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ کا ارشادگرامی دیکھئے۔

❁ "عن معاذ قال قال رسول الله ﷺحق الله علی العباد ان یعبدوه ولایشرکوابه شیأوحق العباد علی الله ان لا یعذب من لا یشرک به شیأقال معاذ افلاابشربه الناس قال لا تبشرهم فیتکلوا" (بخاری ومسلم)

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کوئی شریک نہ ٹھہرائیں اور (اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے بندوں کے حقوق جو اپنے ذمہ لئے ہوئے ہیں) ان میں سے ایک حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو شخص شریک نہ ٹھہرائے اللہ اسے عذاب نہ دے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کیا میں لوگوں کو اس کی بشارت نہ دے دوں؟ آپ نے فرمایا ان کو بشارت نہ دے وہ اسی پر بھروسہ کر لیں گے۔ (ماخوذ از مظہری)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿اَلصَّابِرِیْنَ وَالصَّادِقِیْنَ وَالْقَانِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِo﴾
(آیۃ نمبر ۱۷)

(1) صبر والے اور سچے اور ادب والے اور راہ خدا میں خرچنے والے اور پچھلے پہر سے معافی مانگنے والے۔

(2) صبر کرنے والے اور سچے اور اطاعت کرنے والے اور صدقہ کرنے والے اور بخشش طلب کرنے والے سحری کے وقت۔

تنبیہ: راقم نے ﴿وَالْقَانِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ﴾ کا ترجمہ جلالین سے لیا ہے (والقانتین) المطیعین للہ (والمنفقین) المتصدقین "(**قانیتن**) وہ ہیں جو اللہ کی اطاعت کرتے ہیں اور (**منفقین**) وہ ہیں جو صدقہ کرتے ہیں تفصیل انشاء اللہ آگے آ رہی ہے۔

﴿اَلصَّابِرِیْنَ﴾ ''صبر کرنے والے''

نصب علی وجہ المدح ہے یعنی جن صفات کا ذکر کیا ہے ان صفات والے قابل تعریف ہیں، ''صبر'' کا معنی ہے ''نفس کو ان خواہشات سے روکنا جو شرعاً ممنوع ہیں۔ صبر کی تین قسمیں ہیں۔

''الصبر علی الطاعة ،والصبر عن المعصية والصبر علی المكروه''

(۱) اطاعت پر صبر کرنا، یعنی واجبات اور مستحباب کو ادا کرنا اور ان پر قائم رہنا۔

(۲) معصیت سے رک جانا یعنی ہر وہ کام جو شریعت میں منع ہے اس سے رک جانا، اس کام کو چھوڑ دینا۔

(۳) محنت ومشقت اور مصائب وآلام، تکالیف پر صبر کرنا یعنی ان چیزوں کو برداشت کرنا، جزع وفزع نہ کرنا، نہ روئے، نہ چلائے، نہ چیخ و پکار کرے بلکہ اللہ تعالی کے فیصلے اور اس کی تقدیر پر راضی رہیں۔

جیسا کہ رب تعالی نے ارشاد فرمایا۔ ﴿اَلَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْآ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ﴾ (صبر کرنے والے) وہ لوگ ہیں جب ان کو مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں بیشک ہم اللہ تعالی کیلئے ہیں اور بیشک ہم نے اسی کی طرف لوٹنا ہے اور اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ہے ﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا﴾ اور ہم نے ان میں کچھ امام بنائے کہ ہمارے حکم سے بتاتے ہیں جبکہ انہوں نے صبر کیا۔

حضرت سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ اس آیۃ کریمہ سے واضح ہوا کہ ان کو یہ بلند درجات اللہ تعالی کی

طرف سے صبر کی وجہ سے حاصل ہوئے ۔اور اللہ تعالی نے صبر کرنے والوں کی مدح ان الفاظ مبارکہ سے فرمائی ﴿وَالصَّابِرِيْنَ فِي الْبَأْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَأْسِ﴾ اور صبر والے مصیبت اور سختی میں، اور جہاد کے وقت ۔

(ماخوذ از روح البیان، بیہ)

اولیاءعظام کے نزدیک سب سے مشکل صبر:

"ویروی انه وقف رجل علی الشبلی فقال ای صبر اشد علی الصابرین فقال الصبر فی الله تعالی فقال لا فقال الصبر لله تعالی" فقال لا' الصبر مع الله تعالی قال لا قال فایش (فای شیئ)قال الصبر عن الله تعالی فصرخ الشبلی صرخة کا دت روحه تتلف"

حضرت شبلی رحمہ اللہ کے پاس ایک شخص آیا اس نے سوال کیا کہ صابرین پر سب زیادہ مشکل صبر کون سا ہے؟ تو انہوں نے کہا "الصبر فی الله "سب سے مشکل صبر ہے "الصبر فی الله "کا مطلب یہ ہے کہ" اللہ تعالی میں صبر کرنا" یعنی اللہ تعالی کی یاد میں قائم رہنا یہ بہت مشکل صبر ہے، اس شخص نے کہا یہ صبر سب سے مشکل نہیں ۔حضرت شبلی رحمہ اللہ نے فرمایا"الصبر لله" سب سے زیادہ مشکل ہے گا"الصبر لله " کا مطلب یہ ہے کہ ہر کام میں اللہ تعالی کی رضاء پائی جائے اس کی رضاء کیلئے اچھا کام کیا جائے اور اسی کی رضاء کیلئے برے کام سے رک جائے اس پر قائم رہنا اور یہ صبر سب سے زیادہ مشکل ہے ۔اس شخص نے کہا نہیں یہ تمام صبروں سے مشکل نہیں، حضرت شبلی رحمہ اللہ نے فرمایا "الصبر مع الله " تمام صبروں سے مشکل ہوگا "الصبر مع الله " کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالی کا قرب حاصل کیا جائے اس کی رحمت کی معیت (ساتھ) حاصل کی جائے اس پر قائم رہنا اور اس پر صبر سب صبروں سے مشکل ہے۔اس شخص نے کہا یہ تمام صبروں سے مشکل نہیں، حضرت شبلی رحمہ اللہ نے اس اللہ کے بندے سے پوچھا کہ تم ہی بتاؤ کہ وہ صبر جو سب صبروں سے مشکل ہے وہ کون سا صبر ہے اس شخص نے کہا وہ "الصبر عن الله تعالی " ہے یعنی اللہ تعالی سے دور رہنے پر صبر کرنا اور اللہ تعالی سے غافل رہنے پر قائم رہنا سب صبروں سے مشکل صبر ہے۔حضرت شبلی رحمہ اللہ نے ایک چیخ ماری قریب تھا کہ آپ کی جان نکل جائے ۔ (ماخوذ از کبیر)

حقیقت یہی ہے کہ رب تعالی سے دوری اور اس سے غفلت اللہ کے نیک بندوں کیلئے بہت مشکل کام ہے۔

﴿وَالصّٰدِقِيْنَ﴾ ''اور سچے''

"اعلم ان لفظ الصدق قد یجری علی القول والفعل والنیة"

جان لو بیشک لفظ "صدق" کبھی قول پر بولا جاتا ہے یعنی سچ بولنے والے، اور کبھی 'صدق' فعل پر بولا جاتا

ہے یعنی وہ اپنے فعل میں سچے ہیں اور کبھی ''صدق'' نیت پر بولا جاتا ہے یعنی وہ نیت میں سچے ہیں۔ان تمام قسموں میں سے قول میں صدق زیادہ مشہور ہے۔اس کا مقابل "کذب" ہے یعنی اس صورت میں دونوں لفظوں کا معنی ہوگا سچ بولنے والے (صادقین) اور جھوٹ بولنے والے کا ذہین فعل میں صدق کا یہ مطلب ہے، وہ اپنے کام کو مکمل کرتے ہیں۔مکمل کرنے سے پہلے چھوڑتے نہیں جیسے کہا جاتا ہے "صدق فلان فی القتال'' فلاں شخص نے جنگ کو سچ کر کے دکھایا یعنی جنگ کرنے کا حق ادا کردیا "صدق فلان فی الحملة" فلاں شخص حملہ کرنے میں جھوٹا ثابت ہوا یعنی بزدلی سے اس نے حملہ کیا۔

نیت میں سچا ہونے کا کیا مطلب؟

''الصدق فی النیة امضاء العزم و الاقامة علیه حتی یبلغ الفعل''

نیت میں سچا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کسی کام کو کرنے کا پختہ ارادہ کرلینا، پھر اس پر قائم رہنا، یہاں تک کہ اسی نیت کے مطابق کام کو مکمل کرلے۔ (ماخوذ از کبیر)

تفسیر کبیر کی اس بحث کے بعد اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضاء خان رحمہ اللہ کے ترجمہ کو دیکھیں تو کتنا خوب اور کامل ترجمہ نظر آئے گا۔آپ نے "والصادقین" کا ترجمہ کیا ہے "اور سچے" راقم نے بھی یہی نقل کیا ہے کیونکہ اگر ترجمہ کیا جاتا "سچ بولنے والے" تو یہ صرف "صدق فی القول" (قول کے سچے) کو شامل ہوتا۔"صدق فی الفعل" (کام کے سچے اور پکے) اور "صدق فی النیة" (نیت کے سچے) کو شامل نہ ہوتا لیکن جب ترجمہ صرف یہ کیا "اور سچے" یہ تینوں قسموں کو شامل ہے۔

قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت:

''بظاہر یہ سمجھ آتا ہے کہ "الذین یصبرون ویصدقون" (وہ جو صبر کرتے ہیں اور سچ کو کام میں لاتے ہیں) کا بھی وہی مطلب جو ﴿اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ﴾ کا مطلب ہے، لیکن جب غور کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی میں جو ﴿اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ﴾ استعمال ہے۔اس میں وہ کمال پایا گیا ہے جو "الذین یصبرون ویصدقون" میں نہیں پایا گیا، کیونکہ اس جملہ کا معنی اس وقت بھی صحیح ہوگا جب وہ کبھی کبھی صبر کرتے ہوں اور سچ بولتے ہوں، لیکن

''قوله تعالی (الصابرین و الصادقین) یدل علی ان هذا المعنی عادتهم و خلقهم و انهم لا ینفکون عنها''

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی "الصابرین و الصادقین" اس پر دلالت کررہا ہے ان کی عادت اور گویا کہ پیدائشی صفت ہی

یہ ہے کہ ''وہ صبر کرنے والے ہیں اور سچے ہیں'' یہ صفت ان سے کبھی زائل نہیں ہوتی۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَالْقَانِتِیْنَ﴾ ''اور اطاعت کرنے والے۔''

''قانتین'' کے مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں

''قالوا فی القانتین''الحافظین للغیب وقال الزجاج القائمین علی العبادة وقیل القائمین بالحق وقیل الداعین المتضرعین وقیل الخاشعین وقیل المصلین''

(البحر المحیط)

''قانتین'' کا معنی اللہ تعالی کے اوامر ونواہی کی حفاظت کرنا خواہ کوئی دیکھ رہا یا نہیں دیکھ رہا۔ زجاج نے کہا س کا معنی ہے عبادت پر قائم رہنا۔ بعضوں نے کہا ''اللہ تعالی کی راہ میں بلانے والے، عاجزی کرنے والوں کو'' قانتین کہا جاتا ہے اور بیان کیا گیا ہے کہ **قانتین** کا مطلب ہے خشوع کرنے والے اور بعض حضرات نے یہ بیان کیا ہے کہ **قانتین** کا مطلب ہے ''نماز ادا کرنے والے'' اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ''اداب والے'' سب معانی کو شامل ہے اور راقم نے جو معنی جلالین سے نقل کیا ہے ''اطاعت کرنے والے'' وہ بھی سب معانی کو حاوی ہے۔

﴿وَالْمُنْفِقِیْنَ﴾ ''اور صدقہ کرنے والے''

اصل میں لغوی معنی ''انفاق'' کا خرچ کرنا ہے، لیکن یہاں نیک لوگوں کی صفات بیان کی جا رہی ہیں اسلئے مطلقا بے جا خرچ کرنا تو مراد نہیں ہوسکتا، وہی خرچ مراد ہے جو اللہ تعالی کی راہ میں ہوگا۔

اعلی حضرت رحمہ اللہ نے اسی لئے ترجمہ ہی یہ فرمایا ''اور راہ خدا میں خرچنے والے'' راقم نے جلالین سے ترجمہ لیا جو مختصر ہے اور تمام انواع کو شامل ہے یعنی ''صدقہ کرنے والے'' علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''کونھم منفقین ویدخل فیه انفاق المرء علی نفسه واهله وأقاربه وصلة رحمه وفی الزکوة والجهاد وسائر وجوه البر'' (کبیر)

خرچ کرنے سے مراد عام ہے خواہ وہ اپنے آپ پر خرچ کریں کہ یہ کپڑا پہن کر اللہ تعالی کی عبادت کریں گے، کھانا کھائیں گے تب ہی اللہ تعالی کی عبادت کرسکیں گے تو یہ اپنے پر خرچ کرنا بھی صدقہ کا درجہ رکھتا ہے۔ اہل وعیال پر خرچ کرتے ہیں کہ ان کے حقوق اللہ تعالی نے میرے ذمہ لگا رکھے ہیں، جن کا پورا کرنا میری ذمہ داری ہے۔ تو یہ مال اہل وعیال پر خرچ کرنا بھی صدقہ ہے۔

حضرت سعد ﷺ کی حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی یہ ہے:

"ولست تنفق تبتغي بها وجه الله الاجرت بها حتى اللقمة تجعلها في في امرأتك"

(مسلم ج ۲ ص ۴۷ کتاب الوصیۃ)

اور نہیں خرچ کرو گے تم اللہ تعالی کی رضاء طلب کرنے کیلئے مگر یہ کہ تمہیں اس کا اجر دیا جائے گا یہاں تک کہ جو لقمہ تم اپنی زوجہ کے منہ میں ڈالو گے اس کا اجر بھی ملے گا۔

اسی حدیث کی شرح میں علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "ان الانفاق على العيال يثاب عليه اذا قصد به وجه الله تعالى" جب انسان اہل وعیال پر خرچ کرتا ہے تو اسے ثواب دیا جائے گا جبکہ اس نے اللہ تعالی کی رضاء کے ارادہ سے مال خرچ کیا ہوگا، اور علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسی حدیث سے یہ سمجھ آیا "ان الانسان اذا فعل شئيا اصله على الاباحة وقصد به وجه الله يثاب عليه" بیشک انسان جب کوئی کام کرتا ہے جو کہ اصل میں مباح ہو لیکن اسنے وہ کام اللہ تعالی کی رضاء کی خاطر کیا ہو تو اسے ثواب عطاء کیا جاتا ہے۔

اسی طرح قریبی رشتہ داروں پر مال خرچ کرے کہ اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿وَاُولُو الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ﴾ ذی رحم بعض، بعض سے زیادہ حقدار ہیں اور زیادہ قرب ان کو حاصل ہے۔ اور اسی طرح صلہ رحمی کا حکم دیا گیا" تو یہ مال خرچ کرنا بھی اللہ تعالی کی راہ میں خرچ کرنا ہوگا، اور اسے صدقہ کا حکم حاصل ہوگا۔ غرضیکہ ہر طرح نیکی کی راہ میں مال خرچ کرنا خواہ زکوۃ ہو، یا جہاد ہو سب ہی صدقہ کا درجہ رکھتے ہیں، اور سب ہی طریقوں میں مال خرچ کرنا اللہ تعالی کی راہ میں ہی خرچ کرنا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ۝﴾ "اور بخشش طلب کرنے والے سحری کے وقت۔"

"سحر" صبح صادق سے پہلے وقت کو کہا جاتا ہے، جو رات کا چھٹا حصہ ہے، وہ سحری کا وقت ہے۔ "سحور" (سین کے فتحہ سے) "سحری کا کھانا" اور "سحور" (سین کے ضمہ سے) سحری کا کھانا کھانا" "تسحر" اس نے سحری کا کھانا کھایا۔

سحری کے وقت بخشش طلب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ رات کو بیدار ہو کر تہجد کی نماز ادا کرتے ہیں، پھر اللہ تعالی سے بخشش طلب کرتے ہیں اور دعاء کرتے ہیں۔

"لان الانسان لايشتغل بالدعاء والاستغفار الا ان يكون قد صلى قبل ذلك"

کیونکہ انسان سحری کے وقت وہی بخشش طلب کرتا ہے اور وہی دعا کرتا ہے جو اس سے پہلے نماز تہجد ادا کرتا ہے۔

قوله تعالى "والمستغفرين بالاسحار" يدل على انهم كانوا قد صلوا بالليل"

اللہ تعالیٰ کا ارشادگرامی ﴿وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ﴾ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ جن پرہیز گار لوگوں کی تعریف بیان کی جارہی ہے، ان کا ایک وصف یہ بیان کیا جارہا ہے کہ وہ تہجد گزار ہوتے ہیں۔

سحری کے وقت استغفار کرنے کا بہت زیادہ اثر ہے قوت ایمانیہ میں بھی اور کمال عبودیت میں بھی، چونکہ سحری کا وقت وہ ہے کہ اس کے بعد صبح کی روشنی ظاہر ہو جاتی ہے، رات کی تاریکی چھٹ جاتی ہے اور سوئے ہوئے لوگ جو مردہ کی طرح ہوتے ہیں بیدار ہو کر گویا کہ زندہ ہو جاتے ہیں، اس وقت عبادت کرنے والوں کے دلوں پر اللہ تعالیٰ کے جلال کی نورانیت کا ظہور ہوتا ہے، جس سے انسان کی قوت ایمانیہ میں کمال پیدا ہوتا ہے۔ سحری کے وقت نید کا غلبہ ہوتا ہے، جب انسان اس وقت نید سے بیدار ہوتا ہے تو صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء کیلئے اور عبادت میں مشغول ہونے کیلئے۔ "فاذااعرض العبد عن تلک اللذة و اقبل علی العبودیة کانت الطاعة اکمل" جب انسان اس وقت نیند کی لذت کو چھوڑتا ہے اور اپنے آپ کو رب تعالیٰ کا بندہ سمجھ کر اس کی عبادت میں مشغول ہوتا ہے تو اسے کامل طاعت حاصل ہوتی ہے۔

"ونقل عن ابن عباس (والمستغفرين بالاسحار) يريد المصلين صلوة الصبح"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ﴾ کا معنی کیا ہے" صبح کی نماز ادا کرنے والے" (ماخوذ از کبیر)

لیکن راقم کے نزدیک اس میں کوئی تعارض نہیں، مطلب یہ ہے کہ پرہیز گار لوگ سحری کے وقت تہجد کی نماز ادا کرتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرتے ہیں، پھر صبح کی نماز ادا کرتے ہیں۔

اس پر حدیث نافع رضی اللہ عنہ شاہد ہے۔

❁ "اخرج ابن جرير وابن المنذر وابن ابی حاتم عن ابن عمر انه كان يحيى الليل صلوة ثم يقول يانافع اسحرنا فيقال لافيعاودالصلوة فاذا قال نعم قعد يستغفر الله ويدعو حتى يصبح"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ رات کو بیدار رہتے نماز ادا کرتے رہتے، پھر حضرت نافع رضی اللہ عنہ سے پوچھتے کیا سحری کا وقت ہو گیا، وہ کہتے ابھی وقت نہیں ہوا، تو آپ پھر نماز کو جاری رکھتے، جب وہ کہتے ہاں وقت ہو گیا تو آپ بیٹھ جاتے اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرتے، اور دعاء کرتے یہاں تک کہ صبح ہو جاتی۔ (از در منثور)

(والمستغفرين بالاسحار) دل على فضيلة الاستغفار وقت الاسحار"

اللہ تعالیٰ کا ارشادگرامی ﴿وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ﴾ کا اس پر دلالت کر رہا ہے کہ سحری کے وقت استغفار افضل ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے جب اپنے بیٹوں کو کہا ﴿سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّیْ﴾ میں تمہارے لئے اپنے رب سے مغفرت طلب کروں گا۔ "انہ اخرھم الی وقت السحر" بیشک انہوں نے سحری کے وقت تک دعاء کو مؤخر کیا یعنی آپ نے سحری کے وقت اپنے بیٹوں کیلئے بخشش طلب کی۔

❁ **"قال رسول اللہ ﷺ ینزل اللہ تبارک وتعالی فی کل لیلۃ الی السماء الدنیا حتی یبقی ثلث اللیل الاخیر فیقول ھل من سائل فاعطیہ ھل من داع فاستجیب لہ؟ ھل من مستغفر فاغفرلہ؟** (رواہ البخاری ومسلم عن ابی ھریرۃ)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالی کی رحمت کا ہر رات کو آسمان دنیا پر نزول ہوتا ہے یہاں تک کہ رات کا آخری تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے تو اللہ تعالی فرماتا ہے کوئی ہے سوال کرنے والا کہ میں اسے عطاء کروں؟ کوئی ہے دعاء کرنے والا کہ میں اس کی دعاء کو قبول کروں؟ کوئی ہے بخشش طلب کرنے والا کہ میں اس کی بخشش کروں؟

❁ **"وقال ابن جریر عن ابراھیم بن حاطب عن ابیہ قال سمعت رجلا فی السحر فی ناحیۃ المسجد وھو یقول یا رب امرتنی فاطعتک وھذا السحر فاغفرلی، فنظرت فاذا ھو ابن مسعود رضی اللہ عنہ"**

ابراہیم بن حاطب رضی اللہ عنہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ میرے باپ نے فرمایا میں نے سحری کے وقت مسجد کی ایک طرف ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا "اے میرے رب تو نے مجھے حکم دیا تو میں نے تیری طاعت کی، یہ سحری کا وقت ہے میری مغفرت فرما۔ میں نے دیکھا تو وہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تھے۔

❁ **"وعن انس بن مالک قال کنا نؤمر اذا صلینا من اللیل ان نستغفر فی آخر السحر سبعین مرۃ"** (رواہ ابن مردویہ)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہمیں حکم دیا جاتا تھا کہ جب رات کو ہم نماز ادا کریں تو سحری کے آخری وقت میں ستر مرتبہ اللہ تعالی سے بخشش طلب کریں۔ (ماخوذ از ابن کثیر وصابونی)

❁ **"اخرج ابن ابی شیبۃ واحمد فی الزھد عن ابی سعید الخدری قال بلغنا ان داود علیہ السلام سأل جبریل علیہ السلام فقال یا جبریل ای اللیل افضل قال یا داؤد ماادری الاان العرش یھتز فی السحر"**

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہمیں یہ خبر ملی بیشک داود علیہ السلام نے جبریل علیہ السلام سے سوال کیا کہ اے جبریل کون سی رات افضل ہے۔ انہوں نے کہا میں نہیں جانتا ہاں البتہ ہر سحری کے وقت عرش الہی جھومتا ہے۔ (از درمنثور)

یعنی ہر سحری کو اللہ تعالی کی خاص رحمت کا نزول ہوتا ہے، جس کی وجہ سے عرش الٰہی بھی خوشی سے جھومتا ہے کہ اللہ تعالی کا اپنے بندوں پر کتنا فضل و کرم ہے، اور کتنا زیادہ فیضان ہے۔

❁ "وقال سفیان الثوری بلغنی انه اذا کان اول اللیل نادی منا دلیقم القانتون فیقومون کذلک یصلون الی السحر فاذا کان عندالسحر نادی منادا این المستغفرون فیستغفرا اولئک، ویقوم آخرون فیصلون فیلحقون بهم فاذاطلع الفجر نادی منادالالیقم الغافلون فیقومون من فرشهم کالموتی نشروامن قبورهم"

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں مجھے خبر ملی کہ بیشک رات کے اول حصہ میں نداء دینے والا نداء دیتا ہے کہ خشوع کرنے والے لوگ کھڑے ہو جائیں تو وہ کھڑے ہو جاتے ہیں سحری تک وہ نماز ادا کرتے رہتے ہیں جب سحری کا وقت ہو جاتا ہے نداء دینے والا نداء دیتا ہے کہاں ہیں بخشش طلب کرنے والے تو وہ استغفار کرتے ہیں پھر کچھ اور لوگ کھڑے ہوتے ہیں ان کے ساتھ مل جاتے ہیں پھر جب صبح صادق ہو جاتی ہے تو نداء دینے والا نداء دیتا ہے خبردار اب غافل لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوں تو وہ اپنے بستروں سے اس طرح اٹھتے ہیں جیسے مردے قبروں سے اٹھیں گے۔ (از قرطبی)

❁ "وروی عن انس سمعت النبی ﷺ یقول ان الله یقول انی لاهم بعذاب اهل الارض فاذا نظرت الی عمار بیوتی والی المتحابین فی والی المتهجدین والمستغفرین بالاسحار صرفت عنهم العذاب بهم"

حضرت انس ﷛ فرماتے ہیں میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا بیشک اللہ تعالی فرماتا ہے میں زمین والوں کو عذاب دینے کا ارادہ کرتا ہوں پھر جب میں ان لوگوں کو دیکھتا ہوں جو میرے گھروں (مساجد) کو آباد کئے ہوتے ہیں اور میں ان لوگوں کو جب دیکھتا ہوں جو میری رضاء کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور تہجد گذار لوگوں کو جب دیکھتا ہوں اور سحری کے وقت استغفار کرنے والوں کو جب دیکھتا ہوں تو ان سے عذاب کو پھیر دیتا ہوں۔ (از قرطبی)

❁ قال مکحول اذا کان فی امة خمسة عشر رجلا یستغفرون الله کل یوم خمسا وعشرین مرة لم یؤاخذ الله تلک الامة بعذاب العامة "(ذکرہ ابونعیم فی کتاب الحلیة له)

مکحول فرماتے ہیں جب امت میں پندرہ آدمی اللہ تعالی سے ہر روز پچیس پچیس مرتبہ استغفار کریں تو اللہ تعالی اس امت کو عام عذاب میں مبتلا نہیں فرماتا۔ (از قرطبی)

حقیقت یہی ہے کہ ایسے ہی نیک لوگوں سے دنیا آباد ہے جو راتیں جاگ کر اللہ تعالی کی یاد میں گزار دیتے ہیں اور سحری کے وقت تہجد ادا کرتے ہیں اور سحری کے وقت استغفار کرتے ہیں ورنہ ہمارے جیسے گنہگار ہی سب ہوتے

تو دنیا کب سے برباد ہو چکی ہوتی۔

حضرت لقمان رحمہ اللہ کی اپنے بیٹے کو نصیحت:

"وقال لقمان لابنه یا بنی لایکن الدیک اکیس منک ینادی بالاسحار وانت نائم"

حضرت لقمان رحمہ اللہ نے اپنے بیٹے کو کہا اے میرے بیٹے مرغ تجھ سے زیادہ عقلمند اور زیرک نہ ہو کہ وہ سحری کے وقت اذان دے رب کو یاد کرے اور تو غافل ہو کر سویا رہے۔

سید الاستغفار:

"عن شداد بن اوس قال قال رسول الله ﷺ سید الاستغفار ان تقول اللهم انت ربی لا اله الا انت خلقتنی وانا عبدک وانا علی عهدک ووعدک ما استطعت اعوذ بک من شر ما صنعت ابوء لک بنعمتک علی وابوء بذنبی فاغفرلی فانه لا یغفر الذنوب الاانت "قال ومن قالها من النهار موقنا بها فمات من یومه قبل ان یمسی فهو من اهل الجنة ومن قالها من اللیل وهو موقن بها فمات من لیلة قبل ان یصبح فهو من اهل الجنة" (رواہ البخاری)

شداد بن اوس کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" سید الاستغفار" یہ ہے کہ تم کہو

"اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّیْ لَااِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ خَلَقْتَنِیْ وَاَنَا عَبْدُکَ وَاَنَا عَلٰی عَهْدِکَ وَوَعْدِکَ مَا اسْتَطَعْتُ اَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّ مَاصَنَعْتَ اَبُوْءُ لَکَ بِنِعْمَتِکَ عَلَیَّ وَاَ بُوْءُ بِذَنْبِیْ فَاغْفِرْلِیْ فَاِنَّهُ لَایَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّااَنْتَ"

جس شخص نے یہ الفاظ یقین سے پڑھے، اسی دن شام سے پہلے فوت ہو گیا تو وہ جنتی ہوگا اور جس نے رات کو یہ الفاظ یقین سے پڑھے تو وہ اسی رات فوت ہو گیا تو وہ جنت میں جائے گا۔ (ماخوذ از قرطبی)

بندہ گنہگار ہے رب غفار ہے:

﴿وَالْمُسْتَغْفِرُوْنَ بِالْاَسْحَارِ اَلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ﴾ سحری کے وقت استغفار کرنے والے وہ لوگ بھی ہیں جو جہالت کی وجہ سے برے عمل کرتے ہیں پھر جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ یعنی برے اعمال پر قائم رہنا، رب تعالیٰ کا خوف دل میں نہ آنا، توبہ کرنا برا عمل ہے۔ اگر توبہ کر لی جائے تو اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو مایوس نہیں کرتا بلکہ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔

"عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ والذی نفسی بیده لو لم تذنبوا لذهب الله بکم ولجاء بقوم یذنبون فیستغفرون الله فیغفر لهم"

(رواہ مسلم،وروی احمد وابویعلی من حدیث ابی سعید نحوہ)

حضرت ابو ہریرہ ﷜ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر تم گناہ نہ کرتے (یعنی تم سے کوئی گنہگار نہ ہوتا) تو اللہ تعالیٰ تمہیں لے جاتا اور ایک قول کو لے آتا جو گناہ کرتے اور اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرتا۔ (ماخوذ از مظہری)

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہی ایمان واستغفار حاصل ہوتے ہیں:

"والعبد اذالاحظ ان افعاله مخلوقة لله تعالى وانه تعالى من عليه بتوفيقه وارتضاه لنفسه حيث لم يتركه الى غيره"

بندہ جب یہ سمجھ لیتا ہے کہ میرے تمام افعال اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں، تو یقیناً وہ اپنے اعمال میں رب تعالیٰ کی رضا اور اس کے خوف کو مدنظر رکھتا ہے تو رب تعالیٰ بھی اس پر احسان فرماتا ہے، اسے توفیق عطاء فرماتا ہے اور اسے اپنے لئے پسند کر لیتا ہے، غیروں کی طرف اسے نہیں چھوڑتا۔

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی اس پر واضح دلیل ہے۔

﴿يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْاقُلْ لَّاتَمُنُّوْاعَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدَاكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ﴾

اے محبوب وہ تم پر احسان جتاتے ہیں کہ مسلمان ہو گئے، تم فرماؤ ''اپنے اسلام کا احسان مجھ پر نہ رکھو'' بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں اسلام کی ہدایت کی اگر تم سچے ہو۔

صفات مذکورہ کی شاندار ترتیب:

اللہ تعالیٰ کی رضاء کیلئے بندے مختلف عبادات کرتے ہیں، بعض عبادات میں تکالیف بھی پائی جاتی ہیں، ان کو ادا کرنے میں صبر وتحمل کی ضرورت بھی درپیش آتی ہے۔ صابر وہ ہے جو تمام عبادات کے ادا کرنے میں صبر کرے، پھر بندہ کبھی اپنے آپ پر بعض عبادات کو لازم کر لیتا ہے، کبھی نذر مان کر، اور اور کبھی عبادات کو شروع کر کے اپنے آپ پر واجب کر لیتا ہے۔

"وكمال هذه المرتبة انه اذا التزم طاعة ان يصدق نفسه فى التزامه وذلك بان يأتى

بذلک الملتزم من غیر خلل البتة"

اس مرتبہ میں کمال اس وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ وہ کسی عبادت کو اپنے آپ لازم کرے تو وہ اس میں سچا ہو یعنی اس عبادت کو بغیر کسی خلل ونقصان کے مکمل کرے۔ جب یہ مرتبہ پہلے کے بعد ہے "فلاجرم ذکر سبحانہ (الصابرین) اولا، ثم قال (الصادقین) ثانیا" تو یقیناً یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالی نے پہلے (الصابرین) کا ذکر فرمایا، پھر (الصادقین) کا ذکر فرمایا، پھر اللہ تعالی کو یہ پسند ہے کہ طاعت کی ان دونوں قسموں پر انسان ہمیشہ کیلئے قائم رہے، پھر رب قدوس نے ذکر فرمایا (والقانتین) طاعت کرنے والے، "فھذہ الالفاظ الثلاثة للترغیب فی المواظبة علی جمیع انواع الطاعات" یہ تینوں الفاظ گرامی ﴿اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالْقٰنِتِیْنَ﴾ اس چیز کی رغبت دلا رہے ہیں کہ انسان تمام قسم کی طاعات پر ہمیشگی اختیار کرے۔

اس کے بعد اللہ تعالی نے طاعات معینہ کا ذکر فرمایا، جو قدر و منزلت کے لحاظ پر عظیم درجہ رکھتی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں، مالی خدمت اور جانی خدمت، مالی خدمت کی طرف نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے "الشفقة علی خلق اللہ" "اللہ تعالی کی مخلوق پر شفقت ہے" یعنی انسان جب اللہ تعالی کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے تو وہ اللہ تعالی کے بندوں کی حاجات کو پورا کرتا ہے، تو یہ ان پر شفقت واحسان ہے۔

رب تعالی نے ان کی اسی صفت کو ذکر فرمایا "والمنفقین" وہ صدقہ دینے والے ہیں، یعنی اللہ تعالی کی راہ میں وہ مال خرچ کرتے ہیں، جانی خدمت کی طرف بھی رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی سے اشارہ ملتا ہے "التعظیم لامر اللہ" اللہ تعالی کے امر کی تعظیم ہے یعنی اللہ تعالی کے حکم کو معظم سمجھتے ہوئے بجا لائے ہیں، یہ ان کی جانی خدمت ہے۔ اسی کو مالک کا یوں بیان فرمایا ﴿وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ﴾ سحری کے وقت بخشش طلب کرنے والے ہیں۔

سؤال : اللہ تعالی نے "والمنفقین" (صدقہ کرنے والے ہیں) کا ذکر پہلے فرمایا۔ اس کے بعد ﴿وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ﴾ (سحری کے وقت بخشش طلب کرنے والے ہیں) کا ذکر کیا ہے۔ بظاہر انسانی عقل کا تقاضا یہ ہے کہ "اللہ تعالی کی تعظیم کا ذکر پہلے کیا جاتا، اور مخلوق پر شفقت کا ذکر بعد میں کیا جاتا۔

جواب : یہاں بندے کا ذکر اس انداز پر کیا گیا ہے کہ وہ ادنی درجے سے اعلی درجے کی طرف ترقی کرتا ہے اسلئے ﴿وَالْمُنْفِقِیْنَ﴾ کا ذکر پہلے کیا گیا ہے جس میں مخلوق پر شفقت پائی گئی ہے یہ درجہ ذرا ادنی ہے اس کے بعد ﴿وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ﴾ ذکر کیا ہے جس میں اللہ تعالی کے امر کی تعظیم کا بیان ہے جس کا درجہ بلند ہے ہاں اگر اوپر سے نیچے درجہ کی طرف آنے کا کہیں تذکرہ مقصود ہو تو ترتیب کو الٹ ذکر کرنا پڑے گا جیسا کہ سوال

میں ذکر کیا گیا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

اللہ تعالیٰ نے پانچ صفات کا تذکرہ فرمایا، اوران کے درمیان "واؤ عاطفه "کوذکر کیا اس کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ موصوف متعدد ہوں کہ کئی لوگ صبر کرنے والے ہوں گے کئی لوگ سچے ہوں گے وغیرہ۔ (از روح المعانی)

لیکن راقم کو تفسیر کبیر کی وضاحت کبیر نظر آئی

"هذه الخمسة اشارة الى تعديد الصفات لموصوف واحد فكان الواجب حذف واو العطف عنها كما فى قوله تعالى "هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ "الا انه ذكر ههنا واو العطف واظن والعلم عند الله ان كل من كان معه واحدة من هذه الخصال دخل تحت المدح العظيم واستوجب هذا الثواب الجزيل ،والله اعلم " (کبیر)

یہ پانچ صفات یہاں مذکور ہیں جو متعدد ہیں موصوف ایک ہے یعنی پرہیز گار شخص کیلئے ان تمام صفات کا پایا جانا ضروری ہے، بظاہر قانون کو دیکھا جائے تو "واؤ عاطفہ" کو حذف ہونا چاہئے تھا جیسا کہ ﴿هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ﴾ میں حذف ہے لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ ذکر فرماتے ہیں کہ حقیقی علم اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے البتہ میرا گمان یہ ہے کہ "واؤ عاطفه "کو ذکر کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ جس شخص میں ان صفات سے ایک صفت بھی پائی گئی وہ بھی بہت بڑی مدح کے قابل ہے اور بہت بڑے ثواب کا مستحق ہے، اسی سے خود اندازہ لگالیں کہ جس اللہ کے بندے میں یہ تمام صفات پائی گئیں وہ کتنا عظیم مقام رکھتا ہوگا اور کتنی بڑی تعریف کے قابل ہوگا۔ (ماخوذ از کبیر)

قال الامام القشيرى رحمه الله الصابرين على ما امر الله والصادقين فيما عاهدوا الله والقانتين بالاستقامة فى محبة الله والمنفقين فى سبيل الله والمستغفرين من جميع ما فعلوا لرؤية تقصير هم "

امام قشیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں صابرین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے امر پر قائم رہتے ہیں اور صادقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو پورا کرنے میں سچے ہیں اور قانتین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی محبت میں قائم رہتے ہیں اور مستغفرین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کی اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرتے ہیں۔ (از روح البیان)

سحری کے وقت انسان یہ تسبیحات پڑھے:

"سُبحَانَ المَلِکَ القُدُّوسِ سُبحَانَ الکَرِیمِ "اور یہ پڑھے"سُبحَانَ الکَبِیرِ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الحَیُّ القَیُّوم"

اور یہ پڑھے "سُبحَانَ اللّٰہِ العَلِیِّ العَظِیمِ سُبحَانَ العَزِیزِ القَھَّارِ سُبحَانَ اللّٰہِ رَبِّ العَرشِ الرَّفِیعِ"

ارشاد باری تعالی ہے ﴿وَاِن مِّن شَیءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمدِہٖ﴾ کوئی چیز نہیں مگر وہ اللہ تعالی کی تسبیح وتحمید کرتی ہے تو اشرف المخلوقات کیلئے بھی ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالی کی تعریف کرے۔"فان الانسان اولی بان یشتغل بالدعاء والتسبیح خصوصا فی الخلوات واوقات الاسحار" بیشک انسان کیلئے زیادہ بہتر ہے کہ وہ دعاء اور تسبیح میں مشغول رہے، خاص کر کے وہ اللہ تعالی کو خلوت (تنہائی) میں اور سحری کے وقت زیادہ سے زیادہ یاد کرے۔

دلا برخیز وطاعت کن کہ طاعت بہ زہر کاراست — سعادت آں کسی دارد کہ وقت صبح بیدار است

اے دلا اٹھ اور طاعت کر، کیونکہ طاعت ہر کام سے بہتر ہے نیک بختی اس شخص کو ہی حاصل ہے جو صبح کے وقت بیدار ہوتا ہے۔

خروسان در سحر گویند کہ قم یا ایھا الغافل — تو از مستی نمی دانی کے داند کہ ہشیار است

مرغ سحری کے وقت کہتے ہیں، اے غافل اٹھ (جاگ) تو مستی کی وجہ سے نہیں جانتا (کہ یہ کیسا وقت ہے) وہی شخص جانتا ہے جو ہوشیار ہے۔ (ماخوذ از روح البیان)

راقم کو بھی اللہ تعالی نے گرمیوں، سردیوں میں سحری اٹھنے کی توفیق عطاء فرمائی ہے۔تاہم گنہگار، سیاہ کار اپنے شیخ کامل سید الاولیاء حضرت **پیر مہر علی** شاہ رحمہ اللہ کے ان اشعار کو گنگناتا رہتا ہے۔

گو نامہ سیاہ کردم از بسکہ گنہ گارم — اما نظرے بستہ بر رحمت غفارم

اور ارشاد فرمایا:

گرچہ غرق بحر عصیانم ما — آیۃ لاتقنطوا خوانیم ما

کن بشایان درت مارا قبول — حضرت را گر نشایا نیم ما

اور ارشاد فرمایا:

حریف ساغر ومے ہوں غریق بحر عصیاں ہوں۔

سہارا ہے" فترضی" کا مجھے محشر مکانن میں۔

﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝﴾ (آیۃ نمبر ۱۸)

(1) اللہ تعالیٰ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں نے اور عالموں نے انصاف سے قائم ہو کر اس کے سوا کسی کی عبادت نہیں عزت والا حکمت والا۔

(2) بیان فرمادیا اللہ تعالیٰ نے، بیشک نہیں کوئی معبود سوائے اس کے اور فرشتوں نے اور علم والوں نے قائم رہتے ہوئے انصاف پر، نہیں ہے کوئی معبود سوائے اس کے جو عزت والا، حکمت والا ہے۔

مختصر مطلب:

اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت پر خود گواہی دی کہ بیشک اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی معبود (حقیقی) نہیں، اور فرشتوں نے اور علم والے حضرات نے بھی انصاف پر قائم رہتے ہوئے گواہی دی کہ بیشک اللہ تعالیٰ کے سواء کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ عبادت کے لائق صرف وہی ذات ہے جو عزیز حکیم ہے۔

شان نزول:

(۱) جب نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ میں تشریف لائے، تو وہاں شام کے علاقہ سے یہود کے دو عالم آئے، جب انہوں نے مدینہ طیبہ کو دیکھا تو ایک نے دوسرے کو کہا یہ شہر تو مشابہ ہے آخر الزمان نبی کے مدینہ کے، پھر وہ دونوں جب نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے تو انہوں نے ان اوصاف کے ذریعے پہچان لیا جن کا تذکرہ ان کی کتب میں آچکا تھا، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا "انت محمد؟" کیا تم محمد ہو؟ آپ نے فرمایا ہاں پھر ان دونوں نے آپ سے سوال کیا "انت احمد؟" کیا آپ احمد بھی ہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ تو وہ دونوں کہنے لگے ہم آپ سے شہادت کے متعلق سوال کرنا چاہتے ہیں اگر تم نے خبر دے دی تو ہم ایمان لے آئیں گے، آپ نے فرمایا تم مجھ سے پوچھو، یعنی تم سوال کرو میں جواب دوں گا" تو انہوں نے کہا "اخبرنا عن اعظم شهادة فی کتاب الله" کہ آپ ہمیں سب سے بڑی شہادت کے متعلق بتائیں کہ کتاب اللہ میں عظیم شہادت کون سی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیۃ کریمہ آپ پر نازل فرمادی، تو آپ ان کو پڑھ کر سنائی۔ "فاسلم الرجلان وصدقا برسول الله ﷺ" تو وہ دونوں شخص اسلام لے آئے اور نبی کریم ﷺ کی تصدیق کی۔ (از قرطبی)

(۲) دوسری وجہ شان نزول کی یہ بیان کی گئی کہ یہ نجران کے عیسائیوں کے وفد کے رد میں نازل ہوئی، جبکہ انہوں نے عیسی علیہ السلام کو رب تعالی کا شریک ٹھہرایا تو رب تعالی نے اپنی وحدانیت پر خود ہی شہادت دی۔ (خازن)

﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ ''بیان فرمادیا اللہ نے، بیشک نہیں کوئی معبود سوائے اس کے۔''

''شهدالله يعنى بين الله واظهر لان معنى الشهادة تبين واظهار''

لفظ ''شهادة'' بمعنیٰ ''تبين'' اور ''اظهار'' کے (بیان کرنا، واضح کرنا، ظاہر کرنا) استعمال ہوتا رہتا ہے۔ اسلئے یہاں یہ معنی ہو گیا کہ اللہ تعالی نے بیان کر دیا، واضح کر دیا، ظاہر فرمادیا کہ بیشک اس کے سواء اور کوئی معبود نہیں۔ (خازن)

راقم نے شہادت کا معنی خازن کی اسی تفسیر کے مطابق کیا ہے ''بين الله'' (بیان فرمادیا اللہ تعالی نے)

''وقيل معنى شهد الله حكم الله وقضى'' بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ ''شهد الله'' کا معنی ہے اللہ تعالی نے فیصلہ فرمادیا (بیشک اس کے بغیر اور کوئی معبود نہیں) ''وقيل معناه اعلم الله انه لااله الاهو''، بعض حضرات نے بیان کیا کہ ''شهد الله'' کا معنی ہے ''اعلم الله'' اب اس صورت میں معنی یہ ہوگا ''اللہ علم عطاء کرتا ہے بیشک اس کے سواء کوئی معبود نہیں'' (خازن)

اعلی حضرت رحمہ اللہ نے ''شهد الله'' کا ترجمہ کیا ہے (اللہ تعالی نے گواہی دی) آپ کا ترجمہ تفسیر ابن کثیر اور تفسیر صابونی کے الفاظ یہ ہیں:

(شهد الله)شهد تعالى و كفى به شهيدا وهو اصدق الشاهدين واعدلهم واصدق القائلين(انه لااله الاهو)اى المنفرد بالالهية لجميع الخلائق،وان الجميع عبيده وخلقه وفقراء اليه،وهو الغنى عما سواه كما قال تعالى(لكن الله يشهد بما انزل اليك)

(اللہ تعالی نے گواہی دی) اور وہ اس میں بحیثیت گواہ کافی ہے اور وہ سب گواہی سے زیادہ سچا گواہ ہے اور سب سے زیادہ انصاف والا ہے اور سب کلام کرنے والوں سے زیادہ سچا کلام کرنے والا ہے (اس نے گواہی دی، بیشک اس کے سواء کوئی معبود نہیں)'' بیشک وہ الہ (معبود) ہونے کے لحاظ پر منفرد ہے تمام مخلوق پر'' بیشک تمام کائنات اسی کی غلام ہے، اور اسی کی مخلوق ہے اور اسی کے محتاج ہے، وہ سب سے بے پرواہ ہے، رب تعالی کا یہ ارشاد گرامی ایسا ہی ہے جیسا کہ رب تعالی نے فرمایا ﴿لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ﴾ لیکن اللہ تعالی گواہی دیتا ہے جو اس نے آپ پر نازل کیا'' (از صابونی)

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

شہادت کا ایک معنی ہے،خبر دینا جو علم کے ساتھ ملی ہوئی ہو یعنی گواہی دینا۔اس معنی کے لحاظ سے لفظ "شھد اللہ تعالیٰ اور ملائکہ اور اولوا العلم میں ایک ہی معنی میں استعمال ہوگا۔"ان اللہ تعالی قد اخبر فی القرآن عن کونہ واحدا لا الہ معہ" بیشک اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں خبر دی کہ وہ ایک ہے،اس کے ساتھ کوئی اور معبود نہیں اور ملائکہ اور علم والوں کی شہادت کا یہ مطلب ہے "الملائکۃ و اولوا العلم کلھم اخبروا ان اللہ تعالی واحد لا شریک لہ" سب فرشتوں اور سب علم والوں نے یہ خبر دی بیشک اللہ تعالیٰ ایک ہے،اس کا کوئی شریک نہیں۔ (از کبیر)

شہادت بمعنی اظہار و بیان:

اگر شہادت کا معنی بیان و اظہار کیا جائے تو اس صورت میں معنی یہ ہوگا

"انہ تعالی اظھر ذلک و بینہ بان خلق مایدل علی ذلک اما الملائکۃ و اولوا العلم فقد اظھروا ذلک"

بیشک اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر کیا اور بیان کیا کہ اس کی مخلوق اس پر دلالت کرتی ہے کہ وہ ایک ہے،اس کے سواء اور کوئی معبود نہیں،اور فرشتوں اور علماء نے بھی اسے ظاہر کیا ہے اور دلائل و براہین سے بیان کیا ہے کہ وہ ایک ذات ہے اس کے بغیر اور کوئی معبود نہیں۔فرشتوں نے رسولوں سے یہ بیان کیا اور رسولوں نے علماء سے بیان کیا اور علماء نے عام لوگوں سے بیان کیا اظہار اور بیان کا معنی سب میں پایا گیا ہے،اس لحاظ پر مفہوم ایک ہی ہے۔البتہ اظہار اور بیان اللہ تعالیٰ کا سب سے اعلیٰ ہے،پھر انبیاء کرام کا اظہار ہے،پھر فرشتوں کا پھر علماء کا،یہ درجہ کا لحاظ ہے،ورنہ بتانے کے لحاظ پر فرشتوں کا ذکر پہلے ہوگا۔

ضمناً آنے والی آیۃ کریمہ سے رابطہ بھی واضح ہوگیا،گویا کہ رسول اللہ ﷺ کو رب تعالیٰ نے یہ بتادیا "اللہ تعالیٰ کی وحدانیت خود اس کی اپنی شہادت سے ثابت ہے اور اس کی مخلوق میں سے جن کو بھی سوچنے،سمجھنے کی رب تعالیٰ نے توفیق دے رکھی ہے وہ بھی اس کی وحدانیت پر شاہد ہیں۔سوائے نصاریٰ،یہود اور بت پرستوں کے،لیکن ان کی جہالت سے دین متین میں اور سیدھے راستہ میں کوئی خلل واقع نہیں ہوسکتا۔

"فاثبت انت وقومک یا محمد علی ذلک فانہ ھو الاسلام والدین عند اللہ ھو الاسلام"

لھذا اے محمد ﷺ! تم اور تمہاری امت اس پر قائم رہو، یعنی اسلام پر قائم رہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو دین اسلام ہی پسند ہے یعنی مضمون آنے والی آیۃ کریمہ میں پیش کیا گیا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

شہادت کا مجازی معنی:

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کا اپنی توحید پر گواہی دینے'' کا مطلب یہ ہے ''انه خلق الدلائل الدالة علی توحیده'' اللہ تعالیٰ نے دلائل پیدا فرمائے جو اس کی توحید پر دلالت کر رہے ہیں، ملائکہ اور علم والوں کی شہادت کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان دلائل کو دیکھ کر اقرار کرتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اس کے سواء کوئی معبود نہیں۔ (از کبیر)

''سئل بعض الاعراب ماالدلیل علی وجود الصانع فقال ان البعرة تدل علی البعیر فھیکل علوی بھذه اللطافة و مرکز سفلی بھذه الکثافة اما یدلان علی وجود الصانع الخبیر''

کسی دیہاتی سے سوال کیا گیا اللہ تعالیٰ خالق کائنات کے وجود پر کیا دلیل ہے؟ تو اس نے کہا اونٹ کی مینگنیاں اونٹ پر دلالت کرتی ہیں، تو اتنا بڑا ہیکل علوی (آسمانوں کی شکل اور ان کا وجود) جو لطیف ہے، اور مرکز سفلی یعنی زمین جو کثیف ہے کیا یہ صانع خبیر پر دلالت نہیں کرتے۔ (خازن)

''اولوا العلم'' سے مراد کون لوگ ہیں؟

بعض حضرات نے بیان کیا اس سے مراد انبیاء کرام ہیں اور بعض حضرات نے بیان کیا اس سے مراد مہاجرین وانصار صحابہ کرام اصحاب علم ہیں اور بعض حضرات نے بیان کیا، اس سے مراد اہل کتاب کے علماء ہیں جنہوں نے ایمان قبول کر لیا تھا یعنی عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی اور بعض حضرات نے بیان کیا اس سے مراد تمام علماء مؤمنین ہیں۔ (خازن)

راقم کا موقف یہ ہے کہ مندرجہ بالا تمام حضرات علم والے ہیں، اس لئے انبیاء کرام اور صحابہ کرام خواہ وہ مہاجرین ہوں یا انصار، یا اہل کتاب کے علماء سے ایمان لانے والے ہوں یا نبی کریم ﷺ کی امت کے علماء کرام تا قیامت آنے والے ہوں سب ہی مراد ہیں۔

فائدہ جلیلہ: اس آیۃ کریمہ سے یہ واضح ہو گیا کہ علم کو فضیلت حاصل ہے اور علماء کو شرف وفضیلت حاصل ہے۔

''فانه لو کان احد اشرف من العلماء لقرنھم الله باسمه و اسم ملائکته کما قرن اسم العلماء''

اگر کسی ایک کو علماء سے زیادہ فضیلت وشرف حاصل ہوتے تو اللہ تعالیٰ اپنے اسم گرامی اور ملائکہ کے ساتھ اس کا بھی ذکر کرتا جیسا کہ علماء کا ذکر کیا، جب اللہ تعالیٰ نے اپنے اور ملائکہ کے ساتھ کسی اور کا تذکرہ نہیں کیا بلکہ صرف علماء کرام کا

ذکر کیا ہے تو واضح ہوا کہ علماء کرام سے بڑھ کر کوئی مشرف وافضل نہیں۔

❁ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو فرمایا ﴿وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا﴾ اورعرض کروائے میرے رب میرا علم زیادہ کر، اگر کوئی چیز علم سے زیادہ اشرف ہوتی تو اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کو حکم دیتا کہ جاں چیز کی زیادتی کی دعاء کرو، جب کسی اور چیز کی زیادتی کی دعاء کا حکم نہیں دیا گیا تو پتہ چلا کہ سب چیزوں سے افضل علم ہے۔

❁ "وقال رسول اللہ ﷺ ان العلماء ورثه الانبیاء" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا علماء انبیاء کرام کے وارث ہیں۔

❁ "وقال رسول اللھا العلماء امناء اللہ علی خلقه"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، علماء اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر امین (محافظ) ہیں۔

❁ "عن البراء قال قال رسول اللہ ﷺ العلماء ورثة الانبياء يحبهم اهل السماء ويستغفرلهم الحيتان في البحر اذا ماتوا الى يوم القيامة"

حضرت براء ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا علماء انبیاء کرام کے وارث ہیں، ان سے آسمان والے محبت کرتے ہیں، جب ان کی وفات ہوتی ہے تو مچھلیاں دریاؤں میں ان کیلئے قیامت تک استغفار کرتی ہیں۔ (ماخوذ از قرطبی)

زیر بحث آیۃ کریمہ کی فضیلت:

"روى غالب القطان قال اتيت الكوفة في تجارة فنزلت قريبا من الاعمش فكنت اختلف اليه فلما كان ليلة اردت ان انحدر الى البصرة قام فتهجد من الليل فقرأ بهذه الآية (شهد الله انه لااله الاهو والملائكة واولوا العلم قائما بالقسط لااله الاهو العزيز الحكيم ٥ ان الدين عندالله الاسلام) قال الاعمش وانا اشهد بما شهد الله به، واستود ع الله هذه الشهادة وهي لي (عند الله) وديعة" وان الدين عند الله الاسلام" قالها مرارا فغدوت اليه وودعته ثم قلت انى سمعت تقرأ هذه الآية فما بلغك فيها؟ انا عندك منذسنة لم تحدثني به قال والله لاحدثتك به سنة قال فأقمت و كتبت على بابه ذلك اليوم فلما مضت السنة قلت ياابا محمد قد مضت السنة قال حدثني ابووائل عن عبد الله بن مسعود قال قال رسول الله ﷺ يجاء بصاحبها يوم القيامة فيقول الله تعالى عبدى عهد الى وانا احق من وفي ادخلوا عبدى الجنة" (رواه الطبراني في الكبير بحواله حاشيه صابونى)

غالب قطان روایت کرتے ہیں کہ میں تجارت کی غرض سے کوفہ آیا، میں اعمش رحمہ اللہ کے قریب اترا، میں ان کے پاس اکثر طور پر آتا جاتا رہتا تھا، جب رات ہوئی تو میں نے ارادہ کیا کہ میں بصرہ جاؤں گا، رات کو کھڑے ہوئے، تہجد

ادا کیئے، یہ آیۃ کریمہ پڑھی۔

﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ○ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾

اعمش رحمہ اللہ نے کہا میں اسی چیز کی گواہی دیتا ہوں جس کی اللہ تعالی نے گواہی دی، میں اللہ تعالی کے ہاں اس شہادت کو امانت رکھ رہا ہوں، میری یہ امانت اللہ تعالی کے ہاں ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ ہے۔آپ نے کئی مرتبہ یہ الفاظ دوہرائے۔صبح میں نے انہیں الوداع کیا، پھر میں نے کہا بیشک میں نے آپ سے یہ آیۃ پڑھتے ہوئے سنی، کس چیز نے تمہیں اس میں پہنچایا ہے؟ میں آپ کے پاس ایک سال سے ہوں (یعنی ایک سال ہو چکا ہے تجارتی غرض سے آپ کے پاس آتے جاتے ہوئے) آپ مجھے نے کوئی حدیث نہیں بیان کی، توانہوں نے کہا قسم ہے الہ تعالی کی میں تمہیں ایک سال بعد حدیث بیان کروں گا (مقصد یہ تھا کہ یہ جانا جائے کہ یہ صرف تاجر ہے یا کہ حدیث حاصل کرنے میں مخلص بھی ہے) یہ کہتے ہیں میں وہاں ہی قائم رہا، ان کے دروازے پر وعدہ کی تاریخ لکھ دی کہ آج سے سال بعد حدیث بیان کرنے کا وعدہ کرلیا گیا، جب سال گزر گیا تو میں نے کہا اے ابو محمد سال گزر چکا ہے۔توانہوں نے کہا مجھے ابو وائل نے عبداللہ بن مسعود سے مروی حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس آیۃ کریمہ کو پڑھنے والے شخص کو قیامت کے دن لایا جائے گا، تو اللہ تعالی فرمائے گا اس میرے بندے نے مجھ سے عہد لیا ہے، میں وعدہ کو پورا کرنے کا سب سے زیادہ حق رکھتا ہوں لھذا میرے اس بندے کو جنت میں داخل کردو۔

ابوالفرج جوزی اور ابن عدی کا سند حدیث پر اعتراض:

"قال ابو الفرح الجوزی غالب القطان هو غالب بن خطاف القطان یروی عن الاعمش حدیث شهد الله وهو حدیث معضل ،قال ابن عدی الضعف علی حدیثه بین"

ابوالفرج جوزی نے کہا ہے کہ غالب قطان وہ غالب بن خطاف قطان روایت کرتا ہے اعمش سے اس کی روایت وہ حدیث جس میں "شَهِدَ اللّٰهُ" آیۃ کی فضیلت بیان کی گئی ہے وہ معضل ہے، ابن عدی نے کہا ہے حدیث کا ضعیف ہونا واضح ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ کا شاندار طریقہ سے رد کرنا:

"وقال احمد بن حنبل غالب بن الخطاف القطان ثقة ثقة وقال ابن معین ثقة وقال ابو حاتم صدوق صالح"

احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے فرمایا غالب بن الخطاف القطان ثقہ راوی ہیں، ثقہ راوی ہیں، (یعنی دو مرتبہ ان کو ثقہ بیان کر کے بہت پختہ بات بیان کی) اور ابن معین نے بھی یہی کہا ہے کہ وہ ثقہ راوی ہیں، ابو حاتم نے کہا ہے وہ سچے اور صالح شخص ہیں۔ "قلت یکفیک من عدالتہ وثقتہ ان خرج لہ البخاری ومسلم فی کتابیھما وحسبک" میں کہتا ہوں کہ غالب بن الخطاف القطان کے ثقہ ہونے اور عادل ہونے کیلئے یہی دلیل کافی ہے کہ ان کی روایات کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ (قرطبی)

تنبیہ: طلباء کرام یہ بات ذہن میں رکھیں کہ معضل حدیث وہ ہے جس میں راوی دو واسطے لگا تار چھوڑ دے معضل دراصل مرسل کی ایک قسم ہے، مرسل کے متعلق امام اعظم ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کا موقف یہ ہے۔

" المرسل مقبول مطلقا وھم یقولون انما ارسلہ لکمال الوثوق والاعتماد"

کہ مرسل حدیث مطلقا مقبول ہے، وہ کہتے ہیں کہ راوی نے جن راویوں کو چھوڑا ہے ان پر کامل وثوق کرتے ہوئے چھوڑا ہے کہ یہ ثقہ راوی ہیں۔ اور اصل مسئلہ راوی کے ثقہ ہونے پر ہی مقبولیت کا ہے۔ (مقدمہ مشکوۃ)

حدیث اعمش کے تائید میں اور احادیث:

❁ عن انس قال قال رسول اللہ ﷺ من قرأ ﴿شَھِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ﴾ عند منامہ خلق اللہ لہ سبعین الف ملک یستغفرون لہ الی یوم القیامۃ"

حضرت انس ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جس شخص نے سوتے وقت یہ آیۃ کریمہ پڑھی ﴿شَھِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ﴾ تو اللہ تعالیٰ اس کیلئے ستر ہزار فرشتے مقرر فرما دیتا ہے جو قیامت تک اس کیلئے استغفار کرتے رہیں گے۔

❁ "وروی عن سعید بن جبیر انہ قال کان حول الکعبۃ ثلاثمائۃ وستون صنما لکل حی من احیاء العرب صنم او صنمان فلما نزلت ھذہ الآیہ اصبحت الاصنام قد خرت ساجدۃ للہ"

سعید بن جبیر کہتے ہیں کعبہ شریف کے ارد گرد تین سو ساٹھ بت تھے، عرب کے قبائل میں سے ہر قبیلہ کے ایک ایک، دو دو بت تھے، جب یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی تو وہ تمام سجدہ میں گر گئے (یعنی انہوں نے بھی سجدہ میں گر کر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی شہادت دی) (ماخوذ از قرطبی)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

میرے عزیز مسلک حنفی پر قائم طلباء کرام میں آپ کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ جس طرح آپ نے دیکھا کہ ایک حدیث کو ابوالفرج اور ابن عدی نے ضعیف کرنے کی کوشش کی اور ابن معین نے راوی کو ثقہ کہا اور امام احمد رحمہ اللہ نے ثقہ کہا اور ابو حاتم نے صالح اور سچا قرار دیا اسی طرح کئی احادیث کو غیر مقلدین ضعیف کرنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ وہ دوسرے حضرات کے نزدیک ضعیف نہیں کسی ایک کے قول کو لے کر اور دوسرے اقوال کو چھپانا اور توڑ موڑ کر بات پیش کرنا غیر مقلدین کو وطیرہ ہے ان کے جال سے بچنے کیلئے ان کی پیش کردہ احادیث اور ان کی شروح کا ضرور مطالعہ کیا کریں۔ (راقم)

سؤال : فرشتوں اور علم والوں کی گواہی تو سمجھ آجاتی ہے کہ وہ گواہی دے سکتے ہیں "ولکن المدعی للواحدانیة هو الله فکیف یکون المدعی شاهدا؟" لیکن اللہ تعالی خود اپنی وحدانیت کا مدعی بھی ہے تو کس طرح مدعی خود ہی اپنے دعوی کا گواہ بن سکتا ہے؟

جواب نمبر۱: شاہد حقیقی سوائے اللہ تعالی کے اور کوئی نہیں اسلئے کہ اللہ تعالی نے تمام چیزوں کو پیدا کیا اور ان کو اپنی توحید پر دلائل بنایا اگر یہ دلائل نہ ہوتے تو شہادت بھی صحیح نہ ہوتی، پھر اللہ تعالی نے ان دلائل کے ذریعے علماء کو توفیق عطاء فرمائی کہ انہیں رب تعالی کی وحدانیت کا علم حاصل ہوا

"واذکان الامر کذلک کان الشاهد علی الوحدانیة لیس الاالله وحده ولهذا قال" (قل ای شیئ اکبر شهادة قل الله)

جب معاملہ اس طرح ہو تو اللہ تعالی ہی اپنی وحدانیت پر شاہد ہے اسی وجہ رب تعالی نے فرمایا ﴿قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللّٰهُ شَهِیْدٌ بَیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ﴾ تم فرماؤ سب سے بڑی گواہی کس کی تم فرماؤ کہ اللہ گواہ ہے مجھ میں اور تم میں

جواب نمبر۲: اللہ تعالی ازلی اور ابدی موجود ہے اس کے سواء تمام مخلوق ازل میں موجود نہیں تھی بلکہ معدوم تھی اور معدوم غائب کے مشابہ ہوتا ہے اور موجود حاضر کے مشابہ ہوتا ہے اللہ کے سواء سب چیزیں غائب تھیں وہ اللہ تعالی کی شہادت سے درجہ شہود میں آئیں۔ فکان الحق شاهدا علی الکل فلهذا قال (شهد الله انه لا اله الاهو) اللہ تعالی کی شہادت کل پر ہے اسی وجہ سے اللہ تعالی نے فرمایا ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾

جواب نمبر۳: اگرچہ بظاہر ذکر ہے شہادت کا لیکن حقیقت میں اقرار ہے کیونکہ جب رب تعالی نے خبر دی

"لا الہ الا ھو" کوئی معبود نہیں سوائے اس کے تو اسی سے واضح ہوا کہ تمام مخلوق اس کی غلام ہے ۔

"والمولی الکریم لایلیق به ان یخل به ان یخل بمصالح العبید فکان هذا الکلام جاریامجری الا قرار بأنه یجب وجوب الکرم علیه ان یصلح جهات جمیع الخلق"

مولائے کریم کی شان کے یہ لائق نہیں کہ وہ اپنے بندوں اپنے غلاموں کی مصلحت میں کوئی کمی کرے گویا کہ اس کلام میں اقرار پایا گیا ہے کہ رب تعالی نے اپنے ذمہ کرم پر واجب کرلیا ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ہر طرح کی مصلحت پہنچائے گا۔ (ماخوذ از کبیر)

جواب نمبر٤: "شهد لنفسه بنفسه قبل ان خلق الخلق حین کان ولم تکم سماء ولاارض ولا بر ولابحر فقال تعالی شهد الله انه لا اله الاهو"

اللہ تعالی نے اپنی ذات کیلئے یعنی اپنی واحدنیت پر جو شہادت دی وہ مخلوق کی پیدائش سے پہلے تھی کیونکہ رب تعالی کی نہ ابتداء ہے نہ انتہاء، وہ ازلاً ابداً موجود ہے اسلئے مخلوق کی پیدائش سے پہلے وہ موجود تھا لیکن اس وقت کچھ بھی نہ تھا، نہ آسمان، نہ زمین نہ خشکی، نہ دریا و سمندر اس وقت رب تعالی نے اپنی وحدانیت کی شہادت دی ارشاد فرمایا ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ (از خازن)

﴿قَائِمًا بِالْقِسْطِ﴾ "قائم رہتے ہوئے ان پر"

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

﴿قَائِمًا بِالْقِسْطِ﴾ میں مختلف تراکیب ہیں، اس لئے ہر ترکیب کے مطابق مطلب علیحدہ ہوگا، "قائما" پر نصب (زبر) کی چند وجوہ ہیں (ایک ان میں سے یہ ہے کہ نصب ہو حالیت کی وجہ سے، اس میں پھر چند وجوہ ہیں، ایک یہ ہے کہ حال ہو "شهد" کے فاعل سے، لیکن صرف معطوف علیہ سے دونوں معطوفوں سے حال نہ ہو، البتہ دونوں معطوفوں کو حال سے پہلے ذکر کیا، ان کی عظمت شان کی وجہ سے تاکہ ملائکہ اور اولو العلم کا ذکر رب تعالی کے قریب ہوجائے، اب اس صورت میں مطلب یہ ہوگا "اللہ تعالی نے بیان کیا" یا "اللہ تعالی نے گواہی دی" کہ بیشک اس کے بغیر کوئی معبود نہیں اور فرشتوں اور علم والوں نے بیان کیا یا گواہی دی، اللہ تعالی کی گواہی انصاف پر مبنی ہے۔

دوسری وجہ حالیت میں سے ہے یہ کہ یہ حال ہے "ھو" سے، تقدیر عبارت کی یہ ہے "لاالہ الاھو قائما بالقسط" کوئی معبود نہیں سوائے اس کے درانحالیکہ وہ قائم ہے انصاف پر۔ اس صورت میں حال مؤکدہ ہوگا، کیونکہ "ھو" سے مراد "وہ رب تعالی کی ذات ہے" وہ حق وانصاف پر قائم ہے، وہی معنی "قائما بالقسط" سے

سمجھ آرہا ہے یعنی ''ھو'' سے سمجھ میں آنے والے معنی کی تاکید کررہا ہے۔

(۲) اور اس میں نصب کی وجہ یہ ہے کہ ''قائما بالقسط'' صفت ہے ''لااله'' میں منفی کی، اب تقدیر عبارت کی یہ ہوگی ''لااله قائما بالقسط الاھو'' کوئی معبود نہیں جو انصاف پر قائم سوائے اس ذات کے۔

(۳) اور وجہ نصب کی یہ ہے کہ ''نصب علی وجه المدح'' ہے، اب اس صورت میں مطلب یہ ہوگا انصاف پر قائم رہنا قابل تعریف ہے، بظاہر اس پر اعتراض یہ ہے کہ مدح کے طور پر نصب معرفہ پر آتی ہے جیسا کہ ''الحمد لله الحمید'' میں ''الحمید'' پر نصب مدح کے طور پر ہے لیکن یہ معرفہ ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کوئی مقرر ضابطہ نہیں بلکہ نکرہ پر بھی نصب مدح کے طور پر آسکتی ہے۔

(۴) ﴿قَائِمًا بِالْقِسْطِ﴾ حال ہو، اولو العلم سے، تو اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ علم والے بیان کرتے ہیں اور شہادت دیتے ہیں کہ بیشک اس کے بغیر کوئی معبود نہیں، یہ شہادت وہ انصاف پر قائم رہتے ہوئے دیتے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر و روح المعانی)

علامہ رازی رحمہ اللہ نے تو یہ بیان کیا ہے ''انه حال من شهد الله'' وھو قول جمھور المفسرین'' کہ یہ ''شهدالله'' سے حال ہے یہی جمہور مفسرین کا قول ہے۔ (کبیر)

لیکن راقم کا موقف یہ ہے کہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے یہاں نفی نہیں فرمائی کہ یہ دونوں معطوفوں سے حال نہیں، اسلئے حال ہو فاعل سے بمع دونوں معطوفوں کے۔ اب معنی یہ ہوگا ''اللہ تعالی نے شہادت دی بیشک اس کے بغیر کوئی معبود نہیں، فرشتوں نے شہادت دی، اور علم والوں نے شہادت دی انصاف پر قائم رہتے ہوئے اس کا تعلق اللہ تعالی سے ہے، اور فرشتوں سے بھی ہے اور علم والوں سے بھی ہو، جب اللہ تعالی کی طرف نسبت ہو تو

''ومعناه انه تعالى قائم بتدبير خلقه كما يقال فلان قائم بامر فلان يعني انه مد بر له ومتعهد لاسباب وفلان قائم بحق فلان اى انه مجازله، فالله مدبر وأمر خلقه وقائم بارزاقهم ومجازلهم باعمالهم'' (خازن)

معنی یہ ہوگا ''اللہ تعالی اپنی مخلوق کی تدبیر قائم ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے ''فلان قائم بامر فلان یعني انه مدبر له ومتعهد لاسبابه'' یعنی جب یہ کہا جائے ''فلان قائم بامر فلان'' تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے فلاں شخص فلاں کا مدبر ہے، اور اس کے اسباب کا ذمہ دار ہے، اسی طرح جب یہ کہا جائے ''فلان قائم بحق فلان'' تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فلاں شخص فلاں کو جزاء (بدلہ) دینے والا ہے، اب رب تعالی کی طرف نسبت کرنے سے یہ معنی ہوگا ''اللہ اپنے

بندوں کو جزاء دیتا ہے، اپنی مخلوق کے امور کا مدبر ہے، اوران کو رزق دینے پر قائم ہے اوران کے اعمال کی ان کو جزاء دیتا ہے۔ (ماخوذ از خازن)

فائدہ: اللہ تعالی کا عدل یا دنیا سے متصل ہے یا دین سے۔ وہ عدل جو دنیا سے متصل ہو۔

"فانظر اولا فی کیفیة خلقة اعضاء الانسان حتی تعریف عدل الله تعالی فیها"

اس کو تو دیکھنا چاہیے تو انسانوں کے اعضاء کی خلقت کی کیفیت کو دیکھ یہاں تک کہ تو اللہ تعالی کے عدل کو پہچان لے۔

پھر تو مخلوق کے مختلف احوال کو دیکھ لے "کوئی حسین ہے کوئی قبیح (بدصورت) پھر کوئی غنی ہے، کوئی فقیر، کوئی صحیح ہے کوئی بیمار، کسی کی عمر لمبی ہے اور کسی کی چھوٹی، کسی کو لذت حاصل ہے اور کسی کو درد" **واقطع بان کل ذلک عدل من الله وحکمة وصواب**" ان چیزوں کو دیکھ تو یقین کر لے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالی کے عدل اور حکمت سے ہے اور سب کام رب تعالی کے درست ہیں، کسی میں غلطی کا کوئی احتمال نہیں پھر تو عناصر کو دیکھ یعنی آگ، مٹی، پانی اور ہوا کو دیکھ۔

اسی طرح اجرام فلکیہ کو دیکھ، ہر ایک قدر معین پر ہے، اور معین خاصے ان میں پائے گئے ہیں، تو ان کو دیکھ کر "**واقطع بان کل ذلک حکمة وصواب**" یقین کر لے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالی کی حکمت سے ہے اور اس کا ہر کام درست ہے۔ عدل کا تعلق جب امر دین سے ہو تو تم مخلوق کو دیکھو کوئی عالم نظر آئے گا، کوئی جاہل اور کوئی سمجھ دار نظر آئے گا، کوئی بے وقوف، کوئی ہدایت پر قائم نظر آئے گا اور کوئی بھٹکا ہوا، "**واقطع بان کل ذلک عدل وقسط**" ان چیزوں کو دیکھ کر تم یقین کر لو کہ یہ سب کچھ اللہ تعالی کے عدل وانصاف کی وجہ سے ہی ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

معتزلہ کا باطل استدلال:

معتزلہ نے رب تعالی یا اولو العلم کے عدل وانصاف کو اس آیۃ کریمہ سے ثابت نہیں کیا، بلکہ یہ ثابت کیا کہ اسلام وہ عدل وتوحید ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے مودودی صاحب نے ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ کا ترجمہ کیا ہے "اے محمد ﷺ! ہم نے جو تجھے بھیجا ہے تو یہ دراصل دنیا والوں کے حق میں ہماری رحمت ہے۔ (مودودی)

رسول اللہ ﷺ کی رحمت کا انکار کرتے ہوئے عربی ترکیب کو ہی بدل دیا گیا۔ عربی عبارات کے مفہوم کو تبدیل کر کے جہلاء کو الو بنانا تو ممکن ہے لیکن علم والوں کو بھٹکانا مشکل ہے بلکہ علم والوں کے سامنے اپنی جہالت کا اقرار ہے اور معتزلہ کی ہمنوائی کا اعلان ہے۔

جبریہ کا باطل استدلال:

جبریہ کہتے ہیں بندہ بے اختیار ہے، پتھر کی طرح ہے وہ نیکی کرے یا گناہ کرے وہ اپنے فعل میں مجبور ہے کیونکہ جب یہ معلوم ہے "ان اللہ تعالی عالم بجمیع الجزئیات "کہ بیشک اللہ تعالی تمام جزئیات کو جانتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہے "ان العبد لایمکنہ ان یقلب علم اللہ جھلا" بیشک بندے کیلئے ممکن نہیں کہ اللہ تعالی کے علم کو جہل سے تبدیل کر سکے تو پتہ چلا کہ بندہ اپنے فعل میں مختار نہیں ان کا یہ استدلال باطل ہے اس لئے کہ اللہ تعالی نے بندے کو اختیار عطاء فرمایا بندہ ہر کام اپنے اختیار سے کرتا ہے اللہ تعالی کے علم سے بندے کو مجبور سمجھنا باطل ہے اس مسئلہ کی مکمل تفصیل سورۃ بقرہ کی ابتداء میں دیکھئے ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْھِمْ...... ﴾ کے ضمن میں یہ تفصیلی طور پر ذکر کر دیا گیا۔ (ماخوذ از کبیر مع وضاحت راقم)

﴿ لَآاِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ﴾ "نہیں کوئی معبود سوائے اس کے"

بظاہر اس میں تکرار ہے کہ پہلے ﴿ لَآاِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ ﴾ بیان ہو چکا ہے تو پھر دوبارہ ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ تکرار کے چند فوائد ہیں یہ یقینی بات ہے کہ اللہ تعالی کا کلام فائدہ سے خالی ہو یہ ممکن ہی نہیں۔

(۱) ان میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ تقدیر عبارت کی یہ ﴿شَھِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَآاِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ﴾ و اذا شھد بذلک فقد صح انہ﴿ لَآاِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ﴾ اللہ تعالی نے بیان فرمایا کہ بیشک اس کے بغیر کوئی معبود نہیں اور جب اللہ تعالی نے یہ بیان کر دیا تو صحیح بات یہ ہے کہ بیشک اس کے بغیر کوئی معبود نہیں اس وجہ کو سمجھنے کیلئے ایک مثال سمجھیں جو محاورات میں استعمال ہوتی رہتی ہے جیسا کہ کوئی کہے "الدلیل دل علی وحدانیۃ اللہ تعالی ومتی کان کذلک صح القول بو حدانیۃ اللہ تعالی " یہ دلیل اللہ تعالی کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہے جب اس طرح کی دلیل پائی جائے تو یقیناً یہ کہا جائے گا کہ اللہ تعالی واحد ذات ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔

(۲) تکرار کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالی نے اپنی شہادت اور فرشتوں کی شہادت اور علم والوں کی شہادت کو ان الفاظ مبارکہ سے بیان فرمایا﴿شَھِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَآاِلٰہَ اِلَّا ھُوَ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ وَاُولُوا الْعِلْمِ﴾ کہ اللہ تعالی کے سواء کوئی معبود نہیں اس پر اللہ تعالی اور اس کے فرشتے اور علم والے گواہ ہیں تو دوبارہ ﴿ لَآاِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ﴾ ذکر فرما کر نبی کریم ﷺ کی امت کو گویا کہ یوں کہا:

"یا امۃ محمد فقولوا انتم علی وفق شھادۃ اللہ وشھادۃ الملائکۃ واولی العلم لا الہ الا ھو ،فکان

الغرض من الاعادة الامر بذكر هذه الكمة على وفق تلك الشهادات "

اے امت محمد مصطفیٰ ﷺ! تم بھی گواہی دو کہ ''اللہ کے سواء کوئی معبود نہیں'' تاکہ تمھاری گواہی اللہ تعالیٰ اور فرشتوں اور علم والوں کی گواہی کے مطابق ہو جائے۔ لھذا ان کلمات یعنی ﴿ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ﴾ کو لوٹانے کا یہ فائدہ ہے کہ بندوں کو حکم دیا گیا ہے کہ تمھاری گواہی پہلی گواہیوں کے موافق ہونی چاہئے۔

(۳) تیسرا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ ﴿ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُـوَ ﴾ کو دوبارہ ذکر کر کے یہ مسئلہ بتایا گیا ہے کہ اے مسلمان تو بھی ان کلمات کو ہمیشہ لوٹاتا رہ، بار بار پڑھا کر، "فان اشرف كلمة يذكرها الانسان هي هذه الكمة " اشرف کلمہ یہی ہے کہ انسان اس کلمہ کا ذکر کرتا رہے جب انسان اکثر اوقات ان کلمات کو پڑھتا رہے گا "كان مشتغلا باعظم انواع العبادات " تو وہ عظیم عبادت میں مشغول رہے گا، "فكان الغرض من التكرير في هذه الأية حث العباد على تكريرها "ان الفاظ کے تکرار سے بندوں کو اس آیۃ کے بار بار پڑھنے پر برانگیختہ کیا گیا۔

(۴) تکرار سے چوتھا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ پہلی مرتبہ جب ارشاد فرمایا ﴿ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ ﴾ اس سے یہ ثابت کیا کہ مخلوق کو یہ علم حاصل ہو جائے "انه لاتحق العبادة الاله تعالى " کہ بیشک اس ذات کبریاء کے سواء کوئی عبادت کا حقدار نہیں "وذكرها ثانيا ليعلم انه القائم لقسط لايجور ولايظلم " دوبارہ ذکر کیا تاکہ معلوم ہو جائے بیشک وہ معبود حقیقی انصاف پر قائم ہے وہ کسی طرح کا ظلم و ستم نہیں کرتا (از کبیر)

﴿اَلْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ ''عزت والا حکمت والا ہے۔''

"العزيز " فالعزيز اشارة الى كمال القدرة " سے اشارہ کیا کمال قدرت کی طرف وہ عزت والا ہے یعنی کمال قدرت کا مالک ہے ہر چیز پر اسے غلبہ حاصل ہے۔ "والحكيم اشارة الى كمال العلم "اور "الحكيم" سے اشارہ کمال علم کی طرف پایا گیا ہے کہ وہ حکیم ہے یعنی اسے ہر چیز کا کامل علم حاصل ہے۔ بحر و بر میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اس پر چھپی ہوئی ہو کسی چیز کے واقع ہونے سے پہلے ہی وہ جانتا ہے۔

ان دو صفتوں، یعنی کمال قدرت اور کمال علم کے بغیر ممکن ہی نہیں معبود وہی ہو سکتا ہے جسکا علم کامل ہو اور جس کی قدرت کامل ہو۔ اس کا ﴿قَآئِمًا بِالْقِسْطِ﴾ ہونا بھی اسی وقت مکمل ہوتا ہے جب وہ تمام مخلوق کی حاجات کو جانتا ہو اور ان کے اہم کاموں کو پورا کرنے پر قادر ہو، چونکہ پہلے بیان کر دیا گیا کہ ﴿قَـآئِـمًـا بِـالْقِسْطِ﴾ کا ایک معنیٰ ہے مخلوق کے تمام امور کا مدبر ہونا۔

"العزیز" کو "الحکیم" پر مقدم ذکر کرنے میں حکمت:

اللہ تعالی نے اپنے "عزیز" ہونے کا ذکر کیا اور "حکیم" ہونے کا ذکر بعد میں کیا، اس کی وجہ یہ ہے "ان کونه تعالی قادرا متقدم بکونه عالما فی طریق المعرفة الاستدلالیة فلما کان مقدمافی المعرفة الاستدلالیة و کان هذ الخطاب مع المستدلین لاجرم قدم تعالی ذکر العزیز علی الحکیم"

چونکہ آیۃ کریمہ میں خطاب بندوں کو ہے بندوں کا علم استدلالی (دلائل سے حاصل ہونے والا) ہے علم استدلالی کی معرفت اسی وقت ہوسکتی ہے جب مقدمات وغیرہ کو ترتیب دینے کی اسے قدرت حاصل ہو چونکہ "العزیز" سے اشارہ قدرت کی طرف ہے اور "الحکیم" سے اشارہ علم کی طرف ہے اس لئے رب تعالی نے بندوں کو تعلیم دینے کی غرض سے اپنی صفات کو بھی اسی طرح ذکر فرمایا جیسا کہ بندوں کو اپنی صفات کا مظہر بنا کر ان کی صفات میں ترتیب رکھی۔ (ماخوذ از کبیر)

❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀

﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ اِلَّا مِنْ بَعْدِمَا جَاءَ هُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيَاتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ۝﴾ (آیۃ نمبر ۱۹)

(1) بیشک اللہ کے ہاں اسلام ہی دین ہے، اور پھوٹ میں نہ پڑے کتابی مگر بعد اس کے کہ انہیں علم آچکا اپنے دلوں کی جلن سے اور جو اللہ کی آیتوں کا منکر ہو تو بیشک اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

(2) بیشک دین اللہ کے ہاں اسلام ہی ہے، اور انہیں اختلاف کیا ان لوگوں نے جن کو کتاب دی گئی مگر اس کے بعد کہ آ گیا ان کے پاس علم، (یہ اختلاف) از روئے باہمی حسد کے تھا اور جو شخص کفر کرتا ہے اللہ کی آیتوں سے بیشک اللہ تعالیٰ جلدی حساب لینے والا ہے۔

شانِ نزول:

یہود نے دعویٰ کیا کہ دین یہودیت سے افضل کوئی دین نہیں، اور نصاریٰ نے دعویٰ کیا دین نصرانیت سے افضل کوئی دین نہیں، تو اس وقت یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ دین صرف اسلام ہے۔ (حاشیہ جلالین)

﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ ''بیشک دین اللہ کے ہاں اسلام ہے''

''ای لادین مرضی عند الله سوی الاسلام وهو التوحید والتدرع بالشرع الذی جاء به محمد ﷺ''

یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ دین سوائے اسلام کے اور کوئی نہیں، وہ دین اسلام دین توحید ہے اور جو شریعت نبی کریم محمد ﷺ نے لائی اس کی زرہ پہننا، یعنی اسے کامل طور پر اپنے آپ پر نافذ کرنا۔ (بیضاوی)

''روی عن ابن عباس رضی اللہ عنہ انه قال نزل قوله ان الدین عند الله الاسلام حین افتخر المشرکون بادیانهم وقال کل فریق منهم لادین الادیننا وهو دین الله تعالی منذ بعث آدم علیہ السلام فکذبهم الله تعالی وقال (ان الدین عند الله الاسلام) الذی جاء به محمد ﷺ وهو الدین الحق''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ اس وقت نازل ہوا جبکہ مشرکین نے اپنے اپنے دینوں پر فخر کیا، ہر فریق کہہ رہا تھا جب سے آدم علیہ السلام مبعوث ہوئے ہیں اس وقت سے اللہ تعالیٰ کو پسندیدہ دین ہمارا ہی دین تھا۔ رب تعالیٰ نے ان کی تکذیب کی اور فرمایا اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ دین اسلام ہی ہے، جو حضرت محمد ﷺ نے لایا ہے، وہی دین حق ہے۔ (از شیخ زادہ)

"ان فسر الاسلام بالشریعة الحمدیة فانه الدین المرضی عند الله فی هذا الزمان بعد نسخ الادیان المنزلة من الله تعالی سابقا قال رسول الله ﷺ لو کان موسی حیا ماوسعه الاالباعی" رواه احمد والبیهقی من حدیث جابر"

اگر اسلام سے مراد نبی کریم ﷺ کی شریعت مراد لی جائے تو اب مطلب یہ ہوگا کہ نبی کریم ﷺ جب تشریف لے آئے تو پہلے تمام دین منسوخ ہو چکے ہیں، اس لئے آپ کے تشریف لانے کے بعد صرف شریعت محمد یہ ہی رب تعالی کو پسند ہے وہی دین اسلام ہے۔ مسند احمد اور بیہقی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر موسیٰ (علیہ السلام) زندہ ہوتے تو ان کو سوائے میری اتباع کے کوئی وسعت حاصل نہ ہوتی۔ (تفسیر مظہری)

روح البیان کا خوبصورت بیان:

"وحقیقة دین الاسلام التوحید وصورته الشرائع التی هی الشروط وهذاالدین من ذلک الزمان الی یوم القیامة واحد بحسب الحقیقة وسواء بین الکل ومختلف بحسب الصورة والشروط وهذا الاختلاف الصوری لاینافی الاتحاد الاصلی والوحدة الحقیقة"

اسلام کی ایک ہے حقیقت اور ایک ہے صورت۔

دین اسلام کی حقیقت:

حقیقت کے لحاظ پر دین اسلام توحید باری تعالی ہے، اس معنی کے لحاظ سے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک ایک ہی دین ہے، اس میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں۔ جب دین اسلام کا یہ معنی لیا جائے تو اب مطلب جو ہو گا اسے تفسیر ابن کثیر اور صابونی کے خوبصورت الفاظ میں دیکھئے:

"وقوله تعالی(ان الدین عند الله الاسلام)اخبار منه تعالی بانه لا دین عنده یقبله من احد سوی الاسلام وهو اتباع الرسل فیما بعثهم الله به فی کل حین حتی ختموا بمحمد ﷺ الذی سد جمیع الطرق الیه الامن جهة محمد ﷺ فمن لقی الله بعد بعثة محمد ﷺ بدین علی شریعته فلیس بمتقبل کما قال الله تعالی "ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منه"

رب تعالی کا ارشاد گرامی ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ﴾ اس کی طرف سے یہ خبر دی گئی ہے اللہ تعالی کے ہاں سوائے اسلام کے کوئی دین قبول نہیں، حالانکہ تمام رسولوں کو جو دین دیا گیا اس کو اسلام ہی کہا گیا ہے، اور سب رسولوں کی

اتباع دین اسلام کی اتباع ہی رہی، تو کس طرح یہ کہنا صحیح ہے کہ یہاں دین اسلام سے مراد شریعۃ مصطفویہ ﷺ ہے، تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کے تشریف لانے پر رب تعالیٰ تک پہنچنے کے تمام طریقے بند کر دیے گئے سوائے طریقہ محمدیہ (ﷺ) کے نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے کے بعد آپ کی شریعت کو چھوڑ کر کسی اور دین کے ذریعے رب تعالیٰ سے کوئی ملنا چاہے تو وہ قبول نہیں ہوگا، کیونکہ رب تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا ﴿وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ﴾ اور جس شخص نے اسلام کے بغیر کوئی اور دین تلاش کیا تو وہ ہرگز اس سے قبول نہیں کیا جائے گا۔

غرضیکہ نتیجہ واضح ہوا کہ تمام انبیاء کرام عقیدہ توحید پر قائم رہے، اسی کا نام دین اسلام ہے، یہ حقیقت اسلام ہے حقیقت اسلام میں تمام انبیاء کرام متفق رہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں رہا ہر نبی کی تابعداری دین اسلام کی تابعداری ہی رہی، لیکن نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے پر عقیدہ توحید بھی آپ کے ذریعے ہی قابل قبول ہوا، اسی مسئلہ کو عظیم المرتبت اعلیٰ حضرت مولنا شاہ احمد رضاء خان بریلوی رحمہ اللہ یوں بیان فرماتے ہیں۔

بخدا خدا کا یہی ہے در نہیں اور کوئی مفر مقر
جو وہاں سے ہو یہیں آ کے ہو جو یہاں نہیں تو وہاں نہیں

اور خصوصاً جب عقیدہ توحید کو بھی برباد کر دیا گیا تھا، یہودیوں نے عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا اور عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا، اور بعض عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو مستقل معبود مانا، اور بعض نے تین خدا مانے جن میں ایک عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا شریک مانا گیا تو یقیناً اس وقت عقیدہ توحید بھی وہی مقبول ہوا جو میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ نے پیش فرمایا باقی تمام دینوں میں تحریف کر کے ان کا حلیہ بگاڑ دیا گیا۔

دین اسلام کی صورت :

شرعی احکام اور ان کی شرائط دین اسلام کی صورت ہے اس میں اختلاف ہوتا رہا یعنی شرعی احکام مختلف شریعتوں میں بدلتے رہے، باوجود اس کے کہ صورت اسلام بدلتی رہی لیکن حقیقت اسلام ہر نبی کے دور میں ایک ہی رہی۔

(از روح البیان مع وضاحت)

لیکن یہود و نصاریٰ کے پیروکار دیکھیں کہ عقیدہ توحید کو بھی یہودیوں اور نصرانیوں نے بدل دیا۔

دین کا لغوی معنی :

"اصل الدین فی اللغة الجزاء ثم الطاعة" اصل دین کا لغوی معنی ہے بدلہ پھر طاعت کا نام دین رکھ دیا گیا اسلئے کہ طاعت سبب ہے جزاء کا۔

اسلام کے معانی:
اسلام کے لغوی معنی میں تین وجہ ہیں

(۱) الاول "انه عبارة عن الدخول فی الاسلام" پہلی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں داخل ہونے، یعنی فرمانبرداری اور متابعت کو اسلام کہا جاتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا:

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰی اِلَیْکُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا﴾ اور نہ کہو اس شخص کو جو تمھاری طرف اپنا اسلام پیش کرے کہ تو مومن نہیں۔ اس مقام میں بھی "السلم" اطاعت وفرمانبرداری کے معنی میں استعمال ہے یعنی جو شخص تمہیں یہ کہے کہ میں مسلمان ہوں، تمھارا مطیع اور فرمانبردار ہوں تو تم اسے یہ نہ کہو کہ تو مومن نہیں اس کے ظاہر حال کو دیکھ کر مومن سمجھ کر حقیقت حال کو رب تعالی کے سپرد کردو۔

(۲) والثانی "من اسلم ای دخل فی السلم" دوسرا معنی یہ ہے کہ سلامتی میں داخل ہونا جیسا کہ کہا جاتا ہے "اسنی واقحط" وہ قحط سالی خشک سالی میں داخل ہوگیا۔ یعنی "سلم" کا معنی ہے سلامتی اس سے جب ماخوذ ہو "اسلم" تو معنی ہوگیا "وہ سلامتی میں داخل ہوا"

(۳) الثالث "قال ابن الانباری المسلم معناه المخلص لله عبادته" تیسرا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالی کی عبادت کو خلوص سے ادا کرنا جیسا کہ کہا جاتا ہے "سلم الشئ لفلان ای خلص لہ" فلاں شخص فلاں کا مخلص ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے اسلام کا معنی ہوا دین میں خلوص پیدا کرنا اور اللہ تعالی پر خالص عقیدہ رکھنا۔

اس مقام پر اسلام اور ایمان ایک ہے معنی میں استعمال ہیں:

اگر چہ کبھی کبھی اسلام صرف ظاہری طور پر جھکنے اور دل میں صحیح عقیدہ نہ رکھنے پر بولا جاتا ہے۔ اور ایمان دل میں عقیدہ رکھنا یعنی تصدیق قلبی کو کہا جاتا ہے، جیسا کہ رب تعالی کے ارشاد گرامی سے یہ واضح ہے ﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا﴾ اعراب نے کہا ہم ایمان لائے، فرمادو تم ایمان نہیں لائے، لیکن یہ کہو ہم اسلام لائے۔

یہاں ایمان تصدیق قلبی اور اسلام ظاہری جھکاؤ پر بولا گیا ہے لیکن حقیقت میں اسلام اور ایمان ایک چیز ہیں، اس پر واضح دلائل موجود ہیں، جن میں سے دو کی طرف توجہ فرمائیں، یہاں زیر بحث آیۃ کریمہ میں فرمایا "ان الدین عند الله الاسلام" (بیشک دین اللہ کے ہاں اسلام ہی ہے)

"یقتضی ان یکون الدین المقبول عند الله لیس الا الاسلام فلو کان الایمان غیر

الاسلام وجب ان لا یکون الایمان دنیا مقبولا عند الله، ولاشک فی انه باطل "

جو تقاضا کرتا ہے کہ دین اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول صرف اسلام ہی ہے، اگر ایمان اور اسلام علیحدہ علیحدہ ہوں تو لازم آئے گا کہ ایمان اللہ کے ہاں مقبول نہ ہو، یہ کہنا سراسر باطل ہے، تو پتہ چلا کہ ایمان اور اسلام ایک ہی چیز ہیں۔ اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ﴾ اور جو شخص اسلام کے بغیر دین تلاش کرے، وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ اس سے پتہ چلا

"فلو کان الایمان غیر الاسلام لوجب ان لایکون الایمان دینا مقبولا عند الله تعالیٰ "

اگر ایمان، اسلام کا غیر ہوتو لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایمان مقبول نہ ہو، حلانکہ یہ کہنا باطل ہے۔

نتیجہ واضح ہوا کہ حقیقت میں ایمان اور اسلام ایک چیز ہیں، زیر بحث آیۃ کریمہ میں اگر چہ ذکر اسلام ہے لیکن اس سے مراد ایمان بھی ہے۔ (ماخوذ از کبیر بتصرف)

﴿وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ﴾

"اور نہیں اختلاف کیا ان لوگوں نے جن کو کتاب دی گئی مگر اس کے بعد کہ آ گیا ان کے پاس علم (یہ اختلاف) از روئے باہمی حسد کے تھا۔"

"بغیا" کا معنی تجاوز کرنا، یعنی ایک دوسرے پر زیادتی کرنا، اس معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا "اور نہیں اختلاف کیا ان لوگوں نے جن کو کتاب دی گئی مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آ گیا، (یہ اختلاف ان کا) ایک دوسرے پر زیادتی اور تجاوز کی وجہ سے تھا۔ اور دوسرا معنی "بغیا" کا عام مفسرین کرام نے "حسد" کیا ہے، حسد چونکہ دوسرے کے کمال پر جلنے کی وجہ سے ہوتا ہے، اسی لئے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے کامل طور پر ترجمہ سے ہی مطلب حاصل کرنے کیلئے یوں ترجمہ فرمایا "اپنے دلوں کی جلن سے"

راقم نے ضیاء القرآن سے ترجمہ حاصل کیا ہے، وہ بھی تقریباً تفاسیر کے مطابق عام فہم ہی ہے، ان دونوں معانی کا حسین امتزاج حضرت محمد علی صابونی رحمہ اللہ نے ان الفاظ سے پیش فرمایا:

"بغی بعضهم علی بعض فاختلفوا فی الحق بتحا سد هم وتباغضهم وتدابرهم فحمل بعضهم بغض البعض الآخر علی مخالفته فی جمیع اقواله وافعاله وان کانت حقا" (صابونی)

(بغیا بینهم) کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے ایک دوسرے پر زیادتی کی حد سے تجاوز کیا، تو انہوں نے حق میں

اختلاف کیا ایک دوسرے سے حسد اور بغض کی وجہ سے، اور ایک دوسرے سے پیٹھ پھیر کر رہے یہاں تک کہ بغض کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کی اقوال اور افعال میں مخالفت کرنے لگے، خواہ دوسرے فریق کی باتیں حق ہوتیں اور اس کے کام صحیح ہوتے لیکن پھر بھی اس کا مخالف فریق ان کو جھوٹ اور باطل کہتا۔ جن لوگوں کو کتاب دی، اس سے مراد کون لوگ ہیں؟ اس میں چند وجوہ بیان کی گئی ہیں۔

(۱) الاول "المراد بهم اليهود" ان وجوہ سے پہلی وجہ یہ ہے کہ اس سے مراد یہود ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے وصال کے قریب توراۃ ستر (۷۰) اہل علم کے سپرد کی، ان کو اس کا امین ومحافظ بنایا، اور حضرت یوشع علیہ اسلام کو خلیفہ بنایا۔ جب کچھ زمانہ گزر گیا تو ان ستر لوگوں کے بیٹوں کے آپس میں اختلاف ہوگئے، باوجود اس کے کہ وہ سب ہی توراۃ کا علم رکھتے تھے، ان کے اختلاف کی وجہ (بغيا بينهم) وتحاسدوا على طلب الدنيا" آپس میں ایک دوسرے سے زیادتی اور تجاوز تھا اور دنیا کی طلب کی وجہ سے ایک دوسرے سے حسد کرنا ان کے اختلاف کی وجہ تھی۔

(۲) والثانی" المراد النصارى واختلافهم في امر عيسى علیہ السلام بعد ما جاء هم بانه عبد الله ورسوله" دوسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ جن لوگوں کو کتاب دی گئی ان سے مراد نصاریٰ ہیں۔ ان کا آپس میں عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اختلاف تھا کوئی عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کہہ رہا تھا اور کوئی خدا کا بیٹا کہہ رہا تھا، حالانکہ ان کے پاس یہ علم آچکا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے اور اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔

(۳) والثالث" المرد اليهود والنصارى" ان میں تیسری وجہ یہ بیان کی گئی کہ اس مقام میں اہل کتاب سے مراد یہود اور نصاریٰ کے دونوں فریق ہیں، ان کا اختلاف یہ تھا کہ یہود کہہ رہے تھے حضرت عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں، اور نصاریٰ کہہ رہے تھے کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں یعنی یہود نصاریٰ کو جھوٹا کہہ رہے تھے اور نصاریٰ یہود کو جھوٹا کہہ رہے تھے، حالانکہ دونوں فریقوں کے پاس علم آچکا تھا کہ وہ اولاد سے پاک ہے۔ اسی طرح یہود و نصاریٰ کا اختلاف مؤمنین سے مراد ہو، کہ انہوں نے مؤمنین سے اختلاف کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا انکار کیا اور دعویٰ یہ کیا کہ نبوت کے لائق تو صرف ہمارا خاندان ہی تھا، قریش تو امی ہیں (ان پڑھ لوگ ہیں) ان کے پاس نبوت کیسے آسکتی ہے؟ (ماخوذ از کبیر)

راقم کے نزدیک تمام قول ہی معتبر ہیں، یعنی یہود نے آپس میں اختلاف کیا اور نصاریٰ نے آپس میں اختلاف کیا اور یہود و نصاریٰ نے ایک دوسرے سے اختلاف کیا، اور یہود و نصاریٰ مؤمنین سے اختلاف کیا، ان کے پاس علم آچکا تھا لیکن پھر بھی انہوں نے اختلاف کیا۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"بغیا" پر نصب کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ "مفعول لہ" ہو، یہ اخفش نحوی کا قول ہے،اس صورت میں "بغیا" للبغی، کے معنی میں ہوگا، جیسا کہ کہا جائے "جئتک طلب الخیر ومنع الشر" تو مطلب ہوتا ہے "لطلب الخیر ومنع الشر" دوسرا قول زجاج کا ہے کہ اس پر نصب مفعول مطلق کے طور پر ہے، اصل عبارت ہوگی "یبغون بغیا" "والفرق بین المفعول له وبین المصدر ان المفعول له غرض للفعل واما المصدر فهو المطلق الذی احدثه الفاعل" مفعول لہ اور مفعول مطلق میں یہ فرق ہے کہ مفعول لہ فعل کا سبب ہوتا ہے، لیکن مفعول مطلق کو فاعل تاکید وغیرہ کیلئے لاتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَمَنْ يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللّٰهِ فَإِنَّ اللّٰهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ﴾

"اور جو شخص کفر کرتا ہے اللہ کی آیتوں سے بیشک اللہ جلدی حساب لینے والا ہے۔"

ان الفاظ مبارکہ میں تہدید پائی گئی ہے، تہدید (ڈرانے اور دھمکی) کی دو صورتیں پائی گئی ہیں۔

(۱) الاول "المعنی فانه سیصیر الی الله تعالی سزیعا فیحاسبه ای یجازیه علی کفره"
ان میں سے پہلی صورت یہ پائی گئی ہے کہ جو لوگ کفر کریں گے ان کو جلدی اللہ تعالی کی طرف پھیر دیا جائے گا، وہ ان کو کفر کی جزاء دے گا۔

(۲) والثانی" ان الله تعالی سیعلمه باعماله وانواع کفره باحصاء سریع مع کثرة الاعمال"
اور دوسری صورت یہ ہے کہ بیشک اللہ تعالی ان کے اعمال کو جانتا ہے اور ان کے کفر کی تمام اقسام کو جانتا ہے، باوجود اس کے کہ ان کے اعمال کثیر ہوں گے لیکن اللہ تعالی ان کو جلدی ہی شمار کرے گا۔ (از کبیر)

حساب بھی در اصل لوگوں کو مطمئن کرنے کیلئے ہوگا کہ اپنا اپنا اعمال نامہ ہر شخص دیکھ لے، کسی کو کوئی اعتراض نہ ہو، ورنہ اللہ تعالی سے کسی انسان کا کوئی عمل پوشیدہ نہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خوبصورت ارشاد:

"عن علی کرم الله وجهه قال الاسلام هو التسلیم والتسلیم هو الیقین والیقین هو التصدیق والتصدیق هو الاقرار والاقرار هو الاداء والاداء هو العمل ثم قال ان المومن اخذدینه عن ربه ولم یأخذه عن رأیه ان المؤمن من یعرف ایمان فی عمله وان الکافر یعرف کفره بانکاره ایها الناس دینکم دینکم فان

السیئة فیه خیر من الحسنة فی غیره ان السیئة فیه تغفر و ان الحسنة فی غیره لاتقبل" (روح المعانی)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا اسلام کا مطلب ہے تسلیم کرنا، تسلیم کرنے کا مطلب ہے یقین کرنا، یقین کرنے کا مطلب ہے تصدیق کرنا، تصدیق کرنے کا مطلب ہے اقرار کرنا اور اقرار کرنے کا مطلب ہے اداء کرنا، ادا کرنے کا مطلب ہے عمل کرنا، پھر آپ نے فرمایا بیشک مؤمن نے اپنا دین اپنے رب تعالیٰ سے حاصل کیا ہے، اپنی رائے سے حاصل نہیں کیا، مؤمن کا ایمان اسکے عمل سے پہچانا جاتا ہے اور کافر کا کفر اس کے انکار سے پہچانا جاتا ہے، اے لوگو اپنے دین کو لازم پکڑو، اے لوگو اپنے دین کو لازم پکڑو، مسلمان کا گناہ بھی کافر کی نیکی سے اچھا ہے، کیونکہ مؤمن اگر غلطی سے گناہ صغیرہ کرلے تو عبادات سے وہ معاف ہو جاتے ہیں، اور اگر مؤمن گناہ کبیرہ غلطی سے کرے تو وہ سچے دل سے توبہ کرنے سے معاف ہو جاتے ہیں لیکن کافر کی نیکی کبھی بھی قبول نہیں کی جائے گی، کیونکہ نیکی کی قبولیت کی شرط ایمان ہے۔ جب ایمان ہی نہ ہو تو نیکی حاصل ہی نہیں ہوتی اگرچہ بظاہر کوئی اچھا کام نیکی دکھائی دیتا ہے۔

اسلام کا ذکر احادیث مبارکہ سے:

عن عمر بن خطاب..... وقال یا محمد اخبرنی عن الاسلام قال الاسلام ان تشھد ان لاالہ الااللہ وان محمدا رسول اللہ وتقیم الصلوة وتؤتی الزکوة وتصوم رمضان وتحج البیت ان استطعت الیہ سبیلا"

(بخاری و مسلم، مشکوة کتاب الایمان)

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے طویل حدیث مروی ہے، جس میں جبریل کے چند سوالات کا ذکر ہے جو نبی کریم ﷺ کی امت کی تعلیم کیلئے سوال کر رہے تھے اور حضور ﷺ جواب دے رہے تھے، ان میں سے ایک سوال یہ تھا، اے محمد ﷺ مجھے اسلام کے متعلق خبر دیں، آپ نے فرمایا اسلام یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ بیشک کوئی معبود نہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے، اور بیشک محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور تم نماز قائم رکھنا اور زکوۃ ادا کرنا اور روزہ رکھنا اور بیت اللہ کا حج کرنا اگر تمہیں اس کی طرف راہ کی طاقت ہو۔

وضاحت حدیث:

"اخبرنی" کا معنی ہے "**لما تقرر ان الرسول افضل من الملائکة العلویة**" جب یہ ثابت ہے کہ بیشک رسول تمام فرشتوں سے افضل ہیں۔

(عن الاسلام) مجھے اسلام کے متعلق بتائیں، اسلام کا لغوی معنی ہے مطلقا انقیاد (اطاعت) اور شرعی معنی ظاہری اطاعت کے ساتھ ساتھ باطنی اطاعت بھی پائی جائے، انقیاء باطنی کو ہی ایمان سے تعبیر کیا جاتا ہے، جیسا کہ رب تعالیٰ

نے بیان فرمایا ﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ اعراب نے کہا ہم ایمان لائے، آپ فرمادو تم ایمان نہیں لائے، تم کہو ہم اسلام لائے ہیں، ایمان نہیں داخل ہوا تمہارے دلوں میں، یعنی ان کو ظاہری انقیاد (اطاعت و عجز و انکساری) حاصل تھی، ان کے دلوں میں ایمان نہیں تھا۔

(الاسلام) پر الف لام عہد خارجی ہے، گویا سوال حقیقت شرعیہ کے متعلق تھا، مطلقا ظاہری طور پر جھکنے کے متعلق سوال نہیں تھا، اسی لئے اسلام کے پانچ ارکان بیان فرمائے کہ یہ ہے اسلام۔

(قال الاسلام) جواب میں "ھو" ضمیر کو ذکر نہیں فرمایا، حالانکہ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ ضمیر کا ذکر کرنا کافی تھا، لیکن ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو ذکر کیا زیادتی وضاحت کیلئے۔

(ان تشھدان لاالٰہ الااللہ وان محمد رسول اللہ) یہ کہ تو گواہی دے کہ بیشک اللہ کے سواء کوئی معبود نہیں اور بیشک محمد اللہ کے رسول ہیں، یہ خطاب عام مخاطب کو، اور "تشھد" ذکر کیا گیا ہے "تعلم" ذکر نہیں کیا گیا، کیونکہ "ان الشھادۃ ابلغ فی الانکشاف من مطلق العلم و من ثم لم یکف اعلم عن اشھد فی اداء الشھادۃ" لفظ "شھادۃ" میں بنسبت "علم" کے زیادہ انکشاف پایا گیا ہے، اسی وجہ سے گواہی دیتے وقت "اشھد" کہنا ہوگا "اشھد" کی جگہ "اعلم" کا استعمال کافی نہیں ہوگا، "ان لاالٰہ الااللہ" میں "ان" مخففۃ من المثقلہ ہے یعنی اصل میں "ان" نون کی شد سے ہے، پھر اس میں تخفیف کر کے اسے "ان" نون کے سکون سے کر دیا گیا اور اس میں اسم ضمیر شان محذوف ہے، اصل میں "انہ" ہے۔ اب ترجمہ یہ ہوگیا "انہ لاالٰہ معبود بالحق فی الوجود الااللہ" کہ بیشک اللہ تعالیٰ کے سواء اور کوئی معبود بالحق نہیں۔

توحید کا لغوی اور اصطلاحی معنی:

التوحید ھو الحکم بوحدانیۃ الشئ والعلم بھا واصطلاحا اثبات ذات اللہ بوحدانیتہ منعوتا بالتنزہ عما یشابھہ اعتقادا فقولا وعملا فیقینا وعرفانا فمشاھدۃ وعیانا فثبوتا ودواما"

توحید کا لغوی معنی یہ ہے کسی چیز کو ایک جاننا اور اس پر ایک ہونے کا حکم لگانا۔ اور توحید کا اصطلاحی معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو ایک ماننا کہ اس کا کوئی شریک نہیں، اور اس کو تمام صفات میں ایک ماننا کہ اس کا کوئی مثل نہیں، اسی پر اس کا اعتقاد ہو، اسی کے مطابق اسی کا قول ہو اور اسی کے مطابق اس کا عمل ہو، اسی پر یقین ہو، اسی کی معرفت حاصل ہو، بلکہ انسان اپنے آپ کو اس درجہ پر پہنچائے کہ اس کو رب تعالیٰ کی تجلیات کا مشاہدہ حاصل ہو کہ وہ ایک ہے، اسی عقیدہ پر

انسان قائم ودائم رہے۔علامہ غزالی رحمہ اللہ کہتے ہیں،توحید کے دو چھلکے (یعنی دو پردے) اور دو مغز ہیں۔

"فالقشرة العليا القول باللسان المجرد" اور اوپر والا پردہ صرف زبان سے یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اس کی ذات وصفات میں اس کا کوئی مثل نہیں۔"والثانية الاعتقاد بالقلب جازما" اور دوسرا نیچے والا چھلکا یہ ہے کہ دل میں یہ پختہ اعتقاد رکھے کہ رب تعالیٰ "وحده لا شريك له" ہے۔

"واللب ان ينكشف بنور الله سر التوحيد بان يرى الاشياء الكثيرة صادرة عن فاعل واحد ويعرف سلسلة الاسباب مرتبطة بمسبباتها"

اور توحید کا مغز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو نور معرفت عطاء کر رکھا ہے اس سے بندے پر توحید کے راز ظاہر ہو جائیں،وہ کثیر چیزوں کو یہی سمجھے کہ وہ ایک ہی فاعل سے صادر ہیں،اور اس پر یہ منکشف ہو کہ سلسلہ اسباب مسببات پر مرتبط (متعلق) ہے۔

"ولب اللب ان لا يرى فى الوجود الا واحدا ويستغرق فى الواحد الحق غير ملتفت الى غيره"

اور مغز کا مغز یہ ہے کہ صرف ایک ہی ذات کو موجود دیکھے،کہ حقیقی وجود صرف اسی ذات کو حاصل ہے باقی سب ہی اس کے وجود کا عکس ہیں،اس طرح انسان حق تعالیٰ کی توحید میں مستغرق ہو جائے کہ کسی اور کی طرف اس کی توجہ ہی نہ رہے۔

(وان محمد رسول الله) اور بیشک محمد اللہ کے رسول ہیں یعنی توحید کی شہادت کے بعد رسالت کی شہادت دے،شریف اسلام کی دارومدار توحید اور رسالت پر ہے،اسی وجہ سے اسلام کے بنیادی ارکان دونوں شہادتوں (شہادت توحید اور شہادت رسالت) کو قرار دیا۔

(وتقيم الصلوة) اور تو نماز قائم کرے،یعنی اسلام کا اور رکن نماز قائم کرنا ہے،اور مسلم شریف کی روایت "الصلوة المكتوبة" ذکر فرمایا،جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ "ان النافلة وان كانت من الاسلام لكنها ليست من اركانه" نفلی نماز بھی اگر چہ اسلام میں داخل ہے لیکن وہ اسلام کا رکن نہیں،رکن صرف فرضی نماز ہے۔

''نماز کو قائم کرنا'' کہا ہے''نماز ادا کرنا''یعنی''تصلی''نہیں کہا،جس سے اس کی طرف اشارہ پایا گیا ہے کہ نماز کے ارکان اور شرائط کو صحیح طور پر ادا کرے،اور نماز ہمیشہ ادا کرے۔

(وتوتی الزكوة) اور تم زکوۃ دو''یعنی اسلام کے ارکان میں سے زکوۃ دینا بھی ایک رکن ہے،یہاں بھی زکوۃ دینا ذکر فرمایا،صرف زکوۃ ادا کرنا نہیں کہا کیونکہ کسی کو مال دے دینے کا مطلب یہ ہے کہ مال کا مالک بنا دیا جائے،قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں کامل فصاحت پائی گئی ہے،ایک ایک لفظ سے کئی کئی مسائل سمجھ آتے ہیں۔

(وتصوم رمضان) اورتم روزہ رکھو،اسلام کے ارکان میں سے روزہ بھی رکن ہے۔رمضان شریف کے مسائل وفضائل دوسرے پارہ میں تفصیلی طور پر ذکر ہو چکے ہیں، یہاں دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

(وتحج البیت ان استطعت الیه سبیلا) اورتو حج کرے بیت اللہ کا اگر تجھے اس کی طرف راہ کی طاقت ہو۔استطاعت سے مراد یہ ہے کہ اسباب سلامتی میں ہوں،آلات صحیح ہوں،یعنی ایک شخص کے اعضاء وغیرہ صحیح وسلامت ہوں آنے جانے کا خرچ ہو،اور واپسی تک اہل وعیال کا خرچ بھی ہو۔ (مرقاۃ ج اول ص ۵۲،۵۳)

❁ **"عن عبد الله بن عمرو رضی الله عنهما قال قال رسول الله ﷺ المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده والمهاجر من هجر مانهی الله عنه لفظ البخاری،ومسلم قال ان رجلاسئال النبی ﷺ ای المسلمین خیر قال من سلم المسلمون من لسانه ویده"**

حضرت عبداللہ بن عمرو (بن العاص) ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کامل مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان سلامتی رہیں،اور کامل مہاجر وہ ہے جوان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالی نے منع فرمایا ہے، یہ بخاری کے الفاظ ہیں (جن کا ترجمہ پیش کیا ہے) اور مسلم میں ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا مسلمانوں میں سے بہتر کون سا مسلمان ہے،تو آپ نے فرمایا جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان سلامتی میں رہیں۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

عبداللہ بن عمرو (بن العاص) راوی نے اپنے باپ عمرو بن العاص سے پہلے اسلام قبول کیا، باپ اور بیٹے کے درمیان تیرہ سال کا فرق ہے،یعنی باپ عمرو اپنے بیٹے عبداللہ سے تیرہ سال بڑے ہیں،"عمرو" جب عین کے فتحہ اور میم کے سکون سے پڑھا جائے تو اس کے آخر میں "واؤ" لکھی جاتی ہے تا کہ "عمر" (عین کے ضمہ اور میم کے فتحہ) سے فرق ہو جائے،"عمر" غیر منصرف ہے،"عمرو" منصرف ہے،اسی وجہ سے نصبی حالت میں "عمرو" کے آخر میں "واؤ" نہیں لکھی جاتی (مراح الارواح میں یہ مسئلہ اسی طرح لکھا گیا ہے)

"حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کے متعلق علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وکان غزیر العلم کثیر الاجتهاد فی العبادة عمی آخر عمره وکان اکثر حدیثا من ابی هریرة لانه کان یکتب لکن ماروی عنه وهو سبعما ئة حدیث قلیل بالنسبة لما روی عن ابی هریرة"

کہ وہ بہت بڑے عالم تھے اور بہت ہی زیادہ عبادت گزار تھے،آخری عمر میں آپ کی نظر چلی گئی تھی،ان کی احادیث

حضرت ابوھریرہ ﷺ کی احادیث سے زیادہ ہیں، کیونکہ یہ احادیث کولکھ لیا کرتے تھے لیکن ان کی بیان کی ہوئی روایات سات سو ہیں، جو بیان کے لحاظ پر حضرت ابو ہریرہ ﷺ کی روایات سے کم ہیں۔"استاذن النبی ﷺ فی ان یکتب حدیثه فاذن له"انہوں نے نبی کریم ﷺ سے احادیث کو لکھنے کی اجازت طلب کی تو آپ نے لکھنے کی اجازت فرمادی۔

(از مرقاۃ ج اول ص ۲۷)

اہل علم کی خدمت میں درخواست:

حضرت علامہ محمو احمد رضوی فیوض الباری فی شرح البخاری جلد اول ص ۶۸ میں یوں بیان فرماتے ہیں "حضرت عمر ﷺ کے سواء صحابہ کرام میں "عمر بن الخطاب" کسی کا نام نہیں اور عمر نامی صحابہ میں ۱۲۳ افراد ہوئے ہیں، اسی لئے عمر کے آخر میں "واؤ" زیادہ لکھتے ہیں تا کہ معلوم ہو جائے کہ اس عمر سے عمر بن الخطاب مراد نہیں ہیں۔ چونکہ فیوض الباری میں اس مسئلہ پر کوئی حوالہ نہیں دیا گیا میں نے اپنی طرف سے کوشش کی ہے یہ مسئلہ کسی کتاب سے مل جائے لیکن ابھی تک ملا نہیں کسی بزرگ کو معلوم ہو تو مجھے مطلع کرے۔

فیوض الباری سے سمجھ آتا ہے کہ سب نام "عمر" عین کے ضمہ اور میم کے فتحہ سے ہیں واؤ آخر میں لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ "عمر بن الخطاب" اور باقی "عمر" نام صحابہ میں فرق ہو جائے ، راقم نے حضرت علامہ محمود احمد رضوی رحمہ اللہ کے ارشاد کو رد کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ سمجھنے کی کوشش میں ہوں کیونکہ راقم نے چھ سال حزب الاحناف لاہور میں تدریس کے فرائض سرانجام دے اور راقم بخوبی واقف ہے کہ حضرت علامہ بہت زیادہ مطالعہ میں مشغول رہتے محقق شخص تھے اسلئے بار بار ذہن میں یہی آتا ہے کہ کہیں سے یہ مسئلہ حاصل کیا گیا جو مل نہیں رہا، امید ہے کہ میری اس الجھن کو حل کرنے میں اہل علم معاونت فرمائیں گے، یہ بھی خیال رہے کہ حرکات کا فرق جو میں نے بیان کیا ہے وہ مراح الارواح سے لیا ہے، اگر چہ علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ کی عبارت سے کچھ پتہ چلتا ہے لیکن صراحۃ آپ نے ذکر نہیں فرمایا، آپ کی عبارت یہ ہے (وعن عبد الله بن عمرو) و کتب بالواو لیتمیز عن عمر ومن ثمة لم یکتب حالة النصب لتمیزہ عنه بالالف وھو ابن العاص القرشی" (حوالہ مذکور)(راقم)

وضاحت حدیث:

(**قال قال رسول اللهﷺ المسلم**) " ای الکامل" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مسلمان وہ ہے" اس سے مراد یہ ہے کہ " کامل مسلمان وہ ہے" اس لئے کہ اگر کوئی مسلمان دوسرے کو ایذاء (تکلیف) پہنچاتا ہے تو وہ اگر چہ

مسلمان تو رہتا ہے لیکن کامل مسلمان نہیں رہتا۔

(**من سلم المسلون**) ای والمسلمات اما تغلیبا و اما تبعا" نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی میں "مسلمون" اگرچہ مذکر کا صیغہ ہے لیکن مؤنث کو بھی شامل ہے یا تو قاعدۂ تغلیب کے مطابق اور یا مؤنث کو مذکر کے تابع ہونے کہ وجہ سے ضمناً مراد لے لیا گیا ہے۔ بلکہ یہ حکم ذمی مرد اور عورتوں کو بھی شامل ہے، کیونکہ ابن حبان کی روایت میں "من سلم الناس" کے الفاظ ہیں۔یعنی کامل مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان مرد اور عورتیں، ذمی مرد اور عورتیں محفوظ رہیں۔ (لیکن اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ کافر، ظالم، یہود و نصاری مسلمان کے ملک میں آکر تباہی کرتے رہیں اور مسلمان سلامتی کا دامن ہاتھ میں لئے ہوئے ان کے سامنے سر جھکاتے رہیں اور اپنی عزتیں لٹاتے رہیں بلکہ ان ظالموں کا دفاع جس طرح بھی ممکن ہو اسی طرح کیا جائے ایسی صورت حال میں خود کش حملوں کو دہشت گری قرار دینا اور خودکشی حرام ہے کہ فتوے دینا سوائے حماقت کے اور کچھ نہیں، عراق اور فلسطین کے مسلمانوں کی قربانیاں آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ (راقم)

(**من لسانه**)ای بالشتم واللعن والغیبة والبھتان والنمیة والسعی الی السلطان وغیرہ ذلک"

زبان سے محفوظ رہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی گالیوں اور لعنت اور غیبت اور چغلخوری اور بادشاہ کے پاس جا کر کسی کے خلاف بادشاہ کو بھڑکانے سے مسلمان اور ذمی اس سے محفوظ رہیں۔

(**ویدہ**)"بالضرب والقتل والھدم والدفع والکتابة بالباطل ونحوھا"

اور ہاتھ سے محفوظ رہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی مار اور اس کی قتل اور اس کی طرف سے تباہی اور اس کی طرف سے کسی کو راہ حق سے ہٹانے اور کسی کے خلاف باطل طریقہ کی تحریر سے مسلمان اور ذمی محفوظ رہیں۔

زبان کا ذکر ہاتھ کے ذکر سے پہلے کیوں؟ اس میں چند وجوہ ہیں:

(۱) ابتداء لڑائی جھگڑے کی زبان سے ہی شروع ہوتی ہے جو ہاتھ تک پہنچ جاتی ہے، اس لئے پہلے زبان کی ایذاء کا ذکر کیا۔

(۲) زبان سے کسی کو ایذاء دینا زیادہ پایا جاتا ہے بنسبت ہاتھ سے تکلیف دینے کے۔

(۳) زبان سے تکلیف دینا آسان ہے بنسبت ہاتھ سے تکلیف دینے کے۔

(۴) زبان سے تکلیف دینے سے زیادہ درد ہوتا ہے بنسبت ہاتھ سے تکلیف دینے کے، جیسا کہ کہا گیا ہے

جراحات السنان لھا التیام　　　ولا یلتام ما جرح اللسان

نیزوں کے زخم مل جاتے ہیں اور زبان کے زخم نہیں ملتے

(۵) زبان سے تکلیف دینا عام ہے جو زندہ اور مردہ شخص کو تکلیف دی جاسکتی ہے لیکن ہاتھ سے تکلیف صرف زندہ کو ہی دی جاتی ہے۔کتنا بڑا دشمن بھی مرجائے تو کوئی شخص اس کی قبر کھود کرا سے نہیں مارتا۔

(۶) "وابتلی به الخاص والعام خصوصا فی هذه الایام" زبان سے تکلیف دینے میں عوام وخواص سب ہی مبتلاء ہیں،اسی طرح زبان سے تکلیف عوام اور خواص دونوں کو ہی دی جاتی ہے۔لیکن ہاتھ سے تکلیف نہ ہی خواص دیتے ہیں اور نہ ہی خواص کو دی جاتی ہے۔

خیال رہے کہ کسی سے ایسا مزاح خوش طبعی پر موقوف ہو،جس سے مزاح کیا جارہا ہواسے کوئی تکلیف محسوس نہ ہوتو یہ جائز ہے۔

"(**والمهاجر**)ای الکامل او حقیقة" یعنی حقیقی اور کامل مہاجر وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالی نے منع فرمایا ہے۔یعنی قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں جن چیزوں کو منع کیا گیا ہے،ان سے رک جائے،چونکہ ایک روایت میں یوں ذکر ہے"ما حرم الله علیه"ان چیزوں سے رک جائے جو اللہ تعالی نے حرام کردی ہیں۔
(ماخوذ از مرقاۃ ج ا ص ۴۷)

❁ "عن العباس بن عبد المطلب قال قال رسول الله ﷺ ذاق طعم الایمان من رضی بالله ربا وبالاسلام دینا وبمحمد رسولا" (رواہ مسلم،مشکوۃ کتاب الایمان)

حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس شخص نے ایمان کی حلاوت اور لذت کو حاصل کیا جو اللہ تعالی کے رب ہونے پر راضی ہوا اور اسلام کے دین ہونے پر راضی ہوا اور محمد (ﷺ) کے رسول ہونے پر راضی ہوا۔

وضاحت حدیث: حدیث پاک کے راوی حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ ہیں،جو رسول اللہ ﷺ کے چچا ہیں،اور آپ سے عمر کے لحاظ پر دو سال بڑے ہیں۔

"ومن لطافة فهمه ومتانة علمه انه لما سئل انت اکبر ام النبی ﷺ قال هو اکبر وانا اسن"

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے فہم کی لطافت اور ان کے علم کی متانت یہ ہے کہ جب آپ سے سوال کیا گیا کہ آپ بڑے ہیں یا نبی کریم ﷺ بڑے ہیں،تو آپ نے (خوبصورت جواب) ارشاد فرمایا "بڑے تو وہ ہیں،عمر میری زیادہ ہے"

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی والدہ نے سب سے پہلے کعبہ شریف کو ریشمی اور دیباج اور مختلف قسم کے کپڑوں سے غلاف تیار کر

کے پہنایا، اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک مرتبہ حضرت عباس بچپن میں گم ہو گئے تھے، آپ کی والدہ نے نذر مانی تھی کہ اگر میرا بچہ مل گیا تو میں کعبہ شریف کو غلاف پہناؤں گی، تو بچے کے مل جانے پر انہوں نے اپنی نذر کو پورا کیا۔ حضرت عباس ﷺ زمانہ جاہلیت میں رئیس تھے، مسجد حرام کی تعمیر کرانا آپ کی ہی ذمہ داری تھی جب بھی تعمیر کی ضرورت در پیش آتی تو آپ قریش کو تعمیر کی رغبت دلاتے، اور مسجد میں نیک عمل کرنے اور بیہودہ کلام کے چھوڑنے کا آپ حکم فرماتے اور حاجیوں کو پانی پلانے کی بھی آپ نے ہی ذمہ داری قبول کی ہوئی تھی، حضرت عباس ﷺ نے اپنی زندگی میں ستر غلام آزاد کئے۔ ان کی پیدائش اصحاب فیل کے (ابرہہ اور اس کے چمچوں کا کعبہ شریف کو شہید کرنے کی غرض سے آنے اور ان کے ہلاک ہونے کے) واقعہ سے ایک سال اور چند ماہ پہلے ہوئی۔ آپ کی وفات جمعہ کے دن بارہ رجب بتیس ھجری اٹھاسی سال کی عمر میں ہوئی، آپ کو بقیع میں دفن کیا گیا۔

"وکان اسلم قدیما وکتم اسلامہ وخرج مع المشرکین یوم بدر مکرھا فقال النبی ﷺ من لقی العباس فلایقتلہ فانہ خرج مکرھا"

آپ نے مکہ میں ہی اسلام قبول کیا ہوا تھا، بدر کے دن مشرکوں کے ساتھ آپ کو جبراً لایا گیا تھا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص عباس کو ملے تو انہیں قتل نہ کرے کیونکہ انہیں جبری طور پر لایا گیا ہے۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج اص ۶ ۷)

یہ بدر میں قید ہوئے، فدیہ بھی ادا کیا، ظاہری حکم مشرکوں کے ساتھ مل کر جنگ میں شریک ہونے کا یہی تھا۔

(قال رسول اللہ ﷺ ذاق طعم الایمان) ای نال وادرک واصاب ووجد حلاوتہ ولذتہ"

رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی "ذاق طعم الایمان" کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص نے ایمان کی حلاوت اور لذت کو حاصل کر لیا، پا لیا۔

"ذوق" کا اصلی معنی یہ ہے کہ منہ میں تھوڑی چیز آجائے جس کا ذائقہ اسے حاصل ہو جائے، یہاں "ذوق" سے مراد "ذوق معنوی" ہے، اگرچہ علامہ ابن حجر شارح بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا ذوق حسی اور ذوق معنوی دونوں ہی مراد ہو سکتے ہیں۔

(من رضی باللہ ربا) جو شخص دل کی خوشی اور انشراح صدر (کھلے سینہ) سے اللہ تعالیٰ کے رب ہونے پر راضی ہوا، **(وبالاسلام دینا)** اسلام کے دین ہونے پر راضی ہوا، اسلام کا لفظ اس مقام میں ایمان کو بھی شامل ہے، یعنی اسلام اور ایمان کے دین ہونے پر راضی ہوا۔

(وبمحمد ﷺ رسولا) اور محمد (ﷺ) کے رسول ہونے پر راضی ہوا۔ راضی ہونے سے مراد یہ ہے کہ ظاہری اور

باطنی طور پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا مطیع ہو۔

"والکمال ان یکون صابرا علی بلائه وشاکرا علی نعمائه وراضیا ب قدره وقضائه ومنعه واعطائه وان یعمل بجمیع شرائع الاسلام بامتثال الاوامر واجتناب الزواجر" اللہ تعالیٰ کے رب ہونے پر کامل رضامندی اس وقت پائی جائے گی جب اس کی طرف سے آنے والی مصیبتوں پر وہ صبر کرے، اور اس کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرے، اور اس کی تقدیر پر راضی رہے، وہ کوئی نعمت عطاء کرے یا نہ عطاء کرے ہر حال میں راضی رہے، تمام شرائع اسلام پر عمل کرے، رب تعالیٰ نے جن چیزوں کے کرنے کا حکم دیا ہے ان پر عمل کرے، اور جن چیزوں سے رکنے کا حکم دیا ہے ان سے رک جائے۔

حضرت محمد ﷺ کے رسول ہونے پر راضی ہونے کا مطلب یہ ہے "وان یتبع الحبیب حق متابعته فی سنته وآدابه واخلاقه ومعاشرته" حبیب پاک ﷺ کی کامل طور پر تابعداری کرے، آپ کی سنتوں اور مستحبات کے مطابق عمل کرے، اور آپ کے اخلاق اور آپ کی معاشرت کے مطابق اپنی معاشرت رکھے۔

اور اسلام کے دین ہونے پر راضی ہونے کا مطلب یہ ہے، "والزهد فی الدنیا والتوجه الکلی الی العقبی" دنیا میں کامل طور پر نیک ہو کر رہے، دنیا کے مال ومتاع کی طرف رغبت نہ ہو، بلکہ کامل طور آخرت کی طرف توجہ پائی جائے۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج ۱ ص ۷۶)

❁ "عن سفیان بن عبدالله الثقفی قال قلت یا رسول الله قل لی فی الاسلام قولا لأسئال عنه احدا بعدک وفی روایة غیرک قال قل آمنت بالله ثم استقم"
(رواہ مسلم، مشکوۃ کتاب الایمان)

حضرت سفیان بن عبد اللہ ثقفی فرماتے ہیں، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ مجھے اسلام کے متعلق ارشاد فرمادیں، تاکہ میں آپ کے بعد کسی اور سے سؤال نہ کروں، آپ نے فرمایا تم اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آؤ پھر اس پر قائم رہو۔

وضاحت حدیث:

"قل لی فی الاسلام" اسلام کے متعلق مجھے بتادو، یعنی آپ وہ چیزیں بیان فرمادیں جن سے اسلام مکمل ہوتا ہو، اور اسلام کے حقوق کی ان میں رعایت پائی جائے، اور آپ کے ارشاد گرامی سے دین کے توابع کی رہنمائی مل جائے، "وقیل التقدیر فی مبادی الاسلام وغایاته" یعنی آپ کے ارشاد سے اسلامی کی بنیادی چیزیں اور انتہائی مقاصد حاصل ہو جائیں (قولا لاسئال عنه احدا بعدک) آپ ایسا (جامع) ارشاد فرمائیں کہ مجھے اسلام کے متعلق

آپ کے بعد کسی ایک سے پوچھنے کی ضرورت درپیش نہ آئے۔

ایک روایت میں ہے ''غیرک'' کہ میں آپ کے سواء کسی اور سے اسلام کے متعلق نہ پوچھوں۔

''والاول مستلزم لهذالانه اذالم يسئال إحدا بعد سئواله لم يسئل غيره''

پہلے الفاظ ان کو بھی مستلزم ہیں، کیونکہ جو آپ سے سؤال کرنے کے بعد کسی ایک سے سؤال نہیں کرے گا وہ آپ کے سواء کسی اور سے بھی نہیں پوچھے گا۔(قال قل آمنت بالله ثم استقم) آپ نے فرمایا تم کہو میں نے اللہ پر ایمان لایا، پھر اس پر قائم رہو، اللہ تعالی کے رسولوں، اور اس کی کتابوں، اور اس کے فرشتوں، اور قیامت کے دن، اور خیر و شر کی تقدیر پر ایمان لانا بھی ''آمنت بالله'' میں داخل ہے۔

علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں (آمنت بالله) ای بجميع ما يجب الايمان به'' میں اللہ تعالی پر ایمان لایا یعنی ان تمام پر ایمان لایا جن پر ایمان لانا واجب ہے۔

(**ثم استقم**) پھر اس پر قائم رہا۔ اس حدیث پاک میں قرآن پاک کی ان آیات سے اقتباس حاصل کیا گیا ہے ﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ﴾ بیشک وہ جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر قائم رہے، ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور خوش ہو اس جنت پر جس کا تمہیں وعدہ دیا جاتا تھا۔ ﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ بیشک وہ جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر ثابت قدم رہے نہ ان پر خوف ہے نہ ان کو غم۔ استقامت کیا ہے؟ اس کے متعلق علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

''هذا الحديث من جوامع الكلم لا صول الاسلام التي هي التوحد والطاعة، فالتوحيد حاصل بقوله آمنت بالله والطاعة بانواعها مندرجة تحت قوله ثم استقم لان الاستقامة امتثال كل مامور واجتناب كل محذور فيدخل فيه اعمال القلوب والابدان من الايمان والاسلام والاحسان اذلا تحصل الاستقامة مع شئ من الاعوجاج''

یہ حدیث پاک جوامع الکلم سے ہے (یعنی الفاظ مختصر اور مطالب کثیرہ پائے گئے ہیں) جو کہ تمام اصول اسلام کو شامل ہے، اس میں توحید بھی آگئی اور طاعت کی تمام قسمیں بھی آگئیں۔ ''آمنت بالله'' میں توحید آگئی کیونکہ رب تعالی کو جب تک ''وحده لا شريك له'' نہ مانا جائے اس وقت تک ایمان حاصل ہی نہیں ہوتا۔ اور طاعت کی تمام قسمیں ''ثم استقم'' میں آگئی ہیں، کیونکہ اصل میں استقامت یہ ہے کہ جن چیزوں کا شریعت میں حکم دیا گیا ہے

ان کو بجالائے اور جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے ان سے رک جائے، لھذا استقامت میں دل کے اعمال اور بدن کے اعمال داخل ہیں کیونکہ ایمان اور اسلام اور احسان سب ہی اس وقت معتبر ہیں جب ان میں استقامت پائی جائے۔

صدرالافاضل حضرت مولنا نعیم الدین مرادآبادی رحمہ اللہ" خزائن العرفان" میں فرماتے ہیں، حضرت صدیق اکبر ﷺ سے دریافت کیا گیا استقامت کیا ہے؟ فرمایا یہ کہ اللہ تعالی کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے، حضرت عمر ﷺ نے فرمایا استقامت یہ ہے کہ امرونہی پر قائم رہے حضرت عثمان غنی ﷺ نے فرمایا استقامت یہ ہے کہ عمل میں اخلاص کرے، حضرت علی ﷺ نے فرمایا استقامت یہ ہے کہ فرائض ادا کرے۔

"روی عن علی ﷺ انہ قال قلت یا رسول اللہ ﷺ اوصنی فقال قل ربی اللہ ثم استقم قال قلت ربی اللہ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب،فقال لیھنک العلم اباالحسن"

حضرت علی ﷺ فرماتے ہیں، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ مجھے کوئی نصیحت فرمائیں، تو آپ نے فرمایا تم کہو میرا رب اللہ ہے، پھر اس پر قائم رہو، میں نے کہا میرا رب اللہ ہے، مجھے نہیں توفیق حاصل ہوئی سوائے اللہ (کی توفیق) کے، اسی پر میرا بھروسہ ہے، اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں، تو آپ نے فرمایا، اے ابوالحسن تمہارا علم تمہارے لئے آسانی پیدا کرتا ہے، یہ علم تمہیں مبارک ہو۔

استقامت بہت عظیم اور مشکل کام ہے، کیونکہ تمام امور کو بجالانا ہے اور تمام نواہی سے رکنا ہے۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "شیبتنی سورۃ ھود" سورۃ ہود نے مجھے بوڑھا کردیا ہے، وجہ اس کی یہی ہے کہ اس میں مذکور ہے "فاستقم کما امرت" تمہیں جو حکم دیا گیا ہے اس پر قائم رہو۔ "وھی جامعۃ لجمیع انواع التکالیف" یہ تمام انواع تکالیف کو شامل ہے۔

علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں استقامت بہت مشکل کام ہے، استقامت عقائد صحیحہ کو شامل ہے، دین میں استقامت اسے ہی حاصل ہے جس نے عقائد باطلہ سے اجتناب کیا، یعنی تشبیہ اور تعطیل وغیرہ سے دور رہے، یعنی نہ ہی رب تعالی کو عام جسموں کی طرح سمجھے اور نہ ہی معاذ اللہ اس کو تمام کاموں سے معطل مانے۔ استقامت اعمال کو بھی شامل ہے کہ اعمال کو تغیر وتبدل سے بچائے، ایسا نہ ہو کہ نمازیں پانچ کی جگہ چار یا چھ فرض مان لے، اور ایسا بھی نہ ہو کہ چار رکعت والی نماز کو تین یا پانچ رکعت والی سمجھ بیٹھے۔ استقامت اخلاق کو بھی شامل ہے، کہ انسان کے اخلاق میں اعتدال پایا جائے، نہ تو افراط پایا جائے نہ تفریط یعنی بے جا زیادتی اور بے جا کمی سے اجتناب کرے۔

"وقال الغزالی الاستقامة علی الصراط فی الدنیا صعب کالمرور علی صراط جھنم وکل واحد منھما ادق من الشعر واحد من السیف"
علامہ غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں دنیا میں صراط پر استقامت اسی طرح مشکل ہے جیسا کہ جہنم کے اوپر پل صراط سے گزرنا مشکل ہوگا، ہر ایک بال سے باریک ہیں اور تلوار سے زیادہ تیز ہیں۔

ایک روایت میں ہے "استقیموا ولن تحصوا" دین میں استقامت اختیار کرو، لیکن اسے شمار میں نہ لاؤ، یعنی تم کامل طور پر استقامت کی طاقت نہیں رکھتے ہو، البتہ طاعت میں اپنی کوشش کرو جیسا کہ طاعت کرنے کا حق ہے، "فان مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ" ایک چیز کو انسان اگر مکمل طور پر حاصل نہیں کرسکتا، تو یہ بھی کوئی عقلمندی کا کام نہیں کہ جس چیز کو حاصل کرنا اسے لازم تھا اسے مکمل ہی چھوڑ دے۔ "وفیہ تنبیہ نبیہ علی ان احد لایظن بنفسہ الاستقامة" کامل طور پر انسان کیلئے اس میں تنبیہ پائی گئی ہے کہ کوئی شخص اپنے آپ کو استقامت پر فائز کامل طور پر نہ سمجھے، اور یہ نہ سمجھے کہ وہ کامل طور پر نفس لوامہ کی صفات سے نکل گیا ہے، اگر انسان یہ سمجھے کہ میں نفس لوامہ کی صفات سے مکمل طور پر نکل چکا ہوں تو وہ اپنے آپ پر تعجب کرے گا، اور اس میں تکبر آجائے گا جو اسے پستی کی طرف لے جائے گا۔ انسان کو مکمل طاعت کی طاقت نہ ملنے میں حکمت یہ ہے کہ

"ان تراب الانسان عجن بماء النسیان الناشیٔ عنہ العصیان"
انسان کی مٹی کو بھولنے والے پانی سے گوندھا گیا ہے اسی وجہ سے اس سے وہ نافرمانی کا مرتکب ہوجاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی یہ ہے "کلکم خطاؤن وخیر الخطائین التوابون" تم تمام ہی خطاء کار ہو، بہتر خطاء کار وہ ہے جو خطاء سرزد ہونے کے بعد توبہ کرلے، استقامت کا معنی ہے "سیدھا ہونا" یہ ضد ہے "اعوجاج" کی، جس کا معنی ہے "ٹیڑھا ہونا"، لیکن عمل میں استقامت میانہ روی کو کہا جاتا ہے، کہ اس کے عمل میں اخلاص پایا جائے ریاء کاری، چرچا نہ پایا جائے۔ "واستقامة القلب وھی الثبات علی الصواب" دل کی استقامت یہ ہے کہ وہ درست راہ پر قائم رہے۔ "واستقامة الروح وھی الثبات علی الحق" روح کی استقامت یہ ہے کہ وہ حق پر قائم رہے۔ "ومن لم یکن مستقیما ضاع سعیہ وخاب جھدہ" جس شخص میں امور شرع میں استقامت نہیں، اس کی تمام کوشش برباد ہوکر رہ جاتی ہے۔
(مرقاۃ ج ا ص ۸۴،۸۵)

❁ "وعن طلحة بن عبید اللہ قال جاء رجل الی رسول اللہ ﷺ من اھل نجد ثائر الراس تسمع دوی صوتہ ولا نفقہ مایقول حتی دنا من رسول اللہ ﷺ فاذاھو یسئال عن الاسلام فقال رسول اللہ ﷺ خمس صلوات فی الیوم واللیلة فقال ھل علی غیرھن فقال لا الاان تطوع قال رسول اللہ ﷺ وصیام

شهر رمضان فقال هل علی غیره قال لا الاان تطوع قال وذکرله رسول الله ﷺ الزکوۃ فقال علی غیرها فقال لاالاان تطوع،قال فادبر الرجل وھو یقول واللہ لا ازید علی ھذا ولا انقص منه فقال رسول الله ﷺ افلح الرجل ان صدق'' (بخاری،مسلم،مشکوۃ کتاب الایمان)

حضرت طلحہ بن عبیداللہ کہتے ہیں،ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا جونجد سے آیا اس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے، جس کی آواز سنائی دے رہے تھی،اور ہم سمجھ نہیں رہے تھے وہ کیا کہہ رہا ہے، یہاں تک کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے قریب ہوا،تو اس نے اسلام کے متعلق سوال کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پانچ نمازیں ایک دن اور رات میں،تو اس شخص نے کہا، کیا ان کے بغیر بھی ہیں؟ تو آپ نے فرمایا نہیں،ہاں البتہ نفلی نماز ہے، پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رمضان کے مہینہ کے روزے،تو اس شخص نے پوچھا کیا اس کے بغیر بھی کوئی روزے ہیں،آپ نے فرمایا نہیں،ہاں البتہ نفلی روزے ہیں، پھر رسول اللہ ﷺ نے زکوۃ کا ذکر فرمایا،تو اس شخص نے پوچھا کیا اس کے بغیر بھی کوئی ہے؟(یعنی فرض زکوۃ کے بغیر بھی کوئی صدقہ فرض ہے؟) آپ نے فرمایا نہیں،البتہ نفلی ہے،راوی کہتے ہیں،وہ شخص واپس چلا اور کہہ رہا تھا''قسم ہے اللہ تعالی کی میں اس پر نہ زیادہ کروں گا اور نہ کم کروں گا،تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر یہ شخص سچا ہے تو فلاح پا گیا،یعنی اس نے کامیابی حاصل کرلی اگر یہ اپنے قول میں سچا ہے۔

وضاحت حدیث: ''راوی طلحہ بن عبیداللہ ہیں۔آپ کی کنیت ابومحمد (قرشی) ہے،آپ عشرۃ المبشرین سے ہیں،تمام غزوات میں آپ شریک ہوئے ہیں،سوائے بدر کے،لیکن بدر میں بھی آپ کا مال غنیمت میں حصہ مقرر کیا گیا،اور آپ کا مقام ومرتبہ بھی بدری صحابہ کا ہی تھا، کیونکہ ان کو اور سعید بن زید کو اس قافلہ کا پتہ لگانے کیلئے بھیجا گیا تھا جس کو روکنے کے ارادہ سے واقعہ بدر درپیش آیا،غزوہ احد میں نبی کریم ﷺ کی حفاظت کرتے ہوئے اور آپ کی طرف سے دفاع کرتے ہوئے آپ کو پچہتر (۷۵) زخم آئے،جن میں سے چوبیس زخم بہت گہرے اور نمایاں تھے۔آپ کی انگلیاں غزوہ احد میں ہی شل ہوگئی تھیں،آپ کا نام رسول اللہ ﷺ نے طلحہ خیر اور طلحہ جود رکھا ہوا تھا۔چھتیس ھجری جنگ جمل میں شہید ہوئے اور بصرہ میں دفن ہوئے۔اس وقت آپ کی عمر چونسٹھ سال تھی۔

(جاء رجل الی رسول الله ﷺ من اهل نجد) نجد والے لوگوں سے ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا،اس شخص کا نام ضمام بن ثعلبہ تھا،نجد کا لغوی معنی بلند زمین،اس کے مدمقابل لفظ ''تہامة'' ہے،جس کا معنی ہے''پست زمین'' یہاں مراد خاص جگہ اور شہر ہے،جو عراق اور مکہ کے درمیان ہے۔

(ثائر الرأس) اصل میں ''ثار الغبار'' سے لیا ہوا ہے،جس کا معنی ہے''غبار کا اٹھنا'' یہاں مراد ہے''بال

بکھرے ہوئے ہونا''

(نسمع دوی صوته و لا نفقه یقول) عام طور پر لفظ استعمال ہوتا ہے ''دوی النحل او الذباب'' شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ، یا عام مکھیوں کی بھنبھناہٹ۔ اب مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی کچھ بات گنگنا رہے تھے جس کی آواز ہم سن رہے تھے، لیکن اس کی بات ہم سمجھ نہیں رہے تھے، کہ وہ نبی کریم ﷺ کے قریب آ گیا اور اسلام کے متعلق سوال کرنے لگا یعنی اب اس کی بات کو صحابہ کرام سن رہے اور سمجھ بھی رہے تھے۔

''(یسأل عن الاسلام) ای عن فرائضه التی فرضت علی من وحد الله و صدق رسوله لا عن حقیقته ولذا لم یذکر الشهادتین ولکون السائل متصفابه فلاحاجة الی ذکره''

اس شخص کا سوال فرائض کے متعلق تھا یعنی مطلب یہ تھا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان رکھتا ہو اور رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کرتا ہو تو اس پر اسلام میں کیا چیزیں فرض ہیں، واضح بات ہے کہ حقیقت اسلام کے متعلق اس شخص کا سوال نہیں تھا اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے جواب میں شہادتین کا ذکر نہیں فرمایا۔ چونکہ سوال کرنے والا شخص مؤمن تھا، اس لئے حدیث شریف میں بظاہر ذکر نہیں البتہ بخاری شریف کی روایت سے یہ ساری وضاحت سمجھ آ سکتی ہے۔ بخاری شریف میں یہ الفاظ ہیں ''اخبرنی ما ذا فرض الله علی'' (یارسول اللہ ﷺ) آپ مجھے خبر دیں کہ کیا چیز مجھ پر فرض ہے۔ اور بخاری شریف کے ان الفاظ سے بھی کی گئی وضاحت کو تائید مل رہی ہے۔

''فاخبره النبی ﷺ بشرائع الاسلام'' تو نبی کریم ﷺ نے اسے شرائع اسلام کی خبر دی نبی کریم ﷺ نے اسلام کے فرائض میں سے دن، رات میں پانچ نمازوں کا ذکر فرمایا، تو اس شخص نے سوال کیا، کیا ان کے بغیر بھی نمازیں ہیں؟ تو آپ نے فرمایا، نہیں، ہاں البتہ نفلی ہیں۔ بظاہر پر اس پر سوال ہوتا ہے کہ وتر جب واجب ہیں اور عید بھی واجب ہے تو ان کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے:

> ''وهذا قبل وجوب الوتر او انه تابع لعشاء وصلوة العید لیست من الفرائض الیومیة بل هی من الواجبات السنویة''
>
> کہ یہ حدیث وتر کے واجب ہونے سے پہلے کی ہے، اور ہو سکتا ہے کہ وتر کو اس لئے علیحدہ ذکر نہیں کیا کہ وہ عشاء کے تابع ہیں، علیحدہ مستقل نماز نہیں، اور عید کی نماز ہر دن رات کی نمازوں میں آتی ہی نہیں، کیونکہ وہ سال کے بعد ادا کی جاتی ہے۔

یہ جواب تو علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے دیا لیکن راقم کے نزدیک جواب یہ بہتر ہے کہ سوال اسلام میں

فرائض کا تھا، جواب بھی فرائض سے دیا گیا۔ وتر اور عید کی نماز واجب ہیں فرض نہیں لھذا وہ سوال میں ہی داخل نہیں۔ نفلی نماز اوقات مکروھۃ کے بغیر جب چاہے ادا کرے، نہ اس کی تعداد کی کوئی حد ہے اور نہ ہی رکعتوں کی کوئی حد ہے۔ البتہ نفل جب شروع کرے تو ان کو مکمل کرنا ضروری ہے۔ اسلئے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَلَا تُبْطِلُوْا اَعْمَالَكُمْ﴾ اور اپنے عمل باطل نہ کرو۔ اگر نفل شروع کر کے توڑ دیئے تو ان کی قضاء ضروری ہے۔

پھر نبی کریم ﷺ نے ایک اور فریضہ کا ذکر فرمایا کہ رمضان کے مہینہ کے روزے فرض ہیں، جب اس شخص نے پوچھا کیا ان روزوں کے بغیر بھی کوئی روزے فرض ہیں؟ تو آپ نے فرمایا نہیں، ہاں البتہ نفلی روزے ہیں۔ اسی سے تقریباً واضح ہو جاتا ہے کہ سال میں پانچ دنوں کے علاوہ جب چاہے روزہ رکھے، نفلی روزوں کی کوئی حد نہیں۔ سال میں پانچ دنوں میں روزہ رکھنا منع ہے وہ دن یہ ہیں ''عید الفطر' عید الاضحیٰ اور ایام تشریق یعنی گیارہ، بارہ اور تیرہ ذی الحج'' روزوں کے متعلق زیادہ تفصیل **نجوم الفرقان** کے'' حصہ چھارم'' میں ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ﴾ کی وضاحت کے ضمن میں دیکھیں۔

پھر رسول اللہ ﷺ نے ایک اور فریضہ کا ذکر فرمایا، کہ زکوۃ دینا فرض ہے، جب اس شخص نے سوال کیا، کہ اس کے بغیر بھی کوئی ہے؟ تو آپ نے فرمایا ''نہیں'' ہاں البتہ نفلی (صدقات) ہیں۔ یہاں بھی اصلی صدقہ فرضیہ کا ذکر فرمایا۔ صدقات واجبہ یعنی صدقہ فطر وغیرہ کا ذکر نہیں کیا، اور نہ ہی قربانی کا ذکر کیا کیونکہ یہ واجبات ہیں۔

''قال فادبر الرجل وهو يقول والله لا ازيد على هذا ولا انقص منه''

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، وہ شخص واپس ہوتے ہوئے یہ کہہ رہا تھا کہ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں اس میں نہ زیادتی کروں گا، اور نہ کمی۔

یعنی اگر میں نے کسی کو تبلیغ کی اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی جوں کا توں پیش کروں گا کمی یا زیادتی آپ کے ارشاد گرامی میں نہیں کروں گا۔ اور جن چیزوں کو نبی کریم ﷺ نے فرض قرار دیا، میں اپنی طرف سے ان فرائض میں کوئی کمی یا زیادتی نہیں کروں گا۔

بخاری شریف کی ایک روایت میں یہ ہے ''لا اتطوع شيئا ولا انقص مما فرض الله على شيئا'' میں نوافل نہیں ادا کروں گا لیکن اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو مجھ پر فرض کیا ہے، ان میں کوئی کمی بھی نہیں کروں گا'' فقال رسول الله ﷺ افلح الرجل ان صدق'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر اس نے سچ کہا تو کامیاب ہو گیا۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"ان صدق" شرط ہے "افلح الرجل" جزاء مقدم ہے یا قائم مقام جزاء کے ہے۔ راقم نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے، کہ نبی کریم ﷺ نے پہلے مطلق ذکر کیا "افلح الرجل" یہ شخص کامیاب ہو گیا، پھر یہ خیال فرمایا کہ یہ کہیں غرور میں نہ مبتلاء ہو جائے کہ صرف یہ کہنے سے ہی کامیابی حاصل ہو گی، اسلئے فرمایا، "ان صدق" اگر یہ سچا ہوا (تو پھر کامیابی حاصل ہو گی) کامیابی سے مراد دنیاوی اور اخروی ہی ہیں۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج اص ۸۶،۸۷)

آجکل کی روشن دماغی اور فرمان مصطفوی ﷺ:

آجکل بے حیائی کو پھیلانے کی سرتوڑ کوشش کی جارہی ہے، عورتوں اور مردوں کو ایک ساتھ دوڑا کر یہود ونصاری سے یک جہتی منائی جارہی ہے۔ دفاتر میں زیادہ سے زیادہ عورتوں کو ملازمت دینے کی لالچ میں بے حیاء بنایا جارہا ہے۔ اگر کوئی دین کی بات کرے، تو اسے تنگ نظر، قدامت پسند کا نام دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی قرآن وحدیث کی بات کرتا ہے تو کہا جاتا ہے اسلام کو ہم بھی سمجھتے ہیں، صرف مولوی ہی دین اسلام کے ٹھیکیدار نہیں۔ آیئے ایسے لوگوں کے متعلق مصطفیٰ کریم ﷺ کا ارشاد دیکھئے۔

❁ عن عبد الله بن عمرو قال قال رسول الله ﷺ لیاتین علی امتی کما اتی علی بنی اسرائیل حذو النعل بالنعل حتی ان کان منهم من اتی امه علانیة لکان فی امتی من یصنع ذلک وان بنی اسرائیل تفرقت علی ثنتین وسبعین ملة وتفترق امتی علی ثلاث وسبعین ملة کلهم فی النار الاملة واحدة، قالوا من هی یا رسول الله قال ما انا علیه واصحابی" (رواه الترمذی، مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنة)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ضرور بر ضرور آئے گا میری امت پر جیسا کہ آیا بنی اسرائیل پر، (برابر برابر) جس طرح جوتا دوسرے جوتے کے برابر ہوتا ہے، اگر ان میں سے کوئی اپنی ماں کے پاس ظاہر طور پر آیا تو میری امت میں بھی ایسا کرنے والے ہوں گے، بیشک بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ گئے، اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی، سب ہی جہنمی ہوں گے سوائے ایک فرقہ کے، صحابہ کرام نے پوچھا یارسول اللہ ﷺ وہ کون لوگ ہوں گے؟ تو آپ نے فرمایا وہ فرقہ جو اس راہ پر ہوگا جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ۔

وضاحت حدیث:

"اتیان" کا معنی ہے آسانی سے آنا، لیکن اس کے بعد جب "علی" آجائے تو اس وقت غلبہ والا معنی ہوتا ہے، یعنی اس

طرح کوئی چیز غالب ہو کر آجائے جو ہلاکت تک پہنچادے، یہاں اس حدیث پاک میں بھی نبی کریم ﷺ نے "لیاتین" کے بعد "علی" ذکر فرمایا اور فعل کو لام تاکید اور نون تاکید ثقیلہ سے مئوکد فرما کر واضح فرمادیا کہ میری امت کے کچھ لوگوں پر ضرور بر ضرور تباہ کن زمانہ آئے گا۔ "لیاتین علی امتی" سے مراد بعض امت ہے، جو کہ "لکان فی امتی من یصنع ذلک" سے واضح ہو رہا ہے "میری امت میں بھی ایسا کرنے والے ہوں گے" یہ نہیں فرمایا کہ تمام امت ہی ایسا کرے گی۔

" **لیا تین** " میں وسعت پائی گئی ہے اس کا ایک معنی یہ لیا گیا "**لیأتین علی امتی زمان اتیانا مثل الاتیان علی بنی اسرائیل** " ضرور بر ضرور میری امت پر تباہ کن زمانہ آئے گا جیسا کہ بنی اسرائیل پر تباہ کن زمانہ آیا۔ اور اس کا معنی یہ ہے:

"**لیأتین علی امتی مخالفة لما انا علیه مثل المخالفة التی اتت علی بنی اسرائیل حتی اهلکتهم** " ضرور بر ضرور میری امت پر میری اور میرے دین کی مخالفت آئے گی جیسا کہ بنی اسرائیل نے اپنے نبی اور اپنے دین کی مخالفت کی یہاں تک کہ وہ ہلاک ہوگئے۔ اور زیادہ عام وسعت والا معنی یہ ہے "**لیأتین علی امتی مثل ما اتی علی بنی اسرائیل** " میری امت کچھ لوگوں پر وہی طور طریقے آئیں گے جو بنی اسرائیل پر آئے۔

(**حذو النعل بالنعل**) اگر چہ "حذو" کا لغوی معنی ہے "کاٹنا" اور "حذو النعل بالنعل" دونوں جوتوں کے چمڑے کو برابر برابر کاٹنا لیکن یہاں مراد مطلقاً برابری ہے کہ میری امت کے کچھ لوگ یہود کی طرح برابر برابر طور طریقے اختیار کریں گے ذرا بھر بھی ان سے کوئی کمی نہیں چھوڑیں گے۔ "**ان کان منهم من اتی امه علانیة لکان فی امتی من یصنع ذلک** " اگر ان میں سے کوئی اپنی ماں کے پاس ظاہر طور پر آیا تو میری امت کے کچھ لوگ بھی یہی کام کریں گے۔ "**اتیا نها کنایة عن الزنا**" ماں کے پاس ظاہر طور پر آنے کا مطلب زنا کرنا ہے، یعنی اگر بنی اسرائیل ماں کے ساتھ زنا کے مرتکب ہوئے تو میری امت کے کچھ لوگ بھی اسی فعل کے مرتکب ہوں گے۔

نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی کا مطلب واضح ہے کہ یہود و نصاری کے ہر برے فعل، بے حیائی کی نقل کرنے والے ان کے بے حیائی کے کاموں کو روشن خیالی سے تعبیر کرنے والے میری امت میں کئی لوگ پائے جائیں گے۔ میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ کا ارشاد روز روشن کی طرح جگمگا رہا ہے۔ آجکل بے حیائی کو فروغ دینے کے لیئے روشن خیالی۔ روشن دماغی اور روشن اسلام کا نام دیا جا رہا ہے۔

"**وان بنی اسرائیل تفرقت علی ثنتین وسبعین ملة** "بیشک بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں تقسیم ہوگئے۔

"قال ابن حجر ابر ز ضمیر هم ز یا دۃفی تقبیح صنیعهم وبیا نا لکو ن ذلک دئابهم و عا دتهم "

ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہاں ضمیر پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ اسم ظاہر ''بنی اسرائیل'' ذکر کیا۔ جس سے یہ واضح کر دیا گیا کہ ہر برائی ان کی عادت و خصلت میں داخل تھی ۔ اسی وجہ سے وہ بہتر فرقوں میں تقسیم ہو کر بھی باطل اور برے فعل کے مرتکب ہوئے۔

"ملة" کالغوی معنی طریقہ، خاص کر کے انبیاء کرام کے ذریعے لوگوں کیلئے جو طریقہ مشروع کیا گیا اسے "ملة" کہا جاتا ہے لیکن بعد میں اس لفظ کا اطلاق عام ہو گیا "الملة کل فعل وقول اجتمع علیه جماعة وهو قد یکون حقا وقد یکون باطلا" "ملة" ہر فعل یا ہر قول کو کہا جاتا ہے جس پر جماعت کا اتفاق ہو، پھر بھی وہ فعل اور قول حق ہوگا جس پر ایک جماعت کا اتفاق ہوگا اور کبھی وہ باطل ہوگا لیکن یہاں مراد یہ ہے "انها السعت فاستعملت فی الملل الباطلة" کہ وہ بہتر باطل فرقوں میں بٹ گئے۔ "وتفترق امتی علی ثلاث و سبعین ملة" اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ "کلهم فی النار الا ملة" تمام ہی آگ میں جائیں گے ۔ سوائے ایک گروہ کے۔ یقیناً آگ میں ہمیشہ رہنے والے وہی فرقے ہیں جو کفار ہوں گے۔

"قالوا من هی یا رسول الله" صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ وہ فرقہ کون سا ہے۔ تو آپ نے فرمایا "قال ما انا علیه واصحابی" "جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ ہیں۔ یعنی آپ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ وہ نجات پانے حاصل کرنے والا وہ فرقہ ہوگا۔

" هم المهتدون المتمسکون بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین من بعدی فلاشک ولاریب انهم هم اهل السنة والجماعة "

یہ وہ لوگ ہوں گے جو میری سنت پر عمل کرنے والے ہوں گے اور میرے بعد خلفاء راشدین کی سنت پر عمل کرنے والے ہوں گے۔ وہ فرقہ یقیناً اہل سنت و جماعت کا مراد ہے وہ ہی حق پر ہیں اور دوسرے تمام فرقے باطل ہیں۔

اصل میں رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے " من کان علی ماانا علیه واصحابی من الاعتقاد والقول والفعل " کہ جس عقیدہ اور قول و فعل پر میں اور میرے صحابہ ہیں وہ حق ہے اور دوسرے فرقے باطل ہیں۔ یہ کیسے پتہ چلے گا کہ فلاں فرقہ حق پر ہے اور فلاں باطل ہے کیونکہ بظاہر تو ہر فرقہ یہی کہے گا کہ میرا عقیدہ اور قول و فعل نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے مطابق ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے:

" فان ذلک یعرف بالاجماع فما اجمع علیه علماء الاسلام فهو حق وما عداه باطل "

کہ یہ اجماع امت سے پتہ چلے گا، جس کے حق ہونے پر علماء اسلام کا اجماع ہو وہ حق ہے اور جس کے باطل ہونے پر علماء اسلام کا اجماع ہو وہ باطل ہے۔

تہتر فرقوں میں راقم کا موقف تو یہ ہے کہ جو بھی دعوی اسلام کریں لیکن ان کے عقائد کفریہ ہوں وہ ان بہتر میں شامل ہیں اور ایک فرقہ ناجیہ علیحدہ ہے۔

علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ کا موقف یہ ہے کہ باطل فرقے اصولی طور پر آٹھ ہیں اور ان کی شاخوں کو ملائیں تو بہتر فرقے بنتے ہیں ایک **ناجیہ** فرقہ اہل سنت کا ہے، معتزلہ جو اس کے قائل ہیں کہ بندے اپنے افعال کے خود خالق ہیں اور رویت باری تعالی محال ہے اور اللہ تعالی پر واجب ہے عذاب دینا یا ثواب عطاء کرنا وہ بیس فرقے ہیں۔ **شیعہ** جنہوں نے حضرت علی ﷺ کی محبت میں افراط سے کام لیا وہ بائیس فرقے ہیں۔ **خارجی** جنہوں نے گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر قرار دیا وہ بیس فرقے ہیں۔ **مرجیئہ** فرقہ جو اس کے قائل ہیں کہ جس طرح کافر کو کوئی طاعت فائدہ نہیں دیتی، اسی طرح مؤمن کو کوئی گناہ ضرر نہیں دیتا، یہ پانچ فرقے ہیں۔

نجاریہ فرقہ یہ اہل سنت کے مطابق عقیدہ رکھتے ہیں خلق افعال میں یعنی وہ اس کے قائل ہیں کہ بندوں کے افعال کا خالق اللہ تعالی ہے اور معتزلہ کے ساتھ موافق ہیں نفی صفات میں، اور حدوث کلام میں یہ تین فرقے ہیں۔

جبریہ فرقہ جو اس کا قائل ہے کہ بندہ جو کام بھی کرتا ہے اس میں اس کا کوئی اختیار نہیں، بلکہ وہ اس کام کرنے میں مجبور ہوتا ہے، یہ ایک ہی فرقہ ہے اور **مشبھة** فرقہ، جو اس کے قائل ہیں کہ اللہ تعالی عام بندوں کی طرح ہے، اور جسموں میں حلول کر لیتا ہے یہ بھی ایک ہی فرقہ ہے۔ یہ کل بہتر فرقے ہیں جو تمام ناری ہیں ایک فرقہ **اہل سنت** کا نجات حاصل کرنے والا ہے وہی حق پر ہے ناجیہ فرقہ میں عوام شریعت پر عمل کرتے ہیں خواص شریعت کے ساتھ ساتھ طریقت پر بھی عمل کرتے ہیں اور اخص الخواص شریعت اور طریقت کے ساتھ ساتھ حقیقت پر بھی عمل کرتے ہیں۔

قالاول نصیب الابدان الخدمة والثانی نصیب القلوب من اعلم والمعرفة والثالث نصیب الارواح من المشاهدة والرؤیة "

اول درجہ یہ ہے کہ وہ اپنے اعضاء کو عبادت میں لگائے دوسرا درجہ کہ عبادت کے ساتھ ساتھ دلوں کو اللہ تعالی کی طرف متوجہ کرے تاکہ اسے علم ومعرفت حاصل ہو یہ درجہ پہلے درجہ سے افضل ہے تیسرا درجہ روحوں کا حصہ ہے کہ رب تعالی کی تجلیات کا اسے مشاہدہ حاصل ہو۔ یہ درجہ پہلے دونوں درجوں سے زیادہ افضل ہے۔

الا فالزموا سنة الانبیاء　　　الا فاحفظوا سیرة الاصفیاء

ومن یبتدع بدعة لم یکرم بوجدانه رتبة الاتقیاء

خبردار انبیاء کرام کی سنت کو لازم پکڑو۔ خبردار محافظت کرو اصفیاء، نیک لوگوں کی سیرت کی جو شخص باطل بدعت اختیار کرتا ہے اس کی عزت نہیں ہوتی جو اتقیاء کے درجہ سے حاصل ہوتی ہے۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج ۱ ص ۲۴۷، ۲۴۸)

ایک روایت حضرت معاویہ ﷺ سے ہے جو ابوداؤد اور مسند احمد میں ہے، اس میں ہے:

"وانه سیخرج فی امتی اقوام تتجاری بهم تلک الاهواء کما یتجاری الکلب بصاحبه لایبقی منه عرق ولا مفصل الادخله" (مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنة)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، میری امت میں کچھ ایسے لوگ آئیں جب میں خواہشات اس طرح جاری ہوں گی جس طرح (پاگل) کتا کسی کو کاٹے تو اس پر اثر ہوتا ہے کوئی رگ اور کوئی جوڑ باقی نہیں رہتا مگر یہ کہ اس کر زہر کا اثر ہوتا ہے۔

حدیث پاک سے واضح ہوا کہ باطل خواہشات جو یہود و نصاری سے لائی جائیں گی وہ مسلمانوں کے رگ وریشہ میں چھا جائیں گی۔

دین اسلام پر عمل کرنے میں سب متحد ہو جاؤ:

❁ عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ ان الله لا یجمع امتی او قال امة محمد علی ضلالة ویدالله علی الجماعة ومن شذ شذ فی النار"

(رواہ الترمذی، مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالی نہیں جمع کرے گا میری امت کو یا آپ نے فرمایا امت محمد کو گمراہی پر، اللہ تعالی کا دست رحمت جماعت پر، جو شخص بکھر گیا، وہ آگ میں جا پہنچا۔

وضاحت حدیث: امت سے مراد امت اجابت ہے یعنی جو لوگ مجھ پر ایمان لا چکے ہیں اللہ تعالی ان کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا۔ بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ اللہ تعالی نبی کریم ﷺ کی امت کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا لیکن کفر پر قرب قیامت میں جمع کرلے گا کیونکہ احادیث میں وارد ہے " ان الساعة لاتقوم الاعلی الکفار " بیشک قیامت قائم نہیں ہوگی مگر کفار پر۔

" ید الله فوق الجماعة " اللہ تعالی کا دست رحمت ہے جماعت پر اگرچہ "ید" کا معنی ہے ہاتھ لیکن اللہ تعالی تو ہاتھ سے پاک ہے اسلئے اس کے مجازی معانی میں سے کوئی معنی لیا جائے گا وہ مجازی معانی یہ ہیں۔ اللہ تعالی کی

جماعت کو نصرت (امداد) حاصل رہے گی اور معنی ہے غلبہ یعنی معنی یہ ہے کہ جماعت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے غلبہ حاصل رہے گا یا معنی یہ ہوگا کہ جماعت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت حاصل ہوگی یا معنی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت جماعت پر ہوگی، یا معنی یہ ہو کہ جماعت کو اللہ تعالیٰ کا احسان ہوگا جماعت پر اور اس کی طرف سے جماعت کو توفیق حاصل ہوگی کہ وہ احکام کا استنباط کریں گے اور رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے اعتقادات اور عملیات پر لوگوں کو مطلع کریں گے۔

(علی الجماعة) ای المجتمعین علی الدین " جماعت سے مراد وہ لوگ ہیں جو دین پر مجتمع ہوں یعنی جب لوگ دین پر متحد و متفق ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کی حفاظت و رحمت و نصرت میں ہوں گے۔

(ومن شذ شذ فی النار) ای انفرد عن الجماعة باعتقاد او قول او فعل لم یکونوا علیه "

جماعت سے بکھرنے سے مراد یہ ہے کہ اہل سنت کے عقائد سے ہٹ کر علیحدہ عقائد رکھ لے یا ان کے خلاف اس کے اقوال ہوں یا ان کے افعال صحیحہ کے خلاف اسکے افعال باطلہ ہوں تو یہ جماعت سے منفرد ہوگیا۔ جب جماعت کے لوگ جنتی ہوں گے تو یہاں سے علیحدہ کر کے آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج ا ص ۲۴۹)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿فَاِنْ حَآجُّوْکَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِیَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ وَقُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ وَالْاُمِّیّٖنَ ءَ اَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلٰغُ وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ٥﴾ (آیۃ نمبر ۲۰)

(۱) (پھر اے محبوب ﷺ) اگر وہ تم سے حجت کریں تو فرما دو میں اپنا منہ اللہ تعالیٰ کے حضور جھکائے ہوں اور جو میرے پیرو ہوئے اور کتابیوں اور ان پڑھوں سے فرماؤ کیا تم نے گردن رکھی؟ پس اگر وہ گردن رکھیں جب تو راہ پاگئے اور اگر منہ پھیریں تو تم پر یہی حکم پہنچا دینا ہے اور اللہ بندوں کو دیکھ رہا ہے۔

(۲) پھر اگر وہ آپ سے جھگڑا کریں تو آپ فرما دو "میں نے جھکا لیا اپنی ذات کو اللہ کیلئے اور انہوں نے جنہوں نے میری تابعداری کی" اور فرما دیں ان کو جن کو کتاب دی گئی اور ان پڑھوں کو کیا تم اسلام لے آئے ہو؟ اگر انہوں نے اسلام لایا ہوتا تو وہ ہدایت پاگئے ہوتے اور اگر وہ پھر گئے تو آپ پر صرف پہنچا دینا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ دیکھنے والا ہے بندوں کو۔

مختصر مطلب: تقریباً ترجمہ سے ہی واضح ہے کہ اگر وہ کافر آپ سے حجت بازی کریں، دین کے متعلق جھگڑا کریں تو آپ فرما دیں کہ میں تو اللہ تعالیٰ کا مطیع ہوں، اور جن لوگوں نے میری تابعداری کی وہ بھی اللہ تعالیٰ کے مطیع ہیں، آپ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ اور ان پڑھ لوگوں یعنی مشرکین سے پوچھو کیا تم اسلام لائے ہو؟ اگر انہوں نے اسلام لایا ہوتا تو وہ ہدایت پاچکے ہوتے، اور اگر وہ پھر گئے، یعنی اسلام نہ لائے تو آپ پر تو کوئی حرج لازم نہیں، کیونکہ آپ پر تو صرف اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچا دینا لازم ہے۔ اور اللہ بندوں کو دیکھ رہا ہے۔

﴿فَاِنْ حَآجُّوْکَ﴾ پھر اگر وہ جھگڑا کریں تمہارے ساتھ

یعنی آپ نے جو رب تعالیٰ کا پیغام پہنچایا "ان الدین عند اللہ الاسلام" (بیشک دین اللہ کے ہاں اسلام ہے) اس میں اگر وہ جھگڑا کریں، حجت بازی کریں، دین اسلام کی حقانیت کو تسلیم نہ کریں (از روح البیان)

"(فان حاجوک) ای جادلوک بالأقاویل المزورۃ و المغالطات فاسند امرک الی

ماکلفت من الایمان و التبلیغ وعلی الله نصرک" (قرطبی)

اگر وہ تمہارے ساتھ جھگڑا کریں، یعنی جھوٹے، من گھڑت اقوال (باتیں) پیش کریں، اور مغالطہ ڈالیں تو آپ کو جو ایمان کی تکلیف دی گئی اور تبلیغ کرنے کا حکم دیا گیا آپ وہ ان تک پہنچا دیں، اللہ تعالیٰ تمہاری امداد فرمائے گا۔

''اگر وہ جھگڑا کریں'' اس سے مراد کون لوگ ہیں؟ اس سے مراد اہل کتاب یہود و نصاری، یا اس سے مراد نجران کے وفد کے عیسائی ہیں۔ بلکہ تمام لوگ جو دین کی مخالفت کریں، دین اسلام کے خلاف حجت بازی کریں وہ سب ہی اس آیہ کریمہ میں داخل ہیں۔ (از روح المعانی)

﴿فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ﴾

''تو آپ فرما دو میں نے جھکا لیا اپنی ذات کو اللہ کیلئے، اور انہوں نے جنہوں نے میری تابعداری کی۔''

''**اسلمت**'' کا معنی ہے ''انقدت له'' میں اس کا مطیع ہو گیا، اپنے آپ کو جھکا لیا۔ (جلالین)

''**وجھی**'' سے مراد ہے ''میری ذات'' جیسا کہ حدیث شریف میں ہے ''سجد وجھی للذی خلقه وصوره'' میری ذات نے اسے سجدہ کیا جس نے پیدا کیا اور صورت عطاء کی۔ راقم نے ترجمہ اسی کے مطابق کیا ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ ''وجہ'' بمعنی قصد کے ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے ''خرج فلان فی وجه کذا'' فلاں شخص اپنے اس طرح کے مقصد کیلئے نکلا۔ ''والاول اولی'' لیکن پہلا معنی مراد لینا زیادہ بہتر ہے۔ (قرطبی)

(**ومن اتبعن**) اور جنہوں نے میری تابعداری کی، ''ای ومن اتبعنی اسلم ایضا'' یعنی جنہوں نے میری تابعداری کی وہ بھی رب تعالیٰ کے مطیع ہو گئے، اور رب تعالیٰ کے سامنے انہوں نے بھی اپنے آپ کو جھکا لیا۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

''ومن اتبعن'' اصل میں ''ومن اتبعنی'' ہے یا ضمیر منصوب متصل جو مفعول واقع ہو رہی تھی، اسے حذف کر دیا۔

رسول اللہ ﷺ کو کفار کی حجت بازی سے اعراض کرنے کا حکم کیوں دیا؟

اس لئے کہ نبی کریم ﷺ ان کے سامنے اس سے پہلے کئی مرتبہ اپنی صداقت پر دلائل قائم کر چکے تھے۔ پھر یہ سورت مدنی ہے، اس سے پہلے ان کے سامنے معجزات بھی آ چکے تھے، قرآن پاک بھی رسول اللہ ﷺ کا معجزہ ہے، پر وہ

درخت کو دیکھ چکے تھے کہ اس نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کو سلام کیا، پھر آپ کے ارشاد پر واپس اپنی جگہ پر چلا گیا۔ پھر بھیڑیئے کا آپ سے کلام کرنا ان کے سامنے آچکا تھا، اس آیۂ کریمہ سے پہلے کئی آیات میں دین اسلام کی حقانیت بیان کی جا چکی تھی، نصاریٰ نے جو یہ کہا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا ہیں تو ان کا رد "الحی القیوم" سے کیا، پھر جب ان لوگوں نے نبی کریم ﷺ کی نبوت پر شک کیا، تو ان کا جواب ﴿نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ﴾ (نازل کی گئی آپ پر کتاب حق سے) سے دیا، ان کی تمام حجت بازیوں کو دلائل سے رد کیا، پھر بدر میں مسلمانوں کی کامیابی کا ذکر فرمایا جو درحقیت نبی کریم ﷺ کا معجزہ تھا، اس کا تذکرہ ان لفاظ مبارکہ سے کیا ﴿قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا﴾ تحقیق تمہارے لئے نشانی ہے دو جماعتوں کے ملنے میں۔

اس کے بعد توحید کا ذکر فرمایا، اور رب تعالیٰ کی ضد اور مثل اور اس کی زوجہ اور اولاد کی نفی کی، ارشاد فرمایا ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ اللہ تعالیٰ نے گواہی دی بیشک کوئی معبود نہیں سوائے اس کے، پھر ارشاد فرمایا ﴿وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَ هُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ﴾ مطلب واضح ہے کہ یہود نصاریٰ کو حق کا علم عطاء کر دیا گیا، لیکن انہوں نے علم حاصل ہونے کے باوجود دین میں حسد و بغاوت کی وجہ سے اختلاف کیا۔ اگر وہ مخلص ہوتے دلائل میں غور وفکر کرتے تو اسلام لے آتے، حق کے مطیع ہو جاتے لیکن انہوں نے فقط حسد اور بغاوت سے دین اسلام کی مخالفت کی۔

"فظهر انه لم يبق من اسباب اقامة الحجة على فرق الكفار شئى الاوقد حصل"

تو واضح ہو گیا کہ بیشک حجت کے قائم کرنے کے کوئی اسباب باقی نہ رہے، کفار کے تمام فرقوں پر مکمل دلائل بیان کر دئے، ان میں کوئی کمی باقی نہیں چھوڑی گئی۔

اس کے بعد زیر بحث آیۂ کریمہ میں ذکر فرمایا۔ ﴿فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ﴾ اگر وہ جھگڑا کریں تمہارے ساتھ تو آپ فرما دو میں نے جھکا لیا ہے اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کیلئے، اور انہوں نے جنہوں نے میری تابعداری کی۔ گویا کہ مصطفیٰ کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ ہم نے دلائل بیان کرنے میں مبالغہ کیا ہے کوئی کمی نہیں چھوڑی، اور دلائل کو واضح طور پر بیان کر دیا۔

"فان تركتم الانف والحسد، وتمسكتم بها كنتم انتم المهتدين، وان اعرضتم فان الله تعالى من وراء مجازاتكم"

اگر تم عار اور حسد کو چھوڑ دو، اور تم دلائل سے استنباط کرو (یعنی مسائل حاصل کرو) تو تم ہدایت پا جاؤ گے، اور اگر تم نے

اعراض کیا تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا بدلہ دے گا۔ کلام کا طریقہ یہ ہی ہے کہ جب باطل راہ پر چلنے والا جھگڑالو ہو، حق کو سوچنے کی ضرورت اسے محسوس نہ ہو، صرف یہی کہتا پھرے میں نہیں مانتا، تو اسے کہا جائے۔

"اما انا و من اتبعنی فمنقا دون للحق مستسلمون له مقبلون علی عبودیة الله تعالی فان وافقتم واتبعتم الحق الذی ان علیه بعد هذه الدلائل التی ذکرتها فقداهتدیتم، وان اعرضتم فان الله بالمرصاد"

کہ میں اور میرے متبعین نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر دی، اسی کے سامنے اپنے آپ کو جھکا لیا، اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کی طرف ہم مشغول ہوتے ہیں، اگر تم بھی اس کی موافقت کرو، اور حق کی تابعداری کرو ''جس پر میں ہوں اور تمہارے سامنے دلائل بھی پیش کر چکا ہوں'' تو تم ہدایت پا جاؤ گے، اور اگر تم نے اعراض کیا تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے عذاب تیار کر رکھا ہے، تم اس کی گرفت سے نہیں بچ سکو گے، ہر باطل راہ پر چلنے والوں کو یہی جواب دیا جائے۔ (از کبیر)

آجکل غیر مقلدین کا یہی طریقہ ہے:

کہ نہ ماننے کیلئے کبھی یہ کہیں گے کہ حدیث صحاح ستہ سے پیش کریں اگر صحاح ستہ سے کوئی حدیث پیش کریں مثلاً ترمذی، ابوداؤد سے'' تو کہیں گے، بخاری و مسلم اور موطأ امام مالک سے حدیث پیش کریں کیونکہ یہ قرون اولیٰ کی حدیثیں ہیں۔ ان جہلاء کو یہ پتہ ہی نہیں کہ قرون اولیٰ میں حدیث کی کوئی ایک کتاب ہی نہیں۔ پھر اگر حدیث ترمذی سے حسن پیش کر دیں تو وہ کہیں گے یہ حدیث ضعیف ہے، جن جاہلوں کو ضعیف اور حسن کا فرق ہی نہ پتہ ہو تو ان کو جواب صرف اتنا کافی ہے کہ ہمارا کام کسی کو منوانا نہیں، بلکہ مسئلہ بتانا ہے۔

اگر نبی کریم ﷺ کے ارشاد کو سن کر ابوجہل اور ابولہب نے نہیں مانا تو غیر مقلدین دین کے باغی، کسی معتدل شخص کی بات کو کیا مانیں گے، ان کو اپنی مساجد میں دعوت دینا سوائے شدید غلطی کے کچھ بھی نہیں، مساجد کی عزت کو پائمال کرنے کے مترادف ہے، ان کا انداز کلام جاہلانہ ہے، ایسے فسادیوں سے بچ کر رہنا ضروری ہے۔ علماء اہل سنت آستینوں کے سانپوں کو بھی پہچانیں، جو ان کو جنگ و جدال کی طرف لے جانا چاہتے ہیں، راقم ان بکاؤ مالوں کو بہت قریب سے جان چکا ہے، مفاد پرست ٹولہ ہے۔ (راقم)

''اسلمت لله وجهی'' دلیل مثبت ہو، اعراض نہ ہو:

اس میں چند وجوہ بیان کی گئی ہیں:

(۱) پہلی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ تمام خالق کا اقرار کرتے تھے، اور خالق کو مستحق عبادت بھی سمجھتے تھے، گویا کہ

نبی کریم ﷺ نے قوم کو کہا کہ میں وہ دلیل پیش کرتا ہوں جس پر قول کا اتفاق ہے یعنی میں مخلوق کو خالق کی عبادت کی دعوت دیتا ہوں، اس میں کوئی اختلاف نہیں، اختلاف اور چیزوں میں ہے، لھذا تم اپنا اپنا دعوی پیش کرو۔

"فان الیھود یدعون التشبیہ و الجسمیۃ" تو بیشک یہود نے دعوی کیا کہ اللہ تعالی مخلوق کی طرح ہے، اور اس کا بھی جسم اسی طرح ہے جس طرح مخلوق کے اجسام ہیں۔ "والنصاری یدعون الھیۃ عیسی علیہ السلام" نصاری دعوی کرنے لگے کہ عیسی خدا ہیں، "فان المشرکین یدعون وجوب عبادۃ الأوثان" لیکن مشرکین دعوی کرنے لگے کہ بت معبود ہیں، ان کی عبادت واجب ہے۔ "فھو لاء ھم المدعون لھذہ الاشیاء فعلیھم اثباتھا" یہود ونصاری ومشرکین نے جو جو دعوی کیا ان پر لازم تھا کہ وہ دلائل سے اپنے اپنے دعوی کو ثابت کرتے، لیکن وہ عاجز آ گئے لیکن مصطفی کریم ﷺ نے اپنے دعوی کو گویا کہ یوں پیش کیا۔

"اما انا فلاادعی الاوجوب طاعۃ اللہ تعالی وعبودیتہ، وھذا القدر متفق علیہ"

کہ میں تو صرف یہ دعوی کرتا ہوں کہ اللہ تعالی کی طاعت واجب ہے، اور بندوں پر لازم ہے کہ اس کی عبادت کریں اور اپنے عبد ہونے کا اقرار کریں اس میں میرے ساتھ تم بھی متفق ہو، گویا کہ میرا دعوی بلا دلیل ثابت ہو گیا۔

آپ کا یہ ارشاد (اسلمت وجھی للہ) ایسے ہی ہے، جیسے کہ رب تعالی کا ارشاد آپ نے پیش فرمایا ﴿یٰٓاَھۡلَ الۡکِتٰبِ تَعَالَوۡا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍۭ بَیۡنَنَا وَبَیۡنَکُمۡ اَنۡ لَّا نَعۡبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشۡرِکَ بِہٖ شَیۡئًا﴾ اے اہل کتاب آؤ ایک کلمہ کی طرف جو برابر ہے ہمارے اور تمہارے درمیان "یہ کہ ہم نہ عبادت کریں سوائے اللہ تعالی کے اور اس کے ساتھ کوئی شریک نہ ٹھہرائیں۔

(۲) دوسری وجہ کیفیت استدلال کی ہے کہ یہود ونصاری اور مشرکین تمام ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظمت کے قائل تھے اور یہ کہتے تھے کہ وہ حق پر تھے اور اپنے دین میں سچے تھے۔ اگر چہ شرائع اور احکام میں یہود ونصاری ومشرکین کے اپنے اپنے دعوی کے مطابق ابراہیم علیہ السلام کے متعلق نظریات تھے۔ اللہ تعالی نے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ آپ ابراہیم علیہ السلام کی ملت کی تابعداری کریں ﴿ثُمَّ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ اَنِ اتَّبِعۡ مِلَّۃَ اِبۡرٰھِیۡمَ حَنِیۡفًا﴾ پھر اللہ تعالی نے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ آپ ابراہیم علیہ السلام کے قول کی طرح کہو، ابراہیم علیہ السلام نے کہا ﴿اِنِّیۡ وَجَّھۡتُ وَجۡھِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ﴾ بیشک میں نے اپنا منہ اس کی طرف کیا جس نے آسمان اور زمین بنائے۔ ابراہیم علیہ السلام کا یہ کہنا ﴿وَجَّھۡتُ وَجۡھِیَ﴾ اور نبی کریم ﷺ کا یہ کہنا "اسلمت وجھی للہ" کا ایک ہی مفہوم ہے۔

یعنی ابراہیم علیہ السلام اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا"اعرضت عن کل معبود سوی الله تعالی وقصدته بالعبادة واخلصت له" میں نے اللہ تعالی کے سواء ہر باطل معبود سے اعراض کیا، اور اسی کا عبادت میں قصد کیا اور میں نے اسی کیلئے اپنے آپ کو خالص کر لیا، اب گویا کہ اس تفسیر کے مطابق اللہ تعالی کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہو گیا۔

"فان نازعوک یا محمد فی هذه التفاصيل فقل انا مستمسک بطريقة ابراهيم وانتم معترفون بان طريقته حقةبعيدة عن كل شبهة وتهمة"

اے محمد ﷺ اگر آپ سے وہ جھگڑا کریں ان تفصیلی دلائل میں تو آپ ان کو مختصر یہ فرمادو کہ میں تو ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ پر عمل کر رہا ہوں، انہوں نے کہا﴿اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾ اور میں بھی کہہ رہا ہوں"اسلمت وجهی لله" جب تم ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ کو حق مانتے ہو اور شبہ وتہمت سے پاک مانتے ہو، تو یقیناً میرا طریقہ بھی حق ہے کیونکہ یہ وہی راہ ہے جس پر ابراہیم علیہ السلام چلے ہیں، یہ الزامی جواب ہے۔ اس میں وہی انداز اختیار کیا گیا جس کا رب تعالی نے حکم دیا ہے﴿وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ﴾ آپ ان سے جھگڑا کریں اچھے طریقہ سے یعنی الزامی دلائل اور ظنی دلائل سے بھی ان کو مطمئن کریں۔

(۳) تیسری وجہ کیفیت استدلال یہ ہے کہ جب رب تعالی کا ارشاد گرامی﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ (بیشک دین اللہ تعالی کے ہاں اسلام ہے) حضور ﷺ نے پیش فرمایا، تو اس کے بعد رب تعالی نے فرمایا﴿فَاِنْ حَاجُّوْكَ﴾ اگر وہ تمہارے ساتھ (دین اسلام کی حقانیت میں) جھگڑا کریں، تو آپ بطور دلیل ان کو یہ فرمادو"اسلمت وجهی لله" کیونکہ دین کا اصل مقصود ہی یہ ہے کہ انسان اللہ تعالی کی ربوبیت کو اور اپنی عبودیت کو لازم پکڑے، تو وہ مقصد عظیم ان مختصر الفاظ سے پیش فرما دیا۔

اس لئے کہ جب پیش فرمایا"اسلمت وجهی لله" (میں نے جھکا لیا ہے اپنی ذات کو اللہ کیلئے) تو اس کا مطلب یہ ہو گیا۔

"فلااعبد غيره ولا اتوقع الخير الامنه ولااخاف الامن قهره وسطوته، ولا اشرک به غيره"

جب میں نے اپنی ذات کو رب تعالی کی لئے جھکا لیا ہے تو میں اس کے بغیر کسی اور کی عبادت نہیں کرتا اور میں بھلائی کی توقع صرف اسی سے رکھتا ہو، اور میں خوف نہیں رکھتا سوائے اس کے قہر اور اس کے دبدبہ کے۔

یہ وجہ جو ابھی بیان کی ہے اس میں کامل طور پر لوازم ربوبیت اور عبودیت کی وفاء پائی گئی ہے اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ کامل دین اسلام ہی ہے۔

(۴) چوتھی وجہ کیفیت استدلال کی یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کلام سے دلیل پکڑ کر

عیسائیوں کا رد کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کلام کی حکایت رب تعالیٰ نے یوں بیان فرمائی ﴿لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا یَسْمَعُ وَلَا یُبْصِرُ وَلَا یُغْنِیْ عَنْکَ شَیْئًا﴾ تو کیوں عبادت کرتا ہے ایسے کی جو سن نہیں سکتا اور نہ ہی بے پرواہ کر سکتا ہے تمہیں کسی چیز سے۔

جب اس آیۂ کریمہ سے واضح ہو گیا کہ عبادت تو صرف اس ذات کی ہو سکتی ہے جو نفع وضرر کا ذاتی طور پر مالک ہو، تو ابراہیم علیہ السلام کا مطلب بھی یہ تھا کہ "انما اعبد من کان امری فی یدیه وحکمی فی قبضة قدرته" میں تو صرف اس ذات کی عبادت کرتا ہوں جس کے قبضۂ قدرت میں میرے معاملات ہیں اور میرا حکم جس کے قبضۂ قدرت میں ہے، نبی کریم ﷺ نے عیسائیوں کو یہ بتایا کہ ادھر تم یہ کہتے ہو کہ ابراہیم علیہ السلام سچے تھے اور حق پر تھے اور ادھر تم عیسیٰ علیہ السلام کو خدا مانتے ہو۔ وہ تو ذاتی طور پر نفع وضرر کے مالک نہیں تھے تو عقل کا فیصلہ یہی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی تعلیمات ان کو خدا ماننے سے مانع ہیں۔

اس لئے رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو فرمایا، آپ یہ فرمادیں "اسلمت وجهی لله" جھکا لیا ہے میں نے اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے لئے یعنی میں تو صرف اسے خدا مانتا ہوں جو خیر وشر کا مالک ہے، اور نفع وضرر کا مالک ہے، اور تدبیر وتقدیر کا مالک ہے۔

(۵) پانچویں وجہ کیفیت استدلال کی یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ سے جو یہ کہلایا گیا "اسلمت وجهی لله" یہ ابراہیم علیہ السلام کے اس کلام کے مناسب ہے ﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ جب کہا ان کو ان کے رب نے مطیع ہو جاؤ۔ آپ نے کہا میں مطیع ہو گیا سب جہانوں کے رب کا، تو نبی کریم ﷺ نے اس کے مطابق کلام فرما کر یہود ونصاریٰ ومشرکین کو سوچنے کا موقع دیا کہ دعویٰ یہ کرنا کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کو مانتے ہیں، لیکن ان کے عقائد کے خلاف تم نے اپنے عقائد کفریہ اور شرکیہ رکھے ہوئے ہیں جو سراسر باطل ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ ضمیر مرفوع متصل پر جب عطف کرنا ہو تو ضمیر مرفوع منفصل سے تاکید لانی ضروری ہوتی ہے، جب "ومن اتبعن" کا عطف "اسلمت" کی متکلم ضمیر پر کیا تو "اسلمت انا" کیوں نہیں کہا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ضابطہ اس وقت ہے جب معطوف علیہ اور معطوف میں فاصلہ نہ ہو، جب فاصلہ ہو تو بغیر تاکید منفصل کے عطف جائز ہوتا ہے، یہاں "وجهی لله" کا فاصلہ ہے اس لئے یہ جائز ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَ اَسْلَمْتُمْ﴾

''اور فرمادو انہیں جن کو کتاب دی گئی اور ان پڑھوں کو کیا تم اسلام لے آئے ہو۔''

اہل کتاب سے مراد یہود ونصاری ہیں اور ان پڑھوں سے مراد مشرکین عرب ہیں، کیونکہ انہوں نے کسی کتاب کا دعوی نہیں کیا تھا کہ ہمارے پاس اللہ تعالی کی کتاب ہے ''**وصفوا بانهم اميون تشبيها بمن لايقرأ ولايكتب**'' ان کا وصف ''امی'' (ان پڑھ) ہونا بیان کیا گیا ہے کیونکہ انہیں تشبیہ دی گئی ان لوگوں سے جو لکھنا اور پڑھنا نہ جانتے ہوں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ حقیقت میں مشرکین عرب میں زیادہ وہی لوگ تھے جو لکھنا اور پڑھنا نہیں جانتے تھے، اکثر کو دیکھ کر حکم کل پر لگا دیا، گویا کہ وہ سب ہی ان پڑھ تھے۔

(**ءاسلمتم**) اگرچہ بظاہر استفہام ہے، لیکن اس کا معنی امر والا ہے کہ تم اسلام لے آؤ جیسا کہ ﴿فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ﴾ میں معنی ''انتھوا'' کا ہے رک جائے (شراب سے)۔

﴿فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا﴾ ''اگر وہ اسلام لاتے تو ہدایت پا جاتے۔''

''**وذلک لان الاسلام تمسک بما هدی اليه والمتمسک بهداية الله تعالى يكون مهتديا**''

اس لئے کہ بیشک اسلام کے ساتھ سہارا لگانا ہدایت حاصل کرنا ہے، جس نے اللہ تعالی کی ہدایت حاصل کرلی یعنی اسلام قبول کرلیا وہی ہدایت پر ہوگا، اس کے بغیر سب دعوے باطل ہیں۔ جس نے ہدایت حاصل کرلی اور اس پر ثابت رہا وہی کامیاب ہوا اور اسی نے آخرت میں نجات حاصل کرلی۔

﴿وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ﴾ ''اور اگر وہ پھر گئے تو آپ پر صرف پہنچا دینا ہے۔''

اس میں نبی کریم ﷺ کو تسلی دی گئی کہ آپ پر ہمارے احکام پہنچا دینا لازم ہے، آپ پر یہ لازم نہیں کہ آپ ان کو تسلیم بھی کرائیں، اگر وہ اسلام سے پھر جائیں تو آپ پر کوئی حرج نہیں، کیونکہ آپ نے تو تبلیغ کردی ہے۔

﴿وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ﴾ ''اور اللہ دیکھنے والا ہے بندوں کو۔''

اس میں مؤمنوں کیلئے وعدہ ہے کہ رب تعالی جب بندوں کے اعمال کو دیکھ رہا اس سے کچھ مخفی نہیں تو وہ ایمان والوں کو ثواب وجزاء خیر عطاء کرے گا اور اس میں وعید بھی ہے، یعنی کافروں کو دھمکی دی گئی کہ وہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے، تمہارا کفر اس سے مخفی نہیں، وہ تمہیں دائمی عذاب میں مبتلا کرے گا۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِآيَاتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَأْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ﴾ (آیۃ نمبر ۲۱,۲۲)

(1) وہ جواللہ کی آیتوں سے منکر ہوتے ہیں اور پیغمبروں کو ناحق شہید کرتے اور انصاف کا حکم کرنے والوں کو قتل کرتے ہیں، انہیں خوشخبری دو دردناک عذاب کی ○ یہ ہیں وہ جن کے اعمال اکارت گئے دنیا و آخرت میں اور ان کا کوئی مددگار نہیں۔

(2) بیشک وہ جو کفر کرتے ہیں اللہ کی آیات سے اور شہید کرتے ہیں نبیوں کو ناحق اور قتل کرتے ہیں انہیں جو حکم دیتے ہیں انصاف کا لوگوں سے، خوشخبری دو ان کو دردناک عذاب کی ○ یہ ہیں وہ ضائع ہو گئے اعمال ان کے دنیا و آخرت میں اور نہیں ان کا کوئی مددگار۔

ماقبل سے تعلق:

پہلی آیت میں بیان کیا گیا "وان تولوا فانما علیک البلاغ" اگر وہ پھر جائیں تو آپ پر صرف پہنچا دینا ہے۔ اب اس آیۂ کریمہ میں ان پھر جانیں والوں کی تین صفات بیان کی جارہی ہیں۔

(۱) ان کی ایک صفت یہ بیان کی گئی، وہ اللہ تعالی کی آیات سے کفر کرتے ہیں حالانکہ وہ صانع کا اقرار بھی کرتے ہیں، ان کا بعض آیات سے کفر کرنا، تمام آیات سے کفر کرنے کی طرح ہی تھا، اسی وجہ سے مطلق ذکر فرمایا ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِآيَاتِ اللّٰهِ﴾ بیشک وہ کفر کرتے ہیں اللہ کی آیات سے۔

ایک اور احتمال یہ ہے کہ ﴿ بِآيَاتِ اللّٰهِ﴾ میں اضافت عہدی ہو، مراد خاص آیات ہوں، یعنی وہ قرآن پاک اور رسول اللہ ﷺ سے کفر کرتے ہیں۔

(۲) ان کی دوسری صفت بیان کی گئی وہ انبیاء کرام کو شہید کرتے ہیں، یعنی بعض انبیاء کرام کو انہوں نے زہر دے کر شہید کیا بعض کو جادو سے، بعض کو آرہ سے چیر دیا وغیرہ

(۳) دین سے پھر جانے والوں کی تیسری صفت یہ بیان گئی کہ وہ ان لوگوں کو قتل کرتے ہیں جو انہیں انصاف کرنے

کا حکم دیتے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر والبحر المحیط)

ان کے اوصاف قبیحہ کی ترتیب ذکری:

دین سے پھر جانے والوں کی بری صفات کا ذکر فرمایا۔ سب سے پہلے ان کے عظیم جرم کا ذکر کیا کہ "وہ اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرتے ہیں، ان کا یہ جرم دوسرے جرموں کا سبب بنا۔ "وهو اقوى الا سباب فى عدم المبالاة بمايقع من الافعال القبيحة" کیونکہ اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرنا بہت بڑا سبب تھا انکے برے افعال سے پرواہ نہ کرنے کا۔

ان کی دوسری بری صفت کا ذکر فرمایا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بڑی آیات یعنی انبیاء کرام کو شہید کیا۔ یہ ان کی صفت قبیحہ بنسبت پہلی صفت کے ذرا کم درجہ کی ہے۔

ان کی تیسری صفت قبیحہ بیان کی کہ انہوں نے ان لوگوں کو قتل کیا جنہوں نے ان کو اچھے کاموں کا حکم دیا اور برے کاموں سے روکا۔ ان کی یہ صفت قبیحہ بنسبت پہلی دونوں صفات قبیحہ کے ذرا کم درجہ ہے۔

"فهذه الثلاثة بدى فيها بالاعظم فالاعظم" ان تین صفات میں پہلے عظیم جرم والی صفت کو بیان کیا، پھر اس کے بعد جو عظیم جرم والی صفت تھی، پھر اس کے بعد جو عظیم جرم والی صفت تھی، اسے ذکر کیا تینوں صفاف عظیم جرم والی ہیں، صرف درجہ بدرجہ کا فرق ہے۔ (ماخوذ از البحر المحیط)

بنی اسرائیل میں کثیر تعداد میں انبیاء کرام تشریف لائے جن کے پاس مستقل علیحدہ کتاب نہیں ہوتی تھی، بلکہ وہ توراۃ پر عمل کرنے کا حکم دیتے، اور قوم کو وعظ ونصیحت کرتے، قوم کے لوگ ان کو شہید کر دیتے۔

"فيقول رجال ممن آمن بهم وصدقهم فيذكرونهم ويامرونهم بالمعروف وينهوهم عن المنكر فيقتلونهم"

انبیاء کرام کو شہید کرنے پر ان پر ایمان لانے والے اور ان کی تصدیق کرنے والے ان کو اچھے کاموں کا حکم دینے لگے، اور برے کاموں سے روکنے لگے تو ان لوگوں نے ان نصیحت کرنے والوں کو بھی قتل کر دیا۔

"عن عبيدة بن الجراح قال قلت يا رسول الله اى الناس اشد عذ ابايوم القيامة قال رجل قتل نبيا اورجلا امربالمعروف ونهى عن المنكر ثم قرأ رسول الله ﷺ ويقتلون النبيين بغير حق ويقتلون الذين يأمرون بالقسط من الناس"

(رواہ ابن ابی حاتم وابن جریر، ابن کثیر، صابونی مع حاشیہ)

عبیدہ بن جراح فرماتے ہیں میں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ لوگوں میں سے قیامت کے دن کس کو شدید عذاب دیا جائے گا؟ تو آپ نے فرمایا جس شخص نے اللہ تعالی کے نبی کو شہید کیا یا کسی ایسے شخص کو قتل کیا جس نے اسے اچھے کاموں کا حکم دیا اور برے کاموں سے منع کیا'' پھر آپ نے بطور دلیل یہی دو آیتیں ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ حَقٍّ﴾ سے لے کر ﴿وَمَا لَھُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ﴾ تک تلاوت کیں۔

﴿وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ حَقٍّ﴾ ''اور شہید کرتے نبیوں کو ناحق''۔

''النبیین'' پر الف لام عہد خارجی ہے، جس سے مراد بعض معین انبیاء کرام ہیں، کیونکہ ''ومعلوم انھم ماقتلوا الکل ولاالاکثر ولاالنصف'' یقینی بات ہے کہ بیشک انہوں نے تمام انبیاء کرام کو نہیں شہید کیا تھا اور نہ ہی اکثر اور نہ ہی نصف تعداد کو، بلکہ بعض کو شہید کیا تھا۔ (ازکبیر)

سؤال: ''بغیر حق'' کہنے کا کیا مطلب ہے؟ جب کہ انبیاء کرام کو قتل کرنا تو ناحق ہی ہوتا ہے؟

جواب: وہ قتل کرنے والے بھی سمجھتے تھے کہ ہم ان پر ظلم کر رہے ہیں، اور ناحق ان کو شہید کر رہے ہیں اس کی مکمل تفصیل پہلے پارہ **نجوم الفرقان** کی جلد سوم میں دیکھیے۔

﴿فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ﴾ ''خوشخبری دو ان کو دردناک عذاب کی''۔

بظاہر وہم یہ ہوتا ہے کہ بشارت تو خوشی کی خبر کو کہا جاتا ہے، دردناک عذاب کی خبر کو بشارت کہنے کا کیا مطلب ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ان مظالم پر اتراتے تھے، اپنے کاموں پر فخر کرتے تھے، تو اس وجہ سے انہیں یہ کہا گیا کہ تم اپنے فخریہ کاموں کے انجام پر خوش ہو جاؤ'' اس کو عربی زبان میں ''تھکم'' کہا جاتا ہے۔

سؤال: آیۃ کریمہ میں بظاہر تو یہی سمجھ آرہا ہے کہ خطاب نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود و نصاری کو ہے، انہوں نے تو انبیاء کرام اور انصاف کا حکم دینے والوں کو شہید نہیں کیا تھا، پھر اس ذکر کا کیا فائدہ؟

جواب: ''قتل اولوھم الانبیاء علیھم السلام وقتلوا اتباعھم وھم راضون بما فعلوا'' (تفسیر ابی السعود)

چونکہ پہلے لوگوں نے انبیاء کرام کو شہید کیا تھا اور ان کے متبعین کو قتل کیا تھا، تو نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود و نصاری اپنے آباء و اجداد کے فعل پر راضی تھے، بلکہ ان کے کارنامے بیان کرتے وقت اس کا بھی تذکرہ کرتے تھے، اس لئے قتل انبیاء کرام ان کی طرف بھی ایسے ہی منسوب ہے جیسے ان کے آباء و اجداد کی طرف تھا۔

دوسری وجہ یہ بھی واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود نے بھی آپ کو شہید کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی اگر چہ وہ کامیاب نہیں ہوئے، آپ کو جادو سے شہید کرنے کی انہوں نے کوشش کی اور آپ کو زہر آلود بکری کا گوشت کھلا کر شہید کرنے کی انہوں نے کوشش کی، اس لئے ان کی طرف قتل انبیاء کرام کی نسبت اس معنی کے لحاظ پر حقیقۃ نسبت ہے۔

فائدہ: "قال الحسن هذه الآية تدل على ان القائم بالامر بالمعروف والنهى عن المنكر عند الخوف تلى منزلته فى العظم منزلة الانبياء"

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس آیۃ کریمہ سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ خوف کے وقت اچھے کاموں کا حکم دینا اور برے کاموں سے روکنا انبیاء کرام کے عظیم درجہ کا قرب حاصل کرنا ہے

نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا"اى الجهاد افضل؟فقال ﷺ افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر" کون سا جہاد افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا"ظلم بادشاہ کے سامنے کلمہ حق کہنا" (کبیر)

❁ "قال الحسن قال النبى ﷺ من امر بالمعروف اونهى عن المنكر فهو خليفة الله فى ارضه وخليفة رسوله وخليفة كتابه" (قرطبی)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں جس شخص نے اچھے کاموں کا حکم دیا یا برے کاموں سے منع کیا وہ اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے اس کی زمین میں، اور اس کے رسول (ﷺ) کا خلیفہ ہے، اور اس کتاب کا خلیفہ ہے۔

❁ "وعن درة بنت ابى لهب قالت جاء رجل الى النبى ﷺ وهو على المنبر فقال من خير الناس يا رسول الله؟قال آمرهم بالمعروف وانها هم عن المنكر واتقاهم لله واوصلهم لرحمه" (قرطبی)

درہ بنت وہب رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے ایسے حال میں کہ آپ منبر پر تشریف فرما تھے، تو وہ پوچھنے لگے"یا رسول اللہ ﷺ لوگوں میں سے افضل کون ہے؟ آپ نے فرمایا"جو شخص اچھے کاموں کو حکم دینے والا ہو اور برے کاموں سے روکنے والا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضاء کی خاطر دوسروں سے زیادہ تقویٰ رکھنے والا اور زیادہ صلہ رحمی کرنے والا ہو"

منافقوں اور مؤمنوں کے درمیان بنیادی فرق:

منافقوں کے متعلق رب تعالیٰ نے بیان فرمایا ﴿اَلْمُنَافِقُوْنَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ

بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ﴾ منافق مرد اور منافق عورتیں بعض، بعض کے (دوست) ہیں، برے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور اچھے کاموں سے روکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کے متعلق یہ ارشاد ﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں بعض، بعض کے دوست ہیں، اچھے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور برے کاموں سے روکتے ہیں۔

"فجعل الله تعالى الأمر بالمعروف والنهى عن المنكر فرقا بين المؤمنين والمنافقين"

اللہ تعالیٰ نے "امر بالمعروف" اور" نهي عن المنكر" (اچھے کاموں کا حکم دینا اور برے کاموں سے روکنا) کو مؤمنین اور منافقین کے درمیان وجہ فرق بیان کیا۔

مسئلہ: اگرچہ برے کاموں سے روکنے والے کو خود برائیوں سے اجتناب ضروری ہے تا کہ ﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ (کیا تم لوگوں کو نیکی کے کاموں کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھلاتے ہو (یعنی اپنے آپ کو نیکی کے کاموں سے دور رکھتے ہو) کا مصداق نہ بنے اور ﴿كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾ (کیسی سخت ناپسند ہے اللہ کو وہ بات کہ کہو، جو نہ کرو) کی وعید اس پر صادق نہ آئے، لیکن گنہگار شخص کا دوسرے لوگوں کو نیکی کا حکم دینا اور گناہوں کے چھوڑنے کی ترغیب دینا بہتر ہے بنسبت "امر بالمعروف" اور" نهي عن المنكر" کو ترک کرنے کے۔ (قرطبی)

❁ **"عن ابى سعيد الخدرى قال سمعت رسول الله ﷺ يقول "من رأى منكم منكرا فليغيره بيده فان لم يستطع فبلسانه فان لم يستطع فبقلبه و ذلك اضعف الايمان"**

حضرت ابوسعید خدری ﷺ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا جس شخص نے تم میں سے کسی برائی کو دیکھا تو اسے ہاتھ سے تبدیل کردے، اگر اس کی طاقت نہ رکھے تو زبان سے اسے تبدیل کرے، اگر اس کی طاقت نہ رکھے تو دل سے (اسے برا سمجھے) یہ اضعف (کمزور) ایمان ہے۔

خوبصورت وضاحت:

"قال العلماء "الا مربالمعروف باليد على الامراء، وباللسان على العلماء، وبالقلب على الضعفاء يعنى عوام الناس"

علماء کرام نے اس حدیث کی وضاحت یہ بیان کی کہ اچھے کاموں کا حکم دینا ہاتھ سے حکام پر لازم ہے اور زبان سے

اچھے کاموں کا حکم دینا اور برے کاموں سے روکنا علماء پر لازم ہے، اور دل سے برے کاموں کو برا سمجھنا ضعیف ایمان والے یعنی عام لوگوں کا کام ہے۔

تنبیه: حکام بھی ہاتھوں سے سزا اس وقت دے سکیں گے جب زبان سے اس شخص پر اثر نہ ہو، اگر زبان سے وہ اثر قبول کر لے تو اسے سزا دینا منع ہوگا۔ (ماخوذ از قرطبی)

❁ "وروی عن بعض الصحابة انه قال ان الرجل اذا رأى منكرالايستطيع النكير عليه فليقل ثلاث مرات "اللهم ان هذامنكر"فاذا قال ذلك فقد فعل ما عليه"

بعض صحابہ کرام سے مروی کہ جب کوئی شخص کسی میں برائی کو دیکھے اور اسے روکنے کی طاقت نہ رکھے، تو تین مرتبہ یہ کہے اے اللہ یہ 'برائی پائی گئی ہے' جب ایسا کر لے (تو اس نے برائی کو دل سے برا مانا) تو اس پر کوئی حرج نہیں۔ (قرطبی)

❁ "روی انس بن مالك قال قيل يا رسول الله متى نترك الامر بالمعروف والنهى عن المنكر؟قال اذاظهر فيكم ماظهر فى الامم قبلكم قلنا يا رسول الله وما ظهر فى الامم قبلنا؟قال الملك فى صغاركم والفاحشة فى كباركم والعلم فى رذالتكم"

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا گیا یارسول اللہ "امر بالمعروف" اور "نهی عن المنکر" کو ہم کب چھوڑ دیں گے؟ آپ نے فرمایا جب تم میں بھی وہ صفات ظاہر ہو جائیں گی جو پہلے لوگوں میں ظاہر ہوئیں (تو تم اچھے کاموں کا حکم دینا اور برے کاموں سے روکنا چھوڑ دو گے) آپ سے پوچھا گیا وہ کون سی صفات ہیں جو پہلے لوگوں میں ظاہر ہوئیں؟ تو آپ نے فرمایا جب بادشاہت تمہارے حقیر لوگوں میں آجائے گی، اور بڑے لوگوں میں بے حیائی آجائے گی، اور علم رذیل لوگوں میں آجائے گا۔ (تو اس وقت تم " امر بالمعروف، نهی عن المنکر " کو چھوڑ دو گے) حضرت زید نے وضاحت کی کہ علم کا رذل لوگوں میں آنے کا یہ مطلب ہے کہ فاسق لوگوں کے پاس علم آجائے گا۔ (قرطبی)

﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَةِ﴾

"یہ ہیں وہ ضائع ہو گئے اعمال ان کے دنیا میں اور آخرت میں"

اس آیہ کریمہ اور اس سے پہلی آیہ کریمہ میں کفار کو تین وجہ سے وعید کی گئی (عذاب سے ڈرایا گیا)۔

(۱) ایک پچھلی آیہ کریمہ میں بیان کیا ﴿فبشرهم بعذاب اليم﴾ تو خوشخبری دے دو ان کو دردناک عذاب کی۔

(۲) دوسری وعید اس آیۃ کریمہ میں ان الفاظ مبارکہ سے دی ﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ﴾ (یہ ہیں وہ ضائع ہو گئے اعمال ان کے دنیا اور آخرت میں) کافر چونکہ اپنے اعمال کو حسین سمجھتے تھے، اسی لئے علامہ رازی رحمہ اللہ خوبصورت الفاظ سے وضاحت فرماتے ہیں:

"اعلم انه تعالی بین بهذا ان محاسن اعمال الکفار محبطة فی الدنیا و الآخرة"

بیشک اللہ تعالیٰ نے کافروں کے اعمال کے محاسن یہ بیان کئے کہ وہ دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے دنیا میں ضائع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی مدح کی جگہ مذمت ہونے لگی، ثناء (تعریف) کی جگہ ان پر لعنت کا حکم ہوا، اور ان کو غلام بنانے کا حکم دیا گیا، اور ظاہری ذلت وغیرہ ان کو حاصل ہوئی اور آخرت میں اعمال کے ضائع ہونے کا یہ مطلب ہے کہ ان کو عذاب دیا جائے گا، وہ ثواب سے محروم رہیں گے۔

(۳) تیسری وعید اس آیۃ کریمہ میں ان الفاظ مبارکہ سے فرمائی "وما لهم من ناصرین" "ینصرونهم من بأس الله تعالی وعذابه فی احد الدارین" "اور ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا" کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی گرفت اور اس کے عذاب سے دونوں جہانوں میں بچا سکے۔ (کبیر و روح المعانی)

تنبیہ: آیۃ کریمہ اگرچہ بظاہر الفاظ کے لحاظ پر عام ہے کہ تمام کفار کو یہ شامل ہے، کیونکہ رب تعالیٰ نے مطلقاً ذکر فرمایا ﴿وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ﴾ (اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں)

"الا ان له هنا موقعا حیث ان هؤلاء الکفرة وصفوا بانهم یقتلون الذین یامرون بالقسط وهم ناصروا الحق"

مگر یہاں خصوصی طور پر ان لوگوں کا ذکر ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کیا، اور انبیاء کرام کو شہید کیا اور ان لوگوں کو قتل کیا جنہوں نے انہیں انصاف کرنے کا حکم دیا۔ جب دین حق کی امداد کرنے والوں کو انہوں نے شہید کیا تو ان کا کوئی مددگار نہ رہا، حدیث شریف سے اس طرف اشارہ ملتا ہے

"ولا یوجد فیهم ناصر یحول بینهم وبین قتل اولئک الکرام فقوبلوا لذلک بعذاب لا ناصر لهم منه معین لهم فیه"

ان لوگوں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا، کیونکہ مکرم لوگوں کو ان کا قتل کرنا ایسا عظیم جرم ہوگا کہ ان کی مدد کرنے میں یہ جرم حائل ہوگا، اس وجہ سے ان کا کوئی مدد کرنے والا، اور کوئی معاونت کرنے والا نہیں ہوگا، بلکہ یہ عذاب کے مستحق ہوں گے۔

(روح المعانی)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"اولئک" اسم اشارہ ہے، اس کا مشار الیہ وہی صفات ذمیمہ والے لوگ ہیں جن کا ذکر پچھلی آیۃ کریمہ میں "ان الذین یکفرون بآیات اللہ .. الخ" سے کیا ہے۔ پھر "الذین" موصول کے ذریعے خبر زیادہ بہتر ہے بنسبت فعل کے خبر دینے کے، کیونکہ اس میں انحصار کی قسم پائی گئی ہے۔ پھر موصول کا صلہ فعل اس پر دلالت کر رہا ہے کہ یہ سامع کو معلوم تھا، اور اس کے نزدیک پہلے ہی معین تھا، پھر جب موصول کا صلہ وہ اسم لایا جائے جس کا علم مخاطب کو پہلے ہی حاصل تھا تو وہ منسوب ہوگا اس مخبر عنہ کی طرف جو موصول سے شروع کیا گیا، فعل میں یہ صورت نہیں پائی جا سکتی تھی۔

حاصل کلام یہ ہے ﴿اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ﴾ جب ذکر کیا تو اسی سے واضح کر دیا گیا کہ یہ وہی لوگ ہیں جن کا ذکر پچھلی آیۃ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِآیَاتِ اللّٰهِ﴾ میں آچکا ہے۔ (البحر المحیط)

❊❊❊❊❊❊❊❊❊❊❊❊❊❊❊❊❊❊❊

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتَابِ یُدْعَوْنَ اِلٰی کِتَابِ اللّٰهِ لِیَحْکُمَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ۝﴾ (آیۃ نمبر ۲۳)

(1) کیا تم نے انہیں نہ دیکھا جنہیں کتاب کا ایک حصہ ملا، کتاب اللہ کی طرف بلائے جاتے ہیں کہ وہ ان کا فیصلہ کرے، پھر ان میں کا ایک گروہ اس سے روگرداں ہو کر پھر جاتا ہے۔

(2) کیا آپ نے نہیں دیکھا انہیں جنہیں دیا گیا ایک حصہ کتاب سے، بلایا جاتا ہے ان کو اللہ کی کتاب کی طرف تاکہ وہ فیصلہ کرے ان کے درمیان پھر پھر گیا ایک فریق ان میں سے وہ ہیں ہی پھرنے والے۔

ماقبل سے تعلق:

جب پچھلی آیات میں یہود و نصاری کی سرکشی اور عناد کا ذکر کیا ﴿فَاِنْ حَآجُّوْکَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِیَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ﴾ تو اگر وہ جھگڑا کریں آپ سے تو آپ فرما دیں میں نے جھکا لیا ہے اپنی ذات کو اللہ کیلئے۔ اور میری تابعد

اری کرنے والوں نے (بھی اپنے آپکو جھکا لیا ہے) اب اس آیۃ کریمہ میں ان کی سرکشی اور عناد کی انتہاء کو بیان کیا جا رہا ہے کہ وہ کتنے ہی زیادہ سرکش تھے کہ دعوی ان کا یہ تھا کہ ہمارا اپنی اپنی کتابوں پر ایمان ہے۔ جب ان کو کسی مسئلہ پر دلیل پیش کرنے کیلئے یہ کہا جاتا ہے کہ تم توراۃ لے آؤ، تو وہ اس سے اعراض کر لیتے ہیں۔ (از کبیر)

شان نزول:

آیۃ کریمہ کے شان نزول میں چند وجوہ کو ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ چند واقعات کے بعد یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی جو ان تمام وقعات کو شامل ہے۔ اس لحاظ پر سب ہی مجموعی طور پر اس کا شان نزول ہیں۔

(ا) ایک وجہ اس آیۃ کریمہ میں یہ بیان کی گئی ہے کہ یہود میں سے ایک مرد اور ایک عورت نے زنا کیا۔ وہ دونوں بڑے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ توراۃ کے مطابق ان دونوں کو رجم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ اس مقدمہ کا فیصلہ کرانے کیلئے نبی کریم ﷺ کے پاس آئے۔ آپ نے بھی ان کے حق میں رجم کا فیصلہ کیا تو انہوں نے اسے تسلیم نہ کیا۔ حضور ﷺ نے انہیں توراۃ لانے کیلئے ارشاد فرمایا تو انہوں نے اس میں کج روی (ٹیڑھی چال) سے کام لیا، تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی آیئے پورا واقعہ حدیث پاک سے دیکھئے۔

❁ "عن عبد الله بن عمر قال ان رسول الله ﷺ اتی بیهودی ویهودیة قدزنیا فانطلق رسول الله ﷺ حتی جاء یهود فقال ما تجدون فی التورة علی من زنا قالوا نسود وجوههما ونحملهما ونخالف بین وجوهما ویطاف بهما قال فاتوا بالتوراة ان کنتم صادقین فجاء وا بها فقرأ وها حتی اذا مروا بآیة الرجم وضع الفتی الذی یقرأیده علی آیة الرجم وقرأ مابین یدیها وما ورائها فقال له عبد الله بن سلام وهومع رسول الله ﷺ مره فلیر فع یده فرفعها فاذا تحتها آیة الرجم فامربهما رسول الله ﷺ فرجما قال عبد الله بن عمر کنت فیمن رجمهما فلقد رایته یقیها من الحجارة بنفسه" (مسلم ج ۲ باب حد الزنا)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، ایک یہودی مرد اور یہودیہ عورت نے زنا کیا نبی کریم ﷺ کو یہود نے فیصلہ کرنے کے متعلق کہا، تو آپ نے فرمایا کہ (اس قسم کے) زنا کی حد توراۃ میں کیا ہے؟ تو وہ کہنے لگے ہم زانی مرد اور عورت کا منہ کالا کر دیتے ہیں، ان کو (گدھے پر) سوار کر دیتے ہیں۔ ایک کا منہ آگے اور ایک کا پیچھے کر دیتے ہیں، ان کو (گلیوں مین) پھیر دیتے ہیں، حضور ﷺ نے فرمایا توراۃ لے آؤ اگر تم سچے ہو، وہ توراۃ لے آئے۔ اسے پڑھنا شروع کیا۔ جب آیۃ رجم پر پہنچے۔ تو پڑھنے والے جوان نے اس پر ہاتھ رکھ لیا۔ اس سے آگے پیچھے پڑھ دیا۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ موجود تھے۔ انہوں عرض کیا یا رسول اللہ آپ اسے حکم

دیں کہ یہ اپنا ہاتھ یہاں سے ہٹائے۔ جب اس نے اپنا ہاتھ ہٹایا تو اس کے نیچے آیۃ رجم تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کو رجم کرنے کا حکم دے دیا۔ تو ان کو رجم کر دیا گیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں۔ رجم کرنے والوں میں بھی موجود تھا۔ میں نے اس شخص کو دیکھا جو اپنا چہرہ پتھروں سے بچا رہا تھا۔

خیال رہے کہ وہ یہودی ذمی تھے۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ان کے متعلق فیصلہ کیا۔ ذمی کفار اگرچہ احکام شرع کے پابند تو نہیں ہوتے لیکن ان پر حدود اس لئے جاری کی جاتی ہیں کہ ملکی نظام درست رہے اس میں کوئی بگاڑ نہ پیدا ہو اور یہ بھی خیال رہے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے بتانے سے نبی کریم ﷺ کے علم کی نفی نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کو خود بھی معلوم ہو اور حضرت عبداللہ بن سلام نے بھی بتا دیا ہو۔ دوسری روایت میں آتا ہے"۔

❁ "عن البراء بن عازب قال مر علی النبی ﷺ بیهودی محمما مجلودا فدعاهم فقل هکذا تجدون حدالزانی فی کتابکم قالوانعم فدعا رجلامن علمائهم فقال انشدک بالله الذی انزل التوارة علی موسی علیه السلام اهکذا تجدون حدالزانی فی کتابکم قال لا ولولاانک نشدتنی بهذا لم اخبرک نجده الرجم ولکنه اکثر فی اشرافنا فکنا اذااخذنا الشریف ترکناه واذااخذنا الضعیف اقمنا علیه الحد قلنا تعالوا فلنجتمع علی شئی نقیمه علی الشریف والوضیع فجعلنا التحمیم والجلد مکان الرجم فقال رسول الله ﷺ اللهم انی اول من احیی امرک اذ اماتوه فامربه فرجم" (مسلم ج ۲ کتاب الحدود)

حضرت براء بن عازب ﷺ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کے قریب سے ایک یہودی کو گذارا گیا جس کا چہرہ سیاہ کیا گیا تھا۔ اسے چھتراؤ کیا جا رہا تھا، تو آپ نے یہود کو بلایا تو فرمایا کیا تم اپنی کتاب میں زانی کی حد یہی پاتے ہو؟ انہوں نے کہا ہاں آپ نے ان کے علماء میں سے ایک عالم کو بلایا، اور فرمایا، میں تم سے اس اللہ کی قسم دلا کر پوچھتا ہوں جس نے موسیٰ علیہ السلام پر توراۃ کو نازل کیا، کیا اسی طرح تم زانی کی حد اپنی کتاب میں پاتے ہو؟ اس شخص نے کہا نہیں۔ اگر تم مجھ سے قسم دلا کر سوال نہ کرتے تو میں تمہیں خبر نہ دیتا کہ ہم (اپنی کتاب میں) رجم پاتے ہیں لیکن ہمارے بڑے لوگ زیادہ اس فعل کے مرتکب ہوتے، تو ہم بڑے لوگوں کو رجم کرنا چھوڑ دیتے اور غریب لوگوں پر ہم حد نافذ کر دیتے، ہم نے کہا آؤ ہم کسی ایک حد پر اتفاق کر لیں جو بڑوں اور گھٹیا لوگوں سب پر جاری کر دیا کریں تو ہم نے اس پر اتفاق کر لیا کہ رجم (سنگسار) کرنے کے بجائے منہ کالا کر دیا کریں اور چھتراؤ کر دیا کریں، تو رسول اللہ ﷺ نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا اے اللہ! سب سے پہلے تیرے حکم کو میں زندہ کر رہا ہوں، جسے ان لوگوں نے مار دیا تھا (ختم کر دیا تھا) تو آپ نے دونوں کو رجم کرا دیا۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ حضور ﷺ نے خود ہی ارشاد فرمایا کیا تم اپنی کتاب میں یہی حد پاتے ہو؟ یہود کے کہنے پر کہ ہم یہی حد اپنی کتاب میں پاتے ہیں، آپ نے ان کے ایک عالم کو رب تعالیٰ کی قسم دلا کر سوال کیا۔ یہ سب کچھ اسی وجہ سے تھا کہ آپ کو علم تھا۔

(۲) آیۃ کریمہ کے شان نزول کی دوسری وجہ یہ بیان کی گئی کہ نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ یہود کے مدرسہ میں تشریف لے گئے تو ان کو دعوت اسلام دی تو وہ کہنے لگے "علی ای دین انت" ؟ تم کس دین پر ہو؟ تو آپ نے فرمایا "علی ملة ابراهیم" میں ملت ابراہیمی پر ہوں۔ تو انہوں نے کہا، ابراہیم علیہ السلام تو یہودی تھے، فقال صلی الله علیه وسلم هلموا الی التوراة "فابوا ذلک فانزل الله تعالی هذه الایة" تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم میرے پاس توراۃ لے آؤ، تو انہوں نے انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیۃ کریمہ نازل فرمائی۔

(۳) آیۃ کریمہ کے شان نزول میں تیسری روایت یہ بیان کی گئی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی بعثت کی علامت توراۃ میں مذکور تھی، اور نبی کریم ﷺ کی نبوت کے صحیح ہونے کے دلائل موجود تھے، نبی کریم ﷺ نے ان کو فرمایا تم توراۃ لے آؤ، اس میں میری نبوت کی نشانیاں اور دلائل دیکھ لو، تو انہوں نے توراۃ لانے سے انکار کیا، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا۔

> "والمعنی انهم اذا ابوا ان یجیبوا الی التحاکم الی کتابهم فلا تعجب من مخالفتهم کتابک فلذلک قال الله تعالی "قل فاتوا بالتوراة فاتلوها ان کنتم صادقین"
>
> مطلب یہ ہوا کہ نبی کریم ﷺ کو تسلی دی گئی کہ جب وہ لوگ اپنی کتاب سے فیصلہ کرانے پر رضامند نہیں تو آپ اس پر تعجب نہ کریں کہ وہ قرآن پاک پر ایمان کیوں نہیں لاتے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ فرما دو، تم توراۃ لے آؤ۔ اس کی تلاوت کرو، اگر تم سچے ہو۔

شان نزول کی اس روایت کے مطابق واضح ہو گیا کہ توراۃ میں وہ دلائل موجود تھے جو نبی کریم ﷺ کی نبوت کے صحیح ہونے پر دلالت کر رہے تھے، "اذلو علموا انه لیس فی التوراة مایدل علی صحة نبوته لسارعوا الی بیان مافیها ولکنهم اسروا ذلک" کیونکہ اگر نہیں یہ معلوم ہوتا کہ توراۃ میں آپ کی نبوت کی صحت پر کوئی دلائل موجود نہیں تو وہ بہت جلدی اسے بیان کرتے، لیکن وہ خاموش رہے اور اسے مخفی رکھا۔

(۴) شان نزول کی چوتھی روایت یہ ہے کہ یہ حکم یہود و نصاریٰ میں عام ہے، اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کی نبوت پر

دلائل توراۃ وانجیل میں موجود تھے، جب ان کو توراۃ وانجیل کے حکم کو ماننے کی دعوت دی جاتی تو وہ انکار کر دیتے تو اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا گیا۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿اَلَمْ تَرَ﴾ ''کیا آپ نے نہیں دیکھا''

یہ خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے، آپ کو تعجب دلانے کیلئے یہ ارشاد فرمایا، اور یہ احتمال بھی ہے کہ ہر وہ شخص جو دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اسے ہی خطاب ہو کہ اے دیکھنے والو کیا تم نے اہل کتاب کے حال کو نہیں دیکھا، وہ کتنے ہی برے لوگ ہیں جو اپنی کتاب کا فیصلہ بھی تسلیم نہیں کرتے۔ (از روح البیان)

﴿اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتَابِ﴾ ''ان کی طرف جن کو دیا گیا حصہ کتاب کا۔''

کتاب کا ایک حصہ دیئے جانے کا کیا مطلب؟ جبکہ ان کو مکمل کتاب دی گئی تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کو کتاب آدھی دی گئی یا کتاب میں سے کچھ حصہ دیا گیا کچھ نہیں دیا گیا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو کتاب کا کچھ علم دیا گیا۔ (کبیر)

اس کی اصل وجہ یہ بیان کی گئی (**نصیبا**) ای **نصیبا حقیرا حیث لا نصیب لهم من بطون الکتاب ولا من الایمان بجمیع مافیه**'' یعنی ان کو کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا، کیونکہ ان کو کتاب کے ظاہر کا علم دیا گیا، وہ روح کتاب کو نہ سمجھ سکے اور نہ ہی کتاب کے تمام احکام پر انہوں نے ایمان لایا۔ (مظہری)

رسول اللہ ﷺ کے اوصاف ان کی کتاب میں تھے، آپ کی نبوت کے دلائل مذکور تھے، لیکن ان کا ایمان نہ لانا اس پر دلیل تھی کہ گویا کہ وہ اس سے محروم رکھے گئے۔ ''**من الکتاب**'' اس مقام پر ''کتاب'' سے مراد کون سی کتاب ہے؟ اس سے مراد عام ہے یعنی توراۃ اور انجیل دونوں ہی مراد ہیں، کیونکہ آیۃ کریمہ میں یہود اور انصار دونوں فریقوں کا ذکر ہے۔ (از کبیر)

﴿يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتَابِ اللّٰهِ﴾ ''بلایا جاتا ہے ان کو اللہ کی کتاب کی طرف۔''

ایک قول اگرچہ یہ بھی ہے کہ ''**کتاب اللہ**'' سے مراد اس مقام میں قرآن پاک ہے، اگرچہ بظاہر اس پر اعتراض بھی وارد ہے کہ جب ان کا ایمان ہی قرآن پاک پر نہ تھا تو ان کو قرآن پاک کی طرف بلانے کا کیا مقصد ہے؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ جب ان پر یہ حجت قائم ہوگئی کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، ان کو انکار کی گنجائش نہ رہی

تو ان کو دعوت دی گئی کہ آؤ قرآن پاک سے فیصلہ کرا لیتے ہیں۔لیکن اکثر مفسرین کرام نے یہ بیان کیا ہے کہ اس مقام میں "کتاب الله" سے مراد "توراۃ" ہے انہوں نے اس پر دلائل بھی قائم کئے ہیں۔

(۱) شان نزول کی تمام روایات اس پر دلالت کر رہی ہیں "ان القوم کانوا یدعون الی التوراۃ فکانوا یابون" کہ بیشک قوم یہود کو توراۃ کی طرف بلایا جاتا تھا، وہ اس کا انکار کرتے تھے۔

(۲) نبی کریم ﷺ نے ان کی سرکشی اور ان کے اعراض کرنے پر تعجب کیا۔

"والتعجب انما یحصل اذاتمر دوا عن حکم الکتاب الذی یعتقدون فی صحته ویقرون بحقیته"
آپ کو تعجب اسی وقت سے حاصل ہوا کہ جب انہوں نے اس کتاب سے سرکشی کی اور انکار کیا جس کے حق ہونے کا وہ اقرار کرتے تھے، اور اس کی صحت کا عقیدہ رکھتے تھے، وہ کتاب توراۃ ہی تھی۔

(۳) یہاں "کتاب الله" سے مراد "توراۃ" لینا ہی زیادہ مناسب ہے کیونکہ ماقبل آیۃ سے یہی متعلق ہے۔پہلی آیۃ کریمہ میں ذکر فرمایا ﴿فَاِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلٰغُ﴾ آپ پر صرف پہنچا دینا ہے۔ضمناً اس سے یہ بیان کر دیا گیا "واصبر علی ما قالوا فی تکذیبک مع ظهور الحجة" کہ آپ صبر کریں اس پر جو وہ آپ کی تکذیب کرتے ہیں باوجود حجت کے ظاہر ہونے کے۔

اور آیۃ کریمہ سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ توراۃ میں جب دلائل موجود تھے جو نبی کریم ﷺ کی نبوت پر دلالت کر رہے تھے، تو ان کا ان دلائل کو چھپانا اور آپ کی نبوت کا انکار کرنا ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے تھا۔"فهذا یدل علی انهم فی غایة التعصب والبعد عن قبول الحق" اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہود بڑے متعصب تھے، اس وجہ سے حق کو قبول کرنے سے دور تھے۔ (از کبیر)

﴿لِیَحْکُمَ بَیْنَهُمْ﴾ "تاکہ فیصلہ کرے ان کے درمیان"

"فالمعنی لیحکم الکتاب بینهم" مطلب اس کا یہ ہے کہ کتاب ان کے درمیان فیصلہ کرے۔فیصلہ کرنے کی نسبت کتاب کی طرف مجاز ہے جیسا کہ قرآن پاک کو بشیر ونذیر مجازی طور پر کہا گیا ہے حقیقی طور پر بشیر ونذیر نبی کریم ﷺ ہیں۔ (از کبیر وروح البیان)

نکته: "بینهم" سے یہ مسئلہ واضح ہوا "ان الاختلاف کان واقعا فیما بینهم لا فیما بینهم وبین رسول الله ﷺ" کہ اختلاف ان کا آپس میں تھا، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے جب یہ فرمایا کہ تم توراۃ لاؤ تو کچھ لوگ آپ

کے ساتھ ہو گئے، اپنے علماء کو کہنے لگے تو راۃ لاؤ، کچھ ان کے اصحاب علم انکار کرنے لگے۔اس مقام میں یہود اور نبی کریم ﷺ کے اختلاف کو ذکر نہیں کیا گیا۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ﴾

''پھر پھر گیا ایک فریق ان میں سے، وہ ہیں ہی پھرنے والے''

یعنی جب ان کو کتاب لانے کی دعوت دی گئی تو ''یتولی فریق منهم وهم الرؤساء الذین یزعمون انهم هم العلماء'' ایک فریق ان میں سے پھر گیا، وہ ان کے رئیس لوگ (وڈیرے) تھے، جو یہ گمان کرتے تھے کہ علم والے صرف ہم ہی ہیں۔

''**وهم معرضون**'' میں دو احتمال ہیں، ایک یہ ہے کہ ﴿ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ﴾ سے مراد ان کے رئیس اور علماء ہوں، اور ''وهم معرضون'' سے مراد باقی لوگ ہوں جو علماء کے تابع تھے۔اب اس صورت میں معنی یہ ہوگا ''ثم یتولی العلماء والاتباع معرضون عن القبول من النبی ﷺ لاجل تولی علمائهم'' کہ علماء پھر گئے، اور ان کے متبعین بھی نبی کریم ﷺ کی نبوت کو ماننے سے پھر گئے کیونکہ جب ان کے علماء پھر گئے تو ان کی وجہ سے یہ لوگ بھی پھر گئے۔لیکن دوسرا احتمال یہ ہے ''ان المتولی والمعرض هو ذلک الفریق'' کہ دونوں جملوں کا مطلب ایک ہی ہے، یعنی جو فریق پھرنے والا ہے، جس کا ذکر ﴿ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ﴾ سے کیا، وہی فریق ''وهم معرضون'' کا مصداق بھی ہے کہ ''وہی پھرنے والے ہیں''

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ اسی دوسرے احتمال کے مطابق ہے ''پھر ان میں کا ایک گروہ اس سے روگرداں ہو کر پھر جاتا ہے۔راقم نے بھی تقریباً اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ سے ہی نقل کیا'' پھر پھر گیا ایک فریق ان میں سے وہ ہیں ہی پھرنے والے۔

یہود نے کلی طور پر اعراض کیا:

اسی آیۂ کریمہ سے یہ بھی ثابت کر دیا کہ یہود مکمل طور پر نبی کریم ﷺ کے دلائل سے اعراض کرنے والے تھے، اور ضمناً نبی کریم ﷺ کو بھی تسلی دے دی گئی تا کہ آپ ان کے اعراض سے پریشان نہ ہوں۔

''یعنی انهم معرضون عن استماع سائر الحجج فی سائر المسائل والمطالب، کانه

قیل لاتظن انتم تولوا عن هذه المسالة بل هم معرضون عن الکل"

یعنی وہ مکمل طور پر تمام دلائل کے سننے سے اعراض کرتے ہیں کسی مسئلہ کو اور کسی مطلب کو بھی سننے، ماننے کی کوشش نہیں کرتے۔گویا کہ نبی کریم ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے یہ فرمایا گیا کہ آپ ان لوگوں کے ایک مسئلہ میں اعراض کرنے کو نہ دیکھیں کہ انہوں نے اعراض کیوں کیا ہے، یہ تو ہر مسئلہ میں اعراض کرنے والے ہیں۔ (ماخوذ از ...)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ وَّغَرَّهُمْ فِیْ دِیْنِهِمْ مَّا کَانُوْا یَفْتَرُوْنَ۝﴾ (آیۃ نمبر ۲۴)

(۱) یہ جرأت انہیں اس لئے ہوئی کہ وہ کہتے ہیں ہرگز ہمیں آگ نہ چھوئے گی مگر گنتی کے دنوں، اور ان کے دین میں انہیں فریب دیا اس جھوٹ نے جو باندھتے تھے۔

(۲) یہ اس وجہ سے تھا کہ بیشک انہوں نے کہا ہرگز نہیں مس کرے گی ہمیں آگ مگر چند دن گنتی کے اور ان کو دھوکا دیا ان کے دین میں اس نے جو وہ افتراء (من گھڑت قول، جھوٹ) باندھے تھے۔

﴿ذٰلِکَ﴾ "یہ"

"ذٰلِکَ" کا مشار الیہ (جس کی طرف اشارہ کیا جائے) کیا ہے؟ اکثر مفسرین کرام نے بیان کیا ہے کہ اشارہ ماقبل مذکور "التولی" اور "الاعراض" کی طرف ہے۔اگر چہ ان کا ذکر قریب ہے لیکن اشارہ بعید استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ کبھی کسی گھٹیا چیز کو مقام حضور سے دور سمجھتے ہوئے اشارہ بعید لایا جاتا ہے، خواہ وہ قریب ہی ہو۔

اب مطلب یہ ہوگا کہ ان کا یہ گھٹیا فعل یعنی اعراض کرنا، پیٹھ پھیرنا اس وجہ سے تھا کہ انہوں نے کہا ہرگز نہیں مس کرے گی ہمیں آگ مگر چند دن گنتی کے۔

"اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ" اور علامہ محمد علی صابونی رحمہ اللہ":

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے "ذلک" کا ترجمہ مع مشار الیہ کے بیان کے یہ کہا ہے "جرأت انہیں اس لئے ہوئی" آپ

کا ترجمہ تفسیر صابونی کے عین مطابق ہے، آیئے تفسیر صابونی کی عبارت دیکھئے اور کنز الایمان کے حسن کو دیکھئے:

﴿ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ﴾ ای انما حملھم وجرأھم علی مخالفة الحق افتراؤھم علی اللہ فیما ادعوہ لانفسھم،انھم انما یعذبون فی النار سبعة ایام عن کالف سنة فی الدنیا یوما"

ان کو ابھارا، ان کو جرأت دلائی حق کی مخالفت پر ان کے اللہ تعالی پر جھوٹ باندھنے نے، جوانہوں نے اپنے لئے دعوی کیا کہ ہمیں تو صرف چند دن یعنی سات دن عذاب ہوگا، ان کا عقیدہ یہ تھا کہ دنیا سات ہزار سال تک رہے گی، ہر سال کے بدلے ہمیں ایک دن عذاب دیا جائے گا۔ (صابونی)

راقم نے "ذٰلِکَ" کا مشار الیہ ترجمہ میں ذکر نہیں کیا تا کہ طلباء کرام تفاسیر کے مختلف اقوال کو دیکھ کر جس پر چاہیں محمول کر لیں۔

﴿بِاَنَّھُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ﴾

"بسبب اس کے کہ بیشک انہوں نے کہا ہر گز نہیں مس کرے گی ہمیں آگ مگر چند دن گنتی کے۔"

"ای حاصل لھم بسبب ھذاالقول رسخ اعتقادھم لہ وھو نوابہ الخطوب ولم یبالو امعہ بارتکاب المعاصی والذنوب" (روح المعانی)

یعنی ان کا حق سے پیٹھ پھیرنے اور اعراض کرنے کی وجہ یہ تھی کہ ان کے دلوں میں یہ بات کامل طور پر راسخ ہو چکی تھی کہ ہمیں عذاب چند دن ہونا ہے۔ وہ سات دن ہوگا۔ یا ہمارے آباء واجداد نے بچھڑے کی عبادت چالیس دن کی تھی۔ اسی کی مقدار ہمیں چالیس دن عذاب ہوگا۔ ان کے اس عقیدہ (کہ ہمیں عذاب چند دن ہوگا) نے ان کو عذاب سے بے خوف کر دیا تھا۔ انہیں نافرمانیوں اور گناہوں کے ارتکاب کے کوئی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔

﴿ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْا﴾ بسبب قولھم ذلک فھونوا علی انفسھم جمیع الموبقات من قتل الا بنیاء و عصیانھم وغیر ذلک"

جب ان کا عقیدہ اس بات پر راسخ ہو گیا کہ ہمیں عذاب تو صرف چند دن ہونا ہے تو ان پر تمام وہ کام "جو عذاب کا سبب تھے اور تباہ کن تھے" آسان ہو گئے۔ یہاں تک کہ انبیاء کرام کو وہ شہید کرنے لگے۔ اور ہر قسم کے گناہوں کا ارتکاب کرنے لگے۔

آجکل بھی لوگوں کو بے دین بنانے کیلئے یہود کی ذریت معنوی ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے، کوئی پل صراط کا انکار کر کے لوگوں کو بے خوف بنانے کی کوشش میں ہے، اور کوئی عذاب قبر کا انکار کر کے لوگوں کو بے خوف بنا کر رب

تعالی سے دور کر رہا ہے، کوئی فوت ہونے کے بعد قبر میں زندگی کا انکار کر کے لوگوں کو بے دین بنا رہا ہے کہ بس انسان مر گیا تو مر گیا، پھر کوئی عذاب نہیں اور کوئی راحت نہیں کوئی جنت و دوزخ کا ہی انکار کر رہا ہے،

اے مسلمانو! یہودیوں کی معنوی اولاد سے ہوشیار رہو، بے دینوں کے شکنجے میں پھنس کر کے اپنے آپ کو رب تعالی اور اس کے رسول ﷺ کا باغی نہ بناؤ۔

"والا هتمام بامر الایمان والعمل انما یکون باعتقاد دوامه او اطول مدته"

ایمان اور عمل کا انسان اسی وقت اہتمام کر سکتا ہے جب اس کا عقیدہ یہ ہو کہ کافروں کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے عذاب ہونا ہے، ان کے عذاب نے ختم نہیں ہونا، جب یہ عقیدہ ہوگا تو وہ ایمان پر قائم و دائم رہے گا، اور جب یہ عقیدہ ہوا کہ گنہگار کو بھی رب تعالی نے اگر اپنی گرفت میں لے لیا تو اس کے گناہ کے مطابق اسے عذاب دیا جائے گا، وہ عذاب بھی طویل ہوگا، تو انسان یقیناً گناہوں سے بچنے کی کوشش کرے گا، اگر غلطی سے گناہ کا ارتکاب ہو گیا تو وہ اس پر نادم ہوگا، رب تعالی کے عذاب سے ڈر کر توبہ کرے گا۔

مذہب اہلسنت:

اللہ تعالی اگر مؤمن کو اپنے فضل سے معاف فرمادے، کسی قسم کی گرفت (پکڑ) اس پر نہ کرے تو اس کی مہربانی ہے۔"ان العفو جائز حسن من الله تعالی" بیشک اللہ تعالی کی طرف سے معاف کرنا جائز ہے اور حسن ہے۔ اگر مستحق عذاب کو کچھ دیر کیلئے عذاب دے کر اللہ تعالی معاف فرمادے تو یہ اس کی مرضی اور فضل ہوگا اگر گناہوں کے مطابق کسی کو مکمل عذاب دے کر جہنم سے نکال دے تو یہ عدل ہوگا۔ یہ سب مؤمنوں کیلئے ہے، لیکن کفار کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے عذاب ہوگا، ان کو جہنم سے نہیں نکالا جائے گا۔

معتزلہ کا مذہب:

اگر کسی مسلمان کو عذاب دینے کیلئے جہنم میں داخل کر دیا گیا تو اسے نکالا نہیں جائے گا یہ مذہب عقل و نقل کے خلاف ہے۔ معتزلہ کی دلیل یہی آیۃ ہے کہ بنی اسرائیل نے کہا ہمیں چند دن عذاب ہوگا۔ رب تعالی نے ان کی مذمت بیان کی تو پتہ چلا کہ کسی کو جہنم میں داخل کر کے نہیں نکالا جائے گا۔ یہ دلیل ان کی باطل ہے اس لئے کہ بنی اسرائیل نبی کریم ﷺ کی تکذیب کرنے اور باطل نظریات وعقائد رکھنے کی وجہ سے کافر ہو گئے تھے۔ کافر کا عذاب دائمی ہوگا۔ اور ان کا یہ عقیدہ نہیں تھا کہ ہمیں عذاب ہمیشہ نہیں ہوگا، بلکہ کچھ دیر عذاب ہوگا جو اللہ تعالی چاہے گا ان کا تو عقیدہ

یہ تھا کہ ہمیں چند معین دن عذاب ہوگا، ان کا یہ عقیدہ ان کو کافر بنانے کیلئے کافی تھا۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ﴾

''اور دھوکا دیا ان کو ان کے دین میں جو وہ افتراء (جھوٹ) باندھتے تھے۔''

"(والغرور) هو الاطماع فيما لا يحصل منه شئ" ایسی چیز میں طمع کرنا جو حاصل نہ ہو سکے اسے غرور (دھوکا) کہا جاتا ہے۔ (والافتراء) اختلاق الكذب، جھوٹ گھڑنے کو "افتراء" کہا جاتا ہے۔

اب مطلب یہ ہوا کہ ان کو جھوٹ گھڑنے، افتراء باندھنے نے ان کے دین میں ایسی چیزوں کی طمع دلائی جو ان کو حاصل نہیں تھیں۔ (معالم التنزیل للبغوی)

ان کا افتراء کیا تھا؟

وہ مختلف جھوٹ گھڑتے رہتے تھے، ایک تو اسی آیہ کریمہ میں ذکر کر دیا گیا کہ وہ یہ کہتے تھے ہمیں صرف چند دن گنتی کے عذاب ہوگا، وہ کہتے تھے ہمیں سات دن یا چالیس دن عذاب ہوگا اور وہ یہ کہتے تھے کہ ﴿نَحْنُ اَبْنَآءُ اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾ ہم اللہ تعالیٰ کے بیٹے (معاذ اللہ) ہیں، اور اس کے محبوب ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ رب تعالیٰ اپنے محبوبوں کو ہمیشہ جہنم کے عذاب میں رکھے گا نہیں نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ بلکہ جسطرح محبوبوں کو معمولی سرزنش کی جاتی ہے، وہ دائمی نہیں ہوتی بلکہ عارضی ہوتی ہے، اسی طرح ہمیں بھی چند دن گنتی کے سرزنش کی جائے گی۔

اور ان کا افتراء یہ تھا کہ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام سے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ ان کی اولاد کو عذاب نہیں دے، ہاں البتہ صرف اتنا عذاب ہوگا کہ اس کی قسم پوری ہو جائے جو اس نے پل صراط سے گذارنے کی قسم اٹھا رکھی ہے، اور ان کا افتراء یہ تھا کہ ہم حق پر ہیں اور تم باطل راہ پر ہو۔ یہ سب ان کے جھوٹے اور من گھڑت دعوے تھے، جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ (خازن وروح المعانی)

تنبیہ: دین کو اپنی رائے کے مطابق کرنے کی کوشش طریقہ یہود ہے، کہ توراۃ کے سخت احکام سے پھر جاتے تھے اور اپنی مرضی کے مطابق احکام واضع کرتے رہتے تھے۔ **مسلمانوں** کو چاہئے کہ اس سے عبرت پکڑیں، دین اسلام کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش نہ کریں بلکہ اپنے آپ کو دین اسلام کے مطابق ڈھالیں۔ کبھی اسلامی پردہ کی مخالفت، عورتوں کی آزادی کے دعوے، دفاتر میں عورتوں کو مردوں کے سامنے بٹھانا، بظاہر

عورتوں پر مہربانی کی جارہی ہے لیکن حقیقت میں بے حیائی کو فروغ دیا جارہا ہے۔اسی طرح سودی کاروبار کو فروغ دینے کیلئے مختلف حربے استعمال کئے جارہے ہیں، جو تمام غیر شرعی طریقے ہیں۔ بظاہر معاشیات کو ترقی دینے کے دعوے ہیں لیکن حقیقت میں سودی کاروبار کی بے برکتی نے ملک کو قرضوں میں جکڑ کر کنگال کر دیا ہے۔کبھی پوتے کو وارث بنانے کیلئے غیر شرعی طریقوں کا سہارا لینا بھی درحقیقت اسلام کو اپنے تابع بنانے کے ناجائز ہتھکنڈے ہیں۔ پوتے کا وارثت میں کب حصہ ہوتا ہے،اور کب نہیں،اس کی تفصیل ان شاء اللہ چوتھے پارہ میں آئے گی۔ (ماخوذ از تفسیر نعیمی)

اے مسلمان! تیری کامیابی صرف مصطفےٰ کریم ﷺ کے تابعداری میں ہے۔ یہود ونصاری کے تابعداری چھوڑ دے،ورنہ ذلیل ہوتا رہے گا،آج تو عراق اور کابل کو دیکھ ذرا اور سمجھنے کی کوشش کر جن لوگوں نے یہود ونصاری سے یاری لگائی رب تعالی نے انہیں کے ہاتھوں مسلمانوں کو کتنی بڑی سزا دی،تصور کرنے پر بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، یہود ونصاری کی زیر قیادت جہاد کرنے والے کبھی مجاہدین کے لقب سے پکارے جاتے تھے،لیکن رب تعالی کو نام نہاد جہادی تنظیموں کا کردار پسند نہ آیا کہ تم میری مرضی کے خلاف یہود ونصاری سے ملکر،ان کی زیر قیادت جہاد کررہے ہو،یہ کون سا جہاد ہے کہ بعض کافروں سے یاری لگانا اور بعض کافروں کو قتل کرنا،رب تعالی جب ان پر ناراض ہوا تو وہی جو مجاہدین کہلاتے تھے ان کو دہشت گرد کہلایا گیا،یہ سب رب تعالی کو ناراض کرنے اور یہود ونصاری کو خوش کرنے اور آئندہ مسلمانوں کو قتل کرنے کے منصوبے کے کرشمے ہیں۔

❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀

﴿فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنَاهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ٥﴾ (آیۃ نمبر ۲۵)

(1) تو کیسی ہوگی جب ہم انہیں اکٹھا کریں گے اس دن کیلئے جس میں شک نہیں اور ہر جان کو اس کی کمائی پوری بھر دی جائے گی اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔

(2) تو کیسے (حال) ہوگا جب جمع کریں گے ہم ان کو اس دن کہ نہیں شک اس میں، اور پورا پورا دیا جائے گا ہر نفس کو جو اس نے کسب کیا، اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

یہ خطاب نبی کریم ﷺ اور آپ کی امت کو ہے جس میں یہود و نصاری کے قیامت میں حال سے تعجب دلایا گیا ہے کہ اللہ تعالی پر افتراء باندھنے والے، معاصی کے ارتکاب میں جرأت کرنے والے یہود و نصاری کا "فکیف یکون حالھم" کیسا حال ہوگا۔ (قرطبی)

اس دن جس میں ہم ان کو جمع کریں گے، جس میں کوئی شک نہیں، وہ قیامت کا دن ہے جس نے یقیناً واقع ہونا ہے۔ پورا پورا ہر نفس کو بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کسب کیا، خواہ شر عمل کیا یا خیر عمل کیا اور ان پر کسی قسم کا کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا، یعنی نہ کسی کے برے عمل کا زیادہ عذاب دیا جائے گا اور نہ ہی کسی اچھے عمل کے ثواب میں کوئی کمی کی جائے گی۔ (از خازن و مدارک)

❁ "روی ان اول رأیة ترفع یوم القیامة من رأیات الکفر رأیة الیهود فیفضحهم الله عزوجل علی رؤس الاشهاد ثم یامر بهم الی النار" (تفسیر ابی السعود)

روایت بیان کی گئی کہ قیامت کے دن کفر کے جھنڈوں میں سے سب سے پہلے یہود کا جھنڈا بلند کیا جائے گا، ان کو تمام لوگوں کی موجودگی میں رسوا کیا جائے گا، پھر ان کے متعلق حکم دیا جائے کہ ان کو آگ میں داخل کر دو۔

تنبیه اکثر مفسرین کرام نے "فکیف" کی تفسیر "فکیف یکون حالھم" (تو کیسے ہوگا ان کا حال) سے کی ہے، راقم نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔ تفسیر تبصیر الرحمٰن نے یوں تفسیر بیان کی "فکیف یصنعون لفضیحتھم علیه" ان کی کیسی رسوائی ہوگی، وہ اس رسوائی کے وقت کیا کریں گے، اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے۔ روح المعانی میں (فکیف) تهویل وهدم" سے بھی تفسیر کی گئی ہے، ان کی ہولناکی کیسے ہوگی، ان کی ذلت کیسے ہوگی۔

اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ روح المعانی کے مطابق بھی ہے، کیونکہ آپ کا ترجمہ (تو کیسی ہوگی) یعنی کیسی

رسوائی، کیسی ہولناکی اور کیسی ذلت ان کی ہوگی۔

بندہ اپنے رب تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو:

جب عدل قائم ہوگا تو ہر نفس کو اس کے عمل کے مطابق پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، اور اگر رب تعالیٰ نے فضل فرمایا تو وہ گنہگار کو جہنم سے نکال کر بخش دے گا، جیسا کہ ایک روایت میں مذکور ہے۔

"انه اذا كان يوم القيامة وسكن اهل الجنة الجنة و اهل النار النار اذابصوت حزين ينادى من داخل النار يا حنان يا منان يا ذاالجلال و الاكرام فيقول الله تعالى يا جبريل اخرج هذاالعبد الذى فى النار قال فيخرجه اسود كفرخ الحمام قد تناثرلحمه و ذاب جسمه فينادى يا جبريل لا توقفنى بين يدى الله فافزع فيئوتى به الى الله فيقول له عبدىٰ اتذكر ذنب كذا و كذا فى سنة كذا و كذا؟فيقول نعم يا رب،فيقول الله اذهبوا بعبدى الى النار ،فيكون من العبد التفات،فيقول الله ردوا عبدى الى فيرد اليه،فيقول له عبدى ما كان التفاتک وهواعلم،فيقول يا رب اذنبت ولم اقطع رجاء ى منک،وحاسبتنى ولم اقطع رجائى منک،واد خلتنى النار ولم اقطع رجاء ى منک،واخرجتنى منها اليک ولم اقطع رجاء ى منک ثم رددتنى اليها ولم اقطع رجاء ى منک،فيقول الله تبارک وتعالى وعزتى و جلالى و ارتفاعى فى علومكانى لأكونن عند ظن عبدى بى و لأحققن رجاء ه فى،اذهبو بعبدى الى الجنة"

جب قیامت کا دن ہوگا، جنت والے جنت میں ٹھہرا دیئے جائیں گے اور آگ والے آگ میں ڈال دیئے جائیں گے، تو آگ سے ایک غمناک آواز آئے گی "یا حنان ،یا منان ،یا ذاالجلال و الاكرام" رب تعالیٰ فرمائے گا، اے جبریل اس میرے بندے کو آگ سے نکالو، تو اسے آگ سے نکال لیا جائے گا، وہ کوے کے چھوٹے بچے کی طرح سیاہ رنگ کا ہو چکا ہوگا، اس کا گوشت اس کے جسم سے جھڑ (گر) چکا ہوگا، وہ بندہ کہے گا اے جبریل مجھے میرے رب کے سامنے نہ کھڑا کرنا، میں اپنے رب سے بہت گھبرا رہا ہوں لیکن جبریل اسے (رب تعالیٰ کے حکم کے مطابق) رب تعالیٰ کے پاس لے آئیں گے۔ رب تعالیٰ فرمائے گا، اے میرے بندے! کیا تو فلاں فلاں سال کے اپنے فلاں فلاں گناہ جانتا ہے؟ تو بندہ (اعتراف کرتے ہوئے) کہے ہاں میرے رب (میں جانتا ہوں) تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا اس میرے بندے کو آگ کی طرف لے جاؤ، تو وہ بندہ آگ کی طرف جاتے ہوئے پیچھے مڑ مڑ کر دیکھے گا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا اس میرے بندے کو واپس لوٹاؤ، اسے واپس لوٹا دیا جائے گا، تو رب تعالیٰ سب سے زیادہ جاننے کے باوجود اس سے سوال کرے گا اے میرے بندے تو پیچھے مڑ مڑ کر کیوں دیکھ رہا تھا؟ وہ کہے گا اے میرے رب مجھ

سے گناہ تو سرزد ہو گیا تھا لیکن میں تیری رحمت سے نا امید نہیں ہوا تھا، تو نے مجھ سے حساب لیا لیکن میں نے تیری رحمت سے امید کو ختم نہیں کیا تھا، تو نے مجھے آگ میں ڈال دیا لیکن میں نے تیری رحمت سے امید کو نہیں توڑا تھا، تو نے مجھے جہنم سے اپنی طرف نکال لیا تو میں نے تیری رحمت سے امید کو منقطع (توڑا) نہیں کیا، پھر تو نے مجھے آگ کی طرف لوٹا دیا لیکن میں نے تیری رحمت کی امید کو نہ توڑا، رب تعالی فرمائے گا مجھے میری عزت اور میرے جلال اور میری بلندی شان کی قسم میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق ہوں گا، اور میں اپنے بندے کی امید کو ضرور بر ضرور پورا کروں گا، (اے میرے فرشتو) اس میرے بندے کو جنت کی طرف لے جاؤ۔

خدایا بعزت که خوارم مکن بذل بزه شرمسارم مکن

اے میرے رب تجھے تیری عزت کا واسطہ مجھے ذلیل وخوار نہ کرنا، اور گناہوں میں میرے مبتلاء ہونے کی وجہ سے مجھے شرمسار نہ کرنا۔ (ماخوذ از روح البیان)

❁ "قال رسول الله ﷺ لیس علی اھل لااله الاالله وحشة عند الموت ولا فی قبورھم ولا فی منشرھم کانی باھل لااله الاالله ینفضون التراب عن رؤوسھم وھم یقولون الحمد الله الذی اذھب عنا الحزن"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا "لااله الاالله" پڑھنے والوں کو موت کے وقت قبر میں جاتے وقت اور قبروں سے اٹھاتے وقت کوئی وحشت حاصل نہیں ہوگی۔ گویا کہ میں بھی "لااله الاالله" پڑھنے والوں سے ہوں گا، وہ قبروں سے اٹھیں گے سروں سے مٹی جھاڑتے ہوئے، اور وہ کہہ رہے ہوں گے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ﴾ سب خوبیاں اللہ تعالی کے لئے جس نے ہمارا غم دور کیا"

اسلئے مؤمن کیلئے یہ ضروری ہے وہ اہل بدعت میں داخل نہ ہو بلکہ اللہ تعالی نے اسے جو ہدایت دے رکھی ہے وہ اس پر اللہ تعالی کی حمد کرے، اور اپنے آپ کو نبی کریم ﷺ امت شریفہ میں کامل مسلمان بنا کر رکھے۔

اسی وجہ سے بیان کیا گیا ہے برے انجام کی علامات یہ ہیں کہ بندے کو رب تعالی نے جو ایمان وتوحید عطاء کر رکھے ہیں ان کا وہ شکر یہ ادا نہ کرے، جو لوگ دنیا میں رب تعالی کی نعمتوں کا شکر یہ ادا نہ کر کے دھوکے میں مبتلاء ہو جاتا ہے۔ تو قیامت کے دن وہ اسی دھوکے میں مبتلاء ہونے کی وجہ سے اسے اس کے عمل کے مطابق بدلہ دیا جائے گا۔ "فلیس لھم عنایة رحمانیة" ان کو عنایت رحمانیہ حاصل نہیں ہوگی۔ بندے کو کامل امید اس وقت حاصل ہو گی، جب اس کے عمل نیک ہوں گے، کامل لوگ وہی ہیں جو تزکیہ نفس میں مبالغہ کرتے ہیں اور ہمیشہ برے انجام سے خوف رکھتے ہیں اور اللہ تعالی کی رحمت کی امید کرتے ہیں۔

"فکیف بنا ونحن متور طون فی آبار الاوزار لاتوبة لنا ولااستغفار غیر العناد والاصرار"

ہمارا حال کیسا ہوگا کہ ہم گناہوں کے کنوؤں کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں، نہ ہمیں توبہ حاصل ہے نہ ہی استغفار حاصل ہے، اگر حاصل ہے تو عناد اور گناہوں پر قائم رہنا۔ علامہ غزالی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب منہاج العابدین میں ذکر فرمایا ہے، کہ توبہ کے تین مقدمات ہیں۔

(۱) ایک ان میں سے یہ ہے "احداها ذکر غاية قبح الذنوب" گناہگار شخص گناہوں کی بہت زیادہ قباحت کو یاد کرے۔

(۲) "والثانية ذکر غاية عقوبة الله تعالی والیم سخطه وغضبه الذی لا طاقة لک به"

ان میں سے دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ اللہ تعالی کے عذاب کو یاد رکھے اور یہ یاد رکھے کہ اللہ تعالی ناراضگی اور اس کے غیظ وغضب کے درد کو برداشت کرنا میرے لئے مشکل ہوگا۔

(۳) "والثالثة ذکر ضعفک وقلة حیلتک فان من لا یحتمل حر الشمس ولطمة الشرطی وقرص نملة کیف یحتمل حر نار جهنم وضرب مقامع الزبانية ولسع حیات کاعناق البخت وعقارب کالبغال خلقت من النار فی دار الغضب والبوار"

اور تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو بہت ہی کمزور سمجھے، اور یہ سمجھے کہ میرے حیلے کوئی حیثیت نہیں رکھتے، جب میں دھوپ کی گرمی کو برداشت نہیں کرسکتا، پولیس کے سپاہی کے ایک تھپڑ کو برداشت نہیں کرسکتا، اور چیونٹی کے ڈنگ کو برداشت نہیں کرسکتا، تو جہنم کی شدید گرم آگ کی تپش کو کیسے برداشت کرسکوں گا، اور زبانیہ فرشتوں کے گرزوں کی ضرب کو کیسے برداشت کروں گا، بختی اونٹوں کی لمبی لمبی گردنوں کی طرح بڑے اور لمبے سانپوں کے ڈنگ کس طرح برداشت کروں گا، اور خچر کی طرح بچھوؤں کے ڈنگ کیسے برداشت کروں گا، جو پیدا ہی جہنم کی آگ سے کئے گئے ہیں۔ یہ عذاب جہنم کے مقام دار غضب اور دار بوار میں حاصل ہونے ہیں، "نعوذ بالله من سخطه وعذابه" اللہ کی پناہ اس کی ناراضگی اور اس کے عذاب سے۔ **راقم** کی بھی یہی دعاء ہے کہ اے اللہ اپنا فضل وکرم فرمانا، ہم گنہگار ہیں تو غفار ہے، ستار ہے۔

مرا باید چوں طفلاں گریست ز شرم گناہاں زطفلانہ زیست

مجھے بچوں کی طرح رونا چاہئے گناہوں سے شرم کرتے ہوئے بچوں کی زندگی بسر کروں۔

نکو گفت لقمان کہ نازیستن بہ از سالہا بر خطا زیستن

کتنا اچھا لقمان حکیم نے کہا ہے زندہ نہ رہنا اس سے بہتر ہے کہ کئی سال گناہوں کی زندگی بسر کرے۔

(ماخوذ از روح البیان)

چند مذاهب باطلہ:

جیسا کہ واضح ہو چکا ہے کہ یہود ونصاری نے دین اسلام کی مخالفت صرف سرکشی اور عناد کی وجہ سے کی، ایسے ہی کئی باطل مذاہب کی دراو مدار بھی سرکشی اور عناد پر ہی ہے جنہوں واضح چیزوں کا انکار کیا، حقائق اشیاء کے خلاف نظریات باطلہ کو سمجھنے سے پہلے اس مسئلہ میں اہل سنت کا مذہب سمجھا جائے۔

قال اهل الحق حقائق الاشياء ثابتة: اھل حق کا مذہب یہ ہے کہ حقائق اشیاء ثابت ہیں۔

حقيقة الشی وماهيته مابه الشئ هوهو:

ایک چیز کی حقیقت اور ماہیت "مابه الشی هو هو" کو کہتے ہیں "مابه الشئی هو هو" کا مطلب یہ ہے کہ یہ چیز ذاتیات کے بغیر نہیں پائی جاسکتی، جیسے انسان کا وجود حیوانیت اور ناطقیت کے بغیر نہیں۔ چونکہ انسان کا وجود اس کے ضاحک اور کاتب ہونے (ہنسنے اور لکھنے) پر موقوف نہیں، لھذا ضاحک اور کاتب ہونے کو انسان کے 'عوارض' کہا جائے گا۔ "مابه الشئی هو هو" نہیں کہا جائے گا۔ ایک چیز مختلف اعتبارات سے مختلف نام رکھتی ہے، "مابه الشی هو هو" کے باعتبار تحقق ووجود کے حقیقت کہا جائے گا، اور باعتبار تشخص کے "هوية" کہا جائے گا۔ اور تحقق یا تشخص سے قطع نظر اسے "ماھیت" کہا جائے گا۔

"هوية" کے تین معانی ہیں۔ (۱) ماہت شخصیہ (۲) وجود خارجی (۳) تشخص۔

یہاں یہ بھی خیال رہے کہ 'ثبوت، وجود، تحقق، کون' مترادف الفاظ ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ "حقائق الاشياء ثابتة" جملہ کا کوئی مطلب نہیں نکلتا، اس لئے کہ حقیقت کا معنی بھی ثابت ہونا، اور "ثابتة" کا معنی بھی ثابت ہونا، تو اس کا مطلب تو یہ ہوگا "الامور الثابتة ثابتة" 'جو امور ثابت ہیں وہ ثابت ہیں' اس جملہ کا کیا مطلب ہے؟

اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ ہم پہلے اعتقاد رکھیں گے کہ حقائق اشیاء پائی گئی ہیں، پھر ان کے نام رکھیں گے 'انسان، فرس، سماء، ارض' کہ یہ چیزیں نفس الامر میں موجود ہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے رب تعالی کا نام "واجب الوجود" مانتے ہیں، پھر ہم کہتے "واجب الوجود موجود" واجب الوجوب موجود ہے۔ اس مختصر تمہید کے بعد کچھ باطل مذاہب کو دیکھیں، سب سے پہلے یہ سمجھ لیں کہ 'دین اسلام' اللہ تعالی کا دین ہے، باقی تمام باطل دین لوگوں کے من گھڑت ہیں، کہاں باری تعالی کا دین اسلام، اور کہاں ادیان باطلہ، نتیجہ لازمی طور پر یہی نکلتا ہے کہ لوگوں کے من گھڑت دین باطل ہیں، رب تعالی کے دین

اسلام سے انہیں کوئی نسبت نہیں۔

عنادیہ فرقہ: ان لوگوں کا مذہب یہ ہے ''اشیاء کی حقیقتیں موجود نہیں، ان کا گمان یہ ہے کہ سب چیزیں وہمی اور خیالی ہیں، اس فرقہ والوں نے معاذ اللہ اللہ تعالیٰ کا وجود بھی وہمی اور خیالی قرار دیا ہے، اور انبیاء کرام کو بھی وہمی اور خیالی کہا ہے، غرضیکہ ان کے نزدیک ہر چیز وہمی اور خیالی ہے۔

عندیہ فرقہ: ان لوگوں کا مذہب یہ ہے کہ ہر چیز ہمارے اعتقاد کے تابع ہے، اگر ہم کسی چیز کے جوہر ہونے کا اعتقاد کرلیں تو وہ جوہر ہوگی، اور اگر ہم کسی چیز کے عرض ہونے کا اعتقاد کرلیں تو وہ عرض ہو جائے گی، اگر ہم کسی چیز کے قدیم ہونے کا اعتقاد کرلیں تو وہ قدیم ہو جائے گی، اگر ہم کسی چیز کے حادث ہونے کا اعتقاد کرلیں تو وہ حادث ہو جائے گی۔

لاادریہ فرقہ: یہ لوگ کہتے ہیں کسی چیز کے ہونے یا نہ ہونے کا کوئی علم نہیں، سب میں شک پایا جاتا ہے، بلکہ اس فرقہ والوں کا عجیب مذہب باطل یہ ہے کہ یہ اپنے شک میں بھی شک کرتے ہیں، یہ تینوں فرقے سوفسطائیہ ہیں، یعنی من گھڑت حکمت کے دعویدار، یہ وہ فلاسفہ ہیں جو دین سے برگشتہ (پھرے ہوئے) ہیں، ان کے رد کیلئے ہی علماء اہل سنت نے فلسفہ پڑھا اور فلسفی دلائل سے ہی ان کا رد کیا۔

اہلسنت کے مذہب حق پر دلائل:

اہلسنت نے کہا کہ یہ بدیہی بات ہے کہ بعض چیزوں کا ثبوت "عیان" (ظاہر) سے ہے، جیسا کہ زمین کو دیکھنا اور سورج کو دیکھنا اور بعض چیزوں کا ثبوت ''بیان'' سے یعنی خبر متواترہ سے کئی چیزوں کا ثبوت ہے، جس طرح مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ، جن لوگوں نے نہیں دیکھا وہ بھی مانتے ہیں کہ یہ دونوں مبارک شہر موجود ہیں، کیونکہ انہوں نے کثیر لوگوں سے سن رکھا ہے، جس کے انکار کی گنجائش نہیں۔ اور بعض چیزوں کے موجود ہونے کا دلائل کی وجہ سے یقین آجاتا ہے۔

الزامی جواب: جب بعض چیزوں کا ثبوت واضح ہے جیسے سورج اور چاند، تو ان کی نفی کا قول باطل ہو گیا جب نفی باطل ہے تو ثبوت واضح ہو گیا، اسی سے واضح ہو گیا'' حقائق الاشیاء ثابتة'' چیزوں کی حقیقتیں ثابت ہیں۔

باطل نظریات والوں کے باطل دلائل:

وہ کہتے ہیں حسی چیزیں حواس سے معلوم ہوتی ہیں اور حس سے کئی مرتبہ غلطی ہو جاتی ہے، جس طرح بھینگا

شخص ایک کو دو دیکھتا ہے۔ اور صفراوی مرض والا شخص میٹھی چیز کو کڑوا پاتا ہے۔ لیکن ان جہلاء کو یہ پتہ نہ چل سکا کہ عوارضات یا مرض کی وجہ سے احکام علیحدہ ہوتے ہیں اور صحت کی حالت میں اور عارضہ سے محفوظ صورت میں احکام علیحدہ ہوتے ہیں، اور ان لوگوں کی باطل دلیل یہ ہے کہ بدیہی چیزوں میں بھی اختلاف ہوتا ہے لھذا بدیہی چیزوں کے وجود کا بھی کوئی یقین نہیں ہوتا۔

ان کی یہ دلیل بھی باطل ہے کیونکہ کسی چیز کی طرف تصور کا نہ پایا جانا اس کے وجود کی نفی نہیں کرتا۔

لاادریہ فرقہ سے مناظرہ ممکن نہیں:

کیونکہ وہ ہر چیز کے وجود کا انکار کرتے ہیں، وہ یہی کہتے ہیں ہم نہیں جانتے کہ یہ موجود ہے یا نہیں۔ ان سے مناظرہ کا صرف یہی طریقہ ہے کہ ان کو کسی سوٹے سے خوب مارا جائے، اگر وہ سوٹے کے وجود کا اقرار کرلیں تو ٹھیک ہے، ورنہ ان کی پٹائی جاری رکھی جائے، اور یہی کہا جائے کہ تمہارے مذہب کے مطابق ہم پر کوئی گناہ نہیں، ہم تو وہ چیز چلا رہے ہیں جس کے وجود کا تمہیں کوئی علم نہیں۔ (ماخوذ از شرح عقائد ونبراس)

متواتر خبر علم یقین کا فائدہ دیتی ہے:

متواتر خبر وہ ہے جو اول زمانہ سے لے کر بعد تک اتنے آدمیوں سے سنی گئی ہو جن کا جھوٹ پر متفق ہونا عقلاً محال ہو۔

سمنیہ اور براھمہ فرقے:

یہ دونوں فرقے باطل ہیں، کیونکہ یہ خبر متواتر کا انکار کرتے ہیں۔

سمنیہ: (بضم السین وفتح المیم وقد تسکن) یہ پہلے لوگوں میں پائے گئے ہیں، بت پرست ہیں، یہ اپنے آپ کو ایک بت سومنات کی طرف منسوب کرنے کی وجہ سمنیہ کہلائے۔ سومنات بہت بڑا بت تھا یہ لوگ دور دراز علاقوں سے اس کی طرف سفر کرتے تھے اور گمان کرتے تھے کہ اس میں غیر اختیاری حرکات پائی گئی ہیں، جو شخص اس کی طرف زیارت کیلئے آتا ہے اس کی روح کسی انسان کی طرف ہی لوٹے گی، کسی اور کی طرف نہیں لوٹے گی۔ یہ تناسخ (روح کا کسی انسان کسی حیوان کی طرف منتقل ہونا) سرے سے باطل ہے۔

براھمہ: یہ لوگ اپنے بت برہام کی طرف منسوب تھے، پھر اسی قوم کے ایک سردار برہمن (جس کا نام بت کے نام کی مناسب سے برہمن رکھا گیا) کی طرف منسوب تھے، ہندو قوم تھی۔ (ماخوذ از شرح عقائد ونبراس)

فرشتے، جنات اور نیچری مذہب:

فرشتوں اور جنوں کا نیچری مذہب والوں نے انکار کیا ہے اور اپنی طرف سے منگھڑت تاویلیں پیش کی ہیں اس میں کوئی تعجب نہیں، کیونکہ ہر دور میں حق کے مقابل باطل رہا، لیکن ﴿اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾ بیشک باطل مٹ جانے والا ہے۔ نیچری مذہب کسی وقت زور وشور پر تھا، پھر مٹ گیا، آجکل پھر اس کے پجاری دندنا رہے ہیں، لیکن انشاءاللہ پھر مٹ کر رہیں گے، اسلئے کہ ﴿اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾ معاذ اللہ میرا اور تیرا کلام نہیں بلکہ یہ تو رب قدوس کا کلام ہے جو "اصدق الصادقین" اور "اصدق القائلین" ہے۔

اقسام ملائکہ:

فرشتوں کی چند قسموں کا صراحۃ قرآن پاک میں ذکر کیا گیا ہے، ان کا انکار کرنا ایسے ہی ہے جیسے سورج کا انکار کر دیا جائے۔

(۱) فرشتوں کی ایک قسم حاملین عرش ہیں، جن کا ذکر قرآن پاک نے یوں فرمایا ﴿اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ﴾ (وہ جو عرش اٹھائے ہوئے ہیں)

(۲) دوسری قسم فرشتوں کی یہ ہے جو عرش کے ارد گرد طواف کرنے والے ہیں، ان کے متعلق رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَتَرَى الْمَلَائِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ﴾ اور تم دیکھو گے ان فرشتوں کو جو عرش کے ارد گرد کو ڈھانپے ہوئے ہیں، تسبیح کرتے ہیں اپنے رب کی حمد کے ساتھ۔

(۳) اکابر ملائکہ جن میں جبریل و میکائیل کا خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے، رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكَافِرِيْنَ﴾ جو شخص دشمن ہے اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے رسولوں کا اور جبریل اور میکائل کا تو بیشک اللہ دشمن ہے کافروں کا۔

جبریل کے چند اوصاف قرآن پاک میں ذکر کئے گئے۔

(۱) شدید قوت والا ہونا ﴿عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى﴾ سکھایا آپ کو شدید قوت والے نے۔

(۲) روح امین آپ کا وصف ہے ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ﴾ آپ پر نازل کیا روح امین نے۔

(۳) آپ کا اور لقب "روح قدس" ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ جب تائید دی آپ کو روح قدس کے ذریعے۔

اسرافیل: کا ذکر احادیث میں کثرت سے ہے، ان کے صور پھونکنے کا ذکر قرآن پاک میں موجود ہے ﴿يَوْمَ

یُنۡفَخُ فِی الصُّوۡرِ﴾ جس دن صور پھونکا جائے گا۔ چونکہ احادیث میں بہت واضح طور پر مذکور ہے کہ قیامت کو صور پھونکنا اسرافیل کا کام ہوگا۔

عزرائیل: کا ذکر بھی احادیث پاک میں کثرت سے آیا ہوا ہے، ان کا لقب ملک الموت ہے، جسے قرآن پاک میں بیان کیا گیا ہے ﴿قُلۡ یَتَوَفّٰکُمۡ مَّلَکُ الۡمَوۡتِ الَّذِیۡ وُکِّلَ بِکُمۡ﴾ فرما دو تمہیں فوت کرتا ملک الموت جو تم پر مقرر کیا گیا ہے۔

(۴) ملائکہ کی چوتھی قسم وہ ہے جو عزرائیل کے ساتھ ہوتے ہیں، روح اگرچہ عزرائیل قبض کرتے ہیں لیکن روح کے پٹنے وغیرہ کے کاموں میں وہ معاون ہوتے ہیں، اگرچہ مجازی طور پر وفات کی نسبت ان کی طرف بھی کردی گئی، رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَکُمُ الۡمَوۡتُ تَوَفَّتۡہُ رُسُلُنَا﴾ یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی ایک پر موت آتی ہے تو اس کو ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) فوت کرتے ہیں اور ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَلَوۡ تَرٰۤی اِذۡ یَتَوَفَّی الَّذِیۡنَ کَفَرُوا الۡمَلٰٓئِکَۃُ﴾ کاش کے آپ دیکھتے جب کافروں کو ملائکہ فوت کرتے ہیں (ان کے چہروں اور سرینوں پر مارتے ہیں)

(۵) ملائکہ جنت یہ وہ فرشتے ہیں جو جنت میں جنتی لوگوں کو سلام اور خراج تحسین پیش کرتے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿یَدۡخُلُوۡنَ عَلَیۡہِمۡ مِّنۡ کُلِّ بَابٍ ۞ سَلٰمٌ عَلَیۡکُمۡ بِمَا صَبَرۡتُمۡ فَنِعۡمَ عُقۡبَی الدَّارِ﴾ وہ داخل ہوں گے ان پر ہر دروازہ سے (اور کہیں گے) تم پر سلام ہو کہ تم نے صبر کیا کتنا اچھا ہے آخرت کا گھر۔

(۶) ملائکہ جہنم یہ وہ فرشتے ہیں جو جہنم والے لوگوں پر مقرر ہوں گے، ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿عَلَیۡہَا تِسۡعَۃَ عَشَرَ﴾ اس (جہنم) پر مقرر ہیں انیس (فرشتے) اور ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَمَا جَعَلۡنَاۤ اَصۡحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِکَۃً﴾ اور نہیں بنائے جہنم کے محافظ سوائے فرشتوں کے، یعنی جہنم کے محافظ فرشتے ہی ہیں۔ ان جہنم کے فرشتوں کے سردار کا نام مالک ہے، رب تعالیٰ نے اسے یوں بیان فرمایا ﴿وَنَادَوۡا یٰمٰلِکُ لِیَقۡضِ عَلَیۡنَا رَبُّکَ﴾ اور وہ پکاریں گے اے مالک چاہئے کہ فیصلہ کردے ہم پر تمہارا رب اس کل فریق کا نام زبانیہ ہے، رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿فَلۡیَدۡعُ نَادِیَہٗ سَنَدۡعُ الزَّبَانِیَۃَ﴾ چاہئے کہ وہ اپنے ہم مجلسوں کو بلائے، ہم اپنے زبانیہ کو بلا لیتے ہیں۔

(۷) بنی آدم پر موکل ومحافظ، رب تعالیٰ نے ان کا ذکر یوں فرمایا ﴿عَنِ الۡیَمِیۡنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِیۡدٌ﴾ اور اس کے دائیں اور بائیں ایک محافظ بیٹھا ہے۔ اور ارشاد فرمایا ﴿مَا یَلۡفِظُ مِنۡ قَوۡلٍ اِلَّا لَدَیۡہِ رَقِیۡبٌ عَتِیۡدٌ﴾ آدمی کی ہر بات پر ایک سخت نگہبان ہے اور ارشاد فرمایا ﴿لَہٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡہِ وَمِنۡ خَلۡفِہٖ﴾ اس کے آگے اور پیچھے مقرر

ہیں (فرشتے) (جو اس کے حفاظت کرتے ہیں اللہ کے امر سے) اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً﴾ اور وہ بھیجتا ہے تم پر حفاظت کرنے والے فرشتے۔

(۸) ملائکہ کی آٹھویں قسم وہ ہیں جو لوگوں کے اعمال لکھتے ہیں، جن کا ذکر رب تعالیٰ نے یوں فرمایا ﴿وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِيْنَ ○ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ○ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ○﴾ اور بیشک تم پر مقرر ہیں مکرم لکھنے والے (فرشتے) جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔

(۹) نویں قسم فرشتوں کی وہ ہے جو اس عالم کے احوال پر مقرر ہیں، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی میں وہی مراد ہیں۔ ﴿وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ○ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ○ فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ○ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ○﴾ قسم ہے ان فرشتوں کی جو آندھی چلاتے ہیں، پھر بادل اٹھاتے ہیں، پھر نرم نرم ہوائیں چلاتے ہیں، پھر حصے تقسیم کرتے ہیں۔

فرشتوں کے مختلف اوصاف مذکور ہیں:

قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں فرشتوں کے کئی اوصاف ذکر کئے گئے ہیں۔

وہ اللہ تعالیٰ اور انبیاء کرام کے درمیان واسطہ ہیں، رب تعالیٰ نے اس وصف کو یوں ذکر فرمایا ﴿جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا﴾ ملائکہ کو (انبیاء کرام کی طرف) بھیجا ہوا بنایا گیا۔ اور ارشاد فرمایا ﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا﴾ اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے ملائکہ سے (انبیاء کرام کی طرف) بھیجے ہوؤں کو۔

فرشتے عبادت گذار اور سجدہ کرنے والے ہیں ﴿بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ﴾ بلکہ وہ عبادت گذار مکرم ہیں۔ اور ارشاد فرمایا ﴿يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ﴾ وہ تسبیح بیان کرتے ہیں رات اور دن میں وہ تھکتے نہیں۔

اور ارشاد فرمایا ﴿لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ﴾ وہ سبقت نہیں کرتے اس (رب تعالیٰ) سے بات میں، وہ اس کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ فرشتوں نے صحابہ کرام کی بدر میں امداد کی "رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ﴾ تمہارے رب نے امداد کی تمہاری پانچ ہزار فرشتوں سے جو نشان لگائے گئے تھے۔

فرشتوں کے بازو اور پر ہیں، رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ﴾ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بازو دار بنایا، (پھر بعض کے) دو دو بازو ہیں، بعض کے تین تین اور بعض کے چار چار۔

ملائکہ کی حقیقت:

ملائکہ اجسام لطیفہ ہیں جو مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں، اور بڑے قوی کام کر سکتے ہیں، انبیاء کرام اور اللہ والوں نے ان کو انسانی شکل میں دیکھا ہے، اور دوسری مختلف صورتوں میں بھی دیکھا ہے۔

جن کی حقیقت:

جن کو آگ سے پیدا کیا گیا ہے، وہ مختلف شکلیں بدل لیتا ہے، جنوں میں مذکر ومؤنث پائے جاتے ہیں۔ جنوں کا تذکرہ قرآن پاک میں بہت جگہ میں ہے، سورۃ جن میں تذکرہ ہی جنات کا ہے دو تین جگہ اور دیکھئے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا﴾ کافروں نے خدا اور جنوں میں رشتہ قائم کیا۔ اور ارشاد ہوا ﴿يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ﴾ اے جنوں اور انسانوں کے قبیلے اور ارشاد ہوا ﴿مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ﴾ جنوں اور انسانوں کے شر سے پناہ۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ﴿وَيَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ﴾ وہ کفار جنوں کی عبادت کرتے ہیں۔ اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ﴾ اور نہیں پیدا کیا میں نے جنوں اور انسانوں کو سوائے اس کے کہ وہ میری عبادت کریں۔

شیطان کی حقیقت:

شیطان کو آگ سے پیدا کیا گیا، اس کے مادہ میں ہی ظلمانیت رکھ دی گئی، ابلیس نے آدم علیہ السلام کے مقابل رب تعالیٰ سے کہا ﴿خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ﴾ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اس (آدم) کو مٹی سے۔

تنبیہ: جنوں اور شیطان کی پیدائش آگ سے ہی ہے، اس لئے اصل کے لحاظ پر ایک ہی چیز ہیں، بلکہ جن شیطان کی ہی ذریت (اولاد) ہے۔

جنوں کے مختلف نام:

عرب کے محاورہ میں جنوں پر باعتبار اوصاف کے چند الفاظ بولے جاتے ہیں۔

(۱) جو جن آدمیوں کے ساتھ رہتے تھے ان کو "عامر" کہا جاتا تھا، ہماری زبان میں ان کو "ھمزاد" کہتے ہیں۔

(۲) جو جن چھوٹے بچوں کو ستاتے ہیں، ڈراتے ہیں، دھمکاتے ہیں ان کو "ارواح" کہا جاتا تھا، اہل پسند ان کو بھوت یا آسیب کہتے ہیں۔

(۳) جو خبیث اور سخت تکلیف دینے والے ہیں، ان کو عرب کے محاورہ میں "شیطان" کہا جاتا تھا۔

(۴) اور جو ان سے بھی زیادہ سرکش ہوتے تھے، ان کو "مارد" کہا جاتا تھا۔

(۵) اور جو ان سے بھی زیادہ قوی ہوتے تھے ان کو "عفریت" کہا جاتا تھا۔

(۶) اور جو جنگل میں آواز دیتے ہیں اور چیختے ہیں ان کو "ھاتف" کہا جاتا تھا۔

(۷) اور بعض جو مسافروں کو بھولی ہوئی راہ بتلا دیتے، ان کو "رجال الغیب" کہا جاتا تھا۔

(۸) اور جو جنگلوں میں ''مشعل'' وغیرہ کی شکل میں دکھائی دیتی ہیں ان کو "شھابہ" کہا جاتا تھا۔

(۹) اور جو رات میں یا بعض اوقات میں بیابان جنگلوں میں کبھی چھوٹے چھوٹے لڑکوں کی صورت میں دکھلائی دیتے ہیں، پھر اچانک کسی اور شکل میں تبدیل ہو جاتے ہیں، ان کی پنجابی میں "چھلاوہ" کہا جاتا ہے۔ اہل عرب ان کو "ارواح خبیثه" کہتے تھے، عملیات والے ان کو "بدروح" سے تعبیر کرتے ہیں۔

ابلیس کا ذکر قرآن میں جا بجا ہے، لھذا آیات کریمہ کو جمع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ (ماخوذ از تفسیر حقانی)

نیچری مذہب کی کہانی حقانی کی زبانی:

اصل میں نیچر (نے چر) اگرچہ قدرتی چیزوں پر زیادہ بولا جاتا ہے لیکن جو چیز ''من دھن'' میں آئے اس کے متعلق یہی کہا جاتا ہے کہ فلاں مذہب والے قرآن پاک کو سمجھنے کیلئے اور دین اسلام کو سمجھنے کیلئے مصطفیٰ کریم ﷺ کے اقوال اور صحابہ کرام اور تابعین، اور تبع تابعین اور سلف صالحین کے اقوال کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، بلکہ یوں کہیں کہ وہ ان اقوال کو مانتے ہی نہیں، وہ صرف اسی کو مانتے ہیں جو ان کے ''نیچر'' من، دھن، جی میں آئے۔ (راقم)

جب قرآن پاک کی کثیر آیات فرشتوں کے ایسے حالات پر دلالت کر رہی ہیں کہ وہ کوئی ایسی مخلوق الٰہی ہے جو اور قسم کی ہے، جسم اور افعال میں ہم لوگوں سے بالکل مغائر ہے۔ اب سید احمد خان صاحب ان آیات کی کہاں تک توجیہ کریں گے اور کہاں تک تاویل کر کے اصلی معنی بدل کر ان قوی بتلائیں گے، قرآن پاک بلکہ توراۃ وانجیل اور وید اور وساتیر کے ماننے والے سے یہ امر ناممکن ہے کہ وہ فرشتوں کا انکار کرے، اور ان کو قوی بتلا دے (یعنی سید احمد خان فرشتوں کو نورانی مخلوق نہیں مانتا بلکہ کہتا ہے وہ قوتیں ہیں جن کو ملائکہ کہا گیا ہے) ہاں جو شخص ان کتابوں میں سے کسی کا بھی قائل نہ ہو، اور قدیم اور موجود حکماء کے بھی برخلاف ہو تو وہ جو چاہے سو کرے۔

سید صاحب یا قرآن کا انکار کیجئے یا فرشتوں کا قائل ہو جایئے۔

سرمد گلہ اختصار مے باید کرد　　　یک کار ازیں دو کار مے باید کرد

یاتن برضائے دوست مے بایدداد یا قطع نظر زیارے باید کرد

(اسلام کے خلاف) ہمیشہ گلہ وشکوہ کرتے ہو، اس میں کمی کرلو، دوکاموں میں سے ایک کام کرلو یا اپنے آپ کو رب اور اس کے رسول ﷺ کا بنالو یا ان سے بیزاری کا واضح اعلان کردو۔ (از مقدمہ تفسیر حقانی ص ۱۶)

اسی مضمون کو کسی نے اپنے الفاظ میں یوں پیش کیا۔

دورنگی چھوڑ دے یک رنگ ہوجا سراسر موم یا سراسر سنگ ہو جا
دورنگی چھوڑ دے یک رنگ ہوجا سراسر فقیر یا سراسر ملنگ ہو جا
دورنگی چھوڑ دے یک رنگ ہوجا سراسر مؤمن یا سراسر قادنیوں کے سنگ ہو جا

(راقم)

نیچری مذہب کا ایک اور قول باطل:

فرشتوں کا آدم کو سجدہ کرنا اور شیطان کا نہ کرنا ایک معما ہے کہ جس کا معنی یہ ہے کہ قوی ملکیہ نے آدم کی اطاعت کی اور بھیمہ (چوپاؤں کی صفت) نے نہ کی“

قول باطل کارد:

”سید صاحب“ فرمایئے اگر شیطان آدم کی قوت بھیمہ تھی تو وہ آدم کا وصف بنے گا، پھر اس نے کیا سمجھ کر کہدیا ”کہ میرا مادۂ آتش ہے۔ اور خرابی یہ ہے کہ اس میں اجتماع ضدین لازم آئے گا، کیونکہ جناب نے ملائکہ سے مراد قوت ملکیہ لی اور ان کو آدم کیلئے مسخر بنایا تو اب آدم کی قوت بہمیہ کیا سرکشی کرسکتی ہے، اور قوت ملکیہ کی اطاعت کا کیا مقصد بیان کرو گے؟ اور تمہارا یہ کہنا کہ قوت بہمیہ نے سرکشی کی وہی شیطان ہے یہ سراسر قرآن پاک کے مخالف ہے، اس لئے کہ رب تعالی نے فرمایا ﴿اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطَانٌ﴾ بیشک میرے بندوں پر تجھے کوئی غلبہ حاصل نہیں ہوگا۔ اس آیۂ کریمہ سے بہت واضح ہے کہ اللہ کے بندوں پر شیطان کو غلبہ حاصل نہیں۔ اور تمہارے قول کے مطابق قوت بھیمہ ان پر غالب نہیں، پھر یہ بھی کہنا کہ آدم کی قوت بھیمہ نے آدم کی نافرمانی کی اور آدم کی قوت ملکیہ نے آدم کی نافرمانی کی اور آدم کی قوت ملکیہ نے آدم کی اطاعت کی۔ کیا یہ قرآن پاک کی تحریف معنوی نہیں تو اور کیا ہے؟ حقیقی معانی کو چھوڑ کر بغیر کسی قرینہ اور بغیر کسی وجہ کے مجازی معانی بیان کرنا عقل ونقل کے مخالف ہے۔

اگر یہی حال رہا تو سارے قرآن پاک کو معاذ اللہ اپنی مرضی سے بیان کرنا لازم آئے گا، جو جی میں آیا وہی

کہہ دیا، نماز ادا کرنے کا مطلب ہے، دعاء کر لیا کرو، روزہ رکھنے کا مطلب ہے، کچھ دیر کیلئے باتوں سے رک جایا کرو، چور مرد اور عورت کے ہاتھ کاٹنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی سرزنش کرو، وہ چوری سے باز آجائیں، اس طرح اس کے چوری کرنے سے ہاتھ کٹ جائیں گے۔ (معاذ اللہ) اس طرح جس کے دل میں جو آئے گا وہی کہتا رہے گا۔ حقانی نے کہا اب میں دیکھتا ہوں کہ جہاں کہیں سید صاحب قرآن کے معنی متعارف چھوڑ کر برخلاف سلف وخلف الگ راہ چلے ہیں اور دل کھولکر کلام الٰہی میں اپنے آزادانہ خیالات کو دخل دیتے ہیں، وہاں کیا قرینہ ہے اور کونسا امر ہے جو معنی متعارف کو (کہ جس کو پیغمبر ﷺ کے ہم زمان وہم زبان سمجھتے آئے ہیں) صحیح نہیں ہونے دیتا؟ اور کونسی مشکل سید صاحب کو پیش آئی جس نے تنہا جمہور اہل اسلام بلکہ کل اہل ادیان یہود وعیسائیوں کے مخالف ہو کر ملائکہ اور جن اور شیطان کے معنی میں یہاں تک تغیر کیا کہ سرے سے کلام ہی کو الٹ پلٹ کر دیا۔ (مقدمہ حقانی ص ۱۹)

تنبیہ: افراط وتفریط سے بچنے والے انسان محفوظ رہتے ہیں، جو افراط وتفریط میں مبتلاء ہوتے ہیں وہی بھٹکنے والے ہوتے ہیں۔ قوت وہمیہ کبھی اس قدر پست ہوتی ہے کہ احکام عقل صرف کو قابل العمل نہیں رہنے دیتی، اسی لئے کبھی یہ ہوتا ہے کہ وہی لوگ جن وملائکہ اپنی وہمی باتوں کو سمجھنے لگتے ہیں، صدہا عورتیں بلکہ بہت سے سادہ آدمی اپنی قوت وہمیہ کے زور سے کسی شے کو جن وبھوت فرض کر لیتے ہیں، اسی سبب سے ان کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم پر جنوں، بھوتوں کا اثر ہے، حالانکہ ان کے وہم کے بغیر کچھ بھی نہیں۔ اور قوت وہمیہ کبھی اتنی بلند ہوتی ہے کہ وہمی لوگ ان امور (چیزوں) کو بے اصل سمجھ کر یہاں تک وہم کے گھوڑے دوڑاتے ہیں کہ درحقیقت ان چیزوں کا صفحہ عالم پر وجود ہی نہیں سمجھتے، اور جو چیز محسوس نہ ہو اس کو لاشے محض کہتے ہیں (یعنی یہ تو حقیقت میں کوئی چیز ہی نہیں) پھر جب اس خیال کو اور زیادہ ترقی ہوتی ہے تو جو چیزیں ان کے نزدیک اسباب ظاہرہ پر مبنی نہ ہوں سب غلط ہو جاتی ہیں، نہ پھر وہ اثر دعاء کے قائل رہتے ہیں، اور نہ کبھی کسی نبی یا ولی کے معجزہ یا کرامت کو حق مانتے ہیں، نہ جنوں اور شیطان کے جداگانہ وجود کو تسلیم کرتے ہیں، نہ وہ خدائے قدیر کی بے انتہاء قدرتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ جو اس درجہ سے بھی زیادہ ترقی کر جاتے ہیں، زیادہ ہی روشن خیال ہو جاتے ہیں وہ ملحد (بے دین) ہو جاتے ہیں، نہ ہی وہ اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ کو مانتے ہیں۔ (از مقدمہ حقانی ص ۲۰)

نیچری اور دہریوں کا اور قول باطل:

یہ کہتے ہیں نہ کوئی خدا ہے، نہ رسول ہے کوئی چیز حلال نہیں، اور کوئی چیز حرام نہیں، نہ قیامت آتی ہے، اور نہ

ہی آخرت میں کچھ جزاء وسزاء۔ ہر زمانہ کے اہل عقل ہی پیغمبر ہیں (العیاذ باللہ) انہوں نے ہی فرضی طور پر جزاء وسزا مقرر کی ہے، اس وقت کی مناسب چیزوں کو فرض کیا اور فرضی جنت کا وعدہ دیا، اور اس وقت کی نامناسب چیزوں کو حرام کیا، اور اس پر فرضی دوزخ اور سزا سے ڈرایا، پھر حد سے وہ یہاں تک بڑھے کہ انہوں نے جھوٹے نبیوں کیلئے جھوٹی نبوت کے دروازے اس باطل نظریے سے کھولے ''کہ نبوت کسی پر ختم نہیں، ہر زمانہ میں، ہر ملک میں، ہر شہر میں، اور ہر قوم میں ایک نبی ہے'' وہ جن باتوں کو حسب زمانہ بہتر بتلادے وہ فرض ہیں، اور جن کو نامناسب سمجھ کر منع کر دے وہ حرام ہیں ہر ملک، اور ہر قوم، اور ہر زمانہ کے واجبات اور محرمات کے احکام الگ ہیں، جو احکام نیچر کے موافق ہیں وہ فرض ہیں ورنہ حرام ہیں، ''العیاذ باللہ من هذہ الکفریات'' یہ سب باتیں دراصل قوت وہمیہ کے افراط سے ہیں، حد سے تجاوز کی وجہ سے وہ کفر والحاد میں مبتلاء ہو گئے۔ (از مقدمہ حقانی ص ۲۰)

سید احمد خان کا جبریل ومیکائیل کا انکار درحقیقت وحی کا انکار ہے:

سید صاحب اپنی تفسیر کے ص ۱۴۰ میں بیان کرتے ہیں ''جبریل ومیکائیل یہودیوں نے فرشتوں کے لئے نام مقرر کیے تھے، ان کے ہاں یہ فرشتے نہایت مشہور فرشتوں میں ہیں، مگر اس کا ثبوت نہیں، کہ کسی نبی نے ان کو بتایا تھا کہ یہ فرشتوں کے نام ہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحف انبیاء میں کوئی صفت صفات باری میں سے کسی خاص لفظ کے ساتھ تعبیر کی گئی تھی، پھر رفتہ رفتہ وہ لفظ فرشتہ کا نام متصور ہونے لگا۔

اس قول کا رد: دیکھئے کتاب دانیال باب نمبر ۸ میں یوں ہے ''ایک آواز آئی کہ اے جبریل اس شخص کو اس رویاء (خواب) کا مطلب سمجھادے'' اگر دانیال آپ کے نزدیک کے نبی نہیں ہیں تو یہ اور بات ہے ورنہ دانیال پیغمبر علیہ السلام کی زبان سے جبریل کا نام صاف معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح انجیل باب ۱۹ میں یوں ہے فرشتے نے خواب میں اس سے کہا میں جبریل ہوں جو خدا کے حضور رہتا ہوں۔ (مقدمہ حقانی ص ۲۱)

الزامی جواب: تمہارا یہ کہنا کہ ''صحف انبیاء...... الخ'' دعوی بلادلیل ہے وہ کونسا صحیفہ ہے کہ جس میں جبریل ومیکائیل کو صفت باری تعالی لکھا ہے، ذرا اس کا تو حوالہ دیجئے۔

سید تمہارا اور یہ کہنا ''رفتہ رفتہ وہ لفظ فرشتہ کا نام متصور ہونے لگا'' یہ آپ کیلئے ہی مضر (نقصان دہ) ہے، کیونکہ جب بقول آپ کے فرشتہ کوئی جداگانہ وجود ہی نہیں رکھتا، تو پھر ان اہل کتاب نے (یہود ونصاری نے) کس چیز کا نام فرشتہ رکھا تھا؟ اگر بالفرض اس صفت کو فرشتے کا نام دے دیا جائے تو فرشتے کی علیحدہ وجود کی نفی

کیسے؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکے گا کہ فرشتے علیحدہ علیحدہ مخلوق ہیں، اور بقول تمہارے، قوت عاقلہ کو بھی فرشتہ کہہ لیا گیا، تمہاری اس بات کو مان بھی لیا جائے تو فرشتوں کا علیحدہ وجود ختم نہیں ہوسکتا، بلکہ تمہارے اپنے قول سے ہی ثابت ہو جائے گا کہ فرشتوں کا علیحدہ وجود ہے جو رب تعالیٰ کی مخلوق ہے۔

تحقیقی جواب: جب قرآن مجید میں لفظ ملائکہ کا انہیں معنی میں استعمال ہوا کہ جن معنی میں یہودی استعمال کرتے ہیں تھے تو الحمد للہ آپ ہی کے اقرار سے فرشتوں کا وجود جداگانہ قرآن پاک سے ثابت ہو گیا، کیونکہ بقول آپ کے یہودی فرشتوں کا جداگانہ وجود اہل اسلام کے عقیدہ کے موافق سمجھتے تھے، اب آپ کا اس معنی سے انکار کرنا قرآن کا انکار کرنا ہے، ہمارے لئے تو اسی قدر کافی ہے کہ قرآن میں لفظ انہیں معنی پر وارد ہے، کو جس کو اہل اسلام نے تسلیم کیا ہے، بلکہ یہود نے بھی یہی معنی تسلیم کیا ہے۔ اب آپ کو اختیار ہے آپ قرآن پاک کو صحیح مان کر فرشتوں کے وجود کو تسلیم کرلو، یا یہود کے نظریات کو صحیح مان کر، فرشتوں کے وجود کو نہ مانو۔ (مقدمہ حقانی ص۲۱)

نیچری مذہب: مگر ہمارے ہاں کے علماء نے بھی یہودیوں کی تقلید سے ان کو فرشتوں کے نام قرار دیئے۔

اس کا رد: سید صاحب یہ طریقہ اچھا نہیں کہ علماء کو یہودیوں کی طرح قرار دینا، علماء کا تو وہ مذہب ہے جو قرآن پاک نے پیش کیا ہے، یہ علیحدہ بات ہے کہ دین اسلام کے مطابق یہودیوں نے بھی فرشتوں کو جداگانہ مخلوق تسلیم کیا ہے۔ (ماخوذ از مقدمہ حقانی ص۲۱)

راقم کا تو موقف ہی یہ ہے کہ سید صاحب نے یہود و نصاریٰ کی بظاہر بعض مقامات میں مخالفت کی آڑ میں کام انہیں کا کیا، نام نہاد مسلمانوں کو ان کے نقش قدیم پر ہی چلایا، قرآن پاک کے غلط مطالب پیش کر کے دین اسلام کا حلیہ بگاڑنے کی ناکام کوشش کی، کیونکہ دین اسلام کا محافظ اللہ تعالیٰ ہے۔

نیچری مذہب:

(جبرئیل) عبری (عبرانی) میں اس کے معنی قوت اللہ یا قدرت اللہ کے ہیں، یہ لفظ دانیال پیغمبر کی کتاب میں آیا ہوا ہے۔ الخ۔ لوقا نے جو انجیل لکھی ہے اس کے پہلے باب میں جبرئیل کا ذکر ہے۔

حقانی: اس سہو و نسیان کا کیا ٹھکانا ہے، ابھی ابھی تو آپ فرما چکے ہیں کہ اس کا ثبوت نہیں، کہ کسی نبی نے ان کو بتایا تھا یہ فرشتوں کے نام ہیں، آپ کو لازم تھا کہ اس پیرانہ سالی میں کہ انسان کے حواس بجا نہیں رہتے، اس بڑی بھاری بات کا بیڑا نہ اٹھاتے کہ تیرہ سو برس کے بعد میں ہی تو ایک ہوں کہ جو قرآن کے اصلی معنی سمجھا ہوں، اور سب

اگلے پچھلے غیر محقق تھے۔ (مقدمہ حقانی ص ۲۱)

نیچری مذہب: فرشتے کوئی علیحدہ مخلوق نہیں، بلکہ ان سے مراد قوی اور صفات باری تعالی ہیں، اگر چہ میکائیل کا ذکر بھی دانیال کی کتاب میں ہے، اور ان کی خوابوں میں یہ لفظ آیا ہوا ہے، مشاہدات یوحنا میں بھی یہ لفظ آیا ہوا ہے۔ نیچری مذہب کے اقوال باطلہ میں اور یہ ہے ''علماء یہود بھی سمجھتے کہ جبرئیل بڑے زبان دان ہیں۔ الخ۔ غالبا اسی سبب سے مسلمانوں نے تصور کیا ہے کہ یہی خدا کی وحی یعنی قرآن کی آیتیں خدا سے سن کر یاد کرتے تھے، اور آنحضرت کو سناتے تھے۔

اس کا رد: باوجود اس اقرار کے کہ انبیاء سابقین ان الفاظ کو انہیں معانی میں استعمال کرتے تھے پھر انکار کی کیا وجہ؟ جبریل کے وحی لانے کے متعلق معاذ اللہ مسلمانوں کا من گھڑت عقیدہ نہیں، بلکہ وہی عقیدہ ہے جو قرآن پاک نے پیش کیا ہے، ارشاد باری تعالی ﴿عَلَّمَهُ شَدِيْدُ الْقُوٰى﴾ اور ارشاد فرمایا ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ﴾ ان آیات کریمہ میں جبریل کے وحی لانے کا ذکر ہی تو ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ جبریل کے وحی لانے کا قول یہود کی تقلید ہے، تو اس سے معاذ اللہ یہ لازم آئے گا کہ جب رب تعالی نے بیان فرمادیا ہے کہ جبریل وحی لاتا ہے، تو وہ یہود کا مقلد ہوگا۔

آیئے حقانی کے الفاظ من وعن دیکھیں ''پھر یہ تقلید یہود کی بدگمانی آپ خدائے پاک پر کریں، آپ کو اختیار ہے، مگر اس قدر عرض باقی ہے کہ جب قرآن مجید بلکہ اس کا منزل (نازل کرنے والا) آپ کے نزدیک ایسا لچر ٹھہرا کہ جس نے ایک غلط امر میں یہودیوں کی تقلید کی، پھر اس کی تفسیر لکھنا، اور اس کو کلام الہی لکھنا اور بے دیکھے خدا کا قائل ہونا محض بے فائدہ ہے۔ (ماخوذ از مقدمہ حقانی ص ۲۱)

نیچری مذہب: بہر حال ہم کو اس میں کچھ شبہ نہیں کہ یہ الفاظ صفات باری پر مستعمل تھے، آخر کو انہیں الفاظ کو فرشتوں کا نام سمجھنے لگے گئے۔

اس کا رد: کاش آپ ایک آدھ جگہ بھی قرآن مجید اور توراۃ وانجیل سے ان الفاظ کر جو فرشتوں پر بولے جاتے ہیں صفات باری تعالی پر استعمال ہونے ثابت کر دیتے، تب تو تمھاری کسی قدر تمہاری بات کو تسلیم کیا جاتا تمھارے عقلی ڈھکوسلے تو نہیں مانے جاسکتے۔ (از مقدمہ حقانی ص ۲۱)

حقانی صاحب نے اگر چہ بطور استفسار (وضاحت طلب کرتے ہوئے) کہا ہے۔'' سید صاحب آپ نے

تو نفی وجود ملائکہ میں بڑی معقول صرف کردی ذرا فرمایئے تو سہی یہ کون سی دلیل ہے جو آپ نے قائم کی "برھان لمی" "یا برھان انی" (مقدمہ حقانی ص ۲۱)

راقم کہتا ہے سید صاحب اور ان کی ذریت معنوی کو کیا پتہ "برھان لمی" کیا ہے، اور "برھان انی" کیا ہے یہ تو دینی مدارس کے طلباء ہی جانتے ہیں کہ علت سے دلیل معلول پر پکڑیں، یعنی حقیقت میں جو علت ہو، اسے ہی قضیہ میں بھی علت بنایا گیا تو "برھان لمی" اور اگر دلیل معلول سے علت پر پکڑی گئی تو "برھان انی" دینی مدارس کے تیسری کلاس کے بچے انشاء اللہ یہ بتائیں گے۔

نیچری مذہب کی دلیل کا کیا کہنا:

دلیل یہ دی گئی "ہم کو کچھ شک نہیں کہ جو الفاظ صفات باری تعالیٰ پر مستعمل تھے آخر کو انہیں الفاظ کو فرشتوں کا نام سمجھنے لگے۔

کیسی باطل دلیل:

یہی دعویٰ اور یہی دلیل" جب دلیل عین دعویٰ ہو، یا جزء دعویٰ ہو، یا مساوی دعویٰ ہو یا جزء مساوی دعویٰ ہو تو اسے مصادرہ علی المطلوب کہا جاتا ہے، جو بالاتفاق مردود ہے۔ باطل دلیلیں پیش کرنا باطل مذہب والوں کا خاصہ ہے۔
(ماخوذ از مقدمہ حقانی ص ۲۲ وحاشیہ جائی)

نیچری مذہب کا بیہودہ کلام:

قرآن مجید میں اس قسم کا کلام غیر مقصود نہایت کثرت سے ہے، مشرکین واہل کتاب کے عندیہ میں بہت سی ایسی باتیں سمائی ہوئی تھیں جن کا دراصل کچھ وجود نہ تھا، یا وجود تھا مگر اس کی جو حقیقت کہ وہ سمجھتے تھے دراصل وہ نہ تھی، یا وہ بات ظاہر میں دکھائی دیتی تھی اور بطور غلط العام یا باعتماد مشاہدہ اسی کو واقعی سمجھتے تھے، حالانکہ حقیت اور اصلیت بر خلاف اس کے تھی، اور قرآن مجید کو اس سے بحث مقصود نہ تھی، اس لئے اس کو اس طرح بیان کیا جس طرح مشرکین اور اہل کتاب خیال کرتے تھے۔

بیہودہ کلام کا رد:

اللہ تعالیٰ کے کلام کو غیر مقصودی کہنا کسی مسلمان کا کام نہیں ہوسکتا۔ قرآن پاک کی آیات کا غیر مقصودی ہونا آپ سے قیامت تک بھی ثابت نہیں ہوسکے گا۔ یوں ٹکریں رجما بالغیب ضعیف الایمان لوگوں کے دل میں شبہ ڈالنے

کیلئے، آپ جو چاہئے کہے جائیے، قرآن پاک کی آیات مقصودی ہیں، غیر مقصودی ثابت کرنا سوائے اسلام سے دور ہونے کے اور کچھ نہیں۔

اس بیہودہ کلام کا رد: قرآن پاک کی آیات مقصودی ہیں، کیونکہ اللہ تعالی کا کلام کبھی غیر مقصودی نہیں ہوسکتا اس میں چند وجوہ سے بات کرنا ممکن ہے۔

(۱) اول یہ کہ ہر کلام کے مقصودی ہونے یا غیر مقصودی ہونے کو سمجھنے کیلئے، اس کلام کو پیش کرنے والے کے ہمزمان وہمزبان ہی لائق ہوتے ہیں، نبی کریم ﷺ کے صحبت یافتوں اور ہر وقت آپ کے پاس بیٹھنے والوں خالص عرب کو (جن کے محاورہ میں قرآن اترا) کبھی غیر مقصودی ہونا معلوم نہ ہوا، اور ان کے بعد سے اب تک کسی ملک میں کسی زبان دان کو یہ بات معلوم نہ ہوئی، اور نہ ہی کسی مفسر کو سوجھی، اگر بیہود بات سوجھی تو تیرہ سو برس بعد ایک ہندی کو سوجھی کہ نہ جس کو صرف سے آشنائی نہ لغت سے تعارف نہ زبان عرب قدیم وجدید سے کچھ مس، اور جس کی عقل سلیم کا یہ حال کہ نہ اس کی دلیل ودعوی میں کچھ ربط نہ اس کو یہ تمیز کہ یہ دلیل میرے دعوی کیلئے مفید ہے یا مضر۔

(۲) دوم ہر کلام کا مقصودی ہونا یا غیر مقصودی ہونا اس کے سیاق وسباق سے معلوم ہو جاتا ہے، جب ان آیات کو دیکھا جاتا ہے تو ان میں غیر مقصودی ہونے کی بو بھی نہیں آتی، بلکہ متعدد جگہ میں نئے نئے اسلوب سے وجود ملائکہ کو بلکہ اعجاز انبیاء کو بیان کیا ہے اور کوئی قرینہ غیر مقصودی ہونے کا ہے ہی نہیں۔

(۳) سوم یہ چیزیں کچھ قرآن ہی میں مزکور نہیں بلکہ ہر کتب سماویہ میں اور ہر نبی کی زبان سے ان کا بیان منقول ہے، پھر اس اتنی بڑی غلطی کو خدائے پاک نے اپنی ہر کتاب میں کیوں دخل دیا۔ اور اس کے انبیاء علیہم السلام نے کیوں غلط وجود کو ثابت کیا۔ کیا لوگوں کو دھوکا دینا منظور تھا (معاذ اللہ) کیا ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ تیرھویں صدی میں سید احمد خان صاحب بہادر دنیا سے نرالے محقق اور فلاسفر ہماری اس دھوکا بازی کو طشت از بام کردینگے؟

(۴) اگر یوں بغیر قرائن ہر کلام کو غیر مقصودی اور مجازی کہہ دیا کریں تو پھر اب سید صاحب کے انکار کا بھی کیا اعتبار ہے کچھ عجب نہیں کہ ملحدوں کیلئے انہوں نے بطور کلام غیر مقصودی کا انکار کر دیا ہو۔ راقم کے نزدیک تو سید صاحب نے کام ہی یہود ونصاری اور ملحدوں کا کیا ہے۔

(۵) ایمان بالغیب میں اول درجہ میں خدا بجمیع صفاتہ، دوم درجہ میں ملائکہ ہیں۔ جیسا کہ رب تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ﴾ جب ملائکہ کا وجود کلام غیر مقصودی سے آپ نے اڑا دیا، تو اب آپ کے شاگرد اللہ

تعالی کے متعلق یہی احتمالات قائم کر کے دہریئے بن رہے ہیں تو اس پر کوئی تعجب نہیں، جیسا تربیت دینے والا ہو گا۔ ایسے ہی اس کے تربیت یافتہ ہوں گے، اس کی ذریت معنوی آجکل روشن خیالی کا پرچم ہاتھ میں لئے دین اسلام کا مزاح اڑا رہی ہے اور عورت کو زیادہ سے زیادہ بے حیا بنانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ (ماخوذ از مقدمہ حقانی ص ۲۳)

نیچری مذہب کی اور ناقص دلیل:

توراۃ اور صحف انبیاء اور انجیل میں فرشتہ کے لفظ کا استعمال نہایت وسیع معنوں میں آیا ہے، کتاب ۲ سموئیل باب ۲۴ ورس ۱۶، ۱۷ میں، اور کتاب ۲ ملوک باب ۱۹ اور زبور داود وباء پر فرشتہ کا اطلاق ہوا، اور زبور داؤد باب ۴ میں ہواؤں پر فرشتوں کا اطلاق کیا ہے۔

اس من گھڑت دلیل کا رد:

یہ دوسری دلیل نفی وجود ملائکہ پر آپ نے قائم کی ہے، خلاصہ یہ کہ لفظ فرشتہ مشترک، اس کے ایک معنی نہیں ہو سکتے، جناب عالی کو اب تک یہ بھی معلوم نہیں کہ اشتراک لفظ کی صفت ہے، یا معنی کی، اب ہم پوچھتے ہیں کون سا لفظ فرشتہ مشترک ہے آیا ملک، یا فرشتہ، یا کوئی اور؟ اور یہ ظاہر ہے کہ تورات وانجیل کی اصلی زبان عبرانی ہے جو فارسی اور عربی سے غیر ہے، اور ملک لفظ عربی ہے اور فرشتہ فارسی ہے۔ میں حیران ہوں کہ عبرانی میں ان دونوں میں سے کون سا لفظ مشترک قرار دیا گیا ہے؟ اگر لفظ فرشتہ ہے تو ہم کو اس کی پرواہ نہیں کیونکہ اس سے ہماری بحث نہیں، قرآن پاک عربی زبان میں ہے فارسی میں نہیں۔

اگر تم کہو کہ ہماری مراد لفظ ملک ہے تو یہ قابل تسلیم نہیں کہ عبرانی میں یہ لفظ ان معانی میں استعمال ہوا ہو جو تم نے بیان کئے۔ اور آپ یہ کہنا کہ کتاب ایوب باب نمبر ا کتاب اول سموئیل باب نمبر ۱۱ اور انجیل لوقا باب نمبر ۷ فرشتہ کا لفظ عام ایلچیوں پر بولا گیا ہے آپ کے تبحر علمی کی دلیل واضح ہے کہ جن مقامات کا آپ نے حوالہ دیا ہے وہاں لفظ فرشتہ بولا ہی نہیں گیا۔ (ماخوذ از مقدمہ حقانی ص ۲۴)

نیچری مذہب کی اور باطل دلیل:

ملائکہ کا اطلاق ان قدرتی قوی پر ہے جن سے انتظام عالم مربوط ہے اور ان شئو نقدرت کاملہ پروردگار پر جو

اس کی ہر ایک مخلوق میں یہ تفاوت درجہ ظاہر ہوتی ہیں، ملائکہ کا اطلاق ہوا ہے سورۃ والنازعات سے اس کا بخوبی ثبوت ہے، اس کے چار جملوں میں مفسرین میں اختلاف ہے مگر پانچواں جملہ ﴿فَالْمُدَبِّرَاتِ اَمْرًا﴾ کی نسبت کسی کو اختلاف نہیں اور جملہ مفسرین متفق ہیں کہ "مدبرات" سے ملائکہ مراد ہیں، پس غور کرنا چاہیے کہ "مدبرات" سے کیا مراد ہے؟ یہی قوی ہیں جن کو خدا تعالی نے اپنی حکمت کاملہ سے تمام امور عالم کا مدبر مخلوق کیا ہے۔

اس باطل دلیل کا رد:

آپ کی اس باطل دلیل میں سب سے زیادہ غلطیاں ہیں، آپ کی پہلی غلطی یہ ہے کہ آپ کے اقوال میں تضاد ہی تضاد ہے، آپ نے اپنے دعوی کو ترک کر دیا ہے آپ نے پہلے بیان کیا ہے کہ ملائکہ "خدا کی صفات پر بولا گیا ہے" اور اب اس سے اعراض کر کے یہ کہہ رہے ہیں کہ ملائکہ سے مراد "قوی مدبرہ عالم" ہیں، اور تھوڑا آگے چل کر جبریل کو تم نے ملکہ نبوت کہہ دیا ہے۔

اب آپ سے پوچھنا یہ ہے کہ ان تینوں باتوں میں سے تمہاری کون سی بات صحیح ہے؟ اگر تم یہ کہو کہ کوئی بات نہیں ان تینوں کا مطلب ایک ہی ہے (جیسا کہ آجکل پڑھے لکھے بے وقوفوں نے دین اسلام کا مزاح ایسے جملوں سے ہی اڑانا شروع کیا ہے "کچھ نہیں ہوتا" کچھ فرق نہیں پڑتا، کچھ مضائقہ نہیں، دین میں تنگی نہیں عورتوں کو شمع محفل بناتے رہو، وغیرہ) تو یہ غلط ہے ان تینوں کا مطلب علیحدہ علیحدہ ہے "ملکہ نبوت، صفات خدا تعالی، قوی مدبر عالم" آپس میں غیر اور مخالف ہیں کیونکہ ملکہ نبوت جس کو تم جبریل کہہ رہے ہے یہ تو نبی کی صفت ہے ہوسکتا ہے بلکہ یقینی بات ہے تمہیں "حال اور ملکہ" دو صفات میں فرق بھی معلوم نہیں کہ حال کیا ہے اور ملکہ کیا ہے یہ تو کسی دینی مدرسہ کے طالب علم سے پوچھئے وہ تمہیں بتائے گا کہ حال کیفیت غیر راسخہ کا نام ہے اور ملکہ کیفیت راسخہ کا نام ہے جب نام ملکہ نبوت ہے تو یہ صفت جبریل کی کیسے یہ تو اسی کی صفت ہے جس کا وہ ملکہ ہے۔ پھر ظاہر بات ہے کہ نبی کی صفت (معاذ اللہ) رب کی صفات کا عین نہیں کیونکہ رب تعالی کی صفات قدیم ہیں اور بندہ کی صفات حادث ہیں۔ پھر قوی مدبرات عالم جو نباتات جمادات حیوانات وغیرہا میں پائے جاتے ہیں ان دونوں سے غیر ہیں اس پریشان بیانی کا کیا ٹھکانا کبھی کیا کہہ دیا کبھی کیا۔

یہ سب غلط بیانیوں کی وجہ سے ہوا، نئی راہ نکالنے، یہود و نصاری اور ملحدین کے کام کرنے نے تمہیں خبط حواسی کا شکار کر دیا کاش کہ تم اسلام کا کام کرتے۔ اور آپ کا یہ کہنا کہ "مدبرات" سے مراد قوی مدبرہ عالم ہیں، یہ بھی دعوی بلا دلیل ہے، اسے کیسے تسلیم کر لیا جائے، وہ بھی اس کی زبان سے جس کا وطیرہ ہی ہرزہ سرائی ہو۔ پھر تمہارا یہ کہنا

کہ ''مدبرات'' سے مراد فرشتے ہیں، یہ تو قابل تسلیم ہے، لیکن یہ کہنا کہ اس سے مراد ''قوی'' ہیں یہ غلط ہے، بلکہ اصل بات یہی ہے کہ ''مدبرات عالم'' وہی ملائکہ ہیں جو عالم کیلئے ایسے ہیں کہ جس طرح جسم کیلئے روح مدبر ہے۔
(ماخوذ از مقدمہ حقانی ص ۲۶،۲۵)

نیچری مذہب کا بیہودہ، جاہلانہ قول:

کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ باوجودیکہ خدا کے پاس ان دو فرشتوں (جبرائیل، اور میکائیل) کے سواء اور بھی بہت سے فرشتے ہیں مگر بجز دو فرشتوں کے اور سب بے نام ہیں، کیونکہ اور کسی کا نام قرآن میں نہیں ان سب باتوں سے صاف پایا جاتا ہے کہ فرشتوں کے نام یہودیوں کے مقرر کیے ہوئے ہیں جو مختلف قوی کو تعبیر کرنے کو انہوں نے رکھ لئے تھے۔ (از مقدمہ حقانی ص ۲۷)

راقم کے نزدیک تو یہ قول جاہلانہ اور احمقانہ ہے کہ یہودیوں نے یہ نام رکھے ہیں، سید صاحب کو قرآن پاک آتا تو یہ نہ کہتے، رب تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ﴾ ہ نام تو رب تعالی نے ذکر فرمائے ہیں، کیا رب تعالی (معاذ اللہ) یہود کا پابند ہے۔ کاش کہ معمولی عقل ہوتی تو یہ کہنا دشوار نظر آتا، جب عقل ہی چھوڑ جائے تو جو چاہو کہتے پھرو، تمہارے منہ کو کون لگام دے سکتا ہے؟ حقانی صاحب کہتے ہیں ''کسی چیز کا نام مذکور نہ ہونے سے اس کے وجود کی نفی لازم نہیں آتی، فوجی دفتر میں آپ کا نام مرقوم نہیں کیا اس سے آپ کے وجود میں کچھ خلل آ گیا؟

نیچری مذہب کا ایک اور بیودہ قول:

﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ﴾ اس آیۃ میں وہ ذکر شروع ہوا ہے جو آدم کا قصہ کہلاتا ہے، تمام مفسرین اس کو ایک واقعی جھگڑا یا مباحثہ سمجھتے ہیں جو خدا اور فرشتوں میں ہوا۔

اس بیہودہ قول کا رد: یہ آپ کا بہتان صریح ہے اہل اسلام میں سے کوئی مفسر ذی علم تو کیا ادنی مسلمان بھی یہ نہیں سمجھتا کہ فرشتوں نے خدا سے مباحثہ یا جھگڑا کیا تھا، کیونکہ خدا تعالی فرشتوں کی نسبت فرماتا ہے ﴿لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ﴾ (وہ نہیں نافرمانی کرتے اللہ کی جو اس نے ان کو حکم دیا، اور کرتے ہیں جو ان کو حکم دیا جاتا ہے) کیا فرشتوں کا سمجھنے کیلئے سوال کرنا جھگڑا ہے؟ آپ ایسی بے بنیاد باتوں سے جملہ علماء اہل اسلام کو بے اعتبار بنانا چاہتے ہیں۔ (از مقدمہ حقانی ص ۲۸،۲۷)

راقم کی ''**نجوم الفرقان**'' کے ''جلد دوم'' کا مطالعہ کریں، سید صاحب کے خیالی باطل اقوال کی احادیث مبارکہ کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رہے گی۔

نیچری مذہب کا انسانیت سے دور باطل قول:

یہی حال فرشتوں کی نسبت ہوا ہے، ان کو نوری سمجھ کر گورا گورا سفید برف کا رنگ نوری شمع کی مانند باہیں بلور کی سی، پنڈلیاں ہیرے کی سے پاؤں ایک خوبصورت انسان کی شکل نہ مرد نہ عورت تصور کیا ہے، حاصل کلام یہ ہے کہ فرشتوں کو نادیدہ جسمانی چیزوں پر خیال کرلیا ہے، اور وہ خیال نسل در نسل چلا آیا، دراصل فرشتے کوئی وجود نہیں رکھتے۔

اس انسانیت سے دور باطل قول کا رد:

یہ تمام گفتگو آپ کی شاعرانہ تک بندی ہے، نہ کوئی مسلمان ان کو بلور کی مانند نہ ہیرے کی مانند سمجھتا ہے، ہاں آپ کے بیہودہ مزاج میں یہ بات آئی ہو تو اور بات ہے، انسانیت سے دور شخصیات سے اس قسم کی باتوں پر کوئی تعجب نہیں
(از مقدمہ حقانی، ص ۲۸)

ورنہ مسلمانوں کا صاف وشفاف عقیدہ یہ ہے '' **الملک جسم نوری یتشکل باشکال مختلفة لایذکر ولایؤنث**'' فرشتے نورانی مخلوق ہے، مختلف شکلوں میں آتے رہتے ہیں، حقیقت میں مذکر ومؤنث نہیں البتہ گھٹیا چیزوں کی شکلوں میں نہیں آتے یعنی کتے وغیرہ کی شکل اختیار نہیں کرتے۔ (راقم)

نیچری مذہب کی شاعرانہ گفتگو:

آسمان ان کے رہنے کی جگہ قرار دی، آسمان سے زمین پر آنے اور زمین سے آسمان پر جانے کیلئے ان کے پر لگائے۔

اس قول کا رد: یہ تو قرآن پاک کے صریح ارشاد کا رد ہے، شائد نیچری مذہب کے سید صاحب کو قرآن پاک آتا ہی نہیں تھا، ورنہ رب تعالیٰ نے فرشتوں کے متعلق ارشاد فرمایا ہے، ﴿**اُولِیْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ**﴾ وہ پروں والے ہیں، دو دو، تین تین، چار چار (پروں والے ہیں) فرشتوں کے پر تو رب تعالیٰ نے بیان فرمائے، کسی انسان نے اپنی طرف سے ثابت نہیں کئے۔ (ماخوذ از مقدمہ حقانی ص ۲۸)

نیچری مذہب والے شیخ محی الدین ابن عربی رحمہ اللہ کے قول کو نہ سمجھ سکے:

بعض اکابر علماء اسلام کا بھی یہی مذہب ہے جو میں کہتا ہوں، اور امام محی الدین ابن العربی نے فصوص الحکم

میں بھی یہی مسلک اختیار کیا ہے۔(سید احمد خان)

سید احمد خان کو فصوص الحکم کیا سمجھ آئے، ہر نتھو کھیرا آپ کے کلام کو نہیں سمجھ سکتا، غلطی کی وجہ یہ ہے کہ صوفیاء کرام قرآن پاک کے ظاہر مطالب بیان کرتے ہیں، پھر کچھ اشارات بیان کرتے ہیں اشارات کو حقائق سمجھ کر لوگوں کو دھوکا دینے کی ناپاک جسارت کی۔حضرت شیخ رحمہ اللہ (فتوحات مکیہ جلد سوم باب ۳۶۹ ص ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴) میں بیان فرماتے ہیں

"ان الله لما خلق الارواح النارية والنورية اعنى الملائكة والجان شرك بينهما فى امروهو الاستتار عن اعين الناس مع حضورهم معهم فى مجالسهم وحيث كانوا وقد جعل الله بينهما وبين اعين الناس حجابا مستورا فلانراهم الااذاشاؤاان يظهروا لنا"

بیشک اللہ تعالی نے جب ارواح ناریہ اور نوریہ کو پیدا کیا، یعنی ارواح نوریہ سے مراد ملائکہ ہیں اور ارواح ناریہ سے مراد جن ہیں، فرشتے اور جن اس بات میں مشترک ہیں کہ وہ لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہتے ہیں، باوجود اس کے کہ وہ لوگوں کی مجالس میں موجود ہوتے ہیں، لیکن اللہ تعالی ان کو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھتا ہے، ہاں البتہ جب چاہے ان کو ظاہر بھی کر دیتا ہے۔

شیخ رحمہ اللہ اور یہ فرماتے ہیں:

"والملائكة رسل من الله الى الانسان موكلون به كاتبون افعالنا والشياطين مسلطون على الانسان بامر الله"

فرشتے اللہ تعالی کی طرف سے انسانوں کی طرف بھیجے جاتے ہیں وہ موکل ہوتے ہیں، یعنی ان کے ذمہ نظام لگا دیا جاتا ہے، وہ ہمارے افعال لکھتے ہیں اور شیاطین انسانوں پر اللہ تعالی کے امر سے مسلط کئے جاتے ہیں۔

شیخ نے اور ارشاد فرمایا:

"ولا يطلق على الارواح اسم جن الالاستتارهم فالجنة من الملائكة هم الذين يلازمون الانسان ويتعاقبون فينا بالليل والنهار ولانراهم مادة فاذاارادالله عزوجل ان يراهم من يراهم من الانس من غير ارادة منهم لذلك رفع الله الحجاب عن اعين الذين يريدالله ان يدركهم فيدركهم وقد يامر الله الملك والجن بالظهور لنا فيتجسدون لنا نراهم اويرفع الله الغطاء منافراتهم رأى العين وقد نراهم اجسادا على صورة،وقد نراهم لا على صور بشرية بل نراهم على صورهم فى انفسهم كما يدرك كل احد منهم نفسه وهو صورته التى هو عليها فان الملائكة اصل اجسامها نور والجان نار مارج والانس ماء تراب ولكن كمااستحال الانس عن اصل ما خلق منه كذلك الملك والجان عن اصل ما خلق منه الى ماهما عليه من الصور "

اور ارواح پر جن کا اطلاق نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ وہ نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں، وہ ملائکہ جو انسان کے ساتھ ہر وقت رہتے ہیں، اور رات دن میں آگے پیچھے انسان کے پاس آتے ہیں، ان کو بھی نظروں سے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے جن کہہ لیا جاتا ہے، ہم ان کو عام عادت کے مطابق تو نہیں دیکھ پاتے لیکن اللہ تعالیٰ اگر کسی کو دکھانا چاہے تو حجاب اٹھا لیتا ہے، اس وقت انسان انہیں دیکھ لیتا ہے، کبھی ملائکہ اور جن کو حکم دیتا ہے تو وہ ہم کو مجسم ہو کر عیاناً دکھائی دیتے ہیں، اور کبھی ہم انسان کی صورت میں انہیں دیکھتے ہیں، اور کبھی ان کو ان کی اصلی صورتوں میں جس طرح وہ اپنے کو اپنی اصلی صورتوں میں دیکھتے ہیں کیونکہ ملائکہ کا اصل جسم نورانی ہے، اور جن آگ سے پیدا کیا گیا ہے، اور انسان مٹی اور پانی سے جس طرح انسان اپنے اصل سے اس حالت پر آ گیا جس پر اسے پیدا کیا گیا ہے اسی طرح فرشتے اور جن بھی اپنی اصلی حالت سے ظاہری صورتوں کی طرف آ جاتے ہیں۔

شیخ رحمہ اللہ نے ص ۵۰۶ میں اور ارشاد فرمایا

"اعلم ان الله ما جعل للارواح اجنحة الا للملائكة منهم لانهم السفراء من حضرة الامر الى خلقه فلابد لهم من اسباب يكون لهم بها النزول والعروج فان موضع الحكمة تقتضى هذا فجعل لهم اجنحة على قدر مراتبهم فى الذين يسيرون به من حضرة الامر او يعرجون اليه من خضرة الخلق فهم بين الخلق والامر ينزلون ولذلک قالوا ومانتنزل الابامر ربک"

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ارواح کیلئے پر نہیں بنائے سوائے فرشتوں کے، یعنی فرشتوں کو رب تعالیٰ نے پر عطاء فرمائے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ جو تمام امور کا مالک ہے، اس کے درمیان اور مخلوق کے درمیان وہ سفیر ہیں، اس لئے ان کیلئے اترنے اور چڑھنے کیلئے اسباب کا پایا جانا ضروری ہے، یہی دراصل حکمت کا تقاضا ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے مراتب کے مطابق پر عطاء فرمائے ہیں، جن کی وجہ سے وہ مخلوق کی طرف اترتے ہیں، اور مالک امور کی طرف چڑھتے ہیں۔
(ماخوذ از مقدمہ حقانی ص ۲۹)

یہاں تک سید احمد خان صاحب کا تمام تانا بانا ختم ہو گیا، پچھلی تمام بحث کو غور سے دیکھیں، جتنی وجوہ فرشتوں کے وجود کی نفی پر بیان کی ہیں وہ سب باطل ہو گئیں۔

نیچری مذہب والوں کو شیخ کی ان عبارات سے دھوکا ہوا:

فصوص الحکم میں آپ فرماتے ہیں:

"وكانت الملائكة من بعض قوى تلک الصورة التى هى صورة العالم المعبر عنه فى

اصطلاح القوم بالانسان الکبیر" اور آپ نے فرمایا:

"فکانت الملائکة کالقوی الروحانیة والحسیة التی فی نشأة الانسان"

نیچری مذہب کا رد:

صوفیاء کرام کی باریک اصطلاحوں کو سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں، ان کی عبارات کو سمجھنے کیلئے شعور کی ضرورت ہے، حضرت شیخ کا قول آپ کی سند ہے، ذرا تم غور کرو کہ یہ تمہارا مدعا ثابت کرتی ہے یا تمہارے مدعا کو مٹاتی ہے، پہلی عبارت کا مطلب تو یہ ہے "کہ وہ صورت عالم کہ جس کو صوفیاء کرام کی اصطلاح میں انسان کبیر کہتے ہیں اس کیلئے ملائکہ مجموعہ قوی میں داخل ہیں، یعنی عالم کے تمام کاروبار بغیر ملائکہ کے نہیں ہو سکتے جس طرح کہ انسان کے کاروبار اس کے قوی کے بغیر نہیں انجام پاتے، پس ملائکہ عالم کیلئے بمنزلہ قوی کے ہیں اور دوسری عبارت واضح طور پر اس پر دلالت کر رہی ہے "فکانت الملائکة کالقوی الروحانیة" ملائکہ قوی روحانیہ کی طرح ہیں۔

لیکن بیکار لوگوں کو "کاف تشبیہ" نظر ہی نہ آیا، انہوں نے "عین قوی" مان لیا، عقل کے اندھے "زید کالاسد" کو "زید اسد" پڑھ کر زید کی دم اور چار پاؤں تلاش کرنے لگے کہ یہ ہے تو شیر، لیکن یہ پتہ نہیں کہ اس کی دم اور دو پاؤں کہاں چلے گئے ہیں۔ (ماخوذ از مقدمہ حقانی ص ۳۰)

نیچری مذہب اور ابلیس:

شیطان کی نسبت تو قیصری نے شرح فصوص میں نہایت صاف صاف وہی بات لکھی جو ہم نے کہی ہے، اس میں لکھا ہے کہ بعض نے یہ بات کہی ہے کہ انسان کبیر یعنی عالم میں جو قوت وہمیہ کلیہ ہے وہی ابلیس ہے، اور ہر ایک انسان میں جو قوت وہمیہ ہے وہی ابلیس کی ذریات ہیں۔ (مقدمہ حقانی ص ۳۰)

اس قول کا رد: یہاں بھی تشبیہ کا ذکر ہے کہ صورت عالم جسے صوفیاء کرام کبیر انسان کہتے ہیں اس کے قوی میں قوت وہمیہ اس طرح اثر انداز ہے جیسا کہ ابلیس انسان کی رگ رگ میں سرایت کر جاتا ہے، یعنی قوت وہمیہ جو ابلیس کی طرح ہے اس کو عین ابلیس کہنا کیسی ہی عجیب حماقت ہے۔

نیچری مذہب کا اور سیاہ اقتباس:

غرضیکہ تمام محققین اس بات کے قائل ہیں کہ انہیں قوی کو جو انسان میں ہیں اور جن کی نفس امارہ یا قوی بہمیہ سے تعبیر کرتے ہیں یہی شیطان ہے۔

اس قول کا رد: صرف زبانی کلام دعوی کئے جانا اور دعوی کو ہی دلیل بنائے پھرنا تو انسانیت نہیں، یہ تو فقط حماقت و جہالت ہے، کیونکہ محققین سے مراد ایک نیچری مذہب کا سردار اور اس کی ذریت معنوی مراد ہے تو ان کی جیسی جاہلانہ تحقیق ہے ایسے ہی وہ محققین جو در حقیقت جہلاء مطلق ہیں ان کا اتفاق ہونا تو ضروری ہے، کیونکہ "الکفر ملة واحدة" کا وہ مصداق ہیں۔

لیکن علماء محققین یعنی محدثین کرام اور مفسرین کرام، فقہاء عظام کا تو شیطان کے متعلق وہی عقیدہ ہے جو قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں ہے، جس کا تذکرہ نجوم الفرقان کے دوسرے حصہ میں تفصیلا کر دیا گیا ہے۔

نیچری مذہب کا ملحدوں اور بے دینوں جیسا قول:

اصل یہ ہے کہ ان آیتوں میں خدا تعالی انسان کی فطرت کو اور اس کے جذبات کو بتلاتا ہے اور جو قوی بہیمیہ اس میں ہیں ان کی برائی یا ان کی دشمنی سے اس کو آگاہ کرتا ہے مگر یہ ایک نہایت دقیق راز تھا جو عام لوگوں کے اور اونٹ چرانے والوں کی فہم سے بہت دور تھا۔

اس بیہودہ قول کا رد:

آپ ان چیزوں کے منکر ہو کر اور ان کی باطل تاویلیں کر کے دل میں خوش ہو گئے کہ یہ خیالات پیدا کرنا میرا ہی حصہ ہے کسی اہل اسلام کو یہ باتیں کبھی نصیب نہ ہوئی ہوں گی، اور آپ کے معتقد بھی یہی خیال کر کے آپ کے خیالات کو واجب الایمان سمجھتے ہیں۔

آپ کی عمدہ تحقیقات کا حال یہ ہے کہ وہ ملحدوں اور دہریوں اور بعض حکماء بے دینوں کے پرانے خیالات ہیں کہ جو ان کی کتابوں میں اب تک موجود ہیں، اور کچھ اس وقت کے پادریوں اور لامذہبوں کے اعتراضات ہیں، مگر آپ نے ان کو ذرا بدل کر لکھا ہے، اور ان کے ثبوت میں یہ کمال (بلکہ زوال) ضرور کیا ہے کہ قرآن و احادیث اور متقدمین کے کلام میں تحریف کر کے اور ان کے مطالب و معانی تبدیل کر کے کم علم لوگوں کو شک میں ڈال دیا ہے، حالانکہ یہ الحاد اور بے دینی کی باتیں آپ سے صدہا سال پہلے مشہور ہو چکی ہیں۔ علماء اسلام نے ان کے جواب شافی دیئے ہیں اور اس زمانہ میں جو کچھ دہریوں کے خیالات انگریزی اور فرانسیسی اور جرمنی اور عربی زبان میں بذریعہ کتب و اخبارات جو کچھ یورپ میں مشتہر ہوئے اور ہو رہے ہیں، ان سے بھی اہل اسلام غافل نہیں، ان کے دندان شکن

جواب جو اسلامیوں نے دیئے ہیں ان کا عشر عشیر بھی جناب کے کانوں تک نہیں پہنچا، کچھ تھا آپ ہی نے یورپ کی سیر نہیں کی، اور آپ اچھی طرح نہ عربی قدیم جانتے ہیں نہ جدید، نہ یونانی نہ عبرانی نہ یورپ کی اور زبانوں میں علم رکھتے ہیں آپ کی تحقیقات میں سوائے خود پسندی اور تکبر کے بلکہ بے دینی، الحاد اور یہودیت و نصرانیت کے کچھ نہیں۔

(۱) وجود ملائکہ کا انکار تم نے کیا، خصوصا جبریل و میکائیل کا انکار، ملائکہ کے افعال اور متحیز ہونے کا انکار بے دینی اور الحاد نہیں تو اور کیا ہے؟ ہاں ہاں یہ تو صرف بے دینی ہے۔

(۲) شیطان کا انکار کرنا بھی تم سے ہی ہوا ہے، جس کا ثبوت قرآن پاک اور احادیث مبارکہ سے ہے، کیا شیطان کے انکار سے قرآن پاک اور حدیث پاک کا انکار نہیں تو اور کیا ہے۔

تعجب تو اس بات پر ہے کہ ابلیس کی ذریت معنوی ابلیس کو یا تو واقع میں سمجھ ہی نہ سکی یا انکار کر کے اپنا بچاؤ کیا گیا کہ ہمیں کوئی یہ نہ کہے کہ یہ تو ابلیس کی ذریت ہے۔

(۳) حضرت آدم علیہ السلام کا انکار کر کے اور ''آدم'' سے مراد نوع انسانی لینا قرآن پاک اور حدیث کی تحریف معنوی نہیں تو اور کیا ہے؟

(۴) حضرت آدم علیہ السلام کو ملائکہ کے سجدہ کرنے اور شیطان کے تکبر کرنے کا انکار بلکہ اس قصہ کو جو تم نے انسان کے قوی کے جذبات اور قوت بہیمیہ کے تمرد پر محمول کیا ہے، کیا یہ حماقت و جہالت نہیں تو اور کیا ہے؟

(۵) حضرت آدم علیہ السلام کے جنت میں رہنے پھر وہاں سے نکالے جانے کا انکار کرنا دیوانگی نہیں تو اور کیا ہے۔

(۶) جنت اور اس کی نعمتوں کا انکار، اور انبیاء کرام کے معجزات کا انکار در حقیقت قرآن پاک اور حدیث پاک کا واضح طور پر انکار ہے، یہ ضلالت بھی تمہاری قسمت میں ہی آئی۔

مسلمانوں کے لباس میں گمراہ کن:

صدہا برس سے اہل اسلام میں یہودی اور مجوسی اور دیگر مذاہب کے لوگ مسلمانوں کے لباس میں قرآن وحدیث کے خلاف گمراہ کرنے والی چیزوں کی ایجاد کرتے ہیں، اسی طرح بہت سے ملحد لوگ فلسفی تقریروں میں مسلمان کہلا کر اصول اسلام کے قلع و قمع (برباد) کرنے میں دریغ نہیں کرتے۔

جب سے اسلام میں ایسے لوگ آ گئے، اسی وقت سے مسلمانوں میں اختلاف شروع ہو گئے، در حقیقت ان اختلافات کو بھڑکانے والے، جاہل لوگوں کو پیسے دے کر خریدنے والے ملحد، مجوسی، یہودی، نصرانی، اور دہریئے فلاسفہ

ہی ہیں، جو بظاہر مسلمان بن کرلڑانے کا ذریعہ بنے وہ درحقیقت مسلمان نہیں ہوتے، یا نام نہاد مسلمان ہوتے ہیں۔
بعض کتب سے یہ بات واضح ہے جیسا کہ دبستان المذاہب کے ص ۸۳ میں آخشون کے متعلق یوں لکھا ہے کہ ''صاحبان این مذہب ہمہ اہل اسلام آمیختہ اند وبکسوت ایشاں جلوہ گراند، نام مسلمانان ہم دارندونام دیگر بر کیش خویش'' اس مذہب والے لوگ اہل اسلام سے ملے جلے رہے، مسلمانوں کی طرز اختیار کئے رہے، بظاہر اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے رہے، لیکن کام ان کے اسلام کے خلاف ہی رہے، اسی طرح مزدکیوں کے متعلق ص ۱۴۴ میں لکھا ہے کہ
''اکنوں مزدکیاں درلباس گری بستند درمیان اھل اسلام پنہاں شدہ راہ سپر کیش خویش اند''
مزدکی لوگ بھی اپنے بچاؤ کی خاطر اسلامی لباس میں رہے، کام وہ بھی اسلام کے خلاف ہی کرتے رہے اور کتاب دساتیر کے چودہویں نامہ میں اس بات کی پیشین گوئی ہے ''کہ مسلمانوں میں جب باہم خصومت پیدا ہوگی تو ایرانی لوگ مذہب اسلام میں داخل ہوکر اپنے قدیم مذہب کی باتوں کو یہاں تک رواج دیں گے کہ اصل اسلام برائے نام رہ جائے گا۔ (حقانی کہتے ہیں) یہ بات تو ہم نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لی ہے۔ (ماخوذ از مقدمہ حقانی ص ۳۲،۳۱)

نیچیری مذہب کی ملحدین کے ساتھ اتفاق کی چند مثالیں:

دبستان المذاہب ص ۱۲۶ کی تعلیم اول قواعد زردشتیوں کے بیان میں لکھا ہے کہ ''ملائکہ سے مراد صفات حمیدہ ہیں'' یہی مذہب نیچریوں کا بھی ہے اور ص ۱۶۷ میں ہے ''جہنم کے طبقات اور جنت کے درجات اور اعمال کی جزا وسزا محض خیالی باتیں ہیں'' یہی نیچری مذہب والے بھی کہتے ہیں۔ ص ۳۴۳ نظر اول میں عقائد حکماء کے بیان میں یوں لکھا ہے کہ
''پیوستن روح بدن راندن آدم ست از بہشت ومیل بہ بدن فرمان بردن حوا وکر دارنکو ھیدہ، خوردن شجرہ منھیہ، مار خشم، وطاءس شہوت است، وگفتہ اندابلیس عبارت از قوت وھمی کہ پیرو محسوسات است وعالم معقولات رامنکراست وباقوت عقلی در ستیزد، وآنچہ درشرع آمدہ کہ ھمہ فرشتگان آدم را سجدہ کردند مگر ابلیس، اشارت است بایں معنی کہ ھمہ قوی جسمانی کہ فرشتگاان ارضی اند مطیع روح آدم اند مگر قوت وھمی کہ سر کش است.
''یعنی آدم کا جنت سے نکالا جانا'' اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ان کی روح بدن میں ڈالی گئی، یعنی آدم کی روح کا ان کے بدن میں پھونکنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو جنت سے نکال دیا گیا۔ (کیس ہی احمقانہ قول ہے کہ روح پھونکنا درحقیقت جنت سے نکالنا ہے، جو کسی کے دل میں آئے وہ کہتا پھرے اسے کون روک سکتا ہے) اور مراد

حوا کی فرمانبرداری سے بندن کی طرف میلان کرنا ہے، اور درخت کا پھل کھانے سے روکنے کا مطلب ہے بری خصلتوں سے روکنا، اور سانپ سے مراد غصہ اور مور سے مراد شہوت ہے، اور شیطان سے مراد قوت وہمیہ ہے کہ جو عالم معقولات کی منکر اور محسوسات کی پیرو اور عقل سے معارضہ کرنے والی ہے، اور جو شرع میں آیا ہے کہ فرشتوں نے آدم کو سجدہ کیا اور ابلیس نے نہ کیا تو اس سے یہ مراد ہے کہ قوی جسمانی جو زمین کے فرشتے ہیں آدم کی روح کی تابع ہو گئیں، اور قوت وہمیہ نے سرکشی کی۔ (از مقدمہ حقانی ص ۳۲)

نیچری مذہب بھی یہی ہے پتہ چلا کہ اسلام کے خلاف مداری مختلف شکلیں بدل کر آتے رہے مقصد سب کا ایک رہا، بظاہر قرآن پاک کے ترجمان بن کر حقیقت میں قرآن پاک کی تحریف کر کے لوگوں کے دلوں میں شکوک پیدا کرتے رہے، جو قرآن پاک کے ظاہر مطالب ہیں ان کا انکار کرتے ہیں۔

ہاں صوفیاء کرام کی طرح ظاہری مطالب کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ اشارات بیان کر دیئے جائیں تو یہ درست ہے۔

نیچری مذہب نے وہی کہا جو مسیلمہ کذاب نے کہا:

یہ حقیت بات ہے کہ کذاب نے کذاب کی طرف ہی رجوع کرنا ہے، فرقہ صادقیہ جو مسیلمہ کذاب کا پیرو ہے ان کے حالات دبستان المذاہب کے ص ۲۹۹ میں یوں لکھے "مسیلمہ کذاب جس کو کتاب آسمانی کہتا تھا اس کی دو جلدیں ہیں، پہلی کا نام فاروق اول اور دوسری کا نام فاروق دوم ہے، اس میں لکھا ہے کہ کوئی شیطان نہیں اور نہ خدا کسی کو غیر اللہ کیلئے سجدہ کرنے کا حکم دے سکتا ہے۔ (از مقدمہ حقانی ص ۳۲)

یعنی جھوٹے نبی نے جو مذہب ایجاد کیا وہی نیچری مذہب کے سردار نے اختیار کیا، کذاب کو کذاب کی بات پسند نہ آئے یہ ممکن نہیں۔

مشائین کے مذہب کو توڑ موڑ کر نیچریوں نے پیش کیا:

محمد بن عبدالکریم شہرستانی جو بہت بڑے فاضل شخص تھے بلکہ حکماء اسلام میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی وفات ۵۴۸ھ میں ہوئی وہ اپنی "کتاب الملل والنحل" کی جلد دوم ص ۸۶ میں عقائد حکماء مشائین کے بیان میں یوں لکھتے ہیں کہ "جن لوگوں کو قوت قدسیہ نصیب ہوتی ہے (یعنی انبیاء کرام) ان کی قوت خیالیہ اس درجہ کی قوی ہو جاتی کہ وہ

اپنے ادراکات کو بصورت جمیلہ دیکھتے اور ان کا عمدہ کلام سنتے ہیں یعنی دراصل نہ کوئی فرشتہ ہوتا ہے نہ کوئی آواز یا کلام ان کو سنائی دیتا ہے بلکہ محض ان کے وہ معلومات (جو ان کو مبدأ فیاض سے عطاء ہوئے ہیں) کسی عمدہ شکل میں نظر آتے ہیں اور نہایت دلچسپ کلام کرتے ہیں، پس وہ فرشتہ جو نبی علیہ السلام کو دکھلائی دیتا تھا وہ یہی تھا، اور وہ وحی اور الہام یہی آواز تھی۔ سید صاحب نے اسی بات کو کس برے عنوان سے بیان کیا ہے اور انبیاء کرام کو (معاذ اللہ) مجنون نے سے تشبیہ دے کر کس طرح گستاخی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ (مقدمہ حقانی ص ۳۲)

یعنی نیچری مذہب نے وہی کچھ بیان کیا جو پہلے باطل راہ پر چلنے والوں نے کہا جن کا ہر دور میں رد کیا گیا ہے، مشائین کا مذہب بھی بظاہر بغیر کسی تاویل کے غلط اور باطل ہے، پھر اس پر ملمع سازی کر کے حقیقت سے برگشتہ صرف من دھن کی بات نیچری مذہب والوں نے بیان کر کے نہلے پر دہلے ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

نیچری مذہب والوں نے بعض حکماء کے قول کو نہ سمجھا:

کتاب الملل والنحل میں ہی (جلد دوم ص ٦٧) مذکور ہے کہ بعض حکماء نے کہا ''نبی لوگوں کو آخرت کی ترغیب دیا کرتے تھے اور وہاں کے ثواب وعقاب مثالوں کے ذریعے لوگوں کے اطمینان قلوب کیلئے بتلاتے'' اور حقیقت میں وہ ایک امر مجمل ہے کہ کسی آنکھ نے نہیں دیکھا نہ کسی کان نے سنا۔ (مقدمہ حقانی ص ۳۲)

اگر اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ انبیاء کرام نے ثواب اور جنت کا ذکر فرمایا، اس کا علم ان کو ہی دیا گیا عام لوگوں نے اس کو دیکھا تو نہیں لیکن اس پر ایمان لایا ہے، اسی کو ایمان بالغیب، سے تعبیر کیا گیا، یہ مطلب تو بالکل درست ہے قرآن پاک کے مطابق ہے لیکن اگر یہ کہا جائے کہ جنت ایک خیالی اور تصوراتی چیز کا نام ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں، بلکہ انبیاء نے صرف لوگوں کے دلوں کو اطمینان دینے کیلئے اسے بیان کیا ہے تو یہ کفر ہے، یہی باطل راہ نیچری مذہب والوں نے اختیار کی ''کل شیء یرجع الی اصلہ'' ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے، کا عملی ثبوت پیش کیا۔

اہل اھواء اور نیچری مذہب میں اتفاق:

اہل اھواء وہ لوگ تھے جو اپنی خواہشات کے مطابق کام کرتے تھے، تقریبا وہ اور نیچری مذہب ایک ہی تھے، کیونکہ ''ھواء'' اور ''نیچر'' تقریبا ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے رہتے ہیں۔

کتاب الملل والنحل جلد اول ص ۱۰۴ میں بعض اہل اھواء کا عقیدہ یہ لکھا گیا ہے کہ ''ان کے نزدیک سوائے

عالم محسوس کے اور کوئی عالم نہیں، ان کا ہر بات میں اپنے ذہن صافی اور فطرت سلیمہ پر اعتماد کلی ہے، اس گروہ کا نام "طبیعہ دہریہ" ہے۔

یہی نیچری مذہب والے بھی کہتے ہیں کہ چونکہ جن، فرشتے، جنت وغیرہ جو چیزیں ہمیں نہیں دکھائی دیتیں وہ واقع میں ہیں ہی نہیں، اسی طرح انبیاء کرام کے معجزات کا بھی وہ انکار کرتے ہیں، اور بعض لوگ جو اپنے آپ کو ترقی یافتہ سمجھتے ہیں (حقیقت میں وہ پستی میں ہیں بلکہ جہنم کے گہرے گڑھے میں ہیں) وہ یہ کہتے ہیں کہ شریعت اور اس کے احکام حرام وحلال مصلحت عباد اور رفاہ بلاد رفا مرلوگوں (ناصحین وواعظین) نے اپنی طبیعت صافیہ سے مقرر کردئے ہیں اور وہ جن روحانی چیزوں کی خبر دیتے ہیں جیسا کہ لوح وقلم وعرش وکرسی ملائکہ وغیرھا سو وہ درحقیقت ان کے خیالات ہیں کہ جن کو وہ جسمانی صورتوں کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں، اور اسی طرح آخرت کے احوال جنت اور حور وقصور اور نہر ومیوہ جات جو وہ بیان کرتے ہیں محض عوام کی طبیعتوں کو رجوع کرنے کی باتیں ہیں، اور اسی طرح دوزخ اور اس کے عذاب طوق وغیرہ بھی لوگوں کو ڈرانے کیلئے بیان کرتے ہیں، کہ ان سے ڈر کر ان امور مصلحت پر چلیں جن کو انہوں نے واجب وفرض بتایا ہے۔ اور ان چیزوں سے بچیں جن نامناسب چیزوں کو وقتی مصلحت کی وجہ سے انہوں نے حرام یا مکروہ کہا ہے۔ ورنہ عالم آخرت میں جو کہ علوی عالم ہے صور جسمانی اور اشکال جرمانی کہاں؟ یہ سب قرآن وحدیث کا انکار ہے رب تعالی اور نبی کریم ﷺ نے جو احکام بیان کئے اور جن کاموں سے روکا ہے ان کو واعظین کی طرف منسوب کردیا ہے، یہی بے دینوں، بدمذہبوں کا کام ہے اور یہ تو عام حکماء مشائین کا عقیدہ ہے کہ عالم قدیم ہے اور اس میں قدر انواع ہیں، وہ بھی سب قدیم ہیں چنانچہ نوع انسانی بھی قدیم ہے ان کے نزدیک یہ بات کہ ابتداء نوع انسان حضرت آدم علیہ السلام سے غلط ہے۔

کتاب الملل والنحل کی آخری جلد میں اور اس کے سواء اور کتب الٰہیات میں اس کی تصریح ہے، اب رہے انبیاء کرام کے معجزات تو ان کے سینکڑوں لوگ انکار کرنے والے ہیں، ایسے لوگوں کے حالات سے یہی کتاب اور دبستان المذاہب وغیرہ بھی پڑی ہیں، اور جلال الدین اکبر بادشاہ دہلی کے روبرو تو بڑے زور کے ساتھ ایک بڑے دہریئے نے بمقابلہ اہل اسلام وہل کتاب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ عبور قلزم کا انکار کیا تھا چنانچہ دبستان المذاہب میں اس کی خوب تصریح ہے۔ اب فرمایئے سید صاحب آپ نے وہ کونسی نئی بات ایجاد کی ہے؟

ایسے ایسے خیالات کے لوگ ہر زمانہ میں کتب سماویہ کی نسبت اعتراضات کرتے آئے ہیں۔ کوئی واضح طور پر انکار کرتے رہے اور کوئی تاویلیں کرتے رہے۔ واضح ہوا کہ نیچری مذہب والوں نے اپنی طرف سے کوئی نئی تحقیق

نہیں کی، بلکہ پہلے مذاہب باطلہ کے اقول باطلہ کو ہی توڑ موڑ کر پیش کیا۔ (از مقدمہ حقانی ص ۴۴)

نیچری مذہب نے حضرت آدم علیہ السلام کا انکار کیا:

آدم کے لفظ سے وہ ذات خاص مراد نہیں جس کو عوام الناس اور مسجد کے ملا باوا آدم کہتے ہیں بلکہ اس سے نوع انسانی مراد ہے جیسا کہ تفسیر کشف الاسرار میں لکھا ہے "ماالمقصود بآدم آدم وحدہ" (از مقدمہ حقانی ص ۴۴)

اس باطل قول کا رد:

کشف الاسرار نے جو بیان کیا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ "آدم" سے مراد ہر جگہ آپ کی اولاد مراد ہے آپ خود کہیں بھی معتبر نہیں۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں "انا سید ولد آدم" میں اولاد آدم کا سردار ہوں گا قیامت کے دن، اس میں خود آدم علیہ السلام بھی داخل ہیں کہ آپ کو ان پر بھی سیادت حاصل ہوگی۔ اسی طرح کہیں آدم علیہ السلام کا ذکر ہوتا ہے مراد اس سے آپ خود بھی ہوتے ہیں، اور آپ کی اولاد بھی ہوتی ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ کسی کی بات کو نہ سمجھنا، یا پہلے ہی جن اقوال باطلہ کو مختلف زمانوں میں پیش کیا جا چکا ہے ان کو ہی الفاظ بدل کر پیش کرنا نیچری مذہب کا کمال بلکہ زوال سمجھ آیا۔ رب تعالیٰ کے ارشاد کو مانا جائے یا نیچری مذہب کی غلط تاویلوں کو مانا جائے آیئے ارشادات باری تعالیٰ دیکھیے

(۱) ﴿وَبَدَءَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ o ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ o﴾

اس میں صاف واضح طور پر بیان کر دیا گیا کہ آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنایا اور آپ کی اولاد کو نطفہ سے بنایا گیا، اگر آدم سے مراد نوع انسانی ہو اور کوئی آدم نہ ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ رب تعالیٰ نے یہ فرمایا "ہم نے نوع انسانی کو مٹی سے بنایا، پھر ہم نے نوع انسانی کو نطفہ سے بنایا جب تمام نوع انسانی کی تخلیق ایک طرح ہے تو یہ ادھر ادھر کے چکر لگانے کا کیا مطلب؟ نیچری مذہب کی بدحواسی کے بغیر اور کچھ نظر نہیں آتا۔

(۲) ﴿يٰآدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾

اگر آدم سے مراد نوع انسانی ہے تو اس میں مرد، عورت دونوں ہی شریک ہیں، پھر مؤنث کو علیحدہ ذکر کرنا اور مرد کے برابر ذکر کر کے تثنیہ کے صیغے ذکر کرنے کا کیا مطلب ہے؟ قرآن پاک کے یہ مطالب بیچارے جہلاء کیا سمجھیں، وہ تو خیالاتی گھوڑے دوڑانے جانتے ہیں۔

(۳) ﴿اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ﴾

اس آیۃ میں بھی وضاحت کی ہے کہ جس طرح عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا کیا، ایسے ہی حضرات آدم علیہ السلام کو بھی بغیر باپ کے، مٹی سے پیدا کیا۔

بدحواسی کا یہ عالم کہ کبھی آدم سے مراد نوع انسانی مراد لینا اور آدم علیہ السلام کا کھلا انکار کرنا اور کبھی آدم علیہ السلام کی تخلیق کو تسلیم کر لینا، اسے ہی بدحواسی کہا جاتا ہے، وہ اپنی نام نہاد تفسیر میں سورۃ آل عمران ص ۴ میں لکھتے ہیں'' کیونکہ حضرت آدم مٹی سے یا پانی سے پیدا ہوئے تھے، اور نہ وہ نو مہینے کسی عورت کے پیٹ میں رہے مثل ایسے انسانوں کے جو نطفہ سے پیدا ہوتے ہیں سبحان اللہ، کیا خوب بیان کر دیا گیا کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق عام انسانوں کی طرح نہیں ہوئی، گویا یوں سمجھیں کہ جو خیالی تصورات اور من گھڑت اقوال پیش کئے تھے ان کو خود ہی اپنے قول سے رد کر دیا۔ (ماخوذ از مقدمہ حقانی بتصرف ص ۳۴)

آیات متشابہات اور نیچری مذہب کی بدحواسی:

آیات متشابہات کا انکار یوں چرب زبانی سے کیا گیا کہ سمجھ یہ آئے کہ یہ تو بڑا مصلح ہے لیکن منافقین بھی اپنے آپ کو مصلح کہتے تھے لیکن رب تعالی نے ان کو فسادی کہا، یہ بھی بظاہر مسلمانوں کی اصلاح کا پہلو لے کر قرآن پاک کے مطالب کو بگاڑ کر عظیم فساد کا سبب بنا، جس کا علماء نے رد کیا۔ آج قادیانی علمی سطح پر تو علماء کرام سے مقابلہ کرنے سے قاصر ہیں، لیکن یہود و نصاری سے ملکر علماء کو قتل کرانے میں آگے آگے ہیں۔

آیئے نیچری مذہب کا نظریہ آیات متشابہات کے متعلق دیکھئے، وہ یوں رقمطراز ہیں۔

قرآن مجید تو تمام لوگوں کی ہدایت کیلئے نازل ہوا ہے اس کا مقصود یہ ہے کہ جس طرح ذی علم دانشمند اس سے ہدایت پاویں اسی طرح جاہل و نادان عوام بھیڑوں اور بکریوں اور اونٹوں کے چرانے والے بھی ویسی ہی ہدایت پاویں۔ جن آیات پر متشابہات کا اطلاق ہوتا ہے اگر اس کے ایک پہلو پر خیال کرو تو اس سے وہ مطلب پایا جاتا ہے، جو عوام کے خیالات کے مناسب ہے۔ (از مقدمہ حقانی ص ۳۴)

بظاہر اصلاح کے ضمن فسادی قول کا رد:

اگر چہ بظاہر تو یہ سمجھ آ رہا ہے کہ یہ اصلاحی بات ہے کہ متشابہت کو بھی سب لوگ جانیں تو قرآن پاک مکمل ہر شخص کو سمجھ آئے گا، لیکن حقیقت میں یہ قول فساد پر مبنی ہے کیونکہ اس میں قرآن پاک کا صراحۃ انکار ہے۔ بات یہی

ہے کہ نیچری مذہب کے سردار کی بات کو مانوں یا رب ذوالجلال کے ارشاد کو مانوں؟ یقیناً رب تعالیٰ کے ارشاد کے ماننے کا نام ایمان واسلام ہے، اور اپنے نیچر کی بات کو ماننا، یا نیچری کی بات کو ماننا بے دینی ہے۔ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِي أَنزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ﴾

وہی ہے جس نے تم پر یہ کتاب اتاری، اس کی کچھ آیات صاف معنی رکھتی ہیں، وہ کتاب کی اصل ہیں اور دوسری وہ ہیں جن کے معنی میں اشتباہ ہے، وہ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ اشتباہ والی کے پیچھے پڑتے ہیں گمراہی چاہنے اور اس کا پہلو ڈھونڈنے، اور اس کا ٹھیک پہلو اللہ ہی کو معلوم ہے۔

یقینی امر ہے کہ رب تعالیٰ کے اس ارشاد کے بعد ٹیڑھے دلوں والے متشابہات کی تاویلیں تلاش کریں گے، اپنے من دھن کے مطابق مطالب نکالیں گے، رب تعالیٰ کے ارشاد کے بعد باطل تاویلیں پیش کرنے والوں پر کوئی تعجب نہیں۔

جب نیچری مذہب والوں کا کہنا یہ ہے کہ متشابہات کے بھی ظاہر معانی معتبر ہونے چاہئیں تو خود ان کا محکمات آیات کی تاویلیں کرنا کیسے صحیح ہے، **سبحان اللہ!** اس خبط حواسی کا کیا کہنا'' جب محکمات آیات کے حقیقی معانی مراد ہیں تو نیچری مذہب والوں نے اپنے خیالی تصورات کیوں پیش کئے؟

جنت کے متعلق نیچری مذہب:

یعنی ان کا کہنا یہ ہے کہ جنت صرف راحت کا نام ہے'' جنت یا بہشت کی ماہیت جو خدا تعالیٰ نے بتلائی ہے وہ تو یہ ہے

﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾

یعنی کوئی نہیں جانتا کہ کیا ان کیلئے آنکھوں کی ٹھنڈک (راحت) چھپا رکھی ہے اس کے بدلے میں جو وہ کرتے تھے۔

پیغمبر علیہ السلام نے جو حقیقت بہشت کی فرمائی جیسے کہ بخاری و مسلم نے ابو ہریرہ کی سند بیان کیا ہے، وہ یہ ہے کہ

''قال اللہ تعالی اعددت لعبادی الصالحین مالاعین رأت ولااذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر''

(از مقدمہ حقانی ص ۴۱)

اس کا رد: آیۃ کریمہ اور حدیث پاک کا مطلب واضح ہے کہ جنت کو کسی نے دیکھا نہیں، وہ آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، یعنی جنت کو حقیقی طور پر کوئی نہیں جانتا، لیکن نبی کریم ﷺ نے معراج کی رات جنت کو دیکھا ہے، مؤمنین

جنت کے وہی اوصاف بیان کرتے ہیں جو مصطفیٰ کریم ﷺ نے بیان فرمائے، عقلی ڈھکوسلے تو نیچری مذہب والے پیش کرتے ہیں، مسلمان تو اپنے آپ کو قرآن و حدیث اور رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے تابع سمجھتے ہیں آیئے جنت کا ذکر زبان مصطفیٰ کریم ﷺ سے سنیے۔

﴿جنت کی عظمت﴾

اللہ کے انعام کی عظمت انسانوں کی سمجھ سے بالاتر ہے:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی (حدیث قدسی) ہے۔

"اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رأت و لا اذن سمعت و لا خطر علی قلب بشر، واقرؤا ان شئتم (فلا تعلم نفس ما اخفی لهم من قرة اعین "

(بخاری، مسلم، مشکوۃ باب صفۃ الجنۃ واہلہا)

میں نے اپنے بندوں کے لئے ایسا مقام تیار کر رکھا ہے جو کسی آنکھ نے دیکھا نہیں اور کسی کان نے سنا نہیں اور کسی دل پر کھٹکا نہیں، اگر تم چاہتے ہو تو (قرآن پاک کی یہ آیت) پڑھ لو، (جس کا مطلب ہے) کوئی نفس نہیں جانتا، جو ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک ان کے لئے مخفی کر کے رکھی ہوتی ہے۔ اس سے مراد خصوص ثواب اور انعام و کرام ہے

"ای نوع عظیم من الثواب ادخر الله لاولئک واخفاه من جمیع خلائقه لا یعلمه الاهو مما تقربه عیونهم"

یعنی ثواب کی عظیم قسم جو اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کے لئے تیار کر رکھی ہے اس کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے مخلوق میں سے کوئی ایک بھی نہیں جانتا، یہ وہ عظیم ثواب اور مرتبہ ہوگا جس سے نیک لوگوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔

"بلغک الله امنیتک حتی ترضی به نفسک وتقرعینک ولا تستشرف الی غیره"

یعنی اے نیک انسان اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری تمام خواہشوں پر کامیاب کر دے گا یہاں تک کہ تو راضی ہو جائے گا، اور تیری آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی تجھے غیر کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

جنت کا کم از کم مقام دنیا کی تمام نعمتوں سے اعلیٰ ہے:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"موضع سوط فی الجنة خیر من الدنیا ومافیها" (بخاری، مسلم، مشکوۃ باب صفۃ واهلها)

جنت میں کوڑا (چابک، چھڑی) رکھنے کا مقام دنیا اور اس کی تمام نعمتوں سے بہتر ہے۔

چونکہ جنت کی نعمتیں باقی رہنے والی ہیں اور دنیا کی نعمتیں فنا ہونے والی ہیں، یہ یقینی بات ہے کہ باقی رہنے والی چیز فنا ہونے والی سے بہتر ہے۔"قال ابن الملک سوی کلام الله و صفاته و جمیع انبیائه" ابن الملک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگرچہ دنیا میں اللہ تعالی کے کلام کا نزول بھی ہوا ہے اور اللہ تعالی کی صفات کا ظہور بھی ہوا ہے اور انبیاء کرام بھی تشریف لائے لیکن یہ حکم ان کو شامل نہیں، ان کے سواء باقی دنیا کی تمام نعمتوں یعنی مال و دولت، عالیشان محلوں سے جنت کا ادنی درجہ بھی اعلی ہوگا۔

کوڑے یعنی چابک یا چھڑی کو ذکر کرنے میں خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اسے حقیر سمجھا جاتا ہے، جب کوئی سوار اترنا چاہتا ہے تو ہو وہ پہلے اپنی چھڑی زمین پر پھینکتا ہے پھر خود اترتا ہے، پہلے اس کے چھڑی پھینکنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ دوسرے ساتھیوں کو معلوم ہو جائے کہ یہاں ہی اترنا ہے وہ آگے نہ چلے جائیں، لیکن چھڑی کو زمین پر پھینکنے سے اس کی اور اس کے رکھنے کی جگہ کی حقارت بھی معلوم ہوگئی اس لئے واضح فرمادیا کہ جنت کا ایسا مقام بھی دنیا کی عظیم الشان نعمتوں سے ارفع و اعلی ہوگا۔

جنت کے درخت کی عظمت:

حضرت ابو ہریرہ ﷜ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"ان فی الجنة شجرة یسیر الراکب فی ظلها مائة عام لایقطعها" (بخاری، مسلم، مشکوۃ باب صفۃ الجنۃ واہلہا)

بیشک جنت میں ایک درخت ہے جس کے سائے میں چلنے والا سوار اس کو ایک سو سال میں بھی قطع نہیں کر سکے گا اور جنت میں تمہارے ایک کمان کی مقدار کا مقام بھی سورج کے مقام طلوع اور غروب سے بہتر ہے۔

جنت کے درخت کا نام "طوبی" ہے جس طرح ابن جوزی نے فرمایا "یقال انها طوبی" کہا جاتا ہے بیشک وہ طوبی ہے۔ خیال رہے درخت کے سائے میں چلنے سے مراد اس کے نیچے کنارے پر چلنا ہے کیونکہ دنیا میں سایہ کا اعتبار سورج سے ہے، خصوصا درخت کے سائے میں چلنے سے مراد سایہ میں اس وقت انسان چلتا ہے جب دھوپ اور سورج کی تمازت (گرمی) سے بچنا چاہتا ہو، لیکن جنت کی تعریف میں اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ہے ﴿لَا یَرَوْنَ فِیْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِیْرًا﴾ جنتی لوگ جنت میں نہ دھوپ دیکھیں گے اور نہ سردی، اور ممکن ہے کہ درخت کے اوپر اوپر نورانیت کا ظہور ہو اور اس کے نیچے حجاب ہو جو سایہ نظر آرہا ہو جس طرح ہمارے محاورہ میں رات کو چراغ، بجلی کے قمقموں

کی روشنی میں نظر آنے والے عکس کو بھی سایہ کہہ دیا جاتا ہے اسی طرح صبح صادق سے لیکر طلوع شمس تک سورج کی شعاعوں کے مقابل اس وقت کو بھی ظل (سایہ) کہا گیا ہے۔رب تعالیٰ نے فرمایا﴿وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ﴾ پھیلایا ہوا ظل (سایہ) اس سے مراد یہی وقت ہے۔جس طرح انسان شکار کرنے کے لئے جائیں تو وہ درخت کے سایہ میں یا اور کسی جگہ آرام کرنے کے لئے اپنا کمان رکھ کر اپنی اپنی جگہ مختص کرتے ہیں اسی طرح نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جنت میں اتنی جگہ تم کمان رکھتے ہو وہ طلوع شمس (سورج) اور غروب شمس کے درمیان مقام سے اعلیٰ ہے۔یعنی تمام دنیا سے اعلیٰ ہے

"وفی الجامع ان فی الجنة لشجرة یسیر الراکب الجواد المضمر السریع"

یعنی بخاری میں مزید وضاحت موجود ہے کہ جنت میں درخت کے نیچے چلنے والے سوار سے مراد وہ سوار ہے جو ایسے گھوڑے پر سوار ہو جس کے جسم کو بہت پختہ کیا گیا ہو اور وہ بہت تیز چلتا ہو، عمدہ قسم کا گھوڑا ہو۔

﴿جنت کیسی ہے؟﴾

جنت میں شیشے کے خیمے:

حضرت ابوموسیٰ اشعری ﷛ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا"ان للمومن فی الجنة لخیمة من لؤلؤ واحدة مجوفة" جس کا طول وعرض ساٹھ ذراع (نوے فٹ) ہوگا، (ایک روایت طول ساٹھ ذراع کا ذکر ہے اور دوسری راویت میں عرض ساٹھ ذراع کا ذکر ہے) اور ہر کونے میں اس کی اھل ہوں گی کوئی بعض دوسرے بعض کو نہیں دیکھ سکے گا، مومنین ان کے پاس جائیں گے دو جنتیں چاندی کی ہوں گی اور ان کے برتن اور ہر چیز چاندی کی ہوگی، اور دو جنتیں سونے کی ہوں گی ان کے برتن اور ان کی تمام اشیاء سونے کی ہوں گی، جنت عدن میں مومن قوم اور رب کو دیکھنے میں صرف رداء (چادر) کبریائی حائل ہوگی۔ (بخاری، مسلم، مشکوۃ باب صفة الجنة واھلھا)

"وقد یکون لارباب الکمال جنتان من ذهب وجنتان من فضة" (مرقاۃ المفاتیح)

ارباب کمال کو دو جنتیں چاندی کی اور دو سونے کی حاصل ہوں گی۔اس طرح چار جنتیں ہوں گی لیکن ان کے طبقات آٹھ ہیں۔انسان جب جنت میں ہوگا اس کی جسمانی کدورت اٹھالی جائے گی "حسی موانع" ختم ہو جائیں گے لیکن پھر اللہ تعالیٰ کے جلال کا اتنا رعب ہوگا اور اس کی نورانیت کا اتنا غلبہ ہوگا کہ سوائے اس کی رحمت اور مہربانی کے انسان رب تعالیٰ کو دیکھ نہیں سکے گا، یہ ہی رداء کبریائی ہے۔ (مرقاۃ المفاتیح)

جنت فردوس سب سے اعلیٰ جنت ہے:

حضرت عبادہ بن صامت ﷜ فرماتے ہیں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا، جنت میں ایک سو درجہ ہے اور ہر درجہ میں اتنی وسعت ہے جس طرح زمین و آسمان کے درمیان وسعت ہے۔

"والفردوس اعلاها درجة منها تفجر انهار الجنة الاربعة ومن فوقها يكون العرش فاذا سألتم الله فاسئلوا الفردوس" (ترمذی، مشکوۃ باب صفة الجنة واهلها)

فردوس تمام سے اعلیٰ درجہ والی ہے، اس میں جنت کی چار نہریں جاری ہیں، ان تمام (جنتوں کے) اوپر عرش ہے، جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کرو تو "فردوس" کا سوال کیا کرو۔

وضاحت حدیث:

حدیث شریف میں "مائة درجة" ایک سو درجہ کا ذکر ہے لیکن بیہقی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما سے مرفوع حدیث مروی ہے:

"عدددرج الجنة عدد آی القرآن فمن دخل الجنة من اهل القرآن فليس فوقه درجة"

جنت میں قرآن پاک کی آیتوں کے مطابق درجات ہیں، قرآن پاک پڑھنے والے اور اس پر عمل کرنے والے جس درجہ میں داخل ہوں گے اس کے اوپر کوئی درجہ نہیں۔ ان حدیثوں میں تطبیق اس طرح ہے کہ جنت میں بہت سے مدارج ہوں گے، سو کا ذکر کثرت کے لئے ہے، تعداد کے لئے نہیں، اہل عرب ستر، سو، وغیرہ الفاظ سے عام طور پر کثرت والا معنی لیتے تھے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ کثیر تعداد میں سے، سو درجے ایک ایک شخص کو حاصل ہوں۔

فردوس کا لغوی معنی ایسا باغ جس میں ہر قسم کے درخت اور انگور کی بیلیں ہوں، لیکن جنت کے طبقات میں فردوس کو وہ خصوصیت اور امتیاز حاصل ہوگا جو دوسرے کسی طبقہ کو حاصل نہیں ہوگا اسی وجہ سے امت مصطفیٰ ﷺ کو اس کی طلب کرنے کی تعلیم دی گئی ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کی امت تمام امتوں سے اعلیٰ تو اس کو تمام جنتوں سے اعلیٰ جنت طلب کرنی چاہئے۔ نبی کریم ﷺ کی امت کی برتری کا تذکرہ رب تعالیٰ نے اس طرح فرمایا:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (پ۲)

اور بات یوں ہی ہے کہ ہم نے کیا سب امتوں سے افضل کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ۔

جب پہلی امتیں تبلیغ انبیاء کا انکار کردیں گی تو رب تعالیٰ باوجود علم کے منکرین پر حجت قائم کرنے کے لئے تبلیغ

پر انبیائے کرام سے گواہ طلب کرے گا، انبیاء کرام امت محمد ﷺ کو گواہ پیش کریں گے، پہلی امتیں کہیں گی، تم ہمیں کیسے پہچانتے ہو؟ تو یہ کہیں گے کہ ہمیں اپنے سچے نبی نے اللہ کا کلام اس کی کتاب کے ذریعے پہنچایا جس سے ہمیں علم حاصل ہوا، پھر ان پر نبی کریم ﷺ کو گواہی دینے کے لئے لایا جائے گا، آپ اپنی امت کے حق میں نگہبان کی حیثیت میں شہادت دیں گے۔

خیال رہے کہ ''نگہبان'' کا لفظ صرف اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کے ترجمہ میں ہے باقی کسی ترجمے میں نہیں، یہ لفظ آپ نے کیوں زیادہ فرمایا؟ اور باقی مترجمین کس طرح علمی نقطہ سے غافل رہے؟ یہ وضاحت میں نے اپنی کتاب تسکین الجنان میں کی ہے وہاں دیکھیں۔ اور نجوم الفرقان میں اسی آیۃ کے تحت دیکھیں۔

چار نہریں:

﴿فِيهَا أَنْهَارٌ مِّن مَّاءٍ غَيْرِ آسِنٍ وَأَنْهَارٌ مِّن لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ وَأَنْهَارٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشَّارِبِينَ وَأَنْهَارٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى﴾ (پ ۲۶ ع ۶)

ان (جنتوں) میں ایسی پانی کی نہریں ہیں جو کبھی خراب نہ ہوں اور ایسی دودھ کی نہریں ہیں جس کا مزہ نہ بدلے اور ایسی شراب کی نہریں ہیں جس کے پینے میں لذت ہے، اور ایسی شہد کی نہریں ہیں جو صاف کیا گیا ہے۔

ایک نہر پانی کی ہے اور وہ پانی دنیا کے پانیوں سے مختلف ہے کیونکہ زیادہ دیر ٹھہرنے کی وجہ سے اس کا ذائقہ اور بو نہیں بدلیں گے حالانکہ دنیا کے پانیوں میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے گل سڑ جاتا ہے۔ سب سے پہلے پانی کا اس لئے ذکر کیا کہ انسان دنیا میں بغیر پانی کے زندگی بسر نہیں کر سکتا سب سے زیادہ پانی کی ضرورت ہی در پیش آتی ہے۔

دوسری نہر دودھ کی ہوگی وہ دودھ بھی دنیا کے دودھ سے مختلف ہوگا، نہ کھٹا ہوگا اور نہ ہی اس میں بدبو پیدا ہوگی بلکہ وہ صرف قدرت سے ہی دودھ معرض وجود میں آئے گا کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دودھ کی نہر جانوروں سے دوہا ہوا دودھ نہیں ہوگا، اسی طرح حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جنت کا دودھ گوبر اور خون کے درمیان نالی سے پیدا ہونے والا نہیں ہوگا۔ دودھ کا ذکر دوسرے مرتبہ پر کیا کیونکہ دودھ کو کثیر اہل عرب طعام کی جگہ بھی استعمال کرتے تھے اس لئے پینے کے بعد گویا کہ کھانے کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

تیسری نہر ﴿شَرَابًا طَهُورًا﴾ کی ہوگی دنیا کے شراب نشہ والے ہوتے ہیں ان میں بدبو ہوتی ہے بنانے والے کی میل کچیل کی آمیزش کا بھی قوی گمان ہوتا ہے لیکن جنتی شراب ان تمام چیزوں سے پاک ہوگا۔ تیسرے

مرتبہ پر اس کا ذکر بھی اس لئے کیا گیا ہے کہ عام طور پر کھانے کے بعد تلذذ والی چیز کا استعمال ہوتا ہے اس لئے جنت میں بھی دودھ کی غذائیت کے بعد شراب سے لذت دی جائے گی لیکن وہ شراب پاکیزہ ہوگا، صاف ستھرا مشروب ہوگا، نشہ سے پاک ہوگا۔

چوتھی نہر شہد کی ہوگی لیکن وہ شہد خالص صاف شفاف ہوگا، دنیا کے شہد میں بعض اوقات لوگ شمع کی یا چینی کی آمیزش کر کے شہد کو خراب کر دیتے ہیں جو خالص نہیں رہتا، اسی طرح دنیا کے شہد میں شہد کی مکھیوں کے فضلات کی آمیزش بھی ہو جاتی ہے لیکن جنتی شہد ان تمام چیزوں سے پاک ہوگا کیونکہ وہ فقط قدرت سے معرض وجود میں آیا ہوگا، ظاہری اسباب کو اس میں دخل نہیں ہوگا۔ شہد کا ذکر چوتھے مرتبہ پر کیا کیونکہ اس میں شفاء ہے، مرض میں اس کو استعمال کیا جاتا ہے، عام طور پر کھانے پینے کی بے احتیاطی پر مرض لاحق ہوتی ہے اور دواء کی ضرورت در پیش آتی ہے، اس لئے اس کا ذکر سب کے بعد عام عادت کے مطابق ہے۔ (تفسیر روح المعانی)

ایک حدیث پاک میں نبی کریم ﷺ نے جنت کی چار نہروں کے نام دنیا کی نہروں کے مطابق بیان فرمائے ہیں کہ جنت میں ایک نہر کا نام نیل ہے دوسری کا دجلہ، تیسری کا فرات اور چوتھی کا ''سیحان'' بعض جگہ ''سیحون'' آیا ہوا ہے۔ یہ صرف ناموں کی مطابقت ہے اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ دنیا کے دریا شائد جنت کے ہی ہیں۔ بیہقی میں حضرت کعب سے مروی ہے۔

''نهر النيل نهر العسل ونهر دجلة نهر اللبن ونهر الفرات نهر الخمر ونهر سيحان نهر الماء في الجنة'' (تفسير روح المعاني)

جنت میں نہر نیل شہد کی نہر ہے، نہر دجلہ دودھ کی نہر ہے، نہر فرات شراب کی نہر ہے اور نہر سیحان، سیحون پانی کی نہر ہے۔

جنت کا بازار: حضرت انس ﷺ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں ''ان في الجنة لسوقا يأتونها كل جمعة'' بیشک جنت میں ایک بازار ہے جس میں جنتی لوگ ہر جمعہ کو آئیں گے ان پر شمالی جانب سے ہوا چلے گی ان کے چہروں اور کپڑوں پر (کستوری اور ہر قسم کی خوشبوئیں) پھیلا دے گی۔ ''فيرجعون الى اهلهم وقد ازدادوا حسنا وجمالا'' اپنے اھل کی طرف جب یہ لوٹ کر آئیں گے تو وہ کہیں گے ''والله لقد ازددتم بعدنا حسنا وجمالا'' قسم ہے اللہ تعالی کی تمہارا حسن و جمال ہمارے بعد زیادہ ہو گیا ہے اور یہ انہیں کہیں گے ''وانتم والله تعالى زدتم بعدنا حسنا وجمالا'' قسم ہے اللہ تعالی کی تمہارا بھی حسن و جمال ہمارے بعد زیادہ ہو گیا ہے۔
(مسلم، مشکوۃ باب صفۃ الجنۃ واھلھا)

وضاحت حدیث:

قیامت میں بھی لوگ علماء کے محتاج ہوں گے، اگر چہ قیامت میں سورج اور رات، دن کا وجود نہیں ہوگا لیکن جمعہ اور عیدین کا اعتبار کرنا یا مبارک دنوں میں زیارت کرنا وغیرہ ان تمام چیزوں کی دار و مدار اس پر ہوگی ''وانما یعرف وقت اللیل والنهار بارخاء استار الانوار ورفعها'' جنت میں رات اور دن کی پہچان نور سے ہوگی، جب نور پر پردے لٹکا دئے جائیں گے تو رات ہوگی اور جب پردے ہٹا دئے جائیں گے تو دن ہوگا۔

بیشک اہل جنت، جنت میں علماء کے محتاج ہوں گے اس وجہ سے کہ وہ ہر جمعہ اللہ تعالی کی زیارت کریں گے ''فیقول لهم تمنوا علی ماشئتم'' رب تعالی انہیں کہے گا جو بھی چاہتے ہو اسی چیز کی تمنا کرو یعنی مجھ سے طلب کرو، اب جنت والوں کو معلوم نہیں ہو سکے گا کہ وہ کس چیز کو طلب کریں ''فیلتفتون الی العلماء فیقولون ماذا نتمنی فیقولون تمنوا علیه کذا و کذا'' وہ علماء کی طرف توجہ کریں گے، ان سے پوچھیں گے کہ ہم رب تعالی سے کیا مانگیں؟ علماء انہیں بتائیں گے کہ تم فلاں فلاں چیزوں کی طلب کرو ''فهم یحتاجون الیهم فی الجنة کما یحتاجون الیهم فی الدنیا'' وہ جنتی لوگ جنت میں علماء کے اسی طرح محتاج ہوں گے جیسے وہ دنیا میں ان کے محتاج تھے۔ جنت میں جمعہ کا نام یوم المزید (زیادہ نعمتوں کے حاصل ہونے کا دن) بھی ہوگا، اس سے واضح ہوا کہ جمعہ کے دن کو دنیا کی طرح جنت میں بھی باقی دنوں پر سرداری حاصل ہوگی، اہل عرب شمالی جانب سے چلنے والی ہوا کو برکت والی اور بارش والی ہوا قرار دیتے ہیں اس لئے ذکر فرمایا کہ ان کے چہروں اور کپڑوں کی شمالی جانب سے چلنے والی ہوا کستوری اور طرح طرح کی خوشبوؤں سے معطر کر دے گی جس سے ان کی شکل وصورت اور زیب وزینت میں حسن وجمال زیادہ ہو جائے گا، چونکہ تمام اہل جنت جمعہ کے دن بازار میں جائیں گے اس لئے جب لوٹیں گے تو قبیلہ کا سربراہ اپنی جنتی ازواج سے کلام کرے گا وہ اس سے کلام کریں گی کہ ان کا حسن و جمال زیادہ ہو چکا ہے، اپنے حسن وجمال کی زیادتی کا علم تو ہو نہیں سکے گا، دوسرے کو دیکھ کر کہیں گے تمہارا حسن و جمال زیادہ ہو گیا ہے حالانکہ ہر ایک کا حسن وجمال زیادہ ہوگا۔

احوال جنت کا بہت تفصیلی ذکر راقم کی کتاب ''موت کا منظر مع احوال حشر ونشر'' کو احادیث مبارکہ کی روشنی میں دیکھئے۔ ان شاء اللہ آپ کو خود بخود سمجھ آئے گا کہ علماء کرام وہی اوصاف جنت بیان کرتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائے ہیں عقلی باتیں، من گھڑت اقوال، ارشادات مصطفویہ کا انکار، قرآن وحدیث کی غلط

تاویلیں پیش کرنا نیچری مذہب والوں کا کام ہے، علماء دین کے ہوتے ہوئے ان شاءاللہ مذاہب باطلہ اپنے مقاصد میں کبھی کامیاب نہیں ہوں گے، یہی وجہ ہے کہ دینی مدارس کے خلاف بے دینوں کی آوازیں اٹھ رہی ہیں، علماء کو قتل کیا جارہا ہے لیکن جسے رب تعالی نے قائم ودائم رکھنا ہے، اسے یہود ونصاری نے کیسے مٹانا ہے۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌO﴾
(آیة نمبر ۲۶)

(1) یوں عرض کر اے اللہ ملک کے مالک تو جسے چاہے سلطنت دے، اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے، اور جسے چاہے عزت دے، اور جسے چاہے ذلت دے، ساری بھلائی تیرے ہی ہاتھ ہے، بیشک تو سب کچھ کرسکتا ہے۔

(2) عرض کرو اے اللہ ملک کے مالک تو عطاء کرتا ہے ملک جسے تو چاہے، اور چھین لیتا ہے تو ملک جس سے تو چاہے، اور تو عزت دیتا ہے جسے تو چاہے، اور تو ذلت دیتا ہے جسے تو چاہے، تیرے ہی قبضہ قدرت میں ہر بھلائی ہے، بیشک تو ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

ماقبل سے تعلق:

جب رب تعالی نے پہلی آیات میں اہل کتاب کی گمراہی کا ذکر فرمایا اور موت کے بعد ان کے انجام کا ذکر فرمایا تو اب اس آیۃ کریمہ میں ان کا دنیا میں انجام ذکر کیا جارہا ہے کہ ان کو ذلت حاصل ہوگی، اور ان کی بادشاہتیں تباہ وبرباد ہوں گی، اور مسلمانوں کو عزت حاصل ہوگی، اور ان گمراہوں کے ملک مسلمانوں کو حاصل ہوں گے، اور ساتھ ہی نبی کریم ﷺ کو دعاء کرنے کا حکم دیا ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ﴾ (وجیز، حاشیہ جلالین)

شان نزول: شان نزول کی چند وجوہ ہیں، جو تمام ہی مراد ہیں، یعنی چند وجوہ کے بعد آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

(۱) "اخرج عبدبن حمید وابن ابی جریر وابن ابی حاتم عن قتادة قال ذکرلنا ان نبی اللہ ﷺ

سأل ربه ان یجعل له ملک فارس والروم فی امته فانزل الله "قل اللهم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء" الآیة" (در منثور)

حضرت قتادہ ﷺ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے اپنے رب سے سوال کیا کہ ان کو فارس اور روم کے ملک حاصل ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ سے دعاء کرتے رہو، اللہ تعالیٰ آپ کو یہ ملک عطاء فرمادے گا۔

(۲) "واخرج ابن المنذر عن الحسن قال جاء جبریل الی النبی ﷺ فقال یا محمد سل ربک (قل اللهم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء) الی قوله (وترزق من تشاء بغیر حساب) ثم جاء جبریل فقال یا محمد فسل ربک قل رب ادخلنی مد خل صدق" الآیة. فسأل ربه بقول الله تعالی فاعطاه ذلک" (در منثور)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں، جبریل نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا "اے محمد ﷺ اپنے رب تعالیٰ سے سوال کرو، مکمل آیۃ ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ﴾ بطور دعاء پڑھنے کے متعلق رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، پھر جبریل حاضر ہوئے اور نبی کریم ﷺ کو کہا آپ بطور دعاء مکمل آیۃ ﴿وَقُلْ رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ﴾ پڑھیں نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ کے حکم کے مطابق دونوں دعائیں کر دیں تو آپ کی دونوں دعاؤں کو رب تعالیٰ نے قبول فرمالیا۔

(۳) "وقیل ان الیهود قالوا والله لانطیع رجلا جاء بنقل النبوة من بنی اسرائیل الی غیرهم فنزلت هذه الآیة" (خازن)

شان نزول کی ایک اور وجہ یہ بیان کی گئی کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام کے بعد نبوت آپ کی اولاد میں آ رہی تھی، لیکن نبی کریم ﷺ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تشریف لائے تو یہود حسد سے جل گئے وہ کہنے لگے کہ ہم تو اس شخص پر ایمان نہیں لاتے جو بنی اسرائیل سے نبوت کو دوسرے خاندان کی طرف منتقل کرنے کیلئے آ گیا، تو رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا کہ ملک نبوت تو رب تعالیٰ کے قبضہ وقدرت میں ہے جسے چاہے عطاء فرمادے، اس کی مشیت پر کسی کو دم مارنے کی جرأت حاصل نہیں۔

(۴) "روی الواحدی عن ابن عباس وانس بن مالک انه لما افتتح رسول الله ﷺ مکة وعدامته ملک فارس والروم قالت المنافقون والیهود هیهات هیهات من این لمحمد ملک فارس والروم هم اعزوامنع من ذلک الم یکف محمد امکة والمدینة حتی یطمع فی ملک فارس والروم، فانزل الله

تعالی ھذہ الآیۃ" (روح المعانی)

واحدی نے حضرت ابن عباس اور حضرت انس بن مالک ﷺ سے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ پر اپنی امت سے وعدہ فرمایا کہ روم اور فارس کے ممالک بھی تمہیں حاصل ہوں گے۔ تو منافقین نے اور یہود کہنے لگے یہ بہت بعید ہے، یہ کام محمد سے کیسے ہو سکے گا کہ فارس اور روم کے ممالک کو فتح کر لے، ان لوگوں کو بڑی طاقت حاصل ہے، وہ بہت بڑی دفاعی طاقت رکھتے ہیں تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

(۵) ایک روایت میں یہ ذکر ہے کہ نبی کریم ﷺ یوم احزاب کو دس دس صحابہ کرام کو چالیس چالیس ذراع (ساٹھ فٹ) خندق کھودنے کا حکم دیا، ایک جگہ پر چٹان آ گئی صحابہ کرام نے نبی کریم ﷺ کو بتایا، آپ نے کندال کی ضرب لگائی تو وہ چٹان ریت کے ٹیلے کی طرح ذرہ ذرہ ہو کر ٹوٹ گئی، آپ نے پہلی ضرب پر تکبیر کہی اور مسلمانوں نے بھی تکبیر کہی۔ "وقال علیہ السلام اضاء ت لی منھا قصور الحیرۃ" نبی کریم ﷺ نے فرمایا میرے لئے حیرہ کے محلات روشن کر دیئے گئے۔ پھر دوسری ضرب پر آپ نے فرمایا "اضاء ت لی منھا القصور الحمر من ارض الروم" مجھ پر اس ضرب سے روم کی زمین کے سرخ محلات روشن کر دیئے گئے۔

پھر تیسری ضرب پر آپ نے فرمایا "اضاء ت لی منھا قصور صنعا" مجھ پر صنعاء کے محلات روشن کر دئے گئے۔ اور ساتھ یہ ارشاد فرمایا "واخبرنی جبریل علیہ السلام ان امتی ظاھرۃ علی کلھا فابشروا" اور مجھے جبریل نے خبر دی ہے کہ آپ کی امت ان تمام مقامات کو فتح کرے گی، اس لئے تم خوش ہو جاؤ، آپ کے اس ارشاد پر منافقین کہنے لگے "کیا تمہیں تعجب نہیں کہ تمہارے نبی تمہارے ساتھ باطل وعدہ کرتے ہیں (معاذ اللہ) اور تمہیں یہ خبر دیتے ہیں کہ وہ یثرب سے حیرہ کے محلات دیکھ رہے اور کسری کے شہر دیکھ رہے ہیں، اور یہ مقامات مسلمان فتح کریں گے، ادھر تم خندق کھود کر اپنا دفاع کر رہے ہو اور کفار سے ڈر کی وجہ سے خندق سے نہیں نکل رہے ہو تو اللہ تعالی نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا، اور منافقین کا رد کیا، وہ اللہ تعالی کی قدرت سے بے خبر تھے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿قُلْ﴾ "عرض کرو"

طلباء کرام بخوبی جانتے ہیں کہ امر کا صیغہ کبھی امر کیلئے ہی استعمال ہوتا ہے کہ کوئی شخص اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر یہ کہے کہ یہ کام کر، تو اسے امر کہا جاتا۔ اور جب ایک شخص اپنے آپ کو دوسرے کے برابر سمجھ کر یہ کہے کہ یہ کام کر تو اسے التماس کہا جاتا ہے۔ اور اگر اپنے آپ کو چھوٹا (کم مرتبہ) سمجھ کر بڑے کو یہ کہے کہ یہ کام کر تو اسے دعاء اور عرض کہا

جاتا۔ یہاں ﴿قُـلْ﴾ کہہ کر نبی کریم ﷺ کوارشادفرمایا کہ تم رب تعالی کے حضورعرض کرو، یہی خوبصورت ترجمہ اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ہے، جسے راقم نے بھی نقل کردیا ہے۔

﴿اَللّٰهُمَّ﴾ ''اے اللہ''

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے: ''اللهم''اصل میں''یا الله'' ہوتا ہےحرف نداءکوحذ کیاجاتا ہے،اوراس کےعوض اخر میں''میم''زیادہ کرلیاجاتا ہے،یہی قول زیادہ مشہور ہےاورایک قول یہ بھی ہے کہ اصل میں ہوتا ہے ''اللهم امنا بخير اى اقصدنا''حرف نداءکوحذف کردیاگیا،''امنا''ام ينوم اما'' سے ماخوذ ہے،''نا'ضمیر منصوب متصل ہےیعنی معنی یہ ہے''اے اللہ ہماری بھلائی کاارادہ فرما۔ (ماخوذازمعالم التنزیل للبغوی)

﴿مَالِکَ الْمُلْکِ﴾ ''ملک کے مالک''

کیا شان ھے قرآن پاک کی: بڑامختصرلفظ''مالک الملک '' ہے،لیکن بڑے معانی پرمشتمل ہے۔

(۱) ملک،کامعنی ہے''قدرۃ''اور''مالک''کامعنی ہے،قادراب معنی یہ ہوگا''القادر على القدرة'' قدرت پر قادریعنی مخلوق کوجوقدرت حاصل ہےوہ اللہ تعالی کی عطاء سے ہےوہی ہرمقدورپرقادر ہےوہی ہرمملوک کامالک ہے۔

(۲) ''مالک الملک'' کامعنی ہےجنس ملک کامالک،وہ تصرف فرماتا ہےاپنے ملک میں،جیسا کہ بادشاہ اپنے اپنے ملکوں میں تصرف فرماتے ہیں۔

(۳) ملک نبوۃ ورسالت مرادہوکہ''اے اللہ توہی نبوت ورسالت'' کا مالک ہے،جیسا کہ اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا﴿فَقَدْ آتَيْنَا آلَ اِبْرَاهِيْمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَ آتَيْنَاهُمْ مُلْكًا عَظِيْمًا﴾ (توہم نے توابراہیم کی اولادکو کتاب اورحکمت عطاءفرمائی اورانہیں بڑاملک دیا۔''والنبوة اعظم مراتب الملک''نبوت ملک کے مراتب میں سےعظیم مرتبہ ہے:

''لان العلماء لهم امر عظيم على بواطن الخلق والجبابرة لهم امر على ظواهر الخلق والانبياء امرهم نافذ فى البواطن والظواهر ''

اس لئے کہ علماءکومخلوق کے باطنی امورپرامرعظیم حاصل ہے،اورجابرلوگوں کومخلوق کےظاہرپرامرحاصل ہوتا ہے،اور انبیاءکرام کےامورظاہروباطن پرنافذ ہیں۔

لیکن باطنی امور کے حاصل ہونے کا یہ مطلب ہے کہ ان کی امت میں سے ہر شخص پر لازم ہوتا ہے کہ وہ ان کے دین کو اور ان کی شریعت کو قبول کرلے، اور یہ عقیدہ رکھے کہ بیشک نبی برحق ہیں اور ان کے اقوال حق پر ہیں ظاہری امور کے حاصل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اگر لوگ ان کے سامنے سرکشی اور تکبر سے کام لیں ان کے احکام کا انکار کریں، ان کی نبوت کا انکار کریں تو ان کو قتل کرنا واجب ہو جاتا ہے بعض کفار نے یہ بعید سمجھا کہ "بشر کو رسول بنا کر بھیجا جائے" جیسا کہ ان کے قول کی رب تعالیٰ نے حکایت بیان فرمائی ﴿ابَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا﴾ کیا اللہ تعالیٰ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کا یوں رد فرمایا ﴿وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا﴾ اگر ہم (نبی) کسی فرشتے کو بناتے تو اسے بھی مرد بناتے "یعنی وہ بھی انسانی اور مرد کی شکل میں آتا"

کچھ اور کفار نے یہ کہا کہ یہ تو ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بشر کو رسول بنا کر بھیجے، لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے محمد یتیم اور فقیر ہیں، ان کو عظیم منصب یعنی منصب نبوت کس طرح عطاء کیا گیا۔ ان کے قول کی حکایت رب تعالیٰ نے یوں بیان فرمائی ﴿لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْآنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ﴾ یہ قرآن دو بستیوں (مکہ و طائف) میں سے کسی بڑے شخص پر کیوں نازل نہیں ہوا۔ تو ان لوگوں کا رد یوں فرمایا ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ اللہ خوب جانتا ہے جہاں اس نے منصب رسالت رکھنا ہے۔ یہود کہتے تھے کہ نبوت تو ہمارے آباء واجداد میں آرہی تھی، محمد (ﷺ) کو نبوت کیسے مل گئی اس طرح تو قریش جن کے پاس نبوت نہیں آرہی تھی وہ بھی یہود کی طرح یہی کہہ رہے کہ محمد کو کیسے نبوت عطاء کر دی گئی۔

منافقین آپ سے نبوت پر حسد کر رہے تھے، ان سب لوگوں کو جواب رب تعالیٰ نے یوں دیا ﴿اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ کیا یہ لوگوں پر حسد کرتے ہیں اس پر کہ اللہ نے ان کو عطاء کیا اپنے فضل سے۔

"ثم انه تعالى رد على جميع هؤلاء الطوائف بان بين انه سبحانه هو مالك الملك فيؤتى ملكه من يشاء فقال (تؤتى الملك من تشاء)

پھر اللہ تعالیٰ نے نبوت کے منکرین وحاسدین کے تمام گروہوں کا اس آیۂ کریمہ کو نازل کر کے رد فرمایا کہ "مالک الملک" وہی ہے، جسے چاہے ملک نبوت ورسالت کا مالک بنا دے۔ (از کبیر)

اعتراض: اگر ﴿تُؤْتِي الْمُلْكَ﴾ سے مراد "ملک نبوت کا عطاء کرنا" لیا جائے تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ ﴿وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ﴾ کا مطلب یہ لیا جائے "انه قد يعزل عن النبوة من جعله نبيا" بیشک وہ جسے نبی بناتا ہے کبھی اسے معزول بھی کر دیتا ہے۔ "ومعلوم انه ذلك لا يجوز" اور یہ بھی یقینی طور پر معلوم ہے

کہ کسی منصب سے نبوت سے معزول کرنا جائز نہیں۔

پہلا جواب: اللہ تعالیٰ نے نبوت جب ایک خاندان میں رکھی ہو پھر اس خاندان سے دوسرے خاندان کی طرف منتقل کردے "صح ان یقال انه تعالی نزعها منهم" تو صحیح ہے کہ یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں خاندان سے نبوت کو ہٹا دیا ہے۔ یہود جب یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ نبوت بنی اسرائیل میں ہی ضروری ہے۔

"فلما شرف الله محمدا ﷺ بها صح ان یقال انه ینزع ملک النبوة من نبی اسرائیل الی العرب"

تو جب اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو نبوت سے مشرف فرمایا، تو یہ کہنا صحیح ہے کہ "ملک نبوت کو بنی اسرائیل سے ہٹا کر عرب کو عطاء کر دیا گیا۔

دوسرا جواب: "وتنزع الملک ممن تشاء" کا معنی یہ ہے "تحرمهم ولا تعطیهم هذا الملک لا علی معنی انه یسلبه ذلک بعد ان اعطاه"

کہ اللہ تعالیٰ جنہیں چاہے نبوت سے محروم کر دے اور ان کو نبوت نہ عطاء کرے اس کا یہ مطلب نہیں کہ نبوت عطاء کرے پھر کسی کو محروم کر دے، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ﴾ اللہ ولی ہے ایمان والوں کا نکالتا ہے ان کو تاریکیوں سے نور کی طرف اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایمان والے پہلے تمام ظلمت کفر میں مبتلاء ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو اس سے نکالتا ہے، بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو کفر کی تاریکی سے دور رکھتا ہے۔ اسی طرح رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا﴾ اگرچہ بظاہر اس کا مطلب یہ ہے "تم ہمارے دین میں لوٹ کر آجاؤ" حالانکہ یہ معنی درست نہیں کیونکہ انبیاء کرام کا کافروں کے دین پر ہونا پھر ایمان کی طرف آنا، پھر کافروں کا مطالبہ کرنا کہ تم ہمارے دین میں لوٹ آؤ۔ یہ مطلب لینا محال ہے، ہاں البتہ یہ مطلب لیا جا سکتا ہے کہ (تم ہمارے دین میں آجاؤ) (ماخوذ از کبیر)

ملک عطاء کرنے کا ایک اور مطلب:

ملک سے مراد وہی ہو جو عرف عام میں مراد لیا جاتا ہے۔ ملک چند چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے۔

(۱) مال زیادہ عطاء کرنا اور زیادہ مرتبہ عطاء کرنا۔ مال کی زیادتی میں، سونا، چاندی روپے داخل ہیں، اور سامان، مکانات، اور کھیتی، اور تمام جانور داخل ہیں۔ مرتبہ کی زیادتی کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگوں کے ہاں بارعب ہوتا ہے، اس کی بات کو قبول کیا جاتا ہے۔ اور مخلوق اس کی اطاعت کرتی ہے۔

(۲) ملک کی عطاء میں یہ بھی ہے کہ غیروں پر اس کی اطاعت کو واجب کردیا جاتا ہے، اور اس کے امر و نہی کو لوگوں پر لازم کردیا جاتا ہے۔

(۳) ملک کے عطاء کرنے میں یہ بھی داخل ہے کہ جب کوئی اس کے ملک میں جھگڑا کرتا ہے، تو یہ اس پر قہر کرنے کی قدرت رکھتا ہے، اور اس پر غلبہ حاصل کرلیتا ہے۔ "**ومعلوم ان کل ذلک لا یحصل الا من اللہ تعالی**" معلوم ہوا کہ یہ سب چیزیں اللہ تعالی سے ہی حاصل ہوتی ہیں۔

یہ بات واضح ہے کہ بڑے عقلمند شخص بڑی محنت کرنے کے باوجود، اور مشقت اٹھانے کے باوجود زیادہ مال نہیں حاصل کر سکتے، بلکہ تھوڑے مال کے ہی مالک ہوتے ہیں۔ اور ہم کئی بے وقوف جاہل اور غافل لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ ان کے پاس اتنا مال ہوتا ہے کہ اس مال کی مقدار کو معلوم کرنا عام شخص کی طاقت میں نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کئی بادشاہ رعب حاصل کرنے کیلئے مال خرچ کرتے ہیں، لیکن ہر روز ان کی قدر و منزلت کم ہوتی رہتی ہے، وہ لوگوں کی نظروں میں حقیر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن وہ بادشاہ جن کے عقائد صاف ستھرے ہوتے ہیں، عمل اچھے ہوتے ہیں، عدل وانصاف سے کام لیتے ہیں لوگ ان سے محبت کرتے ہیں، لوگوں کے دلوں میں ان کا قدرتی رعب ہوتا ہے، ہر چھوٹا، بڑا ان کی عزت کرتا ہے، ان کے قریب رہنے والے ہوں یا دور ہوں سبھی ان سے محبت کرتے ہیں۔

راقم نے یہی حال اساتذہ میں بھی دیکھا، کئی رعب جما کر، **ڈنڈے** برسا کر، طلباء کو ذلیل کر کے بھی رعب حاصل نہیں کر سکتے، بلکہ طلباء کی نظر میں حقیر ہوتے ہیں اور کئی طلباء پر شفقت کر کے، عجز اختیار کر کے طلباء کے دلوں میں بس جاتے ہیں۔ ﴿ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰهِ یُؤۡتِیۡهِ مَنۡ یَّشَآءُ﴾

واضح ہوا کہ مال کی زیادتی اور مرتبہ کی زیادتی اللہ تعالی کی عطاء سے ہے، جسے چاہے عطاء فرمادے، اس میں انسان کے عقل و فکر کو دخل حاصل نہیں۔ اسی طرح کسی کو واجب الطاعۃ بنانا کہ لوگ اس کی اطاعت کریں، یہ رب تعالی کی عطاء سے ہے بندہ خود یہ مقام حاصل نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ملک کا دفاع، نصرت اور کامیابی کا حصول بھی اللہ تعالی کی عطاء سے ہے، ﴿کَمۡ مِّنۡ فِئَةٍ قَلِیۡلَةٍ غَلَبَتۡ فِئَةً کَثِیۡرَةً بِاِذۡنِ اللّٰهِ﴾ کتنی ہی چھوٹی جماعتوں کو ہم نے دیکھا کہ وہ اللہ تعالی کے حکم (اس کے فضل و کرم) سے بڑی جماعتوں پر غالب آ گئیں۔ (ماخوذ از کبیر)

معتزلہ کا مذہب: معتزلہ کہتے ہیں کہ اللہ جسے چاہے ملک دے اور جس سے چاہے چھین لے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ رب تعالی کسی کو پسند کرلے تو ملک دے دے، اور نہ پسند کرے تو اس سے ملک چھین لے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے "**فیؤتیہ بالاستحقاق من یقوم بہ**" کہ اللہ تعالی ملک اسے عطاء کرتا ہے جو اس کا مستحق ہوتا ہے۔

"ولا ینزعه الاممن فسق عن امر ربه" ویدل علیه قوله تعالی (لا ینال عهدی الظالمین)

اللہ تعالی ملک صرف اسی سے چھینتا ہے جو اس کے احکام سے عدول کر کے فسق کا مرتکب ہو، اسی لئے رب تعالی نے فرمایا ﴿لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ﴾ (میرا وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچتا) (اس آیۃ کریمہ سے استدلال باطل ہے کیونکہ اس میں نبوت نہ دینے کا ذکر ہے) جبائی معتزلی کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ملک صرف عادل لوگوں کو عطاء کرتا ہے، ظالموں کو عطاء نہیں کرتا۔

اہلسنت کا مذہب: اللہ تعالی جسے چاہے ملک عطاء فرماتا ہے، یہ ضروری نہیں کہ وہ عادل اور نیک ہی ہو، رب تعالی بعض اوقات ظالموں اور فاسقوں کو بھی ملک عطاء کر دیتا ہے، صرف ملک نبوت کے ساتھ تخصیص ہے کہ وہ صالحین کو عطاء کرتا ہے ظالمین کو نہیں عطاء کرتا، بادشاہت کے ساتھ یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ اسی طرح اللہ تعالی کسی عادل سے حکومت چھین لے یہ اس کے اختیار کی بات ہے، اسی طرح چاہے تو ظالم سے حکومت چھین لے۔

ملک کو چھیننے کی چند وجوہ:

کبھی بادشاہ کی موت کی وجہ سے اس کی حکومت کا زوال ہوتا ہے، کبھی عقل کے زوال سے اس کے ملک کا زوال ہوتا ہے۔ کبھی قدرت، قدر، حواس کے زوال سے اس کے ملک کا بھی زوال ہو جاتا ہے، کبھی مال کی ہلاکت و بربادی سے اس کی حکومت کا زوال ہو جاتا ہے کیونکہ مفاد پرست چمچے ساتھ چھوڑ جاتے ہیں، فوجی منہ موڑ لیتے ہیں تو دوسرے ممالک کے بادشاہ اس پر غالب آجاتے ہیں جو اس کے ملک کے زوال کا سبب بن جاتے ہیں۔ کبھی اپنے ہی ملک کے لٹھ بردار حاکم بننے کی خواہش کی وجہ سے شرفاء کی حکومت کے زوال کا سبب بنتے ہیں، یہ سب اللہ تعالی کے عطاء کرنے اور چھیننے کی وجہ سے ہیں، یہ اللہ تعالی کے اختیار کی بات ہے، چاہے تو ظالموں کو حکومت دے دے اور چاہے تو نیکوں سے حکومت چھین لے۔

ظالم کو بادشاہت رب تعالی سے حاصل ہوتی ہے:

اگرچہ عقلی احتمال تین ہیں لیکن دو باطل ہیں ایک صحیح ہے، دو جو باطل ہیں وہ یہ ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ بادشاہ کو بغیر کسی سبب سے بادشاہت حاصل ہو، یہ قول باطل ہے کیونکہ اس میں صانع وخالق کی نفی ہوتی ہے، حالانکہ ہر چیز اللہ تعالی کی خلق میں داخل ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ کہا جائے کہ ظالم کو ملک اسباب ربانیہ سے

حاصل ہوا، یہ قول بھی باطل ہے کیونکہ اسباب ربانیہ تو تمام مخلوق کیلئے ایک جیسے ہیں، اور ہر شخص بادشاہت حاصل کرنے کی تمنا بھی کرتا ہے، لیکن سب کو وہ حاصل نہیں ہوتی۔ تیسرا قول ہی معتبر ہے، وہ یہ ہے "ان ملک الظالمین بایتاء الله تعالی" بیشک ظالموں کو ملک اللہ تعالیٰ کی عطاء سے حاصل ہے۔

﴿تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَاءُ﴾

"تو عطاء کرتا ہے ملک جسے تو چاہتا ہے اور تو چھین لیتا ہے ملک جس سے تو چاہے۔"

ان الفاظ مبارکہ کا مفہوم کافی حد تک واضح ہو چکا ہے جو ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ﴾ کی بحث میں بیان ہو چکا ہے، اب مختصر طور پر اتنا سمجھ لیا جائے "تو جسے چاہے ملک عطاء کرتا ہے" اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ملک کی جمیع اقسام کو شامل ہے، اس میں "ملک نبوت داخل ہے، ملک علم، ملک عقل، ملک صحت، ملک اخلاق حسنہ، ملک نفاذ، ملک قدرت، ملک اموال داخل ہیں۔ یعنی تو جسے چاہے ملک نبوت عطاء کر دے، جسے چاہے علم عطاء کر دے، سب چیزوں کو اسی طرح بیان کر لیں۔ ﴿وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَاءُ﴾ میں بھی عموم ہے، مذکورہ بالا تمام چیزیں داخل ہیں، البتہ نبوت کا چھیننا بظاہر درست نہیں، اس کا مطلب وہی جو سوال و جواب میں بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ ایک خاندان سے نبوت ہٹا کر دوسرے کو دے دیتا ہے، یا کچھ کو نبوت عطاء فرماتا ہے اور باقیوں کو محروم کر دیتا ہے بس یہی دو معنی "نزع ملک نبوت" کے ہیں۔

﴿وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ﴾

"اور تو عزت دیتا ہے جسے تو چاہے اور تو ذلت دیتا ہے جسے تو چاہے"۔

یہ بات واضح رہے کہ "ان العزة قدتكون فی الدين وقدتكون فی الدنيا" بیشک عزت کبھی دین میں حاصل ہوتی ہے اور کبھی دنیا میں۔ دین میں عزت کی قسموں میں اعلیٰ و اشرف یہ ہے کہ ایمان حاصل ہوا، کیونکہ وہ عزت جسے رب تعالیٰ عزت کہے وہ مومنوں کو ہی حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ ﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ﴾ اور اللہ کیلئے عزت ہے اور اس کے رسول کیلئے اور مومنین کیلئے۔

"لما كان اعز الاشياء الموجبة للعزة هو الايمان واذل الاشياء الموجبة للمذلة هو الكفر"

جب کہ عزت کیلئے سب سے اعلیٰ و اشرف ایمان ہے، تو اسی سے واضح ہو گیا کہ ذلت کیلئے سب سے حقیر اور گھٹیا چیز کفر ہے۔

عزت دینیہ اور ذلت کے حصول میں اگر چہ بظاہر بندے کے کسب کو بھی دخل ہے، لیکن حقیت میں اللہ تعالی کی خلق سے ہی سب کچھ حاصل ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ اور اللہ نے تمہیں پیدا کیا، اور تمہارے عملوں کو۔ "لھذا عزت وذلت عطاء کرنا" رب تعالی کے قبضہ قدرت میں ہے۔

عزت کبھی دنیا میں حاصل ہوتی ہے:

اللہ تعالی کثیر مال عطاء کرتا ہے، سونا، چاندی، روپے، اور حیوانات، اور کھیتی، اور اللہ تعالی اس کا رعب کثیر دلوں میں ڈال دیتا ہے۔ یعنی دنیا اور آخرت میں مدح وتعظیم بندے کو اللہ تعالی کی عطاء سے حاصل ہوتی ہے، بندے کی عقل وفراست کی بات نہیں، اگر چہ بندے کے کسب کو دخل ہوتا ہے۔

ذلت عطاء کرنے میں جبائی معتزلی کا مذہب:

لیکن راقم کو بھی یہ پسند ہے، کیونکہ اہل سنت کا مذہب بھی اس کے قریب ہے، جبائی کا قول یہ ہے کہ اللہ تعالی اپنے دشمنوں کو دنیا اور آخرت میں ذلیل کرتا ہے، اور اپنے اولیاء کو ذلیل نہیں کرتا، البتہ کبھی ان کو فقر ومحتاجی اور مرض عطاء کرتا ہے، لیکن اسے ذلت نہیں کہا جاتا، بلکہ یہ اعزاز ہے کیونکہ اس کے بدلے رب تعالی دنیا وآخرت میں ثواب وعزت عطاء فرماتا ہے۔

"فصار ذلک کالفصد والحجامة فانهما وان كانا يؤلمان فی الحال الا انهما لما كانا يستعقبان نفعا عظيما لاجرم لايقال فيها انهما تعذيب"

یہ اسی طرح ہے جس طرح خون نکالنا اور پچھوا لگانا بظاہر درد کا سبب ہے، لیکن اس پر صحت جیسا عظیم فائدہ مرتب ہوتا ہے، اسے عذاب نہیں کہا جاتا، اہل سنت کا قول یہ ہے کہ اللہ تعالی بعض لوگوں کو ایمان عطاء کر کے عزت عطاء فرماتا ہے، اور بعض کو کفر عطاء کر کے ذلیل کرتا ہے۔ بندے کا ایمان وکفر بندے کے کسب واختیار سے ہوتا ہے، لیکن اختیار رب تعالی نے اسے دے رکھا ہوتا ہے، اور وہی تمام افعال کا خالق ہے، اس لئے بندوں کے افعال رب تعالی کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر بتصرف)

ایک غلطی کا ازالہ:

لوگوں میں جو یہ مشہوت ہے کہ "جسے ملک عطاء کر دیا گیا اسے عزت عطاء کر دی گئی اور جس سے ملک چھین

لیا گیا اسے ذلیل کر دیا گیا'' یہ درست نہیں یہ چار جملے علیحدہ علیحدہ ہیں، اور ان کے مطالب بھی چار ہیں۔

(۱) کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ملک عطاء کر کے عزت بھی عطاء کر دی جاتی ہے، جیسا کہ خلفاء راشدین اور حضرت عمر بن عبد العزیز ﷺ اور اس قسم کے عادل وصالح حکمران، ان کو ملک عطاء کیا گیا اور ساتھ ساتھ عزت بھی عطاء کی گئی۔

(۲) ملک عطاء کر کے ذلیل کر دیا جائے جیسا کہ کفار بادشاہ فرعون، نمرود، بخت نصر اور ظالم وفاسق حکمرانوں کو ملک عطاء کر کے ذلیل کر دیا جاتا ہے، یہ بات واضح ہے کہ ایمان، تقوی اور نیکیوں سے عزت عطاء ہوتی ہے، اور کفر وفسق اور بدکاری وظلم سے ذلت حاصل ہوتی ہے۔

(۳) ملک لے کر ذلیل کر دیا جائے، کافر اور ظالم، فاسق وفاجر حکمرانوں سے ملک لے کر انہیں ذلیل کر دیا جاتا ہے، وہ پہلے بھی حکمرانی کے دور میں ذلیل تھے، اور ان سے ملک لے کر انہیں اور زیادہ ذلیل کر دیا جاتا ہے۔

(۴) ملک لے کر عزت عطاء کی جاتی، جیسا کہ حضرت امام حسن ﷺ سے ملک لے کر ان کو عظیم مرتبہ عطاء کیا گیا۔ کیونکہ ان کی شان مصطفیٰ کریم ﷺ اپنی ظاہری حیات میں یوں بیان فرما گئے

''ان النبی ھذا سید ولعل اللہ ان یصلح بین فئتین عظیمتین من المسلمین'' (بخاری، مشکوۃ من قب اھل البیت)

بیشک میرا یہ بیٹا سردار ہوگا اللہ تعالی اس کے ذریعے مسلمانوں کو دو بڑی جماعتوں کے درمیان صلح کرائے گا۔ یہ منصب آپ کو اسی وقت حاصل ہوا جب آپ نے ملک سے دستبردار ہو کر مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں کو خون خرابہ سے بچالیا۔

﴿بِيَدِكَ الْخَيْرُ﴾ ''تیرے قبضہ قدرت میں ہر بھلائی ہے۔''

''فاعلم ان المراد من الید ھو القدرۃ والمعنی بقدرتک الخیر والالف واللام فی الخیر یوجبان العموم فالمعنی بقدرتک تحصل کل البرکات والخیرات'' (کبیر)

واضح ہو کہ بیشک ''ید'' سے مراد ''قدرت'' ہے، اور معنی یہ ہے کہ تیرے قبضہ قدرت میں خیر ہے، اور ''الخیر'' پر الف لام'' عموم پر دلالت کرتے ہیں، اب مطلب یہ ہوگیا کہ تیرے قبضہ قدرت میں ہر برکت اور ہر بھلائی حاصل ہوتی ہے۔

''بیدک'' ظرف پہلے ہے، اور ''الخیر'' بعد میں ہے، جس سے حصر کا فائدہ حاصل ہو رہا ہے، گویا کہ معنی یہ ہوگیا ''بیدک الخیر لا بید غیرک'' تیرے ہی قبضہ قدرت میں ہر بھلائی ہے، تیرے بغیر کسی اور کے ہاتھ میں ہر بھلائی

نہیں، جب یہ پتہ چل گیا کہ "بیدک الخیر" میں حصر پائی گئی ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ "رب تعالی کے قبضہ قدرت میں ہر بھلائی ہے۔ کسی اور کے ہاتھ میں ہر بھلائی نہیں۔ اسی سے پتہ چلا

"ان جمیع الخیرات منه وبتکوینه وتخلیقه وایجاده وابداعه"

بیشک تمام بھلائیاں رب تعالی کی طرف سے ہی حاصل ہوتی ہیں، وہی ان کا خالق ہے، وہی ان کا مکون ہے، وہی ان کا موجد ہے، وہی ان کا مبدع ہے۔

"اذا عرفت هذا فنقول افضل الخیرات هو الایمان بالله تعالی ومعرفته"

جب تو یہ پہچان چکا ہے تو ہم کہتے ہیں سب بھلائیوں سے افضل اللہ تعالی پر ایمان لانا اور اس کی معرفت حاصل کرنا ہے۔ جب بھی ایک کام کو دو شخص کریں تو ایک کام افضل واشرف واکمل ہوتا ہے بنسبت دوسرے کے یہ اسی وقت ہوتا ہے جب فاعل افضل واشرف واکمل ہو۔

جب یہ واضح ہو چکا ہے کہ "اللہ تعالی پر ایمان لانا سب چیزوں سے افضل ہے" تو اسی سے پتہ چل گیا کہ یہ اللہ تعالی کی تخلیق ہے۔

"فلو کان الایمان بخلق العبد لا بخلق الله لوجب کون العبد زائدا فی الخیریة علی الله تعالی وفی الفضیلة والکمال وذلک کفر قبیح"

اگر یہ کہا جائے کہ ایمان بندے کی تخلیق ہے، اللہ کی تخلیق نہیں (معاذ اللہ) تو اس سے یہ لازم آئے گا بندہ بھلائی میں اللہ تعالی پر زائد مرتبہ رکھتا ہے، اور فضیلت وکمال میں رب تعالی سے بڑھ کر ہے، کیونکہ بندے کی تخلیق یعنی ایمان سب سے افضل ہے، جو بندے کی افضلیت پر دلالت کر رہا ہے، یہ قول صریح کفر ہے۔

اعتراض: جب یہ کہا گیا کہ "بیدک الخیر" حصر کا معنی دے رہا ہے تو اس سے یہ ثابت ہوگا کہ

"انه لیس بیدک الا الخیر" وهذا یقتضی ان لا یکون الکفر والمعصیة واقعین بتخلیق الله"

بیشک اللہ تعالی کے قبضہ قدرت میں صرف خیر ہے، لھذا اس حصر کا تقاضا تو یہ ہوگا کہ کفر اور معصیت اللہ تعالی کی تخلیق نہ ہوں۔ (اس سے تو معتزلہ اور مجوسیوں کا مذہب ثابت ہوگا)

جواب: یہ حصر ثابت ہی نہیں جو تم نے بیان کی ہے، حصر تو وہی ثابت ہے جو ہم نے ذکر دی ہے۔ "ان بیده الخیر لا بید غیره" بیشک اسی کے قبضہ قدرت میں ہر بھلائی، کسی اور کے ہاتھ میں نہیں، اس سے یہ ثابت کرنا کہ اللہ تعالی صرف خیر کا خالق ہے شر کا خالق نہیں یہ قول سراسر باطل ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

خیر کو ذکر کیا گیا، شر کو نہیں، کیا وجہ؟

''وانما خص الخیر بالذکر تعلیما لمراعاۃ الادب والا فذکر الاعزاز والاذلال یدل علی ان الخیر والشر کلاھما بیدہ سبحانہ'' (روح المعانی)

خیر کو ذکر کیا گیا ہے، شر کا ذکر نہیں کیا گیا، اس کی وجہ ادب کی رعایت کرنے کی تعلیم دی گئی ہے، کہ براہ راست رب تعالیٰ کی طرف شر کی نسبت نہ کی جائے۔ جب اس سے پہلے یہ ذکر دیا گیا کہ عزت عطاء کرنا اور ذلت دینا رب تعالیٰ کا ہی کام ہے، تو اس سے پتہ چل گیا کہ خیر ہو یا شر سب رب تعالیٰ دست قدرت میں ہیں۔

﴿اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ ''بیشک تو ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔''

اس سے پہلے جب یہ ذکر کیا گیا کہ ''اے اللہ ملک کے مالک، تو عطاء کرتا ہے ملک جسے تو چاہتا ہے، اور چھین لیتا ہے تو ملک جس سے تو چاہے، اور تو عزت عطاء کرتا ہے جسے چاہے، اور تو ذلت دیتا ہے جسے چاہے۔ اب یہ جملہ ﴿اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ بطور تاکید ذکر کیا کہ بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے، اسی وجہ سے ملک عطاء کرنا، عزت عطاء کرنا یا ذلت تیرے قبضہ قدرت میں ہی ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

فائدہ: شر کے پائے جانے یا نہ پائے جانے کے لحاظ سے تمام چیزوں کی پانچ قسمیں ہیں۔

(۱) ایک وہ قسم جس میں شر بالکل نہ پایا جائے۔

(۲) دوسری قسم وہ ہے جس میں شر پایا جائے لیکن خیر اس میں غالب ہو۔

(۳) تیسری قسم وہ ہے جس میں صرف شر پایا جائے، خیر بالکل نہ ہو۔

(۴) چوتھی قسم وہ ہے جس میں شر اور خیر دونوں پائے جائیں لیکن شر غالب ہو خیر پر۔

(۵) پانچویں قسم وہ ہے جس میں شر اور خیر برابر برابر پائے جائیں۔

پہلی اور دوسری قسم میں شر مقصود بالذات نہیں ہوتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے فیصلہ کے مطابق تھوڑے شر کو عظیم بھلائی اور بہت بڑے نفع کا سبب بنا لیا جاتا ہے۔

''والشر الیسیر متی کان وسیلۃ الی الخیر الکثیر کان ارتکابہ مصلحۃ تقتضیھا الحکمۃ ولا یأباھا الکرم المطلق''

تھوڑا شر جب خیر کثیر کا ذریعہ بنے تو اس کا ارتکاب مصلحت ہوتا ہے، رب تعالیٰ کی حکمت اس کا تقاضا

کرتی ہے، رب تعالیٰ کا مطلق کرم اسے منع نہیں کرتا۔ جیسا کہ خون نکلوانا، کڑوی دوا پینا، بظاہر تکلیف دہ چیزیں ہیں، لیکن حقیقت میں نفع مند ہیں حکمت کے تقاضا کے مطابق ہیں۔''

و کل قضاء الله تعالی بما نزاه شرا من هذاالقبيل" اللہ تعالیٰ کا ہر وہ فیصلہ جس کو ہم بظاہر شر سمجھیں وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی حکمت کے مطابق ہوتا ہے، اسی پر توکل ہو، اور اس پر راضی و شاکر ہو، حدیث شریف میں آتا ہے "**لاتتهم الله تعالی علی نفسک**" اللہ تعالیٰ اپنی ذات پر کوئی تہمت نہیں آنے دیتا۔ (راقم نے معنی کو آسان طریقہ پر ذکر کیا ہے)

اور حدیث میں آتا ہے "**لا تكرهوا الفتن فان فيها حصاد المنافقين**" فتنوں کو ناپسند نہ کرو، ان میں منافقوں کی جڑوں کو کاٹ دیا جاتا ہے۔ اور حدیث میں ہے "**لولم تذنبوا لخفت عليكم ما هو اكبر من ذلك العجب العجب**" اگر تم سے کوئی گناہ سرزد نہ ہوتا تو تمہیں اس سے بڑی چیزیں اپنی لپیٹ میں لے لیتیں، جو بہت ہی زیادہ باعث تعجب ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ اگر خیر کے حصول کیلئے شر کا سامنا کرنے پڑے تو شر کے ارتکاب کی رب تعالیٰ سے معافی طلب کر لے، اور خیر کو حاصل کرے۔ (از روح المعانی)

لیکن یہ اسی وقت ہے جب خیر کثیر ہو، اور شر قلیل ہو، بغیر شر قلیل کے ارتکاب کے خیر کثیر کو حاصل کرنا ممکن نہ ہو۔ لیکن مقام افسوس یہ ہے کہ آجکل شر کثیر کو حاصل کرنے کیلئے خیر قلیل کا سہارا لیا جاتا ہے۔

﴿قرض اتارنے کی دعاء﴾

"**وقال معاذ بن جبل احتبست عن النبی ﷺ یوما فلم اصل معه الجمعة، فقل یا معاذ ما منعک من صلوة الجمعة؟ قلت یا رسول الله ﷺ کان لیوحنابن باریا الیهودی علی اوقیة من تبر و کان علی بابی یرصدنی فاشفقت ان یحبسنی دونک، قال قل کل یوم "قل اللهم مالک الملک" الی قوله بغیر حساب رحمن الدنیا والآخرة ورحیمهما تعطی منهما من تشاء و تمنع منهما من تشاء اقض عنی دینی فلو کان علیک مل ء الارض ذهبا لاداه الله عنک**" (قرطبی واخرج ابن ابی الدنیا، درمنثور واخرج الطبرانی)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے، میں ایک دن جمعہ کی نماز پڑھنے کیلئے حاضر نہ ہو سکا تو رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے پوچھا، تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں نے ایک یہودی کا قرض دینا تھا، وہ میرے دروازے پر آگیا تھا، میں اس کے ڈر کی وجہ سے حاضر نہ ہو سکا، آپ نے فرمایا، اے معاذ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارا قرض اتر جائے؟ تو میں نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ، آپ نے فرمایا تم یہ دعاء پڑھ لیا کرو تمہارا قرض اتر جائے گا، خواہ کتنا زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔ (وہ دعاء یہ ہے)

(قُلِ اللّٰھُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ تُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَتُوْلِجُ النَّھَارَ فِی الَّیْلِ وَتُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَیْرِ الْحِسَابِ رَحْمٰنَ الدُّنْیَا وَالْآخِرَةِ وَرَحِیْمَھُمَا تُعْطِیْ مِنْھُمَا مَنْ تَشَاءُ وَتَمْنَعُ مِنْھُمَا مَنْ تَشَاءُ اِقْضِ عَنِّی دَیْنِیْ"

نتیجہ واضح ہوا:

کہ رب تعالی کے دست قدرت میں ہے، جسے چاہے ملک وحکومت عطاء کرے حکمت وہی جانتا ہے، البتہ بظاہر یہ ضروری نہیں کہ حکومت اسے ہی دی جائے جو اہلیت رکھتا ہو، کبھی نااہل، بدھو لوگ بھی ڈنڈے کے زور سے حکومت حاصل کر لیتے ہیں۔ اسی طرح رب تعالی جب چاہے کسی سے ملک چھین لے، حکمت تو رب تعالی ہی جانتا ہے، لیکن بظاہر عقلمند، زیرک، شریف لوگوں کی حکومت کو برخواست کیا جاتا ہے۔

اسی طرح جسے چاہے اسے عزت فرمائے، وہ عزت نیکیوں کی توفیق عطاء کرکے عطاء کر دے، خواہ نیک شخص کو ملک عطاء کرکے عزت دے دے۔ اور رب تعالی کے دست قدرت میں ہے جسے چاہے ذلت عطاء کر دے، یعنی گناہوں میں کوئی شخص مبتلاء ہو کر ذلیل ہو جائے، یا کسی نااھل سے حکومت لے کر اسے ذلیل کر دیا جائے۔

(واللہ اعلم بالصواب)

❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀

﴿تُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ وَتُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ۝﴾ (آیۃ نمبر ۲۷)

(1) تو دن کا حصہ رات میں ڈالے اور رات کا حصہ دن میں ڈالے اور مردہ سے زندہ نکالے اور زندہ سے مردہ نکالے اور جسے چاہے بے گنتی دے۔

(2) تو داخل کرتا ہے رات (کے حصہ) کو دن میں، اور تو داخل کرتا ہے دن (کے حصہ) کو رات میں اور تو نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور تو نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے، اور تو رزق دیتا ہے، جسے تو چاہے بغیر حساب کے۔

راقم کا ترجمہ:

جلالین، مظہری وغیرہ کے مطابق ہے ﴿تُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ﴾ یعنی تدحل احدهما فی الاخر" مطلب یہ ہے کہ "تولج" باب افعال سے ہے "اولج یولج ایلاجا" مجرد میں "ولج یلج ولجا" سے لیا ہوا ہے، جس کا معنی "داخل ہونا" جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ﴾ (یہاں تک کہ داخل ہو جائے اونٹ سوئی کے سوراخ میں، یعنی "یلج" کا معنی داخل ہونا، "یولج، تولج" کا معنی داخل کرنا۔

روح المعانی، مدارک اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ:

یعنی روح المعانی اور مدارک میں تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ان دونوں تفاسیر کے مطابق ہے، میں جب دیکھتا ہوں کہ ایک شخص نے کتنی محنت اور کتنی تفاسیر کو مدنظر رکھتے ہوئے ترجمہ کیا ہے تو دل سے دعا نکلتی ہے اللہ تعالیٰ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کی قبر پر ان گنت رحمتیں نازل فرمائے اور آخرت میں مدارج بلند فرمائے، آیئے دیکھئے، تفسیر مدارک میں علامہ نسفی رحمہ اللہ قمطراز ہیں:

"فالاج ادخال الشیء فی الشیء وهو مجاز هنا ای تنفص من ساعات اللیل وتزیدفی النهار وتنقص من ساعات النهار وتزید فی اللیل" (مدارک)

"ایلاج" کا معنی ہے ایک چیز کو دوسری میں داخل کرنا، یہاں مجازی معنی لیا گیا ہے کہ تو رات کی ساعتوں کو کم کرکے دن

کو زیادہ کرتا ہے اور دن کی ساعتوں کو کم کر کے رات کو زیادہ کرتا ہے۔

"الولوج فی الاصل الدخول و الایلاج الادخال و استعیر لزیادة زمان النهار فی اللیل وعکسه بحسب المطالع والمغارب فی اکثر البلدان" (روح المعانی)

"ولوج" کا اصل میں معنی ہے دخول، اور ایلاج کا معنی ہے داخل کرنا، اور یہاں مجازی طور پر مراد یہ لیا گیا ہے دن کا وقت رات میں زیادہ کر لیا جاتا ہے، اور اس کا عکس یعنی رات کا وقت دن میں زیادہ کر لیا جاتا ہے، یہ طلوع اور غروب کے لحاظ پر اکثر شہروں میں پایا جاتا ہے کہ کبھی دن چھوٹا ہو گیا اور رات بڑی، اور کبھی رات چھوٹی ہو گئی اور دن بڑا۔ اب آپ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کنز الایمان کو دیکھئے (تو دن کا حصہ رات میں ڈالے اور رات کا حصہ دن میں ڈالے) تو بہت خوب نظر آئے گا۔

تنبیہ: "ولایضر تساوی اللیل والنهار دائما عند خط الاستواء لانه یکفی الزیادة والنقصان فیهما فی الاغلب"

خط استواء کے پاس رہنے والوں کیلئے ہمیشہ دن، رات برابر رہتے ہیں، وہاں دن یا رات کا چھوٹا ہونا، یا بڑا ہونا نہیں پایا جاتا۔ اکثر شہروں میں کبھی دن چھوٹا ہوتا ہے اور رات بڑی، اور کبھی رات چھوٹی ہوتی ہے اور دن بڑا، اس لئے ﴿تُولِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ﴾ کہا گیا، اس سے خط استواء کے قرب میں دن رات کی برابری سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ (روح المعانی)

رات اور دن کو ایک دوسرے میں داخل کرنے کے دو مطلب:

(۱) رات کو کبھی چھوٹا کر لیا جاتا ہے، اتنی قدر دن کو بڑھا دیا جاتا ہے، اور کبھی دن کو چھوٹا کر لیا جاتا ہے اور رات کو اتنی مقدار بڑھا دیا جاتا ہے۔ "وانما فعل سبحانه وتعالی ذلک لا نه علق قوام العالم ونظامه بذلک" اللہ تعالیٰ نے دن رات کو کبھی چھوٹا کبھی بڑا کر کے نظام عالم کو اس پر مرتب فرما دیا ہے۔

(۲) دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رات کو دن کے پیچھے لاتا ہے "فیلبس الدنیا ظلمة بعد ان کان فیها ضوء النهار" دنیا تاریکی کا لباس پہن لیتی ہے جبکہ پہلے دن کی روشنی موجود رہتی ہے۔ پھر دن کو رات کے پیچھے لاتا ہے "فیلبس الدنیا ضوء ه فکان المراد من ایلاج احدهما فی الآخر ایجاد کل واحد منهما عقیب الآخر" تو دنیا روشنی کا لباس پہن لیتی ہے، جبکہ پہلے دن کی روشنی موجود تھی۔ لھذا رات کو دن میں داخل کرنے اور

دن کو رات میں داخل کرنے سے مراد یہ ہے کہ ہر ایک کو ایک دوسرے کے پیچھے موجود کرتا ہے۔ تاہم پہلا معنی لفظ کے قریب ہے، یعنی رات کا کچھ حصہ دن میں داخل کر دیا جاتا ہے، اور دن کا کچھ حصہ رات میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ یہ بھی خیلا رہے کہ دوسرے معنی کے لحاظ پر مطلقا معنی ہوگا ''تو داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور تو داخل کرتا ہے دن کو رات میں۔ اس معنی کے لحاظ پر لفظ ''حصہ'' معنی میں نہیں لایا جائے گا۔

دن رات کیا ھیں: فلاسفہ حکمت الھیہ میں یہ بیان کرتے ہیں کہ ستاروں کے دور کا مکمل ہونا ہے دن کہلاتا ہے، اس کے مد مقابل رات ہے۔ ستاروں کے دور کا مطلب یہ ہے کہ نطح سے نطح تک، شرطین سے شرطین تک، بطین سے بطین تک، اس طرح ایک دور جب انتہاء تک پہنچے گا تو اسے دن کہا جائے گا، اس کے مد مقابل رات ہوگی لیکن یہ معنی خواص کیلئے پیش کیا گیا ہے۔ عوام حضرات کے نزدیک حساب کیا جاتا ہے ''طلوع آفتاب'' سے لے غروب تک، اور غروب سے لیکر طلوع آفتاب کا حساب ہوگا۔

یوم کی دو قسمیں ھیں: (۱) یوم جسمانی (۲) یوم روحانی

یوم جسمانی کا طول تین سو ساٹھ درجے، ہے کیونکہ اس میں فلک ظاہر ہوتا ہے، اور اس کی حرکت دکھائی نہیں دیتی، اس جسمانی دن میں ہی اجسام کا تعلق غذاؤں سے، اور غذاؤں کی زیادتی سے، اور (جسم کے) بڑھنے سے اور صحت سے اور بیماری سے اور حیات سے اور موت سے ہے۔ ایام جسمانیہ ظاہر کے لحاظ پر سات قرار دئے گئے ہیں، جن کو ایک ہفتہ سے تعبیر کیا جاتا ہے ان دنوں میں قوۃ فعالۃ نفس کلی کی طرف برانگیختہ ہوتی ہے۔

یوم روحانی میں عقول کو معرفت حاصل ہوتی ہے، نظروں کو مشاہدہ حاصل ہوتا ہے، روحوں کو اسرار حاصل ہوتے ہیں۔ ایام روحانیہ کو ارواح میں احکام حاصل ہوتے ہیں، اور عقلیں صرف قوۃ علامۃ (وہ قوت جس کے ذریعے کئی چیزوں کی علامت کو حاصل کر لیتی ہے) سے حق کی طرف رجوع کرتی ہیں جن سے آسمان و زمین قائم ہیں، وہ حق جس کی طرف ایام روحانیہ میں رجوع پایا جاتا ہے، اس سے مراد ''کلمہ الھیہ'' ہے۔

دن رات کتنے چھوٹے، بڑے ہوں گے:

آسان صورت یہ ہے کہ جتنا دن چھوٹا ہوگا، اتنی رات لمبی ہوگی جتنی رات چھوٹی ہوگی اتنا دن لمبا ہوگا، دن رات کی مجموعی مقدار چوبیس گھنٹے ہوگی۔ مختلف علاقوں میں مختلف مقدار طول البلد کی وجہ سے دن رات کی مقدار مختلف ہوگی۔ ہاں البتہ سب سے بڑا دن (حتی یصیر النهار خمس عشرة ساعة وهو اطول ما يكون والليل تسع

ساعات وھو اقصر ما یکون) پندرہ گھنٹے کا ہوگا، اور سب سے چھوٹی رات نو گھنٹے کی ہوگی۔ (ماخوذ از قرطبی)

﴿وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ﴾

''اور تو نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور تو نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے۔''

زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالنے کا وسیع مفہوم:

(۱) فقال عکرمة ھی اخراج الدجاجة وھی حیة من البیضة وھی میتة، واخراج البیضة وھی میتة من الدجاجة وھی حیة''

حضرت عکرمہ ﷺ نے بیان فرمایا، مرغی زندہ کو انڈے سے نکالنا جو مردہ ہے یہ زندہ سے مردہ کو نکالنا ہے، اور انڈے کو مرغی سے نکالنا، یہ مردہ کو زندہ سے نکالنا ہے۔

(۲) ''وقال ابن مسعود ھی النطفة تخرج من الرجل وھو میتة وھی حی ویخرج الرجل منھا حیا وھی میتة''

حضرت ابن مسعود ﷺ فرماتے ہیں، نطفہ کو مردے سے نکالنا، یہ مردہ کو زندہ سے نکالنا ہے، اور نطفہ سے شخص کو نکالنا، یہ زندہ کو مردہ سے نکالنا ہے۔

(۳) ''وقال عکرمة والسدی ھی الحبة تخرج من السنبلة والسنبلة تخرج من الحبة، والنواة من النخلة والنخلة تخرج من النواة''(والحیاة فی النخلة والسنبلة تشبیه)

عکرمہ اور سدی کا قول یہ ہے کہ دانے کو بالی (سٹے) سے نکالنا، اور بالی کو دانے سے نکالنا، اور گٹھلی کو کھجور کے درخت سے اور کھجور کے درخت کو گٹھلی سے نکالنا مراد ہے۔ کھجور کے درخت اور بالی (سٹے) میں مجازی طور پر حیات (زندگی) کا اعتبار کیا گیا ہے۔ (قرطبی)

(۴) مؤمن کو کافر سے نکالنا، یہ زندہ کو مردے سے نکالنا ہے، کیونکہ مؤمن زندہ کی مثال ہے۔ اور کافر مردہ کی مثال ہے، اور کافر کو مؤمن سے نکالنا، یہ مردہ کو زندہ سے نکالنا ہے،

(۵) طیب کو خبیث سے نکالنا، یہ زندہ کو مردہ سے نکالنا، ہے طیب سے مراد زندہ ہے، اور خبیث سے مراد مردہ ہے، اور خبیث کو طیب سے نکالنا، یہ مردہ کو زندہ سے نکالنا ہے۔ (از کبیر)

تنبیه: ''وفی الحدیث ان رسول الله ﷺ قال سبحان الله الذی یخرج الحی من المیت، وقد رأی امرأة صالحة مات ابوھا کافرا وھی خالدة بنت الاسود بن عبد

يغوث" (ضعيف اخرجه عبد الرزاق. ومن طريقه الطبري. وابن سعد في الطبقات "البحر المحيط")

نبی کریم ﷺ نے ایک نیک عورت خالدہ بنت اسود بن یغوث کے کافر باپ کی موت کو دیکھ کر فرمایا "اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے جو زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے۔

(۲) "وقال الماوردی ویحتمل یخرج الجلد الفطن من البلید العاجز والعکس (لان الفطنة حیاة الحس والبلادة موته)

ماوردی نے کہا ہے کہ اس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ سمجھ دار عقلمند کو بے قوف، عاجز سے نکالنا، یہ زندہ کو مردہ سے نکالنا ہے، اور بے وقوف کو عقلمند سے نکالنا یہ مردہ کو زندہ سے نکالنا ہے کیونکہ عقلمندی حواس کی زندگی ہے اور بے وقوفی حواس کی مردگی ہے۔

(۷) "وقیل یخرج الحکمة من قلب الفاجر لانها لا تستقر فیه، والسقطة من لسان العارف"

بعض لوگوں نے بیان کیا ہے کہ یہ آیۃ کریمہ اسے بھی شامل ہے کہ فاجر کے دل سے حکمت والا قول نکلے، یہ زندہ کو مردہ سے نکالنا ہے، کیونکہ فاسق مردہ کی طرح ہے، حکمت سے بھرا ہوا قول زندہ کی طرح ہے، اور گھٹیا کلام عارف کی زبان سے نکلنا زندہ سے مردہ کو نکالنا ہے کیونکہ عارف زندہ کی طرح ہے، اور گھٹیا کلام مردہ کی طرح ہے۔ (بحر محیط)

(۸) "والعالم من الجاهل والجاهل من العالم"

عالم کو جاہل سے نکالنا زندہ کو مردہ سے نکالنا ہے، کیونکہ عالم زندہ کی طرح ہے اور جاہل مردہ کی طرح ہے، اور جاہل کو عالم سے نکالنا مردہ کو زندہ سے نکالنا ہے۔ (روح المعانی)

فائدہ: "واخرج ابن مردویه من طریق ابی عثمان النهدی عن سلمان الفارسی قال قال رسول الله ﷺ لما خلق الله آدم علیه السلام اخرج ذریته فقبض قبضة بیمینه فقال هؤلاء اهل الجنة ولا ابالی وقبض با لاخری قبضة فجاء فیها کل ردنی فقال هؤلاء اهل النار ولا ابالی فخلط بعضهم ببعض فیخرج الکافر من المؤمن ویخرج المؤمن من الکافر فذلک قوله (یخرج الحی من المیت ویخرج المیت من الحی" (درمنثور)

حضرت سلمان فارسی ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے ان کی اولاد کو نکالا تو اس نے اپنے دائیں دست قدرت (جو اس کی شان کے لائق ہے) میں (تمام ذریت کو) پکڑا اور ارشاد فرمایا یہ جنتی لوگ ہیں، اور مجھے کوئی پرواہ نہیں، پھر دوسرے دست قدرت میں گھٹیا ذریت (کافروں) کو پکڑا اور ارشاد فرمایا یہ جہنمی لوگ ہیں اور مجھے کوئی پرواہ نہیں، پھر بعض کو بعض سے ملایا، کافروں کو مومنوں سے اور مومنوں کو کافروں سے

نکالا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالی کے ارشاد گرامی ﴿وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ﴾ کا یہی مطلب ہے۔

﴿وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ ''اورتورزق دیتا ہے جسے تو چاہے بغیر حساب کے''

ای من غیر تضییق وتقتیر لا یعرف الخلق عدده ومقداره وان کان معلوما عند الله(مظهری)

بغیر حساب کے رزق دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں تنگی اور کمی نہیں پائی جاتی، اس لحاظ پر کہ مخلوق اس کی تعداد اور مقدار کو نہیں جانتی اگر چہ اللہ تعالی کو اس کی تعداد اور مقدار کا علم ہوتا ہے۔

اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ مظہری کی اس تفسیر کے مطابق ہے، کیونکہ آپ نے ترجمہ کیا ہے'' جسے چاہے بے گنتی دے۔راقم نے اپنے ترجمہ میں'' حساب'' کا ترجمہ ''حساب'' سے ہی کیا ہے، ایک تو یہ کہ آجکل اردو میں حساب کا لفظ عام استعمال ہے۔دوسری وجہ یہ ہے کہ تفسیر مظہری اور روح البیان کو شامل ہو جائے۔

حساب کے تین معانی:

''قال ابو العباس المقری وردلفظ الحساب فی القرآن علی ثلاثة اوجه بمعنی التعب قال الله تعالی(وترزق من تشاء بغیر حساب)وبمعنی العدد قال الله تعالی(انما یوفی الصابرون اجرهم بغیر حساب)وبمعنی المطالبة قال الله تعالی(فامنن او امسک بغیر حساب) (روح البیان،ابوالسعود)

ابوالعباس مقری فرماتے ہیں لفظ حساب قرآن پاک میں تین معانی میں استعمال ہے۔

(۱) حساب بمعنی مشقت وتھکن، جیسا کہ اللہ تعالی نے فرمایا﴿ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ اورتو رزق دیتا ہے جسے تو چاہے بغیر مشقت وتھکن کے۔

(۲) حساب بمعنی عدد کے جیسا کہ رب تعالی نے ارشادفرمایا﴿إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ وہ (اللہ) صبر کرنے والوں کو اجر بغیر حساب کے دیتا ہے۔

(۳) حساب بمعنی مطالبہ جیسا کہ اللہ تعالی نے ارشادفرمایا﴿فَامْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ احسان کریا روک لے بغیر مطالبہ کے۔

فائدہ جلیلہ: علامہ بغوی رحمہ اللہ نے مکمل اسناد سے حدیث بیان فرمائی کہ

''جعفر بن محمد عن ابیه عن جده عن علی بن طالب ؓ قال قال رسول الله ﷺ ان فاتحة الکتاب

وآیة الکرسی والآیتین من آل عمران(شهد الله)الی قوله(ان الدین عند الله الاسلام)(وقل اللهم مالک الملک)الی قوله(بغیر حساب)مشفعات معلقات بالعرش مابینهن وبین الله عزوجل حجاب،قلن یا رب تهبطنا الی ارضک والی من یعصیک،قال الله عزوجل بی حلفت لا یقرأ کن احد من عبادی دبر کل صلوة الاجعلت الجنة مثواه علی ماکان فیه واسکنته فی حظیرة القدس،ونظرت الیه بعینی المکنونة ،وقضیت له کل یوم سبعین حاجة ادناها المغفرة،واعذته من کل عدو وحاسد نصرته علیهم" (معالم التنزیل للبغوی)

جعفر بن محمد اپنے باپ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی ﷜ فرماتے ہیں ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک سورۃ فاتحہ اور آیۃ الکرسی اور دو آیتیں ﴿شَهِدَ اللّٰهُ﴾ سے لیکر ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ تک،اور ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ﴾ سے لیکر ﴿بِغَیْرِ حِسَابٍ﴾ تک کو اللہ تعالی نے مقبول الشفاعۃ بنایا، یہ عرش کے ساتھ لٹکی ہوئی تھیں،ان کے درمیان اور اللہ تعالی کے درمیان کوئی حجاب نہیں تھا،تو انہوں نے عرض کیا اے ہمارے رب تو اپنی زمین کی طرف اور اپنے نافرمان بندوں کی طرف ہمیں اتار دے،رب تعالی نے فرمایا مجھے اپنی ذات کی قسم کوئی شخص تمہیں نماز کے بعد نہیں پڑھے گا مگر یہ کہ میں جنت اس کا ٹھکانا بناؤں گا جہاں وہ پہلے تھا (یعنی آدم ﷤ کی پشت میں جنت میں ہی تھا) اور میں اسے مقدس مقام میں ٹھہراؤں گا اور میں اسے اپنی چھپی آنکھوں سے دیکھتا ہوں،اور میں ہر دن اس کی ستر حاجتوں کو پورا کرتا ہوں ان میں سے کم حاجت مغفرت ہے،اور میں اس کو دشمنوں اور حاسدوں سے پناہ دیتا ہوں،اور ان کے خلاف اس کی امداد کرتا ہوں (یعنی دشمنوں اور حاسدوں پر اسے غالب کرتا ہوں)

جیسے لوگ ہوں گے ایسے حکام ہوں گے:

بعض کتب میں ذکر آتا ہے کہ رب تعالی فرماتا ہے:

"انا الله ملک الملوک قلوب الملوک ونواصیهم بیدی فان العباد اطاعونی جعلتهم لهم رحمه وان العباد عصونی جعلتهم علیهم عقوبة فلا تشتغلوا بسبب الملوک ولکن توبوا الی اعطفهم علیکم"

بیشک میں اللہ ہوں سب بادشاہوں کا بادشاہ ہوں سب بادشاہوں کے دل اور ان کی پیشانیاں میرے دست قدرت میں ہیں،بیشک جو بندے میری اطاعت کرتے ہیں،میں ان پر بادشاہوں کو عذاب بنا دیتا ہوں،تم بادشاہوں کی طرف مشغول نہ ہو،بلکہ اس ذات کی طرف توبہ کرو اور رجوع کرو جو بادشاہوں کو تم پر مہربان بناتا ہے۔ (روح البیان)

ارشادِ مصطفوی ﷺ:

"قوله ﷺ کما تکونون یولی علیکم" معناه ان کنتم من اهل الطاعة یول علیکم اهل الرحمة وان کنتم من اهل المعصیة یول علیکم اهل العقوبة"

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جیسے تم ہو گے ایسے تم پر حاکم مقرر کئے جائیں گے" اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے "اگر تم فرمانبردار ہوئے تو تم پر رحمت والے لوگوں کو حاکم بنایا جائے گا اور اگر تم نافرمان ہوئے تو تم پر سزا دینے والے حاکم مقرر کئے جائیں گے۔

موسیٰ علیہ السلام کا رب تعالیٰ کے حضور عرض کرنا:

"یا رب انت فی السماء ونحن فی الارض فما علامة سخطک من رضاک فاوحی اللہ الیہ اذا استعملت علی الناس خیارھم فھو علامة رضای واذا استعملت شرارھم فھو علامة سخطی علیھم"

موسیٰ علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا، اے میرے رب تو بلندی و رفعت میں ہے، ہم زمین میں ہیں، ہمیں کیسے پتہ چلے کہ تو ناراض ہے یا راضی ہے؟ تو رب تعالیٰ نے آپ پر وحی کی جب میں تم پر اچھے لوگوں کو حاکم بناؤں تو یہ میرے راضی ہونے کی علامت ہے، اور جب میں تم پر برے حاکم مقرر کروں تو یہ میرے ناراض ہونے کی علامت ہے۔ (روح البیان)

حجاج بن یوسف کا قول:

حجاج بن یوسف سے کسی نے کہا تو نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ پایا ہے تو ان کی طرح عدل و انصاف کیوں نہیں کرتا؟ تو اس نے جواب دیا۔

"تبذروا العمرلکم" ای کونوا کابی ذرفی الزھد والتقوی اعاملکم معاملة عمر فی العدل والانصاف"

تم حضرت ابوذر کی طرح زاہد و متقی بن جاؤ تو میں عمر کی طرف عدل و انصاف کرنے والا بن جاتا ہوں۔ (روح البیان)

راقم کا موقف: یہ قاعدہ اکثر یہ ہے، کلیہ نہیں، کبھی کبھی نیک لوگوں برے حکام مسلط کر دئے جاتے ہیں، جیسا کہ حجاج بن ابی یوسف ہی کو دیکھئے یہ بدترین ظالم شخص تھا، اس کے زمانہ میں رعایا کے اکثر لوگ نیک تھے، لیکن اس ظالم نے ایک لاکھ چوبیس حضرات کو شہید کر دیا جو کہ صحابہ کرام اور تابعین تھے۔ (ماخوذ از نبراس)

اکثر طور پر ایسا ہوتا ہے: رعایا کے احوال کے مطابق اور ان کے اعمال کے مطابق حاکم مقرر کئے جاتے ہیں، رعایا کے لوگ نیک ہوں تو حکام نیک مقرر کئے جاتے ہیں، اور رعایا کے لوگ برے ہوں تو حاکم

بھی برے مقرر کیے جاتے ہیں۔ عوام کی بداعمالیوں اور حکام کے مظالم کا اثر جانوروں کے تھنوں پر پڑتا ہے کہ ان کا دودھ کم ہو جاتا ہے کھیتی سے برکت اٹھ جاتی ہے، درختوں کے پھل کم ہو جاتے ہیں، تجارتی کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جاتا ہے، اور صنعتی کاروبار میں نقصان ہوتا ہے۔

اس تمام صورت حال کی دارومدار اس پر ہے "وذلک الملک الجائر بشؤم ظلمه وسوء فعله" کہ ظالم بادشاہ کے ظلم اور اس کے برے اعمال کی وجہ سے یہ ساری بے برکتی حاصل ہوتی ہے۔ "ویکون الامر علی العکس اذا عدل" جب حاکم عدل وانصاف کرتا ہے، تو معاملہ اس کے خلاف ہوتا ہے، یعنی برکت ہی برکت ہوتی ہے، نہ سیلاب آتے ہیں نہ طوفان، جانوروں کے دودھ میں کمی نہیں ہوتی بلکہ زیادتی ہوتی ہے، کھیتی میں برکت ہوتی ہے، تجارت میں برکت ہوتی ہے صنعتی کاروبار میں برکت ہوتی ہے۔ (ماخوذ از روح البیان)

طاؤس کی نصیحت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو:

جب عمر بن عبدالعزیز کو خلیفہ بنالیا گیا تو آپ کی طرف طاؤس رحمہ اللہ نے خط لکھا، خط کا مضمون یہ تھا۔

"ان اردت ان یکون عملک خیرا کله فاستعمل اهل الخیر فقال کفی بها موعظة"

اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے تمام کام اچھے رہیں تو بہتر، نیک لوگوں کو مختلف علاقہ جات کے حاکم مقرر کریں، یعنی عاملین (گورنر، وزراء اعلی) اگر نیک ہوں گے تو تمہارے معالات درست ہوں گے، اگر وہ برے ہوں گے تو تمہارے معاملات درہم برہم رہیں گے، آپ نے فرمایا بہت اچھی نصیحت ہے، اس سے بڑھ کر کسی اور نصیحت کی ضرورت نہیں، یقیناً اگر اس نصیحت پر عمل کر لیا تو نظام حکومت درست ہو جائے گا۔ (ماخوذ از روح البیان)

پندم ار بشنوی ای پادشاہ   درہمہ دفتر بہ ازیں پند نیست

میری نصیحت اگر تو سنے اے بادشاہ بڑی بڑی کتابوں میں اس سے بڑھ کر کوئی نصیحت نہیں۔

جز بخرمند مفر ما عمل   گرچہ عمل کار خردمند نیست

سوائے عقل مند شخص کے کام کسی کے سپرد نہ کر اگر چہ وہ کام عقلمند کی شایاں شان نہ ہو۔ (ماخوذ از روح البیان)

ارشاد مصطفوی ﷺ:

"قال النبی ﷺ "سیاتی زمان لامتی یکون امراؤهم علی الجور وعلماؤهم علی الطمع وعبادهم علی الریاء وتجارهم علی اکل الرباء ونساؤهم علی زینة الدنیا"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا میری امت پر عنقریب ایک زمانہ آئے گا، ان کے حکام ظالم ہوں گے، اوران کے علماء لالچی، طمع کرنے والے ہوں گے، اوران کے عبادت کرنے والوں کی عبادت میں دکھلاوا پایا جائے گا، اوران کے تاجر سود کھانے والے ہوں گے، اوران کی عورتیں دنیا کی زینت کرنے والی ہوں گی۔ (از روح البیان)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد سورج کی آب وتاب سے بھی زیادہ جگمگا رہا ہے، آج تباہی و بربادی ہورہی ہے، ہر طرف بے ثباتی کی فضاء قائم ہے، ایک دوسرے پر اعتماد نہیں ایک دوسرے سے برتری کی کوشش میں عوام ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ حکام مظالم برپا کئے ہوئے ہیں، عدل وانصاف کا نام ونشان نہیں ہاں ہاں مقامات انصاف ہی انصاف سے خالی ہیں، منصفین ہی انصاف سے دور چلے گئے ان کے انصاف کی دارومدار یہ ہے کہ بڑوں کے حق میں فیصلہ دینا ہے خواہ وہ ظالم ہی کیوں نہ ہوں اس کا نام انصاف نہیں۔ علماء اسمبلیوں اور پیسے کی لالچ میں مبتلاء ہو کر آجکل مصائب وآلام میں پھنسے ہوئے ہیں۔

اے علماء کرام! خدارا اس گندے کھیل سے دور ہو جائیں، مظالم برپا کرنے والوں سے پیسے لے کر ایک دوسرے کی مساجد پر قبضہ کرنے، اور فتنہ وفساد برپا کرنے سے باز آجائیں، ورنہ رب تعالی کی گرفت میں آتے ہی رہو گے۔ تاجر بلکہ عام لوگ کسی نہ کسی طرح سود کھانے میں مبتلاء ہیں کیونکہ نظام بنکاری سود پر چل رہا ہے، کوئی بھی سود کے غبار سے بچا ہوا نہیں، اس لئے سودی کاروبار سے رب تعالی سے لڑائی مول لئے بیٹھے ہیں۔ عورتیں دنیا کی زیب وزینت میں یوں مبتلاء ہیں کہ شرم وحیاء کا جنازہ نکل چکا ہے "الامان والحفیظ"

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكَافِرِيْنَ اَوْلِيَاءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّا اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰةً وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ٥﴾ (آیۃ نمبر ۲۸)

(1) مسلمان کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں مسلمانوں کے سوا اور جو ایسا کرے گا اسے اللہ سے کچھ علاقہ نہ رہا مگر یہ کہ تم ان سے کچھ ڈرو، اور اللہ تمہیں اپنے غضب سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف پھرنا ہے۔

(2) نہ بنائیں مومن کافروں کو دوست سوائے مومنوں کے، اور جو شخص کرے گا یہ، تو نہیں وہ اللہ کی طرف سے کسی چیز میں مگر یہ کہ تم ڈرو ان سے ڈرنا۔ اور ڈراتا ہے تمہیں اللہ اپنی ذات سے (اپنے غضب سے) اور اللہ کی طرف ہی پھرنا ہے۔

مختصر مطلب تقریباً واضح ہے کہ مؤمن اپنے مؤمن بھائیوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بنائیں، جس شخص نے کافروں کو دوست بنایا اسے اللہ تعالیٰ سے کوئی تعلق نہ رہا، ہاں البتہ کافروں سے اگر تم ڈرو اور اپنے بچاؤ کی خاطر ان سے ظاہری طور پر تعلق رکھو تو یہ جائز ہے، البتہ دلی محبت نہ ہو، اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے غضب سے ڈراتا ہے کہ اگر تم نے کافروں کو دوست بنایا تو تم اللہ تعالیٰ کے غضب میں آجاؤ گے، اور تم نے اللہ کی طرف ہی پھرنا ہے۔

شان نزول:

اس آیۃ کریمہ کے شان نزول میں چند وجوہ بیان کی گئی ہیں، جو مجموعی طور پر ہی نازل ہونی کی وجوہ ہیں۔

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا حجاج بن عمرو، ابن ابی حقیق اور قیس بن زید انصار کے کچھ افراد سے پوشیدہ طور پر تعلق رکھتے تھے، انصار کے ان حضرات کو جن سے ان لوگوں نے تعلقات قائم رکھے تھے "رفاعہ بن منذر، عبداللہ بن جبیر اور سعید بن خیثمہ رضی اللہ عنہم نے کہا "اجتنبوا ھؤلاء الیھود لایفتنونکم عن دینکم" ان یہود سے بچ کر رہو تاکہ یہ تمہیں فتنہ میں نہ ڈالیں، لیکن انصار نے ان رابطہ توڑنے سے انکار کر دیا تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی، انہوں نے یہود سے رابطہ ختم کر دیا۔

(۲) مقاتل کا قول یہ ہے کہ حاطب بن ابی بلتعہ وغیرہ جن کے اہل وعیال مکہ میں تھے وہ اہل مکہ سے محبت کرتے

تھے تو ان کو اس سے منع کرنے کیلئے یہ آیہ کریمہ نزل ہوئی۔

(۳) ابو صالح کا قول یہ ہے کہ آیۃ کریمہ منافقین کے متعلق نازل ہوئی، وہ بظاہر مسلمان بن کر مسلمانوں سے رابطہ قائم کئے ہوئے تھے لیکن حقیقت میں ان کی دلی محبت یہود اور مشرکین سے تھی، وہ مسلمانوں کی خبریں یہود ونصاری تک پہنچاتے تھے۔"ویرجون ان یکون لھم الظفر علی رسول اللہ ﷺ "اور امید یہ کرتے تھے کہ ہم رسول اللہ ﷺ پر کامیاب ہو جائیں گے۔تو اس آیہ کریمہ کو نازل فرما کر ان کو اس حرکت سے منع کیا گیا،اور ساتھ ہی"ونھی المؤمنین عن مثل فعلھم"مسلمانوں کو منع کیا گیا کہ تم ان منافقوں کو حقیقی مؤمن سمجھ کر،ان سے مل کر یہود ونصاری کو خبریں نہ پہنچاتے رہنا۔ (ماخوذ از معالم التنزیل للبغوی)

﴿لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکَافِرِیْنَ اَوْلِیَاءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾

''نہ بنائیں مؤمن کافروں کو دوست سوائے مؤمنوں کے۔''

اللہ تعالی نے کئی آیات کریمہ میں کفار سے دوستی قائم کرنے سے منع فرمایا۔ارشاد باری تعالی ہے﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا﴾اے ایمان والو غیروں کو اپنا راز دار نہ بناؤ،وہ تمہاری برائی میں کمی نہیں کرتے۔

اور ارشاد فرمایا:﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰۤى اَوْلِیَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ وَ مَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ﴾ (المائدة آیة نمبر ۵۱)

اے ایمان والو! یہود ونصاری کو دوست نہ بناؤ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا تو وہ انہیں میں سے ہے، بیشک اللہ بے انصافوں کو راہ نہیں دیتا۔

اور ارشاد فرمایا:﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَوْ كَانُوْۤا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِیْرَتَهُمْ﴾ (المجادلة،آیة نمبر ۲۲)

تم نہ پاؤ گے ان لوگوں کو جو ایمان (یقین) رکھتے ہیں اللہ پر اور آخرت کے دن پر کہ وہ دوستی کریں ان سے جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے مخالفت کی اگر چہ وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا کنبے والے ہوں۔

اور ارشاد فرمایا﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِیَآءَ﴾ (الممتحنة،آیة نمبر ۱)

اے ایمان والو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔

کافروں سے تعلقات کی وجوہ:

کافروں سے تعلقات کی تین وجہ ہیں، دو حرام ہیں، اور ایک جائز ہے۔

(۱) پہلی وجہ یہ ہے کہ کفار سے محبت ان کے کفر کی وجہ سے ہو، اور ان کے کفر پر راضی ہو، یہ محبت حرام ہے، بلکہ کفر ہے، کیونکہ یہ کفار کو ان کے کفر میں حق بجانب سمجھ رہا ہے، کہ ان کا کفر درست ہے "وتصویب الکفر کفرو الرضاء بالکفر کفرفیستحیل ان یبقی مؤمنامع کونه بھذه الصفة" کفر کو صحیح اور درست سمجھنا کفر ہے، کفر پر راضی رہنا کفر ہے، جب کوئی شخص کافر کے کفر کو صحیح سمجھے اور اس کے کفر پر راضی ہو تو ممکن ہی نہیں کہ وہ شخص خود مؤمن ہو، کافر نہ ہو۔

(۲) دوسری قسم بھی حرام ہے، جو پہلی اور تیسری آنے والی قسم کے درمیان ہے، وہ یہ ہے:

"ان موالاة الکفار بمعنی الرکون الیھم والمعونة والمظاھرة والنصرة اما بسبب القرابة او بسبب المحبة مع اعتقاد ان دینه الباطل فھذا لایوجب الکفر الاانه منھی عنه، لان الموالاة بھذاالمعنی قدتجره الی استحسان طریقته والرضابدینه وذلک یخرجه عن الاسلام"

کافروں سے اس طرح کی دوستی رکھی جائے کہ ان کی طرف میلان پایا جائے ان کی امداد کی جائے اور ان کی پشت پناہی کی جائے اور ان کی امداد کی جائے خواہ یہ دوستی رشتہ داری کی وجہ سے ہو یا ان سے محبت کی وجہ سے لیکن دل میں اعتقاد یہ ہو کہ کافر باطل راہ پر ہیں، تو یہ تعلق اور دوستی کفر تو نہیں، لیکن حرام ہے، اس لئے کہ اس سے روکا گیا ہے، خاص کر کے اس قسم کی محبت کفر کی راہ آسان کر دیتی ہے کیونکہ وہ کفر سے محبت کرنی شروع کر دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ کافر ہو جاتا ہے۔

(۳) کفار سے تیسری وجہ محبت کی یہ ہے " المعاشرة الجمیلة فی الدنیا بحسب الظاھر وذلک غیر ممنوع" کہ ان سے دنیاوی تعلقات رکھے، ان سے تجارت کرے یعنی خرید وفروخت میں ان سے تعلقات رکھے تو یہ جائز ہے کیونکہ یہ صرف دنیاوی راہ ورسم ہے، ان کے کفر کو پسند نہیں کر رہا، ہاں اگر کسی نے کفار سے دلی محبت کی تو وہ حرام ہے، جسے بیان کیا جا چکا ہے۔ (کبیر بتقدیم وتاخیر)

﴿مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ "سوائے مومنوں کے"

(من دون المؤمنین)یعنی من غیر المؤمنین والمعنی لا یجعل المؤمن ولا یتعلق ھو غیر مؤمن نھی الله المؤمنین ان یوالوا الکفار اویلا طفوھم لقرابة بینھم اومحبة اومعاشرة والمحبة فی الله والبغض فی الله باب عظیم واصل من اصول الایمان" (خازن، مدارک)

"من دون المؤمنين" میں "دون" کا معنی ہے "غیر" یعنی کوئی مؤمن بغیر مؤمن کے کسی کو دوست نہ بنائے، اور مؤمن کے بغیر کفار سے تعلق (محبت کا تعلق) نہ رکھے اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں کو کفار سے دوستی قائم کرنے سے اور ان کے ساتھ رشتہ داری کی وجہ سے محبت کا سلسلہ قائم کرنے سے، یا ان سے محبت کرنے سے، یا ان سے محبت ودوستی کا بھائی چارہ قائم کرنے سے منع فرمایا۔ ایمان کے قوانین میں سے بہت عظیم قانون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضاء کی خاطر کسی سے محبت کرے اور اللہ تعالیٰ کی رضاء کی خاطر کسی سے بغض رکھے۔

مؤمنوں کو چھوڑ کر کافروں سے محبت کی صورتیں:

دو صورتیں ہیں مؤمنوں کے سواء کافروں سے محبت کرنے کی وہ دونوں ہی منع ہیں۔

(۱) مؤمنوں سے محبت نہ کرے بلکہ کافروں سے محبت کرے، یہ ناجائز اور حرام ہے۔ اس کا مفہوم بھی واضح ہے کہ مؤمنوں کو چھوڑ کر کوئی مؤمن کافروں سے محبت نہ کرے۔

(۲) مؤمن اپنے دوسرے مؤمن بھائیوں سے محبت تو کرے لیکن ان کی محبت کے ساتھ کافروں کو بھی شریک کرے کہ کفار سے محبت کرے، یہ صورت بھی ناجائز ہے اور حرام ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ "نہ بنائیں مؤمن کافروں کو دوست سوائے مؤمنوں کے، یعنی صرف مؤمنوں سے محبت کریں، ان کے ساتھ کافروں کی محبت کو شریک کر کے مؤمنوں کی خالص محبت کو نہ چھوڑیں۔ (ماخوذ از صاوی)

اعتراض: اس آیۃ کریمہ سے ظاہر طور پر تو یہ سمجھ نہیں آرہا کہ کافروں کو مؤمنوں کی محبت سے شریک نہ کرے، بلکہ صرف یہ سمجھ آرہا ہے کہ مؤمنوں سے محبت کو چھوڑ کر کفار سے محبت نہ کرے۔

جواب: اس آیۃ کریمہ کی وضاحت میں جو دوسری آیات پیش کی ہیں ان میں مطلقاً کفار اور یہود ونصاری سے محبت کو منع کیا ہے، لھذا ان آیات سے واضح طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ مؤمنین کی محبت کے ساتھ کفار کی محبت کو شریک نہ کرے۔ (ماخوذ از کبیر)

صاوی سے جو دو صورتیں بیان کی ہیں، وہ صاوی کی عبارت میں طلباء کرام دیکھیں تو کبیر کا جواب واضح سمجھ آئے گا"

من دون المؤمنين" اى تاركين قصر الولاية عليهم وذلك الترك يصدق بصورتين كونها مشتركة بين الكفار والمؤمنين او مختصة بالكفار فالصورتان داخلتان فى منطوق النهى" (صاوی)

دینی طلباء کرام کیلئے: لفظ "دون" مکان کے ساتھ مختص ہے، جیسے کہا جاتا ہے "جلس زید دون

عمرو ای فی مکان اسفل منه" زید عمرو کے مکان سے نیچے مکان میں بیٹھا اصل میں لفظ دون مکان کی مغایرت کیلئے آتا ہے، پھر مطلقا غیر کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَمَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ فَلَيۡسَ مِنَ اللّٰهِ فِىۡ شَىۡءٍ﴾

"اور جو شخص کرے گا یہ تو نہیں وہ اللہ کی طرف سے کسی چیز میں۔"

(ومن یفعل ذلک)ای اتخاذھم اولیاء(فلیس من الله)ای من ولایته تعالی(فی شئ)یصح ان یطلق علیه اسم الولایة یعنی انه منسلخ من ولایة الله رأسا"

(اور جو شخص یہ کرے گا) یعنی اسے اللہ تعالی سے کچھ تعلق نہیں وہ اللہ تعالی کی محبت سے مکمل کٹ کر رہ جائے گا۔ہاں ہاں اس چیز کو عقل بہت جلدی تسلیم کر لیتی ہے"ان موالاۃ الولی وموالاۃ عدوہ متنافیان" کہ بیشک دوست کی محبت اور دوست کے دشمن کی محبت دو متنافی چیزیں یہ دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں، وہ دوست جھوٹا ہے جو دوست کے مخالف سے محبت کی پینگیں چڑھائے اور یہ دعوی بھی کرے کہ میں تمہارا مخلص دوست ہوں۔

"تود عدوی ثم تزعم اننی　　　صدیقک لیس النوک عنک بعازب"

(تو محبت کرتا ہے میرے دشمنوں سے، پھر تو گمان کرتا ہے بیشک میں تیرا دوست ہوں حماقت تجھ سے، دور ہونے والی نہیں)

"النوک،الحمق،والعازب البعید"النوک کا معنی ہے حماقت،اور عازب کا معنی ہے دور ہونا۔(از روح البیان)

دوست اور دشمن:

"الصدیق ھو من یودک ویبغض عدوک"دوست کامل ومخلص وہی ہے جو تمہارے ساتھ محبت کرے اور تمہارے دشمن سے عداوت رکھے۔دشمن تین ہیں،

(۱) "الاول عدوک"ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ تمہارا براہ راست دشمن ہو۔

(۲) "والثانی عدو صدیقک"ان میں سے دوسرا یہ ہے کہ وہ تمہارے دوست کا دشمن ہو۔

(۳) "والثالث صدیق عدوک"اور تیسرا وہ ہے جو تمہارے دشمن کا دوست ہو۔

بشوی اے خردمن ازاں دوست دست　　　کہ　　　بادشمنانت　　　بودھم　　　نشست

اے عقلمند شخص اس دوست سے ہاتھ دھولے جو تیرے دشمنوں کے ساتھ بیٹھنے والا ہو۔ (ماخوذ از روح البیان)

﴿اِلَّآ اَنۡ تَتَّقُوۡا مِنۡهُمۡ تُقٰىةً﴾ ''مگر یہ کہ تم ڈروان سے ڈرنا''

''هٰذا استثناء كأنه قيل لا تتخذوهم اولياء ظاهرا وباطنا في حال من الاحوال الاحال اتقائكم (منهم) اى من جهتهم (تقاة) اى اتقاء بان تغلب الكفار اويكون المؤمن بينهم''

مطلب یہ ہے کہ تم کفار کو اپنا ظاہری اور باطنی دوست کسی حال میں بھی نہ بناؤ ہاں اگر تمہیں کافروں سے ڈر ہو کہ وہ کفار تم پر غالب آجائیں، یا کوئی مؤمن کافروں کے گھیرے میں آجائے تو وہ اپنے بچاؤ کیلئے ان سے ظاہری طور پر تعلق رکھ لے، دل سے ان کو کافر ہی سمجھے تو یہ جائز ہے، یعنی مراد یہ ہے ''کن وسطا وامش جانبا'' درمیان میں ہو جا، اور کنارے پر چل گویا کہ یوں کہا گیا ہے ''کن فیما بینهم صورة وتجنب عنهم سیرة'' تم بظاہر ان کے درمیان رہو، لیکن اعتقاد اور محبت کے لحاظ پر ان سے دور رہو۔ (از روح البیان)

اس مسئلہ کو اللہ تعالی نے دوسرے مقام پر بہت واضح طور پر بیان فرمادیا ہے۔

﴿مَنۡ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنۡ بَعۡدِ اِيۡمَانِهٖۤ اِلَّا مَنۡ اُكۡرِهَ وَقَلۡبُهٗ مُطۡمَئِنٌّۢ بِالۡاِيۡمَانِ وَلٰـكِنۡ مَّنۡ شَرَحَ بِالۡكُفۡرِ صَدۡرًا فَعَلَيۡهِمۡ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ﴾ (النحل، آیۃ نمبر ۱۰۶)

جو ایمان اللہ کا منکر ہو سوا اس کے جو مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر جما ہوا ہو ہاں وہ جو دل کھول کر کافر ہو ان پر اللہ کا غضب ہے اور ان کو بڑا عذاب ہے۔

مسئلہ: کلمہ کفریہ زبان پر جاری کرنے کا جواز دو شرطوں پر موقوف ہے۔ ایک یہ کہ صرف زبان سے کلمہ کفریہ جاری کیا جائے لیکن دل مطمئن رہے، دل میں ایمان قائم رہے اور دوسری شرط یہ ہے کہ مسلمان کافروں کے گھیرے میں اس طرح آجائے کہ وہ اسے کلمہ کفریہ زبان پر جاری نہ کرنے پر قتل یا کسی عضو کے کاٹنے کی دھمکی دیں۔ اگر صرف قید کرنے یا مارنے کی دھمکی دیں تو اس شخص کیلئے جائز نہیں کہ وہ کلمہ کفریہ زبان پر جاری کرے۔ (ماخوذ از نور الانوار)

کلمہ زبان پر نہ جاری کرنے کی وجہ سے قتل ہو جانا شہادت ہے:

یعنی کافروں نے قتل کی دھمکی یا عضو کے کاٹنے کی دھمکی دی تو دل کے ایمان پر قائم رہتے ہوئے کلمہ کفر زبان پر جاری کرنے کی صرف اجازت ہے، واجب نہیں، اگر کفریہ کلمہ زبان پر جاری نہ کیا تو کفار نے قتل کر دیا تو یہ شہید ہوگا۔

❁ ''روى ان مسيلمة الكذاب اخذ رجلين من اصحاب النبى ﷺ فقال لاحدهما اتشهد ان محمدا رسول الله قال نعم قال اتشهد انى رسول الله قال نعم فخلاه، ثم دعا بالآخر وقال اتشهد ان محمدا رسول الله قال نعم قال اتشهد انى رسول الله قال انى اصم قالها ثلاثا فضرب عنقه فبلغ ذلك

رسول الله ﷺ فقال اما هذاالمقتول فمضی علی صدقه ویقینه واخذ بفضیلة فهنیأله واما الآخر فقبل رخصة الله فلا تبعة علیه"

روایت بیان کی گئی ہے کہ بیشک مسیلمہ کذاب نے نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام میں سے دوشخصوں کو پکڑ لیا، ایک سے پوچھا کیا محمد اللہ کے رسول ہیں؟ اس نے کہا ہاں، پھر پوچھا کیا میں اللہ کا رسول ہوں؟ تو اس نے کہا ہاں، تو مسیلمہ نے اسے چھوڑ دیا۔ پھر دوسرے کو بلایا اس سے پوچھا کیا محمد اللہ کے رسول ہیں؟ اس نے کہاں ہاں، پھر پوچھا کیا میں اللہ کا رسول ہوں؟ تو اس نے کہا بیشک میں بہرہ ہوں (سن نہیں سکتا) تین مرتبہ اس کے پوچھنے پر یہی جواب دیا، تو مسیلمہ نے اس کی گردن اڑا دینے کا حکم دیا، گردن اڑا دی گئی۔ یہ خبر جب رسول اللہ ﷺ کو پہنچی تو آپ نے فرمایا یہ شخص جسے قتل کیا گیا وہ اپنے سچ پر قائم رہا اور ایمان پر قائم رہا اور اس نے فضیلت کو پالیا، اس کیلئے مبارک مقام ہے لیکن دوسرے نے اللہ تعالی کی طرف سے عطاء ہونے والی رخصت پر عمل کیا، تو اس کا پیچھا نہ کیا جائے۔

حدیث پاک سے واضح ہوا کہ کلمہ کفر زبان پر نہ جاری کرنے کی وجہ سے قتل ہو جانا شہادت ہے، اور اعلی قسم کی فضیلت کو حاصل کرنا ہے۔ اور اگر کلمہ کفر زبان پر جاری کر کے اپنے آپ کو بچالے، تو یہ بھی جائز ہے، اس کی اجازت بھی خود رب تعالی نے دی ہے۔ اگر کوئی شخص رخصت پر عمل کرتے ہوئے کلمہ کفر کو زبان پر جاری کرلے تو اس کی مذمت نہ کی جائے کیونکہ اس نے رب تعالی کی طرف سے عطاء کی ہوئی رخصت پر عمل کیا ہے۔ (ماخوذ از احکام القرآن للجصاص)

تقیہ کا جواز:

آیۃ کریمہ سے واضح ہوا کہ تقیہ جائز ہے۔ "وعرفوها بمحافظة النفس او العرض او المال من شر الاعداء" تقیہ کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ اپنی جان، اپنی عزت، اپنا مال شریر دشمنوں سے بچانے کیلئے کلمہ کفر زبان پر جاری کرے لیکن دل ایمان پر مطمئن رہے۔

دشمن دو قسم ہیں:

(۱) "الاول من كانت عداوته مبينة على اختلاف الدين كالكافر والمسلم"

پہلی قسم یہ ہے کہ دشمن کی عداوت صرف دین کی غرض سے ہو، وہ مؤمن کا مخالف صرف اس وجہ سے ہے کہ یہ مومن کیوں ہے، یہ قرآن اور حدیث کیوں پڑھتا ہے۔ یہ یہودیوں اور نصرانیوں کا دین کیوں نہیں پڑھتا یہ دشمن عام ہے خواہ کافر ہو یا مسلمان ہو۔ یہ عداوت کھلی اور واضح ہو، کیونکہ دشمن پہلے آہستہ آہستہ چھپی چھپی دشمنی کرتا ہے، پھر وہ کھل جاتا ہے۔

(۲) "والثانی من كانت عداوته مبينة علی اغراض دنيوية كالمال والمتاع

والملک والامارۃ"

دشمن کی دوسری قسم یہ ہے کہ اس کی دشمنی تو کھلی اور واضح وظاہر ہو، لیکن اس کا تعلق دنیاوی اغراض سے ہے جیسا کہ مال ومتاع یا ملک وحکومت چھیننے کیلئے یہ عداوت ہو۔

تقیہ بحیثیت جواز وعدم جواز کے دو قسم:

(۱) جب کوئی مؤمن ایسی جگہ میں ہو، جہاں دشمنوں کی وجہ سے وہ اپنے دین وایمان کو ظاہر نہ کر سکے تو "وجب علیہ الھجرۃ الی محل یقدرفیہ علی اظھار دینہ" اس پر ایسی جگہ ہجرت کر جانا واجب ہو جاتا ہے جہاں وہ دین کو ظاہر کر سکے۔ وہاں رہنا اس کیلئے جائز نہیں کہ وہ دین کو چھپاتا رہے، اور کمزور ہو کر وہاں رہے، اس لئے کہ ارشاد باری تعالی ہے ﴿اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃً فَتُھَاجِرُوْا فِیْھَا﴾ کیا اللہ کی زمین کشادہ نہیں تم اس میں ہجرت کر جاؤ۔

اگر ہجرت ممکن نہ ہو تو تقیہ کرے:

اگر ہجرت کرنے سے کوئی عذر شرعی مانع ہو تو ہجرت نہ کرے وہ عذر مثال کے طور پر یہ ہے کہ بچے، عورتیں، نابینے یا قیدی اپنے اہل وعیال میں ہوں جن کو وہاں سے نکالنا ممکن نہ ہو، اور دشمن اسے یا اس کے اہل وعیال یا اس کے آباء واجداد کو قتل کرنے کی دھمکی دیں، تو اس صورت میں "فانہ یجوز لہ المکث مع المخالف والموافقۃ بقدر الضرورۃ" اس کیلئے جائز ہے کہ وہاں ٹھہرے، اور بقدر ضرورت دشمنوں سے ظاہری تعلقات رکھے۔

"ویجب علیہ ان یسعی فی الحیلۃ للخروج والفرار بدینہ" لیکن واجب ہے اس شخص پر کہ وہاں سے نکلنے کی راہ تلاش کرتا رہے کہ کس حیلہ سے یہاں سے نکلنا ہے، وہی حیلہ کرے اور وہاں سے بھاگ کر اپنے دین کو بچائے اور ایسی جگہ جائے جہاں اپنے دین وایمان کو ظاہر کر سکے۔

"ولو کان التخویف بفوات المنفعۃ اوبلحوق المنفعۃ اوبلحوق المشقۃ التی یمکنہ تحملھا کالحبس مع القوت والضرب القلیل الغیر المھلک لا یجوزلہ موفقتھم"

اگر کفار صرف اسے دنیاوی نفع پہنچانے سے مانع ہوں، خواہ اس کے نفع کو ضائع کر دیں، یا نفع حاصل کرنے دیں، یا اسے مشقت اٹھانی پڑے جسے وہ برداشت کر سکتا ہو جیسا کہ قید کر لیں اور کھانا دیتے رہیں، یا کچھ دیر کیلئے اس کی روزی روک دیں، یا اس کی روزی میں کچھ کمی کر دیں لیکن مکمل روزی نہ روکیں، یا ایسی مار دھمکی دیں جس سے موت واقع نہ ہو

تو ان صورتوں میں وہ کلمہ کفر زبان پر جاری نہیں کر سکتا۔

ہاں اگر اس طرح روزی روک لیں کہ ہلاکت کا خطرہ ہو اس طرح کی مار کی دھمکی دیں جس سے ہلاکت کا خطرہ ہو یا عضو کے کٹ جانے کا خطرہ ہو یا براہ راست قتل کرنے کی دھمکی دیں یا عضو کاٹنے کی دھمکی دیں تو ان صورتوں میں دل کو ایمان پر مطمئن رکھتے ہوئے بظاہر زبان پر کلمہ کفر زبان پر جاری کرنے کی اجازت ہے لیکن صبر پر مرتبہ شہادت حاصل ہوگا جیسا کہ مسیلمہ کذاب کے واقعہ سے مسئلہ واضح کر دیا گیا ہے۔

(۲) دوسری صورت جب مال کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو حکم کیا ہے؟ تقیہ جائز ہے نا جائز اسی طرح مال کی حفاظت کیلئے ہجرت واجب ہے یا نہیں۔ علامہ رازی رحمہ اللہ تفسیر کبیر میں ذکر فرماتے ہیں۔

"التقية هل هي جائزة لصون المال يحتمل ان يحكم بالجواز"

مال کی حفاظت کیلئے کیا تقیہ جائز ہے؟ ہاں اس میں احتمال یہی ہے کہ اس کے جائز ہونے کا حکم لگایا جائے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی یہ ہے "حرمة مال المسلم كحرمة دمه" مسلمان کا مال اسی طرح محترم ہے جس طرح اس کا خون محترم ہے، یعنی مسلمان کے مال کی حفاظت اسی طرح ضروری ہے جیسا کہ اس جان کی حفاظت ضروری ہے۔

اور ارشاد مصطفوی ﷺ یہ ہے "من قتل دون ماله فهو شهيد" جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے (چوروں، ڈاکوں کی مزاحمت پر) قتل کر دیا جائے تو وہ شہید ہے۔ مال کی بہت زیادہ ضرورت در پیش آتی ہے، اسی وجہ سے اگر پانی عام طور پر تو نہیں مل رہا، البتہ کوئی شخص قیمت (ثمن) سے بیع کر رہا ہے، لیکن وہ بہت مہنگے داموں دے رہا ہے جو عام، قیمت کو جاننے والوں کی قیمت سے بہت زیادہ ہے تو اس صورت میں مال کو ضائع ہونے سے بچایا جائے مہنگے داموں پانی خرید کر وضوء نہ کیا جائے بلکہ تیمم کیا جائے ہجرت کا حکم بھی در حقیقت یہی ہے کہ کافر مسلمانوں کا مال چھیننا چاہیں۔ مسلمان ان سے اپنا دفاع نہ کر سکیں تو وہاں سے ہجرت کر لیں۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے اس مسئلہ میں تفصیل بیان کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے، بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ مال کے ضائع ہونے کے ڈر سے ہجرت نہ کی جائے، اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ مال کے خطرہ میں در حقیقت اپنی جان اور اپنے اقارب کی جانوں کا خطرہ بھی پایا جاتا ہے، بلکہ عزتوں کے غیر محفوظ ہونے کا بھی خطرہ دامن گیر رہتا ہے، اس لئے ہجرت تو ضروری ہو جائے گی، البتہ جب تک جانوں کو خطرہ واضح طور پر نہ ہو صرف مال کی حفاظت کیلئے ہجرت کرنے سے ثواب حاصل نہیں ہوگا، کیونکہ یہ ہجرت صرف دنیاوی مصلحت کیلئے ہے، عبادت کا درجہ

اسے حاصل نہیں۔

تنبیہ: "التقیة تجوز فیما یتعلق باظهار المولاة والمعاداة وقد تجوز ایضا فیما یتعلق باظهار الدین فاما مایرجع ضرورة فاما ما یرجع ضرورة الی الغیر کالقتل والزنا وغصب الاموال والشهادة بالزور وقذف المحصنات واطلاع الکفار علی عورات المسلمین فذلک غیر جائز البتة" (کبیر)

علامہ رازی رحمہ اللہ کی فیصلہ کن بات یہ ہے کہ صرف دین کے اظہار میں قتل وغیرہ کی دھمکی سے کفار سے ظاہری دوستی جائز ہے، صرف قتل، زنا، مال کے غصب، جھوٹی شہادت، پاک دامن عورتوں پر تہمت، کفار کا مسلمان عورتوں کے ننگیز پر مطلع ہونے کی وجہ سے کلمہ کفر زبان سے جاری نہ کرے۔

تقیہ کے جواز پر آثار:

❁ دیلمی نے نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی نقل فرمایا "ان الله تعالی امرنی بمداراة الناس کما امرنی باقامة الفرائض" بیشک اللہ تعالی نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں لوگوں سے اچھا سلوک کروں جیسا کہ مجھے میرے رب نے فرائض قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔ "وفی روایة "بعث بالمداراة" ایک روایت میں یہ ہے کہ مجھے لوگوں سے اچھا سلوک کرنے کیلئے مبعوث کیا گیا ہے۔

❁ وفی الجامع "سیأتیکم رکب مبغوضون فاذ جاء وکم فرحبوابهم"

عنقریب تمہارے پاس کچھ سوار آئیں گے جو بغض کے مستحق ہوں، جب وہ تمہارے پاس آئیں تو تم ان کو مرحبا کہو۔

❁ وروی ابن ابی الدنیا رأس العقل بعد الایمان بالله تعالی مداراة الناس"

ابن ابی الدنیا نے روایت بیان کی ہے کہ اللہ تعالی پر ایمان لانے کے بعد اصل عقل یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک رکھے۔

❁ "وعن بردة عن عائشة رضی الله عنها قالت استاذن رجل علی رسول الله ﷺ وانا عنده فقال رسول الله "بئس ابن العشیره اواخو العشیرة ثم اذن له فالان له القول "فلما خرج قلت یا رسول الله قلت ماقلت ثم النت له القول؟فقال یا عائشة ان من اشر الناس من یترکه الناس اویدعه الناس اتقاء فحشة" (رواه مسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے حاضر ہونے کی اجازت طلب کی، میں آپ کے پاس تھی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ اپنے قبیلہ کا برا شخص ہے، پھر آپ نے اسے آنے کی اجازت دی، تو اس سے

نرم گفتگو کی، جب وہ چلا گیا تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ نے فرمایا تھا جو فرمایا (کہ وہ قبیلے کا برا شخص ہے) پھر آپ نے اس سے نرم گفتگو فرمائی؟ تو آپ نے فرمایا اے عائشہ وہ شخص لوگوں میں سے بہت برا ہے جس کی فحش کلامی کی وجہ سے لوگ اسے چھوڑ جائیں،

حدیث پاک سے ثابت ہوا کہ کسی کی برائی کو بیان کرنا جائز ہے تا کہ لوگ اس سے بچ کر رہیں تاہم ملاقات کے وقت حسن خلق سے درپیش آنا، نرم گفتگو کرنا بہتر ہے۔

❁ "وفی البخاری عن ابی الدردا، انا لنکثر فی وجوہ اقوام و ان قلوبنا لتلعنھم"

بخاری میں ابوالدرداء ﷺ سے مروی ہے کہ بیشک ہم کئی قوموں کے سامنے ان سے زیادہ کلام کرتے ہیں اور ہمارے دل ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔ واضح ہوا کہ کافر کو کافر سمجھے اور اسے لعنت کا مستحق سمجھے، البتہ ظاہری طور پر نرم گفتگو کرے۔

(تقیہ کی بحث ماخوذ از روح المعانی)

صوفیاء کرام کا تقیہ:

صوفیاء کرام کے نزدیک اسرارالھیہ کا اغیار سے چھپانا تصوف کا تقیہ ہے اور یہ اہم واجبات میں سے ہے، اسی لئے یہ حضرات اسرار ایسی عبارت میں بیان کر جاتے ہیں۔ جو عام کی سمجھ سے باہر ہو، بعض ظاہرین علماء ان کی ظاہر عبارت پر فتوی کفر دے دیتے ہیں۔ حضرت محی الدین ابن عربی، بایزید بسطامی کی پیچیدہ عبارتیں اسی تقیہ کی مثالیں ہیں اسی لئے فقہاء کرام صوفیاء کرام کے علم کو علم باطن کہتے ہیں یعنی عام سے چھپا ہوا۔ حضرت امام شعرانی نے اپنی کتاب درمنثورۃ فی بیان علوم مشہورہ میں فرمایا کہ بندہ میں جس قدر ادب زیادہ اسی قدر اس کا کلام باریک۔

(روح المعانی منقول از نعیمی)

روافض کا تقیہ: روافض کے نزدیک تقیہ کی نوعیت ہی اور ہے اور اس کے احکام کچھ اور ان کے ضرورت ہو یا ضرورت نہ ہو ہر وقت اور ہر قسم کا تقیہ دینی اور دنیاوی جائز ہے، بلکہ وہ صرف جائز کی حد تک نہیں مانتے، وہ تو تقیہ کو عبادت سمجھتے ہیں۔

روافض کے تقیہ کی چند مثالیں: وہ کہتے ہیں سنی کو دھوکا دینا عبادت ہے، ان کا مذہب یہ ہے اگر کسی نے سنی کو دھوکہ دینے کیلئے اس کے پیچھے نماز پڑھ لی تو گویا کہ اس نے نبی کے پیچھے نماز پڑھی۔ جھوٹ بولنا، اپنا دین بدلنا، یہاں تک کہ اپنی بیٹی کفار کے نکاح میں دے دینا سب تقیہ کی ہی قسمیں ہیں۔

شیعہ ادھر حضرت عمرؓ کو (معاذ اللہ) کافر کہتے ہیں:

شیعہ حضرات کی کتاب جلاء العیون ص ۴۵ پر جو عبارت ہے وہ دیکھیں:

''ای عزیز آیا بعد ازایں حدیث کہ ہمہ عامہ روایت کردہ اند ہیچ عاقل را مجال آں ہست کہ شک کند در کفر کسیکہ عمر را مسلمان داند''

اے عزیز کیا اس حدیث کے بعد (حدیث قرطاس) جس کو عام راویوں نے بیان کیا ہے۔ کیا کسی عاقل کیلئے یہ ممکن ہے کہ وہ عمر کے کفر میں یا جو شخص عمر کو مسلمان جانے اس کے کفر میں شک کرے۔

شیعہ کے اس قول سے واضح ہوا کہ ان کے نزدیک حضرت عمرؓ (معاذ اللہ) کافر ہیں، اور ان کو مسلمان جاننے والے بھی کافر ہیں۔ یعنی تمام مسلمان اہل تشیع کے نزدیک کافر ہیں، کیونکہ تمام مسلمان حضرت عمرؓ کو فقط مسلمان ہی نہیں بلکہ عظیم صحابی اور وزیر مصطفیٰ کریم ﷺ مانتے ہیں۔

شیعہ کے نزدیک حضرت عمرؓ ڈرپوک حضرت علیؓ بہادر ہیں:

راوندی جو شیعہ مذہب رکھتا ہے اور شیعہ کی معتبر کتاب نہج البلاغۃ کا شارح ہے، وہ حضرت سلمان فارسی سے روایت بیان کرتا ہے۔

''ان علیا بلغه عن عمر انه ذکر شیعته فاستقبله فی بعض طرقات بساتین المدینة وفی یدعلی قوس فقال یا عمر بلغنی عنک ذکر ک لشیعتی فقال اربع علی صلعتک فقال علی انک ھھنا لم رمی بالقوس علی الارض فاذاھی ثعبان کالبعیر فاغرافاه وقداقبل نحو عمر لیبتلعه فقال عمر الله تعالی یا ابا الحسن لاعدت بعد ھافی شئی فجعل یتضرع فضرب بیده علی الثعبان فعادت القوس کما کانت فمضی عمر الی بیته''

بیشک حضرت علیؓ کو پتہ چلا کہ حضرت عمرؓ ان کے دوستوں کو برا بھلا کہتے ہیں، مدینہ طیبہ کے باغات کے راستوں میں حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کو ملے جب کہ حضرت علیؓ کے ہاتھ میں کمان تھی، انہوں نے کہا اے عمرؓ مجھے پتہ چلا ہے کہ تم میرے دوستوں کو برا بھلا کہتے ہو، تو انہوں نے کہا تم اپنے گھر کی راہ پکڑو، حضرت علیؓ نے کہا ذرا یہیں ٹھہرو، پھر انہوں نے اپنی کمان زمین پر پھینک دی، وہ بہت بڑا اژدھا بن گئی، اس کی اتنی جسامت تھی جتنی اونٹ کی جسامت ہوتی ہے، اس نے اپنا منہ کھولا ہوا تھا، حضرت عمرؓ کو نگل لینے کیلئے ان کی طرف وہ اژدھا

دوڑا، حضرت عمر ﷺ نے کہا خدا کیلئے اے ابوالحسن (علی) مجھے بچالیں، میں آئندہ تمہارے دوستوں کو برا بھلا نہیں کہوں گا، حضرت عمر ﷺ عاجزی کرنے لگے بڑی منت وسماجت کے بعد حضرت علی ﷺ نے وہ اژدھا اپنے ہاتھ میں پکڑا وہ کمان بن گیا، تو حضرت عمر ﷺ نے اپنے گھر کی راہ لی، حضرت علی ﷺ نے کہا "ان رعب الثعبان فی قلبه الی ان یموت" بیشک اژدھا کا خوف عمر کے دل میں موت تک رہے گا۔

حضرت علی ﷺ نے حضرت عمر ﷺ کی خلافت کو تسلیم کیوں کیا؟

جب شیعہ کے نزدیک حضرت عمر ﷺ (معاذالله) کافر تھے، تو انہوں نے کس طرح حضرت عمر ﷺ کی حکومت کو تسلیم کیا اور ان کی حکومت میں آپ کس طرح ان کے معاون مشیر رہے؟ تو اس کا ایک ہی جواب اہل تشیع کے پاس ہے کہ حضرت علی ﷺ نے تقیہ سے کام لیا۔

حضرت علی ﷺ نے اپنی بیٹی ام کلثوم کا نکاح حضرت عمر ﷺ سے کیوں کیا؟

اگر تشیع سے یہ سوال کیا جائے کہ جب حضرت عمر ﷺ (معاذ اللہ) کافر تھے تو انہوں نے اپنی بیٹی ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عمر ﷺ سے کیوں کیا؟ تو اس کا جواب بھی اہل تشیع کے نزدیک یہی ہے کہ حضرت علی ﷺ نے تقیہ سے کام لیا علامہ آلوسی رحمہ اللہ شیعہ حضرات کی کمان والی روایت نقل کرنے کے بعد یوں بیان فرماتے ہیں۔

"وفی هذه الروایة ضرب عنق التقیة ایضا اذصاحب هذه القوس تغنیه قوسه عنها و لا تحوجه ان یزوج ابنته ام کلثوم من عمر خوفا منه وتقیة"

شیعہ کی اس روایت نے تو تقیہ کی گردن کاٹ کر رکھ دی، اس کمان والا شخص تقیہ کیسے کرسکتا ہے جسے بچانے کیلئے کمان ہی کافی تھی، اسے کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح عمر کے ڈر اور تقیہ کی وجہ سے کرتا، جبکہ معاذ اللہ تمہارے نزدیک حضرت عمر ﷺ کافر تھے۔

شیعہ کی ایک اور روایت تقیہ کا رد کرتی ہے:

شیعہ حضرات کے نزدیک نہج البلاغۃ وہ کتاب ہے جو قرآن کے بعد تمام کتب میں زیادہ اصح ہے، آیئے اس کی ایک روایت کو دیکھئے:

"ان الامیر ﷺ قال علامة الایمان ایثارک الصدق حیث یضرک علی الکذاب حیث ینفعک"

بیشک امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایمان کی نشانی یہ ہے کہ سچائی کو اختیار کرے خواہ سچائی میں نقصان اور جھوٹ میں نفع کیوں نہ ہو۔ پھر اہل تشیع آیۃ کریمہ ﴿اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقٰکُمْ﴾ کی تفسیر یوں بیان کرتے ہیں "باکثر کم تقیة" بیشک تم میں سے اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ مکرم وہ ہے جو تم میں سے زیادہ تقیہ کرنے والا ہوگا۔

"وفیه ایضا انه کرم الله تعالی وجهه قال انی والله لولقیتهم واحداوهم طلاع الارض کلها مابالیت ولا استوحشت وانی من ضلالتهم التی هم فیها والهدی الذی انا علیه لعلی بصیرة من نفسی ویقین من ربی لقاء الله وحسن ثوابه لمنتظرراج"

اسی نہج البلاغۃ میں شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا میں جانتا ہوں وہ لوگ گمراہ ہیں، میں ہدایت پر ہوں، مجھے اپنے نفس پر بصیرت حاصل ہے، مجھے اپنے رب پر اور اپنے رب سے ملاقات پر یقین ہے، اور اس کے اچھے ثواب کی میں امید کرتا ہوں۔

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"وفی هذادلالة علی ان الامیر لم یخف وهو منفرد من حرب الاعداء وهم جموع، مثله لایتصور ان یتاتی فیما فیه هدم الدین"

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قول سے سمجھ آیا کہ آپ کو کبھی ڈر لاحق نہیں ہوا، آپ اکیلئے دشمنوں کی بہت بڑی جماعت سے نہیں ڈرتے تھے، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ڈر کر ان کی بیعت کر لی ہو، حق کو چھوڑ کر دین کی بنیادوں کو منہدم کر (گرا) دیا ہو۔ (ماخوذ از روح المعانی)

تقیہ کی دراو مدار خوف پر ہے: خوف کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) اپنی جان پر خوف ہو کہ مجھے قتل کر دیا جائے گا، اس خوف کی وجہ سے اماموں (اہل بیت) سے تقیہ ممکن نہیں، کیونکہ شیعہ کے معتبر عالم کلینی نے اپنے کتاب کافی میں لکھا ہے "ان موتهم الطبیعی باختیار هم" بیشک ان کی طبعی موت ان کے اختیار میں ہے، اس نے اس مسئلہ کو مستقل باب میں ذکر کیا ہے، اس مسئلہ میں تمام شیعہ کا اتفاق ہے۔ جب اہل بیت کے ائمہ کی موت کو اللہ تعالیٰ نے ان کے اختیار میں دے دیا ہے تو پھر ان کا موت، ہلاکت، قتل سے ڈرنے کا کیا مطلب؟ اور غور فرمائیں کہ شیعہ حضرات کا مذہب یہ ہے:

"ان الائمة یکون لهم علم بما کان وما یکون فهم یعلمون آجالهم و کیفیات موتهم واوقاته بالتفصیل والتخصیص"

کہ اہل بیت کے امام حضرات کو "ماکان ومایکون" (جو ہو چکا ہے، جو ہونا ہے) کا علم حاصل ہے، وہ اپنی موت کو جانتے ہیں، اپنی موت کی کیفیت کو جانتے ہیں، وہ اپنی موت کا وقت جانتے ہیں، یعنی وہ تفصیلی طور پر آنے والے حالات سے مطلع ہوتے ہیں۔

اس سے یقینی طور پر واضح ہو گیا کہ شیعہ کے اپنے مذہب کے مطابق اہل بیت کے امام کسی سے ڈرتے نہیں، جب ڈرتے نہیں تو تقیہ کرنا بھی ان کی شان کے لائق نہیں۔

(۲) دوسری قسم خوف کی یہ ہے کہ مشقت کا خوف ہو، بدن کو ایذاء (تکلیف) پہنچنے کا خوف ہو، گالی اور ہتک عزت کا خوف ہو، اس خوف کی وجہ سے تقیہ کرنا حرام ہے، تعلیمات نبویہ کے مخالف ہے، صلحاء کے طریقہ کے مخالف ہے۔

"ولا شک ان تحمل هذه الامور والصبر عليها وظيعة الصلحاء فقد كانوا يتحملون البلاء دائما في امتثال اوامر الله وربما قابلوا السلاطين الجبابرة واهل البيت النبوى اولى بتحمل الشدائد فى نصرة دين جدهم ﷺ"

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس قسم کے امور کو برداشت کرنا اوران پر صبر کرنا صلحاء کا طریقہ ہے، بیشک وہ مصیبتوں کو ہمیشہ برداشت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے اوامر کو برداشت کرتے ہیں وہ بڑے بڑے جابر بادشاہوں سے صبر وتحمل اور جرأت وبہادری سے مقابلہ کرتے ہیں، اہل بیت کیلئے تو اور زیادہ ضروری ہے کہ وہ اپنے نانا کے دین کی امداد کیلئے مصائب وآرام کو برداشت کریں۔ (از روح المعانی)

اگر تقیہ واجب ہوتا تو چھ ماہ بعد بیعت کا کیا فائدہ:

"وايضا لو كانت التقية واجبة لم يتوقف امام الائمة عن بيعة خليفة رسول الله ﷺ ستة اشهر وماذا منعه من اداء الواجب اول وهلة"

اگر تقیہ واجب ہوتا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت میں چھ ماہ توقف نہ فرماتے شروع میں ہی بیعت کر لیتے، تقیہ کے واجب ہونے پر ابتدائی طور پر بیعت سے کیا چیز مانع تھی؟ (معلوم ہوا تقیہ کا قول ہی من گھڑت اور باطل ہے) (ماخوذ از روح المعانی)

تقیہ کے قول سے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شان میں گستاخی لازم آتی ہے:

اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تقیہ کی وجہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر کے اپنی جان بچالی، تو

کیا وجہ ہے کہ بیٹے نے باپ کے طریقہ کو اختیار کیوں نہیں کیا، تقیہ کے قول سے تو حضرت امام حسین ﷺ پر واجب تھا کہ آپ یزید کی بیعت کر لیتے اور اپنی جان کو اور اپنے اقرباء کی جانوں کو بچا لیتے۔ تقیہ کے قول سے تو حضرت امام حسین ﷺ کی شہادت باطل و رائیگاں چلی جائے گی بلکہ بیٹا باپ کا بھی گستاخ نظر آئے گا۔ (معاذ الله)

شیعہ کے تقیہ پر دلائل:

شیعہ نے تقیہ کے جواز پر وہی دلائل پیش کئے ہیں جن کا ذکر بعنوان '' تقیہ کے جواز پر آثار'' ذکر کر دیا گیا ہے اسی طرح وہ یہ روایت بھی بیان کرتے ہیں '' اخرجه عبد بن حميد عن الحسن انه قال التقية جائزة الى يوم القيامة '' حضرت حسن بصری رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں تقیہ قیامت تک جائز رہے گا اور روایت یہ بیان کی جاتی ہے '' اخرج ابن عدى و ابن عساكر '' من عاش مدارا يا مات شهيدا '' ابن عدی اور ابن عساکر بیان کیا ہے کہ جو شخص لوگوں سے مدارات (تقیہ) کرتے ہوئے فوت گیا تو وہ شہید ہو کر فوت ہوا۔ (از روح المعانی)

وجہ فرق کیا ہے؟

جب یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ اہل سنت و جماعت کے محققین نے تقیہ کے جواز پر دلائل قائم کئے ہیں اور تقیہ کے جواز پر آثار کو جمع کیا ہے، جتنی روایات بیان کی گئی ہیں ان میں شیعہ اور اہل سنت و جماعت کا اتفاق ہے۔ تو وجہ کیا ہے کہ شیعہ تقیہ کا قول کریں تو اسے باطل اور من گھڑت قول سے تعبیر کر دیا جاتا ہے اور جو دلائل شیعہ پیش کرتے ہیں ، وہی دلائل اہل سنت و جماعت پیش کر کے تقیہ کا جواز ثابت کرتے ہیں تو اہل سنت کے تقیہ کو جائز کہا جائے اور شیعہ کے تقیہ کو ناجائز کہا جائے یہ تو ناانصافی ہے۔

وجہ فرق یہ ہے:

چونکہ بزرگان دین علماء اہل سنت نے بھی لفظ تقیہ استعمال اور اس کے جواز پر دلائل مرتب فرمائے، اور شیعہ نے بھی تقیہ کے جواز پر دلائل مرتب فرمائے لیکن ہر فریق کے نزدیک تقیہ کی تعریف علیحدہ علیحدہ ہے، اہل سنت کے نزدیک جب مؤمن کو کفار قتل کرنے یا عضو کاٹنے کی دھمکی دیں تو مؤمن وہاں سے ہجرت کر لے ہجرت نہ کر سکے کوئی عذر حائل ہو تو اگر دین کو ظاہر کرنے کی وجہ سے کفار اسے قتل کر دیں تو وہ شہید ہوگا اگر جان یا عضو بچانے کیلئے دل میں ایمان کا اعتقاد رکھے اور زبان پر کلمہ کفر جاری کر لے تو یہ جائز ہے۔ شیعہ کا تقیہ عام ہے ذرا ذرا باتوں پر جھوٹ سے کام لے، منافقانہ پالیسی اختیار کرے تو یہ ان کے نزدیک تقیہ ہے یہ فرض و واجب ہے دین کے دس حصوں میں سے نو کی

دارومدار تقیہ پر ہے۔

شیعہ کا تقیہ شیعہ کی کتب سے :

"عن ابن ابی عمیر الاعجمی قال قال لی ابو عبد الله علیہ السلام یا ابا عمیر ان تسعة اعشار الدین فی التقیة ولادین لمن لاتقیة له" (کافی مصنفہ ابوجعفر محمد بن یعقوب کلینی باب التقیہ)

یعنی حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خاص شیعہ ابن ابی عمیر الاعجمی سے فرمایا کہ دین میں نوے فیصد تقیہ اور جھوٹ بولنا ضروری ہے اور فرمایا کہ جو تقیہ نہیں کرتا وہ بے دین ہے۔

اصول کافی کے صفحہ ۴۸۲ اور ۴۸۳ پر بھی کثرت کے ساتھ روایات ہیں جن میں سے دو تین نمونہ کے طور پر پیش کی جاتی ہیں

" عن ابی بصیر قال قال ابو عبد الله علیہ السلام التقیه من دین الله "

یعنی ابوبصیر جو امام عالی مقام امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا وزیر و مشیر تھا اور روایت میں اہل تشیع کا مرکز ہے کہتا ہے کہ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تقیہ کرنا اللہ کا دین ہے میں نے عرض کیا'' کیا اللہ کا دین ہے؟ تو امام صاحب نے فرمایا'' اللہ کی قسم ہاں تقیہ اللہ کا دین ہے۔

عن عبد الله ابن ابی یعفو رعن ابی عبد الله علیہ السلام قال اتقوا علی دینکم واحجبوه بالتقیه فانه لا ایمان لمن لاتقیه له "

یعنی ابن ابی یعفور جو امام عالی مقام حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے پاس اکثر اوقات حاضر رہتا وہ کہتا ہے۔ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم اپنے مذہب پر خوف رکھو اور اس کو ہمیشہ جھوٹ اور تقیہ کے ساتھ چھپائے رکھو کیونکہ جو تقیہ نہیں کرتا اس کا کوئی ایمان نہیں۔

اور اصول کافی کے صفحہ ۴۸۴ سے بھی ایک دو روایتیں پیش کی جاتی ہیں۔

" عن معمر بن خلاد قال سئلت ابا الحسن علیہ السلام عن القیام للولاة فقال قال ابو جعفر علیه السلام التقیة من دینی ودین آبائی ولا ایمان لمن لا تقیة له "

یعنی حضرت امام موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ کا خاص شیعہ معمر بن خلاد کہتا ہے، کہ میں نے حضرت امام موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ سے یہ مسئلہ دریافت کیا کہ ان کے امیروں اور حاکموں کے استقبال کیلئے کھڑا ہونا جائز ہے یا نہیں تو آپ نے فرمایا کہ امام محمد باقر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ تقیہ کرنا میرا مذہب ہے اور میرے آباء و اجداء کا دین ہے (معاذ الله ثم معاذ الله) اور جو تقیہ نہیں کرتا وہ بے دین ہے۔ اصول کافی صفحہ ۴۸۶ پر معلیٰ بن الخنیس کی ایک روایت دیکھیں:

"عن معلی بن خنیس قال قال ابو عبد الله علیہ السلام یا معلی اکتم امرنا ولا تذعه فانه من کتم امرنا ولم

یذعه اعزه الله به فی الدنیا و جعله نورا بین عینیه فی الأخرة تقوده الی الجنة یا معلی من اذا ع امرنا ولم یکتمه اذله الله به فی الدنیا ونزع نورا من بین عینیه فی الأخرة وجعله ظلمة تقوده الی النار یا معلی ان التقیة من دینی و دین آباء ی ولا دین لمن لا تقیة له "

یعنی امام جعفر صادق صاحب کا شیعہ خاص اور امام صاحب موصوف سے کثیر الروایات معلّٰی بن خنیس کہتا ہے امام صاحب نے مجھے فرمایا کہ ہماری باتوں کو چھپاؤ اور ان کو مت ظاہر کرو کیونکہ جو شخص ہمارے دین کو چھپاتا ہے اور اس کو ظاہر نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ چھپانے کے سبب سے اس کو دنیا میں عزت دے گا اور قیامت میں اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان ایک نور پیدا کرے گا جو سیدھا جنت کی طرف اسے لے جائے گا اے معلّٰی جو شخص بھی ہماری باتوں کو ظاہر کرے گا اور ان کو نہ چھپائے گا تو دنیا میں اللہ تعالیٰ اس سبب سے اس کو ذلیل کرے گا اور آخرت میں اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان سے نور کو سلب کر لے گا اور اس کے بجائے ظلمت اور اندھیرا بھر دے گا جو اس کو جہنم کی طرف لے جائے گا اے معلّٰی تقیہ کرنا میرا دین ہے اور میرے آباء و اجداء کا دین ہے، جو تقیہ نہیں کرتا وہ بے دین ہے۔

ان شیعی روایات سے پتہ چلا کہ امام جعفر صادق ﷺ کا مذہب یہ تھا کہ ہماری باتوں کو چھپایا جائے وہ جنت کا ذریعہ ہے اور آپ نے فرمایا کہ یہی میرے آباء و اجداء کا دین ہے جب ان کی باتوں کو چھپانا ضروری تھا تو جو باتیں ظاہر ہیں وہ کس کے اقوال ہیں؟ (ماخوذ از تحفہ حسینیہ المعروف تحفہ شیعہ جلد اول ص ۲۰ تا ۲۲ مصنف استاذی المکرّم مولنا محمد اشرف سیالوی)

اس مسئلہ میں اگر کوئی زیادہ تفصیل دیکھنا چاہے تو استاذی المکرّم کی اسی مذکورہ بالا کتاب کا مطالعہ کرے۔

کفار سے امداد لینا کب جائز اور کب نا جائز:

اعلیٰ حضرت مولنا الشاہ احمد رضا خان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کفار سے استعانت (امداد طلب کرنے کی) کی تین حالتیں ہیں۔ (۱) التجاء (۲) اعتماد (۳) استخدام۔

التجاء: یہ کہ قلیل گروہ اپنے کو ضعیف و کمزور یا عاجز پا کر کثیر و قوی تر جتھے کی پناہ لے اپنا کام بنانے کیلئے اس کا دامن پکڑے، یہ بدلیۃ (ظاہر طور پر) اپنے آپ کو ان کے ہاتھ میں دے دینا ہوگا، اور انہیں خواہی نہ خواہی (ان کو پسند کرے یا نہ کرے) ان کے اشارے پر چلنا اور ان کی پس روی (ان کے پیچھے چلنا) کرنی پڑے گی۔ (یہ استعانت حرام ہے)

اعتماد: یہ کہ گروہ مساوی سے یارانہ گانٹھیں، انہیں اپنا یاور و یار و معین و مددگار بنائیں، ان کی مدد و موافقت سے اپنے لئے غلبہ و عزت و کامیابی چاہیں، یہ اگر چہ اپنے آپ کو ان کے رحم پر چھوڑ دینا نہیں مگر ان کی ہمدردی و خیر

خواہی پر اعتماد یقیناً ہے،کوئی عاقل خون کے پیاسے دشمن بدخواہ کو معین و ناصر نہ بنائے گا، یہاں مساوات کے یہی معنی نہیں کہ ہر طرح قوت میں ہم سنگ ہو، بلکہ خود سر گردہ (ہو) کہ ہمارے ہاتھ میں مجبور نہیں۔اور ہمارے ساتھ اظہار بدخواہی کر سکتا ہے،اسی شق میں ہے کہ باوصف خودسری اسے ناصر بنانا بے اعتماد نہ ہوگا، یہ دونوں صورتیں کفار کے ساتھ یقیناً قطعاً نصوص قطعیہ قرآنیہ سے حرام قطعیہ ہیں، ہرگز کوئی مسلمان ان کو حلال نہیں کہہ سکتا۔

استخدام: یہ کہ کافر ہم سے دبا ہوا س کی چٹیا ہمارے ہاتھ میں ہو کہ کس طرح ہمارے خلاف پر قادر نہ ہو وہ اگر چہ اپنے کفر کے باعث یقیناً ہمارا بدخواہ ہوگا مگر بے دست وپا ہے،ہم سے خوف وطمع رکھتا ہے خوف شدید کے باعث اظہار بدخواہی نہ کر سکے بلکہ طمع کے سبب مسلمان کے بارے میں نیک رائے ہوگا، (ایسے شخص سے امداد لینا جائز ہوگا، لیکن مسلمان اس سے غافل نہ رہیں کہ وہ کافر ہے، ہوسکتا ہے در پردہ کسی وقت نقصان نہ پہنچادے)

الحمد اللہ یہ تقریباً فقیر غفرلہ القدیر نے تفقہا (اپنی سمجھ کے مطابق) لکھی تھی پھر امام شمس الائمہ سرخسی کی شرح صغیر امام محمد رضی اللہ عنہ دیکھی عظیم وجلیل تائید ملی۔

سیر الصغیر میں جو کہ کتب ظاہر الروایۃ سے ہے امام محمد نے سیدنا امام اعظم ﷺ سے روایت کی کہ فرمایا:

"سألته عن المسلمين يستعينون باهل الشرک علی اهل الحرب قال لاباس بذلک اذاکان حکم الاسلام هو الظاهر الغالب"

میں نے عرض کیا کہ مسلمان اگر حربیوں پر مشرکوں سے مدد لیں تو کیسا ہے؟ فرمایا مضائقہ (کوئی حرج) نہیں، بشرطیکہ اسلام ہی کا حکم روشن وزبردست ہو۔

مشرکوں سے ذمی مراد ہیں کہ اس سے دو ورق پہلے فرمایا ہے

"لاباس بان يستعين اهل العدل بقوم من اهل البغی واهل الذمة علی الخوارج اذاکان حکم العدل ظاهرا"

اگر اہل عدل خارجیوں کے خلاف باغیوں اور ذمیوں سے امداد لیں تو کوئی حرج نہیں، شرط یہی ہے کہ اہل عدل کو باغیوں اور ذمیوں پر غلبہ حاصل ہو۔

یہ بھی خیال رہے کہ علامہ طحاوی رحمہ اللہ نے تو اور زیادہ تخصیص فرمادی، آپ فرماتے ہیں کہ ذمی سے اس وقت امداد طلب کر سکتے ہیں جب وہ اہل کتاب سے ہو، یعنی یہودی ہو یا نصرانی ہو، اس کے ساتھ بھی شرط یہ ہے کہ وہ مسلمانوں سے دبے ہوئے ہوں، غالب نہ ہوں، اگر غالب ہوں تو ان سے امداد نہ لی جائے، اور مشرکوں سے امداد لینا جائز نہیں۔

راقم کے نزدیک افغانستان کے جہاد میں مسلمانوں سے یہی غلطی ہوئی کہ انہوں نے غالب نصرانیوں سے روسیوں کے خلاف امداد لی، بلکہ یوں کہیں امریکہ کیلئے جہاد کیا، کاش کہ وہ جہاد اسلام کیلئے کیا جاتا تو اس کے نتائج کچھ اور ہوتے۔ ایک خونخوار بھیڑیئے کی زیر قیادت جب جہاد کیا جاتا رہا اور اس سے ڈالر بٹورے جاتے رہے، وہ دینی مدارس پر خرچ کئے جاتے رہے، تو یار کا جب کام نکلا وہ دینی لوگوں کا مخالف ہو گیا دیندار لوگوں کو دہشت گر کہنا شروع کر دیا، دینی مدارس کو دہشت گردی کے اڈے کہنا شروع کر دیا، راقم نے اپنی تقاریر میں بیسیوں مرتبہ افغانستان کے جہاد کے طریقہ کی مخالفت کی کہ یہ انداز اسلامی جہاد کا نہیں، کاش اس وقت کوئی سنتا۔

کافر کو کتا بنا کر استعانت جائز ہے:

جب کہ وہ ہمارے ہاتھ میں کتے کی طرح مسخر ہو، ارشاد ہوا یعنی سیر صغیر میں ذکر ہے

"لان قتالهم بهذا الصفة لا عزاز الدين و الاستعانة عليهم باهل الشرك كالاستعانة بالكلاب"

دو ورق اس سے پہلے ذکر فرمایا "و الا ستعانة باهل الذمة كالاستعانة بالكلاب" یعنی اس لئے کہ جب وہ اس حالت پر ہوں تو ان کا لڑنا ہمارے ہی دین کے اعزاز کو ہوگا، اور حربیوں پر ان ذمی مشرکوں سے استعانت ایسی ہوگی جیسے شکار میں کتوں سے مدد لیتے ہیں، دوسرے یہ کہ وہ ہمارے ہاتھ میں کتوں کی طرح مسخر ہوں کہ ان کا فعل ہمارے ہی لئے ہو، ہمارے ہی دین کے اعزاز کے واسطے ہو۔

کتے سے شکار میں استعانت کب جائز ہوتی ہے؟ جبکہ وہ شکار کے وقت سارا کام ہمارے لئے ہی کرے اس میں اپنے واسطے کچھ نہ کرے، اگر شکار مارا اور ماشہ بھر اس کا گوشت کھا لیا شکار حرام ہے۔

واضح ہوا کہ کافر سے خدمت لینا جائز ہوگا جب کہ وہ کتے کی طرح ہمارے ہاتھ میں ہوں، قلیل ہوں کثیر نہ ہوں۔ بڑا گروہ ہوا تو ممکن ہے کہ میدان میں پہنچ کر کافروں کا لشکر دیکھ کر شرارت پر آئے اور (سانپ کی طرح) پھن دکھائے۔

ممکن ہے کہ یہی حکمت ہو غزوہ احد میں کہ چھ سو یہود کو واپس فرما دیا کہ یہ بڑا جتھا ہوا، خصوصا اس حالت میں کہ مسلمان صرف سات سو، اور مغلطائی کی روایت کے مطابق چھ سو تھے، اور غزوہ خیبر میں حسب روایت واقدی صرف دس یہود کو ہمراہی کا حکم فرمایا کہ مسلمان ایک ہزار چار سو تھے اور غزوہ حنین میں تو صفوان جیسے ستر اسی بھی مان لیجئے تو کچھ نہ تھے کہ الہی لشکر بارہ ہزار تھا جس کی کثرت کا ذکر خود قرآن پاک میں دسویں پارہ میں موجود ہے۔

صفوان بن امیہ سے استعانت کے روشن جواب:

صفوان ﷺ کا اسلام سے پہلے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غزوہ حنین میں شریک ہونا ثابت تو ہے لیکن ان کا جنگ کرنا ثابت نہیں۔صرف اتنا ثابت ہے کہ انہوں نے سوزرہ،خود،بکتر پیش کئے،اور ایک روایت میں ہے کہ ان سے عاریۃ لئے۔حضور ﷺ نے غنائم سے اتنا عطاء فرمایا کہ بے اختیار کہہ اٹھے "واللہ ماطابت بھذاالانفس نبی" خدا کی قسم اتنی عطائیں خوش دلی سے دینا نبی کے سوا کسی کا کام نہیں۔نبی کریم ﷺ کی رحمت کو دیکھ کر ایمان قبول کر لیا،اور کہا"اشھد ان لاالہ الااللہ واشھدان محمد اعبدہ ورسولہ"

امام ابن سعد طبقات میں،پھر حافظ الشان عسقلانی اصابہ فی تمیز الصحابۃ میں انہیں صفوان ﷺ کی نسبت فرماتے ہیں"لم یبلغنا انہ عزامع النبی ﷺ"ہمیں کوئی روایت نہیں پہنچی کہ انہوں نے حضور ﷺ کی ہمراہی میں جہاد کیا ہو۔

امام طحاوی مشکل الآثار میں فرماتے ہیں:

"صفوان کان معہ لابالاستعانۃ منہ ففی ھذا مایدل علی انہ انما امتنع من الاستعانۃ بہ وبامثالہ ولم یمنعھم من القتال معہ باختیارھم لذلک"

یعنی صفوان خود حضور اقدس ﷺ کے ساتھ ہو لئے تھے حضور ﷺ نے ان سے استعانت نہ فرمائی،اس میں دلیل ہے اس پر کہ حضور ﷺ شرکوں سے استعانت سے باز رہتے تھے،اور وہ اپنے ہمراہی میں لڑیں اس سے منع نہ فرماتے تھے۔ (تمام بحث ماخوذ از الحجۃ المئوتمنہ مصنفہ اعلی حضرت رحمہ اللہ)

مسئلہ نکھر کر واضح ہوگیا کہ کافروں کے ساتھ یاری،مسلمانوں سے غداری حرام ہے۔کافر کبھی مسلمان کا خیر خواہ نہیں ہوسکتا،وہ مفاد پرست ہے جب مفاد پورا ہوا تو" چل تو کون؟ میں تمہیں نہیں جانتا۔میں تمہیں سبق سکھاؤں گا،مجھ سے پیسے بٹورنے والو وہ سارے پیسے میں تم سے خرچ کرا کے رہوں گا،میں یاروں کو ذلیل کرتا ہوں،بس یہی میرا کام ہے،تمہیں کس نے کہا تھا میرے ہمنوا بنو۔

﴿ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهُ ﴾ "اور ڈراتا تمہیں اللہ تعالیٰ اپنی ذات سے(اپنے غضب سے)"

ان الفاظ مبارکہ میں دو قول پیش کئے گئے ہیں:

(۱) الاول ان فیہ محذوفا والتقدیر ویحذرکم اللہ عقاب نفسہ"

پہلا قول یہ ہے کہ اس میں حذف مضاف ہے،مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے عذاب سے ڈراتا ہے۔

ابو مسلم نے کہا ہے ﴿وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی تمہیں اپنی نافرمانی کرنے پر اپنے عذاب سے ڈراتا ہے "نفس" کے لفظ کو ذکر کرنے کا خاص فائدہ ہے اگر رب تعالی یہ فرماتا ﴿وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ﴾ (اللہ تمہیں ڈراتا ہے) اس کے دو احتمال ہو سکتے تھے، کہ اللہ تمہیں ڈراتا ہے اپنے عذاب سے" اور دوسرا مطلب یہ ہوتا کہ اللہ تمہیں ڈراتا ہے اور لوگوں کے عذاب سے۔

"فلما ذکر النفس زال هذاالاشتباه ومعلوم ان العقاب الصادر عنه یکون اعظم انواع العقاب لکونه قادرا علی مالا نهایة له وانه لاقدرة لاحد علی دفعه ومنعه مماراد"

جب نفس کا ذکر کیا گیا ہے تو یہ اشتباہ زائل ہو گیا (کہ کسی اور کا عذاب بھی مراد ہو سکتا ہے) اور معلوم ہو گیا کہ رب تعالی کا عذاب ہی مراد ہے وہ تمام عذابوں سے بڑا عذاب ہے، اس لئے کہ عظیم قدرت حاصل ہے جس کی انتہاء نہیں، کوئی شخص رب تعالی کے عذاب کو دور کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، اور نہ ہی اللہ تعالی کے ارادہ کو کوئی منع کرنے پر قادر ہے۔

(۲) والقول الثانی، ان النفس ههنا تعود الی اتخاذ الاولیاء من الکفار ای ینهاهم اللہ عن نفس هذاالفعل"

اس میں دوسرا قول یہ ہے کہ "نفس" سے مراد اس مقام میں ان لوگوں کا "نفس فعل" ہے، کہ اگر تم نے کافروں کو دوست بنانے کا عمل جاری رکھا تو اللہ تعالی تمہیں ڈرا رہا ہے یعنی کافروں سے دوستی کا فعل رب تعالی کی ناراضگی اور اس کے عذاب کا ذریعہ ہے۔

﴿وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ﴾ "اور اللہ کی طرف ہی پھرنا ہے۔"

"والمعنی ان اللہ یحذرکم عقابه عند مصیرکم الی اللہ"

مطلب یہ ہے کہ بیشک اللہ تعالی تمہیں اپنے عذاب سے ڈراتا ہے جبکہ تمہارا پھرنا، تمہارا لوٹنا رب تعالی کی طرف ہے، یعنی جب تم نے اللہ تعالی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، اس کے سامنے تمہارے اعمال پیش کئے جانے ہیں تو تمہیں اس دن سے اور اس ملاقات سے زیادی ڈرنا چاہیے، کیونکہ اگر تم نے کفار سے دوستی کا تعلق برقرار رکھا تو اللہ تعالی تمہیں عذاب دے گا۔

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'فلا تتعرضوا لسخطه بمخالفة احکامه وموالاة اعدائه وهو تهدید عظیم مشعر بتناهی المنهی فی القبح"

کہ آیۂ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی کے احکام کی مخالفت کر کے اور اس کے دشمنوں سے محبت قائم کر کے تم اس

ذات کی ناراضگی کو مول نہ لو جس کی طرف تم نے لوٹ کر جانا ہے، یعنی جس چیز سے روکا گیا کہ کافروں سے دوستی نہ رکھو وہ بہت قبیح ہے، یعنی کفار سے دوستی رکھنا بہت بری چیز ہے، جس سے بچنا ضروری ہے۔

"ضیاء القرآن" کی ضیاء:

اگرچہ کافی کوشش کرتا ہوں کہ "**ضیاء القرآن**" کا لمبا اقتباس نہ نقل کروں تاکہ اس کا جمال اسی کے ساتھ رہے، لیکن مسلمانوں کی حالت زار کو دیکھتے ہوئے محترم پیر صاحب کا ایک ایک لفظ آب زر سے لکھنے کے قابل سمجھتے ہوئے لمبا اقتباس نقل کر رہا ہوں۔

اس سے واضح ہو گیا کہ کفار کے ساتھ ایسے دوستانہ مراسم کہ انہیں اپنے سیاہ سپید کا مالک بنا دیا جائے اور ہر بات میں انہیں کے مشورہ پر اعتماد کیا جائے، اسے قرآن حکیم نے قطعاً ممنوع قرار دے دیا ہے، ایسا رویہ اختیار کرنا کسی آزاد قوم اور آزاد حکومت کے شایان شان نہیں بلکہ حقیقت میں ذہنی غلامی کا یہ دوسرا نام ہے، جسے غیرت اسلام برداشت نہیں کر سکتی، نیز اگر ایک اسلامی مملکت دوسری اسلامی مملکت کے خلاف کسی کافر کی اعانت کر کے اسے شکست دے دیتے ہیں تو حقیقت میں ہم اپنے آپ کو کمزور کر رہے ہیں، اور اپنے دشمن کی تقویت کا باعث بن رہے ہیں، جو آج تو اپنے اغراض و مقاصد کے پیش نظر ہماری خوشامد بھی کر رہا ہے اور طرح طرح کے سبز باغ بھی دکھا رہا ہے لیکن کل اس لہ اغراض ہمارے مفاد سے ٹکرائیں گی تو وہ ہمارا مفاد سے ٹکرائیں گی تو وہ ہمارا قلع قمع کرنے میں دریغ نہیں کرے گا اور اس وقت اسے یاد بھی نہیں رہے گا کہ ہم اس کے وہ مخلص دوست ہیں جنہوں نے اس کی خاطر اپنے دینی بھائیوں کا خون بہانے میں ذرا تامل نہ کیا تھا، جو لوگ اندلس کے زوال اور بربادی کی خونچکاں داستان سے واقف ہیں، یا جنہوں نے سلطنت مغلیہ کے انحطاط کے دور میں بنگال اور جنوبی ہند کے مسلمان نوابوں کی غلط کاریوں کا جائزہ لیا ہے انہیں قدم قدم پر قرآن حکیم کے اس حکم کی اہمیت اور صداقت کے واضح ثبوت ملیں گے، تفسیر المنار کی یہ عبارت بہت جامع ہے:

"فالممنوع منها مایکون فیه خذلان لدینک وایذاء لاهله او اضاعة لمصالحهم"

یعنی کفار کے ساتھ ایسی دوستی ممنوع ہے جس سے تیرے دین کی رسوائی ہو، یا تیرے دینی بھائیوں کو اذیت پہنچے یا ان کے وقار اور مفاد کو نقصان پہنچے۔ (ضیاء القرآن)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَافِیْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ یَعْلَمْهُ اللّٰهُ وَیَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌo﴾ (آیة نمبر ۲۹)

(1) تم فرمادو کہ اگر تم اپنے جی کی بات چھپاؤ یا ظاہر کرو اللہ کو سب معلوم ہے اور جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور ہر چیز پر اللہ کا قابو ہے۔

(2) آپ فرمادو اگر تم چھپاؤ جو تمہارے دلوں میں ہے یا تم ظاہر کرو اسے، جانتا ہے اسے اللہ، اور جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

ماقبل سے تعلق:

پچھلی آیۃ کریمہ میں کفار سے دوستی رکھنے سے منع کیا، پھر حالت عذر میں اعتقاد صحیح رکھتے ہوئے ظاہری طور پر ان سے دوستی قائم کرنے کی اجازت فرمائی۔ پھر ان سے دلی دوستی رکھنے پر اپنے عذاب سے ڈرایا۔ اب اس آیۃ کریمہ میں یہ بیان کیا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ظاہر و باطن کو جانتا ہے، اس سے بندے کو یہ سمجھایا گیا کہ جب اللہ تعالیٰ دلوں کی باتوں کو جانتا ہے تو وہ ضرور دل کے عزم (مصمم ارادہ) کی پکڑ کرے گا، کیونکہ مصمم ارادہ پر گرفت ہے، ہاں وہ اپنے فضل سے معاف فرمادے تو اس کا حکم علیحدہ ہے۔ (از کبیر بزیادۃ)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

اس آیۃ کریمہ میں ﴿اِنْ تُخْفُوْا مَافِیْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ﴾ شرط ہے اور ﴿یَعْلَمْهُ اللّٰهُ﴾ جزا ہے۔ قانون یہ ہے کہ جزاء شرط پر مترتب ہوتی ہے، اور مؤخر ہوتی ہے، یہ چاہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم حادث ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ کا علم قدیم ہے، تو اس جملہ شرطیہ کا وقوع کیسے صحیح ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں دو چیزیں علیحدہ علیحدہ ہیں، ایک ہے علم اور دوسرا علم کا تعلق یہاں علم کا حادث ہونا نہیں سمجھ آرہا بلکہ انسانوں کے چھپانے یا ظاہر کرنے سے اللہ تعالیٰ کے علم کا تعلق حادث ہونا سمجھ آرہا ہے، یہ درست ہے، اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ (ماخوذ از کبیر)

سوال: عام طور پر کسی چیز پر ابھارنا اور کسی چیز کو چھپا کر رکھنا دل کا کام ہے۔ "**قلوب**" ذکر نہیں فرمایا۔ "**صدور**" ذکر کیا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: "لان القلب فی الصدر فجاز اقامة الصدر مقام القلب کما قال(یوسوس فی صدور الناس)وقال فانها لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور"

جواب یہ ہے کہ دل چونکہ سینہ میں پایا جاتا ہے، اس لئے سینہ کو دل کی جگہ ذکر کر دیا، یعنی مراد دل ہی ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے ﴿یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ﴾ میں "صدور" کو "قلوب" کی جگہ رکھا (خناس وہ ہے جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے) اور ایک مقام میں واضح طور پر ذکر فرمایا کہ دل سینہ میں ہے، سمجھنا اور نہ سمجھنا دل کا کام ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿فَاِنَّهَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَلٰکِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ﴾ بیشک وہ آنکھوں کے اندھے نہیں، لیکن ان کے دل اندھے ہیں جو سینے میں ہیں۔

خیال رہے کہ دل کے کون سے ارادہ پر پکڑ ہے اور کس ارادہ پر پکڑ نہیں اس کی مکمل تفصیل سورۃ بقرہ کی آیۃ ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ کے تحت دیکھی جائے۔

مقام تعجب: اس مقام پر مودودی صاحب نے "قل" کا ترجمہ کیا ہے "اے نبی لوگوں کو خبردار کردو" لیکن اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کہیں ﴿قُلْ﴾ کا ترجمہ فرمادیں "(اے محبوب) فرمادو" تو جہلاء یا حاسدیوں اعتراض کرتے ہیں "اے محبوب" کسی لفظ کا ترجمہ نہیں، انہیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ ضمیر کا مرجع بیان کیا گیا ہے، اس قسم کی کئی مثالیں دیوبندی حضرات کے تراجم سے راقم نے تسکین الجنان کے مقدمہ میں ذکر کی ہیں۔

تعجب اس بات پر ہے مودودی صاحب کے ترجمہ میں "اے نبی لوگوں کو" کسی ظاہر عربی لفظ کا ترجمہ نہیں لیکن مودودی صاحب پر آج تک کسی نے اعتراض نہیں کیا، کیونکہ یاروں پر اعتراض نہیں کیا جاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مودودی صاحب نے تو "اے نبی" لکھا ہے، ہم نبی کو مانتے ہیں، لیکن مولنا احمد رضا خان (رحمہ اللہ) نے "اے محبوب" ترجمہ کیا ہے، بس ہم محبوب نہیں مانتے کیونکہ ہمیں محبت ہی نہیں تو ہم محبوب کیوں مانیں، تف تمہاری عقل پر تم محبوب نہیں مانتے تو تمہاری وجہ سے کیا دوسرے بھی رسول اللہ ﷺ سے محبت چھوڑ دیں گے، یہ نہیں ہو سکتا ابھی قریب ہی انشاء اللہ محبت مصطفیٰ کریم ﷺ کا ذکر آئے گا۔

﴿قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِکُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ یَعْلَمْهُ اللّٰهُ﴾

"آپ فرمادو اگر تم چھپاؤ جو تمہارے دلوں میں یا تم اسے ظاہر کرو، جانتا ہے اسے (اللہ)"

مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ (اے محبوب) آپ

فرمادو اگر تم چھپاؤ وہ چیز جو تمہارے دلوں میں ہے یعنی کافروں کی محبت یا تم ظاہر کرو اسے، یعنی کافروں کی محبت کو تم ظاہر کرو قول سے یا فعل سے، اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے،

کلبی نے بیان کیا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے ''اگر تم اپنے دلوں میں رسول اللہ ﷺ کا تکذیب کو چھپا کر رکھو، یا اسے آپ کے ساتھ جنگ وجدال کے ذریعے ظاہر کرو، اللہ اسے جانتا ہے، اور اس کی تم پر حفاظت کرے گا یہاں تک کہ تمہیں اس کا بدلہ دے گا، (راقم کا اس میں موقف یہ ہے کہ آیۃ کریمہ شان نزول کے لحاظ پر خاص ہے کہ کفار سے محبت کرنے والوں کو خطاب ہے لیکن الفاظ کی عمومیت کے لحاظ پر عام ہے۔ اب مراد یہ ہے کہ کسی قسم کے گناہ کو، کسی قسم کی رب تعالیٰ کے حکم سے عدولی ہو چھپی ہو سینوں اور دلوں میں یا ظاہر ہو رب تعالیٰ اسے جانتا ہے، اس نے ان گناہوں پر گرفت فرمائی ہے، عام لوگوں کو اب یہ حکم شامل ہوگا، خواہ مومن ہوں یا کافر ہوں)

﴿وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾

''اور جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے۔''

اذا کان لا یخفی علیہ شئ فی السماوات ولا فی الارض ''فیکف یخفی علیه موالاتکم الکفار ومیلکم الیهم بالقلب''

یعنی جب رب تعالیٰ پر آسمانوں اور زمینوں کی کوئی چیز مخفی (چھپی) نہیں تو تمہارا کافروں سے دوستی رکھنا اور تمہارا ان کی طرف میلان اس سے کس طرح مخفی رہ سکتا ہے، لھذا رب تعالیٰ کے عذاب اور اس کی گرفت سے ڈرتے رہو۔

﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ ''اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے''

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں ''فیقدر علی عقوبتکم ان لم تنتهوا عما نهیتم عنه'' جب رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ تو اسی سے پتہ چل گیا کہ وہ تمہیں عذاب دینے پر قادر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے جن کاموں سے تمہیں منع فرمایا ہے اگر تم ان سے نہ رکے تو وہ تمہیں عذاب دے گا۔

والآیة بیان لقوله(ویحذرکم الله نفسه)فکا نه قال ویحذرکم الله نفسه لانها متصفة بعلم ذاتی محیط بالمعلومات کلها وقدرة ذاتیة تعم المقدورات باسرها فلا تجسروا علی عصیانه اذما من معصیة الاوهو مطلع علیها قادر علی العقاب بها''

یہ آیۃ کریمہ پچھلی آیہ کریمہ میں مذکور الفاظ مبارکہ ﴿وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَه﴾ اور ڈراتا ہے تمہیں اللہ اپنی

ذات سے) کا بیان ہے۔گویا کہ یوں بیان کیا گیا کہ اللہ تعالی ڈراتا ہے تمہیں اپنی ذات (اپنے عذاب) سے، کیونکہ اس کی ذات علم ذاتی سے متصف ہے، یعنی اس کا علم ذاتی ہے جو کہ تمام معلومات کو شامل ہے، اور اس کی قدرت ذاتی ہے تمام مقدورات کو شامل ہے۔اس لئے تم گناہوں پر، اللہ تعالی کی نافرمانیوں پر کسی قسم کی جسارت نہ کرنا، وہ ہر قسم کی معصیت پر مطلع ہے، اور اس پر گرفت کرنے اور عذاب دینے کی اسے قدرت حاصل ہے۔ (بیضاوی)

ایک نکتہ طلباء کرام کی توجہ مطلوب:

جب اس سے پہلے ﴿وَيَعْلَمُهُ اللّٰهُ﴾ ذکر کیا جاچکا ہے، جس میں صراحۃ (یعنی ظاہر طور پر) لفظ ''اللہ'' ذکر ہو چکا ہے، تو اب ﴿وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ ہونا چاہئے تھا کیونکہ صریح لفظ جب مذکور ہو اس کے بعد اسی کا ذکر کرنا ہو تو ''ضمیر'' ذکر کردینا کافی ہوتا ہے، یہاں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو کیوں ذکر کیا؟ اس کا خوبصورت جواب دیکھئے:

''واظهار الاسم الجليل في موضع الاضمار لتربية المهابة وتهويل الخطب وهو تذييل لما قبله مبين لقوله تعالى ويحذركم الله نفسه بان ذاته المقدسة المتميزة عن سائر المتصفة بما لا يتصف به شئى منها من العلم الذاتي المتعلق بجميع المعلومات متصفة بالقدرة الذاتية الشاملة لجميع المقدورات بحيث لا يخرج من ملكوته شئى قط''

رب جلیل کا اسم علم یعنی لفظ ''اللہ'' ذکر کیا گیا ضمیر پر اکتفار نہیں کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ضمیر کی جگہ کبھی اسم ظاہر ذکر کیا جاتا ہے مقصد اس میں رعب اور ڈرانا ہوتا ہے جیسا کہ بادشاہ کہے ''السلطان یأمرک کذا'' بادشاہ تمہیں حکم دیتا ہے۔یہ نہیں کہا ''انا آمرک کذا'' میں تمہیں اس طرح حکم دیتا ہوں، مقصد بات کو رعب دار بنانا ہوتا ہے کہ یہ حکم بادشاہ کا ہے کسی اور کا نہیں۔

اسی طرح بلاتشبیہ وتمثیل یہاں رب تعالی نے بھی اپنا اسم مبارک ذکر کیا ضمیر پر اکتفاء نہیں کیا تا کہ بات رعب دار ہو جائے خطاب ہولناک ہو جائے کہ اللہ تعالی اپنی ذات سے ڈرایا جس سے واضح کر دیا کہ وہ ذات تمام ذاتوں سے ممتاز ہے، کسی کی مجال نہیں کہ اس کی مثل ہو سکے، اس کا علم ذاتی ہے، اس کی قدرت ذاتی ہے، اس کے علم اور اس کے قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں۔ (از تفسیر ابی السعود)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿یَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْءٍ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗ اَمَدًا بَعِيْدًا وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ۝﴾ (آیۃ نمبر ۳۰)

(1) جس دن ہر جان نے جو بھلا کام کیا حاضر پائے گی اور جو برا کام کیا امید کرے گی کاش مجھ میں اور اس میں دور کا فاصلہ ہوتا اور اللہ تمہیں اپنے عذاب سے ڈراتا ہے اور اللہ بندوں پر مہربان ہے۔

(2) جس دن پائے گا ہر نفس جو اس نے عمل کیا اچھا (وہ) حاضر اور جو عمل کیا اس نے برا وہ تمنا کرے گا کاش کہ بیشک اس (نفس) کے درمیان اور اس (عمل) کے درمیان بہت فاصلہ ہوتا، اور ڈراتا تمہیں اللہ اپنی ذات (اپنے عذاب) سے، اور اللہ مہربان ہے بندوں پر۔

﴿يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا﴾

''جس دن پائے گا ہر نفس جو اس نے عمل کیا اچھا، (وہ) حاضر۔''

''یوم'' کے تعلق کے لحاظ پر کئی معانی:

(۱) ﴿یَوْمَ﴾ کا تعلق ہو ﴿وَيُحَذِّرُكُم﴾ سے، اب معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ڈراتا تمہیں اپنے عذاب سے جس دن ہر نفس اپنے اچھے عمل کو پالے گا، اور برے اعمال کے متعلق وہ تمنا کرے گا کاش میرے اور ان اعمال کے درمیان بڑا فاصلہ ہوتا لیکن ﴿يَوْمَ﴾ کا تعلق ﴿يُحَذِّرُكُم﴾ سے ضعیف سمجھا گیا ہے، اس کی دو وجہ ہیں ایک یہ کہ ﴿يَوْمَ﴾ اور ﴿يُحَذِّرُكُم﴾ کے درمیان کافی فاصلہ ہے، یہ لفظی ضعف ہے۔

''واما من جهة المعنى فلان التحذير موجود، واليوم موعود فلايصح له العمل فيه''

لیکن معنوی ضعف یہ ہے کہ ''تحزیر'' ڈرانا تو اب پایا گیا ہے، اور جس دن کا اس آیۃ کریمہ میں ذکر ہے وہ قیامت کا دن ہے، اس کا ابھی وعدہ ہے کہ اس نے آنا ہے، لھذا معنوی طور پر اس میں ضعف ہے۔

(۲) ﴿يَوْمَ﴾ کا تعلق ''المصير'' سے ہو جائے، اب معنی یہ ہوگا اللہ کی طرف ہی پھرنا ہے اس دن جس دن، الخ لیکن یہ بھی ضعیف ہے ''ويضعف انتصابه بالمصير للفصل بين المصدر ومعموله'' ﴿يَوْمَ﴾ پر ''مصیر'' کی وجہ سے نصب کا آنا ضعیف ہے، کیونکہ ''مصیر'' مصدر ہے، مصدر منفصل معمول

میں عمل نہیں کرتا۔

(۳) ایک اور احتمال یہ ہے کہ ﴿یَوْمَ﴾ کا تعلق ''قدیر'' سے ہو جائے، اس صورت میں معنی یہ ہوگا بیشک اللہ تعالی ہر چیز پر قادر ہے، وہ قادر ہوگا اس دن جس دن، الخ لیکن یہ قول بھی معتبر نہیں،

ویضعف نصبه بقدير لان قدرته على كل شيءٍ لا تختص بيوم دون يوم بل هو تعالى متصف بالقدرة دائما''

''قدیر'' سے ﴿یَوْمَ﴾ کا تعلق ضعیف ہے، کیونکہ اس کی قدرت ہر چیز پر کسی دن سے خاص نہیں، بلکہ وہ ہمیشہ کیلئے قدرت سے متصف ہے۔

(۴) اور احتمال یہ ہے کہ ﴿یَوْمَ﴾ کا تعلق ہو ''اذکر'' مقدر سے، اس صورت میں معنی یہ ہوگا یاد کرو اس دن کو جس دن۔الخ

(۵) ایک اور احتمال یہ ہے کہ ﴿یَوْمَ﴾ کا تعلق ہو ''اتقوا'' مقدر سے، اب معنی یہ ہوگا بچ جاؤ اس دن سے جس میں۔الخ

(۶) اور احتمال یہ ہے کہ ﴿یَوْمَ﴾ کا تعلق ہو ''تود'' محذوف سے۔ اب معنی یہ ہوگا جس دن پسند کرے گا ہر نفس کہ وہ پالے.........الخ

لیکن یہ آخری تینوں احتمال بھی ضعیف ہیں ''**واما نصبه باضمار فعل على خلاف الاصل**'' لیکن لفظ ''یَوْمَ'' کی نصب کسی محذوف فعل سے ماننا خلاف اصل ہے، یعنی مذکور فعل سے جب تعلق ہو سکے تو محذوف فعل سے تعلق کرنے کی ضرورت نہیں۔

(۷) زیادہ جمہور حضرات کا قول یہ ہے کہ ''یَوْمَ'' کا تعلق مذکور فعل ''تجد'' سے ہو تو یہ زیادہ بہتر ہے۔

(ماخوذ از البحر المحیط)

اب آپ اعلی حضرت رحمہ اللہ کی ترجمہ کو دیکھئے کیا خوب اور مختصر، جامع نظر آئے گا ''جس دن ہر جان نے جو بھلا کام کیا حاضر پائے گی'' **راقم** نے بھی یہی نقل کیا لیکن لفظوں کے ساتھ ساتھ ترجمہ کرنے میں مشکلات بھی درپیش آتی ہیں اردو جملہ بظاہر مناسب نظر نہیں آتا، کوشش صرف یہی ہوتی ہے کہ دینی مدارس کے متوسط درجے کے طلباء اور عوام کو فائدہ حاصل ہو جائے۔ علماء کرام اور بڑی کلاسوں کے طلباء کرام یقیناً مجھ سے زیادہ سمجھ رکھنے والے ہوتے ہیں۔

سوال: عمل عرض ہے، عرض باقی نہیں رہتی، قیامت کے دن عمل کو حاضر پانے کا کیا مطلب؟

پہلا جواب: اس سے مراد یہ ہے ''**انه يجد صحائف الاعمال**'' ہر شخص اپنی نیکی کے کاموں کا

نامہ اعمال پائے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿اِنَّا کُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ بیشک ہم لکھتے رہے جو تم عمل کرتے رہے۔ اور ارشاد فرمایا ﴿فَیُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا اَحْصَاهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ﴾ ان کو خبر دے گا جو وہ عمل کرتے رہے، وہ رب کے شمار میں ہوں، اور وہ خود اسے بھول چکے ہوں گے۔

دوسرا جواب: اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے اعمال کی جزاء پائیں گے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ،

"قوله تعالى "محضرا" يحتمل ان يكون المراد ان تلك الصحائف تكون محضرة يوم القيامة ويحتمل ان يكون المعنى ان جزاء العمل يكون محضرا، كقوله "ووجدوا ماعملوا حاضرا" وعلى كلا الوجهين فالترغيب و الترهيب حاصلان"

اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی میں "محضرا" کے معنی میں دو احتمال پائے گئے ہیں، ایک یہ کہ وہ اپنے صحائف (نامہ اعمال) کو قیامت کے دن حاضر پائیں گے، اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ عمل کی جزاء کو حاضر پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا﴾ میں بھی یہی دو احتمال ہیں۔ دونوں احتمالوں میں نیکی کے کاموں کی رغبت بھی دلائی گئی ہے، اور گناہوں سے ڈرایا بھی گیا ہے۔ (کبیر)

مؤمن کی نیکیاں اور کافر کی برائیاں ظاہر ہوں گی:

❁ **عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ ان الله يدني المؤمن فيضع عليه كنفه ويستر فيقول اتعرف ذنب كذا اتعرف ذنب كذا فيقول نعم اى رب حتى قرره بذنوبه ورأى فى نفسه انه قد اهلك قال سترتها عليك فى الدنيا وانا اغفرها لك اليوم فيعطى كتاب حسناته واما الكافر والمنافق فينادى بهم على رؤس الخلائق هؤلاء الذين كذبوا على ربهم الالعنة الله على الظالمين"**

(بخاری و مسلم بحوالہ مظہری)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ مومن کو اپنے قریب کرے گا، اسکے کندھے پر اپنا دست قدرت رکھے گا، اس کی پردہ پوشی فرماتے ہوئے (در پردہ) اس سے پوچھے گا، کیا تو اپنے فلاں فلاں گناہ جانتا ہے؟ کیا تو اپنے فلاں فلاں گناہ جانتا ہے؟ وہ عرض کرے ہاں اے میرے رب یہاں تک کہ وہ اپنے گناہوں کا اقرار کرلے گا، اور اپنے دل میں خیال کرے گا بیشک مجھے ہلاک کردیا جائے گا، رب تعالیٰ فرمائے گا میں نے دنیا میں تیری پردہ پوشی فرمائی، اور میں آج تیری مغفرت کررہا ہوں، تو نیکیوں والا اعمال نامہ اسے دے دیا جائے گا (گناہوں والے کو محو کردیا جائے گا) لیکن کافر اور منافق کو مخلوق کے سامنے بلایا جائے گا، (اور سب کو بتلایا جائے

گا) یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی تکذیب کی تھی۔خبردار اللہ کی لعنت ہو ظالموں پر۔

﴿وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًا بَعِيْدًا﴾

''اور جو عمل کیا اس نے برا وہ تمنا کرے کاش کہ بیشک اس کے (نفس) اور اس کے (عمل) درمیان بہت فاصلہ ہوتا۔''

﴿ وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ﴾ کا عطف ہے ﴿مَا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ﴾ پر، اس لئے ﴿مُحْضَرًا﴾ کا تعلق شر سے بھی اسی طرح ہے جس طرح خیر سے ہے۔یعنی جس نفس نے برے عمل کئے وہ اپنے برے اعمال حاضر پائے گا، البتہ خیر کے ساتھ ظاہر طور پر ''محضرا'' کو ذکر کیا ہے اور ''سوء'' یعنی شر کے ساتھ ظاہر طور پر ذکر نہیں کیا، اس کی وجہ یہ ہے:

''انه خص بالذكر في الخير للاشعار يكون الخير مرادابالذات و كون احضار الشر من مقتضيات الحكمة التشريعية''

کہ خیر کے ساتھ صراحۃ (ظاہر طور) پر ذکر کر کے یہ بتا دیا کہ اصل میں ذاتی طور پر خیر ہی مراد ہے۔اصل شر کا ظاہر کرنا مقصود نہیں ہوگا، لیکن شریعت کی حکمت کا تقاضا یہ ہوگا کہ ہر نفس کے برے اعمال بھی ظاہر کئے جائیں۔

لیکن یہ عدل کا مسئلہ ہے، فضل ربی ہوا تو برے اعمال کی پردہ پوشی ہوگی، ان کو ظاہر نہیں کیا جائے گا، امید ہے مصطفیٰ کریم ﷺ کی مہربانی سے رب تعالیٰ فضل و کرم فرمائے گا۔

جو آج عیب میرے کھلنے نہیں دیتے　　وہ کب چاہیں گے حشر میں میری رسوائی ہو

''تود'' ای تتمنی وهو عامل في الظرف ای تتمنی يوم ذلك'' ''تود'' کا معنی ہے تمنا کرنا یعنی اس دن برے عمل کرنے والا نفس تمنا کرے گا کہ میرے اعمال اور میرے درمیان کاش کہ بہت فاصلہ ہوتا۔

ایک احتمال یہ ہے کہ ''بینہ'' میں ضمیر ''یوم'' کی طرف لوٹ رہی ہو، اس صورت میں معنی ہوگا کاش اس کے نفس اور اس دن میں بہت فاصلہ ہوتا۔لیکن اس قول کو پسند نہیں کیا گیا کیونکہ ''یوم'' کا ذکر بعید ہے، مرجع جب قریب ہو تو بعید کی ضرورت نہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ قیامت کے دن تو تمام اعمال نیک یا برے پیش ہوں گے، یہ تمنا تو صرف برے اعمال کو دیکھ کر ہوگی۔

اس لئے بہتر صورت یہ ہے کہ ''الضمير لما عملت لقربه'' کہ ضمیر ''مَا عَمِلَتْ'' کی طرف لوٹ رہی ہے، کہ جس نفس نے برے عمل کئے وہ تمنا کرے گا کاش کہ اس (نفس) کے درمیان اور اس کے (اعمال) کے درمیان

بہت فاصلہ ہوتا۔ (ماخوذ از روح المعانی)

''امدا''غاية الشیء ومنتهاه''''امدا'' کا معنی ہے کسی چیز کی غایت اور منتہا۔

امد اور ابد کے درمیان فرق:

''ابد'' کا معنی ہوتا ہے غیر محدود زمانہ کی مدت، اور ''امد'' کا معنی ہوتا ہے ''ایسی مدت جس کی حد مجہول ہو،''والمراد هنا الغاية الطويلة'' یہاں مراد غایۃ طویلہ ہے۔ مقدار عمر پر بھی ''امد'' کا اطلاق ہے، مشرق و مغرب کے درمیان چلنے پر بھی ''امد'' کا اطلاق ہے۔

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ آیۃ کریمہ میں''ان المراد بالامد البعيد المسافة البعيدة''''امدا بعيدا'' سے مسافت بعیدہ ہے، اس معنی کے متعلق علامہ آلوسی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں''ولعله الاظهر'' یہ معنی زیادہ ظاہر نظر آتا ہے۔ راقم نے اسی کے مطابق ''بہت فاصلہ'' ترجمہ کیا ہے۔ خیال رہے یہ تمنا تو ہوگی لیکن پائی نہیں جائے گی جیسا کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ﴾ میں تمنا نہیں پائی جائے گی، ایک شاعر کا قول بھی اسی پر دلالت کر رہا ہے کہ ہر تمنا کا پایا جانا ضروری نہیں۔

اجل المرء يستحث ولا يدري — اذا يبتغي حصول الاماني

انسان اپنی آرزوؤں کے پائے جانے کی حد مقرر کرتا ہے، فلاں وقت یہ کام ہو جائے گا، اسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ آرزوئیں حاصل ہوں گی، یعنی ضروری نہیں کہ اس کی تمنا اسے حاصل بھی ہو جائے۔

(ماخوذ از روح المعانی بتصرف)

﴿وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ﴾ ''اور ڈراتا ہے تمہیں اللہ اپنے نفس (اپنے عذاب) سے''

بعض حضرات نے بیان فرمایا ہے کہ یہ دوبارہ ذکر کیا ہے تاکید کیلئے، لیکن زیادہ بہتر یہ ہے کہ یہ کہا جائے''انه تكرار لما سبق واعادة له لكن لا للتاكيد فقط بل لافادة ما يفيده'' کہ اس میں اگرچہ پہلے جملہ تکرار ہے، الفاظ کو لوٹایا گیا ہے، لیکن صرف تاکید کیلئے نہیں بلکہ نئے معنی کا فائدہ دے رہا ہے، وہ نئے معنی کا فائدہ یہ ہے کہ پہلے کافروں سے دوستی سے منع فرمایا، اس پر اسے مرتب کیا کہ اگر تم نے کافروں سے دوستی کی تو اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے عذاب سے ڈراتا ہے اور یہاں مطلقاً نیک اعمال پر ابھارا گیا ہے اور برے کاموں سے اجتناب کا حکم دیا گیا ہے، اس پر یہ حکم مرتب کیا گیا ہے کہ کسی قسم کا کوئی بھی برا عمل کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے عذاب سے ڈراتا ہے، ان الفاظ مبارکہ میں

اللہ تعالیٰ نے اپنی کامل کبریائی اور قہاریت کا ذکر فرما دیا ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

﴿وَاللّٰہُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ﴾ ''اور اللہ مہربان ہے بندوں پر۔''

یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کو اپنے عذاب سے ڈرانا بھی اس کی رحمت اور مہربانی ہے۔

"لانهم اذا عرفوه وحذروه جرمهم ذلک الی طلب رضاه واجتناب سخطه وذلک هو الفوز العظیم"
اس لئے کہ جب وہ اس حکم کو سمجھ لیں گے تو جرم سے پرہیز کریں گے گناہوں سے، اور اللہ تعالیٰ کی رضاء طلب کریں گے اور اس کی ناراضگی سے اجتناب کریں گے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے، تو واضح ہوا کہ رب تعالیٰ کا اپنی ذات اور اپنے عذاب سے ڈرانا در حقیقت رب تعالیٰ کی مہربانی ہے۔ (از روح المعانی)

❁ اور فائدہ یہ حاصل ہوا "انه رؤف بالعباد حیث امهلهم للتوبة والتدارک والتلافی" بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہے کہ ان کو توبہ کی مہلت دیتا ہے تاکہ وہ اپنی غلطیوں کا تدارک کر سکیں، جو چیز ان سے رہ گئی ہو اسے پورا کر لیں۔

❁ اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ ﴿وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهُ﴾ میں وعید پائی گئی، یعنی عذاب کی دھمکی دی گئی ہے، اور ﴿وَاللّٰہُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ﴾ میں وعد پایا گیا ہے، گویا کہ نجات حاصل ہونے اور جنت کے عطاء کرنے کا وعدہ پایا گیا ہے "لیعلم العبد ان وعده ورحمته غالب علی وعیده وسخطه" تاکہ بندے کو معلوم ہو جائے کہ بیشک اس کا وعدہ اور رحمت اس کی وعید اور ناراضگی پر غالب ہے۔

❁ اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ ﴿وَاللّٰہُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ﴾ ذکر فرما کر واضح کر دیا کہ پہلے کفار اور فساق کیلئے وعید کا ذکر تھا، اب اطاعت کرنے والے، عبادت کرنے والے لوگوں کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر مہربان ہے۔

"العباد" سے مراد اللہ تعالیٰ کے خاص عبادت گذار بندے ہیں جیسا کہ رب تعالیٰ نے اپنے ان بندوں کا تذکرہ یوں فرمایا ﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ اور رحمٰن کے بندے چلتے ہیں زمین پر آرام آرام سے (پر وقار طریقے سے) اور ارشاد فرمایا ﴿عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ﴾ (چشمہ سے اللہ کے بندے پئیں گے)
(ماخوذ از کبیر)

فائدہ: علامہ قشیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ سلوک کی ابتدائی منازل طے کر رہے ہوتے ہیں ان کیلئے ﴿وَاللّٰہُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ﴾ (اور اللہ مہربان ہے اپنے بندوں پر) فرمایا کیونکہ وہ ابھی آسانی طلب کرنے کی

راہ میں ہوتے ہیں۔اور عارفین کے لیے فرمایا ﴿ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ﴾ (اور ڈراتا ہے تمہیں اللہ اپنی ذات سے) کیونکہ عارفین اپنے آپ کو مقام خوف اور مقام ہولناک میں قائم کئے ہوتے ہیں۔

اور ضمنی طور پر یہ مسئلہ سمجھ آ گیا کہ اللہ تعالی اپنے بندوں پر مہربان ہے،ان کو مہلت دیتا ہے،لیکن "فیجب ان لا یغتر العبد بامهاله بل يتاهب ليوم حسابه وجزائه" ضروری ہے کہ بندہ اس مہلت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرے،اپنے آپ کو دھوکے میں نہ رکھے بلکہ قیامت کے دن کیلئے تیاری رکھے کیونکہ وہ دن اعمال کے حساب کا ہے،اور وہی دن بندوں کی جزاء کا ہے۔

در خیر باز است وطاعت ولیک　　نہ ہر کس تواناست بر فعل نیک

نیکی اور طاعت کا دروازہ کھلا ہے،لیکن ہر شخص نیکی کے کام کی طاقت نہیں رکھتا

ہر خیال کو کند در دل وطن　　روز محشر صورتی خواہد شدن

ہر خیال جو دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے قیامت کے دن اس کو ایک خاص صورت حاصل ہو گی۔

سیرتی کان در وجودت غالب است　　ہم برآں تصویر حشرت واجب است

جو سیرت تیرے وجود میں غالب ہو گی قیامت کے دن وہ تصویر تجھے حاصل ہو گی

مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن تیرے اعمال،تیری عادت،تیری سیرت تیرے سامنے آجائے گی اس کی تجھے جزاء دی جائے گی لھذا نیک عمل کر،بروں سے اجتناب کرتا کہ قیامت کے دن تجھے عظیم کامیابی حاصل ہو۔(از روح البیان)

کامیابی کیلئے برے ساتھیوں سے دور رہو:

حضرت علی ؓ فرماتے ہیں "فلا تصحب اخا الجاهل واياک واياه،فكم من جاهل اردى حليما حين اخاه" جاہل کے ساتھ دوستی قائم نہ کر،تو اس سے دور رہ وہ تجھ سے دور رہے،کتنے ہی جاہل بردبار آدمیوں کو ہلاک کر دیتے ہیں جب وہ ان سے بھائی چارہ قائم کرتے ہیں۔"يقاس المرء بالمرء اذاما هوماشاء وللقلب على القلب دليل حين يلقاه" انسان کو دوسرے انسان پر ہی قیاس کیا جاتا جب یہ اس کی منشا کے مطابق کام کرے جب دو دل آپس میں مل جاتے ہیں تو ایک دل دوسرے پر دلیل ہوتا ہے۔　　(روح البیان)

کامیابی کا راز صبر میں:

حاتم اور شقیق دونوں سفر میں نکلے،ان کے ساتھ ایک بوڑھا فاسق گویا بھی چل پڑا،وہ راستہ میں سارنگی

بجاتا، گانے گاتا، حاتم اس کو روکنے کی کوشش میں سخت نظروں سے دیکھنے لگا تو شقیق نے منع کیا کہ اسے نہ روکو، وہ جو چاہے کرتا رہے، جب تمام کا مشترکہ راستہ طے ہو گیا اور علیحدہ علیحدہ راستہ اختیار کرنے کی ضرورت درپیش آئی تو اس بوڑھے گویے نے کہا میں نے تم جیسا کوئی صابر نہیں پایا کہ میں تمہارے سامنے گانے گاتا رہا تم نے مجھے روکا نہیں۔

حاتم نے اسے کہا اے بوڑھے شخص اگر ہم سے کوئی غلطی ہوگئی ہو تو تم ہم کو معاف کر دینا، میرا نام حاتم ہے یہ میرے دوسرے دوست شقیق ہیں۔ اس شخص نے اپنی سارنگی وغیرہ توڑ دی، کامل توبہ کر کے نیک بن گیا، ان دونوں بزرگوں کی خدمتگذاری میں زندگی بسر کر دی، شقیق نے حاتم کو کہا کیا تم نے صبر کا مقام دیکھ لیا، کہ یہ ہمارے صبر کی برکت ہے جس نے اس شخص کو توبہ کرنے والا بنا دیا۔

نہ آنکہ بر در دعوی نشیند از خلقی　　که گر خلا کنندش بجنگ برخیزد

ایسا نہ ہو کہ اپنے دعوی کے دروازہ پر مخلوق کیلئے بیٹھ جائے، کوئی شخص اس کے خلاف کرے تو یہ جنگ کیلئے اٹھ پڑے۔ اور اگر تو کامیابی چاہتا ہے تو رب تعالی کے احکام کے باغیوں سے قطع تعلق کر لے۔

رب تعالی نے فرمایا ﴿وَاِنْ جَاهَدَاکَ عَلٰی اَنْ تُشْرِکَ بِیْ مَالَیْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا﴾ اگر وہ دونوں (ماں، باپ) تمہارے ساتھ کوشش کریں کہ تم میرے ساتھ شریک ٹھہراؤ، جس کا تمہیں علم نہیں تو تم ان کی فرماں برداری نہ کرو۔

هزار خویش که بیگانه از خدا باشد　　فدای یک تن بیگانه کاشنا باشد

ہزار اپنے جو خدا سے بیگانہ ہیں وہ قربان ہو جائیں اس ایک شخص پر جو بیگانہ ہے لیکن خدا کو پہچاننے والا ہو۔

(ماخوذ از روح البیان زیر آیہ ﴿لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَاءَ﴾)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۝﴾ (آیۃ نمبر ۳۱)

(۱) اے محبوب تم فرمادو کہ لوگو اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میرے فرمانبردار ہو جاؤ، اللہ تمہیں دوست رکھے گا، اور تمہارے گناہ بخش دے گا، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

(۲) (اے محبوب) آپ فرمادو اگر تم محبت کرتے ہو اللہ سے، تو تابعداری کرو میری، محبت کرے گا تمہارے ساتھ اللہ اور بخش دے گا تمہارے گناہ، اور اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

ماقبل سے تعلق:

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا کہ اللہ تعالی نے پہلے اپنی عظمت ذات کا ذکر فرمایا، اسی طرح اپنی سلطنت کے جلال کا ذکر فرمایا۔ یہ ذکر ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ﴾ آیۃ کریمہ میں فرمایا۔ اس آیۃ کریمہ کو دیکھ کر مؤمن بندے کے دل میں عظیم الشان مولی کے ساتھ قلبی تعلق قائم ہو گیا، بندے کو معلوم ہو گیا اللہ تعالی ذوالملک والملوت ہے، اور "ذو الجلال والجبروت" ہے، اس کے بعد مؤمنین کو اپنے دشمنوں (کفار) سے محبت کرنے سے روکا، اور مکمل طور پر اس سے ڈرایا، اس کا تذکرہ ﴿لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ﴾ آیۃ کریمہ میں کیا۔

پھر کافروں سے دوستی کی مکمل جڑیں کاٹ دینے پر متنبہ اس آیۃ کریمہ میں کیا ﴿قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ یَعْلَمْهُ اللّٰهُ﴾ اس کے بعد پہلے تمام مسائل کی تاکید کیلئے اس زیر بحث آیۃ کریمہ ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ﴾ کو نازل کیا۔ گویا کہ رب تعالی سے بندوں نے سوال کیا "بای شیء ینال کمال المحبة و موالاة الرب" اے اللہ تو ہی بتا کہ تیری کامل محبت اور تیری دوستی کیسے حاصل ہوتی ہے؟

"فقیل بعد قطع موالاة اعدائنا تنال تلک الدرجة بالتوجه الی متابعة حبیبنا اذ کل طریق سوی طریقه مسدود و کل عمل سوی ماأذن به مردود"

تو رب تعالی کی طرف سے گویا کہ یوں جواب دیا گیا کہ اگر تو میرے ساتھ محبت کرنے اور میرے ساتھ دوستی قائم کرنے کا خواہشمند ہے تو پہلے میرے دشمنوں کفار سے دوستی توڑ دے، ان سے منہ موڑ لے، پھر اس درجہ کو حاصل کرنے کیلئے میرے حبیب ﷺ کی اتباع کر لے تو میں تیرا محبوب بن جاؤں تو میرا محبوب بن جائے گا۔

ہاں اس درجہ رفیعہ (بلند درجہ) کو حاصل کرنے کیلئے صرف وہی راہ جو تمہیں بتادی گئی، اس کے بغیر سب راہیں بند ہیں، بس اسی ایک راستہ کی تجھے اجازت دی گئی، اس کے بغیر اور راہ تلاش کرے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مردود ہوگی۔ (از روح المعانی)

شان نزول:

اس آیۃ کریمہ کے شان نزول میں چند وجوہ بیان کی گئی ہیں، جو تمام ہی مجموعی طور پر اس کا شان نزول ہیں۔

(۱) "اخرج ابن جریر من طریق بکر بن الاسود عن الحسن قال قال قوم علی عهد النبی ﷺ یا محمد انا نحب ربنا فانزل الله "قل ان کنتم تحبون الله فاتبعونی یحببکم الله ویغفر لکم ذنوبکم "فجعل اتباع نبیه محمد ﷺ علما لحبه وعذاب من خالفه" (در منثور)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں کچھ لوگ یہ کہتے تھے اے محمد ﷺ بیشک ہم اپنے رب سے محبت کرتے ہیں تو اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا، اس دعوی پر سچا ہونے کیلئے نبی کریم ﷺ کی اتباع کو شرط قرار دے دیا، کہ اگر تم نے حضور کی اتباع کی تو اپنے دعوی محبت میں سچے ہو گے، اور رب تعالیٰ بھی تمہارے ساتھ محبت کرے گا، اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔ اگر تم نے نبی کریم ﷺ کی اتباع نہ کی تو تم عذاب کے مستحق ہو گے۔

(۲) "وقال الضحاک عن ابن عباس رضی الله عنهما وقف النبی ﷺ علی قریش وهم فی المسجد الحرام وقد نصبوا اصنامهم وعلقوا علیها بیض النعام وجعلوا فی آذانها الشنوف وهم یسجدون لها فقال والله یا معشر قریش لقد خالفتم ملة ابیکم ابراهیم واسمعیل، فقالت له قریش انما نعبدها حب الله لیقربونا الی الله زلفی، فقال الله تعالی قل لهم یا محمد ان کنتم تحبون الله وتعبدون الاصنام لیقربوکم الیه فاتبعونی یحببکم الله فانا رسوله الیکم وحجته علیکم اتبعوا شریعتی وسنتی یحببکم الله" (معالم التنزیل للبغوی)

ضحاک نے حضرت ابن عباس ﷺ سے روایت ذکر کی کہ نبی کریم ﷺ قریش پر ٹھہرے وہ مسجد حرام میں تھے، انہوں نے بت قائم کر رکھے تھے، ان پر شتر مرغ کے انڈے سجا رکھے تھے اور ان کے کانوں میں بالیاں سجائی تھیں، اور وہ ان کو سجدہ کر رہے تھے، آپ نے فرمایا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اے معشر قریش (قبیلہ قریش) تحقیق تم نے اپنے آباء ابراہیم اور اسمعیل علیہما السلام کے دین کی مخالفت کی، تو قریش نے کہا ہم تو ان کی عبادت اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے قریب کر دیں گے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیۃ کریمہ نازل فرما کر مصطفیٰ کریم ﷺ کو فرمایا" آپ ان کو فرمادیں اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو اور اس لئے بتوں کی عبادت کرتے ہو کہ یہ تمہیں اللہ کے قریب کر دیں گے (یہ دعویٰ تمہارا باطل ہے، بتوں کی عبادت کو چھوڑو) اور میری تابعداری کرو اللہ تمہارے ساتھ محبت کرے گا، میں

اس کا رسول ہوں تمہاری طرف، اور اس کی حجت (دلیل) ہوں تم پر، میری شریعت کی اور میری سنت کی تابعداری کرو تو اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ محبت کرے گا۔

(۳) تیسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے

"وفی روایة ابی صالح ان الیھود لما قالوانحن ابناء الله واحباؤه انزل ھذه الآیة فلما نزلت عرضھا رسول الله ﷺ علی الیھود فابوا ان یقبلوھا"

ابوصالح کی روایت میں ذکر ہے کہ یہود نے جب یہ دعویٰ کیا ہم اللہ کے بیٹے ہیں (معاذ اللہ) اور اس کے محبوب ہیں، تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی کہ اللہ کے وہ محبوب ہیں جو مصطفیٰ کریم ﷺ کی تابعداری کرنے والے ہیں، جب یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی تو مصطفیٰ کریم ﷺ نے یہود پر پیش کی، لیکن انہوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔

(۴) **"ونزلت فی نصاری نجران وذلک انھم قالواانما نعظم المسیح ونعبده حباللہ تعالی وتعظیما له فانزل الله ھذه الآیة رداعلیھم"**

اور وجہ شان نزول کی یہ ہے کہ جب نجران کے عیسائیوں نے یہ کہا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور اس کی محبت کی غرض کی وجہ سے عیسیٰ علیہ السلام کی تعظیم کرتے ہیں اور ان کی عبادت کرتے ہیں تو ان کے رد میں آیۃ کریمہ نازل ہوئی کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو رسول اللہ ﷺ کی تابعداری کرو تو اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ محبت کرے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے کا تمہارا دعویٰ صرف اس وقت سچا ہوگا جب تم مصطفیٰ کریم ﷺ کی اتباع کرو گے، عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت کر کے، شرک کا ارتکاب کر کے تم کس طرح اللہ تعالیٰ کی محبّ ہونے کا دعویٰ کرتے ہو؟ یہ تمہارا دعویٰ سراسر باطل ہے۔ (از روح المعانی)

﴿قُلْ﴾ "(اے محبوب) آپ فرمادو"

جلالین میں ذکر ہے "قل لھم یا محمد" فرمادو ان کو اے محمد ﷺ۔ جب خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے تو اسی لئے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا "اے محبوب تم فرمادو"

راقم نے بھی یہی ترجمہ نقل کیا ہے، اسی لئے بریکٹ میں "اے محبوب" کے الفاظ ذکر کر دیئے ہیں لطف کی بات یہ ہے کہ مودودی صاحب نے یہاں بھی ترجمہ کیا ہے اے نبی لوگوں سے کہہ دو" اگرچہ "اے نبی" اور "اے محمد" بھی یار لوگوں کے مزاج کے خلاف ہے، بقول اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ

تیری انکے تو وکیلوں سے کرے استمداد، یا محمد سے بگڑتی ہے طبیعت تیری

لیکن ''اے محبوب'' سے تو ان کا مزاج زیادہ ہی بگڑ جاتا ہے۔

﴿اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾

''اگر تم محبت کرتے ہو اللہ سے تو تابعداری کرو میری، محبت کرے گا تمہارے ساتھ اللہ، اور بخش دے گا تمہارے گناہ۔''

محبت کی تعریف:

المحبة ميل النفس الى الشىء لكمال ادرك فيه بحيث يحملها على مايقربها اليه'' محبت کا مطلب یہ ہے کہ نفس کا کسی چیز کی طرف میلان پایا جائے، یعنی کسی چیز کا کمال اسے برانگیختہ کرے (ابھارے) کہ یہ اس کے قریب ہو جائے اور دل اس کی طرف میلان کرے۔ (از بیضاوی)

بلکہ یوں کہا جائے محب اپنے دل میں محبوب کو بسالے۔

بندے کی محبت رب تعالیٰ سے:

"والعبد اذا علم ان الكمال الحقيقى ليس الالله وان كل مايراه كمالا من نفسه اوغيره فهو من الله وبالله والى الله لم يكن حبه الالله وفى الله"

بندے کو جب یہ معلوم ہو جائے کہ بیشک کمال حقیقی اللہ کے بغیر کسی اور کو حاصل ہے، بندہ اپنے نفس کے کمالات یا اپنے بغیر اور چیزوں کے کمالات کو اللہ کی طرف سے سمجھے، اور اللہ کے لیے سمجھے اور یہ سمجھے کہ یہ عقیدہ اللہ تعالیٰ کی طرف پہنچانے والا ہے تو یقیناً اسے محبت اللہ کے ساتھ حاصل ہوگی، وہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی توجہ میں مستغرق ہو گا۔ "وذلک يقتضى ارادة طاعته والرغبة فيما يقربه" جب بندے کو رب تعالیٰ سے محبت حاصل ہوگی تو وہ محبت تقاضا کرے گی کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جائے، اور ان اعمال میں رغبت رکھی جائے جو اسے رب تعالیٰ کے قریب کر دیں۔

"فلذلک فسرت المحبة بارادة الطاعة وجعلت مستلزمة لاتباع الرسول فى عبادته والحرص على مطاوعته"

اسی لئے محبت کی تفسیر ارادہ طاعت سے کی جاتی ہے، یعنی مطلب یہ ہو گیا کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے

ہو یعنی اس کی طاعت کا دعویٰ کرتے ہو، تو رب تعالیٰ کی طاعت و عبادت وہی معتبر ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع کی جائے، وہ عبادت معتبر نہیں جو اتباع رسول اللہ ﷺ کے مخالف ہو، رب تعالیٰ کی محبت کے دعویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی فرمانبرداری پر حریص ہو۔ (ماخوذ از بیضاوی)

اللہ کی محبت بندوں سے:

"وحب الله للمؤمنين ثناؤه عليهم وثوابه وعفوه عنهم" اللہ تعالیٰ کا مؤمنوں سے محبت کرنے کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی تعریف فرماتا ہے اور ان کو ثواب عطاء فرماتا ہے، اور ان کو معاف فرماتا ہے۔ (معالم التنزیل للبغوی)

اللہ سے محبت کی علامات:

سب سے بڑی علامات علامہ ازہری رحمہ اللہ کا قول ہے "محبة العبد لله ورسوله طاعته لهما واتباعه امرهما" بندے کی محبت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے، اس کی پہچان یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور مصطفیٰ کریم ﷺ کا مطیع اور ان کے حکم کی تابعداری کرنے والا ہو۔

"وقال سهل بن عبد الله علامة حب الله حب القرآن، وعلامة حب القرآن حب النبى ﷺ وعلامة حب النبى ﷺ حب السنة، وعلامة حب الله وحب القرآن وحب النبى ﷺ وحب السنة حب الآخرة وعلامة حب الآخرة ان يحب نفسه وعلامة حب نفسه ان يبغض الدنيا وعلامة بغض الدنيا الا ان يأخذ منها الا الزاد والبلغة"

سہل بن عبد اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی محبت کی علامت قرآن پاک سے محبت ہے، اور قرآن پاک سے محبت کی علامت نبی کریم ﷺ سے محبت ہے، اور نبی کریم ﷺ سے محبت کی علامت آپ کی سنت سے محبت ہے، اور اللہ تعالیٰ کی محبت اور قرآن پاک کی محبت اور نبی کریم ﷺ کی محبت اور آپ کی سنت کی محبت آخرت سے محبت ہے، اور آخرت سے محبت علامت یہ ہے کہ اپنے نفس سے محبت کرے، اور اپنے نفس سے محبت کی علامت یہ ہے کہ دنیا کو ناپسند کرے، اور دنیا کو ناپسند کرنے کی علامت ہے کہ جو مل جائے اسی پر اکتفاء کرلے، صرف زادراہ اور ضروریات زندگی پر اکتفاء کرے۔ (قرطبی)

یعنی عیاشی کیلئے دنیا کے پیچھے نہ دوڑتا رہے اور حرام و حلال کی تمیز کے بغیر ہی صرف مال بٹورنے پر زندگی نہ گذار دے، بس اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طاعت میں زندگی گذارے اگر غنا بھی حاصل ہو جائے، مالدار ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

❁ "واخرج عبدبن حمید عن الحسن قال قال رسول الله ﷺ من رغب عن سنتی فلیس منی ثم تلاهذه الآیة قل ان کنتم تحبون الله فاتبعونی یحببکم الله"الی اخر الآیة" (درمنثور)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا جس شخص نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں، پھراس پر بطور دلیل یہی آیہ کریمہ ﴿قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ﴾ تلاوت فرمائی۔

❁ "واخرج الا صبهانی فی الترغیب عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ لن یستکمل مؤمن ایمانه حتی یکون هواه تبعا لما جئتکم به" (درمنثور)

اصبہانی نے ترغیب میں ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کسی مؤمن کا ایمان ہرگز اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک وہ اپنے خواہشات کو اس کے تابع نہ کرلے جو میں نے لایا ہے۔

یعنی قرآن پاک وحدیث کی تابعداری کے بغیر کسی کا ایمان مکمل نہیں ہوتا، ایمان کی تکمیل کی دارومدار اتباع مصطفیٰ کریم ﷺ میں ہے۔

❁ "واخرج ابن ابی حاتم عن ابی الدرداء فی قوله"قل ان کنتم تحبون الله فاتبعونی"قال علی البروالتقوی والتواضع وذلة النفس" (درمنثور)

ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے ﴿قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ﴾ کی تفسیر میں بیان فرمایا کہ نیکی اور تقوی، عاجزی اور ذلت نفس کو اختیار کرے، یعنی ان چیزوں میں نبی کریم ﷺ کی کامل طور پر اور خاص طور پہ پھر تابعداری کرے۔

❁ "واخرج ابن ابی حاتم عن سفیان بن عیینة انه سئل عن قوله المرء مع من احب فقال الم تسمع قول الله قل ان کنتم تحبون الله فاتبعونی یحببکم الله یقول یقربکم والحب هوالقرب والله لایحب الکافرین لایقرب الکافرین"

سفیان بن عیینہ سے مروی ہے کہ ان سے رسول اللہ ﷺ کے ارشادگرامی "المرء مع من احب" کے متعلق سوال کیا گیا کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ تو انہوں نے کہا کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا ارشادگرامی ﴿قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰهُ﴾ نہیں سنا۔ اللہ تعالیٰ کے محبت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ "وہ تمہیں اپنے قریب کرے گا محبت کا مطلب ہے "قرب" اللہ تعالیٰ کافروں سے محبت نہیں کرتا یعنی کافروں کو اپنے قریب نہیں کرتا۔

یعنی سوال کا جواب خوبصورت انداز پردے دیا کہ نبی کریم ﷺ کے ارشادگرامی "المرء مع من احب" کا مطلب یہ ہے کہ انسان اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اس کی محبت ہوگی، یعنی اس شخص کا اسے قرب حاصل ہوگا۔

❁ "واخرج احمد وابوداؤد والترمذی وابن ماجه وابن حبان والحاکم عن ابی رافع عن النبی ﷺ قال لاالفین احدکم متکئا علی اریکته یاتیه الامر من امری مما امرت به اونهیت عنه فیقول لاندری ماوجد نا فی کتاب الله اتبعناه" (درمنثور)

ابورافع بیان فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں ہرگز تم میں سے کسی ایک کو نہ پاؤں کہ وہ آرام دہ کرسی پر بیٹھا ہو، اس کے پاس میرے امر سے کوئی امر آئے، یعنی میں نے کسی چیز کا حکم دیا ہو یا کسی چیز سے روکا ہو، وہ کہے ہم نہیں جانتے، ہم نے یہ حکم اللہ کی کتاب (قرآن) میں نہیں پایا، کہ ہم اس کی تابعداری کریں۔

حدیث پاک سے واضح ہوگیا کہ قرآن پاک کی طرح حدیث پاک پر عمل کرنا بھی ضروری ہے، حدیث پاک کا انکار کرنے والا درحقیقت رسول اللہ ﷺ کا انکار کرنے والا ہے، اور رسول اللہ ﷺ کا منکر دراصل رب کا منکر ہے۔ آجکل منکرین حدیث دندنا رہے ہیں، قادیانی، یہودی ونصرانی کا گٹھ جوڑ ہے، وہ دین اسلام کو (معاذاللہ) مٹا دینے کی نئی نئی چالیں چل رہے ہیں، لیکن رب تعالی کا وعدہ بھی سچا اور پکا ہے،

﴿يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ﴾ (سورة الصف، آیة نمبر ۸)

وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کا نور اپنے مونہوں سے بجھا دیں اور اللہ تعالی اپنا نور پورا کرنے والا ہے، اگرچہ کافر ناپسند کریں۔

انشاءاللہ دین کو مٹانے کی کوششیں ناکام ہوں گی، دین کا بول بالا ہوگا، دشمنان دین مٹ جائیں گے۔

مٹے ہیں، مٹ جائیں گے سب اعداء تیرے　　　نہ مٹا ہے نہ مٹے گا چرچا تیرا

اتباع رسول اللہ ﷺ لازم ہے:

اس آیۂ کریمہ سے دووجہ سے یہ ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی اتباع لازم ہے۔

"احدھما، ان کنتم تحبون الله فاتبعونی "لان المعجزات دلت علی انه تعالی اوجب علیکم متابعتی"

ایک وجہ یہ ہے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری تابعداری کرو، کیونکہ اللہ تعالی نے مجھے معجزات عطاء کئے ہیں اس لئے تم پر واجب ہے کہ تم میری طاعت کرو۔

والثانی "ان کنتم تحبون الله فاتبعونی "لانکم اذااتبعتمونی فقداطعتم الله والله تعالی یحب کل من اطاعه"

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری تابعداری کرو، بیشک تم نے جب میری تابعداری کی تو تم اللہ کے مطیع ہو جاؤ گے، جو اللہ کا مطیع ہو جاتا ہے اللہ اس سے محبت کرتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی تابعداری سے اللہ تعالی کی طاعت اور تعظیم حاصل ہوتی ہے، اور جو شخص آپ کی تابعداری نہیں کرتا وہ رب تعالی کی طاعت اور تعظیم بھی نہیں کرسکتا۔ آپ کی تابعداری کی وجہ سے ہی اللہ تعالی کی محبت حاصل ہوگی۔

"ومن احب الله كان راغبا فيه، لان المحبة توجب الاقبال بالكلية على المحبوب والاعراض بالكلية عن غير المحبوب"

اور جو شخص اللہ تعالی سے محبت کرے گا وہ کامل طور پر اسی کی طرف راغب ہوگا، کیونکہ محبت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ محب کی مکمل طور پر توجہ محبوب کی طرف ہوتی ہے، اور غیر محبوب سے وہ مکمل طور پر اعراض کرتا ہے۔ (کبیر)

﴿وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ﴾ "اور بخش دے گا تمہارے گناہ"

یعنی اللہ تعالی بندے سے محبت کرتا ہے کہ اسے ثواب عطاء کرتا ہے، اور اس کے گناہ معاف کرتا ہے، اور اس سے عذاب دور کرتا ہے، "وهذا غاية مايطلبه كل عاقل" ہر عقلمند کا یہی مطلوب ہے۔

﴿وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ "اور اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔"

"يعنى غفور فى الدنيا يستر على العبد انواع المعاصى، رحيم فى الآخرة بفضله وكرمه"

یعنی دنیا میں اس کی صفت غفوریت کی جلوہ گری ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں بندوں کے مختلف گناہوں کو دیکھتا ہے لیکن ان کی پردہ پوشی فرماتا ہے اور ان کے گناہوں کو بخش دیتا ہے کہ انہوں نے میری نبی کی تابعداری کر کے اپنے آپ کو تائب کر لیا ہے۔ اور رب تعالی کی صفت رحیمیت آخرت میں جلوہ گر ہوگی وہ اپنا فضل وکرم فرمائے گا۔ (کبیر)

﴿آیۃ کریمہ سے متعلق چند چیزوں کا ذکر﴾

محب صادق کی علامت:

"عن ابى ايوب النبى ﷺ نزل عليه فنزل النبى ﷺ فى السفل وابو ايوب فى العلو فانتبه ابو ايوب ليلة فقال نمشى فوق رأس رسول الله ﷺ فتنحوا فباتوا فى جانب ثم قال للنبى ﷺ فقال النبى ﷺ السفل ارفق فقال لا اعلو سقيفة انت تحتها فتحول النبى ﷺ فى العلو وابو ايوب فى السفل فكان يصنع للنبى ﷺ طعاما فاذاجىء به اليه سال عن موضع اصابعه فيتتبع موضع اصابعه فصنع له طعاما فيه ثوم فلما رداليه سال عن موضع اصابع النبى ﷺ فقيل له لم ياكل ففزع وصعداليه فقال احرام هو قال النبى ﷺ ولكنى اكرهه قال فانى اكره ماتكره اوماكرهت قال كان النبى ﷺ يوتى بالوحى" (مسلم ج ۲ ص ۱۹۱ باب اباحة اكل الثوم)

حضرت ابوایوب ﷜ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ ان کے گھر اترے، آپ نے گھر کے نیچے حصہ میں قیام کیا، اور حضرت ابوایوب نے اوپر والی منزل میں، ایک رات ابوایوب ﷜ (اچانک) بیدار ہو گئے، کہنے لگے ہم تو نبی کریم ﷺ کے سرمبارک کے اوپر چل رہے ہیں سب (اھل خانہ) ایک طرف ہو گئے، ایک کنارے پر رات گذاردی، پھر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کی (آپ اوپر تشریف لائیں) نبی کریم ﷺ نے فرمایا میرے لئے نیچے رہنے میں آسانی ہے پھر انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میں اس چھت کے اوپر نہیں رہ سکتا جس کے نیچے آپ تشریف فرما ہوں تو نبی کریم ﷺ اوپر تشریف لے گئے اور حضرت ابوایوب نیچے آگئے، حضرت ابوایوب نبی کریم ﷺ کیلئے کھانا تیار کرتے تھے جب بچا ہوا کھانا ابوایوب کے پاس آتا وہ نبی کریم ﷺ کی انگلیوں کی جگہ پوچھتے، پھر وہاں سے ہی کھاتے، ایک مرتبہ آپ کیلئے انہوں نے کھانا تیار کیا جس میں تھوم ڈال دیا، جب کھانا واپس آیا تو یہ پوچھنے لگے نبی کریم ﷺ کی انگلیاں کہاں لگی ہیں، آپ کو بتایا گیا رسول اللہ ﷺ نے کھانا تناول نہیں فرمایا، تو یہ گھبراہٹ میں مبتلاء ہو گئے، اوپر منزل میں چڑھے، حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا، کیا یہ حرام ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''نہیں'' لیکن میں مکروہ سمجھتا ہو، ابوایوب ﷜ نے عرض کیا، میں بھی وہ چیز ناپسند کرتا ہوں جو آپ ناپسند سمجھتے ہیں، نبی کریم ﷺ کے پاس وحی آتی تھی۔

وضاحت حدیث:

راقم نے جس عنوان کے تحت یہ حدیث ذکر کی ہے، اسے دیکھئے، علامہ نووی رحمہ اللہ نے کیا خوب بیان فرمایا:

"وفیہ منقبہ ظاھرۃ لابی ایوب الانصاری ﷜ من اوجہ، منھا نزولہ ﷺ ومنھا ادبہ معہ ومنھا موافقتہ فی ترک الثوم، وقولہ انی اکرہ ما تکرہ ومن اوصاف المحب الصادق ان یحب ماحب محبوبہ ویکرہ ماکرہ"

حدیث پاک سے حضرت ابوایوب انصاری ﷜ کی فضیلت واضح طور پر ظاہر ہوگئی، اس کی چندوجوہ ہیں۔

(۱) نبی کریم ﷺ کا ان کے گھر تشریف لانا اور ان کے گھر قیام کرنا ان کی عظمت شان پر دلالت کر رہا ہے، خاص کر کے جب سب مؤمنین تمنا کر رہے تھے کہ آپ ہمارے گھر تشریف لائیں تو آپ نے فرمایا جہاں رب تعالی چاہے گا وہاں میری اونٹنی خود بخود بیٹھ جائے گی،

(۲) حضرت ابوایوب ﷜ کے دل میں رسول اللہ ﷺ کا کتنا زیادہ ادب واحترام تھا کہ رات کو یہ خیال آنے پر کہ ہم اوپر ہیں اور نبی کریم ﷺ نیچے ہیں یہ تو ادب کے خلاف ہے تو تمام گھر والوں کو جگا کر گھر کی ایک طرف پر کر دیا، رات اسی طرح گذاردی۔

حدیث شریف میں "فتنحوا فباتوا فی جانب" جمع کے صیغے واضح طور پر دلالت کر رہے ہیں کہ سب اہل خانہ

نے گھر کے چھت کے ایک کنارے پر رات گذار دی۔

(۳) حضرت ابوایوب انصاری ﷜ رسول اللہ ﷺ کی بہت زیادہ تابعداری فرماتے تھے، یہ واضح ہے کہ انہوں نے تھوم کھانا چھوڑ دیا اور یہ کہا جس کو نبی کریم ﷺ ناپسند کرتے ہیں میں بھی اسے ناپسند کرتا ہوں۔

(۴) محب صادق کی علامت اور اوصاف کا پتہ چل گیا کہ محب صادق وہ ہوتا ہے، جو محبوب کی پسند کو پسند کرے اور محبوب کی ناپسند کو ناپسند کرے۔

اور فوائد حاصل ہوئے:

"اذابعث الیہ فاکل منہ حاجۃ ثم ردالفضلۃ اکل ابوایوب من موضع اصابع النبی ﷺ تبرکا،ففیہ التبرک بآثار اھل الخیر فی الطعام وغیرہ"

حضرت ابوایوب ﷜ کھانا تیار کر کے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بھیجتے آپ اپنی حاجت کے مطابق تناول فرمالیتے،اور باقی کھانا ان کی طرف واپس بھیج دیتے،دوسری روایت اسی حدیث مذکور سے پہلے مسلم شریف کے اسی صفحہ میں موجود ہے،جس میں صراحۃ ذکر ہے۔

"عن ابی ایوب قال کان رسول اللہ ﷺ اذااتی بطعام اکل منہ وبعث بفضلۃ الی" حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے پاس جب کھانا لایا جاتا،تو آپ اس سے (حاجت کے مطابق) کھالیتے اور باقی بچا ہوا میری طرف بھیج دیتے،تو یہ آپ کی انگلیوں کی جگہ سے کھاتے،انگلیوں کی جگہ سے آپ کا کھانا تبرک کی وجہ سے تھا حدیث پاک سے واضح ہو گیا کہ نیک لوگوں کے طعام وغیرہ سے تبرک حاصل کرنا مستحب ہے۔

مسئلہ: تھوم (لہسن) کھا کر مسجد میں جانا،یا کسی محفل ومجلس میں جانا،یا بڑے لوگوں سے (بزرگوں سے) سے کلام کرنا مکروہ ہے،جو حکم لہسن کا ہے وہی پیاز کا ہے اور کوئی سبزی،ساگ اس قسم کا ہو جس کے کھانے میں بو ہو اس کا حکم بھی یہی ہے۔ہاں اگر پیاز،لہسن کے پکانے سے بو زائل ہو جائے تو پکا کر کھانا اور مسجد وغیرہ میں جانا جائز ہوگا۔

فائدہ: "کان ﷺ یترک الثوم دائما لانہ یتوقع مجیء الملائکۃ والوحی کل ساعۃ"

نبی کریم ﷺ نے ہمیشہ لہسن (تھوم) کا استعمال چھوڑے رکھا،کیونکہ آپ کو ہر گھڑی فرشتوں اور خصوصا ملک وحی (وحی کا فرشتہ) کے آنے کی امید ہوتی تھی۔اسی زیر بحث حدیث پاک سے بھی واضح ہو رہا ہے "وکان النبی ﷺ یؤتی بالوحی" نبی کریم ﷺ کے پاس وحی لائی جاتی تھی یعنی آپ کا لہسن کا استعمال نہ کرنا وحی کے آنے کی انتظار کی وجہ سے تھا،وحی کے آنے کی انتظار کی وجہ سے آپ لہسن کا استعمال کیوں چھوڑتے تھے؟

اس کی وجہ دوسری حدیث میں بہت واضح ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "انی اناجی من لا تناجی وان الملائکة تتأذی ممایتأذی بنو آدم" کہ میں اس ذات سے مناجات کرتا ہوں جس سے تم مناجات نہیں کرتے، اور بیشک فرشتوں کو ہر اس چیز سے تکلیف پہنچتی ہے جس سے انسانوں کو تکلیف ہوتی ہے۔

اس میں واضح طور پر بیان ہوگیا کہ نبی کریم ﷺ نے پکا ہوا لہسن بھی فرشتوں کی ملاقات کی امید پر چھوڑے رکھا۔

کھانے والے شخص کیلئے:

"قال العلماء فی ھذاانه یستحب للآکل والشارب ان یفضل ممایاکل ویشرب فضلة لیواسی من بعده لاسیما ان کان ممن یتبرک بفضلة"

علماء کرام نے حدیث پاک کے اس حصہ سے کہ (نبی کریم ﷺ سے جو کھانا بچ جاتا، ابوایوب کی طرف بھیج دیتے) یہ مسئلہ ثابت کیا ہے کہ جب کسی کو کھانا پیش کیا جائے تو کھانے، پینے والے کیلئے مستحب یہ ہوتا ہے کہ وہ کھانے اور پینے کی چیزوں سے کچھ بچادے، تاکہ وہ دوسروں کے کام آسکیں، یہ بعد میں کھانا کھانے والوں کے ساتھ غمخواری کی علامت ہے۔ (خصوصا جب کھانا کھانے والا وہ شخص ہو جس کے باقی بچے ہوئے کھانے کو تبرک سمجھا جائے، اسے بھی کچھ کھانا چھوڑ دینا مستحب ہے۔

"وکذا اذا کان فی الطعام قلة ولھم الیه حاجة" اسی طرح کھانا قلیل ہو، دوسرے لوگوں کو بھی کھانے کی حاجت ہو تو جن لوگوں کو پہلے کھانا کھلایا جائے وہ دوسروں کا ضرور خیال رکھیں تھوڑی مقدار میں صرف بھوک کو ختم کرنے کی حدتک کھائیں، باقی کھانا دوسروں کیلئے چھوڑ دیں۔

"ویتاکدھذافی حق الضیف لاسیما ان کانت عادة اھل الطعام ان یخرجوا کل ماعندھم وتنتظر عیالھم الفضلة کما یفعله کثیر من الناس.

مہمان کیلئے بہت ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ سارا کھانا ہڑپ نہ کر جائے کیونکہ اکثر لوگوں کی عادت ہوتی ہے وہ مہمان کی عزت کیلئے گھر کا پکا ہوا سارا کھانا (خصوصا سالن) اس کے سامنے رکھ دیتے ہیں اب گھر کے افراد (اہل وعیال) اس انتظار میں ہوتے ہیں کہ کھانا واپس آئے گا تو ہم کھائیں گے۔ (ماخوذ از نووی)

برتن جب واپس آئیں تو گھر والے سمجھیں مہمان مہذب تھا، اس نے مناسب مقدار میں کھانا کھایا، ایک یا دو بوٹیوں پر اکتفاء کیا، ایسا نہ ہو کہ برتن خالی کر کے اٹھے، گھر کے افراد کہیں، کھانے والا کتنا بیہودہ شخص تھا، اسے کھانے

کا کوئی سلیقہ نہ تھا، اس نے پہلے کھانا دیکھا نہیں تھا، وغیرہ وغیرہ اس طرح کے تبصرہ سے بچنے کیلئے مہمان کو اپنا خود خیال کرنا چاہئے۔

ہاں کمال تو یہی ہے: کامل محبّ کا یہی تقاضا ہے کہ محبوب کی طاعت وفرمانبرداری کرے۔

تعصی الاله وانت تظهر حبه　　　هذا لعمری فی القياس بديع

تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے، اور تو اس کی محبت کا اظہار کرتا ہے، مجھے میری عمر کی قسم یہ تو عجیب بات ہے۔

لو كان حبک صادقا لاطعته　　　ان المحب لمن يحب مطيع

اگر تو محبت میں سچا ہوتا تو اس کی فرمانبرداری کرتا　　　بیشک محبّ تو محبوب کی اطاعت کرتا ہے۔

"ان المحبة سبب لاتباع الرسل والاتباع دليل على وجودها وعدمه دليل على عدمها فمن ادعى المحبة مع مخالفة سنة الرسول ﷺ فهو كذاب يكذبه كتاب الله"

بیشک اللہ تعالیٰ کی محبت اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب رسول اللہ ﷺ کی اتباع حاصل ہو، آپ کی اتباع کا پایا جانا دلیل ہے اللہ تعالیٰ کی محبت کے پائے جانے کی، اور آپ کی اتباع کا نہ پایا جانا دلیل ہے رب تعالیٰ کی محبت کے نہ پائے جانے کی، جو شخص محبت کا دعویٰ کرے اور سنت رسول ﷺ کی مخالفت کرے وہ جھوٹا ہے، اس کا جھوٹا ہونا قرآن پاک کی اسی آیہ کریمہ سے ثابت ہے۔

اصل میں اللہ تعالیٰ کی محبت صرف رائے سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ کی تعلیم سے حاصل ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کو جو محبت پسند ہوگی وہی مقبول ہوگی۔ (ماخوذ از مظہری)

کامل محبت یہ ہے:

"الحب وهو عبارة عن اشتغال قلب المحب بالمحبوب وانسه به بحيث يمنعه عن الالتفات الى غيره ولا يكون له بد من دوام التوجه اليه والاشتغال به"

کامل محبت یہ ہے کہ محبّ کا دل محبوب کے ساتھ ہی مشغول رہے اور اسی کے ساتھ اسے انس رہے غیروں کی طرف اس کی توجہ نہ رہے، محبوب کی طرف کامل توجہ اور محبوب کے ساتھ دل کے مشغول ہونے کے بغیر کوئی چارہ کار نہ رہے۔

یہی مطلب ہے اس قول کا "العشق نار فی القلوب تحرق ماسوی المحبوب" عشق وہ آگ ہے جو محبوب کے سواء سب چیزوں کو جلا دیتی ہے یعنی محبّ کامل محبوب کے بغیر سب چیزوں کو بھلا دیتا ہے، گویا کہ اس کے

وجود میں محبوب کے بغیر کوئی چیز سماتی نہیں، یہاں تک اسی کی نظر بصیرت میں اس کی اپنی ذات بھی نہیں رہتی۔

"ومقتضی تلک الصفة ابتغاء مرضات المحبوب و کراهة مایکرهه"

جب اس قسم کی کامل محبت حاصل ہو تو وہ محبت تقاضا کرتی ہے کہ محبوب کی پسند محب کی پسند ہو اور محبوب کی ناپسند محب کی ناپسند ہو۔

رب تعالی سے محبت کرے تو یوں کرے "یحبه بالذات بلاملا حظة طمع فی ثوابه اوخوف من عقابه وان اجتمع مع ذلک طمع وخوف ایضا" محبت صرف اس کی ذات سے ہو، ثواب کی امید اس میں نہ ہو، اور نہ ہی عذاب کے خوف سے بچنے کی اس میں طمع پائی جائے۔ ہاں جب باری تعالی سے محبت بغیر کسی غرض سے ہوگی تو رب تعالی کی مہربانی سے خود بخود نیکیوں پر ثواب حاصل ہوگا، اور عذاب کے خوف سے بھی بچ جائے گا۔ (ماخوذ از مظہری)

گنہگاروں کیلئے امید کی کرن:

﴿وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ﴾ کا مطلب یہ ہے "ای یمحها من الصحف فالمحبوب لا یبقی علیه ذنب والمبغوض لا تبقی له طاعة" کہ اللہ تعالی اس کے گناہوں کو اس کے نامہ اعمال سے مٹاوے گا، محبوب بندے کے ذمہ کوئی گناہ باقی نہیں رہے گا اور رب تعالی جس سے ناراض ہوگا اسے طاعت کی توفیق حاصل نہیں ہوگی۔

"قال بعض العارفین واجعل سیآتنا سیآت من احببت ولا تجعل حسناتنا حسنات من البغضت فلا حسان لا ینفع مع البغض منک والاساءة لا تضرمع الحب منک"

کسی عارف نے کیا خوب کہا اے اللہ! ہمارے گناہوں کو وہ درجہ دے دے جسے تو پسند کرے یعنی صغیرہ گناہوں کو توبہ وعبادت کے ذریعے یا اپنے فضل وکرم کے ذریعے مٹادے، اور کبیرہ گناہوں پر ہمیں توبہ کی توفیق عطاء کردے یا اپنے فضل وکرم سے ان پر عفو کا قلم پھیر دے، تو یقیناً وہ گناہ درجہ عفو میں آکر تیری ناراضگی سے دور ہو جائیں گے۔

اور اے اللہ! ہماری نیکیوں کو ایسی نیکیاں نہ بنا جن کو تو ناپسند کرے یا وہ نیکی جس میں ریاء کاری پائی جائے مغصوبہ زمین میں نماز ادا کی جائے اس کی قسم کی نیکیاں برباد ہیں وہ اللہ تعالی کی ناراضگی کا ذریعہ ہیں۔ وہ نیکیاں جن پر تو ناراض رہے ان کا کوئی نفع نہیں، وہ گناہ جو تیری بخشش میں آکر گناہ ہی نہ رہیں ان میں کوئی نقصان نہیں۔ (ماخوذ از صاوی)

ارشاد مصطفوی ﷺ دیکھئے:

"عن عمر بن الخطاب ان رجلا اسمه عبدالله یلقب حمارا کان یضحک النبی ﷺ وکان النبی ﷺ قد جلده

فی الشراب فاتی بہ یوما فامر بہ فجلد فقال رجل من القوم اللھم العنہ ما اکثر مایؤ تی بہ فقال النبی ﷺ لا تلعنوہ فواللہ ما علمت انہ یحب اللہ ورسولہ" (رواہ البخاری، مشکوۃ باب مالایدعی علی المحدود)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک ایک شخص جس کا نام عبداللہ اور لقب حمار تھا وہ نبی کریم ﷺ کو ہنساتا تھا، نبی کریم ﷺ نے اسے شراب پینے کی وجہ سے کوڑے لگوائے، پھر ایک دن اسے لایا گیا آپ نے اسے پھر کوڑے لگوائے (یعنی دوسری مرتبہ شراب پینے پر دوبارہ کوڑے لگوائے گئے) قوم میں سے ایک شخص نے کہا اے اللہ اس پر لعنت بھیج، قسم ہے اللہ تعالی کی تجھے علم نہیں بیشک یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے۔

وضاحت حدیث: حدیث پاک میں "**ماعرفت**" میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ما موصولہ ہو جائے پھر "**عرفت**" میں دو احتمال ہیں کہ یہ متکلم کا صیغہ ہو یا مخاطب کا، اگر متکلم کا صیغہ ہو تو مطلب یہ ہوگا" اس پر لعنت نہ بھیجو مجھے معلوم ہے یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے، اور اگر مخاطب کا صیغہ ہو تو اس کا یہ مطلب ہوگا اس پر لعنت نہ کرو، تمہیں معلوم ہے یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے۔

حدیث پاک سے اور یہ حاصل ہوا کہ نبی کریم ﷺ کے دور میں قانون کی حکمرانی تھی، اپنے پاس بیٹھنے والے، خوش طبعی کرنے والے کو جرم ثابت ہونے پر حد لگوادی، ایک مرتبہ نہیں بلکہ دو مرتبہ وہاں کئی قانون نہیں تھے، چھوٹے، بڑے، امیر وغریب، ڈنڈے والے یعنی لٹھ برداروں اور ضعیف وناتواں لوگوں کیلئے ایک قانون تھا۔

اور حدیث پاک سے عظیم فائدہ یہ حاصل ہوا کہ اس شخص کے شراب پینے کے باوجود اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت اس کے دل سے نہیں نکلی، جس کی گواہی خود مصطفیٰ کریم ﷺ نے دی، تو پتہ چلا کہ معمولی لغزش پر کسی کو محبت مصطفیٰ کریم ﷺ میں جھوٹا نہ سمجھا جائے، ہوسکتا ہے اس لغزش سے باز آ کر وہ ظاہرا اور باطنا سچا ہو جائے۔

دینی مدارس کے طلباء کی توجہ کیلئے:

﴿فَاتَّبِعُونِی﴾ میں "اتبعوا" امر ہے، مضارع جب جواب امر میں آئے تو مجزوم ہوتا ہے، اسی وجہ سے "یُحْبِبْ" اور "یَغْفِرْ" مجزوم ہیں۔

فائدہ جلیلہ: بظاہر ایک سوال وجواب پایا جاتا ہے، جو بہت بڑے فائدہ پر مرتب ہے، سوال یہ ہے کہ آیۃ کریمہ کا بظاہر تقاضا یہ ہے اللہ تعالی کا بندے سے محبت کرنا ثابت ہوگا، جب اتباع رسول اللہ ﷺ پائی جائے گی، اور آپ کی اتباع تقاضا کرتی ہے کہ بندے کو اللہ تعالی سے محبت ہو، اس سے تو یہ سمجھ آیا کہ اللہ تعالی کی محبت بندے

سے پہلے سے ہے،اور بندے کی اللہ تعالیٰ سے محبت بعد میں ہے،تو یہ کیسے کہا جائے گا کہ بندہ رب تعالیٰ سے محبت کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرے گا۔طلباء کرام قانونی اصطلاح میں یہ سمجھیں کہ یہ مستلزم دور ہے اور دور محال ہے تو اس کا جواب ہی در حقیقت فائدہ جلیلہ ہے،جواب یہ ہے:

"هذه محبة اخرى من الله تعالى سوى المحبة السابقة فمحبة العبد لله محفوف بمحبتين من الله سبحانه سابق و لاحق فالمحبة السابقة ماذكرناه سابقا و المحبة اللاحقة هي التي تقتضي الرحمة و التفضل الكامل"

یہ محبت اور،اور پہلی محبت اور ہے،بندہ جب رب تعالیٰ سے محبت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کو دو محبتیں حاصل ہوتی ہیں،ایک سابق اور ایک لاحق،سابق محبت وہ ہے جس کے بعد اتباع رسول اللہ ﷺ حاصل ہوتی ہے اور اس کے بعد بندے کو رب تعالیٰ سے محبت حاصل ہوتی ہے۔

اور لاحق وہ ہے جو بندے کی محبت کے بعد رب تعالیٰ کی طرف سے بندے کو حاصل ہوتی ہے یہی محبت رحمت کاملہ اور کامل فضل کا تقاضا کرتی ہے۔وہ رحمت کاملہ اور تفضل کامل پتہ کرنا ہو تو اس حدیث پاک کو مدنظر رکھئے:

"ان جزء ا او احدا منها اى من الرحمة قسمها الله بين الخلائق و ادخر لاولياء ه تسعة وتسعين"

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کی ایک جزء تمام مخلوق پر تقسیم فرمادی ہے اور اپنے اولیاء کیلئے ننانوے رحمتیں ذخیرہ بنا رکھی ہیں۔ (مظہری)

یعنی آپ خود اندازہ کریں کہ ماں کو کتنا زیادہ رحم حاصل ہے اولاد سے اور باپ اور بہن بھائیوں کو ایک دوسرے سے،اور بعض اساتذہ کو اپنے شاگردوں سے،اور بعض مشائخ کو اپنے مریدین سے،یہ ساری رحمتیں ایک فیصد ہیں،باقی ننانوے جب اللہ تعالیٰ اپنے مقربین بندوں کو قیامت کے دن عطاء کرے گا تو کیا ہی شان ہوگی اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کی۔

عشق ومحبت کا تقاضا:

جو شخص کسی سے محبت کرے اس کی محبت یہ چاہتی ہے کہ اس کے خاص محبوبوں سے اسے محبت ہو،اور اس کے ساتھ تعلق رکھنے والے اس کے غلاموں،اس کے گھروں،اس کے گھروں کی دیواروں اور اس کے کتوں اور گدھوں سے بھی اسے محبت ہوتی ہے۔"فهذا هو قانون العشق وقاعدة المحبة" یہی وہ قانون عشق ہے،یہی قاعدہ محبت ہے۔مجنون عامری نے کیا خوب کہا:

امر على الديار ديار ليلى ... اقبل ذاالجدار وذاالجدارا

وما حب الديار شغفن قلبى ... ولكن حب من سكن الديارا

میں گھروں سے یعنی لیلیٰ کے گھروں سے گذرتا ہوں میں دیواروں والے گھروں سے گذرتا ہوں کتنی ہی محبت ہے ان گھروں سے جنہوں نے میرے دل کو فریفتہ کر دیا ہے۔لیکن حقیقی محبت تو گھر والوں سے ہے۔(روح البیان)

ہاں ہاں اسی سے یہ فائدہ حاصل ہو گیا کہ وہی محبت رسول اللہ ﷺ میں سچا ہے جسے آپ کے یاروں یعنی صحابہ کرام سے محبت ہو، جو صحابہ کرام کا دشمن ہے وہ محبت مصطفیٰ کریم ﷺ میں جھوٹا ہے، وہ لعنت کا مستحق ہے۔اسی طرح محبت اہل بیت اطہار کے بغیر بھی محبت مصطفیٰ کریم ﷺ کا دعوی جھوٹا ہے۔وہ بھی لعنت کا مستحق ہے۔ (راقم)

علامہ قاشانی فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کی محبت آپ کی متابعت کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے اور آپ کے راستے پر چلنے سے حاصل ہوتی ہے یعنی قول وفعل، عمل وخلق، حال وسیرت اور عقیدہ میں مصطفیٰ کریم ﷺ کی متابعت پائی جائے، اس کے بغیر دعوی محبت درست نہیں، کیونکہ محبت کا قطب (چکی کا کیل) آپ ہی ہیں، محبت کو ظاہر کرنے والے آپ ہی ہیں۔"وطریقته ﷺ المحبة فمن لم یکن له من طریقته نصیب لم یکن له من المحبة نصیب" حبیب پاک ﷺ کا طریقہ ہی محبت ہے، جس کو آپ کے طریقہ سے کچھ حصہ حاصل نہیں اسے محبت کا بھی کوئی حصہ حاصل نہیں۔ (روح البیان)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

محبت اور متابعت میں نسبت عموم وخصوص من وجہ کی ہے متابعت ہو محبت نہ ہو، جیسا کہ منافقین بظاہر آپ کی متابعت کرتے تھے، لیکن ان کے دلوں میں آپ کی محبت نہیں تھی، بلکہ ان کے دلوں میں کدورت، عداوت، نفرت تھی۔محبت ہو متابعت نہ ہو، جیسا کہ حدیث پاک سے ایک صحابی کا واقعہ بیان کیا جا چکا ہے کہ ان کو دو مرتبہ شراب پینے پر کوڑے لگائے گئے، لیکن ان کی محبت کی گواہی خود مصطفیٰ کریم ﷺ نے دی، کہ یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے۔متابعت اور محبت دونوں ہی پائے جائیں تو کمال اسی میں ہے، اعلیٰ درجہ کی محبت رسول اللہ ﷺ کی محبت یہی ہے کہ آپ کے اقوال وافعال کے مطابق مؤمن اپنے اقوال وافعال کو کرلے، تاکہ یہ دعوی محبت سچا متصور ہو۔

صحابہ کرام کی تابعداری:

صحابہ کرام کے دل میں نبی کریم ﷺ کا کتنا ادب احترام تھا اور کس حد کی تابعداری کرتے تھے؟ آیئے اس کی ایک جھلک دیکھیے:

"عن عبادة بن الصامت قال کان النبی ﷺ اذانزل علیه الوحی کرب لذلک وتربد

وجهه وفی روایة نکس رأسه ونکس اصحابه رؤسهم فلما اتلی عنه رفع رأسه"
(مسلم،مشکوۃ باب المبعث وبدء الوحی)

حضرت عبادۃ بن صامت ﷜ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ پر جب وحی نازل ہوتی تو آپ پر شدت کی کیفیت طاری ہوتی اور آپ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا۔ایک روایت میں ہے کہ آپ نے اپنا سر جھکا لیا اور صحابہ کرام نے بھی اپنے سر جھکا لئے ،جب آپ سے یہ کیفیت جاتی رہی تو آپ نے سر اٹھا لیا۔

وحی کے وقت سر جھکانے کی وجہ تفکر کرنا اور امر وحی کا شدید اہتمام کرنا اور حقوق عبودیت کے مطالبہ پر ڈر رکھنا اور منعم کی نعمتوں کی شکریہ بجالانا ،اپنی امت کے نافرمانوں کو عذاب پہنچنے سے پریشان ہونا اور ڈرنا وغیرہ امور تھے اور ہوسکتا ہے کہ حقیقت میں وحی کے نازل ہونے کی وجہ سے ظاہری شدت طاری ہو جاتی ہو،اور چہرے کا رنگ بدل جاتا ہو، نبی کریم ﷺ کے سر جھکانے کی تو وجوہ تھیں لیکن صحابہ کرام کے سر جھکانے کی وجہ فقط "ونکس اصحابه رؤسهم ای اتبا عاله وتادبامعه" یہ تھی کہ انہوں نے آپ کی تابعداری کرتے ہوئے ادب کے طور پر سر جھکا لئے تھے "رفع رأسه وتبعه اصحابه" حضور ﷺ کے سر اٹھانے پر صحابہ کرام نے سر اٹھا لئے۔

سبحان اللہ! کتنی تابعداری، کیسا ادب واحترام تھا کہ حضور ﷺ نے فرمایا بھی نہیں کہ میرے سر جھکانے پر تم بھی سر جھکا لینا اور میرے سر اٹھانے پر تم بھی سر اٹھا لینا، فقط دیکھ کر عمل کرنا صحابہ کرام کی ہی شان تھی۔

محبت مصطفیٰ کریم ﷺ کے بغیر ایمان مکمل نہیں:

"عن انس بن مالک قال قال رسول الله ﷺ لایؤمن احدکم حتی اکون احب الیه من ولده ووالده والناس اجمعین" (مسلم ج اول ص ۴۹ باب وجوب محبۃ رسول اللہ ﷺ)

حضرت انس بن مالک ﷜ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی ایک مومن نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ میں اسے زیادہ محبوب ہوں اس کی اولاد اور اس کے والدین اور سب لوگوں سے۔

وضاحت حدیث: "المحبة المیل الی ما یوافق المحب" محبت کا مطلب یہ ہے کہ محب کے دل میں میلان پایا جائے کہ محب کو محبوب کی موافقت حاصل ہو جائے۔

محبت کی وجوہ: محبت کی دو وجہ ہیں۔ایک ظاہری اور ایک باطنی، معنوی۔

ظاہری وجہ: "ثم المیل قد یکون لما یستلذه الانسان ویستحسنه کحسن الصورة والصوت والطعام ونحوها"

میلان کی وجہ ظاہری یہ ہے کہ انسان کئی چیزوں میں لذت پاتا ہے تو ان کی طرف میلان کرتا ہے، جیسے طعام، پھل وغیرہ۔ اور کبھی کسی چیز کو حسین سمجھ کر اس کی طرف میلان کرتا ہے، جیسے حسین صورت اور حسین آواز۔

باطنی ومعنوی وجہ مطلق:

یعنی باطنی ومعنوی میں پھر دو صورتیں ہیں، ایک مطلق اور ایک مقید، مطلق میلان کی وجہ

"وقد یستلذہ بعقلہ للمعانی الباطنۃ کمحبۃ الصالحین والعلماء واھل الفضل مطلقا"

کبھی انسان عقل کے ذریعے باطنی اسباب کی وجہ سے لذت محسوس کرتا ہے، جیسا کہ صالحین، علماء اور اہل فضل یعنی اولیاء کرام سے مطلقاً محبت پائی جائے، اس میں کسی قسم کی غرض کی کوئی قید نہ ہو، صرف زہد وتقوی اور علم دین اس محبت کا سبب ہو۔

باطنی ومعنوی وجہ مقید:

"وقد یکون لاحسانہ الیہ ودفع المضار والمکارہ عنہ" یعنی کبھی میلان کی وجہ تو عقلی اور باطنی اسباب پائے جاتے ہیں، لیکن مطلق نہیں، بلکہ کسی کے احسان کی وجہ سے اور مصائب وآلام کے دور کرنے کی وجہ سے اس کی طرف میلان پایا جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ میں تینوں وجوہ محبت پائی گئی ہیں:

"وھذہ المعانی کلھا موجودۃ فی النبی ﷺ لما جمع من جمال الظاھر والباطن وکمال خلال الجلال وانواع الفضائل واحسانہ الی جمیع المسلمین بھدایتہ الی الصراط المستقیم ودوام النعیم والابعادمن الجحیم"

یہ تمام وجوہ اور اسباب محبت نبی کریم ﷺ میں موجود ہیں، آپ کو جمال ظاہری و باطنی حاصل ہے، اور رب تعالی کی دوستی کا کمال آپ کو حاصل ہے، ہر قسم کے فضیلت والے اوصاف آپ کو حاصل ہیں، تو سمجھ آیا کہ آپ میں محبت ظاہری کی وجہ اور باطنی ومعنوی وجہ مطلق پائی گئی۔ اور آپ کے تمام مسلمانوں پر عظیم احسانات ہیں کیونکہ سیدھی راہ کی ہدایت آپ نے دی، اور ہمیشہ رہنے والی نعمتوں یعنی جنت اور جنت کی راہ آپ نے دکھائی اور جہنم سے دور رہنے کی رہنمائی آپ نے فرمائی۔

اب اس سے واضح ہو گیا کہ محبت کی وجوہ میں سے باطنی ومعنوی وجہ مقید بھی آپ کو حاصل ہے۔

فائدہ: محبت مصطفیٰ کریم ﷺ ذریعہ ہے محبت باری تعالیٰ کا یعنی اللہ تعالیٰ سے محبت ضروری ہے کیونکہ "وھذا متصور فی حق اللہ تعالی فان الخیر کلہ منہ سبحانہ وتعالی" یہ تمام وجوہ محبت رب تعالیٰ میں حقیقی طور پر پائی جاتی ہیں، بیشک ہر قسم کی خیر حقیقی طور پر اللہ تعالیٰ کو ہی حاصل ہے اور اسی کی عطاء سے نبی کریم ﷺ کو حاصل ہے، اور آپ کے وسیلۂ جلیلہ سے مومنین کو حاصل ہے۔ "قال مالک وغیرہ المحبۃ فی اللہ تعالی من واجبات الاسلام" امام مالک رحمہ اللہ اور دوسرے اہل علم نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت واجبات اسلام سے ہے۔

(ماخوذ از نووی حوالہ مذکور)

کس محبت کے بغیر ایمان کی تکمیل نہیں: اس مسئلہ کو سمجھنے کیلئے یہ سمجھا جائے کہ

محبت کی تین قسمیں ھیں: (۱) محبت طبعی (۲) محبت عقلی (۳) محبت ایمانی۔

"عام" لوگوں کیلئے تو یہ حکم ہے کہ وہ محبت طبعی اپنی ذات سے زیادہ رکھ سکتے ہیں بنسبت مصطفیٰ کریم ﷺ کے لیکن محبت عقلی اور محبت ایمانی کے مطابق مصطفیٰ کریم ﷺ سے محبت سب سے زیادہ جب تک نہیں ہوگی اس وقت تک ایمان کی تکمیل نہیں ہوگی۔ "خواص" کو نبی کریم ﷺ کی برکت سے یہ مقام حاصل تھا کہ وہ محبت طبعی کے لحاظ پر بھی سب سے زیادہ مصطفیٰ کریم ﷺ سے کرتے تھے۔ آیئے اس اجمال کی تفصیل علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ کی زبان سے سنئے۔ آپ فرماتے ہیں:

(۱) "ولیس المراد الحب الطبیعی لانہ لا یدخل تحت الاختیار ولا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا"

یہاں حدیث پاک میں جس محبت کا ذکر ہے وہ محبت طبعی نہیں کیونکہ یہ کسی کے اختیار میں نہیں ہوتی بلکہ یہ طبیعت کے تقاضا کے مطابق ہوتی ہے۔ جب محبت طبعی اختیار میں نہیں تو اس کی تکلیف بھی نہیں دی گئی کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی شان ہی یہ بیان کی گئی ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ آپ اپنی خواہشات کے مطابق کلام نہیں فرماتے بلکہ وحی کے مطابق کلام فرماتے ہیں۔ تو یقیناً آپ بھی اس چیز کی تکلیف نہیں دیں گے جس کی تکلیف رب تعالیٰ نہیں دیتا۔ جب رب تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زائد تکلیف نہیں دیتا تو نبی کریم ﷺ نے بھی کسی کو طاقت سے زائد تکلیف نہیں دی۔

لہذا واضح ہوا کہ محبت طبعی سے اپنے آپ سے یا اہل وعیال سے نبی کریم ﷺ سے زیادہ محبت ہو تو اس پر کوئی پکڑ نہیں۔ گرفت تو وہاں ہوتی ہے جہاں اختیار ہو، جب اختیار ہی نہ ہو تو اس میں گرفت نہیں ہوتی، ورنہ طاقت سے زائد تکلیف دینا لازم آئے گا جو جائز نہیں۔

(۲)"بل المراد الحب العقلی الذی یوجب ایثار ما یقتضی العقل رجحانه ویستدعی اختیاره"

بلکہ مراد محبت عقلی ہے کیونکہ عقل واختیار کے تقاضا کے مطابق وہ نبی کریم ﷺ کی محبت کو سب سے زیادہ ترجیح دے اگرچہ وہ اس کی خواہش کے خلاف ہو۔

اس مسئلہ کو ایک مثال سے سمجھیں کہ مریض کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ میٹھی دوا استعمال کرے کڑوی دوا کو اس کا مزاج قبول نہیں کرتا، میٹھی دوا کی طرف میلان محبت طبعی ہے لیکن مریض کو جب پتہ چلتا ہے کہ کڑوی دوا اس کی صحت کیلئے مفید ہے تو وہ اپنے اختیار اور عقل سے کڑوی دوا سے محبت کرتا ہے۔

"لوامرہ ﷺ بقتل ابویہ واولادہ الکافرین اوبان یقاتل الکفار حتی یکون شھیدا لا حب ان یختار ذلک لعلمہ ان السلامۃ فی امتثال امرہ ﷺ"

اگر نبی کریم ﷺ کسی کو حکم دیں کہ تم اپنی کافر اولاد یا کافر والدین کو قتل کردو، یا آپ حکم فرمائیں کہ کافروں سے قتال کرتے ہوئے شہید ہو جاؤ تو بظاہر یہ اس کی طبیعت کے خلاف ہے لیکن وہ اپنے اختیار وعقل سے نبی کریم ﷺ کے حکم کو تسلیم کرے اور آپ کے حکم سے محبت کرے، سلامتی اس انسان کی آپ کے حکم کو تسلیم کرنے میں ہے۔

(۳) محبت ایمانی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ نبی کریم ﷺ سے محبت تمام چیزوں سے بڑھ کر ہو:

"اوالمراد الحب الایمانی الناشیء عن الاجلال والتوقیر والاحسان والرحمۃ وھو ایثار جمیع اغراض المحبوب علی جمیع اغراض غیرہ حتی القریب والنفس"

محبت ایمان حاصل ہوتی ہے بزرگی، مقام تعظیم، احسان ورحمت کو دیکھ کر، جب محبت ایمانی حاصل ہو تو اس کی وجہ سے محبوب کی اغراض پر باقی تمام کی اغراض کو قربان کردے، یہاں تک کہ اپنے اقرباء اور اپنی جان سے بھی محبوب کو ترجیح دے۔

"ولما کان ﷺ جامعا لموجبات المحبۃ من حسن الصورۃ والسیرۃ وکمال الفضل والاحسان مالم یبلغہ غیرہ استحق ان یکون احب الی المؤمن من نفسہ فضلا من غیرہ سیما وھو الرسول من عندالمحبوب الحقیقی الھادی الیہ والدال علیہ والمکرم لدیہ"

جب نبی کریم ﷺ میں تمام وجوہ محبت پائی گئی ہیں، حسن صورت آپ کو حاصل ہے، حسن سیرت آپ کو حاصل ہے، کامل فضل اور کامل احسان آپ کو حاصل ہے، یہ کمالات جو آپ کو حاصل ہیں کسی اور کو حاصل نہیں، کیونکہ آپ کی امت کے بڑے بڑے مقربین کو بھی ان کی ایک جھلک حاصل ہے، کہاں حقیقی طور پر جامع الکمالات (اگر کوئی واسطہ ہے تو صرف اعطاء رب کائنات) اور کہاں آپ کے واسطہ سے بعض کمالات حاصل کرنے والے۔

بس حق یہی ہے کہ مومن اپنی ذات سے زیادہ محبت حضور ﷺ سے کرے، جب اپنی ذات سے زیادہ محبوب آپ کو رکھنے کا حکم ہے تو غیروں سے زیادہ محبت مصطفیٰ کریم ﷺ سے رکھنے کا حکم تو یقیناً ہوگا۔

پھر جب یہ معلوم ہے کہ آپ محبوب حقیقی یعنی رب تعالیٰ کی طرف سے رسول بن کر آئے، اسی رب کائنات نے آپ کی رسالت کی راہنمائی کی اسی ذات کبریاء نے آپ کو اوصاف عطاء کر کے آپ کی رسالت پر دلالت فرمائی، وہ رسول جو خالق کائنات کے ہاں مکرم ہیں، تو یقیناً وہی حق رکھتے ہیں کہ تمام اغیار و اقرباء سے ان کے ساتھ زیادہ محبت کی جائے بلکہ اپنی جان سے بھی زیادہ آپ کو ہی محبوب رکھا جائے۔

خواص کو محبت طبعی بھی حاصل تھی:

یعنی عوام تو محبت طبعی کے طور پر اپنے آپ سے یا اپنی اولاد اور ماں باپ سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ لیکن خواص کو یہ مقام حاصل ہے کہ وہ محبت طبعی بھی اپنی جان سے زیادہ مصطفیٰ کریم ﷺ سے رکھتے ہیں، آیئے اس کی درخشاں مثال دیکھئے:

"وممن ارتقی الی غایة هذه المرتبة ونهاية هذه المزية سيدنا عمر ؓ فانه لما سمع هذاالحديث اخبر بالصدق حتى وصل ببركة صدقه الى كمال ذلك فقال بمقتضى الامر الطبيعي "لانت يا رسول الله احب الیّ من كل شیء الا من نفسی فقال لا والذی نفسی بیده حتی اكون احب اليک من نفسک فقال عمر فانک الآن والله احب الیّ من نفسی فقال الآن یا عمر تم ايمانک" (رواه البخاری)

جس شخص نے اس مرتبہ کی بلندی کو حاصل کیا اور فوقیت کی انتہاء تک پہنچا وہ ہیں ہمارے سردار حضرت عمر ؓ جنہوں نے اس حدیث کو سنا تو سچ سچ بیان فرمادیا۔ اسی سچ کی برکت کی وجہ ہے (اور مصطفیٰ کریم ﷺ کی برکت کی وجہ سے) آپ اسی کمال تک پہنچے، جب آپ نے اس حدیث پاک کو سنا "لا يؤمن احدكم حتى اكون احب اليه من والده وولده والناس اجمعين" تو امر طبعی کے تقاضا کے مطابق یوں عرض کیا "لانت يا رسول الله احب الیّ من كل شیء الامن نفسی فقال الآن يا عمر تم ايمانک" (رواه البخاری)

یا رسول اللہ آپ مجھے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں سوائے میری اپنی جان کے، آپ نے فرمایا نہیں ایمان کی تکمیل نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے یہاں تک کہ میں محبوب ہوں تمہیں تمہارے نفس سے تو حضرت عمر ؓ نے عرض کیا، بیشک آپ اب قسم ہے اللہ تعالیٰ کی مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ

محبوب ہیں تو آپ نے فرمایا ہاں اے عمر! اب تمہارا ایمان مکمل ہوا۔

اگرچہ حدیث پاک کی شرح میں دو احتمال بیان کئے گئے ہیں، ایک یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے یہ سمجھا ہو کہ محبت طبعی کے طور پر حضور ﷺ سے اپنی جان سے بھی محبت کرنے کا حکم دیا گیا ہو تو آپ نے سچ ذکر کر دیا کہ محبت طبعی تو اپنی جان سے زیادہ ہے، پھر سمجھ لیا ہو کہ مراد محبت ایمانی اور محبت عقلی و اختیاری ہے، تو آپ نے عرض کیا ہو کہ ہاں ان دونوں قسموں کی محبتوں کے مطابق تو میں آپ سے اپنی جان سے بھی زیادہ محبت کرتا ہوں

"وثانیھما انہ اوصلہ اللہ تعالی الی مقام الاتم ببرکۃ توجھہ علیہ الصلوۃ والسلام فطبع فی قلبہ حبہ حتی صار کانہ حیاتہ ولبہ"

دوسرا احتمال یہ ہے کہ اللہ تعالی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نبی کریم ﷺ کی توجہ کی برکت کی وجہ سے یہ کامل مقام عطاء کر دیا کہ ان کے دل میں نبی کریم ﷺ کی محبت کو راسخ کر دیا کہ ان کو اپنی جان سے بھی زیادہ محبت نبی کریم ﷺ سے ہو گئی۔ گویا کہ ان کی زندگی ہی نبی کریم ﷺ کی محبت کے ساتھ قائم ہو گئی۔

واضح ہوا کہ طبعی محبت بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نبی کریم ﷺ سے اپنی جان سے زیادہ حاصل ہو گئی، یہ مقام آپ کو نبی کریم ﷺ کی توجہ کی برکت سے ہی حاصل ہوا۔ (مرقاۃ ج ۱ ص ۷۳، ۷۴)

فائدہ جلیلہ: "قال القرطبی وکل من صح ایمانہ بہ علیہ الصلوۃ والسلام لایخلو عن وجدان شئی من تلک المحبۃ الراجحۃ وان استغرق بالشھوات وحجب بالغفلات فی اکثر الاوقات بدلیل انانری اکثرھم اذاذکر ﷺ اشتاق الی رؤیتہ وآثرھا علی اھلہ ومالہ وولدہ ووالدہ واوقع نفسہ فی المھالک والمخاوف مع وجدانہ من نفسہ الطمانینۃ بذلک لاترددفیہ وشاھد ذلک فی الخارج ایثار کثیرین لزیارۃ قبرہ الشریف ورؤیۃ موضع آثارہ" (مرقاۃ ج ۱ ص ۷۴)

قرطبی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ ہر وہ شخص جس کا ایمان نبی کریم ﷺ سے صحیح اور کامل ہو، اس کا دل آپ کی کامل محبت سے خالی نہیں ہوتا اگرچہ وہ شہوات میں مستغرق ہی کیوں نہ ہو اور اکثر اوقات غفلت کے حجابات ہی اس پر کیوں نہ ہوں، اس پر واضح دلیل موجود ہے کہ ہم اکثر اوقات دیکھتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ کا ذکر کیا جائے تو دل آپ کی زیارت کے مشتاق ہو جاتے ہیں، انسان کی قلبی تمنا یہ ہوتی ہے کہ آپ کا دیدار حاصل ہو جائے خواہ میری اہل، میرا مال، میری اولاد اور میرے والدین ہی کیوں نہ اس پر قربان ہو جائیں، وہ اپنے آپ کو خوف و ہلاکت میں ڈال کر بھی اس منصب کو پانے پر اطمینان حاصل کرتا ہے، ہاں ہاں ہم دیکھ رہے ہیں کہ لوگ دور دراز سے لمبا سفر طے کر کے، کثیر مال خرچ

جب سچے اور کامل مؤمن کو یہ مقام حاصل ہو جاتا ہے تو وہ سمجھتا ہے مجھے دین و دنیا کا عظیم سرمایہ حاصل ہو گیا۔ پتہ چلا کہ شہوات میں مبتلاء اور غفلت میں گھرے ہوئے لوگ بھی محبت مصطفیٰ کریم ﷺ میں سرشار ہوتے ہیں، اور آپ کے مزار انور کو دیکھ کر ان کی آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں۔

"ولا شک ان حظ الصحابة من هذاالمعنی تم لانه ثمرة المعرفة وهم بقدره ومنزلته اعلم"

یقینی بات ہے کہ صحابہ کرام کو نبی کریم ﷺ کی معرفت سب سے زیادہ حاصل تھی، اور آپ کی قدر و منزلت کو وہ لوگ زیادہ جانتے تھے، اس لئے ان کو آپ سے محبت بھی بنسبت دوسرے لوگوں کے زیادہ حاصل تھی۔

محبت کے تین انداز:

(۱) محبت اجلال، یعنی کسی کی عظمت و بزرگی کو دیکھ کر اس سے محبت کر لی جائے جیسے انسان اپنے والدین سے محبت کرتا ہے۔

(۲) محبت شفقت و رحمت جب انسان کسی پر شفیق ہو اور کسی پر رحم کرنے ولا ہو تو اس سے محبت کرتا ہے، جیسا کہ انسان اپنی اولاد سے محبت کرتا ہے۔

(۳) محبت مشاکلت و احسان ایک انسان دوسرے سے محبت کرے دوسرا اس کے جواب میں محبت کرے، ایک شخص دوسرے پر احسان کرے تو وہ اس کے احسان کے بدلے اس سے محبت کرے، اکثر لوگوں میں ایک دوسرے سے یہی محبت پائی جاتی ہے۔

تینوں قسمیں نبی کریم ﷺ میں پائی جاتی ہیں:

نبی کریم ﷺ میں اجلال، بزرگی، عظمت پائی گئی ہے، لھذا آپ کی امت کے لوگوں کو چاہیئے کہ وہ آپ سے محبت اجلال کریں اور جب کہ نبی کریم ﷺ اپنی امت پر شفیق اور رحیم و مہربان ہیں تو امت کو بھی چاہیے کہ وہ اپنی وسعت کے مطابق آپ سے محبت، شفقت و رحمت کرے، نبی کریم ﷺ کے اپنی امت پر ان گنت احسان ہیں۔ لھذا امت کو چاہئے کہ وہ آپ سے محبت مشاکلت و احسان کرے۔ (ماخوذ از نووی شرح مسلم ج ا ص ۶۹)

شان کلام مصطفوی ﷺ:

زیر بحث حدیث شریف میں مسلم شریف کی روایت میں "من والده وولده" اور نسائی کی روایت میں "من

ولـده ووالـده" مذکور ہے۔یعنی ایک روایت میں والد کا ذکر پہلے فرمایا کہ انسان والدین کے احسانات کو دیکھ کر ان سے محبت زیادہ کرتا ہے۔اور دوسری روایت میں "ولـــــد" (اولاد) کا ذکر پہلے فرمایا کہ انسان اپنی اولاد پر شفقت کرتے ہوئے ان سے محبت زیادہ کرتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کے دونوں ارشادات کو یکجا جمع کریں تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ اگر کوئی شخص تمام لوگوں سے زیادہ محبت اپنے والدین سے زیادہ کرتا ہے تو اس کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوگا جب تک والدین سے زیادہ محبت زیادہ نہ کرے۔اور اگر کوئی شخص سب لوگوں سے زیادہ محبت اپنی اولاد سے کرتا ہے تو اس کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوگا جب تک وہ اپنی اولاد سے زیادہ محبت مجھ سے نہ کرے۔

خیال رہے کہ والد مذکر کا صیغہ استعمال ہے لیکن مراد والدین ہیں،مؤنث کا ذکر ضمنا موجود ہے۔اسی طرح "ولد" نکرہ ذکر ہے جو مذکر و مونث اور فردا فردا تمام اولاد کو شامل ہے۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِيْنَ۝﴾ (آیۃ نمبر ۳۲)

(۱) تم فرمادو کہ حکم مانو اللہ اور رسول کا پھر اگر وہ منہ پھیریں تو اللہ کو خوش نہیں آتے کافر۔

(۲) آپ فرمادو تم فرنبرداری کرو اللہ اور رسول کی، پھر اگر وہ پھر جائیں تو بیشک اللہ نہیں پسند کرتا کافروں کو۔

شان نزول:

جب پچھلی آیۃ کریمہ نازل ہوئی جس میں حکم دیا گیا، ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ﴾ "فرمادو اگر تم محبت کرتے ہو اللہ سے تو میری تابعداری" تو عبداللہ بن ابی (رئیس المنافقین) نے اپنے اصحاب کو کہا:

"ان محمد ايجعل طاعته كطاعة الله ويامر ان نحبه كما احبت النصارى عيسى بن مريم فنزل قوله تعالى(قل اطيعوا الله والرسول)"الخ

بیشک محمد ﷺ اپنی طاعت کو اللہ تعالی کی طاعت جیسا سمجھتا ہے،اور حکم دیتا ہے کہ ہم اس سے اس طرح محبت کریں جیسے

کہ نصاری نے عیسیٰ بن مریم سے محبت کی، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا جس میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا۔ (معالم التنزیل للبغوی)

﴿قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ﴾ ''آپ فرمادو فرمانبرداری کرو اللہ اور رسول کی''

''الرَّسُوْلَ'' پر الف لام عہد خارجی ہے، خاص رسول، اور مطلقا جب الرسول ذکر کیا جائے تو اس سے مراد بھی ہمارے رسول کریم حضرت محمد ﷺ ہی ہوتے ہیں۔ اب مطلب واضح ہوا:

''ان اطاعة الله والرسول واحد فان اطاعة الرسول من حيث هو رسول الله انما هی اطاعة الله لاغير''

بیشک اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت ایک ہی چیز ہے، بیشک رسول اللہ ﷺ اس لحاظ پر کہ آپ اللہ کے رسول ہیں ان کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہی تو ہے، کسی اور کی اطاعت نہیں کسی اور کی اطاعت تو تب ہوتی جب وہ اللہ کے رسول نہ ہوتے۔

❁ ''عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ كل امتی يدخلون الجنة الامن ابی قالو ومن يابی يا رسول الله قال من اطاعنی دخل الجنة ومن عصانی فقدابی''بخاری ومسلم''

حضرت ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری تمام امت جنت میں داخل ہوگی سوائے اس کے جس نے انکار کیا، صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ''کون شخص انکار کرے گا'' آپ نے فرمایا جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا، اور جس نے میری نافرمانی کی تحقیق اس نے انکار کیا۔ (ماخوذ از مظہری)

حدیث شریف کی ابتداء میں ہی انکار کرنے والے کو دخول جنت سے مستثنیٰ قرار دے دیا، صحابہ کرام کا سوال تعجب کے طور پر تھا کہ یا رسول اللہ ﷺ انکار کون کرے گا یعنی ہمارے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں کہ آپ کے ارشاد سے بھی کوئی انکار کرے گا۔ صحابہ کرام نے اپنے زمانہ کے لوگوں کو دیکھ کر تعجب فرما کر سوال کیا۔

میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ کا جواب کیا خوب تھا کہ جس نے میری فرمانبرداری کی وہ جنت میں داخل ہوا اور جس نے نافرمانی کی وہی منکر ہوا یعنی وہی جنت میں داخل ہونے سے محروم رہا۔ نبی کریم ﷺ کے جواب کی خوبی یہ ہے کہ صحابہ کرام نے سوال منکرین کے متعلق کیا لیکن آپ نے مخلصین کا بھی ذکر فرما کر جواب کی ہر شق کو مکمل فرمادیا۔

❁ ''عن جابر قال جاء ت ملائكة الى النبی ﷺ وهو نائم فقالوا ان لصاحبكم هذا مثلا فاضربوا له مثلا قال بعضهم انه نائم وقال بعضهم ان العين نائمة والقلب يقظان فقالوا مثله كمثل رجل بنی دارا وجعل فيها مأدبه وبعث داعيا فمن اجاب الداعی دخل الدار واكل من المأدبة ومن لم يجب الداعی

لم یدخل الدار ولم یاکل من المأدبة فقالوا اولوهاله یفقهها قال بعضهم انه نائم وقال بعضهم ان العین نائمة والقلب یقظان فقالوا الدار الجنة والداعی محمد فمن اطاع محمدافقد اطاع الله ومن عصی محمدافقد عصی الله ومحمد فرق بین الناس" (رواہ البخاری، مشکوۃ کتاب الاعتصام بالسنۃ)

حضرت جابر ﷺ فرماتے ہیں، ملائکہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے، ایسے حال میں کہ آپ سو رہے تھے، تو انہوں نے کہا بیشک تمہارے ان صاحب کی مثال ہے ان کی مثال بیان کرو بعض نے کہا بیشک یہ تو سو رہے ہیں، اور بعض نے کہا بیشک ان کی آنکھیں سوتی ہیں، دل جاگتا ہے، تو انہوں نے کہا" ان کی مثال اس شخص کی مثال ہے جس نے گھر بنایا اور اس میں دستر خوان بچھایا دعوت دینے والے کو بھیجا، تو جس شخص نے دعوت دینے والے کی دعوت کو قبول کر لیا اور گھر میں داخل ہو گیا۔ اس نے دستر خوان سے کھالیا اور جس نے دعوت کو قبول نہ کیا، گھر میں داخل نہ ہوا۔ اس نے دستر خوان سے نہ کھایا فرشتوں نے (بعض نے بعض سے) کہا، اس کی وضاحت کر دو تا کہ وہ سمجھ جائیں کچھ فرشتوں نے کہا بیشک یہ تو سوئے ہوئے ہیں اور کچھ دوسروں نے کہا بیشک ان کی آنکھیں سوتی ہیں، اور ان کا دل جاگتا ہے، تو انہوں نے بیان کیا کہ" گھر سے مراد جنت ہے اور دعوت دینے والے سے مراد محمد (ﷺ) ہیں جس شخص نے محمد (ﷺ) کی اطاعت کی تو اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمد (ﷺ) کی نافرمانی کی تحقیق اس نے اللہ کی نافرمانی کی، اور محمد (ﷺ) لوگوں کے درمیان فرق کرنے والے ہیں۔ (معالم التنزیل میں اسی مقام پر یہ حدیث مندرج ہے)

حدیث پاک کی وضاحت تو ترجمہ سے ہی ثابت ہے کچھ الفاظ کی وضاحت کی جاتی ہے۔

"**مأدبة**" دال پر ضمہ اور فتحہ دونوں حرکتیں پڑھنی جائز ہیں، اس کا معنی طعام عام ہے جس کی طرف لوگوں کو دعوت دی جائے جیسے ولیمہ وغیرہ۔

"**فقالوا اولو هاله**" بعض ملائکہ نے بعض کو کہا اس حکایت تمثیلیہ کی وضاحت کرو جو تم نے ان کیلئے بیان کی ہے۔

"**یفقهها**" **بالجزم جواب الامر ای یفهمها**" "یفقهها" میں جواب امر میں واقع ہونے کی وجہ سے اس پر جزم ہے، معنی یہ ہے کہ وہ اس حکایت تمثیلیہ کو سمجھ لیں۔

"**ومحمد فرق بین الناس" روی مشدداعلی صیغة الفعل ومخففا علی المصدر ای فارق بین المؤمن والکافر والصالح والفاسق**"

اور محمد (ﷺ) لوگوں کے درمیان فرق کرنے والے ہیں، "فرق" مشدد بھی پڑھا گیا ہے، ماضی کا صیغہ ہے، اور مخفف بھی پڑھا گیا ہے، مصدر ہے مطلب یہ ہے کہ محمد ﷺ مؤمنوں اور کافروں کے درمیان فرق کرنے والے

ہیں، اور یہ مطلب بھی ہے کہ آپ نیک لوگوں اور برے لوگوں میں فرق کرنے والے ہیں، یعنی آپ یہ بتاتے ہیں کہ یہ کافر ہیں، یہ مؤمن ہیں، یہ نیک ہیں یہ گنہگار ہیں۔ (از مرقاۃ ج ۱ص ۲۱۹)

نبی کریم ﷺ کی متابعت واطاعت جنت کا ذریعہ ہے:

محمود غازی ایک مرتبہ شیخ ربانی ابوالحسن خرقانی قدس سرہ کی زیارت کیلئے ان کے پاس گئے، اور ان کے پاس بیٹھے پھر کہا اے شیخ آپ کی رائے ابویزید بسطامی کے متعلق کیا ہے، وہ کیسے آدمی تھے، شیخ ربانی نے کہا "**هو رجل من اتبعه اهتدى و اتصل بسعادة لاتخفى**" وہ اس ذات کی تابعداری کرنے والے تھے جو ہدایت کے اعلیٰ درجہ پر فائز تھے، اسی تابعداری کی وجہ سے ان کو سعادت (نیک بختی) کا بلند مقام حاصل ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کی تابعداری کی وجہ سے سعادت حاصل کی۔ محمود غازی نے تعجب کرتے ہوئے عرض کیا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا نہیں تو انہوں نے آپ کی تابعداری کر کے سعادت کو حاصل کیا ہو، لیکن ابوجہل نبی کریم ﷺ کو دیکھا بھی ہو اور وہ شقاوت (بدبختی) میں ہی رہا؟ شیخ نے اس کے جواب میں کہا:

> "**ان ابا جهل مارأى رسول الله انما رأى محمد بن عبد الله حتى لو كان رأى رسول الله ﷺ لخرج من الشقاوة و دخل فى السعادة**"

بیشک ابوجہل نے رسول اللہ ﷺ کو نہیں دیکھا بلکہ محمد بن عبداللہ کو فقط دیکھا اگر وہ آپ کو اس لحاظ پر دیکھتا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں تو یقیناً اس سے شقاوت دور ہوجاتی اور سعادت حاصل ہوجاتی۔

اس پر انہوں نے قرآن پاک سے ایک دلیل پیش کی کہ ابوجہل کا حال اس ارشاد باری تعالیٰ کی طرح ہے ﴿وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا وَتَرٰهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ﴾ (اور اگر تم انہیں راہ کی طرف بلاؤ تو نہ سنیں، اور تو انہیں دیکھے کہ وہ تیری طرف دیکھ رہے ہیں، اور انہیں کچھ بھی نہیں سوجھتا)

یعنی مطلب یہ ہے کہ سعادت حاصل کرنے کیلئے صرف سر کی آنکھوں سے دیکھنا کافی نہ تھا۔ ابوجہل نے آنکوں سے دیکھا تھا۔ اس لئے وہ سعادت حاصل نہ کرسکا۔ ہاں سعادت حاصل کرنے کیلئے دل کی آنکھوں سے دیکھنا ضروری ہے پھر اسے آپ کی کامل اتباع واطاعت حاصل ہوگی اور سعادت حاصل ہوگی، کامل سعادت مند وہی ہیں جن کے دل میں محبت مصطفیٰ کریم ﷺ سما گئی، دنیا کی محبت ان کے دل میں نہ سمائی "**فقد سلكت سبيله الذى يسلكه**" امت کی کامیابی مصطفیٰ کریم ﷺ کی راہ پر چلنے میں ہے۔ (ماخوذ از روح البیان)

اللہ تعالیٰ ہمارے جیسے گنہگاروں کو نبی کریم ﷺ کی تابعداری اور اطاعت نصیب فرمائے جس سے محبت کاملہ حاصل ہو جائے۔

﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْكَافِرِیْنَ﴾

''پھر اگر وہ پھر جائیں تو بیشک اللہ نہیں پسند کرتا کافروں کو۔''

''تَوَلَّوْا'' میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ یہ ماضی کا صیغہ ہو، اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ مضارع کا صیغہ ہو، اصل میں ''تَتَوَلَّوْا'' ہو، ایک تاء کو حذف کر دیا ہو۔

(لا یحب الکافرین) وضع المظهر موضع الضمیر ولم یقل لا یحبهم لقصد العموم والدلالة علی ان لتولی کفر والکفر ینفی المحبة وان المحبة مخصوصة بالمؤمنین''

یعنی ﴿لَا یُحِبُّ الْكَافِرِیْنَ﴾ میں اسم ظاہر کو لایا، صرف ضمیر پر اکتفاء نہیں کیا ''لا یحبهم'' نہیں کہا، تاکہ عموم پر دلالت کرے اور یہ مسئلہ مطلقاً ثابت ہو جائے کہ نبی کریم ﷺ کے دین سے اعراض کفر ہے کافروں کو نبی کریم ﷺ اور اللہ تعالیٰ سے محبت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت صرف مؤمنوں کو ہی حاصل ہے۔

اب مطلب واضح ہو گیا کہ اگر رسول اللہ ﷺ کے دین سے کسی نے منہ پھیرا تو وہ کافر ہو جائے گا، کافروں کو رب تعالیٰ اپنے قرب کا حقدار نہیں سمجھتا، اور نہ ہی ان کو پسند کرتا ہے۔ (ماخوذ از مظہری وروح المعانی)

(فان الله لا یحب الکافرین) فدل علی ان مخالفته فی الطریقة کفر، والله لا یحب من اتصف بذلک وان ادعی وزعم فی نفسه انه محب لله ویتقرب الیه حتی یتابع الرسول النبی الامی خاتم الرسل ورسول الله الی جمیع الثقلین الجن والانس الذی لو کان الانبیابل المرسلون بل اولوالعزم منهم فی زمانه ما وسعهم الا اتباعه والدخول فی طاعته واتباع شریعته''

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْكَافِرِیْنَ﴾ ''اس پر دلالت کر رہا ہے کہ بیشک اس کے دین کی مخالفت یعنی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بتائی ہوئی سیدھی راہ کی مخالفت اور اس سے اعراض کرنا کفر ہے، اللہ تعالیٰ اسے پسند نہیں کرتا، اگر کوئی دعویٰ کرے اور اپنے نفس میں گمان کرے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے اور اسے رب تعالیٰ کا قرب حاصل ہے تو وہ اسی وقت تک اپنے دعویٰ میں سچا نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے رسول، نبی، امی، خاتم الرسل، خاتم النبیین کی تابعداری نہ کرے، یہ وہ اللہ کے رسول ہیں جو تمام جنوں اور تمام انسانوں کے رسول بن کر آئے، اگر انبیاء کرام، بلکہ مرسلین، بلکہ اولوالعزم رسول بھی آپ کے زمانہ میں ہوتے تو ان کو بھی آپ کی تابعداری کے بغیر کوئی چارہ کار

نہ ہوتا وہ بھی آپ کی تابعداری میں داخل ہوتے اور آپ کی شریعت کی تابعداری کرتے۔ (ابن کثیر و صابونی)

حضرت جابر ﷜ سے مروی حدیث میں میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ کا ارشاد گرامی بہت واضح ہے

"ولو کان موسی حیا ما وسعه الا اتباعی" (رواہ احمد والبیھقی فی شعب الایمان، مشکوٰۃ باب الاعتصام بالسنۃ)

اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو ان کی میری اتباع کے بغیر کوئی وسعت حاصل نہ ہوتی یعنی وہ بھی میرے اقوال وافعال کی تابعداری کرتے۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىٓ اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾

(آیۃ نمبر ۳۳)

(۱) بیشک اللہ نے چن لیا آدم اور نوح اور ابراہیم کی آل اور عمران کی آل کو سارے جہان سے۔

(۲) بیشک اللہ نے چن لیا آدم اور نوح اور ابراہیم کی آل اور عمران کی آل کو تمام جہانوں سے۔

ماقبل سے تعلق:

جب اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اس کی محبت اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک رسول اللہ ﷺ کی تابعداری نہ کی جائے، تو اسی سے سمجھ آ گیا کہ ہر زمانہ میں ہر نبی کی متابعت محبت باری تعالیٰ کیلئے ضروری تھی۔ اسی وجہ سے اس آیۃ کریمہ میں "بین علو درجات الرسل وشرف مناصبھم" اللہ تعالیٰ نے رسولوں کے بلند درجات اور اعلیٰ منصبوں کا ذکر فرمایا۔ (کبیر)

شان نزول: (۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہود نے کہا ہم ابراہیم ؑ اور اسحٰق ؑ اور یعقوب ؑ کی اولاد سے ہیں، ہم ان کے دین پر ہیں، تو ہم برگزیدہ لوگ ہیں، تو رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا "والمعنی ان الله اصطفی هؤلاء بالاسلام والنبوة والرسالة وانتم یا معشر الیهود علی غیر دینهم" مطلب یہ ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے ان انبیاء کرام کو اسلام، نبوت ورسالت کی وجہ سے برگزیدہ بنایا، تم کیسے دعویٰ کرتے ہوا اے یہود کہ ہم بھی برگزیدہ ہیں، جب کہ تم ان کے دین پر ہی نہیں ہو۔

(۲) نجران کے عیسائیوں نے جب عیسی علیہ السلام کی شان میں حد سے زیادہ تجاوز کیا کہ ان میں سے بعض لوگوں نے آپ کو اللہ کا بیٹا کہا اور بعض نے آپ کو "الٰہ" (معبود) کہا، تو ان کے رد میں یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی کہ تمہیں معلوم ہونا چاہئے عیسی علیہ السلام حضرت مریم کے بیٹے ہیں اور حضرت مریم عمران کی بیٹی ہیں، جو شخص پیدا ہو، مختلف مراحل سے گذرے وہ معبود نہیں بن سکتا، "وھذا وجہ مناسبة الآیة لما قبلھا" شان نزول کی اس وجہ کو ما قبل آیۃ سے مناسبت حاصل ہے۔ (روح المعانی)

ترتیب کا فائدہ:

حضرت آدم علیہ السلام کے ذکر سے سے ابتداء کی اس لئے کہ بشر کی ابتداء تخلیق جسمانی آپ سے ہوئی، پھر نوح علیہ السلام کا ذکر کیا کیونکہ عام طور پر آپ کو لقب حاصل ہے "آدم اصغر" اور "الاب الثانی" پھر آپ کی اولاد سے ہی آگے نسل انسانی کی بقاء ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے ﴿وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِينَ﴾ (اور ہم نے اس کی اولاد باقی رکھی) پھر آل ابراہیم کا ذکر کیا تا کہ وہ لوگ جو ان کی بزرگی کے قائل ہیں، ان پر ایمان بھی لائیں، ان کی نبوت کو تسلیم کریں۔

پھر آل عمران کا ذکر کیا تا کہ لوگ عیسی علیہ السلام کی شان کو اس طرح سمجھیں جس طرح سمجھنے کا حق ہے یہود کی طرح آپ کی نبوت کا انکار آپ کے نسب پر طعنہ زنی کرنا بھی کفر ہے، اور عیسائیوں کی طرح آپ کو خدا یا خدا کا بیٹا یا خدا کا شریک ماننا بھی کفر ہے، آپ کو ماننے کا حق یہ ہے کہ یہ تسلیم کیا جائے وہ انسان ہیں رب تعالی کی مخلوق ہیں اللہ کے نبی ہیں، نفخ جبریل سے رب تعالی کی قدرت سے دنیا میں تشریف لائے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

انسان افضل ہے:

اللہ تعالی کی مخلوق کی دو قسمیں ہیں، مکلّف اور غیر مکلّف، اس پر اتفاق ہے کہ مکلّف کو غیر مکلّف پر افضلیت حاصل ہے مکلفین کی چار قسمیں ہیں، ملائکہ، انسان، جن، شیاطین، ملائکہ کی تخلیق زیادہ مشہور یہی ہے کہ نور سے ہوئی، لیکن ایک قول یہ بھی ہے کہ ملائکہ کی تخلیق ہوا سے ہوئی، علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "والاولی ان یجمع بین القولین فنقول ابدانھم من الریح وارواحھم من النور" بہتر یہ ہے کہ دونوں قول جمع کئے جائیں، اور یوں کہا جائے کہ ملائکہ کے بدن ہوا سے پیدا کئے گئے اور ان کی روحیں نور سے پیدا کی گئیں۔

ملائکہ میں ہوا کے پائے جانے کے مناسب ان کو اڑان حاصل ہے، پرندوں کی طرح پر حاصل ہیں وہ حاملین عرش

ہیں، ان کو روحانیین کہا گیا ہے۔ شیاطین کو آگ سے پیدا کیا گیا، وہ کافر ہیں، ابلیس کا کفر رب تعالٰی کے اس ارشاد گرامی سے واضح ہے ﴿وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ﴾ اور کافر ہو گیا اور باقی شیطانوں کا کفر و شرک اس آیۃ کریمہ سے ثابت ہے ﴿وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ﴾ اور بیشک شیطان اپنے دوستوں کے دلوں میں ڈالتے ہیں کہ تم سے جھگڑیں اور اگر تم ان کا کہنا مانو تو اس وقت تم مشرک ہو۔

ان کے حاکم کو ماننا اسی لئے تو شرک ہے کہ وہ خود کافر و مشرک ہیں۔ شیطانوں کا خاصہ یہ ہے کہ وہ انسانوں کے دشمن ہیں، رب تعالٰی نے ارشاد فرمایا۔

﴿فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ﴾

تو اپنے رب کے حکم سے (ابلیس) نکل گیا، بھلا کیا اسے اور اس کی اولاد کو میرے سوا دوست بناتے ہو اور وہ تمہارے دشمن ہیں۔

اور ارشاد باری تعالٰی ہے ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ﴾ اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن کئے ہیں آدمیوں اور جنوں میں سے شیطان۔ جنات کوئی مؤمن ہیں، کوئی کافر ہیں، رب تعالٰی نے ارشاد فرمایا ﴿وَاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقَاسِطُوْنَ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا﴾ اور یہ کہ ہم میں کچھ مسلمان ہیں اور کچھ ظالم تو جو اسلام لائے انہوں نے بھلائی سوچی، انسانوں کے پہلے باپ آدم علیہ السلام ہیں، تمام انسان آپ کی ہی ذریت (اولاد) ہیں۔

اس تمہید کے بعد اصل مسئلہ عنوان کے مطابق یہ ہے کہ بشر کو شیاطین اور جنوں پر مطلقا فضیلت حاصل ہے، اور انبیاء کرام کو تمام فرشتوں پر فضیلت حاصل ہے، مکمل تفصیل پہلے پارہ میں دیکھیں۔ (ماخوذ از کبیر)

اعتراض: اگر یہ کہا جائے کہ آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام اور آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام جہان پر فضیلت ثابت ہوگی نبی کریم ﷺ پر بھی، حالانکہ آپ کو تمام انبیاء کرام پر فضیلت حاصل۔ اسی پارہ کی ابتداء میں یہ مسئلہ تفصیلی طور پر بیان کر دیا گیا۔

دوسری خرابی یہ لازم آئے گی کہ عبارت میں عجیب تعارض لازم آئے گا کہ آدم علیہ السلام تمام جہانوں پر افضل ہیں، یعنی نوح علیہ السلام اور آل ابراہیم اور آل عمران پر بھی کیونکہ وہ بھی تمام جہانوں میں داخل ہیں، نوح علیہ السلام کو تمام جہانوں پر فضیلت حاصل ہے، یعنی آدم علیہ السلام پر اور آل ابراہیم اور آل عمران پر بھی ان کو فضیلت حاصل ہے کہ وہ بھی سب جہانوں میں داخل ہیں اسی طرح آل ابراہیم کو تمام جہانوں پر افضل مانیں تو آدم علیہ السلام نوح علیہ السلام اور آل عمران

پر بھی فضیلت لازم آئے گی کیونکہ یہ سب تمام جہانوں میں داخل ہیں۔اور اگر آل عمران کو تمام جہانوں پر افضل مانیں تو ان کو آدم علیہ السلام نوح علیہ السلام اور آل ابراہیم پر فضیلت لازم آئے گی، کیونکہ یہ تمام جہانوں میں داخل ہیں کس کو کس پر افضل مانا جائے یہ فیصلہ ممکن نظر نہیں آتا۔

پہلا جواب: "المراد به عالم وزمان کل واحد منهم" مراد اس سے یہ ہے کہ ہر ایک کو اپنے اپنے زمانہ میں دوسرے تمام لوگوں پر فضیلت حاصل تھی۔انبیاء کرام کو جب تمام فرشتوں پر فضیلت حاصل ہے "فیندرج فیه الملک" تو اس میں فرشتے بھی داخل ہوں گے۔اس جواب سے یہ واضح ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ پر کسی کو فضیلت حاصل نہیں اور تعارض بھی اٹھ گیا۔ (ماخوذ از کبیر)

دوسرا جواب: ترمذی حکیم ابوعبداللہ محمد بن علی نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ان حضرات کو تمام مخلوق پر فضیلت دی گئی ہے، البتہ اس کی توجیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ "العالمین" سے مراد عام مخلوق ہے، جن حضرات کی فضیلت کا ذکر کیا گیا وہ انبیاء کرام ہیں "وذلک ان هؤلاء رسل وانبياء فهم صفوة الخلق" اور یہ بات یقیناً ثابت ہے کہ رسولوں اور انبیاء کرام کو مخلوق پر فضیلت حاصل ہے، ان کو رب تعالی نے عام مخلوق پر چن لیا ہے، برگزیدہ بنایا ہے۔یعنی اس آیہ کریمہ میں انبیاء کرام کی ایک دوسرے پر فضیلت کا کوئی ذکر نہیں لھذا یہ اعتراض ہی درست نہیں کہ اس آیہ کریمہ میں مذکور حضرات کی فضیلت نبی کریم ﷺ پر آئے گی، یہ قول درست نہیں، آیئے علامہ قرطبی رحمہ اللہ کا محبت بھرا قول دیکھیے۔

"فامامحمد فقد جازت مرتبته الاصطفاء لا نه حبيب ورحمة"

لیکن محمد ﷺ کا مرتبہ سب سے بلند وبالا ہے کیونکہ آپ حبیب ورحمت ہیں، یقیناً آپ برگزیدہ ہونے میں اور رب تعالی کے چن لینے میں بھی سب انبیاء کرام سے آپ بلند وبالا ہیں۔

رب تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ (اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر سب جہانوں کیلئے رحمت) اسی سے ایک عظیم فائدہ حاصل ہوا "فالرسل خلقوا للرحمة ومحمد خلق بنفسه رحمة" تمام رسول رحمت کیلئے پیدا کیے گئے لیکن نبی کریم حضرت محمد ﷺ کو ذاتی طور پر رحمت پیدا کیا گیا۔

"فلذلک صار امانا للخلق لما بعثه الله امن الخلق العذاب الى نفخة الصور وسائر الانبياء لم يحلوا هذاالمحل"

اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ تمام مخلوق کیلئے امان بن کر تشریف لائے پہلی قوموں پر جو عذاب ہوئے تھے کسی کو بندر بنا

دیا، کسی کو خنزیر وغیرہ بنا دیا، وہ مسخ والے عذاب آپ کے امن کی وجہ سے تا قیامت اٹھا لئے گئے لیکن یہ مقام صرف آپ کو حاصل ہوا باقی انبیاء کرام کو حاصل نہیں ہوا۔

❁ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "ان رحمة مهداة" میں رحمت اور ہدیہ بن کر آیا ہوں "يخبر انه رحمة للخلق من الله وقوله "مهداة" اى هدية من الله للخلق" نبی کریم ﷺ نے اپنی ذات کی خبر دی کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مخلوق کیلئے رحمت بن کر آیا ہوں، اور آپ کے ارشاد گرامی میں (مهداة) کا مطلب یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مخلوق کیلئے ہدیہ اور تحفہ ہوں۔ (قرطبی)

یعنی جسے ہدیہ اور تحفہ دیا جائے اس پر مہربانی کی جاتی ہے اور اس سے اظہار محبت کیا جاتا ہے، یہ اسی وقت ہوتا ہے جب تحفہ کی قدر کی جائے، اب مطلب واضح ہوا کہ رب تعالیٰ نے بندوں پر احسان فرمایا کہ مجھے ان کیلئے بطور ہدیہ وتحفہ کے بھیجا ہے، ہاں رب تعالیٰ کی مہربانی کو اسی وقت حقیقت میں پاسکیں گے جب وہ میری تابعداری کریں گے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى﴾ میں لفظ "اصطفی" کا اصل مادہ "صفو" ہے، صاد پر تینوں حرکتیں (زبر، زیر، پیش) پڑھی گئی ہیں، جس کا معنی ہے پسند کر لینا، چن لینا، برگزیدہ بنانا۔

> فمعنى "اصطفاهم" اى جعلهم صفوة خلقه تمثيلا بما يشاهد من الشئى الذى يصفى وينقى من الكدورة"

ان لوگوں کے "اصطفاء" کا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے ان کو صاف وخالص بنایا جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض چیزیں کدورت، مٹیالا پن سے صاف وشفاف ہوتی ہیں۔ (کبیر)

آدم علیہ السلام کی چن لینے کی وجوہ:

حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے پانچ چیزوں کی وجہ سے پسند فرمایا، ان کو عام مخلوق پر فضیلت دی، ان کو چن لیا۔

(۱) "اولها انه خلقه بيده فى احسن صورة بقدرته" ان چیزوں میں سے پہلی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی اپنے دست سے تخلیق فرمائی، اور اپنی قدرت سے آپ کو اچھی صورت عطاء فرمائی، وہی اچھی صورت آپ کی اولاد میں بھی آرہی ہے۔

(۲) "والثانى انه علمه الاسماء كلها" اور دوسری چیز جس کی وجہ سے آدم علیہ السلام کو برگزیدہ بنایا وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام چیزوں کے ناموں کا علم عطاء فرمایا۔

(۳) "والثالث امر الملائكة بان يسجدو اله" ان وجوہ میں سے تیسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں۔

(۴) "والرابع اسكنه الجنة" اور چوتھی وجہ یہ ہے کہ آپ کو جنت میں ٹھہرایا۔

(۵) "والخامس جعله ابا البشر" اور پانچویں وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام انسانوں کا باپ بنایا، آپ کا لقب ہی ابوالبشر بن گیا۔ (قرطبی)

راقم کے نزدیک سب سے بڑی وجہ آپ کو نبوت عطاء کرنا ہے، منصب نبوت کی وجہ سے ہی آپ کو دوسری مخلوق (غیر نبی) پر فضیلت حاصل ہے۔

پانچ وجہ سے نوح علیہ السلام کو چن لیا:

(۱) "اولها انه جعله ابا البشر لان الناس كلهم غرقوا وصار ذريته هم الباقين" پہلی وجہ یہ ہے کہ جب سب لوگ غرق ہو گئے تو آپ کی اولاد کو ہی باقی رکھا گیا، اسی سے پھر لوگ پیدا ہوئے اس لحاظ پر آپ کو آدم علیہ السلام کے بعد ابوالبشر کا خطاب ملا۔

(۲) "والثاني انه اطال عمره ويقال طوبى لمن طال عمر وحسن عمله"
دوسری وجہ یہ ہے کہ بیشک آپ کو لمبی عمر عطاء کی گئی، جب عمل اچھے ہوں تو لمبی عمر قابل تعریف ہے۔

(۳) "والثالث انه استجاب دعاء ه على الكافرين والمؤمنين"
تیسری وجہ آپ کو چن لینے کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعاء کو کافروں کے خلاف اور مومنوں کے حق میں قبول فرمایا۔

(۴) "والرابع انه حمله على السفينة" اور چوتھی وجہ آپ کو چن لینے کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کشتی پر سوار کر کے طوفان سے بچالیا۔

(۵) "والخامس انه كان اول من نسخ الشرائع وكان قبل ذلك لم يحرم تزويج الخالات والعمات"
پانچویں وجہ ترجیح یہ ہے کہ بیشک آپ نے ہی سب سے پہلے پچھلی شریعت کو منسوخ کیا، کیونکہ آپ کی شریعت میں خالہ، پھوپھی وغیرہ سے نکاح حرام ہوا جبکہ پہلے حرام نہیں تھا۔ (قرطبی)

راقم کے نزدیک یہاں بھی سب سے بڑی وجہ ترجیح آپ کا نبی ہونا ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کو چن لینے کی پانچ وجوہ:

(۱) "اولها انه جعله ابا الانبیاء"

ان میں سے پہلی وجہ یہ ہے کہ آپ کو ابوالانبیاء بنایا گیا، کیونکہ آپ کے آنے والے تمام نبی آپ کی اولاد سے ہیں، باقی تمام اسحٰق علیہ السلام کی اولاد سے، اور نبی کریم ﷺ اسمٰعیل علیہ السلام سے۔ یہاں یہ بھی خیال رہے کہ آیۃ کریمہ میں اولاد ابراہیم سے مراد ہی انبیاء کرام ہیں، غیر نبی مراد نہیں۔

(۲) "والثانی انه اتخذه خلیلا" اور دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیل بنایا۔

(۳) "والثالث انه انجاه من النار" اور تیسری وجہ یہ ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے آپ کو آگ سے نجات دی جبکہ نمرود نے آپ کو زندہ جلا دینے کی (معاذ اللہ) سرتوڑ کوشش کی۔

(۴) "والرابع انه جعله اماما للناس" اور چوتھی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو لوگوں کا امام بنایا، امامت سے مراد نبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا۔

(۵) "والخامس انه ابتلاه بالکلمات فوفقه حتی اتمهن" اور پانچویں وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو چند کلمات سے آزمایا، پھر ان کو پورا کرنے کی آپ کو توفیق عطاء فرمائی، یہاں تک کہ آپ نے ان کو پورا کیا۔ (ماخوذ از قرطبی)

آل عمران کو چن لینے کی وجہ:

"فانه اصطفی له مریم بولادة عیسی بغیر اب ولم یکن ذلک لاحد فی العالم (واللہ اعلم)

عمران کیلئے اللہ تعالیٰ نے مریم کو چنا، اور مریم کو چننے کی اصل وجہ آپ کے شکم سے بغیر باپ کے عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہے، جو جہان میں کسی ایک کو بھی حاصل نہیں۔ (ماخوذ از قرطبی)

آل عمران سے مراد بھی درحقیقت عیسیٰ علیہ السلام ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کو رب تعالیٰ نے چن لیا، کیونکہ عمران کی اولاد میں سوائے عیسیٰ علیہ السلام کے اور کوئی نبی نہیں۔

عجیب اتفاق:

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے والد کا نام بھی عمران ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن کا نام بھی مریم ہے، مریم بنت عمران موسیٰ علیہ السلام کی بہن بھی ہے۔ یہ اور مریم ہے اور عمران بھی اور ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ بھی مریم بنت عمران ہے، لیکن یہ عمران اور مریم اور ہیں۔ "قالوا وبین العمرانین الف

وثمان مائة سنة" اہل علم نے بیان کیا ہے کہ دونوں عمرانوں کے درمیان ایک ہزار آٹھ سو سال کا فاصلہ ہے۔

یہاں آیۃ کریمہ میں زیادہ راجح اور قوی صورت یہی ہے کہ عمران سے حضرت عیسی علیہ السلام کے نانا ہیں کیونکہ بعد والی آیات میں ان کا اور ان کی زوجہ کا اور ان کی بیٹی حضرت مریم کا اور ان کے نواسے حضرت عیسی علیہ السلام کا تذکرہ ہے۔

تاہم علامہ قرطبی نے ایک احتمال یہ بھی بیان کیا ہے کہ ہوسکتا ہے زیر بحث آیۃ کریمہ میں جو آل عمران کا ذکر کیا گیا ہے اس عمران سے مراد موسی علیہ السلام کے والد ہوں، اور آل عمران ۔ سے مراد حضرت موسی اور حضرت ہارون علیہ السلام ہوں کہ ان کو چن لیا۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے اس قول کو مرجوح قرار دیا کہ یہ سیاق وسباق سے ہٹ کر قول ہے۔

انبیاء کرام کی فضیلت کا خوبصورت تذکرہ:

حلیمی رحمہ اللہ نے کتاب المنہاج میں ذکر کیا کہ انبیاء کرام دوسرے لوگوں پر جسمانی قوتوں اور روحانی قوتوں میں برتری اور فوقیت حاصل ہے، جسمانی قوتوں کی پھر دو قسمیں ہیں، قوت مدرکہ اور قوت محرکہ۔

قوت مدرکہ کے لحاظ پر فضیلت:

قوت مدرکہ یا حواس ظاہرہ سے ہوتی ہے یا حواس باطنہ سے، حواس ظاہرہ پانچ ہیں، ان میں سے قوت باصرہ ہے۔

قوت باصرہ: کے لحاظ پر نبی کریم ﷺ وہ کمال حاصل تھا جو دوسروں کو حاصل نہیں۔

❁ "قال ﷺ" زویت لی الارض فاریت مشارقها و مغاربها"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا "میرے لئے زمین کو لپیٹ دیا گیا، تو مجھے زمین کے مشارق ومغارب دکھا دیئے گئے۔

❁ قال ﷺ اقیموا صفوفکم وتراصوا فانی اراکم من وراء ظهری" (رواہ البخاری عن انس)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا صفوں کو درست رکھو، اور مل کر کھڑے ہو، بیشک میں تمہیں اپنی پیٹھ کے پیچھے دیکھ رہا ہوتا ہوں۔

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق رب تعالی نے فرمایا ﴿وَكَذٰلِكَ نُرِيْ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ اور اسی طرح ہم ابراہیم کو دکھاتے ہیں آسمانوں اور زمین کی بادشاہیاں۔ اس کی تفسیر میں مفسرین کرام نے لکھا ہے:

"انه تعالی قوی بصره حتی شاهد جمیع الملکوت من الاعلی و الاسفل"

بیشک اللہ تعالیٰ نے آپ کی بصر کو یہ قوت عطاء فرمائی کہ آپ نے مقام اعلیٰ (بلند مقام یعنی آسمان) کی تمام بادشاہیوں کو دیکھا، اور مقام اسفل (نیچے والا مقام یعنی زمین) کی تمام بادشاہیوں کو دیکھا۔

قوت سامعہ: کے لحاظ پر نبی کریم ﷺ کو وہ برتری حاصل تھی جو دوسروں کو حاصل نہ تھی۔

❁ "قال ﷺ اطت السماء وحق لها ان تئط مافيها موضع قدم الاوفيه ملك ساجدلله"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا آسمان میں چرچراہٹ پیدا ہوئی، حق بھی یہی تھا کہ اس میں چرچراہٹ پیدا ہوتی، کیونکہ آسمانوں میں کوئی ایک قدم کی جگہ بھی نہیں مگر یہ اس میں فرشتہ اللہ کو سجدہ کرنے والا ہوتا ہے۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ آسمان کی چرچراہٹ نبی کریم ﷺ نے سنی کسی اور نے نہ سنی تو آپ کو قوت سامعہ میں وہ قوت حاصل تھی جو دوسروں کو حاصل نہیں تھی۔

❁ "انه ﷺ سمع دويا وذكرانه هوى صخرة قذفت في جهنم فلم تبلغ قعرها الى الآن"

نبی کریم ﷺ نے آواز سنی اور ذکر فرمایا بیشک یہ پتھر کے گرنے کی آواز ہے جو جہنم کی طرف پھینکا گیا ہے، جو جہنم کی گہرائی میں ابھی تک نہیں پہنچا۔

واضح ہوا کہ صحابہ کرام بھی وہیں موجود تھے وہ آواز کو نہ سن سکے اور فقط نبی کریم ﷺ نے وہ آواز سنی اور آواز پتھر کے گرنے کی سنی، وہ آواز یقیناً اس وقت پیدا ہوتی ہے جب پتھر اپنی جگہ پر پہنچتا ہے لیکن آپ نے پتھر کے جہنم کی گہرائی میں پہنچنے سے پہلے ہی آواز کو سن لیا جس سے پتہ چل گیا کہ آپ کی قوت سامعہ کو باقی لوگوں کی قوت سامعہ سے برتری حاصل تھی اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کا چیونٹی کی آواز کو سننا بھی دلالت کرتا ہے کہ انبیاء کرام کی قوت سامعہ کو باقی لوگوں سے برتری اور کمال حاصل ہے۔ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿قَالَتْ نَمْلَةٌ يَّاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ﴾ چیونٹی (جو دوسروں کی سردار تھی) نے کہا اے چیونٹیو اپنے بلوں میں داخل ہو جاؤ۔ اس آواز کی حضرت سلیمان علیہ السلام نے سنا اور سمجھا۔

پتہ چلا کہ انبیاء کرام جانوروں کی باتوں کو سمجھتے بھی تھے۔ نبی کریم علیہ السلام سے بھیڑیے اور اونٹ نے کلام کیا، آپ نے ان کی باتوں کو سمجھا۔

قوت شامہ: سونگھنے والی قوت بھی انبیاء کرام کی دوسروں کی قوت شامہ سے بلند ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے جب اپنے بھائیوں کے قافلہ کو کہا "ارشاد باری تعالیٰ" ﴿اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا وَّاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ میرا یہ کرتا لے جاؤ اسے میرے باپ کے منہ

پر ڈالو، ان کی آنکھیں کھل جائیں گی اور اپنے سب گھر بھر کو میرے پاس لے آؤ۔ ﴿وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ﴾ اور جب قافلہ مصر سے جدا ہوا یہاں ان کے باپ نے کہا بیشک میں یوسف کی خوشبو پاتا ہوں، حضرت یعقوب علیہ السلام نے کنعان میں یوسف علیہ السلام کی قمیص کے مصر سے چلنے پر یوسف علیہ السلام کی خوشبو پالی۔ تو واضح ہوا کہ انبیاء کرام کی سونگھنے والی قوت دوسروں لوگوں کی قوت سے بلند و بالا ہے۔

قوت ذائقہ: انبیاء کرام کے چکھنے سے جن چیزوں کا علم دے دیا جاتا ہے وہ دوسروں کو حاصل نہیں ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ کو جب خیبر میں بکری کا زہر آلودہ گوشت پیش کیا گیا تو آپ نے چکھ کر ہاتھ پیچھے ہٹا لیا اور ارشاد فرمایا "ان هذا الزراع يخبرني انه مسموم" کہ بیشک (بکری کے) اس ذراع نے مجھے خبر دی ہے کہ اسے زہر آلود کیا گیا ہے۔

قوت لامسہ: انبیاء کرام کی چھو کر محسوس کرنے کی قوت بھی بنسبت دوسرے لوگوں کے بلند و بالا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوت لامسہ کی وجہ سے ہی آگ آپ پر گلزار ہوگئی، یعنی آپ کے جسم نے جب آگ کو چھوا تو آگ ٹھنڈی ہوگئی۔ نبی کریم ﷺ کی قوت لامسہ کی وجہ سے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آشوب چشم سے شفاء حاصل ہوگئی اور ایک صحابی کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ آپ کے ہاتھ پھیرنے سے درست ہوگئی۔ یہ آپ کی قوت لامسہ کا ہی کمال تھا۔

حواس باطنہ: میں سے اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی قوت حافظہ کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنسَىٰ﴾ ہم آپ کو پڑھائیں گے آپ نہیں بھولیں گے۔ آپ کی قوت ذکاء کا اندازہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قول سے کریں، آپ فرماتے ہیں۔ "علمني رسول الله الف باب من العلم واستنبطت من كل باب الف باب" رسول اللہ ﷺ نے مجھے علم کے ہزار باب سکھائے اور میں نے ہر باب سے ہزار باب خود استنباط (حاصل) کیے۔ "فاذا كان حال الولي هكذا فكيف حال النبي ﷺ" جب ولی کا حال اس طرح کا ہے تو نبی کے حال کی بلندی کا مقام کیا ہوگا۔

انبیاء کرام کی قوت محرکہ کی فوقیت:

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو وہ قوت محرکہ عطاء فرمائی جو عام لوگوں کو حاصل نہیں، نبی کریم ﷺ کو معراج کرایا، عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمانوں پر اٹھایا، یہ آپ کی قوت محرکہ کا ہی کمال تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ولیوں کو محرکہ میں وہ کمال عطاء کیا جو دوسرے عام لوگوں کو عطاء نہیں کیا، حضرت سلیمان علیہ السلام کے ولی آصف برخیا کے بلقیس کے تخت لانے کا ذکر اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا:

﴿قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْكَ طَرْفُكَ﴾
کہا اس نے جس کے پاس کتاب کا علم تھا، میں تمہارے پاس وہ لے آؤں تمہاری آنکھ جھپکنے سے پہلے۔

جب ولی کا یہ مقام ہے تو انبیاء کرام کا کتنا ہی بلند و بالا مقام ہوگا۔

قوت روحانیہ عقلیہ:

انبیاء کرم کی بہت کامل درجہ کی ہے اور نہایت صاف ہے، کیونکہ نفس قدسیہ نبویہ کی ماہیت دوسرے نفسوں سے بلند ہے۔ اسی قوت روحانیہ عقلیہ کی وجہ سے انبیاء کرام کامل ذکاء، کامل سمجھ داری، شرافت، بلندی کا اعلیٰ معیار حاصل ہوتا ہے۔ جسمانیات اور خواہشات سے انہیں دوری حاصل ہوتی ہے۔ جب روح کو کامل صفائی اور شرافت حاصل ہوتی ہے تو بدن کو بھی کامل طہارت حاصل ہوگی۔

اس تمہید کے بعد حاصل ہوا:

کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو عالم بالا کی مخلوق یعنی فرشتوں پر فضیلت دی اور عالم پست یعنی ارضی مخلوق پر بھی فضیلت دی کیونکہ انبیاء کرام کو فرشتوں جنوں اور انسانوں سب پر فضیلت حاصل ہے۔ پھر وہی قوت قدسیہ یعنی نبوت آپ کی بعض اولاد میں رکھی، رب تعالیٰ کا اپنا ارشاد گرامی اس پر دلالت کر رہا ہے۔ ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ کہاں رسالت کو رکھنا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جن کو منصب رسالت کا اہل سمجھا ان کو ہی نبوت و رسالت عطاء فرمائی، پھر وہ نور نبوت ابراہیم علیہ السلام تک پہنچا، پھر آپ کے بعد تمام نبی آپ کی اولاد سے ہوئے آپ کی اولاد میں سے حضرت اسحٰق علیہ السلام کو روح قدسیہ یعنی نبوت عطاء فرمائی پھر آپ کے بیٹے یعقوب علیہ السلام کو پھر یہ سلسلہ نبوت ان کی اولاد میں چلتا رہا۔ حضرت اسحٰق علیہ السلام کے دوسرے بیٹے عیصو کی اولاد میں سلسلہ بادشاہت چلتا رہا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو بھی روح قدسیہ یعنی نبوت عطاء کی گئی، لیکن آپ کی اولاد میں سلسلہ نبوت عام نہ ہوا بلکہ خصوصی طور پر (”فجعل اسمعیل مبدأ لظهور الروح القدسية لمحمد صلی اللہ علیہ وسلم“) حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی روح قدسیہ یعنی نبوت کے ظاہر ہونے کا ذریعہ بنایا یعنی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں اگرچہ ایک نبی آئے لیکن وہی افضل الانبیاء وہی سید الانبیاء، وہی امام الانبیاء، وہی خاتم الانبیاء کے منصب پر فائز ہوئے، وہ ہیں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ۔

”فلما ظهر محمد ﷺ نقل نور النبوة ونور الملك الى محمد ﷺ وبقيا اعنى الدين

والملک لاتباعه الی یوم القیامة"

جب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اس دنیا میں ظاہر ہوئے تو وہ نور نبوت آپ کی طرف منتقل ہوئے سلسلہ نبوت آپ پر ختم کردیا گیا، حاکمیت بھی آپ کو ہی نصیب ہوئی، بغیر کسی کی شرکت کے آپ ہی مسلمانوں کے واحد حکمران تھے، آپ جورب تعالیٰ کے احکام جاری فرماتے ان میں کسی کو چون وچرا کی گنجائش حاصل نہ تھی۔

دین اور بادشاہت آپ کے متبعین کو تا قیامت حاصل رہیں گے، دین کی حفاظت رب تعالیٰ نے فرمائی ہے، "ومن تأمل فی هذالباب وصل الی اسرار عجیبة" جس نے بھی اس بحث میں تأمل کیا اسی نے عجیب اسرار پائے، حقیقت میں قرآن پاک خزینہ علوم منبع اسرار رموز ہے، جتنا کسی کو رب تعالیٰ نے علم اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت سے حصہ ملا اتنا ہی قرآن پاک سے اسے حصہ ملا۔ (ماخوذ از تیسیر بالوضاحت)

تنبیہ: ﴿اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰی﴾ میں اگر (اصطفاء) کا مطلب یہ لیا جائے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے منصب رسالت کیلئے پسند کیا تو آل ابراہیم اور آل عمران سے مراد بھی انبیاء کرام ہوں گے، لیکن علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے "ولیس المراد الاصطفاء بالنبوة" اصطفاء سے مراد نبوت کیلئے چننا نہیں، اگر یہ معنیٰ لیا جائے تو "آل ابراہیم" اور "آل عمران" سے مراد نبیوں کی تخصیص ضروری نہیں، بلکہ آیۃ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ بیشک آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے متقی حضرات اور عمران کی اولاد سے متقی حضرات کو ان کے اپنے اپنے زمانہ میں دوسرے لوگوں پر فضیلت دی گئی، اور ان کو چن لیا گیا، اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی محبت کیلئے پسند فرمالیا۔

خیال رہے کہ آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کو رب تعالیٰ نے ان کے زمانہ میں تمام لوگوں پر فضیلت دی کیونکہ نبی غیر نبی پر افضل ہوتا ہے لیکن اولاد ابراہیم اور اولاد عمران میں مسئلہ کو مقید کرنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد ابراہیم اور اولاد عمران میں سے ان کے اپنے اپنے زمانہ میں اتقیاء واصفیاء (نیک لوگوں) کو غیر اتقیاء وغیر اصفیاء پر فضیلت دی۔

(واللہ اعلم بالصواب)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ خوب نظر آیا:

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے آیۃ کریمہ کا ترجمہ یوں کیا ہے "بیشک اللہ نے چن لیا آدم اور نوح اور ابراہیم کی آل اور عمران کی آل کو سارے جہاں سے" یہ بامحاورہ ترجمہ ہے اس میں اعتراض وجواب اور لمبی بحثوں کی ضرورت نہیں، یعنی جہان میں سے آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام اور اولاد ابراہیم اور اولاد عمران کو چن لیا ہے۔ اس میں نبی کریم ﷺ

پر ان حضرات کی برتری کا ثابت ہونا پھر یہ جواب دینا کہ اس سے مراد ان کے زمانہ کے لوگ ہیں، اس سوال و جواب کی ضرورت نہیں رہتی۔

با محاورہ ترجمہ راقم نے اسی لئے کیا ہے کہ لغوی ترجمہ اگر چہ اعتراض و جواب کا محتاج ہے۔ "واللہ اعلم بالصواب"

❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀

﴿ذُرِّيَّةً بَعْضُهَامِنْ بَعْضٍ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ (آیۃ نمبر ۳۴)

(1) یہ ایک نسل ہے ایک دوسرے سے اور اللہ سنتا جانتا ہے۔

(2) اولاد کو بعض ان کے بعض سے ہیں اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔

﴿ذُرِّيَّةً﴾ یا مشتق ہے "ذرا" سے، جس کا معنی ہے پیدا کرنا یا مشتق ہے "ذر" سے کیونکہ آدم علیہ السلام کی پشت سے آپ کی تمام اولاد کو یوم میثاق سے چھوٹے چھوٹے ذرات کی طرح نکالا گیا، اسلئے آپ کی اولاد کو "ذریت" کہا جاتا ہے۔

"ویسمی الاولاد والآباء ذریۃ فالاولاد ذریۃ لانہ ذراھم والآباء ذریۃ لانہ ذرأ الابناء منھم"

اولاد اور آباء دونوں پر ذریت کا اطلاق کیا گیا ہے، اولاد اس لئے ذریت ہیں، کہ آباء سے ان کو پھیلایا گیا ہے، یعنی اولاد بمعنی مفعول کے ذریت ہے۔ اور آباء کو ذریت کہا گیا ہے کہ ان سے ان کی اولاد پھیلی ہے، یہ اولاد کے پھیلنے کے ذریعہ ہونے کی وجہ سے ذریت ہیں، یعنی آباء فاعلیت کے معنی کے لحاظ پر ذریت ہیں۔

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ﴾ اور ان کیلئے ایک نشانی یہ ہے کہ انہیں ان کے بزرگوں کی پیٹھ میں ہم نے بھری کشتی میں سوار کیا۔ (از معالم التنزیل للبغوی)

جلالین میں اس مذکورہ آیۃ کریمہ میں ﴿اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ﴾ کا معنی بیان کیا گیا ہے "ای آباء ھم الاصول" یعنی ان کے آباء جو ان کے اصول ہیں ان کو کشتی میں سوار کیا۔

جلالین کے اس ترجمہ پر تفسیر جمل نے لکھا ہے "اطلاق الذریۃ علی الاصول صحیح فان لفظ الذریۃ مشترک بین الضدین" "ذریۃ" کا اطلاق اصول پر صحیح ہے، کیونکہ لفظ ذریت ضدین کے درمیان مشترک ہے۔

(ذریۃ) "نصب علی معنی، واصطفی ذریۃ (بعضھا من بعض) ای بعضھا من ولد بعض"

"ذریة" پر نصب ہے کہ یہ "اصطفی" کا مفعول ہے، اس لحاظ پر معنی یہ ہوگا، کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے ان کی اولاد کو جو بعض کی اولاد ہیں۔

"بعضها من بعض" میں دو احتمال اور ہیں "وقیل بعضها من بعض فی التناصر" بعض بعض سے ہیں یعنی ایک دوسرے کی امداد فرماتے ہیں۔ دوسرا احتمال یہ ہے "بعضها علی دین بعض" بعض بعض سے ہیں، یعنی اولاد اپنے آباء واجداد کے دین پر ہے۔ (معالم التنزیل للبغوی)

"(ذریة بعضها من بعض) حال او بدل من الآلین او منهما ومن نوح ای انهم ذریة واحدة متشعبة بعضها من بعض"

"ذریة" پر نصب کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ یہ حال ہو، یا بدل ہو "آل ابراہیم" اور آل عمران سے، یا دونوں آل اور نوح سے حال یا بدل ہو۔

اب معنی یہ ہوگا کہ بیشک اللہ نے چن لیا ہے آدم اور نوح اور ابراہیم کی آل اور عمران کی آل کو جہان والوں سے ایسے حال میں کہ نوح اور اولاد ابراہیم اور اولاد عمران بعض بعض کی اولاد ہیں یعنی ایک ہی نسل ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کے بعد تمام نبی بمع آل عمران کے آپ کی اولاد ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نوح علیہ السلام کی اولاد سے ہیں اور نوح علیہ السلام آدم علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ (بیضاوی وشیخ زادہ)

تنبیہ: راقم نے ترجمہ تفسیر معالم التنزیل سے لیا ہے، اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ احکام القرآن للجصاص سے لیا ہے۔

"(ذریة بعضها من بعض) فی التناسل لان جمیعهم ذریة آدم ثم ذریة نوح ثم ذریة ابراهیم علیهم السلام" (جصاص)

یہ ایک نسل ہے کیونکہ تمام آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، پھر نوح علیہ السلام کی اولاد ہیں، پھر ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔

فائدہ: "وقال الامام الزاهد ولد بعضها من بعض وهذا شهادة من الله تعالی علی طهارة نسب الانبیاء"

امام زاہد رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ رب تعالیٰ کے ارشاد "بعضها من بعض" سے یہ ثابت کیا گیا کہ انبیاء کرام ایک دوسرے کی اولاد ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف انبیاء کرام کے نسب کے پاکیزہ ہونے پر شہادت مرتب ہوگئی۔

سبحان اللہ! رب تعالیٰ کی گواہی کے بعد بھی انبیاء کرام کے والدین کو کوئی کافر ثابت کرنے کی کوشش کرے تو وہ بدبخت ہے، اللہ تعالیٰ ہی اسے ہدایت دے تو وہ راہ راست پر آسکتا ہے ورنہ بھٹکتے بھٹکتے جہنم کے گڑھے میں گر جائے گا۔

"وفیه دلیل علی ان انکحة الکفار صحیحة علی ای وجه یعتقدون فیما بینهم"

اسی زیر بحث آیہ کریمہ سے ایک اور مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ کفار جو بھی عقیدہ رکھتے ہیں، وہ اپنے عقیدہ کے مطابق جس طرح بھی نکاح پڑھائیں گے ان کا نکاح صحیح ہوگا، اگر دونوں میاں بیوی ایمان لے آئیں تو ان کو نئے نکاح کی ضرورت نہیں ہوگی، بلکہ پہلا نکاح ہی کافی ہوگا۔ (از تفسیرات احمدیہ)

اصطفاء و محبت و خلۃ میں فرق:

اصطفاء عام ہے محبت وخلۃ سے، یہ تمام انبیاء کرام کو شامل ہے "لانهم خيرة الله وصفوته" اسلئے کہ تمام انبیاء کرام اللہ تعالی کے چنے ہوئے برگزیدہ ہیں اور تمام ہی اللہ تعالی کے پسندیدہ ہیں، اس کی طرف سے منصب نبوت پر منتخب کیے ہوئے ہیں۔ البتہ بعض انبیاء کرام کو بعض پر مراتب ودرجات کے لحاظ پر فضیلت حاصل ہے، ارشاد باری تعالی ہے ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ یہ رسول ہیں ہم نے فضیلت دی بعض کو بعض پر۔

محبت تمام سے اخص ہے "فاخص المراتب هو المحبة المشار اليها بقوله ورفع بعضهم درجات" تمام مراتب سے اخص درجہ محبت کا ہے، جس کی طرف اللہ تعالی کے ارشاد گرامی سے اشارہ مل رہا ہے اور بعض کے درجات کو بلند کیا۔ "فلذلک کان افضلهم حبيب الله محمدا ﷺ" اسی وجہ سے اللہ کے حبیب حضرت محمد ﷺ کو سب سے زیادہ فضیلت حاصل ہے۔

"ثم الخلة التى هى صفة ابراهيم عليه السلام" محبت کے بعد خلۃ کا مقام ہے جو ابراہیم علیہ السلام کی صفت ہے، یعنی آپ خلیل اللہ ہی۔ "واعمها الصفاء الذى هو صفة آدم صفى الله" صفاء پہلی دونوں صفتوں کے بعد درجہ میں ہے، اسی لئے آدم علیہ السلام صفی اللہ ہیں۔ (روح البیان)

﴿ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ﴾ انبیاء کرام کا بعض کا بعض سے ہونا" اس کے دو مطلب ہیں، ایک یہ کہ وہ دین میں بعض موافق ہیں بعض کے، اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ بعض اولاد ہیں بعض کی۔ تقریبا اصل معنی میں یہی ہے کہ بعض اولاد ہیں بعض کی، اسی معنی کے ضمن میں پہلے دونوں معانی موجود ہیں آپ اسے دیکھیں۔

ولادت کی دو قسمیں ہیں، صوری اور معنوی، ولادت معنوی کے لحاظ پر ہر نبی دوسرے نبی کے موافق اور متابع ہے توحید اور معرفت میں، اور باطنی عقائد یعنی اصول دین وہ ایک دوسرے کے مطابق ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کی ذریت معنوی ہوئے، یہ ہے دین میں بعض بعض سے ہیں۔

یہی مطلب ہوگا بعض مشائخ کا بعض کے ساتھ علم تصوف میں موافق ہونے اور معمولات میں ایک

دوسرے کے موافق ہونے کا، اسی وجہ سے مشائخ کو بھی ایک دوسرے کی ذریت معنوی کہا جاتا ہے۔

آباء کی تین قسمیں:

"الآباء ثلاثة اب ولدک واب رباک واب علمک" آباء تین ہیں۔

(۱) وہ جو تمہاری پیدائش کا ذریعہ ہے، یعنی حقیقی باپ۔

(۲) وہ باپ جس نے تمہاری تربیت کی ہے۔

(۳) وہ باپ جس نے تمہیں علم سکھایا۔

خیال رہے کہ بعض حضرات نے تربیت کرنے والے کو علیحدہ ذکر نہیں کیا، حقیقی آباء یا اساتذہ جو مجازی آباء ہیں ان کے ضمن میں لایا ہے۔ البتہ تیسرا باپ انہوں نے سر بیان کیا ہے۔

حقیقت ومجاز میں مناسبت:

جس طرح ولادت صوریہ میں وجود بدن باپ کے نطفہ سے ماں کی رحم (بچہ دانی) میں پیدا ہوتا ہے، اسی طرح وجود قلب ولادت حقیقیہ میں شیخ اور معلم کی پھونک یعنی ان کی تربیت سے استعداد نفس کی رحم میں پیدا ہوتا ہے۔ اس ولادت معنویہ پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول دلالت کررہا ہے، آپ فرماتے ہیں "لن یلج ملکوت السماوات من لم یولد مرتین" آسمانوں کی بادشاہیوں میں ہرگز کوئی داخل نہیں ہوگا جب تک وہ دو مرتبہ پیدا نہ ہوا۔

آپ کے اس قول کا مطلب یہی ہے کہ اسے ذریت صوری کے بعد ذریت معنوی ہونے کا بھی شرف حاصل ہو تو اس کی رسائی ملکوت سماوی تک ہوگی، جو ذریت معنوی سے محروم رہا وہ ملکوت سماوات کی رسائی سے بھی محروم رہا۔

ایک عظیم فائدہ اور عظیم تنبیہ:

ذریت معنوی اکثر طور پر ذریت صوریہ کے نسل میں تابع ہوتی ہے، "ولذلک کان الانبیاء فی الظاهر ایضا نسلا واحدا لمرة شجرة واحدة" اسی وجہ سے انبیاء کرام ظاہرا ایک نسل ہیں، گویا کہ ایک درخت کے پھل ہیں۔

"وسببه ان الروح فی الصفاء والکدورة یناسب المزاج فی القرب من الاعتدال الحقیقی وعدمه وقت التکون"

وجہ اس کی یہ ہے کہ بیشک روح صفاء وکدرت (صاف ہونے، مٹیالا ہونے) میں مزاج کے مناسب ہوتا ہے، تکوین کے (معرض وجود میں لاتے) وقت ہی جس میں اعتدال حقیقی پایا گیا اسے تقرب حاصل ہو گیا اور جسے اعتدال حقیقی حاصل نہ ہوا اس میں تقرب بھی نہیں پایا گیا۔

ہر روح کا مزاج اس کے مناسب ہوتا ہے اور اس کے ساتھ خاص ہوتا ہے کیونکہ فیض مناسبت کی وجہ سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ ارواح ازل وابد میں اللہ کے تقرب اور دوری کے لحاظ پر مختلف مزاج رکھیں گے، کیونکہ جن کو صفائی حاصل ہو گی، انہیں قربت بھی حاصل ہو گی، جنہیں کدورت حاصل ہو گئی انہیں دوری حاصل ہو گی۔ (ماخوذ از روح البیان)

تنبیہ: "فمن كان غذاء ه حلالا طيبا وهيآت نفسه فاضلة نورانية ونياته صادقة حقانية جاء ولده مؤمنا صديقا اووليا اونبيا، ومن كان غذاء ه حراما وهيآت نفسه خبيثة ظلمانية ونياته فاسدة ردية جاء ولده فاسقا او كافرا اوزنديقا"

اصل میں غذائیں بدن میں مؤثر ہوتی ہیں جس شخص کی غذاء حلال، پاکیزہ ہو اور اس کے نفس کی ہیئتوں میں فضیلت ونورانیت پائی جائے، نیات صادق وحق پائی جائیں تو اس کی اولاد مؤمن وصدیق ہو گی، یا ولی ہو گی یا عظیم منصب کی ذاتوں میں سے کوئی ذات ہو گی جو منصب نبوت پر فائز ہو گی اور جس شخص کی غذا حرام ہو گی، اور اس کی ھیآت نفس خبیث وظلمانی ہوں گی اور اس کی نیات فاسد وردی ہوں گی تو اس کی اولاد بھی فاسق یا کافر یا زندیق ہو گی "العیاذ باللہ"

اصل بات یہ ہے کہ جس طرح کی غذا ہو گی، اسی طرح کا گوشت اور خون اور نطفہ ہو گا، جیسا نطفہ ہو گا اسی طرح کی اولاد ہو گی۔ (از روح البیان)

روح البیان کے یہ الفاظ دیکھ کر ("والا غذية مؤثرة فی البدن") غذائیں بدن میں مؤثر ہوتی ہیں جیسی غذا ہو گی، ایسا ہی بدن ہو گا") میں خیال کرتا ہوں کہ آج تک میں نے کتنا اچھا جواب دیا ہے، جب مجھ سے کسی نے پوچھا میرا دوست یہودی ہے یا عیسائی ہے یا قادیانی ہے یا شیعہ ہے میرا اس کے ساتھ کھانا پینا کیسا ہے؟ تو میں نے ہمیشہ یہ جواب دیا اسے نہیں دیکھا جائے کہ جائز ہے یا ناجائز ہے، بلکہ اسے دیکھا جائے کہ اس کے برے اثرات کتنے مرتب ہوں گے۔

﴿ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴾ "اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔"

اللہ تعالیٰ بندوں کے اقوال کو سننے والا ہے اور ان کے دلوں کی باتوں اور ان کے افعال کو جاننے والا ہے، "وانما يصطفى من خلقه من يعلم استقامته قولا وفعلا" بیشک اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے ان کو ہی چن لیتا

ہے، جنہیں وہ جانتا ہے کہ انہوں نے قول و فعل میں ثابت رہنا ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ اور اسی طرح رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کے مطابق ہے ﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا وَكَانُوْا لَنَا خَاشِعِيْنَ﴾ بیشک وہ خیرات میں جلدی کرتے ہیں اور ہم سے دعاء کرتے ہیں خوشی اور ڈر میں، وہ ہمارے لئے ہی عجز اختیار کرنے والے ہیں۔

اس تفسیر کے مطابق آیۃ کریمہ کی ابتداء میں انبیاء کرام اور نیک لوگوں کا تذکرہ ہے اور انتہاء میں بھی ان کا ہی تذکرہ ہے۔ اور ایک دوسری تفسیر کے مطابق ''اللہ سننے جاننے والا ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ یہود کہتے تھے کہ ہم ابراہیم علیہ السلام اور اولاد موسیٰ سے ہیں لہٰذا ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔ نصرانی کہتے تھے عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، تو رب تعالیٰ نے فرمایا اللہ ان کے اقوال باطلہ کو سننے والا ہے اور ان کی اغراض فاسدہ کو جاننے والا ہے۔ اس تفسیر کے مطابق ابتداء میں انبیاء کرام کا تذکرہ ہے اور انتہاء میں ان کی تکذیب کرنے والوں کو وعید ہے۔ ''واللہ اعلم بالصواب''

(ماخوذ از کبیر)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿اِذْ قَالَتِ امْرَاَةُ عِمْرَانَ رَبِّ اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ٥﴾ (آیۃ نمبر ۳۵)

(1) جب عمران کی بی بی نے عرض کی اے رب میرے میں تیرے لئے منت مانتی ہوں جو میرے پیٹ میں ہے کہ خالص تیری ہی خدمت میں رہے، تو تو مجھ سے قبول کرلے، بیشک تو ہی ہے سنتا جانتا۔

(2) یاد کرو جب کہا عمران کی زوجہ نے اے میرے رب بیشک میں نے نذر مانی ہے تیرے لئے، جو میرے پیٹ میں ہے وہ آزاد ہوگا، تو تو قبول کر مجھ سے بیشک تو سننے والا، جاننے والا ہے۔

مختصر مطلب:

عمران ابن ماثان بنی اسرائیل کے سردار تھے، یہ سارا قبیلہ بنو ماثان بنی اسرائیل کا سردار تھا، اسی قبیلہ کے لوگ اہل علم تھے، اور بادشاہت بھی اسی قبیلہ میں تھی، اور اس قبیلہ کے لوگ نیکی اور تقویٰ میں بھی دوسروں سے آگے تھے، اور

یہی لوگ بیت المقدس کے خدمتگذار بھی تھے، عمران کی زوجہ حنہ بنت فاقوذا بانجھ تھیں، ان کی کوئی اولاد نہ تھی، عمر رسیدہ ہو گئیں، تو ایک دن آپ درخت کے سایہ میں بیٹھی ہوئی تھیں، دیکھا کہ ایک پرندہ اپنے بچوں کے منہ میں کھانے کی کوئی چیز (چوگ) ڈال رہا ہے، تو ان کے دل میں ایک حرکت، جوش، تمنا پیدا ہوئی کہ کاش میری بھی اولاد ہوتی تو میں اس کی پرورش کرتی، اسی حال میں انہوں نے رب تعالی کے حضور عرض کیا، اے میرے رب مجھے اولاد عطاء فرما، ساتھ ہی نذر مان لی کہ اے میرے رب اگر تو نے مجھے اولاد عطاء کی تو میں اسے بیت المقدس کی خدمت کیلئے تمام مشاغل سے آزاد کردوں گی، اللہ تعالی نے آپ کی دعاء کو قبول کرلیا، آپ حاملہ ہوگئیں تو رب تعالی کے حضور عرض کی ﴿ فَتَقَبَّلْ مِنِّي ﴾ "یعنی تقبل منی مانذرته" اے میرے رب جو میں نے نذر مانی تھی اسے قبول فرمالے۔ ﴿ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴾ بیشک تو میری باتوں کو سننے والا ہے اور میری نیتوں کو جاننے والا ہے۔ (ماخوذ از مظہری)

"محررا" منصوب محل الحالية ای متقا لخدمة بيت المقدس لااشغله بشئی من الدينا خالصا مفرغا لعبادة الله مكان هذا النذر مشروعا فی دينهم فی الغلمان" (مظہری)

"محررا" پر نصب (زبر ہے) اور حال واقع ہے یعنی اے میرے رب بیشک میں نے تیرے لئے نذر مان لی ہے، جو میرے پیٹ میں ہے حال یہ ہے کہ وہ آزاد ہوگا، بیت المقدس کی خدمت کیلئے، اس کو میں دنیا کے کسی کام میں مشغول نہیں رکھوں گی، خالص فارغ ہو کر اللہ تعالی کی عبادت میں مشغول ہوگا، یہ نذر اس وقت ان کے دین میں بچوں کے حق میں جائز تھی، مذکر بچے بیت المقدس پر وقف کئے جاتے تھے جو بیت المقدس کی خدمت گذاری میں رہتے اور خالص اللہ تعالی کی عبادت کرتے۔

"اخرجه ابن جرير عن قتادة والربيع كان اذاحرر غلام جعل فی الكنيسة يكنسها ويخدمها ولا يبرحها حتی يبلغ الحلم ثم يخير ان احب اقام فيه وان احب ذهب حيث شاء" (مظہری)

قتادہ اور ربیع کی روایات میں ہے کہ جب کسی بچے کو دنیاوی کاموں سے آزاد کر کے عبادت خانہ کی خدمتگذاری کیلئے وقف کیا جاتا، تو اسے عبادت خانہ میں داخل کر دیا جاتا وہ جھاڑو دیتا، ہر طرح کی عبادت خانہ کی خدمت کرتا، بالغ ہونے تک وہیں رہتا، پھر اسے اختیار ہوتا، چاہتا تو وہیں رہتا تمام وقت خالص اللہ تعالی کی عبادت میں مشغول ہوتا، اور چاہتا تو وہاں سے نکل آتا، جہاں چاہتا وہاں ہی چلا جاتا۔

تنبیہ: "محررا" کا لغوی معنی ہے "آزاد" اور یہاں آیۃ کریمہ میں مراد یہ ہے کہ وہ دنیاوی مشاغل سے آزاد ہو کر بیت المقدس کی خدمت کرے گا، اور خالص اللہ تعالی کی عبادت کرے گا، اعلی حضرت رحمہ اللہ نے

مرادی ترجمہ کیا ہے''خالص تیری خدمت میں رہے''راقم نے لغوی معنی تحریر کیا ہے''وہ آزاد ہوگا'' تاہم مظہری کی عبارت بمع ترجمہ کے(جوذکر ہو چکا ہے)دیکھیں تو دونوں معانی مجتمع نظر آئیں گے۔

فائدہ: ''ولم یکن احد من الانبیاء والعلماء الاومن نسله محرر لبیت المقدس''

اس وقت انبیاء کرام اور علماء کرام کی اولاد کو بیت المقدس کی خدمت کیلئے ضرور وقف کیا جاتا، جو بالغ ہونے تک ضرور بیت المقدس کی خدمت میں مشغول ہوتے۔

بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ عمران کی زوجہ حنہ نے مذکر اولاد کی دعاء کی کیونکہ نذر ماننے سے پتہ چل گیا کہ بیت المقدس کی خدمت میں مذکر بچے مقرر کیے جاتے، مؤنث بچیاں مقرر نہیں کی جاتی تھیں، لھذا ان کا نذر ماننا مذکر بچے کی دعاء اور نذر کو واضح کرتا ہے۔

لیکن الفاظ عام تھے ﴿مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا﴾ (میرے پیٹ میں جو بھی ہے وہ آزاد ہوگا) ان الفاظ میں مذکر ومؤنث کا کوئی ذکر نہ تھا اسی وجہ سے ان کے زوج عمران نے انہیں کہا:

''ویحک ماصنعت ارأیت ان کان مافی بطنک انثی لایصلح لذلک فوقعا من ذلک فی هم''

تم پر افسوس یہ تم نے کیا نذر مان لی، اگر تمہارے پیٹ میں مؤنث بچی ہوئی جو بیت المقدس کی خدمت پر مقرر نہ کی جاسکی تو تم کیا کروگی؟ اس پر دونوں بہت بڑے غم میں مبتلاء ہوگئے۔

عمران تو اسی غم کے دوران ہی وفات پاگئے، لیکن ان کی زوجہ ان کے بعد زندہ رہیں۔ (ماخوذ از مظہری)

حضرت عیسی اور حضرت یحیی علیہما السلام میں رشتہ داری:

علامہ اسمٰعیل حقی رحمہ اللہ نے ایک مسئلہ کا حل بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اس آیۃ کریمہ میں ہامان سے مراد وہی ہامان ہیں جو عیسی علیہ السلام کے نانا اور حضرت مریم کے والد ہیں، یہاں موسی علیہ السلام کے والد ہامان مراد نہیں، اگرچہ اتفاقی امر یہ ہے کہ عیسی علیہ السلام کی والدہ کا نام بھی مریم ہے اور حضرت موسی علیہ السلام کی بہن کا نام بھی مریم ہے، لیکن دونوں عمرانوں میں ایک ہزار آٹھ سو سال کا فرق ہے۔ حضرت عیسی علیہ السلام کی والدہ کا نام اور لقب''مریم بتول ہے''

لھذا پتہ یہ چلا کہ آیۃ کریمہ میں تذکرہ مریم بتول کا ہے، ان کی کفالت حضرت زکریا علیہ السلام نے کی ہے، حضرت موسی علیہ السلام کی بہن مریم مراد نہیں۔

''وان زکریا بن اذن وعمران بن ماثان کانا فی عصرواحد وقد تزوج زکریا بنته

ایشاع اخت مریم فکان یحیی ویسی علیھما السلام ابنی خالۃ"

بیشک زکریا بن اذن اور عمران بن ماثان دونوں ایک زمانہ میں تھے، تحقیق زکریا نے عمران کی بیٹی سے نکاح کیا جس کا نام ایشاع تھا جو حضرت مریم کی بہن تھیں، اس طرح حضرت یحیی علیہ السلام اور حضرت عیسی علیہ السلام خالہ زاد بھائی ہیں۔
(از روح البیان)

ابھی جو رشتہ ذکر کیا ہے اس کے قائل محی السنۃ، علامہ رازی، علامہ بیضاوی وغیرہ (رحمھم اللہ) بھی ہیں ان حضرات نے اپنے موقف پر یہ دلیل قائم کی ہے کہ بخاری مسلم میں معراج کے واقعہ میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد یہ ہے "فاذاانا بابنی الخالۃ عیسی ابن مریم ویحیی ا بن زکریا" پھر میری ملاقات دو خالہ زاد یعنی عیسی بن مریم اور یحیی بن زکریا علیھما السلام سے ہوئی اس حدیث پاک سے بھی معلوم ہوا کہ یہ دونوں حضرات خالہ زاد تھے۔

جمہور علماء کرام نے یہ کہا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کی زوجہ حضرت مریم کی خالہ تھیں یعنی ایشاع حنہ کی بہن تھی نہ کہ مریم کی، ان حضرات نے حدیث پاک کی توجیہ یہ بیان کی کہ حدیث پاک میں مجاز پایا گیا ہے، کثیر طور پر خالہ کی بیٹی کو عزت وتکریم کے پیش نظر خالہ کہہ دیا جاتا ہے۔ (جیسے ہمارے رواج میں ماں کی خالہ اور ماموں کو بچے بھی خالہ اور ماموں کہہ دیتے ہیں، یہ بھی مجاز ہے)

"والغرض ان بینھما الصلوۃ والسلام ھذہ الجھۃ من القرابۃ وھی جھۃ الخؤلۃ"

مقصد صرف ان دونوں انبیاء کرام کی قربت کو بیان کرنا ہے کہ ان دنوں میں باعتبار خالہ کے رشتہ پایا گیا ہے۔
(روح المعانی)

جمہور حضرات کی دلیل کی طرف روح البیان میں بھی اشارہ مل رہا ہے کہ عمران کی زوجہ حنہ بانجھ تھیں ان کی کوئی اولاد ہی نہیں تھی، دعاء اور نذر سے حضرت مریم ان کے پیٹ میں آئیں، ابھی مریم پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں تو عمران کا وصال ہو گیا، لھذا حضرت یحیی کو حضرت عیسی (علیھما السلام) کا خالہ زاد کہنا درست نہیں۔ جمہور کی اس دلیل کا جواب بیضاوی رحمہ اللہ کے ان الفاظ سے دیا گیا ہے۔

"وکان یحیی وعیسی علیھما السلام ابنی خالۃ من الاب" یحیی علیہ السلام اور عیسی علیہ السلام خالہ زاد بھائی تھے، حضرت یحیی علیہ السلام کی والدہ حضرت مریم کی باپ کی جانب سے بہن تھی، یعنی عمران کی کسی اور زوجہ کی بیٹی تھی۔
(واللہ اعلم بالصواب)

طلباء کرام کے ذوق کیلئے تفصیلی بحث نقل کر دی گئی، دونوں طرف دلائل ہیں جس کے بھی آپ قائل ہوں دلائل ساتھ ہوں گے، راقم بھی کبھی بزرگوں کے اختلاف میں فیصلہ کن بات کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے، شیخ زادہ نے

عجیب انداز پر تطبیق دی ہے، جس میں دونوں قول سمٹ آتے ہیں، وہ یہ ہے، کہ عمران کا نکاح پہلے حنہ کی والدہ فاقوذا سے تھا، جس کے شکم سے ایشاع پیدا ہوئی، حنہ عمران کی ربیبہ تھی یعنی فاقوذا کے پہلے خاوند کی بیٹی تھی، پھر عمران نے اپنی ربیبہ حنہ سے نکاح کیا یہ اس شریعت میں جائز تھا اگر چہ ہماری شریعت میں جب ایک عورت سے نکاح اور مجامعت ہو جائے تو اس کی پہلی بیٹی ربیبہ سے نکاح کبھی بھی نہیں ہوسکتا۔

حنہ کے شکم سے حضرت مریم پیدا ہوئیں، لھذا ایشاع حضرت مریم کے باپ کی بیٹی ہونے کی وجہ سے بہن ہیں، اور نانی کی بیٹی ہونے کی وجہ سے خالہ ہیں۔ یہ تطبیق دینے کے بعد آپ لکھتے ہیں" **وھذا توفیق جد الا انه احتمال عقلی لاتؤیده الروایة**" دونوں قولوں میں یہ توفیق بہت عمدہ ہے، لیکن عقلی دلیل ہے، کوئی روایت اس کی تائید نہیں کرتی۔ (شیخ زادہ)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

"**حـنـه**" (حاء مہملہ، نون) عربی میں کسی عورت کا نام نہیں البتہ عامر کی کنیت ابو حنہ بدری ہے، اور ان کو ابوحبہ بھی کہا گیا۔ ایک شام کے علاقہ میں دیر حنہ ہے، ایک اور دیر حنہ حیرہ میں ہے جس کو ابونواس بھی کہا گیا ہے۔

"**خنه**" (خاء معجمہ اور نون سے) کوئی نام نہیں سوائے خنہ بنت یحیٰ ابن اکثم قاضی کے یہ محمد بن نصر کی ماں ہیں۔

"**جـنـه**" (جیم سے) سے کوئی نام عرب میں نہیں پایا گیا سوائے "ابـو جـنـه" کے جو ذوالرمہ شاعر کا ماموں ہے۔ البتہ "حبہ" باء سے یہ نام بہت پایا گیا ہے، ابوحبہ انصاری، اور ابوالسنابل بن بعکک کا نام بھی حدیث سبیعہ (مصغر) میں "حبہ" آیا ہوا ہے۔

حدیث سبیعہ یہ ہے کہ یہ سبیعہ بنت الحارث اسلمیہ سعد بن خولہ کی زوجہ تھی، ان کا خاوند مکہ میں فوت ہوگیا:

"**فقال لها ابو السنابل حبة ان اجلک اربعة اشهر وعشر وقد کانت وضعت بعدوفاة زوجها بليال قيل خمس وعشرون ليلة وقيل اقل من ذلک فلما قال لها ابو السنابل ذلک اتت الی النبی ﷺ فاخبرته فقال لها "قد حللت فانکحی من شئت"**"

تو ان کو ابوالسنابل حبہ نے بتایا کہ تمہاری عدت چار مہینے دس دن ہے حالانکہ خاوند کی وفات کے پچیس دن یا اس سے بھی کم مدت میں اس کے ہاں ولادت ہو چکی تھی، جب ابوالسنابل نے اس عورت کو عدت بتائی تو وہ نبی کریم علیہ السلام کی خدمت میں آئی اور ماجرا بیان کیا تو آپ نے فرمایا، تم عدت سے فارغ ہو چکی ہو جس سے چاہو تم نکاح کرلو۔

مقصد بیان تو صرف یہ ہے کہ ابو السنابل کا نام "حبۃ" تھا۔ (ماخوذ از قرطبی، تھذیب، طبقات ابن سعد)

طلباء کرام ایک اور بات ذہن نشین کریں:

عمران لفظ عجمی ہے، عجمہ اور علمیت کی وجہ سے غیر منصرف ہے، اگر لفظ عربی ہو تو عمر سے ماخوذ ہوگا، پھر بھی غیر منصرف ہوگا، ایک سبب علم ہوگا اور دوسرا سبب الف ونون زائدتان۔ (البحر المحیط)

فائدہ جلیلہ: "واخرج ابن سعد وابن ابی حاتم عن جعفر بن محمد عن ابیه عن جده ان علیا قال للحسن قم فاخطب الناس قال انی اهابک ان اخطب وانا اراک فتغیب عنه حیث یسمع کلامه ولا یراه فقام الحسن فحمد الله والنی علیه وتکلم ثم نزل فقال علی ﷺ "ذرية بعضها من بعض والله سميع عليم"

ابن سعد اور ابن ابی حاتم نے جعفر بن محمد سے روایت کی وہ اپنے باپ، دادا سے روایت کرتے ہیں بیشک حضرت علی ﷺ نے حضرت امام حسن ﷺ کو کہا اٹھو لوگوں کو خطبہ دو، تو انہوں نے عرض کیا بیشک میں آپ سے ڈرتا ہوں کہ آپ کے سامنے میں خطاب کروں، حضرت علی ﷺ وہاں سے ہٹ گئے، وہ سامنے نہیں تھے لیکن حضرت امام حسن ﷺ کا خطاب سن رہے تھے حضرت امام حسن ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی اور کلام فرمایا، تو حضرت علی ﷺ نے (اسی زیر بحث آیہ کی تلاوت کرتے ہوئے) فرمایا ﴿ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ (درمنثور)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں، عمران کی زوجہ نے جو نذر مانی وہ درحقیقت اللہ کی طرف سے الہام کے بعد تھی، اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس وحی تو نہیں آئی لیکن خواب میں آپ نے دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں تو سمجھ لیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف وحی نہیں آئی البتہ ان کے دل میں القاء کیا کہ اپنے بیٹے کو صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈال دو۔ (کبیر)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَا اُنْثٰی وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰی وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ﴾ (آیة نمبر ۳٦)

(۱) پھر جب اسے جنا بولی اے میرے رب یہ تو میں نے لڑکی جنی اور اللہ کو خوب معلوم جو کچھ وہ جنی، اور وہ لڑکا جو اس نے مانگا اس لڑکی سا نہیں اور میں نے اس کا نام مریم رکھا اور میں اسے اور اس کی اولاد تیری پناہ میں دیتی ہوں راندہوئے شیطان سے۔

(۲) جب اس عورت نے جنا مؤنث کو بولی اے میرے رب بیشک میں نے جنی ہے لڑکی، اور اللہ خوب جانتا ہے وہ جو اس نے جنی، اور نہیں (وہ لڑکا) مثل (اس) لڑکی کے اور بیشک میں نے اس کا نام رکھا مریم اور بیشک میں اسے تیری پناہ دے رہی ہوں اور اس کی اولاد کو راندے ہوئے شیطان سے۔

آیۃ کریمہ کا بیان شروع کرنے سے پہلے طلباء کرام سے معذرت یہ ہے کہ ﴿وَاِنِّیْ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ﴾ کا لفظوں کے مطابق راقم سے ترجمہ نہیں بن سکا اس لئے کچھ نہ کچھ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ سے اردو جملہ درست کرنے کیلئے نقل کر دیا ہے۔ لفظی ترجمہ یوں ہونا چاہئے "بیشک میں پناہ میں دیتی ہوں اسے تیری، اور اس کی اولاد کو راندے ہوئے شیطان سے۔

خیال رہے کہ ضیاء القرآن میں حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ کافی حد تک لفظوں کے مطابق ترجمہ لکھتے ہیں، لیکن اس مقام پر آپ کا ترجمہ بھی لفظوں کے مطابق نہیں، آپ کا ترجمہ یہ ہے "میں تیری پناہ میں دیتی ہوں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود (کے شر) سے۔

مختصر مطلب: عمران کی زوجہ نے اگرچہ مطلقاً نذر مانی تھی کہ جو میرے پیٹ میں ہے میں اسے بیت المقدس کی خدمت پر مقرر کر دوں گی، لیکن ضمناً دعاء مذکر بچے کیلئے ہی تھی، اور نذر بھی مذکر کیلئے، کیونکہ بیت المقدس کی خدمت پر مقرر مذکر ہی ہوا کرتے تھے مؤنث نہیں۔ جب حنہ زوجہ عمران نے بچی جنی تو حسرت سے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا، اے میرے رب! میں نے لڑکی جنی اب میں اسے بیت المقدس کی خدمت پر کیسے مقرر کروں

گی، تو رب تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ خوب جانتا ہے جو اُنے لڑکی جنی، یعنی حسرت و پریشانی کی ضرورت نہیں، تم مطلقا لڑکے کی دعاء کر رہی تھی، تمہاری دعاء میں یہ نہیں تھا کہ وہ لڑکا خاص منصب یعنی نبوت پر فائز ہو، اس لئے تم جس لڑکے کی دعاء کر رہی تھی وہ اس لڑکی جیسا نہیں جو تم نے جنی ہے، اس لئے کہ اس کو ایک عظیم نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں ہونے کا شرف حاصل ہونا ہے، اور رب تعالیٰ کی قدرت کا ظہور اس بچی کے ذریعے ہونے والا ہے کہ اسے بغیر باپ کے بچہ عطاء کیا جائے گا۔ رب تعالیٰ نے کہا، یا عمران کی زوجہ نے کہا'' بیشک میں نے اس بچی کا نام مریم رکھا، پھر اس عورت نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا بیشک میں اس بچی اور اس کی ہونے والی اولاد کو تیری پناہ میں دے رہی تا کہ یہ شیطان مردود کے شر سے محفوظ رہے۔

﴿فَلَمَّا وَضَعَتْهَا﴾ ''جب اس عورت نے جنا مؤنث کو''

دینی طلباء کرام کی توجہ کی ضرورت:

''وضعت'' میں فاعل کی ضمیر ''امراۃ عمران'' کی طرف لوٹ رہی ہے، ''ھا'' ضمیر منصوب متصل مفعول کی یا تو لفظ ''ما'' کی طرف لوٹ رہی ہے، جو ''مافی بطنی'' میں ہے، لفظ ''ما'' اگر چہ مذکر ہے لیکن معنیٰ مؤنث ہے، یا ضمیر لوٹ رہی ہے لفظ ''نفس'' مقدر کی طرف جو لفظا اور معنیٰ مؤنث ہے، یا ضمیر لوٹ رہی ہے ''حبلۃ'' مقدر کی طرف جو لفظا اور معنیٰ مؤنث ہے، یا ضمیر لوٹ رہی لفظ ''نسمۃ'' کی طرف جو لفظا اور معنیٰ مؤنث۔ (از روح المعانی)

سب صورتوں میں تقریبا معنیٰ وہی ہوگا جو راقم نے وضاحت سے ذکر کر دیا یعنی الفاظ کے مطابق معانی یوں ہوں گے، جب اس عورت نے مؤنث کو جنا، جب اس عورت نفس مؤنث کو جنا، جب اس عورت ذی روح مؤنث کو جنا، جب اس عورت مؤنث حمل کو جنا۔

﴿قَالَتْ رَبِّ اِنِّی وَضَعْتُهَا اُنْثٰی﴾ ''بولی اے میرے رب بیشک میں نے جنی لڑکی''

یعنی عمران کی زوجہ کی تمنا تھی کہ جو میرے پیٹ میں ہے وہ بچہ ہو، تا کہ میں اسے بیت المقدس کی خدمت پر مقرر کر دوں، جب بچی پیدا ہوئی تو حسرت اور خوف سے کہا، اے میرے رب میں لڑکی جنی ہے، خوف اس لئے ہوا کہ نذر کو کیسے پورا کروں گی، بچی کس طرح بیت المقدس کی خدمت پر مقرر ہوگی۔ تو رب تعالیٰ نے فرمایا'' اور اللہ خوب جانتا ہے جو اس نے جنی۔ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہوگا:

"واللہ اعلم بما وضعت تعظیما لولدھا وتبجیلا لھا بقدر ذلک الولد"

اور اللہ خوب جانتا ہے جو اسے عظمت والی بچی جنی، اور وہ بچی جنی جو رب تعالیٰ کے ہاں مقبول اور قدرومنزلت والی ہے، اور اس کے ساتھ بڑے عظیم امور معلق ہیں، اور اس کا بچہ جہان والوں کیلئے نشانی بنے گا، لیکن عمران کی زوجہ کو پتہ نہیں اس لئے حسرت کر رہی ہے۔

خیال رہے کہ ایک قرأت میں "وضعت" تاء کی پیش سے متکلم کا صیغہ ہے، یعنی عمران کی زوجہ نے کہا "اور اللہ خوب جانتا ہے جو میں نے جنی" "ولبت انھا لما قالت ذلک للاعتذار لاللاعلام" اور اس سے یہ ثابت ہوا کہ عمران کی زوجہ نے یہ عذر کے طور پر کلام پیش کیا، نہ کہ بتانے کیلئے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثٰى﴾: "اور نہیں (وہ لڑکا مثل (اس) لڑکی کے۔"

"الذکر" اور "الانثی" پر الف لام عہد خارجی ہے، یعنی عمران کی زوجہ نے جو مطلق لڑکا طلب کیا وہ اس لڑکی جیسا نہیں جو اسے عطاء کی گئی۔

مذکر کی فضیلت کی وجوہ:

(۱) وسبب ھذا التفضیل من وجوہ احدھا ان شرعھم انہ یجوز تحریر الذکور دون الاناث"

مذکر کی فضیلت کی کئی وجوہ پائی گئی ہیں، ایک ان میں سے یہ ہے کہ بیشک شریعت نے جائز رکھا کہ مذکر کو بیت المقدس کی خدمت کیلئے مقرر کیا جائے، باقی مشاغل سے اسے آزاد کر دیا جائے، یہ شرف مؤنث کو حاصل نہ تھا۔

(۲) "والثانی ان الذکر یصح ان یستمر علی خدمۃ موضع العبادۃ ولایصح ذلک فی الانثی لمکان الحیض وسائر عوارض النسوان"

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ بیشک مذکر لگاتار، ہمیشہ مقام عبادت کی خدمت بجا لا سکتا ہے، مؤنث یہ کام ہمیشہ نہیں کر سکتی، کیونکہ حیض اور نسوانی عوارض اس میں پائے جاتے ہیں جو اس کے کام میں ہمیشگی سے مانع ہیں۔

(۳) "والثالث الذکر یصلح لقوتہ وشدتہ للخدمۃ دون الانثی فانھا ضعیفۃ لاتقوی علی الخدمۃ"

تیسری وجہ یہ ہے کہ مذکر میں قوت و بہادری کی وجہ سے خدمت کی جو صلاحیت پائی جاتی ہے، وہ مؤنث میں نہیں پائی جاتی اسلئے کہ وہ قدرتی طور پر پیدائشی ضعیف، ناتواں، کمزور ہوتی ہے، اسلئے قوت و بہادری والے کام سرانجام دینے سے وہ قاصر ہے۔

(۴)"والرابع ان الذکر لا یلحقه عیب فی الخدمة والا ختلا ط بالناس ولیس کذلک الانثی"
چوتھی وجہ یہ ہے کہ بیشک مذکر کو خدمت پر مقرر کرنے اور لوگوں سے ملنے جلنے میں کوئی عیب نہیں لیکن عورت میں یہ عیب ہیں کہ وہ لوگوں سے مل جل کر رہے، پردہ کا پاس نہ کرے۔

(۵) "ان الذکر لایلحقه من التهمة عند الاختلاط ما یلحق الانثی"
پانچویں وجہ یہ ہے کہ مرد کو مردوں سے ملنے جلنے میں تہمت کا کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا، لیکن عورت کو تہمت کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ (کبیر)

خصوصا جہاں ایک مرد اور ایک عورت ہوں وہاں مصطفےٰ کریم ﷺ کا ارشاد گرامی صادق آتا ہے۔
"لا یخلون رجل بامراۃ الاکان ثالثهما الشیطان" (ترمذی، مشکوۃ باب النظر الی المخطوبۃ)
کوئی شخص ہرگز کسی عورت سے خلوت (ون ٹو ون ملاقات) نہیں کرے گا مگر یہ کہ وہاں ان دونوں کے ساتھ تیسرا شیطان ہوگا۔ اس حدیث پاک کی شرح میں علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:
"والمعنی یکون الشیطن معهما ویهیج شهوة کل منهما حتی یلقیهما فی الزناء" (مرقاۃ)
شیطان کا ان دونوں کے ساتھ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک خواہشات نفسانیہ ابھریں گی، یہاں تک کہ ان دونوں کو بدکاری میں مبتلاء کردیں گی۔
یہ بھی خیال رہے کہ "لا یخلون" قسم محذوف کا جواب ہے، گویا کہ کلام میں بہت زیادہ تاکید پائی گئی ہے، اور عظیم خطرات سے ڈرایا گیا ہے، یعنی آپ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اجنبی مرد کی عورت سے علیحدگی کی ملاقات میں شیطان ضرور اثر انداز ہوتا ہے۔

عمران کی زوجہ اللہ کی یاد میں مستغرق تھی:

رب تعالیٰ کے ارشاد کے بعد اس عورت کا کلام گویا کہ یوں تھا:
"کان الذکر مطلوبی وهذه الانثی موهوبة الله ولیس الذکر الذی یکون مطلوبی کالانثی التی هی موهوبة لله"
مذکر تو میرا مطلوب تھا، لیکن یہ مؤنث تو رب تعالیٰ کی عطاء ہے، میرا مطلوب مذکر اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ مؤنث کے برابر نہیں ہوسکتا۔
"وهذا الکلام یدل علی ان تلک المراۃ کانت مستغرقة فی معرفة جلال الله عالمة بان مایفعله الرب بالعبد خیر مما یریده العبد لنفسه"

اسی سے پتہ چلا کہ وہ عورت اللہ تعالی کے جلال کی معرفت میں مستغرق تھی، اور وہ جانتی تھی کہ جو اللہ تعالی بندے کو بھلائی پہنچائے وہ اس سے بہتر ہے جو بندہ اپنے لئے چاہے۔

﴿وَاِنِّی سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ﴾ ''اور بیشک میں نے اس کا نام مریم رکھا۔''

یہ کس کا قول ہے اور کس نے اس بچی کا نام مریم رکھا، اس میں دو قول پائے گئے ہیں، ایک یہ کہ یہ اللہ تعالی کا قول ہے، اسی نے بچی کا نام مریم رکھا، جیسا کہ یحیی علیہ السلام کا نام رب تعالی نے رکھا۔

"﴿وَاِنِّی سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ﴾ واثبت الله تعالى لولدها هذا الاسم" اور بیشک میں نے اس کا نام مریم رکھا'' اس کا مطلب یہ ہے کہ خود ہی اللہ تعالی نے اس بچی کا نام رکھا۔ (احکام القرآن للجصاص)

دوسرا قول یہ ہے کہ بچی کا نام عمران کی زوجہ نے رکھا، یہ کلام اس عورت کا ہے۔

"(وانی سمیتها مریم) من مقول حنة عطف على قولها (انى وضعتها) اى انى جعلت اسمها مريم"

اور بیشک میں نے اس کا نام مریم رکھا یہ مقولہ (کلام) ہے حضرت مریم کی والد حضرت حنہ کا، اس کا عطف ہے۔ ﴿اِنِّی وَضَعْتُهَا﴾ پر یعنی عمران کی زوجہ نے کہا بیشک میں نے اس کا نام مریم رکھا، ان کے اس کلام میں غرض کیا تھی؟ جب رب تعالی علام الغیوب ہے، اللہ تعالی کا تقرب حاصل کرنا ان کی غرض تھی، اور بیٹی کی حفاظت طلب کرنے کی درخواست مقصود تھی۔

اور مقصد عرض یہ تھا کہ اے اللہ اگر چہ میں اپنی نیت اور عرض میں تو کامیاب نہیں ہو سکی کیونکہ میں نے لڑکی جنی ہے جسے بیت المقدس کی خدمت پر مقرر کرنا تو مشکل نظر آتا ہے، اس لئے کہ بیت المقدس کی خدمت پر لڑکے مقرر کئے جاتے ہیں لیکن اے اللہ اگر تو مہربانی فرمائے اور اجازت دے تو اسے بیت المقدس میں عبادت کرنے کیلئے بھیج دیا جائے اور وجہ اس کلام کی یہ تھی کہ اس وقت کے رواج کے مطابق بچوں کے نام ان کا باپ رکھتا تھا، تو حضرت مریم کی والدہ نے عرض کی اے اللہ جیسا کہ تو جانتا ہے کہ اس کا باپ تو فوت ہو چکا ہے، اسلئے اس کا نام میں نے مریم رکھ دیا۔

﴿وَاِنِّیْ اُعِیْذُهَا بِکَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ﴾

''اور بیشک میں اسے اور اس کی اولاد کو تیری پناہ میں دے رہی ہوں راندے ہوئے شیطان سے۔''

"الرجيم" اى المطرود، واصل الرجيم الرمى بالحجارة" رجیم کا معنی ہانکا ہوا، راندہ ہوا اصل میں رجم کا معنی ہے پتھر مارنا۔ رب تعالی نے حضرت مریم کی والدہ کی اس دعاء کو قبول کیا، ارشاد مصطفوی اس پر شاہد ہے۔

"عن ابی هریرة ان رسول الله ﷺ قال مامن مولود یولد الانخسه الشیطان فیستهل صارخا من نخسة الشیطان الاابن مریم وامه ثم قال ابوهریرة اقرؤا ان شئتم وانی اعیذها بک وذریتها من الشیطان الرجیم" (مسلم ج۲ باب فضائل عیسی، مشکوۃ کتاب الوسوسۃ)

حضرت ابو ہریرۃ ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی بچہ نہیں پیدا ہوتا مگر یہ کہ شیطان اسے چھوتا ہے، دباتا ہے تو وہ بچہ روتا ہے، سوائے ابن مریم اور ان کی ماں کے۔ پھر حضرت ابو ہریرہ ؓ نے فرمایا، اگر تم چاہتے ہو تو یہ آیۃ کریمہ پڑھو" اور بیشک میں اسے اور اس کی اولاد تیری پناہ میں دے رہی ہوں، راندے ہوئے شیطان سے۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں "یمسه حین یولد فیستهل صارخا من مسة الشیطان" جب بچہ پیدا ہوتا تو شیطان اسے مس کرتا (چھوتا) ہے تو وہ بچہ شیطان کے چھونے سے روتا ہے۔ ایک اور روایت ابی ھریرہ میں یہ الفاظ مذکور ہیں "قال رسول الله ﷺ صیاح المولود حین یقع نزعة" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بچہ شیطان کے دبانے سے روتا ہے۔

احادیث مبارکہ میں استعمال الفاظ "مسة، مس، نخسة، نزعة، طعنة" کا ایک ہی معنی ہے، (بچے کو) ایک طرف سے دبانا۔ اس کی وضاحت دوسری حدیث میں صراحۃ موجود ہے "کل ابن آدم یطعن الشطان فی جنبه حین یولد" ہر ابن آدم جب پیدا ہوتا ہے تو شیطان اسے پہلو میں دباتا ہے۔

اعتراض: "فان قلت الانبیاء معصومون من الشیطن فلا سبیل له علیهم"

انبیاء کرام شیطان سے معصوم (بچے ہوئے ہوتے ہیں) یعنی شیطان کو ان پر غلبہ حاصل نہیں ہوتا، تو حدیث کا مطلب کیسے صحیح ہوگا؟ سوائے حضرت مریم اور حضرت عیسی علیہ السلام کو شیطان ہر بچے کو دباتا ہے۔

پہلا جواب: "اجیب بانهم معصومون من وسوسته واغوائه لا من نخسه فی اجسامهم فان ذلک لا یقدح فی عصمتهم"

تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ بیشک وہ شیطان کے وسوسہ اور بھٹکانے سے محفوظ ہیں نہ کہ جسموں میں انگلیاں چھونے اور دبانے سے، کیونکہ جسم کو دبانے سے ان کی محفوظیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور نہ ہی یہ عیب ہے۔ (ماخوذ از صاوی)

دوسرا جواب: اس میں حصر اضافی ہے، کہ عام لوگوں کا تو یہی حکم ہے کہ ان کو پیدائش کے وقت شیطان انگلیوں سے دباتا ہے جس کی وجہ سے بچے روتے ہیں، لیکن یہ حکم ہر ہر فرد کو شامل نہیں۔

طلباء کرام لفظ "**کل**" کی تین قسموں کو مدنظر رکھیں (۱) کل بمعنی کلی (۲) کلی افرادی (۳) کل مجموعی یعنی ممکن ہے کہ اس مقام کو کل مجموعی کے درجہ میں ہو۔

وقد صح ان رسول الله ﷺ قال لفاطمة حين زوجها عليا "اللهم انى اعيذهابك وذريتها من الشيطن الرجيم و كذا قال لعلى حينئذ" (رواه ابن حبان من حديث انس)

صحیح حدیث پاک سے ثابت ہے جو ابن حبان نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "بے شک رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ نکاح کیا تو ان کے حق میں یہ دعاء فرمائی "اللهم ﴿ اِنِّی اُعِیْذُهَا بِکَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴾ "اے اللہ بیشک میں اسے اور اس کی اولاد کو تیری پناہ میں دے رہا ہوں شیطان راندے ہوئے سے" اور اسی موقع پر یہی دعا حضرت علی رضی اللہ عنہ کیلئے بھی فرمائی۔

"ودعاء النبى ﷺ اولى بالقبول من دعاء امرائة عمران فارجو عصمتها و اولادها من الشيطن وعدم مسه اياهم"

نبی کریم ﷺ کی دعاء یقیناً زیادہ مقبول ہوگی بنسبت عمران کی زوجہ کے، میں امید رکھتا ہوں کہ آپ کی دعاء سے اللہ تعالیٰ نے حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو (اس دعاء کے بعد) شیطان سے محفوظ رکھا ہوگا، اور ان دونوں حضرات کی اولاد کو راندے ہوئے شیطان کے مس کرنے اور دبانے سے محفوظ رکھا ہوگا۔ (ماخوذ از مظہری)

راقم کو بھی اگرچہ جواب یہی پسند ہے تاہم علامہ قرطبی اور علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے حصر حقیقی ہی بنائی ہے کہ حدیث پاک کو ظاہر پر ہی رکھا جائے اور حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تخصیص کی جائے کہ رب تعالیٰ نے حضرت عمران کی زوجہ کی دعاء کو خصوصی شرف قبولیت عطاء فرمایا ہو، لیکن علامہ آلوسی اس پر یوں بحث فرماتے ہیں:

"والقول بانه لا يبعد اختصاص عيسى وامه بهذه الفضيلة دون الانبياء عليهم السلام ولا يلزم منه تفضيله عليهم السلام اذ قد يوجد فى الفاضل مالا يوجد فى الافضل"

جب یہ قول لیا جائے کہ اس فضیلت میں کہ شیطان کے مس سے صرف حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام محفوظ رہے باقی انبیاء کرام محفوظ نہیں رہے تو اس میں کوئی مشکل درپیش نہیں آئے گی کیونکہ بعض اوقات فاضل کو کوئی کمال حاصل ہوتا ہے جو افضل کو حاصل نہیں ہوتا۔ (روح المعانی)

یعنی جزوی فضیلت سے مکمل طور پر دوسروں پر افضل ہونا ثابت نہیں ہوتا، جیسا کہ حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ اکیلے کی گواہی دو مردوں کے برابر تھی، یہ مقام خلفاء راشدین میں سے کسی کو بھی حاصل نہ تھا لیکن پھر بھی فضیلت (مجموعی طور پر) خلفاء راشدین کو ہی حاصل رہی۔

نبی کریم ﷺ کی شان ہی بلند و بالا ہے:

نبی کریم ﷺ "کل مولود" کے عموم سے خارج ہیں، اس حدیث مذکور سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت عیسی علیہ السلام کی رسول اللہ ﷺ پر فضیلت ثابت ہو جائے یہی قول جمہور اہل علم کا ہے، اور اس کی وہ روایت تائید کر رہی ہے جو جلال رحمہ اللہ نے "البهجة السنية" میں حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے۔

"عن عکرمة قال لما ولد النبی ﷺ اشرقت الارض نورافقال ابليس لقد ولد الليلة ولد يفسد علينا امرنا فقالت له جنوده لوذهبت اليه فجاءه فركضه جبريل علیہ السلام فوقع بعدن"

حضرت عکرمہ فرماتے ہیں جب نبی کریم ﷺ کی پیدائش ہوئی تو تمام زمین آپ کے نور کی وجہ سے روشن ہوگئی، ابلیس نے کہا رات کو ایک بچہ پیدا ہوا ہے جو ہمارا معاملہ بگاڑ دے گا، تو اس کے لشکر نے کہا، کاش کہ تم اس کے پاس چلے گئے ہوتے (یعنی ایسا دبایا ہوتا کہ وہ بچہ مر چکا ہوتا) تو وہ آپ کے پاس گیا (اس کے اپنے ارادہ پر عمل کرنے سے پہلے ہی) تو جبرئیل علیہ السلام اسے ایک ٹھوکر لگائی جس سے وہ مقام عدن میں جا گرا۔ (روح المعانی)

سب سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کا اپنا ارشاد گرامی اس مسئلہ کو زیادہ واضح کر رہا ہے کہ آپ شیطان سے محفوظ ہیں۔

❁ "عن ابن مسعود قال قال رسول الله ﷺ مامنكم من احدالاوقدوكل به قرينه من الجن وقرينه من الملائكة قالوا واياك يا رسول الله ﷺ واياى ولكن الله اعانني عليه فاسلم فلايامرني،الا بخير" (رواه مسلم،مشكوة باب الوسوسة)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی ایک بھی نہیں مگر یہ کہ اس کا ایک اس کے ساتھ موکل ہوتا ہے اور ایک ساتھی فرشتہ اس کے ساتھ موکل ہوتا ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا آپ کا قرین بھی ہے یا رسول اللہ؟ آپ نے فرمایا ہاں میرا قرین بھی ہے لیکن اللہ تعالی نے مجھے اس پر غالب کر دیا ہے وہ میرا مطیع ہو گیا وہ مجھے سوائے بھلائی کے کوئی حکم نہیں دیتا۔

وضاحت حدیث: "وکل" مجہول کا صیغہ ہے توکیل سے لیا گیا ہے، یعنی بنی آدم سے جب بھی بچہ پیدا ہوتا ہے تو ابلیس کی اولاد میں سے بھی ایک بچہ پیدا ہوتا ہے جو اسے شر کا حکم دیتا ہے، اس کا نام ہوتا ہے اس کا نام ہوتا ہے "وسواس" اور فرشتوں میں سے ایک اس کا ساتھی ہوتا ہے جو اسے بھلائی کا حکم دیتا ہے اس کا نام ہوتا ہے "ملهم" "ثم الحكمة فى ذلك ظهور خسة العاصى وشرف الطائع" پھر حکمت اس میں عاصی کی خست، ذلت کمینگی کو ظاہر کرنا، اور مطیع کی بزرگی و شرافت کو ظاہر کرنا ہے۔

جب حضور ﷺ سے پوچھا گیا آپ کا قرین بھی شیطان ہے؟ تو آپ نے فرمایا ہاں ہے، (ولکن اللہ اعاننی علیہ) بالعصمة او بالخصوصیة" لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ خصوصیت عطاء فرمائی ہے کہ میں اس سے محفوظ ہوں، یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے اس پر غالب کر دیا ہے۔

"**فاسلم**" اس لفظ کو دو طرح پڑھا گیا، مجہول کا صیغہ اور میم پر پیش ہے، یعنی مجھے اس سے محفوظ کر دیا گیا ہے، اور دوسرا اس کو معروف کا صیغہ پڑھا گیا اور میم پر زبر ہے 'اسلم بالفتح ای استسلم و ذل و انقاد" کہ وہ میرا مطیع ہو گیا، میرے سامنے عاجز ہو گیا، وہ مجھے سوائے بھلائی کے کاموں کے کوئی حکم نہیں دیتا، اس حدیث پاک سے واضح ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ شیطان سے محفوظ ہیں۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج اول ص ۱۳۷، ۱۳۸)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا قَالَ يَا مَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ۝﴾ (آیۃ نمبر ۳۷)

(1) تو اسے اس کے رب نے اچھی طرح قبول کیا اور اسے اچھی پروان چڑھایا اور اسے زکریا کی نگہبانی میں دیا جب زکریا اس کے پاس اس کی نماز پڑھنے کی جگہ جاتے اس کے پاس نیا رزق پاتے کہا اے مریم یہ تیرے پاس کہاں سے آیا بولیں وہ اللہ کے پاس سے ہے، بیشک اللہ جسے چاہے بے گنتی دے۔

(2) تو قبول کیا اسے اس کے رب نے بہت اچھی قبولیت کے ساتھ، اور پروان چڑھایا اسے اچھی پروان اور نگران بنایا اس کا زکریا کو، جب داخل ہوتے اس کے پاس زکریا اس کی عبادت کی جگہ میں، پاتے اس کے ہاں رزق، کہا اے مریم کہاں سے (آتا ہے) تمہارے لئے یہ، بولیں وہ اللہ کے ہاں سے (آتا ہے) بیشک اللہ تعالی رزق دیتا جسے چاہے بغیر حساب کے۔

مختصر مطلب:

اللہ تعالی نے بنسبت مطلوب بیٹے کے حضرت حنہ کی بیٹی حضرت مریم کو بیت المقدس میں عبادت کیلئے بہت اچھی طرح قبول فرمالیا، اور ان کو اچھی طرح پروان چڑھایا، اور بیت المقدس کے خدام میں سے حضرت زکریا علیہ السلام کو اللہ تعالی نے اس بچی کا نگہبان مقرر فرمایا۔ حضرت زکریا علیہ السلام جب ان کی عبادت کے کمرہ میں داخل ہوتے تو ان کے کمرہ میں بے موسم پھل پاتے گرمیوں میں کے پھل سردیوں میں اور سردیوں کے گرمیوں میں، تو بڑے تعجب سے پوچھتے اے مریم یہ رزق تمہارے پاس کہاں سے آجاتا ہے، تو حضرت مریم نے ان کے سوال کے جواب میں کہا اللہ تعالی کے حضور سے مجھے یہ رزق ملتا ہے، اللہ تعالی جسے چاہے بے حساب رزق دیتا ہے۔

﴿فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ﴾ "تو قبول کیا اسے اس کے رب نے بہت اچھی قبولیت کے ساتھ"۔ اچھی طرح قبول کرنے سے کیا مراد ہے؟ اس کے مطالب یوں بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) "اخرج ابن جریر وابن المنزرعن ابن جریج فی قوله(فتقبلها ربها بقبول حسن)قال تقبل من امها ماارادت به الکنیسة فاجرها فیه"

ابن جریج کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشادگرامی ﴿فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ﴾ (تو قبول کیا اسے اس کے رب نے بہت اچھی قبولیت کے ساتھ) کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عمران کی زوجہ نے دعاء کی اور تمنا کی کہ اے اللہ میں نے بچی جنی ہے اسے بیت المقدس کی عبادت کیلئے قبول فرمالے اگر چہ یہ خدمت گذاری تو نہیں کرسکتی، تو اس کی دعاء اور تمنا کو اچھی طرح قبول فرمالیا، بیت المقدس میں عبادت کیلئے بھیجنے کی اجازت دے دی۔ (از درمنثور)

(۲) (فتقبلها)ای رضی بمریم فی النذر مکان الذکر ففیه تشبیه النذر بالهدیة ورضوان الله تعالی بالقبول(ربها)ای رب مریم المبلغ لها الی کمالها اللائق بها(بقبول حسن)ای تقبلها بوجه حسن تقبل به النذائر وهو اختصاصه سبحانه ایا هاباقامتها الذکر فی النذر ولم یقبل قبلها انثی" (روح المعانی بحذف)

"تو قبول کیا اسے" ای اللہ تعالیٰ مذکر کی جو نذر مانی گئی تھی اس کی جگہ مریم پر ہی راضی ہو گیا، بلکہ مریم کا انتخاب خود ہی کیا، اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی ہی قبولیت ہے۔

ضمناً ایک مسئلہ سمجھ آیا کہ اس مقام میں نذر کو ہدیہ سے تشبیہ دی گئی، اسی وجہ سے قبولیت کا ذکر فرمایا ورنہ نذر کے ساتھ قبولیت کا ذکر نہیں کیا جاتا۔

"ربها" (اس کے رب نے) یعنی مریم کے رب نے اسے قبول کیا اور اس اعلیٰ مرتبہ پر پہنچایا جو اس کی شان کے لائق تھا۔

(بقبول حسن) (بہت اچھی قبولیت کے ساتھ) یعنی جس طرح خاص نذروں کو ہدیہ سمجھ کر قبول کرلیا جائے اسی طرح حضرت مریم کو مذکر کی جگہ قبول کر لینا اللہ تعالیٰ کا خاص فضل وکرم تھا جو اس سے پہلے کسی مؤنث کیلئے اس قسم کی کوئی نذر نہیں قبول کی گئی۔

(۳) ﴿فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ﴾ المعنی سلک بها طریق السعداء"

(تو قبول کیا اس کے رب نے بہت اچھی قبولیت کے ساتھ) اس کا مطلب یہ ہے کہ اس بچی کو نیک بخت لوگوں کی راہ پر چلایا، یعنی نیک بخت بنایا۔ (قرطبی)

(۴) "عن ابن عباس وقال قوم معنی التقبل التکفل فی التربیة والقیام بشانها"

حضرت ابن عباس ﷺ فرماتے ہیں، بعض حضرت نے بیان فرمایا کہ اچھی طرح قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی اچھی تربیت فرمائی اور ان کی شان کو اچھا مقام عطاء فرمایا۔ (قرطبی)

(۵) "وقال الحسن معنی التقبل انه ما عذبها ساعة قط من لیل ولا نهار"

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں ان کو اچھی طرح قبول کرنے کا یہ مطلب ہے کہ کسی وقت بھی دن یا رات میں حضرت مریم کو کوئی تکلیف نہیں دی، جس کی وجہ سے انہیں کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوئی۔ (قرطبی)

(۶) "والقبول الحسن هو قبول المراد اهل الاجتباء دون قبول المریدین"

اچھی قبولیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کو جب مطلوب مذکر سے ترجیح دی تو وہ مرتبہ مراد میں آگئیں، ان کو چن لیا گیا، اس لئے ان کو یوں قبول کیا گیا جیسے مراد اور مجتبی کو پسند کرلیا جاتا ہے ایسا قبول نہیں کیا گیا جیسے مرید ہدیہ قبول کرتے ہیں۔ (مظہری)

(۷) "فتقبلها ربها بقبول حسن" یعنی انه تعالی عصمها وعصم ولدها عیسی علیہ السلام من مس الشیطان"

اچھی طرح قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم اور ان کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کو شیطان کے مس کرنے سے محفوظ رکھا۔ (کبیر)

(۸) اچھی طرح قبول کرنے کی ایک اور وجہ بیان کی گئی ہے:

"روی القفال عن الحسن انه قال ان مریم تکلمت فی صباها کما تکلم المسیح ولم تلتقم ثدیا قط وان رزقها کان یاتیها من الجنة"

قفال حضرت حسن بصری سے روایت کرے ہیں کہ بیشک حضرت مریم نے بچپن میں کلام فرمایا جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے کلام فرمایا، اور حضرت مریم نے پستان کو منہ نہیں ڈالا، آپ کو رزق جنت سے عطاء کیا گیا یہ سب عطائیں اچھی قبولیت تھی۔ (کبیر)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

فعول (فاء کلمہ کی نصب سے) کے وزن پر پانچ مصدر استعمال ہیں: "قبول، طهور، وضوء، وقود، ولوغ" البتہ "وقود" جب مصدر ہو تو زیادہ طور پر اس پر ضمہ آتا ہے نصب آئے تو اس اسم ہوتا ہے ایندھن کو کہا جاتا ہے مصدری معنی ہے جلانا، زجاج نے "قبول" کو بھی ضمہ سے پڑھا ہے۔ یعنی "قبول" اس مقام میں مصدر استعمال ہے۔

پھر طلباء کرام خصوصی توجہ فرمائیں کہ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ باب تفعل کا مصدر "تقبل" استعمال ہونا چاہئے

تھا لیکن اسے استعمال نہ کرنے کی وجہ یہ ہے، ''انه يفيد نوع تكلف على خلاف الطبع اما القبول فانه يفيد معنى القبول على وفق الطبع'' ''تقبل'' باب تفعل کے مصدر میں معنی ہوتا ہے'' تکلف سے خلاف طبع قبول کرنا'' لیکن'' قبول'' کا مطلب ہوتا ہے کہ طبع کے مطابق بغیر کسی تکلف کے قبول کر لینا۔

''وهذه الوجوه وان كانت ممتنعة فى حق الله تعالى الا انها تدل من حيث الاستعارة على حصول العناية العظيمة فى تربيتها وهذاالوجه مناسب معقول''

اللہ تعالی کے حق میں یہ کہنا'' کہ اس نے طبع کے مطابق قبول کر لیا، خلاف طبع تکلف سے قبول نہیں کیا'' مشکل ہے، لیکن مجازی معنی عقل کے مناسب ہے، وہ یہ ہے کہ'' اچھی طرح اسے قبول کیا'' یعنی بہت بڑی مہربانی سے حضرت مریم کی تربیت کی۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿ وَاَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ﴾ ''اور پروان چڑھایا اسے اچھی پروان''

''نبت، نبات'' اسے کہا جاتا ہے جو زمین سے نکلے اور بڑھنے والا ہو۔''سواء كان له ساق كا لشجر اولم يكن له ساق كالنجم'' برابر ہے کہ اس کا تنا ہو جیسے درخت یا اس کا تنا نہ ہو جیسے بیل، عرف میں زیادہ طور پر نبات کا اطلاق بیل پر ہوتا ہے۔ اب زیادہ طور پر ان پودہ جات کو نبات کہا جاتا ہے جسے حیوان کھائیں، انسان کیلئے نبات کا اطلاق اس لئے ہوتا ہے کہ اس کی ابتداء اور نشو ونما مٹی سے ہوئی، اور بیشک وہ بھی بڑھتا ہے جس طرح پودہ جات بڑھتے ہیں۔ جیسے رب تعالی نے فرمایا ﴿هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ﴾ وہ ذات جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر مٹی سے اور ارشاد فرمایا، ﴿وَاَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا﴾ اور بڑھایا اسے اچھی طرح بڑھنا۔ (ماخوذ از مفردات راغب)

اسے ہی کنز الایمان اور ضیاء القرآن میں خوبصورت انداز پر پیش کیا گیا'' اور پروان چڑھایا اسے اچھی پروان'' یہ ترجمہ راقم کا ان دو تراجم سے ہی ماخوذ ہے۔

حضرت مریم کو اچھی پروان چڑھانے کا مطلب ہے کہ دنیا میں آپ کو ایسا بڑھایا گیا، ایسا پروان چڑھایا گیا کہ آپ کو عام بچوں کی بنسبت بہت تیزی سے بڑھایا گیا اور دین میں آپ کو پروان چڑھایا گیا یعنی آپ کو صلاح، درستگی، عفت اور طاعت سے نوازا گیا۔ (کبیر)

﴿ وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ﴾ ''اور نگران بنایا اس کا زکریا کو''

''کفل'' میں دو قراءتیں ہیں، ایک تشدید سے، جس کا فاعل اللہ تعالی ہے، یعنی ضمیر مرفوع متصل اللہ تعالی کی

طرف لوٹ رہی ہے، اس لحاظ پر تو وہی معنی ہے جو ذکر کر دیا گیا۔

ایک قراءت میں مخفف ہے فاء پر شد نہیں اس میں فاعل زکریا ہیں، اس صورت میں معنی یہ ہوگا اور نگران بن گیا اس کا زکریا۔ ہمارے پاس شد والی قراءت ہے، اسلئے مطلب یہ ہوگیا کہ اس بچی کی ضمان اللہ تعالی نے حضرت زکریا علیہ السلام کے سپرد کردی، ان کو اس کا کفیل بنایا، اور ان کی مصلحت کا ضامن بنایا، اور اس کے امور کا مدبر بنایا

"والکافل ھو الذی ینفق علی انسان ویھتم باصلاح مصالحه وفی الحدیث(انا وکافل الیتیم کھاتین)

کفیل اسے کہا جاتا ہے جو دوسرے انسان پر مال خرچ کرکے اور اس کی بہتریوں کا اہتمام کرے حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی دو انگلیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا میں اور یتیم کا کفیل ان (انگلیوں) کی طرح ہوں گے۔ (یعنی اسے میرا قرب حاصل ہوگا) (ماخوذ از روح البیان و بیضاوی)

حضرت زکریا علیہ السلام کی کفالت کا تذکرہ:

حضرت عمران کی زوجہ جب اپنی بچی کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر بیت المقدس میں لے آئیں تو وہاں کے علماء جو بیت المقدس کے خدام کہلاتے تھے ان کے حوالے اس بچی کو کردیا۔

یہ بچی ان کے امام اور رئیس کی تھی اسلئے ہر ایک نے خواہش کی کہ یہ میری زیر کفالت (میری نگرانی میں) رہے گی، وہاں اس وقت ان علماء کی تعداد انتیس تھی، بعض نے ستائیس کا بھی ذکر کیا ان میں سے حضرت زکریا علیہ السلام نے کہا کہ اس بچی کی کفالت کا میں زیادہ حق رکھتا ہوں کہ اس کی خالہ میری زوجہ ہے، لیکن دوسرے حضرات نے کہا کہ قرعہ ڈالتے ہیں، جس کے نام قرعہ نکلا وہی اس کا کفیل ہوگا۔ قرعہ ڈالنے کا یہ طریقہ منتخب کیا گیا کہ اپنے اپنے قلم سب جمع کرلو، اور ایک کپڑے کے نیچے ان کو ملا جلا کر چھپادو پھر کسی بچے کو کہو جو ایک قلم ان سے نکال لے۔ جس کا وہ قلم ہوگا وہی کفیل ہوگا اسی طرح کیا گیا، ایک نابالغ لڑکے کو کہا گیا، جس نے ان قلموں میں سے ایک قلم نکالا وہ حضرت زکریا علیہ السلام کا تھا، اس طرح کفالت کا آپ کو حق بظاہر مل گیا لیکن وہ تمام حضرات کہنے لگے کہ ایک مرتبہ پھر قرعہ ڈالتے ہیں، دیکھتے ہیں وہ کس کے نام نکلتا ہے، اب قرعہ ڈالنے کا یہ طریقہ رکھا گیا کہ نہر اردن میں اپنے اپنے قلم ڈالتے ہیں جن کے قلم ڈوب گئے پانی کی پستی، میں چلے گئے ان کو کفالت کا حق حاصل نہیں ہوگا اور جس کا قلم پانی کے اوپر آگیا اور رک گیا نہ ڈوبا اسے کفالت کا حق حاصل ہوگا اس قرعہ اندازی میں بھی قرعہ حضرت زکریا علیہ السلام کے نام نکلا۔

لیکن ان حضرات نے کہا ایک مرتبہ پھر یعنی تیسری مرتبہ قرعہ ڈالتے ہیں، یہ آخری قرعہ اندازی ہوگی اب قرعہ

اندازی کا طریقہ یہ مقرر کیا گیا کہ اپنے اپنے قلم ڈالتے ہیں، جس کا قلم پانی کے آنے کی طرف الٹ سمت میں گیا اسے کفالت کا حق حاصل ہوگا اور جن کا قلم پانی کے چلنے کی سمت نیچے سیدھے جانب گئے ان کو کفالت کا حق حاصل نہیں ہو گا۔ تیسری مرتبہ قرعہ حضرت زکریا علیہ السلام کے حق میں نکلا تو وہی حضرت مریم مکمل کفیل بنا دیے گئے۔ (از روح المعانی)

﴿كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا﴾

''جب داخل ہوتے اس کے پاس زکریا اس کی عبادت کرنے کی جگہ تو پاتے اس کے ہاں رزق۔''

یہ الفاظ مبارکہ اچھی قبولیت کا بیان ہے کہ اللہ تعالی نے اس بچی کو اچھی طرح قبول فرمایا کہ اسے جنت سے رزق عطاء فرمایا، یہی وجہ ہے کہ واؤ عاطفہ نہیں ذکر کی، تا کہ یہ جملہ ماقبل سے علیحدہ نہ ہو۔

''**کلما**'' ما مصدریہ ہے، زمان محذوف ہے معنیٰ اس کا ظرفیت والا ہے **یا** نکرہ موصوفہ ہے معنی وقت کا ہے''**والمعنی کل زمان دخل علیها او کل وقت دخل علیها**'' یعنی جس زمانہ میں اس پر داخل ہوتے، یا جس وقت میں اس پر داخل ہوتے۔

''**المحراب علی ماروی عن ابن عباس رضی الله عنهما غرفة بنیت لها فی بیت المقدس وجعلت بابها فی وسط الحائط وكانت لا یصعد علیها الابسلم مثل باب الكعبة**''

اس آیۃ کریمہ میں محراب سے مراد وہ کمرہ ہے جو خصوصی طور پر حضرت مریم کیلئے بیت المقدس میں بنایا گیا تھا، اور اس کا دروازہ دیوار کے وسط میں بنایا گیا تھا جیسا کہ کعبہ شریف کا دروازہ بلندی پر ہے، اس کمرہ میں سیڑھی کے بغیر کوئی چڑھ نہیں سکتا تھا۔

''**وقیل المراد به المسجد اذقد كانت مساجد هم تسمی المحاریب**''
بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ اس آیۃ کریمہ میں محراب سے مسجد ہے، کیونکہ اس وقت مساجد کو محاریب (محراب کی جمع) کہا جاتا تھا۔

ان دونوں معنوں میں کوئی تعارض نہیں، اس لئے کہ بیت المقدس یعنی مسجد اقصی میں وہ کمرہ بنایا گیا تھا چاہے تو محراب کا معنی مسجد کر لیا جائے، چاہے تو محراب کا معنی خاص کمرہ کر لیا جائے۔ آیۃ کریمہ میں تو یہ دو معنی معتبر ہیں، البتہ ایک معنی اور بھی ہے، وہ یہ ہے، ''**وقیل اشرف مواضعه ومقدمها وهو مقام الامام من المسجد فی رای**'' بعض حضرات نے بیان کیا کہ محراب اشرف اور مقدم مقام کو کہتے ہیں، مسجد میں جہاں امام کھڑا ہوتا ہے

اسے محراب کہا جاتا ہے۔

محراب کو محراب کیوں کہا جاتا ہے؟ "**محراب**" **مفعال** کا وزن ہے، اس میں مبالغہ پایا گیا ہے، جیسے "مطعان" میں مبالغہ پایا گیا ہے، "مطعان" کا معنی ہے بڑا نیزہ باز، اسی طرح محراب کا معنی ہے زیادہ لڑائی کرنے والا چونکہ مقام عبادات میں انسان اپنے نفس سے یا شیطان سے لڑائی کرتا ہے اس لئے ان مقامات کو محراب کہہ دیا جاتا ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

مساجد کے محراب کی ایجاد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے زمانہ میں ہوئی:

"قال القضاعی واول من احدث ذلک عمر بن عبد العزیز وھو یومئذ عامل للولید بن عبد الملک علی المدینة لما اسس مسجد النبی ﷺ وھدمه وزادفیه ویسمی موقف الامام من المسجد محرابا"

قضاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں سب سے پہلے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے محراب کی ایجاد کی، آپ اس وقت ولید بن عبدالملک کے مدینہ طیبہ پر عامل (گورنر) تھے، آپ نے مسجد نبوی شریف کو شہید کر کے نئی تعمیر فرمائی تو امام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو مسجد سے زائد آگے بنا دیا اور اس کا نام محراب رکھ دیا۔

مسجد کی اشرف مجالس کو بھی محراب کہا جاتا ہے، محل کو بھی محراب کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اعلیٰ مقام ہوتا ہے، بادشاہ کی مجلس کو بھی محراب کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اس میں منفرد ہوتا ہے، اور مسجد کے محراب کو بھی اسلئے محراب کہا جاتا ہے کہ امام اس میں منفرد (اکیلے) ہوتا ہے۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج۲ ص۲۲۴ باب المساجد و مواضع الصلوۃ)

﴿وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا﴾ "پاتے اس کے ہاں رزق"

حضرت زکریا علیہ السلام کے بغیر کوئی حضرت مریم کے کمرہ میں نہیں جا سکتا تھا، وہ سات دروازوں میں بند تھا آپ جب نکلتے تھے تو تمام دروازے بند کر دیتے تھے، لیکن جب کمرہ میں جاتے تھے تو گرمیوں میں سردیوں کے اور سردیوں میں گرمیوں کے پھل پاتے۔ "والتنوین للتعظیم" اور "رزقا" میں تنوین تعظیم کی پائی گئی یعنی آپ کے پاس عظیم الشان، بلند قدر والا رزق پاتے۔ (روح المعانی)

راقم کے نزدیک عین ممکن یہ ہے کہ حضرت مریم کو جنت کا دودھ اور شہد بھی میسر ہوتا ہوگا، کیونکہ آپ اس وقت دودھ پینے کی عمر میں تھیں، اسی وجہ سے "رزقا" کہا گیا "طعاما" اور "اکلا" نہیں کہا گیا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

﴿قَالَ یَا مَرْیَمُ اَنّٰی لَکِ هٰذَا﴾ ''کہا اے مریم کہاں سے (آتا ہے) تمہارے لئے یہ۔''

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

''انــــی'' اس مقام میں ''مـــن ایـــن'' کے معنی میں استعمال ہے یعنی اس کا معنی ہے ''کہاں سے'' اور کبھی ''انی'' ''کیف'' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد باری تعالی ہے ﴿فَاْتُوْا حَرْثَکُمْ اَنّٰی شِئْتُمْ﴾ تم آؤ اپنی کھیتی میں (اپنی بیبیوں کے پاس) جس طرح تم چاہو، اور کبھی ''انی'' شرط کے معنی میں آتا ہے، جیسا کہ ''انی تقعد اقعد'' جہاں تو بیٹھے گا میں بیٹھوں گا۔

﴿قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدَاللّٰهِ﴾ ''بولیں وہ اللہ کے ہاں سے (آتا ہے)''

اللہ کے ہاں سے مراد ایک تو یہ ہے کہ یہ رزق میرے پاس جنت سے آتا ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ رزق رب تعالی مجھے بغیر کسی انسان کے واسطہ سے عطاء کرتا ہے۔ ''ولا تستعجب ولا تستبعد'' نہ اس میں کوئی تعجب ہے اور نہ ہی اسے آپ بعید سمجھیں، (روح المعانی)

تنبیہ: ''وکل ذلک من آثار قدرته تعالی ولم یکن هناک وحی الیه بذلک'' (روح المعانی)

یہ تمام چیزیں یعنی حضرت زکریا علیہ السلام کا کفالت کا مطالبہ کرنا، پھر قرعہ اندازی پھر قرعہ آپ کے حق میں نکلنا، پھر علیحدہ کمرہ بنوانا، پھر رزق کے متعلق حضرت مریم سے سوال کرنا صرف اللہ تعالی کی قدرت کی علامات سے ظاہر ہو رہا تھا، اس میں وحی نہیں آئی تھی حالانکہ حضرت زکریا علیہ السلام نبی تھے، اگر وحی آئی ہوتی تو ان چیزوں میں سے کسی کی ضرورت درپیش نہ آتی۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَاءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ﴾

''بیشک اللہ رزق دیتا ہے جسے چاہے بغیر حساب کے۔''

یعنی اللہ تعالی کثیر رزق عطاء فرماتا ہے جس کا اندازہ نہیں، اور وہ اس میں محاسبہ نہیں فرماتا، اور گنتی کر کے نہیں دیتا (روح البیان)

کرامت اولیاء کا ثبوت:

''وفی الآیة دلیل علی جوازا لکرامة للاولیاء'' آیۃ کریمہ میں دلیل پائی گئی ہے کہ اولیاء کرام کی

کرامت برحق ہے، بلکہ حضرت مریم کی کرامت عیسی علیہ السلام کیلئے ارہاص بھی تھا، اعلان نبوت سے پہلے معجزہ ظاہر ہو تو اس کا نام ارہاص ہوتا ہے۔ (روح البیان)

حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کا کلام حضرت مریم کی طرح:

❁ عن جابر ان رسول الله ﷺ اقام ایامالم یطعم طعاما حتی شق ذلک علیه فطاف فی منازل ازواجه فلم یجد عند واحدة منهن شیأ فاتی فاطمة فقال یا بنیة هل عندک شئی آکله فانی جائع؟قالت لا والله بابی انت وامی فلما خرج من عندها بعثت الیها جارة لهابرغیفین وقطعة لحم فاخذته منها فوضعته فی جفنة لهاوقالت والله لاوثرن بهذارسول الله ﷺعلی نفسی ومن عندی،وکانوا اجمعا محتاجین الی شبعة فبعثت حسنا اوحسینا الی رسول الله فرجع الیها فقالت بابی انت وامی قداتی الله بشیء فخباته لک قال"هلمی یابنیة"قالت فاتیته بالجفنة فکشفت عنها فاذاهی مملوءة خبزاولحما فلما نظرت الیها بهت وعرفت انها برکة من الله،فحمدت الله وصلیت علی نبیه وقدمته الی رسول الله ﷺ فلما رآه حمده الله وقال من این لک هذایابنیة؟قالت یاابت"هو من عن الله﴿ان الله یرزق من یشاء بغیر حساب﴾فحمد الله وقال"الحمد لله الذی جعلک یا بنیة شبیهة بسیدة نساء بنی اسرائیل فانها کانت اذارزقها الله شیأ وسئلت عنها"قالت هو من الله ان الله یرزق من یشاء بغیر حساب"فبعث رسول الله ﷺالی علی(رضی الله عنه)لم اکل ای رسول الله ﷺواکل علی وفاطمة وحسن وحسین وجمیع ازواج النبی ﷺ واهل بیته حتی شبعوا اجمیعا،قالت وبقیت الجفنة کما هی قالت فاوسعت ببقیتها علی جمیع الجیران وجعل الله فیها برکة وخیرا کثیرا" (رواه حافظ ابو یعلی)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ چند دنوں کے بھوکے تھے کچھ کھایا نہ تھا، یہاں تک آپ پر یہ حالت شاق (مشقت میں ڈالنے والی) گذری، تو اپنی بیبیوں کے گھروں میں چکر لگایا کہ کھانے کی کوئی چیز مل جائے لیکن کسی گھر سے کوئی چیز نہ ملی، پھر آپ حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لائے تو فرمایا" کیا تمہارے پاس کوئی کھانے کی چیز ہے میں بھوکا ہوں؟" انہوں نے عرض کیا قسم ہے اللہ تعالی کی کچھ نہیں "بابی انت وامی" جب آپ ان کے ہاں سے نکلے تو ان کے پاس ان کی ایک پڑوسن نے دو روٹیاں اور گوشت کا ایک ٹکڑا بھیجا، آپ نے وہ روٹیاں لے کر ایک برتن میں رکھ دیں، (اسے ڈھانپ دیا) آپ کہنے لگیں "قسم ہے اللہ تعالی اس کی اس کھانے میں، میں اپنے ذات اور اپنے گھر کے افراد سے رسول اللہ ﷺ کو ترجیح دوں گی" حالانکہ آپ کے گھر کے تمام افراد روٹی سے پیٹ بھرنے کے محتاج تھے۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت امام حسن یا امام حسین کو رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجا، تو آپ تشریف لے آئے، تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے "مرحبا بابی انت و امی" کہا، پھر عرض کیا اللہ تعالیٰ نے کھانے کی کوئی چیز عطاء فرمادی تو وہ میں نے آپ کیلئے رکھ دی، آپ نے فرمایا اے میری پیاری بیٹی وہ لے آؤ۔ آپ فرماتی ہیں جب میں نے وہ برتن لایا، اسے کھولا تو وہ روٹیوں اور گوشت سے بھرا ہوا تھا، جب میں نے اسے دیکھا تو میں حیران رہ گئی، اور میں نے سمجھ لیا کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی برکت آگئی، تو میں نے اللہ تعالیٰ کی حمد کی اور اللہ تعالیٰ کے نبی پر درود پڑھا اور میں نے وہ کھانا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا تو آپ نے دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی حمد کی، اور فرمایا "اے میری پیاری بیٹی یہ کھانا کہاں سے آیا؟ تو انہوں نے عرض کیا اے میرے ابا جان ﴿هُوَ مِنْ عِنْدِاللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (یہ اللہ کے ہاں سے آیا ہے، بیشک اللہ رزق دیتا ہے جسے چاہے بغیر حساب کے) تو آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد کی اور کہا "سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کیلئے ہیں جس نے تمہیں بنایا ہے، اے بیٹی! بنی اسرائیل کی عورتوں کی سردار عورت (حضرت مریم) کی طرح، ان کو بھی جب اللہ تعالیٰ نے رزق عطاء فرمایا اور ان سے پوچھا گیا کہ یہ رزق تمہارے پاس کہاں سے آیا ہے؟ تو وہ بولیں ﴿هُوَ مِنْ عِنْدِاللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ حضرت علی ؓ کو بھی بلا لیا گیا، پھر وہ کھانا رسول اللہ ﷺ اور حضرت علی اور حضرت فاطمہ اور حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین ؓ اور نبی کریم ﷺ کی تمام ازواج مطہرات (پاکیزہ بیبیوں) اور اہل بیت نے کھایا، سب نے سیر ہو کر کھایا، اور وہ کھانا اسی طرح موجود تھا، پھر تمام پڑوسیوں کو بھی وہ کھانا دیا گیا، ان کو پورا ہو گیا، اللہ تعالیٰ نے اس میں برکت اور خیر کثیر رکھ دیا۔

(ابن کثیر، صابونی)

اس حدیث پاک سے حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کی کرامت اور رسول اللہ ﷺ کا معجزہ واضح طور پر معلوم ہو گیا۔ یہ حدیث روح المعانی، روح البیان، اور شیخ زادہ وغیرہ نے بھی مختصر الفاظ میں ذکر کی ہے۔

کرامت کیسی ہو؟

سہل بن عبداللہ رحمہ اللہ کہتے ہیں "اکبر الکرامات ان تبدل خلقا مذموما من اخلاقک" سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ تم اپنے برے اخلاق کو اچھے اخلاق سے تبدیل کر لو۔

❁ "قال الشیخ ابو العباس رحمه الله لیس الشان من تطوی له الارض فاذا هو بمکة وغیرها من البلدان انما الشان من تطوی عنه اوصاف نفسه"

شیخ ابو العباس رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ کوئی شان کی بات نہیں کہ کسی شخص کیلئے زمین کو سمیٹ دیا جائے جب وہ مکہ

مکرمہ میں ہو، یا دور دراز مسافت کے شہروں میں ہو مہینوں کا سفر دنوں میں طے کر لے۔

❀ "وقیل لابی یزید ان فلانا یمشی علی الماء قال الحوت اعجب منه اذهو شأنه"

ابو یزید بسطامی رحمہ اللہ کی خدمت میں کسی نے ذکر کیا فلاں شخص کی بڑی شان ہے کہ وہ پانی پر چلتا ہے، تو آپ نے فرمایا کہ اس سے بڑھ کر مچھلی کی شان ہوگی، اور اس پر تعجب کیا جائے کیونکہ وہ اس بندے سے زیادہ اچھا پانی پر چلتی ہے۔

❀ "فقیل له ان فلانا یمشی فی الهواء قال الطیر اعجب من ذلک اذهو حاله"

پھر کسی اور شخص نے دوسرے شخص کا کمال بیان کیا کہ وہ فضاء میں اڑتا ہے، اس کی بڑی شان ہے، تو آپ نے فرمایا اس طرح تو پرندے کے حال پر زیادہ تعجب کیا جائے کیونکہ وہ زیادہ اچھی طرح اڑتا ہے۔

❀ "قیل له کان فلان یمشی الی مکة ویرجع من یومه قال ابلیس اعجب من ذلک اذهو حاله تطوی له الارض کلها فی لحظة وهو فی لعنة الله"

پھر کسی اور شخص نے ایک اور صاحب کی تعریف کی کہ فلاں شخص بڑی شان والا اور بڑے کمال والا ہے، کہ وہ مکہ سے ایک دن میں واپس آجاتا ہے، حالانکہ درمیان میں بہت بڑی مسافت ہے۔ آپ نے فرمایا یہ کیا کمال ہے، اس سے بڑھ کر کمال تو ابلیس کو حاصل ہے کہ وہ تمام زمین کو ایک لحظہ میں طے کر لیتا ہے، حالانکہ وہ اللہ تعالی کی لعنت (پھٹکار) میں ہوتا ہے۔

پھر آپ نے فرمایا حقیقی شان اور کمال کسی نے دیکھنا ہو تو یوں دیکھئے۔

"فالطی ء الحقیقی ان تطوی مسافة الدنیا عنک حتی تری الآخرة اقرب الیک منک"

حقیقی طے یعنی حقیقی طور پر منازل کے طے کرنے، کسی چیز کے سمٹنے میں کمال ہے تو اس میں ہے کہ تم دنیا کی مسافت کو سمیٹ دو اور آخرت کو اپنے آپ کو بھی زیادہ قریب سمجھو تو یہ حقیقی شان تمہیں حاصل ہوگی، درحقیقت اس کی وجہ یہ ہے کہ،

"لان الارض تطوی لک فاذاانت حیث شئت من البلاد لان هذاربما جرالی الاغترار وذلک یؤدی للتعلق بالواحد القهار"

زمین کے لپٹ جانے اور مسافت جلدی طے ہو جانے سے انسان متکبر ہو جاتا ہے، اور دنیا کے سمٹ جانے اور آخرت کی منازل کو جلدی طے کرنے سے انسان کو رب تعالی کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ (از روح البیان)

حکایت عجیبہ: ابو عنوان واسطی کہتے ہیں کہ کشتی ٹوٹ گئی، میں اور ایک عورت اس کے تختے پر چند دن پانی میں ہی رہے، اسی حالت میں اس عورت نے بچی کو جنم دیا، اس نے مجھے پکارا کہ میں بہت زیادہ پیاس

میں مبتلاء ہوں، میں نے اسی وقت فضاء میں ایک شخص کو دیکھا، جس کے ہاتھ میں سونے کی زنجیر ہے اور سرخ رنگ کا یاقوتی پیالہ پانی کا ہے، اس نے وہ پیالہ مجھے دیا کہ تم دونوں یہ پانی پی لو، وہ پانی ہم نے پیا جو کستوری سے زیادہ خوشبودار اور شہد سے زیادہ میٹھا تھا تو میں نے اس شخص سے پوچھا اللہ تم پر رحم کرے تم کون ہو؟ "قال ان عبد مولاک" اس نے کہا میں تمہارے مولیٰ کا بندہ ہوں۔

"فقلت بم وصلت الی هذافقال ترکت هوای لمرضاته فاجلنی فی الهواء"

میں نے اسے کہا تم اس مرتبہ پر کیسے پہنچے ہو؟ اس نے کہا میں نے اللہ تعالیٰ کی مرضی کیلئے یعنی اس کی رضاء حاصل کرنے کیلئے اپنی خواہشات کو چھوڑ دیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے مجھے فضاء میں بٹھا دیا ہے ابوعنوان کہتے ہیں پھر وہ شخص مجھ سے غائب ہو گیا میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ (روح البیان)

حکایت: سفیان ثوری نے ایک مرتبہ شیبان راعی کے ساتھ حج پر تشریف لے گئے راستہ میں ایک درندہ دیکھا تو سفیان کہنے لگے راستے میں تو درندہ ہے یعنی ہمارا راستہ طے کرنا دشوار نظر آتا ہے تو شیبان کہنے لگے ڈرو نہیں وہ اس درندے کے پاس گئے، اس کو کانوں سے پکڑا اور اس کے کان مروڑے، سفیان نے تعجب کیا۔

اصل بات یہ ہے کہ انسان جب اللہ تعالیٰ کا ہو جاتا ہے تو تمام مخلوق اس کی ہو جاتی ہے۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ نے اسی قسم کے واقعات کے متعلق یوں ارشاد فرمایا:

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ — کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ
تو بھی گردن اللہ کے حکم سے نہ پھیر — کہ گردن نہیں پھیرے گا تیرے حکم سے کوئی بھی۔
محال ست جوں دوست دارد ترا — کہ در دست دشمن گذارد ترا
محال ہے جب رب تعالیٰ تجھے دوست بنالے، — تو پھر تجھے دشمن کے ہاتھوں میں چھوڑ دے۔

حضرت مریم کا یہ کلام بچپن میں تھا:

اگرچہ اس مسئلہ میں اختلاف تو پایا گیا ہے کہ یہ کلام اس وقت حضرت مریم نے فرمایا جس عمر میں بچے سوال وجواب کر سکتے ہیں، یا بہت چھوٹی عمر میں یہ کلام کیا جس عمر میں بچے کلام نہیں فرماتے۔

علامہ سیوطی رحمہ اللہ کا مختار یہ ہے کہ یہ کلام بچپن میں کیا ہے اور چند حضرات اور بھی ہیں جنہوں نے بچپن میں کلام کیا، آپ نے ایک نظم کی صورت میں یوں بیان فرمایا۔

تکلم فی المهد النبی محمدﷺ ویحیی وعیسی والخلیل والمریم
ومبری جریج ثم شاهد یوسف وطفل الذی الاخدود یرویه مسلم
وطفل علیه مر بالامة التی یقال لها تزنی ولا تکلم
وما شطة فی عهد فرعون(طفلها) وفی زمن الهادی(المبارک)یختم

(۱) نبی کریم ﷺ نے پیدا ہوتے ہی "اللھم رب ھب لی امتی" کلام فرمایا۔
(۲) حضرت یحیٰی علیہ السلام نے بچپن میں کلام فرمایا۔ (۳) حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بچپن میں کلام فرمایا۔
(۴) حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے بچپن میں کلام فرمایا۔ (۵) حضرت مریم رضی اللہ عنہا نے بچپن میں کلام فرمایا۔
(۶) جریج سے تہمت زائل کرنے والے بچے نے بچپن میں کلام فرمایا۔
(۷) حضرت یوسف علیہ السلام کے حق میں گواہی دینے والے بچے نے بچپن میں کلام فرمایا۔
(۸) اصحاب اخدود میں ایک بچے نے ماں کو کہا تم اپنے دین پر قائم رہو، یہ روایت بھی مسلم میں ہے۔
(۹) ایک عورت پر زنا کی تہمت لگا رہے تھے تو وہ خاموش تھی (حقیقت میں پاکدامن تھی) ایک عورت نے اسے دیکھ کر کہا میرے بچے کو اے اللہ اس عورت کی طرح نہ بنانا تو بچے نے بچپن میں کہا اے اللہ مجھے ایسا ہی بنانا کیونکہ یہ عورت بے گناہ ہے۔
(۱۰) فرعون نے جب ایک عورت کو ایمان لانے پر عذاب دیا تو اس کے بچے نے بچپن میں ہی اپنی ماں کو دین پر قائم رہنے کیلئے کہا۔
(۱۱) ہادی کے زمانہ میں مبارک نے بچپن میں کلام فرمایا۔ (ماخوذ از روح المعانی)

﴿هُنَالِکَ دَعَا زَکَرِیَّا رَبَّهٗ قَالَ رَبِّ هَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ ذُرِّیَّةً طَیِّبَةً اِنَّکَ سَمِیْعُ الدُّعَاءِ۝﴾ (آیۃ نمبر ۳۸)

(1) یہاں پکارا زکریا اپنے رب کو بولا اے رب میرے مجھے اپنے پاس سے دے ستھری اولاد بیشک تو ہی ہے دعاء سننے والا۔

(2) اسی وقت دعاء کی زکریا نے اپنے رب سے، عرض کیا اے میرے رب عطاء کر مجھے اپنی طرف سے اولاد پاکیزہ بیشک تو ہی سننے والا ہے دعاء۔

مختصر مطلب:

حضرت زکریا علیہ السلام نے جب دیکھا کہ اللہ تعالی نے اس بچی کو جنتی بے موسم پھل عطاء کئے ہیں، تو رب تعالی سے دعاء کی کہ اے اللہ تعالی میں بے اولاد ہوں، میری عمر بڑھاپے کو پہنچ چکی ہیاور میری زوجہ بھی بانجھ ہے تو ہمیں اولاد یعنی بیٹا عطاء کردے تو تیری قدرت سے بعید نہیں، وہ بیٹا صاف ستھرا پاکیزہ ہو جو منصب نبوت کے لائق ہو، اے اللہ بیشک تو ہی دعا کو سننے والا ہے، یعنی سن کر دعاء کو قبولیت سے تو ہی نوازتا ہے، اسلئے ہماری دعاء قبول فرما۔

﴿هُنَالِکَ دَعَا زَکَرِیَّا رَبَّهٗ﴾ ''اسی وقت دعاء کی زکریا نے اپنے رب سے۔''

"ھنالک" کے متعلق علامہ بیضاوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

"فی ذلک المکان او الوقت اذ یستعار ھنا ولم وحیث للزمان" (بیضاوی)

"ھنالک" کا "حقیقی معنی" مکان ہے، مکان بعید کیلئے زیادہ استعمال ہوتا ہے، لیکن مجازا مکان قریب کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے، اسی لئے اعلی حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ فرمایا ''یہاں پکارا زکریا اپنے رب کو'' اور کبھی ''مجازی'' طور پر زمان کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اسی لئے راقم نے ترجمہ کیا ہے ''اسی وقت دعاء کی زکریا نے اپنے رب سے'' تاکہ طلباء کرام دونوں تراجم ذہن نشین ہو جائیں۔ بیضاوی کی مذکورہ عبارت پر شیخ زادہ رقمطراز (لکھتے) ہیں۔

"جو زحملہ علی الزمان وھو معنی مجازی لھنالک مع جواز حملہ علی معناہ الحقیقی الذی ھو المکان تکثیر اللفائدۃ لان دعاءہ فی زمان رؤیۃ مارآہ من امر مریم علیھا السلام یستلزم دعاءہ فی مکان تلک الرؤیۃ بخلاف الدعاء فی ذلک المکان فانہ لا یستلزم الدعاء فی ذلک الزمان"

"ھنالک" کا مجازی معنی لینا یعنی زمان والا معنی کرنا جائز ہے، باوجود اس کے کہ حقیقی معنی یعنی مکان والا معنی کرنا بھی جائز ہے، تاہم مجازی معنی زیادہ فائدہ پر مشتمل ہے، اس لئے کہ جب آپ نے حضرت مریم کے پاس اللہ تعالی کے ہاں سے آنے والے رزق کو دیکھا تو اسی وقت دعاء کی تو یہ دعاء یقیناً اسی جگہ تھی، کیونکہ بلا تاخیر اسی وقت دعاء اسی جگہ دعاء کو مستلزم ہے، لیکن اسی جگہ دعاء کرنا اسی وقت دعاء کرنے کو مستلزم نہیں۔ (شیخ زادہ)

حضرت زکریا علیہ السلام کو دعاء کرنے کا خیال کیوں آیا؟

اس کی چند وجوہ ذکر کی گئی ہیں۔

(۱) جب حضرت زکریا علیہ السلام نے مریم کے پاس بے موسم پھل پائے یعنی سردیوں کے گرمیوں میں اور گرمیوں کے سردیوں میں، جو جبریل ان کے پاس لاتے تھے، تو حضرت مریم سے پوچھا یہ بے موسم پھل تمہارے پاس کہاں سے آتے ہیں؟ انہوں نے بتایا یہ رزق اللہ تعالی کی طرف سے آتا ہے اللہ تعالی جسے چاہے رزق عطاء فرماتا ہے بغیر حساب کے۔ تو اسی وقت ان کے دل میں تمنا پیدا ہوئی کہ اللہ تعالی ہمیں بیٹا عطاء فرمادے، اللہ تعالی جب قادر مطلق ہے جو مریم کو بے موسم پھل عطاء فرماتا ہے تو اس کی قدرت سے یہ بعید نہیں کہ وہ میری زوجہ کو بھی اولاد کے قابل بنادے۔ اور ہمیں اولاد عطاء فرمادے، آپ نے یہی خیال آنے پر دعاء رب تعالی کے حضور دعاء کی۔

"وذلک لثلاث لیال بقین من المحرم قال زکریا فاغتسل ثم ابتھل فی الدعاء الی اللہ تعالی"

محرم شریف کے مہینہ کی تین راتیں باقی تھیں، تو حضرت زکریا علیہ السلام نے رب تعالی کے حضور قیام کیا غسل کیا پھر اللہ تعالی سے بڑی عاجزی سے دعاء کی۔

(۲) جب آپ نے دیکھا کہ اللہ تعالی نے مؤنث کو مذکر کی جگہ قبول فرمالیا تو اسی وقت دل میں خیال پیدا ہوا کہ اللہ تعالی بوڑھے کو جوان بنادے اور بانجھ عورت کو بچے جننے والا بنادے تو اس کی قدرت سے کون سا بعید ہے تو آپ نے رب تعالی سے اولاد کی دعاء کی۔

(۳) بیت المقدس کی خدمت کیلئے جن بچوں کو مقرر کیا جاتا تھا وہ اگرچہ نابالغ ہوتے، لیکن کم از کم اتنی عمر کے ہوتے کہ وہ خود اپنا کام اور بیت المقدس کی خدمت کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے جب حضرت زکریا علیہ السلام نے دیکھا کہ ایک چھوٹی سی ننھی بچی کو بیت المقدس میں عبادت کیلئے اللہ تعالی نے قبول فرمالیا تو یہ اس ذات کی مہربانی ہے، اسی وقت خیال آیا کہ رب تعالی سے اولاد کی دعاء کی جائے کہ وہ ہم پر بھی مہربانی فرماتے ہوئے

اولاد عطاء فرمادے۔

(۴) جب آپ نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے مریم نے بچپن میں کلام فرمایا جس عمر میں بچے کلام نہیں کرتے تو خیال آیا کہ جس ذات نے اس بچی کو کلام کرنے کی طاقت عطاء فرمائی اگر میں بھی اس سے دعاء کروں تو وہ میری بانجھ زوجہ کو بھی اولاد عطاء فرمادے۔

(۵) جب حضرت مریم سے آپ نے سنا﴿وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (اور اللہ رزق دیتا ہے جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے) تو اسی وقت دل میں خیال آیا کہ رب تعالیٰ سے اولاد کی میں دعاء کروں تو وہ مجھے بڑھاپے میں اور میری زوجہ کے بانجھ پن کے باوجود اولاد عطاء فرمائے گا"فجاز ان تلد من غیر استعداد" میری زوجہ بغیر استعداد کے بچہ جنے گی تو یہ رب قدوس کی قدرت ہوگی' (روح المعانی)

﴿قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً﴾

''عرض کیا اے میرے رب عطاء کر مجھے اپنی طرف اولاد پاکیزہ''

یہاں سے حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنی دعاء کی وضاحت شروع کی اور اس کی کیفیت کو بیان کیا۔

"**رب**" اصل میں 'یاربی' ہے، جس کا معنی ہے''اے میرے رب''

"**ھب**" امر ہے، "وھب یھب" سے، جس کا معنی ہے''عطاء کر'' اولاد کے مطالبہ کیلئے لفظ "ھب" ذکر کرنے میں حکمت یہ ہے"ان الھبة احسان محض لیس فی مقابلة شیء" کہ بیشک ہبہ خالص احسان ہوتا ہے، اس کے مقابلہ میں کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ گویا کہ سوال کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ تعالیٰ جب میں بوڑھا ہوں اور میری زوجہ بھی بانجھ ہے، بظاہر اولاد کے ہونے کا کوئی سبب نظر نہیں آتا، اسلئے تو اپنا خالص احسان عظیم فرماتے ہوئے ہمیں اولاد عطاء کردے۔

"**ذریة طیبة**" (اولاد پاکیزہ) طیبة کا معنی "مبارکة" لیا گیا ہے، برکت والی اولاد عطاء فرما، اور اس کا معنی بیان کیا گیا "صالحة تقیة نقیة العمل" اے میرے رب مجھے نیک، پرہیزگار صاف ستھرے عمل والی اولاد عطاء فرما۔

(ماخوذ از روح المعانی)

حضرت زکریا علیہ السلام کی دعاء بیٹے کیلئے تھی:

اگرچہ یہاں "ذریة طیبة" ذکر کیا گیا ہے، جس سے بظاہر وہم ہوتا ہے کہ "طیبة" صفت مؤنث ہے اور موصوف "ذریة" بھی مؤنث ہے، لیکن اس کی وضاحت مفسرین کرام کے کلام میں دیکھیں تو مسئلہ واضح ہوجاتا ہے۔

"والذرية فی المشهور النسل تقع علی الواحد والجمع والذکر والانثی"

ذریۃ کا معنی مشہور "نسل" ہے، اور یہ لفظ" ذریۃ" مذکر ومؤنث اور واحد وجمع پر برابر سچا آتا ہے، "والمراد ھھنا ولد واحد" اور یہاں مراد ایک بچہ ہے۔

"وانث الطیبة لتانیث لفظ الذریة والتانیث والتذکیر تارة یجیئان علی اللفظ واخری علی المعنی وھذا فی الاسماء الاجناس"

"الطیبة" صفت مؤنث ہے لفظ ذریۃ کو دیکھ کر کہ وہ لفظاً مؤنث ہے، (معنی مذکر ہے) اسماء اجناس میں تذکیر و تانیث کبھی الفاظ کو دیکھ کر آتی ہے اور کبھی معانی کو دیکھ کر آتی ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

یہاں ذریۃ معنوی طور پر مذکر ہے کہ بیٹے کی دعاء کی گئی۔ اس پر واضح دلیل سورۃ مریم میں ارشاد باری تعالی ہے ﴿فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا ○ یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ آلِ یَعْقُوْبَ﴾ تو مجھے اپنی طرف سے عطاء فرما جو میرا کام اٹھالے وہ میرا جانشین ہو، اور اولاد یعقوب کا وارث ہو۔

اس دعاء کا مطلب ہی یہ تھا کہ اے اللہ مجھے اپنا اور اولاد یعقوب کا وارث و جانشین عطاء فرما یعنی وہ منصب نبوت پر فائز ہو، نبی چونکہ مذکر ہی ہوتا مؤنث نہیں، لھذا یہ دعاء بھی مذکر (بیٹے) کیلئے کی گئی۔

﴿اِنَّکَ سَمِیْعُ الدُّعَاءِ﴾ "بیشک تو ہی سننے والا ہے دعاء"

حضرت زکریا علیہ السلام کی دعاء اپنے جد اعلی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کلام کے مطابق ہے، یعنی آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اقتداء کی، ان کے کلام کو رب تعالی نے یوں حکایت بیان فرمائی:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْکِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ﴾ (سورۃ ابراہیم آیۃ نمبر ۳۹)

سب خوبیاں اللہ کو جس نے مجھے بڑھاپے میں اسمعیل واسحق دیئے بیشک میرا رب دعاء سننے والا ہے۔

"اراد کثیر الاجابة لمن یدعوک من خلقک" "بیشک تو ہی دعاء سننے والا ہے" اس کا مطلب یہ ہے کہ اے رب کریم تیری مخلوق سے جب کوئی تیرے حضور دعاء کرتا ہے تو تو ہی اسے قبول فرماتا ہے۔ کثیر دعاؤں کو شرف قبولیت عطاء کرنا تیرا اکرم اور تیری قدرت ہے۔ (از روح المعانی)

جب کسی کو کرم ہی حاصل نہ ہو تو وہ کسی کی التجاء کو قبول نہیں کرتا، جب کسی کو قدرت ہی حاصل نہ ہو تو وہ بھی کسی کو التجاء کو قبول کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔

آیۃ کریمۃ سے متعلق فوائد:

حضرت زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم سے بچپن میں کلام سنا، اور ان کے پاس بے موسم پھل دیکھے "فشاهد تلک الكرامات دعا ربه" تو حضرت مریم کی ان کرامات کو دیکھ کر اولاد کی دعاء کی۔

آیۃ کریمہ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ اولیاء کرام کو کرامات حاصل ہیں۔ "والمعتزله ينكرون كرامات الاولياء وارهاصات الانبياء" معتزلہ اولیاء کرام کی کرامات اور انبیاء کرام کے ارہاصات (قبل از اعلان نبوت حاصل ہونے والے کمالات) کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس لئے وہ کہتے ہیں حضرت زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم کی کرامات کو دیکھ کر دعاء نہیں کی، بلکہ

"لما رأى آثار الصلاح والعفاف والتقوى مجتمعة فی حق مريم عليها السلام اشتهى الولد وتمناه فدعا عندذلک"

جب ان میں بھلائی کی علامات اور پاکدامنی اور تقوی کو مجتمع پایا تو بچے کی خواہش پیدا ہوئی اور اس وقت دعاء کی۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے ان کے اس قول کا رد کیا کہ ان چیزوں کو دیکھ بڑھاپے میں "خرق عادت" عادت کے خلاف سرزد ہونے والے فعل کی دعاء کرنا عقل سے بعید ہے۔ صحیح یہی ہے کہ کرامات کو دیکھ کر آپ نے دعاء کی، اسی وجہ پر عبادت کو محمول کرنا زیادہ بہتر ہے۔ طلباء کرام اگر علامہ رازی رحمہ اللہ کی عبارت کو دیکھنا چاہیں تو وہ مندرجہ ذیل ہے:

(القول الثانی) وهو قول المعتزلة الذين ينكرون كرامات الاولياء وارهاصات الانبياء، قالو "ان زكريا عليه السلام لما رآى آثار الصلاح والعفاف والتقوى مجتمعة فی حق مريم عليها السلام اشتهى الولد وتمناه فدعا عندذلک، واعلم ان القول الاول (ای كرامات الاولياء حق) وذلک لان حصول الزهد والعفاف والسيرة المرضية لايدل على انخراق العادات فرؤية ذلک لا يحمل الانسان على طلب مايخرق العادة، واما رؤية ما يخرق العادة قد يطمعه فی ان يطلب ايضا فعلا خارقا للعادة ومعلوم ان حدوث الولد من الشيخ الهرم والزوجة العاقر من خوارق العادات فكان حمل الكلام على هذاالوجه اولى (كبير)

متکلمین کا قول جمیل:

"ان دعاء الانبياء والرسل عليهم الصلوة والسلام لا يكون الابعد الاذن لاحتمال ان لا تكون الاجابة مصلحة فحينئذ تصير دعوته مردودة وذلک نقصان فی منصب الانبياء عليهم الصلوة والسلام هكذا قاله المتكلمون" (كبير)

متکلمین حضرات نے بیان کیا ہے کہ انبیاء کرام اور رسولوں کو جب رب تعالیٰ کی طرف سے اجازت ملتی ہے تو وہ دعاء کرتے ہیں، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ کسی دعاء کی قبولیت میں مصلحت نہ پائی جائے تو دعاء کو رد کر دیا جائے تو اس میں انبیاء کرام کے منصب میں نقص لازم آئے۔ **راقم** کو متکلمین کا قول ہی پسند ہے، راقم کا موقف بھی یہی ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے اگرچہ یہ بیان فرمایا ہے کہ رب تعالیٰ نے مطلقا دعاء کرنے کی اجازت فرمائی ہے، اور یہ بھی واضح ہے کہ ان الفاظ سے ہی دعاء کبھی قبول ہوتی ہے اور کبھی دعاء قبول نہیں ہوتی۔ دعاء ہر طرح کی جاسکتی ہے البتہ وہ دعاء معصیت کی نہ ہو، لھذا انبیاء کرام بھی جو چاہیں دعاء کریں رب تعالیٰ قبول فرمالے تو اس کا فضل و کرم ہے، اگر نہ قبول فرمائے تو اس کی مرضی کیونکہ وہ خالق ہے اور انبیاء کرام مخلوق ہیں، اس میں انبیاء کرام کے منصب میں کوئی نقص لازم نہیں آتا۔ (ماخوذ از کبیر)

تنبیہ: ''دن'' کے ذکر میں بھی تقریبا وہی فائدہ ہے جو ''ھـــب'' میں بیان کیا جا چکا ہے، یعنی عرف اور عادت کے مطابق اولاد اسباب مخصوصہ سے پیدا ہوتی ہے، آپ نے جب اولاد کی دعاء کی اس وقت آپ کے بوڑھے ہونے اور زوجہ کے بانجھ ہونے کی وجہ سے ظاہری اسباب موجود نہ تھے، تو آپ نے گویا یوں عرض کیا:

''ارید منک الھی ان تعزل الاسباب فی ھذہ الوقعة و ان تحدث ھذا الولد بمحض قدرتک من غیر توسط شی ء من ھذہ الاسباب''

اے اللہ! میں تیرے حضور یہ عرض کرتا ہوں کہ اگرچہ ظاہری اسباب تو ختم ہو چکے ہیں لیکن تو اپنی قدرت سے بغیر ظاہری اسباب کے ''اپنی طرف سے'' اولاد عطاء فرما۔ (ماخوذ از کبیر)

اعتراض: ﴿رَبِّ هَبْ لِیْ﴾ میں ''ھب'' کا معنی ہبہ کر' ہبہ کا معنی یہ ہے کہ کسی کو کوئی چیز بغیر ثمن کے دے دینا کہ وہ قبضہ کر لینے کے بعد مالک بن جاتا ہے۔ ''حـــر'' (آزاد) بیٹے کا کوئی مالک نہیں ہوتا تو ہبہ کرنے کا کیا مطلب ہے؟

جواب: یہاں ہبہ مجازی معنی میں استعمال ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اے میرے رب مجھے عبادت کرنے والا، نبوت و علم کا وارث عطاء فرما، ایسا بیٹا تیرے خصوصی کرم سے ہی حاصل ہونا ہے تو وہ ہبہ کے درجہ میں ہی ہوگا، یہ کلام ایسا ہی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ نے خرید لیا ہے مومنوں سے ان کے نفسوں اور مالوں کو جنت کے بدلے۔

اس آیۃ کریمہ میں بھی' جہاد میں نفسوں کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کو شراء (خریدنے) سے مجازی طور پر

ذکر فرما دیا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ہی ملکیت میں لوگوں کی جانیں اور مال ہیں، جہاد سے پہلے بھی اور بعد میں بھی "وسمی ذلک شراء لما وعدھم علیہ من الثواب الجزیل" اس کو رب تعالیٰ نے شراء سے تعبیر فرمایا ہے جبکہ اس نے بہت عظیم ثواب عطاء کرنے کا وعدہ فرمایا" (احکام القرآن للجصاص)

اولاد کی دعاء کرنا سنت انبیاء وصدیقین ہے:

اس آیۂ کریمہ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت زکریا علیہ السلام نے اولاد کیلئے دعاء کی تو کوئی شخص بھی اولاد کی دعاء کرے گا تو اسی سنت پر عمل ہوگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام وغیرہ نے بھی اولاد کی دعاء کی، پھر اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو بیبیاں اور اولاد عطاء فرمانے کا ذکر فرماتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا:

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً﴾

اور تحقیق ہم نے بھیجے رسول آپ سے پہلے، اور ہم نے بنائے ان کیلئے بیبیاں اور بچے۔

❁ "عن سعد بن ابی وقاص قال اراد عثمان ان یتبتل فنهاه رسول الله ﷺ ولو اجازله ذلک لاختصینا" (مسلم)

سعد بن ابی وقاص ﷺ فرماتے ہیں ایک مرتبہ حضرت عثمان ﷺ نے ارادہ فرمایا کہ بیبیوں سے علیحدہ ہو کر اکیلے زندگی گزاریں (کہ رب تعالیٰ کی طرف کامل رجوع ہو سکے) لیکن رسول اللہ ﷺ نے انہیں اس سے منع فرمایا (سعد کہتے ہیں) اگر آپ اجازت فرماتے، تو ہم اپنے آپ کو خصی کر لیتے۔

❁ عن عائشة قالت قال رسول الله ﷺ النکاح من سنتی فمن لم یعمل بسنتی فلیس منی وتزوجوا فانی مکاثر بکم الامم ومن کان ذا طول فلینکح ومن لم یجد فعلیه بالصوم فان له وجاء " (ابن ماجہ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، نکاح میری سنت ہے جو شخص میری سنت پر عمل نہیں کرتا وہ مجھ سے نہیں اور نکاح کرو بیشک میں تمہاری کثرت دوسری امتوں پر چاہتا ہوں جو شخص تم میں سے نکاح کرنے کی طاقت رکھتا ہو وہ نکاح کرے، اور جس کے پاس نکاح کرنے کی وسعت نہیں وہ روزے رکھے بیشک اس کی شہوت کو کم کرنے کا یہ ذریعہ ہے۔

حدیث شریف میں لفظ "وجاء" استعمال ہوا ہے جس کا معنی ہے "خصیتین کی رگوں کو کوٹ کر "نر" کی شہوت کو کم کر دینا یہ خصی کرنے کا ہی ایک طریقہ ہے تو ہم حدیث پاک میں اس کا معنی یہ ہے " اراد ان الصوم

یقطع شهوة النکاح کما یقطعها الوجاء " کہ روزہ نکاح کی شہوت کو اس طرح توڑ دیتا ہے جس طرح خصی کرنے سے شہوت نفسانیہ ٹوٹ جاتی ہے۔

حدیث پاک سے بعض جہلاء صوفیاء کا رد ہو گیا جنہوں نے یہ کہا " الذی یطلب الولد احمق " جو اولاد طلب کرتا ہے وہ احمق ہے۔" وما عرف انه هو الغبی الاخرق " حقیقت میں یہ قول غبی (کند ذہن) عقل سے دور لوگوں کا ہو سکتا ہے صاحب عقل تو یہ تصور بھی نہیں کر سکتا، اس لئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام رب تعالی کے حضور عرض کرتے ہیں ﴿ رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ○ ﴾ اے میرے رب مجھے اپنے قرب کے لائق اولاد عطاء فرما۔ رب تعالی نے اپنے نیک بندوں کی شان بیان فرمائی:

﴿ وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ ﴾

اور وہ جو عرض کرتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں دے ہماری بیبیوں اور ہماری اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک"

❁ قال ﷺ لابی طلحة حین مات ابنه اعرستم اللیلة ؟ قال نعم قال بارک الله لکما فی غابر لیلتکما قال فحملت " (بخاری باب طلب الولد)

نبی کریم ﷺ نے ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے ان کے بیٹے کی وفات پر (تعزیت کرتے ہوئے) فرمایا کیا تم نے رات کو مجامعت کی ؟ تو انہوں نے عرض کیا ہاں (یا رسول اللہ) آپ نے فرمایا اللہ تعالی تمہارے رات کے فعل سے آنے والے (بچے) میں برکت عطاء فرمائے ان کی زوجہ حاملہ ہو گئی۔

❁ "قال سفیان فقال رجل من الانصار فرأیت تسعة اولاد کلهم قد قرء و االقرآن"
حضرت سفیان کہتے ہیں میں نے انصار میں سے ایک شخص کے بیٹے دیکھے جو سب ہی حافظ قرآن تھے۔

❁ "عن انس بن مالک قال قالت ام سلیم یا رسول الله خادمک انس ادع الله له " فقال اللهم اکثر ماله وولده وبارک له فیما اعطیته "

حضرت انس بن مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں (میری والدہ) ام سلیم نے عرض کیا یا رسول اللہ انس آپ کا خادم ہے آپ اس کیلئے دعاء فرمائیں تو آپ نے ان کیلئے دعاء کی اے اللہ اس کا مال زیادہ کر اور اسے زیادہ اولاد عطاء فرما اور جو تو نے اسے دے رکھا ہے اس میں برکت عطاء فرما۔

❁ "وقال ﷺ اللهم اغفر لابی سلمة وارفع درجته فی المهدیین واخلفه فی عقبه فی الغابرین " (بخاری و مسلم)

نبی کریم ﷺ نے عرض کیا اے اللہ ابو سلمہ کی مغفرت فرما اور ان کے درجات کو ہدایت پر قائم لوگوں میں

بلند فرما، اوران کے پیچھے آنے والے (ان کے بچوں کو) ان کا جانشین بنا۔

❁ "وقال ﷺ تزوجوا لولود الودود فانی مکاثربکم الامم" (ابوداود)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا بچے جننے والی، محبت کرنے والی عورتوں سے نکاح کرو بیشک دوسری امت پر تمھاری کثرت پر مجھے فخر ہوگا۔

"والاخبار فی هذا المعنی کثیرة تحث علی طلب الولد وتندب الیه لما یرجوه الانسان من نفعه فی حیاته وبعد موته"

اس معنی میں کثیر احادیث موجود ہیں جن میں اولاد کی طلب پر ابھارا گیا ہے اوران احادیث سے نکاح کرنا اور اولاد کا طلب کرمستحب بلکہ سنت انبیاء کرام اورسنت صحابہ کرام کا ثبوت واضح طور پر پایا گیا ہے اور خاص کر کے انسان کو اولاد سے اپنی زندگی میں بھی نفع ہوتا ہے وہ تابعدار ہوتے ہیں خدمتگذار ہوتے ہیں اور انسان کو اس کی موت کے بعد بھی اولاد سے نفع ہوتا ہے، آیئے اس پر ارشاد مصطفوی ﷺ دیکھئے:

❁ "عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ اذامات الانسان انقطع عنه عمله الامن ثلاثة الامن صدقة جاریة او علم ینتفع به او ولد صالح یدعوله" (رواہ مسلم، مشکوۃ کتاب العلم)

حضرت ابوہریرہ ؓ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب انسان فوت ہوجاتا ہے تو اس کے عمل منقطع ہوجاتے ہیں سوائے تین (اعمال) کے یعنی سوائے صدقہ جاریہ کے یا علم کے جس سے نفع حاصل کیا جاتا ہو یا نیک اوولاد کے جو اس کے حق میں دعاء کرے۔

اس حدیث پاک کو نقل کرنے کے بعد علامہ قرطبی رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں "ولو لم یکن الا هذاالحدیث لکان فیه کفایة" اگراورکوئی حدیث نہ ہوتی تو صرف یہ حدیث ہی اولاد کی طلب کے مستحب ہونے کیلئے کافی تھی۔ (تمام بحث ماخوذ از قرطبی)

فائدہ جلیلہ : حضرت زکریا علیہ السلام کی دعاء سے یہ عظیم فائدہ حاصل ہوا کہ انسان اپنی اولاد اور زوجہ کی ہدایت کی دعاء کرتا رہے اوران کی صلاح (نیکی) پاک دامنی، اوراحکام شرع کی پاسداری کی دعاء کرتا رہے، تاکہ وہ دین ودنیا میں اس کے مددگار رہوں ان سے دنیا میں اسے نفع حاصل ہواور آخرت میں بھی حضرت زکریا علیہ السلام نے بیٹے کی دعاء میں عرض کیا ﴿وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا﴾ اے میرے رب تو اس کو اپنا پسندیدہ بنا۔ اورعرض کیا ﴿رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً﴾ اے میرے تب تو مجھے اپنی طرف سے پاکیزہ اولاد عطاء فرما۔ اوررب تعالی کے نیک

بندے رب سے یہ دعاء کرتے ہیں۔ ﴿ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ ﴾ اے ہمارے رب ہمیں دے ہماری بیبیوں اور ہماری اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک۔

یقیناً آنکھوں کی ٹھنڈک وہی ہوتے ہیں جو نیک ہوں فاسق وفاجر آنکھوں کی ٹھنڈک نہیں ہوتے بلکہ ہر وقت وبال جان ہوتے ہیں انسان ان سے جلتا ہی رہتا ہے خوش نہیں ہوتا، اور رسول اللہ ﷺ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کیلئے جو دعاء فرمائی اس میں خیر وبرکت کی دعاء کی " اللهم اكثر ماله وولده وبارك له فيه " اے اللہ اسے زیادہ مال اور زیادہ اولاد عطاء فرما اور اس میں اسے برکت عطا فرما۔ (ماخوذ از قرطبی)

اس تمام بحث سے واضح ہوا کہ اولاد اور زوجہ کی ہدایت کی دعاء کرتا رہے خصوصاً زوجہ کے خوش اخلاق ہونے کی دعاء کرے، بداخلاق زوجہ دنیا میں عذاب جہنم کی طرح ہے۔

حضرت زکریا علیہ السلام نے دعاء میں ادب کا لحاظ رکھا:

"وقال الما تريدى كانت تحدثه نفسه بذلك بان يهب الله له ولدا يبقى به الذكر اى يوم القيامة لكنه لم يكن يدعو مراعاة للادب"

ماتریدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت زکریا علیہ السلام کے دل میں تو یہی بات آرہی تھی کہ اللہ تعالی بیٹا عطاء فرمائے جس کا تذکرہ قیامت تک قائم رہے، یعنی منصب نبوت پر فائز ہو آپ یہ دعاء اگرچہ اشارۃ، کنایۃ تو کررہے تھے لیکن واضح طور پر یہ عرض نہیں کررہے تا کہ ادب کا لحاظ قائم رہے۔

آپ پہلے ہی عادت کے خلاف بڑھاپے میں اولاد کی دعاء کررہے تھے اولاد چونکہ عادت کے مطابق مذکر بھی ہوتی ہے اور مؤنث بھی اسلئے آپ مزید دعاء عادت کے خلاف صرف بیٹے کی صراحۃ (واضح طور پر) نہیں کررہے تھے (البحرالمحیط)

سوال: جب حضرت زکریا علیہ السلام کو پہلے بھی معلوم تھا کہ اللہ تعالی کو ہر چیز کی قدرت حاصل ہے تو آپ نے پہلے اولاد کی دعاء نہیں، حضرت مریم کی کرامات کو دیکھ کر دعاء کرنے کا کیا مطلب ہے؟

جواب: **قلنا قد يزداد الانسان رغبة فى الشئى اذا عاينه وان كان عالما نه قبله "**

ہاں یہ ٹھیک ہے کہ آپ کو رب تعالی کی قدرت کا پہلے ہی علم تھا البتہ کبھی کسی چیز کو دیکھ کر زیادہ رغبت اور زیادہ تمنا دل میں پیدا ہو جاتی ہے یہی صورت حال آپ کو بھی حاصل ہوئی۔ (روح البیان)

کیسی تفہیم! تفہیم کا معنی تو سمجھانا ہوتا ہے نہ کہ پھسلانا "تفہیم القرآن کی تحقیق جو حقیقت میں تخریق

ہے" دیکھئے حضرت زکریا جن کی تربیت میں وہ دی گئی تھیں غالباً رشتے میں ان کے خالو تھے اور ہیکل کے مجاوروں میں سے تھے یہ وہ زکریا نبی نہیں ہیں جن کے قتل کو ذکر بائبل کے پرانے عہد نامے میں آیا ہے۔ (تفہیم القرآن)

جمہور مفسرین کرام نے حضرت زکریا علیہ السلام (جن کا یہاں ذکر ہے) کو نبی بیان فرمایا ہے "وکان زکریا راس الاحبار ونبیھم "حضرت زکریا علماء کے سردار تھے اور ان کے نبی تھے۔ (خازن)

آگے آنے والی آیات سے بھی آپ کے نبی ہونا ثابت ہو رہا ہے، یہ وہی زکریا ہیں جو نبی ہیں۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿فَنَادَتْهُ الْمَلٰئِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًابِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًاوَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّامِّنَ الصّٰلِحِيْنَ۝﴾ (آیۃ نمبر ۳۹)

(1) تو فرشتوں نے اسے آواز دی اور وہ اپنی نماز کی جگہ کھڑا نماز پڑھ رہا تھا بیشک اللہ تعالیٰ کو مژدہ دیتا ہے یحیٰی کا جو اللہ کی طرف کے ایک کلمہ کی تصدیق کرے گا اور سردار اور ہمیشہ سے عورتوں سے بچنے والا اور نبی ہمارے خاصوں میں سے۔

(2) تو آواز دی ان کو فرشتے نے اس حال میں کہ وہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے عبادت کی جگہ میں، بیشک اللہ بشارت دیتا ہے آپ کو یحیٰی کی، وہ تصدیق کرنے والا ہوگا ایک کلمہ کی جو اللہ کی طرف سے ہے، اور وہ سردار ہوگا، اور بہت بچنے والا ہوگا (خواہشات سے) اور نبی ہوگا ہمارے خاصوں میں سے۔

مختصر مطلب:

حضرت زکریا علیہ السلام عبادت کی جگہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے تو آپ کی پاس حضرت جبریل آئے جنہوں نے آپ کو یحیٰی کی بشارت دی یعنی آپ کی دعاء کو اللہ تعالیٰ نے قبول کرلیا ہے اور میں آپ کو رب تعالیٰ کی طرف سے آپ کے پیدا ہونے والے بیٹے یحیٰی کی خوشخبری دینے آیا ہوں، آپ کا بیٹا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کرے گا جو اللہ تعالیٰ کا کلمہ ہیں، اور آپ کا بیٹا سردار ہوگا اور آپ کا بیٹا خواہشات نفسانیہ سے رکنے والا ہوگا اور ہمارے خاص قرب کے سزاوار لوگوں میں سے نبی ہوگا۔

﴿فَنَادَتْهُ الْمَلٰئِكَةُ﴾ ''تو آواز دی ان کو فرشتے نے۔''

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

(فنادته الملائكة)ای من جنسهم كقولهم زيد يركب الخيل فان المنادى كان جبريل وحده''

''لفظ ملائكة'' سے مراد جنس ہے، جیسے کہا جاتا ہے ''زيد يركب الخيل'' تو اس سے مراد ایک گھوڑا لیا جاتا ہے کہ ''وہ گھوڑے پر سوار ہے'' حالانکہ ''خيل'' اور ''ابل'' اسم جمع ہیں لیکن جنس کا اعتبار کرتے ہوئے مراد واحد ''ایک گھوڑا، ایک اونٹ'' لے لیا جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں ذکر اگرچہ ''ملائكة'' جمع ہے، لیکن جنس کا اعتبار

کرے ہوئے مراد واحد ہے، یعنی پکارنے والا صرف جبریل تھا۔ قرآن پاک میں ذکر فرمایا گیا ﴿الَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ﴾ وہ کہا ان کو لوگوں نے، اس آیۂ مبارکہ میں "الذین" اور "لھم" جمع ہیں لیکن مراد ایک شخص "نعیم بن مسعود" ہے اور "الناس" سے مراد بھی ایک شخص ابوسفیان ہیں۔ (بیضاوی وشیخ زادہ)

راقم نے ترجمہ اسی وجہ سے مفرد والا کیا ہے، تاکہ یہ مذکور بحث طلباء کرام کے ذہن میں آجائے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ جمع والا کیا ہے "فرشتوں"

اس کے متعلق مفضل بن سلمہ کہتے ہیں جب کسی رئیس کے متعلق خبر دینی مقصود ہو تو جمع کا صیغہ لایا جاتا ہے کہ اس کے ساتھ اس کے اصحاب بھی ہیں۔

"وكان جبريل عليه السلام رئيس الملائكة وقل مابعث الا ومعه جمع فجرى على ذلك قوله تعالى"

حضرت جبریل فرشتوں کے سردار تھے، یہ جب تشریف لاتے تھے تو ان کے اعزاز کی خاطر ان کے ساتھ اور فرشتوں کی جماعت بھی ہوتی تھی، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے جمع کا صیغہ ذکر فرمایا۔ (معالم التنزیل للبغوی)

اس قول کے مطابق صیغہ جمع کا اور معنی بھی جمع کا ہے۔ طلباء کرام یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ "ملائکۃ" جمع مکسر ہے جمع کے ساتھ فعل مؤنث اور مذکر دونوں طرح استعمال ہوتا ہے، اسی لئے یہاں "نادت" مؤنث کا صیغہ استعمال ہے۔

"فالنداء بمعنى القول" "فنادته" قول کے معنی میں ہے، کہا اس کو فرشتوں نے، آواز دی اس کو فرشتوں نے، تقریباً ایک ہی مطلب ہے، اسی طرح پکارنا معنی بھی عام محاورہ کے مطابق ہے کیونکہ پکارنا قریب اور بعید دونوں کیلئے آتا ہے۔

﴿وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ﴾

"اس حال میں کہ وہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے عبادت کی جگہ"

اس جملہ کی دو ترکیبیں ہیں، "وهو قائم" ابتداء وخبر "يصلى" في موضع رفع، "وان شئت كان نصبا على الحال من المضمر" (قرطبی)

ایک ترکیب یہ ہے کہ "وهو قائم" مبتداء ہو، اور "يصلى" خبر ہو، اس لحاظ پر یہ جملہ مستقل ہے، اسی کے مطابق اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ہے "اور وہ اپنی نماز کی جگہ کھڑا نماز پڑھ رہا تھا"

اور دوسری ترکیب یہ ہے کہ یہ جملہ حال ہو، اور منصوب محلا ہو، اس ترکیب کے لحاظ سے راقم کا ترجمہ

ہے ''اس حال میں کہ وہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے عبادت کی جگہ''

محراب سے مراد کیا ہے؟

''المحراب موقف الامام من المسجد وهو قول جمهور المفسرين وقيل القبلة،والظاهر ان المحراب هو المحراب الذى قبله فى قوله(كلما دخل عليها زكريا المحراب)ففى المكان الذى رأى فيه خرق العادة فيه دعاء وفيه جاء ته البشارة وهذا يدل على مشروعية الصلوة فى شريعتهم''

اگر چہ محراب کا معنی ''مسجد میں امام کے کھڑے ہونے کی جگہ'' بھی ہے،اور ''قبلہ'' کو بھی محراب کہا جاتا ہے،لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہاں بھی محراب کا وہی معنی ہے جو پہلے ﴿كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ﴾ میں بیان کیا جاچکا ہے،یعنی وہ حضرت مریم کی عبادت والا کمرہ ہے،اسی میں حضرت زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم کی کرامات دیکھیں،اسی میں آپ نے بیٹے کیلئے دعاء کی،اوراسی میں آپ کو بشارت دی گئی۔

اسی سے یہ بھی واضح ہوا کہ پہلی شریعتوں میں بھی نماز ادا کی جاتی رہی،اور بعض حضرات نے ''صلوۃ'' کا معنی دعاء بھی کیا ہے،کہ آپ دعاء کررہے تھے تو آپ کو بیٹے کی بشارت دی گئی اگر ''یصلی'' کا معنی نماز لیا جائے،بلکہ زیادہ مناسب ہی یہی ہے کہ یہی معنی لیا جائے،تو اس سے ایک اور مسئلہ سمجھ میں آیا۔

''وفى الآية دليل على جواز نداء المتلبس بالصلوة وتكليمه وان كان فى ذلک شغل له عن صلوته''

اس آیۃ کریمہ سے یہ مسئلہ بھی سمجھ آرہا ہے کہ اگر کوئی نماز ادا کر رہا ہو،اسے کسی عذر اور مجبوری کی وجہ سے دوران نماز کوئی پیغام دے دیا جائے تو یہ جائز ہے،اگر چہ بظاہر اس کی توجہ نماز سے معمولی ہٹے گی۔ (ماخوذ از البحر المحیط)

﴿وَهُوَ قَائِمٌ يُّصَلِّيْ﴾ (وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے) اس سے مندرجہ ذیل مسئلہ واضح ہوا۔

نماز میں قیام فرض ہے:

قیام کے رکن اصلی ہونے میں ائمہ کرام کا اتفاق ہے،قیام رکن اصلی ہے،اور قراءت قیام کی زینت ہے،اسی لئے امام کی قراءت مقتدی کی قراءت ہے لیکن امام کا قیام مقتدی کا قیام نہیں۔ (طحطاوی ص۱۲۲)

قیام رکن ہے فرائض اور واجبات اور سنن (سنتوں) میں۔اگر کچھ رکعتیں ادا کرنے کی نذر مانی ہو تو وہ بھی واجب ہوتی ہیں،ان میں بھی قیام رکن ہے،اگر نفل شروع کر کے توڑ دیئے تھے اور ان کی قضا کر رہا ہو تو اس میں بھی

قیام رکن ہے۔ (طحطاوی ص۱۲۲)

اصل دلیل اس پر اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ہے:

"وقوموا للہ قانتین" ای مطیعین وقیل خاشعین وقیل ساکنین وعن ابن عمر ان القنوت طول القیام فی الصلوۃ"

اور کھڑے ہو جاؤ اللہ تعالی کیلئے مطیع ہو کر اور کھڑے ہو جاؤ اللہ تعالی کیلئے خشوع (عاجزی) سے اور کھڑے ہو جاؤ اللہ کیلئے خاموش ہو کر۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے قنوت کا معنی بیان کیا ہے "نماز میں لمبا قیام" اس لحاظ پر معنی یہ ہوگا اور کھڑے ہو جاؤ اللہ کیلئے لمبے قیام سے۔ (ماخوذ از عنایۃ بر فتح القدیر ج اص ۲۳۹)

اور اس پر دلیل ارشاد مصطفوی ﷺ ہے:

"عن عمران بن الحصین قال کانت بی بواسیر فسألت النبی ﷺ عن الصلوۃ فقال صل قائما فان لم تستطع فقاعدا فان لم تستطع فعلی جنب، زاد النسائی فان لم تستطع فمستلقیا لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا" (اخرجہ الجماعۃ الامسلما)

عمران بن حصین کہتے ہیں مجھے بواسیر کی مرض لاحق تھی، میں نے رسول اللہ ﷺ سے نماز کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا "نماز ادا کرو کھڑے ہو کر، اگر کھڑے ہونے کی تمہیں طاقت حاصل نہ ہو تو بیٹھ کر نماز ادا کرو، اگر بیٹھنے کی تمہیں طاقت نہ ہو تو کروٹ پر (لیٹ کر) نماز ادا کرلو۔ نسائی میں یہ بھی ذکر ہے، اور تمہیں اس کی بیٹھنے کی طاقت نہ ہو تو سیدھے لیٹ کر نماز ادا کرلو، کیونکہ اللہ تعالی کسی نفس کو طاقت سے زائد تکلیف نہیں دیتا۔ (ماخوذ از فتح القدیر ج اص ۴۵۸)

قیام کی حد: "وحد القیام ان یکون بحیث اذا مدیدیہ لاینال رکبتیہ" قیام کی حد یہ ہے کہ وہ کم از کم اس مقدار میں کھڑا ہو کہ وہ اپنے ہاتھ لمبے (نیچے کی جانب) کرے تو اس کے ہاتھ گھٹنوں تک نہ پہنچ سکیں۔ قیام کی یہ حد ادنی درجہ کی ہے۔ اعلی درجے کی حد یہ ہے کہ بالکل سیدھا نیزے کی طرح کھڑا ہو، اس میں خشوع پیدا ہوتا ہے، عارف باللہ احمد زروق رحمہ اللہ نے اپنی پند ونصائح میں یہی ذکر فرمایا ہے۔ (مراقی الفلاح طحطاوی ص۱۲۲)

رکوع کے قریب تکبیر تحریمہ کہنے سے نماز ادا نہیں ہوگی:

"وشرط صحۃ الاتیان بالتحریمۃ قائما اومنحنیا قلیلا قبل وجود انحنائہ بما ھو اقرب للرکوع"

تکبیر تحریمہ کے صحیح ہونے کی یہ شرط ہے کہ وہ کھڑے ہو کر تکبیر تحریمہ کہے، یا معمولی جھکنے کی حالت میں تکبیر تحریمہ کہہ لی

تب بھی نماز صحیح ہوگئی اگر رکوع کی حالت میں یا رکوع کے قریب تکبیر تحریمہ کہی تو نماز نہ ہوئی اسلئے کہ قیام نہیں پایا گیا۔
(مراقی الفلاح بر طحطاوی ص ۱۱۹)

فائدہ: صرف تکبیر تحریمہ کہہ کر امام کے ساتھ رکوع میں مل گیا۔ رکوع کی تکبیر نہ کہی تو نماز ہوگئی "لان مدرک الامام فی الرکوع لایحتاج الی تکبیر مرتین" جس شخص نے امام کو رکوع میں پالیا تو اسے دو تکبیریں کہنے کی محتاجی نہیں۔

اسی طرح ایک شخص نے امام کے ساتھ ملنے کیلئے قیام کی حالت میں یا قیام کے قریب ہی معمولی جھکنے کی حالت میں تکبیر کہی لیکن اس نے اس تکبیر میں رکوع کی تکبیر کی نیت کر لی تو پھر بھی نماز ہو جائے گی، کیونکہ وہ تکبیر، تحریمہ ہی سمجھی جائے گی، اس کی نیت کو لغو (بے فائدہ) قرار دیا جائے گا، وجہ یہی ہے کہ امام کو رکوع میں پالینے والا دو تکبیروں کا محتاج نہیں۔
(ماخوذ از مراقی الفلاح بر طحطاوی بتصرف ص ۱۱۹)

مسئلہ: رکوع کے بعد کھڑا ہونا جسے فقہاء کرام "قومه" کہتے ہیں، واجب ہے، فرض نہیں۔

مسئلہ: کھڑے ہونے کی طاقت کے باوجود نفل نماز بیٹھ کر ادا کرنا جائز ہے، البتہ کھڑے ہونے والے کی بنسبت بیٹھنے والے کو ثواب آدھا ملے گا۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے "**صلوة القاعدانصف القائم**" بیٹھنے والی کی نماز کھڑے ہونے والے کی بنسبت آدھی ہے یعنی ثواب آدھا ہے۔

امام کا محراب میں کھڑے ہونے کا حکم:

"**یکره قیام الامام بجملته فی المحراب لاقیامه خارجه والکراهة لاشتباه الحال علی القوم واذاضاق المکان فلا کراهة وهکذااذاانتفی الاشتباه انتفت الکراهة وذهب الاکثر الی ان العلة التشبه باهل الکتاب لانهم یخصون امامهم بمکان وحده والتشبه بهم مکروه**"

امام کا محراب میں مکمل طور پر کھڑا ہونا مکروہ، اور پاؤں باہر ہوں تو مکروہ نہیں، مکروہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ امام جب مکمل طور پر محراب میں کھڑا ہوگا تو اس کا حال لوگوں پر مشتبہ ہوگا، اگر امام کا حال لوگوں پر مشتبہ نہ ہوا تو مکروہ نہیں، اسی طرح اگر جگہ کی تنگی ہو تو پھر بھی مکروہ نہیں۔

یہ بھی خیال رہے کہ جگہ کی تنگی کی صورت میں جب لوگ ایک ہی نماز جماعت سے پڑھ رہے ہوں تو اگلی صف والوں کی پیٹھ پر پچھلی صف والے سجدہ کریں تو جائز ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ امام کا محراب میں کھڑا ہونا اس لئے مکروہ ہے کہ اہل کتاب سے مشابہت پائی گئی ہے کیونکہ ان کے امام اپنے لئے مکان مخصوص کرتے تھے، اسلئے

ان سے مشابہت مکروہ ہے۔ (مراقی الفلاح طحطاوی ص ۱۹۸)

"عن ابی موسی الجهنی قال قال رسول الله ﷺ لا یزال امتی بخیر مالم یتخذ وافی مساجدهم مذابح کمذابح النصاری"

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے "المذابح" کا معنی بیان کیا ہے یعنی "المحاریب"

حدیث شریف کا مطلب یہ ہوا کہ ابوموسی جہنیؓ فرماتے ہیں رسول اللہ نے فرمایا میری امت ہمیشہ خیر پر رہے گی جب تک مساجد میں وہ نصاری کی طرح محراب نہیں بنائیں گے۔ (روح المعانی)

مقام توجہ: مساجد کے یہ محراب جو آجکل ہیں رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں نہیں تھے اور نہ ہی آپ کے زمانہ میں نصاری کے محراب تھے۔ اس محراب کی ابتداء تو حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے زمانہ میں ہوئی اس لئے جس محراب سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا وہ یہ تھا۔ "ان اهل الکتاب انما یخصون الامام بمکان مرتفع" بیشک اہل کتاب امام کو بلند مقام پر کھڑا کرنے سے خاص کرتے تھے۔ (طحطاوی ص ۱۹۸)

واضح ہوا کہ اس موجودہ محراب سے رسول اللہ ﷺ نے منع نہیں فرمایا، ہاں البتہ فقہاء کرام نے قیاس کیا ہے کہ نصاری اپنے اماموں کیلئے خاص چبوترہ بناتے تھے۔ اس لئے ہمارے امام مکمل طور پر محراب میں نہ کھڑے ہوں۔

راقم کا موقف تو یہ ہے کہ زمانہ کے بدلنے سے کئی احکام بدل جاتے ہیں، جب محراب کو مسجد سے جدا سمجھا جاتا تھا اس وقت تو کسی حد تک یہ قول درست ہو سکتا تھا لیکن آجکل تو محراب کو مسجد کا حصہ سمجھا جاتا ہے، جدا نہیں سمجھا جاتا، اسلئے نصاری سے مشابہت والی علت تو اٹھ گئی۔

البتہ امام کی حالت کے مشتبہ ہونے والی بات باقی رہتی ہے لیکن اس سے مکروہ تنزیہی ثابت ہوگا وہ بھی جگہ کی تنگی پر ختم ہو جائے گا، اور اشتباہ کے نہ ہونے کی صورت میں بھی کراہیت ثابت نہیں ہوگی۔ "واللہ اعلم بالصواب"

﴿اَنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکَ بِیَحْیٰی﴾ "بیشک اللہ بشارت دیتا آپ کو یحیی کی۔"

"سورۃ مریم" کی آیۃ نمبر ۷ میں اس بشارت کا ذکر یوں فرمایا ﴿یٰزَکَرِیَّا اِنَّا نُبَشِّرُکَ بِغُلٰمِ اسْمُہٗ یَحْیٰی لَمْ نَجْعَلْ لَّہٗ مِنْ قَبْلُ سَمِیًّا﴾ "اے زکریا! ہم تجھے خوشی سناتے ہیں ایک لڑکے کی جس کا نام یحیی ہے، اس کے ہم نے اس نام کا کوئی نہ کیا" یعنی اللہ تعالی نے آپ کو بیٹے کی بشارت دی۔ نام بھی خود ہی رکھا اور اس سے پہلے وہ کسی اور کا نام بھی نہ تھا۔

یحییٰ نام کی وضاحت:

بعض اہل علم نے کہا کہ یہ نام عجمی ہے۔اس لحاظ پر طلباء کرام یہ خیال کریں کہ یہ لفظ غیر منصرف ہوگا،ایک سبب علم ہوگا اور دوسرا عجمہ ۔طلباء کرام یہ بات بھی نہ بھولیں کہ اس کے آخر میں الف مقصورہ تانیث کیلئے نہیں کہ وہ اکیلے غیر منصرف کا دوسببوں کے برابر سبب بن جائے۔اور بعض حضرات نے کہا یہ لفظ عربی ہے اس صورت میں بھی غیر منصرف ہوگا ایک سبب علمیت اور دوسراوزن فعل ہوگا۔اگر عربی ہوتو اس نام کے معنی کی مختلف وجوہ بیان کی گئی ہیں۔

(۱) ''منهم من وجه تسميته بذلک بان الله تعالى احيابه عقرامه''

بعض حضرات نے آپ کے نام یحییٰ کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی وجہ سے آپ کی ماں کے بانجھ پن کو ختم کر کے رحم کو نئی زندگی عطاء فرمائی تو آپ کا نام یحییٰ رکھ لیا گیا کیونکہ اس کا معنی زندہ کرنا۔

(۲) وروی عن ابن عباس رضی اللہ عنہ ومنهم من وجه تسميته بذلک بان الله تعالى احياقلبه بالايمان''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ آپ کا نام یحییٰ اس لئے رکھا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دولت ایمان سے سرفراز کر کے حیات جاودانی عطاء فرمادی۔دنیا میں زندگی اور قبر میں بھی زندگی اور حشر میں بھی زندگی۔

(۳) ''وروی عن قتادة وقيل سمى بيحيى لانه علم الله سبحانه ان يتشهد والشهداء احياء عندربهم يرزقون''

حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ آپ کا نام یحییٰ اس لئے رکھا گیا کہ اللہ تعالیٰ کو پہلے سے ہی علم تھا کہ آپ کو شہید کر دیا جائے گا۔شہید زندہ ہوتے ہیں،اللہ کے ہاں ان کو رزق دیا جاتا ہے۔

(۴) ''لدنه يحيٰ بالعلم والحكمة للظين يؤتا هما''

اور وجہ یہ بیان کی گئی کہ علم وحکمت ذریعے نہیں قلبی وروحانی زندگی کا آپ کو بھی چونکے علم وحکمت عطا کیے گئے تو رب تعالیٰ نے آپ کا نام ہی یحییٰ رکھ دیا

(۵) ''وقيل لان يحيى به الناس بالهدى''

اور وجہ یہ بیان کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی ہدایت کے ذریعہ لوگوں کو دولت ایمان کی وجہ سے زندہ کر دیا،اسلئے آپ کا نام یحییٰ رکھ دیا گیا۔ (از روح المعانی)

(۶) ''وقال الحسن بن المفضل حيى بالعصمة والطاعة''

حسن بن المفضل فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو معصوم بنایا،گناہوں سے پاک وصاف رکھا،اور اپنا مطیع بنایا جب

آپ کو عصمت وطاعت سے زندہ رکھا تو آپ کا نام بھی یحیی رکھ دیا گیا۔

(۷) "وقال مقاتل سمی یحیی لانه احیاه بین شیخ وعجوز"

اور وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ آپ کا نام یحیی اس لئے رکھا گیا آپ کو ان کے والدین کے بڑھاپے کی عمر میں زندہ کیا گیا، یعنی آپ کو پیدا کیا تو آپ کے والدین کی وہ عمر نہ تھی جس عمر میں اولاد ہوتی ہے۔

(۸) ایک عجیب وجہ سمجھنے سے پہلے یہ سمجھا جائے کہ کبھی نام ضد پر نیک تفاؤلی (نیک شگونی) کیلئے بولا جاتا ہے، جیسا کہ جو شخص سانپ سے ڈسا جائے اسے سلیم کہا جاتا کہ اللہ تعالی اسے سلامتی میں رکھے، حالانکہ اصل میں وہ لدیغ ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص کسی مقصد کو نہ حاصل کر رہا ہو تو اسے "مفاز" کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالی اسے کامیاب فرمائے حالانکہ وہ "متارک" ہوتا ہے،

اسی طرح آپ کا نام یحیی رکھا گیا، اصل وجہ یہ ہے کہ بیان کیا گیا کہ آپ پر بظاہر وفات آنی ہے لیکن اللہ تعالی کی رحمت سے وہی حیات جاودانی ہونی ہے، کہ آپ کو شہید کر دیا جائے، لوگ اسے بظاہر موت سمجھیں گے، اور واقع میں وہ زندگی ہوگی۔ (ماخوذ از البحر المحیط بوضاحت)

(۹) "وقال مقاتل اشتق اسمه من اسم الله تعالی حی فسمی یحیی"

مقاتل کا ہی ایک اور قول یہ ہے کہ اللہ تعالی کا اسم گرامی "حی" ہے۔ اس سے آپ کا نام مشتق کر کے یحیی رکھا گیا۔

(۱۰) آپ کا نام کتاب اول میں "حیا" تھا۔ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا زوجہ ابراہیم علیہ السلام کے نام سے "یا" لے کر آپ کی پیدائش سے پہلے کئی سال آپ کا نام یحیی رکھ دیا گیا۔ حضرت سارہ کا اصلی نام یسارہ تھا۔ یہ عجمی لفظ تھا عربی میں اس کا معنی تھا "لاتلد" (نہ جننے والی عورت) جب آپ کو حضرت اسحاق علیہ السلام کی بشارت دی گئی تو آپ کا نام بھی سارہ بن گیا، انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا کہ میرے نام سے ایک لفظ "یا" کیوں حذف کر دیا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ جبریل نے اللہ تعالی کے حکم سے تمہارے نام سے لفظ "یا" کو حذف کر کے تمہاری نسل سے کئی سال بعد میں پیدا ہونے والے حضرت یحیی علیہ السلام کو دے دیا گیا ہے کیونکہ نام اصل میں "**حیا**" تھا۔ (قرطبی)

علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"رأیت فی انجیل متی انه علیه السلام کان یدعی یوحنا المعمدانی لما انه کان یعمدا لناس فی زمانه علی یحکیه کتب النصاری"

میں نے انجیل میں دیکھا کہ یحییٰ علیہ السلام کو یوحنا معمدانی کہا جاتا تھا کہ آپ نصاریٰ کی کتب کو جو بیان کرتے تھے ان پر اعتماد کیا جاتا تھا۔ (روح المعانی)

﴿مُصَدِّقًا مِّنَ اللّٰهِ﴾ ''وہ تصدیق کرنے والا ہوگا ایک کلمہ کی جو اللہ کی طرف سے ہوگا''

''کلمہ'' سے مراد عیسیٰ علیہ السلام ہیں یعنی وہ بچہ جس کی تمہیں خوشخبری دی جارہی ہے وہ عیسیٰ علیہ السلام کے نبی ہونے کی تصدیق کریں گے۔

''وکان یحیی اکبر من عیسی بستة اشهر ثم قتل یحیی قبل ان رفع عیسی الی السماء'' (روح البیان)

حضرت یحییٰ علیہ السلام عیسیٰ علیہ السلام سے چھ ماہ بڑے تھے لیکن عیسیٰ علیہ السلام کے آسمانوں پر اٹھانے جانے سے پہلے ہی آپ کو شہید کر دیا گیا تھا۔ ''وکان یحیی اول من صدق بعیسی و آمن به'' سب سے پہلے حضرت یحییٰ علیہ السلام نے عیسیٰ علیہ السلام کے نبی ہونے اور اللہ تعالیٰ کا بندہ ہونے کی تصدیق کی اور ان کے نبی ہونے پر ایمان رکھا۔ (شیخ زادہ)

''کان یحیی اول من صدق بعیسی وشهد انه کلمة من الله''

حضرت یحییٰ علیہ السلام نے سب سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کی اور گواہی دی کہ وہ اللہ کی طرف سے ایک کلمہ ہیں۔ (البحر المحیط)

حضرت یحییٰ علیہ السلام نے ماں کے پیٹ میں ہی تصدیق کر دی:

''اخرج احمد عن مجاهد قال ''قالت امراة زکریا لمریم انی اجد الذی فی بطنی یتحرک للذی فی بطنک''

امام احمد نے مجاہد سے روایت ذکر کی کہ حضرت زکریا علیہ السلام کی زوجہ نے حضرت مریم کو کہا میں اپنے پیٹ میں وہ چیز پاتی ہوں جو حرکت کر رہا ہوتا ہے اس چیز کی جو تمہارے پیٹ میں ہے۔

''واخرج ابن جریر من طریق ابن جریج عن ابن عباس قال کان یحیی وعیسی ابنی خالة وکانت ام یحیی تقول لمریم انی اجد الذی فی بطنی یسجد للذی فی بطنک''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام دونوں خالہ زاد بھائی تھے حضرت یحییٰ کی والدہ ایک مرتبہ حضرت مریم کو کہنے لگیں جو میرے پیٹ میں ہے وہ سجدہ کرتا ہے اسے جو تمہارے پیٹ میں ہے۔

''فذالک تصدیقه له'' یہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی طرف سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی یہ تصدیق ہے، جو انہوں نے

اپنی پیدائش سے پہلے کی، یعنی تین ماہ دونوں کا حمل میں رہنے کا مشترک ہے، اگرچہ حضرت یحییٰ علیہ السلام اپنی ماں کے پیٹ میں چھ ماہ پہلے آئے۔ (ماخوذ از روح المعانی بوضاحت)

عیسیٰ علیہ السلام کو "**کلمة الله**" کہنے کی وجوہ:

(۱) ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے اللہ تعالیٰ کے کلمہ "کن" سے پیدا کئے گئے تو اس وجہ سے آپ کو کلمہ کہہ لیا گیا جس طرح مخلوق کو خلق کہہ لیا جاتا ہے۔

(۲) "**والثانی انه تکلم فی الطفولیة**" دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ نے بچپن میں کلام کیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو بچپن کی حالت میں ہی کتاب کا علم دے دیا، آپ نے بچپن میں بلیغ وعظیم کلام فرمایا۔ مبالغہ کے طور پر متکلم کو کلمہ کہہ دیا گیا، جیسا کہ کہا جاتا ہے "**فلان جود**" حالانکہ وہ جواد ہوتا ہے۔

(۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ کلمہ جس طرح معانی وحقائق کا فائدہ دیتا ہے "**کذلک عیسی یرشدنا الی الحقائق والاسرار الالهیة فسمی کلمة**" اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام حقائق اور اسرار الٰہیہ کی طرف راہنمائی فرماتے تھے تو آپ کو کلمہ کہا گیا یعنی اسی طرح جس طرح قرآن پاک کو روح کہا گیا ہے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ قرآن پاک کو روح کیوں کہا گیا ہے؟ اسلئے کہ یہ بھٹکنے سے بچاتا ہے اور انسان کو قلبی زندگی عطاء فرماتا ہے جیسا کہ روح انسان کی ظاہری زندگی کا سبب ہے۔

(۴) چوتھی وجہ یہ ہے کہ آپ کے آنے سے پہلے کئی انبیاء کرام نے ان کی آمد کی بشارت دی "**فلما جاء قیل هذا هو تلک الکلمة**" جب عیسیٰ علیہ السلام آ گئے تو لوگوں کو بتایا گیا کہ یہ وہی کلمہ ہے جس کے متعلق کہا گیا تھا وہ آنے والا ہے، اب وہ آ گیا، یہ مجاز عام طور پر استعمال ہوتا ہے، جیسا کہا جائے "**قد جاء قولی وجاء کلامی**" میری بات آ گئی، میرا کلام آ گیا، یعنی میں جو کہتا تھا وہ میرا قول سچا ہو گیا، واقعہ اسی طرح کا درپیش آ گیا جیسے میں کہتا تھا۔ اس کی نظیر (مثال) اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿وَكَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ﴾ (اور اسی طرح ثابت ہو گیا تمہارے رب کا کلمہ کافروں پر کہ بیشک وہ آگ والے ہیں)

(۵) **والخامس ان الانسان قد یسمی بفضل الله ولطف الله فکذا عیسی علیہ السلام کان اسمه العلم کلمة الله وروح الله**"

جس طرح بعض لوگوں کا نام فضل اللہ اور لطف اللہ ہوتا ہے اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کا نام کلمۃ اللہ، اور روح

اللہ ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

تنبیہ: بعض حضرات نے ”بکلمة من الله“ کا معنی کتاب لیا، یعنی توراۃ وانجیل، لیکن جمہور علماء کرام کا وہی مذہب ہے جو ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس سے مراد عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ (کبیر)

﴿وَسَيِّدًا﴾ ”اور وہ سردار ہوگا۔“

حضرت زکریا علیہ السلام کو جب بیٹے کی بشارت دی گئی تو ساتھ ہی ان کے اوصاف بھی بیان کئے گئے، ایک وصف ان کا ”سید“ (سردار) ہونا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ وصف ہمارے نبی کریم ﷺ کو بھی حاصل ہے بلکہ جس طرح آپ کے درجات تمام انبیاء کرام سے اعلیٰ اور ارفع ہیں، اسی طرح آپ کی سیادت بھی تمام انبیاء کرام کی سیادت سے افضل ہے۔

”سید“ کثیر معانی میں استعمال ہے:

(۱) "قال ابن عباس السيد الكريم" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ”سید “ کا معنی ہے، کریم ہونا۔

(۲) "وقال قتادة الحليم" حضرت قتادہ کہتے ہیں ”سید“ کا معنی ہے حلیم (بردبار، حوصلہ مند) ہونا۔

(۳) "وقال عكرمة من لا يغلبه الغضب" حضرت عکرمہ کہتے ہیں ”سید“ کا معنی ہے ”وہ شخص جس پر غضب غالب نہ ہو“

(۴) "وقال الضحاك الحسن الخلق" ضحاک نے کہا ہے جس کے اچھے اخلاق ہوں وہ ”سید“ ہے۔

(۵) "وقال سالم التقى" سالم نے کہا ہے متقی، پرہیز گار کو ”سید“ کہا جاتا ہے۔

(۶) "وقال ابن زيد، الشريف" ابن زید نے کہا ہے شریف شخص کو ”سید“ کہا جاتا ہے۔

(۷) "وقال ابن المسيب، الفقيه العالم" ابن مسیب نے کہا ہے کہ فقیہ اور عالم کو ”سید“ کہا جاتا ہے۔

(۸) "وقال احمد بن عاصم الراضى بقضاء الله" احمد بن عاصم کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی ہو اسے ”سید“ کہا جاتا ہے۔

(۹) "وقال الخليل المطاع الفائق اقرانه" خلیل کہتے ہیں جس کی اطاعت کی جائے اور اپنے ساتھیوں پر اسے فوقیت حاصل ہو وہ ”سید“ کہلاتا ہے۔

(۱۰) "وقال ابوبكر الوراق، المتوكل" ابوبکر وراق کہتے ہیں اللہ تعالیٰ پر توکل رکھنے والے کو ”سید“ کہا

جاتا ہے۔

(۱۱) "وقال الترمذی العظیم الهمة" ترمذی کہتے ہیں عظیم ہمت والے کو "سید" کہا جاتا ہے۔

(۱۲) "السید من لا یحسد من قولهم الحسود لا یسود" جو شخص حسد نہ کرے اسے "سید" کہا جاتا ہے، اہل علم کا مشہور قول ہے، حسد کرنے والے سردار نہیں بن سکتے۔

(۱۳) "وقال ابو اسحاق السید الذی یفوق فی الخیر قومه" ابواسحاق نے بیان فرمایا ہے کہ جو شخص اپنی قوم پر برتری رکھے اسے "سید" کہا جاتا ہے۔

(۱۴) "وقال بعض اهل اللغة السید المالک الذی تجب طاعته" بعض اہل لغت نے بیان کیا ہے کہ مالک جس کی فرمانبرداری ضروری ہو، اسے "سید" کہا جاتا ہے، "ولهذا قیل للزوج وقیل سید الغلام" اسی وجہ سے خاوند کو سردار کہا جاتا ہے کہ زوجہ پر اس کی اطاعت لازم ہے، اور غلام کے مالک کو سید کہا جاتا ہے کہ غلام پر مالک کی فرمانبرداری لازم ہوتی ہے۔

(۱۵) "وقال سلمة عن الفراء السید المالک والسید الرئیس والسید الحکیم والسید السخی" فراء کہتے ہیں، مالک اور رئیس اور حکیم اور سخی کو سید کہا جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "قوموا الی سیدکم" {تم اپنے سردار (سعد) کیلئے کھڑے ہو جاؤ} (بخاری، مسلم، مسند احمد)

حدیث شریف میں "سیدکم" کا معنی "رئیسکم والمطاع" کیا گیا ہے، یعنی تم اپنے رئیس اور مطاع (جس کی فرمانبرداری کی جائے) کیلئے کھڑے ہو جاؤ۔

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو نبی کریم ﷺ نے "سید" کہا ہے۔

"ان ابنی هذا سید ولعل الله یصلح به بین فئتین عظیمتین من المسلمین"

(بخاری، ترمذی، مسند احمد ابن ماجہ ابن حبان من حدیث ابی بکرۃ)

بیشک میرا یہ بیٹا سردار ہے۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں کے درمیان صلح کرائے گا۔

"وقال الزمخشری السید الذی یسود قومه ای یفوقها فی الشرف"

زمخشری نے بیان کیا ہے جو اپنی قوم کا سردار ہو اور شرافت میں ان سے فوقیت رکھے وہ سید ہے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام میں یہ تمام اوصاف پائے گئے، اسی وجہ سے آپ کو سید کہا گیا ہے۔ (ماخوذ از البحر المحیط)

"قال الهروی اسید هو الذی یفوق قومه فی الخیر وقال غیره هو الذی یفزع الیه فی النوائب

والشدائد فیقوم بامرهم ویحتمل عنهم مکارهم ویدفعها عنهم" (النووی شرح المسلم ج ۲ ص ۲۵۳)

ہروی رحمہ اللہ فرماتے ہیں سید وہ ہے جو اپنی قوم میں بھلائیوں کے لحاظ پر فوقیت رکھتا ہو، دوسرے اہل علم نے کہا ہے کہ سید وہ ہے جس کی طرف مصائب وآلام میں لوگ رجوع کریں، وہ ان کے معاملات کو درست کرے اور ان کی مشکلات کو اٹھائے اور ان کے مصائب کو مندفع (دور) کرے۔

تنبیہ: "ولیس السید هو المالک فحسب لانه لو کان کذلک لجاز ان یقال سیدالدبة وسید الثوب کما یقال سید العبد"

سید کا معنی جو "مالک" کیا گیا ہے، اس سے مراد صرف غلام اور لونڈی کا مالک ہے، ہر چیز کے مالک کو سید نہیں کہا جا سکتا، اس لئے کپڑے کے مالک کو "سید الثوب" نہیں کہا جاتا، اور سواری کے مالک کو "سید الدابة" نہیں کہا جاتا۔ (احکام القرآن للجصاص)

اعتراض: "وقدروی ان وفد بنی عامر قدموا علی النبی ﷺ فقالوا انت سید نا وذوالطول علینا فقال النبی ﷺ هو الله تکلموا بکلامکم ولا یستهو ینکم الشیطان"

نبی کریم ﷺ کے پاس بنی عامر کا ایک وفد آیا۔ انہوں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا آپ ہمارے سردار ہیں۔ آپ ہم پر طاقت رکھتے ہیں تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا سردار تو اللہ تعالی ہے تم اپنی بات کرو، شیطان تمہیں خواہشات میں نہ مبتلاء کرے۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے آپ کو "سید" کہنے سے منع فرمایا تو کس طرح کہا جاتا ہے کہ نبی کریم ﷺ "سید" ہیں۔

جواب: "وقد کان النبیا افضل السادة من بنی آدم ولکنه رآهم متکلفین بهذاالقول فانکره علیهم" نبی کریم ﷺ بنی آدم میں افضل السادات (تمام سرداروں سے افضل) ہیں لیکن جب آپ نے دیکھا کہ وہ تکلف سے آپ کی مدح میں یہ قول ذکر کر رہے ہیں تو آپ نے ان کو منع فرمایا یعنی حضور ﷺ کی شان دل اور محبت سے بیان کی جائے، بناوٹ اور تصنع آپکو پسند نہیں تھے، بناوٹ اور تصنع کی ناپسندیدگی پر واضح ارشاد مصطفوی دیکھئے:

"قالان ابغضکم الی اشرثارون المتشدقون المتفیهقون"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم میں سے میرے نزدیک وہ لوگ ناپسند ہیں جو ادھر ادھر سے باتیں پھیر کر کرتے ہیں، اور باچھیں کھول کر ٹیڑھی کر کے باتیں کرتے ہیں، اور باتیں بکھیر کر کرتے ہیں۔

مسئلہ بہت واضح ہوا کہ "فکرہ لهم تکلف الکلام علی وجه التصنع" نبی کریم ﷺ نیت بنی عامر کے بناوٹ والے قول کو ناپسند کر کے فرمایا کہ "سردار تو اللہ تعالیٰ ہے۔ (احکام القرآن للجصاص)

جصاص رحمہ اللہ کے ایمان افروز جواب کے بعد کوئی اور جواب کی ضرورت تو باقی نہیں رہی، تاہم راقم کے نزدیک اگر یہ جواب دیا جائے کہ بنی عامر کے لوگوں کو جو آپ نے ارشاد فرمایا اس کا مطلب یہ ہوا کہ حقیقی "سید" اللہ تعالیٰ ہے۔ رب تعالیٰ کی عطاء سے جو آپ کو سیادت حاصل ہے اس کی آپ نے نفی نہیں فرمائی۔

منافق کو "سید" کہنا منع ہے:

"وقدروی عن النبی ﷺ انه قال لا تقولوا للمنافق سیدا فانه ان یک سیدا فقد هلکتم"

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ منافق کو سردار نہ کہو، اگر منافق سردار بن گیا تو تم تباہ و برباد ہو جاؤ گے۔

منافق کو "سید" کہنے سے منع کرنے کی وجہ یہ ہے "لانه لا تجب طاعته" کہ اس کی طاعت واجب نہیں۔

اعتراض: رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا﴾ "اور وہ کہیں گے اے ہمارے رب ہم اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کے کہنے پر چلے، تو انہوں نے ہمیں راہ سے بہکا دیا۔" یہ کافروں کے کلام کی حکایت رب قدوس نے بیان فرمائی، (کہ جب ان کو جہنم کی طرف دھکیل دیا جائے گا) تو وہ کہیں گے ہم قوم کو سرداروں اور بڑی عمر کے لوگوں نے گمراہ کر دیا ہے کیونکہ ہم ان کی تابعداری کرتے رہے۔ اس "آیة کریمه" میں کفار کو سردار کہا گیا ہے، حدیث پاک میں منافق کو سید کہنے سے منع کیا گیا ہے، ان میں تطبیق کس طرح ہوگی۔

جواب: کافروں چونکہ قوم کے سرداروں کو اس درجہ میں سمجھا ہوا تھا کہ ان کی طاعت واجب ہے، حقیقت میں تو وہ سرداری (سیادت) کے مستحق نہ تھے "فکانوا عندهم وفی اعتقاداتهم ساداتهم" وہ لوگ ان کافروں کے عقیدہ میں سردار تھے، حقیقت میں سادات نہیں تھے۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿فَمَا أَغْنَتْ عَنْهُمْ آلِهَتُهُمْ﴾ ان کو ان کے معبود بے پرواہ نہ کر سکے، "ولم یکونوا آلهة ولکنهم سموهم آلهة" ان کے معبودان باطلہ کوئی معبود تو نہیں تھے، البتہ آیۃ کریمہ میں ان کو معبود کہا گیا ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ ان کے عقیدہ کے مطابق ان کے معبود تھے، حقیقت میں معبود نہیں تھے۔ (ماخوذ از احکام القرآن للجصاص)

﴿وَحَصُورًا﴾ ''اور بہت بچنے والا ہوگا خواہشات سے۔''

''(وحصورا)ای مبالغافی حصر النفس وحبسها عن الشهوات مع القدرة''

''حصور'' کا معنی اپنے نفس کو بہت زیادہ روکنے والا خواہشات سے، باوجود اس کے کہ وہ ان خواہشات کی طاقت بھی رکھتا ہو۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کا بچپن میں دوسرے بچوں سے گذر ہوا، انہوں نے آپ کو کھیلنے کی دعوت دی ''فقال ماللعب خلقت'' تو انہوں نے کہا مجھے کھیل کیلئے پیدا نہیں کیا گیا۔ (روح البیان)

''فقیل کان لایأتی النساء مع القدرة'' بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ آپ کو ''حصورا'' کے لقب سے نوازا گیا ہے، اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ عورتوں سے بچنے والے تھے باوجود اس کے کہ آپ کو عورتوں سے جماع کرنے کی طاقت حاصل تھی۔ بعض حضرات نے بیان کیا کہ ''انه كان عنينا ای عاجزا عن اتيان النساء'' آپ نامرد تھے یعنی عورتوں سے جماع کرنے پر قادر ہی نہیں تھے''

''وهذاالقول عندنا فاسد لان هذا من صفات نقصان وذكر صفة النقصان فی معرض المدح لا يجوز''

یہ قول ہمارے نزدیک فاسد ہے بیشک یہ صفت نقصان ہے، اور صفت نقصان کا مقام مدح میں ذکر کرنا جائز نہیں۔

اس آیۂ کریمہ میں تو حضرت یحییٰ علیہ السلام کی صفات بیان ہورہی ہیں، عیوب نہیں بیان کئے جارہے۔ (کبیر)

''وقد بان لک من هذاان عدم القدرة على النكاح نقص، وانما الفضل فی كونها موجودة ثم يمنعها''

یہ بات واضح ہے کہ نکاح کی قدرت حاصل نہ ہونا نقص ہے، ''هذه نقيصة وعيب ولا يليق بالانبياء عليهم السلام'' اور نقص اور عیب انبیاء کرام کی شان کے لائق نہیں، فضیلت اس میں ہے کہ طاقت اور قدرت حاصل ہو لیکن اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہونے کی وجہ سے عورتوں کی طرف رغبت کم ہو۔ (ماخوذ از صابونی وابن کثیر)

زیادہ محققین اس طرف ہیں کہ اگر ''حصورا'' کا معنی عورتوں سے بچنے والا معنی لیا جائے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا:

''انه الذی لایأتی النساء لا للعجز بل لعفة والزهد وذلک لا ن الحصور هوالذی يكثرمنه حصر النفس''

آپ کا عورتوں کے پاس نہ آنا عجز کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ عفت اور زہد کی وجہ سے تھا، کیونکہ حصورا سے کہا جاتا ہے جو خود اپنے نفس کو زیادہ روکنے والا ہو، جسے طاقت ہی حاصل نہ ہو وہ حصور نہیں ہوگا بلکہ محصور ہوگا۔ (ماخوذ از کبیر)

"فالاولی ان یقال انه کان منوعاحابسا نفسه عن اتباع الشهوات والملاهی"

بہتر یہ ہے کہ "حصورا" کا معنی یہ لیا جائے کہ وہ اپنے آپ کو خواہشات، کھیل وغیرہ سے بہت زیادہ روکنے والا ہوگا۔ (مظہری)

ابھی جو مظہری سے بیان کیا ہے یہی روح المعانی، صابونی، ابن کثیر وغیرہ میں مختلف الفاظ سے ذکر کیا گیا ہے۔

اعتراض: حضرت یحییٰ علیہ السلام کا عنین (نامرد) ہونا تو حدیث پاک سے ثابت ہے کس طرح اس سے انکار کیا جائے گا، حدیث پاک کو دیکھئے:

"واخرج ابن جریر وابن المنذروابن ابی حاتم وابن عساکر عن عمرو بن العاص عن النبی ﷺ قال ما من عبد یلقی الله الاذاذنب الایحیی بن زکریا فان یقول وسیدا وحصورا قال وانما کان ذکر مثل هدبة الثوب واشار بانملته" (درمنثور)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کوئی بندہ ایسا نہیں جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے گا مگر یہ کہ وہ گنہگار ہوگا، سوائے حضرت یحییٰ بن زکریا کے، بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ﴿سَيِّدًا وَّحَصُوْرًا﴾ (وہ سردار ہوں گے اور عورتوں سے بچنے والے) اور آپ نے فرمایا ان کا ذکر (آلہ تناسل) کپڑے کے دھاگوں کی طرح ہے، آپ نے اپنی انگلیوں سے پوروں اشارہ فرمایا۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ آپ عنین تھے۔

جواب: حدیث پاک کی سند میں وہ قوت نہیں جس سے معترض حضرات اپنا موقف ثابت کرسکیں ضعیف حدیث سے انبیاء کرام کے نقائص وعیوب کیسے ثابت ہوسکیں گے جبکہ قوی حدیث سے بھی ثابت کرنا ممکن نہیں، راوی کو جھوٹا کہنا آسان ہے، نبی کے عیوب ثابت کرنا مشکل ہے۔

پھر حدیث مکمل طور پر تاویل کی محتاج ہے کیونکہ تمام انبیاء کرام گناہوں سے پاک وصاف ہیں، اس لئے مطلقا حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بغیر ہر شخص رب تعالیٰ سے ملاقات کرے تو وہ گنہگار رہوا ایسا ممکن نہیں، جس طرح حدیث شریف کے پہلے حصہ سے تمام انبیاء کرام مستثنی ہیں۔

اسی طرح دوسرے حصہ کا مطلب بھی واضح ہے کہ آپ کو عورتوں سے اس طرح رغبت حاصل نہیں تھی جیسا کہ نامرد انسان جس کا آلہ تناسل کپڑے کے دھاگے کی طرح ہو تو اسے رغبت نہیں ہوتی، اکثر طور پر حروف تشبیہ ذکر نہیں ہوتے لیکن حقیقت میں تشبیہ ہوتی ہے، جیسا کہ کہا جائے "زید اسد"، تو حقیقت میں تو یہ "زید کالاسد" ہے۔ (راقم)

حضرت یحییٰ علیہ السلام نے شادی کی تھی یا نہیں؟

اگر چہ بعض حضرات نے تو یہ بیان کیا ہے "حصورا" کا جب مطلب یہ ہے کہ آپ عورتوں سے بچنے والے ہوں گے تو اس سے پتہ چلا کہ آپ نے شادی نہیں کی تھی لیکن تحقیقی بات یہ ہے کہ آپ نے شادی کی تھی، آپ کی اولاد بھی تھی، آیئے تفاسیر کو دیکھیں:

"والحصور الممتنع من النساء مع القدرة عليهن وقدتزوج مع ذلک ليكون اغض لبصره" (روح البیان)

حصور کا معنی ہے عورتوں سے رک جانا باوجود اس کے کہ وہ عورتوں سے جماع پر قادر ہو آپ نے شادی کی تھی تا کہ آپ کی نظر نیچے رہے (کہیں نہ اٹھے)

"والمقصود انه مدح ليحيى بانه حصور ليس انه لاأتى النساء بل معناه كما قاله هو وغيره انه معصوم من الفواحش والقاذورات، ولا يمنع ذلک من تزويجه بالنساء الحلال وغشيانهن وايلادهن بل قد يفهم وجود النسل له من دعاء زكريا المتقدم حيث قال(رب هب لي من لدنک ذرية طيبة) كأنه قال ولداله ذرية ونسل وعقب" والله سبحانه وتعالى اعلم"

مقصد حضرت یحییٰ علیہ السلام کی مدح بیان کرنا ہے کہ آپ "حصور" ہوں گے، عورتوں کے پاس نہ جانا اس کا مطلب نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ گناہوں سے اور خواہشات سے بہت بچنے والے ہوں گے، اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ نے حلال عورتوں سے نکاح نہیں کیا اور ان سے وطی نہیں کی اور آپ کی اولاد نہیں بلکہ حضرت زکریا علیہ السلام کی دعاء سے ہی یہ سمجھ آرہا ہے کہ آپ کی اولاد تھی، کیونکہ انہوں نے ﴿ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً﴾ کی دعاء کی جس کا مطلب یہ ہے کہ اے میرے رب مجھے وہ پاکیزہ اولاد عطاء فرما جس کی نسل باقی رہے۔ (ماخوذ از صابونی وابن کثیر)

﴿وَنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ "اور نبی ہوگا میرے خاصوں میں سے"

"يعني انه من اولاد الانبياء الصالحين" یعنی وہ انبیاء کرام جو رب تعالیٰ کے قرب کے سزاوار ہوں گے ان کی اولاد سے ہوں گے اور خود بھی نبی ہوں گے۔ (خازن)

اس سے واضح ہو گیا کہ یہ تمام واقعہ حضرت زکریا علیہ السلام کا چل رہا ہے جو نبی تھے، یہ کہنا کہ وہ نبی نہیں تھے جن کا تذکرہ یہاں، یہ باطل قول ہے۔ (راقم)

حضرت زکریا علیہ السلام کو بیٹے کی بشارت دی گئی اور اس سے اعلیٰ بشارت اس بیٹے کے نبی ہونے کی دی

گئی، کیونکہ انسانوں میں نبوت سے بڑھ کر کوئی اور وصف نہیں۔ (از صابونی)

(ونبیا من الصالحین)ای من کبار المرسلین القائمین بحقوقک وحقوق عبادک"

وہ بڑے مرسلین جو تیرے حقوق اور بندوں کے حقوق کو پورا کرنے والے ہیں، ان میں سے ہی یہ نبی ہوں گے۔ (صاوی)

حضرت زکریا علیہ السلام جب عبادت خانہ میں عبادت میں مشغول تھے تو آپ کے پاس ایک سفید کپڑوں والا شخص آیا، تو آپ گھبراہٹ میں مبتلاء ہوگئے یعنی اچانک پریشان ہوگئے کہ یہ کون ہے "فناداه جبریل (یازکریا ان اللہ یبشرک بیحیی) تو آپ کو جبریل نے نداء دی، اے زکریا! بیشک اللہ تمہیں یحیی کی خوشخبری دیتا ہے۔ (خازن)

جبریل کا حضرت زکریا کے پاس آنا اور ہم کلام ہونا اس پر دلالت کررہا ہے کہ حضرت زکریا نبی تھے۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

آیۃ کریمہ میں استعمال کچھ الفاظ کی وضاحت:

زکریا: "عجمی" لفظ ہے، الف ممدودہ کے مشابہ ہے، اسی مشابہت کی وجہ سے غیر منصرف ہوتا ہے اور اگر اس لفظ کو نکرہ بنائیں تو پھر بھی غیر منصرف رہتا ہے، اگر علمیت اور عجمہ کی وجہ سے غیر منصرف ہوتا تو نکرہ بنانے کی صورت میں منصرف ہوجاتا۔

نادت: لفظ مشتق ہے "نداء" سے "نادی ینادی مناداۃ، النداء، رفع الصوت "نداء کا معنی ہے، آواز کو بلند کرنا،"فلان اندی صوتا" فلاں شخص بلند آواز والا ہے۔

"**دارالندوہ**" مشورہ (میٹنگ) کا مقام، وہاں چونکہ لوگوں کی آوازیں بلند ہوتی ہیں تو اسلئے اسے "دار الندوہ" کہا جاتا ہے، یعنی اصلی معنی یہ ہے" آوازوں کے بلند ہونے کا گھر" "منتدی" اور "نادی" کا معنی ہے لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ "مجلس" جب یہ لفظ ناقص یائی ہو تو اس وقت اس کا معنی ہوتا ہے" بارش ہونا" "الندی، المطر، یقال "ندی یندی ندیا" مہموز اللام اور ناقص یائی "ندأ" اور "ندی" کے باب مفاعلہ میں صیغوں کا رسم الخط ایک جیسا ہوتا ہے۔ (ماخوذ از البحر المحیط)

"**من الصالحین**" میں لفظ "من" میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ "من" ابتدائیہ ہو اس وقت معنی ہوگا وہ نبی ہوں کے نبیوں میں پیدا ہوں گے، یعنی انبیاء کرام کے والد ہوں گے۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ "من" تبعیضیہ ہو، اب معنی یہ ہوگا کہ وہ انبیاء کرام میں سے نبی ہوں گے۔" ومعناه علی الاول ذو نسب وعلی الثانی

معصوم" پہلے احتمال پر یہ ثابت ہوگا کہ آپ صاحب نسب ہیں انبیاء کرام کی اولاد سے ہیں۔ اور دوسرے احتمال میں آپ کا معصوم ہونا ثابت ہوگا کیونکہ نبی معصوم ہوتا ہے۔ (روح المعانی)

لیکن راقم کے نزدیک یہ اس وقت بحث مراد ہوگی جب صرف "من الصالحین" کو دیکھا جائے، جب مکمل "ونبیا من الصالحین" کو دیکھا جائے تو پہلے احتمال میں بھی آپ کا معصوم ہونا سمجھ آئے گا۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی والدہ کا نام:

الیساع تھا جن کو الیسابات بھی کہا جاتا تھا، بیت المقدس جس طرح مسجد اقصیٰ کو کہا جاتا ہے، اسی طرح اس علاقہ اور خطہ کو بھی بیت المقدس کہہ لیا جاتا ہے، یہودی اصطلاح میں اس علاقہ کا نام یروشلم ہے۔ (ماخوذ از حقانی بوضاحت)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِیَ الْکِبَرُ وَامْرَاَتِیْ عَاقِرٌ قَالَ کَذٰلِکَ اللّٰہُ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ﴾ (آیۃ نمبر ۴۰)

(۱) بولا اے میرے رب میرا لڑکا کہاں سے ہوگا مجھے تو پہنچ گیا بڑھاپا اور میری عورت بانجھ فرمایا اللہ یونہی کرتا ہے جو چاہے۔

(۲) عرض کیا اے میرے رب کس طرح ہوگا میرا لڑکا، حالانکہ پہنچ گیا مجھے بڑھاپا اور میری عورت بانجھ، فرمایا اسی طرح اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہے۔

مختصر مطلب: جب حضرت زکریا علیہ السلام کو جبریل نے رب تعالیٰ کی طرف سے بشارت دی کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک بیٹا عطاء کرے گا جس کا نام یحییٰ ہوگا تو آپ نے بطور تعجب کہا میرا بیٹا کیسے ہوگا جب میری عمر بڑھاپے کی ہے اور میری زوجہ بانجھ ہے تو رب تعالیٰ کا ارشاد آپ کو پہنچایا گیا کہ رب تعالیٰ جو چاہے وہی کرتا ہے، اس کی قدرت سے کوئی بعید نہیں، اور اسے کوئی اس کی مشیت سے روک نہیں سکتا۔

﴿قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ﴾ ''عرض کیا اے میرے رب کس طرح ہوگا میرا لڑکا۔''

"قال" کا فاعل ضمیر غائب ہے جس سے مراد حضرت زکریا علیہ السلام ہیں یعنی حضرت زکریا علیہ السلام نے رب تعالی کے حضور عرض کیا۔

"رب" اصل میں ''یـــا ربــی'' ہے، اے میرے رب، زیادہ مشہور اور صحیح قول یہی ہے کہ یہ خطاب رب تعالی کو ہی ہے۔ اے میرے مالک! اے میرے رب! تاہم بعض حضرات نے کہا یہ خطاب حضرت جبریل علیہ السلام کو ہے، اس صورت میں معنی ہوگا ''اے میرے سردار!''

﴿اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ﴾ میں لفظ ''انی'' کے دو معنی ہیں ''یعنی من این یکون، و کیف یکون لی غلام'' ایک معنی یہ ہے کہ ''انـی'' این کے معنی میں ہو، اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ میری عورت تو بانجھ ہے، میرا لڑکا کہاں سے آئے گا۔ اور دوسرا معنی یہ ہے کہ ''انی'' کیف کے معنی میں ہو، تو اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ میرا لڑکا کس طرح ہوگا۔ (خازن)

اعلی حضرت رحمہ اللہ نے پہلا معنی ذکر فرمایا۔ راقم نے دوسرا معنی ذکر کیا ہے تاکہ طلباء کرام کو دونوں معنی ذہن نشین ہو جائیں۔

بظاہر حضرت زکریا علیہ السلام کے اس قول پر وہم یہ ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالی کی طرف سے آپ کو بشارت دے دی گئی تو پھر آپ کا یہ عرض کرنا تو اس پر دلالت کر رہا ہے کہ آپ کو اللہ تعالی کے وعدہ پر یا اللہ تعالی کی قدرت پر شک تھا، یہ کیسے ممکن ہے۔ تو اس کا جواب یہ دیا گیا

''لم یشک زکریا علیہ السلام فی وعد اللہ وفی قدرتہ وانما قال ذلک علی سبیل الاستفھام والاستعلام والمعنی من ای جھۃ یکون لی الولد ایکون بازالۃ العقر عن زوجتی ورد شبابی اویکون ونحن علی حالنا من الکبر والضعف فاجابہ بقولہ کذلک اللہ یفعل مایشاء''

حضرت زکریا علیہ السلام کو اللہ تعالی کے وعدہ اور قدرت میں کوئی شک نہ تھا، بلکہ آپ نے سمجھنے اور علم حاصل کرنے کی غرض سے یہ سوال کیا، کہ اللہ تعالی میری زوجہ کا بانجھ پن دور کرے اور میری جوانی لوٹا کر ہمیں بیٹا عطاء کر دے گا۔ یا کہ ہمیں اپنے حال پر رکھتے ہوئے بیٹا عطاء کرے گا۔ یہ تھا تعجب، یہ تھی سوال کی وجہ، تو رب تعالی کی طرف سے جواب دیا گیا: ''اسی طرح کرتا ہے اللہ جو چاہتا ہے''

مطلب یہ تھا کہ تم تعجب نہ کرو، اللہ تعالی چاہے تو اسی حال میں تمہیں رکھتے ہوئے اپنی قدرت کاملہ سے بغیر

اسباب کے بیٹا عطاء کردے، یہ اس کی قدرت سے بعید نہیں۔ اللہ تعالی نے اپنے نظام قدرت کو ظاہری اسباب کے تحت کر دیا ہے، اس لئے تمھاری زوجہ کے بانجھ پن کو دور کر کے تمہاری جوانی کو واپس لوٹا کر تمہیں بیٹا عطاء کر دے تو یہ بھی اس کی قدرت اور مشیت ہے۔ (خازن)

بعض حضرات نے ایک اور وجہ بیان کی ہے، اس پر عکرمہ اور سدی کی ایک روایت پیش کی ہے۔

"لما سمع زكريا نداء الملائكة جاء ه الشيطان وقال يا زكريا ان الصوت الذی سمعت ليس هو من الله تعالى وانما هو من الشيطان ولو كان من الله لا وحاه اليک كما يوحى اليک فی سائر الامور فقال ذلک دفعاللوسوسة "

جب حضرت زکریا علیہ السلام نے فرشتوں کی نداء سنی تو آپ کے پاس شیطان آیا۔ اس نے کہا اے زکریا یہ آواز جو تم نے سنی ہے وہ اللہ تعالی کی طرف سے نہیں بلکہ شیطان کی جانب سے ہے اگر اللہ تعالی کی طرف سے ہوتی تو وہ تمھاری طرف وحی بھیجتا جیسے آپ کی طرف باقی امور میں وحی آتی ہے تو حضرت زکریا علیہ السلام نے اس وسوسہ پر کہا "اے میرے رب میرا لڑکا کیسے ہوگا"

اعتراض: یہ کس طرح جائز ہے کہ انبیاء کرام پر ملائکہ کے کلام اور شیطان کے کلام میں اشتباہ ہو؟ اگر ہم اسے جائز رکھیں " لارتفع الوثوق باخبارهم عن الوحی السماوی " تو انبیاء کرام کی آسمانی خبروں پر اعتماد ہی اٹھ جائے گا۔

جواب: اجيب عن هذا الاعتراض بانه لما دلت الدلائل على سدق الانبياء فيما يخبرون به عن الله تعالى بواسطة الملک فلا مدخل للشيطان فيه وذلک فيما يتعلق بالدين والشرائع فاما ما يتعلق بمصالح الدنيا وبالولد فقد يحتمل فيه حصول الوسوسة فسأل زكريا ذلک لنزول هذه الوسوسة "

اس اعتراض کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جب دلائل واضح طور پر انبیاء کرام کی صداقت پر دلالت کر رہے ہیں جو وہ خبر دیتے ہیں اللہ تعالی کی طرف سے فرشتے کے واسطہ سے وہ سچی ہی سچی خبر ہوتی ہے اس میں شیطان کا کوئی دخل نہیں ہوتا، یہ وہی خبریں ہیں جن کا تعلق دین وشریعت سے ہے۔ البتہ دنیاوی خبروں میں یا بیٹے کی بشارت میں وسوسہ ڈالا جاسکتا ہے، اسی وسوسہ کی وجہ سے آپ نے اللہ تعالی سے سوال کیا۔ (خازن)

تنبیہ: خازن کا یہ جواب راقم کے نزدیک ضعیف ہے شیطان نبی کو وسوسہ نہیں ڈال سکتا، تفصیل پہلے پارہ میں حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ میں دیکھیں۔

بشارت کے وقت حضرت زکریا علیہ السلام کی عمر:

مختلف اقوال ملتے ہیں، کہ آپ کی عمر بانوے سال تھی، یا ننانوے سال تھی یا ایک سو بیس سال تھی۔ راقم کے نزدیک آسان بات یہ ہے کہ آپ کی عمر نوے سال سے زائد تھی۔ آپ کی زوجہ کی عمر بھی نوے سال سے زائد تھی۔ (ماخوذ از خازن)

آپ کی یہ عرض عجز کی وجہ سے تھی:

"وقیل المعنی بای منزلة استوجب هذا و انا و امرأتی علی هذه الحال علی وجه التواضع"

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ آپ نے عاجزی کے طور پر رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا اے میرے رب میں اور میری زوجہ کس مرتبہ کی وجہ سے یہاں اس مرتبہ پر پہنچ گئے ہیں، کہ ہمیں بڑھاپے میں اولاد حاصل ہولی، یہ تو صرف تیرا کرم ہی کرم ورنہ عقل سے یہ بعید ہے ظاہری اسباب اولاد کے بالکل نہیں پائے گئے۔ (ماخوذ از قرطبی)

آپ کے سوال کرنے کی اور وجہ یہ تھی کہ عام طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوئی شخص کسی چیز سے ناامید ہو جائے تو وہ:

"اذا اتفق ان حصل له ذلک المقصود فربما صار کالمدهوش من شدة الفرح فیقول کیف حصل هذا ،ومن این وقع هذا کمن یری انسانا وهبه اموالا عظیمة یقول کیف وهبت هذه الاموال ومن این سمحت نفسک بهبتها"

اس چیز کے حاصل ہونے پر اتنا خوش ہوتا ہے کہ یوں سمجھا جاتا ہے کہ وہ مدہوش ہو گیا ہے، وہ اسی خوشی کے حال میں یوں کہتا ہے "یہ کیسے حاصل ہو گیا، یہ کہاں سے آ گیا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی شخص کسی کو کثیر مال بطور عطیہ دے تو وہ یہ کہے" تم نے اتنا بڑا مال مجھ غریب کو کیسے دے دیا تم نے یہ اتنا مال دے کر کیسے مجھ پر سخاوت کر دی۔

اسی طرح جب حضرت زکریا علیہ السلام نے اولاد کا ملنا بعید سمجھا ہوا تھا، جب آپ کو بیٹے کی بشارت دی گئی "فصار من عظم فرحه وسروره قال ذلک الکلام" تو آپ نے بہت زیادہ خوش ہو کر یہ کلام کیا، اے میرے رب تیرا اتنا کرم کیسے ہو گیا، مجھ بوڑھے کو کیسے اولاد حاصل ہو گی۔ (کبیر)

اور وجہ یہ ہے کہ جب مالک اپنے غلام کو کوئی چیز دینے کے متعلق جب وعدہ کرتا ہے جس چیز کا وہ بڑا مشتاق تھا اور مالک سے مانگ بھی چکا تھا، تو مالک سے یہ سن کر کہ وہ چیز تمہیں دینے والا ہے۔

"فالتذ السائل بسماع ذلک الکلام فربما اعاد السوال لیعید ذلک الجواب فحینئذ یلتذ بسماع تلک الاجابة مرة اخری"

تو وہ سائل لذت محسوس کرتا ہے اس کی بات کو سن کر کہ ہاں مجھے یہ نعمت ملنے والی ہے، وہ پھر سوال کرتا ہے کہ ہاں واقعی مجھے یہ نعمت ملنے والی ہے تو پھر اسے جواب دیا جاتا کہ ہاں تمہیں یہ نعمت عطاء کی جارہی ہے تو وہ سن کر اور زیادہ خوش ہوتا ہے اور لذت محسوس کرتا ہے۔

" فالسبب فی اعادۃ زکریا ھذا الکلام یحتمل ان یکون من ھذا الباب "

حضرت زکریا علیہ السلام کا اس کلام کو لوٹانے کی وجہ بھی یہ ہوسکتی ہے کہ آپ رب تعالی کے کلام کو بار بار سننا چاہتے ہوں اگر چہ وہ بواسطہ جبریل تھی۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿ وَقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ ﴾ ''حالانکہ پہنچ مجھے بڑھاپا۔''

''کبر'' مصدر ہے کہا جاتا ہے " کبر الرجل یکبر کبرا"یعنی وہ شخص بوڑھا ہوگیا۔علم معانی والوں نے کہا ہے " کل شیٔ صادفتہ وبلغتہ فقد صادفک وبلغک " ہر وہ چیز جس کو تم نے پالیا ہو، اور تم اس تک پہنچ گئے ہو، تحقیق اس چیز نے تمہیں پالیا ہے اور وہ تم تک پہنچ گئی ہے، اسلئے یہ کہنا بھی درست ہے " بلغت الکبر " میں نے بڑھاپے کو پالیا ہے جیسا کہ قرآن پاک میں استعمال بھی ہوا ہے ﴿ وقدبَلغتُ مِنَ الْكِبَرِ﴾ اور یوں کہنا بھی درست ہے ﴿بلغنی الکبر﴾ مجھے پہنچ بڑھاپا۔

اسی کے قریب عرب کا قول ہے " لقیت الحائط ،وتلقانی الحائط "میں دیوار کو ملا، اور دیوار مجھے ملی لیکن یہ خیال کیا جائے کہ " بلغت البلد " (میں شہر میں پہنچا) کہنا تو جائز ہے، لیکن ' بلغنی البلد " (مجھے شہر پہنچ گیا) نہیں کہا جاتا۔ وجہ فرق یہ ہے کہ بڑھاپا ایسی چیز ہے کہ جو انسان کو طلب کر رہی ہوتی ہے، وہ اپنے وقت میں انسان کے پاس آکر رہتا ہے اور انسان بھی جب اپنی عمر کے کئی سال گذار لیتا ہے تو بڑھاپا اس کے پاس آتا ہے۔

"اماالبلد فلیس کالطالب للانسان الذاھب فظھر الفرق "

لیکن شہر وہاں جانے والے انسان کو طلب نہیں کر رہا ہوتا اس لئے دونوں مثالوں میں فرق واضح ہوگیا کہ "بلغنی الکبر " کہنا جائز ہے "بلغنی البلد"کہنا جائز نہیں۔ (کبیر)

﴿ وامْرَاتِیْ عَاقِرٌ ﴾ ''اور میری زوجہ بانجھ ہے۔''

" عاقر " اس عورت کو کہتے جس کی اولاد نہ ہوتی ہو۔ یہ لفظ مؤنث کیلئے استعمال ہوتا ہے اسلئے "عاقرۃ " کہنے کی ضرورت نہیں۔ اگر چہ فعل مذکر کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے کہا جاتا " عقر الرجل " فلاں مرد کی مجامعت سے حمل نہیں

ٹھہرتا۔ یہ بھی خیال رہے ''عقر'' باب ضرب، سمع اور کرم پر استعمال ہوتا رہتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے ''رمل عاقر'' ریت میں اگانے کی طاقت نہیں۔

﴿قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَايَشَاءُ﴾ ''فرمایا اسی طرح اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔''

''کذلک'' میں کاف تشبیہ کیلئے ہے اور ''ذلک'' کا اشارہ فعل کی طرف ہے یعنی جب دونوں میاں بیوی بوڑھے ہوں تو ان کو اولاد عطاء کرنا جس طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت اور مشیت ہے اسی طرح اللہ ہر کام کرتا ہے جو چاہے۔
(البحر المحیط)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

(كذلك الله) مبتدأ وخبر، اى على نحو هذه الصفة الله، "ويفعل مايشاء" بيان له اى يفعل مايريد من الافاعيل الخارقة للعاده" (كشاف)

''کذلک'' مبتداء ہے اور ''اللہ'' خبر ہے معنی یہ ہے کہ اسی صفت پر ہے اللہ اور ''یفعل مایشاء'' اس کا بیان ہے یعنی اللہ تعالیٰ عادت کے خلاف اپنی قدرت کا اظہار فرماتا ہے جو ارادہ فرماتا ہے وہی کرتا ہے۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّی آیَةً قَالَ اٰیَتُکَ اَلَّاتُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمْزًا وَاذْکُرْ رَّبَّکَ کَثِیْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِیِّ وَالْاِبْکَارِ﴾ (آیۃ نمبر ۴۱)

(1) عرض کی اے میرے رب میرے لئے کوئی نشانی کردے فرمایا تیری نشانی یہ ہے کہ تین دن تو لوگوں سے بات نہ کرے مگر اشارہ سے، اور اپنے رب کی بہت یاد کر اور کچھ دن رہے اور تڑکے اس کی پاکی بول۔

(2) عرض کیا اے میرے رب بنا میرے لئے کوئی نشانی فرمایا تیری نشانی یہ ہے کہ تم نہیں کلام کر سکو گے لوگوں سے تین دن سوائے اشارہ کے اور یاد کرو اپنے رب کو بہت، اور تسبیح بیاں کرو دن ڈھلے اور صبح سویرے۔

مختصر مطلب:

حضرت زکریا علیہ السلام بیٹے کی بشارت پر خوش ہو کر رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا اے میرے رب! میرے لئے کوئی نشانی بنا دے جس سے مجھے پتہ چل جائے کہ میری زوجہ کا حمل قرار پکڑ گیا تا کہ میں تیری اور زیادہ عبادت کر سکوں تو رب تعالیٰ نے فرمایا کہ تمھاری علامت یہ ہے کہ تم لوگوں سے کلام کرنے کی قدرت نہیں رکھو گے، ہاں البتہ اشارہ سے تم لوگوں کو اپنا مطلب سمجھا سکو گے اور اللہ تعالیٰ کو زیادہ سے زیادہ یاد کرو، سورج ڈھل جانے کے بعد شام تک اور فجر سے چاشت تک صبح سویرے رب تعالیٰ کی تسبیحات ذکر کرو۔

﴿قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّی آیَةً﴾ ''عرض کیا اے میرے رب بنا میرے لئے کوئی نشانی۔''

''(آیة)ای عـلامة تدل'' ''آیة '' کا معنی ہے علامت یعنی اے میرے رب بنا میرے لئے کوئی علامت نشانی جو دلالت کرے کہ میری زوجہ کا حمل ٹھہر گیا ہے۔

اس سوال میں چند وجوہ و مقاصد پائے گئے:

(۱) وانما سألها لان العلوق امر خفی لا یوقف علیه فاراد ان یطلعه الله علیه لیتلقی تلک النعمة الجلیلة مذ حین حصولها بالشکر ولایؤخره الی ان یظهر ظهورا معتادا''

آپ کے سوال کرنے کی وجہ یہ تھی کہ نطفہ کا رحم (بچہ دانی) میں قرار پکڑنا حمل کا ٹھہر جانا یہ مخفی امر ہے اس پر کوئی واقف نہیں

ہوسکتا اسلیئے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ ان کو مطلع کردے تا کہ وہ نعمت جلیلہ جب ہی آپ کو حاصل ہو اسی وقت اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں ایسا نہ ہو کہ جسطرح عام عادت کے مطابق کبھی تاخیر ہو جاتی ہے، اس میں تاخیر نہ ہو۔ (روح البیان)

سبحان اللہ ! کیسا ایمان افروز قول بیان کیا گیا کہ اے مسلمان! جب تجھے نعمت ملے تو اللہ تعالیٰ کی تو عبادت کر اور شکر یہ ادا کر نعمت کے حصول پر ناچ، گانا، بھنگڑا ڈالنا، عورتوں کے گریبان کھولنا لڑکوں اور لڑکیوں کا مل کر ناچنا غیر شرعی امور ہیں ان سے اجتناب ضروری ہے۔ طلباء کرام کیلئے مختصر عبارت یاد کرنے کے قابل یہ ہے:

(قال) یعنی زکریا (رب اجعل لی آیة) ای علامة اعلم بها وقت حمل امرأتی فازید فی العبادة والشکر لک "

عرض کیا، یعنی زکریا نے، اے میرے رب بنادے میرے لئے کوئی نشانی جس سے مجھے پتہ چل جائے کہ میری عورت حاملہ ہو چکی ہے تا کہ اس کا میں شکریہ جلدی ہی ادا کروں اور عبادت زیادہ کروں۔

(۲) "وانما سألها استعجالا للسرور" آپ نے یہ سوال اس لئے کیا تا کہ جلدی خوشی حاصل ہو جائے۔ (روح المعانی)

یعنی بیٹے کی بشارت تو مل چکی ہے جب حمل کے قرار کا پتہ چل جائے گا تو اور ہی زیادہ اور جلدی خوشی حاصل ہوگی۔

(۳) (قال رب اجعل لی آیة) علامة اعرف بها الحبل لا ستقبله بالبشاشة واشکر وتریح مشقة الانتظار"

عرض کیا اے میرے رب بنادے میری لئے کوئی نشانی تا کہ میں اس کے ذریعے حمل کو پہچان لوں تا کہ اس کا خوشی اور شکر سے استقبال کروں اور انتظار کی مشقت زائل ہو جائے۔ (بیضاوی)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"جعل " هنا بمعنی صیر لتعدیه الی مفعولین و(لی) فی موضع المفعول الثانی "

"اجعل " ماخوذ ہے "جعل " سے اس مقام میں " جعل "مرکب ذکر ہے کیونکہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے اس کا ہے "صیر " (پھیر دیا، بنادیا) اس کا ایک مفعول " لی " ہے جو مفعول کے درجہ میں ہے اور ایک مفعول " آیة " ہے جس کا صراحۃ مفعول ہونا واضح ہے۔ (از قرطبی)

﴿قَالَ اٰیَتُکَ اَلَّاتُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمْزًا﴾

"فرمایا تیری نشانی یہ ہے کہ تم نہیں کلام کر سکو گے تین دن سوائے اشارہ کے۔"

اس آیۃ کریمہ میں "ثلاثة ایام " ذکر کیا ہے کہ تم لوگوں سے تین دن کلام نہیں کر سکو گے اور سورۃ مریم میں "ثلاث

لیال "ذکر فرمایا ہے کہ تم لوگوں سے تین راتیں کلام نہیں کرسکو گے چونکہ عربی کا ضابطہ یہ ہے۔

"ان احدالعددین من الجمیع عند الاطلاق یعقل به مقداره من الوقت الأخر"

دن اور رات میں سے کسی ایک کے ذکر کرنے سے دوسرا خود بخود سمجھ آجاتا ہے، مقصد مقدار وقت بیان کرنا ہوتا ہے دن یا رات کی تخصیص مراد نہیں ہوتی۔

فیعقل من ثلاثة ایام ثلاث لیال معها و من ثلاث لیال ثلاثة ایام "

اسی ضابطہ کے تحت جس آیۃ کریمہ میں تین دنوں کا ذکر ہے اس کے ساتھ تین راتیں بھی مراد ہیں اور جس آیۃ کریمہ میں تین راتوں کا ذکر ہے اس کے ساتھ تین دن مراد ہیں۔ ہاں اگر دن اور راتیں علیحدہ بیان کرنی مقصود ہوں تو علیحدہ علیحدہ ان کو ذکر کیا جاتا ہے جیسا کہ عاد کے عذاب کا ذکر کیا تو فرمایا۔

﴿ وامّاعادٌ فاُهلكُوا بريح صرصرٍ عاتيةٍ ٥ سخّرهاعليهم سبع ليالٍ وّثمانية ايّام حسُومًا﴾

(سورۃ الحاقۃ، آیۃ نمبر ۶،۷)

(اور رہے عاد وہ ہلاک کئے گئے نہایت سخت گرجتی آندھی سے وہ ان پر قوت سے لگادی سات راتیں اور آٹھ دن لگاتار)

اس آیۃ کریمہ میں دنوں اور راتوں کا ذکر کیا کیونکہ اگر صرف سات راتوں کا ذکر ہوتا تو دن بھی سات سمجھ آتے حالانکہ دن تو آٹھ تھے اور اگر صرف آٹھ دنوں کا ذکر ہوتا تو راتیں بھی آٹھ سمجھ آتیں، حالانکہ راتیں تو سات تھیں

(از احکام القرآن للجصاص)

(ان لاتکلم الناس ثلاثة ایام لا رمزا) (تمھاری نشانی یہ ہے) کہ تم کلام نہیں کرسکو گے لوگوں سے تین دن سوائے اشارہ کے)" ان لاتکلم الناس " کا مطلب ہے " ان لاتقدر علی تکیمهم "تمہیں لوگوں سے کلام کرنے کی قدرت وطاقت ہی حاصل نہیں ہوگی، یہ سلسلہ تین دن اور تین راتوں تک جاری رہے گا۔ ہاں البتہ لوگوں کو کوئی بات سمجھانی مقصود ہوئی تو اشارہ سے ان کو سمجھا سکو گے۔

یہ تین دن لوگوں سے کلام کرنے کی طاقت آپ سے ہٹا لینے کا مقصد یہ تھا " وانما جعلت آیته ذلک لتخلیص المدة لذکر الله وشکره قضاء لحق النعمة " کہ آپ کو اللہ تعالی کے ذکر اور شکر کا زیادہ سے زیادہ موقع مل جائے، آپ اللہ تعالی کی نعمت کے حاصل ہونے پر اپنی طاقت کے مطابق اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کریں، اگرچہ حق ادا کرنا مشکل ہے۔

(از روح البیان)

فائدہ جلیلہ : "قال ابن زید ان زکریا علیہ السلام لما حملت زوجه منه یحیی اصبح لا یستطیع ان یکلم احدا وهو مع ذلک یقرأ التوراة ویذکر الله تعالی فاذاراد مقاولة احد لم یطقه " (قرطبی)

ابن زید کا قول یہ ہے کہ جس رات حضرت زکریا علیہ السلام کی زوجہ حضرت یحیی علیہ السلام سے حاملہ ہوگئی تو اسی صبح سے آپ کو طاقت نہ

رہی کہ آپ لوگوں میں سے کسی سے کلام کریں، اگر آپ کلام کرنا بھی چاہتے تو آپ کلام نہ کر سکتے، البتہ آپ توراۃ ان دنوں میں بھی پڑھتے رہے اور اللہ تعالی کا ذکر کرتے رہے اس میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہ تھی۔

اس ایک نشانی دو فائدے حاصل ہو گئے ایک یہ کہ آپ کو پتہ چل گیا کہ گذشتہ رات میری زوجہ کا حمل قرار پکڑ گیا اور دوسرا فائدہ یہ حاصل ہو گیا کہ آپ اللہ تعالی کے ذکر تسبیح وتہلیل کا موقع زیادہ حاصل ہو گیا۔ پھر یہ واقعہ چند معجزات پر مشتمل ہے۔

" احدھا ان قدرته علی التکم بالتسبیح والذکر وعجزہ عن لاتکلم بامور الدنیا من اعظم المعجزات "

ایک ان میں سے یہ ہے کہ بیشک آپ کو اللہ تعالی کی تسبیحات اور اس کے ذکر کی طاقت حاصل ہونا، اور امور دنیا کی کلام سے عاجز ہونا آپ کا عظیم معجزہ ہے۔

"وثانیھا ان حصول ذلک المعجز فی تلک الایام المقدرۃ مع سلامة البنیة واعتدال المزاج من جملة المعجزات "

تین دن آپ کے لئے جو رب تعالی نے مقرر فرمائے ان دنوں میں اگر چہ آپ لوگوں سے کلام نہ کر سکے تین آپ کی زبان صحیح سلامت رہی اور مزاج مستقل رہا یہ علیحدہ معجزہ ہے۔

"وثالثھا ان اخبارہ بانه متی حصلت ھذہ الحالة فقد حصل الولد ثم ان الدم خرج علی دفق ھذالخبریکون ایضا من المعجزات"

آپ کا تیسرا معجزہ اس واقعہ سے یہ سمجھ آیا کہ آپ کو اللہ تعالی نے خبر دی کہ جب تمھاری یہ کیفیت ہوگی تو تم سمجھ جانا کہ حمل نے قرار پکڑ لیا ہے پھر آپ نے یہ خبر اہل خانہ کو بھی دے دی جب آپ کی خبر کو اہل خانہ نے سچا پایا تو آپ کا معجزہ ثابت ہو گیا۔ (کبیر)

یہ بھی خیال رہے کہ انبیاء کرام کی غیبی خبریں جو واقع کے مطابق اترتی ہیں یعنی ہر غیبی خبر سچی ہوتی ہے، کسی میں واقع کے مطابق نہ ہونے کا احتمال نہیں پایا جاتا، یہ معجزات ہی ہیں۔

رمز کا معنی :

رمز کا معنی ہے" حرکت کرنا" اسی وجہ سے دریا کو" راموز" کہا جاتا ہے کہ اس کا پانی حرکت کرتا ہے، آیۃ کریمہ میں رمز سے مراد کیا ہے؟ اس میں چند اقوال ہیں:

" احدھا انه عبارۃ عن الا شارۃ کیف کانت بالید اوالرأس اوالحاجب اوالعین او الشفة "

ایک یہ ہے کہ اس سے مراد اشارہ کرنا ہے مطلقاً خواہ وہ ہاتھ سے اشارہ ہو، یا سر سے ہو، یا ابرو سے ہو، یا آنکھوں سے ہو یا ہونٹوں سے ہو۔

"والثانی انه عبارة عن تحریک الشفتین باللفظ من غیر نطق وصوت"

دوسرا قول یہ ہے کہ آیۃ کریمہ میں "رمز" کا مطلب یہ ہے کہ ہونٹوں کو ہلانا بغیر بولنے اور بغیر آواز کے

"والثالث وهو انه کان یمکنه ان یتکلم بالکلام الخفی واما رفع الصوت بالکلام فکان ممنوعا"

تیسرا قول یہ ہے کہ ہوسکتا ہے آیۃ کریمہ میں رمز کا یہ مطلب ہو کہ تم آہستہ آہستہ بہت مخفی آواز سے بات کرسکو گے لیکن تمہاری آواز کسی کو سنائی نہیں جائے گی۔ (کبیر)

راقم کے نزدیک پہلا قول جمیع اقوال پر مشتمل ہے دوسرے اقوال اس میں سمٹ کر آگئے۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"الا رمزا" مستثنیٰ منقطع ہے جبکہ "کلام" کا معنی عام محاورہ کے مطابق بولنا لیا جائے اور "رمز" کا معنی اشارہ کیا جائے تو اس صورت میں مستثنیٰ، مستثنیٰ منہ کی جنس سے نہیں یعنی ماقبل کے حکم میں داخل نہیں اسے ہی مستثنیٰ منقطع کہا جاتا ہے۔ اور اگر کلام کا معنی لیا جائے جو مقصد کو ادا کرے اور "رمز" کا معنی سر اور ہاتھ سے اشارہ لیا جائے جو مقصد پر دلالت کرے تو مستثنیٰ متصل ہوگا کیونکہ مستثنیٰ مستثنیٰ منہ کے حکم میں داخل ہے۔ (ماخوذ از بیضاوی وشیخ زادہ)

فائدہ : آیۃ کریمہ سے یہ مسئلہ سمجھ آیا کہ کئی مقامات میں اشارہ کو کلام کے قائم مقام سمجھا گیا ہے اس مسئلہ کو نبی کریم ﷺ کے ایک فیصلہ سے تائید حاصل ہے آپ نے ایک حبشیہ لونڈی سے پوچھا "این اللہ" اللہ کہاں ہے؟ "فاشارت برأسها الی السماء" تو اس نے سر سے اشارہ آسمانوں کی طرف کیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے مالک کو ارشاد فرمایا "اعتقها فانها مؤمنة" "تم اسے آزاد کردو بیشک یہ مؤمنہ (ایمان والی) ہے۔

یہ آپ نے اس وقت فیصلہ فرمایا جب وہ شخص اپنی ایمان والی غلامہ کو آزاد کرنا چاہتے تھے نبی کریم ﷺ نے اشارہ پر اسلام کا حکم نافذ فرمایا جس سے اس کی دیانت ثابت ہوگئی اس کی جان اور مال محفوظ ہوگئے اس کا جنتی ہونا اور جہنم سے پاک ہونا سمجھ آگیا" فیجب ان تکون الاشارة عاملة فی سائر الدیانة "لھذا ثابت ہوگیا کہ تمام دینی کاموں میں اشارہ کا اعتبار کیا جائے گا، اس پر احکام مرتب ہوں گے۔

ابن قاسم امام مالک رحمہ اللہ سے بیان کرتے ہیں " ان الاخرس اذا اشار بالطلاق انه یلزمه "

بیشک گونگا جب طلاق کا اشارہ کرے تو اس کی طلاق واقع ہو جائے گی۔

"وقال الشافعي رحمه الله في الرجل يمرض فيختل لسانه فهو كالا خرس في الرجعة و الطلاق"

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ایک شخص ایسا مریض ہو جائے کہ اس کی زبان بند ہو جائے تو اس پر طلاق اور طلاق سے رجوع کرنے میں گونگے والے احکام جاری ہوں گے یعنی اس کے اشارہ سے دی ہوئی طلاق واقع ہو جائے گی، اور اشارہ سے کیا ہوا رجوع ثابت ہو جائے گا۔

" وقال ابو حنيفة رحمه الله ذلك جائز اذا كانت اشارته تعرف و ان شك فيها فهي باطل "

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا یہ جائز ہے جبکہ اشارہ معروف ہو، اور اگر اشارہ میں شک ہو تو باطل ہے، یعنی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے شرط سے حکم کو پختہ کر دیا کہ ہر اشارہ کو طلاق نہ سمجھ لیا جائے۔

طلباء کرام یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ یہ مسئلہ کہ اشارہ معتبر ہے اس سے طلاق اور رجوع ثابت ہوگا یہ استحسان سے ثابت ہے نہ کہ قیاس سے۔ (ماخوذ از قرطبی)

﴿وَاذْكُر رَّبَّكَ كَثِيرًا﴾ "اور یاد کرو اپنے رب کو بہت۔"

"كثيرا" اي ذكرا كثيرا" بہت زیادہ یاد کرو اس یاد کرنے سے مراد زبان سے یاد کرنا ہے یا دل سے؟ راقم کے نزدیک یہ حکم مطلق ہے ہر قسم کے ذکر کو شامل ہے یعنی زبان سے یاد کرو اور دل سے بھی یاد کرو۔

فائدہ جلیلہ : اگر مراد دل کا ذکر ہو تو اس لحاظ پر بہتر ہوگا۔

" وذلك لان المستغرقين في بحار معرفة الله عادتهم في الاول ان يواظبوا على الذكر اللساني مدة فاذا امتلأ القلب من نور ذكر الله سلت اللسان وبقي الذكر في القلب "

اس کی وجہ یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی معرفت کے سمندروں میں مستغرق ہوتے ہیں وہ اپنی عام عادت کے مطابق پہلے اللہ تعالیٰ کا زبانی ذکر کرتے ہیں، جب دل اللہ کے ذکر کے نور سے ان کا بھر جاتا ہے تو دل میں ذکر ہمیشہ کیلئے باقی رہتا ہے۔

اسی وجہ سے کہا گیا " من عرف الله كل لسانه " جس نے اللہ کو پہچانا اس کی زبان تھک گئی یعنی جب رب تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو زبان رک جاتی ہے دل میں ذکر جاری ہو جاتا ہے یہی حال حضرت زکریا علیہ السلام کا بھی تھا کہ زبان سے آپ اگرچہ کلام نہیں کر سکتے تھے لیکن زبان سے ذکر جاری تھا جو قلب (دل) میں آ کر سما گیا۔ (ماخوذ از کبیر)

زیادہ ذکر کرنے کا حکم دیا گیا اس کی وجہ یہ تھی " يحتمل ان يكون الامر بالذكر شكرا للنعمة مطلقا" کہ اللہ تعالیٰ کی بندے پر ان گنت نعمتیں ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان نعمتوں کا بہت زیادہ شکریہ ادا کرنے کا حکم دیا۔ (روح المعانی)

وقال محمد بن کعب القرظی لو رخص لاحد فی ترک الذکر لرخص زکریا بقول اللہ عزوجل " الاتکلم الناس ثلاثة ایام الارمزا واذکر ربک کیثرا" ولرخص للرجل یکون فی الحرب بقول اللہ عزوجل اذالقیتم فئة فاثبتوا واذکروا اللہ کثیرا"

محمد بن کعب قرظی نے کہا ہے کہ اگر کسی ایک کو ذکر کے چھوڑنے کی اجازت دی جاتی تو حضرت زکریا علیہ السلام کو اجازت دی جاتی، حالانکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے" کیثر ذکر کرنے کا حکم دیا باوجود اس کے کہ آپ کو تین دنوں تک لوگوں سے کلام کرنے کی طاقت حاصل نہ تھی سوائے اشارہ کے۔ اسی طرح اگر ذکر چھوڑنے کی اجازت ہوتی تو جنگ میں شریک لوگوں کو اجازت دی جاتی، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا" جب تمہاری ملاقات ایک جماعت سے ہو تو ثابت رہو اور اللہ کا بہت زیادہ ذکر کرو۔ (قرطبی)

﴿وَسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ﴾ "اور تسبیح بیان کرو دن ڈھلے اور صبح سویرے۔"

" (وسبح) ای وعظم ربک ونزهه عن النقائص "

اور تسبیح بیان کرو یعنی رب تعالیٰ کی عظمت بیان کرو اور اس کا ہر قوم کے نقص سے پاک ہونے کا ذکر کرو۔

"قیل وصل لربک وسمیت الصلوة تسبیحالان فیها تنزیها للرب سبحانه وتعالی "

بعض حضرات نے بیان کیا ہے" وسبح "کا معنی یہ ہے کہ اپنے رب کیلئے نماز ادا کرو نماز کو تسبیح اس لئے کہہ دیا جاتا ہے کہ نماز میں تسبیح پائی جاتی ہے کہ رب تعالیٰ کی پاکی بیان کی جاتی ہے نفلی نماز کو " سبحة " کہنے کی بھی یہی وجہ ہے کہ اس میں تسبیحات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

"بالعشی" (دن ڈھلے) فاما العشی فهو مابین زوال الشمس الی غروبها ومنه وسمیت صلاتا الظهر والعصر صلاتی العشاء" سورج کے ڈھل جانے اور غروب ہونے کے درمیان وقت کو "عشی "کہا جاتا ہے اسی لئے ظہر اور عصر کی نماز کے وقت پر " عشاء "کا لفظ عام طور پر احادیث میں موجود ہے۔

(والابکار) (اور صبح سویرے) والابکار هو مابین طلوع الفجر الی الضحی " صبح صادق سے لے کر چاشت کے وقت تک تمام درمیانی وقت " ابکار "کہلاتا ہے۔ (از خازن)

یعنی اللہ تعالیٰ کی تسبیحات دن ڈھلے سے لے کر غروب تک اور صبح صادق سے کر چاشت تک بیان کرو،

" ویحتمل ان یکون اراد بالعشی اللیل وبالابکار النهار فعبر بجزء کل واحد منهما عن جملته وهو مجاز حسن "

اور ایک احتمال یہ ہے کہ " عشی "سے مراد رات ہو اور ابکار سے مراد دن ہو ذکر جزء ہو اور مراد کل ہو، یہ مجازی معنی ہے، لیکن خوبصورت معنی ہے اب مطلب یہ ہوگا کہ رب تعالیٰ کی تسبیحات بیان کرو دن اور رات۔

" وقال الراغب لم یعن التسبیح طرفی النهار فقط بل ادامة العبادة "

علامہ راغب اصفہانی نے بیان کیا ہے کہ آیۃ کریمہ میں یہ مراد نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیحات بیان کرو دن اور رات کی طرفوں میں بلکہ ہمیشہ عبادت کرنے کا حکم دیا گیا۔ (ماخوذ از البحر المحیط)

اور اگر "**وسبح**" کا معنی نماز ادا کرنا لیا جائے تو "**عشی**" سے مراد سورج کے ڈھل جانے سے لے کر رات تک کا وقت ہو تو چار نمازیں اس ایک لفظ سے ثابت ہو جائیں گی۔ اور "ابکار" سے صبح کی نماز ثابت ہو جائے گی۔ یعنی اگرچہ بظاہر خطاب حضرت زکریا علیہ السلام کو ہے لیکن عموم الفاظ کا اعتبار کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ اور آپ کی امت کیلئے بھی ان الفاظ مبارکہ سے ہی تمام نمازوں کے اوقات بیان کر دیتے گئے ہوں تو کوئی بعید بات نہیں۔

راقم کو تو اس میں عظمت قرآن نظر آتی ہے کہ مختصر الفاظ وسیع مفہوم کو شامل ہوتے ہیں اور اگر مزید غور کیا جائے تو اسی میں اشراق، چاشت اور اوابین نمازوں کو تذکرہ بھی مل جائے گا۔ بات تو اپنی اپنی سوچ کی ہے یعنی جب یہ بیان کیا جائے کہ خطاب تو حضرت زکریا علیہ السلام کو ہی ہے لیکن ضمنی طور پر یہ مسائل بھی سمجھ آ رہے ہیں اس سے مفہوم قرآن نہیں بدلے گا بلکہ قرآن کا بیان ذیشان سمجھ آئے گا۔ "واللہ اعلم بالصواب"

تنبیہ: محمد بن کعب قرظی کی جو روایت قرطبی سے نقل کی ہے وہ درمنثور میں ابن جریر اور ابن مغذر اور ابن ابی حاتم اور ابونعیم سے نقل کی گئی ہے۔ (راقم)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿وَاِذْقَالَتِ الْمَلٰائِكَةُ يَا مَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعَالَمِيْنَ٥﴾ (آیۃ نمبر ۴۲)

(1) اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم بیشک اللہ نے تجھے چن لیا اور خوب ستھرا کیا اور آج سارے جہاں کی عورتوں سے تجھے پسند کیا۔

(2) اور یاد کرو جب کہا فرشتوں نے اے مریم بیشک اللہ نے چن لیا ہے تجھے اور خوب صاف ستھرا کیا ہے تجھے، اور پسند کیا ہے تجھے آج سارے جہان کی عورتوں سے۔

ترجمہ سے ہی مختصر مطلب تو واضح ہے البتہ علیحدہ علیحدہ الفاظ کی وضاحت کی جارہی ہے۔

﴿وَاِذْقَالَتِ الْمَلٰائِكَةُ﴾ ''اور یاد کرو جب فرشتوں نے۔''

''اذ'' کے متعلق علامہ رازی رحمہ اللہ ایک قول بیان کرتے ہیں کہ یہ ''اذکر'' مقدر کا مفعول فیہ اس لحاظ پر ترجمہ وہی ہے جو راقم نے ذکر کردیا ہے ''المراد بالملائكة ههنا جبريل وحده'' اس مقام میں ملائکہ سے مراد صرف جبریل ہیں، اسی طرح ﴿يُنَزِّلُ الْمَلٰائِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ﴾ میں بھی ذکر جمع ہے لیکن مراد ملائکہ سے صرف جبریل ہیں ذکر جمع ہو اور مراد واحد ہو بظاہر لفظ کی مراد میں عدول (پھیرنا) نظر آتا ہے لیکن یہ مجازی معنی لینا اس لئے ضروری ہے کہ سورۃ مریم میں ذکر جبریل کا ہی ہے جس حضرت مریم سے کلام کیا۔

﴿يَا مَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعَالَمِيْنَ﴾

''اے مریم بیشک اللہ نے چن لیا ہے تجھے اور خوب صاف ستھرا کیا ہے تجھے، اور پسند کیا ہے تجھے آج سارے جہان کی عورتوں سے۔''

جبریل کا حضرت مریم سے ہمکلام ہونا اس لئے نہیں تھا کہ وہ نبی تھیں وہ نبی نہیں تھیں کیونکہ نبی صرف مردوں کو بنایا گیا عورتوں کو نہیں رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی واضح طور پر موجود ہے۔

﴿وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى﴾

''اور ہم نے تم سے پہلے جتنے رسول بھیجے سب مرد ہی تھے، جنہیں ہم وحی کرتے اور سب شہر کے ساکن تھے''

حضرت جبریل کا حضرت مریم سے کلام چند وجوہ سے تھا:

(۱) بعض حضرات نے کہا یہ حضرت مریم کی کرامت کی وجہ سے تھا لیکن کہ مذہب صرف ان لوگوں کا تھا جن کے نزدیک اولیاء کرام سے بطور کرامت فرشتوں کا ظاہراً کلام کرنا جائز ہے لیکن یہ مذہب جمہور علماء کرام کا نہیں۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ''ارہاص'' کے پیش نظر تھا۔ یہ ہمارے نزدیک جائز ہے کعبی معتزلی بھی اس کا قائل ہے۔

راقم کے نزدیک جائز ہے کیونکہ نبی کی پیدائش سے پہلے نبی کے کمال کو یا اعلان نبوت سے پہلے کے کمال کو ارہاص کہا جاتا ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ کی پیدائش سے پہلے ہاتھی والوں ابرھہ اور اس کے ساتھیوں کو تباہ و برباد کیا جبکہ وہ کعبہ پر حملہ کرنے کیلئے آتے تھے، یہ نبی کریم ﷺ کی پیدائش سے چالیس یا پچاس دن پہلے کا واقعہ ہے اس میں برکت آپ کی ہی شامل تھی اسی وجہ سے یہ آپ کا ارہاص ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد کہ میں اس پتھر کو جانتا ہوں جو مجھے کعبہ میں آتے جاتے سلام کرتا تھا یہ بھی آپ کا ارہاص ہی ہے۔

(۳) بعض حضرات نے کہا یہ حضرت زکریا علیہ السلام کا معجزہ ہے کیونکہ حضرت مریم ان کی زیر کفالت تھیں اس لئے ان سے فرشتے کا کلام کرنا حقیقت میں اللہ کے نبی حضرت زکریا علیہ السلام کا معجزہ ہوا،'' وهو جمهور قول المعتزلة ''لیکن یہ قول جمہور معتزلہ کا ہے اہل سنت و جماعت کا نہیں اس لئے کہ حضرت مریم سے فرشتے کا کلام کرنا ان کا یا ان کے بیٹے کا کمال ہو سکتا ہے نہ کہ حضرت زکریا علیہ السلام کا۔

(۴) ومن الناس من قال ان ذلک کان علی سبیل النفث فی الروع والالهام والالقاء فی القلب کما کان فی حق ام موسی علیه السلام فی قوله ''واوحینا الی ام موسی''

بعض حضرات نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ کلام براہ راست نہیں تھا بلکہ یہ دل میں ڈالنا اور الہام اور نفس میں پھونکنا تھا جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا ﴿واوحینا الی اُمّ مُوسیٰ﴾ اگرچہ بظاہر اس کا معنی یہ ہے کہ ہم نے وحی کی موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف، لیکن مراد وہاں بھی یہ ہے کہ (ہم نے موسیٰ کی والدہ کے دل میں ڈالا)

(ماخوذ از کبیر بوضاحت)

پہلے اور دوسرے اصطفاء میں فرق:

اس آیۂ کریمہ میں حضرت مریم کے تین اوصاف بیان فرمائے ہیں پہلا وصف بیان فرمایا '' ان اللّٰه اصطفاک '' بیشک اللہ نے چن لیا تجھے (پسند کر لیا) اور دوسرا وصف ذکر کیا '' وطهرک '' اور خوب صاف ستھرا کیا ہے تجھے، اور تیسرا وصف یہ بیان کیا ہے '' واصطفاک علی نساء العالمین '' اور چن لیا ہے، پسند کر لیا ہے تجھے

آج جہان کی عورتوں پر۔

اصطفاء اول : (۱) پہلے چن لینے کی چند وجوہ ہیں۔

(۱) اللہ تعالی نے بیت المقدس کی خدمت گذاری کیلئے حضرت مریم کے آزاد کرنے کو قبول فرمالیا، باوجود اس کے کہ آپ مؤنث تھیں، اور مؤنث کو بیت المقدس کیلئے وقف نہیں کیا جاتا تھا۔

(۲) دوسری وجہ آپ کو چن لینے کی حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ آپ نے شروع سے ہی دنیاوی غذا حاصل نہیں کی بلکہ جنت کے رزق سے ہی ان کی پرورش کی گئی۔

(۳) آپ کو اللہ تعالی نے عبادت کا فارغ وقت عطاء فرمایا، اپنی مہربانیوں اور ہدایت سے نوازا اور آپ کی حفاظت فرمائی۔

(۴) چوتھی وجہ یہ ہے کہ آپ کی کفالت اگرچہ حضرت زکریا علیہ السلام کے ذمہ تھی، لیکن ان کے رزق میں ان پر کسی کا احسان نہ تھا، بلکہ اللہ تعالی کی طرف سے جو رزق ملتا تھا وہی کافی ہو جاتا تھا۔

حضرت زکریا علیہ السلام جب آپ کے مقفل (تالہ لگے ہوئے) کمرہ میں بے موسم پھل پاتے تو یہ سوال کرتے "انی لک هذا" یہ پھل تمہیں کہاں سے ملے ہیں؟ تو آپ نے اس کے جواب میں فرمایا "**قالت هو من عندالله**" تو انہوں نے کہا اللہ تعالی کی طرف سے۔

(۵) پانچویں وجہ یہ ہے کہ فرشتوں کا کلام آپ نے براہ راست، آمنے سامنے سنا، (یہی قول معتبر ہے، صرف دل میں ڈالنے والا قول معتبر نہیں) یہ وصف کسی اور عورت کو حاصل نہ تھا، صرف آپ کو یہ وصف عطاء کیا گیا۔

اصطفاء دوم: دوسرا اصطفاء (چن لینا) جس کا تذکرہ ﴿**وَاصْطَفَاكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ**﴾ میں بیان کیا گیا ہے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ آپ کو اللہ تعالی نے اپنے فضل وکرم سے بغیر باپ کے بیٹا عطاء فرمایا۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ کے بیٹے حضرت عیسی علیہ السلام کو پیدا ہوتے ہوئے بولنے کی طاقت عطاء فرمائی اور ان کی کلام سے حضرت مریم کو یہود کی تہمت سے نجات حاصل ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالی نے فرمایا ﴿**وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَا آيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ**﴾ اور بنایا ہم نے اسے (مریم کو) اور اس کے بیٹے کو تمام جہانوں کیلئے نشانی۔

ذکر تطہیر: ان دونوں اصطفاء کے درمیان تطہیر "وطهرک" ذکر فرمایا اس میں بھی چند وجوہ ہیں:

(۱) "**احدها انه تعالى طهرها عن الكفر والمعصية فهو كقوله تعالى في ازواج النبي ﷺ (ويطهركم**

تطھیرا) ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کو کفر و معصیت سے پاک رکھا، جیسا کہ نبی کریم ﷺ کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا﴾

(۲) "وثانیھا انه تعالٰی طھرھا عن مسیس الرجال" اوران میں دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مردوں کے چھونے سے پاک رکھا۔

(۳) "وثالثھا طھرھا عن الحیض قالوا کانت مریم لا تحیض" تیسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حیض سے پاک رکھا، یہی قول اہل علم کا ہے کہ حضرت مریم حیض سے پاک تھیں۔ حیض کا نہ آنا اور بیٹا بھی عطاء ہونا وہ بھی بغیر باپ کے یہ سب حضرت مریم کی کرامات تھیں۔

(۴) "ورابعھا، وطھرک من الافعال الذمیمة والعادات القبیحة" اور چوتھی وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو برے افعال اور بری عادات سے پاک رکھا۔

(۵) "وخامسھا، وطھرک عن مقالة الیھود وتھمتھم وکذبھم" اور پانچویں وجہ یہ ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے یہود کی باتوں اور ان کی تہمت اور ان کے جھوٹ سے پاک رکھا۔ (ماخوذ از کبیر بتقدیم وتاخیر)

تسکین الجنان فی محاسن کنزالایمان سے اقتباس:

﴿وَاصْطَفَاکِ عَلٰی نِسَاءِ الْعَالَمِیْنَ﴾ "اور جہان کی عورتوں کو منتخب کیا ہے" (فتح محمد صاحب)

﴿وَاصْطَفَاکِ عَلٰی نِسَاءِ الْعَالَمِیْنَ﴾ "اور برگزیدہ کیا تم کو اوپر عورتوں عالموں کے" (شاہ رفیع الدین صاحب)

﴿وَاصْطَفَاکِ عَلٰی نِسَاءِ الْعَالَمِیْنَ﴾ "اور پسند کیا تجھ کو سب جہان کی عورتوں پر" (محمود الحسن صاحب)

﴿وَاصْطَفَاکِ عَلٰی نِسَاءِ الْعَالَمِیْنَ﴾ "اور تمام دنیا کی عورتوں پر تجھ کو ترجیح دے کر اپنی خدمت کیلئے چن لیا" (مودودی صاحب)

﴿وَاصْطَفَاکِ عَلٰی نِسَاءِ الْعَالَمِیْنَ﴾ "اور آپ کو دنیا جہان کی عورتوں میں برگزیدہ کیا ہے" (عبدالماجد صاحب)

﴿وَاصْطَفَاکِ عَلٰی نِسَاءِ الْعَالَمِیْنَ﴾ "اور آپ کو دنیا جہان کی بیبیوں کے مقابلہ میں منتخب فرمایا ہے" (اشرف علی صاحب)

﴿وَاصْطَفَاکِ عَلٰی نِسَاءِ الْعَالَمِیْنَ﴾ "اور پسند کیا تجھ کو سب جہان کی عورتوں سے" (شاہ عبدالقادر صاحب)

﴿وَاصْطَفَاکِ عَلٰی نِسَاءِ الْعَالَمِیْنَ﴾ "اور آج سارے جہاں کی عورتوں سے تجھے پسند کیا" (اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ)

یہاں حضرت مریم کوخطاب ہے،اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ میں لفظ'' آج'' کی زیادتی ہے۔ جو بظاہر وہم واقع ہوتا ہے اس کا تفاسیر نے بھی ازالہ کیا اور اس وہم کے ازالہ کیلئے تفاسیر کے مطابق اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے بھی ایک لفظ کی زیادتی کی۔

وہ وہم یہ ہے کہ حضرت مریم کوتمام جہان کی عورتوں پرفضیلت کیسے حاصل ہے؟ حالانکہ حضرت فاطمۃ الزہرا اور حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہما) پرحضرت مریم کوفضیلت حاصل نہیں،تو اس کا جواب یہ دیا گیا''ای اھل زمانک'' (جلالین) یعنی تمہیں اپنے زمانے کی عورتوں پرفضیلت حاصل ہے اسی مقام پرجلالین کے حاشیہ پر وضاحت موجود ہے۔

(واصطفاک علی نساء العالمین)ای بان وھب لک عیسی من غیراب ولم یکن ذلک لاحد من النساء ھذا وان کان من خصائص مریم علیھا السلام لکنه لایلزم من ھذہ الفضیله افضلیتھا مطلقة علی فاطمة بنت محمد ﷺوعائشه زوجة النبی ﷺ ففاطمة وعائشة رضی اللہ عنھماافضل نساء العالمین من الاولین والأخرین کما ھو المذھب المحقق عند العلماء''

یعنی مفسر رحمہ اللہ نے ''اھل زمانک '' کے الفاظ کو کیوں زیادہ کیا؟ اس لئے کہ حضرت مریم کو بغیر باپ کے حضرت عیسیٰ کا عطاء ہونا اگر چہ آپ کی خصوصیت ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ کو مطلقاً حضرت فاطمہ بنت النبی ﷺ اور حضرت عائشہ زوجۃ النبی ﷺ پر بھی فضیلت حاصل ہو اگر چہ یہ خصوصیت تو ان دونوں کو حاصل نہیں لیکن ان دونوں کو کثیر خصائص حاصل ہیں جو احادیث مبارکہ میں وارد ہیں جو فضائل حضرت مریم میں نہیں پائے جاتے ،پس فاطمہ اور عائشہ رضی اللہ عنھما کو تمام جہان کی عورتوں پرفضیلت ہے،اس پر تحقیق واتفاق موجود ہے۔ (حاشیہ جلالین)

یہ وجہ تھی جس کا مفصل بیان اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ایک لفظ سے سمجھ میں آتا ہے لیکن اگر مطلقا عام تراجم کی طرح ترجمہ کیا جاتا تو اعتراض کا اندفاع ممکن نہیں تھا (تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان ص ۸۰،۸۱)

ارشادات مصطفویہ ﷺ :

اخرج عبد الرزاق وابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم عن سعید بن المسیب فی قوله '' ان اللہ اصطفاک وطھرک واصطفاک علی نساء العالمین '' قال کان ابوھریرۃ یحدث عن رسول اللہ ﷺانه قال خیر نساء رکبن الابل نساء قریش احناہ علی ولدفی صغرہ وارعاہ علی زوج فی ذات یدہ قال ابوھریرۃ ولم ترکب مریم بنت عمران بعیر اقط اخرجه الشیخان بدون الأیة ''

مصنف عبدالرزاق میں ہے اور ابن جریر اور ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے سعید بن المسیب نے روایت ذکر کی ہے کہ اللہ تعالیٰ

کے ارشادگرامی "ان اللہ اصطفاک وطهرک واصطفاک واصطفاک علی نساء العالمین" کی وضاحت میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث بیان فرماتے تھے کہ آپ نے ارشاد فرمایا بیشک بہتر عورتیں وہ ہیں جو اونٹوں پر سوار ہوتی ہیں وہ عورتیں قریش کی ہیں جو اپنے چھوٹے بچوں پر شفقت کرتی ہیں خاوند کے مال کی حفاظت کرتی ہیں، حضرت ابو ہریرہ ﷺ نے فرمایا مریم بنت عمران تو اونٹوں پر سوار نہیں ہوئیں۔ (از درمنثور)

یعنی حضرت ابو ہریرہ ﷺ نے فرمایا جن عورتوں کو نبی کریم ﷺ نے "خیر النساء" کہا ہے۔ وہ تو اونٹوں پر سوار ہونے والی ہیں حضرت مریم تو اونٹ پر سوار نہیں ہوئیں کہ آپ مطلقا تمام عورتوں سے افضل ہوں یعنی اس حدیث سے بھی پتہ چلا کہ آپ اپنے زمانہ کی عورتوں سے افضل تھیں نہ کہ مطلقاً قریش کی وہ کون سی عورتیں ہیں جو مطلقا خیر النساء (سب عورتوں سے بہتر) ہیں، وہ حضرت خدیجہ اور حضرت عائشہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہن ہیں۔

❁ اخرج ابن ابی شیبة والبخاری ومسلم والترمذی والنسائی وابن جریر وابن مردویه عن علی سمعت رسول اللہ ﷺ یقول خیر نسائها مریم بنت عمران وخیر نسائها خدیجة بنت خویلد"

حضرت علی ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورتوں میں سے بہتر مریم بنت عمران ہیں اور عورتوں میں سے بہتر خدیجہ بنت خویلد ہیں۔ (از درمنثور)

حضرت مریم کے ساتھ تو وہی قید لگانی پڑے گی جس کا ذکر جلالین اور اس کے حاشیہ سے کر دیا گیا کہ آپ کو اپنے زمانہ کی عورتوں پر فضیلت حاصل ہے لیکن حضرت خدیجہ کو مطلقا تمام عورتوں پر فضیلت حاصل ہے۔

❁ وعن انس ان النبی ﷺ قال حسبک من نساء العالمین مریم بنت عمران وخدیجة بنت خویلد وفاطمة بنت محمد وآسیة امرأة فرعون"

(رواہ الترمذی وصححه واحمد وابن المنذر وابن حبان والحاکم)

حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جہان کی عورتوں میں سے تمہیں کافی ہیں مریم بنت عمران، اور خدیجہ بنت خویلد، اور فاطمہ بنت محمد ﷺ اور آسیہ زوجہ فرعون۔ (از درمنثور)

(خیال رہے یہ حدیث ابن شیبہ نے حسن بصری رحمہ اللہ سے مرسل ذکر کی ہے)

❁ "عن ابی موسی اشعری قال قال رسول اللہ ﷺ کمل من الرجال کثیر ولم یکمل من النساء الا مریم بنت عمران وآسیه امرأة فرعون وفضل عائشة علی النساء کفضل الثرید علی سائر الطعام"

(اخرج ابن ابی شیبة والبخاری والمسلم والترمذی والنسائی وابن ماجة وابن جریر)

ابو موسیٰ اشعری ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کامل مرد تو بہت ہیں عورتوں میں سے کامل

صرف مریم بنت عمران اور آسیہ زوجہ فرعون ہیں اور عائشہ کو تمام عورتوں پر اس طرح فضیلت حاصل ہے جس طرح ثرید کو تمام طعاموں پر فضیلت حاصل ہے۔ (از درمنثور)

"قلت لعل معنى قوله ﷺ لم يكمل من النساء من الامم السابقة الامريم و آسية " يدل عليه قوله ﷺ وفضل عائشة على مريم و آسية" (مظهری)

علامہ قاضی ثناء اللہ مظہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کے ارشاد " لم يكمل من النساء الامريم بنت عمران و آسية امرأة فرعون " کا معنی یہ ہے "لم يكمل من النساء من الامم السابقة الامريم و آسية " کہ پہلی امتوں کی عورتوں میں سے کوئی کامل نہیں سوائے مریم بنت عمران کے اور آسیہ زوجہ فرعون کے۔

اس تشریح اور وضاحت پر نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے "فضل عائشة على النساء كفضل الثريد على سائر الطعام " کہ عائشہ کو تمام عورتوں پر اس طرح فضیلت حاصل ہے جس طرح ثرید کو تمام طعاموں پر فضیلت حاصل ہے۔ آپ کو یہ ارشاد اس پر دلالت کر رہا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حضرت مریم اور آسیہ پر مطلقاً فضیلت حاصل ہے۔

حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی فضیلت پر احادیث:

"عن عائشه ان رسول الله ﷺ قال يا فاطمة الا ترضين ان تكونى سيدة نساء اهل الجنة اونساء المؤمنين" (رواه البخاری والمسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے فاطمہ کیا تم پسند نہیں کرتی کہ تم جنت کی عورتوں کی سردار بن جاؤ (یا آپ نے فرمایا) کہ تم مؤمنوں کی عورتوں کی سردار بن جاؤ (از مظہری)

❁ "عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ افضل نساء اهل الجنة خديجة بنت خويلد وفاطمة بنت محمد ﷺ " (رواه ابو داؤد والنسائی والحاكم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا جنت کی عورتوں میں سے افضل خدیجہ بنت خویلد اور فاطمہ بنت محمد ﷺ ہیں۔ (از مظہری)

❁ "عن حذيفة ان النبى ﷺ قال نزل ملک من السماء فاستأذن الله ان يسلم على فبشرنى ان فاطمة سيدة نساء اهل الجنة" (رواه احمد والترمذی والنسائی وابن حبان والحاكم)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا آسمانوں سے ایک فرشتہ نازل ہوا ہے جس نے اللہ تعالیٰ سے اجازت طلب کی کہ وہ مجھ پر سلام بھیجے، پھر اس نے (یعنی اترنے کے بعد) مجھے

بشارت دی کہ بیشک جنت والی عورتوں کی سردار فاطمہ ہوں گی۔

"فھذہ الاحادیث تدل علی ان فاطمة افضل من مریم لان نساء اھل الجنة عام لا یحتمل التخصیص بزمان دون زمان بخلاف قوله تعالی (اصطفاک علی نساء العالمین) فانه یحتمل ان یکون المراد منه عالمی زمانھا کما قلنا"

ان مذکورہ احادیث سے واضح ہوا کہ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا حضرت مریم سے افضل ہیں اس لئے کہ جنتی تمام عورتوں کی جب سردار حضرت فاطمہ ہوں گی تو جنتی عورت حضرت مریم بھی ہیں لھذا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت مطلقا ثابت ہوگئی جو کسی زمانہ سے خاص نہیں۔

بخلاف اللہ تعالیٰ کے ارشادگرامی ﴿وَاصْطَفَاکِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ﴾ میں احتمال ہے کہ مراد یہی ہو جو ذکر کردی گئی کہ حضرت مریم کو اپنے زمانہ کی عورتوں پرفضیلت حاصل ہے۔ (مظہری)

❁ عن ابی سعید الخدری ان النبی ﷺ قال فاطمة سیدة نساء اھل الجنة الا ما کان من مریم"
(رواہ ابو یعلی وابن حبان والحاکم والطبرانی)

حضرت ابوسعید خدری ؓ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا فاطمہ جنتی عورتوں کی سردار ہیں سوائے مریم کے۔

❁ "عن ام سلمة عن فاطمة قالت اخبرنی رسول اللہ ﷺ انی سیدة نساء اھل الجنة الا مریم بنت عمران"

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے روایت فرماتی ہیں کہ انہوں نے فرمایا مجھے رسول اللہ ﷺ نے خبر دی ہے کہ تم تمام جنتی عورتوں کی سردار ہو سوائے مریم بنت عمران کے۔

ان دو حدیثوں سے بظاہر یہ سمجھ آتا ہے کہ حضرت مریم کو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پر فضیلت حاصل ہے لیکن علامہ مظہری رحمہ اللہ نے کیا خوب بیان فرمایا:

فھذان الحدیثان یدلان علی استثناء مریم من المفضولیة ولا یدلان علی کونھا افضل من فاطمة رضی اللہ عنھا"

یہ دونوں حدیثیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حضرت مریم کو مفضولیت سے مستثنیٰ کیا گیا ہے، یہ حدیثیں اس پر دلالت نہیں کر رہیں کہ حضرت مریم کو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پر فضیلت حاصل ہے۔ (ماخوذ از مظہری)

❁ "قال رسول اللہ ﷺ فاطمة بضعة منی" (رواہ البخاری والمسلم عن المسور بن مخرمة)

مسور بن مخرمۃ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا فاطمہ میرے جسم کا ٹکڑا ہے۔

یہی حدیث مسند احمد اور ترمذی اور مستدرک حاکم میں ابن زبیر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اس حدیث

پاک ہے بعض حضرات نے مطلقا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت تمام مردوں اور عورتوں پر ثابت کی، امام مالک رحمہ اللہ کا بھی یہ قول ہے "لانعدل ببضعة رسول الله ﷺ احدا" ہم رسول اللہ ﷺ کے جسم کے ٹکڑے کے برابر کسی اور کو نہیں سمجھتے۔

"لكن عند جمهور اهل السنة خص منه من علم فضلهم قطعا من الانبياء وبعض الصديقين وبقي من سواهم في العموم"

لیکن جمہور علماء اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو کسی نبی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں اور بعض صدیقین (خلفاء راشدین) پر بھی فضیلت حاصل نہیں، البتہ عام مردوں پر آپ کو فضیلت حاصل ہے۔

تنبیہ: بعض مفسرین حضرات نے مطلقا حضرت مریم کو تمام عورتوں پر فضیلت دی ہے، لیکن راقم نے جو کچھ سمجھا وہ یہ ہے کہ حضرت مریم اور حضرت آسیہ زوجہ فرعون کو اپنے اپنے زمانہ کی عورتوں پر فضیلت حاصل ہے، اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو مطلقا تمام عورتوں پر فضیلت حاصل ہے، اس کے بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بحیثیت بنت النبی ﷺ کے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بحیثیت زوجۃ النبی ﷺ کے تمام عورتوں پر فضیلت حاصل ہے

"واللہ اعلم بالصواب"

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿يَا مَرْيَمُ اقْنُتِي لِرَبِّكِ وَاسْجُدِي وَارْكَعِي مَعَ الرَّكِعِيْنَ﴾ (آیۃ نمبر ۴۳)

(1) اے مریم اپنے رب کے حضور ادب سے کھڑی ہو اور اس کیلئے سجدہ کر اور رکوع والوں کے ساتھ رکوع کر۔

(2) اے مریم ادب سے کھڑی ہو جاؤ اپنے رب کے حضور اور سجدہ کرو اور رکوع کرو ساتھ رکوع کرنے والوں کے۔

مختصر مطلب: اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کو نماز با جماعت ادا کرنے کا حکم دیا، البتہ علیحدہ علیحدہ ارکان کا ذکر کیا تاکہ ان کی حفاظت میں مبالغہ کرنے کا حکم پایا جاسکے۔ ''لما ان فی ذکر الشی تفصیلا تقریرا لیس فی الاجمال'' کیونکہ کسی چیز کی تفصیل میں جو تقریر پائی گئی ہے وہ اجمال میں نہیں۔ (روح المعانی)

﴿يَا مَرْيَمُ﴾ ''اے مریم''

''الحکمة فی ان اللہ لم یذکر فی القرآن امرأة باسمها الاهی اشارة الی رد ما قاله الکفار من انها زوجته فان العظیم علی الهمة یا نف من ذکر اسم زوجته بین الناس فکان اللہ یقول لو کانت زوجة لی لما صرحت باسمها''

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں کسی عورت کا نام ذکر نہیں سوائے حضرت مریم کے، اصل میں اس نام کے ذکر کرنے میں یہ اشارہ ملتا ہے کہ اس میں کفار کا رد پایا گیا ہے جنہوں نے یہ کہا تھا کہ وہ آپ کی زوجہ ہیں، اس لئے کہ جو عظیم ہمت والی ہستیاں ہیں وہ اپنی زوجہ کا چرچا لوگوں میں کرنے سے عار محسوس کرتے ہیں، تو گویا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمادیا کہ اگر مریم میری زوجہ ہوتی تو میں اس کا واضح طور پر نام ذکر نہ کرتا، اس کا چرچا نہ کرتا۔ (حاشیہ جلالین)

﴿اقْنُتِي لِرَبِّكِ﴾ ''اپنے رب کے حضور ادب سے کھڑی ہو''

''قنوت'' کے مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں، جلالین میں مذکور ہے ''اطیعیه'' اپنے رب کی اطاعت کرو، ''اطیلی القیام فی الصلوة'' شکرا'' نماز میں لمبا قیام کرو اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنے کیلئے۔ (مظہری)

''اعبدی لربک'' اپنے رب کی عبادت کرو۔ (صابونی)

روح المعانی نے پہلے دو معانی بیان کیا ہے ''الاخلاص فی العبادة'' خلوص سے عبادت کرو۔ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا تقریباً یہی معنی ہے ''اپنے رب کے حضور ادب سے کھڑی ہو'' راقم نے بھی یہی معنی نقل کیا ہے۔ خازن

نے ''لمبا قیام کرو'' معنی بیان کرنے کے بعد یہ ذکر کیا:

''قال الاوزاعی لما قالت الملائکة لهاذلک قامت حتی تورمت قدما ها وسالت دماوقیحا''

اوزاعی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے جب فرشتوں نے آپ کو رب تعالی کا یہ پیغام پہنچایا تو آپ نے اتنا لمبا قیام کرنا شروع کیا یہاں تک کہ آپ کے قدموں پر ورم (سوجن) آ گئی، یہاں تک آپ کے قدموں سے خون بہنا شروع ہو گیا۔ (خازن)

﴿وَاسْجُدِي وَارْكَعِي مَعَ الرّٰكِعِينَ﴾

''اور سجدہ کرو، اور رکوع کرو ساتھ رکوع کرنے والوں کے۔''

''امرت بالصلوة بالجماعة بذکر ارکانها مبالغة فی ایجاب رعایتها وایذانا بفضیلة کل منها واصالته''

اس آیۃ کریمہ میں حضرت مریم کو نماز جماعت سے ادا کرنے کا حکم دیا گیا، البتہ علیحدہ علیحدہ ارکان ذکر کیے گے کہ ''قیام کرو'' (ادب سے کھڑی ہو جاؤ) اپنے رب کے حضور، اور سجدہ کرو، اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ، تا کہ ان کے وجوب رعایت میں مبالغہ کیا جائے۔ اور ساتھ ساتھ ارکان کی فضیلت کو بھی بیان کر دیا، اور یہ بھی بتا دیا کہ اصل ارکان یہی ہیں جن کا تعلق فعل سے ہے۔ (از تفسیر ابی السعود)

سجدہ کو رکوع سے پہلے کیوں ذکر کیا؟

''وتقدیم السجود علی الرکوع امالکون الترتیب فی شریعتهم کذلک''

سجدہ کو رکوع سے پہلے ذکر کرنے کی ایک وجہ ممکن ہے یہ ہو کہ ان کی شریعت میں ترتیب ہی یہ ہو کہ وہ سجدہ پہلے کرتے ہوں اور رکوع بعد میں۔ اگر قوی دلائل سے یہ ثابت ہو جائے تو مسئلہ واضح ہے کہ جس طرح ان پر نماز ادا کرنا لازم تھا اسی طرح ان کو یہاں حکم دیا گیا۔ (از تفسیر ابی السعود)

لیکن زیادہ مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ ان کی نماز ہماری نماز کی طرح ہی تھی، رکوع پہلے تھا اور سجدہ بعد، اس قول کے مطابق (جو صحیح بھی ہے) ضروری ہے کہ وجہ بیان کی جائے کہ کیوں سجدہ کا ذکر رکوع سے پہلے کیا گیا، اس میں چند وجوہ ہیں۔

(۱) **''انما قدم السجود علی الرکوع لان الواو لاتقتضی الترتیب انما هی للجمع کانه قیل لها افعلی الرکوع والسجود''**

سجدہ کو رکوع پر مقدم ذکر کرنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ واؤ ترتیب کو نہیں چاہتی، صرف جمع کیلئے آتی ہے، حکم صرف یہ دیا گیا کہ

رکوع کرو اور سجدہ کرو، یہ مراد نہیں کہ سجدہ پہلے کرو اور رکوع بعد میں۔

(۲) **وقال الانباری امرھاامر اعاماو حضھاعلی فعل ارادالعموم فکانہ قال استعملی السجود فی حال والرکوع فی حال ولم یرد تقدیم السجود علی الرکوع بل ارادالعموم بالامر علی اختلاف الحالین "**

ابن انباری رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ رب تعالیٰ نے حضرت مریم کو مطلقا ایک عام حکم دیا ہے، نیکی کے کام پر ابھارا ہے، گویا کہ کہا ہے سجدہ کرو سجدہ کے وقت اور رکوع کرو رکوع کے وقت، سجدہ کو رکوع پر مقدم کرنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ (خازن)

(۳) **"اولیتقرن(ارکعی)بالراکعین للایذان بان من لیس فی صلوتھم رکوع لیس مصلین"**

اور وجہ یہ ہے کہ سجدہ کا حکم دیا گیا ہے، یعنی ادب سے قیام کرو اور سجدہ کرو، رکوع کا مطلقا حکم نہیں بلکہ رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرنے کا حکم دیا گیا، جس کا مطلب ہے "اور نماز جماعت سے ادا کرو"

اسی سے ضمنا یہ سمجھ آ گیا کہ جن کی نماز میں رکوع نہیں وہ حقیقت میں نہ نماز ہے، اور نہ ہی ادا کرنے والوں کو نمازی کہا جائے گا۔

(۴) **"قال الزمحشری ویحتمل ان یکون فی زمناھما من کان یقول ویسجد فی صلوتہ ولایرکع، وفیہ من یرکع فامرت بأن ترکع مع الراکعین ولا تکون مع من لا یرکع"**

زمخشری نے کہا ہے کہ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس زمانہ میں بعض لوگ وہ ہوں جو نماز ادا کرتے ہوں اس میں سجدہ کرتے ہوں اور رکوع نہ کرتے ہوں اور بعض لوگ نماز میں سجدہ اور رکوع دونوں ہی کرتے ہوں، تو حضرت مریم کو حکم دیا گیا ہو تم نماز ان لوگوں کے ساتھ ادا کرو جو سجدہ بھی کرتے ہوں اور رکوع بھی، ان لوگوں کے ساتھ نماز ادا نہ کرو جو سجدہ تو کرتے ہیں اور رکوع نہیں کرتے۔ (روح المعانی)

اعتراض: یہ وجہ تو اس طرح بھی حاصل ہو سکتی تھی کہ یہ کہہ لیا جاتا **"وارکعی مع الرکعین واسجدی"**

جواب: سجدہ عبادت میں دوسرے ارکان سے اہم ہے، اسی وجہ سے غیر خدا کو سجدہ جائز نہیں اور سجدہ رب تعالیٰ کے قرب کا زیادہ ذریعہ ہے بنسبت دوسرے ارکان کے۔

"قال علیہ الصلوۃ والسلام" اقرب مایکون العبد من ربہ اذاسجد"

بندہ رب تعالیٰ کے اس وقت زیادہ قریب ہوتا ہے، جب سجدہ کرتا ہے۔

"فلما کان السجود مختصا بھذاالنوع من الرتبۃ والفضیلۃ لاجرم قدمہ علی سائر الطاعات "

جب سجدہ کو یہ خصوصی فضیلت اور مرتبہ حاصل ہے تو یقینا اسی وجہ سے اسے پہلے ذکر کر دیا لیکن پہلے ذکر سے یہ لازم نہیں آتا کہ پہلے ہی ادا کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہو۔ (ماخوذ از کبیر و روح المعانی بتصرف)

(۵) سجدہ کا حقیقی معنی مراد نہ ہو اور رکوع کا حقیقی معنی مراد ہو، یعنی سجدہ کا معنی نماز ہو، اور رکوع کا مطلب رکوع ہی ہو تو اب مطلب یہ ہوگا نماز ادا کرو اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ یعنی نماز جماعت سے ادا کرو، سجدہ سے مراد نماز رب تعالی کے اس ارشاد گرامی میں پائی گئی ہے ﴿ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴾ اور کچھ رات گئے اس کی تسبیح کرو اور نمازوں کے بعد۔ اس مقام میں ''سجود'' کا معنی ''نمازیں'' لیا گیا ہے۔

اور حدیث شریف میں ہے " اذا دخل احدکم المسجد فلیسجد سجدتین " جب تم میں سے کوئی ایک مسجد میں داخل ہو تو دو رکعت نماز ادا کرے۔ حدیث شریف میں بھی " فلیسجد " کا معنی'' چاہئے وہ نماز ادا کرے'' اور سجدتین کا معنی دو رکعت نماز۔ (کبیر بتصرف)

(۶) ایک اور احتمال یہ ہے کہ سجدہ کا معنی حقیقی ہو اور رکوع کا معنی مجازی ہو " یعنی ان یکون المراد من الرکوع التواضع " یعنی رکوع کا معنی خشوع وخضوع، عاجزی مراد ہو۔ اب معنی یہ ہوگا'' اور سجدہ کرو اور عاجزی سے یعنی خشوع وخضوع سے نماز ادا کرو۔ (کبیر بتصرف)

(۷) ایک اور احتمال یہ ہے کہ سجدہ اور رکوع دونوں کا معنی مجازی ہو اب مطلب یہ ہوگا نماز ادا کرو، اور خشوع کرنے والوں کے ساتھ خشوع کرو۔ یہ آخری تینوں احتمال جو پیش کئے گئے ہیں ان پر اعتراض وارد ہی نہیں ہوتا۔

"وارکعی مع الراکعات " نہیں کہا، کیا وجہ ہے؟ یعنی یہ نہیں کہا رکوع کرو رکوع کرنے والی عورتوں کے ساتھ بلکہ یہ کہا ہے "وارکعی مع الراکعین " اور رکوع کرو رکوع کرنے والے مردوں سے ساتھ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں چند وجوہ ہیں۔

(۱) والجواب ان الاقتداء بالرجال حال الاختفاء من الرجل افضل من الاقتداء بالنساء "
ایک وجہ ان میں سے یہ ہے کہ اس سے یہ مسئلہ ثابت کیا گیا ہے کہ پردے کی حالت میں اقتداء مردوں سے زیادہ بہتر ہے بنسبت عورتوں کی اقتداء کے۔ (کبیر)

(۲) وجاء (مع الراکعین) دون الراکعات لان هذا الجمع اعم اذ یشمل الرجال علی سبیل التغلیب "
جمع مذکر کے صیغے تغلیبی طور پر مؤنث کو بھی شامل ہیں، لھذا مؤنث کے صیغہ کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ امامت تو مردوں کی ہے اور ان کی اقتداء میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی پردے میں ان کے ساتھ نماز ادا کر رہی ہیں لھذا تم بھی اس جماعت میں شریک ہو جاؤ۔ (ماخوذ از البحر المحیط بوضاحت)

(۳) (مع الراکعین) لم یقل مع الراکعات اما لدخول جمع المؤنث فی المذکر بالتغلیب

اوالمعنی صلی کصلوۃ الرجال من حیث الخشیۃ وعوالھمۃ لا کصلوۃ النساء من حیث التفریط وعدم الخشیۃ" (صاوی)

ایک جواب تو علامہ صاوی رحمہ اللہ کا بھی وہی ہے جو البحر المحیط سے بیان کیا گیا ہے البتہ ایک اور وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ مذکر صیغہ ذکر کیا ہے مؤنث نہیں ذکر کیا اس کی وجہ یہ ہے گویا کہ یہ حکم دیا گیا ہے تم مردوں کی طرح خشوع وخضوع سے اور بلند ہمت سے نماز ادا کرو عام عورتوں کی طرح نماز میں کوتاہی سے کام نہ لو، اور عام عورتوں کی طرح نماز بغیر خشوع کے ادا نہ کرو بلکہ خشوع سے ادا کرو۔

بحث مذکور سے راقم نے یہ سمجھا:

بنی اسرائیل کی نماز ہماری نماز کی طرح ہی تھی اس میں رکوع تھا اور سجود بھی، اسی طرح رکوع پہلے تھا اور سجود بعد میں، سجود کے اہم رکن ہونے کی وجہ سے پہلے ذکر کر دیا گیا، واؤ ترتیب کا تقاضا نہیں کرتی اس لئے مطلوب رکوع اور سجود کی ادائیگی ہے ترتیب ذکری ترتیب فعلی پر دلالت نہیں کر رہی۔ راقم نے ﴿وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾ پارہ اول میں بھی یہی موقف بیان کیا ہے اسلئے بعض حضرات کا یہ قول کہ بنی اسرائیل کی نماز میں رکوع نہیں تھا مرجوح نظر آرہا ہے۔ "واللہ اعلم بالصواب"

حضرت مریم کے قرآنی واقعات پر بنی اسرائیل کے اعتراضات:

اس مقام پر عیسائی نکتہ چین قرآن مجید پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ حضرت مسیح اور مریم کے اور اسی طرح یوحنا یعنی یحییٰ کے قصہ میں چند غلطیاں قرآن میں بیان ہوئیں (معاذ اللہ) جو تاریخی واقعات سے علاقہ رکھتے ہیں،

(۱) یہ کہ مریم کی ماں کا نذر ماننا اور پھر مریم کو ہیکل میں بھیج دینا اور وہاں کاہنوں میں باہم ان کی پرورش کی بابت گفتگو ہر کریا کے نام قرعہ نکلنا اور زکریا کا مریم کو بے موسم پھل کھاتے دیکھ کر اپنے لئے اولاد کے واسطے دعاء کرنا انجیل سے ثابت نہیں اس لئے کہ باتیں غلط ہیں۔

(۲) قرآن میں لکھا ہے کہ زکریا تین روز تک بغیر اشارہ کے کسی سے کلام نہ کریں گے، حالانکہ انجیل لوقا کے اول باب درس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زکریا کو یوں فرشتہ نے کہا کہ تو جب تک یہ باتیں واقع نہ ہولیں گی گونگا ہو جائے گا کسی سے بول نہ سکے گا اور اسی کے باب ۶۴ درس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب یحییٰ پیدا ہوئے اور آٹھویں دن اس کا

ختنہ ہوااوران کا یحییٰ نام رکھا گیا تب ان کی زبان کھلی جس کی مدت تخمینا مہینے ہوتی ہے قرآن باوجود دعوی الہام اور تصدیق انجیل کے کتنی غلطی کی۔

(۳) لڑکپن میں مسیح کا کلام کرنااور پھر پرندوں کا معجزہ کہ مٹی کے جانور بنا کران میں پھونک مارنا اوران کا زندہ ہوکراڑ جانا کہیں سے ثابت نہیں قرآن نے اسکو کہاں سے لیا۔

اعتراضات کے جوابات:

اول سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر تاریخی باتیں چارانجیلوں کے مصنف نے اپنی مختصر تاریخوں میں نہ لکھیں تو اس سے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ امور غلط ہیں، دیکھوزکریا کا فرشتہ سے بشارت پانااور یحییٰ نام رکھناوغیرہ باتیں صرف لوقا نے لکھیں اوروں نے نہیں پھر کیا اس وجہ سے وہ غلط ہوں گی؟ اسی طرح مسیح کے پیدا ہونے کے دنوں میں مجوسیوں کوایک ستارہ دکھائی دینااوراس کا ان کے آگے آگے چلنا سوائے متی کے اور کسی نے نہیں لکھا اس طرح ان چاروں مورخوں کا باہم سیکڑوں باتوں میں اختلاف بیان پایا جاتا ہے

یہی تیسرے اعتراض کا جواب ہے اور تائیداس کی یہ ہے کہ یوحنا اپنی انجیل کے سب سے اخیر میں یہ لکھتا ہے ''کہ اور بھی بہت سے کام ہیں جو یسوع نے کئے، اگر وہ جدا جدا لکھے جاتے تو میں گمان کرتا ہوں کہ کتابیں جو لکھی جاتیں دنیا میں نہ سماتیں'' پھر کیا مسیح نے یہ ہی چند باتیں اور یہی چند کام کئے ہیں جو چارانجیلوں میں ہیں؟ ہرگز نہیں ۔علاوہ اس کے یہودی مورخوں اور دوسری انجیلوں سے بھی ان باتوں کا پتہ لگتا ہے اور لوقا کہ بغیر دوسری انجیلوں کے زیادہ معتبر ہونے کی وجہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کے سب تاریخی واقعات غلط ہوں لیکن صحیح قول یہ ہے کہ خودساختہ انجیلوں کے واقعات کو یقینی بھی نہیں کہا جاسکتا، بلکہ اکثر واقعات ان کے غلط ہیں۔

دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ لوقا نے نہ زکریا کو دیکھا نہ یحییٰ کو اور نہ حضرت عیسی کو۔ یہ مورخ سنی ہوئی باتیں لکھتا ہے، جس پر گمان ہوسکتا ہے کہ یا راوی نے غلطی کی یا خود لوقا سے سہو ہو گیا یا نسخہ میں اوغلطیوں کی طرح یہ بھی واقع ہوئیں۔قرآن پاک نے اس انجیل کے سچا ہونے کا دعوی کیا ہے جو اللہ تعالی نے حضرت عیسی علیہ السلام پر نازل فرمائی چارانجیلیں جو عیسائی مورخوں کی ہیں وہ جب خودساختہ اور جھوٹی ہیں تو قرآن پاک کا ان کے مخالف ہونا ہی عقل کے مطابق ہے۔ (ماخوذازحقانی بتصرف قلیل)

آمدم برسر مطلب:

حضرت مریم کو جماعت سے نماز ادا کرنے کا حکم کیسے دیا گیا حالانکہ وہ ایک جوان لڑکی تھی، جوان لڑکی کو مردوں کے ساتھ جماعت سے نماز ادا کرنے کا حکم عقل وشرع کے خلاف نظر آتا ہے۔

جواب: اس میں چند احتمال پائے گئے جن کو مدنظر رکھنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ آپ کو جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے وہ شرع اور عقل کے مطابق ہے۔ خصوصاً رب تعالیٰ کا حکم ہی تو شرع ہے خلاف شرع تو وہ کام ہوتے ہیں جو باری تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہوں آیئے وہ احتمالات دیکھئے

(۱) ایک احتمال اس میں یہ ہے کہ آپ کیلئے جو حجرہ بنایا گیا وہ اس طرح بیت المقدس کے ساتھ متصل تھا کہ جماعت میں صفیں اس تک پہنچ جاتی تھیں، آپ اپنے حجرہ میں نماز ادا کرتی تھیں اس صورت میں نہ مردوں کے ساتھ کھڑے ہونے کا تصور ہے اور نہ ہی بے پردہ ہونے کا تصور ہے۔

(۲) دوسرا احتمال یہ ہے کہ آپ مردوں کی صف کے پیچھے علیحدہ صف میں باپردہ ہو کر نماز ادا کرتی ہوں اس صورت میں مردوں کے ساتھ ملنے اور بے پردہ ہونے کا کوئی تصور نہیں۔

(۳) ایک احتمال یہ ہے کہ بیت المقدس کے تمام خدام آپ کے اقرباء ہوں، یہی وجہ ہے کہ آپ کی کفالت کا ہر شخص تقاضا کر رہا تھا۔ لھذا بزرگ اقرباء کے ساتھ اس شریعت میں کسی لڑکی کے کھڑے ہونے کو کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا تھا اسلئے جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا شرع وعقل کے مطابق ہے۔

(۴) چوتھا احتمال یہ ہے کہ نماز کے وقت اور عورتیں بھی آتی تھیں جو جماعت سے نماز ادا کرتی تھیں عورتوں کی صف مردوں سے علیحدہ پردے میں ہوتی تھی۔ (ماخوذ از روح المعانی بوضاحت)

اگرچہ چار احتمالات میں سے ہر احتمال قوی ہے لیکن راقم کو آخری احتمال زیادہ قوی نظر آتا ہے۔

گذشتہ سے پیوستہ: حضرت مریم کا ایک وصف بیان کیا گیا "وطھـــرک" اور تجھے صاف وستھرا کیا اس کے متعلق علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے خوب بیان فرمایا:

"والاولی الحمل علی العموم ای طھرک من الاقذار الحسیة والمعنویة والقلبیة والقالبیه"

بہتر یہ ہے کہ معنی عمام ہی مراد لیا جائے، یعنی آپ کو حسی اور معنوی، روحانی اور جسمانی تمام عیوب سے پاک بنایا۔

(ماخوذ از روح المعانی)

﴿ ذٰلِکَ مِنۡ اَنۡبَآءِ الۡغَیۡبِ نُوۡحِیۡهِ اِلَیۡکَ وَمَا کُنۡتَ لَدَیۡهِمۡ اِذۡ یُلۡقُوۡنَ اَقۡلَامَهُمۡ اَیُّهُمۡ یَکۡفُلُ مَرۡیَمَ وَمَا کُنۡتَ لَدَیۡهِمۡ اِذۡ یَخۡتَصِمُوۡنَ ۝ ﴾ (آیۃ نمبر ۴۴)

(1) یہ غیب کی خبریں ہیں کہ ہم خفیہ طور پر تمہیں بتاتے ہیں اور تم ان کے پاس نہ تھے جب وہ اپنی قلموں سے قرعہ ڈالتے تھے کہ مریم کس کی پرورش میں رہیں، اور تم ان کے پاس نہ تھے جب وہ جھگڑ رہے تھے۔

(2) یہ غیب کی خبریں ہیں جو خفیہ طور پر ہم تمہیں بتاتے ہیں، اور نہیں تھے پاس ان کے جب وہ ڈال رہے تھے اپنی قلمیں کہ کون کفالت کرے مریم کی، اور نہیں تھے آپ پاس ان کے جب وہ جھگڑ رہے تھے۔

مختصر مطلب:

نبی کریم ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالی نے فرمایا کہ آپ نے حضرت مریم کی کفالت اور ان کی قلموں کے ذریعے قرعہ اندازی اور ان کے جھگڑے کرنے کی جو خبریں دی ہیں، وہ سب غیبی خبریں ہیں، جو اللہ تعالی نے آپ کے دل میں ڈالی ہیں، حالانکہ آپ ان کی قرعہ اندازی کے وقت اور ان کے جھگڑے کے دوران ان کے پاس موجود نہ تھے۔

﴿ ذٰلِکَ مِنۡ اَنۡبَاءِ الۡغَیۡبِ نُوۡحِیۡهِ اِلَیۡکَ ﴾

''یہ غیب کی خبریں ہیں جو خفیہ طور پر ہم تمہیں بتاتے ہیں''

''(ذلک) اشارة الی ماتقدم والمعنی ان الذی مضی ذکره من حدیث حنة وزکریا ویحیی وعیسی بن مریم انما هو من اخبار الغیب فلا یمکنک انه تعلمه الابالوحی''

لفظ ''ذلک'' کا اشارہ ماقبل خبروں کی طرف ہے، یعنی ''مشار الیہ'' ''ماتقدم'' ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو واقعات بیان کیے گئے ہیں حنہ زوجہ عمران کا واقعہ، زکریا علیہ السلام کا کفیل بننے کا واقعہ، حضرت یحیی اور حضرت عیسی (علیھما السلام) کے واقعات یہ سب غیبی خبریں ہیں۔ اللہ تعالی نے آپ کو ان پر مطلع کیا ہے، اللہ تعالی کی عطاء کے بغیر آپ ذاتی طور پر ان خبروں پر مطلع ہونے کی قدرت نہیں رکھتے تھے۔ (کبیر)

سبحان اللہ ! کیسے اہل سنت کا مسلک جھلملاتا ہوا ثابت ہوگیا کہ اللہ تعالی کی عطاء کے بغیر حضور ﷺ کو ذاتی طور پر غیبی چیزوں کا علم حاصل نہیں، لیکن اللہ تعالی کی عطاء سے آپ کو علم حاصل ہے۔

اعتراض: نبی کریم ﷺ کا مشاہدہ نہ کرنا اور ان سے خبروں کو نہ سننا تو واضح ہے، اس کے ذکر کا کیا فائدہ؟

جواب: چونکہ کفار بھی یقینی طور پر جانتے تھے کہ نبی کریم ﷺ نے ان لوگوں کے واقعات کو نہ سنا تھا اور نہ ہی پڑھا تھا، لیکن وہ وحی کا انکار کرتے تھے، اس لئے اب صرف مشاہدہ رہ گیا تھا جس کی نفی کی گئی۔ (ماخوذ از بیہ)

"انباء الغیب" (غیبی خبریں) "انباء" جمع ہے "نبا" کی اور جب باب افعال کا مصدر ہو تو معنی ہوگا "خبر دینا" "ایحاء" کو مختلف معانی میں استعمال کیا گیا ہے "ویجمعها تعریف الموحی الیه بامر خفی من اشارة او کتابة اوغیرهما" سب معانی اس معنی میں سمٹ کر آجاتے ہیں کہ جسے خفی طریقہ سے یعنی اشارہ یا کتابت وغیرہ سے کسی چیز کی پہچان کرادی جائے اسے وحی کہتے ہیں۔

وحی کا مشہور معنی جبریل کا رب تعالی کا پیغام انبیاء کرام کو پہنچانا، اور وحی کا اطلاق الہام پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے ﴿واوحی ربک الی النحل﴾ تیرے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈالی، الخ۔

اور رب تعالی کا ارشاد گرامی ﴿ان الشیاطین لیوحون الی اولیآئهم﴾ شیطان اپنے دوستوں کے دل میں ڈالتے ہیں اور ارشاد باری تعالی ﴿فاوحی الیهم ان سبحوا بکرة وعشیا﴾ تو زکریا نے اشارہ ان کی طرف کہ صبح وشام تسبیح بیان کرو۔ ان سب مقاموں میں وحی کا معنی اشارہ کرنا، اور دل میں ڈالنا۔ (ماخوذ از بیہ)

علامہ رازی رحمہ اللہ کے ارشاد کو دیکھیں جو انہوں نے تمام معانی کا جامع معنی بیان کیا، پھر اعلی حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کے ترجمہ کو دیکھیں جو راقم نے بھی نقل کیا تو آپ کو بہت خوب نظر آئے گا۔

"ذلک من انباء الغیب" سے یہ واضح ہوگیا "ان هذه القصص وصولها الیک من جهة الوحی اذلست ممن دارس الکتب ولا صحب من یعرف ذلک" کہ یہ واقعات جو نبی کریم ﷺ نے تفصیلی طور پر بیان فرمائے ہیں، آپ تک وحی کے ذریعے پہنچے، کیونکہ آپ نے کسی مدرسہ میں کتابیں نہیں پڑھی تھیں، اور آپ علماء کی مجلس میں شریک نہ ہوئے تھے، کیونکہ آپ امی قوم میں تشریف لائے، وہاں علماء کی محفل میں بیٹھنے کا تصور ہی نہ تھا لهذا آپ تک ان واقعات کا پہنچنا صرف وحی کے ذریعے سے ہی تھا۔

اسی طرح نوح علیہ السلام کی تفصیلی خبریں بیان کرنے کے بعد رب تعالی نے نبی کریم ﷺ کو خطاب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ﴿تلک من انبآء الغیب نوحیها الیک ما کنت تعلمها انت ولا قومک من قبل هذا﴾ یہ غیب کی

خبریں ہم تمہاری طرف وحی کرتے ہیں انہیں نہ تم جانتے تھے نہ تمہاری قوم اس سے پہلے۔

''وفی ھذادلیل علی نبوة رسول الله ﷺ اذا کبر بغیوب لم یطلع علیھا الامن شاھدھا اومن قرأھا فی الکتب السابقة اومن اوحی الله الیه بھا وقدانتفی العیان والقراءة فتعین الثالث وھو الوحی من الله تعالٰی''

اس میں رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر دلیل پائی گئی ہے کہ آپ نے غیبی خبریں دیں، جن پر یا وہ لوگ مطلع جنہوں نے ان کا مشاہدہ کیا اور کچھ لوگوں کو پہلی کتابیں پڑھ کر علم حاصل ہوا، یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعے علم حاصل ہوا، نبی کریم ﷺ نے جب بظاہر مشاہدہ نہیں فرمایا اور کسی مدرسہ میں نہیں پڑھا تو واضح ہوگیا کہ آپ کو وحی کے ذریعے علم حاصل ہوا، آپ کی طرف وحی کا آنا آپ کی نبوت کی دلیل ہے۔ (البحر المحیط)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

''ذلک'' اور ''الیک'' میں کاف سے خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے ''ذلک' مبتداء ہے ''من انباء الغیب'' خبر ہے، اور ''نوحیه'' جملہ مستأنفہ ہے، اور ''نوحیه'' میں ضمیر منصوب کی ''غیب'' کی طرف لوٹ رہی ہے، اب معنی واضح ہوگیا ''ای شاننا انا نوحی الیک الغیب ونعلمک به'' یعنی ہماری شان یہ ہے کہ بیشک ہم آپ کو غیبی خبروں پر خفیہ طور پر مطلع کر دیتے ہیں، اور آپ کو ان کا علم غیب عطاء کر دیتے ہیں۔

''نوحیه'' مضارع کا صیغہ ذکر کیا، یعنی ہم آپ کو وقتاً فوقتاً (یعنی ہم آپ کو کئی وقتوں میں) غیبی خبروں پر مطلع کرتے رہتے ہیں۔ (البحر المحیط)

﴿ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ﴾

''اور نہیں تھے تم پاس ان کے جب وہ ڈال رہے اپنی قلمیں کہ کون ان میں سے کفالت کرے مریم کی۔''

یہاں سے غیبی خبروں پر تعجب دلانے کیلئے وضاحت کی کہ اے نبی کریم ﷺ آپ ان کے پاس نہیں تھے جب وہ مریم کی کفالت کیلئے اپنی قلموں کو ڈال رہے تھے، پھر آپ کا خبر دینا یقیناً وحی کی وجہ سے تھا، جس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو مطلع کیا۔

قلمیں کہاں ڈال رہے اور کیوں ڈال رہے تھے؟

(اذیلقون اقلامھم) یعنی ''التی کانوا یکتبون بھا فی الماء لاجل الاقتراع''

وہ جن قلموں سے لکھتے تھے ان کو پانی میں قرعہ کیلئے ڈال رہے تھے (خازن)

خیال رہے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ روح المعانی کے ان الفاظ کے مطابق ہے " ای یرمونها ویطرحونها للاقتراع" (جب وہ اپنی قلموں سے قرعہ ڈالتے تھے) راقم نے ظاہر الفاظ پر ترجمہ میں اکتفاء کیا ہے قلمیں ڈالنے کی وجہ نہیں بیان کی۔

وہ قلمیں کون سی تھیں ؟

اگر چہ اس میں مختلف اقوال پائے گئے ہیں لیکن صحیح اور معتبر قول یہ ہے" (والاقلام) جمع قلم وهی كانوا يكتبون بها التوراة واختاروها تبركا بها" "اقلام " جمع ہے قلم کی، یہ وہ قلمیں تھیں جن سے وہ تو راۃ لکھتے تھے، ان کو ہی تبرک کیلئے قرعہ اندازی کیلئے پانی میں ڈالا، کہ جس کے حق میں قرعہ نکل آئے وہی مریم کی کفالت کرے گا۔ (از روح المعانی)

قرعہ اندازی کی ضرورت کیوں پیش آئی ؟

وجہ اس کی یہ تھی کہ حضرت مریم کے باپ ان کے سردار اور ان کے رئیس تھے اور ان سے افضل تھے، بیت المقدس کے خدمت گذار حضرات میں ہر ایک چاہتا تھا کہ میں کا کفیل بنوں تو اس لئے قرعہ اندازی کی ضرورت پیش آئی تا کہ نزاع نہ پیدا ہو، اور نہ ہی کسی کی دل شکنی ہو، کیسے انہوں نے قرعہ اندازی کی؟ اس کی تفصیل پہلے ﴿وكفلها زَكَرِيَّا﴾ کے تحت گذر چکی ہے وہاں ہی دیکھی جائے پھر دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

وہ قلمیں ڈالنے والے کون لوگ تھے؟

اس مسئلہ میں اختلاف ہے اہل علم کا کہ وہ کون لوگ تھے "فمنهم من قال هم خدمة البيت " بعض حضرات نے بیان کیا کہ وہ بیت المقدس کے خدام تھے۔"ومنهم من قال بل العلماء والاحبار وكتاب الوحی " بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ قرعہ اندازی کرنے والے ان کے علماء اور محققین تھے جو تو راۃ کا علم رکھتے تھے اور توارة لکھتے رہتے تھے۔ علامہ رازی رحمہ اللہ اپنا مختار ان الفاظ سے تحریر فرمارہے ہیں،

"ولاشبهة فی انهم كانوا من الخواص واهل الفضل فی الدين والرغبة فی الطريق "

یہ بات شبہ سے دور ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے خاص مقربین تھے، اور دین میں خصوصی فضیلت رکھنے والے تھے اور شریعت کی راہ میں خصوصی رغبت رکھنے والے تھے۔ (ماخوذ از کبیر)

راقم کا اس میں موقف یہ ہے کہ حضرت مریم کی کفالت میں جھگڑا کرنے والے لوگ اور قرعہ ڈالنے والے

اھل فضل اور رب تعالی کے مقرب تھے، وہی علماء و محققین تھے، وہی توراۃ کا علم رکھنے والے تھے، اور وہی توراۃ لکھنے والے تھے، وہ اللہ کے نیک بندے بیت المقدس کے خدمتگذار بھی تھے۔ اس وقت مقربین بیت المقدس کی خدمتگذاری کو اپنے سر کا تاج سمجھتے تھے۔ راقم نے اپنا جو موقف بیان کیا ہے اس میں تمام اقوال مجتمع ہیں ان اقوال میں کوئی اختلاف نہیں کسی قسم کا کوئی تعارض نہیں۔

﴿ وما كُنتَ لَدَيهِم اِذ يَختَصِمُونَ ﴾

''اور نہیں تھے آپ پاس ان کے جب وہ جھگڑ رہے تھے۔''

اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ " وما كنت هناك اذ يتقارعون على التكفل بها و اذ يختصمون بسببها" نبی کریم ﷺ کو خطاب ہے کہ حضرت مریم کی کفالت کیلئے ان کی قرعہ اندازی کے وقت آپ ان کے پاس نہیں تھے، اور نہ ہی آپ ان کے پاس تھے جب وہ قرعہ اندازی میں جھگڑ رہے تھے۔

ایک اور مطلب یہ ہے "فيحتمل ان يكون المراد بهذا الاختصام ماكان قبل الاقراع" کہ اس میں یہ احتمال پایا گیا ہے کہ جب وہ قرعہ اندازی سے پہلے جھگڑا کر رہے تھے تو اس وقت آپ ان کے پاس موجود نہیں تھے۔ "ويحتمل ان يكون اختصاما آخر حصل بعد الاقراع" سا ایک احتمال یہ بھی ہے کہ وہ قرعہ کے بعد جب جھگڑا کر رہے تھے اس وقت آپ ان کے پاس موجود نہیں تھے۔

بظاہر اس پر وہم ہے کہ اتنی نیک ہستیوں کے جھگڑا کرنے کا کیا مطلب ہے؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس جھگڑے سے مراد وہ جھگڑا نہیں جو ہمارے ذہنوں میں تصور پایا جاتا ہے کہ تو تو، میں میں پائی جائے گالی گلوچ ہو، باہم دست بگریباں ہوں، بلکہ ان کا جھگڑا یہ تھا:

"وبالجملة فالمقصود من الأية شدة رغبتهم فى التكفل بشأنها و القيام باصلاح مهماتها"
حاصل کلام یہ ہے کہ آیہ کریمہ میں مقصد بیان یہ ہے کہ وہ تمام کے تمام حضرت مریم کی کفالت میں رغبت کر رہے تھے اور ہر ایک چاہتا تھا کہ اس کے امور کی مصلحت کو میں قائم کروں۔

ایک کہتا تھا یہ حق مجھے مل جائے، دوسرا کہتا تھا یہ حق مجھے مل جائے، قرعہ اندازی سے پہلے ہر ایک کا یہ کہنا اسے جھگڑا سے تعبیر کر دیا گیا ہے اور قرعہ اندازی کے وقت ایک مرتبہ قرعہ ڈالا گیا، جو حضرت زکریا علیہ السلام کے نام پر نکلا، انہوں نے کہا پھر قرعہ ڈالتے ہیں، دوسری مرتبہ آپ کے نام پر نکلا، تو پھر کہنے لگے تیسری مرتبہ قرعہ ڈالتے ہیں، پھر آپ کے نام پر

نکلتا۔قرعہ اندازی کے وقت تین مرتبہ قرعہ ڈالنے کے مطالبہ کو جھگڑا سے تعبیر کر دیا گیا۔قرعہ اندازی کے بعد ہر ایک کا حسرت بھرا جملہ کاش میرے نام قرعہ نکلتا، مجھے کفالت کا حق ملتا اسے جھگڑا سے تعبیر کر دیا گیا۔ (کبیر بوضاحت)

قرعہ اندازی جائز ھے :

قرعہ اندازی کے جواز پر یہ دلیل پائی گئی ہے۔

❁ روی عن النبی ﷺ انه کان اذااراد سفرااقرع بین نسائه"

روایت کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب سفر کا ارادہ فرماتے تھے تو اپنی ازواج مطہرات کے نام پر قرعہ ڈالتے۔جس کے نام قرعہ نکلتا،آپ اسے ساتھ لے جاتے تھے۔سفر ساتھ لے جانے کیلئے اپنی ازواج کے نام قرعہ ڈالنا واجب نہیں بلکہ صرف ان کے دل کی خوشی اور ان کی رضاء مندی حاصل کرنے کیلئے بہتر ہے کہ قرعہ ڈال لیا جائے۔اگر خاوند بغیر قرعہ اندازی کے جسے چاہے سفر میں ساتھ لے جائے تو یہ اس کیلئے جائز ہے۔ (احکام القرآن للجصاص بوضاحت)

حضرت مریم کو صدیقیت حاصل تھی نبوت نہیں:

ابھی تک جو بحث ذکر کی گئی ہے،اس میں حضرت مریم کی بہت شان بیان کی گئی، بڑی شان کے باوجود آپ کو نبوت حاصل نہیں تھی،"والنبوة لیست اولی للنساء" نبوت عورتوں کیلئے بہتر نہیں کیونکہ نبی کیلئے ضروری ہے کہ وہ باہر نکلے،لوگوں کے سامنے جا کر انہیں تبلیغ کرے "وحالهن الاستتار ولا تکون النبوة فی حقهن کما لا بل الکمال فی حقهن الصدیقیة وهی قریب من النبوة" اور عورتوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ پردے میں رہیں لھذا نبوت ان کے حق میں کمال نہیں، بلکہ ان کے حق میں صدیقیت کمال ہے اس لئے کہ صدیقیت نبوت کے قریب ہے۔

"والصدیق من صدق فی جمیع اقواله وافعاله واحواله" صدیق وہ ہے جو اپنے تمام اقوال اور افعال اور احوال میں سچا ہو۔یہ مقام عورتوں کو بھی حاصل ہے اس لئے کہ "فمن النساء کاملات عارفات واصلات الی مقام الرجال فهن رجال فی المعنی" بعض عورتیں بھی کامل ولایت کے درجہ میں ہوتی ہیں مقام معرفت ان کو حاصل ہوتا ہے گویا کہ وہ مردوں کے مقام ولایت معرفت تک پہنچی ہوتی ہیں بلکہ یوں کہا جائے کہ حقیقت میں وہ نیکی وتقوی میں مردوں کا درجہ حاصل کئے ہوتی ہیں۔

بعض بزرگوں سے کسی نے پوچھا ابدال کتنے ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا "اربعون نفسا" چالیس نفوس ہیں۔انہیں کہا گیا کہ آپ نے یہ کیوں نہیں کہا چالیس مرد ابدال ہیں۔تو انہوں نے کہا "لان فیهم النساء" اس لئے کہ چالیس ابدال میں کچھ عورتیں بھی ہیں۔

ولو كان النساء كمن ذكرنا لفضلت النساء على الرجال
فلاالتانيث لاسم الشمس عيب ولا التذكر فخر للهلال

اگر عورتیں ایسی ہو جائیں جس طرح ہم نے ذکر کیا۔ تو وہ عورتیں عام مردوں سے فضیلت والی ہوں گی۔ شمس (سورج) کے لفظ میں تانیث اس کیلئے عیب نہیں۔ ہلال (چاند کے لفظ میں تذکیر اس کیلئے کمال نہیں۔

حکایت: حضرت شیخ ابوعبداللہ بن خفیف کی والدہ ام محمد عبادت کرنے والی، خشوع وخضوع سے کام لینے والی تھیں، ان کا بیٹا ابوعبداللہ رمضان کی آخری دس راتوں کو اپنے گھر کی چھت پر نماز ادا کرتا، رات کو جاگے رہتا تاکہ لیلۃ القدر کے انوار کی تجلیات کو پالے، ام محمد اپنے گھر کے اندر نماز ادا کرتیں، توجہ صرف رب تعالی کی طرف ہوتی لیلۃ القدر کے انوار کی تجلیات کی طرف توجہ کم ہوتی لیکن خود بخود ان پر تجلیات کا ظہور ہو گیا، انہوں نے اپنے بیٹے ابوعبداللہ محمد کو پکارا "یا محمد الذی تطلبه هو عندنا فتعال" اے محمد جسے تم چھت پر تلاش کر رہے ہو وہ ہمارے پاس ہے آؤ اس کا مشاہدہ کرلو، برکت حاصل کرلو۔ جب وہ اترے اور انہوں نے انوار کو دیکھا تو ماں کے قدموں پر گر گئے وہ اکثر طور پر کہا کرتے تھے کہ جب میں نے انوار کا مشاہدہ کیا تو مجھے اپنی ماں کی قدر و منزلت کا پتہ چل گیا کہ وہ کس درجہ کی عابدہ، زاہدہ، طاہرہ ہیں۔

جب ماں کا یہ مقام ہے کہ وہ اپنے بیٹے پر اپنی ریاضت وعبادت کے ذریعے فوقیت لے گئیں، بیٹے کی انہوں نے راہنمائی کی تو اسی سے یہ فائدہ حاصل ہو گیا "فظهر ان من النساء من هي افضل من الرجال وذلك بالوصول الى جانب القدس" کہ بعض عورتیں اللہ تعالی کے تقرب کی وجہ سے عام مردوں پر فضیلت حاصل کر لیتی ہیں۔ یہ مقام ان خوش قسمت عورتوں کو حاصل ہو گا جن پر اللہ تعالی کا خصوصی فیضان ہو گا، اور ان کو اس مقام کے حصول کی استعداد اور ہدایت خاصہ ہو گی "اسعدنا الله واياكم"

علامہ اسمعیل حقی رحمہ اللہ (جن کی وفات ۱۱۳۷ھ کو ہوئی) اپنے زمانہ کی عورتوں کے متعلق رقمطراز ہیں:

"ونعوذ بالله من نساء زماننا حيث لايرى فيهن من هي من اهل التقوى"

اللہ کی پناہ ہمارے زمانہ کی عورتوں سے جہاں ان میں کوئی تقوی والی نظر نہیں آتی ان عورتوں پر تو یہ حدیث نبوی سچی آرہی ہے۔

❁ قال رسول الله ﷺ صنفان من اهل النار لم ارهما قوم معهم سياط كأذناب البقر يضربون بها الناس ونساء كاسيات عاريات مميلات مائلات رؤسهم كاسنمة البخت المائلة لايدخلن الجنة ولا يجدن ريحها وان ريحهاليوجدمن مسيرة كذا و كذا" (رواه مسلم)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو قسمیں جہنمی ہوں گی، میں نے ان دونوں کو دیکھا نہیں (ان دونوں میں سے ایک وہ) قوم

ہوگی جن کے پاس کوڑے ہوں گے جیسے گائے کی دم،اسکے ساتھ لوگوں کو ماریں گے،(اور دوسری قسم وہ) عورتیں ہوں گی جولباس پہنے ہوئے بھی ننگی ہوں گی وہ دوسروں کو اپنی طرف مائل کرنے والی ہوں گی،خود غیروں کی طرف میلان کریں گی ان کے سربختی اونٹوں کی کوہانوں کی طرح ہوں گے وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گی،اور نہ ہی جنت کی خوشبو پائیں گی،حالانکہ جنت کی خوشبو تو اتنے اتنے مسافت سے آجائے گی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

(لم ارهما) يعنى فى عصره عليه السلام لطهارة ذلك العصر بل حدثابعده "

میں نے ان کو دیکھا نہیں یعنی اپنے زمانہ میں میں نے انہیں نہیں دیکھا وجہ اسکی یہ تھی کہ آپ کا زمانہ پاکیزہ زمانہ تھا یہ دونوں قسمیں بعد کی پیداوار ہیں جن کے متعلق آپ نے پہلے ہی ارشاد فرما دیا (قوم معهم سياط) ایک قوم ہوگی جن کے پاس (یعنی جن کے ہاتھوں میں) کوڑے ہوں گے (کاذناب البقر) جو گائے کے دم کی طرح ہوں گے۔

"وهم الذين يضربون بها السارقين عراة او الطوافون على ابواب الظملة كالكلاب يطردون الناس عنها بالضرب والسباب "

یہ وہ لوگ ہوں جو چوروں کو ننگا کر کے ماریں گے،یا وہ لوگ ہوں گے جو ظالموں کے دروازوں پر چکر کاٹیں گے یعنی ان کے دربان ہوں گے ان کے پاس آنے والے لوگوں کو کتے کی طرح ہانکیں گے،انہیں ماریں گے اور ان کو گالیاں دیں گے۔

سبحان الله ! آج کے دور میں مصطفیٰ کریم ﷺ کا ارشاد جگمگا رہا ہے۔حکام کے دروازوں پر پولیس کے پہرہ دار کا یہی حال ہے مطلقا پولیس کا انداز گفتگو یہی ہے اور ان کے پاس چابک کا ہونا،غریب بے بس لوگوں پر ظلم کا ڈھانا ان کا خاص طریقہ ہے۔

(نساء كاسيات عاريات) دوسری قسم عورتوں کی ہے جو لباس پہنے ہوئے ننگی ہوں گی،یعنی ظاہری لباس ہوگا لیکن تقوی کے لباس سے خالی ہوں گی،اور لباس اسطرح کا باریک ہوگا جس سے ان کے جسم نظر آرہے ہوں گے،یا لباس ہی ادھورا ہوگا آدھے جسم پر لباس ہوگا،آدھا جسم ننگا ہوگا۔

آج آپ دیکھیں تو (العياذ بالله) حکومت کی سربراہی میں ایسی عورتیں لاکھوں یا کروڑوں نظر آئیں گی جن کی نشاندہی میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ نے کردی۔غیر مردوں کو اپنی طرف دعوت دینا اور خود ان کی طرف میلان کرنا" میرے حبیب پاک کا ارشاد دیکھنا ہو تو،دفاتر،ہسپتالوں،اداکاروں کی محافل،ویگن کے سفر،گلی کوچوں میں پھرنے والیوں اور خاص خاص اڈوں پر بیٹھ کر دعوت گناہ دینے والیوں کو دیکھئے،تو آپ کو مصطفیٰ کریم ﷺ کی

صداقت اوراس کا وجود نظر آ جائے گا۔ ان کے سر بختی اونٹوں کی کوہانوں کی طرح ہوں گے یعنی وہ تکبرانہ انداز پر سروں کو بختی اونٹوں کی کوہانوں کی طرح ایک طرف جھکاتے ہوئے چلیں گی اور سروں پر پگڑی نما اشیاء رکھ کر سروں کو اونٹوں کی کوہانوں کی طرح بلند کیے ہوں گی۔ (ماخوذ از روح البیان بتصرف)

"اسلام میں عورت کا مقام" سے ایک ورق:

راقم نے اپنی کتاب **"اسلام میں عورت کا مقام"** میں اس حدیث پاک کی وضاحت یوں کی ہے

"ھذا الحدیث من معجزات النبوۃ فقد وقع ھذان الصنفان وھما موجودان" یہ حدیث نبی کریم ﷺ کے معجزات سے ہے کیونکہ آپ نے جو خبر دی وہ واقع ہو چکی ہے کیونکہ یہ دونوں قسمیں موجود ہیں۔

☆ راقم کے خیال میں پہلی قسم سے مراد آج کی پولیس ہے جو ظالم اور درندہ لوگ ان میں زیادہ پائے جاتے ہیں نیک اور شرفاء کم۔ پیسے لے کر قاتل کو چھوڑ دیتے ہیں اور دوسرے لوگوں پر مظالم ڈھاتے رہتے ہیں، چوروں کو چھوڑ دیتے ہیں، شرفاء کو پکڑ لیتے ہیں ہر وقت ان کے پاس گائے کی دم کی طرح ڈنڈا موجود رہتا ہے۔

☆ اسی طرح ان سے مراد چور، ڈاکو بھی ہو سکتے ہیں جو اپنے ہاتھوں میں ڈنڈے کی طرح رائفلیں کلاشنکوف لئے پھرتے ہیں ہر وقت ان کے پاس گائے کی دم کی طرح ڈنڈا یعنی اسلحہ موجود رہتا ہے لوگوں کو مار مار کر لوٹ رہے ہیں۔

☆ بدقماش لوگ جو بازاروں اور گلی کوچوں میں لوگوں پر ظلم کرنے والے ہیں، وہ ابھی ایسے ہی لوگ ہیں ان پر بھی حدیث پاک کا صادق آنا واضح ہے، وہ بھی شرفاء پر مظالم ڈھانے میں کم نہیں۔

☆ سرداری نظام میں نام نہاد سردار، وڈیرے جو غرباء کو ناجائز طریقہ سے تنگ کرتے ہیں وہ بھی اسی ضمن میں آتے ہیں۔

دوسری قسم کی تفصیل علامہ نووی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت نے عورتوں کو ڈھانپا ہو گا لیکن وہ شکر کرنے سے عاری ہوں گی۔ کیونکہ انہوں نے اپنے بعض بدن ڈھانپ رکھے ہوں گے اور بعض بدن کو اپنا جمال ظاہر کرنے کیلئے ننگا رکھا ہوگا۔ اگر کل لباس ہوا بھی گا تو اتنا باریک ہوگا کہ ان کے جسم کا رنگ نظر آ رہا ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور فرائض کی بجا آوری سے ہٹ کر ایک طرف میلان کرنے والی ہوں گی یعنی فرائض پر عمل کرنے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے روگردانی کر رہی ہوں گی اور دوسری عورتوں کو بھی اپنی بری حرکات کی طرف

راغب کر رہی ہوں گی، اسی طرح کندھوں کو نازنخرہ سے ہلا ہلا کر، فاحشہ بن کر چل رہی ہوں گی اور دوسری عورتوں کو بھی یہی سبق سکھا رہی ہوں گی۔

(یہ معنی مائلات اور ممیلات کا علامہ نووی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے، اور روح البیان نے بہت مفید معنی جو بیان کیا ہے وہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے) تکبرانہ انداز پر سروں کو بختی اونٹوں کی کوہانوں کی طرح ایک طرف جھکاتے ہوئے چلیں گی، اور سروں پر پگڑی نما اشیاء رکھ کر سروں کو اونٹوں کی کوہانوں کی طرح بلند کئے ہوں گی۔

اب آپ دیکھیں کہ ہماری فیشن پرست لڑکیاں جو لباس پہنتی ہیں کیا وہ اس لباس کے باوجود ننگی نہیں ہوتیں؟ وہ کس طرح مٹک مٹک کر چلتی ہیں اور سروں پر جو انہوں نے مصنوعی جوڑے (وگ) رکھے ہوتے ہیں کیا وہ اونٹ کے کوہان کی طرح نظر نہیں آتے؟ وہ اپنا انجام دیکھ لیں، حضور ﷺ نے اپنے نور نبوت سے چودہ سو سال پہلے ہی آج کی مغربی تہذیب کی دلدادہ عورت کی کس طرح نشاندہی فرما دی، اللہ تعالیٰ ہمیں شرم حیاء عطاء فرمائے۔

کاش کہ عورتیں اس طرح چادریں اوڑھ کر نکلیں جن سے ان کا تمام جسم ڈھانک دیا جائے تو انہیں دور سے ہی پہچان لیا جائے گا کہ یہ عفت مآب اور عصمت شعار مؤمنہ ہے، کسی کو جرأت نہیں ہوگی کہ اس کی طرف بری نظر اٹھا کر دیکھ سکے، نیز اگر عورت شرم وحیا کا دامن مضبوطی سے پکڑ لے اور بن سنور کر باہر نہ نکلے، اپنے لباس اور اپنی چال سے کسی کو دعوت نظارہ نہ دے تو کسی کی مجال نہیں ہوگی کہ وہ اس کی طرف ہوسناک نظروں سے دیکھے۔

(ماخوذ از نووی شرح مسلم وضیاء القرآن، بحوالہ اسلام میں عورت کا مقام از ص ۱۹۹ تا ۲۰۱)

❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀

﴿اِذْ قَالَتِ الْمَلٰئِكَةُ يَا مَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى بْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ○﴾ (آیۃ نمبر ۴۵)

(1) اور یاد کرو جب فرشتوں نے مریم سے کہا اے مریم اللہ تجھے بشارت دیتا ہے اپنے پاس سے ایک کلمہ کی جس کا نام ہے مسیح عیسیٰ مریم کا بیٹا رو دار ہوگا دینا اور آخرت میں اور قرب والا۔

(2) یاد کرو جب کہا فرشتوں نے اے مریم بیشک اللہ خوشخبری دیتا ہے تمہیں ایک کلمہ کی اپنی طرف سے، جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا، وجاہت والا ہوگا دنیا میں اور آخرت میں، اور خاص قرب والوں سے ہوگا۔

مختصر مطلب: تقریبا ترجمہ سے ہی مختصر مطلب واضح ہے کہ جبریل نے حضرت مریم کو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی طرف سے ایک کلمہ (کلمہ عیسیٰ علیہ السلام کا لقب ہے) کی خوشخبری دیتا ہے، جس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا، وہ دنیا اور آخرت میں وجاہت والا اور قدر و منزلت والا ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کے مقرب انبیاء کرام سے ہوگا، یعنی وہ نبی ہوگا اور اللہ تعالیٰ کا مقرب ہوگا۔

﴿اِذْ قَالَتِ الْمَلٰئِكَةُ﴾ ''یاد کرو جب کہا فرشتوں نے۔''

''اذ'' مفعول فیہ ہے ''اذکر'' مقدر کا، اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے ''یاد کرو جب'' راقم نے بھی یہی ترجمہ نقل کیا ہے۔

''ملائکہ'' اگرچہ جمع ہے لیکن مراد اس سے جبریل ہیں، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، وجہ وہی ہے کہ ذکر جمع، مراد واحد ہے، یہ مجاز ہے، یا وجہ یہ ہے کہ جبریل کے ساتھ اعزازی طور پر فرشتوں کی جماعت آتی تھی، اسلئے اگرچہ حضرت مریم سے کلام کرتے صرف جبریل تھے لیکن دوسرے فرشتے ساتھ تھے لھذا صیغہ جمع کا ذکر کیا۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿يَا مَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ﴾

''اے مریم بیشک اللہ خوشخبری دیتا ہے تمہیں ایک کلمہ کی اپنی طرف سے''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمہ کیوں کہا گیا؟ ابھی قریب ہی یہ بحث وضاحت سے بیان ہو چکی ہے

کہ "کلمہ" سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، ان کو چند وجوہ سے کلمہ کہا گیا ہے ﴿مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ کی وضاحت کے ضمن میں دیکھئے، یہاں البتہ موقع ومحل کی مناسبت سے دو وجہ ذکر کی جاتی ہیں۔

(۱) ایک وجہ یہ ہے کہ ہر نطفہ کا قرار ماں کی رحم (بچہ دانی) میں اللہ تعالیٰ کے کلمہ "کن" سے ہوتا ہے، لیکن اس میں مشہور سبب پایا جاتا ہے، یعنی باپ کا ہونا اور مجامعت سبب ہے، عیسیٰ علیہ السلام کا کوئی باپ نہ تھا، اس لئے آپ کی نسبت کلمہ "کن" کی طرف کامل اور اتم ہوگئی، اسلئے آپ کو کلمہ کہا گیا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ جسے کامل جود، کامل کرم، کامل اقبال حاصل ہو تو مبالغہ کے طور پر کہا جاتا ہے "انه نفس الجود ومحض الكرم وصريح الاقبال" بیشک فلاں شخص عین جود، عین کرم، عین اقبال ہے۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ جس طرح عادل بادشاہ کے متعلق کہا جاتا ہے "انه ظل الله في ارضه" بیشک وہ اللہ کی زمین میں اللہ کا سایہ ہے، "انه سبب لظهور ظل العدل" یعنی اس کے عدل کا سایہ لوگوں پر ظاہر ہے۔ اسی طرح احسان کرنے والے بادشاہ کے متعلق کہا جاتا ہے "انه نور الله" بیشک وہ اللہ کا نور ہے" اس کا مطلب یہ ہے "نور احسانه ظاهر" کہ اس کے احسان کا نور ظاہر ہے یعنی اس کا احسان روشن ہے، جگمگا رہا ہے۔ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے کثرت بیان کی وجہ سے اور شبہات اور تحریفات کے ازالہ سے اللہ تعالیٰ کا کلام ظاہر ہوا، اسی وجہ سے آپ کو "کلمۃ اللہ" کہا گیا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

بشارت کسے کہتے ہیں؟ بشارت وہ خوشی کی خبر ہے جسے سن کر چہرہ کھل کھلا اٹھے، زیادہ وضاحت دیکھنی ہو تو ﴿وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ کی بحث "نجوم الفرقان" کو دیکھئے۔

"بکلمة منه" بظاہر یہاں یہ وہم ہوتا ہے کہ "منه" میں ضمیر "کلمة" کی طرف لوٹ، جو لفظ مؤنث ہے، تو ضمیر مذکر کی کس طرح لوٹ رہی ہے؟ اسی کے جواب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لفظ نکالا گیا ہے "ای ولد" کلمۃ سے مراد "ولد" ہے اور "ولد" مذکر ہے لھذا ایسا لفظ جو مؤنث ہو اور اس کا معنی مذکر ہو اس کی طرف مذکر کی ضمیر لوٹانی جائز ہے۔

خازن میں جواب یہ دیا گیا ہے کہ "کلمۃ" عیسیٰ علیہ السلام کا لقب ہے، اسلئے ضمیر "مسمی" یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے، اسلئے ضمیر مذکر کی لائی گئی۔

خوبصورت بحث:

"منه، ای الله" یعنی فرشتوں نے مریم کو کہا بیشک اللہ تمہیں بشارت دیتا ہے ایک کلمہ کی جو کلمہ اللہ نے اپنی طرف سے بھیجا۔

اعلیٰ حضرت کا خوبصورت محققانہ ترجمہ دیکھئے ''اے مریم اللہ تجھے بشارت دیتا ہے اپنے پاس سے ایک کلمہ کی''

"منه" میں ''من'' ابتدائیہ ہے تبعیضیہ نہیں، جیسا کہ ارشاد نبوی میں بھی ''من'' ابتدائیہ استعمال ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''ان اللہ خلق نور نبیک من نورہ'' بیشک اللہ تعالیٰ نے آپ کے نبی کے نور کو اپنے نور سے پیدا کیا ہے۔ اس حدیث پاک میں ''من نورہ'' میں 'من' ابتدائیہ ہے۔

ایک دن اتفاق ایسا ہوا کہ ایک عیسائی ہارون الرشید کے پاس آیا وہاں ایک عالم حسن بن علی واقدی بھی موجود تھے، اس نصرانی نے خلیفہ اور عالم دونوں کو مخاطب بناتے ہوئے یہ کہا کہ قرآن میں ایک آیۃ ہے جو دلالت کر رہی ہے ''ان عیسی جزء من اللہ'' کہ بیشک عیسیٰ اللہ کی جزء ہیں ''یعنی جب جزء ہونا ثابت ہے تو بیٹا ہونا خود بخود ثابت ہو گیا'' صاحب علم یعنی حسن بن علی واقدی نے اس نصرانی سے پوچھا وہ کون سی آیۃ ہے جس سے تم دلیل پکڑ رہے ہو کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی جزء ہیں، اس نے یہی آیۃ زیر بحث ذکر کی ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ﴾ اور دلیل یوں پیش کی ''فمن للتبعیض فمقتضی ذلک انہ جزء منہ'' کہ آیۃ کریمہ میں ''منه'' میں ''من'' تبعیض کیلئے ہے لھذا اس کا تقاضا یہ ہے کہ عیسیٰ اللہ تعالیٰ کا بعض اور جزء ہوں، جب جزءیت اور بعضیت ثابت ہو گی تو خود بخود ثابت ہو جائے گا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہیں۔ تو حسن بن علی واقدی نے فی البدیہ جواب دیا کہ اگر ہر جگہ ''من'' تبعیضیہ مانا جائے تو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کے متعلق تم کیا جواب دو گے ﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ﴾ اور مسخر کیا (تابع بنایا) تمہارے لئے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کی طرف سے ہے۔ اس آیۃ کریمہ میں بھی ''منہ'' لفظ استعمال ہے، کیا زمین و آسمان کی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی جزء اور بعض ہیں، اور کیا تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی اولاد ہیں؟ ''فبہت النصرانی واسلم'' نصرانی مبہوت ہو گیا، آگے اس سے کوئی جواب نہ بن سکا، لا جواب ہو گیا اور اس نے اسلام قبول کر لیا۔

''واغدق الخلیفة علی الشیخ اغداقا عظیما'' خلیفہ نے شیخ حسن واقدی کو بہت بڑا انعام عطاء کیا کہ اس نے اچھا جواب دیا کہ ایک نصرانی عالم نے اسلام قبول کر لیا۔ (ماخوذ از صاوی بوضاحت)

پہلے حکمران اس پر خوش ہوتے تھے کہ کوئی عیسائی مسلمان ہو جائے، آجکل کے حکمران یہود و نصاریٰ کے اتنے پٹھو بن گئے ہیں کہ وہ چاہتے ہیں کہ تمام مسلمان وضع و تمدن کے لحاظ پر یہودیوں اور نصرانیوں کی طرح نظر آئیں۔

﴿ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى بْنُ مَرْيَمَ ﴾ ''جس کا نام مسیح عیسی ابن مریم ہوگا۔''

سوال: مسیح حضرت عیسی علیہ السلام کا لقب ہے، اور ابن مریم آپ کی کنیت ہے، اور آپ کا نام عیسی ہے، تین کے ذکر کا کیا فائدہ ہے؟ صرف ایک کیوں نہیں ذکر کر دیا۔

جواب: ''ویجاب بأنه لما كان لايتميز الابهذه الاشياء كلها جعلت اسما واحدا'' مقصد اصل میں حضرت عیسی علیہ السلام کو تمام لوگوں سے ممتاز کر کے ذکر کرنا ہے، وہ اسی وقت حاصل ہوتا تھا جب تینوں کو ذکر کر کے ایک نام کی حیثیت دی جائے۔ (صاوی)

بظاہر ایک اور وہم ہوتا ہے کہ عیسی علیہ السلام کا نام پہلے ذکر نہیں کیا اور لقب مسیح پہلے ذکر کیا، اس کی کیا وجہ ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ''اسمه'' کی ضمیر ''عیسی'' کی طرف لوٹ رہی ہے، اسلئے معنوی لحاظ پر وہ پہلے ہی ہے۔

عیسی علیہ السلام کو مسیح کہنے کی وجہ:

آپ کو مسیح کہنے کی چند وجوہ ہیں۔ خیال رہے کہ مسیح فعیل کا وزن ہے، فعیل کبھی بمعنی فاعل استعمال ہوتا ہے، اور کبھی بمعنی مفعول کے۔ اگر بمعنی فاعل کے ہو تو آپ کو مسیح کہنے کی یہ وجوہ ہیں۔

(۱) جب کوئی شخص آفت زدہ ہوتا یعنی کسی بھی مرض میں مبتلاء ہوتا تو آپ اس پر ہاتھ پھیرتے تھے تو اس کو شفاء حاصل ہو جاتی۔

(۲) ''مسح الارض'' لفظ استعمال ہوتا ہے جس کا معنی ہوتا ہے زمین کو قطع کرنا، یعنی سفر کرنا اور سیر کرنا، آپ بھی چونکہ ایک جگہ پر ساکن نہیں رہتے تھے بلکہ چلتے پھرتے رہتے اسلئے آپ کو مسیح کہا گیا۔

(۳) آپ اللہ تعالی کی رضاء کیلئے یتیموں کے سر پر ہاتھ پھیرتے اس لئے آپ مسیح ہوئے۔

اور اگر فعیل بمعنی مفعول استعمال ہو تو آپ کو مسیح کہنے کی یہ وجوہ ہوں گی:

(۱) ''مسح'' کا ایک معنی ہوتا ہے ''مٹا دینا'' اس معنی کے لحاظ پر آپ کو اس لئے مسیح کہا گیا کہ آپ سے گناہوں اور گناہوں کے بوجھ اور گناہوں کی آلودگی کو مٹا دیا گیا تھا یعنی آپ کو رب تعالی نے گناہوں سے دور رکھا ہوا تھا۔

(۲) آپ کے قدموں سے نشیب کو مٹایا ہوا تھا، یعنی آپ کے قدم بالکل سیدھے تھے۔ عام آدمیوں کی طرح نہیں تھے کہ قدموں کے تلووں کا کچھ حصہ زمین پر نہیں لگتا کیونکہ اس میں نشیب ہوتا ہے۔

(۳) آپ کو زیتوں کا مبارک تیل اللہ تعالی کی طرف سے لگا دیا گیا تھا جو تمام انبیاء کرام کو لگایا جاتا تھا جس سے

فرشتوں کو پتہ چل جاتا تھا کہ اس ہستی کو نبی بنایا جائے گا۔

(۴) جبریل نے آپ کو اپنے پروں سے مس کیا تھا تا کہ آپ شیطان کے مس سے محفوظ رہیں۔

(۵) آپ جب والدہ کے پیٹ سے باہر تشریف لائے تو آپ کو تیل لگا ہوا تھا عام بچوں کی طرح آپ کے بالوں کو تیل لگانے کی ضرورت درپیش نہیں آئی۔ (ماخوذ از کبیر)

تنبیہ: دجال کو بھی مسیح کہا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ممسوح العین ہوگا، یعنی اس کی ایک آنکھ ضائع ہو گی (کانڑا ہوگا) اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ زمین کو قطع کرے گا مختلف علاقوں میں پھرے گا۔

اسی مقام پر روح المعانی میں مذکور ہے کہ امام نخعی نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے نبی عیسیٰ علیہ السلام کا جب لقب ہوگا تو اس وقت "مسیح" میم کے فتحہ اور سین کی تخفیف، سے پڑھا جائے گا۔ جب اللہ تعالیٰ کے دشمن دجال کا لقب ہوگا تو "مسیح" میم کے کسرہ اور سین کی شد" سے پڑھا جائے گا۔ (روح المعانی)

فائدہ: مسیح آپ کا لقب ہے اور عیسیٰ نام ہے اور ابن مریم آپ کی کنیت ہے، آپ کا لقب ایسا ہے جو آپ کی شرافت اور مراتب کی بلندی پر دلالت کر رہا ہے جس طرح صدیق لقب ہے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا، اور فاروق لقب ہے عمر رضی اللہ عنہ کا، ان کے القاب بھی ان کی شرافت اور بلندی مراتب پر دال ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کے لقب کو پہلے ذکر کیا تا کہ ابتدائی طور پر ہی آپ کی شان کا ہر شخص کو پتہ چل جائے۔

خیال رہے کہ بشارت بھی حضرت مریم کو دی جا رہی ہے، اور پھر ابن مریم بھی کہا جا رہا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ باقی تمام انبیاء کرام کو ان کے آباء کے ناموں کی طرف منسوب کیا، آپ کو ماں کی طرف منسوب کیا، تا کہ حضرت مریم کو ابتدائی بشارت کے وقت ہی پتہ چل جائے کہ میرا بیٹا بغیر باپ کے ہوگا۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ﴾ "وجاہت والا ہوگا دنیا میں اور آخرت میں۔"

"وجیہ" کا معنی صاحب مرتبہ، صاحب شرافت اور صاحب قدر و منزلت ہے۔ "وجہ الرجل یوجہ وجاهة فھو وجیہ" یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب کسی شخص کا مرتبہ لوگوں یا بادشاہ کے نزدیک زیادہ بلند و بالا ہو اور بعض اہل لغت نے بیان کیا ہے "الوجیہ" الکریم "یعنی" وجیہ" کا معنی ہے الکریم "کیونکہ انسان کے تمام اعضاء سے اشرف اس کا چہرہ ہے، اس لئے" الوجہ" کا معنی بطور استعارہ" کرم اور کمال" لیا جاتا ہے۔

آپ دنیا میں وجیہ تھے کیونکہ آپ مستجاب الدعوات تھے آپ کی دعاء سے اللہ تعالیٰ نے مردوں کو زندہ کیا

،اور مادرزاد اندھوں کو نظر عطاء فرمائی، اور برص والے مریضوں کو برص سے نجات دی اور دنیا میں آپ کے وجیہ ہونے کی اور وجہ یہ بھی تھی کہ اللہ تعالی نے آپ کو ان تمام عیوب سے بری رکھا جو یہود آپ پر لگاتے تھے ،یعنی آپ کا حقیقت میں عیوب سے بری ہونا ہی آپکے وجیہ ہونے کا سبب تھا۔ اگر چہ آپ پر یہود عیب لگاتے رہے لیکن آپ کی شان میں کوئی فرق نہ آسکا۔

یہود اگر چہ حضرت موسی علیہ السلام پر بھی عیب لگاتے رہے لیکن اللہ تعالی نے ان کو بھی وجیہ کا لقب عطاء فرما ﴿وَكَانَ عِنْدَاللّٰهِ وَجِيهًا﴾ اس طرح ان سے بھی یہود کے بیان کردہ عیوب سے پاک رکھا۔

عیسی علیہ السلام آخرت میں بھی وجیہ ہوں گے، کیونکہ اللہ تعالی نے آپ کی امت کے مؤمنین کو حق راہ پر چلنے والوں کا شفیع بنایا، آپ کی شفاعت کو دوسرے تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی شفاعت کی طرح قبول کیا جائے گا۔ (ماخوذ از بیر)

اور وجہ یہ بھی ہے کہ آپ کو اللہ تعالی اپنے فضل وکرم کے ذریعے زیادہ ثواب اور بلند مرتبہ عطاء فرمائے گا۔

﴿وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ﴾ ''اور خاص قرب والوں سے ہوگا''

اللہ تعالی نے جب فرشتوں کی عظیم مدح کرتے ہوئے انہیں اپنے مقربین کہا تو آپ کو بھی یہی صفت عطاء فرمائی کیونکہ آپ بھی بلند مراتب اور رفیع درجات رکھتے ہیں اور فرشتوں کے ساتھ ہی زندہ رہیں گے۔ نیز آخرت میں جس شخص کو وجیہ بنایا گیا اس نے مقرب تو ہونا ہی ہے کیونکہ اسے جنت کے اعلی مراتب عطاء ہوں گے۔ (ماخوذ از کبیر)

(ومن المقربين)معطوف على قوله "وجيها" وتقديره "ومقربا من جملة المقربين"

یعنی عیسی علیہ السلام مقرب ہوں گے اور مقربین میں داخل ہوں گے۔طلباء کرام ذہن میں رکھیں کہ "ومن المقربين" کا عطف "وجيها" پر ہے مقربین کون لوگ ہوں گے؟ وهو تقريب من الله تعالى بالمكانة والشرف وعلوا المنزلة" یہ لوگ ہوں گے جن کو اللہ تعالی کے ہاں خصوصی شرف حاصل ہوگا اور ان و بلندی مراتب حاصل ہوگی۔ اور رب تعالی کے خصوصی درجہ حاصل ہوگا۔ (البحر المحیط)

یقیناً سب سے زیادہ قرب اور درجات کی بلندی انبیاء کرام کو حاصل ہوتی ہے۔ اسلئے آیۃ کریمہ میں مذکور الفاظ گرامی ﴿ومن المقربين﴾ کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ نبی ہوں گے جس کی وجہ سے آپ کو رب تعالی کا قرب حاصل ہوگا اور آپ دوسرے انبیاء کرام سے ہوں یعنی دوسرے انبیاء کرام مقربین میں داخل ہوں گے۔

(ومن المقربين)يعني عند الله يوم القيامة لان اهل الجنة منازل ودرجات ومنازل

الانبیاء و درجاتھم اعلیٰ من سواھم" (خازن)

تمام جنتی لوگوں کے مراتب اور درجات ہوں گے لیکن انبیاء کرام کے مراتب ودرجات اور ہی زیادہ بلند ہوں گے۔آپ چونکہ نبی ہوں گے اور دوسرے انبیاء کرام میں سے ہوں گے یعنی ان کے ساتھ ہوں گے اس لئے آپ مقرب ہوں اور مقربین سے ہوں گے۔

گزشتہ سے پیوستہ:

طلباء کے فائدہ کیلئے تفسیر کبیر سے ایک عبارت نقل کی جارہی ہے۔اگرچہ سؤال وجواب پہلے ذکر کیا جاچکا ہے

"الاسم علامة المسمى ومعرف له فكأنه قيل الذى يعرف به و مجموع هذه الثلاثة"

اسم کا معنی ہے "مسمی" (جس کا نام ہے) اس کیلئے اسم علامت اور پہچان کا ذریعہ ہے آپ کے تین نام ذکر کر کے یہ واضح کردیا کہ ان تینوں کا مجموعہ آپ کو دوسرے لوگوں سے کامل طور پر ممتاز کررہا ہے۔ (از کبیر)

لفظ "عیسیٰ" عبرانی لفظ ہے،اصل میں ایشوع تھا جس کا معنی سردار،اور بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ اصل میں عربی لفظ ہے (لیکن عربی والے قول کو شیخ زادہ میں تکلف کہا گیا ہے اگر عربیت کا قول صحیح ہو تو مشتق ہوگا "عیس" سے جس کا معنی ہے "هو البياض المشرب بحمرة" سفید سرخ رنگ ملا جلا ہو آپ کا رنگ ایسا تھا تو اسی وجہ سے آپ کا نام عیسیٰ رکھ لیا گیا لیکن صحیح یہی ہے کہ لفظ عبرانی ہے،عربی نہیں۔ (صاوی)

مسیح کے دو معنی ایک دوسرے کی ضد کے طور پر بھی آتے ہیں مسیح کا معنی صدیق،اس معنی کے لحاظ پر عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح کہا گیا،اور مسیح کا معنی "کذاب" اس معنی کے لحاظ پر دجال کو مسیح کہا گیا۔ (ماخوذ از خازن)

نیچری مذہب:

ان آیات کے صاف اور سیدھے مطلب کو اسی قاعدہ فاسدہ پر "کہ معجزات محال ہیں کوئی چیز خرق عادت نہیں ہوسکتی" عجیب عجیب تاویلیں کر کے الٹ پلٹ کرتے ہیں۔ (العیاذ باللہ)

چنانچہ نیچر مفسر نے اس مقام پر حضرت مریم کو غیب سے روزی پہنچنے کا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کا انکار کیا،اور یہ تاویل کی ہے کہ عیسیٰ یوسف نجار سے پیدا ہوئے تھے۔صرف یہ بات تھی کہ رخصت کر کے لے جانے سے پہلے یوسف مریم سے ہمبستر ہوگئے تھے چونکہ یہ بات یہود میں مذموم (بری) تھی جو دونوں کیلئے شرم وحیاء کا سبب بنا،(یہ مذہب درحقیقت یہود سے لیا گیا ہے وہ معاذ اللہ حضرت مریم کو یوسف نجار کی مزنیہ کہتے ہیں نیچریوں نے

منکوحہ کہا تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی)

اسی طرح زکریا اور مریم سے فرشتوں کا کلام کرنا وہ ان کا خیال مجسم یا خواب تھا، اور چونکہ اس مذہب کا یونانیوں میں رواج دینا منظور تھا اور ان میں ایسی باتیں ہمیشہ سے باعث بزرگی سمجھی جایا کرتی تھیں۔ چنانچہ حکیم افلاطون کا حمل بھی بغیر باپ کے ان میں مشہور تھا، اس غرض سے عیسائی معلموں نے یہ بات مشہور کردی اور اسی مشہور بات کو مفسروں نے قرآن کی تفاسیر میں لکھ دیا۔ (حقانی جلد اول ص ۴۰۷)

نیچری مذہب باطل کیوں ؟:

اس لئے کہ ان لوگوں نے اپنے رائے کے مطابق قرآن کے معانی پیش کئے ہیں اس طرح کے لوگوں کے متعلق حدیث نبوی کو دیکھئے:

❁ عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ من قال فی القرآن برأیه فلیتبو أمقعده من النار وفی روایة من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبو أمقعده من النار " (رواه الترمذی، مشکوة کتاب العلم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے قرآن پاک کو رائے سے بیان کیا تو چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنم بنائے۔ ایک روایت میں رائے کہ جگہ "بغیر علم" کے الفاظ ہیں یعنی جس شخص نے بغیر علم کے قرآن پاک کو بیان کیا تو اسے چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانا آگ بنائے۔

اس حدیث پاک کو دیکھئے، پھر نیچری مذہب کو دیکھئے، جس کی دار و مدار اپنی رائے اور اپنی جہالت سے قرآن کو بیان کرنا ہے ارشاد مصطفوی ﷺ کے مطابق وہ اپنا ٹھکانا جہنم بنا رہے ہیں۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصَّالِحِينَ۝﴾ (آیۃ نمبر ۴٦)

(1) اورلوگوں سے بات کرے پالنے میں اور پکی عمر میں اور خاصوں میں ہوگا۔

(2) اور کلام کرے گا لوگوں سے پنگھوڑے (پالنے) کی عمر میں، اور پکی عمر میں اور خاصوں میں ہوگا۔

مہد سے مراد پنگوڑھا یا ماں کی گود' البتہ اس مقام پر یہ معنی لینا زیادہ بہتر ہے۔

"فانه يكلم الناس فی الحالة التی يحتاج الصبی فيها الی المهد"

بیشک وہ اس حالت میں لوگوں سے کلام کرنے والے ہوں گے جب بچہ پنگوڑھے (پالنے) کا محتاج ہوتا ہے۔ (از کبیر)

خواہ وہ پنگوڑھے میں ہو یا ماں کی گود میں، آپ نے بچپن میں ایک مرتبہ کلام فرمایا جس سے اپنی والدہ کی براءت بیان کی اور اپنے اوصاف بیان، پھر آپ نے خاموشی اختیار کی پھر عام بچوں کی طرح بولنے کے وقت بولنا شروع کیا یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے اور یہی معتبر ہے۔ البتہ ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ نے جب سے کلام شروع فرمایا اسی وقت سے آپ نے اعلان نبوت بھی فرمادیا اور پھر آپ مسلسل تبلیغ فرماتے رہے لیکن یہ قول معتبر نہیں، تحقیق پر مبنی پہلا قول ہی ہے۔ "واللہ اعلم بالصواب" (روح المعانی)

کہولیت یعنی بڑی عمر میں بھی آپ کلام فرمائیں گے، بظاہر یہ سمجھ آتا ہے کہ بڑی عمر میں تو ہر شخص کلام کرتا ہے اس میں آپ کی فضیلت کیسے؟

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس میں ان لوگوں کا رد پایا گیا ہے جو عیسیٰ علیہ السلام کے خدا ہونے کے قائل ہیں کہ جو شخص پہلے چھوٹا ہو پھر بڑا ہو اس میں تغیر آتا ہے جس میں تغیر آئے وہ الٰہ نہیں بن سکتا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ کے بچپن میں کلام کرنا والدہ کی پاک دامنی بیان کرنے کیلئے بھی معجزہ ہے اور بڑی عمر میں وحی اور نبوت کے ذریعے کلام کرنا بھی معجزہ ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ دونوں حالتوں کا ذکر ایک ساتھ ہے، کہ آپ بچپن میں اسطرح کلام فرمائیں گے جس طرح بڑی عمر میں کوئی کلام کرتا ہے، یعنی آپ کا بچپن کا کلام بڑی عمر کے کلام سے کوئی مختلف نہیں ہوگا۔

خیال رہے کہولیت سے مراد بڑھاپا نہیں بلکہ پختہ عمر ہے "ان الكهل فی اصل اللغة عبارة عن الكامل التام" اصل میں کہولیت کی وہ عمر ہوتی ہے جس میں انسان کی عقل کامل ہو۔ (ماخوذ از کبیر)

''الکهل بین حال الغلومة وحال الشیخوخة ''بچپن اور بڑھاپے کی عمر کے درمیان عمر کا کہولیت کی عمر کہا جاتا ہے۔
(قرطبی)

کبیر اور قرطبی کی عبارات کو دیکھنے سے پتہ چلا کہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ کتنا حسین وجمیل ہے اور تحقیق پر مبنی ہے، آپ کے ترجمہ ہے (اور پکی عمر میں) راقم نے بھی یہی نقل کیا ہے۔ کہولیت کی عمر تیس سال سے لے کر چالیس سال کی عمر کو کہا جاتا ہے ایک قول کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تینتیس (33) سال کی عمر میں زندہ آسمانوں پر اٹھایا لیا گیا، اور پھر آپ دنیا میں تشریف لا کر لوگوں سے کلام فرمائیں گے اور دجال کو قتل کریں گے، اس عمر میں آپ آسمانون سے اتر کر کلام کرنا آپ کا معجزہ ہے۔ لیکن زیادہ معتبر قول یہ ہے کہ آپ کو ایک سو تینتیس سال کی عمر میں آسمانوں پر اٹھایا گیا۔ یہی تحقیق استاذی المکرم حضرت مولنا محمد اشرف سیالوی مدظلہ کی ہے۔

آپ کا صالحین سے ہونا:

اللہ تعالیٰ نے آپ کی عظیم صفات کا ذکر فرمانے کے بعد ارشاد فامایا ''ومن الصالحین'' آپ صالحین سے ہوں گے، کیونکہ

''لارتبة اعظم من کون المرء صالحالانه لا یکون کذلک الاویکون فی جمیع الافعال والتروک مواظباعلی النهج الاصلح والطریق الاکمل''

اس سے بڑھ کر کوئی اور مرتبہ نہیں کہ انسان صالح ہو اس لئے کہ صالح وہی ہو سکتا ہے جس کے تمام افعال خواہ ان کا تعلق عمل کرنے سے ہو یا عمل کے چھوڑنے سے ہو ہمیشہ وہ افعال بہتر اور کامل طریقہ پر ہوں۔

اس سے معلوم ہوا صالح ہونے کا تعلق تمام مقامات سے ہے خواہ ان کا تعلق دین سے ہو یا دنیا سے اسی طرح ایسے افعال جو دل سے متعلق ہوں یا ظاہری اعضاء سے تمام میں صالحیت ہوگی۔ (از کبیر)

انسان کے مختلف اطوار میں مختلف نام:

(۱) انه فی الرحم جنین'' جب وہ ماں کے پیٹ (بچہ دانی) میں ہو تو اسے ''جنین'' کہا جاتا ہے۔

(۲) ''فاذا ولد فولید'' جب بچہ پیدا ہو جائے تو وہ ''ولید'' کہلاتا ہے۔

(۳) ''فاذالم یستتم الاسبوع فصدیع'' جب تک بچے پر ایک ہفتہ مکمل نہ ہو تو اسے ''صدیع'' کہا جاتا ہے

(۴) ''واذا دام یرضع فرضیع'' اور جب تک وہ ماں کا دودھ پیتا رہے تو ''رضیع'' کہا جاتا ہے۔

(۵) ''واذالم فطم ففطیم'' جب وہ ماں کا دودھ پینا چھوڑ دے تو اسے ''فطیم'' کہا جاتا ہے۔

(۶) ''واذالم یرضع فحجوش'' جب وہ ماں کا دودھ نہ پی رہا ہوتو اسے ''جحوش'' کہا جاتا ہے۔
(۷) ''فاذادب ونما فدارج'' جب زمین پر گھسٹ کر چلانا شروع کر دے اور بڑھنا شروع ہو جائے تو ''دارج'' کہلاتا ہے۔
(۸) '' فاذاسقطت رواضعه فمثغور'' جب اس کے دودھ والے دانت گر جائیں تو ''مثغور'' کہلاتا ہے۔
(۹) ''فاذانبتت بعد السقوط فمتغر بالتاء والثاء'' جب دانت گرنے کے بعد پھر دانت نکل آئیں تو اسے ''متغر'' (تاء سے) یا ''مثغر'' (ثاء سے) کہا جاتا ہے۔
(۱۰) ''فاذا کان یجاوز العشر فمترعرع وناشئ'' جب دس سال سے تجاوز کر جائے تو اسے ''مترعرع'' اور ''ناشئ'' کہا جاتا ہے۔
(۱۱) ''فاذا کان یبلغ الحلم فیافع وھراھق'' جب بلوغ کے قریب پہنچ جائے تو '' یافع '' اور ''مراھق'' کہلاتا ہے۔
(۱۲) ''فاذا احتلم فمحزور'' جب بالغ ہو جائے تو ''محزور ''(اور بالغ) کہلاتا ہے۔
''وھو فی جمیع ھذہ الاحوال غلام'' ان تمام صورتوں میں بچے کو غلام (اور بچی کو جاریة) کہا جاتا ہے۔
(۱۳) ''فاذا خضرشاربه وسال عذارہ فباقل'' جب اس کی مونچھوں اور رخساروں کے بال نکل آئیں تو اسے ''باقل'' کہا جاتا ہے۔
(۱۴) ''فاذا صار ذاقنا ففتی و شارخ '' جب اس کی ٹھوڑی پر بال آجائیں تو اسے ''فتی اور شارخ '' کہا جاتا ہے۔
(۱۵) ''فاذاکملت لحیته فمجتمع'' جب داڑھی مکمل ہو جائے تو اسے ''مجتمع'' کہا جاتا ہے۔
(۱۶) ''ثم مادام بین الثلاثین والاربعین فھو شاب '' پھر تیس سے لے کر چالیس سال تک اسے شاب کہا جاتا ہے۔لیکن زیادہ مشہور قول یہ ہے کہ اٹھارہ سال سے تیس کے شخص کو ''شاب'' کہا جاتا ہے۔
(۱۷) ''ثم ھو کھل الی ان یستوفی الستین'' پھر چالیس سال سے ساٹھ سال تک کے شخص کو ''کھل'' کہا جاتا ہے۔(لیکن زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ تیس سال سے چالیس سال تک کے شخص کو ''کھل'' کہا جاتا ہے) (البحرالمحیط)

بڑھاپے میں مختلف اطوار پر مختلف نام:

شیب، پھر سمط، پھر شاخ، پھر کبر، پھر ھرم، پھر دلف، پھر خرف، پھر اہتر، پھر محاظلہ، کہا جاتا ہے۔ (روح المعانی)

یہ بحث طلباء کرام کے فائدہ کیلئے لکھ دی، عوام بھی اتنا سمجھ سکتے ہیں کہ عربی کلام میں کیا وسعت اور کیا کمال ہے ہاں ہاں مجھے عربی زبان اس لئے پسند ہے کہ یہ میرے محبوب ﷺ کی زبان ہے۔

یہود ونصاریٰ جن لوگوں کے محبوب ہیں ان کو اپنے محبوں کی زبان پسند ہے، جھگڑا نہیں بلکہ اپنے اپنے محبوبوں کی بات ہے کسی محمد عربی ﷺ سے قرآن سے محبت ہے اور کسی کو یہود ونصاریٰ سے محبت ہے وہ انگلش انگلش کی رٹ لگا رہا ہے کہ مولویوں کو بھی انگلش آنی چاہئے اب مولویوں نے انگلش پڑھنی شروع کر دی تا کہ اسلام کے مخالفین پر انگلش زبان سے ہی ضرب کاری لگائی جا سکے۔ (راقم)

فائدہ جلیلہ: "وحکی عن مجاهد قال قالت مریم کنت اذا خلوت اناوعیسی حدثنی وحدثته فاذااشغلنی انسان سبح فی بطنی"

مجاہد سے مروی ہے کہ حضرت مریم فرماتی ہیں جب میں اکیلی ہوتی تو عیسیٰ میرے پیٹ میں میرے ساتھ کلام کرتے اور میں ان سے کلام کرتی، اور اگر کوئی اور شخص میرے پاس ہوتا تو عیسیٰ میرے پیٹ میں تسبیح پڑھتے جسے میں سن رہی ہوتی۔ (سراج منیر بحوالہ حاشیہ جلالین) (معالم التنزیل)

"ومن الصالحین" سے آپ کی نبوت کی طرف اشارہ:

"(ومن الصالحین)ای کائنا من الصالحین لا یتطرق الیه نوع من النقص والفساد فی الدین وذلک شان الانبیاء فکان معناه ومن النبیین"

یعنی آپ صالحین سے ہوں گے، ان کے دین میں کسی قسم کا کوئی نقص اور فساد کا کھٹکا نہیں پایا جائے گا، یہ انبیاء کرام کی شان ہے، گویا کہ مطلب واضح ہو گیا کہ آپ نبیوں میں ہوں گے، یعنی آپ نبی ہوں گے، اور نبیوں کے ساتھ ہی ہوں گے۔ (ماخوذ از مظہری)

"ومن الصالحین" سے آپ کے کمال کو بیان کیا گیا:

"(ومن الصالحین)ای الکاملین فی الصلاح وهم سادات الرسل قال فی الصالحین لکمال"

"صالحین" سے مراد اس مقام میں وہ حضرات ہیں جن کو صلاح میں کامل درجہ حاصل ہے، وہ بلند مرتبہ رسول ہیں حضرت عیسیٰ

علیہ السلام کے متعلق جب یہ کہا گیا "ومن الصالحین"

تو اس سے یہ واضح کر دیا گیا کہ آپ کو کمال حاصل ہوگا، آپ بلند شان والے نبی ہوں گے۔ (صاوی)

گہوارے میں کلام کرنا کون سا کمال ہے؟

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ وہ عمر ہے جس میں عام بچے کلام نہیں کرتے، آپ کا اس معصومانہ عمر میں کلام کرنا آپ کا معجزہ ہے۔ خوبصورت انداز میں حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ یوں بیان فرماتے ہیں:

''یعنی گہوارے میں بھی وہ جو گفتگو کرے گا وہ بے معنی نہیں ہوگی، بلکہ اس میں بھی نبوت کا وقار اور رسالت کی سنجیدگی پائی جائے گی، اس وقت بھی جو الفاظ ان کی زبان سے نکلیں گے وہ حقائق سے لبریز ہوں گے، اس معصومیت کے زمانہ میں بھی وہ اللہ تعالیٰ کی توحید اور اپنی رسالت کا ایسا زبردست اعلان کرے گا کہ کسی کو انکار کی مجال نہ رہے گی اس کا ذکر سورۃ مریم میں تفصیلا (انشاء اللہ) آئے گا اور یہی وہ معجزانہ پہلو ہے جس کی طرف قرآن اشارہ کر رہا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہر صحت مند بچہ پنگوڑھے میں باتیں کرنے لگتا ہے، لیکن انصاف کے ساتھ یہ کتنا ستم ہوگا اگر بچوں کو غوں غاں اور ان کے بے جوڑ اور بے معنی الفاظ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس کلام معجز نظام سے تشبیہ دی جائے۔ (ضیاء القرآن)

تفہیم القرآن کی ناقص لفاظی:

پس جو لوگ قرآن کو کلام اللہ مانتے ہیں اور پھر مسیح علیہ السلام کے متعلق یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی ولادت حسب معمول باپ اور ماں کے اتصال سے ہوئی تھی وہ دراصل ثابت یہ کرے ہیں کہ (اللہ تعالیٰ ما فی الضمیر) اور بیان مدعا کی اتنی قدرت بھی نہیں رکھتا جتنی خود یہ حضرات رکھتے ہیں۔ (معاذ اللہ) (تفہیم القرآن)

''مافی الضمیر'' کا مطلب ہوتا ہے ''جو کچھ دل میں ہے'' اللہ تعالیٰ اعضاء سے پاک ہے، وہ اپنے متعلق متشابہ الفاظ ذکر کرتا رہتا ہے، لیکن بندے کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ ایسے الفاظ ذکر کرے جو شان الوہیت کے خلاف ہوں، اس لئے ''مافی الضمیر'' کا لفظ شان الوہیت کے خلاف ہے ''بیان مدعا'' پر اکتفاء کر لیا جاتا تو بہتر تھا۔ (راقم)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَايَشَآءُ اِذَاقَضٰٓى اَمْرًافَاِنَّمَايَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۝﴾ (آیۃ نمبر ۴۷)

(1) بولی اے میرے رب میرے بچہ کہاں سے ہوگا مجھے تو کسی شخص نے ہاتھ نہیں لگایا، فرمایا اللہ یوں ہی پیدا کرتا ہے جو چاہے جب کسی کام کا حکم فرمائے تو اس سے یہی کہتا ہے کہ ہو جا وہ فورا ہو جاتا ہے۔

(2) بولی اے میرے رب کیسے ہوگا میرا بچہ، حالانکہ نہیں چھوا مجھے کسی انسان نے ،فرمایا اسی طرح اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے، جب فیصلہ فرمادے کسی کام کا تو بیشک وہ کہتا ہے اسے ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔

﴿قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ وَلَدٌ﴾ ''بولی اے میرے رب کیسے ہوگا میرا بچہ''

اس سوال میں ایک احتمال یہ ہے''استفہام مجازی ہو''یعنی مراد تعجب ہے کیونکہ آپ نے عادۃ اسے بعید سمجھا کہ کنواری لڑکی کا بیٹا ہو بغیر کسی مرد کے چھونے کے،تو آپ نے تعجب کے طور پر یہ سوال کر دیا ہو۔

''ویحتمل ان یکون حقیقیا علی معنی انه یکون بتزوج اوغیره''

ایک اور احتمال یہ ہے کہ آپ کا سوال حقیقی طور پر ہو، پوچھنے کا مقصد یہ ہو کہ وہ بچہ نکاح سے ہوگا، یا بغیر خاوند کے صرف قدرت باری تعالیٰ سے ہوگا۔

''ویحتمل ان یکون استهاما عن انه من ای شخص یکون'' اور ایک احتمال یہ ہے کہ سوال کا مطلب یہ ہو کہ کس شخص سے میرا بچہ ہوگا، میرا خاوند کون شخص ہوگا۔ (روح المعانی)

''انی یکون بمعنی این یکون''''انی یکون''''این یکون'' کے معنی میں ہے۔ یہ ایک محاورہ کلام ہے کہ آپ بہت تعجب کرتے ہوئے کہا کہ وہ بچہ کہاں سے آئے گا، عادت تو یہی ہے کہ بغیر باپ کے بچہ پیدا نہیں ہوتا۔ (اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے (میرا بچہ کہاں سے ہوگا)

او استفهام علی ان انی یکون بمعنی کیف یکون هذاالولد ابتزوج یقع فی المستقبل ام یخلق الله تعالی ایاه ابتداء ای من غیر مسیس''

یہ سوال''انی یکون'' سے''کیف یکون'' کا سوال ہے۔ یعنی یہ بچہ کیسے ہوگا، یا یہ مستقبل کی بات ہے کہ بچہ نکاح سے خاوند

کے ذریعے ہوگا، یا کہ اس میں خاوند کا واسطہ نہیں ہوگا صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت سے وہ بچہ پیدا ہوگا۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

راقم کا ترجمہ دوسری صورت کے مطابق ہے ''اے میرے رب کیسے ہوگا میرا بچہ''

﴿ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ ﴾ ''حالانکہ نہیں چھوا مجھے کسی انسان نے۔''

راقم نے اپنے ترجمہ میں'' حالانکہ'' لفظ ذکر کیا ہے ''تفسیر ابی السعود'' کی اس عبارت کو دیکھ کر ''جملة حالية محققة للاستبعاد'' یہ جملہ حالیہ ہے بعد کو ثابت کررہا ہے، کہ میں تو ابھی کنواری ہوں مجھے کسی انسان نے چھوا نہیں، نہ میرا کوئی خاوند ہے، اور ﴿وَلَمْ اَكُ بَغِيًّا﴾ اور نہ ہی (معاذ اللہ) میں کوئی بدکارہ عورت ہوں۔ یہ عقل سے بہت بعید ہے، اسباب کے بغیر بچہ کیسے پیدا ہوگا۔ (تفسیر ابی السعود)

''بشر'' کا اطلاق واحد پر ہے اور جمع پر بھی، یہاں نکرہ نفی کے تحت آیا ہوا ہے، اسلیئے عام ہے یعنی مجھے کسی ایک بشر نے بھی نہیں چھوا۔ ''بشر'' کو بشر اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کا چمڑا ظاہر ہوتا ہے، اور کہا جاتا ہے ''ابشرت الارض'' زمین نے اپنے پودہ جات نکال دے (یعنی ظاہر کردیئے) اور ذکر کیا جاتا ہے ''تباشير الصبح'' جب صبح صادق کی روشنی ظاہر ہوجائے۔ (البحر المحیط)

فائدہ: ''ولم يمسسني بشر'' اى ولم يصبني رجل وانما قالت ذلك تعجبا لا شكا في قدرة الله تعالى اذلم تكن العادة جرت ان يولد ولد من غيراب''

آپ نے تعجب کے طور پر کہا کہ عادت یہی ہے کہ بغیر باپ کے اولاد نہیں ہوتی آپ کا اللہ تعالیٰ کی قدرت میں کوئی شک نہیں تھا۔ (خازن)

﴿قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ﴾ ''فرمایا اسی طرح اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے۔''

حضرت زکریا علیہ السلام نے جب تعجب کے طور پر سوال کیا ''اے میرے رب میرا بیٹا کیسے ہوگا'' تو رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ﴾ اسی طرح اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ یہاں حضرت مریم کے تعجب کے بعد سوال کرنے پر رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ﴾ اسی طرح اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ وجہ فرق کیا ہے؟

''ان ولادة العذراء من غير ان يمسها بشر ابدع واغرب من ولادة عجوز عاقر من شيخ فان فكان الخلق المنبئ عن الاختراع انسب بهذالمقام من مطلق الفعل'' (تفسير ابى السعود)

وجہ فرق یہ ہے کہ کنواری عورت کی بغیر کسی انسان کے چھونے کے اولاد پیدا ہونا عجیب وغریب ہے، جو بظاہر عادت

کے خلاف ہونے کے مشکل نظر آتی ہے۔لیکن بوڑھے مرد اور بانجھ عورت سے اولاد پیدا ہونا بہت عجیب وغریب نہیں،اسلئے حضرت مریم کے سؤال کے بعد مطلقا فعل نہیں ذکر کیا، بلکہ''خلق'' کا ذکر کیا ہے،جو اللہ تعالی کی قدرت سے پیدا کرنے پر دلالت کررہا ہے،اسی وجہ سے بعد میں آنے والے الفاظ مبارکہ سے مزید وضاحت فرمادی۔

﴿اِذَاقَضٰی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ﴾

''جب فیصلہ فرمادے کسی کام کا بے شک وہ کہتا ہے ھو جا وہ ہو جاتا ہے''۔

''(اذا قضى امرا)من الامور اى ارادشيئا'' جب فیصلہ فرماتا ہے کاموں میں سے کسی کام کا،یعنی جب وہ ارادہ کرتا ہے کسی چیز کا۔یہ ایسے ہی ارشاد ہے جیسے دوسرے مقام پر فرمایا﴿اِنَّمَا اَمۡرُہٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡـًٔا﴾ (بیشک اس کا امر یہ ہے کہ جب وہ ارادہ فرماتا ہے کسی چیز کا)

''واصل القضاء الاحكام اطلق على الارادة الالهية القطعية المتعلقة بوجود الشى لايجابها اياه البتة''

اصل میں قضاء کا معنی ہے حکم دینا،پھر اس کا اطلاق (بولا جانا) اللہ تعالی کے قطعی ارادہ پر ہوتا ہے،جس ارادہ کا تعلق کسی چیز کے لازمی طور پر موجود کرنے سے ہو،یعنی اسے ضروری طور پر عدم سے وجود میں لانا ہے۔یعنی اللہ تعالی کی قدرت اسباب عادیہ کی تابع نہیں بلکہ اس نے اپنی مشیت سے اسباب کے تابع اشیاء کو کردیا ہے۔

خیال رہے اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ اصل لغت کے مطابق ہے(جب کسی کام کا حکم فرمائے)راقم کا ترجمہ بامحاورہ ہے(جب فیصلہ فرمادے کسی کام کا)عام محاورہ یہی ہے کہ جب کوئی کام کرنے کا ارادہ کیا جاتا ہے تو یہ کہا جاتا ہے اس کام کے کرنے کا فیصلہ کردیا گیا ہے۔ (تفسیر ابی السعود)

❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀

﴿وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ﴾ (آیۃ نمبر ۴۸)

(1) اور اللہ سکھائے گا کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل۔

(2) اور سکھائے گا (اللہ) اسے کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل۔

﴿وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ﴾ ''اور سکھائے گا (اللہ) اسے (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو) کتاب''

''الکتاب'' سے مراد کیا ہے؟ (الکتاب) ای الکتابة والخط بالقلم بالالهام والوحی وکان احسن الناس خطافی زمانه'' (الکتاب) سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو الہام اور وحی کے ذریعے کتابت یعنی قلم سے لکھنا سکھایا، اور آپ اپنے زمانہ میں تمام لوگوں سے اچھے خط والے تھے۔ (روح البیان)

''وذهب کثیرون الی ان ال فیه للجنس والمراد جنس الکتب الالهیة''

اکثر حضرات اس طرف گئے ہیں کہ الف لام جنسی ہے، مراد جنس کتب الہیۃ ہیں، آگے توراۃ وانجیل اس کا بیان ہے، یعنی اللہ تعالیٰ آپ کو آسمانی کتابوں کا علم عطاء فرمائے گا، وہ آسمانی کتب کون سی ہیں؟ وہ توراۃ وانجیل ہیں۔

﴿وَالْحِكْمَةَ﴾ ''اور (اللہ سکھائے گا اسے) حکمت''

حکمت سے مراد کیا ہے؟ حکمت کے کئی مطالب تحریر کئے گئے ہیں، جو مجموعی طور پر مراد لئے گئے ہیں۔

(۱) ''ای الفقه وعلم الحلال والحرام قاله ابن عباس''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول یہ ہے کہ حکمت سے مراد فقہ (علوم کی سمجھ) اور حلال وحرام کا علم ہے۔

(۲) ''وقیل جمیع ماعلمه من امور الدین'' اور حکمت تمام امور دین کے علم کو بھی کہا جاتا ہے۔

(۳) ''وقیل سنن الانبیاء علیهم السلام'' اور انبیاء کرام کی سنتوں پر عمل کرنے یعنی ان کے طریقہ پر چلنے کو بھی حکمت کہا جاتا ہے۔

(۴) ''وقیل الصواب فی القول والعمل'' صحیح بات کرنے اور صحیح کام کرنے کو بھی حکمت کہا جاتا ہے۔

(۵) ''وقیل اتقان العلوم العقلیة والنقلیة'' اور علوم عقلیہ ونقلیہ میں پختہ یقین کرنے کو بھی حکمت کہا جاتا ہے۔ (روح المعانی)

(۶) ''والحکمة ای العلوم العقلیة او الشرعیه وتهذیب الاخلاق'' اور حکمت سے مراد علوم عقلیہ اور شرعیہ اور تہذیب اخلاق ہے۔

کیونکہ انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ حق لذاتہ کو پہچانے اور خیر کو پہچانے تا کہ وہ اس پر عمل کرے "ومجموعھا هو المسى بالحكمة" علم وعمل کے مجموعہ کو حکمت کہا جاتا ہے۔ (روح البیان)

﴿ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ ﴾ "(اور سکھائے گا اللہ اسے) توراۃ وانجیل۔"

"فيحفظها عن ظهر القلب" تو وہ (عیسیٰ علیہ السلام) ان دونوں کتابوں میں اپنے دل میں محفوظ کر لے گا، یعنی اسے وہ دونوں کتابیں یاد ہوں گی۔ (اس سے بھی آپ کے نبی ہونے کی طرف اشارہ مل گیا کیونکہ پہلی آسمانی کتابوں کو صرف نبی یاد کر سکتے تھے عوام کی قسمت میں انہیں یاد کرنا نہ تھا۔ یہ شرف قرآن کو اور نبی کریم ﷺ کی امت کو حاصل ہوا کہ آپ کی امت کے چھوٹے چھوٹے بچے قرآن پاک یاد کر رہے ہیں۔ (راقم)

اور اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اس سے حضرت مریم کے دل کو خوش کیا گیا، اور ملامت کے اہم خوف کو زائل کیا گیا جوان کو بغیر باپ کے بچے کی پیدائش پر لاحق تھا، جب یہ بتا دیا گیا کہ اس بچے کو کتاب وحکمت اور توراۃ وانجیل کا علم دیا گیا تو حضرت مریم کو پتہ چل گیا کہ میرے ہاں پیدا ہونے ولا بچہ نبی ہوگا، یہود کی متوقع تہمت کو رب تعالیٰ خود ہی اس بچے کے ذریعے زائل کر دے گا۔ (روح البیان بوضاحت)

چار میں ترتیب کا فائدہ:

یعنی جس طرح چار چیزوں کا ذکر ہے، اسی انداز پر آپ کو علم بھی دیا گیا، کتاب سے مراد خط وکتابت ہے، پہلے اس کا علم دیا گیا۔ حکمت سے مراد علوم کی تعلیم اور تہذیب اخلاق۔

"لان كمال الانسان في ان يعرف الحق لذاته والخير لاجل العمل به ومجموعهما هو المسمى بالحكمة"

اس لئے کہ انسان کا کمال اس میں ہے کہ وہ حق لذاتہ کا پہچانے اور خیر کا پہچانے تا کہ اس کے مطابق عمل کر سکے، اور علم وعمل کے مجموعہ کو حکمت کہا جاتا ہے۔

جب خط وکتابت کا علم دیا گیا، اور علوم عقلیہ ونقلیہ کا احاطہ کرا دیا گیا تو آپ کو توراۃ کا علم دے دیا گیا۔

"وانما اخر تعليم التوراة عن تعليم الخط والحكمة لان التوراة كتاب الهي وفيه اسرار عظيمة، والانسان مالم يتعلم العلوم الكثيرة لا يمكنه ان يخوض في البحث على اسرار الكتب الالهية"

خط و کتابت اور حکمت کے علم کے بعد توراۃ کا علم دیا گیا، اس لئے کہ توراۃ اللہ کی کتاب ہے، اس میں اسرار عظیمہ (بہت بڑے راز) پائے گئے ہیں، انسان جب تک علوم کثیرہ نہ حاصل کر لے اس وقت تک اس کیلئے ممکن نہیں کہ وہ اللہ کی کتابوں کے اسرار کی بحثوں میں غور وخوض (غور وفکر) کرے۔

''انجیل کا ذکر چوتھے مرتبہ میں کیا'' اور توراۃ سے بعد ذکر کیا اس کی وجہ یہ ہے، کہ جب اللہ تعالی نے اپنے بندہ کو خط وکتابت کا علم دے دیا، پھر علوم حق یعنی حق کے مطابق علوم عقلیہ کا علم دے دیا اور علوم شرعیہ کا بھی علم دے دیا، اس کے بعد وہ کتاب جو پہلے نبی پر اتری یعنی توراۃ کا علم دے دیا اس کے رازوں پر مطلع کر دیا، تو علم کا عظیم درجہ عطاء کر دیا گیا، اس کے بعد اللہ تعالی نے آپ پر ایک اور کتاب (انجیل) نازل فرمائی۔

''واوقفه على اسراره فذلك هو الغاية القصوى والمرتبة العليا فى العلم والفهم والاحاطة بالاسرار العقلية والشرعية والاطلاع على الحكم العلوية والسفلية''

اور آپ کو اس کے اسرار (رازوں) پر واقف کر دیا، جس سے آپ کو بلند مرتبہ عطاء کر دیا علم وفہم کی بلندی عطاء کر دی، اسرار عقلیہ اور شرعیہ کا احاطہ کر دیا، اور عالم دنیا اور عالم بالا کی حکمتوں پر مطلع کر دیا۔ (ماخوذ از کبیر)

راقم کا موقف:

اصل میں علامہ رازی رحمہ اللہ نے یہ ترتیب ذکر کرنے کے بعد ارشاد فرمایا ''فهذا ما عندى فى ترتيب هذه الالفاظ الاربعة'' یہ ترتیب ہے میرے نزدیک ان چار قسم کے الفاظ میں، لیکن راقم کا موقف یہ ہے کہ علامہ رازی رحمہ اللہ کا جو علمی مقام ہے، اس کے سامنے میرے جیسے کم علم کو دم مارنے کی کوئی مجال نہیں، آپ کا ارشاد بھی سر اور آنکھوں پر، لیکن اختلاف رائے رحمت سمجھتے ہوئے یوں عرض کر رہا ہوں، کہ جب عطاء کرنے والا رب تعالی ہے اور جسے عطاء کیا جا رہا ہے وہ اللہ کا نبی ہے تو اس ترتیب کی ضرورت نہیں۔

جیسے آپ کی تخلیق قدرت باری تعالی سے کلمہ کن سے ہوئی، ایسے ہی آپ کو یہ تمام علوم ایک مرتبہ ہی عطاء کر دیئے گئے، آہستہ آہستہ ترتیب وار عطاء کی ضرورت نہیں، کیونکہ دینے والے کی قدرت میں کوئی کمی نہیں، اور لینے والے کی استعداد میں کوئی کمی نہیں، دینے والے نے ایک لمحہ میں بہت کچھ دے دیا، اور لینے والے نے بہت کچھ لے لیا'' والله اعلم بالصواب'' (راقم)

عیسی علیہ السلام کے حکمت بھرے کلمات:

❁ ''اخرج ابن المبارک فى الزهد اخبرنا ابن عيينة عن خلف بن حوشب قال قال عيسى عليه

السلام للحواريين كما ترک لکم الملوک الحکمة فکذلک اتر کو الهم الدنیا"
ابن مبارک نے کتاب الزہد میں ابن عیینہ کی روایت خلف بن حوشب سے روایت ذکر کی کہ حضرت عیسی علیہ السلام نے اپنے حواریین کو کہا جس طرح بادشاہوں نے تمہارے حکمت (علم) کو چھوڑ دیا ہے، اسی طرح تم ان کیلئے دنیا کو چھوڑ دو۔ یعنی انہوں نے علم دین حاصل کرنا چھوڑ دیا ہے، وہ تم نے حاصل کرلیا ہے، لھذا تم دنیاوی مال کی طرف توجہ چھوڑ دو، وہ ان کو ہی حاصل ہے۔ (از در منثور)

❁ "واخرج بن عساکر عن یونس عبید قال کان عیسی بن مریم علیہ السلام یقول لا یصیب احد حقیقة الایمان حتی لا یبالی من اکل الدنیا"
ابن عساکر نے یونس بن عبید سے روایت ذکر کی کہ حضرت عیسی ابن مریم علیہ السلام نے فرمایا کوئی شخص حقیقت ایمان کو نہیں پاسکتا یہاں تک کہ وہ دنیا کا مال کھانے کی پرواہ نہ کرے۔ یعنی جو شخص دنیا کا مال حلال وحرام کی تمیز کئے بغیر کھاتا رہے، اسے کوئی پرواہ نہ ہو کہ یہ مال تو حرام ہے، اسے میں نے نہیں کھانا، اسے حقیقت ایمان حاصل نہیں۔

❁ "واخرج ابن عساکر عن مالک بن دینار قال قال عیسی علیه السلام معاشر الحواريين ان خشية الله وحب الفردوس یورثان الصبر علی المشقة ویباعدان من زهرة الدنیا"
ابن عساکر نے مالک بن دینار سے روایت بیان کی کہ حضرت عیسی علیہ السلام نے فرمایا اے حواریین کی جماعت بیشک اللہ تعالی کے ڈر اور الجنۃ الفردوس کی محبت سے مصیبتوں پر صبر کرنا حاصل ہوتا ہے اور دنیا کی زیب وزینت سے اسے دوری حاصل ہوتی ہے۔ (از در منثور)

❁ "واخرج ابن عساکر عن عتبة بن یزید قال قال عیسی بن مریم یا ابن آدم الضعیف اتق الله حیثما کنت وکل کسرتک من حلال واتخذ المسجد بیتا وکن فی الدنیا ضعیفا وعود نفسک البکاء وقلبک التفکر وجسدک الصبر ولا تهتم برزقک غدا فانها خطیئة تکتب علیک"
ابن عساکر نے عتبہ بن یزید کی روایت ذکر کی کہ حضرت عیسی علیہ السلام نے فرمایا اے کمزور ابن آدم تو جہاں بھی ہو اللہ تعالی سے ڈرتا رہ، اور روٹی کا ٹکڑا رزق حلال سے حاصل کر، اور مسجد کو اپنا گھر بنا (یعنی زیادہ وقت مسجد میں عبادت میں مشغول رہ) اور دنیا میں کمزور ہو کر رہ (تکبر نہ کر) اور اپنے آپ کو بار بار (اللہ کی یاد میں) رونے پر لگا، اور اپنے دل کو (اللہ کی یاد کے) تفکر میں لگا، اور اپنے جسم کو صبر پر قائم رکھ، اور اپنے کل کے رزق کا غم نہ کر، بیشک اس کا گناہ تمہارے ذمہ لکھ دیا جائے گا۔ (از در منثور)

❁ "واخرج ابن عساکر عن یحیی بن سعید قال کان عیسی یقول اعبروا الدنیا ولا تعمروها وحب الدنیا رأس کل خطیئة والنظر یزرع فی القلب الشهوة"
ابن عساکر نے یحیی بن سعید سے روایت ذکر کی کہ عیسی علیہ السلام فرماتے تھے "دنیا سے گذر جاؤ، اور اسے آباد نہ کر، دنیا کی محبت ہر خطاء کی اصل ہے، دنیا کی طرف نظر کرنے سے دل میں خواہشات پیدا ہوتی ہیں۔ (از در منثور)

❀ واخرج احمد والبيهقي في شعب الايمان عن سفيان بن سعيد قال كان عيسى عليه السلام يقول حب الدنيا اصل كل خطيئة والمال فيه داء كبير قالوا وماداوه قال لا يسلم من الفخر والخيلاء قالوا فان سلم قال يشغله عن ذكر الله"

مسند احمد میں اور بیہقی کے شعب ایمان میں یہ راویت مذکور ہے کہ سفیان بن سعید نے کہا حضرت عیسی علیہ السلام فرماتے تھے دنیا کی محبت ہر خطاء کی اصل ہے کیونکہ مال میں بہت بڑی بیماری پائی گئی آپ کے حواریین نے کہا وہ کیا بیماری ہے؟ آپ نے فرمایا کہ مال دار تکبر اور نازنخرے سے نہیں بچ سکتا، انہوں نے کہا اگر وہ بچ جائے؟ (تو پھر کیسے وہ بڑی بیماری ہوگی؟) آپ نے فرمایا (اور کچھ نہ ہوا تو کم ازکم یہ اسے ضرور حاصل ہوگا) کہ وہ جتنی دیر مال کی اصلاح میں گذارے گا اتنی دیر وہ اللہ کے ذکر سے دور ہوگا۔ (از منثور)

❀ واخرج ابن المبارک عن عمران الکوفی قال قال عیسی بن مریم للحواریین واعلموا ان فیکم خصلتین من الجھل الضحک من غیر عجب والصبحة من غير سهر"

ابن مبارک نے عمران کوفی سے روایت ذکر کی کہ عیسی علیہ السلام نے اپنے حواریین کو فرمایا "تم میں دو خصلتیں (عادتیں) جاہلانہ پائی گئی ہیں، ہنسنا بغیر تعجب کے اور صبح کرنا بغیر بیدار ہونے کے۔ یعنی بغیر کسی وجہ کے ہنسنا اور صبح سوئے رہنا اور رب تعالی کو نہ یاد کرنا جاہلانہ رسم ہے۔

❀ واخرج احمد عن خیثمه قال مرت امراۃ علی عیسی علیه السلام فقالت طوبی لثدی ارضعک وحجر حملک فقال عیسی علیه السلام طوبی لمن قرأ کتاب الله ثم عمل بمافیه"

امام احمد رحمہ اللہ نے خیثمہ سے روایت ذکر کی ہے کہ ایک عورت عیسی علیہ السلام کے قریب سے گذری اس نے تو کہا کتنی مبارک ہے وہ عورت جس نے تمہیں اپنے پستانوں سے دودھ پلایا اور کتنی برکت والی وہ گود جس نے تمہاری پرورش کی، تو آپ نے فرمایا اس شخص کیلئے خوشی و برکت کا مقام ہے جس نے اللہ کی کتاب کو پڑھا پھر اس پر عمل کیا۔ (از منثور)

❀ واخرج احمد عن وهب بن منبه قال اوحی الله الی عیسی علیه السلام انی وهبت لک حب المساکین ورحمتهم تحبهم ویحبونک ویرضون بک اماما وقائدا وترضی بهم صحابة وتبعا وهما خلقان اعلم ان من لقینی بهما لقینی بازکی الاعمال واحبها الی"

امام احمد رحمہ اللہ نے وہب بن منبہ سے روایت بیان کی کہ وہ کہتے ہیں عیسی علیہ السلام کی طرف اللہ تعالی نے وحی کی فرمائی کہ بیشک میں نے تمہیں مسکینوں کی محبت اور رحمت عطا کی، تم ان سے محبت رکھنا وہ تم سے محبت رکھیں گے۔ وہ تمہارے امام اور قائد ہونے پر راضی ہوں گے، اور تم ان کے صحابہ ہونے اور تابع ہونے پر راضی رہنا۔ یہ دو عادتیں ایسی ہیں جو ان کے ساتھ مجھے ملے تو وہ مجھے پاکیزہ اعمال سے ملا، اور پاکیزہ اعمال ہی مجھے پسند ہیں۔ (از منثور)

❁ واخرج عبد الله فی زوائده عن جعفر بن حرفاس ان عیسی علیہ السلام مریم قال رأس الحطیئة حب الدنیا والخمر مفتاح کل شر والنساء حبالة الشیطان"

جعفر بن حرفاس سے مروی کہ بیشک عیسی علیہ السلام نے فرمایا تمام خطاؤں کی اصل دنیا کی محبت ہے اور شراب ہر برائی کی چابی ہے اور عورتیں شیطان جال ہیں۔

❁ واخرج احمد عن سفیان قال قال عیسی علیہ السلام ان للحکمة اهلا وان وضعتها فی غیر اهلها اضعتها وان منعتها من اهلها ضیعتها کن کالطبیب یضع الدواء حیث ینبغی"

امام احمد رحمہ اللہ سفیان سے روایت ذکر کی کہ عیسی علیہ السلام نے فرمایا بیشک حکمت کیلئے اہل ہیں اگر تم نا اہل میں حکمت کو رکھا تو تم نے ضائع کر دیا اور اگر تم نے اہلیت رکھنے والے سے حکمت کو دور رکھا تو پھر بھی تم نے حکمت کو ضائع کر دیا۔ تم طبیب کی طرح ہو جاؤ جو دوا مناسب جگہ میں رکھتا ہے۔ (از درمنثور)

یعنی بیماری کے مطابق دواء کا انتخاب کرتا ہے بیماری اور ہو دواء اور ہو تو دواء کو ضائع کرنا ہے۔

❁ واخرج احمد عن محمد بن واسع ان عیسی بن مریم قال یا بنی اسرائیل انی اعیذلم بالله ان تکونوا عارا علی اهل الکتاب یا بنی اسرائیل قولکم شفاء یذهب الدواء واعمالکم داء لا تقبل الدواء"

امام احمد رحمہ اللہ نے محمد بن واسع سے روایت ذکر کی کہ بیشک حضرت عیسی علیہ السلام نے فرمایا اے بنی اسرائیل تمہارے لئے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ تم اہل کتاب کیلئے عار بن جاؤ، اے بنی اسرائیل تمہارا قول شفاء ہے جو دواء کو لے جاتا ہے اور تمہارے اعمال ایسی بیماری ہیں جو دواء کو قبول نہیں کرتی۔ (از درمنثور)

یعنی طلب یہ ہے کہ ایسے کوئی کام نہ کرو جو اہل کتاب کیلئے شرم کا سبب بنے کہ بنی اسرائیل نے یہ کام کیا ہے جو شرمندگی کا سبب ہے، وہ بھی اہل کتاب ہیں، اور ہم بھی اہل کتاب ہیں، ان کے اس فعل نے ندامت سے ہمارے سر جھکا دیئے۔ اور تمہارے اقوال تو اچھے ہیں گویا کہ ان میں شفاء ہے، لیکن تمہارے اعمال برے ہیں، گویا کہ وہ لا علاج مرض کی طرح ہیں۔

❁ "واخرج احمد عن وهب قال قال عیسی لاحبار بنی اسرائیل لاتکونوا للناس کالذئب السارق وکالثعلب الخدوع وکالحدأ الخاطف"

امام احمد رحمہ اللہ وہب سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عیسی علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے علماء کو فرمایا کہ تم لوگوں کیلئے چور بھیڑیئے کی طرح نہ بنو اور دھوکا باز لومڑی کی طرح نہ بنو، اور اچک لینے والی گدھ کی طرح نہ بنو۔ (از درمنثور)

یعنی جس طرح اچانک بھیڑیا حملہ کرتا ہے تم بھی لوگوں پر اچانک حملہ نہ کرو، لومڑی کی طرح لوگوں سے دھوکا بازی سے کام نہ لینا۔ گدھ جس طرح اچانک بچوں کے ہاتھوں سے کوئی چیز اچک لیتی ہے یا مرغی کے بچوں کو اٹھا لیتی

ہے تم ایسے نہ بننا۔

❁ "واخرج احمد عن مکحول قال قال عیسی بن مریم یا معشر الحواریین ایکم یستطیع ان بینی علی موج البحر دارا قالوا یاروح الله ومن یقدر علی ذلک قال ایاکم والدنیا فلاتتخذوھا قرارا"

امام احمد رحمہ اللہ مکحول سے روایت ذکر کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے حواریین کی جماعت تم میں سے کون ہے جو طاقت رکھتا ہے کہ دریا پر اپنا گھر بنائے؟ انہوں نے کہا اے روح اللہ اس پر کون قدرت رکھتا ہے؟ آپ نے فرمایا تم اپنے آپ کو دنیا سے بچا کر رکھو، اسے قرار نہ پکڑو۔ (از در منثور)

یعنی جس طرح پانی پر گھر اس لئے نہیں بنا سکتے کہ اسے قرار نہیں، اسی طرح دنیا سے محبت نہ لگاؤ کہ یہ ثابت نہ رہنے والی چیز، جس چیز کو قرار نہیں وہ محبت کے لائق نہیں۔

❁ "واخرج احمد عن زیادابی عمرو قال بلغنی ان عیسی علیہ السلام قال انه لیس بنافعک ان تعلم مالم تعلم ولما تعمل بما قد علمت ان کثرة العلم لا تزید الاکبر اذالم تعمل به"

امام احمد رحمہ اللہ نے زیاد ابو عمرو سے روایت ذکر کی کہ مجھے یہ خبر ملی کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تیرے لئے یہ نفع مند نہیں کہ جو تو نہیں جانتا اس کا علم تو حاصل کرلے لیکن علم کے مطابق علم نہ کرے، اس لئے کہ علم کی زیادتی بغیر عمل کے سوائے تکبر کے اور کوئی چیز نہیں بڑھاتی۔ (از در منثور)

❁ "واخرج احمد عن ابراھیم بن الولید العبدی قال بلغنی ان عیسی علیہ السلام قال الزھد یدور فی ثلاثة ایام امس خلا وعظت به والیوم زادک فیه وغدا لا تدری مالک فیه،قال والامرید ور علی ثلاثة امر بان لک رشده فاتبعه وامربان لک غیه فاجتنبه وامراشکل علیک فکله الی الله عزوجل"

امام احمد رحمہ اللہ نے ابراہیم بن ولید عبدی سے روایت ذکر کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، زہد تین دنوں میں چکر کاٹتا ہے، کل جو گذر گیا اس میں تمہیں نصیحت کردی گئی، اور آج کے متعلق تمہیں کل گذشتہ سے بھی زیادہ علم حاصل ہے اور آئندہ کل کے متعلق تمہیں پتہ نہیں کہ تمہارے لئے اس میں کیا ہے؟ اور آپ نے فرمایا امر تین قسم کے ہیں، ایک وہ امر ہے جس کے متعلق تمہیں پتہ چل گیا کہ یہ گمراہ کن ہے اور بھٹکانے والا ہے، تو اس سے اجتناب کر، اور تیسرا وہ عمل ہے جس کے متعلق تمہیں کوئی پتہ نہیں (کہ یہ سیدھی راہ پر چلانے والا یا بھٹکانے والا ہے) تو اسے اللہ تعالیٰ کے سپرد کردو۔ (از در منثور)

یعنی جس کام کے متعلق تمہیں پتہ نہیں کہ یہ درست ہے یا غلط اس میں توقف اختیار کرو، وہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کردو، جب تمہیں پتہ چلا گیا کہ یہ درست ہے تو اس پر عمل کرلینا، اور جب تمہیں پتہ چل گیا کہ یہ درست نہیں تو اس سے اجتناب کرلینا۔

❁ "واخرج احمد عن قتادة قال قال عیسی علیہ السلام سلونی فان قلبی لین وانی صغیرفی نفسی"

امام احمد رحمہ اللہ نے قتادہ سے روایت ذکر کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا مجھ سے سوال کر لیا کرو، بیشک میرا دل نرم ہے اور بیشک میں اپنے آپ کو چھوٹا سمجھتا ہوں۔ (از درمنثور)

آپ کے اس ارشاد سے واضح ہوا کہ سخت دل سوال کا صحیح جواب نہیں دیتا، اور جو اپنے آپ کو بڑا سمجھے وہ بھی سوال کا جواب صحیح نہیں دیتا، سوال کا جواب وہ دیتا ہے جو نرم دل ہو اور عاجز ہو۔

❁ "واخرج احمد عن بشير الدمشقي قال مر عيسى علیہ السلام يقوم فقال اللهم اغفرلنا ثلاثا، فقالوا يا روح الله انا نريد ان نسمع منك اليوم موعظة ونسمع منك شيئا لم فسمعه فيما مضى فاوحى الله الى عيسى ان قل لهم انى من اغفرله مغفرة واحدة اصلح له بها دنياو آخرته"

امام احمد رحمہ اللہ نے بشیر دمشقی سے روایت ذکر کی کہ عیسیٰ علیہ السلام کے قریب سے ایک شخص کا گذر ہوا، آپ نے ایک محفل قائم کر رکھی تھی، آپ نے تین مرتبہ دعا فرمائی "اے اللہ ہماری مغفرت فرما" آپ سے آپ کے متبعین مطالبہ کر رہے تھے کہ آج ہم آپ سے وہ وعظ سننا چاہتے ہیں جو اس سے پہلے نہ سنا ہو (یعنی آج کوئی نئی بات سناؤ) تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی کہ تم انہیں یہ بتاؤ کہ جس کی میں ایک مرتبہ مغفرت کر دوں، اس کی اس مغفرت کے ذریعے دین و دنیا درست کر دیتا ہوں۔ (از درمنثور)

❁ "واخرج ابن ابى شيبة واحمد عن عمير ان عيسى علیہ السلام كان يلبس الشعر وياكل من ورق الشجر ويبيت حيث امسى ولا يرفع غداء ولا عشاء لغد ياتى كل يوم برزقه"

ابن ابی شیبہ اور امام رحمہما اللہ نے عبید بن عمیر سے روایت ذکر کی کہ بیشک عیسیٰ علیہ السلام بکریوں کے بالوں سے بنا ہوا لباس پہنتے اور درخت کے پتے کھاتے، اور رات گذارتے جہاں بھی شام ہو جاتی، اور کل کیلئے نہ صبح کا کھانا ساتھ رکھتے اور نہ شام کا اور فرماتے تھے "ہر شخص کا کھانا ہر دن آتا ہے۔ (از درمنثور)

یعنی اللہ تعالیٰ جس نے انسان کو پیدا کیا ہے وہی روزی دینے والا بھی ہے، لھذا انسان کل کی فکر کیوں کرے وہی ذات باری تعالیٰ جو خالق ہے رازق بھی ہر دن کا رزق وہی عطاء فرماتا ہے۔

❁ "واخرج احمد عن يزيد بن ميسره قال قال عيسى علیہ السلام ان احببتم ان تكون اصفياء الله ونور بنى آدم من خلقه فاعفوا عمن ظلمكم وعودوا من لا يعودكم واحسنوا من لا يحسن اليكم واقرضوا من لا يجزيكم"

امام احمد نے یزید بن میسرہ سے روایت ذکر کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اگر تم پسند رکھتے ہو کہ تم اللہ تعالیٰ کے چنے ہوئے برگزیدہ بن جاؤ اور اس کی مخلوق میں سے بنی آدم کے نور بن جاؤ تو جو تم پر ظلم کرنے والے ہیں ان کو معاف کر دو، اور جو تمہاری عیادت نہیں کرتے تم ان سے اچھا سلوک کرو، اور تم ان کو قرض دو جو تمہیں جزا نہیں دیتے۔ (از درمنثور)

❁ ''واخرج احمد عن وهب بن منبه قال قال عیسی بن مریم للحواریین بحق اقول لکم وکان عیسی علیه السلام کثیرا مایقول بحق اقوالکم ان اشدکم حباللدنیا اشدکم جزعا علی المصیبة''

امام احمد رحمہ اللہ وہب بن منبہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریین کو ارشاد فرمایا میں تمہیں حق بات بتا تا ہوں، حالانکہ عیسیٰ علیہ السلام حق بات ہی فرماتے تھے، آپ نے ارشاد فرمایا میں تمہیں یہ بتا تا ہوں بیشک تم میں سے جو دنیا سے زیادہ محبت کرتا ہوگا وہی مصیبت پر جزع وفزع تم سب سے زیادہ کرنے والا ہوگا۔ (از درمنثور)

❁ ''واخرج احمد عن عطاء الازرق قال بلغنا ان عیسی علیه السلام قال یا معشر الحواریین کلوا خبز الشعیر ونبات الارض والماء القراح وایاکم وخبز البر فانکم لا تقومون بشکره واعلموا ان حلاوة الدنیا مرارة الآخرة واشد مرارة الدنیا حلاوة الآخرة''

امام احمد رحمہ اللہ نے عطاء ازرق سے روایت ذکر کی کہ بیشک عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے حواریین کی جماعت جو کی روٹی کھاؤ اور زمین کی پیداوار کھاؤ، اور خالص پانی پیو تم اپنے آپ کو گندم کی روٹی سے بچا کر رکھو کیونکہ تم اس کا شکر یہ ادا نہیں کرسکو گے، اور جان لو دنیا کی مٹھاس آخرت کی کڑواہٹ ہے، اور جتنی زیادہ دنیا میں کڑواہٹ حاصل ہوگی اتنی زیادہ آخرت میں مٹھاس حاصل ہوگی۔ (از درمنثور)

یعنی دنیا کی نعمتوں کے حاصل ہونے پر شکر نہ ادا کرنا، اور دنیا کے حصول میں حرام وحلال کا کوئی فرق نہ کرنا اگر چہ حلاوت دنیا ہے لیکن اخروی نقصان ہوگا، اور دنیا کی مصیبتوں پر صبر کرنا مشکل ہے بظاہر اس میں کڑواہٹ ہے لیکن آخرت میں نفع مند ہے۔

❁ ''واخرج ابن احمد فی زوائده عن عبدالله بن شوذب قال قال عیسی بن مریم جودة الثیاب من خیلاء القلب''

ابن احمد رحمہ اللہ نے زوائد میں عبداللہ بن شوذب سے روایت ذکر کی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا عمدہ لباس وہی پہنتا ہے جس کے دل میں نازنخرہ ہو۔ (از درمنثور)

❁ ''واخرج احمد عن سفیان قال قال عیسی علیہ السلام انی لیس احدثکم لتعجبوا انما احدثکم لتعملوا''

امام احمد رحمہ اللہ نے سفیان سے روایت ذکر کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا میں تمہارے ساتھ ایسا کلام نہیں کرتا کہ تم اس کلام پر فریفتہ ہو جاؤ اور تعجب کرو، بیشک میں تو تمہارے ساتھ وہ کلام کرتا ہوں جس پر تم عمل کرو۔ (از درمنثور)

❁ ''واخرج ابن المبارک واحمد عن ابی غالب قال فی وصیة عیسی علیہ السلام یا معشر الحواریین تحببوا الی الله ببغض اهل المعاصی وتقربوا الیه بالمقت لهم والتمسوا رضاه بسخطهم قالوا یانبی الله فمن نجالس قال جالسوا من یزید فی علمکم منطقة ومن یذکرکم الله رؤیته ویزهدکم فی الدنیا عمله''

ابن مبارک اور امام احمد رحمھما اللہ نے ابو غالب سے روایت ذکر کی کہ حضرت عیسی علیہ السلام اپنے حواریین کو نصیحت فرمائی "اے حواریین کی جماعت اللہ تعالیٰ سے محبت کرو اس کے نافرمانوں سے بغض رکھا کرو، اور رب تعالیٰ کا قرب حاصل کرو نافرمانوں کو ناراض کر کے، اور رب تعالیٰ کی رضاء کو چاہو ان کی ناراضگی میں۔ حواریین نے آپ سے پوچھا اے اللہ کے نبی ہم کن لوگوں کے ساتھ بیٹھیں؟

آپ نے فرمایا تم ان لوگوں کے ساتھ بیٹھو جو اپنے کلام کے ذریعے تمہارے علم میں زیادتی کریں، اور جن کا دیکھنا تمہیں اللہ کی یاد دلائے، اور جن کا عمل تمہیں دنیا میں نیک بنائے۔ (از در منثور)

❁ "واخرج احمد عن مالک بن دینار قال اوحی اللہ الی عیسی عظ نفسک فان اتعظت فعظ الناس والا فاستحی منی"

امام احمد رحمہ اللہ نے مالک بن دینار سے روایت بیان کی کہ اللہ تعالیٰ نے وحی کی عیسیٰ علیہ السلام کو کہ تم اپنے نفس کو نصیحت کرو، اگر اس نے تمہاری نصیحت قبول کر لی تو لوگوں کو نصیحت کرو، ورنہ مجھ سے حیاء رکھنا۔ (از در منثور)

اس طرح نبی کو خطاب درحقیقت اس کی امت کو خطاب ہوتا ہے کیونکہ نبی گناہوں سے پاک ہوتے ہیں، ان کا نفس تو ان کی نصیحت کو پہلے سے ہی قبول کئے ہوتا ہے، تب ہی اسے نبی بنایا گیا۔

اب گویا کہ مطلب یہ ہو گیا اے عیسیٰ علیہ السلام کے کلام کو سننے والو اپنے اپنے نفسوں کو نصیحت کرو اگر تمہارے نفسوں نے میری نصیحت کو قبول کر لیا تو بہتر، پھر لوگوں کو بھی نصیحت کرنا، اگر تمہارے نفسوں نے نصیحت کو نہ قبول کیا تو تمہارے لئے باعث شرم و حیاء ہو گا۔ (از در منثور)

❁ "واخرج احمد عن وهب قال قال عیسی للحواریین بقدر ما تنصبون ههنا تستریحون ههنا وبقدر ما تستریحون ههنا تنصبون ههنا"

امام احمد رحمہ اللہ نے وہب سے روایت بیان کی کہ عیسیٰ علیہ السلام نے حواریین کو فرمایا یہاں تم (مشقت آمیز اعمال سے) جتنی تھکن اور مشقت پاؤ گے تو وہاں (مقام آخرت میں) اتنی قدر راحت محسوس کرو گے، اور جتنی یہاں راحت پاؤ گے (جو جی چاہے وہی عمل کر لیا حرام و حلال کی تمیز نہ کی) تو اتنی قدر وہاں تمہیں مشقت اٹھانی پڑے گی۔ (از در منثور)

❁ "واخرج ابن المبارک واحمد عن سالم بن ابی الجعد قال قال عیسی علیہ السلام طوبی لمن خزن لسانه ووسعه بيته وبكى من ذكر خطيئته"

ابن مبارک اور امام احمد رحمھما اللہ نے سالم بن ابی الجعد سے روایت بیان کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا وہ شخص خوش قسمت ہے جس نے اپنی زبان کو خزانہ بنایا اور اپنے گھر کو وسعت دی، اور اپنے گناہوں کو یاد کر کے رویا۔ (در منثور)

زباب کوخزانہ بنانے کا یہ مطلب ہے کہ اس نے اپنی زبان سے اچھے اچھے کلمات بیان کئے اور انہیں اپنی زبان پر محفوظ رکھا، اور اپنے گھر کو وسیع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ گھر کے اہل وعیال کیلئے آسانی پیدا کرے تاکہ اس کے گھر کا ماحول اس کیلئے وسعت کا سبب بنے۔ اور مہمانوں کیلئے گھر کو وسیع کر، اور گناہوں کو یاد کر کے رونے کا یہ مطلب ہے کہ ان پر سچے دل سے توبہ کرے۔

❁ "واخرج احمد عن ابی الجلد قال قال عیسی بن مریم فسکرت فی الخلق فاذامن یخلق کان اغبط عندی ممن خلق وقال لاتنظروا ای ذنوب الناس کانکم ارباب ولکن انظروا فی ذنوبکم کانکم عبید والناس رجلان مبتلی ومھاقی فارحموا اھل البلاء واحمد والله علی العافیة"

امام احمد رحمہ اللہ نے ابوالجلد سے روایت ذکر کی کہ حضرت عیسی علیہ السلام نے فرمایا میں مخلوق کی یاد میں مخمور رہتا ہوں جولوگ ابھی تک نہیں پیدا ہونے وہ میرے نزدیک باقی مخلوق میں سے زیادہ قابل رشک ہیں، اور آپ نے فرمایا تم لوگوں کے گناہوں کو نہ دیکھو جیسا کہ لوگ اپنے غلاموں کو دیکھتے ہیں، بلکہ تم اپنے گناہوں کو دیکھو جیسا کہ غلام اپنے گناہوں کو دیکھتے ہیں۔ لوگ دو قسم ہیں، ایک وہ جو مصائب میں مبتلاء ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جو قابل عافیت ہوتے ہیں تم مصیبت زدہ پر رحم کرو اور اللہ کی حمد بیان کرو عافیت پر۔ (از درمنثور)

❁ "اخرج ابن ابی شیبة واحمد عن جعفر بن برقان قال کان عیسی علیہ السلام یقول اللھم انی اصبحت لا استطیع دفع ما اکرہ ولا املک نفع ما ارجو واصبح الامر بید غیری واصبحت مرتھنا بعملی فلا فقیر افقر منی ولا تشمت بی عدوی ولاتسئی بی صدیقی ولا تجعل مصیبتی فی دینی ولا تسلط علی من لا یرحمنی"

ابن ابی شیبہ اور امام احمد رحمہما اللہ نے جعفر بن برقان سے روایت بیان کی کہ حضرت عیسی علیہ السلام فرماتے تھے "اے اللہ میں نہیں طاقت رکھتا اس چیز کو مندفع کرنے کی جسے میں مکروہ سمجھتا ہوں، اور میں نفع حاصل کرنے کا مالک نہیں جس کی میں امید رکھتا ہوں، میرے امور میرے ہاتھ میں نہیں بلکہ کسی اور کے قبضہ میں ہیں، اور میں اپنے عمل کی وجہ سے مرتھن بن گیا (رہن رکھ لیا گیا) مجھ سے زیادہ کوئی فقیر (محتاج) نہیں، اے اللہ مجھے تکالیف پہنچا کر میرے دشمنوں کو خوش نہ کرنا، اور مجھے تکالیف پہنچا کر میرے دوستوں کو غم میں ڈالنا، اور مجھے میرے دین میں کوئی مصیبت نہ پہنچا (یعنی مجھے ایسی مصیبت نہ پہنچا جو مجھے دین سے دور کردے) اور مجھ پر وہ مسلط نہ کر جو مجھ پر رحم نہ کرے۔ (از درمنثور)

❁ "واخرج احمد عن الحسن بن علی الصنعانی قال بلغنا ان عیسی علیہ السلام قال یا معشر الحواریین ادع الله ان یخفف عنی ھذہ المسکرة یعنی الموت ثم قال عیسی لقد خفت الموت خوفا اوقفنی مخافتی من الموت علی الموت"

امام احمد رحمہ اللہ نے حسن بن علی صنعانی سے روایت ذکر کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے حواریین کی جماعت اللہ سے دعاء کرو کہ مجھ سے سکرات موت کو آسان فرمادے، پھر آپ نے فرمایا میں موت سے بہت زیادہ ڈرتا ہوں، تیرے موت کے ڈر نے مجھے موت کے کنارے کھڑا کردیا ہے۔ (از درمنثور)

❁ "واخرج ابن عساکر عن یزید بن میسرہ قال قال بن مریم کما تواضعون کذلک ترفعون و کما ترحمون کذلک ترحمون و کما تقضون من حوائج الناس کذلک یقضی اللہ من حوائجکم"

ابن عساکر نے یزید بن میسرہ سے روایت بیان کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا جتنی تم عاجزی کرو گے اتنا ہی اللہ کے ہاں تمہارا مرتبہ بلند ہوگا، اور جتنا تم لوگوں پر رحم کرو گے اتنا ہی تم پر رحم کیا جائے گا، اور جتنا تم لوگوں پر رحم کرو گے اتنا ہی تم پر رحم کیا جائے گا، اور جتنا تم لوگوں کی حاجات کو پورا کرو گے اتنا ہی اللہ تعالیٰ تمہاری حاجات کو پورا کرے گا۔ (از درمنثور)

❁ "واخرج احمد بن وہب قال قال المسیح علیہ السلام اکثروا ذکر اللہ وحمدہ وتقدیسہ واطیعوہ فانما یکفی احدکم من الدعاء اذا کان اللہ تبارک وتعالی راضیا علیہ ان یقول اللھم اغفرلی خطیئتی واصلح لی معیشتی وعافنی من المکارہ یا الھی"

امام احمد رحمہ اللہ نے وہب سے روایت ذکر کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اللہ کا ذکر زیادہ کرو اور اس کی تحمید وتقدیس زیادہ کرو، اور اس کی اطاعت کرو، بیشک تم میں سے ہر اس شخص کو یہ دعاء کافی ہوگی جب اللہ اس سے راضی ہوگا وہ یہ دعاء کرے اے اللہ میری خطاؤں کی مغفرت فرما، اور میری معیشت کو درست فرما، اور مجھے مصائب وآلام سے بچا۔ (از درمنثور)

❁ "واخرج احمد عن سعید بن عبد العزیز قال بلغنی انہ ما من کلمۃ کانت تقال لعیسی علیہ السلام احب الیہ من ان یقال ھذا المسکین"

امام احمد رحمہ اللہ نے سعید بن عبد العزیز سے روایت ذکر کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سب سے زیادہ پسند یہ تھا کہ آپ کو "ھذا المسکین" (یہ مسکین) کہہ کر پکارا جائے۔ (از درمنثور)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿وَرَسُوۡلًا اِلٰی بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اَنِّیۡ قَدۡ جِئۡتُکُمۡ بِاٰیَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ اَنِّیۡۤ اَخۡلُقُ لَکُمۡ مِّنَ الطِّیۡنِ کَہَیۡـَٔۃِ الطَّیۡرِ فَاَنۡفُخُ فِیۡہِ فَیَکُوۡنُ طَیۡرًۢا بِاِذۡنِ اللّٰہِ وَاُبۡرِیُٔ الۡاَکۡمَہَ وَالۡاَبۡرَصَ وَاُحۡیِ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِ اللّٰہِ وَاُنَبِّئُکُمۡ بِمَا تَاۡکُلُوۡنَ وَمَا تَدَّخِرُوۡنَ فِیۡ بُیُوۡتِکُمۡ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ۝﴾ (آیة نمبر ۴۹)

(1) اور رسول ہوگا بنی اسرائیل کی طرف یہ فرماتا ہوا کہ میں تمہارے پاس ایک نشانی لایا ہوں تمہارے رب کی طرف سے کہ میں تمہارے لئے مٹی سے پرند کی سی مورت بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ فورا پرند ہو جاتی ہے اللہ کے حکم سے اور میں شفا دیتا ہوں مادرزاد اندھے اور سفید داغ والے کو اور میں مردے جلاتا ہوں اللہ کے حکم سے اور تمہیں بتاتا ہوں جو تم کھاتے ہو اور جو اپنے گھروں میں جمع کر رکھتے ہو بے شک ان باتوں میں تمہارے لئے بڑی نشانی ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

(2) اور رسول ہوگا بنی اسرائیل کی طرف، بیشک میں نے تمہارے پاس لائی ہے نشانی تمہارے رب کی طرف سے بیشک میں بناتا ہوں تمہارے لئے مٹی سے مثل شکل پرندے کے، تو میں پھونک مارتا ہوں اس میں تو ہو جاتا ہے وہ پرندہ اللہ کے حکم سے اور میں درست کرتا ہوں مادرزاد اندھے اور سفید داغ والے کو، اور میں زندہ کرتا ہوں مردہ کو اللہ کے حکم سے، اور میں خبر دیتا ہوں تمہیں جو تم کھاتے ہو، اور جو تم جمع کر کے رکھتے ہو اپنے گھروں میں، بیشک اس میں بڑی نشانی ہے تمہارے لئے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

﴿وَرَسُوۡلًا اِلٰی بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ﴾ ''اور رسول ہوگا بنی اسرائیل کی طرف''

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

''ورسولا'' میں واؤ عاطفہ ہے اس کا عطف ہے '' یعلمه '' پر اگر لفظ ''یکون '' مقدر ہو، تو معنی یہ ہے ''اور رسول ہو

گا بنی اسرائیل کی طرف اور اگر "نجعله "مقدر ہو تو معنی ہوگا" ہم بنائیں گے اسے رسول، اور اگر "نبعثه "مقدر ہو تو معنی یہ ہوگا" اور ہم بھیجیں گے اسے رسول بنا کر۔"والتنوین للتعظیم تقدیرہ ونجعله رسولا عظیما" لفظ "رسولا "پر تنوین تعظیم کیلئے ہے اب مطلب یہ ہوگا کہ" وہ عظیم رسول ہوگا"

"اسرائیل" حضرت یعقوب علیہ السلام کا عبرانی زبان میں نام ہے جس کی تحقیق پہلے پارہ میں بیان ہو چکی "بنی اسرائیل" کا مطلب ہے"اولاد اسرائیل" اولاد یعقوب علیہ السلام سے نبوت کی ابتداء حضرت یوسف علیہ السلام سے ہوئی اور انتہاء حضرت عیسی علیہ السلام پر ہوئی۔ (ماخوذ از مظہری بوضاحت)

﴿اَنِّی قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾

"بیشک میں تمھارے پاس لائی ہے نشانی تمھارے رب کی طرف سے۔"

یعنی میں نے تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے نشانی لائی جو میرے قول کی تصدیق کرتی ہے

اعتراض: حضرت عیسی علیہ السلام نے تو کئی نشانیاں لائیں، صرف ایک نشانی تو نہیں لائی لھذا چاہئے تو یہ تھا کہ جمع کا صیغہ "بأیات "لایا جاتا واحد کا صیغہ کیوں لایا گیا۔

جواب: "ان الکل دل علی شئی واحد وھو صدقه فی الرسالة" بیشک ہر ایک نشانی ایک چیز پر دلالت کرتی ہے، وہ ہے آپ کی رسالت کی تصدیق۔ (عالم التنزیل للبغوی)

جب حضرت عیسی علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو بتایا کہ میں نے تمھارے رب کی طرف تمھارے پاس نشانی لائی ،تو انہوں نے کہا کہ وہ کون سی نشانی تم لائے ہو؟ تو آپ نے اپنے معجزات بیان کئے یعنی ہر معجزہ ایک نشانی ہے جو آپ کی صداقت پر دلالت کر رہا ہے۔

﴿اَنِّیْ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ كَهَیْئَةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَكُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾

"بیشک میں بناتا ہوں تمھارے لئے مٹی سے مثل شکل پرندے کی تو پھونک مارتا ہوں اس میں تو ہو جاتا ہے وہ پرندہ اللہ کے حکم سے۔"

"اخلق" ای اصور واقدر" تصویر بنانا، گھڑنا، بنانا اندازہ کرنا وغیرہ معانی یہاں بن سکتے ہیں۔

خلق کے چند معانی ہیں:

(۱) "الخلق اصله التقدیر المستقیم" خلق کا ایک معنی ہے درست اندازہ کرنا۔

(۲) "ویستعمل فی ابداع الشیء من غیر اصل ولا احتذا" اور اس کا اس معنی میں استعمال ہوتا ہے کہ کسی چیز کو بغیر نمونہ کے بغیر سانچہ کے بنانا جیسا کہ رب تعالی نے فرمایا ﴿خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ﴾ یہی معنی اس مقام میں مذکور ہے اس کی تائید رب تعالی کے اس ارشاد سے حاصل ہو رہی ہے ﴿بَدِيْعُ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ﴾" اللہ تعالی کے اس ارشاد کے مطابق زمین وآسمان کا بغیر نمونہ کے پیدا کرنے کا ذکر ہے

(۳) ویستعمل فی ایجاد الشیء من الشیء نحو "خلقکم من نفس واحدة" اور خلق کا معنی یہ ہے کہ کسی چیز کو کسی چیز سے پیدا کرنا، موجود کرنا، جیسا کہ رب تعالی نے فرمایا ﴿خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ﴾ اس نے پیدا کیا تمہیں ایک نفس سے۔

تنبیہ : بغیر نمونہ کے نئے سرے سے پیدا کرنا صرف رب تعالی کو حاصل ہے اسی لئے رب تعالی نے فرمایا ﴿اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ﴾ کیا وہ جو پیدا کرتا ایسے ہے جو نہیں پیدا کرتا تم کیوں نصیحت حاصل نہیں کرتے۔

مخلوق کی طرف خلق کی نسبت دو معنی سے ہے:

ایک معنی تقدیر اور بنانا، گھڑنا جیسا کہ اسی زیر بحث آیۃ میں ہے ﴿اَنِّیْ اَخْلُقُ لَكُمْ﴾ بیشک میں بناتا ہوں تمھارے لئے" والثانی فی الکذب نحو قوله تعالی " وتخلقون افکا" دوسرا معنی ہے جھوٹ گھڑنا، جیسا کہ رب تعالی نے فرمایا "وتخلقون افکا" اور تم جھوٹ گھڑتے ہو۔

اعتراض : اللہ تعالی نے فرمایا ﴿فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ﴾ تو برکت والا ہے اللہ جو تمام خالقوں سے اچھا خالق ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ رب تعالی کے بغیر اور بھی خالق ہیں، تو کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اللہ کے بغیر کوئی خالق نہیں۔

جواب اول : "قیل ان ذلک معناه احسن المقدرین" اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اس مقام میں خلق کا معنی بنانا، گھڑنا، صورت بنانا ہے یعنی تمام صورتیں، شکلیں بنانے والوں میں سے اللہ تعالی اچھی صورتیں بناتا ہے جو ماؤں کی پیٹوں میں بچہ دانیوں میں صورتیں بناتا ہے۔

جواب دوم : "اویکون علی تقدیر ماکانوا یعتقدون ویزعمون ان غیر الله یبدع"
دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ ارشادگرامی ان کے اعتقاد کے مطابق ہے،ان کا اعتقاد یہ تھا کہ اللہ تعالی کے بغیر انسان بھی بغیر نمونہ کے نئے سرے سے پیدا کر سکتے ہیں تو رب تعالی نے ان کا رد فرمایا کہ تمہارا گمان باطل ہے،حقیقی طور پر خالق رب تعالی ہی ہے،وہی "احسن الخالقین" ہے۔

ضابطہ: "وکل موضع استعمل الخلق فی وصف الکلام فالمراد به الکذب" کلام کے ساتھ جب بھی "خلق" کا استعمال ہوگا اس کا معنی "جھوٹ" ہوگا،اسی وجہ سے کثیر حضرات نے قرآن پاک کے ساتھ "خلق" کا استعمال منع قرار دیا ہے۔

توجہ کی ضرورت:

خلق (خاء کی زبر سے) اور "خلق" (خاء کی پیش سے) کا اصل میں ایک ہی معنی ہے،لیکن زبر کی صورت میں اس کا معنی ظاہری صورت ہوتا ہے جو نظر سے دیکھی جا سکے،اور پیش کی صورت میں باطنی عادات سے تعلق ہوتا جو بصیرت سے مدرک ہوں،یعنی جن کو عقل سے پایا جا سکے۔ (ماخوذ از مفردات راغب)

"کھیئة الطیر" ای مثل صورة الطیر" مثل شکل پرندے" راقم نے یہی ترجمہ پیش کیا ہے، جو روح البیان کے مذکورہ بالا الفاظ سے لیا گیا ہے۔

"فانفخ فیه" ضمیر مجرور جو "فیه" میں ہے وہ "کھئیة" میں کاف کی طرف لوٹ رہی ہے جو مماثل کے معنی میں ہے۔

"فیکون طیرا" "خیاطیارا کسائر الطیور" وہ پرندہ ہوجاتا ہے،یعنی جس طرح باقی پرندے حقیقۃ زندہ ہوتے ہیں وہ جو بناتا ہو وہ بھی حقیقۃ زندہ ہوتا ہے،اسی لئے اڑتا ہے،اس میں کوئی جادو وغیرہ کا (معاذ اللہ) تعلق نہیں۔

"باذن الله" ای بامر الله" اللہ کے حکم سے،اب مکمل مطلب واضح ہوگیا کہ آپ نے اپنے معجزہ کو یوں بیان فرمایا کہ "میں بیشک مٹی سے پرندے کی شکل وصورت بناتا ہوں، پھر اس میں پھونکتا ہوں تو وہ حقیقی طور پر زندہ پرندہ بن جاتا ہے۔" باذن الله" کہہ کر یہ مسئلہ بیان کردیا کہ مٹی کی مورتی سے حقیقی طور پر پرندہ اللہ تعالی ہی بناتا ہے،میں تو اللہ تعالی کے حکم سے صرف پرندے کی شکل وصورت بناتا ہوں اور اس میں پھونکتا ہوں،لیکن زندگی اسے اللہ تعالی ہی عطاء کرتا ہے

"لان الله هو الذی خلق الموت والحیاة فهو یخلق الحیاة فی ذلک الجسم بقدرته عند نفخ عیسی علیه السلام فیه علی سبیل اظهار المعجزات"

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ہی موت وحیات کو پیدا فرماتا ہے، لھذا جس جسم میں عیسی پھونکتا ہے، اسے جو حیات حاصل ہوتی ہے اس میں قدرت باری تعالیٰ کی ہوتی ہے، اور معجزہ عیسی کا ہوتا ہے۔ (روح البیان)

عیسی علیہ السلام نے چمگادڑ بنائی:

حضرت عیسی علیہ السلام نے جب اعلان نبوت فرمایا تو بنی اسرائیل نے آپ سے معجزہ طلب کیا، ان کا معجزہ طلب کرنا اس وجہ سے تھا۔

"طلبوا منه علی سبیل التعنت جریا علی عادتھم مع انبیاء ھم ان یخلق لھم خفاشا فلما فعل قالوا ساحر"

کہ انہوں نے سرکشی اور عناد کی وجہ سے معجزہ طلب کیا تھا، انبیاء کرام سے ان کا یہی طریقہ آرہا تھا، انہوں نے مطالبہ ہی چمگادڑ بنانے کا کیا تھا، جب آپ نے مٹی سے چمگادڑ کی مورتی بنائی اور اس میں پھونک ماری وہ اڑگئی تو وہ اپنی پہلی روش کی مطابق کہنے لگے کہ یہ جادوگر ہے۔

انہوں نے چمگادڑ بنانے کا مطالبہ کیوں کیا تھا:

اس کی وجہ یہ تھی کہ چمگادڑ میں پرندوں، حیوانوں اور انسانوں کے اوصاف پائے جاتے ہیں، اس کے بنانے میں ان کے نزدیک بہت مشکل کام تھا۔

چمگادڑ کے اعضاء واوصاف یہ تھے:

چمگادڑ کی داڑھیں اور دانت ہوتے ہیں، اسے حیض آتا ہے، اس کے بچے پیدا ہوتے ہیں، عام پرندوں کی طرح یہ انڈے نہیں دیتی، اور بغیر پروں کے اڑتی ہے، اور اس کے کان ہوتے ہیں جیسے انسانوں کے کان ہوتے ہیں، اور اس کے پستان ہوتے ہیں، اور ان پر تھن ہوتے ہیں، یعنی پستان انسانوں کی طرح اور تھن حیوانوں کی طرح، اور ان سے دودھ آتا ہے، اور ایسے ہنستی ہے جیسے انسان ہنستے ہیں، اور اسے نہ دن میں نظر آتا ہے، اور نہ ہی رات کو اسے نظر آتا ہے صرف دو مختصر وقتوں میں اسے نظر آتا ہے، ایک غروب کے بعد اندھیرا چھا جانے سے پہلے، اور دوسرا طلوع فجر کے بعد روشنی سے پہلے۔

زیادہ مشہور یہی ہے کہ آپ نے چمگادڑ کے بغیر کوئی اور پرندہ نہیں بنایا، البتہ بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ آپ نے

مختلف پرندے بنائے ہیں "واللہ اعلم بالصواب"

وہب کا قول یہ ہے کہ آپ نے جو پرندہ بنایا ہے اس کی آگے نہ نسل چلی اور نہ ہی وہ زیادہ دیر زندہ رہا

"کان یطیر مادام الناس ینظرون الیہ فاذاغاب عن اعینھم سقط میتا لیتمیز عن خلق اللہ تعالی بلاواسطۃ"

بلکہ وہ لوگوں کے سامنے اڑتا، جب لوگوں کی آنکھوں سے غائب ہوتا تو مر کر گر جاتا، تا کہ اللہ تعالی کی مخلوق بلاواسطہ اور باواسطہ میں فرق ہو جائے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

﴿ وَاُبۡرِئُ الۡاَکۡمَهَ وَالۡاَبۡرَصَ ﴾

"اور میں درست کرتا ہوں مادرزاد اندھے اور سفید داغ والے کو۔"

"الاکمہ" ماخوذ ہے "کمہ" سے، اس کا ایک معنی ہے "ھوالذی ولد اعمی" کہ جو نابینا پیدا ہو، یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے جو جریر نے ضحاک کی روایت سے بیان کیا ہے۔

اور دوسرا معنی یہ ہے کہ "اکمہ" اسے کہتے ہیں "انہ الممسوح العین الذی لم یشق بصرہ ولم یخلق لہ حدقۃ" جس کی آنکھیں ہی نہ ہوں اور اس کی نہ نظر ہو، اور نہ ہی اس کی آنکھ کی پتلی پیدا کی گئی ہو، یہ قول عطاء کا ہے جا ابن ابی حاتم نے پیش کیا ہے اور معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ "اکمہ" اسے کہا جاتا ہے "انہ الذی یبصر بالنھار ولایبصر باللیل" جسے دن کو نظر آئے اور رات کو نظر نہ آئے۔ "وعن عکرمۃ انہ الاعمش ای اخلص" حضرت عکرمہ فرماتے ہیں "اکمہ" خالص نابینا کو کہتے ہیں۔

خیال رہے کہ "اکمہ" کے تو سارے معانی معتبر ہیں، البتہ حضرت عیسی علی علیہ السلام نے جن اندھوں کی نظر کو درست کیا وہ وہی تھے جو پیدائشی اندھے تھے جن کے علاج سے بڑے بڑے ماہر طبیب عاجز آ گئے تھے، اسی وجہ سے یہ آپ کا معجزہ کہلایا، اگر طبیب اس کا علاج کر سکتے تو آپ کی اس میں تخصیص ثابت نہ ہوتی،

"والابرص" سفید داغوں والے (کو میں درست کرتا ہوں) جسم سے اصلی چمڑا اتر جاتا ہے سفید داغ پڑ جاتے ہیں اسے "برص کی مرض کہا جاتا ہے" آجکل یہودیوں، نصرانیوں اور ہندوؤں سے تجارت کے یہ اثرات ظاہر ہو رہے ہیں کہ اکثر لوگ ملک پاکستان میں اس مرض مبتلاء ہو چکے ہیں، کیونکہ سائنسی ترقی، خوراکوں میں کیمیائی اجزاء کے استعمال نے لوگوں کی صحتوں کو تباہ و برباد کر دیا ہے، اسی وجہ سے ہسپتالوں میں جگہ نہیں مل رہی۔

صرف دو مرضوں کا ذکر کیوں؟

اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ دو مرض اس قسم کی تھیں جن سے طبیب عاجز آگئے تھے، باوجود اس کے حضرت عیسی علیہ السلام کے زمانہ میں بڑے بڑے ماہر طبیب موجود تھے، آپ کو یہ معجزہ اسی لئے دیا گیا تھا کہ اس وقت کے نامور لوگ آپ کے سامنے عاجز ہو جائیں، جیسا کہ حضرت موسی علیہ السلام کے زمانہ میں جادوگری کا زور تھا، اس وقت کے نامور لوگ جادوگر تھے، آپ کو عصا اور ید بیضاء عطاء فرمائے جن کی وجہ سے آپ کے زمانہ کے مشہور معروف لوگ عاجز آگئے۔ اور نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں فصاحت وبلاغت کا زور تھا، تو آپ کو فصیح وبلیغ کتاب قرآن پاک عطاء کیا گیا، جس کی وجہ سے بڑے بڑے فصیح وبلیغ شعراء اور قصیدہ خواں عاجز آگئے۔

آپ نے کئی مریضوں کو صحیح فرمایا:

''والا قتصار علی هذین الامرین لا یدل علی نفی ماعداهما ،فقدروی انه علیه السلام ابرأ ایضا غیرهما''

ان دو قسم کی مرضوں کے ذکر سے باقیوں کی نفی نہیں پائی گئی، بلکہ آپ نے کئی قسم کی مرضوں سے لوگوں کو رب تعالی کے حکم سے شفاء عطاء کی۔

''من اطاق منهم ان یبلغه بلغه ومن لم یطق زلک منهم اتاه عیسی علیه السلام فمشی الیه وکان یدا ویهم بالدعاء الی الله تعالی بشرط الایمان''

اگر کوئی مریض آپ کے پاس آنے کی طاقت رکھتا تو وہ آجاتا، اور اگر کوئی طاقت نہ رکھتا تو آپ خود اس کے پاس آتے، آپ مریض پر ہاتھ پھیرتے اور دعاء فرماتے تو اللہ تعالی اسے شفاء عطاء فرما دیتا تھا، البتہ آپ صرف مؤمنوں کیلئے دعاء فرماتے تھے، کافروں کیلئے نہیں۔

آپ کی دعاء سے مختلف مرضوں میں مبتلاء لوگ شفاء یاب ہوئے، چلنے پھرنے سے عاجز لوگوں کو آپ کی دعاء سے چلنے پھرنے کی طاقت مل گئی اور پاگل صحیح ہو گئے۔

حضرت عیسی علیہ السلام کی دعاء:

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ اِلٰهُ مَنْ فِی السَّمَاءِ وَاِلٰهُ مَنْ فِی الْاَرْضِ لَااِلٰهَ فِیهِمَا غَیْرُکَ وَاَنْتَ جَبَّارُ مَنْ فِی السَّمَاءِ وجَبَّارُ مَنْ فِی الْاَرْضِ لا جَبَّار فِیهِما غَیْرُکَ وَاَنْتَ مَلِکُ مَنْ فِی السَّمَاءِ وَمَلِکُ مَنْ فِی الْاَرْضِ لَا مَلِکَ فِیهِمَا غَرُکَ قُدْرَتُکَ فِی الْاَرْضِ کَقُدْرَتِکَ فِی

السَّمَاءِ وَسُلْطَانُکَ فِي الْاَرْضِ کَسُلْطَانِکَ فِي السَّمَاءِ اَسْاَلُکَ بِاسْمِکَ الْکَرِيْمِ وَوَجْهِکَ الْمُنِيْرِ وَمُلْکِکَ الْقَدِيْمِ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَيْئٍ قَدِيْرٌ"

فائدہ جلیلہ: "ومن خواص هذا الدعاء كما قال وهب انه اذاقرى على الفزع والمجنون و كتب له وسقى منه ان شاء الله تعالى"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو دعاء فرماتے تھے اس دعاء میں رب تعالیٰ نے یہ خیر و برکت رکھی ہے کہ جب کسی پریشان یا پاگل پر پڑھی جائے اور اسے لکھ کر پانی میں حل کر کے پلائی جائے تو اسے ان شاء اللہ فائدہ حاصل ہوگا۔

(ماخوذ از روح المعانی)

﴿ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ ''اور میں مردے زندہ کرتا ہوں اللہ کے حکم سے۔''

اس مقام میں بھی "باذن الله" اللہ کے حکم کی قید ذکر کی، کیونکہ یہ آپ کا بہت بڑا معجزہ تھا، اور اس معجزہ سے آپ کی الوہیت کا وہم بھی ہو سکتا تھا اسلئے کہ یہ کام انسان نہیں کر سکتے تھے، تو آپ نے "باذن الله" کہہ کر واضح کر دیا کہ اگرچہ بظاہر میری دعاء سے مردے زندہ ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں قدرت باری تعالیٰ سے ہی مردے زندہ ہوتے ہیں۔

آپ نے چار مردے زندہ فرمائے:

(۱) عازر، (۲) ایک بڑھیا کا بیٹا، (۳) اور عاشر (شہر کے باہر تجارتی مال کا عشر لینے والا) (۴) اور سام بن نوح کو۔

عازر: آپ کا دوست تھا۔ اس کی بہن نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف پیغام بھیجا کہ آپ کا بھائی عازر فوت ہو گیا ہے آپ کے اور عازر کے گاؤں کے درمیان تین دن کی راہ کا فاصلہ تھا، آپ اور آپ کے کچھ اور احباب آئے، جو کچھ دنوں سے فوت ہو چکا تھا، آپ نے اس کی بہن کو کہا مجھے اس کی قبر پر لے چلو، وہ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو بھائی کی قبر پر لے گئی، آپ نے اس کے زندہ ہونے کیلئے دعاء کی تو اللہ تعالیٰ نے اسے زندہ کر دیا، وہ قبر سے نکلنے کے بعد کچھ دیر زندہ رہا یہاں تک کہ اس کی اولاد بھی ہوئی۔

بڑھیا کا بیٹا: فوت ہو گیا، اس کا جنازہ اٹھا کر جا رہے تھے، (آپ کی اس کی بوڑھی ماں کے بے سہارا ہونے پر رحم آ گیا) تو آپ کے قریب سے جب جنازہ گذرا تو آپ نے اس کے زندہ ہونے کی دعاء کی تو اللہ تعالیٰ نے اسے زندہ کر دیا، وہ چارپائی کے اوپر ہی زندہ ہو کر بیٹھ گیا، اس نے کپڑے پہنے، خود ہی اپنے جنازہ والی

چارپائی کو اٹھا کر لایا، اپنے گھر والوں کے پاس زندہ ہو کر لوٹ آیا، کچھ دیر زندہ رہا، یہاں تک کہ اس کی بھی اولاد ہوئی، پھر بعد میں کچھ عرصہ کے بعد فوت ہوا۔

عاشر کی بیٹی: شہر کے باہر تجارتی مال سے عشر وصول کرنے والے شخص کی بیٹی فوت ہوگئی، آپ نے (اس کے کہنے پر) موت اور دفن کے دوسرے دن بعد اس کے حق میں دعاء کی تو اللہ تعالیٰ نے اسے زندہ کر دیا، یہ بھی زندہ ہونے کے بعد کچھ عرصہ زندہ رہی، اس کی بھی زندہ ہونے کے بعد اولاد ہوئی۔

سام بن نوح: بیشک حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کی قبر پر آئے تو آپ نے اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم "یاحی یاقیوم" پڑھا، اس کے زندہ ہونے کی دعاء کی تو وہ زندہ ہو کر قبر سے باہر آ گیا،

"**وقد شاب نصف راسه خوفا من قيام الساعة ولم يكونوا يشيبون في ذلک الزمان**"

تو قیامت کے خوف کی وجہ سے اس کا آدھا سر سفید ہو چکا تھا، حالانکہ اس وقت یعنی ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے پہلے سر سفید نہیں ہوا کرتا تھا، سر سفید ہونے کی ابتدا اللہ تعالیٰ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی۔ وہ جب قبر سے نکلا تو اس نے پوچھا "**اقدقامت الساعة**" کیا قیامت ہوگئی؟ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، نہیں قیامت تو قائم نہیں ہوئی، البتہ میں نے تمہیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس سے دعاء کر کے زندہ کیا ہے۔ پھر اس سے پوچھا کیا تو زندہ رہنا چاہتا ہے یا کہ پھر فوت ہو کر قبر میں رہنا پسند کرتا ہے، اس نے قبر کی زندگی کو پسند کیا، البتہ آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے موت تو ابھی آ جائے البتہ میں سکرات موت سے محفوظ رہوں، آپ نے رب تعالیٰ کی حضور دعاء کی، آپ کی دعاء کو قبول کر لیا گیا۔ بغیر سکرات موت کے اللہ تعالیٰ نے اسے پھر موت عطاء کر دی۔

سام بن نوح کو زندہ کرنے کی کیا وجہ تھی؟

پہلے جن تین شخصوں کو زندہ کرنے کے واقعات بیان کیے گئے ان کو زندہ کرنے پر قوم نے کہا کہ ان کی موت میں زیادہ وقت نہیں گذرا تھا، ہو سکتا ہے ان پر غشی طاری ہو، وہ حقیقت میں مرے ہی نہ ہوں۔ انہوں نے آپ سے سام بن نوح کو زندہ کرنے کا مطالبہ کیا جسے فوت ہوئے تقریبا چار ہزار سال گذر چکے تھے، آپ نے اسم اعظم پڑھا اور اللہ تعالیٰ سے دعاء کی، آپ کی دعاء کو شرف قبولیت بخشا گیا تو اسے زندہ کر دیا گیا۔ اسے زندہ کرنے کے بعد آپ نے قوم سے مطالبہ کیا کہ تم میرے نبی ہونے کی تصدیق کرو، لیکن "**فامن به بعضهم و كذبه آخرون**" تو بعض لوگوں نے آپ پر ایمان لایا، اور بعض نے آپ کی (معاذ اللہ) تکذیب کر دی، اور کہنے لگے کہ یہ تو جادو ہے، البتہ کوئی اور

معجزہ دکھاؤ،تو آپ نے آنے والے معجزہ کا ذکر فرمایا۔

﴿ وَاُنَبِّئُكُم بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ﴾

''اور میں تمہیں بتاتا ہوں جو تم کھاتے ہو،اور جو تم جمع کر کے رکھتے ہو اپنے گھروں میں۔''

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

لفظ''ما''دونوں جگہ میں''ماتاکلون''میں،اور''ماتدخرون''میں موصولہ ہے،یا دونوں جگہ''ما''نکرہ،موصوفہ ہے،عائد محذوف ہے،اصل معنوی لحاظ پر عبارت یہ ہوگئی''ماتاکلونہ وما تدخرونہ''(جس چیز کو تم کھاتے ہو اور جس چیز کو تم ذخیرہ بناتے ہو)اور''فی بیوتکم''کا تعلق''ما''سے ہے،

''تدخرون''کو''ذخیرۃ''سے ماخوذ کیا گیا ہے،جب باب افتعال پر لے گئے تو یوں ہو گیا''اذتخر یذتخر اذتخارا''پھر قاعدہ کے مطابق''تاء افتعال''کو دال سے بدلنا واجب ہو گیا،تو اب یوں ہو گیا''اذدخر،یذدخر،اذدخارا''اس میں ایک وجہ تو یہ بھی جائز ہے کہ بغیر ادغام کے یونہی پڑھا جائے،اور دوسری صورت یہ ہے کہ''دال''کو''ذال''سے تبدیل کر کے اور ادغام کر کے''اذخر،یذخر،اذخارا''ذال کی شد سے پڑھا جائے اور تیسری صورت یہ ہے کہ''ذال''کو دال کر کے،پھر ادغام کر کے پڑھا جائے''ادخر،یدخر،ادخارا''دال کی شد کے ساتھ۔آیۃ کریمہ میں یہ تیسری صورت ہی استعمال ہے،جس کا مطلب ہے''ذخیرہ بنانا،جمع کرنا۔ (ماخوذ از روح المعانی)

تنبیہ: ''وقد کان هذاالاخبار بعد النبوة واحیائه الموتی علیه السلام علی مافی الاخبار''

صحیح قول یہی ہے کہ یہ واقعات یعنی آپ کا خبر دینا کہ میں جانتا ہوں جو تم کھاتے ہو اور جو تم گھروں میں جمع کرتے ہو ،اور اسی طرح مردوں کو زندہ کرنا وغیرہ معجزات بعد از نبوت آپ سے ظاہر ہوئے ہیں۔

بعض حضرات نے بچپن کے متعلق ایک روایت ذکر کی:

ابن عساکر عبداللہ بن عمرو بن العاص سے ایک روایت ذکر کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بچپن میں لڑکوں کے ساتھ کھیل رہے تھے تو آپ نے ایک لڑکے کو کہا''ترید ان خبرک ماخبات لک امک''کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں یہ بتاؤں کہ تمھاری ماں نے تمھارے لئے کیا چھپا کر رکھا ہوا ہے؟اس لڑکے نے کہا ہاں آپ مجھے

بتائیں۔آپ نے اسے بتادیا،فلاں فلاں چیزیں تیری ماں نے تیرے لئے چھپارکھی ہیں۔وہ گھر آیا،اس نے ماں کو کہا جو چیزیں آپ نے چھپارکھی ہیں وہ مجھے کھانے کیلئے دو،ماں نے پوچھا وہ کیا چیزیں ہیں جو میں نے چھپارکھی ہیں ؟ بچے نے وہ بتادیں۔ماں نے پوچھا تمہیں کس نے بتایا؟اس نے کہا''عیسی بن مریم نے''ان لوگوں نے یہ سن کر ایک دوسرے کو کہا کہ بچوں کو عیسی بن مریم کے ساتھ نہ کھیلنے دیں ورنہ ان کو (معاذ اللہ) بگاڑ دے گا۔انہوں نے بچوں کو آپ کے ساتھ کھیلنے سے منع کرنے کیلئے ایک گھر میں بند کردیا ادھر حضرت عیسی علیہ السلام بچوں کو تلاش کرتے ہوئے اس مکان پر پہنچ گئے جس میں بچوں کو بند کیا گیا تھا۔آپ نے بچوں کے متعلق پوچھا کہ میرے دوست کہاں گئے ہیں؟انہوں نے کہا ہمیں تو پتہ نہیں آپ نے فرمایا اس مکان سے ان کی آواز آرہی ہے۔

ان لوگوں نے کہا،اس گھر میں تو بندر اور خنزیر ہیں۔آپ نے یہ سن کر یوں دعاء کردی ''اللھم اجعلھم قردة وخنازیر فکانوا کذلک''اے اللہ ان کو بندر اور خنزیر بنادے تو رب تعالی نے ان کو بندر اور خنزیر بنادیا۔

راقم کو اس روایت سے ذرا بھی اتفاق نہیں کیونکہ نبی قبل از نبوت (نبوت سے پہلے) بھی اس قسم کی دعاء ہلاکت بچوں کیلئے بغیر کسی وجہ سے نہیں کرتا۔روایت کو رد کرنا آسان ہے نبی کی گستاخی کے پہلو کو قبول کرنا پسند نہیں۔ (راقم)

ایک اور وجہ یہ بیان کی گئی کہ جب ان پر آسمانوں سے دسترخوان نازل کیا گیا تو انہیں کہا گیا کہ تم جتنا کھا سکو ،کھالو،جمع نہ کرو،لیکن انہوں نے جمع کرنا شروع کردیا،تو عیسی علیہ السلام نے فرمایا ﴿ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِىْ بُيُوْتِكُمْ ﴾ اور میں تمہیں خبر دیتا ہو جو تم کھاتے ہو اور جو تم (اس مائدہ (دسترخوان سے) اپنے گھروں میں جمع کرتے ہو۔''وخانوا فجعلوا قردة وخنازیر'' انہوں نے خیانت کی،اور انہوں نے مائدہ کے کھانے کو گھروں میں جمع کیا تو رب تعالی نے ان کو بندر اور خنزیر بنادیا۔

راقم نے ابن عساکر کی راویت کے متعلق اپنا موقف پیش کردیا،اگرچہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے تینوں اقوال میں سے کسی کو رد نہیں کیا،بلکہ یوں کہا ہے ''ویمکن ان یقال ان کل ذلک قدوقع'' ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ تمام قسم کے مذکور واقعات کے پائے گئے ہوں،''واللہ اعلم بالصواب''

کیا ان دونوں خبروں پر حکم بند ہے؟

''فالمراد الاخبار بخصوصیة ھذین الامرین کما یشعر بہ الظاھر''

آیۂ کریمہ سے ظاہر طور پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان دو چیزوں کو جوذکر کیا گیا ہے ان کی خبر ہی مراد ہے کہ آپ نے یہ خبر دی

کہ تم جو کھا کر آتے ہو یا گھروں میں جمع کر کے آتے ہو اس کی میں تمہیں خبر دیتا ہوں لیکن راقم کو یہ قول زیادہ پسند ہے

"وقيل المراد الاخبار بالمغيبات الاانه قد اقتصر علی ذکر امرين منها"

بعض نے حضرات نے بیان کیا کہ آپ ہر قسم کی غیبی خبریں دیتے تھے، اگر چہ یہاں ذکر دو چیزوں کا کیا گیا ہے۔

دو چیزوں کے ذکر پر اقتصار کی وجہ یہ ہے کہ ان دو پر ان کو یقین تھا کوئی شک وشبہ نہیں تھا۔ ایک اور وجہ یہ ہے:

"والسر في ذكر هذين الامرين بخصوصهما ان غالب سعي الانسان وصرف ذهنه لتحصيل الأكل الذي به وقوامه والادخار الذي يطمئن به اكثر القلوب ويسكن منه غالب النفوس فليفهم"

اگر چہ آپ نے ہر قسم کی غیبی خبر دی، البتہ صرف دو کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ انسان کی غالب کوشش یہ ہوتی ہے، اور ذہن کو انسان اس طرف لگا دیتا ہے کہ کھانے کی چیزیں حاصل کرے تا کہ ان کے ذریعے اس کا جسم اور بدن صحیح سلامت رہے۔

اور جمع کر کے رکھنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان عام طور پر کامل متوکل نہیں ہوتا، بلکہ کل کی فکرات لاحق ہوتی ہے کل کیا کھاؤں، اھل وعیال کو کل کیا کھلاؤں، جب وہ کل کیلئے جمع کر لیتا ہے تو اس کا دل مطمئن ہو جاتا ہے اور اس کے نفس کو سکون مل جاتا ہے ان مسائل کو آپ بھی سمجھ لیں۔ (روح البیان)

﴿ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴾

"بیشک اس میں نشانی ہے تمھارے لئے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔"

"ذلک" کا اشارہ واحد کا ہے جبکہ معجزات چار ذکر ہوئے ہیں اشارہ جمع کا کیوں ذکر نہیں ہوا۔

تو اس کا جواب یہ ہے (ان فی ذلک) ای المذکور من الخوارق الاربعة" ہاں یہ ٹھیک بات ہے کہ معجزات چار ہیں جن کی طرف "ذلک" کا اشارہ ہے لیکن "المذکور" کی تاویل میں ہے۔ یعنی ہر معجزہ جو مذکور ہے اس میں تمھارے لئے نشانی ہے۔

اس کلام میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ یہ کلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہو اور رب تعالیٰ نے اس کی حکایت بیان کی ہو اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے خود ان لوگوں کی توبیخ (ڈانٹ ڈپٹ) کیلئے ذکر فرمایا ہو "لاية" میں دو احتمال ہیں (لاية) ای جنسها وقرئی لأيات" ایک احتمال یہ ہے کہ مراد مطلقاً جنس آیۃ ہو، اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس میں ایک قراءت میں جمع (لأيات) بھی پڑھا گیا ہے یعنی اس میں تمھارے لئے نشانیاں ہیں۔

"لکم" (تمھارے لئے) یعنی اس میں نشانی ہے تمھارے لئے جو عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت پر دلالت کر رہی ہے کیونکہ

آپ نے مادرزاد اندھے اور برص والے کوشفاء دی تو اس میں کوئی اسباب عادیہ نہیں پائے گئے جیسا کہ طبیب حضرات دواؤں کے ذریعے شفاء دیتے ہیں بلکہ یوں کہا جائے کہ ان دونوں مرضوں سے طبیب عاجز آ چکے تھے اسی وجہ سے آپ کا معجزہ ظاہر ہو گیا کسی نے تسلیم کیا اور کسی نے انکار کیا۔

پرندہ کی مورتی بنا کر، اس میں پھونک مار کر اللہ کے حکم سے اسے صحیح پرندہ بنا دینا تو صرف آپ کا معجزہ ہی تھا ورنہ عام انسان کی طاقت میں ہی یہ نہیں تھا۔ اور مردہ کو زندہ کرنا بھی آپ کا معجزہ تھا، عام انسان اس سے عاجز تھے،

اسی وجہ سے ''لکم'' ذکر کیا ہے ''اس میں تمھارے لئے نشانی ہے''یعنی عقلمند انسان تو سمجھ سکتا ہے کہ یہ معجزہ ہے، اگر تمہیں بھی عقل وشعور حاصل ہو تو تم بھی سمجھ سکتے ہو۔

تنبیہ: آپ کا یہ ارشاد کہ میں تمہیں خبر دیتا ہوں جو تم کھاتے ہو اور جو تم اپنے گھروں میں جمع کرتے ہو۔ یہ بھی معجزہ تھا، اس میں نجومیوں کے علوم اور قواعد وضوابط کا کوئی دخل نہ تھا۔

اسی سے واضح ہو گیا کہ ''علم جفر'' اور ''علم فلکیات'' کو علوم غیبیہ نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ ان علوم میں قواعد وضوابط کا دخل پایا گیا ہے ان قواعد کا لحاظ کیا جائے تب ہی نجومیوں کی ہزار میں سے کوئی ایک خبر سچی ہو جاتی ہے، اگر وہ ان قوانین کو مدنظر نہ رکھیں تو ہزار میں سے ایک خبر کا سچا ہونا بھی ممکن نہیں رہتا۔

''ان علم الغيب شرطه ان يكون مجردا عن المواد والو سائط الكونية''

بیشک علوم غیبیہ کیلئے شرط یہ ہے کہ وہ مادہ اور وسائط کونیہ سے (جو واسطے کسی چیز کو موجود کریں ان سے) سے خالی ہو۔

''وليس ذلك كالعلم بالوحي لانه غير مكتسب بل الله تعالى يختص به من يشاء''

علم جفر اور فلکیات وحی کی طرح نہیں۔ وحی سے علم غیب حاصل ہوتا ہے اس میں بندے کے کسب کو دخل نہیں بلکہ اللہ تعالی جسے چاہے خاص کر دے اور اپنے فضل سے بغیر کسب کے عطاء کر دے لیکن علم جفر اور علم فلکیات کو حاصل کرنا پڑتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ علم غیب موہبی (رب کی عطاء سے) ہے، اور علم جفر وفلکیات کسبی (انسان کے عمل سے حاصل ہوتا) ہے۔

''وكذا العلم بالالهام فانه لامادة له الا الموهوبة الالهية والمخة الازلية''

اسی طرح الہام کے ذریعے حاصل ہونے والا علم بھی کسی مادے کا محتاج نہیں، بلکہ صرف اللہ تعالی کی عطاء سے ہی حاصل ہوتا ہے۔

واضح ہوا کہ الہام کے ذریعے حاصل ہونے والے علم کے برابر بھی علم جفر اور علم فلکیات نہیں ہو سکتا۔

﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ ''اگر تم ایمان رکھتے ہو۔''

یعنی ہر معجزہ جو ذکر کیا گیا ہے، اس میں تمھارے لئے نشانی ہے لیکن اس نشانی سے تم نفع اسی وقت حاصل کر سکتے ہو جب تمہیں اللہ تعالی ایمان کی توفیق عطاء فرمائے، تم نبی کی تصدیق کرو، اور اللہ کے نبی کے لائے ہوئے احکام کی تصدیق کرو۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ کا جب معنی کیا جائے ''ان کنتم موفقین للایمان'' (اگر تمہیں ایمان کی توفیق حاصل ہو) تو اسے ''مجاز مشارفة'' کہا جاتا ہے، ایک لفظ کے لغوی معنی کے قریب دوسرا معنی لیا جائے جسے لغوی معنی کی مجاورت حاصل ہو۔ (ماخوذ از روح المعانی)

اعلی حضرت رحمہ اللہ اور روح البیان:

اعلی حضرت رحمہ اللہ نے ''ان فی ذلک لاية لكم'' کا ترجمہ کیا ہے ''ان باتوں میں تمھارے لئے بڑی نشانی ہے'' راقم نے بھی یہی ترجمہ نقل کیا ہے صرف لفظوں کی ترتیب کے مطابق ترجمہ کرنے کی وجہ سے اعلی حضرت رحمہ اللہ اور راقم کی ترتیب میں فرق ہے۔ اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ روح البیان سے منقول ہے

''(ان فی ذلک)ای ماذکر من الخوارق والامور العظام (لأية)عظيمة (لكم) دالة على صحة رسالتي دلالة واضحة. (روح البیان)

بیشک ان باتوں میں جو مذکور ہیں یعنی آپ کے معجزات اور بڑے بڑے امور میں بڑی نشانی ہے تمھارے لئے جو میری رسالت کے صحیح ہونے پر واضح طور پر دلالت کر رہی ہے۔

فائدہ: جالینوس (جو علم طب میں بہت بڑی مہارت رکھتا تھا) سے جب لوگوں نے حضرت عیسی علیہ السلام کے متعلق سوال کیا کہ وہ نبی ہیں یا طبیب ہیں تو اس نے جواب دیا۔

''المیت لایحی بالعلاج فان کان هو یحیی الموتی فهو نبی ولیس بطبیب''

کہ میت علاج سے زندہ نہیں ہو سکتا اگر وہ مردہ کو زندہ کرتے ہیں تو نبی ہیں، طبیب نہیں۔ (روح المعانی)

❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀

﴿وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰةِ وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُونِ﴾ (آیۃنمبر ۵۰)

(1) اور تصدیق کرتا آیا ہوں اپنے سے پہلے کتاب توراۃ کی اور اس لئے کہ حلال کروں تمہارے لئے کچھ وہ چیزیں جو تم پر حرام تھیں اور میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نشانی لایا ہوں تو اللہ سے ڈرو اور میرا حکم مانو۔

(2) اور تصدیق کرتے ہوئے اپنے سے پہلے کتاب توراۃ کی، اور تا کہ حلال کروں تمہارے لئے بعض وہ چیزیں جو حرام کی گئیں تم پر، اور لایا ہوں تمہارے پاس نشانی تمہارے رب کی طرف سے، تو اللہ سے ڈرو، اور میری اطاعت کرو۔

﴿وَمُصَدِّقًا﴾ کا تعلق ﴿قَدْ جِئْتُكُمْ﴾ محذوف سے ہے۔ اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے "اور تصدیق کرتا آیا ہوں" راقم نے ظاہر الفاظ کے مطابق ترجمہ پر اکتفاء کیا ہے۔

"لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰةِ" ای۔ لما تقدمنی التوراۃ ای موافقا علی ما کان قبلی" (روح البیان)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ روح البیان کی مذکورہ عبارت کے مطابق ہے، آپ کا ترجمہ پھر سے دیکھئے "اپنے سے پہلے کتاب توراۃ کی" راقم نے بھی اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ہی نقل کیا ہے، صرف ترتیب لفظی کا لحاظ کیا ہے۔

فائدہ: تمام انبیاء کرام ایک دوسرے کی تصدیق کرتے رہے۔ بلکہ انبیاء کرام پر ایک دوسرے کی تصدیق واجب تھی۔

" فلهذا قلنا بان عيسى عليه السلام يجب ان يكون مصدقا لموسى بالتوراة ولعل من جملة الاغراض فى بعثة عيسى عليه السلام تقرير التوراة وازالة شبهات المنكرين وتحريفات الجاهلين "

اسی وجہ سے ہم نے کہا ہے کہ بیشک عیسیٰ علیہ السلام پر واجب تھا کہ آپ موسیٰ علیہ السلام کی توراۃ کی تصدیق کریں عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کی وجہ یہ تھی کہ توراۃ کی تصدیق کی جائے، اور منکرین کے شبہات کو زائل کیا جائے اور جہلاء کی تحریفات کو زائل کیا جائے۔ (کبیر)

﴿وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ﴾

اور تا کہ حلال کروں بعض وہ چیزیں جو حرام کی گئیں تم پر۔

اس کا تعلق بھی " جئتکم " سے ہے کہ میں تمہارے پاس آیا ہوں تا کہ حلال کروں.......... الخ۔

اعتراض : ان دونوں عبارات میں تو بظاہر تعارض پایا گیا ہے۔ پہلے بیان ہوا کہ میں آیا ہوں تمہارے پاس اپنے سے پہلے کتاب کی تصدیق کرتے ہوئے۔ اس سے پتہ چلا کہ آپ نے توراۃ کے تمام احکام کو تسلیم کیا، اور ان پر عمل کیا۔ اور دوسرے الفاظ مبارکہ سے یہ سمجھ آ رہا ہے کہ میں آیا ہوں تمہارے پاس تا کہ توراۃ میں بعض حرام چیزوں کو حلال کروں۔

ان دونوں عبارات میں کیسے تطبیق پائی جائے گی کہ تعارض اٹھ جائے؟

جواب اول : انه لاتناقض بین الکلامین وذلک لان التصدیق بالتوراة لامعنی له الاالاعتقاد ان کل مافیها فهو حق وصواب .

دونوں کلاموں میں کوئی تناقض نہیں، اسلئے کہ توراۃ کی تصدیق کا صرف یہ مطلب تھا کہ توراۃ میں جن مسائل واحکام کو ذکر کیا گیا ہے، ان کے حق اور صواب ہونے کا ہمیں اعتقاد ہے۔

جواب دوم : جو احکام توراۃ میں تھے وہ عیسی علیہ السلام کو عطا نہیں کئے گئے لھذا انجیل میں جن چیزوں کو حلال کیا گیا، وہ باوجود اس کے کہ توراۃ میں حرام کی گئیں لیکن توراۃ کی تصدیق کے منافی نہیں۔

طلباء کرام تفسیر کبیر کی عبارت دیکھیں، شائد یہ جواب بھی صرف طلباء کرام ہی سمجھ سکیں۔

" واذلم یکن الثانی مذکورا فی التوراة لم یکن حکم عیسی بتحلیل ما کان محرما فیها مناقضا لکونه مصدقا بالتوراة "

جب ثانی یعنی حکم حلت توراۃ میں موجود ہی نہ تھا تو عیسی علیہ السلام کا توراۃ میں حرام اشیاء کو حلال کرنا توراۃ کی تصدیق کے مخالف نہیں۔

جواب سوم : وایضا اذا کانت البشارة بعیسی علیہ السلام موجودة فی التوراة لم یکن مجیء عیسی علیہ السلام وشرعه مناقضا للتوراة " جب عیسی علیہ السلام کے آنے کی بشارت توراۃ میں موجود تھی تو آپ کا تشریف لانا اور آپ کی شریعت توراۃ کے مخالف نہیں۔

بعض حلال چیزوں کو حرام کرنے کا کیا مطلب؟:

اس کے دو مطلب ہیں:

(۱) ایک یہ ہے کہ یہود کے اہل علم لوگوں نے اپنی طرف سے بعض چیزوں کو حرام کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیا تھا کہ ان اشیاء کو موسیٰ علیہ السلام نے حرام کیا تھا، اور توراۃ میں ان کی حرمت کا تذکرہ موجود ہے۔" فجاء عیسی علیہ السلام ورفعها وابطلها واعاد الامرالی ماکان فی زمن موسی علیہ السلام "تو عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے، آپ نے ان کی خود ساختہ حرمت کو اٹھا دیا، اور اسے باطل قرار دیا جو انہوں نے توراۃ اور موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کر رکھا تھا، اور آپ نے ان چیزوں کا تذکرہ اس طرح کیا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تھیں یعنی جو چیزیں موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں حلال تھیں لیکن آپ کے بعد یہود کے اہل علم نے حرام کر دی تھیں، عیسیٰ علیہ السلام نے آ کر ان کو حلال کر دیا۔

(۲) دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہود پر ان کی جنایت، سرکشی، حدود سے تجاوز کی وجہ سے بعض چیزوں کو ان پر بطور سزا حرام کر دیا تھا، جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ﴾ تو یہودیوں کے بڑے ظلم کے سبب ہم نے وہ بعض ستھری چیزیں کہ ان کیلئے حلال تھیں ان پر حرام فرما دیں۔

" وقال آخرون ان عیسی علیہ السلام رفع کثیرا من احکام التوراة ولم یکن ذلک قادحافی کونه مصدقا بالتوراة "

اور کچھ حضرات نے بیان کیا ہے کہ بیشک عیسیٰ علیہ السلام نے توراۃ کے کئی احکام کو ختم کیا ہے لیکن اس میں آپ کی توراۃ کی تصدیق میں کوئی عیب لازم نہیں آتا۔

آپ نے ہفتہ کا احترام ختم کر کے اتوار قائم کر دیا، لیکن سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھا، اسلئے آپ کا ہر عمل اور ہر حکم حق تھا، اصل وجہ یہ ہے "ان الناسخ والمنسوخ کلاهماحق وصدق" کہ ناسخ اور منسوخ دونوں ہی حق ہوتے ہیں۔ اسلئے کہ رب تعالیٰ کے حکم سے جب ایک کتاب کے احکام دوسری کتاب و شریعت میں منسوخ کر دئے گئے تو کسی کی کیا مجال ہے کہ وہ کسی کو حق کہے اور کسی کو باطل۔ (ماخوذ از کبیر)

عیسیٰ علیہ السلام کی حلال کی ہوئی کچھ اشیاء کا تذکرہ:

مچھلی کا گوشت اور اونٹوں کا گوشت جو موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں حرام تھے، وہ عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں حلال کر دئے

گئے۔اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَا اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَا اَوِ الْحَوَايَا اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ﴾

(سورۃ الانعام آیت نمبر ۱۴۶)

اور یہودیوں پر ہم نے حرام کیا ہر ناخن والا جانور، اور گائے اور بکری کی چربی مگر جو ان کی پیٹھ میں لگی ہو یا آنت یا ہڈی سے ملی ہو، ہم نے یہ ان کی سرکشی کا بدلہ دیا، اور بے شک ہم ضرور سچے ہیں۔ان اشیاء کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں حلال کر دیا گیا۔ (از روح البیان بوضاحت)

تنبیہ: " ولم یحل لهم القتل ولا السرقة ولا الفاحشة " حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک دوسرے کو قتل کرنا، اور چوری کرنا، اور بے حیائی کے اقوال افعال حلال نہیں کئے تھے۔ (قرطبی)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں نرمی:

روی عن قتادة انه قال جاء هم عیسی بالین مما جاء به موسی "صلی الله علیهما وعلی نبینا" لان موسی جاء هم بتحریم الابل واشیاء من الشحوم فجاء هم عیسی بتحلیل بعضها"

قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں عیسیٰ علیہ السلام نرم طبیعت رکھتے تھے، اس لئے آپ کو جو شریعت دی گئی وہ بنسبت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے نرم تھی، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں اونٹوں کا گوشت اور گائے اور بھیڑ بکری کی چربی حرام تھی لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں ان کو حلال کر دیا گیا۔

اعتراض: جلالین میں ذکر کیا گیا ہے "وقیل احل الجمیع بمعنی کل" اور بیان کیا گیا ہے کہ "بعض" بمعنی "کل" آتا رہتا ہے۔لھذا اب معنی یہ ہوگا "اور تا کہ میں حلال کروں تمام وہ چیزیں تمہارے لئے جو تم پر حرام تھیں" اس سے تو یہ لازم آئے گا کہ آپ نے قتل، چوری اور بے حیائی کو بھی حلال کیا ہوگا۔

جواب: "ان المراد جمیع ما طرأ تحریمه من اجل التشدید لا ما کان محرما بالاصالة" اس مراد وہ حرام چیزیں ہیں جو یہود کی بغاوت، سرکشی کی وجہ سے ان پر بطور شدت حرام کر دی گئی تھیں وہ تمام چیزیں مراد نہیں جو اصل میں ہی حرام تھیں۔ (صاوی)

"واستدلاله علی بعضا تاتی بمعنی کل بقول لبید لیس بصحیح"

لبید کے قول سے یہ دلیل پکڑنا ہی صحیح نہیں کہ لفظ بعض ''کل'' کے معنی میں آتا ہے۔ (البحر المحیط)

﴿وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ﴾

''اور میں لایا ہوں تمہارے پاس نشانی تمہارے رب کی طرف سے، تو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔''

پہلے توراۃ کی تصدیق کا ذکر کیا، پھر بعض چیزوں کے حلال کرنے کا ذکر کیا، اسی طرح پہلے معجزات کا ذکر کیا اور ان کے متعلق فرمایا ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ﴾ تو دوبارہ ﴿وَجِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

اس کو لوٹانے یعنی دوبارہ ذکر کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ انسان کی طبیعت کے مطابق جو کام ہو، اور اسے اس کام سے الفت ہو چکی ہے اور اس پر عرصہ بھی گذر چکا ہو، تو اس شخص کو اس کام سے ہٹانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس لئے پہلے معجزات کا ذکر کیا تا کہ کلام ان کے دلوں میں اثر انداز ہو جائے، تو پھر ان کو خوف دلایا، اور ارشاد فرمایا۔ ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ﴾ (تو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو) اسلئے کہ اللہ سے تقوی کیلئے لازم ہے کہ اللہ کے رسول کی اطاعت کی جائے۔

''فبین انه اذا لزمکم ان تتقوا اللہ لزمکم ان تطیعونی فیما آمرکم به عن ربی''

تو آپ نے یوں بیان فرمادیا کہ جب تم پر لازم ہے کہ تم اللہ سے ڈرو، یعنی تقوی کو لازم پکڑو، تو لازم ہے تم پر کہ جن کاموں کا میں تمہیں حکم دوں کہ یہ میرے رب کی طرف سے حکم آیا ہے تو اس میں میری اطاعت کرنا تم پر لازم ہے۔ (کبیر)

(وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ) ''شاهدة علی صحة رسالتی، وقریٔ بآیات'' اور میں تمہارے پاس نشانی لایا ہوں تمہارے رب کی طرف سے' جو میری رسالت کے صحیح ہونے پر وہ نشانیاں دلالت کر رہی ہیں، ایک قرات میں جمع کا صیغہ ''آیات'' آیا ہوا ہے۔

(فَاتَّقُوا اللّٰهَ) فی عدم قبولها و مخالفة مدلولها'' تو اللہ سے ڈرو' ان نشانیوں کو نہ قبول کرنے میں اور ان کے مطالب کی مخالفت میں۔

(وَاَطِیْعُوْنِ) فیما آمرکم به وانهاکم عنه بامر اللہ تعالی'' اور میری اطاعت کرو' ان احکام میں جن کا میں تمہیں حکم دیتا ہوں اللہ کے حکم سے، اور ان کاموں میں میری اطاعت کرو جن سے میں تمہیں روکتا ہوں اللہ کے حکم

ہے۔ (ابوالسعود)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

﴿ وَاَطِیۡعُوۡنِ﴾ نون کے نیچے کسرہ ہے، جو دلالت کر رہا ہے کہ اصل میں یہ لفظ ''اطیعونی'' ہے، یاء متکلم محذوف ہے، جس کے محذوف ہونے پر کسرہ دلالت کر رہا ہے، اسی لئے اس کا معنی ہے ''اور میری اطاعت کرو'' (راقم)

مقام توجه: اگر ﴿وَجِئۡتُکُمۡ بِاٰیَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ﴾ میں ''بآیة'' سے مراد معجزات ہو تو پھر تکرار ہے، لیکن خازن نے یوں بیان کیا ہے ﴿وَجِئۡتُکُمۡ بِاٰیَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ﴾ ای بحجة واضحة شاهدة علی صحة رسالتی ''میں تمہارے پاس نشانی لایا ہوں تمہارے رب کی طرف سے، یعنی واضح حجت لایا ہوں جو میری رسالت کے صحیح ہونے پر شاہد ہے اس صورت میں تکرار نہیں، بلکہ نیا معنی ہے۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ۝﴾ (آیۃ نمبر ۵۱)

(1) بیشک میرا تمہارا سب کا رب اللہ ہے تو اسی کو پوجو یہ ہے سیدھا راستہ۔

(2) بیشک اللہ میرا رب ہے اور تمہارا رب ہے، تو عبادت کرو اسی کی، یہ سیدھا راستہ ہے۔

ماقبل سے تعلق:

پہلے بیان کیا کہ ''اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، اب یہ بیان کیا ہے کہ میں جس چیز کی تمہیں دعوت دے رہا ہوں، وہ یہ ہے کہ میرا اور تمہارا رب ایک ہے، اس لئے تو اسی ذات کی عبادت کرو جو ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے وہی دعوت دی جو تمام رسول دیتے آئے۔ '' **لان جمیع الرسل کانوا علی دین واحد هو التوحید ولم یختلفوا فی الله تعالی**'' اسلئے کہ تمام رسول ایک چیز پر متفق رہے وہ ہے توحید باری تعالیٰ، اس میں تمام انبیاء کرام میں سے کسی ایک کا بھی اختلاف نہ تھا۔ (خازن)

عیسیٰ علیہ السلام کا یہ کہنا ﴿اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبُّكُمْ﴾ **اقرار بالعبودیة ونفی الربوبیة عن نفسه بخلاف مایزعم النصاری** '' کہ ''بیشک اللہ میرا اور تمہارا رب ہے'' یہ اپنے عبد ہونے کا اقرار ہے کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، میں رب نہیں، نصاریٰ کا آپ کے متعلق باطل گمان تھا کہ آپ رب ہیں۔ (مدارک)

اس سورۃ پاک میں نجران کے عیسائیوں کا نبی کریم ﷺ سے مناظرہ کرنا، اور ان کے اقوال باطلہ کا ذکر کیا جارہا ہے، اس آیہ کریمہ میں بھی ان کا مکمل طور پر رد کردیا گیا کہ بیشک اللہ تعالیٰ تو ایک ہے وہی جو میرا اور تمہارا رب ہے۔ میں تو اس کا بندہ ہوں۔ مجھے رب کہنے والے جھوٹے ہیں۔ ان کا قول باطل ہے، یہ ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے ان لوگوں کے باطل اقوال کا رد۔ (ماخوذ از خازن)

'' **هذا صراط مستقیم** '' **ای هذا الذی آمرکم به (صراط) طریق مستقیم فکذبوه ولم یؤمنوا به**'' (جلالین)

یعنی یہ راہ جس کا میں تمہیں حکم دیتا ہوں، یہی وہ سیدھی راہ ہے، لیکن انہوں نے آپ کی تکذیب کی اور ایمان نہ لایا۔ گویا کہ یہ واضح کردیا کہ یہی سیدھی راہ ہے اور دین قیم ہے، جس نے اس سے دلیل پکڑی وہ نجات پا گیا اور جو اس سے پھر گیا وہ ذلیل وخوار ہوا۔ (صاوی)

فائدہ جلیلہ: (اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبُّكُمْ) **اشاره الی استکمال القوة النظریة بالاعتقاد**

الحق الذی غایته التوحید" رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی (اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ) سے توحید حاصل ہو رہی ہے، لهذا اس سے اس طرف اشارہ ملتا ہے کہ حق کا اعتقاد رکھنا جس کی غایت توحید ہے، اس سے قوت نظریہ کی تکمیل حاصل ہوتی ہے۔

(فَاعْبُدُوْهُ) اشارة الی استکمال القوة العملیة فانه یلازم الطاعة التی هی الاتیان بالاوامر والا نتهاء بالنواهی " رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی (فَاعْبُدُوْهُ) سے عبادت کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جس سے اس طرف اشارہ پایا گیا ہے کہ عبادت سے ہی قوت عملیہ کی تکمیل حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ قوت عملیہ کیلئے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت ضروری ہے، اطاعت اس وقت حاصل ہوگی جبکہ اوامر (احکام) پر عمل کرے، اور جن کاموں سے اسے روکا گیا ہے ان سے رک جائے۔ جب قوت عملیہ اور قوت نظریہ دونوں پائی جائیں، یعنی حق کا اعتقاد پایا جائے اور کامل عمل اس پر تو اسی کو استقامت کہا جاتا ہے۔

اسی پر نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے 'قل آمنت ثم استقم " تم کہو میں ایمان لایا، پھر اس پر قائم رہو۔" فالعلم والعمل من مبادی الاستقامة فعلیک بالتمسک بالحجة القویة "علم اور عمل استقامت کے مبادیات ہیں، تم پر لازم ہے کہ قوی دلائل سے ان کو لازم پکڑو۔ (روح البیان)

رب تعالیٰ کے قرب کے لئے حضرت جنید رحمہ اللہ کا ارشاد:

حضرت جنید رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ کس طرح انسان سب چیزوں سے ہٹ کر اللہ تعالیٰ کا قرب اختیار کر سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا سچے دل سے توبہ کرے، پھر خوف ورجاء (خوف اور امید) کے درمیان رہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا مختلف اوقات میں ذکر کرے، پھر اپنے نفس کی توہین کرے، یعنی اپنے نفس کی ہر تمنا پوری نہ کرے، بلکہ اپنے نفس کو یہ بتائے کہ موت قریب ہے اور امیدیں دور ہیں۔

" قیل له فیماذایصل العبد الی هذا؟فقال بقلب مفرد فیه توحید مجرد"

آپ سے پوچھا گیا کہ انسان جب اس مقام پر پہنچ گیا، تو کیا حاصل ہوا؟ آپ نے فرمایا کہ اس وقت اسکا دل تمام چیزوں سے ہٹ جائے گا، منفرد ہوگا، اور اسے خالص توحید حاصل ہوگی۔ (روح البیان)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جنت کے حاصل کرنے کے حاصل کرنے کیلئے عبادات میں کامل عمل کرنا ضروری ہے، اور پھر ان پر قائم رہنا ضروری ہے، اسی لئے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوا

رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَ لَا تَحۡزَنُوۡا وَ اَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ ﴿ (بیشک) وہ جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے، پھر اس پر قائم رہے، ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو، اور خوشی ہو اس جنت پر جس کا تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے۔ استقامت صرف علم والے اور تقوی والے بزرگوں کو حاصل ہوتی ہے، کیونکہ عادات اور رسم اور ذہن وضمیر راسخ چیزوں کو چھوڑنا بہت مشکل کام ہے، یہ ہر انسان کو حاصل نہیں۔ ارشاد مصطفوی ﷺ اس پر واضح دلیل ہے، آپ فرماتے ہیں

" لایکونن احدکم کالعبد السوء ان خاف عمل ولا کالا جیر السوء ان لم یعط لم یعمل "

تم میں سے کوئی اس برے غلام کی طرح نہ ہو جسے ڈر ہو تو کام کرے، اور نہ ہی اس گھٹیا مزدور کی طرح بنو کہ اسے مال نہ دیا جائے تو وہ کام نہ کرے۔ یعنی نہ جنت کو دیکھو، نہ دوزخ کو صرف رب تعالی کی رضاء کیلئے اچھے کام کرو، اور برے کاموں سے رک جاؤ۔

"فاذا جرد عمله وتوحیده عن الاغراض فقد استقام واتخذ الصراط المستقیم مذهبا"

جب انسان کا عمل اور توحید باری تعالی پر اعتقاد اغراض سے دور رہا تو اسے استقامت حاصل ہوگئی۔ وہ "صراط مستقیم" پر چلنے والا ہوا۔

" فعلیک بخدمة الکاملین والاستقامة فی طریق الیقین " تجھ پر لازم ہے کہ کاملین کی خدمت کر، اور راہ یقین پر قائم رہ۔

زخود بہتری جوی وفرصت شمار — کہ باچوں خودی کم کنی روزگار

اپنے آپ سے بہتر تلاش کر، فرصت کو غنیمت شمار، اس طرح اپنی خودی کو زمانہ میں کم کر کے کامیاب ہو جا۔

اسی وجہ سے عیسی علیہ السلام نے فرمایا "فاتقوا الله واطیعون " اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ " فاذا داوم العبد الاتباع یصل الی الاستقامة " جب بندہ اتباع پر ہمیشگی اختیار کرتا ہے تو اسے استقامت حاصل ہو جاتی ہے۔ علامہ جلال الدین رومی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

سالہا باید کہ اندر آفتاب — لعل یابد رنگ درخشانی وتاب

کئی سال سورج میں رہنے سے لعل رنگ، چمک اور تابندگی حاصل کرتا ہے۔ (ماخوذ از روح البیان)

❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀

﴿فَلَمَّا اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْھُمُ الْکُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَاشْھَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ٥﴾ (آیۃنمبر ۵۲)

(1) پھر جب عیسی علیہ السلام نے ان سے کفر پایا بولا کون میرے مددگار ہوتے ہیں۔اللہ کی طرف،حواریوں نے کہا ہم دین خدا کے مددگار ہیں،ہم اللہ پر ایمان لائے اور آپ گواہ ہو جائیں کہ ہم مسلمان ہیں۔

(2) پھر جب محسوس کیا عیسی علیہ السلام نے ان سے کفر،کہا کون ہیں میرے مددگار اللہ کی طرف ؟ کہا حواریوں نے ہم مددگار ہیں اللہ کے دین کے،ہم ایمان لائے اللہ پر،اور آپ گواہ ہو جائیں کہ ہم مسلمان ہیں۔

جب حضرت عیسی علیہ السلام نے اپنے حکیمانہ کلام اور اپنے معجزات اس قوم کے سامنے پیش کئے تو انہوں نے بجائے اطاعت کے ان کے قتل کرنے کی تدبیر کی لھذا عیسی علیہ السلام نے انکے اس ارادہ اور پختہ کفر کو علامات سے محسوس فرمایا تو اپنے متبعین سے خطاب کیا کہ فی سبیل اللہ میرا مددگار کون ہے؟ انکے خاص دوستوں نے کہا ہم اللہ تعالی کے دین کے مددگار ہیں،اے عیسی علیہ السلام ہم آپ کی ضرور مدد کریں گے،اس مدد پر کوئی دینوی اجرت نہیں مانگتے اور نہ ہی اس کے بدلہ میں کوئی اور چیز مانگتے ہیں صرف خواہش یہ ہے کہ آپ قیامت کے دن ہماری اطاعت اور فرمانبرداری اور ہمارے مسلمان ہونے کی گواہی دیں۔ (از نعیمی)

﴿فَلَمَّا اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْھُمُ الْکُفْرَ﴾ ''پھر جب محسوس کیا عیسی نے ان سے کفر''

''احساس'' کا لغوی معنی یہ ہے''کسی چیز کو حواس کے ذریعے پانا''اب بظاہر اس پر وہم یہ ہوتا ہے کہ کفر تو دل کے اعتقاد کفریہ کو کہا جاتا،اس کا حواس ظاہرہ سے تعلق نہیں تو ﴿فَلَمَّا اَحَسَّ﴾ کیسے کہا گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے یہاں اس لفظ کے استعمال کی دو وجہ ہو سکتی ہیں۔

(۱) ان میں سے ایک یہ کہ لفظ اپنے ظاہری معنی میں استعمال ہو اور مطلب یہ ہے''وھوانھم تکلموا بالکفر فاحس ذلک باذنہ'' کہ انہوں نے کفر یہ کلام کیا جس کو آپ نے اپنے کانوں سے سنا،اس

طرح حاسہ سے کفر کا پانا ثابت ہو گیا۔

(۲) اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں یہ تاویل کی جائے کہ مراد یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے جب ان کا کفر پر قائم رہنا پا لیا، اور آپ کو جب یہ پتہ چل گیا کہ یہ میرے قتل کا پختہ ارادہ کر چکے ہیں تو آپ کے اس علم جس میں کوئی شبہ نہیں تھا اس علم کی طرح قرار دیا جو حواس کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، "لاجرم عبر ذلک العلم بالا حساس" یقیناً اس علم کو احساس سے تعبیر فرمادیا۔ (کبیر)

اس مقام پر مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے بہت خوب وجہ بیان کی جو راقم کو بہت پسند آئی، آپ بھی دیکھئے آپ کیا خوب ذکر فرماتے ہیں۔ "قوی تر یہ ہے کہ "احس" بالکل ظاہری معنی میں ہو، اگرچہ کفر و ایمان محبت و بغض محسوس چیزیں نہیں اور قیامت میں تو ہر شخص اپنے اعمال کو مختلف شکلوں میں دیکھے گا یہ ہی اعمال تولے جائیں گے۔ (نعیمی)

ان کے کفر کو محسوس کرنے کی چند وجوہ:

(۱) جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا آپ نے ان کو اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت دی وہ سرکش اور نافرمان ہو گئے تو آپ نے ان سے مخفی رہنے کا فیصلہ فرمایا تا کہ وہ کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں، آپ کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا مکہ مکرمہ میں حال تھا کہ آپ کفار کے خوف سے ابتداء میں مخفی طور پر نمازیں ادا فرماتے رہے۔ عیسیٰ علیہ السلام اپنی والدہ کے ساتھ وہاں سے چلے گئے تا کہ کچھ دیر کیلئے ان سے کنارہ کش ہو جائیں، تو آپ نے ایک بستی میں ایک شخص کے پاس قیام کیا، اس نے بہت اچھی طرح مہمان نوازی کی، اس شہر کا بادشاہ بہت بڑا ظالم تھا، ایک دن وہ شخص جو آپ کا مہمان نواز تھا غمگین تھا، آپ نے اس سے پوچھا تم اتنے پریشان اور غمگین کیوں ہو؟

اس نے کہا اس شہر کا بادشاہ بڑا ظالم ہے اور اس کی عادت ہے کہ وہ ہم میں سے ہر شخص پر باری باری دعوت کو لازم کر دیتا ہے کہ اس کی اور اس کے لشکر کی دعوت کرے، انہیں کھانا کھلائے اور شراب پلائے، آج میری باری ہے اور میرے پاس اتنا مال نہیں کہ میں اس دعوت کا انتظام کر سکوں۔ جب حضرت مریم علیہا السلام نے سنا تو آپ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہا اے اللہ تعالیٰ کے نبی اس کیلئے دعا کرو تا کہ اس کی مشکل حل ہو جائے، آپ نے کہا اے میری امی اگر میں نے اس کیلئے دعاء کر دی تو اس میں فتنہ برپا ہو جائے گا، لیکن حضرت مریم علیہا السلام نے کہا اس شخص نے ہماری بہت عزت کی، بہت احسان و اکرام کیا اس پر بھی احسان ہونا چاہئے۔ والدہ کے ارشاد و اصرار پر آپ نے اسے

کہا کہ جب بادشاہ اوراس کے لشکر کے آنے کا وقت قریب ہو جائے تو ہنڈیا اور مٹکے پانی سے بھر لینا اور مجھے مطلع کرنا۔

جب اس شخص نے آپ کے ارشاد پر عمل کرلیا تو آپ نے اللہ تعالی سے دعاء کی، جتنی ہنڈیا پانی سے بھری تھیں سب میں پکا ہوا گوشت ہو گیا اور سب پانی سے بھرے ہوئے مٹکے شراب سے بھر گئے۔ جب وہ بادشاہ اور اس کے لشکری آئے تو انہوں نے کھانا کھایا اور شراب پی تو اس شراب کو عام شہریوں سے مختلف لذت والا پا کر سوال کیا کہ شراب تم کہاں سے لائے؟ پہلے تو اس شخص نے ٹال مٹول سے کام لیا لیکن بادشاہ کے زیادہ مجبور کرنے پر اس نے بتا دیا، بادشاہ کا ایک بیٹا چند دن پہلے مر گیا تھا اس نے خیال کیا کہ جس شخص کی دعاء سے اللہ تعالی پانی کو شراب بنا دیتا ہے، اس کی دعاء سے اللہ تعالی میرے بیٹے کو بھی زندہ کردے گا۔ اس نے عیسی علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ دعاء کریں تا کہ اللہ تعالی میرے بیٹے کو زندہ کردے۔

عیسی علیہ السلام نے فرمایا کہ ایسا نہیں کرتے کیونکہ اگر وہ زندہ ہو گیا تو اس پر فتنہ برپا ہو جائے گا۔ اس بادشاہ نے کہا جب میرا بیٹا نظر آجائے گا تو مجھے کسی چیز کی پرواہ نہیں ہوگی۔ اور جب تم میرے بیٹے کو زندہ کردو گے تو میں تمہیں ہر قسم کی آزادی دے دوں گا تم جو چاہو وہی کرو، تم سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی، عیسی علیہ السلام نے اللہ تعالی سے دعا کی تو اس کا لڑکا زندہ ہو گیا، جب اس کی بادشاہی کے لوگوں کو پتہ چلا کہ اس کا لڑکا زندہ ہو گیا تو وہ فوراً اپنے اپنے ہتھیار لے کر آ گئے اور انہوں نے اسے قتل کردیا۔ عیسی علیہ السلام کی جب زیادہ شہرت ہونے لگی تو یہود نے حسد کرنا شروع کردیا، آپ کے نسب میں طعنہ زنی شروع کردی، اور آپ کو قتل کرنے کی سازشیں کرنے لگے، تو آپ نے ان کے کفر کو محسوس کیا۔

(۲) عیسی علیہ السلام کی تشریف آوری کی بشارت توراۃ میں رب تعالی نے دے دی تھی، اس لئے یہود کو معلوم تھا کہ انہوں نے توراۃ کے کئی احکام منسوخ کردیے ہیں، اس لیئے پہلے انہوں نے آپ کے نسب پر طعنہ زنی شروع کی پھر آپ کے قتل کے منصوبے بنانے لگے یعنی آپ نے جب دین حق کی دعوت دینی شروع کی تو یہود کا غیظ وغضب بڑھ گیا اور آپ کو ایذاء پہنچائی اور وحشت پھیلانی شروع کی اور آپ کو قتل کرنے کی کوشش کی، تو آپ کو ان کے کفر کا پتہ چل گیا۔ (کبیر)

﴿قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰهِ﴾ ''کہا کون ہیں میرے مددگار اللہ کی طرف''۔

عیسی علیہ السلام نے گمان کیا کہ آپ نے قوم کو دعوت ایمان دی ہے، لیکن وہ ایمان نہیں لائیں گے، اور میری دعوت ایمان کا انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا، تو آپ نے پسند فرمایا کہ ان کا امتحان لے لیں تا کہ آپ کے ذہن میں جو

بات آئی ہے اس کی تحقیق ہو جائے ،تو آپ نے فرمایا ﴿مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰهِ﴾ کون میرے مددگار اللہ کی طرف ؟ تو اس کا جواب صرف حواریین نے دیا کہ ہم اللہ کے دین کے مددگار ہیں ،تو آپ کو محسوس ہو گیا کہ سوائے حواریین کے سب کافر ہیں ۔انکار دین پر ان کا اصرار ہے،اور آپ کے قتل کرنے کے وہ منصوبے بنا رہے ہیں ۔ (کبیر)

اس سے امداد طلب کرنے کی ایک وجہ کا بھی پتہ چل گیا ،اور ان کے کفر کا ظاہر ہونے ،اور آپ کو پتہ چل جانے کی تیسری وجہ بھی معلوم ہوگئی۔

حواریین کون تھے : حواریون جمع ہے حواری کی عام طور پر کہا جاتا ہے ''فلاں حواری فلاں '' فلاں شخص فلاں کے مددگاروں اور دوستوں میں سے خاص ہے۔خیال رہے کہ بظاہر وہم ہوتا ہے ''حواری'' جمع ہے ''کراسی'' کی طرح لیکن ایسا نہیں ''**بل هو مفرد منصرف كما صرح به المحققون**'' بلکہ وہ مفرد منصرف ہے جیسا کہ محققین نے وضاحت کی ہے۔

حواری کے معانی:

حواری سفید ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔گھروں میں باپردہ رہنے والی سورج کی گرمی سے بچنے والی عورتوں کو بھی حواریات کہا جاتا ہے۔ان کو بھی حواریات کہنے کی اصل وجہ تو یہی نظر آتی ہے کہ سورج کی گرمی اور باہر کے راستوں کی گرد وغبار سے بچنے والی عورتوں کا رنگ صاف ہوتا ہے ،اس لئے ان کو حواریات کہا جاتا ہے۔اسی وجہ سے دھوبی کو بھی حواری کہا جاتا ہے کہ وہ کپڑوں کو سفید کرتا ہے۔

عیسی علیہ السلام کے حواریین کی وجہ تسمیہ:

عیسی علیہ السلام کے حواریون کو حواریین کہنے کی وجہ میں مختلف اقوال ہیں ۔وہ سفید کپڑے پہنتے تھے اس لئے ان کو حواریین کہا گیا **یا** وہ دھوبی تھے لوگوں کے کپڑے سفید کرتے تھے اس لئے ان کو حواریین کہا گیا **یا** ان کے دل صاف اور اخلاق پاکیزہ تھے اس لیے ان کا یہ نام ہوا۔

وہ لوگ کیا کام کرتے تھے:

اس میں بھی مختلف اقوال ہیں ۔ایک یہ کہ وہ مچھلی کا شکار کرتے تھے ،ان میں یعقوب ،شمعون ،اور یوحنا نامی

آدمی تھے، عیسی علیہ السلام ان کے قریب سے گذرے تو انہیں کہا تم مچھلی کا شکار کرتے ہو۔ فان اتبعتمونی صرتم بحیث تصیدون الناس بالحیاۃ الابدیۃ" اگر تم میری تابعداری کرو تو ہمیشہ لوگوں کا شکار کرو گے، یعنی مجھ پر ایمان لاؤ تو تمہیں حیات جاودانی حاصل ہوگی، لوگ خود بخود تمہاری تابعداری کریں گے، تمہارے احکام پر چلیں گے، گویا وہ تمہارے شکار ہوں گے، انہوں نے آپ سے پوچھا تم کون ہو؟ آپ نے فرمایا "عیسی ابن مریم اللہ تعالی کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ ان لوگوں نے آپ سے معجزہ طلب کیا، آپ نے شمعون کو پانی میں جال ڈالنے کیلئے کہا، جب اس نے جال ڈالا تو اتنی مچھلیاں نکلیں کہ دو کشتیاں بھر گئیں، حالانکہ اس سے پہلے وہ اپنی کوشش کر چکا تھا کئی مرتبہ جال ڈالنے پر کوئی مچھلی نہیں نکلی تھی۔

عیسی علیہ السلام کے اس معجزہ کو دیکھ وہ لوگ ایمان لے آئے، اس وقت وہاں جتنے لوگ تھے بارہ یا انتیس سب ہی ایمان لے آئے، یہ جب بھوکے ہوتے تو کہتے اے روح اللہ ہم بھوکے ہیں تو عیسی علیہ السلام اپنا ہاتھ زمین پر مارتے ہر ایک کو دو دو روٹیاں نکال دیتے، جب وہ پیاسے ہوتے تو پیاس کی شکایت کرتے تو آپ زمین پر ہاتھ مار کر ہر ایک کو پانی نکال دیتے تو وہ پانی پی لیتے۔ وہ کہنے لگے ہم سے افضل کون ہوگا؟ جب ہم طعام طلب کرتے ہیں تو آپ طعام کھلا دیتے ہیں، اور جب ہم پانی طلب کرتے ہیں تو ہمیں پانی پلا دیتے ہیں، تحقیق ہم آپ پر ایمان لا چکے ہیں۔ عیسی علیہ السلام نے فرمایا "افضل منکم من یعمل بیدہ و یاکل من کسبہ" تم میں سے افضل وہ ہے جو اپنے ہاتھوں سے کام کرے اور اس سے حاصل کردہ مال کھائے۔ آپ کے اس ارشاد کے بعد انہوں نے محنت و مزدوری شروع کردی وہ لوگوں کے کپڑے دھوتے تھے اور اس کی حاصل شدہ مزدوری کو ہی اپنا خرچ بناتے، حواریین کے متعلق ایک قول یہ بھی ہے کہ بادشاہ نے ایک مرتبہ لوگوں کی دعوت کی، طعام تیار ہو گیا تقسیم کے وقت ایک پیالے پر حضرت عیسی علیہ السلام مقرر ہوئے، آپ نے تقسیم کرنا شروع کیا ایک پیالہ سب لوگوں سے ختم نہ ہو سکا، بادشاہ نے جب آپ کے معجزہ کو دیکھا تو اس نے اپنی بادشاہت چھوڑ دی آپ کی تابعداری اختیار کر لی، بادشاہ کے کچھ قریبی لوگ بھی اس کے ساتھ عیسی علیہ السلام کے تابع ہو گئے، ان ہی لوگوں کو حواریین کہا جاتا ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ آپ کی والدہ نے آپ کو ایک کپڑے رنگنے والے شخص کے پاس چھوڑا کہ یہ کپڑے رنگنا سیکھ جائیں وہ آپ کو جب بھی کوئی اپنے فن کی بات بتانا چاہتا تو وہ آپ پہلے جانتے ہوتے، ایک دن وہ شخص کسی کام کو جانے لگا تو آپ کو کہا کہ یہ کپڑے ہیں ہر ایک پر میں نے نشان لگا دیا ہے اس کے مطابق تم کپڑے رنگ دینا وہ چلا گیا تو آپ نے تمام رنگ ایک برتن میں ڈال کر پکائے، اور اسی برتن میں تمام کپڑے بھی ڈال دیئے۔ اور کپڑوں سے

مخاطب ہو کر کہا ''کونوا باذن اللہ کما ارید'' تم اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایسے ہو جاؤ جیسے میں چاہتا ہوں۔
جب وہ شخص واپس آیا تو اس نے پوچھا کیا تم نے کپڑے رنگ دیئے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں میں نے سب رنگے اور سب کپڑے ایک برتن میں ڈال دیئے ہیں، رنگے جا چکے ہیں، آپ نکال لیں، اس نے جب یہ سنا تو کہنے لگا تم نے کپڑے برباد کر دیئے ہیں۔ آپ نے فرمایا اٹھ کر دیکھو تو شائد صحیح رنگے ہوں، اس نے جب کپڑے نکالنا شروع کیے تو وہ اسی طرح رنگے ہوئے تھے جیسے اس نے نشان لگائے تھے کوئی سرخ کوئی زرد اور کوئی سبز رنگ تھا، یہ ماجرا دیکھ کر وہاں سب حاضرین متعجب ہوئے اور سب نے ایمان قبول کر لیا، ان لوگوں کو ہی حواریین کہا جاتا ہے۔ ان تمام اقوال کے متعلق قفال کی رائے یہ ہے کہ ان اقوال میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ ان میں سے بعض بادشاہ اور اس کے قریبی تھے، اور کچھ شکاری تھے، کچھ کپڑے رنگنے والے۔ اور کچھ دھوبی تھے۔ ان تمام کو حواریین کہا گیا کیونکہ وہ تمام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مددگار تھے، اور ان کے ساتھ محبت کرنے والے اور ان کی اطاعت میں مخلص تھے۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہاں مجازی معنی لینا زیادہ مناسب ہے کہ آپ کے جتنے لوگ بھی معاون تھے اور خلوص سے آپ کے ساتھ محبت کرنے والے تھے وہ تمام حواریین تھے۔ (روح المعانی ج ۲ ص ۱۷۶)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

﴿مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ﴾ میں چند وجوہ بیان کی گئی ہیں:

(۱) ''الاول التقدیر من انصاری حال ذھابی اللہ او حال التجائی الی اللہ''

ان میں سے پہلی وجہ یہ بیان کی گئی کہ ان الفاظ مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے کہ میرے اللہ تعالیٰ کی طرف جاتے ہوئے میرا مددگار کون ہے؟ یا یوں معنی ہوگا ''کہ اللہ کی طرف میری التجاء میں میرا مددگار کون ہے؟

(۲) ''والثانی التقدیر من انصاری الی ان ابین امر اللہ تعالیٰ والی ان اظھر دینہ''

ان میں سے دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ کہ میرا مددگار کون ہوگا اس وقت تک کہ میں بیان کروں اللہ تعالیٰ کے امر کو اور یہ کہ میں ظاہر کروں اللہ کے دین کو۔

''ویکون الی ھھنا غایۃ کانہ اراد من یثبت علی نصرتی الی ان تتم دعوتی ویظھر امر اللہ تعالیٰ''

''الی'' اس مقام میں اس معنی مذکور کے لحاظ سے ''غایۃ'' کیلئے استعمال ہے، یعنی کون ہے جو میرا مددگار رہو گا جس کی امداد میری اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت کی تکمیل تک جاری رہے گی۔ اور اللہ تعالیٰ کے امر یعنی اللہ تعالیٰ کے دین کے ظاہرو

غالب ہونے تک اس کی امداد رہے گی۔

(۳) "والثالث قال الا کثر ون من اهل اللغة الی ههنا بمعنی مع "

ان وجوہ میں تیسری وجہ یہ ہے کہ "الی" اس مقام میں "مع" کے معنی میں استعمال ہے، لیکن اس قول کو زجاج نحوی نے رد کیا ہے کہ "الی" کو "مع" کے معنی میں استعمال کرنا درست نہیں، کیونکہ "الی" "غایۃ" کیلئے استعمال ہوتا ہے، اور "مع" کا مطلب ہوتا ہے ایک چیز کو دوسری چیز سے ملانا، لیکن زجاج کے قول دوسرے نحویوں نے رد کر دیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَلَا تَأْكُلُوْا اَمْوَالَهُمْ اِلٰى اَمْوَالِكُمْ﴾ میں "الی" بمعنی مع کے استعمال ہے، کیونکہ اس کا معنی یہ ہے اور نہ کھاؤ ان (یتامی) کے مالوں کو اپنے مالوں کے ساتھ ملا کر۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ نے فرمایا "الذود الی الذود ابل" اس میں بھی "الی" بمعنی "مع" کے استعمال ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ "ذود ذود" سے مل کر "ابل" ہے۔ یعنی "ابل" کا لفظ واحد اونٹ پر بھی بولا جاتا ہے، اور جمع پر بھی۔

(۴) "والرابع ان یکون المعنی من انصاری فیما یکون قربة الی الله ووسیلة الیه"

ان وجوہ میں سے چوتھی وجہ یہ ہے کہ میرا مددگار کون ہے کہ اس کی مدد قربت الٰہی بن سکے اور اس کی طرف وسیلہ بن سکے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ جب قربانی کرتے تو یہ پڑھتے "اللهم منک والیک" اے اللہ یہ تیری توفیق سے ہے اور تیرے قرب کا ذریعہ ہے۔

اس لئے مطلب یہ ہو گیا "من انصاری فیما یکون قربة الی الله" میرے مددگار کون ہیں، جن کو مدد قربت الٰہی کا ذریعہ ہے۔ اسی طرح کوئی شخص دوسرے کے قرب کی دعاء کرتا ہے تو کہتا ہے "اللهم ایاه الی" اے اللہ اسے میرے قریب کر دے۔

(۵) "الخامس ان یکون "الی" بمعنی اللام کانه قال من انصاری لله"

ان وجوہ میں سے پانچویں وجہ یہ ہے کہ "الی" بمعنی لام کے استعمال ہو، معنی یہ ہو کہ کون ہیں جو میری امداد کریں اللہ کیلئے۔

(۶) "والسادس تقدیر الآیة من انصاری فی سبیل الله، والی بمعنی فی جائز وهذا قول الحسن"

ان میں وجوہ میں چھٹی وجہ جو حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے بیان فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ اس مقام میں "الی" بمعنی "فی" استعمال ہے۔ "الی" بمعنی "فی" استعمال ہوتا رہتا ہے۔ اس لحاظ پر معنی یہ ہوگا "کون ہیں جو اللہ کی راہ میں میرے مددگار رہوں گے" (ماخوذ از کبیر)

﴿قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ﴾ ''کہا حواریون ہم مددگار ہیں اللہ کے دین کے''

'' نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ''ای نحن انصار دین اللہ وانصار انبیائه''لان نصرة اللہ تعالی فی الحقیقة محال فالمراد منه ماذکرناہ''

﴿نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ﴾ کا معنی یہ ہے کہ''ہم مددگار ہیں اللہ کے دین کے''اور ہم مددگار ہیں اللہ کے انبیاء کے، کیونکہ یہ معنی درست نہیں کہ''ہم اللہ کے مددگار ہیں'' کیونکہ اللہ تعالی کی مدد کرنا حقیقت میں محال ہے۔ (کبیر)

علامہ رازی رحمہ اللہ کی اس بحث کے بعد راقم کی'' **تسکین الجنان فی محاسن کنزالایمان**'' کو دیکھیں۔

﴿نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ﴾

''ہم ہیں مدد کرنے والے اللہ کی''	(محمود الحسن صاحب)
''ہم اللہ کے مددگار ہیں''	(مودودی صاحب)
''ہم ہیں اللہ کے مددگار''	(عبدالماجد صاحب)
''ہم ہیں مدد کرنے والے اللہ کی''	(شاہ عبدالقادر صاحب)
''کہ ہم ہیں مدد دینے والے اللہ کی''	(شاہ رفیع الدین صاحب)
''ہم اللہ کے دین کے مددگار ہیں''	(اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ)

یہاں ذکر کیا جارہا ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام نے اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ﴿مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰهِ﴾ کون شخص ہے جو اللہ کے دین میں میری مدد کرے گا؟ تو آپ کے حواریون نے کہا ﴿نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ﴾ ہم اللہ کے دین کی مدد کریں گے۔

اب اس مفہوم کو ان الفاظ سے ادا کرنا کہ''ہم ہیں اللہ کی مدد کرنے والے'' یہ بظاہر بہت بڑی غلطی کا عام آدمی کیلئے سبب بن جاتا ہے، کیونکہ عام لوگ صرف ترجمہ کو دیکھ کر خود بخود مطالب حاصل کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں، جو یقیناً اس سے یہ مطلب حاصل کریں گے کہ اللہ تعالی بھی مدد کا محتاج ہے لیکن جب یہ ترجمہ کیا جائے''ہم دین خدا کے مددگار ہیں'' تو اس میں یہ وہم نہیں ہوتا بلکہ مطلب صاف واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام نے اپنی قوم کو

دین خدا کے پھیلانے میں مدد کرنے کا ارشاد فرمایا اور اسی کا انہوں نے جواب دیا کہ ''ہم دین خدا کے مددگار ہیں'' اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی کے ترجمہ کو تفاسیر بھی واضح کرتی ہیں:

(نحن انصار الله)اعوان دينه" (مدارک)

''ہم اس کے دین کے مددگار ہیں'' بعینہ ان الفاظ سے ہی جلالین میں تفسیر کی گئی ہے (دوسری تفاسیر میں بھی اسی طرح بیان کیا گیا ہے) (تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان ص ۸۲)

﴿اٰمَنَّا بِاللّٰهِ﴾ ''ہم ایمان لائے اللہ پر''

حواریین کا یہ قول علت کے درجے میں ہے، یعنی ہم پر واجب ہے کہ ہم اللہ کے دین کے مددگار ہیں کیونکہ ہم اللہ پر ایمان لے آئے ہیں۔

"فان الايمان بالله يوجب نصرة دين الله والذب عن اوليائه والمحاربة معن اعدائه"

بیشک اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا واجب کرتا ہے کہ اس کے دین کی امداد واجب ہے، اور اس کے ولیوں کی اور اس کے نبیوں کی امداد کی جائے اور ان کے دشمنوں کے ساتھ لڑائی کی جائے۔

﴿وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾ ''اور آپ گواہ ہو جائیں کہ ہم مسلمان ہیں''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انہوں نے اپنے مسلم ہونے پر گواہ بنایا، اور اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے گواہ ہونے کو لکھ لینے کی درخواست کی جس کا ذکر آنے والی آیۃ میں آ رہا ہے۔ اسلام کا کون سا معنی معتبر ہے؟ اس میں دو قول ہیں:

ایک قول یہ ہے کہ یہاں لغوی معنی معتبر ہے، یعنی مطلب یہ ہے کہ آپ گواہ بن جائیں کہ جو آپ ہم سے چاہتے ہیں کہ ہم آپ کے مددگا بن جائیں، ہم اس میں آپ کے مطیع وفرمانبردار ہیں، اور آپ کے دشمنوں کا آپ سے دفاع کریں گے ''ان مستسلمون لامر الله تعالى'' ہم اللہ تعالیٰ کے حکم کے فرمانبردار ہیں۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ ان کے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ آپ گواہ بن جائیں کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا دین اسلام ہے، اور یہی تمام انبیاء کرام کا دین ہے۔ (کبیر)

راقم کا اس میں مؤقف یہ ہے کہ انہوں نے آپ کو گواہ بنایا کہ آپ گواہ بن جائیں کہ ہم نے ایمان لایا ہے اور آپ کی اطاعت کرتے ہیں اس میں جو آپ نے امداد کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ اس طرح دونوں معنی مراد ہوں

گے، علیحدہ علیحدہ اقوال مراد لینے کی ضرورت در پیش نہیں آئے گی۔

اعتراض: حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر جہاد فرض ہی نہیں تھا تو آپ کا حواریین سے امداد طلب کرنے کا کیا مطلب ہے؟

جواب: آپ نے ان لوگوں سے جہاد کرنے کا مطالبہ نہیں کیا کہ تم نے مجھ پر ایمان لایا ہے تو میرے ساتھ یہ معاہدہ بھی کرو کہ تم جہاد میں شریک ہو گے، بلکہ آپ کا امداد طلب کرنے میں مقصد یہ تھا:

"انه علیہ السلام لما علم ان الیهود یریدون قتله استنصر لحمایة منهم کما قاله الحسن ومجاهد"

آپ کو جب یہ پتہ چلا کہ یہود آپ کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو آپ نے حواریین سے اپنی حفاظت کیلئے امداد طلب کی، اس میں عام قتال کی بات نہیں تھی، حضرت حسن اور مجاہد نے یہی بیان کیا ہے۔ (روح المعانی)

فائدہ: "حواری" کا معنی جو پہلے بیان کیا ہے "ناصر و مخلص" اسی معنی کا لحاظ کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"عن جابر عبدالله قال ندب النبی ﷺ یوم الخندق فانتدب الزبیر ثم ندبهم فانتدب الزبیر ثم ندبهم فانتدب الزبیر فقال النبی ﷺ ان لکل نبی حواریا وحواری الزبیر" "رواہ البخاری ومسلم"

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے خندق کے دن امداد کیلئے طلب کیا تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ امداد کیلئے حاضر ہوئے، یعنی آپ کے ارشاد کو قبول کیا آپ نے پھر امداد کیلئے طلب کیا پھر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے ہی آپ کی دعوت کو قبول کیا۔ پھر آپ نے امداد کیلئے بلایا تو پھر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ ہی حاضر ہوئے، تو اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر نبی کے حواری (مددگار) ہوتے ہیں، میرے حواری (یعنی میرے مددگار) زبیر ہیں۔ (ماخوذ از خازن)

نبی کے امداد کرنے کا کیا مطلب:

تو اس کا جواب یہ ہے کہ انبیاء کرام کا ظاہری اسباب کی امداد طلب کرنا جائز ہے، حضرت لوط علیہ السلام نے کہا ﴿اَوْ اٰوِیْۤ اِلٰی رُكْنٍ شَدِیْدٍ﴾ یا کسی مضبوط پائے کی پناہ لیتا" نبی کریم ﷺ نے فرمایا "یرحم الله لوطا لقد کان یاوی الی رکن شدید" "اللہ تعالیٰ لوط پر رحم فرمائے آپ کسی مضبوط پائے کی پناہ لینا چاہتے تھے۔

بظاہر یہاں وہم ہوتا ہے کہ لوط علیہ السلام نے یہ کیوں کہا؟ (معاذ اللہ) آپ نے بے صبری کا مظاہرہ کیا اس کا جواب ذکر کرتے ہوئے حضرت علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے فرمایا:

"انہ کان بمقتضی الجبلة البشریة بعض الامور الضروریة یمیل الی الاستعانة بالعشیرة القویة" (مرقاة المفاتیح باب بدء الخلق و ذکر الانبیاء)

انسان کی جبلت بشری کا تقاضا ہے کہ وہ بعض امور ضروریہ میں اپنے قوی قبیلہ سے امداد طلب کرتا ہے، یہ انبیاء کرام کی شان کے مخالف نہیں بلکہ حضرت لوط علیہ السلام کے بعد آنے والے تمام انبیاء کرام نے بھی اپنے قبائل کے کئی افراد سے امداد طلب کی، اس میں اللہ کی طرف سے کوئی ممانعت نہیں پائی گئی۔

نبی کریم ﷺ کا امداد طلب کرنا:

"کان النبی ﷺ یقول فی مواسم الحج قبل ان یھاجر "من رجل یؤوینی حتی ابلغ کلام ربی "فان قریشا قد منعونی ان ابلغ کلام ربی"

نبی کریم ﷺ ہجرت سے پہلے اوقات حج میں یہ فرما رہے تھے" وہ کون شخص ہے جو میری حفاظت کرے تاکہ میں اپنے رب کا کلام (لوگوں تک) پہنچا سکوں، بیشک قریش مجھے اللہ کا کلام پہنچانے میں منع کرتے ہیں (یعنی وہ رکاوٹ کا ذریعہ ہیں) اسی وجہ سے آپ نے ان کی طرف ہجرت کی اور انہوں نے آپ کے غمخوراگی کی اور ہر سیاہ وسفید کو آپ سے دور رکھا۔ (صاوی، ابن کثیر)

نبی کریم ﷺ نے امداد طلب کرنا ترک کر دیا:

جب آیۃ کریمہ ﴿وَاللّٰہِ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ﴾ نازل ہوئی تو اس کے بعد آپ نے کسی سے اپنی حفاظت کی امداد طلب نہیں کی، جس کا ذکر اسی آیۃ کریمہ کی وضاحت کے ضمن میں انشاء اللہ آئے گا۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿رَبَّنَا اٰمَنَّا بِمَا اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ٥﴾ (آیۃنمبر ۵۳)

(1) اے ہمارے رب ہم اس پر ایمان لائے جو تو اتارا اور رسول کے تابع ہوئے تو ہمیں حق پر گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔

(2) اے ہمارے رب ایمان لایا ہم نے اس پر جو تو نے نازل کی، اور تابعداری کی ہم نے رسول کی پس تو لکھ دے ہمیں گواہی دینے والوں میں۔

جب قوم نے عیسیٰ علیہ السلام کو اپنے ایمان اور اپنے اسلام پر گواہ بنایا، پھر انہوں عاجزی سے رب تعالی کے حضور جو عرض کیا وہ اس آیۃ کریمہ میں ذکر کر دیا گیا۔ قوم نے جب اللہ تعالی پر ایمان لایا تو عرض کیا ﴿اٰمَنَّا بِاللّٰهِ﴾ ہم ایمان لائے اللہ پر' اس کا ذکر پچھلی آیۃ کریمہ میں ہو چکا ہے۔ جب انہوں نے اللہ تعالی کی کتابوں پر ایمان لایا تو کہا ﴿رَبَّنَا اٰمَنَّا بِمَا اَنْزَلْتَ﴾ اے ہمارے تب ہم نے ایمان لایا جو تو نے نازل کیا اور انہوں نے اللہ کے رسول عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کا ذکر یوں کیا ﴿وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ '' اور ہم نے تابعداری کی رسول کی۔ پھر انہوں رب تعالی کے قرب اور ثواب کا مطالبہ کرتے ہوئے عرض کیا ﴿فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ﴾ تو ہمیں لکھ دے گواہی دینے والوں میں۔

"وهذا يقتضي ان يكون للشاهدين فضل يزيد على فضل الحواريين وبفضل على درجته"

اس سے پتہ چلا کہ شاہدین کا مرتبہ بلند ہے حواریین کے مرتبہ پر، تو انہوں نے اپنے درجہ کی بلندی کا مطالبہ کیا۔

شاہدین سے مراد کون لوگ ہیں؟

اس میں چند اقوال پائے گئے ہیں کہ وہ کون سے لوگ ہیں جن کے درجہ کو حاصل کرنے کا حواریین نے مطالبہ کیا۔

(۱) اس میں ایک قول یہ ہے کہ شاہدین سے مراد سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور آپ کی امت ہے، اسلئے کہ قیامت کے دن ان کو ہی خصوصی طور پر شہادت دینے کا منصب حاصل ہوگا، رب تعالی نے ارشاد فرمایا:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾

اور بات یوں ہی ہے کہ ہم نے تمہیں کیا سب امتوں میں افضل کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ۔

(۲) دوسرا قول بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ ﴿اُكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ﴾ کا معنی ہے "اكتبنا في زمرة الانبياء" اے ہمارے رب ہمیں انبیاء کرام کی جماعت میں لکھ دے یعنی ہمیں انبیاء کرام کا

قرب حاصل ہو جائے۔

"لان کل نبی شاهد لقومه قال الله تعالی "فلنسألن الذین ارسل الیهم ولنسألن المرسلین"

کیونکہ ہر نبی اپنی امت کا گواہ ہوگا، رب تعالی کا ارشاد گرامی اس پر دلیل ہے کہ رب تعالی نے فرمایا "تو ضرور ہمیں پوچھنا ہے ان سے جن کے پاس رسول گئے اور بیشک ضرور ہمیں پوچھنا ہے رسولوں سے،

(۳) والقول الثالث "اکتبنا مع الشاهدین ای اکتبنا فی جملة من شهدلک بالتوحید ولا نبیائک بالتصدیق"

تیسرا قول یہ ہے کہ شاہدین سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالی کی توحید اور انبیاء کرام کی تصدیق کی گواہی دی، جب انہوں نے اپنے اسلام پر عیسی علیہ السلام کو گواہ بنایا تو بطور تاکید اللہ تعالی کو بھی اپنے ایمان پر گواہ بنایا۔

"فقد اشهدوا الله علی ذلک تاکیدا للامر وتقویة له" اور ساتھ ھی "طلبوا من الله مثل ثواب کل مؤمن شهدلله بالتوحید ولانبیائه بالنبوة"

انہوں نے رب تعالی سے مطالبہ کیا کہ اے اللہ ہمیں ان تمام مؤمنین کا درجہ اور ثواب عطاء فرما جنہوں نے تیری توحید کی گواہی دی، اور انبیاء کرام کی نبوت کی گواہی دی۔

(۴) القول الرابع ان قوله (فاکتبنا مع الشاهدین) اشارة الی ان کتاب الابرار انما یکون فی السماوات مع الملائکة"

چوتھا قول یہ ہے کہ اللہ تعالی کے ارشاد گرامی ﴿فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِيْنَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ حواریین نے کہا کہ ہمارا ذکر کتاب الابرار میں کر دے جو آسمانوں میں فرشتوں کے پاس ہے، جس کا ذکر اللہ تعالی کے اس ارشاد گرامی میں ہے:

(كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْأَبْرَارِ لَفِي عِلِّيِّيْنَ) (سورة المطففين، آية نمبر ۱۸)

"ہاں ہاں بیشک نیکوں کی لکھت سب سے اونچے محل علیین میں ہے" جب اللہ تعالی ان کے ذکر کو مؤمنین گواہوں میں کر دے گا تو ان کا ذکر بھی ملائے اعلی میں اور ملائکہ مقربین کے ساتھ ہو جائے گا۔

(۵) القول الخامس انه تعالی قال (شهدالله انه لااله الاهو والملائکة واولوا العلم"

(گواہی دی اللہ نے بیشک وہ نہیں ہے کوئی معبود سوائے اس کے، اور (گواہی دی) فرشتوں نے اور علم والوں نے) علم والوں کو اللہ تعالی نے گوہوں میں شامل فرمایا، اور ان کا ذکر اپنے ذکر کے ساتھ کیا، علم والوں کیلئے یہ عظیم درجہ اور بلند مرتبہ ہے، اسلئے عیسی علیہ السلام کے حواریین نے بھی عرض کیا ﴿فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِيْنَ﴾ (تو لکھ لے ہمیں گواہوں کے

ساتھ)ای اجعلنا من تلک الفرقة الذین قرنت ذکر هم بذکرک" یعنی ہمیں اس گروہ کے ساتھ ملا دے جن کا ذکر تو نے اپنے ساتھ کیا ہے۔

(۶) والقول السادس ان جبریل لما سأل محمدا عن الاحسان فقال "ان تعبد الله کانک تراه"

چھٹا قول یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام نے جب نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ احسان کیا ہے تو آپ نے فرمایا (احسان یہ ہے کہ تو رب کی عبادت کرے تو یہ سمجھے کہ تو رب کو دیکھ رہا ہے) یہ مقام شہود ہے، یعنی بندہ رب تعالیٰ کے ہاں حاضر ہوتا ہے، غیب کے درجہ میں نہیں ہوتا۔

"لما صاروا کاملین فی درجة الاستدلال ارادوا الترقی من مقام الاستدلال الی مقام الشهود والمکاشفة فقالوا "فاکتبنا مع الشاهدین"

جب وہ لوگ درجہ استدلال میں کمال حاصل کر چکے تو انہوں نے مقام استدلال سے مقام شہود و مکاشفہ کی طرف ترقی کا ارادہ کیا تو کہا (ہمیں لکھ لے مقام شہود والوں کے ساتھ)

(۷) القول السابع ان کل من کان فی مقام شهود الحق لم یبال بما یصل الیه من المشاق والآلام"

ساتواں قول یہ ہے کہ جن لوگوں کو رب تعالیٰ کے ہاں مقام شہود حاصل ہوتا ہے، یعنی رب تعالیٰ کے ہاں حاضر ہوتے ہیں انہیں رب تعالیٰ کی تجلیات میں مشغول ہونے کی وجہ سے کوئی مشقت اور مصیبت، درد و تکلیف حاصل نہیں ہوتی۔

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حواریین کو کہا تم اللہ کے دین میں میری مدد گار بن جاؤ اور میرا دفاع کرو، تو حواریین نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا ﴿فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ﴾ (تو ہمیں لکھ دے شاہدین کے ساتھ) یعنی اے اللہ "اجعلنا ممن یکون فی شهود جلالک" ہمیں ان لوگوں میں کر دے جن کو تیرے جلال کا شہود حاصل ہے، تا کہ ہم ہر قسم کے مصائب و آلام، درد، تکالیف کو گھٹیا سمجھ کر پرواہ میں نہ لائیں تو اس وقت ہم پر تیرے نبی سے وفا کرنا آسان ہوگا، اسلئے ہم تیرے رسول و نبی کی امداد کرنا اپنے آپ پر لازم کر سکیں گے۔ (کبیر)

حواریین کی اس دعاء پر آثار:

"اخرج القربانی وعبدبن حمید وابن المنذر من طریق الکلبی عن ابی صالح عن ابن عباس "فاکتبنا مع الشاهدین" قال مع محمد ﷺ وامته انهم شهدوا له انه قد بلغ وشهدوا للرسل انهم قدبلغوا" (در منثور)

فریابی اور عبد بن حمید اور ابن منذر نے کلبی سے ابو صالح کی ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کو ذکر کیا کہ ان کا یہ عرض

کرنا ﴿فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِيْنَ﴾ (ہمیں شاہدین کے ساتھ لکھ لے) کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں محمد ﷺ کے ساتھ لکھ لے اور آپ کی امت کے ساتھ لکھ لے کیونکہ انہوں نے آپ کی تبلیغ (رب کے حکم پہنچا دینے) کی شہادت دی، اور تمام رسولوں کے متعلق شہادت دی کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچا دے۔

❁ "واخرج ابن مردویه عن ابی سعید الخدری ان رسول اللهﷺ کان یقول اذاقضی صلوته اللهم انی اسألک بحق السائلین علیک فان للسائلین علیک حقا ایما عبد اوامة من اهل البر والبحر تقبلت دعوتهم واستجیبت دعاء هم ان تشرکنا فی صالح ما یدعونک به وان تعافینا وایاهم وان تقبل منا ومنهم وان تجاوز عنا وعنهم بانا آمنا بما انزلت واتبعنا الرسول فاکتبنا مع الشاهدین، وکان یقول لایتکلم بهذااحد من خلقه الااشرکه الله فی دعوة اهل برهم واهل بحرهم فعمتهم وهو مکانه" (درمنثور)

ابن مردویہ نے ابوسعید خدری ﷺ کی روایت نقل فرمائی کہ بیشک رسول اللہ ﷺ (تعلیم امت کیلئے) نماز سے فارغ ہونے پر یہ دعاء فرماتے تھے، "اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں سائلین کے حق کے واسطہ سے جو تو نے اپنے ذمہ کرم پر لازم کیا ہے، بیشک سائلین کا تیرے ذمہ کرم پر یہ حق ہے کہ جو بھی مرد اور عورت خواہ وہ خشکی میں رہنے والے ہیں یا سمندری علاقہ میں رہنے والے ہیں وہ عبادت کے بعد جب تجھ سے دعاء کرتے ہیں تو تو (اپنے فضل وکرم سے) وہ دعاء قبول کرتا ہے، جب تو ان کی دعاء کو قبول کرتا ہے تو ہمیں بھی نیک بندوں کی دعاء میں شریک کر کے تو ہمیں معاف کر اور ان کو (بھی) معاف کر، اور ہماری دعاء کو قبول کر اور ان کی دعاء کو (بھی) قبول کر، اور ہم سے درگذر فرما اور ان سے (بھی) درگذر فرما، کیونکہ ہم ایمان لائے ہیں اس پر جو تو نے نازل کیا ہے، اور ہم نے (اللہ کے) رسول پر ایمان لایا ہے تو ہمیں لکھ لے شہادت دینے والوں میں، اور آپ فرماتے تھے کہ کوئی شخص اللہ کی مخلوق میں سے یہ دعاء نہیں کرتا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے بر و بحر (خشکی وتری) کے لوگوں کی دعاء میں شریک کرتا ہے، وہ کہیں بھی ہو سب کی دعاء میں اس کی دعاء شریک ہو جاتی ہے۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ۝﴾ (آیۃ نمبر ۵۴)

(1) اور کافروں نے مکر کیا اور اللہ نے ان کے ہلاک کی خفیہ تدبیر فرمائی اور اللہ سب سے بہتر چھپی تدبیر والا ہے۔

(2) اور مکر کیا انہوں نے اور (ان کو ہلاک کرنے کی) خفیہ تدبیر فرمائی اللہ نے، اور اللہ سب سے بہتر خفیہ تدبیر فرمانے والا ہے۔

سب سے پہلے تو آپ تراجم کا فرق دیکھئے، اس آیۃ کریمہ کے ترجمہ کا اکثر مترجمین نے حق ادا نہیں کیا۔

''اور مکر کیا ان کافروں نے'' اور مکر کیا اللہ نے اور اللہ کا مکر سب سے بہتر ہے۔'' (محمود الحسن صاحب)

''فریب کیا ان کافروں نے اور فریب کیا اللہ نے اور اللہ کا داؤ سب سے بہتر ہے'' (شاہ عبدالقادر صاحب)

''(یعنی یہود قتل عیسی کے بارے میں) ایک چال چلے اور خدا بھی (عیسی کو بچانے کیلئے) چال چلا اور خدا خوب چال چلنے والا ہے'' (فتح محمد)

''اور مکر کیا انہوں نے یعنی کافروں نے اور مکر کیا اللہ نے اور اللہ بہتر مکر کرنے والا ہے'' (شاہ رفیع الدین صاحب)

''اور کافروں نے مکر کیا اور اللہ نے ان کے ہلاک کی خفیہ تدبیر فرمائی اور اللہ سب سے بہتر تدبیر والا ہے''

(اعلی حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ)

اس آیۃ کریمہ کا ترجمہ کرتے وقت عام مترجمین نے اس مقام کی نزاکت کو نہیں سمجھا اور براہ راست مکر، فریب، دھوکا، دغا، داؤ جیسے الفاظ کی نسبت رب قدوس بے عیب ذات کی طرف کر دی، عام انسان جو مفسرین کرام کے نکات سے بے خبر ہے ضرور یہ سمجھے گا کہ حقیقۃً اللہ تعالی مکار، دھوکا باز، وغیرہ ہے (معاذ اللہ) اسی وجہ سے مفسرین کرام نے اس مقام پر نہایت غور فکر کے بعد بتایا کہ یہاں مکر کی نسبت اللہ تعالی کی طرف کیسے ہے۔

"ومكر الله"عبارة عن الاحتيال في ايصال الشرو الاحتيال على الله تعالى محال فصار لفظ المكر في حقه من المتشابهات"وذكروا في تاويله وجوها احدها انه تعالى سمى جزاء المكر مكرا كقوله تعالى وجزاء سيئة مثلها سمى جزاء المخادعة بالمخادعة وجزاء الا ستهزاء بالاستهزاء والثانى ان معاملة الله معهم كانت شبيهة بالمكر فسمي بذلك، والثالث ان هذااللفظ ليس من المتشابها ت لانه عبارة عن بالتدبير المحكم الكامل ثم اختص في العرف ب التدبير ايصال الشر الى الغير وذلك في حق

الله تعالی غیر ممتنع و الله اعلم" (کبیر)

اعتراض: یہ ہوا کہ مکر کا معنی ہوتا ہے "کسی کو شر پہنچانے میں حیلہ کرنا" اور اللہ تعالی کا شر پہنچانے میں حیلہ کرنا محال ہے، تو مکر کی نسبت اللہ تعالی کی طرف کس طرح صحیح ہے۔

جواب: یہ لفظ اللہ تعالی کی شان میں استعمال ہونے سے متشابہات سے ہے، اس کی مختلف تاویلیں کی گئی ہیں۔

(۱) ایک یہ ہے کہ یہاں جزاء مکر کو مکر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس طرح قرآن پاک میں ہی "جزاء سئیۃ" ذکر فرمایا گیا، یعنی مشاکلت کے طور پر ﴿جَزَآءُ سَیِّئَةٍ﴾ کو "سئیۃ" کہا گیا ہے۔ اسی ضابطہ کے مطابق 'جزاء مخادعۃ" کو مخادعۃ سے، اور جزاء استھزاء کو استھزاء سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اب اس تاویل کے مطابق "مکر اللہ" کا معنی یہ ہوگا کہ "اللہ تعالی مکر کی جزاء دے گا۔

(۲) دوسری تاویل یہ ہے کہ اللہ تعالی ان سے ایسا معاملہ فرماتا ہے کہ جو ان کے مکر کے مشابہ ہوتا ہے یعنی مکر کا اصل مطلب یہ ہے کہ کسی کو نقصان پہنچانے میں خفیہ طور پر حیلہ کرنا جس سے وہ بے خبر ہو۔ اسی طرح اللہ تعالی ان کو اس فعل کی جزاء دے گا، جس جزاء (عذاب) سے وہ خبر ہیں، تو اس طرح مکر کی مشابہت ہوئی، کیونکہ وجہ شبہ کسی ایک صورت میں کافی ہوتی ہے، وہ فقط "خفاء" ہے۔ انہوں نے حضرت عیسی علیہ السلام سے ان کے قتل کرنے کا حیلہ ان سے مخفی رکھا، اسی طرح اللہ تعالی نے اپنا عذاب اب سے مخفی رکھا۔ اب اس صورت میں "مکر اللہ" کا معنی یہ ہوا 'اللہ تعالی ان کے مکر کا معاملہ ان سے ایسا ہی فرمائے گا۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ یہ لفظ متشابہت سے نہیں، بلکہ اس کا معنی "تدبیر محکم و کامل" ہے۔ پھر عرف میں اس کا معنی مختص ہو گیا کہ "کسی کو عذاب پہنچانے اور ہلاک کرنے میں خفیہ تدبیر کرنا" اور یہ اللہ تعالی کے حق میں ممتنع نہیں۔ اب تفسیر کبیر کی اس بحث کے بعد اعلی حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کے ترجمہ کو دیکھیں آپ کا ترجمہ اس تیسری صورت کے عین مطابق آپ کو نظر آئے گا۔ "کہ اللہ نے ان کے ہلاک کی خفیہ تدبیر فرمائی" (راقم نے بھی یہی معنی نقل کیا) لیکن باقی تراجم کا مقصد عم اردو دان کو سمجھانا مقصود ہے تو وہی ترجمہ اس کو راہ راست پر لاسکتا ہے جس میں وہ غلطیوں واقع ہو کر اللہ تعالی پر عیب ثابت کرنے شروع نہ کردے۔ اسی طرح پارہ انیس رکوع چار ،اور پارہ نو رکوع بارہ میں بھی مترجمین نے اپنے تراجم میں ایسے ہی غلطیاں کیں۔ (تسکین الجنان ص ۸۳،۸۴)

حضرت پیر کرم شاہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں، تقریبا ہر زبان میں بلا استثناء ایسے مشترک الفاظ پائے جاتے ہیں

جو متعدد معانی پر دلالت کرتے ہیں اور اہل زبان ان الفاظ کو بلا تامل اب کے مختلف معنوں میں استعمال کرتے رہتے ہیں، لیکن جب وہی لفظ کسی دوسری زبان میں استعمال ہونے لگتا ہے تو وہ اپنے اصلی مختلف معنوں میں سے کسی ایک معنی میں مشہور ہو جاتا ہے، اب جب ہم اسے اس کو اصلی زبان مستعمل ہوتے ہوئے پاتے ہیں تو اس کا وہی معنی جو ہمارے ذہن نشین ہو چکا ہوتا ہے، چسپاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور جب وہ چسپاں نہیں ہوتا تو پریشان ہو جاتے ہیں۔ اس کی ایک لفظ "مکر" ہے، اس کا معنی 'حیلہ سازی' بھی ہے، اور یہی لفظ عربی میں صرف کرنے اور کسی پنہاں سازش کو خفیہ طیقہ سے ناکام بنا دینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، لیکن اردو میں ہم اس لفظ "مکر" کو صرف دھوکہ دہی اور فریب کاری کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔

جب اس فعل کی نسبت ذات باری تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے تو ہمارا ذہن بلا وجہ طرح طرح کے شکوک وشبہات کی آماجگاہ بن جاتا ہے، حالانکہ جب اس کا فاعل وہ ذات مقدس ہو جو ہر عیب، ہر نقص اور نازیبا فعل سے پاک ہے تو ہم لفظ مکر کا معنی صرف خفیہ تدبیر یا خفیہ طریقہ جس سے دشمنان حق کے شیطانی منصوبوں کو خاک ملانا مقصود ہوتا ہے کریں گے اب کسی قسم شک باقی نہیں رہتا۔

"قال المفضل و دبروا و دبر الله والمکر لطف التدبیر" (البحر المحیط)

مفضل فرماتے ہیں 'ومکروا ومکر الله'' کا معنی ہے اور یہودیوں نے بھی (مسیح علیہ السلام کو قتل کی) خفیہ تدبیر کی، اور اللہ تعالیٰ نے بھی (مسیح علیہ السلام کو بچانے کی) خفیہ تدبیر کی، کیونکہ مکر کا معنی یہاں صرف تدبیر، خفیہ تدبیر ہی لیا جا سکتا ہے۔ اور اگر ان لغوی تحقیقات کیلئے انسان کے پاس وقت نہ ہو تو کم از کم علم بدیع کے قاعدہ مشاکلت کو ہمیشہ پیش نظر رکھے وہ یہ ہے کہ عربی میں کسی برے اور ناپسندیدہ فعل پر جو سزا دی جاتی ہے اسی لفظ سے تعبیر کر دیتے ہیں، حالانکہ وہ سزا کتنی مناسب اور قرین انصاف کیوں نہ ہو مثلاً ﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ یعنی برائی کا بدلہ برائی ہے۔ حالانکہ برائی کی سزا برائی نہیں ہوا کرتی بلکہ عین انصاف ہوا کرتی ہے۔ اسی طرح اور ارشاد فرمایا ﴿فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ﴾ یعنی جو تم پر زیادتی کرے تم اس پر زیادتی کرو۔ حالانکہ زیادتی اور تعدی کی روک تھام کرنا زیادتی اور ظلم نہیں بلکہ دین اور اخلاق کے تمام ضابطے اس کے درست ہونے کی تائید کرتے ہیں۔

اسی طرح یہاں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کرنے کی جو مکارانہ سازش ان یہودیوں نے کر رکھی تھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو ناکام بنانے کی جو تدبیر کی گئی اسے مکر سے تعبیر فرما دیا۔ اور اس میں کوئی نقص نہیں۔ (ضیاء القرآن)

ان کا مکر کیا تھا؟

ان کا مکر یہ تھا کہ وہ عیسی علیہ السلام کو قتل (شہید) کرنے کیلئے حیلے، بہانے تراش رہے تھے، جس کا علم عیسی علیہ السلام کو بھی ہوگیا۔

رب تعالی کی خفیہ تدبیر:

اللہ تعالی نے عیسی علیہ السلام کو آسمانوں پر اٹھالیا، ان کو ناکام کردیا۔ ان کے ہی ایک شخص کو ان کے ہاتھوں سے ہلاک کرادیا، اور اخروی عذاب کی ہلاکت کا سب کو مستحق ٹھہرادیا۔

عیسی علیہ السلام کے آسمانوں پر اٹھائے جانے کا واقع:

تفسیر خازن اور روح المعانی میں بیان کیا گیا ہے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بنی اسرائیل کو جب عیسی علیہ السلام نے تبلیغ فرمائی تو وہ آپ سے مقابلہ تو نہ کرسکے البتہ ان کی شان میں گستاخی شروع کردی۔ اور آپ کی والدہ مکرمہ پر عیب لگانے شروع کردیئے اور آپ کو طرح طرح کی تکالیف دینی شروع کردیں۔ ایک دن آپ شہر میں گشت فرمارہے تھے کہ شہر کے لوگوں نے آپ کو بہت پریشان کیا تب آپ نے اللہ تعالی سے دعاء کی اے مولائے کائنات، میں کہاں تک صبر کروں، اب بہتر یہی ہے کہ تو ان کو خنزیر بنادے، آپ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ وہ سب خنزیر بن گئے، اس واقع سے لوگوں پر ایک خوف طاری ہوگیا۔ کسی نے اس وقت کے یہودی بادشاہ کو خبر دی کہ عیسی علیہ السلام کی دعاء کو اللہ تعالی قبول فرماتا ہے، آپ کی دعاء سے اتنے لوگ خنزیر بن گئے ہیں، تم بھی ان کے مخالف ہو اس لئے تم اپنی فکر کرو، کہیں وہ تمہارے خلاف بھی دعاء نہ کردیں اور تمہارا بھی ایسا حال نہ ہوجائے۔

اس نے کہا کیا ہوسکتا ہے ایسے مقبول الدعاء کے مقابلہ میں کوئی تدبیر بھی کام نہیں آسکتی البتہ یہ ہوسکتا کہ کسی حیلہ سے شہید کردیا جائے تو ان کی دعاء کا خوف ختم ہوجائے گا کہ کہیں وہ مخالف دعاء نہ کریں۔ اس نے ایک شخص ''ططیانوس'' کو اس کام کیلئے منتخب کردیا وہ ایک منافق شخص تھا بظاہر عیسی علیہ السلام سے بھی ملتا تھا لیکن در پردہ وہ یہود سے بھی ملا ہوا تھا۔

جب یہ واقع درپیش آنے والا ہی تھا تو حضرت عیسی علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے پہلے فرمادیا تھا کہ آج صبح سے پہلے ہی مجھے ایک شخص چند دراہم کے عوض فروخت کردے گا۔

خیال رہے کہ منافقین تقریباً ہر دور میں رہے، یعنی جہاں مخلصین ہوتے ہیں وہاں منافقین بھی ہوتے ہیں، نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں بھی منافقین تھے جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم نہیں آیا تھا اس وقت تک جاننے کے باوجود آپ ان سے چشم پوشی فرماتے ہے، جب حکم آ گیا تو ایک ایک کا نام لے کر مسجد سے نکال دیا گیا۔ عیسیٰ علیہ السلام کو بھی معلوم تھا لیکن آپ بھی رب تعالیٰ کی مثبت پر شاکر تھے اسے کچھ نہیں کہا اور نہ ہی کسی اور کو کہا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ ططیانوس کو اس یہودی بادشاہ نے جس کا نام بھی یہودا تھا، تیس درہم دینے کا وعدہ کیا کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کو خود شہید کر دے یا کسی اور سے کرا دے۔

تیس درہم کی لالچ میں آ کر ططیانوس نے یہود کے چند آدمیوں کو ساتھ لیا اور آپ کی قیام گاہ پر آ گیا، ان لوگوں کو باہر کھڑا کیا اور خود اندر گیا۔ اس کے سامنے ہی عیسیٰ علیہ السلام کو کھڑکی کے ذریعے آسمانوں پر زندہ اٹھا لیا گیا، وہ یہ ماجرا دیکھ کر بہت متعجب ہوا، اور کافی دیر تک اس تعجب میں گم سم رہا، اس کے ساتھیوں نے سمجھا کہ شائد ططیانوس اور عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان لڑائی ہو رہی ہے، وہ اندر جانا ہی چاہتے تھے لیکن ان کا ساتھی باہر آ گیا، اللہ تعالیٰ نے اسے عیسیٰ علیہ السلام کا ہم شکل بنا دیا، اب اس کے ساتھی یہودیوں نے اس کے باہر آتے ہی یہی سمجھا کہ یہ عیسیٰ علیہ السلام ہیں کیونکہ یہ ان کا ہم شکل بھی تھا اس لئے انہوں نے اسے پکڑ لیا یہ چلا چلا کر انہیں بتا رہا تھا کہ میں تمہارا ساتھی ہوں حضرت مسیح کو قتل کرنے گیا تھا، لیکن اس کی بات کو کسی ایک نے بھی نہ سنا بلکہ وہ کہنے لگے اے عیسیٰ تم نے ہمارے ساتھی کو قتل کر دیا ہے اب ہمیں دھوکہ دینا چاہتے ہو، یہ کہہ کر اسے سولی پر چڑھا دیا۔

خیال رہے کہ عیسائی بھی آج تک اسی وہم میں مبتلاء ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر چڑھا دیا گیا تھا البتہ پھر زندہ کر کے انہیں آسمانوں پر اٹھایا گیا ہے، اسی وجہ سے سارے عیسائی صلیب کو پوجتے ہیں، اس سولی کو اپنے گناہوں کا کفارہ سمجھتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ططیانوس کو قتل کیا گیا ہے، عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا گیا۔ (روح المعانی، خازن)

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کا قول:

قتادہ کہتے ہیں ہمیں یہ بتایا گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں کو کہا "ایکم یقذف علیه شبهی فانه مقتول" تم میں سے کون ہے جس پر میری شبیہ ڈال دی جائے تو اسے قتل کر دیا جائے، تو ایک شخص نے کہا کہ اے اللہ کے نبی مجھ پر تمہاری شبیہ ڈال دی جائے، تو اس پر آپ کی شبیہ ڈال دی گئی، تو وہ قتل کر دیا گیا، اور عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے قتل ہونے سے بچا لیا، اور ان کو زندہ آسمانوں پر اٹھا لیا گیا، اور انہیں نورانی لباس پہنا دیا گیا، اور ان سے

کھانے پینے کی لذت کو اٹھالیا گیا، اوران کی اڑان فرشتوں کے ساتھ کردی گئی، اور آپ کو عرش کے گرد پھرنے والے فرشتوں کے ساتھ کردیا گیا۔ "وصار انسیا ملکیا ارضیا سماویا" اس لحاظ پر آپ کو انسان ہونے، فرشتہ ہونے زمینی ہونے اور آسمانی ہونے کا شرف حاصل ہوگیا۔ (خازن)

تنبیہ: اس روایت میں اور پہلے ذکر کیے ہوئے واقع میں کوئی تعارض نہیں پایا گیا، کیونکہ ططیانوس منافق ہوگیا تھا، ابتدائی طور پر جب منافق نہیں تھا تو عیسیٰ علیہ السلام کے قول کا جواب دیا کہ مجھے آپ کی شبیہ حاصل ہو جائے اور مجھے قتل کردیا جائے، لیکن بعد میں وہی یہودیوں کا طرف دار ہوگیا، اور پیسوں پر بک گیا، منافق ہوگیا، اور عیسیٰ علیہ السلام کو شہید کرنے کی سازش کرنے لگا تو اسی کے سامنے رب تعالیٰ کی خفیہ تدبیر آگئی کہ اسے عیسیٰ علیہ السلام کی شبیہ دے کر قتل کرادیا گیا۔ (راقم)

اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر کی کئی صورتیں:

(۱) اللہ تعالیٰ نے یہود کے مکروحیلہ کو ان پر ہی لوٹا دیا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو شہید کرنا چاہتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ اسی شخص پر عیسیٰ علیہ السلام کی شبیہ ڈال کر قتل کرادیا جو عیسیٰ علیہ السلام کو شہید کرنے کی سازش کررہا تھا۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے یہود پر اہل فارس کو مسلط کیا، انہوں نے ان کو قتل کردیا اور ان کی اولاد کو قید کرلیا، یہ قول ابن اصم کا ہے۔

(۳) عیسیٰ علیہ السلام کے آسمانوں پر اٹھائے جانے کے بعد یہود نے حواریین سے جہاد کیا، ان کو یہود نے پکڑ لیا اور طرح طرح کی تکالیف پہنچائیں یہ خبر شاہ روم کو پتہ چلی تو اس نے حواریین کو ان سے چھڑالیا، یہود کی بادشاہت بھی اس کی زیر سلطنت تھی، پھر بنی اسرائیل سے اس نے جہاد کیا تو وہ در پردہ عیسائی ہوگیا، اور اپنے عیسائی ہونے کا انہیں پتہ نہ چلنے دیا، اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی خفیہ تدبیر سے یہود کو ان کے اپنے بادشاہ کے ذریعے نقصان پہنچایا۔ (ازالبحرالمحیط)

انتباہ شدید:

"ولا یقال للہ ماکر اومکار الامشاکلۃ وزول بما علمت لان اصل المکر یستعمل فی المحتال لأخذ صاحبہ لعجزہ عنہ وھو مستحیل علی اللہ" (صاوی)

اللہ تعالیٰ کو "ماکر" (مکر کرنے والا) یا (مکار) نہیں کہا جاسکتا، ہاں صرف مشاکلت کے طور پر اور تاویل کر

کے یہ الفاظ اللہ تعالیٰ پر استعمال ہوتے ہیں، اس کا ذکر پہلے کر دیا گیا۔

اصل میں مکر کا مطلب ہے کہ حیلہ سے دوسرے کو دھوکہ دینا جس کو مندفع کرنے کی وہ طاقت نہ رکھتا ہو، اس معنی کے لحاظ پر اللہ تعالیٰ کی طرف ان الفاظ کی نسبت صحیح نہیں (لیکن اردو زبان میں مکر صرف فریب کرنے، دھوکہ دینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اس لئے کسی صورت میں بھی یہ کہنا درست نہیں، اللہ تعالیٰ مکر کرتا ہے، اللہ تعالیٰ ماکر ہے، اللہ تعالیٰ مکار ہے، کیونکہ اردو زبان میں سوائے فریب کرنے، دھوکہ دینے کے استعمال نہیں البتہ عربی زبان میں "مکر" کا معنی خفیہ تدبیر، یا جزاء مکر وغیرہ میں استعمال ہے، عربی اور اردو کے استعمالات میں جب فرق پایا جاتا ہے تو ایک زبان کے استعمال کو دوسری زبان کے استعمال پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

فائدہ: نبی کریم ﷺ دعاء فرماتے تھے "اللھم امکرلی ولا تمکر علی" "اے اللہ میرے لئے بہتر خفیہ تدبیر فرما، میرے خلاف خفیہ تدبیر نہ فرما۔ (قرطبی)

رب تعالیٰ کا عجیب انداز پر گرفت کرنا:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ ہم ان کو درج (داخل) کرتے ہیں وہاں جہاں وہ جانتے ہی نہیں سہل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ "نمدھم بالنعم وننسیھم الشکر علیھا فاذا رکنوا الی النعمة وحجبوا عن المنعم اخذوا" ہم ان کی نعمتوں کے ذریعے امداد کرتے ہیں، اور ان کو شکر کرنے سے دور کر دیتے ہیں، جب لوگ نعمتوں کی طرف میلان کریں اور منعم سے دور ہوں، اس کا شکر ادا نہ کریں تو وہ گرفت میں آ جاتے ہیں،

"وقال ابو العباس ابن عطاء یعنی کلما احدثوا خطیئة جددنا لھم نعمة وانسیناھم الاستغفار من تلک الخطیئة"

ابو العباس ابن عطاء نے بیان کیا ہے کہ لوگ جب نئے نئے گناہ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو نئی نئی نعمتیں عطاء کرتا ہے تا کہ ان کو استغفار کرنے کا موقع ہی نہ ملے، اس طرح وہ گناہوں کی سزا میں مبتلاء کر دئے جائیں۔ (از روح البیان)

واضح ہوا کہ دنیاوی نعمتیں ملنا کبھی اللہ تعالیٰ کی گرفت کا بھی ذریعہ بنتی ہیں۔ (روح البیان)

فائدہ: ومن جھل المرید بنفسه وبحق ربه ان یسیء الادب باظھار دعوی"

وہ شخص جو اپنے نفس کا ارادہ رکھتا ہو، یا اللہ تعالیٰ کے حقوق کا ارادہ رکھتا ہو اس وقت جاہل کہلائے گا، جب وہ اپنے دعوی

کے اظہار میں ادب کا لحاظ نہیں رکھے گا۔ (روح البیان)

اسی طرح اگر کوئی شخص گناہوں کی دلدل میں پھنس جائے لیکن اسے ان کی سزا دینے میں مہلت دی جائے تو وہ کہے کہ اگر یہ میرے کام جائز نہ ہوتے تو مجھے مہلت نہ دی جاتی بلکہ میری گرفت ہوتی تو اس کا یہ نہ سمجھنا کہ مجھے مہلت تو گناہوں سے توبہ کرنے کیلئے دی گئی ہے، اس کی وجہ صرف یہ ہے "وما ذاک الا لفقد نور بصیرتہ او ضعف نورھا" کہ اسے نور بصیرت ہی حاصل نہیں، یا اس کے نور بصیرت میں ضعف ہے، یعنی اس کے نور بصیرت کی کمی کی وجہ سے اسے وہ مطلب نہ سمجھ آیا جس کا سمجھنا ضروری تھا۔ (از روح البیان)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿اِذْقَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسٰٓی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَھِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُکُمْ فَاَحْکُمُ بَیْنَکُمْ فِیْمَا کُنْتُمْ فِیْہِ تَخْتَلِفُوْنَo﴾ (آیۃ نمبر ۵۵)

(1) یاد کرو جب اللہ نے فرمایا اے عیسیٰ میں تجھے پوری عمر تک پہنچاؤں گا اور تجھے اپنی طرف اٹھالوں گا اور تجھے کافروں سے پاک کردوں گا اور تیرے پیروؤں کو قیامت تک تیرے منکروں پر غلبہ دوں گا پھر تم سب میری طرف پلٹ کر آؤ گے تو میں تم میں فیصلہ فرمادوں گا جس بات میں جھگڑتے ہو۔

(2) یاد کرو جب کہا اللہ نے اے عیسیٰ بیشک میں تمہیں پوری عمر تک پہنچاؤں گا، اور اٹھا رہا ہوں تمہیں اپنی طرف، اور پاک کررہا ہوں (دور کررہا ہوں) تمہیں ان سے جنہوں نے کفر کیا، اور کروں گا ان کو جنہوں نے تابعداری کی تمہاری اوپر ان کے جنہوں نے کفر کیا "قیامت تک" پھر میری طرف لوٹنا ہے تم نے تو میں فیصلہ کروں گا درمیان تمہارے، جس میں کرتے تھے تم اختلاف۔

﴿اِذْقَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسٰٓی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ﴾

"یاد کرو جب کہا اللہ نے اے عیسیٰ! بیشک میں پوری عمر تک پہنچاؤں گا۔"

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ﴿اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ﴾ کا ترجمہ کیا ہے "میں تجھے پوری عمر تک پہنچاؤں گا" یہی ترجمہ

راقم نے بھی نقل کیا ہے۔آیئے راقم کی تسکین الجنان سے تراجم کا تقابلی جائزہ دیکھئے،اور انصاف سے فیصلہ کیجئے کہ کون سا ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہے۔تراجم پر نظر ڈالئے:

﴿اِنِّی مُتَوَفِّیکَ﴾

''میں لوں گا تجھ کو''	(محمود الحسن صاحب)
''اب میں تجھے واپس لے لوں گا۔''	(مودودی صاحب)
''اے عیسیٰ میں تم کو موت دینے والا ہوں''	(عبدالماجد صاحب)
''بے شک میں تم کو موت دینے والا ہوں''	(اشرف علی تھانوی صاحب)
''میں تجھ کو پھر لوں گا ''	(شاہ عبدالقادر صاحب)
''تحقیق میں پھر لینے والا تجھ کو''	(شاہ رفیع الدین صاحب)
''میں تجھے پوری عمر تک پہنچاؤں گا''۔	(اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ)

یہ خطاب ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو، اگر ترجمہ کیا جائے کہ ''میں لے لوں گا تجھ کو'' ''میں تم کو موت دینے والا ہوں''، ''میں لے لوں گا تجھ کو'' اس ترجمہ میں کئی احتمال ہیں ''تجھے لے لوں گا'' یعنی تیری روح کو قبض کر لوں گا، تجھے اپنی حفاظت میں لے لوں گا، یہ الفاظ مرزائیوں کے عقائد کا رد نہیں کرتے۔اور ترجمہ ''میں موت دینے والا ہوں تجھ کو'' مرزائیوں کے عقیدہ کی امداد کرتا ہے، کیونکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں، ان کے متعلق تو رب تعالیٰ فرما چکا ہے ''انی متوفیک'' لہذا احادیث میں جو مسیح موعود کا ذکر ہے، اس سے مراد ہمارا نبی (کذاب) مرزا غلام احمد قادیانی (لعنة الله عليه) ہی ہے، لیکن ان کے اس نظریئے کے باطل کرنے کے لیے اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ موزون ترین ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ تفسیر کبیر کے مطابق ہے، یہ مرزائیوں کا گروہ تو کل کی پیداوار ہے، علامہ رازی رحمہ اللہ نے پہلے ہی ایسی تفسیر کی جو ان کے نظریات کو رد کرنے کیلئے کافی ہے۔

معنی قوله ''انی متو فیک '' ای انی متمم عمرک فحینئذ الو فاک فلا اترکھم حتی یقتلوک بل انا رافعک الی سمائی و مقربک بملائکتی و اصونک عن ان یتمکنوا من قتلک وھذا تاویل حسن'' (کبیر)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ﴾ کا معنی یہ ہے ''میں تمہیں پوری عمر تک پہنچاؤں گا'' پھر تمھیں وفات عطاء کروں گا، ان کو نہیں چھوڑوں گا (یعنی ان کو کھلی چھٹی نہیں دوں گا) کہ وہ تمہیں قتل کر سکیں بلکہ میں تمہیں آسمانوں کی طرف اٹھاؤں گا بلکہ اپنے ملائکہ کے ساتھ ٹھہراؤں گا، میں آپ کی حفاظت کروں گا، وہ تمہیں قتل کرنے کی قدرت نہیں رکھ سکتے'' یہ تاویل اچھی ہے''

معلوم ہوا کہ جس تاویل کو علامہ رازی رحمہ اللہ نے اچھا کہا پسند کیا ہے وہ یہی ہے کہ ''میں تمھیں پوری عمر تک پہنچاؤ ں گا'' ان کا قتل کرنے کا دعوی باطل ہوگا، وہ کسی طرح بھی اس پر قادر نہیں ہو سکتے۔

یہی ترجمہ اعلی حضرت رحمہ اللہ کا بھی ہے اور اسی سے مرزائیوں کا رد کامل طور پر ایک اردو دان بھی ترجمہ سے سمجھ سکتا ہے۔ اسی طرح مدارک میں علامہ نسفی رحمہ اللہ نے بھی یوں تفسیر کی ﴿اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ﴾ ای **مستوفی اجلک**'' یعنی تمہیں پوری عمر تک پہنچاؤں گا۔ (تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان)

یہی الفاظ خازن، روح البیان وغیرہ میں بھی ہیں۔

حضرت پیر **محمد کرم** شاہ رحمہ اللہ نے بھی وہی معنی بیان کیا ہے جو اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ہے۔ اور آپ نے خوبصورت انداز پر تفسیر کی ہے، خیال تو تھا کہ لمبا اقتباس ذکر نہ کیا جائے تا کہ ضیاء القرآن کی ضیاء اسی سے قائم رہے، لیکن محبت وذوق کی وجہ سے اور خصوصا اپنی کم علمی کی وجہ سے بھی مناسب یہی سمجھا کہ ضیاء القرآن کے الفاظ کو ہی ذکر کیا جائے عین ممکن ہے کہ راقم کے الفاظ سے وہ مقصد ادا نہ ہو جو حضرت پیر صاحب نے بیان کیا، کیا خوب بیان کیا، آیئے دیکھیے، علم معانی کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ اگر کسی لفظ کا ایک حقیقی معنی ہو اور دوسرا مجازی تو حقیقی معنی کو مجازی پر ترجیح دی جائے گی، ہاں اگر کوئی ایسا قرینہ پایا جائے جس کے ہوتے ہوئے حقیقی معنی متعذر ہو تو اس وقت معنی حقیقی کو ترک کر کے معنی مجازی مراد لیا جائے، لیکن اگر ایسے قوی قرائن موجود ہوں جو حقیقی معنی مراد لینے کے ہی مؤید ہوں تو اس حالت میں حقیقی معنی کو ترک کر کے مجازی معنی مراد لینے پر اصرار کرنا تو الٹی گنگا بہانے کے مترادف ہے اب آپ لفظ ''**توفی**'' کے معنی پر غور فرمائیں تاج العروس میں لفظ ''**وفی**'' کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''**وتوفاہ ای لم یدع منہ شئیا**'' یعنی پورے کا پورا لے لیا اور اس سے کوئی چیز باقی نہیں رہنے دی'' امام ابو عبداللہ رحمہ اللہ ''الاحکام'' میں لکھتے ہیں ''**توفیت مالی من فلان ای قبضتہ**'' یعنی میں نے اس سے سارا مال لے لیا۔ یہ تو ہے لفظ ''**توفی**'' کا حقیقی معنی، ہاں یہ لفظ موت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے لیکن یہ اس کا مجازی معنی

ہے، جیسے صاحب تاج العروس نے لکھا ہے:

"ومن المجاز ادركته الوفاة اى الموت والمنية وتوفى فلان اذمات وتوفاه الله عزوجل اذاقبض روحه"

اس کا مجازی معنی ہے کہ اسے موت نے پالیا جو کوئی شخص فوت ہو جائے تو "توفي فلان" کہا جاتا ہے، اور جب اللہ تعالی کے حکم سے کسی کی روح کو قبض کر لیا جائے تو کہا جاتا ہے "توفاه الله عزوجل"

اب آپ خود فیصلہ فرمالیں کہ ایک لفظ کا حقیقی معنی ترک کر کے بغیر قرینہ کے اس سے مجازی معنی اخذ کرنے پر اصرار کرنا اس لفظ کے ساتھ بے جا زیادتی ہے اور یہاں صرف اتنا ہی نہیں کہ مجازی معنی لینے کا کوئی قرینہ موجود نہیں بلکہ قوی قرائن موجود نہیں جو اس لفظ کے حقیقی معنی لئے جانے پر دلالت کرتے ہیں۔ آپ پوچھیں گے کہ وہ کون سے ایسے قرائن ہیں تو اس کے متعلق عرض ہے کہ

(۱) ایک تو آیہ کا سیاق وسباق اس امر کا قوی قرینہ ہے، یہاں گفتگو نجران کے عیسائیوں سے ہو رہی ہے جو حضرت مسیح کی الوہیت کے قائل تھے، مقصد کلام ہے اثبات توحید باری تعالی اور بطلان الوہیت مسیح، اگر حضرت عیسی علیہ السلام مر چکے ہوتے تو کتنی صاف بات تھی کہ نجران کے عیسائیوں سے کہہ دیا جاتا کہ جن کو تم خدا مانتے ہو وہ تو مر چکے ہیں اور جو مر جائے کیا وہ بھی کہیں خدا بن سکتا ہے؟ لیکن قرآن کا اس اسلوب کو اختیار نہ کرنا بلکہ اس انداز کو اپنانا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قرآن کی اس آیہ کا مدعی حضرت عیسی علیہ السلام کی موت کو بیان کرنا نہیں۔

(۲) دوسرا واضح قرینہ حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔ "قال الحسن قال رسول الله ﷺ لليهود ان عيسى لم يمت وانه راجع اليكم قبل يوم القيامة" رسول اللہ ﷺ نے یہود کو فرمایا کہ عیسی علیہ السلام مرے نہیں اور قیامت سے پہلے وہ تمہاری طرف لوٹ کر آئیں گے۔ ان تصریحات کی موجودگی میں حقیقی معنی کو چھوڑ کر مجازی معنی مراد نہیں ہو سکتا، اسی لئے جمہور مفسرین اس حقیقی معنی کو مدنظر رکھے ہوئے ہیں۔

"متوفيك" اى مستوفى اجلك معناه انى عاصمك من ان يقتلك الكفار" (كشاف)

اللہ تعالی تمہیں پوری عمر تک پہنچائے گا یعنی تمہیں کفار کے قتل سے بچائے گا۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ لکھتے ہیں "واولى الاقوال بالصحة عندنا قول من قال معنى ذلك انى قابضك من الارض ورافعك الى لتواتر الاخبار من رسول الله ﷺ" یعنی میرے نزدیک صحیح ترین قول یہ ہے کہ اے عیسی میں تجھے زمین سے قبض کرنے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھانے والا ہوں، کیونکہ حضور ﷺ کی احادیث

متواترہ سے یہی چیز ثابت ہے کہ آپ کو زندہ آسمانوں پر اٹھا لیا گیا۔ (ضیاء القرآن)

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ﴿اِنِّی مُتَوَفِّیکَ﴾ اور اس کی مثل رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ﴾ (پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو تو ہی ان پر نگاہ رکھتا تھا) میں تفسیر دو طرح کی جا سکتی ہے ایک یہ کہ آیہ کو اپنے ظاہر پر رکھا جائے اور کسی قسم کی تقدیم و تاخیر نہ کی جائے اور دوسری میں تقدیم و تاخیر کا اعتبار کرنا فرض ہوگا۔

پہلی وجہ: ''انی متوفیک ای متمم عمرک فحینئذ اتوفاک فلااترکھم حتی یقتلوک بل انا رافع الی سمائی ومقربک بملائکتی واصونک عن ان یتمکنوا من ذلک وھذا تاویل حسن''

یعنی ''اِنِّی مُتَوَفِّیکَ'' کا معنی یہ ہے کہ میں تمہیں پوری عمر تک پہنچاؤں گا، اب ''اتوفاک'' کا مطلب یہ ہوگا کہ میں یہود کو ایسے ہی نہیں چھوڑوں گا کہ وہ تمہیں قتل کر دیں بلکہ میں آسمانوں کی طرف تمہیں اٹھا لوں گا اور فرشتوں کا مقرب بنا دوں گا اور تمہیں اس سے محفوظ رکھوں گا کہ یہود تم پر قادر ہو سکیں، علامہ رازی رحمہ اللہ نے اس تاویل کو حسن کہا ہے کہ یہ تاویل اچھی ہے۔

دوسری وجہ: کہ ''متوفیک'' کا معنی ''ممیتک'' کا کیا جائے، یہی معنی ابن عباد اور محمد بن اسحاق سے مروی ہے۔ مقصد اس کا یہ ہے کہ یہود آپ کو قتل نہیں کر سکیں گے بلکہ آپ کو اپنے وقت پر طبعی طور پر وفات ہوگی، اگرچہ ابن وہب نے ایک قول یہ بھی کیا ہے کہ آپ کو تین ساعتیں وفات حاصل ہونے کے بعد آسمانوں پر اٹھائے جانے کا ذکر کیا ہے، اور محمد بن اسحاق نے سات ساعتیں وفات ہونے کے بعد اسمانوں پر اٹھائے جانے کا قول کیا ہے۔

لیکن ان دونوں کے اقوال سے مرزائی آپ کی وفات ثابت نہیں کر سکتے کہ ان کے مرزا صاحب کو مسیح موعود کہا جا سکے، کیونکہ انہوں نے تین یا سات ساعتوں کی وفات کا ذکر کیا ہے، لیکن اس کے بعد یوں ذکر کیا ''ثم احیاہ اللہ ورفعہ'' پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ کیا اور آسمانوں پر اٹھا لیا، ان دونوں حضرات کے اقوال سے بھی آپ کا زندہ ہونا اور آپ کا ہی واپس آنا ثابت ہو گیا، مسیح ابن مریم ہی مسیح موعود ہیں، مرزا غلام احمد صاحب جب مسیح ابن مریم نہیں تو ان کے لوٹنے کا قول کیسے کیا جا سکتا ہے۔ راقم نے یہ بحث اپنی کتاب تذکرۃ الانبیاء میں بھی ذکر کی لیکن اس میں چند سطور شامل نہ کر سکنے کی وجہ سے بحث کچھ کمزور رہ گئی اس کی اصل وجہ والدہ مکرمہ کی علالت اور وفات تھی، عجیب ذہنی دباؤ تھا، اللہ تعالیٰ والدہ مکرمہ کو جنت الفردوس عطاء فرمائے، مغفرت فرمائے، مدارج بلند کرے۔

تیسری وجہ: ربیع بن انس کا قول یہ ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کی طرف اٹھانے میں وفات عطاء کی، لیکن یہ وفات کیسے تھی؟ یہ اسطرح تھی جس کا ذکر رب تعالیٰ نے یوں فرمایا ﴿اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا﴾ (سورۃ الزمر، آیۃ نمبر ۴۲)

''اللہ تعالیٰ جانوں کو وفات دیتا ہے ان کی موت کے وقت، اور جو نہ مریں انہیں ان کے سوتے میں''، یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو اٹھاتے وقت نیند کا غلبہ عطاء کیا جسے بظاہر وفات سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس لئے کہ روح سیلانی کو قبض کر لیا جاتا ہے، انسان چلتا پھرتا نہیں، سنتا، سمجھتا نہیں، لیکن اس کی روح حیاتی باقی رہتی ہے، اسی لئے سانس چل رہا ہوتا ہے۔

چوتھی وجہ: اگر چہ واؤ ترتیب پر دلالت نہیں کرتی لیکن اگر ترتیب والا معنی اعتبار کر ہی لیا جائے تو پھر بھی اتنا مطلب نکل سکے گا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرمایا کہ میں تمہیں پہلے فوت کرنے والا ہوں اور پھر آسمانوں پر اٹھانے والا ہوں، لیکن یہ کیسے کرے گا، اور کب کرے گا، یہ ذکر نہیں یہ دلیل پر موقوف ہے کہ اس موت وحیات سے مراد کون سی موت وحیات ہے۔ دلیل سے تو یہ ثابت ہے کہ آپ زندہ ہیں، کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اتریں گے اور دجال کو قتل کریں گے پھر فوت ہوں گے، اس سے معلوم ہوا کہ آپ کو آسمانوں پر زندہ اٹھالیا گیا، پھر آپ اتریں گے، اس کے بعد آپ پر وقت مقرر پر وفات آئے گی، اس وفات کے بعد آپ کو آسمانوں پر اٹھایا جائے گا جیسا کہ سب لوگوں کو موت عطاء کر کے پھر زندہ کر کے آسمانوں پر اٹھایا جائے گا۔ لھذا واؤ کو ترتیب کے معنی میں اگر لیا جائے تو اترنے کے بعد وفات اور اس کے اٹھایا جانا مراد ہے۔

پانچویں وجہ: ابوبکر واسطی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ﴿اِنِّیْ مُتَوَفِّيْكَ﴾ کا معنی یہ ہے کہ تمہاری خواہشات اور نفسانی منافع کے حصول کو مارنے والا ہوں، اور میں تمہیں آسمانوں پر اٹھانے والا ہوں۔

اسلئے کہ جو اللہ کے سواء سے اپنے آپ کو دور نہ کرلے وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے مقام تک نہیں پہنچ سکتا، عیسیٰ علیہ السلام کو جب آسمانوں پر اٹھالیا گیا تو آپ کا حال فرشتوں والا ہو گیا، فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے شہوت اور غیظ وغضب اور برے اخلاق سے دور رکھا ہوا ہے۔

چھٹی وجہ: بیشک ''التوفی'' کا معنی کسی چیز کو مکمل طور پر لینا'' اللہ تعالیٰ ''علیم'' اور ''خبیر'' ہے جسے یہ معلوم تھا کہ کچھ لوگ کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی روح کو آسمانوں پر اٹھایا ہے جسم کو نہیں، تو رب تعالیٰ نے ''متوفیک'' ذکر فرما کر اس وہم کا ازالہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مکمل طور پر روح اور جسم دونوں کو آسمانوں پر

اٹھایا ہے۔ اس تاویل کے صحیح ہونے پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿وَمَا یَضُرُّوْنَکَ مِنْ شَیْءٍ﴾ (وہ آپ کا کچھ نقصان نہیں کر سکیں گے) دلالت کر رہا ہے۔

ساتویں وجہ: ﴿اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہیں فوت ہونے والے کی طرح کرنے والا ہوں، اس لئے کہ جب آپ کو آسمانوں پر اٹھالیا گیا تو دنیا والے آپ کی زیارت سے مشرف نہ ہو سکے آپ کی خبر اور آپ کے اثرات زمین سے بظاہر منقطع ہو گئے تو آپ فوت ہونے والے کی طرح ہو گئے۔

"واطلاق اسم الشئی علی ما یشابهه فی اکثر خواصه وصفاته جائز حسن"

ایک چیز پر اطلاق کرنا اس کے مشابہ کے اکثر خواص وصفات کو دیکھ کر جائز اور حسن ہے۔

آٹھویں وجہ: "التوفی" کا معنی "قبض کرنا" بھی آتا ہے جیسے کہا جاتا ہے "وفاتنی فلان دراهمی" یعنی فلاں شخص نے میرے درہم میرے قبضہ میں دے دئے۔ اور کبھی کہا جاتا ہے "توفیتها منه" تو اس کا معنی ہوتا ہے "میں نے اس سے دراہم قبضہ میں لے لئے۔

اعتراض: اس صورت میں یہ دونوں لفظوں کا ایک معنی ہوگا کیونکہ "متوفیک" کا معنی ہوگا "قبض کرنا یعنی اٹھانا" اور "رافعک" کا معنی ہوگا "اٹھانا" یہ تکرار ہے اس کا کیا فائدہ؟

جواب: "متوفیک" ایک عمومی معنی پر دلالت کر رہا ہے یعنی یہ جنس ہے اس کے تحت مختلف نوعیں ہیں کیونکہ قبض کرنا کبھی موت کے ذریعے ہوتا ہے اور کبھی آسمانوں پر اٹھا کر ہوتا ہے، اب واضح ہوا کہ "متوفیک" سے پتہ چلا کہ آپ کو قبض کرنا ہے وہ کیسے؟ پھر "رافعک" سے یہ واضح ہو گیا کہ آسمانوں پر اٹھا کر۔

نویں وجہ: "متوفیک" کا معنی فوت کرنے والا نہیں، بلکہ مکمل کرنا مراد لیا گیا ہے اور مضاف یہاں محذوف ہے، اصل عبارت "متوفی عملک" ہے، یعنی میں تمہارے اعمال کو اپنے حضور مکمل طور پر قبول کرنے والا ہوں یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ﴾ اس کا مطلب بھی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مکمل طور پر تمہارے اعمال کو قبول کرنے والا ہے، یعنی اس طرح کلمات کے چڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو جو اللہ کے دین کی راہ میں اور اس کے دشمنوں تک دین کے پھیلانے میں جو مشقت پہنچتی ہے وہ اس کے اجر وثواب کو ضائع نہیں کرتا، یہاں تک تو پہلی تاویل کے مطابق کلام ہے جو اپنے ظاہر پر ہے، کوئی تقدیم وتاخیر کا اعتبار نہیں۔

دوسری تاویل: یعنی جب واؤ کو اپنی اصلی حالت میں رکھا جائے کہ واؤ میں ترتیب کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا

تو اب معنی میں تقدیم وتاخیر ہوگی، اب آیۃ کریمہ کا مطلب یہ ہوگا:

"ورافعک الی ومطھرک من الذین کفروا ومتوفیک بعدانزال ایاک فی الدنیا"

بیشک میں تمہیں اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور کافروں سے تمہیں پاک کرنے والا ہوں اور پھر تمہیں دنیا میں جب اتاروں گا اس کے بعد فوت کرنے والا ہوں۔ (ماخوذ از کبیر)

تقدیم وتاخیر قرآن پاک میں کثیر جگہ واقع ہے، اتقان میں علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اس کی کئی مثالیں دیں ہیں، چند ملاحظہ ہوں ﴿وَاسْجُدِیْ وَارْکَعِیْ﴾ (اور سجدہ کرو اور رکوع کرو) حالانکہ اس وقت بھی نماز میں رکوع پہلے اور سجدہ بعد میں تھا، لیکن یہاں تقدیم وتاخیر کے طور پر ذکر ہوا۔

﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ﴾ اللہ تعالیٰ نے موت وحیات کو پیدا کیا، حالانکہ حیات موت سے پہلے ہے، لھذا یہاں بھی تقدیم وتاخیر ہے۔

﴿خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ﴾ (وہ ذات جس نے) تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا، یہاں بھی مخاطبین کا ذکر پہلے ہوا اور ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کا ذکر بعد میں کیا گیا، اس میں تقدیم وتاخیر ہے۔

﴿وَلَقَدْ اُوْحِیَ اِلَیْکَ وَاِلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکَ﴾ اور تحقیق آپ کی طرف اور آپ سے پہلے انبیاء کرام علیھم السلام کی طرف وحی کی گئی، یہاں بھی تقدیم وتاخیر پائی گئی کیونکہ پہلے انبیاء کرام کی طرف وحی پہلے کی گئی اور نبی کریم ﷺ پر بعد میں، لیکن ذکر آپ کا پہلے اور دوسرے انبیاء کرام کا بعد میں کیا گیا۔ (ماخوذ از نعیمی)

﴿وَرَافِعُکَ اِلَیَّ﴾ "اور اٹھا رہا ہوں تمہیں اپنی طرف"

راقم نے یہ ترجمہ روح البیان سے لیا ہے (وَرَافِعُکَ) الآن (الی) اور ابھی اٹھا رہا ہوں تمہیں اپنی طرف۔ (روح البیان)

اپنی طرف اٹھانے کا کیا مطلب:

اس کی چند وجوہ ہیں، ظاہر معنی مراد لینا ممکن نہیں کہ یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ (معاذ اللہ) کسی مکان میں ہے تو اس مکان کی طرف آپ کو بلانے کا تذکرہ ہے۔

(۱) "الاول ان المراد الی محل کرامتی وجعل ذلک رافعا الیہ للتفخیم والتعظیم"

پہلی وجہ ان میں سے یہ ہے کہ اپنی طرف اٹھانے کا یہ مطلب ہے کہ میں تمہیں اپنے مقام عزت

میں بلند کرنے والا ہوں، یعنی اس مقام کی طرف اٹھانے والا ہوں جہاں تمہیں عظمت وکرامت حاصل ہوگی۔اس لحاظ پر اپنی طرف اٹھانے کا مطلب مقام عزت وتکریم کی طرف بلند کرنا جو تقرب الہی کا ذریعہ ہوگا۔

یعنی مراد آسمانوں پر اٹھانا ہی ہے،لیکن آسمان اللہ تعالی کا مکان نہیں وہ تو مکان سے پاک ہے،البتہ''اپنی طرف اٹھانے'' کا مطلب اپنی طرف سے کرامت وتعظیم عطاء کرنا ہے۔یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام نے عراق سے شام تک ہجرت کرتے ہوئے کہا ﴿اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ﴾ بیشک میں جانے والا ہوں اپنے رب کی طرف۔اس کا مطلب بھی یہ ہے کہ میں ہجرت کررہا ہوں رب تعالی کی رضاء کیلئے ،لھذا وہ مجھے اپنے قریب کرے گا اور مجھے معظم ومکرم بنائے گا۔اسی طرح بادشاہ کہتا ہے''ارفعو ھذاالامر الی القاضی'' اس معاملہ کو قاضی کی طرف اٹھاؤ''یعنی یہ مقدمہ قاضی کی عدالت میں لے جاؤ کہ وہ ہی اس کا فیصلہ کرے گا۔

اسی طرح حاجی لوگوں کو کہا جاتا ہے''زوار اللہ''(اللہ کی زیارت کرنے والے)یعنی مقامات مقدسہ کی زیارت سے اللہ تعالی کا تقرب حاصل کرنے والے۔اور کعبہ شریف کے مجاوروں کو کہا جاتا ہے''جیران اللہ'' اللہ کے مجاور(پڑوسی)اس سے مراد بھی یہی ہے کہ کعبہ کی مجاورت کی وجہ سے اللہ تعالی کا تقرب حاصل کرنے والے جن کو اللہ تعالی عظمت وتکریم عطاء فرماتا ہے۔

(۲) ''الوجه الثانی فی التاویل ان یکون قوله''ورافعک الی''معناه انه یرفع الی مکان لا یملک الحکم علیه فی الحقیقةوفی الظاهر الاالله''

دوسری وجہ تاویل کی یہ ہے کہ اللہ تعالی کے ارشاد گرامی ﴿وَرَافِعُکَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں اس مکان کی طرف اٹھا رہا ہوں جہاں حکم حقیقت میں اور ظاہر میں بھی صرف اللہ تعالی کا چلتا ہے،زمین میں تو کئی حاکم اپنے اپنے حکم چلانے کے دعویدار ہوتے ہیں،لیکن آسمانوں میں ان کی حکومت نہیں چلتی،لھذا تمہیں آسمانوں پر اٹھا رہا ہوں۔

(۳) ''الوجه الثالث لابد من حمل اللفظ علی ان المراد ورافعک الی محل ثوابک ومجازاتک''

تیسری وجہ یہ ہے کہ ان الفاظ گرامی کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی تمہیں تمہارے ثواب اور جزاء کی طرف اٹھانے والا ہے،جب جزاء اور ثواب رب تعالی نے عطاء کرنا ہے تو مطلب یہ ہوگیا کہ وہ تمہیں اس جزاء وثواب کی طرف اٹھانے والا ہے جو اسی کی طرف سے تمہیں حاصل ہونا ہے۔

﴿وَمُطَهِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوا﴾

''اور پاک کررہا ہوں (دور کررہا ہوں) تمہیں ان سے جنہوں نے کفر کیا''

یعنی تمہیں کافروں سے نکال رہا ہوں، اور تمہارے اور ان کے درمیان جدائی پیدا کررہا ہوں، ''تمہیں پاک کررہا ہوں کافروں سے'' کہہ کر عیسیٰ علیہ السلام کی عظمت شان کو ذکر کیا اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے بلند منصب کا ذکر کیا، صرف یہ نہیں کہا کہ تمہیں کافروں سے دور کررہا ہوں، بلکہ کہا کہ وہ تمہیں کافروں سے پاک کررہا ہے کہ وہ نجس ہیں، اسلئے کافروں کے کفر یعنی نجاست سے تمہیں پاک کررہا ہے۔

﴿وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوا اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ﴾

''اور کروں گا ان کو جنہوں نے تابعداری کی اوپر ان کے جنہوں نے کفر کیا قیامت تک۔''

رب تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو بتایا کہ میں تمہارے متبعین کو کافروں سے بلند مرتبہ عطاء کروں گا، مطلب یہ ہے کہ میں ان کو کافروں پر غلبہ عطاء کروں گا۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ہی بامحاورہ یہی ہے کہ، وہ ان کو کافروں پر غلبہ دے گا، بظاہر ایک مراد تو یہ ہے کہ عیساؤں کو یہودیوں پر قیامت تک غلبہ حاصل رہے گا کہ یہودی عیساؤں کے زیر تسلط رہیں گے، اور ان کے محتاج رہیں گے، لیکن حقیقت میں مطلب یہ ہے کہ آپ کے متبعین اس وقت وہ لوگ تھے، ''فھم الذین کانوا یؤمنون بانہ عبداللہ ورسولہ'' جنہوں نے آپ کو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول مانا، جنہوں نے آپ کو خدا یا خدا کا شریک یا خدا کا بیٹا کہا وہ آپ کی تابعداری نہ کرنے والے تھے۔

''واما بعد الاسلام فھم المسلمون'' لیکن اسلام کے بعد آپ کو اللہ کا بندہ اور رسول ماننے والے مسلمان ہی ہیں۔ یہ بھی خیال رہے کہ عیسائی اگرچہ بظاہر اپنے آپ کو عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین کہلاتے ہیں لیکن وہ ایسے نظریات رکھتے ہیں، جو عیسیٰ علیہ السلام کو ناپسند تھے، لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو دولت دے رکھی ہے اور یہود پر ان کو قوت دے رکھی ہے۔

''واما الیھود فلاتری فی طرف من اطراف الدنیا ملکا یھودیا ولا بلدة مملوأة من الیھود بل یکونون این کانوا بالذلة والمسکنة واما النصاری فامرھم بخلاف ذلک''

یہودیوں کی دنیا میں کہیں حکومت قائم نہیں، کوئی ایسا شہر نہیں جہاں صرف یہودی آباد ہوں، بلکہ یہودیوں کو ذلت اور مسکینی حاصل ہے بخلاف عیسائیوں کے کہ ان کی حکومتیں قائم ہیں اور وہ ذلت وخواری سے بچے ہوئے ہیں۔ فلسطین میں حقیقت میں یہودیوں کی حکومت قائم نہیں، کیونکہ وہ نصاریٰ نے ہی حکومت بنا رکھی ہے یہود ان کے غلامی میں زندگی گذار رہے ہیں، ان کے نمک خوار ہیں۔

خیال رہے کہ فلسطین میں بنی اسرائیل کی حکومت اور قبضہ حرامی بچے کی طرح ہے جن مسلمانوں نے بنی اسرائیل کی حکومت کو تسلیم کیا یا تسلیم کرنے کیلئے بے تاب ہیں وہ ملت اسلامیہ کے غدار ہیں، اور حرامی بچے کو حلالی بنانے کی ناکام کوشش کررہے ہیں۔

فوقیت کا ایک اور مطلب:

"ان المراد من هذه الفوقية الفوقية بالحجة و الدليل" یعنی مراد اس فوقیت سے حجت اور دلیل میں فوقیت ہے جس طرح اس سے پہلے الفاظ گرامی "ورافعک" کا مطلب بھی درجہ اور منقبت کے لحاظ سے زندہ ہی اپنی طرف اٹھانا ہے اسی طرح یہاں بھی بلند درجات مراد ہیں۔

﴿ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُکُمْ فَاَحْکُمُ بَیْنَکُمْ فِیْمَا کُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ﴾

"پھر میری طرف لوٹنا ہے تم نے، تو میں فیصلہ کروں گا درمیان تمہارے جس میں کرتے تھے تم اختلاف۔"

عیسیٰ علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے بشارت دی کہ ان کو دنیا میں خواص شریفہ اور درجات رفیعہ عالیہ (خاص قسم کے فضائل اور بلند درجات) عطاء کئے جارہے ہیں، البتہ قیامت کے دن آپ پر ایمان لانے والوں اور آپ کی رسالت کا انکار کرنے والوں کے درمیان فیصلہ کردیا جائے گا۔ اس فیصلہ کے متعلق آنے والی آیۃ کریمہ میں تفصیل آرہی ہے۔

اعتراض: جو یہ بیان کیا گیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی شبیہ ایک اور شخص ططیانوس کو دے دی گئی تو اسے قتل کردیا گیا، اس طرح تو محسوسات پر اعتبار ہی اٹھ جائے گا، ایک شخص کہتا ہے میں نے اپنے بیٹے کو دیکھا، پھر میں نے اسے دوبارہ دیکھا لیکن میں نے یہ سمجھا کہ ہوسکتا ہے کہ یہ میرا بیٹا نہ ہو بلکہ کوئی اور شخص ہو، اس پر میرے بیٹے کی شبیہ ڈال دی گئی ہو، "وحينئذ يرتفع الامان عن المحسوسات" اس وقت محسوسات سے امان اٹھ جائے گا۔

"وایضا فالصحابة الذین رأوا محمدا ﷺ یأمرھم وینھا ھم وجب ان لایعرفوا انه محمدلاحتمال انه القی شبھه علی غیره وذلک یقتضی الی سقوط الشرائع"

اسی طرح اس میں اور خرابی یہ لازم آئے گی کہ صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ انہیں اوامر ونواہی بیان فرمارہے ہیں (یعنی بعض کاموں کا حکم دے رہے ہیں اور بعض سے منع فرمارہے ہیں) لیکن اس میں احتمال یہ پایا جائے گا کہ ہوسکتا ہے یہ کوئی اور شخص ہو اس پر نبی پاک ﷺ کی شبیہ ڈال دی گئی ہو۔اس طرح تو کسی شریعت، کسی نبی پر اعتبار نہیں رہے، اور نہ ہی مبصرات (دیکھی جانے والی چیزوں) پر اعتبار رہے گا، تو پتہ چلا کہ شبیہ ڈالنے والا قول درست نہیں۔

جواب: "والجواب ان کل من البت القادر المختار یسیلم انه تعالٰی قادر علی ان یخلق انسانا آخر علی صورة زید"

شبیہ ڈالنے کا یہ مقصد نہیں کہ ہر جگہ شبیہ ڈالنے کا قول کیا جائے بلکہ دلائل وروایات سے ثابت ہو تو پھر شبیہ ڈالنے کا قول کیا جائے گا، صرف اتنا تسلیم کرنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ قادر ومختار ہے جب چاہے کسی پر دوسرے کی شبیہ ڈال دے، لیکن اس کا ثبوت یقینی ہو تو شبیہ ڈالنے کا قول کیا جائے گا صرف عقلی احتمالات کی وجہ سے محسوسات اور شرعی احکام کے اٹھنے کا قول نہیں کیا جائے گا۔عیسیٰ علیہ السلام کی شبیہ ططیانوس پر ڈال دی گئی روایات سے ثابت ہے جس کا مزید تذکرہ ان شاء اللہ ﴿وَمَاقَتَلُوْهُ وَمَاصَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ﴾ کی وضاحت میں آئے گا۔

لیکن کسی اور شخص کی شبیہ کسی اور پر ڈالنے کا کوئی ثبوت نہیں، اسلئے صرف عقلی ڈھکوسلوں کا کوئی اعتبار نہیں۔

(تمام بحث ماخوذ از کبیر)

علامہ رازی رحمہ اللہ نے اس مقام پر مختلف انداز پر کئی اشکال پیش کئے ہیں لیکن تمام ہی ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں، تمام کے ذکر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

گذشتہ سے پیوستہ:

پہلے جو اقوال ذکر کئے گئے ہیں کہ بعض اقوال میں آپ کو چند گھڑیاں وفات عطاء کر کے پھر زندہ کر کے اٹھایا گیا ہے وہ اقوال صحیح نہیں۔

"والصحیح کما قاله القرطبی ان الله تعالی رفعه من غیر وفاة ولانوم وھواختیار الطبری"

صحیح قول وہی ہے جو قرطبی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے آپ کو بغیر وفات اور بغیر نیند کے زندہ آسمانوں پر اٹھالیا" یہی طبری کا بھی مختار قول ہے۔ (روح المعانی)

سب سے زیادہ قوی دلیل تو ارشاد مصطفوی ہے "قال ﷺ ان عیسی لم یمت وانہ راجع الیکم قبل یوم القیامۃ" نبی کریم ﷺ نے فرمایا عیسی علیہ السلام فوت نہیں بیشک وہ قیامت سے پہلے تمہاری طرف لوٹ کر آئیں گے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

حیات عیسی علیہ السلام پر مزید بحث ان شاء اللہ چھٹے پارہ میں آئے گی۔

تنبیہ: علامہ محی السنۃ ابو محمد حسین بن مسعود بغوی رحمہ اللہ نے محمد بن اسحاق کے قول کو یوں نقل فرمایا:

"وقال محمد بن اسحاق ان النصاری یزعمون ان اللہ تعالی توفاہ سبع ساعات من النہار ثم احیاہ ورفعہ"

محمد بن اسحاق کا قول یہ ہے کہ نصرانی گمان کرتے ہیں کہ اللہ تعالی نے عیسی علیہ السلام کو دن کی سات گھڑیاں موت عطاء کی پھر ان کو زندہ کر کے اٹھالیا گیا۔ (معالم التنزیل للبغوی)

یعنی محمد بن اسحاق کا یہ اپنا قول نہیں بلکہ یہ قول نصرانیوں کا ہے جسے محمد بن اسحاق نے نقل کیا ہے، راقم کو علامہ بغوی کی عبارت دوسرے مفسرین کی عبارات سے عظیم نظر آئی۔

عیسی علیہ السلام کے بعد دین میں تحریف:

حضرت عیسی علیہ السلام کو جب اللہ تعالی نے آسمانوں پر اٹھالیا تو آپ کی امت کے لوگ مختلف فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ بعض وہ تھے جو ایمان پر قائم رہے کہ عیسی علیہ السلام اللہ کے بندے اور اس کے رسول تھے، اور اللہ کی عبادت گذار عورت مریم کے بیٹے تھے۔

اور بعض نے عیسی علیہ السلام کے متعلق غلو (حد سے تجاوز) کیا اور آپ کو اللہ کا بیٹا کہا۔

اور ایک فرقہ نے آپ کے متعلق کہا "ھو اللہ" عیسی ہی خدا ہیں۔

اور ایک فرقہ نے یوں کہا "ھو ثالث ثلاثۃ" وہ تین خداؤں میں سے ایک خدا ہیں۔

(ان تینوں فرقوں کی تفصیل اور ان کا رد ان شاء اللہ چھٹے پارہ میں آئے گا)

پھر یونان کے بادشاہوں میں سے ایک ان کا بادشاہ بنا جسے قسطنطین کہا جاتا تھا، یہ نصرانیت میں داخل ہوا لیکن مکاری کی وجہ سے تاکہ ان لوگوں کے دین کو فاسد کر دے، یہ اگرچہ دین عیسوی سے جاہل تھا لیکن فلسفی تھا، بے دین، مکار، حیلہ ساز، روشن خیال تھا، (بے حیائی اور بے دینی کا نام روشن خیالی رکھ لیا گیا ہے) اس نے دین

عیسوی کو تبدیل کر دیا، اس میں کچھ زیادتیاں کر دیں اور میں کچھ کمی کر دی، اپنی طرف سے قوانین بنادے، عظیم امانت یعنی دین عیسوی میں گھٹیا قسم کی خیانت کر دی۔

"واحل فی زمانه لحم الخنزیر" اسی کے زمانہ میں خنزیر کا گوشت حلال کیا گیا۔

"وصلوا الی المشرق" اسی کے کہنے پر مشرق کی طرف منہ کر کے وہ لوگ نماز پڑھنے لگے۔

"وصوروا له الکنائیس والمعابد والصوامع" گرجا، کلیسا اور عبادت خانوں میں اس کی تصویریں لگائی گئیں۔

"وزادفی صیامهم عشرة ایام من اجل ذنب ارتکبه فیما یزعمون" نصرانیوں نے اس کے بعض افعال کو گناہ سمجھا تو اس نے ان کو مطمئن کرنے کیلئے دس روزوں کا اضافہ کر دیا۔ یعنی چالیس روزے کر دیئے، (دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ ان لوگوں نے رمضان کے روزوں کو موسم بہار میں رکھنے کا فیصلہ کیا اور دس روزے بڑھا دیئے) "وصار دین المسیح دین قسطنطین" دین عیسوی دین قسطنطین بن گیا۔

اس کی مکاری کا یہ عالم تھا کہ بظاہر دین دار بننے کیلئے اس نے بارہ ہزار سے زائد عبادت خانے بنائے اور اس نے ایک شہر بنایا جس کو اپنے نام کی طرف منسوب کر کے اس کا نام "قسطنطنیہ" رکھا، شاہی چمچے اور درباری کڑ چھے (جو ہر حاکم کی تعریف کر کے اپنے ذہن وضمیر کا سودا کر کے، بے حیاء بن کر مفاد حاصل کرتے ہیں) مفاد پرست ٹولہ (گروہ) اس کا تبع ہو گیا۔

ان لوگوں نے یہود پر قہر و جبر کیا "ایده الله علیهم لانه اقرب الی الحق منهم وان کان الجمیع کفار العن الله علیهم" اللہ تعالی نے اس گروہ کو یہود پر فتح عطاء فرمائی، اگرچہ دونوں فرقے کافر تھے، اللہ کی لعنت کے مستحق تھے تاہم یہ لوگ بنسبت یہودیوں کے کچھ حق کے قریب تھے۔

جب نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالی نے مبعوث فرمایا تو وہی لوگ آپ پر ایمان لائے یعنی اللہ تعالی اور فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر حق کے ساتھ ایمان لائے، "فکانوا هم اتباع کل نبی علی وجه الارض" جو نسل بنسل اس روئے زمین پر ہر نبی پر ایمان لاتے رہے جن ان لوگوں نے مطلقا عربی امی نبی کی تصدیق کی۔ خاتم الرسل تسلیم کیا اور تمام انسانوں بلکہ تمام مخلوق کا سردار تسلیم کیا تو وہ تمام لوگوں سے افضل ہو گئے، کیونکہ باقی لوگ اگرچہ بظاہر یہ دعوی کرتے تھے کہ ہم اپنے نبی پر ایمان رکھتے ہیں اور اپنے نبی کے دین پر قائم ہیں لیکن ان کا یہ دعوی جھوٹا تھا کیونکہ نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے پر پہلی تمام شریعتوں کو منسوخ کر دیا گیا، جن تمام دین منسوخ ہو چکے

تھے تو ان کا یہ کہنا کہ ہم اپنے نبی کے دین پر قائم ہیں خود بخود باطل ہو گیا، ان کا جھوٹ واضح ہو گیا۔

نبی کریم ﷺ کا دین وہ دین ہے جو قیامت تک قائم رہنے والا ہے، اور تمام دینوں پر اسے فوقیت حاصل ہوئی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت، تائید اور نصرت کو اپنے ذمہ کرم پر لے لیا ہے۔

"فلهذافتح الله لاصحابه مشارق الارض مغاربها واحتازوا جميع الممالك ودانت لهم جميع الدول وكسروا كسرى وقصروا قيصر وسلبوهما كنوزهما وانفقت في سبيل الله"

اسی وجہ سے کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام نے آپ پر ایمان لایا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو زمین کے مشارق و مغارب پر فتح عطاء فرمائی، قیصر و کسریٰ کی بادشاہیاں ان کو حاصل ہوئیں، اور ان کے خزانے ان کو حاصل ہوئے جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کے ذریعے ان لوگوں کو یہ خبر دے دی:

"وَعَدَاللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُو الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِخَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ" (سورة النور آية نمبر ٥٥)

اللہ نے وعدہ دیا ان کو جو تم میں سے ایمان لائے اور اچھے کام کیے کہ ضرور انہیں زمین میں خلافت دے گا جیسی ان سے پہلوں کو دی اور ضرور ان کیلئے جما دے گا (قائم رکھے گا) ان کا وہ دین جو ان کیلئے پسند فرمایا ہے اور ضرور ان کے اگلے خوف کو امن سے بدل دے گا، میری عبادت کریں، میرا شریک کسی کو نہ ٹھہرائیں اور جو اس کے بعد ناشکری کریں تو وہی لوگ بے حکم (فاسق) ہیں۔

جب عیسیٰ علیہ السلام پر حقیقی اور سچا ایمان رکھنے والے نبی کریم ﷺ پر ایمان لے آئے تو اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو اپنی تائید و نصرت سے نوازا تو "سلبوا النصارى بلاالشام والجؤهم الى الروم فلجا واالى مدينتم القسطنطنية ولايزال الاسلام واهله فوقهم الى يوم القيامة" مؤمنوں نے نصرانیوں سے شام کے علاقہ جات چھین لئے اور ان کو روم کی طرف دھکیل دیا تو وہ اپنے شہر قسطنطنیہ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ اسلام کو اور مسلمانوں کو قیامت تک غلبہ حاصل رہے گا، یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے، اور حقیقت یہی ہے کہ "ان الاسلام يعلو ولايعلى" اسلام یقیناً غالب رہے مغلوب نہیں ہو گا، یہود و نصاریٰ یا ان کے حواری کوشش کرتے رہے، کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے لیکن ذلیل و خوار ہوتے رہیں گے۔

"وقد اخبر الصادق والمصدوق ﷺ امته بان آخرهم سيفتحون القسطنطيهة

ویستفینون ما فیها من الاموال ویقتلون الروم مقتلة عظیمة جدالم یر الناس مثلها ولا یرونّ بعدها نظیرھا"

سچے نبی کریم ﷺ نے خبر دی، جو سچ ہو کر رہی کہ میری امت کے لوگ آخر میں (یعنی صحابہ اپنے آخری دور میں) قسطنطنیہ کو فتح کرلیں گے، اس کا مال ان کے ہاتھ آئے گا، اور رومیوں سے یہ بہت عظیم جنگ کریں گے جس کی نظیر نہ کسی نے اس سے پہلے دیکھی ہوگی اور نہ ہی کوئی بعد میں دیکھے گا اور آخر کار روم کو بھی فتح کرلیں گے۔

آپ کی یہ دونوں خبریں سچی ہو کر رہیں، کافروں کے منہ بند ہو گئے جو کہتے تھے کہاں قیصر و کسری اور قسطنطنیہ کی مضبوط بادشاہیاں اور مضبوط قلعے اور کہاں مسلمانوں کے نبی کی فتح کی خبریں، رب تعالی کا یہ وعدہ بھی سچا ہو کر رہا ﴿وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (اور کروں گا ان کو جنہوں نے تمہاری تابعداری کی اوپر ان لوگوں کے جنہوں نے کفر کیا) کہ عیسی علیہ السلام پر ایمان لانے والے اور آپ کے متبعین نبی کریم ﷺ پر ایمان لے آئے وہی حضرت عیسی علیہ السلام کے سچے متبعین ہیں، ان کو کافروں پر فوقیت حاصل رہی اور اللہ تعالی کے وعدہ کے مطابق تا قیامت ان کو فوقیت حاصل رہے گی۔ (ماخوذ از ابن کثیر وصابونی)

❁ واخرج ابن عساکر عن معاویة بن ابی سفیان قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول انها لن تبرح عصابة من امتی یقاتلون علی الحق ظاهرین علی الناس حتی یأتی امر اللہ وهم علی ذلک ثم قرا بهذه الآیة یا عیسی انی متوفیک "الآیة"

ابن عساکر نے حضرت امیر معاویہ بن ابی سفیان سے روایت ذکر کی کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ میری امت میں سے حق پر جہاد کرنے والی ہمیشہ قائم رہے گی قیامت تک، ان کو دوسرے لوگوں پر غلبہ حاصل رہے گا، پھر آپ نے یہی آیۃ کریمہ "یاعیسی انی متوفیک" (مکمل آیۃ کریمہ) تلاوت کی۔ (درمنثور)

❁ واخرج ابن المنذر عن الحسن فی الآیة قال عیسی مرفوع عنداللہ لم ینزل قبل یوم القیامة فمن صدق عیسی و محمد ﷺ وکان علی دینهما لم یزالوا ظاهرین علی من فارقهم الی یوم القیامة"

ابن منذر نے حسن بصری رحمہ اللہ سے ایک روایت ذکر کی کہ عیسی علیہ السلام کو اللہ تعالی کے ہاں اٹھالیا گیا پھر وہ قیامت سے پہلے اتریں گے، جس شخص نے عیسی علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ کی تصدیق کی وہ ان کے دینوں پر قائم ہو گئے، وہ قیامت تک ان لوگوں پر غالب رہیں گے جو ان کے دینوں سے جدا رہے یعنی ان پر ایمان نہ لائے۔ (درمنثور)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نَّاصِرِیْنَ○﴾ (آیۃ نمبر ۵۶)

(1) تو وہ کافر ہوئے میں انہیں دنیا وآخرت میں سخت عذاب دوں گا اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔

(2) تو وہ جنہوں نے کفر کیا تو میں عذاب دوں گا ان کو سخت عذاب دنیا میں اور آخرت میں، اور نہ ہی ہوگا ان کا کوئی مدد کرنے والا۔

ماقبل سے تعلق:

اس سے پہلے ذکر فرمایا ﴿اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَیْنَكُمْ فِیْمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ﴾ (میری طرف ہی تم نے لوٹنا ہے تو میں فیصلہ کردوں گا تمہارے درمیان جس میں تم اختلاف کرتے تھے) اب اس کی تفصیل بیان کی جارہی ہے کہ تمہارا اختلاف یہ تھا کہ ایک قوم نے تم میں سے ایمان قبول کیا اور دوسری نے کفر کیا، اور ان کے درمیان فیصلہ کیا ہوگا؟ وہ رب تعالیٰ نے کافروں کے متعلق بیان فرمادیا۔ ﴿فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ﴾ تو میں ان کو عذاب دوں گا سخت دنیا اور اخرت میں، ایمان والوں کے متعلق جو فیصلہ کیا جانا ہے اسے بھی ذکر فرمادیا جو ساتھ ہی آنے والی آیۃ کریمہ میں آرہا ہے ﴿فَیُوَفِّیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ﴾ پورا پورا دے گا ان کو ان کا اجر وثواب۔

کافر کا عذاب دنیا میں دوطریقے سے ہوگا:

(۱) ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ مومنوں کو حکم دیا گیا ہے کہ کافروں کو وہ جہاد میں قتل کردیں یا قید کرلیں، یہ ان کیلئے دنیا میں عذاب ہے، اگر کفار ایمان لے آئیں تو اس عذاب سے چھٹکارا حاصل کرلیں، اسلئے کافر جب ایمان لے آئے تو اس کی جان اور مال محفوظ ہوجاتے ہیں۔

(۲) "والثانی مایلحق الکافر من الامراض والمصائب" ان میں دوسری وجہ یہ ہے کہ کافر کو دنیا میں عذاب یہ حاصل ہوگا کہ اسے امراض اور مصائب حاصل ہوں گی۔

لیکن اس مسئلہ میں اہل علم کا اختلاف ہے کہ کیا امراض ومصائب کو عذاب کہا جائے یا نہ کہا جائے؟ بعض حضرات نے یہ کہا "انہ عقاب فی حق الکافر واذاوقع مثلہ لمؤمن فانہ لا یکون عقابا" کہ کافر کے حق

میں یہ عذاب ہیں، لیکن مؤمن کے حق میں امراض ومصائب کا واقع ہونا عذاب نہیں، بلکہ امتحان وابتلاء ہے کہ یہ صبر کرتا ہے یا نہیں۔ (از کبیر)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کافر کے حق میں بھی امتحان ابتلاء کا قول کرتے ہیں، وہ عذاب نہیں کہتے۔

اعتراض: کافروں کو دنیا میں عذاب دیا جانا دوسری آیات کے مخالف ہے۔ رب تعالی کا ارشاد ﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ﴾ (اگر پکڑتا اللہ تعالی لوگوں کو ان کے ظلم کی وجہ سے تو نہ چھوڑتا روئے زمین پر کوئی چلنے والی چیز)''لفظ''لو''ایک چیز کے امتناع سے دوسری چیز کا امتناع ثابت کرتا ہے، جب روئے زمین پر تمام چیزوں کو فناہ نہیں کیا گیا تو کافروں اور مشرکوں پر عذاب کا دنیا میں نہ آنا بھی ثابت ہو گیا اور رب تعالی کا ارشاد گرامی ہے ﴿اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ﴾ آج (قیامت کے دن) ہر نفس کو اس کے کسب کی جزاء دی جائے گی۔

جواب: یہ آیۃ کریمہ جو زیر بحث ہے اس میں خصوصی طور پر اللہ تعالی نے دین اور دنیا میں عذاب دینے کا ذکر کیا اور دوسری آیات میں حکم عمومی ہے، پہلی آیۃ میں ذکر ہے کہ نبی کریم ﷺ پر اس طرح کا عذاب نہیں آئے گا کہ تمام امت کو اور روئے زمین پر تمام چلنے والے ذی روح حیوانات کو تباہ وبرباد کر دیا جائے، جیسا کہ پہلی امتوں کو مکمل طور پر تباہ وبرباد کر دیا گیا، اور دوسری آیۃ کریمہ میں عمومی طور پر آخرت میں جزاء دینے کا ذکر ہے جس میں دنیا میں عذاب دینے کی ممانعت نہیں۔

قانون یہی ہے کہ خصوص مقدم ہوتا ہے عموم پر، لھذا اس آیۃ کریمہ میں خصوصی طور پر جب دنیا میں عذاب دینے کا ذکر ہے تو آیات میں کوئی تعارض نہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

اعتراض: پہلی آیۃ کریمہ میں جب ﴿اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ﴾ ذکر فرمایا کہ تم میری طرف لوٹنا ہے (تو میں تمہارے درمیان فیصلہ کر دوں گا) لوٹنا تو قیامت کو ہی ہے وہ تو اخروی عذاب کا ہی تقاضا کرتا ہے جب اس کی تفصیل اس آیۃ اور آنے والی آیۃ میں ہے تو دنیا کے عذاب کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟

جواب اول: مقصد یہ ہے کہ کافروں کو عذاب دائمی ہوگا، اس کا انقطاع نہیں ہوگا دنیا اور آخرت میں عذاب کا یہی مقصد ہے۔

جواب دوم: دنیا اور آخرت سے مراد ہو سکتا ہے اول وآخر ہو، یعنی ان کو عذاب اول بھی ہوگا اور آخر

بھی مراد اس سے بھی دوام ہے۔

جواب سوم: رب تعالی نے ذکر فرمایا ﴿وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ﴾ کروں گا آپ کی تابعداری کرنے والوں کو کافروں کے اوپر قیامت تک، ''الی یوم القیامۃ'' غایت ہے ''فوق'' کی، نہ کہ ''جاعل'' کی، یعنی ان کو فوقیت قیامت تک حاصل رہے گی، اس کے بعد ذکر فرمایا ﴿ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ﴾ پھر میری طرف تم نے لوٹنا ہے، اس لوٹنے سے مراد بھی فوقیت اور قرب ہے، کہ ایمان والوں کو کافروں پر فوقیت حاصل رہے گی اور رب تعالی کا قرب حاصل رہے گا، یہ دنیا میں بھی حاصل رہے گا، اور آخرت میں بھی، بخلاف کفار کے کہ وہ پستی میں ہوں گے اور قرب الٰہی سے محروم ہوں گے، یہ محرومیت ہی درحقیقت ان کیلئے دنیا اور آخرت میں شدید عذاب ہوگا، اس سے بڑھ کر اور عذاب کیا ہوگا کہ رب تعالی سے دور ہو جائیں گے۔

طلباء کرام خیال رکھیں کہ ''ثم'' ''تراخیٔ رتبی'' کیلئے استعمال ہے، ایک کلام سے دوسری کلام کی طرف ترقی کیلئے استعمال ہے ''تراخیٔ زمانی'' کیلئے استعمال نہیں۔ (ماخوذ از روح المعانی)

اعتراض: آیۃ کریمہ سے تو یہ سمجھ آ رہا ہے کہ دنیا میں کافروں کو سخت عذاب دیا جائے گا، حالانکہ دنیا میں کبھی کافروں کی سخت گرفت ہوتی ہے، کبھی مومنوں کی تو فرق کیسے ثابت ہوگا؟

جواب: آیۃ کریمہ میں اگر یہود مراد ہوں تو فرق واضح ہے کہ ان کو ذلت اور مسکینی لازم ہے، اگر عام کفار مراد ہوں تو پھر بھی فرق واضح ہے کہ وہ فوقیت وقرب سے محروم ہوں گے، اور مومنوں کو حاصل ہوں گی۔ (از ایضاً بتصرف)

﴿وَمَا لَهُمْ مِّنْ نَّاصِرِيْنَ﴾ **اور نہیں ہوگا کوئی ان کا مدد کرنے والا۔**

بظاہر اس پر وہم یہ ہوتا ہے کہ کبھی مومنوں کو یا ان کے حکام کو وعدہ کی وجہ سے ان کو قتل کرنے سے منع کیا جاتا ہے، یہ ان کی امداد ہی ہے، لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ ان کو قتل کرنے سے مانع وعدہ ہے نہ کہ ان کی امداد مقصود ہے۔ (از ایضاً)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿وَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیۡهِمۡ اُجُوۡرَهُمۡ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیۡنَ۝﴾ (آیۃ نمبر ۵۷)

(1) اور وہ جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے اللہ ان کا نیگ انہیں بھرپور دے گا اور ظالم اللہ کو نہیں بھاتے۔

(2) اور وہ جو ایمان لائے اور عمل کیے اچھے، تو پورا پورا دے گا ان کو اجر ان کا، اور اللہ نہیں پسند کرتا ظالموں کو۔

اللہ تعالیٰ نے پہلے کفار کا ذکر فرمایا، اب ایمان والوں کا اور ان کے متعلق فیصلہ کا ذکر کیا جا رہا ہے، کافروں کا ذکر پہلے کیوں کیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ کافروں کی تہدید یعنی عذاب کا ذکر کیا گیا، تو عقل کا تقاضا بھی یہی تھا کہ تہدید کا ذکر پہلے ہو اور ایمان والوں کے اجر کا ذکر بعد میں ہو، اور وجہ یہ بھی ہے کہ پہلے ذکر ﴿فَوۡقَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا﴾ قریب ہی تھا تو اس کی مناسبت کی وجہ سے پہلے ذکر کفار کا کر دیا۔ (روح المعانی)

اعلیٰ حضرت اور علامہ آلوسی رحمہما اللہ:

"فَیُوَفِّیۡهِمۡ اُجُوۡرَهُمۡ" ای فیوفر علیهم ویتمم جزاء اعمالهم القلبية والقالبية ويعطيهم ثواب ذلك وافيا من غير نقص"

"فَیُوَفِّیۡهِمۡ اُجُوۡرَهُمۡ" کا ترجمہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے "فيوفر عليهم" کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے اچھے اعمال کی جزاء وافر مقدار میں دے گا۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے "اللہ ان کا نیگ انہیں بھرپور دے گا" راقم کا ترجمہ بھی علامہ آلوسی رحمہ اللہ کے آنے والے الفاظ کے مطابق ہے، یعنی راقم کا ترجمہ ان الفاظ سے لیا گیا ہے۔

"ویتمم جزاء اعمالهم القلبيهة والقالبية ويعطيهم ثواب ذلك وافيا من غير نقص"

اور ان کو پورا پورا بدلہ دے گا ان کے اعمال کا خواہ وہ اعمال باطنی ہوں یا ظاہری ہوں، اور دے گا ان کو اس کا ثواب پورا پورا اس میں کوئی کمی نہیں کرے گا۔

"وزعم بعضهم ان توفية الاجور هي قسم المنازل في الجنة والظاهر انها اعم من ذلك"

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ "توفية الاجور" جنت میں خصوصی منازل کا نام ہے کہ "ایمان والوں کو اللہ تعالی جنت میں منازل رفیعہ عطاء فرمائے گا، لیکن صحیح یہ ہے کہ مراد اس سے عام ہے، مطلقا "پورا پورا اجر دینا" مقصود ہے، جو ہر قسم کی مہربانیوں کو شامل ہے۔ (از روح المعانی)

ایمان کا ذکر پہلے کیا، پھر اچھے اعمال کا ذکر کیا، اس سے اس مسئلہ کی طرف اشارہ کر دیا گیا کہ اعمال نفس ایمان سے خارج ہیں، یعنی ایمان تصدیق قلبی سے حاصل ہو گیا، اچھے اعمال اس کے اوپر مرتب ہیں۔ (از کبیر)

ایمان والوں کی شان اس سے بھی واضح طور پر سمجھ آ رہی ہے کہ نفس ایمان پر ہی اجر و ثواب مرتب ہے البتہ اچھے اعمال پائے جائیں گے تو اور ہی زیادہ ثواب حاصل ہوگا، لیکن کفر کے بعد برے اعمال کا تذکرہ نہیں تو اس سے اس مسئلہ کی طرف اشارہ پایا گیا کہ کفر خود ہی دنیا اور آخرت میں عذاب شدید کا سبب ہے، اس پر برے اعمال پائے جائیں یا نہ پائے جائیں۔ (ماخوذ از روح المعانی)

﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ﴾ "اور نہیں پسند کرتا ظالموں کو"

ظالم سے مراد کون؟ "لا يحب من ظلم غيره حقاله" ظالم سے مراد ایک تو یہ ہے کہ غیر پر ظلم کرے اور اس کی حق تلفی کرے۔ "اووضع شيا في غير موضعه" یا ظالم سے مراد عام ہے کہ وہ ایک چیز کو اپنی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھ دے، یعنی ہر قسم کے گناہ اور بے راہ روی کو شامل ہے۔

"والمعنى انه تعالى لا يرحمهم ولا يثني عليهم بجميل" مطلب اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالی ظالموں اور گناہگاروں پر رحم نہیں فرماتا تا کہ ان کے بندوں پر کئے گئے مظالم کو معاف کر دے اور نہ ہی ان کی اچھی تعریف کرتا ہے۔ (خازن)

معتزلہ کا مذہب:

معتزلہ نے ﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ﴾ انه تعالى لا يدالكفر والمعاصى" اللہ تعالی کفر اور معاصی کا ارادہ نہیں کرتا۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ کسی چیز کا ارادہ اسی وقت پایا جاتا ہے جن اس سے محبت بھی ہو، البتہ یہ اس وقت ہے جب وہ چیز افعال سے ہو، اگر اشخاص سے ہو تو پھر قانون نہیں، جیسا کہ کہا جائے "احب زيدا" میں زید کو پسند کرتا ہوں" تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ "اريده" میں اس کا ارادہ کرتا ہوں۔

اہل سنت و جماعت کا مذہب:

ارادہ اور محبت ایک چیز نہیں، بلکہ علیحدہ علیحدہ مراد ہیں مومنوں سے محبت کرنے کا یہ مطلب ہے کہ ان کو خیر (بھلائی) پہنچانے کا ارادہ کرنا، اور کافروں کے کفر کا ارادہ پایا جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے محبت بھی کرتا ہے۔

فائدہ جلیلہ: ﴿واللہ لا یحب الظالمین﴾ ای الذین یظلمون علی انفسھم با نقضاء العمر فی طلب غیر اللہ "اللہ نہیں پسند کرتا ظالموں کو" یعنی ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا جو عمر بھر اللہ کے غیروں کے طلب میں ہوتے ہیں۔

خالفت طریقت بود کاولیاء　　　تمنا کنند از خدا جزء خدا

اہل طریقت کے نزدیک وہ اولیاء طریقت کے مخالف ہیں، جو اللہ تعالیٰ کو اس کے غیروں کے ذریعے تلاش کرتے ہیں۔

اہل طریقت اپنے دل کے صفحات سے غیر کے نقش مٹا دیتے ہیں، ارا پنے نفوس کو برے اوصاف سے پاک رکھتے ہیں، کیونکہ یہ چیزیں انسان کو وصال کی بلندیوں اور معرفت کے آسمانوں تک عروج سے مانع ہیں، حضرت مولنا جلال الدین رومی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

آں یکے نحوی بلشتی درنشست　　　روبکشتیبان نہاد آں خود پرست

ایک نحوی کشتی میں بیٹھ گیا، منہ کشتی چلانے والے کی طرف رکھا اس خود پرست نے، (کشتیبان سے مخاطب ہوا)

گفت ہیچ از نحو خواندی؟ گفت لا　　　گفت نیم عمر تو شد درفنا

اس نے کہا کیا تو نے نحو بھی پڑھی، کشتیبان نے کہا نہیں، نحوی نے کہا تو نے آدھی عمر ضائع کردی،

دل شکستہ گشت کشتیبان زتاب　　　یک آن دم گشت خاموش از جواب

دل شکستہ ہو گیا کشتیبان کا اس کی سرزنش سے، لیکن وہ اس کا جواب دینے سے خاموش ہو گیا،

باد کشتی را بگردابی فگند　　　گفت کشتیبان بداں نحوی بلند

ہوا نے کشتی کو بھنور میں ڈال دیا، کشتیبان نے اس نحوی کو بلند آواز سے کہا،

ہیچ دانی آشنا کر بگو　　　کفت نے ای خوش جواب خوب رو

﴿ذٰلِکَ نَتْلُوْهُ عَلَیْکَ مِنَ الْاٰیَاتِ وَالذِّکْرِ الْحَکِیْمِ○﴾ (آیۃ نمبر ۵۸)

(1) یہ ہم تم پر پڑھتے ہیں کچھ آیتیں اور حکمت والی نصیحت

(2) یہ کہ بیان کرتے ہیں ہم تم پر آیات اور قرآن محکم۔

"ذٰلِکَ" کا اشارہ ہے عیسی علیہ السلام کے عجائب کی طرف جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے البتہ عجائب کئی مذکور ہیں اور اشارہ واحد کا ہے (بظاہر اگرچہ درست نظر نہیں آتا لیکن) اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مذکور کی تاویل میں ہے اسی وجہ سے جلالین میں یوں تفسیر کی گئی "ذلک" "المذکور من امر عیسی" یہ یعنی عیسی علیہ السلام کا معاملہ (عجائب وغرائب) جو مذکور ہو چکا ہے۔ (جلالین ص ۵۰)

﴿نَتْلُوْهُ عَلَیْکَ﴾ "ہم بیان کرتے ہیں آپ پر۔"

"نَتْلُوْهُ" تلاوت سے لیا گیا ہے، لغوی معنی اس کا یہی ہے جو اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے اپنے ترجمہ میں ذکر کیا ہے، تاہم علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے "نَتْلُوْهُ" کی تفسیر "نسرده ونذکره شئیا بعد شئ" سے کی ہے ہم وہ بیان کرتے ہیں آپ پر، ہم وہ ذکر کرتے ہیں آپ پر آہستہ آہستہ،

اگرچہ بظاہر یہ سمجھ آتا ہے کہ ماضی کا صیغہ "تـلـونـا" ہونا چاہئے تھا کہ ہم آپ پر بیان کر چکے ہیں ہاں البتہ "عبر بالمضارع استحضار اللصورة الحاصلة اعتناء بها" ماضی کو مضارع سے تعبیر کر دیا گیا کہ جو چیز بیان ہو چکی ہے اس کے اہتمام شان کیلئے اس کی صورت کو بیان حال سے سامعین کے ذہن میں حاضر کر دیا جائے۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "نتلوه" اپنی اصلی حالت پر ہو، ذکر بھی مضارع اور مراد بھی مضارع ہو کہ ابھی حضور ﷺ پر مکمل واقعات نہ ذکر کئے گئے ہوں تو پہلے ہی اس آیہ کریمہ کو نازل کیا گیا، یعنی ہم تم پر پڑھتے ہیں، بیان کر رہے ہیں، ذکر کر رہے ہیں، وغیرہ معانی ہوں۔

﴿مِنَ الْاٰیٰتِ﴾ "آیات (نشانیاں)"

"من الآیات" "ای الحجج الدالة علی صدق نبوتک اذا علمتهم بما لا یعلمه الاقاری کتاب او معلم"

آیات سے مراد حجتیں، دلائل ہیں جو آپ کی نبوت کی صداقت پر دلالت کر رہی ہیں، یعنی میں نے تمہیں وہ دلائل بتا دیئے ہیں جو آپ کی نبوت کی صداقت پر دلالت کر رہے ہیں وہ ایسے ہی بیان کئے گئے جیسے کتاب کو صرف قاری

کتاب یا معلم ہی بیان کرسکتا ہے،اسی طرح مکمل طور پر آپ کو بذریعہ وحی وہ تمام بیان کردئے گئے ہیں۔

﴿وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ۝﴾ ''اور قرآن محکم''

اعلیٰ حضرت اور علامہ بغوی رحمہما اللہ:

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ معالم التنزیل کے ان الفاظ میں دیکھئے:

(ذلک)ای هذاالذی ذکرته لک من الخبر عن عیسی ومریم والحواریین(نتلوه علیک)یعنی نخبرک به بتلاوة جبریل علیک(من الآیات والذکر الحکیم)یعنی القرآن والذکر ذی الحکمة''

یہ جو ہم نے آپ پر ذکر کردیا ہے،یعنی عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم اور حواریین کے واقعات وہ ہم آپ پر پڑھتے ہیں،یعنی جبریل آپ پر ہمارے حکم سے پڑھتے ہیں اور اس پڑھنے سے ہم آپ کو قرآن پاک کی بعض آیات سے خبر دیتے ہیں،اور یہ نصیحت والا ذکر ہے۔ (معالم التنزیل للبغوی)

خیال رہے کہ ''ذکر'' کا معنی قرآن پاک بھی ہے اور لوح محفوظ بھی ہے اور نصیحت بھی ہے۔اور یہ خیال کیا جائے کہ جب "نتلوه" کا معنی ''تلاوت کرنا'' لیا جائے تو "من الآیات" میں ''من تبعیضیہ ہوگا،یعنی ''ہم پڑھتے ہیں آپ پر کچھ آیتیں'' اور اگر "نتلوه" کا معنی "نسرد،نذکر" (ہم بیان کرتے ہیں،ذکر کرتے ہیں) لیا جائے تو "من الآیات" میں "من" ابتدائیہ ہوگا۔اس صورت میں معنی بعض کرنا صحیح نہیں،یعنی صحیح معنی یہ ہوگا ''ہم بیان کرتے ہیں آپ پر آیات'' لیکن یہ ترجمہ درست نہیں ہوگا ''ہم بیان کرتے ہیں آپ پر بعض آیات'' (از روح المعانی)

راقم جب اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کنز الایمان کو دیکھتا ہے اور تفاسیر کی بحثوں کو دیکھتا ہے تو بے ساختہ زبان سے نکلتا ہے(واہ اعلیٰ حضرت آپ نے کتنی تفاسیر کو دیکھ کر کتنی محنت سے ترجمہ کیا ہے)

راقم کا ترجمہ بھی معالم التنزیل اور روح المعانی میں دیکھئے،کچھ حصہ ذکر ہو چکا ہے،اور دیکھئے "الحکیم"المحکم المتقن نظمه" حکیم کا ایک معنی یہ ہے کہ (قرآن پاک) محکم ہے جس کی نظم یعنی اس کے الفاظ مبارکہ یقین پر دلالت کررہے ہیں۔

تاہم ایک معنی یہ بھی کیا گیا ہے "الممنوع الباطل" وہ جو باطل سے دور ہو،یعنی آپ پر ہم بیان کرتے ہیں قرآن کی آیات جو حق ہیں،باطل سے دور ہیں۔

ایک معنی یہ بھی لیا گیا ہے ''صاحب الحکمة'' یعنی ''نصیحت والی'' (روح المعانی)

علامہ رازی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں ﴿وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ O﴾ کہنے کی چند وجوہ ہیں۔

(۱) الاول انه بمعنى الحاكم مثل القدير والعليم والقرآن حاكم بمعنى ان الاحكام تتفادمنه"

ان میں سے ایک یہ ہے کہ "حکیم" بمعنی حاکم ہے جیسے قدیر بمعنی قادر، اور علیم بمعنی عالم استعمال ہوتے ہیں، قرآن حاکم ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ "احکام قرآن پاک سے حاصل ہوتے ہیں" لھذا قرآن پاک حاکم ہے۔

(۲) والثاني معناه ذو الحكمة في تاليفه ونظمه وكثرة علومه"

ان میں سے دوسری وجہ یہ ہے کہ "حکیم" کا معنی ہے "حکمت والا ہونا" قرآن پاک کی تالیف اور نظم حکمت پر مبنی ہے اور اس میں کثیر علوم پائے گئے ہیں، اس لئے ﴿وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ O﴾ کا مطلب ہوا "اور قرآن حکمت والا"

(۳) والثالث انه بمعنى المحكم فعيل بمعنى مفعل قال الازهري وهوشائع في اللغة لان حكمت يجري مجرى احكمت في المعنى فرداى الاصل ومعنى المحكم في القرآن انه احكم عن تطرق وجوه الخلل اليه قال الله تعالى احكمت آياته"

ان وجوہ میں تیسری وجہ یہ ہے کہ "حکیم" کا وزن "فعیل" کا ہے، اور فعیل بمعنی "مفعل" استعمال ہوتا رہتا ہے، اسلئے "حکیم" کا معنی ہے "محکم"۔ اب ﴿وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ O﴾ کا معنی ہوگیا "قرآن محکم" اب اس پر بظاہر وہم یہ ہوا کہ "حکیم" مجرد ہے، اور محکم "مزید فیہ" تو "حکیم" بمعنی "محکم" کیسے؟

تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ "حکیم" کا "محکم" کے معنی میں استعمال ہونا بہت ظاہر اور واضح ہے۔ کیونکہ "حکمت" مجرد، اکثر طور پر "احکمت" مزید فیہ، کے معنی میں استعمال ہوتا رہتا ہے۔

(۴) والرابع ان يقال القرآن لكثرة حكمه انه ينطق بالحكمة فوصف بكونه حكيما على هذاالتاويل"

چوتھا احتمال یہ ہے کہ قرآن پاک کو حکمت والا اس لئے کہا گیا ہے کہ اس میں کثیر حکمتوں کا ذکر ہے اسی وجہ سے قرآن پاک کو حکیم کہا گیا ہے۔

یہ تمام وجوہ جو ابھی بیان کی گئی ہیں ان کا تعلق اس سے ہے کہ "الذکر" سے مراد قرآن پاک ہو، دوسرا احتمال یہ ہے کہ ذکر سے مراد لوح محفوظ ہو، انبیاء کرام پر نازل ہونے والی تمام کتب لوح محفوظ سے منتقل ہوئی ہیں، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے واقعات جو آپ پر بیان کئے گئے ہیں وہ لوح محفوظ سے نقل کئے گئے ہیں، وہ واقعات حق ہیں، باطل سے دور ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

تیسرا احتمال روح المعانی سے پہلے ہی نقل کیا جاچکا ہے کہ "الذکر" سے مراد نصیحت ہو، اور "الحکیم" سے مراد حکمت والی،'' اور حکمت والی نصیحت'' اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا یہی ترجمہ ہے۔

تنبیہ: تیسری وجہ میں ''حکیم'' کا معنی ''محکم'' کیا ہے، لیکن مراد لغوی معنی ہے کہ قرآن پاک خلل اور نقص سے پاک ہے، اور اصطلاحی معنی محکم بمقابلہ متشابہ نہیں، یعنی تمام قرآن پاک محکم ہے کیونکہ اس میں کوئی خلل اور نقص نہیں پایا گیا، اگر چہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے بطور دلیل ﴿اُحْکِمَتْ آیَاتُهُ﴾ ذکر فرمایا، ممکن ہے آپ نے ان الفاظ کا بھی لغوی معنی لیا ہو۔

❁ **اخرج ابن ابی حاتم عن الحسن قال اتی رسول الله ﷺ راهبا نجران فقال احدهما من ابو عیسی و کان رسول الله ﷺ لایعجل حتی یامره ربه فنزل علیه "ذلک نتلوه علیک من الآیات و الذکر الحکیم الی قوله من الممترین"**

ابن ابی حاتم نے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے روایت ذکر کی کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس نجران کے دو راہب آئے، ان میں سے ایک نے آپ سے پوچھا ''عیسیٰ علیہ السلام کا باپ کون تھا؟ آپ چونکہ اپنی طرف سے جلدی کوئی جواب نہیں دیتے تھے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے منتظر رہتے تھے اس وقت یہ آیت کریمہ اور آنے والی آیات ﴿مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ﴾ تک نازل ہوئیں (درمنثور)

❁ **واخرج ابن جریر عن الضحاک فی قوله والذکر الحکیم قال القرآن"**

ابن جریر نے ضحاک سے روایت ذکر کی کہ اللہ تعالیٰ کے ارشادِ گرامی ﴿وَالذِّکْرِ الْحَکِیْمِ O﴾ سے مراد قرآن پاک ہے۔ (درمنثور)

❁ **واخرج ابن ابی حاتم عن علی قال سمعت رسول الله ﷺ یقول ستکون فتن قلت فما المخرج منها قال کتاب الله هو الذکر الحکیم والصراط المستقیم"**

ابن ابی حاتم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی، آپ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ ''فتنے نمودار ہوں گے'' تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ان سے نکلنے (بچنے) کی کیا صورت ہوگی؟ آپ نے فرمایا کتاب اللہ پر عمل کرنے سے ان فتنوں سے بچا جاسکے گا، کیونکہ قرآن پاک ذکر حکیم اور صراط مستقیم ہے۔ (درمنثور)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

''ذلک'' اشارہ بعید کا ہے جو بلندی مرتبت پر دلالت کررہا ہے ''ذلک'' مبتداء ہے ''نتلوه'' اس کی خبر

ہے، اور "علیک" متعلق ہے "نتلوہ" کے "من الآیات" حال ہے "نتلوہ" کی ضمیر منصوب سے۔

ایک اور احتمال یہ ہے کہ "من الآیات" دوسری خبر ہو جائے "ذلک" کی۔

اور ایک احتمال یہ ہے کہ "نتلوہ" حال ہو اسم اشارہ سے اور "من الآیات" خبر ہو۔ (تفسیر ابی السعود)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَاللّٰهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۝﴾

(آیۃ نمبر ۵۹)

(1) عیسیٰ علیہ السلام کی کہاوت اللہ کے نزدیک آدم کی طرح ہے، اسے مٹی سے بنایا پھر فرمایا ہو جا وہ فوراً ہو جاتا ہے۔

(2) بیشک شان عجیبہ عیسیٰ علیہ السلام کی مثال ہے حالت عجیبہ آدم کی، پیدا کیا اسے مٹی سے، پھر کہا ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔

شان نزول:

نجران کا ایک وفد مدینہ طیبہ میں آیا، وہ وفد ان کے چودہ سرداروں پر مشتمل تھا ایک ان کا بڑا سردار تھا جس کا نام اہیب تھا، اور دوسرا ان میں سے صاحب رائے تھا، یعنی اس کی رائے کو مانا جاتا تھا، اور ایک شخص ابو حارثہ تھا جو بادشاہ روم کا بہت مقبول تھا، یہ لوگ مدینہ طیبہ میں عصر کی نماز کے بعد پہنچے، انہوں نے خوبصورت کپڑے پہنے ہوئے تھے، اور بہت جسیم تھے، یہ لوگ چونکہ عیسائی تھے انہوں نے کھڑے ہو کر نماز بیت المقدس کی طرف منہ کر کے شروع کی، صحابہ کرام نے ارادہ کیا کہ ان کو روکیں (تا کہ یہ کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے نماز ادا کریں) لیکن نبی کریم ﷺ نے فرمایا "دعوھم" ان کو چھوڑ دو، یعنی ان کو اپنے عقیدہ کے مطابق نماز ادا کرنے دو۔ اس وفد کے آنے سے پہلے ہی ان کے ساتھ مناظرہ کیلئے سورۃ آل عمران کی کچھ ابتدائی آیات نازل ہو چکی تھیں۔

وہ لوگ جب نماز سے فارغ ہوئے تو ان میں سے ابو حارثہ اور اس کے ساتھ ایک اور شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آئے تو

آپ نے ان کو فرمایا "اسلما" اسلام لے آؤ، وہ کہنے لگے "اسلمنا قبلک" ہم تم سے پہلے ہی اسلام قبول کر چکے ہیں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"کذبتما یمنعکما عن الاسلام ثلاث عبادتکما الصلیب واکلکما الخنزیر وزعمکما ان لله ولدا"

تم جھوٹ کہتے ہو، تمہیں اسلام قبول کرنے سے تین چیزیں روک رہی ہیں (ایک ان میں سے تمہارا صلیب کی عبادت کرنا، اور دوسری چیز) تمہارا خنزیر کھانا، اور (تیسری چیز ان میں سے تمہارا یہ گمان کہ بیشک اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے۔ تو وہ کہنے لگے کہ اے محمد تم ہمارے صاحب (عیسیٰ علیہ السلام) کو گالی کیوں دیتے ہو؟

نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں کیا کہتا ہوں؟ وہ کہنے لگے تم کہتے ہو وہ عبد (بندہ) ہیں تو آپ نے فرمایا "اجل هو عبد الله ورسوله و کلمته القاها الی العذراء البتول" ہاں وہ اللہ کے عبد اور اس کے رسول ہیں، اور اس کا کلمہ ہیں جو کنواری مریم کی طرف ڈالا گیا، تو وہ لوگ غصہ میں آگئے، کہنے لگے کیا تم نے کوئی ایسا انسان بھی دیکھا ہے جو بغیر باپ کے ہو، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ انسانوں میں ان کا کوئی باپ نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ ان کا باپ ہو۔

تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا "ان آدم علیہ السلام ما کان له اب و لاام" بیشک آدم علیہ السلام کا نہ باپ تھا اور نہ ماں تھی، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آدم علیہ السلام کو ابن اللہ" (اللہ کا بیٹا) کہا جائے۔ تو یہی حال ہے عیسیٰ علیہ السلام کا، کیونکہ بغیر ماں اور بغیر باپ کے انسان کا پیدا ہونا بہت ہی عادت کے خلاف ہے بنسبت عیسیٰ علیہ السلام کے۔ "فشبه الغریب بالاغرب لیکون اقطع لشبهة الخصم" آپ نے عجیب و غریب کو تشبیہ دی بہت زیادہ عجیب و غریب سے تاکہ مخاصمت کرنے والے کے شبہات مکمل طور پر ختم کیے جاسکیں (ماخوذ از روح البیان)

اعلیٰ حضرت اور علامہ رازی رحمہما اللہ:

(ان مثل عند الله کمثل آدم) ای صفته کصفة آدم، ونظیره "مثل الجنة التی وعد المتقون" ای صفة الجنة"

علامہ رازی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ آیۃ کریمہ میں "مثل" کا معنیٰ صفت ہے، جیسا کہ دوسری آیۃ کریمہ "مثل الجنة التی وعد المتقون" میں بھی "مثل" کا معنیٰ صفت ہی ہے، اب مطلب یہ ہوگیا بیشک عیسیٰ علیہ السلام کی صفت، واقع، بات، کہاوت آدم علیہ السلام کی صفت، واقع، بات، کہاوت کی طرح ہے۔

راقم نے ترجمہ روح البیان اور تفسیر ابی السعود سے لیا ہے، تفسیر ابی السعود کی عبارت ملاحظہ ہو:

(ان مثل عیسی)ای شانه البدیع المنتظم لغرابته فی سلک الامثال(عندالله)ای فی تقدیره وحکمه کمثل آدم ای کحالة العجیبة التی لا یرتاب فیها مرتاب ولا ینازع فیها منازع"

بیشک عیسی علیہ السلام کی عجیب شان جو عجائب وغرائب پر مشتمل ہے اللہ کے ہاں، یعنی اللہ کی تقدیر وحکم میں آپ کی مثال آدم علیہ السلام کی حالت عجیبہ کی طرح ہے جس میں کوئی شک کرنے والا شک نہ کرے اور کوئی جھگڑا کرنے والا جھگڑا نہ کرے۔

راقم نے اسی کا اختصار کر کے یوں ترجمہ کیا بیشک شان عجیبہ عیسی کی مثل ہے حالت عجیبہ آدم کی۔

انسانوں کا والد اول آدم علیہ السلام ہیں:

عقل کا تقاضا یہی ہے کہ انسان کا کوئی والد اول ہو ورنہ لازم یہ آئے گا کہ اولاد والد سے پہلے ہو، جب یہ نہیں ہوسکتا تو خود بخود سمجھ آ گیا کہ انسان کے والد اول حضرت آدم علیہ السلام ہی ہیں۔ قرآن پاک بھی اس پر شاہد ہے ﴿یٰاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا﴾ (اے لوگو ڈرو اپنے رب سے جس نے تمہیں پیدا کیا ایک نفس سے اور پیدا کیا اسی نفس سے اس کی زوجہ کو) اس نفس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں، اور زوجہ سے مراد آپ کی زوجہ حضرت حوا ہیں۔

اسی مضمون کو اس آیہ کریمہ میں بھی پیش کیا گیا ﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا﴾

تخلیق آدم علیہ السلام کی کیفیت میں وجوہ کثیرہ:

حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق میں رب تعالی نے کئی وجوہ کو ذکر کیا۔

(۱) ﴿خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ﴾ رب تعالی نے ان کو مٹی سے پیدا کیا۔

(۲) ﴿وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا﴾ وہ ذات جس نے بشر کو پانی سے پیدا کیا۔

(۳) ﴿وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ﴾ انسان کی تخلیق کی ابتداء کیچڑ سے کی۔

(۴) ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ﴾ بیشک ہم نے آدمی کو چنی ہوئی مٹی سے بنایا (یعنی مٹی کے خمیر کے جوہر و سے)

(۵) ﴿اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِیْنٍ لَّازِبٍ﴾ بیشک ہم نے ان کو چپکتی مٹی سے بنایا۔

(۶) ﴿اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ﴾ بیشک میں آدمی کو بنانے والا ہوں بجتی مٹی سے جو

بد بودار سیاہ مٹی سے ہے۔

ان تمام صورتوں مین تطبیق اور مختلف اوقات کا ذکر پہلے پارہ میں تخلیق آدم علیہ السلام کی بحث میں گذر چکا ہے۔ یہاں چند حکمتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مٹی سے پیدا کرنے میں حکمت کی چند وجوہ:

(۱) مٹی سے پیدا کرنے میں ایک حکمت یہ ہے کہ انسان کو عجز اور تواضع حاصل رہے کہ وہ سمجھے میری پیدائش مٹی سے ہے، مٹی میں پستی ہے تو میں نے بھی پست ہو کر رہنا ہے۔

(۲) کسی چیز کو ڈھانپنا چاہیں تو مٹی سے ڈھانپ سکتے ہیں، جیسا کہ سونا اور چاندی کو پہلے زمانہ میں زمین میں دفن کر کے ڈھانپ دیا جاتا تھا، تو گویا کہ زمین کو ستار ہونے کا وصف حاصل ہوا۔

تو انسان کو مٹی سے پیدا کر کے یہ بتا دیا کہ تو اپنی اصلیت کو دیکھتے ہوئے دوسرے لوگوں کے عیوب کی پردہ پوشی کرتا رہ تا کہ تجھے بھی ستار ہونے کا وصف حاصل ہو جائے، اور تجھے رب تعالیٰ کے وصف ستار کا مظہر ہونے کا شرف بھی حاصل ہو جائے۔

(۳) مٹی چونکہ زمین میں پائی جاتی ہے، انسان کو پیدا کرنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ زمین میں ہی رہے اسلئے کہ رب تعالیٰ کے ارشادِ گرامی ﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ (بیشک میں بنانے والا ہوں زمین میں خلیفہ) کے مطابق اسے زمین والوں کی خلافت کا حق دیا گیا ہے تا کہ وہ زمین میں ہی رہے۔ ہاں اگر اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے اظہار کیلئے کسی کو زندہ آسمانوں پر اٹھائے تو یہ اس کی مرضی اور اختیار کی بات ہے، جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ ہی آسمانوں پر اٹھا لیا گیا۔

(۴) چوتھی وجہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے اپنی قدرت کے اظہار کیلئے اپنی مخلوق کو مختلف چیزوں سے پیدا کر کے ان میں مختلف اوصاف رکھ دیئے۔

اللہ تعالیٰ نے شیاطین کو آگ سے پیدا کیا جو دوسرے ''اجرام'' (اجسام) سے زیادہ روشن ہے پھر اسی مخلوق کو گمراہی کی تاریکیوں میں مبتلاء کر دیا جسے روشن چیز سے پیدا کیا۔ فرشتوں کو لطیف چیز سے پیدا کیا یعنی نور اور ہواء لطیف سے پھر ان کو کامل شدت اور قوت عطاء کر دی، یعنی یہ رب تعالیٰ کی قدرت ہی ہے جس نے لطیف کو شدید وقوی بنا دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا مٹی ''اکثف الاجرام'' ہے۔ پھر اس کثیف چیز کو اپنی قدرت

کاملہ سے محبت، معرفت اور نور و ہدایت عطاء کر دے۔

اور آسمانوں کو دریاؤں اور سمندروں کے پانی کی موجوں سے پیدا کیا، پھر ان آسمانوں کو ہوا میں معلق رکھ کر باقی رکھا تا کہ یہ اجرام فلکیہ (فلکی اجسام) رب تعالیٰ کی قدرت باہرہ (روشن قدرت) پر دلالت کریں۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق اس پر دلیل بن گئی کہ

"انه تعالى هو المدبر بغير احتياج، والخالق بلامزاج وعلاج"

کہ اللہ تعالیٰ تمام چیزوں کا خالق ہے، اسے تخلیق میں کوئی محتاجی نہیں اور نہ ہی ان کی تدبیر میں اسے کوئی محتاجی حاصل ہے، بلکہ اس کے کام "کن" سے ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی یہ قدرت ہے کہ وہ اپنی مخلوق کی اصلیت کے خلاف ان کو مزاج عطاء کر دیتا ہے اور اس کو تخلیق میں آلات اور مشقت کی ضرورت نہیں۔

(۵) انسان کو مٹی سے پیدا کرنے کی پانچویں وجہ یہ ہے کہ مٹی کو یہ وصف حاصل ہے کہ یہ آگ کو بجھا دیتی ہے اس لئے مٹی سے پیدا کیا تا کہ وہ شہوت غضب اور حرف کی آگ کو بجھا سکے کیونکہ ان چیزوں کی آگ سوائے مٹی کے یعنی سوائے عجز کے نہیں بجھائی جا سکتی۔

پانی سے پیدا کرنے میں حکمت:

پانی کو صاف اور شفاف ہونے کا وصف حاصل ہے، پانی میں جھانکنے سے انسان کو اپنا عکس نظر آتا ہے، اسی وجہ سے انسان کو پانی سے پیدا کیا تا کہ اسے وہ صفاء اور روشنی حاصل ہو جائے کہ اشیاء (چیزوں) کی صورتیں اس میں منقش ہو جائیں۔ گویا کہ انسان تمام مخلوق کا مظہر بنایا گیا کیونکہ فرشتوں والی صفات آپ کو انسان میں نظر آئیں گی، اسلئے کہ انسان کو لطافت و محبت بھی حاصل ہے اور عبادت گزار ہونے کا شرف بھی اسے حاصل ہے اور انسان کو صفات شیاطین بھی حاصل ہیں، کہ آگ کی طرح ذرا ذرا بات پر اکڑ جانا، بھڑک اٹھنا انسان کے مزاج میں داخل ہے، اور شیطانی کام بھی اسے حاصل ہیں۔ حیوانوں کی طرح کھانا، سونا، خواہشات رکھنا بھی انسان کو حاصل ہے۔

تو واضح ہوا کہ انسان تمام مخلوق کا مظہر ہے کیونکہ اسے پانی سے پیدا کر کے شفاف بنا دیا گیا ہے، جس میں اشیاء کی صورتیں منقش ہیں۔ انسان کی جو صفت غالب رہے انسان کو وہی مقام حاصل ہوتا ہے، دعاء یہی کی جائے کہ انسان کی صفت ملکی غالب رہے، شیطانی صفات سے دور رہے، درندگی سے رب تعالیٰ بچائے، اور حیوانی صفات بھی انسان پر غالب نہ رہیں، وہی انسان کامل ہے۔

کیچڑ سے پیدا کرنے میں حکمت:

مٹی کو کثافت حاصل ہے اور پانی لطافت حاصل ہے، جب مٹی اور پانی کو ملا لیا جائے تو کیچڑ بن جائے گا، جسے عربی زبان میں ''طین'' کہا جاتا ہے کیچڑ میں دونوں صفات جمع ہو جاتی ہیں، کثافت بھی اور لطافت۔ انسان کو کیچڑ سے پیدا کیا گیا تا کہ اس کی اصلیت یعنی مٹی کی کثافت کو کم کر کے اسے پانی کی لطافت بھی عطاء کر دئے جائے، تو اب انسان کو بھی دونوں وصف کثافت اور لطافت حاصل ہو گئے۔ اسی مضمون سے رب تعالی کے ارشاد گرامی ''انـــی خالق بشرا من طین'' کی حکمت واضح ہو گئی۔

خالص طین سے بنانے کی حکمت:

رب تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ﴾ اور تحقیق ہم نے انسان کو چنی ہوئی مٹی سے بنایا، یعنی خالص مٹی کے خمیر کے جوہر سے بنایا۔

''السلالة بمعنی المسلولة فعالة بمعنی المفعولة لانها هی التی تسل من الطف اجزاء الطین''

سلالہ بمعنی مسلولہ کے ہے کیونکہ فعالہ کا وزن مفعولہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، سلالہ اس مٹی کو کہتے ہیں جسے کیچڑ کے لطیف اجزاء سے کھینچا (نکالا) گیا ہو۔

چنی ہوئی خالص مٹی سے بنانے میں حکمت یہ ہے کہ انسان کو کثافت و لطافت کے ساتھ ساتھ قوت بھی حاصل ہے، جس طرح خالص کیچڑ سے بنی ہوئی چیز مضبوط ہوتی ہے، لیکن ریت وغیرہ ملی ہو تو وہ مضبوط نہیں ہوتی، اسی طرح انسان کو جب خالص مٹی سے بنایا ہے تو اسے قوی بنایا گیا ہے۔

چپکنے والی مٹی سے بنانے میں حکمت:

کہ انسان جب غور کرے گا کہ مجھے تو رب تعالی کے ارشاد گرامی ﴿إِنَّا خَلَقْنَاهُم مِّن طِينٍ لَّازِبٍ﴾ (ہم نے ان کو پیدا کیا چپکتی مٹی سے) کے مطابق چپکنے کی قوت عطاء کی گئی تو وہ عبادات پر لزومی عمل کرے گا ایسا نہیں کہ کبھی اس پہ عمل کرے اور کبھی عمل نہ کرے، بلکہ چپک کر عمل پر قائم و دائم رہے۔

بدبودار مٹی سے انسان کو پیدا کرنے میں حکمت:

رب تعالی نے ارشاد فرمایا'' ﴿إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ﴾ بیشک میں آدمی کو

بنانے والا ہوں بجتی مٹی سے جو بدبودار سیاہ مٹی سے ہے۔ (از ہری)

اس آیۃ کریمہ میں مٹی کے تین وصف ذکر کئے گئے ہیں، بدبودار ہونا، اور رنگ بدل کر سیاہ ہو جانا، اور مٹی کا کھنکنا اور بجنا جیسے گھنٹی بجتی ہے۔ مٹی کا جب کیچڑ بنایا جائے اور اسے کچھ دیر اسی طرح چھوڑ اجائے تو اس میں بدبو آجاتی ہے، بدبودار مٹی سے پیدا کرنے میں یہ حکمت اور اشارہ پایا گیا ہے کہ انسان کے پسینہ میں بدبو ہوگی۔

نبی کریم ﷺ کی تخلیق:

علامہ امام ابن جوزی نے کتاب الوفاء میں کعب بن احبار ﷺ سے روایت کو نقل کیا ہے کہ

لما اراد الله عزوجل ان يخلق محمدا ﷺ امر جبريل عليه السلام فاتاه بالقبضة البيضاء التي هي موضع قبر رسول الله ﷺ فعجنت بماء التسنيم فغمست في انهار الجنة وطيفها في السماوات فعرفت الملائكة محمدا ﷺ قبل ان يعرف آدم ثم كان نور محمد يرى في غرة جبهة آدم وقيل له يا آدم هذا سيد ولدك من المرسلين فلما حملت حواء بشيث انتقل النور من آدم الى حواء وكانت تلد في كل بطن ولدين الاشياء فانه ولدته وحده كرامة لمحمد ﷺ ثم لم يزل ينتقل من طاهر الى طاهر الى ان ولدته آمنة من عبدالله ابن عبدالمطلب" (مرقاۃ ج ۱۱ ص ۴۴ باب فضائل سید المرسلین)

جب اللہ تعالی نے محمد (رسول اللہ ﷺ) کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو جبریل کو حکم دیا کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کی قبر شریف کی جگہ سے سفید مٹی کی ایک مٹھی لی پھر اسے ماء تسنیم (جنت کی نہر تسنیم کے پانی) سے گوندھا گیا، پھر اسے جنت کی نہروں میں ڈبویا گیا اور آسمانوں میں اسے پھیرلیا گیا پس فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو پہچاننے سے پہلے ہی محمد ﷺ کو پہچان لیا، پھر نور محمدی کو آدم علیہ السلام کی پیشانی میں رکھا گیا جس کی وجہ سے آپ کی پیشانی جگمگاتی تھی، اور ان کو بتایا گیا اے آدم یہ تمہاری اولاد سے ہوں گے، اور تمام رسولوں کے سردار ہوں گے، پس جب حضرت حوا کے پیٹ میں شیث آئے تو وہ نور آدم علیہ السلام کی پیشانی سے منتقل ہو کر حوا کے پاس آگیا، حالانکہ حضرت ہوا کے بطن سے دو دو بچے ہر حمل سے پیدا ہو رہے تھے لیکن (نبی کریم ﷺ کے نور کو منقسم ہونے سے بچانے کیلئے) صرف شیث علیہ السلام ہی اکیلے پیدا ہوئے اس میں حضور ﷺ کی کرامت کا لحاظ رکھا گیا پھر آپ کا نور ہمیشہ سے پاک ہستی کی طرف منتقل ہوتا رہا، یہاں تک کہ آپ کی والدہ آمنہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو عبداللہ بن عبدالمطلب سے جنا۔

خیال رہے کہ پاک نسلوں سے منتقل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے آباء واجداد بدکاری اور کفر سے پاک تھے، طہارت کو صرف بدکاری کی نجاست سے پاک ہونے کے ساتھ خاص کرنا باطل ہے، بلکہ زیادہ مقصود ہی کفر

سے پاک ہونے کا بیان کرتا ہے۔

یہ تفصیل راقم نے پہلے پارہ ﴿وَلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ﴾ کی وضاحت کے ضمن میں بیان کر دی ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی مٹی کو جنت کے پانی (ماء تسنیم) سے گوندھا گیا اس لئے آپ کی مٹی خوشبودار تھی، آپ کا پسینہ بھی خوشبودار تھا۔

آپ کا پسینہ خوشبودار اور باعث برکت تھا:

عن ام سلیم ان النبی ﷺ کان یاتیھا فیقبل عند ھا فتبسط نطعا فیقیل علیه و کان کثیر العرق فکانت تجمع عرقه فتجعله فی الطیب فقال النبی ﷺ یا ام سلیم ما ھذا؟ قالت عرقک نجعله فی طیبنا وھو من الطیب اطیب وفی روایة قالت یا رسول الله نرجو برکته لصبیا ننا قالت اصبت'' (بخاری، مسلم مشکوۃ باب اسماء النبی ﷺ و صفاته)

حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ بیشک نبی کریم ﷺ ان کے گھر عام طور پر تشریف لاتے اور قیلولہ فرماتے، وہ آپ کیلئے چمڑے کا بچھونا بچھاتیں، جس پر آپ قیلولہ فرماتے، حضور ﷺ کو پسینہ بہت آتا تھا وہ آپ کے پسینے کو جمع کر کے اپنی خوشبو میں ملا رہی تھیں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے ام سلیم یہ کیا؟ انہوں نے کہا ''یہ آپ کا پسینہ ہے، جس کو ہم اپنی خوشبو میں ملا رہے ہیں کیونکہ یہ سب خوشبوؤں سے اعلیٰ خوشبو ہے''

اور ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اس سے ہم اپنے بچوں کیلئے برکت حاصل کرنے کی امید رکھتے ہیں، تو حضور ﷺ نے فرمایا ٹھیک ہے، تمہیں اس سے برکت حاصل ہوگی۔

خیال رہے کہ ام سلیم رضی اللہ عنہا نے جمع کے صیغے ذکر کئے حالانکہ ان کا بظاہر اپنا ہی فعل تھا لیکن انہوں نے کہا ''عرقک نجعله فی طیبنا وھو من الطیب اطیب'' یہ آپ کا پسینہ ہے، ہم اس کو اپنی خوشبو میں ڈالیں گے کیونکہ آپ کا پسینہ سب خوشبوؤں سے زیادہ خوشبودار ہے۔ پھر اور عرض کیا ''یا رسول الله نرجو برکته لصبیاننا'' یا رسول اللہ ہم آپ کے پسینہ سے اپنے بچوں کیلئے برکت حاصل کریں گے'' جمع کے صیغے ذکر کر کے گویا کہ زبان حال سے یوں عرض کر دیا کہ یا رسول اللہ جو میرا عقیدہ و نظریہ ہے وہی میرے گھر کے ہر فرد کا ہے۔

نبی کریم ﷺ کو پسینہ زیادہ آتا تھا:

وجہ اس کی یہ تھی ''لانه کثیر الحیاء'' کیونکہ نبی کریم ﷺ کو حیاء زیادہ آتی تھی، اور جسے حیاء زیادہ آئے اسے

پسینہ زیادہ آتا ہے۔ کسی قسم کا عطر، کستوری، ہر قسم کی خوشبو والی اشیاء میں ایسی خوشبو نہیں پائی گئی جو میرے حبیب پاک ﷺ کے پسینہ مبارک میں تھی، میرے آقا و مولی کو ایک عام انسان سمجھنے والوں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ ان کے پسینہ سے بدبو آتی ہے، ان کے قریب کوئی بیٹھنا پسند نہیں کرتا، اور ان کی تخلیق بدبودار مٹی سے کی گئی لیکن حضور ﷺ کی تخلیق خوشبودار مٹی سے کی گئی، اور آپ کا پسینہ خوشبودار چیزوں کی خوشبو بڑھانے کیلئے استعمال ہوتا تھا، اور آپ کے پسینہ سے برکت حاصل کی جاتی تھی۔

حضرت ام سلیم رضی اللہ عنما کے یہ عرض کرنے پر کہ ہم آپ کے پسینہ کو بچوں کیلئے برکت حاصل کرنے کیلئے استعمال کریں گے، آپ نے منع نہیں فرمایا بلکہ ارشاد فرمایا۔ "**اصبت ای فعلت الصواب**" تم نے درست کام کیا ہے، یقیناً میرے پسینہ میں برکت ہے۔

"**وفیہ استحباب التبرک و التقریب بآثار لصالحین**"

اس حدیث پاک سے یہ سمجھ آیا کہ نیک لوگوں کے آثار سے تبرک حاصل کرنا اور ان کا تقرب حاصل کرنا مستحب ہے۔

"**لما حضر انس بن مالک الوفاۃ اوصی ان یجعل فی حنوطه من ذلک الطیب**"

جب حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کے بیٹے حضرت انس بن مالک ﷺ کی وفات کا وقت قریب آ گیا تو آپ نے وصیت فرمائی کہ میری وفات کے بعد مجھے جو خوشبو (حنوط) لگائی جائے گی اس میں وہ خوشبو بھی ملانا جو میری ماں نے حضور ﷺ کا پسنیہ ملا کر تیار کی تھی۔

سبحان اللہ ! صحابی رسول کا کیسا پختہ ایمان ہے کہ آپ کا پسنیہ قبر میں بھی برکت کا باعث بنے گا۔

خیال رہے کہ ام سلیم اور ام حرام دونوں بہنیں ہیں، ملحان کی بیٹیاں ہیں۔ ام سلیم رضی اللہ عنہا حضو ﷺ کی دس سال خدمت کرنے والے خوش نصیب صحابی حضرت انس ﷺ کی والدہ ہیں، ان کا نکاح پہلے مالک سے تھا، وہ حالت کفر پر ہی مر گیا تھا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ اسی مالک کے بیٹے ہیں بعد میں حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت طلحہ ﷺ سے ہوا، آپ کے پورے گھرانے کے افراد صحابی تھے۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ علامہ نووی رحمہ اللہ مسلم شریف کی شرح میں بیان فرماتے ہیں کہ ام سلیم اور ام حرام رسول اللہ ﷺ کی خالہ تھیں، رضاع کی وجہ سے تھیں یا نسب کی وجہ سے اس لحاظ پر آپ ان کے گھر عام طور پر تشریف لے جاتے، آپ ان کے محرم تھے، وہ آپ کی محرمہ تھیں، محرمہ عورت سے خلوت جائز ہے، اسی لئے آپ ان کے گھر عام طور پر تشریف لے جاتے تھے خواہ وہ اکیلی ہی کیوں نہ ہوں۔

ہوں، اس قانون اور ضابطہ کے مطابق گدھے اور خچر کا پسینہ بھی مشکوک ہونا چاہئے تھا۔

لیکن تمام فقہاء کرام کا اس مسئلہ میں اتفاق ہے کہ ان کا پسینہ پاک ہے، اس کی طہارت میں کوئی شک نہیں۔ اس کی وجہ راقم کے ذہن میں جو آتی ہے (فقہاء کرام کی بحثوں سے ہٹ کر) وہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بعض اوقات گدھے اور خچر پر بغیر زین کے سواری کی، ان کی پیٹھ پر کپڑا وغیرہ بھی نہیں ہوتا تھا، اگر ان کا پسینہ ناپاک ہوتا تو آپ ان پر سواری نہ فرماتے کیونکہ کسی جانور کی ننگی پیٹھ پر سوار ہونے سے پسینہ تو آتا ہی ہے یا دوسرے لفظوں میں میرے عشق ومحبت سے یوں کہو کہ نبی کریم ﷺ کے ان پر سوار ہونے نے ان کے پسینہ کو پاک بنا دیا، جس نے شک وشبہ کو زائل کر دیا۔ (راقم)

رنگ بدلتی ہوئی مٹی سے پیدا کرنے میں حکمت:

ایک وجہ تو حدیث پاک میں واضح طور پر مذکور ہے جو پہلے پارہ ''نجوم الفرقان'' میں ذکر کردی گئی کہ حضرت آدم علیہ السلام کے خمیر میں مختلف رنگوں کی مٹی رکھی گئی تھی وہی تمام رنگ آپ کی اولاد میں موجود ہیں۔

اور دوسری حکمت یہ ہے کہ جس طرح کیچڑ میں رنگ بدل جاتا ہے اسی طرح انسان کا مختلف کیفیات میں رنگ بدل جاتا ہے۔ شرمندگی آنے پر رنگ سرخ ہو گیا، اور ڈر کے وقت زرد ہو گیا، اور پریشانی کے وقت یوں سمجھ آتا ہے کہ اس کے چہرہ سے خاک اڑ رہی ہے۔

کھنکتی (بجتی) مٹی سے پیدا کرنے میں حکمت:

جس طرح مٹی کے برتن کو جب یہ دیکھنا ہو کہ یہ خوب پختہ ہے یا کہ کچا ہے، اور یہ صحیح ہے یا ٹوٹا ہوا تو اسے کھٹکا اور بجا کر دیکھا جاتا ہے، اگر اسمیں گھنٹی کی طرح آواز آئے تو سمجھ آتا ہے کہ یہ پختہ اور صحیح ہے، اگر اس طرح آواز نہ آئے تو پتہ چلتا ہے یہ کچا ہے یا ٹوٹا ہوا ہے۔ انسان کو بجتی ہوئی مٹی سے پیدا کر کے یہ اشارہ کر دیا کہ اے انسان تو اپنے ایمان میں پختہ رہ، اور ایمان میں صحیح سلامت رہ، کبھی ادھر اور کبھی ادھر نہ ہو۔

﴿ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ۝﴾ ''پھر کہا ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔''

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

بظاہر طور پر عقل کا تقاضا ہے کہ یہ کہنا چاہئے تھا ''ثم قال لہ کن فکان'' (پھر کہا ہو جا تو وہ ہو

حضور ﷺ نے تعلیم امت کیلئے حقیقی محرمہ کے بغیر کسی دوسری عورت سے خلوت نہیں فرمائی اگر چہ آپ کی امت کی تمام عورتوں کو آپ کی محرمہ ہونے کا شرف حاصل تھا، لیکن تمام عورتیں حقیقی محرمہ نہ تھیں اسی وجہ سے آپ کے نکاح میں امہات المؤمنین آئیں۔ حضرت ام سلیم اور حضرت ام حرام بنی نجار سے تھیں اور حضرت عبدالمطلب کی شادی بھی بنی نجار قبیلہ کی عورت سے ہی تھی، یہ اپنے باپ ہاشم سے جدا ہو کر مدینہ طیبہ چلے گئے تھے اور وہاں بنی نجار کی ایک عورت سے شادی کر لی۔ (از مرقاۃ ج ۱۱ ص ۲۹)

پسینہ کی خوشبو سے پتہ چلتا کہ آپ یہاں سے گزر رہے ہیں:

عن جابر ان النبی ﷺ لم یسلک طریقا فیتبعه احد الاعرف انه قد سلکه من طیب عرقه دارمی، مشکوة (باب اسماء النبی ﷺ و صفاته)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بیشک نبی کریم ﷺ جب بھی کسی راستہ پر چلتے تو آپ کے بعد جب کوئی اس راستہ پر چلتا تو اسے آپ کے پسینہ کی خوشبو سے پتہ چل جاتا کہ حضور ﷺ کا یہاں سے گذر ہوا۔

یہاں جس خوشبو کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ "**طیب عرقه الخلقی لاطیب العرفی**" آپ کے پسینہ مبارک میں جو خوشبو قدرتی طور پائی جاتی تھی وہ مراد ہے، عام طور پر پسینہ کی بدبو زائل کرنے کیلئے لوگ جس خوشبو کا استعمال کرتے ہیں وہ مراد نہیں۔

"**هذا من خصائصه دون سائر الانبیاء علیه وعلیهم الصلوة والسلام**" (از مرقاۃ ج ۱۱ ص ۸۳)

پسینہ میں قدرتی طور پر خوشبو کا پایا جانا حضور ﷺ کی خصوصیت ہے باقی انبیاء کرام کو بھی یہ شرف حاصل نہ ہوا۔

راقم کے ذہن میں ایک عجیب مسئلہ گھومتا ہے:

فقہاء کرام نے ایک ضابطہ بیان کیا ہے کہ جس کا جوٹھا (بقیہ) پاک ہے اس کا پسینہ بھی پاک۔ انسان اور گھوڑے کا جوٹھا پاک ہے، اسلئے ان کا پسینہ بھی پاک ہے، کتے اور باقی درندوں کا جوٹھا ناپاک ہے اسلئے ان کا پسینہ بھی ناپاک ہے۔ گدھے اور خچر (جس خچر کی ماں گدھی ہو) کا جوٹھا مشکوک ہے، اس لئے کہ اس میں روایات بھی مختلف ہیں اور قیاس بھی مختلف ہیں، اگر اور پانی نہ میسر ہو تو گدھے اور خچر کے جوٹھے پانی سے وضوء بھی کرے اور تیمم بھی کرے کیونکہ ہوسکتا ہے نجس ہونے والی روایات غالب ہوں اور ہوسکتا ہے کہ طہارت والی روایات غالب

گیا)"فکان" کی جگہ "فیکون" کیوں ذکر کیا، تو اس کا ایک جواب یہ ہے کہ اصل مفہوم یہ ہے:

(ثم قال له کن فیکون)فکان، واعلم یا محمد ان ما قال له ربک (کن)(فانه یکون لا محالة)

کہ اے محمد ﷺ آپ کا رب جس کسی کو کہتا ہے "ہو جا" تو وہ یقیناً "ہو جاتا ہے" تو حضرت آدم علیہ السلام کی مٹی کو بھی کہا اس شکل پر بن جا تو وہ بن گئی (کبیر)

دوسرا جواب یہ دیا گیا کہ ماضی سے مضارع کی طرف عدول کر کے اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ اس میں ماضی کے حال کی حکایت پائی گئی ہے۔ (روح البیان)

❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋

﴿اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ فَلَا تَکُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِیْنَ٥﴾ (آیۃ نمبر ٦٠)

(1) اے سننے والے یہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے تو شک والوں میں نہ ہوتا۔

(2) (اے سننے والے) یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے تو نہ ہو شک کرنے والوں۔

میں سے اس آیۃ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ آپ پر عیسی علیہ السلام کی جو خبر نازل کی گئی ہے وہی حق ہے کہ آپ کلمہ کن اور نفخ جبریل (جبریل کی پھونک) سے پیدا کئے گئے۔ آپ کی والدہ مریم کنواری تھی، پاکدامن اور نیک تھی، عیسی علیہ السلام کے متعلق جو یہود و نصاری نے کہا وہ باطل ہے، اسے ماننا کفر ہے۔

"فالنصاری قالوا ان مریم ولدت الھا"

نصاری نے کہا کہ بیشک مریم نے خدا کو جنا ہے۔ یعنی وہ عیسی علیہ السلام کو معاذ اللہ خدا کہنے لگے، ان کے متعلق ہی رب تعالی نے فرمایا:

﴿لَقَدْ کَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ﴾

تحقیق انہوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا بیشک اللہ وہ مسیح ابن مریم ہیں۔

"والیھود رموا مریم علیھا السلام بالافک ونسبوھا الی یوسف النجار"

اور یہود نے مریم علیہا السلام پر بہتان باندھا اور ان کو یوسف نجار کی طرف منسوب کیا، یعنی یہودیوں نے معاذ اللہ حضرت مریم کو بدکارہ اور مزنیہ قرار دیا۔

خیال رہے یہود کے پیروکار نیچری مذہب والوں نے بھی وہی کچھ کہا جو یہود نے کہا لیکن مسلمانوں کے غیظ وغضب سے بچنے کیلئے حضرت مریم کو یوسف نجار کی منکوحہ قرار دیا۔ نصاری اور یہود اور یہود کے پیروکار لوگوں کے اقوال من گھڑت اور باطل ہیں، ان کے نظریات کفریہ ہیں، ان کے اقوال کو تسلیم کرنے والے کافر ہیں۔

"فاللہ تعالی بین ان ھذاالذی انزل فی القرآن ھو الحق"

بس حق وہی ہے جو عیسی علیہ السلام کی شان رب تعالی نے قرآن پاک میں بیان فرمائی ہے۔

اس آیۃ کریمہ سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اس سے پہلی آیۃ میں اللہ تعالی نے حضرت عیسی علیہ السلام کی شان عجیبہ کو حضرت آدم علیہ السلام کی حالت عجیبہ کے مشابہ قرار دیا، تو اس آیۃ کریمہ میں بیان کیا کہ "ان الحق فی بیان ھذہ المسألہ ماذکرناہ من المثل" جو مشابہت ہم نے بیان فرمائی ہے وہ حق ہے وہ تخلیق آدم علیہ السلام کا ذکر ہے۔ "ولا

برھان اقوی من التمسک بھذہ الواقعۃ" اس واقعہ سے بڑھ کر قوی دلیل اور کیا ہوسکتی ہے۔ (بیر)

﴿فَلا تَكُنْ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ۝﴾ (اے سننے والے) تو نہ ہو شک کرنے والوں میں سے

یعنی جب حق وہی ہے جو رب تعالی نے بیان فرمایا ہے تو اس میں شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

"ممتری" وزن ہے "مفتعل" کا "مریۃ" سے ماخوذ ہے، جس کا معنی ہے شک کرنا' عام طور پر عرب استعمال کرتے ہیں "مریت الناقۃ والشاۃ" میں نے اونٹنی کو دوہا، یا میں نے بکری کو دوہا، جس طرح دودھ دوہنے والا دودھ دوہ کر کھینچتا ہے، اسی طرح شک کرنے والا مختلف طرح کے خیالات کو کھینچتا ہے اور جذب کرتا ہے، اسلئے "مریۃ" کا معنی شک بھی ہے۔

اسی طرح "مریۃ" کا معنی جھگڑا کرنا بھی آتا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے "ماری فلان فلانا" فلاں نے فلاں سے جھگڑا کیا، جھگڑا کرنے والا بھی غضب کو ظاہر کرتا ہے اور شک کرنے والا بھی تردد کو ظاہر کرتا ہے، لھذا "مریۃ" کا معنی اس مناسبت سے بھی شک لیا گیا ہے۔

خطاب کسے کیا گیا؟

﴿فَلا تَكُنْ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ۝﴾ کا خطاب کسے کیا گیا ہے؟

"خطاب فی الظاھر مع النبی ﷺ وھذا بظاھرہ یقتض انہ کان شا کافی صحۃ ما انزل علیہ وذلک غیر جائز"

بظاہر تو یہ سمجھ آتا ہے کہ یہ خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے، لیکن اس سے تو یہ ثابت کرنے پڑے گا کہ نبی کریم ﷺ پر اللہ تعالی کا کلام جو نازل کیا آپ کو اس میں شک تھا، لیکن یہ تو جائز نہیں کہ آپ "معاذ اللہ" کلام الہی میں شک کریں۔

واختلف الناس فی الجواب عنہ، فمنھم من قال الخطاب وان کان ظاھرہ مع النبی ﷺ لانہ فی المعنی مع الامۃ قال تعالی "یا ایھا النبی اذا طلقتم النساء"

اہل علم حضرات نے اس کا جواب مختلف انداز پر دیا ہے، ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ اگرچہ بظاہر خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے لیکن مراد آپ کی امت ہے، جیسا کہ اللہ تعالی کے ارشاد گرامی ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ﴾ میں خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے لیکن مراد آپ کی امت ہے۔

(یہی جواب صاوی، مدارک، مظہری، قرطبی، خازن وغیرہ نے پسند کیا ہے، اسی کے مطابق اعلی حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ ہے کہ آپ نے "اے سننے والے" الفاظ ذکر کر کے اسی جواب کی طرف اشارہ کر

دیا ہے، راقم نے بھی یہی ترجمہ نقل کیا ہے)

"والثانی انه خطاب للنبی ﷺ والمعنی فدم علی یقینک وعلی ماانت علیه من ترک الامتراء"

دوسرا جواب اہل علم نے دیا ہے کہ یہ خطاب تو نبی کریم ﷺ کو ہے، لیکن اس صورت میں یہ معنی درست نہیں ہوگا کہ'' نہ ہو تم شک کرنے والوں میں سے'' بلکہ درست معنی یہ ہوگا'' تم یقین پر قائم رہو اور شک جو آپ سے پہلے ہی دور ہے اسی پر قائم رہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

یہ دوسرا جواب تفسیر ابی السعود اور روح البیان میں پسند کیا گیا ہے۔ روح البیان کی واضح عبارت کو دیکھئے:

فی ذلک الخطاب للنبی ﷺ علی طریق الالهاب والتهیج لزیادة التبثیت لان النهی عن الشئ حقیقة یقتض ان یتصور صدور المنهی عنه من المنهی ولا یتصور کونه علیه السلام شاکا فی صحة ما انزل علیه والمعنی دم علی یقینک وعلی ماانت علیه من الاطمئنان علی الحق والتنزه عن اشک فیه"

یہ خطاب نبی کریم کو زیادہ ثابت رہنے پر برانگیختہ کرنے کیلئے ہے، حقیقی نہی یہاں نہیں پائی گئی، نہی وہاں ہوتی ہے جہاں "منهی عنه" (جس کام سے روکا گیا ہے) کا پایا جانا "منهی" (جسے روکا گیا ہے) سے متصور ہو سکے، (جب کوزے میں پانی ہی نہ ہو تو یہ کہنے کا کوئی مقصد نہیں "لا تشرب الماء من الکوز" کوزے سے پانی نہ پیو۔

نبی کریم ﷺ سے جب کلام الٰہی میں شک کرنے کا تصور ہی نہیں پایا گیا تو نہی حقیقی معنی میں نہیں لھذا یہ معنی کرنا تو درست نہیں کہ (نہ ہو تم شک کرنے والوں میں سے) البتہ یہ معنی کرنا درست ہوگا کہ'' آپ یقین پر قائم رہیں اور آپ پہلے سے ہی جو حق پر اطمینان رکھتے ہو اور شک سے جب آپ پاک ہو تو اسی پر قائم رہو۔

جب آپ معصوم ہیں تو آپ کو زیادہ ثابت رہنے پر برانگیختہ کرنے کا کیا فائدہ؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا:

"قال الامام ابو منصور رحمه الله العصمة لا تزیل المحنة ولاترفع النهی"

امام ابو منصور رحمہ اللہ نے فرمایا کہ آپ کے معصوم ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ کو مشقت میں نہ ڈالا جائے اور آپ کو نہی نہ کی جائے یہ بلندی شان کیلئے پائی جاتی ہیں۔ (روح البیان)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿فَمَنْ حَآجَّکَ فِیْهِ مِنْ بَعْدِمَا جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَکُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَکُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَکُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَةَ اللّٰهِ عَلَی الْکَاذِبِیْنَ ○﴾ (آیة نمبر ۶۱)

(1) پھر اے محبوب جو تم سے عیسی کے بارے حجت کریں بعد اس کے کہ تمہیں علم ہو چکا تو ان سے فرمادو آؤ ہم بلائیں اپنے بیٹے اور تمہارے بیٹے اور اپنی عورتیں اور تمہاری عورتیں اور اپنی جانیں اور تمہاری جانیں پھر مباہلہ کریں تو جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ڈالیں۔

(2) تو جو شخص جھگڑا کرے آپ سے اس کے بارے میں، بعد اس کے جو آ گیا تمہارے پاس علم، تو اس نے فرمادو، آؤ ہم بلاتے ہیں اپنے بیٹوں کو اور (تم بلاؤ) اپنے بیٹوں کو، اور ہم اپنی بیٹیوں کو اور تم اپنی بیٹیوں کو، اور ہم اپنی جانوں کو اور تم اپنی جانوں کو، پھر ہم مباہلہ کریں تو کریں اللہ کی لعنت جھوٹوں پر۔

ماقبل سے تعلق:

اللہ تعالی نے پہلے اس سورۃ میں قطعی دلائل سے عیسائیوں کا رد فرمایا، جو وہ حضرت مریم کو اللہ کی زوجہ اور عیسی علیہ السلام اللہ کا بیٹا مانتے تھے، پھر ان کو بتایا کہ تمہارا یہ دعوی باطل ہے کہ عیسی علیہ السلام کا جب انسانوں میں کوئی باپ نہ تھا تو وہ ابن اللہ (اللہ کا بیٹا) ہی ہوگا، یا خدا ہوگا، اگر یہ تمہارا دعوی سچا ہو تو آدم علیہ السلام کے متعلق تم کیا کہو گے، ان کا نہ کوئی باپ ہے اور نہ ماں۔

اب اس آیۃ کریمہ میں ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کو ختم کرنے کیلئے یعنی ان کو مکمل طور پر لاجواب کرنے کیلئے فرمایا گیا کہ اگر قطعی دلائل کے بعد بھی ان کی حجت بازی نہ ختم ہو تو ان کو آپ فرماؤ آؤ مباہلہ کرلیں تو سچے جھوٹے کا پتہ چل جائے، تو یہ ضدی لوگوں کو لاجواب کرنے کا آخری جواب تھا۔ (از کبیر)

شان نزول:

مختلف آیات میں نجران کے وفد کا تذکرہ ہو چکا ہے، ابھی ﴿اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ کَمَثَلِ اٰدَمَ﴾ کی بحث میں بھی تفصیل ذکر ہو چکا ہے، اسی وفد کی حجت بازی کو ختم کرنے کیلئے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرما کر ان کو مباہلہ کا

چیلنج کرکے لاجواب کردیا گیا۔

﴿فَمَنْ حَآجَّکَ فِیْهِ﴾ ''تو جو شخص جھگڑا کرے آپ سے اس کے بارے میں۔''

زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ ''من ''موصولہ ہے، اگرچہ شرطیہ بنانا بھی صحیح ہے۔

''فمن حاجک ای من نازعک وجادلک'' جس شخص نے آپ سے نزاع کیا اور مجادلہ (جھگڑا) کیا اصل میں جھگڑا سے مراد ایک دوسرے کے خلاف حجت و دلائل پیش کرنا مراد ہے۔ یہ باب مفاعلہ ہے جو فعل کو جانبین سے چاہتا ہے، اب مطلب واضح ہوا کہ آپ کے دلائل کے بعد بھی آپ پر کوئی حجت قائم کرے تو اسے مباہلہ کا چیلنج کریں۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ''حاجک'' کا معنیٰ ہی یہ کیا ''جو تم سے حجت کریں ''فیہ' کی ضمیر کے مرجع میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ ضمیر ''عیسیٰ'' (علیہ السلام) کی طرف لوٹ رہی ہے، اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے ''پھر اے محبوب جو تم سے عیسیٰ کے بارے میں حجت کریں'' اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ ''فیہ ''کی ضمیر ''الحق ''کی طرف لوٹ رہی ہو، تو اس صورت میں معنیٰ یہ ہوگا، جو شخص آپ سے حق میں جھگڑا کرے۔

راقم نے ''حاجک'' کا ترجمہ لغوی کیا ہے اور ''فیہ'' کی ضمیر میں دو احتمال پائے جانے کی وجہ سے صرف ترجمہ کیا ہے ''اس کے بارے میں'' (ماخوذ از البحر المحیط و کبیر)

﴿مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ﴾ بعد اس کے جو آ گیا تمہارے پاس علم''

''ما'' موصولہ ہے ''الذی'' کے معنیٰ میں ہے، اور ''علم'' سے مراد ''وحی'' ہے، یعنی قرآن پاک کے نازل ہونے کے بعد جس میں عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر موجود ہے جو حق ہے، آپ کا حق دلائل پیش کرنے کے بعد پھر آپ سے جو حجت بازی کریں (ان کو مباہلہ کا چیلنج کریں) (البحر المحیط)

اسی سے واضح ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ کے دلائل قطعی اور حق تھے، ان لوگوں کے دلائل باطل تھے بلکہ ان کے دلائل کفر پر مبنی تھے۔

﴿فَقُلْ تَعَالَوْا﴾ ''فرما دو آؤ''

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں: ''تعالوا'' امر کا صیغہ ہے، مبنی بر سکون ہونے کی وجہ

سے نون اعرابی ساقط ہے۔ اصل میں "تعالیوا" ہے، یا متحرک ماقبل مفتوح ہونے کی وجہ سے یاء کو الف سے تبدیل کیا گیا، پھر الف اور واؤ میں التقاء ساکنین ہوا تو الف کو حذف کر دیا گیا۔ چونکہ "تعالوا" امر ہے، اسی وجہ سے "ندع" جواب امر میں مضارع واقع ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے، لھذا اس کے آخر میں سے "واؤ" کو حذف کر دیا گیا۔ (صاوی)

﴿نَدْعُ اَبْنَآءَ نَا وَاَبْنَآءَ كُمْ وَنِسَآءَ نَا وَنِسَآءَ كُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ﴾

''ہم بلاتے ہیں اپنے بیٹوں کو اور (تم بلاؤ) اپنے بیٹوں کو، اور ہم اپنی بیٹوں کو اور تم اپنی بیٹوں کو، اور ہم اپنی جانوں کو اور تم اپنی جانوں کو۔''

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ظاہری الفاظ مبارکہ کے مطابق ہے، اور راقم نے روح المعانی اور روح البیان سے مرادی معنی لیا ہے،

"ندع ابناء نا و ابنائکم، الخ" ای یدع کل مناو منکم ابناء ہ و نساء ہ و نفسہ للمباھلة" (روح المعانی)

یعنی ہر ایک ہم میں سے اور تم میں سے اپنے بیٹوں اور عورتوں اور اپنی جانوں کو مباہلہ کیلئے بلائیں۔

"قیل ابناء ناالحسن والحسین و نساء نا فاطمة" "ابناء نا" سے مراد امام حسن اور حسین رضی اللہ عنہما ہیں۔ اور "نساء نا" سے حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا ہیں۔ (روح البیان)

اولاد کا ذکر اپنی جان سے پہلے کرنے میں حکمت:

اولاد کا پہلے ذکر کرنے کی دو وجہ ہیں۔

(۱) "وقد مھم علی النفس لان الرجل یخاطر بنفسہ لھم ویحارب دونھم"

ایک وجہ یہ ہے کہ اولاد کا ذکر مقدم کیا ہے اپنی جان پر کیونکہ انسان کبھی اپنے آپ کو اولاد کی خاطر خطرہ میں ڈال لیتا ہے، اور اولاد پر واقع ہونے والے مظالم کا ان کی جانب سے دفاع کرتا۔

(۲) ولان الاصل فی الدعاء المغایرة بین الداعی والمدعو، والمغایرة بین الرجل وبین ابنائہ ونسا ئہ حقیقی وبینہ وبین نفسہ اعتباری فقدم الحقیقی علی الاعتباری"

اصل قانون یہ ہے کہ بلانے والا اور ہوتا ہے اور جسے بلایا جائے وہ اور ہوتا ہے یعنی داعی اور مدعو میں مغایرت پائی جاتی

ہے، انسان اور اس کی اولاد کے درمیان مغایرت حقیقی پائی جاتی ہے، اور انسان اور اس کی جان کے درمیان مغایرت اعتباری پائی جاتی ہے، اسلئے مغایرت حقیقی کو مغایرت اعتباری سے پہلے ذکر کیا۔

❁ عن سعد بن ابی وقاص قال لما نزلت هذه الآية دعا رسول الله ﷺ عليا وفاطمة وحسنا وحسينا فقال اللهم هؤلاء اهل بيتی " (رواہ الترمذی ومسلم)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب یہ آیۃ کریمہ نازل ہو تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی اور حضرت فاطمہ اور حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو بلایا اور (رب تعالیٰ کے حضور) اے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں۔

رافضیوں کا استدلال:

رافضی لوگوں نے یہ کہا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ بالفصل ہیں اور ابو بکر اور عمر اور عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافتیں باطل ہیں۔ معاذ اللہ وہ غاصب تھے، خلیفہ برحق نہیں تھے۔ انہوں نے اس آیۃ کریمہ سے یہ دلیل پیش کی کہ "ابناء نا" سے مراد حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما ہیں۔ اور "نساء نا" سے مراد حضرت فاطمۃ الزہراء ہیں اور "انفسنا" سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں، "واراد الله تعالى به كون على رضی اللہ عنہ مساويا له ﷺ فی الفضائل" اللہ تعالیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نبی کریم ﷺ کے فضائل میں اس آیۃ کریمہ سے برابر کرنے کا ارادہ فرمایا۔

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو لوگوں کی جانوں سے بھی زیادہ "اولى فی التصرف" بنایا، یعنی ان کے حقوق میں تصرف کا اختیار اتنا زیادہ دیا جو ان کو اپنی جانوں میں تصرف کا اتنا اختیار نہ تھا۔ "فكان علی كذلك فهو الامام" حضرت علی رضی اللہ عنہ جب نفس محمد ہیں تو مؤمنوں کی جانوں سے زیادہ ان پر "اولى بالتصرف" ہیں تو حقیقی امام آپ ہی ہیں۔

اس دلیل کے رد میں چند وجوہ:

(۱) رب تعالیٰ نے جمع کا صیغہ ذکر فرمایا "وانفسنا" اس سے مراد یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ہم اپنی جان اور اپنے متبعین کی جانوں کو بلاتے ہیں۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نبی کریم ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک جان تھی۔

(۲) حضرت علی رضی اللہ عنہ کا "ابناء نا" میں داخل قوی احتمال رکھتا ہے کیونکہ عرفاً عموم المجاز کے لحاظ پر داماد کو بیٹا اور

سسر کو باپ کہہ دیا جاتا ہے۔

(۳) جائز ہے کہ "انفسناء" سے مراد وہ لوگ ہوں جو نسب اور دین کے لحاظ پر آپ سے متصل ہوں اس لحاظ پر صرف حضرت علی ﷛ کا "انفسنا" میں داخل ہونا اور نبی کریم ﷺ کے فضائل میں مساوی ہونا لازم نہیں آتا۔ کئی آیات مبارکہ میں "انفس "کا اطلاق نسبی اور دینی بھائیوں پر قرآن پاک میں آیا ہوا ہے:

﴿وَلَاتُخرِجُوْنَ اَنفُسَکُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ﴾ اور نہ نکالو اپنے نفسوں (اپنے بھائیوں) کو اپنے شہروں سے" ﴿تَقْتُلُوْنَ اَنفُسَكُمْ﴾ تم قتل کرتے ہو اپنے نفسوں کو (اپنے بھائیوں کو) ﴿ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا﴾ مؤمن مرد اور عورتیں اپنے نفسوں (اپنے بھائیوں) کے متعلق خیر کا گمان کرتے ہیں۔ ﴿وَلَاتَلْمِزُوْااَنْفُسَكُمْ﴾ اور نہ عیب لگاؤ اپنے نفسوں پر (اپنے بھائیوں پر) ان تمام آیات میں "انفس" سے مراد "بھائی ہیں" دینی یا نسبی۔

(۴) اگر اس آیہ کریمہ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے کہ نبی کریم ﷺ مومنوں کی جانوں سے زیادہ "اولی بالتصرف" ہیں، لھذا حضرت علی ﷛ "اولی بالتصرف" ہیں، تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ حضرت علی ﷛ نبی کریم ﷺ کی ظاہری حیات میں بھی "اولی بالتصرف" تھے، حالانکہ تم اس کے قائل نہیں ہو، بلکہ تم صرف آپ کی ظاہری حیات کے بعد حضرت علی ﷛ کو اولی بالتصرف مانتے ہو۔

رافض حضرات کی دلیل کو مکمل طور پر رد کر دیا گیا ہے:

ہاں اس واقعہ سے یہ ضرور ثابت ہے "ان ھؤلاء الکرم احب الناس الی رسول اللہ ﷺ" کہ بیشک یہ حضرات یعنی حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین ﷛ رسول اللہ ﷺ کے محبوب تھے، اس کا کوئی انکار نہیں۔

(ماخوذ از مظہری)

اعتراض: داعی مدعو کا غیر ہوتا ہے کوئی اپنے آپ کو بلاتا نہیں، لھذا "انفسنا" سے مراد نبی کریم انہیں بلکہ صرف حضرت علی ﷛ ہی ہیں۔

جواب: یہ اعتراض محاورات عرب سے بے خبری پر مبنی ہے، کیونکہ عرب کے محاورہ میں اپنے آپکو بلانے کا یہ مطلب ہے کہ ہم خود موجود ہو جاتے ہیں، اسے مغایرۃ اعتبار یہ کہا جاتا ہے جو پائی گئی ہے۔ (راقم)

شیعہ کے نزدیک حضرت علی ﷛ انبیاء کرام سے افضل ہیں:

اثناء عشریہ کا معلم محمود بن حسن حمصی علاقہ رے میں رہتا تھا "**وھو کان یزعم ان علیا ﷛ افضل من جمیع الانبیاء سوی محمد ﷺ**" وہ یہ گمان رکھتا تھا کہ حضرت علی ﷛ سوائے حضرت محمد ﷺ کے باقی تمام انبیاء کرام سے افضل ہیں۔اس نے اپنے مذہب وعقیدہ پر یہی آیۃ کریمہ بطور دلیل پیش کی کہ "**انفسنا**" سے مراد خود نبی کریم ﷺ نہیں کیونکہ کوئی شخص اپنے آپ کو نہیں بلاتا بلکہ غیر کو بلاتا ہے، وہ بالاتفاق حضرت علی ﷛ ہیں، لھذا آیۃ کریمہ سے واضح ہوگیا کہ نفس علی نفس محمد ہے، اور مراد یہ بھی نہیں کہ عین نفس علی عین نفس محمد ہے

"**فالمراد ان ھذہ النفس مثل تلک النفس وذلک یقتضی الاستواء فی جمیع الوجوہ**"

بلکہ مراد یہ ہے کہ نفس علی مثل نفس محمد ہے، لھذا اس سے یہ ثابت ہوا کہ حضرت علی نبی کریم ﷺ کے ساتھ تمام اوصاف میں برابر ہیں، ہاں البتہ اجماع امت سے یہ ثابت ہے کہ حضرت علی نبی نہیں اور یہ ثابت ہے کہ تمام کائنات میں افضل حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔

جب نبی کریم ﷺ تمام انبیاء کرام سے افضل ہیں تو حضرت علی ﷛ جو اوصاف میں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے برابر ہیں وہ بھی تمام انبیاء کرام سے افضل ہیں۔اور اس نے ایک حدیث بطور دلیل یہ پیش کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"**من اراد ان یری آدم فی علمہ ونوحا فی طاعتہ وابراھیم فی خلتہ وموسی فی ھیبتہ وعیسی فی صفوتہ فلینظر الی علی بن ابی طالب**"

جو شخص ارادہ رکھے کہ وہ حضرت آدم ﷵ کا علم اور نوح ﷵ کی طاعت اور ابراہیم ﷵ کی خلت اور موسیٰ ﷵ کا رعب اور ان کی ہیبت اور عیسیٰ ﷵ کی برگزیدگی کو دیکھے تو حضرت علی بن ابی طالب کو دیکھ لے۔

لھذا اس حدیث سے بھی واضح ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تمام انبیاء کرام سے افضل ہیں۔

شیعہ کی دلیل کا رد:

"انفسنا" مراد صرف حضرت علی ﷛ نہیں، (تفصیل طور پر تفسیر مظہری سے راقم نے نقل کردیا ہے) اور جب شیعہ حضرات کے نزدیک اجماع امت دلیل ہے اس پر کہ حضرت علی نبی نہیں اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے افضل نہیں،

"**واجمعوا علی ان النبی افضل ممن لیس بنبی واجمعوا علی ان علیا ﷛ ما کان نبیا**"

تو اس مسئلہ پر بھی اجماع ہے کہ کوئی غیر نبی کسی نبی پر افضل نہیں، اور اس بات پر بھی اجماع ہے کہ حضرت علی

نبی نہیں۔لھذا اتم پر لازم ہو گیا کہ اسے تسلیم کرلو کہ اجماع امت سے ثابت ہے کہ حضرت علی ﷺ کسی نبی سے نہ افضل ہیں، بلکہ برابر بھی نہیں، جب کسی نبی کے برابر نہیں تو نبی کریم ﷺ کے برابر ہونے کا تصور ہی نہیں ہوسکتا۔ (ماخوذ از نبیہ)

﴿ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَةَ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ ۝﴾

''پھر ہم مباہلہ کریں تو اللہ کی لعنت کریں جھوٹوں پر''

"ثم نبتهل" میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول یہ ہے "نتضرع فی الدعاء" کہ ہم دعاء میں عاجزی کریں۔اور کلبی کا قول ہے "نجتهد و نبالغ فی الدعاء" کہ ہم دعاء میں کوشش اور مبالغہ کریں۔کسائی اور ابو عبیدہ کا قول یہ ہے کہ "نبتهل" باب افتهال ہے""ابتهال" التعان کے معنی میں آتا ہے، عام طور پر کہا جاتا ہے "علیه بهلة الله" اس پر اللہ کی لعنت ہو۔لھذا معنی یہ ہو گیا ''ہم اللہ کی لعنت کریں'' (معالم التنزیل للبغوی)

راقم کے نزدیک اقوال میں کوئی تعارض نہیں سب کا مطلب ایک ہی ہے، کیونکہ کبیر میں یوں بیان کیا گیا ہے "ابتهال" کا ایک معنی ہے دعاء میں اجتہاد کرنا، لھذا "ابتهل فی الدعاء" اس وقت تک نہیں کہا جاسکے گا جب تک دعاء میں کوشش اور مبالغہ نہیں پایا جائے گا۔

دوسرا معنی ہے لعنت کرنا، جیسا کہ کہا جاتا ہے "علیه بهلة الله" اس پر اللہ کی لعنت ہو، کیونکہ اس کا لغوی معنی ہے چھوڑ دینا، اور دور کر دینا جیسا کہ کہا جاتا ہے ''ناقة باهل'' اونٹنی کھلی چھوڑی ہوئی، یعنی اسے باندھا ہوا نہیں، یہ معنی لغت میں بھی پایا گیا ہے۔"لان معنی اللعن هو الابعاد و الطرد" اسلئے کہ لعنت کا معنی ہے ''دور کرنا، ہانکنا'' جیسا کہ کہا جاتا ہے "بهله الله ای لعنه و ابعده من رحمته" بہلہ اللہ کا معنی لیا جاتا ہے اللہ تعالی اسے رحمت سے دور کرے، اس پر لعنت کرے، (کبیر)

"و الاصل فی البهلة بالضم و الفتح فیه کما قیل اللعنة و الدعاء بها ثم شاعت فی مطلق الدعاء" اصل میں "بهلة" (پیش اور زبر سے) کا معنی لعنت ہے اور لعنت کی دعاء ہے، لیکن پھر مطلقا دعاء کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ (روح المعانی)

البتہ آیۂ کریمہ "ابتهال" لعنت کے معنی میں استعمال ہے جس پر آنے والے الفاظ گرامی ﴿فَنَجْعَلْ لَّعْنَةَ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ ۝﴾ دلالت کر رہے۔ (کبیر)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نجران کے نصاری کا ایک وفد (جوان کے چودہ سرکردہ

آدمیوں پر مشتمل تھا) رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا، ان میں ایک قبیلہ کا سردار تھا اور ایک عاقب یعنی قبیلہ کے سردار کا نائب تھا جو ان کا صاحب رائے بھی تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو فرمایا "اسلما" تم اسلام قبول کرلو، وہ کہنے لگے، ہم نے تو اسلام قبول کیا ہوا ہے، تو آپ نے فرمایا، تم نے اسلام قبول نہیں کیا ہوا۔ وہ کہنے لگے کیوں نہیں؟ ہم نے تو تم سے پہلے اسلام قبول کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا تم نے جھوٹ کہا ہے، تمہارے اسلام قبول کرنے میں تین چیزیں مانع ہیں، ایک تمہارا صلیب کی عبادت کرنا، دوسری چیز تمہارا خنزیر کا گوشت کھانا، اور تیسری چیز تمہارا عیسی علیہ السلام کو خدا کا بیٹا ماننا۔ انہوں نے کہا کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ بغیر باپ کے کوئی بچہ پیدا ہو؟ جب عیسی علیہ السلام کا انسانوں میں کوئی باپ نہیں تو ان کا باپ (معاذ اللہ) خدا ہی ہوسکتا ہے۔ تو رب تعالی آیۃ کریمہ ﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ (الآیۃ)﴾ کو نازل فرمایا کہ "عیسی کی شان عجیبہ آدم کی حالت عجیبہ کی طرح ہے، گویا کہ عجیب چیز یعنی عیسی علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کو عجیب ترین یعنی آدم علیہ السلام کا بغیر ماں اور باپ کے پیدا ہونے سے تشبیہ دے کر سمجھایا، لیکن وہ لوگ سمجھنے کے بجائے یوں کہنے لگے "ما نعرف ما تقول" ہمیں تو پتہ نہیں چل رہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو، اس وقت آیۃ مباہلہ کو نازل کیا گیا۔

نبی کریم ﷺ نے ان لوگوں کو کہا اگر تم اللہ تعالی کی طرف سے نازل کردہ دلائل کو قبول نہیں کرتے تو اللہ تعالی نے مجھے تمہارے ساتھ مباہلہ کا حکم دیا ہے۔ انہوں نے کہا اے ابا القاسم ہم ابھی واپس جاتے ہیں علیحدہ ہو کر اپنے معاملہ میں غور فکر کرتے ہیں پھر ہم تمہیں بتائیں گے کہ ہم نے مباہلہ کرنا ہے یا نہیں، وہ علیحدہ ہو کر ایک دوسرے سے مشورہ کرنے لگے، تاکہ ایک دوسرے کی تصدیق کر کے اتفاقی فیصلہ کرسکیں۔

اس قبیلہ کے سردار نے اپنے نائب کو کہا "قد و الله علمتم ان الرجل بنی مرسل" تحقیق قسم ہے اللہ تعالی کی کہ تم یقینی طور پر جانتے ہو کہ بیشک یہ نبی مرسل ہے، اگر تم نے اس شخص پر لعنت کر دی تو تم تباہ و برباد ہو جاؤ گے۔ جب بھی کسی قوم نے اللہ کے نبی پر لعنت بھیجی تو وہ تباہ و برباد ہوئی، ان کے چھوٹے اور بڑے تباہ و برباد ہوئے۔ "فان انتم لن تتبعوه وابیتم الا الف دینکم فواد دعوه وارجعوا الی بلادکم" اگر تم اللہ کے نبی کی تابعداری نہیں کرتے اور ماننے سے انکار کرتے ہو اور تمہیں اپنے دین سے الفت ہے تو اس شخص کو چھوڑ دو اور اپنے شہروں کی طرف لوٹ چلو۔

"وقد کان رسول الله ﷺ خرج ومعه علی والحسن والحسین وفاطمة فقال رسول الله ﷺ ان انا دعوت فامنوا انتم فابوا ان یلاعنوه وصالحوه علی الجزیة"

رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لے گئے، آپ کے ساتھ حضرت علی اور حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین اور فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا تھے، رسول اللہ ﷺ نے ان حضرات کو فرمایا جب میں دعاء کروں تم آمین کہنا۔ لیکن نصرانیوں نے مباہلہ کرنے سے انکار کردیا اور حضور ﷺ سے جزیہ پر صلح کرلی۔ (روح المعانی)

مباہلہ کے متعلق چند روایات:

واخرج البخاری ومسلم والترمذی والنسائی وابو نعیم فی الدلائل عن حذیفة ان لاعاقب والسید اتیا رسول الله ﷺ فاراد ان یلاعنهما فقال احدهما لصاحبه لاتلاعنه فوالله لئن کان نبیا فلا عننا لانفلح نحن ولا عقبنا من بعد نافقالوا له نعطیک ما سألت فابعث معنا رجلا امینا فقال قم یا ابا عبیدة فلما قفا قال هذه امین هذه الامة"

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں نجران کے وفد میں قوم کا ایک سردار اور ایک اس کا جانشین صاحب رائے نبی کریم ﷺ کے پاس آئے، تو آپ نے ارادہ فرمایا کہ ان سے مباہلہ کیا جائے یعنی اگر یہ دونوں جھوٹے ہیں تو ان پر لعنت کی جائے لیکن ان میں سے ایک شخص دوسرے کو کہنے لگا تو اس پر لعنت نہ کر، قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اگر یہ شخص نبی ہوا اور اس نے ہم پر لعنت کردی تو ہم کبھی کامیاب نہیں ہوں گے اور نہ ہی ہمارے بعد ہماری نسل میں سے کوئی کامیاب ہوگا، تو انہوں نے نبی کریم ﷺ سے کہا ہم آپ کو وہ چیز (بطور جزیہ) دیں گے جس کا آپ مطالبہ کریں گے، آپ ہمارے ساتھ ایک امین شخص کو بھیج دیں۔ تو آپ نے فرمایا اے ابوعبیدہ کھڑے ہو جائے جب وہ کھڑے ہوئے تو حضور ﷺ نے فرمایا یہ اس امت کا امین ہے۔ (منقول از درمنثور)

خیال رہے بعض روایات میں "فلما قفا" کی جگہ "فلما قام" ہے، مطلب ایک ہی ہے، حدیث پاک سے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی شان سمجھ آئے گی کہ وہ کتنے خوش بخت انسان تھے جن کو نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کا امین کہا۔

❁ واخرج الحاکم وصححه وابن مردویة وابو نعیم فی الدلائل عن جابر قال قدم علی النبی ﷺ العاقب والسید فدعا الی الاسلام فقالا اسلمنا یا محمد قال کذبتما ان شئتمااخبرلکما بما یمنعکما من الاسلام قالا فهات قال حب الصلیب وشرب الخمر واکل لحم الخنزیر قال جابر فدعا هما الی الملاعنة فوعداه الی الغد فغدارسول الله ﷺ واخذبید علی وفاطمة والحسن والحسین ثم ارسل الیهما فابیا ان یجیباه واقراله فقال والذی بعثنی بالحق لوفعلا لامطر الوادی علیهما نارا قال جابر فیهم نزلت تعالوا ندع ابناء نا وابنائکم الآیة قال جابر انفسنا وانفسکم رسول الله ﷺ علی وابناء نا الحسن

والحسین ونساء نا فاطمة"

حضرت جابر ﷺ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کے پاس نجران کی قوم کا ایک سردار اور ایک اس کا جانشین صاحب رائے آیا، آپ نے ان دونوں کو دعوت اسلام دی، وہ دونوں کہنے لگے اے محمد ہم تو اسلام لا چکے ہیں آپ نے فرمایا تم جھوٹے ہو۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں بتاؤں تمہیں کس چیز نے اسلام سے دور کر رکھا ہے، انہوں نے کہا ہاں آپ بتائیں، آپ نے فرمایا صلیب کی محبت اور شراب پینے اور خنزیر کے گوشت کھانے نے تمہیں اسلام لانے سے منع کیا ہوا ہے۔

حضرت جابر کہتے ہیں نبی کریم ﷺ نے انہیں مباہلہ کے متعلق فرمایا کہ آؤ جھوٹے پر لعنت کریں، انہوں نے کل کا وعدہ کیا (یعنی وہ سوچ کر بتائیں گے) کل صبح رسول اللہ ﷺ سے مباہلہ کیلئے گھر سے نکلے اور آپ نے حضرت علی، حضرت فاطمہ اور حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہم کے ہاتھ پکڑے (اور ساتھ لیا) پھر ان کی طرف پیغام بھیجا لیکن انہوں نے مباہلہ کے چیلنج کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھے حق کیساتھ مبعوث فرمایا اگر وہ مباہلہ کر لیتے تو اللہ تعالیٰ ان کی وادی پر آگ کی بارش برساتا، حضرت جابر کہتے ہیں ان بارے میں ہی یہ آیت تعالوا ندع ابناءنا (الآیۃ) نازل ہوئی۔ حضرت جابر کہتے ہیں "انفسنا" سے مراد نبی کریم ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور "ابناء نا" سے مراد حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہما ہیں، اور "نساء نا" سے مراد حضرت فاطمۃ الزاہرا رضی اللہ عنہا ہیں۔ (منقول از درمنثور)

❀ واخرج الحاكم وصححه عن جابر ان وفد نجران اتوا النبی ﷺ فقالوا ماتقول فی عیسی فقال هو روح الله وكلمته وعبدالله ورسوله قالوا له هل لک ان نلاعنک انه لیس کذلک قال وذلک احب الیکم قالوا نعم قال فاذاشئتم فجاء وجمع ولده الحسن والحسین فقال رئیسهم لا تلاعنوا هذالرجل فوالله لئن لاعنتموه لیخسفن باحدالفریقین فجاء وافقالوا یا ابا القاسم انما اراد یلا عنک سفهاء نا وانا نحب ان تعفینا قال قداعفیتکم ثم قال ان العذاب قد اظل نجران"

حضرت جابر ﷺ فرماتے ہیں بیشک نجران کا وفد نبی کریم ﷺ کے پاس آیا تو انہوں نے کہا تم عیسی علیہ السلام کے متعلق کیا کہتے ہو؟ آپ نے فرمایا وہ روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں، اور اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ وہ کہنے لگے کیا ہم تمہارے ساتھ مباہلہ نہ کریں یعنی ہر فریق جھوٹے پر لعنت کرے کہ عیسی اسطرح نہیں تھے، آپ نے فرمایا ٹھیک ہے مباہلہ کر لیتے ہیں میں تو پہلے ہی یہی چاہتا تھا، انہوں نے کہا ٹھیک ہے مباہلہ کرتے ہیں، آپ نے فرمایا جب چاہو

مباہلہ کرلو۔آپ آئے اپنی اولاد میں سے امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما کو (اپنے ساتھ مباہلہ کیلئے) جمع کیا، لیکن ان کے سردار نے کہا اس شخص سے مباہلہ نہ کرو۔قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اگر تم نے اس شخص سے مباہلہ کیا تو دونوں میں سے ایک (جھوٹے) فریق کی شکل نے ضرور بگڑنا ہے (وہ سچے ہم جھوٹے ہیں) وہ لوگ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے اے ابو القاسم ہم میں سے کچھ بے وقوف لوگوں نے آپ سے مباہلہ کرنے کا ارادہ کیا تھا ہم یہی چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں معاف فرمادیں، آپ نے فرمایا میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے، پھر آپ نے فرمایا کہ نجران کے لوگوں کے قریب عذاب آچکا تھا۔(یعنی اگر وہ مباہلہ کر لیتے تو تباہ و برباد ہو جاتے) (منقول از درمنثور)

❁ ابو نعیم کی ایک روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے ان پر آیۂ مباہلہ کو پیش فرمایا''

"فقالوا اخرنا ثلاثة ایام فذهبوا الی بنی قریظة والنضیر وبنی قینقاع فاستشاروهم فاشاروا علیهم ان یصالحوه ولا یلاعنوه وهو النبی الذی نجده فی التوراة فصالحوا النبی ﷺ علی الف حلة فی صفر والف فی رجب ودراهم"

تو انہوں نے کہا کہ ہمیں تین دنوں کی مہلت دیں تو وہ بنی قریظہ بنی نضیر اور بنی قینقاع کے یہودیوں کے پاس گئے اور مشورہ کیا تو انہوں نے ان کو نبی کریم ﷺ سے صلح کر لینے کا ارشارہ دیا کہ تم ان پر لعنت نہ کرنا کیونکہ وہ نبی ہیں ان کا تذکرہ ہم توراۃ میں پاتے ہیں (وہی اوصاف ان میں پائے گئے جو توراۃ میں مذکور ہیں) تو ان لوگوں نے یہود کے مشورہ سے نبی کریم ﷺ سے صلح کر لی کہ ہم ایک ہزار کپڑے کے جوڑے صفر میں ادا کریں گے اور ایک ہزار جوڑے رجب میں ادا کریں گے اور ساتھ ساتھ دراہم بھی دیں گے۔ (منقول از منثور)

❁ واخرج ابن ابی شیبة وسعید بن منصور عبدبن حمید وابن جریر وابونعیم عن الشعبی قال کان اهل نجران اعظم قوم من النصاری قولا فی عیسی بن مریم فکانو ایجادلون النبی ﷺ فیه فانزل الله هذه الآیات فی سورة آل عمران "ان مثل عیسی عندالله" الی قوله "فنجعل لعنة الله علی الکاذبین" فامر بملا عنتهم فواعدوه لغد فغداالنبی ﷺ ومعه الحسن والحسین وفاطمة فابوا ان یلاعنوه وصالحوه علی الجزیة فقا النبی ﷺ لقداتانی البشیر بهلکة اهل نجران حتی الطیر علی الشجر لو تموا علی الملاعنة"

شعبی بیان فرماتے ہیں کہ نصرانیوں میں سے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بات کرنے میں اہل نجران عظیم قوم تھی، وہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جھگڑا کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے "ان مثل عیسی عند الله کمثل آدم" سے

لے کر "فنجعل لعنة الله علی الکاذبین" تک آیات کریمہ کو نازل کیا، تو آپ نے ان کو مباہلہ کا حکم دیا کہ ہر فریق دعاء کرے اور جھوٹوں پر لعنت کرے، انہوں نے کل آنے کا وعدہ کیا، کل نبی کریم باہر تشریف لے گئے، آپ کے ساتھ امام حسن اور امام حسین اور فاطمہ رضی اللہ عنہم بھی تھے" لیکن نجرانیوں آپ کے ساتھ مباہلہ کرنے سے انکار کر دیا اور جز یہ دینے پر صلح کر لی، نبی کریم ﷺ نے فرمایا مجھے بشارت مل چکی تھی کہ اگر نجرانیوں آپ سے مباہلہ کر لیا تو وہ تباہ و برباد ہو جائیں گے یہاں تک کہ ان علاقہ میں درختوں پر کوئی پرندہ بھی نہیں بچ سکے گا۔ (منقول از درمنثور)

❁ واخرج عبد الرزاق والبخاری والترمذی والنسائی وابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم وابن مردویه وابونعیم فی الدلائل عن ابن عباس "قال لو باهل اهل نجران رسول الله ا لرجعوا الا یجدون اهلا ومالا"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اگر اہل نجران نبی کریم ﷺ سے مباہلہ کر لیتے تو وہ اپنے مال اور اپنی اہل نہ پاتے (یعنی سب کچھ تباہ و برباد ہو جاتا) (منقول از درمنثور)

مباہلہ کی ایک طویل روایت ابونعیم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ذکر کی، اس میں یہ مذکور ہے۔

"وقد غدا رسول الله ﷺ محتضنا الحسین آخذا بیدالحسن وفاطمة تمشی خلفه وعلی خلفها وهو یقول اذادعوت فامنوا،فقال اسقف نجران یا معشرالنصاری انی لاری وجوها لوسألوالله ان یزیل جبلا عن مکانه لازاله فلا تبتهلوا فتهلکوا ولا یبقی علی وجه الارض نصرانی الی یوم القیامة"

نصرانیوں نے مباہلہ کیلئے کل تک جب سوچنے کی مہلت طلب کی تو نبی کریم ﷺ کلہ باہر تشریف لے گئے، آپ کی بغل میں امام حسین تھے اور آپ نے امام حسن کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا اور حضرت فاطمة الزاہراء رضی اللہ عنہا آپ کے پیچھے چل رہی تھیں اور حضرت علی حضرت فاطمہ کے پیچھے چل رہے تھے، آپ ان کو فرما رہے تھے میں جب دعاء کروں تو تم آمین کہنا، نجران کے سردار نے کہا اے نصرانیوں کے قبیلہ بیشک میں یہ چہرے جو دیکھ رہا ہوں اگر انہوں نے اللہ تعالی سؤال کیا کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو ہٹ جائے گا، اس لئے تم اس شخص سے مباہلہ نہ کرو، ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے، اور روئے زمین پر قیامت تک کوئی نصرانی باقی نہیں رہے گا۔

اسی روایت کے آخر میں یہ بھی مذکور ہے:

"قال ﷺ والذی نفسی بیده ان العذاب قدتدلی علی اهل نجران ولو تلاعنوا لمسخوا قردة وخنازیر ولا ضطرم علیهم الوادی نارا ولا ستاصل الله نجران واهله حتی الطیر علی الشجر ولما حال الحول علی النصاری کلهم حتی هلکوا وکذااخرج ابو نعیم فی الدلائل من طرق عن ابن عباس"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے بیشک اہل نجران کے قریب عذاب آچکا تھا، اگر یہ میرے ساتھ مباہلہ کر لیتے تو بندر اور خنزیر بنا دیئے جاتے، اور ان کو آگ کی وادی بھر کر جلا دیا جاتا، اللہ تعالیٰ نجران اور ان کی اہل کو تباہ و برباد کر دیتا (ان کوی نحوست کی وجہ سے) پرندے بھی درختوں پر ہلاک ہو جاتے، (نبی کریم ﷺ کے مقابل آنے والے) ایک سال کے بعد تمام ہی ہلاک ہو گئے۔ (ماخوذ از مظہری)

مقام اهل بیت:

"وانما قدمهم فی الذکر علی النفس لینبه بذلک علی لطف مکانهم وقرب منزلتهم"

نبی کریم ﷺ نے اپنے ذکر سے پہلے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کا کیا تا کہ اس پر تنبیہ کی جا سکے کہ اہل بیت کا مرتبہ آپ کے قریب تھا اور آپ کو ان پر خصوصی لطافت و مہربانی حاصل تھی، امت مصطفیٰ ﷺ کیلئے بھی لازم ہے کہ وہ صحابہ کرام اور اہل بیت پر ایمان رکھے اور ان سے محبت رکھے ورنہ جہنم کی وادیوں میں ہی رہے گا۔

آیۃ مباہلہ سے حاصل ہوا:

وفیه دلیل قاطع وبرهان واضح علی صحة نبوة محمد ﷺ لانه لم یروا احد من موافق ومخالف انهم اجابوا الی المباهلة لانهم عرفوا صحة نبوته وما یدل علیها فی کتبهم"

اس آیہ کریمہ سے قطعی طور پر ثابت ہوا، اور واضح دلائل سے یہ بات سامنے آئی کہ نبی کریم ﷺ کی نبوت صحیح ہے، کیونکہ موافقین اور مخالفین سبھی نے ان کو یہی مشورہ دیا کہ مباہلہ نہ کرو ورنہ تباہ و برباد ہو جاؤ گے، اس کی وجہ یہی تھی کہ نصرانی جو ان کے موافق تھے وہ بھی اپنی کتاب سے نبی کریم ﷺ کی نبوت کی حقانیت کو سمجھ چکے تھے، اور یہود جو ان کے مخالف تھے وہ اپنی کتاب توراۃ سے مصطفیٰ کریم ﷺ کی حقانیت کو پہچان چکے تھے۔ (خازن)

نبی کریم ﷺ نے بیٹے کیسے کہا جبکہ وہ نواسے ہیں:

بظاہر وہم یہ ہے کہ اولاد کی نسبت باپ کی طرف ہوتی ہے، ماں کی طرف نہیں، اگر کوئی ہاشمی شخص رومی یا حبشی عورت سے نکاح کرے اور اس سے اولاد پیدا ہو تو وہ اولاد باپ کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے ہاشمی کہلائے گی رومی یا حبشی نہیں کہلائے گی، اسی وجہ سے امام محمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص وصیت کرے کہ میری موت کے بعد یہ میرا مال میری اولاد کو دے دینا، اگر اس کی اپنی (صلبی) اولاد نہیں بلکہ اس کے پوتے اور نواسے ہوں تو وہ مال اس کے پوتوں کو ملے گا نواسوں کو نہیں، ایک شاعر نے بھی یوں کہا:

بنونا بنو ابنائنا وبناتنا　　　　بنوهن ابناء الرجال الاباعد

ہمارے بیٹے، ہمارے پوتے نواسے سبھی اپنے آباء کی طرف منسوب ہیں خواہ وہ بعید خاندان کے ہی ہوں۔

تو نبی کریم ﷺ نے اپنے نواسوں کو "ابنائنا" ہمارے بیٹے، کیسے کہا؟

تو اس کا جواب یہ ہے:

"فنسبة الحسن والحسین رضی الله عنهما الی النبی ﷺ بالبنوة علی الاطلاق مخصوص بها لا یدخل فیه غیرهما"

کہ حضرت امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما کو جو نبی کریم ﷺ نے اپنا بیٹا کہا تو یہ آپ کی خصوصیت ہے، ان دونوں حضرات کے بغیر اور کسی کو شرف حاصل نہیں۔

اس پر نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے۔

"کل سبب ونسب منقطع یوم القیامة الاسببی ونسبی"

ہر سبب اور نسب قیامت کے دن منقطع ہو جائے گا سوائے میرے سب اور میرے نسب کے

ہاں البتہ باقی لوگوں کا قانون یہی ہے:

"وان غیرهما من الناس انما ینسبون الی الآباء وقومهم دون قوم الام"

نبی کریم ﷺ کے نواسوں کے بغیر تمام لوگوں کیلئے یہی قانون ہے کہ وہ اپنے اپنے باپ اور اس کی قوم کی طرف منسوب ہوتے ہیں، اپنی ماؤں کی طرف منسوب نہیں ہوتے۔ (ماخوذ از احکام القرآن للجصاص)

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

عام طور پر ایک غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صرف حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کو اور حسنین کریمین کو ساتھ لیا، اور باقی بیٹیوں اور نواسوں کو ساتھ کیوں نہ لیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں تین احتمال ہیں ایک تو یہ کہ مباہلہ کے وقت باقی بیٹیوں کو اس لئے ساتھ نہ لیا ہو کہ وہ وفات پا چکی ہوں، لیکن جواب اس وقت صحیح ہو سکتا ہے جبکہ مباہلہ کا واقعہ ۹ھ کے آخر کا ہو، کیونکہ حضرت رقیہ کی وفات ۲ھ کو ہے، اور حضرت زینب کی وفات ۸ھ کو ہے، اور حضرت ام کلثوم کی وفات ۹ھ کو ہے۔

دوسرا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ مباہلہ کے وقت باقی بیٹیاں مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ میں نہ پہنچیں ہوں) یہ جواب قوی ہو سکتا ہے، کیونکہ مفسرین کرام کے اقوال سے یہی پتہ چلتا ہے کہ مباہلہ کا واقعہ مدینہ طیبہ میں آنے

کے بعد جلدی ہی در پیش آیا۔**تیسرا جواب** یہ ہو سکتا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ساتھ اس لئے لیا ہو کہ وہ سب سے زیادہ پیاری ہوں، چونکہ عام عادت یہی ہے کہ چھوٹی اولاد پیاری ہوتی ہے۔ (ماخوذ از نعیمی بالوضاحت)

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا ایک بیٹا علی تھا جو حد بلوغ تک پہنچ کر فوت ہو گیا، البتہ ان کی بیٹی امامہ تھیں جن سے نبی کریم ﷺ کو بہت پیار تھا، یہ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے وصال کے بعد حضرت علی ﷜ کے نکاح میں آئیں۔حضرت رقیہ کا صرف ایک بیٹا تھا جو دو سال کا ہو کر فوت ہو گیا۔اور حضرت ام کلثوم کی کوئی اولاد نہیں تھی، البتہ بعض حضرات نے کہا دو بیٹے پیدا ہوئے لیکن بچپن میں ہی فوت ہو گئے، یہی وجہ ہے کہ خاندان سادات حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی طرف منسوب ہے۔کیونکہ باقی بیٹیوں کی آگے نسل چلی ہی نہیں۔ (ماخوذ از مدارج النبوت بوضاحت)

مسئلہ: نبی کریم ﷺ کی امت کو مباہلہ کرنے کی اجازت نہیں دی گئی، کیونکہ مباہلہ اس وقت کیا جا سکتا ہے جب دوسرے شخص کا جھوٹا ہونا قطعی ہو، اس کا علم حضور ﷺ کو تھا عام آدمیوں کو قطعی علم حاصل نہیں ہوتا، البتہ امت کے افراد کو لعان کی اجازت دی گئی۔یعنی جب خاوند اپنی زوجہ کو تہمت لگائے زنا کی اور گواہ نہ پیش کر سکے اور عورت اقرار بھی نہ کرے تو اس وقت مرد چار مرتبہ اپنے سچے ہونے کی قسم اٹھاتا ہے اور پانچویں مرتبہ کہتا ہے اگر میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر اللہ کی لعنت ہو، اور اس کے جواب عورت چار مرتبہ قسم اٹھا کر کہتی ہے یہ جھوٹا ہے، اور پانچویں مرتبہ کہتی ہے اگر یہ سچا ہوں تو مجھ پر اللہ کا غضب ہو، یہ ہے لعان جواب بھی جائز ہے، اور لعان کے بعد زوجین کے درمیان تفریق کر دی جاتی ہے، زیادہ تفصیل سورۃ نور میں موجود ہے۔ (ماخوذ از نعیمی وصاوی بوضاحت)

البتہ بعض فرقہ نواصب نے کہا ہے جب دوسرے کا جھوٹا ہونا یقینی ہو تو مباہلہ کیا جا سکتا ہے۔ (احکام القرآن للجصاص)
لیکن یہ قول جمہور کے مخالف ہے۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ٥﴾

(آیة نمبر ۶۲)

(1) یہی بیشک سچا بیان ہے اور اللہ کے سواء کوئی معبود نہیں اور بیشک اللہ ہی غالب ہے حکمت والا.

(2) بیشک یہی واقعات ہیں حق، اور نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے اور بیشک اللہ ہی غالب (اور) حکمت والا ہے۔

"هــــذا" کے اشارہ میں دو احتمال ہیں، ایک یہ ہے کہ اشارہ قرآن پاک کی طرف ہو، تو معنی یہ ہوگا بیشک یہ قرآن ہے، وہ حق بیان ہے، یا یہ مطلب ہے کہ اس میں واقعات حق ہیں. (قرطبی)

ایک اور احتمال یہ ہے کہ "هذا کا اشارہ ہو "المذکور فی شان عیسی علیہ السلام قالہ ابن عباس "المذکور کی طرف تاویلا، یعنی عیسی علیہ السلام کی شان میں جو واقعات مذکر ہو چکے ہیں" المذکور " یا "ما ذکر" یا "ما قصص " کے الفاظ مفسرین کرام نے "هذا" مفرد مذکر ہونے کی وجہ سے بیان کئے ہیں۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"ان" حرف تحقیق مشبہ بالفعل ہے۔ "هذا" اسم ان ہے، "القصص" موصوف "الحق" صفت، موصوف ملکر خبر ان، درمیان میں "لهو" میں لا تاکید کیلئے اور "هو ضمیر فصل حصر اضافی کیلئے ہے، جیسا کہ قانون ہے کہ مبتداء اور خبر جب دونوں معرفہ ہوں تو درمیان میں ضمیر فصل حصر کیلئے آتی ہے۔ اب معنی یہ ہو گیا "ان هذا هو الحق" بیشک یہی حق ہے، یعنی عیسی علیہ السلام کے واقعات جو قرآن پاک میں موجود ہیں وہی حق ہیں۔

حصر اضافی ذکر کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ قرآن پاک میں مذکور عیسی علیہ السلام کے واقعات حق ہیں اور باقی قرآن میں مذکور آیات حق نہیں، معاذ اللہ یہ مطلب نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے:

"ان هذا لهو الحق لا مایدعیه النصاری من کون المسیح علیہ السلام الها و ابن الله سبحانه وتعالی عما یقوله الظالمون علوا کبیرا"

کہ بیشک عیسی علیہ السلام کے واقعات جو قرآن پاک میں مذکور ہیں وہی حق ہیں، وہ واقعات حق نہیں جو نصرانیوں نے بیان کئے ہیں کہ عیسی علیہ السلام معبود یعنی خود خدا تھے اور اللہ کا بیٹا تھے یہ ان کے اقوال باطل تھے اسلئے کہ ان ظالموں کے

اقوال سے اللہ تعالی پاک و بلند ہے، کیونکہ نہ اس کا کوئی شریک ہے اور نہ اس کی اولاد ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

طلباء کرام یہ بھی خیال میں رکھیں:

کہ اگر "ھذا" کا اشارہ قرآن پاک کی طرف ہو تب بھی حصر اضافی پائی جائے گی، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ بیشک یہ قرآن ہی حق ہے، یہود و نصاری کے اقوال باطل ہیں، ان کی تحریف شدہ انجیلیں اور توراۃ باطل ہیں۔

حصر اضافی کا یہی فائدہ ہے کہ وہ حقیقی انجیل اور توراۃ جو رب تعالی کی طرف سے نازل ہوئیں، ان کا باطل ہونا نہیں ثابت ہوگا وہ حق ہیں، البتہ قرآن پاک کے نازل ہونے اور نبی کریم ﷺ کی بعثت (اعلان نبوت) کے ساتھ پہلی کتب منسوخ ہوگئیں۔

"**القصص**" کا معنی ہے واقعات، عام طور "قص یقصه قصاء قصصا" کا معنی آتا ہے بیان کرنا جیسا کہ کہا جاتا ہے "قص فلان الحديث" فلاں نے کلام بیان کیا، یا فلاں نے حدیث بیان کی، اصل معنی اس کا ہے کسی کے پیچھے چلنا، کسی کی تابعداری کرنا، جیسا کہ موسی علیہ السلام کی والدہ نے اپنی بیٹی اور موسی علیہ السلام کی بہن سے جو کلام کیا رب تعالی نے اس کی حکایت بیان کی ﴿وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ﴾ اور اس (موسی علیہ السلام کی ماں) نے کہا اس کی بہن کو اس کے پیچھے پیچھے چلو (کہ یہ صندوق جس میں موسی علیہ السلام کو بند کر کے دریا میں ڈالا گیا یہ کدھر جاتا ہے)

قصہ اور واقعہ بیان کرنے والے کو "قاص" کہا جاتا ہے کہ وہ بھی ایک خبر کے پیچھے دوسری خبر لاتا ہے۔

"فمعنى القصص الخبر المشتمل على المعاني المتتابعة" یہاں "**قصص**" کا معنی یہ ہے کہ وہ خبر جو پے در پے معانی پر مشتمل ہو اسے "قصص" کہا جاتا ہے۔ (کبیر)

﴿وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ﴾ "اور نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے۔"

ان الفاظ مبارکہ سے ان نصاری کا بھی رد ہوگیا جو تین خدا مانتے ہیں اور ان کا بھی رد ہوگیا جو عیسی علیہ السلام کو خدا مانتے ہیں، ضمناً ان کا بھی رد ہوگیا جو عیسی علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں کیونکہ خدا تو وہی ہے جو ﴿لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ﴾ ہے، یعنی اولاد سے پاک ہے اور والدین سے بھی پاک ہے، ماں، باپ اور اولاد ایک دوسرے کے محتاج ہوتے ہیں، رب تعالی احتیاجی سے پاک ہے، جہاں توالد و تناسل (سلسلہ اولاد پائے) پایا جائے وہاں حدوث ہو گا، رب تعالی حادث ہوگا،، اور مشرکین کا بھی رد ہوگیا، غرضیکہ رب تعالی کو معبود حقیقی وحده لا شريك له نہ ماننے

والے تمام فرقوں کا اس آیۂ کریمہ سے رد کر دیا گیا۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"**من**" زائد ہے، صلہ پر داخل ہونے والا "**من**" زائد ہوتا ہے "من زائدہ کما ھو شان الصلات" (صلہ کا اصطلاحی معنی موصول وصلہ والا نہ سمجھنا بلکہ لغوی معنی سمجھنا) "**الٰہ**" نکرہ ہے، نکرہ تحت النفی آجائے تو استغراق کا فائدہ دیتا ہے، لھذا معنی واضح ہو گیا، کہ کوئی ایک بھی معبود نہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے۔

﴿وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ٥﴾ "بیشک اللہ ہی غالب (اور حکمت والا ہے۔"

"**العزیز**" ای الغالب غلبة تامة "العزیز" کا معنی ہے "وہ غالب جس کو کامل غلبہ حاصل ہو"

"**العزیز**" ای القادر قدرة تامة "العزیز کا معنی ہے وہ قادر جسے قدرت کاملہ حاصل ہو"

"**العزیز**" ھو الذی لانذیر له "العزیز کا معنی وہ (عزت والا) جس کی کوئی نظیر نہ ہو، بلکہ ہر صفت میں نظیر سے پاک "العزیز" ہے۔

"**الحکیم**" ای المتقن فیما صنع اوالمحیط بالمعلومات "الحکیم" کا مطلب ہے "وہ ذات جسے اپنی صنعت میں پختگی اور یقین حاصل ہو، اور وہ ذات جسے اپنی معلومات پر احاطہ حاصل ہو" (روح المعانی)

جب معنی کیا جائے "حکمت والا" تو یہ معانی خود بخود اس میں سمٹ کر آجاتے ہیں، ان الفاظ مبارکہ سے بھی باطل فرقوں کا رد کر دیا گیا کہ "اللہ" وہی ہے جو غالب (اور) حکمت والا ہے، جسے غلبہ کاملہ حاصل نہیں، جسے قدرت کاملہ حاصل نہیں، جو بے نظیر بے مثل نہیں، اور جو حکمت والا نہیں، جسے اپنی صنعت میں پختگی حاصل نہیں، اور جسے اپنی معلومات پر احاطہ حاصل نہیں وہ معبود بننے کے لائق بھی نہیں۔ لھذا ان صفات کاملہ مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے وہ معبود حقیقی ہے وہی وحدہ لاشریک لہ ہے۔

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

اصل میں مبتداء پر لام داخل ہوتا ہے جس کی وجہ سے اسے لام ابتداء کہا جاتا ہے، پھر وہی لام تاکید کیلئے خبر پر داخل ہوتا ہے لیکن جب مبتداء اور خبر کے درمیان ضمیر فصل نہ ہو، اگر ضمیر فصل ہو تو وہی لام ضمیر فصل پر داخل ہوتا ہے، اسی وجہ سے "لھو" میں ضمیر فصل پر لام داخل ہے۔ (مظہری)

﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِالْمُفْسِدِيْنَ۝﴾ (آیۃ نمبر ۶۳)

(1) پھر اگر وہ منہ پھیریں تو اللہ فسادیوں کو جانتا ہے۔

(2) پھر اگر وہ پھر جائیں تو بیشک اللہ جاننے والا ہے فساد پھیلانے والوں کو۔

قرآن تیری عظمت پہ قربان:

بظاہر آیۃ کریمہ بڑی مختصر اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ بھی بڑا مختصر اور جامع و مانع، لیکن یہ آیۃ کریمہ عظیم مطالب کو حاوی ہے۔

﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا﴾ ''اگر وہ پھر جائیں''

''تـولـوا'' میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ ماضی کا صیغہ ہو اور دوسرا یہ کہ مضارع کا صیغہ ہو، اصل میں تتولوا ہو ایک تاء کو حذف کر دیا گیا ہو، اور آخر سے نون اعرابی ''ان'' شرطیہ کی وجہ سے محذوف ہو، تاہم ''ان'' کی وجہ سے معنی دونوں صورتوں میں مستقبل کا ہوگا۔ (از روح المعانی)

اگر وہ پھر جائیں کس چیز سے پھرنا مراد ہے؟

''فان تولوا عن الحجج و اعرضوا عن التوحید'' ''اگر وہ دلائل سے اور اللہ تعالیٰ کی توحید سے پھر جائیں۔ (مظہری)

(فان تولوا عن ذلک الی غیرہ) ہم نے جو واقعات حق بیان کئے ہیں ان سے اگر یہ اعراض کریں اور غیر راہ یعنی باطل راہ پر چلیں۔ (صابونی)

(فـان تـولـوا) ای اعـرضـوا عن قبول التوحید و الحق الذی قص علیک بعد ما عاینوا تلک الحجج النیرۃ و البراھین الساطعۃ''

اگر وہ توحید کے قبول کرنے سے اعراض کریں، اور وہ حق جو آپ پر بیان کیا اس کا روشن دلائل اور روشن وقوی براھین کو دیکھنے کے باوجود پھر جائیں۔ (روح البیان)

﴿فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِالْمُفْسِدِيْنَ﴾ ''تو بیشک اللہ جاننے والا ہے فساد پھیلانے والوں کو''

یعنی اگر وہ حق راہ سے پھر جائیں تو وہ فسادی ہیں، آپ ان سے اعراض کریں، ان سے کلام منقطع کریں، ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیں۔ (روح البیان)

وہ فسادی کیوں ہیں؟ اسلئے کہ وہ آفاق میں کفر و معاصی پھیلاتے ہیں، اور لوگوں کو ایمان سے روکتے ہیں، اور ان کے نفسوں میں منعم ذات کی نعمتوں کا کفران (ناشکری) پایا جاتا ہے، اور وہ شکر کو چھوڑنے والے ہیں اور اللہ کے رسول کی مخالفت کرنے والے ہیں، اسلئے وہ عذاب کے مستحق ہیں۔

"وفیه اشارة الی ان التولی عن الحق افساد" "والله اعلم"

اس آیۃ کریمہ میں اشارہ پایا گیا ہے، اس طرف کہ حق سے پھرنا حقیقت میں فساد پھیلانا ہے۔ (مظہری)

(فان الله علیم بالمفسدین) وعیدلهم بالعذاب المذکور فی قوله زدنا هم عذابا فوق العذاب بما کانو ایفسدون"

اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ بِالْمُفْسِدِیْنَ﴾ (تو بیشک اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے فساد پھیلانے والوں کو) میں وعید (عذاب کی دھمکی) پائی گئی ہے، دوسری آیۃ کریمہ میں فساد پھیلانے والوں کے عذاب کا ذکر ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿زِدْنَاهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا یُفْسِدُوْنَ﴾ ہم زیادہ کرتے ہیں عذاب اوپر عذاب کے بوجہ اس کے کہ وہ فساد پھیلاتے تھے۔ " (مدارک)

آیۃ کریمہ سے یہ مسئلہ واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے قطع تعلق کرنی ضروری ہے، یہ قطع تعلق واجب ہے اور اس میں ثواب ہے، مومنوں اور نیک آدمیوں تین دنوں سے زیادہ قطع تعلقی ناجائز ہے۔ اور مسئلہ روز روشن کی طرح واضح ہے کہ حق سے پھرنے والے، بے دین خدا اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے باغی فسادی ہیں، حق راہ پر چلنے والے شریف ہیں۔

❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋

﴿قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَ بَیْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْـًٔا وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ۝﴾ (آیۃ نمبر ۶۴)

(1) تم فرماؤ اے کتابیو ایسے کلمہ کی طرف آؤ جو ہم میں تم میں یکساں ہے یہ کہ عبادت نہ کریں مگر خدا کی اور اس کا شریک کسی کو نہ کریں اور ہم میں کوئی ایک دوسرے کو رب نہ بنالے اللہ کے سوا پھر اگر وہ نہ مانیں تو کہہ دو تم گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں۔

(2) آپ فرمادیں، اے اہل کتاب آؤ ایسے کلمہ کی طرف جو برابر ہے ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان یہ کہ نہ عبادت کریں ہم سوائے اللہ کے، اور نہ شریک ٹھہرائیں ہم اس کے ساتھ کسی چیز کو، اور نہ بنائے ہمارا بعض بعض کو رب سوائے اللہ کے، پھر اگر وہ پھر جائیں تو تم کہو "تم گواہ رہو بیشک ہم مسلمان ہیں۔

یہ خطاب عام ہے تمام اہل کتاب کو ہے خواہ وہ یہودی ہوں یا نصرانی، یا ان کے متبعین ہوں، یعنی مسلمانوں کا لبادہ اوڑھ کر یہودیوں کے طرز عمل پر کام کررہے ہوں۔ (صابونی)

طلباء کرام تفسیر صابونی کی عبادت بھی یاد کرلیں:

"هذا الخطاب يعم اهل الكتاب من اليهود والنصارى ومن جرى مجراهم"

شان نزول :

جب نجران کا وفد مدینہ طیبہ میں آیا تو وہ یہود کے ساتھ ایک جگہ جمع ہوئے لیکن مدینہ طیبہ کے یہود اور نجران کے نصاری کا حضرت ابراھیم علیہ السلام کے متعلق اختلاف ہوگیا نصرانی کہنے لگے ابراہیم علیہ السلام نصرانی تھے ہم ان کے دین پر ہیں اور سب لوگوں سے ہم ابراہیم علیہ السلام کے زیادہ قریب ہیں اور یہودیوں نے کہا ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے ہم ان کے دین پر ہیں اور سب لوگوں سے ہم ابراہیم علیہ السلام کے قریب ہیں۔

"فقال رسول كلا الفريقين برى من ابراهيم ودينه بل كان حنيفا مسلما وانا على دينه فاتبعوا دينه الاسلام"

تورسول اللہ ﷺ نے فرمایا دونوں فریق ہی ابراہیم علیہ السلام کے متعلق رائے یہ رکھتے ہیں کہ ہم ان کے دین پر ہیں ان کا دین یہی تھا جو ہمارا دین ہے، حالانکہ آپ تو ان دینوں سے جدا ہو کر اسلام پر قائم تھے (یعنی افراط وتفریط کے درمیان دین اسلام پر قائم تھے) میں ان کے دین پر ہوں تو تم لوگ ان کے دین اسلام کی تابعداری کرو۔

ضمناً واضح کر دیا کہ اگر تم ابراہیم علیہ السلام کے متعلق اچھا اعتقاد اور اچھی رائے رکھتے ہو تو میری تابعداری کرو اور دین اسلام پر قائم ہو جاؤ، کیونکہ آپ کا اسلام تھا، اور میں ہی ان کا متبع ہوں، تم ان کے متبع نہیں، تمہارا دعویٰ جھوٹا ہے۔

"فقالت الیھود ماترید الاان نتخذک ربا کما اتخذت النصاری عیسی ربا"

رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے بعد یہود نے کہا، تم صرف یہی کہتے ہو کہ تمہیں رب مان لیں، جیسا کہ نصرانیوں نے عیسیٰ کو رب مان لیا ہے۔

"وقالت النصاری یا محمد ما ترید الاان نقول فیک ماقالت الیھود فی عزیر"

اور نصرانیوں نے کہا اے محمد تم تو صرف یہی چاہتے ہو کہ ہم تمہارے متعلق وہی کچھ کہیں جو یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کے متعلق کہا تھا (کہ وہ خدا کا بیٹا ہے)

اسی وقت یہ آیۂ کریمہ نازل ہوئی ﴿قُلْ يَآ أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ﴾ فرمادو اے اہل کتاب ایک کلمہ کی طرف آجاؤ جو برابر ہو ہمارے اور تمہارے درمیان آگے اسی کلمہ کی وضاحت کر دی کہ وہ کلمہ یہ ہے ﴿أَنْ لَا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾ یہ کہ ہم نہ عبادت کریں سوائے اللہ کے، اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں اور نہ بنائے بعض ہمارا بعض کو رب سوائے اللہ کے۔

مطلب واضح ہے کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ مجھے (معاذ اللہ) اللہ کا بیٹا یا اللہ کہا جائے، میں تو وہی چاہتا ہو جو میرا رب تعالیٰ چاہتا ہے ہاں رب قدوس نے ہی تو فرمایا ہے کہ میں تمہیں اس کلمہ کی دعوت دوں جو حقیقت میں ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے وہ یہی ہے کہ آؤ ہم سب ایک ہی ذات اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں، اور آؤ اس بات میں ہمارا اتفاق ہو جائے کہ ہم میں سے کوئی ایک فریق بھی اپنے ہی آدمیوں کو رب نہ بنا بیٹھے، ان باتوں میں اتفاق ہو جائے تو جھگڑے سب ختم ہو جائیں، تم اپنے باطل عقیدہ پر بھی قائم رہو، دین اسلام کی بھی مخالفت کرتے رہو، اپنی مرضی کے مطابق ڈگڈگی بجاتے رہو اور یہ بھی تصور کرو کہ ہم تمہارے تابع ہو جائیں گے اور ہم تمہارے باطل عقائد

میں تمہارے ساتھ متفق ہو جائیں گے تو یہ تمہارا تصور غلط ہوگا، حق تو یہ یہی ہے کہ تم رب تعالی کے پیش کردہ قانون اور متفق ہونے کیلئے لائحہ عمل کے مطابق اسلام قبول کرلو، گویا کہ رب تعالی کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ایمان قبول کرلیں تو بہتر ورنہ اے نبی کریم اور مؤمنین تم ان سے یہ کہو ﴿ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُوْنَ O﴾ پھر اگر وہ پھر جائیں تو تم کہو گواہ بن جاؤ بیشک ہم مسلمان ہیں یعنی جس چیز کا تم نے ان کو حکم دیا ہے اگر وہ اسے تسلیم نہ کریں اور اس سے پھر جائیں تو تم ان کو کہہ دو کہ اگر تم ایمان نہیں لاتے تو ہمارے اسلام اور ایمان اور اللہ تعالی کی توحید کو خلوص سے ماننے اور اللہ تعالی کی عبادت کرنے پر گواہ بن جاؤ۔ (ماخوذ از خازن)

کلمہ سے مراد کیا ہے:

اس مقام پر کلمہ سے مراد نحوی کلمہ نہیں کہ نحویوں کے نزدیک کلمہ مفرد کو کہا جاتا ہے وہ مرکب کا مقابل ہوتا ہے، اسم ہو یا فعل ہو یا حرف، بلکہ اس مقام پر کلمہ سے مراد یہ ہے:

"والعرب تسمي كل قصة لها شرح كلمة ومنه سميت القصيدة كلمة" (معالم التنزیل للبغوی)

عرب ہر قصہ جس کی شرح و وضاحت پائی جائے یعنی طویل اور واضح قصہ کو کلمہ کہتے ہیں، اور قصیدہ کو بھی کلمہ کہا جاتا ہے۔ اس مقام پر کلمہ سے مراد یہی ہے کہ آؤ ایک بات پر متفق ہو جائیں، اس کے بعد اس کی وضاحت کردی اگرچہ وہ تینوں جملے مفیدہ ہیں۔

خیال رہے کہ ﴿يَـٰٓأَهْلَ الْكِتَابِ﴾ کا خطاب یہود و نصاری دونوں فریقوں کو ہے جیسا کہ شان نزول سے واضح ہے کہ دونوں فریقوں نے جب نبی کریم ﷺ کو کہا تم تو چاہتے عیسی علیہ السلام کی طرح تمہیں خدا مانا جائے یہ یہود کا قول تھا، اور نصاری کا قول تھا کہ تم تو چاہتے ہو تمہیں عزیر کی طرح خدا کا بیٹا مانا جائے تو ان دونوں فریقوں رد میں آیہ کریمہ نازل ہوئی تو خطاب بھی دونوں فریقوں کو ہے، اگرچہ بعض مفسرین کرام نے خطاب کو نجران کے نصرانیوں کے وفد سے خاص کیا ہے، لیکن راقم کو وہی قول پسند ہے جس میں خطاب کو عام رکھا گیا ہے جو یہود و نصاری دونوں کو شامل ہے۔

"سواء" عدل بيننا وبينكم مستوية اى امر مستو" یعنی "سواء" کا ایک معنی ہے برابر ہونا، عام طور پر "سواء" استواء کے معنی میں لیا جاتا ہے۔ "مستوی کا معنی "برابر ہونا" مشہور و معروف ہے۔ "سواء" انصاف کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے "دعا فلان الى السواء الى النصفة" فلاں شخص نے انصاف کی طرف بلایا، اور "سواء" کا معنی وسط بھی آتا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے:

"سواء کل شئی وسطه" ومنه قوله "فَرَآهُ فِیْ سَوَاءِ الْجَحِیْمِ"

ہر چیز کے وسط کو "سواء" کہا جاتا ہے، قرآن پاک کی اس آیۃ کریمہ میں "سواء" کا معنی برابر ہے۔

"سواء" مصدر بمعنی مستویة ای" لا یختلف فیها التوراة والانجیل والقرآن اولااختلاف فیها بکل الشرائع"

"سواء" مصدر ہے، "مستویة" کے معنی میں استعمال ہے، یعنی اے اہل کتاب آؤ اس کلمہ کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے یعنی توراۃ وانجیل اور قرآن میں سے کسی ایک کا اختلاف نہیں، سب کا اتفاق ہے، اور سب ہی برابر طور پر اس پر متفق ہیں کہ عبادت صرف اللہ کی ہے اس کا کوئی شریک نہیں، اور نہ ہی بندوں میں سے کوئی رب ہے۔ بلکہ اس مسئلہ میں کسی شریعت میں بھی کوئی اختلاف نہیں، اور نہ ہی کسی شریعت میں اس کے خلاف حکم دیا گیا ہے۔ (روح المعانی)

بعض کا بعض کو رب نہ بنانے کا کیا مطلب؟

اس کا مطلب یہ ہے:

(ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون) کما اتخذتم الاحبار والرهبان" (جلالین)

اور نہ بنائے ہمارا بعض بعض کو رب سوائے اللہ کے جیسا کہ تم نے اپنے علماء اور پادریوں کو اپنا رب بنالیا ہے۔ وہ لوگ اپنے علماء اور پادریوں کو اپنا رب بنالیا ہے۔ وہ لوگ اپنے علماء اور پادریوں کو کس طرح رب مانتے تھے، اس پر تفسیر صاوی کی ایک تحقیقی عبارت کو دیکھئے جس سے بے دین دہریوں کا بھی رد ہو جائے گا اور جھوٹے پیروں اور ان کے مریدوں کا بھی رد ہو جائے، حقیقی طور پر سچا عقیدہ نکھر کر سامنے آجائے گا۔

"کما اتخذتم الاحبار" ای وهم علماء الیهود والرهبان عبادالنصاری واتخاذهم اربابا من حیث انهم ینسبون التحلیل والتحریم والاقالةمن الذنوب لهم ولا یتبعون ما انزل الله بل المدارعندهم علی ما حللته الاحبار والرهبان اوحرموه ،وهذه الآیة وان کانت خطاباللیهود والنصاری الاانهاتجری بذیلها علی من یشرک بالله غیره من المسلمین کضعفاء الایمان الذین یعتقدون فی الاولیاء انهم یضرون وینفعون بذواتهم ویحلون ماحرم الله ویحرمون ما احل الله ومع ذلک یحدثون بدعا عظیمة ماانزل الله بهامن سلطان ویجعلون تلک البدع طرقالهؤلاء الاولیاء ویزعمون انهامنجیة وان کانت مخالفة للشرع ویحسبون انهم علی شئ الاانهم هم الکاذبون استحوذعلیهم الشیطان فانساهم ذکر الله

اولئک حزب الشیطان الاان حزب الشیطان ھم الخاسرون "

آیہ کریمہ میں خطاب یہود و نصاریٰ کو ہے لھذا ﴿وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ﴾ (اور نہ بنائے بعض ہمارا بعض کو رب سوائے اللہ کے) کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے بغیر تم نے علماء کو رب بنایا ہوا ہے، ان کی ربوبیت سے باز آجاؤ، ہم نے تو کسی عالم کو رب نہیں مانا ہوا تو خود بخود اس پر عمل ہو جائے گا، کہ " بعض ہمارا بعض کو رب نہیں مانے گا سوائے اللہ کے" اسی طرح تم اپنے راہبوں یعنی پادریوں کو خدا مانتے ہو، اسے چھوڑ دو صرف رب تعالیٰ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ۔

وہ لوگ علماء اور راہبین کو کس طرح رب مانتے تھے؟:

وہ اس طرح رب مانتے تھے کہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ راہب حضرات اور علماء جس چیز کو حلال کریں وہی حلال ہوتی ہے، اور جس چیز کو حرام کریں وہ حرام ہو جاتی ہے، اور یہ لوگ ہمارے گناہوں کو ہم سے دور کر دیتے ہیں، اور وہ یہود و نصاریٰ ان احکام پر عمل نہیں کرتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے نازل کئے بلکہ ان کی دارومدار صرف علماء اور راہبوں پر ہوتی، ان چیزوں کو ہی یہ حرام سمجھتے تھے جن کو ان کے علماء اور راہب حرام کہتے ہیں، اور ان چیزوں کو ہی حلال سمجھتے ہیں جن کو ان کے علماء اور راہب حلال کہتے ہیں۔

علماء سوء اور علماء حق میں فرق واضح ہو گیا:

وہ علماء کرام ہی علماء حق ہیں جن کو "العلماء ورثة الانبیاء" کا شرف حاصل ہے، یعنی وہ انبیاء کرام کے وارث ہیں، ان کا کام اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام لوگوں تک پہنچانا ہے۔ جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے حلال کیا ہے وہ لوگوں کو بتاتے ہیں کہ یہ چیزیں حلال ہیں، اور جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام کیا ہے وہ ان کو حرام سمجھتے ہیں۔ علماء سوء وہ لوگ ہیں جو مفاد پرست ہوتے ہیں، حکومتی ٹٹو ہوتے ہیں، حکام کے خوشامدی ہوتے ہیں۔ اور پیسے دینے والوں کو چاپلوسی کرتے ہیں، ان لوگوں کو دنیاوی مال عزیز ہوتا ہے، وہ اسی دنیاوی مفاد کو ترجیح دیتے ہیں، حکام صحیح کہیں یا غلط کہیں یہ علماء سوء اسی ہاں میں ہاں ملائیں گے، ان کے نزدیک حق و باطل میں فرق کرنا کوئی چیز نہیں، وہ ہر چڑھتے سورج کے پجاری ہوتے ہیں۔

آیئے آیئے قارئین کرام! خود فیصلہ فرمائیں کون سے علماء حق ہیں اور کون سے علماء سواء ہیں۔ اگر حکام یہ کہیں

کہ قرآن پاک سے جہاد کی آیات کی وضاحت لوگوں کے سامنے نہیں کرنی اور جہاد کے متعلق کوئی تقریر نہیں کرنی، اور دینی مدارس کے کورس سے جہاد کی آیات اور احادیث کو نکالنا ہے تو علماء سوء کہیں گے ہاں یہی درست ہے، لیکن علماء حق کہیں گے نہیں نہیں ہم یہ نہیں مانتے، ہم قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں ترمیم کر کے کفر مول نہیں لیتے۔

اسی طرح اگر روشن خیالی سائنسی ترقی ہو تو اس کا کوئی عالم دین مخالف نہیں، اگر روشن خیالی بے حیائی کا نام ہو یعنی مخلوط تعلیم اور ایسی محافل کا قیام جہاں عورتوں کو گانا گانے اور ناچ کرانے کیلئے بلایا جائے، مردوں اور عورتوں کی ملی جلی محافل جہاں عورتوں کے سر اور گریبان کھلے ہوں اور بازو ننگے ہوں تو اس روشن خیالی کو علماء سوء تعریفی کلمات سے یاد کریں گے کہ ہاں ہمارے حاکم صاحب نے جو فرمایا ہے کہ ساری قوم روشن خیال ہو جائے ہاں یہی ٹھیک ہے، سب روشن خیال ہو جاؤ یعنی سب بے حیاء ہو جاؤ۔ لیکن علماء حق کہیں گے نہیں نہیں، یہ روشن خیالی جو حقیقت میں بے حیائی ہے وہ تو ہم جائز نہیں کہتے البتہ سائنسی ترقی کریں، ایٹم بم بنائیں یا میزائل بنائیں ہم اس کی تعریف کریں گے۔

حقیقی ولیوں اور بناوٹی پیروں اور ان کے پیروکاروں میں فرق:

اگر چہ اس آیۃ کریمہ میں خطاب تو یہود ونصارٰی کو ہے لیکن ضمناً یہ بھی سمجھ آ گیا جو لوگ ضعیف ایمان رکھتے ہیں، دین کی ان کو واقفی نہیں ہوتی ان کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ ولی اللہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو ذاتی طور پر نفع ونقصان پہنچا سکتے ہیں، اور جس چیز کو اللہ تعالیٰ حرام کرے یہ اسے حلال کر لیتے ہیں، اور جسے رب حرام کرلے یہ اسے حلال کر لیتے ہیں، یہ عقائد ونظریات بے دین لوگوں کے ہیں۔ دیندار لوگ صاف ستھرا عقیدہ رکھنے والے یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی ولی بلکہ کوئی نبی اور کوئی رسول ذاتی طور پر نفع ونقصان کے مالک نہیں، البتہ اللہ تعالیٰ کی عطاء سے ان کو ان تصرفات کا حق حاصل ہوتا ہے کہ ان کی تابعداری کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نفع پہنچاتا ہے، ان کی مخالفت کرنے والوں کو نقصان پہنچاتا ہے، نفع ونقصان سے مراد دنیاوی مال ودولت نہیں بلکہ دینی اور اخروی نفع ونقصان مراد ہے۔

اور دیندار لوگ اور صحیح عقیدہ رکھنے والے کہتے ہیں کہ اللہ کے اولیاء تو وہ ہیں جو لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کی تابعداری کا حکم دیتے ہیں، اس راہ پر لوگوں کو چلاتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے "صراط مستقیم" کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ولی اسی چیز کو حلال سمجھتے ہیں جسے رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے حلال کیا ہے، اور اسی چیز کو حرام سمجھتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام کیا ہے۔

اسی طرح جھوٹے اور بے دین لوگ شریعت کے خلاف نئے نئے کام ایجاد کر کے اولیاء کرام کی طرف

منسوب کر دیتے ہیں کہ یہی کام ذریعہ نجات ہیں باوجود اس کے کہ وہ کام خلاف شرع ہوں، ان کا گمان یہ ہوتا ہے کہ ہم سیدھی راہ پر ہیں، ان کے نظریات باطل ہیں، ان پر شیطان غالب آ چکا ہے، شیطان نے ان کو اللہ تعالیٰ کی یاد سے دور کر دیا ہے، وہ شیطانی گروہ ہیں، خبردار شیطانی گروہ خسارے میں ہے، یعنی واضح ہوا کہ اللہ کے ولی خود بھی "صراط مستقیم" پر قائم ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی اسی کی ترغیب دیتے ہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ کا ولی خلاف شرع کاموں کا حکم دے۔ (صاوی بمع وضاحت)

نبی کریم ﷺ کا مکتوب اور اس پر ردعمل:

اس آیۃ کریمہ کے نازل ہونے بعد نبی کریم ﷺ نے دوسرے ممالک میں اہل کتاب سربراہان مملکت کو خطوط لکھے، ان میں سے ایک خط اور اس کا ردعمل مسلم شریف سے ذکر کیا جا رہا ہے، اگرچہ بخاری میں ذکر کچھ اور طویل ہے:

❁ عن ابن عباس ان ابا سفيان اخبره من فيه الى فيه قال انطلقت في المدة التي كانت بيني وبين رسول الله ﷺ قال فبينا انا بالشام اذجئ بكتاب من رسول الله ﷺ الى هرقل قال و كان دحية الكلبي جاء به فدفعه الى عظيم بصرىٰ فدفعه عظيم بصرى الى هرقل فقال هرقل هل ههنا من قوم هذاالرجل الذى يزعم انه نبى قالوا نعم قال فدعيت في نفرمن قريش فدخلنا على هرقل فاجلسنا بين يديه فقال ايكم اقرب نسبامن هذاالرجل يزعم انه نبى فقال ابو سفيان فقلت انا فاجلسوني بين يده و اجلسوا اصحابي خلفي ثم دعابترجمانه فقال له قل لهم انى سائل هذا عن الرجل الذى يزعم انه نبى فان كذبني فكذبوه قال فقال ابو سفيان وايم الله لولامخافة ان يؤثر على الكذب لكذبت ثم قال لترجمانه سله كيف حسبه فيكم قال قلت هو فينا ذوحسب قال فهل كان من آبائه ملك قالت لا،قال فهل كنتم تتهمونه بالكذب قبل ان يقول ما قال قلت لا،قال ومن يتبعه اشراف الناس ام ضعفائهم قال قلت بل ضعفائهم قال ايزيدون ام ينقصون قال قلت لا بل يزيدون،قال هل يرتد احد منهم عن دينه بعد ان يدخل فيه سخط له،قال قلت لا،قال فهل قاتلتموه قلت نعم قال فكيف كان قتالكم اياه قال قلت يكون الحرب بيننا وبينه سجا لا يصيب منا ونصيب منه قال فهل يغدر قلت لا،ونحن في مدة لا ندرى ماهو صانع فيها قال فو الله ما امكنني من كلمة ادخل فيها شيئا غير هذه قال فهل قال هذاالقول احد قبله قال قلت لاقال لترجمانه قل له انى سالتك عن حسبه فزعمت انه فيكم ذوحسب و كذلك الرسل تبعث في احساب قومها وسالتك هل كان في آبائه ملك فزعمت ان لا،فقلت لو كان من آبائه ملك قلت رجل يطلب ملك آبائه وسالتك عن اتباعه اضعفاؤهم ام اشرافهم فقلت بل ضعفاؤهم وهم اتباع الرسل وسالتك هل كنتم تتهمونه بالكذب قبل ان يقول ما قال فزعمت ان لا

فقد عرفت انه لم یکن لیدع الکذب علی الناس لم یذهب فیکذب علی الله وسألتک هل یرتداحد منهم عن دینه بعد ان یدخله سخطة له فزعمت ان لا وکذلک الایمان حتی یتم وسألتک هل قاتلتموه فرعمت انکم قد قاتلتموه فتکون الحرب بینکم وبینه سجالا ینال منکم وتنالون منه وکذلک الرسل تبتلی ثم تکون لهم العاقبة وسألتک هل یغدر فرعمت ان لا فقلت لو قال هذاالقول احد قبله قلت رجل انتم بقول قیل قبله قال ثم قال بم یأمرکم قلت یا مرنا بالصلوة والذکوةوالصلة والعفاف قال ان یکن ماتقول فیه حقافانه نبی وقدکنت اعلم انه خارج ولم اکن اظنه انه منکم ولوانی اعلم انی اخلص الیه لا حببت لقاء ہ ولوکنت عنده لغسلت عن قدمیه ولیبلغن ملکه ما تحت قدمی قال ثم دعا بکتاب رسول الله ﷺ فقرأه فاذافیه بسم الله الرحمن الرحم من محمدرسول الله ﷺ الی هرقل عظیم الروم سلام علی من اتبع الهدی اما بعد فانی ادعوک بدعایة الاسلام اسلم تسلم واسلم یؤتک الله اجرک مرتیین وان تولیت فان علیک الم الاریسیین ویااهل الکتاب تعالواالی کلمة سواء بینا وبینکم الا نعبد الاالله ولا نشرک به شئیا الی قوله فقولواالشهدوابانا مسلمون فلما فرغ من قرائة الکتاب ارتفعت الاصوات عنده وکثراللغط وامربنا فاخرجنا قال فقلت لاصحابه حین خرجنا لقد امرامر ابن کبشة انه لیخافه ملک بنی الاصفر قال فما زلت موقنا بامررسول الله ﷺانه سیظهر حتی ادخل الله علی الاسلام" (مسلم جلد ثانی کتب النبی ﷺ الی ہرقل ص ۱۰۵)

ترجمه وضاحت:

اس حدیث پاک باب (عنوان) ہی یہ قائم کیا گیا کہ (باب اس بیان میں کہ نبی کریم ﷺ نے ہرقل بادشاہ شام کی طرف خط لکھا جس میں دعوت اسلام دی گئی۔

"هرقل بکسرالهاء وفتح الراء واسکان القاف هذاهوالمشهور ویقال هرقل بکسر الهاء واسکان الراء وکسر القاف"

"هرقل" کا صحیح اور مشہور تلفظ یہ ہے کہ ہاء کے نیچے زیر اور راء کے اوپر زبر اور قاف ساکن، اور اس کا تلفظ یہ بھی ہے، ہاء کے نیچے زیر اور راء ساکن اور قاف کے نیچے زیر۔

"ہرقل" اس بادشاہ کا نام تھا، اور "قیصر" اس کا لقب تھا، روم کے ہر بادشاہ کا لقب قیصر ہی تھا"

خیال رہے کہ اس وقت شام کا علاقہ بہت وسیع تھا، روم بھی اسی کے ضمن میں تھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مجھے حضرت ابوسفیان ﷺ نے خبر دی جیسا کہ ان کا منہ میرے منہ کی طرف تھا، یعنی میں نے ان سے براہ راست آمنے سامنے یہ سنا کہ وہ کہہ رہے کہ جس وقت ہمارے اور رسول اللہ

ﷺ کے درمیان صلح حدیبیہ کا معاہدہ تھا اس وقت میں شام کے علاقہ میں (تجارت کیلئے) گیا۔اس وقت وہاں ہرقل کے پاس رسول اللہ ﷺ کا خط پہنچا جو دِحیہ کلبی لے کر گئے تھے۔(دحیہ کی دال پر زبر اور زیر دونوں ہی آئی ہوئی ہیں) وہ خط حضرت دحیہ کلبی نے بصری کے امیر کو دیا تا کہ وہ ہرقل کو پہنچا دے، بصری کے امیر نے وہ خط ہرقل کو پہنچا دیا، بصری شام اور حجاز کے درمیان حوران کے علاقہ میں ایک شہر کا نام ہے، ہرقل نے پوچھا کیا کوئی شخص اس شخص کی قوم کا بھی یہاں ہے جو یہ گمان کرتا ہے کہ وہ نبی ہے۔

ابوسفیان نے کہا کہ میں ۔نے انہیں بتایا کہ ہاں میں اس شخص کی قوم کا ہوں۔ان لوگوں نے مجھے ہرقل کے سامنے بٹھا دیا،اور میرے دوسرے ساتھیوں کو میرے پیچھے بٹھا دیا۔پھر اس نے ایک ترجمان کو بلایا، ہرقل نے ترجمان کو کہا کہ تم اس کے ساتھیوں کو بتا دو کہ میں اس (ابوسفیان) سے اس شخص کے متعلق کچھ سوالات کر رہا ہوں،اگر یہ میرے سامنے جھوٹ بولے تو بتانا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ابوسفیان کے ساتھیوں کو اس کے پیچھے بٹھانے کی وجہ بھی یہ تھی کہ اگر ابوسفیان جھوٹ بولے تو یہ لوگ اس کی آسانی سے تکذیب کر سکیں کیونکہ سامنے کسی تکذیب کرنے میں لوگ شرم محسوس کرتے ہیں،ابوسفیان کہتے اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ میرے ساتھی مجھے جھوٹا کہہ دیں گے تو میں جھوٹ سے کام لیتا بخاری شریف میں یہ الفاظ ہیں"لولا الحیاء من ان یأثروا علی کذبا لکذبت عنه"اگر مجھے یہ حیاء وشرم دامنگیر نہ ہوتی کہ میرے ساتھی مجھے جھوٹا کہنا اختیار کرلیں گے تو میں جھوٹ سے کام لیتا،ابوسفیان کا جھوٹ کی طرف منسوب ہونے سے ڈرنے کی وجہ یہ تھی۔

"ان الکذب قبیح فی الجاهلیة کما هو قبیح فی الاسلام" بیشک جھوٹ زمانہ جاہلیت میں بھی اسی طرح برا سمجھا جاتا تھا جیسا کہ اسلام میں جھوٹ بری چیز ہے۔پھر ہرقل نے ترجمان کو کہا اس سے پوچھو اس (مدعی نبوت) کا حسب کیسا ہے؟ابوسفیان کہتے ہیں میں نے اسے بتایا کہ وہ شخص تو بہت اچھے حسب (خاندانی شرف) والا ہے،یہاں حسب تقریباً نسب کے معنی میں لیا گیا ہے،لیکن راقم کے بریکٹ میں لائے گئے الفاظ حسب ونسب دونوں کو شامل ہیں۔

پھر اس نے سوال کیا،کیا اس شخص کے آباء واجداد میں سے کوئی بادشاہ تھا؟تو میں نے کہا"نہیں"

پھر اس نے سوال کیا کہ وہ شخص جو کہہ رہا ہے اس سے پہلے (یعنی اس کے دعوہ نبوت سے پہلے) کیا تم اس سے پہلے جھوٹا سمجھتے تھے،یعنی جھوٹا ہونے کی تہمت لگاتے تھے؟میں نے کہا"نہیں"

پھر اس نے سوال کیا اس شخص کی تابعداری کرنے والے کون سے لوگ ہیں۔قوم بڑے سردار

یا ضعیف (غریب) لوگ؟ میں نے کہا بلکہ غریب لوگ اس کے متبعین ہیں۔

پھر اس نے سوال کیا، کیا اس کی تابعداری کرنے والے زیادہ ہورہے ہیں یا کم ہورہے ہیں؟ میں نے کہا کم نہیں ہورہے، بلکہ زیادہ ہورہے ہیں۔

پھر اس نے سوال کیا، کیا اس شخص سے ناراض ہوکر کوئی اس کے دین میں آکر پھر مرتد ہوا ہے یا نہیں؟ میں کہا ایک بھی مرتد نہیں ہوا۔

پھر اس نے سوال کیا کیا تم نے اس شخص سے کبھی جنگ بھی کی ہے؟ میں نے کہا ہاں ہماری اس سے کئی جنگیں ہوئیں۔

پھر اس نے سوال کیا تمہارے درمیان جنگوں کے نتائج کیا رہے؟ میں نے کہا نتیجہ باری باری رہا، کبھی انہوں نے ہمیں شکست دی، کبھی ہم (بظاہر) غالب رہے۔

پھر اس نے سوال کیا، کیا وہ شخص عذر کرتا ہے؟ یعنی کیا جنگ نہ کرنے کا وعدہ کر کے پھر جاتا ہے؟ میں نے کہا، اس سے پہلے تو کوئی عذر اس نے نہیں کیا، البتہ اب ہم ایک معاہدہ (صلح حدیبیہ) کی مدت گذار رہے ہیں، ہمیں معلوم نہیں کہ اس میں وہ کیا کرے گا۔ (صلح حدیبیہ کے وعدہ کو توڑنے والے کفار ہی تھے، نبی کریم ﷺ نے وہ وعدہ نہیں توڑا) ابوسفیان کہتے ہیں قسم ہے اللہ تعالی کی میں اپنے کلام میں کوئی اور (جھوٹا) کلمہ نہ ملا سکا۔

پھر اس نے سوال کیا، کیا یہ قول (دعوی نبوت) اس سے پہلے بھی کسی (اس کے آباء واجداد) نے کیا ہے؟ میں نے کہا نہیں۔

پھر ہرقل بادشاہ نے ترجمان کو کہا، تم اس شخص کو بتاؤ کہ میں نے تم سے اس شخص کے حسب کے متعلق سوال کیا تو تم نے بتایا کہ وہ شخص اچھے حسب والا ہے۔ (ہاں یہ یقین کرلو کہ) رسول اپنی قوم میں اچھے حسب والے ہوتے ہیں۔ (حکمت اس کی یہ ہوتی ہے کہ اچھے حسب ونسب والے شخص کے کمالات وشرافت کو دیکھ کر لوگ جلدی ایمان قبول کرلیتے ہیں، اگر حسب ونسب اچھا نہ ہو تو لوگ طعنہ زنی کرتے ہیں، ایمان نہیں لاتے)

پھر میں نے تم سے سوال کیا کہ اس کے آباء میں سے کوئی شخص بادشاہ تھا تو تم نے جواب دیا کہ نہیں کوئی اس کے آباء سے بادشاہ نہیں تھا، تو اس کے بارے میں یہی کہتا ہوں کہ اگر اس کے آباء سے بادشاہ ہوتا تو میں یہ کہتا کہ ہاں یہ شخص اپنے آباء کی سلطنت کو (دعوی نبوت کی چال سے) حاصل کرنا چاہتا ہے۔

پھر میں تم نے سے سوال کیا کہ اس کے متبعین قوم کے بڑے بڑے سردار اور جابر لوگ ہیں یا غریب، تو تم

نے جواب دیا کہ غریب لوگ اس کی تابعداری کرنے والے ہیں (تو رسولوں کی تابعداری کرنے والے غریب لوگ ہی ہوتے ہیں کیونکہ وہ کسی کو اپنے آپ سے بڑا سمجھنے میں عار نہیں سمجھتے، لیکن بڑے سردار لوگ کسی کو اپنے سے بڑا نہیں سمجھتے کیونکہ وہ اس میں عار سمجھتے ہیں)

پھر میں نے تم سے سوال کیا کہ اس مدعی نبوت کو اس کے دعوی نبوت سے پہلے تم جھوٹا سمجھتے تھے یا نہیں، تو تم نے کہا کہ ہم اسے جھوٹا نہیں سمجھتے تھے، تو میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص لوگوں پر جھوٹ کو نہ چھوڑے وہ اللہ تعالی پر بھی جھوٹ کو نہیں چھوڑتا (جب وہ شخص لوگوں سے کوئی جھوٹی بات نہیں کرتا تو یقیناً وہ اللہ تعالی پر بھی کوئی جھوٹ نہیں بول رہا، وہ سچا ہی سچا ہے)

پھر میں نے تم سے سؤال کیا کہ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ کوئی شخص (ناراض ہو کر اس کے دین سے مرتد ہو گیا ہو اس کے دین میں داخل ہونے کے بعد، تو تم نے کہا نہیں (تو اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ سچا ہے کیونکہ صدق اور حق سے لوگ پھرا نہیں کرتے بلکہ ان کو اس پر بصیرت حاصل ہوتی ہے، لیکن جھوٹے اور باطل شخص کو لوگ چھوڑ دیتے ہیں) وجہ اصل میں یہ ہے کہ ایمان حاصل ہونے کے بعد دلوں کو خوشی حاصل ہوتی ہے، اور سینہ میں انشراح پایا جاتا ہے اور انسان کو لطافت حاصل ہو جاتی ہے۔

پھر میں نے تم سے سؤال کیا کہ اس کے متبعین کم ہو رہے یا زیادہ تو تم نے کہا وہ زیادہ ہو رہے ہیں، تو اس کے متعلق بھی سمجھتا ہو کہ تابعداری کرنے والے زیادہ ہوں تب ہی ایمان کی تکمیل ہوتی ہے، پھر میں نے تم سے سوال کیا کہ اس شخص اور تمہارے درمیان جنگ ہوئی ہے یا نہیں؟ تم نے کہا جنگیں ہوئی ہیں، ان کے نتائج باری باری رہے، کبھی وہ غالب رہے اور کبھی ہم اپنے آپ کو غالب سمجھتے رہے، کہ ان کو کبھی تم سے تکلیف پہنچی اور کبھی تمہیں ان سے تکلیف پہنچی۔

ہاں رسولوں کو اسی طرح آزمائش میں مبتلاء کیا جاتا ہے لیکن آخر کار کامل کامیابی رسولوں کو ہی حاصل ہوتی ہے، (رسولوں کو آزمانے کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ صبر کریں، تاکہ ان کو اجر وثواب عطاء کیا جائے) اور میں نے تم سے سؤال کیا کہ وہ شخص کیا عذر کرتا ہے یا نہیں، تم نے کہا نہیں (وہ عذر نہیں کرتا)

اسی طرح رسول وہ ہی ہوتے ہیں جو جنگ نہ کرنے کا معادہ کر کے اسے توڑتے نہیں، دھوکہ بازی نہیں کرتے، پھر میں نے تم سے سؤال کیا کہ اس شخص سے پہلے بھی کسی نے (اس کے آباء سے) دعوی نبوت کیا ہے؟ تم

نے کہا نہیں، اگر اس سے پہلے کسی نے دعویٰ نبوت کیا ہوتا تو میں کہتا یہ ان لوگوں کی اقتداء کر رہا ہے۔

پھر اس نے کہا وہ تمہیں کس چیز کا حکم دیتا ہے؟ ابو سفیان کہتے ہیں میں کہا وہ ہمیں نماز کا اور زکوۃ کا اور صلہ رحمی کا اور پاک دامنی کا حکم دیتا ہے، ہرقل بادشاہ نے کہا اگر یہ باتیں ہیں تو وہ شخص یقیناً نبی ہے۔ مجھے یہ پہلے ہی معلوم تھا کہ آخر الزمان نبی نے آنا ہی ہے لیکن مجھے یہ گمان نہیں تھا کہ وہ نبی تم میں سے ہوگا، اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو میں اس کیلئے بڑا خلوص دل میں رکھتا اور اس سے ملاقات کرنا پسند کرتا، اگر میں اس کے پاس ہوتا تو میں اس کے قدموں کو دھوتا، اور اپنی بادشاہی اس پر نثار کر دیتا، پھر اس بادشاہ نے نبی کریم ﷺ کا خط طلب کیا، اس میں یہ مضمون درج تھا:

"بسم اللہ الرحمن الرحیم" سے وہ خط شروع کیا گیا تھا کہ:

یہ خط محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہرقل بادشاہ روم کی طرف!

سلام ہو! اس پر جس نے ہدایت کی تابعداری کی، اس مضمون مذکور کے بعد بیشک میں تمہیں دعوت اسلام دیتا ہوں، اسلام لے آؤ سلامتی میں رہو گے، اور اسلام لے آؤ تو اللہ تعالیٰ تمہیں دو مرتبہ اجر عطاء فرمائے گا۔ اور اگر تم پھر گئے تو بیشک تم پر تمہاری رعایا کے لوگوں کا گناہ بھی ہوگا۔

پھر اس خط میں یہ آیۃ کریمہ لکھی گئی۔

﴿قُلْ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَنْ لَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْھَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ○﴾

جب وہ خط پڑھنے سے فارغ ہوا تو اس کے پاس آواز بلند ہوئی، شور و غل زیادہ ہوا، ابو سفیان کہتے ہیں ہمیں وہاں سے نکل جانے کا حکم دیا گیا۔ جب ہم وہاں سے نکلے تو میں نے دوستوں کو کہا ابن ابی کبشہ کا تو کام بن گیا، ابن ابی کبشہ سے مراد نبی کریم ﷺ لئے گئے ہیں، ابو کبشہ آپ کی والدہ مکرمہ کے اجداد میں سے تھا، بیشک اس سے تو رومیوں کا بادشاہ بھی ڈرنے لگ گیا۔

حدیث شریف میں "بنی اصفر" سے مراد رومی لوگ ہیں کیونکہ ان کی اولاد میں حبشہ کی سیاہی اور رومیوں کی سفیدی موجود تھی جس کی وجہ سے ان کا رنگ زرد تھا۔ ابو سفیان کہتے ہیں میں نے اس وقت سے یقین کر لیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا معاملہ بڑھے گا، آپ غالب ہو جائیں گے، آپ چھا جائیں گی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اسلام میں داخل کر دیا۔ (ترجمہ اور مختصر وضاحت از نووی)

مزید وضاحت ابھی انشاء اللہ آ رہی ہے۔

خط پڑھنے کے بعد آوازوں کے بلند ہونے کی وجہ:

ارباب سیر بیان کرتے ہیں کہ ہرقل حضرت دحیہ کلبی کو علیحدگی میں لے گیا، اور اس نے کہا خدا کی قسم میں جانتا ہوں وہ سچے رسول ہیں، اور یہ وہی ہیں جن کی ہم انتظار کر رہے تھے، اور ہم نے ان کی صفات آسمانی کتاب میں پڑھی ہیں۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے ان کی تابعداری کی تو رومی مجھے ہلاک کر دیں گے۔ اس کے بعد ہرقل نے اپنے دارالخلافہ (صدر ہاؤس) میں بڑے بڑے رومیوں کو بلایا درمیان میں ایک محل میں جمع کیا جس کے اردگرد کمرے تھے، وہ سب بند کر دئے، اس کے بعد محل کے ایک دریچہ سے سرکردہ رومیوں کو خطاب کیا، اے روم کے لوگو اگر تم اپنی بھلائی، اپنی نجات اور راہ راست کی خواہش رکھتے ہو اور چاہتے ہو کہ تمہارا ملک برقرار رہے تو اس نبی کی تابعداری کرو جو مبعوث ہوا ہے، جس نے ہمیں بھی دعوت ایمان دی ہے۔

ہرقل کی یہ بات سن کر قوم بگڑ گئی، ادھر ادھر بھاگنے لگے، گدھے کی طرح دولتیاں مارنے لگے، چاہتے تھے محل سے باہر نکل جائیں، لیکن محل کے تمام دروازے بند تھے، وہ وہاں سے نکل نہیں سکتے تھے۔

ہرقل نے جب دیکھا کہ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں اور نہ ہی میرے ایمان لانے پر مجھے زندہ رہنے دیں گے تو اس نے سب کو پھر آواز دی، اے روم کے لوگو تم مجھ سے نفرت کیوں کر رہے ہو تمہیں معلوم نہیں کہ میں تو صرف تمہیں آزمانا چاہتا تھا کہ تم دین پر کتنے پختہ طریقہ سے قائم ہو، اب مجھے پتہ چل گیا کہ تم اپنے دین پر پختہ طریقہ سے قائم ہو، لھذا اسی دین پر تم قائم رہو، یہ سن کر وہ سب راضی ہو گئے اور ہرقل کو سجدہ کیا، تو محل کے دروازے کھول دیئے گئے وہ واپس چلے گئے۔ (ماخوذ از مدارج النبوت ج ۲)

ہرقل بدقسمت انسان نکلا:

"انہ قد عرف صدق النبی ﷺ وانما شح فی الملک ورغب فی السیاسۃ فآثرھا علی الاسلام وقد جاء ذلک مصرحا فی صحیح البخاری" "ولو اراد اللہ لوفقہ کما وفق النجاشی" (نووی بر مسلم ج ۲ ص ۱۰۶)

ہرقل نے نبی کریم ﷺ کی حقانیت کو پہچانا، بلکہ اظہار محبت کیا، لیکن وہ اپنی بادشاہی میں حریص نکلا، اور اس نے سیاست میں رغبت کی، اور سیاست کو اسلام پر ترجیح دی، بخاری شریف میں صراحۃ آتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اسے (ہرقل) کو اسی طرح توفیق دے دیتا کہ یہ ایمان قبول کر لیتا جیسا کہ نجاشی کو ایمان کی توفیق دی گئی۔

حدیث پاک سے حاصل ہونے والے فوائد:

(۱) کفار کو جنگ سے پہلے دعوت اسلام دی جائے، اگر ان کو پہلے اسلام کی دعوت نہیں ملی تو ان کو دعوت اسلام دینا واجب ہے، اور اگر ان کو اس سے پہلے دعوت اسلام مل چکی ہے تو پھر دوبارہ دعوت اسلام دینا مستحب ہے۔

(۲) قاصد جب کوئی خبر لے جائے خصوصاً وہ خط جو سربمہر ہوں یعنی مہر لگا کر بند کر دیئے گئے ہوں ان پر ان لوگوں کو اعتبار کر لینا چاہئے جن کی طرف وہ خطوط لکھے گئے ہیں۔

(۳) خط کو "بسم اللہ الرحمن الرحیم" سے شروع کیا جائے اگرچہ کافر کی طرف بھی بھیجا جائے، یہ امر مستحب ہے، راقم کے نزدیک اس میں تبلیغ دین بھی ہے کہ ہم اللہ کے نام سے ابتداء کرتے ہیں جبکہ تم اپنے بتوں کے اسماء سے ابتداء کرتے ہو۔

(۴) نبی کریم ﷺ کا خط مبارک "وهذا الكتاب كان ذا بال بل من المهمات العظام وبدأفيه بالبسملة" ذی شان تھا، بلکہ عظیم اہمیت والا تھا کیونکہ اس میں دعوت اسلام کا تذکرہ تھا، اسی لئے اسے "بسم الله" شریف سے شروع کیا گیا تھا، اسلئے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "كل امر ذی بال لايبدأفيه ببسم الله الرحمن الرحيم فهوابتر" ہر ذی شان کام جو "بسم الله" کے بغیر شروع کیا جائے وہ بے برکت ہوتا ہے۔

اگرچہ بظاہر اس پر وہم ہوتا ہے کہ ایک حدیث میں "كل امر ذی بال لا يبدأ فيه بالحمد لله فهو اقطع" بھی آتا ہے تو حضور ﷺ اپنے خط مبارک میں "الحمد لله" کو ابتداء میں نہیں لکھا، اس کی کیا وجہ ہے؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ "بسم الله" یا "الحمدلله" سے مراد "اللہ کا ذکر ہے" یعنی اگر ذی شان کام اللہ کے ذکر کے بغیر شروع کیا جائے تو وہ بے برکت ہوتا ہے۔ علامہ نووی فرماتے ہیں:

"المراد بالحمد لله ذكر الله وقد جاء فی رواية بذكر الله"

"الحمد لله" والی حدیث سے مراد "اللہ کا ذکر ہے" کیونکہ ایک روایت میں "بذكر الله" بھی آیا ہوا ہے۔ لھذا "بسم الله" سے ابتداء کافی ہے، بیشک "الحمدلله" ابتداء میں نہ ذکر کیا جائے۔

مرقاۃ میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

"ثم انه وردالحديث بلفظ كل كلام ذی بال لايبدأ فيه بالحمدلله فهواجذم رواه ابوداؤد والنسائی فی

عمل الیوم واللیة وبلفظ کل امر ذی بال لا یبدأ فیه بالحمدلله فهو اقطع رواه ابن ماجة والتوفیق بینهما ان المراد منهما الابتداء بذکر الله سواء یکون فی ضمن البسملة او الحمدلة بدلیل انه جاء فی حدیث رواه الرهاوی فی اربعینه وحسنه ابن الصلاح ولفظه کل امر ذی بال لا یبدأ فیه بذکر الله فهو اقطع"

حضرت علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ اس مشکل کا حل پیش فرمار ہے ہیں کہ ایک حدیث میں یہ ذکر ہے، ہر ذی شان کام جو بسم الله الرحمن الرحیم سے نہ شروع کیا جائے تو وہ بے برکت ہوتا ہے۔

اور دوسری حدیث میں "کل امر ذی بال لا یبدأ فیه بالحمدلله فهو اقطع" ہر ذی شان کام جو الحمدللہ سے نہ شروع کیا جائے تو وہ بے برکت ہے۔

جب حدیثیں دو ہیں، دونوں میں ذی شان کام کی ابتداء کا ذکر ہے تو کس حدیث سے ابتداء کی جائے، تو اس کا ایک جواب آپ نے یہ ذکر فرمایا کہ دونوں حدیثوں سے مراد یہ ہے "کہ ہر ذی شان کام جو اللہ کے ذکر کے بغیر شروع کیا جائے وہ بے برکت ہوتا ہے۔

اس پر دلیل یہ ہے کہ اربعین رہاوی میں ایک حدیث میں صراحۃ "بذکر الله" موجود ہے، وہ حدیث یہ ہے "کل امر ذی بال لا یبدأ فیه بذکر الله فهو اقطع" ہر ذی شان کام جو اللہ کے ذکر سے نہ شروع کیا جائے وہ بے برکت ہوتا ہے۔

اس حدیث (حدیث اربعین رہاوی) کو ابن الصلاح رحمہ اللہ نے "حسن" قرار دیا ہے۔ یعنی یہ حدیث ضعیف بھی نہیں "والله اعلم بالصواب" (ماخوذ از مرقاۃ ج اول ص ۳)

(۵) حدیث پاک سے اور یہ فائدہ حاصل ہوا کہ قرآن پاک کی ایک یا دو آیتوں کو کفار کی طرف لے جانا جائز ہے جبکہ مقصد بھی عظیم ہو، یعنی کفار کو جب تبلیغ کرنی مقصود ہو تو ایک دو آیات کو کفار کی طرف لے جانے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے کفار کو جو خطوط لکھے ان میں "بسم الله الرحمن الرحیم" سے ابتداء کی گئی، اور تبلیغ یہی آیۃ کریمہ جس کی وضاحت جاری ہے "(یااهل الکتاب تعالوا......) تحریر فرمائی۔

ہاں البتہ مکمل قرآن پاک کا نسخہ یا زیادہ مقدار میں آیات کو کفار کے ملک میں لے جانا اس وقت منع ہے جبکہ یہ خطرہ ہو کہ قرآن پاک ان کے ہاتھوں میں آجائے گا تو وہ اس کی توہین کریں گے، جب یہ خطرہ نہ ہو تو قرآن پاک کا لے جانا بھی منع نہیں۔

(۶) خط کا عنوان اس طرح مستحب ہے کہ پہلے اپنا ذکر کرے پھر اس کا جس کو خط لکھا گیا، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے

تحریرفرمایا"من محمدرسو ل الله الی هرقل عظیم الروم" محمدرسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہرقل بادشاہ روم کی طرف۔

(۷) ایمان لانے پر دو اجر کا ذکر حدیث پاک میں فرمایا گیا تو اسی سے پتہ چلا کہ اہل کتاب ایمان لے آئیں تو ان کو ایک اجر اپنی کتاب پر ایمان لانے کا اور دوسرا اجر قرآن پاک پر ایمان لانے کا حاصل ہوتا ہے۔

(۸) اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ جب کسی کو دعوت ایمان دی جائے تو واضح الفاظ میں اس کی گمراہی کے اسباب اور ہدایت سے دوری کی وجوہ کو ذکر کیا جائے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے خط میں لکھا "وان تولیت فان علیک اثم الاریسیین" اگر تم پھر گئے (ایمان نہ لایا) تو تمہارے ذمہ تمہاری رعایا کا گناہ بھی ہوگا۔

بخاری شریف میں لفظ "یریسیین" استعمال ہے، معنی دونوں لفظوں کا ایک ہی ہے۔

"واصح الاقوال واشهرها انهم الاکارون ای الفلاحون والزراعون ومعناه ان علیک اثم رعایاک الذین یتبعونک"

"اریسین" ہو، یا "یریسین" ہو، اس کے معنی میں صحیح اور مشہور قول یہ ہے کہ اس کا معنی ہے کسان، کھیتی باڑی کرنے والے، مراد اس کی رعایا ہے، یعنی بادشاہ کی روش (طریقہ) پر اس کی رعیت چلتی ہے، اس لئے اگر تم نے اسلام قبول نہ کیا تو تمہاری وجہ سے تمہاری رعیت نے بھی اسلام قبول نہ کیا تو تمہیں رعیت کا بھی گناہ حاصل ہوگا۔

(۹) اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ کافروں کو ابتدائی طور پر سلام نہ کیا جائے، اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے کفار کو خطوط میں "السلام علیکم" نہیں لکھا، بلکہ ﴿سَلَامٌ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی﴾ سلام ہو اس پر جس نے ہدایت کی تابعداری کی۔ (ماخوذ از نووی)

فائدہ عظیمہ:

"**قیصر**" لقب تھا روم کے بادشاہوں کا۔ "**کسری**" لقب تھا فارس کے بادشاہوں کا۔

"**نجاشی**" لقب تھا حبشہ کے بادشاہوں کا۔ "**خاقان**" لقب تھا ترک کے بادشاہوں کا۔

"**فرعون**" لقب تھا قبطی بادشاہوں کا۔ "**عزیز**" لقب تھا مصر کے بادشاہوں کا۔

"**تبع**" لقب تھا حمیر کے بادشاہوں کا۔ (ماخوذ از نووی)

تاہم یہ بھی خیال رہے کہ بعض حضرات نے مطلق مصر کے بادشاہوں کا لقب "فرعون" بیان کیا

ہے۔اور ''عزیز''مصر میں بادشاہ کے نائب (وزیر اعظم) کا لقب بیان کیا ہے۔ (راقم)

تنبیہ: ''ولیبلغن ملکه ما تحت قدمی'' راقم نے ان الفاظ کا ترجمہ کیا ہے ''اور اپنی بادشاہی اس پر نثار کر دیتا'' یہ ترجمہ سیاق وسباق کو دیکھ کر با محاورہ طور پر کیا گیا ہے، ورنہ حقیقت میں معنی یہ ہے کہ ضرور بضرور پہنچ جائے گی اس کی بادشاہی اس مقام تک جو میرے قدموں کے نیچے ہے۔ (راقم)

مکتوب گرامی بنام کسریٰ پرویز:

''بسم الله الرحمن الرحیم''

محمد رسول (ﷺ) کی جانب سے بنام کسریٰ شاہ فارس، سلام ہو! اس پر جو راہ راست کی پیروی کرے اور خدا پر ایمان رکھے اور گواہی دے کہ خدا ایک اور محمد اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں، میں تم کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں، بلاشبہ میں خدا کا رسول ہوں تمام لوگوں کی طرف، تاکہ میں خوف دلاؤں اور ڈراؤں، میں نے کفار پر حجت قائم کر دی، مسلمان ہو جاؤ گے تو سلامت رہو گے اور اگر انکار اور سرکشی کرو گے تو مجوسیوں کا وبال تم پر ہوگا۔

نبی کریم ﷺ کا یہ خط حضرت عبداللہ بن حذافہ لے کر گئے تو اس نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ کی، وہ تو خدا بنا بیٹھا تھا، نبی کریم ﷺ کے خط کو دیکھ کر کہنے لگا محمد میری طرف خط لکھتا ہے حالانکہ وہ میرا بندہ ہے۔

''وہ کتنا جاہل تھا اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ اللہ کے بندہ ہیں'' پھر اس نے نبی کریم ﷺ کے نام کو اپنے نام سے پہلے دیکھا تو اور غصہ میں آ گیا کہ اس شخص نے اپنا نام میرے نام کے اوپر کیوں لکھا ہے۔اس جاہل کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ خط کا مضمون ہی اس وقت اسی انداز کا ہوتا تھا کہ لکھنے والا پہلے اپنا نام لکھتا تھا، پھر اس جاہل کو یہ بھی پتہ نہ چل سکا کہ یہ تو وہ ذات ہے جن کا نام اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ عرش پر لکھا ہوا ہے'' اس نے خط کا جواب نہ دیا، بلکہ خط کو پھاڑ کر ٹکرے ٹکرے کر دیا۔

جب یہ خبر نبی کریم ﷺ کو پہنچی تو آپ نے فرمایا''مزق کتابی مزق الله ملکه'' اس نے میرے خط کو پھاڑ کر ٹکرے ٹکرے کر دیا ہے ''اللہ تعالیٰ اس کے بادشاہی کے ٹکرے ٹکرے کر دے گا'' اس کے بعد کسریٰ (فارس کے بادشاہ) پرویز نے یمن کے حاکم باذان کو لکھا کہ دو آدمی بڑے اعتماد والے اس شخص کے پاس بھیجوا سے باندھ کر میرے پاس لے آئیں (معاذ اللہ)

اس نے دو شخص بڑے سرکردہ منتخب کیے، انہوں نے داڑھیاں منڈا رکھی تھیں، مونچھیں بڑھائی ہوئی تھیں، مونچھوں کو بل (طاؤ) دے کر رکھتے تھے، وہ پوچھتے پوچھتے طائف میں پہنچ گئے، وہاں ان کو ابوسفیان وغیرہ ملے، انہوں نے بتایا کہ وہ مدینہ میں ہوتے ہیں، کفار دل میں خوش ہوئے کہ فارس کا بادشاہ آپ کا مخالف ہو گیا ہے، اب کام بن جائے گا وہ یہ نہ جانتے تھے کہ جس کے ساتھ رب تعالی ہو اسے کسی مخالف اور موافق کی کیا پرواہ، والی یمن کے دونوں قاصد بحکم پرویز کسری نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچ گئے، انہوں نے نبی کریم ﷺ کو کہا کہ ہم فارس کے بادشاہ کسری کی طرف سے تمہارے پاس آئے ہیں اس نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم تمہیں باندھ کر اپنے ساتھ لے چلیں، اور بادشاہ تک پہنچا دیں، لھذا تم ہمارے ساتھ چلو، ورنہ ہمارا بادشاہ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو تباہ و برباد کر دے گا۔

رسول اللہ ﷺ نے بغیر کسی غصہ کے ان کی باتوں کو تحمل مزاجی سے سنا، اور ان کو ایمان کی دعوت دی، راہ حق بیان فرمائی، اللہ تعالی کی وحدانیت اور اپنی رسالت کو بیان فرمایا، وہ ایمان نہ لائے، اور یہی کہتے رہے تم ہمارے ساتھ چلو ہم تمہیں اپنے بادشاہ کے دربار میں پہنچانا چاہتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا آج ٹھہرو، کل تمہیں جواب دیں گے، وہ جب آپ کی مجلس سے نکلے تو کانپ رہے تھے، قدرتی طور پر ان پر شان نبوت کی عظمت کا رعب چھا گیا تھا، وہ ایک دوسرے کو کہہ رہے تھے کہ اگر ہم تھوڑی دیر وہاں اور ٹھہرتے تو ہم ہلاک ہو جاتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کو اللہ تعالی کی تائید حاصل ہے، اور اس کا کام خدا کا کام ہے، صبح جب وہ دونوں قاصد نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان دونوں کو بتایا جاؤ اپنے صاحب، یعنی باذان کو خبر دو کہ تمہارے شہنشاہ کا بوجھ اتار دیا ہے، یعنی خسرو (کسری کو عربی میں خسرو کہا جاتا تھا) کو قتل کر دیا گیا ہے۔

سبحان اللہ! میرے پیارے مصطفی کریم ﷺ کو کیا خوب اللہ تعالی نے علوم غیبیہ عطاء فرمائے، مدینہ طیبہ میں کوئی بھی نہیں جانتا، اور نہ ہی شاہ فارس کے قاصد جانتے ہیں کہ ہمارے بادشاہ سے کیا معاملہ ہو چکا ہے۔ یہ واقعہ دس جمادی الاخری ۷ھ کا ہے۔

پھر آپ نے ان قاصدوں کو کہا کہ باذان کو جا کر بتا دو بہت جلدی میرا دین کسری کی مملکت پر غالب آ جائے گا، اگر تم مسلمان ہو جاؤ گے تو تمہارا علاقہ تمہارے زیر تصرف رہے گا، اگر تم نے اسلام قبول نہ کیا تو تمہیں معزول کر دیا جائے گا۔ جب وہ دونوں قاصد یمن میں پہنچے تو نبی کریم ﷺ کا پیغام باذان والئی یمن کو پہنچا دیا، اور آپ کی مجلس میں جن چیزوں کا مشاہدہ کیا تھا وہ سب اس کو بتا دیا۔

اس نے پوچھا کہ ان کے پہریدار اور محافظ ہیں، انہوں نے بتایا نہیں، ان کے محافظ تو نہیں وہ تو بلا خطر گھومتے پھرتے ہیں۔ باذان نے کہا جو اوصاف تم نے بتائے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نبی ہیں، بادشاہ نہیں کیونکہ یہ اوصاف بادشاہوں کو حاصل نہیں ہوتے۔ ان کی نبوت میں مجھے کوئی شک نظر نہیں آتا، اسلئے میں یہی چاہتا ہوں کہ مجھ سے پہلے کوئی اور بادشاہ ایمان نہ لے آئے۔ اسی دوران اس کے بعد شیرویہ کا خط پہنچ گیا کہ کسریٰ لوگوں پر ظلم کرتا تھا اور مملکت کی جماعت عظیمہ میں تفرقہ ڈالتا تھا، اس لئے میں نے اسے قتل کر دیا، لوگ اس کے شر سے محفوظ ہو گئے ہیں، لھذا تمہیں چاہئے کہ تم خود بھی میری تابعداری کرو، اور لوگوں کو بھی میری تابعداری کا حکم دو، خبردار اس شخص کے درپے نہ ہونا جس نے دعویٰ نبوت کیا ہوا کہ میں عرب وعجم کا نبی ہوں، ہاں میرا خط ان کے متعلق تمہیں ملے تو اس پر عمل کرنا، اس سے پہلے ان کے حق میں خاموشی اختیار کرنا، ان کی مخالفت نہ کرنا۔ باذان پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ مجھے وہ شخص نبی سمجھ آتے ہیں، مجھے ان کی نبوت میں کوئی شک نہیں، ادھر شیرویہ کا خط بھی مل گیا تو وہ بغیر کسی توقف اور تاخیر کے مسلمان ہو گیا، اور اس کے کئی ساتھیوں نے بھی ایمان قبول کر لیا۔ (ماخوذ از مدارج النبوت بالاختصار)

مکتوب گرامی حبشہ کے شاہ نجاشی کی طرف:

نجاشی کا نام اصمحہ بن الحر ہے، ان کی طرف عمرابن امیہ ضمری کو قاصد بنا کر بھیجا گیا تھا، یہ حضور ﷺ کے سعادتمندوں سے تھے، جب حضور ﷺ کا خط مبارک ان کو پہنچا تو تخت سے اتر کر انہوں نے بڑے ادب واحترام سے وہ خط وصول کیا، اور اس خط کو چوما اور آنکھوں سے لگایا۔

اس خط کا مضمون یہ تھا، محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے نجاشی شاہ حبشہ کی طرف، تمہاری طرف اس خدا کی حمد وثنا بھیجتا ہوں جو مالک برحق ہے، اور مالک مطلق ہے، اور وہ ہر عیب اور نقص سے پاک ہے، وہ آفات اور عیوب سے محفوظ ہے، اور وہی آیات ومعجزات کے ذریعے اپنے نبیوں کی تصدیق فرماتا ہے، اور وہی اپنے بندوں کو قیامت کی ہولناکیوں سے محفوظ رکھنے والا ہے، وہی ان کو بلند درجات عطاء کرنے والا ہے، وہ ہر چیز پر غالب ہے، اور وہی جبار اور متکبر وعلیم ہے۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ عیسیٰ روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں، جن کو حضرت مریم بتول پاکدامن نے جنا، اور عیسیٰ علیہ السلام کا ماں ہونے کا شرف انہیں حاصل ہوا، عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف سے روح پھونک کر پیدا فرمایا، جسطرح آدم علیہ السلام کو اپنے دست قدرت سے بنا کر ان میں روح کو پھونکا، اما بعد بلا شبہ میں تمہیں دین اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اس سے

پہلے میں نے اپنے چچا کے بیٹے جعفر بن ابی طالب اوران کے ساتھ چند اور مسلمانوں کو بھیجا ہے ان کے ساتھ حسن سلوک سے در پیش آنا۔تمہارے لائق یہی ہے کہ میری نصیحت سننا اور اسے قبول کرنا،تکبر اختیار نہ کرنا،اطاعت وفرنبرداری کرنا﴿وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی﴾اس پر سلام ہو جس نے ہدایت کی تابعداری کی۔

نجاشی نے خط پڑھتے ہوئے کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت زبان پر جاری کیا،اسلام قبول کرلیا اور کہا کہ اگر مجھ میں طاقت ہوتی تو خود چل کر نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوتا،اور آپ کے پاس حاضر ہوکر سعادت حاصل کرتا،(لیکن یہ بادشاہی امور میں مشغول ہونے کی وجہ سے آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکے،صحابی نہ بن سکے،تابعی رہے)نجاشی نے نبی کریم ﷺ کے خط کا جواب اس مضمون کا لکھا:

"بسم الله الرحمن الرحيم"

"نجاشی شاہ حبشہ کی طرف سے محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف"

اے نبی آپ پر سلام ورحمت ہو اور رب تعالیٰ کی برکتیں نازل ہوں،عیسیٰ علیہ السلام جو آپ نے فرمایا وہی حق ہے اس میں ذرا بھر بھی کوئی کمی زیادتی نہیں۔میں نے آپ کے چچا کے بیٹے اور آپ کے صحابہ کی عزت کی،اور آپ کے چچا کے بیٹے کے ذریعہ آپ کی بیعت کررہا ہوں،اگر حکم ہو تو آپ کے پاس حاضر ہو جاؤں،وہیں آکر رہوں؟لیکن آپ نے ان کو حبشہ میں رہنے کے متعلق ارشاد فرمایا۔

(ماخوذ از مدارج النبوت ج ۲)

گذشتہ سے پیوستہ:

جب آیۂ کریمہ نازل ہوئی﴿وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ تو عدی بن حاتم(جو اس وقت اسلام لاچکے تھے)نے"ما كنا نعبدهم يا رسول الله"ہم تو ان کی(یعنی اپنے علماء اور راہبوں کی)عبادت نہیں کرتے تھے،(تو ان کو رب کیوں کہا گیا)

قال اليس كانوا يحلون لكم ويحرمون فتاخذون بقولهم قال نعم قال هو ذاك" (رواہ الترمذی وحسنہ)

تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا وہ تمہارے لئے حلال اور حرام نہیں کرتے تھے اور تم ان کے قول پر ہی عمل نہیں کرتے تھے؟انہوں نے کہاں یہ تو تھا،آپ نے فرمایا رب ماننے کا یہی مطلب ہے۔

یعنی تمہارا عقیدہ جو یہ تھا کہ ہمارے علماء اور راہب جس چیز کو حلال کہہ دیں وہ حلال ہو جاتی ہے،اور جس چیز کو حرام کہہ دیں وہ حرام ہو جاتی ہے،یہ دراصل ان کو رب ماننے کے مترادف تھا،اسی سے رب تعالیٰ نے منع فرمایا کہ کوئی بعض تمہارا بعض کو رب نہ مانے۔

فائدہ جلیلہ: "فما کان من اطاعة الرسول فهو اطاعة الله لا غیر" رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہے، وہ کسی غیر کی اطاعت نہیں، اس لئے کہ رب تعالیٰ کا اپنا ارشاد گرامی ہے "ومن یطع الرسل فقد اطاع الله" جو شخص رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرتا ہے تحقیق وہ اللہ کا مطیع ہے۔علماء ومشائخ وسلاطین کی اطاعت میں دو رخ ہیں پہلا رخ یہ ہے:

"وکذا ماکان من اطاعة العلماء والاولیاء والسلاطین والحکام علی مقتضی الشرع"
علماء کرام اور اولیاء کرام اور بادشاہوں اور حکام کی اطاعت جب کہ شریعت کے مطابق ہو،تو وہ بھی حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی ہی اطاعت ہے۔

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرو، اور تم اپنے میں سے "اولی الامر" امور کے والیوں کی اطاعت کرو، "اولی الامر" کا اطلاق علماء کرام، مشائخ کرام اور بادشاہوں اور حکام تمام کو شامل ہے، لیکن ان تمام کی اطاعت کی شرط یہی ہے کہ وہ شریعت کے تقاضا کے مطابق حکم دیں تو ان کی اطاعت ضرور ہی کی جائے۔

دوسرا رخ یہ ہے:

"وما کان علی خلاف مقتضی الشرع فهو الاتخاذ بعضنا بعضا اربابا من دون الله" اگر کوئی عالم یا شیخ خلاف شرع کام کا حکم دے تو پھر اس کی بات کو ماننا اسے رب ماننے کے مترادف ہے، گویا کہ اسے اس نے رب مان لیا ہے۔حالانکہ رب تعالیٰ بندوں کو رب بنانے سے منع فرمایا ہے۔یہی حکم بادشاہوں اور حکام کا ہے کہ اگر یہ لوگ شریعت کے خلاف حکم دیں، اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کر کے لوگوں کو عیاشی اور فحاشی کی طرف مائل کریں تو گویا کہ وہ اپنے آپ کو رب بنا رہے ہیں، ان کے احکام کو ماننے والے نے ان کو رب مان لیا ہے، جبکہ رب تعالیٰ نے کو رب ماننے سے منع فرمایا ہے، اس طرح رب تعالیٰ کی نافرمانی کی جا رہی ہے۔

❀ عن علی رضی اللہ عنہ لا طاعة لا حد فی معصیة الله انما الطاعة فی المعروف" (رواہ البخاری ومسلم)
حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اللہ کی نافرمانی کر کے کسی شخص کی طاعت نہ کی جائے۔ہاں اچھے کاموں میں، یعنی شریعت کے مطابق کاموں کا کوئی حکم دے تو ان کاموں میں اس کی فرمانبرداری کی جائے۔

❀ وعن عمر ان بن حصین والحکیم بن عمرو الغفاری لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق"
عمران بن حصین اور حکیم بن عمرو غفاری فرماتے ہیں خالق کی نافرمانی کر کے مخلوق کی فرمانبرداری کرنا جائز نہیں۔

تفسیر مظہری سے غیر مقلدین کا استدلال درحقیقت اپنی جہالت کا ثبوت:

مظہری میں یوں ذکر ہے:

"ومن ههنا يظهر انه اذااصح عنه احد حديث مرفوع من النبی سالما عن المعارضة ولم يظهر ناسخ وكان فتوى ابی حنيفة رحمه الله مثلا خلافه وقد ذهب علی وفق الحديث احد من الائمة الاربعة يجب عليه اتباع الحديث الثابت ولا يمنعه الجمود علی مذهبه من ذلک كيلا يلزم اتخاذ بعضنا بعضا اربابا من دون الله"

یہاں سے ہی یہ بات ظاہر ہوگئی کہ جب کوئی ایک مرفوع حدیث پیش کرے جو نبی کریم ﷺ سے ثابت ہو اور وہ حدیث معارضہ سے بھی سلامتی میں ہو، اور اس حدیث کا منسوخ ہونا بھی ثابت نہ ہو، اور مثال کے طور پر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا فتوی اس کے خلاف ہو اور دوسرے ائمہ کرام میں سے کسی کا قول حدیث پاک کے موافق ہو تو انسان پر واجب ہوگا کہ وہ حدیث پاک جو ثابت ہے اس کی اتباع کرے، اس کو اپنے مذہب پر جمود منع نہ کرے تا کہ یہ لازم نہ آئے کہ ہم میں سے بعض بعض کو سوائے اللہ تعالی کے رب مان رہا ہے۔

اس عبارت کو غیر مقلدین بیان کرتے ہیں اور سر دھنتے ہیں، اور خوشی سے اتراتے ہیں، کہ قاضی ثناء اللہ حنفی مجددی نقشبندی نے تفسیر مظہری میں بیان کر دیا کہ امام ابو حنیفہ کا فتوی جب حدیث پاک کے مخالف تو اسے رد کردو، ورنہ یہ لازم آئے گا کہ (معاذاللہ) تم امام ابوحنیفہ (رحمہ اللہ) کو رب مان رہے ہو۔

طلباء کرام! جاہلوں کی تقاریر سن کر جاہل نہ بن جانا، آیئے راقم سے مظہری کی عبارت کا مطلب سمجھئے، اس عبارت کو سمجھنے سے پہلے رب تعالی کے اس ارشاد گرامی کو مدنظر رکھئے ﴿قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِیْنَ﴾ تم فرماؤ بفرض محال رحمٰن کے کوئی بچہ ہوتا تو سب سے پہلے میں پوجتا۔ (کنزالایمان)

اعلی حضرت رحمہ اللہ نے کیا خوبصورت ترجمہ لکھا ہے جس میں شان الوہیت کا کیا خوب لحاظ کیا ہے "بفرض محال" کے الفاظ سے یہ بات سمجھادی کہ رب تعالی اولاد سے پاک ہے، اگر بفرض محال اس کا کوئی بچہ ہوتا (نبی کریم ﷺ سے کہلایا گیا) تو میں سب سے پہلے اس کی پوجا کرتا، جب اس کی کوئی اولاد ہی نہیں تو میں سوائے اس کے اور کس کی عبادت کروں؟

اصل میں ان کے تراجم میں "بفرض محال" کی کوئی قید نہیں، ہوسکتا ہے جہلاء اس آیۃ کریمہ کا مطلب یوں سمجھنے لگیں کہ (معاذاللہ) رب تعالی کی اولاد ہے اور نبی کریم ﷺ اس اولاد کی پوجا کرتے تھے، تو تمہاری عقل پر

جاہلو، کیا تمہاری نظر آنے والی آیۃ کریمہ پر نہیں۔

﴿سُبْحَانَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ﴾ (الزخرف آیۃ نمبر ۸۲)

پاکی ہے آسمانوں اور زمین کے رب کو عرش کے رب کو ان باتوں جو یہ بناتے ہیں۔

ان دونوں آیات سے واضح ہوگیا کہ رب تمہارے کی نہ اولاد ہے، اور نہ ہی نبی کریم ﷺ نے رب تعالی کوئی اولاد سمجھی اور نہ ہی اس کے سواء کسی کی عبادت کی۔ ہاں کافروں نے رب تعالی کی اولاد مانی، اور اسے معبود مانا۔

آیئے طلباء کرام! ان دونوں آیات کے سمجھنے کے بعد قاضی مظہری رحمہ اللہ کی عبارت کو سمجھئے قاضی مظہری فرماتے ہیں:

"وكان فتوى ابى حنيفه رحمه الله مثلا خلافه" امام حنیفہ رحمہ اللہ کا فتوی مثال کے طور پر حدیث کے خلاف ہو۔ "مثال کے طور پر" اور "بفرض محال" تقریبا ایک ہی معنی میں استعمال ہیں۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کوئی فتوی حدیث پاک کے خلاف نہیں دیا، ہاں کسی جاہل کو پتہ ہی نہ چلے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے جو فتوی دیا ہے وہ حدیث پاک کے مطابق ہے، تو نہ وہ حدیث کو مانے اور نہ ہی فتوی کو مانے تو اس کی ضد اور ہٹ دھرمی کا تو کوئی علاج نہیں، جو عبارت مظہری سے نقل کی گئی ہے، اس کے بعد متصل بیہقی کی روایت کو دیکھئے۔

روى البيهقى فى المدخل باسناد صحيح الى عبد الله بن المبارک قال سمعت ابا حنيفة يقول اذا جاء عن النبى ﷺ فعلى الراس والعين واذاجاء عن اصحاب النبى ﷺ نختار من قولهم واذاجاء من التابعين زاحمناهم"

بیہقی نے اسناد صحیح سے روایت ذکر کی کہ حضرت عبداللہ بن مبارک رضی اللہ عنہ نے ذکر فرمایا میں نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے فرماتے ہوئے سنا کہ جب ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ کا ارشاد یعنی مرفوع حدیث آجائے تو سر آنکھوں پر (ہم اسے بسروچشم قبول کریں گے) اور اگر ہمارے پاس صحابہ کرام کا ارشاد یعنی حدیث موقوف آجائے تو ہم اسے بھی ترجیح دیں گے اس کے خلاف اپنا کوئی قول نہیں پیش کریں گے، ہاں اگر تابعی کا قول ہمارے سامنے آئے یعنی حدیث مقطوع ہو تو ہم اس کی مزاحمت کریں گے۔

یعنی ہم بھی تابعی ہیں، وہ بھی تابعی ہیں، تابعی کے قول کے خلاف ہمیں اجتہاد کا حق حاصل ہے۔

❁ وذكر عن روضة العلماء قال اتركوا قولى بخبر رسول الله ﷺ وقول الصحابة"

روضۃ العلماء میں مذکور ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا اگر تمہیں میرا قول رسول اللہ ﷺ کے خلاف یا صحابہ

کرام کے اقوال کے خلاف نظر آئے تو اسے چھوڑ دو۔

بہت واضح اور خوبصورت انداز میں سمجھایا کہ میں نبی کریم ﷺ کے ارشاد کے خلاف کوئی قول نہیں کرتا اور نہ ہی صحابہ کرام کے اقوال کی مخالف کرتا ہوں۔"ونقل انه قال اذاصح الحديث فهو مذهبي" امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب صحیح حدیث کسی مسئلہ میں ثابت ہو تو وہی میرا مذہب ہے۔ یہ تمام بحث مختصر طور پر مظہری میں موجود ہے، اب عقل کا اندھا کوئی یہ کہتا پھرے کہ امام صاحب کا مذہب رائے پر مبنی ہے حدیث کے خلاف ہے تو وہ اپنی حماقت کا علاج کرائے۔

مظہری کی ایک اور بحث سے بیہودہ لوگوں کا اترانا:

لیکن افسوس یہ کہ وہ عبارات جن سے اپنی مرضی کے مطالب نکالے جاتے ہیں ان سے پہلے مقصودی بحثوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مکمل مسئلہ مظہری میں یوں بیان کیا گیا:

"لا يجوز لا حد ان يقول في امرافتي علماء الشرع على حرمته او كراهته ان مشائخ الصوفية سلواكذلك ونحن نتبع سنتهم والصحيح ان الصوفيه الكرام ما فعلوا قط على خلاف مقتضى الشرع وانماالفساد من جهال اتباعهم"

علماء شرع کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ حرمت یا کراہت پر فتوی دیں۔ مشائخ صوفیہ کا یہی طریقہ ہے، اس لئے ہم صوفیاء کرام کے طریقہ کی تابعداری کرتے ہیں۔ صحیح بات یہی ہے کہ صوفیاء کرام وہی ہیں جو شریعت کے خلاف کوئی کام نہیں کرتے، فساد ان کے جاہل متبعین کی طرف سے آتا ہے کہ وہ خلاف شرع کاموں کو مشائخ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں کہ ہمارے شیخ نے یہ کہا ہے۔

(اور کبھی بناوٹی پیر غلط غلط طریقے ایجاد کر کے مشائخ کی بدنامی کا بظاہر سبب بنتے ہیں، لیکن ان جہلاء سے دھوکے میں آنے والے بھی جاہل ہوتے ہیں، حقیقی معبود اور باطل معبودوں میں فرق کرنا ضروری ہے اور حقیقی نبی اور جھوٹے نبی میں فرق کرنا ضروری ہے تو یقیناً یہ بھی ضروری ہے کہ حقیقی مشائخ اور جھوٹوں میں فرق سمجھا جائے)

اس تمہید کے بعد مظہری میں یوں بیان کیا گیا ہے:

"لا يجوز ما يفعله الجهال بقبور الاولياء والشهداء من السجود والطواف حولها واتخاذ اسرج والمساجد عليها ومن الاجتماع بعد الحول كا لاعياد ويسمونه عرسا"

یہ جائز نہیں جو جاہل لوگ اولیاء کرام اور شہداء کرام کی قبور کو سجدہ کرتے ہیں، اور ان کے ارد گرد طواف کرتے ہیں، اور

چراغ جلاتے ہیں اور ان کو سجدہ گاہ بناتے ہیں، اور سال کے بعد عیدوں کی طرح جمع ہو کر میلہ لگاتے ہیں اسے عرس کہہ لیتے ہیں۔

راقم کی وضاحت:

اہل سنت و جماعت کا صاف وستھرا مذہب یہ ہے کہ قبر سجدہ کرنا حرام ہے، حرام بھی اس وقت جب قبر والے کو معبود نہ سمجھے، اگر معبود سمجھے تو شرک ہے۔ قبر کو طواف کرنا حرام ہے علامہ شامی رحمہ اللہ نے اس کی وضاحت کی ہے، طواف صرف کعبہ شریف کا ہے، سید الانبیاء حضرت محمد ﷺ کے مزار انور کا طواف حرام ہے، تو باقی کسی اور قبر کے اردگرد تو یقیناً طواف حرام ہوگا۔

جہاں تک چراغ جلانے کا مسئلہ ہے اس میں تفصیل ہے، جب تک وہ تفصیل بیان نہ کی جائے تو مسئلہ سمجھ میں نہیں آئے گا، آیئے توجہ فرمائیں۔

اصل میں ہر چیز مباح اور جائز ہے، اگر شرعی دلیل سے کسی چیز کو منع کیا جائے تو وہ ناجائز ہوگی، حقیقت میں حکم کی دارومدار ''نیت'' پر ہے چراغ جلانے والے کی نیت اگر صاحب قبر کو معبود سمجھنا ہو تو یقیناً شرک اور حرام ہوگا، اگر کوئی اور فاسد غرض ہو تو اسی کے مطابق ممانعت کا حکم بھی ہو گا، اور اگر اس چراغ سے لوگوں کو نفع پہنچانا مقصود ہو تو جائز ہوگا، جیسا کہ مجمع البحار میں مذکور ہے:

''وان کان ثم مسجدا وغیرہ ینتفع فیہ للتلاوۃ والذکر فلا باس بالسراج فیہ'' (مجمع البحار جلد سوم ص ۱۰۴)

اگر قبر کے نزدیک مسجد ہو کہ قبر کے چراغ سے اس میں تلاوت قرآن پاک اور ذکر کرنے والوں کو فائدہ پہنچتا ہو تو ایسی حالت میں چراغ جلانے میں کوئی حرج نہیں۔

اس ''وغیرہ'' کے لفظ سے یہ سمجھ آ رہا ہے کہ کسی طرح بھی وہ چراغ فائدہ پہنچائے تو جائز ہے، ورنہ نہیں، جیسے قبر کے قریب سے راستہ گذر رہا ہو اس چراغ سے راہ گذر کو فائدہ ہو یا وہ قبر گاؤں کے قریب ہو اس کا چراغ گاؤں کا پتہ دے رہا ہو تو یقیناً اس کا فائدہ لوگوں کو حاصل ہوتا ہے کیونکہ دیہاتوں میں رات کو چلنے والے مسافر اکثر طور پر بھٹک جاتے ہیں کسی گاؤں کے چراغ سے وہ اپنی راہ متعین کرتے ہیں۔

میلہ اور عرس میں فرق:

تفسیر مظہری کی عبارت ''ومن الاجتماع بعدالحول کا لاعیاد ویسمونہ عرسا'' سے نہ خود گمراہ ہوں اور نہ

دوسروں کو گمراہ کریں۔ مظہری کی عبارت کا مطلب یہ ہے کہ جاہل لوگ جو سال کے بعد اولیاء کی قبور پر عید کی طرح جمع ہوتے ہیں اور اسے عرس کہتے ہیں، جائز نہیں۔

جاہل لوگوں کا اولیاء کرام کے قبور پر عرس کے نام سے میلہ لگانا جائز نہیں جس طرح عید کے دن اگر جہلاء جمع ہو جائیں، ایسی محافل قائم رہیں کہ ڈھول، باجے، گانے، ان میں ہوں، اور گانے والی عورتیں ان محافل میں بلائی جائیں، اس طرح کی محافل قائم کرنا یقیناً ناجائز ہے۔ اگر اولیاء کرام کی قبور پر سال کے بعد ان کی وفات کے دن لوگ جمع ہو جائیں اور قرآن خوانی ہو، تقاریر ہوں، نعت خوانی ہو، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا ذکر ہو، اور اس بزرگ، اور دیگر بزرگان دین اور انبیاء کرام اور تمام مؤمنین ومؤمنات کے حضور ایصال ثواب کا نذرانہ عقیدت پیش کرے تو یہ جائز ہے یہ ہی حقیقت میں عرس ہے۔

عید میں بھی دو ہی رخ ہیں جس سے تشبیہ دی گئی، اگر عید کے دن خرافات اور ناجائز کاموں میں مشغول ہو کر خوشی کا اظہار کرے تو یہ ناجائز ہے۔ اگر عید کے دن نیا لباس پہن لے، خوشبو لگا لے، غسل کر لے، عید کی نماز ادا کرے، جائز اور مباح کاموں سے خوشی کا اظہار کرے تو یقیناً جائز ہے۔ ایصال ثواب کی زیادہ تفصیل ''نجوم الفرقان'' کے دوسرے حصہ میں دیکھئے۔

مظهری سے ایک غلط فهمی:

"وروی الحاکم وصححه عن ابن عباس لعن الله زائرات القبور والمتخذین علیها المساجد والسرج"

حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت ذکر کی ہے، اور اسے صحیح قرار دیا ہے کہ ''اللہ کی لعنت ہو قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر، اور قبروں کو سجدہ گاہ بنانے والوں اور ان پر چراغ جلانے والوں پر اللہ کی لعنت ہو۔

سجدہ گاہ بنانے اور چراغ جلانے کا ذکر پہلے کر دیا گیا ہے، عورتوں کے قبروں کی زیارت کرنے میں تفصیل ہے، جسے سمجھنا ضروری ہے۔

> روح کا تعلق انسان کے جسم کے ذرات سے قائم ہوتا ہے اسی وجہ سے اسے قبر کا عذاب ہو تو اسے درد محسوس ہوتا ہے، اور قبر میں نیک آدمی کو راحت سے سرور حاصل ہوتا ہے، عام آدمی کا جسم مٹی ہو جاتا ہے اور ہڈیاں بوسیدہ ہو جاتی ہیں، لیکن نیک آدمیوں کے جسم بھی صحیح سلامت رہتے ہیں، انہیں قبر میں کامل زندگی حاصل رہتی ہے، ان کی قبر پر جا کر جزع وفزع نہ کریں اور کوئی

عذر شرعی نہ ہو تو ایسی حالت میں ان کا بھی قبروں کی زیارت کیلئے جانا جائز ہے۔
صاحب قبر کو زیارت کرنے والوں سے سکون حاصل ہوتا ہے، آیئے اس پر حدیث پاک دیکھئے:

❁ **اخرج ابن ابی الدنیا فی کتاب القبور عن عائشة قالت قال رسول الله ﷺ ما من رجل یزور قبر اخیه ویجلس عنده الاستأنس به ورد علیه حتی یقوم"** (شرح الصدور ص ۸۴)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے کہا کہ جب بھی کوئی شخص اپنے (مسلمان) بھائی کی قبر کی زیارت کرتا ہے تو اسے سکون وراحت میسر ہوتی ہے، اور وہ سلام کا جواب دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ کھڑا ہوتا ہے۔

اس شخص کے اٹھ جانے تک یہی کیفیت رہتی ہے، کہ اس شخص سے قبر والے کو انس ہوتا ہے، اور سکون حاصل ہوتا، اور راحت میسر ہوتی ہے۔

❁ **عن ابن مسعود قال قال رسول الله ﷺ کنت نهیتکم عن زیارة القبور فزوروها فانها تزهد فی الدنیا وتذکر الآخرة"** (ابن ماجہ، مشکوۃ باب زیارۃ القبور)

میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا، اب قبروں کی زیارت کیا کرو کہ اس سے دنیا میں زہد (تقوی) حاصل ہوگا اور آخرت کی یاد حاصل ہوگی۔

یعنی نبی کریم ﷺ نے پہلے قبروں کی زیارت سے منع فرمایا تھا، کیونکہ زمانہ جاہلیت قریب تھا، لوگ بت پرستی کے عادی تھے، اس لئے منع کیا تھا کہ لوگ قبر والوں کو معبود نہ سمجھ لیں، جب صحابہ کرام کے دلوں میں اسلام اور اسلامی طریقے راسخ ہو گئے تو آپ نے اجازت فرمادی، موت کی یاد لذتوں کو مٹادیتی ہے، دلی کدورتوں کو ختم کر دیتی ہے۔

مرقاۃ شرح مشکوۃ میں ہے:

"اذا تحیرتم فی الامور فاستعینوا باهل القبور" (مرقاۃ)

جب تمہیں کچھ معاملات میں حیرانی و پریشانی ہو تو قبروں والوں سے امداد طلب کرو۔

اسی طرح قبروں کی زیارت سے انسان کو آخرت کی یاد حاصل ہوتی ہے وہ اس کی تیاری کرتا ہے، برائیوں کو چھوڑ دیتا ہے اور نیکیاں کرتا ہے۔ وہ کتنے بے نصیب ہیں جو قبرستان میں بھی فحش مزاح کرنے سے یا وہاں بھنگ کا گھوٹا لگانے سے باز نہیں آتے آیئے اب اصل مقصد کو سمجھئے کہ عورتوں کیلئے بھی قبروں کی زیارت کرنا جائز ہے۔ عام طور پر ایک حدیث پاک بطور دلیل پیش کی جاتی ہے کہ عورتوں کی قبروں کی زیارت کرنے پر حدیث پاک میں لعنت کی گئی، لیکن حدیث پاک کی مکمل وضاحت نہیں کی جاتی جو خود محدثین کرام نے بیان کی ہے۔

❁ عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ لعن زوارات القبور"

(مسند احمد، ترمذی، ابن ماجه، مشکوۃ باب زیارۃ القبور)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت ہو۔

ترمذی نے اس حدیث پاک کو حسن صحیح کہا ہے، اور خود ہی حدیث پاک کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے

"قدرأی بعض اهل العلم ان هذا كان قبل ان يرخص النبی ﷺ فی زيارة القبور فلما رخص دخل فی رخصته الرجال والنساء وقال بعضهم انما كره زيارة القبور للنساء لقلة صبرهن ولشدة جزعهن" (مشكوة باب زيارة لقبور)

امام ترمذی نے کہا کہ بعض اہل علم کا اس حدیث پاک میں اعتقاد یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قبروں کی زیارت کی جو رخصت فرمائی ہے یہ حدیث اس سے پہلے کی ہے، کیونکہ پہلے مردوں کو بھی منع کیا گیا تھا اور عورتوں کو بھی، لیکن جب اجازت فرمائی تو مردوں اور عورتوں تمام کیلئے اجازت فرمادی، البتہ اگر عورتیں صبر نہ کریں اور قبروں پر جا کر رونا پیٹنا اور جزع وفزع کریں تو ایسی حالت میں انہیں قبروں پر جانا منع ہے۔

تنبیہ: راقم نے جو تحریر کیا ہے یہ فتوی کے درجہ میں ہے، اور اعلی حضرت رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "حیات الموات فی بیان سماع الاموات" میں مطلقا عورتوں کو قبروں پر جانے سے شدت سے منع کیا ہے لیکن وہ آپ کا تقوی ہے، آپ کا تقوی بھی سر آنکھوں پر، لیکن فتوی سے انحراف بھی ممکن نہیں احتیاطی مسائل اور جوازی مسائل میں فرق کرنا ضروری ہے۔ (راقم)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِیْٓ اِبْرٰھِیْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰۃُ وَالْاِنْجِیْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِہٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۝﴾ (آیۃ نمبر ۶۵)

(۱) اے کتاب والو! ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو توراۃ وانجیل تو اتری مگر ان کے بعد تو کیا تمہیں عقل نہیں۔

(۲) اے اہل کتاب! کیوں جھگڑا کرتے ہو تم ابراہیم کے متعلق، حالانکہ نہیں اتاری گئی توراۃ اور انجیل مگر بعد آپ کے، کیا نہیں عقل رکھتے تم؟

شان نزول: یہودی کہتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام دین یہودیت پر قائم تھے، اور نصرانی کہتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام نصرانی تھے، دونوں فریق ابراہیم علیہ السلام سے محبت کرنے کے دعویدار تھے اور ہر فریق ان کو اپنے دین پر سمجھتا تھا، لیکن رب تعالی نے ان کا رد فرمایا کہ دین یہود یعنی دین موسوی کی ابتداء توراۃ کے نازل ہونے سے ہوئی، اور دین نصرانیت یعنی دین عیسوی کی ابتداء انجیل کے نازل ہونے سے ہوئی، تو تمہیں عقل کیوں نہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کے وقت یہ دونوں کتابیں نازل ہی نہیں ہوئی تھیں تو وہ کس طرح یہودی یا نصرانی تھے؟

اعتراض: جب تم یہ کہتے ہو کہ ابراہیم علیہ السلام دین اسلام پر تھے، اور تم یہ کہتے ہو کہ اصول دین یا فروع میں ان کے موافق ہو، اور ابراہیم علیہ السلام اصول دین میں اس مذہب پر تھے جس پر آج مسلمان ہیں۔ تمہارا یہ کہنا کس طرح صحیح ہے "والاسلام انما انزل بعد بزمان طویل" حالانکہ اسلام ان کے بعد بہت زمانہ گذرنے کے بعد نازل ہوا۔ جب تم یہ کہہ سکتے ہو کہ ابراہیم علیہ السلام کا دین، اسلام تھا، جبکہ اسلام بعد میں نازل ہوا تو ہم (یہود) بھی کہہ سکتے ہیں کہ آپ یہودی تھے بیشک یہودیت کا نزول بعد میں ہوا، اور ہم (نصاری) بھی یوں کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نصرانی تھے، بیشک نصرانیت کا وجود انجیل کے نزول سے ہوا جو آپ کے بعد نازل ہوئی، جو جواب تم دو گے تو وہی جواب ہم دے دیں گے۔

پہلا جواب: ہمارے قوی جواب کے مقابل تم کیا جواب دے سکو گے، آیئے دیکھئے ہم کیا کہتے ہیں۔

"والجواب ان القرآن اخبر ان ابراھیم "کان حنیفا مسلما" ولیس فی التوراۃ والانجیل "ان ابراھیم کان یھودیا اونصرانیا فظھر الفرق"

اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ تمہارا یہ کہنا ہی غلط ہے کہ اسلام بعد میں نازل ہوا تو ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہ کہنا

درست نہیں کہ وہ اسلام پر تھے، تمہارا یہ کہنا باطل کیوں ہے؟ اسلئے کہ رب تعالی نے خود ہی قرآن پاک میں ابراہیم علیہ السلام کا وصف بیان فرمادیا ﴿كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا﴾ وہ باطل دینوں سے جدا، مسلمان تھے۔ ''لیکن توراۃ نے یہ نہیں بیان کیا کہ وہ یہودی تھے، اور انجیل نے بھی نہیں بیان کیا کہ وہ نصرانی تھے'' اب تمہارے دعوی اور ہمارے دعوی میں فرق واضح ہوگیا۔

دوسرا جواب: نصرانیوں کا یہ دعوی کہ ''ابراہیم علیہ السلام نصرانی تھے'' اس لئے باطل ہے کہ نصرانی تو عیسی علیہ السلام کو معبود مانتے ہیں، یعنی ان کی عبادت کرتے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں تو کسی نے بھی عیسی علیہ السلام کی عبادت کی اور نہ ہی آپ نے (معاذ اللہ) نہ عیسی علیہ السلام کی عبادت کی۔

"فكان الاشتغال بعبادة المسيح مخالفة لملة ابراهيم لا محالة"

لھذا حضرت عیسی علیہ السلام کی عبادت میں مشغول ہونا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کے یقیناً مخالف ہے۔

واضح ہوا کہ یہ دعوی سراسر باطل ہے ابراہیم علیہ السلام نصرنی تھے، اور ہم (نصرانی) ان کے دین پر چلنے والے ہیں اور ان کے متبعین ہیں، یہود کا دعوی بھی باطل ہے کہ ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے، کیونکہ حضرت موسی علیہ السلام کے تشریف لانے سے پہلے بھی مخلوق پر اللہ تعالی کے اوامر ونواہی (احکام اور ممنوع اشیاء) نافذ تھے، اور وہ انبیاء کرام کے ذریعے حاصل ہوئے اور انبیاء کرام کو معجزات کے ذریعے تائید دی گئی۔

اب اگر یہ کہا جائے کہ موسی علیہ السلام جب تشریف لائے تو آپ کو پہلی شریعت کی تشریح اور وضاحت کرنے کیلئے بھیجا گیا تو یہ قول یقیناً یہود بھی نہیں تسلیم کریں گے، اور واقع کے بھی خلاف ہے، حق یہی ہے کہ آپ کو نئی شریعت مستقل طور پر عطاء کی گئی۔ جب آپ کو نئی شریعت عطاء کی گئی تو وہ پہلی شریعتوں کی ناسخ بن گئی، تو ابراہیم علیہ السلام کا یہودیت (دین موسوی) پر قائم ہونے کا دعوی بھی باطل ہوگیا۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ کیا نہیں عقل رکھتے تم؟

"ای الاتتفكرون فلا تعقلون بطلان مذهبكم فتجادلون بالجدال المحال لان بين ابراهيم وموسى الف سنة وبين موسى وعيسى الفى سنة فكيف يكون ابراهيم على دين الابعد عهده بازمنة متطاولة"

تم یہ سوچتے کیوں نہیں، تمہیں عقل کیوں نہیں حاصل ہوتی کہ تمہارا مذہب باطل ہے، تم باطل اور محال جھگڑا کیوں کرتے ہو، تمہیں پتہ نہیں کہ ابراہیم علیہ السلام اور موسی علیہ السلام کے درمیان ایک ہزار سال کا فاصلہ ہے، اور موسی علیہ السلام اور عیسی علیہ السلام کے درمیان دو ہزار سال کا فاصلہ ہے، ابراہیم علیہ السلام اس دین پر کیسے قائم تھے جو بہت طویل زمانہ آپ

کے بعد آیا۔ (روح البیان)

کسی کے ساتھ دین میں موافق ہونے کیلئے ضروری ہے کہ عقائد میں اور احکام میں اسکے موافق ہو، عیسائیوں کے ایک فرقہ کا عقیدہ یہ تھا، عیسی علیہ السلام الہ (معبود) ہیں، دوسرے فرقے کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ "ابن اللہ" (اللہ کا بیٹا ہیں) اور تیسرے فرقہ کا عقیدہ یہ تھا ﴿هُوَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ﴾ وہ تین خداؤں میں سے ایک خدا ہے۔ اور یہودیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ عزیر علیہ السلام "ابن اللہ" (خدا کا بیٹا) ہیں۔ لیکن ابراہیم علیہ السلام کا عقیدہ نہ وہ تھا جو یہود کا تھا اور نہ وہ تھا جو نصرانیوں کا تھا۔

احکام میں بھی موافقت ممکن نہیں کیونکہ احکام توراۃ وانجیل کے ابراہیم علیہ السلام کے بعد طویل عرصہ گذرنے کے بعد نازل ہوئے تو کیسے ممکن ہے کہ ابراہیم علیہ السلام توراۃ وانجیل کے احکام پر عمل کرتے تھے۔ جب عقائد اور احکام میں کسی میں بھی ابراہیم علیہ السلام ان کے موافق نہ تھے تو یقیناً یہ دعوی ہی باطل ہو گیا کہ وہ یہودی یا نصرانی تھے۔ (البحر المحیط)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿هَآاَنْتُمْ هٰؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَالَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَالَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ٥﴾ (آیۃ نمبر ٦٦)

(1) سنتے ہو یہ جو تم ہو اس میں جھگڑے جس کا تمہیں علم تھا تو اس میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تمہیں علم ہی نہیں اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

(2) خبردار تم یہ ہو کہ جھگڑا کیا تم نے اس میں جس کا تمہیں علم تھا، تو کیوں جھگڑا کرتے ہو اس میں جس کا تمہیں علم نہیں، اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

﴿هَآاَنْتُمْ هٰؤُلَآءِ﴾ میں "ھاء" حرف تنبیہ ہے، انتم مبتداء ہے اور "ھؤلاء" خبر ہے۔ "ھاانتم" میں پانچ قراءتیں ہیں جو سب ہی قراء سبعہ کی ہیں:

(١) "ھـــــاء" میں الف ہو اور بعد میں ہمزہ ہو، دونوں ثابت ہوں، جیسا کہ ہم اپنی قراءت روایت حفص کے مطابق پڑھ رہے ہیں۔

(٢) "ھا انتم" کے ہمزہ میں تخفیف کے طور پر تسہیل کی جائے یعنی بین بین کر کے پڑھا جائے۔

(٣) "ھاء" کا الف تخفیف کیلئے حذف ہو اور ہمزہ موجود ہے "صنعتم" کے وزن پر پڑھا جائے اور ہمزہ ثابت رہے۔

(٤) اسی تیسری صورت میں ہمزہ میں تسہیل کردی جائے یعنی بین بین کر کے پڑھا جائے۔

(٥) "ھاء" کا الف موجود ہو اور انتم کا ہمزہ محذوف ہے۔ (صاوی)

اہل کتاب کو تنبیہ کی گئی "خبردار" تم تو یہ ہو کہ تم نے اس چیز میں بھی جھگڑا کیا جس کا تمہیں علم تھا، وہ کیا چیز تھی جس کا انہیں علم تھا؟

(حاججتم فیما لکم به علم)من امر موسی وعیسی ای الذی نطقت به التوراة والانجیل من انهما عبدان ورسولان لله یا مران بعبادة الله وحده ولا یشرکان به غیره"

تم نے جھگڑا کیا اس چیز میں جس کا تمہیں علم تھا یعنی موسی علیہ السلام کے متعلق یہود کو علم تھا جس کا ذکر توراۃ میں تھا کہ آپ اللہ کے بندہ اور اس کے رسول ہیں، اور صرف اللہ تعالی کی عبادت کا حکم دیتے ہیں کہ اس کے ساتھ کوئی شریک نہ ٹھہرایا

جائے، اور یہود یہ گمان بھی کرتے تھے کہ ہم حق پر ہیں، اور موسیٰ علیہ السلام کے دین پر ہیں، لیکن پھر انہوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا اور اللہ کا شریک مانا اور توراۃ کے احکام پر عمل نہ کیا، اور نبی کریم ﷺ سے ان کے جھگڑا کرنے کا یہ مطلب تھا کہ وہ اپنے باطل عقائد ونظریات پر دلائل دیتے اور آپ کی حقانیت اور قرآن پاک کی حقانیت کا انکار کرتے تھے۔

اسی طرح نصاریٰ کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر ہیں، حالانکہ انجیل میں بھی یہی تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا بندہ اور اس کے رسول ہیں، آپ نے حکم دیا کہ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے اور اس کا کوئی شریک نہ ٹھہرایا جائے، لیکن پھر تم نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جھگڑا کیا کہ وہ خدا کا بیٹا ہے، یا خدا ہے، یا خدا کا شریک ہے۔ کیا یہ نظریات جو یہود کے ہیں وہ موسیٰ علیہ السلام نے بتائے ہیں؟ کیا یہ نظریات جو عیسیٰ علیہ السلام کے ہیں وہ عیسیٰ علیہ السلام نے بتائے ہیں؟ نہیں یقیناً انہوں نے نہیں بتائے۔ تو تم ان چیزوں میں بھی جھگڑا کر رہے جو تمہاری کتب میں واضح طور پر موجود ہیں تو تمہارے جھوٹا ہونے کے لئے یہی کافی ہے (ماخوذ از جلالین وصاوی)

﴿فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ﴾

''تو کیوں جھگڑا کرتے ہو تم اس میں جس کا تمہیں علم نہیں''

اس سے مراد کیا ہے؟ مراد یہ ہے:

''من شان ابراهيم الى لكونه لم يذكر فى كتبكم ما كان ابراهيم عليه فكيف تدعون انكم على دينه مع جهلكم به''

یعنی تم کیوں جھگڑا کرتے ہو ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ان کے متعلق تمہاری کتب میں کوئی تذکرہ نہیں کہ وہ یہودی تھے یا نصرانی تھے جبکہ توراۃ وانجیل نازل ہی آپ کے بعد ہوئیں تو تم کس طرح دعویٰ کرتے ہو کہ وہ یہودی تھے یا نصرانی تھے، تمہارا یہ دعویٰ سراسر تمہاری جہالت پر دلالت کر رہا ہے۔ (ماخوذ از جلالین وصاوی)

اور اقوال :

''وقيل الذى لهم به علم هو امر محمد ﷺ لانهم وجدا نعته فى كتبهم فجادلوا بالباطل والذى ليس لهم به علم هو امر ابرهيم''

بعض اور حضرات نے یہ بیان کیا ہے کہ ان کو نبی کریم ﷺ کے متعلق علم تھا، کیونکہ انہوں نے آپ کے اوصاف کو اپنی

کتب میں پایا، پھر انہوں نے اس میں باطل طریقے پر جھگڑا کیا کہ آپ کے اوصاف کو ہی بدل ڈالا۔ جس چیز کا انہیں علم نہیں تھا وہ ابراہیم علیہ السلام کے متعلق علم نہیں تھا، باطل طور پر وہ دعوی کر رہے تھے کہ وہ یہودی یا نصرانی تھے۔ (البحر المحیط)

(حاججتم فیما لکم به علم)هو انهم زعموا ان شریعة التوراة والانجیل مخالفة لشریعة القرآن،فکیف تحاجون فیما لاعلم لکم به؟وهو ادعاؤ کم ان شریعة ابراهیم کانت مخالفة شریعة محمدﷺ"

تم نے جھگڑا کیا اس میں جس کا تمہیں علم ہے، اس علم سے مراد ان کا گمان ہے، حقیقی علم نہیں، کیونکہ انہوں نے گمان کیا کہ توراۃ اور انجیل کی شریعت قرآن پاک کی شریعت کے مخالف ہے۔ یہ ان کا گمان کیوں تھا؟ اس لئے کہ قرآن پاک تو پہلی کتب کی تصدیق کرتا ہے، البتہ توراۃ و انجیل کے احکام پر عمل کا وقت قرآن پاک کے نازل ہونے تک تھا، قرآن پاک کے نازل ہونے پر ان کے احکام منسوخ ہو گئے۔ جس چیز کا انہیں علم نہیں تھا، اس سے مراد ان کا یہ دعوی کہ ابراہیم علیہ السلام کی شریعت نبی کریم ﷺ کی شریعت کی مخالف تھی، یہ دعوی ان کا باطل تھا کیونکہ اس کا انہیں گمان بھی حاصل نہیں تھا۔ (کبیر)

﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ٥﴾ اور اللہ جانتا ہے، اور تم نہیں جانتے۔

یعنی اللہ تعالی جانتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کس دین پر تھے، اور اللہ تعالی جانتا ہے جن چیزوں میں تم جھگڑا کر رہے ہو، اور تم جانتے نہیں، یعنی تم جاہل ہو اور تمہارے اقوال اور تمہارے جھگڑے باطل ہیں۔ (خازن، مدارک)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿مَا كَانَ اِبْرَاهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۝﴾ (آیة نمبر ۶۷)

(1) ابراہیم نہ یہودی تھے، اور نہ نصرانی بلکہ ہر باطل سے جدا مسلمان تھے اور مشرکوں سے نہ تھے۔

(2) نہیں تھے ابراہیم یہودی اور نہ نصرانی، لیکن تھے باطل سے جدا مسلمان، اور نہیں مشرکوں سے۔

شان نزول:

"واخرج ابن ابی حاتم عن مقاتل بن حیان قال قال کعب واصحابه ونفر من النصاری ان ابراهیم منا وموسی منا والانبیاء منا فقال الله ما کان ابراهیم یهودیا ولا نصرانیا ولکن کان حنیفا مسلما"

ابن ابی حاتم نے مقاتل بن حیان سے روایت ذکر کی کہ کعب اور اس کے ساتھیوں اور نصرانیوں کے چند لوگوں نے کہا کہ ابراہیم ہم سے تھے، اور موسیٰ ہم سے تھے، اور انبیاء ہم میں سے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا کہ ابراہیم نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی تھے۔ (درمنثور)

﴿مَا كَانَ اِبْرَاهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا﴾ "نہیں تھے ابراہیم یہودی اور نہ نصرانی"۔

رب تعالیٰ نے یہود اور نصاریٰ دونوں فرقوں کی تکذیب کی کہ تمہارا دعویٰ باطل ہے، یہودیوں کا یہ کہنا کہ ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے، ان کا یہ قول باطل ہے، آپ یہودی نہیں تھے، یہودیت آپ کے بعد ہے، اور نصاریٰ کا یہ کہنا کہ ابراہیم علیہ السلام نصرانی تھے، ان کا بھی یہ قول باطل ہے، کیونکہ آپ نصرانی نہیں تھے، نصرانیت آپ کے بعد ہے۔ (کبیر)

﴿وَلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا﴾ "لیکن تھے باطل سے جدا" "مسلمان"

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ اور تفسیر تبصیر الرحمٰن:

(ولکن کان حنیفا) ای مائلا عن الاعتقادات الفاسدة (مسلما) ای منقادا للاعتقادات الصحیحة" (تبصیر الرحمٰن)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ تفسیر تبصیر الرحمٰن کے بعینہ مطابق ہے، (بلکہ ہر باطل سے جدا مسلمان تھے) یہی تفسیر کی عبارت سے واضح ہے کہ آپ تمام اعتقاد فاسدہ سے اعراض کرنے والے تھے، اور اسلام پر قائم تھے یعنی اعتقادات صحیحہ کے متبع تھے۔

راقم نے پہلے پارہ میں "حـنیـفـا" پر تسکین الجنان میں تراجم میں تقابلی جائزہ پیش کیا وہ نجوم الفرقان میں شامل کرنا بھول گیا، اسے یہاں ہی دیکھ لیا جائے، بحث تقریباً ایک ہی ہے۔

﴿قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا﴾ (پ ۱ ع ۱۶)

''کہہ دے کہ ہرگز نہیں بلکہ ہم نے اختیار کی راہ ابراہیم جو ایک ہی طرف کا تھا'' (محمود الحسن صاحب)

''آپ کہہ دیجئے کہ ہم تو ملت ابراہیم پر رہیں گے جس میں کجی کا نام نہیں۔'' (اشرف علی صاحب)

''ان سے کہہ دو بلکہ سب چھوڑ کر ابراہیم کا طریقہ۔'' (مودودی صاحب)

''تم فرماؤ بلکہ ہم تو ابراہیم کا دین لیتے ہیں جو ہر باطل سے جدا تھے'' (اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ)

اس مقام پر "قـــــل" کا خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے'' کہہ دے'' اور'' تم فرماؤ'' یہ دونوں ترجمے اسی لفظ'' قل'' کے ہیں، ان میں جو فرق ہے وہ بیان وضاحت کا محتاج نہیں، اس مقام پر'' حنیفا'' کا ترجمہ بعض حضرات نے کیا ہے'' ایک ہی طرف کا''

اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے اسی لفظ کا ترجمہ کیا ہے'' ہر باطل سے جدا تھے'' پہلی بات تو یہ ہے کہ عام اردو زبان کے محاورات سے واقف آدمی سمجھ لے گا'' ایک ہی طرف کا ہونا'' اور'' باطل سے جدا ہونا'' ان دونوں میں سے یقیناً دوسرا معنی زیادہ مناسب ہے۔ پھر بھی اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہونے پر جلالین نے'' حنیفا'' کی جو تفسیر کی ہے وہ شاہد ہے۔

''(حنیفا) حال من ابراهیم مائلا عن الادیان کلها الی الدین القیم''

یعنی "حـنیفا" ترکیبی لحاظ پر لفظ "ابراهیم" سے حال ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام باطل دینوں سے جدا ہونا ایک دین مستقیم پر قائم ہونا سو ارک نے اس طرح بیان کیا ہے۔

''الحنیف المائل من کل دین باطل الی دین الحق''

یعنی "حنیفا" کا مقصد یہ ہے کہ ہر باطل دین سے جدا ہونا، دین حق کی طرف متوجہ ہونا''

بیضاوی میں ہے''(حنیفا) مائلا عن الباطل الی الحق'' باطل سے جدا ہونا حق کی طرف متوجہ ہونا''

خیال رہے کہ مودودی صاحب کا ترجمہ صرف خیالی ہے، عربی گرائمر کی مطابق سے اسے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ اور اشرف علی صاحب نے "حـنیفا" کا ترجمہ کیا ہے'' جس میں کجی کا نام نہیں'' یہ ترجمہ آپ نے کسی لغت اور کسی تفسیر سے لیا ہے؟ ہمیں تو یہی سمجھ آیا کہ یہ ترجمہ لغوی نہیں اور نہ ہی مقصد کو واضح کرتا ہے۔ (تسکین الجنان ص ۴۷، ۴۸)

❁ واخرج ابن جریر عن سالم بن عبدالله لااراہ الایحدلہ عن ابیہ ان زیدبن عمر وبن نفیل خرج الی الشام یسأل عن الدین ویتبعہ فلقی عالما من الیہود فسألہ عن دینہ وقال انی لعلی ان ادین دینکم فاخبرنی عن دینکم فقال لہ الیہودی انک لن تکون علی دیننا حتی تاخذ بنصیبک من غضب اللہ قال زید مافرالامن غضب اللہ ولا احمل من غضب اللہ شیأ ابدافہل تدلنی علی دین لیس فیہ ھذا قال ما اعلمہ الا ان تکون حنیفا قال وما الحنیف قال دین ابراھیم لم یکن یہودیا ولا نصرانیا وکان لایعبد الااللہ فخرج من عندہ فلقی عالما من النصاری فسألہ عن دینہ فقال انی لعلی ان ادین دینکم فاخبرنی عن دینکم قال انک لن تکون علی دیننا حتی تاخذ بنصیبک من لعنۃ اللہ قال لااحتمل من لعنۃ اللہ شیأ ولا من غضب اللہ شیأ ابدا فہل تدلنی علی دین لیس فیہ ھذافقال لہ نحو ماقالہ الیہودی لا اعلمہ الاان تکون حنیفا فخرج من عندھم وقدرضی الذی اخبراہ و الذی اتفقاعلیہ من شأن ابراھیم فلم یزل رافعایدیہ الی اللہ وقال اللھم انی اشھدک انی علی دین ابراھیم" (درمنثور)

ابن جریر نے روایت ذکر کی کہ زید بن عمر بن نفیل شام کی طرف گئے دین کے بارے میں سوال کر رہے تھے کہ مجھے کوئی دین حاصل ہو جائے جس کی میں تابعداری کرو، تو ان کی ملاقات ایک یہودی عالم سے ہوئی، اس سے زید نے دین کے متعلق پوچھا، اور بتایا کہ میں چاہتا ہوں کہ تمہارے دین پر آجاؤں، لیکن پہلے تم مجھے اپنے دین کے متعلق معلومات پہنچاؤ۔ یہودی عالم نے کہا تم اس وقت تک ہمارے دین پر نہیں آسکتے جب تک تم اللہ تعالی کے غضب کا کچھ حصہ برداشت نہ کرلو (کیونکہ یہود اللہ تعالی کے غضب کے مستحق ہیں) زید نے کہا میں تو اللہ تعالی کے غضب سے بھاگا ہوں، اب اللہ تعالی کے غضب کا کچھ حصہ بھی قابل برداشت نہیں البتہ تم مجھے کسی اور دین کی راہنمائی کروجس میں آنے کیلئے اللہ تعالی کا غضب برداشت نہ کرنا پڑے۔ اس نے کہا مجھے اور تو کچھ علم نہیں، البتہ تم دین حنیف پر آجاؤ، زید نے پوچھا وہ دین حنیف کیا ہے؟ اس نے کہا وہ دین ابراہیم ہے، کیونکہ ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی تھے، اور وہ اللہ تعالی کے بغیر کسی اور کی عبادت نہیں کرتے تھے،

پھر زید نے ایک نصرانی عالم سے ملاقات کی، اس سے اس کے دین کے متعلق سوال کیا، اور اسے کہا کہ میں تمہارے دین پر آنا چاہتا ہوں تم مجھے اپنے دین کے متعلق معلومات فراہم کرو تو اس نے کہا کہ تم ہمارے دین پر اس وقت تک نہیں آسکتے جب تک اللہ تعالی کی لعنت کا کچھ حصہ حاصل نہ کرلو (کیونکہ نصرانی اللہ تعالی کی لعنت کے مستحق ہیں) زید نے کہا میں تو اللہ تعالی کی لعنت کو برداشت نہیں کرسکتا، اور نہ ہی اللہ تعالی کے غضب کو برداشت کرسکتا ہوں، اس لئے تم مجھے کسی اور دین کے متعلق بتاؤ جس میں اللہ تعالی کی لعنت اور اس کے غضب کو برداشت نہ کرنا

پڑے، اس نصرانی عالم نے بھی یہودی عالم کی طرح ابراہیم علیہ السلام کے دین کی راہنمائی کی۔ زید وہاں سے نکلا تو اس کے دل میں دین ابراہیم کی محبت کامل طور پر آ گئی، کیونکہ وہ دونوں (یہودی اور نصرانی) عالموں سے دین ابراہیم کی تعریف سن چکا تھا، زید نے اپنے دونوں ہاتھ رب تعالیٰ کے حضور اٹھائے اور عرض کیا، اے اللہ میں تجھے گواہ بناتا کہ میں دین ابراہیم پر آ گیا ہوں۔

اعتراض: تم کہتے ہو ابراہیم علیہ السلام دین اسلام پر تھے اس مراد تم لیتے ہو کہ اصول دین میں تم ان سے متفق ہو یا فروع دین میں۔ اگر تم کہو کہ اصول دین میں ہم ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ متفق ہیں اس لئے وہ بھی مسلمان تھے، تو اس طرح ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ اصول دین میں ہم بھی ان سے متفق ہیں کیونکہ اصول دین میں تمام انبیاء کرام متفق ہیں، لھذا ہم یہ کیوں نہیں کہہ سکتے کہ ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے یا نصرانی اگر تم کہو کہ تمہارا ابراہیم علیہ السلام سے فروع دین میں اتفاق ہے اس لئے وہ مسلمان تھے تو اس قول کے مطابق تو تمہارے نبی کی شریعت مستقل شریعت ہی نہیں ہو گی بلکہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کی تابع ہو گی لھذا یہ تمہارا کہنا کے ابراہیم علیہ السلام مسلمان تھے درست نہیں۔

جواب: نبی کریم ﷺ کی شریعت اصول دین میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کے موافق تھی اور فروع دین میں بھی۔ فروع دین میں فوافق ہونے کے باوجود آپ کی شریعت مستقل تھی حضرات ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کے تابع نہیں تھی، آیئے اس کا خوبصورت بیان علامہ رازی رحمہ اللہ کے الفاظ میں دیکھئے:

وجاز ایضاان یقال المرادبه الفروع وذلک لان الله نسخ تلک الفروع بشرع موسی علیہ السلام ثم فی زمان محمد ﷺ نسخ شرع موسی علیہ السلام بتلک الشریعة التی کانت ثابتة فی زمن ابراهیم علیہ السلام وعلی هذالتقدیر یکون محمد ﷺ صاحب الشریعة ثم لما کان غالب شرع محمد ﷺ موافقا لشرع ابراهیم علیہ السلام فلووقعت المخالفة فی القلیل لم یقدح ذلک فی حصول الموافقة"

نبی کریم ﷺ کی شریعت فروع (یعنی احکام میں) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کے فروع (احکام) میں موافق تھی، لیکن نبی کریم ﷺ کی شریعت مستقل تھی، کسی شریعت کے تابع نہیں تھی، اس کی وجہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے آنے کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کے احکام منسوخ ہو گئے، پھر جب نبی کریم ﷺ تشریف لائے تو آپ کی مستقل شریعت سے موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے احکام منسوخ کر دیئے گئے، زیادہ طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی

شریعت کے احکام کو بحال کر دیا گیا، اگر چہ بعض احکام دونوں شریعتوں کے مختلف بھی ہیں، لیکن اکثر احکام میں موافق ہونے کے باوجود یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ نبی کریم ﷺ کی شریعت کے احکام حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کے احکام کے موافق ہیں۔ اصول دین یعنی اعتقادات میں تو ہر نبی دوسرے نبی کے موافق رہا، سب کا اللہ تعالی اور ملائکہ پر، اور قیامت کے دن پر اور اس کے انبیاء کرام کے برحق ہونے پر، اور اس کی طرف سے نازل ہونے والی کتب پر ایمان رہا۔

واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ کی شریعت مستقل بھی تھی اور شریعت ابراہیم کے موافق بھی تھی، اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وصف رب تعالی نے بیان فرمائے کہ وہ تمام باطل دینوں سے جدا تھے اور مسلمان تھے۔

تینوں آیات کا خلاصہ:

ابھی متصل ہی ماقبل جن تین آیات کریمہ کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ "اے اہل کتاب تم ابراہیم علیہ السلام کے متعلق کیوں جھگڑا کرتے ہو جبکہ ان کے وقت توراۃ وانجیل نازل ہی نہیں ہوئی تھیں تو تمہارا دعوی کرنا کہ وہ ہماری کتب کے موافق تھے یہ باطل ہے، جس سے تمہاری عقلوں کی نفی ہوتی ہے اور جہالت کا ثبوت ہوتا ہے۔

تم تو یہ لوگ ہو کہ جس چیز کا تمہیں علم ہے اس کے متعلق بھی جھگڑا کرتے ہو، گویا کہ حق کی بھی نفی کرتے ہو، اور جن چیزوں کا تمہیں علم ہی نہیں ان میں تم کیوں جھگڑا کرتے ہو، یعنی جہالت کے باوجود جھگڑا کرنا اور بے وقوفی ہے، اللہ تعالی جانتا ہے، تم نہیں جانتے، حق تو یہی تھا کہ ناحق جھگڑا کرنے سے تم باز آتے اور یہ کہتے کہ ہمیں تو کچھ علم نہیں، اللہ تعالی ہی بہتر جانتا ہے، ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے اور نہ ہی نصرانی تھے (جبکہ توراۃ وانجیل ان کے بعد نازل ہوئیں، تو وہ کس طرح تمہارے دعوی کے مطابق تھے یا نصرانی تھے) بلکہ وہ تمام باطل دینوں سے جدا تھے، مسلمان تھے، اور مشرکوں سے نہیں تھے۔

تفسیر نعیمی کا نورانی بیان:

حضرت قبلہ شاہ سید محمد صاحب محدث کچھوچھوی دام ظلہم کی ایک شیعہ سے اس پر گفتگو ہوئی کہ سنی اور شیعہ میں کون (سا) مذہب پرانا ہے، محدث صاحب نے فرمایا کہ پرانا مذہب سنی ہی ہے، اس لئے کہ اس کا نام اہل سنت وجماعت" جب سے سنت رسول اللہ ﷺ اور جماعت مسلمین دنیا میں قائم ہوئی تب ہی سے یہ مذہب آیا۔ تمہارا نام

ہے **اثنا عشریہ** یعنی بارہ امام والے، جب بارہ امام ہوئے تو تم بنے (یعنی بارہ اماموں کے آنے کے بعد فرقہ اثنا عشریہ بنا، کیونکہ بارہ اماموں کے مکمل ہونے سے پہلے اثناعشریہ نام رکھنا ہی صحیح نہیں کیونکہ "**اثنا عشر**" کا معنی ہے "بارہ") اور یقینی بات ہے کہ یہ بارہ امام عرصہ بعد پیدا ہوئے، لھذا تمہارا دین بھی پیچھے ہی ہے، تمہارا نام تمہاری تاریخ کا پتہ دے رہا ہے۔

اسی طرح ہر دین کے نام سے اس کی تاریخ کا پتہ چلا لو، محمد بن عبدالوہاب سے وہابی بنے، ان کی پیداوار بارھویں صدی میں ہے۔ عبداللہ چکڑالوی سے چکڑالوی فرقہ بنا یعنی ان کی پیداوار گیارھویں صدی میں ہے۔ مرزا قادیانی سے قادیانی فرقہ بنا، یعنی ان کی پیدوار تیرھویں صدی میں ہے۔ (سر سید احمد خان سے نیچری مذہب بنا، نیچری کی پیدوار چودھویں صدی کے آغاز میں ہے) غرضیکہ ہر مذہب کی تاریخ اس کے نام سے معلوم کرو، البتہ سنی وہ فرقہ ہے، وہ مذہب ہے جو سنت رسول اللہ ﷺ سے بنا۔

{اب قارئین کرام (کتاب کو پڑھنے والے حضرات) خود فیصلہ فرمالیں کہ کون سا مذہب حق ہے، اور کون سا باطل}

خیال رہے کہ حنفی، شافعی مالکی عاقائد کا نام نہیں فروعی اعمال کا نام ہے، یہ سب عقائد میں سنی ہیں، فروعی اور اجتہادی اعمال میں حنفی اور شافعی ہیں، ایسے ہی چشتی اور قادری وغیرہ عقائد میں حنفی اور اعمال شافعی ہیں، ایسے ہی چشتی اور قادری وغیرہ عقائد میں سے سنی ہیں، روحانی اعمال کے لحاظ سے یہ چشتی اور قادری ہیں۔

تنبیہ: سنت کی دستگیر فرائض سے پہلے ہے، پیدا ہوتے ہی ناف کی نال کٹوانا سنت اور عقیقہ سنت، اور ختنہ سنت، اور تعلیم و تربیت سنت ہے۔ اور بالغ ہونے کے بعد نماز فرض ہے، اس لئے ہمارا نام اہل سنت ہے نہ کہ اہل فرض، نیز مرتے ہی فرائض علیحدہ ہوجاتے ہیں، مگر سنت مصطفے ﷺ قبر میں ساتھ جاتی ہے، قبر کی گہرائی سنت، اور کفن کی مقدار سنت، دفن کے بعد فاتحہ ایصال ثواب سنت (**راقم "بھترالوی"** کی کتاب ایصال ثواب مستحب ہے کا مطالعہ کریں) لھذا ہم پیدائشی سنی ہیں، اور مرنے کے بعد بھی سنی، اللہ تعالی اس سنت والے کے زیر سایہ رکھے غرضیکہ ہمارا نام ہی ہماری تاریخ بنا رہا ہے۔

فائدہ: پچھلوں کا اثر اگلوں پر نہیں پڑتا، ہاں اگلوں کا اثر پچھلوں پر پڑتا ہے۔ ہم لوگ ابراہیمی ہیں کیونکہ ابراہیم علیہ السلام ہم سے پہلے گذرے، مگر ابراہیم علیہ السلام یہودی یا نصرانی نہیں تھے کیونکہ یہ چیز ان کے بعد کی ہیں۔

لطیفہ: ایک سنی کا کسی وہابی غیر مقلد سے "**قراءت خلف الامام**" پر مناظرہ ہوا۔ سنی نے کہا کہ

حدیث شریف میں ہے "قراء ۃ الامام لہ قراء ۃ" یعنی امام کی قراءت مقتدی کی قراءت ہے۔وہابی غیر مقلد بولا یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ اس کی اسناد میں جابر جعفی ہیں، جو نا قابل اعتبار تھا۔سنی نے پوچھا کہ جابر جعفی کب پیدا ہوا؟ وہاں غیر مقلد نے کہا ۲۵۰ھ میں۔سنی نے کہا کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے وقت میں جابر جعفی اپنے والد کی پشت میں بھی نہ آیا ہوگا کیونکہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی وفات ۱۵۰ھ میں ہے۔اس وقت یہ حدیث صحیح تھی۔(یہ حدیث مسند امام اعظم میں بھی مذکور ہے، امام صاحب کی روایت کی دارومدار تابعین یا صحابہ پر ہے، ان میں سے صحابہ کرام پر تو جرح ہو نہیں سکتی کیونکہ وہ سب عادل اور ثقہ ہیں، تابعین میں سے کسی پر کوئی جرح کرے تو اسے دیکھا جائے، جو راوی امام صاحب کی وفات کے ایک سو سال بعد پیدا ہوا اسے ضعیف کہہ کر حدیث پاک کو امام صاحب کے زمانہ میں ضعیف قرار دینا حماقت اور جہالت نہیں تو اور کیا ہے۔ (راقم بھترالوی)

ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ حدیث ہم تک پہنچنے میں ایک سند سے ضعیف ہے، لیکن دوسری سند اور مسند امام اعظم کی روایت سے صحیح ہے۔لھذا بعد کی سند کے ضعیف راوی کا امام صاحب پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔وہاں یہ سن کر خاموش ہوگیا۔

ضروری نوٹ:

اہل سنت و جماعت کو یہ قاعدہ خوب یاد رکھنا چاہئے، بہت فائدہ مند ہے۔ (ماخوذ از نعیمی)

راقم کی کتاب "نماز حبیب کبریاء" کا مطالعہ کریں، انشاءاللہ اپنے سنی حنفی بھائیوں کو کافی فائدہ ہوگا۔غیر مقلدین نے تو کبھی نہیں ماننا، لیکن یہ خیال کریں کہ نبی کریم ﷺ کے ارشادات کو ابو جہل اور ابولہب اور دوسرے کافروں نے نہیں مانا تو بدقسمت وہ رہے، نبی کریم ﷺ کے ارشادات تو نورانی تھے،

اسی طرح یہ بھی واضح ہے کہ بری چیز کا اثر اچھی چیز پر زیادہ ہوتا ہے۔اور اچھی چیز کا اثر بری چیز پر کم ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ راقم نے کبھی نہیں سوچا کہ غیر مقلدین میری بات مان جائیں گے، راقم کے ذہن میں صرف ایک بات ہوتی ہے کہ حنفی حضرات غیر مقلدین کے فریب اور دھوکے میں نہ آئیں۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِاِبْرَاهِیْمَ لَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِیُّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاللّٰهُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ٥﴾ (آیة نمبر ٦٨)

(1) بیشک سب لوگوں سے ابراہیم کے زیادہ حقدار وہ تھے جو ان کے پیرو ہوئے، اور یہ نبی اور ایمان والے اور ایمان والوں کا والی اللہ ہے۔

(2) بیشک زیادہ قریب سب لوگوں سے ابراہیم کے وہ جنہوں نے ان کی تابعداری کی اور یہ نبی اور ایمان والے ہیں، اور اللہ والی ہیں ایمان والوں کا۔

راقم نے ﴿اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ﴾ کا ترجمہ تفسیر مظہری سے لیا ہے۔

"اولی "مشتق من الولی بمعنی القریب یعنی اخصهم و اقربهم دینا"

لفظ "اولی" ولی سے بنا ہے، جس کا معنی ہے قریب ہونا، یعنی سب لوگوں میں سے ابراہیم علیہ السلام کے زیادہ قریب اور ان کے خاص اور دین کے لحاظ پر ان کے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جنہوں نے آپ پر ایمان لایا اور آپ کی تابعداری کی بلاشبہ (یقیناً) وہ آپ کی امت اجابت کے درجہ پر آئے، اسی طرح ابراہیم علیہ السلام کے دین کے اکثر احکام کے قریب یہ نبی محمد ﷺ اور مؤمنین ہیں، کیونکہ یہ اللہ تعالی کی وحدانیت پر ایمان رکھتے ہیں، اور قربانی کرتے ہیں، اور ختنہ کراتے ہیں، اور کعبہ کی طرف متوجہ ہو کر نماز ادا کرتے ہیں، اور ابراہیم علیہ السلام کی طرح حج اور عمرہ کرتے ہیں۔

لھذا واضح ہوا کہ آپ کی امت میں سے آپ کے متبعین اور نبی کریم ﷺ اور مؤمنین زیادہ حقدار ہیں کہ یہ کہیں کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کے دین کے احکام کے زیادہ قریب ہیں۔ (از مظہری)

شان نزول:

کلبی نے ابو صالح سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے اور محمد بن اسحاق نے ابن شہاب سے اسناد صحیح سے روایت ذکر کی، حضرت جعفر بن ابی طالب اور کچھ صحابہ کرام نے حبشہ کی جانب ہجرت کی اور نبی کریم ﷺ نے مدینہ طیبہ کی جانب ہجرت کی، بدر کا واقعہ بھی گذر چکا تھا تو قریش "دار الندوہ" (میٹنگ روم) میں جمع ہوئے، مشورہ کیا، اور طے یہ ہوا کہ والی حبشہ کے پاس دو شخص سمجھدار بہت تحائف دے کر بھیجے جائیں، جو ان لوگوں کے خلاف اسے بھڑکائیں جو اس کے ملک میں ہجرت کر کے چلے گئے ہیں۔

جن دو شخصوں کو منتخب کیا گیا وہ عمرو بن العاص اور ع عمارۃ بن ابی معیط تھے، یہ اپنے ساتھ بہت قیمتی تحائف لے کر سمندری راستہ سے کشتیوں پر سوار ہو کر حبشہ میں پہنچ گئے۔ نجاشی کو ملے اور اسے سجدہ کیا اور سلام کیا، پھر نجاشی کو کہا کہ ہماری قوم تمہارے لئے بہت خلوص رکھتی ہے، اور تمہاری شکر گذار ہے، اور تمہاری اچھائیوں سے محبت رکھتی ہے، بیشک انہوں نے ہمیں آپ کے پاس بھیجا ہے تاکہ ہم آپ کو ان لوگوں سے ڈرائیں جو ہمارے ملک سے تمہارے ملک میں آگئے ہیں۔ یہ لوگ ایک ایسے شخص کی تابعداری کر رہے ہیں جو جھوٹا ہے، اور وہ ہم میں سے ہی ہے، اور گمان یہ کرتا ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔

"ولم یتابعه منا احد الا اسفهاء" ہم میں سے کوئی بھی اس کی تابعداری نہیں کر رہا سوائے بے وقوفوں کے" ہم نے ان لوگوں پر راستہ تنگ کر دیا اور ان کو وادیوں اور گھاٹیوں میں محبوس کر دیا تاکہ ان کے پاس کوئی آ جا نہ سکے، ان لوگوں کو ہم نے بھوک اور پیاس میں مبتلاء کر دیا۔

"فلما اشتد علیه الامر بعث الیک ابن عمه لیفسد علیک دینک وملکک ورعیتک فاحذرهم"

جب اس مدعی نبوت پر معاملہ سخت ہو گیا تو اس نے اپنے چچا کے بیٹے کو تمہارے ملک میں بھیج دیا تاکہ وہ تمہیں اور تمہارے دین اور تمہارے ملک اور تمہاری رعایا کو فساد میں مبتلاء کر دیں، اسلئے تم ان آئے ہوئے لوگوں سے بچ کر رہو۔

"وادفعهم الینا لنکفیهم" یہ لوگ ہمارے حوالے کر دو، تاکہ ہم خود ہی ان سے نمٹ لیں۔ اور ساتھ ہی ان دونوں نے یہ کہا کہ تم ہماری سچائی دیکھنا چاہتے ہو تو ان مہاجروں کو اپنے دربار میں بلا لو، وہ تمہیں سجدہ نہیں کریں گے، اور تمہاری مجلس کے وہ آداب بجا نہیں لائیں گے جو دوسرے لوگ بجا لاتے ہیں۔ اس سے تمہیں پتہ چل جائے گا کہ وہ تمہارے دین اور تمہارے طریقہ سے منہ موڑنے والے ہیں (اعراض کرنے والے ہیں) نجاشی نے اپنے درباریوں کو حکم دیا کہ ان لوگوں کو میرے دربار میں بلا لو، ان کو بلایا گیا

"فلما حضروا صاح جعفر بالباب یستاذن علیک حزب الله"

جب مہاجرین نجاشی کے دروازے پر پہنچے تو حضرت جعفر بن ابی طالب نے زور سے کہا" اللہ کا گروہ (ٹولہ) آگیا ہے جو تمہارے پاس آنے کی اجازت طلب کرتا ہے۔ نجاشی نے جب سنا تو کہنے لگا" مروا هذا الصائح فلیعد کلامه" اس آواز دینے والے کو کہو اپنا کلام پھر لوٹاؤ۔ حضرت نجاشی دوبارہ وہی کلمات لوٹائے" یستاذن علیک حزب الله" اللہ کا ٹولہ (گروہ) تمہارے پاس آنے کی اجازت طلب کرتا ہے۔ تو نجاشی نے کہا

"نعم فلید خلوا باذن الله و ذمته" ہاں اللہ تعالیٰ کی اجازت اور اسی کی امان سے اندر آ جاؤ۔

ادھر کفار کا نمائندہ عمرو بن العاص (ابھی تک ایمان قبول نہیں کیا ہوا تھا، بعد میں ایمان لا کر صحابی بنے) اپنے دوسرے ساتھی کو دیکھ کر کہنے لگے کہ ان لوگوں نے "حزب اللہ" کہہ کر کس طرح نجاشی کو متاثر کر دیا۔ اور ادھر نجاشی کا کلام سن کر کہ اس نے ان کو امن دی، شیریں کلام ان سے کیا، وہ دونوں غمناک ہو گئے، شائد ہمارا کام نہیں ہو گا، یہ کہیں نجاشی پر کامل طور پر اثر انداز نہ ہو جائیں "ثم دخلوا علیه فلم یسجدوا له" مہاجرین حضرات جب نجاشی کے کمرہ میں داخل ہوئے تو اسے انہوں نے سجدہ نہیں کیا۔

عمرو بن العاص نے کہا اے بادشاہ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ یہ بڑے متکبر ہیں، انہوں نے تمہیں سجدہ نہیں کیا ۔ بادشاہ (نجاشی) نے ان سے پوچھا کیا وجہ ہے کہ تم نے مجھے سجدہ نہیں کیا، اور جس طرح باہر سے آنے والے لوگ میری محفل کے آداب خدمت بجالاتے ہیں وہ آداب تم نے کیوں نہیں بجالائے۔" قالوا نسجد لله الذی خلقک وملکک" انہوں نے کہا ہم تو صرف اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہیں جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہیں بادشاہی عطاء کی۔ ہم بت پرست تھے، اللہ تعالیٰ نے ہم میں سچے نبی کو مبعوث فرمایا، اور آپ نے ہمیں یہ بتایا کہ کسی محفل میں جاؤ، کسی سے ملاقات کرو تو "السلام علیکم" کہو، کیونکہ جنت والے ملاقات پر یہی کہتے ہیں، رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے "تحیتهم سلام" ان (جنتیوں) کا ایک دوسرے کو تحفہ دینا سلام ہو گا۔ ہم نے آپ کو سلام دے دیا ہے، جنتی آداب سے بڑھ کر اور کیا آداب خدمت ہوں گے،؟'

'فعرف النجاشی ان ذلک حق وانه فی التوراة والانجیل"

نجاشی نے سمجھ لیا کہ یہ بات حق ہے جو اس شخص نے کہی ہے، یہی توراۃ وانجیل میں بھی مذکور ہے،

"قال ایکم الهاتف یستاذن علیک حزب الله؟قال جعفر انا"

نجاشی نے کہا باہر سے آواز دینے والا کون تھا، جس نے یہ کہا کہ اللہ کا گروہ تم سے اجازت طلب کرتا ہے۔ حضرت جعفر بن ابی طالب نے کہا "وہ میں تھا"

نجاشی نے کہا تم کوئی کلام کرو، حضر جعفر نے کہا تم روئے زمین کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ ہو، اور اہل کتاب سے ہو اس لئے تمہارے سامنے زیادہ کلام کرنا اور حد سے تجاوز کرنا تو اچھا نہیں، البتہ یہ دو شخص جو ہمارے علاقہ سے آپ کے پاس آئے ہیں اور ہماری شکایات آپ کے پاس لائے ہیں، ان میں سے ایک کو کہو کہ وہ کلام کرے اور دوسرا خاموش رہے، آپ ہمارے مکالمہ کو سنیں، آپ کو سچے اور جھوٹے کا پتہ چل جائے گا۔

بادشاہ نے جب ان کو کلام کرنے کے متعلق فرمایا تو عمرو بن العاص نے حضرت جعفر کو کہا پہلے تم کلام کرو، حضرت جعفر ﷺ نے نجاشی کو کہا آپ ان دونوں سے پوچھئے "اعبید نحن ام احرار" کیا ہم غلام ہیں یا آزاد ہیں "قال بل احرار کرام" عمرو بن العاص نے کہا یہ لوگ آزاد ہیں اور اچھے حسب ونسب والے ہیں، نجاشی نے کہا "نجوا من العبودیة" ان لوگوں کو تمہارے اقرار سے غلامیت کے طعن سے تو نجات مل گئی۔

"ثم قال جعفر سل هما هل اهرقنا دما بغير حق فيقتص منا؟

پھر حضرت جعفر ﷺ نے کہا آپ ان دونوں سے پوچھئے کیا ہم نے ان کا کوئی ناحق خون بہایا ہے کہ یہ ہم سے قصاص لینا چاہتے ہیں۔

"قال عمرو لا ولا قطرة" عمرو بن العاص نے کہا، نہیں انہوں نے کوئی ایک قطرہ خون کا ناحق کسی کا نہیں بہایا۔

"قال جعفر سل هل اخذنا اموال الناس بغير حق فعلينا قضاء وها،قال النجاشي ان كان قنطارا فعلى قضاء وه"

حضرت جعفر ﷺ نے کہا ان سے پوچھئے کیا ہم نے کسی کا ناحق مال لے لیا ہے جس کا ادا کرنا ہمارے ذمہ ہے۔ نجاشی نے کہا اگر تمہارے ذمہ ڈھیروں (بہت کثیر) مال بھی ہو تو وہ میں ادا کر دوں گا۔

"قال عمرو لا ولا قیراطا" عمرو بن العاص نے کہا نہیں ان کے ذمہ کسی کا مال ایک قیراط کے برابر بھی نہیں۔ (قیراط رتی کے قریب وزن ہے، چار جو کی قیراط اور پانچ جو کی ایک رتی ہوتی ہے)

نجاشی نے ان کے مکالمہ کو سن کر کافروں کے نمائندوں کو کہا تم ان سے کیا مطالبہ کرتے ہو، وہ کہنے لگے کہ ہم اور یہ ایک دین پر تھے، وہ ایک ہی دین ہمارے آباء واجداد کا دین تھا، لیکن انہوں نے وہ دین چھوڑ دیا اور غیر کی تابعداری اختیار کر لی۔ "فبعثنا الیک قومهم لتدفعهم الینا" اسلئے ہماری قوم نے ہمیں آپ کے پاس بھیجا ہے کہ تم ان کو ہمارے حوالے کر دو۔

نجاشی حضرت جعفر ﷺ سے پوچھا کہ وہ کیا دین تھا جس کو تم نے چھوڑا ہے، اور وہ کیا دین ہے جس کو تم نے اختیار کیا ہے؟ مجھے سچ سچ بتاؤ۔

"قال جعفر امادين الذى كنا عليه فتركناه فهو دين الشيطان كنا نكفر بالله ونعبد الحجارة"

حضرت جعفر ﷺ نے کہا جس دین کو ہم نے چھوڑا ہے وہ شیطان کا دین تھا، ہم اللہ تعالیٰ سے کفر کرتے تھے، اور بتوں کی پوجا کرتے تھے۔

"واما الذى تحولنا فدين الله الاسلام جاء نا به من الله رسول وكتاب مثل كتاب ابن مريم وموافقاله"

لیکن اب جس دین کو ہم نے اختیار کیا ہے وہ اللہ کا دین اسلام ہے، ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ آئے، اور رب تعالیٰ کی کتاب (قرآن پاک) ہمارے پاس آئی، وہ کتاب ابن مریم (عیسیٰ علیہ السلام) کی کتاب (انجیل) کے موافق ہے۔

نجاشی نے یہ سن کر کہا تم نے عظیم بات کہی ہے، تم ابھی کچھ دیر کیلئے رک جاؤ، نجاشی نے ناقوس بجانے کا حکم دیا، اس نے تمام راہبوں اور اہل علم مبلغین کو جمع کر لیا، ان کو کہا کہ میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی قسم دلا کر پوچھتا ہوں جس نے انجیل عیسیٰ علیہ السلام پر اتاری "هل تجدون بين عيسى وبين يوم القيامة نبيا مرسلا" کیا تم نے انجیل میں پایا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اور قیامت کے درمیان کوئی نبی مرسل آئے گا؟

"قالو اللهم نعم قد بشرنا به عيسى وقال من آمن به فقد آمن بي ومن كفر به فقد كفر بي"

انہوں نے کہا ہاں ہم نے یہ پایا ہے "اے اللہ تو خوب جانتا ہے" کہ ہمیں عیسیٰ علیہ السلام نے بشارت دی ہے کہ میرے بعد آخری نبی آئیں گے، جن کا نام احمد ہوگا۔ (نبی کریم ﷺ کا نام احمد آسمانوں میں زیادہ بولا جاتا ہے، عیسیٰ علیہ السلام نے بھی چونکہ آسمانوں پر زیادہ دیر زندگی گذارنی تھی اس لئے آپ نے احمد نام استعمال فرمایا) ان کے ساتھ جو ایمان لائے گا وہ میرے ساتھ بھی ایمان لانے والا ہوگا، ان کے ساتھ جو کفر کرے گا وہ میرے ساتھ بھی کفر کرے گا۔

پھر نجاشی نے حضرت جعفر بن ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ وہ شخص جس پر تم نے ایمان لایا ہے "وہ کیا کہتا ہے؟ اور کس چیز کا حکم دیتا ہے، اور کس چیز سے منع کرتا ہے۔

"قال يقرأ علينا كتاب الله ويأمرنا بالمعروف وينهى عن المنكر وأمر بحسن الجوار وصلة الرحم وبر اليتيم ويأمر بان نعبد الله وحده لا شريك له"

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا وہ اللہ کے نبی ہمیں اللہ کی کتاب پڑھ کر سناتے ہیں، اچھے کاموں کا ہمیں حکم دیتے ہیں، اور برے کاموں سے ہمیں منع کرتے ہیں۔

اور پڑوسیوں سے اچھا تعلق رکھنے کا حکم دیتے ہیں، اور صلہ رحمی کا حکم دیتے ہیں، صلہ رحمی کا مطلب یہ ہے کہ قریبی رشتہ داروں سے اچھا تعلق رکھنے کا حکم دیتے ہیں، اور یتیموں پر بھلائی کرنے کا حکم دیتے ہیں، اور ہمیں حکم دیتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں اور اسی کو صرف ایک معبود مانیں، اس کے ساتھ کوئی شریک نہ ٹھہرائیں۔

"قال اقرأ علي مما يقرأ عليكم" نجاشی نے کہا "اللہ کا کلام جو تمہارے نبی تمہیں سناتے ہیں، وہ ہمیں بھی پڑھ کر سناؤ"

"فقرأ علیهم سورة العنکبوت والروم ففاضت عین النجاشی، واصحابه من الدمع"
تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے انہیں سورۃ عنکبوت اور سورۃ روم پڑھ کر سنائیں، تو نجاشی اور اس کے دوسرے تمام ساتھیوں یعنی راہبوں اور اہل علم مبلغین کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں۔
"فقالوا زدنا یا جعفر من هذاالحدیث الضیب فقرأ علیهم سورة الکهف"
وہ تمام لوگ کہنے لگے اے جعفر یہ کتنا ہی پاکیزہ کلام ہے، یہ کلام ہمیں اور بھی سناؤ، تو آپ نے سورۃ "الکہف" ان کو پڑھ کر سنائی،

عمرو بن العاص نے نجاشی کو غضب دلانے کیلئے کہا کہ یہ مہاجرین تو عیسی علیہ السلام اور ان کی ماں کو گالی دیتے ہیں۔نجاشی نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ سے پوچھا تم عیسی علیہ السلام اور ان کی والدہ کے متعلق کیا عقیدہ رکھتے ہو؟ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے سورۃ مریم پڑھ کر سنائی، حضرت عیسی علیہ السلام اور حضرت مریم کے متعلق آیات کو سن کر، نجاشی نے اپنی مسواک سے آنکھ کی خاشاک کے برابر تھوک کو انگلی سے اٹھا کر کہا "والله مازاد المسیح علی مایقولون" قسم ہے اللہ تعالی کی عیسی علیہ السلام نے اپنے متعلق یا اپنی ماں کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں جو یہ کہتے ہیں۔یعنی قرآن پاک میں عیسی علیہ السلام اور ان کی والدہ کی وہی شان بیان کی گئی جو انجیل میں بیان کی گئی، نجاشی قرآن پاک میں عیسی علیہ السلام اور ان کی والدہ کی وہی شان بیان کی گئی جو انجیل میں بیان کی گئی۔

نجاشی نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو کہا "اذهبو افانتم سیوم بارضی" اب تم یہاں سے چلے جاؤ، میرے اس ملک میں تم آرام اور چین سے رہو (سیوم) حبشہ کی زبان میں "آمنون" امن میں رہنے کے معنی میں استعمال ہوتا تھا پھر نجاشی نے کہا آج کے بعد تم میرے ملک میں امن سے رہو کوئی تمہیں گالی نہیں دے گا، اور کوئی تمہیں اذیت (تکلیف) نہیں پہنچائے گا، خوش ہو کر رہو، کسی قسم کا خوف دل میں نہ رکھو، اور نجاشی نے یوں کہا:
"فلا دهورة الیوم علی حزب ابراهیم"
آج کے بعد ابراہیم علیہ السلام کے گروہ کی حفاظت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی جائے گی۔
"الدهورة جمعک الشیٔ کانه اراد لاضیعة علیهم ولا یترک حفظهم"
"دہورۃ" کا معنی ہے کسی چیز کو جمع کرنا اور اسے ضائع نہ ہونے دینا، اور اس کی حفاظت کو نہ چھوڑنا)

عمرو بن العاص نے پوچھا "ابراہیم کا گروہ" کون ہے؟ نجاشی نے کہا یہی لوگ ہیں اور وہ ذات ہے جس سے انہوں نے دین اسلام حاصل کیا ہے، اور اس نبی کے تمام متبعین "حزب ابراہیم" (ابراہیم علیہ السلام کا گروہ ہیں) عمرو بن العاص اور دوسرے مشرکین نے اس کا رد کیا، اور دعوی یہ کیا ہم ابراہیم علیہ السلام کا گروہ ہیں۔نجاشی نے

عمرو بن العاص پر غصہ کرتے ہوئے، اس کے مشرکین کی جانب سے لائے ہوئے تحفے واپس کر دیئے، اور کہا۔

"انما هديتكم الى رشوة فاقبضوها فان الله ملكني ولم ياخذ مني رشوة"

بیشک یہ تمہارا ہدیہ تو رشوت ہے، یہ تم واپس لے لو، بیشک اللہ تعالی نے مجھے بادشاہی عطاء فرمائی ہے، میں رشوت دیتا نہیں اور مجھ سے کوئی رشوت حاصل کرنے کی بھی امید نہ کرے۔

حضرت جعفر بن ابی طالب ﷺ فرماتے ہیں کہ ہمیں شاہی دربار سے بہتر گھروں میں رہنے کی اجازت دے دی گئی جن کے پڑوسی بھی اچھے تھے۔

یہ تمام واقعہ بیان کرنے کے بعد حضرت جعفر ﷺ فرماتے ہیں عمرو بن العاص اور عمارۃ بن معیط کا نجاشی کو یہ کہنا کہ ہم ابراہیم علیہ کا گروہ ہیں، ادھر تمام مشرکین بھی یہی کہہ رہے تھے تو

"وانزل الله تعالى ذلك اليوم على رسول الله ﷺ في خصومتهم في ابراهيم وهو بالمدينة قوله عزوجل "ان اولى الناس "الاية"

اللہ تعالی نے نبی کریم ﷺ پر یہ آیۃ کریمہ ﴿اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ﴾ مکمل نازل فرمائی کہ (بیشک زیادہ قریب سب لوگوں سے ابراہیم کے قریب وہ ہیں جنہوں نے ان کی تابعداری کی اور یہ نبی اور ایمان والے ہیں، اور اللہ والی ہے مؤمنون کا) یہ آیۃ کریمہ مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی، یعنی نبی کریم ﷺ جب مدینہ طیبہ میں ہجرت کر کے آچکے تھے۔

راقم کے ذہن میں بار بار یوں آرہا ہے:

کہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کا مکالمہ تیئس شب رمضان کا ہے اور آیۃ کریمہ کا نزول چھ ماہ بعد (ہجرت کے بعد) ہوا، کیونکہ بزرگان دین تیئس شب رمضان کو بڑے اہتمام سے عشاء کی نماز کے بعد سورۃ عنکبوت اور سورۃ روم پڑھتے رہے، بعض اوقات صرف سورۃ عنکبوت پر ہی اکتفاء کیا جاتا رہا، اور اصحاب علم کے گھروں میں گاؤں کی تمام عورتیں جمع ہوتی تھیں، وہاں بھی اصحاب علم کی عورتوں میں سے کوئی ایک ان کو سورۃ عنکبوت اور سورۃ روم سنائی۔

راقم کو اس کی اصل یہی نظر آئی کہ حضرت جعفر ﷺ نے نجاشی اور اس کے دربار میں آنے والے راہب، پادری وغیرہ کو یہی دو سورتیں سنائیں جن سے ان کے دل کانپ اٹھے اور آنسوؤں سے آنکھیں ڈبڈبا گئیں، اسی کی یاد میں بزرگان دین نے ان دونوں سورتوں کو تیئس شب رمضان کو پڑھنے کا معمول بنایا۔

"والله اعلم بالصواب واليه المرجع واليه المآب"

تاہم کوئی صریح قول مل گیا تو ان شاء اللہ نقل کر دیا جائے گا، ابھی تو بغیر کسی حوالہ کے صرف ذہنی سوچ کو لکھا ہے۔ (راقم)

تنبیہ: نجاشی حبشہ کے بادشاہ کا لقب تھا، کسی خاص شخص کا نام نہیں تھا، نبی کریم ﷺ نے دو نجاشیوں کی طرف خط لکھے تھے ایک یہ نجاشی جن کا تذکرہ ہو رہا ہے، ان کا نام مواہب لدنیہ میں "اصـمـحـه" بیان کیا گیا ہے۔ یعنی وہ نجاشی جن کا نام اصحمہ تھا ان کی طرف مسلمان ہجرت کر کے گئے تھے، اور ان کی طرف نبی کریم ﷺ نے خط مبارک بھیجا تھا اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا، اگر چہ وہ اپنی بادشاہی مصروفیات اور نبی کریم ﷺ کے حکم سے حبشہ میں رہے اور مدینہ طیبہ میں آ کر نبی کریم ﷺ کی صحبت اختیار نہ کر سکے اور نہ ہی زیارت سے مشرف ہو سکے، البتہ نجاشی رحمہ اللہ کے ہاتھ پر ایمان لانے والے کئی حضرات کو مدینہ طیبہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہونے اور زیارت سے مشرف ہونے کی وجہ سے مقام صحابیت حاصل ہو گیا، لیکن خود نجاشی تابعی رہے۔

ان کی وفات پر نبی کریم ﷺ ان کا جنازہ مدینہ طیبہ میں پڑھا، یہ آپ کی خصوصیت تھی یا آپ کے سامنے سے حجاب اٹھا دئے گئے تھے اور جنازہ آپ کے سامنے تھا، زیادہ تفصیل ان شاء اللہ دسویں پارہ میں جنازہ کے مسائل کے ضمن میں آئے گی، اصحمہ نجاشی رحمہ اللہ کے بعد جو حبشہ کا حاکم بنا اس کا لقب بھی نجاشی تھا، اس کی طرف بھی نبی کریم ﷺ نے خط بھیجا تھا لیکن اس کے ایمان لانے کا ثبوت نہیں ملتا، یہی وجہ ہے کہ مسلم شریف کی ایک روایت میں یوں ذکر ہے۔

"عن انس ان نبی اللہ ﷺ کتب الی کسری والی قیصر والی النجاشی والی کل جبار یدعوھم الی اللہ ولیس بالنجاشی الذی ﷺ"

(مسلم ج ۲ ص ۱۰۷، باب کتب النبی ﷺ الی ملوک الکفار یدعوھم الی الاسلام)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے کسریٰ اور قیصر اور نجاشی (یعنی فارس کے بادشاہ اور روم کے بادشاہ اور حبشہ کے بادشاہ) کو خطوط لکھے اور تمام جابر کافر بادشاہوں کو خط لکھے ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی (یعنی دعوت اسلام دی) لیکن نجاشی وہ مراد نہیں جن کی نماز جنازہ نبی کریم ﷺ نے پڑھائی تھی، اس حدیث سے ہی تقریباً یہ بات سمجھ آ رہی ہے کہ حدیث پاک میں ان بادشاہوں کا ذکر ہے جن کو نبی کریم ﷺ نے دعوت اسلام دی اور انہوں نے اسے قبول نہیں کیا، وہ جابر اور ظالم اور کافر ہی رہے، یقیناً اس نجاشی سے مراد وہ نجاشی ہے جس نے اسلام قبول نہیں کیا، جس نجاشی کے ایمان لانے کا ذکر ہے وہ اور ہیں۔

غلطی کی وجہ صرف یہ ہے کہ لوگوں نے نجاشی نام سمجھ لیا ہے، یہ نہیں سمجھا کہ حبشہ کے ہر حاکم کو نجاشی کہا جاتا

تھا۔اور یہ بھی نہ سمجھا کہ نبی کریم ﷺ دو نجاشیوں کو خطوط لکھے،ایک نے ایمان قبول کیا اور ایک نے ایمان قبول نہیں کیا۔ (ماخوذ از مدارج النبوۃ ج ۲ بوضاحت کثیرہ)

عمرو بن العاص کا مائل باسلام ہونا:

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے جب نجاشی کے دربار میں اس بابرکت انقلاب کے خدوخال وضاحت سے بیان کئے جس سے نبی کریم ﷺ سے نبی کریم ﷺ کی غلامی نے انہیں مالا مال کر دیا تھا،تو ان کی تقریر کی اثر انگیزی کا یہ عالم تھا کہ درباری میں حاضر رئیسوں اور پادریوں کے علاوہ خود بادشاہ کی آنکھیں بھی اشکبار ہوگئیں،نہ صرف نجاشی اور اس کے متعدد باری حلقہ بگوش اسلام ہو گئے بلکہ اہل مکہ کا جو وفد مسلمان مہاجرین کو حبشہ سے باہر کرنے کا مشن لے کر وہاں گیا تھا،اس کا سربراہ عمرو بن العاص بھی حضرت جعفر کے دلآویز حسن بیان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔وہ گیا تھا مسلمان درویشوں کو شکار کرنے کیلئے،لیکن مرد حق کی زبان کی کمان سے کلمۂ حق کا ایک تیر اس کو بھی گھائل کر گیا،

علامہ ابن عبدالبر ''الاستیعاب'' میں لکھتے ہیں:

''انه لم يات من ارض الحبشه الامعتقداللاسلام''

یعنی عمرو بن العاص جب حبشہ کی سرزمین سے واپس آئے تو ان کا دل اسلام کی حقانیت کو تسلیم کر چکا تھا،اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک روز نجاشی نے عمرو بن العاص کو اپنے پاس بلایا اور اسے کہا

''يا عمر و كيف يعزب عنک امر ابن عمک؟فو الله انه لرسول الله حقا''

اے عمرو تجھ سے اپنے چچازاد کی حقیقت کیسے مخفی رہی بخدا وہ اللہ کے سچے رسول ہیں،عمرو نے ازراہ حیرت نجاشی سے پوچھا ''**انت تقول هذا**'' اے نجاشی تم بھی ان کی نبوت کو تسلیم کرتے ہو؟

''**قال النجاشي اى و الله فاطعني**'' نجاشی نے کہا ہاں بخدا میں ان کو اللہ کا رسول مانتا ہوں۔تم بھی اس بات میں میری پیروی کرو (یعنی تم بھی ایمان لے آؤ) علامہ ابن عبدالبر لکھتے ہیں:

''فخرج من عنده مهاجرا الى النبى ﷺ فاسلما قبل خيبر و الصحيح انه قدم مسلما على رسول الله ﷺ فى صفر سنة ثمان قبل الفتح بستة اشهر وهو وخالدبن الوليد وعثمان بن طلحة وكان هم بالاقبال الى رسول الله ﷺ فى حين انصرافه من الحبشة ثم لم يعزم له الى الوقت الذى ذكرنا'' والله اعلم''

پس عمرو بن العاص نجاشی کے پاس سے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کی نیت سے روانہ ہوئے فتح خیبر سے

چھ مہینے پہلے آکر مسلمان ہوئے۔ لیکن صحیح روایت یہ ہے کہ وہ ۸ ہجری ماہ صفر میں فتح مکہ سے پہلے چھ ماہ حضرت خالد بن ولید اور حضرت عثمان بن طلحہ کے ہمراہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوئے جب وہ حبشہ سے روانہ ہوئے تھے تو ان کا ارادہ فورا بارگاہ رسالت میں حاضر ہونے کا تھا، لیکن وہ ایسا نہ کر سکے اور اس وقت حاضر ہوئے جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا" واللہ اعلم" (الاستیعاب ج ۲ ص ۵۰۲)

حافظ ابن حجر الاصابہ میں زبیر بن بکار مشہور ماہر علم انساب سے نقل کرتے ہیں:

"کہ عمرو بن العاص نے نجاشی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا جب کہ وہ حبشہ میں تھے" مہاجرین حبشہ کی ہجرت کی جو گوناگوں برکات ظاہر ہوئیں ان کا خلاصہ آپ نے ملاحظہ فرمایا، اور اگر ان کی ہجرت کی صرف یہی ایک برکت ہوتی کہ عمرو بن العاص جیسی نابغہ روزگار شخصیت نے اسلام قبول کر لیا تو یہ بھی کچھ کم نہ تھی۔ (ضیاء النبی ج ۳ ص ۴۱)

❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀

﴿وَدَّتْ طَّائِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ۝﴾ (آیة نمبر ٦٩)

(1) کتابیوں کا ایک گروہ دل سے چاہتا ہے کہ کسی طرح تمہیں گمراہ کر دیں اور وہ اپنے ہی آپ کو گمراہ کرتے ہیں اور انہیں شعور نہیں۔

(2) تمنا کی ایک گروہ اہل کتاب نے کاش کہ وہ گمراہ کر دیں تمہیں، حالانکہ وہ نہیں گمراہ کرتے سوائے اپنی جانوں کے اور نہیں وہ سمجھ رکھتے۔

ماقبل سے تعلق:

اس سے پہلے اللہ تعالی نے اہل کتاب (یہود و نصاری) کا ذکر کیا کہ وہ حق سے پھر جاتے ہیں، اور دلائل کو قبول کرنے سے اعراض کرتے ہیں۔ اب بیان کیا جارہا ہے کہ وہ صرف اسی پر اقتصار نہیں کرتے بلکہ وہ کوشش کرتے ہیں کہ جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ پر ایمان لایا ہے ان کو (معاذ اللہ) گمراہ کر دیا جائے۔ ان کو وہ اپنے باطل گمان کے مطابق گمراہ کرنے کیلئے ان کے دلوں میں شبہات ڈالتے تاکہ یہ راہ حق سے پھر جائیں، لیکن مسلمانوں کو وہ راہ راست سے نہ بھٹکا سکے۔ مسلمانوں کے دلوں میں اس طرح کے شبہات ڈالتے۔

"ان محمد(ﷺ)مقر بموسی وعیسی ویدعی لنفسه النبوة"

بیشک محمد (ﷺ) موسی علیہ السلام اور عیسی علیہ السلام کا اقرار بھی کرتے ہیں کہ وہ نبی تھے پھر اپنی نبوت کا بھی دعوی کرتے ہیں۔ حالانکہ چاہئے یہ تھا کہ یہ موسی علیہ السلام کے امتی ہونے کا دعوی کرتے یہ یہود نے کہا اور نصرانیوں نے یہ کہا کہ ان کو عیسی علیہ السلام کا امتی ہونے کا دعوی کرنا چاہئے تھا، ان جاہلوں کو یہ بھی سمجھ نہ آسکا کہ ہر نبی نے دوسرے نبی کی نبوت کا اقرار بھی کیا کہ وہ سچے نبی تھے لیکن اپنی نبوت کا دعوی بھی کیا، اس میں کوئی تقابل نہیں پایا گیا۔

"وایضا ان موسی علیہ السلام اخبر فی التوراة بان شرعه لا یزول"

اور مسلمانوں کے دلوں میں یوں شک ڈالتے کہ موسی علیہ السلام نے توراۃ میں خبر دی ہے کہ ان کی شریعت میں زوال نہیں آئے گا اور محمد (ﷺ) کہتے ہیں کہ ان کی شریعت منسوخ ہوگئی، منسوخ کا دعوی کرنا تو باطل ہے۔ یہودیوں کا یہ قول سراسر جھوٹا تھا، موسی علیہ السلام نے تو نبی کریم ﷺ کے اوصاف بیان فرمائے تھے ان میں یہ بھی ذکر کیا تھا کہ ان کی

شریعت پہلی شریعتوں کو منسوخ کردے گی۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ یہودیوں کے نمک خوار، اوران کے غمخوار اوران کے یار لوگوں نے بھی یہی کہا کہ قرآن پاک کی بعض آیات کو منسوخ کہنا باطل ہے، یہ نیچریوں اور قادیانیوں کا قول ہے۔

"والغرض منه تنبيه المؤمنين على ان لا يغتروا بكلام اليهود"

اس آیۃ کریمہ کو نازل فرما کر مومنوں کو تنبیہ کردی کہ تم یہود کے کلام سے دھوکے میں نہ آنا ورنہ وہ تمہیں گمراہ کردیں گے۔(مقام افسوس قرآنی تعلیمات سے دور ہو کر لوگ آجکل نام نہاد مسلمان یہودیوں اور نصرانیوں کے ہمنوا بنے بیٹھے ہیں، نام تو مسلمانوں والے ہیں لیکن کام یہودیوں اور نصرانیوں والے ہیں)۔رب تعالیٰ نے اور آیات کریمہ میں بھی اسی مضمون کو ذکر فرمایا ہے:

﴿وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ﴾

بہت کتابیوں نے چاہا کاش تمہیں ایمان کے بعد کفر کی طرف پھیر دیں۔ (سورۃ البقرۃ آیۃ نمبر ۱۰۸)

اور ارشاد فرمایا﴿وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً﴾ (سورة النساء آية نمبر ٨٩)

وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ کہیں تم بھی کافر ہو جاؤ جیسے وہ کافر ہوئے تو تم سب ایک سے ہو جاؤ۔ (کبیر)

شان نزول: یہود کے مختلف قبائل بنی قینقاع، بنی نضیر اور بنی قریضہ اور نجران کے عیسائیوں نے حضرت معاذ اور حضرت حذیفہ اور اور حضرت عمار ﷺ کو اپنے دین میں آنے کی دعوت دی۔

"وقال ابن عباس هم اليهود قالوالمعاذ وعمار تركتما دينكما واتبعتما دين محمد"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہود نے حضرت معاذ اور عمار کو کہا کہ تم نے اپنے دین کو چھوڑ کر محمد کے دین کی تابعداری کیوں کرلی، آؤ اپنے دین کی طرف لوٹ آؤ، تو اس وقت رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا'' کہ اہل کتاب یعنی یہود ونصاری کا ایک گروہ تمنا کرتا ہے کہ کاش وہ تمہیں گمراہ کرسکیں، حالانکہ وہ اپنے آپ کو ہی گمراہ کررہے ہیں(کیونکہ ان کے گمراہ کرنے کا وبال ان پر ہی لوٹ کر آتا ہے)اور وہ سمجھ نہیں رکھتے۔(البحر المحیط)

﴿وَدَّتْ طَّائِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ﴾

تمنا کی ایک گروہ اہل کتاب نے کاش وہ گمراہ کردیں تمہیں''

وقال ابو مسلم الاصبهاني وبمعنى تمنى فستعمل معها لو،و،ان،وربما جمع بينهما فيقال وددت ان لو فعل"

ابو مسلم اصبہانی کہتے ہیں کہ "ود" تمنا کے معنی میں استعمال ہے، اس کے ساتھ کبھی "لو" آجاتا ہے اور کبھی "ان" آجاتا ہے، اور کبھی لو اور ان دونوں آجاتے ہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے "وددت ان لو فعل" میری تمنا یہ تھی کہ وہ یہ کرتا۔

"ودد" الود محبة الشئ وتمنى كونه ويستعمل فى كل واحد من المعنيين على ان التمنى يتضمن معنى الود لان التمنى هو تشهى حصول ماتوده"

"الود" کا معنی ہے کسی چیز کی محبت کرنا اور اس کے پائے جانے کی تمنا کرنا، البتہ ہر ایک معنی دوسرے کو شامل ہوتا ہے، کیونکہ تمنا محبت کے معنی کو شامل ہے اسلئے کہ جس چیز کی محبت ہوگی اسی کے حصول کی خواہش ہوگی، جس طرح اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ہے۔ ﴿وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَّرَحْمَةً﴾ اور اس نے بنائی ہے تمہارے درمیان محبت ورحمت، اس مقام میں "مودة" محبت اور تمنا دونوں معنوں کو شامل ہے۔ اور کبھی "مودة" صرف محبت کے معنی میں استعمال ہوتی ہے، جیسا کہ ﴿قُلْ لَّا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى﴾ (فرمادو نہیں سوال کرتا میں تم سے اس پر سوائے اہل قرابت کی محبت کے) یہاں "مودة" صرف محبت کے معنی میں استعمال ہے۔ اور کبھی صرف تمنا کے معنی میں استعمال ہوتی ہے جیسا کہ ﴿وَدَّتْ طَّائِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ﴾ (اور تمنا کی ایک گروہ اہل کتاب نے کاش کہ وہ تمہیں گمراہ کردیں)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

(من اهل الكتاب) فى موضع الصفة لطائفة، والطائفة رؤساؤهم واحبارهم، وقال ابن عطية ويحتمل من ان تكون لبيان الجنس، وتكون الطائفة جميع اهل الكتاب"

یہاں ترکیبی لحاظ پر دو احتمال ہیں کہ "من اهل الكتاب" "طائفة" کی صفت ہو، اور طائفہ سے مراد، اہل کتاب کے رئیس اور پادری ہوں گے، اس صورت میں معنی ہوگا "تمنا کی ایک گروہ اہل کتاب نے" یعنی اہل کتاب کے رئیسوں اور پادریوں نے تمنا کی، اور دوسری ترکیب یہ ہے کہ "من" بیانیہ ہو، اور "طائفة" سے مراد تمام یہود اور نصاری ہوں، لیکن جنس اہل کتاب کا بیان ہو افراد کا نہ ہو، اس صورت میں معنی یہ ہوگا۔ "تمنا کی اہل کتاب کے کسی ایک گروہ نے۔ (از البحر المحیط)

لیکن اگر مراد طائفہ سے اہل کتاب کے تمام افراد ہوں تو "من" تبعیضیہ ماننا ضروری ہو جائے گا۔

وایلم ان "من" ههنا للتبعيض وانما ذكر بعضهم ولم يعممهم لان منهم من آمن والنى

الله عليهم بقوله "منهم امة مقتصده" (ان میں کوئی اگروہ اعتدال پر ہے)

اور ارشاد فرمایا ﴿لَيْسُوْا سَوَاءً مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَّتْلُوْنَ آيَاتِ اللّٰهِ آنَاءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ﴾ (سب برابر نہیں، کتابیوں میں کچھ وہ ہیں کہ حق پر قائم ہیں اللہ کی آیتیں پڑھتے ہیں رات کی گھڑیوں میں اور سجدہ کرتے ہیں) اس سے مراد چالیس مرد اہل نجران کے بتیس (۳۲) حبشہ کے اور آٹھ روم کے ہیں جو دین عیسوی پر تھے پھر سید عالم ﷺ پر ایمان لے آئے، (خزائن العرفان)

"من" تبعیضیہ کی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ "تمنا کی گروہ یہود و نصاری سے بعض نے " (ماخوذ از کبیر)

﴿لَوْيُضِلُّوْنَكُمْ﴾ "کاش کہ وہ گمراہ کردیں تمہیں"

وانما قال (لويضلونكم) ولم يقل ان يضلوكم لان "لو" للتمنى فان قولك لو كان كذايفيد التمني ونظيره قوله تعالى (يوداحدهم لويعمر الف سنة)

رب تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿لَوْيُضِلُّوْنَكُمْ﴾ اور یہ ارشاد نہیں "ان يضلوكم" اس لئے کہ "لو" یہاں تمنی کیلئے استعمال ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے "لو كان كذا" کاش کہ ایسا ہوتا، اسی طرح رب تعالی کے ارشاد گرامی ﴿يَوَدُّ اَحَدُهُمْ اَلْفَ سَنَةٍ﴾ (اور مشرکوں سے) ایک کو تمنا ہے کاش کہ اسے عمر دی جاتی ہزار سال) میں بھی "لو" تمنی کے معنی میں استعمال ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

تاہم بعض حضرات نے "لو" کو "ان مصدريه" کے معنی میں بھی لیا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا "تمنا کی ایک گروہ اہل کتاب نے تمہیں گمراہ کرنے کی" (ماخوذ از مظہری)

لیکن جب "ودت" کا معنی "تمنا کی" لیا جائے، اور "لو" کو بھی تمنی کیلئے بنایا جائے اور اسے ماقبل کا بیان بنایا جائے تو معنی میں خوبصورتی نظر آئے گی۔

﴿وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ﴾ "حالانکہ وہ نہیں گمراہ کرتے سوائے اپنی جانوں کے۔"

یعنی اگرچہ وہ تمنا یہ رکھتے ہیں کہ کاش وہ مومنوں کو گمراہ کردیں، لیکن درحقیقت وہ اپنے آپ کو ہی گمراہ کر رہے ہیں۔

(وما يضلون الاانفسهم) وهو وجوها، منها اهلاكم انفسهم باستحقاق العقاب على قصدهم اضلال الغير وهو كقوله تعالى "وما ظلمونا ولكن كانوا انفسهم يظلمون"

رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَمَا يُضِلُّونَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ﴾ کے چند مطالب ہیں:

(۱) ان میں سے ایک یہ ہے کہ "اضلال" کا معنی "اہلاک" کیا جائے کہ وہ صرف اپنی جانوں کو ہلاک کر رہے ہیں کیونکہ جب وہ مؤمنوں کو گمراہ کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اپنے آپ کو عذاب اور ہلاکت کا مستحق بناتے ہیں۔ یہ اسی طرح ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ اور انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا، لیکن وہ اپنے نفسوں پر ظلم کرتے رہے۔

(۲) ومنها اخرجهم انفسهم عن معرفة الهدى والحق لان الذاهب عن الاهتداء يوصف بانه ضال"

دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ مؤمنوں کو وہ گمراہ کرنے کی تمنا اس لئے کرتے ہیں کہ وہ خود ہدایت اور معرفت کی راہ سے دور ہیں، جو ہدایت کی راہ سے دور ہو جائے وہ گمراہ ہی ہوتا ہے۔ "یعنی وہ اپنے آپ کو ہی گمراہ کر رہے ہیں۔

(۳) ومنها انهم لما اجتهدوا في اضلال المؤمنين ثم ان المؤمنين لم يلتفتوا اليهم فهم قدصاروا خائبين خاسرين حيث اعتقدوا اشيا ولاح لهم ان الامر بخلاف ما تصوروه"

تیسرا مطلب یہ ہے کہ "اضلال" کا معنی ہے "رسواء کرنا، اور خسارے میں ڈالنا، اب معنی یہ ہوگا کہ وہ نہیں رسوا کر رہے اور نہیں خسارے میں ڈال رہے سوائے اپنی جانوں کے۔ کیونکہ جب انہوں نے مؤمنوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی، لیکن مؤمنوں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی تو وہ رسوا ہو گئے، اور خسارے میں رہے، اسلئے کہ جب ان کا اعتقاد یہ تھا کہ وہ مؤمنوں کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے، ان کے تصور کے خلاف ہوا تو ان کی اپنی جانوں کیلئے رسوائی اور خسارہ حاصل ہوا۔ (ماخوذ از کبیر)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

"وما يضلون الاانفسهم جملة حالية جيئى بها للدلالة على كمال رسوخ المخاطبين وثباتهم على ما هم عليه من الدين القويم اى وما يتخطاهم الاضلال ولا يعودوباله الااليهم لما انه يضاعف به عذابهم"

﴿وَمَا يُضِلُّونَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ﴾ جملہ حالیہ ہے، جملہ حالیہ لانے کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ مخاطبین کو کامل راسخ ہیں (پختہ عقیدہ رکھنے والے ہیں) اور دین قویم پر ثابت اور قائم ہیں، گمراہ کرنا ان کی طرف قدم نہ بڑھا سکا یعنی یہود کا گمراہ کرنا انہیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکا، ان کے مؤمنوں کو گمراہ کرنے کی تمنا کا وبال ان کی طرف ہی لوٹا، کیونکہ وہ دوگنا عذاب کے مستحق ٹھہرے۔ (روح البیان)

﴿وَمَا يَشْعُرُوْنَ﴾ ''اور نہیں وہ سمجھ رکھتے''

"(وما يشعروون)ان ذلك الضلال هو مختص بهم" اور وہ سمجھ نہیں رکھتے کہ بیشک یہ گمراہی ان کے ساتھ ہی خاص ہے۔ یعنی ان کے دل بہت سخت ہو گئے، اور ان پر یہ معاملہ مخفی اور دقیق (باریک) رہا۔

"فهم لا يعلمون انهم يضلون انفسهم" اس لئے وہ سمجھ نہیں کہ بیشک وہ تو اپنے نفسوں کو ہی گمراہ کر رہے ہیں۔

"ودل ذلك على ان من اخطأ الحق جاهلا كان ضالا" اسی سے یہ پتہ چل گیا کہ جو حق سے جاہلانہ طریقے سے پھر گیا وہ گمراہ ہے۔

''(وما يشعرون)انهم لا يصلون الى اضلالكم'' یعنی وہ سمجھ نہیں رکھتے اے مؤمنین کہ وہ تمہیں گمراہ نہیں کر سکتے ''او لا يفطنون صحة الاسلام'' یا اس کا اور مطلب یہ ہے کہ وہ اسلام کی صحت وحقانیت کی سمجھ نہیں رکھتے، حالانکہ ان پر واجب تھا کہ وہ اسلام کی حقانیت کو واضح دلائل سے سمجھتے اور اس پر ایمان لاتے۔ (یہ قرطبی نے ذکر کیا ہے)

او(وما يشعرون)ان الله يدل المسلمين على حالهم ويطلعهم على مكرهم وضلالتهم'' (ذکرہ ابن الجوزی)

ابن جوزی نے ذکر فرمایا ہے کہ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ وہ اس بات کی سمجھ نہیں رکھتے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی راہنمائی فرماتا ہے اور ان کو ہمارے مکر وفریب پر اور ہمارے گمراہ کرنے کی تمنا پر ان کو مطلع کر دیتا ہے۔ (ماخوذ از البحر المحیط)

نصیحت عظیمہ:

تفسیر روح البیان نے اس مقام پر بہت نفع مند نصیحت ذکر فرمائی ہے طلباء کرام کے فائدہ کیلئے عربی عبارت بمع ترجمہ نقل کر رہا ہوں۔

''اعلم ان الله تعالى لما بين ان من طريقة اهل الكتاب العدول عن الحق والاعراض عن قبول الحجة بين انهم لا يقتصرون على هذاالقدر بل يجتهدون فى اضلال من آمن بالرسل عليه السلام بالقاء الشبهات،فعلى العاقل ان لا يضل عن الطريق القويم بالقاء ات كل شيطان رجيم من ضلال الانس والجان،اصلحهم الله الملك المنان وماذابعد الحق الاالضلال''

یہ بات جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے جب یہود ونصاریٰ کا طریقہ بیان فرمایا کہ وہ اسی قدر پر اقتصار نہیں کریں گے بلکہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے والوں کو گمراہ کرنے کی پوری کوشش کریں گے ان کے دلوں میں طرح طرح کے شبہات ڈالیں

گے، عقل مند شخص کو چاہئے کہ وہ راندے ہوئے شیطان کے شبہات ڈالنے سے راہ راست سے نہ بھٹکے وہ راندہ ہوا شیطان خواہ انسان ہو یا جن، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی حالت کو درست رکھے، اسلئے کہ حق سے پھرنے کے بعد تو فقط گمراہی ہے، لھذا مسلمانوں کو چاہئے وہ گمراہی سے بچ کر رہیں۔

❁ قال ابن مسعود ﷺلما دنا فراق رسول الله ﷺ جمعنافی بیت امنا عائشة رضی الله عنها ثم نظر الینا فد معت عیناه وقال(مرحباکم الله رحمکم الله اوصیکم بتقوی الله وطاعته قد دنا الفراق وحان المنقلب الی الله ولی سدرة المنتهی والی جنة الماوی یغسلنی رجال اهل بیتی ویکفنونی فی ثیابی هذه ان شاء واوفی حلة یمانیة فاذاغسلتونی و کفنتمونی علی سریری فی بیتی هذا علی شفیر لحدی ثم اخرجواعنی ساعة فاول من یصلی علی حبیبی جبریل علیه السلام ثم میکائیل ثم اسرافیل ثم ملک الموت مع جنودهم،ثم ادخلواعلی فوجاصلواعلی)فلما سمعوافراقه صاحواوبکواوقالوایارسول الله ﷺ انت رسول ربنا شمع جمعنا وسلطان امرنا اذاذهبت عنا فالی من نراجع فی امورنا،قا(ترکتم علی المحجة البیضاء)ای علی الطریق الواسع الواضع لیلها کنهارها فی الوضوح ولایزیغ بعدها الی غیرها الاهلاک،وترکت لکم واعظین ناطقاوصامتا فالنا طق القرآن والصامت الموت فاذااشکل علیکم امر فارجعوا الی القرآن والسنة واذاقساقلبکم فلینوه بالاعتبار فی احوال الاموات"

حضرت ابی مسعود ﷺ فرماتے ہیں، جب رسول اللہ ﷺ کا دنیا سے تشریف لے جانے کا وقت قریب آ گیا تو ہم ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر جمع ہوئے، پھر آپ نے ہماری طرف دیکھا تو آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اور فرمایا "مرحبابکم" (تمہارا آنا اچھا ہے) اللہ تعالیٰ تمہاری زندگی میں برکت عطاء فرمائے، اور اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے، میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے تقوی رکھنا اور اطاعت کرنا، تحقیق فراق ہمارے قریب آ چکا ہے، اور اب اللہ تعالیٰ کی طرف اور سدرة المنتهی اور جنة المأوی کی طرف جانے کا وقت قریب آ گیا ہے، اور مجھے میرے اہل بیت کے مرد غسل دیں، اور اگر وہ چاہیں تو مجھے ان کپڑوں میں ہی کفن دے دیں، اور اگر چاہیں تو مجھے یمنی چادروں میں کفن دے دیں، جب تم مجھے غسل دے دو اور کفن پہنا دو، تو میری چارپائی کو اسی حجرہ میں لحد کے ایک کنارے پر رکھ دینا، پھر تم سب کچھ وقت کیلئے نکل جانا۔

سب سے پہلے میرے حبیب جبریل مجھ پر جنازہ پڑھیں گے، پھر میکائیل، پھر اسرافیل، پھر ملک الموت، ان فرشتوں کے ساتھ اور فرشتوں کے لشکر بھی ہوں گے جو میرا جنازہ پڑھیں گے، پھر فوج درفوج تم آکر میرا جنازہ

پڑھنا، جب آپ کے صحابہ نے یہ سنا کہ فراق واقع ہو رہا ہے تو ان کی چیخیں نکل گئیں (یعنی وہ پریشان ہو گئے "صــاحــوا" کا یہ مطب نہیں کہ انہوں نے چلانا شروع کر دیا) اور آنسو نکل آئے، اور انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ ہمارے رب کے رسول ہیں، اور آپ ہی ہماری شمع محفل ہیں، اور آپ ہی ہمارے امور کے والی ہیں، جب آپ تشریف لے جائیں گے تو ہم اپنے امور میں کس کی طرف رجوع کریں گے، (یعنی اپنے معاملات) کس کے پاس لے جائیں گے؟) تو آپ نے فرمایا تمہارے پاس روشن دلائل تمہارے پاس چھوڑ کر جا رہا ہوں (یعنی اتنا واضح راستہ چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ جس میں رات کو بھی دن کی طرح کوئی بھٹک نہیں سکے گا، اور اس روشن دین کو چھوڑ کر اور راستہ اختیار کرنے والا اپنے آپ کو تباہ و برباد کر دے گا، اور آپ نے فرمایا اور میں تمہارے لئے دو چیزیں نصیحت کرنے والی چھوڑ کر جا رہا ہوں، ایک بولنے والی چیز ہے، اور دوسری خاموش ہے، بولنے والی چیز قرآن پاک ہے، اور خاموش چیز موت ہے، جب تمہیں اپنے معاملات میں مشکل درپیش آئے تو قرآن وسنت کی طرف رجوع کرنا، اور جب تمہارے دل سخت ہو جائیں تو موت کے احوال سے عبرت پکڑتے ہوئے ان کو نرم کر لینا۔ (انتہی)

روح البیان نے یہ روایت جو ذکر کی ہے راقم کی نظر سے کہیں اور نہیں گذری۔ واللہ اعلم بالصواب۔

جہاں اے پسر ملک جاوید نیست زدنیا وفاداری امید نیست

جہاں اے لڑکے ہمیشہ رہنے والا ملک نہیں، دنیا سے وفاداری کی امید نہیں ہے۔

فائدہ: لوگ اعتقاد وعمل میں مختلف ہیں، بعض وہ ہیں جو مضبوط قلعہ کی طرح اپنے اعتقاد میں پختہ ہوتے ہیں، وہ کبھی اپنے اعتقادات سے نہیں پھرتے خواہ انہیں گمراہ کرنے میں سب لوگ متفق ہو جائیں تو پھر بھی ان کو اپنی راہ سے وہ ہٹا نہیں سکتے، یہ ہیں انبیاء کرام اور اولیاء کرام اور چیدہ چیدہ مؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اگر تمام پردے اٹھ جائیں تو میرا یقین زیادہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ مجھے تو پہلے ہی یقین محکم حاصل ہے، حضرت علی ﷺ کے ارشاد کے الفاظ یہ ہیں، "لو کشف الغطاء ماازددت یقینا" اور بعض لوگ ضعیف اعتقاد رکھتے ہیں، ان کو اس میں متانت (پختگی) حاصل نہیں ہوتی "تذروہ ریاح الھوی حیث شاء بعد ان لم تساعدہ لہ العنایۃ الازلیۃ" ایسے شخص کو خواہشات کی ہوائیں جہاں چاہیں اڑا کر لے جاتی ہیں، اصل وجہ اس کی یہ ہوتی ہے کہ اسے رب تعالیٰ کی طرف سے ازلی عنایت حاصل نہیں ہوتی۔

❁ قال رسول اللہ ﷺ الناس کمعادن الذھب والفضۃ"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگ سونے اور چاندی کے معاذن کی طرح ہیں۔

حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں میں سے ہر شخص اپنے اعمال، اخلاق اور اقوال کا معدن ہے، لیکن لوگ اس میں مختلف درجات رکھتے ہیں جس طرح سونے اور چاندی کے معادن مختلف ہوتے ہیں، شرح مصباح میں ذکر کیا گیا ہے، کہ حدیث پاک میں اس طرف اشارہ ملتا ہے۔

"ان ماضی معادن الطباع من جواهر مكارم الاخلاق ينبغی ان تستخرج برياضة النفوس كما يستخرج الجواهر من المعادن بالمقاساة و التعب"

جیسے جواہر کو ان کے معادن سے بہت سخت محنت ومشقت سے نکالا جاتا ہے، ایسے ہی طبیعتوں کے معادن سے مکارم اخلاق کے جواہر (موتیوں) کو ریاضت وعبادت کے ذریعے نکالا جاسکتا ہے۔

کیا خوب کسی نے کہا:

بقدر الكد تكتب المعالی   ومن طلب العلی سهر الليالی

جتنی قدر زیادہ محنت ومشقت پائی جائے گی اتنی قدر بلندی حاصل ہوگی۔ جو شخص بلندی کو طلب کرنا چاہتا ہے وہ راتوں کو جاگے (اور اللہ کو یاد کرے)

تروم العز لم تنام ليلا   يغوص البحر من طلب الآلی

تو عزت کا ارادہ کرتا ہے پھر رات کو سوجاتا ہے، ایسا شخص تو موتیوں کی طلب میں دریا میں غوطے ہی کھاتا رہتا ہے۔

"فلا بد من الاجتهاد والا ستمداد من الابدال والاوتاد لعل الله يسهل سلوك هذا الطريق ويخلص من خطر هذا البحر العميق"

اے انسان اگر تو راہ سلوک کو اختیار کرنا چاہتا ہے اور مقام ولایت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تو عبادت وریاضت اختیار کر، عبادت کرنے میں مکمل محنت وکوشش کر، اور ابدال واوتاد (اللہ کے نیک بندوں، اولیاء کرام) سے امداد طلب کر، تاکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم اور اولیاء کرام کی برکت سے تمہارے لئے راہ سلوک کو آسان کردے، اور اس گہرے سمندر کے خطرات سے تمہارے لئے آسانی پیدا کردے،

باری کہ آسمان وزمین سرکشید ازاں   مشکل بود بیاوری جسم وجان کشید
ہمت قوی کن از مدد راہروان عشق   کان بار را بقوت ہمت تواں کشید

ایک بار آسمان وزمین نے سر اس سے کھینچ لیا، تو جسم وجان سے اسے لانا مشکل ہوگا، ہمت کو عشق کی راہ پر چلنے والوں کی امداد سے قوی کر، پھر اس بوجھ کو ہمت وطاقت سے کھینچ سکے گا۔

مطلب واضح ہے کہ رب تعالیٰ کی قربت کی راہ رب تعالیٰ کی رحمت سے ملتی ہے، رب تعالیٰ کی رحمت اگر اس

سے دور ہو جائے تو اپنے جسم و جان کی محنت و مشقت کام نہیں آسکے گی۔ ہاں اگر اس راہ سلوک میں انسان اپنے آپ کو مضبوط کرنا چاہتا ہے تو اس راہ سلوک پر چلنے والوں سے امداد طلب کرے، پھر ان کی دعاء کی برکت کی وجہ سے اسے قوت و ہمت حاصل ہو جائے گی اور اس راہ پر چلنے میں درپیش آنے والی مشکلات دور ہو جائیں گی۔

مقام افسوس: آجکل تمام ممالک اسلامیہ خواہشات کی آندھیوں کی گردش میں ہیں، کفار سے خائف ہیں، کافروں سے صلح کی راہیں تلاش کرتے پھرتے ہیں، اور مسلمانوں کا قتل عام کر رہے ہیں، یہود و نصاری کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں، ادھر سے جو اشارہ ملتا ہے وہی ممالک اسلامیہ کے سربراہان راگ الاپتے ہیں۔ کاش کہ اسلامی تعلیمات پر عمل ہو جائے، یہود و نصاری سے دوستی کو چھوڑ دیا جائے، یہود و ہنود و نصاری کے خوف کو دل سے نکال دیا جائے، مسلمان ایک دوسرے کو اپنا بھائی بنالیں مسلمانوں کو ہی اپنی خیر خواہ سمجھیں، مسلمان مسلمانوں کا قتل عام بند کر دیں تو ان شاء اللہ وہی مقام حاصل کرلیں کہ قیصر و کسری اور یہود و نصاری کے حکمران ان کا نام سن کر خائف ہو جائیں، وہ ان کو دیکھ کر کانپنے لگیں۔ کاش کہ اپنی زندگی میں مسلمانوں کے سر بلند دیکھ لیں۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نجوم الفرقان

من تفسیر آیات القرآن

جلد ہشتم

سورۃ آل عمران آیات ۶۰ تا ۱۹۵

از رشحات قلم

محقق اہلسنت

شیخ الحدیث والتفسیر حضرت علامہ

مولانا عبدالرزاق بھترالوی حطاروی

مہتمم جامعہ غوثیہ مہر العلوم راولپنڈی

ناشر جامعہ غوثیہ مہر العلوم راولپنڈی

[illegible] ٹاؤن شکریال راولپنڈی

کتاب لاریب کی توضیحات وتشریحات، علوم عقلیہ ونقلیہ کی روشنی میں
علمی وتحقیقی ذوق رکھنے والوں کے لئے قدیم وجدید مسائل پر ابحاث کا حسین مرقع
تفسیر القرآن بالقرآن، ارشادات نبویہ، اقوال صحابہ وتحقیقات اسلاف اور روایات صحیحہ پر مشتمل تفسیر

مسمی بہ

نجوم الفرقان

من تفسیر آیات القرآن

جلد ہشتم

سورۃ آل عمران آیات 70تا165

از رشحات قلم

محقق اہلسنت

شیخ الحدیث والتفسیر حضرت علامہ

مولانا **عبدالرزاق** بھترالوی، حطاروی

مہتمم وشیخ الحدیث جامعہ جماعتیہ مہر العلوم راولپنڈی

ناشر: **جامعہ جماعتیہ مہر العلوم** راولپنڈی

- نام کتاب:............ نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن
  سورۃ آل عمران آیات 70 تا 165
- تالیف:............ شیخ الحدیث علامہ **عبدالرزاق** بھتر الوی حطاروی
- کمپیوٹر گرافکس:............ **محمد اسحاق** ہزاروی
- کمپوزر:............ افضال احمد، تنویر احمد ہزاروی
- کمپوزنگ سنٹر:............ مہر العلوم کمپوزنگ سنٹر راولپنڈی
- بار طباعت:............ اول مارچ 2008ء
- صفحات:............ 832　　23 × 36/8

ملنے کے پتے

- **جامعہ جماعتیہ مہر العلوم** شکریال راولپنڈی
- **جامع مسجد غوثیہ F.6/1** اسلام آباد
- **اسلامک بک کارپوریشن** کمیٹی چوک راولپنڈی
- **مکتبہ امام ابوحنیفہ** مسلم ٹاؤن راولپنڈی
- **اسلامک یونیورسٹی بک سینٹر H.10** اسلام آباد

اور ہر اچھے بکسٹال سے خرید فرمائیں

﴿انتباہ﴾

عنوان	صفحہ

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
نئے کاموں کے ایجاد کیلئے نبی کریم ﷺ نے ضابطہ بیان فرمایا	786	مقام توجہ	799
میلاد النبی ﷺ پر انعقاد محافل اور ہر جائز خوشی مستحب ہے	787	مندرجہ بالا بحث سے ثابت ہو گیا	799
مقررون میں اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا	787	میلاد النبی ﷺ کی عید کہنے کی وجہ	799
نبی کریم ﷺ نے ہر پیر کے دن اپنا یوم ولادت منایا	788	اعتراض	800
جائز کاموں سے اظہار مسرت کرے	789	پہلا جواب	801
مباح کام کرنے میں کوئی حرج نہیں	789	دوسرا جواب	801
حرام و مکروہ خلاف اولی کاموں سے بچنا ضروری ہے	789	تیسرا جواب	802
خرابی کو دور کیا جائے اچھائی کو ختم نہ کیا جائے	789	اہل سنت و جماعت سے دردمندانہ اپیل	802
دوسری وجہ جس پر میلاد النبی ﷺ کی خوشی کا مستحب ہونا قیاس کیا گیا	790	لمحات فکر	803
نبی کریم ﷺ کی ولادت پر اللہ تعالی نے قوم کوثر کے عطاء کئے	790	اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ......(۱۶۵)	804
نیکی کے کاموں میں خرچ کرنا اسراف نہیں	791	مقام توجہ	804
اعتراض	791	شان نزول	804
جواب	791	زجاج کی غلطی علامہ واحدی کی گرفت	805
اعتراض	793	قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ	806
پہلا جواب	793	ایک اور وجہ عظیم	806
دوسرا جواب	793	اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ	807
خلاصہ جواب	794		
علم کے بحر بیکراں مفکر اسلام، مفسر قرآن کی تحقیق	795		
دو سیرت نگاروں کی غلط فہمی کی وجہ سے سکولی طبقہ غلط فہمی کا شکار ہوا	798		

يٰٓاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تَكۡفُرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنۡتُمۡ تَشۡهَدُوۡنَ O (آیۃ نمبر ۷۰)

(1) اے کتابیو! اللہ کی آیتوں سے کیوں کفر کرتے ہو، حالانکہ خود گواہ ہو۔ (کنز ایمان)

(2) اے اہل کتاب! کیوں کفر کرتے ہو تم اللہ کی آیتوں سے، حالانکہ تم خود گواہی دیتے ہو۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

اللہ تعالی نے پہلے اہل کتاب کے اس گروہ کا ذکر فرمایا جن کو سمجھ اور شعور ہی حاصل نہ تھا کہ توراۃ میں نبی کریم ﷺ کی نبوت پر دلالت کرنے والی آیات پائی گئی ہیں۔ اب اس آیۃ کریمہ میں ان کے علماء کا ذکر کیا جارہا ہے جو کہ نبی کریم ﷺ کی نبوت پر دلالت کرنے والی آیات اور آپ کے اوصاف کو بیان کرنے والی آیات کو جانتے تھے، لیکن جاننے کے باوجود کفر کرتے تھے۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"لِمَ" (لام کے نیچے کسرہ اور میم پر فتحہ) اصل میں "لِمَا" ہے۔ یہ مرکب ہے لام جارہ اور ما استفہامیہ سے "مَا" کے آخر الف کو تخفیف کیلئے حذف کر دیا گیا، اور حرف جار کو گویا کہ اس کا عوض (بدل) سمجھ لیا گیا ہے، الف چونکہ بر طرف تھا اسی وجہ سے عربی قوانین کے مطابق تخفیف کیلئے اسے ہی حذف کرنا تھا، اور میم کا فتحہ برقرار رکھ دیا تاکہ الف کے حذف ہونے دلالت کرے، یہی قانون ﴿عَمَّ يَتَسَآءَلُوۡنَ﴾ کے لفظ "عَمَّ" اور ﴿فَبِمَ تُبَشِّرُوۡنَ﴾ کے لفظ "بِمَا" میں جاری ہے، اور وقف کی حالت میں ان کے آخر میں "ھاء" بڑھا دی جاتی ہے 'فبمہ' "لمہ" پڑھ لیا جاتا ہے۔
(ماخوذ از کبیر)

یہاں اللہ کی آیات سے مراد کیا ہے؟

اس آیۃ کریمہ میں جو ذکر کیا گیا ہے کہ "اے اہل کتاب کیوں کفر کرتے ہو تم اللہ کی آیتوں سے" ان آیات سے مراد میں کئی احتمال ہیں، جو تمام ہی پائے جاتے ہیں، ان میں کوئی تعارض نہیں۔

(۱) "قال ابن عباس هی التوراة والانجيل وكفرهم بها من جهة تغيير الاحكام وتحريف الكلام"

حضرت ابن عباس ﷺ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی آیات سے مراد توراۃ وانجیل ہیں۔ مراد یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی کتب توراۃ وانجیل کی آیات میں مذکور احکام کو بدل کر اور اللہ تعالیٰ کے کلام میں تحریف کر کے کیوں کفر کرتے ہو۔

(۲) **او لایات التی فی التوراۃ و الانجیل من وصف النبی ﷺ والایمان به کما بین فی قوله تعالی یجدونه مکتوبا عندهم فی التوراۃ و الانجیل"**

یا آیات سے مراد وہ آیات ہیں جو توراۃ انجیل میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف پر دلالت کر رہی ہیں، ان پر انہوں نے ایمان نہ لایا، بلکہ ان سے کفر کیا، اسی کا تذکرہ یہاں کیا گیا کہ تم اللہ تعالیٰ کی آیات سے کیوں کفر کرتے ہو۔

• یہی مضمون اللہ تعالیٰ کے دوسرے ارشاد گرامی میں بھی موجود ہے ﴿يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ﴾ وہ پاتے ہیں اسے لکھا ہوا اپنے پاس توراۃ وانجیل میں، یعنی نبی کریم ﷺ کے اوصاف ان کی کتب توراۃ وانجیل میں موجود تھے، لیکن انہوں نے ان آیات پر ایمان نہ لایا بلکہ کفر کیا۔ (ماخوذ از البحر المحیط)

❁ **واخرج عبد بن حمید و ابن جریر و ابن المنذر عن قتادۃ فی قوله "يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللّٰهِ وَأَنتُمْ تَشْهَدُونَ" قال تشهدون ان نعت نبی الله محمد ﷺ فی کتابکم ثم تکفرون به وتنکرونه ولا تؤمنون به وانتم تجدونه مکتوبا عندکم فی التوراۃ والانجیل النبی الامی"**

عبد بن حمید اور ابن جریر اور ابن المنذر نے قتادہ ﷺ سے بیان کیا ہے اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللّٰهِ وَأَنتُمْ تَشْهَدُونَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اے اہل کتاب تم گواہی بھی دیتے ہو کہ اللہ کے نبی محمد ﷺ کے اوصاف ہماری کتابوں میں موجود ہیں، پھر تم ان سے کفر کرتے ہو، اور ان کا انکار کرتے ہو، اور ان کے ساتھ ایمان نہیں لاتے ہو، جبکہ تم توراۃ وانجیل میں ان کے اوصاف کو لکھا ہوا پاتے ہو کہ وہ نبی امی ہوں گے" تو پھر تم اللہ کی آیات سے کفر کیوں کرتے حالانکہ تم گواہی دیتے ہو" (درمنثور)

(۳) اللہ تعالیٰ کی آیات سے مراد میں تیسرا قول یہ ہے جو قتادہ، سدی، ربیع، ابن جریج ﷺ نے بیان کیا ہے۔

او القرآن من جهة قولهم " إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ" "إِنْ هٰذَا إِلَّا إِفْكٌ افْتَرَىٰهُ" "إِنْ هٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ"

کہ اس آیہ کریمہ میں "آیات اللہ" سے مراد قرآن پاک ہے یعنی اے اہل کتاب تم قرآن پاک کی آیات کا کیوں انکار کرتے ہو۔

یہود ونصاریٰ کے قرآن پاک سے کفر کو رب تعالیٰ نے کئی آیات کریمہ میں ذکر کیا ہے۔ ﴿اِنَّمَا یُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ﴾ یہود ونصاریٰ قرآن پاک کا انکار اس طرح کرتے تھے کہ وہ کہتے تھے، ''یہ قرآن اسے کوئی انسان سکھاتا ہے'' اور کبھی یوں کہہ کر انکار کرتے ﴿اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ اِفْتَرٰىهُ﴾ یہ تو نہیں مگر ایک بہتان جو انہوں نے بنالیا ہے اور کبھی یوں کہہ کر انکار کرتے ﴿اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ یہ تو نہیں مگر پہلے لوگوں کی داستانیں۔

(۴) اور اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرنے کا یہ مطلب ہے

"او الایات التی اظهرها علی یدیه من انشقاق القمر وحنین الجذع وتسبیح الحصی وغیره ذلک"

کہ وہ نبی کریم ﷺ کے معجزات کا انکار کرتے تھے، آپ کے چاند توڑنے کا وہ انکار کرتے تھے، اور مسجد نبوی میں ستون سے سہارا لگا کر خطبہ منبر پر پڑھنے پر ستون کے رونے کو وہ نہیں مانتے تھے اور کنکریوں کا آپ کے ہاتھ مبارک میں تسبیحات پڑھنے کا وہ انکار کرتے تھے، اور اس قسم کے معجزات کا وہ انکار کرتے تھے، اس کا تذکرہ بھی اس آیۃ کریمہ میں موجود ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی آیات یعنی جو معجزات اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو عطاء کر رکھے ہیں ان سے کفر کیوں کرتے ہو۔

(۵) ''او محمد ﷺ والاسلام'' اللہ کی آیات سے مراد نبی کریم ﷺ اور دین اسلام ہیں۔ یعنی حضرت محمد ﷺ اور دین اسلام جو کہ اللہ تعالیٰ کی آیات (نشانیاں) ہیں، ان کا انکار کر کے تم کفر کیوں کرتے ہو؟ (البحر المحیط)

❀ واخرج ابن جریر وابن ابی حاتم عن ابن جریج "لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ" علی ان الدین عند الله الاسلام لیس لله دین غیره"

اس مقام میں اللہ تعالیٰ کی آیات سے مراد دین اسلام ہے، یعنی جب تم خود گواہی دیتے ہو کہ دین اللہ تعالیٰ کو پسند اسلام ہی ہے، اس دین کے بغیر کوئی پسندیدہ دین نہیں۔ یعنی دین اسلام کے آجانے کے بعد پہلے دین منسوخ ہو چکے ہیں، رب کا اب پسندیدہ دین صرف اسلام ہے اس کا اعتراف کرنے کے باوجود تم کفر کیوں کرتے ہو۔ (البحر المحیط)

(۶) ومنها ما فی هذین الکتابین ان ابرهیم علیه السلام کان حنیفا مسلما"

اور مراد اللہ تعالیٰ کی آیات سے ہے کہ توراۃ وانجیل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اوصاف ذکر ہیں کہ بیشک ابراہیم تمام باطل دینوں سے جدا (اور) مسلمان تھے (اسلام پر قائم تھے) لیکن یہود نے اس کا انکار کر کے آپ کو یہودی کہا، اور نصرانیوں نے اس کا انکار کر کے نصرانی کہا، اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرتے ہیں۔ قرآن

پاک کی فصاحب وبلاغت واضح ہوئی کہ مختصر الفاظ مبارکہ کتنے بڑے مطالب کو حاوی ہیں، اسلئے کہ تمام مطالب کو بیک وقت ﴿ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيَاتِ اللّٰهِ ﴾ کے الفاظ مبارکہ شامل ہیں۔

﴿ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴾ ''حالانکہ تم خود گواہی دیتے ہو۔''

ان الفاظ مبارکہ کے بھی کئی مطالب، ایک وہی جو اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ سے واضح ہے'' حالانکہ تم خود گواہ ہو'' **راقم** نے بھی یہی نقل کیا ہے، وہ مسلمانوں کے سامنے گواہی دیتے تھے کہ نبی کریم ﷺ کے اوصاف ہماری کتابوں میں موجود ہیں آپ آخری اور سچے نبی ہیں، قرآن پاک سچی کتاب ہے، لیکن عوام کے سامنے انکار کردیتے تھے کہ توراۃ وانجیل میں محمد ﷺ کی نبوت پر دلالت کرنے والی کوئی آیات موجود نہیں۔ ''ثم اذا خلا بعضهم مع بعض شهدوا بصحتها'' پھر جب آپس میں وہ ایک دوسرے سے ملتے تو نبی کریم ﷺ کی نبوت کے صحیح ہونے کی شہادت دیتے تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ﴾ تم ٹیڑھا پن (کج روی) تلاش کرتے ہو حالانکہ تم خود گواہ ہو۔ (کبیر)

علم غیب نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے:

''واعلم ان لتفسير الآية بهذا القول يدل على اشتمال هذه الآية على الاخبار عن الغيب لانه ﷺ اخبرهم بما يكتمونه فى انفسهم ويظهرون غيره ولا شك ان الاخبار عن الغيب معجز''

جان بیشک آیۃ کریمہ کی اس تفسیر سے یہ واضح ہوگیا کہ یہ آیۃ کریمہ غیبی خبروں پر مشتمل ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ان کو خبر دی جو وہ اپنے نفسوں میں چھپاتے تھے، اور ظاہر اور کرتے تھے، یقینی بات ہے یہ غیب کی خبر ہے، علم غیب نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے۔ (کبیر)

(وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ) اى تعترفون فيما بينكم على سبيل الكتمان انه نبى حق مذكور نعته فى التوراة والانجيل''

حالانکہ تم اعتراف کرتے ہو آپس میں چھپے ہوئے طریقہ سے کہ یہ نبی تو برحق ہیں، یہ تو وہی نبی ہیں جن کے اوصاف توراۃ وانجیل میں مذکور ہیں۔

یعنی اس تفسیر کے مطابق ﴿ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴾ کا معنی ہوا، حالانکہ تم اعتراف کرتے ہو'' وانتم تعلمون بالمعجزات انه نبى حق'' یا معنی یہ ہوا ﴿ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴾ حالانکہ تم جانتے ہو، یعنی تم نبی کریم ﷺ کے معجزات

کو دیکھ کر تم جانتے ہو کہ وہ نبی برحق ہیں۔ (ماخوذ از مظہری)

"وقیل المعنی وانتم تشهدون بمثلها من آیات الانبیاء التی انتم مقرون بها" (قرطبی)

اور معنی ﴿ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴾ کا یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے سامنے نبی کریم ﷺ کے اوصاف "جو تمھاری کتب میں ہیں" کا اقرار کرتے ہو جیسے کہ دوسرے انبیاء کرام کے اوصاف و معجزات کا اقرار کرتے ہو۔

تعجب یہی ہے تم پر کہ یہ جاننے، ماننے، اقرار کرنے اور گواہی دینے کے باوجود تم انکار کرتے ہو اور کفر کرتے ہو، درحقیقت ان کو اس پر توبیخ کی گئی (یعنی ڈانٹ دی گئی ہے۔)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

یٰاَھْلَ الْکِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَO (آیۃ نمبر ۷۱)

(1) اے کتابیو! حق میں باطل کیوں ملاتے ہو اور حق کیوں چھپاتے ہو حالانکہ تمہیں خبر ہے۔ (کنزالایمان)

(2) اے اہل کتاب! تم کیوں ملاتے ہو حق کو باطل کے ساتھ اور کیوں چھپاتے ہو حق کو حالانکہ تم جانتے ہو۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

علمائے یہود کے دو طریقے تھے۔ ایک قسم کے وہ لوگ تھے اور ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ نبی کریم ﷺ سے کفر کرتے تھے باوجود اس کے کہ اپنے دلوں سے جانتے تھے کہ بیشک یہ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں۔ اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں ان کا ہی ذکر ہے اور ان کو کفر سے باز رہنے کا حکم دیا۔ اور **دوسری قسم** کے وہ لوگ تھے جو لوگوں کے دلوں میں شبہات ڈالتے تھے اور دلائل و بینات کو مخفی رکھتے تھے تاکہ لوگ ایمان نہ لائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ میں ان دوسری قسم کے لوگوں کو اس غلط طریقہ سے منع فرمایا۔

"فالمقام الاول مقام الغواية والضلالة والمقام الثانی مقام الاغواء والاضلال"

پہلی قسم کے لوگوں کا مقام بھٹکنا اور گمراہ ہونا ہے اور دوسرے قسم کے لوگوں کا مقام بھٹکانا اور گمراہ کرنا ہوتا ہے۔ (کبیر)

﴿یٰاَھْلَ الْکِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾

''اے اہل کتاب تم کیوں ملاتے ہو حق کو باطل سے''

''ای تخلطون الحق الذی انزل علی موسی من آیات التوراۃ بالباطل الذی کتبته ایدیکم بالتحریف''

یعنی اے اہل کتاب کیوں ملاتے ہو اس حق کو جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا گیا یعنی توراۃ کی آیات کیوں ملاتے ہو باطل سے جو تمہارے ہاتھوں نے تحریف کر کے لکھا ہے۔ (مظہری)

خیال رہے راقم کا ترجمہ تفسیر مظہری کے مطابق ہے۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ و تفسیر خازن:

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ یہ ہے ''اے کتابیو! حق میں باطل کیوں ملاتے ہو، تفسیر خازن نے اس مقام پر یوں بیان کیا۔

(۱) وذلک ان علماء الیھود والنصاری کانوا یعلمون بقلوبھم ان محمدا رسول من عند اللہ وان دینه حق وکانوا ینکرون ذلک بالسنتھم وکانوا یجتھدون فی القاء الشبھات والتشکیکات وذلک ان الساعی فی اخفاء الحق لایقدر علی ذلک الا بھذہ الامور، فقوله تعالی (لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ) معناہ تحریف الرورة وتبدیلھا فیخلطون المحرف الذی کتبوہ بایدیھم بالحق المنزل''

اس آیۃ کریمہ کا شان نزول یہ ہے کہ یہود ونصاری کے علماء اپنے دلوں سے جانتے تھے کہ بیشک محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اور بیشک آپ کا (رب تعالی کی طرف سے لایا ہوا) دین حق ہے، لیکن وہ زبان سے انکار کرتے تھے، اور کوشش کرتے رہتے تھے کہ دوسرے لوگوں کے دلوں میں شکوک وشبہات ڈالیں، کیونکہ حق کو مخفی رکھنے کی کوشش کرنے والا اسی قسم کے ہتھکنڈے (حیلے) استعمال کر کے اپنے مقاصد میں بظاہر کامیابی سمجھتا ہے، (درحقیقت وہ ذلیل ہی ہوتا ہے) رب تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾ باطل کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے توراۃ میں تحریف کر دی تھی، یعنی اس میں تبدیلی کر دی تھی'' تو وہ اپنے ہاتھوں سے لکھی تحریف شدہ کو ملا دیتے تھے حق سے جو رب تعالی کی طرف سے نازل کیا گیا تھا''

خازن کے ان الفاظ:

"فیخلطون المحرف الذی کتبوہ بایدیھم بالحق المنزل"

کو بار بار دیکھیں اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کو بھی دیکھیں تو یقیناً خازن کے مطابق پائیں گے۔

دونوں تراجم میں کوئی تعارض نہیں:

چاہئے تو یوں ترجمہ کر لیا جائے اے اہل کتاب تم کیوں ملاتے ہو حق کو باطل سے؟ یا یوں ترجمہ کر لیا جائے اے اہل کتاب تم باطل کو حق سے کیوں ملاتے ہو۔ان دونوں تراجم میں کوئی تعارض نہیں، بلکہ دونوں ترجمے صحیح ہیں، اسلئے کہ "تلبس" کا معنی ہے خلط ملط کر دینا، دو چیزوں کو آپس میں ملا دینا، لھذا، "لِمَ تَلْبِسُوْنَ" کا لفظ دونوں معانی کو شامل ہے "یعنی حق اور باطل کو کیوں خلط ملط کرتے ہو"

(۲) "وقیل ھو خلط الاسلام بالیھودیة والنصرانیة"

اور اس کا یہ معنی بھی لیا گیا ہے کہ اسلام کو یہودیت و نصرانیت سے کیوں ملاتے ہو؟ جبکہ اسلام حق ہے اور یہودیت و نصرانیت تحریف کے بعد باطل ہو چکی ہیں، اور اسلام کے آنے کے بعد منسوخ ہو چکی ہیں، پھر تم اسلام اور یہودیت کو خلط ملط کیوں کرتے ہو۔ (خازن)

(۳) "ان المراد اظھارھم الاسلام وابطانھم النفاق" اس آیۃ کریمہ کا اور مطلب یہ ہے وہ اسلام کو ظاہر کرتے تھے اور دل میں منافقت کرتے تھے، تو ان کو کہا گیا، اسلام اور کفر کو تم کیوں خلط ملط کرتے ہو۔

(۴) "ان المراد الایمان بموسی وعیسی والکفر بمحمد علیھم الصلوۃ والسلام"

کہ وہ اہل کتاب یہ دعوی کرتے تھے کہ ہم موسی علیہ السلام اور عیسی علیہ السلام سے ایمان رکھتے ہیں لیکن محمد (ﷺ) پر ایمان نہیں لاتے، بلکہ اس سے ہم کفر کرتے ہیں۔ تو رب تعالی کے ارشاد کا ایک مطلب یوں بھی ہے اے اہل کتاب تم اپنے دعوی کے مطابق موسی علیہ السلام اور عیسی علیہ السلام پر ایمان لانے کے ساتھ محمد ﷺ کے ساتھ کفر کرنے کو کیوں ملاتے ہو۔

(۵) "ان المراد مایعلمونه فی قلوبھم من حقیة رسالته ﷺ وما یظھرونه من تکذیبه"

وہ نبی کریم ﷺ کی حقانیت کو دل سے مانتے تھے اور ظاہر طور پر آپ کی تکذیب کرتے تھے، تو ان کو کہا گیا اے اہل کتاب تم دل سے حق کو ماننے کے ساتھ ظاہری کفر کو کیوں ملاتے ہو۔ (ماخوذ از روح المعانی)

قرآن پاک کی فصاحت بلاغت کو دیکھا جائے کہ ایک چھوٹا سا جملہ ﴿لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾ کتنے معانی کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

﴿وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ﴾ ''اور کیوں تم چھپاتے ہو حق کو''

طلباء کرام بخوبی جانتے ہیں کہ معطوف سے پہلے والے الفاظ کا تعلق معطوف سے بھی ہوتا ہے ﴿وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ﴾ کا عطف ہے ﴿تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ﴾ پر''اس لئے ''لم'' کا لفظ معطوف علیہ اور معطوف دونوں سے متعلق ہے، اسی لئے معنی یہ ہے''اور کیوں تم چھپاتے ہو حق کو''

حق کو چھپانے کی کوشش کرنے والوں کے دو طریقے:

''اعلم ان الساعی فی اخفاء الحق لا سبیل له الی ذلک الامن احدو جهین اما بالقاء شبهة تدل علی الباطل و اما باخفاء الدلیل الذی یدل علی الحق''

جان لو بیشک حق کو چھپانے کی کوشش کرنے والوں کے دو طریقہ واردات ہیں۔ایک یہ کہ وہ لوگوں کے دلوں میں شکوک وشبہات ڈال کر باطل کی طرف انہیں مائل کرتے ہیں۔ان کا ذکر رب تعالیٰ نے ان الفاظ مبارکہ سے کردیا ﴿لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾ (تم کیوں ملاتے ہو حق کو باطل سے)

اور دوسرا طریقہ ان کا یہ تھا کہ وہ حق پر دلالت کرنے والے دلائل کو مخفی رکھتے تھے تا کہ ان دلائل کو دیکھ کر کوئی ایمان قبول نہ کرلے، ان کا ردان الفاظ مبارکہ سے کیا ﴿وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ﴾ ''اور کیوں چھپاتے ہو تم حق کو''

وہ حق کو کیسے چھپاتے تھے؟

''فالمراد ان الآیات الموجودة فی التوراة الدالة علی نبة محمدا کان الاستدلال بها مفتقرا الی التفکر'' ''والتامل والقوم کانوا یجتهدون فی اخفاء تلک الالفاظ التی کان بمجموعهایتم هذا الا استدلال،مثل ما ان اهل البدعة فی زماننا یسعون فی ان لایصل الی عوامهم دلائل المحققین''

مراد اس سے یہ ہے کہ توراۃ میں موجود آیات جو حضرت محمد ﷺ کی نبوت پر دلالت کرتی تھیں، جن میں غور وفکر کرکے آپ پر ایمان لانا آسان تھا، ان آیات کو قوم سے مخفی رکھتے تھے تا کہ یہ لوگ ایمان نہ لاسکیں، جیسا کہ اہل بدعت ہمارے زمانہ میں کوشش کرتے ہیں کہ محققین کے دلائل عوام تک نہ پہنچ سکیں۔ (کبیر)

علماء اہل سنت و جماعت آجکل اسی کسی مپرسی کا شکار ہیں، میڈیا تک ان کی رسائی نہیں، یہ وقت خریدنے کی طاقت نہیں رکھتے یا راقم کی طرح ہر سنی عالم دین یہی سمجھتا ہے کہ نفع اس کا کم ہے نقصانات زیادہ ہیں، گوشہ نشینی ہی بہتر ہے۔

﴿وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ ''حالانکہ تم جانتے ہو۔''

اس کے چند مطالب ہیں:

(۱) **احدھا انکم تعلمون انما تفعلون ذلک عناداو حسدا**'' ان میں سے ایک مطلب یہ ہے کہ بیشک تم جانتے ہو کہ نبی کریم ﷺ سچے نبی ہیں اور قرآن پاک سچی کتاب ہے، اور تمہاری کتب میں ان کا تذکرہ موجود ہے، پھر تم حق و باطل کو ملاتے ہو اور حق کو چھپاتے ہو تو اس کی وجہ صرف حسد اور عناد ہے۔

(۲) **وثانیھا**(وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ)**ای انتم ارباب العلم والمعرفۃ لاارباب الجھل والخرافۃ**''

دوسرا مطلب یہ ہے، حالانکہ تم جانتے ہو'' یعنی تم علم والے اور معرفت تمہیں حاصل ہے، تم جاہل نہیں ہو، بے سمجھ نہیں ہو، پھر تم حق و باطل کو کیوں ملا رہے ہو، اور حق کو تم کیوں چھپا رہے ہو، یہ کام تو جاہل لوگوں اور بے سمجھ لوگوں کا ہے۔

(۳) **وثالثھا**(وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ)**ان عقاب من یفعل مثل ھذہ الافعال عظیم**'' اور تیسرا مطلب ہے کہ ''حالانکہ تم جانتے ہو'' کہ اس قسم کے افعال پر سخت عذاب ہوگا، پھر جاننے کے باوجود تم حق و باطل کو کیوں ملا رہے ہو، اور حق کو کیوں چھپاتے ہو؟

(کبیر)

معتزلہ کا مذہب:

معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے، وہ ان دونوں آیات سے اپنے موقف پر یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ''لِمَ تَكْفُرُوْنَ'' اور ''لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ'' اس پر دلالت کر رہے ہیں کہ وہ اپنے کفر اور اپنے فعل حق و باطل کے ملانے کے خود ہی خالق تھے اور کوئی ان کا خالق نہیں تھا۔

اہل سنت و جماعت کا مذہب:

یہ ہے کہ بندہ اپنے افعال کا کاسب ہے، خالق تمام افعال کا اللہ تعالیٰ ہے رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ (اور اللہ نے تمہیں پیدا کیا ہے اور تمہارے اعمال کو) یہ بات واضح ہے کہ حادث چیز کا خالق ہونا ضروری ہے، ایسا ممکن نہیں کہ حادث چیز بغیر خالق و صانع کے معرض وجود میں آجائے، اور اگر بندے کو خالق ہونا

ضروری ہے، ایسا ممکن نہیں کہ حادث چیز بغیر خالق وصانع کے معرض وجود میں آجائے، اور اگر بندے کے خالق مانا جائے تو وہ ارادہ کا محتاج ہوگا، پھر ارادہ کیلئے اور ارادہ کی محتاجی ہوگی، یہ سلسلہ چلتا رہے گا ختم نہیں ہوگا، یہ محال ہے، طلباء کرام اصطلاحی الفاظ ذہن میں رکھیں "دور یا تسلسل" لازم آئے گا یہ دونوں محال ہیں۔ اسلئے یقیناً خالق اللہ تعالیٰ کو ہی ماننا پڑے گا، البتہ بندہ اپنے افعال کا کاسب ہے، یعنی ان پر عمل کرتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر بتصرف)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ۝ (آیۃ نمبر ۷۲)

(1) اور کتابیوں کا ایک گروہ بولا وہ جو ایمان والوں پر اترا صبح کو اس پر ایمان لاؤ اور شام کو منکر ہو جاؤ شاید وہ پھر جائیں۔ (کنز الایمان)

(2) اور کہا اہل کتاب کے ایک گروہ نے ایمان لاؤ اس پر "جو اتارا گیا ان پر جنہوں نے ایمان لایا" صبح کو، اور کفر کرو اس کے آخر میں، شاید کہ وہ پھر جائیں۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

یہود ونصاریٰ کے مختلف مکروفریب کے حیلے تھے کہ وہ مسلمانوں کو کس طرح دین سے پھیریں یا جنہوں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا وہ اسلام سے دور کس طرح رہیں۔ ان کے ایک مکر کو اس سے پہلے مذکورہ آیۃ کریمہ میں ذکر آچکا ہے کہ وہ حق وباطل کو ملاتے تھے، اور ان کے ایک اور مکر کو اس آیۃ کریمہ میں ذکر کیا جارہا ہے۔

شان نزول:

میں چند وجوہ پائی گئی ہیں، جو تمام ہی معتبر ہیں۔

(۱) یہود ونصاریٰ نے نئے نئے مسلمانوں کے دلوں میں شک ڈالنے اور ان کو اسلام سے پھیرنے کا حیلہ نکالا کہ بعض لوگ ہم سے صبح کے وقت ایمان لے آئیں اور شام کے وقت انکار کردیں، صبح اور شام سے مراد بھی معین اوقات

نہیں بلکہ ان کا کہنا یہ تھا کہ بعض اوقات میں ایمان لے آؤ کہ جو کتاب اور شریعت نازل ہوئی ہے (حضرت) محمد ﷺ پر ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور اس کی تصدیق کرتے ہیں کچھ دیر کے بعد اسکا انکار کردو کہ یہ شریعت تو اس طرح نہیں جس طرح ہماری کتب میں اس کا ذکر ہے۔ جب لوگ اس تکذیب کا مشاہدہ کریں گے تو وہ کہیں گے کہ اہل کتاب کا انکار کرنا حسد اور عناد کی وجہ سے نہیں ورنہ یہ لوگ ابتدائی طور پر ایمان ہی نہ لاتے۔

جب یہ لوگ اہل کتاب ہیں، دین کو سمجھتے ہیں تو یقیناً انہوں نے مکمل غور وفکر اور کامل تحقیق کے بعد ہی اس شخص کو چھوڑا ہے، تو پتہ چلتا ہے کہ "انـه کـذاب" وہ مدعی نبوت (معاذ اللہ) جھوٹا ہے، اسی طرح نئے نئے مسلمانوں کو ہم اسلام سے پھیرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

"وقيل تو اطأاثناعشر رجلا من احبار يهود خيبر على هذاالطريق"

(۱) یہ مکروفریب کا جال بچھانے والے اور یہ منصوبہ تیار کرنے والے خیبر کے یہود میں سے بارہ شخص تھے جو بظاہر اہل علم تھے۔ اگر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ بدترین جاہل تھے، نبی کریم ﷺ کی شان سے اور آپ پر ایمان لانے والے صحابہ کرام کی شان سے بے خبر تھے۔

(۲) شان نزول کی اور وجہ یہ ہے کہ یہود ونصاری کے رئیس لوگ ایک دوسرے کو کہنے لگے کہ ہم سے کچھ لوگوں کو منافق ہو جانا چاہئے جو مسلمانوں سے بظاہر اچھا سلوک کریں اور ان سے محبت کا دعوی کریں، اور بظاہر ایمان لے آئیں، لیکن شرط یہ ہے وہ اپنے دین پر پختگی سے قائم رہیں، اور علیحدگی میں اپنے بھائیوں سے ملتے رہیں۔ کچھ دیر کے بعد نئے نئے مسلمانوں کے دلوں میں شکوک پیدا کئے جائیں کہ یہ دین اور یہ نبی تو سچے نہیں، ہماری کتب میں تو اور اوصاف مذکور ہیں جو ان میں نہیں پائے جاتے، قرآن پاک میں منافقین کا تذکرہ بہت ہے۔

(۳) یہود ونصاری میں سے بعض لوگوں نے دوسرے بعض کو مشورہ دیا کہ کچھ لوگ ایمان لے آؤ۔ کچھ دیر کے بعد ایمان سے پھر جانا، لیکن یہ نہ کہنا کہ یہ دین مکمل طور پر جھوٹا ہے، اگر تم نے مکمل دین کو جھوٹا کہا تو تمہاری بات کو عام لوگ تسلیم نہیں کریں گے۔

"ولـكـن صـدقـوه فـي بـعـض و كذبوه في بعض حتى يحمل الناس تكذيبكم له على الانصاف لاعلى العناد فيقبلوا قولكم"

البتہ یہ طریقہ اختیار کرو کہ بعض مسائل کو سچا کہو، اور بعض کو جھوٹا، یعنی نئے نئے اسلام کو قبول کرنے والے ضعیف الاعتقاد لوگوں کو کہو کہ اس دین کی یہ یہ باتیں تو سچی معلوم ہوتی ہیں، لیکن یہ یہ باتیں جھوٹی بھی ہیں۔ اس طرح

لوگ تم پر اعتبار کرلیں گے کہ یہ لوگ تو بڑی انصاف کی بات کرتے ہیں، سچ کو سچ کہتے ہیں اور جھوٹ کو جھوٹ کہتے ہیں، لیکن جس دین میں جھوٹ کی آمیزش ہو، اس دین پر ہمیں بھی قائم نہیں رہنا چاہئے۔ (ماخوذ از کبیر)

یہ تمام وجوہ ہی شان نزول ہیں:

یہود و نصاری کے مختلف لوگوں کی مختلف سوچیں تھیں، اس بات پر تو متفق تھے کہ مسلمانوں کو ان کے دین سے پھیر دیا جائے، لیکن کیسے پھیرا جائے اس میں ان کے اپنے اپنے خیالات اور اپنے مکر و فریب تھے، ان تمام کے مکر و فریب کا ذکر کرنے کیلئے اس آیہ کریمہ کو نازل کیا گیا۔

"وجه النهار" اور "آخره" سے کیا مراد ہے؟

اس میں کئی وجوہ ہیں وہ تمام ہی معتبر ہیں۔

(۱) "وجه النهار" سے مراد صبح، اور "آخره" سے مراد شام ہے، اہل کتاب کے کچھ لوگ نبی کریم ﷺ کے پاس صبح آئے تو دوسرے ضعیف الاعتقاد لوگوں کو کہا کہ یہ سچے نبی ہیں، یہ دین حق ہے تم اس پر قائم رہو، اور یہود و نصاری میں سے اپنے سے گھٹیا لوگوں کو بھی یہ مشورہ دیا کہ تم اس کی تابعداری کرو، ساتھ ہی انہوں نے کہا کہ ہم ایک مرتبہ توراۃ میں دیکھ لیں کیا وہی اوصاف اس شخص میں پائے گئے یا نہیں، شام کو وہ واپس لوٹے کہنے لگے۔

"وقد نظرنا فی التوراۃ فلیس ھوبه ،یقولون انه لیس بحق"

ہم نے توراۃ کو دیکھا ہے، لیکن یہ شخص وہ نبی نہیں جس کے اوصاف توراۃ میں ذکر ہیں، کیونکہ اس میں وہ اوصاف نہیں پائے گئے۔

"وانما ارادوا ان یلبسوا علی السفلة وان یشککوافیه"

انہوں نے ارادہ یہ کیا تھا کہ ہمارے گھٹیا لوگوں اور جاہل لوگوں پر خلط ملط ہو جائے، وہ شک میں پڑ جائیں تاکہ وہ ایمان نہ لائیں، دوسرا مقصد ان کا ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کو راہ راست سے پھیرنا بھی تھا۔ (ماخوذ از قرطبی)

(۲) کعب بن اشرف اور اس کے ساتھی بعض بعض کو کہنے لگے کہ صبح صبح قبلہ کے معاملہ میں جو آیات نازل ہوئیں ان پر ایمان لے آؤ اور صبح کی نماز کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے ادا کرو، پھر شام کو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرو، تاکہ لوگ دیکھ کر پھر جائیں کہ یہ اہل کتاب ہیں، ان کو کوئی چیز باطل نظر آئی، اسی لئے یہ پھر گئے ہیں۔ ان لوگوں نے اسی پر عمل کیا، صبح کی نماز کعبہ شریف کی طرف متوجہ ہو کر ادا کی اور ظہر کی صخرہ یعقوبی (جو بیت

المقدس میں ہے) کی طرف متوجہ ہو کر نماز ادا کی، رب تعالی نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرما کر ان کی چالبازی سے نبی کریم ﷺ کو مطلع فرما دیا۔ (خازن وکبیر)

"وجہ النہار" کا معنی ہے "دن کا اول حصہ" لغت میں ہر وہ چیز جس کی طرف توجہ کی جائے اسے "وجہ" کہہ لیا جاتا ہے، نئی کوالٹی میں آنے والے کپڑے کو "وجہ الثوب" کہا جاتا ہے، کیونکہ اسے دیکھنے کیلئے اسی کی طرف چہرے اٹھتے ہیں۔ یہ کہا جائے کہ "اتیتہ بوجہ النھار" یا کہا جائے "اتیتہ بصدر النھار" یا یہ کہا جائے "اتیتہ بشباب نھار" سب کا ایک ہی معنی ہے "میں اس کے پاس صبح آیا"

فائدہ: اللہ تعالی نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرما کر مؤمنین کو مطلع فرما دیا، اس میں چند فوائد حاصل ہو رہے ہیں۔

(۱) غیب نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے:

یہود ونصاری کا یہ حیلہ اور مکر وفریب لوگ سے مخفی تھا، کوئی ایک بھی اس پر مطلع نہیں تھا، "فلما اخبر الرسول عنھا کان ذلک اخبارا عن الغیب فیکون معجزا" جب رسول اللہ ﷺ نے یہ غیبی خبر دی تو آپ کا یہ معجزہ بن گیا۔

(۲) مسلمان محفوظ رہے:

اللہ تعالی نے مؤمنوں کو جب مطلع فرما دیا کہ یہود ونصاری اس قسم کے حیلے کر رہے ہیں۔

"لم یحصل لھذہ الحیلۃ اثر فی قلوب المؤمنین"

تو یہود ونصاری کے مکر وفریب کا مؤمنوں کے دل میں کوئی اثر نہیں ہوا۔

اگر مؤمنوں کو مطلع نہ کیا جاتا تو ہو سکتا تھا کہ کچھ ضعیف الاعتقاد حضرات ان لوگوں کے مکر وفریب کا شکار ہو جاتے اور ایمان سے پھر جاتے "العیاذ باللہ"

(۳) یہود ونصاری ذلیل وخوار ہوئے:

ان القوم لما افتضحوا فی ھذہ الحیلۃ صار ذلک رادعالھم عن الاقدام علی امثالھا من الحیل والتلبیس"

یہود ونصاری اس حیلہ میں جب ناکام ہو گئے تو رب تعالی نے ان کے مکرہ فریب کی خبر دے کر بے نقاب کر

دیا ان کی ذلت ورسوائی کا ذکر کر کے گویا کہ ان کو تنبیہ کر دی کہ آئندہ اس قسم کے ہتھکنڈوں سے باز آجانا، کہاں تمہارے باطل حیلے اور کہاں نبی کریم ﷺ اور مؤمنوں کی بلند شان۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾ ''شاید وہ پھر جائیں''

یعنی یہود ونصاری نے حیلہ سوچا کہ صبح ایمان لے آؤ اور شام کو پھر جاؤ ہوسکتا ہے یہ لوگ ایمان سے پھر جائیں تفسیر کبیر سے جو تین وجوہ تفصیلا ذکر کردی گئی ہیں کہ رب تعالی نے ان کے حیلے سے مطلع فرمادیا، ان میں دوصورتوں کے مضمون کو خازن میں مختصر الفاظ سے ذکر کیا گیا ہے، اگر طلباء کرام عبارت یاد کرنا چاہیں تو ان کے فائدہ کیلئے خازن کی عبارت ذکر کی جارہی ہے۔

''ولمادبروا هذه الحيلة اخبر الله تعالى نبيه ﷺ بها فلم تتم لهم ولم يحصل لها اثرفي قلوب المؤمنين ولولا هذاالاعلام من الله تعالى لكان ربما اثر ذلك في قلوب بعض من كان في ايمانه ضعف'' (خازن)

جب انہوں نے اس حیلہ کی تدبیر کی تو اللہ تعالی نے اپنے نبی کریم ﷺ کو مطلع فرمادیا تو وہ لوگ اپنے حیلہ میں ناکام ہوگئے، اور مؤمنوں پر ان کے حیلہ کا کوئی اثر نہ ہوا، اگر ان کی چالبازی کی خبر نہ دی جاتی تو ہوسکتا تھا کہ کچھ ضعیف ایمان والوں پر اس کا اثر ہوتا اور وہ پھر جاتے۔

تنبیہ: آیۃ کریمہ سے اتنا تو واضح ہوا کہ یہود ونصاری نے ایک دوسرے کو اس حیلہ اور مکر وفریب کا مشورہ دیا کہ ایسا کرو، اور یوں کہو۔

''واماامتثال الامر من المامورات فمسكوت عن بيان وقوعه وعدمه''

کیا انہوں نے اس حیلہ پر عمل بھی کیا تھا؟ یا نہیں، بعض نے بعض کی بات کو مانا تھا یا نہیں؟ اس کا بظاہر ذکر اس آیۃ کریمہ میں نہیں۔

''وعن بعضهم ان في الاخبار ما يدل على وقوعه''

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ آیۃ کریمہ سے تقریبا یہ سمجھ آرہا ہے کہ انہوں نے اپنے حیلہ پر عمل تو کیا تھا لیکن وہ اس میں ناکام رہے اور ذلیل وخوار ہوئے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

تفسیر کبیر اور خازن سے یہی بات سمجھ آرہی ہے کہ انہوں نے حیلہ کیا اور اس میں ناکام ہوکر ذلیل وخوار ہوئے، تفسیر البحر المحیط نے لکھا ہے۔

"واسباب النزول تدل علی وقوعه"
آیۃ کریمہ کے نزول کی وجہ اسی پر دلالت کر رہی ہے کہ انہوں نے اپنے اس حیلہ پر عمل کیا۔ وہ اپنا حیلہ کرنے کے باوجود ناکام رہے، مسلمانوں کو اسلام سے نہ پھیر سکے۔

تنبیہ: کفار کی چاپلوسی پر اعتماد نہ کرنا چاہیئے، بسا اوقات ان کی نمازیں، روزے، بلکہ ان کا کلمہ طیبہ پڑھنا سیاسی ہوتا ہے نہ کی دینی، غضب تو دیکھو کہ یہود نے مسلمانوں کو بہکانے کیلئے ایمان قبول کر کے نمازیں پڑھ کر مرتد ہونے کی ٹھان لی۔

خیال رہے کفار کی یہ تدبیریں اب بھی باقی ہیں، ہر سال بعض یہودی فرمان مصطفوی کے نام سے اشتہار چھاپتے ہیں جس میں لکھتے ہیں کی شیخ احمد خادم روضۂ رسول اللہ ﷺ نے حضور ﷺ کی خواب میں زیارت کی کہ ان سے حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس ہفتہ میں اتنے مسلمان مرے جن میں سے پچانوے فی صدی کافر ہو کر مرے اور پانچ فی صد مسلمان، میں خدا کے سامنے اپنی امت کی بدعملیوں سے سخت شرمندہ ہوں، فلاں سنہ میں سورج مغرب سے نکلے گا، فلاں سنہ میں یاجوج وماجوج ظاہر ہوں گے اور فلاں سنہ میں لوگوں کی صورتیں مسخ ہوں گی، اور جو اس مضمون کو نہ مانے وہ کافر ہے وغیرہ وغیرہ یہ سب یہود کی حرکتیں ہیں تا کہ مسلمان ان حالات کو سن کر اسلام سے بددل ہوں، اور ان پیشگوئیوں کی غلطی معلوم کر کے بانی اسلام ﷺ سے پھر جائیں اور سوچیں کہ بارہا ایسی پیشگوئیاں ہوئیں مگر ظاہر کچھ بھی نہ ہوا، حالانکہ روضۂ مطہرہ کے خدام میں سے کسی کا نام شیخ احمد نہیں، سیدھے سادھے مسلمان اسے وحی سمجھ کر چھاپتے اور شائع کرتے ہیں یہ یہودیوں کی وہی پرانی چال ہے۔ (تفسیر نعیمی)

وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ○ (آیۃ نمبر ۷۳)

(1) اور یقین نہ لاؤ مگر اس کا جو تمہارے دین کا پیرو ہو، تم فرمادو کہ اللہ ہی کی ہدایت ہدایت ہے (یقین کا ہے کا نہ لاؤ) اس کا کہ کسی کو ملے جیسا تمہیں ملا، یا کوئی تم پر حجت لا سکے تمہارے رب کے پاس، تم فرمادو کہ فضل تو اللہ ہی کے ہاتھ ہے جسے چاہے دے اور اللہ وسعت والا علم والا ہے۔ (کنزالایمان)

(2) اور نہ لاؤ تم ایمان مگر ان کیلئے جنہوں نے تمہارے دین کی تابعداری کی، آپ فرمادیجئے بیشک ہدایت اللہ ہی کی ہدایت ہے، کسی ایک کو دیا جائے مثل اس کے جو تمہیں دیا گیا، یا حجت لا سکے تم تمہارے رب کے ہاں، فرمادیجئے بیشک فضل اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے دیتا ہے وہ جسے چاہے، اور وسعت والا، علم والا ہے۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

مفسرین کرام کا اتفاق ہے کہ یہود کے بقیہ کلام کی حکایت بیان کی گئی ہے، جب ان میں سب بعض نے بعض کو کہا کہ تم صبح ایمان لاؤ، شام کو پھر جاؤ شاید کہ یہ لوگ بھی پھر جائیں، اس کے بعد ان کا یہ کلام جو اس آیۃ کریمہ میں ذکر کر دیا گیا۔

﴿وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ﴾

''اور نہ ایمان لاؤ مگر ان کیلئے جنہوں نے تابعداری کی تمہارے دین کی''

اعلیٰ حضرت وعلامہ رازی رحمھما اللہ:

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے ''اور یقین نہ لاؤ مگر اس کا جو تمہارے دین کا پیرو ہو'' (کنزالایمان)

حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے ''کہ مت مانو کسی کی بات سوائے ان لوگوں کے جو پیروی کرتے ہیں

تمہارے دین کی۔ان کی بزرگوں کے تراجم علامہ رازی رحمہ اللہ کی تفسیر کبیر کی اس عبارت کے مطابق ہیں''

"ولاتصدقوا الانبیا یقرر شرائع التوراة فاما من جاء بتغییر شیٔ من احکام التوراة فلاتصدقوه،وهذا هو مذهب الیهود الی الیوم"

اور نہ تصدیق کرو یعنی یقین نہ لاؤ،مت مانو سوائے اس نبی کے جو توراۃ کے احکام کو ہی بیان کرے اور ان کے مطابق ہی عمل کرے،جو نبی توراۃ کے احکام میں سے کچھ بھی بدل دے،اس کی بات پر یقین نہ کرو،اس کی بات کو مت مانو،یہی مذہب یہود کا آج تک چل رہا ہے،کہ جو ہماری چال چلے وہ تو کچھ ہمارے قریب ہے،اور جو ہماری چال نہ چلے وہ ہم سے دور ہے،ہم اسے سر نہیں اٹھانے دیں گے،وہ نصاری کو اپنے ساتھ ملائے ہوئے ہیں،یا یوں کہیں یہود نصاری سے ملکر مسلمانوں پر مظالم ڈھا رہے ہیں۔بعض مسلمان یہود و نصاری سے مل کر دوسرے مسلمانوں کو مروار ہے ہیں،افسوس اے مسلمان تیری عقل کہاں گئی۔

تنبیہ: ابھی تفسیر کبیر سے جو عبارت پیش کی ہے،اس تفسیر کیلئے یہ جاننا بھی ضروری ہے۔

وعلی هذا التفسیر تکون"اللام"فی قوله(الالمن تبع)صلة زائدة فانه یقال صدقت فلانا،ولایقال صدقت لفلان،وکون هذااللام صلة زائدة جاز کقوله تعالی(ردف لکم)والمراد ردفکم"

اس تفسیر کیلئے یہ ضروری کہ لام کو زائد مانا جائے جو ﴿اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ﴾ میں ہے کہ یہ فقط اتصال کیلئے ہے اور زائد ہے،جیسا کہ اللہ تعالی کے ارشاد گرامی ﴿رَدِفَ لَكُمْ﴾ میں لام معنوی لحاظ پر زائد ہے اور رابطہ کیلئے،اسی وجہ سے اس کا معنی "رَدِفَكُمْ" والا ہے۔

تنبیہ: طلباء کرام تو سمجھتے ہیں کہ بعض اوقات کسی لفظ کا کسی جگہ معنی نہیں ہوتا وہ دو کلموں یا دو کلاموں کے درمیان رابطہ کا کام دے رہا ہوتا ہے،اس حرف کو زائد کہتے ہیں،جو صرف معنوی طور پر زائد ہوتا ہے،زائد کو (معاذ اللہ) کوئی بے فائدہ کہہ کر اپنے ایمان کا جنازہ نہ نکالے۔

راقم اور روح البیان و تفسیر کبیر:

راقم نے جو ترجمہ کیا ہے وہ روح البیان سے لیا ہے،اور تفسیر کبیر نے بھی دوسرا معنی وہی لکھا ہے،اصل میں راقم کی کوشش ہوتی ہے کہ دینی مدارس کے طلباء کرام کے سامنے تمام بحثیں آجائیں تا کہ وہ بھر پور فائدہ حاصل کر سکیں۔

(ولاتؤمنوا)ای لاتقروا بتصدیق قلبی)الالمن تبع دینکم)ای لاهل دینکم لالمن تبع

محمدا واسلم لما قالت الطائفة المتقدمة لاتباعهم اظهروا الایمان بالقرآن اول النهار کان من بقیة کلامها لهم الکم لاتصدقوا بحقیه الاسلام والقرآن بقلوبکم لکن لاتظهروه للمسلمین ولاتقروا بذلک الا لاهل دینکم" (روح البیان)

اورتم دل سے تصدیق کر کے اقرار نہ کرو(یعنی ایمان نہ لاؤ) مگران کی وجہ سے جنہوں نے تمہارے دین کی تابعداری کی، ان کی وجہ سے ایمان لانا مقصود نہیں جنہوں نے محمد ﷺ کی تابعداری کی اور اسلام قبول کیا۔ جب اس سے پہلی آیۃ میں گذر چکا ہے کہ ایک گروہ نے اپنے متبعین (پیروی کرنے والوں) کو کہا: "تم قرآن پر ایمان کو دن کے اول حصہ میں ظاہر کرو" تو اس آیۃ کریمہ میں ان کے کلام کا بقیہ حصہ ذکر کیا "تم اسلام اور قرآن کی حقانیت کو دلوں سے تسلیم نہ کرنا" لیکن مسلمانوں کے سامنے اپنے ایمان کا نہ اظہار کرنا اور نہ اقرار کرنا مگر بوجہ اپنے دین والوں کے۔

تفسیر کبیر نے دوسرا معنی ان الفاظ سے بیان کیا:

(ولاتؤمنوا الالمن تبع دینکم)ای لاتاتوا بذلک الایمان الا لاجل من تبع دینکم، کانهم قالوا لیس الغرض من الاتیان بذلک التلبیس الابقاء باعکم علی دینکم فالمعنی ولاتاتوا بذلک الایمان الالاجل من تبع دینکم"

یعنی تم ایمان نہ لاؤ مگر بوجہ ان کے جنہوں نے تمہارے دین کی تابعداری کی، گویا کہ انہوں نے کہ یہ ایمان لانے کا مکروفریب اور ملمع سازی صرف اپنے متبعین کو دین پر قائم رکھنا مقصود ہو، اب آیۃ کریمہ کا معنی واضح ہو گیا "ولاتاتوا بذلک الایمان الالاجل من تبع دینکم" "اور ایمان نہ لاؤ مگر بوجہ ان کے جنہوں نے تمہارے دین کی تابعداری کی" اس صورت میں ﴿لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ﴾ میں لام تعلیلیہ ہے۔ (ماخوذاز کبیر)

آیۃ کریمہ کا مختصر مطلب:

یہود جو رئیس تھے انہوں نے اپنے پیروی کرنے والے لوگوں کو یہ کہا کہ تین باتوں کو ذہنوں میں رکھو ایک یہ کہ (پہلے معنی کے مطابق) کسی کو بات پر یقین نہیں لانا، ہاں البتہ صرف ان کی بات کو ماننا جو تمہارے دین کے متبع ہوں، (اور دوسرے معنی کے مطابق مطلب یہ ہے) کہ دل سے ایمان نہ لانا البتہ ایمان کا اظہار اور اقرار بھی صرف اپنے دین والوں کے فائدہ کیلئے کرنا کہ کہیں وہ ایمان نہ لے آئیں، جب تم صبح ایمان کا صرف اظہار کر کے شام کو پھر جاؤ گے تو ہمارے دینی بھائی یہ دیکھ کر اپنے دین پر قائم رہیں گے کہ اگر یہ دین سچا ہوتا تو ہمارے اہل علم ایمان لا کر نہ

پھرتے، دوسری چیز کی ترغیب دیتے کہ اللہ تعالی نے جو انعامات تمہیں عطاء کر رکھے ہیں وہ کسی اور کو عطا نہیں کئے گئے، (لھذا تم اپنے دین پر قائم رہنا صرف زبانی، کلامی اسلام کا اظہار کرنا) تیسری چیز تم یہ یاد کرلو کہ وہ لوگ قیامت کے دن بھی تمہارے ساتھ حجت ودلیل میں غالب نہیں آئیں گے۔ یہ تین چیزیں رئیس یہودیوں نے اپنے متبعین کو سکھائیں تاکہ یہ ظاہری طور پر ایمان لائیں اور دل میں اپنے دین کو ہی پختہ رکھیں، پھر البتہ ظاہری طور پر لائے ہوئے ایمان سے بھی پھر جائیں۔ رب تعالی نے اپنے محبوب ﷺ سے ان کو دو جواب دلائے۔ ایک یہ کہ اے محبوب ''آپ فرمادو کہ بیشک ہدایت اللہ کی طرف سے ہدایت ہے'' یعنی ہدایت دینا جب اسی کے قبضہ قدرت میں ہے تو تمہاری یہ تدبیر باطل وبرباد ہو کر رہ جائے گی کہ صبح ایمان لاکر شام پھر جاؤ تو لوگ اسلام سے پھر جائیں گے، یہ احمقانہ تدبیر ہے۔ اور دوسرا جواب یہ دیا گیا ''اے محبوب آپ فرمادو'' بیشک فضل اللہ تعالی کے قبضہ قدرت میں ہے جسے چاہتا ہے وہ عطاء کرتا ہے بیشک اللہ تعالی وسعت والا علم والا ہے'' یعنی تمہاری یہ نصیحت بھی باطل ہے کہ اللہ تعالی کے انعامات صرف یہود پر ہی ہیں وہ جسے چاہے اپنے انعامات سے نواز دے، جب فضل اسی کے قبضہ قدرت میں تو تمہارا یہ کہنا بھی باطل ہے کہ قیامت کے دن حج ودلائل میں ان پر کوئی غالب نہیں آئے گا۔

﴿قُلۡ اِنَّ الۡهُدٰی هُدَی اللّٰهِ﴾ ''آپ فرمادیجئے بیشک ہدایت اللہ ہی کہ ہدایت ہے''

"قل یا محمد للمرؤساء(ان الهدی هدی الله)یهدی به من یشاء الی الایمان ویثبته علیه فاذا کانت الهدایة والتوفیق من الله فلایضر کیدکم وحیلکم، وهو اعتراض مقید لکون کیدهم غیر مجدلطائل"

یہ جملہ معترضہ ہے اس میں بتانا یہ مقصود ہے کہ یہود ونصاری کا مکروفریب باطل ہے اس میں کسی قسم کا ان کو نفع نہیں۔ اسلئے اے محمد مصطفی ﷺ یہود ونصاری کے رئیسوں کو آپ فرمادیں بیشک ہدایت اللہ ہی کی ہدایت ہے'' وہ جسے چاہے ایمان کی ہدایت عطاء فرماتا ہے، اور ان کو اس پر ثابت قدم رکھتا ہے، جب ہدایت اللہ تعالی کی طرف سے ہے اور اسی کی توفیق سے ہے تو اے یہود ونصاری تمہارا مکروفریب نبی کریم ﷺ اور مؤمنین کو نقصان نہیں پہنچا سکتا'' (روح البیان)

ان الفاظ مبارکہ سے ہی یہ حاصل ہوگیا ''فمن یهدی الله فلا مضل له'' جس کو اللہ ہدایت دے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں، اور اسی سے اللہ تعالی کے اس ارشاد گرامی کا بھی پتہ چل گیا۔

﴿یُرِیۡدُوۡنَ لِیُطۡفِئُوۡا نُوۡرَ اللّٰهِ بِاَفۡوَاهِهِمۡ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوۡرِهٖ وَلَوۡ كَرِهَ الۡكٰفِرُوۡنَ﴾ (سورۃ الصف پارہ ۲۸ آیہ نمبر ۸)

''وہ ارادہ رکھتے ہیں کہ اللہ کا نور بجھادیں اپنے مونہوں سے، حالانکہ اللہ مکمل کرنے والا ہے اپنے نور کو

اگرچہ ناپسند کریں کافر۔" (ماخوذ از روح المعانی)

﴿اَنْ یُّؤْتٰٓی اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِیْتُمْ اَوْ یُحَآجُّوْکُمْ عِنْدَ رَبِّکُمْ﴾

یہ کہ کسی ایک کو دیا جائے مثل اس کے جو تمہیں دیا گیا، یا حجت لا سکے تمہارے رب کے ہاں۔"

ان الفاظ مبارکہ کے مختلف مطالب بیان کئے گئے، اصل میں تراکیب میں جب مختلف احتمال ہوں تو یقیناً معانی بھی مختلف ہوتے ہیں، زیادہ فہم کے قریب خازن اور صاوی سے ایک معنی پیش کر رہا ہوں، جو طلباء کی سمجھ کیلئے زیادہ بہتر ہے"

(۱) (قل ان الهدى هدى الله)ای ان الدين دين الله و البيان بيانه وهذا خبر من الله تعالى ثم اختلفوا فيه فمنهم من قال هذا كلام معترض بين كلامين ومابعده متصل بالكلام الاول وهو اخبار عن قول اليهود بعضهم لبعض ومعنى الآية ولاتؤمنوا الالمن تبع دينكم ولاتؤمنوا ان يؤتى احد مثل ما اوتيتم من العلم والحكمة والكتاب والآيات من فلق البحر وانزال المن والسلوى عليكم وغير ذلك من الكرامات ولاتؤمنوا ان يحاجوكم عندربكم لانكم اصح دينا منهم فلما اخبر الله تعالى عن اليهود بذلك قال في اثناء ذلك قل ان الهدى هدى الله والمعنى ان الذى انتم عليه انما صار دينا بحكم الله وامره فاذاً امر بدين آخروجب اتباعه والانقياد لحكمه لانه هو الذى هدى اليه وأمربه ،وقيل معناه قل لهم يامحمد ان الهدى هد الله وقد جئتكم به ولن ينفعكم في دفعه هذاالكيدالضعيف"

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿قُلْ اِنَّ الْھُدٰی ھُدَی اللّٰہِ﴾ کا مطلب یہ ہے (اے محبوب) آپ فرما دیجئے ہدایت اللہ ہی کی ہدایت ہے" یعنی دین اللہ ہی کا دین ہے، اور بیان اللہ ہی کا بیان ہے۔ اب ترکیبی لحاظ پر ایک احتمال یہ ہے کہ یہ جملہ معترضہ ہے، یعنی فعل "وَلَاتُؤْمِنُوْا" اور اس کے معمولات ﴿اَنْ یُّؤْتٰٓی اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِیْتُمْ﴾ اور ﴿اَوْ یُحَآجُّوْکُمْ عِنْدَ رَبِّکُمْ﴾ کے درمیان واقع ہے، اس ترکیب کے لحاظ پر مطلب یہ ہے کہ یہود کے بعض لوگوں نے جو بعض کو کہا، اس کی حکایت رب تعالیٰ نے بیان فرمائی، اس لحاظ پر آیۃ کریمہ کا معنی یہ ہوا۔ اور نہ ایمان لاؤ مگر ان کیلئے جنہوں نے تمہاری تابعداری کی، اور نہ ایمان لاؤ اس پر کہ کسی اور کو دیا جائے مثل اس کے جو تمہیں دیا گیا یعنی جو علم تمہیں دیا گیا، کتاب و حکمت تمہیں دی گئی، اور نشانیاں تمہیں گئیں، یعنی دریا کا تمہارے لئے پھاڑنا، اور من و سلوی تم پر نازل کرنا، اور طرح طرح کی کرامات سے تمہیں نوازنا (یہ نعمتیں کسی اور نہیں دی جائیں یہ صرف تمہاری ہی شان

ہے) اور تم اس پر ایمان نہ لاؤ کہ وہ کسی قسم کی حجت ودلیل میں تم پر غالب آسکیں گے، اس لئے کہ تمہارا دین ان کے دین سے زیادہ صحیح ہے۔ رب تعالیٰ نے یہود کے تین اقوال کا ذکر فرمایا تو درمیان میں ذکر فرمایا ﴿قُلْ اِنَّ الْهُدٰی هُدَی اللّٰهِ﴾ (آپ فرمادیجئے بیشک ہدایت تو اللہ ہی کی ہدایت ہے) یعنی جس دین پر تم ہو وہ اللہ کے حکم سے ہی دین بنا تھا، اب رب تعالیٰ نے جب اسے منسوخ فرما کر دوسرے دین کا حکم دیا ہے تو تمہارے لئے ضروری ہو چکا ہے کہ تم اسی کی تابعداری کرو، کیونکہ ہدایت تو وہی جو رب تعالیٰ کی ہدایت ہے، صرف تمہاری عقل اور سوچ کی بات نہیں۔ اور بعضوں نے کہا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اے محبوب آپ فرمادیں کہ بیشک ہدایت اللہ ہی کی ہدایت ہے جو میں نے تمہارے پاس دین لایا ہے، وہی اللہ کی ہدایت ہے، لھذا یہ کمزور قسم کے تمہارے مکروفریب اور گھٹیا تمہاری چالیں تمہیں نفع نہیں پہنچا سکتیں، اور نہ ہی دین کو ختم کر سکتی ہیں۔ (خازن)

طلباء کرام خازن کی عبارت اور ترجمہ کو دیکھنے کے بعد "صاوی کو دیکھیں تو (ان شاء اللہ) اس میں سے بھی یہ مطالب سمجھنے آسان ہوں گے۔ یہ مطلب جو بیان کیا گیا ہے اس کی دارومدار ﴿لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ﴾ کے لام کا معنی علت اور انتفاع کا لینے پر ہے۔

(۲) اگر لام زائد ہو تو معنی یہ ہوگا نہ یقین لاؤ اور نہ مانو سوائے ان کی باتوں کے جنہوں نے تمہاری تابعداری کی، اور یہ نہ مانو کہ کسی اور کو اس کی مثل دیا جائے گا جو تمہیں دیا گیا ہے، اور یہ نہ مانو اور اس پر یقین نہ لاؤ کہ کوئی تم پر دلائل میں تمہارے رب کے ہاں تم پر غالب ہوگا۔

(۳) تیسرا معنی لام کو صلہ کا بناتے ہوئے یہ ہوگا۔

"لاتظهروا ایمانکم بأن یؤتی احدمثل اوتیتم اویحاجوکم عندربکم الالمن تبع دینکم"

کہ تم اپنے ایمان کو ظاہر نہ کرو کہ کسی اور کو تمہاری مثل انعامات دیئے جائیں گے، یا کوئی اور اللہ کے ہاں تم پر دلائل میں غالب آسکے گا۔ ہاں یہ باتیں صرف اپنے متبعین کے سامنے ظاہر کر سکتے ہو۔

"ولاتفشوه الی المسلمین کیلا یزید ثباتهم ولاالی المشرکین کیلا یدعوهم الی الاسلام"

یعنی مسلمانوں کے سامنے یہ ظاہر نہ کرنا کہ ہماری آسمانی کتابوں میں یہ مذکور ہے کہ آخری نبی آئیں گے اور ان کا دین دین اسلام ہوگا، تو یہ تمہاری باتیں سن کر مسلمان دین پر اور پختہ طریقے سے قائم ہوں گے، اسلئے مسلمانوں پر یہ باتیں ظاہر نہ کریں، اور مشرکین کو بھی یہ نہ بتائیں ورنہ مسلمان ان کو اپنے دین کی طرف پھیر لیں گے، اور ان کو یہ

کہیں گے کہ ہمارا دین سچا ہے کیونکہ اس کی حقانیت کا تذکرہ پہلی آسمانی کتب میں بھی موجود ہے۔ (ماخوذ از مظہری)

خیال رہے یہی معنیٰ تفسیر ابن کثیر اور صابونی میں ذکر کیا گیا ہے۔

(ولا تؤمنوا الا لمن تبع دینکم) ای لاتطمئنوا او تظھروا سرکم وما عندکم الا لمن تبع دینکم ولاتظھروا ما بایدکم الی المسلمین فیؤمنوا به ویحتجوا به علیکم"

یعنی تم یقین نہ کرو اور اپنے راز ظاہر نہ کرو، اور جو تمہاری کتب میں موجود ہے اسے ظاہر نہ کرو سوائے ان کے جنہوں نے تمہاری تابعداری کی، اور جو چیزیں تمہارے علم میں ہیں، انہیں مسلمانوں پر ظاہر نہ کریں ورنہ وہ اپنے ایمان پر پختہ طریقہ سے قائم رہیں گے، اور تم پر دلائل میں غالب آجائیں گے کہ جب ہماری دین اور ہمارے نبی کریم ﷺ کا ذکر تمہاری کتب میں موجود ہے تو کیا وجہ ہے کہ تم ہمیں دین سے پھیرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ (صابونی)

(۴) اور ایک معنیٰ اس صورت کے مطابق ہے جس میں "اَنْ یُّوْتٰی" میں "لا" کو مقدر مانا گیا، جسطرح ﴿یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَکُمْ اَنْ تَضِلُّوْا﴾ میں "لا" مقدر ہے، اصل میں معنوی طور پر اسطرح ہے ﴿یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَکُمْ لِئَلَّا تَضِلُّوْا﴾ (اللہ بیان کرتا ہے تمہارے لئے تاکہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ) اب یہاں معنوی طور پر عبارت یوں ہوگئی۔

"ولا تؤمنوا الا لمن تبع دینکم لئلا یؤتی" یعنی لاتصدقوھم لئلا یعلموا مثل ما علمتم فیکون لکم الفضل علیھم بالعلم ولئلا یحاجوکم عند ربکم فیقولوا عرفتم ان دیننا حق ولم تؤمنوا"

اب مطلب یہ ہوا کہ "تم ان کی تصدیق نہ کرنا تاکہ انہیں ایسا علم حاصل نہ ہو جائے جو تمہیں حاصل ہے یہ اس لئے ضروری ہے کہ تمہاری علمی برتری ان پر قائم رہے، اور رب تعالیٰ کے ہاں وہ تم پر حجت نہ پیش کر سکیں، اور رب کے تمہیں یہ نہ کہیں کہ تم ہمارے دین کی حقانیت کو جانتے تھے لیکن تم نے ایمان نہیں لایا۔ (ماخوذ از مظہری)

﴿قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ﴾

فرما دیجئے بیشک فضل اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے عطاء کرتا ہے جسے چاہے۔

یہ ان لوگوں کا رد ہے جنہوں نے اپنے یہود و نصاریٰ کو کہا کہ کسی ایک کو تمہاری مثل انعام و اکرام نہیں دیا جائے گا "وفی الحقیقة ھو ردلدعواھم من اولھا الی آخرھا" حقیقت میں ان کے دعویٰ کا اول سے آخر تک رد ہے۔ نبی کریم ﷺ کو خطاب فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے محبوب آپ فرما دیں بیشک فضل اللہ تعالیٰ کے قبضہ

قدرت میں ہے جسے چاہے عطاء کرتا ہے۔

"ای الامور کلہا تحت تصرفہ وھو المعطی المانع یمن علی من یشاء بالایمان والعلم والتصرف التام ویضل من یشاء فیعمی بصرہ وبصیرتہ ویختم علی قلبہ وسمعہ ویجعل علی بصرہ غشاوۃ ولہ الحجۃ والحکمۃ البالغۃ"

یعنی تمام امور رب تعالیٰ کے تصرف میں ہیں وہی عطاء کرنے والا ہے، وہی اپنی مہربانیوں سے کسی کو دور کرنے والا ہے، جس پر چاہے اس پر احسان فرماتا ہے یعنی اسے ایمان وعلم اور تصرف تام عطاء فرماتا ہے۔ اور جسے چاہے گمراہ کرتا ہے اور اس کی بصارت اور بصیرت کو گم کردیتا ہے۔ اور اس کے دل اور کانوں پر مہر لگادیتا ہے، اور اس کی آنکھوں پر پردہ کردیتا ہے، رب تعالیٰ کے قبضۂ قدرت پر حجت اور حکمت بالغہ ہے۔ (صابونی)

﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾ "اور اللہ وسعت والا، علم والا ہے"

اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے، یعنی بہت بڑے فضل والا ہے، "وہ علم والا ہے، یعنی وہ جانتا ہے کہ کون اس کی اہلیت رکھتا ہے کہ اس پر فضل کیا جائے۔

يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝ (آیۃ نمبر ۷۴)

(1) اپنی رحمت سے خاص کرتا ہے جسے چاہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ (کنزالایمان)

(2) خاص کرتا ہے اپنی رحمت سے جسے چاہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

جب اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے، یعنی بہت بڑے فضل والا ہے، اور "وہ علم والا ہے" یعنی جانتا ہے کہ کون اس کے فضل کا مستحق ہے" تو اس آیۃ کریمہ میں یہ ذکر کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جسے چاہے خاص کرتا ہے، اور اللہ ہی بہت بڑے فضل والا ہے، نصاری اور یہودی کا یہ دعوی کہ اللہ تعالیٰ کا احسان اور فضل صرف ہم پر ہے جو ہمیں اس نے انعام واکرام عطاء کیا ہے وہ کسی اور کو عطاء نہیں کیا، یہ (ان کا دعوی) باطل ہے۔

"اختصكم ايها المؤمنون من الفضل بمالايحد ولايوصف بما شرف به نبيكم محمدﷺ علی سائر الانبیاء وهداكم به الى اكمل الشرائع"

اس آیۃ کریمہ سے یہود ونصاری کے دعوی کو رد کر کے مؤمنین کو بتایا گیا ہے کہ اے مومنو اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنے فضل سے خاص کیا ہے۔ اتنے بڑے فضل سے تمہیں نوازا ہے جس کی کوئی حد اور کوئی وصف نہیں بیان کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کرام پر تمہارے نبی کو افضل بنایا، جس کی وجہ سے تمہیں تمام امتوں سے افضل بنایا، اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں سید الانبیاء اور افضل الانبیاء کے ذریعے کامل شریعت کی ہدایت دی۔ تو اب اے مؤمنو تم خود ہی سمجھ جاؤ کہ تم سے کوئی افضل نہیں۔ یہود کے غلط دعوی اور باطل نظریات کے ڈھنڈورا پیٹنے سے کہیں بدظن نہ ہونا۔ (ماخوذ از صابونی)

(يختص برحمته من يشاء) يعني بنبوته ورسالته وقيل بدينه الذى هو الاسلام وقيل بالقرآن (من يشاء) يعني من خلقه وفيه دليل على ان النبوة لاتحصل الابالاختصاص والتفضل لابالاستحقاق لانه تعالى جعلها من باب الاختصاص وللفاعل ان يفعل مايشاء الى من يشاء بغيرا استحقاق"

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جسے چاہے خاص کرتا ہے، یعنی نبوت اور رسالت اپنی مخلوق سے جسے چاہے عطاء کرتا ہے۔ اور جسے چاہے دین اسلام عطاء فرما کر اور قرآن پاک عطاء فرما کر اپنی رحمت سے خاص فرما لیتا ہے۔ آیۃ کریمہ سے ایک اور دلیل حاصل ہوگئی کہ نبوت صرف اللہ تعالیٰ کے فضل سے حاصل ہوتی ہے، رب تعالیٰ جسے چاہے

نبوت کیلئے خاص کردے، اور وہی جانتا ہے کہ نبوت کا اہل کون ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ" اللہ زیادہ جانتا ہے کہ منصب رسالت کسے عطاء کرتا ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے نبوت استحقاق (حقدار ہونے) کی وجہ سے ملی ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس خصوص فضل کو اپنی مشیت سے خاص کردیا ہے کہ (اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جسے چاہے خاص کردے) اللہ تعالیٰ فاعل مختار ہے، فاعل مختار جسے چاہے اس کے استحقاق کے بغیر ہی عطاء کردے۔ (از خازن)

فائدہ جلیلہ: ان دونوں مذکورہ آیات سے صوفیاء کرام نے اس عظیم فائدہ کا ذکر کیا ہے کہ

"لاتعاشروا الامن یوافقکم علی احوالکم و طریقتکم فان من لایوافقکم لایرافقکم واللہ اعلم"

کہ ان لوگوں سے تعلقات رکھو جو تمہارے حالات کے مطابقت تمہارے موافق ہو، اور تمہارے طریقہ پر چلیں، جو لوگ تمہارے موافق نہیں وہ تمہارے رفیق نہیں بن سکتے، "واللہ اعلم" (قرطبی)

یہود کی دو چالوں کے دو بیان:

یہود نے ایک چال یہ چلی کہ اپنے بعض لوگوں کو کہا کہ تم صبح ایمان لے آؤ اور شام کو کفر اختیار کرلو، تاکہ ضعیف الاعتقاد مسلمان اسلام سے پھر جائیں، تو رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ کی کامل ہدایت اور اسی کی کامل قوت بیانیہ کے ہوتے ہوئے تمہارے یہ کمزور حیلے، گھٹیا قسم کے مکروفریب کسی کام کے نہیں، تم نے اپنے ان مقاصد میں ناکام ہی ناکام ہونا ہے، دوسری چال ان کی یہ تھی کہ وہ اپنے لوگوں کو اپنے عقائد پر قائم رکھنے کیلئے اور اس غرض کیلئے کہ یہ ہماری ہر بات پر عمل کرتے رہیں تو انہوں نے کہا کہ جو کتاب اور احکام اور حکمتیں اور نبوت تمہیں عطاء کی گئی ہے وہ کسی اور کو عطاء نہیں کی گئی، تو رب تعالیٰ نے ان کے رد میں ذکر فرمایا۔ ﴿قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾ فرما دیجئے فضل اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں عطاء کرتا ہے وہ جسے چاہتا ہے۔ (کبیر)

فضل سے مراد رسالت و نبوت بھی ہے:

اور ہر قسم کا زیادہ احسان بھی ہے۔

"الفضل ھو فی اللغۃ عبارۃ عن الزیادۃ واکثر مایستعمل فی زیادۃ الاحسان والفاضل الزائد علی غیرہ فی خصال الخیر ثم کثراستعمال الفضل حتی صار لکل نفع قصد

به فاعله الاحسان الی الغیر"

فضل کالغوی معنی ہے ''زیادہ ہونا'' اکثر طور پر احسان کی زیادتی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔اسی لئے جو دوسروں پر اچھے کاموں میں زیادہ فوقیت رکھتا ہو اسے ''فاضل'' کہا جاتا ہے۔پھر عام طور پر ہر نفع مند چیز پر اور دوسروں پر احسان کرنے کے معنی میں ''فضل'' کا استعمال ہونے لگا۔ (کبیر)

بندوں پر رب تعالی کے انعامات کی کوئی حد نہیں:

"ویحصل من مجموع الآیتین انها لانهایة لمراتب اعزازالله واکرامه لعباده وان قصر انعامه واکرامه علی مراتبه معینة وعلی اشخاص معینین جهل بکمال الله فی القدرة والحکمة"

ان دونوں آیتوں کے مجموعہ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ اللہ تعالی اپنے بندوں کو جو اعزاز واکرام عطاء فرماتا ہے اس کی کوئی حد نہیں، اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اللہ تعالی اپنے بندوں کو چند معین قسم کے اعزاز واکرام سے نوازتا ہے ، یا یہ کہے کہ چند آدمیوں کو وہ اعزاز واکرام سے نوازتا ہے تو یہ کہنا درحقیقت جہالت ہے کہ وہ رب تعالی کے قدرت وحکمت میں بے حد کمال کو نہیں جانتا۔ (کبیر)

ہاں اتنی بات واضح ہے کہ رب تعالی کا فضل مؤمنین کو حاصل ہے، کافر اس سے محروم ہیں پھر خصوصی کمالات وانعامات بندوں کے مراتب کے مطابق حاصل ہوتے ہیں۔

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ اِلَّا مَادُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِی الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○ (آیۃ نمبر ۷۵)

(1) اور کتابیوں میں کوئی وہ ہے کہ اگر تو اس کے پاس ایک ڈھیر امانت رکھے تو وہ تجھے ادا کردے گا اور ان میں سے کوئی وہ ہے کہ اگر ایک اشرفی اس کے پاس امانت رکھے تو وہ تجھے پھیر کر نہ ادا کرے گا مگر جب تک تو اس کے سر پر کھڑا رہے، یہ اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ ان پڑھوں کے معاملہ میں ہم پر کوئی مؤاخذہ نہیں اور اللہ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھتے ہیں۔ (کنز الایمان)

(2) اور بعض اہل کتاب وہ ہیں کہ تم ان کے پاس امانت رکھو کثیر مال وہ ادا کردیں گے تمہاری طرف اور ان میں سے بعض وہ ہیں کہ تم ان کے پاس ایک دینار امانت رکھو تو نہیں ادا کریں گے وہ تمہاری طرف مگر یہ کہ تم لگاتار اس پر کھڑے رہو، یہ بے شک اس وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ میں کوئی راہ (پکڑ کی راہ) اور وہ کہتے ہیں اللہ پر جھوٹ حالانکہ وہ جانتے ہیں۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق: اس آیۃ کریمہ کا تعلق ماقبل سے دو وجہ سے ہے۔

پہلی وجہ: اس لئے پہلی آیۃ کریمہ میں یہود کے ایک جھوٹ کا ذکر کیا کہ وہ کہتے ہیں کہ رب تعالی کا فضل صرف ہم پر ہے اور کسی کو رب تعالی نے ان نعمتوں سے نہیں نوازا ہے جن سے ہمیں نوازا ہے، اب اس آیۃ کریمہ میں ان کا امانت میں خیانت کے ارتکاب کا ذکر کیا جارہا ہے، اور اسی آیۃ کریمہ سے ان کے جھوٹے ہونے پر دلیل قائم کی گئی، وہ اس طرح کہ

"انہ تعالی بین ان الخیانۃ مستقبحۃ عند جمیع ارباب الادیان وھم مصرون علیھا فدل ھذا علی کذبھم"

اللہ تعالی نے جب ان کی خیانت کا ذکر فرمایا تو اسی سے پتہ چل گیا کہ وہ جھوٹے ہیں، کیونکہ خیانت تو

تمام دینوں والوں کے نزدیک قبیح (بری) چیز ہے۔ جب وہ خیانت پر قائم رہنے پر اصرار کر رہے ہیں تو ان کے جھوٹے ہونے پر ان کا اپنا عمل ہی دلیل کیلئے کافی ہے۔

دوسری وجہ: پہلی آیۃ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے یہود کے ان قبیح (برے) احوال کا تذکرہ کیا جن کا تعلق دین سے تھا یعنی انہوں نے کہا (وَلَاتُؤْمِنُوْا اِلَّالِمَنْ تَبِعَ دِیْنَکُمْ) تم ایمان نہ لاؤ مگر بوجہ ان کہ جنہوں نے تابعداری کی تمھارے دین کی۔

"حکی فی هذه الآية بعض قبائح احوالهم فيما يتعلق بمعاملة الناس وهو اصرارهم علی الخيانة و الظلم واخذاموال الناس فی القليل والكثير"

اس آیۃ کریمہ میں یہود کے ان برے احوال کا ذکر کیا جا رہا ہے جو لوگوں کے معاملات سے تعلق رکھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ وہ لوگ خیانت پر اصرار کرتے ہیں، اور لوگوں کا مال ناحق طریقے سے لے لیتے ہیں، خواہ وہ مال قلیل ہو یا کثیر ہو۔ (ماخوذ از کبیر)

شان نزول:

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ عبداللہ بن سلام کے پاس دو ہزار دوسو اوقیہ سونا بطور امانت رکھا، جب اس نے طلب کیا تو عبداللہ بن سلام نے وہ سونا اسے واپس لوٹا دیا (اوقیہ کا وزن چالیس درھم کے برابر ہے یعنی ساڑھے دس تولے کا ایک اوقیہ ہے) اسی طرح آپ کے دوسرے ساتھی بھی امانت کا یوں ہی پاس کرتے تھے اور علامہ بغوی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ قریش کے ایک شخص نے فخاص ابن عازورا یہودی کے پاس ایک دینار بطور امانت رکھا تو اس نے خیانت کر لی، وہ ایک دینار واپس نہ لوٹایا تو رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو پہلے فریق کی تعریف اور دوسرے فریق کی مذمت میں نازل کیا۔ (ماخوذ از مظہری)

آیۃ کریمہ کے نزول سے تنبیہ:

اخبر تعالی ان فی اهل الكتاب الخائن والامين والمؤمنون لايميزون ذلك فينبغی اجتناب جميعهم"

اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ میں یہ خبر دی ہے کہ اہل کتاب میں سے بعض خیانت کرنے والے ہیں، اور بعض امانت کا پاس کرنے والے ہیں، مؤمن چونکہ ان میں فرق نہیں کر سکتے تھے تو گویا کہ تمام اہل کتاب سے اجتناب کا حکم دیا گیا۔ (قرطبی)

قرطبی کی اس عبارت سے راقم کے موقف کو تائید حاصل ہوگئی کہ عبداللہ بن سلام نے جب کثیر مال امانت رکھا ہوا واپس کر دیا تو اس وقت وہ یہودی تھے، مؤمن اور صحابی نہیں تھے۔ البتہ امانت کا پاس کرنے کی برکت اور رسول اللہ ﷺ کی نظر عنایت کی وجہ سے ان کو ایمان نصیب ہوگیا۔ اگر یہ مطلب لیا جائے کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے ایمان لانے کے بعد امانت واپس کی جس کا تذکرہ اس آیۃ کریمہ میں ہے تو علامہ قرطبی رحمۃ اللہ تعالی کے قول "فینبغی اجتناب جمیعھم" کا کوئی مطلب نہیں نکل سکتا۔

اعتراض: تفسیر مظہری میں تو یوں بیان کیا گیا ہے "ومن اھل الکتاب یعنی عبداللہ بن سلام واشباھہ مومنی اھل الکتاب" جن اہل کتاب کے امانت لوٹا دینے کا ذکر ہے اس سے مراد اہل کتاب سے ایمان لانے والے عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی ہیں۔

اسی طرح روح البیان نے بیان کیا ہے " فاھل الامانۃ من اھل الکتاب ھم الذین اسلموا" جن اہل کتاب کے متعلق ذکر ہے کہ وہ امانتیں ادا کر دیتے ہیں خواہ ڈھیروں مال ہی ان کے پاس رکھا جائے، اس سے مراد وہ اہل کتاب ہیں جنہوں نے اسلام قبول کیا۔ ان تفاسیر سے تو پتہ چلتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا اسلام لانے کے بعد امانت واپس کرنے کا ذکر ہے، حالت یہودیت میں مراد لینا کیسے صحیح ہے۔

جواب: ان تفاسیر میں یہ ذکر نہیں کہ آپ نے اسلام لانے کے بعد امانت واپس کی، بلکہ مراد یہ ہے کہ یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جنہوں نے امانت واپس کی جب کہ وہ ڈھیروں مال تھا، اور انہوں نے اسلام بھی قبول کرلیا تھا

"واللہ اعلم باالصواب"

آیۃ کریمہ میں مذکور قنطار سے مراد:

"والقنطار عبارۃعن المال الکثیر والدینار عبارۃ عن المال القلیل"

قنطار سے مراد کثیر مال اور دینار سے مراد قلیل مال ہے، اگرچہ حقیقی معنی کے لحاظ سے قنطار کا معنی ڈھیر جمع کیا ہوا، اور دینار سونے کا ایک سکہ ہے، جسے اشرفی بھی کہا جاتا ہے اور دینار بھی جو اس کا مشہور نام ہے، یہ ساڑھے چار ماشے کا وزن ہے۔ اب مطلب یہ ہوگیا:

"منھم من یؤدی الامانۃ وان کثرت مثل عبد اللہ بن سلام واصحابہ ومنھم من لایؤدیھا وان قلت وھم کفار اھل الکتاب مثل کعب الاشرف واصحابہ وفنحاص بن عاوزراء"

بعض اہل کتاب امانت ادا کر دیتے اگر چہ وہ بہت کثیر مال ہی کیوں نہ ہو، جیسا کہ عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی امانتیں لوٹا دیا کرتے تھے اور بعض اہل کتاب وہ ہیں کہ جو امانتیں واپس نہیں کرتے اگر چہ وہ مال بہت تھوڑا ہی کیوں نہ ہو، جیسا کہ کعب بن اشرف اور اس کے ساتھی اور فنحاص بن عازوا (یہ وہی شخص ہے جس کا ذکر شان نزول میں آچکا ہے) (ماخوذ از خازن)

خازن میں بھی "وھم کفار" ذکر کیا گیا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ امانتیں ادا کرنے والے مسلمان تھے اور نہ ادا کرنے والے کافر تھے، لیکن راقم کا موقف وہی ہے جو ذکر دیا گیا کہ بعض اہل کتاب امانتیں واپس کر دیتے ہیں اگر چہ کثیر مال ہی کیوں نہ ہو یہ وہی ہیں جو بعد میں اسلام لے آئے اور بعض ان میں سے وہ ہیں جو امانتیں واپس نہیں کرتے اگر چہ وہ مال قلیل ہی کیوں نہ ہو، یہ وہ لوگ ہیں جو کفر پر ہی قائم رہے۔

"وَمِنْهُمْ مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ لَا يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ إِلَّا مَادُمْتَ عَلَيْهِ قَائِمًا"

اور ان میں سے بعض وہ ہیں کہ تم ان کے پاس امانت رکھو ایک دینار تو وہ نہیں ادا کریں گے تمہاری طرف مگر یہ کہ تم لگاتار اس پر کھڑے رہو۔

یعنی بعض اہل کتاب کے پاس تم تھوڑا مال بطور امانت رکھ دو تو وہ تمہیں نہیں لوٹائیں گے، ہاں اگر تم ان سے لگاتار مطالبہ کرتے رہو تو وہ مال لوٹانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ "إِلَّا مَادُمْتَ عَلَيْهِ قَائِمًا" کا حقیقی معنیٰ تو یہ ہے "مگر یہ کہ تم ہمیشہ اس کے اوپر کھڑے رہو" یہ حقیقی معنیٰ تو متعارف نہیں، البتہ مجازی معانی میں سے کوئی ایک لے لیا جائے۔

مجازی معانی:

(۱) "قال ابن عباس يريد تقوم عليه وتطالبه بالالحاح والخصومة والملازمة"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس پر کھڑا رہنے کا مقصد یہ ہے کہ تم اس سے بار بار مطالبہ کرتے رہو، اور جھگڑا کرتے رہو، اسے لازم پکڑو، یعنی اس کا پیچھا نہ چھوڑو، تا کہ وہ تمہاری امانت ادا کرنے پر مجبور ہو جائے۔

(۲) "الا مدة دوامک عليه يا صاحب الحق قائما على راسه متوكلا عليه بالمطالبة له والتعنيف بالرفع الى الحاكم واقامة البينة عليه"

اس پر کھڑے رہنے کا مطلب یہ ہے کہ اے صاحب حق تم اس کے سر پر کھڑے رہو، یہ بھروسہ رکھتے ہوئے (یہ توکل کرتے ہوئے) کہ یہ ادا کر دے گا اور اسے دھمکی دی جائے کہ میں اپنا یہ مقدمہ عدالت میں لے جاؤں گا اور دعویٰ پر تمہارے خلاف گواہ قائم کروں گا۔ دھمکی سے کام چل جائے تو بہتر ورنہ اپنا مقدمہ حاکم کے پاس لے جائے اور اپنے دعویٰ پر گواہ قائم کر دے تا کہ حاکم اسے امانت واپس کرا دے۔

(۳) تو امانت ایسے لوگوں کے پاس رکھ کرو ہیں کھڑا رہ اور جلدی ہی لوٹا لے تو وہ تمہیں واپس کر دیں گے اگر تو نے دیر کی اور وہاں سے واپس لوٹ آیا تو تجھے وہ امانت واپس نہیں کریں گے۔ (خازن)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ و مدارک:

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ تفسیر مدارک التنزیل المعروف بالنسفی کے مطابق ہے۔
(الا ما دمت علیه قائما) الا مدة دوا مک علیه یا صاحب الحق قائما علی رأسه ملازما له یؤ ده''
یعنی مطلب یہ ہوا کہ بعض اہل کتاب کے پاس اگر تم نے ایک دینار امانت رکھ دیا تو تمیں ادا نہیں کریں گے سوائے اس کے کہ اے صاحب حق تم ان کے سر پر کھڑے رہو، انہیں لازم پکڑے رہو، انکا پیچھا نہ چھوڑو تو وہ تمہیں تمہاری امانت ادا کریں گے، اگر تم نے انہیں یوں ہی چھوڑ دیا کہ یہ خود ہی ادا کر دیں گے تو وہ ادا نہیں کریں گے۔

آیئے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کو ایک مرتبہ پھر دیکھیں اور تفسیر مدارک کو پھر دیکھیں تو اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ تفسیر مدارک کے مطابق خوب ترین با محاورہ ترجمہ نظر آئے گا۔ (اور ان میں سے کوئی وہ ہیں کہ اگر ایک اشرفی اس کے پاس امانت رکھے تو وہ تجھے پھیر کر نہ دے گا مگر تو اس کے سر پر کھڑا رہے'' (کنز الایمان)

﴿ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ﴾

''یہ بیشک اس وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ میں کوئی راہ (پکڑ کی راہ)''

بعض اہل کتاب جو امانت میں خیانت کر لیتے تھے وہ اس پر دلیل یہ دیتے تھے کہ ہم ان ان پڑھ لوگوں کی خیانت کر لیں تو ہمیں کوئی گرفت (پکڑ) نہیں ہوگی۔ ان کا یہ کہنا ہمیں کوئی گرفت نہیں ہوگی۔ اس کے چند مطالب ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) یہود اپنے دین میں سخت شدت رکھتے تھے، ان کا عقیدہ یہ تھا ''یحل قتل المخالف ویحل اخذ ماله بای طریق کان'' کہ مخالف کو قتل کرنا حلال ہے اور اس کا مال جس طرح بھی حاصل کر لو وہ حلال ہے، مخالف کا مال حاصل کرنے کے لئے حلال طریقے کی ضرورت نہیں۔

وروی فی الخبرانه لمانزلت هذه الأیة قال ﷺ ''کذب اعداء الله مامن شیء کان فی الجاهلیة الا وهو تحت قدمی الا الامانة فانها مؤداة الیٰ البر والفاجر''
روایت بیان کی گئی ہے کہ جب یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے دشمن جھوٹے

ہیں، زمانہ جاہلیت کی کوئی چیز نہیں مگر وہ میرے قدموں کے نیچے ہے (یعنی زمانہ جاہلیت کے تمام رسم ورواج، طور طریقے سب میری شریعت نے ختم کر دیئے) سواء امانت کے وہ ادا کی جائے خواہ مال امانت رکھنے والا نیک ہو یا برا۔

(۲) دوسری وجہ ''یہود کے یہ کہنے کی کہ ہم ان پڑھوں کا مال کھاتے رہیں تو ہم پر کوئی مؤاخذہ (پکڑ) نہیں'' یہ تھی کہ وہ یوں کہہ رہے تھے ''نحن ابناء الله واحباؤه'' والخلق لناعبيد فلاسبيل لاحد علينا اذا اكلنا اموال عبيدنا'' کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں (معاذ اللہ) اور مخلوق ہماری غلام ہے، کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم کسی کا مال کھالیں تو وہ ہم سے پوچھیں کیونکہ ہم جس کا مال بھی کھائیں گے وہ ہمارا غلام ہوگا، غلام کا مال آقا کو کھانا جائز ہے۔

(۳) تیسری وجہ ان کے قول کی یہ تھی کہ وہ معاذ اللہ اسلام لانے والوں کو مرتد سمجھ رہے تھے، کہ انہوں نے دین کو چھوڑ دیا ہے، لھذا دین کو چھوڑ دینے والے کا مال حلال ہے، خواہ جس طرح بھی اس کا مال کھالیا جائے۔ (ماخوذ از کبیر)

راہ کی نفی کا مطلب:

ان کا یہ کہنا ''نہیں ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ میں کوئی راہ'' اس کا یہ مطلب ہے ''نفی السبيل المراد منه نفي القدرة على المطالبة والالزام'' '' ہم پر کوئی راہ نہیں'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ گویا کہ یوں کہہ رہے تھے کہ ہم جب ان لوگوں کا مال لے لیں تو یہ ہم سے مطالبہ کرنے کی قدرت ہی نہیں رکھتے، اور نہ ہی یہ کہہ سکتے ہیں کہ تم پر ہمارا مال دینا لازم ہے۔ (از کبیر)

ہمیں کوئی عذاب دینے والا نہیں، ہماری کوئی گرفت نہیں کرسکتا، ہمارا کوئی مؤاخذہ نہیں کرسکتا۔

﴿وَيَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾

''اور وہ کہتے ہیں اللہ پر جھوٹ حالانکہ وہ جانتے بھی ہیں''

ان الفاظ مبارکہ کے چند مطالب ہیں۔

✿ ''ایک مطلب اس کا یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں تو راۃ میں مذکور ہے کہ مخالف کے مال میں خیانت کر لینا جائز ہے'' ان کا یہ قول سراسر جھوٹ پر مبنی ہے، ''اور وہ جانتے بھی تھے کہ ہم جھوٹے ہیں'' ''ومن كان كذلک كانت خيانة اعظم وجرمه افحش'' ، جو شخص اس طرح ہو اس میں بہت بڑی خیانت پائی جاتی ہے اور وہ بہت بڑا مجرم ہوتا ہے۔

✿ "الثانی انهم یعلمون کون الخیانة محرمة" دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ جانتے بھی تھے کہ خیانت حرام ہے، پھر وہ یہ کہہ رہے تھے کہ حلال ہے، رب تعالیٰ ہم سے کوئی مؤاخذہ نہیں کرے گا، یہ ان کا کہنا اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھنا ہی تھا۔

✿ "الثالث انهم یعلمون ما علی الخائن من الاثم" اس کا تیسرا مطلب یہ ہے کہ وہ جانتے تھے کہ خیانت کرنے والے پر کتنا عظیم گناہ ہے، لیکن یہ جاننے کہ باوجود وہ کہہ رہے تھے کہ یہ جائز ہے کہ مخالف کا مال خیانت کر کے کھالیا، اس کی ہمیں رب تعالیٰ نے اجازت دے رکھی ہے، یہ ان کا کہنا سراسر اللہ تعالیٰ پر جھوٹا افتراء باندھنا تھا۔
(ماخوذ از کبیر بوضاحت)

یہود کا عجیب قول یا احمقانہ قول یہ بھی تھا کہ وہ یہ کہہ رہے تھے کہ تمام مال ہمارے تھے، عرب کے لوگوں نے ہم پر ظلم کر کے ہم سے مال چھین لیا، اس لئے ہم پر کوئی گناہ نہیں کہ ہم اپنا مال ان سے لے لیں خواہ خیانت کر کے ہی کیوں نہ لے لیں۔

گذشته سے پیوسته : ابن ابی حاتم نے مالک بن دینار سے عجیب وغریب بات دینار کو دینار کہنے کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے یوں بیان فرمائی۔

انما سمی الدینار دینار الانة "دین و نار" ومعناه ان من اخذه بحقه فهو دینه ومن اخذه بغیر حقه فهو نار"

دینار کو دینار کہنے کی وجہ یہ ہے "دین" اور "نار" سے مرکب ہے، جو شخص جائز طریقے سے مال حاصل کرے تو اس کے لئے یہ دین ہے اور جو ناجائز طریقے سے حاصل کرے اس کے لئے یہ "نار" (آگ) ہے۔ (روح المعانی)

امانت کے متعلق احادیث مبارکہ:

✿ **وعن انس قال قلماخطبنارسول الله ﷺالا قال لا ایما ن لمن لاامانةله ولا دین لمن لا عهد له"**
(رواه البهیقی فی شعیب الایمان، مشکوة کتاب الایمان)

حضرت انس فرماتے ہیں بہت کم ہی آپ نے ہمیں خطبہ دیا ہوگا جس میں یہ ارشاد فرمایا ہوگا "اس شخص کا (کامل) ایمان نہیں جسے امانت کا پاس نہیں، اور اس کا دین (پریقین) نہیں جو وعدہ پورا نہیں کرتا۔

وضاحت حدیث:

" قلما " کے دو مطلب ہیں ایک تو یہ کہ "ما" مصدریہ ہو، اب اس صورت میں معنی یہ ہوگا "قل خطبة

خطبنا " کم ہی آپ نے ہمیں خطبہ دیا" جس میں یہ نہ کہا ہوالخ" اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ "ما" کافہ ہو، اور وہ نفی میں استعمال ہوتا ہے اور اس پر استثناء دلالت کرتا ہے، اب معنی یہ ہوگیا "**ما وعظنا الا قال فیها لا ایمان لمن لا امانة له**" الخ آپ نے ہمیں کوئی نصیحت نہیں فرمائی مگر یہ کہ اس میں فرمایا اس شخص کا ایمان (کامل) نہیں جسے امانت کا پاس نہیں"

(لا ایمان) ای علی وجه الکمال (لمن لا امانة له) فی النفس والا هل والمال وقیل فیما استؤمن علیه من حقوق الله وحقوق العباد التی کلف بها"

حدیث شریف میں امانت کا وسیع تر مفہوم لیا گیا ہے" آپ کے ارشاد گرامی" **لا ایمان لمن لا امانة له**" کا مطلب یہ ہے کہ" اسے کامل ایمان حاصل نہیں جو اپنے نفس اور اہل اور مال میں خیانت کا لحاظ نہیں کرتا، جس شخص کو حقوق اللہ اور حقوق العباد کا مکلف بنایا گیا ہے، اسے چاہیے کہ وہ ان کو پورا کرے۔

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی اس وسیع مفہوم کی وضاحت کر رہا ہے۔

﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا﴾ (سورۃ الاحزاب آیہ نمبر ۷۲)

بے شک ہم نے بامانت پیش فرمائی آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر تو انہوں نے اس کے اٹھانے کا انکار کیا اور اس سے ڈر گئے، اور آدمی نے اٹھالی، بے شک وہ اپنی جان کو مشقت میں ڈالنے والا بڑا نادان ہے۔

صدر الافاضل مولنا نعیم الدین مراد آبادی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں، حضرت ابن عباس ﷺ نے فرمایا کہ امانت سے مراد طاقت وفرائض ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر پیش کیا انہیں کو آسمانوں، زمینوں، پہاڑوں پر پیش کیا تھا کہ اگر وہ انہیں ادا کریں گے تو ثواب دیئے جائیں گے، نہ ادا کریں گے تو عذاب کئے جائیں گے، حضرت ابن مسعود ﷺ نے فرمایا کہ امانت نمازیں ادا کرنا، زکوۃ دینا، رمضان کے روزے رکھنا، خانہ کعبہ کا حج، سچ بولنا، ناپ اور تول میں اور لوگوں کی دولتیوں میں عدل کرنا۔

بعضوں نے کہا کہ امانت سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جن کا حکم دیا گیا اور جن کی ممانعت کی گئی، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے فرمایا کہ تمام اعضاء کان، ہاتھ، پاؤں وغیرہ سب امانت ہیں، اس کا ایمان ہی کیا جو امانت دار نہ ہو، اور حضرت ابن عباس ﷺ نے فرمایا کہ امانت سے مراد لوگوں کی ودیعتیں اور عہدوں کا پورا کرنا ہے، تو ہر مؤمن پر فرض ہے کہ نہ کسی مؤمن کی خیانت کرے، نہ کافر معاہد کی، نہ قلیل کی نہ کثیر کی، (آیۃ کریمہ کی مکمل تفسیر ان

شاء اللہ اپنی جگہ پر ہی آئے گی)

(ولا دین)علی طریق الیقین (لمن لا عهد له)بان غدر فی العهد والیمین ، "ولا دین لمن لا عهد له"

(اسے دین حاصل نہیں جسے وعدہ کا پاس نہیں)یعنی اس شخص کو دین پر کامل یقین حاصل نہیں جو وعدہ کر کے پھر جائے،اور قسم اٹھا کر پوری نہ کرے۔

تنبیہ : "لا ایمان لمن لا امانة له" میں اگر چہ بظاہر طور پر مطلقا ایمان کی نفی سمجھ آرہی ہے لیکن اس کی وضاحت علامہ ملاعلی قاری رحمہ اللہ ان الفاظ سے کرتے ہیں۔

" هذاالکلام وامثاله وعیدلایراد به الانقلاع بل الزجر ونفی الفضیلة دون الحقیقة وقیل یحتمل ان یراد به الحقیقة فان من اعتاد هذه الامور "

یہ کلام ہو یا اس کی مثل اور کلام ہو جس میں کسی عمل کے چھوڑنے پر وعید فرمائی گئی، بظاہر ایمان کی نفی ہو رہی ہو،اس میں حقیقت ایمان کی نفی نہیں، بلکہ زجر پائی گئی ہے،اور فضیلت کی نفی ہے یعنی نفی کمال ایمان کی ہے،نفی اصل ایمان کی نہیں۔

ہاں البتہ ایک شخص ان امور کی عادت بنالے،امانت میں خیانت کرنے کو جائز مانے،جھوٹ کو جائز مانے، اور وعدہ توڑنے کو جائز مانے تو وہ حقیقی طور پر کافر ہے۔اسی حدیث کی شرح مرقاۃ میں طبرانی کی معجم کبیر میں بیان کردہ روایت کو ذکر کیا،جس میں مزید چیزوں کا ذکر ہے،فائدہ کے لئے اسے ذکر کیا جارہا ہے۔

عن ابن مسعود قال قال رسول الله ﷺلا ایمان لمن لا امانة له ولا دین لمن لا عهد له والذی نفس محمد بیده لا یستقیم دین عبد حتی یستقیم لسانه ولا یستقیم له حتی یستقیم قلبه ولا یدخل الجنة من لا یأمن جاره بوائقة فقیل ما البو ائق یا رسول الله قال غشمه وظلمه وایما رجل اصاب مالا من حرام وانفق منه لم یبارک له فیه وان تصدق منه لم یقبل منه وما بقی فزاده الی النار الا ان الخبیث لا یکفر الخبیث ولکن الطیب یکفر " (رواه الطبرانی فی معجمه الکبیر)

حضرت ابن مسعود ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اس شخص کا ایمان (کامل) نہیں جسے امانت کا پاس نہیں،اور اس شخص کا دین (پریقین) نہیں جسے وعدہ کا پاس نہیں،قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد ﷺ کی جان ہے اس شخص کا دین درست نہیں جس کی زبان درست نہیں،اور اس شخص کی زبان درست نہیں جس کا دل درست نہیں،اور وہ شخص (ابتدائی طور پر) جنت میں داخل نہیں ہو

گا جس کے پڑوسی اس کے بوائق سے محفوظ نہ ہوئے، آپ سے پوچھا گیا یا رسول اللہ ﷺ "بوائق" سے مراد کیا ہے، آپ نے فرمایا اس کے مظالم اور بے جا زیادتیاں ہے۔

یعنی جس شخص کے مظالم اور بے جا زیادتیوں سے اس کے پڑوسی محفوظ نہ ہوئے تو وہ ابتدائی طور پر جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ اور جس شخص نے حرام مال حاصل کیا اور اسے خرچ کیا اس شخص کو اس مال میں کوئی برکت حاصل نہیں ہوگی، اور اگر اس نے وہ حرام مال صدقہ کیا تو اس سے وہ قبول نہیں کیا جائے گا، اس سے جو مال بچ گیا وہ آگ میں لے جانے کا ذریعہ ہوگا۔ خبردار ناپاک لوگ ناپاک چیز کا انکار نہیں کرتے، لیکن پاک لوگ ناپاک (اور حرام) چیزوں کا انکار کرتے ہیں، یعنی ان سے اجتناب کرتے ہیں۔ (وضاحت حدیث از مرقاۃ ج ا صفحہ نمبر ۱۰۹)

❁ **عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ آية المنافق ثلاث زاد مسلم وان صام وصلی وزعم انه مسلم ثم اتفقا اذا حدث كذب واذا وعد اخلف واذا ائتمن خان.**
(مشکوۃ باب علامات المنافق)

حضرت ابو ھریرہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا منافق کی تین علامتیں ہیں، مسلم میں یہ الفاظ زائد ہیں اگر چہ اس نے روزہ رکھا ہو اور نماز ادا کی ہو، یعنی وہ اپنے آپ کو مسلمان ہونے کا دعوہ بھی کرے، پھر بخاری اور مسلم کے آگے الفاظ ایک ہی ہیں، جن کا مطلب یہ ہے جب کلام کرے جھوٹ بولے اور جب وعدہ کرے تو خلاف کرے، اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو وہ اس میں خیانت کرے۔

وضاحت حدیث:

اس حدیث شریف میں پہلے اور آخری جملے بخاری اور مسلم کے اتفاقی ہیں درمیان میں الفاظ "وان صام وصلی" زائد ہیں۔

"**آية المنافق**" کا مطلب یہ ہے کہ منافق کی علامت جو اس کی بری نیت اور فساد پر مبنی افعال پر دلالت کرتی ہے، وہ تین ہیں:

(اصل النفاق من يظهر خلاف ما يضمر ثم غلب علی من يظهر الاسلام ويبطن الكفر)

نفاق کا اصل میں معنی یہ ہے کہ جو وہ دل رکھتا ہے (فساد اور برے عقائد وغیرہ) ظاہر اعمال اس کے خلاف ہوں، یعنی ظاہری طور پر اس کے عمل بہتر ہوں اگر چہ ان میں پوشیدہ ہو، لیکن نفاق کا غالب استعمال اس میں ہو رہا ہے کہ اسلام کو ظاہر کرے اور کفر کو پوشیدہ رکھے۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

حدیث شریف میں بظاہرو ہم ہوتا ہے کہ "آیۃ"مفرد ہے،اور" ثــلاث "جمع پر دلالت کر رہا ہے تو ان دونوں میں مطابقت کیسے؟''نشانی منافقت کی تین ہیں'' کا کیا مطلب ہے؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ "آیۃ" مفرد ذکر کر کے مراد جنس آیۃ لیا گیا ہے،اب معنی یہ ہوگا"کـل واحـد منهـا آیة " ہرایک ان میں سے علامت ہے،اور دوسرا احتمال یہ بھی ہے "اوان العلامة انما تحصل باجتماع الثلاث " کہ تینوں مل کر علامت نفاق ہوں۔ پہلا معنی زیادہ معتبر ہے کہ ہرایک ایک علیحدہ علیحدہ علامت ہے،اس معنی کو صحیح ابن عوانہ کی حدیث سے تائید حاصل ہے جس میں یوں ذکر ہے "علامات المنافق ثلاث "منافق کی علامتیں تین ہیں۔

اعتراض : حدیث پاک سے ظاہر طور پر یہ سمجھ آرہا ہے کہ تین میں حصر پائی گئی ہے،یعنی منافقت کی تین علامتوں میں اسے بند کیا گیا ہے کہ کوئی چوتھی علامت نہیں، حالانکہ دوسری حدیث میں چار علامات کا ذکر کیا گیا ہے،تو ان میں کس طرح تطبیق دی جائے گی؟

جواب : مسلم شریف کی ایک روایت میں جو علاء بن عبدالرحمٰن نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت ابوھریرہ ﷺ سے روایت کی اس میں حصر نہیں پائی گئی،اس کے الفاظ یہ ہیں"من عـلامة المنافق ثلاث"منافق کی علامتوں میں سے تین علامتیں یہ ہیں الخ۔

"فیکون قد اخبر ببعض العلامات فی وقت وبعضها فی وقت آخر"

نبی کریم ﷺ نے کسی وقت میں منافقت کی بعض علامتوں کا ذکر فرمایا کہ اس وقت ان کے ذکر کی ہی ضرورت تھی،اور کسی دوسرے وقت میں دوسری علامات کو ضرورت کے پیش نظر بیان فرمادیا،لھذا دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں۔

مسلم شریف میں جو الفاظ زائد مذکور ہیں "وان صام وصلي وزعم انه مسلم "ان کا مطلب یہ ہے کہ اگر چہ وہ روزہ رکھے اور نماز ادا کرے اور دعوی کرے کہ میں کامل مسلمان ہوں، پھر بھی اس میں تین خصلتیں اس کی منافقت پر دلالت کرتی ہیں۔

"**زعم**" کا معنی "ادعی "کیا گیا،اور "انــه مسلم " میں تنوین کو تعظیم کے لئے لیا گیا ہے اسی لئے اس کا معنی کیا گیا ہے "انـه مسلم ای کامل " اب راقم کے ترجمہ کو دیکھیں''اور دعوی کرے کہ میں کامل مسلمان ہوں''تو مرقاۃ کے مطابق پائیں گے،اور طلباء کرام کو باخوبی علم ہے کہ کہیں غائب کے صیغوں سے مراد تکلم ہوتا ہے،اسی لئے راقم نے ترجمہ تکلم کا کیا ہے۔

(اذا حدث کذب) منافقت کی ایک علامت یہ ہے کہ جب بات کرے تو جھوٹ بولے، "وھو اقبح الثلاثة" تین علامتوں میں سے بری علامت جھوٹ بولنا ہے۔

"**واذا وعد اخلف**" (اور جب وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے) یہ منافقت کی دوسری علامت ہے، مستقبل میں اچھا کام کرنے کی خبر دینا "وعد" ہے۔ "اذ وعد یغلب فی الخیر واو عد فی الشر" "وعد" کا لفظ غالبًا خیر کے لئے استعمال ہوتا، اور "اوعد" کا لفظ زیادہ طور پر شر کیلئے استعمال ہوتا ہے، یعنی دھمکی دینا اسے وعید کہا جاتا ہے، مہربانی کرنے کو وعد کہا جاتا ہے، اگر چہ علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے یوں ارشاد فرمایا "الخلف فی الوعید من مکارم الا خلاق "وعید (دھمکی) کی مخالفت اچھے اخلاق کا اظہار ہے، یہ علامت نفاق نہیں۔ کسی شاعر نے کہا:

"وانی اذا او عدته او وعدته لمخلف ایعادی ومنجز موعدی"

بے شک میں جب کسی کو وعید کروں (دھمکی دوں) یا وعدہ کروں، تو وعید کی میں خلاف ورزی کر لیتا ہوں اور وعدہ پورا کرتا ہوں۔

لیکن راقم کا اس میں موقف یہ ہے کہ صراحۃ جھوٹ منع ہے خواہ وعد میں ہو یا وعید میں، بلکہ شروع میں ہی ایسے الفاظ کو شامل کیا جائے کہ بغیر جھوٹ کے وعید کو چھوڑ دے۔ جیسے ہم طلباء کو کہتے ہیں اگر تم نے مدرسہ سے بہت غیر حاضریاں کیں، اسباق یاد نہ کئے تو ہم تمہیں مدرسہ سے نکال دیں گے، تاہم ہماری طرف سے پوری کوشش ہوگی کہ ہم کوئی سخت قدم نہ اٹھائیں آپ کا نقصان نہ ہو، لیکن آپ بھی اپنے نفع ونقصان کو اپنے اپنے ذہنوں میں رکھتے ہوئے، اچھے اخلاق سے کام لیں۔ اس قسم کے جملوں سے "وعید" سے نکلنے کی پہلے ہی راہ رکھ دی گئی ہے۔

آہ! ہم کتنے بے قدر ہیں:

الخلف فی الوعید (وعید کی خلاف ورزی) کا مسئلہ استاذ العلماء حضرت علامہ مولانا غلام رسول رضوی رحمہ اللہ (شیخ الحدیث فیصل آباد) نے مقدمہ مسلم الثبوت سے عربی حاشیہ میں بہت خوبصورت انداز میں حل فرمایا ہے، آپ کا عربی حاشیہ مختصر لیکن جامع و مانع اور کتاب کو حل کرنے میں بہت آسان ہے، اس حاشیہ کو پڑھ کر بار بار دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالی اس کے محشی کے مزار پر انوار پر ان گنت رحمتیں نازل فرمائے۔

لیکن مقام افسوس یہ ہے کہ تنظیم المدارس کے کورس سے مسلم الثبوت کو نکال دیا گیا ہے جس کی وجہ سے عظیم شخصیت کا عظیم کام بھی علماء کرام اور طلباء کرام کی نظروں سے غائب ہو گیا۔ راقم بھی اہلسنت وجماعت کے طلباء کرام

کے فائدہ کے لئے دن رات ایک کئے ہوئے، صحت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دنیاوی کاموں سے مکمل اجتناب کرتے ہوئے حواشی تیار کررہا ہے، تلخیص المفتاح، نورالایضاح، قدوری، کنزالدقائق کے عربی حواشی طبع ہوچکے ہیں، ھدایہ اولین کے حاشیہ کا کام جاری ہے، جزء اول ختم ہوچکی ہے، جزء ثانی کا حاشیہ ترتیب دے رہا ہوں، دعا ہے اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے یہ کتب تنظیم المدارس میں جاری رہیں تاکہ طلباء کرام محشی کے لئے دعاء فرماتے رہیں۔ اگرچہ راقم کے اردو حواشی مراح الارواح، میزان الصرف، سراجی کے بھی طبع ہوچکے ہیں، لیکن اردو حواشی کوئی معیاری کام نہیں۔

سؤال: جھوٹ بولنا اور وعدہ کے خلاف بظاہر ایک ہی صورت نظر آتی ہے، دونوں میں جھوٹ بولنا لازم آتا ہے، پھر وعدہ کی خلاف ورزی کو علیحدہ ذکر کیوں کیا؟

جواب: "ان الاخلاف قد یکون بالفعل وهو غیر الکذب الذی هو لازم التحدیث ولیس فیه ما یدل علی وجوب الوفاء بالوعد"

وعدہ کی خلاف ورزی کبھی فعل (عمل) سے بھی ہونی ہوتی ہے ضروری نہیں کہ زبان سے ہی وعدہ خلافی ہو، لیکن جھوٹ کا تعلق زبان سے ہے کیونکہ جھوٹی بات پر جھوٹ کا اطلاق ہے وعدہ کے خلاف فعل کو جھوٹ سے تعبیر نہیں کیا جاتا۔

اور دوسرا فرق یہ ہے کہ جھوٹ کے لئے ضروری نہیں اس سے پہلے وعدہ بھی پایا جائے، اور وعدہ خلافی میں یقیناً پہلے وعدہ پایا جاتا ہے۔ "واذا اؤتمن خان" اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے وہ اس میں خیانت کرے، یعنی منافقت کی تیسری علامت امانت مین خیانت کرنا ہے۔

"وحق الامانة ان تؤدی الی اهلها فالخیانة مخالفة لها"

امانت کا حق یہ ہے کہ حقدار کو وہ ادا کردی جائے، حقدار کو امانت نہ دینا، امانت میں خیانت کرنا ہے جو علامت منافقت ہے۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"ائتمن" باب افتعال ہے اور ماضی مجہول ہے، بعض روایات "اتمن" بھی آیا ہوا ہے۔ جو اصل میں "ائتمن" ہی ہے، ہمزہ کو واؤ بنایا گیا، اور واؤ کو تاء سے بدلا گیا اور تاء کو تاء میں ادغام کیا گیا "اتمن" میں تاء مشدد ہے۔

سؤال: "فان قیل هذا الحدیث مشکل من حیث ان هذه الخصال قد توجد فی المسلم المجمع علی عدم الحکم بکفره"

یہاں سوال یہ ہے کہ یہ حدیث بظاہر مشکل نظر آتی ہے کہ جن تین خصلتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی مسلمانوں میں بھی پائی جاتی ہیں، حالانکہ اجماع امت اس پر ہے کہ مسلمان میں اگر یہ عیوب پائے جائیں تو اسے کافر نہیں کہا جائے گا۔

جواب: "قلنا اللام فی المنافق اما تکون للجنس فهو اما علی التشبیه لنفاق العمل الذی لاینافی الاسلام او ان المراد الا عتیاد"

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ "آیۃ المنافق" میں المنافق پر الف لام جنسی ہے، اور یہ بیان کیا گیا ہے، کہ یہ علامتیں جس میں پائی جائیں گی وہ منافق کے مشابہ ہے، نفاق عملی اعلام کے منافی نہیں، کیونکہ ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے، البتہ نفاق قلبی، اعتقادی ایمان کے منافی ہے، کیونکہ دونوں کا ایک جگہ جمع ہونا ممکن نہیں، یعنی جس کا عقیدہ بھی منافقوں والا ہو وہ حقیقی منافق ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو ان خصلتوں کو عادت بنا لے، اور ان پر بار بار عمل کرے، جب ان کی کوئی پرواہ نہیں کرے گا تو ان کو جائز سمجھنے لگے گا، جب جائز سمجھے گا تو کافر ہو جائے گا، اب اس پر حقیقی منافقت کا اطلاق بھی جائز ہو جائے گا (وضاحت حدیث از مرقاۃ ج نمبر ا صفحہ ۱۲۶)

وعن عبدالله بن عمرو قال قال رسول الله ﷺ اربع من کن فیه منافقا خالصا ومن کانت فیه خصلة منهن کانت فیه خصلة من النفاق حتی یدعها اذا ائتمن خان واذا حدث کذب واذا عاهد غدر واذا خاصم فجر" (رواہ البخاری ومسلم، مشکوۃ باب علامات النفاق)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چار (خصلتیں) جس میں پائی جائیں وہ شخص خالص منافق ہے، جس میں ایک خصلت پائی جائے اس میں منافقت پائی گئی یہاں تک کہ اسے چھوڑ دے (وہ چار یہ ہیں) جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے، اور جب بات کرے تو جھوٹ بولے، اور جب وعدہ کرے تو اسے توڑ دے، اور جب جھگڑا کرے تو فجور سے کام لے (یعنی گالی نکالے)

وضاحت حدیث:

دونوں حدیثوں سے واضح ہوا کہ منافقت کی علامتیں پانچ ہیں اس لئے کہ "واذا عاهدو غدر" کے دو معنی بیان کئے گئے ہیں ایک معنی "نقض العهد ابتداء" ابتدائی طور پر ہی وعدہ کو توڑ دے اور دوسرا معنی علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہ بیان کیا ہے "اذا خالف ترک الوفاء" جب قسم اٹھا لے تو اسے پورا نہ کرے۔

راقم کے نزدیک "واذا وعد اخلف" عام ہے، جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے" یہ ہر قسم کے وعدہ کو شامل ہے، اور "واذا عاهد غدر" خاص ہو جائے کیونکہ "غدر" کا اطلاق زیادہ طور پر جنگی وعدہ کو توڑنے پر بولا جاتا ہے، کہ جب جنگ میں وعدہ کرے کہ ہم تم پر حملہ نہیں کریں گے تو پھر حملہ کر دے وعدہ توڑ دے تو یہ علامت منافقت ہے۔

حدیث شریف میں جو یہ ذکر ہے کہ جن میں ایک خصلت پائی گئی تو وہ منافقت کی خصلت ہو گی اس کی وضاحت تو پہلے جن دو حدیثوں کا ذکر کیا گیا ہے ان سے سمجھ آ گئی۔ البتہ آپ کا ارشاد "اربع من کن فیه منافقا خالصا" "جس میں چار خصلتیں پائی جائیں وہ خالص منافق ہے" اس میں مشکل یہ درپیش آ رہی ہے کہ چار عیوب جب پائے جائیں تو پھر بھی وہ گنہگار ہو گا، کافر نہیں ہو گا، آپ کے ارشاد گرامی میں "خالص منافق ہونے کا" کیا مطلب ہے؟ اس کے چند جواب دئے گئے ہیں کہ یہ حدیث ظاہر پر مبنی نہیں، بلکہ اس کی تاویلات پائی گئی ہیں۔ اس کا ایک جواب یہ دیا گیا ہے۔

"من اجتمعت فیه هذه الخصال واستمرت فبالحری ان یکون منافقا"

جس شخص میں یہ چار خصلتیں پائی جائیں اور وہ ان پر قائم رہے اور ان کی عادت بنا لے تو لائق یہ ہے کہ وہ خالص منافق ہو جائے، کیونکہ ہمیشہ کی عادت ان افعال کے جواز کی طرف پہنچا دے گی جو یقیناً کفر ہے، دعوی ایمان کا اور حرام کاموں جائز سمجھنا خالص منافقت ہی ہے۔

"وقیل یحتمل ان یکون المراد کا لمنافق بحذف اداة التشبیه مثل زید اسد"

اور دوسرا معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ حدیث شریف میں حرف تشبیہ محذوف ہے، یعنی حدیث شریف معنوی لحاظ پر اس طرح ہو گی "اربع من کن فیه کان کالمنافق الخالص" جس میں چار خصلتیں پائی گئی وہ خالص منافق کی طرح ہے، طلباء کرام سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ حرف تشبیہ عام طور پر محذوف ہوتا رہتا ہے، عام محاورہ عرب میں "زید اسد" استعمال ہوتا ہے، جس کا معنی ہوتا ہے "زید کالاسد" "زید شیر کی طرح ہے، یہ معنی نہیں کہ زید حقیقی طور پر شیر ہے۔

ویحتمل ان یکون هذا مختصا باهل زمانه فانه علیه الصلوة والسلام عرف بنور الوحی بواطن احوالهم ومیز بین من آمن به صدقا ومن اذعن له نفاقا"

اور تیسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے زمانہ کے چند لوگوں کا تذکرہ کیا ہوا اور آپ کو نور وحی سے ان کے باطن احوال پر مطلع فرما دیا گیا، جن کے اعتقادات سے بھی آپ کو باخبر کر دیا گیا، آپ کو معلوم تھا کہ سچے

مسلمان کون ہیں، اور خالص منافق کون ہیں، آپ نے ان کے درمیان فرق کرنے کے لئے یہ ارشاد فرمایا، البتہ خالص منافقوں کے نام ذکر نہیں فرمائے کہ ہوسکتا ہے کہ توبہ کرلیں، ان کو لوگوں کے سامنے رسواء نہ کیا جائے۔

"ولان ترک التصریح اوقع فی النصیحة وادل علی الشفقة واجلب علی الدعوة الی الایمان وابعد عن النفور والمخاصمة والالتحاق باالمخالفین"

صراحۃً (واضح طور پر) کسی کی برائی کا نہ ذکر کرنا نصیحت کے لئے بہت نفع مند ہے، اور شفقت پر دلالت کرتا ہے، اور ایمان کی دعوت کی طرف کھینچنے میں مفید ہے، اور کسی کو نفرت دلانے اور جھگڑا پیدا کرنے سے یہ طریقہ دور ہے، اور مخالفین کو اپنے ساتھ ملانے میں فائدہ مند ہے، "**واذا خاصم فجر**" کا وسیع مفہوم بیان کیا گیا ہے، ایک معنی تو ذکر کردیا گیا ہے "**واذا خاصم فجر ای شتم**" اور جب جھگڑا کرے تو گالی دے لیکن ایک معنی یہ بیان کیا گیا ہے "**ورمی بالاشیاء القبیحة**" اور بری چیزوں کو کسی طرف منسوب کرنا، یعنی کسی کو ناحق طور پر بری تہمت لگانا، کسی کی طرف برائی کو منسوب کرنا، کسی پر بدگمانی کرنا، اور کسی کی غیبت کرنا وغیرہ سب کو یہ شامل ہے، یعنی یہ سب چیزیں منافقت کی علامت ہیں، آپ کا یہ ارشاد "**جوامع الکلم**" صفت میں آتا ہے کہ الفاظ مختصر ہوں اور مطالب زیادہ ہوں۔ (وضاحت حدیث ماخوذ از کبیر مرقاۃ ج نمبر ۱ صفحہ نمبر ۱۲۸)

فائدہ جلیلہ: حضرت یوسف علیہ السلام کی بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے اپنے باپ سے جھوٹ بولا، وعدہ خلافی کی لیکن یہ گناہ کے کام تھے، کفر نہیں، وہ چونکہ نبی نہیں تھے اسلئے ان سے گناہ سرزد ہونا ممکن تھا، اسی لئے انہوں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا:

﴿قَالُوْا يَآ اَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خَاطِئِيْنَ﴾ (سورۂ یوسف، آیۃ نمبر ۹۷)

بولے اے ہمارے باپ ہمارے گناہوں کی معافی مانگئے بے شک ہم خطاوار ہیں۔

"ان الانبیاء معصومون قبل النبوة وبعدها عن کبائر الذنوب وصغائرها ولوسهوا علی ما هو الحق عند المحققین" (ماخوذ از مرقاۃ ج نمبر ۱ صفحہ نمبر ۱۲۷)

البتہ انبیاء کرام نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد چھوٹے اور بڑے گناہوں سے محفوظ رہتے ہیں ان سے بھول کر بھی کوئی گناہ سرزد نہیں ہوتا، محققین کا یہی مذہب ہے۔

نجوم الفرقان کے دوسرے حصہ میں حضرت آدم علیہ السلام کے ذکر میں تفصیل دیکھئے۔

❀ **عن ابن عمران النبی ﷺ قال ان اللہ عزوجل اذاارادان یهلک عبدانزع منه الحیاء فاذانزع منه الحیاء لم تلقه الامقیتاممقتافاذالم تلقه الامقیتاممقتانزعت منه**

الامانۃفاذانزعت منہ الامانۃلم تلقہ الاخائنامخوناقاذا لم تلقہ الاخائنامخونا نزعت منہ الرحمۃفاذانزعت منہ الرحمۃلم تلقہ الارجیماملعنافاذالم تلقہ الارجیماملعنانزعت منہ ربقۃ الاسلام " (رواہ ابن ماجہ)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا، تحقیق اللہ تعالیٰ جب کسی کو ہلاک کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو اس سے حیاء کو دور کردیتا ہے، جب حیاء کو اس سے نکال دیا گیا تو تم اس کو نہیں پاؤ گے سوائے اس کے کہ وہ شدید قابل نفرت ہوگا، جب تم نے اسے نہ پایا سوائے شدید قابل نفرت کے تو اس سے امانت کو ہٹادیا گیا، جس سے امانت کو ہٹادیا گیا تو اسے نہیں پاؤ گے سوائے خائن ہونے کے اور خیانت میں شدید طور پراسے مبتلاء پاؤ گے، جب تم کسی کو نہ پاؤ سوائے شدید خائن ہونے کے تو اس سے رحمت کو دور کردیا گیا، جس سے رحمت کو دور کردیا گیا اسے تم نہیں پاؤ گے سوائے راندے ہوئے لعنت کے مرتکب کے، جس کو تم نہ پاؤ سوائے راندے ہوئے ملعون کے اس (کی گردن) سے اسلام کا ڈورا (دھاگہ) اتار دیا گیا ہے۔ (منقول از قرطبی)

حدیث شریف کے ترجمہ سے واضح ہوگیا کہ جسے حیاء حاصل نہ ہو وہ قابل نفرت ہے، ہاں محبوب وہی جسے حیاء حاصل ہو، جو شخص قابل نفرت ہو وہ امین نہیں ہوگا بلکہ خیانت کرنے والا ہوگا، یعنی امین وہی ہوگا جو قابل محبت ہوگا، خیانت کرنے والا رحمت سے دور ہوگا، جسے رحمت ہی حاصل نہ ہو یقیناً رحمت سے دور قابل لعنت اور دربار خداوندی سے ہانکا ہوا ہوگا، ایسا شخص گویا کہ اسلام سے بہت دور ہوگا۔

ودیعت اور امانت میں فرق:

"الودیعۃخاصۃ والامانۃعامۃفان الودیعۃھی المستحفظ قصداوالامانۃ ھی الشیء الذی وقع فی یدہ وان من غیر قصدبان ھبت الریح والقت لوب انسان فی حجرانسان "

ودیعت خاص ہے کیونکہ ودیعت میں خود اپنے ارادے سے کسی سے حفاظت طلب کی جاتی ہے کہ ہمارا یہ مال تم اپنی حفاظت میں رکھ لو، امانت عام ہے کیونکہ کسی شخص کا مال دوسرے کے ہاتھ میں آجائے تو وہ امانت ہی کہلائے گا جیسا کہ ہوا نے کوئی کپڑا اڑا کر کسی دوسرے کے پاس پہنچا دیا ہو۔

اسی طرح کسی سے کوئی چیز نفع اٹھانے کے لئے عاریۃ (مانگ کر) لی، وہ بھی امانت کے درجہ میں ہی ہے، اس کی کئی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ ہر ودیعت کو امانت ضرور کہہ لیا جائے گا، لیکن ہر امانت ودیعت نہیں، دینی مدارس کے طلباء کرام اپنی اصطلاح میں کہیں گے کہ ودیعت اور امانت میں نسبت عموم وخصوص مطلق کی پائی گئی ہے۔

ودیعت کے متعلق چند ضروری مسائل:

الودیعة امانة فی ید المودع اذا ھلکت یضمنھا "

جس کے پاس حفاظت کے لئے مال رکھا جائے اس کے پاس وہ مال امانت ہوتا ہے، امانت خود بخود ہلاک ہو جائے تو اس شخص پر کوئی ضمان لازم نہیں۔ جیسا کہ مکان گر گیا، مکان کو آگ لگ گئی، چوروں، ڈاکوؤں نے مال لے لیا، ان تمام صورتوں میں (مودع) جس کے پاس امانت رکھا گیا اس پر کوئی ضمان لازم نہیں ہے۔

"لقولہ ﷺ لیس علی المستعیر غیر المغل ضمان ولا علی المستودع غیر المغل ضمان "

اس پر دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''جس نے عاریۃً کوئی چیز لی اس پر کوئی ضمان لازم نہیں سوائے اس کے کہ اس نے کوئی خیانت کی، اور جس کے پاس امانت رکھی گئی اس پر کوئی ضمان لازم نہیں سوائے خیانت کرنے کے، یعنی نفع اٹھانے کیلئے مانگ کر لے جانے والا، یا امین اگر خیانت کر لیں تو ان پر ضمان لازم نہیں۔ (ھدایة کتاب الودیعة)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

حدیث شریف میں جو لفظ ''مغل'' استعمال ہے یہ اغلال سے لیا ہوا ہے، ''اغلال'' ہر قسم کی خیانت پر بولا جاتا ہے، لیکن ''غلول'' صرف مال غنیمت کی خیانت پر بولا جاتا ہے۔ اور دوسری توجہ اس طرف کر لیں کہ حدیث شریف پر اعتراض کیا گیا ہے یہ حدیث مرفوع نہیں، تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے ''**والجواب بانہ مسند عن عبداللہ بن عمر عن النبی ﷺ**'' کہ یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مسند ثابت ہے۔ (العنایة)

ضمان لازم نہ ہونے پر عقلی دلیل:

چونکہ لوگ اپنے کاروبار کے سلسلہ میں اپنا مال کسی کے پاس بطور امانت رکھنے پر مجبور ہوتے ہیں، اگر مال کے خود ہلاک ہو جانے پر ضمان لازم آئے تو کوئی شخص اپنے پاس کسی کی امانت رکھنے کے لئے تیار نہیں ہوگا، اسی طرح لوگوں کے فائدہ والے کام معطل ہو کر رہ جائیں گے۔ (ھدایة)

امانت کی حفاظت کون کون کر سکتے ہیں؟

جس شخص کے پاس مال بطور امانت رکھا گیا ہے وہ خود اس مال کی حفاظت کرے یا اس کی زوجہ، یا اس کے عیال

حفاظت کریں تو مال ہلاک ہو جائے تو کوئی ضمان لازم نہیں آئے گی، اس لئے کے ان کو حفاظت کا حق حاصل ہے۔ عیال میں اس کی زوجہ، اس کی اولاد، اس کے والدین اور اس کے گھر میں رہنے والا خادم جو ماہانہ تنخواہ لیتا ہو، یا سال بعد ایک مرتبہ ہی سال کی تنخواہ لیتا ہو، وہ خادم عیال میں داخل نہیں جو یومیہ (ہر دن کی) مزدوری لے لیتا ہے، اسی طرح شاگرد جو اپنے پاس رہیں اور ان پر اعتماد کیا جائے وہ بھی عیال میں داخل ہوتا ہے، قیمتی اشیاء کے سٹور کی چابیاں اسے ہی دے دی جاتی ہیں جس پر اعتماد ہو، اگر والدین یا اولاد کا خرچ تو اس کے ذمہ لازم ہے لیکن وہ اس کے گھر نہیں رہتے تو ان کو امانت والے مال کی حفاظت کا حق حاصل نہیں، کیونکہ مال امانت رکھنے والے نے اس شخص اور اس کے گھر پر اعتماد کیا ہے، اور اگر بڑا بیٹا یا بڑی بیٹی باپ کے گھر میں رہتے ہوں، ان کا خرچ باپ پر لازم نہیں، بلکہ وہ اپنا علیحدہ خرچ کرتے ہیں تو وہ بھی عیال میں داخل ہیں، ان کو بھی باپ کے پاس رکھی ہوئی امانت کا حق حاصل ہے۔ (هدایه ، کفایة)

تنبیه : عیال کو امانت کی حفاظت کرنے کا حق اسی وقت دیا جاسکے گا جب غالب گمان یہ ہو کہ یہ خیانت کرنے والے نہیں "**فان علم ذلک و حفظ بهم ضمن**" اگر اس شخص کو معلوم ہو کہ میرے گھر کے افراد تو مال میں خیانت کر لیتے ہیں تو پھر بھی ان سے حفاظت کراتا ہے تو مال کے نقصان اسے ضمان دینا لازم آئے گا۔ (عناية)

فائدہ : اگر ایک شخص نے کسی کا مال اپنے گھر بطور امانت رکھا ہوا ہے، اس گھر کو آگ لگ گئی تو اس نے مال پڑوسی کو دے دیا یا اس نے حفاظت والا مال اپنے پاس کشتی میں رکھا ہوا تھا اسے کشتی کے غرق ہونے کا خطرہ ہوا اس نے مال ساتھ دوسری کشتی میں کسی کو دے دیا، وہ مال دوسرے شخص کے پاس ہلاک ہو جائے، اور اس کے پاس دو گواہ بھی ہوں کہ اس نے مال ہلاکت سے بچانے کیلئے دوسرے کو دیا تھا تو اس پر کوئی ضمان نہیں۔ (هدایه)

اگر گواہ نہ ہوں تو ضمان لازم آئے گی تا کہ لوگ بغیر کسی ثبوت کے جھوٹے دعوے نہ کر سکیں۔

مسئلہ ۱: اگر امانت رکھنے والے نے اپنا مال طلب کیا تو امین نے اسے مال نہیں دیا، حالانکہ وہ مال دینے پر قادر بھی تھا تو اس صورت میں اگر مال ہلاک ہو جائے تو اس پر ضمان لازم آئے گی، کیونکہ اس نے مال کو اپنے پاس روک کر حد سے تجاوز کیا۔ (هدایه)

مسئلہ ۲: اگر امین نے امانت والے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا لیا جسے جدا کرنا مشکل ہو گیا جیسا کے گندم کے ساتھ گندم کو ملا لیا، جو کے ساتھ جو کو ملا لیا تو اس صورت میں ضمان لازم آئے گی، اگر مال خود مل گیا کہ بوریاں پھٹ گئیں اور امین کے دانے اور جس نے امانت رکھی اس کے دانے آپس میں مل گئے تو یہ دونوں اس غلہ میں شریک ہوں گے۔ (هدایه)

مسئلہ ۳: اگر امین امانت والے مال سے کچھ خرچ کر لیا، پھر اتنا ہی مال اس میں لوٹا دیا، اگر مال ہلاک ہو گیا تو تمام مال کی ضمان اس پر لازم آئے گی، اس لئے کہ غیر کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر یہ تجاوز کرنے والا بن گیا، گویا کہ اس نے مال خود ہلاک کیا، لہذا ضمان لازم ہے۔ (هدایه)

مسئلہ ۴: اگر کسی شخص کے پاس سواری امانت رکھی گئی وہ اس پر سوار ہو گیا، یا کپڑا رکھا گیا اس نے وہ پہن لیا، یا غلام رکھا گیا تو اس نے اس سے خدمت لے لی، یا ان چیزوں کو کسی دوسرے کے پاس امانت رکھ دیا، اگر ان چیزوں میں کوئی نقصان نہیں تو ضمان لازم نہیں آئے گا، اگر چہ امانت میں مال دار کی اجازت کے بغیر تصرف کرنے کی وجہ سے وہ شخص گنہگار ہوا۔ اور اگر ان تصرفات سے مال میں نقصان لازم آیا تو ضمان لازم آئے گی، کیونکہ اس نے تجاوز کیا ہے۔ (هدایه وعینی)

مسئلہ ۵: اگر امین شخص امانت والے مال کو حفاظت کیلئے سفر میں اپنے ساتھ رکھے تو وہ مال ہلاک ہو جائے تو امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس پر ضمان لازم نہیں کیونکہ اسے یہ حق تھا کہ جس طرح بھی حفاظت کر سکے حفاظت کرے۔ امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ سفر میں خطرات ہوتے ہیں اس لئے امانت والا مال سفر میں ساتھ نہ لے جائے، مال کو ساتھ لے جانے پر مال کے ہلاک ہونے پر ضمان لازم آئے گی، اصل میں یہ اختلاف، اختلاف زمان کی وجہ سے تھا، امام صاحب رحمہ اللہ کے وقت سفر میں وہ خطرات نہیں تھے جو صاحبین کے زمانہ میں تھے۔ (هدایه مع حاشیه)

راقم کے نزدیک آجکل کے دور میں امانت والے مال کو سفر میں ساتھ رکھنا ممکن نہیں، آجکل جب گھر میں امانت رکھنے کے لئے کوئی تیار نہیں کہ ڈاکو امانت کے ساتھ ساتھ ہمارا مال بھی لوٹ کر لے جائیں گے، تو سفر میں تو مال کے ساتھ جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

ہاں یہ خیال رہے کہ اگر مال دار نے سفر میں مال کو ساتھ لے جانے سے منع کیا تھا، امین پھر بھی ساتھ لے گیا مال کے ہلاک ہونے پر بالاتفاق اس پر ضمان لازم آئے گی۔ (ہدایہ)

مسئلہ ۶: جب دو آدمی مل کر کسی کے پاس کوئی چیز بطور ودیعت (امانت) رکھیں، تو پھر ان میں سے، ایک شخص آئے اور مطالبہ کرے کہ ہماری امانت واپس کر دو، تو وہ امانت واپس نہ کی جائے جب تک کہ دونوں مل کر نہ آئیں۔ یہی امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے، اسی پر فتوی ہے، اس لئے کہ اگر تمام مال واپس لوٹائے گا تو دوسرے کا مال اس مطالبہ کرنے والے کو دینا لازم آئے گا جو جائز نہیں، اور اگر اس کا حصہ تقسیم کر کے دے دیا گیا تو پھر بھی درست نہیں، کیونکہ امین کو یہ حق ہی حاصل نہیں کہ دو شخصوں کی مشترک چیز ان دونوں میں سے کسی ایک غائب ہونے پر تقسیم کر دے۔ (ماخوذ از هدایه)

استاذی المکرم مولانا غلام یوسف گجراتی رحمہ اللہ جن سے راقم نے ابتدائی صرف کی کتب پڑھیں، انہوں نے صبح کی نماز کے بعد درس قرآن پاک میں ایک مرتبہ امام شافعی رحمہ اللہ کے فضائل بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ دو شخص ان کی والدہ کے پاس کوئی چیز امانت رکھ گئے، اور ساتھ ہی یہ کہہ گئے کہ جب تک ہم دونوں نہ آئیں تو یہ چیز واپس نہیں کرنی۔ چند دنوں بعد ان میں سے ایک آیا تو اس کے مطالبہ کرنے پر آپ کی والدہ نے وہ چیز اسے واپس کردی، ایک دو دنوں کے بعد دوسرا شخص آیا کہ ہماری امانت ہمیں واپس کرو، تو امام شافعی رحمہ اللہ کی والدہ نے کہا کہ تمہارا دوسرا ساتھی امانت لے گیا ہے، اس نے جھگڑا شروع کردیا تو وہ بہت پریشان ہوئیں، امام شافعی اس وقت نابالغ بچے تھے لیکن بہت زیادہ ذہین تھے، انہوں نے والدہ کی پریشانی کو دیکھ کر کہا، اے اماں جی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، بلکہ اس شخص کو کہو تم اکیلے کیوں آگئے ہو، اپنے دوسرے ساتھی کو بھی ساتھ لاؤ تاکہ تمہاری امانت تمہیں واپس کی جائے، یہ کہنے پر وہ واپس چلا گیا، پھر لوٹ کر نہیں آیا۔

مسئلہ: "وفی الجامع الصغیر اذا نهاه ان یدفع الی احد من عیاله فد فعها الی من لابد منه لایضمن"

جامع صغیر میں یہ مذکور ہے اگر کسی شخص نے مال امانت رکھا اور امین کو منع کیا کہ یہ میری امانت میرے اہل وعیال کو نہیں دینی، تو امین نے اس کی زوجہ کو دے دی تو ضمان لازم نہیں آئے گی، کیونکہ عیال میں بعض وہ افراد ہوتے ہیں جن سے چھٹکارا نہیں ہوتا، زوجہ بھی ان میں سے ہی ہے، لیکن زوجہ کو مال دینے پر اسی وقت ضمان لازم نہیں آئے گی جب وہ امانت میں خیانت کرنے میں مشہور نہ ہو۔

"وان کان له منه بد ضمن لان الشرط مفید فان من العیال من لایؤتمن علی المال"

اگر عیال میں وہ اشخاص ہوں جن کو مال دینا کوئی ضروری نہ ہو جیسے بڑی اولاد ہے تو ان کو امانت نہ لوٹائی جائے کیونکہ عیال میں بعض وہ افراد ہوتے ہیں جن کو مال دینے میں اعتماد نہیں کیا جاتا، اس لئے اس کا یہ شرط لگانا کہ میرے عیال کو میری امانت نہ لوٹانا ان کے حق میں مفید ہے، کیونکہ امانت میں خیانت کرنے میں جو مشہور ہوں ان کو مال لوٹانا ضمان کا سبب ہوگا۔ (ماخوذ از هدایه)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

بَلٰی مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰی فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ○ (آیۃ نمبر ۷۶)

(1) ہاں کیوں نہیں جس نے اپنا عہد پورا کیا اور پرہیز گاری کی اور بے شک پرہیز گار اللہ کو خوش آتے ہیں۔ (کنز الایمان)

(2) کیوں نہیں، جس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور تقوی اختیار کیا بیشک اللہ پسند کرتا ہے پرہیز گاروں کو۔ (نجوم الفرقان)

﴿بَلٰی﴾ ''کیوں نہیں!''

اثبات لما نفوه ای بلی علیهم فیهم سبیل" جب یہود نصاری نے کہا "لیس علینا فی الامیین" نہیں ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ میں کوئی راہ (یعنی پکڑ کی راہ) تو رب تعالی نے ان کا رد فرمایا، ارشاد فرمایا "بلی" یہ ایک لفظ ان کے نفی جملہ کو رد کر کے حکم کو ثابت کر رہا ہے، اب صرف ایک لفظ کا مطلب یوں ہوگا کیوں نہیں ان پر ان پڑھوں کے معاملہ میں پکڑ کی راہ ضرور پائی گئی ہے۔ (ماخوذ از تفسیر ابی السعود)

سبحان اللہ! قرآن پاک کی فصاحت کیا ہی خوب ہے کہ بظاہر ایک لفظ نظر آتا ہے، لیکن کثیر معانی پر مشتمل ہے۔

خیال رہے کہ تفسیر ابی السعود سے جو قول لیا گیا ہے وہ زجاج نحوی کا ہے، اس قول کے مطابق "بلی" پر وقف تام ہے، اور اس کے بعد جملہ استینافیہ ہے" اس قول کے مطابق مکمل آیہ کریمہ کا یوں مطلب ہوگیا، ہاں کیوں نہیں اہل کتاب (یہود و نصاری) کو عرب لوگوں کے مال کھانے پر پکڑ ہوگی جن کو یہ ان پڑھ کہتے تھے، اور ان کا یہ دعوی باطل ہے کہ ہمیں ان کے معاملہ میں کوئی پکڑ نہیں۔ (بات یہاں ختم ہوگئی آگے نئی بات شروع ہے) کہ جس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور تقوی اختیار کیا (وہی اللہ تعالی کے محبوب ہیں) کیونکہ اللہ تعالی پرہیز گاروں سے ہی محبت کرتا ہے۔

"والثانی ان کلمة (بلی) کلمة تذکر ابتداء الکلام آخر یذکر بعده وذلک لان قولهم لیس علینا فیما نفعل جناح قائم مقام قولهم نحن احباء الله تعالی ان اهل الوفاء بالتهد واتقی هم الذین یحبهم الله تعالی لاغیرهم، وعلی هذا الوجه فانه لایحسن الوقف علی (بلی)"

اور دوسرا قول اس میں یہ ہے کہ لفظ "بلی" کبھی ابتداء کلام میں آتا ہے، اس کے بعد والا جملہ اسی پر مرتب ہوتا ہے، اس قول کے مطابق، ان کا یہ کہنا ﴿لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّيْنَ سَبِيْلٌ﴾ (نہیں ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ میں کوئی راہ گرفت) کا مطلب یہ ہے کہ ہم جو بھی کرتے رہیں ہم پر کوئی بھی گناہ نہیں، یہ جملہ معنوی اعتبار سے ان کے اس قول

کے مطابق ہے "نحن احباء الله وابناء وه" ہم اللہ کے محبوب اور اس کے بیٹے ہیں، تو اللہ تعالی نے ان کے دعوی کو باطل اور جھوٹا ظاہر کرنے کیلئے ارشاد فرمایا ﴿بَلٰی مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰی فَاِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ﴾

اب اس کا مطلب یہ ہو گیا کہ ان کا قول درست نہیں بلکہ وعدہ کی وفاء کرنے والے اور تقوی اختیار کرنے والے ہی وہ لوگ ہیں جن سے اللہ تعالی محبت کرتا ہے، ان کے بغیر کسی اور سے محبت نہیں کرتا، اس قول کے مطابق لفظ "بلی" پر وقف نہیں ہوگا، اس قول کے مطابق ترجمہ یوں ہوگا ایسا نہیں، بلکہ وہ جس نے وفاء کی عہد کی اور پرہیزگاری کی (وہی اللہ کے محبوب ہیں) بے شک اللہ تعالی پسند کرتا ہے پرہیزگاروں کو۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

حروف ایجاب چھ ہیں، نَعَمْ ، بَلٰی ، اِیْ، اَجَلْ ، جَیْرِ ، اور "اِنَّ" نعم اور بلی، میں ابن حاجب رحمہ اللہ نے کافیہ میں بیان کیا "فنعم مقررة لما سبقها وبلی مختصة بایجاب النفی" "نعم" ماقبل مضمون کی تقریر کے لئے آتا ہے، اور "بلی" نفی کے ایجاب کے لئے خاص ہے، اس کی وضاحت میں علامہ جامی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا:

(فنعم مقررة لما سبقها) ای محققة لمضمونه استفهاما كان او خبرا فهی فی جواب اقام زید بمعنی قام زید وفی جواب الم یقم زید بمعنی لم یقم زید ، وبلی فی جواب الم یقم زید بمعنی قام زید ، فمعنی بلی فی جواب (الست بربكم) انت ربنا ، ولو قیل فی موضع بلی ههنا نعم لكان كفرا فان معناه حینئذلست بربنا"

"نعم" ماقبل مضمون کی توثیق کرتا ہے، خواہ استفہام ہو، خواہ خبر ہو، اگر پہلے کلام مثبت ہو تو مثبت کی توثیق کرتا ہے، جیسا کہ کوئی پوچھے "اقام زید" (کیا زید کھڑا ہے) تو جواب میں "نعم" کہا جائے تو معنی ہوگا "قام زید" ہاں (زید کھڑا ہے) اور اگر کوئی پوچھے "الم یقم زید" (کیا زید نہیں کھڑا؟) تو جواب میں کہا "نعم" (ہاں) تو اس مقام پر نفی کی توثیق ہے، یعنی جواب یہ ہوگا "لم یقم زید" ہاں (زید نہیں کھڑا) اگر "الم یقم زید" (کیا زید نہیں کھڑا) کے جواب میں "بلی" آجائے تو معنی یہ ہوگا "قام زید" کیوں نہیں بلکہ زید کھڑا ہے۔

اسی وجہ سے رب تعالی نے یوم میثاق کو جب اولاد آدم علیہ السلام سے پوچھا "الست بربكم" کیا میں تمہارا رب نہیں؟ تو جواب میں "قالو بلی" انہوں نے کہا کیوں نہیں، یعنی تو ہمارا رب ہے۔ اس مقام پر اگر جواب میں "نعم" بولا جائے تو کفر لازم آئے گا کیونکہ وہ تو نفی کی نفی سے توثیق کیلئے آتا ہے، اس صورت میں، یعنی جواب میں "نعم" بولنے سے

معاذ اللہ معنی یہ ہو جاتا ہاں (تو ہمارا رب نہیں) تو اس سے کفر لازم آتا۔

البتہ یہ خیال رہے کہ کبھی عرف میں "نعم" "بلی" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لیکن عرف قانون نہیں بلکہ مختلف علاقہ جات کے مختلف عرف ہوتے ہیں، بعض علاقوں میں اس طرح استعمال ہوتا ہے کہ کوئی کہے:

"یا زید الیس لی علیک الف درهم وقال زید نعم یکون اقرار ا وتفوم مقام بلی لتقریر الالبات بعد النفی"

اے زید کیا میرے تجھ پر ہزار درھم نہیں؟ تو زید اس کے جواب میں کہے "نعم" تو یہ بعض علاقوں کے عرف کے مطابق اقرار ہو جائے گا کہ ہاں مجھ پر تمہارے ہزار درھم ہیں، اس صورت میں، نعم، بلی کے معنی میں استعمال ہوگا۔
(ماخوذ از شرح جامی، بحث الحروف صفحہ نمبر ۳۶۱)

طلباء کرام! یہ بحث طویل اس لئے ذکر کی کہ راقم کو تفسیر نعیمی کی یہ بحث سمجھ نہیں کہ اس میں سہو ہے یا کہ نحو کی کسی اور کتاب سے آپ نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے، قبلہ مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا بلی، نعم، اور ای، جیر سب جواب کے حروف ہیں، بمعنی ہاں، مگر فرق یہ کہ "نعم" نفی کے اثبات کے لئے آتا ہے، بلی منفی کے اثبات کیلئے (راقم کو سہو ہی نظر آتا ہے)
(نعیمی)

عظمت قرآن پر جان قربان:

قرآن پاک کی فصاحت کو بیان کرنا بھی میرے جیسے ہیچمدان کیلئے تو ممکن ہی نہیں، البتہ علماء کرام کے بیان سے نقل کر کے طلباء کرام کو کچھ فائدہ پہنچا دیتا ہوں علامہ رازی رحمہ اللہ کیا خوب بیان فرماتے ہیں۔

"واعلم ان هذالآية دالة علی تعظيم امر الوفاء بالعهد وذلک۔ لان الطاعات محصورة فی امرين التعظيم لامر الله، والشفقة علی خلق الله فالوفاء بالعهد مشتمل عليهما معا، لان ذلک سبب لمنفعة الخلق فهو شفقة علی خلق الله ولما امر الله به کان الوفاء به تعظيما لامر الله فثبت ان هذه العبارة مشتملة علی جميع انواع الطاعات والوفاء بالعهد کما يمکن فی حق الغير يمکن ايضافی حق النفس لان الوافی بعهدالنفس هو الآتی بالطاعات والتارک للمحرمات لان عند ذلک تفوذالنفس بالثواب عن العقاب"

اس آیۃ کریمہ سے یہ فائدہ حاصل ہو رہا ہے کہ وعدہ کو پورا کرنا اور وعدہ کے امر کو معظم سمجھنا ضروری ہے، اس لئے کہ طاعات کو دو چیزوں میں منحصر کر دیا گیا۔

(۱) اللہ تعالی کے امر کی تعظیم، یعنی اللہ تعالی کے امر کو معظم سمجھنا۔ (۲) اللہ تعالی کی مخلوق پر شفقت کرنا۔

"من اوفی بعهده" ان دو چیزوں کو شامل ہے، اسلئے کہ وعدہ کو پورا کرنا مخلوق کے نفع کا سبب ہے، تو واضح ہوا کہ وعدہ کو پورا کرنا اللہ تعالی کی مخلوق پر شفقت کا ذریعہ ہے، اور اللہ تعالی نے جب وعدہ پورا کرنے کا حکم دیا ہے تو وعدہ کو پورا کرنے میں اللہ تعالی کے امر کی تعظیم بھی پائی جائے گی۔

واضح ہوا کہ ارشاد باری تعالی میں "بلی من اوفی بعهده" بہت مختصر الفاظ مبارکہ ہیں، لیکن فصاحت و بلاغت کے لحاظ پر بہت عظیم کلام ہے، جو کہ تمام طاعات پر مشتمل ہے، آیۂ کریمہ سے اور یہ فائدہ حاصل ہوا کہ جس طرح اور لوگوں سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنا لازم ہے، اسی طرح اپنے آپ سے کئے گئے وعدے پورے کرنے بھی لازم ہیں، انسان نے اپنے نفس سے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ طاعات کو لائے گا، اور حرام کاموں کو چھوڑ دے گا، لھذا جب اپنے نفس سے کئے گئے ان دعووں کو پورا کرے گا تو اللہ تعالی اپنی رحمت سے اسے ثواب عطا فرمائے گا، اور عذاب سے بچائے گا۔ (کبیر)

صرف لفظ "بلی" سے یہود کے من گھڑت اقوال کو رد کر دیا گیا کہ تمہارا یہ کہنا کہ ہم عرب لوگوں کا جو مال ہڑپ کرتے رہیں ہمیں کوئی گرفت نہیں، یہ باطل ہے، یعنی انہوں نے جب یہ کہا کہ ہمیں کوئی مؤاخذہ (پکڑ) نہیں، ہم جو بھی کرتے رہیں، تو رب تعالی نے ہمیں کوئی عذاب نہیں دینا، تو ان کے رد میں صرف لفظ "بلی" ذکر فرما دیا، کیوں نہیں؟ یعنی تمہیں رب تعالی نے اپنی گرفت میں تو لینا ہی ہے۔

یہود کے من گھڑت اقوال کی ایک جھلک دیکھیے، تفہیم میں بیان کیا گیا ہے "تلمود میں کہا گیا ہے کہ اگر اسرائیل کا بیل کسی غیر اسرائیلی کے بیل کو زخمی کر دے تو اس پر کوئی تاوان نہیں، مگر غیر اسرائیلی کا بیل اگر اسرائیل کے بیل کو زخمی کرے تو اس پر تاوان ہے۔ اگر کسی شخص کو کسی جگہ کوئی گری پڑی چیز ملے تو اسے دیکھنا چاہیے کہ گرد و پیش آبادی کن لوگوں کی ہے اگر اسرائیلیوں کی ہو تو اسے اعلان کرنا چاہیے، غیر اسرائیلیوں کی ہو تو اسے بلا اعلان ہی چیز رکھ لینی چاہیے۔

ربی اشماعیل کہتا ہے کہ اگر امی اور اسرائیل کا مقدمہ قاضی کے پاس آئے تو قاضی اگر اسرائیلی قانون کے مطابق اپنے مذہبی بھائی کو جتوا سکتا ہے تو اس کے مطابق جتوائے، اور کہے کہ یہ ہمارا قانون ہے، اور اگر امیوں کے قانون کے تحت جتوا سکتا ہو تو اس کے تحت جتوائے اور کہے کہ یہ تمہارا قانون ہے، اور دونوں قانون ساتھ نہ دیتے ہوں تو پھر جس حیلے سے بھی وہ اسرائیلی کو کامیاب کر سکتا ہو کرے، ربی شموایل کہتا ہے کہ غیر اسرائیلی کی غلطی سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

(تالمود ک مسلینی، پال آئزک ہرشوں، لندن ۱۸۸۰ء صفحات ۳۷، ۲۱۰، ۲۲۱)

آج تک یہود و نصاری یہی کہہ رہے ہیں کہ ہم ایٹم بم بنائیں اور ان کو استعمال کریں تو ہماری مرضی کی بات ہے ہمیں اس میں اختیار ہے، کوئی دوسرا ملک ایٹم بم بنائے گا تو یہ ہمارے لئے قابل برداشت نہیں، ہم اس کے ایٹم بم کو اور اس

کے ملک کو تباہ کر دیں گے۔ ان کی یہ بڑھک سن کر ایٹمی قوتیں مفلوج ہو گئیں، ایٹم کے تذکرے ختم ہو گئے، موجد ہیرو سے زیرو بنا دیئے گئے، **مقام افسوس!** مسلمان اتنے زیادہ ڈرپوک کیوں ہو گئے؟

فوائد : **"التقوی تعم وفاء ما عاهدوا الله علیه من الایمان بمحمد ﷺ وبما جاء به مما یتعلق بتکمیل القوۃ النظریة والعملیة"**

تقوی عام ہے، وعدہ کی وفاء کو شامل ہے، یعنی اللہ تعالی کیا ہوا وعدہ کہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لاؤ گے ﴿اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ قَالُوۡا بَلٰی﴾ اس وعدہ کو شامل ہے، اور تقوی اس چیز سے بھی متعلق ہے کہ قوت نظریہ اور قوت عملیہ کی تکمیل جن کاموں سے ہو سکے وہ کیے جائیں۔

سبق آموز حکایت:

ایک جوان نے اللہ تعالی سے وعدہ کیا کہ میں دنیا کی خوبصورت چیزوں کو نہیں دیکھوں گا، ایک دن وہ بازار سے گزرا تو اس نے موتیوں سے مرصع ایک کمر بند دیکھا، تو اس کی طرف کچھ دیر تعجب سے دیکھا، پھر آگے چلا گیا، ابھی آگے چلا ہی تھا کہ دکاندار کو کمر بند نظر نہ آیا، وہ جلدی سے اپنی دکان سے نکلا تو اس اللہ کے بندے کو پکڑ لیا کہ تو تو عیار و مکار ہے، میری دکان سے کمر بند تو نے چوری کر لیا ہے، وہ پکڑ کر حاکم کے پاس لے گیا، حاکم نے اس کے ظاہر حال کو دیکھ کر کہا یہ چور نہیں ہو سکتا یہ تو نیک شخص ہے، دکاندار نے کہا میرا کمر بند اس اس طرح تھا، دکان کے پاس یہی کھڑا ہوا تو وہ کمر بند گم ہو گیا، آپ اس کی تلاشی لیں، تلاشی لینے پر وہ کمر بند اس کی کمر سے باندھا ہوا مل گیا، بادشاہ نے بھی کہا تو تو بڑا عیار ہے، کیا تجھے شرم نہیں آتی لباس تو نیک لوگوں کا پہنتا ہے اور پھر چوریاں بھی کرتا ہے۔

اس جوان نے کمر بند کو دیکھ کر کہا **"مولای الا قالة الهی لا اعود الی مثلها"** اے میرے مولی میں باز آگیا، میں باز آگیا (میری پناہ، میری پناہ) اور میرے اللہ میں آئندہ ایسا کام نہیں کروں۔

اس نے وہ کمر بند چوری تو نہیں کیا تھا، قدرتی طور پر اس کی کمر کے ساتھ اس طرح باندھ دیا گیا تھا کہ اسے پتہ بھی نہ چل سکا، بادشاہ نے کہا اسے خوب مارو، جب اس کے کارندوں نے اس شخص کے کپڑے اتار دیئے تاکہ اسے خوب ماریں **"فاذاهم بصوت یسمع ولایری یقول دعوه ولاتضربوه انما اردنا تأدیبه"** اچانک ایک غیبی آواز آئی، آواز تو سنی جا رہی تھی لیکن بولنے والا کوئی نظر نہیں آ رہا تھا، وہ آواز یہ آ رہی تھی کہ اسے نہ مارو، ہم نے تو اسے ادب سکھانے کا ارادہ کیا، **"فوثب السلطان الی الفتی وقبله بین عینیه"** بادشاہ جلدی سے جوان طرف آگے بڑھا، اس کی درمیان آنکھوں کے

بوسہ لیا، اس جوان سے پوچھا تمہارا معاملہ کیا ہے؟ اس نے بتایا میرا رب تعالی سے وعدہ یہ تھا کہ میں دنیا کی اچھی چیزوں کو نہیں دیکھوں گا، لیکن بازار سے گزرتے ہوئے مجھے یہ کمر بند خوبصورت نظر آیا تو میں نے اسے دیکھنا شروع کر دیا تھا، آگے کا رب تعالی ہی بہتر جانتا ہے کہ میرے ساتھ کیا ہوا، پھر اس نے آیۃ کریمہ کا یہ حصہ پڑھا ﴿وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا﴾ وہ اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہیں.......... وہی لوگ سچے ہیں اور وہی لوگ پرہیزگار ہیں۔

کمر بند کے مالک دکاندار نے بھی اس جوان کی خدمت میں یوں عرض کیا "سالتک باالله الا ما قبلتها منی واجعلنی فی حل" میں اللہ تعالی کے لئے تم سے سوال کرتا ہوں جو مجھ سے تم ضرور قبول کرو وہ سوال یہ ہے تم مجھے معاف کردو، "فقال الیک عنی لیس هذا من صنعتک انما الصنع لصاحب الصنع ولا مؤثر فی الوجود غیر الحق ولیس فی الدار غیره دیار" اس جوان نے کمر بند والے دکاندار کو کہا میں نے تمہیں معاف کر دیا، درحقیقت تمہارا یہ کام ہی نہیں، یہ کام تو کام والے کا ہی ہے، وہی قادر مطلق ہے، اس کام میں سوائے حق تعالی کے اور کوئی مؤثر نہیں، یہ سب جہان اسی کا ہے، اس کے جہان میں اور کوئی جہان نہیں۔

اس حکایت سے یہ سبق حاصل ہوا "فعلی العاقل ان یوفی بعهده فی السراء والضراء ویجتهد فی محافظته" کہ عقلمند شخص کے لئے ضروری ہے کہ اپنے وعدہ کو ہر حال میں پورا کرے خواہ خوشی میں ہو یا پریشان حالی میں ہو، اس وعدہ کو پورا کرنے کی پوری پوری کوشش کرے۔

راقم کو اس حکایت سے اور یہ فائدہ سمجھ آیا کہ اللہ تعالی بعض اوقات آزمائش میں مبتلا کرتا ہے، بظاہر ان کا وہ گناہ نہیں ہوتا جس میں انہیں پکڑ لیا جاتا ہے، خناس لوگ اللہ کے پیاروں پر انگشت زنی کرتے ہیں (ان کی طرف انگلیاں اٹھاتے ہیں) دیکھو جی اس صوفی، اس مولوی کی طرف اس نے یہ کام کیا ہے یہ تو کتنا برا کام ہے، انہیں پتہ ہی نہیں ہوتا کہ یہ کسی اور گرفت میں ہیں، حقیقت سے باخبر صرف رب تعالی ہی ہوتا ہے، ایک مرتبہ موسلا دھار بارشوں کی وجہ سے لاہور شہر سیلاب کا منظر پیش کر رہا تھا، گلبرگ جیسی جگہ بھی جھیل کا منظر پیش کر رہی تھی،

عبدالقادر حسن (سابقہ کالم نگار روزنامہ جنگ) نے اس پر ایک مضمون لکھا کہ یہ درحقیقت مرغی کے چوزوں کے خون کو مال روڈ سے دھونے کے لئے آیا، کیونکہ جب مرغبانی پر ٹیکس لگایا گیا تو مرغی کا کاروبار کرنے والوں نے چوزوں کو مختلف رنگ لگا کر مال روڈ پر بطور احتجاج چھوڑ دیا جو گاڑیوں کی زد میں آ کر مر گئے تھے اس خون کو دھونے کیلئے رب تعالی نے سیلابی بارشوں کا انتظام کیا۔

اس پر اس نے ایک صاحب کشف بزرگ کا واقعہ نقل کیا کہ دو شخص قتل کے ملزم قرار دئے گے، وہ جیل میں تھے، ان کے لواحقین ایک نیک بزرگ کے پاس دعاء کرانے کے لئے گئے، اس نے کہا اللہ تعالیٰ خیر کرے ابھی گھوڑی بہت روتی ہے اور اس کا بچھیرا بہت روتا ہے، اس بزرگ کا یہ اشارہ جیل میں قیدیوں کے لواحقین کو نہ سمجھ آسکا، انہوں نے قیدیوں کو بزرگ کی بات سنائی تو انہوں نے سمجھ لیا، وہ کہنے لگے کہ ہم نے ایک مرتبہ چوری کی تھی، چوری کیا ہوا مال اسی گھر سے گھوڑی کو کھول کر اس پر لاد لیا تھا، اس گھوڑی کا بچھیرا بار بار گھوڑی کے آگے آجاتا جو ہمارے سفر میں رکاوٹ بن رہا تھا تو ہم نے اس بچھیرے کو مار کر ایک کنویں میں پھینک دیا تھا، یعنی وہ دونوں قیدی درحقیقت گھوڑی کے بچھیرے کو قتل کرنے کے جرم میں مبتلاء تھے، لیکن بظاہر ان پر کسی شخص کو قتل کرنے کا الزام تھا، وہ حقیقت میں اس شخص کے قتل کے شریک نہیں تھے، اللہ تعالیٰ ہی حقائق کو جانتا ہے، وہی علیم وخبیر ہے۔

راقم نے کئی مرتبہ اپنا موقف تقریر میں دہرایا ہے کہ نواز شریف اور شہباز شریف میرے خیال میں لاہور میں مساجد کو شہید کرنے اور جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے اور لاہور کو خوبصورت بنانے کے زعم باطل کے جرم کی وجہ سے جلاوطن کردئے گئے، ورنہ طیارہ فراڈ کیس فراڈ کیس ہی تھا

اور سبق حاصل یہ ہوا کہ ہر چیز کو اللہ تعالیٰ کی طرف سمجھے، اسی کی طرف رجوع کرے۔

چہ خوش گفت بہلول فرخندہ خوی   چو بگذشت برعارفی جنگ جوی

کتنا اچھا کہا بہلول اچھی عادت والے نے۔ جب وہ گزرا ایک عارف جنگجو (لڑائی کرنے والے) پر

گر ایں مدعی دوست بشناختی   بہ بیکار دشمن نہ پرداختی

اگر یہ مدعی معرفت اپنے دوست (اللہ تعالیٰ) کو پہچانتا، تو بیکار دشمن سے (لڑائی کرنے) مشغول نہ ہوتا،

گر از ہستی حق خبر داشتی   ہمہ خلق را نیست پنداشتی

اگر اسے یہ خبر ہوتی کہ اللہ تعالیٰ کی ذات موجود ہے، تو تمام مخلوق نہ ہونے کے برابر سمجھتا،

"فاذا وقفت علی هذا الخبر فقم فی تربية نفسک الی ان تصل الی الهوية المطلقة مميطالثام الاثنينة مشاهدا وجود الحق فی کل شئی رزقنا الله واياکم مشاهدته"

جب یہ بات تمہیں سمجھ آجائے کہ حقیقی موجود اللہ تعالیٰ ہی ہے، مخلوق تمام فانی ہے تو تم اپنے نفس کی یوں تربیت کرو کہ تمہاری رسائی ذات مطلق (باری تعالیٰ) کی طرف ہو، دوئی کو مٹا دو فنا فی اللہ کا درجہ حاصل کرو تا کہ ہر چیز میں تمہیں وجود باری تعالیٰ کا مشاہدہ حاصل ہو، اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو اپنا مشاہدہ عطا فرمائے "آمین"

(ماخوذ از روح البیان مع خیالات راقم)

اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِاللّٰهِ وَاَیْمَانِهِمْ ثَمَنًاقَلِیْلًا اُولٰئِکَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ وَلَا یُکَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا یَنْظُرُاِلَیْهِمْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَلَا یُزَکِّیْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌO (آیۃ نمبر ۷۷)

(۱) وہ جو اللہ کے عہداوراپنی قسموں کے بدلے ذلیل دام لیتے ہیں آخرت میں اُن کا کچھ حصہ نہیں، اور اللہ نہ ان سے بات کرے نہ ان کی طرف نظر فرمائے قیامت کے دن، اور نہ انہیں پاک کرےاوران کے لئے دردناک عذاب ہے۔ (کنزالایمان)

(۲) بیشک وہ جو حاصل کرتے ہیں اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے گھٹیا مال، یہ وہ ہیں کہ نہیں حصہ ان کا آخرت میں اور نہیں کلام کرے گا ان سے اللہ اور نہ ہی نظر (رحمت) کرے گا ان کی طرف قیامت کے دن اور نہ انہیں پاک کرے گا اور ان کیلئے عذاب ہے دردناک'' (نجوم الفرقان)

شان نزول:

میں چند وجوہ ذکر کی گئی ہیں، لیکن ان میں کوئی تعارض نہیں، وہ تمام وجوہ ہی حقیقت میں شان نزول ہیں، یعنی کئی واقعات کے بعد آیۃ کریمہ کا نزول ہوا۔

(۱) قال عکرمۃ نزلت فی رء و س الیھود کتموا ما عھد اللہ الیھم فی التوراۃ فی شان محمد وبدلوہ و کتبوا بایدیھم غیرہ وحلفوا انہ من عنداللہ لئلا یفوتھم الماکل و الرشاالتی کانت لھم من اتباعھم "

شان نزول کی ایک وجہ عکرمہ ﷺ کی روایت میں مذکور ہے کہ یہ آیۃ کریمہ یہود کے سرداروں کے متعلق نازل ہوئی جنہوں نے چھپادیا نبی کریم ﷺ کی شان کو، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے توراۃ میں ان سے وعدہ لیا کہ اسے حق طور پر بیان کرنا، لیکن انہوں نے نبی کریم ﷺ کی شان کو تبدیل کردیا، اپنے ہاتھوں سے آپ کے اوصاف کو تبدیل کر کے لکھ دیا، اور قسمیں اٹھائیں کے توراۃ میں اللہ تعالیٰ نے یہی بیان فرمایا ہے، اس لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کی تابعداری کریں۔ یہ اوصاف تبدیل کرنے، توراۃ میں لئے گئے وعدہ کو توڑنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ ان کی رشوت اور امیر لوگوں سے ملنے والا مال بند نہ ہوجائے۔ (معالم التنزیل للبغوی)

وہ یہود کے سرکردہ لوگ تھے جن کا تذکرہ اس روایت میں موجود ہے۔

"واخرج ابن جرير عن عكرمة قال نزلت هذه الآية "ان الذين يشترون بعهد الله وايمانهم ثمناقليلا "في ابی رافع وكنانة بن ابی الحقيق وكعب ابن اشرف وحيى بن اخطب"

ابن جریر نے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ یہ آیۃ کریمہ ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا﴾ ابورافع، کنانۃ بن حقیق، کعب بن اشرف اور حیی بن اخطب یہود کے متعلق نازل ہوئی جن کی کوشش سے نبی کریم ﷺ کے اوصاف توراۃ میں تبدیل کردیئے گئے (درمنثور)

(۲) عن ابی وائل عن عبدالله قال قال رسول الله ﷺ من حلف على يمين صبر يقتطع بها مال امرئی مسلم لقی الله يوم القيامة وهو عليه غضبان فانزل الله تعالى تصديق ذلک، ان الذين يشترون بعهد الله ايمانهم ثمنا قليلا" (رواه البغوی باالاسناد على طريق البخاری)

ابووائل حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص قسم اٹھاتا ہے اور اس کے ذریعے کسی مسلمان کا مال لے لیتا ہے، قیامت کے دن وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوگا، رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی کی تصدیق کے لئے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا۔ (معالم التنزیل للبغوی ومظہری)

(۳) دخل الاشعث بن قيس فقال ما يحدثكم ابو عبد الرحمن ؟فقالو كذاكذا فقال فی انزلت كانت لی بئر فی ارضی ابن عم لی فاتيت رسول الله ﷺ فحدثته فقال هات بينتک او يمينه قلت اذا يحلف عليها يا رسول الله فقال رسول الله ﷺ "من حلف على يمين صبر وهو فيها فاجر يقتطع بها مال امرئی مسلم لقی الله يوم القيامةوهو عليه غضبان"

اشعث بن قیس آئے انہوں نے پوچھا ابوعبدالرحمٰن اس آیۃ کے متعلق کیا کہتے ہیں، ان کو بتایا گیا کہ اس اس طرح وہ بیان کرتے ہیں تو انہوں نے کہا یہ آیۃ کریمہ میرے حق میں نازل ہوئی، میرا ایک کنواں چچا کے بیٹے کی زمین میں تھا (وہ مجھے دے نہیں رہا تھا) میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ کو بتایا، آپ نے فرمایا، گواہ پیش کرو یا قسم اٹھاؤ (یہ اس وقت کا واقع ہے جب مدعی سے بھی قسم لے کر فیصلہ کیا جاتا تھا) میں قسم اٹھانے پر پختہ طریقہ سے تیار ہوگیا۔ میں نے کہا میں قسم اٹھاتا ہوں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو قسم اٹھا کر اپنے بھائی کا مال لے لے تو اللہ تعالیٰ سے قیامت کے دن اس حال میں ملے گا کہ وہ اس پر ناراض ہوگا، تو آپ کے ارشاد کی تائید میں یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔ (معالم التنزیل للبغوی)

(۴) واخرج مسلم وابو داؤد والترمذی عن وائل بن حجر قال جاء رجل من حضر موت

ورجل من كندة الى النبی ﷺفقال الحضرمی یا رسول الله ان هذا قد غلبنی علی ارض كانت لابی قال الكندی هی ارض كانت فی یدی از رعها لیس له فیها حق فقال النبی ﷺللحضرمی الک بینة قال لا قال ذلک یمینه فقال یا رسول الله ان الرجل فاجر لایبالی علی ما حلف علیه ولیس یتورع عن شئ فقال لیس لک منه الا ذلک فانطلق لیحلف فقال رسول الله ﷺلما ادبر لئن حلف علی مال لیأ کله ظلما لیلقین الله وهو عنه معرض"

مسلم، ابوداؤد، ترمذی نے وائل بن حجر سے روایت بیان کی کہ ایک شخص حضرموت سے اور دوسرا کندہ سے نبی کریم ﷺ کے پاس آئے، حضرمی نے کہا یارسول اللہ یہ شخص مجھ پر غالب آ گیا ہے، میرے باپ کی طرف سے مجھے ملی ہوئی زمین پر اس نے قبضہ کرلیا ہے، کندی نے کہا یہ زمین میرے قبضہ میں ہے، میں اس میں کھیتی باڑی کررہا ہوں، اس شخص کا اس میں کوئی حق نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے حضرمی کو کہا، کیا تمہارے پاس گواہ ہیں؟ اس نے کہا میرے پاس گواہ تو نہیں۔ آپ نے فرمایا پھر وہ دوسرا شخص قسم اٹھالیتا ہے، حضرمی نے کہا یارسول اللہ ﷺ وہ شخص تو فاجر ہے، وہ قسم اٹھانے میں کوئی پرواہ نہیں کرے گا، اسے پرہیزگاری تو کچھ بھی حاصل نہیں، تو آپ نے فرمایا تمہارے لئے اس کے بغیر اور کوئی فیصلہ نہیں، تو وہ کندی شخص قسم اٹھانے کیلئے چلا، تو نبی کریم ﷺ نے اس کے پھر جانے پر فرمایا کہ اگر کوئی شخص دوسرے بھائی کا مال ظلما کھانے کے لئے قسم اٹھائے گا، تو اللہ تعالیٰ سے جب ملاقات کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس سے اعراض فرمائے گا، یعنی رب تعالیٰ اسکی طرف نظر رحمت نہیں فرمائے گا۔ تو اس وقت یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔ (منقول از درمنثور)

علامہ بغوی نے ایک روایت علقمہ سے بیان کی کہ کندی شخص کا نام امرؤالقیس تھا اور حضرمی کا ربیعہ بن عبدان تھا جب امرؤالقیس نے قسم اٹھانے کا ارادہ کیا تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی تو وہ اٹھانے سے رک گیا "واقر لخصمه بحقه و دفعه اليه" اور اپنے مدعی کے حق کو تسلیم کرلیا، زمین اس کے حوالے کردی۔ (معالم التنزیل)

(5) اور شان نزول یہ بیان کیا گیا "عن ابی امامة ان رسول الله ﷺقال من اقتطع حق امرئی مسلم بیمینه حرم الله علیه الجنة واوجب له النار قالوا وان كان شیئا یسیرا یارسول الله ؟قال وان كان قضیبا من اراک قالها ثلاث مرات" (رواہ مالک وابن سعد واحمد ومسلم والنسائی وابن ماجہ درمنثور)

حضرت ابوامامہ کہتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے اپنی قسم کے ذریعے کسی مسلمان کا حق مارا تو اللہ تعالیٰ نے اس پر جنت کو حرام کردیا، اور اس کے لئے جہنم کو ثابت کردیا" صحابہ کرام نے پوچھا یارسول اللہ اگرچہ وہ چیز تھوڑی بھی ہو، آپ نے فرمایا ہاں اگرچہ وہ پیلو درخت کی شاخ ہی ہو، (اس کی جھوٹی قسم کے ذریعے حاصل کرنے پر

جنت حرام ہوگئی جہنم ثابت ہوگئی) یہ جواب آپ نے تین مرتبہ ارشاد فرمایا، آپ کی تائید کیلئے اللہ تعالی نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا۔ (معالم التنزیل للبغوی)

(٦) عن عبد الله بن ابی اوفی ان رجلا اقام سلعة وهو فی السوق فحلف بالله لقد اعطی بها مالم یعط لیوقع رجلا من المسلین "فنزلت "

(رواہ ابن ابی حاتم ورواہ البخاری من غیر وجہ عن العوام حاشیہ صابونی)

عبداللہ بن ابی اوفی فرماتے ہیں بیشک ایک شخص (یہود میں سے) اپنا سامان بازار میں لے کر کھڑا ہے وہ (جھوٹی) قسم اٹھا رہا ہے کہ یہ چیز میں اسے دوں گا جو مجھے اتنی رقم اس کے بدلے دے گا جو مجھے پہلے نہیں دی گئی، (کیونکہ مجھے پہلے اس کے بدلے اتنا مال مل رہا تھا) وہ اصل میں کسی مسلمان کو پھنسانا چاہتا تھا، تو یہ آیۃ کریمہ (اس کی مذمت میں) نازل ہوئی۔ (معالم التنزیل للبغوی)

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِاللّٰهِ وَاَیْمَانِهِمْ ثَمَنًاقَلِیْلًا اُولٰٓئِکَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ﴾

" بیشک وہ جو حاصل کرتے ہیں اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے گھٹیا مال، یہ وہ ہیں کہ نہیں حصہ ان کا آخرت میں "

اعلی حضرت رحمہ اللہ و تفسیر تبصیر الرحمٰن:

اعلی حضرت رحمہ اللہ نے مذکورہ بالا الفاظ کا ترجمہ کیا ہے، اور وہ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے ذلیل دام لیتے ہیں آخرت میں ان کا کچھ حصہ نہیں۔ آپ کا یہ ترجمہ تفسیر تبصیر الرحمٰن کے کامل طور پر مطابق ہے، آیئے ذرا دیکھیں، غور کریں۔

(اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِاللّٰهِ)ای یاخذون بدله بتغیره (وایمانهم)ای بایمانهم الکاذبة یبدلونها فیاخذون (ثمنا قلیلا)اشیأحقیرا من الدنیاالحقیرة التی لانسبة لجمعها الی ادنی مافوتوه (اولئک لاخلاق) ای لانصیب (لهم فی الاخرة) (تبصیر الرحمن)

بے شک وہ جو لیتے ہیں اللہ تعالی کے عہد کے بدلے (یعنی اللہ کے وعدے کو توڑ کر اس کے بدلے لیتے ہیں) اور اپنی قسموں کے بدلے یعنی جھوٹی قسموں کے ذریعے کہ اپنی قسموں کو تبدیل کر کے جھوٹ سے حاصل کرتے ہیں حقیر دنیا کا حقیر مال اسلئے کہ دنیا کے تمام مال کو وہ حیثیت حاصل نہیں ہوتی جو ان چیزوں کو حاصل تھی جن کو انہوں نے تبدیل کر دیا "یعنی اللہ تعالی کے عہد اور اپنی قسموں کو انہوں نے توڑ دیا " آخرت میں انکا کچھ حصہ نہیں " راقم نے بھی تقریبا اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ہی نقل کیا۔

خیال رہے کہ "شـراء کا معنیٰ'' بیچنا اور خریدنا'' دونوں معنیٰ آتے ہیں، بیچنا ہو یا خریدنا ہو تو ہر ایک میں ایک شخص کی طرف سے مال دیا جاتا ہے دوسرے کی طرف سے اس کے بدلے میں مال دیا جاتا ہے۔اس لئے اس کا معنیٰ تبدیل کرنا، حاصل کرنا، لینا وغیرہ کیا جاتا ہے۔

ہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے اگر "ثـمـنا قلیلا "کا معنیٰ''تھوڑا مال'' کیا جائے تو پھر بھی درست ہے، کہ یہ حقیقی معنیٰ ہے، لیکن پھر بھی اس کی وضاحت کی ضرورت ہوگی کہ دنیا کا تمام مال ہی تھوڑا ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَاقَلِيلٌ﴾(آپ فرما دیجئے دنیا کا سامان تھوڑا ہے) یعنی دنیا کا تمام مال حقیر ہونیکی وجہ تھوڑا ہی ہے۔

﴿اُولٰٓئِکَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ﴾ "یہ وہ ہیں کہ نہیں حصہ ہوگا ان کا آخرت میں"

یعنی اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑ کر اور جھوٹی قسمیں اٹھا کر یہ آخرت کی نعمتوں اور ثواب کو حاصل نہیں کر سکیں گے۔

﴿وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ﴾ "اور نہیں کلام فرمائے گا ان سے اللہ"

یعنی وعدہ توڑنے والوں اور جھوٹی قسمیں اٹھانے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کلام نہیں فرمائے گا۔

اعتراض: سورۃ المومنون میں رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے﴿قَالَ اخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ﴾ سورۃ المومنون آیۃ (۱۰۸) سے پتہ چلتا ہے کہ رب تعالیٰ ان سے کلام فرمائے گا؟

پہلا جواب: اجیب بان قوله تعالی "ولایکلمهم الله "ای کلام رضافلاینافی انه یکلمهم کلام غضب "

کہ یہاں جو ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے کلام نہیں فرماء گا اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے رحمت اور رضاء مندی کا کلام نہیں فرمائے گا۔اور سورۃ المومنون میں جس کلام کا ذکر ہے اس سے مراد ناراضگی کا کلام ہے یعنی غیظ وغضب والا کلام کیا جائے گا اور رضاء مندی اور رحمت والا کلام نہیں کیا جائے گا۔

دوسرا جواب: ولایکلمهم اصلا و آیات الکلام علی لسان الملائکة ویشهد لذلک قوله تعالی "ونادوا یامالک لیقض علینا ربک "

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ رب تعالیٰ کافروں سے بالکل کلام نہیں فرمائے گا ان سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے فرشتوں کے ذریعے کلام فرمائے گا۔جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔﴿وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ﴾ اور وہ پکاریں گے اے مالک! کوئی فیصلہ کر ہی دے ہم پر تیرا رب۔

مالک نام ہے جہنم کے بڑے سردار فرشتے کا، وہ مالک سے درخواست کریں گے کہ تم اللہ پر ہمارا پیغام پہنچادو کہ وہ ہمیں موت عطا کر دے ہم پر مکمل فیصلہ کر دے یعنی ہمیں نیست و نابود کرے (ہمیں مٹا ہی دے) اس آیۃ کریمہ سے پتہ چلا کہ فرشتوں کے ذریعے بات ہوگی۔ (ماخوذ از صاوی)

لیکن راقم کو پہلا جواب قوی نظر آیا، کیونکہ رب تعالیٰ ان کو منع فرمادے گا کہ "تم میرے ساتھ کلام نہ کرو" وہ رب تعالیٰ سے کلام فرشتہ کے ذریعے کریں گے، اور رب تعالیٰ ناراضگی کا کلام ان سے خود ہی فرمائے گا "واللہ اعلم بالصواب"

آیۃ کریمہ میں وعید شدید:

دنیا کے حقیر مال کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو توڑ دینے اور جھوٹی قسمیں اٹھا کر لوگوں کا مال ہڑپ کر جانے والوں کے لئے اس آیۃ کریمہ میں وعید شدید (سخت گرفت کا حکم) پائی گئی ہے۔ پانچ قسم کے سزاؤں کا تذکرہ کیا، چار سے یہ ذکر فرمایا کہ وہ ثواب سے محروم ہوں گے اور پانچویں سے یہ ذکر فرمایا کہ وہ شدید عذاب میں واقع ہوں گے۔

"ان الثواب عبارة عن المنفعة الخاصة المقرونة بالتعظيم"

بیشک ثواب سے مراد یہ ہے کہ کسی کو خالص نفع پہنچایا جائے، ساتھ ساتھ اس کی تعظیم بھی کی جائے۔

"فالاول وهو قوله "اولئک لاخلاق لهم فی الآخرة "اشارة الی حرمانهم عن منافع الآخرة"

ان کی پہلی سزا رب تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی کہ "ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا آخرت میں" اس سے یہ بیان فرمادیا گیا کہ وہ آخرت میں نفع حاصل کرنے سے محروم رہیں گے۔

واماالثلاثة الباقية وهی قوله تعالیٰ "ولا يكلمهم الله ولا ينظر اليهم ولا يزكيهم "فهو اشارة الی حرمانهم عن التعظيم والاعزاز"

باقی تین سزاؤں کا جو تذکرہ فرمایا کہ "ان سے اللہ تعالیٰ کلام نہیں فرمائے گا، اور ان کو دیکھے گا نہیں اور ان کو پاک نہیں کرے گا" ان سزاؤں کے تذکرہ سے یہ بیان فرمادیا گیا کہ وہ لوگ تعظیم اور اعزاز سے محروم ہوں گے۔

"واما الخامس وهو قوله "ولهم عذاب اليم "فهو اشارة الی العقاب"

پانچویں سزا جس کا ذکر فرمایا کہ "ان کو دردناک عذاب ہوگا" اس سے بہت واضح فرمادیا کہ وہ رب تعالیٰ کے شدید عذاب میں مبتلاء ہوں گے۔

خیال رہے کہ ان کی دو سزاؤں ﴿اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ﴾ اور ﴿وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ﴾ کو تفصیل طور پر بیان کیا جا چکا ہے، اب باقی تین کو ذکر کیا جا رہا ہے۔

﴿وَلَا یَنۡظُرُ اِلَیۡهِمۡ یَوۡمَ الۡقِیَامَةِ﴾ ''اور نہیں نظر (رحمت) کرے گا ان کی طرف قیامت کے دن۔''

راقم نے ترجمہ میں نظر کے بعد بریکٹ میں، رحمت کا لفظ بڑھایا ہے، اسلئے کہ رب تعالی کے ارشاد گرامی ﴿وَلَا یَنۡظُرُ اِلَیۡهِمۡ﴾ کا معنی یہ ہے "انه لاینظر الیهم بالاحسان" کہ بیشک وہ ان طرف احسان کی نظر نہیں کرے گا، عام طور پر کہا جاتا ہے "فلان لاینظر الی فلان" فلاں شخص فلاں کی طرف نظر نہیں کرتا، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص اسے شمار میں ہی نہیں لاتا اور نہ ہی اس پر احسان کرتا ہے، اس مجاز کا سبب یہ ہے "ان من اعتد بالانسان التفت الیه واعاد نظره الیه مرة بعد اخری" کہ بیشک جب کوئی انسان کسی دوسرے شخص کو شمار میں لائے تو اس کی طرف توجہ کرتا ہے، اور بار بار اسے دیکھتا ہے۔ اللہ تعالی کے نظر کرنے سے مراد بھی ''کسی کو شمار میں لانا اور اس پر احسان کرنا'' ہے۔

اسی سے واضح ہو گیا کہ اللہ تعالی کے نظر نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو شمار میں ہی نہیں لائے گا اور ان پر احسان نہیں گا۔

"ولا یجوز ان یکون المراد من هذاالنظر الرؤیة لانه تعالی یراهم کما یری غیرهم "
آیۂ کریمہ نظر میں سے مراد رؤیت (دیکھنا) نہیں، کیونکہ اللہ تعالی کی شان کے لائق جو دیکھنا ہے وہ اس شان سے اس کو بھی ایسے ہی دیکھے گا جیسے اوروں کو دیکھے گا۔

"ولا ان یکون المراد من النظر تقلیب الحدقة الی جانب المرئی التماسا لرؤیته لان هذا من صفات الاجسام وتعالی الهنا عن ان یکون جسما "

یہاں نظر نہ کرنے سے مراد یہ بھی نہیں کہ وہ آنکھ کی پتلی سے ان کو نہیں دیکھے گا، اسلئے کہ آنکھ کی پتلی جسموں کی ہوتی ہے، اللہ تعالی جسم سے پاک ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

بعض حضرات نے کہا ہے کہ "نظر" کے بعد "الی" آئے تو اس کا معنی ''دیکھنا'' آتا ہی نہیں۔ بلکہ جب بعد میں ''لام'' آئے تو معنی ''دیکھنا'' آتا ہے۔ یہاں ﴿وَلَا یَنۡظُرُ اِلَیۡهِمۡ﴾ ہے، ''ولا ینظر لهم'' نہیں۔ لیکن یہ قول عربی زبان سے ناواقفی کی علامت ہے، اس لئے کہ ''نظر'' کے بعد ''الی'' آئے یا ''لام'' آئے دونوں ہی، دیکھنے کے معنی میں استعمال ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

احادیث مبارکہ:

یہاں چند احادیث مبارکہ ذکر کی جارہی ہیں جن کا وعدہ توڑنے اور جھوٹی قسموں کے ساتھ متعلق ہیں، اگر چہ زیادہ احادیث کا ذکر پہلے پارہ میں بھی آچکا ہے، لیکن سلف صالحین مفسرین کرام کی تفاسیر سے نقل کر رہا ہوں، سلف صالحین کا انداز یہی ہے کہ کسی دوسری آیۃ کریمہ کی تفسیر سے متعلق جن احادیث کا ذکر ہوتا ہے انہیں دوبارہ ذکر کر دیتے ہیں۔

❁ عن ابی ذر قال قال رسول الله ﷺ ثلاثة لا یکلمهم الله ولا ینظر الیهم یوم القیامة ولا یزکیهم ولهم عذاب الیم ، قلت یا رسول الله من هم؟ خسروا وخابوا، قال واعاده رسول الله ﷺ ثلاث مرات قال المسبل والمنفق سلعته بالحلف الکاذب والمنان "

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین سے (قسم کے لوگوں سے) قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کلام نہیں کرے گا اور ان کی طرف نظر رحمت نہیں کرے گا، اور ان کو پاک نہیں کرے گا اور ان کو دردناک عذاب دے گا۔ (حضرت ابوذر کہتے ہیں) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ کون ہوں گے؟ وہ خسارے میں ہوں گے، رسوا ہوں گے، وہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے تین مرتبہ اپنے کلمات کو دہرایا، پھر آپ نے فرمایا (تکبرانہ انداز پر) چادر کو گھسیٹنے والا اور جھوٹی قسم کے ذریعے اپنے سامان کو اچھا کر کے دکھانے والے، اور احسان جتلانے والا۔ (ماخوذ از صابونی وابن کثیر)

❁ قال احمد عن سهل بن معاذ بن انس عن ابیه ان رسول الله ﷺ قال ان الله تعالی عبادا لا یکلمهم یوم القیامة ولا یزکیهم ولا ینظر الیهم ، قیل ومن اولئک یا رسول الله ؟قال متبرئ من والدیه راغب عنهما ومتبرئ من ولده ورجل انعم علیه قوم فکفر نعمتهم وتبرأ منهم "

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ کچھ بندوں سے قیامت کے دن کلام نہیں کرے گا اور ان کو پاک نہیں کرے گا اور ان کی طرف نظر رحمت نہیں کرے گا، آپ سے پوچھا گیا، یا رسول اللہ وہ کون ہوں گے؟ آپ نے فرمایا وہ شخص جو اپنے والدین سے بیزار ہو کر ان سے اعراض کر لے، اور وہ شخص جو اولاد سے بیزار ہو جائے، اور وہ جس پر کسی قوم کے انعامات ہوں وہ ان کی ناشکری کرے ان سے بیزار ہو جائے۔ (ماخوذ از صابونی وابن کثیر)

❁ عن ابی هریرة رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ ثلاثة لا یکلمهم الله یوم القیامة ولا ینظر الیهم ولا یزکیهم ولهم عذاب الیم رجل منع ابن السبیل فضل ماء عنده ، ورجل حلف علی سلعته بعد العصر یعنی کاذبا ورجل بایع اماما فان اعطاه وفی له وان لم یعطه لم یف له "

(رواه احمد وابو داؤد والترمذی وقال الترمذی حدیث حسن صحیح)

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین (قسم کے لوگوں) سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کلام نہیں فر

مائے گا، اور ان کی طرف نظر رحمت نہیں کرے گا، اور ان کو پاک نہیں کرے گا، اور ان کو دردناک عذاب ہوگا "(ایک) وہ شخص جو اپنی ضرورت سے زائد پانی سے مسافر کو روکے، اور (دوسرا) وہ شخص جو عصر کے بعد اپنے سامان کو بیچنے کیلئے جھوٹی قسموں کے ذریعے اچھا کر کے دکھائے، اور (تیسرا) وہ شخص جو امام (حاکم) کی بیعت کرے پھر اگر وہ اسے مال دے تو یہ وعدہ کو پورا کرے، اور اگر وہ اسے مال نہ دے تو یہ وعدہ کو پورا نہ کرے۔ (ماخوذ از ابن کثیر وصابونی)

❁ واخرج الحرث ابن ابی اسامة والحاكم وصححه عن كعب بن مالك سمعت رسول الله ﷺ يقول من اقتطع مال امرئ مسلم بيمين كاذبة كانت نكتة سوداء فی قلبه لا يغيرها شیء الی يوم القيامة "

کعب ابن مالک فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا جس شخص نے کسی مسلمان کا مال جھوٹی قسموں کے ذریعے (ناحق طور پر) لے لیا تو اس کے دل پر سیاہ نکتہ چھا جائے گا، قیامت کے دن تک کوئی چیز اسے تبدیل نہیں کر سکے گی۔ (ماخوذ از در منثور)

❁ واخرج عبد الرزاق عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ ان اليمين الكاذبة تنفق السلعة وتمحق الكسب"

حضرت ابوھریرہ ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک جھوٹی قسم سامان کو رائج کر دے گی اور کسب کو مٹا دے گی، یعنی جھوٹی قسم کے ذریعے سامان کو اچھا دکھا کر بیچا جا سکے گا، لیکن اس سے حاصل ہونے والی آمدنی بے برکت ہو جائے گی اور مٹ جائے گی۔

❁ واخرج عبد الرزاق عن ابی سويد سمعت رسول الله ﷺ يقول ان اليمين الفاجرة تعقم الرحم وتقل العدد وتدع الديار بلاقع "

ابو سوید فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا بیشک جھوٹی قسم رحم (بچہ دانی) کو بانجھ کر دیتی ہے، اور تعداد کو کم کر دیتی ہے، اور شہروں کو ویران کر دیتی ہے۔ (ماخوذ از در منثور)

حقوق العباد اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرے گا:

(ولا يزكيهم) ای لا يثنی عليهم والظاهر ان معناه لا يغفر الله ذنبه لانه من حقوق العباد وفيه القصاص لامحالة "

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی "ولا يزكيهم" کا ایک مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی تعریف نہیں کرے گا، لیکن

زیادہ ظاہر معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے گناہ معاف نہیں کرے گا جو وعدہ توڑ کر یا جھوٹی قسمیں اٹھا کر دوسرے لوگوں کا مال ہڑپ کر جائیں، کیونکہ یہ حقوق العباد سے ہے، اس کا بدلہ ضروری ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے حقوق العباد کو معاف نہیں کرتا۔

❁ عن عائشة رضی الله عنهاقالت قال رسول الله ﷺ الدواوین ثلاثة فدیوان لا یعباالله به شیئاودیوان لا یترک الله منه شیئاودیوان لا یغفر الله اما الدیوان الذی لا یغفر الله فهو الشرک واماالدیوان الذی لا یعباالله به شیئا فظلم العبد نفسه فیما بینه وبین ربه من صوم ترکه او صلوٰة ترکهاواماالدیوان الذی لا یترک منه شیئافظلم العباد بعضهم بعضا القصاص لا محالة"

(رواہ الحاکم واحمد وروی الطبرانی مثلہ من حدیث سلمان وابی هریرة والبزار مثلہ من حدیث انس)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دفاتر تین (قسم) کے ہیں۔

(۱) ایک وہ دفتر ہے جس کی اللہ تعالیٰ کو کوئی پرواہ نہیں۔

(۲) اور دوسرا دفتر وہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ کسی ذرا بھر چیز کو بھی نہیں چھوڑتا۔

(۳) اور تیسرا دفتر وہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی بخشش نہیں فرمائے گا۔

(دفاتر سے مراد نامہ اعمال ہے، یعنی لوگوں کے اعمال کے دفاتر تین قسم کے ہوں گے) لیکن وہ دفتر جس کی اللہ تعالیٰ نے مغفرت (بخشش) نہیں کرنی وہ ہے شرک، لیکن وہ دفتر جس کی اللہ تعالیٰ کو کوئی پرواہ نہیں وہ ہے بندے کا اپنے نفس پر ظلم کرنا یعنی بندے اور رب تعالیٰ کے درمیان جو چیزیں ہیں روزہ چھوڑ دے یا نماز چھوڑ دے (یعنی حقوق اللہ کو پورا نہ کرنا) (رب تعالیٰ کو اس کی پرواہ نہیں چاہے تو اس کو معاف فرما دے اور چاہے تو عذاب میں مبتلاء کر لے) لیکن وہ دفتر جس میں سے اللہ تعالیٰ کسی چیز کو بھی نہیں چھوڑے گا یہ بندوں کا ایک دوسرے پر ظلم کرنا، ان کا بدلہ ضرور دلایا جائے گا، (یعنی حقوق العباد کو اللہ تعالیٰ کبھی معاف نہیں فرمائے گا، بلکہ ان کا بدلہ دلائے گا) (مظہری)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتَابِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَاهُوَمِنَ الْكِتَابِ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَمِنْ عِنْدِاللّٰهِ وَمَاهُوَمِنْ عِنْدِاللّٰهِ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ○ (آیة نمبر ۸۷)

(1) اوران میں کچھ وہ ہیں جو زبان پھیر کر کتاب میں میل کرتے ہیں کہ تم سمجھو یہ بھی کتاب میں ہے اوروہ کتاب میں نہیں اوروہ کہتے ہیں یہ اللہ کے پاس سے ہے اوروہ اللہ کے پاس سے نہیں اوراللہ پر دیدہ ودانستہ جھوٹ باندھتے ہیں۔ (کنزالایمان)

(2) اور بے شک ان سے ایک فریق پھیرتے ہیں اپنی زبانوں کو کتاب میں تاکہ تم اسے گمان کرو کتاب سے حالانکہ نہیں ہے وہ کتاب سے اوروہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ نہیں ہے وہ اللہ کی طرف سے اوروہ کہتے ہیں اللہ پر جھوٹ حالانکہ وہ جانتے ہیں۔ (نجوم الفرقان)

شان نزول :

اس آیۃ کریمہ کے شان نزول میں دوقول بیان کیے گئے ہیں۔

(۱) ایک قول یہ بیان کیا ہے کہ آیۃ کریمہ یہود کے چند اشخاص کے متعلق نازل ہوئی وہ کعب بن اشرف اور مالک اور حیی بن اخطب اورابو یاسر اور شعبہ بن عمرو اشاعر۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے تورات سے اپنے خلاف دلائل کو تبدیل کردیا گیا۔

(۲) روی الضحاک عن ابن عباس ﷺ ان الآیة نزلت فی الیھودوالنصاری جمیعاوذلک انھم حرفواالتوراة والانجیل والحقوابکتاب اللہ تعالی مالیس منه "

ضحاک حضرت ابن عباس ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ یہ آیۃ کریمہ یہودونصاری دونوں فریقوں کے متعلق نازل ہوئی کیونکہ انہوں نے توراۃ وانجیل میں تحریف کی اور کتاب اللہ میں ان چیزوں کوملادیا جو اللہ تعالی کی کتابوں میں توراۃ وانجیل میں نہیں تھیں۔ والقمر کو دوسرا قول زیادہ معتبر نظر آتا ہے اگر چہ تفسیر کبیر میں پہلے قول کو ترجیح دی گئی ہے۔

"یلوون" ماخوذ ہے "لیّ" سے جواصل میں "لوی" ہے "سید" والے قاعدے کے مطابق واؤ کو یاء کیا اور یاء کو یاء میں ادغام کیا۔"اللی فتل الحبل" لوی کا معنی رسی بٹنا۔"لوی یدہ" ہاتھ کو پھیرنا یا مروڑنا۔لوی راسه" سکر کو پھیرنا۔رب تعالی کا ارشادگرامی ہے "لوواروسھم" انہوں نے اپنے سروں کو پھیرا۔لوی لسانه

بـکـذا" کـنـایة عن الکذب و تخرص الحدیث " اس نے اپنی زبان کو اس طرح پھیرا یعنی جھوٹی بات کی اور اٹکل سے بات کی یعنی من گھڑت کلام پیش کیا۔ رب تعالی کے اس ارشاد گرامی "یـلـوو ن السنتهم بالکتاب " میں یہی معنی ہے "وہ اپنی زبانوں کو کتاب میں پھیرتے ہیں" یعنی جھوٹ بولتے ہیں اور من گھڑت باتوں کو اللہ تعالی کی کتابوں تورات اور انجیل میں شامل کرتے ہیں۔ (مفردات راغب)

"والـمعنی یحرفون الکلم ویعدلون به عن القصد " مطلب یہ ہے کہ وہ کلمات میں تحریف کرتے ہیں اور حق سے اسے پھیر دیتے ہیں۔ (قرطبی)

خیال رہے کہ "لـویـت الـغریم "کا معنی یہ بھی ہے کہ "میں نے قرض خواہ کو ٹال دیا" وفـی الـخبر "لی الواجد ظلم " جس شخص کے پاس مال ہو وہ قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول سے کام لے تو یہ ظلم ہے۔ (روح المعانی)

"وفـی الـحـدیـث لی الوجد یحل عرضه وعقوبته" جس شخص کے پاس مال ہو وہ قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول سے کال لے تو اسکی بے عزتی کرنا اور اسے سزا دینا جائز ہے۔ (قرطبی)

﴿لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتَابِ﴾ "تا کہ تم اسے گمان کرو کتاب سے"

یہ خطاب ہے مؤمنین کو "لتـحسبوه " میں منصوب کی ضمیر "محرف " تحریف شدہ کلام کی طرف لوٹ رہی ہے جس پر سیاق وسباق دلالت کر رہا ہے یعنی ماقبل اور مابعد سے یہ بات واضح ہو رہی ہے۔ علامہ آلوسی نے اسی مسئلہ کو ان الفاظ سے بیان فرمایا:

"لتحسبوه من الکتاب "ای لتظنوا ایها المسلمون ان المحرف المدلول علیه (روح المعانی)

﴿وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ﴾ "حالانکہ وہ کتاب سے نہیں"

یعنی وہ اللہ کی کتابوں توراۃ وانجیل میں تحریف کر کے مؤمنوں کو یہ گمان دلانا چاہتے ہیں کہ یہ تحریف شدہ عبارت بھی اصل توراۃ وانجیل کا حصہ ہیں حالانکہ وہ توراۃ وانجیل کا حصہ نہیں۔

﴿وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾

"اور وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں"

یعنی وہ بہت کھلے انداز میں بغیر اشارہ کے یہ کہتے ہیں کہ ہم جو کلام پیش کر رہے ہیں کہ یہ اللہ تعالی نے نازل

فرمایا ہے اسی مسئلہ کو علامہ آلوسی رحمہ اللہ ان الفاظ سے پیش کرتے ہیں۔

"ویزعمون صریحا غیر متمکن بالتوراۃ والتعریض ان المحرف او المشابہ نازل من عنداللہ ولیس ہو نازلا من عنداللہ" (روح المعانی)

تنبیہ: راقم نے "وما ہو من الکتاب" اور "وما ہو من عنداللہ" کا ترجمہ حال والا کیا ہے جو روح المعانی کی اس عبارت سے لیا ہے۔ "والواو للحال والجملۃ حال من ضمیر المبتدأ فی الخبر" واؤ حال کے لئے اور خبر میں جو ضمیر مبتداء کی طرف لوٹ رہی ہے یہ جملہ اس سے حال واقع ہو رہا ہے۔

﴿وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ "اور وہ کہتے ہیں اللہ پر جھوٹ حالانکہ وہ جانتے ہیں"

"وہم یعلمون" کے دو مطلب ہیں، ایک یہ کہ

"(وہم یعلمون) انہم کاذبون علیہ سبحانہ وہو تسجیل علیہم بان ما افتروہ عن عمد لا خطاء"

وہ جانتے ہیں کہ بیشک وہ جھوٹے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے اس فعل پر مہر لگادی، پختہ طریقے سے بیان فرمادیا کہ وہ جو افتراء باندھتے تھے، جھوٹ بولتے ہیں وہ جان بوجھ کر، غلطی سے نہیں۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے اسی قول کے مطابق ترجمہ کیا ہے اور اللہ پر دیدہ ودانستہ جھوٹ باندھتے ہیں" اور دوسرا مطلب یہ ہے" "وقیل (یعلمون) ما علیہم فی ذلك من العقاب" "وہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ ان پر اس جھوٹ کی وجہ سے شدید عذاب آئے گا" راقم نے کوشش کی ہے کہ الفاظ مبارکہ کا لغوی ترجمہ بھی ہو اور ان دونوں مطالب کو شامل بھی ہو، راقم کا ترجمہ یہ ہے "اور وہ کہتے ہیں اللہ پر جھوٹ حالانکہ وہ جانتے ہیں۔

خیال رہے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ قرآن پاک کنز الایمان کو اور تفاسیر کو دیکھتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ آپ راجح قول کے مطابق ترجمہ کرتے ہیں اور ادب واحترام کا لحاظ کرتے ہیں۔ اور راقم کا خیال ہوتا ہے کہ طلباء کرام کو دوسرا مطلب بھی ذہن نشین ہو جائے اور ترجمہ میں ہی تمام اقوال سمٹ آئیں تو ان کو سمیٹ لیا جائے۔ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ اصل ہے راقم کا ترجمہ زیادہ مقامات آپ کے ترجمہ کی ہی نقل ہے، یہ بات واضح ہے کہ اصل اور نقل میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

معتزلہ کا استدلال:

معتزلہ نے اپنے مذہب پر اس آیۃ کریمہ سے یہ دلیل پیش کی ہے کہ بندے کا برا فعل اللہ تعالیٰ کی تخلیق نہیں، ورنہ یہ سچا آتا "اولئک المحرفون بقولہم ہو من عند اللہ تعالیٰ" کہ ان لوگوں کی تحریف اللہ تعالیٰ کی طرف

سے ہے کیونکہ ان کی تخلیق ہے، ان لوگوں کا دعوی ہی یہ تھا"ان التحریف من عند الله و بخلقه " کہ ان کی تحریف اللہ تعالی کی طرف سے ہے اور اسی کی تخلیق ہے، لیکن رب تعالی نے ان کے دعوے کو رد کر دیا کہ ان کی تحریف اللہ تعالی نے نازل نہیں کی اور نہ ہی اللہ تعالی کے حکموں میں سے کوئی حکم ہے۔

اس تمام بحث سے یہ واضح ہوگیا کہ لوگوں کے برے افعال اللہ تعالی کی تخلیق نہیں، بلکہ بندوں کی اپنی تخلیق ہیں، یہ ہیں دلائل جبائی اور کعبی معتزلیوں کے۔

معتزلہ کا رد:

ان المقصود بالنفی کما اشرنا الیه نزوله من عنده سبحانه وهو اخص من کونه من فعله وخلقه ونفی الخاص لا یستلزم نفی العام فلا یدل علی مذهب المعتزلة القائلین بأن افعال العباد مخلوقة لهم لالله تعالی "

یہود و نصاری کا دعوی یہ تھا کہ ہماری تحریف اللہ تعالی نے نازل فرمائی ہے تو اللہ تعالی نے ان کا رد فرمایا کہ وہ جھوٹے ہیں، اللہ تعالی نے ان کی تحریف کو نازل نہیں فرمایا۔ یہود و نصاری کا یہ دعوی ہی نہیں کہ ہماری تحریف اللہ تعالی کا فعل اور اس کی تخلیق ہے، جب ان کا یہ دعوی ہوتا تو ان کے قول کے رد سے سمجھ آتا کہ بندوں کے برے افعال رب تعالی کی تخلیق نہیں۔

معتزلہ کا یہ کہنا ہی سراسر جھوٹ ہے کہ یہود و نصاری کا یہ دعوی تھا"ان التحریف من عند الله وبخلقه" کہ بیشک تحریف اللہ تعالی کی طرف سے ہے اور اس کی تخلیق سے ہے۔ ان کا دعوی تو قرآن پاک نے صرف اتنا بیان کیا "ویقولون هو من عند الله" وہ کہتے کہ یہ اللہ تعالی کی طرف سے ہے" انہوں نے "من عندالله" کے ساتھ "وبخلقه" کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ ان کا دعوی خاص ہے، نفی بھی خاص کی ہے اور یہ قانون بھی دینی طلباء پر مخفی نہیں "نفی الخاص لا یستلزم نفی العام" خاص کی نفی سے عام کی نفی نہیں ہوتی۔

جب ان کا دعوی صرف اتنا تھا کہ یہ اللہ تعالی کی طرف سے ہے (یعنی اس نے جو نازل کیا ہے وہی ہے) تو اس قول کا رد کیا ﴿وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ یہ اللہ کی طرف سے (نازل) نہیں۔ اس سے یہ ثابت کرنا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ "یہ اللہ تعالی کی تخلیق نہیں" یہ باطل اور جھوٹ ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

یہ حقیقت ہے کہ یہود و نصاری کی طرح معتزلہ بھی جھوٹے ہیں۔ پرانے مذاہب باطلہ کو آج کل پھر اجاگر کیا جا رہا ہے لیکن وہ پہلے بھی باطل تھے آج بھی باطل ہیں اور آئندہ بھی انشاء اللہ باطل ہی رہیں گے۔ یہود و نصاری نے

اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں کیسے تحریف کی؟ اس مسئلہ میں دو قول بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) ایک قول یہ ہے "فذهب جمع الى انه ليس فى التوراة سوى كلام الله وان تحريف اليهود لم يكن الا تغييرا وقت القراءة او تاويلا باطلا للنصوص واما انهم يكتبون ما يرومون فى التوراة على تعدد نسخها فلا"

ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ توراۃ میں صرف اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور بیشک یہود کی تحریف یہ تھی کہ پڑھتے ہوئے الفاظ کو اس طرح بدل دیتے تھے کہ اس سے مطالب تبدیل ہو جاتے تھے، اور کبھی الفاظ مبارکہ کے باطل مطالب پیش کرتے تھے، لیکن انہوں نے توراۃ میں اپنی طرف سے کوئی الفاظ شامل نہیں کئے۔ ان لوگوں نے اپنے دعویٰ پر ابن منذر اور ابن ابی حاتم کی وہب ابن منبہ کی روایت کو پیش کیا ہے وہ کہتے ہیں۔

"ان التوراة والانجيل كما انزلهما الله تعالى لم يغير منهما حرف ولكنهم يضلون بالتحريف والتاويل وكتب كانوا يكتبونها من عند انفسهم ويقولون ان ذلك من عند الله وما هو من عند الله فأما كتب الله تعالى فانها محفوظة لا تحول"

کہ توراۃ وانجیل کو جس طرح نازل فرمایا اسی طرح رہیں، ان میں کسی ایک حرف کو بھی تبدیل نہیں کیا گیا لیکن وہ تحریف یعنی انداز بیان اور غلط مطالب بیان کرنے سے گمراہ ہوئے، وہ اپنی طرف سے مطالب توراۃ وانجیل سے علیحدہ لکھ کر پیش کرتے اور کہتے یہ تھے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہوتا تھا، اصل کتابوں کو وہ تبدیل نہ کر سکے بلکہ وہ محفوظ رہیں۔

ان حضرات کی اور دلیل یہ ہے کہ

"ان النبی ﷺ كان يقول لليهود الزامالهم "ائتو بالتوراة فاتلوها ان كنتم صادقين"

بیشک نبی کریم ﷺ یہود کو الزامی جواب کے طور پر یوں ارشاد فرماتے تھے "تم توراۃ لے آؤ اور اسے پڑھو اگر تم سچے ہو" اگر اصل توراۃ میں تبدیلی ہوتی تو نہ نبی کریم ﷺ لانے کا ارشاد فرماتے، اور نہ ہی وہ توراۃ لانے سے رکتے۔ لیکن وہ توراۃ لانے سے رک جاتے تھے، اس کی وجہ یہی تھی کہ توراۃ میں تبدیلی نہیں تھی اسی وجہ سے ان کا موقف ثابت نہیں ہوتا تھا۔ وہ توراۃ کو پیش کرنے سے ہچکچاتے تھے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

(۲) دوسرے حضرات کا قول یہ ہے "وذهب آخرون الى انهم بدلوا وكتبوا ذلك فى نفس كتابهم" کہ انہوں نے اصل کتاب کو تبدیل کر دیا تھا اور اپنی طرف سے اس میں لکھ دیا تھا، ان حضرات کی دلیل قرآن پاک کی آیات ہیں جو ظاہر طور پر دلالت کر رہی ہیں کہ انہوں نے الفاظ کو تبدیل کیا۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ ﴿فَوَيۡلٌ

لِلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ﴾ (تو بربادی ہے ان کے لئے جو لکھتے ہیں کتاب اپنے ہاتھوں سے پھر کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے)۔ اسی طرح اور ارشاد گرامی ہے ﴿يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ﴾ وہ کلمات کو اپنی جگہ سے پھیر دیتے ہیں اس پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت بھی دلالت کر رہی ہے۔

❁ عن ابی عباس رضی اللہ عنہ انہ قال ان النفر الذین لا یکلمھم اللہ یوم القیامۃ ولا ینظر الیھم کتبوا کتابا شوشوہ فیہ نعت محمد ﷺ وخلطوہ بالکتاب الذی کان فیہ نعت محمد ﷺ ثم قالوا ھذا من عند اللہ"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بیشک کچھ وہ لوگ ہیں جن سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نہ ہی کلام فرمائے گا اور نہ ہی نظر رحمت فرمائے گا یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی طرف سے لکھا تو نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو منتشر کر دیا اور آپ کے اوصاف کو خلط ملط کر دیا پھر کہنے لگے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی وکبیر)

راقم کا موقف:

اس مسئلہ میں یہ ہے کہ ابتدائی طور پر وہ صرف اتنی تحریف کرتے تھے کہ لفظوں کی حرکات وغیرہ کو تبدیل کر دیتے تھے اور پڑھنے کا انداز تبدیل کر کے معانی تبدیل کر دیتے تھے اور مطالب تبدیل کر دیتے تھے کہ ان الفاظ کا یہ مطلب نہیں بلکہ یہ مطلب ہے۔ آہستہ آہستہ وہ ترقی کرتے چلے گئے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں اپنے الفاظ بھی داخل کر دئے راقم کا موقف انشاء اللہ دونوں قولوں میں شاندار تطبیق ثابت کرے گا۔

انجیلوں کی تعداد:

انجیلوں کی تعداد چار ہے۔

(1) **انجیل متی:** یہ انجیل عیسیٰ علیہ السلام کے آسمانوں پر اٹھائے جانے کے آٹھ سال بعد بارہ حواریوں نے فلسطین کی سرزمین پر سریانی زبان میں لکھی۔

(2) **انجیل مرقس:** یہ انجیل عیسیٰ علیہ السلام کے آسمانوں پر اٹھائے جانے کے بارہ سال بعد شہر روم میں فرنگی زبان میں ستر شخصوں نے مل کر لکھی۔

(3) **انجیل لوقا:** یہ انجیل بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمانوں پر اٹھائے جانے کے بعد ستر شخصوں نے مل کر شہر سکندریہ میں یونانی زبان میں لکھی۔

(4) **انجیل یوحنا:** یہ انجیل عیسیٰ علیہ السلام کے آسمانوں پر اٹھائے جانے کے تیس سال بعد آپ کے ایک

دوست نے رومی شہروں میں سے ایک شہر افسس میں انگریزی زبان میں لکھی۔

ان چار انجیلوں میں سے کوئی بھی اصلی انجیل نہیں، اصل انجیل تو صرف وہی ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی، یہ سب انجیلیں آپ کے آسمانوں پر اٹھائے جانے کے بعد بنائی گئیں، جو یقینی طور پر من گھڑت انجیلیں ہیں۔

"یؤید وقوع التغیر فی کتب اللہ وانھا لم تبق کیوم نزلت وقوع التناقض فی الاناجیل وتعارضھا وتکاذبھا وتھافتھا ومصادمتھا بعضھا ببعض"

اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں حقیقی طور پر ردوبدل کر دیا گیا، وہ آج اپنی اصل حالت میں نہ رہیں، اس پر انجیلوں کی تعداد اور ان کا اختلاف تائید کر رہا ہے، کہ انجیلیں ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ ان کے دلائل ایک دوسرے کے مخالف ہیں، یہ انجیلیں ایک دوسری کی تکذیب کر رہی ہیں۔ ایک دوسری کے خلاف تصادم ان میں پایا گیا ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

انجیلوں کا اختلاف:

چار انجیلوں کا ایک دوسری سے اس طرح اختلاف پایا گیا ہے کہ ان میں مذکور واقعات اور قصص (قصے) ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ ایک انجیل میں واقعات کا دوسری انجیل کے واقعات کے خلاف پائے جانے سے یہ واضح طور پر معلوم ہو رہا ہے۔

"وفیھا ما تحکم الضرورۃ بانہ لیس من کلام اللہ تعالٰی اصلا"

کہ ان مذکورہ انجیلوں میں سے کوئی ایک انجیل بھی اللہ کا کلام بالکل نہیں۔

آئیے انجیلوں کے اختلاف پر نظر ڈالئے تو مسئلہ نکھر کر واضح ہو جائے اور شاید یہود و نصاریٰ کے چیلے، چمچے، کڑچھے بھی کچھ سمجھ جائیں۔

متی انجیل : کا بیان یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو جب سولی پر چڑھایا گیا تو آپ کے ساتھ دو چوروں کو بھی سولی چڑھایا گیا، ایک کو آپ کی دائیں جانب اور دوسرے کو آپ کی بائیں جانب سولی چڑھایا گیا، وہ دونوں چور یہود کے ساتھ مل کر عیسیٰ علیہ السلام سے مزاح اڑا رہے تھے اور آپ کو عار دلا رہے تھے۔

لوقا کا بیان : لوقا انجیل میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک عیسیٰ علیہ السلام سے مزاح اڑا رہا تھا اور دوسرا اسے یہ کہہ رہا تھا کہ تو اللہ تعالیٰ سے کیوں نہیں ڈرتا، ہمیں اسی وجہ سے تو سزا دی جارہی ہے۔ اس شخص نے آپ کے متعلق کوئی بیہودہ بات نہیں کی، پھر اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہا "اے میرے سردار میرا ذکر ملکوت میں رب تعالیٰ کے حضور کر

دینا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا' ہاں تمہارے ساتھ پکا وعدہ ہے کہ تم میرے ساتھ جنت الفردوس میں رہو گے۔

بیان اختلاف:

"ولا یخفی ان ھذا یؤول الی التناقض فان اللصین عند متی کافران وعند لوقااحدھما مؤمن والأخر کافر"

متی اور لوقا دونوں میں اختلاف واضح نظر آرہا ہے کہ متی کے مطابق دونوں چور کافر تھے کیونکہ دونوں اللہ کے نبی سے مزاح اڑا رہے تھے، اور لوقا کے بیان کے مطابق ایک ان دونوں میں سے مؤمن تھا اور دوسرا کافر تھا۔

مرقس اور یوحنا اس بیان سے خالی ہیں:

"واغفل ھذہ القصة مرقس ویوحنا" مذکورہ بالا واقعہ جو متی انجیل اور لوقا انجیل نے ایک دوسرے کے خلاف بیان کیا ہے، وہ واقعہ مرقس اور یوحنا نے سرے سے بیان ہی نہیں کیا۔ واضح ہوا کہ چار کی چار من گھڑت انجیلیں ایک دوسرے کے مخالف اور متصادم ہیں۔

ایک اور اختلاف دیکھئے:

لوقا انجیل نے یہ بیان کیا ہے کہ حضرت یسوع (عیسیٰ علیہ السلام) نے فرمایا ہے کہ انسان دو انسانوں کو ہلاک کرنے کیلئے نہیں آیا بلکہ زندہ رکھنے کیلئے آیا ہے اور دوسری انجیلوں میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ انسان روئے زمین پر کوئی سلامتی لے کر نہیں آیا، بلکہ تلوار اور جلانے والی آگ لے کر آیا ہے۔

"ولاشک عن ھذا تناقض احدھما یقول جاء رحمة اللعلمین والأخریقول جاء نقمة علی الخلائق اجمعین"

یہ بات بغیر کسی شک وشبہ کے ثابت ہے کہ ان دونوں قوموں میں تناقض (مخالفت) ہے۔ ایک انجیل سے یہ سمجھ آرہا ہے کہ انسان سب کیلئے رحمت بن کر آیا ہے، اور دوسری انجیلوں سے یہ سمجھ آرہا ہے کہ انسان لوگوں کیلئے عذاب بن کر آیا، انسان صرف انتقامی کاروائیوں کیلئے آیا ہے۔

انجیلوں کا ایک اور اختلاف دیکھئے:

متی انجیل میں ہے کہ حضرت یسوع (عیسیٰ علیہ السلام) نے اپنے بارہ شاگردوں کو کہا کہ تم آئندہ بارہ کرسیوں پر

بیٹھو گے، تم ایسے دیندار ہو گے جیسے اسرائیل علیہ السلام (یعقوب علیہ السلام) کے بارہ بیٹے دیندار تھے۔ پھر آپ نے ان تمام کی قیامت کے دن کامیابی کی خبر دی۔ پھر اسی متی انجیل اور دوسری انجیلوں نے اس کے خلاف بیان کیا کہ ان شاگردوں میں سے ایک یہودا تھا جس نے یہودیوں سے تیس درھم رشوت لے کر حضرت عیسی علیہ السلام کا انکو پتہ دے دیا، بلکہ کے سپاہیوں کو ساتھ لے آیا اور حضرت عیسی علیہ السلام کو ان کے حوالے کر دیا، آپ نے فرمایا اس کیلئے بربادی ہو، کاش یہ بیدار ہی نہ ہوتا۔ متی کے ایک قول کے مطابق بارہ نیک تھے، قیامت میں وہ سب اللہ تعالی کے مقرب تھے، اور دیندار تھے اور متی کے دوسرے قول کے مطابق ایک ان میں سے بدترین گنہگار تھا۔

ایک ہی انجیل کے دو قول ایک دوسرے کے مخالف ٹھہرے جو انجیل کے من گھڑت ہونے پر دلالت کر رہے ہیں، صحیح انجیل تو صرف وہ تھی جو عیسی علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ (روح المعانی)

تفسیر نعیمی سے ایک خوبصورت اقتباس:

اس امت میں بھی بعض لوگ یہود سے پیچھے نہ رہے، بلکہ انہوں نے ان سے چار قدم آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے الہامات اس پر گواہ ہیں کہ کچھ عبارتیں اپنی اور کچھ قرآن پاک کی آیتیں ملا کر کہتے ہیں کہ یہ مجھے الہام ہوا۔

"یا ایتھا المراۃ توبی توبی انا رادوہ الیک وجاعل الذین اتبعوک فوق الذین کفروا الی یوم القیامۃ"

یہ مرزا جی کا الہام ہے ماشاء اللہ مخمل کے کپڑے میں ٹاٹ کا پیوند۔ اب ذرا ترجمہ سنئے:

''اے محمدی بیگم (مرزا جی کی عرشی منکوحہ) توبہ توبہ کر (تو دوسرے کے نکاح میں کیوں چلی گئی) اے مرزا جی ہم اس عورت کو تم پر لوٹائیں گے اور تمہارے متبعین کو قیامت تک کفار پر غالب رکھیں گے، (حالانکہ مرتے دم تک محمدی بیگم مرزا جی کے ہاتھ نہ آئی)

یہ ہے ''یَلْوُوْنَ اَلْسِنَتَھُمْ'' کی کھلی مثال مگر چونکہ قرآن پاک کا رب تعالی محافظ ہے، اس لئے یہ تحریفیں مٹ گئیں، قرآن پاک اپنے اصلی سے جگمگاتا رہے گا (جگمگا رہا ہے اور انشاء اللہ قیامت تک جگمگاتا رہے گا) (نعیمی)

مودودی صاحب کی کذب بیانی:

مودودی صاحب ﴿یَلْوُوْنَ اَلْسِنَتَھُمْ﴾ کی تفسیر یوں بیان کرتے ہیں، اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ

کتاب الٰہی کے معانی میں تحریف کرتے ہیں، یا الفاظ کا الٹ پھیر کر کچھ سے کچھ مطالب نکالتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کتاب کو پڑھتے ہوئے کسی خاص لفظ یا فقرے کو جو ان کے مفاد یا ان کی خود ساختہ عقائد ونظریات کے خلاف پڑتا ہو، زبان کی گردش سے کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں۔

اس کی نظیریں قرآن کو ماننے والے اہل کتاب سے بھی مفقود نہیں ہیں، مثلاً بعض لوگ جو نبی کی بشریت کے منکر ہیں آیۃ ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ میں "انما" کو "ان ما" پڑھتے ہیں، اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ "اے نبی کہہ دو کہ تحقیق نہیں ہوں میں بشر تم جیسا" (تفہیم القرآن)

اس کے متعلق اتنا ہی کہنا آسان ہے "لعنة الله على الكذبين" کیونکہ نبی کریم ﷺ کی نورانیت کے منکر کو تو بہت لوگ ملتے ہیں، لیکن نبی کریم ﷺ کی بشریت کا کوئی منکر نہیں۔

ہاں البتہ اہلسنت وجماعت کا یہ مذہب ہے کہ نبی کریم ﷺ حقیقت میں نور ہیں اور ظاہر طور پر بشر ہیں۔ آج تک کسی اہل سنت وجماعت کے عالم نے یہ معنی نہیں کہا جو مودودی صاحب نے اہل سنت وجماعت کی طرف منسوب کیا ہے "اللهم انا اعوذبك من الكذبين" "انما" کا لفظ حصر کیلئے آتا ہے "ما" اور "الا" کا معنی دیتا ہے۔

بعض حضرات مختصر معنی بیان کر دیتے ہیں۔ ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ "فرمادیجئے بیشک میں بشر ہوں تمہارے جیسا" (یہ ترجمہ کامل نہیں) کامل ترجمہ جو طلباء کو ہم کراتے ہیں وہ یہ ہے "فرمادیجئے جز ایں نیست میں بشر ہوں تمہارے جیسا" عام فہم ترجمہ یہ ہے "سوائے اس کے نہیں کہ میں بشر ہوں تمہارے جیسا" کبھی یوں ترجمہ کیا جاتا ہے "فرمادیجئے میں نہیں مگر تمہارے جیسا بشر" اس ترجمہ سے مودودی صاحب غلطی کا شکار ہوئے ہیں کہ آپ نے کسی سنی مولوی کی تقریر سنی اور لفظ "مگر" کی طرف توجہ نہ کر سکے، خبط حواسی اور ضد کی وجہ سے انہوں نے یوں سمجھ لیا کہ وہ مولوی یوں ترجمہ کر رہا تھا "فرمادیجئے کہ میں نہیں ہوں تمہارے جیسا بشر" "مگر" کو مودودی صاحب نہ سن سکے، "الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے" کے متعلق جھوٹی الزام تراشی علماء اہلسنت پر، اللہ تعالیٰ جھوٹے الزامات سے محفوظ رکھے، دجال جس کی ایک آنکھ نہیں ہوگی اس (کانترے) سے نبی کریم ﷺ نے پناہ طلب کرنے کے متعلق اسی وجہ سے ارشاد فرمایا کہ وہ جھوٹا اور مکار ہوگا۔

❁ **عن قتادة قال سمعت رسول الله ﷺ ما منى نبى الا وقد انذر امته الا عور الكذاب الا انه اعور وان ربكم عزوجل ليس يا عور مكتوب بين عينيه ك ف ر "**

(مسلم ۲ باب ذکر الدجال صفحہ نمبر ۴۰۸)

حضرت قتادہ صفرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، کوئی نبی نہیں مگر یہ کہ اس نے اپنی امت کو یک چشم گل (کانڑے) چھوٹے سے ڈرایا، خبردار وہ یک چشم گل (کانڑا) ہوگا، بیشک تمہارا رب عزوجل یک چشم گل نہیں اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان لکھا ہوگا ''ک ف ر'' کہ وہ کافر ہوگا۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

مَاكَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ○ (آیة نمبر ۷۹)

(1) کسی آدمی کا حق نہیں کہ اللہ اسے کتاب اور حکم و پیغمبری دے پھر وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ، ہاں یہ کہے گا کہ اللہ والے ہو جاؤ اس سبب سے کہ تم کتاب سکھاتے ہو اور اس سے کہ تم درس کرتے ہو۔ (کنز الایمان)

(2) نہیں ہے کسی بشر کیلئے کہ اللہ اسے کتاب اور حکم اور نبوت دے، پھر وہ کہے لوگوں سے ''تم ہو جاؤ میرے بندے سوائے اللہ کے، اور (وہ کہے گا) لیکن ہو جاؤ اللہ والے اس سبب سے کہ تم سکھاتے ہو کتاب، اور اس سبب سے کہ تم پڑھتے رہتے ہو۔ (نجوم الفرقان)

شان نزول :

شان نزول کی چند وجوہ ہیں جو تمام ہی مجموعی طور پر پائی گئی ہیں، یعنی چند واقعات کے بعد آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

(1) حضرت ابن عباس ﷺ نے بیان فرمایا کہ ابو رافع قرظی نے بیان فرمایا کہ جب اہل نجران سے یہود و نصاری کا ایک وفد رسول اللہ ﷺ کے پاس جمع ہوا تو آپ نے ان کو دعوت اسلام دی، تو وہ کہنے لگے۔

''اترید یا محمد ان نعبدک کما تعبد النصاری عیسی ابن مریم''

اے محمد! کیا تم یہ ارادہ رکھتے ہو کہ ہم تمہاری عبادت کریں جیسا کہ نصاری عیسی ابن مریم کی عبادت کرتے تھے۔

ان اہل نجران میں ایک نصرانی تھا، جسے رئیس کہا جاتا تھا، وہ کہنے لگا "او ذاك تريد منا يا محمد" اے محمد کیا واقعی تم ہم سے یہی ارادہ رکھتے ہو؟" فقال رسول الله ﷺ "معاذالله ان نعبد غير الله او نامر بعبادة غيره" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "معاذ اللہ" (اللہ کی پناہ) ہم اللہ کے بغیر کسی اور کی عبادت کریں یا کسی اور کی عبادت کا حکم دیں۔

"فانزل الله آية" اس واقعہ پر اللہ تعالی نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا۔

(2) عبد بن حمید حسن بصری رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ مجھے یہ خبر ملی ہے کہ یہ آیۃ کریمہ اس وقت نازل ہوئی جب ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا۔

يارسول الله نسلم عليک كما يسلم بعضنا على بعض افلا نسجد لک؟ قال، لا، ولكن كونوا اكرموا نبيكم واعرفوا الحق لاهله فانه لاينبغي ان يسجد لاحد من دون الله"

یارسول اللہ ہم آپ کو ایسے ہی سلام کرتے ہیں جیسے ہمارے بعض بعض کو سلام کرتے ہیں، کیا ہم آپ کو سجدہ نہ کرلیا کریں؟ آپ نے فرمایا نہیں، لیکن تم اپنے نبی کی عزت کرو، اور حق کو پہچانوں کہ اس حق کا حقدار کون ہے، کسی کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ اللہ کے سوا کسی اور کو سجدہ کرے۔

(3) یہود کے بعض لوگ بعض کی عبادت کرتے تھے، اور اللہ تعالی کی کتابوں میں تحریف کردیتے تھے، اور کہتے یہ تھے کہ یہ اللہ کی کتاب میں ہے، ان کا یہ کہنا اللہ تعالی کی طرف منسوب ہوتا تھا، تو اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا گیا۔ (از روح المعانی)

﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾

"نہیں ہے کسی بشر کیلئے کہ اللہ اسے کتاب اور حکم اور نبوت دے پھر وہ کہے لوگوں سے تم ہو جاؤ میرے بندے سوائے اللہ کے"

ان الفاظ مبارکہ کے چند مطالب ہیں:

(1) بالفرض محال "انهم لو ارادوا ان يقولوا ذلک لمنعهم الله عنه"

اگر وہ یہ کہنے کا ارادہ کریں کہ ہمیں خدا کہو، تم اللہ کے سواء ہمارے بندے بن جاؤ تو اللہ تعالی ان کو منع کردے گا۔

اس پر دلیل یہ ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ○ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ﴾ (سورۃ الحاقۃ آیہ نمبر ۴۴، ۴۵) ''اور اگر وہ ہم پر ایک بات بھی بنا کر کہتے، ضرور ہم ان سے بقوت بدلہ لیتے''

سورۃ الحاقہ کی آیات مبارکہ کا اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ہی یہ بتا رہا ہے کہ یہ کلام بالفرض محال پر مبنی ہے، کہ ''اگر وہ بات بناتے ہم ان کو گرفت میں لیتے'' نہ انہوں نے کہا نہ ہی ان کی پکڑ ہوئی، اسی طرح یہاں بھی یہی مطلب ہے کہ اگر بالفرض محال وہ ارادہ کرتے تو رب تعالیٰ ان کو روک دیتا، نہ انہوں نے ارادہ کیا نہ ہی روکنے کی ضرورت در پیش آئی۔

(2) دوسرا مطلب یہ ہے ''الثانی ان الانبياء عليهم السلام موصوفون بصفات لا يحسن مع تلك الصفات ادعاء الالهية والربوبية''
کہ انبیاء کرام کو اللہ تعالیٰ نے کامل صفات عطاء فرمائی ہیں جن کے ہوتے ہوئے ان سے تصور ہی ممکن نہیں کہ وہ اپنی الوہیت اور اپنی ربوبیت کا دعویٰ کریں۔

(3) ومنها ان الله تعالى آتاهم الكتاب والوحي وهذا لا يكون الا في النفوس الطاهرة والارواح الطيبة والنفس الطاهرة يمتنع ان يصدر عنها هذه الدعوى''
اور اس کے مطالب سے یہ مطلب ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے ان کو کتاب عطاء فرمائی اور ان کی طرف وحی کی یہ منصب صرف پاکیزہ نفوس اور پاکیزہ ارواح کو ہی حاصل ہو سکتا ہے، اور پاکیزہ نفوس سے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اپنی الوہیت و ربوبیت کا دعویٰ کریں۔

انبیاء کرام کے نفوس کی طہارت اور ان کی ارواح کے طیب ہونے پر ارشادات باری تعالیٰ روز روشن کی طرح دلالت کر رہے ہیں۔ ﴿ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ﴾ ''اللہ خوب جانتا ہے کہ کہاں (منصب) رسالت کو رکھتا ہے''

﴿ وَلَقَدِ اخْتَرْنَاهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعَالَمِيْنَ ﴾ (الدخان ۳۲)

''اور تحقیق ہم نے اس کو چن لیا ہے علم پر اس جہان والوں پر''

﴿ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ﴾ ''اللہ ہی پسند فرماتا ہے ملائکہ سے پیغام پہنچانے والوں کو اور لوگوں سے رسولوں کو''

(4) اللہ تعالیٰ نبوت ان ہستیوں کو عطاء فرماتا ہے جن کی قوت نظریہ اور قوت عملیہ کامل ہو، قوت نظریہ کو کمال حاصل ہوتا ہے علوم اور معرفت حقیقیہ سے، اور قوت عملیہ کو کمال حاصل ہوتا ہے جب وہ برے اخلاق سے پاک ہو،

جب رب تعالیٰ بعض شخصیات کو قوت نظریہ اور قوت عملیہ میں کمال عطاء فرما دیتا ہے، ان میں سے جن کو منصب رسالت کا اہل سمجھتا ہے ان کو منصب رسالت عطاء فرما دیتا ہے ایسی ہستیوں سے یہ ممکن نہیں کہ وہ خود اپنی الوہیت (خدائی) کا دعویٰ کر بیٹھیں۔

(5) ان الله تعالى لايشرف عبده بالنبوة والرسالة الا اذا علم منه انه لا يقول مثل هذاالكلام"
اللہ تعالیٰ کو چونکہ معلوم ہوتا ہے کہ میرے اس بندے نے منصب رسالت و نبوت پر فائز ہو کر اپنے معبود ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں کرنا ان کو ہی نبوت عطاء کرتا ہے۔

(6) اللہ کے رسول دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اللہ کے احکام پہنچا رہے ہیں، وہ اپنے اس دعویٰ کی صداقت پر معجزات کے ذریعے دلیل قائم کرتے ہیں کہ رب تعالیٰ کی طرف سے ہمیں جو معجزات عطاء کر دئے گئے ہیں وہی ہماری صداقت کے لئے کافی ہیں۔

"فلو امرهم بعبادة نفسه فحينئذ تبطل دلالة المعجزة على كونه صادقا وذلك غير جائز"
اگر نبی اپنی عبادت کرنے کا حکم دیں کہ تم ہماری عبادت کرو تو ان کا معجزات کے ذریعے اپنی نبوت پر دعویٰ کی صداقت پر دلیل قائم کرنا ممکن نہیں رہتا، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ نبی اپنی صداقت معجزات کے ذریعے ظاہر کرے اور پھر دعویٰ خدائی بھی کرے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ﴾ میں بشر سے مراد کون ہے، بعض حضرات نے بیان کیا ہے "بشر" سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور کتاب سے مراد "انجیل" ہے یعنی عیسیٰ علیہ السلام کے لائق نہ تھا کہ آپ کو انجیل اور حکم اور نبوت عطاء کی گئی تو آپ نے یہ کہا ہو کہ تم میرے بندے بن جاؤ اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ آیۃ کریمہ میں بشر سے مراد نبی کریم ﷺ ہیں اور کتاب سے مراد قرآن پاک ہے چونکہ ہم یہود کے جواب میں آیہ کریمہ نازل ہوئی جب انہوں نے کہا "یامحمد اترید ان نعبدك وتتخذك ربا" اے محمد ﷺ کیا تم یہ ارادہ رکھتے ہو کہ ہم تمہاری عبادت کریں اور تمہیں رب مانیں۔ اگرچہ نبی کریم ﷺ نے یوں جواب دے دیا:۔

"قال معاذالله ان آمر بعبادة غير الله ومابذلك امرني الله ومابذلك بعثني فانزل الله هذه آلاية"
اللہ کی پناہ کہ میں کسی کو اللہ کے غیروں کی عبادت کو حکم دوں مجھے اللہ تعالیٰ نے نہ ہی اس کا حکم دیا ہے اور نہ ہی اسکے لئے مجھے مبعوث کیا ہے تو آپ کے اس ارشاد پر اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرما دیا۔

لیکن زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ "بشر" سے مراد عام ہو اور کتاب سے مراد بھی عام ہو جو ہر آسمانی کتاب کو شامل ہو۔
ماکان لبشر ای ماينبغي لبشرولجميع بني آدم لاواحدله من لفظه كالقوم والرهط

ویوضع موضع الواحد والجمع"

لفظ بشر واحد اور جمع دونوں پر اطلاق ہوتا ہے جس طرح قوم اور رھط کا کوئی اور مفرد نہیں یہ خود ہی مفرد ہیں لیکن جمع پر بولے جاتے ہیں ایسے ہی لفظ بشر کا کوئی اور مفرد نہیں یہ خود مفرد ہے اور اس کا اطلاق مفرد پر بھی ہوتا ہے اور جمع پر بھی۔

اس لحاظ سے معنی یہ ہوگا کہ بنی آدم سے کسی بشر کے یہ لائق نہیں کہ اسے کتاب، حکم اور نبوت دی جائے تو وہ کہے کہ میرے بندے ہو جاؤ۔ (ماخوذ از خازن)

عموم الفاظ کا لحاظ کرتے ہوئے یہ آیۃ کریمہ تمام انبیاء کرام اور تمام آسمانی صحیفوں اور کتابوں کو مشتمل ہے۔خیال رہے کہ خازن کی طرح ہی معالم التنزیل میں بھی ہے اور کبیر میں بھی تقریباً یہی ہے۔"والحکم "یعنی الحکمۃ والسنۃ او امضاء الحکم 'حکم عطاء کرنے سے مراد یہ ہے کہ' اللہ تعالیٰ اسے حکمت عطاء کرے اور سنت عطاء کرے یا معنی یہ ہوگا کہ حکم جاری کرنے کی اجازت دی جائے۔ (مظہری)

"والحکم ای الفهم والعلم وقیل امضاء الحکم عن الله عزوجل"

حکم کا مطلب علم وفہم ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اسے علم وفہم عطا کردے، اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے احکام جاری کرنے کی اجازت دے دے۔ (معالم التنزیل للبغوی)

چونکہ لفظ"حکم" وسیع تر مفہوم کے پیش نظر کئی معانی اور مطالب پر مشتمل تھا، اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے اپنے ترجمہ میں حکم کا معنی بھی حکم ہی کیا ہے تاکہ تمام مطالب کو شامل ہو جائے، راقم نے بھی یہی معنی نقل کیا ہے۔

"والنبوة "ای المنزلة الرفیعة " نبوت سے مراد' بلند مرتبہ' ہے، نبی چونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان واسطہ ہیں، بحیثیت نورانیت کے رب تعالیٰ سے فیض لیتے ہیں، اور بحیثیت بشر ہونے کے بندوں تک وہ فیضان پہنچاتے ہیں، اس منصب کی وجہ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سب سے بلند مقام انبیاء کرام کا ہے، پھر انبیاء کرام میں سے بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے، تفصیل تیسرے پارے کی ابتداء نجوم الفرقان میں دیکھئے۔

﴿ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾

"پھر وہ کہے لوگوں سے تم ہو جاؤ میرے بندے اللہ کے سواء"

"العباد جمع عبد قال القاضی وهو هنا من العبادة ولم یقل عبیدا لانه من العبودیة وهی لاتمنع ان تکون لغیر الله تعالی ولهذا یقال هؤلاء عبید زید ولا یقال عباده"

عباد جمع ہے عبد کی، قاضی اور ابو زید نے کہا کہ ''عباد'' عبادت سے لیا ہوا ہے، اسی وجہ سے ''عبید'' نہیں کہا گیا، کیونکہ رب تعالی کے غیروں کی عبادت منع ہے، عبودیت منع نہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ کہا جا سکتا ہے "ھؤلاء عبید زید" یہ زید کے غلام ہیں، لیکن یہ کہنا جائز نہیں "ھؤلاء عباد زید" یہ زید کے بندے ہیں۔ (روح المعانی)

نتیجہ: واضح ہے کہ بندوں کی غلامیت تو پائی گئی ہے لیکن بندوں کی عبادت نہیں پائی گئی۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ''میں تین ترکیبیں پائی گئی ہیں''

(1) مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ متعلق ہو جائے ''عبادا'' کے کیونکہ اس میں فعل والا معنی بھی موجود ہے ''عبادت کرو''

(2) ''عبادا'' صفت اول ہو اور مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ صفت ثانیہ ہو۔

(3) ''عبادا'' حال واقع ہو اور مِنْ دُوْنِ اللّٰه صفت کی وجہ نکرہ مخصصہ ہو جائے۔ (از روح المعانی)

''وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ'' لیکن ہو جاؤ اللہ والے یہاں کچھ الفاظ پوشیدہ ہیں، مطلب یہ ہے ''وَلٰكِنْ يَقُوْلُ لَهُمْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ'' (لیکن وہ ان کو کہتے ہیں ہو جاؤ اللہ والے) "رَبّٰنِيّٖنَ" بظاہر ایک لفظ ہے لیکن کثیر معانی پر مشتمل ہے۔

(1) اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ ''ربانی'' اصل میں ''ربی'' ہے جس میں یا نسبت کی پائی گئی ہے، یعنی منسوب ہے رب کی طرف، مفہوم یہ حاصل ہوا کہ وہ اللہ کو جاننے والا ہے اور اس کی طاعت (فرمانبرداری) پر ہمیشہ عمل کرنے والا ہے، جسطرح کہا جاتا ہے "رجل الھی" اس میں بھی یاء نسبت کی ہے، معنی اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالی کی معرفت اور اس کی طاعت کی طرف متوجہ ہونے والا، الف اور نون "ربانی" میں مبالغہ کیلئے ہے جو اس صفت کے کمال پر دلالت کر رہا ہے، یعنی وہ کہیں گے خالص اور کامل اللہ والے ہو جاؤ۔

جب کسی کو یہ کہنا مقصود ہو کہ وہ بالوں والا ہے تو کہا جاتا ہے ''ھو شعری'' اور جب یہ کہنا مقصود ہو کہ وہ زیادہ بالوں والا ہے تو کہا جاتا ہے ''ھو شعرانی'' داڑھی والے کو کہتے ''لحیی'' اور لمبی اور گھنی داڑھی والے کو کہتے ہیں ''لحیانی'' اسی طرح گردن کی طرف نسبت کرنی تو کہا جاتا ہے ''رقبی'' اور جب موٹی گردن والا کہنا ہو تو کہا جاتا ہے ''رقبانی''

(2) دوسرا مطلب یہ ہے کہ ''ربانیون'' کا مطلب ہے ''اصحاب علم'' واحد اس کا ہے ''ربانی''

''ھو الذی یرب العلم ویرب الناس ای یعلمھم ویصلحھم ویقوم بامرھم''

اس صورت میں "ربانی" کا مطلب علم حاصل کرنے والا، اور لوگوں کی تربیت کرنے والا، یعنی لوگوں کو علم سکھانے والا، اوران کی اصلاح کرنے والا، اوران کے معاملات کو درست کرنے والا، اس صورت میں بھی الف ونون مبالغہ کیلئے ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے "ریان، عطشان، شعبان اور عریان "ان سب میں مبالغہ کا معنی پایا گیا ہے۔زیادہ سیر آب" زیادہ پیاسا، زیادہ سیر، زیادہ ننگا۔

اس صورت میں اور پہلی صورت میں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں ''الف ونون'' زائد ہیں، اور دوسری صورت میں کلمہ کے ہیں۔

(3) الربانی هو الذی یرب الناس فالربانیون هم ولاةالامة والعلماء"

''ربانی'' اسے کہا جاتا ہے جولوگوں کی تربیت کرے، لھذا حکام اور علماء کو''ربانیون'' کہا جائے گا۔ (ماخوذازکبیر)

﴿بِمَا كُنتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنتُمْ تَدْرُسُوْنَ﴾

''اوراس سبب سے کہ تم پڑھاتے ہو کتاب اوراس سبب سے کہ تم پڑھتے رہتے ہو''

خیال رہے کہ "تَعْلَمُوْنَ" میں دو قرأتیں ہیں ایک تخفیف والی، یعنی یہ لفظ ماخوذ ہے "علم یعلم علما" سے اوردوسری قرأت میں تشدید ہے، یعنی "تُعَلِّمُوْنَ" تعلیم سے ماخوذ ہے۔

"وکلاهما صواب لانهم کانو یعلمونه فی انفسهم ویعلمونه غیرهم"

دونوں قرأتیں درست ہیں، یعنی وہ خودعلم حاصل کرتے ہیں، اورغیروں کوعلم سکھاتے ہیں۔ (کبیر)

وَبِمَا كُنتُمْ تَدْرُسُوْنَ (اوراس سبب سے کہ تم پڑھتے رہتے ہو)''تَدْرُسُوْنَ'' کا معنی "درس الکتاب" (اس نے کتاب پڑھی) اور''درس العلم'' سے لیا ہوا ہے، درس العلم (اس نے علم حاصل کیا) یعنی اسباق کو یاد کرکے علم کے اثرات کوحاصل کیا۔

"ولماکان تناول ذلک بمداومة القرأةعبر عن ادامةالقرأة بالدرس"

جب علم حاصل کرنے کیلئے باربار پڑنا پڑتا ہے، جب لگا تار پڑھتے رہیں تو علم حاصل ہوتا رہتا ہے ورنہ حاصل کئے ہوئے مسائل بھول جاتے ہیں، اس لئے ہمیشہ پڑھنے کو جاری رکھنے کو درس کہا جاتا ہے، اللہ تعالی کے ارشاد گرامی "ودرسوامافیه" میں یہی معنی لیا گیا ہے (وہ پڑھتے رہو جو اس میں ہے) اوررب تعالی کے ارشادگرامی "وَبِمَا كُنتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنتُمْ تَدْرُسُوْنَ" میں بھی یہی معنی استعمال ہے۔ (مفردات راغب)

راقم نے مفردات راغب کو ہی دیکھ کر ترجمہ لکھا ہے''اور اس سبب سے کہ تم پڑھاتے ہو کتاب اور اس سبب سے کہ تم پڑھتے رہتے ہو''

فائدہ جلیلہ گذشتہ سے پیوستہ:

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ﴾ ''کسی بشر کیلئے نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے کتاب اور حکم اور نبوت عطاء کرے'' ﴿ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ﴾ ''پھر وہ لوگوں کو کہے تم میرے بندے ہو جاؤ'' اس مقام پر تین چیزوں کا ذکر کیا ''کتاب'' اور ''حکم'' اور ''نبوت'' "اشارة الی ثلاثة اشیاء وذکرھا علی ترتیب فی غایة الحسن" ان تین چیزوں میں بہت اچھی ترتیب رکھی گئی ہے۔

وذلک لان الکتب السماوی ینزل اولا، ثم انه یحصل فی عقل النبی فهم ذلک الکتاب، والیه الاشارة بالحکم، فان اهل اللغة والتفسیر اتفقوا علی ان هذا الحکم هو العلم قال تعالی "وآتیناه الحکم صبیا" یعنی العلم والفهم، ثم اذا حصل فهم الکتاب فحینئذ یبلغ ذلک الی الخلق وهو النبوة فما احسن هذا الترتیب"

آسمانی کتابوں کو پہلے نازل کیا جاتا ہے، پھر نبی کی عقل میں اس کتاب کا علم و فہم ڈال دیا جاتا ہے، اسی کا ذکر ''حکم'' سے کیا کیونکہ اہل لغت اور اہل تفسیر کا اس پر اتفاق ہے کہ اس مقام میں ''حکم'' سے مراد ''علم'' ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی "وَاٰتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا" میں ''حکم'' سے مراد ''علم و فہم'' ہے، یعنی ہم نے عطاء کیا اسے (یحیی علیہ السلام کو) علم و فہم بچپن میں، پھر جب کتاب کی سمجھ عطاء کر دی جاتی ہے تو اس وقت نبی مخلوق کو تبلیغ کرتے ہیں، وہ ہے نبوت، اب دیکھئے کتاب کا ذکر پہلے، حکم (علم و فہم) کا ذکر اس کے بعد، اور نبوت کا ذکر اس کے بعد، کتنی ہی اچھی ترتیب رکھی گئی ہے۔ (از تفسیر کبیر)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

لفظ ''ما'' دونوں جگہ مصدر کیلئے ہے، تقدیر عبارت کی یہ ہے۔ ''کونوا ربانیین بسبب کونکم عالمین ومعلمین وبسبب دراستکم الکتاب'' (بلکہ وہ کہتے ہیں) تم اللہ والے ہو جاؤ بسبب عالم اور معلم ہونے کے اور بسبب تمہارے کتاب پڑھنے کے۔ (کبیر)

فائدہ عظیمہ: دلت الآیة علی ان العلم والتعلیم والدراسة توجب کون الانسان ربانیا" آیۃ کریمہ اس پر دلالت کر رہی ہے کہ علم اور تعلیم اور دراسۃ سے انسان ربانی بن جاتا ہے، لیکن صرف علم حاصل کرنا مقصود نہیں، بلکہ مقصود یہ ہے۔

"وما ذاک الاان یکون بحیث یکون تعلمه لله وتعلیمه و دراسة لله وبالجملةفان یکون الداعی له الی جمیع الافعال طلب مرضاة الله والصارف له عن کل الافعال الهرب عن عقاب الله"

کہ وہ علم و تعلیم و دراسۃ صرف اللہ تعالیٰ کیلئے ہو، اس میں دنیا کا مال حاصل کرنا، ریاء کاری اور چرچا مقصود نہ ہو، تمام افعال میں مقصد اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی حاصل کرنا ہو، اور تمام افعال پر مقصد اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچنا مقصود ہو۔

"فمن اشتغل بالتعلیم والتعلیم لالهذاالمقصود ضاع سعیه وخاب عمله"

جس شخص نے علم حاصل کرنے میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی کو مدنظر نہ رکھا اس کی کوشش ضائع ہوگئی اور اس کے عمل ضائع چلے گئے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "نعوذبالله من علم لا ینفع وقلب لایخشع" ہم اللہ کی پناہ پکڑتے ہیں اس علم سے جس میں نفع نہ ہو، اور اس دل سے جس میں خشوع نہ ہو۔ (ماخوذ از کبیر بتقدیم وتاخیر)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَلَا یَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِیّٖنَ اَرْبَابًا اَیَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۝

(آیة نمبر ۸۰)

(1) اور نہ تمہیں یہ حکم دے گا کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا ٹھہرالو کیا تمہیں کفر کا حکم دے گا بعد اس کے کہ تم مسلمان ہولئے۔ (کنزالایمان)

(2) اور نہیں تمہیں حکم دے گا کہ تم ٹھہرالو فرشتوں اور نبیوں کو رب، کیا حکم دے گا تمہیں کفر کا بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو گئے۔ (نجوم الفرقان)

شان نزول :

تقریباوہی جو پچھلی آیۃ میں گزر چکا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قریش کو کہا کہ تم فرشتوں کی عبادت نہ کرو اور یہود

کو کہا تم عزیر علیہ السلام کی عبادت نہ کرو، اور نصاری کو کہا تم عیسی علیہ السلام کی عبادت نہ کرو، تو ان سب کی طرف سے یہ جواب تھا "الـریـد ان نتخذک ربا" کیا تم ارادہ رکھتے ہو کہ ہم تمہیں رب ٹھہرالیں۔ اس وقت یہ آیۃ کریمہ اور اس سے پہلے جو آیۃ ہے یہ نازل ہوئیں۔

پہلی آیۃ کریمہ کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی بشر کے لائق نہیں کہ اللہ تعالی اسے کتاب اور علم وفہم اور نبوت عطاء کرے تو وہ لوگوں کو کہے کہ تم میرے بندے ہو جاؤ، بلکہ وہ تو کہتا ہے تم اللہ والے ہو جاؤ کیونکہ تم اہل کتاب ہو کہ کتاب پڑھتے ہو اور پڑھاتے ہو۔ اس آیۃ کریمہ کا تعلق چونکہ ماقبل سے ہی ہے، اس لئے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی بشر کے لائق نہیں کہ اسے کتاب، اور علم وفہم، اور نبوت عطاء کی جائے تو وہ تمہیں حکم دے کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو رب ٹھہرالو، کیا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نبی تمہیں حکم دے کہ تم اسلام لانے کے بعد کافر ہو جاؤ؟ ایسا نہیں ہوسکتا، کبھی نہیں ہوسکتا۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

راقم نے ابھی جو دونوں آیات کا خلاصہ بیان کیا ہے وہ اسی ترکیب کے مطابق ہے جس میں "ولا یامرکم" کو منصوب پڑھا گیا ہے، اور عطف اس کا "یقول" پر ہے تو یقینی بات ہے کہ معطوف علیہ سے پہلی عبارت ساتھ ملے گی اور یہ بھی خیال رہے کہ خلاصہ سے یہ بھی سمجھ آرہا ہے کہ "ولا یامرکم" میں "لا" زائد ہے نفی والا معنی "ماکان لبشر" سے سمجھ آرہا ہے۔ زیادہ مفسرین کرام کا رجحان اسی ترکیب کی طرف تھا اسی لئے راقم نے دونوں آیات کا خلاصہ اسی ترکیب کے مطابق تحریر کر دیا ہے۔

دوسری ترکیب یہ ہے کہ "ولا یامرکم" مرفوع ہے اور جملہ استینافیہ ہے، اس کا عطف "یقول" پر نہیں، اور "لا" بھی زائد نہیں، بلکہ تاکید نفی کیلئے ہے۔ جملہ استینافیہ کبھی سوال کے جواب میں بھی آتا ہے، اس ترکیب کے لحاظ پر ضمنا سوال ہوگا کہ نبی یہ حکم تو نہیں دیتے کہ تم ہمارے بندے ہو جاؤ لیکن کیا یہ حکم دیتے ہیں کہ فرشتوں کو اور ہمارے بغیر دوسرے نبیوں کو خدا ٹھہرالو؟ تو اس کا جواب دیا گیا کہ نبی تمہیں حکم نہیں دیتے کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو رب ٹھہرالو۔
(ماخوذ از کبیر وروح المعانی)

ابھی تک جو بحث کی ہے اس کے مطابق "ولا یامرکم" کی مرفوع ضمیر نبی کی طرف لوٹ رہی ہے۔ پہلی ترکیب کے مطابق بشر کی شان کے لائق نہیں کہ وہ تمہیں حکم دے کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو خدا ٹھہرالو۔

دوسری ترکیب کے لحاظ پر پھر تین احتمال ہیں ایک یہ کہ مرفوع ضمیر نبی کریم ﷺ کی طرف لوٹ رہی ہے

"وقال ابن جریج لا یأمرکم محمد" ابن جریج نے کہا آیۃ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ محمد (ﷺ) تمہیں حکم نہیں دیتے کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو خدا ٹھہرالو۔ "وقیل لا یأمرکم الانبیاء" اور ایک قول یہ بیان کیا گیا ہے کہ تمام انبیاء کرام میں سے کوئی نبی بھی تمہیں حکم نہیں دیتا کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو خدا ٹھہرالو۔ اس صورت میں ضمیر مرفوع ہر نبی کی طرف لوٹ رہی ہے۔

تیسرا احتمال یہ ہے "قال الزجاج ولا یأمرکم الله" کہ مرفوع اللہ کی طرف لوٹے اور معنی یہ ہو کہ "اللہ تمہیں حکم نہیں دیتا کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو اپنا رب ٹھہرالو" یہ قول زجاج کا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

ملائکہ اور انبیاء کرام کی تخصیص کی وجہ:

انما خص الملائكة والنبيين بالذكر لان الذين وصفوا من اهل الكتاب بعبادة غير الله لم يحك عنهم الا عبادة الملائكة وعبادة المسيح وعزير فلهذا المعنى خصهما بالذكر"

جن اہل کتاب (اور مشرکین مکہ) کو خطاب ہے وہ صرف ملائکہ اور حضرت عزیر علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت کرتے تھے، اسلئے ملائکہ اور انبیاء کرام کا خصوصی طور پر ذکر کیا گیا۔ (ماخوذ از کبیر)

(ایأمرکم) استفهام بمعنى الانكار اى لا يفعل ذلك"

رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی "ایأمرکم" میں ہمزہ استفہامیہ (سوالیہ) انکار کے لئے استعمال ہے "کیا وہ تمہیں حکم دے گا کہ تم اسلام لانے کے بعد کافر ہو جاؤ؟ نہیں، یہ حکم وہ ہرگز نہیں دے گا۔ (از کبیر)

علامہ زمخشری نے کہا "قوله بعد اذانتم مسلمون دليل على ان المخاطبين كانوا مسلمين وهم الذين استأذنوا الرسول ﷺ في ان يسجدواله"

کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی "بعد اذانتم مسلمون" اس پر دلیل ہے کہ مخاطبین وہ مسلمان تھے جنہوں نے نبی کریم ﷺ سے آپ کو سجدہ کرنے کی اجازت طلب کی تھی۔ (کشاف)

راقم کا موقف یہ ہے کہ ظاہر کو دیکھتے ہوئے کشاف کا قول بھی درست ہے، لیکن جب خطاب اہل کتاب کو ہو تو اس وقت مطلب یہ ہوگا کہ تمہارے کتاب کو ماننے کے بعد کیا وہ تمہیں کفر کا حکم دے گا؟ ہرگز یہ حکم نہیں دے گا۔ جب تم کتاب کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہو تو صرف اللہ کو معبود مانو، حضرت عزیر علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو اس کے بندے ہیں، معبود نہیں۔ (لکھنے کے بعد مظہری کو دیکھا تقریباً یہی اس میں بیان کیا گیا)

جب خطاب مشرکین مکہ کو ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اسلام قبول کو لو تا کہ تم فرشتوں کی عبادت کرنا چھوڑ

دو، کیونکہ اللہ تعالی اور اس کے نبی تمہیں اسلام لانے کے بعد فرشتوں کی عبادت کا حکم ہرگز نہیں دیں گے۔

فائدہ: فحرم الله تعالى على الانبياء ان يتخذوا الناس عبادا بتألهون لهم ولكن الزم الخلق حرمتهم وقد ثبت عن النبى ﷺ انه قال لا يقولن احدكم عبدى وامتى وليقل فتاى وفتاتى ولايقل احدكم ربى وليقل سيدى" (قرطبی)

اللہ تعالی نے انبیاء کرام پر حرام کر دیا ہے کہ وہ لوگوں کو اپنا بندہ بنالیں اور ان کو کہیں کہ تم ہماری عبادت کرو، البتہ مخلوق پر لازم کر دیا ہے کہ وہ ان کی تعظیم وتکریم کریں، اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا، تم میں سے ہرگز کوئی شخص عبدی (میرے عبد) اور "امتی" (میری باندی) نہ کہے، بلکہ "فتای" (میرے جوان) اور "فتاتی" (میری جوان) کہے۔ یعنی جب کوئی اپنے غلام کو "عبدی" کہے، یا اپنی غلامہ کو "امتی" کہے تو اس سے کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ "عبدی" اور "امتی" کہنے والا اپنے آپ کو معبود سمجھتا ہے، لیکن "فتای" اور "فتاتی" کہنے میں یہ احتمال نہیں۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی شخص کسی کو "ربی" (میرے رب) نہ کہے، بلکہ "سیدی" (میرے سردار) کہے کیونکہ "ربی" کہنے میں وہم یہ پایا جاتا ہے کہ یہ اسے اپنا معبود سمجھ رہا ہے، لیکن "سیدی" کہنے میں یہ وہم نہیں پایا جاتا۔

آیۃ کریمہ سے معتزلہ کا استدلال:

جبائی معتزلی نے آیۃ کریمہ سے دلیل یہ پکڑی ہے کہ یہ کہنا درست نہیں "اللہ تعالی سے کفر، اس سے جاہل ہونا ہے" اور اسی طرح یہ کہنا بھی درست نہیں کہ "اللہ تعالی پر ایمان لانا، اللہ تعالی کی معرفت کا حاصل ہونا ہے" یہ قول کیوں درست نہیں اس لئے کہ اللہ تعالی نے یہاں ان کا کفر بھی ثابت کیا "ایامرکم بالکفر" سے، لیکن ان کو عارف باللہ بھی ثابت کیا ہے۔

"فلما حصل الكفر ههنا مع المعرفة بالله دل ذلك على ان الايمان به ليس هو المعرفة والكفر به تعالى ليس هو الجهل به"

جب یہ پتہ چل گیا کہ اس آیۃ کریمہ میں جن لوگوں کو خطاب کیا جا رہا ہے وہ کافر بھی تھے اور ان کو اللہ تعالی کی معرفت بھی حاصل تھی، تو اسی سے پتہ چل گیا کہ صرف یہ کہنا کہ "اللہ تعالی پر ایمان لانے سے ہی اس کی معرفت حاصل ہوتی ہے، اور اس سے کفر کرنے سے اس سے جہالت حاصل رہتی ہے یہ قول درست نہیں۔

معتزلہ کی دلیل کا رد:

والجواب ان قولنا الكفر بالله هو الجهل به لاتعنى به مجرد الجهل بكونه موجودا

بل نعتی به الجهل بذاته وبصفاته السلبية وصفاته الاضافية انه لا شريک له فی المعبودية فلما جهل هذا فقد جهل بعض صفاته"

ان کی دلیل کا جواب یہ ہے کہ ہمارا قول کہ "اللہ تعالیٰ سے کفر اللہ تعالیٰ سے جہالت کی وجہ سے ہے" بالکل درست نہیں، کوئی غلط نہیں، کیونکہ ہمارا یہ مطلب نہیں وہ اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے کو بھی نہیں جانتے، بلکہ ہمارا یہ مطلب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات سلبیہ اور صفات اضافیہ سے جاہل ہوتے ہیں، اگر وہ یہ جانتے تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی شریک نہ ٹھہراتے۔ جب وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانے کی ممانعت سے جاہل تھے تو اس کی وجہ ہی یہ تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات سے جاہل تھے۔ (ماخوذ از کبیر)

نتیجہ یہ واضح ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کی معرفت رکھنے کے باوجود کافر تھے، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی بعض صفات سے جاہل تھے، کاش کہ ان کو اہلسنت و جماعت کا علم حاصل ہوتا تو وہ ظاہری علم رکھنے کے باوجود اس قسم کے لغویات نہ کہتے۔ "**ایأمرکم بالکفر بعداذ انتم مسلمون**" کی تفسیر میں صابونی میں یوں ذکر ہے۔

"**ای لایفعل ذلک الامن دعاالی عبادة غیرالله ومن عاد الی عبادة غیرالله فقددعا الی الکفر**"

تمہارے ایمان لانے کے بعد اللہ اور اس کے نبی تو تمہیں کفر کا حکم نہیں دیں گے، ہاں مگر وہ شخص جو غیراللہ کی عبادت کی دعوت دے گا، اور جو غیراللہ کی عبادت کی دعوت دے وہ کفر کی دعوت دے گا، انبیاء کرام نے تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے اور اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہرانے کا حکم دیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾ (سورۃ الانبیاء آیۃ نمبر ۲۵) "اور نہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول مگر ہم وحی کرتے اس کی طرف کہ بیشک کوئی معبود نہیں سوائے میرے، تو میری ہی عبادت کرو" (از صابونی)

تنبیہ: یہ بات واضح ہے کہ کوئی مسلمان صاحب علم اللہ تعالیٰ کے بندوں میں وہ صفات کبھی بھی نہیں جانتا جو اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، ہاں اگر اللہ تعالیٰ خود ہی انبیاء کرام کو "رؤف، رحیم، حمید، حلیم" بنادے تو یہ اس کی مرضی ہے۔

پھر بھی فرق واضح ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات ذاتی ہیں اور بندوں کی یہ صفات عطائی ہیں۔ اگر کوئی صاحب علم یہ کہہ دے کہ اللہ تعالیٰ رؤف ہے، رحیم ہے اور نبی کریم ﷺ بھی "رؤف" اور "رحیم" تو یہ سن کر کوئی کہہ دے کہ یہ تو شرک ہوگیا، تو چاہیئے یہ کہ وہ اپنی جہالت کا علاج کرائے اور ذاتی و عطائی کا فرق سمجھے۔

"**اللهم انا نعوذبک من الضالین المتعصبین المعاندین**"

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَاۤ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ O (آیۃ نمبر ۸۱)

(1) اور یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے ان کا عہد لیا جو میں تم کو کتاب اور حکمت دوں پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول کہ تمہاری کتابوں کی تصدیق فرمائے تو تم ضرور ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور ضرور اس کی مدد کرنا فرمایا کیوں تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا بھاری ذمہ لیا، سب نے عرض کی ہم نے اقرار کیا فرمایا تو ایک دوسرے پر گواہ ہو جاؤ اور میں آپ تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں۔ (کنز الایمان)

(2) اور یاد کرو جب لیا اللہ نے (پختہ) وعدہ نبیوں سے، جب میں تمہیں عطاء کروں کتاب اور حکمت، پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول جو تصدیق کرنے والا ہو اس چیز کی جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور بر ضرور اس پر ایمان لانا، اور تم ضرور بر ضرور اس کی امداد کرنا، فرمایا کیا تم نے اقرار کر لیا، اور (کیا) تم نے لے لیا ہے اس پر میرا بھاری ذمہ، ان تمام نے کہا ہم نے اقرار کر لیا ہے، فرمایا تم گواہ ہو جاؤ، اور میں تمہارے ساتھ گواہوں سے ہوں۔ (نجوم الفرقان)

سب سے پہلے تسکین الجنان سے ایک ورق دیکھئے:

راقم کی سب سے پہلی تصنیف ''تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان'' ہے۔

﴿ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ﴾

''پھر آوے تمہارے پاس کوئی رسول''	(محمود الحسن صاحب)
''کل اگر کوئی دوسرا رسول آئے''	(مودودی صاحب)
''پھر تمہارے پاس کوئی رسول آئے''	(عبد الماجد صاحب)

''پھر تمہارے پاس کوئی اور پیغمبر آئے''	(اشرف علی صاحب)
''پھر تمہارے پاس کوئی پیغمبر آئے''	(فتح محمد صاحب)
''پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول''	(اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ)

وجہ فرق آوے، آئے اور تشریف لائے میں ثابت ہے، ہر ذی شعور کے فہم وادراک سے بعید نہیں کہ ''تشریف لائے'' جسطرح ادب واحترام پر دال ہے، اسی طرح لفظ آوے اور آئے میں کیسے ادب واحترام؟ دوسرا فرق (جو در حقیقت مقصود بیان ہے) ''کوئی رسول'' عام ہے، اور ''وہ رسول'' خاص ہے۔

اس فرق کو سمجھنے کیلئے، پہلے اس آیۃ کریمہ کا کچھ مطلب ذہن نشین کریں، یہ وہ ہے کہ جب اللہ تعالی نے انبیاء کرام سے وعدہ لیا کہ جب میں تمہیں کتاب وحکمت عطاء کر دوں، پھر تمہارے پاس وہ رسول تشریف لائیں جو تمہاری کتاب وحکمت کی تصدیق کرنے والے ہوں تو ضرور بر ضرور ان پر ایمان لانا اور ان کی امداد کرنا، پھر رب تعالی نے ان کو فرمایا کہ کیا تم نے اقرار کر لیا اور اس میرے وعدے کو قبول کر لیا؟ تو انہوں نے عرض کیا ہم نے اقرار کر لیا۔

اب اس مفہوم کے سمجھنے کے بعد واضح ہوا کہ یہاں جن رسول مقبول ﷺ کے متعلق انبیاء کرام سے وعدہ لیا گیا وہ خاص رسول حضرت محمد مصطفی ﷺ ہیں۔ اگر یہاں یہ وہم پیش کیا جائے کہ آیۃ کریمہ میں لفظ ''رسول'' نکرہ ہے، اس کے مطابق ''کوئی رسول'' ہی ترجمہ ٹھیک ہے ''وہ رسول'' یہ تو خاص ہے، یہ ترجمہ کیسے درست ہے۔

تو اس جواب یہ دیا جائے گا کہ نکرہ کا تنوین تعظیم سے خاص ہو جانا نحو کی کتب میں موجود ہے، اور تنوین کا تعظیم کیلئے ہونا بھی علم معانی میں مذکور ہے۔ جب معنیٰ ''وہ رسول'' کیا جائے گا تو تخصیص ہوگی، جس سے مراد نبی کریم ﷺ ہی ہوں گے، اسی پر تفاسیر بھی دلالت کر رہی ہیں۔

﴿ثُمَّ جَاءَ کُمْ رَسُوْلٌ مُصَدِّقٌ لِمَامَعَکُمْ مِنَ الْکِتَابِ وَالْحِکْمَةِ''وھو محمد ﷺ﴾ (جلالین)

''پھر تمہارے پاس وہ رسول تشریف لائے جو تصدیق کرنے والے ہوں تمہاری کتاب وحکمت کی وہ محمد ﷺ ہیں''

یہ حکم اگرچہ بظاہر انبیاء کرام کو ہے لیکن ان کی امتیں بھی ان کے تابع ہونے کی وجہ سے اس حکم میں داخل ہیں۔ ''وامم تبع لھم فی ذلک'' (جلالین) انبیاء کرام کی امتیں بھی ان کے تابع ہونے کی وجہ سے اس حکم میں داخل ہیں۔

اب یہاں پر اگر یہ وہم پیش کیا جائے کہ انبیاء کرام سے وعدہ لینے اور اقرار کرانے کی وجہ کیا ہے جبکہ نبی کریم ﷺ آخر الزمان ہیں، انبیاء کرام نے تو آپ کا زمانہ پانا ہی نہیں تھا، اس کا جواب صاوی میں ہے، سوال وجواب اس طرح پیش کیا گیا ہے۔

قولہ"اقررنا"جواب عن سؤال مقدر تقدیرہ ماذا قالواحینئذ وثمرۃ المعاھدۃعلی محمد مع علم اللہ انہ لایأتی فی زمن نبی من الانبیاء الثواب علی العزم بالاتباع والعقاب علی العزم بعدم الایمان فجمع الانبیاء یثابون علی الایمان بمحمد ومن عزم علی عدم الایمان بہ لو ظھر عوقب"

سوال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کوعلم ہے کہ انبیاء کرام میں سے کوئی نبی، حضور ﷺ کے زمانہ میں نہیں آئیں گے تواس وعدہ واقرار کا کیا فائدہ؟اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہاں مقصود یہ ہے کہ جو نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے کا عزم کرے اس کو ثواب دیا جائے گا،اور جو ایمان نہ لانے کا عزم کرے اسے عذاب دیا جائے گا۔گویا جمیع انبیاء کرام کونبی کریم ﷺ پر ایمان لانے کا ثواب دینا مقصود تھا،اور اگر یہ ظاہر ہو جائے کہ کسی نے نبی کریم ﷺ پر ایمان نہ لانے کا ارادہ کیا ہے تو اس کوعذاب دیا جائے گا،یعنی اس حکم میں انبیاء کرام کے ساتھ چونکہ ان کی امتیں بھی داخل ہیں،اس لئے امتوں میں سے جس شخص نے ایمان نہ لانے کا عزم کیا وہ عذاب میں داخل ہوگا۔

اب اس بیان کے بعد سمجھنے میں کوئی مشکل نہیں رہی کہ یہ حکم نبی کریم ﷺ کے متعلق ہی ہے لھذاایسا معنی کرنا جو عموم پر دال ہے جس سے مقصد واضح نہ ہو یقیناً اس سے بہتر وہی ترجمہ ہوگا جو تخصیص پر دلالت کرے گا اور مقصد کو واضح کرے گا۔ "ولتنصرنہ"ای الرسول وھو محمد ﷺ"(تم اس کی امداد کرنا)اس سے مراد بھی محمد رسول اللہ ﷺ ہی ہیں کہ تم ان کی امداد کرنا" جلالین" (تسکین الجنان صفحہ نمبر ۸۶،۶۷)

تنبیہ: تسکین الجنان میں راقم نے"اس سے بہتر وہی ترجمہ ہوگا"تحریر کرکےاشارہ کر دیا تھا کہ یہ ترجمہ جو کنزالایمان ہے یہ بہتر ہے اگر چہ اس میں دوسرے اقوال بھی ہیں وہ مرجوح ہیں۔مرجوح اقوال مرجوح ہی ہوتے ہیں،تاہم زیادہ وضاحت انشاء اللہ قریب ہی خازن کے حوالہ سے آرہی ہے۔

﴿وَاِذۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ النَّبِيّٖنَ﴾ "اور یاد کرو جب لیا اللہ نے (پختہ) وعدہ نبیوں سے"

"اذ" سے پہلے اگر "اذکر" واحد کا صیغہ مقدر ہو تو خطاب نبی کریم ﷺ کو ہوگا،اب مطلب یہ ہوگا یاد کرو ان واقعات کو جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر بیان کئے ہیں،ان میں سے ایک واقعہ انبیاء کرام سے عہد لینے کا بھی ہے،اسے بھی آپ یاد کریں۔اور اگر"اذکروا"جمع کا صیغہ مقدر ہو تو خطاب اہل کتاب کو ہوگا،جو واقعات ان کی کتاب میں آچکے تھے ان میں سے ایک واقعہ یہ بھی تھا کہ"اے اہل کتاب یاد کرو جب اللہ نے وعدہ لیا نبیوں سے" (خازن)

عجیب دل چسپ مسئلہ:

اصل المیثاق فی اللغة عقد مؤكد بیمین و معنی میثاق النبیین ماولقوابه علی انفسهم من طاعة الله فیما امرهم به ونهاهم عنه"

میثاق کا اصل لغت میں معنی ہے ''وہ عقد جس کو قسم اٹھا کر پختہ کیا جائے'' انبیاء کرام سے رب تعالی نے جو وعدہ لیا وہ مطلق تھا، لیکن انبیاء کرام نے خود اپنے آپ پر اللہ تعالی کے امور کی طاعت کر کے اور منہیات سے رک کر اس وعدہ کو پختہ کر لیا تھا۔ (خازن)

وعدہ کی نسبت جب اللہ تعالی کی طرف کریں تو ترجمہ صرف وہی ہوگا جو اعلی حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے کیا ہے (اور یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے ان کا عہد لیا) ''کنز الایمان'' اور اگر نسبت انبیاء کرام کی طرف کرو تو مطلب یہ ہوگا''یاد کرو جب اللہ نے نبیوں سے وعدہ لیا جسے نبیوں نے اپنے آپ پختہ کر لیا'' (خازن)

راقم نے اپنے ترجمہ میں بریکٹ میں اسی وجہ سے (پختہ) کا لفظ بڑھایا تا کہ طلباء کرام کو اس عجیب اور دل چسپ مسئلہ کی طرف اشارہ مل جائے، کہ قرآن پاک میں کیا خوب فصاحت پائی گئی ہے، کہ ایک ایک لفظ میں کتنے مطالب پائے گئے ہیں۔

مقام توجہ: اس مقام پر مختلف اقوال کا ذکر کیا جارہا ہے، بعد میں راجح قول کا ذکر کر دیا جائے گا، اگر چہ تسکین الجنان سے جو بحث ذکر کی ہے اسی سے راجح قول کا کافی حد تک پتہ چل چکا ہے۔

"وذكروا فی معنی "اخذ المیثاق وجهین "احدهما انه ماخوذ من الانبیاء والثانی انه ماخوذ لهم من غیرهم"

میثاق لینے کی اہل علم نے دو وجہ ذکر کی ہیں، ایک یہ کہ یہ وعدہ انبیاء کرام سے لیا گیا۔ دوسری وجہ یہ بیان کی گئی انبیاء کرام کیلئے یہ وعدہ اوروں سے لیا گیا،

یہی وجہ ہے کہ آیہ کریمہ کے معنی اور مطلب میں اہل علم کا اختلاف نظر آتا ہے۔ **"فذهب القوم الی ان الله تعالی اخذ المیثاق من النبیین خاصة"** کچھ حضرات نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ وعدہ خصوصی طور پر انبیاء کرام سے لیا گیا ہے۔ انبیاء کرام سے یہ وعدہ ان کی اپنی نبوت اور کتاب کی تبلیغ سے پہلے کا ہے، وعدہ لینے کا مطلب یہ ہے کہ ہر نبی اپنے بعد آنے والے نبی پر ایمان لائے۔ یعنی:

"فاخذ المیثاق من موسی ان یؤمن بعیسی ومن عیسی ان یؤمن بمحمد ﷺ"

موسیٰ علیہ السلام سے عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کا وعدہ لیا گیا، اور عیسیٰ علیہ السلام سے محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کا وعدہ لیا گیا۔

امداد کرنے کا کیا مطلب ہے؟ امداد کرنے کا مطلب یہ ہے۔

"وینصرہ ان ادرکہ و ان لم یدرکہ ان یأمر قومہ بنصرتہ ان ادرکوہ"

کہ اگر پہلے نبی بعد میں آنے والے نبی کو پالیں تو خود ان کی امداد کریں، اور اگر خود نہ پائیں تو اپنی امت کو وصیت کر جائیں کہ اگر تم نے بعد میں آنے والے نبی کو پالیا تو ان کی امداد کرنا۔

"وقیل انما اخذ المیثاق من النبیین فی امر محمد ﷺ خاصۃ"

اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ محمد ﷺ کے متعلق نبیوں سے وعدہ لیا گیا ہے۔

اس قول میں پھر کچھ حضرات نے یہ بیان کیا ہے کہ ذکر نبیوں کا ہے مراد ان کی امتیں ہیں، کیونکہ نبی کریم ﷺ انبیاء کرام کی طرف مبعوث نہیں ہوئے، بلکہ اور لوگوں کی طرف مبعوث ہوئے ہیں جن میں پہلے انبیاء کرام پر ایمان رکھنے والے اہل کتاب بھی تھے۔ (لیکن یہ قول بہت ہی ضعیف ہے کہاں کہاں تاویلیں کریں گے، ذکر نبیوں کا مراد ان کی امتیں ہیں) پھر "لما اتیتکم من کتاب و حکمۃ" کی بھی تاویل کرنی پڑے گی (لھذا یہ قول تو عقل سے بہت بعید ہے)

وقیل اخذ اللہ المیثاق علی النبیین و اممھم جمیعا فی امر محمد ﷺ فاکتفی بذکر الانبیاء لان العھد مع المتبوع عھد مع الاتباع وھو قول ابن عباس"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول اس میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام اور ان کی امتوں سے وعدہ لیا کہ جب میرے آخری نبی محمد ﷺ تشریف لے آئیں تو تم ان پر ایمان لانا اور ان کی امداد کرنا، البتہ ذکر صرف انبیاء کرام کا کیا کیونکہ جو وعدہ متبوع (جس کی تابعداری کی جائے) سے لیا جائے وہی تابع سے بھی لیا جاتا ہے۔

"قال علی بن ابی طالب مابعث اللہ نبیا آدم فمن بعدہ الااخذ علیہ العھد فی امر محمد ﷺ واخذ ھو العھد علی قومہ"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی سے وعدہ لیا کہ جب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تشریف لے آئیں تو تم ان پر ایمان لانا اور ان کی امداد کرنا، اور یہی وعدہ انبیاء کرام نے اپنی اپنی امتوں سے لیا۔

"وقیل ان المراد من الآیۃ ان الانبیاء کانوا یاخذون العھد و المیثاق علی اممھم بانہ اذابعث محمد ﷺ ان یؤمنو بہ وینصرونہ"

ایک اور قول اس میں یہ ہے کہ آیۃ کریمہ میں انبیاء کرام سے مراد یہ ہے کہ انبیاء کرام اپنی اپنی امتوں سے وعدہ لیتے

رہے کہ جب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تشریف لائیں تو تم ان پر ضرور بر ضرور ایمان لانا اور ان کی ضرور بر ضرور امداد کرنا۔

راجح قول:

راقم نے تمام اقوال انصاف سے بیان کر دیئے ہیں، تاہم صحیح اور معتبر قول وہی ہے جو تسکین الجنان کے حوالے سے جلالین اور صاوی سے بیان کیا، اس میں کوئی تاویل نہیں، حقیقی معنی مراد لیا گیا ہے مجازی معنی نہیں لیا گیا، قانون یہی ہے کہ جب حقیقی معنی صحیح ہو سکے تو مجازی معنی کی ضرورت نہیں، اور جب بغیر تاویل کے معنی درست ہو تو تاویل کی ضرورت نہیں۔ جلالین میں جو بیان کیا گیا ہے وہی مدارک التنزیل للنسفی میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ مظہری نے بھی قیل وقال کے بعد آخری فیصلہ کن قول یہی کیا۔

"وجاز ان یکون تخصیص العهد لمحمد ﷺ لاظهار فضله"

جائز ہے کہ یہاں جس رسول ﷺ کے تشریف لانے کا ذکر ہے وہ حضرت محمد ﷺ ہوں آپ کی فضیلت کو ظاہر کرنے کیلئے آپ کیلئے انبیاء کرام سے وعدہ لیا گیا، آپ کی خصوصیت کے پیش نظر آیۃ کریمہ میں آپ کا ہی خصوصی طور پر تذکرہ کیا گیا۔

آیئے علامہ آلوسی رحمہ اللہ کی خوبصورت عبارت دیکھئے، آپ رقم طراز ہیں:۔

ومن هنا ذهب العارفون الی انه ﷺ هو النبی المطلق و الرسول الحقیقی و المشرع الاستقلالی و ان من سواه من الانبیاء علیهم الصلوة السلام فی حکم التبعیة له ﷺ"

عارفین حضرات نے یہی بیان کیا ہے کہ اس آیۃ کریمہ میں جن رسول معظم کا ذکر ہے وہ نبی مطلق، رسول حقیقی مستقل شریعت لانے والے یعنی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں اور دوسرے انبیاء کرام نبی کریم ﷺ کے تابع ہیں۔ (روح المعانی)

تنبیہ: روح المعانی سے کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ نبی کریم ﷺ کی نبوت اصلی ہے اور باقی انبیاء کرام کی نبوتیں عارضی ہیں "معاذ اللہ یہ قول سراسر باطل ہے" اس کا صرف یہ مطلب ہے کہ انبیاء کرام کو اس معظم رسول کی تابعداری کا حکم دیا گیا وہ مطلق نبی ہیں کہ جب صرف "رسول اللہ کہا جائے، یا صرف "اللہ کا نبی" کہا جائے تو اس سے مراد صرف محمد رسول اللہ ﷺ ہی ہوتے ہیں۔ وہ چونکہ ساری مخلوق کی تخلیق کا باعث ہیں، لھذا وہ باعث تخلیق انبیاء کرام بھی ہیں۔ اس لحاظ پر آپ کو حقیقی نبی ہونے کا حق حاصل ہوا، کہ حقیقت میں آپ ہی باعث ایجاد کائنات ہیں۔ باقی شریعتیں منسوخ ہو گئیں، لیکن نبی کریم ﷺ کی شریعت منسوخ نہ ہوئی، نہ ہی قیامت تک منسوخ ہو گی، اس لئے آپ کا لقب بن

گیا آپ مستقل شریعت لانے والے ہیں۔علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے اپنی اس عبارت سے پہلے ایک حدیث بیان کی جس سے **راقم** کی یہ وضاحت بخوبی سمجھ آجائے گی۔وہ حدیث پاک یہ ہے۔

اخرجه ابو یعلی عن جابر قال،قال رسول اللہ ﷺ "لاتسألوا اهل الکتاب عن شئی فانهم لن یهدوکم وقد ضلوا فاما ان تصدقوا بباطل واما ان تکذبوا بحق وانه والله لوکان موسی حیا بین اظهرکم ماحل له الا ان یتبعنی"

مسند ابویعلی میں حضرت جابر ﷺ سے روایت ذکر کی گئی ہے،رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اہل کتاب سے کسی چیز کا سوال نہ کرو،وہ تمہیں ہرگز ہدایت نہیں دے سکیں گے،وہ تو خود گمراہ ہیں۔(ان کی بات کی مان کر) یا تم باطل کی تصدیق کرو گے،یا تم حق کی تکذیب کرو گے،بیشک قسم ہے اللہ تعالی کی اگر موسی علیہ السلام تمہارے درمیان زندہ موجود ہوتے تو ان کے لئے جائز نہ ہوتا سوائے میری تابعداری کے۔

حدیث پاک سے واضح ہوگیا کہ انبیاء کرام میں سے کوئی نبی بھی رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ظاہری حیات میں ہوتے تو ان پر لازم ہوتا کہ وہ نبی کریم ﷺ کی تابعداری کرتے۔ (راقم کی وضاحت)

"اعلم ان المقصود من هذه الآیات تعدید تقریر الاشیاء المعروفة عند اهل الکتاب مما یدل علی نبوة محمدا قطعا لعذرهم واظهار العنادهم ومن جملتها ماذکره الله تعالی فی هذا الآیة"

یقین کرلو بیشک مقصود ان آیات سے چندان چیزوں کو بیان کرنا تھا جو اہل کتاب کے نزدیک مشہور و معروف تھیں اور حضرت محمد مصطفی ﷺ کی نبوت پر دلالت کرتی ہیں،تا کہ ان کا عذر ختم ہوجائے کہ وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمیں تو علم نہیں تھا، اور بیان کرنا یہ مقصود تھا کہ ان کا عناد ظاہر ہوجائے کہ ان کا نبی کریم ﷺ پر ایمان لانا صرف عناد کی وجہ سے تھا۔اور اس آیۃ کریمہ سے اس بات کو واضح کردیا کہ

"انه تعالی اخذ المیثاق من الانبیاء الذین آتاهم الکتاب والحکمة بانهم کلما جاء هم رسول مصدق لما معهم آمنوا به ونصروه واخبرانهم قبلوا ذلک"

بیشک اللہ تعالی نے جب انبیاء کرام سے وعدہ لیا کہ جب ان کو اللہ تعالی کتاب و حکمت عطاء کردے،اور ان کے پاس وہ رسول معظم تشریف لائیں جو ان کی کتب و شرائع کی تصدیق کریں تو ان پر ایمان لانا اور ان کی امداد کرنا۔

رب تعالی کے اس حکم کو انبیاء کرام نے تسلیم کرلیا،جس پر" قالوا اقررنا" واضح طور پر دلالت کررہا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

اسی طرح انبیاء کو نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے اور آپ کی امداد کرنے کا اجر و ثواب حاصل ہوگیا۔

اعتراض: جب نبی کریم ﷺ کی شریعت پہلی شریعتوں کی ناسخ ہے تو کس طرح ان کی تصدیق کرنے والی ہے۔

جواب: المراد به حصول الموافقة فی التوحید والنبوات واصول الشرائع" مراد اس سے توحید ،نبوت اور اصول شرائع میں متفق ہونا ہے، اختلاف صرف تفاصیل میں تھا، وہ حقیقت میں کوئی اختلاف نہ تھا۔

"ان جمیع الانبیاء علیهم السلام متفقون علی ان الحق فی زمان موسی علیه السلام لیس الاشرعه ، وان الحق فی زمان محمد ﷺ لیس الاشرعه"

تمام انبیاء کرام کا اس پر اتفاق رہا کہ موسی علیه السلام کے زمانہ میں آپ کی شریعت حق پر تھی، اور بیشک نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں آپ کی ہی شریعت حق ہے۔ (کبیر)

﴿لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ﴾ "ضرور بضرور تم ان پر ایمان لانا اور ضرور بضرور ان کی امداد کرنا"

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

لام موطأ للقسم ہے، اسلئے قسم مقدر ہے، اور مبتداء کی خبر "لاظهار دین الحق" بھی محذوف ہے، اسلئے معنوی طور پر عبادت یوں بن گئی۔

"والله لتصدقنه برسالته وتنصرنه علی اعدائه لاظهار دین الحق"

قسم ہے اللہ تعالی کی ضرور بضرور تم ان کی رسالت کی تصدیق کرنا اور ضرور بضرور ان کی ان کے دشمنوں کے خلاف امداد کرنا دین حق کے اظہار کیلئے۔ (از روح البیان)

﴿قَالَ اَاَقْرَرْتُمْ﴾ "کہا کیا تم نے اقرار کرلیا"

اللہ تعالی نے انبیاء کرام سے وعدہ لینے کے بعد یہ ارشاد فرمایا "اَقْرَرْتُم" کیا تم نے اقرار کرلیا کہ اس نبی معظم پر ایمان لانا اور اس کی امداد کرنی ہے۔

"والاستفهام للتقریر والتاکید علیهم لاستحالة حقیقة الاستفهام فی حقه تعالی"

اس مقام پر استفہام تقریر و تاکید کیلئے ہے، حقیقت استفہام رب تعالی کی شان کے لائق نہیں کہ وہ سوال کرے کیا تم نے اقرار کرلیا ہے، مجھے بتاؤ، جب رب تعالی سب کچھ جانتا ہے تو اسے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ اصل مقصود انبیاء کرام سے اقرار کرانا ہے تا کہ ان کو اقرار کا ثواب بھی حاصل ہوجائے۔ (از روح البیان)

﴿وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِکُمْ اِصْرِیْ﴾ ''اور (کیا) تم نے لے لیا اس پر میرا بھاری ذمہ''

یہ جملہ بھی استفہام تقریری کیلئے ہے، اسی لئے علامہ آلوسی نے بیان کیا ہے "ھل اخذتم" (کیا تم نے لیا) راقم نے بھی اسی وجہ سے بریکٹ میں لفظ (کیا) زیادہ کیا ہے۔

''(اصری) ای عقدی الذی عقدته علیکم'' ''اصری'' کا مقصد یہ ہے کہ ''میرا وہ عقد جو میں نے تم پر باندھا ہے''

''والاصر الثقل الذی یلحق الانسان لاجل ما یلازمه من العمل''

"اصر" اس بوجھ کو کہا جاتا ہے جو انسان کو اس کے عمل کی وجہ سے لاحق ہوتا ہے۔

''والاصر ھھنا العھد الثقیل لانه ثقل علی صاحبه من حیث انه یمنع عن مخالفته ایاه''

"اصر" کا اس آیۂ کریمہ میں معنیٰ ''بھاری وعدہ'' ہے۔ کیونکہ جس طرح بوجھ ادھر ادھر حرکت سے روکتا ہے، اسی طرح بھاری وعدہ بھی اس کی مخالفت سے روکتا ہے۔ (از روح البیان)

علامہ رازی رحمہ اللہ نے اسی لئے خوبصورت ترجمہ یوں تحریر کیا۔

(واخذ تم علی ذلکم اصری) ای قبلتم عھدی والاخذ بمعنی القبول کثیر فی الکلام''

کیا تم نے میرا وعدہ قبول کر لیا ہے۔ ''اخذ'' کا معنیٰ قبول کرنا ''کلام اللہ'' میں کئی جگہ استعمال ہے۔ جیسا کہ "ولا یؤخذ منھا فدیة" (اور نہیں قبول کیا اس سے فدیہ) اسی طرح "ویاخذ الصدقات" قبول کرتا ہے صدقات کو۔

﴿قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا﴾ ''ان تمام نے کہا اقرار کر لیا ہے''

یعنی اے اللہ تعالیٰ تو نے ہم سے جو وعدہ لیا ہے محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے اور ان کی امداد کرنے کا ہم اس کا اقرار کرتے ہیں، یعنی اس قول سے انبیاء کرام کو اقرار کا ثواب مل گیا۔

خیال رہے کہ چونکہ "اصر" کا معنیٰ بھی پختہ وعدہ ہے، جس کا ترجمہ ''بھاری ذمہ داری'' بزرگوں نے کیا تو راقم نے بھی وہی نقل کیا، یہی وجہ ہے کہ صرف عہد کے اقرار کا سوال کیا گیا اور اسی کا اقرار کر لینے کا جواب دیا گیا، اصر کے متعلق نہ سوال کیا گیا اور نہ ہی جواب دیا گیا کیونکہ وہ ضمنا خود بخود ذکر ہو گیا۔ (از روح البیان)

﴿قَالَ فَاشْھَدُوْا وَاَنَا مَعَکُمْ مِّنَ الشّٰھِدِیْنَ﴾

''فرمایا تم گواہ ہو جاؤ اور میں تمہارے ساتھ گواہوں سے ہوں''

یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم گواہ ہو جاؤ، جو ارشاد فرمایا ''تم گواہ ہو جاؤ'' اس کے چند مطالب ہیں۔

(1) الاول فليشهد بعضكم على بعض بالاقرار وانا على اقراركم واشهاد بعضكم بعضا من الشاهدين "

پہلا مطلب یہ کہ بعض تمہارے بعض پر اقرار کرنے کے گواہ ہو جاؤ، اور تمہارے اقرار کرنے اور بعض کے بعض پر گواہ بننے پر میں بھی گواہ ہوں گا۔

اس میں زیادہ تاکید پائی گئی ہے، اور ان کو پھرنے سے ڈرایا گیا ہے، اس لئے کہ جب انہیں معلوم ہوگا کہ ہمارے بعض بعض پر گواہ ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی ہم پر گواہ ہے تو وہ کبھی اس سے پھرنے کا تصور بھی نہیں کر سکیں گے۔

(2) الثاني ان قوله فاشهدوا خطاب للملائكه"

اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ "فاشهدوا" میں خطاب فرشتوں کو ہے کہ "اے فرشتو تم ان کے اقرار پر گواہ ہو جاؤ" اور میں بھی اس پر گواہ ہوں۔

(3) الثالث ان قوله (فاشهدوا) اى ليجعل كل احد نفسه شاهدا على نفسه ونظيره قوله "واشهدهم على انفسهم الست بربكم قالوا بلى شهدنا على انفسنا" وهذا من باب المبالغة "

تیسرا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے نفسوں پر، اپنے اقرار پر گواہ ہو جاؤ، یہ اسی طرح جس طرح آیۃ کریمہ ﴿وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا عَلٰى اَنْفُسِنَا﴾ میں تمام لوگوں کو یوم میثاق میں ان کے اپنے ہی نفسوں پر گواہ بنایا گیا۔

(4) الرابع "فاشهدوا" اى بينوا هذا الميثاق للخاص والعام لكى لا يبقى لاحد عذر فى الجهل به واصله ان الشاهد هو الذى يبين صدق الدعوى"

چوتھا مطلب یہ ہے کہ "فاشهدوا" کا معنی یہ ہے کہ یہ وعدہ جو اللہ تعالیٰ نے تم سے لیا ہے اسے خاص و عام کے سامنے بیان کرو، تاکہ کسی ایک کو عذر باقی نہ رہے کہ مجھے پتہ نہیں، اصل میں شاہد کو شاہد کہنے کی وجہ ہی یہ ہے کہ وہ دعویٰ کی سچائی کو بیان کرتا ہے کہ مدعی کا یہ دعویٰ سچا ہے۔

(5) الخامس "فاشهدوا" اى فاستيقنوا ما قررته عليكم من هذا الميثاق وكونو فيه كالمشاهد للشىء المعاين له"

پانچواں مطلب یہ ہے کہ "گواہ بن جاؤ" یعنی جو تم نے اپنے آپ اقرار کر لیا ہے اس وعدہ کا یقین کر لو اس طرح ہو جاؤ جس طرح گواہ کسی چیز کا معاینہ اور مشاہدہ کر کے یقین کر لیتا ہے، یقین کے بعد وہ گواہی دیتا ہے۔

(6) السادس اذا قلنا ان اخذ الميثاق كان من الامم فقوله "فاشهدوا" خطاب الانبياء

علیهم السلام بان یکون شاھدین علیھم "

چھٹا مطلب یہ ہے کہ جب یہ خطاب انبیاء کرام کی امتوں کو بھی ان کی تابعداری کی وجہ سے ہے تو" گواہ ہو جاؤ" کا حکم انبیاء کرام کو ہے کہ تم اپنی اپنی امتوں پر گواہ ہو جاؤ کہ انہوں نے بھی اقرار کیا تھا۔ (از کبیر)

اللہ تعالیٰ کے گواہ ہونے سے مزید تاکید پیدا ہو گئی، اور جس حکم کو لازم کیا گیا ہے وہ زیادہ پختہ ہو گیا، کہ جب اللہ تعالیٰ بھی گواہ ہے تو یقیناً اس حکم جس کو ماننے کا ہم نے اقرار کیا ہے وہ بہت پختہ ہے۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

فَمَنْ تَوَلّٰی بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ○ (آیۃ نمبر ۸۲)

(1) تو جو کوئی اس کے بعد پھرے تو وہی لوگ فاسق ہیں۔ (کنز الایمان)

(2) تو جو کوئی پھر گیا بعد اس کے تو وہی لوگ فاسق (حد سے تجاوز کرنے والے) ہیں۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے رابطہ:

اللہ تعالیٰ جب تمام مخفی چیزوں کو جانتا ہے، اس پر کوئی چیز مخفی (پوشیدہ) نہیں، لیکن اس نے مصلحت کیلئے دوسرے لوگوں کو گواہ بنایا تا کہ ایک حکم میں تاکید پائی جائے، اب اس آیۃ کریمہ میں مزید تاکید کا ذکر کیا کہ جس نے اس رسول یعنی محمد ﷺ پر ایمان لانے سے اعراض کیا اور آپ کی امداد کرنے سے انکار کیا تو وہ فاسق ہوں گے۔ (ماخوذ از کبیر)

(الفاسقون) المتمردون الخارجون عن الطاعة من الکفرة فان الفاسق من کل طائفة من کان متجاوزا عن الحد"

"فاسقون" سے مراد سرکش لوگ، کفر کی وجہ سے طاعت سے خارج ہونے والے لوگ ہیں، اس لئے کہ اصل فسق کا معنی حد سے تجاوز کرنا، ہر گروہ میں جو حد سے تجاوز کرے وہ فاسق ہے۔ (روح البیان)

"(الفاسقون) ای الخارجون عن الایمان" فاسقون" سے مراد ایمان سے نکل جانے والے لوگ ہیں، کیونکہ "فاسق" کا معنی "خارج" (نکل جانے والا) ہے۔ (قرطبی)

اعتراض: جب پہلے دلائل سے بیان کر دیا گیا کہ اس سے پہلے آیۃ کریمہ میں مختار قول یہی ہے کہ وعدہ انبیاء

کرام سے لیا گیا اور "ثم جاء کم رسول" سے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ یعنی مطلب یہ ہوا کہ یاد کرو جب اللہ نے وعدہ لیا نبیوں سے کہ جب میں تمہیں کتاب وحکمت دوں پھر تمہارے پاس وہ رسول آئیں جو تصدیق کرنے والے ہوں اس چیز کی جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور برضرور ایمان لانا، اوران کی ضرور برضرور امداد کرنا۔ انبیاء کرام کا اپنے اقرار کے بعد پھرنا اوران کا فاسق ہونا کیسے صحیح ہے؟

پہلا جواب: یہ بات بھی پہلے ذکر ہو چکی ہے کہ اگر چہ خطاب انبیاء کرام کو ہے لیکن ان کی امتیں بھی ان کے تابع ہونے کی وجہ سے اس حکم میں داخل ہیں۔

"قال فی التیسیر والتولی لایقع من الانبیاء ولا یوصفون بالفسق لکن له وجهان احدهما ان المیثاق کان علی الانبیاء وامیهم علی التبعیة والتولی من الامم خاصة"

تیسیر میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ بھی یقینی بات ہے کہ انبیاء کرام کا اپنے وعدہ اوراقرار سے پھرنا ممکن نہیں، اور یہ بھی یقینی بات ہے کہ انبیاء کرام کو (معاذ اللہ) فاسق کہنا بھی ممکن نہیں۔ تو اس مشکل کے حل کی دو وجہ بیان کی گئی، پہلی وجہ یعنی پہلا جواب یہ ہے کہ خطاب جب انبیاء کرام اوران کی امتوں کو بھی ہے، تو اس آیۃ کریمہ میں امتوں کا تذکرہ ہے۔

اب مطلب یہ ہو گیا کہ انبیاء کرام کو گویا کہ یوں خطاب ہے "کہ اے انبیاء کرام تمہاری امتوں میں جو لوگ اس عہد واقرار سے پھر گئے وہ فاسق ہو جائیں گے، یعنی ایمان سے خارج ہوں گے۔ (روح البیان)

قرطبی رحمہ اللہ نے بھی اسی کے مطابق تفسیر کی:

"فمن تولی من امم الانبیاء عن الایمان بعد اخذ المیثاق" (فاولئک هم الفاسقون) ای الخارجون عن الایمان"

انبیاء کرام کی امتوں میں سے جو شخص وعدہ سے پھر گیا وہ لوگ ایمان سے نکل جانے والے ہیں۔ (قرطبی)

دوسرا جواب: انبیاء کرام کی عصمت ان سے محنت کو زائل نہیں کرتی، یعنی یہ یقینی بات ہے کہ انبیاء کرام کا وعدہ سے پھرنا اوران کا (معاذ اللہ) فاسق وکافر ہونا تو ممکن نہیں کیونکہ وہ معصوم حضرات ہیں، لیکن انبیاء کرام پر رب تعالیٰ نے عصمت کی وجہ سے محنت کو زائل نہیں کیا۔ ان پر احکام لازم کیے گئے اوران کو حرام کاموں سے منع کیا گیا، لھذا مطلب یہ ہوا کہ اے انبیاء کرام بالفرض المحال "اگر تم وعدہ سے پھر گئے تو تم فاسق ہو جاؤ گے" جو کلام "بالفرض المحال" پر مبنی ہوتی ہے اس سے مراد حقیقت نہیں ہوتی، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ﴿قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ

الْعَابِدِيْنَ﴾ ''آپ فرمادیجئے اگر بالفرض اللہ تعالیٰ کی اولاد ہوتی تو میں سب سے پہلے اس کی عبادت کرنے والا ہوتا'' یعنی نہ رب تعالیٰ کی اولاد ہے نہ ہونی ہے تو رب تعالیٰ کی اولاد جب ہونی ہی نہیں تو ہم ان کی عبادت کریں یہ متصور نہیں ، اب مسئلہ نکھر کر سامنے آ گیا کہ انبیاء کرام کا وعدہ سے پھرنا جب ممکن نہیں تو ان کا فاسق ہونا بھی ممکن نہیں ، البتہ بالفرض محال کلام سے دوسرے لوگوں کو تاکیدی حکم دے دیا گیا کہ اے عام لوگو اگر تم وعدہ سے پھر گئے تم نے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہ لایا اور ان کی امداد نہ کی تو تم کافر ہو جاؤ گے ، بالفرض اگر انبیاء کرام سے بھی پھرنا ممکن ہوتا تو ان پر بھی فسق کا حکم لگایا جاتا ، البتہ انبیاء کرام پر ایک حکم فرض کر کے ان کو محنت میں مبتلاء کر کے ان کو ثواب کا مستحق بنا دیا۔
(ماخوذ از روح البیان بالوضاحت)

گذشتہ سے پیوستہ:

قال علی وابن عباس رضی اللہ عنهما مابعث الله نبیا من الانبیاء الا اخذ علیه المیثاق لئن بعث الله محمدا وهو حی لیؤمنن به ولینصرنه'' وامره ان یاخذ المیثاق علی امته لئن بعث محمد وهم احیاء لیؤمنن به ولینصرنه''

حضرت علی اور حضرت ابن عباس ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام میں سے کسی نبی کو مبعوث نہیں فرمایا مگر یہ کہ اس سے وعدہ لیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اگر تمہاری زندگی میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمایا تو تم ان پر ضرور بر ضرور ایمان لانا ، اور ہر نبی کو یہ حکم دیا کہ تم نے اپنی اپنی امتوں سے وعدہ لینا ہے کہ اگر تمہاری زندگی میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ مبعوث ہو جائیں تو تم ان پر ضرور بر ضرور ایمان لانا اور ان کی ضرور بر ضرور امداد کرنا۔

''وقال الحسن البصری وقتادة اخذ الله میثاق النبیین ان یصدق بعضهم بعضا''

حضرت حسن بصری اور حضرت قتادہ رحمهما اللہ کا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کرام سے وعدہ لیا کہ بعض کی تصدیق کریں۔

''وهذا لایضاد ما قاله علی وابن عباس ولا ینفیه بل یستلزمه ویقتضیه''

حضرت حسن بصری اور حضرت قتادہ رحمهما اللہ کا قول حضرت علی اور حضرت ابن عباس ﷺ کے قول کے منافی نہیں ، بلکہ یہ تو ان کے قول کو لازم کرتا ہے اور اس کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ پایا جائے مطلب یہ واضح ہو گیا کہ ہر نبی جو دوسرے نبی کو اپنی زندگی میں پالے تو اس کی تصدیق کرے ، اور ہر نبی پر واجب ہے کہ اگر اس کی زندگی میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لائیں تو وہ ان پر ضرور بر ضرور ایمان لائیں اور ان کی ضرور بر ضرور امداد کریں۔

ارشاد مصطفوی سے مسئلہ واضح ہوتا ہے:

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "لو کان موسی وعیسی حیین لما وسعھما الا اتباعی" اگر موسیٰ اور عیسیٰ علیہ السلام دونوں زندہ ہوتے تو ان کو سوائے میری اتباع کے کوئی چارۂ کار حاصل نہ ہوتا۔

اوصاف مصطفیٰ کریم ﷺ کا تقاضا:

نبی کریم ﷺ کو رب تعالیٰ نے ایسے اوصاف سے متصف کر دیا کہ وہ خود ہی اس کا تقاضا کرتے ہیں کہ ہر نبی پر آپ کی تصدیق وامداد لازم ہے۔

"فالرسول محمد خاتم الانبیاء صلوات اللہ وسلامہ علیہ دائما الی یوم الدین"
حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تمام انبیاء کرام کے خاتم ہیں، قیامت تک آپ کی شریعت قائم ودائم رہے گی آپ کی شریعت بھی منسوخ نہیں ہوتی، آپ کے بعد تا قیامت کوئی نبی نہیں آتا۔

"ھو الامام الاعظم الذی لو وجد فی ای عصر وجد لکان ھو الواجب الطاعۃ المقدم علی الانبیاء کلھم ولھذا کان امامھم لیلۃ الاسراء لما اجتمعوا ببیت المقدس"

نبی کریم ﷺ امام اعظم ہیں جس زمانہ میں بھی دوسرے انبیاء کرام آپ میں موجود ہوں تو امامت آپ کا ہی حق ہے، یہی وجہ تھی کہ معراج کی رات کو جب تمام انبیاء کرام بیت المقدس میں جمع ہوئے، تو نبی کریم ﷺ نے ہی ان کی امامت کرائی، آپ کو امام الانبیاء ہونے کا شرف حاصل ہو گیا۔

"وکذلک ھو الشفیع فی المحشر فی اتیان الرب جل جلالہ لفصل القضاء بین عبادہ"

محشر کے دن حساب وکتاب شروع کرنے کیلئے صرف آپ کی شفاعت کو ہی قبول کیا جائے گا، جس سے پتہ چلا کہ قیامت کے دن آپ کے سید الانبیاء ہونے کا سب کو پتہ چل جائے گا، کوئی براہ راست رب تعالیٰ کے پاس آپ کے وسیلہ کے بغیر پہنچنے کا دعویٰ نہیں کر سکے گا۔

"وھو المقام المحمود الذی لایلیق الالہ" مقام محمود پر جلوہ گری صرف آپ کو ہی حاصل ہوگی کسی اور نبی کو یہ منصب نہیں ہوگا، اس سے آپ کا افضل الانبیاء ہونا واضح ہو جائے گا۔ ان تمام اوصاف سے آپ کا تمام انبیاء کرام سے یکتا ہونا سمجھ آیا کہ آپ کو جو خصوصیات وکمالات حاصل ہیں وہ دوسرے انبیاء کو حاصل نہیں۔

جب انبیاء کرام پر لازم تھا کہ ان کی زندگی میں جو نبی بھی موجود ہو وہ اس کی تصدیق کریں، تو اسی سے اور

زیادہ واضح ہو گیا کہ تمام انبیاء کرام کو "واذاخذ اللہ میثاق النبیین" آیۃ کریمہ میں خصوصی طور پر اور تاکیدی طور پر حکم دیا کہ تمام پر لازم ہے کہ جس نبی کی زندگی میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئیں تو ان پر وہ ایمان لائیں اور ان کی امداد کریں۔ (ماخوذ از صابونی وابن کثیر)

مقصد یہی تھا کہ تمام انبیاء کرام کو یہ اقرار کر کے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے اور آپ کے امتی ہونے کا شرف حاصل ہو جائے۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ۝ (آیۃ نمبر ۸۳)

(1) تو کیا اللہ کے دین کے سواء اور دین چاہتے ہیں اور اسی کے حضور گردن رکھے ہیں جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہیں خوشی سے اور مجبوری اور اسی کی طرف پھریں گے۔ (کنز الایمان)

(2) تو کیا اللہ کے دین کے غیر کو وہ چاہتے ہیں، حالانکہ اسی کے حضور گردن رکھے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں خوشی سے اور مجبوری سے، اور اسی کی طرف پھیرے جائیں گے۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

جب اللہ تعالیٰ نے پہلی آیۃ کریمہ میں بیان فرمایا کہ تمام انبیاء کرام پر لازم ہے کہ وہ حضرت محمد ﷺ پر ایمان لائیں اور ان کی امداد کریں، پھر انبیاء کرام کے واسطہ سے خطاب ان کی امتوں کو بھی ہے۔ اس کے بعد اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا، جس میں عجیب انداز پر بیان کیا گیا ہے۔

طلباء کرام ذرا عجیب دل چسپ مسئلہ دیکھئے:

الهمزة للاستفهام والمراد استنكار ان يفعلوا ذلك اوتقرير انهم يفعلونه" (كبير)

"افغیر" میں ہمزہ یا تو استفہام انکاری کیلئے ہے، کیا وہ اللہ کے دین کے سواء دین کو وہ چاہتے ہیں؟ نہیں وہ تو یہ نہیں

چاہتے، یہ اسی وقت ہوگا جب خطاب انبیاء کرام کو ہو، اور یا ہمزہ استفہام تقریری ہے، یعنی کیا وہ اللہ کے دین کے علاوہ کوئی اور دین چاہتے ہیں؟ ہاں وہ تو اور دین چاہتے ہیں، یہ اسی وقت ہوگا جب خطاب ان کی امتوں کو ہوگا۔

مطلب واضح ہوا کہ انبیاء کرام کی شان کے تو لائق نہیں کہ وہ اللہ تعالی کے دین کے بغیر اور دین تلاش کریں، البتہ ان کی امتوں کے لوگ حسد کی وجہ سے نبی کریم ﷺ پر ایمان نہیں لائیں گی، وہ گویا کہ اللہ کے دین کو چھوڑ کر اور دین تلاش کرر ہے ہوں گے۔

تنبیه: اس آیۃ کریمہ کا شان نزول علامہ بغوی اور علامہ آلوسی اور علامہ قرطبی رحمھم اللہ نے یہ بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ یہودی اور نصرانی مل کر نبی کریم ﷺ کے پاس آئے، وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین میں اختلاف کرر ہے تھے، ایک فریق کہہ رہا تھا ہمارا دین ہی دین ابراہیمی ہے، ہم ان کے زیادہ قریب ہیں، دوسرا فریق کہہ رہا تھا ہمارا دین ہی دین ابراہیمی ہے ہم ان کے زیادہ قریبی ہیں۔ وہ دونوں فریق نبی کریم ﷺ کو کہنے لگے کہ آپ ہمارے درمیان فیصلہ فرمادیں کہ کون حق پر ہے؟

"فقال علیه الصلوة والسلام کلاالفریقین بریء من دین ابراھیم علیه السلام"

تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا دونوں فریق ابراہیم علیہ السلام کے دین سے دور ہیں۔

"فقالوا امانرضی بقضائک ولا ناخذبدینک فنزلت ھذہ الآیة"

وہ کہنے لگے ہم تمہارے فیصلہ پر راضی نہیں اور نہ ہی تمہارے دین کو تسلیم کرتے ہیں، تو اس آیۃ کریمہ کا نزول ہوا کہ "کیا یہ اللہ تعالی کے دین کے سواء کوئی اور دین چاہتے ہیں"

علامہ رازی رحمہ اللہ نے اس شان نزول پر اپنا موقف یوں بیان کیا ہے:

"ویبعد عندی حمل ھذہ الآیة علی ھذاالسبب لان علی ھذاالتقدیر تکون ھذہ الآیة منقطعة عما قبلھا"

میرے نزدیک نزول کی یہ وجہ بعید ہے کیونکہ اس شان نزول سے تو آیۃ کریمہ ماقبل سے منقطع ہو جائے گی (کٹ جائے گی)

راقم کا موقف یہ ہے کہ جب ﴿ واذ اخذالله میثاق النبیین الآیة﴾ آیۃ کریمہ میں انبیاء کرام کی امتیں بھی داخل ہیں تو شان نزول جس کو ذکر کیا گیا ہے اس سے آیۃ کریمہ ماقبل سے منقطع نہیں ہوگی، بلکہ مطلب یہ ہوگا کہ یہ تو وہ لوگ ہیں جن کو ان کے انبیاء کرام بتا کر دنیا سے تشریف لے گئے ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا اور ان کی امداد کرنا، اب یہ لوگ فیصلہ کرانے کیلئے آئے لیکن فیصلہ تسلیم نہیں کرتے اور دین مصطفیٰ کریم ﷺ کو بھی تسلیم نہیں کرتے،

کیا یہ اللہ کے دین کے سواء اور کوئی دین چاہتے ہیں؟ راقم نے جس انداز پر بیان کیا ہے، اسے طلباء کرام بار بار پڑھیں توان شاء اللہ ما قبل سے منقطع نہیں پائیں گے۔

﴿وَلَهُ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا﴾

''حالانکہ اسی کے حضور گردن رکھے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں خوشی سے اور مجبوری سے''

''الاسلام هو الاستسلام والانقياد والخضوع'' ''**وله اسلم**'' کا مطلب یہ ہے کہ اسی کو تسلیم کیا ہے، اسی کے سامنے سر جھکایا ہے، اسی کے سامنے گردن رکھی، اسی کے سامنے عجز کا اظہار کیا۔ زمین و آسمان میں جو ہیں وہ اس کے حضور سر جھکائے ہیں، گردن رکھے ہیں، اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب بیان کرتے ہوئے چند وجہ بیان کی گئی ہیں۔

''الاول، وهو الاصح عندى ان كل ما سوى الله سبحانه ممكن لذاته و كل ممكن لذاته فانه لايوجد الا بايجاده ولا يعدم الا باعدامه فاذن كل ما سوى الله فهو منقاد خاضع لجلال الله فى طرفى وجوده وعدمه وهذاهو نهاية الانقياد والخضوع''

ان میں سے پہلی وجہ:

جو میرے نزدیک زیادہ صحیح ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سواء تمام چیزیں ممکن لذاتہ ہیں، اور جو چیز ممکن لذاتہ ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے موجود کرنے کے بغیر موجود نہیں ہوسکتی، اور اللہ تعالیٰ کے معدوم کرنے کے بغیر معدوم نہیں ہوسکتی، جب تمام مخلوق اپنے وجود وعدم میں رب تعالیٰ کے سامنے سر جھکائے ہو گردن رکھے ہوئے ہے، تو یہی مطلب ہے ﴿وَلَهُ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ﴾ کا۔

دوسری وجہ: یہ ہے جو ہر شخص کے ذہن میں آسکتی ہے، اور اسے ماننے کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں، کہ ''طوعا و کرھا'' کو ساتھ ملا کر مفہوم یوں ہوگیا کہ نیک مسلمان خوشی سے دین کے متعلق چیزوں میں اللہ تعالیٰ کی طاعت کرتے ہیں اور مسلمان کئی چیزوں کو جو ان کی طبیعت کے مخالف ہوتی ہیں یعنی مرض اور فقر اور موت وغیرہ مجبوری سے مانتے ہیں کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے لاحق ہیں۔ حق تو یہ تھا کہ رب تعالیٰ کی طرف سے جب یہ چیزیں انسان کو حاصل ہوتی ہیں تو خوشی سے ان کو تسلیم کیا جاتا لیکن انسان اپنی فطرت کی وجہ سے مجبوری سے ان کے سامنے سر جھکاتا ہے۔ لیکن کافر لوگ اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر کو ٹالنے کی طاقت نہیں رکھتے تو مجبوری سے رب تعالیٰ کو مانتے ہیں دین سے تو ان کا تعلق ہی نہیں ہوتا، باقی امور میں بھی ان کا ماننا مجبوری کی وجہ سے ہے خوشی سے نہیں۔

تیسری وجہ: مسلمان خوشی سے اسلام قبول کرتے ہیں، لیکن کئی کافر موت کے وقت رب تعالیٰ کو مانتے ہیں، لیکن اس وقت ماننا ان کیلئے نفع مند نہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ﴿فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا﴾ ''تو ان کے ایمان نے انہیں کام نہ دیا جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا''

چوتھی وجہ: تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے کو خوشی سے تسلیم کرتی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ﴾ (سورۃ العنکبوت، آیۃ نمبر ۶۱) ''اور اگر تم ان سے پوچھو کس نے بنائے آسمان اور زمین اور کام میں لگائے سورج اور چاند تو ضرور کہیں گے اللہ نے''

لیکن **تکلیفی** کام جو ان کے ذمہ لازم ہیں، یا ان کو درد و آلام کا پہنچنا، ان چیزوں کو کہیں مجبوری سے انہیں ماننا پڑے تو مانتے ہیں، ورنہ خوشی سے نہیں مانتے۔

پانچویں وجہ: یوم میثاق کو تمام لوگوں نے خوشی سے اللہ تعالیٰ کو تسلیم کیا تھا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

﴿وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰي﴾ ''اور اے محبوب یاد کرو جب تمہارے رب نے اولاد کی پشت سے ان کی نسل نکالی، اور انہیں خود ان پر گواہ کیا، کیا میں تمہارا رب نہیں؟ سب بولے کیوں نہیں'' (یعنی ہاں اے اللہ تو ہمارا رب ہے) یہ سب لوگوں نے خوشی سے تسلیم کیا، لیکن دنیا میں آکر رب تعالیٰ کی ربوبیت کو مسلمانوں نے خوشی سے مانا، اور کافروں نے مجبوری سے۔

چھٹی وجہ: حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اہل سماء نے (آسمان والوں نے) اللہ تعالیٰ کو خوشی سے تسلیم کیا، لیکن اہل ارض (یعنی زمین والوں) میں سے بعض نے خوشی سے تسلیم کیا اور بعض نے مجبوری سے خوشی سے اسلام لانے والے مؤمن ہیں، رب تعالیٰ کے عذاب یعنی موت کو دیکھ کر ایمان لانے والے کافر ہیں۔ (ماخوذ از کبیر بالوضاحت)

طاعت اور اطاعت:

قال ابن السکیت یقال طاع له و اطاع" ابن سکیت رحمہ اللہ نے فرمایا "طاع له" (فلاں نے اس کی طاعت کی) کہا جائے، یا کہا جائے "اطاع" (فلاں نے اطاعت کی) ان دونوں کا مطلب ایک ہے۔

"قال الواحدی رحمه الله الطوع الانقیاد، یقال طاعه یطوعه طوعا اذا انقاد له وخضع واذامضی لأمره فقد اطاعه واذا وافقه فقد طاوعه"

واحدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن سکیت کا قول بھی درست ہے کہ طاعت اور اطاعت ایک ہی معنی میں

استعمال ہوتے ہیں لیکن کبھی فرق بھی کرلیا جاتا ہے۔ جب کسی امر کے سامنے سر جھکا لیا جائے، خشوع وخضوع سے تسلیم کرلیا جائے تو یہ طاعت ہے جب اس پر عمل بھی پایا جائے تو یہ اطاعت ہے، اور اگر خوشی سے اسے دل بھی قبول کرلے تو یہ مطاوعت ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَاِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ﴾ ''اور اسی کی طرف وہ لوٹائے جائیں گے''

زمین وآسمان کی تمام مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹایا جانا ہے، جو اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی مخالفت کریں گے کل قیامت کے دن ان کو رب تعالیٰ کے حضور پیش کیا جائے گا وہاں ان کو رب تعالیٰ کے سواء کوئی نفع ونقصان نہیں پہنچا سکے گا۔''وَاِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ'' میں دین حق کے مخالفوں کیلئے وعید عظیم پائی گئی۔

فوائد: فعلی العاقل ان یطیع ربه ولا یعصیه بنقض ماعهدالیه یوم المیثاق''

عقلمند شخص کیلئے لازم ہے کہ وہ آیۃ کریمہ کو سمجھے اور یہ سمجھے کہ رب تعالیٰ کی اطاعت اس پر لازم ہے اس کی نافرمانی نہ کرے، میثاق کے دن اللہ تعالیٰ سے کیا ہوا وعدہ نہ توڑے۔

- **فعهد الله مع الانبیاء والاولیاء والمؤمنین التوحید واقامة الذین وعدم التفرق فیه وتصدیق بعضهم بعضاودعوة الخلق الی الطاعة وتخصیص العبادة بالله فالله تعالیٰ لا یطلب من العبد الا الصدق فی العبودیة والقیام بحقوق الربوبیة''**

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام اور اولیاء کرام اور مؤمنین سے توحید کا وعدہ لیا کہ صرف میری ہی عبادت کرو، میرے ساتھ کوئی شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور وعدہ یہ لیا کہ دین پر قائم رہو اور آپس میں تفرقہ پیدا نہ کرو اور بعض بعض کی تصدیق کرو، اور رب تعالیٰ نے یہ وعدہ لیا کہ مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی طاعت کی دعوت دو، اور عبادت کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص کرو۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے مطالبہ نہیں رتا سوائے اس کے وہ عبودیت میں سچے دل سے قائم رہیں، اور حقوق ربوبیت کو قائم کریں۔

- شیخ شاذلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے جب تمہیں طاعت کی توفیق عطاء فرمائی تو اس نے تم پر ظاہری نعمتوں کی تکمیل فرمادی، اور تمہارے ظاہر وباطن کو اپنے امر کی مخالفت سے بچالیا، تو تمہیں حق پر قائم کردیا، اللہ تعالیٰ تم سے یہی چاہتا ہے کہ تم اس کے مطیع بن کر رہو۔

- حضرت ابراہیم ادہم رحمہ اللہ کو کہا گیا کہ اگر آپ مسجد میں بیٹھ جایا کریں، اور ہمیں کچھ وعظ ونصیحت سنایا کریں تو یہ ہمارے لئے بہتر ہو، آپ نے فرمایا مجھے چار چیزیں تمہارے پاس بیٹھنے اور بات کرنے سے مانع ہیں، اگر وہ چار چیزیں دور ہوگئیں تو میں تمہارے پاس مسجد میں بیٹھ جاؤں گا، آپ سے پوچھا گیا اے ابو اسحٰق (یہ کنیت ہے

ابراہیم ادہم رحمہ اللہ کی) وہ چار چیزیں کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا پہلی چیز ان میں سے یہ ہے کہ مجھے جب وہ وعدہ یاد آتا ہے جو اللہ تعالی نے تمام اولاد آدم سے لیا، اور اللہ تعالی نے بتادیا یہ لوگ جنتی ہیں، مجھے ان کی کوئی پرواہ نہیں، اور یہ لوگ جہنمی ہیں مجھے ان کی کوئی پرواہ نہیں، (یعنی رب تعالی مستغنی ذات ہے کسی کا جنتیوں والا عمل اس کے اپنے نفع کیلئے ہے، اور جہنم والا عمل اس کے اپنے نقصان کیلئے ہے)"فلم ادرمن ای الفریقین کنت" مجھے معلوم نہیں کہ میں اس وقت کس فریق میں تھا۔

دوسری چیز یہ ہے کہ اللہ تعالی جب کسی بچے کو اس کی ماں کے پیٹ میں تخلیق کرتا ہے اور اس میں روح پھونکتا ہے تو اس پر موکل فرشتہ رب تعالی سے پوچھتا ہے کیا یہ نیک بخت ہے یا بد بخت ہے (رب تعالی جو بتاتا ہے، فرشتہ وہی لکھ لیتا ہے)"فلادری کیف یخرج جوابی فی ذلک الوقت" مجھے معلوم نہیں اس وقت میرے متعلق کیا جواب تھا۔

تیسری چیز یہ ہے کہ جب ملک الموت فرشتہ (عزرائیل) روح قبض کرنے کیلئے آتا ہے تو وہ رب تعالی سے پوچھتا ہے اے اللہ! کیا یہ مسلمان تھا کہ اس کا روح اسلام پر قبض کروں کہ اس کا خاتمہ بالخیر ہو یا کہ یہ کافر تھا کہ اس کا روح کفر پر قبض کروں کہ اس کا خاتمہ بالشر ہو۔"فلادری کیف یخرج جوابی فی ذلک الوقت" مجھے معلوم نہیں کہ اس وقت میرے متعلق کیا جواب ہوگا۔

چوتھی چیز یہ ہے کہ میں جب رب تعالی کے اس ارشاد گرامی میں تفکر کرتا ہوں۔ ﴿وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ﴾ "جدا ہو جاؤ آج اے مجرمو""فلادری من ای الفریق اکون" مجھے معلوم نہیں کہ میں اس وقت کس فریق میں ہوں گا۔ "ففی ھذا شغل شغلنی عن الجلوس لکم والحدیث معکم" یہ چار چیزیں مجھے تمہارے پاس بیٹھنے اور وعظ ونصیحت سے مانع ہیں۔

حضرت ابراہیم ادہم رحمہ اللہ کے اس واقعہ سے یہ بات واضح ہوئی کہ انسان کو چاہئے کہ وہ اس پر ایمان رکھے کہ اللہ تعالی کی تقدیر میں خیر وشر ہیں، اور اسی کے علم میں ہے کہ کون خیر پر مرے گا، اور کون شر پر مرے گا۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی کو مدنظر رکھتے ہوئے عمل کرتا رہے، اور اپنی طرف سے کوشش کرتا رہے اور دعاء کرتا رہے کہ اس کا خاتمہ بالخیر ہو۔ آپ کا ارشاد گرامی یہ ہے۔"اعملوا فکل میسر لما خلق له" عمل کرو ہر شخص جس کیلئے پیدا کیا گیا ہے وہ اس میں آسانی پیدا کرنے والا ہے۔

❁ فلیجا ھدالعاقل فی تزکیه النفس اولا ثم الوصیة الی عباداللہ ولایکلف المرء الا بقدر وسعه والناس فی المراتب مختلفون فطوبی لمن وصل الی اعلی المطالب"

عقلمند شخص کو چاہیے کہ وہ پہلے اپنے تزکیہ نفس (نفس کو پاک کرنے) کی کوشش کرے، پھر وہ اللہ کے بندوں کو وصیت کرے، کسی انسان کو اس کی طاقت سے زائد تکلیف نہیں دی جاتی، لوگ مراتب میں مختلف ہیں خوشی کا مقام ان کیلئے ہی ہے جو اعلیٰ مطالب کو حاصل کر لیں۔

بقدر حوصلہء خویش دانہ چینید مرغ   بصعوہ نتواں داد طعمہء شہباز

اپنی طاقت کے مطابق پرندہ دانہ چن سکتا ہے   چڑیا محولا باز کو لقمہ کھلانے کی طاقت نہیں رکھتی۔

❁ حضرت شیخ صفی رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا کہ رب تعالیٰ کے قرب کو طلب کرنے والا اپنے خیال میں تمام منازل طے کر لے تو اس پر کوئی اور منزل بھی باقی رہ جاتی ہے جسے اس نے طے کرنا ہے۔ تو آپ نے جواب دیا، ہاں "یبقی علم انه هل كان مقبولا للرب تعالى اولا" ابھی یہ علم حاصل ہونا باقی ہے کہ وہ شخص جو یہ جاننے کی کوشش کرے کہ اس نے جو عبادت کی اور اپنے خیال میں تمام منازل طے کر لیں، وہ اللہ تعالیٰ کے حضور قبول ہوئی ہیں یا نہیں۔

❁ وفی القشیری ماحاصله ان الولی فی الحال یجوزان یتغیر حاله فی المآل ویجوزان یکون من جملة کرامات الولی ان یعلم انه مامون العاقبة عصمنا الله وایاکم بحسن الخاتمة"

کتاب قشیری میں ہے کہ یہ بھی ممکن ہے کہ آج کے ولی کا حال کل بدل جائے، انجام ولایت پر نہ ہو، یعنی ایمان وہی معتبر ہے جب موت ایمان پر آئے، کسی شخص نے ایمان لایا، نیکی کے عمل کرتا رہا لیکن "العیاذ باللہ" مرتد ہو گیا اور موت کفر پر آ گئی تو اس کے پہلے ایمان سے اسے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔

ایسے ہی اگر کوئی شخص منصب ولایت پر فائز ہو گیا، حقیقۃ وہ اپنے اعمال کے لحاظ پر ولی ہے، لیکن اس کی ولایت پر موت آ جائے تو وہ کامیاب ہو گیا، اور اگر وہ بدقسمتی سے بداعمال ہو گیا اور اس کا خاتمہ بداعمالیوں پر ہوا تو اس کا خاتمہ ولایت پر نہیں ہوا، ولی کی سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے خاتمہ بالخیر کا اسے علم عطاء کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم تمام مؤمنین کا خاتمہ بالخیر فرمادے۔ آمین ثم آمین

ہمہ عالم ہمی گویند ہر آن   کہ یا رب عاقبت محمود گردان

تمام جہان کے (مؤمنین) ہر وقت یہی کہتے ہیں   کہ اے رب عاقبت اچھی کر دے (ماخوذ از روح البیان)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

زیر بحث آیہ کریمہ میں ﴿اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰهِ یَبْغُوْنَ﴾ میں ہمزہ استفہام انکاری کیلئے ہے اور فاء عاطفہ پر داخل ہے، اب اس میں دو احتمال ہیں۔

ایک یہ کہ عطف جملہ کا جملہ پر ہو، یعنی ﴿فَأُولٰئِکَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ پر عطف ہو۔اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ عطف محذوف مقدر پر ہو، تقدیر عبارت کی یہ ہو "ایقولون فغیر دین الله یبغون" (ماخوذ از مدارک التنزیل للنسفی)

فائدہ جلیلہ: وقال ﷺ لاتسبوا اصحابی فان اصحابی اسلموا من خوف الله واسلم الناس من خوف السیف"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا میرے صحابہ کو گالی نہ دینا، بیشک میرے صحابہ نے اسلام قبول کیا ہے اللہ تعالیٰ کے خوف سے اور باقی لوگ اسلام قبول کریں گے تلوار کے خوف سے۔ (قرطبی)

خیال رہے کہ راقم نے "اسلم" ماضی کا ترجمہ مستقبل کا کیا ہے کیونکہ کئی مقاموں پر ماضی مستقبل کے معنی میں استعمال ہوتی رہتی ہے۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلی امتوں کا ذکر ہو تو ترجمہ ماضی والا کیا جائے گا کہ 'اور لوگوں نے اسلام قبول کیا تلوار کے خوف سے۔

گذشتہ سے پیوستہ: "طوعا و کرها" کی تفسیر میں صوفیاء کرام کا ارشاد گرامی یہ ہے۔

ان الاسلام طوعا هو الانقياد والامتثال لما امر الله تعالى من غير معارضة ظلمة نفسانية وحيلولة حجب الانانية والاسلام كرها هو الانقياد مع توسط المعارضات والوساوس وحيلولة الحجب والتعلق بالوسائط "

خوشی سے تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مطیع ہو اور اس کے احکام پر عمل کرے یہاں تک کہ نفسانی تاریکیاں اور "انا" (میں ہوں، انداز متکبرانہ) درمیان میں حائل نہ ہوں۔

پہلا اسلام فرشتوں اور انبیاء کرام کے اسلام کی طرح ہے، اور دوسرا اسلام ان لوگوں کی طرح ہے جو کثیر شبہات میں گھرے رہتے ہیں۔ کفار بھی رب تعالیٰ کو مجبوری سے مانتے ہیں ظلمت کفر جوں کی توں برقرار رہتی ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلٰۤی اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَاۤ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی وَالنَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○ (آیۃ نمبر ۸۴)

(1) یوں کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو ہماری طرف اترا اور جو اترا ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کے بیٹوں پر اور جو کچھ ملا موسیٰ اور عیسیٰ اور انبیاء کو ان کے رب سے، ہم ان میں سے کسی پر ایمان میں فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کے حضور گردن جھکائے ہیں۔ (کنزالایمان)

(2) آپ فرمادیجئے ہم ایمان لائے اللہ پر، اور اس پر جو اتارا گیا ہماری طرف، اور جو اتارا گیا ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کے بیٹوں پر، (اور ہم ایمان لائے) اس پر جو دیا گیا موسیٰ اور عیسیٰ اور نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے، ہم نہیں فرق کرتے کسی ایک کے درمیان ان میں سے (ایمان لانے میں) اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

جب اللہ تعالیٰ نے گذشتہ آیۃ کریمہ "وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ" میں انبیاء کرام سے وعدہ لیا کہ جب تمہیں کتاب وحکمت عطاء کردی جائے تو پھر تمہارے پاس وہ رسول آجائیں جو تصدیق کررہے ہوں اس چیز کی جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور بضرور ان پر ایمان لانا اور ضرور بضرور ان کی امداد کرنا۔ اب اس آیۃ کریمہ میں نبی کریم ﷺ کے تصدیق کرنے کی مزید وضاحت فرمائی جارہی ہے۔ (ازکبیر)

مختصر مطلب از ضیاء القرآن:

اپنے حبیب مکرم ﷺ کی زبان پاک سے اس حقیقت عظمیٰ کا پھر اعلان کروایا جارہا ہے کہ دین الٰہی اسلام ہی ہے، سب انبیاء ورسل اپنے اپنے زمانہ میں اس کی تبلیغ فرماتے رہے اور میں بھی اس دین کا داعی اور مبلغ بن کر آیا ہوں، اس لئے وہ تمام مقدس ہستیاں جن کو بارگاہ الٰہی سے نبوت کا شرف بخشا گیا اور ان پر جو کتابیں نازل ہوئیں میں اور

میرے ماننے والے ان سب کی صداقت کو تسلیم کرتے ہیں، ہمارا یہ شیوہ نہیں کہ بعض کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں، یہ ہے دین محمدی کی وہ وسعت اور گہرائی جو ہر حق کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، جہاں کسی قومی، وطنی اور نسلی عصبیت کی گنجائش نہیں، اس دین قیم کی روح تمام ان عناصر سے پاک ہے جو انسان کو انسان سے ملنے نہیں دیتے، یہ کسی خاندان یا نسل خدا کا دین نہیں بلکہ رب العالمین کا دین ہے، اور اسی کے داعی کو صرف بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کو جمع کرنے کیلئے بھیجا نہیں گیا، بلکہ وہ رحمۃ للعلمین ہے جو سارے عالم انسانیت کی شیرازہ بندی کیلئے مطلع وجود پر جلوہ نما ہوا، اس لئے صرف یہی دین انسانی اتحاد کیلئے اساس محکم ثابت ہو سکتا ہے۔ (ضیاء القرآن)

﴿قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا﴾

''آپ فرمادیجئے ہم ایمان لائے اللہ پر، اور اس پر جو اتارا گیا ہماری طرف''

قرآن پاک کی کیا خوب شان:

''قل'' مفرد کا صیغہ ہے (آپ فرمادیجئے) اور ''اٰمنّا'' جمع کا صیغہ ہے (ہم ایمان لائے اللہ پر) اسی طرح ''عَلَيْنَا'' میں ضمیر جمع کی ہے کہ (ہم ایمان لائے اس پر جو ہماری طرف نازل کیا گیا۔ بظاہر یہ عجیب بات نظر آتی ہے کہ واحد کے صیغہ اور جمع کو کس طرح ایک جگہ استعمال کیا گیا ہے، لیکن جب قرآن پاک کی عظمت سمجھ آئے تو یہ مسئلہ آسانی سے سمجھ آسکتا ہے کہ اس میں چند وجوہ پائی گئی ہیں۔

(۱) (قل آمنا بالله) امر للرسول ﷺ بان يخبر عن نفسه ومن معه من المؤمنين بالايمان بما ذكر وجمع الضمير في قوله تعالى (وماانزل علينا) وهو القرآن لماانه منزل عليهم بتوسط تبليغه اليهم"

"قل" سے خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے، لیکن ''اٰمَنَّا بِاللّٰهِ'' جمع کا صیغہ ذکر کیا گیا کہ اے نبی کریم ﷺ آپ فرمادیجئے کہ میں اور میرے ساتھ مؤمنین ہم سب اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اسی طرح ''وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا'' سے مراد تو قرآن پاک ہے، لیکن جمع کی ضمیر ''عَلَيْنَا'' میں لائی گئی کیونکہ قرآن پاک نبی کریم ﷺ پر نازل ہوا، اور آپ کے واسطہ جلیلہ سے آپ کی امت پر بھی نازل ہوا کہ آپ نے اپنی امت کو قرآن پاک کی تبلیغ فرمادی۔ اب ﴿وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا﴾ ''اور جو نازل کیا گیا ہم پر'' کا مطلب بھی واضح طور پر سمجھ آ گیا۔ (تفسیر ابی السعود)

(۲) علامہ رازی رحمہ اللہ نے بھی ایک وجہ یہی بیان کی جو تفسیر ابی السعود سے نقل کی گئی۔

اور وجہ یہ بیان کی گئی "انه تعالی حین خاطبه انما خاطبه بلفظ الواحدان وعلمه انه حین بخاطب القوم یخاطبهم بلفظ الجمع علی وجه التعظیم و التفخیم مثل مایتکلم الملوک و العظماء"

اللہ تعالی نے جب آپ کو خطاب کیا تو لفظ واحد سے خطاب کیا، پھر آپ کو یہ سکھایا کہ جب آپ قوم سے خطاب فرمائیں تو جمع کے صیغے سے خطاب کریں جو آپ کی عظمت اور رفعت شان پر دلالت کرے، یعنی جس طرح بادشاہ اور بڑے لوگ اپنی عظمت شان بیان کرنے کیلئے جمع کے صیغے استعمال کرتے ہیں، اسی طرح آپ بھی جمع کے صیغے اپنے حق میں استعمال کریں۔

راقم کو اس وجہ سے یہ سمجھ آیا کہ کبھی عاجزانہ کلام کو جھوٹے، مکار، دجال ایک آنکھ والے کانٹرے حقیقت سمجھ لیتے ہیں، ان جاہلوں کو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ یہ کلام عاجزانہ کلام ہے، اسلئے جاہلوں اور کافروں، جھوٹے اور مکاروں کو کبھی یہ بھی بتانا چاہیے کہ میرا منصب و مقام کیا ہے۔

(۳) اللہ تعالی نے پہلے آپ کو لفظ "قــل" سے خطاب فرمایا کہ آپ کو ہی فقط اس کا مکلف بنایا کہ آپ فرمادیں "میں اس چیز کی تصدیق کرتا ہوں جو تمہارے پاس ہے" یہ کام ہی جب آپ نے کرنا تھا تو خطاب بھی صرف آپ کو ہی کیا گیا۔ لیکن اس کے بعد اللہ تعالی پر اور قرآن پاک پر ایمان لانے کا ذکر کیا گیا تو جمع کے صیغے ذکر کیے گئے

"ثم قال (آمنا) تنبیها علی ان هذاالتکلف لیس من خواصه بل هو لازم لکل المؤمنین"

جن سے اس پر تنبیہ کرنی مقصود تھی کہ ایمان لانے کا مکلف بنانا صرف نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ تمام لوگوں کو اس کا مکلف بنایا گیا، مؤمنین نے اسے قبول کرلیا، کافروں نے انکار کیا۔

جیسا کہ اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَانُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾ تمام مؤمنوں نے ایمان لایا اس چیز پر جو اللہ نے ان کے رسول پر نازل فرمایا، ہر ایک نے اللہ اور اس کے فرشتوں، اور اس کی کتابوں، اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا (اور یہ کہا کہ) ہم نہیں فرق کرتے اس کے رسولوں کے درمیان کسی ایک پر ایمان لانے میں۔ (ماخوذ از کبیر)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

یہاں زیر بحث آیۃ میں لفظ "علی" ذکر کیا ﴿وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرَاهِيْمَ، الآیة﴾ اور سورۃ بقرہ میں ارشاد ہوا "وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرَاهِيْمَ "الآیة، اس میں ایک وجہ فرق یہ بیان کی گئی ہے "علی" استعلاء (بلندی) پر دلالت کرتا ہے، اور "الی" انتہا پر، یہاں اس آیۃ کریمہ میں خطاب نبی کریم ﷺ ہے لھذا مناسب استعلاء ہے،

اور سورۃ بقرہ میں خطاب میں عموم ہے، اس لئے وہاں انتہاء مناسب ہے، اسلئے "الـــی" ذکر کیا کیونکہ اس سے پہلے لفظ "قولوا" ہے جو عموم پر دلالت کر رہا ہے، طلباء کرام عربی عبارت یاد کرنا چاہیں تو وہ عبارت یہ ہے۔

"وقد جعل الخطاب هنا للنبی ﷺ فناسبه الاستعلاء وهناک العموم فناسب الانتهاء" (روح المعانی)

تنبیہ: کبھی "علـی" اور "الی" کے ذریعے متعدی بنانے میں کوئی فرق نہیں کرتے، بلکہ مبدأ کا لحاظ کریں تو "علی" ذکر کر دیا جاتا ہے، اور انتہاء کا لحاظ کریں تو "الی" ذکر کر دیا جاتا ہے۔

"ویلاحظ احد الاعتبارین تارۃ والآخر اخری تفننا بالعبارۃ"

عبارت میں تفنن پیدا کرنے کیلئے کبھی مبدأ کا اعتبار کرلیا جاتا ہے، لفظ "عـلـی" ذکر کر دیا جاتا ہے، اور کبھی انتہاء کا لحاظ کرلیا جاتا ہے تو لفظ "الی" ذکر کرلیا جاتا ہے۔

وفرق الراغب بان ما کان واصلا من الملأ الأعلی بلاواسطة کان لفظ "علی" المختص بالعلو اولی به، ومالم یکن کذلک کان لفظ "الی" المختص بالایصال اولی به"

علامہ راغب اصفہانی نے ایک اور فرق بیان کیا ہے کہ جب ملأ اعلی سے بغیر کسی واسطہ کے پہنچے تو اس کے مناسب لفظ "عـلـی" ہوتا ہے جو استعلاء پر دلالت کرتا ہے، جیسا کہ اس آیۃ کریمہ میں خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے، تو یہاں مناسب "علی" کا لفظ ہی ہے۔

اور سورۃ بقرہ میں خطاب عوام کو ہے ان پر بغیر واسطہ کے تو کوئی کتاب نازل نہیں، بلکہ انبیاء کرام کے واسطہ سے ان پر کتب کا نزول ہوا اس لئے وہاں لفظ "الی" کا ذکر کرنا ہی مناسب تھا۔ (ماخوذ از روح المعانی)

ترتیب ذکری کا فائدہ:

پہلے ذکر فرمایا "اٰمَنَّا بِاللّٰہِ" ہم اللہ پر ایمان لائے، اس کے بعد انبیاء کرام کی نبوت اور ان پر ایمان لانے کا ذکر فرمایا "لان الایمان بالله اصل الایمان بالنبوة" اس لئے کہ اللہ تعالی پر ایمان لانا اصل ہے نبوت پر ایمان لانے کیلئے، کیونکہ اللہ تعالی پر ایمان لانے کے بغیر نبوت پر ایمان ممکن ہی نہیں۔ پھر "وَمَا اُنْزِلَ عَلَیْنَا" کو "وَمَا اُنْزِلَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ" الآیۃ، سے پہلے ذکر کیا۔

"لان کتب سائر الانبیاء حرفوها وبدلوها فلا سبیل الی معرفة احوالها الا بما انزله الله علی محمد ﷺ فکان ما انزل علی محمد کالأصل لما انزل علی سائر الانبیاء فلهذا قدمه علیه"

اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء کرام کی کتب میں تحریف کر دی گئی تھی، ان کی حقانیت کو پہچاننے میں مشکل

در پیش تھی، اس کا ایک ہی حل تھا کہ پہلے قرآن پاک پر ایمان لایا جائے پھر قرآن پاک کی رہنمائی سے دوسری آسمانی کتب پر ایمان لایا جائے کہ جو کتابیں اللہ تعالی کی طرف سے انبیاء کرام پر نازل کی گئیں ان پر تو ہمارا ایمان ہے، لیکن جن میں تحریف کردی گئی ان کو ہم نہیں تسلیم کرتے۔

چند انبیاء کرام کے خصوصی ذکر کی وجہ:

﴿وَمَا اُنْزِلَ عَلٰی اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ﴾

''اور ہم نے ایمان لایا اس پر جو نازل کیا گیا ابراہیم اور اسماعیل اور یعقوب اور ان کے بیٹوں پر''

"انما خص هؤلاء الانبياء بالذكر لان اهل الكتاب يعترفون بوجودهم ولم يختلفوا بنبوتهم"

ان انبیاء کرام کا خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اہل کتاب ان انبیاء کرام کے وجود کا اعتراف کرتے تھے، اور ان کی نبوت کا بھی اعتراف کرتے تھے، ان میں کوئی اختلاف نہیں رکھتے تھے۔ (از خازن)

(والاسباط) اولاد یعقوب وکان فیهم انبیاء" (مدارک) اور اس پر ایمان ہے جو نازل کیا گیا اسباط پر، اسباط سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہے، کیونکہ آپ کے بعد حضرت عیسی علیہ السلام تک آ۔نے والے تمام انبیاء کرام آپ کی اولاد سے ہی تھے، چونکہ یعقوب علیہ السلام حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے تھے، اس لئے یہ بھی کہہ لیا جاتا ہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کے بعد آنے والے تمام انبیاء کرام آپ کی اولاد سے تھے سوائے نبی کریم ﷺ کے کہ آپ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔ (وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی) اور ہمارا ایمان اس پر بھی ہے جو موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا۔ یعنی ہمارا ایمان توراۃ پر ہے اور انجیل پر بھی، اور موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات پر بھی، ''وَمَآ اُوْتِیَ'' ذکر فرمایا' وَمَآ اُنْزِلَ'' ذکر نہیں فرمایا، جس سے کتابوں اور معجزات پر ایمان رکھنے کا ثبوت مل گیا۔

پھر ان دونبیوں کا علیحدہ ذکر کیا، ماقبل کا انداز بیان بدلا جس سے یہ ثابت کیا کہ دونوں ہی اللہ کے نبی تھے یہود کا عیسیٰ علیہ السلام کو نبی نہ ماننا، اور نصاری کا موسیٰ علیہ السلام کو نبی نہ ماننا باطل اور غلط طریقہ ہے۔

حکمت: ﴿وَالنَّبِيُّوْنَ﴾ ''اور ہمارا ایمان تمام انبیاء کرام پر ہے''

كرر في البقرة وما اوتى ولم يكررهنا لتقوم ذكر الايتاء حيث قال لما آتيتكم"

سورۃ بقرۃ میں دوبارہ ''وَمَآ اُوْتِیَ'' ذکر کیا ہے، یعنی وہاں ہے ''وَمَآ اُوْتِیَ النَّبِيُّوْنَ'' اور یہاں صرف ذکر ہے ''وَالنَّبِيُّوْنَ'' اس لئے کہ اس مقام پر پہلے ''لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ'' آچکا ہے، جس میں انبیاء کرام کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا

گیا" جب میں تمہیں کتاب وحکمت عطاء کروں" اسی وجہ سے "وَمَـا اُوتِـیَ" دوبارہ ذکرنہیں کیا۔(مدارک) "مِـن رَّبِّهِـمْ" سے بھی واضح کردیا گیا ہے کہ جوان کے رب تعالیٰ کی طرف سے عطاء کیا گیا ہے اس پر ہمارا ایمان ہے، ان کی امتوں نے ان کی بعد کتابوں میں جب تحریف کردی تو ہم اسے تسلیم نہیں کرتے۔

تمام انبیاء کرام کی نبوت کے اقرار میں فائدہ:

اس میں چند فوائد کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۱) ایک یہ کہ جب یوم میثاق کو تمام انبیاء کرام سے وعدہ لیا گیا کہ تم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا اوران کی امداد کرنا کیونکہ وہ تمہاری تصدیق کرنے والے ہیں۔تو یہاں نبی کریم ﷺ سے اقرار کرا کے واضح کردیا کہ ہاں واقعی آپ پہلی کتب اور معجزات کی تصدیق فرمانے والے ہیں۔

(۲) چونکہ بعض اہل کتاب دوسرے بعض کے مخالف تھے کوئی فریق کسی نبی کو تسلیم کرتا اور کسی کو نہیں، اسی طرح جن کو نبی تسلیم نہیں کرتے تھے، یقیناً ان کے معجزات کو بھی تسلیم نہیں کرتے تھے، تو رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ سے تمام انبیاء کرام پر ایمان لانے کا ذکر فرما کر واضح کردیا کہ "الحق تصديق الكل والاعتراف نبوة الكل" حق یہ ہے کہ تمام آسمانی کتب اور تمام انبیاء کرام کے معجزات کی تصدیق کی جائے اور تمام انبیاء کرام کی نبوت کو تسلیم کیا جائے۔(از کبیر)

﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ﴾

"ہم نہیں فرق کرتے کسی ایک کے درمیان ان میں سے" (ایمان لانے میں)

"لانفرق بين احد منهم" "بأن نؤمن ببعض دون بعض كما تفرقت اليهود والنصارى" ہم ان میں سے کسی ایک کے درمیان تفریق نہیں کرتے کہ بعض پر ایمان لائیں اور بعض پر ایمان نہ لائیں، یہ تو یہود ونصاریٰ کا کام تھا کہ بعض انبیاء پر ایمان رکھتے اور بعض پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔

﴿وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ "ہم اسی کے فرمانبردار ہیں"

اس ارشاد گرامی کے چند مطالب بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) ہم ان انبیاء کرام کی نبوت کی اقرار کیا ہے اس وجہ سے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہیں، اسی کے حکم وامر کو تسلیم کرتے ہیں، اسی کی اطاعت کرتے ہیں۔یہاں سے اس امر کی طرف اشارہ پایا گیا ہے کہ

نبی کریم ﷺ اور آپ کی امت کے لوگوں نے رب تعالیٰ کے حکم کو خوشی اور عجز سے تسلیم کیا کہ رب تعالیٰ کے حکم کے آگے سر جھکا دیا، گردن رکھ دی، بخلاف پہلے انبیاء کرام کی امتوں کے، جن کا ذکر اس آیۃ کریمہ میں آیا ہوا ہے۔ ﴿اَفَغَیۡرَ دِیۡنِ اللّٰہِ یَبۡغُوۡنَ وَلَہٗۤ اَسۡلَمَ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ طَوۡعًا وَّکَرۡہًا وَّاِلَیۡہِ یُرۡجَعُوۡنَ﴾ انہوں نے رب تعالیٰ کے اوامر کو خوشی سے تسلیم نہیں کیا۔

(۲) ﴿وَنَحۡنُ لَہٗ مُسۡلِمُوۡنَ﴾ کا اور یہ مطلب ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے حکم رضاء مندی سے خوشی سے تسلیم کرتے ہیں، اس کی مخالفت نہیں کرتے، "وتلک صفة المؤمنين بالله وهم اهل السلم" یہ صفت ان لوگوں کو حاصل ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں اور اسی کے حکم کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ بخلاف کفار کے "والکافرون یوصفون بالمحاربة لله" کہ ان کافروں کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ حاصل ہے، جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیۡنَ یُحَارِبُوۡنَ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ﴾ اس آیۃ کریمہ میں کفار کا رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کرنے کا واضح ذکر موجود ہے۔

(۳) تیسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ:

> ﴿وَنَحۡنُ لَہٗ مُسۡلِمُوۡنَ﴾ يفيد الحصر والتقدير له اسلمنا لا لغرض آخر من سمعة ورياء وطلب مال، وهذا تنبيه على ان حالهم بالضد من ذلك فانهم لا يفعلون ولا يقولون الا للسمعة والرياء وطلب الاموال، "والله اعلم"

﴿وَنَحۡنُ لَہٗ مُسۡلِمُوۡنَ﴾ میں حصر کا فائدہ پایا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم صرف اس کی رضاء کیلئے اسے تسلیم کرتے ہیں، اس اطاعت میں اور کوئی غرض نہیں ہوتی کہ ہمیں چرچا حاصل ہو جائے، ہمیں ریاء کاری مقصود نہیں، نہ ہی رب کی اطاعت میں مال کی طلب کی حرص ہے، بخلاف مؤمنین کی ضد یہود و نصاریٰ، کفار وہ کہیں مجبوری سے رب تعالیٰ کے خالق ہونے کو تسلیم کرلیں تو اس میں بھی ان کا مقصد چرچا حاصل کرنا، ریاء کاری، اور مال کی طلب ہوتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

سبحان اللہ! مؤمن تیری کیا شان ہے، ہر طرف یہود کے یار، نصاریٰ کے غمخوار دندناتے پھر رہے ہیں لیکن مؤمن رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حضور سر جھکائے ہوئے ہیں۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب پہلے ایمان کا ذکر ہو چکا ہے تو "ونحن له مسلمون" جملہ مستدرک ہے، اس

کے ذکر کرنے کا کیا فائدہ‘‘ لیکن ابھی تک جو بحث ذکر کی ہے اس سے واضح ہوا کہ ”ونحن له مسلمون“ سے مراد صرف اسلام لانا نہیں، بلکہ خوشی اور اعتقاد اور خلوص سے رب تعالیٰ کے حضور سر جھکانا، گردن رکھنا مراد ہے، لھذا یہ جملہ مستدرک نہیں، طلباء کرام روح المعانی کی اس عبارت کو دیکھیں اور راقم کے تذکرہ کو دیکھیں تو ان شاء اللہ ذرا بھر انحراف نہیں پائیں گے۔

(ونحن له مسلمون)ای مستسلمون بالطاعة والانقياد فی جميع امامر به ونهی عنه او مخلصون له فی العبادة وعلى التقديرين لاتكون هذه الجملة مستدركة بعد جملة الايمان كما هو ظاهر. (روح المعانی)

تنبیہ: والاسباط الاحفادلااولادالبنات“

اسباط سے مراد مذکر اور مذکر کی اولاد یعنی بیٹے اور پوتے ہیں لیکن بیٹیوں کی اولاد یعنی نواسے معتبر نہیں۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا خوب ترجمہ:

آپ نے ”الاسباط“ کا ترجمہ کیا ہے ’’ان کے بیٹوں، پر‘‘ راقم نے بھی یہی ترجمہ نقل کیا ہے۔ راقم نے آگے بحث میں ”الاسباط“ سے مراد ”اولاد“ بھی ذکر کیا ہے، لیکن صرف اسی خیال سے کہ طلباء کرام ترجمہ کو دیکھ کر ہی سمجھ جائیں گے کہ ’’اولاد‘‘ سے مراد خاص مذکر لیا گیا ہے، اگرچہ حقیقت میں مذکر و مؤنث دونوں کو شامل ہے۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَO

(آیۃ نمبر ۸۵)

(1) اور جو اسلام کے سواء کوئی اور دین چاہے گا، وہ ہرگز اس سے قبول نہ کیا جائے گا، اور وہ آخرت میں زیاء کاروں میں سے ہے۔ (کنز الایمان)

(2) اور جو شخص چاہے سوائے اسلام کے کوئی اور دین، تو ہرگز وہ نہیں قبول کیا جائے گا اس سے، اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

جب اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں بیان کیا۔ ﴿وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ "اور ہم اسی کی اطاعت کرنے والے ہیں" اس کے پیچھے اس آیۃ کریمہ میں) گویا کہ یہ بیان فرمادیا کہ اللہ کے ہاں معتبر دین صرف دین اسلام ہی ہے۔

"وان کل دین سوی الاسلام فانه غیر مقبول عندالله"

بیشک اللہ کے حضور سوائے اسلام کے اور کوئی دین مقبول نہیں۔

"لان القبول للعمل هو ان یرضی الله ذلک العمل ویرضی عن فاعله ویثیبه علیه ولذلک قال الله تعالی انما یتقبل الله من المتقین"

اللہ تعالی جس عمل کو پسند فرماتا ہے وہی اس کے ہاں قبول ہے، اور اس پر عمل کرنے والوں کو ثواب دیا جائے گا اسی وجہ سے اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا "بیشک اللہ تعالی پرہیزگاروں سے قبول فرماتا ہے" جب اللہ تعالی کے ہاں دین اسلام کے سواء کوئی اور دین پسند نہیں تو یہی وجہ ہے کہ کسی اور دین پر عمل کرنے والے خسارہ پانے والے ہیں، کیونکہ وہ اللہ تعالی کو ناراض کرنے والے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

شان نزول:

(۱) بارہ شخص مدینہ طیبہ سے (العیاذ باللہ) مرتد ہوکر مکہ میں چلے گئے، جن میں حارث بن سوید انصاری بھی تھا، تو ان کے بارے میں یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی کہ اسلام سے پھر جانے والے، کفر کو اختیار کرنے والے خسارے میں ہیں، رب تعالی کی ناراضگی ان کو حاصل ہے، اور رب تعالی کا غیظ وغضب ان کو حاصل ہونا ہے، وہ اللہ تعالی کی شدید گرفت میں آئیں گے۔ (ماخوذ از معالم التنزیل للبغوی)

مقام توجه: بعد میں مستثنیٰ ﴿اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ، الآیۃ﴾ آرہا ہے، جس سے واضح ہو رہا ہے کہ بعض لوگ مرتد ہونے کے بعد پھر اسلام کی طرف لوٹ کر آ گئے تھے "فرجع الحارث فاسلم وحسن اسلامه" حارث بن سوید انصاری لوٹ کر آ گیا، پھر دوبارہ اسلام قبول کیا، اور اسلام پر صدق دل سے قائم رہا۔ (البحر المحیط)

(۲) شان نزول اور وجہ یہ بیان کی گئی کہ یہ بنی قریظہ اور بنی نضیر یہود مدینہ کے بارے میں نازل ہوئی کہ وہ نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے سے پہلے آپ کی نبوت کی بشارت دیتے تھے اور گواہی دیتے تھے کہ وہ نبی برحق ہوں گے "فلما بعث وجاء هم بالبينات والمعجزات كفروا بغيا وحسدا" جب آپ کو مبعوث فرمایا اور آپ دلائل و معجزات لے کر آئے تو انہوں نے سرکشی اور حسد کی وجہ سے انکار کیا۔ (ماخوذ از کبیر)

(۳) **"وقيل هي في عامة المشركين"** بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ یہ آیۃ کریمہ عام مشرکین کے متعلق نازل ہوئی، جنہوں نے بھی دین اسلام کے سواء شرک کو پسند کیا وہ سب خسارے میں ہیں۔

(۴) **"الفاظ الآية تعم كل من ذكر وغيرهم"** شان نزول کی جو چند وجوہ بیان کی گئی ہیں، آیۃ کریمہ ان کو بھی شامل ہے، لیکن الفاظ کی عمومیت کی وجہ سے ان تمام لوگوں کے متعلق ہے جو دین اسلام کے سواء اور دین پسند کرنے والے ہیں، یعنی تمام ادیان باطلہ پر عمل کرنے والے خسارے میں ہیں۔ (البحر المحیط)

"الاسلام هنا قيل هو الاستسلام الى الله والتفويض اليه وهو مطلوب في كل زمان ومكان وشريعة، ولذلك فسره الزمخشري بالتوحيد واسلام الوجه لله"

اسلام کا مطلب اس آیۃ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کے حضور سر جھکانا ہے اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کرنا ہے، ہر زمانے، ہر جگہ اور ہر شریعت میں یہی مطلوب رہا کہ بندہ اپنے آپ کو رب تعالیٰ کے سپرد کر دے۔ اسی لئے زمخشری نے اسلام کا معنیٰ "توحید اور اللہ کی رضاء کیلئے سر جھکانا، گردن رکھنا" کیا ہے۔

"وقيل المراد بالاسلام شريعة محمد ﷺ بيّن تعالى ان من تحرى بعد مبعثه شريعة غير شريعة فغير مقبول منه"

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ اس مقام میں اسلام سے مراد نبی کریم ﷺ کی شریعت ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ میں یہ واضح کر دیا ہے کہ جس نے نبی کریم ﷺ کے مبعوث ہونے کے بعد آپ کی شریعت کو چھوڑ کر کسی اور شریعت پر عمل کیا وہ قبول نہیں کیا جائے گا۔ (البحر المحیط)

❁ **قال النبی ﷺ فی الحدیث الصحیح "من عمل عملا ليس عليه امرنا فهو رد"**

نبی کریم ﷺ کا ارشاد حدیث صحیح میں یہ ہے کہ "جس شخص نے ہماری شریعت کے بغیر کوئی اور عمل کیا وہ

مردود ہے۔ (منقول از صابونی وابن کثیر)

☆ اخرج احمد والطبرانی فی الاوسط عن ابی هريرةقال قال رسول اللهﷺ تجئی الاعمال يوم القيامة فتجئی الصلوة فتقول يارب اناالصلوة فيقول انک علی خير وتجئی الصدقة فتقول يارب اناالصدقة فيقول انک علی خير ثم يجيئی الصيام فيقول اناالصيام فيقول انک علی خير ثم تجئی الاعمال كل ذلک يقول الله انک علی خير ثم يجيئی الاسلام فيقول يارب انت السلام واناالاسلام فيقول الله انک علی خير اليوم آخذ وبک اعطی قال الله فی كتابه ﴿ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًافَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ ﴾

مسند احمد اور اوسط طبرانی میں حضرت ابوھریرہ﷜ سے حدیث بیان کی گئی کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا اعمال قیامت کے دن (رب کے حضور) آئیں گے، تو نماز حاضر ہوگی، عرض کرے گی اے میرے رب میں نماز ہوں، تو رب تعالی فرمائے گا بیشک تو بھلائی پر ہے، اور صدقہ حاضر ہوگا تو عرض کرے گا، اے میرے رب میں صدقہ ہوں تو رب تعالی فرمائے گا بیشک تو بھلائی پر ہے، پھر روزے (رب تعالی کے حضور) حاضر ہوں گے، تو کہیں گے ہم روزے ہیں، تو رب تعالی فرمائے گا بیشک تم بھلائی پر ہو، پھر تمام اعمال (اسی طرح رب تعالی کے حضور) حاضر ہوں گے، رب تعالی فرمائے گا بیشک تم خیر پر ہو، پھر اسلام حاضر ہوگا تو عرض کہے گا اے میرے رب! تو سلام ہے اور میں اسلام ہوں، تو رب تعالی فرمائے گا بیشک تو بہتری پر ہے، آج میں تیری وجہ سے ہی (کچھ کو) گرفت میں لے رہا ہوں اور (کچھ کو انعامات) عطاء کرر ہا ہوں۔ اللہ تعالی نے اپنی کتاب (قرآن پاک) میں بیان فرمایا ہے۔

﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًافَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ﴾

''اور جو شخص چاہتا ہے سوائے اسلام کے کوئی اور دین تو ہرگز نہیں قبول کیا جائے وہ اس سے، اور وہ آخرت میں ہوگا خسارہ پانے والوں میں سے'' (ماخوذ از در منثور)

وہ خسارہ کیا ہوگا؟

ان کو خسارہ ہوگا آخرت میں ثواب سے محروم ہوکر، اور ان کو عذاب ہونے کی وجہ سے خسارہ میں مبتلاء ہونا پڑے گا۔ اور نیک اعمال کے ضائع ہونے پر جو افسوس اور حسرت ہوتی ہے وہ خسارہ ہی ہے، اسی طرح دنیا میں باطل دین پر قائم رہ کر اسے جو تھکن اور مشقت حاصل ہوتی ہے وہ بھی اس کیلئے خسارہ ہوگا، غرضیکہ دین حق سے پھرنے والا دین ودنیا میں خسارے میں رہتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَاءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ O (آیة نمبر ۸۶)

(1) کیونکر اللہ تعالی ایسی قوم کو ہدایت چاہے جو ایمان لاکر کافر ہو گئے اور گواہی دے چکے تھے کہ رسول سچا ہے اور انہیں کھلی نشانیاں آچکی تھیں اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا۔ (کنزالایمان)

(2) کیسے ہدایت چاہتا ہے اللہ تعالی اس قوم کی جو کافر ہو گئے ایمان لانے کے بعد، حالانکہ وہ گواہی دے چکے تھے کہ بیشک رسول سچا ہے، اور آچکی تھی ان کے پاس کھلی نشانیاں، اور اللہ نہیں ہدایت دیتا ظالم قوم کو۔ (نجوم الفرقان)

بظاہر اس آیۃ کریمہ میں واقع ہونے والے اعتراضات تفسیر روح البیان کی خوبصورت تفسیر سے خود بخود زائل ہو جاتے ہیں، آیئے زرا دیکھئے۔

(كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ)الى الحق(قوما كفروا بعد ايمانهم)قيل هم عشرة رهط ارتدوا بعد ماآمنوا ولحقوا بمكة وهو الاستبعاد لان يهدى قوماهم معاندون للحق مكابرون فيه غير خاضعين له بان يخلق فيهم الاهتداء ويوفقهم لا كتساب الاهتداء وانما يخلق الاهتداء ويوفق الاكتساب الاهتداء وانما يخلق الاهتداء ويوفق على كسب ذلك ويقدرهم عليه اذا كانوا خاضعين متواضعين للحق راغبين فيه فالمراد من الهداية خلق الاهتداء وقد جرت سنة الله فى دار التكليف على ان كل فعل يقصد العبد الى تحصيله فان الله تعالى يخلقه عقيب قصد العبد فكانه تعالى قال كيف يخلق فيهم المعرفة والاهتداء وهم قصدوا التحصيل الكفر وارادوه"

"کیسے ہدایت چاہتا ہے اللہ اس قوم کی جو کافر ہو گئے ایمان لانے کے بعد' بیان کیا گیا ہے وہ دس گروہ تھے جو ایمان لانے کے بعد مرتد ہو گئے تھے اور مکہ میں چلے گئے، ان کی ہدایت کو رب تعالی نے بعید سمجھا کہ یہ لوگ جو حق سے عناد رکھتے ہیں اور اس کی شدید مخالفت کرتے ہیں، رب کے حضور جھکتے ہیں، ان کیلئے رب تعالی کیسے ہدایت پیدا فرمادے، اور ان کو کیسے ہدایت کی توفیق عطاء فرمادے کہ وہ ہدایت کو حاصل کرلیں، اور ان کو کیسے ہدایت پر قادر کردے، ہاں البتہ جب وہ رب تعالی کے حضور جھک جاتے ہیں، عجز اختیار کرلیتے ہیں، اور رب تعالی سے محبت کرتے ہیں تو ان کو رب کائنات توفیق عطاء کردیتا ہے کہ وہ ہدایت حاصل کرلیں، اور ان کو ہدایت پالینے پر قادر کردیا جاتا ہے۔

ہدایت سے مراد اس مقام میں "خلق اهتداء" ہے، (یعنی ہدایت کا پیدا کرنا اس مقام میں مراد ہے) اللہ تعالیٰ کا طریقہ شریف یہ ہے کہ اس دنیا میں جب کوئی بندہ ہدایت حاصل کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے ارادے کے بعد اللہ تعالیٰ اس کے لئے ہدایت کی تخلیق فرماتا ہے۔ اور بندے جب رب تعالیٰ کے حضور جھک جاتے ہیں، عجز و انکساری اختیار کرتے ہیں، ایمان اور نیک اعمال کا ارادہ کر لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی ان کیلئے معرفت و ہدایت پیدا کر دیتا ہے۔

﴿وَشَهِدُوْا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَاءَ هُمُ الْبَيِّنٰتُ﴾

''حالانکہ وہ گواہی دے چکے تھے کہ رسول سچا ہے اور آ چکی تھیں ان کے پاس کھلی نشانیاں''

یعنی جو لوگ مرتد ہو گئے وہ پہلے ایمان لا چکے تھے، جب تک وہ خود دوبارہ توبہ کرنے کی اور اسلام کی طرف میلان کی کوشش نہیں کریں گے ان کی معرفت و ہدایت کو رب تعالیٰ کیسے پیدا فرمائے گا۔

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ ''اور اللہ نہیں ہدایت دیتا ظالموں کی قوم کو''

یعنی وہ جنہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا اور رب تعالیٰ کی معرفت کی طرف توجہ ہی نہ کی، اور کفر کو ایمان پر ترجیح دی، ان کے پاس حق اور رب تعالیٰ کی معرفت کیسے آئے گی۔

اعتراض: فان قيل ظاهر الآية يقتضى ان من كفر بعد اسلامه لايهديه الله ومن كان ظالما لايهديه الله وقد رأينا كثيرا من المرتدين اسلموا وهداهم وكثيرا من الظالمين تابوا عن الظلم"

ظاہر آیۃ کریمہ سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ جس نے اسلام کے بعد کفر اختیار کیا اللہ تعالیٰ اسے ہدایت نہیں دیتا، اور جو شخص ظالم ہو اللہ تعالیٰ اسے بھی ہدایت نہیں دیتا، حالانکہ ہم نے بہت مرتدین کو دیکھا کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت عطاء فرما دی، اسی طرح کتنے ہی ظالموں کو ہم نے دیکھا کہ وہ ظلم سے تائب ہو گئے، تو آیۃ کریمہ کا مطلب کس طرح درست ہو سکتا ہے کہ مرتدوں اور ظالموں کو رب تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا۔

جواب: فالجواب ان معناه لايهديهم ماداموا مقيمين على الرغبة فى الكفر وفى الثبات عليه ولايقبلون على الاسلام واما اذاتحروا اصابة الحق والاهتداء بالادلة المنصوبةفحينئذيهديهم الله بخلق الاهتداء فيهم"

آیۃ کریمہ کا مفہوم واضح ہے کہ جب تک وہ کفر کی طرف راغب رہتے ہیں، اور کفر پر قائم رہتے ہیں اور اسلام کی طرف توجہ نہیں کرتے، لیکن وہ حق کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور حق پر قائم رہنے کیلئے

دلائل کی طرف متوجہ کرتے ہیں تو رب تعالیٰ ان کیلئے ہدایت کو پیدا کر دیتا ہے، اور وہ ہدایت کو حاصل کر لیتے ہیں۔ (تفسیر آیۃ از روح البیان)

آیۃ کریمہ میں تکرار نہیں:

بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ آیۃ کریمہ کی ابتداء میں ﴿كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ﴾ ذکر فرمایا، اور انتہاء میں ذکر فرمایا ﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ یہ تکرار ہے۔ تو اس وہم کا یوں ازالہ کیا گیا۔

"قلت ليس فيه تكرار لان قوله "كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا" انما هو مختص باولئك المرتدين عن الاسلام ثم انه تعالى عمم ذلك الحكم فى آخر الآية فقال "وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ" يعنى جميع الكفار المرتدين عن الاسلام والكافر الاصلى"

کہ اس میں تکرار نہیں اسلئے کہ "كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ" میں ان کفار و مرتدین کا ذکر ہے جن کا پچھلی آیۃ کریمہ کے شان نزول میں بیان کیا جا چکا ہے، یعنی اس میں تخصیص پائی گئی ہے اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو عام کر دیا، یعنی تمام کفار خواہ وہ اصلی کافر ہوں یا مرتد ہوں، سب کا ذکر "وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ" میں فرمادیا۔

"وانما سمى الكافر ظالما لانه وضع العبادة فى غير موضعها"

کافر کو اسلئے ظالم کہا گیا ہے کہ وہ عبادت کو اس کی جگہ کے غیر میں رکھتا ہے۔ یعنی وہ رب تعالیٰ کے بغیر اوروں کی عبادت کرتا ہے اس لئے وہ ظالم ہے۔ (خازن)

ظلم کا مطلب یہ ہے کہ "وضع الشئ فى غير محله" کسی چیز کو غیر محل میں رکھنا۔

❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋

اُولٰئِکَ جَزَآؤُھُمْ اَنَّ عَلَیْھِمْ لَعْنَةَ اللّٰہِ وَالْمَلَائِکَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ○ خَالِدِیْنَ فِیْھَا لَایُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ وَلَاھُمْ یُنْظَرُوْنَ ○ اِلَّاالَّذِیْنَ تَابُوْامِنْ بَعْدِ ذٰلِکَ وَاَصْلَحُوْ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ○ (آیۃ نمبر ۸۷،۸۸،۸۹)

(1) ان کا بدلہ یہ ہے کہ ان پر لعنت ہے اللہ کی، اور فرشتوں اور آدمیوں کی سب کی○ ہمیشہ اس میں رہیں نہ ان پر سے عذاب ہلکا ہو نہ انہیں مہلت دی جائے○ مگر جنہوں نے اس کے بعد توبہ کی اور آیا سنبھالا تو ضرور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (کنزالایمان)

(2) وہ (لوگ) ان کا بدلہ (یہ ہے) بیشک ان پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی اور سب لوگوں کی○ ہمیشہ رہیں گے اس میں، نہیں ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب، اور نہ ہی ان کو مہلت دی جائے گی○ مگر وہ جنہوں نے توبہ کرلی بعد اس کے، اور اپنی اصلاح کرلی تو بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (نجوم الفرقان)

پچھلی آیۃ کریمہ "کَیْفَ یَھْدِی اللّٰہُ قَوْمًا کَفَرُوْا" اور یہ تین آیتیں ملا کر پڑھی جائیں تو ان کا مطلب سمجھنا آسان ہوگا، ابتداء درمنثور کی روایات سے کررہا ہوں، پھر کبیر وغیرہ سے ان شاءاللہ منقول ہوگا، اس لئے پچھلی آیۃ کریمہ کا ذکر بھی ساتھ ساتھ آتا رہے گا۔

❁ اخرج النسائی وابن حبان وابن ابی حاتم والبیھقی فی سننہ من طریق عکرمۃ عن ابن عباس قال کان رجل من الانصار فاسلم ثم ارتدولحق بالمشرکین ثم ندم فارسل الی قومہ ارسلواالی رسول اللہ ﷺ ھل الی من توبہ ؟فنزلت کیف یھدی اللہ قوماکفروابعد ایمانھم، الی قولہ فان اللہ غفوررحیم، فارسل الیہ قومہ فاسلم"

نسائی اور ابن حبان اور ابن ابی حاتم اور بیہقی نے حضرت ابن عباس کی روایت عکرمہ سے نقل کی کہ انصار سے ایک شخص نے اسلام لایا، لیکن کچھ عرصہ بعد وہ (العیاذ باللہ) مرتد ہوگیا اور مشرکوں سے جاملا، پھر اس پر پشیمان ہوگیا، اس نے اپنی قوم کی طرف پیغام بھیجا کہ تم رسول اللہ ﷺ کی طرف پیغام بھیج کر میرے لئے پوچھو "کیا میری توبہ قبول کی جائے گی" تو ان کے پوچھنے پر "کَیْفَ یَھْدِی اللّٰہُ قَوْمًا کَفَرُوْابَعْدَاِیْمَانِھِمْ" سے لیکر "غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ" تک چار آیات کریمہ

"نازل ہوئیں۔ (از درمنشور)

یعنی اسے بتایا گیا کہ جب تک کوئی شخص اپنے ارتداد اور کفر پر قائم رہے تو اس کیلئے رب تعالی ہدایت ومعرفت پیدانہیں فرماتا، لیکن اللہ تعالی کی طرف اگر وہ توبہ کرلے اور اپنی اصلاح کرلے تو اللہ تعالی اسے بخش دیتا ہے کیونکہ وہ "غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ" ہے۔

❁ واخرج عبدالرزاق ومسددفی مسنده وابن جرير وابن المنذر والباوری فی معرفة الصحابة قال جاء الحارث بن سويد فاسلم مع النبی ﷺ ثم كفر فرجع الی قومه فانزل الله فيه القرآن كيف يهدی الله قوما كفروا الی قوله رحيم، فحملها اليه رجل من قومه . فقرأها عليه فقال الحارث انک والله ما علمت لصدوق وان رسول الله ﷺ لاصدق منک وان الله عزوجل لاصدق الثلاثة فرجع الحارث فاسلم فحسن اسلامه"

مسندعبدالرزاق وغیرہ میں ذکر کیا گیا کہ حارث بن سوید نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اسلام قبول کیا، پھر کافر ہوگئے، پھر اپنی قوم کی طرف لوٹ کر چلے گئے، (ایک روایت کے مطابق مکہ میں چلے گئے مشرکوں سے جا ملے) تو اللہ تعالی نے "کَیْفَ یَھْدِی اللّٰہُ قَوْمًا کَفَرُوا" سے لے کر "غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ" تک چار آیات نازل فرمائیں، تو اس قوم کا ایک شخص (جو مسلمان تھا) یہ آیات حارث کے پاس لے گیا، اور اس پر یہ آیات پڑھیں، تو حارث نے کہا قسم ہے اللہ تعالی کی مجھے معلوم ہے بیشک تو سچا ہے، اور رسول اللہ ﷺ تم سے بھی زیادہ سچے ہیں، اور اللہ تعالی سب سے زیادہ سچا ہے، تو حارث لوٹ آئے، پھر اسلام قبول کرلیا، اور اچھے طریقہ سے یعنی خلوص قلب سے ایمان قبول کرلیا۔ (منقول از درمنشور)

❁ قال عكرمة نزلت فی ابی عامر الراهب والحارث بن سويد بن الصامت ووحوح بن الاسلت فی اثنی عشر رجلا رجعوا عن الاسلام ولحقوا بقريش ثم كتبوا الی اهلهم هل لنا من توبة فنزلت الا الذين تابوا من ذلک "الآيات"

حضرت عکرمہ ؓ نے فرمایا یہ آیات کریمہ نازل ہوئی ہیں ابو عامر راہب اور حارث بن سوید بن صامت اور وحوح بن اسلت وغیرہ بارہ شخصوں کے متعلق جو (العیاذ باللہ) اسلام سے پھر گئے اور قریش سے لاحق ہوگئے، پھر انہوں نے اپنی اہل (یعنی اپنی قوم) کی طرف لکھا کیا ہماری توبہ قبول ہوجائے گی، تو "اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا" وغیرہ آیات نازل ہوئیں۔ (منقول از درمنشور)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿اُولٰئِکَ جَزَاؤُھُمْ اَنَّ عَلَیْھِمْ لَعْنَةَ اللّٰہِ وَالْمَلٰئِکَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ○ خَالِدِیْنَ فِیْھَا﴾

''وہ (لوگ) ان کا بدلہ (یہ ہے) کہ بیشک ان پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی اور سب لوگوں کی وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''

ماقبل سے تعلق:

اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں ذکر فرمایا کہ جو لوگ ایمان کے بعد کافر ہو جاتے ہیں ان کو اللہ تعالی کیسے ہدایت دے گا'' یعنی جب تک وہ کفر پر جمے رہے اور ایمان کی طرف انہوں نے میلان نہ کیا تو اللہ تعالی ان کیلئے ہدایت و معرفت پیدا نہیں فرمائے گا کہ وہ ہدایت پر آجائیں۔ اب اس آیۃ کریمہ میں یہ ذکر کیا جارہا ہے کہ صرف ہدایت نہ دینے پر معاملہ محدود نہیں۔

''بل کما لایھدیھم فی الدنیا یلعنھم اللعن العظیم ویعذبھم فی الآخرة علی سبیل التابید والخلود''

بلکہ جس طرح ان کو دنیا میں ہدایت نہیں دی جاتی اسی طرح آخرت میں ان پر بہت عظیم لعنت ہوگی اور ان کو عذاب دیا جائے گا، یہ لعنت و عذاب ان کیلئے دائمی ہوگا، اس سے ان کو چھٹکارا حاصل نہیں ہوگا۔ (از کبیر)

اللہ کی لعنت اور فرشتوں اور لوگوں کی لعنت میں فرق:

واعلم ان لعنة اللہ مخالفة للعنة الملائکة لان لعنة بالابعاد من الجنة وانزال العقوبة والعذاب واللعنة من الملائکة ھی بالقول و کذلک من الناس''

اللہ تعالی کی لعنت فرشتوں کی لعنت سے علیحدہ ہے، کیونکہ اللہ تعالی کی لعنت کا یہ مطلب ہے کہ وہ ان کو جنت سے دور رکھے گا، اور ان کو اپنی گرفت میں لے گا اور ان پر عذاب نازل کرے گا، اور فرشتوں اور لوگوں کی لعنت زبانی، کلامی ہوگی کہ ''اللہ کی ان پر لعنت ہو'' (از کبیر)

انتباہ: اولئک جزاؤھم '' کا مطلب یہ "اولئک جزاء کفر ھم" وھناک اولئک علیھم لعنة اللہ" کہ ان لوگوں کے کفر کی جزاء یہ ہے کہ ان پر اللہ تعالی کی لعنت ہے۔ "جزاء کفر" کی تخصیص کی ضرورت کیوں درپیش آئی؟ اس لئے کہ جس کی موت کفر پر آنے کا یقین ہو لعنت اس پر ہی بھیجی جاتی ہے، مؤمن پر لعنت کرنا جائز نہیں۔ ان آیات کریمہ کے شان نزول سے واضح ہو چکا ہے کہ کئی لوگ ایمان کے بعد مرتد ہوئے لیکن پھر وہ توبہ

کر کے ایمان بھی لے آئے، ان پر لعنت بھیجنا جائز نہیں، لھذا یہاں ضروری ہے کہ مطلب یوں ہی بیان کیا جائے کہ وہ لوگ جو کافر ہوئے اور کفر پر ہی مر گئے ان کی جزاء یہ ہے کہ ان پر اللہ کی لعنت ہے، اور فرشتوں کی اور سب لوگوں کی ان پر لعنت ہے۔ لیکن وہ خوش قسمت جو توبہ کر کے پھر ایمان لے آئے، ان کو ہدایت بھی مل گئی، مغفرت اور رحمت بھی حاصل ہوگئی اور وہ لعنت سے بھی بچ گئے۔ (از البحر المحیط)

اعتراض: یہ کیسے کہا گیا ہے کہ لعنت صرف کافروں پر مومنوں پر نہیں، حالانکہ نبی کریم ﷺ ایک جگہ سے گزر رہے تھے تو آپ نے ایک گدھے کے چہرہ کو دیکھا جسے گرم لوہے سے داغ دیا ہوا تھا، تو آپ نے فرمایا "لعن اللہ تعالی من فعل ھذا" اللہ کی اس پر لعنت ہو جس نے یہ کام کیا۔

"وبماصح ان الملائکۃ تلعن من خرجت من بیتھا بغیر اذن زوجھا"

صحیح روایات سے ثابت ہے کہ جو عورت خاوند کے گھر سے اس کی اجازت کے بغیر نکلے اس پر فرشتے لعنت کرتے ہیں، ان روایات سے مؤمنوں پر لعنت کرنے کا جواز ملتا ہے۔

جواب: واجیب بان اللعن ھناک للجنس الداخل فیہ الشخص ایضا"

کہ روایات میں جس لعنت کا ذکر ہے وہ جنس لعنت ہے یعنی مطلقا لعنت میں مؤمنین بھی داخل ہیں۔ (روح المعانی)

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ لعنت کا جب معنی یہ لیا جائے کہ "اللہ تعالی ان کو جنت سے دور رکھتا ہے اور دائمی عذاب میں مبتلاء رکھتا ہے" تو یہ لعنت صرف کافروں پر کی جاسکتی ہے، مؤمنوں پر نہیں، فرشتوں اور لوگوں کی یہی لعنت رب تعالی سے کافروں کیلئے ہی طلب کی جاسکتی ہے، مومنوں کے لئے نہیں۔ لیکن جب لعنت کا معنی یہ لیا جائے کہ رب تعالی کے خصوصی تقرب سے دوری تو یہ لعنت مومنوں پر کی جاسکتی ہے، بلکہ یہ لعنت صرف مومنوں پر ہی کی جاسکتی ہے، کیونکہ تقرب الہی ان کو ہی حاصل ہوتا ہے، کافروں کو جب تقرب حاصل ہی نہیں ہوتا تو ان کیلئے دوری کی دعاء کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔

سوال: یہاں سب لوگوں کے لعنت بھیجنے کا ذکر کیوں کیا گیا، حالانکہ کافر کافروں پر لعنت نہیں کرتے۔

پہلا جواب: یہاں مراد یہ ہے کہ ہر شخص کا حق یہ ہے کہ وہ کافر پر لعنت بھیجے خواہ وہ لعنت بھیجے یا نہ بھیجے۔

دوسرا جواب: یوم آخرت میں کافر بھی کافروں پر لعنت کریں گے، رب تعالی کا ارشاد گرامی یہ ہے۔ ﴿كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعَنَتْ أُخْتَهَا﴾ "جب بھی کوئی گروہ (کافروں کا) داخل ہوگا تو لعنت کرے گا اپنے ہم جنس گروہ پر" اور ارشاد باری تعالی ہے۔ ﴿ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُم بِبَعْضٍ وَيَلْعَنُ بَعْضُكُم

بَعۡضًا﴾ "پھر قیامت کے دن بعض بعض کا انکار کردیں گے اور لعنت بھیجیں گے بعض بعض پر"

"وعلی ھذاالتقدیر فقد حصل اللعن للکفار من الکفار"

جب یہ معنی لیا جائے کہ قیامت کے دن سب لوگ کافروں پر لعنت بھیجیں گے تو سب کافروں کی دوسرے کافروں کیلئے لعنت ثابت ہوجائے گی۔

تیسرا جواب: الثالث کان الناس ھم المؤمنون والکفار لیسوا من الناس"

رب تعالیٰ نے "الناس" ذکر فرمایا جس کا معنی ہے "انسان" کہ سب انسان لعنت بھیجتے ہیں، اس سے مراد مؤمنین ہیں، کہ حقیقت میں "انسان" صرف مؤمن ہی ہے، کافر تو انسان ہی نہیں، بلکہ وہ تو چوپاؤں سے بھی گھٹیا ہے، جس پر قرآن پاک کی یہ آیۃ کریمہ دلالت کررہی ہے۔﴿اُولٰٓئِکَ کَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ ھُمۡ اَضَلُّ﴾ "وہ چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں"

چوتھا جواب: والرابع وھو الاصح عندی ان جمیع الخلق یلعنون المبطل والکافر، ولکنه یعتقد فی نفسه انه لیس بمبطل ولا بکافر فاذالعن الکافر وکان ھو فی علم اللہ کافرا فقدلعن نفسه وان کان لایعلم ذلک"

اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق باطل راہ پر چلنے والے اور کافر پر لعنت بھیجتی ہے، البتہ کافر کافر پر تو لعنت بھیجے گا، لیکن اپنے عقیدہ میں اپنے آپ کو وہ کافر نہیں مانتا، وہ کہتا ہے میں تو حق راہ پر ہوں میں کوئی کافر تو نہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ کافر ہے، جب وہ باطل راہ پر چلنے والے، اور کافر پر لعنت بھیجے گا تو گویا کہ وہ اپنے آپ پر بھی لعنت بھیج رہا ہوگا۔ (ماخوذ از کبیر)

وعید شدید:

وکل ذلک مستحق لھم بسبب ظلمھم وکفرھم فصلح ان یکون جزاء لذلک"

ہر ظالم اور کافر کی یہی جزاء ہے کہ اس پر لعنت بھیجی جائے کیونکہ وہ مستحق لعنت ہے۔ (کبیر).

اعلیٰ حضرت وعلامہ رازی رحمھما اللہ:

ثم لما ذکر لعن الثلاث قال اجمعین" (کبیر) پھر جب تین لعنتوں کا ذکر دیا گیا، یعنی اللہ اور فرشتوں اور لوگوں کی لعنت کا ذکر کردیا گیا تو فرمایا "اجمعین" یہ تینوں کی تاکید ہوگئی کہ "سب کی لعنت ہو" اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضاء خان بریلوی رحمہ اللہ نے ترجمہ فرمایا "لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی اور آدمیوں کی سب کی" آپ کے ترجمہ میں "سب کی

''علیحدہ مذکور ہے جس سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ "اجمعین" تینوں کی تاکید ہے۔

راقم نے طلباء کرام کے فائدہ کیلئے یہ ترجمہ کیا ہے کہ ان کو دوسری صورت بھی سمجھ آجائے ورنہ بہتر وہی ہے جو علامہ رازی رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔ راقم کا ترجمہ تفسیر مظہری سے لیا گیا ہے، آپ رقمطراز ہیں:۔

﴿وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ﴾ المراد به المؤمنون منهم او المراد مؤمنهم و كافرهم اجمعين فان الكفار ايضا يلعنون منكرى الحق وان كانوا لايعرفون الحق بعينه اوهم يلعن بعضهم بعضا يوم القيامة قال الله تعالى يكفر بعضكم بعضا يوم القيامة ، قال الله تعالى يكفر بعضكم ببعض ويلعن بعضكم بعضا''

﴿وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ﴾ (سب لوگوں کی لعنت) سے مراد یہ ہے کہ لوگوں میں سے سب مؤمنین کافروں پر لعنت کرتے ہیں، اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ مراد سب لوگ ہوں خواہ مؤمن ہو یا کافر، کیونکہ کافر بھی حق کے منکرین پر لعنت بھیجتے ہیں، اگر چہ وہ حق نہیں پہچانتے، یعنی وہ خود بھی حق کے منکر ہوتے ہیں لیکن اپنے آپ کو حق پر سمجھتے ہیں، یا مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن سب ہی کافروں پر لعنت کریں گے۔ جو رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی سے واضح ہے، وہ ارشاد یہ ہے ﴿يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا﴾ (ماخوذ از مظہری)

اور تفسیر تبصیر الرحمٰن نے بھی "اجمعین" کو تاکید "والناس" کی بتایا ہے۔

﴿وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ﴾ من المؤمنين الذين آذوهم والكافرين الذين وقعوا فى الكفر بسببهم يتسلطون عليهم مجتمعين''

﴿وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ﴾ سے مراد یا تو کل مؤمنین ہیں جن کو انہوں نے ایذاء دی ہے، اور یا تو صرف کافر مراد ہوں جن کے سبب وہ کفر میں واقع ہوں، وہ ان پر مسلط ہے ہوں۔ (از تبصیر الرحمٰن)

﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ "وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے"

یعنی وہ ہمیشہ لعنت میں رہیں گے، اس ارشاد گرامی کے چند مطالب ہیں، ایک یہ کہ وہ قیامت کے دن لعنت میں مبتلاء ہوں گے جو ان سے کبھی زائل نہیں ہوگی، ہمیشہ ان پر اللہ اور فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہوتی رہے گی، بلکہ ان کے ساتھی کفار جہنم میں ہوں گے یہ کافر جہنم میں ایک دوسرے پر لعنت کر رہے ہوں گے۔

دوسری وجہ کہ وہ ہمیشہ لعنت میں رہیں گے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان پر لعنت کا اثر ہمیشہ رہے گا، لعنت کا اثر

عذاب ہے، یعنی وہ عذاب میں ہمیشہ رہیں گے، لعنت کے اثر میں ہمیشہ رہنا لعنت میں ہی ہمیشہ رہنا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وِزْرًا ○ خَالِدِيْنَ فِيْهِ﴾ ''جس شخص نے اس سے اعراض کیا بیشک وہ قیامت دن بوجھ اٹھائے ہوگا وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے'' یہاں بھی گناہوں کے بوجھ میں رہنے سے مراد عذاب میں رہنا ہے۔

تیسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے حضرت ابن عباس ﷺ نے فرمایا کہ (خالدین فیها) ای فی جهنم'' وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے یعنی جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔ اگرچہ جہنم کا ذکر صراحۃ تو پہلے نہیں، لیکن کنایۃ سمجھ آرہا ہے کہ لعنت ذریعہ ہے جہنم میں جانے کا لہذا "فیها" میں ضمیر "جهنم" کی طرف لوٹا دی، اسی وجہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا "فعلى هذا الكناية عن غير مذكور" کہ یہ غیر مذکور سے کنایہ کے طور پر مذکور ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

واعلم ان قوله ﴿خَالِدِيْنَ فِيْهَا﴾ نصب على الحال مما قبله وهو قوله تعالىٰ ﴿عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ﴾

﴿خَالِدِيْنَ فِيْهَا﴾ منصوب ہے کیونکہ ﴿عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ﴾ سے حال واقع ہے، اگرچہ بظاہر یہ مبتداء خبر ہیں لیکن ظرف جب خبر ہو وہاں فاعلیت والا معنی پایا جاتا ہے، کیونکہ عامل وہاں استقر ہوتا ہے، اس لئے حال بنانا صحیح ہے۔ (کبیر بوضاحت)

﴿لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ﴾

''نہیں ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب اور نہ ہی ان کو مہلت دی جائے گی۔''

مطلب واضح ہوا کہ ان کے عذاب میں کوئی تخفیف نہیں کی جائے گی اور نہ ہی ان کا عذاب ایک وقت سے دوسرے وقت مؤخر کیا جائے گا۔

﴿وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ﴾ معنى الانظار، التاخير، قال تعالىٰ ﴿فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ﴾

''انظار'' کا معنی ہے تاخیر، جیسا کہ ﴿فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ﴾ میں ''نظرة'' کا معنی تاخیر اور مہلت ہے، اسی طرح ﴿وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ان کے عذاب کو مؤخر نہیں کیا جائے گا، ان کو عذاب میں مہلت نہیں دی جائے گی۔

''ان العذاب الملحق بالكافر مضرة خالصة عن شوائب المنافع دائمة غير منقطعة'' نعوذ منه بالله''

کافروں کا عذاب مکمل طور پر نقصان اور ضرر پہنچانے والا ہوگا، اس میں ذرا بھر نفع کا کوئی احتمال نہیں ہوگا، حالانکہ دنیا

میں ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی سزا دی جاتی ہے لیکن اس میں نفع پایا جاتا ہے کہ یہ پڑھ جائے، یا یہ سنور جائے، اس کیلئے اس کا انجام بہتر ہو جائے، لیکن کافر کے عذاب میں نفع کا کوئی شائبہ نہیں پایا جائے گا، اور کافر کا اخروی عذاب ختم بھی نہیں ہونا، کیونکہ نہ اخروی زندگی نے ختم ہونا ہے ہے اور نہ عذاب نے، (نعوذ بالله منه) ''اللہ کی پناہ ایسے عذاب سے۔'' (کبیر)

﴿اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ وَ اَصۡلَحُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ﴾

''مگر وہ جنہوں نے توبہ کر لی بعد اس کے اور اپنی اصلاح کر لی تو بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے''

یعنی کافر جب کفر سے توبہ کر کے ایمان لے آئیں اور اچھے عمل کر لیں تو اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے گا، اور اللہ ان پر رحم فرمائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ ''تَابُوۡا'' کے بعد ''وَاَصۡلَحُوۡا'' ذکر فرما کر یہ مسئلہ واضح کر دیا کہ کامیابی کیلئے صرف توبہ کافی نہیں بلکہ توبہ کے بعد ظاہری اور باطنی اصلاح ضروری ہے۔ راقبہ وغیرہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرے، اور باطنی اصلاح یہ ہے کہ ظاہری اصلاح یہ ہے کہ عبادت کرے یعنی حقوق اللہ ادا کرے، اور حقوق العباد کا لحاظ کرے، کسی انسان پر ظلم نہ کرے، کسی کا مال ناحق اپنے قبضہ میں نہ کرے، جب توبہ بھی کر لے گا اور اپنی ظاہری اور باطنی اصلاح کر لے گا تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس پر رحم فرمائے گا، اس کی بخشش کر دے گا۔

(فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ) کے دو مطلب ہیں، ایک یہ کہ دنیا میں ان کی برائیوں کی پردہ پوشی کر کے ان کی مغفرت کرتا ہے کیونکہ وہ غفور ہے، اور آخرت میں اپنی رحمت سے ان کو معاف فرمائے گا کیونکہ وہ رحیم ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ عذاب کو زائل کر کے بخشش فرمائے گا کیونکہ وہ غفور ہے، اور اپنی رحمت سے ثواب عطاء فرمائے گا کیونکہ وہ رحیم ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿قُلۡ لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِنۡ یَّنۡتَهُوۡا یُغۡفَرۡ لَهُمۡ مَّا قَدۡ سَلَفَ﴾ ''(اے محبوب) آپ فرما دیں انہیں جنہوں نے کفر کیا ہے کہ اگر وہ رک جائیں تو بخش دے گا ان کے پہلے گناہ، یعنی وہ کفر سے رک کر ایمان لے آئیں تو اللہ تعالیٰ ان کے پہلے تمام گناہ کر دے گا، قانون شریعت ہی رب تعالیٰ نے اپنے فضل سے یہ مقرر فرما دیا ''ان الاسلام یهدم ما مضی'' بیشک اسلام گذرے ہوئے تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ (کبیر)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

''فان الله'' میں ''فاء'' آئی ہوئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاق وسباق سے (یعنی عبارت کے ماقبل اور

مابعد سے)واضح ہورہا ہے کہ یہ جزاء اور شرط اس کی مفہوم کلام سے واضح ہے، معنوی طور پر عبارت یوں بن گئی ﴿اِنْ تَابُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ لَهُمْ﴾ "اگر وہ توبہ کرلیں تو بیشک اللہ تعالیٰ ان کی بخشش کردے گا۔" (ماخوذ از کبیر)

اعتراض : یہ کہنا کس طرح صحیح ہے کہ صرف توبہ کافی نہیں بلکہ اصلاح عقائد واعمال بھی ضروری ہے، حالانکہ

"ان مجرد التوبة يوجب تخفيف العذاب ونظر الحق اليهم"

صرف توبہ سے ہی عذاب کی تخفیف ہوجاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی نظر رحمت کا وہ مستحق ہوجاتا ہے۔

"فالظاهر انه ليس تقييدا بل بيان لان يصلح مافسد"

اس سے پتہ چلا کہ "واصلحوا" بخشش کی قید نہیں بلکہ بیان ہے اس چیز کا کہ توبہ خود ہی اصلاح ہے کہ گناہ جو ذریعہ فساد ہیں وہ توبہ سے مٹ جاتے ہیں۔

جواب : یہاں دو لحاظ ہیں ایک یہ کہ ماضی کے گناہوں کی توبہ کرلے تو وہ گناہ تو صرف توبہ سے معاف کردئے جاتے ہیں، لیکن توبہ یہ ہے کہ "ماضی کے گناہوں پر نادم ہو" اور گناہوں کی معافی طلب کرے، اور مستقبل میں گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرلے۔ یہ پختہ ارادہ گناہ نہ کرنے کا مستقبل میں کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ اصلاح عقائد واعمال بھی ضروری ہے، جواب میں علامہ آلوسی رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں۔

"واجيب بانه ليس بواردلان مجرد الندم والعزم على ترك الكفر في المستقبل لا يخرجه منه فهو بيان للتوبة المعتدبهافالمآل واحد" (روح المعانی)

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ۝ (آیۃ نمبر ۹۰)

(1) بیشک وہ جو ایمان لا کر کافر ہوئے پھر اور کفر میں بڑھے ان کی توبہ ہرگز قبول نہ ہوگی، اور وہی ہیں بہکے ہوئے۔ (کنزالایمان)

(2) بیشک وہ جنہوں نے کفر کیا ایمان کے بعد، پھر بڑھے اور کفر، ہرگز نہیں قبول کی جائے گی ان کی توبہ، وہی (کامل) بھٹکے ہوئے ہیں۔ (نجوم الفرقان)

کفر میں زیادتی کیسے؟

اس میں چند وجوہ بیان کی گئی ہیں:

(۱) ایک تو مرتد کا کفر کہ وہ کفر پر قائم رہے، اور اسی پر اسرار کرے "فیکون الاصرار کالزیادۃ" تو اس کا اصرار کفر میں زیادتی ہے۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ کفر کے ساتھ اور کفر ملایا جائے، جیسا کہ اہل کتاب نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے آپ پر ایمان رکھتے ہیں "ثم کفروا به عند المبعث" پھر انہوں نے آپ کی بعثت پر آپ سے کفر کیا۔

"ثم ازدادوا کفرا بسبب طعنهم فيه فی کل وقت، ونقضهم ميثاقه وفتنتهم للمؤمنين وانکارهم لکل معجزة تظهر"

پھر وہ اور کفر میں بڑھے، کیونکہ وہ ہر وقت آپ کی نبوت اور آپ پر طعن کرتے، اور وعدہ کر کے توڑ دیتے، اور مؤمنوں کو فتنوں میں مبتلاء رکھتے، اور جب بھی کوئی معجزہ ظاہر ہوتا وہ اس کا انکار کرتے، یہ تھا ان کا کفر میں بڑھنا۔

(۳) کفر میں ان کے بڑھنے کی اور وجہ یہ ہے کہ یہود نے موسیٰ علیہ السلام سے ایمان لایا، پھر عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کا انکار کر کے کافر ہو گئے "ثم ازدادوا کفرا بسبب انکارهم محمد ﷺ والقرآن" پھر وہ حضرت محمد ﷺ اور قرآن پاک کا انکار کر کے کفر میں اور بڑھے۔

(۴) آیۃ کریمہ کے شان نزول کی ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ ان لوگوں کے حق میں نازل ہوئی جو مرتد ہو کر مکہ چلے گئے، اور ان کا کفر اور زیادہ ہوا کیونکہ انہوں نے کہا۔ "نقيم بمكة نتربص بمحمد ريب المنون"

ہم مکہ میں ہی رہیں گے اور محمد (ﷺ) پر حوادثات زمانہ کی انتظار کریں گے۔

(۵) "المراد فرقة ارتدوا لم عزموا على الرجوع الى الاسلام على سبيل النفاق فسمى الله تعالى ذلك النفاق كفرا"

اس آیۃ کریمہ میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو مرتد ہو گئے تھے، پھر انہوں نے اسلام کی طرف منافقانہ انداز پر رجوع کرنے کا ارادہ کیا، تو اللہ تعالی نے ان کے اس نفاق کو کفر سے تعبیر کیا، کہ وہ پہلے ہی ارتداد کی وجہ سے کافر تھے پھر منافقت کی وجہ سے اور ہی زیادہ کفر میں بڑھ گئے۔ (کبیر)

(۶) وقيل نزلت في قوم من اصحابه ممن كان يكفر ثم يراجع الاسلام"

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ یہ آیۃ کریمہ ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی جو کبھی اسلام لے آتے، اور کبھی کافر ہو جاتے ان کا بار بار کفر کی طرف رجوع کرنا حقیقت میں کفر کی طرف بڑھنا تھا، اسی کو رب تعالی نے بیان فرمایا۔
(از روح المعانی)

﴿ثُمَّ ازْدَادُوْ كُفْرًا﴾ "پھر وہ اور کفر میں بڑھ گئے"

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

﴿اِزْدَادُوْا﴾ ماخوذ ہے "زیادۃ" سے، اصل میں ﴿اِزْتَادُوْا﴾ ہے، باب افتعال کی فاء کلمہ میں "زاء" واقع ہے، اسلئے "تاء" کو "دال" سے تبدیل کرنا واجب ہوگیا، اسطرح ﴿اِزْتَادُوْا﴾ سے ﴿اِزْدَادُوْا﴾ بن گیا۔ (ماخوذ از روح المعانی)

توبہ کا قبول نہ ہونا کیسے؟

بظاہر یہ مسئلہ مشکل نظر آرہا ہے۔

"انه تعالى حكم في الآية الاولى بقبول توبة المرتدين وحكم في هذه الآية بعدم قبولها"

کہ اللہ تعالی نے اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں مرتدین کی توبہ کی قبولیت کا ذکر فرمایا، اور اس آیۃ کریمہ میں ذکر فرمایا کہ ان کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی، یہ تو دونوں آیتوں میں تناقض پایا گیا ہے، اس تناقض کو کیسے دور کیا جائے۔

"وايضا ثبت بالدليل انه متى وجدت التوبة بشروطها فانهاتكون مقبولة لامحالة"

اور یہ بات بھی دلائل سے ثابت ہے کہ جب توبہ اپنی شرائط کے ساتھ پائی جائے تو وہ یقیناً قبول کی جاتی ہے، تو اس آیۃ کریمہ میں توبہ کے قبول نہ کئے جانے کی کیا وجہ ہے۔

توبہ کے نہ قبول کرنے کی چند وجوہ:

(۱) اس میں سے پہلی وجہ یہ ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو موت کے وقت توبہ کرتے ہیں، ان کی توبہ نہ قبول کرنیکا ذکر رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی میں پایا گیا ہے۔

﴿وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْاٰنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا﴾ (النساء آیۃ نمبر ۱۸)

''اور نہیں توبہ ان کی جو گناہوں کا عمل کرتے رہے یہاں تک کہ ان میں سے جب کسی کو موت آئے تو وہ کہے اب میں نے توبہ کی، اور نہ ان کی جو کافر مریں، ان کیلئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے''

یہ جواب حضرت حسن بصری اور قتادہ اور عطاء رحمہم اللہ نے دیا ہے۔

(۲) صاحب کشاف نے یہ ذکر کیا ہے۔

"قو له تعالى (لن تقبل توبتهم) جعل كناية عن الموت على الكفر"

اس آیۃ کریمہ میں جن لوگوں کا ذکر ہے کہ ان کی توبہ قبول نہیں کی جاتی اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی موت کفر کی حالت میں آئے، جو کفر کی حالت میں مرے اس کی توبہ قبول نہیں جاتی۔ جو آیۃ کریمہ سورۃ نساء کی جواب اول میں ذکر کی ہے اس سے یہ مسئلہ واضح طور پر سمجھ آ رہا ہے۔﴿وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ﴾ ''اور نہ (توبہ) ان کی جو کافر مریں'' اب آیۃ کریمہ کا معنی یہ ہوگیا۔

"ان اليهود والمرتدين الذين فعلوا مافعلوا ماتون على الكفر داخلون فى جملة من لاتقبل توبتهم"

بیشک یہود اور مرتدین نے کیا جو کیا، یعنی کفر پر کفر کرتے چلے گئے، پھر موت بھی ان کی کفر پر آئی، اس لئے وہ ان لوگوں میں داخل ہو گئے جن کی توبہ کو نہیں قبول کیا جاتا۔

(۳) انه يحمل هذا على ما اذا تابوا باللسان ولم يحصل فى قلوبهم اخلاص"

اور جواب یہ دیا گیا ہے کہ آیۃ کریمہ میں جن لوگوں کی توبہ قبول نہ کرنے کا ذکر ہے اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو توبہ زبان سے کرتے ہیں اور ان کے دلوں میں خلوص نہیں پایا گیا۔ ان کا زبان سے توبہ کرنا اور دل سے توبہ نہ کرنا اللہ تعالیٰ سے مخفی نہیں، اس لئے رب تعالیٰ ان کی توبہ قبول نہیں کرے گا۔

(۴) اور وجہ یہ بیان کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے یہ ذکر فرمایا جو لوگ ایمان کے بعد کفر کرتے ہیں ان پر اللہ تعالیٰ

اور فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہوتی ہے۔ پھر ارشاد فرمایا: ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِکَ وَاَصْلَحُوْا﴾ ''کہ مگر جن لوگوں نے اس کے بعد توبہ کر لی اور اپنی اصلاح کر لی'' اور لوگ اللہ کی رحمت اور بخشش کے مستحق ہو جاتے ہیں، اب اس آیۂ کریمہ میں گویا کہ یہ ذکر فرمایا گیا۔

''انه لو کفر مرة اخری بعد تلک التوبة فان التوبة الاولی تصیر غیر مقبولة وتصیر کانها لم تکن''

توبہ کے بعد اگر انہوں نے پھر کفر کیا تو وہ پہلی توبہ غیر مقبول ہوگی، گویا کہ پہلے انہوں نے توبہ کی ہی نہیں تھی۔

یہ قول قاضی ابوبکر رازی اور قفال اور ابن انباری کا ہے، اس قول کو بعض حضرات نے پسند کرتے ہوئے یوں کہا۔ ''وهذا الوجه الیق بالآیة من سائر الوجوه'' ''تمام وجوہ میں سے یہ وجہ زیادہ مناسب ہے''

(۵) لعل المراد ما اذا تابوا عن تلک الزیادة فقط فان التوبة عن تلک الزیادة لاتصیر مقبولة مالم تحصل التوبة عن الاصل''

آیۂ کریمہ میں بیان کیا گیا: ﴿ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا﴾ ''پھر وہ کفر میں بڑھتے گئے'' جب وہ کفر پر کفر کرتے گئے تو ان میں سے کئی لوگوں نے زیادتی کفر سے توبہ کی لیکن اصل کفر سے توبہ نہیں کی، تو آیۂ کریمہ میں ان لوگوں کا ذکر کیا گیا کہ جو لوگ اصل کفر سے توبہ نہیں کرتے بلکہ صرف زیادتی کفر سے توبہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول نہیں فرماتا۔ (ماخوذ از کبیر)

چند لوگوں کی توبہ قبول نہیں کی جاتی:

وکل مسلم ارتد فتوبته مقبولة الا احد عشر من تکررت ردته ساب النبی ﷺ وساب احد الشیخین والساحر والزندیق والخناق والکاهن والملحد والاباحی والمنافق ومنکر بعض الضروریات باطنا''

ہر مسلمان جو مرتد ہو جائے ''العیاذ باللہ'' اس کی توبہ قبول ہے، سوائے گیارہ آدمیوں کے، ان کی توبہ قبول نہیں۔

(۱) وہ شخص جو بار بار مرتد ہو جائے، یعنی جو شخص اسلام کو کھیل تماشہ بنا لے اور بار بار اسلام قبول کرتا رہے، بار بار کفر اختیار کرتا رہے، اس کے اسلام کے ساتھ مزاح اڑانے کی وجہ سے مرتے وقت اسے توبہ کی توفیق ہی نہیں حاصل ہوتی وہ کفر پر ہی مر جاتا ہے۔

(۲) اور نبی کریم ﷺ کو (معاذ اللہ) گالیاں دینے والے کی توبہ قبول نہیں، کیونکہ وہ واجب القتل ہے اسے بھی توبہ کی توفیق حاصل نہیں ہوتی بلکہ وہ کفر پر ہی مرتا ہے۔

(۳) اور حضرت ابو بکر صدیق ﷛ اور حضرت عمر ﷛ میں سے کسی ایک کو گالیاں دینے والے کی توبہ قبول نہیں ہوتی، اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ وہ کافر ہو جاتا ہے اور واجب القتل ہو جاتا ہے، وہ بھی کفر پر ہی مرجاتا ہے، وہ بھی توبہ کرنے کی توفیق حاصل ہونے سے محروم ہو جاتا ہے۔

(۴) "**زندیق**" یعنی بے دین شخص کی توبہ قبول نہیں، کیونکہ جن لوگوں کا کوئی دین نہیں ہوتا، ان کو ہر شخص جانتا ہے کہ انہیں راہ راست پر لانا ممکن نہیں ہوتا وہ بھی یوں ہی کفر پر مرتے ہیں، توبہ کی ان کو بھی توفیق حاصل نہیں ہوتی۔

(۵) "**ملحد**" یہ وہ شخص ہوتا ہے جو بظاہر اسلام کا دعوی کرتا ہے لیکن کفریہ عقائد کو اسلام بتاتا ہے، یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے یہود و نصاری سے پیسے لے کر دین کو برباد کرنے کی ناپاک جسارت کی، دین کو برباد تو نہ کر سکے کیونکہ اس کا محافظ اللہ تعالی ہے، لیکن وہ خود توبہ کرنے سے محروم ہو کر کوئی جھوٹا مدعی نبوت بن کر مرا، اور کوئی نیچری (جو کچھ ذہن وضمیر میں یعنی جو من ودھن میں آئے وہی کرے اسے نیچری کہا جاتا ہے) بن کر مرا، توبہ کی توفیق سے یہ لوگ محروم ہو کر مرے۔

(۶) "**اباحی**" یہ وہ لوگ ہیں جو ہر چیز کو مباح کہتے ہیں، کہ یہ بھی جائز ہے، یہ بھی جائز ہے، وہ بھی حلال وحرام میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے توبہ کی توفیق حاصل ہونے کے بغیر ہی مرجاتے ہیں۔

آجکل اباحی لوگوں کی کوئی کمی نہیں، جن لوگوں سے یہ سنو" کچھ نہیں ہوتا جی دین میں کوئی تنگی نہیں، یہ تو مولوی لوگوں نے چیزیں حرام کر رکھی ہیں، سیر وتفریح کیلئے شراب پی لیا تو کیا ہے، ننگی عورتوں کے مجرے دیکھ لئے تو کیا، یہ مولوی لوگ تو تنگ نظر ہیں، قدامت پسند ہیں، یہ تو ہمیں پندرہ سو سال پیچھے لے جانا چاہتے ہیں، ایسے لوگ بغیر توبہ کے کفریات ولغویات بکتے بکتے مرجاتے ہیں۔

(۷) **جادوگر** جو کفریہ کلمات کے ذریعے شیطانوں اور جنوں کو کارساز سمجھ کر ان سے امداد لے کر جادو کرتا ہے وہ بھی کافر ہوتا ہے، بغیر توبہ کے ہی مرجاتا ہے، اس کی موت بھی کفر پر آتی ہے۔

(۸) "**خناق**" جو لوگوں کا گلہ گھونٹ کر ان کو مارتا رہے، اگر یہ کام جائز سمجھ کر کرے تو وہ کافر ہے، اگر اس کو جائز نہ سمجھے تو "والخناق غیر کافر وانما یقتل لسعیه بالفساد" "خناق کافر نہیں لیکن وہ فساد پھیلا رہا ہے" اس لئے اسے قتل کر دیا جائے، اس طرح وہ بھی توبہ کی توفیق حاصل ہونے سے پہلے ہی قتل کر دیا جائے گا۔

(۹) "**کاهن**" یہ وہ شخص ہے جو دعوی کرے کہ میں غیبی خبریں جانتا ہوں ستاروں وغیرہ کے حساب سے، یہ شخص بھی بغیر توبہ کے مرجاتا ہے۔

(۱۰) ''**منافق**'' جو بظاہر مسلمان ہو، اندرونی طور پر کافر ہو، کافروں سے اس کی ساز باز ہو، مسلمان کو نقصان پہنچا رہا ہو، ایسا شخص بھی بغیر توبہ کے کفر پر مرتا ہے، اسلئے اس کی توبہ قبول نہیں۔

(۱۱) بعض ضروریات دین کا باطنی طور پر انکار کرنے والے کی توبہ قبول نہیں ہوتی کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے توبہ کی توفیق حاصل ہونے سے پہلے ہی مرجاتا ہے۔ (ماخوذ از شامی بوضاحت)

تنبیہ: ان تمام صورتوں میں توبہ کے نہ قبول کئے جانے کا ایک ہی مطلب ہے کہ ان لوگوں کو توبہ کرنے کی توفیق ہی حاصل نہیں ہوتی، یوں ہی توبہ کے بغیر یہ مردود مرجاتے ہیں۔

کچھ اور لوگ جن کی توبہ قبول نہیں ہوتی:

لیکن یہ لوگ اکثر طور پر توبہ سے محروم رہتے ہیں، لیکن بعض کو اللہ تعالیٰ توبہ کی توفیق عطاء فرما دیتا ہے اور ان کی توبہ قبول کر لیتا ہے، اسی طرح جن لوگوں کا پہلے ذکر کیا، ان میں سے بھی کئی لوگوں کو مرنے سے پہلے توبہ کی توفیق حاصل ہو جاتی ہے، ان کی توبہ کو قبول کر لیا جاتا ہے۔

''فكان المناسب ذكر قطاع الطريق وكذااهل الاهواء وكذاكل من وجب عليه حدزناا وسرقة اوقذف اوشرب'' (شامی)

مناسب یہی ہے کہ جن لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی ان میں ان کو بھی شامل کیا جائے ''ڈاکو اور خواہشات نفسانیہ کی وجہ سے دین کی پرواہ نہ کرنے والے اور جن پر حد زنا یا حد سرقہ یا حد قذف ثابت ہو جائے''

لیکن ان کے ساتھ یہ قید لگانی ضروری ہے کہ ان میں سے اکثر توبہ سے محروم رہ جاتے ہیں، ورنہ بعض کو توبہ کی توفیق حاصل ہو جاتی ہے، جیسا کہ حضرت ماعز اسلمی ﷺ کی توبہ کی قبولیت کا ذکر خود رسول اللہ ﷺ نے کیا ان شاء اللہ تفصیلی بیان سورۃ نور میں آئے گا۔

﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ﴾ ''وہی (کامل) بھٹکے ہوئے ہیں''

''راقم نے اپنے ترجمہ میں بریکٹ میں لفظ ''کامل'' ذکر کیا ہے، اس کی وجہ علامہ رازی رحمہ اللہ کے سؤال و جواب میں دیکھئے۔

سؤال: ﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ﴾ ينفي كون غيرهم ضالا وليس الامر كذلك فان كل كافر فهو ضال سواء كفر بعد الايمان او كان كافرا في الاصل''

یہاں جن کفار کا ذکر ہو رہا ہے وہ مرتدین ہیں جن کا ذکر گذشتہ چند آیات میں آ رہا ہے۔

﴿وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الضَّآلُّوْنَ﴾ میں مبتداء اور خبر دونوں معرفہ ہیں اور درمیان میں "ھم" ضمیر حصر کیلئے ہے، اس کا معنی تو یہ ہوگا، "کہ صرف وہی لوگ بھٹکے ہوئے ہیں" صرف ان پر اس حکم کو بند کرنا کیسے صحیح ہے جبکہ تمام کفار ہی بھٹکے ہوئے ہیں۔

جواب: والجواب هذامحمول علی انهم هم الضالون علی سبیل الکمال"

آیۂ کریمہ میں جن مرتدین کا ذکر ہے، وہ کامل بھٹکے ہوئے ہیں، اب مطلب واضح ہو گیا کہ تمام کفار ہی بھٹکے ہوئے ہیں لیکن جن مرتدین کا ذکر کیا جا رہا ہے "وہی تو کامل بھٹکے ہوئے ہیں"

سؤال: جن کفار کا ذکر ہو رہا ہے وہ تو کفر میں گھرے ہوئے ہیں، ہر طرف سے کفر ان پر چھایا ہوا ہے، ان کو "ضال" کہنے کا کیا فائدہ ہے؟ کیونکہ اعلیٰ کا حکم گھٹیا پر ہوتا ہے نہ کہ گھٹیا کا اعلیٰ پر، ضلالت کا درجہ ہے کفر سے، تو کافر کو ضال کہنے کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا، ہاں البتہ ضال کو کافر کہا جائے تو فائدہ حاصل ہوگا۔

جواب: یہاں ضالون سے مراد کاملون فی الضلالت ہیں وہ عام کافروں سے اوپر درجہ رکھتے ہیں۔

(ماخوذ از کبیر)

بیان کردہ مضمون کی روایات سے تائید:

❁ اخرج البزار عن ابن عباس ان قوما اسلموا ثم ارتدوا ثم اسلموا ثم ارتدوا فارسلوا الی قومهم یسالون لهم فذکروا ذلک لرسول الله ﷺ فنزلت هذه الآیة"

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا﴾ هذا خطأ من البزار" (در منثور)

بزار نے حضرت ابن عباس ﷺ کی روایت کو نقل کیا ہے کہ ایک قوم نے اسلام قبول کیا، پھر وہ مرتد ہو گئے، پھر اسلام قبول کر لیا، پھر مرتد ہو گئے، تو انہوں نے اپنی قوم کی طرف پیغام بھیجا کہ ہمارے متعلق سؤال کرو ان کی قوم نے رسول اللہ سے سؤال کیا تو یہ آیۂ کریمہ نازل ہوئی۔ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا﴾

اگرچہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اس روایت کو شان نزول کی وجہ بیان کرنے میں بزار کی خطاء قرار دیا ہے، لیکن خطاء اسی وقت ہو سکتی ہے جب حد مقرر کر دی جائے کہ دو مرتبہ مرتد ہونے کے بعد تیسری مرتبہ توبہ کی جائے تو وہ توبہ قبول نہیں لیکن جب روایت سے مراد بار بار اسلام لانا اور مرتد ہونا لیا جائے تو ان کی توبہ کا نہ قبول کیا جانا اسلام کو کھیل تماشہ سمجھ کر بہت واضح سمجھ آتا ہے، کبیر کا حوالہ گذشتہ اوراق میں دیکھئے۔

❁ واخرج ابن جریر عن الحسن فی الآیة قال الیھود والنصاری لن تقبل توبتھم عند الموت" (درمنشور)

ابن جریر نے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے اس آیۃ کریمہ کے متعلق روایت ذکر کی، وہ فرماتے ہیں کہ اس آیۃ کریمہ میں یہود ونصاری کا ذکر ہے کہ ان کا موت کے وقت توبہ کرنا قابل قبول نہیں ہوگا۔

❁ واخرج عبد بن حمید وابن جریر وابن ابی حاتم عن قتادۃ فی الآیۃ قال ھم الیھود کفروا بالانجیل وعیسی ثم ازدادوا کفرا بمحمد ﷺ والقرآن" (درمنشور)

عبد بن حمید اور ابن جریر اور ابن ابی حاتم سے حضرت قتادہ سے اس آیۃ کریمہ کے متعلق بیان کیا کہ وہ لوگ جن کا ذکر اس آیۃ کریمہ میں ہے وہ یہود ہیں جنہوں نے انجیل اور حضرت عیسی علیہ السلام سے کفر کیا، اور پھر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اور قرآن پاک سے کفر کر کے اور کفر میں بڑھے۔

❁ واخرج ابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم عن ابی العالیۃ فی الآیۃ قال انھا نزلت فی الیھود والنصاری کفروا بعد ایمانھم ثم ازدادوا کفرا بذنوب اذنبو ھا ثم ذھبوا یتوبون من تلک الذنوب فی کفرھم ولو کانوا علی الھدی قبلت توبتھم ولکنھم علی ضلالۃ" (درمنشور)

ابن جریر اور ابن منذر اور ابن ابی حاتم اس آیۃ کریمہ کے متعلق ابن عالیہ کی روایت ذکر کرتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ بیشک یہ آیۃ کریمہ یہود ونصاری کے متعلق نازل ہوئی کہ انہوں نے ایمان کے بعد (نبی کریم ﷺ سے) کفر کیا، پھر وہ گناہوں پر گناہ کرتے چلے گئے یہاں تک کہ کفر میں بڑھتے چلے گئے، پھر انہوں نے صرف گناہوں یعنی کفریات کی زیادتی سے توبہ کرنی شروع کی لیکن اصل کفر سے توبہ نہ کی، اسی وجہ سے ان کی توبہ قبول نہیں کی گئی کہ وہ گمراہی میں جوں کے توں رہے، اگر وہ ہدایت پر آنے کی کوشش کرتے تو یقیناً ان کی توبہ قبول کی جاتی۔

❁ واخرج عبد بن حمید وابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم عن ابی العالیۃ فی قولہ لن تقبل توبتھم قال تابوا من الذنوب ولم یتوبوا من الاصل" (درمنشور)

عبد بن حمید اور ابن جریر اور ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے ابوعالیہ ﴿لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ﴾ کے متعلق ایک روایت ذکر کی کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ زیادتی کفر کے گناہوں سے توبہ کر رہے تھے، لیکن اصل کفر سے توبہ نہیں کر رہے تھے اسی وجہ سے ان کی توبہ قبول نہیں کی جاتی۔

❁ واخرج عبد بن حمید وابن جریر عن مجاھد فی قولہ "ثم ازدادو کفرا" قال تمواعلی کفرھم" (درمنشور)

عبد بن حمید اور ابن جریر نے صحابہ سے روایت ذکر کی کہ ﴿ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا ﴾ "پھر وہ کفر میں بڑھے"
کا مطلب یہ ہے کہ وہ کامل طور پر کافر ہے، کفران پر چھایا رہا۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

اس آیۃ کریمہ میں ﴿لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ﴾ میں "فاء" نہیں، اور آنے والی آیۃ کریمہ میں "فاء" مذکور ہے "فَلَنْ يُّقْبَلَ" اس میں وجہ فرق کیا ہے؟

ولم تدخل الفاء فی "لن يقبل" هنا ودخلت فی "فَلَنْ تُقْبَلَ" لان الفاء مؤذنة بالاستحقاق بالوصف السابق وهناک قال "وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ" وهنالم يصرح بهذاالقيد"

تو اس کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ "فاء" سے یہ پتہ چلتا ہے کہ "فاء" کے بعد والا حکم ماقبل وصف پر مرتب ہے "فَلَنْ يُّقْبَلَ" سے پہلے واضح طور پر "وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ" ذکر کر دیا گیا، کہ ان کی موت جب کفر پر آئے گی تو ان سے کوئی فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا، (تفصیل انشاء اللہ، قریب ہی آرہی ہے) لیکن اس آیۃ کریمہ میں کفر کی حالت میں موت کا تذکرہ نہیں، لھذا "فاء" کو ذکر نہیں کیا، یہی وجہ ہے کہ توبہ کے قبول نہ کرنے کی چند وجوہ بیان کی گئی ہیں۔
(ماخوذ از البحر المحیط)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ○ (آیة نمبر ۹۱)

(1) وہ جو کافر ہوئے اور کافر ہی مرے ان میں کسی سے زمین بھر سونا ہرگز قبول نہیں جائے گا، اگر چہ اپنی خلاصی کو دے ان کیلئے دردناک عذاب ہے اور ان کا کوئی یار نہیں۔ (کنز الایمان)

(2) بیشک وہ جنہوں نے کفر کیا اور مر گئے اس حال میں کہ وہ کافر تھے، تو ہرگز نہیں قبول کیا جائے گا ان میں سے کسی ایک کا زمین بھر سونا، اگر چہ وہ فدیہ دیں اس کا (جان چھڑانے کیلئے) ان کیلئے عذاب ہوگا دردناک، اور نہیں ہوگا ان کا کوئی مددگار۔ (نجوم الفرقان)

اعتراض: قیامت کے دن تو کسی کے پاس مال ہی ہونا، تو ان کا فدیہ دینا اور اسے قبول نہ کیا جانا، کا کیا

مطلب ہے۔ جبکہ "انھم فی ذلک الیوم افلس من ابن المذلق" قیامت کے دن ہر شخص مذلق سے بھی زیادہ غریب ہوگا۔

پہلا جواب: یہ کلام تقدیر وفرض پر مبنی ہے، معنوی لحاظ پر تقدیر عبارت کی یہ ہے۔

"لوان الکافر یوم القیامة قدرعلی اعز الاشیاء ثم قدرعلی بذله فی غایة الکثرة نعجزان یتوسل بذلک الی تخلیص نفسه من عذاب الله"

کہ اگر کافر قیامت کے دن زمین بھر سونا دینے پر قادر ہو جائے، پھر وہ کثیر مال خرچ کرنے پر قادر ہو جائے، تو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے اپنے آپ کو چھڑانے سے عاجز آ جائے گا۔

"وبالجملة فالمقصود انهم آیسون من تخلیص النفس من العقاب"

حاصل کلام یہ ہے کہ مقصد بیان یہ ہے کہ کفر کی حالت پر مرنے والے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے چھڑانے سے ناامید ہو جائیں گے۔ (روح المعانی، وکبیر)

اس جواب پر ایک حدیث بطور تائید دیکھئے۔

❁ عن انس ان النبی ﷺ قال "یحاسب الکافر یوم القیامة، فیقال له ارأیت لو کان لک ملء الارض ذهبا اکنت تفتدی به؟ فیقول نعم، فیقال له، قد کنت سئلت ایسر من ذلک" (قد اخذت علیک فی ظهر ابیک آدم ان لاتشرک بی شیأفابیت الاان تشرک)

(بخاری، صابونی) صحیح اخرجه البخاری (۳۳۳۴) ومسلم (۲۸۰۵) واحمد (۳.۱۲۷، ۱۶۹) وابویعلی (۴۱۸۶) وابن عاصم فی السنة (۹۹) وابونعیم فی الحلیله (۲.۲۱۵) (البحر المحیط مع حاشیه) (وصابونی)

حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن کافر سے حساب لیا جائے گا اور اسے کہا جائے گا تیرا کیا خیال ہے کہ اگر تیرے پاس زمین بھر سونا ہوتا تو تو فدیہ دے کر اپنی جان چھوڑ الیتا؟ تو وہ کہے ہاں (میرے رب میں فدیہ دے دیتا) رب تعالیٰ فرمائے گا، میں نے تو تجھ سے اس سے بہت آسان مطالبہ کیا تھا کہ تو نے ایمان لانا اااور میرے ساتھ شریک نہیں ٹھہرانا، لیکن تم نے میرے ساتھ شریک ٹھہرانے سے انکار کر دیا۔

❁ وقال الامام احمد عن انس قال قال رسول الله ﷺ ویؤتی بالرجل من اهل الجنة فیقول له یاابن آدم کیف وجدت منزلک فیقول ای رب خیر منزل فیقول سل وتمن فیقول ماأسال ولا اتمنی الا تردنی الی الدنیا فاقتل فی سبیلک عشر مرار لمایری من فضل الشهادة ویؤتی بالرجل من اهل النار فیقول له یاابن آدم کیف وجدت منزلک فیقول یارب شرمنزل فیقول له اتفتدی منی بطلاع الارض

ذهبا؟فیقول ای رب نعم،فیقول کذبت قد سألتک اقل من ذلک وایسر فلم تفعل فیرد الی النار" (منقول از صابونی)

مسند احمد میں حضرت انس ﷺ سے حدیث روایت کی گئی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت والے ایک شخص کو (رب تعالیٰ کے حضور) لایا جائے گا، اسے رب تعالیٰ فرمائے گا اے ابن آدم تو نے اپنا مرتبہ کیسے پایا؟ وہ عرض کرے اے میرے رب بہتر مقام پایا، رب تعالیٰ فرمائے گا "سوال کر، اور تمنا کر" وہ کہے گا میں اور تو کچھ سوال نہیں کرتا اور تو کچھ تمنا نہیں کرتا مگر یہ چاہتا ہوں کہ تو مجھے دنیا میں لوٹا دے، تا کہ مجھے تیری راہ میں دس مرتبہ شہید کر دیا جائے (یہ اس کی تمنا اس لئے ہوگی کہ) وہ شہادت کی فضیلت دیکھ رہا ہوگا، اور ایک جہنمی شخص کو لایا جائے گا، رب تعالیٰ اس سے پوچھے گا تو نے اپنا مقام کیسے پایا؟ وہ کہے گا اے میرے رب بہت برا مقام پایا، رب تعالیٰ فرمائے گا (اگر تیرے پاس زمین بھر سونا ہوتا) کیا تو وہ زمین کے ٹیلوں برابر سونا بطور فدیہ دے کر اپنی جان چھوڑا لیتا؟ وہ کہے گا ہاں میرے رب، رب تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹا ہے، میں نے تجھ سے اس سے کم اور آسان سوال کیا تھا (کہ تو ایمان لے آ اور شرک نہ کر) تو نے وہ نہیں کیا، تو اسے آگ کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔

دوسرا جواب: انهم اذا ماتوا على الكفر فلو انهم كانوا قد انفقوا فى الدنيا ملء الارض ذهبا لن يقبل الله تعالى ذلك منهم لان الطاعة مع الكفر لاتكون مقبولة"

ان سے فدیہ نہ قبول کئے جانے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ جب کافر اپنے کفر پر مر جائیں گے تو قیامت کے دن جب وہ رب تعالیٰ کی گرفت میں آئیں گے تو یہ کہیں گے ہم نے تو دنیا میں زمین بھر سونا خرچ کیا تھا، تو اللہ تعالیٰ ان کے دنیا میں زمین بھر سونا خرچ کرنے کو قبول نہیں کرے گا، کیونکہ کفر کی حالت میں کی گئی نیکیاں قبول نہیں۔ (کبیر)

کاش کہ یہود و نصاریٰ سے پیسے لے کر رفاہ عامہ کا کام کرنے والے نام نہاد مسلمانوں کو یہ بات سمجھ آ جائے کہ کافروں کی کوئی نیکی معتبر نہیں، یہ بہت بڑی حماقت ہے کہ کافروں کو مسلمانوں کا ہمدرد سمجھا جائے۔

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ "اور ان کیلئے عذاب ہوگا دردناک۔"

رب تعالیٰ نے جب یہ ارشاد فرمادیا کہ کفار اپنی دنیاوی نیکیوں کی وجہ سے، اور آخرت میں ان کے پاس زمین بھر سونا ہوتا تو فدیہ دے کر رب تعالیٰ کے عذاب سے چھٹکارا حاصل نہیں کریں گے۔ "اردفه بصفة ذلك العذاب فقال ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ ای مؤلم" تو اس کے پیچھے اس عذاب کی صفت بیان کی تو ارشاد فرمایا ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ "الیم" فعیل کا وزن ہے جو فاعل کا معنی دے رہا ہے، اور ساتھ ساتھ دوام بھی پایا

گیا ہے، یعنی ان کو دائمی طور پر درد پہنچانے والا عذاب ہوگا۔

﴿وَمَالَهُمْ مِنْ نّٰصِرِيْنَ﴾ "اور نہیں ہوگا ان کا کوئی مددگار۔"

جب یہ بیان فرمادیا کہ کافروں کی عذاب الیم سے فدیہ دے کر نجات نہیں ہوگی اور دنیا میں مال خرچ کرنے کی وجہ سے بھی نجات حاصل نہیں ہوتی، تو اب ساتھ ہی یہ بیان فرمادیا "انہ لا خلاص لهم عنه بسبب النصره والاعانة والشفاعة" کہ بیشک کافروں کی نجات دردناک عذاب سے کسی مددگار، کسی معاون اور کسی شفاعت کرنے والوں سے بھی نہیں ہوگی۔ (کبیر)

پارہ چہارم

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ○ (آیۃ نمبر ۹۲)

(1) تم ہرگز بھلائی کو نہیں پہنچو گے جب تک راہ خدا میں اپنی پیاری چیز خرچ نہ کرو، اور تم جو کچھ خرچ کرو اللہ کو معلوم ہے۔ (کنزالایمان)

(2) تم ہرگز نہیں پاؤ گے (کامل) بھلائی کو یہاں تک کہ تم خرچ کرو اس چیز سے جسے تم پسند کرتے ہو، اور جو چیز تم خرچ کرو، تو بیشک اللہ اسے جاننے والا ہے۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں بیان فرمایا کہ کافر جو مال دنیا میں خرچ کریں خواہ وہ بطور صدقہ خرچ کریں، یا بطور صلہ رحمی، ان کا خرچ کرنا رب تعالیٰ کے حضور قبول نہیں ہوگا، کیونکہ ان کا ایمان نہیں، اسی طرح بالفرض آخرت میں اگر ان کو مال مل جائے اور وہ زمین بھر سونا خرچ کر دیں تو ان کا سونا قبول نہیں کیا جائے گا، اس آیۃ کریمہ میں مؤمنوں کو خرچ کرنے کی کیفیت بتائی جارہی ہے کہ انہیں آخرت میں اس سے زیادہ نفع حاصل ہوگا۔ (کبیر)

(تفصیل انشاءاللہ ساتھ ہی آرہی ہے)

مختصر مطلب:

تم ہرگز نہیں پاؤ گے (کامل) بھلائی کو یہاں تک کہ تم اس چیز کو خرچ کرو جسے تم پسند کرتے ہو، قرآن پاک میں کیا خوب فصاحت ہے، کتنا مختصر جملہ لیکن عظیم مطالب کو حاوی ہے، یعنی کامل بھلائی کو اس وقت تک حاصل نہیں کر سکو گے جب تک تم اللہ کی راہ میں اپنی پیاری چیز خرچ نہیں کرو گے۔

وہ پیاری چیز: انسان کا مال ہے، انسان اپنے مال سے محبت کرتا ہے، کسی مال کو اپنے لئے زیادہ نفع مند ہونے کی وجہ زیادہ پسند کرتا ہے، جب اللہ تعالیٰ کی راہ میں وہی پسندیدہ مال خرچ کرے گا تو کامل بھلائی حاصل کر لے گا۔

وہ پیاری چیز: اپنی اولاد بھی ہے، مؤمنین کو گویا کہ یوں بھی بتا دیا گیا ہے کہ تم کامل بھلائی اس وقت تک حاصل نہیں کر سکو گے جب تک اللہ کی راہ میں یعنی جہاد میں بوقت ضرورت تم اپنی اولاد قربان نہیں کرو گے، ہاں اگر تم نے اللہ کی راہ میں جہاد "فی سبیل اللہ" میں اپنی پیاری چیز یعنی اولاد کو خرچ کر دیا تو تم نے کامل بھلائی حاصل کر لی۔

وہ پیاری چیز: اپنا جاہ وجلال بھی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں اگر اپنا جاہ وجلال قربان کرنا پڑے تو وہ نہ قربان کرے تو کامل بھلائی حاصل نہیں کر سکے گا، کامل بھلائی اسی وقت حاصل ہوگی بوقت ضرورت اپنے جاہ وجلال کو قربان کر دے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات لوگوں تک پہنچانے میں لوگ اسے بھٹکا ہوا اور گمراہ کہیں تو بظاہر اس کا جاہ وجلال ضائع ہو رہا ہے، لیکن پیاری چیز ''جاہ وجلال'' اللہ کی راہ میں قربان کر دے اور یہ سمجھے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو بھی یوں کہا گیا۔

﴿قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهٖ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴾ (الاعراف آیۃ نمبر ۶۰)

''اس کی قوم کے سردار بولے بیشک ہم تمہیں کھلی گمراہی میں دیکھتے''

آپ نے یوں جواب دیا ﴿قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ (الاعراف آیۃ نمبر ۶۱)

''کہا اے میری قوم مجھ میں گمراہی کچھ نہیں، میں تو رب العالمین کا رسول ہوں۔''

اے مؤمن! اے عالم دین! اے طالب دین! تجھے بھی کوئی گمراہ کہے تو تو اپنے جاہ وجلال کو خیال میں نہ لا، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کو لوگوں تک پہنچانا جاری رکھ، ہاں یہود ونصاریٰ اور ان کے حواریین کو صرف یوں کہہ دے میں گمراہ نہیں، میں تو نائب رسول ہوں، تبلیغ دین کو جاری رکھوں گا'' جب لوگ تجھے بے وقوف اور جھوٹا کہیں، تو تجھے یہ یاد ہونا چاہیے کہ حضرت ہود علیہ السلام کو بھی یوں کہا گیا ﴿اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ﴾ ''بیشک ہم تمہیں بے وقوف سمجھتے ہیں، اور بیشک ہم تمہیں جھوٹوں میں گمان کرتے ہیں۔'' (اعراف آیۃ نمبر ۶۵)

آپ نے قوم کو یوں جواب دیا ﴿قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ (الاعراف آیۃ نمبر ۶۶)

''کہا اے میری قوم میں بے وقوف نہیں، میں تو پروردگار عالم کا رسول ہوں۔''

ہاں تو بھی اے مؤمن! اے عالم دین! اے طالب دین! اپنے ظاہری جاہ وجلال کو اللہ کی راہ میں قربان کرتے ہوئے یوں کہہ میں بے وقوف نہیں، میں جھوٹا نہیں، میں تو نائب رسول ہوتے ہوئے ''اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ارشاد لوگوں تک پہنچا رہا ہوں۔ ہاں اگر تجھے دیوانہ پاگل کہیں تو تو یہ نہ بھول کہ رسول اللہ ﷺ کو بھی پاگل اور دیوانہ کہا گیا ﴿وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ﴾ (الدخان آیۃ نمبر ۱۴) ''اور بولے سکھایا ہوا دیوانہ ہے۔''

قربان جاؤں رحمۃ اللعلمین پر، رب تعالیٰ نے آپ کی طرف سے یوں جواب دیا ﴿مَاۤ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ﴾ ''تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں۔'' ہاں اے مؤمن! اے عالم دین! اے طالب دین! تو

بھی یہ کہہ دے کہ میں پاگل، دیوانہ نہیں، مجھے تو انبیاء کرام کا وارث ہونے کی وجہ سے یہ القاب مل رہے ہیں، لیکن میں اپنی پیاری چیز اپنے ''جاہ وجلال'' کو اللہ تعالی کی راہ میں قربان کررہا ہوں تاکہ مجھے کامل بھلائی حاصل ہو جائے۔

وہ پیاری چیز تیری جان بھی:

اگر اللہ تعالی کی راہ میں جہاد کی ضرورت درپیش آئے تو تو اسے اللہ تعالی کی راہ میں قربان کرنے کے بغیر کامل بھلائی حاصل نہیں کر سکے گا۔ غرضیکہ انسان کے والدین، اقرباء، زوجہ، مکانات، زمین، باغات وغیرہ سب پیاری چیزیں ہیں، بوقت ضرورت ان کو اللہ تعالی کی راہ میں قربان کرنے سے دریغ نہ کیا جائے۔

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ﴾ "تم ہرگز نہ پاسکو گے (کامل) بھلائی۔"

"تنال" من نال نیلا اذا اصاب و وجد" ویقال نال العلم اذا وصل الیه واتصف به"

نال، ینال، نیلا" کا معنی ہوتا ہے کسی چیز تک پہنچنا، کسی چیز کو "پالینا" جیسا کہ کہا جاتا ہے "نال العلم" اس نے علم کو پالیا، وہ علم تک پہنچ گیا، وہ علم سے متصف ہو گیا۔ "البر" کے مختلف معانی ہیں "البر" الاحسان و کمال الخیر" "البر" کا معنی احسان" یعنی ہرگز تم احسان کو نہیں پاسکو گے یہاں تک کہ تم خرچ کرو اس چیز سے جو تمہیں پسند ہو" "البر" کا معنی کامل بھلائی" اب معنی یہ ہوگا" ہرگز نہیں پاؤ گے کامل بھلائی یہاں تک کہ خرچ کرو اس چیز سے جو تمہیں پسند ہو"

بھلائی کے ساتھ "کامل" کی قید کا فائدہ:

اصل میں اعتراض یہ ہوتا ہے کہ فقیر جسے ساری عمر مال نہ ملے اور وہ اپنا محبوب مال خرچ نہ کر سکے تو وہ بھلائی سے محروم رہے، یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ اور دوسرا اعتراض یہ تھا کہ رب تعالی نے جب یہ ارشاد فرمایا ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ﴾" جو شخص ذرہ بھر نیکی کا عمل کرے وہ اسے پالے گا" تو اس سے پتہ چلا کہ تھوڑا مال اور حقیر مال بھی خرچ کرنے کا فائدہ ہوگا، اور بھلائی کو پالے گا، تو پسندیدہ مال کے خرچ نہ کرنے سے بھلائی کی نفی کیسے درست ہے؟

اس کا جواب یہ دیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ﴾ الکامل" کہ ہرگز تم کامل بھلائی نہیں پاؤ گے یہاں تک وہ چیز خرچ کرو جو تمہیں پسند ہو، اگرچہ اس پر پھر اعتراض ہوتا ہے کہ یہ معنی بھی درست نظر آتا کیونکہ اس معنی کے لحاظ پر لازم یہ آئے گا کہ فقیر ہمیشہ کیلئے کامل بھلائی سے محروم رہے، یہ کس طرح درست ہے؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا" وقیل الاولی من هذا ان یقال ان المراد ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ﴾ علی الانفاق" کہ یہ خرچ کرنے سے مقید ہے،

اب مکمل مطلب یہ ہو گیا ''ہر گز تم کامل بھلائی نہیں پاؤ گے خرچ کرنے میں یہاں تک کہ اس چیز سے خرچ کرو جو تمہیں پسند ہو''یعنی تم تھوڑا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرو، اور جو مال تم خرچ کرو وہ تمہارا پسندیدہ نہ ہو تو پھر بھی تمہیں اس کا ثواب ملے گا،لیکن کامل بھلائی اگر تم اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے حاصل کرنی چاہتے ہو تو اپنا پسندیدہ مال اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ (ماخوذ از روح المعانی)

راقم کا اس مسئلہ میں موقف یہ ہے کہ ﴿حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ میں مال خرچ کرنے کی قید ہی نہیں۔اس لئے ہر شخص جس چیز کا مالک ہے اس میں سے پسند چیز اللہ کی راہ میں خرچ کرے تو کامل بھلائی پالے گا۔فقیر اپنی آسائش کا وقت اللہ کی راہ میں خرچ کرے، اپنی پسند قربان کر کے اللہ کو یاد کرے، اپنا آرام قربان کر کے اللہ کو یاد کرے لوگوں کی جھڑکیاں برداشت کر کے اپنا وقار قربان کر کے اللہ کو یاد کرے، اس کا یہی پسندیدہ چیز خرچ کرنا ہے۔

"البر" یعنی الجنة ""البر" کا معنی ابن عباس اور ابن مسعود اور مجاہد رضی اللہ عنہم نے ''جنت'' بیان کیا ہے ، وقال مقاتل بن حیان "التقوی" مقاتل بن حیان نے "البر" کا معنی تقوی بیان کیا ہے۔ **"وقیل الطاعة وقیل الخیر"** اور بعض حضرات نے کہا کہ "البر" کا معنی طاعت ہے، بعض نے کہا اس کا معنی خیر ہے

"وقال الحسن لن تکونوا ابرارا" حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ہر گز نیک نہیں بن سکو گے یہاں تک کہ خرچ کرو اس چیز سے جو تمہیں پسند ہو، لھذا سچ بولے، جھوٹ سے بچ جائے تو انسان نیکی پالیتا ہے، ابرار کی جماعت میں داخل ہو جاتا ہے۔

❁ **اخبرنا احمد بن عبدالله النعیمی انا ابو بکر احمد بن الحسن الحیری انا حاجب بن احمد الطوسی اخبرنا محمد بن حماد الصالحی قال اخبرنا ابو معاویة عن الاعمش عن شفیق عن عبدالله قال قال رسول الله ﷺ علیکم بالصدق، فان الصدق یهدی الی البر، وان البر یهدی الی الجنة، وما یزال الرجل یصدق ویتحری الصدق حتی یکتب عند الله صدیقا وایاکم والکذب فان الکذب یهدی الی الفجور، والفجور یهدی الی النار ومایزال الرجل یکذب ویتحری الکذب حتی یکتب عند الله کذابا"**

(معالم التنزیل للبغوی) (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت عبداللہ (بن مسعود) رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم پر لازم ہے کہ سچ بولو، بیشک سچ بولنا ہدایت دیتا ہے نیکی کی، اور بیشک نیکی ہدایت دیتی ہے جنت کی، اور جو شخص ہمیشہ سچ بولتا ہے اور سچ بولنے کی کوشش کرتا ہے اللہ تعالی کے ہاں اسے "صدیق" لکھ لیا جاتا ہے۔اور تم اپنے آپ کو جھوٹ سے بچا کر رکھو بیشک جھوٹ فجور کی

رہنمائی کرتا ہے، اور فجور آگ کی راہنمائی کرتا ہے، اور ہمیشہ ایک شخص جھوٹ بولتا رہتا ہے اور جھوٹ بولنے کی کوشش کرتا رہتا ہے، اسے اللہ تعالیٰ کے ہاں کذاب لکھ لیا جاتا ہے۔

"وقال الحسن کل انفاق یبتغی به المسلم وجه الله حتی الثمرة ینا ل به هذاالبر"

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں مسلمان جب خلوص سے اللہ تعالیٰ کی رضاء کیلئے مال خرچ کرتا ہے، تو جو کچھ بھی خرچ کرے یہاں تک کہ ایک پھل (ایک کھجور) بھی خرچ کرنے سے وہ کامل بھلائی حاصل کر لیتا ہے، کیونکہ خلوص سے خرچ کیا ہوا مال اس کا پسندیدہ مال ہے۔ (معالم التنزیل للبغوی)

❁ وقال عطاء ﴿لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ﴾ ای شرف الدین والتقوی حتی تتصدقو وانتم اصحاء اشحاء"

عطاء رحمہ اللہ فرماتے ہیں آیۃ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ ہرگز تم دین کی شرافت اور تقویٰ حاصل نہیں کر سکو گے یہاں تک کہ تم صدقہ کرو (یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرو) جب کہ تم صحیح ہو اور مال پر حریص ہو، (یعنی ایسے حال میں جبکہ انسان خود بھی مال کا محتاج ہو تو وہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرے گا تو وہ اپنا پسندیدہ مال خرچ کرے گا۔) (معالم التنزیل للبغوی)

(عطاء رحمہ اللہ کے اس قول میں "البر" کا معنیٰ "دین کی شرافت اور تقویٰ لیا گیا")

❁ عن النواس بن سمعان قال سالت رسول الله عن البر والالم فقال البر حسن الخلق والالم ماحاک فی صدرک وکرهت ان یطلع علیه الناس منک (رواہ مسلم)

حضرت نواس بن سمعان ﷛ فرماتے ہیں، میں نے رسول اللہ ﷺ سے نیکی اور گناہ کے متعلق پوچھا، تو آپ نے فرمایا "بر" (نیکی) یہ ہے کہ تم اچھی عادات رکھو، اور گناہ یہ ہے کہ وہ تمہارے سینہ میں کھٹکے (یعنی تمہیں گناہ کرنے کا خیال آئے) تو تم ناپسند سمجھو کہ لوگ تم پر مطلع ہو جائیں۔

"فعلی هذایکون المعنی علیکم بالاعمال الصالحة حتی تکونو ابرار اوتدخلوافی زمرة الابرار"

حدیث مذکورہ سے "البر" کا معنی جو واضح کیا گیا، اس سے آیۃ کریمہ کا مطلب یوں بھی بیان کیا جا سکے گا، "ہرگز تم نیک نہیں بن سکو گے یہاں تک کہ تم نیک عمل کرو" جب تم نیک عمل کرو گے تو ابرار بن جاؤ گے، اور اللہ تعالیٰ کے کامل تقرب کے حقدار (کامل ابرار) کے زمرہ میں داخل ہو جاؤ گے۔ (منقول از خازن)

❁ عن ابی هریرة قال اتی رسول الله ﷺ رجل فقال یارسول الله ای الصدقة افضل؟ قال ان تصدق وانت صحیح شحیح تخشی الفقر وتامل الغنی" (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت ابوھریرہ ﷛ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شخص آیا، اس نے کہا یا رسول اللہ کون سا

صدقہ افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ تم صدقہ کرو جو تم صحیح ہو اور اپنے مال پر بخیل و حریص ہو، تمہیں فقر کا ڈر ہو اور غنا کی امید ہو۔ (منقول از خازن)

بعض حضرات نے "البر" اور "الخیر" میں فرق بیان کیا ہے:

البر هو النفع الواصل الى الغير مع القصد الى ذلك والخير هو النفع مطلقاوان وقع سهوا وضدالبر العقوق وضدالخير الشر"

"البر" اس نفع کو کہتے ہیں جو غیر تک اپنے ارادہ سے پہنچائے" لیکن "الخیر" مطلقا نفع کو کہا جاتا ہے، غیر کو وہ نفع تو پہنچ جائے لیکن خواہ بھول کر اسے کوئی چیز دے دی، دینی اور کوئی تھی، تو اسے "الخیر" کہہ لیا جائے گا، لیکن "البر" نہیں کہا جائے گا "البر" کی ضد "العقوق" ہے، اور "الخیر" کی ضد "الشر" ہے۔ (روح المعانی)

بیان ذیشان:

اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ میں بیان فرمایا "ان من انفق مما احب کا ن من جملة الابرار" جو شخص اپنی پیاری چیز کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا ہے وہ ابرار (نیک لوگوں) سے ہو جاتا ہے۔ "ابرار" کی شان دوسری آیات میں یوں بیان فرمائی۔ ﴿اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ﴾ "بیشک نیک لوگ چین (نعمتوں) میں ہوں گے۔"

اس کے مقابل یہ ارشاد فرمایا ﴿وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ﴾ (اور بے شک بدکار ضرور دوزخ میں ہیں) اور ارشاد فرمایا ﴿اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا﴾ (سورۃ الدھر، آیۃ نمبر ۵)

"بیشک نیک، پئیں گے اس جام میں سے جسکی ملونی کافور ہے" اور ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ○ عَلَى الْاَرَآئِكِ یَنْظُرُوْنَ ○ تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِیْمِ ○ یُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍ ○ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ﴾ (المطففین)

بیشک نیکو کار ضرور چین میں ہیں، تختوں پر دیکھتے ہیں، تو ان کے چہرے میں چین کی تازگی پہچانے نتھری (خالص) شراب پلائے جائیں گے جو مہر کی ہوئی رکھی ہے، اس کی مہر مشک (خوشبو) پر ہے، اور اسی پر چاہئے کہ للچائیں للچانے والے۔

اور ارشاد فرمایا:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾ (سورۃ البقرہ، آیۃ نمبر ۱۷۷)

"کچھ اصل نیکی یہ نہیں کہ منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرو، ہاں اصل نیکی یہ ہے ایمان لائے اللہ اور قیامت اور فرشتوں اور کتاب اور پیغمبروں پر، اور اللہ کی محبت میں اپنا عزیز مال دے رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور راہ گیر اور سائلوں کو اور گردنیں چھوڑانے میں اور نماز قائم رکھے، اور زکوۃ دے، اور اپنا قول پورا کرنے والے جب عہد کریں اور صبر والے مصیبت اور سختی میں اور جہاد کے وقت یہی ہیں جنہوں نے اپنی بات سچی کی اور یہی پرہیزگار ہیں۔"

ان تمام آیات میں ابرار (نیک لوگوں) کے اجر وثواب کو ذکر کیا، اور آیۃ کریمہ ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ میں کمال بر (یعنی کامل بھلائی) کا ذکر فرمایا۔

نتیجہ یوں واضح ہوا، کہ جب تم اللہ کی راہ میں اپنی محبوب چیز خرچ کرو گے تو تم نیک ہوجاؤ گے، جب تم ابرار کی جماعت میں آجاؤ گے تو تم قیامت کے دن اللہ تعالی کی طرف سے چین اور نعمتوں میں ہو گے، اور تمہیں قیامت کے دن وہ پاکیزہ مشروب پلائے جائے گا جس میں کافور ملی ہوگی، اور ان کو تختوں پر بٹھایا جائے گا کہ وہ جنت کے نظارے کر رہے ہوں گے، ان کے چہروں پر چین کی تازگی نظر آرہی ہوگی، خالص پاکیزہ مشروب جس پر مہر لگی ہوگی وہ ان کو پلائی جائے گی، اس کی مہر خوشبو پر ہوگی، وہ ایسے لذت والے مشروب ہوں گے کہ ان کو دیکھ کر دوسرے للچانے والے للچارہے ہوں گے۔ خاص کر کے "لیس البر" آیۃ کریمہ میں بہت سے اعمال کو نیکی کے کام قرار دیا گیا ہے، لیکن اس زیر بحث آیۃ کریمہ ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ سے یہ ثابت کردیا "فانکم لا تفوزون بفضیلۃ البر حتی تنفقوا مما تحبون" کہ بیشک تم نیکی کی فضیلت کو حاصل کرنے میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتے جب تک تم اللہ کی راہ میں اپنی پسندیدہ چیز نہیں خرچ کرو گے۔

وھذا یدل علی ان الانسان اذا انفق ما یحبہ کان ذلک افضل الطاعات"

اس سے یہ واضح ہوگیا، کہ انسان کا اپنی محبوب اور پسندیدہ چیز اللہ کی راہ میں خرچ کرنا تمام عبادتوں سے افضل عبادت ہے۔

اعتراض: اس تمام بحث سے تو یہ پتہ چلا کہ جو شخص اللہ کی راہ میں اپنی پسندیدہ چیز خرچ کرتا ہے وہ کامل بھلائی حاصل کر لیتا ہے، وہ ابرار کی جماعت میں آجاتا ہے، اور جنت میں طرح طرح کی نعمتیں حاصل کرے گا، خواہ اور کوئی عبادت کرے یا نہ کرے، یہ کس طرح صحیح ہے کہ فرائض کا تارک صرف اپنی پسندیدہ چیز کو خرچ کر کے کامل بھلائی حاصل کر لے اور جنت کی نعمتوں کا مستحق ہو جائے۔

جواب: انسان اپنی پسندیدہ چیز کو اس وقت تک خرچ نہیں کر سکتا جب تک اسے یہ پتہ نہ ہو کہ وہ اس کے بدلے اعلیٰ چیز حاصل کرے گا۔ انسان دنیا کی چیز میں اسی وقت خرچ کرے گا جب اسے یہ یقین ہوگا کہ اس کے ذریعے آخرت کی سعادت حاصل ہوگی، اور آخرت کی سعادت کا اسی وقت اعتراف کرے جب وہ اللہ تعالیٰ جو صانع، عالم، قادر ہے اس کے وجود کا اقرار کرلے گا۔ جب وہ رب تعالیٰ کے وجود کا اقرار کرلے گا تو وہ خود بخود اپنے آپ کو مکلف سمجھے گا کہ مجھ پر واجب ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے اوامر کو ادا کروں، اور مجھ پر واجب ہے کہ میں نواہی سے اجتناب کروں۔

فاذاتاملت علمت ان الانسان لایمکنه الفاق الدنیاالااذا کان مستجمعالجمیع الخصال المحمودة فی الدین"

ابھی ہم نے جو بیان کیا اگر تو اس میں غور وفکر کرے تو تجھے پتہ چل جائے گا کہ بیشک انسان دنیا کا مال دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رضاء کی خاطر اس وقت خرچ ہی نہیں کر سکتا جب تک دین کے تمام فرائض اور مستحسنات پر عمل نہیں کرے گا، اور نواہی سے نہیں بچے گا۔ دنیاداری، دکھلاوہ، چرچا، نام روشن کرنا خرچ کرنے میں مقصود ہو تو وہ مال اللہ کی راہ میں خرچ کرنا بنتا ہی نہیں بلکہ وہ وبال جان بن کر رہے گا۔ (ماخوذ از کبیر)

مقام توجہ: جس مال کے خرچ کرنے کی فضیلت بیان کی جارہی ہے، اس سے مراد کیا ہے؟ اس میں بظاہر اہل علم کا اختلاف نظر آتا ہے کہ اس سے مراد زکوۃ اور صدقات واجبہ ہیں، یا اس سے مراد صدقات مستحبہ ہیں، راقم کا موقف اس میں یہ ہے کہ اس سے مراد صدقات واجبہ اور مستحبہ دونوں ہیں؛ اس لئے کہ جب حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا یہ قول مراد لیا جائے۔

"وقال الحسن کل شیء انفقه المسلم من ماله طلب به وجه الله فانه من الذین عنی الله سبحانه بقوله ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ حتی التمرة"

کہ مسلمان کوئی چیز بھی اپنے مال میں سے اللہ تعالیٰ کی رضاء حاصل کرنے کیلئے خرچ کرے وہ ان کامل نیک لوگوں میں شامل ہو جاتا ہے، جن کا تذکرہ رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی

تُنفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ میں ذکر کیا، یہاں تک کہ وہ اپنی محبت سے اللہ تعالیٰ کی رضاء کیلئے ایک کھجور بھی خرچ کرے گا تو وہ بھی یہ مقام حاصل کرلے گا۔

اسی کے ضمن میں راقم کے نزدیک حضرت ابن عباس ﷺ کا یہ قول "ارادبه الزکوة یعنی حتی تخرجوا زکوة اموالکم" (اس سے مراد زکوۃ ہے کہ تم اپنے مالوں کی زکوۃ ادا کرو) بھی آجاتا ہے۔ اب مطلب یہ گیا کہ (ہرگز تم کامل بھلائی نہیں پاؤ گے یہاں تک کہ تم خرچ کرو اس چیز سے جو تمہیں پسند ہو) خواہ وہ چیز تمہاری جانیں ہوں یا اولاد ہو، یا مال ہو، مال ہو تو عام ہے خواہ زکوۃ ہو، یا صدقہ فطر ہو، یا قربانی ہو، یا صدقات مستحبہ ہوں سب کو یہ آیۃ کریمہ شامل ہے۔ "واللہ اعلم بالصواب"

ابھی تک ذکر کردہ بحث کو بیضاوی میں دیکھئے:

(لَنْ تَنَالُوْا الْبِر)ای لن تبلغوا حقیقة البر الذی هو کمال الخیر ولن تنالوا بر الله الذی هو الرحمة والرضی والجنة(حَتّٰی تُنفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ)ای من المال اومایعمه وغیره کبذل الجاه فی معاونة الناس والبدن فی طاعة الله والمهجة فی سبیله"

(ہرگز تم بھلائی نہیں پاؤ گے) اس سے مراد یہ ہے کہ ہرگز تم اس نیکی کی حقیقت نہیں پاؤ گے جس میں کامل بھلائی ہے۔ یعنی حقیقی بھلائی وہی ہے جس میں کمال پایا جائے، اور اس کا مطلب یہ ہے "کہ ہرگز تم اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری کو نہیں پاؤ گے" وہ فرمانبرداری جو رحمت ہے، وہی رب کی رضاء ہے، وہی حصول جنت کا ذریعہ ہے ﴿حَتّٰی تُنفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ یہاں تک کہ خرچ کرو اس چیز سے جسے تم پسند کرتے ہو، یہ حکم عام ہے، مال اور غیر مال سب کو شامل ہے، لوگوں کی معاونت کیلئے اپنے مرتبہ (جاہ وجلال) کو خرچ کرنا بھی اسی میں شامل ہے، اور اللہ کی طاعت میں اپنی جان قربان بھی اسی میں داخل ہے، اور اپنے چہرے کے حسن و جمال اور اپنی آب وتاب کو اللہ کی راہ میں قربان کردینا بھی اس آیۃ کریمہ میں مذکور ہے۔ (بیضاوی)

کیا ہی شان ہے قرآن پاک کی جس نے ایک جملہ میں بے بہا خزانے اور بے حد سمندر سمودیے ہیں۔

﴿وَمَا تُنفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ﴾

"اور جو چیز تم خرچ کرو، تو بیشک اللہ اسے جاننے والا ہے۔"

یہاں علم کا ذکر فرما کر مراد ثواب کا عطاء کرنا لیا گیا ہے، اب تقدیر عبارت کی معنوی طور پر یہ ہوگی

"ومـاتنفقوا من شيء فان الله به يجازيكم قل ام كثر لانه عليم به لايخفي عليه شيء منه" اور جو چیز بھی تم خرچ کرو گے بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں جزاء دے گا، خواہ قلیل ہو یا کثیر ہو، اس لئے کہ وہ سب کچھ جانتا ہے، اور اس پر کوئی چیز مخفی نہیں۔

اور اس کا مطلب یہ ہے "انه تعالى يعلم الوجه الذى لاجله يفعلونه ويعلم ان الداعي اليه اهو الاخلاص ام الرياء ويعلم انكم تنفقون الاحب الاجود ام الاخس الارذل"

بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ مال خرچ کرنے والے کس وجہ سے خرچ کر رہے ہیں، وہ جانتا ہے کہ ان کو خرچ کرنے پر برانگیختہ کرنے والا اخلاص ہے یا ریاء (دکھلاوا) اور وہ جانتا ہے کہ خرچ کیا جانے والا مال عمدہ اور پسندیدہ ہے، یا گھٹیا اور رذیل مال ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

مطلب تقریباً مختصر یہ ہو گیا جسطرح کا مال، جس نیت سے خرچ کرو گے رب تعالیٰ اسی کے مطابق تمہیں جزاء دے گا کیونکہ وہ سب کچھ جانتا ہے، کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں۔

پسندیدہ مال رب کی راہ میں خرچ کرنے کی درخشاں مثالیں:

❁ اخرج مالك واحمد وعبد بن حميد والبخارى ومسلم والترمذى والنسائى وابن المنذر وابن ابى حاتم عن انس قال كان ابو طلحة اكثر انصارى بالمدينة نخلا وكان احب امواله اليه بيرحاء وكانت مستقبلة المسجد وكان النبى ﷺ يدخلها ويشرب من ماء فيها طيب فلما انزلت (لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ) قال ابو طلحة يارسول الله ﷺ يقول (لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ) وان احب اموالى الى بيرحاء وانها صدقة الله ارجو ابرها عندالله فضعها يارسول الله حيث اراك الله فقال رسول الله ﷺ بخ ذاك مال رابح ذلك مال رابح وقد سمعت ماقلت وانى ارى ان تجعلها فى الاقربين فقال ابوطلحة افعل يارسول الله فقسمها ابو طلحة فى اقاربه وبنى عمه"

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ابوطلحہ کی مدینہ طیبہ میں بہت کھجوریں تھیں، ان کا سب سے پسندیدہ مال ایک باغ تھا، جس کا نام "بیـرحـاء" تھا، جو مسجد کی قبلہ کی جانب تھا، نبی کریم ﷺ اس باغ میں تشریف لے جاتے تھے، اس میں ٹھنڈا، میٹھا پانی پیتے تھے، جب آیۃ کریمہ ﴿لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ نازل ہوئی، تو ابوطلحہ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ﴿لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ تو بیشک میرا سب سے پسندیدہ مال میرا باغ "بیـرحـاء" ہے، میں وہ اللہ کی راہ میں صدقہ کر رہا ہوں، مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس سے کامل

بھلائی عطاء فرمائے گا، اور میرے لئے اللہ تعالی کے اپنے ہاں وہ ذخیرہ بنائے گا، اس لئے یارسول اللہ ﷺ آپ اللہ تعالی کے ارشاد کے مطابق وہ باغ جسے چاہیں عطاء فرمادیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بڑی خوشی کا مقام ہے یہ تمہارے لئے، اور یہ مال تمہارے لئے نفع مند ہوگا، (پھر فرمایا) اور یہ مال تمہارے لئے نفع مند ہوگا۔ (ایک روایت کے مطابق آپ نے دومرتبہ فرمایا "بخ بخ") اور تحقیق میں نے سنا جو تم نے کہا ہے، اور بیشک میری رائے یہ ہے کہ تم یہ باغ اپنے قریبی رشتہ داروں پر تقسیم کردو، ابوطلحہ نے عرض نے کیا یارسول اللہ ﷺ میں یہی کرتا ہوں (جو آپ نے فرمایا ہے) تو آپ نے اپنے قریبی رشتہ داروں، اپنے چچا کے بیٹوں کو وہ دے دیا۔ (منقول از در منثور)

ابوداوٗد اور نسائی میں یہ بھی آتا ہے "**فقال رسول الله ﷺ اجعلها فی قرابتک فجعلها فی حسان بن ثابت و ابی بن کعب**" نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہ باغ اپنے قریبی رشتہ داروں کو دے دو تو انہوں نے حسان بن ثابت اور ابی بن کعب کو دے دیا (کیونکہ یہ ان کے رشتہ دار تھے) (منقول از در منثور)

طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"**بیرحاء**" اصل میں لفظ "بئر" (با، ہمزہ، راء ہیں) البتہ ہمزہ ساکن ماقبل مکسور کی وجہ سے "یاء" سے تبدیل کرنا بھی جائز ہے، قانون جوازی ہے اسلئے دونوں طرح استعمال ہو رہا ہے۔ اور یہ یاد رہے کہ "بئر حاء" مکمل نام ہے، بئر کی اضافت حاء کی طرف نہیں جیسے بئر ذروان اور بئر بضاعۃ میں اضافت پائی گئی ہے۔

اکثر محدثین کرام نے تو مد سے ہی اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔ تاہم زمخشری نے فائق میں اسے قصر سے لکھا ہے "بیرحی" بروزن فیعلی، یہ البراح سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے "منکشف ظاہر زمین" پھر اس کی حرکات میں "اختلف الفاظ المحدثین فیھا فیروونھا بفتح الباء و کسرھا معا و بفتح الراء وضمھا والمد فیھا والقصر" مختلف اقوال ہیں، ان کی مجموعی صورت جائز ہے، باء پر فتحہ پڑھیں یا کسرہ (زیر یا زبر) اور راء پر فتحہ پڑھیں یا ضمہ (زیر یا پیش) اور مد سے پڑھیں یا قصر سے۔

اسی طرح حدیث شریف میں "بخ" کا لفظ استعمال ہوا ہے جو مقام مدح اور رضاء میں استعمال ہوتا ہے، خاء کو سکون سے پڑھا گیا ہے، اور کسرہ اور تنوین سے بھی پڑھا گیا ہے۔ (از شیخ زادہ)

اور طلباء کرام یہ بھی توجہ فرمائیں ﴿مِمَّا تُحِبُّونَ﴾ میں "مما" اصل میں "من ما" ہے، نون کو میم میں ادغام کیا گیا ہے۔ (مظہری)

❁ واخرج عبد بن حمید والبزار عن ابن عمر قال حضرتنی هذه الآیة(لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ)فذکرت مما اعطانی الله فلم اجد شیأاحب الی من مرجانة جاریة لی رومیة فقلت هی حرة لوجه الله فلو انی اعود فی شیء جعلته لله لنکحتها فانکحها نافعا"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، جب یہ آیۃ کریمہ ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ میرے سامنے آئی، تو میں نے یاد کرنا شروع کیا کہ اللہ تعالی نے جو مال مجھے دے رکھا ہے اس میں سے زیادہ پسندیدہ چیز کیا ہے؟ میں نے ایسی پسندیدہ چیز کوئی اور نہ پائی جیسی میری رومیہ لونڈی مرجانہ تھی، میں نے کہا یہ اللہ تعالی کی رضاء کیلئے آزاد ہے، اب میں اس کی طرف نہیں لوٹوں گا، البتہ اللہ تعالی کی رضاء کیلئے اس کی مرضی سے نکاح کردوں گا، پھر آپ نے اپنے غلام نافع سے اس لونڈی کی اجازت سے نکاح کردیا۔ (از درمنثور)

❁ واخرج عبد الرزاق وابن جریر من طریق معمر عن ایوب وغیره انهاحین نزلت لن تنالوا البر الآیة جاء زید حارثة بفرس له کان یحبهافقال یارسول الله هذه فی سبیل الله فحمل علیهارسول الله ﷺ اسامة بن زید فکان زیداوجد فی نفسه فلمارای ذلک منه النبی ﷺ قال اماان الله قد قبلها"

معمر بن ایوب وغیرہ سے روایت ذکر کی کہ جب یہ آیۃ کریمہ ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ نازل ہوئی تو حضرت زید بن حارثہ ایک گھوڑی لائے جسے وہ بہت پسند کرتے تھے، عرض کیا یارسول اللہ یہ اللہ کی راہ میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے (وہ گھوڑی ان کے بیٹے کو دے دی) اس گھوڑی پر اسامۃ بن زید کو سوار کردیا، زید نے اپنے نفس میں گویا کہ کچھ محسوس کیا (انہوں نے سمجھا شائد میرا مال اللہ کی راہ میں قبول نہیں کیا گیا) جب نبی کریم ﷺ نے ان کی کیفیت کو دیکھا تو آپ نے فرمایا "خبردار بیشک اللہ تعالی نے اسے قبول کرلیا ہے" (منقول از درمنثور)

اس حدیث پاک میں ایک اور مسئلہ یہ سمجھ آیا کہ اگر صدقہ کرنے والا اپنی وسعت سے زیادہ اپنے نیک جذبات سے خرچ کردے تو صدقہ وصول کرنے والے اس سے وصول کرکے، اس کے بیٹے وغیرہ پر وہی چیز یا اس کی چیز جیسی کوئی چیز صدقہ کردیں، تاکہ اسے صدقہ کا ثواب بھی حاصل ہوجائے اور وہ مالی طور پر مجبور اور پریشان حال بھی نہ ہوجائے۔

❁ واخرج ابن جریر عن میمون بن مهران ان رجلا سأل اباذرای الاعمال افضل قال الصلوة عمادالاسلام والجهاد سنام العمل والصدقة شیء عجیب فقال یااباذرلقد ترکت شیأهو اوثق عملی فی نفسی لااراک ذکرته قال ماهو قال الصیام فقال قربة

ولیس هناو تلاهذه الآیة(لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْن)

ابن جریر نے میمون بن مہران سے روایت ذکر کی کہ ایک شخص نے حضرت ابوذر ؓ سے سوال کیا کہ اعمال میں سے افضل عمل کیا ہے؟ آپ نے فرمایا نماز اسلام کا ستون ہے، جہاد عمل کی کوہان (بلندی) ہے، اور صدقہ تو عجیب ہی چیز ہے، تو اس شخص نے کہا آپ نے کس چیز کو چھوڑ دیا جو میرے نزدیک بہت مضبوط عمل ہے، جو میں نے آپ کو ذکر کرتے ہوئے نہیں پایا، آپ نے فرمایا وہ کیا، اس نے کہا روزے، آپ نے فرمایا ہاں روزے بھی بڑی قربت کا ذریعہ ہیں، لیکن صدقہ کا عجیب چیز ہونا قرآن پاک کی آیۃ ﴿لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْن﴾ سے ثابت ہے۔ (منقول از در منثور)

❁ واخرج احمد فی الزهد و ابن المنذر و ابن ابی حاتم عن مجاهد قال قرأ ابن عمر وهو یصلی فاتی علی هذه الآیة(لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْن)فاعتق جاریة له وهو یصلی اشار الیها بیده"

حضرت مجاہد سے مروی ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نماز ادا کر رہے تھے، آپ جب اس آیۃ کریمہ ﴿لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْن﴾ پر پہنچے تو نماز پڑھتے ہوئے اپنے ہاتھ کے اشارہ سے اپنی لونڈی کو آزاد کر دیا۔ (منقول از در منثور)

روایت کے انداز سے کہ نماز میں اشارہ کیا سمجھ آتا ہے کہ روایت ضعیف ہے، اگرچہ اشارہ کرنا عمل قلیل ہے تاہم کراہیت سے خالی نہیں۔

❁ واخرج ابن المنذر عن نافع قال کان ابن عمر یشتری السکر فیتصدق به فنقول له لو اشتریت لهم بثمنه طعاما کان انفع لهم من هذا فیقول انی اعرف الذی تقولون ولکن سمعت الله یقول(لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْن)وان ابن عمر یحب السکر"

ابن منذر نے حضرت نافع سے روایت ذکر کی کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما شکر خرید کر صدقہ کرتے تھے، تو ہم کہتے کہ اگر آپ اسی رقم سے ان کو طعام خرید کر دے دیا کرو تو ان کیلئے زیادہ نفع ہو، تو آپ فرماتے میں آپ کی بات سمجھتا ہوں، لیکن میں نے رب تعالی کا ارشاد گرامی ﴿لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْن﴾ سنا ہے، بیشک حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما شکر پسند فرماتے تھے، (اس لئے شکر کو پسندیدہ چیز سمجھ کر اللہ کی راہ میں خرچ کرتے) (منقول از در منثور)

ام ولد ربیع بن خیثم بھی شکر پسند فرماتی تھیں، اسلئے گھر والوں کو سائل کو شکر دینے کا حکم فرماتیں، اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیز ؓ کو بھی شکر پسند تھی وہ بھی شکر خرید کر فقراء پر تقسیم کرتے تھے۔ (از قرطبی)

❁ واوی شبل عن ابی نجیح عن مجاهد قال کتب عمر بن الخطاب الی ابی موسی الاشعری ان یتاع لـه جاریة من سبی جلولاء یوم فتح مدائن کسری فقال سعد بن ابی وقاص فدعا بهاعمر فاعجبته فقال ان الله عزوجل یقول(لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْن)فاعتقها عمر رضی اللہ عنہ"

مجاہد فرماتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کسری کے شہر کے فتح ہونے کے دن حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کی طرف لکھا کہ جلولاء کے قیدیوں میں سے میرے لئے ایک لونڈی خرید لینا، سعد بن ابی وقاص فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب اس لونڈی کو اپنے پاس بلایا تو اس نے آپ کو تعجب میں ڈال دیا، یعنی آپ کو وہ بہت پسند آئی، تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ہے ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْن﴾ ہے، جس میں پسندیدہ چیز کے خرچ کرنے کے متعلق فرمایا گیا ہے، تو آپ نے وہ لونڈی آزاد کردی۔ (منقول از قرطبی)

❁ روی عن عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ انه كانت لزوجته جارية بارعة في الجمال وكان عمر راغبافيهاوكان قدطلبهامنهامرارافلم تعطه اياهاثم لماولي الخلافة زينتها وارسلتهااليه فقالت وهبتكهاياامير المؤمنين فلتخدمك قال من اين ملكتهاقالت جئت بهامن بيت ابي عبدالملك ففتش عن تملكه اياهافقيل انه كان على فلان العامل ديون فلماتوفي اخذت من تركته ففتش عن حال العامل واحضر ورثته وارضاهم جميعاباعطاء المال ثم توجه الى الجارية وكان يهواهاهوى شديدافقال انت حرة لوجه الله فقيل لم ياامير المؤمنين وقدازحت عن امرها كل شبهة قال لست اذا ممن نهى النفس عن الهوى"

روایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کی زوجہ کے پاس ایک لونڈی تھی جو بہت خوبصورت تھی، آپ اس کی طرف رغبت رکھتے تھے، کئی مرتبہ آپ نے اپنی زوجہ سے مطالبہ کیا کہ تم اپنی یہ لونڈی مجھے ہبہ کردو ،لیکن آپ کی زوجہ نے آپ کو نہ دی، جب آپ والئی خلافت بن گئے تو آپ کی زوجہ نے آپ کے پاس وہی لونڈی مزین کرکے بھیج دی کہ میں نے آپ کو یہ ہبہ کردی، اب آپ کی یہ خدمت کرے گی، آپ نے پوچھا تمہیں اس کی ملکیت کیسے حاصل ہوئی تھی؟ تو آپ کی زوجہ نے بتایا کہ میں یہ اپنے باپ عبدالملک کے گھر سے لائی تھی، آپ نے اس کی تفتیش کی کہ اس کا باپ کس طرح اس لونڈی کا مالک بنا تھا، تو پتہ چلا کہ فلاں عامل پر کچھ قرضے تھے اس کے فوت ہونے پر اس کے ترکہ سے عبدالملک نے شاہی قرضوں کے بدلے یہ لے لی تھی، آپ نے اس عامل کے حال کی تفتیش

کی پھر اس کے ورثاء کو بلا کر اس کو اس لونڈی کی قیمت دے کر راضی کر دیا، پھر آپ اس لونڈی کی طرف متوجہ ہوئے تو آپ کو اس سے شدید محبت ہوگئی، آپ نے اسے اللہ تعالی کی رضاء کیلئے آزاد کر دیا، آپ سے پوچھا گیا کہ یہ کیا وجہ ہے اسے آزاد کرنے کی حالانکہ آپ نے تمام شبہات کو دور کر دیا تھا یعنی عامل کے ورثاء کو قیمت دے کر رضاء مند کر دیا تھا، پھر آپ نے اسے آزاد کیوں کر دیا؟ "قال لست ممن نهى النفس عن الهوى" آپ نے فرمایا میں ان لوگوں سے نہیں جو اپنے نفس کو خواہشات سے روک لیتے ہیں، یعنی پسندیدہ چیز پاس ہو، پھر اپنے نفس کو اللہ تعالی کی رضاء اور اس کی یاد میں مشغول رہنے کی وجہ سے خواہشات سے روک رکھنا دشوار ہے، اور اپنی پسندیدہ چیز کو اللہ تعالی کی راہ میں خرچ کر دینا آسان ہے اور کامل بھلائی کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ (روح البیان)

✿ حضرت ربیع فالج کی مرض میں مبتلاء ہو گئے، آپ کے دروازے پر جب کوئی سائل آتا تو آپ اپنی زوجہ کو فرماتے کہ اسے شکر کھلا دو، کیونکہ آپ کو شکر پسند تھی، وجہ اس کی رب تعالی کا ارشاد ہی مدنظر تھا ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ حضرت ربیع کی بیماری لمبی ہوگئی، آپ کے دل میں مرغی کا گوشت کھانے کی رغبت ہوئی، چالیس دن تک تو آپ نے اپنی خواہش کو روکے رکھا، لیکن ایک دن اپنی زوجہ کو اپنی شدید رغبت کے متعلق بتا دیا کہ میں چالیس دنوں سے اپنی رغبت کو روک رہا تھا، لیکن آج خواہش کے غالب ہونے پر تمہیں بتا رہا ہوں کہ میں مرغی کا گوشت کھانا چاہتا ہوں، آپ کی زوجہ نے کہا "سبحان الله وای شئ هذا تكف نفسك عنه وقد احله الله تعالى" سبحان اللہ اس میں اپنے نفس کو اس خواہش سے روکنے کی کیا ضرورت تھی؟ جب کہ اللہ تعالی نے اسے حلال کر دیا ہے، آپ کی زوجہ نے بازار سے مرغی خرید کر پکا دی، جب آپ کے سامنے روٹی اور مرغی کا گوشت رکھا گیا، تو ایک سائل دروازے پر آ کر کہنے لگا "تصدقوا علی بارک الله فیکم" مجھے صدقہ عطاء کرو اللہ تمہیں برکت عطاء فرمائے، آپ نے کھانے سے ہاتھ ہٹا لیا، اور اپنی زوجہ کو فرمایا یہ روٹی اور گوشت سائل کو دے دو، آپ کی زوجہ نے کہا سبحان اللہ، اتنی خواہش پھر سائل کو دینے کا حکم یہ کیسے؟ آپ نے فرمایا بس وہی کرو جو میں تجھے حکم دے رہا ہوں، آپ کی زوجہ نے کہا کہ اس سے بہتر پر بھی عمل ہوسکتا ہے، آپ نے فرمایا وہ کیسے؟ اس نے کہا اس کھانے کی قیمت سائل کو دے دیں، "قال قد احسنت اء تنی بثمنه" آپ نے فرمایا بہت اچھا مشورہ تم نے دیا ہے، کھانے کی قیمت میرے پاس لاؤ، کھانے کی قیمت لائی گئی، آپ نے وہ رقم کھانے کے ساتھ رکھی اور فرمایا کہ یہ کھانا اور اس کی قیمت تمام ہی فقیر سائل کو دے دو، آپ کی زوجہ نے آپ کے حکم کے مطابق مکمل کھانا اور اس کی قیمت سائل کو دے دی،

سبحان اللہ! کیا ہی خوب ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ پر عمل کیا گیا۔

بہ احسانے آسودہ کردن دلے　　　　به از الف رکعت بهر منزلے

احسان کے ساتھ کسی دل کو آرام پہنچانا آسودہ حال کرنا　ہر منزل میں ہزار رکعت نماز ادا کرنے سے بہتر ہے۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است　　　　از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

دل کو ہاتھ میں لا کہ حج اکبر ہے　ہزاروں کعبہ سے ایک دل بہتر ہے۔یعنی تو کسی دل کو نہ ستا، کسی مسکین، فقیر، پریشان حال کی دل جوئی کر، یہ بھی حج اکبر کا ثواب رکھتا ہے۔

کعبہ بنیاد خلیل آزر است　　　　دل نظرگاہ جلیل اکبر است

کعبہ کی بنیاد حضرت خلیل اللہ نے رکھی جن کا چچا آزر ہے　دل رب جلیل کی نگاہ میں ہے جو سب سے بڑا ہے۔

"ویقال اذا کنت لاتصل الی البر الا بانفاق محبوبك فمتی تصل الی البار وانت ثو ثر علیه حظوظك"

کیا خوب بیان کیا ہے کہ جب تو اپنی محبوب چیز اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے بغیر کامل بھلائی حاصل نہیں کرسکتا تو تجھے چاہیے کہ تو یہ سمجھ لے کہ تو اسی وقت بار (اللہ تعالی کا اسم گرامی) تک پہنچ سکے گا جب تو اپنی خواہشات کو اس کی رضاء پر قربان کردے گا۔

"قال القشیری من اراد البر فلینفق بعض ما یحبه ومن اراد البارتعالی فلینفق جمیع مایحبه"

علامہ قشیری رحمہ اللہ نے بیان فرمایا جو شخص بھلائی حاصل کرنا چاہے وہ بعض محبوب چیزوں کو خرچ کرے، اور جو بارتعالی (اللہ تعالی) کو حاصل کرنے ،یعنی اس کا تقرب حاصل کرنے ،یعنی اس کا تقرب حاصل کرنے کا ارادہ رکھے تو اپنی تمام محبوب چیزوں کو اس پر قربان کردے۔

"قال القاشانی کل فعل یقرب صاحبه من الله فهو بر ولا یمکن التقرب الیه الابالتبری مماسواه فمن احب من دون الله شیافقد حجب به عن الله واشرک شرکاخفیالتعلق محبته بغیر الله"

قاشانی رحمہ اللہ نے فرمایا ہر فعل جو انسان کو اللہ تعالی کے قریب کردے وہ "بر" (بھلائی) ہے اللہ تعالی کا قرب اس وقت تک حاصل نہیں ہوگا جب تک اللہ تعالی کے سواء چیزوں سے بیزاری اختیار نہ کرے، جس نے اللہ تعالی کے سواء اور چیزوں سے محبت کی وہ اللہ تعالی سے اسے دور کردے گی، گویا کہ اغیار سے تعلق کی وجہ سے صوفیاء کرام اسے شرک خفی کہیں گے۔

ترا ہر چہ مشغول دارد ز دوست　　　　اگر راست خواہی دلا رامت اوست

ہر وہ چیز جو تجھے دوست سے دور رکھے　　اے دل اگر تو سچ پوچھے تو تو اس غیر چیز کا مطیع ہے۔

اگر یاری از خویشتن دم مزن کہ　　　　شرک است باریار و باخویشتن

اگر تجھے اپنے آپ سے محبت ہے تو رب تعالیٰ کی یاری کا دم نہ مار کہ یہ اپنے یار سے شرک ہے اور اپنے آپ سے دھوکا ہے۔ (ماخوذ از روح البیان)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِىٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسۡرَآءِيۡلُ عَلٰى نَفۡسِهٖ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تُنَزَّلَ التَّوۡرٰٮةُ‌ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِالتَّوۡرٰٮةِ فَاتۡلُوۡهَاۤ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ○ (آیۃ نمبر ۹۳)

(1) سب کھانے بنی اسرائیل کو حلال تھے مگر وہ جو یعقوب نے اپنے اوپر حرام کرلیا تھا توراۃ اترنے سے پہلے "تم فرماؤ" توراۃ لا کر پڑھو اگر سچے ہو۔ (کنز الایمان)

(2) تمام طعام حلال تھے بنی اسرائیل پر مگر وہ جو حرام کیے اسرائیل (یعقوب) نے اپنی ذات پر پہلے نازل ہونے توراۃ کے"، آپ فرمادو" تم توراۃ لے آؤ تو پڑھو اسے اگر تم سچے ہو۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

اس سے پہلی آیۂ کریمہ میں رب تعالیٰ نے مؤمنین کو خطاب فرمایا ﴿لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰى تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ﴾ "ہرگز تم بھلائی کو نہیں پاؤ گے یہاں تک کہ تم خرچ کرو اس چیز سے جو تمہیں پسند ہو" اس آیۂ کریمہ میں یہ ذکر کیا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت اسرائیل (یعقوب) علیہ السلام بہت شدید مریض ہوگئے، آپ کی بیماری لمبی ہوگئی، آپ نے اللہ تعالیٰ کیلئے نذمانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے بیماری سے عافیت عطاء فرمائی تو میں اپنے آپ پر محبوب کھانا اور پینا حرام کردوں گا، آپ کا محبوب کھانا اونٹ کا گوشت تھا، اور آپ کا محبوب مشروب اونٹنی کا دودھ تھا، آپ نے اپنے آپ پر ان چیزوں کو اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کیلئے اپنے آپ پر حرام کیا، (حدیث پاک کا عربی متن یہ ہے)

ونبی الله اسرائیل روی فی الحدیث "انه مرض مرضاشدیدافطال سقمه فنذرلله نذران عافاه الله من سقمه ان یحرم او لیحرمن احب الطعام والشراب الیه و کان احب الطعام الیه لحوم الابل واحب الشراب البانهافعل ذلک تقربا الی الله"

البحر المحیط میں اس حدیث پر حاشیہ میں یہ الفاظ ہیں "حدیث حسن ان شاء اللہ" بفضلہ تعالیٰ حدیث حسن ہے

پہلی آیۃ کریمہ اور اس آیۃ کریمہ میں وجۂ جامع یہ ہے۔

"ھذہ الآیۃ وما قبلھا فی ان کلامنھما فیما ترک مایحبہ الانسان وما یؤثرہ علی سبیل التقرب بہ للہ تعالی"

ان دونوں آیتوں میں یہ ذکر ہے کہ انسان اپنی محبوب چیز کو اللہ تعالی کی رضاء کی خاطر اللہ تعالی کی راہ میں قربان کردے تو اسے اللہ تعالی کا قرب حاصل ہوگا اور کامل بھلائی حاصل ہوگی۔

شان نزول اور مختصر مطلب:

قال ابوروق وابن السائب نزلت حین قال النبی ﷺ اناعلی ملۃ ابراھیم فقالت الیھود فکیف وانت تاکل لحوم الابل والبانھافقال ﷺ ذلک حلال لأبی ابراھیم ونحن نحلہ فقالت الیھود کل شئی اصبحناالیوم نحرمہ فانہ کان محرماعلیٰ نوح وابراھیم حتی انتھی الینا،فانزل اللہ تکذیبالھم"

ابوروق اور ابن سائب نے یہ فرمایا کہ آیۃ کریمہ کا شان نزول یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں ملت ابراہیم پر ہوں، تو یہود نے کہا یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ تم تو اونٹ کا گوشت کھاتے ہو، اور اونٹوں کا دودھ پیتے ہو، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہ چیزیں میرے باپ ابراہیم علیہ السلام پر حلال تھیں ہم بھی حلال سمجھتے ہیں، تو یہود کہنے لگے ہر چیز جو آج ہم پر حرام ہے وہ نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام پر بھی حرام تھیں، وہی حرمت ہم تک پہنچی ہے تو اس وقت ان کی تکذیب کیلئے یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی، یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو رب تعالی نے فرمایا ﴿قُلْ فَأْتُوْا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوْهَا اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ﴾ (اے محبوب)" آپ فرمادو تم توراۃ کو لے آؤ، پھر اسے پڑھو اگر تم سچے ہو" یعنی تم اپنی کتاب توراۃ میں سے ہی یہ نکال کردو کہ یہ چیزیں نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام پر حرام تھیں، اگر تم اپنے دعوی میں سچے ہو، لیکن وہ تو جھوٹے تھے توراۃ کو لا کر نہ پڑھ سکے۔ (البحر المحیط)

ایک طویل حدیث پہلے پارہ ﴿قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ﴾ کے بیان میں گزر چکی۔ مسند احمد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ یہود کے ایک وفد نے نبی کریم ﷺ سے چار سوال کئے، ان میں سے ایک سوال یہ تھا "اخبرنا ای الطعام حرم اسرائیل علی نفسہ" آپ ہمیں خبر دیں کون سا طعام حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر حرام کیا تھا؟

فقال انشدکم بالذی انزل التوراۃ علی موسی ھل تعلمون ان اسرائیل مرض مرضاشدیداوطال سقمہ فنذرللہ نذرالئن شفاہ اللہ من سقمہ لیحرمن احب الطعام

والشراب الیہ، وکان احب الطعام الیہ لحم الابل واحب الشراب الیہ البانھا"

تو آپ نے فرمایا میں تم سے اس ذات کی قسم دلا کر پوچھتا ہوں، کیا تم جانتے ہو کہ بیشک حضرت یعقوب علیہ السلام شدید مریض ہو گئے، اور آپ کی مرض لمبی ہو گئی، تو آپ نے اللہ تعالیٰ کیلئے نذر مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے اس بیماری سے شفاء دی تو میں ضرور بر ضرور اپنے آپ پر محبوب کھانا اور پینا حرام کر دوں گا، آپ کا محبوب کھانا اونٹوں کا گوشت تھا، اور آپ کا محبوب مشروب اونٹوں کا دودھ تھا۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"**الطعام**" بمعنی مطعوم ہے، یا تو اس سے مراد مطلقاً تمام مطعومات ہیں جو کھانے اور پینے کی تمام اشیاء کو شامل ہے، اور کبھی اس کا اطلاق صرف ماکولات یعنی کھانے کی چیزوں پر ہوتا ہے۔ (یہاں ماکولات اور مشروبات کھانے اور پینے کی تمام اشیاء کو شامل ہے) اور "الطعام" کا لفظ واحد اور جمع، سب کو شامل ہے۔ (روح المعانی)

"**الطعام**" پر الف لام جب استغراقی آئے تو اس وقت، اور لفظ "کل" اس پر داخل ہو تو یہ عام مطعومات کو شامل ہوتا ہے، ورنہ صرف "طـعـــام" عام نکرہ کا ہی حکم رکھتا ہے۔ یہاں عمومیت پر "استثناء" بھی دلیل ہے، کیونکہ ﴿اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسۡرَآءِیۡلُ عَلٰی نَفۡسِہٖ﴾ اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جب کہ ﴿کُلُّ الطَّعَامِ﴾ کا معنی "کل المطعومات" کریں، جیسا کہ ﴿اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا﴾ میں "الانسان" پر الف لام استغراقی ہے جو عموم افراد پر دلالت کر رہا ہے، جس سے "ایمان والوں" کو مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

اعتراض: طعام تو مردار کو بھی شامل ہے اور خنزیر کو بھی شامل ہے، کیا یہ چیزیں بھی حضرت یعقوب علیہ السلام پر حلال تھیں؟ یہ تو عقلاً بعید نظر آتا ہے۔

جواب: شانِ نزول سے یہ واضح ہو چکا ہے کہ مسئلہ ان چیزوں میں چل رہا تھا جو بنی اسرائیل پر حرام تھیں، وہ کہہ رہے تھے کہ یہ تو حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بھی حرام تھیں، تو نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا مقصد یہ تھا کہ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پر یہ چیزیں حرام نہیں تھیں بلکہ ان پر حلال تھیں، جو چیزیں ان پر حلال تھیں وہ تمام بعد میں بھی حلال رہیں، ہاں البتہ وہ چیزیں جو حضرت یعقوب علیہ السلام نے حلال چیزوں میں سے اپنے اوپر حرام کر دیں وہ ان پر حرام ہو گئیں۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿كَانَ حِلًّا لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ﴾

"**حل**" واحد، جمع، مذکر ومؤنث کو شامل ہے، اس کا معنی حلال ہونا، اترنا ﴿وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ﴾ "اترنے" کے معنی میں استعمال ہے، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت "کنت اطیب رسول اللہ ﷺ لحلہ ولحرمہ" (میں رسول اللہ ﷺ کیلئے حالت حلت (غیر احرام) میں اور حالت احرام میں خوشبو تیار کرتی تھی) میں "حلال ہونے" یعنی غیر محرم ہونے کے معنی میں استعمال ہے، اور ﴿لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ﴾ میں جمع کیلئے استعمال ہے۔ (البحر المحیط)

اعتراض: آیۃ کریمہ کے ظاہر سے یہ سمجھ آرہا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر اونٹوں کا گوشت اور دودھ حرام کرلیا تھا، آپ کے حرام کرنے سے حرام کیسے ہوگیا۔ جبکہ "ان التحریم والتحلیل انما یثبت بخطاب اللہ تعالی" حرام ہونا یا حلال ہونا تو اللہ تعالی کے ارشاد سے ثابت ہوتا ہے۔

جواب اول: یہ کوئی بعید بات نہیں کہ آپ کے حرام کرنے پر اللہ تعالی نے بھی آپ پر حرام کردیا ہو، یہ کہنا جائز ہے بندے نے اپنے آپ پر ایک چیز کو حرام کیا تو اللہ تعالی نے بھی اس پر حرام کردیا، جیسا کہ بندہ اپنی زوجہ کو اپنے آپ پر طلاق کے ذریعے حرام کرلیتا ہے تو اللہ تعالی بھی اس پر اس کی زوجہ حرام کردیتا ہے، اسی طرح بندہ جب لونڈی کو آزاد کرکے اپنے آپ حرام کرلیتا ہے تو رب تعالی بھی اس پر اس لونڈی کو حرام کردیتا ہے۔

جواب دوم: انه علیه الصلوة والسلام ربما اجتهد فادی اجتهاد الی التحریم فقال بحرمته"
نبی کریم ﷺ نے بسا اوقات اجتہاد کیا، آپ نے اپنے اجتہاد سے کسی چیز کو حرام کیا، تو اللہ تعالی کی طرف سے بھی وہ چیزیں حرام کردی گئیں، اسی طرح حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھی اپنے آپ پر اجتہاد سے محبوب کھانے اور پینے کی چیز کو حرام کیا تو اللہ تعالی نے بھی آپ پر حرام کردیا۔

انبیاء کرام کے اجتہاد کے جواز پر چند وجوہ:

(۱) رب تعالی نے ارشاد فرمایا: ﴿فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ﴾ (سورۃ الحشر، آیۃ نمبر۲)
"(تو عبرت لو اے نگاہ والو) اس میں اجتہاد کرنے کا ہی حکم دیا گیا۔"

"ولاشک ان الانبیاء علیهم السلام رؤساء اولی الابصار" یہ بھی یقینی بات ہے کہ انبیاء کرام "نگاہ والوں" کے رئیس ہیں، اسلئے آپ کا نظر کرنا، عبرت پکڑنا، اجتہاد کرنا دوسرے لوگوں کے اجتہاد سے افضل ہے۔

(۲) اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ" (سورۃ النساء، آیۃ نمبر ۸۳)
(تو ضرور ان سے اس کی حقیقت جان لیتے) حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مرادآبادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

مسئلہ ۱: مفسرین کرام نے فرمایا اس آیۃ کریمہ میں دلیل ہے جواز قیاس پر اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک علم تو وہ ہے جو نص قرآن وحدیث سے حاصل ہو، اور ایک علم وہ ہے جو قرآن وحدیث سے استنباط وقیاس کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔

مسئلہ ۲: یہ بھی معلوم ہوا کہ امور دینیہ میں ہر شخص کو دخل دینا جائز نہیں جو اہل ہو اس کو تفویض کرنا چاہیئے۔ (خزائن العرفان)

اس آیۃ کریمہ میں رب تعالیٰ نے مستنبطین (مجتہدین) کی مدح فرمائی "والانبیاء اولی بھذا المدح" اور انبیاء کرام اس مدح کے زیادہ مستحق ہیں۔ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿عَفَا اللّٰهُ عَنكَ لِمَ اَذِنتَ لَهُمْ﴾ (اللہ تمہیں معاف فرمائے تم نے انہیں کیوں اذن دے دیا)

اس آیۃ کریمہ سے بھی یہ واضح ہو رہا ہے، کہ نبی کریم ﷺ نے منافقین کو غزوہ سے واپس لوٹ جانے کی اجازت سے نص سے دی تھی بلکہ اجتہاد سے دی تھی "فلو کان ذلک الاذن بالنص لم یقل لم اذنت" اگر نص سے اجازت دی ہوتی تو آپ کو "لِمَ اَذِنتَ" نہ فرمایا جاتا، اس آیۃ کریمہ سے بھی نبی کریم ﷺ کا اجتہاد کرنا ثابت ہوا، ساتھ ہی اجتہاد کی فضیلت بھی ثابت ہوگئی۔

(۴) اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق سے بڑھ کر اس کی اطاعت کرنے والے انبیاء کرام ہیں، انبیاء کرام کا فعل، عظیم فعل ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے خاص مقام حاصل ہوتا ہے۔

"ولاشک ان استنباط احکام اللہ تعالی بطریق الاجتھاد طاعة عظیمة شاقة فوجب ان یکون للانبیاء علیھم الصلوة والسلام فیھا نصیب"

یہ یقینی بات ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے احکام میں استنباط واجتہاد اللہ تعالیٰ کی عظیم طاعت ہے، اس میں بہت مشقت پائی جاتی ہے، تو ضروری ہے کہ اس عظیم طاعت سے انبیاء کرام کو بہت بڑا حصہ عطاء کیا جائے، خصوصاً انبیاء کرام کو سب سے زیادہ معرفت حاصل ہوتی ہے، ان کی عقلیں سب سے زیادہ منور ہوتی ہیں، اور ان کے ذہن سب سے زیادہ صاف ہوتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی ان کو خصوصی تائید وتوفیق حاصل ہوتی ہے جو ان کو درست راہ پر قائم رکھتی ہے۔

"ثم اذا حكموا بحكم بسبب الاجتهاد يحرم على الأمة مخالفتهم في ذلك الحكم كما ان الاجماع اذا انعقد على الاجتهاد فانه يحرم مخالفته"

انبیاء کرام جب اجتہاد سے کسی مسئلہ پر حکم لگادیں تو امت پر ان کی مخالفت حرام ہو جاتی ہے، جیسا کہ اجتہاد پر اجماع منعقد ہو جائے تو اس کی مخالفت حرام ہو جاتی ہے۔

جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اونٹوں کے گوشت اور دودھ کو جو اپنے آپ پر حرام کیا تھا وہ اپنے اجتہاد سے کیا تھا، نص سے نہیں، اگر نص سے حرام کیا گیا ہوتا، تو یوں کہا جاتا "الا ماحرم الله على اسرائيل"، لیکن جب یہ نہیں کہا گیا بلکہ حرام کرنے کی نسبت حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرف کی گئی، ارشاد فرمایا ﴿اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَائِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ﴾ تو اس سے واضح ہو گیا کہ یہ فعل حضرت یعقوب علیہ السلام کے اجتہاد سے تھا۔ (ماخوذ از کبیر)

جواب سوم: الثالث يحتمل ان التحريم في شرعه كالنذر في شرعنا فكما يجب علينا الوفاء بالنذر كان يجب في شرعه الوفاء بالتحريم"

تیسرا جواب یہ ہے کہ احتمال یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی شریعت میں اگر کسی چیز کو اپنے آپ حرام کر لیا جاتا تو اسے حرام سمجھنا اور اس سے بچنا فرض ہو جاتا تھا، جیسا کہ ہماری شریعت میں نذر کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

اسی سے ایک سوال کا جواب خود بخود آ گیا کہ حلال چیز کو حرام کرنا منع ہے، جو کہ رب تعالی کے ارشاد سے واضح ہے ﴿يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ﴾ "اے نبی! کیوں حرام کرتے ہو وہ جو حلال کی ہے اللہ تعالی نے آپ کیلئے" تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر حلال چیزوں کو کیسے حرام کر لیا تھا؟ اس کا جواب یہ سمجھ آ گیا کہ ان کی شریعت میں یہ جائز تھا کہ کسی حلال چیز کو اپنے آپ پر حرام کر لیا جائے، لیکن ہماری شریعت میں منع ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

پہلی شریعتوں کے قوانین ان سے ہی سمجھے جائیں ان کو نبی کریم ﷺ کی شریعت پر قیاس نہ کیا جائے۔

جواب چہارم: ہوسکتا ہے کہ یہاں "تحریم" کا مجازی معنی لیا گیا ہو، کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو اونٹوں کا گوشت اور دودھ پسند تھے، طبیعت ان کی طرف مائل رہتی تھی تو آپ نے اپنے پر قہر کرتے ہوئے، نفس کو روکنے کیلئے نذر مان لی ہو کہ میں ان چیزوں کو استعمال نہیں کروں گا۔ حقیقی معنی یہاں نہیں کہ آپ نے واقعی اپنے آپ پر حلال چیزوں کو حرام کر دیا (لیکن راقم کے نزدیک یہ جواب ضعیف ہے کیونکہ دوسرے جوابات ظاہر کے مطابق ہیں)

(ماخوذ از کبیر)

علامہ رازی رحمہ اللہ کی ایک خوبصورت تحقیق:

اس مقام پر مفسرین کرام کی مختلف بحثیں ہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر جن چیزوں کو حرام کیا تھا، وہ بنی اسرائیل پر بھی حرام ہوگئی تھیں یا نہیں؟ کیا ایک مرتبہ ان پر حرام ہوئی تھیں یا دو مرتبہ؟ کبیر میں مختصر اور تحقیقی طور پر خوبصورت انداز پر اس مسئلہ کو ان الفاظ سے حل کیا گیا۔

ظاهر هذه الآية يدل على ان الذى حرمه اسرائيل على نفسه فقد حرمه الله على بنى اسرائيل، وذلك لانه تعالىٰ قال (كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِىٓ اِسۡرَآءِيۡلَ) فحكم بحل كل انواع المطعومات لبنى اسرائيل، ثم استثنى عنه ماحرمه اسرائيل على نفسه فوجب بحكم الاستثناء ان يكون ذلك حراما على بنى اسرائيل" واللہ اعلم

آیۂ کریمہ کا ظاہر اس پر دلالت کر رہا ہے کہ بیشک جن چیزوں کو حضرت اسرائیل (یعقوب) علیہ السلام نے اپنے آپ پر حرام کیا، وہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد (بنی اسرائیل) پر حرام کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِىٓ اِسۡرَآءِيۡلَ﴾ تمام کھانے (جو نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام پر حلال تھے) وہ حلال تھے بنی اسرائیل کیلئے۔ پھر اس سے مستثنیٰ کیا ﴿اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسۡرَآءِيۡلُ عَلٰى نَفۡسِهٖ﴾ (مگر وہ جو حرام کیا یعقوب نے اپنے آپ پر) استثناء کا تقاضا یہ ہے کہ وہ چیزیں بنی اسرائیل پر بھی حرام ہوں۔

﴿مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تُنَزَّلَ التَّوۡرٰٮةُ﴾ "پہلے نازل ہونے توراۃ کے۔"

مطلب یہ ہے کہ توراۃ کے نازل ہونے سے پہلے بنی اسرائیل پر تمام کھانے حلال تھے سوائے اس کے جو چیزیں حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر حرام کیں وہی بنی اسرائیل پر بھی اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیں۔

"اما بعد التوراة فلم يبق كذلك بل حرم الله تعالى عليهم انواعا كثيرة"

لیکن توراۃ کے نازل ہونے کے بعد حکم اس طرح نہ رہا بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان پر کثیر چیزوں کو حرام کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بنی اسرائیل جب کوئی عظیم جرم کرتے تو اللہ تعالیٰ ان پر کئی حلال چیزوں کو حرام کر دیتا تھا، ان پر ہلاکت اور عذاب کو مسلط کر دیتا تھا۔

اس مسئلہ پر ارشاد باری تعالیٰ دیکھئے:

﴿فَبِظُلۡمٍ مِّنَ الَّذِيۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا عَلَيۡهِمۡ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتۡ لَهُمۡ﴾ (سورۃ النساء، آیۃ نمبر ۱۶۰)
"بوجہ ظلم کرنے یہودیوں کے حرام کر دیں ہم نے ان پر بعض پاکیزہ چیزیں جو حلال تھیں ان کیلئے"

اور رب تعالی کا ارشاد گرامی دیکھئے:

﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِىْ ظُفُرٍ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَا اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَا اَوِ الْحَوَايَا اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ﴾ (سورة الانعام، آية نمبر ۱۴۶)

''اور یہودیوں پر ہم نے حرام کیا ہر ناخن والا جانور اور گائے اور بکری کی چربی ان پر حرام کی مگر جو ان کے پیٹھ میں لگی ہو، یا آنت یا ہڈی سے ملی ہو، ہم نے یہ ان کی سرکشی کا بدلہ دیا، اور بیشک ہم ضرور سچے ہیں۔''

﴿قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَا اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾

''آپ فرمادیں تو لے آؤ تم توراۃ تو اسے پڑھو اگر تم سچے ہو۔''

بنی اسرائیل قوم نے جب رسول اللہ ﷺ سے جھگڑا کیا اور دعوی کیا کہ جو چیزیں ہم پر حرام ہیں یہ تو پہلے سے ہی حرام چلی آرہی ہیں، کیونکہ نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام پر بھی یہ چیزیں حرام تھیں، بلکہ ان میں سے بعض نے کہا یہ تو آدم علیہ السلام کے زمانہ سے حرام چلی آرہی ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ان کی تکذیب کی کہ تم جھوٹے ہو، کیونکہ یہ چیزیں پہلے سے حلال چلی آرہی ہیں، صرف ان چیزوں کو ابتدائی طور پر حرام کیا گیا جو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر حرام کیں، تو انہوں نے کہا نہیں بات وہی صحیح جو ہم کہہ رہے ہیں، تو رب تعالی نے نبی کریم ﷺ کو حکم دے دیا کہ اے محبوب ''آپ ان کو فرمادو تم توراۃ لے آؤ، اسے پڑھو اگر تم سچے ہو'' (کبیر)

''فلم یأتوا بها و خافوا الفضیحة'' وہ توراۃ نہ لائے کیونکہ ان کو اپنے رسواء ہونے کا خوف تھا۔ (خازن)

یہ یقینی بات ہے کہ وہ توراۃ لاتے تو اپنے دعوی کو توراۃ سے ثابت نہ کرسکتے، اور ذلت و رسوائی کا انہیں سامنا کرنا پڑتا۔

فائدہ عظیمہ: حضرت یعقوب علیہ السلام نے جس بیماری سے شفاء حاصل کرنے کیلئے اپنے آپ پر اپنی محبوب چیزوں کو حرام کردیا تھا، وہ آپ کی بیماری "عرق النساء" کی تھی۔ ''عرق النساء'' وہ بیماری ہے جو ران سے درد شروع ہوتا ہے گٹنے یا قدم تک پہنچتا ہے، (المنجد) اس کا علاج ابن ماجہ شریف میں ذکر فرمایا گیا ہے۔

❁ حدثنا انس بن سيرين انه سمع انس بن مالك يقول سمعت رسول الله ﷺ يقول شفاء عرق النساء اليه شاة (اعرابية) تذاب ثم تجزا ثلاثة اجزاء ثم يشرب على الريق فى كل يوم جزء"

حضرت انس بن مالک فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا عرق النساء کی شفاء اس میں ہے کہ (عربی انسل) بھیڑ کی لاٹ (دم کی چکی) کو پگھلایا جائے، پھر اس (چربی) کے تین حصے کئے جائیں، پھر ہر روز (یعنی تین دن) نہار منہ اس کا ایک ایک حصہ پئے"

خیال رہے کہ تفسیر نعیمی میں "یشرب علی الریق" کا معنی کیا گیا ہے، پھر اس رگ میں جذب کر دیا جائے جسے ریق کہا جاتا ہے۔

❁ واخرج الثعلبی فی تفسیرہ ایضا "من حدیث انس بن مالک قال قال رسول اللہ ﷺ فی عرق النساء تؤخذ الیة کبش عربی لاصغیر ولا کبیر فتقطع صغارا فتخرج اھالتہ فتقسم ثلاثة اقسام فی کل یوم علی ریق النفس ثلاثا"

تفسیر ثعلبی میں یہ حدیث مذکور ہے، ترجمہ وہی ہے جو بیان ہو چکا ہے "اھالة" کا معنی پگھلائی ہوئی چربی "قال انس فوصفتہ لأکثر من مائة فبرأ باذن اللہ تعالی" حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں "میں نے ایک سو سے زائد آدمیوں کو یہی علاج بتایا، جنہوں نے اس پر عمل کر کے اللہ تعالی کے فضل وکرم سے شفاء حاصل کی۔ (ماخوذ از قرطبی)

شان نبوت:

نبی کریم ﷺ کا مطالبہ کرنا کہ تم توراۃ لاؤ اور اسے پڑھو، اپنا دعوی توراۃ سے ثابت کرو اگر تم سچے ہو، اس سے نبی کریم ﷺ کی شان عظیم واضح ہوئی کہ جس ذات نے کسی مدرسہ میں اور کسی معلم سے تعلیم حاصل نہیں کی، وہ چیلنج کر رہے ہے کہ تم جھوٹے ہو، تمہاری کتاب میں تمہارے دعوی پر کوئی دلیل نہیں، تو آپ کا یہ ارشاد گرامی آپ کی حقانیت پر دلالت کر رہا ہے۔ (ماخوذ از البحر المحیط)

کفار کے نظریات ہمیشہ ایک رہے:

وکان سبب نزول ھذہ الآیة ان الیھود انکروا تحلیل النبی ﷺ لحوم الابل لانھم لایرون النسخ جائزا فانزل اللہ ھذہ الآیة"

یہود نے نبی کریم ﷺ پر اعتراض کیا کہ تم اونٹوں کا گوشت کیوں حلال مانتے ہو، یہود احکام کے منسوخ ہونے کو نہیں مانتے تھے، تو رب تعالی نے اس آیۃ کریمہ کو نازل کر کے واضح کر دیا کہ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت میں یہ حلال تھا، حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر حرام کیا تو رب تعالی نے بھی بنی اسرائیل پر حرام کر دیا، اور ان کو بتایا کہ یہ مسئلہ توراۃ میں موجود ہے اگر تم سچے ہو تو توراۃ لاؤ اور پڑھو، جب ایک چیز کی

حلت منسوخ ہوگئی اور حرمت آگئی تو اب اس کی حرمت منسوخ ہوگئی اور حلت آگئی، یہ تو اللہ تعالی کی مرضی ہے جو چاہے کرے "وبین ذلک بطلان قولهم فی اباء النسخ اذ ماجاز ان یکون مبا حا فی وقت ثم حظر جازت اباحته بعد حظره " واضح ہوگیا کہ یہود کا نسخ کا انکار باطل ہے، بلکہ جائز ہے کہ اللہ تعالی ایک چیز کی کسی وقت اجازت دے اور کسی وقت منع کردے۔ (احکام القرآن للجصاص)

آج بھی باطل مذاہب والے قادیانی، نیچری وغیرہ نسخ کے قائل نہیں، کیا خوب یہود سے بھائی چارہ۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

فَمَنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ مِنْ بَعْدِذٰلِکَ فَاُولٰئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○(آیۃ نمبر ۹۴)

(1) تو اس کے بعد جو اللہ پر جھوٹ باندھے تو وہی ظالم ہے۔ (کنزالایمان)

(2) تو جنہوں نے گھڑا اللہ پر جھوٹ بعد اس کے، تو وہی ظالم ہیں۔ (نجوم الفرقان)

یعنی جب ان پر دلائل قائم کردئے گئے کہ اونٹوں کا گوشت اور دودھ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پر حرام نہیں تھے بلکہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر یہ حرام کئے بعد میں اللہ تعالی نے بنی اسرائیل پر بھی حرام کردئے، یہ مسئلہ توراۃ میں موجود ہے، اگر تم اپنے دعوی میں سچے ہو تو توراۃ لے آؤ، لیکن وہ رسوائی سے بچنے کیلئے توراۃ نہ لاسکے۔ اس آیۃ کریمہ میں یہ بیان فرمایا گیا کہ اگر ان دلائل کے قائم ہونے کے بعد بھی تم اپنے دعوی پر قائم رہے اور رب تعالی کی طرف تم نے جھوٹ منسوب کیا کہ یہ چیزیں تو اللہ تعالی نے حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پر حرام کی تھیں تو تم ظالم ہوجاؤ گے۔

﴿فَمَنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ﴾ "تو جنہوں نے گھڑا اللہ پر جھوٹ۔"

"الافتراء، اختلاق الکذب والفریۃ الکذب والقذف" "افتراء" کا معنی ہے جھوٹ گھڑنا، جھوٹ باندھنا، تہمت لگانا، "فریۃ" کا معنی جھوٹ اور تہمت ہے، اصل میں اس کا معنی ماخوذ ہے "فری الادیم" (چمڑا کاٹنا) سے، جھوٹ باندھنے کو "افتراء" اس لئے کہا جاتا ہے کہ کاذب (جھوٹا) بغیر تحقیق کے کلام (منقطع) یعنی جھوٹ گھڑلیتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿مِنۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ﴾ "بعد اس کے۔"

"ای من بعد ظهور الحجة بان التحريم انما كان من جهة يعقوب، ولم يكن محرما قبله"
(تو جنہوں نے گھڑا اللہ پر جھوٹ اس کے بعد) "اس کے بعد" کا مطلب کیا ہے؟ مطلب اس کا یہ ہے کہ جب دلائل سے ثابت کردیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر خود "اونٹوں کا گوشت اور دودھ" حرام کیا تھا، اس سے پہلے ان پر کوئی چیز حرام نہیں تھیں۔

﴿فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ﴾ "تو وہی ظالم ہیں۔"

یعنی حجت ودلائل حاصل ہونے کے بعد جنہوں نے اللہ تعالی پر جھوٹ باندھا تو وہی ظالم ہیں "یعنی اللہ تعالی کے عذاب کے مستحق ہیں، اس لئے کہ ان کا کفران کی اپنی جانوں پر ظلم ہے، اور ان لوگوں پر بھی ان کا ظلم ہے جن کو وہ گمراہ کررہے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

اعتراض: اللہ تعالی پر جھوٹ باندھنا تو ہمیشہ ظلم ہے "مِنۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ" یعنی حجت ودلائل کے بعد" کی قید کیوں لگائی؟

پہلا جواب: وانما قيد بالبعدية مع انه يستحق الوعيد بالكذب على الله تعالى فى كل وقت وفى كل حال للدلالة على كمال القبح"
یہ بات تسلیم ہے کہ اللہ تعالی پر جھوٹ مطلقا حرام ہے، اور اس سے انسان ہر وقت اور ہر حال میں عذاب کا مستحق ہوتا ہے لیکن جب کسی مسئلہ پر دلائل بھی حاصل ہوجائیں تو دلائل کے بعد نہ تسلیم کرنا اور اپنا من گھڑت اور غلط دعوی کرکے اللہ تعالی کی طرف منسوب کرنا یہ بہت ہی زیادہ برا طریقہ ہے، اور بہت بڑے عذاب کا مستحق ہونا ہے، اور بہت بڑا ظلم ہے۔

دوسرا جواب: وقيل لبيان انه انما يؤاخذ به بعد اقامة الحجة عليه ومن كذب فليس بمحجوج فيه فهو بمنزلة الصبى الذى لا يستحق الوعيد بكذبه، وفيه تأمل"
بعض حضرات نے بیان یہ کیا ہے کہ ﴿مِنۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ﴾ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ دلائل اور حجت کے حاصل ہونے کے بعد اللہ تعالی کی طرف جھوٹ باندھنا کہ یہ اللہ تعالی نے کہا ہے، حالانکہ اللہ تعالی نے نہیں کہا ہوتا" یہ عذاب کا سبب ہے، لیکن اگر کسی شخص نے جہالت کی وجہ سے کہہ دیا کہ "اللہ نے یہ کیا ہے" اور "اللہ تعالی نے یہ کہا ہے" حالانکہ وہ اللہ تعالی کا قول وفعل نہیں ہوتا، تو یہ شخص جس نے لاعلمی اور جہالت کی وجہ سے یہ کہہ دیا تھا، اس کے پاس دلائل نہیں آئے تھے وہ بچے کی طرح معذور سمجھا جائے گا، اسے کسی قسم کی گرفت نہیں ہوگی۔ لیکن اس جواب کے ضعیف

ہونے کی طرف "وفیہ تامل" (اوراس میں تامل (سوچ) ہے) سے اشارہ فرمادیا کہ بغیر تحقیق کے یہ کہہ دینا کہ یہ ''اللہ تعالیٰ کا ارشاد'' یہ بھی باعث عذاب ہے، وہ مقام ادب ہے جس کا پاس کرنا ضروری ہے۔ (ماخوذ از روح البیان)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

لفظ" مــن" میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ شرط ہو، اور دوسرا یہ کہ موصولہ ہو، ''وقــد روعــی لــفـظـهــا ومعناها" آیۃ کریمہ میں لفظ'' من '' اور معنی '' من '' دونوں کالحاظ کیا گیا ہے، کیونکہ ''لفظ من'' مفرد ہے، اور ''معنی من'' جمع ہے، عموم پر دلالت کررہا ہے، لفظ کا اعتبار کر کے'' افتــری " واحد کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے، اور اس کے معنی کا اعتبار کر کے " اولئك" اشارہ جمع '' هم '' ضمیر جمع " الظـالمون" جمع ذکر کئے گئے۔ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے مکمل مفرد والا معنی ذکر فرمایا، راقم نے معنی کا اعتبار کر کے مکمل جمع کا معنی کیا ہے، تاہم لفظوں کے ظاہر کو دیکھ کر یہ ترجمہ بھی درست ہے بلکہ لفظوں کے مطابق یہی ہے۔

''توجس نے جھوٹ باندھا اللہ پر اس کے بعد، تو وہی ظالم ہیں''

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (آیۃ نمبر ۹۵)

(1) تم فرمادو اللہ سچا ہے تو ابراہیم کے دین پر چلو جو ہر باطل سے جدا تھے اور شرک والوں میں نہ تھے۔ (کنزالایمان)

(2) آپ فرمادیں سچا ہے اللہ تو تابعداری کرو دین ابراہیم کی جو ہر باطل سے جدا تھے اور نہیں تھے مشرکوں سے۔ (نجوم الفرقان)

یہاں تین مطلب بیان کئے گئے ہیں، ایک یہ کہ نبی کریم ﷺ نے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا اے محمد ﷺ آپ فرمادیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو خبر دی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد پر جو محبوب طعام یعقوب علیہ السلام کے حرام کرنے پر حرام کردیا گیا، اللہ تعالیٰ نے اس کی خبر دی ہے، اللہ تعالیٰ سچا ہے، اسی سے یہ واضح ہوگیا "فــصــح

القول بالنسخ وبطل قول الیھود " کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشادات کو منسوخ فرماتا رہتا ہے، جو طعام پہلے حلال تھا وہ بنی اسرائیل پر حرام کیا گیا، پھر نبی کریم ﷺ پر حلال کر دیا گیا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سچا ہے یہ خبر دینے میں کہ اونٹوں کا گوشت اور دودھ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر حلال تھا، بعد میں حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر حرام کیا۔

تیسرا مطلب یہ ہے وہ اللہ تعالیٰ اس خبر میں صادق ہے کہ جو کھانے کی چیزیں حضرت ابراہیم علیہ السلام پر حلال تھیں، وہ بنی اسرائیل پر بھی حلال تھیں، کچھ چیزیں جو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے پر حرام کیں جو بنی اسرائیل پر بھی حرام کر دی گئیں، اور بعض طعام بنی اسرائیل کے گناہوں کی وجہ سے ان پر بطور سزا حرام کر دیئے گئے۔

"ففیه تعریض بکذب الیھود والمعنی ثبت ان الله تعالی صادق فیماانزل واخبر وانتم کاذبون یا معشر الیھود"

اس میں تعریضا (اشارۃ) یہود کے جھوٹ کو ذکر کر دیا گیا، معنی یہ ہے کہ ثابت ہے کے بیشک اللہ تعالیٰ اپنے کلام اور خبر میں صادق ہے اور اے یہود تم جھوٹے ہو۔ (خازن)

راقم کے نزدیک تینوں مطالب اس مختصر عبارت میں سمٹ کر آجاتے ہیں " آپ فرما دیجئے اللہ تعالیٰ سچا ہے تمہارا دعویٰ باطل ہے کہ یہ ارشاد جو ہم پر حرام ہیں وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بھی حرام تھیں، بلکہ ان پر حلال تھیں تم پر حرام ہیں، منسوخیت کا انکار کرنا درست نہیں۔

﴿فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا﴾ "تو تابعداری کرو دین ابراہیم کی جو ہر باطل سے جدا تھے۔"

یعنی اے یہود تم جو یہ کہتے ہو کہ ہمیں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے محبت ہے اور ہم ان کے دین پر ہیں، تمہارا یہ کہنا سراسر جھوٹ پر مبنی ہے، دین ابراہیم علیہ السلام تو دین اسلام ہے جس کی طرف نبی کریم ﷺ تمہیں بلاتے ہیں۔

(فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ) وھی ملة الاسلام التی علیھا محمد ﷺ ومن آمن معه حتی تتخلصوا من الیھودیة التی ورطتکم فی فساد دینکم ودنیاکم حیث اضطرتکم الی تحریف کتاب الله "

دین ابراہیم وہ دین اسلام ہے جس کی طرف حضرت محمد ﷺ دعوت دے رہے ہیں، جس نے آپ پر ایمان لایا، اس نے یہودیت سے چھٹکارا حاصل کر لیا، کیونکہ یہودیت نے تمہیں دین و دنیا کے فساد کی دلدل میں پھنسا دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں تحریف کرنے پر تمہیں یوں لگا دیا ہے جیسے کہ کوئی شخص

اضطراری حالت میں ہوتا ہے۔ (مدارک التنزیل للنسفی)

دین ابراہیم کے اوصاف:

وکان ملته انفاق المال علی الضیفان وبذل الروح عند الامتحان وتسلیم القربان وھذہ ملة الخلة"

آپ کے دین میں یہ چیزیں تھیں "مہمان پر مال خرچ کرنا اور امتحان کے وقت اپنی جان قربان کرنا، اور قربانی کو تسلیم کرنا" یہی چیزیں رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں بھی جاری رکھی گئیں۔ (روح البیان)

﴿حَنِیۡفًا﴾ "جو ہر باطل سے جدا تھے۔"

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ و تفسیر ابی السعود:

"حَنِیۡفًا" کا ترجمہ اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے کیا ہے "ہر باطل سے جدا" راقم نے بھی یہی نقل کیا ہے، آیئے تفسیر ابی السعود کو دیکھئے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ آپ کو اسی کے مطابق نظر آئے گا۔ "(حَنِیۡفًا) ای مائلا عن الادیان الزائغة کلھا" آپ تمام ٹیڑھے (باطل) دینوں سے اعراض کرنے والے (جدا) تھے۔ (تفسیر ابی السعود)

﴿وَمَا کَانَ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ﴾ "اور آپ مشرکوں میں سے نہیں تھے۔"

قرآن پاک کی عظمت کو دیکھیں یہ قلیل الفاظ کتنے عظیم معانی و مطالب کو حاوی ہیں۔

(۱) "(وَمَا کَانَ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ) ای فی امر من امور دینه اصلا وفرعا"

کہ ابراہیم علیہ السلام امر دین کے اصول اور فروع میں کسی ایک چیز میں بھی آپ مشرکوں کے ساتھ شریک نہیں تھے۔

(۲) "وفیه تعریض باشراک الیھود" ان مختصر الفاظ مبارکہ سے تعریضا (اشارۃ) یہ بھی سمجھ آ گیا کہ یہود دین کے امور میں مشرکوں کے ساتھ شریک تھے۔

(۳) "وتصریح بانه علیه السلام لیس بینه وبینھم علاقة دینیة قطعیة"

ان الفاظ گرامی سے واضح طور پر یہ بھی سمجھ آ گیا کہ یہود اپنے دعوی میں جھوٹے ہیں کہ ہم دین ابراہیمی پر قائم ہیں، ان کو تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین سے کوئی واسطہ نہیں۔

(۴) "والغرض بیان ان النبی ﷺ علی دین ابراهیم علیہ السلام فی الاصول لانه لایدعو الا الی التوحید والبراءة عن کل معبود سواه سبحانه"

ان مختصر الفاظ سے اصل مقصد بیان بھی واضح ہوگیا کہ نبی کریم ﷺ اصول دین میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر تھے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف اللہ تعالی کی توحید کی دعوت دی اور رب تعالی کے بغیر تمام باطل معبودوں سے آپ نے اعراض کیا، یہی کام نبی کریم ﷺ نے بھی کئے، تو پتہ چل گیا کہ اصول دین میں آپ دین ابراہیم پر تھے۔

(۵) "ولجملة تذییل لما قبلها" یہ مختصر جملہ ماقبل تمام مضمون کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے (تفسیر ابی السعود)

میرے **عزیز طلبہ کرام** ! "كُلُّ الطَّعَامِ" سے لے کر یہاں تک تمام ابحاث کو دیکھیں، اور خاص کر کے "وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ" کے ضمن میں چار وجوہ کو دیکھیں تو یہ پانچویں وجہ روز روشن کی طرح نکھر کر سامنے آئے گی۔

تین آیات سے حاصل ہونے والے فوائد جلیلہ:

نجم الدین رحمہ اللہ نے تاویلات میں ذکر کیا کہ بیشک اللہ تعالی نے مخلوق کو تین قسموں پر پیدا کیا۔ ایک قسم ان سے فرشتے روحانی، علوی، لطیف، اور نورانی مخلوق ہے، ان کی غذا ان کے مناسب ان کو عطاء کی گئی، وہ اللہ تعالی کا ذکر اور اس کی عبادت یعنی ان کو پیدا ہی عبادت کیلئے کیا گیا ہے۔

مخلوق کی دوسری قسم حیوانی، جسمانی، سفلی، کثیف، ظلمانی ہیں، ان کی غذا ان کے مناسب عطاء کی گئی، ان کی غذا چارہ ہے، ان کو پیدا ہی خدمت گزاری کیلئے کیا ہے، اور اس لئے کہ اس جہان میں یوں ہی کھانے، پینے میں وقت گذار کر چلے جائیں۔

مخلوق کی تیسری قسم انسان ہیں جو ملکی روحانی اور حیوانی جسمانی کا مرکب ہیں، یعنی ان میں فرشتوں والی حالت بھی ہے، اور حیوانوں والی بھی، ان کی غذا ان کے مطابق مقرر کی گئی ہے، ان کی روحانی غذا اللہ تعالی کا ذکر ہے، اور ان کی جسمانی غذا طعام ہے، اور ان کو عبادت اور معرفت کیلئے پیدا کیا گیا ہے۔

انسانوں کی ایک قسم یہ ہے:

﴿فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ﴾ ان میں سے بعض وہ ہیں جو اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں، یہ وہ ہیں جن کی

حیوانیت روحانیت پر غالب ہوتی ہے، وہ جسمانی غذا کھانے کی طرف ہی متوجہ رہتے ہیں، روحانی غذا کی طرف ان کی توجہ نہیں ہوتی، گویا کہ ان کی روح حقیقی مرجاتی ہے جس پر ملکی زندگی کی حیات موقوف تھی، اور ان پر حیوانیت غالب ہوجاتی ہے، یہ وہی ہیں جن کے متعلق رب تعالی نے فرمایا﴿اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ﴾ وہ لوگ چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں، (یہ درحقیقت کافرلوگ ہیں یا گناہوں پر ہمیشہ قائم رہنے والے)

مرد در پے ہر چہ دل خواہدت — کہ تمکین تن نور جاں کاہدت

دل کی ہر مراد کے پیچھے نہ چل — کہ تیرے جسم کے پالنے سے تیری جان کا نور کم ہوجائے گا۔

ز دوران پسی نامرادی بری — اگر ہر چہ باشد مرادت خوری

نفس کے پیچھے چلنے کے دوران تجھے نامرادی حاصل ہوگی جبکہ تیرا مقصد ہی (جانوروں کی طرح) صرف کھانا ہوگا

کند مرد را نفس امارہ خوار — اگر ہوشمندی عزیزش مدار

نفس امارہ انسان کو ذلیل کرتا ہے، — اگر تو عقلمند ہے تو اس کو عزیز نہ رکھ۔

دریغ آدمی زادہ پر محل — کہ باشد چو انعام بل ھم اضل

انسان کی بلند محلات پر اڑان ختم ہوجائے گی — وہ چوپاؤں کی طرح ہوگا، بلکہ اس سے بھی بھٹکا ہوا ہوگا۔

اور انسانوں کی دوسری قسم یہ ہے:

﴿وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ﴾ اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو میانہ روی پر ہوتے ہیں، یہ وہ لوگ ہوں گے، جن کی روحانیت اور حیوانیت برابر ہوں گی، ہر ایک کے مطابق اسے غذا حاصل ہوگی، وہ نیک عمل بھی کرتے ہیں اور ذکر وعبادت بھی ان کو حاصل ہوتے ہیں یہ ہے روحانیت، اور وہ کھاتے پیتے بھی ہیں خواہش سے، اور کبھی ان سے گناہ صغیرہ بھی سرزد ہوتے رہتے ہیں جو ان کی نیکیوں سے ختم ہوتے رہتے ہیں، اور کبھی ان سے برے اعمال گناہ کبیرہ کی شکل میں سرزد ہوتے ہیں، اللہ تعالی ان کو توبہ کی توفیق عطاء فرمادیتا ہے وہ توبہ کرتے ہیں ان کی توبہ کو قبول کرتے ہیں۔

ارشاد باری تعالی ہے:﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ﴾ (سورۃ ھود، آیہ نمبر۱۱۴)

''بیشک نیکیاں برائیوں کو مٹادیتی ہیں۔'' (ان برائیوں سے مراد صغائر گناہ ہیں)

اور رب تعالی کا ارشاد ہے:

﴿وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَیِّئًا عَسَی اللّٰهُ اَنْ یَّتُوْبَ عَلَیْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ (سورۃ التوبہ، آیۃ نمبر ۱۰۲)

''اور کچھ وہ ہیں جو اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں، انہوں نے ملا رکھے ہوتے ہیں، اچھے عمل اور برے، قریب ہے اللہ تعالیٰ ان کی توبہ کو قبول کر لے، بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔''

دینی طلباء کرام راقم کے ترجمہ کو دیکھ کر اعتراض نہ کریں کہ ماضی کے صیغوں کا ترجمہ مضارع والا کیوں کیا ہے یہ ترجمہ عموم الفاظ کا لحاظ کرتے ہوئے کیا گیا ہے، خصوصی مورد کا لحاظ نہیں کیا گیا۔

انسانوں کی تیسری قسم یہ ہے:

﴿وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ﴾ ''اور بعض ان میں سے وہ ہیں جو نیکیوں میں سبقت لے جاتے ہیں'' یہ وہ لوگ ہیں جن کی روحانیت حیوانیت پر غالب ہوتی ہے، وہ روحانیت کی غذا کو زیادہ حاصل کرتے ہیں، یعنی ذکر وعبادت میں ان کا وقت زیادہ گزرتا ہے، حیوانیت کی غذا وہ کم استعمال کرتے ہیں یعنی طعام صرف زندگی کو برقرار رکھنے کیلئے کھاتے ہیں، وہ حیوانوں کی طرح صرف کھانے کی تمنا نہیں رکھتے، ان کا نفس مرجاتا ہے اور روحانیت کو قوت و غلبہ حاصل ہوتا ہے، ان تمام قسموں کا ارشاد ان آیات سے مل گیا، کیونکہ جس طرح حضرت یعقوب علیہ السلام کے متعلق ذکر فرمایا، ﴿كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَىٰ نَفْسِهِ﴾ ''ہر کھانا بنی اسرائیل کیلئے حلال تھا مگر وہ جو یعقوب علیہ السلام نے اپنے نفس پر حرام کیا۔'' اسی سے یہ مسئلہ سمجھ آ گیا کہ اولیاء عظام پر حلال کھانے مباح تھے، لیکن انہوں نے اپنے آپ پر خواہشات کو ترک کرتے ہوئے زندگی کی بقاء تک کھانوں کو باقی رکھا، لذات کو چھوڑ دیا۔ ﴿فَمَنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ سے اشارہ ان لوگوں کی طرف مل گیا جو کھانے پینا ہی مقصد حیات سمجھتے ہیں، رب تعالیٰ سے دور رہتے ہیں وہ درحقیقت ظالم ہیں۔

﴿وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ سے تیسری قسم کی طرف اشارہ مل گیا کہ جس طرح ابراہیم علیہ السلام مشرکوں سے نہیں تھے ایسے ہی تم نیکیوں سے گناہوں کی شراکت نہ کیا کرو، اگر غلطی ہو جائے تو توبہ کرنا تاکہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو مٹا دے، اور یہ بتا دیا کہ ابراہیم علیہ السلام کی محبت کے دعویدارو! انہوں نے تو زندگی بھر مہمان نوازی کی، امتحان کے وقت اپنی جان کو قربان کرنے کیلئے آگ میں جانا پسند کر لیا، اور امتحان کے وقت بیٹے کو ذبح کرنے کیلئے پیش کر دیا تم بھی یہی راہ اختیار کرو تو اپنے دعویٰ میں سچے ہو گے کہ تمہیں ابراہیم علیہ السلام سے محبت ہے ورنہ تم اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہو گے، اور یہ فائدہ حاصل ہوا کہ انسان کو گویا کہ یوں کہا گیا کہ تو سب کو چھوڑ کر صرف مجھے ہی خلیل بنا۔

اگر جز بحق میرود جادہ ات　　　　در آتش فشانند سجادہ ات

اگر اللہ تعالیٰ کے غیر کی طرف تیرا راستہ گیا　　　تو آگ میں تیرا مصلی جھاڑ دیں گے۔

اتباع ملت ابراہیم کی علامت:

"فعلامة اتباع ملة ابراهيم هو الاطاعة للحق والتبرى من كل دين سوى الاسلام ومحبة الاولياء وعداوة الاعداء"

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کی علامت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مطیع ہو، اور سوائے دین اسلام کے باقی باطل دینوں سے دور ہو جائے، اور اولیاء کرام کی محبت اسے حاصل ہو، اور وہ رب تعالیٰ کے دشمنوں سے دور ہو۔

رب تعالیٰ کے قرب کیلئے دل میں خلوص ضروری ہے:

ولو كان المرء آتيا بجميع الطاعات وليس فى قلبه خلوص المحبة فانما يضرب حديدا باردا والله تعالى لايحب القلب المشرك بمحبة غيره من شهوة اوغيرها"

اگر انسان تمام طاعات کو لائے لیکن اس کے دل کی محبت میں خلوص نہ ہو تو وہ ٹھنڈے لوہا کوٹ رہا ہے، اللہ تعالیٰ کو وہ دل پسند نہیں جس میں اللہ کے بغیر کسی اور کی محبت ہو۔

حکایت: محمد ابن حسان رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں لبنان کے پہاڑوں میں پھر رہا تھا وہاں میں نے ایک جوان دیکھا جسے گرم ہوا کی لو نے جلا دیا ہے، وہ مجھے دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا، میں نے اسے کہا اے جوان مجھے کوئی نصیحت کرتا جا، اس نے کہا "احذره تعالى فانه غيور لايحب ان يرى فى قلب عبد سواه " اللہ تعالیٰ سے ڈرو، وہ غیور ہے، وہ پسند نہیں کرتا کہ بندے کے دل میں اس کے غیر کی محبت ہو۔　　(ماخوذ از روح البیان)

خیال رہے انبیاء کرام اور اولیاء کرام سے محبت رب تعالیٰ کے غیروں کی محبت نہیں، بلکہ اللہ والوں سے محبت ہے، اللہ والوں سے محبت حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی محبت ہی ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ O (آیة نمبر ۹۶)

(1) بیشک سب میں پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کو مقرر ہوا وہ ہے جو مکہ میں ہے برکت والا اور سارے جہان کا راہنما۔ (کنز الایمان)

(2) بیشک سب سے پہلا گھر جو بنایا گیا لوگوں (کی عبادت) کیلئے، وہ ہے جو مکہ میں ہے، برکت والا اور ہدایت دینے والا ہے سب جہان والوں کیلئے۔ (نجوم الفرقان)

شان نزول:

روایت کی گئی کہ جب قبلہ کعبہ کو بنالیا گیا تو یہود نے نبی کریم ﷺ کی نبوت میں طعن کیا، اورانہوں نے کہا بیشک بیت المقدس کعبہ شریف سے افضل ہے، اورزیادہ حق یہی ہے کہ قبلہ بیت المقدس ہی ہونا چاہیے کیونکہ بیت المقدس کعبہ سے پہلے بنایا گیا، اوروہ محشر کی زمین ہے، اوروہ انبیاء کرام کی ہجرت کا مقام ہے، اوروہ انبیاء کرام کا قبلہ ہے، وہ مقدس زمین میں ہے، اللہ تعالی نے اس میں تمام جہانوں کیلئے برکتیں رکھی ہیں، اس میں وہ پہاڑ ہے جس پر اللہ تعالی نے موسی علیہ السلام سے کلام کیا، اس لئے بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبہ کو قبلہ بنانا درست نہیں۔ یہود کے ان اقوال پر اللہ تعالی نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا، اوران کا رد فرمایا کہ تمہارے اقوال درست نہیں کیونکہ سب سے پہلے عبادت کیلئے بننے والا گھر کعبہ شریف ہے جو مکہ میں ہے، سب سے زیادہ برکتیں بھی اسی میں ہیں، اوریہی تمام جہانوں کیلئے ہدایت ہے۔ (روح البیان)

اس آیۃ کریمہ اوراگلی آیۃ کریمہ میں کعبہ شریف کی افضلیت کو اللہ تعالی نے تفصیل سے بیان فرمایا ہے، اس کی وضاحت انشاء اللہ بیان کی جارہی ہے۔

﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ﴾

"بیشک سب سے پہلا گھر جو بنایا گیا لوگوں (کی عبادت) کیلئے وہ ہے جو مکہ میں ہے۔"

روایات اوران میں تطبیق:

❁ اخرج ابن المنذر وابن ابی حاتم من طریق الشعبی عن علی بن ابی طالب فی قوله ان اول بیت وضع للناس للذی ببکة قال کانت البیوت قبله ولکنه کان اول بیت وضع لعبادة الله"

ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے شعبی کی روایت سے حضرت علی بن ابی طالب ﷺ کی روایت کو ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشادگرامی ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّةَ﴾ (بیشک سب سے پہلا گھر جو لوگوں کیلئے بنایا گیا وہ مکہ میں ہے) اس کو مطلب یہ ہے کہ عبادت کیلئے سب سے پہلے بننے والا گھر کعبہ شریف ہے جو مکہ میں ہے اگر چہ لوگوں کے رہائشی گھر اس سے پہلے بھی موجود تھے۔ (از درمنثور)

❁ **واخرج ابن جریج عن الحسن فی الآیة قال ان اول بیت وضع للناس یعبد الله فیه للذی ببکة"**

ابن جریج نے حسن سے اس آیہ کریمہ کے متعلق ذکر فرمایا کہ بیشک سب سے پہلا گھر لوگوں کیلئے جو بنایا گیا کہ لوگ اس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں وہ مکہ میں ہے۔ (از درمنثور)

❁ **واخرج ابن ابی شیبة واحمد وعبد بن حمید والبخاری والمسلم وابن جریر والبیهقی فی الشعب عن ابی ذر قال قلت یارسول الله ای مسجد وضع اول قال المسجد الحرام قلت ثم ای قال المسجد الاقصی قلت کم بینهماقال اربعون سنة"**

ابن ابی شیبہ اور احمد اور عبد بن حمید اور بخاری اور مسلم اور ابن جریر اور بیہقی نے شعب ایمان میں حضرت ابوذر (غفاری) ﷺ سے روایت ذکر کی آپ فرماتے ہیں میں نے کہا یارسول اللہ کونسی مسجد سب سے پہلے بنائی گئی؟ تو آپ نے فرمایا مسجد حرام، میں نے کہا پھر کونسی؟ آپ نے فرمایا پھر مسجد اقصیٰ، میں نے کہا ان دونوں کے درمیان کتنا عرصہ کا فرق ہے؟ آپ نے فرمایا چالیس سال۔ (از درمنثور)

❁ **واخرج ابن المنذر عن ابی هریرة قال ان الکعبة خلقت قبل الارض بالفی سنة وهی من الارض انما کانت حشفة علی الماء علیها ملکان من الملئکة یسبحان فلما اراد الله ان یخلق الارض دحاها منها فجعلها فی وسط الارض"**

ابن منذر نے حضرت ابوھریرۃ ﷺ سے روایت بیان فرمائی کہ کعبہ شریف کو زمین سے دو ہزار سال پہلے پیدا کیا گیا، جب کہ وہ پانی پر گول جزیرہ جھاگ کی صورت میں تھا، فرشتے اس کو تیراتے رہتے تھے، جب اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا زمین کو پیدا فرمانے کا تو اسے پھیلا دیا تو اسے وسط زمین میں رکھ دیا۔ (از درمنثور)

❁ **واخرج ابن جریر وابن المنذر والطبرانی والبیهقی فی الشعب عن ابن عمرو قال خلق الله البیت قبل الارض بالفی سنة وکان اذا کان عرشه علی الماء زبدة بیضاء وکانت الارض تحته کانها حشفة فدحیت الارض من تحته"**

حضرت ابن عمرو بن العاص فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو زمین سے دو ہزار سال پہلے پیدا کیا، جبکہ عرش پانی پر سفید

جھاگ کی صورت میں تھا، زمین اس کے نیچے چھوٹا سا گول جزیرہ نما تھی، اسی کے نیچے سے زمین کو پھیلایا گیا۔ (از در منثور)

❁ واخرج البیھقی فی الشعب عن ابن عباس قال قال رسول اللہ ﷺ اول بقعة وضعت فی الارض موضع البیت ثم مھدت منھا الارض وان اول جبل وضعه اللہ علی وجه الارض ابوقبیس ثم مدت منه الجبال"

بیہقی نے شعب ایمان میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کو ذکر فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک سب سے پہلے زمین کا ٹکڑا بیت اللہ شریف کی جگہ رکھا گیا، پھر اسی سے زمین کو پھیلایا گیا، اور بیشک پہلا پہاڑ اللہ تعالیٰ نے زمین پر ابوقبیس رکھا پھر اس سے اور پہاڑ پھیلا دیئے گئے۔ (از در منثور)

روایات میں بظاہر اختلاف:

ایک روایت میں آرہا ہے کہ کعبہ شریف کو زمین سے دوہزار سال پہلے پیدا کیا گیا، اور دوسری روایت میں آرہا ہے کہ کعبہ شریف اور بیت المقدس میں چالیس سال پائے جاتے ہیں، ان میں تطبیق کیسے پائی جائے، بظاہر تو تعارض نظر آتا ہے۔

وجۂ تطبیق: ایک ہے کعبہ شریف کی ابتدائی تخلیق وہ یہ ہے کہ پہلے تمام پانی تھا، پانی پر ایک جھاگ پیدا کی گئی جو گول تھی، بہت چھوٹا سا ایک جزیرہ نظر آنے لگا، اسی جھاگ کو زمین کے وسط میں رکھا گیا، اور وہاں سے ہی زمین کو پھیلایا گیا، یہ کعبہ شریف کی جگہ ہے جہاں سے زمین کو پھیلایا گیا، جھاگ زمین کی تخلیق اور پھیلاؤ سے دوہزار سال پہلے پیدا کی گئی، یہ کعبہ شریف کی جگہ کی تخلیق ہے، پھر کعبہ شریف حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ میں تعمیر ہوا۔ چالیس سال کا فاصلہ کعبہ شریف کی اس تعمیر کی بات ہے جو ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر فرمایا، اور بیت المقدس کی اس تعمیر کی بات ہے جو حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے کی، ورنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کعبہ شریف کی تعمیر اور بیت المقدس کی تعمیر جو حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے کی ان میں بہت زیادہ فاصلہ پایا گیا۔ اگرچہ اسی سؤال کا جواب "کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کعبہ شریف کی تعمیر اور حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی بیت المقدس کی تعمیر میں تو بہت زیادہ فاصلہ ہے، رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کہ چالیس سال کا فرق ہے، یہ کیسے صحیح ہے؟

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے یوں جواب دیا:

"واجیب بان الوضع غیر البناء والسؤال عن مدة مابین وضعیھما لاعن مدة مابین بناء یھما"

اس کا جواب یہ دیا گیا کہ:

" وضع " اور چیز ہے، اور "بناء" (تعمیر) اور چیز ہے، نبی کریم ﷺ سے سؤال وضع کے متعلق تھا "بناء" کے متعلق سؤال نہیں تھا، اس لئے آپ نے جو چالیس سال کا ذکر فرمایا اس سے مراد کعبہ شریف کی جگہ کی تخلیق اور بیت المقدس کی جگہ کی تخلیق ہے، جن کے درمیان چالیس سال کا فاصلہ ہے۔ تاریخ کعبہ تفصیلی طور پر پہلے پارہ نجوم الفرقان کی جلد سوم میں بیان ہو چکی ہے، تاہم اختصار کے طور روح المعانی کے ان الفاظ کو مدنظر رکھا جائے۔

"وحکی ان بناء الملائکة له کان من یاقوته حمراء ثم بناء آدم ثم شیث ثم ابراهیم ثم العمالقة ثم جرهم ثم قصی ثم قریش ثم عبد الله بن الزبیر ثم الحجاج"

بیان کیا گیا ہے کہ کعبہ شریف کو ملائکہ نے سرخ یاقوت سے بنایا، پھر آدم علیہ السلام نے تعمیر کی، پھر شیث علیہ السلام پھر ابراہیم علیہ السلام نے پھر قبیلہ عمالقہ نے پھر جرہم قبیلہ نے، پھر نبی کریم ﷺ کے اجداد سے قصی نے، پھر قریش نے، پھر عبداللہ بن زبیر نے، پھر حجاج نے تعمیر کی۔ (روح المعانی)

"بکه" کی وجہ تسمیہ:

بک یبک (ن) مزاحمت کرنا "تباک القوم" لوگوں کا بھیڑ کرنا، ہجوم کرنا (المنجد) اس معنی کی مناسبت سے مکہ شریف کو بکہ کہنے کی وجہ پر یہ روایات دلالت کر رہی ہیں۔

❁ **"واخرج سعید بن منصور وابن جریر والبیهقی فی الشعب عن مجاهد قال انماسمیت بکة لان الناس یتباکون فیها الرجال والنساء یعنی یزدحمون"**

سعید بن منصور اور ابن جریر اور بیہقی نے شعب ایمان میں مجاہد کی روایت نقل کی کہ مکہ شریف کو بکہ اس لئے کہا گیا ہے کہ وہاں جانے اور طواف وغیرہ میں مرد اور عورتیں ازدحام کرتے ہیں۔ (از درمنثور)

(بھیڑ کرتے ہیں، ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں) "بک یبک بکا" کا اور معنی ہے "پھاڑنا، فسخ کرنا" (المنجد) اس معنی کے لحاظ پر ایک اور روایت دیکھئے۔

❁ **واخرج ابن ابی حاتم عن محمد بن زید بن مهاجر قال انماسمیت بکة لانها کانت تبک الظلمة"**

ابن ابی حاتم نے محمد بن زید بن مہاجر سے روایت نقل کی کہ مکہ کو بکہ اس لئے کہا گیا ہے کہ جن لوگوں نے ظلم کے طور پر کعبہ شریف کو برباد کرنے کی کوشش کی ان کو تباہ و برباد کر دیا (یعنی چیر پھاڑ دیا)

اس معنی کو علامہ بیضاوی نے خوبصورت انداز میں یوں تحریر کیا "اومن بکها اذادقه فانها تبک اعناق

الجبابرۃ ''بکہ کہنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ "بکھا" سے معنوی طور پر ماخوذ ہے، جس کا معنی ہے توڑ دینا، یہ بھی جابروں اور ظالموں کی گردنوں کو توڑ دیتا ہے اس لئے اسے "بکہ" کہا گیا۔ (بیضاوی)

"تدقهالم یقصدها جبار الاقصمه الله عز وجل" جن جابروں اور ظالموں نے ارادہ کیا کعبہ شریف کو نقصان پہچانے کا اللہ تعالیٰ نے ان کی گردنوں کو توڑ دیا۔ بظاہر اس پر یہ وہم پیش کیا گیا کہ حجاج نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو مسجد حرام میں روک لیا تھا، جبل ابی قبیس پر منجنیق نصب کئے، اور وہاں سے پتھروں کے گولے برسائے گئے جو مسجد حرام میں گرے، مسجد حرام کو نقصان پہنچا لیکن حجاج بن یوسف کی گردن نہیں ٹوٹی، تو یہ کہنا کیسے درست ہے کہ "بکہ" جابروں کی گردنوں کو توڑ دیتا ہے؟ اس کا جواب یہ دیا گیا:

"فلیس ذلک اضرار بالبیت وقصدا بالسوء لان مقصود الحجاج کان اخذ عبدالله"

کہ حجاج بن یوسف کا مقصد بیت اللہ شریف کو نقصان پہچانا نہیں تھا، بلکہ اس کا مقصد حضرت عبداللہ بن زبیر کو پکڑنا تھا، اگر وہ بیت اللہ شریف کو نقصان پہچانے کا ارادہ رکھتا تو اس کی گردن کو وہیں توڑ دیا جاتا۔

(از روح البیان)

مقام توجه!

کعبہ شریف اور اس کے متصل ارد گرد کو "بکہ" کہا گیا ہے اور باقی مقامات کو مکہ کہا گیا ہے، اس پر چند روایات ملاحظہ ہوں۔

❁ واخرج ابن ابی شیبة وعبد بن حمید وابن ابی حاتم عن عکرمة قال البیت وماحوله بکة وماوراء ذلک مکة"

حضرت عکرمہ ﷛ فرماتے ہیں بیت اللہ شریف اور اس کا ارد گرد "بکة" ہے، اور اس کے سواء مقامات مکہ ہیں۔ (از درمنثور)

❁ واخرج سعید بن منصور وعبدبن حمید وابن ابی شیبة وابن جریر وعن ابی مالک الغفاری قال بکة موضع البیت ومکة ماسوی ذلک"

ابو مالک غفاری فرماتے ہیں بیت اللہ شریف کے مقام کو "بکہ" کہا جاتا ہے، اور اس کے سواء مقامات کو مکہ (از درمنثور)

❁ واخرج ابن حریر عن ابن شهاب قال بکة البیت والمسجد ومکة الحرم کله"

حضرت ابن شہاب کی روایت میں یہ ہے کہ بیت اللہ شریف اور مسجد حرام بکة ہیں اور باقی تمام حرم مکہ ہے۔ (از درمنثور)

❁ واخرج عبد بن حمید عن مجاهد قال بکة الکعبة ومکة ماحولها"

حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ کعبہ شریف کو بکہ کہا جاتا ہے، اور اس کے سواء باقی مقامات مکہ ہیں۔ (از درمنثور)

راقم کی سوچ میں ابتدائی طور پر تو صرف بیت اللہ شریف یا مسجد حرام کو ہی بکہ کہا گیا، اور اس کے سواء مقامات کو مکہ کہا گیا، پھر عرف عام میں زیادہ مقام پر بکہ بولا جانے لگا، اس پر ایک اور روایت دیکھئے۔

❁ **واخرج ابن ابی حاتم عن ابن عباس قال مکة من الفج الی التنعیم وبکة من البیت الی التنعیم"**

حضرت ابن عباس ﷺ فرماتے ہیں کہ مقام فج سے لے کر مقام تنعیم تک مکہ ہے، اور مقام تنعیم سے لے کر بیت اللہ شریف تک بکہ ہے۔ (از درمنثور)

اور راقم کی سوچ یہ ہے کہ بعد میں عرف عام میں مکہ اور بکہ میں کوئی فرق نہیں کیا گیا، پورے شہر کو مکہ بھی کہا گیا اور بکہ بھی کہا گیا، اس پر ایک روایت مشاہدہ ہو۔

❁ **واخرج ابن جریر عن الضحاک قال بکة هی مکة"**

ابن جریر نے ضحاک سے روایت کیا ہے کہ بکہ وہ مکہ ہی ہے۔ (از درمنثور)

یعنی بکہ اور مکہ ایک ہی شہر کے نام ہیں، راقم نے اپنی سمجھ کے مطابق محاکمہ تیار کر دیا ہے۔ "واللہ اعلم بالصواب"

"بکہ بمعنی ہجوم کرنا" کے مطابق اور روایات:

❁ **واخرج ابن ابی شیبة وعبد بن حمید والبیهقی عن مجاهد قال انماسمیت بکة لان الناس یبک بعضهم بعضافیهاوانه یحل فیهامالا یحل فی غیرها"**

ابن ابی شیبۃ اور عبد بن حمید اور بیہقی نے مجاہد سے روایت نقل کی کہ بکہ اس لئے نام رکھا گیا کہ بعض لوگ بعض پر ہجوم کرتے ہیں، کیونکہ اس میں بعض وہ کام جائز ہو جاتے ہیں جو دوسری جگہ پر جائز نہیں ہوتے۔ (از درمنثور)

❁ **قال قتادہ رأیت محمد بن علی الباقر یصلی فمرت امرأۃ بین یدیه فذهبت ادفعهافقال دعها فانهاسمیت بکة لان الناس یبک بعضهم بعضاتمر المرأۃ بین یدی الرجل وهو یصلی والرجل بین یدی المرأۃ وهی تصلی لاباس بذلک"**

قتادہ کہتے ہیں میں محمد بن علی باقر کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، ایک عورت ان کے سامنے سے گزرنے لگی تو میں اسے روکنے لگا آپ نے مجھے (اشارہ سے) کہا اس کو چھوڑ دیں۔ اس مقام کا نام بکہ رکھا گیا، کیونکہ لوگ بعض بعض پر ہجوم کرتے ہیں عورت مرد کے نماز پڑھتے ہوئے آگے سے گذر جاتی ہے، مرد عورت کے آگے سے گذر جاتا ہے، حالانکہ عورت نماز پڑھ رہی ہوتی ہے، یہاں کوئی حرج نہیں۔ (شیخ زادہ)

طلباء کے فائدہ کیلئے:

بکہ ایک لغت ہے مکہ میں، یعنی میم کی جگہ باء کو استعمال کیا گیا ہے، عرب حضرات کئی جگہ میم کے مقام پر باء کو استعمال کرتے ہیں "لازب" (چمٹنا) کی جگہ "لازم" اور تیل والی جگہ کو نمیط کہا جاتا ہے، اس کی جگہ "نبیــــط" بھی استعمال کیا جاتا ہے، اور امر راتب کی جگہ امر راتم بھی استعمال کرتے ہیں" سمد رأسه" (سر کی گوند) کی جگہ سبد راسه بھی استعمال کرتے ہیں۔ (تفسیر ابی السعود)

مکہ کہنے کی وجہ:

❁ وامـامکة سـمیت بذلک لقلة مائهامن قول العرب مک الفصیل ضرع امه وامتکه اذاامتص کل مافیه من اللبن"

مکہ شریف کو مکہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہاں پانی کم ہوتا تھا اس لئے اسے مکہ کہہ لیا گیا، یہ لفظ ماخوذ ہے مک الفصیل اور امتک الفصیل سے جب اونٹنی کا بچہ اپنی ماں کے تھنوں سے سارا دودھ پی لے۔ (معالم التنزیل للبغوی)

مکہ کہنے کی ایک اور وجہ:

"وقیـل لانهـاتمک الذنوب ای تزیلها" بعض حضرات نے کہا مکہ کو اس لئے مکہ کہا جاتا ہے کہ یہ وہاں جا کر، عبادت کرنے والوں کے گناہوں کو زائل کرتا ہے۔ (خازن)

مکہ کا نام ام القریٰ:

"وسـمیـت ام القری لانهااصل کل البلدة" مکہ شریف کو ام القریٰ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ وہ تمام شہروں کا اصل ہے۔ (خازن)

مکہ کا نام ضراح:

قاموس میں ذکر کیا گیا ہے "ان الضراح البیت المعمور فی السماء الرابعة" ضراح اصل میں چوتھے آسمان پر بیت المعمور کو کہا جاتا ہے۔ (مدارک التنزیل للنسفی)

حضرت آدم علیہ السلام نے فرشتوں سے کعبہ شریف کی بنیادوں کو تعمیر کرایا، پھر اس کے اوپر فرشتوں نے بیت المعمور کو رکھ دیا جو بعد میں طوفان نوح کے وقت اٹھالیا گیا ہے، اصل میں "ضراح" کعبہ کو کہا گیا، پھر مکہ کو بھی ضراح کہا گیا۔

مکہ کے نام:

مکہ ، بکہ ، البیت العتیق ، البیت الحرام ، البلد الامین ، ام القری ،القادس (کیونکہ یہ گناہوں سے پاک کرتا ہے)المقدسہ،الحاطمة ،الرأس ، البلدة ، البنیة، الکعبة ۔ (ابن کثیر وصابونی)

فائدہ جلیلہ: کعبہ شریف کی تعمیر کا حکم دینے والا اللہ تعالیٰ ، اور رب تعالیٰ کا پیغام پہنچانے والا اور(آدم علیہ السلام کے زمانہ کی بنیادوں کی نشاندہی کرنے والا)اور انجینئر جبریل علیہ السلام ،اور تعمیر کرنے والے حضرت ابراہیم خلیل اللہ اوران کی معاونت کرنے والے حضرت اسماعیل علیہ السلام ،یہی وجہ ہے"قیل لیس فی العالم بناء اشرف من الکعبة " کہ جہان میں کعبہ شریف سے اشرف اور بلند وبالا شان والا کوئی اور مقام نہیں تیار کیا گیا۔(روح البیان)

﴿مُبَارَکًا﴾ "برکت والا"

بیشک پہلا گھر جو بنایا گیا ہے لوگوں (کی عبادت) کیلئے ،وہ جو مکہ میں ہے، برکت والا ہے۔ "مبارکا " پر نصب ہے کیونکہ یہ حال واقع ہورہا ہے،مطلب یہ ہے کہ بیت اللہ شریف کو برکت والا بنایا ہے اس میں اجروثواب زیادہ رکھا گیا ہے ۔بعض عبادات تو ادا ہی مکہ میں ہوتی ہیں جیسے حج اور ھدی کا ذبح کرنا ،اور عمرہ ادا کرنا ،اور بعض عبادات میں وہاں زیادہ ثواب ہوتا ہے جو دوسرے مقامات پرنہیں ہوتا جیسے وہ ادا کی ہوئی نماز اور روزہ اور اعتکاف کا بنسبت دوسرے مقاموں کے زیادہ ثواب رکھتا ہے۔

"ومن ثم قال ابو یوسف رحمه الله من نذر ان یصلی فی المسجد الحرام رکعتین لایجزئی عنه ان یصلی فی غیره "

یہی وجہ ہے کہ امام یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے نذر مانی کہ وہ دو رکعت مسجد حرام میں ادا کرے گا تو اس کیلئے جائز نہیں کہ یہ دو رکعت کہیں اور ادا کرے۔

❁ لحدیث انس بن مالک قال قال رسول الله ﷺ صلوة الرجل فی بیته بصلوة،وصلوته فی مسجد القبائل بخمس وعشرین صلوة وصلوته فی المسجد الذی یجمع فیه بخمس مائة صلوة وصلوته فی المسجد الاقصی بالف صلوة وصلوته فی مسجدی بخمسین الف سنة وصلوته فی المسجد الحرام بمائة الف صلوة (رواه ابن ماجة)

امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے اپنے موقف پر یہ حدیث پیش کی جو ابن ماجہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت بیان کی "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مرد کی نماز گھر میں ادا کرنے پر ایک نماز کا ثواب رکھتی ہے ، اور اپنے قبیلہ کی مسجد

میں (جماعت سے ادا کرنے پر) پچیس درجہ اسے ثواب حاصل ہوگا، اور جامع مسجد میں نماز ادا کرنے پر پانچ سو نمازوں کا ثواب حاصل ہوگا، اور مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کرنے پر ایک ہزار نمازوں کا ثواب حاصل ہوگا، اور میری مسجد (مسجد نبوی) میں نماز ادا کرنے سے پچاس ہزار نمازوں کا اسے ثواب حاصل ہوگا، اور مسجد حرام میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کا ثواب حاصل ہوگا۔ (ماخوذ از مظہری و در منثور)

(خیال رہے کہ ایک روایت میں مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کرنے سے دس ہزار نماز کا ثواب بھی مذکور ہے)

❁ وروى الطحاوى عن عطاء بن الزبير قال ﷺ صلوة فى مسجدى هذا افضل من الف صلوة فيما سواه من المساجد الا المسجد الحرام وصلوة فى المسجد الحرام افضل من مائة صلوة فى هذا"

طحاوی نے عطاء بن زبیر سے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری اس مسجد میں نماز ادا کرنا اس کے سواء مساجد میں نماز ادا کرنے سے ہزار درجہ افضل ہے سوائے مسجد حرام کے، کیونکہ مسجد حرام میں نماز ادا کرنا میری مسجد میں نماز ادا کرنے سے سو مرتبہ افضل ہے۔ (ماخوذ از مظہری)

امام ابوحنیفہ وامام محمد رحمهما اللہ کا موقف:

آپ فرماتے ہیں یہ مراتب جو نبی کریم ﷺ نے بیان فرمائے ہیں، ان کا تعلق فرضی نمازوں سے ہے نفلی نمازوں سے نہیں، تاکہ ایک اور حدیث ان فضائل والی حدیثوں کے متعارض نہ ہو، اس لئے کہ فضائل والی احادیث میں گھر کی نسبت مسجد میں نماز ادا کرنا افضل قرار دیا گیا ہے، حالانکہ دوسری حدیث میں نوافل گھر ادا کرنا افضل قرار دیا گیا ہے، وہ حدیث یہ ہے۔

❁ عن زيد بن ثابت قال قال رسول الله ﷺ افضل الصلوة صلوة المرء فى بيته الا المكتوبة" (رواه البخارى ومسلم)

زید بن ثابت ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مرد کا گھر نماز ادا کرنا افضل ہے سوائے فرض نمازوں کے۔ (از مظہری)

حدیث شریف سے واضح ہو گیا کہ فرض نماز مساجد میں ادا کرنا افضل ہے اور نوافل گھر میں ادا کرنا افضل ہیں، یہی حال مسجد اقصیٰ، مسجد نبوی اور مسجد حرام کا بھی ہے۔ "واللہ اعلم بالصواب"

لیکن یہ بھی خیال رہے کہ اگر آرام وسکون سے نوافل گھر ادا کر سکے تو گھر ادا کرنا بہتر ہے، اگر گھر مسجد کی

طرح خشوع وخضوع نہ پایا جائے تو مسجد میں ادا کرنا بہتر ہے۔

۞ واخرج الازرقی والطبرانی فی الاوسط عن جابر بن عبدالله قال قال رسول الله ﷺ هذاالبيت دعامة الاسلام من خرج يؤم هذالبيت من حاج او معتمر كان مضمونا على الله ان قبضه ان يدخله الجنة وان رده ان يرده باجر اوغنيمة"

حضرت جابر بن عبداللہ ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ بیت اللہ شریف اسلام کا ستون ہے، جو شخص اس بیت اللہ شریف کے ارادہ سے حج یا عمرہ کیلئے نکلا اور اس پر وفات آ گئی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ کرم پر لے رکھا ہے کہ اسے جنت میں داخل کردے، اور اگر وہ لوٹ آیا تو اللہ تعالیٰ اسے عظیم اجر وثواب عطا فرمائے گا۔

۞ وروی ابن الجوزی فی فضائل مكة عن عبدالله بن عدی بن الحمراء انه سمع رسول الله ﷺ يقول وهو واقف بالحزورة فی سوق مكة والله انک لخير ارض الله واحب ارض الله الى الله عزوجل ولولا انى خرجت منک ماخرجت"

ابن جوزی نے فضائل مکہ میں عبداللہ بن عدی بن حمراء سے روایت ذکر کی کہ بیشک انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا جبکہ آپ مکہ کے بازار مکہ حزوراء میں کھڑے تھے "قسم ہے اللہ تعالیٰ کی (اے بیت اللہ) بیشک اللہ کی زمین میں سے تو بہتر ہے، اور اللہ کی زمین میں سے تو اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہے، اگر میں نے تجھ سے ہجرت نہ کرلی ہوتی تو میں اب تجھے چھوڑ کر نہ جاتا۔ (منقول از مظہری)

"وكذاروی ابن الجوزی عن ابی هريرة مرفوعا" اسی طرح ابن جوزی نے حضرت ابو ہریرہ ؓ سے بھی یہی حدیث مرفوعاً ذکر کی ہے۔ (مظہری)

کعبہ شریف کی فضیلت کی چند وجوہ:

(۱) کعبہ شریف کی عمارت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنائی جبکہ آپ کے ساتھ حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے اور بیت المقدس کی تعمیر حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنوں سے کرائی۔

"ولا شک ان الخليل اعظم درجة واكثر منقبة من سليمان عليه السلام فمن هذاالوجه يجب ان تكون الكعبة اشرف من بيت المقدس"

جب یقینی طور پر یہ واضح ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا درجہ بلند ہے اور آپ کے فضائل زیادہ ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام سے تو اسی وجہ سے حضرت خلیل اللہ کا تعمیر کردہ کعبہ افضل ہے بیت المقدس سے۔

(۲) کعبہ شریف کا متصل مقام ابراہیم ہے، مقام ابراہیم کی وجہ سے کعبہ شریف کو افضلیت حاصل ہے، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بہت بڑی نشانی ہے، مقام ابراہیم یہ پتھر ہے جس پر ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوتے تو یہ نرم ہو جاتا، آپ کے قدموں کے نشان اس میں قائم ہو گئے، آپ نے جب اس سے قدم ہٹائے تو اس میں وہی پتھر کی سختی آ گئی

"فهذه انواع من الآيات العجيبة والمعجزات الباهرة اظهرها الله سبحانه في ذلك الحجر" یہ آیات عجیبہ اور معجزات باہرہ (روشن) اللہ تعالیٰ نے اس پتھر قائم میں کر دیئے۔

(۳) صدیاں بیت گئیں، لاکھوں کی تعداد میں ہر سال لوگ حج کرتے ہیں، مقام منیٰ میں جمرات کو ماری جانی والی کنکریاں آج تک ختم نہیں ہوئیں۔

"وقد جاء في الآثار ان من كان حجة مقبولة رفعت حجارة جمراته الى السماء"

روایات میں آتا ہے کہ جس شخص کا حج مقبول ہو، اسکی جمرات کو ماری جانے والی کنکریاں آسمانوں کی طرف اٹھائی جاتی ہیں۔

(۴) پرندے اکٹھے جماعت (جھنڈ) کی شکل میں اڑتے آتے ہیں، لیکن کعبہ شریف کے قریب پہنچ کر دائیں، بائیں ہو جاتے ہیں، کعبہ شریف کے اوپر سے نہیں اڑتے۔

(۵) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعاء کی ﴿رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا﴾ "اے میرے رب اس مقام کو امن والا شہر بنا دے" رب تعالیٰ نے اس دعاء کو شرف قبولیت بخشا، یہی وجہ ہے کہ وہاں کوئی درندہ کسی جانور کو شکار نہیں کرتا، "وايضا كل من سكن مكة امن من النهب والغارة" اور اسی دعاء کا یہ اثر آج تک جاری ہے کہ وہاں رہنے والے چوری، ڈاکہ، لوٹ مار سے محفوظ ہیں۔

(۶) ابرہہ اشرم نے جب ایک لشکر کی قیادت کی کہ (معاذ اللہ) کعبہ کو شہید کر دے تو قریش اس کے مقابلہ سے عاجز آ گئے کیونکہ وہ ہاتھیوں پر سوار تھے اور مسلح تھے، قریش نے مکہ کو چھوڑ دیا اور کعبہ کو ان کیلئے خالی کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے مقابلہ کیلئے چھوٹے چھوٹے پرندوں (ابابیل) کو بھیجا جو جماعت بعد جماعت آ رہے تھے، حالانکہ وہ بہت چھوٹے چھوٹے پرندے تھے اور ان کی چونچوں میں چھوٹے چھوٹے پتھر تھے جو جہنم کی آگ سے تیار کئے گئے تھے، ان کے ذریعے ہی انہیں ہلاک کرا دیا۔

"وهذه آية باهرة دالة على شرف الكعبة وارهاص لنبوة محمد ﷺ"

یہ واضح نشانی ہے جو کعبہ کی بزرگی پر دلالت کر رہی ہے اور نبی کریم ﷺ کے اعلان نبوت سے پہلے یہ آپ کا معجزہ ہے جسے ارہاص کہا جاتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

عجیب حکمت:

اللہ تعالیٰ نے کعبہ شریف کو ایسی وادی میں رکھا جہاں کھیتی باڑی نہیں ہوسکتی، اس میں چند حکمتیں ہیں۔

(۱) ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہاں کے رہنے والوں اور کعبہ شریف کے خدام کو دنیا کے اسباب سے تعلق توڑ کر صرف اپنی ذات پر توکل کرنے کا حکم دیا۔

(۲) دوسری حکمت یہ ہے کہ وہاں جابر لوگ اور بادشاہ قابض نہ ہوجائیں، کیونکہ وہ تو عیش وعشرت چاہتے ہیں جب ان کو دنیا کی آسائش وہاں نظر نہیں آئے گی تو وہاں مستقل طور پر نظر نہیں ٹھہرائیں گے، بلکہ اس جگہ کو وہ چھوڑ دیں گے "فالمقصود تنزیه ذلک الموضع عن لوث وجود اهل الدنیا" مقصد یہی تھا کہ اس جگہ کو دنیا داروں کے ملوث ہونے سے بچایا جائے۔

(۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ اس جگہ کو خالص عبادت اور زیارت کے لئے مختص کرنا مقصود تھا کہ وہ تجارتی منڈی نہ بن جائے، بلکہ ضرورت کے مطابق اشیاء کی خرید وفروخت کی جائے۔

(۴) چوتھی حکمت اس میں یہ پائی گئی کہ وہاں کی زمین کو کھیتی باڑی کے قابل نہیں رکھا گیا تاکہ لوگوں کو یہ اشارہ دیا جائے کہ تم فقر کو ترجیح دو، اس سے تمہاری دنیا اور تمہاری آخرت امن وحفاظت میں ہوگی۔

(۵) پانچویں حکمت یہ پائی گئی کہ کعبہ شریف جس زمین میں ہے اسے کھیتی باڑی سے خالی رکھا گیا جس سے ایمان والوں کو یہ بتادیا گیا کہ اگر تم رب تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنے دل کو اغیار کی محبت سے خالی رکھو تاکہ اس میں نور ایمان ضوفگن ہوسکے۔

﴿هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ "ہدایت ہے جہان والوں کیلئے۔"

کعبہ شریف کے ہدایت ہونے کا مطلب کیا ہے؟ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ کعبہ شریف قبلہ ہے، اس کی وجہ سے لوگوں کو نماز کی ہدایت ملتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کعبہ شریف کی برکات وفضائل سے رب تعالیٰ کے صانع ومختار ہونے کا علم حاصل ہوتا ہے، اور نبی کریم ﷺ کی صداقت کا پتہ چلتا ہے، تمام وہ دلائل اور نشانیاں جن سے نبی کریم ﷺ کی صداقت کا پتہ چلتا ہے ان سے ہی اللہ تعالیٰ کے صانع ومختار، عالم وقدیر، حکیم وغنی ہونے کا علم حاصل ہوتا ہے، اس لحاظ پر کعبہ شریف ﴿هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ کعبہ شریف جنت کی ہدایت دیتا ہے، اس لئے کہ جو لوگ کعبہ شریف کی طرف متوجہ ہوکر نماز ادا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو جنت عطاء فرماتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

فِيْهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ اِبْرَاهِيْمَ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ O (آیۃ نمبر ۹۷)

(1) اس میں کھلی نشانیاں ہیں ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ اور جو اس میں آئے امان میں ہو اور اللہ کیلئے لوگوں پر اس گھر کا حج کرنا ہے جو اس تک چل سکے اور جو منکر ہو تو اللہ سارے جہان سے بے پرواہ ہے۔ (کنزالایمان)

(2) اس میں نشانیاں کھلی ہیں، ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ، اور جو شخص داخل ہو اس میں ہوگا امن میں، اور اللہ کیلئے لوگوں پر اس گھر کا حج کرنا ہے، جو طاقت رکھے اس کی طرف راہ پانے کی، اور جس نے کفر کیا تو بیشک اللہ بے پرواہ ہے جہان والوں سے۔ (نجوم الفرقان)

مختصر مطلب تقریباً ترجمہ سے ہی واضح ہے کہ کعبہ شریف اور اس کے مضافات میں بڑی کھلی نشانیاں موجود ہیں، وہاں مقام ابراہیم ہے، اور جو شخص وہاں داخل ہو جاتا ہے وہ امن میں ہو جاتا ہے، اور جس شخص کو وہاں تک جانے کی طاقت حاصل ہو، اس پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کیلئے بیت اللہ شریف کا حج کرے یعنی بیت اللہ شریف کا طواف کرے، کیونکہ طواف کرنا حج کے ارکان میں ایک رکن ہے، اور جس شخص نے حج کی فرضیت کا انکار کر دیا تو وہ کافر ہو جائے، اس کے کفر کا اسے ہی نقصان ہوتا ہے، رب تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں کیونکہ وہ تو جہان والوں سے بے پرواہ ہے۔

﴿فِيْهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ اِبْرَاهِيْمَ﴾

''اس میں نشانیاں کھلی ہیں، ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ۔''

یہاں دو احتمال پائے گئے ہیں، ایک یہ کہ کھلی نشانیوں سے مراد وہی ہوں جن کو فضیلت کعبہ میں ذکر کیا گیا ہے یعنی خوف کرنے والے کو وہاں امن مل جاتا ہے، مریض کو شفاء حاصل ہوتی ہے، کعبہ شریف کو شہید کرنے کی غرض سے آنے والے تباہ و برباد ہوتے ہیں، کعبہ شریف کے اوپر سے پرندے نہیں گزرتے، وغیرھا'' اس لحاظ پر ''مَقَامُ اِبْرَاهِيْمَ'' ماقبل کا بیان نہیں، بلکہ نیا جملہ ہے، اب مطلب یہ ہوگیا ''اس میں کھلی نشانیاں ہیں، اور مقام ابراہیم بھی ہے، ان تمام چیزوں کی وجہ سے کعبہ شریف کو اور زیادہ عظمت حاصل ہوگئی، جبکہ وہ خود بذاتہ بھی معظم و مشرف ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ ''مَقَامُ اِبْرَاهِيْمَ'' تفسیر ہو ''آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ'' کی، اب اس صورت میں معنی یہ ہوگا

اس میں کھلی نشانیاں ہیں، وہ مقام ابراہیم ہے۔

اعتراض: فان قیل الآیات جماعة ولا یصح تفسیرھا بشیء واحد" یہ دوسرا احتمال درست نہیں نظر آتا کیونکہ " آیات "جمع ہے، اور" کہ" مَقَامُ اِبْرَاهِيمَ " "واحد ہے، واحد سے تفسیر جمع کی کیسے صحیح ہے؟

پہلا جواب: یہ ہے کہ " مَقَامُ اِبْرَاهِيمَ "اگر چہ واحد ہے لیکن آیات کثیرہ کے درجہ میں ہے، اس لئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معجزہ ہے، جو اللہ تعالی کے عالم ہونے پر دلالت کرر ہا ہے، اور رب تعالی کے صانع ہونے اوراس کے قادر ہونے اوراس کے ارادہ رکھنے اوراس کی حیات اوراس کے غنی ہونے اوراس کے منزہ (ہر عیب سے پاک) ہونے اوراسکے محدثات کے مشابہ ہونے سے پاک ہونے پر یہ معجزہ دلالت کرر ہا ہے۔

"فمقام ابراهيم، وان كان شيئا واحدا الا انه لما حصل فيه هذه الوجوه الكثيرة كان بمنزلة الدلائل "

اگر چہ کہ" مَقَامُ اِبْرَاهِيمَ "ایک ہے لیکن جب اس سے کثیر چیزوں کا علم حاصل ہو گیا تو یہ کئی دلائل کے درجہ میں آ گیا۔

دوسرا جواب: "ان مقام ابراهيم اشتمل على الآيات " یعنی دوسرا جواب یہ ہے کہ بیشک مقام ابراہیم چند آیات پر مشتمل ہے، لھذا حکم جمع میں ہے، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدموں کا ایک سخت پتھر میں قدموں کا نشان پڑ جانا یہ ایک نشانی ہے، اور قدموں کا ٹخنوں تک پتھر میں گڑ جانا یہ دوسری نشانی ہے۔ اور پتھر کا صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدموں کی جگہ نرم ہونا اور ادھر ادھر سے سخت ہونا یہ تیسری نشانی ہے، اور مقام ابراہیم کا آج تک محفوظ رہنا یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک علیحدہ معجزہ ہے، ورنہ نبی کریم ﷺ کے معجزہ قرآن پاک کے علاوہ دوسرے انبیاء کرام کے معجزات ختم ہو گئے، لھذا مقام ابراہیم کا آج تک محفوظ رہنا یہ چوتھی نشانی ہے۔

"فثبت ان مقام ابراهيم عليه السلام آيات كثيرة" لھذا ثابت ہو گیا کہ" مَقَامُ اِبْرَاهِيمَ" کثیر آیات ہیں۔

تیسرا جواب: یہ ہے کہ زجاج نے کہا کہ صرف کہ" مَقَامُ اِبْرَاهِيمَ "آيات بينات کی تفسیر نہیں، بلکہ" مَقَامُ اِبْرَاهِيمَ" کے ساتھ "وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ امِنًا" بھی داخل ہے، دو چیزوں کا جمع پر اطلاق ہوتا رہتا ہے جیسا کہ " فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا "میں استعمال ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے "الاثنان فما فوقهما جماعة" دو اور دو سے اوپر ایک جماعت ہے۔

چوتھا جواب: جب ذکر فرمایا" فِيهِ آيات" کہ اس میں کثیر آیات ہیں تو مثال کے طور پر دو کا صراحۃ ذکر

کر دیا کہ ان میں کثیر کھلی نشانیوں میں سے "مَقَامُ اِبْرَاهِیْمَ" بھی ہے اور جو وہاں داخل ہو وہ امن میں بھی رہتا ہے۔
(ماخوذ از کبیر)

"مَقَامُ اِبْرَاهِیْمَ" کی تفصیل پہلے پارہ "وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِیْمَ" میں مکمل طور پر بیان ہو چکی ہے۔

﴿وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا﴾ "اور جو شخص داخل ہوگا اس میں امن میں ہوگا۔"

حصول امن کی چند وجوہ:

- الاول ان من دخله للنسک تقربا الی الله تعالی کان آمنا"
امن حاصل ہونے کی پہلی وجہ یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالی کا تقرب حاصل کرنے کیلئے حج کرنے کیلئے گیا وہ عذاب سے محفوظ رہے گا، اللہ تعالی کی امان میں آجائے گا۔ (کبیر)
- واخرج عبد بن حمید وابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم عن یحیی بن جعدة بن هبیرة فی قوله ومن دخله کان آمناقال آمنامن النار"
یحیی بن جعدہ بن ھبیرہ کی روایت میں ہے کہ "وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا" کا ایک مطلب یہ ہے کہ جو اس میں داخل ہوا وہ آگ سے محفوظ رہے گا۔ (از درمنشور)
- واخرج البیهقی عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ من دخل الیت دخل فی حسنة وخرج من سیئة مغفورا له"
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص بیت اللہ شریف میں آتا ہے اسے نیکیاں حاصل ہوتی ہیں اور برائیاں اس سے دور کردی جاتی ہیں اور اس کی مغفرت کردی جاتی ہے۔
(از درمنشور)

یعنی حج کرنے سے ثواب حاصل ہوگا، اور صغائر گناہ تو اس کے حج کرنے سے ہی مٹا دیے جائیں گے، اور اسے توبہ کی بھی توفیق عطاء کردی جاتی ہے تو وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہو جاتا ہے جیسا کہ بچہ ماں کے پیٹ سے باہر آنے پر گناہوں سے پاک وصاف ہوتا ہے۔ راقم نے یہ وضاحت جو کی ہے، یہ علامہ علی قاری رحمہ اللہ کی وضاحت کے مطابق کہ حج سے صغیرہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں کبیرہ گناہ صرف توبہ سے معاف ہوتے ہیں، لیکن بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ حج سے صغائر اور کبائر دونوں ہی معاف ہو جاتے ہیں۔ "واللہ اعلم بالصواب"

- واخرج ابن المنذر عن عطاء قال من مات فی الحرم بعث آمنایقول الله ومن دخله کان آمنا"

ابن منذر نے عطاء کی روایت بیان کی ہے کہ جو شخص حرم میں فوت ہو گیا اسے امن میں اٹھایا جائے گا، اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے "وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا" جو وہاں داخل ہوا امن میں ہو گا۔ (از در منثور)

❁ واخرج البيهقي في الشعب عن جابر قال قال رسول الله ﷺ من مات في احد الحرمين بعث آمنا"

بیہقی نے شعب ایمان میں حضرت جابر کی روایت بیان کی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کی حرمین میں سے کسی ایک میں وفات ہو گئی تو وہ امن میں اٹھایا جائے گا۔ (از در منثور)

یعنی جو شخص حالت ایمان میں مدینہ طیبہ یا مکہ مکرمہ میں فوت ہوا تو قیامت کے دن عذاب سے امن میں اٹھایا جائے گا۔

❁ واخرج البيهقي في الشعب وضعفه عن سلمان قال قال رسول الله ﷺ من مات في احد الحرمين استوجب شفاعتي وجاء يوم القيامة من الآمنين"

بیہقی نے شعب ایمان کے باب میں سلمان کی روایت ذکر کی، رسول اللہ ﷺ نے ذکر فرمایا جو شخص حرمین (حرم مکہ، حرم مدینہ) میں سے کسی ایک میں فوت ہوا وہ میری شفاعت کو پالے گا، اور قیامت کے امن والے لوگوں میں آئے گا۔ (از در منثور)

❁ واخرج الجندی والبيهقي عن انس بن مالک قال قال رسول الله ﷺ من مات في احد الحرمين بعث من الآمنين يوم القيامة ومن زارني محتسبا الى المدينة كان في جواري يوم القيامة"

انس بن مالک فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کی حرمین میں سے کسی ایک میں وفات ہو گئی تو وہ قیامت میں امن میں ہو گا، اور جس نے میری زیارت کی ثواب کی غرض سے مدینہ طیبہ میں وہ قیامت کے دن میری پناہ میں ہو گا۔ (از در منثور)

(۲) والثاني يحتمل ان يكون المراد ما اودع الله في قلوب الخلق من الشفقة على كل من التجاء اليه ودفع المكروه عنه"

حصول امن کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کے دلوں میں شفقت رکھ دیتا ہے کہ جو بھی کعبہ میں جائے اسے امن پہنچایا جائے اور اس سے مکروہات کو دور رکھا جائے۔ (کبیر)

یہ صرف انسان تک محدود نہیں بلکہ جانور بھی دوسرے جانوروں پر رحم کرتے ہیں "وان الجارحة اذا قصدت صيدا فاذا دخل الصيد الحرم كفت عنه" بیشک جب کوئی شکار کرنے والا، چیرنے پھاڑنے والا

جانور دوسرے جانوروں پر حملہ کرتا ہے تو وہ جانور جس پر حملہ کیا گیا اس نے حرم شریف میں پناہ لے لی، اس کے حرم شریف میں داخل ہوتے ہی حملہ آور جانور اس پر حملہ کرنے سے رک جاتا ہے کہ اس کے دل میں بھی اللہ تعالیٰ نے الفت ڈال دی اور عناد و غضب اس کے دل سے نکال دیا گیا۔ (ماخوذ معالم التنزیل للبغوی)

(۳) وقیل المراد به ان من دخله عام عمرة القضاء مع رسول الله ﷺ کان آمنا، کما قال الله تعالیٰ "لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيۡنَ"

اور بیان کیا گیا ہے کہ مراد اس سے یہ ہے کہ جو شخص نبی کریم ﷺ کے ساتھ عمرہ قضاء کرنے کیلئے جائے گا وہ امن میں رہے گا جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيۡنَ﴾ (سورۃ الفتح، آیہ نمبر ۲۷) ''بیشک تم ضرور مسجد حرام میں داخل ہوگے اگر اللہ چاہے امن و امان سے۔'' (معالم التنزیل للبغوی)

(۴) چوتھی وجہ اس میں یہ ہے:

"وقیل هو خبر بمعنی الامر تقدیره ومن دخله فامنوه کقوله تعالیٰ "فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوۡقَ وَلَا جِدَالَ فِی الۡحَجِّ" ای لا ترفثوا ولا تفسقوا"

کہ اگرچہ صیغے خبر کے ہیں، لیکن معنیٰ ''نہی'' والا ہے، مطلب یہ ہے کہ جو شخص حرم میں داخل ہو جائے اس امن دے دو، یہ ایسے ہی ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ہے: ﴿فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوۡقَ وَلَا جِدَالَ فِی الۡحَجِّ﴾ (سورۃ البقرۃ، آیہ نمبر ۱۹۷) ''میں ہے، یہاں بھی اگرچہ بظاہر معنیٰ خبر والا ہے، لیکن مراد امر ہے۔'' (معالم التنزیل للبغوی)

یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ایسا خوبصورت ترجمہ کیا ہے کہ اس میں خبر اور امر دونوں کی جھلک موجود ہے، ''تو نہ عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ ہو، نہ کوئی گناہ، نہ کسی سے جھگڑا''

(۵) پانچویں وجہ یہ ہے کہ اس آیۂ کریمہ میں زمانۂ جاہلیت کے طریقہ کو رد کیا گیا ہے، کیونکہ زمانۂ جاہلیت میں کفار لوگ ایک دوسرے کو حرم میں بھی قتل کر دیتے تھے اور ایک دوسرے کے اعضاء کاٹ دیتے تھے، اس آیۂ کریمہ میں ان سے ضمناً منع کیا گیا، گویا کہ مفہوم یہ ہوگیا "ومن دخل الحرم لا یتعرضونه" جو حرم میں داخل ہوا اس کا پیچھا نہ کرو، نہ اسے قتل کرو، نہ اس کے اعضاء کاٹو (چوتھی اور پانچویں وجہ قریب قریب ہی ہیں) حضرت حسن بصری رحمہ اللہ اور حضرت قتادہ اور جمہور مفسرین کرام نے یہی وجہ بیان کی ہے، (تاہم راقم کے نزدیک جمیع وجوہ ہی معتبر ہیں، جو تمام کی تمام ہی بیک وقت پائی جاتی ہیں) اسی مضمون کو ایک اور آیۂ کریمہ میں بھی پیش کیا گیا ہے۔

"اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ" (سورة العنكبوت، آية نمبر ٦٧)

"اور کیا انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ ہم نے رمت والی زمین پناہ بنائی اور ان کے آس پاس والے لوگ اچک لئے جاتے ہیں۔"

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا موقف:

وقال ابو حنيفة رحمه الله معناه من دخله كان آمنا لايجوز قتله، فمن وجب عليه القتل قصاصا او حدا خارج الحرم فالتجأ الى الحرم لايستوفى منه لكنه لايطعم ولايبائع ولا يشارى حتى يخرج فيقتل، كذا قال ابن عباس"

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ آمِنًا" کا مطلب یہ ہے کہ حرم شریف میں کسی کو قتل نہیں کیا جائے گا، یہ اس وقت جب کہ کسی نے حرم کے باہر قتل کیا اور اس پر قصاص لازم آگیا تو اسے حرم میں قصاصا قتل نہیں کیا جائے گا، اسی طرح کسی نے حرم کے باہر کسی کے اعضاء کو عمدا کاٹا، پھر وہ حرم میں آگیا تو اس کے اعضاء حرم میں نہیں کاٹے جائیں گے، اسی طرح اگر کسی نے حرم کے باہر کوئی جرم کیا اور پھر حرم میں آگیا تو اس پر حرم میں حد نہیں لگے گی، البتہ اس شخص سے خرید وفروخت منع کردی جائے گی، اس تک کھانے پینے کی اشیاء نہیں پہنچنے دی جائیں گی تاکہ وہ حرم سے نکل جائے تو اس پر حد نافذ کردی جائے، یا اسے قصاصا قتل کردیا جائے، اگر اس سے اعضاء کاٹنے کا قصاص لینا ہے تو اسکے اعضاء کاٹ دیے جائیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا موقف:

وقال الشافعی وغيره يستوفى منه القصاص وان دخل فيه" امام شافعی وغیرہ یہ فرماتے ہیں کہ باہر قتل کرکے یا اعضاء کاٹ کر، یا باعث حد جرم کرکے حرم میں پناہ لینے والے کو حرم میں ہی قتل کردیا جائے، یا اس کے اعضاء کاٹ دیے جائیں، یا اس پر حد نافذ کردی جائے، لیکن ہر صاحب علم و دانش امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے موقف کو اعظم ہی سمجھے گا۔

اتفاقی مسئلہ: "واما اذا ارتكب الجريمة فی الحرم يستوفى منه عقوبته" جب کوئی شخص حرم میں ہی جرم کرے تو اس پر اس کے جرم کے مطابق حرم میں اسے سزا دی جائے، اس مسئلہ میں تمام ائمہ کا اتفاق ہے، زیادہ تفصیل "وَلَا تُقَاتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقَاتِلُوْكُمْ فِيْهِ" (البقرة) کی وضاحت کے ضمن میں دیکھئے۔

(ماخوذ از مظہری)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"وَمَنْ دَخَلَهٗ" میں ضمیر منصوب کو بعض مفسرین نے "حرم" کی طرف لوٹایا، اور بعض نے "بیت" کی طرف لوٹایا، البتہ جنہوں نے "بیت" کی طرف لوٹایا انہوں نے بھی مضافات کعبہ کو ساتھ ہی مراد لیا، اسلئے مقصد سب حضرات کا ایک ہی ہے کہ جو شخص حرم میں داخل ہوا وہ امن میں ہوگا۔

دینی طلباء کے فائدہ کیلئے ایک اور بحث:

کبھی قانون "طی الذکر" کا جاری ہوتا ہے، جسے "الذکر المطوی" بھی کہا جاتا ہے، یعنی زیادہ چیزوں کا ذکر کیا جائے، پھر کسی حکمت کیلئے بعض کو ذکر کر کے بحث کو سمیٹ دیا جائے، وہی قانون یہاں بھی جاری کیا گیا، پہلے ذکر کیا گیا "فِیْهِ آیَاتٌ بَیِّنَاتٌ" اس میں کھلی نشانیاں ہیں، (یہ جمع ہے) پھر دو چیزوں کا ذکر کر کے بحث کو سمیٹ دیا گیا، وہ دو چیزیں یہ ہیں "مَقَامُ اِبْرَاهِیْمَ" "وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ آمِنًا" حکمت اس میں یہ ہے کہ بتانا یہ مقصود تھا کہ نشانیاں تو بہت زیادہ ہیں، البتہ ان میں سے دو کا ذکر ان کی اہمیت اور افضلیت کے پیش نظر کر دیا گیا۔

"طی الذکر" قانون کے مطابق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی دیکھئے، آپ فرماتے ہیں "حبب الی من دنیاکم ثلاث الطیب والنساء وقرة عینی فی الصلوة" مجھے تمہاری دنیا میں سے تین چیزیں پسند ہیں، خوشبو اور اپنی ازواج" اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے، دو کا ذکر کر کے بحث کا لپیٹ دیا گیا، تیسری چیز کا ذکر نہیں کیا، حکمت اس میں یہ ہے کہ دو چیزوں کا ذکر کر کے اور تیسری کا ذکر نہ کر کے اشارہ یہ فرمایا کہ دنیا کا زیادہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ دو کے ذکر کے بعد جملہ استینافیہ کے طور پر ذکر فرمایا "وقرة عینی فی الصلوة" میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے،

"وقرة عینی فی الصلوة "لیست من امور الدنیا وانما هی من الامور الآخرة" یعنی یہ خیال رہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی "وقرة عینی فی الصلوة "امور دنیا کی تیسری چیز نہیں، کیونکہ یہ تو امور آخرت سے ہے، تیسری چیز کا ذکر ہی نہیں کیا۔ (مدارک التنزیل للنسفی، شیخ زادہ)

تنبیه: ابھی جو حدیث پاک بیان کی، وہ حضرت انس ﷺ کی روایت ہے جسے مسند احمد اور نسائی میں ذکر کیا گیا ہے "حبب الی" کے بعد "من الدنیا" کے الفاظ ابن جوزی کی روایت میں زیادہ کئے گئے۔ (مشکوۃ باب فضل الفقراء)

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے تیسری چیز کا بھی ذکر فرمایا، لیکن وہ حدیث موقوف ہے مرفوع نہیں۔

❁ وعن عائشة قالت كان رسول الله يعجبه من الدنيا ثلاثة الطعام والنساء والطيب فاصاب اثنين ولم يصب واحدا اصاب النساء والطيب ولم يصب الطعام"

"رواہ احمد" (مشکوۃ باب فضل الفقراء)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، رسول اللہ کو دنیا کی تین چیزیں پسند تھیں طعام، اور اپنی ازواج، اور خوشبو، تو آپ نے ان میں دو پالیں اور ایک نہیں پائی، آپ نے ازواج اور خوشبو کو پالیا، لیکن آپ نے طعام نہیں پایا، "ولم يصب الطعام الا بوصف القلة فاطلاق النفى للمبالغة" طعام نہ پانے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے وافر مقدار میں طعام نہیں پایا، اسی مبالغہ کی نفی ہے، اگر چہ قلیل طعام آپ کو حاصل رہا۔ (مرقاۃ)

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾

"اور اللہ کیلئے لوگوں پر اس گھر کا حج کرنا ہے جو طاقت رکھے اس کی طرف راہ پانے کی۔"

"**ولله**" اور اللہ کیلئے" ان الفاظ مبارکہ سے یہ ثابت فرمایا کہ حج اللہ تعالیٰ کی رضاء کیلئے ہو، اس میں دکھلاوا مقصود نہ ہو، اپنا چرچا کرنا مقصود نہ ہو، طلباء کرام یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ "**لله**" میں "لام جار" کا تعلق "استقر" محذوف سے ہے یہ ظرف مستقر ہے۔

﴿**عَلَى النَّاسِ**﴾ لوگوں پر" یہاں علی لزوم پر دلالت کر رہا ہے، جس سے پتہ چلے کہ معنی یہ ہے لوگوں پر لازم ہے، یعنی "افترض على الناس" لوگوں پر حج کرنا فرض ہے۔ "الناس" پر الف لام عہد خارجی، جس سے مراد خاص لوگ ہیں، وہ خاص لوگ کون ہیں؟

"المراد بالناس الاحرار العقلاء البالغون فلا يجب الحج على المجانين والصبيان لعدم اهليتهم للخطاب ولا على العبيد بالاجماع"

وہ خاص لوگ یہ ہیں کہ آزاد ہوں، عاقل ہوں، اور بالغ ہوں، ان لوگوں پر حج فرض ہے، پاگل لوگوں پر، بچوں پر حج فرض نہیں، کیونکہ وہ خطاب کے اہل نہیں، یعنی فرضیت کا خطاب عاقل و بالغ کو ہوتا ہے، اگر چہ دکان وغیرہ پر نابالغ بچے کو بھی بھیجا جا سکتا ہے اور غلام پر بھی بالاتفاق حج فرض نہیں۔

مسئلہ ۱: فلو حج الكافر او الصبى العاقل او العبد ثم اسلم الكافر وبلغ الصبى واعتق العبد يجب عليه حجة الاسلام ثانيا بالاجماع"

اگر کافر نے حج کیا، یا عاقل بچے نے حج کیا، یا غلام نے حج کیا، حج کرنے کے بعد کافر نے اسلام قبول کیا، اور بچہ بالغ ہوگیا، اور غلام آزاد کردیا گیا تو ان پر دوبارہ حج فرض ہوگا، پہلا حج کافی نہیں، کافر اگرچہ حج کرتے تھے لیکن ان کا حج تو مقبول ہی نہیں، کسی عبادت کے مقبول ہونے کیلئے ایمان ضروری ہے، البتہ بچے اور غلام کا حج نفلی ہوگا، فرض حج بالغ ہونے کے بعد اور غلام کے آزاد کئے جانے کے بعد ہی ادا کیا جاسکے گا، یہ مسئلہ اجماع امت سے ثابت ہے، اور اجماع امت پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت تائید کررہی ہے۔

❁ عن ابن عباس ایماصبی حج لم بلغ الحنث فعلیه ان یحج حجة اخری، وایمااعرابی حج لم هاجر فعلیه ان یحج حجة اخری وایماعبد حج لم اعتق فعلیه حجة اخری "رواه الحاکم" والمراد بالاعرابی الذی لم یهاجر من لم یسلم فان مشرکی العرب کانوا یحجون "قال الحاکم صحیح علی شرط الشیخین ورواه ابن ابی شیبة فذکر نحوه وروی ابو داؤد دمر سلا عن محمد بن کعب القرطبی وفی الباب عن جابر وسنده ضعیف وهذه الاحادیث تلقته الامة بالقبول وانعقد علی مقتضاه الاجماع فجازبه تخصیص الکتاب"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جو بچہ حج کرے، بعد میں بالغ ہو اس پر لازم ہے کہ وہ پھر (فرض) حج کرے، جو اعرابی حج کرے پھر ہجرت کرے اس پر (فرض) حج اور ادا کرنا لازم رہے گا، اور جو غلام حج کرے پھر اسے آزاد کردیا جائے تو وہ (فرض) اور ادا کرے، اعرابی سے مراد مشرکین عرب ہیں جو حج کیا کرتے تھے اور "لم یهاجر" سے مراد "لم یسلم" ہے۔ یعنی مشرکین اگر اسلام لانے سے پہلے حج کریں اور بعد میں اسلام لائیں تو فرض حج ان کو پھر ادا کرنا پڑے گا۔ یہ حدیث حاکم نے بیان کی ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث شرط شیخین پر صحیح ہے، اور اسی کی طرح ابن ابی شیبہ نے بھی حدیث ذکر کی ہے، اور ابوداؤد نے بھی محمد بن کعب قرطبی سے روایت کی ہے، اور اسی مسئلہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی حدیث مروی ہے اگرچہ اس کی سند ضعیف ہے، (لیکن دوسری احادیث کی وجہ سے متعدد طرق سے روایت کا درجہ اسے بھی حاصل ہے جو حسن لغیرہ کے درجہ میں ہے) یہاں سے ایک اعتراض بھی اٹھ گیا، وہ اعتراض یہ تھا کہ قرآن پاک نے تو حج کے فرض ہونے کو مطلق ذکر کیا ہے، تو عاقل، بالغ، آزاد، مسلمان ہونے کی قید درست نہیں۔ تو اس کا جواب واضح ہوگیا کہ یہ احادیث اجماع امت سے مقبول ہیں، اور اس مسئلہ پر اجماع امت ہے لهذا ان احادیث سے قرآن پاک کی آیۃ کریمہ کی وضاحت کرنی درست ہوگئی۔ (ماخوذ از مظہری)

﴿ حِجُّ الْبَيْتِ ﴾ ''اس گھر کا حج کرنا ہے۔''

ابو جعفر، حمزہ، کسائی اور حفص کی قرأت میں صرف اسی مقام میں ''حج'' کی ''حاء'' کے نیچے کسرہ پڑھا گیا ہے، اور باقی قرآن پاک میں جہاں بھی یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے، وہاں ''حاء'' پر فتحہ پڑھا گیا ہے'' اہل نجد کی لغت میں کسرہ ہے، اور اہل حجاز کی لغت میں فتحہ ہے، یہ دونوں فصیح لغتیں ہیں، اور دونوں کا معنی ایک ہے۔ ''وفی المدارک انه بالکسر اسم وبالفتح مصدر'' تفسیر مدارک التنزیل میں ذکر کیا گیا ہے کہ جب کسرہ (زیر) سے پڑھا جائے تو یہ اسم، یعنی ذات حج، اور اگر فتحہ (زبر) سے پڑھا جائے تو مصدر ہے یعنی ''حج کرنا''۔ ''حج'' کا لغوی معنی ارادہ کرنا، اور اصطلاح میں خاص عبادت جس میں خاص مقامات کی زیارت اور مناسک حج ادا کرنے کا قصد پایا جاتا ہے۔ (ماخوذ از مظہری)

حج فرض ہے:

اس میں اجماع امت ہے کہ حج ارکان اسلام میں سے ایک رکن ہے، مسلمانوں پر فرض ہے جب اس کی تمام شرائط پائیں جائیں۔

❁ عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ بنی الاسلام علی خمس شهادة ان لااله الا الله وان محمدارسول الله ﷺ واقام الصلوة وايتاء الزكوة والحج وصوم رمضان''
(بخاری ومسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے، یہ گواہی دینا کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی معبود نہیں، اور بیشک محمد اللہ کے رسول ہیں، اور نماز قائم کرنا اور زکوۃ ادا کرنا، اور حج کرنا، اور رمضان کا روزہ رکھنا۔ (ماخوذ از مظہری)

﴿ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ﴾ ''جو طاقت رکھے اس کی طرف راہ پانے کی۔''

استطاعت کی دو قسمیں، ایک استطاعت بنفسہ یعنی وہ آنے جانے پر قادر ہو، اور اس کے پاس واپسی تک کا خرچ ہو، اور سواری ہو۔ اور دوسری قسم ہے ''استطاعت بالغیر'' اگر خود حج نہ کر سکے کہ حج فرض ہو جانے کے بعد معذور ہو گیا، تو کسی اور کو خرچ دے کر حج کرالے۔ (ماخوذ از معالم التنزیل للبغوی)

خیال رہے کہ حج کی تفصیلی بحث دوسرے پارہ میں بیان کی جا چکی ہے، یہاں تو صرف اتنی چیزوں کو ذکر کیا جا رہا ہے جو مفسرین کرام نے آیہ کریمہ کی تفسیر میں نقل کی ہیں، اگرچہ بعض چیزیں وہی ذکر کی جا رہی ہیں جو دوسرے پارہ

میں ذکر ہو چکی ہیں، مفسرین کرام کی تابعداری کی وجہ سے راقم کی بھی مجبوری ہے کہ آیۃ کریمہ کی وضاحت ضروری ہے۔

حج عمر میں ایک مرتبہ فرض ہے:

❁ **عن ابی ھریرۃ قال خطبنا رسول اللہ ﷺ فقال ایھا الناس قد فرض علیکم الحج فحجوا فقال رجل اکل عام یارسول اللہ؟فسکت حتی قالھا ثلاثا فقال رسول اللہ ﷺ لو قلت نعم لوجبت ولما استطعتم ، ثم قال ذرونی ماترکتکم فانما ھلک من کان قبلکم بکثرۃ سؤالھم واختلافھم علی انبیائھم واذاامرتکم بشیء فأتوا منہ مااستطعتم واذانھیتکم عن شیء فدعوہ" (رواہ احمد ومسلم)**

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خطبہ دیا،تو آپ نے فرمایا اے لوگو تحقیق تم پر حج فرض کر دیا گیا،تو تم حج کرو، ایک شخص اٹھے،عرض کیا، کیا ہر سال یارسول اللہ؟ تو آپ خاموش رہے، یہاں تک کہ آپ نے تین مرتبہ اسے (حج کی فرضیت) کو بیان کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اگر میں " نعم " (ہاں) کہہ دیتا تو حج ہر سال فرض ہو جاتا اور تم طاقت نہ رکھتے ، پھر آپ نے فرمایا تم مجھے چھوڑ دیا کرو جب میں تمہیں چھوڑ دوں، بیشک تم سے پہلے لوگ اسی وجہ سے ہلاک ہو گئے کہ انہوں نے کثیر سوال کئے اور اپنے انبیاء کرام سے اختلاف پیدا کئے،اور جب میں تمہیں کسی چیز کا حکم دوں تو تم اس پر عمل کرو جتنی تمہیں طاقت حاصل ہو،اور جب میں تمہیں کسی کام سے منع کر دیا کروں تو اس سے رک جاؤ۔

❁ **وعن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال خطبنا رسول اللہ ﷺ فقال یا ایھا الناس ان اللہ کتب علیکم الحج ، فقال اقرع بن حابس فقال یارسول اللہ افی کل عام؟فقال لو قلتھا لوجبت ولووجبت لم تعملوابھا ولن تستطیعوا ان تعملوابھا،الحج مرۃ فمن زاد فھو تطوع.**

(رواہ احمد وابو داؤد والنسائی وابن ماجہ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خطبہ دیا اور فرمایا اے لوگو! بیشک اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے تو اقرع بن حابس کھڑے ہوئے عرض کیا، کیا ہر سال حج فرض کیا گیا یارسول اللہ؟ تو آپ نے فرمایا اگر میں ہاں کہہ دیتا البتہ واجب ہو جاتا تم اس پر عمل کرنے کی طاقت نہ رکھتے ، حج ایک مرتبہ فرض ہے جو زیادہ ہو گا وہ نفل ہو گا۔ (ابن کثیر ومظہری)

استطاعت بالغیر کا مطلب:

اگر ایک شخص پر حج فرض ہو جائے ،آنے جانے کا خرچہ موجود ہے،اور اہل وعیال کیلئے بھی خرچ موجود ہے،

اسے کوئی عذر لاحق نہیں، کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں، اس صورت میں اس پر حج فرض ہوگیا، اب تاخیر کی وجہ سے حج کی فرضیت ساقط نہیں ہوگی، لھذا اسے چاہئے کہ وہ اپنے مال سے کسی سے حج کرائے جب خود کسی عذر کی وجہ سے آنے جانے سے قاصر ہوگیا، زندگی میں حج کرائے یا وصیت کر جائے کہ میرے مال میں سے میری طرف سے کسی کو حج پر بھیجنا، اب عام ہے کہ اس کا کوئی وارث اس کی طرف سے حج کر آئے یا کوئی اجنبی شخص اگر اس نے وصیت نہیں کی تھی تو اب ورثاء پر واجب تو نہیں کہ کسی کو اس کے بدل میں بھیجیں، تاہم اگر چاہیں تو بھیج دیں، میت کو ان شاء اللہ نفلی حج کا ثواب ملے گا، اس حج سے فرض ساقط نہیں ہوگا۔

طلباء کرام! ابھی جو مسئلہ بیان کیا ہے تفسیر مظہری کی اس عبارت میں دیکھیں۔

"من استقر فی ذمته صحیحالم طراعلیه ضعف وزمانة فانه لا یستحط عنه الحج بل یجب علیه ان یحج عنه غیره من ماله مادام حیااویوص به عند موته واذامات ولم یحج یحج عنه وارثه اویحج عنه اجنبیامن ماله ان شاء" (مظهری)

اس مسئلہ کو کہ حج غیر کی طرف سے قضاء مثل غیر معقول ہے، قیاس سے تو ثابت نہیں، حدیث پاک پیش کی گئی جس سے یہ مسئلہ ثابت ہو جاتا ہے۔ وہ حدیث یہ ہے۔

❁ عن ابن عباس رضی الله عنهما کان الفضل ردف النبی ﷺ فجاء ت امرأة من خثعم فجعل الفضل ینظر الیهاوتنظر الیه وجعل النبی ﷺ یصرف وجه الفضل الی الشق الآخر فقالت یارسول الله ان فریضة الله علی عباده فی الحج ادرکت ابی شیخاکبیرالا یستطیع ان یمسک علی الرجل افاحج عنه قال نعم، وفی روایة لایستطیع ان یستوی علی الراحلة فهل تقضی عنه ان احج عنه قال نعم وذلک فی حجة الوداع" (رواه البخاری ومسلم)

حضرت ابن عباس ﷺ فرماتے ہیں کہ فضل (ابن عباس) نبی کریم ﷺ کے ساتھ آپ کی سواری پر سوار تھے، خثعم قبیلہ کی ایک عورت آئی، فضل اسے دیکھنے لگے وہ ان کو دیکھنے لگی، نبی کریم ﷺ نے فضل کا رخ دوسری طرف پھیر دیا، پھر اس عورت نے عرض کیا یارسول اللہ اللہ تعالی نے اپنے بندوں پر حج فرض کر رکھا ہے، میں نے اپنے باپ کو بوڑھا پایا، جو طاقت نہیں رکھتے کہ وہ سواری پر سوار ہوسکیں، تو کیا میں ان کی طرف سے حج کرلوں؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ دوسری روایت سے یہ بھی ثابت ہے کہ یہ سؤال حجۃ الوداع کے موقع پر کیا گیا، اس حدیث سے مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ اس شخص پر حج فرض ہو چکا تھا، جو بغیر کسی عذر کے تاخیر کی وجہ سے معاف نہ ہوسکا تو نبی کریم ﷺ نے اس کی بیٹی کو اجازت دی کہ تم باپ کی طرف سے حج کرلو۔ (زیادہ درست قول یہی ہے) بعض حضرات نے کہا کہ وہ عورت اپنی خوشی سے

اپنے باپ کو نفلی حج کر کے ثواب پہنچانا چاہتی تھی، اس کی اجازت نے نبی کریم ﷺ سے اس نے طلب کی، تو آپ نے اسے اجازت دے دی۔ "واللہ اعلم بالصواب"

❁ عن ابن عمر عن النبی ﷺ قال لاتسافر المرأة ثلاثا الا معها ذومحرم "(رواہ البخاری ومسلم)
حضرت ابن عمر ؓ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا عورت بغیر محرم کے تین دنوں کا سفر نہ کرے۔

❁ وفی روایة المسلم لایحل لامرأة تؤمن بالله والیوم الآخر تسافر مسیرة ثلاث لیال الاومعها ذومحرم"
جو عورت اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہے وہ بغیر محرم کے تین راتوں کا سفر نہ کرے۔
ابوداؤد کی روایت میں ہے "الا مع زوج او محرم" بغیر خاوند یا بغیر محرم کے سفر نہ کرے، ان روایات سے واضح ہوا کہ عورت کا بغیر خاوند یا محرم کے حج کرنا جائز نہیں۔ (ماخوذ از مظہری)

جو عورتیں مصنوعی محرم بنا کر حج کرتی ہیں، وہ شریعت کی عدولی کرتی ہیں، اور پیسہ ضائع کرتی ہیں۔

﴿وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ﴾

''اور جس نے کفر کیا تو بیشک اللہ بے پرواہ ہے جہان والوں سے۔''

اس مقام پر "وَمَنْ كَفَرَ" سے مراد ہے"ومن انکر وجوب الحج"جس نے وجوب حج کا انکار کیا۔

❁ اخرج سعید بن منصور وابن جریر عن الضحاک مرسلا انه لما نزل صدرالآیة جمع رسول الله ﷺ ارباب المال فخطبهم وقال ان الله کتب علیکم الحج فحجوا فآمنت به ملة واحدة یعنی المسلمین وکفرت به خمس ملل یعنی المشرکین والیهود والنصاری والصابئین والمجوس فنزل 'وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ"

ضحاک کی روایت میں آتا ہے کہ جب اس آیہ کریمہ کا اول حصہ نازل ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے تمام دینوں کے لوگوں کو جمع کیا اور ان کو خطبہ دیا، اور فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کر دیا ہے، تم حج کرو'' آپ کے اس ارشاد پر ایک گروہ یعنی مسلمانوں نے ایمان لایا (کہ حج کی فرضیت کو تسلیم کیا) اور پانچ گروہوں نے ایمان نہ لایا (وہ پانچ گروہ یہ ہیں) یہود، انصاری، مشرکین، دہریے، مجوسی تو رب تعالیٰ نے نازل فرمایا"وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ"، جس نے کفر کیا یعنی حج کا انکار کیا تو بیشک اللہ تعالیٰ تمام جہانوں والوں سے بے پروہ ہے۔

❁ واخرج سعید بن منصور عن عکرمة قال لمانزلت ومن یبتغ غیر الاسلام دینا، الآیة قالت الیهود فنحن مسلمون فقال لهم النبی ﷺ ان الله فرض علی المسلمین حج البیت

فقالوا لم یکتب علینا وابوا ان یحجوا فانزل الله "وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ"

اور وجہ ان الفاظ مبارکہ کے نازل ہونے کی حضرت عکرمہ کی روایت ہے جو سعید بن منصور نے بیان کی ہے وہ فرماتے ہیں جب آیۃ کریمہ نازل ہوئی ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ﴾ (سورۃ آل عمران آیۃ نمبر ۸۵) "اور جو اسلام کے سواء کوئی دین چاہے گا وہ ہرگز اس سے قبول نہ کیا جائے گا، اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں سے ہے۔" تو یہود نے کہا ہم بھی مسلمان ہیں تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر بیت اللہ شریف کا حج فرض کیا، وہ کہنے لگے ہم پر کوئی حج فرض نہیں، انہوں نے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا" وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ"

تنبیہ: حج کے فرض ہونے کے انکار سے کفر لازم آتا ہے، اگر کسی پر حج فرض تھا اس نے حج نہیں کیا وہ گنہگار رہوا، کافر نہیں ہوا، اس پر نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی واضح موجود ہے۔

❁ اخرج عبد بن حمید فی تفسیره عن نقیع قال قرأ رسول الله ﷺ هذه الآية فقام رجل من هذيل فقال يارسول الله فمن تركه فقد كفر قال من تركه لايخاف عقوبته ولا يرجو ثوابه"

عبد بن حمید نے اپنی تفسیر میں نقیع سے روایت بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ آیۃ کریمہ پڑھی تو ہذیل قبیلہ سے ایک شخص کھڑا ہوا، سوال کیا یا رسول اللہ! کیا حج نہ کرنے والا کافر ہو جائے گا؟ آپ نے فرمایا جس نے حج چھوڑ دیا اسے عذاب کا خوف نہیں اور وہ ثواب کی امید نہیں رکھتا۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت میں ہے چاہے وہ تو اسے عذاب دے، چاہے تو اسے معاف کر دے، اس نے حج کی فرضیت کا انکار نہیں کیا، اگر چہ بظاہر معلوم ہوتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا خوف نہیں رکھتا اور اس کے ثواب کی امید نہیں رکھتا ہاں اگر یہی چیز بوجہ انکار ہو تو کافر ہو جائے گا۔

❁ وعن علی ﷺ من ملک زادا وراحلة يبلغه الى بيت الله ولم يحج فلاعليه ان يموت يهوديا اونصرانيا" (رواه الترمذی وضعفه)

حضرت علی ﷺ فرماتے ہیں جو شخص زادِ راہ کا مالک ہو گیا اور اسے سواری میسر ہو گئی پھر اس نے حج نہ کیا تو کوئی پرواہ نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے۔ (ماخوذ از مظہری)

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَO (آیۃ نمبر ۹۸)

(1) تم فرماؤ اے کتابیو! اللہ کی آیتیں کیوں نہیں مانتے اور تمہارے کام اللہ کے سامنے ہیں۔ (کنز الایمان)

(2) آپ فرما دیجئے اے اہل کتاب! تم کیوں کفر کرتے ہو اللہ کی آیات سے، حالانکہ اللہ مطلع ہے اس پر جو تم عمل کرتے ہو۔ (نجوم الفرقان)

راقم اور روح البیان:

﴿وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ﴾ حال من فاعل تكفرون والمعنى لاى سبب تكفرون بآياته عزوجل والحال انه تعالى مبالغ فى الاطلاع على جميع اعمالكم وفى مجازاتكم عليها ولاريب فى ان ذلك يسد جميع انحاء ماتأتونه ويقطع اسبابه بالكلية"

(روح البیان)

راقم نے ترجمہ روح البیان سے لیا ہے، علامہ اسمٰعیل حقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ﴿وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ﴾ ﴿تَكْفُرُوْنَ﴾ کے فاعل سے حال واقع ہے، معنی یہ ہے کہ کس سبب سے تم اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرتے ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ کامل طور پر تمہارے اعمال پر مطلع ہے اور تمہیں ان کی جزاء دے گا، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ تمہاری تمام راہیں بند کر دے گا، اور اسباب مکمل طور پر منقطع کر دے گا۔

آیۃ کریمہ میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ یہود کے علماء کو خطاب ہو، کہ اے یہود کے علماء تم نبی کریم ﷺ کی نبوت کی صداقت کو جاننے کے باوجود انکار کیوں کرتے ہو؟ اور ایک احتمال یہ ہے کہ "آیات" سے مراد مطلقاً اللہ تعالیٰ کی آیات ہیں جو نبی کریم ﷺ کی نبوت کی صداقت پر دلالت کرتی ہیں، اور خطاب تمام یہود و نصاریٰ کو ہے، یعنی اے یہودیو، اے نصرانیو تم قرآن پاک کی آیات کا کیوں انکار کرتے ہو اور نبی کریم ﷺ کی نبوت کا کیوں انکار کرتے ہو۔ (خازن)

﴿وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ...... وَالشَّهِيْدُ الْعَالِمُ الْمُطَّلِعُ﴾ "شہید کا اس مقام پر معنی عالم، مطلع ہے" حالانکہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم عمل کرتے ہو، یا معنی یوں کیا جائے حالانکہ اللہ تعالیٰ مطلع اس پر جو تم عمل کرتے ہو۔ (روح البیان)

اہل کتاب کو خطاب کی وجہ کیا؟

وتحصيص اهل الكتاب بالخطاب دليل على ان كفرهم اقبح لان معر فتهم بالآيات

اقوی وانهم وان زعموا انهم مؤمنون بالتوراة والانجیل فهم کافرون بهما"

اہل کتاب کے ساتھ خطاب کو خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ بتانا مقصود یہ ہے کہ ان کا کفر زیادہ قبیح (برا) تھا کیونکہ یہ آیات کو زیادہ جانتے تھے (جو نبی کریم ﷺ کی صداقت پر دلالت کرتی تھیں) یہ اپنے گمان کے مطابق توراۃ وانجیل پر ایمان رکھتے، حالانکہ حقیقت میں توراۃ وانجیل سے کفر کرتے تھے۔ (بیضاوی)

﴿لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ "بآیاته السمعیة والعقلیة" آیات سے مراد عام ہے جو سمعی اور عقلی دونوں کو شامل ہے، یہ ان لوگوں کو توبیخ (ڈانٹ ڈپٹ) کیلئے کہا گیا، کہ اے اہل کتاب (یہود ونصاری) تم اللہ تعالیٰ کی آیات "سمعیہ اور عقلیہ" "جو نبی کریم ﷺ کی نبوت کی صداقت پر دلالت رہی ہیں" کا انکار کیوں کرتے ہو؟ (بیضاوی)

اس آیۂ کریمہ سے یہود ونصاری پر وعید شدید فرمائی کہ اے اہل کتاب تمہارے اعمال کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے، لہذا جو تم اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں تحریف کرتے ہو وہ تمہیں جزادے گا، اور تمہارا حق کو چھپانا تمہیں نفع نہیں پہنچائے گا۔ (مظہری)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۝ (آیة نمبر ۹۹)

(۱) تم فرماؤ اے کتابیو! کیوں اللہ کی راہ سے روکتے ہو اسے جو ایمان لائے اسے ٹیڑھا کیا چاہتے ہو اور تم اس پر خود گواہ ہو اور اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں۔ (کنزالایمان)

(۲) آپ فرمادیجئے اے اہل کتاب! تم کیوں روکتے ہو اللہ کی راہ سے ان کو جنہوں نے ایمان لایا، ایسے حال میں کہ تم چاہتے ہو اس راہ کو ٹیڑھا کرنا، حالانکہ تم گواہ ہو، اور نہیں اللہ غافل اس سے جو تم عمل کرتے ہو۔ (نجوم الفرقان)

اس سے پہلی آیۂ کریمہ میں ذکر فرمایا کہ یہود ونصاری اللہ تعالیٰ کی آیات "جو صداقت رسول اللہ ﷺ پر دلالت کررہی ہیں" کا انکار کرتے ہیں، ان کا انکار کرنا بہت برا ہے کیونکہ وہ اللہ کی آیات کو اپنی کتاب میں پاتے ہیں،

علم کے ہوتے ہوئے انکار بہت بری چیز ہے۔

اب اس آیہ کریمہ میں ان کو پھر خطاب کیا " کرر الخطاب والا ستفهام مبالغة فی التقریع و نفی العذر لهم و اشعار اهان کل واحد من الامرین مستقبح فی نفسه مستقبل با ستجلاب العذاب "

اب اس آیہ کریمہ میں ان کو پھر خطاب کیا اور ان سے ہی نبی کریم ﷺ کے ذریعے پوچھا، اے اہل کتاب "یہود و نصاریٰ" تم ایمان والوں کو اللہ کی راہ سے کیوں روک رہے ہو ایسے حال میں کہ تم چاہتے ہو اس راہ کو ٹیڑھا کرنا، اس آیہ کریمہ میں ان کو زیادہ توبیخ کی گئی، ان کے عذر پیش کرنے کی راہ کو مزید بند کر دیا گیا، اور یہ بتایا گیا کہ ان کا اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرنا بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مستقل ذریعہ ہے، اور ان کا مومنوں کو اللہ تعالیٰ کی سیدھی راہ سے ہٹا کر ٹیڑھی راہ پر چلانے کی کوشش یہ بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب کو لانے کا مستقل ذریعہ ہے۔ "سبیل اللہ" اللہ کی راہ سے مراد دین حق ہے، جس پر چلنے کا حکم دیا گیا ہے، وہ ہے اسلام، کہ اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے اسلام پر چلو، یہود و نصاریٰ اسلام سے پھیرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، مومنوں کو فتنے میں ڈالنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ یہ راہ راست سے کیسے پھر جائیں، مومنوں کو ایک دوسرے کے خلاف ابھارنے کی اپنی طرف سے سرتوڑ کوشش کرتے ہیں۔ (ماخوذ از بیضاوی)

وجہ اس کی یہی ہے کہ وہ خود گمراہ ہیں، مومنوں کو بھی سیدھی راہ سے ہٹا کر ٹیڑھی راہ پر چلا کر گمراہ کرنا چاہتے ہیں کہ یہ بھی ہماری طرح ہی ہو جائیں۔

راقم اور بیضاوی رحمہ اللہ:

راقم نے " تبغونها عوجا " کا ترجمہ بیضاوی کی اس عبارت سے لیا ہے " تبغونها عوجا " حال من الواو ای باغین طالبین لها اعو جاجا " یعنی "عوجا "تبغونها " کی واو ضمیر سے حال واقع ہے، معنی یہ ہے "ایسے حال میں کہ تم چاہتے ہو اس راہ کو ٹیڑھا کرنا" یعنی تم مسلمانوں پر حق راہ کو خلط ملط کرتے ہو، ان کو وہم میں ڈالتے ہو کہ یہ راہ حق نہیں جس پر تم چل رہے ہو، اور نبی کریم ﷺ کی صفات کو بدل کر پیش کرنا تمہارا مسلمانوں کو راہ راست سے ہٹانے کی ناکام کوشش ہے۔ (ماخوذ از بیضاوی)

﴿وَاَنْتُمْ شُهَدَاءُ﴾ "حالانکہ تم گواہ ہو"

اس مقام میں "وَاَنْتُمْ شُهَدَاءُ" کے معنی میں چند احتمال پائے گئے ہیں۔

(۱) الاول قال ابن عباس رضی الله عنهما یعنی انتم شهداء ان فی التوراة ان دین الله

الذی لایقبل غیرہ ھو الاسلام"

ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں "حالانکہ تم گواہ ہو" کا مطلب یہ ہے کہ توراۃ میں نبی کریم ﷺ کے لانے کا ذکر اور آپ کے اوصاف کا ذکر موجود ہے، آپ کا ایک وصف توراۃ میں یہ بھی مذکور ہے کہ آپ کے تشریف لانے کے بعد صرف دین اسلام ہی مقبول ہوگا، باقی کوئی دین مقبول نہیں ہوگا، اس پر تم گواہ بھی ہو، پھر مسلمانوں کو دین سے پھیرنے کا کیا مطلب؟

(۲) والثانی وانتم شھداء علی ظھور المعجزات علی نبوتہ ﷺ"

دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کو "وَاَنْتُمْ شُهَدَاءُ" کہہ کر یہ بتایا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی نبوت پر دلالت کرنے والے معجزات آپ کو رب تعالیٰ نے عطاء فرمائے، جن پر تم گواہ ہو، پھر مؤمنوں کو ایمان سے پھیرنے کی ناپاک جسامت تمہارے عملوں کو برباد کرنے کا ذریعہ ہے۔

(۳) الثالث وانتم شھداء انہ لایجوز الصد عن سبیل اللہ"

تیسری وجہ یہ ہے کہ اہل کتاب کو خطاب کرتے ہوئے یوں کہا گیا کہ تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کی راہ سے کسی کو روکنا حرام ہے، تو پھر ان کو تم روک رہے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے جس کام پر تم خود گواہ ہو، وہی کام تم کر رہے ہو۔

(۴) الرابع وانتم شھداء بین اھل دینکم عدول یثقون باقوالکم ویعولون علی شھادتکم فی عظام الامور وھم الاخبار والمعنی ان من کان کذلک فکیف یلیق بہ الاصرار علی الباطل والکذب والضلال والاضلال"

چوتھی وجہ یہ بیان کی گئی کہ تم اپنے دین والوں کے نزدیک شاہد معتبر ہو کہ وہ تمہارے اقوال پر اعتبار کرتے ہیں اور تمہاری شہادت پر بڑے بڑے امور میں اعتبار کرتے ہیں، لیکن اس صورت میں خطاب یہود کے اہل علم کو ہے، معنی یہ ہوا کہ جب تم اپنے پیروکار لوگوں کے نزدیک معتبر گواہ ہو تو تمہارا باطل اور جھوٹ، گمراہ رہنے اور گمراہ کرنے پر قائم رہنا کس طرح تمہارے لائق ہے، یعنی لوگ تمہیں علم والا سمجھ کر تم پر اعتبار کرتے ہیں اور تمہیں اپنے بڑے بڑے امور پر گواہ بناتے ہیں، تم تو خود بھٹکے پھرتے ہو اور مومنوں کو بھٹکانے کی کوشش کر رہے ہو۔ (کبیر)

﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ "اور نہیں اللہ غافل اس سے جو تم عمل کرتے ہو۔"

کنز الایمان مطالب کا حقیقی ترجمان:

اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ دیکھئے "اور اللہ تمہارے کوتکوں سے بے خبر نہیں" برے

اعمال کیلئے آپ لفظ ''کونکوں'' استعمال فرماتے ہیں، اور اچھے اعمال کیلئے لفظ عمل استعمال فرماتے ہیں، یہ فرق مطالب کو سمجھانے کیلئے بہت خوب ہے۔ ہماری زبان میں لفظ ''کونکوں'' استعمال نہیں، اس لئے ہم اس حسین اور تحقیقی ترجمہ کے کمال کو سمجھنے کے بغیر ہی گذر جاتے ہیں، بلکہ بعض اوقات سمجھ ہی نہیں پاتے، راقم نے ظاہری الفاظ کے مطابق ترجمہ کر دیا ہے، تاہم کنزالایمان کے مطابق ہم اپنے استعمال الفاظ میں ترجمہ کرنا چاہیں تو یوں کر سکتے ہیں ''اور اللہ تمہارے کرتوتوں سے بے خبر نہیں'' ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کو دھمکی دی کہ تم رب تعالیٰ کی گرفت میں ہو، اس کے عذاب سے بچ نہیں سکو گے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی شخص کا غلام اس کا حکم نہ مانے اور اس کے کہنے پر نہ چلے تو وہ اسے کہے ''لایخفی علی مالانت علیہ، ولست غافلا عن امرک'' تم جس طریقہ پر ہو وہ مجھ سے پوشیدہ نہیں، میں تمہارے کرتوتوں سے غافل نہیں، مطلب اس کا بھی یہ ہے کہ ''تم باز آجاؤ ورنہ میں تمہیں شدید سزا دوں گا۔

عجیب حکمت: اس سے پہلی آیۃ کریمہ کو ﴿وَاللّٰہُ شَہِیْدٌ عَلٰی مَاتَعْمَلُوْن﴾ سے ختم کیا، اور اس آیۃ کریمہ کو ﴿وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ سے ختم کیا، اس میں عجیب حکمت یہ پائی گئی کہ پہلی آیۃ کریمہ میں ان کے کفر کا ذکر فرمایا، ان کا کفر ظاہر تھا، اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ﴿وَاللّٰہُ شَہِیْدٌ عَلٰی مَا تَعْمَلُوْن﴾ ذکر فرمایا کہ اللہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ لیکن اس آیۃ کریمہ میں ان کے مسلمانوں کو راہ راست سے ہٹانے کی ناپاک جسارت کا ذکر فرمایا یہ کام یہ حیلے، بہانے سے کرتے تھے، تو اس کے مناسب رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا ﴿وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ اور اللہ تمہارے کرتوتوں سے غافل نہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تُطِيعُوا فَرِيقًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كَافِرِينَ ○ (آیۃ نمبر ۱۰۰)

(1) اے ایمان والو! اگر تم کچھ کتابیوں کے کہنے پر چلے تو وہ تمہارے ایمان کے بعد تمہیں کافر کر چھوڑیں گے۔ (کنزالایمان)

(2) اے ایمان والو! اگر تم نے فرمانبرداری کی ایک فریق کی ان لوگوں سے جن کو کتاب دی گئے تو وہ تمہیں پھیر دیں گے تمہارے ایمان کے بعد حالت کفر میں۔ (نجوم الفرقان)

شانِ نزول:

بہت طویل روایت کی وجہ سے ترجمہ پر اکتفاء کیا جارہا ہے، عربی عبارت روح المعانی، درمنشور، بیضاوی وغیرہ میں دیکھی جائے، یہ بھی خیال رہے شان نزول جو بھی بیان کیا جارہا ہے وہ روح المعانی اور درمنشور نے ﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللّٰهِ﴾ کی تفسیر میں بیان کیا ہے، اور علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے اس زیر بحث آیۃ کریمہ کے ساتھ بیان کیا ہے۔

❁ ابن اسحاق، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے زید بن اسلم سے روایت ذکر کی کہ مرشاس بن قیس ایک بوڑھا شخص تھا، زمانہ جاہلیت میں مسلمانوں کے خلاف شدید حسد رکھتا تھا، کفر میں بہت اونچا درجہ رکھتا تھا، مسلمانوں کے خلاف دل میں کھوٹ کینہ اس کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، ایک مرتبہ یہ گذر رہا تھا تو اس نے اوس اور خزرج قبائل کے مسلمانوں کو ایک جگہ بیٹھے ہوئے آپس میں باہم شیر وشکر دیکھا، اور یہ دیکھ کر حیران ہوگیا کہ اسلام نے ان میں کس طرح الفت ومحبت پیدا کردی، ورنہ یہ دونوں قبیلے ایک دوسرے کے بہت بڑے دشمن تھے، ان کے درمیان بہت شدید جنگیں لڑی گئیں۔ وہ کہنے لگا بنی قیلہ کے یہ سردار آپس میں متحد ومتفق رہے تو ہمارا کیا بنے گا، یہ تو ہم پر چھا جائیں گے ہمیں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ اس نے یہود کے چند نوجوانوں کو کہا تم ان کی مجلس میں چلے جاؤ، ان کو یوم بعاث کی لڑائی یاد دلاؤ، اور اس جنگ کے متعلق کہے گئے اشعار ان دونوں کو سناؤ۔ بعاث کا دن وہ دن تھا جس میں اوس اور خزرج کے درمیان لڑائی ہوئی، فتح اوس کو حاصل ہوئی تھی، جب یہود کے نوجوانوں نے اس جنگ کے متعلق اشعار اس محفل میں پڑھے جس میں اوس وخزرج آپس میں محبت سے مل جل کر بیٹھے تھے، جب انہوں نے وہ اشعار

سنے، تو ان کے جذبات بھڑک اٹھے، یہاں تک کہ اوس بن قیظی جو اوس قبیلہ کے بنی حارثہ میں سے تھا، اور جبار بن صخر جو خزرج قبیلہ کے بنی سلمہ میں سے تھا، ان کے درمیان تکرار شروع ہوگئی، ایک دوسرے کے خلاف تیز زبانیں کھل گئیں، معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ ایک دوسرے فریق کو کہا گیا آؤ میدان جنگ میں نکلو، ایک مرتبہ پھر دو دو ہاتھ کرتے ہیں، پتہ چل جائے گا بہادر کون ہے، ہر فریق اپنی اپنی بہادری بیان کر رہا ہے، دوسرے کو طعنہ دے رہا تھا۔ دونوں فریق اپنے اپنے ہتھیار لے کر مقام حرہ میں پہنچ گئے، وہی زمانہ جاہلیت کے مطابق ایک دوسرے کو آواز کہنے لگے، آؤ ہمارے مقابل تمہیں پتہ چل جائے، ادھر مصطفیٰ کریم ﷺ کو پتہ چلا، تو آپ چند مہاجرین صحابہ کرام کو ساتھ لے کر ان کے مقابلہ میں میدان جنگ میں پہنچ گئے اور ارشاد فرمایا۔

"یا معشر المسلمین الله الله بدعوی الجاهلیة و انا بین اظهر کم بعد اذهداکم الله الی الاسلام و اکرمکم به و قطع به عنکم امر الجاهلیة و استنقذکم به من الکفر و الف به بینکم ترجعون الی ما کنتم علیه کفارا فعرف القوم الهانزغة من الشیطان و کیدمن عدو هم لهم فالقوا السلاح وبکوا وعانق الرجال بعضهم بعضا ثم انصرفوا مع رسول الله ﷺ سامعین مطیعین قد اطفا الله عنهم کید عدوا الله شاس"

اے مسلمانوں کی جماعت! اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو، کیا تم زمانہ جاہلیت کے طریقہ پر عمل کر رہے ہو، جبکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں اور اس کے بعد جب تمہیں اللہ تعالیٰ نے اسلام کی ہدایت دی اور تمہیں اللہ تعالیٰ نے مکرم بنایا ہے، اور تم سے جاہلیت کو دور کر دیا ہے، اور تمہارے درمیان الفت ومحبت ڈال دی، کیا تم پھر کفر کی طرف لوٹنا چاہتے ہو؟ (العیاذ باللہ) اب قوم کو بات سمجھ آگئی کہ ہمارے درمیان اختلافات کو بھڑکانے والا شیطان کا وسوسہ تھا، اور ہمارے دشمن کا مکروفریب تھا، انہوں نے ہتھیار پھینک دیئے اب وہ پھر ایک دوسرے کے گلے ملنے لگے، اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ واپس لوٹ آئے، آپ کے ارشادات کو (دل وجان سے) سن رہے تھے، آپ کی فرمانبرداری میں مشغول ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں سے دشمنی کی وہ آگ نکال دی جو اللہ کے دشمن شاس یہودی نے بھڑکائی تھی، پہلی دو آیات ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ﴾ سے لے کر ﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ تک شاس بن قیس اور اس کے فعل کے متعلق نازل ہوئیں۔ اور یہ زیر بحث آیہ کریمہ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِیْعُوْا﴾ سے لے کر ﴿اُولٰٓئِکَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ﴾ تک آیات اوس بن قیظی اور جبار بن صخر اور ان کے ساتھیوں اور ان کے افعال کے متعلق نازل ہوئی جنہوں نے مسلمانوں کے جذبات کو بھڑکا کر ان کو لڑنے پر آمادہ کر لیا۔ (ماخوذ از در منثور)

ماقبل سے تعلق:

پہلی دونوں آیتوں میں اہل کتاب یعنی یہود ونصاری کو ڈرایا گیا کہ تم اللہ تعالی کی آیات سے کیوں کفر تے ہو، اوردوسری آیۃ میں ان کو کہا گیا کہ تم مسلمان کوراہ راست سے ہٹانے کی ناپاک جسارت کیوں کررہے ہو؟ ان دونوں آیتوں میں یہود ونصاری کو کہا گیا تم اللہ تعالی کی گرفت میں آؤ گے، اب اس آیۃ کریمہ میں مومنوں کو ڈرایا گیا کہ اگر تمہیں یہود ونصاری بھٹکانے کی کوشش کریں تو بھٹک نہ جانا، اگر وہ تمہیں گمراہ کرنے کی کوشش کریں تو گمراہ نہ ہو جانا بلکہ ان کی باتوں کی طرف توجہ بھی نہ کرنا۔ (کبیر)

رب تعالی نے مومنوں کو اس لئے متنبہ کیا:

"ان المؤمنین ان لانوا وقبلوا منهم قولهم ادی ذلک حالا بعد حال الی ان یعود واکفارا والکفر یوجب الهلاک فی الدنیا والدین"

کہ بیشک مؤمنین نے اگر یہود ونصاری کے سامنے نرمی کا مظاہرہ کیا، اور ان کی باتوں کو مان لیا تو وہ آہستہ آہستہ انہیں کافر بنادیں گے، اور کفران کا دین اور ان کی دنیا برباد کردے گا، آج ہم دیکھتے ہیں یہود ونصاری کے یار مسلمانوں اور اسلام کے غدار نظر آتے ہیں، اور قادیانی اور نیچری بن کر اپنی عاقبت برباد کر بیٹھے۔ "الحفیظ الامان"

کافروں کے یار جب کافر بن گئے تو ان کا دین تو برباد ہونا عقل میں آتا ہے، لیکن ان کی دنیا کیسے برباد ہو جاتی ہے؟ بظاہر تو عقل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کافروں سے پیسے بٹورنے کیلئے ہی تو ان کے ہمنوا بنے اور یہود ونصاری اپنے یاروں کو بہت مالی امداد کرتے ہیں، تو اس کا جواب یہ ہے۔

"واما فی الدنیا فبوقوع العداوة والبغضاء وهیجان الفتنة وثوران المحاربة المؤدیة الی سفک الدماء"

دنیا ان کی اس طرح برباد ہو جاتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے دشمن بن جاتے ہیں، اور مسلمانوں سے بغض شروع کردیتے ہیں، وہ فتنہ بھڑکادیتے ہیں، وہ لڑائی کو بھڑکاتے ہیں، جس سے مسلمانوں کا ہی خون بہاتے ہیں۔ (کبیر)

آج کل ہم علامہ رازی رحمہ اللہ کی بیان کردہ وجوہ کو دیکھتے ہیں تو سو فیصد سچی نظر آرہی ہیں، کل تک جن لوگوں کو مجاہد کہتے کہتے زبانیں نہیں تھکتی تھیں، آج ان کو ہی نام نہاد مسلمان قتل کر کے اپنے دین و دنیا برباد کررہے ہیں۔

ایک عجیب نکتہ:

اگرچہ آیۂ کریمہ اوس اور خزرج کے حق میں نازل ہوئی جو اسلام لانے اور باہم شیر وشکر ہو جانے کے بعد یہود سے سازش سے ایک دوسرے سے لڑنے کیلئے جنگ میں اتر آئے، لیکن ضمناً یہ خطاب تمام مؤمنین کو ہے۔

"وخاطبهم الله تعالى بنفسه بعد ما امر رسوله ﷺ بخطاب اهل الكتاب اظهار الجلالة قدرهم واشعار ابانهم هم الاحقاء بان يخطا بهم الله تعالى ويكلمهم فلا حاجة الى ان يقال المخاطب للرسول ﷺ بتقدير قل لهم"

اللہ تعالیٰ نے جب اہل کتاب یعنی یہود ونصاریٰ کو خطاب کیا تو نبی کریم ﷺ کے ذریعے ارشاد فرمایا ﴿قُلْ یَااَھْلَ الْکِتَابِ﴾ آپ فرما دیجئے اے اہل کتاب" یعنی وہ ذلیل لوگ ہیں اس لئے اے میرے محبوب میں ان سے براہ راست بات نہیں کرنا چاہتا، اسلئے آپ کو کہتا ہوں "قُلْ" آپ ہی ان کو فرما دیں، لیکن جب مؤمنوں کو خطاب کرنے کی باری آئی تو درمیان میں "قُلْ" کا واسطہ نہیں رکھا، یہ نہیں کہا کہ اے محبوب آپ مؤمنوں کو کہہ دیں، اگرچہ مومنوں تک بھی رسول اللہ ﷺ کے ذریعے ہی بات تو پہنچی لیکن ان کو جلیل القدر سمجھتے ہوئے رب تعالیٰ نے اس قابل سمجھا کہ ان کو براہ راست کہا جائے ﴿یَااَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ "اے ایمان والو!" (روح المعانی)

"فَرِیْقًا" سے مراد اگرچہ بظاہر "شماس بن قیس" یہودی مراد ہے، لیکن عموم لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے مراد تمام ہی کافر ہیں، کہ تمام کفار یہی چاہتے ہیں کہ مومنین بھی ہماری طرح کافر ہو جائیں۔ (روح المعانی)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"کَافِرِیْنَ" ترکیبی لحاظ پر یا تو "مفعول" ہے، اور "یَرُدُّوْکُمْ" تصییر کے معنی کو متضمن ہے کہ "وہ تمہیں کفر کی طرف پھیر دیں گے" اور یا "حال" واقع ہے، مفعول سے، اس صورت میں معنی ہو "وہ تمہیں لوٹا دیں گے حالت کفر کی طرف" مفعول والا معنی لینا زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس میں ایمان والوں کی طرف ان کے پہلے کفر کی نسبت بھی نہیں، مطلب یہ ہے کہ "اے ایمان والو اگر تم نے اہل کتاب میں سے ایک فریق کی تابعداری کی تو وہ تمہیں کفر کی طرف پھیر دیں گے" لیکن اگر حال والا معنی ہو تو ایمان والوں کا پہلا کفر واضح ہوگا اب مطلب یوں ہوگا "اے ایمان والو اگر تم نے اہل کتاب میں سے ایک فریق کی تابعداری کی تو وہ تمہیں کفر کی طرف لوٹا دیں گے، اور پہلا معنی لینا اس لئے بھی زیادہ معتبر ہے کہ خطاب عام ہے، اس لئے جدی پشتی ایمان والوں کو جب خطاب ہوگا تو دوسرا معنی بغیر تاویل کے درست ہی نہیں ہوگا۔ (ماخوذ از روح المعانی بوضاحت)

وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍO (آیۃ نمبر ۱۰۱)

(1) اورتم کیونکر کفر کرو گے تم پر اللہ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور تم میں اس کا رسول تشریف لایا، اور جس نے اللہ کا سہارا لیا تو ضرور وہ سیدھی راہ دکھایا گیا۔ (کنز الایمان)

(2) اورتم کیسے کفر کرو گے حالانکہ تلاوت کی جاتی ہیں تم پر اللہ کی آیتیں اور تم میں اس کے رسول موجود ہیں، اور جس نے سہارا لگایا اللہ سے تو تحقیق ہدایت دی گئی اسے سیدھی راہ کی۔ (نجوم الفرقان)

"کَیْفَ" اس مقام میں تعجب انکاری کے ہے "کہ تم کیسے کفر کرو گے" تمہاری شان کے لائق نہیں کہ تم کفر تک پہنچ جاؤ"

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا حسین وجمیل ترجمہ:

اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضاء خان بریلوی رحمہ اللہ نے ﴿وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ﴾ کا ترجمہ کیا ہے "اور تم کیونکہ کفر کرو گے" اور یوں ترجمہ نہیں کیا "اور تم کیونکر کفر کرتے ہو" کیونکہ یہ خطاب تو اوس اور خزرج کے مسلمان صحابہ کرام کو ہے جو وقتی طور پر یہود کی سازش سے ایک دوسرے کے سامنے لڑائی کیلئے جمع ہو گئے، ان کو رب تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تم یوں ہی یہود کی سازش کا شکار ہوتے رہے تو وہ تمہیں آہستہ آہستہ کافر بنا دیں گے، تم بھلا کیسے کافر ہو گے؟ نہیں نہیں تم کافر نہیں ہو گے تم پر اللہ کے نبی براہ راست اللہ تعالیٰ کی آیات کو تلاوت کر رہے ہیں، خود بنفس نفیس رسول اللہ ﷺ تمہارے درمیان موجود ہیں، لھذا تمہیں چاہیے کہ تم اللہ تعالیٰ پر سہارا لگاؤ، جس نے اللہ تعالیٰ پر سہارا لگایا اسے سیدھی راہ کی ہدایت دے دی گئی۔

اعتراض: وكلمة كيف تعجب، والتعجب انما يليق بمن لا يعلم السبب وذلک على الله محال"

کلمہ "کیف" تعجب کیلئے ہے، اکثر مفسرین کرام نے یہی لکھا ہے تعجب تو وہاں ہوتا ہے جہاں اسباب کا علم نہ ہو کہ یہ کیسے ہو گیا؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ پر اسباب کا مخفی رہنا محال ہے، تو اس مقام میں "کیف" کا تعجب کے معنی میں استعمال کس طرح درست ہے؟

جواب: والمراد منه المنع والتغليظ وذلک لان تلاوة آيات الله عليهم حالا بعد حال مع كون الرسول فيهم الذى يزيل كل شبهة ويقرر كالحجة كالمانع من وقوعهم فى الكفر، فكأن صدور الكفر عن الذين كانوا بحضرة الرسول ابعد من هذا الوجه"

اس مقام میں "کَیْفَ" صرف تعجب کیلئے نہیں کہ اعتراض وارد ہو سکے، بلکہ تعجب اور انکار کیلئے ہے، یعنی استفہام انکاری کیلئے ہے جو تعجب پر دلالت کر رہا ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات ان پر وقتاً فوقتاً (آہستہ آہستہ بوقت ضرورت) تلاوت کی جارہی ہیں، خصوصاً وہ آیات جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبی کریم ﷺ کی نبوت پر دلالت کر رہی ہیں وہ ان پر رسول اللہ ﷺ تلاوت کر رہے ہیں، اور آپ خود ان میں تشریف فرما ہیں، ان کے شبہات کو آپ خود زائل کر رہے ہیں، ان پر دلائل قائم کر رہے ہیں یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ان کو کفر سے روکا جارہا ہے، پھر ان کا رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں یہود کی سازش کا شکار ہو جانا اور آہستہ آہستہ کفر کی طرف پہنچ جانے کا امکان بعید تھا، اب واضح ہو گیا کہ "کَیْفَ" استفہام انکاری کیلئے ہے ضمناً تعجب بھی پایا گیا ہے، لھذا کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ (ماخوذ از تفسیر کبیر)

اللہ تعالیٰ کی کتاب کا ان پر پڑھا جانا اور نبی کریم ﷺ کا ان مؤمنین میں موجود ہونا کفر سے عقلاً بعید ہے "وجود هاتين الحالتين تنافي الكفر و لا تجامعه" یہ دونوں چیزیں کفر کے مخالف ہیں، اس لئے ان میں کفر کا پایا جانا منع تھا "فلايتطرق اليهم كفر مع ذلك" صحابہ کرام پر قرآن پاک کی آیات کا پڑھا جانا اس پر دلالت کر رہا ہے کہ کفران کے قریب کھٹک بھی نہیں سکتا۔

فرق واضح ہو گیا:

اگرچہ یہاں بھی ﴿کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ﴾ ہے، اور ﴿کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَکُنْتُمْ اَمْوَاتًا﴾ میں بھی ﴿کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ﴾ ہے، لیکن ﴿کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَکُنْتُمْ اَمْوَاتًا﴾ میں خطاب حقیقت میں کفار کو ہے، لھذا وہاں کفر کا سرزد ہونا حقیقی طور پر پایا گیا ہے، لیکن اس آیۂ کریمہ خطاب مؤمنین کو ہے "وليس المعنى انه وقع منهم الكفر فوبخوا على وقوعه لانهم مؤمنون ولذلك نودوا بقوله "يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" اس آیۂ کریمہ میں یہ معنی نہیں کہ جن کو خطاب ہے ان سے کفر واقع ہوا اور ان کو اس پر ڈانٹ ڈپٹ دی گئی ہو، بلکہ یہ خطاب تو مؤمنین کو ہے، جس پر پچھلی آیۂ کریمہ واضح طور پر دلالت کر رہی ہے، جس کی ابتداء ہی "یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" سے کی گئی ہے۔ (البحر المحیط)

البحر المحیط کی اس طویل بحث کو اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضاء خان بریلوی رحمہ اللہ نے اپنے ترجمہ میں خوبصورت انداز پر سمودیا ہے جس کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے۔

مقام توجہ: والخطاب قال الزجاج لاصحاب النبی ﷺ خاصة لان النبی ﷺ كان فيهم وهم يشاهدونه وقيل لجميع الامة لان آثاره وسنة فيهم وان لم يشاهدوه"

آیۃ کریمہ میں خطاب براہ راست تو آپ کے صحابہ کرام کو ہے کہ آپ ان میں تشریف فرما تھے، اور وہ آپ کا مشاہدہ کرر ہے تھے، لیکن بالواسطہ خطاب آپ کی تمام امت کو ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کے آثار اور آپ کی سنتیں آپ کی تمام امت میں موجود ہیں، اگرچہ براہ راست نبی کریم ﷺ کا صحابہ کرام کے بعد والے لوگ مشاہدہ تو نہیں کرر ہے، لیکن آپ کے آثار اور آپ کی سنتیں گویا کہ آپ کے مشاہدہ پر ہی دلالت کر رہی ہیں۔ (ماخوذ از البحر المحیط)

﴿وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْهُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾

اور جس نے سہارا لگایا اللہ سے تو تحقیق ہدایت دی گئی اسے سیدھی راہ کی۔

"ومن يعتصم بالله "ومن يتمسک بدينه اويلتجئ اليه فی مجامع اموره"

بیضاوی رحمہ اللہ نے دو معنی بیان کئے ہیں کہ یا تو "ومن يعتصم بالله" کا معنی یہ ہے "ومن يتمسک بدينه" اور جس اللہ تعالیٰ کے دین کو مضبوطی سے پکڑا تو تحقیق اسے سیدھی راہ دی گئی، اور یا اس کا معنی یہ ہے "ومن يلتجئ اليه فی مجامع اموره" جس نے اپنے تمام امور میں اللہ تعالیٰ سے پناہ پکڑی تو اسے سیدھی راہ کی ہدایت دی گئی۔ اس کی مزید وضاحت دیکھئے:

"الاعتصام هو الاستمساک بالشئی واصله من العصمة بمعنی المنع والعاصم المانع واستعصم فلان بالشئی اذا تمسک بالشئی فی منع نفسه عن الوقوع فی آفة واعتصم الرجل بصاحبه لزمه وتمسک به فی الامتناع عما يضر والعصمة المنع يقال عصمة الطعام ای منعه من الجوع"

اعتصام کا معنی ہے "کسی چیز سے سہارا لگانا" اصل میں عصمت کا معنی ہے منع کرنا، اور عاصم کا معنی ہے "منع کرنے والا" اسی طرح کہا جاتا ہے "استعصم فلان بالشئی "فلاں شخص نے ایک چیز سے سہارا لگا کر اپنے آپ کو گرنے سے یا کسی مصیبت میں پھنسنے سے بچالیا۔ "عصمة" کا معنی ہے منع کرنا، جیسے کہا جاتا ہے "عصمه الطعام" طعام نے اس کی بھوک کو روک دیا۔

اب اس تفصیل کے بعد یہ سمجھا جائے کہ علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے جو دو معانی بیان کئے اس کی وجہ کیا ہے؟

"وبالجملة لابد فی الاعتصام من ملاحظة معنی التمسک والتمسک بالله تعالی حقيقة لايتصور فلابد ان يقدر مضاف وهو الدين اويجعل الاعتصام بالله استعارة للالتجاء اليه بان يشبه الالتجاء بالتمسک"

حاصل کلام یہ ہے کہ ''اعتصام'' کا معنی ہے سہارا لگانا، جیسا کہ کسی دیوار وغیرہ سے سہارا لگایا جائے، اس معنی کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ سے تمسک (سہارا لگانا) نہیں پایا جا سکتا، اس لئے یا تو ضروری ہے کہ حذف مضاف والا قانون پایا جائے، معنی ہو جائے "ومن یعتصم بدین اللہ" جو شخص اللہ تعالیٰ کے دین سے سہارا لگاتا ہے تو تحقیق اسے سیدھی راہ کی ہدایت دے دی گئی، اور یا مجازی طور پر ''اعتصام'' کا معنی ''التجاء'' کر لیا گیا ہے، سہارا لگانے کا مطلب ہے پناہ پکڑنا، اب اس معنی کے لحاظ پر مطلب یہ ہوگا ''اور جس نے پناہ پکڑی اللہ تعالیٰ کی تو تحقیق اسے سیدھی راہ کی ہدایت دے دی گئی۔ (شیخ زادہ)

دینی طلباء کرام کی خصوصی توجہ کیلئے:

وجیء فی الجواب بقد دلالة علی التحقیق و التوقع فان کلمة قد سواء دخلت علی الماضی او المضارع لابد فیها معنی التحقیق ثم انه ینضاف فی بعض المواضع الی هذاالمعنی فی الماضی التقریب من الحال مع التوقع ای بکون مصدره متوقعا لمن یخاطبه واقعا عن قریب کما تقول لمن یتوقع رکوب الامیر ،قدرکب، ای حصل عن قریب ماکنت تتوقعه،ولا شک ان المعتصم بالله متوقع لهدایته وقوله لامحالة اشارةالی مافی قد من معنی التحقیق''

"فقد هدی" میں لفظ'' قد'' لایا گیا ہے، جو تحقیق اور توقع کا معنی دیتا ہے، لفظ'' قد'' خواہ ماضی پر داخل ہو یا مضارع پر، اس میں تحقیق کا معنی ضرور پایا جاتا ہے، یعنی مضارع پر داخل ہو کر تقلیل کا معنی بھی پایا جاتا اور تحقیق کا بھی "قد یجئ" کا معنی ہوگا تحقیق وہ کبھی کبھی آئے گا، اور ماضی پر داخل ہو تو تحقیق کے ساتھ ساتھ اس میں کبھی کبھی ''توقع'' کا معنی بھی پایا جاتا ہے، جیسا کہ کہا جائے "قدرکب" جس کے سوار ہونے کی توقع تھی تحقیق وہ قریب زمانہ میں سوار ہو گیا، اب اس تمہید کے بعد معنی یہ ہوا ﴿وَمَنْ یَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ﴾ اور جس نے اللہ تعالیٰ پر سہارا لگایا اسے توقع تھی کہ رب تعالیٰ کی طرف سے اسے سیدھی راہ کی ہدایت حاصل ہو گئی، تحقیق اسے سیدھی راہ کی ہدایت دے دی گئی۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

اهلسنت وجماعت کا مذهب:

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے تمام افعال کا خالق ہے، جو اس آیۃ کریمہ سے ثابت ہو رہا ہے "فلما جعل ذلک الاعتصام فعلالهم وهدایة من الله ثبت ماقلناه" جب اللہ تعالیٰ سے سہارا لگانا بندوں کا فعل ہے اور

ہدایت اللہ تعالیٰ سے حاصل ہوتی ہے تو اس سے ہمارا مذہب ثابت ہو گیا۔

معتزلہ کا مذہب:

وہ کہتے ہیں بندے اپنے افعال کے خود خالق ہیں، وہ اس آیۃ کریمہ کی مختلف توجیہات بیان کرتے ہیں کبھی کہیں گے ہدایت کا مطلب زیادہ رحمت، کبھی کہیں گے ہدایت کا معنی ہے جنت کی راہ، کبھی کہیں گے ہدایت کا معنی اچھے فعل کی تخلیق کی ان کو توفیق دی جاتی ہے، اور کبھی کہیں گے یہ خبر ہے کہ اللہ تعالیٰ پر سہارا لگانے والوں نے اپنے اچھے اعمال کی تخلیق خود کر لی۔ (ماخوذ از کبیر)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ (آیۃ نمبر ۱۰۲)

(1) اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور ہرگز نہ مرنا مگر مسلمان۔ (کنز الایمان)

(2) اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے جیسا کہ حق ہے اس سے ڈرنے کا، اور ہرگز تم نہ مرنا مگر یہ کہ تم مسلمان ہو۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

پچھلی آیۃ کریمہ میں بیان کیا کہ یہود و نصاریٰ چاہتے ہیں تمہیں اسلام سے پھیر دیں، اسلئے ان کی سازشوں سے ہوشیار رہنا، گمراہ کرنے کی ان کی سازش کو ناکام بنا دینا، تاکہ تم دین پر قائم رہ سکو، اور گمراہی سے بچ جاؤ، اب اس آیۃ کریمہ میں تمام طاعات پر قائم رہنے کا حکم دیا، تفسیر کے الفاظ یہ ہیں "لما حذر هم تعالى من اضلال من يريد اضلالهم امرهم بجميع الطاعات" (البحر المحیط)

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا﴾ "اے ایمان والو!۔"

یہ ترجمہ جو نقل کیا گیا ہے، یہ مختصر ہے، ورنہ مکمل الفاظ کا ترجمہ یہ ہے (اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو) پچھلی آیۃ کریمہ میں بھی خطاب ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا﴾ سے کیا، یہاں دوبارہ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا﴾ سے خطاب کیا، جس

سے مسلمانوں کی شرافت و بزرگی کو ظاہر کیا گیا ہے، خاص کر کے جب پچھلی آیۃ کریمہ " اوتوا الکتاب "ذکر کیا گیا ، تو وہم ہوتا تھا کہ شاید یہود و نصاری تو "اہل کتاب" ہیں وہ ہم سے کہیں افضل نہ ہوں ، تو اس وہم کا ازالہ " ﴿یَـٰٓأَیُّهَا الَّذِینَ اٰمَنُوْا﴾ سے کر دیا، (اے ایمان والو) یقینی بات ہے، ایمان مکمل اسی وقت ہوگا جبکہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے ساتھ نبی کریم ﷺ کی رسالت اور قرآن پاک پر بھی ایمان لائے گا، تو گویا ﴿یَـٰٓأَیُّهَا الَّذِینَ اٰمَنُوْا﴾ کہ کر نبی کریم ﷺ کے ایماندار لوگوں کو بتایا گیا کہ تم تمام امتوں سے افضل ہو، اسلئے کہ تمہارے نبی سب نبیوں سے افضل ہیں ، اور تمہاری کتاب سب کتابوں سے افضل ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی بالوضاحت)

﴿اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ﴾ "ڈرو اللہ سے جیسا کہ حق ہے اس سے ڈرنے کا۔"

اس آیۃ کریمہ میں دو قول ہیں، ایک یہ کہ الفاظ مبارکہ منسوخ ہیں، اور دوسرا یہ کہ یہ منسوخ نہیں، جن حضرات نے کہا ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ﴾ 'منسوخ ہیں، انہوں نے کہا کہ اس میں روایات موجود ہیں جن سے یہ مسئلہ واضح ہو جاتا ہے۔ (کبیر)

❁ اخرج ابن المبارک فی الزھد وعبدالرزاق والفریابی وعبد بن حمید وابن ابی شیبہ وابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم والنحاس فی الناسخ والطبرانی والحاکم وصححه وابن مردویه عن ابن مسعود فی قوله "اتقوا الله حق تقاته" قال ان یطاع فلا یعصی ویذکر فلا ینسی ویشکر فلا یکفر"

حضرت ابن مسعود ﷺ (موقوف حدیث) بیان فرماتے ہیں ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جائے اس کی نافرمانی نہ کی جائے اور اسے یاد کیا جائے اس کی یاد کو چھوڑا نہ جائے ، اور اس کو شکر ادا کیا جائے ، اس کی نعمتوں کا کفران (ناشکری) نہ کی جائے۔ (ماخوذ از درمنثور)

✿ واخرج الحاکم وصححه وابن مردویه من وجه آخر عن ابن مسعود قال قال رسول الله ﷺ (اتقوا الله حق تقاته) ان یطاع فلا یعصی وان یذکر فلا ینسی"

حاکم نے مستدرک میں حدیث بیان کی جسے اس نے صحیح قرار دیا اور ابن مردویہ نے بھی ایک اور سند سے حضرت ابن مسعود ﷺ سے مرفوع حدیث بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ﴾ ا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جائے ، اس کی نافرمانی نہ کی جائے ، اور اسے یاد کیا جائے اس کی یاد کو چھوڑا نہ جائے۔ (ماخوذ از درمنثور)

✿ واخرج عبد بن حمید عن عکرمة (اتقوا الله حق تقاته)قال ان یطاع فلا یعصی وان یذکر فلا ینسی قال عکرمة قال ابن عباس فشق ذلک علی المسلمین فانزل الله بعدذلک فاتقوا الله مااستطعتم"

عبد بن حمید نے حضرت عکرمہ سے روایت نقل کی کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهِ﴾ امطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی جائے نافرمانی نہ کی جائے اور اسے یاد کیا جائے اس کی یاد کو چھوڑا نہ جائے، حضرت عکرمہ فرماتے ہیں حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا کہ جب یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی تو مسلمانوں کا اس پر عمل کرنا شاق گذرا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد یہ الفاظ مبارکہ نازل فرمائے ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ تو تم اللہ سے ڈرو جب تک تم طاقت رکھتے ہو۔ (ماخوذ از در منثور)

✿ واخرج ابن مردویه عن ابن عباس فی قوله (اتقوا الله حق تقاته)ان یطاع فلا یعصی فلم یستطیعوا قال الله تعالی فاتقوا الله مااستطعتم"

ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ذکر کی ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهِ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے جیسا کہ اس کی اطاعت کا حق ہے اور اس کی نافرمانی نہ کی جائے، تو صحابہ کرام کو اس پر عمل کرنے کی طاقت حاصل نہ ہوئی، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ تو اللہ سے ڈرو جتنی تم طاقت رکھتے ہو۔ (ماخوذ از در منثور)

صحابہ کرام پر عمل شاق کیوں گذرا؟

✿ واخرج ابن ابی حاتم عن سعید بن جبیر قال لما نزلت هذه الآیة اشتد علی القوم العمل فقاموا حتی ورمت عراقیبهم وتقرحت جباهم فانزل الله تخفیفا علی المسلمین فاتقوا الله مااستطعتم فنسخت الآیة الاولی"

ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر کی روایت نقل کی کہ جب آیۃ کریمہ ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهِ﴾ نازل ہوئی تو قوم (صحابہ کرام) کا اس پر عمل کرنا مشکل ہو گیا (کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حق یوں ادا کیا) کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کھڑے ہو کر شروع کی یہاں تک کہ ان کے پاؤں سوج گئے، ان کی پیشانیاں زخمی ہو گئیں تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر تخفیف کیلئے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ "تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو جتنی طاقت رکھتے ہو" اسی سے پہلی آیۃ ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهِ﴾ منسوخ ہو گئی۔ (از در منثور)

بعض حضرات نے اس آیۃ کو منسوخ نہیں مانا:

ان حضرات کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) **الاول ما روی عن معاذ انه ﷺ قال له هل تدری ما حق الله علی العباد؟قال الله ورسوله اعلم قال هو ان یعبدوه ولا یشرکوا به شیئا" وهذامما لایجوزان ینسخ"**

ان کی پہلی دلیل یہ ہے کہ حضرت معاذ ﷺ سے روایت کی گئی کہ نبی کریم ﷺ نے ان سے پوچھا کیا تم جانتے ہو کہ اللہ تعالی کا بندوں پر کیا حق ہے؟ (یعنی اس سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے) اس حق کا کیا مطلب ہے؟ تو انہوں نے عرض کیا اللہ تعالی اور اس کے رسول اللہ ﷺ ہی زیادہ بہتر جانتے ہیں، تو آپ نے فرمایا کہ رب تعالی کا بندوں پر یہ حق ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہرائیں" (یہ حکم منسوخ نہیں) کیونکہ نہ اس کی عبادت کو چھوڑنے کی اجازت ہے، اور نہ ہی اس سے شریک ٹھہرانے کی اجازت ہے۔

(۲) **والثانی ان معنی قوله "اتقوا الله حق تقاته" ای کما یحق ان یتقی وذلک بان یجتنب جمیع معاصیه"**

ان حضرات کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالی کے ارشاد گرامی ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے کہ تمام معاصی سے اجتناب کرو، اگر آیۃ کریمہ کو منسوخ مانا جائے تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ بعض معاصی کی اجازت دے دی گئی (معاذ اللہ) ایسا تو ہو نہیں سکتا لھذا آیۃ کریمہ منسوخ نہیں ہو سکتی۔ (ماخوذ از کبیر)

محاکمہ: دونوں قولوں میں محاکمہ اور تطبیق پائی گئی ہے، کسی قسم کا کوئی تعارض نہیں، اسلئے کہ جب ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم اللہ تعالی سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے، کہ تم ساری ساری رات قیام اور سجود میں گذار دو جس سے ان کے پاؤں پر ورم آگیا اور ان کی پیشانیاں زخمی ہوگئیں، اس معنی کے لحاظ پر ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ سے منسوخ ہے۔ اور اگر معنی یہ لیا جائے کہ تم اپنی طاقت کے مطابق اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے تو آیۃ کریمہ منسوخ نہیں، اتنا مسئلہ واضح ہے ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ اللہ تعالی کسی نفس کو اس کی طاقت سے زائد تکلیف نہیں دیتا۔ (راقم)

اعتراض: فان قیل الیس انه تعالی قال ﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ﴾ اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا "انہوں

نے اللہ کی قدر نہیں جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق تھا، اس سے پتہ چلا کہ مؤمنین نے اللہ تعالیٰ کی قدر کرنے کا جو حق تھا اس طرح قدر نہیں کی، اور دوسری بات یہ سمجھ آئی کہ ''تکلیف مالا یطاق'' جائز ہے، اسی وجہ سے طاقت سے زائد قدر کرنے کا گویا کہ حکم دے کر کہا گیا ہے کہ انہوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جیسا کہ قدر کرنے کا حق تھا۔

جواب: قلنا سنبين فی تفسیر هذه الآية انها جاء ت في القرآن في ثلاثة مواضع وكلها في صفة الكفار لافي صفة المسلمين''

﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ﴾ کی مکمل تفسیر تو اپنی اپنی جگہ آئے گی ان شاء اللہ، البتہ اجمالی جواب یہ سمجھ لیا جائے کہ قرآن پاک میں یہ الفاظ مبارکہ تین جگہ پر آئے ہوئے ہیں، ہر جگہ میں کافروں کے حق میں یہ نازل ہوئے ہیں مسلمانوں کے حق میں کہیں بھی نازل نہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

حقیقت یہی ہے کہ فتنہ وفساد کی جڑ ہی یہ ہے کہ کافروں کے حق میں نازل ہونے والی آیات کو مسلمانوں پر چسپاں کیا جائے۔

اظہار تشکر:

اللہ تعالیٰ کا ان گنت مرتبہ شکر ہے کہ راقم اپنے ذہن سے کوئی چیز تحریر کر دیتا ہے پھر اسے کسی تفسیر سے تائید حاصل ہوتی ہے، دینی مدارس کے میرے پیارے طلباء کرام آیئے! تفسیر خازن کی عبارت کو دیکھیں اور راقم کے محاکمہ کو دیکھیں لفظ بلفظ مطابق پائیں گے۔

''وموجب هذا الاختلاف يرجع الى معنى الآية فمن قال انها منسوخة قال حق تقاته هو ان يأتي العبد بكل ما يجب لله ويستحقه فهذا يعجز العبد عن الوفاء به فتحصيله ممتنع ومن قال بانها محكمة قال ان حق تقاته اداء ما يلزم العبد على قدر طاقته فكان قوله تعالى ''فاتقوا الله ما استطعتم'' مفسرًا لحق تقاته لاناسخا ولامخصصا، فمن اتقى الله ما استطاع فقد اتقاه حق تقواه'' (خازن)

﴿وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ ''اور ہر گز تم نہ مرنا مگر یہ کہ تم مسلمان ہو۔''

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

﴿وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ کی ایک ترکیب یہ ہے کہ یہ جملہ حالیہ ہے، اس کے مطابق مطلب یوں ہو گیا ''ولا

تکونن علی حال سوی حال الاسلام اذا ادرککم الموت" اور ہرگز نہ ہونا کسی حال پر سوائے حالت اسلام کے جب تمہیں موت پائے۔ لفظوں کے مطابق ترجمہ یوں ہوگا"اور ہرگز تم نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو"
(مدارک التنزیل للنسفی)

پہلا معنی:

"ولا تموتن" جمع مذکر مخاطب نہی حاضر معلوم مؤکد بانون تاکید ثقیلہ ہے، لیکن امر کے معنی کو مستلزم ہو، یعنی ﴿وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ﴾ کا مطلب یہ ہے" کونوا علی الاسلام فاذاو دد علیکم الموت صادفکم وانتم علی الاسلام "تم اسلام پر قائم رہو، جب تمہارے پاس موت آئے تو وہ تمہیں اسلام پر قائم پائے۔
(خازن)

"(ولا تموتن الا وانتم مسلمون)ای حافظوا علی الاسلام فی حال صحتکم وسلامتکم لتموتوا علیه فان الکریم قد اجری عادته بکرمه ، انه من عاش علی شئی مات علیه ومن مات علی شئی بعث علیه فعیاذبالله من خلاف ذلک"

"تم ہرگز نہ مرنا مگر یہ کہ تم مسلمان ہو" اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی صحت اور سلامتی کے حال میں اسلام کی حفاظت کرو، اسلئے کہ رب کریم کی عادت کریمہ یہ ہے کہ جو شخص کسی عمل پر دنیا کی زندگی میں ہوتا ہے اسے اسی حال پر موت دیتا ہے، اس لئے انسان اسلام پر قائم رہے تا کہ موت اسی پر آئے، ایسا نہ ہو" العیاذ باللہ" کہ اسلام سے دور رہ کر کفر پر اس کی موت آجائے، انسان کی یہی بڑی بدقسمتی ہے۔
(ماخوذ از صابونی)

دوسرا معنی:

وقیل معناه"ولا تموتن الا وانتم مسلمون"مخلصون مفضون الی الله امورکم تحسنون الظن به عزوجل"

اور معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ" ہرگز تم نہ مرنا مگر یہ کہ تم مسلمان ہو" کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری موت ایسی حالت میں آئے کہ تم خلوص سے اپنے تمام امور کو اللہ تعالی کے سپرد کر دو، اور اللہ تعالی پر اچھا گمان رکھو۔ (خازن)

✿ **روی الامام احمد عن مجاهد ان الناس کانوا یطوفون بالبیت وابن عباس جالس معه محجن فقال قال رسول الله ﷺ یا ایها الذین آمنوا اتقوا الله حق تقاته ولا تموتن الا وانتم مسلمون ولو ان قطرة من الزقوم قطرت فی دار الدنیا لأفسدت علی اهل**

الدنیامعا یشهم فکیف بمن لیس له طعام الا الزقوم"

(رواه الترمذی والنسائی وابن ماجة)(ماخوذ از صابونی،ابن کثیر وخازن)

امام احمد رحمہ اللہ نے مجاہد کی روایت نقل کی کہ بیشک لوگ بیت اللہ شریف کا طواف کرر ہے حضرت ابن عباس وہاں بیٹھے ہوئے تھے،آپ کے ہاتھ میں ایک ٹیڑھی نوک والا عصا تھا،آپ فرمار ہے تھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رب تعالی کاارشاد گرامی ہے ﴿یٰاَیُّهَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ ''اے ایمان والو اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور ہرگز نہ مرنا مگر یہ کہ تم مسلمان ہو'' (اس سے پتہ چلا کہ جہنم میں جہنمیوں کی خوراک تھور کے درخت سے بھی ڈرتا رہے)اگراس تھور کا ایک قطرہ زمین پرڈال دیا جائے تو تمام زمین کی معیشیت تباہ و برباد ہوکر رہ جائے ،تو کیسا حال ہوگا اس شخص کا جس کو اس تھور کے بغیر کوئی اور طعام نہیں ملے گا۔

وقال الامام احمد عن عبدالله بن عمرو قال قال رسول الله ﷺ من احب ان یزحزح عن النار ویدخل الجنة فلتدر که منیته وهو یؤمن بالله والیوم الآخر ویأتی الی الناس ما یحب ان یؤتی الیه"

امام احمد رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص جہنم کی آگ سے دور رہنا چاہتا ہے اور جنت میں داخل ہونا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ اس کے پاس موت اس حال میں آئے کہ وہ اللہ تعالی پر اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو،اور لوگوں کیلئے وہی چیز پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہو۔

(ماخوذ از صابونی وابن کثیر)

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ O (آیۃ نمبر ۱۰۳)

(1) اور اللہ کی رسی مضبوط تھام لو سب مل کر اور آپس میں پھٹ نہ جانا اور اللہ کا احسان اپنے اوپر یاد کرو جب تم میں بیر تھا اس نے تمہارے دلوں میں ملاپ کردیا تو اس کے فضل سے تم آپس میں بھائی ہوگئے اور تم ایک غار دوزخ کے کنارے پر تھے تو اس نے تمہیں اس سے بچادیا اللہ تم سے یونہی اپنی آیتیں بیان فرماتا ہے کہ کہیں تم ہدایت پاؤ۔ (کنزالایمان)

(2) اور تھام لو اللہ کی رسی کو سب مل کر، اور آپس میں تفرقہ پیدا نہ کرو، اور یاد کرو اللہ کی نعمتوں کو جو تم پر ہیں، جب تم (ایک دوسرے کے) دشمن تھے تو اس نے الفت ڈالی تمہارے دلوں میں، تو ہوگئے تم اس کی نعمت سے آپس میں بھائی بھائی، اور تم جہنم کی آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے تو اس نے تمہیں اس سے نکالا، اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تمہارے لئے اپنی آیات کو تاکہ تم ہدایت پاجاؤ۔ (نجوم الفرقان)

مختصر مطلب:

اللہ تعالیٰ کے دین اسلام اور قرآن پاک پر مضبوطی سے قائم رہو، جس طرح رسی سے کوئی سہارا لے کر اپنے آپ کو گرنے سے بچالیتا ہے ایسے ہی تم اپنے آپ کو راہ راست سے پھسلنے سے بچانے کیلئے دین اسلام اور قرآن پاک کا مضبوطی سے سہارا لو، اور تمام مسلمان اس پر متفق ہوجاؤ، حق راہ میں کوئی تفرقہ بازی پیدا نہ کرو، جیسا کہ یہود ونصاریٰ نے ایک دوسرے سے اختلاف رکھے، ایسے اختلاف آپس میں نہ رکھو، تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد رکھو کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے، ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار تھے تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں الفت ومحبت ڈال دی جس کی وجہ سے تم ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے، اور جب تم کافر تھے اور ایک دوسرے سے لڑتے تھے اسی وقت تم جہنم کی آگ کے گڑھے کے ایک کنارے پر تھے، اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایمان عطاء فرما کر اس آگ سے نکال

کر بچالیا، اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنی آیات کو بیان کرتا ہے تا کہ تم ہدایت پا جاؤ۔

شان نزول: یہ خطاب بھی اوس اور خزرج کے قبائل کو ہے جن کا ذکر پہلے سے آ رہا ہے، تو ان کے متعلق ہی یہ آیۂ کریمہ نازل ہوئی۔ (روح البیان)

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا﴾ ''اور تھام لو اللہ کی رسی کو سب مل کر''

''حَبْلُ'' کے مختلف معانی بیان کئے گئے، تاہم تمام کا مقصد ایک ہی ہے، وہ ہے دین اسلام اور قرآن پاک۔

"والحبل لفظ مشترک واصله فی اللغة السبب الذی یوصل به الی البغیة والحاجة"

''حَبْلُ'' لفظ مشترک ہے، اصل لغت میں اس کا معنی سبب ہے جو مقصد اور حاجت تک پہنچائے۔

اور کندھے اور گردن کے درمیان پٹھوں کو بھی حبل کہا جاتا ہے، اور ریتلے مقامات کو بھی حبل کہا جاتا ہے، جیسے ایک اعرابی نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا۔ "**واللہ ما ترکت من حبل الا وقفت علیه فهل لی من حج**" قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں نے کوئی ریگستان اور ریتلے ٹیلے نہیں چھوڑے مگر یہ کہ میں ان پر ٹھہرا ہوں، کیا میرا حج ہو گیا (آپ نے فرمایا ہاں ہو گیا) یعنی حدیث شریف میں لفظ حبل استعمال ہوا ہے جس کا معنی ہے ریتلے ٹیلے، ''حَبْلُ'' کا معنی ''وعدہ'' بھی ہے، اور حبل کا معنی رسی بھی ہے، یہ بھی اصل میں کنوئیں میں ڈول پہنچانے اور پانی نکالنے کا ذریعہ ہے، یہ سب لغوی معانی ہیں۔

(ماخوذ از قرطبی)

اللہ کی رسی سے مراد کیا ہے؟ اس کے مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں۔

حبل اللہ بمعنی قرآن:

وروی ذلک بسند صحیح عن ابن مسعود واخرج غیر واحد عن ابی سعید الخذری قال قال رسول اللہ ﷺ کتاب اللہ حبل اللہ الممدود من السماء الی الارض"

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سند صحیح سے ثابت ہے، اور کئی راویوں نے حضرت ابو سعید حذری رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کی کتاب (قرآن پاک) اللہ کی رسی ہے، جو آسمانوں سے زمین تک پھیلی ہوئی ہے۔

حبل اللہ بمعنی قرآن وعترت:

واخرج احمد عن زید بن ثابت قال قال رسول اللہ ﷺ انی تارک فیکم خلیفتین کتاب اللہ عزوجل ممدود ما بین السماء والارض وعترتی اهل بیتی وانهما لن

یفترقا حتی یردا علی الحوض"

مسند احمد میں حضرت زید بن ثابت ﷺ کی روایت آتی ہے وہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک میں تم میں دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، اللہ کی کتاب جو آسمانوں سے زمین تک پھیلی ہوئی ہے، اور اپنی اہل بیت سے اپنی عترت (اولاد) چھوڑ کر جا رہا ہوں، جو حوض کوثر تک وارد ہونے تک ساتھ ہوں گی جدا نہیں ہوں گی۔

حبل اللہ بمعنی طاعت وجماعت:

وقیل المراد بحبل الله الطاعة والجماعة "وروی ذلک عن ابن مسعود ایضا"

حبل اللہ کا معنی طاعت اور جماعت ہے، یہ روایت بھی حضرت ابن مسعود ﷺ سے مروی ہے، یعنی اللہ تعالی کی طاعت کو لازم پکڑو، اور جماعت کے ساتھ رہو۔

اخرج ابن ابی حاتم من طریق الشعبی عن ثابت بن قطنة المزنی قال سمعت ابن مسعود یخطب وهو یقول ایهاالناس علیکم بالطاعة والجماعة فانهما حبل الله تعالی الذی امربه"

ثابت بن قطنہ مزنی کہتے ہیں میں نے حضرت ابن مسعود ﷺ سے خطبہ میں یہ کہتے ہوئے سنا" اے لوگو تم پر اللہ تعالی کی طاعت لازم ہے، اور تم پر لازم ہے کہ جماعت کے ساتھ رہو، بیشک یہ دونوں چیزیں اللہ تعالی کی رسیاں ہیں، اللہ تعالی نے اپنی رسی کو لازم پکڑنے کا حکم دیا ہے۔

"وفی روایة عنه حبل الله الجماعة وروی ذلک ایضا عن ابن عباس رضی الله عنهما"

ابن مسعود کی ایک اور روایت میں اور حضرت ابن عباس کی ایک اور روایت میں بھی "**حبل اللہ**" سے مراد جماعت لیا گیا ہے کہ تم جماعت کو لازم پکڑو۔

حبل اللہ بمعنی اخلاص:

روی عن ابی العالیة انه الاخلاص لله تعالی وحده" ابو العالیہ سے روایت کی گئی کہ "**حبل الله**" کا مطلب ہے اللہ تعالی وحدہ سے اخلاص رکھنا، یعنی حکم یہ دیا گیا کہ تم صرف کامل طور پر اللہ تعالی سے اخلاص رکھو۔

حبل اللہ بمعنی اسلام:

وعن ابن زید انه الاسلام " ابن زید کی روایت میں آتا ہے کہ حبل اللہ سے مراد اسلام ہے یعنی حکم یہ دیا گیا کہ اسلام پر مضبوطی سے قائم رہو۔

حبل اللہ بمعنی عہد وامر:

"وعن قتادة انه عهد الله وامره" حضرت قتادہ کہتے ہیں "حبل الله" سے مراد اللہ تعالی کا عہد اور اس کا حکم ہے، یعنی حکم دیا گیا کہ تم اللہ تعالی کے عہد اور اس کے حکم پر مضبوطی سے قائم رہو۔

سب معانی قریب قریب ہیں:

"و كلها متقاربة" ان تمام بیان کردہ معانی میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں۔ (روح المعانی)

اللہ تعالی کے دین کو رسی سے تشبیہ کیوں دی گئی؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح کوئی شخص چھوٹے تنگ راستہ سے گذر رہا ہو تو اسے گرنے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے، لیکن دونوں طرف اگر رسی باندھ دی جائے اور وہ اس رسی کے سہارے پر چلے تو وہ گرنے کے خطرہ سے محفوظ رہتا ہے اسی طرح حق راہ تنگ راہ ہے، اس راہ سے کثیر مخلوق پھسل گئی، جس شخص نے اللہ تعالی کے دلائل اور بینات سے سہارا لگا لیا وہ اس خوف سے محفوظ رہا۔

"فكان المراد من الحبل ههنا كل شئی يمكن التوصل به الى الحق فی طريق الدين"

رسی سے مراد یہاں ہر وہ چیز ہے جس کے ذریعے انسان دین کی راہ حق میں پہنچ جائے، "وهو انواع كثير" وہ کثیر قسم ہیں، جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، جب یہ معنی کیا جائے "اللہ تعالی کے دین سے مضبوطی سے سہارا لگا لو" تو اس میں وہ تمام معانی آجائیں جن کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، طلباء کرام بخوبی جانتے ہیں کہ یہاں تشبیہ پائی گئی ہے، استعارہ مکنیہ پایا گیا ہے۔

(ماخوذ از کبیر)

﴿وَلَا تَفَرَّقُوْا﴾ "اور تفرقہ نہ پیدا کرو۔"

تفرقہ سے ممانعت کی تین وجوہ ہیں جو تمام ہی معتبر ہیں کہ ان میں سے کوئی ایک تفرقہ بھی ناجائز ہوگا:

(۱) الاول انه نهی عن الاختلاف فی الدين وذلك لان الحق لايكون الا واحدا وما عداه يكون جهلا وضلالا، فلما كان كذلك وجب ان يكون النهی عن الاختلاف فی الدين، واليه الاشارة بقوله تعالى "فماذا بعد الحق الا الضلال"

ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ دین میں اختلاف کرنے سے منع کیا گیا ہے، اسلئے کہ حق صرف ایک ہی ہے اور اس کے سوا جہالت وگمراہی ہے، لھذا ضروری ہے کہ دین میں اختلاف نہ کیا جائے، دین صرف ایک ہے، اسی طرف اللہ تعالی نے اشارہ فرمایا ہے ﴿فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلَالُ﴾ (حق کے بعد سوائے گمراہی کے کچھ نہیں)

(۲) **والثانی انه نهی عن المعاداة والمخاصمة فانهم كانوا فی الجاهلية مواظبين على المحاربة والمنازعة فنهاهم الله عنها"**

''تفرقہ نہ کرو'' کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی نے دشمنی کرنے اور جھگڑا کرنے سے منع کیا، مطلب یہ ہوگیا کہ ایک دوسرے سے دشمنی نہ کرو، اور ایک دوسرے سے جھگڑا نہ کرو۔

(۳) **والثالث انه نهی عما یوجب الفرقة ویزیل الألفة والمحبة"**

تفرقہ سے ممانعت کی تیسری وجہ ہے کہ تم ایک دوسرے سے ایسا تفرقہ نہ کرو جو تمہارے درمیان واقع ایمانی الفت ومحبت کو ہی زائل کردے۔ (ماخوذ از کبیر)

اصل بنیادی چیز : اصل بنیادی چیز یہی ہے کہ ایک دوسرے سے ایسا تفرقہ نہ رکھو جو بعض کو دین سے ہی دور کردے جیسا کہ اہل کتاب کا ایک دوسرے سے اختلاف تھا، اور ایسا تفرقہ بھی ایک دوسرے سے نہ رکھو جو تمہارے درمیان لڑائی اور دشمنی کا سبب بن جائے اور تم سے ایمان کی وجہ سے دولت محبت والفت نہ چھینی جائے۔

مسائل کی تحقیق کا اختلاف رحمت ہے:

وقد روی عن النبی ﷺ انه قال اختلاف امتی رحمة" نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔

اس حدیث پر معترضین کا حال:

وقد اعترض على حديث اختلاف رحمة رجلان احدهما مغموس عليه فی دينه وهو عمر وبن الجاحظ والآخر معروف بالسخف والخلاعة"

اس حدیث پر دو شخصوں نے اعتراض کیا ہے، ان میں سے ایک بے دین اور جاہل ومتجاہل ہے، وہ ہے عمرو بن جاحظ، اور دوسرا شخص حدیث کی سند میں ضعیف اور متروک سمجھا گیا ہے، وہ ہے اسحاق بن ابراہیم موصلی، اس شخص نے اغانی میں ایک کتاب لکھی جس میں گانے بجانے کے متعلق باطل اقوال نقل کئے:

"لم یرض بما تزود من المها حتی صدر کتابه بذم اصحاب الحدیث وزعم انهم یردون مالایدرون"

اس کتاب میں اس نے اپنے لئے گناہوں کا کافی حد تک توشہ جمع کرلیا تھا، لیکن ان گناہوں پر راضی نہ ہوا بلکہ اس نے اور گناہوں کا انبار اٹھانے کیلئے اصحاب حدیث کی مذمت شروع کردی اور یہاں تک کہنے لگا کہ وہ ایسے ہی روایات ذکر کردیتے ہیں جن کا انہیں علم ہی نہیں ہوتا، کیا ایسا شخص حدیث کی روایات میں معتبر ہوسکتا ہے، کیا ایسے شخص کے اعتراض کی کوئی حقیقت ہے وہ تو خود ہی غیر معتبر ہے، وہ تو خود ہی اصحاب حدیث سے دور ہے اور مردود ہے۔

آیئے عمرو بن جاحظ کی باطل دلیل کو دیکھئے وہ کہتا ہے:

"لو کان الاختلاف رحمة لکان الاتفاق عذابا" وہ کہتا ہے اگر اختلاف امت رحمت ہے تو اتفاق امت عذاب ہوگا، اس کی یہ دلیل اسکی جہالت وحماقت پر دلالت کررہی اس کا موقف ثابت نہیں کررہی،

"والجواب عن هذاالاعتراض انه لایلزم من کون الشئی رحمة ان یکون ضده عذابا ولایلزم هذاولم یذکره الاجاهل او متجاهل وقد قال الله تعالی "ومن رحمته جعل لکم اللیل والنهار لتسکنوافیه" فسمی اللیل رحمة ولم یلزم من ذلک ان یکون النهار عذابا وهو ظاهر لاشک فیه"

عمرو بن جاحظ کے اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ یہ دلیل باطل ہے کہ ایک چیز رحمت ہو تو اس کی ضد عذاب ہو، ایسا قول تو صرف کسی جاہل یا خودساختہ جاہل کا ہوسکتا ہے، آیئے رب تعالی کے ارشاد گرامی کو دیکھئے ﴿وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ﴾ اور اس نے اپنی رحمت سے تمہارے لئے رات کو بنایا، اور دن کو تمہارے آرام کیلئے، آیۃ کریمہ میں رات کو رحمت قرار دیا گیا، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دن کو عذاب بنایا گیا ہو۔ (حوالہ بعد میں آرہا ہے)

اختلاف کی تین قسمیں ہیں:

احدها فی اثبات الصانع ووحدانیته وانکار ذلک کفر، والثانی فی صفاته ومشیته وانکارها بدعة والثالث فی احکام الفروع المحتملة وجوها فهذا جعله الله تعالی رحمة وکرامة للعلماء وهو المراد بحدیث اختلاف امتی رحمة"

اختلاف کی تین قسموں میں سے ایک یہ ہے کہ رب تعالی کے خالق ہونے اور اس کی وحدانیت میں اختلاف کیا جائے اور اس کا انکار کیا جائے یہ کفر ہے اور انکار کی دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ تعالی کی صفات اور اس کی مشیت میں اختلاف کیا

جائے، صفات ومشیت کا انکار بدعت ہے اور اختلاف کی تیسری وجہ فروعی احکام میں اختلاف کا پایا جانا ہے، کسی مسئلہ میں کئی وجوہ کا احتمال ہو اپنے اپنے دلائل سے مختلف وجوہ کو ثابت کیا جائے تو اس اختلاف کو اللہ تعالیٰ نے علماء کرام کی عزت افزائی کیلئے رحمت بنایا ہے، یہی وہ اختلاف ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے رحمت قرار دیا، اور ارشاد گرامی (اختلاف امتی رحمۃ) میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔ (مسلم شریف جلد ثانی صفحہ نمبر ۱۵ باب ترک الوصیۃ لمن لیس لہ شئی یوصی فیہ)

واضح ہوا کہ ہر اختلاف جائز بھی نہیں اور ہر اختلاف کو ناجائز قرار دینا بھی حماقت ہے۔

جماعت کو لازم پکڑنا:

❁ **وعن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ ان الله لا یجمع امتی او قال امة محمد علی ضلالة ویدالله علی الجماعة ومن شذشذ فی النار"رواه الترمذی"**

(مشکوة باب الاعتصام بالکتاب والسنة)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ میری امۃ کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا (راوی کو شک ہے کہ شاید آپ نے "امة محمد" فرمایا ہو کہ اللہ تعالیٰ امت محمد کو گمراہی پر جمع نہیں فرمائے گا) اللہ تعالیٰ کا دست قدرت جماعت پر ہے، جو جماعت سے بکھر گیا وہ بکھر کر آگ میں چلا گیا۔

وضاحت حدیث:

وانما حمل الامة علی امة الاجابة لما ورد ان الساعة لاتقوم الا علی الکفار"

نبی کریم ﷺ کی حدیث پاک میں جس امت کا ذکر ہے وہ امت اجابت ہے یعنی جنہوں نے ایمان قبول کیا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ روایات میں موجود ہے کہ بیشک قیامت نہیں قائم ہوگی مگر کفار پر"

"فالحدیث یدل علی ان اجماع المسلمین حق" حدیث پاک سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ مسلمانوں کا اجماع حق ہے، یعنی اجماع امت شریعت کی قوی دلیل ہے، لیکن اس اجماع سے مراد "والمراد اجماع العلماء ولا عبرة باجماع العوام لانه لایکون عن علم" علماء کا اجماع ہے، کہ جب علماء مجتہدین کسی مسئلہ میں اتفاق کر لیتے ہیں تو وہ ایک قوی دلیل ہوتی ہے، اس اجماع سے مراد عوام کا اجماع نہیں، کیونکہ انہیں علم حاصل نہیں ہوتا۔

جہالت سے کسی مسئلہ پر مجتمع ہو جانا شریعت میں معتبر نہیں، آجکل کے دور میں جہلاء تو بے حیائی کو فروغ دینے میں مجتمع ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے علماء کرام کو اس سے محفوظ رکھا ہوا ہے۔

نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی میں "لا یجتمع امتی علی ضلالۃ" میں "ضلالۃ" سے کیا مراد ہے؟

"وقال الابهری قوله علی ضلالة ای علی خطأ وقیل علی کفر ومعصیة"

اس سے مراد خطاء، کفر ومعصیت ہے، یعنی آپ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ میری امت خطاء وکفر ومعصیت پر مجتمع نہیں ہوگی۔

(وید الله) کنایة عن النصرة والغلبة او الحفظ والرحمة او معناه احسانه وتوفیقه لاستنباط الاحکام والاطلاع علی ما کان علیه رسول الله ﷺ واصحابه من الاعتقاد والعمل (علی الجماعة) ای المجتمعین علی الدین یحفظهم من الضلالة والخطأ او للتوفیق لموافقة اجماع هذه الامة"

"اور اللہ کا دست رحمت جماعت پر ہے" یعنی اللہ تعالی کی طرف سے ان کو نصرت حاصل ہے، اور ان کو غلبہ حاصل ہے، اور ان کی رب تعالی حفاظت فرماتا ہے اور انہیں رحمت عطاء فرماتا ہے، یا ان کو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے اعتقاد اور عمل کے مطابق احکام استنباط (حاصل کرنے) کی اور ان پر مطلع ہونے کی توفیق عطا فرماتا ہے جو لوگ دین پر مجتمع ہوتے ہیں، اللہ تعالی ان کو گمراہ ہونے اور گنہگار رہونے سے بچالیتا ہے، یا ان کو اس امت کے ساتھ اجماع میں (اجماع امت میں) متفق ہونے کی توفیق عطاء فرمادیتا ہے

"ومن شذ" ای انفرد عن الجماعة باعتقاد او قول او فعل لم یکونوا علیه (شذفی النار) ای انفرد فیها ومعناه الفرد عن اصحابه الذین هم اهل الجنة والقی فی النار"

اور جو شخص جماعت سے اعتقاد یا قول یا فعل سے ہٹ گیا، بکھر گیا، ایسا عقیدہ ایجاد کیا، یا ایسا قول کیا یا ایسا عمل کیا جو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے مخالف اور دین اور شریعت کے مخالف ہو وہ جماعت سے ہٹ کر اکیلا جہنم کی آگ میں پہنچ جائے گا، یعنی جماعت والے صحیح اعتقادات اور صحیح اقوال وافعال جو جنت میں جانے کا ذریعہ تھے ان کو چھوڑنے اور جماعت سے بکھرنے کی وجہ سے جہنم کی آگ میں پہنچ گیا۔ (مرقاۃ جلد اول صفحہ نمبر ۲۴۹)

❁ وعن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ اتبعوا السواد الاعظم فانه من شذشذ فی النار "رواه ابن ماجة"

(مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنة)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سواد اعظم (بڑی جماعت) کی تابعداری کرو، بیشک جو اس سے بکھر گیا وہ آگ میں بکھر گیا۔

وضاحت حدیث:

"**سواد اعظم**" سے مراد بڑی جماعت ہے "والمراد ما علیہ اکثر المسلمین" مراد اس سے وہ ہے جس پر اکثر مسلمان ہوں۔

وھذا فی اصول الاعتقاد کان الاسلام واما الفروع کبطلان الوضوء بالمس فلا حاجة فیه الی الاجماع بل یجوز اتباع کل واحد من المجتھدین کالائمة الاربعة"

بڑی جماعت کی تابعداری کرنے کے حکم کا تعلق اعتقادی اصول سے ہے، جیسا کہ ارکان اسلام ہیں، ان میں سب کا متفق ہونا ضروری ہے، لیکن فروع دین میں اجماع امت ضروری نہیں، بعض مسائل میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف بھی ہوگا، جو شخص جس امام کا مقلد ہوگا وہ اسی کی تابعداری کرے گا، اس سے وہ جہنم کی آگ کا مستحق نہیں ہوگا، وضوء کے مسائل کو ہی آپ اپنے سامنے رکھیں امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک عورت کو مس کرنے (چھونے سے) اور ذکر کو مس کرنے سے وضوء ٹوٹ جاتا ہے، اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب میں وضو نہیں ٹوٹتا، اس طرح کے ائمہ مجتہدین کے نزدیک سینکڑوں مسائل اختلافی ہیں۔ آجکل غیر مقلدین نے اودھم مچا رکھا ہے، ایسے فروعی مسائل کو اصول سے بھی آگے لے جاتے ہیں۔ "اللھم انا نعوذبك من الشر المفسدین"

ماتریدیہ اور اشاعرہ کا اختلاف فروع میں ہے، اصول میں نہیں، جن مسائل میں ان کا اختلاف ہے وہ ظنی ہیں اعتقادی اور یقینی نہیں، بلکہ بعض محققین نے کہا ہے کہ اشاعرہ اور ماتریدیہ کا اختلاف لفظی ہے حقیقی نہیں:

"اتبعوا السواد الاعظم "یدل علی ان اعاظم الناس العلماء وان قل عددھم ولم یقل الاکثر لان العوام والجھال اکثر"

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "بڑی جماعت کی تابعداری کرو" اس سے یہ مسئلہ واضح ہوگیا کہ لوگوں میں سے عظیم مرتبہ والے علماء کرام ہیں، یعنی علماء حق کی تابعداری کرو، وہی عظیم جماعت ہے، صرف آپ نے یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ، اکثر لوگوں کی تابعداری کرو، کیونکہ صرف تعداد کے لحاظ پر زیادہ تو عوام و جہال ہیں، عوام و جہال کا کوئی اعتبار نہیں۔

(**من شذ**) فی الدین (شذفی النار) جو شخص دین سے ہٹ گیا، دین پر چلنے والی علماء کرام کی عظیم جماعت سے عقیدہ کے لحاظ پر پھر گیا وہ اکیلے نار (آگ) میں پہنچ گیا، اکیلے نار میں پہنچنے کا یہی مطلب ہے کہ جس طرح دین پر چلنے والے علماء کے نظریات و عقائد سے پھر کر علیحدہ ہوگیا، اس طرح آخرت میں اللہ تعالیٰ دیندار لوگوں کو جنت میں

بھیج دے گا اور ان سے پھرنے والے کو ان سے دور کر کے آگ میں بھیج دے گا۔ (مرقاۃ جلد ۱، صفحہ ۲۴۹، ۲۵۰)

❁ **عن معاذ بن جبل قال قال رسول الله ﷺ ان الشيطان ذئب الانسان كذئب الغنم ياخذ الشاذة و القاصية و الناحية و اياكم و الشعاب و عليكم بالجماعة و العامة "رواه احمد"** (مشكوة باب الاعتصام بالكتاب و السنة)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک شیطان انسانوں کا بھیڑیا ہے جس طرح بھیڑ، بکریوں کا بھیڑیا ہے، بھیڑیا اس بکری کو پکڑتا ہے جو دوسری بکریوں سے علیحدہ ہو جاتی ہے، دور ہو جاتی ہے اور کنارے پر ہو جاتی ہے، تم پر لازم ہے کہ تم اپنے آپ کو علیحدہ ہونے سے بچالو، جماعت کو لازم پکڑو، اور عامہ کو لازم پکڑو۔

وضاحت حدیث:

"**ذئب الانسان**" سے مراد مفسد و مہلک ہے، یعنی انسانوں کو شیطان فساد اور ہلاکت میں ڈال دیتا ہے۔

"**شاذة**" اس بکری کو کہیں کہ جو دوسری بکریوں سے نفرت کر کے علیحدہ ہو جائے "**قاصية**" اس بکری کو کہتے ہیں جو چرتے چرتے دور نکل جائے اگرچہ دوسری بکریوں سے نفرت نہ کرے۔ "**ناحية**" اس بکری کو کہتے ہیں جو غفلت کی وجہ سے دوسری بکریوں سے دور کنارے پر چلی جائے، یعنی علیحدہ رہنے والی بکری کو بھیڑیا کھا جاتا ہے، تمہیں بھی لازم ہے کہ علیحدہ رہنے سے بچ کر رہو اور جماعت کو لازم پکڑو، تاکہ تمہیں شیطان ہلاکت میں نہ ڈال دے جو انسانوں کیلئے بھیڑیے کی طرح ہے۔

"**والعامة**"**اى عامة الجماعة يعنى عليكم بمتابعة جمهور العلماء من اهل السنة و الجماعة**"

"عامہ کو لازم پکڑو" کا مطلب یہ ہے کہ تم پر لازم ہے کہ عام جماعت کو لازم پکڑو، جمہور علماء اہل سنت و جماعت کی تابعداری کرو۔

اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ وہ عوام جو دین پر قائم ہیں، ان کے ساتھ مل کر تم بھی دین پر قائم رہو، مقصود یہی ہے کہ دین سے دور نہ ہو جانا اور دین پر قائم رہنا۔

یہاں ایک ہی مسئلہ کو تین مرتبہ ذکر کیا، جس میں شدید تاکید پائی گئی، ایک مرتبہ ذکر فرمایا "**واياكم و الشعاب**" تم اپنے آپ کو علیحدہ ہونے سے بچا کر رکھو، اور دوبارہ ذکر کیا "**عليكم بالجماعة**" تم پر لازم ہے کہ جماعت کو لازم پکڑو، اور تیسری مرتبہ ذکر کیا "**والعامة**" یعنی "**عليكم بالعامة**" تم پر لازم ہے کہ جمہور اہل سنت و جماعت کے علماء

کرام کے ساتھ رہو۔ (ماخوذ از مرقاۃ جلد اول صفحہ نمبر ۲۵۵)

✿ **وعن ابی ذر قال قال رسول الله ﷺ من فارق الجماعة شبرا فقد خلع ربقة الاسلام من عنقه "رواه احمد"** (مشکوة باب الاعتصام بالکتاب والسنة)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی جماعت سے ایک بالشت جدا ہو گیا اس نے اپنی گردن سے اسلام کا ڈورا اتار دیا۔

اس حدیث سے مراد بھی یہی ہے "قال الابهری مفارقة الجماعة ترك السنة واتباع البدعة" **جو علامہ ابہری رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ جماعت کو چھوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ سنت کو چھوڑ دے اور بدعت کی اتباع کرے۔** (مرقاۃ جلد اول صفحہ نمبر ۲۵۵)

✿ **وعن مالک بن انس مرسلا قال قال رسول الله ﷺ ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکم بهما کتاب الله وسنة رسوله رواه فی الموطا"** (مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

حضرت امام مالک بن انس رحمہ اللہ سے مرسل روایت آتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے تم میں دو چیزوں کو چھوڑا ہے جب تک تم ان سے سہارا رکھو گے ہرگز گمراہ نہیں ہو گے (ایک) کتاب اللہ اور (دوسری) سنت رسول اللہ ﷺ ہے۔

وضاحت حدیث:

"ترکت فیکم امرین" ای شیئین عظیمین او حکمین بفتحهما"

میں تم میں دو امر چھوڑے جا رہا ہوں، یعنی دو بڑی چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہو، یا آپ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ میں تم میں دو فیصل (دو فیصلہ کرنے والے چیزیں) چھوڑ کر جا رہا ہوں۔

"لن تضلو" ای لن تقعوا فی الضلالة (ما تمسکتم) ای مدة تمسککم (بهما) ای بالامرین معا (کتاب الله) ای القرآن (وسنة رسوله) ای حدیث رسوله"

تم ہرگز گمراہی میں واقع نہیں ہو گے جب تک ان دونوں چیزوں سے سہارا لگائے رکھو گے، وہ ہے قرآن پاک اور حدیث پاک، کسی ایک کو بھی چھوڑنے سے گمراہ ہو جاؤ گے۔

(مرقاۃ جلد اول صفحہ نمبر ۲۵۶)

"حبل الله" سے حدیث پاک کے انکار کرنے والوں کا استدلال باطل ہے، کیونکہ خود میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ نے قرآن پاک اور حدیث دونوں پر سہارا لینے پر زور دیا ہے۔

وعن غضيف (بالمعجمتين مصغرا) بن الحرث الثمالى قال قال رسول الله ﷺ ما احدث قوم بدعة الا رفع مثلها من السنة فتمسك بسنة خير من احداث بدعة "

(مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب و السنۃ)

غضیف بن حرث ثمالی فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قوم نے نہیں ایجاد کیا بدعت کو مگر اس کی مثل سنت کو اٹھالیا گیا، سنت پر عمل کرنا بدعت کی ایجاد سے بہتر ہے۔

وعن جابر ﷺ قال قال رسول الله ﷺ اما بعد فان خير الحديث كتاب الله وخير الهدى هدى محمد وشر الامور محدثا تها وكل بدعة ضلالة "

"رواہ مسلم" (مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب و السنۃ)

حضرت جابر ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ''امابعد'' بیشک بہتر کلام اللہ کی کتاب ہے، اور بہتر ہدایت محمد (ﷺ) کی ہدایت ہے، اور شر امور نئی چیزوں کی ایجاد ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

وضاحت حدیث:

نبی کریم ﷺ اپنے کلام کو حمد باری تعالی اور اپنے آپ پر درود پاک سے شروع فرماتے تھے، اس لئے مقصد کو شروع کرنے سے پہلے ''امابعد'' ذکر فرماتے، یعنی ''حمد وصلوۃ'' کے بعد "فان خير الحديث كتاب الله "تمام کلاموں سے بہتر کلام اللہ کی کتاب ہے، یعنی اس میں وہ فصاحت و بلاغت ہے جو کسی اور کتاب میں نہیں

"واشتمل عليه من بيان كل شئى تصريحا او تلويحا قال تعالى "ونزلنا عليك الكتاب تبيانا لكل شئى "اى مما يحتاج اليه من امر الدين و الدنيا و العقبى كالعلوم الاعتقادية والاعمال الشرعية والاخلاق البهية والاحوال السنية وغيرها "

قرآن پاک صراحۃ یا اشارۃ ہر چیز کے بیان پر مشتمل ہے، کیونکہ اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ہے ﴿ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ﴾ ہم نے آپ پر کتاب نازل کی جو ہر چیز کا واضح بیان ہے، یعنی دین و دنیا اور آخرت میں جن چیزوں کی محتاجی تھی ان سب کو بیان کر دیا، خواہ ان کا تعلق علوم اعتقادیہ سے ہو یا اعمال شرعیہ سے، خواہ وہ اچھے اخلاق ہوں یا اچھے اعمال ہوں، ''وغیرھا'' سب کو قرآن پاک میں واضح طور پر بیان کر دیا۔

فائدہ جلیلہ:

وقد ورد فضل كلام الله على سائر الكلام كفضل الله على خلقه، وفيه اشارة واضحة الى ان كلام الله تعالى غير مخلوق "

اللہ تعالیٰ کی کلام کو تمام کلاموں پر فضیلت حاصل ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق پر فضیلت حاصل ہے، اسی سے ایک اور مسئلہ واضح طور پر حل ہو گیا ہے، وہ یہ ہے کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، جو اس کی صفت ہے، اس لئے کلام نفسی قدیم ہے، حادث نہیں۔

کون سی بدعت ضلالت ہے؟

و کل بدعة ضلالة "قال فی الازهار ای کل بدعة سیئة ضلالة"

ہر بدعت سیئہ (بری بدعت) گمراہی ہے، یہ مراد نہیں کہ مطلقاً ہر بدعت گمراہی ہے۔

"لقوله ﷺ من سن فی الاسلام سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها"

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے جس نے اسلام میں اچھا طریقہ جاری کیا اسے اس کا اجر (ثواب) حاصل ہوگا اور جتنے لوگ اس پر عمل کریں گے ان کا ثواب بھی اسے حاصل ہوگا۔

صحابہ کرام نے نئے کام ایجاد کئے:

"وجمع ابو بکر وعمر القرآن وکتبه زید فی المصحف وجدد فی عهد عثمان ؓ"

حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے قرآن پاک جمع کیا، اور حضرت زید رضی اللہ عنہ نے قرآن پاک کو لکھ کر جمع کیا، پھر حضرت عثمان ؓ کے دور میں لغت حجاز پر قرآن جمع کیا گیا، یہ سب کام رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں نہیں تھے۔

"قال النووی البدعة کل شئی عمل علی غیر مثال سبق وفی الشرع احداث مالم یکن فی عهد رسول الله ﷺ وقوله کل بدعة ضلالة عام مخصوص"

علامہ نووی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا بدعت ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کی مثال پہلے موجود نہ ہو، اور شریعت میں نیا کام جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں نہیں تھا" "کل بدعة ضلالة" عام مخصوص البعض ہے، یعنی بدعات حسنہ اس سے خارج ہیں اور بدعات سیئہ اس میں داخل ہیں۔

بدعت واجبہ: البدعة اما واجبة کتعلم النحو لفهم کلام الله ورسوله وکتدوین اصول الفقه والکلام فی الجرح والتعدیل"

بدعت یا واجب ہوگی، جس طرح اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے کلام کو سمجھنے کیلئے علم نحو کا پڑھنا واجب ہے اور اصول فقہ کی تدوین واجب ہے، مسائل میں جرح و تعدیل، یعنی یہ حق ہے، اس میں کمزوری ہے، یہ بحثیں واجب ہیں۔

بدعة محرمة: واما محرمة کمذهب الجبریة والقدریة والمرجئة والمجسمة،

والرد علی ھؤلاء من البدع الواجبة لان حفظ الشریعة من ھذہ البدع فرض کفایة"

بدعت کبھی حرام ہوتی ہے، جیسا کہ باطل مذاہب کی ایجاد، یعنی جبریہ فرقہ، قدریہ فرقہ، مرجیہ فرقہ، مجسمہ فرقہ تمام نئی نئی ایجادات ہیں، سب فرقے باطل ہیں، بدعات محرمہ ہیں اوران کا رد کرنا بدعات واجبہ سے ہے، کیونکہ شریعت کی حفاظت کرنا فرض کفایہ ہے۔

بدعة مستحبة: واما مندوبة کاحداث الربط والمدارس وکل احسان لم یعھد فی الصدر الاول"
بعض بدعات مستحب ہیں جیسے سرائے بنانا اور مدارس بنانا اور ہر اچھا کام جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں نہیں تھا لیکن وہ کام اچھا تو یہ بدعت مستحب ہے۔

بدعة مکروہ: واما مکروھة کزخرفة المساجد" مکروہ بدعت یہ ہے کہ مساجد کو ریاکاری کیلئے مزین کرے، لیکن اگر نیت یہ ہو کہ دوسرے گھروں سے اللہ تعالیٰ کا گھر زیادہ حسین نظر آتا ہے تو یہی بدعت مستحب ہو جائے گی۔

بدعت مباحة: واما مباحة کالتوسع فی لذائذ المآکل والمشارب والمساکن" مباح بدعت جس طرح کھانے پینے میں وسعت پیدا کرے، لذت دار کھانے کھائے، اور وسیع مکان میں رہے۔

بدعات کے متعلق خوبصورت ضابطہ:

قال الشافعی رحمه الله ماحدث مما یخالف الکتاب اوالسنةاوالأثر اوالاجماع فھو ضلالة وماحدث من الخیر ممالا یخالف شیئاذلک فلیس بمذموم"
امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ہر وہ نیا کام جو قرآن پاک اور حدیث پاک اور صحابہ کرام کے اقوال اور اجماع امت کے مخالف ہو وہ گمراہی ہے، اور جو نئے کام اچھے ہوں، بھلائی پر مشتمل ہوں اور قرآن پاک، حدیث پاک، اقوال صحابہ، اجماع امت کے مخالف نہ ہوں تو وہ برے کام نہیں، بلکہ اچھے کام اچھے ہی ہیں۔

"وقال عمر ﷺ فی قیام رمضان نعمت البدعة" حضرت عمر ﷺ نے تراویح کے قیام پر صحابہ کرام کو مجتمع دیکھ کر یہ فرمایا یہ کتنی ہی اچھی بدعت ہے" "وروی عن ابن مسعود مارآہ المسلمون حسنا فھو عند الله حسن" حضرت ابن مسعود ﷺ سے مروی ہے کہ جسے مسلمان اچھا سمجھیں وہ چیز اللہ کے ہاں بھی اچھی ہوتی ہے، اس سے مراد علماء وصلحاء واتقیاء کا کسی چیز کو اچھا سمجھنا عند اللہ اچھا ہوتا ہے۔

"وفی حدیث مرفوع لایجتمع امتی علی الضلالة" مرفوع حدیث میں یعنی رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی یہ ہے

کہ میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہوگی۔ (ماخوذ از مرقاۃ جلد اول صفحہ نمبر ۲۱۷)

باطل فرقے اور سیدھی راہ:

وعن عبدالله بن عمرو قال قال رسول الله ﷺ لیأتین علی امتی کما أتی علی بنی اسرائیل حذو النعل بالنعل حتی ان کان منهم من اتی امه علانیة لکان فی امتی من یصنع ذلک وان بنی اسرائیل تفرقت علی ثنتین وسبعین ملة وتفترق امتی علی ثلاث وسبعین ملة کلهم فی النار الاملة واحدة قالوا من هی یارسول الله قال ماانا علیه واصحابی "رواه الترمذی" وفی روایة احمد وابی داود عن معاویة ثنتان وسبعون فی النار وواحدة فی الجنة وهی الجماعة وانه سیخرج فی امتی اقوام تتجاری بهم تلک الاهواء کما یتجاری الکلب بصاحبه لایبقی منه عرق ولا مفصل الادخله "

(مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ضرور بر ضرور میری امت پر ایک وقت آئے گا جیسا کہ بنی اسرائیل پر آیا، یہ ان کے ساتھ برابر چلیں گے جیسا کہ جوتا اپنے فرمہ کے برابر ہوتا ہے، یہاں تک کہ ان میں سے اگر کوئی اپنی ماں کے پاس علانیہ (ظاہر) طور پر آیا تو میری امت میں ایسے ہوں گے جو یہی کام کریں گے، بیشک بنی اسرائیل بہتر فرقے بنے اور میری امت کے تہتر فرقے بنیں گے، سب آگ میں جائیں گے، سوائے ایک فرقہ کے، صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ وہ ایک فرقہ کون سا ہوگا؟ آپ نے فرمایا وہ جس (راہ) پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔ (یہ ترمذی کی روایت ہے)

اور مسند احمد اور ابوداود کی حضرت معاویہ ؓ سے ایک روایت میں ہے "بہتر فرقے آگ میں جائیں گے اور ایک فرقہ جنت میں جائے گا، یہ جماعت ہے، اور بیشک میری امت میں ایسی قومیں نکلیں گی جن پر خواہشات اس طرح جاری ہوں گی، جیسے کتا کسی شخص کو کاٹ دے تو اس پر اس کے اثرات اس طرح پائے جاتے ہیں کہ اس کی کوئی رگ اور کوئی جوڑ باقی نہیں رہتا مگر اس میں وہ اثرات داخل ہو جاتے ہیں۔

وضاحت حدیث:

"لیأتین علی امتی" "**اتیان**" کا معنی ہے "سہولت سے آنا" اور جب "علی" سے متعدی ہو تو اس کا معنی غالباً "ہلاکت تک پہنچانا" ہوتا ہے، جیسا کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ماتذر من شیء اتت علیه﴾ میں

برباد کرنے اور ہلاک کرنے والا معنی ہی لیا گیا ہے۔

"لیاتین علی امتی کما اتی علی بنی اسرائیل" کے دو مطلب ہیں، ایک مطلب اس کا یہ ہے "لیاتین علی امتی زمان الیانا مثل الاتیان علی بنی اسرائیل" میری امت پر ایک زمانہ (ایک وقت) آئے گا جیسا کہ بنی اسرائیل پر وقت آیا۔ دوسرا معنی یہ ہے :

"لیا تین علی امتی مخالفة لما انا علیه مثل المخالفة التی اتت علی بنی اسرائیل حتی اهلکتهم"

کہ میری امت میرے ہی احکام وشریعت کی اس طرح مخالفت کرے گی جیسا کہ بنی اسرائیل مخالفت کررہے ہیں، ایک تیسرا معنی مختصر بھی ہوسکتا ہے، جبکہ کاف کو مثل کے مقام پر رکھ کر فاعل مان لیا جائے تو اب مطلب یہ ہوگا "میری امت ضرور بر ضرور بنی اسرائیل کی طرح ہوگی"

"**حذو النعل بالنعل**" کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ جوتا کو دوسرے جوتے کے برابر کاٹنا، اور دوسرا معنی یہ ہے کہ جوتا کو اس کے قالب (فرمہ) کے برابر بنانا، مقصد کامل مشابہت کو بیان کرنا ہے کہ میری امت کامل طور پر بنی اسرائیل کے مشابہ ہوگی۔

"حتی ان کان منهم من اتی امه علانیة لکان فی امتی من یصنع ذلک"

یہاں تک کہ اگر ان میں کوئی ماں کے پاس علانیہ طور پر آئے گا تو میری امت میں سے کئی لوگ ہوں گے جو (ان کو دیکھ کر) یہی کریں گے، یہ آپ نے اپنی امت کی بنی اسرائیل سے کامل مشابہت کی مثال دی، ماں کے پاس آنے کا مطلب بدکاری کا مرتکب ہونا، یعنی اگر یہود علانیہ طور پر ماں سے بدکاری کے مرتکب ہوئے تو ان کو دیکھ کر میری امت کے لوگ بھی ماں سے بدکاری کے مرتکب ہوں گے۔

تہتر فرقوں کو علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ یوں بیان فرماتے ہیں:

نبی کریم ﷺ کی امت اجابت یعنی کلمہ گو لوگ کفریہ عقیدہ تک پہنچے ہوں گے، وہ لوگ جنہوں نے اصول دین میں اختلاف کیا ہے اور کفر تک پہنچ گئے وہ ابتدائی طور پر آٹھ فرقے ہیں، پھر ہر ایک میں کئی کئی فرقے ہیں۔

"المعتزلة القائلون بان العباد خالقوا اعمالهم وبنفی الرؤیة وبو جوب الثواب والعقاب وهم عشرون فرقة"

معتزلہ اس کے قائل ہیں کہ بندے اپنے افعال کے خالق ہیں، اور وہ باری تعالی کی رؤیۃ کا انکار کرتے ہیں، وہ ثواب وعذاب کو نہیں مانتے، پھر ان کے بیس فرقے ہیں۔

خیال رہے کہ ثواب وعذاب پر ایمان ہوتو خوف خدا بھی ہوتا ہے، اسی لئے آجکل معتزلہ کے مذہب کو زندہ کرنے کی بھرپور کوششیں جاری ہیں، کہ عذاب قبر نہیں تاکہ ہر قسم کی بے حیائی کو بغیر کسی خطرہ کے فروغ دیا جاسکے، یہ کوئی نہ کہے کہ یہ کام تو عذاب کا ذریعہ ہے۔

"والشیعة المفرطون فی محبة علی کرم الله وجهه وهم اثنان وعشرون فرقة"

اور رافضی جنہوں نے حضرت علی ﷺ کی محبت میں بہت زیادہ حد سے تجاوز کیا وہ بائیس فرقے ہیں۔

"والخوارج المفرطة المکفرة له ﷺ ومن اذنب کبیرة وهم عشرون فرقة"

اور خارجی لوگ جنہوں نے حضرت علی ﷺ کی شان میں نہایت گستاخی کی، یہاں تک کہ معاذ اللہ آپ کو کافر کہا، اور انہوں نے گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر کہا، یہ بیس فرقے ہیں۔

"والمرجئة القائلة بانه لایضر مع الایمان معصیة کما لاینفع مع الکفر طاعة وهی خمس فرق"

مرجئہ فرقہ جو اس کے قائل ہیں کہ ایمان کے ساتھ گناہ کوئی نقصان نہیں دیتے جس طرح کفر کے ساتھ طاعت کوئی نقصان نہیں دیتی، یہ پانچ فرقے ہیں۔

"والنجاریة الموافقة لاهل السنة فی خلق الافعال والمعتزلة فی نفی الصفات وحدوث الکلام وهم ثلاث فرق"

نجاریہ فرقہ یہ تو مانتا ہے کہ بندوں کے افعال کا خالق اللہ تعالی ہے، اس مسئلہ میں وہ اہل سنت کے ساتھ ہیں، لیکن وہ صفت باری تعالی کو نہیں مانتے اور اللہ تعالی کے کلام کو حادث مانتے ہیں، ان مسائل میں وہ معتزلہ کے ساتھ ہیں، یہ تین فرقے ہیں۔

"والجبریة القائلة بسلب الاختیار عن العباد فرقة واحدة"

اور جبریہ فرقہ اس کا قائل ہے کہ بندے کو کوئی اختیار نہیں، بلکہ وہ پتھر کی طرح مجبور محض ہے،" معاذ اللہ" اس نے وہی کام کرنے ہیں جو رب نے اس سے جبری طور پر کرانے ہیں، یہ ایک فرقہ ہے۔

"والمشبهة الذین یشبهون الحق بالخلق فی الجسمیة والحلول فرقة واحدة ایضا"

مشبہ فرقہ جو اللہ تعالی کو مخلوق سے تشبیہ دیتے ہیں اور اللہ تعالی کا جسم مانتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ وہ بندوں میں حلول کرتا ہے یہ ایک فرقہ ہے۔

"فتلک اثنان وسبعون فرقة کلهم فی النار" یہ بہتر فرقے ہیں جو تمام آگ والے ہیں۔

فرقہ ناجیہ : وہ ایک فرقہ جونجات حاصل کرنے والا ہے، جس کی وضاحت خود رسول اللہ ﷺ نے فرمادی ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں جو اس راہ پر قائم ہوں جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔ ان کو ہی اہلسنت کہا جاتا ہے۔

"والفرقة الناجية هم اهل السنة البيضاء الحمدية و الطريقة النقية الاحمدية "

یعنی فرقہ ناجیہ وہ ہے جو نبی کریم ﷺ کی روشن سنتوں پر قائم ہوں، اور آپ کے صاف طریقہ پر قائم ہوں، پھر یہی اہل سنت زہد وتقوی کے لحاظ پر مختلف مراتب رکھتے ہیں، کوئی شخص بھی شریعت سے دور رہ کر متقی نہیں ہوسکتا، شریعت پر چلنے کا نام "شــــرعة" ہے، باطنی علم ومعرفت کا حصول اور تقرب الی اللہ کا نام "منہاج" ہے اور زیادہ خلوص حاصل ہوجائے تو اس کا نام معراج ہے۔ کیا خوب کسی نے کہا۔

الافالزموا سنة الانبياء — الا فـاحـفظوا سيـرة الاصـفياء

ومن يبتدع بدعة لم يكرم — بـوجـد انــه رتبة الاتــقيــاء

خبردار لازم پکڑو انبیاء کرام کی سنت کو خبردار نیک لوگوں کی سیرت کی حفاظت کرو۔ جن لوگوں نے بری بدعات کو ایجاد کرلیا ان کی کوئی عزت نہیں کہ وہ متقی لوگوں کے مرتبہ کو پالیں۔

اور دوسری روایت میں ذکر فرمایا گیا "وواحدة فى الجنة وهى الجماعة " اور ایک جنتی فرقہ وہ جماعت ہے۔

(وهـى الـجـمـاعة)اى اهل العلم والفقه الذين اجتمعوا على اتباع آثاره عليه الصلوة والسلام فى النقير والقطمير ولم يبتدعوا بالتحريف والتغير "

جماعت سے مراد اہل علم اور اہل فقہ ہیں جو نبی کریم ﷺ کی سنتوں کے مطابق قائم ہیں ذرا بھر بھی سنتوں سے انحراف نہیں کرتے اور بدعات سے سنتوں میں کوئی تحریف اور تبدیلی نہیں کرتے۔

"قال شريح ان السنة قد سبقت قياسكم فاتبع ولا تبتدع فانك لن تضل ما اخذت بالاثر "

شریح رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ بیشک سنت قیاس سے پہلے ہے، سنت کے ہوتے ہوئے قیاس پر عمل نہ کرو اور سنت کے خلاف کوئی نئے کام ایجاد نہ کرو، جب تک نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کی اتباع کرتے رہو گے گمراہ نہیں ہوگے۔

"وعن سفيان لوان فقيها على رأس لكان هو الجماعة "

حضرت سفیان فرماتے ہیں کہ اگر ایک فقیہ پہاڑ کی چوٹی پر ہوتو وہ بھی جماعت ہے۔

"جماعت کے ساتھ ہونے کا مطلب واضح ہوگیا کہ علماء کرام، فقہاء عظام کے ساتھ ہوجاؤ"

اور دوسری روایت میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی:

"وانه سیخرج فی امتی اقوام تتجاری بهم تلک الاهواء کما یتجاری الکلب بصاحبه لا یبقی منه عرق ولا مفصل الا دخله"

کا مطلب یہ ہے'' کہ میری امت میں کئی قومیں ایسی ہوں گی جو سنت کے خلاف نئے نئے کام ایجاد کر لیں گے، وہ نئی چیزوں کی ایجاد کی محبت ان کی رگوں اور جوڑوں میں ایسے اثر انداز ہوگی جیسے کہ پاگل کتا کسی کو کاٹ دے تو اس کے زہریلے اثرات اس کاٹے ہوئے انسان کی رگوں اور جوڑوں میں پہنچ جاتے ہیں، کوئی رگ، کوئی جوڑ اس کے اثر سے محفوظ نہیں رہتے۔ (مرقاۃ جلد اول صفحہ نمبر ۲۴۷ تا ۲۴۹)

ہاں یہ خیال سے نہ نکلے کہ نئے کام وہی منع ہیں جو کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ﷺ اور اجماع امت کے مخالف ہوں، جب تک بدعات حسنہ اور سیئہ کا فرق نہیں کیا جائے گا اس وقت تک کوئی فرقہ دیندار ہونے کا دعویدار یہ ثابت نہیں کر سکے گا کہ ہمارے فرقہ کے تمام کام وہی ہیں جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ اطہر میں تھے، اس سے ہٹ کر ہمارا کوئی نیا کام نہیں، دینی مدرسہ ہم نے کوئی نہیں بنایا، پختہ مساجد ہماری نہیں، ہماری مساجد میں بجلی کے پنکھے نہیں، سنگ مرمر یا چپس کے فرش نہیں، ہماری مساجد میں قالین نہیں بچھائے گئے، لھذا ہمارے کام صحابہ کرام والے کام ہیں۔ جب سب کچھ تم کر رہے ہو تو بدعت بدعت کی رٹ لگا کر، آئے دن پوسٹر چھاپ کر، لوگوں کو گمراہ کرنے کی دن رات تمہیں فکر لگی ہوئی ہے، آئیے ذرا غور تو کرو، کتوں کی طرح بھونکنا، مسلمانوں کو گمراہ کہنا، مسلمانوں کو مشرک کہنا کون سا انصاف ہے، یہ کیسے دین کی خدمت ہے۔

بہتر ناری فرقوں کو علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے یوں بیان کیا:

اسی زیر بحث آیہ کریمہ کی تفسیر میں قرطبی رحمہ اللہ یوں رقمطراز ہیں، بظاہر اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والے وہ فرقے جو حقیقت میں کفر کی حد تک پہنچے ہوئے ہیں جن کو نبی کریم ﷺ نے ناری (جہنمی) کہا ہے، وہ چھ فرقے ہیں، ہر فرقے کی بارہ بارہ شاخیں ہیں۔

وہ چھ فرقے یہ ھیں: حروریہ، قدریہ، جہمیہ، مرجئہ، رافضیہ، جبریہ "انقسمت الحروریة اثنتی عشرة فرقة" حروریہ کے بارہ فرقے ہیں:-

(1) فاولهم الازرقية قالوا لانعلم احدا مؤمنا وكفروا اهل القبلة الا من دان بقولهم"
پہلا فرقہ حروریہ میں سے ازرقیہ ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مؤمن نہیں سمجھتے، وہ اہل قبلہ کو بھی کافر کہتے

ہیں مگر یہ کہ جو ان کی بات کو مانیں وہ مؤمن ہو سکتے ہیں۔

(2) والاباضية قالوا من اخذ بقولنا فهو مؤمن ، ومن اعرض عنه فهو منافق "

حروریہ میں سے ایک فرقہ "اباضیہ" ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ جو ہماری بات پر عمل کرے گا وہ مؤمن ہے، اور ہماری بات سے اعراض کرے گا وہ منافق ہے۔

(3) والثعلبية قالوا ان الله عزوجل لم يقض ولم يقدر"

حروریہ میں سے تیسرا فرقہ "ثعلبیہ" ہے جو اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر کو تسلیم نہیں کرتے۔

(4) والخازمية قالوا لاندری ماالايمان والخلق كلهم معذورون "

حروریہ میں چوتھا فرقہ "خازمیہ" ہے وہ کہتے ہیں، ہمیں معلوم نہیں کہ ایمان کیا ہے، تمام مخلوق معذور ہے (جو چاہیں لوگ وہی کریں ان سے کوئی باز پرس (پوچھ گوچھ) نہیں ہونی)

(5) والخلفيه زعموا ان من ترک الجهادمن ذكر او انثى كفر "

پانچواں فرقہ "خلفیہ" ہے، جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ جس مذکر یا مؤنث نے جہاد کو چھوڑا وہ کافر ہو گیا،

(ان کا یہ قول سراسر مردود ہے، اس میں صحیح عقیدہ یہ ہے کہ جہاد فرض کفایہ ہے، اگر مسلمان دفاع نہ کر سکیں، کافروں کی یلغار ہو تو فرض عین ہو جاتا ہے، فرض عین کا تارک گنہگار ہے، اور فرض عین کی فرضیت کا منکر کافر ہے)

(6) والكوزية قالوا ليس لاحدان يمس احدالانه لايعرف الطاهر من النجس ولا ان يؤاكله حتى يتوب ويغتسل "

چھٹا فرقہ **کوزیہ** ہے، اسے کرویہ بھی کہا گیا ہے اور کدریہ بھی کہا گیا ہے، یہ کہتے ہیں کہ کسی شخص کو ہاتھ نہ لگایا جائے یہ معلوم نہیں کہ یہ پاک ہے یا ناپاک ہے، کسی کے ساتھ مل کر کھانا نہ کھایا جائے یہاں تک کہ وہ پہلے توبہ کرلے اور غسل کرلے۔

(7) والكنزية قالوا لايسع احدا ان يعطى ماله احدا لانه ربما لم يكن مستحقا بل يكنزه فى الارض حتى يظهر اهل الحق "

ساتواں فرقہ "کنزیہ" ہے، وہ کہتے ہیں، کسی ایک کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ دوسرے کو مال دے کیونکہ پتہ نہیں ہوتا کہ یہ مستحق ہے یا نہیں، اسلئے وہ اپنا مال جو کسی کو دینا ہے اسے زمین میں دفن کر دے، جب کوئی حقدار واضح طور پر ظاہر ہو جائے تو اسے مال دے۔

(8) والشمراخية قالوا لاباس بمس النساء الا جانب لانهن رياحين "

اٹھواں فرقہ **شمراخیہ** ہے، وہ کہتے ہیں کہ اجنبی عورتوں کو چھونے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ عورتیں گل ریحانہ (خوشبودار پھول) ہیں۔

(یہی آجکل روشن خیال بھی کہتے ہیں اگران کو کہا جائے کہ یہ حرام ہے تو وہ کہتے ہیں یہ قدامت پسند ہے)

(9) والاخنسية قالوا لا يلحق الميت بعد موته خير ولاشر"

نواں فرقہ "اخنسیه" ہے، وہ کہتے ہیں مرجانے کے بعد کوئی خیر وشر میت کو لاحق نہیں ہوگا۔

(نہ عذاب قبر، اور نہ قبر میں راحت، نہ جنت، نہ دوزخ، آجکل کچھ مردود اسی فرقہ کے مطابق اشتہار چھاپ کر لوگوں کے دلوں سے خوف خدا کو دور کرنیکی ناپاک جسارت کر رہے ہیں)

(10) والحكمية قالوا من حاكم الى مخلوق فهو كافر"

دسواں فرقہ یہ ہے کہ جو اپنا فیصلہ مخلوق کے پاس لے گیا وہ کافر ہے، (یعنی ان کے نزدیک مخلوق میں نہ کوئی حکم (فیصل) ہے اور نہ ہی کوئی حاکم ہے۔

(11) والمعتزلة قالوا اشتبه علينا امر علي ومعاوية فنحن نتبرأ من الفريقين"

گیارھواں فرقہ "معتزله" ہیں، وہ کہتے ہیں ہم پر (حضرت) علی (رضی اللہ عنہ) اور (حضرت) معاویہ (رضی اللہ عنہ) کا معاملہ مشتبہ ہے (کہ کون سچا ہے یا کون جھوٹا ہے، کون حق پر ہے یا کون باطل پر ہے) اسلئے ہم دونوں سے بیزاری اختیار کرتے ہیں۔

(خیال رہے کہ یہ فرقہ حروریہ کی ایک قسم ہے، نام اس کا بھی معتزلہ ہے، قدریہ میں سے ایک فرقہ معتزلہ زیادہ مشہور ہے، جس کا ذکر ان شاء اللہ آگے آرہا ہے)

(12) والميمونية قالوا لا امام الا برضا اهل محبتنا"

بارھواں فرقہ "ميمونيه" ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ کوئی امام نہیں سوائے ہمارے اہل محبت کی رضامندی کے۔

قدریہ فرقہ کی بارہ فرقوں میں تقسیم:

(۱) الاحمرية وهي التي زعمت ان في شرط العدل من الله ان يملك عباده امورهم ويحول بينهم وبين معاصيهم"

قدریہ فرقہ میں سے پہلا فرقہ ''احمریہ'' ہے، ان کا گمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ (معاذ اللہ) اس وقت عادل ہوگا جب وہ اپنے بندوں کو تمام امور کا مالک بنادے گا، اور بندوں اور ان کے گناہوں کے درمیان خود حائل ہو جائے (یعنی بندوں کو گناہ نہ کرنے دے)

(۲) والثنوية وهي التي زعمت ان الخير من الله والشر من الشيطان"

دوسرا فرقہ ثنویہ ہے یہ وہ فرقہ ہے جس کا عقیدہ یہ ہے کہ خیر تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور شر شیطان کی

طرف سے ہے، (یعنی یہ فرقہ خیر کا خالق اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں، اور شر کا خالق شیطان کو)

(۳) **والمعتزلة وهم الذين قالوا بخلق القرآن وجحدوا (صفات) الربوبية "**

تیسرا فرقہ معتزلہ ہے، یہ وہ لوگ جنہوں نے قرآن پاک کے مخلوق ہونے کا قول کیا ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار کرتے ہیں، (ان کے بہت نظریات اہل سنت کے خلاف ہیں)

(۴) **والكيسانية وهم الذين قالوا لاندری هذه الافعال من الله او من العباد ولا نعلم ايثاب الناس بعد او يعاقبون "**

چوتھا فرقہ "کیسانیہ" ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں ہمیں معلوم نہیں کہ یہ افعال اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہیں، یا کہ بندوں کی تخلیق ہے، پھر ہمیں یہ بھی پتہ نہیں کہ لوگوں کو ثواب دیا جائے گا یا عذاب دیا جائے گا۔

(۵) **والشيطانية قالوا ان الله تعالى لم يخلق الشيطان "**

پانچواں فرقہ "شیطانیہ" ہے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو پیدا نہیں کیا، یعنی تمام مخلوق کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، لیکن وہ شیطان کا خالق نہیں۔

(۶) **والشريكية قالوا ان السيآت كلها مقدرة الا الكفر "**

چھٹا فرقہ "شریکیہ" ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ تمام گناہ تو رب تعالیٰ کی تقدیر میں ہیں، لیکن کفر اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں نہیں۔

(۷) **والوهمية قالوا ليس لافعال الخلق وكلامهم ذات ولا للحسنة والسيئة ذات "**

ساتواں فرقہ "وہمیہ" ہے وہ کہتے ہیں مخلوق کے افعال اور ان کے کلام کیلئے کوئی ذات نہیں پائی گئی، اور نہ ہی اچھائیوں اور برائیوں کیلئے کوئی ذات پائی گئی، (اس فرقہ میں کتنی حماقت پائی گئی ہے کہ یہ افعال مانتے ہیں لیکن فاعل نہیں مانتے جبکہ کسی فعل کا فاعل کے بغیر پایا جانا ممکن نہیں)

(۸) **والزبرية قالوا كل كتاب نزل من عندالله فالعمل به حق ناسخا كان او منسوخا "**

آٹھواں فرقہ "زبریہ" ہے، اسے "زبوندیہ" بھی کہا گیا ہے، یہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے جو کتاب بھی نازل فرمائی اس پر عمل کرنا حق ہے خواہ وہ ناسخ ہو یا منسوخ ہو، گویا کہ یہ لوگ منسوخ ہونے کے منکر ہیں، اسی لئے منسوخ پر عمل کرنا حق مانتے ہیں حالانکہ منسوخ کہتے ہی اسے ہیں جس پر عمل کرنا اللہ تعالیٰ نے ختم کر دیا ہے، اگر منسوخ ہونے کے باوجود اس پر عمل کرنا جائز ہو تو اسے منسوخ کہنے کا مطلب ہی کیا؟ آجکل نیچری اور قادیانی بھی یہی مذہب رکھتے ہیں، سب باطل مذاہب ایک مرتبہ پھر معرض وجود پر لائے جا رہے ہیں، لیکن وہ پہلے بھی مٹ گئے، پھر مٹ کر رہیں گے۔

(۹) **والمسعدية زعموا ان من عصى ثم تاب لم تقبل توبته "**

نواں فرقہ "مسعدیہ" ہے، جسے "متبریہ" بھی کہا جاتا ہے، ان کا گمان یہ ہے کہ بیشک جس نے نافرمانی کی پھر توبہ کرلی

لیکن اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی، (ان کا یہ عقیدہ قرآن پاک کی صریح آیات سے مخالف ہے، جن میں توبہ کی قبولیت کا ذکر ہے)

(۱۰) والناكثية زعموا ان من نكث بيعة رسول الله ﷺ فلا الم عليه "

دسواں فرقہ ''ناکثیہ'' ہے، ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اگر کسی نے رسول اللہ ﷺ کی بیعت توڑ لی تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ (معاذاللہ یہ صریح کفر ہے)

(۱۱) والقاسطية تبعوا ابراهيم بن النظام في قوله من زعم ان الله شيئ فهو كافر "

گیارھواں فرقہ ''قاسطیہ'' ہے یہ ابراہیم بن نظام کے متبع ہیں اس کے اس قول میں کہ جس نے ''شـــیٔ'' کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر کیا وہ کافر ہے (یہ اس کا عقیدہ سراسر باطل ہے، کیونکہ ''شیٔ'' کا معنی موجود ہونا، اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہے)

بارھواں فرقہ غالباً علامہ قرطبی رحمۃ اللہ سے یا کاتب سے چھوٹ گیا ہے، جس کا ذکر نہیں، عین ممکن ہے۔

جہمیہ فرقہ کی بارہ فرقوں میں تقسیم:

(۱) المعطلة زعموا ان كل ما يقع عليه وهم الانسان فهو مخلوق وان من ادعى ان الله يرى فهو كافر "

جہمیہ فرقہ میں سے ایک فرقہ ''معطلہ'' ہے، جن کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر چیز جو واقع ہے وہ مخلوق ہے، لیکن اس کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ انسانوں کے اعمال کو اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے، یہ کفر ہے۔

(یہ خیال رہے کہ زیادہ مشہور تعطیلیہ یا معطلہ فرقہ وہ فرقہ ہے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف ایک عقل کو پیدا کیا، اس عقل نے دوسرے کو، دوسرے نے تیسرے کو، اس طرح دس عقل معرض وجود میں آئے جو ''عقول عشرہ'' سے مشہور ہیں، اب سب نظام ان عقول کے ذمہ ہے، اللہ تعالیٰ تمام امور سے معطل ہے۔ (معاذاللہ)

(۲) والمريسية قالوا اكثر صفات الله تعالى مخلوقة"

دوسرا فرقہ ''مریسیہ'' ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو قدیم نہیں مانتے بلکہ اکثر صفات کو مخلوق اور حادث مانتے ہیں۔

(۳) والملتزقة جعلوا البارى سبحان فى كل مكان "

تیسرا فرقہ ''ملتزقہ'' جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر مکان میں مکین ہے، خیال رہے کہ ایک یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے جو اس کی شان کے لائق ہے موجود ہونا، یہ عقیدہ تو کامل ایمان ہے، دوسرا یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ ہر مکان میں مکین ہے، یہ کفر ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی مکان سے متمکن ہونے سے پاک ہے، اس لئے کہ مکان کی جہات ستہ ((فوق، تحت، یمین و یسار، امام، خلف) اوپر، نیچے، دائیں، بائیں، آگے اور پیچھے) سے مقید ہوتا ہے، رب

تعالی جہات ستہ کی تقیید سے پاک ہے۔ فلاسفہ کے نزدیک مکان جسم حاوی کی سطح باطنی ہے جو جسم محوی کی سطح ظاہری سے مماس ہے، مکان کا یہ معنی بھی لیں تو پھر بھی مقید ہونا لازم آئے گا جو رب تعالی کی شان کے لائق نہیں، کیونکہ یہ حدوث پر دلالت کرے گا، اللہ تعالی حدوث سے پاک ہے۔

(۴) **والواردیة قالوا لا یدخل النار من عرف ربه ومن دخلها لم یخرج منها ابدا"**

چوتھا فرقہ ''واردیہ'' ہے، وہ کہتے آگ میں وہ شخص داخل نہیں ہوگا جس نے اپنے رب کو پہچان لیا، اور جو آگ میں داخل ہو گیا وہ کبھی بھی نہیں نکالا جائے گا، یہ عقیدہ بھی باطل ہے، کیونکہ کافر کو تو جہنم سے کبھی نہیں نکالا جائے، لیکن مؤمن گنہگار کو اگر سزا دی گئی تو اسے سزا کے ختم ہونے پر جہنم سے نکال دیا جائے گا۔

(۵) **والزنادقة قالوا لیس لا حد ان یثبت لنفسه ربا، لان الاثبات لایکون الا بعد ادراک الحواس وما لایدرک لا یثبت "**

پانچواں فرقہ ''زنادقہ'' (زندیق کی جمع) ہے، کسی ایک کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ یہ کہے کہ ''رب تعالی'' ہے اس لئے کہ کسی چیز کو ثابت کرنے کیلئے ضروری ہے کہ وہ حواس میں آئے اور اس کا ادراک کیا جا سکے، جب یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالی حواس میں نہیں آتا تو اس کا ثبوت بھی ممکن نہیں۔

(۶) **والحرقیة زعموا ان الکافر تحرقه النار مرة ثم یبقی محترقا ابدا لا یجد حر النار"**

چھٹا فرقہ ''حرقیہ'' ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ کافر کو ایک مرتبہ آگ جلائے گی، پھر وہ جل کر خاکستر ہو جائے گا، اور اسے دوبارہ آگ کی تکلیف کبھی بھی نہیں ہوگی، ان کا عقیدہ سراسر قرآن پاک کے ارشاد گرامی ﴿كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُوْدًا﴾ کے مخالف ہے۔

(۷) **والمخلوقیة، زعموا ان القرآن مخلوق "**

ساتواں فرقہ ''مخلوقیہ'' ہے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن پاک مخلوق ہے (یعنی حادث ہے، قدیم نہیں) خیال رہے کہ مختلف فرقوں کا کئی معانی میں اختلاف بھی ہے، اور کئی فرقے کسی ایک نظریہ میں متفق بھی ہوتے ہیں، جیسا کہ خلق قرآن کئی فرقوں کا عقیدہ ہے۔

(۸) **والفانیة زعموا ان الجنة والنار یفنیان، ومنهم من قال لم یخلقا "**

آٹھواں فرقہ ''فانیہ'' فرقہ ہے ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جنت اور جہنم دونوں فنا ہونے والی چیزیں ہیں، اور اسی فرقہ میں ایک اور گروہ ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ جنت اور دوزخ ابھی پیدا نہیں ہوئیں، خیال رہے کہ نیچری فرقہ جنت اور جہنم کو نہیں مانتا، بلکہ جنت سے مراد دنیا کے باغات ہیں، اور جہنم سے مراد دنیا کے مصائب وآلام ہیں، یہ فرقہ بھی قرآن

وحدیث کا واضح طور پر منکر ہے، کیونکہ جنت ودوزخ کا ذکر قرآن وحدیث میں صراحۃ کثرت سے موجود ہے۔

(۹) والعبدیة جحدوا الرسل وقالوا انماھم حکماء"

نواں فرقہ ''عبدیہ'' ہے، انہوں نے رسولوں کا انکار کیا ہے کہ کوئی رسول نہیں، البتہ بعض لوگ علم والے دوسروں کے راہنمار ہے، وہ حقیقت میں حکماء ہیں، (ان لوگوں کو رسول سمجھ لیا گیا) یہ فرقہ بھی قرآن پاک اور حدیث پاک کے حکم صریح کا مخالف ہے۔

(۱۰) والواقفیة قالوا لا نقول ان القرآن مخلوق ولا غیر مخلوق"

دسواں فرقہ ''واقفیہ'' (وقف سے لیا گیا ہے) ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نہ تو یہ کہتے ہیں کہ قرآن مخلوق ہے، اور نہ ہی یہ کہتے ہیں قرآن مخلوق نہیں۔

(۱۱) والقبریة ینکرون عذاب القبر والشفاعة"

گیارھواں فرقہ ''قبریہ'' ہے، جو قبر کے عذاب اور شفاعت کے منکر ہیں، یہ فرقہ بھی کفریہ فرقہ ہے، یہ فرقہ آجکل بہت پایا جاتا ہے، جن کو میرے پیارے حبیب پاک ﷺ نے جہنمی کہا، علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے وضاحت کی، راقم کو کوئی نہ برا، کہے، بلکہ اپنے آپ کو صحیح کیا جائے، توبہ کی جائے۔

(۱۲) واللفظیة قالوا لفظنا بالقرآن مخلوق"

بارھواں فرقہ ''لفظیہ'' ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ہم تو قرآن کے مخلوق ہونے کا تلفظ کرتے ہیں، یعنی ہم تو بول بول کر کہہ رہے ہیں کہ (معاذ اللہ) قرآن مخلوق ہے۔

مرجئہ فرقہ کی بارہ فرقوں میں تقسیم:

(۱) التارکیة قالوالیس للہ عزوجل علی خلقه فریضة سوی الایمان به فمن آمن به فلیفعل ما شاء"

مرجئہ میں سے پہلا فرقہ ''تارکیہ'' ہے، وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق پر سوائے ایمان کے کوئی چیز فرض نہیں کی، جو شخص ایمان لے آئے، وہ جو چاہے کرے، اسے کوئی نہیں پوچھا جائے گا تو نے یہ گناہ کیوں کیا تھا۔

(۲) والسائبیة قالوا ان اللہ تعالی سیب خلقه لیفعلوا ما شاؤا"

دوسرا فرقہ ''سائبیہ'' ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر لازم ہے کہ وہ اپنی مخلوق کو آزاد چھوڑ دے وہ جو چاہیں کرتے پھریں، ان سے کسی قسم کی کوئی باز پرس نہ ہو، ان کا قول (معاذ اللہ) یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ کسی چیز کو فرض کرے، یا کسی چیز کو حرام کرے۔

(۳) والراجية قالوا لايسمى الطائع طائعا و لا العاصى عاصيا لانا لاندرى ماله عندالله تعالى "

تیسرا فرقہ ''راجیہ'' ہے، ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خوشی سے طاعت کرنے والے کو مطیع اور طائع نہ کہا جائے، اور معصیت کرنے والے کو عاصی نہ کہا جائے، کیونکہ ہمیں معلوم نہیں کہ وہ اللہ کے ہاں کس درجہ میں ہوگا، ہوسکتا ہے کہ ہم مطیع اور طائع کہتے رہیں وہ حقیقت میں عاصی ہو، اور ہم عاصی کہتے رہیں وہ مطیع اور طائع ہو، ان لوگوں کا مذہب اس لئے باطل ہے۔ ظاہر اعمال پر احکام کا دارومدار ہے، حقیقت کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا جائے، مطلقا ظاہر سے روگردانی درست نہیں۔

(۴) والسالبية قالوا الطاعة ليست من الايمان "

چوتھا فرقہ ''سالبیہ'' ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ طاعت ایمان کا حصہ نہیں، یعنی یہ کہا جائے نیکیاں صرف ایمان والوں کی معتبر ہیں، اور کافروں کی معتبر نہیں، یہ غلط ہے، بلکہ کافروں کی نیکیاں بھی مقبول ہیں، کافر لوگ ایمان والوں سے زیادہ نیک ہوتے ہیں۔ یہ فرقہ بھی کافر ہے، کافروں کی تعریف کر کے ان سے ہڈی (دنیاوی حقیر مال) وصول کر رہا ہے، وہ بھی ایک کو ہڈی ڈالتے ہیں جب تک وہ ان کی ہمنوائی کی طاقت رکھتا ہے اس وقت تک اسے ہڈی پر ہڈی ڈالتے چلے جاتے ہیں، جب ذرا بھر اس کی ہمنوائی میں کمی آجاتی ہے اس سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں، وہ حسرت سے کبھی ادھر دیکھتا ہے، کبھی ادھر دیکھتا ہے، اس کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا، کاش کہ مسلمانوں کو ہوش آجائے کہ وہ کافروں سے دور ہوجائیں، آپس میں ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن جائیں۔

(۵) والبهيشة قالوا الايمان علم ومن لايعلم الحق من الباطل والحلال من الحرام فهو كافر "

پانچواں فرقہ ''بہیشہ'' ہے، وہ کہتے ہیں ایمان علم ہے، جو حق و باطل اور حلال وحرام کا علم نہ رکھے وہ کافر ہے، یہ عقیدہ باطل ہے، صحیح عقیدہ یہ ہے کہ ایمان لانے سے مؤمن ہوگیا، اب اسے چاہئے وہ حق و باطل میں اور حلال وحرام میں فرق سمجھے، یعنی علم حاصل کرے، یہ مطلب نہیں کہ جاہل لوگ مؤمن نہیں ہوسکتے۔

(۶) والعملية قالوا الايمان عمل "

چھٹا فرقہ ''عملیہ'' ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ایمان عمل ہے، جس کے عمل درست ہوئے وہ مؤمن ہے اور جس کے عمل درست نہ ہوئے وہ کافر ہے، یہ عقیدہ بھی قرآن وحدیث کے مخالف ہے، صحیح عقیدہ یہ ہے کہ تصدیق قلبی کا نام ایمان ہے، اور نیک اعمال کچھ فرائض ہیں، کچھ واجبات وسنن ومستحبات۔

(۷) والمنقوصية قالوا الايمان لايزيد ولا ينقص "

ساتواں فرقہ ''منقوصیہ'' ہے وہ کہتے ہیں، ایمان زیادہ اور کم نہیں ہوتا۔

یہ مذہب باطل ہے، قرآن پاک کے مخالف ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا﴾ (اور جب ان پر اس کی آیتیں پڑھی جائیں زیادہ کرتی ہیں ان کے ایمان کو)

(۸) والمستثنية قالوا الاستثناء من الايمان ''

آٹھواں فرقہ ''مستثنیہ'' ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ استثناء ایمان کا حصہ ہے، یعنی ان کے نزدیک کوئی چیز مستثنیٰ نہیں، جو چاہیں وہ کریں، ایسا نہیں کہ یہ چیز حلال ہے سوائے فلاں کے، وغیرہ، تمام مستثنیات خود ایمان میں داخل ہیں۔

(۹) والمشبهة قالوا بصر كبصرويد كيد ''

نواں فرقہ ''مشبھۃ'' ہے، وہ اللہ تعالیٰ کو عام جسموں کے مشابہ مانتے ہیں، وہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہمارے ہاتھوں کی طرح ہے، اور اللہ تعالیٰ کی آنکھیں ہماری آنکھوں کی طرح ہیں۔

(۱۰) والحشوية قالوا حكم الاحاديث كلها واحد، فعندهم ان تارك النفل كتارك الفرض ''

دسواں فرقہ ''حشویہ'' ہے، وہ کہتے ہیں کہ تمام احادیث کا حکم ایک ہے، ان کے نزدیک نہ ہی راویوں کی تعداد کے لحاظ پر خبر واحد، مشہور اور متواتر کی طرف کوئی تقسیم ہے اور نہ ہی راویوں کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کے لحاظ پر صحیح، حسن، ضعیف کی طرف کوئی تقسیم ہے، اور ان کے نزدیک نفلوں کو ترک کرنے والا اسی طرح گنہگار ہوتا ہے جیسا کہ فرضوں کو ترک کرنے والا گنہگار ہوتا ہے۔

(۱۱) والظاهرية الذين نفوا القياس ''

گیارھواں فرقہ ''ظاہریہ'' ہے، یہ قیاس کے منکر ہیں، یہی فرقہ آجکل کی اصطلاح میں غیر مقلدین کا ہے، جو خود ساختہ اہل حدیث بنے بیٹھے ہیں۔

(۱۲) والبدعية اول من ابتدع هذه الاحداث في هذه الامة ''

بارھواں فرقہ بدعیہ ہے، یہ وہ فرقہ ہے جنہوں نے بری بری بدعات اس امت میں ایجاد کی ہیں، پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآن پاک، حدیث پاک، اجماع امت کے خلاف جو بدعت ہوگی وہ سیئہ کہلائے گی، بعض بدعات حرام ہوں گی، اور بعض مکروہ، لیکن بدعات حسنہ کوئی واجب، کوئی مستحب، کوئی مباح ہیں۔

فرقہ رافضیہ کی بارہ فرقوں میں تقسیم:

(۱) العلوية قالوا ان الرسالة كانت الى عليّ وان جبريل اخطأ''

رافضیہ میں سے پہلا فرقہ ''علویہ'' ہے، جن کا عقیدہ یہ ہے کہ رسالت کے حقدار حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے، لیکن جبریل سے غلطی ہوگئی کہ وہ وحی حضرت محمد (ﷺ) کے پاس لے آئے۔

(۲) والامرية قالوا ان علياشريک محمد فی امره ''

دوسرا فرقہ ''امریہ'' ہے، یہ کہتے ہیں کہ حضرت علی ﷛ حضرت محمد ﷺ کے ساتھ ان کے امر میں شریک ہیں، یعنی ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت علی ﷛ اور حضرت محمد ﷺ دونوں ہی نبی ہیں، اور نبوت میں دونوں شریک ہیں۔

(۳) والشيعة قالوا ان عليا ﷛ وصی رسول الله ﷺ ووليه من بعده وان الامة كفرت بمبايعة غيره ''

تیسرا فرقہ ''شیعہ'' ہے یہ کہتے ہیں حضرت علی ﷛ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے وصیت فرمادی کہ میرے بعد یہ میرے ولی یعنی میرے جانشین ہوں گے، بیشک تمام امت دوسروں کی بیعت کر کے (معاذ اللہ) کافر ہوگئی، اس فرقہ نے تمام صحابہ کرام کو معاذ اللہ کافر کہا، جنہوں نے حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم کی بیعت کی۔

(۴) والاسحاقية قالوا ان النبوة متصلة الى يوم القيامة وكل من يعلم علم اهل البيت فهو نبی ''

چوتھا فرقہ ''اسحاقیہ'' ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ نبوت قیامت تک جاری ہے، جس کو اہل بیت کے متعلق علم حاصل ہوگیا وہ نبی ہے، یہ فرقہ ختم نبوت کا منکر ہے، اور جھوٹے نبیوں کیلئے اس فرقہ نے نبوت کا دروازہ کھولا ہے، یعنی قادیانی اسی فرقہ کی پیداوار ہیں، جن کا پہلا شکار ہی رافضی اور دیوبندی بنے، اب بریلوی حضرات ان کی ناپاک نگاہ میں ہیں۔

(۵) والناؤوسية قالوا على افضل الامة فمن فضل غيره عليه فقد كفر ''

پانچواں فرقہ ''ناؤوسیہ'' ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت علی ﷛ تمام امت سے افضل ہیں، اگر کسی نے دوسرے کسی شخص کو فضیلت دی تو وہ کافر ہوگیا۔ (معاذ اللہ)

اس فرقہ کے مطابق بھی تمام امت (معاذ اللہ) کافر ہے، کیونکہ اجماع امت ہے اس مسئلہ پر کہ حضرت ابوبکر صدیق ﷛ تمام صحابہ کرام سے افضل ہیں، پھر حضرت عمر ﷛ پھر حضرت عثمان ﷛ پھر حضرت علی المرتضی ﷛۔

(۶) والامامية قالوا لا يمكن ان تكون الدنيا بغير امام من ولدالحسنين ، وان الامام يعلمه جبريل ﷩ فاذا مات بدل غيره مكانه ''

چھٹا فرقہ ''امامیہ'' ہے، وہ کہتے ہیں، دنیا کا بغیر امام کے قائم ہونا ممکن نہیں، وہ امام ضروری ہے کہ حضرت امام حسنین ﷛ کی اولاد سے ہو، جبریل ﷩ امام مقرر کرتے ہیں، جب ایک امام فوت ہو جاتا ہے تو دوسرا اس کی جگہ قائم کر دیتے ہیں۔

(۷) والزیدیة قالوا ولدالحسنین کلهم ائمة فی الصلوات ، فمتی وجد منهم احدلم تجز الصلوة خلف غیرهم برهم وفا جرهم "

ساتواں فرقہ ''زیدیہ'' ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ نماز کی امامت کرانا صرف حضرت امام حسین ﷺ کی اولاد کا حق ہے، جب آپ کی اولاد میں سے کوئی شخص موجود ہو، اس کے ہوتے ہوئے کوئی دوسرا شخص نماز نہیں پڑھا سکتا، خواہ وہ سید نیک ہو یا فاسق و فاجر ہو۔

(۸) والعباسیة زعموا ان العباس کان اولی بالخلافة من غیره "

آٹھواں فرقہ ''عباسیہ'' ہے ان کا عقیدہ یہ ہے کہ خلافت کے حقدار حضرت عباس ﷺ تھے، ان کے نزدیک بھی دوسری خلافتیں باطل ہیں، خلیفہ بنانے والے (معاذ اللہ) کافر ہیں، حضرت ابوبکر صدیق ﷺ کی خلافت اجماع صحابہ سے ثابت ہے، ان کے عقیدہ کے مطابق تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فیصلہ باطل ہے۔

(۹) والتناسخیة قالوا الارواح تتناسخ فمن کان محسنا خرجت روحه فدخلت فی خلق یسعد بعیشه "

نواں فرقہ ''تناسخیہ'' ہے ، یہ تناسخ ارواح کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ ایک نیک شخص کی روح جب نکل جاتی ہے تو دوسرے نیک بخت میں منتقل ہو جاتی ہے، دوسرا نیک بخت انسان ہونا بھی ضروری نہیں، بلکہ کوئی جانور بھی جسکی زندگی دوسروں کیلئے نفع مند ہو، اس میں بھی وہ روح منتقل ہو سکتی ہے۔

(۱۰) والرجعیه زعموا ان علیا و اصحابه یرجعون الی الدنیا وینتقمون من اعدائهم "
دسواں فرقہ ''رجعیہ'' ہے، ان کا گمان یہ ہے کہ حضرت علی ﷺ اور ان کے اصحاب دنیا میں پھر لوٹ کر آئیں گے اور اپنے دشمنوں سے انتقام لیں گے۔

(۱۱) واللاعنة یلعنون عثمان وطلحة وزبیر ومعاویة وابا موسی وعائشة وغیرهم "
گیارھواں فرقہ ''لاعنہ'' ہے، جو حضرت عثمان اور طلحہ اور زبیر اور معاویہ اور ابوموسیٰ اشعری اور حضرت عائشہ (وغیرہم) رضی اللہ عنہم پر (معاذ اللہ) لعنت بھیجتے ہیں۔

وہ لعنت یقیناً ان کی طرف لوٹتی ہے، اس لئے کہ جس پر لعنت بھیجی جائے وہ لعنت کا مستحق نہ ہو تو وہ لعنت بھیجنے والے کی طرف لوٹ کر آجاتی ہے۔

(۱۲) والمتربصة تشبهوا بزی النساک ونصبوا فی کل عصر رجلاینسبون الیه الامر یزعمون انه مهدی هذه الامة فاذامات نصبوا آخر"

بارھواں فرقہ ''متربصہ'' ہے، یہ لوگ بظاہر اپنے آپ کو درویشوں کی شکل کے مشابہ رکھتے ہیں، اور ہر زمانے میں ایک شخص کو والئی امور سمجھتے ہیں کہ یہ امت کا مہدی ہے، جو وہ مر جاتا ہے تو ایک اور شخص کو مہدی مان لیتے ہیں، یہ سلسلہ ان کا یوں ہی چلتا رہتا ہے۔

فرقہ جبریہ کی بارہ فرقوں میں تقسیم:

(۱) فمنهم المضطرية قالوا لافعل للآدمي بل الله يفعل الكل ''

جبریہ فرقہ میں سے ایک فرقہ ''مضطریۃ'' ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ بندے کا کوئی فعل نہیں سب فعل اللہ تعالیٰ کے ہیں، اس فرقہ کو مضطریہ بھی کہا گیا ہے۔ یہ فرقہ درحقیقت انسانوں کو گنہگار بنانے کی طرف راغب ہے کہ جب یہ کہا جائے گا کہ کوئی فعل بندے کا نہیں، تو لوگ عیاش ہو جائیں گے، اور یہ کہیں گے کہ یہ فعل تو ہمارا نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا ہے، گویا کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بندے میں حلول کئے ہوتا ہے، لھذا بندے کے افعال حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے افعال ہیں۔

(۲) والافعالية قالوا لنا افعال ولكن لا استطاعة لنا فيها ، وانما نحن كالبهائم نقاد بالحبل ''

دوسرا فرقہ افعالیہ ہے، یہ کہتے ہیں کہ فعل تو ہمارا ہوتا ہے، لیکن ہمیں اس میں استطاعت واختیار حاصل نہیں ہوتا، وہ کام تو ہم سے اللہ تعالیٰ کراتا ہے، ہم تو چوپاؤں کی طرح ہوتے ہیں کہ جس طرح چوپاؤں کو رسی ڈال کر جدھر چاہیں گھماتے رہیں، اسی طرح وہ کام ہم سے جبراً کرائے جاتے ہیں۔

(۳) والمفروغية قالوا كل الاشياء قد خلقت والآن لايخلق شئى ''

تیسرا فرقہ ''مفروغیۃ'' ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ تمام چیزوں جنہوں نے پیدا ہونا تھا وہ پیدا ہو چکی ہیں، اس کے بعد کسی اور چیز نے پیدا نہیں ہونا، یہ بدیھی چیزوں کا انکار ہے، ہم دیکھ رہے ہیں کہ کوئی پیدا ہو رہا ہے، اور کوئی فوت ہو رہا ہے۔

(۴) والنجارية زعمت ان الله تعالى يعذب الناس على فعله لاعلى فعلهم ''

اور چوتھا فرقہ ''نجاریہ'' ہے، ان کا گمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو اپنے فعل پر عذاب دیتا ہے، لوگوں کے افعال پر عذاب نہیں دیتا، یعنی یہ لوگ معاذ اللہ بندوں کے افعال ہی نہیں مانتے، بلکہ تمام افعال اللہ تعالیٰ کے مانتے ہیں، معاذ اللہ کتنا برا اور کتنا کفریہ عقیدہ ہے کہ بندے کا برا کام رب کا ہو جائے، (معاذ اللہ) ثم (معاذ اللہ) برا کام تو رب کرے اور سزا بندوں کو دے، کیسے احمق ہیں یہ لوگ؟

(۵) والمنانية قالوا عليک بما يخطر بقلبک ، فافعل ماتو سمت منه الخير''

پانچواں فرقہ ''منائیہ'' ہے، وہ کہتے ہیں، جو تمہارے دل میں آئے وہی کام کرنا تم پر لازم ہے، جو کام تمہیں اچھا سمجھ آئے وہی کرلو۔

(۶) والکسبیة قالوا لایکتسب العبد ثوابا ولا عقابا"

چھٹا فرقہ کسبیہ ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ بندے کے کسی فعل پر کوئی ثواب اور کوئی عذاب نہیں۔

یہ فرقہ قرآن پاک کے صریح ارشاد کے منافی ہے۔

﴿بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ " وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ (البقرة، آیة نمبر ۸۱۔۸۲)

ہاں کیوں نہیں جو گناہ کمائے اور اس کی خطاء اسے گھیر لے وہ دوزخ والوں میں ہے، انہیں ہمیشہ اس میں رہنا ہے÷ اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے وہ جنت والے ہیں، انہیں ہمیشہ اس میں رہنا ہے۔

(۷) والسابقية قالوا من شاء فليعمل ومن شاء فلايعمل ، فان السعيد لا تضره ذنوبه والشقى لاينفعه بره"

ساتواں فرقہ سابقیہ ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ جو چاہو عمل کرو، جو چاہو نہ کرو، کیونکہ نیک بخت کو گناہ کوئی نقصان نہیں پہنچاتے، اور بد بخت کو نیکیاں کسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں پہنچاتیں۔

(۸) والحبية قالوا من شرب كاس محبة الله تعالى سقطت عنه عبادة الاركان"

آٹھواں فرقہ ''حبیہ'' ہے، وہ یہ کہتے ہیں جس نے اللہ تعالی کی محبت کا پیالہ پی لیا اس سے عبادات ساقط ہو جاتی ہیں، یعنی صرف اللہ تعالی کی محبت کا دعوی کرلے کہ مجھے رب تعالی کی محبت حاصل ہے، اس کے بعد کوئی نماز نہ پڑھے اور روزے نہ رکھے، زکوۃ ادا نہ کرے اور حج نہ کرے تو کوئی حرج نہیں۔

(۹) والخوفية قالوا من احب الله تعالى لم يسعه ان يخافه ، لان الحبيب لايخاف حبيبه"

نواں فرقہ ''خوفیہ'' ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جو اللہ تعالی سے محبت کرتا ہے اسے ڈرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ حبیب اپنے حبیب سے نہیں ڈرتا، اس فرقہ کا یہ عقیدہ باطل ہے، کیونکہ یہ تو رب تعالی ہی جانتا ہے کہ وہ محبت میں کتنا سچا ہے، ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ محبت کا دعوی کرتا رہے لیکن وہ اس میں کامل درجہ نہ رکھتا ہو، اس لئے اللہ تعالی کو وہ دعوی قبول ہی نہ ہو۔

(۱۰) والفكرية قالوا من ازداد علما اسقط عنه بقدر ذلك من العبادة"

دسواں فرقہ ''فکریہ'' ہے، وہ یہ کہتے ہیں جس قدر کسی کا علم بڑھتا جاتا ہے اسی مقدار کے مطابق اس سے عبادات اٹھ جاتی ہیں، اس فرقہ کی کوشش ہے کہ علماء کو جہنمی بنایا جائے، کیونکہ جتنی مقدار میں علم زیادہ ہوگا اتنی مقدار میں اس سے عبادات اٹھ جانے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ یہ کہے میں تو بڑا عالم ہوں مجھے نمازوں، روزوں کی کیا ضرورت ہے۔

(۱۱) والخشبية قالوا الدنيا بين العباد سواء لاتفاضل بينهم فيما ورثهم ابو هم آدم ''

گیارھواں فرقہ ''خشبیہ'' ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ دنیا سب بندوں میں برابر ہے، کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہیں، اسلئے کہ سب کے باپ حضرت آدم علیہ السلام ہیں، اور ان کی وراثت سب کو حاصل ہے۔

(۱۲) والمنية قالوا منا الفعل ولنا الاستطاعة ''

بارھواں فرقہ ''منیۃ'' ہے، وہ کہتے ہیں، کام بھی ہمارے ہیں، استطاعت بھی ہماری ہے، یہ فرقہ بھی رب تعالیٰ کا منکر ہے، کیونکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں کسی نے کوئی استطاعت عطا نہیں کی، یہ ہمیں خود ہی حاصل ہے، ہمیں اعمال کی کوئی توفیق عطا نہیں کرتا، بلکہ ہم اپنی طاقت سے عمل کرتے ہیں۔ (ماخوذ از قرطبی بوضاحت)

حاصل کلام :

ابھی تک جو بحث کی ہے، اس تمام بحث کا نتیجہ قرطبی کی مندرجہ ذیل بحث میں دیکھئے۔

❁ وقال ابن عباس لسماک الحنفي يا حنفي الجماعة الجماعة ، فانما هلكت الامم الخالية لتفرقها اما سمعت الله عزوجل يقول ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سماک حنفی کو کہا، اے حنفی جماعت کو لازم پکڑو، جماعت کو لازم پکڑو، بیشک پہلی امتیں تفرقہ کی وجہ سے ہلاک ہوگئیں، کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی نہیں سنا۔ ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا﴾ ''اور تھام لو اللہ کی رسی کو سب مل کر''

❁ وفي صحيح مسلم عن ابي هريرة قال قال رسول الله ﷺ ان الله يرضى لكم ثلاثا ويكره لكم ثلاثا يرضى لكم ان تعبدوه ولا تشركوا به شيئا وان تعتصموا بحبل الله جميعا ولا تفرقوا وان تناصحوا من ولاه الله امركم ''ويكره لكم ثلاثا قيل وقال وكثرة السؤال واضاعة المال ''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے لئے تین چیزوں کو پسند کرتا

ہے،اور تین چیزیں تمہارے لئے ناپسند کرتا ہے،تمہارے لئے یہ پسند کرتا ہے کہ تم اس کی عبادت کرواوراس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ،اور یہ کہ تھام لو اللہ کی رسی کو سب مل کر اور تفرقہ بازی نہ کرو،اور یہ کہ تم اس کی نصیحت قبول کرو جس کو اللہ تعالیٰ نے امور کا والی بنایا ہے،اور تین چیزیں تمہارے لئے ناپسند کرتا ہے وہ یہ ہیں قیل وقال (بے مقصد بحثوں میں الجھنا)اورزیادہ سوال کرنا،اور مال ضائع کرنا۔

❁ "فاوجب الله تعالى علينا التمسک بكتابه وسنة نبيه والرجوع اليهما عند الاختلاف وامرنا بالاجتماع على الاعتصام بالكتاب والسنة اعتقادا وعملا ، وذلک سبب اتفاق الكلمة وانتظام الشتات الذى يتم به مصالح الدنيا والدين والسلامة من الاختلاف ، وامر بالاجتماع ونهى عن الافتراق الذى حصل لاهل الكتابين هذا معنى الآية على التمام"

اس آیۃ کریمہ کا مکمل معنی اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر لازم قرار دیا ہے کہ ہم قرآن پاک اور حدیث پاک سے مضبوطی سے تھام لیں،اگر کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو قرآن وحدیث کی طرف رجوع کریں،اور ہمیں رب تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ اعتقاد اور عمل میں قرآن پاک اور حدیث پاک کو سب متفق ہو کر تھام لیں،قرآن پاک اور حدیث پاک کی طرف رجوع کرنے سے کلمات میں اتفاق حاصل ہوگا،قرآن پاک وحدیث پر اجتماع کا حکم دیا گیا،اور یہود ونصاریٰ کی طرح تفرقہ سے منع کیا گیا۔ (قرطبی)

فائدہ جلیلہ :

وفيهادليل على صحة الاجماع جسما هو مذكور في موضعه من اصول الفقه "واللہ اعلم"

یہی آیۃ کریمہ اس مسئلہ پر کافی دلیل ہے کہ''اجماع امت''شرعی دلائل میں سے ایک عظیم دلیل ہے۔ (قرطبی)

اجماع امت پر مختصر بحث ان شاء اللہ اسی آیۃ کریمہ کی وضاحت کے ضمن میں آخر میں ذکر کردی جائے گی۔

﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا﴾

''اور یاد کرو اللہ کی نعمتوں کو،جو تم پر ہیں،جب تم (ایک دوسرے کے) دشمن تھے تو اس نے الفت ڈالی تمہارے دلوں میں،تو ہو گئے تم اس کی نعمت سے آپس میں بھائی بھائی۔''

جو آیۃ زیر بحث ہے یہ اسی کا آخری حصہ ہے،شان نزول سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ یہ آیۃ کریمہ اور اس

سے پہلی آیات اوس اور خزرج کے بارے میں نازل ہوئیں، وہ اسلام لانے سے پہلے ایک دوسرے کے دشمن تھے، اسلام لانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں الفت ڈال دی، جس کی وجہ سے وہ آپس میں ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے، یہ حقیقت میں ان پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان تھا اسی احسان اور نعمت کو یاد رکھنے کا حکم دیا، کہ جب تم اللہ کی اس نعمت کو یاد رکھو گے تو یقیناً تمہاری اخوت اسلامیہ قائم ودائم رہے گی۔

زیادہ مفسرین کرام نے تو یہی مطلب بیان کیا ہے جسے ذکر کر دیا گیا، لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اس کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہودی کی سازش سے اسلام لانے کے بعد ان دونوں قبیلوں کا ایک دوسرے کے سامنے لڑائی کیلئے آجانے کا تذکرہ کیا ہو کہ تم جب ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ تمہارے پاس تشریف لائے یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی تم پر نعمت تھی کہ اس نے تمہارے دلوں میں الفت ومحبت ڈال دی، جس سے تمہاری دشمنی جاتی رہی۔ (ماخوذ از کبیر)

فائدہ جلیلہ: واعلم ان کل من وجهه الی الدنیا کان معادیا لأکثر الخلق ومن کان وجهه الی خدمة الله تعالی لم یکن معادیا لاحد"

جو شخص دنیا کی طرف نظر رکھے، اس کے کام دنیاوی اغراض پر مبنی ہو وہ بہت لوگوں کا دشمن ہوتا ہے، اس کا کام انسانیت کے مطابق نہیں بلکہ خواہشات کے مطابق ہے، لیکن جس کی نظر اللہ تعالیٰ کی طرف ہو وہ کسی کا بھی دشمن نہیں ہوتا۔

اصل وجہ یہ ہے کہ جس کی حقیقت میں نظر اللہ تعالیٰ کی طرف ہو اور بالتبع اس کی نظر مخلوق کی طرف ہو تو وہ سب چیزوں کو قضاء وقدر کے قبضہ میں سمجھتا ہے، اس لئے وہ کسی کے دشمنی نہیں کرتا، یہی وجہ ہے کہ بیان کیا گیا ہے

"ان العارف اذا امر امر برفق ویکون ناصحا لایعنف ویعیر فهو مستبصر بسر الله فی القدر"

بیشک عارف جب نرمی سے کسی کو کوئی حکم دیتا ہے تو وہ اسے نصیحت کر رہا ہوتا ہے، وہ نہ تو سختی سے حکم دیتا ہے اور نہ ہی اسے عار دلاتا ہے، وجہ اس کی یہی ہے کہ وہ تقدیر میں اللہ تعالیٰ کے رازوں کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔
(ماخوذ از کبیر)

﴿فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا﴾ "تم ہو گئے اس کی نعمت سے آپس میں بھائی بھائی"

اس سے پتہ چلا کہ اسلام کے بعد جو ان کے درمیان اچھے معاملات جاری رہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو حاصل ہوئے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں اپنی نعمت سے ایک طاقت پیدا فرما دی جو الفت ومحبت کی طرف دعوت دیتی ہے تو اس پر وہ الفت ومحبت لزومی طور پر ان کو حاصل ہو جاتی ہے۔ معتزلہ کا مذہب اس میں یہ ہے

کہ بندوں کے دلوں میں محبت کا پایا جانا بندوں کی اپنی تخلیق ہے، اسلئے کہ بندوں کے افعال کا خالق اللہ تعالیٰ نہیں، بلکہ بندے اپنے افعال کے خود خالق ہیں۔

"قال الکعبی ان ذلک بالهداية و البيان و التحذير و المعرفة و الالطاف"

یہی وجہ ہے کہ کعبی معتزلی نے یہ کہا ہے کہ بندے خود ایک دوسرے سے محبت والفت کو پیدا کرتے ہیں، البتہ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دیتا ہے، ان کے سامنے بیان کرتا ہے، الفت ومحبت نہ کرنے پر ان کو ڈراتا ہے، اور الفت ومحبت کی ان کو پہچان کراتا ہے، ان پر مہربانیاں کرتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

اخوت وصداقت: اصل الاخ فی اللغة من التوخی وهو الطلب فالاخ مقصده مقصدا خيه "اخ" لغت میں "توخی" سے لیا ہوا ہے، جس کا معنی ہے" طلب "لهذا بھائی کا وہی مقصد ہوتا ہے جو اس کے بھائی کا ہوتا ہے۔

"والصديق ماخوذ من ان يصدق كل واحد من الصديقين صاحبه مافی قلبه ولا يخفى عليه شئ"

صدیق (صاد پر زبر، دال مخفف) کا معنی ہے گہرا دوست، اس وقت دوست کو "صدیق" کہا جائے گا، جب ایک دوسرے دوست کی کوئی بات مخفی نہ رہے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا﴾

اور تم جہنم کی آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے تو اس نے تمہیں اس سے نکالا۔

اللہ تعالیٰ نے پہلے دنیاوی نعمتوں کا ذکر فرمایا، اس کے بعد اخروی نعمت کا ذکر فرمایا کہ تمہیں جہنم کی آگ کے گڑھے سے نکالنا یہ تم پر اللہ تعالیٰ کا اخروی عظیم انعام ہے، "شَفَا" (شین پر زبر، الف مقصورہ) اس کا معنی ہے کنارہ "شفا البیر" کنوئیں کا کنارہ، اس کی جمع ہے "اشفاء" "نقذ" "استنقذ" "انقذ" کا معنی ہے خلاصی دینا، نجات دینا "حُفْرَةٍ" کا معنی ہے گڑھا، معنی یہ ہے کہ تم اپنے کفر کی وجہ سے جہنم کے کنارے پر تھے، جہنم کو اس گڑھے سے تشبیہ دی جس میں آگ ہو، گویا کہ یوں بیان کیا گیا کہ تم کفر کی وجہ سے آگ کے اسطرح مستحق ہو گئے تھے کہ کوئی آگ کے گڑھے کے کنارے پر ہو، گرنے کے قریب ہو "فبین تعالی انه انقذهم من هذه الحفرة وقد قربوا من الوقوع فيها" اسی طرح رب تعالیٰ نے اوس وخزرج کا حال بیان فرمایا کہ وہ کفر کی وجہ سے آگ میں گرنے کے قریب تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو آگ میں گرنے سے بچالیا، گویا کہ آگ سے نکال لیا۔ (ماخوذ از کبیر)

دینی طلباء کرام کیلئے:

﴿فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا﴾ میں "ھا" ضمیر ﴿شَفَا حُفْرَةٍ﴾ کی طرف لوٹ رہی ہے، تو یہ کس طرح صحیح ہے کہ ضمیر مؤنث ہے اور "شفا" مذکر ہے۔

پہلا جواب: یہ ضمیر ﴿حُفْرَةٍ﴾ کی طرف لوٹ رہی ہے، کہ گڑھے سے نکالا، اسلئے کہ گڑھے کے کنارے سے نکالنا گڑھے سے نکالنا ہی ہے۔

دوسرا جواب: ضمیر "نار" کی طرف لوٹ رہی ہے جو مؤنث سماعی ہے، یعنی تمہیں آگ سے نکالا۔ "شفا" اور "شفة" دونوں ایک معنی میں استعمال ہوتے رہتے ہیں، اس لئے یہ ضمیر گویا کہ "شفة" کی طرف لوٹ رہی ہے، جو مؤنث ہے۔

تیسرا جواب: خود لفظ "شفا" میں تذکیر و تانیث کا احتمال پایا گیا ہے، لھذا ضمیر مذکر کی لوٹائی جائے یا مؤنث کی لوٹائی جائے دونوں جائز ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

دنیا کی زندگی کتنی ہے:

آیۃ کریمہ سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر وہ کفر پر مرجاتے تو آگ میں گرجاتے، ان کی زندگی کی مثال بیان کی گئی کہ جس طرح کوئی آگ کے گڑھے کے کنارے پر بیٹھا ہوا ہو اور اس کا گڑھے میں گرجانا متوقع ہو (گرجانے کی امید کی جاری ہو) یہی حال ان لوگوں کا ہے۔

"وھذا فیہ تنبیہ علی تحقیر مدۃ الحیاۃ فانہ لیس بین الحیاۃ وبین الموت المستلزم للوقوع فی الحفرۃ الا مابین طرف الشئی وبین ذلک الشئی"

اسی سے یہ مسئلہ بیان ہو رہا ہے کہ دنیا کی زندگی کی مدت بہت تھوڑی ہے گویا کہ زندگی اور موت کے درمیان اتنا وقفہ ہے جتنا گڑھے کے کنارے پر ہو تو گڑھے میں گرجانے میں وقفہ ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾

اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تمہارے لئے اپنی آیات کو تا کہ تم ہدایت پاجاؤ۔

آیات سے مراد دلائل ہیں، یعنی جس طرح یہ دلیل تمہارے لئے بیان کی اسی طرح اور بھی دلائل تمہارے

لئے بیان کرتا ہے، اس ارادہ سے کہ تم ہدایت حاصل کرلو۔ (بیضاوی)

اجماع کی مختصر بحث از حسامی مع نامی:

قرطبی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا کہ آیۂ کریمہ ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ دلالت کر رہی ہے اس پر کہ ''اجماع امت'' بھی دلائل شرع میں سے ایک دلیل ہے، جس کا ذکر اصول فقہ میں ہے، طلباء کرام کے فائدہ کیلئے اصول فقہ کی مشہور کتاب حسامی اور اس کی شرح نامی سے مختصر بحث اجماع امت کی پیش کی جارہی ہے، زیادہ تفصیل دیکھنی ہو تو نورالانوار کو دیکھئے۔

اجماع کا لغوی معنیٰ:

اجماع کے لغوی دو معانی ہیں، ایک ''العزم من الشئی'' کسی چیز کا پختہ ارادہ کرنا، جیسا کہ کہا جاتا ہے ''اجمع فلان علی کذا'' فلاں شخص نے اس کام کا پختہ ارادہ کرلیا ہے، اور دوسرا معنیٰ اسکا ''اتفاق'' ہے، جیسا کہ کہا جائے ''اجمعوا علی هذا'' اس پر تمام کا اتفاق ہے۔

اصطلاحی معنیٰ:

هو اتفاق جمیع المجتهدین الصالحین من امة محمد ﷺ فی عصر علی واقعة ''

نبی کریم ﷺ کی امت کے نیک مجتہدین اصحاب علم کا ایک زمانہ میں ایک مسئلہ میں متفق ہوجانا، اجماع امت ہے تعریف میں ''اتفاق'' لفظ ذکر کیا گیا ہے جو اقوال اور افعال اور سکوت اور تقریر دونوں کو شامل ہے، یعنی سب کسی مسئلہ پر بول کر اتفاق کریں، یا اس پر عمل کر کے اتفاق کریں، یا بعض کہیں یہ مسئلہ اس طرح ہے، دوسرے اس پر خاموش رہیں، یا کوئی شخص عمل کر رہا ہو تو علماء مجتہدین دیکھ کر خاموش ہو جائیں، یہ سب صورتیں اجماع امت کی ہیں، جو شرعی دلیل ہے۔

''وقولنا جمیع المجتهدین یخرج اتفاق بعضهم ویخرج اتفاق العوام ایضا فانهما لیسا باجماع ''

''اجماع'' کی تعریف میں ''تمام مجتہدین کا متفق ہونا'' ذکر کیا ہے، جس سے یہ واضح ہو گیا کہ اگر بعض علماء مجتہدین کسی مسئلہ میں متفق ہو گئے اور بعض نے مخالفت کی تو وہ ''اجماع امت'' نہیں، اور وہ شرعی دلیل بھی نہیں کہ اس پر اعتبار کر کے اس مسئلہ میں عمل کیا جائے، اسی طرح عوام تمام ہی کسی مسئلہ میں متفق ہو جائیں تو ان کا اتفاق شرعی دلیل نہیں، اسے اجماع امت نہیں کہا جائے گا۔

"وقولنا الصالحين يخرج اجماع الفاسقين والمبتدعين من المجتهدين فانه ليس بحجة"

اجماع امت کی تعریف میں "صالحین" کا ذکر کیا گیا ہے، جس سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ اگر علماء مجتہدین فاسق اور بدعات سیئہ پر عمل کرنے والے ہوں تو ان کا اجماع کوئی دلیل نہیں، واضح ہوا کہ حکمرانوں سے پیسے بٹورنے والے، اور پیسے لے کر ہاں میں ہاں ملانے والے اور غلط فتوے دینے والے علماء کا کسی مسئلہ میں اتفاق یا اختلاف کوئی حیثیت نہیں رکھتا، کیونکہ وہ تو "العوام کالانعام" سے بھی گھٹیا اور بدترین ہیں۔

"وقولنا من امة محمد ﷺ يخرج اجماع مجتهدى الامم السابقة لانه من خصائص هذه الامة"

اور اجماع کی تعریف میں ذکر کیا ہے امت محمد مصطفیٰ ﷺ کے علماء مجتہدین وصالحین کا کسی مسئلہ پر اتفاق کرنا "اجماع امت ہے" اس سے یہ واضح ہو گیا کہ صرف نبی کریم ﷺ کا یہ خاصہ ہے کہ آپ کی امت کے "علماء مجتہدین وصالحین" کا اجماع دلیل ہے، ورنہ پہلی امتوں کا اجماع نہ اس وقت دلیل تھا اور نہ ہی اب دلیل ہے۔ تعریف میں "فی عصر علی واقعة" کہا ہے، جس سے یہ فائدہ حاصل ہو گیا کہ ایک زمانہ میں کسی مسئلہ میں علماء کا متفق ہونا "اجماع امت" ہے، خواہ تعداد علماء کی قلیل ہو یا کثیر ہو، اسلئے بعض لوگوں کا اس مسئلہ میں یہ کہنا غلط اور باطل ہے کہ کسی مسئلہ میں تمام مجتہدین کا ہر زمانہ میں قیامت تک متفق ہونا اجماع امت ہے۔ اس بحث سے واضح ہو گیا کہ "اجماع" میں کئی اقوال باطل ہیں، بعض لوگوں نے کہا "اجماع" صرف صحابہ کرام کا ہے، اور بعض لوگوں نے کہا "اجماع" صرف اہل مدینہ کا ہے، بعض نے کہا اجماع عترت نبی کریم ﷺ کا ہے، یہ تمام اقوال باطل ہیں۔

"والصحيح عندنا ان اجماع كل عصر من اهل العدالة والاجتهاد حجة ولا عبرة لقلة العلماء وكثرتهم ولا بالثبات على ذلك حتى يموتوا"

ہمارے نزدیک صحیح مذہب یہ ہے کہ ہر زمانہ کے عادل (صالحین) مجتہدین علماء کرام کا اجماع حجت ہے، علماء کی تعداد قلیل ہونے یا کثیر ہونے کا کوئی اعتبار نہیں، اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ وہ اجماع کے بعد تا حیات اسی پر قائم رہیں (بلکہ بعد میں موقف بدل جائے اور اس مسئلہ سے کسی نے رجوع کر لیا، تو اس سے اجماع میں کوئی فرق نہیں آئے گا) اھل ھوی کی اجماع کی مخالفت سے اجماع میں کوئی فرق لازم نہیں آتا۔

"اذا انعقد الاجماع على فضيلة ابى بكر فخلاف الروافض فيه غير معتبر"

جب حضرت ابوبکر ﷛ کی فضیلت پر اجماع منعقد ہے، تو رافضیوں کے اختلاف سے "اجماع امت" میں کوئی فرق لازم نہیں آئے گا، بلکہ رافضیوں کو رافضی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اہل حق کو چھوڑ دیا ہے۔

"ولا عبرة لمخالفة من لارأی له کالعوام فی الباب الا فیما یستغنی عن الرأی"

جن لوگوں کو رائے اور اجتہاد حاصل نہیں، جیسے عوام ہیں، ان کی اجماع کے خلاف مخالفت کا کوئی لحاظ نہیں، صاحب کتاب نے "الا فیما یستغنی عن الرای" کو مستثنیٰ کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے، بعض احکام میں رائے کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا جیسا کہ "نقل قرآن اور تعداد رکعات" ان میں نہ عوام کی رائے کا کوئی اعتبار ہے، اور نہ مجتہدین کی رائے کا کوئی اعتبار ہے، کیونکہ ان چیزوں کا ثبوت خبر متواتر سے ہے، بعض احکام میں رائے کا اعتبار پایا جاتا ہے، ان میں علماء صالحین مجتہدین کا رائے میں اتفاق اجماع ہے، لیکن عوام کی رائے کا ان میں بھی کوئی اعتبار نہیں۔

اجماع کے مراتب:

سب سے قوی اجماع صحابہ کرام کا ہے۔ جس میں نص پائی جائے کہ وہ کہیں "اجمعنا علی کذا" ہمارا اس مسئلہ میں اجماع ہے، اس اجماع کے حجت ودلیل ہونے میں کوئی اختلاف نہیں، اسلئے اجماع صحابہ کرام کے ضمن میں اجماع اہل مدینہ بھی آ گیا اور اجماع عترت رسول اللہ ﷺ بھی آ گیا" اس اجماع کا منکر کافر ہے"

اس کے بعد اجماع سکوتی کا درجہ ہے:

اجماع سکوتی یہ ہے کہ بعض صحابہ کرام کے قول میں نص ہو کہ ہم اس مسئلہ میں متفق ہیں، اور بعض اس میں خاموش ہوں، بعض کے خاموش رہنے اور مخالفت نہ کرنے کی وجہ سے اجماع ہو گیا، لیکن پہلے اجماع سے کم درجہ ہو گیا، "لان السکوت فی الدلالة علی تقریر الحکم دون النص ولذا لایکفر جاحده" اسلئے کہ سکوت کسی حکم کو ثابت کرنے کی دلالت میں نص سے کم درجہ رکھتا ہے، اتنا تو ہر صاحب عقل سمجھ لیتا ہے، کہ یہ کہنا کہ ہم اس میں متفق ہیں، اور خاموش رہنا لیکن مخالفت نہ کرنا، ان میں بہت بڑا فرق ہے، اسی وجہ سے اجماع سکوتی کے منکر کو کافر نہیں کہا جائے گا۔

پھر ہر زمانہ کے علماء صالحین ومجتہدین کا اجماع:

لیکن شرط یہ ہے کہ ان کا اجماع صحابہ کرام کے اجماع کے مخالف نہ ہو "فهذا لاجماع بمنزلة المشهور يفيد الطمانينة دون اليقين" یہ اجماع خبر مشہور کے درجہ میں ہے، یہ اطمینان حاصل ہونے کا فائدہ دیتا ہے، اس سے یقین حاصل نہیں ہوتا اس اجماع کا منکر کافر نہیں، لیکن شدید گنہگار ہے، جیسا کہ خبر مشہور کا منکر کافر نہیں لیکن گنہگار ہوتا ہے۔

پھر اجماع جس میں بعض صحابہ کرام کی مخالفت پائی گئی ہو:

یعنی اجماع علماء صالحین مجتہدین کا ہو، اس میں بعض صحابہ کرام کی موافقت پائی گئی ہو، اور بعض کی مخالفت، یہ اسی وقت ہوگا جب بعض صحابہ کرام کا اس میں اختلاف پایا گیا ہوگا، جیسا کہ ''ام ولد'' کی بیع (فروخت کرنے) میں صحابہ کرام کا اختلاف تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ جائز نہیں مانتے تھے، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ جائز مانتے تھے، پھر اجماع حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق ہوگیا کہ ''ام ولد'' کی بیع جائز نہیں، یہ اجماع پہلے تین قسم کے اجماع سے کم درجہ ہے، اس کا مقام خبر واحد کا ہے، یہ قیاس پر مقدم ہوگا، عمل اس پر واجب ہوگا، لیکن اس کا منکر کافر نہیں ہوگا ''خبر واحد کا بھی یہی حکم ہے''

اس آخری درجہ اجماع پر بحث:

یہ اجماع جس میں بعض صحابہ کرام کی مخالفت پائی گئی ہو، اس میں علماء کرام کا اختلاف ہے، بعض اہل ظواہر، اور اصول فقہ والے کئی حضرات جیسے ابو بکر صیرفی شافعی، شیخ ابو الحسن اشعری، احمد بن حنبل، غزالی، امام الحرمین جوئی، اور بعض احناف رحمهم الله کا قول یہ ہے، کہ۔

''هذا لايكون اجماعا حتى يبقى المسئلة اجتهادية كما كانت ويجوز لاحد ان ياخذ بالقول المخالف لهذا الجماع''

یہ اجماع ہی نہیں، بلکہ یہ مسئلہ اجتہادیہ ہے جیسے پہلے اجتہادیہ تھا، اجماع کے بعد بھی اجتہادیہ ہے، اس میں اگر کوئی مخالفت کرے تو جائز ہے، ان لوگوں کی اس پر دلیل یہ ہے کہ اس اجماع میں اتفاق نہیں پایا گیا، کیونکہ بعض صحابہ کی مخالفت پائی گئی ہے، پھر مخالفت جس کی کی گئی اس کی وفات سے بھی ''یہ اجماع دلیل نہیں بن سکے گا'' ''لان موت المخالف لايبطل قوله'' اس لئے کہ جس کی مخالفت کی گئی اس کی وفات سے اس کا قول باطل نہیں ہوگا۔

احناف کا اس میں مذہب:

یعنی امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے کثیر اصحاب اور امام شافعی رحمہ اللہ کے بعض اصحاب کا صحیح قول اس میں یہ ہے ''اجماع علماء كل عصر حجة فيما سبق فيه الخلاف وفيما لم يسبق'' ہر زمانے کے علماء صالحین و مجتہدین کا اجماع حجت ہے خواہ پہلے حضرات میں سے بعض کی مخالفت پائی گئی ہو یا نہ پائی گئی ہو، دونوں اجماع حجت ہیں۔ البتہ فرق یہ ہے کہ جس اجماع میں پہلے حضرات کی مخالفت نہیں پائی گئی وہ خبر مشہور کے درجہ میں ہے، اور جس میں اختلاف

پایا گیا وہ خبر واحد صحیح کے درجہ میں ہے۔

اجماع کے انتقال کی اقسام:

صحابہ کرام کے اجماع کا ہماری طرف منتقل ہونا دو قسم ہے۔ **ایک** یہ کہ صحابہ کرام کا اجماع ہم تک ہر زمانے کے اتنے لوگوں سے پہنچے جن کا جھوٹ پر متفق ہونا محال ہو یعنی اجماع ہم تک ہر زمانے میں اجماع سے پہنچے تو یہ خبر متواتر کے درجہ میں ہوگا۔ **دوسرا** یہ ہے کہ اجماع صحابہ ہم تک احاد سے پہنچے عمل کرنا اس پر واجب ہوگا لیکن علم یقین حاصل نہیں ہوگا، کیونکہ اصل کے لحاظ پر تو اس میں یقین پایا گیا ہے، لیکن نقل کے لحاظ پر اس میں ظن آ گیا، تاہم یہ اجماع بھی قیاس سے مقدم ہوگا۔ (حسامی مع نامی)

فرقہ واریت ناسور ہے:

یہ جملہ عام لوگوں کے ذہنوں میں ان لوگوں نے بٹھایا ہوا جو در حقیقت فرقہ واریت کی آگ کو ہوا دے کر بھڑکانے والے، یہ کہنے والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے پیسے خرچ کر کے ملک میں افراتفری پیدا کرنے کیلئے فرقہ واریت کو پیدا کیا، یہی لوگ ہیں جنہوں نے فرقہ واریت کے پودوں کی آب زر سے آبیاری کر کے اسے تناور درخت بنا دیا، جس کی جڑیں ملک کے کونہ کونہ میں پھیل گئیں۔

آیئے! خدارا تجزیہ کی جئے وہ کون ہیں جنہوں نے فرقہ واریت کی آگ کو بھڑکا کر یہ راگ الاپنا شروع کر دیا فرقہ واریت ناسور ہے، یہ مولوی دہشت گرد ہیں، یہ تو اسی طرح کا جملہ ہے جیسا کہ چور چوری کرنے کے بعد دوسرے لوگوں سے مل کر شور کرنے لگے وہ چور گیا، وہ بھاگ گیا، وہ تنگ گلیوں میں گھس گیا، اس نے تاریک رات کا فائدہ اٹھالیا ،اپنے آپ کو اسنے بچالیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

ہاں ہاں اب ہر ذی شعور انسان سمجھ چکا ہے کہ یہ کام ان لوگوں کا ہے جو ایک مرتبہ اقتدار سے چمٹ جاتے ہیں تو ڈنڈے کے زور سے اپنے ساتھ لٹھ برداروں کو ملا کر اس اپنے اقتدار کو طول دینے کیلئے طرح طرح کے حربے استعمال کرتے ہیں، ان حربوں میں سے ایک یہ ہے کہ لوگوں کو لڑاؤ حکومت چلاؤ۔

پھر ان کے مشیر جو پہلے ان کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ تمہاری کامیابی کا راز صرف اس میں ہے کہ لوگوں کا لڑاؤ اور حکومت چلاؤ، نااہل حکام، اور بے تدبیر وزیر، اور فسادی مشیر مل کر پیسہ چھانٹا شروع کر دیتے ہیں کبھی ایک کو خرید اور

بھی دوسرے کو، ایک دوسرے کو لڑانے کے ذرائع پیدا کیئے جاتے ہیں کون نہیں جانتا کہ تخریب کار تنظیموں کو ارباب حکومت نے ہی کھڑا کیا ہے، بغیر پیچھے آہنی ہاتھ کے کوئی تخریب کار تنظیم دو دن بھی قائم نہیں رہ سکی، یہ صرف پیچھے خفیہ ہاتھ کے بل بوتے اور ان کو ملنے والے پیسے سے قائم ودائم رہتی ہیں، جب ان سے پیسہ دینے والے اس لئے ناراض ہو جاتے ہیں کہ تمہیں لڑانے کیلئے، تمہیں پروان چڑھانے کیلئے جو غیر مسلم ہمیں پیسہ دیتے تھے اب وہی تم سے ناراض ہو گئے ہیں کیونکہ تم نے ان کا کام چھوڑ دیا، ان کی بات مانتے چلے جاتے ان کا کام کرتے رہتے تو تمہیں پیسے ملتے رہتے، تمہاری تنظیمیں برقرار رہتیں۔ تم نے تلے لگنا چھوڑ دیا ہے تو یاروں نے تم سے منہ موڑ لیا ہے، اس لئے اب تم دہشت گرد ہو، ہاں اگر تم نے پھر سے مجاہد کا لقب حاصل کرنا ہے تو نصرانیوں کے غلام بن جاؤ، ان کا کام کرو تو تمہیں پیسے بھی ملیں گے اور تمہیں مجاہد بھی کہا جائے گا۔

یہ ہے وہ سبب جس نے فرقہ واریت کو جنم لیا، اسکے جڑوں کو مضبوط کیا، ملک کو تباہ کیا ملک کے دو ٹکڑے کیئے، ابھی تک سوچ وہی ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، پیچھے آنے والا پہلے کے نقش قدم پر چلتا ہے بلکہ دو قدم آگے بڑھ جاتا ہے، سب خرابی کی جڑ غیر مسلموں کی غلامی ہے، بظاہر ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم آزاد ہیں، لیکن درحقیقت پہلے سے زیادہ غلامیت ہمیں حاصل ہوئی ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہودیوں اور نصرانیوں کے یار ہی ارباب حکومت کے مشیر بے تدبیر ہوتے ہیں، جب ان کو مشورہ دے کر کہ ''لوگوں کو لڑاؤ اور حکومت چلاؤ'' میں کافی حد تک کامیاب ہو جاتے ہیں، ان سے کافی کام ملک کی تباہی کا مسلمانوں کو قتل کرانے کا لے لیتے ہیں تو جب ارباب حکومت ان کی ہاں میں ہاں ملانا ذرا کم کر دیتے ہیں تو اب وہ دوسری طرف آ جاتے ہیں اپنے غیر مسلم آقاؤں سے لیا ہوا پیسہ دوسری جانب چھانٹنا شروع کر دیتے ہیں، اب ان کا نعرہ یہ ہوتا ہے ''شور مچاؤ حاکم ہٹاؤ''

یہ ہیں اسباب جن کی وجہ سے کالج، یونیورسٹیاں، دکانیں، اور بازار اور گھر لڑائی کی لپیٹ میں ہیں، یہ وہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے داڑھیوں والے، جبہ و دستار والے جہلاء کو بھی خرید لیا جاتا ہے، ان سے بھی ایک دوسرے سے لڑانے کا کام لے لیا جاتا ہے لیکن اللہ تعالی کے فضل وکرم سے حقیقی علماء کبھی نہیں بکے اور انشاء اللہ کبھی نہیں بکیں گے، خصوصی طور پر علماء اہل سنت بریلوی مسلک کے علماء جو بحیثیت جماعت کے قائد اعظم کے ساتھ پاکستان بنانے میں پیش پیش تھے وہ انشاء اللہ کبھی ملک کے وقار کے خلاف کام نہیں کریں گے کیونکہ اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی چیز کو بگاڑنا اہل علم کا شیوہ ہی نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ ہر مسلک کے حقیقی علماء اللہ کے فضل وکرم سے تخریب کار لوگوں کا کبھی آلہ کار نہ بنے اور نہ ہی انشاء اللہ کبھی بنیں گے۔

اس لئے میرے پیارے عوام الناس! یہ جملہ ضرور یاد کریں کہ "فرقہ واریت ناسور ہے" لیکن اس کے اسباب کو بھی نہ بھولیں، انشاء اللہ آپ کو پتہ چل جائے کہ نام ونہاد ملک کے محافظ ہی سب تباہی کا سبب ہیں۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ○ (آیۃ نمبر ۱۰۴)

(۱) اور تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہئے کہ بھلائی کی طرف بلائیں، اور اچھی بات کا حکم دیں اور بری سے منع کریں اور یہی لوگ مراد کو پہنچے۔

(۲) اور چاہئے کہ تم میں سے ایک گروہ ہو جو دعوت دیں بھلائی کی طرف، اور حکم دیں اچھی چیزوں کا، اور منع کریں بری چیزوں سے، اور یہی، لوگ کامل کامیاب ہیں۔

ماقبل سے تعلق:

گزشتہ آیات میں اہل کتاب (یہود ونصاری) کے دوعیبوں کا ذکر فرمایا، ایک کفر کا ذکر کیا:

"يَآاَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِآيَاتِ اللّٰهِ" اے اہل کتاب تم اللہ کی آیات سے کیوں کفر کرتے ہو۔

اور دوسرا ان کا عیب ذکر کیا کہ وہ غیروں کو کفر میں واقع کرنے کی ناپاک جسارت کرتے تھے۔

"يَآاَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ آمَنَ بِهٖ"

اے اہل کتاب تم کیوں روکتے ہو اللہ کی راہ سے ایمان والوں کو۔

اہل کتاب کے عیوب ذکر کرنے کے بعد ایمان والوں کا تذکرہ فرمایا، اور ان کو ایمان وتقوی کا حکم دیا۔

"يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ"

اے ایمان والو اللہ سے ڈرو جیسا کہ ڈرنے کا حق ہے، اور ہرگز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔

پھر حکم فرمایا ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ اور تھام لو اللہ کی رسی کو سب مل کر، اب اس آیۃ کریمہ میں ایمان والوں کو حکم دیا کہ تم اوروں کو بھی ایمان واطاعت کی طرف لانے کی کوشش کرو، یہی وجہ ہے ارشاد فرمایا ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ﴾ اور چاہیے کہ تم میں سے ایک گروہ ہو جو دعوت دیں بھلائی کی طرف۔ (کبیر)

لفظ "من" کے متعلق بحث:

منکم، میں لفظ "من" تبعیض کیلئے ہے، یا تبیین کیلئے ہے، اس میں اہل علم کا اختلاف ہے، ایک قول یہ ہے کہ یہ تبیین کیلئے ہے، تبعیض کیلئے نہیں، ان حضرات نے اپنے موقف پر دو دلیلیں پیش کی ہیں۔

" الاول ان اللہ تعالیٰ اوجب الامر بالمعروف و النهی عن المنکر علی کل الامة فی قوله " کنتم خیرا مة اخرجت للناس تا مرون با لمعروف و تنهون عن المنکر "

پہلی دلیل ان میں سے یہ ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے " امر بالمعروف " اور " نهی عن المنکر " کا حکم تمام امت کو دیا ہے، بعض کو حکم نہیں، ابھی آگے قریب ہی آیۃ کریمہ آرہی ہے، " كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ " (تم بہتر ہو ان سب امتوں میں جو لوگوں میں ظاہر ہوئیں بھلائی کا حکم دیتے ہوئے اور برائی سے منع کرتے ہوئے)

اس آیۃ کریمہ میں تمام امت کے " امربالمعروف " اور " نهی عن المنکر " کا ذکر ہے، صرف بعض کا ذکر نہیں۔ ان حضرات کی دوسری دلیل یہ ہے

"لا مکلف الا و یجب علیه الامر بالمعروف و النهی عن المنکر " کہ کوئی مکلّف (عاقل و بالغ) نہیں یہ کہ اس پر واجب ہے کہ وہ اچھے کاموں کا حکم دے، اور برے کاموں سے منع کرے، خواہ ہاتھ سے روکے، یا زبان سے روکے، یا دل سے روکے، ہر ایک پر واجب ہے کہ وہ اپنے آپ سے ضرر کو دور کرے۔

" اذا ثبت هذا فتقول معنی هذا الآیة کو نو ا امة دعاة الی الخیر آمرین بالمعروف ناهین عن المنکر " جب یہ ثابت ہے تو ہم کہتے ہیں معنی اس آیۃ کا یہ ہے "ہو جاؤ تم امت بھلائی کی دعوت دو، اچھے کاموں کا حکم دو، اور برے کاموں سے منع کرو۔

اس تمام تقریر کے بعد واضح ہوا کہ "من" تبیین ہے، تبعیض کیلئے نہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ﴾ یہاں بھی "من" تبیین کیلئے ہے، اس طرح کہا جاتا ہے "لفلان من اولادہ جند " فلاں کی اولاد لشکر ہے، اور کہا جاتا ہے "وللامیر من غلمانه عسکر " امیر کے غلام لشکر ہیں، ان مثالوں میں "من " بیانیہ ہے، تبعیض کیلئے نہیں، بعض اولاد یا بعض لشکر مراد نہیں۔

مقام توجه : اگر چہ حکم تو تمام امت کو ہے، لیکن اگر بعض نے " امر بالمعروف اور نهی عن المنکر " پر عمل کر دیا تو باقیوں سے حکم ساقط ہو جائے گا، یعنی یہ فرض کفایہ ہے، فرض عین نہیں۔

دوسرا قول : بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ "مــــن" تبعیض کیلئے، جس کا معنی ہوتا ہے "بعض" "اب ان حضرات کے دو قول ہیں، ایک یہ کہ "مــــن" تبعیض کیلئے بنانے کا فائدہ یہ ہے کہ قوم کے بعض لوگ اچھے کاموں کا حکم دینے اور برے کاموں سے روکنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے، جیسا کہ عورتیں، مریض، اور عاجز، دوسری دلیل ان حضرات کی یہ ہے کہ یہ تکلیف مختص ہے علماء کرام سے۔ اس پر دو دلیلیں موجود ہیں ایک یہ کہ یہ آیۃ کریمہ مشتمل ہے تین چیزوں پر۔

(۱) "الدعوۃ الی الخیر" "بھلائی کے کاموں کی طرف بلانا" (۲) "والامر بالمعروف" اچھے کاموں کا حکم دینا۔

(۳) "والنھی عن المنکر" برے کاموں سے روکنا، یہ کام علماء ہی کر سکتے ہیں، جہلاء نہیں کر سکتے، کیونکہ جاہل بسا اوقات باطل کی طرف بلائیں گے، برے کاموں کا حکم دیں گے، اچھے کاموں سے روکیں گے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جاہل بسا اوقات اپنے مذہب کا پرچار کرے گا، دوسرے کے مذہب کو نہیں جانتا ہوگا تو اسے اچھے کاموں سے روک دے گا، جاہل نرمی کے وقت سختی کرے گا سختی کے وقت نرمی کرے گا، اس لئے آیۃ کریمہ میں جب علماء کا ذکر ہے تو وہ امت کا بعض ہیں، لہذا "مــــن" تبعیض کیلئے آئے گا، دوسرے مقام پر رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی اس کی تائید کر رہا ہے۔

"فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِى الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ٥ (سورۃ التوبۃ آیۃ نمبر ۱۲۲)

تو کیوں نہ ہو کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکلے کہ دین کی سمجھ حاصل کریں، اور واپس آ کر اپنی قوم کو ڈر سنائیں، اس امید پر کہ وہ بچیں۔

دوسری یہ کہ آیۃ کریمہ میں مراد علماء ہیں، اس لئے کہ جب اس مسئلہ میں اتفاق ہے کہ "امر بالمعروف و نھی عن المنکر" کا حکم فرض کفایہ ہے تو واضح بات ہے کہ یہ کام علماء کرام ہی مستحسن طریقہ پر ادا کر سکتے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

راقم کے نزدیک محاکمہ :

جن حضرات نے "من" بیانیہ کہا اور جن حضرات نے "من" تبعیض کیلئے کہا ہے حقیقت میں ان میں کوئی اختلاف نہیں، جنہوں نے ابتداء کو دیکھا ہے (کہ اچھے کاموں کا حکم دینا اور برے کاموں سے روکنا، یہ حکم امت کے ہر فرد کو ہے، مراد امت اجابت ہے، یعنی جنہوں نے ایمان قبول کیا ہے، ان سب کو یہ حکم دیا گیا، اگر کسی ایک نے

بھی اس پر عمل نہ کیا تو سب ہی گنہگار ہوں گے) انہوں نے کہا کہ " من " بیانیہ ہے، مراد تمام امت ہے، جنہوں نے انتہاء کو دیکھا (کہ مطلوب تو فرض کفایہ ہے، بعض کے ادا کرنے سے حکم پر عمل ہو جائے گا، کوئی بھی گنہگار نہیں ہو گا) انہوں نے کہا ہے کہ " مــن " تبعیض کیلئے، امید ہے کہ طلباء کرام کے روشن اذہان اس محاکمہ کو قبول کریں گے کہ ابتداء کو دیکھنے سے " من " بیانیہ ہے، اور انتہاء کو دیکھنے سے " من " تبعیض کیلئے ہے۔

ضحاک کا قول:

اس آیۃ کریمہ میں خطاب صحابہ کرام کو ہے، کیونکہ وہ براہ راست نبی کریم ﷺ سے علم حاصل کرتے تھے، اس لئے ان کو ہی حکم دیا کہ تم دوسروں کو بھی علم سکھاؤ، اس قول کے مطابق آیۃ کریمہ کا معنی یہ ہوگا " کونوا امة مجتمعين على حفظ سنن الرسول ﷺ و تعلم الدين " کہ تم تمام ایک گروہ بن کر متفق ہو جاؤ اس پر کہ نبی کریم ﷺ کی سنتوں کی حفاظت کرنی ہے، اور دین کی تعلیم حاصل کرنی ہے۔

راقم کے نزدیک ضحاک اور جمہور کے اقوال میں کوئی اختلاف نہیں، اس لئے کہ ابتدائی طور پر حکم صحابہ کرام کو تھا، اس طرح ضحاک کا قول ثابت ہو گیا، بعض میں عموم الفاظ کا اعتبار کرتے ہوئے تمام مؤمنین کیلئے حکم نافذ کر دیا، اس طرح جمہور کا قول ثابت ہو گیا۔

آیۃ کریمہ میں تین چیزوں کا حکم دیا گیا:

(۱) بھلائی کی دعوت (۲) اچھے کاموں کا حکم دینا (۳) اور برے کاموں سے روکنا۔

دینی طلباء کرام اس مسئلہ سے بخوبی واقف ہیں کہ عطف مغایرت کو چاہتا ہے، اسلئے تینوں چیزیں علیحدہ علیحدہ مراد ہوں گی۔ اسلئے "دعوت الی الخیر" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کو ثابت کرنے کیلئے دوسروں کو بھی دعوت دے، اور اللہ تعالیٰ کو ممکنات کی مشابہت سے پاک رکھے، رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی اس پر دلالت کر رہا ہے ﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ﴾ (سورة النحل آية نمبر ۱۲۵) اپنے رب کی راہ کی طرف بلاؤ حکمت سے۔

اور ارشاد باری تعالیٰ بھی اسی مفہوم کو ثابت کر رہا ہے ﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ﴾ (سورۃ یوسف آیۃ نمبر ۱۰۸) تم فرماؤ یہ میری راہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں اور میری تابعداری کرنے والے دل کی آنکھیں رکھتے ہیں۔

بھلائی کی طرف دعوت دینے کے بعد ایسے فعل کی رغبت دلائی گئی جو مناسب اور بہتر ہو، اسی کو " ویامرون بالمعروف " سے بیان فرمایا کہ وہ اچھے کاموں کا حکم دیں، اس کے بعد رغبت دلائی کہ جو کام مناسب نہیں ان کو چھوڑ دیا جائے اسی کو " وینھون عن المنکر " سے بیان فرمایا کہ وہ برے کاموں سے منع کریں۔ (تمام بحث ماخوذ از کبیر)

﴿وَاُولٰئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ "اور وہی کامل کامیاب ہیں"۔

راقم نے یہ ترجمہ بیضاوی سے لیا ہے" واولئک ھم المفلحون "المخصوصون بکمال الفلاح" اور وہی کامل کامیاب ہیں، اور اس کامل میں ان کو خصوصی کمال حاصل ہے۔ (بیضاوی)

فاسق اچھے کاموں کا حکم اور برے کاموں سے روک سکتا ہے یا نہیں؟

بعض حضرات نے اس آیۂ کریمہ سے یہ دلیل پکڑی ہے کہ رب تعالی نے اچھے کاموں کا حکم دینے والوں اور برے کاموں سے روکنے والوں کے متعلق فرمایا ﴿وَاُولٰئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ فاسقوں کو چونکہ کامیابی حاصل نہیں ہوتی، لھذا ان کیلئے جائز نہیں کہ وہ دوسروں کو اچھے کاموں کا حکم دیں اور برے کاموں سے روکیں، اس قول کا رد کیا گیا ہے کہ یہ درست نہیں، اس لئے کہ رب تعالی نے اکثریت کا ذکر فرمایا ہے کہ اکثر لوگ جب دوسرے کو نصیحت کریں گے تو یقیناً خود بھی اس پر عمل کریں گے۔

والعلماء قالوا "الفاسق له ان یامر بالمعروف لانه وجب علیه ترک ذلک المنکر ووجب علیه النھی عن ذلک المنکر فبأن ترک احدالواحبین لا یلزمه ترک الواجب الآخر"

علماء کرام نے یہ کہا ہے کہ فاسق دوسرے کو اچھے کام کا حکم دے، کیونکہ کسی کو اچھی نصیحت نہ کرنا بھی برا فعل ہے، اور برے فعل سے بچنا بھی ضروری ہے۔ دو چیزیں واجب ہیں، ایک یہ کہ فاسق گناہوں سے باز آجائے، اور دوسری چیز واجب یہ ہے کہ فاسق دوسروں کو اچھے کاموں کا حکم دے، اگر فاسق سے ایک واجب چھوٹ رہا ہے تو دوسرا وہ نہ چھوڑے۔

"**وعن السلف مروا بالخیر وان لم تفعلوا**" سلف صالحین سے مروی ہے کہ اچھے کاموں کا حکم دو اگرچہ خود اس پر عمل نہ کرو۔

"وعن الحسن انه سمع مطرف ابن عبدالله یقول لااقول مالاافعل فقال واینایفعل ما یقول؟ ودالشیطان لوظفر بھذه الکلمة منکم فلا یامراحدبمعروف ولا ینھی عن المنکر"

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے مطرف ابن عبداللہ کو یہ کہتے ہوئے سنا "کہ میں وہ بات نہیں کہتا جو خود نہیں کرتا" آپ

نے فرمایا ہم میں سے کون ہے جو کہے خود بھی اس پر عمل کرے، یعنی بعض اوقات انسان سے کوتاہی ہو جاتی ہے کہ دوسروں کو نصیحت کرتا ہے اور خود اس پر عمل نہیں کر سکتا، اگر شیطان نے تم سے یہ کلمہ سن لیا تو وہ بہت خوش ہوگا، کیونکہ اس طرح تو اچھے کاموں کا حکم دینے والا اور برے کاموں سے منع کرنے والا کوئی ملے گا نہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

☆ روی انه علیه ﷺ سئل من خیر الناس قال آمرهم بالمعروف وانهاهم عن المنکر واتقاهم لله واوصلهم للرحم"

نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا، یا رسول اللہ ﷺ لوگوں میں سے بہتر کون ہے، تو آپ نے فرمایا، جو اچھے کاموں کا حکم دینے والا ہو، اور برے کاموں سے روکنے والا ہو، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہو اور صلہ رحمی کرنے والا ہو۔ (ماخوذ از بیضاوی)

"والامر بالمعروف یکون واجبا مندوبا علی حسب ما یؤمر به والنهی عن المنکر واجب کله لان جمیع ما انکره الشرع حرام"

اچھے کاموں کا حکم دینا کبھی واجب ہوتا ہے اور کبھی مستحب ہوتا، جیسا امر کا تقاضا ہوگا ایسا ہی حکم ہوگا، لیکن برے کاموں سے روکنا ہمیشہ واجب ہوگا، کیونکہ جمیع کام شریعت کے مخالف حرام ہوں گے، حرام سے روکنا واجب ہوگا۔

لیکن علامہ بیضاوی کے اس آخری قول کو شیخ زادہ نے رد کیا ہے:۔

قوله (والنهی عن المنکر واجب کله) قال النحریر التفتازانی فیه نظر اذ المکروه منکر یندب ترکه ولا یجب والا لکان حراما"

"علامہ بیضاوی کا یہ کہنا کہ تمام برے کاموں سے روکنا واجب ہے" یہ درست نہیں، اس لئے کہ بعض برے کام مکروہ ہوتے ہیں، ان سے روکنا مستحب ہے، اگر تمام برے کاموں سے روکنا واجب ہو تو تمام کام حرام ہوں گے، حالانکہ کوئی برے کام مکروہ ہوں گے۔ (شیخ زادہ)

راقم کے نزدیک علامہ بیضاوی کا قول مقید ہے کہ وہ برے کام جو حرام کے درجہ میں ہیں، ان تمام سے روکنا واجب ہے۔

طریقہ تبلیغ: یبدأ فی الامر بالمعروف والنهی عن المنکر بالارفق مترقیا الی الاغلظ فالاغلظ"

اچھے کاموں کے حکم دینے کی ابتداء اور برے کاموں سے روکنے کی ابتداء نرم کلام سے کرے، اگر نرم کلام کو ہی وہ تسلیم کرلے تو بہتر بات، ورنہ آہستہ آہستہ کلام میں سختی کرتا جائے۔

"ثم اذا لم یتم الامر بالتغلیظ والتشدید وجب علیه القهر بالید"

اگر سخت کلام اور زور دار کلام کا ان پر کوئی اثر نہ ہو تو اب ضروری ہو جائے گا کہ ان کو ہاتھ سے سمجھایا جائے، یعنی اگر طاقت حاصل ہو تو ان کی سرزنش کی جائے، ان کو تھپڑ رسید کئے جائیں۔ "فان عجز فباللسان وان عجز فبالقلب" اگر ہاتھ سے روکنے کی ان کو طاقت حاصل نہ ہو تو زبان سے روکے، اگر زبان سے بھی روک نہ سکے تو دل سے ان کو برا سمجھے۔

خیال رہے یہ سب سے کم درجہ ہے ایمان کا، اگر برے شخص کو برا نہ سمجھا جائے تو اس انسان کا ایمان کامل نہیں، پہلے نرمی سے بات کرے، نرمی سے بات نہ بنے تو پھر سختی سے کلام کرے، اس قول کو رب تعالی کے ارشاد سے تائید حاصل ہے۔

"وَاِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَی الْاُخْرٰی فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰی تَفِیْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰهِ"

اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑیں تو ان میں صلح کراؤ، پھر اگر ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس زیادتی والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔

اس آیۂ کریمہ میں" قدم الاصلاح علی القتال "اصلاح کو قتال سے پہلے ذکر کیا، جس سے پتہ چلا کہ نرم کلام سے سمجھانا پہلے ہے اور سخت کلام کا درجہ اس کے بعد ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

امر بالمعروف، نہی عن المنکر پر احادیث مبارکہ:

✿ عن ابی سعید الخدری عن رسول اللہ ﷺ قال من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ و ذلک اضعف الایمان "

("رواہ مسلم" مشکوۃ باب الامر بالمعروف)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جو شخص تم میں سے برے کام کو دیکھے تو اس کو ہاتھ سے بدل دے، اگر اس کی طاقت نہ رکھے تو زبان سے، اور اگر اس کی طاقت نہ رکھے تو دل سے، یہ ضعیف ایمان ہے۔

وضاحت حدیث:

"والخطاب للصحابة اصالة ولغیرهم تبعا"

اس حدیث پاک میں اصل میں خطاب تو صحابہ کرام کو ہے، اور بالتبع تمام امت کو یہ حکم شامل ہے، "منکم" "میں" من "تبعیض کیلئے جس پتہ چلا کہ" امر بالمعروف "اور" نہی عن المنکر "فرض کفایہ ہے۔

تنبیہ: وایماء الی انه لایباشر الامن یعرف مراتب الاحسان وتفاوت المنکرات

ویمیز بین المتفق علیه والمختلف فیه منها ، وهذاالمعنی مقتبس من قوله تعالی
"ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینهون عن المنکر"

حدیث پاک میں اس مسئلہ کی طرف واضح اشارہ ہے کہ وہ شخص دوسروں کو دعوت دے جو صاحب علم ہو، احسان کے مراتب وہ جانتا ہو، اور منکرات کا فرق اسے پتہ ہو، اور یہ اسے علم ہو کہ اس مسئلہ میں اہل علم کا اتفاق ہے، اور اس مسئلہ میں اہل علم کا اختلاف، یہ تمام معنی درحقیقت اللہ کے ارشاد گرامی ﴿وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ سے لیا ہے۔

ہاتھ سے بری چیز کو روکنے کا ایک مطلب:

"یمنعه بالفعل بان یکسر الآلات ویریق الخمر ویرد المغصوب الی مالکه"

جب کسی میں برائی دیکھے تو اس کے برے فعل کو ہاتھ سے روکے یعنی اس کے لہو ولعب کے آلات کو توڑ دے، اور اس کی شراب کو بہادے، اور اگر اس نے کسی کی کوئی چیز غصب کی ہو تو اس سے لے کر مالک کو واپس کر دے۔

قول سے برائی کا بدلنا:

(فان لم یستطع فبلسانه)ای فلیغیره بالقول وتلاوة ماانزل الله من الوعید علیه وذکر الوعظ والتخویف والنصیحة"

اگر ہاتھ سے برائی کو تبدیل کرنے (روکنے) کی طاقت نہ رکھے تو زبان سے اس برائی کو تبدیل کر دے یعنی قرآن پاک کی وہ آیات پڑھ کر سنائے جن میں برائی پر وعید آئی ہوئی ہے، اور وعظ و نصیحت فرمائے، اور خوف دلائے۔

دل سے برائی کو تبدیل کرنے کا مطلب:

(فان لم یستطع فبقلبه)بان لایرضی به وینکر فی باطنه علی متعاطیه فیکون تغییرا معنویا اذلیس فی وسعه الاهذا القدر من التغییر"

اگر زبان سے برائی کو تبدیل کرنے کی طاقت نہ رکھے تو دل سے برائی کو تبدیل کرے، دل سے برائی کو تبدیل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ "اس کی برائی کو پسند نہ کرے، اور دل سے اس کے گناہوں کے ارتکاب کو برا سمجھے، یہ تغییر معنوی ہے، ورنہ دل سے کسی کی برائی کو تبدیل کرنے کی اسے وسعت حاصل نہیں۔

دل سے برا سمجھنا اضعف ایمان ہے:

یعنی اگر برے شخص کو دل سے برا سمجھتا ہے، لیکن زبان سے نہیں روکتا تو یہ ایمان کے شعبوں میں سے کم درجہ کا ایمان ہے، اسلئے کہ قوی ایمان اس ارشاد نبوی سے واضح ہے "افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر" افضل جہاد یہ ہے کہ کلمہ حق بیان کرے ظالم بادشاہ کے سامنے، اور اللہ تعالیٰ نے نیک بندوں کی شان ان الفاظ مبارکہ سے بیان کی ہے ﴿وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ﴾ وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔

بعض علماء نے تین مدارج اسطرح بیان کئے:

"وقد قال بعض علمائنا الامر الاول للامراء، والثانی للعماء، والثالث لعامة المؤمنين"

بعض علماء نے بیان کیا ہے کہ ہاتھ سے برائی کو تبدیل کرنے کا حکم ارباب حکومت کو ہے، اور دوسرا حکم یعنی زبان سے روکنے کا حکم علماء کو ہے، اور دل سے برا سمجھنے والا حکم عام مومنیں کو ہے۔ راقم کے نزدیک اس قول اور پہلی وضاحت میں کوئی تعارض نہیں، بلکہ مطلب یہ بھی ہے اور پہلا بھی ہے۔

اضعف ایمان کا مطلب:

معصیت کا انکار دل سے کرنا، یہ ایمان کے مراتب میں سے کم درجہ ہے۔

"لانه اذا رأى منكرا معلوما من الدين بالضرورة فلم ينكره ولم يكرهه ورضي به واستحسنه كان كافرا"

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی انسان دوسرے میں برائی دیکھے، اس برائی کا برا ہونا دین میں واضح طور پر بغیر کسی شک وشبہ سے ثابت ہو، اس برائی کا انکار نہ کرے، اور اس برائی کو برا نہ سمجھے، بلکہ اس برائی پر راضی ہو اور اسے مستحسن (اچھا) سمجھے تو وہ کافر ہو جائے گا۔

سؤال: حدیث پاک سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کبھی کم ہوتا ہے اور کبھی زیادہ ہوتا ہے، یہی امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب ہے، اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب کس طرح صحیح ہوگا کہ وہ کہتے ہیں، ایمان کم اور زیادہ نہیں ہوتا، ایمان کا صرف ایک ہی درجہ ہے۔

جواب: "معناه اضعف ثمرات الايمان "والانكار بالقلب منها"

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ایمان کے ثمرات ضعیف ہوں گے، صرف دل سے برائی کو برا سمجھنا اسی قبیلہ سے ہے۔

اعتراض: ابھی تم نے پہلے بیان کیا ہے کہ برائی کو دل سے بھی برا نہ سمجھنا کفر ہے، وہ کس طرح صحیح ہے۔

جواب: ثمرات ایمان کبھی قوی ہوتے ہیں، اور کبھی ضعیف ہوتے ہیں، قوی سے دوری کفر ہے، ہم نے جو مسئلہ بیان کیا ہے وہ مکمل یہ ہے کہ برائی کا انکار نہ کرے، برائی کو برا نہ سمجھے، برائی کو اچھا سمجھے، اور برائی پر راضی ہو تو کفر ہے، اور اگر ضعیف ثمرات سے دوری ہو تو فسق ہے جیسا کہ برے شخص کو دل سے برا نہ سمجھے، لیکن برائی کو اچھا نہ سمجھے، اور برائی پر راضی نہ ہو۔ (ماخوذ از مرقاۃ جلد نمبر ۹ صفحہ نمبر ۳۲۸)

✿ **عن النعمان بن بشیر قال قال رسول الله ﷺ مثل المداهن فی حدود الله و الواقع فیها مثل قوم استهموا سفینة فصار بعضهم فی اسفلها و صار بعضهم فی اعلاها فکان الذی فی اسفلها یمر بالماء علی الذین فی اعلاها فتاذوا به فاخذ فأسا فجعل ینقر اسفل السفینة فاتوه فقالوا مالک قال تأذیتم بی و لابدلی من الماء فان اخذوا علی یدیه انجوه ونجوا انفسهم و ان ترکوه اهلکوه و اهلکوا انفسهم"**

(رواہ البخاری، مشکوۃ باب الامر بالمعروف)

نعمان بن بشیر کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالی کی حدود میں کوتاہی سے کام لینے والے اور ان حدود کی وجوہ کے مرتکب لوگوں کی مثال اسطرح ہے، جس طرح ایک قوم کشتی میں بیٹھنے کیلئے قرعہ ڈالیں قرعہ نکلنے پر بعض نیچے ہوں اور بعض اوپر ہوں، سب سے نیچے حصہ میں جو پانی گذرنے کے ساتھ حصہ ہے اس میں ایک شخص کو اوپر والوں نے کوئی اذیت پہنچائی ہو، اس نے کلہاڑا لے کر کشتی کو نیچے سے سوراخ کرنا چاہا، وہ اوپر والے اس کے پاس آ گئے، اور اس سے پوچھا تمہیں کیا ہوا؟ اس نے کہا تم نے مجھے ایذاء پہنچائی، اب مجھے پانی کی ضرورت ہے (میں کشتی کو سوراخ کر کے پانی حاصل کرنا چاہتا ہوں) اگر ان لوگوں نے اس کے ہاتھ کو پکڑ لیا تو اس کو بھی بچا لیا اور اپنے آپ کو بھی بچا لیا، اور اگر اسے اسی طرح چھوڑ دیا تو اسے بھی ہلاکت میں ڈال دیا، اور اپنے آپ کو بھی ہلاکت میں ڈال لیا۔

وضاحت حدیث:

"مثل المداهن فی حدود الله و الواقع فیها"

اللہ کی حدود میں کوتاہی کرنے والوں اور ان میں واقع ہونے والوں کی مثال "المداهن ای المتساهل" "مداہن" کا معنی سستی کرنا، کوتاہی کرنا "فی حدود اللہ" (اللہ کی حدود میں) اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی کی حدود کو قائم کرنے میں سستی سے کام لے یعنی حدود قائم نہ کرے، یا مراد یہ ہے کہ دوسروں کو گناہوں سے نہ روکے جو حدود قائم

کرنے کا ذریعہ ہیں۔

"**حدود الله**" کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا، اسلئے کہ یہ بہت بڑے گناہوں کے ارتکاب پر لازم آتی ہے، دوسری وجہ ان کے ذکر کی تخصیص کی یہ ہے "ان ضررها قد يتعدى الى غير فاعلها" کہ ان گناہوں کے باعث حدود نافذ نہ کرنے کا ضرر (نقصان) دوسروں کو بھی ہوتا ہے جو ان کے مرتکب نہیں ہوتے۔

"**ويمكن ان يراد بالحدود مطلق المعاصي فذكر الحدود لتغليب الاقوى**"

ممکن ہے مراد حدود سے مطلقاً گناہ ہوں، البتہ ان کو "حدود" سے اس لئے تعبیر کر دیا کہ باعث حدود گناہ چونکہ بہت بڑے گناہ ہیں، قاعدہ تغلیب کا لحاظ کرتے ہوئے حدود کو غالب سمجھتے ہوئے ذکر کر دیا اور باقیوں کو اس کے تابع کر دیا۔

"**اولان حد كل معصية معروف مقرر**" یا وجہ یہ ہے کہ ہر معصیت کو حد کہنا بھی مشہور و معروف ہے کہا جاتا ہے حد سے تجاوز نہ کرو، یعنی گناہوں کا ارتکاب نہ کرو۔

والواقع فيها: (اور ان میں واقع ہونے والے) یعنی اللہ تعالیٰ کی حدود میں کوتاہی کرنے والے اور گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کی مثال۔

عربی زبان کا کمال:

وفي التعبير بالواقع فيها اشارة الى بسيب المعصية كأنه طارح من علو منزلته في هوى بئر عميق ومكان سحيق"

باعث حدود گناہ کرنے والوں کے متعلق نبی کریم ﷺ نے "والواقع فيها" کے الفاظ استعمال فرمائے جس سے یہ اشارہ فرمایا کہ گناہوں کی وجہ سے انسان بلند مرتبہ سے خواہشات کے گہرے کنوئیں اور تنگ مکان میں گر جاتا ہے، یہ اشارہ لفظ "واقع" سے ملا ہے، جس کا یہی معنی ہوتا ہے "طارح" گرنے والا۔

مداہنت اور مدارات میں فرق:

مداہنت ناجائز ہے، شریعت نے اس سے منع کیا ہے، اور مدارات جائز ہے، شریعت نے اس کا حکم دیا ہے۔

"**ان المداهنة في الشريعة ان يرى منكرا ويقدر على دفعه ولم يدفعه حفظالجانب مرتكبه اوجانب غيره لخوف اوطمع اوالاستحياء منه اوقلة مبالاة في الدين**"

شرعی اصطلاح میں مداہنت اسے کہا جاتا ہے کہ ایک شخص کسی کو برائی کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھے، اور اسے طاقت بھی حاصل ہو برائی سے روکنے کی، لیکن نہ روکے، اس کے نہ روکنے کی وجہ یہ ہوگی کہ وہ برے شخص کی حفاظت کرتا ہے، کبھی کسی دوسرے شخص کا اسے خوف ہوتا ہے کہ تم کون ہوتے ہو فلاں کو برائی سے روکنے والے، اور کبھی برائی کے مرتکب سے، اسے لالچ ہوتی ہے کہ وہ میری مالی معاونت کرتا ہے، مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں اسے برائی سے منع کروں، اور کبھی یہ شرم محسوس کرتا ہے کہ میں اسے کیسے منع کروں مجھے تو اس سے شرم آتی ہے، یا یہ شخص دین کی کچھ پرواہ ہی نہیں کرتا اس لئے اسے برائی سے منع نہیں کرتا۔

"والمداراة موافقته بترک حظ نفسه وحق يتعلق بماله وعرضه فيسكت عنه دفعا للشر ووقوع الضرر "

مدارات یہ ہے کہ اپنے مال اور اپنی عزت سے تعلق رکھنے والے حقوق کو معاف کر دینا تا کہ شر دور ہو جائے، اور کسی کو نقصان نہ ہو، میرا نقصان ہو جائے تو کوئی حرج نہیں، یہ اچھا فعل ہے اسے شریعت میں پسند کیا گیا ہے، کیونکہ اس میں جائز امداد پائی گئی ہے، کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے" فدارهم مادمت فی دارهم "ان سے مدارات کر جب تک تو ان کے گھر میں موجود ہے، مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی رضاء کی خاطر بندوں سے تکلیف برداشت کرنا پسندیدہ عمل ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں کہا جائے:

"ان المداهنة انما تكون فى الباطل مع الاعداء والمداراة فى امر حق مع الاحباء "

باطل طریقے سے دشمنوں کی امداد کرنا مداہنت ہے، اور جائز طریقے سے احباب سے امداد کرنا مدارات ہے۔

مثال اور ممثل لہ کا بیان:

نبی کریم ﷺ نے "اللہ کی حدود میں کوتاہی کرنے والے کو کشتی سے اوپر حصہ میں بیٹھنے والوں سے تشبیہ دی" "اور حدود میں واقع ہونے والوں کو کشتی کے نیچے حصہ والوں سے تشبیہ دی" گناہوں کے مرتکبین جو گناہوں میں کامل طور پر واقع ہو گئے، اور اس سے نکل نہیں سکے ان کو تشبیہ دی کشتی میں سوراخ کرنے والے سے" اور جو برائی سے روکنے والے ہیں ان کو تشبیہ دی ان لوگوں سے جو کشتی میں سوراخ کرنے والے کو روکیں۔

حاصل کلام : والمعنى انه كذلك ان منع الناس الفاسق عن الفسق نجا، ونجوا من عذاب الله تعالى وان تركوه على فعل المعصية ولم يقيموا عليه الحد حل بهم العذاب وهلكوا بشؤمه "

معنی اس کا یہ ہے کہ اگر لوگ فاسق کو برائی سے منع کریں تو وہ فاسق بھی اور یہ لوگ بھی رب تعالیٰ کے عذاب سے نجات پا جائیں گے، اور اگر اسے برائی سے نہیں منع کرتے اس پر حدود نافذ نہیں کرتے تو تمام پر رب تعالیٰ کا عذاب آجائے گا، اور فاسق کی نحوست کی وجہ سے سب ہلاک ہو جائیں گے۔ (مرقاۃ جلد نمبر۹ صفحہ نمبر ۳۳۰، ۳۳۱)

وعن اسامة بن زيد قال قال رسول الله ﷺ يجاء بالرجل يوم القيامة فيلقى في النار فتندلق اقتابه في النار فيطحن فيها كطحن الحمار برحاه فيجتمع اهل النار عليه فيقولون اى فلان ماشانك اليس كنت تأمرنا بالمعروف وتنهانا عن المنكر قال كنت آمركم بالمعروف ولا آتيه وانهاكم عن المنكر وآتيه"

(رواه البخاری ومسلم، مشکوة باب الامر بالمعروف)

حضرت اسامہ بن زید ﷺ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن ایک شخص کو لایا جائے گا تو اسے آگ میں ڈالا جائے گا، تو جلدی ہی آگ میں اس کی انتڑیاں باہر نکل آئیں گی، تو وہ ان میں گھومے گا جیسا کہ گدھا آٹے والی چکی کے اردگرد گھومتا ہے، آگ والے (جہنمی) لوگ اس کے اردگرد جمع ہو جائیں گے، وہ کہیں گے اے فلاں شخص تیرا کیا حال ہے کیا تو ہمیں اچھے کاموں کا حکم دیتا تھا اور برے کاموں سے روکتا تھا، تو وہ کہے گا، ہاں میں تمہیں اچھے کاموں کا حکم دیتا تھا اور خود ان پر عمل نہیں کرتا تھا، اور تمہیں برے کاموں سے روکتا تھا اور خود برے کام کرتا تھا۔

"قال المظهر اى يدور ويتردد فى اقتابه يعنى يدور حول اقتابه ويضربها برجله"

اپنی انتڑیوں میں پھرنے کا یہ حکم ہے کہ وہ ان کے اردگرد پھرے گا اور ان کو اپنے پاؤں سے مارے گا۔

(مرقاۃ جلد نمبر۹ صفحہ نمبر ۳۳۱)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"فتندلق اى تخرج سريعااقتابه اى امعاؤه فيطحن بصيغة الفاعل على الصحيح اى يدور فيهااى فى اقتابه كطحن الحمار برحاه اى كدورانه حول رحاه"

(مرقاۃ جلد نمبر۹ صفحہ نمبر ۳۳۱)

عن حذيفة ان النبى ﷺ قال والذى نفسى بيده لتأمرن بالمعروف ولتنهون عن المنكر او ليوشكن الله ان يبعث عليكم عذابا من عنده ثم لتدعنه ولايستجاب لكم

(رواہ الترمذی، مشکوۃ باب الامر بالمعروف)

حضرت حذیفہ ﷺ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے "تم ضرور بر ضرور اچھے کاموں کا حکم دو گے یا برے کاموں سے روکو گے" یا قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی طرف

سے عذاب بھیج دے، پھر تم اس سے دعاء کرو تو تمہاری دعاء کو قبول نہ کیا جائے۔

"والمعنی واللہ ان احد الامرین واقع اما الامر والنهی منکم واما انزال العذاب من ربکم ثم عدم استجابة الدعاء له فی دفعه عنکم"

مطلب یہ کہے کہ "قسم ہے اللہ تعالیٰ کی دو چیزوں سے ایک کا وقوع ضروری ہے یا اچھے کاموں کا حکم دینا اور برے کاموں سے روکنا پایا جائے گا، اگر یہ چیز نہ پائی گئی تو تم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آئے گا، اس عذاب کے دور ہونے کی تمہاری دعائیں قبول نہیں کی جائیں گے۔ (مرقاۃ جلد نمبر ۹ صفحہ نمبر ۳۳۲)

✿ عن ابی هریرة لتأمرن بالمعروف ولتنهون عن المنکر اولیسلطن اللہ علیکم شرارکم فیدعو خیارکم فلا یستجاب لهم"

(رواه الطبرانی فی الاوسط، وهکذا رواه البزار، مرقاۃ جلد نمبر ۹ صفحه نمبر ۳۳۲)

حضرت ابوھریرہ ﷺ سے روایت آتی ہے کہ "ضرور بضرور تم اچھے کاموں کا حکم دو اور برے کاموں سے روکو" یا تم پر اللہ تعالیٰ شریر لوگوں کو مسلط کردے گا، تو (ان سے نجات کیلئے) نیک لوگ دعائیں کریں گے، ان کی دعائیں قبول نہیں کی جائیں گی۔

اس حدیث پاک کو دیکھئے اور آجکل کے حالات کو دیکھئے تو اس کا وقوع سو فیصد ہو چکا ہے، کیونکہ علماء امر بالمعروف، نہی عن المنکر سے پیچھے ہٹ گئے تو رب تعالیٰ نے ان پر اشرار کو مسلط کردیا ہے اب ہر ہاتھ میں تسبیح دیکھتا ہوں، دعائیں کی جارہی ہیں، اشرار سے جان چھوٹنا ممکن نظر نہیں آتا۔

✿ وعن العرس بن عمیرة عن النبی ﷺ قال اذا عملت الخطیئة فی الارض من شهدها فکرهها کان کمن غاب عنها فرضیها کان کمن شهدها"

(رواه ابو داؤد، مشکوۃ باب الامر بالمعروف)

عرس بن عمیرہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب گناہوں کا ارتکاب زمین میں کیا جائے گا جس نے ان برائیوں کو دیکھ کر انہیں ناپسند سمجھا (خواہ دل سے ہی) تو وہ شخص ایسا ہوگا جیسا کہ برائیوں کے ارتکاب کے وقت کوئی موجود ہی نہیں تھا، (یعنی اس کی کوئی گرفت نہیں ہوگی) اگر ایک شخص برائیوں کے ارتکاب پر تو موجود نہیں تھا لیکن وہ ان برائیوں پر راضی رہا، انہیں پسند کیا تو وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ وہ برائیوں کے وقت موجود تھا، حدیث پاک سے واضح ہے کہ برائی کو برا سمجھنا باعث نجات ہے، برائی کو اچھا سمجھنا باعث عذاب ہے۔

✿ وعن ابی بکر الصدیق قال یاایها الناس انتم تقرؤن هذه الآیة (یاایها الذین امنوا علیکم انفسکم لایضرکم من ضل اذا اهتدیتم) فانی سمعت رسول اللہ ﷺ یقول ان الناس اذا

رؤا منکرا فلم یغیروہ یوشک ان یعمھم اللہ بعقابہ "رواہ ابن ماجہ "وفی روایۃ ابی داود اذا راوا الظالم فلم یاخذوا علی یدیہ اوشک ان یعمھم اللہ بعقاب، وفی اخری لہ مامن قوم یعمل فیھم بالمعاصی لم یقدرون علی ان یغیروا الا یوشک ان یعمھم اللہ بعقاب وفی اخری لہ ما من قوم یعمل فیھم بالمعاصی ھم اکثر ممن یعملہ "

حضرت ابو بکر صدیق ﷛ نے فرمایا، اے لوگو تم یہ آیۃ کریمہ پڑھتے ہو۔

"یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَایَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ"

(اے ایمان والو تم اپنی فکر رکھو، تمہارا کچھ نہ بگاڑے گا جو گمراہ ہوا جبکہ تم راہ پر ہو) میں نے تو نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا "بیشک لوگ جب برائی کو دیکھیں تو اسے نہ بدلیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالی ان پر عام عذاب مسلط کر دے (یہ روایت ہے ابن ماجہ کی) اور ایک روایت ابو داؤد کی یوں ہے "لوگ جب ظالم کو دیکھیں تو اس کے ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالی ان پر عام عذاب مسلط کر دے، اور ابو داؤد کی ایک روایت میں ہے "کوئی قوم ایسی نہیں کہ ان میں برائیوں کا ارتکاب کیا جا رہا ہو وہ اس برائی کو تبدیل کرنے پر قادر بھی ہوں، پھر نہ تبدیل کریں مگر یہ کہ قریب ہے کہ اللہ تعالی ان پر عام عذاب بھیج دے "ابو داؤد کی ایک اور روایت میں ہے کہ کوئی ایسی قوم نہیں جن میں برائیوں کا ارتکاب کیا جا رہا ہو، وہ لوگ زیادہ ہوں، برائی کے مرتکب کم ہوں (جب وہ ان کو نہ روکیں، حالانکہ روکنے پر قادر ہوں مگر یہ کہ اللہ تعالی ان کو عام عذاب دے گا) یعنی برائیوں کے مرتکبین، اور ان کو نہ روکنے والے سب ہی عذاب میں مبتلاء ہو جائیں گے۔

وضاحت حدیث:

حضرت ابو بکر صدیق ﷛ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ تم آیۃ کریمہ کے ظاہر معنی کو دیکھ کر غلطی کا شکار ہو رہے ہو، جس کا تم مطلب یہ لے رہے ہو کہ انسان خود اچھے عمل کرے، برائیوں سے رکے، دوسروں کو اچھے کام کا حکم دے یا نہ دے، اور دوسروں کو برائی سے روکے یا نہ روکے، اس کیلئے کوئی حرج نہیں، بلکہ وہ خود تو ہدایت پر ہے، آیۃ کریمہ کا جو تم مطلب سمجھ رہے ہو، وہ نہیں، اگر یہی مطلب ہوتا تو رسول اللہ ﷺ یہ ارشاد کیوں فرماتے "بیشک لوگ جب برائی کو دیکھیں اسے نہ تبدیل کریں تو قریب ہے کہ اللہ تعالی ان کو عام عذاب دے دے"

آیۃ کریمہ کا مطلب:

اس سے پہلی آیۃ کریمہ کے آخری الفاظ پر ایک نظر ڈالئے وہ الفاظ مبارکہ یہ ہیں ﴿اَوَلَوْ کَانَ اٰبَآءُھُمْ

لَا یَعْلَمُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَهْتَدُوْنَ﴾ (کیا اگر چہ ان کے باپ دادا نہ کچھ جانیں اور نہ راہ پر ہوں) ان دونوں آیتوں کا آپس میں باہمی ربط ابن ابی حاتم کی روایت سے واضح ہے، وہ یہ ہے۔

"انما انزلت هذه الآية لان الرجل كان يسلم ويكفر ابوه ويسلم الرجل ويكفر اخوه فلما دخل قلوبهم حلاوة الايمان دعوا آباء هم واخوانهم فقالوا حسبنا ما وجدنا عليه آباؤنا فانزل الله "يا ايها الذين آمنوا عليكم انفسكم "الاية"

بیشک کبھی کوئی انسان اسلام قبول کر لیتا اور اس کا باپ کافر ہوتا، اور کبھی کوئی شخص اسلام قبول کر لیتا اس کا بھائی کافر ہوتا، اسلام لانے والوں میں جب ایمان کی حلاوت داخل ہو جاتی، وہ اپنے آباء اور اپنے بھائیوں کو اسلام کی دعوت دیتے، تو ان کے کافر باپ اور بھائی یہ جواب دیتے "ہمیں وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے آباء کو پایا" (تو وہ پریشان ہوتے) تو اللہ تعالی نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا۔

"یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا یَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ"

(اے ایمان والو تم اپنی فکر رکھو، تمہارا کچھ نہ بگاڑے گا جو گمراہ ہوا جبکہ تم راہ پر ہو)

تفسیر بیضاوی میں ہے "والآية نزلت لما كان المؤمنون يتحسرون على الكفرة ويتمنون ايمانهم" کہ جب مؤمن کافروں پر حسرت رکھتے اور تمنا کرتے کہ کاش کہ یہ ایمان لے آئیں، تو اس وقت آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔ (بیضاوی)

عذر کی وجہ سے امر بالمعروف، نہی عن المنکر کے ترک کی اجازت:

وفى هذه الآية رخصة فى ترك الحسبة اذا علم عدم قبولها او فيها مفسدة او اضرار له منها اتفقت عليه كلمة السلف على ذلك والاحاديث تدل عليه"

اس آیۃ کریمہ میں عذر کی وجہ سے امر بالمعروف نہی عن المنکر کے چھوڑنے کی اجازت ہے، جب اسے یہ معلوم ہو کہ میری بات یہ لوگ نہیں سنتے، یا اسے یہ خیال ہو کہ اگر میں نے ان کو اچھے کاموں کا حکم دیا، یا برائیوں سے منع کیا تو یہ فساد برپا کریں گے، یا اسے خطرہ ہو کہ یہ لوگ مجھے نقصان پہنچائیں گے تو اسے اجازت ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دے، اس مسئلہ پر سلف وصالحین کا اتفاق ہے، اور اس پر احادیث بھی دلالت کر رہی ہیں۔ (تفسیر المعین الضعوی) (ماخوذ از مرقاۃ جلد نمبر ۹ صفحہ نمبر ۳۳۳)

✿ وعن ابى ثعلبة فى قوله تعالى عليكم انفسكم لايضركم من ضل اذا اهتديتم فقال اما والله لقد سالت عنها رسول الله ﷺ فقال بل ائتمروا بالمعروف وتناهوا عن المنكر

حتی اذا رأیت شحا مطاعا وهوی متبعا ودنیا مؤثرة واعجاب کل ذی رأی برأیه
ورأیت امر الابد لک منه نعلیک نفسک ودع امر العوام فان ورائکم ایام الصبر
فمن صبر فیهن قبض علی الجمر للعامل فیهن اجر خمسین منکم

(رواه الترمذی وابن ماجة ، مشکوة باب الامر بالمعروف)

حضرت ابوثعلبہ ﷺ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾ کے متعلق قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا ہے، تو آپ نے فرمایا بلکہ تم اچھے کاموں کا حکم دو اور برے کاموں سے روکو، یہاں تک کہ جب تم دیکھو بخل مطاع کو (یعنی تم دیکھو ایسے شخص کو جو بظاہر تمہارا مطیع ہو اور حقیقت میں غیر کے تابع ہو) اور خواہشات کا تابع ہو، اور دنیا کو وہ (امور دین اور درجات آخرت پر) ترجیح دیتا ہو، اور ہر رائے دینے والے کی رائے کو پسند کرتا ہو (یعنی قرآن پاک وحدیث، اجماع اور قیاس کی طرف اس کی نظر نہیں ہوتی) اور تم اس سے کوئی امر ضروری طور پر دیکھو (یعنی تم اس سے کوئی برائی دیکھو، لیکن تمہارا عذر، اور تمہاری مجبوری ہو کہ تم اس سے چھٹکارا بھی نہیں پاسکتے، لیکن تمہیں یہ بھی خطرہ ہو کہ اگر میں یہاں لوگوں کے ساتھ کھڑا رہا اور اسے برائی سے بھی نہ روک سکا تو میں خود بھی اس برائی کا مرتکب ہوسکتا ہوں) تو ایسی صورت میں تمہا ... [illegible]
اگر تم اس برائی کو دیکھتے ہو اور تمہیں طاقت حاصل نہیں کہ تم اس کا دفاع کرسکو (فیجب علیک حفظها عن المعاصی) تم پر واجب ہے کہ اپنے نفس کو [illegible] بچا سکو۔ "ودع امر العوام" اور عوام کا معاملہ چھوڑ دو" (یعنی عام لوگ جو خواص کے طریقہ سے دور ہیں [illegible] طریقہ کو چھوڑ دو)

"وحاصله انه اذا رأیت بعض الناس یعملون المعاصی ولا بدلک من السکوت لعجزک فاحفظ نفسک عن المعاصی واترک الامر بالمعروف والنهی عن المنکر واشتغل بنفسک ودع امر الناس الی الله فانه تعالی لایکلف نفسا الاوسعها"

حاصل کلام یہ ہے کہ جب تم دیکھو کہ بعض لوگ برائیوں کے مرتکب ہو رہے ہیں، لیکن تم اپنی مجبوری اور معذوری کی وجہ سے خاموش ہو، تو تم پر ضروری ہے کہ اپنے نفس کو برائیوں سے بچالو، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دو، اور خود اچھے کاموں میں مشغول رہو، اور برے کاموں سے اجتناب کرتے رہو، اور لوگوں کا معاملہ اللہ کی طرف چھوڑ دو، اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی طاقت سے زائد تکلیف نہیں دیتا۔)

"فان وراء کم ایام الصبر" بیشک تمہارے لئے اس کے سواء صبر ہے" (یہاں دو مطلب ہیں" فان ورائکم ای قدامکم من الازمان الآتیة اوخلفکم من الامور الهادیة 'وراء" کا معنی ہے "سواء" جو آگے اور

پیچھے دونوں کو شامل ہے، یعنی تم آنے والے زمانہ میں صبر کرو، یا معنی یہ ہے کہ تم اپنے پیچھے ایسے امور سے صبر کرو جو تمہیں جہنم میں گرانے والے ہوں اور عذاب میں واقع کرنے والے ہوں، ''صبر کرنے سے مراد کیا ہے؟

''وھو الحبس علی خلاف النفس من اختیار العزلة وترک الخلطة والجلوة ''

یعنی اپنے نفس کو اپنی خواہشات کے خلاف روک لے، برائیوں کے مرتکب لوگوں سے اپنے آپ کو جدا کرلے، ان سے میل ملاپ نہ رکھے، اور ان کی محفلوں میں نہ جائے)''فمن صبر فیھن ''ای فی تلک الایام ''قبض علی الجمر '' جس شخص نے ان دونوں میں صبر کیا تو وہ ایسے ہی ہوگا جیسا کہ اسے آگ کی چنگاری پر روک لیا گیا ہو، (کیونکہ سب لوگوں سے علیحدگی اگرچہ اس کیلئے ذہنی طور پر بہت بڑی مشقت ہوگی، لیکن رب تعالیٰ کی رضاء کی خاطر کی ہوئی مشقت پر عظیم اجر وثواب ہوگا، اسی وجہ سے حضور ﷺ نے فرمایا'' للعامل فیھن اجر خمسین رجلا یعملون مثل عمله '' ان مشکل ایام میں صبر سے کام لینے والے کو اتنا اجر وثواب حاصل ہوگا، جتنا پچاس آدمیوں کو یہی عمل کرنے کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔ یعنی مشقت کے دنوں کے بغیر پچاس لوگ اگر صبر سے کام لیں تو جتنا ثواب ان کو ملے گا، اتنا ثواب اس اکیلے کو حاصل ہوگا''قالوا یا رسول اللہ اجر خمسین منھم قال اجر خمسین منکم '' صحابہ کرام نے تعجب کے طور پر پوچھا، یارسول اللہ کیا واقعی اسے پچاس آدمیوں کا ثواب حاصل ہوگا، آپ نے فرمایا ہاں تمہارے پچاس آدمیوں کا اسے ثواب حاصل ہوگا۔ ''اجر خمسین منکم ''آپ نے ارشاد فرما کر، مشقت کے دنوں میں صبر کرنے والے کا عظیم درجہ بیان کیا کہ اسے عام پچاس آدمیوں کا ثواب نہیں ملے گا بلکہ تمہارے جیسے جلیل القدر پچاس آدمی مشقت کے دنوں کے بغیر جو ثواب حاصل کریں، وہ اکیلا اتنا ثواب حاصل کرلے گا۔ (وضاحت ماخوذ از مرقاۃ جلد ۹ صفحہ نمبر ۳۳۶)

❁ وعن ابی سعید قال قال رسول اللہ ﷺ ان اللہ یسأل العبد یوم القیامة فیقول مالک اذا رأیت المنکر فلم تنکرہ قال رسول اللہ ﷺ فیلقی حجته فیقول یا رب خفت الناس ورجوتک'' (رواہ البیھقی ، مشکوۃ باب الامر بالمعروف)

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بندے سے پوچھے گا، اور کہے گا تجھے کیا ہوا کہ تو نے برائی کو دیکھ کر اس کا انکار (زبان سے یا ہاتھ سے) نہیں کیا، نبی کریم ﷺ نے فرمایا (فیلقی) بتشدید القاف المفتوحة (حجته) بالنصب '' اس کے دل میں یہ حجت ڈال دی جائے گی (کہ وہ یہ کہے) وہ عرض کرے گا اے میرے رب میں لوگوں سے ڈرتا تھا، اور تیری (رحمت کی) امید کرتا تھا، سبحان اللہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر کتنا کریم ہے کہ خود ہی دل میں یہ بات ڈالے گا کہ یوں کہتا کہ میں تیری بخشش کردوں''

❁ عن عبد الله بن مسعود قال قال رسول الله ﷺ لما وقعت بنواسرائیل فی المعاصی نهتهم علماؤهم فلم ینتهوا فجالسوهم فی مجالسهم وآکلوهم وشاربوهم فضرب الله قلوب بعضهم ببعض فلعنهم علی لسان داود وعیسی ابن مریم ذلک بما عصوا وکانوا یعتدون قال فجلس رسول الله ﷺ وکان متکئا فقال لا والذی نفسی بیده حتی تاطروهم اطرا" (رواه الترمذی وابو داود)مشکوۃ باب الامر بالمعروف)

حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب بنی اسرائیل گناہوں میں واقع ہو گئے تو انہیں ان کے علماء نے منع کیا، انہوں نے ان کو اپنی مجالس میں بٹھایا اور ان کو کھلایا اور ان کو پلایا، تو اللہ تعالی نے ان میں سے بعض کے دلوں کو بعض سے ملا دیا، تو ان پر اللہ تعالی نے حضرت داود علیہ السلام اور حضرت عیسی ابن مریم کے ذریعے لعنت فرمائی، یہ (لعنت ان پر کی گئی) بوجہ اس کے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے تجاوز کیا، راوی کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ سہارا لگا کر بیٹھے، تو آپ نے فرمایا نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے یہاں تک کہ تم بھی ان کی طرح (حق کی جانب سے) پھر جاؤ گے۔

وضاحت حدیث:

معاصی میں مبتلاء ہونے سے مراد، ان کا زنا اور ہفتے کے شکار، اور بڑے بڑے گناہوں میں مبتلاء ہونا ہے، ابتدائی طور پر ان کے علماء نے ان کو گناہوں سے منع کیا، لیکن وہ گناہوں سے نہ رکے، تو ان برائیوں کے مرتکب لوگوں نے علماء کو بھی اپنی مجالس میں بٹھا لیا، اور ان کو کھانے اور پینے میں شریک کر لیا (ان کی خوب دعوت کی) تو اللہ تعالی نے ان برے افعال والوں اور علماء کے دلوں کو آپس میں ملا جلا دیا۔ "فضرب الله قلوب بعضهم ببعض" تو اللہ تعالی نے ان کے بعض کے دلوں کو بعض کی وجہ سے ملا دیا، عرب حضرات کہتے ہیں" ضرب اللبن بعضه ببعض ای خلطه ذکره الراغب "علامہ راغب اصفہانی نے بیان کیا اس کا مطلب یہ ہوتا ہے"بعض دودھ بعض سے ملا لیا"

"وقال ابن الملک رحمه الله الباء للسببیة ای سود الله قلب من لم یعص بشؤم من عصی فصارت قلوب جمیعهم قاسیة بعیدة عن قبول الحق والخیر او الرحمة بسبب المعاصی ومخالطة بعضهم بعضا"

ابن الملک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ " ببعض " میں باء سببیت کیلئے ہے، مطلب یہ ہے کہ جب گناہوں کے مرتکب لوگوں کی مجلس میں دوسرے بیٹھیں گے تو ان بروں کی نحوست کی وجہ سے ان کے ساتھ بیٹھنے والوں کے دل ان بروں کے دلوں سے مل جائیں گے، یعنی ان کے دل سیاہ اور بہت زیادہ سخت

ہو جائیں گے یہاں تک کہ وہ حق اور خیر اور رحمت کو قبول نہیں کریں گے، کیونکہ گناہ گاروں کے ساتھ ملنے والوں کے دل بھی سخت ہو جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ ان پر حضرت داود علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ ابن مریم کے ذریعے ان پر لعنت بھیجے گا، اسی کا ذکر قرآن پاک میں ان الفاظ سے کیا گیا ﴿لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا وَّکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ﴾ "قال" یعنی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا، نبی کریم ﷺ سہارا لگا کر بیٹھ گئے، یعنی آپ نے یہ کلام بڑے اطمینان سے فرمایا" لا" نہیں، اس کا مطلب یہ ہے "لاتعذرون او لاتنجون من العذاب انتم ایھا الملة خلف اھل تلک الامة" یعنی "لا" قسم پر داخل ہو کر زائد نہیں، بلکہ نفی کا معنی دے رہا ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ اگر تم نے بھی بنی اسرائیل کا طریقہ اختیار کیا کہ برے لوگوں کی محفل میں بیٹھ کر دعوت کھالی تو قیامت کے دن تمہارا کوئی عذر قبول نہیں کیا جائے گا، یہاں تک کہ تمہیں عذاب سے نجات نہیں دی جائے گی، تم اے امت اسی امت کے پیچھے آنے والے ہو۔ "والذی نفسی بیده حتی تأطروھم اطرا" قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے یہاں تک کہ تم بھی ان کی طرح حق سے پھر جاؤ گے، یعنی اگر تم حق سے پھر کر باطل سے مل گئے تو تم عذاب سے بچ نہیں سکو گے، ہاں اگر تم باطل سے پھر کر حق کی طرف مائل ہو گئے تو اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب سے بچالے گا۔ (ماخوذ از مرقاۃ جلد نمبر ۹ صفحہ نمبر ۳۴۱)

وَلَاتَكُونُوا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِمَا جَاءَ هُمُ الْبَيِّنَاتِ وَاُولٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌO (آیۃ نمبر ۱۰۵)

(1) اور ان جیسے نہ ہونا جو آپس میں پھٹ گئے اور ان میں پھوٹ پڑ گئی بعد اس کے کہ روشن نشانیاں انہیں آچکی تھیں اور ان کیلئے بڑا عذاب ہے۔ (کنزالایمان)

(2) اور نہ ہو تم ان کی طرح جو آپس میں بٹ گئے، اور انہوں نے اختلاف کیا اس کے بعد کہ آگئیں ان کے پاس واضح نشانیاں، اور ان کیلئے بڑا عذاب ہے۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

رب تعالیٰ نے اس سے پہلے ذکر فرمایا کہ توراۃ وانجیل وہ آسمانی کتابیں جو دین اسلام کے سچے ہونے اور صحیح ہونے پر دلالت کرتی ہیں، اور ان میں نبی کریم ﷺ کی صداقت وحقانیت کا تذکرہ موجود ہے۔ اس کے بعد ذکر فرمایا کہ اہل کتاب (یہود نصاری) نے نبی کریم ﷺ سے حسد کیا، اور مسلمانوں کو دین سے پھیرنے کیلئے شکوک وشبہات ڈالنے شروع کئے کہ یہ مسلمان دین سے برگشتہ ہوجائیں (پھر جائیں) اس کے بعد مؤمنوں کو حکم دیا کہ ایمان پر قائم رہو، اور اللہ تعالیٰ کی راہ کی طرف لوگوں کو دعوت دو۔

اب اس آیۃ کریمہ کے ذریعے اس مضمون کو ختم کیا جارہا ہے کہ اے مومنو تم اہل کتاب (یہود ونصاری) کی طرح نہ بن جانا کہ آیات کریمہ میں شبہات ڈالتے رہو، اور ان کی فاسد تاویلات کرتے رہو، جس سے ان آیات کے حقیقی مطالب ہی اٹھ جائیں، ہاں اگر تم نے ایسا کیا تو تم بھی ان کی طرح بہت بڑے عذاب میں مبتلاء ہو جاؤ گے۔

﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِمَا جَاءَ هُمُ الْبَيِّنَاتِ﴾

''اور نہ ہو تم انکی طرح جو آپس میں بٹ گئے، اور انہوں نے اختلاف کیا اس کے بعد کہ آگئیں ان کے پاس واضح نشانیاں۔''

یہاں معنی میں دو احتمال ہیں، **ایک** ان میں سے یہ ہے کہ یہ کہا گیا ہے، اے مؤمنو ان آیات کو سننے کے بعد ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو بٹ گئے، اور انہوں نے واضح نشانیوں کے بعد دین میں اختلاف کیا اس لحاظ پر یہ آیۃ

کریمہ تمام پہلی آیات کا تتمہ ہے یعنی پہلی آیات کو معنوی طور پر تکمیل کرنے والی ہے۔ اور **دوسرا** احتمال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ارشاد فرمایا، تو اس کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک اچھے کاموں کا حکم دینے والا ظالموں اور غلبہ رکھنے والوں پر حکم دینے کی طاقت نہ رکھے، اور یہ طاقت اس وقت تک نہیں حاصل ہو سکتی جب تک اہل حق و دین کی آپس میں الفت و محبت نہیں ہوگی، اس آیۃ کریمہ میں مومنو کو تفرقہ اور اختلاف سے ڈرایا گیا ہے کہ اگر تم نے ایک دوسرے سے اختلاف کیا تو تمہیں امر بالمعروف نہی عن المنکر کی طاقت حاصل نہیں ہوگی، اس معنی کے لحاظ پر یہ آیۃ کریمہ صرف سابقہ آیۃ کریمہ کا تتمہ ہے۔ (کبیر)

یہود و نصاری کے تفرقہ و اختلاف کی چند وجوہ:

(۱) **تفرقوا واختلفوا بسبب اتباع الهوى وطاعة النفس والحسد** "ان لوگوں نے ایک دوسرے سے اختلاف کیا خواہشات کی تابعداری کی وجہ سے، اور نفس کی طاعت کی وجہ سے اور حسد کی وجہ سے۔

(۲) **تفرقوا حتى صار كل فريق منهم يصدق من الانبياء بعضادون بعض فصاروا بذلك الى العداوة والفرقة**"

دوسری وجہ ان کے اختلاف کی یہ تھی کہ ان میں سے کسی فریق نے کسی ایک نبی کی تصدیق کی، اور دوسرے کا انکار کیا، دوسرے فریق نے اس نبی کی تصدیق کی جس کی ایک فریق تکذیب کر چکا اور دوسرے نبی کی ان لوگوں نے تصدیق کی، جس کی وجہ سے ان لوگوں کی ایک دوسرے سے عداوت ہوگئی، اور ان کے آپس میں اختلاف ہو گئے، آپس میں بٹ اور پھٹ گئے۔

(۳) **صاروا مثل مبتدعة هذه الامة مثل المشبهة والقدرية والحشوية**"
تیسری وجہ ان کے اختلاف کی یہ تھی کہ ان میں بھی کئی نئے نئے فرقوں نے جنم لیا تھا، جیسے اس امت میں مشبہہ، قدریہ، حشویہ فرقے پیدا ہوئے، ایسے ہی ان میں بھی کئی اس قسم کے نئے نئے فرقے ایجاد ہو گئے تھے۔

تفرقہ و اختلاف میں فرق:

بعض حضرات نے تو یہ بیان کیا کہ دونوں کا معنی ایک ہے، اسلئے "**تفرقوا**" کے بعد "**واختلفوا**" بطور تاکید ذکر کیا گیا ہے، اور بعض حضرات نے ان دونوں لفظوں کے معانی میں چند فرق بیان کئے ہیں۔

(۱) **قيل تفرقوا بالعداوة واختلفوا في الدين**"

ایک وجہ فرق یہ ہے کہ تفرقہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے عداوت کی وجہ سے علیحدہ ہو گئے، آپس میں بٹ گئے، ایک دوسرے سے پھٹ گئے۔

(۲) **وقیل تفرقوا بسبب استخراج التاویلات الفاسدة من تلک النصوص ثم اختلفوا بان حاول کل واحد نصرة قوله ومذهبه "**

اور بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے تفرقہ پیدا کیا یعنی ظاہری آیات کے مطالب چھوڑ کر غلط اور باطل تاویلیں نکال لیں، پھر ایک دوسرے سے اختلاف کیا کہ ہر فریق نے اپنے اپنے اقوال اور اپنے مذہب کو صحیح کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا، حالانکہ ہر ایک باطل راہ پر تھا۔

(۳) **والثالث تفرقوا بابدانهم بان صار کل واحد من اولئک الاحبار رئیسا فی بلد، ثم اختلفوا بان حاول کل واحد منهم نصرة قوله ومذهبه "**

اور تیسری وجہ فرق یہ ہے، وہ متفرق ہو گئے یعنی ان کے اصحاب علم میں سے کوئی کسی شہر کا رئیس بن گیا اور کوئی کسی شہر کا رئیس بن گیا، پھر انہوں نے آپس میں ایک دوسرے سے اختلاف کیا، ہر ایک دعویٰ کرنے لگا کہ میں حق پر ہوں، دوسرا باطل پر ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے تفرقہ اور اختلاف کی یہ تیسری وجہ بیان کرنے کے بعد ذکر فرمایا۔

"واقول انک اذا انصفت علمت ان اکثر علماء هذاالزمان صاروا موصوفین بهذه الصفة فنسأل الله العفو والرحمة "

میں کہتا ہوں کہ بیشک جب تو انصاف کرے تو تجھے خود پتہ چل جائے گا کہ اس زمانے کے اکثر علماء میں یہ وصف پایا جاتا ہے، ہم اللہ تعالیٰ سے عفو اور رحمت کا سوال کرتے ہیں۔ (کبیر)

راقم کہتا ہے ہر زمانہ میں علماء کے لباس میں جہلاء نے علماء کو بدنام کیا، اس قسم کے علماء حقیقت میں علماء نہیں ہوتے، بلکہ دین فروش ہوتے ہیں۔

ان کا اختلاف کیسا تھا؟

یہود و نصاریٰ کا اختلاف اصول دین میں تھا، صرف فروعی اختلاف کی مذمت نہیں بیان کی گئی، اور نبی کریم ﷺ کی امت کو بھی یہی حکم دیا گیا۔

"والاظهر ان النهی فیه مخصوص بالتفرق فی الاصول دون الفروع لقوله ﷺ "اختلاف امتی رحمة "ولقوله ﷺ من اجتهد فاصاب فله اجران ومن اخطأ فله اجر واحد "

زیادہ ظاہر بات یہی ہے کہ اصول دین میں اختلاف سے منع کیا گیا ہے، فروع دین میں اختلاف سے منع نہیں کیا گیا، اسلئے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا میری امت کا اختلاف رحمت ہے، اور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جس نے اجتہاد کیا اگر اس نے درست راہ پالی تو اسے دو اجر حاصل ہوں گے، اور اگر اس سے خطاء ہوگئی تو اسے ایک اجر حاصل ہوگا، یعنی اجتہاد کا ثواب خطاء پر بھی حاصل ہوگا، ان دونوں احادیث سے واضح ہوا کہ فروع میں اختلاف جائز ہے، اس سے منع نہیں کیا گیا۔ (ماخوذ از بیضاوی)

﴿مِنْ بَعْدِمَا جَاءَ هُمُ الْبَيِّنَاتِ﴾ "اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح نشانیاں آگئیں۔"

یعنی وہ واضح نشانیاں آگئیں جو حق راہ کی دعوت دیتی تھیں، اتفاق کرنے کی راہ بتاتی تھیں اور ایک کلمہ پر متحد ہونے کا سبق دیتیں، لیکن انہوں نے اس کے بعد ان میں اختلاف کیا۔ (روح البیان)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"جَاءَ هُمُ الْبَيِّنَات" میں فعل مذکر رکھا گیا، کیونکہ فاعل مؤنث غیر حقیقی ہے، اور فعل و فاعل میں "هم" ضمیر کا فاصلہ بھی موجود ہے، اسلئے فعل کا مذکر ذکر کرنا صحیح ہے، علامہ رازی رحمہ اللہ نے اس مسئلہ کو مختصر طور پر بیان فرمایا (جو اعتراض سے خالی نہیں)

"انما قال (مِنْ بَعْدِمَا جَاءَ هُمُ الْبَيِّنَات) ولم يقل جاء تهم لجواز حذف علامة التانيث من الفعل اذ كان فعل المؤنث متقدما"۔

جن فروع پر اجماع امت ہو ان میں اختلاف حرام ہے:

یہود و نصاری یا اس امت کے وہ لوگ جنہوں نے واضح قطع دلائل کے بعد اختلاف کیا اور فرقوں میں بٹ گئے، ان کیلئے بڑا عذاب ہے، وہ واضح نشانیاں کیا ہیں؟

"الدلائل الواضحة القاطعة من الآيات المحكمة والاخبار المتواترة المحكمة من الانبياء ونحو ذلك كاجماع هذه الامة سواء كان ذلك الاختلاف في اصول الدين كاختلاف اهل الاهواء مع اهل السنة او في الفروع المجمع عليها كمسئلة غسل الرجلين ومسح الخفين في الوضوء وخلافة الخلفاء الاربعة"

واضح نشانیاں یہ ہیں "قرآن پاک کی آیات قطعیہ، احادیث متواترہ، تمام انبیاء کرام کی اخبار متواترہ محکمہ، اور نبی کریم ﷺ کی امت کے علماء صالحین ومجتہدین کا اجماع، لھذا اصول دین میں اختلاف سے بھی منع کیا گیا ہے جیسا کہ اپنی خواہشات کے مطابق چلنے والوں نے اہل سنت کے خلاف عقائد باطلہ پر قائم ہو کر ان سے اختلاف کیا اور راہ حق سے بھٹک گئے، اسی طرح وہ فروع جن پر اجماع امت ہے ان سے اختلاف کرنے والے بھی صراط مستقیم سے ہٹ گئے وہ علیحدہ فریق بن کر اہل سنت سے دور ہو گئے۔

وہ فروع جن پر اجماع علماء صالحین ومجتہدین ہیں، وہ یہ ہیں "وضوء میں پاؤں کے دھونے میں اجماع ہے، پاؤں نہ دھونا اختلاف اور تفرقہ بازی ہے، جس سے شریعت نے منع کیا ہے، اور وضوء میں موزوں پر مسح کرنے کا جواز اجماع سے ثابت ہے، موزوں پر مسح کرنے کو جائز نہ سمجھنا اختلاف اور تفرقہ بازی ہے جس سے شریعت نے منع کیا (خیال رہے موزوں پر مسح کرنا ضروری نہیں بلکہ مسح کو جائز سمجھنا ضروری ہے۔) اور چار خلفاء راشدین کی خلافت جس ترتیب سے واقع ہوئی اس کو حق سمجھنے پر اجماع ہے، خلفاء راشدین کی خلافت راشدہ کو حق نہ سمجھنا اختلاف اور تفرقہ بازی ہے، جس سے منع کیا گیا، اسی سے یہ واضح ہو گیا کہ ظنی دلائل سے اجتہاد کے ذریعے جو مسائل حاصل کئے جاتے ہیں، ان میں اختلاف کا پایا جانا عین ممکن ہے، بعض مجتہدین کا اجتہاد میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ (مظہری)

"فذلک الاختلاف بعد بذل الجهد بلا مکابرة وتعصب معفو بل هو رحمة وسعة للناس"

یہ اختلاف چونکہ مسائل کے حصول کیلئے اپنی پوری کوشش صرف کرنے کے بعد پایا جاتا ہے، اس میں نہ کوئی ایک دوسرے سے ضد پائی جاتی ہے، اور نہ کوئی تعصب، یہ اختلاف معاف ہے، بلکہ رحمت ہے، اس کی لوگوں کو اجازت ہے۔ (مظہری)

❁ **عن عمر بن الخطاب قال قال رسول الله ﷺ سالت ربی عن اختلاف اصحابی من بعدی فاوحی الله یامحمد ان اصحابک عندی کالنجوم بعضها اقوی من بعض "وفی روایة بعضها اضوء من بعض ولکل نور فمن اخذ بشئی مماهم علیه من اختلافهم فهو عندی علی هدی"**

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، میں نے اپنے رب سے اپنے صحابہ کے اختلاف کے متعلق پوچھا تو رب تعالیٰ نے میری طرف وحی کی، اے محمد بیشک تیرے صحابہ میرے نزدیک ستاروں کی طرح ہیں، جس طرح بعض ستارے بعض سے زیادہ قوی ہیں (اسی طرح بعض صحابہ بعض پر فوقیت رکھتے ہیں) (مظہری)

اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ بعض ستارے بعض سے زیادہ روشن ہیں، (اسی طرح آپ کے صحابہ کو) بعض کو بعض پر نور حاصل ہے، صحابہ کا جس مسئلہ میں اختلاف ہوا اس میں کسی شخص نے جس صحابی سے قول پر عمل کرلیا وہ میرے نزدیک ہدایت پر ہوگا۔

("رواہ عبد بن حمید فی مسندہ والدارمی وابن ماجہ والعبدری فی الجمع بین الصحیحین وابن عساکر والحاکم عن عمر بن الخطاب "ورواہ الدار قطنی فی فضائل الصحابۃ وابن عبد البر عن جابر والبیھقی فی المدخل عن ابن عباس ") (مظهری)

❁ وروی البیھقی ایضافی المدخل بسند ضعیف عن ابن عباس قال قال رسول اللہ ﷺ مھما اوتیتم من کتاب اللہ فالعمل بہ ولا عذر لاحد فی ترکہ فان لم یکن فی کتاب اللہ فسنۃ نبی ماضیۃ فان لم یکن سنۃ نبی فماقال اصحابی ان اصحابی بمنزلۃ النجوم فی السماء فایھا اخذتھم بہ اھتدیتم واختلاف اصحابی لکم رحمۃ "

بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ذکر کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بیان فرمایا جب تمہیں اللہ کی کتاب دی گئی تو اس پر عمل کرو، کتاب اللہ (قرآن پاک) کو چھوڑنے کا کسی کا عذر قبول نہیں کیا جائے گا، اگر کتاب اللہ میں (کوئی مسئلہ بظاہر موجود) نہ ہو تو اللہ کے نبی کی سنت جاری ہے، (یعنی سنت رسول اللہ پر عمل کرو) اگر سنت میں نہ ہو تو صحابی کے قول پر عمل کرو، میرے صحابہ آسمان میں ستاروں کی طرح ہیں جس پر تم عمل کرو گے ہدایت پا جاؤ گے، میرے صحابہ کا اختلاف تمہارے لئے رحمت ہے۔ (مظہری)

❁ واخرج البیھقی فی المدخل وابن سعد فی الطبقات عن القاسم بن محمد قال اختلاف اصحاب محمد رحمۃ لعباد اللہ "

بیہقی اور طبقات سعد نے قاسم بن محمد سے روایت بیان کی کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام کا اختلاف اللہ تعالی کے بندوں کیلئے رحمت ہے، اور بیہقی نے اس قسم کی روایت حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے بھی بیان کی۔ (مظہری)

﴿وَاُولٰئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ﴾ "اور ان کیلئے بڑا عذاب ہے۔"

یعنی قطعی دلائل جن لوگوں کو حاصل ہوگئے، اس کے بعد جب وہ پھر گئے [illegible] بہت بڑے عذاب کے مستحق ہوگئے۔ (مظہری)

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ○ (آیۃ نمبر ۱۰۶)

(1) جس دن کچھ منہ اونجالے ہوں گے اور کچھ منہ کالے، تو وہ جن کے منہ کالے ہوئے کیا تم ایمان لا کر کافر ہوئے تو اب چکھو اپنے کفر کا بدلہ۔ (کنز الایمان)

(2) اس دن سفید ہوں گے کچھ چہرے، اور سیاہ ہوں گے کچھ چہرے، لیکن وہ جو سیاہ ہوئے چہرے ان کے (ان کو کہا جائے گا) کیا تم نے کفر کیا بعد ایمان لانے کے، تو چکھو عذاب بوجہ اسکے جو تم کفر کرتے رہے۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

اللہ تعالیٰ نے یہود کو بعض اشیاء کا حکم دیا اور بعض سے منع کیا، پھر مسلمانوں کو بعض چیزوں کا حکم دیا اور بعض سے منع کیا، اب اس آیۃ کریمہ میں پہلے امور کی تاکید کیلئے احوال آخرت کا تذکرہ کیا۔ (کبیر)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

" یوم " میں نصب کی دو وجہ ہیں، ایک یہ کہ " لھم " ظرف کی وجہ سے نصب ہو جسکا عامل فعل مقدر ہے، معنوی طور پر تقدیر عبارت کی یہ ہوگی "سیکون لھم عذاب عظیم فی ھذا الیوم " ان کو بڑا عذاب ہوگا اس دن میں جس دن کچھ چہرے سفید ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے۔ **دوسری** وجہ نصب کی "اذکر" مقدر ہے، یعنی یاد کرو اس دن کو جس دن کچھ چہرے سفید ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے۔

اس آیۃ کریمہ میں کن لوگوں کا تذکرہ ہے:

(۱) آیۃ کریمہ "اہل اہواء" (خواہشات کے مرتکبین) کے متعلق نازل ہوئی، اس پر حدیث اسماء دلالت کر رہی ہے۔

❁ **عن اسماء بنت ابی بکر قالت قال رسول اللہ ﷺ انی علی الحوض حتی انظر من یرد علیّ منکم وسیؤخذ ناس دونی فاقول یارب منی ومن امتی فیقال ھل شعرت ما عملوا بعدک واللہ مابرحوا یرجعون علی اعقابھم"** (رواہ البخاری)

اسماء بنت ابی بکر (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک میں حوض (کوثر) پر ہوں گا یہاں تک کہ میں دیکھوں گا تم میں سے (میری امت میں سے) جو مجھ پر وارد ہوں گے، کچھ لوگوں کو میرے قریب آنے سے منع کر دیا جائے گا، تو میں کہوں گا اے میرے رب یہ تو میرے ہیں اور میری امت کے لوگ ہیں، تو کہا جائے گا "کیا آپ کو معلوم ہے انہوں نے آپ کے بعد کیا عمل کئے ہیں؟ قسم ہے اللہ تعالی کی وہ ہمیشہ اپنی ایڑیوں کے بل پیچھے لوٹتے چلے جائیں گے۔ (مظہری)

❁ عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ ﷺ قال بادروا بالاعمال فتنا کقطع اللیل المظلم یصبح الرجل مؤمنا ویمسی کافرا اومؤمنا ویصبح کافرا ایبیع دینه بعرض من الدنیا قلیل" (رواہ مسلم واحمد والترمذی)

حضرت ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اعمال کی طرف جلدی کرو فتنوں سے پہلے جس طرح تاریک رات میں ڈاکہ ڈالا جائے، صبح ایک شخص مومن ہوگا شام کو کافر ہو جائے گا اور شام کو کوئی شخص مؤمن ہوگا صبح کافر ہو جائے گا، اپنے دین کو دنیا کے تھوڑے مال کے بدلے بیچ دے گا۔ (مظہری)

خیال رہے کہ دنیا حقیر چیز ہے اس کا سارا مال دین اور آخرت اور اخروی نعمتوں کے مقابلہ میں قلیل ہی ہے۔

(۲) اس میں دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ "خوارج" کے بارے میں نازل ہوئی۔ "عن ابی امامۃ عن النبی ﷺ قال ھم الخوارج" "رواہ احمد وغیرہ" ابوامامہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "وہ خارجی لوگ ہیں"

(۳) اس میں تیسرا قول یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ مرتدین کے بارے میں نازل ہوئی، ظاہری معنی سے یہ قول زیادہ واضح ہے۔

(۴) اس میں چوتھا قول یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ اہل کتاب کے متعلق نازل ہوئی جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور توراۃ پر ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا، اور وہ اہل کتاب بھی اس آیۃ کریمہ میں آتے ہیں جنہوں نے نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے آپ پر ایمان لایا اور آپ کی بعثت کے بعد آپ سے کفر کیا۔

(۵) تمام اقوال کا جامع قول: جس میں سارے اقوال سمٹ کر آجاتے ہیں۔

"وقیل فی جمیع الکفار کفروا بعد ما اشھدھم اللہ علی انفسھم او بعد ما تمکنوا من الایمان بالنظر الی الدلائل"

اس آیۂ کریمہ میں تمام کفار کا ذکر ہے جنہوں نے یوم میثاق کو رب تعالی کے ارشاد گرامی "اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ" (کیا میں تمہارا رب نہیں) کے جواب میں کہا "قَالُوْا بَلٰی" انہوں نے کہا ہاں (تو ہمارا رب ہے) یا تمام کفار کو دلائل کی طرف نظر کرنے سے ایمان لانا چاہئے تھا، اسے ایمان سے تعبیر کردیا، اوران کا ایمان نہ لانا گویا کہ ایمان کے بعد کفر کرنے کے مترادف ہے، اس قول میں اہل اہواء جو درجۂ کفر تک پہنچے ہوں، اور مرتدین اور خوارج سب ہی آجاتے ہیں۔

خوارج کے متعلق ارشاد مصطفوی ﷺ:

❁ **اخرج مسلم عن زید بن وهب انه کان فی الجیش الذین کانوا مع علی (رضی اللہ عنہ) لما ساروا الی الخوارج فقال علی ایها الناس انی سمعت رسول الله ﷺ یقول یخرج قوم من امتی یقرؤن القرآن لیس قراء تکم الی قرأتهم بشئ ولا صلوتکم الی صلوتهم بشئ ولا صیامکم الی صیامهم بشئی یقرؤن القرآن یحسبون انه لهم وهو علیهم لاتجاوز صلوتهم تراقیهم یمرقون من الاسلام کما یمرق السهم من الرمیة"**

زید بن وہب فرماتے ہیں کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے، جب وہ خارجیوں کی طرف چلے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے لوگو بیشک میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرمارہے تھے "میری امت میں سے ایک قوم نکلے گی جو قرآن پڑھتے ہوں گے، تمہارا قرآن پڑھنا ان کے پڑھنے کے مقابل کچھ نہیں ہوگا، تمہاری نمازیں ان کی نمازوں کے مقابل کچھ نہیں ہوں گی، اور تمہارے روزے ان کے روزوں کے مقابل کچھ نہیں ہوں گے، وہ قرآن پڑھیں گے گمان یہ کریں گے کہ قرآن ان کو نفع پہنچا رہا ہے لیکن حقیقت میں قرآن انہیں نقصان پہنچا رہا ہوگا (کیونکہ ان کا ایمان ہی نہیں ہوگا) ان کی نمازیں ان کی سینے کی ہڈیوں سے نیچے نہیں جائیں گی، (یعنی ان کے اعمال کو قبولیت حاصل نہیں ہوگی) وہ اسلام سے ایسے نکل جائیں جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔ (خازن)

چہرے سفید ہونے اور سیاہ ہونے سے کیا مراد ہے؟

اس کے دو معنی لئے گئے ہیں، ایک مجازی اور دوسرا حقیقی۔

مجازی معنی: ان البیاض مجاز عن الفرح والسرور والسواد عن الغم " چہرے کے سفید ہونے کا مجازی معنی یہ لیا گیا کہ ان کو فرحت وسرور (بہت زیادہ خوشی کا مقام) حاصل ہوگا، اور چہرے کے سیاہ ہونے کا مجازی معنی یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ غم میں مبتلاء ہوں گے، یہی معنی دوسری آیات میں بھی پایا گیا ہے۔

﴿وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ﴾ (پارہ نمبر ۲۴ سورۃ الزمر، آیۃ نمبر ۵۹)

''اور قیامت کے دن تم دیکھو گے انہیں جنہوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا کہ ان کے منہ کالے ہیں۔''

﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ (پارہ نمبر ۱۱ سورۃ یونس آیۃ نمبر ۲۶)

''بھلائی والوں کیلئے بھلائی ہے اور اس سے بھی زائد، اور ان کے منہ پر نہ چڑھے گی سیاہی اور نہ خواری وہی جنت والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔'' (اس کے بعد آیہ نمبر ۲۷ میں بیان کیا گیا)

﴿وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ﴾

''اور جنہوں نے برائیاں کمائیں تو برائی کا بدلہ اسی جیسا اور ان پر ذلت چڑھے گی۔''

یہاں بھی یقیناً ''قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ'' مراد ہے، جو پچھلی آیۃ سے سمجھ آ رہا ہے، ''قَتَرٌ'' کا معنی ہے ''سیاہی'' یعنی جنتی لوگ سیاہی سے محفوظ رہیں گے اور جہنمی چہرے سیاہی میں مبتلاء ہوں گے۔

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ۝ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ﴾ (پارہ نمبر ۲۹ سورۃ القیامۃ، آیۃ نمبر ۲۲ تا ۲۵)

کچھ منہ اس دن تروتازہ ہوں گے اپنے رب کو دیکھتے اور کچھ منہ اس دن بگڑے ہوئے ہوں گے سمجھتے ہوں گے کہ ان کے ساتھ وہ کی جائے گی جو کمر کو توڑ دے۔

﴿يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ﴾ (سورۃ الرحمن، آیۃ نمبر ۴۱)

(مجرم اپنے چہرے سے پہچانے جائیں گے)

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۝ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ﴾ (پارہ نمبر ۳۰ سورۃ عبس آیۃ نمبر ۳۸ تا ۴۲)

کتنے منہ اس دن روشن ہوں گے، ہنستے خوشیاں مناتے، اور کتنے مونہوں پر اس دن گرد پڑی ہوگی ان پر سیاہی چڑھ رہی ہے، یہ وہی کافر بدکار'' ان تمام مذکورہ آیات میں ''بیاض اور ناضرۃ'' کا مجازی معنی ہے ''فرحت وسرور حاصل ہونا'' اور سواد، اور غبرۃ اور قترۃ'' کا مجازی معنی ہے غم اور پریشانی'' حضرت امام حسن ؓ نے جب حضرت امیر معاویہ ؓ سے صلح کر لی، کچھ امور طے کر کے امارت (حاکمیت) ان کے حوالہ کر دی، تو کسی سفید بالوں والے بوڑھے نے آپ کو کہا ''یا مسود وجوہ المؤمنین'' اے مومنوں کے چہروں کو سیاہ کرنے والے، آپ نے اسے جواب دیا۔

یابیاض القرون سودت وجھی عند بیض الوجوہ سود القرون

فلعمری لاخفینک جھدی | عن عیانی وعن عیان العیون
بسواد فیہ بیاض لوجھی | وسواد لوجھک الملعون

(۱) اے سفید گیسوؤں والے میں نے اپنا چہرا سیاہ کیا جب کہ سیاہ بالوں والے جوانوں کے چہرے سفید ہو گئے۔

(۲) مجھے اپنی عمر کی قسم میں اپنی عمر کو ضرور برضرور تم سے مخفی رکھوں گا، اپنے آپ کو ظاہر ہونے اور لوگوں کی نظروں میں ظاہر ہونے سے۔

(۳) یہ ایسی سیاہی ہے جس میں حقیقت میں میرے چہرے کی سفیدی ہے، اور تمہارے چہرے کی سیاہی ملعون ہے۔

ان اشعار میں بھی چہرے کی سفیدی سے مراد ''فرحت وسرور'' اور چہرے کی سیاہی سے مراد غم اور پریشانی ہے، جب کوئی شخص اپنا مطلوب ومقصود پالیتا ہے تو عرب حضرات اس کیلئے یہ لفظ استعمال کرتے ہیں۔ "ابیض وجھہ "ومعناہ الاستبشار والتھلل" اس کا چہرا سفید ہوگیا یعنی اسے خوشی حاصل ہوگئی اور اس کا چہرا چمک اٹھا۔ اسی طرح دعائیہ کلمات میں یوں استعمال کیا جاتا ہے" الحمد للہ الذی بیض وجھك "سب تعریفیں اللہ تعالی کیلئے ہیں جس نے تمہارے چہرے کو سفید کیا یعنی تمہیں راحت وسرور عطاء کیا، اور جس شخص کو غم اور پریشانی لاحق ہو، اس کیلئے یہ الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں،" اربدو جھہ واغبر لونہ وتبدلت صورتہ " اس کا چہرا خاکستری ہوگیا، اس کا رنگ غبار آلودہ ہوگیا اور اس کی صورت بدل گئی، ان تمام الفاظ کا مجازی معنی یہی ہے کہ وہ غمناک ہوگیا۔

دوسرا معنی حقیقی ھے : کہ مؤمنین کے چہرے حقیقی طور پر سفید ہوں گے اور ان میں نورانیت ہوگی وہ چمک دمک رہے ہوں گے اور کافروں کے چہرے سیاہ ہوں، غبار آلود ہوں گے، خاکستری ہوں گے۔ (ماخوذ از کبیر)

راقم کے نزدیک عموم المجاز معنی لینا بہتر ہے:

مؤمنین کے چہرے نورانی ہوں گے اور کافروں کے تاریکی میں ڈوبے ہوئے ہوں گے، اس معنی میں مجاز خود بخود داخل ہو جائے گا، حقیقت ومجاز کا اجتماع بھی لازم نہیں آئے گا، مطلب یہ ہوگا، مؤمنین کے چہرے نورانی ہوں گے وہ سفید ہوں گے، ان میں آب وتاب ہوگی، وہ اپنی اس کیفیت اور اپنے اعمال کی مقبولیت اور رب تعالی کے تقرب اور انبیاء کرام کے مؤمنین پر راضی ہونے کی وجہ سے خوش ہوں گے، ان کو فرح وسرور حاصل ہوگا۔

اور کافروں کے چہروں پر تاریکی چھائی ہوگی، ان کے چہرے سیاہ ہوں گے، غبار ان کے چہرے سے اڑ رہا ہوگا، ان کے چہرے آگ سے جل جانے کی طرح خاکستری نظر آئیں گے، وہ اپنی یہ حالت دیکھ کر بہت زیادہ غم اور

پریشانی میں مبتلاء ہوں گے، رب تعالی اور انبیاء کرام ان سے ناراض ہوں گے۔

چہرے سیاہ وسفید کب ہوں گے اور کہاں ہوں گے؟

یہ چند مقامات ہیں جہاں مؤمنین کے چہرے سفید اور کفار کے سیاہ ہوں گے، یہ منظر قیامت کے دن ہوگا۔

(۱) **یوم القیامة حین یبعثون من قبورهم تکون وجوه المؤمنین مبیضة ووجوه الکافرین مسودة "**
یعنی قیامت کے دن جب لوگوں کو قبروں سے اٹھایا جائے گا تو مؤمنوں کے چہرے سفید، چمکدار ہوں گے، اور کافروں کے سیاہ، کالے ہوں گے۔

(۲) دوسرا مقام اس حال کا نامہ اعمال پڑھنے کے وقت ہوگا۔
اذاقرأالمؤمن کتابه فرأی فی کتابه حسناته استبشر وابیض وجهه واذاقرأالکافر والمنافق کتابه فرأی فیه سیآته اسود وجهه "
جب مؤمن اپنا نامہ اعمال پڑھے گا تو وہ خوش ہوگا اور اس کا چہرا سفید ہوگا، جس میں آب وتاب ہوگی، جب کافر اور منافق اپنا اپنا نامہ اعمال پڑھیں گے تو ان کے چہرے سیاہ ہوں گے اور وہ پریشان ہوں گے۔

(۳) یہ حال اس وقت ہوگا جب رب تعالی کی طرف سے کہا جائے گا۔

﴿وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ﴾ جدا ہو جاؤ آج اے مجرمو، یعنی جب کفار ومنافقین کو مومنین سے جدا کر دیا جائے گا تو اس وقت مؤمن خوش ہوں گے اور ان کے چہرے سفید ہوں گے، اور کافر اور منافق لوگ اس وقت غم میں ہوں گے، اور ان کے چہرے سیاہ ہوں گے۔

(۴) ویقال ان ذلك عند المیزان اذارجحت حسناته ابیض وجهه واذارجحت سیآته اسود وجهه "
یہ حالت میزان کے وقت ہوگی، جن کی نیکیاں بڑھ جائیں گی وہ خوش ہوں گے، اور ان کے چہرے سفید ہوں گے، اور جن کی برائیاں بڑھ جائیں وہ غمزدہ ہوں اور ان کے چہرے سیاہ ہوں گے۔

(۵) **ویقول اذا کان یوم القیامة یؤمر کل فریق بان یجتمع الی معبوده فاذاانتهوا الیه حزنوا واسودت وجوههم، فیبقی المؤمنون واهل الکتاب والمنافقون، فیقول الله تعالی للمؤمنین من ربکم؟فیقولون ربناالله عزوجل فیقول لهم اتعرفونه اذارأیتموه فیقولون سبحانه،اذااعترف عرفناه فیرونه کما شاء الله،فیخر المؤمنون سجدالله تعالی فتصیر وجوههم مثل الثلج بیاضاویبقی المنافقون واهل الکتاب لایقدرون علی السجود فیحزنواوتسودوجوههم"**

اور یہ حالت اس وقت ہوگی جب قیامت کے دن ہر فریق کو حکم دیا جائے گا کہ وہ اپنے اپنے معبودوں کے ساتھ جمع ہو جائیں گے، جب خالص کافر اپنے معبودوں سے ملیں گے تو وہ غمزدہ ہو جائیں گے اور ان کے چہرے سیاہ ہو جائیں گے، لیکن مؤمنین اور منافقین اور اہل کتاب ابھی تک کافروں سے جدا ہوں گے، مؤمنین سے اللہ تعالیٰ سؤال کرے گا تمہارا رب کون ہے؟

وہ کہیں گے ہمارا رب اللہ عزّ وجل ہے، پھر رب تعالیٰ ان کو کہے گا کیا تم اپنے رب کو دیکھ کر پہچان لو گے، وہ کہیں گے کہ ہمارا رب تو پاک ذات ہے، (یعنی ہم اسے کیسے دیکھ سکھیں گے) مؤمن جب اپنے عجز کا اعتراف کرلے گا تو رب تعالیٰ اپنی پہچان کرادے گا، یعنی وہ اپنے دیدار سے مشرف فرمائے گا، تو مؤمنین رب تعالیٰ کو دیکھیں گے جس طرح رب تعالیٰ چاہے گا، (اس کی کیفیت کو بیان نہیں کیا جاسکتا) مومنین رب تعالیٰ کے حضور سجدہ میں گر جائیں گے تو ان کے چہرے برف کی طرح سفید ہوں گے، لیکن منافقین اور اہل کتاب اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار اور رب تعالیٰ کے حضور سجدہ کرنے سے محروم رہیں گے اس لئے ان کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ (ماخوذ از قرطبی)

دینی طلباء کرام کیلئے ایک علمی نکتہ:

اس آیۃ کریمہ سے یہ ثابت ہوا کہ مکلف یا مؤمن ہوگا یا کافر، ان کے درمیان کوئی واسطہ نہیں، جیسا کہ معتزلہ مؤمن اور کافر کے درمیان واسطہ مانتے ہیں، جسے نہ مؤمن مانتے ہیں، نہ کافر، اہل سنت کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت والے لوگوں کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں، ایک قسم یہ ہے کہ ان کے چہرے سفید ہوں گے وہ مومن ہوں گے، اور دوسری قسم یہ ہے کہ ان کے چہرے سیاہ ہوں گے وہ کافر ہوں گے ''ولم یذکر الثالث فلو کان ھھنا قسم ثالث لذکرہ اللہ تعالیٰ'' یہاں تیسری قسم کا کوئی ذکر نہیں، اگر تیسری قسم ہوتی تو اسے ذکر کیا جاتا، معتزلہ کی جانب سے جواب یہ دیا گیا کہ تیسری قسم کے نہ ذکر کرنے سے تیسری قسم معدوم نہیں ہوگئی، ایک وجہ تو یہ ہے کہ ''وجوہ'' نکرہ ہے، مقام مثبت میں واقع ہے، جو عموم کا فائدہ نہیں دیتا، پھر آیۃ کریمہ میں مؤمنین کا ذکر ہے اور ان کافروں کا ذکر ہے جو ایمان کے بعد کفر اختیار کرتے ہیں، اصلی کافروں کو یہ آیۃ کریمہ شامل نہیں، جب اصلی کافر دو قسموں سے باہر ہیں تو وہ لوگ بھی ان دو قسموں سے باہر ہیں جو نہ مؤمن ہیں اور نہ کافر۔

اہل سنت کی طرف سے ان کے استدلال کا رد یہ کیا گیا ہے کہ نکرہ مقام اثبات میں عموم پر دلالت کرتا ہے، جب قرینہ پایا جائے، قرائن اس میں واضح ہیں کیونکہ پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور نبی کریم ﷺ کی نبوت پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا، جس کا تقاضا یہی ہے کہ ایمان لانے والوں کے چہرے سفید ہوں اور کفر کرنے والوں کے

چہرے سیاہ ہو جائیں۔

”ثم دل مابعد هذه الآية على ان صاحب البياض من اهل الجنة وصاحب السواد من اهل النار فحينئذ يلزم نفى المنزلة بين المنزلتين“

پھر اسی کا تذکرہ کر دیا گیا کہ بعض چہرے سفید ہوں گے اور بعض چہرے سیاہ ہوں گے، اس کے بعد ذکر کیا جن کے چہرے سیاہ ہوں گے وہ جہنمی ہوں گے اور جن کے چہرے سفید ہوں گے وہ جنتی ہوں گے اب واضح ہو گیا کہ لوگوں کی کل دو قسمیں ہیں، مؤمن اور کافر، درمیان میں اور کوئی قسم نہیں۔ جہاں تک اس دلیل کا تعلق ہے کہ اصلی کافروں کو یہ آیہ کریمہ شامل نہیں، یہ درست نہیں، کیونکہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ اصلی کافر بھی یوم میثاق کو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کر چکے ہیں، اسے ہی ایمان سے تعبیر کر دیا گیا، کہ وہ ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے۔

پھر اس آیہ کریمہ کے آخر میں ﴿فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ﴾ ذکر کیا گیا، جو سبب ہے عذاب کا وہ کفر ہے۔

”واذاوقع التعليل بمطلق الكفر دخل كل الكفار فيه سواء كفر بعد الايمان او كان كافرا اصليا“

جب علت مطلق کفر ہے تو یہ ان کافروں کو بھی شامل ہے جو ظاہری ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے، یعنی مرتد ہو گئے، اور اصلی کافروں کو بھی شامل ہے کہ وہ یوم میثاق کو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کو مان کر پھر گئے۔ (ماخوذ از کبیر)

سوال: جب دو قسموں کا ذکر کیا گیا تو ارشاد فرمایا ﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ﴾ اس میں چہروں کے سفید ہونے کا پہلے ذکر کیا اور سیاہ ہونے کا ذکر بعد میں کیا لیکن جب تفصیل ذکر کی تو ارشاد فرمایا ﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ﴾ اس میں سیاہ چہرے والوں کا ذکر پہلے کیا اور سفید چہرے والوں کا بعد میں ﴿وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ﴾ میں ذکر ہو رہا ہے، اس کی وجہ کیا ہے۔

جواب: اس میں چند وجوہ ہیں:

(۱) واؤ مطلق جمع کیلئے ہے ترتیب کیلئے نہیں، اس لئے ﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ﴾ میں مطلقاً یہ ذکر کیا گیا کہ بعض چہرے سفید ہوں گے، بعض سیاہ ہوں گے، ترتیب مقصود نہیں۔

(۲) مقصود مخلوق کو رحمت پہنچانا ہے نہ کہ عذاب، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے پہلے سفید چہرے والوں کا ذکر کیا کیونکہ وہ اہل ثواب ہیں، اور وہی سفید چہرے والے ہوں گے۔

”تقديم الاشرف على الاخس فى الذكر احسن ثم ختم بذكرهم ايضاتنبيهاعلى ان

ارادة الرحمة اکثر من ارادة الغضب، کما قال سبقت رحمتی غضبی "
اعلی واشرف کو گھٹیا سے پہلے ذکر کرنا احسن ہے، پھر آخر میں بھی ان کا ہی تذکرہ کیا، جس سے یہ اشارہ بھی کر دیا کہ رب تعالی کی رحمت اس کے غضب پر زیادہ ہے، یہی وجہ ہے کہ حدیث قدسی میں رب تعالی نے فرمایا کہ ''میری رحمت میرے غضب سے سبقت لے گئی''

(۳) فصحاء اور شعراء اپنے کلام کی ابتداء ایسے الفاظ سے شروع کرتے ہیں کہ جن سے طبیعت خوش ہو اور سینہ میں شرح پائی جائے، اللہ تعالی کی رحمت بھی سرور اور شرح صدر کا سبب ہے، اسی وجہ سے اہل ثواب کا ذکر پہلے کیا کہ وہ سفید چہرے والے ہوں گے اور اختتام بھی اسی سے کیا۔ (ماخوذ از کبیر)

دینی مدارس کے طلباء توجہ فرمائیں:

سوال یہ پیدا ہوتا کہ ﴿وَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِكُمْ﴾ میں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ '' اما '' کا کوئی جواب ذکر نہیں کیا گیا، اس کا مطلب واضح نہیں کہ وہ جن کے چہرے سیاہ ہوں گے،'' کیا تم نے کفر کیا ایمان لانے کے بعد'' تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں عبارت مقدر ہے، وہ یہ ہے " فیقال لھم "تو ان کو کہا جائے گا، اب مطلب یہ ہوگیا'' اور لیکن وہ جن کے چہرے سیاہ ہوں گے تو ان کو کہا جائے گا کیا تم نے ایمان کے بعد کفر کیا (اب مطلب واضح ہوگیا) اس طرح اور آیات میں بھی اس قسم کے الفاظ محذوف ہیں۔

﴿وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ﴾
اور فرشتے داخل ہوں گے ان پر ہر دروازے سے "وَيَقُوْلُوْنَ لَهُمْ "اور ان کو کہیں گے''تم پر سلام ہو''

﴿وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا﴾
اور جب اٹھا رہے تھے ابراہیم اس گھر ''بیت اللہ'' کی بنیادیں، اور اسمٰعیل (فقالا) تو ان دونوں نے عرض کیا اے ہمارے رب قبول کر ہم سے۔

﴿وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ رَبَّنَا﴾
اور اگر آپ دیکھتے جب مجرم جھکائیں ہوں گے اپنے سروں کو اپنے رب کے ہاں (فیقولون) تو کہہ رہے ہوں گے''اے ہمارے رب'' (ماخوذ از کبیر)

"فَذُوْقُوا الْعَذَابَ" الف لام عہد خارجی ہے، یعنی وہ عذاب جو عظیم ہے "ذوقوا" امر ہے جو اہانت کیلئے استعمال ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا ''چکھو بڑا عذاب'' یعنی اتنا عظیم ہوگا عذاب، جس کی وجہ سے ان کا ہر عضو گرفت میں

ہوگا، یہ ان کی ذلت کیلئے ہوگا۔

﴿بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ﴾ ''بوجہ اس کے جو تم کفر کرتے رہے۔''

اس میں ''با'' سببیت کیلئے ہے (اسی کے مطابق راقم نے ترجمہ کیا ہے) (ماخوذ از روح المعانی)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ○ (آیة نمبر ۱۰۷)

(1) اور وہ جن کے منہ اونجالے ہوئے وہ اللہ کی رحمت میں ہیں وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ (کنزالایمان)

(2) اور وہ جن کے چہرے سفید (چمکدار) ہوئے وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (نجوم الفرقان)

(ففی رحمة الله) یعنی الجنة والثواب المخلد، عبر عن ذلک بالرحمة تبینها علی ان المؤمن وان استغرق عمره فی طاقة الله لایدخل الجنة الا برحمته وفضله"

رحمت سے مراد جنت اور دائمی ثواب ہے، اسے رحمت سے تعبیر کیا گیا، جس سے اس پر متنبہ (خبردار) کیا گیا کہ اگرچہ انسان بہت بڑی عمر اللہ کی طاعت کرتا رہے لیکن جنت میں سوائے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل سے داخل نہیں ہوگا، اصل وجہ خاتمہ بالخیر پر جنت میں جانے کی دارومدار ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے حاصل ہوتا ہے۔
(ماخوذ از بیضاوی)

جنت کو رحمت کہنے کی وجہ:

''سمیت الجنة رحمة لانها دار رحمة'' جنت کا نام رحمت رکھا گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ رحمت کا مقام ہوگا، جو وہاں پہنچ گیا وہ اللہ تعالیٰ کے غضب اور اس کے عذاب سے ہمیشہ کیلئے محفوظ ہوگیا۔ (خازن)

سفید چہرے والے کون ہوں گے؟

وہ مؤمنین ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی طاعت کرنے والے ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو پورا کرنے

والے ہوں گے۔ (خازن،قرطبی)

جنت میں دخول رب تعالیٰ کی رحمت سے ہوگا، کوئی ذاتی طور پر مستحق نہیں، اس پر حدیث پاک دیکھئے۔

❁ عن عائشة عن النبی ﷺ قال سددوا وقاربوا وابشروا فانه لایدخل الجنة احدا عمله قالوا ولاانت یارسول الله قال ولاانا ان یتغمدنی الله بمغفرة ورحمة "

(رواه الشیخان فی الصحیحین واحمد)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا درست ہوجاؤ، اور قریب ہوجاؤ اور خوش ہوجاؤ، بیشک جنت میں کسی کو اس کا عمل داخل نہیں کرے گا، صحابہ کرام نے عرض کی آپ کو (بھی) نہیں یارسول اللہ؟ آپ نے فرمایا، اور نہ ہی مجھے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت ورحمت نے مجھے ڈھانپ لیا ہے، مطلب واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرو، اسی سے خاتمہ بالخیر کی دعاء کرو، جب صحابہ کرام نے پوچھا کہ آپ کو بھی آپ کے اعمال جنت میں نہیں داخل کریں گے تو آپ نے فرمایا ہاں مجھے بھی اعمال جنت میں داخل نہیں کریں گے، البتہ مجھے رب تعالیٰ کی مہربانی سے رحمت ومغفرت نے ڈھانپ لیا ہے، یعنی میں نے بھی رب تعالیٰ کی رحمت سے ہی جنت میں جانا ہے، لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس کی رحمت مجھ پر چھا چکی ہے، تمہیں معلوم نہیں، اسلئے اس کی رحمت کے حصول کی کوشش کرتے رہو۔

❁ وعن جابر عن النبی ﷺ لایدخل احدامنکم عمله الجنة ولا یجیره من النار ولا انا الا برحمة من الله " (رواه مسلم)

حضرت جابر ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کسی ایک کو تم میں سے اس کا عمل اسے جنت میں داخل نہیں کرے گا اور نہ ہی اسے آگ سے نجات دے گا اور نہ ہی مجھے سوائے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے۔

سؤال: قرآن پاک کی آیہ کریمہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ جنتی لوگوں کو کہا جائے گا ﴿اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ داخل ہوجاؤ جنت میں بوجہ اس کے کہ تم (اچھے) عمل کرتے رہے" تو یہ کہنا کس طرح درست ہے کہ "نیک اعمال سے انسان جنت میں داخل نہیں ہوگا بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل سے داخل ہوگا؟

جواب: قرآن پاک کی آیہ کریمہ اور حدیث پاک میں کوئی تعارض نہیں، بلکہ سمجھنے کی ضرورت ہے "ان للجنة منازل ینال بالاعمال وذلک محمل الآیة " آیہ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ جنت میں منازل ومراتب ہوں گے، ان کو اچھے اعمال کے ذریعے حاصل کیا جاسکے گا۔

"واما اصل دخولها والخلود فیها بفضل الله ورحمته وذلک معنی الاحادیث "

جنت میں اصل دخول اور اس میں ہمیشہ رہنا اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہوگا، یہ مطلب ہے حدیث پاک کا۔

"ویدل علیہ قول ابن مسعود تجوزون الصراط بعفو الله وتدخلون الجنة برحمة الله وتقسمون المنازل باعمالكم" (رواہ ھناد فی الزھد وابو نعیم عن عون بن عبداللہ مثلہ)

اسی پر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول دلالت کر رہا ہے کہ پل صراط سے تم اللہ تعالیٰ کے معاف کرنے سے گذرو گے، اور جنت میں تم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے داخل ہو گے اور منازل تمہارے حصہ میں تمہارے اعمال کی وجہ سے آئیں گی۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

تِلْکَ آیَاتُ اللّٰہِ نَتْلُوْھَا عَلَیْکَ بِالْحَقِّ وَمَا اللّٰہُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعَالَمِیْنَ○ (آیۃ نمبر ۱۰۸)

(1) یہ اللہ کی آیتیں ہیں ہم ٹھیک تم پر پڑھتے ہیں اور اللہ جہان والوں پر ظلم نہیں چاہتا۔ (کنز الایمان)

(2) یہ آیتیں ہیں اللہ کی، ہم پڑھتے ہیں وہ تم پر حق سے اور نہیں اللہ ارادہ فرماتا ظلم کا جہان والوں پر۔ (نجوم الفرقان)

معنی سمجھنے کیلئے نحوی ترکیب کی طرف توجہ ضروری ہے:

"تلک" مبتداء ہے اور " آیات اللہ" اس کی خبر ہے اور " نتلوھا" جملہ حالیہ، جیسا کہ "ھذا بعلی شیخا" میں "شیخا" حال ہے اسم اشارہ میں " اشیر "فعل والا معنی ہوتا ہے، اسی وجہ سے "فاعلیت اور مفعولیت" والا معنی اس سے سمجھ میں آ رہا ہوتا ہے، جسکی وجہ سے حال بنانا درست ہوتا ہے، اور ایک دوسری ترکیب میں "آیات اللہ" بدل ہے "تلک" سے اور تمام جملہ خبر مبتداء ہے، اور "بالحق "نتلوھا کے فاعل سے حال ہے، یا مفعول سے حال ہے، اگر فاعل سے حال ہو تو ان تمام الفاظ کا معنی یہ ہوگا" یہ اللہ تعالیٰ کی آیات ہیں، ہم آپ پر تلاوت کرتے ہیں ہمارا پڑھنا حق ہے۔

اور اگر مفعول سے حال ہو تو اب مکمل معنی یہ ہوگا" یہ اللہ کی آیات ہیں، ہم آپ پر تلاوت کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ آیات حق ہیں۔ اس صورت میں یہ حال تاکید کیلئے ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہوتی ہی حق ہیں، پھر حق کا ذکر کرنا تاکید ہو گیا۔ (شیخ زادہ)

"تلک" اشارہ پہلی آیات کی طرف ہے جن میں کافروں کے عذاب اور نیک لوگوں کی نعمتوں کا ذکر ہے اس پر بظاہر سوال یہ وارد ہوتا ہے کہ یہ آیات تو قریب ہیں، ان کی طرف "تلک" اشارہ بعید سے کیسے کیا گیا؟ تو اس کا

جواب یہ دیا گیا کہ اگر چہ یہ آیات تو قریب ہیں، لیکن "ان ھذہ الآیات المذکورۃ قد انقضت بعد الذکر فصار کانھا بعدت " بیشک یہ آیات مذکورہ جب ان کو بیان کردیا گیا تو ان کا بیان ختم ہونے کے بعد وہ بعید ہونے کے درجہ میں چلی گئیں، وانما جاز اقامۃ "تلک" مقام "ھذہ "اس لئے اشارہ قریب کی جگہ اشارہ بعید کالانا صحیح ہے۔

اوردوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ وہ کتاب نازل کرے گا جو ضروریات دین پر مشتمل ہوگی۔

"فلماانزل ھذہ الآیات قال تلک الآیات الموعودۃ ھی التی نتلوھاعلیک بالحق"

تو جب ان آیات کو نازل کیا گیا تو یہ فرمایا گیا کہ وہ آیات جن کا وعدہ کیا گیا وہ ہم آپ پر حق سے تلاوت کررہے ہیں، اس صورت میں اشارہ بعید اپنے حقیقی معنی پر مشتمل ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

"(نتلوھا)جملۃ حالیۃ من الآیات (علیک)ای نقرأھا علیک یامحمد بواسطۃ جبریل"

''ہم پر وہ (آیتیں) پڑھتے ہیں'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اے محمد ﷺ ہم آپ پر جبرائیل کے واسطہ سے پڑھتے ہیں۔ (روح البیان)

﴿وَمَااللّٰہُ یُرِیۡدُ ظُلۡمًالِّلۡعٰلَمِیۡنَ﴾ ''اور نہیں اللہ ارادہ فرماتا ظلم کا جہان والوں پر''

یعنی اللہ تعالیٰ جہان والوں میں سے کسی ایک پر ظلم کرنے کا ارادہ نہیں فرماتا۔

اللہ تعالیٰ کے ظلم نہ فرمانے کا مطلب:

والمعنی ان اللہ لایریدان ینقص ثواب من عمل خیربفضلہ ولا ان یزید فی عذاب العاصی علی قدر جریمتہ "

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے جس نے نیکی کا عمل کیا، اللہ تعالیٰ اس کے ثواب کو کم کرنے کا ارادہ فرماتا، کہ اس پر ظلم ہو اور نہ ہی عاصی (گنہگار) کے گناہوں سے زیادہ اسے عذاب دیتا ہے، کہ اس پر ظلم ہو۔

"والکفر باللہ تعالی اعظم الخطایالاذنب فوقہ فیعذب بالنار المخلدۃ عذابالایکون عذاب فوقہ جزاء وفاقا"

اللہ تعالیٰ سے کفر تمام گناہوں سے عظیم گناہ ہے، اس سے بڑھ کر کوئی اور عظیم گناہ نہیں، اس لئے اس کا عذاب بھی جہنم کی آگ میں ہمیشہ رہنے کا عذاب ہوگا، یہ عذاب بھی وہ عذاب ہے جس سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں، لھذا جرم کے موافق کامل جزاء دی جائے گی۔ (ماخوذ از مظہری)

"وظلمانکرۃ فی سیاق النفی فیعم جمیع انواع الظلم والعالمین جمع محلی باللام

فیفید العموم ایضا،فالمعنی مایرید شیأمن الظلم لاحد من خلقه "

آیۃ کریمہ میں ظلما نکرہ ہے جونفی کے تحت واقع ہے اس لئے وہ عموم کا فائدہ دے رہا ہے، جس کا مطلب ہے تمام قسم کے مظالم،اور عالمین پر الف لام استغراق کیلئے جوعموم پر دلالت کررہی ہے،اب مطلب یہ ہوگیا،اور تمام جہانوں میں اپنی مخلوق کے کسی ایک فرد پر کسی قسم کا کوئی ایک بھی ظلم نہیں کرتا۔

"کیف والظلم وضع الشئی فی غیر موضعه والتصرف فی ملک الغیر وهو تعالی انما یتصرف فی ملک نفسه "

رب تعالی کیسے ظلم کرسکتا ہے؟ظلم تو یہ ہے کہ ایک چیز کو جہاں رکھنا ہے وہاں نہ رکھا جائے بلکہ اس جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھ دیا جائے ، وہ غیر کے ملک میں تصرف نہیں کرتا ،اور وہ کسی چیز کو غیر محل میں بھی نہیں رکھتا ، بلکہ وہ تو ہر چیز کو اس کے محل میں رکھتا ہے،ایک چیز کو غیر محل میں رکھنے کی دو وجہ ہوتی ہیں کبھی مستحق کو اس کا حق نہ دینا ،اور کبھی وہ کام کرنا جس سے منع کیا گیا ہے۔

"وکل ذلک لایتصور فی حقه تعالی فیستحیل تصور الظلم من الله تعالی فانه لاحق علیه لاحد فیظلم بنقصه "ولا یمنع عن شئی فیظلم بفعله بل هو المالک علی الاطلاق یفعل مایشاء بقدرته وبحکم مایرید بحکمته فکل ماجاء منه فهو محض حکمة وعدل "

اللہ تعالی کے حق میں ان میں سے کوئی صورت بھی نہیں پائی جاسکتی، لھذا اللہ تعالی سے ظلم کرنے کا تصور بھی محال ہے، کیونکہ اللہ تعالی پر کسی کا کوئی حق نہیں ،اس پر کوئی چیز واجب نہیں کہ وہ اس میں کمی کرکے کسی پر ظلم کرے ،اور رب تعالی کو کسی چیز سے منع نہیں کیا گیا کہ وہ اس پر عمل کرکے ظلم کرے ، بلکہ وہ مطلقا مالک ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے جو چاہے وہ کرتا ہے،اور اپنی حکمت کے مطابق جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے، رب تعالی کا ہر کام حکمت اور عدل پر مبنی ہے۔ (شیخ زادہ)

سؤال : رب تعالی کے ارشاد گرامی ﴿وَمَا اللّٰهُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعَالَمِیْنَ﴾ کا تم کیا مطلب لیتے ہو یا تم کہو گے "هو لایرید ان یظلمهم "وہ بندوں پر ظلم کرنے کا ارادہ نہیں فرماتا ،اور یا تمہارا موقف یہ ہوگا "انه لایرید منهم ان یظلم بعضهم بعضا" وہ یہ نہیں چاہتا کہ بعض بندے دوسرے بعض بندوں پر ظلم کریں، یہ دونوں مطلب درست نظر نہیں آتے ، پہلا معنی لینا اس لئے درست نہیں کہ تمہارا مذہب یہ ہے

"انه تعالی لوعذب البرئی عن الذنب باشدالعذاب لم یکن ظالما ، بل کان عادلا لان الظلم تصرف فی ملک الغیر وهو تعالی انما یتصرف فی ملک نفسه فاستحال کونه ظالما "

کہ اللہ تعالی اگر گناہ سے بری شخص کو شدید عذاب دے تو یہ ظلم نہیں ہوگا بلکہ عدل ہوگا ، کیونکہ ظلم تو اس

وقت ہوتا ہے جب غیر کی ملکیت میں تصرف کیا جائے، اللہ تعالیٰ تو اپنی ملکیت میں تصرف فرماتا ہے لھذا اسے ظلم نہیں کہا جاسکتا۔

اگر تم دوسرا مطلب لو تو وہ بھی درست نظر نہیں آتا، اسلئے کہ تمہارا مذہب یہ ہے "کل افعال العباد ارادة الله وتکوینه علی قولکم" کہ بندوں کے تمام افعال اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے اور اس کے موجود کرنے سے پائی جاتے ہیں، تو یہ کہنا کس طرح درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نہیں ارادہ فرماتا جہان والوں پر ظلم کا، جب کہ اس کے بندے ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

جواب: آیۃ کریمہ کا صحیح مطلب تو وہی ہے جو تفسیر مظہری سے بیان کیا جاچکا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کسی کے نیک عمل کا ثواب کم کرنے کا ارادہ نہیں فرماتا، اور کسی گنہگار کو اس کے گناہوں سے زیادہ عذاب دینے کا ارادہ نہیں فرماتا۔ اس سے ظلم نہ کرنے کا مفہوم واضح طور پر سمجھ آگیا، تاہم یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ اگر گناہوں سے بری شخص کو شدید عذاب دے تو یہ ظلم نہیں کہ وہ اپنے ملک میں تصرف کررہا ہے، یہ بھی درست ہے کہ حقیقت میں یہ ظلم ہی نہیں تو اعتراض بھی درست نہیں۔

جہاں تک بندوں کا بعض کا بعض پر ظلم کرنے کا رب ارادہ نہیں فرماتا، اس صورت میں ارادہ کا مجازی معنی پسند کرنا لے لیا جائے تو مسئلہ واضح ہوجاتا ہے کہ رب تعالیٰ بندوں کا ایک دوسرے پر ظلم کرنا پسند نہیں فرماتا، لیکن بندوں کو افعال کا اختیار دیا ہوا ہے وہ اپنے اختیار سے ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں۔ (راقم)

سؤال: اللہ تعالیٰ نے اپنی مدح بیان کی کہ وہ "جہان والوں پر ظلم کا ارادہ نہیں فرماتا" یہ مدح کس طرح درست ہے، مدح تو اس وقت ہوتی ہے جب ایک چیز کا پایا جانا ممکن ہو تو وہ کام نہ کیا جائے "الظلم منه محال علی مذهبکم فامتنع التمدح به" جب اللہ تعالیٰ کا ظلم کرنا تمہارے مذہب میں محال ہے تو اس کی نفی کیسے ہے؟

پہلا جواب: یہ کوئی قانون نہیں کہ ایک چیز ممکن ہو پھر وہ اللہ تعالیٰ سے نہ پائی جائے تو وہ قابل مدح ہے یہ قانون بندوں کے لحاظ پر ہے، اللہ تعالیٰ کی شان کے جو لائق ہی نہ ہو اور محال ہو اس کا نہ پایا جانا بھی قابل مدح ہے، رب تعالیٰ نے اپنی مدح بیان فرمائی ﴿لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ﴾ اسے نہیں پکڑی اونگھ اور نیند، یعنی وہ اونگھ اور نیند سے پاک ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنی مدح فرمائی ﴿وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ﴾ وہ کھلاتا ہے، اسے نہیں کھلایا جاتا "ولا يلزم من ذلك صحة النوم والاكل عليه فكذاههنا" اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسے نیند کا آنا صحیح ہے لیکن اسے نیند آتی نہیں، اور یہ کہنا بھی درست نہیں کہ وہ کھا سکتا لیکن کھاتا نہیں، اس آیۃ کریمہ میں بھی یہی مطلب ہے کہ ظلم اس

سے محال ہوتا، ظلم کا اس سے محال ہونا ہی قابل مدح ہے۔

دوسرا جواب: الثانی انه تعالی ان عذب من لم یکن مستحقاللعذاب فهو و ان لم یکن ظلمافی نفسه لکنه فی صورة الظلم وقد یطلق اسم احدالمتشابهین علی الآخر کقوله "وجزاء سیئة مثلها"

اگر اللہ تعالی اس شخص کو عذاب دے جو مستحق عذاب نہیں تو یہ حقیقت میں ظلم تو نہیں، لیکن بظاہر ظلم نظر آتا ہے، تو اس لحاظ پر مدح کرنا صحیح ہے، دو مشابہ چیزوں کا ایک دوسرے پر اطلاق درست ہے، جس طرح رب تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿وَجَزَآءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ برائی کا بدلہ اسی کی مثل برا ہے، حالانکہ برائی کا بدلہ حقیقت میں برا نہیں بلکہ عدل وانصاف ہے، لیکن بظاہر برا نظر آتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

فائدہ : "والعدل من جزاء المحسن والمسئی" اچھے کام کرنے والے کو اس کے مطابق جزاء دینا اور برے کام کرنے والے کو اس کے مطابق جزاء دینا عدل وانصاف ہے۔ (مدارک)

تنبیہ: اس سے پہلے کافروں کے چہرے سیاہ ہو جانے اور عذاب میں مبتلاء ہونے کا ذکر کیا تو بظاہر وہم ہوتا تھا کہ شاید یہ عذاب دینا ظلم ہوگا تو ظلم کی نفی کرکے اسے رد کر دیا اور یہ بتایا۔

"انماوقعوا فیماوقعوافیه بسبب افعالهم المنکرة وانه لایظلم احدامن خلقه"

کہ ان لوگوں نے برے افعال یعنی کفر کی وجہ سے اپنے آپ کو عذاب میں واقع کر دیا، ورنہ اللہ تعالی اپنی مخلوق میں سے کسی ایک پر بھی ظلم نہیں کرتا۔ (خازن)

گذشتہ سے پیوستہ:

- واخرج ابو نعیم عن انس قال قال رسول الله ﷺ الغبار فی سبیل الله اسفار الوجوه یوم القیامة"

حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالی کی راہ میں غبار قیامت کے دن چہرے کو روشن کر دے گا۔ (درمنثور)

یہ بھی واضح ہے کہ اللہ کی راہ سے مراد جہاد ہے، اور حج کرنا بھی "فی سبیل الله" میں آتا ہے، اور دینی طلباء کرام کا تعلیم حاصل کرنے کیلئے گھر سے باہر جانا بھی "فی سبیل الله" میں داخل ہے۔ (راقم)

- واخرج الطبرانی عن ابی الدرداء عن النبی ﷺ قال لیس من عبد یقول لااله الاالله مائة مرة الابعثه الله یوم القیامة ووجهه کالقمر لیلة البدر"

حضرت ابوالدرداء ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی ایسا بندہ نہیں، جس نے لا الہ الا اللہ سو مرتبہ پڑھا مگر وہ جنت میں جائے گا۔ (درمنثور)

زیر بحث آیۃ کے متعلق:

❁ روی ابو ذر ان النبی ﷺ قال فیمایروی عن ربه عزوجل "انه قال یاعبادی انی حرمت الظلم علی نفسی وجعلته بینکم محرمافلا تظالموا" (بخاری ومسلم وترمذی وابن ماجة)

حضرت ابوذر ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ اللہ تعالی کا ارشاد (حدیث قدسی) بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی فرماتا ہے اے میرے بندو میں نے اپنے نفس پر ظلم حرام کردیا ہے اور تمہارے درمیان بھی ظلم کو حرام کردیا ہے، تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔ (منقول از البحر المحیط)

❁ وفی الحدیث الصحیح ایضاان رسول اللہ ﷺ قال ان اللہ لایظلم المؤمن حسنة یعطی بها فی الدنیاویجزی بهافی الآخرة ،واماالکافر فیطعم بحسناته فی الدنیاما عمل للہ بهافاذاافضی الی الآخرة لم یکن له حسنة یجزی بها" (مسلم،مسند احمد)

حدیث صحیح میں ہے بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بیشک اللہ تعالی مؤمن پر ظلم نہیں فرماتا اسے دنیا میں نیکی کرنے کی توفیق عطاء فرماتا ہے اور اس کی جزاء آخرت میں عطاء فرمائے گا، لیکن کافر اپنی اچھائیوں کے بدلے دنیا میں کھالیتا ہے، اس کا عمل اللہ کی رضاء کیلئے نہیں ہوتا، جب وہ قیامت میں پہنچے گا تو اس کے پاس کوئی نیکی نہیں ہوگی کہ اسے جزاء دی جائے۔ (منقول از البحر المحیط)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَلِلّٰهِ مَافِی السَّمَاوَاتِ وَمَافِی الْاَرْضِ وَاِلَی اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ○ (آیة نمبر ۱۰۹)

(1) اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہی کی طرف سب کاموں کی رجوع ہے۔ (کنز الایمان)

(2) اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹایا جانا ہے تمام کاموں کو۔ (نجوم الفرقان)

"وللہ" جار مجرور کو پہلے ذکر کیا جو حصر پر دلالت کررہا ہے، یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالی "وحده لا شریک له" ہے اس کا کوئی شریک نہیں، تمام مخلوق اسی کی ملکیت میں ہے، موت دینا اور حیات عطا کرنا اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے،

ثواب دینا اور عذاب دینا اسی کے قبضہ قدرت میں ہے، لفظ "ما" ذکر کیا یا تو غیر ذوالعقول کی تعداد میں کثرت کی وجہ سے ان کو غالب کیا، یا اس سے یہ بتایا گیا ہے کہ رب تعالیٰ کی عظمت کے مقابل مخلوق کو پستی حاصل ہے، (اگرچہ مخلوق میں اولوالعزم حضرات انبیاء کرام ہیں اور سید الکائنات حضرت محمد ﷺ ہیں)

"والی اللہ"ای الی حکمۃ وقضائہ لاالی غیرہ شرکۃ واستقلالا" (ترجع الامور) ای امورھم فیجازی کلامنھم بماوعدلہ واوعدہ من غیر دخل فی ذلک لاحدقط"

اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی قضاء (اس کے فیصلہ) کی طرف تمام امور لوٹائے جاتے ہیں، وہ ہر ایک کو اپنے وعدہ کے مطابق جزاء عطاء کرے گا، اور اپنی وعید (ڈرانے) کے مطابق عذاب دے گا، کسی اور کو اس میں کوئی دخل حاصل نہیں ہوگا، اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے حکم وقضاء میں کوئی شریک ہے، اور نہ ہی رب کے بغیر کسی اور کو یہ حاصل ہے کہ امور اس کی طرف لوٹائے جائیں۔ (روح البیان)

سوال: "رجوع" کا تو یہ مطلب ہوتا ہے کہ کوئی چیز چلی جائے پھر لوٹ کر آجائے، رب تعالیٰ کی طرف کاموں کا لوٹنا کس طرح صحیح ہے، کہ کام پہلے چلے جائیں پھر لوٹ آئیں۔

جواب: قلنا کانت کالذاھبۃ بھلا کھا ثم اعادتھالان فی الدنیایملک بعض الخلق بالتدبیر وفی القیامۃ یکون کل ذلک اللہ تعالیٰ"

جب تمام چیزوں میں ایک مرتبہ فنا ہے، پھر ان کو لوٹانا "رجوع" ہی ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ دنیا میں مخلوق کو بعض چیزوں کی تدبیر کی وجہ سے ملکیت حاصل ہوتی ہے، لیکن قیامت میں صرف اللہ تعالیٰ کو ملکیت حاصل ہوگی، "اللہ تعالیٰ کی طرف تمام کاموں کے لوٹائے جانے کا یہی مطلب ہے" (ماخوذ از روح البیان)

ماقبل سے تعلق:

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے کافروں اور مومنوں کے احوال بیان فرمائے کہ مؤمنوں پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے گا اور کافروں کو عذاب دے گا" "نبہ علی ان التصرف ھو فیمایملکہ، فلا اعتراض علیہ تعالیٰ" اب اس آیۃ کریمہ میں اس پر تنبیہ کی گئی کہ اللہ تعالیٰ اپنے ملکیت میں تصرف فرماتا ہے، اس پر کسی کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں، اس آیہ کریمہ سے پہلی آیۃ کریمہ کی توثیق بھی ہوجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ملک میں وسعت پائی گئی، تمام امور اسی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں "فھو غنی عن الظلم" جو اپنی وسیع ملکیت میں تصرف کرتا ہے وہ ظلم سے مستغنی ہے، جو

غیر کے ملک میں تصرف کرے ظالم تو وہ ہوتا ہے، اپنی ملکیت میں تصرف کرنا ظلم نہیں۔ (ماخوذ از البحر المحیط)

دینی طلباء کرام کیلئے بہت مفید:

آیات کریمہ میں یعنی "تبیض" اور "تسود" میں، اور اسودت اور ابیضت میں، اور "اَکَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ" میں اور "بالحق" اور "وظلما" میں طباق پایا گیا ہے، یہ بھی خیال رہے کہ 'طباق' 'مطابقۃ' 'تضاد' ایک معنی میں علم بدیع میں استعمال کیے گئے ہیں "وھی الجمع بین المتضادین" دو متضاد چیزوں کو ایک جگہ جمع کرنا مطابقۃ اور طباق و تضاد ہے۔

اور "اکفرتم" اور "تکفرون" میں تجنیس تماثل پائی گئی ہے، جب دو لفظ ایک نوع میں متفق ہوں، دونوں اسم ہوں، یا دونوں فعل ہوں یا دونوں حرف ہوں تو اسے تجنیس مماثل کہتے ہیں، یہاں بھی ایک مادہ سے دو فعل لئے ہوئے ہیں "اکفرتم" اور "تکفرون" ان دونوں میں تجنیس تماثل ہے، اور ﴿فَفِیْ رَحْمَۃِ اللّٰہِ ھُمْ فِیْھَا خَالِدُوْنَ﴾ میں اسم ظاہر کی تاکید مضمر سے کی گئی ہے، یعنی رحمۃ کی طرف ھا ضمیر لوٹ رہی ہے۔ پھر لفظ "اللہ" کا تکرار متغائر المعانی (جن کے مختلف معانی ہیں ان) میں استعمال جو زیادتی حسن پر دلالت کرتا ہے۔

"والمعروف فی لسان العرب اذا اختلف الجمل اعادت المظھر لا المضمر"

عرب کی زبان میں یہ مشہور ہے کہ جب جملے مختلف (معانی پر دلالت کر رہے) ہوں تو اسم ظاہر کو لوٹایا جاتا، ضمیر کو نہیں لایا جاتا اس میں تفخیم شان پائی گئی ہے، اور خصوصی طور پر اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی کی تعظیم پائی گئی ہے۔ (ماخوذ از البحر المحیط مختصر المعانی)

زیر بحث آیۃ کریمہ کے متعلق کچھ مزید بحثیں:

احتج اصحابنا بقولہ تعالی "وللہ مافی السموات ومافی الارض" علی کونہ خالقا لاعمال العباد"

اہل سنت نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَلِلّٰہِ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ﴾ سے یہ دلیل حاصل کی کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے تمام افعال کا خالق ہے، خواہ وہ اعمال اچھے ہوں یا برے، بندوں کے افعال بھی جب زمین و آسمان سے باہر نہیں تو وہ واضح ہو گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ "فدلت ھذہ الآیۃ علی انہ خالق لافعال العباد" تو یہ آیۃ دلالت کر رہی ہے کہ وہ بندوں کے تمام افعال کا خالق ہے۔

معتزلہ کا چونکہ مذہب یہ ہے کہ بندے اپنے افعال کے خود خالق ہیں، تو اسلئے

"اجاب الجبائی عنه بان قوله (لله) اضافة ملک لااضافة فعل الاتری انه یقال "هذاالبناء لفلان فیریدون انه مملوکه لاانه مفعوله "

جبائی معتزلی نے اہل سنت و جماعت کی دلیل کا جواب یہ دیا کہ ارشاد باری تعالیٰ میں " لله" میں نسبت ملک کی طرف ہے، فعل کی طرف نسبت نہیں، عام طور پر بیان کیا جاتا ہے، یہ مکان فلاں کا ہے تو اس سے مراد یہ لی جاتی ہے ، کہ یہ مکان فلاں کی ملکیت میں ہے، اور یہ معنی نہیں کہ فلاں نے یہ مکان خود تعمیر کیا ہے، تعمیر تو معماروں نے کیا ہے، جبائی نے اور یہ دلیل قائم کی ہے کہ آیۃ کریمہ میں مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت اور اپنی مدح بیان کی اگر یہ کہا جائے کہ بندوں کے افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے تو بندوں کے افعال تو برے بھی ہوتے ہیں، برے افعال کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کس طرح قابل مدح ہے۔

اور دلیل جبائی نے یہ پیش کی ہے کہ ﴿ مَافِي السَّمَاوَاتِ وَمَافِي الْأَرْضِ ﴾ سے یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ یہاں ان چیزوں کا ذکر ہے جو آسمانوں اور زمین کا مظروف بن سکیں (یعنی زمین و آسمان میں سما سکیں)

"وذلک من صفات الاجسام لامن صفات الافعال التی هی اعراض "

یہ صفات اجسام سے ہے نہ کہ صفات افعال سے، کیونکہ یہ اعراض ہیں، اعراض بغیر معروض کے، صفت بغیر موصوف کے نہیں پائی جاتی۔

ہمارے اصحاب نے جواب یہ دیا ہے:

"ان هذه الاضافة اضافة الفعل بدلیل ان القادر علی القبیح والحسن "

کہ یہ کہنا غلط ہے کہ یہ اضافت فعل نہیں، بلکہ یہاں اضافۃ فعل پائی گئی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اچھی اور بری تمام چیزوں کی تخلیق کی قدرت ہے، اور یہ بھی واضح ہے کہ بندوں کے برے افعال رب تعالیٰ کی طرف بحیثیت تخلیق کے منسوب ہیں، برے افعال کی تخلیق بری نہیں بلکہ برے افعال کا کسب برا ہے۔ بندوں کے افعال اللہ تعالیٰ کی قدرت سے تخلیق ہیں اور بندوں کے اسباب جو انکو معرض وجود میں لاتے ہیں وہ امور داعیہ کہلاتے ہیں۔

"ولبت ان مجموع القدرة والداعیة بخلق الله تعالی لبت ان فعل العبد مستند الی الله خلقاوتکوبنابواسطة فعل السبب"

ثابت ہو گیا کہ بیشک انسان کی مجموعی قدرت اور امور داعیہ کا اللہ تعالیٰ خالق ہے، لھذا بندے کے افعال اسباب کے ذریعے پائے جاتے ہیں، لیکن حقیقت میں ان کا خالق اور انکو معرض وجود میں لانے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

فلاسفہ کا مذہب:

اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ﴿وَلِلّٰهِ مَافِي السَّمَاوَاتِ وَمَافِي الْاَرْضِ﴾ فلاسفہ نے یہ گمان کیا ہے کہ "مافی السماوات" کو پہلے ذکر کیا گیا، اور" مافی الارض "کو بعد میں، اسی سے پتہ چل گیا کہ" ان احوال السماویۃ اسباب للاحوال الارضیۃ فقدم السبب علی المسبب " سماوی احوال سبب ہیں ارضی احوال کا، اور سبب مسبب سے پہلے ہوتا ہے اسی وجہ سے ما فی السماوات کو پہلے ذکر کیا گیا۔

"وھذا یدل علی ان جمیع الاحوال الارضیۃ مستندۃ الی الاحوال السماویۃ ولا شک ان الاحوال السماویۃ مستندۃ الی خلق اللہ وتکوینہ فیکون الجبر لازما"

یہ قول اس پر دلالت کر رہا ہے کہ تمام احوال ارضیہ منسوب ہیں احوال سماویہ کی طرف، اور یہ بھی یقینی بات ہے کہ احوال سماویہ اللہ کی خلق اور تکوین کی طرف منسوب ہیں، فلاسفہ کے اس قول سے جبریہ فرقہ کا مدعی ثابت ہوگا کہ انسان احوال سماویہ میں اختیار نہیں رکھتا اور حقیقیطور پر مراد احوال سماویہ ہی ہیں، اس طرح انسان کا مجبور محض ہونا لازم آئے گا۔
(ماخوذ از کبیر)

وہی اول وہی آخر:

﴿وَلِلّٰهِ مَافِي السَّمَاوَاتِ وَمَافِي الْاَرْضِ﴾ میں رب تعالی نے اپنا اسم گرامی" اللہ " ذکر فرمایا، پھر ﴿وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ﴾ میں اسم گرامی" اللہ "ذکر فرمایا۔

"والغرض منہ تاکید التعظیم والمقصود ان منہ مبدأالمخلوقات والیہ معادھم"

اس سے غرض تاکید تعظیم ہے، اور مقصود اس سے یہ بیان کرنا ہے کہ بیشک اسی سے مخلوقات کی ابتداء ہے، اور اسی کی طرف انتہاء ہے۔

فقولہ (وللہ مافی السماوات ومافی الارض) اشارۃ الی انہ سبحانہ ھوالاول وقولہ (والی اللہ ترجع الامور) اشارۃ الی انہ "ھو الآخر"

اور اللہ تعالی کے ارشاد گرامی ﴿وَلِلّٰهِ مَافِي السَّمَاوَاتِ وَمَافِي الْاَرْضِ﴾ سے اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالی ہی اول ہے، اور ﴿وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ﴾ سے اس طرف اشارہ ہے کہ وہی آخر ہے۔

وذلک یدل علی احاطۃ حکمہ وتصرفہ وتدبیرہ باولھم وآخرھم وان الاسباب والمسببات منتسبۃ الیہ وان الحاجات منقطعۃ عندہ"

اوراس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ اللہ کا حکم اوراس کا تصرف اوراس کا تصرف اوراس کی تدبیر تمام اول وآخر کا احاطہ کئے ہوئے ہیں، کیونکہ ظاہری اسباب اور مسببات تمام اسی کی طرف منسوب ہیں، اور تمام حاجات اسی پر جاکر ختم ہوتی ہیں۔

فائدہ: ظاہری اسباب اور ہیں، حقیقی سبب اللہ تعالی ہے، نماز کا سبب ظاہری وقت ہے، اور روزے کا سبب ظاہری رمضان کا موجود ہونا ہے، اور حقیقی سبب تمام چیزوں کا اللہ تعالی ہے اسی طرح تمام حاجتیں اللہ تعالی پر جاکر ختم ہوتی ہیں، حقیقی طور پر حاجت رواء وہی ہے، البتہ اس نے خود ہی وسائل بنا رکھے ہیں، بیماری سے نجات دینے کا ذریعہ طبیب کو بنادیا، اور کبھی کسی نیک کی دعاء سے حاجت پوری ہوگئی، کبھی کسی نیک شخص سے دم کرالیا تو شفاء حاصل ہوگئی، کبھی کسی نیک شخص کے وسیلہ سے دعاء کرلی تو وہ دعاء مقبول ہوگئی، یہ سب مجازی طور پر حاجت روا ہیں۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

کلمة الی فی قوله "والی الله ترجع الامور" لاتدل علی کونه تعالی فی مکان وجهة بل المراد ان رجوع الخلق الی موضع لاینفذفیه حکم احد الاحکمه ولایجری فیه قضاء احدالاقضاؤه"

رب تعالی کے ارشادگرامی ﴿وَإِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْأُمُوْرُ﴾ میں کلمہ "الی" اس پر دلالت نہیں کرتا کہ اللہ تعالی کسی مکان یا کسی جہت میں ہے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ مخلوق نے وہاں لوٹنا ہے جہاں کسی ایک کا حکم نہیں چلے گا صرف اللہ تعالی کا ہی حکم ہوگا، کسی ایک کا وہاں فیصلہ نہیں ہوگا صرف اللہ تعالی کا فیصلہ ہوگا۔ (کبیر)

طلباء کرام کے فائدہ کیلئے ایک اور مسئلہ:

ترجع شامی وحمزة وعلی کان عبارة عن وجودالشئی فی زمان ماض علی سبیل الابهام ولا دلیل فیه علی عدم سابق ولا علی القطاع طارئی "

شامی اور حمزہ اور علی رحمہم اللہ نے ایک اعتراض کا جواب دیا ہے، وہ اعتراض یہ تھا کہ ایک چیز پہلے موجود ہو، پھر اس کی طرف لوٹے تو اسے رجوع کہا جائے گا، جب کوئی چیز پہلے موجود ہی نہ ہو تو لوٹانے کا کیا مطلب؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ اگر کوئی چیز زمانہ ماضی میں مبہم طور پر بھی پائی جائے تو اس کیلئے مراجعت کا لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے، اس پر کوئی دلیل نہیں کہ تمام امور پہلے معدوم تھے، یا ان پر انقطاع جاری ہوگیا۔

(ماخوذ از مدارک التنزیل للنسفی المعروف بالنسفی)

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُم مِّنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ۝ (آیۃ نمبر ۱۱۰)

(1) تم بہتر ہو ان سب امتوں میں جو لوگوں میں ظاہر ہوئیں بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو، اور اگر کتابی ایمان لاتے تو ان کا بھلا تھا ان میں کچھ مسلمان ہیں اور زیادہ کافر۔ (کنز الایمان)

(2) تم بہتر ہو تمام امتوں سے جو ظاہر کی گئیں لوگوں کیلئے، تم حکم دیتے ہو اچھے کاموں کا، اور تم منع کرتے ہو برے کاموں سے، اور تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر، اور اگر ایمان لاتے اہل کتاب تو بہتر ہوتا ان کیلئے، ان میں سے کوئی مؤمن ہیں، اور اکثر ان میں سے حد سے تجاوز کرنے والے کافر۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

اس سے پہلے آیات میں مؤمنوں کو بعض چیزوں کا حکم دیا، اور بعض سے منع کیا، اور اہل کتاب کی طرح سرکش اور نافرمان ہونے سے منع فرمایا، اس کے بعد مطیع لوگوں کے ثواب کا ذکر کیا اور کافروں کے عذاب کا ذکر کیا۔ تمام آیات میں غرض یہ ہے کہ مؤمنین و مکلفین کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے احکام کے تسلیم کرنے کا حکم دیا گیا، اور سرکشی اور معصیت سے منع کیا گیا، اس کے بعد اس آیۃ کریمہ میں ایک اور طریقہ سے مؤمنین کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر ابھارا گیا ہے۔

❁ ﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ﴾ والمعنى انكم كنتم في اللوح المحفوظ خير الامم وافضلهم، فاللائق بهذا ان لاتبطلوا على انفسكم هذه الفضيلة وان لاتزيلوا عن انفسكم هذه الخصلة المحمودة وان تكونوا منقادين مطيعين في كل مايتوجه عليكم من التكاليف"

تم تمام امتوں سے بہتر ہو، یعنی لوح محفوظ میں لکھ دیا گیا ہے کہ تم تمام امتوں سے بہتر اور افضل ہو، لائق یہی ہے کہ تم اپنے اعمال کو ترک کر کے اپنے نفسوں کی اس فضیلت کو باطل نہ کردو، اور نہ ہی اپنے نفسوں سے یہ اچھا طریقہ زائل کرو، جو بھی تمہیں تکالیف دی جاتی ہیں یعنی جن کاموں سے تمہیں روکا گیا ان سے رک جاؤ، اور جن کاموں کا

تمہیں حکم دیا گیا ان پر عمل کرو، اللہ تعالی کے مطیع اور فرمانبردار بن جاؤ، اور ماقبل سے تعلق کی دوسری وجہ یہ ہے کہ رب تعالی نے اشقیاء (بدبختوں) کا کامل حال بیان فرمایا۔ ﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ﴾ ''لیکن وہ جن کے چہرے سیاہ ہیں۔ پھر نیک بختوں کا کامل حال بیان فرمایا۔ ﴿وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ﴾ '' لیکن وہ جن کے چہرے سفید ہیں۔ اس کے بعد بدبختوں کی وعید کا سبب بیان فرمایا۔ ﴿وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ ''اور اللہ نہیں ارادہ فرماتا ظلم کرنے کا جہاں والوں پر''

'' یعنی انهم انما استحقو اذلک بافعالهم القبيحة ''

یعنی وہ اپنے برے افعال کی وجہ سے اس عذاب کے مستحق ہوئے ہیں، اللہ تعالی کا ان پر کوئی ظلم نہیں۔

ثم نبه فی هذه الآية علی ماهو السبب لوعد السعداء بقوله (كنتم خير امة اخرجت للناس) ای تلک السعادات والكمالات والكرامات انما فازوا بها فی الآخرة لانهم كانوا فی الدنيا ''خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ''

اس کے بعد اس آیہ کریمہ میں اس پر تنبیہ کی گئی کہ اے نیک بختو تمہارے ساتھ وعدہ کا تعلق اس سے ہے کہ تم تمام امتوں سے بہتر ہو جو لوگوں کیلئے ظاہر کی گئیں، یہ نیک بختی اور کمال اور کرامت تمہیں آخرت میں حاصل ہونی ہے، جس کی وجہ سے تمہیں اعلی درجہ کی کامیابی حاصل ہوگی، کیونکہ دنیا میں تم تمام امتوں سے بہتر ہو۔ (مفاتیح الغیب المعروف بالکبیر)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

لفظ '' کان '' کبھی تامہ ہوتا ہے، کبھی ناقصہ، اور کبھی زائدہ، اور کبھی ''صار'' کے معنی میں ہوتا ہے، یہاں تمام احتمال پائے گئے ہیں۔

پہلا احتمال: جب ﴿كُنْتُمْ﴾ میں ''کان'' تامہ ہوتو اس صورت میں ''کان'' بمعنی وقوع اور حدوث کے ہوگا، اور وہ خبر کا محتاج نہیں ہوگا ''والمعنی حدثتم خير امة ووجدتم خير امة وخلقتم خير امة '' تمہیں سب امتوں سے بہتر امت بنایا گیا، تمہیں سب امتوں سے بہتر امت پایا گیا، اور تمہیں سب امتوں سے بہتر امت پیدا کیا گیا، اس ترکیب میں ''خیر امة'' میں حال واقع ہوگا، اس پر ہی جمہور مفسرین کرام ہیں۔

دوسرا احتمال: دوسرا احتمال یہ ہے کہ '' کان '' ناقصہ ہو، لیکن اس پر یہ اعتراض ہوگا کہ اس سے تو پتہ چلے گا کہ یہ معنی ہوگا ''انهم كانوا موصوفين بهذه الصفة وانهم مابقوا الآن عليها'' کہ وہ پہلے اس صفت سے

متصف تھے اب اس صفت پر باقی نہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ کان ناقصہ ہمیشہ انقطاع پر دلالت نہیں کرتا، بلکہ کبھی دوام پر دلالت کرتا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا﴾ یہاں کان ناقصہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا ہمیشہ کیلئے غفار ہونا ثابت ہے یہ مطلب نہیں کہ وہ پہلے غفار تھا اور اب معاذ اللہ نہیں ہے اور اسی طرح ﴿وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ میں کان دوام پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ ہمیشہ کیلئے "غَفُوْرٌ" اور "رَحِيْمٌ" ہے۔

کان ناقصہ کی صورت میں معانی میں چند احتمال:

(۱) احدها کنتم فی علم الله خیر امة " ان میں سے ایک معنی یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے علم میں تمام امتوں سے بہتر امت ہو۔

(۲) وثانیها کنتم فی الامم الذین کانوا قبلکم مذکورین بانکم خیر امة " دوسرا معنی یہ ہے کہ تم سے پہلے جو امتیں گذر گئیں جن کا تذکرہ کیا جاچکا ہے بیشک تم ان تمام سے بہتر امت ہو۔

(۳) وثالثها کنتم فی اللوح المحفوظ موصوفین بانکم خیر امة " تیسرا معنی یہ ہے کہ لوح محفوظ میں لکھ دیا گیا ہے کہ تم "خیر امة " کی صفت سے متصف ہو۔

(۴) ورابعها کنتم منذ آمنتم خیر امة اخرجت للناس" چوتھا معنی یہ ہے کہ تم نے جب سے ایمان لایا ہے اس وقت سے تم تمام امتوں سے بہتر ہو، جو امتیں لوگوں پر ظاہر کی گئیں۔

(۵) پانچواں معنی ابو مسلم نے بیان کیا کہ "كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ" پیچھے لایا گیا ﴿وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ﴾ کے تو جب ان کو جنت میں ہمیشہ رہنے کا حکم دیا جائے گا تو اس وقت ان کو کہا جائے گا۔

"کنتم فی دنیاکم خیر امة فاستحققتم ما التم فیه من الرحمة وبیاض الوجه بسببه "

تم دنیا میں تمام امتوں سے بہتر امت تھے، اسی وجہ سے تم رحمت اور چہرے کی سفیدی کے مستحق ہو۔

(۶) کنتم مذ آمنتم خیر امة تنبیها علی انهم کانوا موصوفین بهذه الصفة مذ کانوا"

چھٹا معنی یہ ہے کہ تم نے جب ایمان لایا اس وقت سے تم تمام امتوں سے افضل ہو، اسی سے اس کی طرف تنبیہ کر دی گئی کہ پہلی امتوں کے وہی لوگ بہتر تھے جو ایمان والے تھے، لیکن تم ایمان لانے کے بعد ان سے افضل ہو گئے (کافر کبھی بہتر نہیں ہو سکتا، کافروں کو بہتر کہنے والے اسلام کے باغی ہیں)

(۷) قوله تعالیٰ "کنتم" مخصوص بقوم معینین من اصحاب الرسول ﷺ وهم السابقون

الاولون ومن صنع مثل ماصنعوا"

اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی " کنتم "معین لوگوں سے خاص ہے، وہ ہیں نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام کیونکہ وہی سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں، پھر البتہ آیۃ کریمہ بعد میں آنے والے ان لوگوں کو شامل ہے جن کے اعمال صحابہ کرام کے اعمال کی طرح ہیں۔ (ماخوذ از کبیر بحذف وتقدیم وتاخیر)

راقم کو یہی آخری معنی پسند ہے، کیونکہ افضلیت کے حقدار صحابہ کرام یا ان کے متبعین۔

تیسرا احتمال: تیسرا احتمال یہ کہ "کان" زائدہ ہو، زائدہ ہونے کی صورت میں "کان" کو ذکر کیا جائے، یا پوشیدہ رکھا جائے معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا، البتہ اس قول کو ابن الانباری رحمہ اللہ نے ضعیف قرار دیا ہے، کیونکہ "کان" زائدہ ہوتا ہے درمیان میں یا آخر میں، شروع میں زائدہ نہیں ہوتا "عبداللہ کان قائم" میں، اور " عبداللہ قائم کان " میں "کان" کو عرب حضرات زائد مانتے ہیں، لیکن " کان عبداللہ قائما" میں "کان" کو زیادہ نہیں مانتے۔

چوتھا احتمال: چوتھا احتمال یہ ہے کہ "کان" بمعنیٰ "صار" کے ہو، یعنی "کنتم خیر امۃ" کا معنیٰ " صرتم خیر امۃ " تم تمام امتوں سے بہتر امت ہوگئے، اب مکمل معنی یہ ہوگیا:

" صرتم خیر امۃ بسبب کونکم آمرین بالمعروف وناہین عن المنکر ومؤمنین باللہ "

تم تمام امتوں سے بہتر ہوگئے اس سبب سے کہ تم اچھے کاموں کا حکم دینے والے ہو، اور برے کاموں سے روکنے والے ہو اور اللہ پر ایمان لانے والے ہو۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ "جو ظاہر کی گئیں لوگوں کیلئے۔"

اعلیٰ حضرت وعلامہ رازی وعلامہ بیضاوی رحمہم اللہ:

اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضاء خان بریلوی رحمہ اللہ نے ﴿اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ کا ترجمہ کیا" جو لوگوں میں ظاہر ہوئیں" یہی ترجمہ بیضاوی اور رازی رحمہما اللہ نے تحریر فرمایا، الفاظ علامہ رازی رحمہ اللہ کے دیکھیں۔

"ان المعنی کنتم خیر الامم المخرجۃ للناس فی جمیع الاعصار فقولہ "اخرجت للناس" ای اظہرت للناس حتی تمیزت وعرجت وفصل بینھا وبین غیرھا"

﴿اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ کا معنی ہے "ظاہر کی گئیں لوگوں کیلئے" یعنی تمام امتیں جو لوگوں کیلئے ظاہر کی گئیں کہ ان کی پہچان ہوسکے اور دوسروں سے ممتاز ہوسکیں، ان تمام امتوں سے تم بہتر اور افضل ہو،

خیال رہے کہا "اُخرِجت" کا لغوی معنی ہے "نکالی گئی" بامحاورہ مرادی معنی ہے "ظاہر کی گئی"۔

آیہ کریمہ اجماع امت کی حجت پر دلالت کر رہی ہے:

"احتج اصحابنا بهذه الآية على ان اجماع الامة حجة" ہمارے اصحاب نے اس آیہ کریمہ سے یہ دلیل پکڑی ہے کہ اجماع امت بھی شرعی احکام ثابت کرنے والے دلائل میں سے ایک دلیل ہے، حجت ثابت کرنے کیلئے دو وجہ بیان کی گئیں۔

تقریر اول: اللہ تعالیٰ کا ارشادگرامی ہے ﴿وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ﴾ موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ وہ ہے جو حق کی ہدایت دیتے ہیں، پھر اس آیہ کریمہ میں "کنتم خیر امة" (تم تمام امتوں سے بہتر ہو) اس سے واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ کی امت کے وہ لوگ جو اچھے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور برے کاموں سے روکتے ہیں اور اللہ پر ایمان رکھتے ہیں وہ موسیٰ علیہ السلام کی امت کے ان لوگوں سے افضل ہیں جو حق کی ہدایت دیتے ہیں۔

"واذا كان هؤلاء افضل منهم وجب ان تكون هذه الامة لاتحكم الابالحق"
جب کہ یہ لوگ افضل ہیں ان پہلے لوگوں سے تو ضروری ہے کہ یہ امت سوائے حق کے کوئی حکم نہ دے، اگر نبی کریم ﷺ کے امت کے وہ لوگ جو صحابہ کرام اور اہل بیت کی اتباع کرتے ہیں، وہ ناحق بات کریں تو موسیٰ علیہ السلام کی امت کے حق بات کرنے والوں سے افضل نہیں ہو سکتے۔

"لان المبطل يمتنع ان يكون خيرا من المحق" کیونکہ باطل راہ پر چلنے والے کا حق راہ پر چلنے والے سے افضل ہونا منع ہے۔

"فثبت ان هذه الامة لاتحكم الابالحق واذاكان كذلك كان اجماعهم حجة"
تو ثابت ہوا کہ بیشک یہ امت صرف حق کا فیصلہ کرے گی، جب اس طرح ہے تو ان کا اجماع حجت ہے۔

تقریر دوم: "المعروف" اور "اَلْمُنْكَرُ" پر الف لام استغراقی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ معنی یہ ہے۔

"وهذا يقتضي كونهم آمرين بكل معروف وناهين عن كل منكر ومتى كانوا كذلك كان اجماعهم حقا وصدقا لامحالة فكان حجة"
کہ وہ صحابہ کرام اور آپ کے متبعین ہر ایک بھلائی کا حکم دینے والے ہیں اور ہر ایک برائی سے منع کرنے والے ہیں، جب ان کا وصف یہ ہے تو واضح ہوا کہ ان کا اجماع یقینی طور پر حق اور سچ ہے، لھذا ان کا اجماع حجت ہے۔ (کبیر)

فائدہ: زجاج نے کہا ہے کہ ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ﴾ بظاہر خطاب ہے نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام کو، لیکن یہ حکم تمام امت کو شامل ہے، جیسا کہ ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ اور ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ﴾ کا حکم بظاہر اس وقت حاضرین کو تھا، لیکن بعد میں وہ حکم تمام امت کو شامل ہو گیا۔ (کبیر)

البتہ امت کے وہی لوگ اس میں آئیں گے جن کے اعمال قرآن وسنت کے مطابق ہوں گے۔

﴿تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ﴾

''تم حکم دیتے ہو اچھے کاموں کا اور تم روکتے ہو برے کاموں سے اور تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر۔''

''واعلم ان هذا كلام مستأنف والمقصود منه بيان علة تلك الخيرية'' یہ نئی بات شروع ہو رہی ہے، اور مقصد امت کے خیر ہونے کی علت بیان کرنا ہے، جسطرح کہا جاتا ہے ''زيد كريم يطعم الناس ويكسوهم ويقوم بما يصلحهم'' زید کریم ہے کہ وہ لوگوں کو طعام کھلاتا ہے اور ان کو کپڑے پہناتا ہے، اور ان کی حاجات کو پورا کرتا ہے یعنی زید کے کریم ہونے کی علت لوگوں کو طعام کھلانا اور ان کو کپڑے پہنانا اور ان کی حاجات کو پورا کرنا ہے۔

اصول فقہ کا قانون:

اصول فقہ میں قانون بیان کیا گیا ہے کہ کوئی حکم بیان کیا جائے اس کے بعد اس کے اوصاف بیان کئے جائیں تو وہ اوصاف اس حکم کی علت بنتے ہیں، اس آیۃ کریمہ میں پہلے امت کے خیر ہونے کا ذکر کیا، پھر ان کے یہ تمام اوصاف امت کی افضلیت کے اسباب ہیں، ان کے بغیر امت افضل نہیں ہو سکتی۔ (کبیر)

سوال: اچھے کاموں کا حکم دینا اور برے کاموں سے روکنا اور اللہ پر ایمان رکھنا اس امت کی افضلیت کے اسباب کیسے ہیں؟ یہ اوصاف تو پہلی امتوں کو بھی حاصل تھے۔

جواب: نبی کریم ﷺ کی امت کو یہ اوصاف اعلیٰ درجے کے حاصل ہیں، اعلیٰ درجہ کا ''امر بالمعروف ونهي عن المنكر'' جہاد کرنا ہے، کامل درجہ کا جہاد اسی امت کو حاصل ہے۔

''ان الامر بالمعروف قد يكون بالقلب وباللسان وباليد واقواها مايكون بالقتال لانه القاء النفس في خطر القتل''

بیشک اچھے کاموں کا حکم دینا کبھی دل سے ہوتا ہے اور کبھی زبان سے اور کبھی ہاتھ سے، ان تم میں سے زیادہ قوی جہاد سے دین کی تبلیغ کی جائے، یہ افضل اس لئے ہے کہ اس میں اپنے نفس کو قتل کے خطرہ میں ڈالنا پایا جاتا ہے

"واعرف المعروفات الدين والايمان بالتوحيد والنبوة، وانكر المنكرات الكفر فكان الجهاد في الدين محملا لاعظم المضار لغرض ايصال الغير الى اعظم المنافع وتخليصه من اعظم المضار فوجب ان يكون الجهاد اعظم العبادات ولما كان امر الجهاد في شرعنا اقوى منه في سائر الشرائع لاجرم صار ذلك موجب الفضل هذه الامة على سائر الامم"

سب کاموں سے اچھا کام دین حق اور اللہ تعالیٰ کی توحید پر اور نبی کریم ﷺ کی نبوت پر ایمان لانا ہے اور سب کاموں سے برا کام اللہ تعالیٰ سے کفر کرنا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے میں اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال کر اوروں کو عظیم منافع پہنچانا کہ جہاد عبادات میں سے عظیم عبادت ہو، جب جہاد ہماری شریعت میں بنسبت دوسری شریعتوں سے زیادہ قوی درجہ رکھتا ہے تو یقیناً وہ امت جسے اعلیٰ درجہ کی عبادت قوی ترین جہاد "فی سبیل اللہ" حاصل ہے وہ تمام امتوں سے افضل ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ارشاد:

وهذا معنى ماروى عن ابن عباس انه قال في تفسير هذه الآية قوله (كنتم خير امة اخرجت للناس) تامرونهم ان يشهدوا ان لااله الاالله ويقروا بما انزل الله وتقاتلونهم عليه "ولااله الاالله" اعظم المعروف والتكذيب هو انكر المنكر"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس آیۃ کی تفسیر یوں بیان فرماتے ہیں کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ آیۃ کریمہ میں ﴿تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم حکم دیتے ہو کہ گواہی دو اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں، اور اللہ تعالیٰ نے جو نازل کیا اس کے اقرار کرنے اور اللہ کی راہ میں قتال (جہاد) کرنے کا حکم دیتے ہو، "لاالہ الاالله" سب کاموں سے اچھا ہے تو اس کی شہادت پر قائم رہنے کا حکم دینا اچھے کام کا حکم دینا ہے، اور "لاالہ الا اللہ" کی تکذیب برا کام ہے، اور "لاالہ الااللہ" کی تکذیب سے روکنا برے کام سے روکنا ہے۔

جہاد کا فائدہ:

قفال کہتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے فائدہ کا کوئی انصاف کرنے والا انکار نہیں کرسکتا، کیونکہ اکثر لوگ اپنے اپنے دین پر آباء واجداد کی محبت اور عادت کی وجہ سے قائم رہتے ہیں، ان پر جو دلائل بھی قائم کرو وہ ان کی

طرف توجہ نہیں کرتے، اور نہ ہی سوچنے کی کوشش کرتے ہیں، جب وہ دین میں داخل ہونے کو ناپسند کرتے کریں، جو دین قبول کرلیں ان کو اس دین حق سے برگشتہ (پھیرنے) کرنے کی کوشش کریں، اور دیندار لوگوں کیلئے راہ حیات تنگ کردیں، تو ایسے لوگوں سے جہاد کرنا ضروری ہوجاتا ہے کہ ہوسکتا ہے وہ راہ راست پر آجائیں، اگر ان کی قسمت میں راہ راست پر آنا نہ ہو تو کم از کم دیندار لوگ ان سے نجات حاصل کرلیں گے، بعض اوقات مسلمانوں کی جرأت، بے باکی کو دیکھ کر ان کے دلوں سے باطل دین کی محبت کم ہوجاتی ہے اور دین حق سے محبت ان کو حاصل ہوجاتی ہے، جو عذاب دائمی کے مستحق تھے ان کو ثواب دائمی حاصل ہوجاتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر بوضاحت)

سوال: اس مقام پر "امر بالمعروف ونهي عن المنكر" کو پہلے ذکر کیا گیا اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے کو بعد میں ذکر کیا گیا "وان الايمان بالله لابد ان يكون مقدما على كل الطاعات" حالانکہ تمام عبادات سے پہلے ایمان کا ہونا ضروری ہے" تو کیا وجہ ہے کہ ایمان کو مؤخر ذکر کیا گیا؟

جواب: اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا حق پر قائم رہنے والی پہلی تمام امتوں کو حاصل رہا، جب اللہ تعالیٰ نے اس امت کو تمام ان امتوں پر فضیلت دی گئی جو حق پر قائم تھیں اور پہلے گذر گئیں، یہ فضیلت صرف ایمان کی وجہ سے نہیں، ایمان تو تمام کو ہی حاصل رہا، بلکہ یہ فضیلت اس لئے حاصل ہوئی کہ نبی کریم ﷺ کی فضیلت کو اچھے کاموں کا حکم دینا اور برے کاموں سے روکنا اعلیٰ درجہ کا حاصل رہا، اس کا ذریعہ جہاد جیسا "امر بالمعروف ونهي عن المنكر" کا سبب اسی امت کو حاصل رہا، (نفس ایمان میں کوئی زیادتی نہیں، جسکی تفصیل (ان شاء اللہ) سورۃ انفال میں آئے گی)

"فان المؤثر في حصول هذه الخيرية هو الامر بالمعروف والنهي عن المنكرواماالايمان بالله فهو شرط لتاثيرهذاالمؤثرفي هذاالحكم ......والمؤثر الصق بالاثرمن شرط التاثيرفلهذاالسبب قدم الله تعالى ذكرالامر بالمعروف والنهي عن المنكرعلى ذكر الايمان"

اصل میں اس امت کے خیر ہونے پر مؤثر "امر بالمعروف والنهي عن المنكر" ہیں "ايمان بالله" اس مؤثر کی شرط تاثیر ہے، کیونکہ ایمان کے بغیر کوئی عبادت مؤثر نہیں، مؤثر کا اثر سے شرط تاثیر سے ملنا ضروری ہوتا ہے، اسی وجہ سے "امر بالمعروف ونهي عن المنكر" کو پہلے ذکر فرمایا، اور ایمان باللہ کو بعد میں ذکر کیا۔ (ماخوذ از کبیر)

سوال: آیۃ کریمہ میں اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے کا ذکر فرمایا اور نبوت پر ایمان رکھنے کا ذکر نہیں کیا، حالانکہ نبوت پر ایمان رکھنے بغیر ایمان حاصل نہیں ہوتا۔

جواب: "الایمان باللہ یستلزم الایمان بالنبوۃ" اللہ پر ایمان حاصل ہی اس وقت ہوتا ہے جب نبوت پر ایمان ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان اس وقت تک حاصل نہیں جب تک نبی کے سچے ہونے پر ایمان نہ ہو، اور اس کے سچے ہونے پر ایمان اسی وقت حاصل ہوگا جب اللہ تعالیٰ اس کے دعویٰ کے سچے ہونے پر اسے معجزات عطاء فرمائے گا "لان المعجز قائم مقام التصدیق بالقول" اس لئے کہ معجزہ عطاء کرنا اسی طرح تصدیق ہے جسطرح زبان سے کسی کی تصدیق کردی کہ یہ سچا ہے۔

"فلما شاهدنا ظهور المعجز علی وفق دعوی محمد ﷺ کان من ضرورة الایمان بالله الایمان بنبوة محمد ﷺ فکان الاقتصار علی ذکر الایمان بالله تنبیها علی هذه الدقیقة"

جب ہم نے نبی کریم ﷺ کے دعویٰ نبوت پر آپ کے معجزات کا مشاہدہ کیا تو ضروری ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان اسی وقت حاصل ہوگا جب نبی کریم ﷺ کی نبوت پر ایمان ہوگا، کیونکہ معجزات کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے آپ کی تصدیق فرمائی، اگر آپ پر ایمان نہیں ہوگا تو رب تعالیٰ کی تصدیق کا انکار ہوگا جب رب تعالیٰ نے آپ کی جو تصدیق فرمائی اس پر ایمان نہیں ہوگا تو یقیناً اللہ تعالیٰ پر بھی ایمان نہیں ہوگا، واضح ہوا کہ "ایمان باللہ مستلزم ہے ایمان بالنبوۃ کو" (اللہ پر ایمان رکھنے سے نبوت پر ایمان خود بخود لازم آجاتا ہے) اسی نکتہ کی وجہ سے صرف اللہ پر ایمان رکھنے کا ذکر فرمادیا۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ﴾

"اور اگر ایمان لاتے اہل کتاب تو ان کیلئے بہتر ہوتا۔"

"یعنی کمالکم اکتسبتم هذه الخیرامة بسبب هذه الخصال فاهل الکتاب لو آمنوا لحصلت لهم ایضا صفة الخیریة" واللہ اعلم

یعنی اے مومنو جس طرح تم نے اچھی صفات کے ذریعے بہتری اور افضلیت حاصل کی، اگر اہل کتاب بھی ایمان لے آتے اور وہی صفات حاصل کر لیتے جو تمہیں حاصل ہیں تو وہ بھی تمام امتوں سے افضل ہوجاتے۔ (کبیر)

اہل کتاب کا کونسا ایمان معتبر ہے؟

ولو آمن اهل الکتاب بهذا الدین الذی لأجله حصلت صفة الخیریة لاتباع محمد ﷺ لحصلت هذه الخیریة ایضا لهم فالمقصود من هذا الکلام ترغیب اهل الکتاب فی هذا الدین"

مراد یہ ہے کہ اگر اہل کتاب نبی کریم ﷺ کے دین پر ایمان لے آتے جس پر ایمان لانے اور آپ کی تابعداری

کرنے کی وجہ سے صحابہ کرام اور آپ کی امت کے دوسرے حضرات یعنی علماء وصلحاء کو تمام امتوں سے افضلیت حاصل ہوئی تو ان کو بھی نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے اور آپ تابعداری کرنے سے بہتری حاصل ہو جاتی، اس آیۃ کریمہ سے مقصد ہی اہل کتاب اس دین میں داخل ہونے کی ترغیب دینا ہے۔

اہل کتاب غلطی فہمی سے محروم ہو گئے:

ان اهل الكتاب انما آثروا دينهم على دين الاسلام حباللرياسة واستتباع العوام ولوآمنوالحصلت لهم هذه الرياسة في الدنيامع الثواب العظيم في الآخرة فكان ذلك خيرالهم ممافنعوابه "

اہل کتاب نے اپنے دین کو اسلام پر ترجیح دی اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ریاست و سرداری کو پسند کرتے تھے کہ اگر ہم اپنے دین پر قائم رہے تم ہمیں سرداری حاصل رہے گی اور عوام بھی ہمارے تابع ہوں گے، یہ درحقیقت ان کی غلط فہمی تھی، اگر وہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لے آتے تو ان کو دنیا میں سرداری حاصل ہو جاتی اور آخرت میں ثواب عظیم حاصل ہوتا، یہ فضیلت ان کو قناعت سے حاصل ہو جاتی۔ (کبیر)

جب قسمت ساتھ چھوڑ دے تو عقل بھی ساتھ چھوڑ جاتی ہے، محرومیت ان کی قسمت میں تھی تو اور کیا چیز ان کی مدد کر سکتی تھی۔

﴿مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُوْنَ﴾

''ان میں سے کوئی مؤمن ہیں اور اکثر ان میں سے حد سے تجاوز کرنے والے کافر۔''

"المؤمنون" پر الف لام عہد خارجی ہے، اس سے مراد یہود سے ایمان لانے والے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے چند ساتھی جو ایمان لائے، اسی طرح نصرانیوں میں سے حضرت نجاشی جنہوں نے ایمان قبول کیا اور ان کے چند ساتھی جنہوں نے ایمان قبول کیا، یعنی ایمان والے بہت تھوڑی تعداد میں تھے، اور ان میں کافر زیادہ تعداد میں تھے۔

کافر کو فاسق کہنے میں عجیب حکمت:

اگرچہ "فسق" کا معنی حد سے تجاوز کرنا، جو بہت زیادہ حد سے تجاوز کر جائے وہ کافر ہوتا ہے، یہاں آیۃ کریمہ میں "الفاسقون" سے مراد کافر ہیں، اسی لئے اعلی حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ﴿وَاَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُوْنَ﴾ اور زیادہ کافر، کتنا مختصر اور خوب ترین ترجمہ ہے لیکن راقم نے علامہ رازی رحمہ اللہ کی تفسیر

دل پذیر و بینظیر یعنی تفسیر کبیر کو دیکھا تو تفصیلی ترجمہ لکھ دیا'' اور اکثر ان میں سے حد سے تجاوز کرنے والے کافر'' آیئے آپ بھی تفسیر کبیر کی خوبصورت تحقیقی تفسیر کو دیکھئے، بلا اختیار میری طرح شاید آپ کی زبان سے بھی نکلے'' واہ قرآن تیری عظمت پر قربان۔

''الوصف انما یذکر للمبالغة فای مبالغة تحصل فی وصف الکافر بانه فاسق''

یہ ایک سوال کیا گیا کہ ''فسق'' کا معنی ہے حد سے تجاوز کرنا، اس وصف میں مبالغہ پایا گیا، اس سے مراد تو کافر ہے، لیکن کافر کو فاسق کہنے کی وجہ کیا ہے؟

تو اس کا جواب دیتے ہوئے علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

''الکافر قدیکون عدلافی دینه وقدیکون فاسقافی دینه فیکون مردوداعندالطوائف کلهم لان المسلمین لایقبلونه لکفره والکفار لایقبلونه لکونه فاسقافیمابینهم، فکانه قیل اهل الکتاب فریقان منهم من آمن، والذین ماآمنوافهم فاسقون فی ادیانهم فلیسوا ممن یجب الاقتداء بهم البتة عن احدمن العقلاء''

کافر بھی اپنے دین میں عادل ہوتا ہے، یعنی دوسرے کافر اسے عادل کہتے ہیں، وہ کافروں کے نزدیک مقبول ہوتا ہے، اور کبھی کافر اپنے دین میں فاسق ہوتا ہے، حد سے تجاوز کرنے والا ظالم ہوتا ہے، یہ فاسق تمام کے نزدیک مردود ہوتا ہے، مومن تو اسے اس لئے قبول نہیں کرتے کہ وہ کافر ہے، لیکن دوسرے کافر بھی اسے قبول نہیں کرتے کہ وہ فاسق ہے گویا کہ یوں بیان کیا گیا کہ اہل کتاب کے دو فریق ہیں، بعض وہ ہیں جنہوں نے ایمان قبول نہیں کیا وہ حقیقت میں اپنے اپنے دین میں فاسق ہی ہیں، خواہ کافران کو فاسق سمجھیں یا نہ سمجھیں، لھذا کسی عقلمند شخص کے لائق نہیں کہ وہ کسی کافر کی اقتداء کرے۔ (کبیر)

بات صرف سمجھنے کی ہے کہ کافر لوگ کسی کافر کو عادل کہتے ہیں اور کسی کو فاسق، لیکن اسلام ہر کافر کو فاسق کہتا ہے کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کافر ہو اور فاسق نہ ہو۔

''امة'' کا کیا مطلب؟

''الامة الطائفة المجتمعة علی الشئی الواحد'' امت کا لغوی معنی ایک گروہ جو ایک چیز پر متفق ہو جائیں

نبی کریم ﷺ کی امت کی دو قسمیں ہیں، امت دعوت اور امت اجابت، امت دعوت میں تمام مؤمنین اور کافرین آتے ہیں، کیونکہ امت دعوت کا مطلب ہی یہ ہے کہ آپ نے جن لوگوں کو دعوت اسلام دی، آپ نے چونکہ دعوت اسلام تو لوگوں کو

دی اس لئے تمام ہی امت دعوت میں شامل ہیں لیکن امت اجابت وہ ہے "ھم الجماعة الموصوفون بالایمان به والاقرار بنبوته" جن لوگوں نے ایمان لایا اور آپ کی نبوت کا اقرار کیا۔ اگر مطلقا آپ کی امت کا لفظ آئے تو اس وقت آپ کی امت اجابت مراد ہوتی ہے جنہوں نے آپ پر ایمان لایا ہے، جیسا کہ آپ کا اپنا ارشاد گرامی ہے "امتی لاتجتمع علی ضلالة" میری امت گمراہی پر مجتمع (جمع) نہیں ہوگی، اور قیامت کے دن آپ فرمائیں گے "امتی امتی" یہ تو میری امت کے لوگ ہیں، ان ارشادات سے مراد آپ کی امت کے ایماندار لوگ ہیں، کافر مراد نہیں، اگر آپ کی امت دعوت کا ذکر کرنا مقصود ہو تو وہاں صرف امت کا ذکر نہیں ہوگا، بلکہ "امت دعوت" مکمل الفاظ آئیں گے۔ (از کبیر)

افضلیت امت مصطفیٰ کریم ﷺ پر احادیث مبارکہ:

❁ عن ابن مسعود ان رسول الله ﷺ قال خیر الناس قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم" (بخاری)

حضرت ابن مسعود ؓ فرماتے ہیں، بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگوں میں سے بہتر میرا زمانہ ہے، پھر ان لوگوں کا جن کا ان کے بعد متصل آنے والے ہیں، پھر ان لوگوں کا جو ان کے بعد متصل آنے والے ہیں۔ قوله "خیر الناس قرنی یعنی اصحابی" نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی "لوگوں سے بہتر میرا زمانہ ہے" اس سے مراد "میرے صحابہ کا زمانہ" ہے۔

"والقرن اهل كل زمان ماخوذ من الاقتران فكانه الزمان الذی یقترن فیه اهل ذلك الزمان فی اعمارهم واحوالهم"

"قرن" کا لفظ معنوی لحاظ پر "اقتران" سے ماخوذ ہے، یعنی ایک زمانہ میں عمر گذارنے والے لوگ، اور ایک قسم کے احوال رکھنے والے، مراد اس سے ہم زمان لوگ۔ (ماخوذ از خازن)

اسی حدیث کو نقل کرنے کے بعد علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"وهذا یدل علی ان اول هذه الامة ممن بعدهم والی هذ ذهب معظم العلماء وان من صحب النبی ﷺ ورآه ولو مرة فی عمره افضل ممن یاتی بعده وان فضیلة الصحبة لا یعدلها عمل"

یہ حدیث اس پر دلالت کر رہی ہے کہ اس امت کے اول لوگ بعد میں آنے والوں سے افضل ہیں، عظیم علماء کرام کا یہی فیصلہ ہے کہ جن خوش بخت لوگوں کو نبی کریم کی زیارت ایک مرتبہ اپنی عمر میں حاصل ہوئی، خواہ بہت ہی قلیل، اسی طرح نابینا صحابہ کو ایک مرتبہ آپ کی صحبت میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا ہو تو وہ بعد میں آنے والوں سے

افضل ہیں، کیونکہ کوئی عمل صحابیت کی فضیلت کو نہیں پا سکتا۔ (قرطبی)

تنبیہ: کئی احادیث میں بعد میں آنے والے لوگوں کی فضیلت نظر آتی ہے، لیکن ان سے مراد، بعد میں آنے والے لوگوں کی حضور ﷺ سے شدید محبت کا ذکر ہے، یا ان کا آپ کو بغیر دیکھے ایمان لانے کا ذکر خیر ہے، یا صحابہ کرام سے تشبیہ ہے ورنہ حقیقت میں صحابہ کرام کا مرتبہ دوسرے لوگوں سے افضل ہے، آیئے وہ احادیث دیکھئے جن میں بظاہر بعد میں آنے والوں کی فضیلت کا ذکر ہے۔

❁ **روی ابو امامة ان النبی ﷺ قال طوبی لمن رآنی و آمن بی وطوبی سبع مرات لمن لم یرنی و آمن بی"**

ابو امامہ نے فرمایا بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا مبارک ہے اس شخص کیلئے جس نے مجھے دیکھا اور میرے ساتھ ایمان لایا اور سات مرتبہ مبارک ہو اس شخص کیلئے جس نے مجھے نہیں دیکھا اور مجھ پر ایمان لایا۔ (منقول از قرطبی)

اس حدیث سے بھی بعد میں آنے والوں کی افضلیت نہیں ثابت ہو رہی البتہ بغیر دیکھے ایمان لانے پر تعجب کا اظہار کیا گیا اور ان کی تعریف کی گئی۔

❁ **وفی مسند ابی داود الطیالسی عن محمد بن ابی حمید عن زید بن اسلم عن ابیه عن عمر قال کنت جالسا عند رسول الله ﷺ فقال اتدرون ای الخلق افضل ایمانا؟ قلنا الملائکة" قال وحق لهم بل غیرهم "قلنا الانبیاء، قال" وحق لهم بل غیرهم ثم قال رسول الله ﷺ افضل الخلق ایمانا قوم فی اصلاب الرجال یؤمنون بی ولم یرونی یجدون ورقا فیعملون بما فیها فهم افضل الخلق ایمانا"**

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، میں رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا، تو آپ نے فرمایا کیا تمہیں معلوم ہے کہ کون سی مخلوق افضل ہے از روئے ایمان کے؟ ہم نے عرض کیا "وہ فرشتے ہیں" آپ نے فرمایا وہ تو ٹھیک ہیں، لیکن میرا سوال اور لوگوں کے بارے میں ہے، ہم نے پھر عرض کیا وہ انبیاء کرام ہیں، آپ نے فرمایا یہ بات بھی حق ہے، لیکن میری مراد کچھ اور لوگ ہیں، پھر آپ نے خود ہی ارشاد فرمایا ایمان کے لحاظ پر افضل مخلوق ابھی تک اپنے آباء (باپوں) کی پشتوں میں ہے جو میرے ساتھ ایمان لائیں گے حالانکہ انہوں نے مجھے دیکھا نہیں ہوگا، وہ (کتاب وسنۃ کے) اوراق پائیں، ان میں جو ہوگا اس کے مطابق عمل کریں گے وہ ایمان کے لحاظ پر مخلوق سے افضل ہوں گے۔ (منقول از قرطبی)

اس حدیث پاک سے بھی بعد میں آنے والوں کے بغیر دیکھے ایمان لانے کی تعریف کی گئی، مطلقاً صحابہ کرام

سے افضلیت ثابت نہیں۔

❁ وروی صالح بن جبیر عن ابی جمعة قال قلنایارسول الله هل احدخیر مناقال نعم قوم یجیئون من بعدکم فیجدون کتابابین لوحین فیؤمنون بمافیه ویؤمنون بی ولم یرونی "

ابو جمعہ نے فرمایا کہ ہم نے عرض کیا یارسول اللہ کیا ہم سے بھی کوئی بہتر ہے؟ آپ نے فرمایا، ہاں وہ قوم جو تمہارے بعد میں آئے گی، وہ دو تختیوں (گتوں) کے درمیان کتاب پائیں گے، اس میں جو کچھ ہوگا اس پر وہ ایمان لائیں گے، اور مجھ پر ایمان لائیں گے حالانکہ انہوں نے مجھے دیکھا نہیں ہوگا۔ (منقول از قرطبی)

ان تمام احادیث سے شدت محبت سمجھ آرہی ہے کہ وہ کتنے محبت والے لوگ ہوں گے جو مجھے دیکھے بغیر مجھ پر ایمان لائیں گے، شدت محبت پر حدیث مسلم بہت واضح ہے۔ (منقول از قرطبی)

❁ عن ابی هریرة ان رسول اللها قال من اشدامتی الی حباناس یکونون بعدی یوداحدهم لورآنی باهله وماله"

(مسلم جلد ثانی صفحه نمبر ۳۸۷، کتاب الجنة وصفة نعیمهاو اهلها)

حضرت ابوھریرہ ﷛ فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، لوگوں میں سے شدید محبوب مجھے وہ لوگ ہیں جو میرے بعد میں آئیں گے (وہ میرے ساتھ اتنی محبت کریں گے) کہ ان کی تمنا یہ ہوگی کہ کاش وہ مجھے دیکھ لیں اگر اہل وعیال اور مال ہی قربان کیوں نہ کرنا پڑتا، اس حدیث سے واضح ہوا کہ بعد میں آنے والے، نبی کریم ﷺ سے شدید محبت کریں گے اور رسول اللہ ﷺ کو بھی ان سے شدید محبت تھی لیکن صحابہ کرام پر افضلیت اور برتری اس حدیث سے ثابت نہیں ہوتی۔ **دوسری** وجہ ان احادیث سے صحابہ کرام سے تشبیہ کو ثابت کرنا ہے، جیسا کہ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے وضاحت کی۔

"وقدقیل فی توجیه احادیث هذاالباب ان قرنه انمافضل لانهم کانواغرباء فی ایمانهم لکثرة الکفاروصبرهم علی اذاهم وتمسکهم بدینهم و ان اواخرهذه الامة اذااقاموا الدین وتمسکوابه وصبرواعلی طاعة ربهم فی حین ظهور الشرو الفسق والهرج والمعاصی والکبائرکانواعندذلک ایضاغرباء وزکت اعمالهم فی ذلک الوقت کمازکت اعمال اوائلهم "

ان احادیث میں جن میں بظاہر بعد میں آنے والے لوگوں کی افضلیت سمجھ آتی ہے ان کی وجہ یہ بیان کی گئی

کہ یہ بات تو یقینی ہے کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کا زمانہ افضل تھا، ان لوگوں کو فضیلت دی گئی وہ اپنے ایمان میں غریب الوطن مسافرین کی طرح تھے، کفار کی تعداد زیادہ تھی، اور صحابہ کرام صبر سے کام لے رہے تھے، اور اپنے دین پر پختگی سے قائم تھے، ان سے تشبیہ دیتے ہوئے گویا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے ارشادات سے یوں فرمادیا کہ بیشک اس امت کے بعد میں آنے والے جب دین پر قائم رہیں گے، دین سے مضبوطی سے سہارا لگائے ہوں گے، اور وہ اپنے رب کی فرمانبرداری میں اس وقت صبر کریں گے جبکہ شر ظاہر ہوگا، فسق وفجور، قتل وغارت، اور بڑے بڑے جرائم اور ہر طرف نافرمانیوں کا دور ہوگا، اس وقت بعد میں آنے والے لوگ بھی پہلے دور یعنی صحابہ کرام کی طرح غریب الوطن مسافرین کی طرح بے سروسامان ہوں گے، اور اس وقت ان کے اعمال اسی طرح پاکیزہ ہوں گے جیسے پہلے لوگوں کے اعمال پاکیزہ تھے۔ (منقول از قرطبی)

یہی مطلب جو بیان کیا گیا اس پر نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے۔

❁ قال ﷺ بدأ الاسلام غریبا وسیعود کما بدأ فطوبی للغرباء" نبی کریم ﷺ نے فرمایا اسلام بے سروسامانی کی حالت میں شروع ہوا، پھر اسی حالت کی طرف لوٹ آئے گا، تو مبارک ہے ان لوگوں کیلئے جو بے سروسامانی میں (دین کی آبیاری کرنے والے) ہوں گے۔ (منقول از قرطبی)

❁ روی عن انس قال قال رسول الله ﷺ مثل امتی مثل المطر لایدری اوله خیر ام آخره"
(ذکره ابو داؤد الطیاسی وابو عیسی الترمذی)

حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت کی مثال بارش کی طرح ہے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس کا پہلا قطرہ بہتر ہے یا آخری بہتر ہے۔ (منقول از قرطبی)

(اس حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو یہ پتہ نہیں ہوگا کہ پہلے لوگوں میں ایمان لانے والے ایمان پر قائم رہے گا یا بعد میں ایمان لانے والا ایمان پر قائم رہے گا، کیونکہ صحابہ کرام کے دور میں کئی لوگ (العیاذ باللہ) مرتد ہو گئے لیکن بعد کے دور میں بفضلہٖ تعالیٰ کتنے ہی لوگ وہ ہیں جو ابتداء سے انتہاء تک ایمان پر قائم رہیں گے) (راقم)

❁ روی ان عمر بن عبدالعزیز لماولی الخلافة کتب الی سالم بن عبدالله ان اکتب الی بسیرة عمر بن الخطاب لأعمل بها، فکتب الیه سالم "ان عملت بسیرة عمر فانت افضل من عمر لان زمانک لیس کزمان عمر ولا رجالک کرجال عمر قال و کتب الی فقهاء زمانه فکلهم کتب الیه بمثل قول سالم" (منقول از قرطبی)

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ جب خلیفہ بنے تو انہوں نے سالم بن عبداللہ بن عمر بن خطاب کی طرف خط لکھا

کہ تم میری طرف حضرت عمرؓ کی سیرت لکھ کر بھیجو تا کہ میں اس پر عمل کروں، تو ان کی طرف حضرت سالم نے لکھا کہ اگر تم نے حضرت عمرؓ کی سیرت پر مکمل طور پر عمل کرلیا تو تم حضرت عمرؓ سے افضل ہو جاؤ گے کیونکہ تمہارا زمانہ حضرت عمر کے زمانہ کی طرح نہیں، اور نہ ہی تمہیں ان کے اصحاب کی طرح ساتھی مل سکتے ہیں، پھر حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے زمانہ کے کثیر فقہاء کی طرف یہی خط لکھا، لیکن سب نے جواب وہی دیا جو حضرت سالم نے جواب دیا تھا۔

مطلب واضح ہے:

کہ حضرت سالمؓ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جب تمہیں حضرت عمرؓ کا زمانہ حاصل نہیں، اور ان کے اصحاب کی طرح تمہیں اصحاب میسر نہیں تو تم ان کی سیرت پر کامل عمل تو نہیں کر سکتے، اگر بالفرض ان کی طرح تم کامل عمل کر سکتے تو ان سے افضل ہوتے، لیکن تمہارا ان سے افضل ہونا ممکن نہیں۔ (راقم)

❁ **عن عمربن الخطاب "بسندحسن" قال رسول الله ﷺ الجنة حرمت على الانبياء حتى ادخلهاوحرمت على الامم حتى يدخلهاامتي"** (رواه الطبرانی فی الاوسط)

حضرت عمر بن خطابؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت انبیاء کرام پر حرام ہوگی یہاں تک کہ میں اس میں داخل ہو جاؤں، اور امتوں پر جنت حرام ہوگی، یہاں تک کہ میری امت داخل ہو جائے۔ (منقول از مظہری)

مطلب واضح ہے کہ جنت میں مجھ سے پہلے انبیاء کرام داخل نہیں ہو سکیں گے، اور میری امت سے پہلے کوئی امت داخل نہیں ہو سکے گی۔

❁ **وروی (ایضا) عن ابن عباس مرفوعا الجنة محرمة على جميع الامم حتى ادخلهااناوامتي الاول فالاول"**

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوع حدیث مروی کہ (نبی کریم ﷺ نے فرمایا) جنت تمام امتوں پر حرام ہوگی یہاں تک کہ میں اور میری امت اس میں داخل ہو جائیں، درجہ بدرجہ اس میں داخل ہوں گے۔ (منقول از مظہری)

(یعنی پہلے زیادہ مرتبہ والے پھر ان سے کم مرتبہ والے، پھر ان سے کم)

❁ **عن جابر قال قال رسول الله ﷺ انی لارجوان يكون من تبعنی ربع اهل الجنة ثم قال ارجوان يكون ثلث اهل الجنة ثم قال ارجوان يكون الشطر"** (رواہ احمد والبزار والطبرانی بسند صحیح)

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: امید کرتا ہوں میرے متبعین (میری امت کے

میری تابعداری کرنے والے) تمام جنتیوں کا چوتھائی حصہ ہوں گے، پھر آپ نے فرمایا میں امید کرتا ہوں کہ وہ تمام جنتیوں کا تہائی درجہ ہوں گے، پھر آپ نے فرمایا کہ میں امید کرتا ہوں کہ وہ تمام جنتیوں کے نصف برابر ہوں گے۔ (منقول از مظہری)

❁ عن بهزبن حكيم عن ابيه عن جده قال قال رسول الله ﷺ انكم تتمون سبعين امة انتم خيرها واكرمها على الله عزوجل" (رواه الترمذی وحسنه وابن ماجه والدارمی)

بہز بن حکیم اپنے باپ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک تم ستر امتوں کی تکمیل کرنے والے ہو، تم ان تمام سے بہتر اور مکرم ہو اللہ تعالیٰ کے ہاں۔ (منقول از مظہری)

مطلب واضح ہے کہ تم بہت سی امتوں پر زیادہ تعداد میں ہو گے، دوسرے احادیث سے واضح ہے کہ آپ کی امت دو تہائی ہوگی، اور ساری امتیں مجموعی طور پر ایک تہائی ہوں گی، حدیث شریف میں ستر کا ذکر کثرت کیلئے استعمال ہے، معین تعداد کیلئے نہیں، محاورہ عرب یہی تھا کہ کثرت کو ستر سے تعبیر کر دیا جاتا تھا۔

❁ وقال رسول الله ﷺ اهل الجنة عشرون ومائة صفالمانون منهامن هذه الامة والباقون من سائر الامم" (رواه الترمذی وحسنه والحاکم وصححه وروى الطبرانى مثله من حديث ابى موسى وابن عباس ومعاية بن جندة وابن مسعود)

حضرت ابوموسیٰ اور ابن عباس اور معاویہ بن جندہ اور ابن مسعود ؓ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جنت والے تمام لوگوں کی ایک سو بیس صفیں ہوں گی جن میں اسی صفیں اس (میری) امت کی ہوں گی، اور باقی (چالیس) صفیں تمام امتوں کی مجموعی ہوں گی۔

❁ وقال ﷺ ان الله تجاوزعن امتى الخطاء والنسيان وماastكرهوا عليه"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے میری امت کی خطاء اور بھول اور جبری طور پر کام کرانے سے درگذر فرمایا۔ (رواه ابن ماجة والبيهقى)

❁ عن بريدة عن رسول الله ﷺ قال مامن احدمن اصحابى يموت بارض الابعث قائداونورالهم يوم القيامة" (رواه الترمذی)

حضرت بریدہ ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرا صحابہ میں سے کوئی ایک (بھی) نہیں جو کسی زمین میں فوت ہو جائے مگر یہ کہ اسے قائد اور نور بنا کر قیامت کے دن اٹھایا جائے گا۔ (منقول از مظہری)

❁ عن ابى هريرة قال قال رسول الله ﷺ كل امتى يدخلون الجنة الامن ابى قالواومن يابى؟قال من اطاعنى دخل الجنة ومن عصانى فقدابى" (رواه البخاری)

حضرت ابوھریرہ ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری تمام امت جنت میں داخل ہوگی سوائے اس کے جس نے انکار کیا، صحابہ نے پوچھا، انکار کرنے والے کون ہوں گے؟ آپ نے فرمایا جنہوں نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوں گے اور جنہوں نے میری نافرمانی کی وہ انکار کرنے والے ہیں (یعنی وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گے۔ (منقول از خازن)

خیال رہے کہ جب حدیث شریف میں "وَمَنْ عَصَانِیْ" کا معنی یہ لیا جائے کہ میری امت کے مؤمنین جب گنہگار، نافرمان ہو جائیں تو وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گے۔

❁ عن ابی امامة قال سمعت رسول الله ﷺ یقول وعدنی ربی ان یدخل من امتی الجنة سبعون الفا لاحساب علیهم و لاعذاب و مع کل الف سبعون الفا" (بخاری)

حضرت ابو امامہ ﷺ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا میرے رب نے میرے ساتھ وعدہ فرمایا کہ میری امت میں سے ستر ہزار کو بغیر حساب عذاب کے جنت میں داخل کرے گا، اور ہر ایک ہزار کے ساتھ ستر ہزار اور داخل کرے گا۔ (منقول از خازن)

❁ عن ابی بکر الصدیق ﷺ قال قال رسول الله ﷺ اعطیت سبعین الفا یدخلون الجنة بغیر حساب وجوههم کالقمر لیلة البدر قلوبهم علی قلب رجل واحد فاستزدت ربی فزادنی مع کل واحد سبعین الفا" (رواه احمد)

حضرت ابو بکر صدیق ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ستر ہزار جنت میں بغیر حساب کے داخل کرنے کا انعام دیا گیا، جن کے چہرے چودھویں کی رات کی طرح چمکدار ہوں گے، اور ان کے دل ایک آدمی کا دل ہوں گے، (یعنی وہ متفق و متحد ہوں گے) میں نے اپنے رب سے (اپنی امت کے لوگوں کی بخشش کی) زیادتی طلب کی تو رب تعالیٰ مجھے ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار ستر ہزار جنت میں داخل کرنے کا وعدہ فرمالیا۔

❁ عن ابن عباس عن النبی ﷺ انه قال عرضت علی الأمم فرایت النبی ومعه الرهیط والنبی ومعه الرجل والرجلان والنبی ولیس معه احد اذ رفع لی سواد عظیم فظننت انهم امتی، فقیل لی هذا موسی وقومه، ولکن انظر الی الافق فنظرت فاذا سواد عظیم فقیل لی انظر الی الافق الآخر فاذا سواد عظیم فقیل لی هذه امتک ومعهم سبعون الفا یدخلون الجنة بغیر حساب ولاعذاب، ثم نهض فدخل منزله فخاض الناس فی اولئک الذین یدخلون الجنة بغیر حساب ولاعذاب فقال بعضهم فلعلهم الذین صحبوا رسول الله ﷺ وقال بعضهم فلعلهم الذین ولدوا فی الاسلام ولم یشرکوا بالله

شیاوذکروااشیاء فخرج علیهم رسول الله ﷺفقال ماالذی تخوضون فیه؟فاخبروه فقال هم الذین لایرقون ولایسترقون ولایکتوون ولایتطیرون وعلی ربهم یتوکلون،فقام عکاشة بن محصن فقال ادع الله ان یجعلنی منهم،قال انت منهم، ثم قام رجل آخرفقال ادع الله ان یجعلنی منهم،قال سبقک بها عکاشة" (رواه مسلم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھ پر امتیں پیش کی گئیں، میں نے کسی نبی کو دیکھا، ان کے ساتھ (ان کی امت) ایک چھوٹا سا قبیلہ تھا، اور کسی نبی کو دیکھا، ان کے ساتھ ایک یا دو آدمی تھے، اور کسی نبی کو دیکھا ان کے ساتھ کوئی ایک شخص نہیں تھا، اسی دوران ایک بہت بڑی جماعت میرے سامنے آئی، میں نے خیال کیا، یہ میری امت ہوگی، مجھے بتایا گیا یہ موسیٰ (علیہ السلام) اور ان کی قوم (آرہی) ہے، لیکن تم (آسمان کے) ایک کنارے کی طرف دیکھو، تو میں نے ایک بہت بڑی جماعت کو دیکھا، پھر مجھے کہا گیا دوسرے کنارے کی طرف دیکھو ادھر بھی ایک بہت بڑی جماعت تھی، پھر مجھے بتایا گیا یہ تمہاری امت ہے، اور ان کے ساتھ ستر ہزار وہ لوگ تھے جو بغیر حساب اور عذاب کے جنت میں داخل ہو جائیں گے، پھر آپ اٹھے اور اپنے گھر تشریف لے گئے، تو لوگوں نے غور وفکر شروع کیا کہ وہ کون لوگ ہوں گے جو بغیر حساب اور بغیر عذاب کے جنت میں داخل ہوں گے؟ بعض حضرات کہنے لگے وہ نبی کریم ﷺ کی مصاحبت میں رہنے والے ہوں گے (یعنی صحابہ کرام ہوں گے) بعض لوگ کہنے لگے کہ یہ وہ حضرات ہوں گے جن کی پیدائش اسلام پر ہوئی، اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی شریک نہیں ٹھہرایا، اسی طرح لوگوں نے چند چیزوں کا ذکر کیا (یعنی اپنی اپنی رائے پیش کی کہ وہ فلاں لوگ ہوں گے، وہ فلاں لوگ ہوں گے) تو نبی کریم ﷺ تشریف لے آئے، آپ نے فرمایا "تم کس چیز میں غور وفکر کر رہے ہو؟ صحابہ کرام نے آپ کو خبر دی (کہ ہم ان لوگوں کے متعلق غور وفکر کر رہے ہیں کہ وہ کون لوگ ہوں گے جو بغیر حساب وعذاب کے جنت میں داخل ہوں گے) تو آپ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہوں گے جو جنتر منتر نہ کریں گے اور نہ کروائیں گے، اور داغ نہیں دیں گے اور فال نہیں نکالیں گے، اپنے رب پر توکل کریں گے، عکاشہ بن محصن کھڑے ہوئے، آپ نے عرض کیا آپ اللہ تعالیٰ سے دعاء کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان سے کردے، تو آپ نے فرمایا تم ان میں سے ہی ہو گے، پھر ایک اور شخص (انصار میں سے) کھڑے ہوئے، عرض کیا، آپ اللہ تعال سے دعاء کریں کہ مجھے ان میں سے کردے، آپ نے فرمایا "عکاشہ تم سے سبقت لے گئے" (منقول از ابن کثیر وصابونی)

خیال رہے جنتر منتر اور فال کی بحث پہلے پارہ میں تفصیلی طور پر بیان کی جاچکی ہے۔

❁ واخرج احمد بسند عن علی (ﷺ) قال قال رسول الله ﷺ اعطیت مالم یعط احد من الانبیاء نصرت بالرعب واعطیت مفاتیح الارض وسمیت احمد وجعل التراب لی طهورا وجعلت امتی خیر الامم"

مسند احمد میں مسند حسن سے حضرت علی ﷺ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے وہ دیا گیا جو انبیاء کرام میں سے کسی ایک کو بھی نہیں دیا گیا، میری رعب سے امداد کی گئی، مجھے زمین کی چابیاں دے دی گئیں، اور میرا نام احمد رکھا گیا، اور مٹی میرے لئے پاک کرنے والی بنائی گئی (کیونکہ تیمم سے پاکیزگی حاصل ہونا اس امت کی خصوصیت ہے) اور میری امت کو سب امتوں سے افضل بنایا گیا۔ (منقول از در منثور)

❁ واخرج عبد بن حمید وابن ابی حاتم عن عطیة فی الآیة قال خیر الناس للناس شهدتهم للنبیین الذین کذبهم قومهم بالبلاغ"

عطیہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ سب لوگوں سے بہتر تم لوگ ہو کیونکہ تم انبیاء کرام کے حق میں گواہی دو گے جب ان کی قومیں ان کی تبلیغ کی تکذیب کریں گے۔ (منقول از در منثور)

فائدہ: (وتؤمنون بالله) ای ایمانا متعلقا بکل مایجب ان یؤمن به من رسول و کتاب وحساب وجزاء"

آیۂ کریمہ میں جو ارشاد ہے "وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ" (اور تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر) اس سے مراد ہر اس چیز پر ایمان رکھنا ضروری ہے جس پر ایمان رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، یعنی تمہارا ایمان رسولوں پر اور اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر اور حساب اور جزاء (یعنی یوم آخرت) پر ہے۔ (تفسیر ابی السعود)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

(للناس) انما عبر باللام دون من اشارة الی ان هذه الامة نفع ورحمة لنفسها وللخلق عموما فی الدنیا بالدعاء لجمیع الامم وفی الآخرة بالشهادة للانبیاء"

(للناس) میں لام ذکر کیا ہے "من" نہیں ذکر کیا، یعنی "مِنَ النَّاسِ" نہیں کہا، اس سے اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ امت اپنے لئے بھی نفع اور رحمت ہے، اور تمام مخلوق کیلئے بھی، کیونکہ تمام امتوں کیلئے دعاء کریں گے دنیا میں، اور آخرت میں انبیاء کرام کے حق میں گواہی دیں گے۔ (صاوی)

خطاب کا فائدہ: (کنتم) خطاب کا صیغہ ہے، غیب کے صیغہ سے خبر نہیں دی گئی جس کا فائدہ یہ ہے۔

واختیرت صیغة الخطاب تشریفا لهم واشارة الی رفع الحجب عنهم حیث خاطبهم ولم یخبر عنهم وانهم مقربون من حضرة الله"

کہ اس امت کی شرافت وفضیلت ظاہر کرنا مقصود ہے، کہ ان کو خطاب کر کے گویا کہ ان سے حجاب اٹھایا گیا، غیب کے صیغہ سے صرف خبر نہیں دی گئی تا کہ ان کا اللہ تعالی کا مقرب ہونا سمجھ آئے۔ (صاوی)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿﴾ (آیۃ نمبر ۱۱۱)

(1) وہ تمہارا کچھ نہ بگاڑیں گے مگر یہی ستانا اور اگر تم سے لڑیں تو تمہارے سامنے سے پیٹھ پھیر جائیں گے، پھر ان کی مدد نہ ہوگی۔ (کنزالایمان)

(2) ہرگز وہ ضرر نہیں پہنچا سکیں گے تمہیں مگر ستانا، اور اگر وہ لڑائی کریں تمہارے ساتھ وہ پھیر جائیں گے تم سے پیٹھ، پھر ان کی مدد نہیں کی جائے گا۔ (نجوم الفرقان)

شان نزول:

یہودی رئیسوں نے جب ایمان لانے والے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھیوں کو ان کے اسلام لانے پر ستانا شروع کیا تو اس وقت اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا گیا۔

(لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى) یعنی لن یضروکم ایھاالمؤمنون ہؤلاء الیھود الاذی یعنی باللسان من طعنھم فی دینکم اوتھدیدا والقاء شبھة وتشکیک فی القلوب وکل ذلک یوجب الاذی والغم"

یعنی اے مومنو یہ یہود تمہیں ہرگز کوئی ضرر (تکلیف) نہیں پہنچا سکیں گے سوائے ستانے کے، یعنی زبان سے وہ تمہارے دین میں طعن کریں گے، تمہیں دھمکیاں دیں گے، اور دین کے متعلق تمہارے دلوں میں شکوک وشبہات ڈالیں گے، یہ تمام چیزیں تمہیں ستانے اور غم میں ڈالنے کا ذریعہ ہوں گی۔ (ماخوذ از خازن)

﴿وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ﴾

اگر وہ تمہارے ساتھ لڑائی کریں تو وہ تم سے پیٹھ پھیر جائیں گے، پھر ان کی امداد نہیں کی جائے گی۔

"هكذا وقع فانهم يوم خيبر اذلهم الله وارغم انوفهم وكذلك من قبلهم من يهود المدنية بني قينقاع وبني النضير وبني قريظة كلهم اذلهم الله"

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی واضح طور پر سچا ہو چکا ہے، خیبر میں اللہ تعالیٰ نے یہود کو شکست دے کر ذلیل کیا اور ان کا ناک خاک آلود کیا، اور اسی طرح خیبر سے پہلے مدینہ طیبہ کے یہود بنی قینقاع اور بنی نضیر اور بنی قریظہ کو اللہ تعالیٰ نے ذلیل کیا، مسلمانوں کے مقابل ان کو شکست ہوئی، اور اللہ تعالیٰ نے ان کی کوئی امداد نہیں فرمائی۔ (صابونی، ابن کثیر)

یہود کے ستانے کے مختلف انداز:

کبھی نبی کریم ﷺ پر طعن کر کے مسلمانوں کو ستایا گیا، اور کبھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر طعن کر کے مسلمانوں کو ستایا گیا، کسی نبی کی شان میں کوئی نازیبا الفاظ استعمال کئے جائیں تو مسلمان کو اذیت پہنچتی ہے، اور مسلمان کا خون کھول اٹھتا ہے، کبھی یہود کلمات کفر اپنی زبانوں پر جاری کر کے مسلمانوں کو ستاتے، اور حضرت عزیز علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہہ کر کبھی ستاتے۔ اگرچہ آیۃ کریمہ یہود کے بارے میں نازل ہوئی لیکن "الکفر ملة واحدة" (کافر سب ایک گروہ ہیں) کے مصداق کے مطابق نصرانیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رب تعالیٰ کا بیٹا کہہ کر، اور بعض نصرانیوں نے مستقل خدا کہہ کر اور بعض نصرانیوں تین خداؤں میں سے ایک خدا عیسیٰ ہیں کہہ کر ستایا، یہود کی طرح نصرانیوں نے بھی مسلمانوں کے دلوں میں شکوک وشبہات ڈال کر مسلمانوں کو ستایا۔

آیۃ کریمہ غیبی خبروں پر مشتمل:

واعلم ان هذه الآية اشتملت على الاخبار عن غيوب كثيرة، منها ان المؤمنين آمنون ضررهم ومنها انه لايحصل لهم قوة وشوكة بعد الانهزام، وكل هذه الاخبار وقعت كما اخبر الله عنها فان اليهود لم يقاتلوا الا انهزموا وما اقدموا على محاربة وطلب رياسة الا خذلوا وكل ذلك اخبار عن الغيب فيكون معجزا"

یقینی بات ہے کہ یہ آیۃ کریمہ بہت سی غیبی خبروں پر مشتمل ہے، یعنی یہ بیان کیا گیا کہ مؤمنین یہودیوں کے ضرر سے امن میں رہیں گے، اور یہ بتایا گیا کہ اگر مؤمنین سے انہوں نے لڑائی کی تو ان کو شکست

ہوگی، اور یہ بتایا گیا کہ شکست کے بعدان کو قوت وشوکت حاصل نہیں ہوگی، یہ تمام غیبی خبریں ہیں جو نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہیں۔ (کبیر)

فائدہ: قرآن پاک کی اس ایک آیۃ کریمہ میں کئی غیبی خبریں نبی کریم ﷺ کو دی گئیں، سارے قرآن پاک میں کتنی ہی غیبی خبریں دی گئیں، اہل علم سے مخفی نہیں، غیبی خبریں نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے، معجزہ کا انکار روز روشن کے انکار کے مترادف ہے۔ (راقم)

مقام توجہ: آج تک یہود اپنے قدموں پر نہیں کھڑے ہو سکے اور قیامت تک ان شاءاللہ وہ ذلیل ہوتے رہیں گے، باوجود اس کے کہ خونخوار درندہ امریکہ ان کی پشت پناہی کر رہا ہے، انہیں اسلحہ دے رہا ہے، لیکن کبھی چند فلسطینی بنی اسرائیل (یہودیوں) کی نیند حرام کر دیتے ہیں، چند بے سروسامان مسلمانوں کے ہاتھوں اسے ذلت اٹھانی پڑتی ہے، اور آجکل لبنانی حزب اللہ کے ہاتھوں ذلیل ہو رہا ہے، اگر چہ اسلامی حکومتوں میں گھسے ہوئے قادیانی بھی امریکیوں کی طرح یہودیوں (بنی اسرائیل) کی پشت پناہی کر رہے ہیں لیکن پھر بھی وہ ذلیل وخوار ہو رہے ہیں، سبحان اللہ مولائے کائنات تیرے وعدے کتنے سچے، پکے حق پر مبنی ہیں جن کو دیکھ کر انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ مسلح یہودی امریکہ کی امداد کے باوجود مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی جماعتوں سے ذلیل ہو رہے ہیں۔ (راقم)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

﴿ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ﴾ میں لفظ "ثم" ذکر کیا گیا جو تراخی رتبی پر دلالت کر رہا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ "ان الاخبار بتسليط الخذلان عليهم اعظم من الاخبار بتوليتهم الادبار" پہلے ان کا لڑائی میں پیٹھ پھیر جانے کا ذکر کیا گیا، پھر ان کی امداد نہ کرنے کا ذکر فرمایا، اس میں ان کی ذلت کا ذکر کیا گیا، ان کی رسوائی وذلت کی خبر ان کے پیٹھ پھیرنے کی خبر سے عظیم ہے۔ (کبیر)

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ○ (آیۃ نمبر ۱۱۲)

(1) ان پر جمادی گئی خواری جہاں ہوں امان نہ پائیں مگر اللہ کی ڈور اور آدمیوں کی ڈور سے اور غضب الٰہی کے سزاوار ہوئے اور ان پر جمادی گئی محتاجی یہ اس لئے کہ وہ اللہ کی آیتوں سے کفر کرتے اور پیغمبروں کو ناحق شہید کرتے یہ اس لئے کہ نافرمانبردار اور سرکش تھے۔ (کنز الایمان)

(2) مسلط کردی گئی ان پر ذلت جہاں پائے جائیں، مگر اللہ کی رسی اور لوگوں کی رسی سے، اور وہ ٹھہرے اللہ کے غضب میں، اور مسلط کردی گئی ان پر مسکینی، یہ بسبب اس کے کہ بیشک وہ کفر کرتے اللہ کی آیتوں سے اور وہ شہید کرتے انبیاء کرام کو ناحق، یہ بسبب اس کے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے تجاوز کرتے تھے۔ (نجوم الفرقان)

﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْا﴾

"مسلط کردی گئی ان پر ذلت جہاں بھی وہ پائے گئے۔"

"والمعنى جعلت الذلة ملصقة بهم كالشئى يضرب على الشئى فيلصق به"

"ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ" کا معنی یہ ہے کہ ذلت ان کے ساتھ ملا دی گئی (یعنی چپکا دی گئی) جب ایک چیز کے اوپر دوسری چیز ہو اور وہ نیچے والی چیز سے مل جل جائے چپک جائے تو اس وقت یہ لفظ بولے جاتے ہیں "ضرب الشئی علی الشئی" کبھی ایک چیز دوسری کے اوپر آجائے، ملے اور چپکے نہیں تو اس کیلئے بھی یہی الفاظ استعمال کردیئے جاتے ہیں جیسے کہا جاتا ہے "ضرب علیهم الخباء" ان پر خیمہ لگا دیا گیا۔ "الذلة هی الذل" "ذلت" اور "ذل" کا ایک ہی معنی ہے، ان پر ذلت چھا جانے سے کیا مراد ہے؟

"ان المراد ان يحاربوا ويقتلوا وتغنم اموالهم وتسبى ذراريهم وتملک اراضيهم"

اس سے مراد یہ ہے کہ ان سے لڑائی کی جائے اور ان کو قتل کردیا جائے اور ان کی اولاد کو قید کرلیا جائے اور ان کا مال، مال غنیمت بنا لیا جائے، اور ان کی زمین کی ملکیت حاصل ہو جائے۔ (کبیر)

﴿ اَیۡنَ مَاثُقِفُوۡا ﴾ ''جہاں بھی وہ پائے جائیں۔''

یہ رب تعالیٰ کے اس ارشادِ گرامی کے مطابق ہے " اُقۡتُلُوۡهُمۡ حَیۡثُ ثَقِفۡتُمُوۡهُمۡ "ان کو قتل کرو جہاں بھی تم ان کو پاؤ۔ (کبیر)

(اَیۡنَمَاثُقِفُوۡا) وجدوا'' جہاں بھی وہ پائے جائیں ''ثقف یثقف ثقفا'' پالینا ''ثُقِفُوۡا'' مجہول ہے پالئے جائیں۔ ''فی ای مکان وای زمان وجدوافی دارالاسلام الزمواالذل'' یعنی دارِ اسلام میں جہاں بھی اور جس وقت بھی پائے جائیں ذلت ان کے ساتھ لازم کردی گئی۔ (بیضاوی، شیخ زادہ)

ان کی ذلت کی اور وجوہ:

ایک وجہ پہلے قریب ہی ذکر ہو چکی ہے، دوسری وجہ یہ ہے ''وقیل المراد ضرب الجزیة علیهم لانه یوجب الصغار ولذلة'' کہ ان پر جزیہ مقرر کر کے ان کو ذلیل کردیا جائے گا۔

''وقیل المرادبه انک لاتری فیهم ملکاقاهراولارئیسامعتبراوانماتراهم مستحقرین فی جمیع البلاد ذلیلین مهانین''

اوران کی ذلت کی تیسری وجہ یہ بیان کی گئی کہ بیشک تم ان میں کوئی قاہر بادشاہ اور کوئی معتبر رئیس نہیں دیکھو گے، بیشک تم ان کو تمام شہروں میں ذلیل ہوتا ہوا اور رسوا ہوتا ہوا دیکھو گے۔

''وقیل المرادبه کونهم اذلاء فیمابین المسلمین المؤمنین بسبب کفرهم وتمسکهم بالدین المنسوخ بل بالطریقة المخترعة الباطلة فی نفسها''

اور بعض حضرات نے ان کی ذلت کی چوتھی وجہ یہ بیان کی کہ وہ مسلمانوں، مومنوں میں کفر کی وجہ سے، اور منسوخ دین پر عمل کرنے اور اس پر سہارا لگانے کی وجہ سے ان پر ذلت مسلط کردی گئی، بلکہ ان کا اپنا من گھڑت دین ان کے ایمان و عمل کا ذریعہ تھا، جو سراسر باطل ہے، یہی وجہ ان کی ذلت کی تھی۔

سب سے بہتر قول:

والظاهرابقاء الذل علی عمومه اذلاوجه لتخصیصه بلامخصص''

ظاہر بات یہی ہے کہ ان کی ذلت کو عام رکھا جائے، کسی مخصص کے بغیر ان کے ساتھ کسی خاص ذلت کو مختص نہ کیا جائے، یعنی مراد یہ لی جائے کہ ان پر ہر قسم کی ذلت مسلط کردی گئی۔ (شیخ زادہ)

﴿اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ﴾ "مگر اللہ کی رسی اور لوگوں کی رسی سے۔"

یعنی ان پر ذلت مسلط کر دی گئی وہ جہاں بھی ہوں گے، سوائے اس کے کہ انہوں نے اللہ کی رسی اور لوگوں کی رسی کا سہارا لے لیا تو وہ ذلت سے اپنے آپ کو بچا سکیں گے۔

اللہ کی رسی سے مراد کیا ہے؟

(اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ) یعنی الا بعهد من الله وهو ان يسلموا فتزول عنهم الذلة"

اللہ تعالیٰ کی رسی سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے یوم میثاق کو کیے ہوئے وعدہ کے مطابق اسلام لے آئیں تو مکمل طور پر ان سے ذلت دور کر دی جاتی ہے، یعنی اسلام قبول کر کے انہوں نے اپنے آپ سے ذلت کو دور کر لیا۔ (خازن)

لوگوں کی رسی سے مراد کیا ہے؟

(وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ) یعنی المؤمنين ببذل الجزية "لوگوں کی رسی سے مراد یہ ہے کہ مومنوں سے جزیہ دینے کا معاہدہ کر کے دنیا میں اپنے آپ کو قتل ہونے اور اولاد کے قید کیے جانے اور مال کو مال غنیمت بنائے جانے کی ذلت سے بچا لیتے ہیں۔ (خازن)

اللہ کی رسی اور لوگوں کی رسی کا ایک اور مطلب:

ان پر ذلت اس طرح مسلط کر دی گئی جیسا کہ خیمہ کسی پر لگا دیا جائے، یہ ذلت ان پر تمام احوال میں مسلط رہے گی سوائے اس کے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری اور مسلمانوں کی ذمہ داری کا سہارا لے لیا، حبل سے مراد عہد ہے، کیونکہ یہ سبب ہے نجات کا، اور مراد پر کامیاب ہونے کا، عہد کا لفظ استعمال کریں یا ذمہ داری کا بظاہر تو دونوں جگہ پر ایک ہی لفظ "حبل" استعمال ہے، لیکن حقیقت میں فرق ہے، فرق کی وجہ ہے "وعطف قوله (وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ) علی قوله (بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ) یقتضی المغایرة "وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ" کا عطف ہے "حَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ" پر ان دونوں میں مغائرت ہے کیونکہ معطوف علیہ اور معطوف میں مغایرت پائی جاتی ہے۔

وہ وجہ فرق یہ ہے:

"قال الامام فی وجه الامان الحاصل للذمی قسمان، احدهما الذی نص الله علیه

وھو الامان الحاصل له باعطاء الجزية عن يدوقبول اياها،والثانی الامان الذی فوض الی رای الامام واجتهاده فيعطيهم الامان مجاناتارة وببدل زائداوناقص اخری علی حسب اجتهاده فالاول ھو المسمی بحبل الله والثانی ھو المسمی بحبل المؤمنين فالامانان واقعان بمباشرة المسلمين الاانهمامتغايران بالاعتبار"

امام (رازی) نے بیان کیا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ امان جو ان کو حاصل ہوتی ہے، اس کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس پر اللہ تعالیٰ نے نص بیان فرمائی۔

﴿قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ اُوتُوا الْكِتَابَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَّهُمْ صَاغِرُونَ﴾ (سورة التوبة، آية نمبر ۲۹)

لڑو ان سے جو ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور قیامت پر اور حرام نہیں مانتے اس چیز کو جس کو حرام کیا اللہ اور اس کے رسول نے اور سچے دین کے تابع نہیں ہوتے یعنی وہ جو کتاب دیے گئے جب تک اپنے ہاتھ سے جزیہ نہ دیں ذلیل ہو کر یعنی پہلی قسم امان کی وہ ہے جو نص (قرآن پاک) سے ثابت ہے، ان کا جزیہ دینا، یہ ہے "حَبْلٍ مِّنَ اللّٰہ" دوسری قسم جو حاکم ان سے صلح کرے، کبھی بغیر مال لینے کے ان سے کچھ شرائط پر صلح کر لی جاتی ہے، کبھی مقرر جزیہ سے کم مال مقرر کر کے اور کبھی زائد مال مقرر کر کے ان سے صلح کی جاتی ہے اور انہیں امان دی جاتی ہے، اسے "حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ" کہا گیا، بظاہر دونوں امانیں حاکم کی طرف سے ہی دی جاتی ہیں، لیکن ان میں فرق واضح طور پر پایا گیا ہے۔ (ماخوذ از روح البیان)

﴿ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ﴾ "اور وہ ٹھہرے اللہ کے غضب میں۔"

معناه انهم مكثوا، ولبثوا وداموا فی غضب الله" اس کا معنی یہ ہے کہ وہ ٹھہرے اور رکے اور ہمیشہ اللہ کے غضب میں رہے۔

"واصل ذلک ماخوذ من البوء وھو المکان، ومنه تبوأفلان منزل کذا، وبوأته اياه"

اصل میں "بَاءُوا" ماخوذ ہے "بوء" سے، جس کا معنی مکان، جس طرح کہا جاتا ہے "تبوأفلان منزل کذا" فلاں شخص اسطرح کے گھر میں رہا، اور یہ کہا جاتا ہے "بوأته اياه" میں نے اسے فلاں جگہ ٹھہرایا۔ (کبیر)

راقم نے تفسیر کبیر کے مطابق ترجمہ کیا ہے اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ بیضاوی اور روح المعانی کے مطابق ہے۔

"وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ" ای رجعوا به وھو کناية عن استحقاقهم له واستيجابهم اياه "

وہ اللہ تعالیٰ کے غضب سے لوٹے، اشارۃ معنی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہوئے اور انہوں نے اپنے افعال سے اللہ کے غضب کو قبول کیا۔ (روح المعانی)

﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ﴾ "اور مسلط کردی گئی ان پر مسکینی۔"

یعنی وہ غالب اوقات مسکین رہیں گے، ایسا یہودی کم ہی ملے گا جو اپنا غنی ہونا ظاہر کرے گا، وہ اپنی مسکینی کا ہی اظہار کرتے رہیں گے۔ (روح المعانی)

ان کے مسکین رہنے کی اور وجہ یہ ہے کہ ان پر جزیہ مقرر ہوگا، وہ جزیہ ادا کرنے کی وجہ سے مسکین ہوں گے، حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے یہی تفصیل بیان کی، اور وجہ یہ ہے کہ یہود کا مال مسلمانوں کے ہاتھ آیا، وہ خود مسکین ہوگئے، خیبر کی یہودیوں کا مال مسلمانوں کے ہاتھ آیا، بنو قینقاع اور بنو نضیر کا مال مسلمانوں کے ہاتھ آیا، جس کی وجہ سے وہ مسکین ہوگئے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ﴾

"یہ بسبب اس کے کہ بیشک وہ کفر کرتے اللہ کی آیتوں سے اور وہ شہید کرتے انبیاء کو ناحق۔"

پہلے تین مکروہات یہود کے ذکر فرمائے، ان کے ساتھ ذلت کو لازم کردیا گیا، اور اللہ تعالیٰ کا غضب ان کے ساتھ لازم کردیا گیا، اور مسکینی ان کیلئے لازم کردی گئی، پھر ان تینوں چیزوں کے لازم ہونے کی وجہ بیان کی گئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرتے، اور انبیاء کو ناحق کرتے۔ (کبیر)

سوال: یہ ارشاد تو میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ کے زمانہ کے یہودیوں سے ہے، حالانکہ انہوں نے تو انبیاء کرام کو شہید نہیں کیا تھا، تو اس کا کیا مطلب ہے؟

جواب: ان ھؤلاء المتاخرین وان کان لم یصدر عنھم قتل الانبیاء علیھم السلام لکنھم کانوا راضین بذلک "نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود سے اگرچہ انبیاء کرام کا قتل صادر نہیں ہوا، لیکن وہ اپنے اسلاف کے اس فعل پر راضی تھے، اس وجہ سے خطاب ان کو کیا گیا۔

﴿ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ﴾

"یہ بسبب اس کے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے تجاوز کرتے تھے۔"

(ذلک)اشارة الی کفرھم وقتلھم الانبیاء علیھم السلام علی مایقتضیه القرب فلاتکرار"
ایک احتمال یہ ہے کہ " ذلك" کا اشارہ ان کے کفر اور انبیاء کرام کو ناحق شہید کرنے کی طرف ہو، جو کا " قرب" تقاضا کرتا ہے، اس صورت میں کوئی تکرار نہیں۔ (روح المعانی)

اب مطلب یہ ہوگا کہ ان پر ذلت کا مسلط ہونا، اور ان پر مسکینی کا مسلط ہونا، اور غضب کا ان کے ساتھ لازم ہونا اس کی وجہ اور سبب ان کا کفر اور قتل الانبیاء تھا، اور کفر اور انبیاء کرام کو ناحق شہید کرنے کی وجہ اور اس کا سبب ان کی نافرمانی اور حد سے تجاوز تھا۔ **دوسرا** احتمال یہ ہے کہ کفر، قتل الانبیاء اور نافرمانی اور حد سے تجاوز کرنا تمام ہی سبب ہوں، ان پر ذلت وغیرہ کے مسلط کئے جانے کے، تو اس صورت میں مندرجہ ذیل سؤال و جواب ہوں گے۔

سؤال: (ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا) تو تکرار پر دلالت کر رہا ہے، اور تکرار کی کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی، کیونکہ تکرار آتا ہے تاکید کیلئے، اور تاکید کیلئے ضروری ہے کہ وہ مؤکد سے قوی ہو، چونکہ عصیاں میں کفر سے کمی ہے، لھذا اس کی تاکید تو ہو نہیں سکتی، تو اس تکرار کا فائدہ کیا؟

جواب: ذلت اور غضب اور مسکینی کا سبب "کفر اور قتل انبیاء" ہے، اور کفر اور قتل انبیاء کا سبب نافرمانی تھی، لیکن جب وہ مکمل طور پر نافرمانیاں ہی فرمانیاں کرتے رہے ان کے گناہ بڑھتے رہے، تو ان کا نور ایمان ضعیف ہوتا چلا گیا۔

"ولم یزل کذلک الی ان بطل نور الایمان وحصلت ظلمة الکفر"

تو اسی وجہ سے ان کا نور ایمان باطل ہو گیا اور ان کو کفر کی ظلمت و تاریکی حاصل ہو گئی، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ ہرگز ایسا نہیں (قرآن پہلے لوگوں کی کہانیاں نہیں) بلکہ زنگ ان کے دلوں پر ہے بوجہ اس کے کہ جو وہ کسب کرتے تھے۔ اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کی نافرمانی بھی کفر سے کم نہیں تھی، بلکہ وہ کفر کے درجہ تک پہنچی ہوئی تھی، تاہم آخر میں اس جواب کو علامہ رازی رحمہ اللہ نے جس انداز پر بیان کیا ہے، روح المعانی نے وہی نقل کیا جو بیان کیا جا چکا ہے۔ کبیر میں یوں ذکر کیا گیا۔

"فقوله (ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا) اشارة الی علة العلة" اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی "ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا" علت کی علت کی طرف اشارہ ہے، یعنی نافرمانی کو کفر اور قتل انبیاء کا سبب بنایا گیا۔

کبھی مستحبات کی ترک کا انجام کفر ہو جاتا ہے:

ولھذا المعنی قال ارباب المعاملات من ابتلی بترک الآداب وقع فی ترک

السنن،ومن ابتلی بترک السنن وقع فی ترک الفریضة،ومن ابتلی بترک الفریضة وقع فی استحقار الشریعة ومن ابتلی بذلک وقع فی الکفر"

اوپر جو بیان ہوا "علت کی علت کی طرف اشارہ ہے" اس کے بعد علامہ رازی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا یہی وجہ ہے کہ ارباب معاملات نے کہا ہے "جو شخص مستحبات کو چھوڑنے میں مبتلاء ہوتا ہے، وہ سنت کو چھوڑنے کا عادی ہوجاتا ہے، اور جو سنت کے چھوڑنے میں مبتلاء ہوجاتا ہے وہ فرض کے چھوڑنے میں واقع ہوجاتا ہے، اور جو فرض کو چھوڑنے میں مبتلاء ہوجاتا ہے وہ شریعت کو حقیر سمجھنا شروع کرلیتا ہے، جو شریعت کو حقیر سمجھے وہ کافر ہوجاتا ہے، اس سے وہ لوگ عبرت پکڑیں جو فرض نماز کے بعد اور نماز جنازہ کے بعد دعاء کرنے سے روکتے ہیں، سوم، چہلم اور تعزیت کی دعاؤں سے منع کرتے ہیں، یہ مستحبات ہیں، ان کے تارک اور ان سے منع کرنے والے اپنے انجام کی فکر کریں۔

جواب دوم: اس میں دوسرا احتمال یہ ہے کہ ﴿ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ﴾ پہلے گزرے ہوئے یہود کے ذلت، مسکینی اور غضب میں مبتلاء ہونے کی علت ہو، اور "ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا" بعد والے یہود (جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں تھے) کے ذلت وغیرہ میں مبتلاء ہونے کی علت اور وجہ ہو، اس میں کوئی تکرار لازم نہیں آتا۔

"فکانه تعالی بین علة عقوبة من تقدم ثم بین ان من تأخر لماتبع من تقدم کان لأجل معصية وعداوته مستوجبا لمثل عقوبتهم حتی یظهر للخلق ان ماانزله الله بالفریقین من البلاء والمحنة لیس الامن باب العدل والحکمة"

گویا کہ اللہ تعالی نے پہلے لوگوں کی سزا کا ذکر کیا، اور اس سزا کے مستحق ہونے کی وجہ بھی بیان کی، اس کے بعد، پیچھے آنے والوں کی سزا کا ذکر کیا کہ ان کی سزا بھی پہلے لوگوں کی تابعداری کی وجہ سے وہی ہے جو پہلوں کی ہے البتہ اس کی وجہ ان کی معصیت اور عداوت ہے، اللہ تعالی نے دونوں فریقوں کی سزاؤں کا ذکر کیا اور ان کے اسباب بھی بیان کیے، جس سے یہ ظاہر کیا کہ یہ اللہ تعالی کے عدل اور اس کی حکمت کا تقاضا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

❁ واخرج ابن جریر وابن حاتم عن الحسن "ضربت علیهم الذلة" قال اذلهم الله فلامنعة لهم وجعلهم الله تحت اقدام المسلمین"

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے "ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ" کی تفسیر بیان کی کہ اللہ تعالی نے ان کو ذلیل کردیا، ان کو کوئی طاقت اور دبدبہ حاصل نہیں ہوگا، اور اللہ تعالی نے ان کو مسلمانوں کے قدموں کے نیچے کردیا۔ (از در منثور)

❁ واخرج ابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم عن قتادة فی قوله (ذٰلِکَ

بِمَاعَصَوْا وَّکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ)قال فاجتنبوا المعصیة والعدوان فان بهماهلک من هلک قبلکم من الناس"

حضرت قتادہ نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ذٰلِکَ بِمَاعَصَوْا وَّکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ﴾ کی تلاوت کے بعد مسلمانوں کو تنبیہ کی کہ معصیت اور حد سے تجاوز سے بچ جاؤ، ان دو چیزوں کی وجہ سے تم سے پہلے لوگ ہلاک ہو گئے۔ (درمنشور)

آیات سے مراد کونسی آیات ہیں؟ جن سے وہ کفر کرتے ہیں:۔

"آیات الله الناطقة بنبوة محمدﷺوتحریفهم لهاوبسائر الآیات القرآنیة"

آیات سے مراد ان کی آسمانی کتاب توراۃ کی وہ آیات ہیں جو نبی کریمﷺ کی نبوت پر دلالت کرتی تھیں ،ان سے یہود نے انکار کیا، اور ان کی تحریف کی، اور اسی طرح قرآن پاک کی تمام آیات کا انہوں نے انکار کیا۔ (تفسیر ابی السعود)

(ذٰلِکَ)اشارة الی ماذکرمن الکفروالقتل(بِمَاعَصَوْا وَّکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ)ای کائن بسبب عصیانهم واعتدائهم حدودالله تعالی علی الاستمرارفان الاصرارعلی الصغائریفضی الی مباشرة الکبائروالاستمرارعلیهایؤدی الی الکفر"

یہ ان کا کفر اور قتل انبیاء بسبب نافرمانی کے تھا، کیونکہ وہ ہمیشہ ہی نافرمانی کرتے رہے، اور اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرتے رہے، کیونکہ صغائر پر ہمیشہ قائم رہنا کبیرہ گناہوں کی طرف پہنچا دیتا ہے ،اور کبیرہ پر ہمیشہ قائم رہنا کفر تک پہنچا دیتا ہے۔ (تفسیر ابی السعود)

"فعلی المؤمن ان لایفتح باب المعصیة علی نفسه خوفامما یؤدی الیه بل ویترک ایضابعض ماابیح له"

مؤمن کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ پر معصیت کا دروازہ نہ کھولے، اس خوف سے کہ کہیں معصیت میں مبتلاء نہ ہو جائے، بلکہ جن مباح چیزوں کی وضاحت کردی گئی لیکن کچھ شبہ ان کے ناجائز ہونے کا ہو تو ایسی مباح چیزوں کو بھی چھوڑ دینا تقویٰ ہے۔

"وقال ﷺالحلال بین والحرام بین وبینهماامورمشتبهات فمن اتقی الشبهات استبراء لعرضه ومن وقع فی الشبهات وقع فی الحرام کالراعی حول الحمی یوشک ان یقع فیه"

نبی کریمﷺ نے فرمایا حلال واضح ہے اور حرام واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان کچھ امور مشتبہ ہیں، جو شخص شبہات سے بچ گیا اس نے عزت اور دین کو بچالیا، اور جو شخص شبہات میں واقع ہو گیا (گویا کہ) وہ حرام میں واقع ہو گیا

،جیسا کہ چرواہا حد بندی کے اردگرد جانوروں کو چرائے تو قریب ہے کہ اس میں واقع ہو جائے۔ (منقول از روح البیان)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

لَيْسُوْا سَوَاءً مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَّتْلُوْنَ آيَاتُ اللّٰهِ آنَاءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ٥ (آیۃ نمبر ۱۱۳)

(1) سب ایک سے نہیں کتابیوں میں کچھ وہ ہیں کہ حق پر قائم ہیں اللہ کی آیتیں پڑھتے ہیں رات کی گھڑیوں میں اور سجدہ کرتے ہیں۔ (کنز الایمان)

(2) وہ سب برابر نہیں، اہل کتاب سے ایک گروہ وہ ہے جو قائم رہنے والے ہیں، تلاوت کرتے ہیں اللہ کی آیتیں رات کی گھڑیوں میں ایسے حال میں کہ وہ سجدہ کرتے ہیں۔ (نجوم الفرقان)

شان نزول:

قال ابن عباس لما اسلم عبدالله بن سلام و اصحابة قالت احبار اليهود ما آمن بمحمدﷺ الاشررنا ولولا ذلك ماتركوا دين آبائهم فانزل الله هذه الآية "

(اخرجه الطبرانی و البهیقی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب عبداللہ بن سلام (جو یہودیوں کے بہت بڑے عالم تھے) اور ان کے ساتھی ایمان لے آئے تو یہودی علماء کہنے لگے کہ محمد (ﷺ) کے ساتھ ایمان لانے والے نہیں مگر وہ جو ہم سے شر لوگ ہیں، اگر وہ شریر نہ ہوتے تو وہ اپنے آباء کے دین کو نہ چھوڑتے، ان کے یہ کہنے پر یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔ (تفسیر خازن) درمنشور)

﴿لَيْسُوْا سَوَاءً﴾ "وہ سب برابر نہیں۔"

ان الفاظ مبارکہ کا مطلب دو طرح بیان کیا گیا ہے، ایک یہ کہ ان الفاظ پر وقف تام ہے۔

"والمعنى ان اهل الكتاب الذين سبق ذكرهم منهم المؤمنون وَاَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُوْنَ لَيْسُوْا سَوَاءً"

اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ "بیشک اہل کتاب جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ" ان میں بعض ایمان لانے والے ہیں، اور ان میں سے اکثر کافر ہیں، وہ اہل کتاب سب برابر نہیں، اسی صورت میں بعض حضرات نے ایک اور معنی یہ بیان کیا ہے

"وقیل معناه لایستوی الیھود وامۃ محمد القائمۃ بامر اللہ الثابتۃ علی الحق"

کہ یہود اور نبی کریم ﷺ کی امت "جو کہ اللہ تعالیٰ کے امر پر قائم ہے، اور حق پر ثابت ہے" برابر نہیں۔

دوسرا احتمال یہ ہے "لَیْسُوْا سَوَاءً" پر وقف نہ ہو، بلکہ معنوی لحاظ پر اس کا بعد سے تعلق ہو، کیونکہ بعد میں آنے والے جار مجرور (مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ) کا تعلق "لیسوا" سے ہو، اس صورت میں اختصار ہوگا، اور عبارت پوشیدہ ہوگی معنوی عبارت یوں ہوگی "لَیْسُوْا سَوَاءً مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ اُمَّۃٌ قَائِمَۃٌ ومنھم امۃ ملعومۃ غیر قائمۃ" کہ سب اہل کتاب برابر نہیں، کیونکہ ان میں سے ایک گروہ وہ ہے جو حق پر قائم ہے، اور دوسرا گروہ وہ ہے جو حق پر قائم نہیں، چونکہ عرب حضرات دو مخالف چیزوں کا ذکر کرنا ہو تو ایک کو ذکر کر دیتے ہیں کہ دوسری قرائن سے خود بخود سمجھ آجائے گی، اسی ضابطہ کو یہاں استعمال کیا گیا۔ (خازن)

﴿مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ اُمَّۃٌ قَائِمَۃٌ﴾ "اہل کتاب سے ایک گروہ وہ ہے جو قائم رہنے والے ہیں۔"

قائم رہنے سے مراد:

(۱) اس کا ایک مطلب یہ ہے "جماعۃ قائمۃ ای مستقیمۃ عادلۃ" اہل کتاب میں سے ایک جماعت عدل وانصاف پر قائم ہے، یہ لفظ لیا ہوا "قامت العود" لکڑی درست ہوگئی، سیدھی ہوگئی۔ (روح البیان)

(۲) قال ابن عباس قائمۃ ای مھدیۃ قائمۃ علی امر اللہ تعالیٰ لم یضیعوہ ولم یترکوہ"
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کا معنی یہ بھی بیان کیا ہے کہ "قائم رہنے سے" مراد یہ ہے کہ اہل کتاب سے ایک گروہ ہدایت پر قائم ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے امر پر قائم ہیں، اس کو انہوں نے چھوڑا نہیں۔

(۳) وقیل قائمۃ علی کتاب اللہ عزوجل وحدودہ" اور معنی یہ بیان کیا گیا ہے، کہ اہل کتاب سے ایک گروہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کی حدود پر قائم ہے۔

(۴) وقیل قائمۃ فی الصلوۃ" اور معنی یہ ہے کہ اہل کتاب سے ایک گروہ وہ ہے جو نماز میں قیام کرنے والا ہے۔ (خازن)

(۵) قائمۃ بامر اللہ مطیعۃ لشرعہ متبعۃ نبی اللہ" اللہ تعالیٰ کے امر پر قائم رہنے والے ہیں، اور اس کی شریعت کے فرمانبردار ہیں، اور اللہ کے نبی کے تابعدار ہیں۔ (صابونی، ابن کثیر)

یہ پانچواں معنی دوسرے معنی کے کچھ قریب ہے، الفاظ کچھ مختلف تھے تو طلباء کے فائدہ کیلئے علیحدہ ذکر کر دیا ہے۔

(۶) قائمة علی کتاب الله وحده "اللہ تعالیٰ وحدہ ذات کی کتاب پر قائم رہنے والے ہیں۔ (معالم التنزیل للبغوی)

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ (کچھ وہ ہیں کہ حق پر قائم) تمام معانی کو شامل ہے **راقم** نے مطلق چھوڑ دیا ہے، یہ ترجمہ کیا ہے (اہل کتاب سے ایک گروہ وہ ہے جو قائم رہنے والے ہیں) تاکہ طلباء کرام جس معنی پر محمول کرنا چاہیں اسی پر محمول کرلیں۔ (محمول کرنا یعنی چسپاں کرنا)

﴿يَتْلُونَ آيَاتِ اللّٰهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ﴾

''تلاوت کرتے ہیں اللہ کی آیتیں رات کی گھڑیوں میں ایسے حال میں کہ وہ سجدہ کرتے ہیں۔''

اس میں چند مطالب بیان کئے گئے ہیں:

(۱) یعنی یصلون عبربالسجودعن الصلوة لان التلاوة لاتکون فی السجود"

آیۂ کریمہ میں "یسجدون " سے مراد یہ ہے کہ ''وہ نماز پڑھتے'' سجدہ سے مراد نماز ہے، کیونکہ سجدہ میں قرآن پاک کی تلاوت نہیں ہوتی، اس قول کے مطابق ان کا مطلق نماز ادا کرنا مراد لیا گیا ہے، کسی نماز کی تخصیص نہیں، یعنی وہ رات کو نوافل ادا کرتے ہیں۔

(۲) وقیل هی صلوة التهجدبالليل" بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ اس نماز سے مراد خاص نماز یعنی تہجد ادا کرنا مراد ہے۔

(۳) وقیل هی صلوة العشاء لان اليهود لايصلونها" بعض حضرات نے کہا اس نماز سے مراد عشاء کی نماز ہے کیونکہ یہود عشاء کی نماز ادا نہیں کرتے تھے۔

(۴) وقیل یحتمل انه ارادبالسجودالخضوع والخشوع لان العرب تسمی الخشوع سجودا"

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ "وَهُمْ يَسْجُدُونَ" سے مراد خشوع کرنا ہے، کیونکہ عرب حضرات خشوع کا نام سجدہ رکھتے ہیں۔ (ماخوذ از خازن)

(۵) اونزلت فی قوم یصلون صلوة الاوابین وهی الثناعشرة رکعة بعدصلوة المغرب"

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ یہ آیۂ کریمہ ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی جو مغرب کے بعد بارہ رکعت نماز اوابین پڑھتے تھے۔ (روح البیان)

اوابین اور تہجد کا ذکر قریب ہی (انشاء اللہ) بیان کیا جارہا ہے، خشوع کا ذکر پہلے پارہ میں "اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ" کی وضاحت کے ضمن میں آچکا ہے۔

آیۃ کریمہ میں کن لوگوں کا ذکر ہے؟

ایک تو شان نزول میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس سے مراد حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی مراد ہیں جنہوں نے یہودیت کو چھوڑ کر ایمان قبول کر لیا تھا، اس میں چند اور لوگ بھی اس آیۃ کریمہ کے نزول کا مصداق ہیں، یعنی یہ آیۃ کریمہ مندرجہ ذیل کو شامل ہے، عرب میں سے اہل نجران کے چالیس آدمیوں کو، اور حبشہ کے بتیس آدمیوں کو اور روم کے آٹھ آدمیوں کو شامل ہے جو حضرت عیسی علیہ السلام کے دین پر قائم تھے پھر نبی کریم ﷺ کی تصدیق کی اور ان پر ایمان لے آئے۔ اسی طرح یہ آیۃ کریمہ انصار کے چند آدمیوں کو بھی شامل ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو اسلام لانے سے پہلے بھی اللہ تعالی کی وحدانیت کو تسلیم کرتے تھے، اور جنابت کا غسل کرتے تھے، اور جو بھی ان کو دین حنیف (حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین) کے مسائل کا علم تھا اس پر عمل کرتے تھے، یہاں تک کہ اللہ تعالی نبی کریم ﷺ کو لے آیا تو انہوں نے آپ پر ایمان لایا اور آپ کی تصدیق کی، اللہ تعالی نے ان کو بھی اہل کتاب میں شامل کیا کہ وہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے سے پہلے اپنے علم کے مطابق دین ابراہیم علیہ السلام پر قائم تھے۔ (خازن)

صلوۃ اوابین: "وست بعدالمغرب لیکتب من الاوابین" (درمختار)

اور چھ رکعت مغرب کے بعد ادا کرے تاکہ اوابین کے درجہ میں اسے لکھ دیا جائے۔

"الاوابین جمع اواب ای رجاع الی الله تعالی بالتوبة والاستغفار" "اوابین" جمع ہے "اواب" کی اس کا معنی ہے اللہ تعالی کی طرف رجوع کرنا توبہ اور استغفار کے ذریعے (شامی) یہی وجہ ہے مغرب کے بعد نوافل کا نام اوابین رکھنے کا، کہ جو لوگ مغرب کے بعد نوافل ادا کرتے ہیں ان کو وہ درجہ حاصل ہو جاتا ہے جو اللہ تعالی کی طرف رجوع کرنے والے توبہ کرنے والوں کو حاصل ہو جاتا ہے۔

تنبیہ: اگرچہ درمختار میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ چھ رکعت ایک سلام سے یا دو سلاموں سے یا تین سلاموں سے ادا کرے، لیکن اپنا مختار صاحب درمختار نے ان الفاظ سے پیش کیا "والاول ادوم واشق" پہلا قول کہ ایک سلام سے چھ رکعت ادا کرے اس میں نماز لمبی ہوتی ہے اور مشقت اس میں زیادہ ہوتی ہے، مشقت آمیز میں افضلیت پائی جاتی ہے، لیکن علامہ شامی نے ان الفاظ سے اس قول کو رد کیا ہے "وکان جمعها بتسلیمة واحدة خلاف الافضل" کہ چھ رکعت ایک سلام سے ادا کرنا افضلیت کہ مخالف ہے، اسلئے کہ یہ ثابت ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک دو دو رکعت نوافل ادا کرنا افضل ہے، لھذا چھ کو ایک سلام سے ادا کرنے کی افضلیت کا قول باطل ہو گیا۔

"فکان المستحب فیه ثلاث تسلیمات لیکون علی نسق واحد"

مستحب اس میں تین سلام ہیں تا کہ ایک ہی طریقہ پر تمام رکعتیں ادا ہوجائیں، یعنی دو دو رکعت ادا ہوجائیں گی جو صاحبین کے قول کے مطابق افضل ہیں۔ (ماخوذ از شامی باب النوافل جلد اول صفحہ نمبر ۴۹۸)

❁ وعن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ من صلی بعدالمغرب ست رکعات لم یتکلم فیمابینھن بسوء عدلن له بعبادة ثنتی عشرة سنة،رواه الترمذی وقال ھذاحدیث غریب لانعرفه الامن حدیث عمر بن ابی خثعم وسمعت محمدبن اسمعیل یقول ھو منکرالحدیث وضعفه جدا"

حضرت ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے مغرب کے بعد چھ رکعت ادا کیں ،اوران میں کوئی بری بات نہ کی تو وہ بارہ سال کی عبادت کے برابر ہوں گی۔

تنبیہ: اگرچہ ترمذی نے یوں بیان کیا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور عمر بن ابی خثعم کے واسطہ سے آتی ہے،اور ترمذی کہتے ہیں کہ میں نے محمد بن اسمعیل بخاری سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ عمر بن ابی خثعم معروف راویوں کے خلاف روایت کرتا ہے اور بہت زیادہ ضعیف ہے۔علامہ ملاعلی قاری رحمہ اللہ میرک کا قول نقل کرنے کے بعد ان کے تضاد پر گرفت کرتے ہیں۔

"قال میرک نقلاعن المنذری ورواه ابن ماجة وابن خزیمه فی صحیحه"

میرک رحمہ اللہ منذری سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں، یہ روایت ابن ماجہ نے بھی ذکر کی ہے اور ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں بھی نقل کی ہے۔

"قال میرک ناقلاعن التصحیح والعجب من محی السنة کیف سکت علیه وھو ضعیف باجماع اھل الحدیث قلت ینافیه ماتقدم انه رواه ابن خزیمه فی صحیحه مع انھم اجمعوا علی جوازالعمل بالحدیث الضعیف فی فضائل الاعمال"

میرک نے تصحیح سے نقل کرتے ہوئے کہا کہ تعجب ہے محی السنۃ پر کہ انہوں نے اس حدیث پر کیسے خاموشی اختیار کی حالانکہ اس حدیث کے ضعیف ہونے پر اجماع ہے۔علامہ ملاعلی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قول میرک کے پہلے قول کے مخالف ہے، کیونکہ وہ پہلے بیان کرچکے ہیں، کہ ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں اسے نقل کیا ہے، جس کی وجہ سے حدیث کا ضعیف ہونا اتفاقی نہ رہا،اوراس پر بھی اجماع ہے کہ ضعیف حدیث پر فضائل اعمال میں عمل جائز ہے۔

"قال میرک وعن محمد بن عماربن یاسر قال رأیت عماربن یاسر یصلی بعدالمغرب ست رکعات وقال رأیت حبیبی رسول اللہ ﷺ یصلی بعد المغرب ست

رکعات وقال من صلی بعد المغرب ست رکعات غفرت له ذنوبه وان کانت مثل زبد البحر"

میرک کہتے ہیں محمد بن عمار بن یاسر نے کہا میں نے (اپنے باپ) عمار بن بن یاسر کو مغرب کے بعد چھ رکعت ادا کرتے ہوئے دیکھا، اور انہوں نے کہا کہ میں اپنے حبیب رسول اللہ ﷺ کو مغرب کے بعد چھ رکعات ادا کرتے ہوئے دیکھا، اور آپ نے فرمایا جس شخص نے مغرب کے بعد چھ رکعت ادا کیں اس کے گناہ معاف کردئے جائیں گے خواہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہی کیوں نہ ہوں، (یہ بھی خیال رہے کہ عبادات کہ ذریعے معاف ہونے والے صغائر گناہ ہوتے ہیں، کبائر توبہ سے معاف ہوتے ہیں۔

❁ وعن عائشة قالت قال رسول الله ﷺ من صلی بعدالمغرب عشرین رکعة بنی الله له بیتافی الجنة" (رواه الترمذی)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے مغرب کے بعد بیس رکعت ادا کیں اللہ تعالی اس کیلئے جنت میں گھر بنائے گا۔

"وقال ابن حجر وفیهاحدیث آخر،وهوانه علیه السلام کان یصلیهاعشرین ویقول هذه صلوة الاولین فمن صلاهاغفرله"وکان السلف الصالح یصلونهاقال جمع ورویت اربعاورویت رکعتین فاقلهارکعتان واکثرهاعشرون"

ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا اس میں ایک اور حدیث ہے، وہ یہ کہ بیشک رسول اللہ ﷺ (مغرب کے بعد) بیس رکعت ادا کرتے تھے اور فرماتے تھے یہ پہلے لوگوں کی نماز ہے، جس نے یہ نماز ادا کی اس کی مغفرت کردی جائے گی۔ یہ نماز سلف صالحین ادا کرتے رہے، البتہ بعض روایات میں دو رکعت کا ذکر ہے، اور بعض میں چار رکعت کا ذکر ہے، اور بعض میں چھ کا ذکر ہے، اور بعض روایات میں بیس کا ذکر بھی پایا گیا ہے روح البیان کے بارہ رکعت کا قول بھی کیا ہے، ان تمام اقوال میں وجہ تطبیق یہ ہے کہ کم از کم اوابین کی نماز کی دو رکعت ہیں، اور زیادہ سے زیادہ بیس رکعت ہیں۔

(مشکوۃ باب النوافل مع مرقاۃ جلد نمبر ۳، صفحہ نمبر ۱۱۴، ۱۱۵)

رات کی نماز اور تہجد : رات کی نماز عام ہے اور تہجد کی نماز خاص ہے۔

"وما کان بعد صلوة العشاء فهو من اللیل" جو نوافل عشاء کی نماز کے بعد ادا کئے جائیں گے وہ "صلوة اللیل" (رات کی نماز) کہلاتی ہے۔

"وهذایفیدان هذه السنة تحصل بالتنفل بعدصلوة العشاء قبل النوم"

اسی سے یہ فائدہ حاصل ہوگیا کہ یہ سنت (غیر مؤکدہ) عشاء کی نماز کے بعد، سونے سے پہلے نوافل ادا کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

"وان التهجد ازالة النوم بتكلف مثل تأثم اى تحفظ عن الاثم نعم صلوة الليل وقيام الليل اعم من التهجد"

"تہجد" کا معنی ہے تکلف سے نیند کا زائل کرنا، جیسا کہ "تاثم" کا معنی ہے "گناہوں سے دور رہنا" یعنی عشاء کی نماز کے بعد سو جائے پھر نوافل ادا کرنے کیلئے بیدار ہو (جاگے) تو وہ نوافل جو ادا کرے گا ان کو نماز تہجد کہا جائے گا، لیکن عشاء کی نماز کے بعد سوئے یا نہ سوئے جو نوافل عشاء کی نماز کے بعد ادا کرے گا وہ "صلوۃ اللیل" وہ رات کی نماز کہلائے گی، یہی مطلب ہے کہ "صلوة الليل" (رات کی نماز) عام ہے تہجد کی نماز سے کیونکہ تہجد کی نماز عشاء کے بعد سو کر جاگنے کے بعد ادا ہوتی ہے۔

تہجد نوافل ہیں: ان التهجد لا يحصل الا بالتطوع فلو نام بعد صلوة العشاء ثم قام فصلى فوائت لا يسمى تهجدا"

بیشک تہجد سوائے نوافل کے حاصل نہیں ہوتے، اگر ایک شخص سو گیا عشاء کی نماز کے، پھر جاگ کر اس نے قضاء نمازیں ادا کیں تو ان کو تہجد نہیں کہا جائے گا۔ (خیال رہے کہ اگرچہ وہ تہجد نہیں لیکن تہجد سے افضل فوت شدہ نمازوں کی قضاء ہے کیونکہ فرض سے بریٔ الذمہ ہونا بنسبت نوافل کے افضل ہے۔ (راقم)

تمام رات جاگنے والے کے نوافل تہجد کا درجہ رکھتے ہیں:

اگرچہ معجم طبرانی میں ایک روایت حجاج بن عمر کی یہ ہے کہ "تہجد" سونے کے بعد ہی ہیں، بغیر سونے کے تہجد نہیں، لیکن صحیح قول یہی ہے جس پر تقریباً جمہور کا اتفاق ہے کہ تمام رات جاگنے والے شخص نے جو نوافل عشاء کی نماز کے بعد رات میں ادا کئے وہ اس کے تہجد ہوں گے۔

عشاء کی نماز سے پہلے تہجد نہیں:

وقته بعد صلوة العشاء حتى لو نام ثم تطوع قبلها لا يحصل السنة " اگر ایک شخص عشاء کی فرض ادا کرنے سے پہلے سو گیا اور جاگنے پر نماز سے پہلے ہی نوافل ادا کئے تو ان سے تہجد ادا کرنے کی سنت حاصل نہیں ہوگی، اسلئے کہ تہجد کا وقت عشاء کی فرض نماز کے بعد سو کر اٹھنے پر ہوتا ہے۔

تہجد کا وقت مقرر نہیں:

جو اوپر بحث ذکر کی گئی ہے اس سے واضح ہو گیا کہ عشاء کی نماز پڑھ کر سو گیا، پھر جاگ کر تہجد کی نیت سے نفل ادا کئے تو ان کو تہجد ہی کہا جائے گا، یہ ضروری نہیں کہ پچھلے پہر ہی جو نوافل ادا کئے جائیں وہی تہجد ہوں۔

البتہ افضل طریقہ یہ ہے:

ان الافضل من الثلث الاوسط السدس الرابع والخامس " بہتر یہ ہے کہ رات کے درمیانی تہائی حصہ کے آخر میں تہجد ادا کرے، کیونکہ حدیث شریف میں آتا ہے۔

❁ قال رسول اللہ ﷺ احب الصلوۃ الی اللہ تعالی صلوۃ داود (علیہ السلام) کان ینام نصف اللیل ویقوم ثلثه وینام سدسه"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کو نمازوں میں سے پسندیدہ نماز حضرت داود علیہ السلام کی نماز تھی، وہ رات کا آدھا حصہ سوتے تھے، اور رات کے تہائی حصہ میں قیام کرتے تھے اور چھٹا حصہ پھر سو جاتے تھے، یعنی اگر رات نو گھنٹے کی ہوتی تو آپ پہلے ساڑھے چار گھنٹے کے آخر تک عشاء کی نماز کے بعد سو جاتے، پھر رات کے تین گھنٹے قیام کرتے، یعنی کھڑے ہو کر نوافل ادا کرتے، پھر ڈیڑھ گھنٹہ سو جاتے۔

رات کی نماز افضل ہے:

صلوۃ اللیل افضل من النهار" رات کی نماز دن کی نماز سے افضل ہے، مسلم شریف میں مرفوع حدیث ہے "افضل الصلوۃ بعد الفریضة صلوۃ اللیل "فرض نماز کے بعد افضل نماز رات کی نماز ہے۔

تہجد کی کتنی رکعت ہیں:

تہجد کی رکعات کے متعلق مختلف روایات آتی ہیں، ان تمام سے نتیجہ یہ نکلا۔

"اقول فینبغی القول بان اقل التهجد رکعتان واوسطه اربع واکثره ثمان" "واللہ اعلم"

میں کہتا ہوں (شامی کہتے ہیں) مناسب یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ تہجد کی کم از کم دو رکعت ہیں، درمیانی چار رکعت ہیں اور اکثر آٹھ رکعتیں ہیں۔ حاوی قدس میں ہے "یصلی ما سهل علیه ولو رکعتین والسنة فیها ثمان رکعات" کہ جتنی رکعت آسانی سے پڑھ سکے وہی پڑھ لے، خواہ دو رکعت ہی ادا کر لے البتہ مسنون رکعت ہیں۔

حدیث ابی داؤد سے پتہ چلتا ہے "ان اقل تهجده اربع سوی ثلاث الوتر" کہ بیشک رسول اللہ ﷺ کی تہجد کے نماز کم از کم چار رکعت ہوتی سوائے تین وتر کے، لیکن دوسری روایت میں دو رکعت کا بھی ذکر ملتا ہے۔

"قال ﷺ من استیقظ من اللیل وایقظ اهله فصلیا رکعتین کتبامن الذاکرین الله کثیرا والذاکرات (رواه النسائی وابن ماجه وابن حبان فی صحیحه والحاکم)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص رات کو بیدار ہوا اور اپنے اہل کو بھی بیدار کیا تو انہوں نے دو، دو رکعت ادا کیں تو اس شخص اور اس کی اہل کو اللہ کا کثیر ذکر کرنے والے مردوں اور عورتوں میں لکھ دیا جائے گا، اس روایت میں کم از کم دو رکعت ادا کرنے کا ذکر ہے۔

تہجد کی عادت بنا کر چھوڑ دینا مکروہ ہے:

"قال ﷺ لابن عمر یاعبدالله لاتکن مثل فلاں کان یقوم اللیل ثم ترکه" (بخاری ومسلم)

نبی کریم ﷺ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو فرمایا اے عبداللہ فلاں شخص کی طرح نہ ہو جانا کہ وہ رات کو قیام کرتا تھا (یعنی تہجد ادا کرتا تھا) پھر اس نے ادا کرنا چھوڑ دیا۔

"ولذاقال ﷺ احب الاعمال الی الله ادومها وان قل "رواه الشیخان وغیرهما"

بخاری اور مسلم میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو وہ عمل پسند ہے کہ وہ ہمیشہ جاری رکھے اگرچہ وہ عمل کم ہی کیوں نہ ہو۔ "فینبغی للمکلف الاخذ من العمل بمایطیقه" عاقل وبالغ کو چاہئے کہ وہ اپنی طاقت کے مطابق عمل کرے۔

تنبیہ: اگرچہ رات کی نماز عام ہے جسطرح پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، لیکن احادیث میں قیام اللیل کا جو ذکر ملتا ہے اس سے مراد تہجد کی نماز ہی ہے "ان صلوة اللیل المحثوث علیها هی التهجد" بیشک رات کی نماز ادا کرنے پر جو برانگیختہ کیا گیا اس سے مراد تہجد ہیں۔ (تہجد کی تمام بحث ماخوذ از شامی جلد اول صفحہ نمبر ۵۰۶، ۵۰۷)

رات کی نماز کے متعلق احادیث:

عن عائشة رضی الله عنها قالت کان النبی ﷺ یصلی فیمابین ان یفرغ من صلوة العشاء الی الفجر احدی عشرة رکعة یسلم من کل رکعتین ویوتر بواحدة فیسجد السجدة من ذلک قدر مایقرأ احدکم خمسین آیة قبل ان یرفع رأسه فاذاسکت المؤذن من صلوة الفجر وتبین له الفجر قام رکعتین خفیفتین ثم اضطجع علی شقه الایمن حتی یأتیه المؤذن للاقامة فیخرج" (بخاری ومسلم)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ عشاء کی نماز کے فارغ ہونے کے بعد اور صبح کی نماز سے پہلے گیارہ رکعت ادا فرماتے تھے، ہر دو رکعت کے بعد سلام پھیرتے، البتہ وتر کی نماز میں دو رکعت کے ساتھ ایک رکعت اور ملا کر طاق بناتے، ان میں سجدہ کرتے اتنی قدر جتنی قدر تم سجدہ کرتے ہوئے سر اٹھانے سے پہلے پچاس آیتیں پڑھو، جب مؤذن فجر کی نماز کی اذان سے فارغ ہوتا، اور فجر ظاہر ہو جاتی (یعنی روشنی ہو جاتی) آپ کھڑے ہوتے تو دو خفیف رکعت ادا فرماتے پھر آپ دائیں کروٹ پر لیٹ جاتے یہاں تک کہ مؤذن آپ کو نماز کیلئے اٹھاتا تو آپ مسجد میں تشریف لے جاتے۔

وضاحت حدیث:

نبی کریم ﷺ رات کے وقت گیارہ رکعت ادا فرماتے تھے، آٹھ رکعت نوافل ہوتے، اور تین رکعت وتر، اور یہ واضح ہوا کہ آپ تہجد دو دو رکعت کر کے ادا کرتے تھے۔

"فیسجد السجدة من ذلک قدر مایقرأ احدکم خمسین آیة" والظاهر ان الفاء لتفصیل المجمل یعنی فیسجد کل واحدة من سجدات تلک الرکعات طویلة"

ظاہر یہی ہے کہ "فیسجد" پر فاء اجمال کی تفصیل کیلئے، یعنی تمام رکعتوں میں آپ ہر سجدہ اتنا لمبا فرماتے جتنا تم پچاس آیات پڑھتے میں وقت صرف کرتے ہو۔

اور ایک معنی یہ بھی ممکن ہے:

"ومن فی من ذلک للتبعیض والفاء للتفریع ومعناه قد کان بعض سجداته طویلا بقدر مایقرأ احد خمسین آیة"

کہ "من ذلک" میں "من" تبعیض کیلئے ہو (جس کا معنی "بعض" ہو) اور فا تفریع کیلئے ہو کہ آپ کے بعض سجدے اتنے لمبے ہوتے جتنی مقدار تم پچاس آیتیں پڑھتے ہو، خیال رہے بعض حضرات نے اس سے مراد سجدۂ شکر لیا ہے کہ آپ نماز کے بعد سجدۂ شکر ادا کرتے لیکن امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جہاں بھی سجدہ کا ذکر ہے، جس سے مراد بظاہر فقط سجدۂ شکر کا ذکر سمجھ آتا ہے، اس سے مراد دو رکعت نوافل ہیں۔ (**فاذا سکت المؤذن ای فرغ**) جب مؤذن اذان سے فارغ ہوتا (**من صلوة الفجر ای اذانها**) فجر کی اذان سے (**تبین له الفجر**) جب فجر سفید ہو جاتی تو آپ کھڑے ہوتے تو دو رکعت خفیف ادا فرماتے، یعنی ان میں چھوٹی چھوٹی سورتیں (**قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ** اور سورۃ اخلاص وغیرہ) آپ پڑھتے۔

"قلت الظاهران المرادبالتبین لاسفارفیفیدان الاسفارمستحب حتی فی حق السنة"

(میں کہتا ہوں) ملاعلی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں ظاہر یہی ہے کہ " تبیـن " سے مراد فجر کا سفید ہو جانا ہے تو اسی سے یہ فائدہ حاصل ہوگیا کہ صبح کی نماز روشنی میں ادا کرنا مستحب ہے، یہاں تک کہ فجر کی سنتیں بھی روشنی میں ادا کرے، پھر آپ اپنی دائیں کروٹ پر لیٹ جاتے، تاکہ رات کے قیام کی تھکن کی وجہ سے جسم میں سستی نہ رہے بلکہ چستی آجائے۔ (مشکوۃ باب قیام اللیل مع مرقاۃ جلد نمبر۳ صفحہ نمبر۱۲۱)

۞ وعن عائشة قالت کان النبی ﷺ اذاصلی رکعتی الفجرفان کنت مستیقظة حدثنی والااضطجع " (رواہ مسلم، مشکوۃ باب قیام اللیل)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی کریم ﷺ (رات کے قیام کے بعد) جب فجر کی دو رکعت ادا فرماتے اگر میں بیدار ہوتی تو میرے ساتھ کلام فرماتے اور اگر میں سوئے ہوتی تو آپ لیٹ جاتے۔

۞ وعن عائشة قالت ﷺ یصلی من اللیل ثلاث عشرة رکعة منهاالوترور کعتاالفجر "

(رواہ مسلم، مشکوۃ باب قیام اللیل)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی کریم ﷺ رات تیرہ رکعت ادا فرماتے تھے، جن میں (تین رکعت) وتر بھی ہوتے اور دو رکعت فجر کی بھی ہوتیں۔ (یعنی آٹھ رکعت تہجد کی ہوتیں)

۞ وعن مسروق قال سألت عائشة عن صلوة رسول اللہ ﷺ باللیل قالت سبع وتسع واحدی عشرة رکعة سوی رکعتی الفجر" (رواہ البخاری (باب قیام اللیل)

حضرت مسروق کہتے ہیں میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نبی کریم ﷺ کی رات کی نماز کے متعلق پوچھا، تو آپ نے بتایا کہ آپ کبھی فجر کی دو رکعت کے علاوہ سات رکعت ادا کرتے (چار نفل، تین وتر) اور کبھی نو رکعت ادا فرماتے (چھ رکعت نفل اور تین وتر) اور کبھی گیارہ رکعت ادا فرماتے (آٹھ رکعت نفل اور تین رکعت وتر۔

۞ وعن عائشة قالت کان النبی ﷺ اذاقام من اللیل لیصلی افتتح صلوته برکعتین خفیفتین " (رواہ مسلم، مشکوۃ باب قیام اللیل)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی کریم ﷺ جب رات کو قیام کا ارادہ فرماتے تو دو رکعت خفیف سے ابتداء فرماتے۔

"واماروایة خمس عشرة فمحمولة علی انه ﷺ کان یفتتح صلوة اللیل برکعتین خفیفتین "

ایک روایت میں پندرہ رکعت کا بھی ذکر ہے، اس کا شاید یہی مطلب ہوگا کہ تہجد کی نماز کو شروع کرنے سے پہلے دو رکعت نفل چھوٹی چھوٹی سورتوں سے افتتاحی طور پر ادا فرماتے (واللہ اعلم بالصواب)

(مرقاۃ جلد نمبر۳ صفحہ نمبر۱۲۲)

❁ عن ابی هریرة قال قال رسول اللهﷺ ینزل ربنا تبارک وتعالی کل لیلة الی السماء الدنیا حتی یبقی ثلث اللیل الآخر یقول من یدعونی فاستجیب له من یسألنی فاعطیه من یستغفرنی فاغفرله (بخاری ومسلم) وفی روایة لمسلم ثم یبسط یدیه ویقول من یقرض غیر عدوم ولاظلوم حتی ینفجر الفجر" (مشکوة باب التحریض علی قیام اللیل)

حضرت ابوھریرہ ﷛ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" ہمارا رب تعالیٰ ہر رات کو جب رات کا آخری تہائی حصہ رہ جاتا تو آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے (یعنی اس کی رحمت یا اس کے فرشتوں کا نزول ہوتا ہے) وہ کہتا ہے کہ کون ہے جو مجھ سے دعاء کرے کہ میں اس کی دعاء کو قبول کروں کون ہے جو مجھ سے سوال کرے کہ میں اسے عطاء کروں، کون ہے جو مجھ سے بخشش طلب کرے کہ میں اس کی بخشش کروں۔ **مسلم** کی ایک روایت ہے" پھر وہ اپنے ہاتھ (جو اس کی شان کے لائق ہیں) کشادہ کردیتا ہے اور فرماتا ہے کون ہے جو مجھے قرض دے حالانکہ وہ محتاج نہیں، اور وہ ظالم نہیں، یہ سلسلہ فجر تک جاری رہتا ہے۔

وضاحت حدیث:

"ینزل ربنا" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا امر نازل ہوتا ہے، یا مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے نازل ہوتے ہیں، یا مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نداء دینے والا فرشتہ نازل ہوتا ہے یا مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا نزول ہوتا ہے

"قیل مقصود الحدیث الترغیب والتحثیث وتخصیص هذاالوقت بمزید الشرف والفضل وان مایاتی به المکلف انفع وارجی وبالقبول احری"

حدیث پاک میں رات کے پچھلے تہائی حصہ میں دعاء کرنے، رب تعالیٰ سے طلب کرنے، اور استغفار کرنے پر برانگیختہ کیا گیا، اور اس وقت کی شرافت اور فضیلت کو بیان کیا گیا ہے، اور مکلف جو اس وقت میں دعاء وغیرہ کرے گا اس کی قبولیت کی زیادہ امید کی جاتی ہے، اور انسان کے لائق اور مناسب یہی ہے کہ اس وقت کی برکات سے فائدہ حاصل کرے۔ "ثم یبسط یدیه "ای لطفه ورحمته" ہاتھوں کو کشادہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے لطف اور اپنی رحمت کو پھیلاتا ہے۔ "ویحتمل ان یکون بالتجلی الصوری لتنزه ذاته عن الجارحة والنزول الحسی" اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ وہ اپنی تجلی صوری فرماتا ہے، کیونکہ رب تعالیٰ اعضاء سے پاک ہے، اور ظاہری طور پر اترنے سے بھی پاک ہے۔ "ویقول من یقرض غیر عدوم" اور وہ کہتا ہے کون ہے جو مجھے قرض دیتا ہے، حالانکہ وہ محتاج نہیں۔ "ویقول" وہ کہتا ہے۔ یعنی خود وہ کہتا ہے، یا اپنے کسی خاص فرشتے کے ذریعے وہ کہلاتا

ہے "من یقرض" "اویعطی العبادة البدنیة اوالمالیة علی سبیل القرض واخذالعوض" "کون ہے جو قرض دے" اس کا مطلب یہ ہے کون ہے جو عبادت بدنیہ یا مالیہ ادا کرے، اسی کو قرض سے تعبیر کیا ہے کہ وہ عبادت کرے اور ثواب حاصل کرے۔ "غیر عدوم" "ای رباغنیا غیر فقیرعاجز عن العطاء" یعنی اللہ تعالیٰ غنی ہے، فقیر نہیں، اور عطاء سے عاجز نہیں، بندے کا عبادت بدنیہ اور مالیہ کرنا بندے کے اپنے فائدہ کیلئے رب تعالیٰ کو اس ضرورت نہیں۔ "ولاظلوم" "بعدم الوفاء اوبنقص من الثواب والجزاء" اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا کہ اسے ثواب عطاء نہ کرے یا اس کے ثواب میں کمی کرے۔ بلکہ وہ مکمل جزاء عطاء فرماتی ہے۔

❁ عن ابی امامة قال قال رسول الله ﷺ علیکم بقیام اللیل فانه دأب الصالحین قبلکم وهو قربة لکم الی ربکم ومکفرة للسیات ومنهاة عن الاثم"

(رواہ الترمذی، مشکوۃ باب التحریض علی قیام اللیل)

حضرت ابوامامہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اپنے پر رات کے قیام اور نوافل کو لازم پکڑو بیشک یہ تم سے پہلے نیک لوگوں کی عادت ہے، اور وہ تمہارے لئے تمہارے رب کی قربت اور گناہوں کے مٹانے، اور گناہوں سے رکنے کا ذریعہ ہے۔

❁ وعن ابی سعیدالخدری قال قال رسول الله ﷺ ثلاثة یضحک الله الیهم الرجل اذاقام باللیل یصلی والقوم اذاصفوافی الصلوة والقوم اذاصفوافی قتال العدد"

(رواه فی شرح السنة"مشکوة باب التحریض علی قیام اللیل)

حضرت ابوسعید خدری ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین شخصوں پر اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے، ایک وہ شخص جو رات کو قیام کرتا ہے اور نماز (نوافل) ادا کرتا ہے، اور دوسرا وہ شخص جو اس وقت نماز ادا کرتا ہے جب قوم نماز کی صفیں بناتی ہے، اور تیسرا وہ شخص جو اس وقت نماز ادا کرتا ہے جب قوم جہاد کی صفیں بناتی ہے۔

عشاء کی نماز یہود ادا نہیں کرتے تھے، اس کا کیا مطلب ہے؟

❁ وعن معاذبن جبل قال قال رسول الله ﷺ اعتموابهذه الصلوة فانکم قد فضلتم بهاعلی سائر الامم ولم تصلهاامة قبلکم" (رواه ابوداؤد، مشکوة باب تعجیل الصلوات)

حضرت معاذ بن جبل ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم یہ نماز تاریکی آجانے پر ادا کرو (یعنی شفق کے غائب ہونے پر ادا کرو) بیشک تمہیں تمام امتوں پر فضیلت دی گئی اس نماز کے ذریعے، کیونکہ تم سے پہلے کسی امت نے یہ نماز ادا نہیں کی۔

اعتراض: جبریل امین نے نبی کریم ﷺ کو جب نمازوں کے ابتدائی اوقات اور انتہائی اوقات بتائے تو بعد

میں عرض یہ کیا"هذه وقت الانبیاء من قبلک" آپ سے پہلے انبیاء کرام کی نمازوں کے اوقات بھی یہی تھے اس سے پتہ چلتا ہے کہ سب نمازیں تمام امتوں پر فرض تھیں، ان دونوں حدیثوں میں تطبیق کیسے ہے؟

جواب اول: **راقم** کے نزدیک آسان جواب یہ ہے کہ پانچ نمازیں جو ہم پر فرض ہیں اسی طرح پانچ نمازیں ہر امت پر فرض نہیں تھیں، بلکہ بعض نمازیں بعض امتوں پر، اور بعض دوسری نمازیں دوسری امتوں پر، اسی طرح تمام نمازوں کے اوقات کو پہلے انبیاء کرام کی طرف منسوب کرنا صحیح ہے۔ (راقم)

جواب دوم: دوسری حدیث شریف میں ذکر ہے کہ "یہ وقت آپ سے پہلے انبیاء کرام کا ہے" اس میں یہ ذکر نہیں کہ یہ وقت پہلی امتوں کیلئے ہے، لھذا مطلب یہ ہے۔

"ان صلوة العشاء كانت تصليها الرسل نافلة لهم أى زائدة ولم تكتب على اممهم كالتهجدفانه وجب على رسول الله ﷺ ولم يجب علينا"

بیشک انبیاء کرام عشاء کی نماز بطور نفل ادا کرتے رہے لیکن ان کی امتوں پر عشاء کی نماز فرض نہیں تھی، یہ اسی طرح ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ پر تہجد واجب تھے اور ہم پر واجب نہیں۔

جواب سوم: **ويحتمل انه ارادانه لم تصلها على النحو الذى تصلونهامن التاخير و انتظار الاجتماع فى وقت حصول الظلام وغلبة المنام على الانام"**

اور احتمال یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام امتوں نے عشاء کی نماز اس طرح نہیں ادا کی جیسے تم ادا کرتے ہو کہ نماز تاخیر سے ادا کرتے ہو اور شفق کے غائب ہونے، اندھیرا چھا جانے کی انتظار کرتے ہو، اور جب نیند لوگوں پر غالب آجاتی ہے اس وقت تم نماز ادا کرتے ہو۔ (ماخوذ از مرقاۃ جلد دوم صفحہ نمبر ۱۳۸)

اس تیسرے جواب پر ایک اور حدیث پاک دلالت کر رہی ہے:

❁ **عن عبدالله بن عمر قال مكثناذات ليلة ننتظر رسول الله ﷺ صلوة العشاء الآخرة فخرج الينا حين ذهب ثلث او بعده فلاندرى اشئ شغله فى اهله اوغير ذلك فقال حين خرج انكم لتنظرون صلوة ماينتظرها اهل دين غيركم ولولا ان يثقل على امتى لصليت بهم هذه الساعة ثم امر المؤذن فاقام الصلوة وصلى"** (رواه مسلم،مشكوة باب تعجيل الصلوة)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، ہم رات عشاء کی نماز کیلئے نبی کریم ﷺ کی انتظار میں رکے رہے، تو آپ ہماری طرف تشریف لے آئے جبکہ رات کا تہائی حصہ یا اس سے زائد گذر چکا تھا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ آپ اپنی اہل میں مشغول رہے یا کہ کوئی اور وجہ تھی (جب آپ تشریف لائے) تو آپ نے فرمایا بیشک تم نماز کی انتظار

کرتے رہے، اتنی انتظار تمہارے بغیر کسی اور دین والوں نے نہیں کی، پھر آپ نے فرمایا اگر میں امت پر بوجھ نہ سمجھتا تو ان کو اسی وقت میں نماز پڑھاتا، پھر آپ نے موذن کو حکم دیا تو انہوں نے اقامت کہی، پھر آپ نے نماز پڑھائی۔

حدیث پاک سے فائدہ حاصل ہوا:

آپ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ "انتظارهذه الصلوة من بين سائر الصلوات من خصوصياتكم التي خصكم الله بهافكلمازدتم يكون الاجراكمل مع ان الوقت زمان يقتضي الاستراحة فالمثوبة على قدرالمشقة ولان الذاكرفي الغافلين كالصابر في الفارين"

اس (عشاء کی) نماز کی انتظار تمہاری خصوصیات میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ خصوصیت عطاء کی ہے کہ تم یہ نماز دیر سے ادا کرتے ہو، جب نیک عمل میں مشقت زیادہ ہوتی ہے، اس میں اجر بھی زیادہ ہوتا ہے کیونکہ یہ وقت آرام کا ہوتا ہے، آرام کو چھوڑ کر جب مشقت برداشت کرے گا تو اسے ثواب بھی زیادہ ہوگا وہ ایسے ہوگا جیسے غافل لوگوں میں کوئی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا ہو، اور جہاد سے بھاگنے والوں میں کوئی ثابت قدم رہنے والا ہو۔ (مرقاۃ جلد دوم صفحہ نمبر ۱۴۰)

تنبیہ: ثم ان التاخير المذكورفي هذاالحديث لم يخرج به عن وقت الاختياروهو نصف الليل اوثلثه"

عشاء کی نماز کو تاخیر سے ادا کرنے کا جو ذکر حدیث پاک میں ہے، اس کا یہ مطلب ہے کہ مختار وقت سے زیادہ دیر نہ ہو، وہ رات کا تہائی حصہ یا نصف رات تک ہے۔ (مرقاۃ جلد نمبر ۲ صفحہ نمبر ۱۴۰)

راقم کے نزدیک وہی مسئلہ مختار ہے جو فقہاء کرام نے بیان کیا ہے کہ تاخیر اتنی مقدار میں ہو کہ جماعت میں نمازیوں کے کم ہونے کا ذریعہ نہ بنے، اگر دیر سے ادا کرنے میں نمازی زیادہ ہوں تو دیر سے ادا کرنا بہتر ہوگا، اور اگر جلدی نماز ادا کرنے میں نمازی زیادہ ہوں تو جلدی نماز ادا کرنا بہتر ہوگا۔ مطلقا تاخیر کو اگرچہ نبی کریم ﷺ نے پسند فرمایا لیکن وہ دور صحابہ کرام کا تھا، جو آپ کی انتظار میں رہتے تھے، اب ہمارے زمانہ میں تو نماز ادا کر لینا بھی غنیمت ہے، اگر لوگ تاخیر سے جماعت سے بھاگ جائیں تو جلدی نماز ادا کی جائے۔ آجکل تو اتنی زیادہ جہالت چھا گئی کہ مقرر امام کو (امام الحی) اگر ایک یا دو منٹ دیر ہو جائے تو کسی کو پکڑ کر آگے مصلی پر کھڑا کر دیا جاتا ہے، جہلاء کو یہ پتہ نہیں کہ امام الحی کی اجازت کے بغیر نماز پڑھا دینا مکروہ تحریمہ ہے۔ امام الحی کو آج کے دور میں صرف پانچ منٹ کا اختیار اپنے پاس رکھنا چاہئے، امام ہمیشہ دیر کرنے کا عادی نہ بن جائے۔ کبھی کسی عذر کی وجہ سے امام کو دیر ہو جائے تو نمازی پانچ منٹ تک انتظار کریں، پھر امام نے اگر اجازت دے رکھی ہے تو کسی کو امام بنا کر نماز باجماعت پڑھ لی جائے۔

يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ وَاُولٰئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ O (آیۃ نمبر ۱۱۴)

(1) اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لاتے ہیں، اور بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے منع کرتے ہیں اور نیک کاموں پر دوڑتے ہیں اور یہ لوگ لائق ہیں۔ (کنز الایمان)

(2) ایمان رکھتے اللہ پر، اور آخرت کے دن پر، اور حکم دیتے ہیں بھلائی کا، اور منع کرتے ہیں برائی سے، اور جلدی کرتے ہیں نیکی کے کاموں میں، اور یہی لوگ صلاحیت رکھنے والوں میں سے ہیں۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

اہل کتاب سب برابر نہیں، اس کی وجہ بیان فرمائی کہ بعض اہل کتاب وہ ہیں ''جو حق پر قائم ہیں'' (اور ان کی صفت یہ ہے کہ) وہ رات کی گھڑیوں میں اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں، (اور ان کی صفت یہ ہے) کہ وہ نماز ادا کرتے ہیں، (اور ان کی صفت بیان کی کہ) وہ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں اور ان کی صفت یہ بیان کی گئی کہ نیکی کے کاموں میں جلدی کرتے ہیں، ان کی چھ صفات بیان کرنے کے بعد فرمایا ''وَاُولٰئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ'' صالحین کے چند معانی بیان کیے گئے۔

صالحین بمعنی صلاحیت احوال:

''اولئک الموصوفون بتلک الاوصاف من الذین صلحت احوالھم عنداللہ''

وہ لوگ جو ان صفات سے متصف ہیں، یہ ان لوگوں سے ہوں گے جن کے احوال اللہ تعالیٰ کے ہاں درست ہوئے، یعنی باصلاحیت ہوئے۔ (البحر المحیط) **راقم** نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔

صالحین بمعنی مسلمین:

زمخشری نے بیان کیا ہے **''ویجوز ان یرید بالصالحین المسلمین''** جائز ہے کہ مراد ''صالحین'' سے مسلمان لوگ ہوں، جو اللہ تعالیٰ کے قرب کے لائق ہوں، زمخشری نے بیان کیا ہے کہ وصف صلاح زیادہ طور پر وصف اسلام کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اسی وجہ سے انبیاء کرام نے ''صالحین'' میں ہونے کی دعائیں کیں، حضرت سلیمان

علیہ السلام کی دعاء کو رب تعالیٰ نے بیان کیا ﴿وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِکَ فِیْ عِبَادِکَ الصّٰلِحِیْنَ﴾ (اور داخل کر مجھے اپنی رحمت سے اپنے قرب کے سزاوار بندوں میں) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق رب تعالیٰ نے بیان فرمایا ﴿وَلَقَدِ اصْطَفَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ﴾ (اور البتہ تحقیق ہم نے اسے چن لیا دنیا میں اور بیشک وہ آخرت میں قرب کے لائق بندوں سے ہوں گے) اور حضرت ابراہیم اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب (علیہم السلام) کے متعلق فرمایا "وَکُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِیْنَ" اور ہر ایک کو ہم نے قرب کے لائق بنایا، حضرت اسمٰعیل اور حضرت ذوالکفل اور حضرت ادریس (علیہم السلام) کے متعلق ارشاد فرمایا "وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِیْ رَحْمَتِنَا اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ" اور داخل کیا ہم نے ان کو اپنی رحمت میں، بیشک وہ قرب کے لائق لوگوں میں سے ہیں۔ (ماخوذ از کشاف والبحر المحیط)

صالحین بمعنی اصحاب محمد:

قال ابن عباس (اُولٰٓئِکَ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ) ای من اصحاب محمد ﷺ"
وہ لوگ صالحین سے ہوں گے یعنی نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام سے ہوں گے۔ (البحر المحیط)

صالحین بمعنی نیک لوگ:

یہود نے جب یہ کہا "ما آمن بہ الا شرارنا" (نہیں ایمان لایا اس کے ساتھ سوائے ہمارے برے لوگوں کے) تو رب تعالیٰ نے ایمان لانے والوں کا وصف بیان کیا "وَاُولٰٓئِکَ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ" "ای من عداد الذین صلحت عند الله حالهم" "یعنی یہ نیک لوگوں کے ساتھی ہوں گے جن کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا۔ (روح المعانی)

صالحین بمعنی صلاحیت اجسام:

(مِنَ الصّٰلِحِیْنَ) ممن صلحت اجسادهم بصلاح قلوبهم وزکاء نفوسهم" صالحین سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کی درستگی اور نفسوں کی پاکیزگی کی وجہ سے ان کے جسم درست ہوں، اب مطلب یہ ہوا کہ ان صفات کے متصف لوگ ان میں سے ہوں گے جن کے اجسام درست ہوں گے۔ (مظہری)

صالحین بمعنی رب کی رضاء وثناء کے مستحق:

(مِنَ الصّٰلِحِیْنَ) ای من جملة من صلحت احوالهم عند الله تعالی واستحقوا رضاه وثناه"

اب مطلب یہ ہوگا کہ وہ لوگ جو ان صفات سے متصف ہوں گے، وہ ان لوگوں میں سے ہوں گے جن کے احوال اللہ تعالیٰ کے ہاں درست ہوں گے اور وہ رب تعالیٰ کی رضاء اور اس کی ثناء کے مستحق ہوں گے۔ (روح البیان)

''من'' بمعنی ''مع'':

(وَاُولٰئِکَ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ) ای مع الصالحین وھم اصحاب محمد ﷺ فی الجنة''

اور وہ جو ان صفات سے متصف ہوں گے، یہ صالحین (نیک لوگوں) کے ساتھ جنت میں ہوں گے، وہ نیک لوگ نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام ہیں، یعنی ان لوگوں کو جنت میں صحابہ کرام کا قرب حاصل ہوگا۔ (قرطبی)

سب تراجم کو حاوی ترجمہ:

اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضاء خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ مختصر، خوبصورت اور تمام تراجم کا جامع ترجمہ'' آپ نے ترجمہ کیا ''اور یہ لوگ لائق ہیں'' آپ نے اپنے ترجمہ میں ''مــن '' بیانیہ بنایا ہے، یہ ترجمہ نہیں کیا کہ ''یہ لوگ لائق لوگوں سے ہوں گے'' بلکہ ترجمہ کیا ''یہ لائق لوگ ہیں'' **راقم** نے اگرچہ ترجمہ عام مفسرین کے مطابق'' من ''تبعیضیہ والا کیا، تاہم البحر المحیط سے لیا ہے جو تقریبا دوسرے تراجم کو اپنے دامن میں لپیٹے ہوئے ہے۔

تنبیہ: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بحث ابھی قریب ہی گذر چکی ہے، دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

اعتراض: آیۃ کریمہ میں اہل کتاب سے ایمان لانے والوں کے اچھے اوصاف ذکر کئے جا رہے ہیں، ان میں ایک وصف یہ بیان کیا گیا ﴿وَیُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرَاتِ﴾ وہ جلدی کرتے ہیں نیکی کے کاموں میں، نیکی کے کاموں میں جلدی کرنا کس طرح قابل تعریف ہے؟ جبکہ حدیث شریف میں جلدی کرنے کی مذمت ان الفاظ سے کی گئی ہے ''العجلة من الشیطان الا فی امور'' جلد بازی شیطان کی جانب سے ہے سوائے چند امور کے اور ارشاد فرمایا ''العجلة من الشیطان والتانی من الرحمن'' عجلت شیطان کی جانب سے ہے اور دیر کرنا رحمٰن کی جانب سے ہے۔

جواب: مسارعت اور عجلت میں فرق ہے ''معنی المسارعة انه اذا تعارض حق الله وحظ لنفسه بادر لحق الله وترک حظه'' جب اللہ تعالیٰ کے حق اور اپنے نفس کے حصہ میں تعارض آجائے تو جلدی سے اللہ تعالیٰ کے حق کو ادا کیا جائے، اور اپنے نفس کے حصہ کو چھوڑ دیا جائے اسے مسارعت کہا جاتا ہے ''والسرعة مخصوصة بأن یقدم ماینبغی تقدیمه'' سرعت ان کاموں سے خاص ہے جن کو مقدم ذکر کرنا پسند کیا گیا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ:

"ان المسارعة مخصوصة بفرط الرغبة فيما يتعلق بالدين لان من رغب في الأمر آثر الفور على التراخي"

بیشک مسارعت فرط رغبت (زیادتی رغبت) سے مخصوص ہے ان کاموں میں جو دین سے تعلق رکھتے ہیں، جب نیکی کے کاموں میں رغبت پائی جائے تو دیر پر جلدی کام کرنے کو ترجیح دے،

اسی لئے رب تعالی نے فرمایا ﴿وَسَارِعُوا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ﴾ اپنے رب سے مغفرت طلب کرنے کی طرف جلدی کرو، خیال رہے کہ "سرعة" کا مقابل "اناءة" ہے، اسی سے حدیث شریف میں "والتانی من الرحمن" آیا ہوا ہے، لیکن اس کا معنی مجازی مراد ہے مطلقا "تاخیر کرنا" واما العجلة فهي المبادرة للشئی مطلقا" عجلت یہ ہے کہ کسی چیز کی طرف مطلقا جلد بازی کرنا، عجلت کا مقابل تاخیر ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ "والعجلة مخصوصة بان يقدم مالا ينبغي تقديمه" عجلت مخصوص ہے ان کاموں سے جن کا جلدی کرنا مناسب نہ ہو، جیسا کہ نماز وقت سے پہلے ادا کرنا، نماز میں رکوع اور سجود کے مکمل ہونے کا یقین نہ ہو، رکوع سے صحیح سیدھا کھڑا ہونا اور رکوع میں صحیح جھک جانا اور کم از کم ایک مرتبہ تسبیح مکمل کر لینا، اسی طرح سجدہ میں، یہ رکوع اور سجود مکمل ہے، تین مرتبہ تسبیحات کو مکمل کرنا سنت ہے، اس سے زائد مستحب ہے کاش کہ نادان لوگ مسائل بھی پڑھیں رکوع و سجود میں سو جانے والے بعض اوقات ائمہ پر اعتراض کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ "العجلة ليست مذمومة على الاطلاق" عجلت مطلقا منع نہیں، کیونکہ حضرت موسی علیہ السلام نے رب تعالی کے حضور عرض کیا ﴿وَعَجِلْتُ اِلَیْکَ رَبِّ لِتَرْضٰی﴾ میں نے تیری طرف (آنے میں) جلدی کی اے میرے رب تاکہ تو راضی ہو جا۔

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جہاں عجلت کی مذمت بیان کی وہاں بعض امور کو مستثنی بھی کیا "العجلة من الشيطان الافي امور" عجلت شیطان کی طرف سے ہے سوائے چند امور کے، آیئے دیکھئے "تو یہ جلدی کرنا، مہمان کے سامنے طعام جلدی رکھنا، اور میت کی تجہیز و تکفین جلدی کرنا، اور باکرہ عورت کی شادی جلدی کرنا، اور نماز اول وقت مستحب میں پڑھنا" ان تمام کاموں کو جلدی کرنا بہتر ہے، خواہ یوں کہا جائے کہ یہ وہ امور ہیں جن کو نبی کریم ﷺ نے عجلة مذمومہ (بری جلد بازی) سے مستثنی (علیحدہ) فرمایا، یا یوں کہا جائے کہ ان میں جلدی کرنا مستحب ہے اسے مسارعت کہا جائے گا، جس کی رب تعالی نے تعریف فرمائی ہے ﴿وَیُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرَاتِ﴾ وہ نیکی کے کاموں میں جلدی کرتے ہیں۔ (ماخوذ از صاوی و کبیر و روح المعانی)

اصل بات یہ ہے کہ عربی الفاظ کی کہیں کہیں اردو الفاظ سے صحیح ترجمانی نہیں ہوسکتی، جس کی وجہ سے اس قسم کے اعتراض وجواب کی ضرورت درپیش آتی ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضاء خان بریلوی رحمہ اللہ نے اس اعتراض سے بچنے کیلئے ترجمہ یہ کیا ہے "اور نیک کاموں پر دوڑتے ہیں" واقــــم نے اصل میں اعتراض وجواب کی وضاحت کیلئے "وَيُسَارِعُونَ" کالفظی ترجمہ کیا ہے۔

❁ اغتنم خمساقبل خمس شبابک قبل هرمک وصحتک قبل سقمک وفراغک قبل شغلک وحیاتک قبل موتک وغناک قبل فقرک"

حدیث شریف میں ہے "پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت سمجھو، جوانی کو بڑھاپے سے پہلے، اور صحت کو بیماری سے پہلے، اور فراغت کو مشغولیت سے پہلے، اور زندگی کو موت سے پہلے، اور غنی ہونے کو محتاجی سے پہلے۔ یہ حدیث حسن ہے، ابن مبارک نے کتاب الزہد میں بیان کی ہے، علامہ بغوی نے عمرو بن میمون اودی سے بالا سناد مرسل روایت ذکر کی ہے۔ (البحر المحیط مع حاشیہ)

❁ عــن ابــی امـامة قــال رسـول الـلــه ﷺ بــادروا بــالاعــمــال هرماناغضاوموتاخالساومرضاحابساوتسويفامويسا" (رواه البيهقى)

ابوامامہ کہتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا "نیک اعمال کی طرف جلدی کرلو اس بڑھاپے سے پہلے جس کی وجہ سے سر کانپ رہا ہو، اور اچانک موت کے آجانے سے پہلے، اور اعمال سے روک دینے والی مرض سے پہلے، اور اس محتاجی سے پہلے جس میں کہنا پڑے اچھا ہو جائے گا، اچھا ہو جائے گا۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

واولئک اشارة الى امة باعتبار اتصافهم بمافصل من النعوت الجليلة ومافيه من معنى البعدللايذان درجتهم وسموطبقتهم فى الفضل وايثاره على الضميرللاشعار بعلة الحكم والمدح اى اولئک المنعوتون بتلک الصفات الفاضلة بسبب اتصافهم بها"

یہاں دو چیزیں سمجھنے کے قابل ہیں، ایک یہ کہ "اولئك" کا اشارہ "امة" کی طرف ہے جو قریب ہے تو اشارہ بعید کیوں لایا گیا؟ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ "اہل کتاب سے ایک گروہ" جس کا ذکر ہو رہا اس امت (گروہ) کے اوصاف جلیلہ ذکر کئے گئے ہیں، ان اوصاف جلیلہ میں درجات کی بلندی اور طبقات کی فضیلت میں رفعت کی وجہ سے "بعد مرتبۃ" (مرتبہ میں بلندی) حاصل ہے، اس "بعد مرتبۃ" کو مکان کی دوری کے درجہ میں رکھ کر اشارہ بعید کالایا گیا ہے۔

دوسری بات قابل توجہ یہ ہے کہ "اولئك" اشارہ لایا گیا ہے، ضمیر نہیں لائی گئی "وھم من الصالحین" نہیں کہا گیا، اس کی وجہ کیا ہے، تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اشارہ کو ضمیر پر ترجیح دینے کی یہ وجہ ہے کہ حکم اور مدح کی علت (سبب) بیان کیا گیا ہے کہ وہ صالحین سے کیوں ہیں یا صالحین کیوں ہیں؟ اسلئے کہ وہ اعلیٰ قسم کی فضیلت رکھنے والی صفات یعنی صفات جلیلہ ورفیعہ سے متصف ہیں یہ سبب ہے ان کا صالحین سے ہونے گا۔ (تفسیر ابی السعود)

"وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ" التی یعملونھا مبادرین غیر متاقلین لمعرفتھم بقدر ثوابھم"

وہ نیکی کے کاموں پر عمل کرنے میں جلدی کرتے ہیں، نیکی کے کاموں کو بوجھ نہیں سمجھتے، اس لئے کہ انہیں نیکی کے اعمال کے ثواب کی قدر کا علم حاصل ہوتا ہے۔ "وقیل یبادرون بالعمل قبل الفوت" اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ عمل کے فوت ہونے سے پہلے ہی اسے جلدی سے ادا کر لیتے ہیں۔ (قرطبی)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُكْفَرُوهُ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ ۝ (آیۃ نمبر ۱۱۵)

(1) اور وہ جو بھلائی کریں ان کا حق نہ مارا جائے گا، اور اللہ کو معلوم ہیں ڈر والے۔ (کنز الایمان)

(2) اور جو وہ بھلائی کریں تو اسے ہرگز ضائع نہیں کیا جائے گا، اور اللہ جانتا ہے پرہیزگاروں کو۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

جب جاہل یہودیوں نے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کے متعلق کہا "انھم خسروا بسبب ھذا الایمان" بیشک یہ لوگ اس ایمان کی وجہ سے خسارہ میں آگئے، تو رب تعالیٰ نے ان کی صفات جلیلہ کا ذکر فرما کر ان کے متعلق یہ ارشاد فرمادیا "واولئک من الصالحین" وہ باصلاحیت لوگوں سے ہیں، تو اسی سے گویا کہ یہ اعلان فرمادیا "بل فازوا بالدرجات العظمیٰ" وہ خسارہ میں نہیں، بلکہ وہ بہت بڑے درجات حاصل کر کے کامیاب ہو گئے مقصد ان ایمان لانے والوں کی تعظیم تھی تا کہ ان کے دل سے ان جاہلوں کے کلام کا اثر زائل ہو جائے، پھر اس آیۃ کریمہ میں اہل کتاب جو ایمان لانے والے تھے ان کے دل کو مزید تسلی دی، کہ یہ لوگ جو بھی نیکی کا

کام کریں گے خواہ قلیل ہو یا کثیر اس کا ثواب ضائع نہیں کیا جائے گا۔ ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهُ﴾ جس نے ذرا برابر نیکی کا عمل کیا وہ اسے پالے گا (یعنی اس کا ثواب پالے گا) "فان سائر الخلق يدخلون فيه نظرا الى العلة" بیشک تمام مخلوق اس حکم میں داخل ہے، کیونکہ سبب عام ہے کہ جو شخص بھی جو بھلائی کا کام کرے گا اس کا ثواب اسے عطاء کر دیا جائے، اس کے ثواب میں نہ کمی کی جائے گی، اور نہ ہی اس کا ثواب ضائع کیا جائے گا۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ﴾ "اور جو وہ بھلائی کریں۔"

اس سے مراد ہر قسم کی نیکی کے کام ہیں، خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، خواہ وہ متعدی ہوں یعنی ان کا نفع غیروں تک بھی پہنچے یا وہ غیر متعدی یعنی ان کا نفع اس کی ذات تک محدود ہو، دوسروں کو اس کا نفع نہ پہنچے، خواہ وہ نیکی کے کام ظاہر ہوں یا باطن ہوں۔

﴿فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ﴾ "تو اسے ہرگز ضائع نہیں کیا جائے گا۔"

اس مقام پر "یکفرو" کا لفظ "کفران" سے لیا ہوا ہے، جس کا معنی ہے "کفران نعمت" یعنی ناشکری کرنا لیکن یہ معنی یہاں ممکن نہیں کہ معنی یوں کیا جائے ہرگز ان کی اس بھلائی کی ناشکری نہیں کی جائے گی اور ان کی اس بھلائی کی نعمت کا کفران نہیں کیا جائے گا۔ یہ معنی کیوں درست نہیں، یہ اس لئے درست نہیں کہ "یکفرو" مجہول کا فاعل اللہ تعالی ہے، اور اس کا ایک مفعول جمع کی ضمیر، اور دوسرا مفعول واحد کی ضمیر ہے۔

"لايجوز ان يضاف الكفران الى الله تعالى لانه ليس لاحد عليه تعالى نعمة حتى يكفرها"

اللہ تعالی کی طرف کفران کی نسبت جائز نہیں، اسلئے کسی ایک کا اللہ تعالی پر کوئی انعام نہیں، کہ اللہ اس انعام کا شکر ادا نہ کرے تو "کفران نعمت" ہو جائے۔ جب یہ معنی مراد لینا درست نہیں تو مجازی معنی ہوگا "فلن يضيع ولا ينقص ثوابه البتة سمى ذلك كفرانا كما سمى توفية الثواب شكرا" وہ یہ ہے "کہ ہرگز ان کا ثواب نہیں کیا جائے گا، اور ہرگز ان کے ثواب میں کمی نہیں کی جائے گی، ثواب کے ضائع کر دینے اور ثواب کے کم کر دینے کو مجازی طور پر "کفران" کہا جاتا ہے جیسا کہ مکمل ثواب کے عطاء کرنے کو "شکر" کہا جاتا ہے، اسی معنی کا اعتبار ان آیات میں کیا گیا ہے۔ ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ﴾ (بیشک اللہ شاکر اور علم والا ہے) اسی طرح ﴿فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا﴾ ان کی کوشش کا شکریہ قبول کیا جائے، یعنی ان کو ثواب دیا جائے گا۔ (بیضاوی و شیخ زادہ)

دینی مدارس کے طلباء کرام توجہ فرمائیں:

یہاں ایک اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ "کفران" اور "شکر" کا ایک ایک مفعول آتا ہے "فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ" کے دو مفعول ایک نائب فاعل اور دوسرا مفعول ضمیر منصوب متصل، کیسے آ گئے ہیں۔

جواب: کہ یہاں قاعدہ تضمین جاری کیا گیا ہے، وہ یہ کہ "کفر" متضمن ہے اس فعل کو جو دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے، وہ ہے "حرم" اور "منع" گویا کہ یوں کہا گیا ہے "فلن يحرموه" ان کو اس بھلائی سے ہرگز محروم نہیں کیا جائے گا، یا اصل میں یوں تھا "ولن يمنعوا جزاءه" ہرگز ان سے ان کی جزاء کو نہیں روکا جائے گا۔ (شیخ زادہ)

تنبیہ: ایک قرأت میں تاء سے پڑھا گیا ہے ﴿وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ تُكْفَرُوْهُ﴾ اس صورت میں یہ جملہ استینافیہ (نیا جملہ) ہوگا، اور خطاب عام مؤمنین کو ہوگا، مطلب یہ ہوگا "اے مؤمنو جو نیکی کا کام تم کرو تو وہ بھلائی کا کام ہرگز تم سے ضائع نہیں کیا جائے گا۔ تاء والی قراءت کو تائید ان آیات سے بھی ملتی ہے ﴿وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ﴾ اور جو تم کرو بھلائی کا کام اللہ اسے جانتا ہے ﴿وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ﴾ اور جو تم کرو بھلائی پورا پورا دیا جائے گا تمہیں (اس کا ثواب) ﴿وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ اور جو تم بھلائی کرو تم اسے پالو گے اللہ کے ہاں۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ﴾ "اور اللہ جانتا ہے پرہیزگاروں کو۔"

جب اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ ان کے بھلائی کے اعمال کا ثواب ہرگز ضائع نہیں کیا جائے گا، تو اس کے بعد یہ الفاظ مبارکہ ذکر فرمائے ﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ﴾ جو دلیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ الفاظ مبارکہ دلیل کے قائم مقام کیسے ہیں؟ وہ اس طرح کہ ثواب اور جزاء کا نہ پہنچانا یا ہوگا سہو و نسیان (بھولنے) کی وجہ سے "وذلك محال فی حقه لانه عليم بكل المعلومات" "اور یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں" (کہنا کہ وہ (معاذ اللہ) بھول گیا ہے) محال ہے، اس لئے کہ وہ ہر وقت تمام معلومات کو جاننے والا ہے، ابتدائی طلباء کرام بھی بخوبی جانتے ہیں کہ "علیم" صفت مشبہ والا معنی دے رہا ہے جس میں دوام و ثبات ہوتا ہے اسلئے الفاظ کے مطابق لغوی معنی یہ ہے "اور اللہ ہر وقت پرہیزگاروں کو جاننے والا ہے"

عوام کی آسانی کیلئے راقم نے ترجمہ کر دیا "اور اللہ جانتا ہے پرہیزگاروں کو۔" "واما ان يكون للعجز والبخل والحاجة" اور یہ ثواب و جزاء نہ پہنچانے کی وجہ عاجز ہونا اور کنجوس ہونا، اور محتاج ہونا ہے "وذلک

محال لانه اله جمیع المحدثات" اللہ تعالی کو عاجز اور بخیل اور محتاج کہنا محال ہے، کیونکہ وہ معبود حقیقی ہے یہ صفات حدوث پر دلالت کرتی ہیں، وہ تو قدیم ہے۔

"فاسم (الله) تعالی یدل علی عدم العجز و البخل و الحاجة" وقوله (علیهم) یدل علی عدم الجهل"

رب تعالی کا اسم گرامی "الله" اس پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ عجز، بخل احتیاجی سے پاک ہے، اور لفظ "علیم" اس پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ جہالت سے پاک ہے، یہاں سے ہی دلیل مکمل ہوگئی کہ وہی جزا دینے والا ہے کسی کو جزاء سے محروم نہیں کرے گا کیونکہ وہ سہو ونسیان، جہالت، عجز، بخل اور احتیاجی سے پاک ہے، متقین کا ذکر کیا، حالانکہ اللہ تعالی تمام مخلوق کو جاننے والا ہے، اس کی وجہ یہ ہے "هذاالقول بشارة للمتقین بجزیل الثواب و دلالة علی انه لایفوز عنده الا اهل التقوی" کہ اس میں متقین کی بشارت کا ذکر ہے کہ انہیں بہت بڑا ثواب حاصل ہوگا، اور ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ یہ مرتبہ بغیر تقوی کے حاصل نہیں ہوگا۔

تقوی خیر اور اچھے اعمال کا مبدأ ہے:

اللہ تعالی کے ہاں کامیاب ہونے والے اہل تقوی ہیں ﴿وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ﴾ سے یہ واضح اشارہ ملتا ہے "ان الخیر یقربهم الیه" کہ بھلائی کے کام ان لوگوں کو اللہ تعالی کے قریب کر دیتے ہیں، اس پر حدیث قدسی دلالت کر رہی ہے "من تقرب الی شبرا تقربت الیه باعا" رب تعالی فرماتا ہے "جو میرے قریب ایک بالشت ہوتا ہے، میں اس کے قریب اتنا ہوتا ہوں جتنا دو بازوؤں کے درمیان فاصلہ ہوتا ہے۔ اور ارشاد فرماتا "انا جلیس من ذکرنی وانیس من شکرنی ومطیع من اطاعنی" جو میرا ذکر کرتا ہے میری رحمت اس کے ساتھ ہوتی ہے، اور جو میرا شکر یہ ادا کرتا ہے میں اس سے محبت کرتا ہوں، اور جو میری اطاعت کرتا ہے میں اسے اطاعت کا ثواب عطاء کرتا ہوں۔

"ومطیع من اطاعنی" ای کمااطعتمونی بتصفیة الاستمدادو التوحیدنحوی اطعتکم بافاضة الفیض عل حسبه والاقبال الیکم"

جس طرح تم خالص مجھ سے امداد طلب کر کے اور خالص میری طرف توجہ کر کے میری اطاعت کرتے ہو، اسی طرح میں تمہیں اس کے مطابق ثواب پہنچاتا ہوں اور تمہاری طرف توجہ کرتا ہوں، یہ گویا کہ میری طرف سے تمہاری اطاعت ہے۔ سبحان اللہ کیسی ہے شان رحیمی وکریمی۔

(وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ) بالذین اتقوامایحجبهم عنه فتجلی لهم بقدرزوال الحجاب"

اور اللہ تعالی ہمیشہ تقوی والے لوگوں کو جاننے والا ہے، یعنی جب لوگ ان چیزوں سے بچ جائیں گے جوان کے اور رب تعالی کے درمیان حجاب کا ذریعہ بنتی ہیں، تو حجاب زائل ہوتا چلا جائے گا، جتنا حجاب زائل ہوگا اسی قدر ان پر اللہ تعالی کی صفاتی تجلیات واضح ہوں گی۔ (روح البیان)

خوبصورت سبق آموز حکایت:

ابوبکر کتانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں نے خواب میں ایک نوجوان کو دیکھا اتنا خوبصورت جوان میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا، میں نے اس سے پوچھا تو کون ہے؟ "فقال التقوی "اس نے جواب دیا میں تقوی ہوں، قلت فاین تسکن ؟ قال فی کل قلب حزین " میں نے کہا تو کہاں رہتا ہے؟ اس نے کہا کہ میں ہر غمناک دل میں رہتا ہوں، پھر میں نے ایک سیاہ وحشناک عورت کو دیکھا، میں نے اس سے پوچھا تو کون ہے؟ فقال الضحک " اس نے کہا" میں ہنسی ہوں "فقلت ابن تسکنین فقالت فی کل قلب فرح مرح " میں نے پوچھا تو کہاں رہتی ہے؟ تو اس نے کہا میں خوش اور اترانے والے دل میں رہتی ہوں، ابوبکر کتانی فرماتے ہیں میں جب بیدار ہوا تو میں نے دل میں پختہ عقیدہ جمالیا کہ آئندہ میں نہیں ہنسوں گا ہاں اگر کہیں ہنسی غالب ہوگئی جو مجھے بے اختیار آگئی تو وہ مستثنی رہے گی۔

"فعلی السالک ان یتمسک بحبل التقوی ویانس بد فی الدنیالعل اللہ یجعلہ الیسالہ فی قبرہ وحشرہ فالتقوی من دیدن الصلحاء وھم الذین یسارعون الی الخیرات ماداموا فی الحیاۃ "

سالک پر لازم ہے کہ تقوی کی رسی کو لازم پکڑے، اور تقوی سے ہی دنیا میں انس پکڑے، تاکہ اللہ تعالی تقوی کو اس کی قبر میں اور حشر میں اس کا انیس بنادے، تقوی صلحاء کا طریقہ ہے، یہی وہ لوگ ہیں جو بھلائی کے کاموں میں جلدی کرتے ہیں جب تک زندہ رہتے ہیں۔ (روح البیان)

"قال الشیخ ابوالحسن رحمہ اللہ افضل مایسال العبدمن اللہ خیرات الدین ففی خیرات الدین خیرات الآخرۃ ففی خیرات الآخرۃ خیرات الدنیاوفی خیرات ظھور خصائص الاولیاء وھی اربعۃ اوصاف العبودیۃ ونعوت الربوبیۃ والاشراف علی ماکان ومایکون والدخول علی اللہ فی کل یوم سبعین مرۃ والخروج "

شیخ ابوالحسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں، افضل یہ ہے کہ بندہ رب تعالی سے دین بھلائی طلب کرتا رہے، کیونکہ دین کی بھلائی میں آخرت کی بھلائی ہے، اور آخرت کی بھلائی میں دنیا کی بھلائی ہے، اور دنیا کی بھلائی میں اس پر اولیاء کرام کی خصوصیات ظاہر ہوجاتی ہیں، اولیاء کرام کی اعلی قسم کی خصوصیات چار ہیں۔

(۱) **اوصاف عبودیت:** کہ انسان میں رب تعالیٰ کی عبادت کرنے کا خصوصی مقام حاصل ہو جائے۔

(۲) **نعوت ربوبیت:** کہ اس خاص بندے کو رب تعالیٰ کی صفات کا مظہر ہونے کی حیثیت حاصل ہو جائے۔

(۳) **والاشراف علی ماکان وما یکون:** باقی مخلوق جو پیدا ہو چکی ہے یا ہونی ہے اس پر اس انسان کو اشرفیت حاصل ہو جائے، خیال رہے کہ عام عرف میں ولی کا اطلاق غیر نبی پر ہوتا ہے، اسلئے ولی کی اشرفیت انبیاء کرام اور جلیل القدر ملائکہ کے سواء باقی مخلوق پر ہوگی۔

(۴) **والدخول علی الله فی کل یوم سبعین مرة والخروج** "اور ان کو اللہ تعالیٰ کے حضور ہر دن ستر مرتبہ آنے جانے کا موقع مل جاتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی صفاتی تجلیات اس پر منکشف ہوتی ہیں۔ (روح البیان)

"**فلیسارع العبد الی الخیرات والحسنات وجمیع الحالات ولایتیسر ذلک الالارباب الارادات واصحاب المجاهدات**"

لھذا بندے کو چاہئے کہ وہ ہر قسم کے نیکی و بھلائی کے کاموں میں جلدی کرے، یہ کام خاص ارادۃ اور مجاہدہ کرنے والے حضرات ہی کر سکتے ہیں۔

نیاید نکو کاری از بدگان | محال ست دوزندگی از سگان
بداصلوں سے نیکی نہیں آسکتی | زندگی کی دوڑ کتوں سے حاصل ہونا محال ہے
تواں پاک کردن زِزنگ آئینہ | ولیکن نیاید زسنگ آئینہ
آئینہ کو زنگ سے پاک کیا جاسکتا | لیکن پتھر کو آئینہ نہیں بنایا جاسکتا
بکوشش نروید گل از شاخ بید | نہ زنگے بگر مابہ گردد سفید

کوشش کے باوجود بید درخت کی شاخ پر پھول نہیں اگتا زنگ کو ریگ مال سے بھی سفید نہیں کیا جاسکتا۔ (روح البیان)

تمام اشعار کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اپنے آپ میں تقوی کے ذریعے اہلیت پیدا کرتا کہ تجھے رب تعالیٰ کا قرب حاصل ہو سکے، اگر تیرا دل گناہوں سے زنگ آلود ہوا تو رب تعالیٰ کا قرب حاصل نہیں کر سکے گا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا وَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ○ (آیۃ نمبر ۱۱۶)

(1) وہ جو کافر ہوئے ان کے مال اور اولاد ان کو اللہ سے کچھ نہ بچا ئیں گے، اور وہ جہنمی ہیں ان کو ہمیشہ اس میں رہنا۔ (کنزالایمان)

(2) بیشک وہ جنہوں نے کفر کیا ہرگز نہیں بے پرواہ کریں گے ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ سے کچھ (بھی) اور وہ آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (نجوم الفرقان)

مختصر مطلب تقریباً ترجمہ سے ہی واضح ہو رہا ہے، کہ بیشک کافروں کو ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ تعالی کے عذاب سے بالکل نہیں بچا سکیں گے، اور وہ لوگ جہنمی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، لیکن مؤمنوں کو ان کے مال اور ان کی اولاد نفع پہنچا ئیں گے۔

"وان کان التصدیق بالاموال یطفئی غضب الرب فی حق المؤمنین ویغفرون بموت اولادهم او استغفارهم"

کیونکہ مؤمن حضرات جب اللہ تعالی کی راہ میں اپنے مال صدقہ کریں تو اس سے اللہ تعالی کا غضب ختم ہو جاتا ہے اور اس کی رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے، اور ان کے بچوں کے فوت ہونے کی وجہ سے یا ان کی اولاد کی اپنے والدین کیلئے مغفرت طلب کرنے سے ان کی بخشش کر دی جاتی ہے۔ (تفسیر تبصیر الرحمٰن)

شان نزول:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ آیۃ کریمہ بنی قریظہ اور بنی نضیر کے بارے میں نازل ہوئی، کیونکہ یہود کے رئیس لوگ نبی کریم ﷺ کی دشمنی میں مال حاصل کرنے کی طرف مائل ہوتے تھے۔

"وانما کان مقصودهم بمعاداته تحصیل الریاسة والاموال فقال اللہ عزوجل لن تغنی عنهم اموالهم ولا اولادهم"

ان کا مقصد نبی کریم ﷺ کی دشمنی سے یہ ہوتا تھا کہ ریاست اور مال حاصل کرلیں اور اللہ تعالی نے ارشاد گرامی ﴿لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ﴾ ان کے مال اور ان کی اولاد ان کو بے پرواہ نہیں کرسکے گی۔

(۲) دوسرا قول شان نزول میں یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ قریش مشرکین کے متعلق نازل ہوئی، کیونکہ
"فان ابا جهل كان كثير الافتخار بالاموال وانفق ابو سفيان مالا كثيرا في يومی بدر واحد على المشركين"
بیشک ابوجہل اپنے مال پر بہت زیادہ فخر کرتا تھا اور ابوسفیان نے بدر اور احد میں کثیر مال مشرکوں پر خرچ کیا، تو آیۃ کریمہ نازل ہوئی کہ تمہاری اولاد تمہیں اللہ تعالیٰ سے نہیں بچا سکیں گے۔

(۳) تیسرا قول شان نزول میں یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ عام مشرکین کے متعلق نازل ہوئی، کہ کفار اگر مال بطور فدیہ دے کر اپنے آپ کو عذاب سے بچانا چاہیں گے تو نہیں بچا سکیں گے۔ (خازن)

راقم کے نزدیک تمام اقوال ہی معتبر ہیں، اس لئے کہ آیۃ کریمہ میں بنی قریظہ اور بنی نضیر کا ذکر بھی موجود ہے اور قریش مشرکین کو بھی آیۃ کریمہ شامل ہے اور اپنے عموم الفاظ کے لحاظ پر آیۃ کریمہ تمام کفار و مشرکین کو شامل ہے۔

صرف مال اور اولاد کا ذکر کیوں؟

"وانما خص الاموال والاولاد بالذكر لان الانسان يدفع عن نفسه تارة بالفداء بالمال وتارة بالاستعانة بالاولاد فاعلم الله تعالى ان الكافر لا ينفعه شئی من ذلک فی الآخرة ولا مخلص له من عذاب الله"
اللہ تعالیٰ نے مال اور اولاد کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا ہے کیونکہ انسان کبھی مال کا فدیہ دے کہ اپنے آپ سے عذاب کو دور کرتا ہے، اور کبھی اولاد سے امداد کر کے مدافعت کرتا ہے، رب تعالیٰ نے واضح فرما دیا کہ کافر کو عذاب سے نہ اس کا مال بچا سکتا ہے اور نہ اولاد۔

﴿وَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ﴾

"اور وہ لوگ آگ والے ہیں اس میں ہمیشہ رہیں گے۔"

راقم نے لفظی ترجمہ کیا ہے، مرادی ترجمہ وہی خوبصورت ہے جو اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے کیا ہے، "اور وہ جہنمی ہیں۔ "وَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّار" ای مصاحبوها على الدوام وملازموها" وہ اصحاب نار ہوں گے، یعنی آگ کے مصاحب ہوں گے ہمیشہ کیلئے اور آگ کو لازم پکڑنے والے ہوں گے۔ (روح البیان)

"هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡن" کہہ کر ان کے آگ سے نکلنے کے طمع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا کہ وہ آگ میں ہمیشہ رہیں گے، وہ

اپنے دل ودماغ سے یہ باطل تصور نکال دیں کہ وہ مال بطور فدیہ دے کر اور اپنی اولاد سے امداد طلب کر کے اپنے آپ کو جہنم سے بچالیں گے۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

مَثَلُ مَا يُنۡفِقُوۡنَ فِیۡ هٰذِهِ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا كَمَثَلِ رِيۡحٍ فِيۡهَا صِرٌّ اَصَابَتۡ حَرۡثَ قَوۡمٍ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ فَاَهۡلَكَتۡهُ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنۡ اَنۡفُسَهُمۡ يَظۡلِمُوۡنَ ۝ (آیۃ نمبر ۱۱۷)

(1) کہاوت اس کی جو اس دنیا کی زندگی میں خرچ کرتے ہیں اس ہوا کی سی ہے جس میں پالا ہو وہ ایک ایسی قوم کی کھیتی پر پڑی جو اپنا ہی برا کرتے تھے تو اسے بالکل مار گئی اور اللہ نے ان پر ظلم نہ کیا وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ (کنزالایمان)

(2) مثال اس کی جو وہ خرچ کرتے ہیں اس دنیا کی زندگی میں، ایسی ہے جیسے ہوا ہو اس میں سخت ٹھنڈک ہو پہنچے وہ ایک قوم کی کھیتی کو جنہوں نے ظلم کیا اپنی جانوں پر تو فنا کر دے اس (کھیت) کو، اور نہیں ظلم کیا اللہ نے ان پر، لیکن وہ اپنی جانوں پر خود ہی ظلم کرتے ہیں۔ (نجوم الفرقان)

شان نزول: شان نزول میں چند احتمال ہیں۔

(۱) قیل ارادنفقة ابی سفیان واصحابه ببدر واحدفی معاداة رسول الله"
اس میں ایک قول یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی، جو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی دشمنی میں مال خرچ کیا۔

(۲) وقیل ارادنفقة الیهود علی علمائهم ورؤسائهم" دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ یہود کے بارے میں نازل ہوئی جو وہ مال اپنے علماء اور رئیسوں پر خرچ کرتے تھے۔

(۳) وقیل ارادنفقات جمیع الکفار وصدقاتهم فی الدنیا" تیسرا قول یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ تمام کفار کے متعلق نازل ہوئی جو دنیا میں مال خرچ کرتے رہے، اور اپنے خیال میں صدقات کرتے رہے۔

(۴) وقیل ارادنفقة المرائی الذی لایرید بماینفق وجه الله" چوتھا قول یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ لوگوں کے متعلق نازل ہوئی جو دکھلاوے کے طور پر دنیا میں مال خرچ کرتے رہے، ان کا ارادہ اللہ تعالیٰ کی رضاء طلب کرنا نہیں تھا۔ (خازن)

مختصر مطلب:

تمام اقوال شان نزول کے جمع ہیں، آیئے ذرا دیکھئے اسی سے مختصر مطلب بھی واضح کیا جاتا ہے، ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کے رسول اللہ ﷺ کی دشمنی میں مال خرچ کرنے کی مثال، اور یہود ونصاری کے اپنے علماء اور رئیسوں پر مال خرچ کرنے کی مثال، اور عام کفار کے مال خرچ کرنے کی مثال اور لوگوں کا دکھلاوے کے طور پر مال خرچ کرنے کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی قوم گناہوں اور مظالم سے اپنی جانوں پر ظلم کرلیں تو ان کی سزا کیلئے ان کی کھیتی پر سخت سرد ہوا یا سخت گرم لو چلے تو ان کی کھیتی برباد ہو جائے تو ان پر اللہ تعالی کا کوئی ظلم نہیں بلکہ ان کے معاصی ومظالم کی وجہ سے انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا جس کی وجہ سے ان کی کھیتی برباد ہوگئی، ایسے ہی کفار و یہود ونصاری اور ریاء کاروں کا مال خرچ کرنا ضائع چلا جائے، ان کو نفع نہ پہنچائے تو ان پر اللہ تعالی کا ظلم نہیں، بلکہ ان لوگوں کا خود ہی اپنی جانوں پر ظلم ہے "صر" کے دو معانی ذکر کیئے گئے ہیں، ایک یہ "ان الصر البرد الشدید" بیشک "صر" کا معنی ہے سخت ٹھنڈک، یعنی ہوا کی مثال جو شدید ٹھنڈی ہو۔ یہ قول اکثر مفسرین اور اہل لغت کا ہے، اسی کے مطابق ایک روایت حضرت ابن عباس کی ہے اور حضرت ابن انباری کا ایک قول یہی ہے، لیکن ان دونوں حضرات نے دوسرا معنی اس کا یہ بیان کیا ہے "ان الصر هو السموم الحارة التی تقتل" بیشک "صر" وہ گرم لو ہے جو کھیتی کو برباد کردیتی ہے۔ (خازن)

﴿اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ﴾

"وہ پہنچی ایک قوم کی کھیتی کو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔"

(ظلموا انفسهم) الكفر والمعاصی فباؤا بغضب من الله وانما وصفوا بذلك لان الاهلاك عن سخط اشد وافظع"

جس قوم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا کفر اور گناہوں کے سبب وہ اللہ کے غضب سے لوٹے، ان کا یہ وصف بیان کیا کہ ان کی کھیتی کا برباد ہونا اللہ تعالی کو ناراض کرنے کی وجہ سے تھا۔

﴿فَاَهْلَكَتْهُ﴾ "وہ اسے برباد کردے۔"

طلباء کیلئے: "اهلكت" مؤنث کا صیغہ ہے، تاء تانیث اس پر دلالت کررہی ہے کہ اس کا فاعل "هی" ضمیر ہے جو ریح کی طرف لوٹ رہی ہے، اور تاء کے بعد ضمیر واحد مذکر کی منصوب متصل ہے جو "حرث" کی طرف لوٹ رہی ہے، کہ وہ سخت ٹھنڈی ہوا، یا گرم لو اس کھیتی کو پہنچے تو اس کو برباد کردے مراد تشبیہ سے یہ ہے کہ جو انہوں نے مال

خرچ کیا وہ سب ضائع ہو گیا، مکمل طور پر برباد ہو گیا سوائے اس کے کہ ان کو نفع کے لوٹنے کی کوئی امید ہو، جس طرح کافروں کی کھیتی کو سخت سرد ہوا یا گرم لو پہنچے تو اس کھیتی کو برباد کردے "عقوبة لهم ولم تدع منه اثرا" ان کی سزا کیلئے اور اس کا نام نشان چھوڑے، اس سے نفع کی امید مکمل ختم ہو گئی، کیونکہ "فاستأصلته" ہوا نے اسے جڑوں سے اکھیڑ کر رکھ دیا ہے۔ (ماخوذ از روح البیان)

﴿وَمَاظَلَمَهُمُ اللّٰهُ﴾ "اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا۔"

اس کی وجہ ہے کہ انہوں نے جو مال غیر شرعی طور پر خرچ کیا وہ ان کی سزا کیلئے ضائع ہو گیا۔

﴿وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ "لیکن وہ اپنے نفسوں پر خود ہی ظلم کرتے ہیں۔"

یعنی وہ اپنے کفر اور ریاء کاری کی وجہ سے اپنا مال بے جا خرچ کر کے اپنے مال کو ضائع کر کے اپنی جانوں پر ظلم کر رہے ہیں۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

وتقديم المفعول لرعاية الفواصل لاللتخصيص "انفسهم" مفعول ہے جو فعل سے مقدم ذکر کیا گیا ہے، لیکن اس میں تخصیص کا معنیٰ نہیں پایا گیا، بلکہ آیات کے آخری الفاظ کو ملانے کیلئے ذکر کیا گیا ہے، یعنی آخر میں "اَلْمُفْلِحُوْنَ، يَسْجُدُوْنَ، خَالِدُوْنَ، يَظْلِمُوْنَ" سب الفاظ ایک جیسے آگئے، جو عبارت کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہے ہیں۔ (ماخوذ از روح البیان)

کافروں کا ان کو نفع کیوں نہیں پہنچائے گا؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ کافروں کے مال خرچ کرنے میں دو احتمال ہیں۔ **ایک** یہ کہ وہ دنیاوی منافع کیلئے خرچ کریں، اور **دوسرا** یہ کہ دینی، اخروی منافع کیلئے مال خرچ کریں۔

"فان كان لمنافع الدنيالم يبق منه الراالبتة فى الآخرة فى حق المسلم فضلاعن الكافر"

اگر دنیا کے منافع کیلئے مال خرچ کیا جائے تو اس کا اثر آخرت میں مسلمان کے حق میں بھی باقی نہیں رہے گا تو کافر کو یقیناً اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اگر کافر آخرت کے منافع والے کاموں میں مال خرچ کریں، سرائے بنادیں، پل تعمیر کردیں، غریبوں، ضعیفوں پر احسان کریں، یتیموں کی پرورش و تربیت کیلئے مال خرچ کریں، بیوہ عورتوں کو مال

دیں، یہ سب کام اگرچہ آخرت میں عظیم نفع کا سبب ہیں، لیکن ان میں ایمان شرط ہے، اگر ایمان نہ ہوا تو سب اعمال مکمل طور پر ضائع ہو جائیں گے، جیسا کہ کھیتی کاشت کرنے والا نفع کثیر کی توقع رکھتا ہے تو اسے سخت ٹھنڈی ہوا یا گرم لو پہنچے تو اسے تباہ و برباد کر دے، سوائے غم اور افسوس کے کوئی چیز باقی نہ رہے۔

ایک اور رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی سے مسئلہ واضح ہو جاتا ہے:

﴿وَقَدِمْنَا إِلَىٰ مَا عَمِلُوا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَاهُ هَبَاءً مَّنثُورًا﴾ (سورة الفرقان آية نمبر ۲۳)

''اور جو کچھ انہوں نے کام کیے تھے ہم نے قصد فرما کر انہیں باریک باریک غبار کے بکھرے ہوئے ذرے کر دیا۔''

عمل میں اخلاص ضروری ہے:

فلیبادر العاقل الی الانفاق من ماله والاخلاص فی عمله '' عقل مند شخص کو چاہئے کہ وہ اپنا مال خرچ کرنے میں جلدی کرے اور اپنے عمل میں اخلاص رکھے، وہی عمل قبول ہوگا جس میں اللہ تعالیٰ کی رضاء پائی گئی، جس عمل میں دکھلاوا پایا گیا وہ ضائع چلا جائے گا، کیونکہ وہ عمل صالح بنا ہی نہیں، بلکہ ریاء کاری عذاب کا ذریعہ بنے گی، کیونکہ یہ برے عمل میں داخل ہوگی۔

ریاء کاری سے بے برکتی:

منصور بن عمار رحمہ اللہ فرماتے ہیں ایک مومن جو اللہ کی رضاء کی خاطر میرا بھائی بنا ہوا تھا، میرے ساتھ اعتقاد رکھتا تھا، اور وہ خواہ مشکل ہو یا آسانی ہر حال میں میری زیارت کیا کرتا تھا، اور وہ بہت زیادہ عبادت گذار تھا، تہجد ادا کرتا تھا اور روتا رہتا تھا، میں نے چند دن اسے گم پایا (وہ میری زیارت کو نہ آیا) تو میں نے اس کے متعلق پوچھا، تو پتہ چلا کہ وہ بیمار ہے، اور بیماری کیوجہ سے کافر کمزور ہو چکا ہے، میں اس کی زیارت اور بیمار پرسی کیلئے اس کے گھر گیا، اس کے دروازہ کو کھٹکٹایا تو اس کی بچی باہر نکلی، تو اجازت طلب کر کے میں اس کے گھر میں داخل ہوا تو میں نے اسے گھر کے صحن کے درمیان بستر پر لیٹا ہوا پایا، اس کا چہرا سیاہ ہو چکا تھا، اور آنکھیں اس کی نیلی ہو چکی تھیں، ہونٹ اس کے سخت ہو گئے تھے، تو میں نے اسے کہا اے میرے بھائی ''لاالـه الاالله'' کا ورد زیادہ کرو، اس نے آنکھیں کھول کر مجھے غصہ سے سرخ آنکھوں سے دیکھا، پھر اس نے مجھے اسی طرح دیکھا، اور پھر اس نے مجھے اسی حال میں دیکھا، میں نے اسے کہا تم کلمہ کا ذکر کیا کرو، ورنہ میں تمہیں غسل، مرے کر، کفن پہنا کر دفن کر دوں گا، تمہاری نماز جنازہ نہیں پڑھوں گا۔ تو اس نے کہا اے میرے بھائی منصور میرے اور کلمہ کے درمیان کوئی چیز حائل ہو چکی ہے، یعنی میری زبان پر کلمہ جاری نہیں

ہورہا، میں نے "لا حول ولا قوة الا بالله العلی العظیم" پڑھتے ہوئے کہا "فاین تلک الصلوة و الصیام والتهجد و القیام" کہاں ہیں وہ تمہاری نمازیں اورروزے، کہاں ہیں وہ تمہارے تہجد اوردوسرے نوافل؟

"فقال یااخی کل ذلک کان لغیر وجه الله الماکنت افعل ذلک لیقال واذکربه"

عبادات اللہ کی رضاء کے لئے نہیں تھیں، بلکہ ان میں میرا مقصد یہ تھا کہ میرے اعمال کا اور میرا چرچا ہو، اور لوگ یہ کہیں بڑا نمازی اور تہجد گذار ہے، جب میں گھر میں اکیلا ہوتا تو میں گناہوں میں مبتلاء ہوجاتا تھا۔

درآوازہ خواہی دراقلیم فاش　　بروں حلہ کن دروں حشو باش

اگر تو چاہتا ہے کہ ملک میں تیری تعریف کی جائے　　تو تو منافقت والالباس اتاردے

"فلاغرور للعاقل بکثرة الاعمال والاولادوالاموال اذالم تکن نیة صحیحة"

جب تک انساب صحیح نہ ہو، اس میں خلوص نہ ہو تو وہ اپنے اعمال کی کثرت اور اولاد کے زیادہ ہونے اور بہت مال کے ہونے پر ناز نہ کرے اور اس غرور میں نہ رہے کہ یہ چیزیں میرے لئے نفع مند ہیں۔ نفع منداسی وقت ہیں جب ایمان اور خلوص پایا گیا۔ خیال رہے جولوگ آخرت کوترجیح دیتے ہیں، بلکہ باقی تمام چیزوں کو چھوڑ کر صرف اللہ تعالی کی رضاء ومحبت کو حاصل کرنے کی فکر میں ہوتے ہیں "فوجدوا الفقر اعزمن الغنی والذل الذمن العزة وبذلوا اموالهم واروا حهم فی سبیل الله" وہ فقر کو غنی ہونے سے عزیز سمجھتے ہیں، اور دنیاداروں کے عزت دینے سے زیادہ وہ دنیاداروں کی طرف دی جانی والی ذلت کو پسند کرتے ہیں۔ اوروہ اپنے مال اوراپنی جانیں اللہ تعالی کی راہ میں قربان کردیتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ بہت کم ہی ملتے ہیں۔

❁ نبی کریم ﷺ نے ﴿اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ۝ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ﴾ کی تلاوت کی، پھر ارشاد فرمایا۔

"یقول ابن آدم مالی وهل لک من مالک الاما اکلت فافنیت اولبست فابلیت اوتصدقت فامضیت"

انسان کہتا ہے (یہ) میرا مال (ہے) اے انسان تیرا مال تو صرف وہ ہے جوتو نے کھا کر ختم کرلیا، اور تو نے پہن کر پرانا کرلیا ہے، یاتم نے صدقہ کرکے آخرت کیلئے جاری کردیا ہے۔

❁ قال ﷺ (یاعائشة ان اردت اللحوق بی فلیلفک من الدنیا کزادالراکب وایاک ومجالسة الاغنیاء ولاتستخلقی ثوباحتی ترقعیه"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے عائشہ اگرتو میرے ساتھ ملنے کا ارادہ رکھتی ہے، تو تمہیں اتنا مال کافی ہونا چاہئے جتنا مسافر کو زادراہ کافی ہوتا ہے، اوراغنیاء کی مجلسوں سے اپنے آپ کو دور رکھو، کسی کپڑے کو پرانا نہ سمجھو بلکہ اسے ٹکڑے لگا کر پہن لیا کرو۔

وقال ﷺ اللهم من احبنی فارزقه العفاف والکفاف ومن ابغضنی فاکثرماله وولده"
نبی کریم ﷺ نے رب تعالی کے حضور عرض کیا "اے اللہ جو میرے ساتھ محبت رکھے اس کو پاکدامنی اور قناعت کا رزق عطاء فرما، اور جس نے میرے ساتھ بغض رکھا تو تو اس کے مال اور اولاد کو زیادہ کر (یعنی مال اور اولاد کی زیادتی کی اس کے دل میں حرص رکھ دے۔

نتیجہ واضح ہے:

فقد وقفت ایها العبد علی حقیقة الحال وان المال لایغنی عن المرء شیئا فعلیک بالقناعة وتقلیل الدنیا ولاتغتر باصحاب الاموال والجاه"

اے انسان جب تو حقیقت مال سے واقف ہو چکا ہے تو یقین کر لے کہ مال انسان کو کسی چیز سے بے پرواہ نہیں کرسکتا، تو تو قناعت کو لازم پکڑ، اور دنیا کی قلت (قلیل ہونے) کو لازم پکڑ، لوگوں کے دنیاوی مرتبہ اور دنیا کے مال پر دل نہ للچا، بس تو رب کا ہو کر اپنے آپ کو یوں سمجھ،

از پی ذکر وشوق حق مارا درد و عالم دل وزبانی بس

اللہ تعالی کے ذکر اور اس کی ملاقات کے شوق کیلئے ہمیں دونوں جہانوں میں دل اور زبان کافی ہے۔

وز طعام ولباس اہل جہاں کہنہ دلقی ونیم نانی بس

جہاں والوں کے طعام اور لباس کی بنسبت ہمیں پرانی گدڑی اور آدھی روٹی کافی ہے اے انسان تو رب تعالی کی رضاء کی خاطر کام کر دنیا کو دکھلاوے کیلئے کام نہ کر

زعمرو ای پسر چشم اجرت مدار چو در خانہ زید باشی بکار

اے لڑکے عمرو سے امید اجرت کی نہ رکھ جبکہ تو کام زید کے گھر میں کرتا ہے اے انسان عبادت میں زیادہ سے زیادہ کوشش کر بغیر عبادت کے تو رب تعالی کا قرب حاصل نہیں کرسکتا

چہ قدر آورد بندہ خورد لیش کہ زیر قبا دارد اندام پیش

وہ انسان کیا خوراک حاصل کرے گا جو اپنے جبہ کے نیچے ہاتھ باندھے رکھے۔ (ماخوذ از روح البیان)

اعمال کے ضائع ہونے میں معتزلہ اور اہل سنت کا مذہب:

معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ عمل کرنے کے بعد ضائع ہو جاتے ہیں، اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ مجازی طور پر

عمل ضائع ہوجانا ذکر کیا جاتا ہے، حقیقت میں کوئی عمل ضائع نہیں ہوتا۔ معتزلہ نے اس آیۃ کریمہ سے یہ دلیل پکڑی ہے کہ جس طرح سرد ہوا یا گرم لو کھیتی کو برباد کردیتی ہے اسی طرح کفروغیرہ سے عمل ضائع ہوجاتے ہیں، لھذا یوں کہا جائے گا "انہ لو لا الکفر لکان ذلک الانفاق موجباللمنافع الآخرۃ وحینئذ یصح القول بالاحباط" کہ اگر وہ کافر نہ ہوتے تو ان کا مال خرچ کرنا ان کیلئے آخرت میں نفع مند ہوتا، لیکن ان کے کفر نے ان کے مال خرچ کرنے کو ضائع کردیا، معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ انہوں نے کفر کی حالت میں جو مال خرچ کیا ہے وہ حقیقت میں باطل ہوگیا کہ انہوں نے مال خرچ ہی نہیں کیا۔

اہل سنت اس مسئلہ میں یہ کہتے ہیں:

"ان العمل لایستلزم الثواب الابحکم الوعد، والوعدمن اللہ مشروط بحصول الایمان، فاذاحصل الکفرفات المشروط لفوات شرطہ لان ازالہ بعد ثبوتہ"

انسان کو عمل کا ثواب اس وقت حاصل ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کا وعدہ پایا جائے، اللہ تعالیٰ کا وعدہ ایمان کے ساتھ مشروط ہے، جب ایمان ہی نہیں پائے جائے گا تو ثواب بھی حاصل نہیں ہوگا، جب ثواب حاصل نہ ہوا تو مجازی طور پر کہا جائے کہ اس کا عمل ضائع ہوگیا، اہل سنت کے مذہب میں کافر کا مال خرچ تو ختم نہیں ہوتا البتہ ثواب سے اسے محرومیت رہتی ہے۔ (کبیر)

يَـا اَيُّهَـا الَّـذِيْـنَ اٰمَـنُـوْا لَا تَـتَّـخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ قَـدْ بَـدَتِ الْـبَغْضَاءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ O (آیة نمبر ۱۱۸)

(1) اے ایمان والو غیروں کو اپنا راز دار نہ بناؤ وہ تمہاری برائی میں کمی نہیں کرتے ان کی آرزو ہے جتنی ایذاء تمہیں پہنچے بیر ان کی باتوں سے جھلک اٹھا اور وہ جو سینے میں چھپائے ہیں اور بڑا ہے، ہم نے نشانیاں تمہیں کھول کر سنا دیں اگر تمہیں عقل ہو۔ (کنزالایمان)

(2) اے ایمان والو نہ بناؤ راز دان اپنوں کے سواء اوروں کو، وہ نہیں کمی کرتے تمہیں فساد پہنچانے میں اور وہ پسند کرتے ہیں تمہارا مشقت میں پڑنا، تحقیق ظاہر ہو گیا بغض ان کے مونہوں سے، اور وہ جو چھپائے ہیں اپنے سینوں میں اور بڑا ہے، اور تحقیق ہم نے کھول کر بیان کر دی ہیں نشانیاں تمہارے لئے اگر تم عقل رکھتے ہو۔ (نجوم الفرقان)

شان نزول: (۱) شان نزول کے متعلق ایک روایت یہ ہے۔

❁ اخرج ابن اسحق وابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم عن ابن عباس قال کان رجال من المسلمین یواصلون رجالا من یهود لما کان بینهم من الجوار والحلف فی الجاهلیة فانزل الله فیهم ینهاهم عن مباطنتهم تخوف الفتنة علیهم منهم یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِکُمْ" (الآیة)

ابن اسحاق اور ابن جریر اور ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی کہ مسلمانوں میں سے کچھ حضرات یہودیوں کے پڑوسی تھے، زمانہ جاہلیت میں ان کی آپس میں دوستی تھی کہ ایک دوسرے کے حلیف تھے، اب اسلام لانے کے بعد بھی یہ ان سے میل جول رکھتے تھے، تو اللہ تعالی نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرما کر مومنو کو یہود سے ملنے سے منع کر دیا کہ تم ان کو اپنا راز دار نہ بناؤ ورنہ وہ تمہیں فتنہ میں ڈال دیں گے۔ (منقول از درمنثور)

(۲) واخرج عبد بن حمید وابن جریر وابن ابی حاتم عن مجاهد فی الآیة قال نزلت فی المنافقین من اهل المدینة نهی المؤمنین ان یتولوهم"

شان نزول کے متعلق دوسری روایت عبد بن حمید اور ابن جریر اور ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے حضرت

مجاھد سے بیان کی ہے کہ اس آیۃ کریمہ سے مدینہ طیبہ کے منافقوں سے محبت رکھنے سے مؤمنوں کو منع کیا۔
(منقول از درمنثور)

اصل میں کئی مسلمان تو منافقوں کو سمجھ چکے تھے، لیکن بعض مسلمان ان کو مخلص مؤمن سمجھتے تھے، ان کو منع کیا کہ تم ان کو اپنا رازدار نہ بناؤ، وہ تمہاری باتیں یہودیوں تک پہنچاتے ہیں۔

(۳) واخرج ابن حاتم والطبرانی بسند جید عن حمید بن مهران المالکی الخیاط قال سالت اباغالب عن قوله (یاایھاالذین آمنوا لاتتخذوا بطانة من دونکم) الآیة. قال حدثنی ابو امامة عن رسول اللهﷺ انه قال هم الخوارج"

ابن ابی حاتم اور طبرانی نے سند صحیح سے حمید بن مہران مالکی خیاط سے روایت ذکر کی، وہ کہتے ہیں مجھے ابوامامہ نے رسول اللہ ﷺ سے حدیث بیان کی ہے کہ اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا گیا ہے کہ خارجیوں سے محبت کرنے اور ان کو اپنا رازدار بنانے سے منع کیا ہے۔ (منقول از درمنثور)

(۴) واخرج عبد بن حمید وابویعلی وابن جریر وابن ابی حاتم والبیهقی فی الشعب عن انس عن النبی ﷺ قال لاتنقشوا فی خواتیمکم عربیا ولا تستضیئوا بنار المشرکین فذکر ذلک للحسن فقال نعم لاتنقشوا فی خواتیمکم محمدا ولا تستشیروا المشرکین فی شئی من امورکم قال الحسن وتصدیق ذلک فی کتاب الله یاایھاالذین آمنوا لاتتخذوا بطانة من دونکم"

حضرت انس ﷺ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی انگوٹھیوں میں عربی کا نقش نہ کراؤ، اور مشرکوں کی آگ سے روشنی حاصل نہ کرو (صحابہ کرام کے دور کے بعد تابعین کے دور میں) یہ حدیث حضرت حسن بصری رحمہ اللہ پر پیش کی گئی، آپ نے فرمایا ہاں حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی انگوٹھیوں پر نبی کریم ﷺ کا اسم گرامی "محمد" نقش نہ کراؤ (عربی ذات سے مراد آپ ہی ہیں، اور دوسری روایات میں واضح طور پر آپ کے نام کو انگوٹھیوں میں نقش کرانے سے منع کیا گیا ہے) اور آپ کے فرمان کہ مشرکوں کی آگ سے روشنی حاصل کرنے سے منع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تم مشرکوں سے اپنے معاملات میں کسی چیز کے متعلق مشورہ نہ کیا کرو، اس کی تائید کتاب اللہ میں موجود ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ﴾ (اے ایمان والو تم نہ بناؤ رازدار اپنوں کے سوا غیروں کو) اس روایت کے مطابق مشرکین کو رازدار بنانے سے منع کیا گیا ہے۔ (منقول از درمنثور)

تمام روایات ہی شان نزول ہیں:

راقم نے نزدیک روایات میں کوئی تعارض نہیں، بلکہ سب ہی اجتماعی طور پر مراد ہیں، یعنی اے ایمان والو یہود کو، منافقین کو، خارجیوں کو، مشرکین کو، غرضیکہ ہر قسم کے کافر کو اپنا رازدار نہ بناؤ۔ (**بِطَانَةً**) **ولیجة وھو الذی یعرفہ الرجل اسرارہ ثقة بہ**" جو شخص دوسرے کو اپنے راز بتادے اور اس پر بھروسہ کرے، اور اس پر کامل اعتبار کرے، اسے "بِطَانَةً" اور (وَلِیْجَةً) کہا جاتا ہے، اصل میں رازدار کو تشبیہ دی گئی ہے کپڑے یعنی استر سے، استر کو بطانہ کہا جاتا ہے اور کپڑے کے ظاہر حصہ کو "ظھارۃ" کہا جاتا ہے۔ اسی کپڑے کے اندر پہننے والے کپڑے کرتی، بنیان وغیرہ کو "شعار" کہا جاتا ہے، اور کپڑے کے اوپر پہننے والے چادر، کوٹ وغیرہ کو "دثار" کہا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے انصار کو "شعار" سے تشبیہ دی اور عام لوگوں کو "دثار" سے آپ نے ارشاد فرمایا "**الانصار شعار والناس دثار**" انصار شعار ہیں، یعنی جگری یار ہیں، اور عام لوگ "دثار" ہیں یعنی اوپری یار ہیں۔ (ماخوذ از بیضاوی و شیخ زادہ)

خیال رہے کہ "اَلنَّاسِ" پر الف لام عہد ذہنی ہے، مہاجرین صحابہ کرام "دثار" نہیں، بلکہ وہ "شعار" ہی ہیں انصار کی کسی خاص موقع پر تعریف کرتے ہوئے صرف ان کا ذکر کردیا گیا ہے۔ ﴿مِنْ دُوْنِکُمْ﴾ **دون اما بمعنی غیر او بمعنی الادون والدنی** "دُوْنِ" کے دو معنی ہیں۔ ایک بمعنی "غیر" کے، اسی کے مطابق **راقم** نے ترجمہ کیا ہے "اے ایمان والو تم نہ بناؤ رازدار اپنوں کے سوا غیروں کو" "کم" ضمیر جو مضاف الیہ ہے "دُوْنِ" کا یہ مؤمنین کی طرف لوٹ رہی ہے، اب واضح طور پر ترجمہ یہ ہوگا "اے ایمان والو ایمان والوں کے سوا کافروں کو رازدار نہ بناؤ" "دون" کا دوسرا معنی ہے "گھٹیا" اب اس صورت میں معنی ہوگا اے ایمان والو اپنے اعلیٰ و اشرف لوگوں کے سوا گھٹیا لوگوں کو اپنا رازدار نہ بناؤ۔ (ماخوذ از روح المعانی)

اس ترجمہ میں بہت ہی حسن و جمال پایا گیا ہے کہ بہت مختصر الفاظ سے مومنوں کی شان بیان ہوگئی کہ وہ اعلیٰ اور اشرف ہیں، وہی تمہارے اپنے ہیں، اور کافروں کی مذمت بھی پائی گئی کہ وہ گھٹیا ہیں اور وہ تم سے دور ہیں، وہ تمہارے نہیں۔

دینی طلباء کرام کیلئے چند مسائل:

(۱) ﴿مِنْ دُوْنِکُمْ﴾ **ای من دون المسلمین ومن غیر اھل ملتکم**" ﴿مِنْ دُوْنِکُمْ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ "مسلمانوں کے سوا" یا مطلب یہ ہے کہ اپنے مذہب والوں کے سوا دوسرے مذاہب والے، یہ معنی مراد لینا بہت اچھا ہے، کیونکہ اس سے یہ بھی سمجھا دیا گیا ہے کہ اے ایمان والو مؤمنین ہی تمہارے اپنے ہیں، وہی تمہارے بھائی ہیں

،یہ ایسے ہی ہے جیسے کہا جائے "قد احسنتم الینا وانعمتم علینا وھو یرید احسنتم الی اخواننا" تم نے ہم پر احسان کیا اور تم نے ہم پر انعام کیا، تو اس کا مطلب یہ لیا گیا ہے کہ تم نے ہمارے بھائیوں پر احسان کیا، یعنی ہمارے بھائیوں پر احسان کرنا ہم پر احسان کرنا ہے، اسی طرح آیۃ کریمہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مؤمن بھائیوں کو راز دار بنانا غیروں کو راز دار بنانا ہے، وہ راز دوسرے کافروں تک بھی پہنچ جائے گا۔ (کبیر بوضاحت)

(۲) "لَاتَتَّخِذُوْا بِطَانَةً" میں "بِطَانَةً" نکرہ ہے جو تحت النفی واقع ہے، جو عموم کا فائدہ دے رہا ہے یعنی کسی ایک کافر کو بھی اپنا راز دار نہ بناؤ۔ (کبیر)

(۳) ﴿مِنْ دُوْنِكُمْ﴾ میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ یہ متعلق ہو "لَاتَتَّخِذُوْا" سے، اب معنوی طور پر عبارت یہ ہو "لَاتَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِكُمْ بِطَانَةً" اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ وصف ہو "بِطَانَة" کا اب معنوی لحاظ پر تقدیر عبارت کی یہ ہو "لَاتَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ" یہی صورت زیادہ بہتر ہے، کیونکہ جس چیز کا ذکر کرنا اہم ہو، اسے پہلے ذکر کیا جاتا ہے، اس صورت میں نفی راز دار بنانے کی اہم ہے اگرچہ مراد اس سے غیر مذاہب والے ہی ہیں، دوسری صورت میں نفی غیروں کی ہوئی، راز دار بنانے کا ذکر ضمنی طور پر ہو گیا، حالانکہ مقصود راز دار بنانے کی نفی ہے۔ (کبیر)

❁ عن ابی ھریرۃ عن النبی ﷺ قال المرء علی دین خلیله فلینظر احدکم من یخالل" (سنن ابی داؤد)
حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا انسان اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے تم میں سے ہر ایک کو دیکھنا چاہئے کہ وہ کس سے دوستی قائم کر رہا ہے۔ (منقول از قرطبی)

یعنی انسان کو چاہئے کہ مسلمان، نیک، دیندار سے دوستی قائم کرے تاکہ اس کے اچھے اعمال اس پر بھی اثر انداز ہوں، کافر، بے دین شخص سے دوستی قائم نہ کرے تاکہ اسکے برے اعمال اس پر اثر انداز نہ ہوں۔

﴿لَايَأْلُوْنَكُمْ خَبَالًا﴾ (وہ کمی نہیں کرتے تمہیں فساد پہنچانے میں)

(لَايَأْلُوْنَكُمْ خَبَالًا) ای لایقصرون لکم فی الفساد" وہ کمی نہیں کرتے تمہیں فساد پہنچانے میں۔

دینی طلباء کی توجہ کیلئے:

الا، یالو، الوا" کا معنی ہے کوتاہی کرنا، کمی کرنا، یہ زیادہ طور پر ایک مفعول سے متعدی ہوتا ہے، اور کبھی دو مفعولوں سے بھی متعدی ہوتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے "لاآلوک نصحا" جب دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے تو

زیادہ طور پر منع یا" نقص " کے معنی کو متضمن ہوتا ہے "لایالوک نصحا" کا معنی ہے وہ تمہیں نصیحت کرنے سے رکتا نہیں، یا معنی یہ ہوگا وہ تمہیں نصیحت کرنے میں کمی نہیں کرتا، تاہم تقصیر والا معنی بھی کبھی دو مفعولوں میں استعمال ہوتا ہے جیسا علامہ بیضاوی نے ﴿لَا يَأْلُوْنَكُمْ خَبَالًا﴾ کا ترجمہ کیا ہے "لایقصرون لکم فسادا" ۔وہ کوئی کمی نہیں چھوڑتے تم میں فساد ڈالنے کی۔ (ماخوذ از بیضاوی وشیخ زادہ)

"والخبال الفساد واصله مایلحق الحیوان من جنون فیورثه فسادا واضرارا"

خبال کا معنی ہے فساد، اصل میں ذی روح چیز کو جو جنون لاحق ہوتا ہے اسے خبال کہا جاتا ہے، چونکہ اس سے فساد اور ضرر پیدا ہوتا ہے اسلئے پھر فساد اور ضرر پر بھی خبال بولا جانے لگا "**مخبول**" اور "**خابل**" ناقص العقل کو کہتے ہیں۔

حضرت عمر ﷺ کے درخشندہ فیصلے:

وروی ان اباموسی الاشعری استکتب ذمیافکتب الیه عمر یعنفه وتلاعلیه هذه الآیة وقدم ابوموسی الاشعری علی عمررضی الله عنهمابحساب فرفعه الی عمرفاعجبه، وجاء عمر کتابلفقال لابی موسی این کاتبک یقراهذاالکتاب علی الناس؟فقال انه لایدخل المسجدفقال لم؟اجنب هو؟قال انه نصرانی؟ فانتهره وقال لاتدنهم وقداقصاهم الله ولاتکرمهم وقداهانهم الله ولاتامنهم وقدخونهم الله"

روایت بیان کی گئی ہے کہ بیشک ابوموسی اشعری نے ایک ذمی کو حساب لکھنے پر مقرر کیا تو حضرت عمر ﷺ نے ان کی طرف خط لکھا ان کو سختی سے منع کیا اور یہی آیت بطور دلیل تلاوت فرمائی ۔حضرت ابوموسی ﷺ (اس غیر مسلم ذمی کی قابلیت بیان کرنے کے لئے) حضرت عمر ﷺ کے پاس حساب لیکر آئے اور حضرت عمر ﷺ کے پاس وہ حساب پیش کیا۔آپ نے اس حساب پر تعجب کیا حضرت عمر نے ابوموسی سے پوچھا کہ وہ تمہارا کاتب کہاں ہے؟وہ آکر لوگوں پر یہ لکھا ہو حساب خود پڑھ کر سنائے ۔ابوموسی اشعری نے کہا وہ مسجد میں داخل نہیں ہوسکتا۔آپ نے پوچھا کیوں داخل نہیں ہوسکتا کیا وہ جنبی ہے؟ حضرت ابوموسی نے کہا وہ نصرانی ہے آپ نے ان کو جھڑکا اور فرمایا "ان کو قریب نہ کرو" اسلئے کہ اللہ تعالی نے ان کو تم سے دور کردیا ہے اور ان کو عزت نہ دو، تحقیق اللہ تعالی نے ان کو ذلیل کردیا ہے اور ان کو امین نہ سمجھو رب تعالی نے ان کو خائن کہہ دیا ہے۔

۞ **وعن عمر ﷺ قال لاتستعملوااهل الکتاب فانهم یستحلون الرشاء واستعینواعلی امورکم وعلی رعیتکم بالذین یخشون الله تعالی وقیل لعمررضی الله ان**

ھھنـا رجلا من نصاری الحیرة لا احد اکتب منه ولا اخط بقلم افلا یکتب عنک فقال لا آخذ بطانة من دون المؤمنین فلا یجوز استکتاب اهل الذمة، ولا غیر ذلک من تصرفاتهم فی البیع والشراء والاستنابة الیهم"

حضرت عمر ﷛ نے فرمایا اہل کتاب کو کسی کام پر نہ لگاؤ، کیونکہ وہ رشوت کو حلال سمجھتے ہیں، تم اپنے معاملات میں اور اپنی رعایا پر ان لوگوں سے امداد طلب کرو جو اللہ تعالیٰ کا خوف رکھتے ہوں، حضرت عمر ﷛ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ یہاں حیرہ کے نصاریٰ میں سے ایک شخص بہت اچھا کاتب ہے، کوئی ایک اس سے اچھا کاتب نہیں، اور کسی کا قلم اس سے اچھا نہیں لکھ سکتا، کیا ہم اسے کاتب نہ بنالیں، آپ نے فرمایا میں مؤمنوں کے سوا کسی ایک کو راز دار نہیں بناتا، ذمیوں کو کاتب بنانا جائز نہیں، اور اس کے بغیر خرید وفروخت کے تصرفات ان کیلئے جائز نہیں، اور ان کو نائب بنانا جائز نہیں۔

(ماخوذ از قرطبی)

﴿وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ﴾ "اور وہ پسند کرتے ہیں تمہارا مشقت میں پڑنا۔"

"ود، یود، ودا" محبت کرنا، جیسا کہ کہا جاتا ہے "وددته کذا" ای اجبته کذا" میں فلاں سے اس طرح کی محبت کرتا ہوں۔ "العنت" شدة الضرر والمشقة "العنة" کا معنی ہے "شدید نقصان پہنچانا اور مشقت میں مبتلاء کرنا" "ما" مصدریہ ہے **راقم** نے ترجمہ مصدری ہی کیا ہے، "تمہارا مشقت میں پڑنا" معنوی طور پر تقدیر عبارت کی یہ ہوگی "احبوا ان یضروکم فی دینکم ودنیاکم اشد الضرر" وہ پسند کرتے ہیں تمہارے دین اور تمہاری دنیا میں تمہیں شدید نقصان پہنچنے کو "لَا یَاْلُوْنَکُمْ خَبَالًا" اور "وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ" میں چند وجہ سے فرق پایا گیا ہے۔

(۱) الاول لا یقصرون فی افساد دینکم فان عجزوا عنه ودوا القاء کم فی اشد انواع الضرر"

پہلی وجہ فرق یہ ہے کہ وہ تمہارے دین میں فساد پہنچانے میں کوئی کمی نہیں کرتے، اگر وہ فساد پھیلانے سے عاجز آجائیں تو تمہارا شدید میں مشقت پڑنا انہیں پسند آتا ہے۔

(۲) الثانی لا یقصرون فی افساد امورکم فان لم یفعلوا ذلک لمانع من خارج فحب ذلک غیر زائل عن قلوبهم"

دوسری وجہ فرق یہ ہے کہ وہ تمہارے ہر قسم کے معاملات میں فساد پھیلانے میں کوئی کمی نہیں کرتے، اگر کسی خارجی مانع کی وجہ سے ایسا نہ کرسکیں تو ان کے دلوں میں تمہیں فساد میں مبتلاء کرنے کی محبت برقرار رہتی ہے وہ زائل نہیں ہوتی۔

(۳) والثالث لا یقصرون فی فساد امورکم فی الدنیا فاذا عجزوا عنه لم یزل عن قلوبهم

حب اعنالکم"

تیسرا وجہ فرق یہ ہے کہ وہ تمہارے دنیاوی امور میں فساد پھیلانے میں کوئی کمی نہیں کرتے، جب وہ اس سے عاجز آجائیں تو ان کے دلوں میں تمہارا مشقت میں پڑنا پسند آتا ہے، یہ تمنا ان سے زائل نہیں ہوتی۔ (کبیر بتقدیم وتاخیر)

"البغضاء" کا معنی بہت شدید بغض ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے "البغض مع البغضاء" بہت شدید بغض، اسی طرح کہا جاتا "الضر مع الضراء" بہت زیادہ ضرر۔ (کبیر)

"افواہ" جمع ہے "فم" کی "فم" اصل میں "فوہ" ہے، اس پر دلیل ہی "افواہ" ہے، کیونکہ جمع تکسیر اور تصغیر اسموں کو اپنے اصل کی طرف لوٹاتی ہے، یہ جمع ایسے ہی ہے جیسے سوط کی جمع اسواط آتی ہے، اور طوق کی جمع اطواق آتی، ہے جب کوئی شخص عمدہ بات کرے تو کہا جاتا ہے" رجل مفوہ " اور کہا جاتا ہے "افوہ "جبکہ وہ وسیع منہ والا ہو۔ (کبیر)

بغض ضد ہے محبت کی، مطلب یہ ہے کہ تمہاری عداوت اور تکذیب ان کے مونہوں سے ظاہر ہوتی ہے۔

"افواہ" کہا" السنة" نہیں کہا کیا وجہ ہے؟

بظاہر عجیب وہم ہوتا ہے کہ یہ کہا گیا ہے ﴿قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ﴾ (تحقیق بغض ظاہر ہوگیا ان کے مونہوں سے) یہ کیوں نہیں کیا ﴿قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ اَلْسِنَتِهِمْ﴾ کہ ان کی زبانوں سے بغض ظاہر ہوگیا۔

"وخص تعالی الافواہ بالذکر دون الالسنة اشارة الی تشدقھم وثرثرتھم فی اقوالھم ھذہ"

اس کی وجہ یہ ہے منہ کا ذکر کیا، زبان کا نہیں کیا جس سے یہ اشارہ کیا ہے، کہ کافروں کا تمہارے ساتھ بغض صرف زبانوں سے ظاہر نہیں ہو رہا، بلکہ ان کی باچھوں سے بھی بغض بکھر رہا ہے۔ (قرطبی)

- نھی النبی ﷺ ان یشتحی الرجل فاہ فی غض اخیہ" معناہ ان یفتح" نبی کریم ﷺ نے اپنے مومن بھائی کی عزت کے خلاف منہ کھولنے سے منع فرمایا۔
- وقال ﷺ ان دماء کم واموالکم واعراضکم علیکم حرام " نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک تمہارے خون اور تمہارے مال اور تمہاری عزتیں تم میں سے ایک دوسرے پر حرام ہیں۔ (قرطبی)

اور رب تعالی کا ارشاد گرامی اور زیادہ واضح ہے ﴿وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا﴾ اور نہ غیبت کرے تمہارا بعض بعض کی۔

فعل قلبی کے بعد فعل بدنی کا ذکر:

پہلے ذکر فرمایا﴿وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ﴾ (وہ پسند کرتے تمہارا مشقت میں پڑتا) اس میں ان کے فعل قلبی (دل کے کام) کا ذکر کیا گیا کہ وہ مؤمنین سے دل میں شدید بغض رکھتے ہیں، اس کے بعد ذکر فرمایا﴿قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ﴾ (تحقیق ظاہر ہو گیا بغض ان کے مونہوں سے) اس میں ان کے فعل بدنی کو بیان کیا گیا کہ مؤمنوں کے بغض کو وہ مونہوں سے بھی ظاہر کرتے رہتے ہیں "فجمعوا بين كراهة القلوب و بذاذة الالسن"، یعنی ان میں مؤمنوں کو دلوں سے ناپسند کرنا، اور مؤمنوں کے خلاف فحش کلامی دونوں چیزیں جمع تھیں۔ (البحر المحیط)

ان کی فحش کلامی ان کی باچھوں سے بھی بکھر رہی ہوتی تھی، قرطبی کی ایک عبارت پہلے نقل کی جا چکی ہے، طلباء کرام روح المعانی کی ایک خوبصورت عبارت بھی یاد کر لیں۔

"(قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ) ای ظهرت امارات العداوة لكم من فلتات السنتهم وفحوى كلماتهم لانهم لشدة بغضهم لكم لايملكون انفسهم ولايقدرون ان يحفظوا السنتهم"

(تحقیق ظاہر ہو چکا بغض ان کے مونہوں سے) یعنی تمہاری عداوت کی علامات ونشانیاں ان کی زبانوں کی جان بوجھ کر لغزشوں سے اور ان کے انداز کلام سے ظاہر ہوتی رہتی ہے کیونکہ وہ مؤمنین سے شدید بغض رکھتے ہیں وہ اپنے نفسوں پر مالک نہیں، اور نہ ہی اپنی زبانوں کی حفاظت کر سکتے ہیں۔

یعنی مطلب وہی جو پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ فحش کلامی میں اتنے آگے نکل چکے ہیں کہ ان کی زبانوں سے تابڑ توڑ حملے ان کے بس میں نہیں ہوتے، ان کا بیہودہ کلام ان کی باچھوں سے بھی بکھر پڑتا ہے۔

ان کے مونہوں سے بغض کے ظاہر ہونے کے دو مطلب:

(۱) ایک یہ کہ وہ مومنوں کے خلاف باتیں توڑ موڑ کر پیش کرتے جس سے وہ مؤمنوں کے خلاف اپنی باتوں کو پیش کر کے خوش ہوتے، رب تعالیٰ نے فرمایا﴿وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ﴾ آپ ضرور بر ضرور ان کو پہچانو گے ان کی باتوں کی ادائیگی میں۔

(۲) دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے کافروں سے مسلمانوں کے خلاف باتیں کرتے ہیں، نبی کریم ﷺ اور قرآن پاک کی تکذیب کرتے ہیں اور مؤمنوں کو جاہل اور احمق کہتے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَمَا تُخۡفِیۡ صُدُوۡرُهُمۡ اَكۡبَرُ﴾ ''اور وہ جو چھپائے ہیں اپنے سینوں میں اور بڑا ہے۔''

یعنی وہ جو منافقوں کی زبان پر بغض کی علامات ظاہر ہوتی ہیں وہ کم ہیں اور ان کے سینوں میں چھپی نفرت بہت بڑی ہے اور ان کی زبانوں سے جو کینہ کی علامات ظاہر ہوتی ہیں وہ کم ہیں اور جو ان کے سینوں میں کینہ چھپا ہوا ہے وہ بہت بڑا ہے۔ (کبیر)

﴿قَدۡ بَیَّنَّا لَكُمُ الۡاٰیٰتِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ﴾

''تحقیق ہم نے کھول کر بیان کر دی ہیں تمہارے لئے نشانیاں اگر تم عقل رکھتے ہو۔''

یعنی ہم نے واضح آیات ذکر فرما دی ہیں، جن میں واضح طور پر اللہ تعالی اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے دشمنوں سے محبت کرنے سے منع کیا گیا ہے، یا دوسرا مطلب یہ ہے کہ نے واضح آیات ذکر کر دی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ سے محبت کرنے والے اور ان کے دشمنوں میں تمیز کر رہی ہیں۔ (روح المعانی)

﴿اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ﴾ ''اگر تم عقل رکھتے ہو۔''

یعنی اگر تم صاحب عقل و فہم ہو اور سمجھ رکھتے ہو تو دشمن اور دوست میں فرق محسوس کرو، کافروں کو دشمن سمجھو، اور مومنین کو دوست سمجھو، کافروں سے دور ہو جاؤ اور مومنوں کے قریب ہو جاؤ، آجکل الٹی گنگا بہہ رہی ہے، مسلمانوں، دینداروں، علماء کا قتل عام کیا جا رہا ہے، یہود و ہنود و نصاری کی غلامی کا پٹہ گلے میں ڈالا ہوا ہے۔

هَاَنْتُمْ اُولَاۤءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا یُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَیْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَیْظِ قُلْ مُوْتُوْا بِغَیْظِكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ O (آیۃ نمبر ۱۱۹)

(1) سنتے ہو یہ جو تم ہو تم تو انہیں چاہتے ہو اور وہ تمہیں نہیں چاہتے اور حال یہ کہ تم سب کتابوں پر ایمان لاتے ہو اور وہ جب تم سے ملتے ہیں کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور اکیلے ہوں تو تم پر انگلیاں چبائیں غصہ سے تم فرمادو کہ مرجاؤ اپنی گھٹن میں اللہ خوب جانتا ہے دلوں کی بات۔ (کنزالایمان)

(2) خبردار تم یہ ہو، تم پسند کرتے ہو ان کو اور وہ نہیں پسند کرتے تمہیں، حالانکہ تم ایمان رکھتے ہو تمام کتابوں پر، اور وہ جب تمہیں ملتے ہیں، کہتے ہیں ہم ایمان لائے، اور جب علیحدہ ہوتے ہیں تو کاٹتے ہیں تم پر (انگلیوں کے) پورے آپ فرمادو مرجاؤ تم حسرت سے، بیشک اللہ جاننے والا ہے سینوں کی باتوں کو۔ (نجوم الفرقان)

طلباء کرام پہلے ترکیب دیکھیں پھر مطلب واضح ہوگا:

ترکیب میں چند احتمال ہیں "ھا" تنبیہ کیلئے ہے "انتم" مبتداء ہے اور "اولاء" پہلی خبر ہے، اور تحبونھم دوسری خبر ہے دوسری ترکیب یہ ہے کہ "انتم" مبتداء ہے، اور "اولاء" پھر مبتداء ہے، اور "تُحِبُّوْنَهُمْ" خبر ہے، مبتداء خبر مل کر مکمل جملہ خبر ہے پہلے مبتداء کی ان دونوں صورتوں میں "اولاء" اسم اشارہ ہے جو قریب کیلئے استعمال ہے، اب معنی یہ ہوگیا ''خبردار تم یہ ہو تم انہیں پسند کرتے ہو اور وہ تمہیں پسند نہیں کرتے'' ایک اور احتمال یہ ہے کہ "اولاء" موصول ہو، اور بعد میں آنے والا جملہ صلہ ہو، اس صورت میں معنی یہ ہوگا ''خبردار تم وہ لوگ ہو کہ تم انہیں پسند کرتے ہو اور وہ تمہیں پسند نہیں کرتے۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

"ھا" تنبیہ ذکر کرنے کا فائدہ:

جب کوئی شخص غافل ہو، یا اس کی توجہ کامل نہ ہو متکلم کی طرف تو اسے خواب غفلت سے جگانے کیلئے حرف تنبیہ ذکر کیا جاتا ہے، مؤمنین چونکہ توجہ کی کمی، یعنی غفلت کی وجہ سے منافقوں کو مخلص مؤمن سمجھ کر، ان سے محبت کرتے

اوران کوراز بتا دیتے، تو رب تعالیٰ نے " ھا" تنبیہ سے ان کو بتایا کہ "ان المخاطبین مخطئو ن فی اتخاذھم بطانة " بیشک مؤمنین جن کو خطاب کیا جارہا ہے وہ کافروں کو دوست اور رازدار بنا کر غلطی کررہے ہیں، اس غلطی سے ان کو باز رہنا ضروری ہے۔ (از روح المعانی وشیخ زادہ)

﴿هَاَنْتُمْ اُولَاءِ﴾ میں اشارہ کا فائدہ:

والاشارة للتحقیر فاستعملت ھنا للتوبیخ کانه ازدری بھم لظھور خطئھم فی ذلک الاتخاد"

"اولاء" اشارہ تحقیر کیلئے ہے، لیکن یہاں توبیخ کیلئے استعمال ہے، یعنی مؤمنین کو کفار سے محبت کرنے سے ڈرایا گیا ہے، اور انکی کفار کے ساتھ دوستی پر ان کی ظاہر خطاء پر عیب لگایا گیا ہے، یہ مکمل مسئلہ صرف "اولاء" سے سمجھ آگیا، بعد میں آنے والے الفاظ تفسیر بن گئے۔ (روح المعانی)

تنبیہ: صحابہ کرام کی محبت منافقوں سے ان کے کفر کے ظاہر ہونے کے بعد نہیں تھی، بلکہ جب تک ان کا کفر ظاہر نہیں ہوا تھا، ان کو مخلص سمجھ کر محبت کی گئی، یا منافقین اور یہود وغیرہ سے محبت یہ تھی۔

"والمرادبمحبة المؤمنین لھم المحبة العادیة الناشئة من نحو الانسان والصداقة"

مؤمنوں کی ان لوگوں سے دلی محبت، ایمانی محبت نہیں تھی، بلکہ عام عادت کے مطابق جو کسی احسان کرنے والے سے، یا ظاہری طور پر دوستی قائم کرنے والے سے محبت ہوتی ہے، وہی محبت ان سے تھی۔

اس ظاہری اور عام عادت کے مطابق محبت کو بھی رب تعالیٰ نے عجیب وغریب سمجھتے ہوئے مؤمنین کو منع فرمایا کہ تم منافقوں کی چھان بین کیوں نہیں کررہے، یہود سے زمانہ جاہلیت کے معاہدوں کا پاس کیوں کررہے ہو وہ معاہدے تو خود بخود ختم ہوگئے، اور وہ تو ﴿اَلَّذِیْنَ یَتَرَبَّصُوْنَ بِکُمْ رَیْبَ الْمَنُوْنَ﴾ تمہارے حوادثات اور مصائب وآلام کے منتظر رہتے ہیں، وہ تمہیں کافر بنانے کے درپے ہوتے ہیں (پیچھے لگے رہتے ہیں) اگرچہ اس میں کامیاب تو نہیں ہوتے، لیکن تمہیں نقصان پہنچانے کا کوئی وقت ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، لھذا تم ان سے ہر وقت محتاط رہو، کہیں ان کے جال میں نہ پھنس جانا۔ (از روح المعانی)

﴿هَاَنْتُمْ اُولَاءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا یُحِبُّوْنَکُمْ﴾

"خبردار تم یہ ہو کہ تم ان کو پسند کرتے اور وہ تمہیں پسند نہیں کرتے۔"

اس میں چند وجوہ پائی گئی ہیں:

(۱) احدهاقال المفضل(تحبونهم)تریدون الاسلام وهو خیر الاشیاء(وَلَایُحِبُّوْنَکُمْ)لانهم یریدون بقائکم علی الکفرو لاشک انه یوجب الهلاک"

ان میں ایک وجہ یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے جو مفضل رحمہ اللہ نے بیان کیا کہ تم ان کو پسند کرتے ہو، یعنی تم چاہتے ہو کہ وہ اسلام لے آئیں، تم ان کیلئے سب چیزوں سے اعلیٰ چیز پسند کررہے ہو، لیکن وہ تمہیں پسند نہیں کرتے کیونکہ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تم بھی ان کی طرح کافر بنو، حالانکہ یقینی بات ہے کہ کفر ہلاک کردینے والی چیز ہے۔

(۲) الثانی(تُحِبُّوْنَهُمْ)بسبب مابینکم وبینهم من الرضاعة والمصاهرة(وَلَایُحِبُّوْنَکُمْ)بسبب کونکم مسلمین"

دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم ان سے محبت کرتے ہو کہ تمہارے ان سے رشتے قائم ہیں، کوئی ان میں تمہارے دودھ شریکے ہیں، اور بعض خاندانوں کی بعض سے شادیاں ہیں، لیکن وہ رشتہ داری کا پاس نہیں کرتے بلکہ تمہیں مسلمان سمجھ کر تمہارے ساتھ محبت نہیں کرتے۔

(۳) الثالث(تُحِبُّوْنَهُمْ)بسبب انهم اظهروالکم الایمان(وَلَایُحِبُّوْنَکُمْ)بسبب ان الکفرمستقرفی باطنهم"

تیسرا مطلب یہ ہے کہ تم ان سے محبت کرتے ہو، اس وجہ سے کہ وہ تمہارے سامنے اپنے ایمان کا اظہار کرتے ہیں، لیکن وہ تمہارے ساتھ محبت نہیں کرتے، کیونکہ ان کے دلوں میں کفر مضبوطی سے قرار پکڑے ہوئے ہے۔

(۴) الرابع قال ابوبکرالاصم(تُحِبُّوْنَهُمْ)بمعنی انکم لاتریدون القاء هم فی الآیات والمحن(وَلَایُحِبُّوْنَکُمْ)بمعنی انهم یریدون القائکم فی الآفات والمحن ویتربصون بکم الدوائر"

چوتھا مطلب جو ابوبکر اصم نے بیان کیا ہے کہ تم ان سے محبت کرتے ہو، یعنی تم نہیں چاہتے کہ وہ مصائب وآلام میں مبتلاء ہو، لیکن وہ تمہارے ساتھ محبت نہیں کرتے کیونکہ وہ تو چاہتے ہیں کہ تم مصائب وآلام میں گرفتار ہو جاؤ، بلکہ وہ تو انتظار کررہے ہوتے ہیں کہ تمہیں حوادثات پہنچیں۔

(۵) الخامس(تُحِبُّوْنَهُمْ)بسبب انهم یظهرون لکم محبة الرسول ومحب المحبوب محبوب(وَلَایُحِبُّوْنَکُمْ)لانهم یعلمون انکم تحبون الرسول وهم یبغضون الرسول ومحب المبغوض مبغوض"

پانچواں مطلب یہ ہے کہ تم ان سے محبت کرتے ہو اس وجہ سے کہ وہ تمہارے سامنے رسول اللہ ﷺ کی محبت کا اظہار

کرتے ہیں، تم یہ کہتے ہو کہ ہمارے محبوب مصطفیٰ ﷺ سے محبت کرنے والے ہمارے بھی محبوب ہیں، لیکن وہ تم سے محبت نہیں کرتے، اس کی وجہ ہی یہ ہے کہ تم نبی کریم ﷺ سے محبت کرتے ہو، وہ حقیقت میں آپ سے بغض رکھتے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ جس سے ہم بغض رکھتے ہیں اس سے محبت کرنے والوں سے بھی ہم بغض رکھتے ہیں۔

(۶) السادس (تُحِبُّوْنَهُمْ) ای تخالطونهم، وتفشون الیهم اسرارکم فی امور دینکم (وَلَا یُحِبُّوْنَكُمْ) ای لایفعلون مثل ذلک بکم"

چھٹا مطلب یہ ہے کہ تم ان سے محبت کرتے ہو، یعنی ان سے میل جول رکھتے ہو، اور دینی امور کے راز ان پر ظاہر کردیتے ہو، لیکن وہ تمہارے ساتھ اس طرح درپیش نہیں آتے۔

تمام وجوہ سے نتیجہ یہی نکلا کہ مؤمن کفار سے محبت کرتے ہیں، لیکن وہ ان سے بغض رکھتے ہیں، اسلئے مومنوں کو بھی چاہیئے کہ کفار سے دور ہوجائیں، ان کو اپنا دشمن سمجھیں، ان سے میل جول محبت کرنا، اپنے راز ان پر ظاہر کرنا شدید نقصان دہ ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتَابِ كُلِّهٖ﴾ "حالانکہ تم ایمان رکھتے ہو تمام کتابوں پر۔"

(وتؤمنون بالکتاب کله) ای بجنس الکتب جمیعا وهو حال" (تفسیر ابی السعود)

"الکتاب" سے جنس کتاب ہے، لیکن کثرت کو مستلزم ہے، اور جملہ حال ہے۔

اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے دونوں چیزوں کو ترجمہ میں مدنظر رکھا، یعنی حال ہونے اور کثرت کو، اسلئے ترجمہ کیا "اور حال یہ کہ تم سب کتابوں پر ایمان لانے والے ہو" **راقم** نے بھی اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "الکتاب" کو لفظ واحد سے ذکر کیا گیا ہے، اس میں چند وجہ ہیں ایک یہ کہ یہاں مراد جنس کتاب ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے "کثر الدراهم فی ابدی الناس" جنس درہم کی کثرت پائی گئی ہے لوگوں کے ہاتھوں، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ "الکتاب" کو مصدر تسلیم کیا جائے مصدر چونکہ تثنیہ اور جمع بغیر تاویل کے نہیں ہوتا، اسلئے جمع نہیں لایا گیا، تاہم جمع "الکتاب" لانے میں جواز اور وسعت تھی تقدیر الکلام "انکم تؤمنون بکتبهم کلها" اب تقدیر کلام کے مطابق معنی یہ ہوگیا کہ "بیشک تم تو ان کی تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہو" لیکن وہ تمہارے ساتھ بغض رکھتے ہیں، وہ تمہاری کتاب پر ایمان نہیں رکھتے، باوجود اس کے تم ان سے محبت رکھتے ہو "وفیه توبیخ شدید بانهم فی باطلهم اصلب منکم فی حقکم" اس میں مؤمنوں کو ڈانٹ دی گئی کہ وہ باطل راہ پر ہونے کے باوجود اپنے نظریات پر بڑی سختی سے جمے ہوئے ہیں کہ وہ تمہارے ساتھ محبت نہیں رکھتے، تمہاری کتاب پر

ایمان نہیں رکھتے، اور ادھر تم ہو کہ حق پر ہونے کے باوجود اتنے نرم ہو کہ تم ان سے محبت رکھتے ہو۔ (کبیر)

خیال رہے کہ مؤمنوں کو ان سے محبت رکھنے پر ڈانٹا گیا ہے، ان کی اصلی کتابوں پر ایمان لانے پر ڈانٹ نہیں دی گئی، کیونکہ تمام آسمانی کتب پر ایمان رکھنے کے بغیر ایمان ہی مکمل نہیں، اسی لئے رب تعالی نے فرمایا ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ (یعنی ایمان ان لوگوں کا ہی مکمل ہے) جو ایمان رکھتے ہیں اس چیز پر جو آپ پر نازل کی گئی اور اس چیز پر جو آپ سے پہلے نازل کی گئی۔

راقم کا موقف:

راقم کے نزدیک "الکتاب" پر الف لام جنسی ہے، کثرت کا معنی لینے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ زیادہ مناسب معنی یہ ہے "حالانکہ تم مکمل کتاب پر ایمان رکھتے ہو" یعنی تمہارا ایمان کامل قرآن پاک پر ہے، جب مکمل قرآن پاک پر ایمان ہو تو یقیناً پہلی تمام آسمانی حقیقی کتب پر ایمان ہوگا یعنی تمہارا مکمل قرآن پر ایمان ہے جو دوسری کتابوں پر ایمان لانا فرض قرار دیتا ہے، لیکن ان کا ایمان قرآن پاک پر نہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ تمہارے ساتھ محبت نہیں رکھتے۔

﴿وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْا اٰمَنَّا﴾ "اور جب وہ تم سے ملتے ہیں کہتے ہیں ہم ایمان لائے۔"

رب تعالی نے منافقین کا وصف بیان کیا کہ وہ جب ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے ایمان لایا جیسا کہ تم نے ایمان لایا، اور ہم نے تصدیق کی جیسا کہ تم نے تصدیق کی۔

﴿وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ﴾

"اور جب وہ علیحدہ ہوتے ہیں تم پر (انگلیوں کے) پورے کاٹتے ہیں۔"

یعنی جب مومنوں سے علیحدہ ہوتے ہیں تو عداوت ظاہر کرتے ہیں، اور مؤمنوں پر شدید غصے میں ہوتے ہیں، اسلئے کہ مؤمنوں کو ایک دوسرے سے محبت کرتا ہوا دیکھتے ہیں، اور ان کا ایک کلمہ (لا الٰہ الا اللہ) پر اتفاق دیکھتے ہیں، بلکہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے کلام سے بھی اتفاق کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور ان کی آپس میں ایک دوسرے سے صلح ہی صلح نظر آتی ہے، تو مؤمنین پر شدید غصے میں آکر اپنی انگلیوں کے پورے چبانے شروع کردیتے ہیں۔

"عض الانامل عبارة عن شدة الغيظ" پوروں کو کاٹنے سے مراد ہی شدید غصے میں آنا ہے، اگرچہ حقیقی طور پر انگلیوں کو کاٹنا مراد نہیں، بلکہ یہ مجازی طور پر استعمال ہے جیسا کہ کئی مثالیں مجازی معنی میں استعمال ہوتی ہیں۔ (خازن)

البتہ انسان کبھی شدید غصہ میں ہوتا ہے یا کسی کام پر نادم ہوتا ہے تو وہ انگلیوں کے پورے اپنے دانتوں کے نیچے دباتا ہے، یا اپنے انگوٹھے کو دانتوں کے نیچے دباتا ہے، اسی حالت کا یہاں ذکر کیا گیا۔ (مدارک التنزیل للنسفی)

اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضاء خان بریلوی رحمہ اللہ نے ﴿عَضُّوا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ﴾ کا ترجمہ کیا ہے (تم پر انگلیاں چبائیں) آپ کا ترجمہ مرادی مقصد کے مطابق ہے، کہ وہ انگلیوں کو دانتوں کے نیچے دباتے تھے، یعنی چباتے تھے، پھر آپ نے "اَنَامِلَ" کا ترجمہ انگلیاں کیا ہے، کہ وہ اتنے شدید غصہ میں ہوتے ہیں کہ پہلے تو وہ اپنے انگلیوں کے پورے دانتوں کے نیچے دباتے ہیں، لیکن آہستہ آہستہ وہ پوری انگلیاں ہی اپنے مونہوں میں ٹھونس لیتے ہیں۔ **راقم** نے "عَضُّوا" کا اور "اَنَامِلَ" کا لغوی ترجمہ کیا ہے تاکہ طلباء کرام کو لغوی معنی بھی سمجھ آجائے، اور اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے مرادی معنی بھی سمجھ آجائے، لغوی معنی یوں بیان کیا گیا ہے "العض هو بالاسنان" (البحرالمحیط)

"عض" کا معنی ہے دانتوں سے کاٹنا "انامل جمع انملة طرف الاصابع" انامل جمع ہے "انملة" کی اس کے معنی ہے انگلیوں کی طرفین، یعنی انگلیوں کے پورے۔ (خازن)

﴿قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ﴾ "آپ فرمادو تم مرجاؤ حسرت سے۔"

(مِنَ الْغَيْظِ) من اجله تأسفا وتحسرا حيث لم يجدوا الى التشفى سبيلا (قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ) دعاء عليهم بدوام الغيظ وزيادته بتضاعف قوة الاسلام واهله حتى يهلكوا به"

(وہ تم پر (انگلیوں کے) پورے کاٹتے ہیں) بوجہ افسوس اور حسرت کے وہ اس سے شفا (نکلنے) کی کوئی راہ نہیں پاتے، اس لئے اے محبوب آپ ان کے خلاف دعاء کردیں کہ تم ہمیشہ اسی حسرت میں رہو، اور تمہاری حسرت بڑھتی چلی جائے، کیونکہ اسلام اور مسلمانوں کی شوکت میں تو اضافہ ہوتا ہی رہے گا، لھذا تم حسرت میں ہی ہلاک ہو جاؤ۔ (بیضاوی)

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ "بیشک اللہ جاننے والا ہے سینوں کی باتوں کو۔"

"ذات" کا لفظ مؤنث ہے، جیسے "ذو" مذکر ہے، جمع مکسر حکم مؤنث میں ہے، اس لئے مطلب یہ ہوگا "والمراد (بِذَاتِ الصُّدُوْرِ) الخواطر القائمة بالقلب والدواعي والصوارف الموجودة فيه" کہ "اللہ جاننے والا ہے جو دلوں میں واقع ہونے والے خطرات ہیں، اور دلوں میں ہر قسم کے اسباب اور دلوں کو پھیرنے والے ذرائع کو رب تعالی جانتا ہے۔ یہ چیزیں دلوں کی طرف منسوب ہیں، اس لئے ان کو "ذَاتِ الصُّدُوْرِ" کہا گیا ہے۔

"والمعنی انه تعالی عام بکل مایحصل فی قلوبکم من الخواطر والبواعث والصوارف"

معنی اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالی تمہارے دلوں میں واقع ہونے والے خطرات اور اسباب اور دلوں کے پھیرنے والے ذرائع کو جانتا ہے۔ (کبیر)

دینی مدارس کے طلباء کرام توجہ فرمائیں:

صاحب کشاف نے ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ کے ترکیبی لحاظ پر دو مطالب بیان کیے ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ یہ الفاظ مبارکہ " قُلْ " کا مقولہ ہیں، یعنی درمیان میں حرف عطف ذکر نہیں کیا گیا، جیسا کہا جائے "حامد حافظ عالم کریم" حامد حافظ ہے اور عالم ہے، اور کریم ہے، ہر عطف اگر چہ بظاہر ذکر نہیں لیکن معتبر ہے اب مطلب یہ ہوگیا، آپ فرمادیں "مرجاؤ تم اپنی حسرت اور غیظ وغضب میں" اور آپ فرمادیں بیشک اللہ تعالی سینوں کی باتوں کو جاننے والا ہے، وہ جانتا ہے جب تم ہم سے علیحدہ ہو کر حسرت و پریشانی کی وجہ سے یعنی مؤمنوں کے بڑھتے ہوئے اتفاق واتحاد کو دیکھ کر حسد سے جلتے ہوئے اپنی انگلیوں کے پوروں کو منہ میں ڈال کر کاٹ رہے ہوتے ہو۔

(۲) دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ "قل" کا مقولہ نہ ہو۔

"فمعناه قل لهم ذلک یامحمد ولاتتعجب من اطلاعی ایاک علی مایسرون فانی اعلم ماهو اخفی من ذلک وهو مااضروه فی صدورهم ولم یظهروه بالسنتهم"

اس صورت میں معنی یہ ہے اے رسول (ﷺ)! آپ فرمادیں تم مرجاؤ حسرت سے، اب اس سے آگے "آپ فرمادیں" نہیں بلکہ نیا جملہ شروع ہو رہا ہے کہ آپ ان کو جب یہ فرمائیں "تو میں جو تمہیں ان کے رازوں پر مطلع کر رہا ہوں تو میں اس سے بھی زیادہ پوشیدہ چیزوں کو جانتا ہوں اور وہ جو انہوں نے اپنے سینوں میں چھپا رکھا ہے میں اسے بھی جانتا ہوں حالانکہ انہوں نے اسے زبان سے ظاہر نہیں کیا ہوتا۔

(ماخوذ از کبیر)

سبحان اللہ! علامہ رازی رحمہ اللہ نے کیا خوب فرمایا "ولا تعجب من اطلاعی ایاک علی مایسرون" "اے میرے حبیب آپ اس پر تعجب نہ کریں جو میں تمہیں ان کے پوشیدہ رازوں پر مطلع کر رہا ہوں" نبی کریم ﷺ کو رب تعالی نے منافقوں کے دلوں پر مطلع کر دیا، اب بھی آپ کے علم کے کوئی پیمانے سے ناپنے کی کوشش کرے تو اس کی اپنی بدنصیبی، دوسرا کوئی کیا کر سکتا ہے۔

﴿قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ﴾ میں ایک اور احتمال:

یہ خطاب نبی کریم ﷺ کے دل کو خوش کرنے کیلئے اور قوی امید رکھنے کیلئے ہو کہ آپ اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر خوش ہو جائیں کہ رب تعالیٰ نے اسلام کو عزت عطاء فرمائی ہے اور کفار و منافقین کو ذلت عطاء کرنی ہے وہ اسی وجہ سے جل جل کر مر جائیں گے، اب صورت میں مطلب یہ ہوگا "حدث نفسک بذلک" اے محبوب آپ اپنے نفس سے یہ بات کریں کہ ان کو گویا دل سے یہ کہتے رہیں۔ (کبیر)

اصل میں دو احتمال ہیں کہ ﴿قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ﴾ یا تو دعاء ہو ان کے خلاف، یا خبر ہو "ان المعنی اخبرهم انهم لایدرکون مایؤملون" اس صورت میں معنی ہو گیا کہ اے محبوب آپ ان کو خبر دے دو کہ بیشک وہ نہیں پائیں گے جس کی وہ امید رکھتے ہیں۔ (قرطبی)

تقریباً یہی مطلب ہے جو احتمال کبیر سے پیش کیا گیا ہے۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ O (آیۃ نمبر ۱۲۰)

(1) تمہیں کوئی بھلائی پہنچے تو انہیں برا لگے اور تم کو برائی پہنچے تو اس پر خوش ہوں، اور اگر تم صبر اور پرہیز گاری کئے رہو تو ان کا داؤں تمہارا کچھ نہ بگاڑے گا بیشک ان کے سب کام خدا کے گھیرے میں ہیں۔ (کنز الایمان)

(2) اگر تمہیں پہنچے بھلائی تو ان کو غم میں ڈال دے اور اگر پہنچے تمہیں کوئی مصیبت تو وہ خوش ہوتے ہیں اس پر اور اگر تم صبر کرو اور پرہیز گار ہو جاؤ تو نہیں نقصان پہنچائے گا تمہیں ان کا مکر کچھ (بھی) بیشک اللہ جو تم عمل کرتے ہو ان کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ (نجوم الفرقان)

مختصر مطلب:

تقریباً ترجمہ سے ہی واضح ہے، خطاب ہے مؤمنوں کو ہے کہ اگر تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی قسم کی بھلائی، کسی قسم کے منافع پہنچیں، تو وہ ان کو غم میں مبتلاء کر دیتی ہے، اور اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچے تو وہ منافقین اس پر خوش ہوتے ہیں، اے مومنو تم صبر اور تقویٰ اختیار کرو، اگر تم نے صبر اور تقویٰ اختیار کیا تو ان کا مکر و فریب، ان کی چالبازیاں تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکیں گی، بیشک اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو جو وہ کرتے ہیں احاطہ کئے ہوئے ہے۔

﴿اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ﴾ "اگر پہنچے تمہیں بھلائی تو غم میں ڈالے ان کو"

"مس یمس مسا" کا اصل میں لغوی معنیٰ "ہاتھ سے چھونا" ہے، پھر ایک چیز دوسری کو پہنچے تو اسے بھی "مس" کہتے ہیں "قال صاحب الکشاف المس ھھنا بمعنی الاصابۃ" صاحب کشاف نے بیان کیا ہے کہ اس مقام میں "مس" کا معنیٰ پہنچنا اور پہنچانا ہے۔ "حسنۃ" سے مراد دنیاوی منافع ہیں جو مختلف احوال کے مطابق حاصل ہوتے ہیں، جیسے صحت بدن، بارشوں کی وجہ سے سال کا خوشحال ہونا، مال غنیمت کا حاصل ہونا، دشمن پر غلبہ حاصل ہونا، اور احباب کے درمیان محبت و الفت حاصل ہونا، وغیرھا۔ "سیئۃ" ضد ہے "حسنۃ" کی یعنی فقر حاصل ہونا، دشمن سے شکست حاصل ہونا، پریشانی کا لاحق ہونا، اقارب کے درمیان اختلاف پیدا ہونا، قتل و غارت

وغیرہ حاصل ہونا، ساء الشيء يسوء کا معنی قبیح ہونا، یہ "حسنة" کی ضد ہے۔

رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی کا مفہوم یہ ہے:

"انهم يحزنون ويغتمون بحصول نوع من انواع الحسنة للمسلمين ويفرحون بحصول نوع من انواع السيئة لهم"

کہ مسلمانوں کو جب کوئی بھلائی پہنچے تو وہ حزن اور غم میں مبتلاء ہوجاتے ہیں اور مسلمانوں کو اگر کوئی مصیبت پہنچے تو وہ اس پر خوش ہوتے ہیں۔ (کبیر)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"وجملة الشرط متصلة بالشرط قبل ومابينهمااعتراض والمعنى انهم متناهون في عداوتكم فلم توالونهم فاجتنبوهم"

یہ جملہ شرطیہ یعنی "اِنْ تَمْسَسْكُمْ الخ" متصل ہے پہلے جملہ شرطیہ سے یعنی "وَاِذَا لَقُوْكُمْ الخ" سے اور درمیان میں جملہ معترضہ ہے، مطلب یہ ہوگیا" کہ بیشک وہ تمہاری دشمنی میں انتہاء درجہ تک پہنچے ہوئے ہیں، تم ان سے محبت کیوں کرتے ہو ان سے اجتناب کرو۔

﴿وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا﴾

"اور اگر تم صبر کرو، اور پرہیزگار ہو جاؤ تو نہیں نقصان پہنچائے گا تمہیں ان کا مکر کچھ (بھی)"

راقم نے یہ ترجمہ خازن کی اس عبارت سے لیا ہے:

"وان تصبروا يعني على اذاهم وقيل ان تصبروا على طاعة الله ومانالكم فيهامن شدة(وتتقوا)اى تخافواربكم وقيل وتتقوامانهاكم عنه وتتوكلواعليه(لايضركم)اى لاينقصكم(كيدهم)اى عداوتهم ومكرهم(شيئا) اى لانكم في عناية الله وحفظه"

اور اگر تم صبر کرو ان کی طرف سے تکالیف پہنچانے پر، اور اگر تم صبر کرو اللہ تعالیٰ کی طاعت پر اور اس طاعت میں تکالیف کے پہنچنے پر، اور پرہیزگار ہو جاؤ یعنی اپنے رب سے ڈرو، اور جن چیزوں سے رب تعالیٰ نے تمہیں روکا ہے ان سے بچ جاؤ، اور رب تعالیٰ پر توکل رکھو، تو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا ان کی عداوت اور ان کا مکر کچھ بھی، اس لئے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عنایت اور حفاظت میں ہو۔

فائدہ: ﴿لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا﴾ (تمہیں نہیں نقصان پہنچائے گا ان کا مکر کچھ بھی) اسلئے کہ تم اللہ تعالیٰ کی

حفاظت میں ہو، اس سے رب تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یہ تعلیم دی، اور ان کی یہ راہنمائی کی "یستعان علی کید العدو بالصبر و التقوی" کہ دشمن کے مکروفریب پر صبر اور تقویٰ سے امداد طلب کی۔

"قال الحکماء اذا ردت ان تکبت من یحسدک فازدد فضلا فی نفسک لا یضرکم"
حکماء نے بیان کیا ہے کہ اگر تو ارادہ رکھتا ہے کہ اپنے ساتھ حسد کرنے والے کو اپنے راستہ سے ہٹا دے تو تو اپنے نفس میں فضیلت پیدا کر تو وہ تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ (مدارک التنزیل للنسفی)

﴿اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ﴾ "بیشک اللہ جو وہ عمل کرتے ہیں ان کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔"

"والمعنی محیط جزاؤہ" مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جزاء ان کے اعمال کا احاطہ کئے ہوئے ہے صرف یہ نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کو جزاء عطاء فرمائے گا، بلکہ احاطہ کا ذکر فرمایا ہے، اس کا کیا فائدہ ہے؟ "وعبر بالاحاطة عن الاطلاع التام والقدرة والسلطان" احاطہ سے تعبیر کرنے سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو ان لوگوں کے اعمال پر کامل علم حاصل ہے، اور اسے ان پر سلطنت حاصل ہے، اور وہ ان کو جزاء دینے پر کامل قادر ہے۔ (البحر المحیط)

اعتراض: محیط تو اسے کہتے ہیں جو تمام جوانب (طرفوں) سے احاطہ کرے، یہ صفت اجسام کی ہے، اللہ تعالیٰ جسمیت سے پاک ہے، تو کس طرح "محیط" کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر صحیح ہے؟

جواب: محیط کا مجازی معنی مراد لیا گیا ہے "انہ تعالی لما کان عالما بکل الاشیاء قادرا علی کل الممکنات جاز فی مجاز اللغة انه محیط بها" اسلئے کہ اللہ تعالیٰ جب تمام چیزوں کو جاننے والا ہے، اور تمام ممکنات پر قادر ہے تو مجازی طور پر یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ تمام چیزوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"محیط" باب افعال سے اسم فاعل ہے، اسم فاعل حدوث پر دلالت کرتا ہے، ثبوت پر نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کیلئے جن صفات کا بھی تذکرہ ہو ان میں دوام و ثبات ہوتا ہے، اسی لئے ﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا﴾ میں "کان" "دوام و استمرار پر دلالت کر رہا ہے، راقم نے اسی لئے اپنے ترجمہ میں دوام کو پیش نظر رکھا، اور ترجمہ یوں کیا "بیشک اللہ جو وہ عمل کرتے ہیں ان کا احاطہ کئے ہوئے ہے" رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ﴾ ذکر ہوا ﴿اِنَّ اللّٰهَ مُحِيْطٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ﴾ ذکر نہیں کیا گیا اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہم چیز کو پہلے ذکر کیا جاتا

ہے، پھر دوسری چیز کو۔

"ولیس المقصود ههنابیان کونه تعالی عالمابل بیان ان جمیع اعمالهم معلومة لله تعالی ومجازیهم علیهافلاجرم قدم ذکر العمل" (واللہ اعلم)

مقصد یہاں یہ بیان کرنا نہیں کہ اللہ تعالی عالم ہے، بلکہ مقصد بیان کرنے کا ان کے اعمال ہیں، کہ اللہ تعالی کو ان کے اعمال کا علم ہے وہ انہیں جزاء عطاء کرے گا، اس لئے "عمل" کو پہلے ذکر کیا، اور احاطہ جو علم پر دلالت کر رہا ہے اسے بعد میں ذکر کیا۔ (کبیر)

فائدہ: "حسنة" کے ساتھ "مس" کو ذکر کیا، اور "سیئة" کے ساتھ "اصابة" کو ذکر کیا اس میں کوئی وجہ فرق بھی ہے یا نہیں؟ بعض حضرات نے تو بیان کیا ہے کہ کوئی فرق تو نہیں، عبارت میں حسن و جمال پیدا کرنے کیلئے بطور تفنن (فنی کمال) ذکر کر دیا ہے، لیکن بعض محققین نے بیان کیا ہے کہ زیادہ بہتر اور زیادہ مناسب یہ ہے کہ وجہ فرق جو واضح طور پر سمجھ آ رہی ہے اسے بیان کیا جائے، اس انداز ترتیب سے یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے وہ منافق خوش بھی بہت زیادہ ہوتے تھے، اور غمناک بھی بہت زیادہ۔

"لان المس اقل من الاصابة کماهو الظاهر فاذاساء هم اقل خیرنالهم فغیره اولی منه، واذافرحوا باعظم المصائب ممایرلی له الشامت ویرق الحاسدفغیره اولی فهم لاترجی موالاتهم اصلافکیف تتخذولهم بطانة"

وجہ اس کی یہ ہے کہ "مس" اصابۃ سے کم ہے یہ تو بالکل ظاہر ہے جب مسلمانوں کو تھوڑی بھلائی سے وہ بہت زیادہ غمناک ہوتے ہیں، تو یقیناً زیادہ بھلائی کے پہنچنے سے تو ان کے غم اور پریشانی میں اور ہی زیادہ اضافہ ہوتا تھا، اور جب مسلمانوں کو زیادہ مشکل درپیش آتی تو وہ اس پر خوش ہوتے تھے تو یقیناً تھوڑی مصیبت پہنچنے پر بھی وہ اسی طرح خوش ہوتے تھے۔ تو اس سے مسلمانوں کو سمجھا دیا گیا کہ وہ تو دوستی کے قابل نہیں، ان کو اپنا رازدار بنانا کس طرح درست ہوسکتا ہے ایک اور وجہ فرق یہ بیان کی گئی۔

"ان ذلک اشارة الی ان مایصیبهم من الخیر بالنسبة الی لطف الله تعالی معهم خیر قلیل، ومایصیبهم من السیئة بالنسبة لمایقابل به من الاجر الجزیل عظم بعید کمالایخفی"

کہ اس ترتیب میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ ان کو بظاہر بھلائی یعنی فوائد دنیاوی کم ہی حاصل ہوتے ہیں لیکن اس پر اللہ تعالی کی طرف سے بہت زیادہ ثواب حاصل ہوگا، اور جو ان کو مشکلات پہنچتی ہیں بیشک وہ بظاہر زیادہ اور عظیم نظر آتی ہوں گی،

لیکن ان پر صبر کرنے سے بہت بڑا ثواب رب تعالیٰ نے عطاء فرماتا ہے، یہ وجہ فرق واضح ہے، مخفی نہیں۔ (روح المعانی)
سبحان اللہ قرآن پاک کیسی عظیم کتاب ہے جس کا ایک ایک جملہ، ایک لفظ کتنے بیش بہا (بہت قیمتی) موتی بکھیر رہا ہے۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"لایضرکم" کے تحت بیان کیا گیا ہے کہ اسے "ضاد" کے کسرہ اور راء کی جزم سے بھی پڑھا گیا ہے، اس صورت میں یہ "ضارہ یضیرہ" سے لیا جائے گا، البتہ معنی "ضر یضر" والا ہی ہوگا۔ (روح المعانی)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَاِذۡ غَدَوۡتَ مِنۡ اَهۡلِكَ تُبَوِّئُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ مَقَاعِدَ لِلۡقِتَالِ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ۝ (آیۃ نمبر ۱۲۱)

(1) اور یاد کرو اے محبوب جب تم صبح کو اپنے دولت خانہ سے برآمد ہوئے مسلمانوں کو لڑائی کے مورچوں پر قائم کرتے اور اللہ سنتا جانتا ہے۔ (کنزالایمان)

(2) اور یاد کرو جب آپ صبح نکلے اپنی اہل سے، آپ قائم کر رہے تھے مؤمنوں کو مقام قتال میں اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ (نجوم الفرقان)

شان نزول:

اگرچہ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ آیۃ کریمہ بدر کے واقعہ پر نازل ہوئی، اور ایک قول یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ غزوہ خندق کے متعلق نازل ہوئی، لیکن جمہور مفسرین کرام کا قول یہ ہے کہ غزوہ احد کے متعلق نازل ہوئی اسی پر زیادہ وثوق اختیار کیا گیا۔ (قرطبی)

جب بدر کو قریش کے سرکردہ لوگوں کو قتل کر کے ان کا ایک اکنوئیں میں پھینک دیا گیا تھا، باقی کفار جب شکست حاصل ہونے کے بعد مکہ میں پہنچے تو بدر میں جو لوگ قتل کردئے گئے ان کے بیٹے ابوسفیان کے پاس جمع ہو کر کہنے لگے کہ ہمیں بدر کا انتقام لینا چاہئے، ابوسفیان کے پاس آنے والے عکرمہ بن ابی جہل اور عبداللہ بن ابی ربیعہ اور صفوان بن امیہ تھے ان دنوں میں ہی قریش کو کافی تجارتی نفع ہو چکا تھا (جس کا ذکر قریب ہی بدر کے واقعہ میں ان

شاء اللہ آ جائے گا) یہ لوگ کہنے لگے۔

"یا معشر قریش ان محمد اقدوتر کم وقتل اخیار کم فاعینونا بھذاالمال علی حربه لثارنابمن اصاب مناففعلوا"

اے قریش کے قبیلے! بیشک محمد نے تمہیں برباد کر کے رکھ دیا، اور تمہارے بھائیوں کو قتل کر دیا، یہ تجارتی نفع والا تمام مال ہمیں دے دیں تا کہ ہم محمد اور اس کے ساتھیوں سے جنگ کر کے بدلہ لیں، قریش نے وہ تمام مال ابو سفیان اور اس کے ساتھیوں کو دے دیا جو مسلمانوں سے جنگ کرنا چاہتے تھے، ابوسفیان کی زیر قیادت قریش کا لشکر تین ہزار افراد پر مشتمل تیار کر لیا گیا لشکر کے ساتھ ابوسفیان کی زوجہ ھند بنت عتبہ بھی تھی، اور بھی قریش کی عورتیں ساتھ تھیں، جو لشکر کا گانا گا کر جوش دلا رہی تھیں، ان کے ساتھ دو سو گھوڑے تھے اور بھی ہر قسم کا جنگی سامان وافر مقدار میں ان کے پاس موجود تھا یہ لوگ مدینہ طیبہ کے مقابل بطن سبخہ میں ایک پہاڑ کے پاس اتر گئے۔

❁ قال رسول اللہﷺانی رأیت بقرا تنحرورأیت فی ذباب سیفی ثلماورأیت انی ادخلت یدی فی درع حصینة فأولتهاالمدینة"

نبی کریمﷺ نے خواب دیکھا، آپ فرماتے ہیں میں نے گائے کو ذبح ہوتے ہوئے دیکھا، اور میں نے اپنی تلوار کو دیکھا کہ اس میں دندانے پڑ گئے، اور میں نے دیکھا کہ میں نے اپنا ہاتھ اپنی مضبوط زرہ میں داخل کر لیا، اس کی تعبیر میں نے مدینہ طیبہ لی ہے۔

"وعبرا ذبح البقرة بذبح اناس من اصحابه والثلم الذی بذباب سیفه بقتل رجل من اهل بیته"

نبی کریمﷺ نے گائے کے ذبح کئے جانے سے اشارہ کیا کہ کچھ صحابہ کرام شہید کر دیئے جائیں گے، اور تلوار کے کند ہونے اور اس میں داندانے پڑ جانے سے اشارہ کیا کہ آپ کے اہل بیت میں سے کسی شخص کو شہید کر دیا جائے گا، ایسا ہی ہوا کہ حضرت حمزہؓ کو شہید کر دیا گیا۔

نبی کریمﷺ کا مشورہ:

آپ نے صحابہ کرام کو مشورہ کیلئے طلب کر لیا، اس مشورہ میں رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول کو بھی طلب کر لیا گیا تھا، نبی کریمﷺ نے اپنی رائے یہ بیان فرمائی۔

"فان رایتم ان تقیموا بالمدینة وتدعوهم حیث نزلوا فان اقاموا اقاموا ابشر مقام وان هم دخلوا علینا قاتلناهم فیها"

اگر تم مدینہ میں ہی رہو تو بہتر ہے، ان کو چھوڑ دو، وہ جہاں بھی اترے ہیں ٹھیک ہے، وہ جہاں ٹھہریں گے

وہی مقام ان کیلئے شر ہوگا اگر انہوں نے ہم پر (مدینہ طیبہ میں) حملہ کیا تو ہم ان سے قتال کریں گے، نبی کریم ﷺ کی رائے کو عبداللہ بن ابی بن سلول نے بھی پسند کیا، وہ بھی چاہتا تھا کہ ہمیں مدینہ طیبہ سے باہر نکل کر جنگ نہیں کرنی چاہئے، نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ سے باہر نکل کر جنگ کرنے کو ناپسند فرما رہے تھے، آپ کا موقف یہ تھا کہ ہمیں مدینہ طیبہ میں رہ کر دفاعی جنگ کرنی چاہئے۔

"فقال رجال من المسلمین ممن اکرمه الله تعالی بالشهادة یوم احد وغیرهم ممن کان فاته یوم بدر اخرج بنا یارسول الله الی اعدائنا لایرون انا جبنا عنهم و ضعفنا"

لیکن وہ صحابہ کرام جن کو شہادت سے احد کے دن رب تعالی نے مکرم کرنا تھا اور کچھ دوسرے صحابہ کرام جو بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے ان تمام کا مطالبہ یہ تھا کہ یارسول اللہ ﷺ آپ ہمیں دشمن کے مقابل لے چلیں، کبھی بھی ہمارا دشمن ہمیں بزدل اور کمزور نہیں پائے گا۔ ادھر عبداللہ بن ابی بن سلول بار بار زور دے رہا تھا کہ ہمیں مدینہ طیبہ میں رہ کر دفاع کرنا چاہئے، باہر نہیں نکلنا چاہئے، یہ اپنے دلائل قائم کر رہا تھا، اور کہہ رہا تھا۔

یا رسول الله اقم بالمدینة لاتخرج الیهم فوالله ماخرجنا منها الی عدو لنا قط الا اصاب منا ولا دخل علینا الا اصبنا منه "

یارسول اللہ ﷺ آپ مدینہ طیبہ میں ہی رہیں۔ باہر جنگ کیلئے نہ جائیں، کیونکہ ہم نے جب بھی باہر نکل کر جنگ کی دشمن نے ہم پر غلبہ پایا، اور جب ہم نے شہر میں رہ کر دفاع کیا تو ہم نے غلبہ پایا۔

لیکن یہ دلیل اس کی بہت کمزور تھی کیونکہ بدر میں نبی کریم ﷺ نے مدینہ طیبہ سے باہر نکل کر جنگ کی تھی اور وہ غلبہ حاصل کیا جس کی مثال نہیں ملتی۔ ہاں البتہ یہاں اس کی رائے کو اس لئے قوت حاصل تھی کہ اس کی رائے نبی کریم ﷺ کی رائے سے ملتی تھی۔ لیکن شہادت کے مشتاق حضرات بار بار دشمن کے مقابل جنگ کرنے کو ترجیح دیتے ہوئے باہر نکلنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔

❁ "دخل رسول الله ﷺ فلبس لامة حربه وذلک یوم الجمعة حین فرغ من الصلوة ثم خرج علیهم"

نبی کریم ﷺ گھر تشریف لے گئے اور جنگی اسلحہ زیب تن کیا (یعنی تلوار کو گلے میں لٹکایا، زرہ پہنی، نیزہ ہاتھ میں لیا) یہ جمعہ کا دن تھا، آپ نماز جمعہ سے جب فارغ ہوئے تو گھر جا کر اسلحہ زیب تن کر کے ان کے پاس تشریف لے آئے۔

"وقد ندم الناس وقالوا استکرهنا رسول الله ﷺ ولم یکن لنا ذلک فان شئت فاقعد ﷺ "

نبی کریم ﷺ کو اسلحہ زیب تن کئے ہوئے تشریف لانے پر لوگ پشیمان ہو گئے کہ ہم نے نبی کریم ﷺ کو اس حال

میں نکلنے پر مجبور کیا ہے۔ حالانکہ ہمیں یہ حق حاصل نہ تھا۔ اب تمام حضرات مؤدبانہ طور پر عرض کر رہے تھے یا رسول اللہ اگر آپ یہاں ہی تشریف رکھنا چاہتے ہیں تو آپ یہی بیٹھ جائیں، باہر نہ نکلیں۔

"فقال ﷺ ماینبغی لنبی اذالبس لامته ان یضعها حتی یقاتل فخرج ﷺ بالف من اصحابه"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ نبی کی شان کے لائق یہ نہیں کہ اسلحہ زیب تن کر کے پھر اتار دے یہاں تک کہ وہ جہاد کرے، تو نبی کریم ﷺ اپنے ساتھ ایک ہزار آدمیوں کو ساتھ لے کر احد کی طرف تشریف لے گئے۔ احد کا واقعہ شوال ۳ھ میں در پیش آیا۔

عبد اللہ بن ابی بن سلول اپنے تین سو ساتھیوں سمیت لوٹ آیا۔ اب نبی کریم ﷺ کے ساتھ سات سو افراد رہ گئے۔ نبی کریم ﷺ نے احد پہاڑ کے درہ پر حضرت عبد اللہ بن جبیر کو کھڑا کیا اور ان کے ساتھ پچاس آدمی کھڑے کئے۔ آپ نے ان لوگوں کو حکم دیا کہ تم نے یہاں ہی ٹھہرنا ہے، تا کہ وہ ہمارے پیچھے سے حملہ نہ کر دیں، اور ساتھ ہی یہ فرمایا "ان کان علینا اولنا فاثبت مکانک" کہ جنگ خواہ ہمارے مخالف ہو یا موافق ہو تم نے یہی ٹھہرنا ہے، تا کہ تمہاری جانب سے آکر وہ حملہ نہ کر دیں۔ احد کے دن نبی کریم ﷺ دو زرہ استعمال فرما رہے تھے۔ جھنڈا آپ نے مصعب بن عمیر کو دیا۔ احد میں صحابہ کرام کو فتح حاصل ہو گئی، مال غنیمت جمع کرنا شروع کیا، تو جو صحابہ کرام حضرت عبد اللہ بن جبیر کی زیر قیادت درہ پر مقرر کئے گئے تھے، انہوں نے جب دیکھا کہ باقی حضرات مال غنیمت جمع کر رہے ہیں ہم رہ رہے ہیں

"وجعلوا ینسلون رجلا فرجلا حتی اخلوا مراکزهم ولم یبق مع عبد الله سوی النی عشر رجلا مع ایصاء رسول الله ﷺ بثبوتهم مکانهم"

لیکن ان حضرات نے درہ کو چھوڑنا شروع کر دیا، ایک ایک اس سے ہٹ رہا، یہاں تک کہ انہوں نے اپنے اس مرکز کو خالی کر دیا جس میں انہیں کھڑا کیا گیا تھا۔ حضرت عبد اللہ بن جبیر ﷺ کے ساتھ صرف بارہ آدمی رہ گئے تھے کہ ہم یہاں ہی کھڑے رہیں گے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں یہاں کھڑے رہنے کا حکم فرمایا۔

کفار نے جب درہ خالی پایا تو اس جانب سے حملہ کر دیا، جنگ کا نقشہ بدل گیا، ستر صحابہ کرام شہید ہو گئے، بہت زیادہ تعداد میں شدید زخمی ہو گئے، خود نبی ﷺ بھی زخمی ہو گئے، آپ کے دانت مبارک کا کچھ حصہ شہید ہو گیا، سر اور چہرے پر زخم آئے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

خیال رہے کہ درہ کے چھوڑنے میں صحابہ کرام کی اجتہادی خطاء تھی، جن حضرات نے درہ کو چھوڑا ان کا اجتہاد یہ تھا کہ اب مکمل فتح ہو چکی ہے، اب یہاں ٹھہرنے کا کوئی مقصد نہیں، اور جو حضرات وہاں قائم رہے ان کا موقف یہ تھا

کہ جب تک نبی کریم ﷺ یہاں سے ہٹنے کا حکم نہیں دیں گے اس وقت تک ہمارا یہاں کھڑے رہنا ضروری ہے، احد کا واقعہ تیسرے پارہ میں بیان کر دیا گیا، یہاں تو آیۃ کریمہ کا شان نزول بیان کرنے کیلئے مفسرین کرام نے جن چیزوں کو دوبارہ ذکر کیا وہ ذکر کر دی گئیں۔

آیۃ کریمہ کے الفاظ مبارکہ کے متعلق:

واذغدوت "ای واذکر اذخرجت غدوۃ" اور یاد کرو جب تم صبح نکلے "من اھلک" "من عند اھلک وکان الخروج من حجرۃ عائشۃ رضی اللہ عنھا" اپنی اہل کے گھر سے، آپ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ سے نکل کر غزوہ میں تشریف لے گئے تھے یہ ہفتہ کے دن کے صبح تھی، اور جب آپ ہتھیار زیب تن کر کے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر سے باہر تشریف لائے تھے وہ ہفتہ کے دن کی صبح تھی۔ خیال رہے کہ اگر "غدوت" بمعنی "صرت" کے ہو جائے تو دونوں وقتوں کو شامل ہو جائے گا، اب معنی صرف یہ ہوگا جب آپ ہو گئے نکلنے والے اپنی اہل کے گھر سے، یعنی ہتھیار زیب تن کر کے آپ نکلے، پھر صبح جنگ کیلئے نکلے۔

فائدہ: رب تعالی نے مؤمنین سے وعدہ فرمایا کہ "کافروں کا مکر تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا" لیکن اس کے ساتھ شرط یہ رکھی کی "اگر تم نے صبر کیا اور پرہیزگاری اختیار کی" غزوہ احد میں مسلمانوں کو شکست نہیں ہوئی کیونکہ وہ میدان میں جمے رہے، میدان چھوڑ کر بھاگے نہیں، ابتدائی طور پر اچانک حملہ میں کچھ پسپا ہونے کا نام وہ فرار نہیں تھا جس کی مذمت احادیث میں آئی ہوئی ہے، شہادت حاصل ہونا عظیم کامیابی تھی، لیکن منافقین کی نظر میں مسلمانوں کا ظاہری نقصان (معاذ اللہ) شکست تھا، اس آیۃ کریمہ میں ضمنا یہ مسئلہ بھی بتا دیا کہ "اے محبوب آپ صبح جنگ کیلئے گھر سے جب نکلے" یعنی آپ کی رائے کے خلاف کچھ حضرات نے مدینہ طیبہ میں رہنے کیلئے صبر نہیں کیا، اور باہر [illegible] سے پرہیز نہیں کیا تو ظاہری طور پر کچھ تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔

﴿تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ "ای توطنھم"

(۱) آپ مؤمنوں کو مقام قتال ٹھہرنے کی جگہ عطاء کر رہے تھے۔

(۲) "وقیل تنزلھم" اور معنی یہ بیان کیا گیا کہ آپ مؤمنوں کو مقام قتال میں اتار رہے تھے۔

(۳) "قیل تسوی لھم" اور معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ مؤمنوں کی صفوں کو میدان قتال میں برابر کر رہے تھے۔

(۴) "قیل تھیئی لھم "اور معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ مؤمنوں کو مقام قتال میں جہاد کیلئے تیار کررہے تھے۔ (روح المعانی)

﴿ مَقَاعِدَلِلْقِتَالِ ﴾ "مقامات لڑائی میں۔"

(مقاعد)ای مواطن مواقف ومقامات له "مقاعد" کا معنی ٹھہرنے کی جگہ، رکنے کی جگہ، اور قائم ہونیکی جگہ، "قتال" کا معنی جنگ لڑائی، اب ﴿ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَلِلْقِتَالِ ﴾ کا معنی یہ ہوگیا" آپ قائم کررہے تھے مؤمنوں کو مقامات جنگ میں"اعلی حضرت مولنا احمد رضاء خان بریلوی رحمہ اللہ کا مرادی ترجمہ بہت ہی خوبصورت ہے "مسلمانوں کولڑائی کے مورچوں پر قائم کرتے۔

﴿وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ﴾ "اوراللہ سننے والا ہے۔"

یعنی تمام سنی جانے والی چیزوں کو سننے والا ہے، اوراس غزوہ میں کی جانے والی باتوں کو بھی سننے والے ہیں۔

﴿ عَلِيْمٌ ﴾ "جاننے والا ہے۔"

یعنی تمام باتیں جوعلم میں آنے والی ہیں ان تمام کو جاننے والا ہے، اس غزوہ میں لوگوں کے دلوں میں پائی جانے والی تمام باتوں اورر ازوں کو جاننے والا ہے۔

فائدہ جلیلہ: قولہ(وَاِذْغَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَلِلْقِتَالِ)یروی انه ﷺغدامن منزل عائشة رضی الله عنها فمشی علی رجلیه الی احدوهذاقول مجاهدو الواقدی فدل هذاالنص علی ان عائشة رضی الله عنها کانت اهلاللنبی ﷺوقال تعالی(اَلطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبَاتِ) فدل هذاالنص علی انها کانت مطهرة مبرأة عن کل قبیح الاتری ان ولدنوح لماکان کافراقال(انه لیس من اهلک)وکذلک امرأة لوط" (کبیر)

آیۃ کریمہ میں"اہل" سے مراد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں کہ نبی کریم ﷺ صبح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ سے پیدل ہی احد کی طرف تشریف لے گئے (یہی قول مجاھد اور واقدی کا ہے اس آیۃ کریمہ سے واضح طور پر ثابت ہوا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کی اہل ہیں۔

اوردوسری آیۃ کریمہ سے یہ واضح ہورہا ہے ﴿اَلطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبَاتِ﴾ (پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کیلئے اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کیلئے ہیں) کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پاکیزہ اور ہر عیب اور

برائی سے پاک تھیں، خاص کر کے اس پر اور دلیل دلالت کر رہی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا کافر تھا، تو رب تعالی نے فرمایا ﴿اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ﴾ بیشک وہ تمہاری اہل سے نہیں اور حضرت لوط علیہ السلام کے متعلق فرمایا ﴿لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ﴾ فرشتوں نے ابراہیم علیہ السلام کو بتایا ہم جانتے ہیں اس بستی میں کون ہیں ''ہم اس (لوط) کو اور اس کی اہل کو ضرور بر ضرور نجات دیں گے سوائے ان کی عورت کے'' یہاں بھی لوط علیہ السلام کی کافرہ عورت کو آپ کی اہل سے نکال دیا کہ وہ آپ کی اہل سے نہیں۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

اِذْهَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝

(آیۃ نمبر ۱۲۲)

(1) جب تم میں کے دو گروہوں کا ارادہ ہوا کہ نامردی کر جائیں اور اللہ ان کا سنبھالنے والا ہے، اور مسلمانوں کو اللہ پر ہی بھروسہ چاہئے۔ (کنز الایمان)

(2) جب ارادہ کیا دو گروہوں نے تم میں سے بزدلی کا، حالانکہ اللہ ان کا مددگار ہے، اور اللہ پر ہی چاہئے کہ مؤمنین توکل رکھیں۔ (نجوم الفرقان)

شان نزول:

اِذْهَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا "ای تجبنا وتضعفا وتتخلفا" والطائفتان بنو سلمة من الخزرج وبنو حارثة من الاوس وكانا جناحي العسكر وذلك ان رسول الله ﷺ خرج الى احد في الف رجل وقيل في تسعمائة رجلا، فلما بلغوا الشوط انخذ عبد الله بن ابى بثلث الناس ورجع في ثلاث مائة وقال علام تقتل انفسنا او لادنا؟ فتبعهم ابو جابر السلمي فقال انشدكم بالله في نبيكم وفي انفسكم، فقال عبد الله بن ابى "لو نعلم قتالا لاتبعناكم" وهمت بنو سلمة وبنو حارثة بالانصراف مع عبد الله بن ابى، فعصمهم الله فلم ينصرفوا فذكرهم الله عظيم نعمته"

"فشل" کا معنی بزدلی، ضعف، اور پیچھے رہ جانا'' اب مطلب یہ ہوا کہ جب ارادہ کیا دو گروہوں نے تم میں سے بزدلی کا، اور انہوں نے کمزوری دکھائی، پیچھے لوٹ جانے کا ارادہ کیا'' دو گروہوں سے مراد خزرج سے بنو سلمہ،

اوراوس سے بنو حارثہ، یہ دونوں گروہ نبی کریم ﷺ کے لشکر کے بازو تھے، نبی کریم ﷺ ایک ہزار اور ساڑھے نوسو کے درمیان لشکر کو لے کر احد کی طرف تشریف لے گئے، احد کے قریب مقام شوط میں جب پہنچے تو عبداللہ بن ابی نے لشکر کا تہائی حصہ یعنی تین سو جو اس کے ساتھ لوگ تھے کو ساتھ لیا اور واپس لوٹ پڑا، اور کہہ رہا تھا کہ ہم کس وجہ سے اپنی جانوں اور اپنی اولاد کو قتل کرائیں، ابو جابر سلمی ان کے پیچھے آئے، ان کو رب تعالیٰ کا واسطہ دے کر کہا کہ تم نبی کریم ﷺ سے پیچھے ہٹ کر آپ کو اور اپنی جانوں کو تکلیف میں نہ ڈالو، لیکن عبداللہ بن ابی یہ کہہ رہا تھا کہ اگر ہمیں جنگ کرنے کا طریقہ آتا تو ہم ضرور جنگ کرتے، ہمیں تو لڑنا آتا ہی نہیں، جب وہ اور اس کے ساتھی واپس لوٹ آئے، تو بنو سلمہ اور بنو حارثہ نے بھی عبداللہ بن ابی کے ساتھ لوٹ جانے کا ارادہ کیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو محفوظ رکھا، وہ واپس نہ لوٹے، اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرما کر ان کو اپنی عظیم نعمت کی یاد دلائی کہ رب تعالیٰ کا تم پر خصوصی فضل و کرم ہوا کہ اس نے تمہیں واپس لوٹنے سے بچالیا، اور تمہارا ایمان سلامت رہا۔ (معالم التنزیل للبغوی)

﴿وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا﴾ "حالانکہ اللہ ان کا مددگار ہے۔"

"والله وليهما "ناصرهما وحافظهما" اور اللہ ان دونوں کا محافظ ہے اور مددگار ہے۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ اور البحر المحیط:

والله وليهمامعنى الولاية التثبيت والنصر "ولایۃ کا معنی ہے ثابت رکھ دیا اور مدد کرنا۔ (البحر المحیط)

اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے "التثبیت" والا ترجمہ کیا ہے "اور اللہ ان کا سنبھالنے والا ہے" اور راقم نے "النصر" والا ترجمہ کیا ہے "حالانکہ اللہ ان کا مددگار ہے" اور راقم نے حال والا معنی روح المعانی سے لیا "وجوز ان تكون حالا من فاعل "اس جملہ کو فاعل سے حال بنانا جائز رکھا گیا ہے۔

❁ عن جابرقال نزلت فينااذهمت طائفتان منكم ان تفشلاوالله وليهماقال نحن الطائفتان بنوحارثة وبنوسلمة ومايسرني انهالم تنزل لقول الله والله وليهما" (بخاری ومسلم)

حضرت جابر ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ آیۃ کریمہ ﴿اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا﴾ ہمارے متعلق نازل ہوئی مجھے یہ بات خوش نہیں لگی کہ یہ آیۃ کریمہ ہمارے متعلق نازل نہ ہوتی، کیونکہ آیۃ کریمہ میں "وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا" آیا ہوا ہے۔ اس حدیث پاک میں بشارت دی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی حفاظت

میں لیا، ان کی مدد کی اوران کو ثابت قدم رکھا یہ ان کے اعلی مقام کا ذکر کیا کہ ان کو رب تعالی نے شرافت عظیمہ عطاء کی، آیۃ کریمہ میں واضح طور پر ذکر کیا گیا "وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا" یعنی دوگروہوں نے اگر چہ بزدلی کا ارادہ کیا تھا لیکن اللہ تعالی نے ان کو اپنی حفاظت میں لے کر واپس لوٹنے سے روک لیا۔ (خازن)

اعتراض: "الھم" کا معنی ہے "عزم" آیۃ کریمہ اس پر دلالت کر رہی ہے کہ دوگروہوں نے بزدلی کا اور واپس لوٹنے کا عزم کر لیا تھا "وذلک معصية فكيف مدحهما الله تعالى بقوله والله وليهما" جہاد سے منہ پھیرنے کا عزم معصیت۔ ہے تو رب تعالی نے ان کی کیسے تعریف فرمائی اور ارشاد فرمایا "وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا"

جواب: "الھم" کے دو معنی ہیں، ایک "عزم" اور دوسرا "حدیث النفس" کسی چیز کا دل میں واقع ہونا پختہ ارادہ نہ کرنا، اس لئے یہاں "الھم" کا معنی "حدیث النفس" لینا ہی بہتر ہے۔ "والله تعالى لايؤاخذ بحديث النفس" اللہ تعالی دل میں واقع ہونے والے ارادہ یعنی قصد پر گرفت نہیں فرماتا، اس کی گرفت عزم پر ہوتی ہے، جس میں پختہ ارادہ پایا جائے اور کام کے اسباب میں بڑی کوشش پائی جائے۔

❁ قال ابن عباس انهم اضروا ان يرجعوا افلما عزم الله لهم على الرشد ولبتوا مع رسول الله ﷺ مدحهم الله تعالى بقوله والله وليهما"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بیشک ان لوگوں نے دل میں پوشیدہ رکھا کہ ہمیں بھی واپس لوٹ جانا چاہئے لیکن اللہ تعالی نے ان کو بھلائی عطاء فرمادی اور ان کو نبی کریم ﷺ کے ساتھ ثابت قدم رکھا، تو رب تعالی نے ان کی تعریف فرمائی اپنے اس قول سے "وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا" اللہ ان کا مددگار ہے، وہی ان کو ثابت قدم رکھنے والا ہے۔ (خازن)

مراتب القصد خمس هاجس ذكروا   فخاطر فحديث النفس فاستمعا
يليه هم فعزم كلها رفعت   سوى الاخير ففيه الاخذ قد وقعا

ارادہ کے مراتب پانچ ہیں، ایک ہاجس ذکر کیا گیا ہے اور دوسرا خاطر، اور تیسرا حدیث النفس دل میں واقع ہونے والی اشیاء، اور چوتھا اس کے ساتھ متصل "ھم" ہے، اور اس کے بعد پانچوں عزم ہے، کسی میں بھی گرفت نہیں، سوائے عزم کے، عزم میں گرفت ہے۔ (صاوی)

﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ "اور اللہ پر ہی چاہئے کہ توکل رکھیں ایمان والے۔"

"توکل" کا وزن ہے "تفعل" جب کوئی شخص کسی دوسرے پر اعتماد کرے اور اپنے معاملات اللہ تعالی کے سپرد

کردے، اس وقت کہا جاتا ہے "وکل امرہ الی غیرہ" اس نے اپنا معاملہ غیر کے سپرد کردیا "والتوکل ھو العجز والاعتماد علی الغیر" توکل کا معنی یہ ہے کہ خود عاجز ہو اور غیر پر اعتماد کرے۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"وَعَلَى اللّٰهِ" جار و مجرور، ظرف ہیں، ظرف کی تقدیم حصر پر دلالت کر رہی ہے، مطلب یہ ہوا "فامر اللہ عبادہ المؤمنین ان لایتوکلوا وان لایفوضوا امرھم الا الیہ" اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو حکم دیا کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ پر توکل کریں، اور اپنے تمام معاملات اسی کے سپرد کریں اور اسی کے حسن تدبیر پر اعتماد کریں۔ (خازن)

صرف اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے کا مسئلہ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ کی بحث میں نجوم الفرقان کی جلد اول میں دیکھیں۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝ (آیت نمبر ۱۲۳)

(1) اور بیشک اللہ نے بدر میں تمہاری مدد کی جب تم بالکل بے سروسامان تھے تو اللہ سے ڈرو کہیں تم شکر گذار ہو۔ (کنز الایمان)

(2) اور تحقیق امداد کی تمہاری اللہ نے بدر میں، حالانکہ تم بالکل بے سروسامان تھے، تو اللہ سے ڈرو تا کہ تم شکر گذار ہو جاؤ۔ (نجوم الفرقان)

سب سے پہلے راقم کی "تسکین الجنان" کا ایک ورق دیکھئے:

﴿وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ﴾

تم کمزور تھے۔	(محمود الحسن صاحب)
حالانکہ تم اس وقت بہت کمزور تھے۔	(مودودی صاحب)
حالانکہ تم پست تھے۔	(عبد الماجد دریا آبادی صاحب)
اور تھے تم ذلیل۔	(شاہ رفیع الدین صاحب)
تم بالکل بے سروسامان تھے۔	(اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ)

وانتم اذلۃ لقلۃ العدد والسلاح (جلالین) تم تعداد اور ہتھیاروں کے لحاظ سے کم تھے، یعنی بے سروسامان تھے۔

وانما فسر بقلة العدد والسلاح لئلا ينافی مدلول هذه الآية(ولله العزة ولرسوله وللمؤمنين)ويقتضيه العزو القوة والغلبة"

﴿وَّاَنۡتُمۡ اَذِلَّةٌ﴾ کی تفسیر بے سروسامان ہونے سے یعنی قلت عدد اور ہتھیاروں کی قلت سے کی گئی، تاکہ بظاہر "ذلت" کا مفہوم رب تعالی کے اس ارشاد گرامی کے منافی (مخالف) نہ ہو ﴿وَلِلّٰهِ الۡعِزَّةُ وَلِرَسُوۡلِهٖ وَلِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴾ (اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کیلئے عزت ہے) اس لئے کہ ذلت کی نقیض (الٹ) "عزت، قوت، غلبہ" ہے پھر صحابہ کرام کیلئے ﴿وَّاَنۡتُمۡ اَذِلَّةٌ﴾ کا استعمال کیسے صحیح ہے؟ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہاں تو معنی "تعداد کی کمی اور ہتھیاروں کی کمی مراد ہے۔

روی ان المسلمين ثلثمائة وثلاثة عشر جلاستة وسبعون من المهاجرين وبقيتهم من الانصار وما كان فيهم الافرس واحد والكفار قريب الف مقاتل ومنهم مائة فرس مع الاسلحة الكثيرة"

بیان کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی کل تعداد تین سو تیرہ تھی، چھہتر مہاجرین اور باقی انصار تھے، ان کے پاس صرف ایک گھوڑا تھا، جبکہ کافر ایک ہزار کے قریب تھے، اور ان کے پاس ایک سو گھوڑے اور کثیر ہتھیار موجود تھے۔

(حاشیہ جلالین)

(خیال رہے کہ دو گھوڑوں والی روایت زیادہ مشہور ہے، اگرچہ صاوی نے تین گھوڑوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

(واللہ اعلم بالصواب)

(وَّاَنۡتُمۡ اَذِلَّةٌ) بقلة العدد" (مدارک) تم تعداد میں کم تھے یعنی بے سروسامان تھے۔

اب اس وضاحت کے بعد اعلی حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کے ترجمہ کی طرف نظر کی جائے کہ آپ کا ترجمہ کس طرح شان صحابہ کے مطابق ہے، لیکن اس کے برخلاف دوسرے تراجم کو دیکھیں، "تم ذلیل تھے" "تم بہت پست تھے" کتنے شان صحابہ کرام کے خلاف تراجم ہیں "اور تم بہت کمزور تھے" یہ ترجمہ بھی مقصد کو واضح کرنے میں ناکام ہے، کیونکہ "تم بہت کمزور تھے" اس کا مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "جسمانی طور پر کمزور تھے" اور (العیاذ باللہ) یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ تم ایمان کے طور پر کمزور تھے، یہ تراجم مقصد بیان سے کوسوں دور ہیں۔ اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ حقیقت کو سمجھانے میں اور مقصد بیان کی وضاحت کرنے میں اور صحابہ کرام کی شان کو ثابت کرنے میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ (تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان صفحہ نمبر ۸۸، ۸۹)

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ○ (آیة نمبر ۱۲۴)

(1) جب اے محبوب تم مسلمانوں سے فرماتے تھے کیا تمہیں یہ کافی نہیں کہ تمہارا رب تمہاری مدد کرے تین ہزار فرشتے اتار کر۔ (کنزالایمان)

(2) جب آپ فرمارہے تھے مؤمنوں کو، کیا کافی نہیں تمہیں کہ امداد فرمائے تمہاری تمہارا رب تین ہزار فرشتوں سے اس حال میں کہ وہ اتارے ہوئے ہوں۔ (نجوم الفرقان)

رب تعالیٰ نے مسلمانوں کی بدر میں پہلے ایک ہزار فرشتوں سے امداد فرمائی۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ﴾(سورۃ الانفال آیۃ نمبر ۹)

جب تم اپنے رب سے فریاد کرتے تھے تو اس نے تمہاری سن لی کہ میں تمہیں مدد دینے والا ہوں ہزار فرشتوں کی قطار سے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے تین ہزار فرشتوں سے مؤمنوں کی امداد کی جو اسی زیر بحث آیۃ کریمہ میں ہے، پھر رب قدوس نے مؤمنوں کی پانچ ہزار فرشتوں سے امداد فرمائی جو اس کے بعد آیۃ کریمہ میں ذکر آرہا ہے۔

﴿اِذْ تَقُوْلُ﴾ ''ظرف ہے'' نصر کم ''کی، تحقیق اللہ تعالیٰ نے تمہاری امداد کی جب تم مؤمنوں کو کہہ رہے تھے۔

﴿لِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾حین اظہروا العجز عن المقاتلۃ''

مؤمنوں کو آپ اس وقت تسلی دے رہے اور یہ ارشاد فرمارہے تھے جب انہوں نے کافروں سے جنگ کرنے میں اپنے عجز کا اظہار کیا۔

﴿اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ﴾

''کیا تمہیں کافی نہیں کہ تمہاری امداد کرے تمہارا رب تین ہزار فرشتوں سے۔''

''الکفایۃ سد الخلۃ و القیام بالامر '' کفایت کا مطلب ہے کہ حاجت کو پورا کرنا اور تمام معاملات کی حفاظت کرنا ''الامداد اعانۃ الجیش بالجیش '' جنگ میں امداد کا مطلب ہی یہ ہے کہ ایک لشکر کی دوسرے لشکر کے ذریعے امداد کی جائے، صحابہ کرام کافروں کی بڑی تعداد سے ''جو اسلحہ سے مسلح تھے'' جنگ کرنے کیلئے نہیں گئے تھے، بلکہ ایک قافلہ کی سرکوبی کیلئے گئے تھے (جس کا تفصیلی ذکر انشاء اللہ آگے آرہا ہے) اس لئے صحابہ کرام اپنی تعداد میں کمی اور بے سروسامانی اور کافروں کی تعداد میں زیادتی اور ظاہری قوت اور اسباب جنگ کے پائے جانے کی وجہ سے یہ

خیال کر رہے تھے کہ ہماری امداد کہاں سے آئے گی تو اس وقت یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی، صحابہ کرام کو تسلی دی کہ اللہ تعالی تمہاری تین ہزار فرشتوں سے امداد فرمائے گا۔

﴿مُنْزَلِيْنَ﴾ "اس حال میں کہ وہ اتارے ہوئے ہوں۔"

﴿مُنْزَلِيْنَ﴾ ای حال کونهم نازلین من السماء باذنه تعالی (مُنْزَلِيْنَ) حال واقع ہو رہا ہے یعنی اس حال میں کہ وہ اللہ تعالی کی اجازت سے آسمانوں سے اترنے والے ہیں، یعنی وہ اللہ تعالی کی طرف سے اتارے ہوئے ہوں گے۔ (ماخوذ از روح البیان)

مطلقا امداد کا معنی یہ ہے "والامداد فی الاصل اعطاء الشئی حالا بعد حال" امداد اصل میں یہ ہے کہ کسی کو کوئی چیز وقتاً فوقتاً عطاء کرنا۔ شر میں بھی امداد کرنے کا ذکر قرآن پاک میں ہے ﴿وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ﴾ اسی طرح اور ارشاد ہے ﴿وَنَمُدُّ لَهُ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا﴾ اور خیر میں امداد جس طرح یہاں ذکر ہے، اور ارشاد گرامی ہے ﴿وَاَمْدَدْنَاكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ﴾۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

بَلٰى اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلَافٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ○ (آیۃ نمبر ۱۲۵)

(1) ہاں کیوں نہیں اگر تم صبر کرو اور تقوی کرو اور کافر اسی دم تم پر آپڑیں تو تمہارا رب تمہاری مدد کو پانچ ہزار فرشتے نشان والے بھیجے گا۔ (کنز الایمان)

(2) ہاں کیوں نہیں، اگر تم صبر کرو، اور پرہیزگار ہو جاؤ، اور وہ تمہارے پاس جلدی اسی وقت (حملہ کرنے) آجائیں تو امداد کرے گا تمہاری رب پانچ ہزار فرشتوں سے جو نشان والے ہیں۔ (نجوم الفرقان)

"بَلٰى" ایجاب لمابعدان وتحقیق ای بلی یکفیکم ذلک ثم وعدهم الزیادة بشرط الصبروالتقوی حثالهم وتقویة لقلوبهم فقال (ان تصبروا) علی لقاء العدو ومناهضتهم (وتتقوا) معصیة الله ومخالفة نبیه ﷺ"

کیوں نہیں یہ امداد تمہیں کافی ہے، پھر رب تعالی نے ان سے زیادہ امداد کرنے کا وعدہ فرمایا، یعنی تین ہزار فرشتوں کا اتارا جانا ہی تمہارے لئے امداد کافی ہے، البتہ وہ اور زیادہ پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری امداد کرے گا شرط یہ ہے کہ تم صبر کرو، یعنی دشمن سے جب تمہاری ملاقات ہو تو صبر سے کام لو اور تقوی اختیار کرو، یعنی اللہ تعالی کی معصیت اور نبی کریم ﷺ کی مخالفت سے بچ کر رہو۔

﴿وَيَأْتُوكُم مِّن فَوْرِهِمْ هَٰذَا﴾ ''وہ آجائیں تمہارے پاس جلدی سے۔''

یعنی مشرکین اگر تمہارے پاس اسی گھڑی آجائیں حملہ کرنے کی غرض سے، تو ان کے آنے پر بغیر کسی تاخیر کے تمہاری امداد فرمائے گا۔

﴿يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُم بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ﴾

''وہ تمہاری امداد کرے گا پانچ ہزار فرشتوں سے جو نشان والے ہوں گے۔''

''التسویم الذی ھو الذی ھو اظھار سیما الشئی'' تسویم کا معنی ہے کسی چیز کی علامات کو ظاہر کرنا۔

''روی ان الملائکۃ کانو ابعمائھم بیض الاجبریل علیہ السلام فانہ کان بعمامۃ صفراء علی مثال الزبیر بن العوام ونزلوا علی الخیل البلق موافقۃ لفرس المقداد واکرامالہ''

روایت میں آتا ہے کہ فرشتے جب اترے تو ان کی سفید پگڑیاں تھیں، سوائے جبریل کے کہ ان کی پگڑی زرد رنگ کی تھی، جیسے حضرت زبیر بن عوام کی پگڑی تھی، وہ چتکبرے گھوڑے پر اترے جیسا کہ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کا گھوڑا تھا، اس میں حضرت مقداد کی خصوصی عزت افزائی تھی۔

فرشتوں نے لڑائی کی تھی یا نہیں؟

اس مسئلہ میں دو قسم کی روایات پائی جاتی ہیں۔

''وانما کانت الفائدۃ فی کثرۃ الملائکۃ لتسکین قلوب المؤمنین ولان اللہ تعالی جعل اولئک الملائکۃ مجاھدین الی یوم القیامۃ فکل عسکر صبر واحتسب تاتیھم الملائکۃ ویقاتلون معھم''

بدر میں کثیر فرشتوں کو مؤمنوں کے دلوں کو تسلی دینے کیلئے بھیجا گیا، اس لئے کہ اللہ تعالی نے ان فرشتوں کو قیامت تک جہاد کرنے والا بنایا، ہر وہ لشکر جس نے صبر کیا اور تقوی اختیار کیا وہ ان کے ساتھ جہاد میں شریک ہوتے ہیں۔

"وقال ابن عباس ومجاھدلم تقاتل الملائکة الایوم بدروفیماسوی ذلک یشھدون ولایقاتلون انمایکون عدداوامددا"

حضرت ابن عباس ومجاہد (ﷺ) فرماتے ہیں، بدر کے سواکسی اور جنگ میں فرشتوں نے لڑائی میں حصہ نہیں لیا،صرف بدر میں فرشتوں نے لڑائی کی، اور باقی جنگوں میں فرشتے حاضر ہوتے رہے، مؤمنوں کی تعداد بڑھاتے رہے، اور مؤمنوں کے دلوں کو تسلی دے کران کی امداد کرتے رہے، اس روایت سے واضح ہورہا ہے کہ بدر میں فرشتے صحابہ کرام کے ساتھ ملکر جہاد کرتے رہے۔

"وقال بعضھم انماکانت الفائدة فی کثرة الملائکة انھم کانوایدعون ویسبحون ویکثرون الذین یقاتلون یومئذ"

بعض روایات کے مطابق فرشتوں کا زیادہ تعداد میں آنے کا فائدہ یہ تھا کہ وہ اس دن بدر میں جنگ کرنے والوں کیلئے دعاء کرر ہے تھے، اوران کی کامیابی کیلئے اللہ تعالیٰ کی تسبیحات پڑھ رہے۔

اس روایت سے دوفائدے حاصل ہوئے (ایک یہ کہ مشکل وقت میں اللہ تعالیٰ کی تسبیحات پڑھ کر دعاء کی جائے) اوردوسرافائدہ یہ حاصل ہوا"فعلی ھذا لم تقاتل الملائکة یوم بدروانماحضروا للدعاء بالتثبیت" کہ اس روایت کے مطابق یہ واضح ہورہا ہے کہ فرشتوں نے بدر کے دن لڑائی میں حصہ نہیں لیا، وہ صرف صحابہ کرام کی تسلی کیلئے آئے تھے اوران کی ثابت قدمی کیلئے دعاء کرر ہے تھے۔ (ماخوذازقرطبی)

راقم کا موقف:

اس مسئلہ میں یہ ہے کہ فرشتے اپنی ملکی طاقت سے لڑائی نہیں کرر ہے، اور نہ ہی سب فرشتے لڑائی کرر ہے تھے، بلکہ بعض فرشتے بشری طاقت کے مطابق (جواس وقت ان کوعطاء کی گئی) لڑائی کرر ہے تھے **انشاء اللہ** بدر کے تفصیلی واقعات کے ضمن میں قریب ہی آرہا ہے۔

فائدہ جلیلہ:

"نزول الملائکة بسبب من اسباب النصر لایحتاج الیه الرب تعالی وانمایحتاج الیه المخلوق"

فرشتوں کا اترنا امداد کے اسباب میں سے ایک سبب تھا، اللہ تعالیٰ اس کا محتاج نہیں تھا، بلکہ مخلوق اس کی محتاج تھی "فلیعلق القلب بالله ولیثق به" کہ مخلوق کا دل رب تعالیٰ کی ذات سے معلق (لگا) رہے، اوررب

تعالیٰ کی امداد پر ان کو غالب وثوق (اعتبار) رہے۔

رب تعالیٰ امداد فرماتا ہے کبھی اسباب کے ذریعے اور کبھی بغیر اسباب کے یعنی وہ صرف "کن" سے کبھی امداد فرماتا ہے ﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ (بیشک اس کا امر یہ ہے کہ جب وہ ارادہ فرماتا کسی چیز کا تو کہتا ہے "کن" (ہوجا) تو وہ ہوجاتی ہے۔ بدر میں سبب کے ذریعے امداد کی تاکہ مخلوق کو بھی پتہ چل جائے کہ رب تعالیٰ نے اسباب کے ذریعے بھی امداد کرنے کا وعدہ فرمالیا ہے ﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا﴾ (تم ہرگز اللہ تعالیٰ کے فیصلوں میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔

اعتراض: اقویاء یعنی بڑی شان والے بلند ہمت لوگ تو صرف رب تعالیٰ پر توکل رکھتے ہیں، وہ اسباب کا سہارا نہیں لیتے "ان الاسباب انما بنيت في حق الضعفاء لاللاقوياء" اسباب تو کمزور لوگوں کیلئے ہوتے ہیں جو توکل نہیں رکھتے، بڑے لوگوں کیلئے اسباب نہیں ہوتے، تو صحابہ کرام کو امداد کے سبب سے مطلع کرنے کا کیا جائزہ تھا۔

جواب: یہ ضابطہ ہی درست نہیں کہ اسباب توکل کے خلاف ہیں، اولیاء کرام، بلکہ انبیاء کرام نے بھی مرض میں علاج کرانے کو توکل کے مخالف نہیں قرار دیا، اور لوگوں نے اپنی بیماری وغیرہ میں نبی کریم ﷺ سے دعاء کرائی، ان کا دعاء کرانا توکل کے مخالف نہیں تھا، ورنہ یہ حقیقت ہے "ان النبی ﷺ واصحابه كانوا الاقوياء وغيرهم هم الضعفاء" کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام قوی حضرات تھے اور باقی حضرات ضعفاء (ضعیف لوگ) تھے۔
(ماخوذ از قرطبی بوضاحت)

﴿يَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا﴾ میں "مِنْ فَوْرِهِمْ" کا ایک معنی "من وجههم" وہ منہ اٹھائے تمہارے پاس اسی گھڑی میں آدھمکیں، دوسرا معنی ہے "من غضبهم" وہ غصہ سے اسی گھڑی تمہارے پاس آجائیں یعنی تم پر چڑھائی کردیں۔ اصل میں "فور" کا معنی "فارت القدر" (ہنڈیا نے جوش مارا) سے لیا ہے، غیظ وغضب کی حالت پر لفظ "فور" کا اطلاق ہوتا ہے "والاصل الفور الى الشئى والاخذ فيه بجد" "فور" کا اصل میں معنی یہ ہے کہ ایک چیز کی طرف ارادہ کرنا اور اسے بڑی کوشش سے حاصل کرنا۔

﴿واقعہ بدر﴾

تاریخ بدر: غزوہ بدر کیلئے نبی کریم ﷺ ہجرت کے انیسویں مہینہ میں بارہ رمضان المبارک کو روانہ ہوئے، بعض نے آٹھ رمضان کہا اور قتال سترہ رمضان المبارک ۲ھ کو واقع ہوا، جمعہ کا دن تھا، بعض نے ہفتہ کا دن کہا ہے۔ (مدارج النبوۃ جلد دوم)

بدر کا نام بدر کیوں؟

بدر ایک بستی کا نام ہے جو بدر بن مخلد بن نضر بن کنانہ سے اس لئے منسوب ہے کہ اس نے اس جگہ پڑاؤ کیا تھا، اور بدر بن حارث کی طرف اس لئے منسوب ہے کہ اس نے یہاں ایک کنواں کھودا تھا جو بدر (چودہویں کے چاند) کی طرح گول تھا۔ (مدارج النبوۃ بتصرف)

غرضیکہ جہاں بدر کی جنگ ہوئی وہاں قریب ایک بستی کا نام بھی بدر تھا، اس بستی کو آباد کرنے والے کا نام بھی بدر تھا اور ایک کنواں تھا اس کا نام بھی بدر تھا، درحقیقت بستی اور کنواں بدر نامی شخص کی طرف منسوب تھے۔

غزوہ بدر حق وباطل میں تمیز کرنے کا ذریعہ واقع ہوا:

نبی کریم ﷺ کے تمام غزوات میں سے یہ غزوہ بہت زیادہ عظیم غزوہ تھا، اس دن دین کو عزت وشوکت حاصل ہوئی، اسی وجہ سے اس دن کو ﴿يَوْمَ الْفُرْقَانِ﴾ (حق وباطل میں فرق کرنے والا دن) کہا گیا ہے رب تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ﴾ فرقان کا دن وہ دن ہے جس دن دو جماعتیں ملیں۔ اس دن کفر کی بنیادوں کو تباہ وبرباد کر کے کافروں کو ذلیل وخوار بنا دیا، حالانکہ مسلمانوں کی تعداد کم اور دشمناں دین کی تعداد زیادہ تھی، اور کفار جنگ کے پورے ساز وسامان سے لیس ہو کر اتراتے اور تکبر کرتے آئے تھے، مگر اللہ تعالی نے اپنے رسول اللہ ﷺ کو عزت دی اور اپنے دین کو قوی اور مضبوط بنایا، رب تعالی کی امداد کا ذکر قریب ہی تین آیات میں گذر چکا ہے۔

مسلمانوں کی تعداد : تین سو تیرہ تھی جن میں ستتر (۷۷) مہاجرین، اور دو سو چھتیس (۲۳۶) انصار تھے، لیکن نبی کریم ﷺ ساتھ کے صرف تین سو پانچ صحابہ کرام تھے، باقی آٹھ میں سے ایک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہیں جو آپ کے حکم سے اپنی زوجہ سیدہ رقیہ بنت رسول اللہ ﷺ کی علالت اور تیمارداری کیلئے رکے تھے لیکن آپ کا شمار بدری صحابہ کرام میں ہوتا ہے۔ اور سات صحابہ کرام کو مشرکین کے قافلہ کی تلاش میں بھیجا ہوا تھا، جن میں پانچ انصار تھے، اور دو مہاجرین سے حضرت طلحہ اور سعید بن زید ہیں، یہ سات بھی بدری صحابہ کہلاتے ہیں، یعنی ان کا درجہ بدر والے صحابہ کے برابر ہے، اور بدر کے مال غنیمت میں یہ برابر کے شریک تھے۔ (مدارج النبوۃ جلد دوم)

مسلمانوں کے پاس جنگی سامان چھ زرہیں اور آٹھ تلواریں، اور ستر اونٹ، اور تین گھوڑے (جس روایت میں زیادہ گھوڑوں کا ذکر ہے وہ تین ہیں، ورنہ دو اور ایک کا بھی ذکر ہے۔

مشرکوں کی تعداد وجنگی سامان :

مشرکین ایک ہزار کے قریب تھے، ان کے ساتھ ایک سو گھوڑے اور سات سو یا کچھ زیادہ اونٹ تھے، کفار بڑی شوکت اور کروفر میں تھے، مکمل جنگی ساز وسامان ان کے پاس تھا، وہ بڑے غرور اور تکبر میں تھے، ان کا ہر شخص زرہ پوش خواہ سوار تھا یا پیادہ ان کے ساتھ آلات طرب (عیش وعشرت) بھی تھے، اور ان کے ساتھ گانا گانے والی ڈومنیاں بھی تھیں، وہ گانا گا کر مسلمانوں کے خلاف زبان طعن دراز کرتیں، اور مشرکوں کو جوش دلاتیں، قریش کے سرداروں میں سے ہر روز کوئی نہ کوئی سب لشکر والوں کو کھانا دیتا تھا، وہ بظاہر اس شان وشوکت سے آئے تھے لیکن رب تعالی نے ان کو ذلیل کیا۔ (مدارج النبوۃ جلد دوم)

جنگ بدر کا سبب :

بدر کا واقعہ مسلمانوں کے بغیر قصد وارادہ اور منصوبہ بندی کے واقع ہوا تھا، نبی کریم ﷺ اور تمام مسلمان اس جنگ کیلئے پہلے سے تیار نہ تھے، وہ تو قریش کے اس بڑے قافلہ کی سرکوبی کیلئے مدینہ طیبہ سے نکلے تھے جو شام سے آرہا تھا، اس میں قریش کا کثیر مال تجارت تھا، اس کا امیر قافلہ ابوسفیان تھا، اس میں عمرو بن العاص بھی شامل تھا (ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا) یہ قافلہ تیس سواروں پر مشتمل تھا، یہ لوگ جب بدر کے قریب پہنچ گئے تو نبی کریم ﷺ کو اطلاع ملی آپ نے صحابہ کرام سے فرمایا وہ قافلہ آرہا ہے جس کے ساتھ اموال کثیرہ بھی ہے اور دشمنوں کی تعداد بھی بہت کم ہے، لھذا اس کی سرکوبی کیلئے چلو ممکن ہے کہ حق تعالی اس طرح تمہیں سامان عطاء فرمائے، ایک روایت میں دعاء کا تذکرہ ہے، آیئے وہ حدیث پاک دیکھئے۔ (ماخوذ از مدارج النبوۃ جلد دوم)

❁ عن عبدالله ابن عمرو ان النبی ﷺ خرج یوم بدر فی ثلثمائة وخمسة عشر قال اللهم انهم حفاة فاحملهم اللهم انهم عراة فاكسهم اللهم انهم جياع فاشبعهم ففتح الله له فانقلبوا ومامنهم رجل الا وقد رجع بجمل او جملين واكتسبوا وشبعوا" (رواہ ابوداؤد، مشکوۃ باب المعجزات)

عبداللہ بن عمرو (بن العاص) فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ بدر کے دن تین سو پندرہ اصحاب کے ساتھ نکلے، (تین سو پندرہ کا مطلب کسر کا لحاظ نہ کرتے ہوئے تین سو تیرہ کو تین سو پندرہ اصحاب سے تعبیر کر دیا گیا) آپ نے عرض کیا اے اللہ! بیشک یہ پاؤں سے ننگے ہیں، ان کو سواریاں عطاء کر، اے اللہ یہ ننگے ہیں ان کو کپڑے عطاء کر، اے اللہ یہ بھوکے ہیں ان کو سیر کر، اللہ تعالی نے آپ کو فتح عطاء کی تو وہ جب واپس لوٹ کر آئے، کوئی شخص بھی ان میں سے نہیں تھا مگر یہ کہ وہ ایک یا دو اونٹ لے کر واپس آیا ہر شخص کو کپڑے حاصل تھے اور سب سیر تھے۔

وضاحت حدیث:

"اللهم انهم،ای غالبهم(حفاۃ)بضم الحاء جمع خاف وھو من لانعل لہ(فاحملھم)بھمز وصل وکسر میم ای اعنھم علی الحمل والمعنی اعط کلامنھم المرکوب"

آپ کی دعاء کا یہ مطلب ہے کہ اے اللہ ان میں سے اکثر لوگ پاؤں سے ننگے ہیں، انہیں جوتے میسر نہیں، ان کی امداد فرما، ان میں سے ہر ایک کو سواری عطاء فرما۔

"اللھم انھم عراۃ فاکسھم" اے اللہ یہ ننگے ہیں، یعنی ان کو مکمل زینت والا لباس میسر نہیں، زیادہ سے زیادہ کمر سے باندھنے والی چادریں ان کو میسر ہیں، ان کو زیب وزینت والا مکمل لباس تو عطاء فرما" اللھم انھم جیاع فاشبعھم" اے اللہ! یہ بھوکے ہیں ان کو سیر کر، یعنی ان کے ظاہر و باطن کو سیر کر، تا کہ ان کو طاعت پر قوت عطاء فرما۔"ففتح اللہ لہ" اللہ تعالی نے نبی کریم ﷺ کو فتح عطاء فرمائی، یعنی آپ کی مشرکین مکہ پر اور صنادید قریش (قریش کے سرکردہ سرداروں) پر امداد فرمائی، یہاں تک کہ مشرکین کے ستر آدمی قتل کردئے گئے، اور ستر آدمی قید کر لئے گئے،"فانقلبوا"فرجع اصحابہ "صحابہ کرام لوٹے۔ "ومامنھم رجل الا وقد رجع بجمل او جملین واکتسوا وشبعوا" یعنی صحابہ کرام کو اللہ تعالی نے کفار کا مال بطور غنیمت عطاء فرمایا جس سے ہر شخص کو ایک یا دو اونٹ حاصل ہو گئے، ان کو مکمل زیب وزینت والا لباس عطاء کر دیا گیا، اور مال کے ملنے کی وجہ سے ان کو کھانا بھی میسر ہو گیا، اللہ تعالی کا ارشاد گرامی کتنا ہی سچا ہے ﴿عَسٰی اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـٴًـا وَّ یَجْعَلَ اللّٰهُ فِیْهِ خَیْرًا كَثِیْرًا﴾ ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند سمجھو اور اللہ نے اس میں خیر کثیر رکھ دی ہو۔

"وفی الحدیث ان الصبر علی ماتکرہ فیہ خیر کثیر ثم ھذہ نتیجتہ فی الدنیا والآخرۃ خیر وابقی"

حدیث سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ جس چیز کو تم ناپسند سمجھتے ہو، اسی پر صبر کرنے سے کثیر بھلائیاں حاصل ہوتی ہیں پھر یہ نتیجہ دنیا اور آخرت میں بھلائی کا ذریعہ ہے اور قائم رہنے والا ہے۔ (ماخوذ از مرقاۃ جلد ۱۱ صفحہ نمبر ۲۱۴)

عاتکہ بنت عبدالمطلب کا خواب دیکھنا:

نبی کریم ﷺ کی پھوپھی عاتکہ بنت عبدالمطلب نے خواب دیکھا کہ کچھ لوگ اونٹوں پر سوار ہو کر آئے، اور مقام ابطح میں آئے اور بلند جگہ کھڑے ہو کر انہوں نے یہ کہا اے قریش کے لوگو جلدی کرو اور اپنے قتل کی جگہ آؤ، جب ابو جہل لعین کو اس خواب کا پتہ چلا تو وہ (حضرت) عباس سے کہنے لگا، اے ابو الفضل یہ عورت تم

میں کب سے نبی بن گئی، پھر وہ بطور (طنز) کہنے لگا کیا تمہارے مردوں کا نبوت کا دعوی کرنا کافی نہیں تھا، بڑا تعجب ہے اب تمہاری عورتیں بھی نبوت کا دعوی کرنے لگ گئی ہیں، پھر وہ کہنے لگا کہ میں تین دن انتظار کرتا ہوں اگر اس خواب کا کوئی اثر ظاہر نہ ہوا تو میں تمام قبائل عرب میں خط بھیج دوں گا کہ تم لوگ یعنی بنی ہاشم سب سے زیادہ جھوٹے ہو۔ (سیرت ابن ابی ہشام وطبقات ابن سعد بالاختصار ترجمہ عاتکہ بنت عبدالمطلب)

اصل میں ابوجہل کا تکبر اسے بدر میں جانے پر ابھار رہا تھا، تاکہ اپنے قتل کی جگہ تک جلدی پہنچ جائے۔

صمضم غفاری کا خواب:

صمضم غفاری نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں ایک اونٹ پر سوار ہوں اور ایک ایسی گھاٹی سے گذر رہا ہوں جو خون سے لبریز ہے، جب میں بیدار ہوا تو میں نے سمجھ لیا کہ قریش کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہوں گے، اس خواب کو سن کر بنی ہاشم بڑے خوش ہوئے کیونکہ یہ خواب عاتکہ بن عبدالمطلب کے خواب کی تائید کر رہا تھا۔ (مدارج النبوۃ جلد ۲)

اہل مکہ کا فیصلہ:

اہل مکہ نے جنگ کی تیاری شروع کرلی اور فیصلہ یہ کیا کہ ہر وہ شخص جن کو مکہ میں کوئی کام ہے ان میں سے ایک جنگ کیلئے باہر نکل آئے یا اپنی طرف سے کسی اور کو بھیج دے، قریش کے تمام سردار جنگ کیلئے آمادہ ہوگئے، لیکن ابولہب نے ٹال مٹول سے کام لیا اور پیچھے رہنے کا فیصلہ کیا، اس نے اپنی جگہ پر ابوجہل کے بھائی عاص بن ہشام بن مغیرہ کو بھیجا، اور اس کے ذمہ سودی رقم ابولہب کے چار ہزار درہم تھے جو اس نے معاف کردئے تھے۔ امیہ بن خلف بھی چھپ رہا تھا، مکہ سے باہر جانے کا ارادہ کر رہا تھا، کیونکہ اسے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے ذریعے یہ خبر مل چکی تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے خبر دی ہے کہ میرے اصحاب امیہ بن خلف کو قتل کردیں گے، نبی کریم ﷺ کی خبر نے سچا ہونا ہی تھا، یہی وجہ ہے کہ ابوجہل نے بہت زیادہ اصرار کیا، اور ولید کو کہا اے ابوصفوان تو مکہ کے بہت سے لوگوں کا سردار ہے، جب لوگوں کو پتہ چل گیا کہ تو نہیں جا رہا، پیٹھ پھیر رہا ہے اور پیچھے رہ رہا ہے تو دوسرے لوگ بھی پیچھے رہ جائیں گے تو ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے، ابوجہل کے بار بار اصرار پر امیہ بن خلف جانے پر تیار ہوگیا۔

وضاحت حدیث: وہ حدیث جس میں امیہ بن خلف کے قتل ہوجانے کی پیشنگوئی کی گئی ہے، وہ یہ ہے۔

عن سعدبن معاذانه قال کان صدیقالامیة بن خلف و کان امیة اذامربالمدینة نزل علی سعدو کان سعداذامربمکة نزل علی امیة فلمام قدم رسول الله ﷺالمدینة انطلق سعدمعتمرافنزل علی امیة بمکة فقال لامیة انظرلی ساعة خلوة لعلی ان اطوف بالبیت فخرج به قریبامن نصف النهارفلقیهماابوجهل فقال یااباصفوان من هذامعک؟فقال هذاسعدفقال له ابوجهل الاأراک تطوف بمکة آمناوقداویتم الصباة وزعمتم انکم تنصرونهم وتعینونهم اماوالله لولاانک مع ابی صفوان مارجعت الی اهلک سالمافقال له سعدورفع صوته علیه اماوالله لئن منعتنی هذالامنعنک ماهواشد علیک منه طریقک علی المدینة فقال له امیة لاترفع صوتک یاسعدعلی ابی الحکم سیداهل الوادی،فقال سعددعناعنک یاامیة فوالله لقدسمعت رسول الله ﷺیقول انهم قاتلوک قال بمکة قال لاادری،ففزع لذلک امیة فزعاشدیدافلمارجع امیة الی اهله قال یاام صفوان الم تری ماقال لی سعد؟قال زعم ان محمدااخبرهم انهم قاتلی فقلت له بمکة قال لاادری فقال امیة والله لااخرج من مکة فاتاه ابوجهل فقال یااباصفوان انک حتی یراک الناس قد تخلفت وانت سید اهل الوادی تخلفوامعک فلم یزل به ابوجهل حتی قال اما اذاغلبتنی فوالله لاشترین اجودبعیربمکة ثم قال امیه یاام صفوان جهزینی فقالت له یااباصفوان وقدنسیتَ ماقال لک اخوک یثربی؟قال لامااریدان اجوزمعهم الاقریبافلماخرج امیة لاینزل منزلاالاعقل بعیره فلم یزل بذلک حتی قتله الله عزوجل ببدر"

(بخاری باب ذکر النبیﷺمن یقتل ببدر)

عبداللہ بن مسعود بن معاذ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ امیہ بن خلف کے دوست تھے، امیہ جب مدینہ سے گذرتا تو سعد کے پاس ٹھہرتا، سعد کا جب مکہ سے گذر ہوتا تو یہ امیہ کے پاس ٹھہرتے، جب رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ میں تشریف لے آئے تو سعد عمرہ کرنے کی غرض سے چلے، مکہ میں امیہ کے پاس جا کر ٹھہرے، پھر امیہ کو کہنے لگے کہ دیکھ رکھنا کوئی (لوگوں سے) علیحدہ گھڑی مل جائے، ہوسکتا ہے میں بیت اللہ شریف کا طواف کرلوں، وہ دن کے آدھے حصہ میں (یعنی دوپہر کے وقت) سعد کو لے گیا، تو ان دونوں کو ابوجہل (راستہ میں آتے ہوئے) مل گیا، تو اس نے کہا، اے ابوصفوان! یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟ امیہ نے کہا "یہ سعد ہے" ابوجہل نے امیہ کو کہا کیا تم مکہ میں امن میں (بغیر کسی خوف کے) طواف کر رہے تھے؟ اور تحقیق تم نے ایک بے دین (اپنے آباء اجداد کے دین سے پھر جانے والے) کو امن دیا ہوا ہے اور تم یہ گمان کرتے ہو کہ بیشک تم ان کی امداد کرو گے اور معاونت کرو گے، (پھر سعد کو کہنے لگا) قسم

ہے اللہ کی اگر تو ابوصفوان (امیہ کی کنیت ہے) کے ساتھ نہ ہوتا تو تو اپنی اہل کی طرف صحیح وسلامت لوٹ کر نہ جاتا، تو سعد نے اسے زوردار گرجدار آواز سے کہا، خبردار قسم ہے اللہ تعالی کی اگر تو نے مجھے یہاں سے منع کیا تو میں تمہارے (شام کی طرف جانے والے) مدینہ سے گذرنے والے راستے بند کردوں گا۔

امیہ نے سعد کو کہا، اے صفوان! تم اپنی آواز اس وادی کی کے سردار ابوالحکم پر بلند نہ کرو، (کفار ابوجہل کو ابوالحکم کہتے تھے، مسلمان ابوجہل کہتے تھے، حق یہ تھا کہ امیہ اپنے مہمان کا ساتھ دیتا لیکن اس نے جب ابوجہل کا ساتھ دینا شروع کردیا تو سعد غصہ میں آگئے) تو سعد نے کہا اے امیہ تم اپنے آپ سے ہمیں ہٹادو (یعنی تم ہمارے راستہ سے ہٹ جاؤ، تم ہمیں کیا بچاؤ گے) میں نے تو رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ فرمارہے تھے، بیشک میرے صحابہ امیہ بن خلف کو قتل کردیں گے، اس نے پوچھا کیا مکہ میں (مجھے قتل کریں گے) حضرت سعد نے کہا یہ تو مجھے معلوم نہیں، امیہ یہ خبر سن کر بہت پریشان ہوگیا، شدید گھبراہٹ میں مبتلاء ہوگیا (نبی کریم ﷺ کی غیبی خبروں پر کفار بھی یقین رکھتے تھے) امیہ جب اپنی اہل کے پاس آیا، تو اس نے کہا اے ام صفوان (یہ کنیت ہے اس کی زوجہ کی) کیا تمہیں علم حاصل ہوا مجھے سعد نے کیا کہا؟ اس نے پوچھا کہ سعد نے تمہیں کیا کہا؟ اس نے بتایا کہ وہ گمان کرتا ہے کہ بیشک محمد نے ہمیں خبردی ہے کہ ان کے اصحاب تمہیں قتل کردیں گے، تو میں نے اس سے پوچھا کیا وہ مجھے مکہ میں قتل کردیں گے؟ اس نے کہا یہ تو مجھے علم نہیں، امیہ نے کہا قسم ہے اللہ کی میں مکہ سے باہر نہیں جاؤں گا، جب بدر (کی طرف نکلنے) کا دن آگیا تو ابوجہل اسے کہہ رہا تھا کہ تم ہمارے ساتھ چلو، کیونکہ میں نے اور لوگوں کو بھی کہہ دیا ہے کہ چلو مسلمانوں کو ہمارے قافلہ کے روکنے کا مزہ چکھاتے ہیں، لیکن امیہ مکہ سے باہر جانے سے ڈر رہا تھا (انکار کررہا تھا) ابوجہل نے کہا اے ابوصفوان تم اس وادی میں (اپنے قبیلے کے) کے سردار ہو، جب لوگ تمہیں دیکھیں گے کہ تم پیچھے رہ گئے ہو تو وہ بھی پیچھے رہ جائیں گے۔ ابوجہل باربار کہتا رہا، یہاں تک کہ امیہ نے کہا کہ اگر تم مجبور ہی کرتے ہو تو قسم ہے اللہ کی میں مکہ میں سب سے عمدہ اونٹ خریدوں گا، پھر امیہ نے (گھر آکر اپنی زوجہ کو) کہا اے ام صفوان میرا سامان تیار کردو، اس نے کہا اے ابوصفوان کیا تم اپنے یثربی بھائی کی باتوں کو بھول گئے ہو؟ اس نے کہا نہیں (بھولا نہیں) میں کوئی دور جانے کا ارادہ نہیں رکھتا، بلکہ قریب سے ہی واپس آجاؤں گا، یہ جہاں بھی اترتا، اونٹ کو رسی سے باندھ دیتا، اس کا ارادہ یہ ہوتا کہ لوٹ آئے، لیکن یہ اسی طرح بدر میں پہنچ گیا، اللہ تعالی نے اسے وہاں بدر میں پہنچادیا۔

حدیث پاک میں استعمال ہوا ہے "صباۃ" (بضم الصاد) یہ جمع ہے صابی کی "هو المائل عن دينه الى دين غيره" یہ اسے کہتے ہیں جو ایک دین سے دوسرے دین کی طرف پھر جائے، امیہ کی زوجہ نے حضرت سعد کو امیہ کا

یثربی بھائی کہا "والمراد الاخوة بینهمابحسب المعاهدة و الموالاة "اخوۃ سے مراد ان کا وعدہ اور دوستی کا بھائی چارہ ہے۔ (عمدۃ القاری جز ۱۷ صفحہ نمبر ۷۶)

ابوجہل کا کعبہ کے اوپر کھڑے ہوکر لوگوں کو بھڑکانا:

ایک روایت میں ہے کہ ابوجہل لعین نے خانہ کعبہ کے اوپر کھڑے ہوکر آواز لگائی کہ اے مکہ والو جلدی کرو، جلدی نکلو، اور اپنے اموال اور اپنے قافلہ کے پاس پہنچو اگر تم سے پہلے محمد (ﷺ) کے اصحاب پہنچ گئے تو پھر تمہاری خیر نہیں، اس پر ایک ہزار جنگی لوگ نکل آئے اور بصد کروفر غرور وتکبر اور پورے ساز وسامان، آلات غنا اور ملاہی (لہو ولعب کے سامان) کے ساتھ چل پڑے۔

نبی کریم ﷺ کا صحابہ کرام سے مشورہ اور صحابہ کرام کی طرف آپ کو اطمینان بخش جواب:

❁ عن انس ان رسول الله ﷺ شاور حین بلغه اقبال ابی سفیان قال فتکلم ابوبکر فاعرض عنه ثم تکلم عمر فاعرض عنه فقال سعدبن عبادة فقال ایانا ترید یارسول الله والذی نفسی بیده لو امرتنا ان نخیضها البحر لاخضناها ولو امرتنا ان نضرب اکبادها الی برک الغماد لفعلنا قال فندب رسول الله ﷺ الناس فانطلقوا حتی نزلوا بدر ووردت علیهم روایا قریش وفیهم غلام اسود لبنی الحجاج فاخذوه فکان اصحاب رسول الله ﷺ یسالونه عن ابی سفیان واصحابه فیقول مالی علم بابی سفیان ولکن هذا ابوجهل وعتبة وشیبة وامیة بن خلف فی الناس فاذا قال هذا ضربوه ورسول الله ﷺ قائم یصلی فلما رای ذلک انصرف وقال والذی نفسی بیده لتضربوه اذا صدقکم وتترکوا اذا کذبکم قال فقال رسول الله ﷺ هذا مصرع فلان ویضع علی الارض ههنا وههنا قال فماماط احدهم عن موضع ید رسول الله ﷺ" (مسلم جلد ثانی باب غزوة بدر صفحه نمبر ۱۰۲)

حضرت انس ؓ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے (صحابہ کرام سے) مشورہ کیا جب آپ کو ابوسفیان (کے قافلہ) کی آنے کی خبر ملی، تو حضرت ابوبکر ؓ نے آپ سے اس کے متعلق (اچھا) کلام فرمایا، لیکن آپ نے ان سے اعراض فرمایا، (کہ میرا مشورہ تم سے نہیں) پھر حضرت عمر ؓ نے اس کے متعلق بہتر کلام فرمایا، لیکن آپ نے ان سے اعراض فرمایا کہ (میرا مقصد تم سے مشورہ لینا نہیں، کیونکہ آپ انصار کے رائے لینا چاہتے تھے کہ یہ مدینہ طیبہ سے باہر جنگ کیلئے جائیں گے یا نہیں) پھر حضرت سعد بن عبادہ (جو انصار کے سردار تھے) کھڑے ہوئے، عرض کیا

یارسول اللہ اگر آپ ہم سے بات کرنے کا ارادہ فرمارہے ہیں تو قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اگر آپ ہمیں حکم دیں کہ ہم اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیں، تو ہم دریا میں ڈال دیں گے، راوی کہتے ہیں، نبی کریم ﷺ نے لوگوں کو بلایا، تو لوگ چلے یہاں تک کہ بدر میں پہنچ گئے، وہاں قریش کے کچھ لوگ پانی لینے کیلئے آگئے، ان میں بنی حجاج کا ایک حبشی غلام بھی تھا، اسے صحابہ کرام نے پکڑ کر پوچھا کہ ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کے متعلق بتاؤ وہ کہاں ہیں؟ اس نے کہا کہ ابوسفیان کے قافلہ کا تو مجھے کوئی علم حاصل نہیں، البتہ ابوجہل، عتبہ، شیبہ اور امیہ بن خلف یہاں (قریب) ہی آچکے ہیں، تو صحابہ کرام نے اسے مارا (اس خیال سے کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے) اس نے کہا اچھا میں تمہیں (صحیح) خبر دیتا ہوں، یہاں قریب ہی ابوسفیان اور اس کے ساتھی موجود ہیں، صحابہ کرام نے اسے چھوڑ دیا، پھر اس سے پوچھا، اس نے کہا ابوسفیان کے متعلق تو مجھے کوئی علم نہیں، البتہ لوگوں میں (یعنی بہت بڑے لشکر میں) ابوجہل، عتبہ، شیبہ اور امیہ بن خلف آرہے ہیں، صحابہ کرام نے پھر اسے مارا، رسول اللہ ﷺ نماز ادا فرمارہے تھے، آپ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم اسے مارتے ہو جب یہ سچ کہتا ہے، اور تم اسے چھوڑ دیتے ہوئے جب یہ جھوٹ بولتا ہے پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ فلاں کے مرنے کی جگہ ہے یہ فلاں کی یہ فلاں کی آپ نے اپنا ہاتھ مبارک رکھ کر بتایا، یہاں اور یہاں روای کہتے ہیں کوئی ایک بھی آپ کے ہاتھ کی جگہ سے نہیں ہٹا (بلکہ وہیں مرا۔

وضاحت حدیث: "برك الغماد" برک باء پر فتحہ، راء کو ساکن، مفتوح اور مکسور تینوں طرح پڑھا گیا ہے۔

"واما الغماد فبغين معجمة مكسورة ومضمومة لغتان مشهورتان، وهو موضع من وراء مكة بخمس ليال بناحية الساحل وقيل بلديمان وقال ابراهيم الحربی برك الغماد وسعفات هجر كناية يقال فيما تباعد"

"برك الغماد" یا تو مکہ مکرمہ سے پانچ راتوں (پانچ دن پانچ راتوں) کے فاصلہ پر جنگل کے کنارے پر جگہ کا نام ہے، پانچ دنوں کا فاصلہ تقریبا تہتر میل ہے، اور بعض حضرات نے کہا یمن میں ایک شہر کا نام ہے، ابراہیم حربی کا قول یہ ہے کہ عرب حضرات "برك الغماد" اور "سعفات هجر" دو لفظ بولتے ہیں، جن کا کنایۃ معنی "دوری" لیتے ہیں، مطلب یہ ہوا کہ اگر آپ ہمیں حکم دیں کہ بہت دور و دراز سفر کر کے جہاد کیلئے جانا ہے تو ہم وہاں جائیں گے خواہ وہ یمن کا شہر ہو یا دور و دراز جنگل ہو۔ "**وفيه جواز ضرب الكافر الذی لاعهد له وان كان اسيرا**" حدیث پاک سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ جس کافر سے کوئی معاہدہ نہیں، وہ ذمی نہیں، اسے امن نہیں دیا گیا اسے مارنا جائز ہے

خواہ وہ قیدی ہی کیوں نہ ہو۔

"وفیہ معجزتان من اعلام النبوۃ احداھما اخبارہ ﷺ بمصرع جبابرتھم فلم یتعد احد مصرعہ الثانیۃ اخبارہ ﷺ بان الغلام الذی کانوا یضربونہ "یصدق اذا ترکوہ ویکذب اذا ضربوہ وکان کذلک فی نفس الامر" (نووی)

اس حدیث پاک سے نبی کریم ﷺ کے دو معجزے ثابت ہو رہے ہیں، ایک تو یہ کہ نبی کریم ﷺ نے قریش کے جن سرکردہ لوگوں کے نام بتائے اور جگہ کا انتخاب کیا کہ فلاں شخص یہاں مرے گا، اور فلاں شخص یہاں مرے گا، سب وہیں مرے، کوئی بھی وہاں سے ہٹ کر نہیں مرا، اور نہ ہی بچ کر نکلا، امیہ بن خلف جس کے متعلق نبی کریم ﷺ نے بہت پہلے خبر دے رکھی تھی کہ اسے میرے اصحاب قتل کر دیں گے، وہ بدر میں نہیں آنا چاہتا تھا لیکن اسے مجبور کر کے بدر میں لے جایا گیا وہ بھی وہاں قتل کر دیا گیا۔

ابوسفیان کا مشورہ لیکن ابوجہل کا اصرار:

ارباب سیر نے بیان کیا ہے کہ جب ابوسفیان اپنے قافلہ کو بچا کر ایک طرف سے نکل گیا تو اس نے مکہ میں پیغام بھیجا کہ قافلہ خطرہ سے نکل آیا ہے، لھذا تم لوگ لوٹ آؤ، محمد (ﷺ) کا پیچھا نہ کرو، قریش کے دوسرے عقلمند لوگ اور مدبر حضرات بھی انہیں منع کر رہے تھے، عتبہ اور شیبہ بھی منع کرنے والوں سے ہی تھے، عداس نصرانی جو عتبہ اور شیبہ کے غلام تھے، اور در پردہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لا چکے تھے، یہ بھی اپنے مالکوں کو منع کر رہے تھے کہ محمد (ﷺ) اللہ کے نبی ہیں، ان سے جنگ کر کے بدبختی میں مبتلاء نہ ہو، لیکن ابوجہل جس نے بدر میں قتل ہونا تھا یہ اصرار کر رہا تھا کہ ہم جنگ کرنے سے باز نہیں رہ سکتے، خدا کی قسم ہم بدر میں پہنچے سے پہلے واپس نہیں لوٹ سکتے، وہاں ہم تین دن ٹھہریں گے، اپنے اونٹ ذبح کریں گے، شراب پئیں گے، اور گانا سنیں گے، وہاں میلے کی طرح جشن منائیں گے، تا کہ ہماری شوکت وشجاعت کا چرچا ہر طرف عرب قبائل میں پھیل جائے تا کہ وہ ہم سے ڈرتے رہیں۔ ابوجہل کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس نے بدر سے لوٹ کر آنا ہی نہیں البتہ وہاں کفر وشرک اور فسق وفجور کا بازار گرم کریں گا، ذلت کی خاک میں سو کر جہنم میں جانے کا اسے پتہ نہیں تھا، بات اس کی یوں سچی ہوئی کہ کفار کی ذلت کی موت کا تمام قبائل میں چرچا ہو گیا۔ (ماخوذ از مدارج النبوۃ جلد دوم)

مسلمانوں اور کافروں کے لشکر بدر کے دو کناروں پر ٹھہر گئے:

نبی کریم ﷺ نے جب بدر کی جانب کوچ فرمایا تو مدینہ طیبہ کی جانب بدر کے ایک کنارے پر آپ اتر گئے۔

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَاَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى﴾ "عدوہ" کا معنی ہے" وادی کا کنارہ "اور" دنیا" دنو سے ہے جس کا معنی ہے "قریب" اور "قصوی" کا معنی ہے "بعید" یعنی مسلمانوں کو خطاب کر کے بتایا گیا کہ تم مدینہ کے قریب جانب تھے، اور وہ یعنی کفار مدینہ کی دور جانب تھے، یعنی وہ بدر کے اس کنارے پر تھے جو مکہ کی طرف تھا۔

شیطان وسوسہ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت:

جس جانب مسلمان اترے تھے وہ علاقہ ریگستان تھا، جس میں ان کے پاؤں اور گھوڑوں کے سم ریت میں دھنس جاتے تھے، مسلمانوں پر پیاس کا بھی غلبہ ہو جاتا تھا، اور جس طرف کفار تھے وہ پختہ زمین تھی، یعنی وہ مٹی والی طرف تھی، پانی بھی اس طرف تھا، شیطان نے مسلمانوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالا کہ تم کہتے ہو ہم حق پر، اللہ کا نبی تمہارے ساتھ ہے اور ہم اللہ کے محبوب ہیں، حالانکہ پختہ زمین قریش کی جانب ہے، پانی ان کے پاس موجود ہے، تم پیاسے ہو رہے ہو، اور تم ریگستان میں ہو، تمہارے پاؤں زمین میں دھنس رہیں، تم کس طرح جنگ کرو گے؟ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے بارش نازل فرمائی، مسلمانوں نے سیر ہو کر پیا، اونٹوں کو پانی پلایا، اور پانی اپنے پاس جمع کر لیا، اور ان کی ریتلی زمین بارش سے سخت ہو گئی، کافروں کی چٹیل زمین میں کیچڑ ہو گیا، اس طرح رب تعالیٰ نے مسلمانوں کے دلوں سے شیطان کا وسوسہ زائل کر دیا، اور مسلمانوں کے دلوں کو اطمینان وسکون عطاء فرمایا، رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لِيُطَهِّرَكُمْ بِهِ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ﴾ اور اللہ نے تم پر آسمان سے پانی نازل کیا تاکہ تم اس سے پاکیزگی حاصل کرو، اور وہ تمہارے دلوں سے شیطان کا وسوسہ دور فرمائے۔

نبی کریم ﷺ کی دعاء:

❁ عن ابن عباس قال قال رسول اللہ ﷺ یوم بدر اللهم انشدک عهدک ووعدک اللهم ان شئت لم تعبد فاخذ ابوبکر بیده فقال حسبک فخرج وهو يقول سيهزم الجمع ويولون الدبر"

(بخاری باب غزوۃ البدر)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ بدر کے دن رب کے حضور عرض کر رہے تھے اے اللہ میں تجھ سے وعدہ پورا کرنے کی درخواست کرتا ہوں، اے اللہ تو چاہتا ہے کہ تیری عبادت نہ کی جائے؟ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ کے ہاتھ مبارک پکڑ لیا، اور عرض کیا کہ تمہیں کافی ہے، تو آپ (اپنے عریشہ یعنی قبہ سے) نکلے، تو آپ فرما رہے تھے عنقریب جماعتیں شکست کھا جائیں گی اور پیٹھ پھیر جائیں گی۔

وضاحت حدیث :

"انشدک"بضم الشین ای اطلب منک الوفاء بماعهدت ووعدت من الغلبة علی الکفار والنصر للرسول واظهار الدین"

اے اللہ! جو تو نے مؤمنوں کو کفار پر غالب کرنے کا، اور اپنے رسول ﷺ کی امداد کرنے کا اور دین کو غلبہ عطاء کرنے کا وعدہ فرمایا ہے، میں اس وعدہ کی وفاء تجھ سے طلب کرتا ہوں، یہاں حدیث شریف میں ''عہد اور وعد'' ایک ہی معنی میں استعمال ہے "ان شئت لم تعبد" کا مطلب تقریباوہی ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں واضح طور پر موجود ہے

"اللهم ان تهلک هذه العصابة من اهل الاسلام لاتعبد فی الارض"

اے اللہ اگر تو نے مسلمانوں کی اس جماعت کو ہلاک کر دیا تو زمین میں تیری عبادت کرنے والا کوئی نہیں رہے گا۔

"حسبک"ای یکفیک من القول فاترکه""حسبك" کا مطلب یہ ہے کہ اے نبی کریم ﷺ ''آپ کا اتنا عرض کرنا کافی ہے، اب آپ چھوڑ دیں'' علامہ خطابی کہتے ہیں کوئی شخص یہ گمان نہ کرے کہ اللہ تعالی نے جو وعدہ نبی کریم ﷺ سے آپ کی امداد کرنے کا فرمایا اس کے پورا کرنے کا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو بنسبت رسول اللہ ﷺ کے زیادہ وثوق تھا'' "انه لایجوز ذلک قطعا" بیشک یہ کہنا ہرگز جائز نہیں، بلکہ نبی کریم ﷺ اپنے صحابہ پر شفقت کرتے ہوئے اوران کو تقویت پہنچانے کیلئے یہ دعاء کر رہے تھے، خاص کر کے اسلام میں یہ پہلا غزوہ تھا "فابتهل فی الدعاء لیسکنهم اذ کانوا یعلمون ان وسیلته مقبولة ودعاءه مستجاب" اسلئے نبی کریم ﷺ بڑی انکساری سے رب تعالی کی طرف رجوع کرتے ہوئے دعاء فرما رہے تھے تا کہ صحابہ کرام کے دلوں کو سکون حاصل ہو جائے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ نبی کریم ﷺ کا وسیلہ مقبول ہے، اور آپ کی دعاء کو قبول کیا جاتا ہے۔ کیا اس طرح کی دعاء کہیں اور بھی فرمائی ؟ ہاں ابونعیم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ذکر کی کہ آپ نے غزوہ احد میں یہ دعاء فرمائی

"اللهم انک ان تشاء لاتعبد فی الارض" "واللہ اعلم" (عینی جزء۷اصفحہ نمبر۸۱)

نبی کریم ﷺ کیلئے عریشہ بنایا گیا:

عریشہ اس جھونپڑی کو کہتے ہیں جو اکثر طور پر باغ میں ٹہنیوں اور پتوں سے بناتے ہیں، نہایہ میں ہے "العریش کل یستظل به" عریش اسے کہتے ہیں جس کے سایہ میں آرام کیا جائے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی اجازت سے بدر میں آپ کیلئے عریشہ تیار کیا، نبی کریم ﷺ نے ان کے حق میں دعاء خیر فرمائی، آج عریشہ کی جگہ مسجد بنی ہوئی ہے،

جیسا کہ کئی اور مقام پر یادگاروں کو قائم کرنے کیلئے مسجدیں بنی ہوئی ہیں۔ (ماخوذ از مدارج النبوۃ جلد دوم بالاختصار)

قریش کے ایک لشکری نے قریش کو جنگ سے منع کیا:

قریش نے اپنے ایک لشکری کو بھیجا کہ وہ مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ لگا کر بتائے، اس نے ادھر ادھر دیکھ کر بتایا کہ مسلمانوں کی تعداد تین سو کے قریب نظر آتی ہے اس نے کہا اے گروہ قریش میں نے ان بلاؤں کو دیکھا ہے جو اموات کو اٹھائے ہوئے ہیں، اور یثرب کے ان اونٹوں کو دیکھا ہے جو زہر قاتل کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں، مطلب یہ کہ ان کے ساتھ جنگ کرنا تمہاری ہلاکت کا سبب ہے، جب تم سب ہلاک ہو جاؤ گے، تو تمہارے پیچھے زندہ رہنے والوں کا کیا فائدہ ہوگا؟ تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ تم لوٹ چلو اور جنگ نہ کرو، حکیم بن خرام جو اس وقت کافروں میں تھا (بعد میں ایمان قبول کیا) اس نے بھی عتبہ کو یہی مشورہ دیا کہ واپس لوٹ چلو تو بہتر ہے، ورنہ تمہارا نام مٹ جائے گا، عتبہ نے کہا میرا ارادہ تو یہی ہے، البتہ تم ابو حنظلہ یعنی ابو جہل کے پاس جاؤ، اس کو واپس جانے کیلئے تیار کرو، حکیم بن خرام ابو جہل کے پاس آیا اسے واپس لوٹ جانے کا مشورہ دیا ابو جہل کو جب پتہ چلا کہ اسے میرے پاس عتبہ نے بھیجا ہے، تو اس نے عتبہ کے پاس آ کر کہا "افتضخ سحرک" یعنی تمہارے پھیپھڑے میں ہوا بھر گئی، یعنی تم بزدل ہو گئے ہو، عتبہ نے کہا عنقریب پتہ چل جائے گا کس کا پھیپھڑا پھولا ہوا ہے، بزدل کون ہے۔ (ماخوذ از مدارج النبوۃ جلد دوم)

نبی کریم ﷺ کی جنگی مہارت:

جب لشکر اسلام میدان کارزار میں اتر آیا تو نبی کریم ﷺ نے صفوں کو برابر فرمایا، پھر ارشاد فرمایا جب تک میں حکم نہ دوں دشمنوں پر حملہ نہ کرنا، اور اگر وہ تمہارے قریب آجائیں تو تیر اندازی شروع کر دینا، لیکن اتنے اندازے سے تیر پھینکنا کہ تیر ختم نہ ہو جائیں۔ (مدارج النبوۃ جلد دوم)

اس سے نبی کریم ﷺ کی جنگی مہارت واضح ہوتی ہے، کہ دشمن پر حملہ کرنے میں جلد بازی نہ کرنا بلکہ رکے رہنا، وہ تمہیں ڈرا ہوا، سہما ہوا سمجھیں گے، وہ تمہارے قریب ہونے کی کوشش کریں گے، جب وہ قریب آجائیں، تو اچانک تیر اندازی شروع کر دو، انہیں سنبھلنے کا موقع نہ ملے، تیروں سے چھلنی ہو جائیں، پھر مسلمانوں کے پاس اسلحہ کم ہونے کی وجہ سے انہیں مشورہ دیا کہ آہستہ آہستہ اسلحہ استعمال کرنا، جلدی سے تمام اسلحہ جنگ میں نہ پھونک دینا، تاکہ دشمن کو پتہ چلے کہ تمہارے پاس بہت اسلحہ ہے۔

نبی کریم ﷺ کے انصاف کی درخشاں مثال:

ارباب سیر نے ایک عجیب وغریب واقعہ بیان کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کی صفیں درست فرمار ہے تھے، تو آپ کے ہاتھ مبارک میں ایک چھڑی تھی، سواد ابن غریہ جو خوش طبع اور خوش فہم صحابی ہوئے ہیں، وہ صفوں سے آگے نکل آئے، نبی کریم ﷺ نے وہ چھڑی ان کے سینے پر لگاتے ہوئے فرمایا "استویا سواد" اے سواد صف کو سیدھا کرو، سواد نے عرض کیا یارسول اللہ آپ کی چھڑی سے مجھے تکلیف ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو حق سے بھیجا ہے، عدالت وانصاف آپ کے ہاتھ میں ہے، اس لئے آپ میرا قصاص دیجئے۔

نبی کریم ﷺ نے اسی وقت اپنے لباس مبارک کو اپنے سینہ اقدس سے دور کرتے ہوئے فرمایا اے سواد ابھی تم قصاص لے لو، سواد نے جلدی سے آگے بڑھ کر نبی کریم ﷺ کے سینہ مبارک کو چوم لیا، آپ نے فرمایا اے سواد تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟ تو انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ ہوسکتا ہے یہ میرا آخری وقت ہو، میں اس جنگ میں شہید ہو جاؤں، اس لئے میں نے چاہا کہ آخر میں میرا جسم آپ کے جسم سے مس ہو جائے، تو نبی کریم ﷺ ان کیلئے دعاء خیر فرمائی۔ (مدارج النبوۃ جلد ۲)

اس سے دو فائدے حاصل ہوئے ایک تو یہ کہ نبی کریم ﷺ نے دوران جنگ اگر کسی کیلئے دعاء فرمائی "رحمہ اللہ" تو اسے شہادت حاصل ہوئی، غزوہ خیبر میں نبی کریم ﷺ نے حضرت عامر رضی اللہ عنہ کیلئے دعاء فرمائی "یرحمہ اللہ" تو ایک صحابی نے کہا "وجبت یا رسول اللہ" یارسول اللہ ﷺ اس کیلئے شہادت واجب ہوئی۔ (باب غزوۃ الخیبر مسلم جلد ۲ صفحہ نمبر ۱۲۰)

معنی وجبت ای ثبتت له الشهادة وستقع قریبا وکان هذا معلوما عندهم ان من دعا له النبی ﷺ هذا الدعاء فی هذا الموطن استشهد" (نووی)

"وجبت" کا معنی یہ ہے کہ "اس کیلئے شہادت ثابت ہو چکی ہے" یعنی عنقریب شہادت واقع ہو جائے گی، صحابہ کرام کو یہ معلوم تھا کہ نبی کریم ﷺ نے جنگ میں جس کیلئے بھی رحمت کی دعاء کی، وہ اس جنگ میں شہید ہو گیا۔

دوسرا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ صحابی نے نبی کریم ﷺ سے قصاص کا مطالبہ کیا تو آپ نے اپنے آپ کو قصاص کیلئے پیش کر دیا، یہ نبی کریم ﷺ کے عدل وانصاف کی درخشاں مثال ہے، یہ علیحدہ بات ہے کہ صحابی نے قصاص نہ لیا اور لینے کا ارادہ تھا، بلکہ آپ کے جسم کو چومنا مقصود تھا، لیکن قصاص کے مطالبہ پر آپ کا اپنے آپ کو پیش کرنا عظیم عدل ہے۔

ولید، عتبہ، شیبہ کا پہلے نکلنا اور اپنے مقابل طلب کرنا:

جیسا کہ اس وقت جنگ کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ پہلے نامی گرامی بہادر لوگ صفوں سے باہر نکلتے، اور اپنے

مقابل لوگوں کے نکلنے کا مطالبہ کرتے، ایسے ہی بدر میں بھی صورت درپیش آئی، آیئے حدیث پاک دیکھئے۔

❁ عن علی قال لما کان یوم بدر تقدم عتبة بن ربیعة وتبعه ابنه واخوه فنادی من یبارز فانتدب له شباب من الانصار فقال من انتم فاخبروه فقال لا حاجة لنا فیکم انما اردنا بنی عمنا فقال رسول الله ﷺ قم یا حمزة قم یا علی قم یا عبیدة بن الحارث فاقبل حمزة الی عتبة واقبلت الی شیبه واختلف بین عبیدة والولید ضربتان فاثخن کل واحد منهما صاحبه ثم ملنا علی الولید فقتلناه واحتملنا عبیدة" رواه احمد وابو داؤد" (مشکوة باب القتال فی الجهاد صفحه نمبر ۳۴۳)

حضرت علی ﷺ فرماتے ہیں بدر کے دن عتبہ بن ربیعہ صف سے باہر نکلا، اس کے پیچھے اس کا بیٹا (ولید) اور اس کا بھائی شیبہ صفوں سے باہر نکلے، پکارا کون ہے جو ہمارے مقابلہ کیلئے آئے، ان کے اس چیلنج کو چند انصار کے نوجوان نے قبول کیا، (عتبہ نے) کہا تم کون ہو؟ انہوں نے اپنے متعلق خبر دی (کہ ہم انصار سے ہیں) اس نے کہا ہمیں تم سے کوئی مطلب نہیں، ہم تو اپنے خاندان قریش کو اپنے مقابلہ کیلئے بلا رہے ہیں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے حمزہ تم اٹھو، اے علی تم اٹھو، اے عبیدہ بن الحارث تم اٹھو، حمزہ عتبہ کے مقابل آگئے، (انہوں نے عتبہ کو قتل کر دیا) اور میں شیبہ کے مقابل آ گیا (اس طرح حضرت علی ﷺ نے شیبہ کو قتل کر دیا) عبیدہ اور ولید کا ایک دوسرے سے مقابلہ ہوا، ہر ایک نے دوسرے کو زخمی کر کے تھکا دیا کمزور کر دیا، ہم ولید پر جھپٹ پڑے، ہم نے اسے قتل کر دیا، اور ہم عبیدہ کو اٹھا کر (خیمہ میں) لے آئے، عبیدہ شہید ہو گئے۔

تنبیہ: حضرت عبیدہ کی عمر اس وقت اسی سال تھی، عبیدہ کو زخمی حالت میں خیمہ میں لایا گیا تھا، ان کی پنڈلیوں کا مغز بہہ رہا تھا، چونکہ میدان جنگ میں جلدی یہ جان نہ دے سکے، تو ان کو خیال آیا کہ شاید مجھے شہادت حاصل نہیں ہوگی، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ کیا میں شہید نہیں؟ تو آپ نے فرمایا ہاں تم شہید ہو۔
(مدارج النبوۃ جلد دوم)

ابوجہل کا قتل:

❁ عن عبدالرحمن بن عوف انه قال بینا انا واقف فی الصف یوم بدر نظرت عن یمینی وشمالی فاذا انا بین غلامین من الانصار حدیثة اسنانهما تمنیت لو کنت بین اضلع منهما فغمزنی احدهما فقال یاعم هل تعرف اباجهل قال قلت نعم وما حاجتک الیه یا ابن اخی قال اخبرت انه یسب رسول الله ﷺ والذی نفسی بیده لئن رأیته لایفارق

سوادی سواده حتی یموت الاعجل منا قال فتعجبت لذلک فغمزنی لذلک فغمزنی الآخر فقال مثلها قال فلم انشب ان نظرت الی ابی جهل یزول فی الناس فقلت الاتریان هذا صاحبکما الذی تسالون عنه قال فابتدراه فضرباه بسیفهما حتی قتلاه ثم انصرفا الی رسول اللہ ﷺ فاخبراه فقال ایکما قتله فقال کل واحد منهما انا قتلته فقال هل مسحتما قالا لافنظر فی السیفین فقال ایکما قتله فقال کلاکما قتله وقضی بسلبه لمعاذبن عمروبن جموح والرجلان معاذبن عمر الجموح ومعاذبن عفراء" (مسلم جلدثانی صفحہ نمبر ۹۲ باب استحقاق القاتل سلب القتل)

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف فرماتے ہیں، بیشک میں بدر کی جنگ کے دوران قتال کی صف میں کھڑا تھا، میں نے دائیں اور بائیں دیکھا کہ میں تو دونو جوانوں تھوڑی عمروں کے انصار کے درمیان ہوں، میں نے تمنا کی کاش کہ میں بہادر اور جنگی تجربہ کار شخصوں کے درمیان ہوتا، تو اتنے میں ان دونوں میں سے ایک نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اے میرے چچا کیا تم ابو جہل کو جانتے ہو، میں نے کہا ہاں میں جانتا ہوں، تمہیں اس سے کیا کام ہے؟ اس نے کہا مجھے یہ پتہ چلا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کا گالیاں دیتا ہے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اگر میں اسے دیکھ لوں تو میرا جسم اس کے جسم سے جدا نہیں ہوگا یہاں تک کہ وہ مر جائے جس کی موت ہم میں سے جلدی آنی ہے، عبدالرحمٰن بن عوف کہتے ہیں میں نے اس کی بات پر بہت تعجب کیا جو اس نے میرے ساتھ کی، اتنے میں دوسرے نے میرے ساتھ کلام کیا اسی طرح جس طرح پہلے نے کیا تھا، یہ کہتے ہیں میں ابو جہل کو دیکھنے لگا کہ وہ کہاں ہے، کیونکہ وہ گھوم پھر رہا تھا، تو میں نے اسے دیکھتے ہی ان نو جوانوں کو بتایا وہ ہے تمہارا صاحب (ابو جہل) جس کے متعلق تم پوچھ رہے تھے، یہ کہتے ہیں ان دونوں نے جلدی اپنی تلواروں سے اس پر حملہ کر دیا یہاں تک کہ اسے قتل کر دیا، پھر یہ دونوں وہاں سے لوٹ کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو ابو جہل کے قتل کی خبر دی، آپ نے فرمایا تم میں سے کس نے قتل کیا ہے، تو ان میں سے ہر ایک نے کہا میں نے قتل کیا ہے، پھر آپ نے فرمایا کیا تم دونوں نے اپنی اپنی تلواروں کو صاف کر لیا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں، آپ نے دونوں کی تلواروں کو دیکھ کر فرمایا تم دونوں نے ہی اسے قتل کیا ہے، پھر آپ نے ابو جہل کا سامان معاذ بن عمرو بن جموح کو دے دیا، وہ انصاری دونو جوانوں میں سے ایک معاذ بن عمرو بن جموح تھے، اور دوسرے معاذ بن عفراء تھے۔

وضاحت حدیث: "تمنیت لو کنت بین اضلع منهما" اضلع کا اصلی معنی بڑی پسلیوں والا، لیکن مراد اس سے بہادر آدمی ہے، بخاری کی بعض روایات میں "اصلح" آیا ہے، زیادہ صلاحیت رکھنے والا، تجربہ

کار، اگر چہ "اضلع" کو زیادہ صحیح قرار دیا گیا ہے، لیکن راقم نے ترجمہ علامہ نووی رحمہ اللہ کے اس قول کے مطابق کیا ہے "ولعله قالهما جميعا و معنى اضلع اقوى" ہو سکتا ہے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ؓ نے دونوں لفظ کہے ہوں، ایک راوی نے ایک لفظ استعمال کیا ہو، دوسرے نے دوسرا لفظ استعمال کیا ہو، راقم کا ترجمہ دونوں لفظوں کا اعتبار کرتے ہوئے ہے، آیئے دیکھئے "میں نے تمنا کی کاش میں بہادر اور جنگی تجربہ کار شخصوں کے درمیان ہوتا" "لا يفارق سوادی سواده ای شخصی شخصه" میری ذات اس کی ذات سے، میرا جسم اس کے جسم جسم سے جدا نہیں ہوگا، یہاں تک کہ جس کی موت جلدی آنی ہے وہ مر جائے گا، میری موت پہلے آئے یا اس کی موت پہلے آئے۔

(ماخوذ از نووی)

اعتراض: بعض روایات میں آتا ہے کہ ابن مسعود ؓ نے ابوجہل کو قتل کیا، دونوں روایات میں کس طرح تطبیق دی جائے گی۔

جواب: ابوجہل پر تلوار معاذ بن عفراء نے چلائی، اور معاذ بن عمرو بن جموح نے بھی چلائی، لیکن ابوجہل زمین پر معاذ بن عمرو بن جموح کی تلوار سے گرا (اور ٹھنڈا ہوا اسی وجہ سے ابوجہل کا سامان ان کو دیا گیا، اگر چہ حضور ﷺ نے دونوں کے متعلق فرمایا کہ تم دونوں نے ہی قتل کیا ہے' وجاء ابن مسعود بعد ذلک وفيه رمق فجز رقبته " اس کے بعد ابن مسعود آئے جبکہ ابوجہل کے کچھ آخری سانس موجود تھے تو انہوں نے اس کی گردن کاٹ دی۔ (ماخوذ از نووی)

اعتراض: اس روایت میں ذکر ہے کہ ابوجہل معاذ بن عمرو جموح اور معاذ بن عفراء نے قتل کیا ہے، لیکن دوسری روایت میں یہ ہے کہ عفراء کے دونوں بیٹوں نے قتل کیا ہے، تو کس طرح دونوں روایات میں تطبیق دی جا سکتی ہے، آیئے پہلے وہ روایت دیکھئے پھر جواب دیا جائے گا۔

- **عن انس بن مالک قال قال رسول الله ﷺ من ينظر لنا ما صنع ابو جهل فانطلق ابن مسعود فوجده قد ضربه ابنا عفراء حتى برد قال فاخذ بلحيته فقال انت ابو جهل فقال وهل فوق رجل قتلتموه او قال قتله قومه قال وقال ابو مجلز قال ابو جهل فلو غير اكار قتلنی"**

حضرت انس بن مالک ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کون ہے جو دیکھ کر یہ بتائے ابوجہل سے کیا ہوا؟ ابن مسعود گئے، انہوں نے اسے اس حالت میں پایا کہ عفراء کے دو بیٹوں نے اسے تلواریں مار کر ٹھنڈا کر دیا ہے (لیکن ابھی وہ مکمل نہیں مرا تھا) ابن مسعود نے اس کی داڑھی کو پکڑ کر کہا کیا تو ابوجہل ہے؟ اس نے کہا کیا تم نے ایک

بڑے شخص کو قتل نہیں کیا؟ یا اس نے کہا کیا اسے اس کی قوم نے قتل کیا ہے ابومجلز کی روایت میں ہے کہ ابوجہل نے کہا کاش مجھے دہقانی قتل نہ کرتے، یعنی انصار کے نوجوان جو کھیتی باڑی کرتے ہیں کاش کہ وہ مجھے قتل نہ کرتے بلکہ قریش کے لوگ مجھے قتل کرتے، کیسا متکبر تھا مرتے دم بھی اس کا تکبر اس کے رگ وریشہ سے نہ نکلا۔

عبداللہ سندھی کا جواب لیکن ضعیف:

قوله قد ضرب ابنا عفراء يمكن ان يكون به تغليب بناء على ماسبق ان احدهما كان ابن عفراء والآخر غيره فهذا التغليب في الاضافة كمايغلب اطلاق نفس الاسم كمافي عمرين ونحوه" (حاشیه مسلم سندی)

عفراء کے دو بیٹوں کو جو ذکر ہے اس میں قاعدہ تغلیب جاری کیا گیا ہے جیسے ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کو عمرین کہا گیا ہے، اسی طرح اس روایت میں معاذ بن عفراء اور معاذ بن عمرو بن جموح کو "ابنا عفرا" کہہ دیا گیا ہے، حالانکہ ایک ابن عفراء ہے دوسرا ابن عفراء نہیں۔

صحیح جواب:

(والرجلان) ای الغلامان (معاذ بن عمرو بن الجموح ومعاذ بن عفراء) هي امه وهما اخوان امهما واحد وابوهما مختلف"

(مشكوة باب قسمة الغنائم والغلول فيها، مرقاة جلد ۸ صفحه نمبر ۵۸)

معاذ بن عمرو بن جموح اور معاذ بن عفراء دونوں بھائی تھے، دونوں کی ماں عفراء تھی، البتہ باپ دونوں کے علیحدہ علیحدہ تھے، ایک روایت میں معاذ بن عمرو بن جموح ذکر کیا گیا جس میں نسبت باپ کی طرف کی گئی، اور دوسری روایت میں "ابنا عفراء" کہا گیا ہے، یعنی عفراء کے دونوں بیٹے، اس روایت میں ماں کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

فرشتوں کو دیکھنا اوران کی آواز سننا:

❁ وعن ابن عباس ان النبی ﷺ قال یوم بدر هذا جبريل آخذ برأس فرسه عليه اداة"

(رواه البخاری، مشكوة باب المعجزات)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، بیشک نبی کریم ﷺ نے بدر کے دن فرمایا یہ جبریل ہیں اپنے گھوڑے کے سر کو پکڑے ہوئے ہیں، جبریل پر آلات حرب ہیں، یعنی وہ اسلحہ سے مسلح ہیں۔

"ولعله ﷺ اظهره لانس حتى ابصره كمايشير اليه قوله هذالانه في الاصل موضوع للمحسوس

وبھذایتبین وجه ایرادالحدیث فی باب المعجزات" (مرقاۃ جلد 11 صفحہ نمبر ۱۶۶)

شاید نبی کریم ﷺ نے (اپنے ہم رکاب) حضرت انس رضی اللہ عنہ پر ظاہر فرمایا ہو، اور انہیں جبریل دکھائے ہوں ،اسی وجہ سے "ھــــذا" سے اشارہ کیا گیا، جو اصل میں محسوس چیز کی طرف اشارہ کیلئے وضع کیا گیا ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کو دکھانا آپ کا معجزہ تھا اسی وجہ سے مشکوۃ میں یہ حدیث کتاب المعجزات میں ذکر ہے۔

وعن ابن عباس قال بینمارجل من المسلمین یومئذیشتدفی الرجل من المشرکین امامه اذسمع ضربة بالسوط فوقه وصوت الفارس یقول اقدم حیزوم اذنظر الی المشرک امامه خرمستلقیا فنظر الیه فاذاھو قدخطم انفه وشق وجھه کضربة السوط فاخضرذلک اجمع فجاء الانصاری فحدث رسول الله ﷺ فقال صدقت ذلک من مددالسماء الثالثة فقتلوایومئذسبعین" (رواہ مسلم مشکوۃ کتاب المعجزات)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، مسلمانوں میں سے ایک شخص اس دن ایک مشرک کے پیچھے تیز تیز دوڑ رہا تھا جو اس کے آگے آگے تھا، مسلمان نے اچانک مشرک پر کوڑا کی ضرب (مار) کی آواز سنی، اور ایک سوار کی آواز سنی جو یہ کہہ رہا تھا "اقدم حیزوم" حیزوم آگے بڑھو، مسلمان نے مشرک کو دیکھا جو اس کے آگے تھا، وہ سیدھا گر چکا تھا، اور مسلمان نے اسے دیکھا کہ اس کی ناک کٹ چکی تھی، اور اس کے چہرے پر کوڑا چلنے کا نشان موجود تھا، وہ مشرک تمام سیاہ ہو چکا تھا، وہ انصاری نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور آپ کے سامنے واقعہ بیان کیا، تو آپ نے فرمایا ہاں تم نے سچ کہا، یہ تیسرے آسمان سے امداد آئی تھی، اس دن ستر آدمی کافروں کے قتل کر دیئے گئے اور ستر قید کر لئے گئے۔

وضاحت حدیث:

چند مشکل الفاظ یا ان میں ضمیروں کے مرجع کی طرف طلباء کرام توجہ دیں تا کہ معنی درست کیا جا سکے "یشتد ای یسرع ویعدو" یشتد کا معنی یہاں یہ ہے "تیز چلنا، اور دوڑنا" "فی اثر رجل" بعض حضرات نے بیان کیا کہ "رجل" کی راء کے نیچے کسرہ ہے اور جیم ساکن ہے یعنی مشرک پیدل دوڑ رہا تھا، اور مسلمان بھی اس کے قدموں کے نشانوں پر تیز دوڑ رہا تھا بعض حضرات نے "راء" کے فتحہ سے پڑھا ہے کہ وہ اس مشرک کے پیچھے دوڑ رہا تھا، (اذسمع) ای المسلم (ضربة) ای صوت ضربة بالسوط (فوقه) ای فوق المشرک" مسلمان نے اچانک مشرک پر کوڑا کی مار کی آواز سنی۔ مسلمان نے سوار کی آواز سنی کہ وہ کہہ رہا ہے "اقدم حیزوم" "وحیزوم اسم فرس الملک" حیزوم فرشتے کے گھوڑے کا نام ہے اور "اقدم

" کو دو طرح پڑھا گیا ہے، ایک ہمزہ اور دال کے ضمہ (پیش) سے، معنی اس کا ہے "تقدم" آگے بڑھ" **راقم** نے یہی ترجمہ کیا ہے۔

دوسرا ہمزہ کے فتحہ (زبر) اور دال کے کسرہ (زیر) سے اس، اس کے پھر دو مطلب بیان کئے گئے ہیں ایک مطلب یہ ہے کہ اس کا معنی "اعزم" سیدھے ہوکر، مضبوط ہوکر رہو، اور دوسرا مطلب علامہ نووی نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ گھوڑے کیلئے کلمہ زجر ہے۔ "فاخضر ذلک اجمع "احضر" کی راء مشدد ہے، احضرار کا معنی سبز ہو جانا یا سیاہ ہو جانا، کیونکہ "فان الخضرة قد تستعمل بمعنی السواد کعکسه للمبالغة" بیشک خضرۃ کبھی سواد کے معنی میں آتا ہے، اور سواد کبھی خضرۃ کے معنی میں استعمال ہوتا رہتا ہے (سواد کا معنی سیاہ، خضرۃ کا معنی سبز) اگرچہ علامہ قاری رحمہ اللہ نے یہ بیان کیا ہے "ای صار موضع الضرب کله اخضر او اسود" جہاں اسے کوڑا لگا (اور اس کا ناک کٹا اور چہرہ زخمی ہوا) وہ تمام جگہ سبز یا زخمی ہوگئی۔ راقم نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے یہ خیال کرتے ہوئے کہ فرشتہ کے کوڑے کی ضرب کی وجہ سے وہ مشرک مکمل سیاہ ہو گیا۔ (واللہ اعلم)

انصاری نے جب نبی کریم ﷺ کو واقعہ بتایا تو آپ نے فرمایا "صدقت ذلک من مدد السماء الثالثة" تم نے سچ کہا یہ تیسرے آسمان سے امداد آئی" اس میں صحابی کی کرامت سمجھ آرہی ہے کہ انہوں نے فرشتے کی آواز سنی، اس کی ضرب کو دیکھا، اور نبی کریم ﷺ کا معجزہ واضح ہو رہا ہے "لان المدد کان من السماوات کلها وهذا من الثالثة خاصة" کیونکہ امداد تو تمام آسمانوں سے آرہی تھی لیکن یہ امداد جو اس صحابی کو حاصل ہوئی وہ خاص کر کے تیسرے آسمان سے آئی تھی، یہی وجہ ہے جو صاحب مشکوۃ نے اس حدیث کو کتاب المعجزات میں ذکر کیا ہے۔ (مرقاۃ جلد ۱۱ صفحہ نمبر ۱۶۶، ۱۶۷)

استاذی المکرم کا استدلال:

اس حدیث کی وضاحت میں استاذی المکرم حضرت علامہ محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی نے فرمایا تھا کہ فرشتوں کا ناک اور چہرے پر ضرب لگانا اس پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ مسلمانوں کے دلوں کو تسلی دینے کیلئے آئے تھے، لڑنے کیلئے نہیں آئے تھے، کہیں کہیں ضرب سے کام لیا، وہ بھی معمولی، اگر لڑنے کیلئے آتے تو گلا کاٹتے، ناک کاٹنے، چہرہ زخمی کرنا کیا مقصد ہے؟

غزوہ احد میں بھی فرشتوں کو دیکھا گیا:

"وعن سعد بن ابی وقاص قال رایت عن یمین رسول الله وعن شماله یوم احد رجلین

علیهما ثیاب بیض یقاتلان کاشد القتال ما رأیتهما قبل ولا بعد یعنی جبریل ومیکائیل"
(بخاری، مسلم، مشکوۃ کتاب المعجزات)

حضرت سعد بن ابی وقاص فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کی دائیں جانب اور دوسری جانب غزوہ احد کے دن دو آدمیوں کو دیکھا ان پر سفید کپڑے تھے، بہت شدید قتال کر رہے تھے، میں نے یہ منظر نہ اس سے پہلے دیکھا، نہ بعد۔ "والاظهر ان معناه قتالا مثل اشد قتال رجال الانس" اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ وہ انسانوں کی طرح انسانی طاقت کے مطابق شدید لڑائی کر رہے تھے ورنہ ایک پر کی نوک سے مشرکین کو زیروزبر (اوپر نیچے) کر دیتے۔ (مرقاۃ جلد ۱۱ صفحہ نمبر ۱۶۷)

پانچ ہزار فرشتے آئے یا نہیں:

زیادہ مفسرین کرام نے تو یہی لکھا ہے کہ پہلے ایک ہزار فرشتوں سے پھر تین ہزار فرشتوں سے اور پھر پانچ ہزار فرشتوں سے امداد کی گئی، یعنی پانچ ہزار فرشتے کل تعداد میں تھے۔ لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ کا موقف یہ ہے۔

"فجعل مجئ خمسة آلاف من الملائكة مشروطا بثلاثة اشياء الصبر والتقوى و مجئ الكفار على الفور فلما توجد هذه الشرائط لاجرم لم يوجد المشروط"

پانچ ہزار فرشتوں کا آنا تین شرطوں سے مشروط تھا، (۱) صبر (۲) تقوی (۳) کافروں کا فوراً حملہ کرنا۔ جب یہ تینوں شرطیں مجموعی طور پر نہیں پائی گئیں، کیونکہ کافروں کا فوراً اور اچانک حملہ کرنا ثابت نہیں، جب شرط نہیں پائی گئی تو مشروط یعنی پانچ ہزار فرشتوں کا آنا بھی ثابت نہیں۔ (کبیر) (واللہ اعلم بالصواب)

نبی کریم ﷺ کا کفار کیلئے دعاء ہلاکت کرنا:

عن عبدالله بن مسعود ﷺ قال استقبل النبی ﷺ الكعبة فدعا على نفر من قريش على شيبة بن ربيعة وعتبة بن ربيعة والوليد بن عتبة وابی جهل بن هشام فاشهد بالله لقد رأيتهم صرعى قد غيرتهم الشمس وكان يوما حارا" (بخاری، باب دعاء النبی ﷺ علی کفار قریش الخ)

حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ سے فرمایا نبی کریم ﷺ نے کعبہ شریف کی طرف متوجہ ہو کر (بدر کے دن) قریش کے چند لوگوں یعنی شیبہ بن ربیعہ اور عتبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ اور ابو جہل بن ہشام کیلئے دعاء ہلاکت کی (کہ اے اللہ ا کو ہلاک کر دے) میں گواہی دیتا ہوں کہ تحقیق میں نے ان سب کو ہلاک ہوئے دیکھا، ان کے جسموں کو دھوپ نے بدل دیا تھا، وہ دن بڑا گرم تھا۔

قدرت کا عجیب فیصلہ:

حضرت بلال ﷜ امیہ بن خلف کے غلام تھے، حضرت بلال ﷜ کے ایمان لانے پر اس نے آپ پر بڑے مظالم ڈھائے، حضرت بلال ﷜ کی مظلومیت کو دیکھ کر حضرت ابو بکر ﷜ نے ان کو خرید کر آزاد کر دیا، لیکن حضرت بلال نے بدر کے دن کچھ اور ساتھیوں کی مدد سے امیہ بن خلف کو قتل کر دیا۔

❁ **عن عبدالرحمن بن عوف قال کاتبت امية بن خلف فلما کان يوم بدر فذكر قتله ابنه فقال بلال لانجوت ان نجاامية" (بخاری باب قتل ابی جهل)**

عبدالرحمن بن عوف کہتے ہیں میں نے امیہ بن خلف سے معاہدہ کیا ہوا تھا، جب بدر کا دن ہوا تو اس کے اور اس کے بیٹے کے قتل کا ذکر کیا گیا (کہ ان کو قتل کر دیا جائے) تو حضرت بلال نے کہا میری نجات نہیں اگر امیہ نے نجات پالی۔

وضاحت حدیث:

کاتبت معناه عاهدت امية بن خلف(بفتحتين)ولفظ الذى فى كتاب الوكالة كاتبت امية بن خلف كتابابان يحفظنى فى صاغيتى بمكة واحفظه فى صاغيته" وصاغية الرجل خاصته والذين يميلون وياتونه"

"کاتبت" کا معنی ہے کہ میں نے امیہ بن خلف سے (خاء اور لام پر زبر) معاہدہ کیا' بخاری کتاب الوکالۃ میں یہ حدیث زیادہ الفاظ سے زیادہ واضح ہے، اس میں آگے والے الفاظ "کاتبت" سے لے کر "فی صاغیته" تک ہیں "صاغیة الرجل" انسان کے خاص آدمی جو اس کی طرف میلان کریں اور اس کے پاس آئیں، لیکن اس مقام پر حملہ کرنے والے خاص لوگ ہیں، وہ معاہدہ ایک دستاویز کی صورت میں لکھا گیا، کہ اگر مکہ میں مجھ پر کوئی حملہ کرے تو تم مجھے بچانا، اور تم پر کسی نے حملہ کیا تو میں تمہاری حفاظت کروں گا۔ آگے بخاری کتاب الوکالۃ کی حدیث میں مزید وضاحت موجود ہے۔

"قال فلما كان فى يوم بدر خرجت الى جبل لاخرزه حين نام الناس فابصره بلال فخرج حتى وقف على مجلس من الانصار فقال "امية بن خلف" لانجوت ان نجاامية فخرج معه فريق من الانصار فى آثار فلماخشيت ان يلحقوناخلفت لهم ابنه لاشغالهم فقتلوه ثم ابواحتى يتبعوناوكان رجلاثقيلافلماادركوناقلت له ابرك فبرك فالقيت عليه نفسى لامنعه فتخللوه بالسيوف من تحتى حتى قتلوه"

عبدالرحمن بن عوف کہتے ہیں جب بدر کا دن واقع ہوا تو میں ایک پہاڑ کی طرف نکلا کہ جب لوگ سوئے ہوئے ہوں (یعنی دوپہر قیلولہ کے وقت) تو میں اسے بچالوں، یعنی پہاڑ میں کہیں چھپادوں، لیکن بلال نے اسے دیکھ لیا، یہ انصار کی ایک مجلس میں جا کھڑے ہوئے، اور کہا "وہ امیہ بن خلف ہے" "میری نجات نہیں اگر امیہ نے نجات پالی" انصار کے چند آدمی (حضرت بلال کے ساتھ) ہمارے پیچھے چل پڑے، جب مجھے خوف لاحق ہوا کہ یہ تو ہمیں مل جائیں گے، تو میں نے امیہ کے بیٹے کو پیچھے چھوڑ دیا کہ وہ لوگ اس کے ساتھ مشغول ہو جائیں گے (یعنی اس سے پوچھیں گے تمہارا باپ کہاں ہے، اسے قتل کرنے کا وہ ارادہ نہیں رکھیں گے) لیکن انصار صحابہ نے امیہ کے بیٹے کو قتل کردیا، پھر انہوں نے پیچھے ہٹنے سے انکار کردیا، یہاں تک کہ وہ ہم تک پہنچ گئے، امیہ بن خلف جسیم شخص تھا، جب انہوں نے ہمیں پالیا (یعنی بہت ہی ہمارے قریب ہوگئے) تو میں نے اسے کہا ایسے بیٹھ جا جیسے اونٹ بیٹھتے ہیں، وہ اسی طرح بیٹھ گیا، میں نے اپنے آپ کو اس کے اوپر ڈال دیا تا کہ میں اسے بچا سکوں، لیکن صحابہ کرام نے میرے نیچے سے تلواریں گھسا کر اسے قتل کردیا۔

"قال الکرمانی فقتله بلال لانه کان قدعذب بلالا کثیرا فی المستضعفین بمکة"

علامہ کرمانی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ حضرت بلال ﷺ نے امیہ بن خلف کو قتل کردیا، کیونکہ اس نے مکہ میں حضرت بلال ﷺ کو کمزور سمجھ کر بہت زیادہ تکالیف پہنچائی تھیں، کیا خوب کسی نے کہا۔

هنیئا زادک الرحمن فضلا　　　فقد ادرکت ثارک یابلال

مبارک ہو تم پر کتنا زیادہ اللہ کا فضل ہے تم نے پالیا ہے اپنے مظالم کا بدلہ اے بلال

اعتراض: پہلے جو حدیث بیان کی گئی اس میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد گزر گیا کہ میرے صحابہ امیہ بن خلف کو قتل کریں گے بخاری کی کتاب الوکالۃ میں مذکور حدیث میں بھی جمع کا صیغہ ہے "حتی قتلوه" تو علامہ کرمانی رحمہ اللہ کا قول کیسے صحیح ہے کہ حضرت بلال ﷺ نے امیہ بن خلف کو قتل کیا۔

جواب: ان الحدیث لایدل علی ان بلالا اختص بقتل امیة ویمکن ان یکون بلال مع الذین تخللوه بالسیوف تحت عبدالرحمن ابن عوف فصار من جملة القاتلین"

یہ بات قابل تسلیم ہے کہ حدیث پاک سے یہ واضح نہیں کہ صرف اکیلے حضرت بلال ﷺ بھی شریک تھے لهذا ان کی طرف نسبت کرنا درست ہے۔　(ماخوذ از عمدۃ القاری جلد ۱۷)

یہ بات ذہن میں رہے کہ حضرت بلال ﷺ کو مکہ مکرمہ میں ہی حضرت ابوبکر ﷺ نے خرید کر آزاد کردیا تھا، اسلئے آپ کے ارشاد "لا نجوت ان نجا امیة" کا یہ مطلب نہیں کہ امیہ اگر نجات پا گیا تو مجھ پر پہلے کی طرح

مظالم ڈھائے گا تو مجھے اس سے نجات حاصل نہیں ہوگی۔ بلکہ آپ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ مجھ پر ظلم کرنے والا آج بچ نہ جائے، وہ بچ گیا تو مجھے افسوس رہے گا کہ وہ ظالم کیوں قتل نہیں ہوا، اس طرح میں افسوس سے نجات حاصل نہیں کر سکوں گا۔ بدر میں قریش کے سردار قتل ہونے والوں پر حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی دعاء ہلاکت کا بھی اثر تھا:

❁ عن عبدالله قال بينما رسول الله ﷺ ساجد و حوله ناس من قريش اذجائه عقبة ابن معيط بسلا جزور فقذفه على ظهر رسول الله ﷺ فلم يرفع رأسه فجاء ت فاطمة فاخذته عن ظهره و دعت على من صنع ذلک فقال اللهم عليک الملأ من قريش اباجهل بن هشام و عتبة بن ربيعة و شيبة بن ربيعة و عقبة بن ابی معيط و امية بن خلف شعبة الشاک قال فلقدرايتهم قتلوا يوم بدر فالقوا فی بئر غيران امية او ابياتقطعت اوصاله فلم يلق فی البئر"

(مسلم جلد ۲ صفحہ نمبر ۱۱۶ باب مالک النبی ﷺ اذی من المشرکين و المنافقين)

حضرت عبداللہ (بن مسعود) ﷺ فرماتے ہیں ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نماز ادا کر رہے تھے، آپ سجدہ میں گئے، آپ کے اردگرد قریش کے کچھ لوگ تھے، عقبہ بن ابی معیط ایک اونٹنی کی جیلی لے کر آ گیا، اور نبی کریم ﷺ کی پیٹھ پر رکھ دی، آپ نے سر نہیں اٹھایا یہاں تک کہ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا آئیں تو آپ نے حضور ﷺ کی پیٹھ سے اس جیلی کو ہٹایا، اور آپ ان لوگوں کے خلاف دعاء کر رہی تھیں جنہوں نے یہ کام کیا تھا، اے اللہ قریش میں سے ابوجہل بن ہشام اور عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ اور عقبہ بن ابی معیط اور امیہ بن خلف یا ابی بن خلف کو تو اپنی گرفت میں لے لے "یہ شعبہ راوی کو شک گذار کہ امیہ بن خلف ہے یا ابی بن خلف ہے" راوی بیان کرتے ہیں کہ تحقیق میں نے دیکھا کہ ان میں سے اکثر لوگ بدر کے دن قتل کر کے ایک کنویں میں ڈال دیئے گئے، البتہ امیہ یا ابی کے جوڑ کٹ گئے تھے اسے کنویں میں نہیں ڈالا گیا۔

وضاحت حدیث:

السلا بفتح السين المهملة و تخفيف اللام مقصور و هو اللفافة التي يكون فيها الولد في بطن الناقة و سائر الحيوان و هي من الآدمية مشيمة "

سلا لام مقصورہ سے ہے، اسی وجہ سے المنجد میں رسم الخط بھی "سلی" استعمال کیا گیا ہے، یہ اس لفافہ کو کہتے ہیں جس میں اونٹنی وغیرہ کے پیٹ میں بچہ ہوتا ہے، ہماری زبان میں اسے "جیلی" کہتے ہیں بلکہ پنجابی میں "جیر" کہتے ہیں، اور انسانوں میں اس لفافہ کو "مشیمہ" کہتے ہیں۔

اعتراض: جیلی میں تو خون اور رطوبت ہوتی ہے جو نجس ہیں، تو نبی کریم ﷺ نے پیٹھ پر نجس جیلی کے ہوتے

ہوئے نماز کیسے جاری رکھی؟

جواب: انه ﷺلم یعلم ماوضع علی ظهره فاستمرفی سجوده اتصحابالطهارة"
بیشک نبی کریم ﷺ کو معلوم نہ ہوسکا کہ آپ کی پیٹھ پر جیلی رکھ دی گئی، آپ تو طہارت سے نماز ادا کر رہے تھے۔

راقم نے علامہ نووی رحمہ اللہ کے قول "لم یعلم" پر اپنے قلمی حاشیہ میں یہ لکھا۔

" قوله لم یعلم لان النبی ا اذا کان یصلی فیتوجه توجها کاملا الی الله ، ولهذا لم یعلم لغیر الله فی الصلوة "

آپ کامل توجہ سے فناء فی اللہ کے درجہ میں نماز ادا کرتے تھے، آپ کو اللہ تعالی کے بغیر کسی طرف توجہ نہ ہوسکی لھذا یہ معلوم نہ ہوسکا کہ میری پیٹھ پر کوئی چیز رکھ دی گئی، البتہ یہ خیال رہے کہ علامہ نووی کا مختار یہ ہے کہ آپ نے محسوس ہونے پر بعد میں نماز کو لوٹالیا تھا، اگرچہ اس وقت نماز کو نہیں لوٹایا کیونکہ وقت میں وسعت تھی۔ (نووی)

مقام توجہ: مسلم شریف کی اس حدیث سے پہلے مذکور حدیث میں ہے "قال ابو اسحاق الولید بن عقبة غلط فی هذاالحدیث " ابواسحاق نے کہا ہے کہ اس حدیث میں ولید بن عقبہ (بالقاف) درست نہیں، اس کے بعد حدیث میں صحیح نام مذکور ہے "ولید بن عتبہ" (بالتاء)

"قال العلماء والولیدبن عقبة بالقاف هوابن ابی معیط لم یکن ذلک الوقت موجوداوکان طفلاصغیراجدا"

ولید بن عقبہ (بالقاف) جو ابن ابی معیا تھا اس وقت موجود نہیں تھا، یا بہت چھوٹا بچہ تھا۔

اعتراض: حدیث شریف میں ہے "قال فلقدرأیتم قتلوا یوم بدر فالقوافی بئر" راوی کہتے ہیں میں نے ان تمام کو دیکھا کہ وہ قتل کر دئے گئے اور ایک کنویں میں پھینک دئے گئے، حالانکہ عمارة بن ولید بدر میں قتل نہیں کیا گیا بلکہ یہ حبشہ کے کسی جزیرہ میں مرا ہے۔

جواب: ان المرادانه رای اکثرهم بدلیل ان عقبة بن ابی معیط منهم ولم یقتل ببدر"
راوی نے جو جمع کا صیغہ ذکر کیا ہے اس سے مراد اکثر لوگ ہیں، کیونکہ عقبہ بن ابی معیط بدر میں قتل نہیں کیا گیا۔ (نووی)

راقم کے نزدیک صحیح جواب:

راقم کے نزدیک صحیح جواب یہ ہے کہ اس روایت میں عمارہ بن ولید کا ذکر ہی نہیں بلکہ بخاری کی ایک روایت

میں عمارہ بن ولید کا ذکر ہے، اور ولید بن عقبہ بن ابی معیط کا ذکر ہی سہوا ہے، اس لئے اس روایت کے مطابق راوی نے سب کو (جو اس روایت میں ہیں) بدر میں دیکھا کہ انہیں قتل کر کے ایک کنویں میں پھینک دیا گیا۔

تنبیہ: ولید بن عقبہ بن ابی معیط بدر میں نہیں تھا، البتہ اس کا باپ عقبہ بن ابی معیط بدر میں تھا، یہ بھی قتل نہیں ہوا تھا، البتہ قیدی بنایا گیا تھا "وانما قتله النبی ﷺ صبرا بعد انصرافه من بدر یعرق الظبية" بدر سے لوٹتے ہوئے مقام "عرق الظبیه" میں اسے نبی کریم ﷺ نے قتل کر دیا، یعنی آپ نے اسے قتل کرنے کا حکم دے دیا تھا (نووی) عقبہ بن ابی معیط کا تذکرہ اس روایت میں ہے۔

❁ عن عبدالله قال استقبل رسول الله ﷺ البیت فدعا علی ستة نفر من قریش فیهم ابو جهل وامية بن خلف وعتبة بن ربیعة وشیبة بن ربیعة وعقبة ابن ابی معیط فاقسم بالله لقد رأیتم صرعی علی بدر قد غیرتهم الشمس وکان یوما حارا"

(مسلم جلد ۲ صفحه نمبر ۱۱۷ باب مالقی النبی ﷺ من اذی المشرکین والمنافقین)

حضرت عبداللہ ؓ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے بیت اللہ شریف کا استقبال کیا (یعنی توجہ بیت اللہ شریف کی طرف کی) پھر قریش کے چھ آدمیوں کی خلاف دعاء ہلاکت کی، وہ چھ یہ ہیں، ابو جہل اور امیہ بن خلف اور عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ اور عقبہ بن ابی معیط" میں اللہ تعالی کی قسم اٹھاتا ہوں کہ تحقیق میں نے ان (میں سے اکثر) کو بدر میں ہلاک ہوئے دیکھا، دھوپ نے ان کے جسموں کو بدل دیا تھا (یعنی ان کے جسم بدبودار ہو گئے تھے) وہ دن بہت گرم تھا۔

بیر اور قلیب میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟

ابھی جس حدیث پر بحث ہو رہی ہے اور اس کے ضمن میں کچھ روایات آ رہی ہیں، اس میں ذکر ہے "بیر" کا کہ انہیں "بیر" میں ڈال دیا گیا، اور دوسری روایت میں قلیب کا ذکر ہے۔

"فو الذی بعث محمدا بالحق لقد رأیت الذی سمی صرعی یوم بدر ثم سحبوا الی القلب قلیب بدر"

راوی کہتے ہیں قسم ہے اس ذات کی جس نے محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا تحقیق میں نے ان کو بدر میں ہلاک ہوتے دیکھا جن کا نام نبی کریم ﷺ نے اپنی دعاء (جو ان کے خلاف کی گئی) میں کیا، پھر ان کو کھینچ کر قلیب میں ڈال دیا گیا، قلیب سے مراد بدر کا قلیب ہے۔

خیال رہے اسی روایت میں "وذکر السابع ولم احفظه" کہ ساتویں شخص کا بھی آپ نے دعاء ہلاکت

میں کیا لیکن مجھے یاد نہیں، اس پر علامہ نووی نے لکھا ”وقد وقع فی روایة البخاری تسمیة السابع انه عمارة بن الولید“ بخاری میں ساتویں کا ذکر ہے، اس کا نام عمارہ بن ولید ہے۔

جواب: بیر اور قلیب میں ایسا فرق نہیں جس سے تضاد لازم آئے، بلکہ فرق صرف عام و خاص کا ہے خاص عام کے ضمن میں پایا جاتا ہے، بیر عام ہے ہر کنویں کو کہتے ہیں خواہ کنواں صرف کھودا گیا ہو اور اس میں دیواروں کی چنائی نہ کی گئی ہو، یا دیواروں کی چنائی کر کے اسے تیار کر دیا گیا ہو، لیکن قلیب خاص ہے کہ یہ صرف اس کنویں کو کہتے ہیں جو کھودا گیا ہو لیکن اس میں دیواروں کی چنائی نہ کی ہو، بدر میں جس کنویں میں کفار کو ڈالا گیا تھا اس میں دیواروں کی چنائی نہیں تھی، اسی لئے بعض روایات میں اس پر بیر کا اطلاق ہے اور بعض میں اس پر قلیب کا اطلاق کیا گیا۔ (ماخوذ از نووی بالوضاحت)

چوبیس صنادید قریش کو کنویں میں ڈالا گیا:

❁ عن ابی طلحة ان نبی الله ﷺ امر یوم بدر باربعة و عشرین رجلا من صنادید قریش فقذفوا فی طوی من اطواء بدر خبیث مخبث و کان اذا ظهر علی قوم اقام بالعرصة ثلاث لیال فلما کان ببدر الیوم الثالث امر براحلته فشد علیها رحلها ثم مشی و اتبعه اصحابه و قالوا ما نری ینطلق الا لبعض حاجته حتی قام علی شفة الرکی فجعلینادیهم باسمائهم و اسماء آبائهم یافلان و یافلان بن فلان ایسرکم انکم اطعتم الله و رسوله فانا قد وجدنا ما وعدنا ربنا حقا فهل وجدتم ما وعد ربکم حقا قال فقال عمر یارسول الله ﷺ ما تکلم من اجساد لا اروا ح لها فقال رسول الله ﷺ والذی نفس محمد بیده ما انتم باسمع لما اقول منهم“ (بخاری کتاب المغازی باب قتل ابی جهل)

حضرت ابوطلحہ بیان کرتے ہیں کہ بدر کے دن نبی کریم ﷺ نے چوبیس صنادید (سرداران) قریش کے متعلق حکم دیا کہ ان کو بدر کے ایک ناپاک اور ناپاک کرنے والے کنوئیں میں ڈال دیا جائے، آپ جب جنگ سے فارغ ہوتے تو کامیابی کی صورت میں وہاں تین دن تک ٹھہرتے، جب تیسرا دن ہوا تو آپ نے سواری تیار کرنے کا حکم دیا، آپ کیلئے سواری تیار کر دی گئی، آپ سواری پر سوار ہو کر چلے، صحابہ آپ کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے، صحابہ کرام کہہ رہے تھے آپ کسی حاجت کو پورا کرنے کیلئے چلے ہیں، یہاں تک کہ آپ کنویں کے کنارے پر کھڑے ہوئے، آپ ان کے اور ان کے آباء (باپوں) کے نام لے پکار رہے تھے۔ اے فلاں ابن فلاں، اے فلاں ابن فلاں کیا تمہیں اب یہ پسند آرہا ہے کہ کاش تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے، ہمارے ساتھ جو ہمارے رب نے وعدہ فرمایا ہم

نے اسے حق پالیا، کیا تمھارے ساتھ جو تمھارے رب نے وعدہ کیا تم نے اسے حق پالیا ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ کیا آپ ان جسموں سے کلام فرمارہے ہیں جن میں روح نہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد (ﷺ) کی جان ہے تم ان سے زیادہ میری بات کو نہیں سن رہے۔

وضاحت حدیث:

صنادید جمع ہے صندید (بروزن عفریت کے) "وهو السيد الشجاع العظيم" اس کا معنی سردار، بہادر اور بڑا یعنی کفار قریش کے سردار اور بہادر اور بڑے لوگ جنگ میں مارے گئے تھے، خیال رہے کہ کفار بدر میں ستر کی تعداد میں قتل کردئے گئے تھے لیکن کنویں میں چوبیس ان کے سرکردہ لوگ ڈال دئے گئے تھے۔ "خبيث ومخبث" اس کنویں کو خبیث ومخبث کہا گیا، اسلئے کہ وہ نجاست وغیرہ کے پھینکے جانے کی وجہ سے ناپاک تھا، اور اس کی نجاست اوروں کو ناپاک کرنے والی تھی۔

اعتراض: حدیث شریف کے پہلے حصہ میں کنویں کو "طوی" (طاء کی زبر اور واؤ کے نیچے زیر، اور یاء مشدد) کہا گیا "وهي البئر المطوية بالحجارة" اس کنویں کو کہتے ہیں جس میں دیوار کی چنائی کی گئی ہو، اور حدیث کے آخر میں آرہا ہے "رکی" (راء پر زبر اور یاء مشدد) "وهو البئر قبل ان تطوى" یہ اس کنویں کو کہتے ہیں، جس میں دیوار کی چنائی نہ کی گئی ہو، اسی طرح بعض روایات میں "قليب" کا ذکر ہے "قليب" بھی اسی کنویں کو کہتے ہیں جس میں پتھروں وغیرہ سے دیوار کی چنائی نہ کی گئی ہو، ایک ہی کنویں پر "طوی" اور "رکی" کا اطلاق کیسے صحیح ہے؟

جواب: لامنافاة لانها كانت مطوية ثم استهدمت فصارت كالركى"

ان میں کوئی منافات (مخالفت) نہیں، کیونکہ پہلے اس کی دیوار چنی گئی تھی، اب گر چکی تھی، مطلب یہ ہوا کہ ان کو اس کنویں میں ڈال دیا گیا جس کی دیوار چنی گئی تھی، لیکن اب اس کی دیوار گر چکی تھی، سابقہ لحاظ پر وہ "مطوی" تھا، موجود لحاظ پر "رکی" اور قلیب تھا۔ (عمدة القاری جلد ۷ صفحہ نمبر ۹۲)

"قال عمر يارسول الله ماتكلم "كلمة اما استفهامية "" ما" سوالیہ ہے، اور "تکلم" میں ایک تاء حذف ہے، یہ مضارع ہے، اصل میں "تتکلم" ہے۔

کنویں میں کفار کو کیوں ڈالا گیا؟

وانما وضعوا في القليب تحقير الهم ولئلا يتاذى الناس برائحتهم وليس هو دفنا لان الحربي

لایجب دفنه" (نووی جلد۲ صفحہ ۱۰۶ باب مالقی النبی ﷺ من اذی المشرکین والمنافقین)

کفار کو کنویں میں ڈالنے کی دو وجہ ہیں، ایک یہ کہ ان کی حقارت بیان کرنی مقصود تھی کہ یہ حقیر لوگ ہیں زندگی میں بھی مسلمانوں کے نزدیک گھٹیا تھے، موت کے بعد بھی گھٹیا ہیں، ایسے ہی جیسے کسی گھٹیا جانور کے مرنے کے بعد اسے گھسیٹ دیا جاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ زیادہ لاشیں بکھرنے کی وجہ سے بو پھیل رہی تھی، اس لئے ان کو کنویں میں پھینک دیا گیا تا کہ مسلمان کچھ نہ کچھ بدبو سے محفوظ رہ سکیں، ان کو دفن اس لئے نہیں کیا گیا تھا کہ حربی کافر کو دفن کرنا مسلمانوں پر لازم نہیں۔ (حوالہ مذکور)

اس حدیث سے شیخ کا سماع موتی پر استدلال:

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ اس حدیث کی وضاحت میں قلمطراز ہیں" جاننا چاہئے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور متفق علیہ (یعنی بخاری ومسلم میں مذکور) ہے، اس میں مردوں کے سننے اور ان کو علم وشعور حاصل ہونے کا واضح ثبوت موجود ہے، کیونکہ جو کچھ حضور ﷺ نے خطاب فرمایا ان کا علم ان کو حاصل ہوا، اسی طرح صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ" دفنانے والے جب مردہ کو دفن کر کے لوٹتے ہیں تو مردہ "لوگوں کی جوتیوں کی آہٹ سنتا ہے" اسی طرح حضور ﷺ کا فرمان اہل بقیع کی زیارت کے سلسلہ میں مروی ہے کہ ان کو سلام کرو اور اس میں ان کو خطاب کرو اور کہو کہ اے قبروں والو تم پر سلام ہو اے مسلمانو تمہیں وہ سب کچھ مل گیا جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا، اور انشاءاللہ ہم بھی تمہارے ساتھ شامل ہونے والے ہیں۔ (مدارج النبوۃ جلد دوم)

شهداء مسلمان : اس جنگ میں مسلمانوں میں سے چودہ شہید ہوئے، چھ مہاجرین، اور آٹھ انصار۔

مہاجرین شہداء کرام کے اسماء گرامی:

حضرت عبیدہ بن حارث بن مطلب بن عبدمناف، حضرت عمیر بن ابی وقاص، حضرت ذوالشمالین عمیر بن عبد عمرو بن نضلہ، حضرت عاقل بن ابی بکیر، حضرت مہجع مولی عمر بن الخطاب، حضرت صفوان بن بیضاء رضی اللہ عنہم۔

انصار شہداء کرام کے اسماء گرامی:

حضرت سعد بن خثیمہ، حضرت مبشر بن عبدالمنذر، حضرت حارثہ بن سراقہ، حضرت عوف ومعوذ پسران عفراء، حضرت عمیر بن حمام، حضرت رافع بن معلّٰی، حضرت یزید بن حارث بن سحم۔

مقتولین کفار:

ستر کی تعداد میں کافر قتل کئے گئے ان میں مشہور لوگوں کے نام یہ ہیں۔ (شیبہ بن ربیعہ، عتبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ، عاص بن سعید بن عاص، ابوجہل بن ہشام، ابوالبختری، حنظلہ بن ابی سفیان بن حرب، حارث بن عامر بن نوفل بن عبد مناف، طعیمہ بن عدی، زمعہ بن اسود بن مطلب، نوفل بن خویلد، عاص بن ہشام بن مغیرہ (جو حضرت فاروق اعظم کا ماموں تھا) (بعض نے اس کا ذکر قیدیوں میں کیا ہے) امیہ بن خلف، علی بن امیہ بن خلف، منبہ بن حجاج، معبد بن وہب۔)

کفار قیدی:

ستر کی تعداد میں کافر قید کر لئے گئے تھے، ان میں سے مشہور لوگ یہ ہیں۔ (نوفل بن حارث بن عبد المطلب ،عباس بن عبد المطلب، عقیل بن ابی طالب، ابوالعاص بن ربیع، عدی بن خیار، ابوعزیز بن عمیر، ولید بن ولید بن مغیرہ، عبداللہ بن ابی بن خلف، ابوعزہ عمرو بن عبداللہ جمحی شاعر، وہب بن عمیر بن وہب جمحی، ابووداعہ بن ضبیرہ سہمی، سہیل بن عمرو عامری۔ (غزوات النبی مصنفہ علامہ نور بخش توکلی رحمہ اللہ)

بدر کے قیدیوں کے مشورہ پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قتل کرنے کی اپنی رائے دی، اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے، نبی کریم ﷺ نے بھی اسی رائے کو پسند کرتے ہوئے فدیہ لے کر قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ (مکمل تفصیل ان شاء اللہ دسویں پارہ میں آئے گی)

شبلی نعمانی صاحب اور علامہ نور بخش توکلی رحمہ اللہ:

غزوات النبی میں علامہ توکلی لکھتے ہیں غزوہ بدر کے مختصر بیان کے بعد یہاں ایک خاص بحث پیش آ گئی ہے جسے دیدہ دانستہ پس انداز کرنا مناسب نہیں، اور وہ یہ ہے کہ آیا مدینہ سے مسلمان قافلہ ابوسفیان سے تعرض کرنے کیلئے نکلے تھے یا فوج قریش سے مقابلہ کیلئے؟ اس بحث میں مولوی شبلی نعمانی نے سیرۃ النبی میں سب سے نرالا پہلو اختیار کیا، اور یہ دعوی کیا ہے کہ اس بارے میں اب تک مؤرخین وارباب سیر بلکہ تمام علماء اسلام نے غلطی کھائی ہے، لھذا ذیل میں احقاق حق کیلئے مولوی صاحب کی عبارت بلفظہ نقل کر کے اس کا جواب باصواب دیا جاتا ہے۔"واللہ ھو الھادی الی الصواب"

قال الشبلی النعمانی: غزوہ بدر پر دوبارہ نظر:

سادہ واقعات کرنے کے بعد اب وقت آیا ہے کہ محققانہ طور پر اس بات پر بحث کی جائے کہ غزوہ بدر کا مقصد

جیسا کہ عام مؤرخین نے بیان کیا ہے، کاروان تجارت کو لوٹنا تھا یا قریش کے حملہ کا دفاع تھا۔ میں اس بات سے واقف ہوں کہ تاریخ اور محکمہ عدالت میں فرق ہے، مجھکو یہ بھی معلوم ہے کہ تاریخ کا انداز بیان مقدمہ دیوانی یا فوجداری کے فیصلے لکھنے سے بالکل مختلف ہے،

میں اس کو تسلیم کرتا ہوں کہ میرا منصب واقعہ دیوانی نگاری ہے فیصلہ نویسی نہیں، لیکن موقع ایسا آپڑا ہے کہ ایک واقعہ تاریخی نے مقدمہ عدالت کی حیثیت حاصل کر لی ہے، اس لئے مجھکو اپنے منصب سے ہٹ کر فصل مقدمہ کا قلم ہاتھ میں لینا پڑتا ہے، اس بات کا مجھ کو مطلق خوف نہیں کہ اس فیصلہ میں عام مؤرخین اور ارباب سیر میرے حریف مقابل ہیں، نہایت جلد نظر آئے گا کہ حق اکیلا تمام دنیا پر فتح پا سکتا ہے، سلسلۂ کلام کے اچھی طرح پیش نظر رکھنے کیلئے سب سے پہلے ہم کو بتا دینا چاہئے کہ (ہماری تحقیقات کی رو سے) واقعہ کی اصلی صورت کیا تھی؟ واقعہ یہ ہے کہ حضرمی کے قتل نے تمام مکہ کو جوش انتقام سے لبریز کر دیا تھا اور اس سلسلے میں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں بھی پیش آگئیں، دونوں فریق ایک دوسرے سے پرحذر رہتے تھے اور جیسا کہ ایسی حالتوں میں عام قاعدہ ہے، غلط خبریں خود بخود مشہور ہو کر پھیل جاتی ہیں، اسی اثناء میں ابوسفیان قافلہ تجارت کے ساتھ شام کو گیا اور ابھی شام میں تھا کہ یہ خبر وہاں مشہور ہوگئی کہ مسلمان قافلہ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، ابوسفیان نے وہیں سے مکہ کو آدمی دوڑایا کہ قریش کو خبر ہو جائے، قریش نے لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ مدینہ منورہ میں یہ مشہور ہو گیا کہ قریش ایک لشکر عظیم لیکر مدینہ آ رہے ہیں آنحضرت ﷺ نے مدافعت کا قصد کیا اور بدر کا معرکہ پیش آیا۔ (سیرت النبی جلد اول ص ۲۵۰)

اقول: مؤرخین وارباب سیر بلکہ محدثین ومفسرین میں سے بھی کسی نے یہ بیان نہیں کیا کہ غزوۂ بدر کا مقصد کاروان کو لوٹنا تھا، وہ سب بالاتفاق یہی کہتے ہیں کہ مسلمان مدینہ منورہ سے محض قافلہ قریش سے تعرض کے لیے نکلے تھے، اس اثناء میں اتفاقیہ غزوۂ بدر پیش آگیا، قافلوں سے تعرض کی وجہ یہ ہوئی کہ کفار قریش ہجرت کے بعد بھی مسلمانوں کے مذہبی فرائض کی بجا آوری میں مزاحم ہوتے تھے، بلکہ دیگر قبائل کو بھی ان کی مخالفت پر برانگیختہ کرتے تھے، اس لیے حضور اقدس ﷺ نے مختلف اوقات میں مختلف اغراض کے لیے اپنے اصحاب کی چھوٹی چھوٹی جماعتیں اطراف مدینہ میں بھیجنی شروع کیں، بلکہ بعض دفعہ خود بھی شرکت فرمائی، کہیں دشمن کی نقل وحرکت کی خبر لانے کے لیے کہیں بعض قبیلوں سے معاہدہ قائم کرنے کے لیے اور کہیں محض مدافعت کے لیے ایسا کیا گیا، ہاں ایک غرض یہ بھی تھی کہ قریش کی شامی تجارت کا راستہ بند کر دیا جائے اور یہ وہی بات ہے جس کی دھمکی حضرت سعد بن معاذ ﷺ نے ہجرت کے بعد ابوجہل کو خاص خانہ کعبہ میں یوں

دی تھی کہ اگر تم نے ہم کو طواف کعبہ سے روکا، تو ہم تمہارا مدینہ کا راستہ بند کر دیں گے۔

(صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب ذکر النبی ﷺ من یقتل ببدر)

چونکہ قریش بالعموم مسلمانوں کو حج وعمرہ سے روکتے تھے، اس لئے مجبوراً مسلمانوں کو ان کے تجارتی قافلوں سے تعرض کرنا پڑا تا کہ مذہبی مداخلت سے باز آجائیں مصنف کا یہ قول (اس سلسلے میں لڑائیاں بھی پیش آگئیں) ثبوت طلب ہے، کیونکہ حضرمی کے قتل کے بعد جنگ بدر سے پہلے مسلمانوں اور کفار قریش میں کوئی لڑائی نہیں ہوئی اور اس کا یہ قول (اسی اثناء میں ابوسفیان قافلہ تجارت کے ساتھ شام گیا) بھی درست نہیں، کیونکہ ابوسفیان واقعہ حضرمی سے پہلے شام چلا گیا تھا، چنانچہ طبقات ابن سعد میں غزوۂ ذوالعشیرہ میں تصریح ہے کہ جو قافلہ بچ کر نکل گیا، جب وہ شام سے واپس آیا تو مسلمان اسی سے تعرض کے لیے نکلے اور غزوۂ بدر پیش آیا، اسی طرح مصنف کا یہ کہنا کہ کہ مدینہ منورہ میں مشہور ہوا کہ قریش کی ایک جمعیت عظیم لے کر مدینہ آرہے ہیں، دعوی بلا دلیل ہے، ایسی دعاوی پر بنائے کلام کرنا محقق کی شان سے بعید ہے۔

قال الشبلی النعمانی:

اس بحث کے فیصلہ کے لیے سب سے پہلے ان واقعات کو یکجا لکھ دینا چاہیے جن پر دونوں فریق کا اتفاق ہے تا کہ وہ انفصال بحث میں اصول موضوعہ کے طور پر کام آئیں وہ یہ ہیں۔

(۱) قرآن مجید میں اگر کسی واقعہ کا صاف ذکر ہے، تو اس کے مقابلہ میں کسی روایت اور تاریخ کا اعتبار نہ کیا جائے گا۔

(۲) کتب حدیث میں صحت کے لحاظ سے باہم جو فرق مراتب ہے اس کا لحاظ رکھا جائے گا۔

اس قدر عموماً مسلم ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کو یہ خبر معلوم ہوئی کہ قریش بڑی تیاری کے ساتھ مکہ سے نکلے ہیں، تو آپ نے صحابہ سے مخاطب ہو کر ان کا استمزاج کیا، مہاجرین نے نہایت جوش کے ساتھ آمادگی ظاہر کی، لیکن آنحضرت ﷺ انصار کی مرضی دریافت کرنا چاہتے تھے، یہ دیکھ کر حضرت سعد یا کوئی اور معزز انصاری اٹھے اور کہا ''یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ کا روئے سخن ہماری طرف ہے؟ ہم وہ لوگ نہیں ہیں جنہوں نے موسی سے کہا تھا (تم اور تمہارا خدا دونوں جا کر لڑو، ہم یہیں بیٹھے رہیں گے) خدا کی قسم اگر آپ حکم دیں، تو ہم آگ اور سمندر میں کود پڑیں'' یہ بھی مسلم ہے کہ صحابہ میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو شرکت سے ہچکچاتے تھے، چنانچہ خود قرآن مجید میں تصریح ہے۔ ﴿وَاِنَّ فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ﴾ اور مسلمانوں کا ایک گروہ قطعاً ناخوش تھا عموماً تمام ارباب سیر اور محدثین نے تصریح کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے انصار کی رضامندی جو خاص طور پر دریافت کی، اس کی وجہ یہ تھی کہ انصار نے مکہ میں جب آپ

کے ہاتھ بیعت کی تھی، تو صرف یہ اقرار کیا تھا۔ ''جب کوئی دشمن خود مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوگا، تو انصار مقابلہ کریں گے '' یہ اقرار نہ تھا کہ مدینہ سے باہر نکل کر بھی لڑیں گے، ان واقعات کے بعد اب مرکز بحث یہ ہے ''یہ واقعات کہاں پیش آئے؟'' ارباب سیر لکھتے ہیں کہ مدینہ سے جب آپ نکلے تو صرف قافلہ تجارت پر حملہ کرنا مقصود تھا، دو چار منزل چل کر معلوم ہوا کہ قریش فوجیں لیے چلے آتے ہیں، اس وقت آپ نے مہاجرین اور انصار کو جمع کیا کہ ان کا عندیہ دریافت فرمائیں، آگے کے واقعات یہیں پیش آئے، لیکن کتب سیر، تاریخ اور تمام دیگر شہادتوں سے بالاتر ایک اور چیز ہمارے پاس موجود ہے (قرآن پاک) جس کے آگے ہم سب کو گردن جھکا دینی چاہیے۔ ترکیب نحوی کی رو سے وَاِنَّ میں جو واو ہے حالیہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کا ایک گروہ جو لڑائی سے جی چراتا ہے، یہ موقع عین وہ تھا جب آپ مدینہ سے نکل رہے تھے نہ کہ مدینہ سے نکل کر جب آگے بڑھے، کیونکہ واو حالیہ کے لحاظ سے خروج من البیت اور اس کے گروہ کے جی چرانے کا وقت اور زمانہ ایک ہی ہونا چاہیے۔

﴿كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝ يُجَادِلُوْنَكَ فِى الْحَقِّ بَعْدَمَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ (سورۃ الانفال رکوع نمبر ۱)

''جس طرح تجھ کو تیرے خدا نے تیرے گھر سے حق پر نکالا درآں حالیکہ مسلمانوں کا ایک گروہ اس کو پسند نہیں کرتا تھا، یہ لوگ حق کے ظاہر ہوئے پیچھے تجھ سے حق بات میں جھگڑا کرتے تھے گویا کہ موت کی طرف ہنکائے جا رہے ہیں اور موت کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور جب کہ خدا تم سے یہ وعدہ کرتا تھا کہ دو جماعتوں میں سے کوئی جماعت تم کو ہاتھ آئے گی اور تم یہ چاہتے تھے کہ بے کھٹکے والی جماعت تم کو ہاتھ آ جائے اور اللہ تعالیٰ یہ چاہتا تھا کہ حق کو اپنی باتوں سے قائم کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔''

(۲) آیت مذکور میں بہ تصریح مذکور ہے کہ یہ جس وقت کا واقعہ ہے، اس وقت دو گروہ سامنے تھے، ایک کاروان تجارت اور ایک قریش کی فوج جو مکہ سے آ رہی تھی، ارباب سیر کہتے جہیں کہ آیت قرآنی میں یہ اس وقت کا واقعہ مذکور ہے جب آنحضرت ﷺ بدر کے قریب پہنچ چکے تھے، لیکن بدر کے قریب پہنچ کر تو کاروان تجارت صحیح وسلامت بچ کر نکل گیا تھا، اس وقت یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ ''دونوں میں سے ایک کا وعدہ ہے'' اس لیے یہ بالکل ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی نص کے مطابق یہ واقعہ اس وقت کا ہونا چاہیے جب دونوں گروہ کے ہاتھ آنے کا احتمال ہو سکتا ہو اور یہ صرف دو وقت ہو سکتا ہے، جب آنحضرت ﷺ مدینہ میں تھے اور دونوں طرف کی خبریں آ گئی تھیں کہ ادھر ابوسفیان کا روان

تجارت لے کر چلا ہے اور ادھر قریش جنگ کے سر و سامان کے ساتھ مکہ سے نکل چکے ہیں۔

(۳) سب سے زیادہ قابل لحاظ یہ امر ہے کہ قرآن مجید کی آیت مذکورہ بالا میں کفار کے دو فریق کا خدا تعالی نے بیان کیا ہے، ایک قافلہ تجارت اور دوسرا صاحب شوکت یعنی کفار قریش جو مکہ سے لڑنے کے لیے آ رہے تھے، آیت میں تصریح ہے کہ مسلمانوں میں ایک جماعت ایسی تھی جو چاہتی تھی کہ کاروان تجارت پر حملہ کیا جائے، اللہ تعالی نے ان لوگوں پر ناراضی ظاہر کی اور فرمایا۔

﴿تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ (سورۃ الانفال رکوع ۱)

"تم چاہتے ہو کہ بے خرخشہ والا گروہ تم کو ہاتھ آجائے اور خدا یہ چاہتا ہے کہ اپنی باتوں سے حق کو قائم کردے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔"

ایک طرف وہ لوگ ہیں جو قافلہ تجارت پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، دوسری طرف خدا ہے جو چاہتا ہے کہ حق کو قائم کردے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے، اب سوال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان دو میں سے کس کے ساتھ ہیں؟ عام روایتوں کے مطابق اس سوال کا کیا جواب ہوگا، میں اس تصور سے کانپ اٹھتا ہوں۔

(۴) اب واقعہ کی نوعیت پر غور کرو، واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ سے اس سر و سامان کے ساتھ نکل رہے ہیں کہ تین سو سے زیادہ جانباز مہاجر اور انصار ساتھ ہیں، ان میں فاتح خیبر اور حضرت سید الشہداء امیر حمزہ ﷺ بھی ہیں جن میں سے ہر ایک بجائے خود ایک لشکر ہے باوجود اس کے (جیسا کہ قرآن مجید میں بہ تصریح مذکور ہے) ڈر کے مارے بہت سے صحابہ کا دل بیٹھا ہے اور ان کو نظر آتا ہے کہ کوئی ان کو موت کے منہ میں لیے جاتا ہے۔ قرآن مجید میں مذکور ہے۔

﴿وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَمَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ﴾

"مسلمانوں کی ایک جماعت کارہ تھی، وہ تجھ سے حق ظاہر ہوئے، پیچھے بھی جھگڑا کرتے تھے، گویا کہ موت کی طرف ہنکائے جا رہے ہیں۔"

اگر صرف قافلہ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو یہ خوف و اضطراب یہ پہلو تہی کس بناء پر تھی، اس سے پہلے بارہا (بقول ارباب سیر قافلہ قریش پر حملہ کرنے کے لیے تھوڑے تھوڑے آدمی بھیج دیئے گئے تھے اور کبھی ان کو ضرر نہیں پہنچا تھا، اس دفعہ اسی قافلہ کا اتنا ڈر ہے کہ تین سو چیدہ اور منتخب فوج ہے اور پھر لوگ ڈر کے مارے سہمے جاتے ہیں، یہ قطعی دلیل ہے کہ مدینہ ہی میں یہ خبر آ گئی تھی کہ قریش مکہ سے جمعیت عظیم لے کر مدینہ پر آ رہے ہیں۔ (سیرت النبی جلد اول صفحہ نمبر ۲۵۰، ۲۵۲)

اقول: مولوی شبلی صاحب کا دعوی ہے کہ مسلمان مدینہ سے کاروان تجارت سے تعرض کے لیے نہ نکلے تھے، بلکہ بڑے سروسامان سے فوج قریش کے مقابلہ کے لیے نکلے تھے اس دعوی کے ثبوت میں مولوی صاحب نے قرآن کریم کی تین آیتوں سے چار دلیلیں پیش کی ہیں، جن پر ہم بالترتیب نمبر دار بحث کرتے ہیں۔

(۱) ''وَاِنَّ'' میں واؤ بے شک حالیہ ہے اور یہ جملہ کاف ''اخرجک'' سے حال میں واقع ہوا ہے، مگر اس سے یہ ضروری نہیں کہ خروج من البیت اور اس گروہ کے جی چرانے کا زمانہ ایک ہی ہو، ہم ذرا اس کی تشریح کر دیتے ہیں، ہدایۃ النحو میں ہے۔ ''الحال لفظ یدل علی بیان ہیئۃ الفاعل او المفعول بہ او کلیہما'' یعنی حال وہ لفظ ہے جو فاعل یا مفعول یا ہر دو کی ہیئت کے بیان پر دلالت کرے، ہدایۃ النحو کی شرح درایۃ میں اس کے متعلق یوں لکھا ہے۔

''ثم المراد بالھیئۃ ھھنا الحالۃ وھی اعم من ان تکون حقیقۃ اومقدرۃ نحو قولہ تعالی فادخلوھا خالدین ای مقدرین الخلو ویسمی الاول حالاً محققۃ والثانی حالامقدرۃ''

ترجمہ: پھر ہیئت سے مراد یہاں حالت عام ہے، اس سے کہ حقیقیہ ہو یا مقدرہ جیسا کہ اللہ تعالی کا قول ہے ''فادخلوھا خالدین'' یعنی تمہارے واسطے خلود مقدر ہے پہلی قسم کو حال محققہ اور دوسری قسم کو حال مقدرہ کہتے ہیں۔ انتہی

اب دیکھنا یہ ہے کہ آیت زیر بحث میں حال کس قسم کا ہے محققہ یا مقدرہ، علمائے کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ یہاں حال مقدرہ ہے چنانچہ علامہ آلوسی روح المعانی میں فرماتے ہیں۔

(وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ) والجملۃ فی موضع الحال وھی حال مقدرۃ لان الکراھۃ وقعت بعدالخروج کماستراہ انشاء اللہ تعالی اویعتبر ذلک ممتدا''

یعنی یہ جملہ حال کی جگہ ہے اور یہ حال مقدرہ ہے کیونکہ کراہت خروج کے بعد واقع ہوتی ہے جیسا کہ انشاء اللہ تعالی تو عنقریب اسے دیکھے گا یا اسے ممتد اعتبار کیا جائے۔ انتھی

مطلب یہ ہے کہ اس کو حال مقدرہ سمجھنا چاہیے یا اس کے لیے زمان وسیع خیال کرنا چاہیے کہ جس کے بعض اجزاء میں کراہت اور بعض میں خروج واقع ہے۔ تفسیر جلالین کے حاشیہ جمل میں ہے۔

''فقولہ وان فریقاالخ حال مقدرۃ لماعلمت ان الکراھۃ لم یقارن الخروج''

یعنی یہ حال مقدرہ ہے کیونکہ کراہت خروج کے ساتھ واقع نہیں ہوئی، جیسا کہ تجھے معلوم ہے۔ انتھی

ہمارے اس قول کی تائید مورخین وارباب سیر اور تمام محدثین ومفسرین کر رہے ہیں، احادیث صحیحہ ہماری تائید کر رہی ہیں جیسا کہ بیان ہوگا، قرآن کریم کی دوسری آیت جو عنقریب پیش ہوگی ہماری تائید کر رہی ہے، اب

ناظرین خود انصاف کریں کہ ان حالات میں شبلی بیچارے کی رائے محض کیا وقعت رکھ سکتی ہے۔

(۲) مصنف نے تین آیتیں نقل کی ہیں جنہیں وہ ایک آیت خیال کر رہا ہے، مگر حقیقت میں یہاں تیسری آیت معرض بحث میں ہے ہم تسلیم کرتے ہیں کہ دونوں میں سے ایک کا وعدہ اللہ تعالی نے اس وقت کیا، جبکہ دونوں گروہ کے ہاتھ آنے کا احتمال و امکان تھا، مگر یہ کہنا کہ یہ صرف وہ وقت ہو سکتا ہے الخ درست نہیں بظاہر مصنف نے "وَاِذْ يَعِدُكُم " کی واؤ سے مغالطہ کھایا ہے اور یہ سمجھا ہے کہ وقت خروج اور وقت وعدہ ایک ہی ہیں حالانکہ یہ غلط ہے، کیونکہ اذ ظرف ہے فعل مضمر "اذ کروا" کانہ کہ "اخرجك" کا، ایک لحہ کے لیے آیات "لاحقہ اِذْتَسْتَغِيثُوْنَ رَبَّكُمْ(الاية) "اِذْيُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ(الایہ) پر بھی نظر ڈالو، ان آیتوں میں اذ بدل ہے وَاِذْ يَعِدُكُم سے، مصنف کے قول کے مطابق وعدہ، استغاثہ مسلمین، نیند کا طاری ہونا اور مینہ کا برسنا، یہ سب مدینہ ہی میں ہونا چاہیے و ھذا کما تری.

مؤرخین و محدثین کے نزدیک حضرت جبرائیل دو جماعتوں میں سے ایک کا وعدہ وادیٔ ذفران میں لائے، اس کے بعد حضور ﷺ نے صحابہ سے استمزاج فرمایا، اس وقت بے شک دونوں گروہ کے ہاتھ آنے کا امکان تھا، غور کرو وعدہ کرنے والا قادر مطلق ہو اور مولوی شبلی امکان و احتمال میں کلام کریں، وادیٔ ذفران کیا اس سے آگے بڑھ کر جب ہر دو فریق میدان بدر میں اترے، مسلمان مدینہ کے طرف کے ناکے پر اور مشرکین مکہ کی طرف کے ناکہ پر اس وقت بھی وہ قادر مطلق اگر چاہتا تو قافلہ کو مسلمانوں کے ہاتھ میں گرفتار کروا دیتا، یہ تو کوئی بڑی بات نہ تھی، کیونکہ وہ قافلہ لشکر اسلام سے فقط تین میل ساحل سمندر کی طرف تھا، مگر وہ مکہ بھی پہنچ جاتا ہے، تو اس کا مسلمانوں کے ہاتھ آنا قدرت الہی سے خارج نہ تھا، اب آیت زیر بحث کے معنی بھی سن لو، یہاں واؤ استیناف کے لیے جیسا کہ اہل علم کو معلوم ہے، اذ فعل ماضی پر داخل ہوا کرتا ہے، مگر یہاں ماضیہ کی حکایت کے لیے صیغہ مضارع استعمال ہوا ہے، پس اس کے معنے یوں ہوئے "اے مومنو! یاد کرو وہ وقت کہ اللہ تعالی نے تم سے دو گروہ میں سے ایک کا وعدہ کیا کہ یہ تمہارے واسطے ہے اور تم نے دوست رکھا کہ بن شدت والا تمہارے واسطے ہو اور اللہ نے چاہا کہ اپنے کلاموں سے سچ کو سچا کرے اور کافروں کا پیچھا کاٹ دے" بیان بالا سے مصنف کی قرآن فہمی اور نحو دانی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

(۳) مصنف کے اعتراض کا ماحصل یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں کفار کے دو فریق (قافلہ تجارت اور فوج قریش) کا ذکر ہے اور یہ بھی تصریح ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت قافلہ پر حملہ کرنا پسند کرتی تھی مگر خدا چاہتا ہے کہ فوج کفار کے شکست ہو، لہذا آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ سے قافلہ تجارت پر حملہ کرنے کے لیے نکلے، تو (نعوذ باللہ) آپ نے اللہ تعالی کی مرضی کے خلاف کیا، مگر ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ وعدہ زیر بحث مدینہ منورہ میں نہ ہوا تھا، وعدہ مذکورہ اور

قافلہ تجارت پر حملہ کرنا کی خواہش کا وقت اور مدینہ منورہ سے خروج کا وقت ایک نہیں جیسا کہ قرآن کریم سے ظاہر ہے ''وَاِذْ یَعِدُکُمُ اللّٰہُ (الایہ) کلام مستانف ہے، اس کو اخرجک سے کوئی ربط نہیں پس ارباب سیر و محدثین درست فرماتے ہیں کہ وادی ذفران میں وعدہ'' احدی الطائفتین'' ہوا، اس کے بعد حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے اصحاب سے استمزاج فرمایا، بے شبہ آنحضرت ﷺ وہی چاہتے تھے جو اللہ تعالیٰ چاہتا تھا، چنانچہ جب مہاجرین میں سے حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے جنگ پر پوری آمادگی ظاہر فرمائی، تو حضور اقدس ﷺ بہت خوش ہوئے۔

(صحیح بخاری میں ہے، اشرق وجہہ، وسرہ،(کتاب المغازی باب قول اللہ تعالی اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّکُمْ الآیہ)

آپ اسی طرح انصار میں سے حضرت سعد بن معاذ ﷛ کی تقریر پرتاثیر پر حضور انور بابی ھو وامی نہایت خوش ہوئے۔ (سیرت ابن ہشام فبشر رسول اللہا بقول سعد ونشطہ ذالک ثم قال سیروا وابشر والمان اللہ تعالی قد وعد فی احدی الطائفعین واللہ لکافی الآن انظر الی مضارع القوم. ۱۲)

آپ کا ان تقریروں سے خوش ہونا اور فوج کفار کی شکست کی بشارت دینا صاف بتارہا ہے کہ آپ بھی فوج قریش کا مقابلہ چاہتے تھے اور مسلمانوں کی فوج کا اکثر حصہ بھی یہی چاہتا تھا ہاں ایک قلیل جماعت تھی جو بوجہ بے سروسامانی بتقاضائے طبع بشری فوج کفار کے مقابلہ سے ہچکچاتی تھی۔

(۴) یہ پہلے ثابت کیا جاچکا ہے کہ ﴿ وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ لَکٰرِھُوْنَ ﴾ حال مقدرہ ہے، یہ کراہت ومجادلہ مدینہ منورہ میں پیش نہیں آیا، پس مصنف کی تمام خامہ فرسائی بے سود ہے، مسلمان جس سروسامان سے مدینہ منورہ سے نکلے، اس کا ذکر عنقریب آتا ہے، یہ کہنا (کہ مدینہ ہی میں یہ خبر آگئی تھی کہ قریش مکہ سے جمعیت عظیم لے کر مدینہ منورہ پر آرہے ہیں) بالکل غلط ہے، اس کا کوئی ثبوت نہیں، حسب وعدہ ہم یہاں قرآن کریم کی ایک دوسری آیت غزوہ بدر کے متعلق نقل کرتے ہیں جو ہمارے مدعا کی مؤید ہے اور وہ یہ ہے۔

﴿اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْیَا وَھُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰی وَالرَّکْبُ اَسْفَلَ مِنْکُمْ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِی الْمِیْعٰدِ وَلٰکِنْ لِّیَقْضِیَ اللّٰہُ اَمْرًا کَانَ مَفْعُوْلًا﴾ (سورۃ الانفال، ع۵)

''جس وقت تم تھے ورے کے ناکے اور وہ پرے کے ناکے اور قافلہ نیچے اتر گیا تم سے اور اگر آپس میں تم وعدے کرتے تو نہ پہنچتے وعدے پر، لیکن اللہ تعالیٰ کو کرڈالنا ایک کام جو ہو چکا تھا۔'' (ترجمہ شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ تعالیٰ)

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمان مدینہ منورہ سے فوج کفار کے مقابلہ کے لیے نہ نکلے تھے اور نہ انہیں فوج کفار کے مکہ سے آنے کا اس وقت علم تھا۔ مولوی شبلی صاحب نے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے'' جب تم قریب کے میدان میں اور قریش کی فوج دور کے میدان میں اور قافلہ تم سے نیچے تھا اگر تم ایک دوسرے سے وقت مقرر کر کے آتے، تو وقت میں

اختلاف ہوجاتا لیکن (خدانے یہ اس لیے کر دیا) تا کہ جو ہونے والا تھا، خدا اس کو کر دے" (سیرت النبی، جلد اول صفحہ نمبر ۲۴۸)

کسی بھی لغت یا تفسیر کو اٹھا کر دیکھئے تواعد کے معنی ہیں ایک دوسرے سے وعدہ کرنا اسی طرح میعاد کے معنی وقت کے نہیں، قرآن پاک کے معنی میں رائے زنی سے اللہ تعالی بچائے، بغرض توضیح اس آیت کی تفسیر کے متعلق چند اقوال نقل کیے جاتے ہیں، علامہ قسطلانی (مواہب لدنیہ مطبوعہ مصر، جزء اول صفحہ نمبر ۷۸) غزوۂ بدر کی نسبت لکھتے ہیں۔

"وكانت من غير قصد من المسلمين اليها ولا ميعاد كما قال الله تعالى ولو تواعدتم لاختلفتم في الميعاد ولكن ليقضي الله امرا كان مفعولا وانما قصد ﷺ والمسلمون التعرض لعير قريش"

ترجمہ: غزوۂ مسلمانوں کے قصد اور وعدے کے بغیر واقع ہوا ہے جیسا کہ اللہ تعالی نے فرمایا ہے، ولو تواعدتم الآیہ آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں نے فقط قافلہ قریش سے تعرض کا قصد کیا تھا۔ انتہی۔ تفسیر بیضاوی میں ہے۔

ولو تواعدتم لاختلفتم في الميعاد اى لو تواعدتم وهم القتال ثم علمتم حالكم وحالهم لاختلفتم انتم في الميعاد هيبة منهم ويأسا من الظفر عليهم ليتحققوا ان ما اتفق لهم من الفتح ليس الا صنعا من الله خارقة للعادة فليزدادوا ايمانا وشكرا ولكن جمع بينكم على هذه الحالة من غير ميعاد ليقضي الله امر كان مفعولا حقيقا بان يفعل وهو نصر اوليائه وقهر اعدائه "

ترجمہ: (اور اگر تم آپس میں وعدہ کرتے، تو تم وعدے میں اختلاف کرتے) یعنی اگر تم اور وہ آپس میں لڑائی کا وعدہ کرتے پھر تم اپنا اور ان کا حال جان لیتے، تو بے شک تم ان سے ڈر کر اور ان پر فتح پانے سے مایوس ہو کر وعدے میں اختلاف کرتے (بن وعدہ لڑائی اس لیے ہوئی) کہ مسلمان جان لیں کہ جو انہیں فتح نصیب ہوئی وہ محض بطور خارق عادت اللہ تعالی کی عنایت سے ہوئی تا کہ وہ ایمان وشکر میں زیادہ ہو جائیں۔ انتہی

حاشیہ شیخ زادہ علی البیضاوی میں ہے۔

(قوله لاختلفتم) اى لخالف بعضكم بعضا وعزمتم على التخلف عن محاربة النفير لكثرتهم وقلتكم ولكن جمعكم الله تعالى من غير ميعاد لكم ليقضي الله امرا كان مفعولا في علمه وحكمه او كان حقيقا بان يفعل فانه تعالى دبر تدبيرا عجيبا لوقوع الحرب بين الجمعين من حيث اله اخبر المؤمنين باقبال العير حتى خرجوا واقلق الكفار بسماع خبر خروجهم لكي ينفروا وسبب الاسباب

حتی اجتمعوا للحرب وایدالله تعالی للمؤمنین بنصره بان ربط الله علی قلوبهم وقواها وازال عنها الاضطراب والارتیاب والقی فی قلوب الذین کفروا الرعب وامدهم بانزال الملائکة والمطر وغیر ذلک من وجوه لطفه وفعل ذلک خارقا للعادة لیظهر الحق ویقطع دابر الکفرین "

ترجمہ: (قوله اختلفتم) یعنی تم ایک دوسرے کی مخالفت کرتے اور ان کی کثرت اور اپنی قلت کے سبب فوج قریش کی لڑائی سے پیچھے رہ جانے کا ارادہ کرتے، مگر اللہ نے تم کو وعدے بغیر جمع کر دیا تا کہ وہ بات کر دے جو اس کے علم وحکم میں ہو چکی ہے، یا ہونے والی ہے، پس اللہ تعالی نے دونوں فریقوں میں لڑائی ہونے کے لیے عجیب تدبیر کی، بدینطور کہ مومنوں کو قافلہ کے آنے کی خبر دی، یہاں تک کہ وہ (مدینہ منورہ سے) نکلے اور کفار کو مسلمانوں کے نکلنے کی خبر سننے سے بے چین کر دیا تا کہ وہ لڑائی کے لیے نکلیں اور اسباب پیدا کر دیئے، یہاں تک کہ لڑائی کے لیے جمع ہو گئے اور اللہ تعالی نے اپنی مدد سے مومنوں کی تائید کی، بدیں طور کہ ان کے دل مضبوط کر دیئے اور ان کو تقویت دی اور ان سے اضطراب وشبہ دور کر دیا اور کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دیا اور فرشتے اور بارش اتار کر اور کئی قسم کی مہربانیوں سے ان کی مدد کی اور یہ بطور خارق عادت کیا تا کہ حق کو ظاہر کر دے اور کافروں کا پیچھا کاٹ دے۔ انتہی

غرض تمام علماء نے اس آیت کے یہی معنی بیان کیے ہیں، حتی کہ صحابہ کرام بھی یہی معنے سمجھے ہیں، چنانچہ حدیث کعب سے عیاں ہوگا۔

قال الشبلی النعمانی:

(۵) قرآن مجید میں ایک اور آیت اسی بدر کے واقعہ کے متعلق نازل ہوئی ہے اور اس وقت جب آپ مدینہ میں ہی تشریف رکھتے تھے چنانچہ صحیح بخاری میں تفسیر سورۃ انفال میں تصریحاً مذکور ہے۔ آیت یہ ہے۔

﴿لَایَسْتَوِی الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِیْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَی الْقَاعِدِیْنَ دَرَجَةً﴾

"بجز معذوروں کے وہ لوگ جو بیٹھ رہے اور وہ لوگ جو خدا کی راہ اپنے مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں برابر نہیں ہوسکتے خدا نے مجاہدین کو جو مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں، درجہ میں فضیلت دی ہے۔" (سورۃ انفال)

صحیح بخاری میں اس آیت کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ یعنی وہ لوگ جو بدر میں شریک نہیں ہوئے اور وہ جو شریک ہوئے دونوں برابر نہیں ہوسکتے صحیح بخاری میں یہ بھی ہے کہ جب یہ آیت مدینہ منورہ میں نازل ہوئی تو پہلے غیر اولی الضرر کا جملہ نہ تھا، یہ آیت سن کر حضرت عبداللہ ابن مکتوم آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے

اندھے پن کا عذر کیا، اس پر وہیں یہ جملہ نازل ہوا: " غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ " (یعنی معذوروں کے سوا) یہ صاف اس بات کی دلیل ہے کہ مدینہ ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ قافلہ پر حملہ کرنا نہیں، بلکہ لڑنا اور جان دینا ہے۔ (سیرت النبی، جلد اول صفحہ نمبر ۲۵۴)

اقول: آیۂ لایستوی القاعدون سورۃ نساء میں ہے اور صحیح بخاری تفسیر سورۂ نساء میں مذکور ہے، یہ کہنا کہ یہ آیت صحیح بخاری تفسیر سورۂ انفال میں تصریحاً مذکور ہے بالکل غلط ہے اور امام بخاری علیہ الرحمہ پر بہتان ہے، اس قرآن دانی پر مولوی شبلی صاحب کو محقق بننے کا دعوی ہے، العجب العجب، مولوی صاحب کا خیال ہے کہ آیۂ لایستوی القاعدون " مدینہ منورہ میں بدر کو جانے سے پہلے نازل ہوئی، لہذا اصحابہ کرام مدینہ منورہ ہی سے قتال قریش کے لیے نکلے تھے، مگر ایسا خیال مولوی صاحب کی نادانی پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ یہ معلوم ہے کہ آیات و سور قرآن کی ترتیب نزولی اس ترتیب سے مختلف ہے جو اب قرآن میں موجود ہے چنانچہ حضرت ابن عباس ﷺ کی روایت کے مطابق مدینہ منورہ میں جو سورتیں نازل ہوتیں، وہ اس ترتیب سے نازل ہوئیں، سب سے پہلے بقرہ، پھر انفال، پھر آل عمران، پھر احزاب، پھر ممتحنہ پھر نساء، پھر اذا زلزلت، پھر الحدید الخ۔ (تفسیر الاتقان للسیوطی مطبوعہ مصر جزء اول صفحہ نمبر ۱۱، ۱۲)

صحیح بخاری تفسیر سورۂ انفال میں ہے:

عن سعیدبن جبیر قال قلت لابن عباس سورۃ الانفال قال نزلت فی بدر "

یعنی حضرت سعید بن جبیر کا بیان ہے کہ میں نے حضرت ابن عباس سے سورۂ انفال کی بابت دریافت کیا، آپ نے فرمایا کہ سورۂ انفال غزوۂ بدر میں نازل ہوئی ہے، پس ثابت ہوا کہ سورۂ نساء جس میں آیت زیر بحث ہے جنگ بدر کے بعد نازل ہوئی ہے، لہذا مولوی صاحب کی تمام خامہ فرسائی بے سود ہے۔

قال الشبلی النعمانی:

(۶) کفار قریش جو مکہ سے لڑنے کے لیے بدر میں آئے، ان کی نسبت یہ قرآن مجید میں ہے۔

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ﴾

(ان لوگوں کی طرح نہ بنو) جو اپنے گھروں سے مغرورانہ نمائشی اور خدا تعالی کی راہ سے روکتے ہوئے نکلے۔

اگر قریش صرف قافلۂ تجارت کے بچانے کے لئے نکلے تو خدا تعالی یہ کیوں کہتا کہ وہ اظہار شان اور دکھاوے کے لیے خدا کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے؟ اسمیں اظہار شان اور دکھاوے کی کیا بات تھی؟ اور خدا تعالی کی راہ سے لوگوں کو روکنا کیا تھا؟ البتہ درحقیقت وہ مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کے لیے نکلے تھے جس سے مقصود اپنے زور اور قوت کا اعلان و نمائش اور اسلام کی ترقی کا انسداد تھا، اس لیے خدا تعالی نے اس غرور و نمائش اور صد عن سبیل اللہ کہا۔ (سیرت النبی جلد اول صفحہ نمبر ۲۵۴، ۲۵۵)

اقول: سیرت ابن ہشام غزوہ بدر میں ہے۔

قال ابن اسحق ولما رأی ابوسفیان انه قد احرز عیره ارسله الی قریش انکم انما خرجتم لتمنعوا عیرکم ورجالکم واموالکم فقد نجاها الله فارجعوا فقال ابوجهل بن هشام والله لا نرجع حتی نرد بدرا وکان بدر اموسما من مواسم العرف یجتمع لهم به سوق کل عام فنقیم علیه ثلاثا فننحر الجزور ونطعم الطعام ونسقی الخمر وتعزف علینا القیان وتسمع بنا العرب وبمسیرنا وجمعنا فلا یزالون یهابوننا ابدا بعدها فامضوا"

ابن اسحاق نے کہا کہ جب ابوسفیان نے دیکھا کہ اس نے اپنے قافلہ کو بچالیا ہے تو اس لیے قریش کو کہا بھیجا کہ تم صرف اپنے قافلہ اور اپنے آدمیوں اور مالوں کو بچانے کے لیے نکلے ہو، سو اللہ تعالی نے ان کو بچالیا، اس لیے تم واپس چلے جاؤ، ابوجہل بن ہشام نے جواب دیا اللہ کی قسم ہم واپس نہ ہوں گے، یہاں تک کہ ہم بدر میں اتریں گے (بدر عرب کی منڈیوں میں سے ایک منڈی تھی جہاں وہ جمع ہوا کرتے تھے اور وہاں ایک بازار تھا) اور وہاں تین راتیں ٹھہریں گے اور اونٹ ذبح کریں اور کھانا کھلائیں گے اور شراب پلائیں گے اور غلام باجے بجا کر ہمیں گا سنائیں گے اور عرب ہمارا حال اور ہمارا آنا اور ہماری جمعیت سنیں گے پس وہ آج سے ہم سے ڈرتے رہیں گے لہذا آگے چلو۔

آیت زیر بحث میں ابوجہل اور اس کے ساتھیوں کی اسی حالت کی طرف اشارہ ہے، اس کا اترانا اور دکھاوا ہونا تو ظاہر ہے، اس میں اسلام کی ترقی کا انسداد بھی ہے، کیونکہ جب تمام عرب ہیبت زدہ ہو جائیں گے، تو کسی کو ان کی مرضی کے خلاف اسلام لانے کی جرأت نہ ہوگی، حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ ﷺ اور دیگر مفسرین کرام اس آیت کی یہی تفسیر بیان فرماتے ہیں ہم یہاں صرف چند عبارتیں نقل کر رہے ہیں جن سب کا ماحصل یہی ہے۔

روی عن ابن عباس ﷺ عنهما لما رأی ابوسفیان انه احرز ارسل الی قریش ان ارجعوا فقد سلمت العیر فقال ابوجهل والله لا نرجع حتی نرد بدرا ونشرب الخمور وتعزف علینا القینات ونطعم بها من حضرنا من العرب فوافوها ولکن سقوا کاس المنایا بدل الخمور وناحت علیهم النوائح بدل القینات وکانت اموالهم غنائم بدلا عن بذلها" (تفسیر روح المعانی جزء ثالث صفحه نمبر ۲۴۵)

اخرج ابن المنذر وابن ابی حاتم وابو الشیخ عن قتادہ ﷺ فی الآیة قال کان مشرکوا قریش الذین قاتلوا النبی ﷺ یوم بدر خرجوا ولهم بغی وفخر وقد قیل لهم یومئذ ارجعوا فقد انطلقت عیرکم وقد ظفرتم فقالوا الا والله حتی یتحدث اهل الحجاز بمسیرنا وعددنا" (درمنثور للسیوطی)

(کالذین خرجوا من دیارهم)هم اهل مکة حین خرجوا الحماية العير فاتاهم رسول ابی سفيان وهم بالجحفة ان ارجعوا فقد سلمت عيركم فابی ابو جهل وقال حتی نقدم بدرا نشرب بها الخمور وتعرف علينا القيان ونطعم بها من حضرنا من العرب فذالک بطرهم ورئاؤهم الناس باطعامهم فوافوها نسقوا كئوس المنايا مكان الخمرو ناحت عليهم النوائح مكان القيان" (تفسیر کشاف للزمخشری)

وایں حال ابوجہل وتابعان اوست (حاشیہ ترجمہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ) پس ظاہر ہو گیا کہ اس آیت کے معنی جو مولوی شبلی صاحب سمجھے ہیں، وہ ان کی محض اپنی رائے ہے جو سراسر غلط ہے۔

قال الشبلی النعمانی: قرآن مجید کے بعد احادیث نبوی کا درجہ ہے، احادیث کی متعدد کتابوں میں غزوۂ بدر کا مفصل و مجمل ذکر ہے لیکن کعب بن مالک والی حدیث کے سوا اور کسی حدیث میں یہ واقعہ میری نظر سے نہیں گزرا کہ آنحضرت ﷺ بدر میں قریش کے قافلۂ تجارت کو لوٹنے کے لیے نکلے تھے، کعب بن مالک کی حدیث متعدد وجوہ سے قابل بحث ہے۔

(۱) حضرت کعب بن مالک غزوۂ بدر میں شریک نہیں تھے اس لیے ان کی روایت اس موقع پر مشاہدہ و واقفیت کی روایت نہیں۔

(۲) اس واقعہ کی روایت سے ان کا مقصد یہ ہے کہ غزوۂ بدر کی اہمیت کم ہو جائے، تا کہ عدم شرکت سے ان کا وزن کم نہ ہو، حالانکہ بدر کو تاریخ اسلام میں جو اہمیت حاصل ہے، وہ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن پاک نے اس کو یوم الفرقان کہا ہے، خدا نے تمام شرکائے بدر کے گناہ معاف کر دیئے ہیں، بدری صحابہ کی یہ عزت تھی کہ حضرت عمر کے عہد میں ان کے وظائف سب سے زیادہ تھے کسی صحابی کے نام کے ساتھ بدری کہنا خاص امتیاز کا سبب شمار کیا جاتا تھا، حضرت کعب کی حدیث یہ ہے۔

"عن عبدالله بن كعب قال كعب لم اتخلف عن رسول الله ﷺ في غزوة تبوک غير انی كنت تخلفت في غزوة بدر ولم يعاقب احد تخلف عنها انما خرج النبی ﷺ يريد عير قريش حتى جمع الله بينه وبينهم على غير ميعاد" (غزوۂ تبوک، بخاری)

حضرت کعب کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر کسی غزوہ سے پیچھے نہیں رہا بجز غزوۂ تبوک کے اور ہاں غزوۂ بدر میں بھی شریک نہ تھا اور جو اس پر شریک نہ ہوا، اس پر کچھ عتاب نہیں ہوا، کیونکہ آنحضرت ﷺ قریش کے قافلہ کے لیے نکلے تھے کہ خدا تعالیٰ نے دونوں فریق کو اچانک مقابل کر دیا۔

(سیرت النبی، جلد اول صفحہ نمبر ۲۵۵)

اقــول: بے شک قرآن مجید کے بعد احادیث کا درجہ ہے احادیث ہی قرآن مجید کی صحیح تفسیر ہیں، حدیث کعب بن مالک جیسی اور بھی حدیثیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ قافلہ تجارت سے تعرض کرنے کے لیے نکلے تھے مگر اس تعرض سے اصلی غرض قریش کی شامی تجارت کا راستہ بند کرنا تھا، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، وہ حدیثیں یہ ہیں۔

(۱) اخرج ابن جریر وابن ابی حاتم وابن مردویة والبیهقی فی الدلائل عن ابی ایوب الانصاری قال قال لنا رسول الله ﷺ ونحن بالمدینة وبلغه ان عیر ابی سفیان قد اقبلت فقال ماترون فیها لعل الله یغنمنا ویسلمنا فخرجنا الحدیث" (درمنثور للسیوطی)

ابن جریر اور ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے اور بیہقی نے دلائل میں روایت کی ہے کہ حضرت ابوایوب انصاری نے کہا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ہم سے ارشاد فرمایا اور ہم مدینہ میں تھے اور حضور کو خبر آ پہنچی تھی کہ ابوسفیان کا قافلہ آ گیا ہے پس حضور نے فرمایا کہ اس میں تمہاری کیا رائے ہے؟ شاید اللہ تعالیٰ ہم کو غنیمت دے اور سلامت رکھے، پس ہم (قافلہ کے لیے) مدینہ سے نکلے۔

(۲) اخرج ابن جریر وابن المنذر ابن مردویة عن ابن عباس رضی الله تعالی عنهما فی قوله واذ یعدکم الله احدی الطائفتین قال اقبلت عیر اهل مکة من الشام فبلغ اهل المدینة ذلک فخرجوا ومعهم رسول الله ﷺ یرید العیر الحدیث" (درمنثور للسیوطی)

ابن جریر اور ابن المنذر اور ابن مردویہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے "وَاِذْ یَعِدُکُمُ اللّٰہُ اِحْدَی الطَّآئِفَتَیْنِ" کی تفسیر میں فرمایا کہ اہل مکہ کا قافلہ تجارت شام سے آیا، پس اہل مدینہ کو جو اس کی خبر پہنچی تو وہ نکلے اور ان کے ساتھ رسول اللہ ﷺ تھے جو بقصد قافلۂ تجارت نکلے تھے۔

(۳) اخرج ابن اسحق وابن جریر وابن المنذر عن ابن عباس رضی الله عنهما قال لما سمع رسول الله ﷺ بابی سفیان مقبلا من الشام ندب المسلمین الیهم وقال هذه عیر قریش فیها اموالهم فاخرجوا الیها لعل الله یملککموها فانتدب الناس فخف بعضهم وثقل بعضهم وذلک انهم لم یظنوا ان رسول الله ﷺ یلقی حربا الحدیث" (درمنثور للسیوطی)

ابن اسحاق اور ابن جریر اور ابن منذر نے روایت کیا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ جب رسول اللہ ﷺ نے سنا کہ ابوسفیان شام سے آ رہا ہے، تو مسلمانوں کو ان کی طرف نکلنے کے لیے بلایا اور فرمایا کہ یہ قریش کا قافلہ تجارت ہے جس میں ان کے مال ہیں سو ان کی طرف نکلو، شاید اللہ تعالیٰ تمہیں غنیمت دے پس لوگوں نے حضور کی دعوت کو قبول کیا، لہٰذا بعض نے نکلنے میں جلدی کی اور بعض نے سستی کی، اس سستی کی وجہ یہ تھی کہ انہیں خیال نہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو لڑائی پیش آئے گی۔

حضرت کعب بن مالک ﷺ کی حدیث صحیح بخاری کے علاوہ صحیح مسلم (کتاب التوبۃ، باب حدیث توبۃ کعب بن مالک وصاحبیہ) میں بھی موجود ہے، اس کی صحت میں کیا شک ہو سکتا ہے؟ یہ حدیث مسئلہ زیر بحث میں نہایت قابل غور ہے، کیونکہ یہ " **ولو تواعدتم لاختلفتم فی المیعاد** " (الآیۃ) کی صحیح تفسیر ہے جس کا بیان پہلے آچکا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ جو کچھ مولوی شبلی صاحب نے اس بحث میں ثابت کرنا چاہا ہے، وہ قرآن وحدیث صحیح کے خلاف ہے، یہ کہنا کہ اس سے حضرت کعب کا مقصود فقط اپنے تخلف کا عذر کرنا ہے اور وہ بجا ہے، کیونکہ مسلمان مدینہ منورہ سے محض تجارت سے تعرض کے لیے نکلے تھے۔

قال الشبلی النعمانی:

اس (حدیث کعب بن مالک) کے برخلاف حضرت انس کی حدیث ہے جو بخاری ومسلم دونوں میں مذکور ہے۔

(۱) **عن انس ان رسول اللہ ﷺ شاور حین بلغه اقبال ابی سفیان قال فتکلم ابوبکر فاعرض عنه فتکلم عمر فاعرض عنه فقام سعد بن عبادة فقال ایانا ترید یا رسول اللہ ﷺ والذی نفسی بیده لو امرتنا ان نخیضها البحر لاخضناها ولو امرتنا ان نضرب اکبادها الی برک الغماد لفعلنا قال فندب رسول اللہ ﷺ الناس فانطلقوا حتی نزلوا بدرا "**

حضرت انس سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ کو جب ابوسفیان کے آنے کی خبر معلوم ہوئی تو آپ نے مشورہ طلب کیا، حضرت ابوبکر بولے تو آپ نے توجہ نہ فرمائی، پھر حضرت عمر بولے تو آپ نے ان کی طرف بھی توجہ نہ فرمائی پھر حضرت سعد بن عبادہ کھڑے ہوئے اور کہا یا رسول اللہ؟ کیا آپ کا روئے سخن ہم انصار کی طرف ہے خدا کی قسم اگر آپ دریا میں سواری ڈالنے کا ہمیں حکم دیں تو ہم ڈال دیں گے تو ہم جائیں گے اگر برک الغماد تک جانے کا حکم دیں گے، حضرت انس کہتے ہیں کہ اس کے بعد لوگوں کو شرکت جنگ کی دعوت دی، لوگ چل پڑے اور بدر پر اترے۔

(۲) **ووردت علیهم روایا قریش وفیهم غلام اسود لبنی الحجاج فاخذوه فکان اصحاب رسول اللہ ﷺ یسألون عن ابی سفیان واصحابه فیقول مالی علم بابی سفیان ولکن هذا ابوجهل وعتبة وشیبة وامیة بن خلف فاذا قال ذلک ضربوه فقال نعم انا اخبرکم هذا ابوسفیان فاذا ترکوه فقال مالی بابی سفیان من علم هذا ابوجهل و ...... رسول اللہ ﷺ قائم یصلی فلما رای ذلک الضرب قال والذی نفسی بیده لتضربوه اذا صدقکم وتترکوه اذا کذبکم "**

اور (پہلے) قریش کا ہراول دستہ آکر اترا، اس میں بنی حجاج کا ایک حبشی غلام تھا، اصحاب رسول اللہ ﷺ نے

اسے گرفتار کرلیا اور اس سے ابوسفیان کا حال پوچھنے لگے وہ کہتا تھا مجھے ابوسفیان کی خبر نہیں، لیکن یہ ابو جہل عتبہ، شیبہ، امیہ بن خلف آرہے ہیں، جب وہ کہتا تو لوگ اس کو مارتے، وہ کہتا اچھا ابوسفیان کا بتاتا ہوں، تب اس کو چھوڑ دیتے، تو پھر وہ کہتا تو مجھ کو ابوسفیان کی خبر نہیں، لیکن ابوجہل وغیرہ رؤسائے قریش آرہے ہیں، آنحضرت ﷺ نماز میں مشغول تھے، آپ نے یہ دیکھ کر فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جب وہ سچ کہتا ہے، تو تم اس کو مارتے ہو اور جب جھوٹ بولتا ہے تو چھوڑ دیتے ہو۔

حدیث کے پہلے ٹکڑے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب ابوسفیان کے آنے کا حال معلوم ہوا، اسی وقت آپ نے مہاجرین وانصار سے مشورہ کیا اور انصار سے اعانت کی خواہش ظاہر کی اور یہ متفقا ثابت ہے کہ ابوسفیان کی آمد کا حال مدینہ ہی میں معلوم ہو چکا تھا، اس بناء پر یہ محقق طور پر ثابت ہو چکا کہ اس غزوہ کی شرکت کے لیے آپ نے انصار سے مدینہ ہی میں خواہش کی تھی، ورنہ اگر باہر نکل کر یہ معاملہ پیش آتا جیسا کہ کتب سیرت میں مذکور ہے، کہ آنحضرت ﷺ نے مشورہ کے بعد لوگوں کو شرکت کی دعوت دی حالانکہ ارباب سیرت کے مطابق واقع یہ ہونا چاہیے کہ انصار معاہدہ اور معمول سابق کے خلاف شرکت کے لیے نکلے! آنحضرت ﷺ نے پھر ان کا عندیہ دریافت فرمایا اور اس کے بعد شرکت کے لیے آمادہ کیا، ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ ایک مجنونانہ بات ہے۔ حدیث کے دوسرے ٹکڑے سے بوضاحت تمام محقق ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو وحی کے ذریعہ سے یا کسی اور طریقہ سے یہ پہلے ہی سے معلوم تھا کہ تجارتی قافلہ کا نہیں، بلکہ جنگی فوج کا مقابلہ ہے گو عام لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو۔ اس حدیث میں ایک گرہ اور کھولنا ہے اگر پہلے صرف ابوسفیان کا آنا معلوم ہوا تھا اور قریش کے حملہ کی خبر نہ تھی، تو آنحضرت ﷺ اس اصرار اور سروسامان سے کیوں اجتماع کا اہتمام فرماتے؟ اس لیے ابوسفیان کی آمد کے بجائے موقع کا اقتضاء یہ ہے کہ یہ ہو کہ ''جب مشرکین مکہ کی آمد کی خبر معلوم ہوئی'' چنانچہ اسی واقعہ کو انہیں الفاظ کے ساتھ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالی نے مسند۔ (جلد اول صفحہ نمبر ۱۱۷) میں ابن ابی شیبہ نے مصنف میں (منتخب کنز العمال غزوۂ بدر میں) اور ابن جریر نے تاریخ (جلد ۳ صفحہ نمبر ۱۲۸۹) میں اور بیہقی نے دلائل میں روایت کیا ہے اور اس کو صحیح کہا ہے اور اس کے راوی معرکہ بدر کے ہیرو اسد اللہ علی بن ابی طالب ہیں۔

عن علی قال لما قدمنا المدينة اصبنامن ثمارها فاجتويناها و اصابنا بها وعك و كان النبي ﷺ يتخبر عن بدر فلما بلغنا ان المشركين قد اقبلوا سار رسول الله ﷺ الى بدر و بدر بئر فسبقنا المشركين اليها"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ جب ہم مدینہ آئے، تو وہاں پھل کھانے کو ملے جو ہمارے ناموافق مزاج تھے، اس لیے ہم لوگ بیمار ہو گئے، آنحضرت ﷺ بدر کو پوچھا کرتے تھے، جب ہم کو خبر ملی

کہ مشرکین آرہے ہیں تو جناب رسول اللہ ﷺ بدر کو چلے ، بدر ایک کنواں کا نام ہے جہاں ہم مشرکین سے پہلے پہنچ گئے۔

(اس کے بعد بدر کے تمام واقعات وجزئیات مذکور ہیں) اس میں صاف تصریح ہے کہ مشرکین مکہ کے حملہ کی خبر سن کر آپ نکلے تھے اور بدر پر آکر قیام فرمایا تھا، اس پوری حدیث میں ابوسفیان کے قافلۂ تجارت کا ذکر تک نہیں ہے۔
(سیرت النبی، جلد اول صفحہ نمبر ۲۵۶،۲۵۸)

اقول: اس مقام پر مولوی شبلی صاحب کی حدیث دانی کو دیکھئے کہ حدیث کعب بن مالک جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں ہے، اس کو تو آپ صرف صحیح بخاری میں سمجھتے ہیں اور حدیث انس جو صرف مسلم میں ہے، اسے صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں بنا رہے ہیں حدیث انس کا جو مطلب آپ سمجھے ہیں، وہ بھی عجیب ہے، اس حدیث سے ایک اردو ترجمہ خوان بھی سمجھ سکتا ہے کہ جب ابوسفیان کے آنے کی خبر مدینہ میں پہنچی، تو آپ نے قافلۂ تجارت سے تعرض کرنے کے لیے مشورہ طلب کیا، نہ کہ غزوۂ بدر کے لیے، خبر پہنچے قافلۂ تجارت کے آنے کی، اور مشورہ لیا جائے غزوۂ بدر کے لیے! یہ کیونکر ہوسکتا ہے؟ بے شک یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ارباب سیر نے تو مشورہ کا مقام مدینہ سے باہر وادی ذفران بتایا ہے اور اس حدیث میں خاص مدینہ منورہ ہے قاعدۂ اصول کے مطابق ان دونوں میں تطبیق دینی چاہئے اگر تطبیق ممکن ہو تو ایک کو ترجیح دی جائے ، یہاں ترجیح کی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ تعارض تطبیق سے رفع ہوسکتا ہے ،چنانچہ زرقانی علی المواھب اللدنیہ صفحہ نمبر ۴۱۴ میں ہیں۔

قال الحافظ ويمكن الجمع بانه ﷺ استشارهم مرتين الاولى بالمدينة اول مابلغه خبر العير وذلک بين من لفظ مسلم انه شاور حين بلغه اقبال ابى سفيان و الثالثة كانت بعذان خرج كمافى حديث الجماعة"

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ تطبیق ممکن ہے بدیں طور کہ آنحضرت ﷺ نے ان سے دو دفعہ مشورہ طلب کیا، پہلی دفعہ مدینہ میں جبکہ آپ کو قافلۂ تجارت کی خبر پہنچی اور یہ مسلم کے الفاظ شاور حين بلغه اقبال ابى سفيان (آپ نے مشورہ کیا جبکہ ابوسفیان کے آنے کی خبر پہنچی) سے واضح ہے، دوسری دفعہ مدینہ سے باہر جیسا کہ اوروں کی حدیث میں ہے۔

یہ تطبیق کیسی اچھی ہے، چونکہ انصار نے بیعت کے وقت آنحضرت ﷺ سے یہ عہد کیا تھا کہ جب آپ مدینہ میں ہوں گے، تو ہماری امان میں ہوں گے، لہذا ان سے دو دفعہ مشورہ طلب کیا گیا، پہلی دفعہ مدینہ سے نکلنے کے وقت، یہ مشورہ محض قافلۂ تجارت سے تعرض کے لیے تھا، دوسری دفعہ وادی ذفران میں جبکہ قریش کے مکہ سے آنے کی خبر لگی، یہ

مشورہ فوج قریش سے مقابلہ کے لیے تھا، حدیث انس کے دوسرے ٹکڑے میں جو حبشی غلام کا قصہ مذکور ہے، وہ بدر پہنچ کر وقوع میں آیا ہے، اس سے یہ کیونکر ثابت ہو سکتا ہے کہ مدینہ ہی میں آنحضرت ﷺ کو معلوم ہو گیا تھا کہ جنگی فوج کا مقابلہ ہے، مولوی شبلی صاحب کا بار بار کہنا کہ آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ سے بڑے سامان کے ساتھ اچھی طرح تیاری کر کے نکلے تھے، بالکل بے اصل ہے، ہم اپنے قول کے ثبوت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی کی دوسری حدیث پیش کرتے ہیں اور وہ یہ ہے۔

عن ثابت عن انس بن مالک قال بعث رسول اللہ ﷺ بسبسة عينا ينظر ماصنعت عير ابی سفيان فجاء ومافی البيت احد غيری رسول اللہ ﷺ قال لاادری مااستثنی بعض نسائه قال فحدثه الحديث قال فخرج رسول اللہ ﷺ فتكلم فقال ان لنا طلبة فمن كان ظهره حاضرا فليركب معنا فجعل رجال يستاذنونه فی ظهرانهم فی علو المدينة فقال لاالامن كان ظهره حاضرا فانطلق رسول اللہ ﷺ واصحابه حتی سبقوا المشركين الی بدر (الحديث) (صحيح مسلم، كتاب الجهاد باب سقوط فرض الجهاد عن المعذورين)

حضرت ثابت ؓ سے روایت ہے کہ حضرت انس بن مالک ؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بسبسہ ؓ کو بطور جاسوس بھیجا کہ ابو سفیان کے قافلہ کا حال دریافت کرو، پس حضرت بسبسہ آئے اور دولت خانہ میں سوائے میرے اور رسول اللہ ﷺ اور کوئی نہ تھا، راوی نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں کہ انس نے ازواج مطہرات میں سے کسی کو مستثنیٰ نہ کیا، راوی کا قول ہے کہ انس نے مجھ سے بیان کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نکلے، پس آپ نے کلام کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارا مطلوب ایک ہے جس کا سواری کا اونٹ موجود ہو، وہ سوار ہو کر ہمارے ساتھ چلے، پس لوگ آپ سے ان اونٹوں کے لانے کیلئے جو مدینہ کے بالائی حصہ میں تھے، اجازت مانگنے لگے، آپ نے فرمایا نہیں، مگر وہ جس کا سواری کا اونٹ حاضر ہے، پس رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب روانہ ہوئے یہاں تک کہ مشرکین سے پہلے بدر میں پہنچ گئے۔

اس حدیث مسلم سے ناظرین بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مسلمان مدینہ منورہ سے کیسی جلدی اور کس بے سروسامانی میں نکلے ہیں اور نکلے بھی قافلہ کے لیے ہیں۔ علامہ ابن قیم (زاد المعاد، غزوۂ بدر) یوں لکھتے ہیں۔

وجملة من حضر بدر من المسلمين للثمانة وبضعة عشر رجلا من المهاجرين ستة وثمانون ومن الاوس احد وستون ومن الخزرج مائة وسبعون وانما قل عدد الاوس عن الخزرج وان كانوا اشد منهم واقوی شوكة ...... عند اللقاء لان منازلهم كانت فی عوالی المدينة وجاء النفير بغتة وقال النبی ﷺ لايتبعنا الامن كان ظهره

حاضر افاستأذنه رجال ظهورهم كانت في علو المدينة ان يسأني بهم حتى يذهبو االى ظهورهم فابى ولم يكن عزمهم على اللقاء ولاعدواله عدة ولاتاهبواله اهبة ولكن جمع الله بينهم وبين عدوهم على غير ميعاد"

مسلمانوں کی تعداد جو بدر میں حاضر ہوئے، تین سو دس سے کچھ اوپر تھی، مہاجرین میں سے ۸۳، اوس میں سے ۶۱، اور خزرج میں سے ۱۷۰ تھے، اوس اگرچہ شوکت میں خزرج کی نسبت شدید وقوی تھے اور لڑائی کے وقت زیادہ ثابت تھے، مگر ان کی تعداد خزرج سے اس لیے کم تھی کہ ان کے گھر مدینہ کی بالائی آبادی میں تھے اور روانگی اچانک ہوگئی، اور نبی اکرم ﷺ نے فرمادیا کہ ہمارے ساتھ وہی چلے گا جس کے پاس سواری کا اونٹ موجود ہو، اس پر ان لوگوں نے جن کے اونٹ مدینہ کے بالائی حصہ میں تھے، آپ سے اجازت طلب کی کہ آپ مہلت دیں کہ ہم اپنے اونٹ لے آئیں، مگر آپ نے اجازت دینے سے انکار کیا اور ان کا ارادہ لڑائی کا نہ تھا اور نہ لڑائی کے لیے کوئی سامان تیار کیا تھا اور نہ اس کے لیے کوئی تیاری کی تھی، لیکن اللہ تعالی نے ان کو اور ان کے دشمنوں کو بغیر وعدہ مقابل کردیا۔

بیان بالا سے صاف ظاہر ہے کہ مدینے سے نکلتے وقت کوئی خاص تیاری نہیں کی گئی، ورنہ فقط دو گھوڑے ستر اونٹ اور تین سو پانچ اصحاب ساتھ نہ ہوتے، بلکہ اس سے کئی گنا سامان ساتھ ہوتا، مولوی شبلی صاحب کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ فوج قریش مکہ سے مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے نہیں نکلی تھی، چنانچہ صحیح بخاری (کتاب المغازی، باب من یقتل ببدر) میں حدیث عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما میں یہ الفاظ ہیں۔

فلما كان يوم بدر استنفر ابو جهل الناس قال ادركوا عيركم فكره امية ان يخرج "

جب بدر کا دن آیا ابوجہل نے لوگوں کو نکلنے کی دعوت دی اور کہا "تم اپنے قافلۂ تجارت کو بچاؤ" پس امیہ نے نکلنا پسند نہ کیا۔

اس حدیث بخاری سے صاف ظاہر ہے کہ قریش مکہ سے اپنے قافلے کو بچانے کے لیے نکلے تھے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جو حدیث پیش کی گئی ہے، اس میں اختصار ہے اور صرف مدینہ سے باہر کے واقعات بیان کیے گئے ہیں، اس میں یہ مذکور نہیں کہ مدینہ میں مشرکین کے آنے کی خبر پہنچی، بدر کے حالات کا دریافت کرنا اور مشرکین کی آمد کی خبر کا آنا یقیناً مدینہ سے باہر وقوع میں آیا جیسا کہ قرآن واحادیث صحیحہ سے ثابت ہے، حضرت علی کی دوسری حدیث میں جو بروایت ابن عساکر کنز الایمان (جزء خامس صفحہ نمبر ۲۶۶) میں مذکور ہے، بخار کا آنا بھی مدینہ میں نہ تھا، حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

عن علي قال لما كان ليلة بدر اصابنا وعك من حمى وشيئى من مطر الحديث"

حضرت علی کرم اللہ تعالی وجہہ فرماتے ہیں کہ جب بدر کی رات آئی، تو ہمیں تپ کی تکلیف اور کچھ بارش ہوئی۔

بہر حال تپ کا آنا کہیں ہو، مشرکین کے مکہ سے آنے کی خبر مدینہ میں نہ پہنچی تھی اور مسلمان مدینہ منورہ سے محض قافلۂ تجارت سے تعرض کے لیے نکلے تھے۔

نتیجہ: ہماری تحقیقات بالا سے جو قرآن مجید اور احادیث صحیحہ پر مبنی ہے، غزوۂ بدر کے متعلق واقعات میں ترتیب حسب ذیل ہے۔

ہجرت کے بعد قریش نے مسلمانوں کو حج وعمرہ سے روک دیا، اس پر مسلمانوں نے ان کی شامی تجارت کا راستہ بند کرنے کا ارادہ کیا تا کہ وہ مذہبی مداخلت سے باز آجائیں، اسی غرض کے لیے مسلمانوں نے ان کے قافلوں سے چھیڑ خانی شروع کی، چنانچہ جب آنحضرت ﷺ کی بذریعہ وحی ابوسفیان کے قافلۂ تجارت کے آنے کی خبر لگی تو آپ نے بالخصوص انصار سے قافلۂ تجارت پر حملہ کرنے کے لیے استمزاج فرمایا، چنانچہ آپ فوری ناتمام تیاری کر کے نہایت جلدی سے مدینہ سے نکلے، وادیٔ ذفران میں حضرت جبرائیل علیہ السلام حضور اقدس ﷺ کی خدمت بابرکت میں قریش کے مکہ سے آنے کی خبر دار دونوں جماعتوں (قافلۂ تجارت وفوج قریش) میں سے ایک کے وعدے کے ساتھ نازل ہوئے، حضور نے مہاجرین وانصار سے دوبارہ استمزاج فرمایا کہ وہ دونوں جماعتوں میں سے کسے چاہتے ہیں، اسی اثناء میں اللہ تعالی نے آپ کو طائفہ ثانیہ پر فتح کی بشارت دی، لہذا حضور جاں نثارانہ تقریریں ن کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا ''اللہ کی قسم! گویا میں قریش کے مرنے کی جگہوں کو دیکھ رہا ہوں'' قصہ کوتاہ آنحضرت ﷺ وہاں سے بدر پہنچے، جہاں اللہ تعالی نے مسلمانوں کو فتح عظیم دی۔

قال الشبلی النعمانی: ان قطعی نصوص کے بعد اگر چہ کسی اور استدلال کی ضرورت نہیں، لیکن لیطمئن قلبی کے طور پر واقعات ذیل پر لحاظ کرنا چاہیے۔

(۱) آنحضرت ﷺ نے اس سے پہلے قریش کے قافلوں پر حملہ کرنے کے لیے جس قدر سرایا بھیجے اور جن میں بیس تیس آدمی سے لے کر سو دو دو سو تک کی جمعیت تھی، ان میں کبھی کسی انصاری کو نہیں بھیجا، ارباب سیر اس خاص امر کو یہ تصریح لکھتے ہیں اور اس تصریح کی اس لیے ضرورت سمجھتے ہیں کہ انصار نے بیعت کے وقت مدینہ سے باہر نکلنے کا اقرار نہیں کیا تھا، اس بناء پر اگر اس دفعہ بھی مدینہ سے نکلنے کے وقت صرف قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو انصار ساتھ نہ ہوتے، حالانکہ اس واقعہ میں انصار کی تعداد مہاجرین سے زیادہ تھی، یعنی کل فوج ۳۰۵ تھی جن میں ۷۴ مہاجرین اور باقی سب انصار تھے، یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ جس وقت مدینہ سے آپ نکلے یہ خبر آچکی تھی کہ قریش مدینہ پر آرہے ہیں، اسی بناء پر آپ نے انصار کو مخاطب کیا، کیونکہ معاہدۂ بیعت کے موافق اب انصار سے کام لینے کا وقت آچکا تھا۔
(سیرت النبی جلد اول صفحہ نمبر ۲۵۸)

اقول: مولوی شبلی صاحب نے اس مقام تک جو نصوص قطعی پیش کی ہیں ان کا حال تو ناظرین پر واضح ہو چکا ہے، اب مولوی صاحب بلا سند اپنے قیاسات بیان کرتے ہیں، ہم کہتے ہیں کہ قریش کے مکہ سے آنے کی خبر مدینہ میں نہ پہنچی تھی، ہاں قافلہ ابوسفیان کے شام سے آنے کی خبر پہنچ چکی تھی، لہذا بنا بر معاہدہ بیعت حضور اقدس ﷺ نے مدینہ ہی میں قافلہ تجارت سے تعرض کرنے کے لیے انصار سے مشورہ طلب فرمایا جیسا کہ حدیث مسلم کے حوالے سے پہلے بیان ہوا، لہذا مولوی صاحب کی خامہ فرسائی بے سود ہے۔

قال الشبلی النعمانی: (۲) مکہ سے جو قافلہ تجارت کے لیے شام کو جایا کرتا تھا، مدینہ کے پاس سے ہو کر گزرتا تھا، مدینہ سے مکہ تک جس قدر قبائل آباد تھے، عموماً قریش کا اثر نہ تھا، اس بناء پر اگر کاروان تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو شام کی طرف بڑھتا تھا، یہ بالکل خلاف قیاس ہے کہ کاروان تجارت شام سے آ رہا ہے، آنحضرت ﷺ کو خبر ہو چکی ہے اور آپ بجائے اس کے کہ شام کی طرف بڑھیں، مکہ کی طرف جاتے ہیں اور پانچ منزل مکہ کی طرف جا کر خبر آتی ہے کہ قافلہ بچ کر نکل گیا اور قریش سے جنگ پیش آ جاتی ہے۔ (سیرت النبی جلد اول صفحہ نمبر ۲۵۸،۲۵۹)

اقول: اس میں شک نہیں کہ جب مسلمان مدینہ منورہ سے نکلے تو ان کا مقصود فقط کاروان تجارت سے تعرض کرنا تھا، مولوی شبلی صاحب کا یہ قیاس بالکل درست ہے کہ انہیں شام کی طرف بڑھنا چاہیے تھا، مگر چونکہ قافلہ کا ٹھیک مقام اور پہنچنے کا وقت معلوم نہ تھا، اس لیے حضور اقدس ﷺ نے پہلے دو آدمیوں کو شام کی طرف بغرض تجسس بھیجا۔ چنانچہ طبقات ابن سعد میں ہے۔

> لما تحين رسول الله ﷺ انصراف العير من الشام التی كان خرج لها يريدها حتى بلغ ذو العشيرة بعث طلحة بن عبيد الله التيمی وسعيد بن زيد بن عمرو بن نفيل يتجسسان خبر العير فبلغا التجبار من ارض الحوراء فنزلا على كشد الجهنی فاجارهما وانزلهما وكتم عليهما حتى مرت العير ثم خرجا وخرج معهما كشد خفيرا حتى اوردهما ذا المروة وساحلت العير واسرعت فساروا الليل والنهار فرقا من الطلب فقدم طلحة وسعيد المدينة ليخبرا رسول الله ﷺ خبر العير فوجداه قد خرج "

چونکہ رسول اللہ ﷺ شام سے اس قافلہ کی واپسی کے منتظر تھے جس کے قصد سے ذوالعشیرہ تک تشریف لے گئے تھے، اس لیے آپ نے حضرت طلحہ بن عبید اللہ تیمی اور سعید بن زید بن عمرو بن نفیل کو بطور جاسوس قافلہ کی خبر لانے

کے لیے بھیجا، چنانچہ وہ دونوں تجبار واقع سرزمین حوراء تک پہنچے اور کشد جہنی کے ہاں اتارا اور ان کو پوشیدہ رکھا یہاں تک کہ قافلہ گزر گیا، پھر وہ دونوں نکلے اور ان کے ساتھ کشد بھی بطور رہنما نکلا، یہاں تک کہ ان کو ذوالمرۃ لے آیا اور قافلہ ساحل کی طرف ہولیا اور جلدی چلا، اہل قافلہ گرفتاری کے ڈر سے دن رات چلتے تھے، پس طلحہ اور سعید مدینہ منورہ میں آئے، تا کہ رسول اللہ ﷺ کو قافلہ کی خبر دیں مگر حضور اقدس ﷺ ان کے پہنچنے سے پہلے روانہ ہو چکے تھے۔

ذوالمروہ (دیکھو معجم البلدان) وادی القری میں ہے جو مدینہ منورہ سے شام کے راستے میں ہے، چونکہ ذوالمروہ سے قافلہ مدینہ کا راستہ چھوڑ کر ساحل بحر کو ہولیا تھا، اور بچنے کے لیے شب و روز چلتا تھا، اس لیے حضرت طلحہ و سعید رضی اللہ عنہما کے مدینہ منورہ پہنچنے سے پہلے وہ ساحل بحر کے رخ دور نکل گیا تھا کہ اس اثنا میں حضرت بسیسہ رضی اللہ عنہ اس کی خبر لائے، یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کو نہایت جلدی مدینہ منورہ سے نکلنا پڑا اور انہوں نے بجائے شمال مدینہ کے مدینہ منورہ کے جنوب مغرب کو ساحل بحر کا رخ کیا تا کہ اسے جا گھیریں۔ مولوی شبلی صاحب نے اس قسم کے اور قیاسات بھی پیش کیے ہیں جو نظر براختصار پس انداز کیے جاتے ہیں۔

اللھم انی اسئلک بحبیبک سیدنا و مولنا محمد ن المصطفی ﷺ و باھل بدر ﷺ ان تبلغنی فی الدارین اقصی مرامی وتغفرلی ولوالدی ولمشائخی ولاحبائی ولسائر المؤمنین والمؤمنات وان تؤیدالاسلام والمسلمین" (غزوات النبی)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰی لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝ (آیۃ نمبر ۱۲۶)

(1) اور یہ فتح اللہ نے نہ کی مگر تمہاری خوشی کیلئے اور اسی لئے کہ اس سے تمہارے دلوں کو چین ملے اور مدد نہیں مگر اللہ غالب حکمت والے کے پاس سے۔ (کنزالایمان)

(2) اور نہیں بنایا اس کو (امداد کو) اللہ نے مگر خوشخبری تمہارے لئے اور تا کہ اطمینان حاصل ہو جائے تمہارے دلوں کو اس کی وجہ سے، اور نہیں ہے امداد مگر اللہ کی طرف سے جو غالب ہے (اور) حکمت والا۔ (نجوم الفرقان)

﴿وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ﴾ اس میں ضمیر منصوب "نصر" مصدر کی طرف لوٹ رہی ہے جو "نصر کم" کے ضمن میں

موجود ہے، یعنی فعل مصدر پر دلالت کر رہا، یا ضمیر "امداد" کی طرف لوٹ رہی ہے جس پر یمدد کم دلالت کر رہا ہے، مطلب یہ ہوا کہ نہیں بنایا مدد کو مگر بشارت تمہارے لئے۔ تفسیر ابن کثیر نے انزال کی طرف ضمیر لوٹائی ہے جس پر منزلین دلالت کر رہا ہے، اب مطلب یوں ہو جائے گا اور نہیں بنایا اسے (فرشتوں کے نازل کرنے کو) اللہ نے مگر خوشخبری تمہارے لئے۔

اعتراض: "بُشْرٰی" اسم ہے ابشار سے، اور "وَلِتَطْمَئِنَّ" فعل ہے، یہاں عطف فعل کا اسم پر ہے جو نحویوں کے نزدیک پسندیدہ طریقہ نہیں۔

جواب اول: امداد میں دو چیزیں مطلوب ہیں، ایک مطلوب ہونے میں دوسری چیز سے قوی ہے، وہ دو چیزیں یہ ہیں۔

(۱) دلوں میں سرور کو داخل کرنا جو مراد ہے (اِلَّا بُشْرٰی) سے۔

(۲) دوسری چیز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معاونت اور امداد پر دلوں کو اطمینان حاصل ہو جائے، تا کہ وہ بزدل نہ ہو جائیں "وھذاھو المقصود الاصلی" یہی مقصود اصلی ہے۔

"ففرق بین ھاتین العبارتین تنبیھا علی حصول التفاوت بین ھذین الامرین فی المطلوبیة فکونه بشری مطلوب ولکن المطلوب الاقوی حصول الطمانینة"

ان دونوں عبارتوں میں اس لئے فرق رکھا ہے کہ اس پر تنبیہ کر دی جائے کہ دونوں چیزوں کے مطلوب ہونے میں فرق ہے، اگر چہ بشارت بھی مطلوب ہے، لیکن اطمینان قلب زیادہ قوی مطلوب ہے۔

"فلھذا ادخل التعلیل علی فعل الطمانینة فقال (ولتطمئن)

یہی وجہ ہے کہ مقصود اصلی اطمینان قلب تو اس پر لام داخل کیا، امداد کرنے کی وجہ تمہارے دلوں کو اطمینان دیتا تھا۔

اس کی نظیر قرآن پاک کی یہ آیۃ کریمہ بھی ہے "والخیل والبغال الحمیر لترکبوھا وزینة" یعنی ان پر سوار ہو جاؤ، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ تم ان سے زینت حاصل کرو، لیکن ان دونوں چیزوں میں سے "ولما کان المقصود الاصلی ھو الرکوب ادخل حرف التعلیل علیھا" مقصود اصلی سوار ہونا ہے اسلئے اس پر لام تعلیلیہ داخل کیا ہے۔ (ماخوذ از مفاتیح الغیب المعروف بالکبیر)

اعتراض: اللہ تعالیٰ کے افعال معلل بالاغراض (کسی غرض اور علت پر موقوف) نہیں ہوتے، تو اس زیر بحث آیۃ کریمہ اور دوسری آیۃ جو بطور نظیر پیش کی ان میں لام تعلیلیہ کے آنے کا کیا مطلب؟

جواب: یہ چیزیں بندوں کیلئے علت ہیں، اللہ تعالیٰ کیلئے کوئی چیز علت نہیں۔ (راقم)

جواب دوم: پہلے اعتراض کا یہ دوسرا جواب ہے کہ "ولتطمئن" میں واؤ زائد عاطفہ نہیں کہ اس پر کسی قسم کا کوئی گناہ لازم آئے۔

﴿وَمَا النَّصۡرُ اِلَّا مِنۡ عِنۡدِاللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَكِيۡمِ﴾

''اور نہیں امداد مگر اللہ کی طرف سے جو غالب (اور) حکمت والا۔''

"والغرض منه ان يكون توكلهم على الله لا على الملائكة" غرض اس بیان سے یہ ہے کہ صحابہ کرام کو متنبہ (خبردار) کرنا مقصود تھا کہ فرشتوں کی امداد کی طرف توجہ نہ کرنا، بلکہ کامل بھروسہ اللہ تعالیٰ پر رکھنا کہ حقیقی طور پر وہی ہے امداد کرنے والا، یہ ظاہری فقط اسباب ہیں۔

"وهذا تنبيه على ايمان العبد لا يكمل الا عند الاعراض عن الاسباب والاقبال بالكلية على مسبب الاسباب"

اور اس سے ایمان والوں کو تنبیہ کی گئی کہ بندے کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہوتا، اور اعلیٰ درجہ تک نہیں پہنچتا جب تک وہ اسباب سے اعراض نہ کرے، یعنی اسباب کو مؤثر حقیقی نہ سمجھے، بلکہ مؤثر حقیقی صرف اللہ تعالیٰ کو سمجھے۔

﴿اَلۡعَزِيۡزِ الۡحَكِيۡمِ﴾

"فالعزيز اشارة الى كمال قدرته" اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت "عزیز" ذکر فرما کر اس طرف اشارہ کیا کہ اسے کمال قدرت حاصل ہے۔

"والحكيم اشارة الى كمال علمه فلا يخفى عليه حاجات العباد ولا يعجز عن اجابة الدعوات"

اور رب تعالیٰ نے اپنی صفت حکیم ذکر فرما کر یہ بتایا کہ اللہ کو کامل اور حقیقی علم حاصل ہے وہ اپنے بندوں کی حاجات کو جانتا ہے، ان کی کوئی حاجت ان پر مخفی نہیں، اور ان کی دعاؤں کو قبول کرنے سے کوئی چیز اسے عاجز نہیں کر سکتی۔ جس ذات کی یہ شان ہے اس کا امداد کرنا سوائے اس کی رحمت کے نہیں، اور نہ ہی اس کی اعانت حاصل ہے سوائے اس کے فضل و کرم کے۔ (کبیر)

اعتراض: انهم لو كانوا اجساما كثيفة وجب ان يراهم الكل وان كانوا اجساما لطيفة هوائية تعذر ثبوتهم على الخيل"

فرشتے اگر اجسام کثیفہ تھے تو ضروری تھا کہ ان کو سب لوگ دیکھتے، اگر اجسام لطیفہ ہوائیہ تھے تو ان کو گھوڑوں پر سوار متعذر (مشکل) ہے، پتہ چلا کہ فرشتے گھوڑوں پر سوار ہو کر امداد کیلئے آئے تھے یہ قول درست نہیں۔

جواب: یہ اعتراض قوانین شریعت کے خلاف ہے، اور نہ ہی وہ اعتراض کرسکتا ہے جو یہ اعتراف کرے "انه تعالی قادر علی مایشاء فعال لمایرید" کہ اللہ تعالیٰ قادر ہے ہر چیز پر جسے وہ چاہے، اور وہ کرتا ہے جس کام کا وہ ارادہ کرتا ہے، جب قرآن پاک کی آیات میں واضح طور پر فرشتوں کا آنا اور امداد کرنا ثابت ہے اور احادیث سے ثابت ہے جو متواتر کے قریب ہیں تو ان کا انکار بہرہ اور گونگا ہی کرسکتا ہے "فکأن الاصم اصم عن سماعه او اعمی عن رؤیة رباعه" گویا کہ کفر کی وجہ سے جو بہرہ ہے وہ آیات واحادیث کو سننے سے بھی بہرہ ہے، اور کفر کی وجہ سے جو حق راہ کو دیکھنے سے اندھا ہے وہ قرآن پاک کی آیات مبارکہ اور احادیث مبارکہ کو حق دیکھنے سے بھی اندھا ہے۔ (روح المعانی)

اعتراض: اکیلے جبریل نے لوط علیہ السلام کی قوم کو زیروزبر کردیا تھا، فرشتے جب بدر میں آگئے تھے تو لوگوں کو لڑائی کرنے کا حکم کیوں دیا گیا، اور اتنے فرشتوں کے آنے کا کیا فائدہ تھا ایک جبریل ہی کفار قریش کو قتل کرسکتے تھے۔

جواب: لوط علیہ السلام کی قوم جب مستحق عذاب ہوگئی تو وہ دائرہ تکلیف (مکلف ہونے) سے باہر آگئے، اس لئے جبریل نے ان کو زیروزبر کردیا، لوگوں کو ان سے لڑنے کا حکم نہیں دیا گیا کیونکہ وہ تمام گمراہ تھے سوائے لوط علیہ السلام کے اور ان کی بچیوں کے، لیکن یہاں تو صحابہ کرام مکلف تھے اسلئے ان کو لڑائی کرنے کا حکم دیا گیا، جہاں تک اس اعتراض کا تعلق ہے کہ اتنی تعداد میں فرشتے کیوں آئے صرف جبریل ہی کافی تھے، اس کی وجہ پہلے بیان کی جاچکی ہے کہ فرشتے لڑائی کرنے کیلئے نہیں آئے تھے صرف مسلمانوں کے اطمینان قلب کیلئے آئے تھے، ہاں کہیں کہیں کفار پر ضرب بھی لگادی جیسا کہ پہلے حدیث پاک سے یہ مسئلہ ثابت کیا جاچکا ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

"فان الانسان معتاد بتثبت الاسباب فیطمئن قلبه عند ملاحظة الاسباب بالنصر عند کثرة الاعوان"

اصل وجہ یہ ہے کہ انسان کی ایک عادت ہے کہ وہ اسباب کا سہارا لیتا ہے، جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ امداد کے ظاہری اسباب پائے گئے ہیں، اور کثیر مددگار پائے گئے ہیں تو اس کا دل مطمئن ہوجاتا ہے۔

(مظہری)

یہی وجہ ہے کثیر تعداد میں فرشتوں کے آنے کی، صحابہ کرام چونکہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی پر کامل ایمان رکھتے تھے آپ نے جب رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی سنادیا تو انہوں نے اس پر ایمان لایا کہ ہاں یقیناً کثیر تعداد میں فرشتے ہماری امداد کو آگئے، کہیں کہیں کسی فرشتے کو انسانی شکل میں گھوڑے پر سوار بعض صحابہ نے دیکھ بھی لیا۔

لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ۝ (آیۃنمبر ۱۲۷)

(1) اس لئے کہ کافروں کا ایک حصہ کاٹ دے یا انہیں ذلیل کرے کہ نامراد پھر جائیں۔ (کنزالایمان)

(2) تاکہ کاٹ دے ایک حصہ کافروں کا یا ذلیل کردے ان کو کہ وہ لوٹیں محروم ہوکر۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

"لِيَقْطَعَ" میں "لام کی" جو حقیقت میں لامِ جارہ ہی ہوتا ہے اس کا تعلق ﴿وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ﴾ سے ہے۔

"والمعنى ان المقصود من نصركم بواسطة امداد الملائكة هو ان يقطعوا طرفا من الذين كفروا اى يهلكوا طائفة منهم ويقتلوا قطعة منهم"

مطلب یہ ہے کہ تمہاری فرشتوں کے ذریعے امداد کرنے کا مقصد یہ ہے کہ کافروں کی ایک طرف کو کاٹ دیا جائے یعنی ایک گروہ کو ہلاک کردیا جائے کہ وہ میدان جنگ میں قتل کردئے جائیں۔ "لِيَقْطَعَ" کا تعلق" **ولتطمئن قلوبكم به**" سے بھی کیا گیا ہے، البتہ اس صورت میں حرف عطف واؤ کو حذف کیا گیا ہے، اس صورت میں مطلب یوں ہو جائے گا، یہ امداد تمہارے لئے اللہ تعالیٰ نے بشارت بنائی اور تمہارے دلوں کو اطمینان پہنچانے کیلئے، تاکہ اس امداد کے ذریعے تمہارے دلوں کو اطمینان حاصل ہو خاص کر کے کافروں کے ایک حصہ کے کٹ جانے سے تمہارے دلوں کو اور زیادہ اطمینان حاصل ہو جائے۔ "**طرفا**" **اى طائفة وقطعة** "" **طرفا**" کا معنی ایک گروہ اور ایک ٹکڑا، ایک حصہ، "طرف" ذکر کیا، وسط ذکر نہیں کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ وسط تک پہنچنے کیلئے ضروری ہے کہ پہلے ایک طرف سے شروع کرے، اس سے جنگی تدبیر میں بتادی، جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا "**قاتلوا الذين يلونكم**" قتال کروان لوگوں سے جو تمہارے قریب ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

یعنی پہلے ایک طرف کے قریب لوگوں سے جنگ کی جائے، ان کو ختم کر کے آگے بڑھا جائے، ایسا نہ ہو کہ ایک مرتبہ ہی درمیان میں گھس جائے، کفار ادھر ادھر سے گھیرے میں لے کر اسے شکست سے دوچار نہ کردیں۔

"**اويكبتهم**" "**يذلهم بالهزيمة**" (جلالین) یا ان کو شکست دے کر ذلیل وخوار کردے، **الكبت :فتاء ہ مبدلة من الدال وهو الغيظ الذى يحرق الكبد**" "**الكبت**" اصل میں "**الكبد**" ہے، دال کو تاء بنایا گیا، کبد کا معنی ہے "جگر" کلیجہ" پھر" کبت "اس غیظ وغضب پر بولا گیا جس سے جگر اور کلیجہ جل اٹھے۔ (صاوی)

اسی مناسبت سے لغت میں یہ معنی بھی استعمال ہے۔ "الکبت فی اللغة صرع الشئی علی وجهه" "الکبت" کا لغوی معنی یہ ہے "کسی چیز کا چہرا کے بل گر جانا" "اوندھا ہونا" "سرنگوں ہونا، الٹا ہونا کہ سر نیچے اور پاؤں اوپر ہونا وغیرہ اس قسم کے معانی میں عام طور پر استعمال ہوتا رہتا ہے، اسی طرح کہا جاتا ہے "کبته فانکبت" میں نے اسے چہرے کے بل گرایا تو وہ گر گیا۔

"والمراد به الاخزاء والاهلاک واللعن والهزیمة والغیظ والاذلال فکل ذلک ذکره المفسرون فی تفسیر الکبت"

مفسرین کرام نے "کبت" کی تفسیر میں مرادی معانی مختلف بیان کئے ہیں تقریباً مقصد سب کا ایک ہی ہے، وہ معانی یہ بیان کئے گئے ہیں "رسوا کرنا، ہلاک کرنا، لعنت کرنا، شکست دینا، غیظ وغضب کرنا اور ذلیل کرنا۔ (کبیر)

﴿فَيَنْقَلِبُوْا خَائِبِيْنَ﴾ "کہ وہ لوٹیں محروم ہو کر۔"

وقوله (خائبین) الخیبة هی الحرمان "خیبۃ کا معنی ہے محروم ہونا، اسی وجہ سے **راقم** نے یہی ترجمہ کیا ہے" کہ وہ لوٹیں محروم ہو کر" "خیبة" اور "یاس" میں فرق یہ ہے "ان الخیبة لاتکون الابعد التوقع واما الیاس فانه قد یکون بعد التوقع وقبله" کہ بیشک "خیبة" اس محرومیت اور رسوائی پر بولتے ہیں جو توقع کے بعد حاصل ہو، کام کے ہونے کی توقع تھی لیکن وہ کام نہ ہوا بلکہ محرومیت حاصل ہوئی، اور یاس کبھی توقع کے بعد امید کے ختم ہونے پر بولتے ہی، اور کبھی اس پر بولتے ہیں کہ توقع تو نہیں تھی لیکن پہلے ہی کام ہونے کی امید ختم ہوگئی۔ فنقیض الیاس الرجاء ونقیض الخیبة الظفر "والله اعلم، یاس کی نقیض "رجاء" ہے، یعنی "یاس" کا معنی ناامید ہونا، اور رجاء کا معنی ہے "امید رکھنا" اور خیبۃ کی نقیض "ظفر" ہے "خیبة" کا معنی ہے کامیاب نہ ہونا، اور "ظفر" کا معنی ہے "کامیاب ہونا۔ (کبیر)

علامہ رازی رحمہ اللہ کی تفسیر کبیر کو دیکھنے کے بعد اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ بہت خوب نظر آئے گا، آپ نے یوں ترجمہ کیا "کہ نامراد پھر جائیں۔

تنبیہ: بعض مفسرین کرام نے اس آیۃ کریمہ کو غزوہ احد کے متعلق ذکر کیا ہے، لیکن زیادہ جمہور محققین نے بدر کے ساتھ متعلق کیا ہے، اگر غزوہ احد کے ساتھ متعلق ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ جب تم نے درہ کو چھوڑ دیا تھا اور بظاہر نبی کریم ﷺ کے حکم کی تم سے اجتہادی خطاء سے مخالفت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے تمہاری امداد کی کہ سولہ یا اٹھارہ کافر قتل

ہو گئے تھے، اور تمہیں میدان جنگ میں قائم رکھ کر ان کو رسواء کر کے لوٹا دیا۔ (ماخوذ از کبیر)

تنبیہ: (لیقطع طرفا من الذین کفروا) بالقتل والاسر" (جلالین)

تا کہ کاٹ دے ایک طرف کافروں کی، یعنی ان کو قتل کرا کے اور قید کرا کے ان کی طرف کاٹ دیا جائے، یعنی ستر کی تعداد میں وہ قتل ہو گئے اور ستر قید ہو گئے، یہی تفسیر البحر المحیط میں بھی ہے۔

لَیۡسَ لَکَ مِنَ الۡاَمۡرِ شَیۡءٌ اَوۡ یَتُوۡبَ عَلَیۡہِمۡ اَوۡ یُعَذِّبَہُمۡ فَاِنَّہُمۡ ظٰلِمُوۡنَ ۝ (آیۃ نمبر ۱۲۸)

(1) یہ بات تمہارے ہاتھ نہیں یا انہیں توبہ کی توفیق دے یا ان پر عذاب کرے کہ وہ ظالم ہیں۔ (کنز الایمان)

(2) نہیں ہے آپ کیلئے کسی امر سے کوئی چیز، یہاں تک کہ وہ ان کی توبہ قبول کرے، یا ان کو عذاب دے بیشک وہ ظالم ہیں۔ (نجوم الفرقان)

مقام پر خطر ایمان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھنا:

(لَیۡسَ لَکَ مِنَ الۡاَمۡرِ شَیۡءٌ) ای لاتملک لهم نفعا فتصلحهم ولا ضرا فتهلكهم فنفى ذلک من حيث الايجاد والاعدام وامامن حيث الدلالة والشفاعة فهو الدليل الشفيع المشفع جعل الله مفاتيح خزائنة بيده فمن زعم ان النبی ﷺ كآحاد الناس لايملک شيئا اصلا ولا نفع به لاظاهرا ولا باطنا فهو كافر خاسر الدنيا والآخرة واستدلاله بهذه الآية ضلال مبين" (صاوی)

"آپ کیلئے کسی امر میں کوئی خبر نہیں" یہ راقم نے لغوی ترجمہ کیا ہے، مطلب اس کا تفسیر صاوی میں بہت خوب بیان کیا گیا ہے، کہ آپ کے ہاتھ میں کسی چیز کا موجود کرنا یعنی تخلیق کرنا یا کسی چیز کا معدوم کرنا یعنی فوت کرنا نہیں، کہ آپ ذاتی طور پر ان کو نفع نہیں پہنچا سکتے جو ان کیلئے نفع مند ہو اور نہ ہی آپ ذاتی طور پر ان کو نقصان پہنچا سکتے ہیں جو ان کو ہلاک کر دے۔

"والمعنى ان الله مالک امرهم على الاطلاق فاما ان يهلكم اويكبتهم اويتوب عليهم ان اسلموا اويعذبهم تعذيبا شديدا اخرويا ان اصروا" (روح البیان)

معنی یہ ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ ان کے تمام امور کا مطلقاً مالک ہے، ان کو ہلاک یا ان کو ذلیل ورسوا کرے یا ان کو ایمان کی توفیق عطاء کر دے کہ وہ ایمان لے آئیں تو ان کی توبہ قبول کر لے، اور اگر وہ کفر پر اصرار

کریں تو ان کو شدید اخروی عذاب دے"

(فانھم ظالمون)قد استحقوا التعذیب بظلمھم " (بیشک وہ ظالم ہیں) یعنی بوجہ ظلم کرنے کے وہ مستحق عذاب ہیں۔عنوان کے مطابق تفسیر صاوی کی بعد والی عبارت پر توجہ کریں" کہ نبی کریم ﷺ سے ایجاد کرنے اور معدوم کرنے کی نفی کی گئی ہے، جہاں تک راہنمائی کرنے اور شفاعت کرنے کا تعلق ہے اس میں آپ کو اختیار دیا گیا ہے،آپ کو رب تعالی نے "شافع مشفع" بنایا ہے کہ آپ شفاعت فرماتے ہیں اور آپ کی شفاعت کو قبول کیا جاتا ہے آپ کے ہاتھوں میں اللہ تعالی نے خزانوں کی چابیاں دے دیں، جو شخص یہ گمان کرے کہ نبی کریم ﷺ امت کے عام آدمیوں کی طرح ہیں، کسی چیز کے ظاہرا اور باطنا مالک نہیں وہ کافر ہے دنیا اور آخرت میں خسارت میں ہے، اگر کوئی اس آیۃ کریمہ سے نبی کریم ﷺ کے اختیار کی نفی ثابت کرنے کی کوشش تو وہ واضح گمراہ ہے، اور اس کا یہ باطل استدلال کھلی گمراہی ہے۔

شان نزول میں چند احتمالات:

اگر چہ بظاہر چند احتمالات نظر آرہے ہیں لیکن تمام ہی حقیقت میں معتبر ہیں۔کئی واقعات کے بعد آیۃ کریمہ جب نازل ہو تو وہ سب ہی مجموعی طور شان نزول ہوتے ہیں۔

(۱) شان نزول میں ایک قول یہ ہے کہ یہ آیہ کریمہ غزوہ احد کے متعلق نازل ہوئی جب نبی کریم ﷺ کا دانت مبارک شہید کر دیا گیا اور آپ کا سر مبارک زخمی کر دیا گیا۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ بیر معونۃ کے متعلق نازل ہوئی، جہاں حفاظ وقراء کو شہید کر دیا گیا تھا۔

شان نزول کی مکمل تفصیل:

پہلا قول: جب پہلا قول مراد لیا جائے لیا جائے کہ یہ آیۃ کریمہ غزوہ احد کے متعلق نازل ہوئی تو اس میں پھر تین احتمال ہیں۔

ایک احتمال یہ ہے:

"وقیل اراد ان یدعو علیھم فنزلت ھذہ الآیۃ" کہ نبی کریم ﷺ نے ارادہ فرمایا کہ احد والے کفار

کے خلاف دعاء کریں کہ وہ تباہ و برباد ہو جائیں، تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی جس سے آپ کو منع کیا گیا کہ یہ معاملہ رب تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے آپ نے احد میں شریک کفار کے متعلق دعاء ہلاکت کرنے کا ارادہ کیوں فرمایا؟ اس کی وجہ اس حدیث پاک سے دیکھئے۔

❁ عن انس ابن مالک ان رسول اللہ ﷺ کسرت رباعیته وشج فی راسه فجعل یسلت الدم عنه ویقول کیف یفلح قوم شجوانبیهم و کسروا رباعیته وهو یدعوهم الی اللہ تعالی فانزل اللہ تعالی "لیس لک من الامرشیٔ"

حضرت انس ابن مالک ؓ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ کا جب رباعیہ دانت کا کچھ حصہ شہید کر دیا گیا (آپ کا سر مبارک زخمی کر دیا گیا تو آپ وہ خون صاف کر رہے تھے اور ارشاد فرما رہے تھے وہ قوم کیسے فلاح پائے گی جنہوں نے اپنے نبی کے سر اور چہرہ کو زخمی کر دیا اور دانت کا ایک حصہ شہید کر دیا حالانکہ وہ نبی ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتا ہے (تو اس وقت آپ نے ارادہ فرمایا کہ ان کیلئے دعاء ہلاکت کریں) تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیۃ کریمہ نازل فرمائی۔

دوسرا احتمال اس میں یہ ہے:

❁ روی احمد والبخاری عن ابن عمر قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول اللهم العن فلانا، وفی روایة اللهم العن اباسفیان اللهم العن الحارث بن هشام اللهم العن سهیل بن عمرو اللهم العن صفوان ابن امیة فنزلت هذه الآیة الی آخر فتیب علیهم کلهم"

مسند احمد اور بخاری نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ذکر کی کہ آپ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا "اے اللہ فلاں پر لعنت کر" ایک روایت میں (صراحۃً مذکور) ہے کہ آپ یہ کہہ رہے تھے "اے اللہ ابوسفیان پر لعنت بھیج، اے اللہ حارث بن ہشام پر لعنت بھیج، اے اللہ سہیل بن عمرو پر لعنت بھیج، اے اللہ صفوان بن امیہ پر لعنت بھیج تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی، یہ تمام لوگ ایمان لے آئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ کو قبول فرمالیا۔

تیسرا احتمال اس میں یہ ہے:

❁ وقال سعید بن المسیب ومحمد بن اسحاق لما رأی رسول اللہ ﷺ والمسلمون یوم احد ما نال اصحابهم من جزع الآذان والانوف وقطع المذاکیر قالوا لئن انالنا اللہ منهم لنفعلن بهم مثل مافعلوا ولنمثلن بهم مثلة، لم یمثلها احد من العرب باحد، فانزل

الله هذه الآية وقيل اراد النبی ﷺ ان يدعو عليهم بالاستيصال فنزلت هذه الآية "

سعید بن میتب اور محمد بن اسحاق کہتے ہیں جب رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں نے احد کے دن دیکھا کہ بعض صحابہ کرام (حضرت حمزہ ؓ) کے کان اور ناک کاٹ دیئے گئے، اور ان کا آلہ تناسل کاٹ دیا گیا یعنی ان کو مثلہ بنا دیا گیا، تو انہوں نے کہا اگر ہمیں موقع ملا تو ہم بھی کافروں کو مثلہ بنا کر ان کی شکلوں کو بگاڑ دیں گے، کیونکہ اس سے پہلے عرب میں کسی ایک نے بھی کسی کو مثلہ نہیں بنایا تھا، یہ پہلا موقع تھا جہاں کفار نے مثلہ بنانے کا رواج قائم کیا، رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرما کر مسلمانوں کو اس ارادہ سے منع فرما دیا، کہ انہوں نے اگر غلط کام کیا ہے تو تم اس کے جواب میں ایسا نہ کرنا، اور بعض روایات میں ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی اس حالت کو دیکھ کر نبی کریم ﷺ نے ارادہ فرمایا کہ ان کی تباہی و بربادی کی دعاء کی جائے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا۔ (ماخوذ از کبیر و مظہری)

روایات میں تطبیق کیسے؟

ابھی تک جو روایات بیان کی گئی ہیں ان میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے غزوۂ احد میں کافروں کے تباہ و برباد ہو جانے کی دعاء کا ارادہ کیا، بلکہ چند لوگوں پر نام لے کر لعنت بھی فرمائی، لیکن دوسری روایت ان روایات کے خلاف نظر آتی ہے، جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے۔

۞ **عن ابن مسعود قال كانی انظر الی رسول الله ﷺ يحكی نبيا من الانبياء ضربه قومه وهو يمسح الدم عن وجهه ويقول "رب اغفر لی لقومی فانهم لايعلمون"**

حضرت ابن مسعود ؓ فرماتے ہیں کہ میں گویا کہ اب بھی رسول اللہ ﷺ کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ انبیاء کرام میں سے ایک نبی کی حکایت بیان کر رہے تھے کہ اللہ کے نبی کو اس کی قوم نے مارا، وہ اللہ کا نبی اپنے چہرے سے خون صاف کر رہا تھا اور یہ کہہ رہا تھا، اے میرے رب میری قوم کی مغفرت فرما بیشک وہ نہیں جانتے۔

"قال علماؤنا فالحاكی فی حديث ابن مسعود هو الرسول ﷺ وهو المحكی عنه"

علماء کرام نے بیان کیا ہے ابن مسعود ؓ کی اس حدیث میں مراد یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ خود اپنا واقعہ بیان فرما رہے تھے، اگرچہ غائب کے صیغے استعمال کئے ہیں، لیکن دوسری روایت میں وضاحت موجود ہے۔

۞ **انه ﷺ لما كسرت رباعيته وشج وجهه يوم احد شق ذلك على اصحابه شقا شديدا وقالوا لو دعوت عليهم فقال انی لم ابعث لعانا ولكن بعثت داعيا ورحمة اللهم اغفر لقومی فانهم لايعلمون"**

نبی کریم ﷺ کے دانت مبارک کا کچھ حصہ احد کے دن شہید کر دیا گیا، آپ کا سر مبارک اور چہرا زخمی کر

دیا گیا تو آپ کے صحابہ کرام پر شاق گذرا بڑی شدید کوفت ہوئی صحابہ کرام کو، انہوں نے عرض کیا'' کاش آپ ان لوگوں کے خلاف دعاء ہلاکت کر دیتے'' تو آپ نے فرمایا بیشک مجھے لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا، لیکن مجھے دعاء کرنے والا اور رحمت بنا کر بھیجا گیا، اے اللہ میری قوم کی مغفرت فرما دے بیشک وہ نہیں جانتے۔ (ماخوذ از قرطبی)

وجۂ تطبیق : جب تک نبی کریم ﷺ کو کافروں کے خلاف دعاء ہلاکت کرنے سے منع نہیں کیا گیا اس وقت تک آپ نے ان کے خلاف دعاء کی لیکن وہ بھی اس وقت جبکہ کافروں نے اللہ تعالیٰ کے احکام میں خلل ڈالنے کی کوشش کی، ذاتی تکلیف کی وجہ سے آپ نے کسی کے خلاف دعاء نہیں کی، جب آپ کو منع فرما دیا گیا تو اس کے بعد آپ نے کفار کے خلاف دعاء ہلاکت نہیں کی۔ (راقم)

"قال القفال رحمه الله وكل هذه الاشياء حصلت يوم احد فنزلت هذه الآية عندالكل فلايمتنع حملها على كل الاحتمالات "

قفال رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ احد کے ساتھ متعلق تمام واقعات پہلے گئے، آیۃ کریمہ بعد میں نازل ہوئی، اسلئے آیۃ کریمہ تمام احتمالات کو شامل ہے۔ (کبیر)

دوسرا قول : دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ بئر معونہ کے واقعہ کے بعد نازل ہوئی، بئر معونۃ کا واقعہ مختصر اس روایت میں دیکھئے، تفصیلی واقعہ مدارج النبوت سے (انشاء اللہ قریب ہی ذکر کیا جائے گا۔

۞ **عن ابن عمر انه سمع رسول الله ﷺ اذارفع رأسه من الركوع في الركعة الاخيرة من الفجر يقول اللهم العن فلاناوفلاناوفلانابعد مايقول سمع الله لمن حمده ربنالك الحمدفانزل الله عليه ليس لک من الامرشئی الى قوله فانهم ظالمون "** (رواه البخاری)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنھما سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے سنا جب آپ نے اپنا سر مبارک فجر کی دوسری رکعت کے رکوع سے اٹھایا تو آپ فرما رہے تھے اے اللہ فلاں، فلاں، فلاں پر لعنت فرما، یہ دعا آپ رکوع سے سر اٹھا کر "سمع الله لمن حمده" اور "ربنالک الحمد" کے بعد پڑھ رہے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ مکمل آیہ کریمہ ﴿لَيْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَئٌ﴾ نازل فرمائی، تو آپ کو دعاء سے منع فرما دیا، یہ دعا بئر معونہ کے بعد کی گئی۔

بئر معونہ کا تفصیلی واقعہ:

ہجرت کو چوتھے سال ماہ صفر میں بئر معونہ کا واقعہ درپیش آیا، بئر معونہ کا نام سریۃ المنذر بن عمرو، اور سریۃ

القریٰ بھی ہے، بئر معونہ ہذیل کے شہروں میں سے ایک موضع ہے، جو مکہ اور عسفان کے درمیان واقع ہے، اس جگہ کا ابو براء عامر بن مالک بن جعفر مدینہ منورہ میں آیا، وہ قبیلہ نجد اور بنی عامر سے تھا، اور نبی کریم ﷺ کی مجلس میں آیا، نبی کریم ﷺ نے اسے دعوت اسلام دی لیکن اس نے اسلام تو قبول نہ کیا، البتہ دین اسلام کی اس نے بہت تعریف کی، کہ آپ کا دین مبارک ہے، اور آپ ملت حنیف پر قائم ہیں، اس نے کہا میری قوم بہت بڑی ہے آپ صحابہ کی ایک جماعت کو میرے ساتھ بھیجیں تا کہ وہ ان کو تبلیغ کریں ہوسکتا ہے وہ ایمان لے آئیں، اس کا مطلب یہ تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی دعوت کو قبول کرلوں، اور آپ کے حکم کی اطاعت کروں لیکن میں اپنی قوم کا لحاظ کرتا ہوں، وہ ایمان لائیں گے تو میں بھی ایمان لے آؤں گا، نبی کریم ﷺ نے اصل واقعہ کے متعلق پہلے ہی خبر دے دی، اور ارشاد فرمایا کہ میں نجدیوں سے بے خوف نہیں ہوں مجھے خطرہ ہے کہ وہ سرکشی کریں گے۔

ابو عامر نے کہا آپ فکر نہ کریں آپ کے صحابہ میری پناہ اور میری حفاظت میں ہوں گے، آپ ان کی تبلیغ دین کیلئے ضرور بھیجیں، نبی کریم ﷺ پر لازم ہوگیا تھا کہ آپ تبلیغ دین کیلئے صحابہ کرام کی ایک جماعت کو بھیجیں، اگر چہ اصل سامنے آنے والے حالات سے بھی باخبر کردیا، آپ نے اپنے ستر صحابہ کرام کو ان کے ساتھ بھیج دیا، جو حفاظ اور قراء تھے، یہ فقراء تھے جو جنگل سے لکڑیاں لا کر ازواج مطہرات کی خدمت میں پیش کرتے تھے، اور بیچ کر اصحاب صفہ کیلئے بھی کھانا لاتے تھے، یہ زیادہ انصاری حضرات تھے، جب رات آئی تو نماز، ذکر، اور تلاوت قرآن میں مشغول ہوئے صحابہ کرام کی اس جماعت کا امیر حضرت منذر بن عمرو کو بنایا، اور کچھ خطوط بھی نجد اور بنی عامر کے رئیسوں کے نام لکھ کر ان کو دیئے۔

ابو براء عامر بن مالک کا ایک بھتیجا عامر بن طفیل بن مالک تھا جو سرکش، دین کا مخالف اور مسلمانوں کا دشمن تھا، برخلاف اس کے ابو براء عامر سرکش نہیں تھا اور مسلمانوں سے اسے دشمنی اور عداوت نہ تھی، مسلمانوں کی جماعت جب بئر معونہ پر پہنچی تو انہوں نے اونٹوں کو چرانے کیلئے عمرو بن امیہ ضمری اور حارث بن صمہ کے سپرد کیا، اور حضور ﷺ کا خط خرام بن ملجان کے سپرد کیا، یہ بنی عامر کی طرف مبعوث تھے۔

خیال رہے کہ اس وقت کی اصطلاح میں امیر خاص ہوتا تھا، اور مبعوث امیر سے عام ہوتا تھا، خرام اپنے ساتھ دو آدمیوں کو لے کر گئے تا کہ نبی کریم ﷺ کے خطوط عامر بن طفیل تک پہنچائیں، انہوں نے اپنے دونوں ساتھیوں کو پیچھے رکھا کہ پہلے میں جاتا ہوں، ان سے امان طلب کرتا ہوں، اگر انہوں نے امان دے دی تو تم بھی آجانا کہ میں تمہارے لئے بھی امان طلب کرلوں گا اگر انہوں نے امان نہ دی مجھے شہید کردیا تو تم اپنے ساتھیوں سے جا کر مل جانا۔

خرام نے ان لوگوں سے امان طلب کی کہ مجھے امان دو تا کہ میں رسول اللہ ﷺ کا مکتوب گرامی تم تک پہنچاؤں،

لیکن عامر بن طفیل نے کسی آدمی کو اشارہ کیا جس نے نیزہ مارا وہ پار ہو کر دوسری طرف نکل گیا۔ اسکے بعد خرام نے اپنے چہرے سے خون صاف کرتے ہوئے کہا "اللہ اکبر فزت برب الکعبہ" رب کعبہ کی قسم میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں'' یعنی رسول اللہ ﷺ کے حکم کی بجا آوری میں، میں نے شہادت حاصل کر لی، عامر بن طفیل نے اپنے قبیلہ بنی عامر سے امداد طلب کی کہ تم میرے ساتھ بئر معونہ کی طرف چلو تا کہ وہاں پہنچ کر مسلمانوں کو قتل کر دیں، لیکن اس کے قبیلہ کے لوگوں نے انکار کر دیا کہ مسلمانوں کو ابو عامر نے پناہ دے رکھی ہے اسلئے ہم اس کے وعدہ کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتے، اس نے دوسرے قبائل سلیم، رعل، اور ذکوان کے پاس آدمی بھیج کر ان سے امداد طلب کر لی۔ اس نے اپنے ساتھ کثیر جماعت جمع کر لی اور بئر معونہ کی طرف روانہ ہو گیا، وہاں مسلمانوں کو گھیرے میں لے لیا، مسلمان جب گھیرے میں آ گئے تو رب تعالی کے حضور عرض کیا اے مولاء کائنات ہمارا اسلام رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچا دے، تو رب تعالی کے حکم سے جبریل نے ان دردمندوں کا سلام بارگاہ نبوی میں پیش فرمایا۔

نبی کریم ﷺ نے پہلے ہی صحابہ کرام کو خبر دے دی کہ تمہارے ساتھی مصیبت میں مبتلاء ہو گئے اور حق تعالی سے مناجات کر رہے ہیں کہ ہمارے حال کی خبر ہمارے ساتھیوں کو پہنچا، ہم تیری رضاء چاہتے ہیں، جس میں تو راضی ہے ہم بھی اس میں راضی ہیں۔ صحابہ کرام نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا، ان کے پاس اسلحہ نہیں تھا، کفار زیادہ تعداد میں تھے اور مسلح تھے، صحابہ کرام جوانمردی، ثابت قدمی سے مقابلہ کرتے ہوئے سب ہی شہید ہو گئے، ابھی تک منذر بن عمرو کو ان لوگوں نے شہید نہیں کیا تھا بلکہ ان کو امان دینے کی پیشکش دی، لیکن انہوں نے اسے ٹھکرا دیا، آخر کار یہ بھی کافروں سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے، مسلمانوں کو ایک سبق دے دیا کہ مسلمانوں کے لشکر کے امیر، جنگی جرنیل وقائد کفار کے سامنے سر نہ جھکانا بلکہ جرأت اور بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہو جانا کہیں ضمیر فروش بن کر، ایمان فروش کر کافروں سے صلح کر کے، مسکراہٹ سے سر جھکا کر معاہدہ پر دستخط نہ کرنا، مسلمانوں کا اسلحہ کافروں کے حوالہ کر کے ہمیشہ کیلئے مسلمانوں کی گردن میں ذلت کا طوق نہ ڈال دینا۔

عمر بن عمیر ضمیری اور حارث بن صمہ جو اونٹوں کو چراگاہ کی طرف لے گئے تھے، واپس آئے تو دیکھا کہ گرد و غبار چھایا ہوا ہے اور لشکر والے مقام پر پرندے اڑ رہے ہیں، اور کافروں کا لشکر بلندی پر چڑھ رہا ہے یعنی بلند گھائیوں کے راستہ واپس جا رہا ہے، ادھر دیکھا کہ ہمارے تمام ساتھی شہید ہو گئے ہیں، ان دونوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے عمرو بن عمیر نے کہا ہمیں رسول اللہ ﷺ کے پاس واپس چلا جانا چاہئے، لیکن حارث بن صمہ نے کہا شہادت حاصل کرنے کا بہت اچھا موقع ہے اسے اپنے ہاتھ نہ جانے دیا جائے، یہ دونوں کافروں پر جھپٹ

پڑے، حارث نے دو کافروں کو قتل کر دیا، کافروں نے جب ان کو قید کرنا چاہا تو حارث کے سر سے خون بہہ رہا تھا لیکن پھر بھی دو اور کافروں کو قتل کر دیا، بعد میں خود بھی شہید ہو گئے، لیکن عمرو بن عمیر کو قید کر لیا گیا، عامر بن طفیل نے ان کو اپنا غلام بنا کر سر منڈا کر آزاد کر دیا، اس لئے کہ اس کی ماں پر ایک غلام آزاد کرنا لازم تھا، ان کو اجازت دی کہ تم آزاد ہو مدینہ (منورہ) جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔

عامر بن طفیل نے عمرو بن عمیر سے پوچھا تم اپنے ساتھیوں کو پہچانتے ہو؟ انہوں نے کہا ہاں سب کو پہچانتا ہوں، وہ ان کے ساتھ آیا، ایک ایک کا نام ونسب پوچھا جو آپ نے بتا دیا، اس نے پوچھا کیا تمہارا کوئی آدمی غائب بھی ہے، انہوں نے کہا ہاں عامر بن فہیرہ جو حضرت ابو بکر صدیق ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے وہ بھی ہمارے ساتھ تھے لیکن یہاں موجود نہیں، اس نے پوچھا وہ کیسا شخص تھا؟ انہوں نے بتایا وہ ہم سے فاضل ترین شخص تھا اور سب سے اول اسلام لانے والوں سے تھا، تو عامر بن طفیل نے کہا جب ان کو شہید کیا گیا تو میں نے دیکھا کہ ان کو آسمان کی طرف اٹھا کر لے جایا جا رہا ہے، عامر بن طفیل نجدی ملعون، شقی القلب کتنا ہی بدنصیب اور بدبخت تھا کہ صحابہ کرام کی جماعت مقدسہ کی برکات وکرامات کو دیکھ کر بھی اس کے دل میں اثر نہ ہوا اور ایمان نہ لایا بنی کلاب کا ایک شخص جبار بن سلمی جو کافروں کے درمیان تھا، اس سے منقول ہے کہ جب میں نے عامر بن فہیرہ کو نیزہ مارا تو وہ دوسری طرف پار ہو گیا، تو میں نے سنا وہ کہہ رہا ہے "فزت برب الکعبہ" رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا، میں نے دیکھا کہ اسے آسمانوں پر لے جایا جا رہا ہے، اس منظر کو دیکھ کر میں دل میں سوچنے لگا کہ عامر کے الفاظ "فزت برب الکعبہ" کا حقیقی مطلب کیا ہو سکتا ہے؟ تو میں نے بعد میں ایک مسلمان ضحاک بن سفیان کلابی سے ان الفاظ کا مطلب پوچھا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ اس کا مطلب یہ تھا "فزت برب الکعبہ" رب کعبہ کی قسم میں جنت میں جانے میں کامیاب ہو گیا، یہ سن کر جبار بن سلمی نے اسلام قبول کر لیا، سبحان اللہ سعادت مند لوگ کرامات کو دیکھ کر ایمان لے آتے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے

﴿اِنَّمَا تُنۡذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكۡرَ وَخَشِیَ الرَّحۡمٰنَ بِالۡغَیۡبِ فَبَشِّرۡهُ بِمَغۡفِرَةٍ وَّاَجۡرٍ كَرِیۡمٍ﴾

"جو ذکر کی تابعداری کرتے ہیں اور بے دیکھے رحمٰن سے ڈرتے ہیں انہیں کو آپ کا ڈرانا مؤثر ہے تو انہیں مغفرت اور اجر کریم کی بشارت دیجئے۔"

بخاری نے بھی عامر بن طفیل کے قول کو ذکر کیا کہ میں نے دیکھا عامر کو آسمانوں پر لے جایا جا رہا ہے، قسطلانی کہتے ہیں کہ واقدی کی روایت میں ہے ان کو زمین نے چھپا لیا، پھر کافروں نے دیکھا، ابو براء چونکہ اپنی ذمہ داری پر صحابہ کرام کی اس جماعت کو لے کر گیا تھا، اور اس وقت کافر بھی وعدے کا پاس کرتے تھے، اسلئے ابو براء اپنے بھتیجے عامر

بن طفیل کی غداری سے بہت زیادہ شرمندہ ہوا، لیکن ایمان نہ لا سکا، فرق یہ تھا کہ عامر بن طفیل پر شیطان غالب رہا یہ مسلمان کا شدید مخالف رہا، اور اس نے بھی ایمان نہ لایا، اور ابو براء پر دنیا غالب رہی وہ بھی ایمان نہ لایا، کافر دونوں ہی رہے البتہ ایک سرکش اور مسلمانوں سے عناد رکھنے والا تھا، اور دوسرا کچھ نرم گوشہ رکھنے والا تھا" نبی کریم ﷺ نے دعاء فرمائی "اللھم اکفنی عامرا" اے اللہ ہمیں عامر سے بچا" وہ یہ تھی وہ غدار، دھوکہ باز تھا، کسی قانون کا اپنے آپ کو پابند نہیں سمجھتا تھا، ایسا شخص پر خطر ہوتا ہے کہ وعدہ اور کرے، اور کام اور کرے، جب فقراء اصحاب رسول کے شہید ہونے کی خبر پہنچی تو رسول اللہ ﷺ بہت زیادہ غمزدہ اور پریشانی ہوئے، تو نبی کریم ﷺ نے ایک ماہ اور چالیس دن کے قریب قنوت نازلہ پڑھی اور چند قبائل کے خلاف دعاء ہلاکت فرمائی۔ (ماخوذ از مدارج النبوۃ جلد نمبر ۲)

قنوت نازلہ کا ثبوت احادیث سے:

حدثنا عمر و بن عثمان حدثنا بقية عن ابی حمزة قال حدثنی محمد قال حدثنی سعيد بن المسيب و ابو سلمة بن عبدالرحمن ان اباهريرة كان يحدث ان رسول الله ﷺ كان يدعو فی الصلوة حين يقول سمع الله لمن حمده ربنا لک والحمد ثم يقول وهو قائم قبل ان سجد اللهم انج الوليد بن الوليد و سلمة بن هشام و عياش ابن ابی ربيعة و المستضعفين من المؤمنين اللهم اشدد وطاتک علی علی مضر و اجعلها عليهم كسنی يوسف ثم يقول الله اكبر فيسجد و ضاحية مضر يؤمئذ مخالفون لرسول الله ﷺ (نسائی باب القنوت فی الصبح)

حضرت ابوہریرہ ﷺ حدیث بیان کرتے تھے کہ بیشک رسول اللہ ﷺ نماز میں دعاء کرتے تھے جبکہ "سمع الله لمن حمدة" اور "ربنا ولك الحمد" کہہ لیتے تھے، پھر آپ کھڑے ہو کر سجدہ سے پہلے یہ کہتے تھے، اے اللہ ولید ابن ولید اور سلمہ بن ہشام اور عیاش بن ربیعہ اور کمزور وضعیف مؤمنین کو نجات دے، اے اللہ مضر کو ذلیل کر اور ان کو اس طرح قحط سالی میں مبتلاء کر جیسے یوسف ﷺ کی قوم قحط سالی میں مبتلاء ہوئی تھی، پھر آپ اللہ اکبر کہہ کر سجدہ کرتے (مضر قبیلہ کے خلاف دعاء کرنے کی وجہ یہ تھی) کہ مضر رسول اللہ ﷺ کے (دین کے) مخالف تھے۔

حدثنا محمد حدثنا سفيان قال خفظناه من الزهری عن سعيد عن ابی هريرة قال لما رفع رسول الله ﷺ رأسه من الركعة الثانية من صلوة الصبح قال انج الوليد بن الوليد و سلمة بن هشام و عياش بن ربيعة و المستضعفين بمكة اللهم اشدد وطاتک علی مضر و اجعلها عليهم سنين كسنی يوسف" (نسائی باب القنوت فی الصبح)

حضرت ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ جب اپنا سر صبح کی نماز کی دوسری رکعت سے اٹھاتے تو یہ دعاء کرتے (دعاء کا ترجمہ وہی جو پہلی حدیث میں بیان کیا ہے) قنوت نازلہ جب تک جائز رہا اسی کے مطابق مسلم نے یہ عنوان قائم کیا۔

باب استحباب القنوت فی جمیع الصلوات اذانزلت نازلة العیاذباللہ واستحبابه فی الصبح دائماوبیان ان محله بعد رفع الرأس من الرکوع فی الرکعة الاخیرة واستحباب الجهریة" (مسلم شریف جلداول صفحہ نمبر ۲۵۷)

باب اس کے بیان میں کہ قنوت تمام نمازوں میں پڑھنا مستحب ہے جبکہ مسلمانوں پر کوئی مصیبت نازل ہو "العیاذ باللہ" خصوصاً صبح کی نماز میں ہمیشہ پڑھنا مستحب ہے، اور باب اس چیز کے بیان میں کہ قنوت نازلہ کا محل آخری رکعت کے رکوع سے سر اٹھانے کے بعد ہے، اور باب اس چیز کے بیان میں کہ قنوت نازلہ کا محل آخری رکعت کے رکوع سے سر اٹھانے کے بعد ہے، اور مستحب یہ ہے کہ بلند آواز سے پڑھے، یہ تھا مسلم شریف کا عنوان جس میں بیان کیا گیا ہے کہ مصیبت کے تمام نمازوں میں قنوت نازلہ پڑھا گیا ہے، اور صبح کی نماز میں زیادہ مرتبہ پڑھا گیا ہے۔

تنبیہ: نبی کریم ﷺ نے ایک ماہ یا کچھ دن زائد قنوت نازلہ پڑھا، پھر اسے پڑھنا چھوڑ دیا یعنی اب قنوت نازلہ پڑھنا درست نہیں کیونکہ یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے۔

قنوت نازلہ کی منسوخیت احادیث سے:

عن عاصم قال سألت انس بن مالک عن القنوت فقال قدکان القنوت قبل الرکوع اوبعده قال قبله قال فان فلانااخبرنی عنک انک قلت بعدالرکوع فقال کذب انماقنت رسول اللہ ﷺ بعد الرکوع شهرااراه کان بعث قومایقال لهم القراء زهاء سبعین رجلاالی قوم مشرکین دون اولئک وکان بینهم وبین رسول اللہ ﷺ عهدفقنت رسول اللہ ﷺ شهرایدعوعلیهم"

(بخاری باب القنوت قبل الرکوع وبعدہ، مسلم باب استحباب القنوت فی جمیع الصلوات)

عاصم کہتے ہیں میں نے حضرت انس بن مالک ﷺ سے قنوت کے متعلق پوچھا کہ رکوع کے بعد ہے یا پہلے؟ انہوں نے کہا رکوع سے پہلے، یہ کہتے ہیں، میں نے کہا مجھے تو ایک شخص نے تمہارے متعلق خبر دی ہے کہ تم کہتے ہو رکوع کے بعد قنوت ہے، انہوں نے کہا اس شخص نے جھوٹ بولا ہے، ہاں البتہ یقینی بات ہے رسول اللہ ﷺ نے ایک مہینہ رکوع کے

بعد قنوت پڑھا جب آپ نے تقریباً ستھر اشخاص کو مشرک قوم کی طرف بھیجا وہ لوگ جن کو بھیجا گیا تھا ان کو قراء کہا جاتا تھا، لیکن مشرک ان کے درپے ہوئے (ان کو شہید کر دیا گیا) حالانکہ ان لوگوں نے درمیان اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان عہد تھا (ان کی وعدہ شکنی اور نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام کو شہید کرنے کی وجہ سے) نبی کریم ﷺ نے ان کے خلاف ایک مہینہ تک دعاء کی، اس حدیث سے واضح ہوا وتر کا قنوت رکوع سے پہلے ہے، قنوت نازلہ رکوع کے بعد ہے، وہ ایک مہینہ تک پڑھا گیا، پھر چھوڑ دیا گیا، اب منسوخ ہو چکا ہے۔

۞ عن محمد قال قلت لانس هل قنت رسول الله ﷺ في صلوة الصبح قل نعم بعد الركوع يسيرا" (بخاری باب القنوت قبل الرکوع وبعدہ، مسلم باب استحباب القنوت فی جمیع الصلوات)

محمد (ابن سیرین) کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس ؓ سے پوچھا کیا نبی کریم نے صبح کی نماز میں قنوت پڑھا ہے؟ انہوں نے کہا ہاں رکوع کے بعد تھوڑا عرصہ پڑھا ہے۔

عن ابي مجلز عن انس بن مالك قال قنت رسول الله ﷺ شهرا بعد الركوع في صلوة الصبح يدعو على رعل و ذكوان ويقول عصية عصت الله ورسوله (بخاري باب غزوة الرجيع ورعل و ذكوان، باب استحباب القنوت في جميع الصلوات)

ابومجلز حضرت انس بن مالک ؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے صبح کی نماز میں رکوع کے بعد ایک مہینہ قنوت پڑھا، رعل اور ذکوان (قبائل) کے خلاف دعاء کی اور فرمانے لگے ''قبیلہ عصیہ'' اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کا نافرمان ہے۔

۞ عن محمد بن سيرين عن انس بن مالك ان رسول الله ﷺ قنت شهرا بعد الركوع في صلوة الفجر يدعو على بني عصية" (مسلم باب استحباب القنوت فی جمیع الصلوات)

حضرت انس بن مالک ؓ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے صبح کی نماز کے بعد ایک ماہ قنوت (نازلہ) پڑھا اور بنی عصیہ کے خلاف دعاء کرتے رہے۔

۞ عن قتادة عن انس ان رسول الله ﷺ قنت شهرا يدعو على (احياء من) احياء العرب ثم تركه" (مسلم باب استحباب القنوت فی جمیع الصلوات)

حضرت قتادہ فرماتے ہیں حضرت انس ؓ نے فرمایا بیشک رسول اللہ ﷺ ایک مہینہ عرب کے بعض قبائل کے خلاف دعاء فرماتے رہے پھر اسے چھوڑ دیا، اس مضمون کی اور کئی احادیث ہیں جن سے ثابت ہو رہا ہے کہ قنوت نازلہ منسوخ ہو چکا ہے۔

فائدہ : ابھی تک جو احادیث ذکر کی گئی ہیں، ان سے ضمناً یہ مسئلہ ثابت ہوا کہ وتر میں قنوت رکوع سے پہلے پڑھا

گیا، اور قنوت نازلہ رکوع کے بعد پڑھا گیا پھر چھوڑ دیا گیا، اور یہ بات ثابت ہوئی کہ تمام نمازوں میں قنوت نازلہ پڑھا گیا، لیکن صبح کی نماز میں زیادہ پڑھا گیا پھر منسوخ ہو گیا۔

تنبیہ: غیر مقلدین وتر میں رکوع کے بعد قنوت پڑھتے ہیں، اپنے اس موقف پر جب دلیل پیش کرتے ہیں تو قنوت نازلہ والی احادیث پیش کرتے ہیں، یا تو لفظ قنوت کو دیکھ کر انہوں نے یہی سمجھا کہ وتر کا قنوت اور قنوت نازلہ ایک چیز ہے، یعنی وہ قنوت وتر اور قنوت نازلہ میں فرق نہیں سمجھے کہ قنوت وتر ہمیشہ کیلئے جاری ہے اور قنوت نازلہ ایک ماہ یا کچھ دن زائد پڑھا گیا پھر چھوڑ دیا گیا، اے حنفیو میری دعاء بھی آپ کیلئے ہے آپ بھی کوشش کریں کہ غیر مقلدین کے جال میں پھنسنے سے بچ جائیں۔

شان نزول کے اقوال میں کوئی اختلاف نہیں:

ایک قول کے مطابق اس آیۃ کریمہ کا شان نزول غزوہ احد کا واقعہ ہے، اور دوسرے قول کے مطابق بئر معونہ کا واقعہ ہے، اور جن احادیث میں بعض قبائل پر لعنت کا ذکر ہے ان میں بنی لحیان کا بھی ذکر آتا ہے، بنی لحیان بئر معونہ میں شریک نہیں تھے بلکہ سریہ رجیع میں شریک تھے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ سریہ رجیع میں شرکاء کے خلاف دعاء کی گئی، بظاہر ان اقوال میں تعارض نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں کوئی تعارض نہیں، اسلئے کہ سریہ رجیع اور بئر معونہ بہت قریب قریب ہیں، اسی لئے صاحب مواہب لدنیہ نے بیان کیا ہے کہ سب خبریں (یعنی سریہ رجیع اور بئر معونہ کی) رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک ہی وقت پہنچیں، اسی وجہ سے ایک دعاء میں مختلف طوائف وقبائل کو شامل کر لیا گیا، بخاری کی حدیث میں جو بنی لحیان کا ذکر ہے اس کی توجیہ بھی یہی ہے۔ (ماخوذ از مدارج النبوۃ حصہ دوم، ذکر بئر معونہ)

"ویحتمل ان یقال ان قصة رعل وذکوان کان عقیب غزوة احد باربعة اشهر فی صفر سنة اربع من الهجرة فلعلها نزلت فی جمیع ذلک وتاخیر نزول الآیة عن سبب نزولها قلیلا غیر مستبعد"

غزوہ احد کے چار ماہ بعد صفر کے مہینہ میں ہجرت کے چوتھے سال رعل وذکوان مسلمانوں کے قتل عام میں شریک ہوئے، اسلئے نبی کریم ﷺ نے احد میں بھی کافروں کے خلاف دعاء کی اور سریہ رجیع میں شریک ہونے والے کافروں کے خلاف بھی دعاء کی اور بئر معونہ والے کافروں کے خلاف بھی دعاء کی تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی، کسی آیۃ کریمہ کا کچھ واقعات کے بعد کچھ تاخیر سے نازل ہونا کوئی بعید نہیں۔ (مظہری)

نبی کریم ﷺ کو کافروں کے خلاف دعاء سے کیوں منع کیا گیا؟

والحکمة فی منعه ﷺ من الدعاء علیهم ولعنهم ان الله تعالی علم من حال بعض الکفار انه سیسلم فیتوب علیهم او سیولد من بعضهم ولد یکون مسلما برا تقیا فلاجل هذا المعنیٰ منعه الله تعالی من الدعاء علیهم لان دعوته ﷺ مجابة ولو دعا علیهم بالهلاک هلکوا اجمیعا" (خازن)

نبی کریم ﷺ کو کافروں کے خلاف دعاء کرنے سے منع کرنے میں حکمت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کو علم حاصل ہے کہ بعض کافر مسلمان ہو جائیں گے، کفر سے تائب ہو جائیں گے ان کی توبہ قبول کر لی جائے گی، اور کئی کافر وہ ہیں جو خود تو کافر ہی رہیں گے لیکن ان کی اولاد مسلمان ہو جائے گی، اور وہ لوگ نیک اور پرہیزگار ہو جائیں گے، اس وجہ سے آپ کو دعاء کرنے سے منع کیا کہ اگر آپ نے دعاء کر دی تو اسے قبول کیا جائے گا کافر سب ہلاک ہو جائیں گے، حالانکہ ان میں سے بعض نے اسلام قبول کرنا ہے، اور بعض کی اولاد نے اسلام قبول کرنا ہے۔

سریہ رجیع کے متعلق بخاری کی ایک روایت:

حدثنی ابراهیم بن موسی اخبرنا هشام بن یوسف عن معمر عن الزهری عن عمرو ابن ابی سفیان الثقفی عن ابی هریرة ﷺ قال بعث النبی سریة عینا و امر علیهم عاصم بن ثابت وهو جد عاصم بن عمر بن الخطاب فانطلقوا حتی اذا کان بین عسفان ومکة ذکروا الحی من هذیل یقال لهم بنو لحیان فتبعوهم بقریب من مائة رام فاقتصوا آثارهم حتی اتوا منزلا نزلوه فوجدوا فیه نوی تمر تزوده من المدینة فقالوا هذا تمر یثرب فتبعوا آثارهم حتی لحقوهم فلما انتهی عاصم واصحابه لجؤا الی فدفد وجاء القوم فاحاطوا بهم فقالوا لکم العهد والمیثاق ان نزلتم الینا ان لا نقتل منکم رجلا فقال عاصم اما انا فلا انزل فی ذمة کافر اللهم اخبر عنا نبیک فقاتلوهم حتی قتلوا عاصما فی سبعة نفر بالنبل، وبقی خبیب وزید ورجل آخر فاعطوهم العهد والمیثاق فلما اعطوهم العهد والمیثاق نزلوا الیهم فلما استمکنوا منهم حلوا اوتار قسیهم فربطوهم بها فقال الرجل الثالث الذی معهما هذا اول الغدر فابی ان یصحبهم فجرروه وعالجوه علی ان یصحبهم فلم یفعل فقتلوه وانطلقوا بخبیب وزید حتی باعوهما بمکة فاشتری خبیبا بنو الحارث بن عامر بن نوفل وکان خبیب هو قتل الحارث یوم بدر فمکث عندهم اسیرا حتی اذا اجمعوا قتله استعار موسی من بعض بنات الحارث لیستحد بها فاعارته قالت فغفلت عن صبی لی فدرج الیه حتی اتاه فوضعه علی فخذه

فلما رأيته فزعت فزعة عرف ذاك مني وفي يده الموسى فقال اتخشين ان اقتله ماكنت لافعل ذلک ان شاء الله وكانت تقول مارأيت اسيراقط خيرامن خبيب لقدرأيته ياكل من قطف عنب ومابمكة يومئذثمرة وانه لموثق في الحديدوماكان الارزق رزقه الله فخرجوابه من الحرم ليقتلوه فقال دعوني اصلي ركعتين ثم انصرف اليهم فقال لولاان تروا ان مابي جزع من الموت لزدت فكان اول من سن الركعتين عند القتل هوثم قال اللهم احصهم عددا،ثم قال:

مابالي حين اقتل مسلما علي اى شق كان لله مصرعي

وذلک في ذات الاله وان يشا يبارک علي اوصال شلوممزع

ثم قام اليه عقبة بن الحارث فقتله وبعثت قريش الى عاصم ليئوتوابشئ من جسده يعرفونه وكان عاصم قتل عظيمامن عظمائهم يوم بدرفبعث الله عليه مثل الظلة من الدبرفحمته من رسلهم فلم يقدروامنه علي شئ"

حضرت ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے ایک سریہ (چھوٹے لشکر) کو جاسوسی کیلئے بھیجا، اوران پر عاصم بن ثابت کوامیر بنایا، یہ نانا تھے حضرت عاصم بن عمر بن الخطاب کے، یہ لوگ چلے یہاں تک کہ عسفان اور مکہ کے درمیان پہنچے تو ہذیل قبیلہ کوان کی اطلاع مل گئی، ان کو بنی لحیان کہا جاتا تھا ان لوگوں نے صحابہ کرام کا ایک سو تیراندازوں سے خبر ملتے ہی پیچھا کیا، یہاں تک کہ وہ لوگ وہاں پہنچ گئے جہاں یہ اترے تھے، وہاں انہوں نے کھجوروں کی گٹھلیاں پائیں جو صحابہ کرام مدینہ طیبہ سے زادراہ لے کر گئے تھے، انہوں نے کہا یہ تو یثرب کی کھجوریں ہیں، انہوں نے صحابہ کرام کے قدموں کے نشانوں پر چلتے ہوئے ان کو پالیا، عاصم ﷺ اور دوسرے صحابہ نے پہاڑ کی پناہ لی، لیکن انہوں نے صحابہ کرام کو گھیرے میں لے لیا، انہوں نے کہا ہم تمہارے ساتھ وعدہ کرتے ہیں کہ اگر تم ہمارے پاس آجاؤ تو ہم تم میں سے کسی ایک کو بھی قتل نہیں کریں گے عاصم نے کہا میں کسی کافر کے وعدہ اور امان پر اعتبار کرتے ہو نیچے نہیں اترتا، پھر دعاء کی اے اللہ اپنے نبی کو ہماری خبر پہنچادے، کفار نے ان حضرات سے لڑائی کی تو یہ مقابلہ کرتے ہوئے سات آدمی شہید ہوگئے، ایک حضرت عاصم اور چھ دوسرے (چونکہ کفار ایک سو تیرانداز اور تین سو غیر مسلح تھے، لیکن مسلمان صرف دس تھے اور وہ بھی بہت معمولی اسلحہ رکھتے تھے) ان میں سے حضرت خبیب اور حضرت زید، اور ایک تیسرے شخص (جن کا نام ابن اسحاق کی روایت میں واضح طور پر عبداللہ بن طارق ظفری آیا ہوا ہے) باقی رہ گئے، کفار نے ان کو امان دینے کا وعدہ کیا، وہ نیچے اتر آئے، کافر جب ان پر قادر ہوگئے تو ان کے تیر کے کمانوں کے وتر (چمڑے کے دھاگے) کھولے، اور ان کو باندھ لیا، تیسرے شخص (عبداللہ بن طارق) نے کہا یہ پہلا غدر (دھوکہ) ہے، انہوں نے

کافروں کے ساتھ چلنے سے انکار کردیا، کفار نے ان کو گھسیٹا اور بہت کوشش کی کہ یہ ہمارے ساتھ چلیں، لیکن انہوں نے انکار کردیا، کفار نے ان کو شہید کردیا۔

حضرت خبیب اور حضرت زید رضی اللہ عنہما کو یہ قید کر کے مکہ میں لے گئے تاکہ ان کو بیچ دیں، حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو حارث بن عامر بن نوفل کے بیٹوں نے خرید لیا کیونکہ انہوں نے بدر میں حارث کو قتل کیا تھا، یہ ان کے پاس قیدی کی حیثیت سے رہے، جب ان سب نے حضرت خبیب کو شہید کرنے پر اتفاق کرلیا، تو انہوں نے حارث کی بیٹیوں میں سے کسی ایک بیٹی سے استرہ طلب کیا تاکہ زیر ناف بال دور کرلیں، اس نے ان کو عاریۃً استرہ دے دیا، وہ کہتی ہے میں اپنے ایک چھوٹے بچے سے غافل ہوگئی، وہ اچانک خبیب کے پاس چلا گیا خبیب نے اسے ران پر بٹھا لیا، میں نے جب یہ منظر دیکھا تو میں بہت زیادہ ڈرگئی، خبیب نے میرے ڈر کو پہچان لیا اور اس کے ہاتھ میں استرہ بھی تھا، اس نے کہا کیا تو ڈرگئی کہ میں اس بچے کو قتل کردوں گا، میں ان شاء اللہ ایسا کبھی نہیں کروں گا، وہ کہتی ہے میں نے خبیب سے اچھا کوئی قیدی نہیں دیکھا، وہ کہتی ہے میں نے انگور کا (گچھہ) کھاتے ہوئے دیکھا، حالانکہ مکہ میں ان دنوں میں (انگور کا) پھل موجود نہیں تھا آپ لوہے کی بیڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے، آپ کو کھانے کی کوئی خبر نہیں دی جارہی تھی لیکن اللہ تعالیٰ آپ کو رزق عطاء فرما رہا تھا، جب کفار نے آپ کو حرم سے نکالا تاکہ ان کو قتل کردیں، آپ نے کہا مجھے اجازت دو کہ میں دو رکعت نفل ادا کرلوں، دو رکعت ادا کر کے آپ خود ہی کافروں کے پاس پہنچ گئے، آپ نے کہا اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ تم کہو گے میں موت سے گھبرا رہا ہوں تو میں اور زیادہ نماز ادا کرتا، سب سے پہلے قتل کے وقت دو رکعت نفل ادا کرنے کو آپ نے ہی جاری کیا جو آپ کی سنت ہے پھر آپ نے عرض کیا (میرے قتل میں شریک) سب کو تو برباد کردے، پھر آپ نے دو شعر پڑھے جن کا ترجمہ یہ ہے۔

(مجھے کوئی پرواہ نہیں جب میں حالت اسلام میں شہید کردیا جاؤں، کہ اللہ کیلئے میں کس کروٹ پر گر رہا ہوں۔ یہ سب کچھ اللہ کی رضاء کی خاطر ہے، وہ چاہے، تو میرے اعضاء کو علیحدہ کر کے مجھے برکت عطاء کردے)

پھر عقبہ بن حارث ان کی طرف کھڑا ہوا اور انہیں شہید کردیا، قریش نے وہاں کچھ لوگوں کو بھیجا جہاں حضرت عاصم کو شہید کیا گیا تھا تاکہ ان کے جسم کا کچھ حصہ کاٹ کر لے آئیں، ہم اس کو پہچانیں کہ یہ عاصم ہی ہے، کیونکہ انہوں نے بدر میں ان کے ایک بڑے لیڈر (عقبہ بن معیط کو نبی کریم ﷺ کے حکم سے) قتل کردیا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک لشکر بھیج دیا جس نے ان پر سایہ کردیا، اور اللہ کی بھیجی ہوئی مخلوق نے ان کی حفاظت کی، کفار ان کے کسی عضو کو کاٹنے پر قادر نہ ہوسکے۔

وضاحت حدیث:

بخاری کے باب سے بعض حضرات غلطی میں پڑھے انہوں نے یہ سمجھا کہ بئر معونہ اور سریہ رجیع کا واقعہ ایک ہے۔

"ولیس کذلک لان غزوة الرجیع کانت سریة عاصم وخبیب فی عشرة انفس وهی مع عضل والقارة وبئر معونه کانت سریة القراء السبعین وهی مع رعل وذکوان"

حالانکہ ایک واقعہ نہیں، کیونکہ سریہ رجیع میں امیر عاصم ہیں، اور خبیب اس میں ہے، یہ دس افراد پر مشتمل قافلہ تھا، ان کا مقابلہ عضل اور قارہ گاؤں کے لوگوں سے ہوا، اگرچہ بخاری نے عضل اور قارہ کا ذکر نہیں کیا لیکن ابن اسحاق کی روایت میں یہ ذکر موجود ہے، اور بئر معونہ کے سریہ میں ستر قراء تھے جن کو شہید کیا گیا، اس میں امیر منذر بن عمرو تھے، اور نائب امیر خرام بن ملحان تھے، اس میں کفار قبائل اور ذکوان تھے۔

غزوہ اور سریہ میں فرق:

دو طرح کا ان میں فرق جس جنگ میں نبی کریم ﷺ نے شرکت کی اسے غزوہ کہا جاتا ہے اور جس میں آپ نے شرکت نہیں کی اسے سریہ کہا جاتا ہے، اور دوسرا فرق یہ ہے کہ بڑا لشکر جو کم از کم چار سو افراد پر مشتمل ہو اسے غزوہ کہا جاتا ہے، اور اس سے کم کو سریہ کہا جاتا ہے۔

۞ غزوہ بدر کی بحث میں ہے "بعث عشرة عینا" یہاں مذکور ہے "بعث النبی ﷺ سریة عینا" اور غزوہ کی روایت میں ہے "بعثهم عیونا الی مکة لیاتوه بخبر قریش" ان تمام الفاظ کا مجموعی مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سریہ (رجیع) میں دس صحابہ کرام کو جاسوسی کیلئے بھیجا کہ وہ قریش کی خبر لا کر دیں "امر" میں میم مشدد ہے، یعنی امیر بنایا "اللهم اخبر نبیک" عاصم نے دعاء کی اے اللہ اپنے نبی کو ہماری خبر پہنچا دے۔

"وفی روایة الطیالسی عن ابراهیم بن سعد فاستجاب الله عاصم فاخبر رسوله خبره اصحابه بذلک یوم اصیبوا"

طیالسی نے ابراہیم بن سعد سے روایت کی کہ اللہ تعالیٰ نے عاصم کی دعاء کو قبول کر لیا، اور اپنے رسول اللہ ﷺ کو ان کی خبر دے دی، اور آپ نے اپنے صحابہ کرام کو ان حضرات کی شہادت کی خبر دے دی "من بعض بنات الحارث" حدیث شریف میں حارث کی بعض بیٹیوں کا جو ذکر ہے، اس کا نام زینب بنت حارث ہے جو حضرت خبیب ﷺ کے قاتل عقبہ بن حارث کی بہن ہے۔

مقام توجہ : بخاری شریف کی اس روایت میں، اور ایک روایت میں جو ذکر ہے اس سے مراد مشہور

خبیب یعنی خبیب بن عدی ہیں، وہی بدر میں حاضر ہوئے، انہوں نے ہی حارث کو قتل کیا تھا، صرف حافظ دیا مطی نے تمام معروف روایات سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بدر میں شریک ہونے والے خبیب بن اساف ہیں، اسی نے حارث کو قتل کیا وہ خزرجی ہیں، اور خبیب بن عدی اوسی ہیں، راقم کے نزدیک بخاری وغیرہ کا قول ہی صحیح نظر آتا ہے،

"من قطف عنب" بکسر القاف وهو العنقود" قطف کے قاف کے نیچے زیر ہے، مراد گچھہ اور خوشہ ہے

"لموثق بالحديد "اى مقيد بالحديد" آپ کو لوہے کی بیڑیوں سے جکڑا ہوا تھا، "دعونى اصلى "بعض روایات "اصل" بغیر یاء کے ہے کہ مضارع جواب امر میں مجزوم ہے، جن روایات میں یاء ہے، ان میں "لامکی" محذوف ہے، اصل میں "لاصلی" ہے، آپ نے دو رکعت جو ادا کیں وہ مقام تنعیم میں ادا کیں۔

"اللهم احصهم عددا" دعاء عليهم بالاستئصال والهلاك بحيث لايبقى منهم احد"

حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے جو قاتلین کے خلاف دعاء کی "اللهم احصهم عددا" اس کا لغوی معنی تو یہ ہے "اے اللہ ان کی تعداد کو گن لے" اور مرادی معنی یہ ہے اے اللہ ان کو تباہ و برباد کر دے تا کہ ان میں سے کوئی بھی باقی نہ رہے۔ ایک روایت میں "واقتلهم بددا" آیا ہوا ہے، جس کا معنی ہے ان کو متفرق متفرق کر کے قتل کر دے"

"مثل الظلة" بضم الظاء المعجمة وهى السحابة "قوله من الدبر بفتح الدال المهملة وسكون الباء المواحدة وهى الزنابير، وقيل ذكور النحل"

ظلمة کا معنی ہے بادل اور "دبر" کا معنی ہے "بھڑ" یا شہد کی مذکر مکھیاں" مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی بھیجی ہو مخلوق بھڑوں اور شہد کی مکھیوں نے ان پر بادل کی طرح سایہ کر دیا، "فحمته اى منعته" اس مخلوق نے ان کے جسم کی حفاظت کی، کافروں کو ان کے جسم تک نہ پہنچنے دیا، وہ ان کے جسم سے کسی ایک عضو کو بھی نہ کاٹ سکے۔

(عمدۃ القاری، جزء ۱۷ صفحہ نمبر ۱۶۸، ۱۶۹)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ O (آیۃ نمبر ۱۲۹)

(1) اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے، اور جو کچھ زمین میں ہے، جسے چاہے بخشے اور جسے چاہے عذاب کرے اور اللہ بخشنے والا مہربان۔ (کنز الایمان)

(2) اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں، بخشش کرتا ہے جس کو چاہے اور عذاب دیتا ہے جسے چاہے، اور اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ (نجوم الفرقان)

﴿وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ﴾ "اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں"

"ای ملکا (بالضم) وملکا (بالکسر) وخلقا واقتدارا" سب چیزوں پر اسے ہی بادشاہی حاصل ہے اور سب چیزیں اسی کی مملوک ہیں، اور سب چیزیں اسی کی مخلوق ہیں، اور سب چیزوں پر اسے ہی قدرت حاصل ہے کسی ایک کو اس میں دخل اندازی کی کوئی طاقت حاصل نہیں۔ 'فالامر کله یفعل مایشاء ویحکم مایرید" تمام امور اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں، وہ جو چاہے وہی کرتا ہے، اور وہ جو ارادہ کرتا ہے وہی حکم دیتا ہے۔ (روح المعانی)

"ولم یقل (من) لان الامر الاشارة الی الحقائق والماهیات فدخل فیه الکل"

لفظ "ما" ذکر کیا ہے "من" نہیں ذکر کیا، اسی لئے کہ "ما" سے مراد تمام حقائق اور ماہیات ہیں کہ سب چیزیں خواہ ان کا تعلق حقائق سے ہو یا ماہیات سے ہو وہ اللہ کی مخلوق ہیں اور اسی کی مملوک ہیں "یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ" (بخشش کرتا ہے جس کو چاہے اور عذاب دیتا ہے جسے چاہے)

اہل سنت وجماعت کا مذہب:

اس مسئلہ میں اہل سنت وجماعت کا مذہب یہ ہے کہ کہ سب کائنات اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور مملوک ہے، اللہ تعالیٰ اپنی ملکیت میں جو چاہے تصرف کرے، اسے یہ حق حاصل ہے۔

"انه سبحانه له ان یدخل الجنة بحکم الهیته جمیع الکفار والمردة، وله ان یدخل النار بحکم الهیته جمیع المقربین والصدیقین"

کہ وہ پاک ذات اپنے معبود ہونے اور خالق ومالک ہونے کے لحاظ سے جو چاہے تصرف کرے، خواہ وہ تمام کفار اور

سرکشوں کو جنت میں داخل کردے" یہ اس کا حق ہے، خواہ وہ چاہے کہ اپنے معبود ہونے کے لحاظ سے مقربین وصدیقین کو جہنم میں داخل کردے، اس پر کوئی شخص اعتراض نہیں کرسکتا۔

"فعل الله لایوجب علی الله شیئا البتة فلاالطاعة توجب الثواب ولاالمعصیة توجب العقاب"

اللہ تعالیٰ پر کوئی فعل واجب نہیں، نہ طاعت پر ثواب دینا اس پر واجب ہے اور نہ ہی معصیت پر عقاب دینا اس پر واجب ہے، بلکہ تمام امور اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔

اعتراض : الیس انه ثبت انه لایغفرلکفار ولایعذب الملائکة ولانبیاء" کیا یہ بات یقینی طور پر ثابت نہیں کہ بیشک وہ کافروں کی بخشش نہیں فرمائے گا، اور فرشتوں اور انبیاء کرام کو عذاب نہیں دے گا، پھر اس کا مطلب کیا کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو نیک لوگوں کو عذاب دے دے اور چاہے تو کفار کو بخش دے۔

جواب : قلنامدلول الآیة انه لواراد لفعل ولااعتراض علیه وهذاالقدرلایقتضی انه یفعل اولایفعل" آیۂ کریمہ سے یہ ثابت ہورہا ہے "اگر وہ ارادہ کرتا تو ایسے کرلیتا" کیونکہ ساری کائنات اس کی مخلوق ہے، اپنی مخلوق اور مملوک میں جو چاہے تصرف کرے، اتنے مسئلہ میں کوئی اعتراض نہیں، اور نہ ہی اس سے یہ لازم آرہا ہے کہ وہ ایسے کرے گا یا نہیں کرے گا۔ اسی وجہ سے روح المعانی تفسیریوں کی گئی:

(یغفر لمن یشاء)ان یغفر له من المؤمنین فلا یعاقبه علی ذنبه فضلامنه "(ویعذب من یشاء)ان یعذبه عدلامنه" (روح المعانی)

"وہ مغفرت فرماتا ہے جس کے چاہے" یعنی وہ چاہے تو مؤمنوں کی مغفرت فرمادے، انہیں عذاب نہ دے یہ اس کے فضل کا فیصلہ ہے، اور جسے چاہے عذاب دے یہ اس کے عدل کا فیصلہ ہوگا۔

معتزلہ کا مذہب : وہ کہتے ہیں یہ جائز ہی نہیں کہ بغیر توبہ کہ اللہ تعالیٰ کسی کی مغفرت کرے۔

اہلسنت اور معتزلہ کا آسان لفظوں میں فرق:

اہل سنت کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا مغفرت فرمانا اور عذاب دینا کسی شرط سے مقید نہیں، اللہ تعالیٰ جو چاہے وہ کرتا ہے اس کیلئے کوئی مانع نہیں، معتزلہ کے نزدیک مغفرت مشروط ہے توبہ نہ کرنے سے، یعنی ان کے نزدیک جائز ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ بغیر توبہ کے کسی کی مغفرت کرے، لیکن اہل سنت کے نزدیک یہ جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر توبہ کے اپنے فضل سے مغفرت فرمادے۔

معتزلہ کی دلیل : انہوں نے اپنے مذہب پر حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کی ایک روایت پیش کی۔

"روی عن الحسن انه قال یغفر لمن یشاء بالتوبة ولا یشاء ان یغفر الا للتائبین ویعذب من یشاء ولا یشاء ان یعذب الا المستوجبین للعذاب"

حضرت حسن بصری کہتے ہیں "وہ جس کی چاہے مغفرت کرے" اس کا مطلب ہے توبہ کے ذریعے وہ مغفرت فرماتا ہے وہ نہیں چاہتا کہ مغفرت فرمائے سوائے توبہ کرنے والوں کے، اور عذاب دیتا ہے جسے چاہے وہ نہیں چاہتا کہ عذاب دے سوائے مستحقین عذاب کے۔

وعن عطاء یغفر لمن یتوب الیه ویعذب من لقیه ظالما" عطاء کہتے ہیں وہ مغفرت فرماتا ہے اس کی جو توبہ کرے، اور وہ عذاب دیتا ہے اسے جو اس سے حالت ظلم میں ملاقات کرے، یعنی گناہوں سے توبہ نہ کر کے گناہ ساتھ لے جائے اس حال میں رب تعالیٰ سے ملاقات کرے، گناہ بھی حقیقت میں ظلم ہی ہیں۔

معتزلہ کی دوسری دلیل :

ان المذنب اذا علم انه لا یعاقب علی ذنبه کان ذلک تقریرا له واغراء للغیر علیه وهذا ینافی حکمة ارسال الرسل علیهم السلام"

وہ کہتے ہیں گنہگار کو جب یہ پتہ چلے گا کہ اسے عذاب نہیں دیا جاتا تو وہ گناہ پر قائم رہے گا، اور گناہ کرنے پر دلیر ہوگا، اور غیر کو بھی گناہوں پر ابھارے گا، یہ رسولوں کے بھیجنے کی حکمت کے مخالف ہے۔

اہل سنت و جماعت کی طرف سے رد:

"فالآیة ظاهرة فی نفی الوجوب علی الله تعالی وانه یجوز ان یغفر سبحانه للمذنب ویعذب المصلح"

آیۃ کریمہ ظاہر طور پر واضح کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں اس کیلئے جائز ہے کہ گناہگار کی مغفرت کردے اور نیک کو عذاب دے، اگرچہ وہ کسی نیک کو عذاب دیتا نہیں، فقط اس کی قدرت واختیار میں ہے، البتہ گنہگار کو اپنے فضل سے بخش دے تو اس کی مرضی کی بات ہے، کافر کی وہ اپنے وعدہ کے مطابق مغفرت فرماتا نہیں، اگرچہ اس کے اختیار میں ہے کہ وہ مغفرت کردے، جو روایات انہوں نے پیش کی ہیں ان کی اسناد کا ہی پتہ نہیں، لھذا ان سے استدلال باطل ہے، ان کی عقلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ اہلسنت و جماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ جس کی مغفرت چاہے اسے بخش دے اس کے ساتھ توبہ کی کوئی قید نہیں، اور کون دعوی کرسکتا ہے کہ میری گناہوں کو رب نے ضرور بخشا ہے،

جب کسی کو علم ہی نہیں کہ رب نے کس کی مغفرت کرنی ہے تو گناہوں پر قائم رہنا اور گناہوں پر دلیر ہونا یہ قول ہی باطل ہے۔ (ماخوذ از شیخ زادہ وروح المعانی)

﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ ''اور اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے''

اس سے واضح کیا کہ اللہ تعالیٰ کی جہت احسان جہت گرفت پر غالب ہے۔ (از روح المعانی)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ○
(آیۃ نمبر ۱۳۰)

(1) اے ایمان والو! سود دونا دون نہ کھاؤ، اور اللہ سے ڈرو اس امید پر کہ تمہیں فلاح ملے۔ (کنز الایمان)

(2) اے ایمان والو! نہ کھاؤ سود دونا دون، اور ڈرو اللہ سے تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

اللہ تعالیٰ نے پہلے ان نعمتوں کا ذکر فرمایا جو مؤمنوں کو عطاء کیں، ارشاد فرمایا: ﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ﴾ الآیۃ '' اوران کی امر دین میں اصلاح کا ذکر فرمایا، پھر جہاد کا ذکر کیا، اب امر، نہی ترغیب وترہیب کا ذکر شروع کیا، اس آیۃ کریمہ میں نہی کا ذکر ہے، جس میں سود کھانے سے منع کیا گیا، اس لحاظ پر صرف ترتیب کا تعلق ہے کلام میں استیناف پایا گیا ہے۔ جب یہ لحاظ کیا جائے کہ مشرکین نے جنگوں میں سودی مال خرچ کیا تو مؤمنوں کو اس لئے منع کیا گیا کہ کہیں ان کے دل میں بھی سودی مال کی لگن پیدا نہ ہو جائے۔

عین ممکن ہے کہ مؤمنوں کے دلوں میں یہ بات آگئی ہو کہ ہم بھی سودی مال جمع کرتے ہیں تاکہ مشرکین سے انتقام لے سکیں، اس لحاظ پر یہ آیۃ کریمہ ماقبل سے متعلق ہے، البتہ نزول کے لحاظ سے سود کی ممانعت والی آیات میں سے سب سے پہلے یہ نازل ہوئی، کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ پہلے سود کی حرمت والی کوئی آیۃ نازل ہو چکی ہو، اس کے بعد صحابہ کرام نے سود کا مال جمع کرنے کی تمنا کی ہو۔

دونا دون سود کی ممانعت کیوں؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں سودی کاروبار کا طریقہ یہ تھا کہ کسی کو سود پر مال دیا جاتا جب ادائیگی کا وقت آجاتا لیکن وہ شخص قرض ادا کرنے کی طاقت نہ رکھتا، تو مال دینے والا کہتا تم میرا سود بڑھا دو میں تمہاری ادائیگی کی مہلت بڑھا دیتا ہوں، ایک سو درہم قرض لیا ہوا کبھی ہزار یا اس سے کم وبیش ہو جاتا، اس طرح ان کے ظالمانہ طریقہ سے ان کو منع کیا۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ ''اور ڈرو اللہ سے تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔''

رب تعالی نے اس آیۃ کریمہ میں ''سود کھانے سے نہی فرمائی'' اس نہی میں اللہ تعالی سے ڈرنا واجب ہے، اس لئے کہ فلاح (کامیابی) اس پر موقوف ہے، اگر کسی شخص نے سود کھایا اور اللہ سے نہ ڈرا تو اس سے فلاح زائل ہو جائے گی، یہ آیۃ کریمہ واضح طور پر دلالت کر رہی ہے کہ سود حاصل کرنا حرام ہے، گناہ کبیرہ ہے، جو لوگ سود کو گناہ صغیرہ کہتے ہیں، ان کا قول سراسر باطل ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

اعلی حضرت اور بیضاوی رحمہما اللہ:

اعلی حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے "لعلكم تفلحون" کا ترجمہ کیا (اس امید پر کہ تمہیں فلاح ملے) علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے "لعلكم تفلحون" کی تفسیر "راجين الفلاح" سے کی، اس سے شیخ زادہ نے یوں وضاحت کی، قوله "راجين الفلاح" کہ بیضاوی رحمہ اللہ نے "لعلكم تفلحون" کی تفسیر "راجين الفلاح" (فلاح کی امید کرتے ہوئے) سے کیوں کی؟

لما كانت كلمة لعل للترجي والاشفاق وهما لايصلحان الا عند الجهل بالعاقبة وذلك على الله محال جعل الترجي راجعا الى العباد"

اسلئے کہ ''لعل'' ترجی (امید) کیلئے استعمال ہوتا ہے، یا ڈرانے کیلئے، یہ دونوں معانی وہاں استعمال ہوتے ہیں جہاں کوئی شخص انجام سے بے خبر ہو، یہ معانی اللہ تعالی کی طرف منسوب ہونے محال ہیں، اسلئے ترجی کی نسبت بندوں کی طرف کی گئی، لھذا یہ معنی درست نہیں ہوگا کہ ''شاید تم کامیاب ہو جاؤ'' اسی طرح یہ معنی بھی درست نہیں کہ ''امید ہے تم کامیاب ہو جاؤ'' ہاں یہ معنی درست ہے ''اور تم ڈرو اللہ سے فلاح کی امید کرتے ہوئے۔

راقم اور روح المعانی:

(لعلکم تفلحون)ای لکی تفلحوا" تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ، البتہ روح المعانی میں بھی دوسرا معنی بیضاوی کے موافق ہی لیا گیا ہے "راجین الفلاح"

فائدہ : ولایخفی ان اقتران الرجاء بالتخویف یفیدان العبدینبغی ان یکون بین الرجاء والخوف فھماجناحاہ اللذان یطیربھماالی حضائرالقدس"(روح المعانی)

ادھر فرمایا گیا" واتقوا اللہ "اور اللہ سے ڈرو" اور ادھر فرمایا گیا "لعلکم تفلحون " کامیابی کی امید کرتے ہوئے ،یعنی خوف اور رجاء دونوں چیزوں کو ذکر کیا گیا ہے، اس سے یہ بتایا گیا کہ بندے کیلئے ضروری ہے کہ وہ امید اور خوف کے درمیان رہے، یہ دونوں بندے کو رب تعالی کے حضور اڑا کر لے جاتے ہیں۔

مقام توجہ: آیۃ کریمہ میں ربو کے ساتھ "اضعافامضاعفۃ " (دونادون) ذکر کیا یہ اس طرح کی قید نہیں کہ درجۂ شرط اسے حاصل ہو کہ دونا دون سود نہ لیا جائے تو حلال ہو جائے ،نہیں نہیں ایسا ہرگز نہیں ، بلکہ "والربومحرم جمیع" ربو کی تمام قسمیں حرام ہیں، سورۃ بقرہ میں ربو کو تفصیلی طور پر بیان کر دیا گیا ہے، وہاں مطلق ہے، یہاں جو"اضعافا مضاعفہ "ذکر کیا گیا ہے"فھذہ الحال لامفھوم لھا ولیست قیدافی النھی " یہ ان لوگوں کا ایک حال بیان کیا گیا ہے یہ نہی کی قید نہیں کہ دونا دون نہ ہو تو جائز، ایسا کہنا کلمہ کفر ہے۔ (البحرالمحیط)

خیال رهے: کہ اس رواج کے مطابق سود کے طور پر جانور بھی لئے جاتے تھے، تم یہ قرض لے لو اور مجھے اتنے عرصہ میں یہ مال بھی واپس کرنا ہے اور ساتھ بطور ربو بنت لبون (دوسالہ اونٹنی) دے دینا میں اتنی مدت قرض بڑھا دیتا ہوں۔ (البحرالمحیط)

اس وقت ربو ان کے دلوں میں گھر کر چکا تھا، ان کیلئے ربو کا چھوڑنا مشکل کام تھا، اسی وجہ سے ان کو اللہ تعالی سے ڈرنے کا حکم دیا، اس وجہ سے کہ انسان کی عادت میں جو خلاف شرع کام آگئے ہوں ان کو تقوی کے ذریعے چھوڑنا آسان ہوتا ہے۔ (البحرالمحیط)

تنبیہ : ثم ذکر ان التقوی سبب لرجاء الفلاح وھو الفوزوامربھامطلقالامقیدابفعل الربو"

پھر یہ ذکر فرمایا کہ تقوی ذریعہ ہے فلاح حاصل کرنے کیلئے ،تقوی کا حکم مطلق ہے، یہ فعل ربو سے مقید نہیں ،یعنی یہ مطلب نہیں کہ صرف سود حاصل کرنے کے ساتھ تقوی کا تعلق ہے، بلکہ حکم یہ دیا گیا کہ ہر معاملہ میں تقوی اختیار کرو،

اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ (البحر المحیط)

اس ظالمانہ نظام (سودی نظام) کو اسلام نے ختم کر دیا، کیونکہ اس سے اگر ایک طبقہ میں تن آسانی، حرام خوری، حرص و بخل کے جذبات پرورش پاتے ہیں تو قوم کے دوسرے طبقہ میں حسد و عناد اور منافرت کی تخم ریزی ہوتی ہے۔ وہ امت جسے دنیا میں تبلیغ توحید و ہدایت کا ایک عظیم المرتبت مشن سرانجام دینا ہو اس میں ایسے عناصر کو کب برداشت کیا جا سکتا ہے جو ملی وحدت کو پارہ کردیں۔ (ضیاء القرآن)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْٓ اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ○ (آیۃ نمبر ۱۳۱)

(1) اور اس آگ سے بچو جو کافروں کیلئے تیار کر رکھی ہے۔ (کنز الایمان)

(2) اور بچو اس آگ سے جو تیار کی گئی ہے کافروں کیلئے۔ (نجوم الفرقان)

﴿وَاتَّقُوا النَّارَ﴾ "آگ سے بچو"

ای احترزوا عن متابعة المرابین وتعاطی مایتعاطونه من اکل الربو المفضی الی دخول النار"

(آگ سے بچو) اس کا مطلب یہ ہے کہ سود خوروں کی تابعداری سے بچ جاؤ، سود کھانے والے کی طرح تم بھی نہ ہو جانا بلکہ سود حاصل کرنے سے بچ کر رہو، کیونکہ سود خوری انسان کو جہنم کی آگ کی طرف لے جاتی ہے۔

﴿الَّتِیْٓ اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ﴾ "(بچو اس آگ سے) جو تیار کی گئی ہے کافروں کیلئے۔"

اعتراض: جہنم میں تو چور، زانی، ڈاکو دوسروں پر ناحق تہمت لگانے والے، قاتل وغیرہ بھی داخل کئے جائیں گے، تو کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے" کا کیا مطلب ہے؟

جواب اول: (اعدت للکافرین) وهی الطبقة التی اشد حرها وتضاعف عذابها وهی غیر النار التی یدخلها عصاة امة محمد ﷺ فانها دون ذلک "

وہ آگ جو کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے وہ جہنم کا اور طبقہ ہے جس میں شدید گرمی ہوگی، اور اس میں سخت عذاب ہوگا، اور وہ آگ جس میں نبی کریم ﷺ کی امت کے نافرمان لوگ جائیں گے وہ اور طبقہ ہوگا، اس میں حرارت کم ہوگی بنسبت

کافروں کیلئے تیار کی ہوئی آگ سے، اور اس میں عذاب بھی بنسبت اس کے کم ہوگا۔

"وفيه اشارة الى ان اكلة الربو على حفرة الكفرة"

اسی سے ضمنی طور پر یہ مسئلہ سمجھ آ گیا کہ سود کھانے والے کافروں کی آگ کے گڑھے کے کنارے پر ہیں۔

جواب دوم: اس میں ایک احتمال یہ بھی پایا گیا ہے کہ "اعدت للکافرین" صفت تخصیص کیلئے نہیں، بلکہ

"ان النار مطلقا مخلوقة للكافرين معدة لهم اولاد بالذات وغيرهم يدخلهاعلي وجه التبع"

وہ آگ مطلقا کافروں کیلئے پیدا کی گئی ہے اور انہیں کیلئے ابتدائی طور بالذات تیار کی گئی ہے، اور دوسرے بالتبع اس میں داخل کئے جائیں گے، یعنی اگرچہ وہ آگ پیدا کئے جانے اور تیار کئے جانے کے لحاظ پر تو کافروں سے خاص ہے، لیکن اس آگ میں داخل کیا جانا کافروں کے ساتھ خاص نہیں بلکہ مؤمن گنہگار بھی اس میں داخل کئے جائیں گے۔
(روح المعانی)

اس آیۃ کریمہ میں وعید ہے یا رجاء:

كان ابوحنيفةص يقول هي اخوف آية في القرآن حيث اوعدالله المؤمنين بالنار المعدة للكافرين ان لم يتقوه ويجتنبو امحارمه" (مدارک وخازن)

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیۃ کریمہ قرآن پاک میں بہت زیادہ خوف دلانے والی ہے کہ اس میں اللہ تعالی نے مؤمنوں کو اس آگ سے ڈرایا ہے جو کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے کہ اگر وہ حرام کاموں سے نہ بچے تو اس آگ میں داخل کئے جائیں گے جو کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے۔

وقال الواحدى في هذه الآية تقوية لرجاء المؤمنين رحمة من الله لانه قال اعدت للكافرين فجعلهامعدة للكافرين دون المؤمنين" (خازن)

واحدی نے یہ کہا ہے کہ اس آیۃ میں مؤمنوں کو اللہ تعالی کی رحمت کی امید دلائی گئی، کیونکہ اللہ تعالی نے فرمایا "اُعِدَّتْ لِلْكَافِرِيْنَ" کہ وہ کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے نہ کہ مؤمنوں کیلئے، واحدی کے قول کے مطابق ہی زمخشری معتزلی کا قول بھی ہے۔ معتزلہ کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کو بے خوف بنایا جائے تاکہ وہ بلاخطر عیاش ہو جائیں، گناہ کرنے میں دلیر ہو جائیں، آجکل ہمارے ملک پاکستان میں سب معتزلہ کے نظریات کو ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر پیش کیا جارہا، عذاب قبر کا انکار کیا جارہا ہے یہ وہی مذہب ہے جو صدیوں پہلے معتزلہ نے پیش کیا۔

تہدید شدید: قال ابن عباس هذاالتهديدللمؤمنين ان يستحلوا ماحرم الله عليهم من الربو وغيره مما اوجب الله فيه النار" (خازن)

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں، اس آیہ کریمہ سے مؤمنوں کو بہت زیادہ ڈرایا گیا ہے، کہ اللہ تعالی نے جن چیزوں کو تم پر حرام کیا ہے ان کو حلال سمجھ کر اور جن چیزوں کو تم پر واجب کیا ہے ان سے انکار کر کے کہیں اس آگ کا اپنے آپ کو مستحق نہ بنا دینا جو کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے۔

معتزلہ کا مذہب باطل ہے:

معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ جنت اور جہنم ابھی پیدا نہیں کی گئیں، بلکہ قیامت کو پیدا کی جائیں گی، لیکن ان کا یہ مذہب باطل ہے "لان قوله تعالى (اعدت) اخبار عن الماضي فلابد ان يكون قد دخل ذلك الشئ في الوجود" اس لئے کہ اللہ تعالی کا ارشاد گرامی (اُعِدَّتْ) ماضی کا صیغہ ہے، قانون یہ ہے کہ جب تک کسی لفظ کا حقیقی معنی مراد لیا جا سکے مجازی معنی مراد نہیں لیا جاتا، لھذا واضح ہوا کہ جہنم کی آگ پیدا کی جا چکی ہے۔

سود کھانا کتنا عظیم جرم ہے:

بعض حضرات نے کہا ہے کہ سود کھانے والوں کو کافروں کی آگ سے ڈرایا گیا ہے، نہ کہ گنہگاروں کو آگ سے ڈرایا گیا، خیال رہے کہ جہنم کی آگ کے ساتھ طبقے ہیں، ایک گنہگاروں کیلئے آگ کا طبقہ ہے، جس میں گرفت تو ہوتی ہے لیکن ذلت حاصل نہیں ہوتی، بلکہ گناہوں کی آلودگی سے پاک وصاف کرنا مقصود ہوگا جس طرح سونے کو آگ کی بھٹی میں ڈال کر کھوٹ سے پاک کیا جاتا ہے، اور ایک طبقہ آگ کا منافقوں کیلئے ہے جو جہنم کے تمام طبقات سے نیچے ہے، اس میں بہت شدید عذاب ہوگا، رب تعالی نے اس ذکر یوں فرمایا ﴿إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ او رجہنم کی آگ کے پانچ طبقات کافروں کیلئے تیار کئے گئے ہیں جن میں کفار کو عذاب ہوگا اوران کی اس میں ذلت بھی ہوگی، اسی لئے رب تعالی نے اسے ﴿عَذَابٌ مُّهِينٌ﴾ (رسوا کرنے والے عذاب) قرار دیا ہے۔ (ماخوذ از البحر المحیط)

چو پاک آفریدت بھش باش پاک — کہ ننگست ناپاک رفتن بخاک

جب رب تعالی نے تجھے پاک پیدا کیا تو ہوش میں پاک ہوکر رہ کہ شرم کی بات ہے خاک میں گناہوں سے ناپاک ہوکر جانا۔

پیاپی بیفشاں از آئینہ گرد — کہ صیقل نگیرد چو زنگار خورد

(دل کے) آئینہ کو لگاتار صاف کرتا رہ کہ جب زنگ نے اسے کھا لیا تو اسے نکل (صاف) نہیں کیا جا سکے گا۔ (از روح البیان)

"جلاء القلب انما يحصل بذكر الله وتلاوة القرآن والصلوة على النبی ﷺ وخير الاذكار كلمة التوحيد وهي العروة الوثقى"

دل کی صفائی حاصل ہوتی ہے، اللہ تعالی کے ذکر سے اور قرآن پاک کی تلاوت سے، اور نبی کریم ﷺ پر درود پاک پڑھنے سے اور کلمۂ توحید سے جو کہ تمام ذکروں سے بہتر ذکر ہے اور مضبوط رسی ہے۔

ابراہیم خواص رحمہ اللہ نے بیان فرمایا دل کی دوا پانچ چیزوں میں ہے، قرآن پاک کو تدبر سے تلاوت کیا جائے، اور پیٹ کو خالی رکھے، یعنی کم کھائے، اور رات کو قیام کرے اور سحری کے وقت اللہ تعالی کی طرف عاجزی سے رجوع کرے، اور نیک لوگوں کی مجلس اختیار کرے، ان عادات پر عمل کرنے سے انسان آگ سے بچ جائے گا، اور رب تعالی کا اسے قرب حاصل ہوگا۔ (ماخوذ از روح البیان)

❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀

وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ O (آیۃ نمبر ۱۳۲)

(1) اور اللہ ورسول کے فرمانبردار رہو اس امید پر کہ تم رحم کیئے جاؤ۔ (کنز الایمان)

(2) اور اطاعت کرو اللہ اور (اسکے) رسول کی، تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں وعید کا ذکر کیا گیا، یعنی آگ سے ڈرایا گیا، اور اس آیۃ کریمہ میں وعد کا ذکر ہے، یعنی رحم کرنے کا، البتہ اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرنے کا حکم بھی دیا گیا ہے۔

معتزلہ: معتزلہ کہتے ہیں کہ اس آیۃ میں بھی وعید ہے، اس لئے کہ جب رحم کرنے کو اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت پر موقوف کیا گیا ہے تو اسی سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ یہ آیۃ کریمہ اس پر دلالت کر رہی ہے۔

"من عصی اللہ ورسولہ فی شیٔ من الاشیاء انہ لیس اھلا للرحمۃ وذلک یدل علی قول اصحاب الوعید"

کہ جس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی کسی چیز میں نافرمانی کی وہ رحمت کا مستحق نہیں، تو پتہ چلا کہ یہ آیۃ کریمہ وعید پر دلالت کر رہی ہے۔

اہل سنت وجماعت کا قول:

اس مسئلہ میں اہل سنت وجماعت کا موقف یہ ہے کہ ایک چیز کا ظاہر طور پر ثبوت جب ہو رہا ہے تو آیۃ کریمہ

اسی پر محمول ہوگی کہ اس میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور اس پر رحم کرنے کو مرتب کیا گیا لھذا یہ خوشبخت لوگوں کیلئے وعد ہے، یعنی ان پر رحم کئے جانے کی ان کیلئے بشارت ہے، اگر چہ ضمنی طور پر سمجھ آ رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے نافرمانوں کیلئے رحم کرنے کا وعدہ نہیں، لیکن فضل وکرم سے رحم کرنے کی نفی بھی نہیں کی گئی اسلئے اس آیۃ کریمہ کو مطلقا وعید پر محمول کرنا درست نہیں، ضمنی طور پر وعید ثابت وہو سکتی ہے لیکن وہ بھی مطلق نہیں، کیونکہ رب تعالیٰ اپنے فضل وکرم گنہگاروں پر رحم کردے تو اس کی مرضی کی بات ہے۔ (کبیر بالوضاحت)

اطاعت کن چیزوں میں کی جائے:

اگر چہ بعض حضرات نے اس مقام پر اس آیۃ کریمہ کو خاص کیا ہے (اَطِیْعُوا اللّٰـهَ) فی الفرائض (والرسول) فی السنن "اللہ کی اطاعت کرو فرائض میں اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو سنتوں میں۔

"وقیل فی تحریم الربو والرسول فیما بلغکم من التحریم"

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ رب تعالیٰ نے ربو کو حرام کیا اس کے حرام کرنے میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول اللہ ﷺ نے جو تم تک اس کی حرمت کو پہنچایا ہے اس میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرو۔

"وقیل واطیعوا الله والرسول فیما یأمرکم به وینها کم عنه"

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ حکم مطلق ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول انے جن جن چیزوں کا تمہیں حکم دیا ہے یا جن جن چیزوں سے تمہیں روکا ہے ان تمام اوامر ونواہی میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اکی اطاعت کرو۔ (البحر المحیط)

یہی مذہب جمہور کا ہے کہ خصوص مورد کا لحاظ نہیں کہ آیۃ کریمہ کس موقع پر نازل کی گئی بلکہ عموم الفاظ کا لحاظ کیا گیا ہے کہ یہ حکم عام ہے جمیع اوامر ونواہی کو شامل ہے۔

فائدہ جلیلہ: دوبارہ "اطیعوا" ذکر نہیں کیا گیا یعنی "وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ" نہیں کہا گیا بلکہ لفظ "اللہ" پر عطف کیا گیا، اس کی وجہ یہ ہے "فان طاعة الرسول طاعة الله" بیشک رسول اللہ ﷺ کی طاعت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ہی طاعت ہے، رب تعالیٰ نے اس مسئلہ کو واضح طور پر ان الفاظ مبارکہ سے بیان کیا ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ جو شخص رسول (ﷺ) کی اطاعت کرتا ہے وہ اللہ کا مطیع ہے۔ (البحر المحیط)

(لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ) ای لکی تنالوا رحمة الله وراجین رحمته" (روح المعانی)

یعنی جو دو احتمال "لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ" میں بیان کئے ہیں وہی دو یہاں بھی پائے گئے ہیں، ایک یہ کہ

"لعل "کی" کے معنی میں ہو، اب معنی یہ ہو" تا کہ تم پر رحم کیا جائے"

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ "لعل" ترجی کیلئے استعمال ہو نسبت ترجی کی بندوں کی طرف ہو، رب تعالی کی طرف نہ ہو، اب آیۃ کریمہ کا وہی ترجمہ ہوگا جو اعلی حضرت مولنا احمد رضاء خان بریلوی نے کیا (اور اللہ و رسول کے فرمانبردار ہو اس امید پر کہ تم رحم کئے جاؤ) یعنی نسبت امید اور توقع کی بندوں کی طرف کی جاسکتی ہے لیکن اللہ تعالی کی طرف نہیں کی جاسکتی" "لعل" اور "عسی" کی نسبت (امید اور شاید) کی نسبت رب تعالی کی طرف نہیں کی جاسکتی بیضاوی کے حوالہ سے ایک آیۃ سے پیچھے "لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ" میں دیکھئے۔

مودودی صاحب کا ترجمہ دونوں جگہ باطل ہے:

انہوں نے "لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ" کا ترجمہ کا کیا "امید ہے کہ فلاح پاؤ گے" یہاں امید کی نسبت انہوں نے اللہ تعالی کی طرف کر دی جو یقیناً غلط ہے اور جمہور مفسرین کرام کی مخالفت ان کے ترجمہ سے لازم آرہی ہے۔ مودودی صاحب نے "لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ" کا ترجمہ کیا ہے "توقع ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا" رب تعالی کا علم تو قطعی اور یقینی ہے، اس کی طرف یہ نسبت کرنا "امید ہے" "توقع ہے"، کسی طرح بھی صحیح نہیں۔

"لعل وعسی فی امثال ذلک عزة التوصل الی ماجعل خبراله (بیضاوی) لما كانت لعل للترجی والاشفاق وهمالايصلحان الاعندالجهل بالعاقبة وذلک علی الله محال جعل الترجی راجعاالی العباد" (شیخ زادہ)

اس قسم کے مقامات میں لعل اور عسی کا استعمال اس پر دلالت کرتا ہے کہ جو خبر بنائی گئی ہے اس کا بندوں تک پہنچنا غالب ہے، وجہ اصل میں یہ ہے کہ "لعل" ترجی کا معنی دیتا ہے جس میں امید پائی جاتی ہے، اور عسی میں بھی رجاء پائی جاتی ہے، اسی طرح "لعل" کبھی ڈرانے کے معنی بھی استعمال ہوتا ہے، یہ دونوں معانی اس مقام میں نہیں لئے جاسکتے کیونکہ یہ وہاں مراد لئے جاسکتے ہیں جہاں انجام سے بے خبری ہو، رب تعالی انجام سے بے خبر نہیں، ہاں البتہ امید کی نسبت بندوں کی طرف کی جاسکتی ہے۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَسَارِعُوْا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ○

(آیۃ نمبر ۱۳۳)

(1) اور دوڑو اپنے رب کی بخشش اور ایسی جنت کی طرف جس کی چوڑان میں سب آسمان وزمین آجائیں پرہیزگاروں کیلئے تیار کر رکھی ہے۔ (کنزالایمان)

(2) اور جلدی کرو اپنے رب کی بخشش کی طرف اور جنت کی طرف اس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کی (چوڑائی) کی طرح ہے، وہ تیار کی گئی ہے پرہیزگاروں کیلئے۔ (نجوم الفرقان)

راقم نے ترجمہ سورۃ حدید کی آیۃ کے مطابق کیا ہے۔

"سَابِقُوْا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ" (وَسَارِعُوْا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ) یعنی وبادروا وسابقوا الی مایوجب المغفرة من ربکم وھی الاعمال الصالحۃ المأمور بفعلھا"

"جلدی کرو اپنے رب کی بخشش کی طرف" یعنی جلدی کرو، سبقت لے جاؤ ایسے اسباب کی طرف جو تمہارے رب کی طرف سے بخشش کا ذریعہ بنیں، وہ نیک اعمال ہیں جن کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔"

اسباب مغفرت میں چند اقوال:

(۱) قال ابن عباس ھو الاسلام "حضرت ابن عباس ﷺ فرماتے ہیں بخشش کا سبب اسلام ہے "مغفرۃ" نکرہ ذکر کیا گیا، مراد اس سے مغفرت عظیمہ ہے جو عظمت میں انتہاء درجہ تک پہنچی ہوئی ہے، یہ وہ مغفرت ہے جو اسلام کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔

(۲) روی عن علیص انہ قال ھو اداء الفرائض "حضرت علی ﷺ فرماتے ہیں بخشش کا مطلب سب فرائض کو ادا کرنا ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ لفظ مطلق ذکر کیا گیا ہے اس لئے ضروری ہے کہ کل فرائض کا ادا کرنا مراد ہو۔

(۳) والثالث انہ الاخلاص وھو قول عثمان بن عفانص "حضرت عثمان ﷺ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد اخلاص ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ جمیع عبادات میں اخلاص معتبر ہے، لھذا اخلاص ذریعۂ بخشش ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ اور ان کو نہیں حکم دیا گیا مگر یہ

کہ اللہ کی بندگی کریں خالص اسی کیلئے دین کریں۔

(۴) الرابع قال ابو العالیة هو الهجرة "چوتھا قول ابوالعالیہ کا ہے کہ بخشش کا سبب ہجرت ہے۔

(۵) والخامس انه الجهاد هو قول الضحاک ومحمد بن اسحاق " پانچواں قول ضحاک اور محمد بن اسحاق رحمہما اللہ کا ہے مغفرت کا سبب جہاد ہے، اس لئے کہ یہاں آگے پیچھے جہاد کا ہی ذکر ہے، لھذا مغفرت کا سبب جہاد کو ہی قرار دینا زیادہ بہتر ہے۔

(۶) السادس قال سعید بن جبیر انها التکبیرة الاولی " چھٹا قول حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کا ہے کہ بیشک اس سے مراد نماز کی پہلی تکبیر ہے، جو بخشش کا ذریعہ ہے۔

(۷) السابع قال عثمان انها الصلوات الخمس " ساتواں قول بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ہے اس سے مراد پانچ نمازیں ہیں، اسلئے کہ بخشش کا سبب پانچ نمازوں کا ادا کرنا ہے۔

(۸) والثامن قال عکرمة انها جمیع الطاعات لان اللفظ عام فیتناول الکل " آٹھواں قول حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کا ہے کہ تمام طاعات مراد ہیں کیونکہ لفظ عام ہے جو جمیع طاعات کو شامل ہے۔

(۹) التاسع قال الاصم سارعوا ای بادروا الی التوبة من الربوا والذنوب " نواں قول اصم کا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تم سود اور گناہوں سے توبہ کرنے کی طرف جلدی کرو۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے سود کے استعمال کرنے سے منع کیا، پھر ارشاد فرمایا ﴿وَسَارِعُوْۤا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ تو اس سے یہ واضح ہوا کہ پہلے جس نہی (ممانعت) کا ذکر ہے اسی کو جلدی چھوڑنے کا حکم دیا گیا ہے۔(ماخوذ از کبیر)

تمام اقوال کا جامع قول:

تمام اقوال کا جامع قول وہی ہے جو خازن سے نقل کیا گیا ہے کہ اس سے مراد "وهی الاعمال الصالحة المامور بفعلها" تمام نیک اعمال ہیں جن پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اسی وجہ سے علامہ رازی رحمہ اللہ نے تمام اقوال ذکر کرنے کے بعد یہ فرمایا۔

"والاولی ماتقدم من وجوب حمله علی اداء الواجبات والتوبة عن جمیع المحظورات لان اللفظ عام فلاوجه فی تخصیصه "

زیادہ بہتر یہی ہے کہ اس کو عام رکھا جائے معنی اس کا یہ ہو کہ واجبات کے ادا کرنے اور تمام ممنوعات

سے توبہ کرنے کی طرف جلدی کرو اسلئے کہ یہ اسباب بخشش ہیں، چونکہ لفظ عام ہے اسلئے کسی معنی کے ساتھ خاص کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

﴿وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوَاتُ وَالْاَرْضُ﴾

"اور جلدی کرو جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کی چوڑائی کی طرح ہے"۔

جلالین میں یوں تفسیر بیان کی گئی:

(وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوَاتُ وَالْاَرْضُ)ای کعرضهما لو وصلت احداهما بالاخری ، والعرض السعة"
"اور (جلدی کرو) جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کی چوڑائی کی طرح ہے۔"

یعنی اگر تمام آسمانوں اور زمینوں کو علیحدہ علیحدہ کر کے ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر رکھا جائے تو ان کی وسعت کی طرح جنت کی وسعت ہے، یعنی مقصود ہی وسعت کو بیان کرنا ہے، مقدار بیان کرنا کہ جنت کی چوڑائی زمین و آسمان کی چوڑائی جتنی ہے، یہ مقصود ہی نہیں۔ جلالین کے تفسیری الفاظ "کعرضها" پر صاوی میں یوں تحریر کیا گیا ہے "اشار بذلک الی ان الکلام حذف مضاف واداة التشبیه" کہ مفسر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں "کعرضها" کے الفاظ نکال کر اس طرف اشارہ کیا کہ اس کلام میں مضاف حذف ہے اور حرف تشبیہ بھی حذف ہے۔ صاوی میں ہی یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس میں دو احتمال پائے گئے ہیں ایک حقیقی کہ مراد ہی ہو جو جلالین میں بیان کی گئی ہے کہ تمام آسمانوں اور تمام زمینوں کی چوڑائی کی علیحدہ علیحدہ کر کے جوڑا جائے پھر بھی جنت کی چوڑائی ان سے زیادہ ہوگی، اور دوسرا معنی مجازی مراد لیا جائے کہ جنت کی وسعت زمین و آسمان کی وسعت سے بھی زیادہ ہے، راقم کے نزدیک یہی مجازی معنی لینا عوام کو سمجھانے کیلئے بہتر ہے۔

مختصر مطلب:

(وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوَاتُ وَالْاَرْضُ)ای کعرضها صفة لجنة وتخصیص العرض بالذکر للمبالغة فی وصفها بالسعة والبسطة علی طریقة التمثیل فان العرض فی العادة ادنی من طول"

جنت کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کی چوڑائی کی طرح ہے، یہاں چوڑائی کا ذکر کیا گیا ہے جس میں جنت کی وسعت اور بساطت کو کامل طریقہ سے بیان کیا گیا ہے، اور تمثیل کے طور پر کہ آسمانوں اور زمین کی وسعت کی طرح جنت بھی وسیع اور بسیط (کشادہ) ہے عرض عام طور پر طول سے چھوٹی ہوتی ہے۔

جب عرض کی اتنی بڑی وسعت ہے تو طول یقیناً بہت ہی وسیع ہوگا۔ (تفسیر ابی السعود)

❁ روی ان هرقل ارسل الی النبی ﷺ انک کتبت تدعونی الی جنة عرضها السموات والارض فاین النار؟فقال رسول الله ﷺ سبحان الله فاین اللیل اذاجاء النهار"

روایت بیان کی گئی کہ ہرقل نے اپنا ایک قاصد نبی کریم ﷺ کی طرف بھیجا کہ تم نے اپنے خط میں مجھے جنت کی دعوت دی ہے جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کی چوڑائی کی طرح ہے (جب جنت اتنی وسیع ہے) تو آگ کہاں ہوگی؟ (یعنی اس کیلئے تو کوئی جگہ ہی باقی نہیں رہے گی) تو نبی کریم ﷺ نے (کیسا ہی حکیمانہ) جواب دیا۔

سبحان اللہ! جب دن آتا ہے تو رات کہاں ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا یہ جواب آپ کی خصوصی صفت "جوامع الکلم" کے مطابق ہے کہ مختصر الفاظ کثیر معانی پر مشتمل ہیں۔

"قیل معناه والله اعلم بذلک انه اذادار الفلک حصل النهارفی جانب واللیل فی ضدذلک الجانب فکذلک الجنة فی جهة العلو والنارفی جهة اسفل"

نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی کا معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب آسمان پھرتا ہے تو ایک جانب دن ہوتا ہے اور دوسری جانب رات ہوتی ہے، اسی طرح جنت اوپر کی جانب ہے اور جہنم نیچے کی جانب ہے۔

❁ وروی طارق ابن شهاب ان ناسامن الیهودسالواعمربن الخطاب رضی الله عنه وعنده اصحابه فقالواارایتکم قولکم "وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ" فاین النار؟فقال عمربن الخطاب ارایتم اذاجاء اللیل فاین یکون النهارواذاجاء النهارفاین یکون اللیل فقالواان لمثلهافی التوراة"

طارق ابن شہاب سے روایت ذکر کی گئی کہ یہود کے چندلوگ حضرت عمر ﷺ سے آکر سوال کرنے لگے جب کہ آپ کے اصحاب بھی آپ کے پاس موجود تھے، انہوں نے کہا تمہاری اس تمہارے (قرآن کے) قول کے مطابق کیا رائے ہے جو یہ کہا گیا "وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ" جنت کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کی چوڑائی کی طرح ہے، جب جنت کی اتنی وسعت ہے تو آگ کہاں ہوتا ہے؟ اور جب دن آتا ہے تو رات کہاں ہوتی ہے تو وہ کہنے لگے ہاں توراۃ میں بھی اسی طرح ہے۔

"ومعناه حیث یشاء الله" مطلب اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں چاہا وہیں آگ کو رکھ دیا اور جہاں چاہا وہاں جنت کو رکھ دیا، اس کی قدرت میں بڑی وسعت ہے، جس وسعت کی کوئی حد نہیں۔ (خازن)

اعتراض: رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿وَفِی السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ﴾ اور آسمانوں میں تمہارا رزق

ہے اور جس چیز کا تمہیں وہ دیا گیا ہے "و اراد بالذی وعدنا به الجنة" جس چیز کا ہمیں وعدہ دیا گیا ہے وہ جنت ہے، اب آیۃ کریمہ کا مفہوم یہ ہو گیا اور آسمانوں میں تمہارا رزق ہے اور آسمانوں میں جنت ہے، جب جنت آسمانوں میں ہے تو وہ آسمانوں میں سما گئی، آسمان اس پر حاوی ہو گئے، تمام آسمانوں سے جنت کی وسعت کیسے ثابت ہو گی؟

جواب: المرادمن قولناانهافی السموات انهافوق السماوات وتحت العرش"

ہم نے جو یہ بیان کیا ہے "انها فی السماوات" یہاں اصل میں "فی" بمعنی "علی" کے ہے جیسا کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَلَأُ صَلِّبَنَّكُمْ فِي جُذُوعِ النَّخْلِ﴾ میں "فی" بمعنی "علی" کے ہے، فرعون نے جادوگروں کو کہا میں تمہیں ضرور بضرور کھجور کے تنوں پر سولی چڑھادوں گا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ کھجور کے تنوں میں سولی چڑھادوں گا لھذا ہم جنت کے متعلق جو یہ کہتے ہیں "انها فی السماوات" اس کا مطلب یہ ہے "انها فوق السماوات وتحت العرش" کہ بیشک جنت آسمانوں کے اوپر اور عرش کے نیچے ہے، رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی "وماتوعدون" کا بھی یہی مطلب ہے کہ جس جنت کا تمہیں وعدہ دلایا جا رہا ہے وہ آسمانوں کے اوپر ہے۔ (خازن بالوضاحت)

❁ فان فی حدیث ابی ذرعن النبی ﷺماالسماوات السبع والارضون السبع فی الکرسی الاکدراهم القیت فی فلاة من الارض وماالکرسی فی العرش الاکحلقة القیت فی فلاة من الارض"فهذه مخلوقات اعظم بکثیر جدامن السماوات والارض وقدرة الله اعظم من ذلک کله"

حضرت ابوذر ﷺ سے روایت کردہ حدیث میں یہ بھی ذکر ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا سات آسمان اور سات زمینیں کرسی میں ہوں تو ایسے ہوں گی جیسے کہ درہم جنگل میں ڈال دیئے جائیں، اور کرسی عرش میں ہو تو ایسے ہو گی جیسے لوہے کی انگوٹھی کو جنگل میں ڈال دیا جائے، یہ مخلوقات آسمانوں اور زمینوں سے بہت عظیم ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی قدرت ان تمام سے زیادہ عظیم ہے۔ (منقول از قرطبی)

❁ واخرج مسلم وابن المنذروالحاکم وصححه عن انس ان رسول الله ﷺقال یوم بدر قوموا الی جنة عرضهاالسموات والارض فقال عمیربن الحمام الانصاری یارسول الله جنة عرضهاالسموات والارض قال نعم قال بخ بخ لاوالله یارسول الله ﷺلابدان اکون من اهلهاقال فانک من اهلهافاخرج تمیرات من قرنه فجعل یاکل منهن ثم قال لئن حییت حتی آکل تمرالی هذه انهالحیاة طویلة فرمی بماکان معه من التمرثم قاتلهم حتی قتل"

حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں، بیشک رسول اللہ ﷺ نے بدر کے دن فرمایا" کھڑے ہو جاؤ اس جنت کی طرف

جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کی (چوڑائی) کی طرح ہے، عمیر بن الحمام انصاری نے فرمایا یارسول اللہ (کیا) جنت کی چوڑائی آسمانوں اورزمین کی چوڑائی کی طرح ہے؟ آپ نے فرمایاہاں وہ صحابی کہنے لگے بڑی خوشی کا مقام ہے، بڑی خوشی کا مقام ہے، قسم ہے اللہ تعالیٰ کی یارسول اللہ میں ضرور اس کا اہل بنوں گا حضور ﷺ نے فرمایا بیشک تم اس کے اہل ہو، انہوں نے اپنے توشہ دان سے کچھ کھجوریں نکالیں، ان کو کھانا شروع کیا، پھر کہنے لگے اگر میں زندہ رہا تو پھر کھجوریں کھالوں گا (کیونکہ یہاں سے زندہ رہنے کے بعد) بیشک زندگی طویل ہوگی، ان کے پاس جو کھجوریں تھیں وہ انہوں نے پھینک دیں، پھر کفار سے قتال کیا یہاں تک کہ وہ شہید ہو گئے، وہ صحابی کا قسم اٹھا کر کہنا کہ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں اس کا ضرور اہل بنوں گا، اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد کہ ہاں تم اس کے اہل ہو" رب تعالیٰ نے اسے سچا کر دکھایا، کہ وہ صحابی بارشادنبوی شہید کر جنت کے اہل بنے۔ (منقول از در منشور)

❁ وفی الصحیح ان ادنی اهل الجنة منزلة من یتمنی ویتمنی حتی اذاانقطعت به الامانی"
صحیح (بخاری) میں ہے کہ بیشک اہل جنت کا ادنیٰ مرتبہ یہ ہوگا کہ ان کو تمنا حاصل ہوگی، اور تمنا اسی وقت حاصل ہوگی جب اپنی آرزوں اور امیدوں کو ختم کرلیں۔ (منقول از قرطبی)

﴿اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ﴾ "وہ تیار کی گئی پرہیزگاروں کیلئے۔"

آیہ کریمہ میں لفظ "اُعِدَّت" ماضی کا صیغہ ہے، جس کو اپنے حقیقی معنی اور حقیقی زمانہ سے بلاوجہ نہیں پھیرا جاسکتا "ودلت الآية علی ان الجنة والنار مخلوقتان" اور آیہ کریمہ اس پر دلالت کررہی ہے کہ بیشک جنت اور نار (جہنم) پیدا کی جاچکی ہیں، معتزلہ کا یہ کہنا کہ ابھی پیدا نہیں کی گئیں بلکہ یوم آخرت (قیامت کے دن) پیدا کی جائیں گی، ان کا یہ قول باطل ہے۔ متقی سے مراد یہ ہے کہ وہ شرک سے بچے، جیسے سورۃ حدید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

﴿وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِیْنَ آمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ﴾
"اور جنت (کی طرف سبقت کرو) جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کی چوڑائی کی طرح ہے، وہ تیار کی گئی ہے ان لوگوں کیلئے جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لایا۔"

یا متقی کا معنی یہ ہے کہ وہ گناہوں سے بچنے والے ہیں، جب یہ معنی لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ بغیر سزا کے جنت میں چلے جائیں گے، اور اگر پہلا معنی شرک سے بچنے والا لیا جائے کہ وہ شرک سے تو بچتے ہیں لیکن گناہوں سے نہیں بچتے تو پھر مطلب یہ ہوگا "فهی لهم ایضافی العاقبة" کہ ان کو بھی آخرکار جنت حاصل ہوگی، یعنی اگر گناہوں کی سزا ان کو حاصل ہونی ہوئی تو سزا کے بعد گناہوں کی آلودگی سے پاک ہو کر جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ (مدارک)

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ○ (آیۃ نمبر ۱۳۴)

(1) وہ جو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں خوشی میں اور رنج میں اور غصہ پینے والے ہیں اور لوگوں سے درگذر کرنے والے اور نیک لوگ اللہ کے محبوب ہیں۔ (کنز الایمان)

(2) (پرہیزگار) وہ ہیں جو خرچ کرتے ہیں آسانی میں اور مشکل میں، اور وہ روکنے والے ہیں غصہ کو، اور درگذر کرنے والے ہیں لوگوں سے اور اللہ محبت کرتا ہے احسان کرنے والوں سے۔ (نجوم الفرقان)

﴿اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ﴾ "وہ جو خرچ کرتے ہیں آسانی میں اور مشکل میں۔"

راقم نے ترجمہ روح المعانی کے ان الفاظ سے لیا ہے ﴿فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ﴾ ای فی الیسر والعسر "آسانی میں اور مشکل میں، یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے روح المعانی کے ہی ان الفاظ سے لیا "وقیل فی حال السرور والاغتمام" اور بیان کیا گیا کہ وہ خوشی کی حالت میں اور غم کی حالت میں خرچ کرتے ہیں، طلباء کرام کے فائدہ کیلئے دونوں معانی پیش کردیے گئے "وقیل فی الحیاۃ وبعد الموت بأن یوصی" اور بیان کیا گیا ہے کہ وہ زندگی میں خرچ کرتے ہیں، اور موت کے بعد خرچ کرنے کی وصیت کرتے ہیں۔

"وقیل فیمایسر کالنفقۃ علی الولد والقریب وفیمایضر کالنفقۃ علی الاعداء"

اور بیان کیا گیا ہے کہ وہ ان لوگوں پر خرچ کرتے ہیں جن پر خرچ کرنا انہیں خوش لگتا ہے، جیسے اولاد پر اور قریبوں رشتہ داروں پر خرچ کرتے ہیں، اور خرچ کرتے ہیں ان پر جن پر خرچ کرنے سے ان کو ضرر محسوس ہوتا ہے جیسا کہ دشمنوں پر ان کا خرچ کرنا۔ (روح المعانی)

مشکل اور آسانی میں خرچ کرنے کا اور مطلب یہ ہے:

"لایترکون الانفاق فی کلتاالحالتین فی الغنی والفقر والرخاء والشدۃ ولافی حال فرح وسرور ولافی حال محنۃ ولابلاء سواء کان الواحد منهم فی عرس اوحبس فانهم لایدعون الاحسان الی الناس"

کہ وہ حالت غناء اور فقر (امیر و غریب ہونے کی حالت) میں خرچ کرتے ہیں، کسی حال میں وہ خرچ کرنا نہیں چھوڑتے رزق کی کشادگی اور تنگی میں خرچ کرتے ہیں، اور خوشی اور فرحت کے حال میں اور محنت اور مصیبت کے حال

میں خرچ کرنا چھوڑتے ، پرہیزگاروں میں سے کوئی ایک خواہ شادی میں ہو یا قید میں وہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں ، اور مال خرچ کرنے پر لوگوں کے سامنے اپنے احسان کا کوئی دعویٰ نہیں کرتے ، رب تعالیٰ نے جب یہ ذکر فرمایا "اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ" جنت پرہیزگاروں کیلئے تیار کی گئی" تو یہاں جنت میں جانے کا ایک سبب سخاوت کو بیان کیا لیکن سخاوت لوگوں پر شاق ہوتی ہے ، اسلئے کہ انسان اپنے آپ کو حاجتمند سمجھتے ہوئے جب فقیروں کی غمخواری کرتے ہوئے ان پر خرچ کرتا ہے ، اور دشمن کے ساتھ جہاد کرنے میں جب مال خرچ کرتا ہے تو اسے بہت مشکل نظر آتا ہے۔ (خازن)

شان سخاوت اور مذمت بخیل پر احادیث مبارکہ:

❁ عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ ﷺ قال السخی قریب من اللہ قریب من الناس قریب من الجنۃ بعیدمن النار والبخیل بعیدمن اللہ بعیدمن الناس بعیدمن الجنۃ قریب من النار ولجاھل سخی احب الی اللہ تعالی من عابدبخیل" (اخرجہ الترمذی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سخی اللہ تعالیٰ کے قریب ہے اور لوگوں کے قریب ہے اور جنت کے قریب ہے ، اور آگ سے دور ہے ، اور بخیل (کنجوس) اللہ سے دور ہے اور لوگوں سے دور ہے ، اور آگ کے قریب ہے ، جاہل سخی اللہ تعالیٰ کی بنسبت کنجوس عابد کے زیادہ محبوب ہے۔ (منقول از خازن)

❁ عن ابی ھریرۃ انہ سمع رسول اللہ ﷺ یقول مثل البخیل والمنفق کمثل رجلین علیھما جنتان من حدیدمن لدیھما الی تراقیھمافاماالمنفق فلاینفق الاسبغت اووفت علی جلدہ حتی تخفی ثیابہ وتعفوالرہ واماالبخیل فلایریدان ینفق شیئاالالزقت کل حلقۃ مکانھافھویوسعھافلاتتسع الجنۃ الدرع من الحدید" (بخاری ومسلم)

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا بخیل اور خرچ کرنے والے کی مثال ایسے ہی جیسے دو شخص ہوں جنہوں نے لوہے کی زرہ پہن رکھی ہوں ، وہ زرہ ان کے پستانوں (سینہ کے وسط) سے سینہ کے اوپر گلے کے قریب ہڈیوں تک ہوں ، خرچ کرنے والا نہیں خرچ کرتا مگر یہ کہ اس کے چمڑے پر وہ زرہ مکمل ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ اس کے کپڑوں کو چھپا لیتی ہے ، اور اس کا اثر (اس کے قدموں کے نشانوں کو) مٹا دیتی ہے ، اور کنجوس خرچ کرنے کا ارادہ نہیں کرتا مگر یہ کہ وہ زرہ اپنی جگہ سے چمٹ جاتی ہے ، وہ اسے وسیع کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ زرہ لوہے کی ہوتی ہے اس لئے اس کے وسیع کرنے سے وہ وسیع نہیں ہوتی۔ (منقول از خازن)

❁ عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ مامن یوم یصبح العبادفیہ الاملکان ینزلان فیقول

احدھمااللھم اعط منفقاخلفاویقول الآخراللھم اعط ممسکاتلفا" (بخاری ومسلم)

حضرت ابو ہریرۃ ﷺ فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندوں پر کوئی صبح نہیں آتی مگر یہ کہ اس میں دوفرشتے نازل ہوتے ہیں، ان میں سے ایک کہتا ہے اے اللہ اپنی راہ میں خرچ کرنے والے کو اس کے بدلے اور عطاء کر، اور دوسرا کہتا ہے اے اللہ مال روک کر رکھنے والے (یعنی اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے والے) کے مال کو تباہ و برباد کر۔ (منقول از خازن)

وعن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ ﷺ قال قال اللہ تبارک وتعالی انفق ینفق علیک"

حضرت ابو ہریرۃ ﷺ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالی فرماتا ہے تم مال (میری راہ میں) خرچ کرو، تم پر مال خرچ کیا جائے گا۔ (منقول از خازن)

یعنی جو شخص اللہ تعالی کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے اللہ اسے اور مال عطاء کرتا ہے۔

رواہ البیھقی عن جابرو الطبرانی عن عائشۃ وعن ابن عباس مرفوعاالسخاء خلق اللہ الاعظم"

بیہقی نے حضرت جابر ﷺ سے اور طبرانی سے حضرت نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوع حدیث بیان کی، یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالی نے سخاوت کو عظیم مرتبہ عطاء کر کے پیدا کیا۔ (منقول از مظہری)

وقال رسول اللہ ﷺ السخاء شجرۃ من اشجار الجنۃ اغصانھامتدلیات فی الدنیافمن اخذبغصن منھاقادۃ ذلک الغصن الی الجنۃ والبخل شجرۃ من الشجار النار اغصانھامتدلیات فی الدنیافم اخذبغصن من اغصانھاذلک الغصن الی النار" رواہ الدارقطنی والبیھقی عن علی ﷺ وابونعیم فی الحلیۃ عن جابر ﷺ والخطیب عن ابی سعید ﷺ وابن عساکر عن انس ﷺ والدیلمی فی مسندالفردوس عن معاویۃ ﷺ"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سخاوت جنت کے درختوں میں سے ایک درخت ہے، جس کی شاخیں دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں، جس نے ان ٹہنیوں میں سے ایک ٹہنی کو پکڑا تو وہ شاخ اسے جنت میں لے جائے گی، اور بخل (کنجوسی) جہنم کے درختوں میں سے ایک درخت ہے، اس کی شاخیں دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں، جس نے اس کی شاخوں میں سے ایک شاخ کو پکڑا تو وہ اسے جہنم میں لے جائے گی۔ (یہ روایت دار قطنی اور بیہقی نے حضرت علی ﷺ سے بیان کی، ابن عدی اور بیہقی کی ایک اور روایت حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے منقول ہے، اور ابو نعیم نے حلیہ میں حضرت جابر ﷺ سے اور خطیب نے حضرت سعید ﷺ سے اور ابن عساکر نے حضرت انس ﷺ سے اور دیلمی نے مسند فروس میں حضرت معاویہ ﷺ سے بیان کی۔

(منقول از مظہری)

❁ وعن ابی هریرة ﷺ قال قال رسول الله ﷺ سبق درهم مائه الف، فقال رجل وکیف ذالک یارسول الله فقال رجل له مال کثیرا اخلمن عرضه مائةدرهم تصدق بهاور جل لیس له الادرهمان فاخذاحدهما فتصدق به" (رواه النسائی وصححه وابن خزیمة والحاکم)
حضرت ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک درہم ایک لاکھ درہموں پر سبقت لے جاتا ہے، ایک شخص نے عرض کیا، یارسول اللہ یہ کیسے ہوگا؟ آپ نے فرمایا ایک شخص کے پاس بہت زیادہ مال ہوتا ہے وہ اس مال سے ایک لاکھ روپے خرچ کرتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں وہ صدقہ کرتا ہے اور ایک شخص کے پاس صرف دو درہم ہوتے ہیں وہ ان میں سے ایک صدقہ کرتا ہے۔ (منقول از مظہری)

حدیث پاک سے یہ واضح ہورہا ہے کہ اصل میں ثواب کا دارومدار نیت پر ہے اور مشکل میں خرچ کرنے پر ہے یقینی طور پر دو درہموں میں سے ایک خرچ کر دینا خلوص نیت پر مبنی ہے، اور دینے والے نے کتنی مشکل سے وہ ایک درہم خرچ کیا کہ خود حاجتمند تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی رضاء کیلئے اس نے اپنے حاجت کی پرواہ نہ کی، یہی وجہ ہے کہ کثیر مال والے کے ایک لاکھ دراہم پر وہ غالب آگیا۔ مقصود یہ ہے کہ خلوص نیت سے رب تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کیا جائے، کثیر مال والا کثیر خرچ کرے، اور قلیل مال والا قلیل مال خرچ کرے۔

❁ روی عن عائشة رضی الله عنها انها تصدقت بحبة عنب" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ انگور کا ایک دانہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدقہ کیا۔

❁ وعن بعض السلف انه تصدق ببصلة"، بعض سلف صالحین سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک پیاز صدقہ کیا۔

❁ وفی الخبر "اتقوا النار ولو بشق تمرة" حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آگ سے بچ جاؤ خواہ کھجور کے ایک حصہ سے۔

❁ ردوا السائل ولو بظلف محرق" سائل کو لوٹاؤ خواہ (بکری کے) پاؤں کی جلی ہوئی ہڈی سے۔
مطلب واضح ہے کہ سائل کو کوئی نہ کوئی چیز دے کر لوٹاؤ، خواہ وہ تھوڑی سی تھوڑی ہی کیوں نہ ہو۔

﴿وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ﴾ "اور وہ روکنے والے ہیں غصہ کو۔"

کظم (ض) کظم الباب، دروازہ بند کیا" کظم النهر" نہر کو روکا، کظم القربة، مشکیزہ کو بھر کر اس کا منہ باندھا" کظم

البعیر "اونٹ جگالی کرنے سے رک گیا" کظم فلان علی جرته "فلاں کے پیٹ میں بات نہیں پچتی" کظم غیظه "فلاں نے اپنے غصہ کو پی لیا۔ (المنجد)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے یہی ترجمہ کیا ہے، یہ لغوی ترجمہ بھی ہے، اور بامحاورہ بھی ہے، اور تفسیر روح المعانی نے بھی ایک ترجمہ یہی کیا ہے "والمتجرعین للغیظ" اور غصہ کو پینے والے ہیں۔

راقم نے بیضاوی سے ترجمہ لیا ہے، علامہ بیضاوی رقمطراز ہیں "الممسکین علیه الکافین عن امضائه" المنجد سے جو معانی ذکر کئے ہیں، ان کے مناسب ہی مفسرین کرام نے مختلف الفاظ سے وضاحت کی۔

"یقال کظم غیظه اذاسکت علیه ولم یظهره لابقول ولابفعل"

کہا جاتا ہے "کظم غیظه" وہ اپنے غصہ پر خاموش رہا، نہ زبان سے نہ فعل سے اس کا اظہار کیا۔

"قال المبرد تاویله انه کتم علی امتلائه منه یقال کظمت السقاء اذملأته وسددت علیه"

مبرد نے کہا ہے "کظم غیظه" کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے غصہ کو چھپایا باوجود اس کے کہ وہ غصہ سے بھرا ہوا تھا، جس طرح کہا جاتا ہے "کظمت السقاء" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے مشکیزہ بھر کر اس کا منہ بند کر دیا "ویقال فلان لایکظم علی جرته اذا کان لا یحتمل شیئا" جب کوئی شخص اپنے غصہ کو برداشت نہ کرے تو کہا جاتا ہے "فلان لایکظم علی جرته" فلاں شخص اپنے جگالی سے نہیں رکتا، یعنی غصہ کے وقت بڑبڑا رہا ہے جیسے جانور جگالی کرتا ہے تو اس کی بڑبڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے "کظم ماء" اس نے پانی بند کر لیا "کظم بابا" اس نے دروازہ بند کر لیا "کظم طریقا" اس نے راستہ روک لیا، ان معانی کے مطابق "وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ" کا ترجمہ ہوگا وہ غصہ کو بند کرنے والے ہیں، وہ غصہ کر روکنے والے ہیں، کسی چیز کے بند کرنے اور روکنے کے آلہ کو "سدادة" یا "کظامة" کہا جاتا ہے، اسی طرح کہا جاتا ہے "اخذ فلان یکظم فلان اذااخذ بمجری نفسه" فلاں شخص فلاں پر اپنے غصہ کو اندر اندر ہی گھما رہا ہے، صرف غصہ بھرا سانس لے رہا ہے، لیکن ظاہر نہیں کر رہا، یہ بھی اس معنی کے مناسب ہے کہ کہا جاتا "کظم البعیر کظوما اذاامسک علی مافی جوفه ولم یجتر" اونٹ نے جگالی نہیں کی چارہ کو اپنے پیٹ میں روک رکھا ہے، **راقم** کے نزدیک زیادہ بہتر ہے یوں کہا جائے "کظم البعیر علی جرته ویحرکه" اونٹ جگالی کر رہا ہے وہ اپنے چارہ کو اندر اندر ہی گھما رہا ہے۔

غصہ کو روکنے کی فضیلت میں احادیث مبارکہ:

❀ عن سهیل بن معاذ عن انس الجهنی عن ابیه ان رسول الله ﷺ قال من کظم غیظا وهو

یستطیع ان ینفذه دعاه الله یوم القیامة علی رؤس الخلائق حتی یخیره فی ای الحور شاء" (ترمذی،ابوداؤد)

انس جہنی اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے غصہ کو روک رکھا حالانکہ وہ اس کو نافذ کرنے پر قادر تھا تو اللہ تعالی قیامت کے دن اسے تمام مخلوق کے سامنے بلائے گا ، یہاں تک کہ اسے اختیار دے گا کہ جو حور چاہتا ہے وہ لے لے۔ (منقول از خازن)

خیال رہے کہ "علی رؤس الخلائق" کا عجیب مفہوم یہ ہے کہ وہ پیچھے کھڑا ہوگا، تمام لوگوں کے سروں کے اوپر سے آواز دے کر اسے قریب بلا کر یہ مژدہ سنایا جائے گا کہ تجھے اختیار ہے جو حور چاہتا ہے لے لے۔

❁ عن ابی هریرة ﷺ قال قال رسول الله ﷺ لیس الشدید بالصرعة انما الشدید الذی یملک نفسه عند الغضب" (بخاری و مسلم)

حضرت ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ شخص بہادر نہیں جو کسی کو پچھاڑ دے، بلکہ بہادر وہ شخص ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ کا مالک ہو۔ (منقول از خازن)

اپنے آپ کے مالک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے غصہ پر قبضہ کر سکے۔

❁ عن ابن عمر مرفوعا من کف غضبه ستر الله عورته" (رواه ابن ابی الدنیا)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوع حدیث مروی ہے (یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا) جس شخص نے اپنے غصہ کو روک رکھا اللہ تعالی اس کے عیوب کی پردہ پوشی فرمائے گا۔ (منقول از مظہری)

❁ اخرج عبدالرزاق وابن جریر وابن المنذر عن ابی هریرة فی قوله والکاظمین الغیظ ان النبی ﷺ قال من کظم غیظا وهو یقدر علی انفاذه ملأه الله امنا و ایمانا" واخرجه البیهقی عن ابن عمر مثله"

حضرت ابو ہریرہ ﷺ نے رب تعالی کے ارشاد گرامی "وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ" کی وضاحت میں حدیث شریف بیان کی، بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس نے غصہ کو روکا حالانکہ وہ اسے جاری کرنے پر قادر تھا تو اللہ تعالی اسے امن و ایمان سے بھر دے گا، بیہقی نے حضرت ابن عمر ﷺ سے بھی اس طرح حدیث بیان کی۔ (منقول از در منشور)

❁ واخرج البیهقی عن علی بن الحسین ان جاریة جعلت تسکب علیه الماء یتهیا للصلوة فسقط الابریق من یدها علی وجهه فشجه فرفع رأسه الیها فقالت ان الله یقول والکاظمین الغیظ قال قد کظمت غیظی قالت والعافین عن الناس قال قد عفا الله عنک قالت والله یحب المحسنین قال اذهبی فانت حرة"

بیہقی نے حضرت علی بن الحسین (زین العابدین) ؓ سے روایت ذکر کی کہ ان کی ایک لونڈی آپ کو نماز کی تیاری کیلئے وضوء کرا رہی تھی کہ اس کے ہاتھ سے لوٹا گرا جو آپ کے چہرے پر آ لگا، اور آپ کا چہرا زخمی ہو گیا، آپ نے (غصہ سے) اپنے سر کو اس کی طرف اٹھایا، تو اس نے کہا اللہ تعالی نے (متقین کی شان میں) فرمایا "وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ" وہ غصہ کو روکنے والے ہیں، آپ نے فرمایا "قد كظمت غيظى" تحقیق میں نے اپنے غصہ کو روک لیا ہے، اس نے پھر کہا (اللہ کا ارشاد گرامی ہے) "وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ" وہ لوگوں سے درگذر کرنے والے ہیں، آپ نے فرمایا "قَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ" اللہ تعالی تمہیں معاف فرمائے (یعنی میں نے درگذر کر لیا، تمہیں معاف کر دیا برکت حاصل کرنے کیلئے اللہ تعالی کی طرف منسوب کرتے ہوئے فرمایا اللہ تمہیں معاف فرمائے) اس نے پھر کہا (اللہ تعالی نے فرمایا) وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ" تو آپ نے فرمایا "جا تو آزاد ہے" (منقول از در منثور)

❁ **واخرج البيهقى فى شعب الايمان عن عمرو بنٌ عبسة ان رجلا سال النبى ﷺ ماالايمان فقال الصبر والسماحة وخلق حسن"**

عمرو بن عبسہ ؓ فرماتے ہیں بیشک ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا ایمان (کامل) کیا ہے، آپ نے فرمایا صبر کرنا، سخاوت کرنا، اور اچھے اخلاق رکھنا۔ (منقول از در منثور)

❁ **واخرج الاصبهانى فى الترغيب عائشة سمعت رسول الله ﷺ يقول وجبت محبة الله على من اغضب فحلم"**

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا اس شخص کو اللہ تعالی کی محبت حاصل ہوتی ہے جو غصہ کی حالت میں برداشت سے کام لیتا ہے۔ (منقول از در منثور)

❁ **واخرج الطبرانى فى الاوسط والبيهقى فى الشعب وضعفه عن عائشة مرفوعا قال الشئوم سوء الخلق"**

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مرفوع حدیث بیان کی یعنی نبی کریم ﷺ نے فرمایا نحوست، بدبختی بد خلقی میں ہے، اگرچہ اس حدیث کو بیہقی نے ضعیف کہا ہے (لیکن دوسری اسناد سے یہی حسن یا صحیح بھی ثابت ہے۔
(منقول از در منثور)

❁ **واخرج البزار وابن حبان عن ابى هريرة قال قال رسول الله ﷺ الا اخبركم بخياركم قالوا بلى يارسول الله ﷺ قال اطولكم اعمارا واحسنكم اخلاقا"**

حضرت ابو ھریرہ ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں تم میں سے بہتر لوگوں کی خبر نہ دوں، صحابہ کرام نے عرض کی ہاں یارسول اللہ ﷺ ضرور خبر دیں، آپ نے فرمایا جو تم میں سے بڑی عمر

والے ہوں اوراچھے اخلاق والے ہوں۔ (منقول از درمنشور)

❁ واخرج ابن ابی شیبة واحمدو الطبرانی بسندجیدعن جابر بن سمرة قال قال رسول الله ﷺان الفحش والتفحش لیسامن الاسلام فی شیٔ وان احسن الناس اسلاما احسنهم خلقا"

حضرت جابر بن سمرہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک فحش کلامی اور بداخلاقی کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، بیشک لوگوں میں وہی لوگ اچھے اسلام والے ہیں جو اچھے اخلاق والے ہیں۔(منقول از درمنشور)

❁ واخرج ابوداودوالنسائی عن ابی هریرة ان رسول الله ﷺ کان یدعو اَللّٰهُمَّ اِنِّیٓ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الشِّقَاقِ وَالنِّفَاقِ وَسُوْءِ الْاَخْلَاقِ"

حضرت ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ دعاء فرماتے تھے (تعلیم امت کیلئے) اے اللہ بیشک میں تیری پناہ طلب کرتا ہوں بدبختی اور منافقت اور بداخلاقی سے۔ (منقول از درمنشور)

❁ واخرج البیهقی فی الاسماء والصفات عن عائشة قالت قال النبی ﷺ الرفق یمن والخرق شؤم واذاارادالله باهل بیت خیراادخل علیهم باب الرفق ان الرفق لم یکن فی شیٔ قط الازانه وان الخرق لم یکن فی شیٔ قط الاشانه وان الحیاء من الایمان وان الایمان فی الجنة ولوکان الحیاء رجلاکان رجلاصالحاوان الفحش من الفجوروان الفجورفی النارولوکان الفحش رجلا یمشی فی الناس لکان رجلاسوأ"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا نرمی سے برکت حاصل ہوتی ہے، اور سختی سے نحوست وبدبختی حاصل ہوتی ہے، اللہ تعالی جب کسی گھر والوں پر بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو ان پر نرمی کا دروازہ کھول دیتا ہے، بیشک نرمی کسی چیز میں نہیں پائی جاتی مگر یہ کہ اسے مزین بنادیتی ہے، اور سختی کسی چیز میں نہیں پائی جاتی مگر یہ کہ اسے بدنما بنادیتی ہے، بیشک حیاء ایمان کا حصہ ہے، اور بیشک ایمان جنت میں جانے کا سبب خاص ہے، جس انسان کو حیاء حاصل ہو وہ شخص نیک ہوتا ہے اور بیشک بے حیائی فجور ہے اور بیشک فجور آگ میں جانے کا ذریعہ ہے، اگر کسی شخص کو فحش کلامی حاصل ہو تو وہ لوگوں میں چلتے برا نظر آرہا ہوگا۔ (منقول از درمنشور)

﴿وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ﴾ "اور درگذر کرنے والے ہیں لوگوں سے۔"

"العفو عن الناس اجل ضروب فعل الخیر" لوگوں کو معاف کردینا بھلائی کے کاموں میں بہت بڑا کام ہے۔ انسان جب درگذر سے کام لیتا ہے تو اسے اپنے حقوق خود بخود حاصل ہوجاتے ہیں، درگذر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ

جوسزا کا مستحق ہو، اسے سزا نہ دی جائے بلکہ معاف کر دیا جائے۔ "عَنِ النَّاسِ" سے مراد کون سے لوگ ہیں، اس میں ابوالعالیہ اور کلبی اور زجاج نے یہ بیان کیا "وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ" "یرید عن الممالیک" لوگوں کو معاف کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے غلاموں کو معاف کر دیتے ہیں، ابن عطیہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ مطلب لینا زیادہ بہتر ہے "اذھم الخدمة فھم یذنبون کثیرا والقدرة علیھم متیسرة" جب کہ خدام سے غلطیاں بہت ہوتی ہیں، اور مالک حضرات کو ان پر قدرت میسر ہوتی ہے "وانفاذ العقوبة سھل" اور انہیں سزا دینا آسان ہوتا ہے۔ زید بن اسلم رحمہ اللہ نے بیان فرمایا "وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ" "عن ظلمھم واساء تھم، وھذا عام وھو ظاھر الآیة" لوگوں سے درگذر نے کا حکم ظاہر آیۃ کریمہ سے عام ہے کہ کسی شخص کے ظلم اور اس کے برائی سے درپیش آنے کو معاف کر دیا جائے، اس وجہ سے کہ رب تعالی نے دوسرے مقام پر بھی اسے عام ہی ذکر فرمایا "وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ" جب انہیں کوئی غضب دلا دے تو وہ اسے معاف کر دیتے ہیں۔ (منقول از قرطبی)

راقم کے نزدیک بھی یہ حکم عام ہے ہر صاحب طاقت کو چاہئے کہ وہ اپنے تحت افراد کی غلطیوں کو معاف کر دے، اگر معاف کرنے سے وہ زیادہ جرائم پیشہ ہو جائیں تو سرزنش کی جائے۔

﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ "اور اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

یعنی ان کو ثواب عطاء کرتا ہے۔ سری سقطی رحمہ اللہ نے فرمایا۔

"الاحسان ان تحسن وقت الامکان فلیس کل وقت یمکنک الاحسان"

احسان یہ ہے کہ جب بھی طاقت حاصل ہو تو تم احسان کرو، کیونکہ ہر وقت احسان کرنے کی تمہیں قدرت حاصل نہیں۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا:

بادر بخیر اذ ما کنت مقتدرا   فلیس فی کل وقت انت مقتدر

تم بھلائی کی طرف جلدی کرو جب تمہیں قدرت حاصل ہو   ہر وقت تمہیں (بھلائی کی) قدرت حاصل نہیں ہوتی

ابوالعباس جمانی نے کتنے ہی حسین شعر بیان کئے:

لیس فی کل ساعة واوان   لتھیا صنائع احسان

ہر گھڑی ہر وقت میں نہیں حاصل ہوتے   احسان کرنے کے ذرائع

واذا امکنت فبادر الیھا   حذرا من تعذر الامکان

جب تمہیں قدرت حاصل ہو تو احسان کے ذرائع کی طرف جلدی کرو اس ڈر سے کہ کہیں اس قدرت میں پھر عذر درپیش نہ آجائے۔ (قرطبی)

قال رسول الله ﷺ ان هؤلاء من امتی قلیل الا من عصم الله"
(رواه الثعلبی فی تفسیره عن مقاتل والبیهقی فی مسند الفردوس من حدیث ابن مالک (رحمهم الله)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت میں یہ لوگ (درگذر کرنے والے) بہت کم ہیں ہاں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ جسے اپنی حفاظت میں لے لے۔

"عن الثوری رحمه الله الاحسان ان تحسن الی المسیء فان الاحسان الی المحسن متاجرة"
ابو سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں احسان یہ ہے کہ جو تمہارے ساتھ برائی سے درپیش آئے تم اس پر احسان کرو، جب کوئی احسان کرے تو اس پر احسان کرنا تو عام عادت جاری ہے۔ (مظہری)

خیال رہے:

خیال رہے کہ جبریل علیہ السلام کا نبی کریم ﷺ سے سوال کرنا ''احسان کیا ہے؟ اور آپ کا جواب دینا "الاحسان ان تعبد ربک کانک تراہ فان لم تکن تراه فانه یراک" یہ تفصیلی طور پر سورۃ فاتحہ کی بحث نجوم الفرقان میں دیکھئے۔

فائدہ جلیلہ: غصہ کو روکنے کے مطلب سے اس طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنے نفس کو فنا کر دیتے ہیں ان کی میں اور اکڑ ختم ہو جاتی ہے، اسلئے وہ اپنے غصہ کو روک رکھتے ہیں "لان الغیظ منشاه رذائل النفس من الکبر والحسد والحقد والبخل ونحو ذلک" غصہ کی وجہ سے انسان سے گھٹیا کام سرزد ہوتے ہیں، غصہ کی بڑی وجوہ تکبر اور حسد، کینہ اور بخل وغیرہ جیسی برائیاں ہیں۔ لوگوں کو معاف کرنے سے اشارہ اس طرف ہے کہ اپنے دل کو فناء کے درجہ میں پہنچایا جائے "لان بفناء القلب یسقط الناس عن نظر اعتباره ویری الافعال کلها منسوبة الی الله تعالی" اسلئے کہ جب دل کو دنیا سے دور کر کے اللہ کی یاد میں فناء کر دیا جائے تو اس وقت اس کی نظر لوگوں کی طرف نہیں ہوگی بلکہ تمام افعال اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب سمجھے گا، وہ کسی انسان کا مؤاخذہ کرنا جائز نہیں سمجھے گا بلکہ یہی سمجھے گا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اسی کے حکم کو تسلیم کرتا ہے۔

"ولعل الانفاق فی السراء والضراء عبارة عن علم اشتغال قلوبهم بامتعة الدنیا، والله اعلم"
اللہ تعالیٰ نے متقین کی جو یہ شان بیان کی کہ وہ مشکل اور آسانی میں، خوشی اور غم میں اللہ کی راہ میں مال خرچ

کرتے ہیں، اس سے اشارہ ہے اس طرف کہ ان کو دنیا کے مال سے محبت نہیں ہوتی، مال ان کے سامنے صرف دنیا کی زندگی گذارنے کیلئے ضروری ہوتا ہے، دنیا کے مال سے محبت نہیں لگاتے کہ مال کے جانے سے وہ غم میں مبتلاء ہو جائیں، بلکہ ان کو مال کے آنے اور جانے کی کچھ پرواہ نہیں ہوتی۔ (ماخوذ از مظہری)

احسان کی دو قسمیں ہیں: یعنی غیر پر احسان کرنے کا ایک مطلب یہ ہے کہ اسے نفع پہنچائے، اور دوسری قسم یہ ہے کہ اس سے ضرر کو دور کرے، نفع پہنچانے کا ذکر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی میں ہے ﴿اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ﴾ وہ خرچ کرتے ہیں آسانی میں اور مشکل میں۔

”ویدخل فیه انفاق العلم وذلک بان یشتغل بتعلیم الجاهلین وهدایة الضالین ویدخل فیه انفاق المال فی وجوه الخیرات والعبادات“

اس میں علم خرچ کرنے کا ذکر بھی ہے، کیونکہ مال کی کوئی قید نہیں، وہ لوگ بھی احسان کرنے والے یعنی نفع پہنچانے والے ہیں جو جاہلوں کو تعلیم دیتے ہیں، اور گمراہوں کو ہدایت دیتے ہیں، اور اس میں مال خرچ کرنے کا ذکر بھی ہے، تمام خیرات و بھلائی کی قسموں میں مال خرچ کرنا، اور عبادات میں مال خرچ کرنا جیسے زکوۃ، صدقہ فطر وغیرہ ادا کرنا۔

احسان کی دوسری قسم:

احسان کی دوسری قسم یہ ہے کہ غیر سے ضرر کو دور کرنا، اس کی پھر دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ دنیا میں ضرر کو دور کیا جائے ”وهو ان لایشتغل بمقابلة تلک الاساءة باساءة اخری“ وہ یہ ہے کہ کسی کی برائی کے مقابل برائی نہ کی جائے بلکہ اس سے اچھائی کی جائے اس کا ذکر ”وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ“ میں آ گیا“ اور دوسری صورت یہ ہے کہ کسی سے اخروی ضرر دور کی جائے ”وهو ان یبرئ ذمته عن التبعات والمطالبات فی الآخرة“ وہ یہ ہے کہ آخرت میں جن چیزوں کے پیچھا کرنے اور مطالبہ کرنے کا اسے حق حاصل ہے وہ دنیا میں ہی معاف کر دے، اس کا ذکر ”وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ“ میں آ گیا، لھذا آیۃ کریمہ غیر پر احسان کرنے کی تمام قسموں کو شامل ہو گئی جب یہ تینوں امور یعنی ”مشکل اور آسانی میں مال خرچ کرنا“ اور ”غصہ کو روکنا“ اور ”لوگوں سے درگذر کرنا“ غیر پر احسان کرنے میں مشترک ہیں تو اس کے بعد ان تمام امور کا ثواب ذکر کیا ”وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ“ اور اللہ محبت کرتا ہے احسان کرنے والوں سے ”فان محبة الله للعبد اعم درجات الثواب“ بیشک اللہ تعالیٰ کی بندوں سے محبت کرنا ثواب کے تمام درجات کو شامل ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہر قسم کا، ہر درجہ کا ثواب عطاء فرماتا ہے۔ (کبیر)

"فعلى العاقل ان يسارع الى العمل بالحسنات من الاحسان وانواع الخيرات سريعاقبل الفوات لان فى التاخير آفات"

عقلمند انسان پر لازم ہے کہ وہ نیکیوں کے کام کرنے میں جلدی کرے، یعنی احسان کرے اور ہر قسم کی بھلائیاں ان کے فوت ہونے سے پہلے جلدی کرے، کیونکہ تاخیر میں آفات ہیں، یعنی نفس اور شیطان اسے راہ راست سے روکنے کی کوشش کریں گے۔

جواں مردا جوانمردی بیاموز — زمردان جہان مردی بیاموز

اے جوان مرد جوانمردی سیکھ — جہان کے مردوں سے مرد بنا سیکھ

درون از کین جویاں نگاہ دار — زبان از طعن بدگویان نگاہ دار

تو اپنے باطن کو کینہ تلاش کرنے والوں کے کینہ سے محفوظ رکھ — بدکلامی والوں کے طعنوں سے تو اپنی زبان کو محفوظ رکھ

نکوئی کن آں کہ باتو بدکرد — کزاں بد رخنہ دراقبال خود کرد

نیکی کی اس سے جس نے تیرے ساتھ برائی کی — کہ اس نے برائی سے اپنے بخت میں نقصان پیدا کیا

کنوں وقت تخم ست اگر پروری — گر امید داری کہ خرمن بری

اب بیج بونے کا وقت ہے اگر تو فصل پالنا چاہتا ہے اگر تو امید رکھتا ہے کہ کھلیاں حاصل کرے۔(تو نیکیوں میں جلدی کر)

"یعنی ان کنت تامل الجنة فاعبدربک بانواع العبادات مادمت فی الحیاة فان الفرصة غنیمة والمتاخرین عن الیسر الی الله مغبون"

یعنی اگر تو جنت حاصل کرنے کی امید رکھتا ہے تو اپنے رب کی تمام عبادات پر عمل کر جب تک زندہ ہے، بیشک فرصت کو تو غنیمت جان، جو اللہ تعالی کی طرف چلنے سے تاخیر کرتا ہے، اسے غبن کر لیا جاتا ہے (یعنی نفس وشیطان اسے راہ راست سے ہٹا دیتے ہیں) (روح البیان)

وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (آیۃ نمبر ۱۳۵)

(1) اور وہ کہ جب کوئی بے حیائی یا اپنی جانوں پر ظلم کریں اللہ کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی معافی چاہیں اور گناہ کون بخشے سواء اللہ کے اور اپنے کئے پر جان بوجھ کر اڑ نہ جائیں۔ (کنز الایمان)

(2) وہ جنہوں نے کیا بے حیائی کا کام یا ظلم کیا اپنی جانوں پر تو اللہ کو یاد کیا اور بخشش طلب کی اپنے گناہوں کی، اور کون بخشتا ہے گناہوں کو سوائے اللہ کے، اور نہیں اصرار کیا انہوں نے اس پر جو انہوں نے کیا اور وہ جانتے ہیں۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

(۱) پچھلی آیات میں پہلے جنت کا وصف بیان کیا "اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ" پرہیزگاروں کیلئے تیار کی گئی ہے، اس کے بعد متقین کی ایک قسم کا ذکر کیا "احدهما الذين اقبلوا على الطاعات و العبادات" یعنی متقین کی دو قسمیں ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ابتدائی طور پر ہی طاعات اور عبادات کی طرف متوجہ ہوئے، وہ گناہوں سے محفوظ رہے، ان کے اوصاف اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائے کہ وہ مشکل میں اور آسانی میں خرچ کرتے ہیں، اور وہ غصہ کو روک رکھتے ہیں، اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں۔

وثانیھما الذين اذنبوا ثم تابوا وهو المراد بقوله "وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَه" متقین کی دوسری قسم یہ ہے کہ ان سے گناہ تو سرزد ہوئے لیکن وہ ان پر نادم ہوگئے، اور توبہ کرلی، ان لوگوں کا ذکر ہی اس آیۃ کریمہ میں ہو رہا ہے جس کی بحث جاری ہے "یعنی (وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً) الآية" میں اسی کا ذکر ہے۔ توبہ کرنے والا فرقہ بھی، گناہ نہ کرنے والے فرقہ کی طرح متقی بن جاتا ہے۔

"وذلک لان المذنب اذا تاب عن الذنب صار حاله كحال من لم يذنب قط فی استحقاق المنزلة والكرامة عند الله"

اس کی وجہ یہ ہے کہ گنہگار جب گناہوں سے توبہ کر لیتا ہے تو اس کا حال وہی ہو جاتا ہے جیسا کہ حال اس شخص کا ہوتا ہے جس نے کبھی گناہ کیا ہی نہیں ہوتا، یعنی توبہ کر لینے والوں کو بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسے ہی بلند مرتبہ اور

کرامت کا مستحق ٹھہرالیا جاتا ہے جیسا کہ گناہ نہ کرنے والوں کو بلند مرتبہ اور کرامت کا مستحق ٹھہرالیا جاتا ہے۔

(۲) ما قبل سے دوسرا تعلق یہ ہے کہ پچھلی آیۃ کریمہ میں بیان فرمایا "وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ" (اللہ محبت رکھتا ہے احسان کرنے والوں سے) یعنی غیروں پر احسان کرنے والے اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں۔ اب اس آیۃ کریمہ میں بیان کیا جارہا ہے "وندب فی ھذہ الآیۃ الی الاحسان الی النفس" کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے نفس پر احسان کرنے والے بھی پسند ہیں "فان المذنب العاصی اذاتاب کانت تلک التوبۃ احسانا منہ الی نفسہ" اس لئے کہ گنہگار جب سچے دل سے توبہ کرلیتا ہے تو اس کا توبہ کرنا اس کے اپنے نفس پر اس کا احسان کرنا ہے، اسی لئے وہ رب تعالیٰ کو پسند ہے۔

شان نزول: (۱) شان نزول کی ایک وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دو شخصوں یعنی انصاری اور ثقفی کے درمیان بھائی چارہ قائم کردیا، وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے تھے، ایک ساتھ ہی رہتے تھے، نبی کریم ﷺ جہاد وغیرہ کے سفر میں جن جن لوگوں کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا ہوتا، قرعہ اندازی کے ذریعے ان میں سے ایک ایک کو اپنے ساتھ لے جاتے اور دوسرے کو دونوں گھروں کا نظام چلانے کیلئے چھوڑ جاتے۔ ایک مرتبہ قرعہ اندازی کے ذریعے نبی کریم ﷺ نے اپنے ساتھ ثقفی کو سفر میں لیا۔ اور انصاری کو پیچھے چھوڑا، انصاری سے غلطی یہ ہوئی کہ وہ ثقفی کی غیر موجودگی میں ان کی زوجہ کی طرف کھڑا ہوا کہ اس کا بوسہ لے لے، لیکن اس عورت نے اپنے چہرے پر اپنا ہاتھ رکھ لیا۔ تو وہ انصاری اپنے اس فعل پر نادم ہوگیا۔ جب ثقفی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ لوٹے تو انصاری کو گھر میں نہ پایا، معاملہ کا پتہ چلا کہ وہ تو ایک پہاڑ میں پریشان ہوکر سرگرداں ہوکر پھر رہے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ میرے گناہ کی وجہ سے جو میں توبہ کررہا ہوں اسے قبول فرمالے۔ رسول اللہ ﷺ خاموش رہے کہ اللہ تعالیٰ کا جو حکم آئے گا وہی ہوگا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا کہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والے کی توبہ کو قبول فرماتا ہے۔

(۲) شان نزول کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ مؤمنین کہنے لگے کہ بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کے ہاں ہم سے زیادہ مکرم ہیں کیونکہ وہ کوئی گناہ کرلیں تو ان کے دروازے کی چوکھٹ پر ان کے گناہ کو لکھ دیا جاتا ہے، اور ساتھ ہی یہ لکھ دیا جاتا ہے "اجدع انفک، افعل کذا" تیرا ناک کٹ جائے (تو ذلیل ہوجائے) تو اس طرح کر۔ یعنی جرائم سے دور رہ اور اچھے نیکی کے کام کر۔ صحابہ کرام کا مطلب یہ تھا کہ جب بنی اسرائیل کے گناہوں کے گناہوں کو ان کے دروازے پر لکھ دیا جاتا ہے تو وہ اس رسوائی سے بچنے کیلئے گناہوں سے بھی کافی حد تک دور رہتے ہوں گے، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا "وبین انھم اکرم علی اللہ منھم حیث جعل کفارۃ ذنبھم الاستغفار

"اور مؤمنین کو تسلی دی کہ تمہارا مقام میرے نزدیک مکرم ہے بنی اسرائیل کو تو گناہوں پر توبیخ کر کے رسوا کیا جاتا ہے، لیکن تمہارے گناہوں کا کفارہ توبہ کو بنا دیا گیا، تو سچے دل سے توبہ کرو اللہ تعالی سے گناہوں کی بخشش طلب کرو، اللہ تعالی گناہ معاف کر دے گا۔ (کبیر)

یعنی شان نزول کی دونوں وجوہ میں کوئی تعارض نہیں، بلکہ دونوں وجہ کے پائے جانے پر آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

مختصر مطلب:

اگر چہ ترجمہ سے کافی حد تک مطلب تو سمجھ آرہا ہے لیکن ذرا آسان کرنے کیلئے قدرے وضاحت کی جاتی ہے جو لوگ بے حیائی کا کام کرلیں، یا گناہوں کے ذریعے اپنے آپ پر ظلم کرلیں، لیکن پھر وہ اللہ کو یاد کریں، یعنی اپنے گناہوں پر پشیمان ہو جائیں اور اپنے گناہوں کی اللہ تعالی سے مغفرت (بخشش) طلب کریں، اور وہ یقین کرلیں کہ اللہ تعالی کے بغیر کوئی گناہوں کو بخشنے والا نہیں، اور وہ اپنے گناہوں پر اصرار نہ کریں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ گناہوں پر اصرار جائز نہیں، بلکہ توبہ سے ہی گناہوں کے وبال سے نکل سکتا ہے۔

فاحشہ اور ظلم میں فرق:

مفسرین کرام نے مختلف الفاظ سے ان دونوں گناہوں میں فرق کیا ہے، ان وجوہ میں بھی کوئی تعارض نہیں، بلکہ تمام وجوہ فرق پائی جاتی ہیں۔ "فاحشة "فعلة بالغة فی القبح کالزنا" ہر وہ گناہ جس میں زیادہ قباحت اور بے حیائی پائی جائے اسے "فاحشة" کہا جاتا ہے (او ظلموا انفسهم) بان اذنبوا ای ذنب کان" اور ہر قسم کے گناہ کو ظلم کہا جاتا ہے "وقیل الفاحشة الکبیرة وظلم النفس الصغیرة" اور بیان کیا گیا ہے کہ کبیرہ گناہ کو فاحشہ کہا جاتا ہے، اور صغیرہ کو ظلم کہا جاتا ہے "ولعل الفاحشة مایتعدی وظلم النفس مالیس کذلک" وہ گناہ جو متعدی ہو یعنی گناہ کرنے والوں سے تجاوز کر کے دوسروں کو بھی نقصان پہنچائے، اسے فاحشہ کہا جاتا ہے، اور آگے دوسروں کی طرف متجاوز نہ ہو اسے ظلم کہا جاتا ہے۔ (بیضاوی)

بیضاوی نے جو وجوہ فرق بیان کی ہیں وہ کبیر میں بھی بیان کی گئی ہیں، اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے "الفاحشة هی الزنا وظلم النفس هی القبلة واللمسة والنظرة "فاحشہ سے مراد زنا، اور ظلم نفس سے مراد بوسہ اور چھونا اور نظر کرنا۔

تنبیہ: صغیرہ گناہوں پر انسان مصر نہ رہے یعنی صغیرہ گناہوں کا بار بار ارتکاب کرنے سے وہ کبیرہ بن جاتے

ہیں "والصغیرہ یجب الاستغفار منہا" (صغیرہ سے بھی استغفار کرنا ضروری ہے) علامہ رازی رحمہ اللہ نے تو ان الفاظ کے بعد یوں تحریر کیا۔

"بدلیل ان النبی ﷺ کان مامورا بالاستغفار وھو قولہ "واستغفرلذنبک" وما کان استغفار دالا علی الصغائر بل علی ترک الافضل" (کبیر)

اس کی مکمل بحث ان شاء اللہ اپنے مقام پر ہی آئے گی۔

راقم نے "وَالَّذِيْنَ اِذَافَعَلُوْا فَاحِشَةً" کا ترجمہ کیا ہے "اور وہ جنہوں نے کیا بے حیائی کا کام" یہ ترجمہ کبیر کی اس عبارت سے لیا گیا "الفاحشة ھھنا نعت محذوف والتقدیر "فعلوا فعلة فاحشة"

آیۃ کریمہ کے نزول پر شیطان کی پریشانی و بے قراری:

❁ واخرج الترمذی عن عطاف بن خالدانہ قال بلغنی انھالمانزلت صاح ابلیس بجنودہ وحثاعلی راسہ التراب ودعابالویل والثبورحتی جاء تہ جنودہ من کل بروبحرفقالوا، مالک یاسیدناقال آیة نزلت فی کتاب اللہ لایضربعدھااحدامن بنی آدم ذنب قالواوماھی؟فاخبرھم"قالوانفتح لھم باب الاھواء فلایتوبون ولایستغفرون ولایرون الاانھم علی الحق فرضی منھم بذلک"

عطاف بن خالد کہتے ہیں کہ مجھے یہ خبر ملی کہ جب یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی تو شیطان نے چیخ و پکار کر کے اپنے لشکر کو بلانا شروع کیا، اور اپنے سر پر مٹی ڈالنے لگا، ہائے ہلاکت، ہائے بربادی کی آوازیں دینے لگا، بحر و بر (تری اور خشکی) سے اس کے تمام لشکر جمع ہو گئے، انہوں نے کہا اے ہمارے سردار تمہیں کیا ہو گیا؟ اس نے کہا اللہ کی کتاب (قرآن پاک) میں ایک آیۃ نازل ہوئی جس میں یہ بیان کیا گیا آج کے بعد کسی مؤمن کو کوئی گناہ نقصان نہیں پہنچا سکے گا کیونکہ وہ گناہوں سے توبہ کر کے متقی پرہیزگار بن جائیں گے، انہوں نے پوچھا وہ کون سی آیۃ ہے تو شیطان نے ان کو اس آیۃ (وَالَّذِيْنَ اِذَافَعَلُوْا فَاحِشَةً الآیہ) کے متعلق خبر دی، تو وہ کہنے لگے ہم ان کیلئے خواہشات کا دروازہ کھول دیں گے، وہ توبہ نہیں کریں گے، بخشش طلب کریں گے اور جو کام بھی کریں گے اسے وہ حق سمجھیں گے، شیطان اپنے چیلوں کی یہ بات سن کر راضی ہو گیا۔
(منقول از روح البیان)

﴿ذَكَرُوا اللّٰهَ﴾ "انہوں نے یاد کیا اللہ کو۔"

اس یاد کرنے کی دو وجہ ہیں، ایک یہ کہ وہ اللہ تعالی کی وعید اور اس کے عذاب اور اس کے جلال کو یاد کرتے

ہیں یہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور اس سے حیاء کرنے کے ذرائع ہیں۔ پھر ارشاد فرمایا "فَاسْتَغْفِرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ" وہ اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے ہیں، یعنی استغفار اللہ تعالیٰ سے اس کے عذاب، نہی اور وعید کو یاد کرنے کا اثر اور نتیجہ ہے، اسی مفہوم کو دوسری آیۃ کریمہ میں یوں بیان کیا گیا۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ﴾ (الاعراف آیة نمبر ۲۰۱)

بیشک وہ لوگ جو تقوی اختیار کیئے ہیں جب چھوتا ہے انہیں کوئی خیال شیطان کی طرف سے تو وہ (خدا کو) یاد کرنے لگتے ہیں تو فوراً ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ **دوسری وجہ** اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تعریف کرنا عظمت بیان کرنا اور اس کی بزرگی بیان کرنا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سے جب سوال کیا جائے تو پہلے اللہ تعالیٰ کی ثناء بیان کرنا ضروری ہے۔

"فهنا لما كان المراد الاستغفار من الذنوب قدموا عليه الثناء على الله تعالى ثم اشتغلوا بالاستغفار عن الذنوب"

اس آیۃ کریمہ میں بھی مقصود جب گناہوں سے توبہ کرنا ہے تو پہلے اللہ کو یاد کرنے کا ذکر کیا، پھر گناہوں سے استغفار کا ذکر کیا۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ﴾ "تو بخشش طلب کی انہوں نے اپنے گناہوں کی۔"

مراد اس سے صحیح توبہ کرنا جو اللہ تعالیٰ کے ہاں درجہ مقبولیت حاصل کر لے "وهو الندم على فعل ما مضى مع العزم على ترك مثله في المستقبل" وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے ماضی کے گناہوں پر نادم ہو جائے، اور مستقبل میں گناہ کو چھوڑنے کا پکا ارادہ کر لے، صرف زبان سے استغفار کرنے سے گناہوں کا زوال نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ کی طرف کامل توجہ کرنے سے، اسی سے معافی طلب کرنے سے گناہوں کا زوال ہوگا۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ "اور کون بخشتا ہے گناہوں کو سوائے اللہ کے۔"

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

یہاں بظاہر استفہام ہے، لیکن سوال مقصود نہیں بلکہ استفہام انکاری پایا گیا ہے، کون بخشتا ہے یعنی کوئی بھی گناہوں کو نہیں بخشتا سوائے اللہ کے، مقصد بیان کرنے کا یہ ہے کہ بندہ رب تعالیٰ کے بغیر کسی اور سے بخشش طلب نہ کرے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں بندے کو عذاب دینے پر قادر ہے تو وہی عذاب کو دور کرنے پر قادر ہے

"فصح انه لایجوز طلب الاستغفار الامنه" صحیح یہی ہے کہ بخشش صرف رب تعالیٰ سے ہی طلب کی جاسکتی ہے۔

﴿وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَافَعَلُوْا﴾ "اور نہیں اصرار کیا انہوں نے اس پر جو انہوں نے کیا۔"

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

"فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ" یہ جملہ معطوف علیہ ہے "وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَافَعَلُوْا" جملہ معطوف ہے، درمیان میں ﴿وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ یہ جملہ معترضہ ہے (وَلَمْ يُصِرُّوْا) یدیموا (عَلٰى مَافَعَلُوْا) بل اقلعوا عنه" (جلالین) یعنی وہ اپنے گناہوں پر قائم نہیں رہتے، بلکہ توبہ کر کے یعنی رب تعالیٰ سے گناہوں کی بخشش طلب کر کے گناہوں کو زائل کر دیتے ہیں۔

﴿وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ "اور وہ جانتے ہیں۔"

دینی طلباء کرام بہتر سمجھتے ہیں:

کہ جس طرح ترکیب ہوگی، اسی طرح معنی ہوگا، ایک ترکیب اس جملہ کی یہ ہے کہ یہ حال واقع ہو رہا ہے، اس صورت میں معنوی طور پر عبارت یہ ہوگی "ولم یصروا علی مافعلوا من الذنوب حال ماکانوا عالمین بکونها محظورة محرمة" وہ اصرار نہیں کرتے گناہوں کے فعل پر حالانکہ وہ جانتے ہیں، کہ یہ کام ممنوع اور حرام ہے، اس لئے کہ جو شخص کسی فعل کی حرمت کو نہیں جانتا اسے کبھی معذور سمجھا جاتا ہے، لیکن جو شخص کسی فعل کی حرمت کو نہیں جانتا وہ معذور نہیں سمجھا جاتا۔ **دوسری** ترکیب یہ ہے کہ یہ جملہ معطوفہ ہے، اس سے عقل، تمیز اور گناہوں سے بچنے پر قادر ہونا مراد ہو، اب معنی یہ ہوگا، اور وہ جانتے ہیں، یعنی عقل و تمیز رکھتے ہیں، اسی لئے وہ گناہوں پر اصرار نہیں کرتے بلکہ توبہ کرتے ہیں، رب تعالیٰ سے معافی طلب کرتے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

وضاحت کیلئے مزید اقوال دیکھئے:

(وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ) قال ابن عباس وهم يعلمون انها معصية وان لهم ربا يغفرها" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی "وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ" کا مطلب یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ گناہ کا کام ہے، اور بیشک ان کا رب ہی ان کی بخشش فرمائے گا "وقيل معناه وهم يعلمون ان الله يملك مغفرة

الذنوب" اور اس کا معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ بیشک اللہ تعالیٰ گناہوں کی مغفرت کا مالک ہے۔

"وقیل وهم یعلمون ان الله لایتعاظمه العفو عن الذنوب وان کثرت" اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر گناہوں کا معاف کرنا بھاری نہیں خواہ گناہ کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں "وقیل وهم یعلمون انهم ان استغفروا اغفرلهم" اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ بیشک انہوں نے اگر مغفرت طلب کی تو ان کی مغفرت کردی جائے گی۔ (خازن)

استغفار کی فضیلت کا بیان:

❁ عن علی بن ابی طالب ﷺ انه قال انی کنت اذا سمعت حدیثا من رسول الله ﷺ نفعنی الله منه ماشاء ان ینفعنی واذا حدثنی احد من الصحابة استحلفته فاذا حلف لی صدقته وانه حدثنی ابوبکر وصدق ابوبکر انه سمع رسول الله ﷺ یقول مامن عبد مؤمن اوقال مامن رجل یذنب ذنبا فیقوم فیتطهر ثم یصلی رکعتین ثم یستغفر الله الا غفر الله له ثم قرأ هذه الآیة والذین اذا فعلوا فاحشة او ظلموا انفسهم ذکروا الله الی آخر الآیة"

(اخرجہ ابوداود والترمذی)

حضرت علی ﷺ فرماتے ہیں بیشک میں نے جب رسول اللہ ﷺ سے حدیث سنی اللہ تعالیٰ نے مجھے نفع عطاء کیا جو نفع وہ دینا چاہتا، جب مجھے کسی ایک صحابی نے حدیث بیان کی تو میں نے اس سے قسم طلب کی جب مجھے قسم اٹھا کر بتایا گیا تو میں نے اس کی تصدیق کردی، بیشک مجھے حضرت ابوبکر ﷺ نے حدیث بیان کی، بیشک آپ نے سچ بیان فرمایا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے فرماتے ہوئے سنا کوئی مومن بندہ نہیں کہ وہ گناہ کرلے پھر کھڑا ہو جائے، پاکیزگی اختیار کرلے، پھر دو رکعتیں پڑھے پھر اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کی بخشش فرماتا ہے، پھر آپ نے یہی آیۃ کریمہ ﴿وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً﴾ مکمل آیۃ کریمہ پڑھی۔ (منقول از خازن)

❁ عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ والذی نفسی بیده لو لم تذنبوا لذهب الله بکم ولجاء بقوم یذنبون فیستغفرون فیغفر لهم" (رواه مسلم)

حضرت ابوھریرہ ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اگر تم گناہ نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ تمہیں لے جاتا، ایک اور قوم کو لے آتا جو گناہ کرتی تو اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرماتا۔ (منقول از خازن)

سحری کے وقت استغفار:

سیدالاستغفار وان وقته الاسحار فالاستغفار عظیم وثوابه جسیم" سیدالاستغفار کا وقت سحری کا وقت ہے، سحری کے وقت استغفار عظیم استغفار ہے، اوراس کا ثواب بہت بڑا ثواب ہے۔

سید الاستغفار:

روی الترمذی عن النبی ﷺ انه قال من قال استغفر الله الذی لااله الاھوالحی القیوم واتوب الیه غفرله وان کان قدفرمن الزحف"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا، جس شخص نے کہا "اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِیْ لَآاِلٰهَ اِلَّاھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْهِ" تو اس کی بخشش کردی جاتی ہے اگرچہ وہ جنگ سے بھاگ آئے۔ (منقول از قرطبی)

❁ وروی مکحول عن ابی هریرة قال مارایت اکثراستغفارامن رسول الله ﷺ وقال مکحول مارایت اکثراستغفارمن ابی هریرة وکان مکحول کثیرالاستغفار"

حضرت مکحول ﷺ فرماتے ہیں حضرت ابوھریرہ ﷺ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ استغفار کرنے والا کوئی نہیں دیکھا، مکحول ﷺ فرماتے ہیں میں نے حضرت ابوہریرہ ﷺ سے زیادہ استغفار کرنے والا نہیں دیکھا، مکحول خود بھی بہت زیادہ استغفار کرتے تھے۔ (منقول از قرطبی)

خطباء کے فائدہ کیلئے:

قال سهل بن عبدالله، اَلْجَاهِلُ مَیِّتٌ، وَالنَّاسِیُ نَائِمٌ، وَالْعَاصِیْ سَکْرَانُ، وَالْمُصِرُّ هَالِکٌ"

سہل بن عبداللہ رحمہ اللہ کہتے ہیں، جاہل میت کی طرح ہے، بھولنے والا سونے والے کی طرح ہے، اور نافرمان نشے والے کی طرح ہے، اور گناہوں پر اصرار کرنے والا ہلاک ہونے والے کی طرح ہے۔ (قرطبی)

فائدہ: الاصرارھوان ینوی الایتوب فاذانوی التوبة النصوح خرج عن الاصرار"

گناہوں پر اصرار کرنے والا جب خالص توبہ کرنے کی نیت کر لیتا ہے تو وہ اصرار سے نکل جاتا ہے۔

انسان تفکر کرے اور دعاء بھی کرے:

گناہوں پر اصرار ختم ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسے توبہ کی توفیق عطاء کر دیتا ہے جب وہ قرآن پاک میں تفکر

کرتا ہے اور اسے جنت کا تفصیلی تذکرہ جو رب تعالی نے فرمایا وہ اور مطیعین سے وعدہ اور آگ کا عذاب نافرمانوں کیلئے اور ان پر تہدید (دھمکیاں) وغیرہ جب اس کے ذہن میں آجائیں گی تو اسکے دل میں اللہ تعالی کا خوف اور اس کی رحمت کی امید آجائے گا تو یہ رب تعالی سے دعاء کرے گا، اس کی طرف رجوع کرے گا یہ توفیق بھی اسے رب تعالی سے ہی حاصل ہوگی کہ وہ توبہ کرلے اور اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرلے۔ (منقول از قرطبی)

تنبیہ: حقوق العباد جب تک ادا نہیں کرے گا اس وقت تک اللہ تعالی اس کی توبہ قبول نہیں کرے گا، اس لئے توبہ کرنے والے کیلئے ضروری ہے کہ اگر اس کے ذمہ حقوق العباد ہیں تو ان کو ادا کرے۔ (منقول از قرطبی)

❁ **عن ابی هريرة عن النبی ﷺ فيمايحكی عن ربه تعالی قال اذااذنب عبدذنبافقال اللهم اغفرلی ذنبی قال تبارک وتعالی اذنب عبدی دنباعلم ان له ربايغفرالذنب وياخذبالذنب،وفی رواية اعمل ماشئت قدغفرت لک،قال عبدالاعلی لاادری أقال فی الثالثة اوالرابعة اعمل ماشئت"**

حضرت ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب تعالی (کی رحمت) کی حکایت اس طرح بیان کی کہ بندہ جب گناہ کرتا ہے اور (توبہ کرتا) کہتا ہے اے اللہ میرے گناہ معاف کردے، اللہ تبارک وتعالی فرماتا ہے میرے بندے نے گناہ کرلیا ہے، اسے معلوم ہے کہ بیشک اس کا رب ہے جو گناہوں کی مغفرت بھی کرتا ہے اور گناہوں پر پکڑتا بھی ہے، (رب تعالی ان الفاظ سے اس کی مغفرت کردیتا ہے) بندہ پھر گناہ کرلیتا ہے پھر عرض کرتا ہے اے اللہ میرے گناہ کو معاف کردے، اللہ تعالی فرماتا ہے میرے بندے نے گناہ کرلیا ہے، وہ جانتا ہے کہ اس کا رب ہے جو گنا معاف کرتا ہے، اور گناہوں پر پکڑ بھی وہی کرتا ہے، ایک روایت میں ہے کہ (بندہ جب بار بار غلطی کرتا ہے اور رب تعالی سے ہی معافی طلب کرتا ہے) اللہ تعالی فرماتا ہے تو جو چاہے عمل کر میں نے تیری مغفرت کردی۔

گذشتہ سے پیوستہ:

آیۃ کریمہ کے شان نزول کی دو وجہ شروع میں بیان کردیں، روح البیان، معالم التنزیل وغیرہ نے ایک اور وجہ بھی بیان کی کہ "کہ ایک شخص جس کا نام تیہان تھا، وہ کھجوریں بیچتا تھا، اس کا لقب تمار تھا، اس تیہان تمار کے پاس ایک حسین عورت کھجوریں خریدنے کیلئے آئی تو اس نے عورت کو اپنے گلے لگالیا اور بوسہ لےلیا، لیکن پھر اپنی غلطی پر نادم ہوگیا (توبہ کی غرض سے کہ غلطی معاف ہوجائے) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اپنا معاملہ آپ پر پیش کیا، تو اس وقت یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی، آیۃ کریمہ کے شان کی تین وجوہ ذکر کرنے کے بعد علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"وانت تعلم انه لامانع من تعدد سبب النزول و ایاما کان فباطلاق اللفظ ینتظم مافعله الرماۃ انتظاما اولیا"

اور تمہیں معلوم ہے کہ نزول کے اسباب کے تعدد میں کوئی ممانعت نہیں، کئی واقعات کے بعد آیۃ کریمہ کا نزول ہوا ایسا ممکن ہے اس میں کوئی خرچ نہیں، شان نزول کوئی بھی ہو عموم الفاظ سے مطلب یہی ہے کہ جو بھی گناہ کرلے اور ان گناہوں پر جمانہ رہے بلکہ فورا رب تعالی کو یاد کرے اور اس سے گناہوں کی مغفرت طلب کرے تو اللہ تعالی اس کی مغفرت کردے گا۔ (منقول از روح المعانی)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

اُولٰئِکَ جَزَاؤُهُمْ مَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ۝ (آیۃ نمبر ۱۳۶)

(1) ایسوں کو بدلہ ان کے رب کی بخشش اور جنتیں ہیں، جن کے نیچے نہریں رواں ہمیشہ ان میں رہیں، اور کامیوں کا کیا اچھا نیک ہے۔ (کنز الایمان)

(2) یہی بلند مرتبہ ہیں وہ جن کا بدلہ بخشش ہے ان کے رب کی طرف سے، اور جنتیں ہیں جاری ہیں ان کے نیچے نہریں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، کتنا ہی اچھا ہے اجر (نیک) عمل کرنے والوں کا۔ (نجوم الفرقان)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"اولئک" کی ترکیب میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ یہ جملہ استینافیہ ہو اس صورت میں اس کا "مشار الیہ" اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ" میں جو متقین کا ذکر ہے اور پچھلی آیۃ میں جو توبہ کرنے والوں کا ذکر ہے۔ وہ مجموعی طور پر ہے، یعنی یہی متقین اور تائبین کا بدلہ ان کے رب کی طرف سے بخشش ہے۔ الخ

اور دوسری ترکیب یہ ہے کہ پچھلی آیۃ کریمہ جو موصول "والذین" ہے اس موصول اور صلہ کی یہ خبر ہو تو اس صورت میں "مشار الیہ" صرف تائبین ہوں گے۔ یعنی توبہ کرنے والے ہی وہ لوگ ہیں جن کا بدلہ مغفرت ہے ان کے رب کی طرف سے۔ الخ (مظہری)

راقم نے "اولئك" کا ترجمہ کیا ہے "یہی بلند مرتبہ ہیں" یہ ترجمہ تفسیر ابی السعود سے لیا گیا ہے۔

"اولئک" اشارة الی المذکورین آخرا باعتبار اتصافهم بما مر من الصفات الحمیدة وما فیه من معنی البعد للاشعار ببعد منزلتهم وعلو طبقتهم فی الفضل"

"اولئك" کا اشارہ پچھلی آیات میں جن لوگوں کا ذکر ہے ان کی طرف ہے، ان کی اچھی صفات کی وجہ سے ذکر فرمایا کہ وہ اچھی جزاء کے مستحق ہیں "اولئك" اشارہ بعید کیلئے ہے حالانکہ ان لوگوں کا ذکر قریب ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ فضیلت میں ان کا مرتبہ بلند ہونے اور ان کا طبقہ بلند ہونے کی وجہ سے گویا کہ ان مرتبہ کے لحاظ پر بعد (دوری) حاصل ہے، طلباء کرام جانتے ہیں اسے "بعد رتبی" کہا جاتا ہے، حقیقت میں قرب اور شان اور فضیلت میں بعد دونوں چیزوں کا اعتبار کرتے ہوئے راقم نے ترجمہ کیا ہے "یہی بلند مرتبہ ہیں" واللہ اعلم بالصواب

دو امر مطلوب ہیں:

ایک یہ کہ عذاب سے محفوظ رکھنا، اس کا تذکرہ "مَغْفِرَةٌ مِنْ رَّبِّهِمْ" میں کیا ہے، کہ ان کے گناہوں کی ستر پوشی کی جاتی ہے اور ان کی بخشش کی جاتی ہے۔ **دوسری چیز** مطلوب یہ ہے کہ ان کو ثواب پہنچانا اس کا ذکر ﴿جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا﴾ (اور ان کی جزاء) جنتیں ہیں جاری ہیں ان کے نیچے نہریں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اس کے بعد اللہ تعالی نے "نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ" ذکر فرما کر یہ واضح کر دیا "ان **الذی یحصل لهم من ذلک وهو الغفران والجنات یکون اجر العلهم و جزاء علیه**" بیشک ان کو جو مغفرت اور جنتیں (باغات) جو حاصل ہوں گی یہ ان کے نیک عمل پر اجر اور جزاء ان کو حاصل ہونی ہے۔ (کبیر)

تنبیه: **قال القاضی، وهذا یبطل قول من قال ان الثواب تفضل من الله ولیس بجزاء علی عملهم"**

رب تعالی کے ارشاد گرامی "وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ" (کتنا ہی اچھا ہے اجر (نیک) عمل کرنے والوں کا) سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ ان لوگوں کا یہ قول باطل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ثواب صرف اللہ تعالی کے فضل سے حاصل ہوتا ہے، کسی عمل کا بدلہ نہیں ہوگا، یہ قول درست نہیں کیونکہ واضح طور پر ان الفاظ مبارکہ میں عمل پر اجر و ثواب کا ذکر کیا۔ (کبیر)

اور رب تعالی کا ارشاد گرامی:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا﴾ "بیشک اللہ تعالی ضائع نہیں کرتا اجر اس کا جو اچھا عمل کرتا ہے" بھی

اسی پر دلالت کر رہا ہے کہ ان کو نیک عمل پر اجر وثواب حاصل ہوگا۔ راقم کا اس پر موقف یہ ہے کہ نیک اعمال اجر وثواب کا ذریعہ ہیں، البتہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم بھی ان کے شامل حال رہتا ہے، کیونکہ اگر وہ چاہے تو بغیر عمل کے بھی مغفرت فرمادے۔

ماقبل اور مابعد سے تعلق:

اس آیۃ کریمہ کا ماقبل سے تعلق یہ ہے کہ پہلے ذکر کیا گیا توبہ کرنے والوں کا جو اپنے گناہوں پر اصرار نہیں، اب ذکر کیا جارہا ہے کہ جو خلوص دل سے توبہ کرتے ہیں، اور اپنے گناہوں پر جمے نہیں رہتے، اللہ تعالیٰ ان کو مغفرت اور جنات عطاء کرتا ہے۔ مابعد سے تعلق یہ کہ غزوۂ احد میں بعض صحابہ کرام پسپا ہو گئے تھے، اس ذکر سے پہلے ہی یہ بیان کردیا "من فرثم تاب ولم یصر فله مغفرة الله" جو شخص پسپا ہو گیا لیکن اس نے توبہ کر لی اور اپنی خطاء پر جما نہیں رہا اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت کردی۔ (ماخوذ از قرطبی)

راقم نے چند سطر پہلے اپنا موقف ذہنی سوچ سے لکھا، روح البیان سے اسے تائید ان الفاظ سے حاصل ہوگئی

"وَنِعْمَ اَجْرُ الْعَامِلِیْنَ" المخصوص بالمدح محذوف ای ونعم اجر العاملین ذلک ای ماذکر من المغفرة والجنات والتعبیر عنهما بالاجر المشعر بانهما تستحقان بمقابلة العمل وان کان بطریق التفضل لمزید الترغیب فی الطاعات والزجر عن المعاصی" (روح البیان)

"نعم" فعل مدح ہے اس کا مخصوص بالمدح "ذلك" محذوف ہے جس کا اشارہ مغفرت اور جنات کی طرف ہے یعنی وہ مغفرت اور جنات کے مستحق ہوں گے کہ ان کے اعمال اچھے ہوں گے ہاں البتہ ان کو اللہ تعالیٰ کا فضل بھی حاصل ہوگا جس کی وجہ سے ان کو نیکیوں میں رغبت زیادہ حاصل ہوگی، اور معاصی سے زجر حاصل ہوگی۔

انسان عمل سے بے نیاز نہ ہو:

"روی ان الله تعالی اوحی الی موسی علیه السلام "ماقل حیاء من یطمع فی جنتی بغیر عمل یاموسی کیف اجود برحمتی علی من یبخل بطاعتی"

روایت بیان کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ وہ شخص کتنی ہی کم حیاء والا ہے جو بغیر عمل کے میری جنت کی طمع رکھتا ہے۔ اے موسیٰ میں اسے اس پر جنت عطاء کرنے کی کیسے سخاوت کروں جو

میری طاعت کرنے میں بخل کرتا ہے۔ (روح البیان، بحرالحیط)

❀ وعن شهر بن حوشب طلب الجنة بلاعمل ذنب من الذنوب وانتظار الشفاعة بلاسبب نوع من الغرور وارتجاء الرحمة ممن لايطاع حمق وجهالة"

شہر بن حوشب کا قول یہ ہے کہ جنت کی طلب بغیر عمل کے گناہوں میں سے ایک گناہ، اور بغیر سبب کے شفاعت کی انتظار دھوکہ کی قسموں میں سے ایک قسم ہے، اور رحمت کی امید اس ذات سے کرنا جس کی اطاعت ہی نہ کی جائے حماقت وجہالت ہے۔ (روح البیان، بحرالحیط)

حضرت رابعہ بصریہ رحمہا اللہ اکثر طور پر یہ شعر پڑھا کرتی تھیں۔

ترجوالنجاة ولم تسلک مسالكها ان السفينة لاتجری علی اليبس"

تو نجات کی امید کرتا ہے اور اس کے راستوں پر نہیں چلتا۔ بیشک کشتی خشکی پر نہیں چلا کرتی۔ (روح البیان)

فائدہ: سب سے عمدہ چیز ایمان ہے، یہ توحید سے حاصل ہوتا ہے اسلئے کہ توحید شرک کے منافی ہے، وہ ایمان وتوحید انسان کو توبہ اور استغفار کی طرف پہنچاتے ہیں، مومن وموحد کیلئے یہی بلندی مقام ہے کہ وہ توبہ استغفار کی طرف پہنچاتے ہیں، مومن وموحد کیلئے یہی بلندی مقام ہے کہ وہ توبہ واستغفار کے ذریعے متقین میں آجائے تاکہ وہ جنت میں داخل ہوسکے۔ اللہ تعالی کی ذات وصفات پر ایمان رکھنے والے اور اللہ تعالی کی واحدانیت پر ایمان رکھنے والے بندہ کے لائق یہی ہے کہ وہ اپنے اختیار سے اللہ تعالی کے احکام تسلیم کرتا رہے اور اللہ تعالی نے جن کاموں سے روکا ہے ان سے رک جائے، اور یہ بھی ایمان رکھے "وان كان التوفيق الى جانب العمل ايضا من عنايته تعالى " کہ عمل کی توفیق بھی اللہ تعالی کی مہربانی سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

نخست اوارادت بدل درنہاد پس این بندہ برآستان سرنہاد

سب سے پہلے بندہ اپنے دل کے ارادہ کو رب کے در پر رکھے اس کے بعد بندہ اپنے رب تعالی کے آستانہ پر سر رکھے۔ یعنی ایمان پہلے لائے اور پھر رب تعالی کی عبادت کرے۔

طالب حق کیلیے یہ ضروری ہے:

کہ وہ کامل ادب کو بجالائے تاکہ ادب کے ذریعے بلند مراتب تک پہنچ جائے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ رسول اللہ ﷺ صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے پاک ہونے کے باوجود اللہ تعالی سے ہر روز ستھر یا سو مرتبہ استغفار کرتے، اس کی

وجہ یہی تھی کہ اللہ تعالیٰ کے ادب کو بجالایا جائے۔

وبکمال ادبه وصل الی ماوصل حتی صار اتباعه سببا لمحبة الله کما قال الله تعالی "قل ان کنتم تحبون الله فاتبعونی یحببکم الله"

نبی کریم ﷺ رب تعالیٰ کے کامل ادب کو بجالانے کی وجہ سے اس عظیم درجہ پر پہنچے کہ آپ کی تابعداری اللہ تعالیٰ کی محبت کا ذریعہ بن گئی، اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ (اے محبوب) آپ فرمادیجئے اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری تابعداری کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔ نبی کریم ﷺ اتنے بلند و بالا منصب پر قائم ہونے کے باوجود "**ومع ذلک کان خوفه واجلاله فی غایة والکمال**" کامل درجہ کا اللہ تعالیٰ کا خوف اور اس کے جلال کا لحاظ دل میں رکھتے تھے۔ اے نبی کریم ﷺ کے امتی، آپ کی اتباع کرنے والے تیرے لئے تو اور ہی ضروری ہے کہ تو اپنے آقا ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے اور اپنے آقا و مولیٰ کی تابعداری کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں رکھ، اللہ تعالیٰ کے جاہ و جلال کو بھی دل میں بسالے، **راقم** کے نزدیک یہ بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت پر بھی قوی امید رکھ اور اس کے جمال کی طرف بھی دھیان رکھ۔ (ماخوذ از روح البیان)

علامہ اسمٰعیل حقی رحمہ اللہ نے اپنے لئے اور دوسرے مؤمنین کیلئے دعاء کی راقم کی بھی اپنے لئے اور تمام مؤمنین کیلئے وہی دعاء ہے۔

"وفقنی الله وایاکم الی مایجب ویرضی ویداوی بلطفه وکرمه هذه القلوب المرضی فان بیده مفاتیح الاصلاح والفوز بالبغیة والظفر بالفلاح"

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو توفیق عطاء فرمائے کہ ہم وہی کام کریں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہوں اور جن پر وہ راضی ہوجائے، اے اللہ اپنے لطف و کرم سے ہمارے مریض دلوں کو دواء دے دے (تاکہ ان کو شفا حاصل ہوجائے) اصلاح اور مقاصد کے حصول کی کامیابی اور فلاح پر کامیاب کرنے کی چابیاں رب تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہی ہے (اس لئے اسی پر امید ہے کہ وہ ہمیں بھی یہ مقاصد عطاء فرمائے گا)۔ (روح البیان)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"خَالِدِیْنَ فِیْهَا" حال مقدرة من الضمیر المجرور فی (جزاؤهم) لانه مفعول به معنی اذهو فی قوة یجزیهم الله جنات خالدین فیها"

اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی میں "خَالِدِیْنَ فِیْهَا" "جزاؤهم" کی مجرور ضمیر یعنی مضاف الیہ سے حال مقدرہ ہے کیونکہ وہ معنی مفعول ہے، معنوی لحاظ پر مطلب یوں ہوگیا، وہ ان کو جزاء عطاء کرے گا یعنی جنات عطاء کرے گا تو

اس حال میں انہیں وہاں ہمیشہ رہنا ہوگا۔ (روح المعانی)

حال مقدرہ کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ جس کام نے مستقبل میں حاصل ہونا ہو اور اس حال میں کسی چیز نے واقع ہونا ہو۔

مؤمنین کے تین طبقات ہیں:

(۱) متقین (۲) تائبین (۳) مصرین

(۱) **متقین:** کو اللہ تعالیٰ نے اجر و ثواب عطاء کرنے کا اور مغفرت کرنے کا اپنے فضل و کرم سے وعدہ کر رکھا ہے اور ساتھ ہی یہ فرمایا ﴿وَلَا نُضِيعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ اور ہم ضائع نہیں کرتے اجر احسان کرنے والوں کا۔

(۲) **تائبین:** یعنی توبہ کرنے والوں سے رب تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مغفرت کا اور جنت عطاء کرنے کا وعدہ فرمایا۔ جس کا ذکر اس زیر بحث آیۃ کریمہ اور اس سے پچھلی آیۃ کریمہ میں ہے۔

(۳) **مصرین:** یعنی گناہوں پر اصرار کرنے والوں کے متعلق کیا حکم ہے؟ اس میں دو مذہب ہیں۔

ایک مذہب یہ ہے:

ان غیر المصریین تغفر ذنوبهم ويدخلون الجنة واماالهاتدل على ان المصريين لاتغفر ذنوبهم ولايدخلون الجنة كمازعمه البعض "

یعنی بعض لوگوں نے یہ کہا کہ جب رب تعالیٰ نے مغفرت کا وعدہ توبہ کرنے والوں سے فرمایا اور ساتھ ہی یہ فرمایا "وَلَمْ يُصِرُّوْعَلٰى مَافَعَلُوْا" کہ وہ اپنے برے افعال پر اصرار نہ کریں یعنی گناہوں پر جمے نہ رہیں تو رب تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے گا تو اس سے پتہ چل گیا کہ جو گناہوں پر اصرار کریں گے تو ان کے گناہوں کو رب تعالیٰ نہیں بخشے گا اور نہ ہی ان کو جنت میں داخل کرے گا

یہ مذہب صحیح نہیں: علامہ آلوسی رحمہ اللہ اسے رد فرماتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں۔

كمازعمه البعض فلا، لان السكوت عن الحكم ليس بيانا لحكمهم عندبعض "

بعض لوگوں نے یہ گمان کیا ہے کہ گناہوں پر اصرار کرنے والوں کی مغفرت نہیں ہوگی اور وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گے ان کا یہ گمان درست نہیں، اس لئے کہ بعض محققین نے یہ بیان کیا ہے کہ ایک حکم بیان کر دیا جائے دوسرا نہ بیان کیا جائے تو وہ بیان کئے جانے والے حکم سے خود بخود بیان نہیں ہو جاتا، گناہوں پر اصرار نہ کرنے والوں اور توبہ کرنے والوں کا حکم بیان

کر دیا گیا ہے کہ ان کی مغفرت اللہ تعالیٰ فرمائے گا اور ان کو جنات عطاء فرمائے گا، لیکن اس سے اصرار کرنے والوں کا حکم خود بخود صادر نہیں ہوتا کیونکہ ان کے متعلق بیان ہی نہیں کیا گیا، بلکہ ان کے حکم سے سکوت کیا گیا ہے۔

دوسرا مذہب: یہی صحیح ہے کہ گناہوں پر اصرار کرنے والے اگر گناہوں کو جائز سمجھتے ہوں تو وہ کافر ہوں گے اور ان کی مغفرت نہیں ہوگی اور وہ جنت میں بھی داخل ہوں گے اور اگر وہ گناہوں کو گناہ ہی سمجھتے ہوئے غلطی سے گناہوں پر اصرار کرتے ہوں، ان گناہوں پر جمے ہوئے ہوں تو وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت میں ہیں رب تعالیٰ چاہے تو ان کو اپنے فضل سے معاف کر دے اور چاہے تو ان کو گناہوں کا عذاب دے دے۔

تفضّل کی دو قسمیں ہیں:

ایک قسم یہ ہے کہ وہ عمل پر مرتب ہوتا ہے جیسا کہ کھانے پر سیر ہونا مرتب ہوتا ہے اس کا نام اجر و جزاء ہے۔

تفضّل کی دوسری قسم:

هو محض التفضل حقيقة واسما" وہ فقط مہربانی ہے حقیقۃً بھی اور نام کے لحاظ سے بھی صرف رب کا فضل اور مہربانی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا کبیرہ گناہوں کا معاف کرنا اور جنت میں اللہ تعالیٰ کا اپنا دیدار سے مشرف فرمانا جو بھی اس کی شان کی لائق ہوگا اس دیدار کی کیفیت کو بیان نہیں کیا جاسکتا یہ سب عمل کے بغیر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہوگا اس کا نام ہی عفو، کرم، تفضّل اور مہربانی ہے اسے اجر و ثواب نہیں کہا جاسکتا۔ (ماخوذ از روح المعانی)

نکتہ: "ونعم اجر العاملین" لان المتدارک کالعامل لتحصل بعض مافوّت علی نفسه وکم بین المحسن والمتدارک والمحبوب والاجیر ولعل تبدیل لفظ الجزاء بالاجر لهذه النکته" (بیضاوی)

اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ﴿وَنِعْمَ اَجْرُ الْعَامِلِیْنَ﴾ اور اچھا ہے اجر (نیک) عمل کرنے والوں کا، گناہوں سے توبہ کر کے اپنی تقصیر کا تدارک کرنے والے ایسے ہی ہیں جیسے اپنی ذاتی کوئی چیز فوت ہو جائے تو اسے حاصل کر لے۔ ابتدائی طور پر احسان کرنے والے، اور غلطیوں کا تدارک کرنے والوں میں بہت بڑا فرق ہے اور رب تعالیٰ کی رضاء کیلئے عمل کرنے والے رب تعالیٰ کے محبوب بن جاتے ہیں، اور جنت کیلئے عمل کرنے والے اجر (مزدور) کے درجے میں ہوتے ہیں، ان دونوں میں بھی بہت بڑا فرق ہے، اسی نکتہ کیلئے جزاء کے بعد اجر ذکر کیا کہ ان کا عمل ہی حصول جنت کیلئے ہے تو ان کی جزاء حقیقت میں اجر کا درجہ رکھتی ہے۔

قَدْخَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ○ (آیۃ نمبر ۱۳۷)

(1) تم سے پہلے کچھ طریقے برتاؤ میں آچکے ہیں تو زمین میں چل کر دیکھو، کیسا انجام ہے جھٹلانے والوں کا۔ (کنز الایمان)

(2) تحقیق گذر گئے تم سے پہلے طریقے، تو چلو زمین میں تو دیکھو کیسے ہوا انجام جھٹلانے والوں کا۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

پچھلی آیۃ میں اللہ تعالیٰ کے وعدہ کا ذکر ہے جو طاعت پر اور معصیت سے توبہ پر مغفرت اور جنت عطاء کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے، اب اس آیۃ کریمہ میں فعل طاعت پر اور گناہوں سے توبہ کرنے پر ابھارا گیا ہے"وھو تامل احوال القرون الخالية من المطيعين والعاصين" وہ ہے گذرے ہوئے لوگوں کے احوال میں غور وفکر کرنا، یعنی مطیع اور عاصی لوگوں کی حالات میں غور وفکر کرو تاکہ تمہیں طاعت کرنے اور گناہ سے بچنے یا گناہ سے توبہ کرنے کا پتہ چل جائے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿قَدْخَلَتْ﴾ (تحقیق گذر گئے)

واحدی نے بیان کیا ہے کہ لغت میں "الخلو" کا معنی ہے "انفراد" وہ مکان جو خالی ہو رہنے والوں سے منفرد ہوا سے "المكان الخالی" کہا جاتا ہے۔ اور گزرے ہوئے زمان پر بھی بولا جاتا ہے، کہا جاتا ہے 'الزمان الخالی" گذرا ہوا زمانہ" کیونکہ وہ بھی اب موجود نہیں۔ موجود ہونے سے خالی ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے "الامم الخالية" گذری ہوئی قومیں۔ "سنن جمع ہے "سنة" کی، "واما السنة فهي الطريقة المستقيمة" سنت ایک جاری طریقہ کو کہا جاتا ہے۔ اور وہ مثال جو جاری ہوا سے بھی سنت کہا جاتا ہے۔

اس لفظ کے اشتقاق میں چند وجوہ ہیں:

(۱) یہ وزن ہے "فعلة" کا، لیا ہوا ہے "سن الماء يسنه" سے یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب پانی لگا تار گرایا جائے۔ "السن الصب للماء" پانی کے بہانے کو "السن" کہا جاتا ہے۔ عرب حضرات جاری پانی سے

جاری راستہ کوتشبیہ دے کر "الطریقة المسنونة"
(۲) یاماخوذ ہے "سن الرمح" سے نیزے کو پھل لگانا۔ "سن الاسنان" دانتوں میں مسواک کرنا۔ "استسن" عمر رسیدہ ہونا "حمأ مسنون" بدبودار مٹی "الفعل المنسوب الی النبی ﷺ سمی سنة" نبی کریم ﷺ کے فعل کو سنت کہا جاتا ہے یہ معنی سب سے زیادہ مشہور ہے۔ (ماخوذ از کبیر المنجد)

﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ﴾ ان الفاظ مبارکہ سے مراد یہ ہے "قَدْ انْقَضَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنُ الله تعالی فی الامم السالفة" تحقیق گذر گئے تم سے پہلے اللہ تعالی کے طریقے تم سے پہلے گذری ہوئی امتوں میں، (کبیر)
"قیل سنن" ای "امم" و السنة الامة" بعض حضرات کا قول ہے کہ "سنة" کا معنی "امت" ہے۔ "سنن" جمع ہے "سنة" کی اسلئے "سنن" کا معنی ہے "امتیں" اب "قَدْ انْقَضَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ" کا مطلب یہ ہوگیا تحقیق گذر گئیں تم سے پہلے امتیں۔ سنن کا معنی "امتیں" جولیا گیا ہے، وہ ایک شاعر کے شعر سے لیا گیا ہے کسی شاعر نے کہا۔

ماعاین الناس من فضل کفضلکم ولا رأوا مثلکم فی سالف السنن

لوگوں نے تمہارے فضل جیسا کوئی فضل نہیں دیکھا اور نہ ہی انہوں نے دیکھا تمہارے جیسے گزری ہوئی امتوں میں۔
اس شعر میں "سنن" کو "امم" (امتیں) کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ (ماخوذ از معالم التنزیل للبغوی)

پہلے طریقے، یا پہلی امتیں گذر گئیں اس سے مراد کیا ہے؟

اس مسئلہ میں دو قول ہیں، فالاکثرون من المفسرین علی ان المراد سنن الهلاک والاستئصال" بدلیل قولہ تعالی ﴿فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ﴾ ایک قول اس میں اکثر مفسرین کا ہے کہ مراد "سنن" سے ان کی ہلاکت اور بربادی ہے یعنی تم سے پہلے امتوں کی ہلاکت اور تباہی اور بربادی گذر چکی ہے، یہ معنی ان الفاظ مبارکہ سے سمجھ آرہا ہے ﴿فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ﴾ (تو دیکھو کیسے ہوا انجام جھٹلانے والوں کا) یعنی انہوں نے دنیا کی حرص اور دنیا کی طلب کیلئے انبیاء کرام اور رسولوں کی مخالفت کی، پھر وہ تباہ و برباد ہوگئے ان کی دنیا کے اثرات ختم ہوگئے، "وبقی اللعن فی الدنیا و العقاب فی الآخرة علیهم" اور ان پر دنیا میں لعنت باقی رہی اور آخرت میں ان کو عذاب ہوگا۔

اللہ تعالی نے نبی کریم ﷺ کی امت کو پہلے لوگوں کے حالات میں غور وفکر کرنے کی رغبت دلائی کہ ان کے حالات میں غور وفکر کر کے ایمان پر قائم رہو اور دنیا کی ریاست اور دنیاوی جاہ وجلال سے اعراض کرلو، دوسرا قول اس

مسئلہ میں مجاہد رحمہ اللہ کا ہے"وقال مجاهد بل المراد سنن الله تعالى فى الكافرين والمؤمنين"کہ "سنن" سے مراد پہلی امتیں ہیں مطلقا، یہ کافر امتوں اور مؤمن امتوں دونوں کو شامل ہے، دنیا نہ مؤمنوں کے ساتھ قائم رہی اور نہ ہی کافروں کے ساتھ رہی، البتہ مؤمنوں کی اچھی تعریف دنیا میں قائم ودائم ہے، اور آخرت میں ان کو بہت بڑا ثواب حاصل ہوگا۔ اور کافروں پر دنیا میں لعنت قائم رہے گی، اور آخرت میں وہ عذاب میں مبتلاء ہوں گے۔

پہلے قول پر دلیل یہ قائم کی گئی ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا﴿ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ﴾ تو دیکھو کیسا ہے انجام جھٹلانے والوں کا" اس سے پتہ چلتا ہے کہ پہلی کافروں امتوں کے احوال میں غور وفکر کا حکم دیا گیا ہے، تو اس کا جواب دوسرے قول والوں نے یہ دیا ہے"ثم انه تعالى قال" فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ "لان التأمل فى حال احدالقسمين يكفى فى معرفة حال القسم الآخر" کہ مراد تو عام ہے کہ پہلے گذرے ہوئے مؤمنوں اور کافروں دونوں کے احوال میں غور وفکر کرنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن ذکر صرف ایک فریق کا بظاہر نظر آتا ہے کہ حکم دیا گیا تو دیکھو تم انجام جھٹلانے والوں کا" لیکن ایک فریق کے ذکر اور اس کے احوال میں تامل کرنے سے دوسرے فریق میں تامل کرنے کا حکم خود بخود پتہ چل جاتا ہے۔ مجاہد رحمہ اللہ کے اس قول پر در منثور میں ایک روایت مذکور ہے۔

❁ اخرج عبدبن حميد وابن جرير وابن المنذر وابن ابى حاتم عن مجاهد فى قوله "قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ" يعنى تداول من الكفار والمؤمنين فى الخير والشر"

عبد بن حمید اور ابن جریر اور ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشادگرامی﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ﴾ کا مطلب یہ ہے، کہ آگے پیچھے گذر جانے والے مؤمنین کے خیر کے حالات اور کفار کے شر کے حالات کو دیکھو۔ (منقول از در منثور)

راقم کا اپنا موقف تو اگر چہ پہلے قول سے متفق ہے جو اکثر مفسرین کرام کا ہے، تاہم حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ کے ترجمہ میں بریکٹ میں الفاظ بڑھا کر اور تفسیر میں دوسرے قول کو ترجیح دی گئی۔

ضیاء القرآن میں ترجمہ یوں پیش کیا گیا" گزر چکے ہیں تم سے پہلے (قوموں کے عروج وزوال کے) قاعدے پس سیر کرو زمین میں اور (اپنی آنکھوں سے) دیکھو کہ کیسا انجام ہوا (دعوت حق کو) جھٹلانے والوں کا۔ تفسیر یوں کی گئی "سنن" جمع ہے سنت کی، اور سنت وہ راستہ ہے جو شاہراہ عام ہو، وہ طرز زندگی ہے جس کا ہمیشہ التزام اور پابندی کی جائے، غزوۂ احد کی تکلیفات، بدر کی فتح مبین، سود خواری کے نقصان عظیم اور مرد مؤمن کی صفات کا ذکر فرمانے کے بعد بتایا جارہا ہے کہ زمین کے اس کھلے ہوئے صفحہ پر تم سے پہلے گزری ہوئی اقوام کے حالات جلی قلم سے مرقوم ہیں، تم انہیں پڑھ لو، فتح وسرخروئی کی عزت انہیں دی گئی جو ان صفات کے مالک تھے اور ناکامی وذلت انہیں

کے حصہ میں آئی جوان سے محروم تھے، قدرت کے قوانین یکساں اور اٹل ہیں، کسی کیلئے انہیں توڑا نہیں جاتا۔
(ضیاء القرآن)

اصل مقصود عبرت پکڑنا ہے:

اللہ تعالیٰ کے ارشادگرامی "فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا" میں چل کر ہی پہلے لوگوں کے حالات دیکھنا لازم نہیں۔ "بل المقصود تعرف احوالهم، فان حصلت هذه المعرفة بغير المسير فی الارض كان المقصود حاصلا" بلکہ مقصد یہ ہے کہ تم ان کے احوال کو پہچانو، اگر تمہیں چلنے کے بغیر ہی پہلے لوگوں کے حالات کا پتہ چل جائے تو مقصد حاصل ہوگیا۔ یعنی پہلے لوگوں کے حالات کو دیکھ کر، ان کے حالات کو سن کر، ان کے حالات کو کتابوں میں پڑھ کر عبرت حاصل ہوگیا، ہاں البتہ یوں کہا جاسکتا ہے۔

"ان المشاهدة آثار المتقدمين اثر اقوى من اثر السماع" کہ چل کر جانا ان اجڑی بستیوں کو دیکھنا، ان کی قبروں اور بوسیدہ ہڈیوں کو دیکھنا یہ زیادہ قوی ہے بنسبت سننے کے لھذا رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی "فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ" یقیناً اسی فائدہ پر مرتب ہے، جس کا ابھی ذکر کیا گیا ہے، یعنی۔

"شنیده کے باشد مثل دیده"

سنی ہوئی باتوں میں وہ اثر نہیں جو دیکھی ہوئی میں ہے۔

ان آثارنا تدل علینا	**فانظروا بعدنا الی الآثار**
بیشک ہمارے آثار (نشانات) ہم پر دلالت کررہے ہیں	ہمارے بعد ہمارے نشانات کو دیکھنا

یعنی شاعر نے بھی حالات، علامات، نشانات کو دیکھنے کا حکم دیا۔ (ماخوذ از کبیر بوضاحت)

اعتراض: رب تعالیٰ نے حکم دیا ہے "فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ" تو رب تعالیٰ کے امر کو ماننا ضروری ہے، یہ کہنا کیسے صحیح ہے کہ مقصود عبرت پکڑنا ہے خواہ دیکھ کر، خواہ سن کر، خواہ کتب میں پڑھ کر عبرت حاصل کرلے۔

جواب: "امر ندب لاعلى سبيل الوجوب بل المقصود تعرف احوال الماضين"

کہ یہ امر استحبابی ہے، وجوبی نہیں۔ مقصد پہلے لوگوں کے حالات کو پہچاننا ہے، خواہ کسی طرح بھی پہچان لے۔
(خازن بوضاحت)

فائدہ: وفيه ايضازجر للكافرين عن كفره لانه اذاتامل احوال الكفار واهلاكهم صار ذلك داعياله الى الايمان"

رب تعالیٰ کے ارشادگرامی ﴿فَانْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ﴾ سے کافروں کو بھی

زجر (ڈانٹ ڈپٹ) کی گئی کہ تم بھی اپنے سے پہلے کفار کے احوال اور ان کی بربادی کو دیکھو، اس میں غور وفکر کرو، اگر تم نے ضد اور ہٹ دھرمی کو چھوڑ کر، ان کے احوال میں نظر کی تو تمہیں بھی عبرت حاصل ہوگی کہ تمہیں ایمان کی طرف آنے کی یہ دعوت ہوگی۔ (خازن)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ٥ (آیة نمبر ۱۳۸)

(۱) یہ لوگوں کو بتانا اور راہ دکھانا اور پرہیزگاروں کو نصیحت ہے۔ (کنزالایمان)

(۲) یہ بیان ہے لوگوں کیلئے۔ اور ہدایت ہے اور نصیحت ہے پرہیزگاروں کیلئے۔ (نجوم الفرقان)

﴿هٰذَا﴾ ای القرآن اوقوله قدخلت اومفهوم قوله فانظروا (بَيَانٌ لِّلنَّاس) عامة (هٰذَا) من الضلالة (وَمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْن) خاصة فانهم هم المنتفعون به" (مظهری)

"ھٰذَا" کا ارشاد یا قرآن پاک کی طرف ہے، یا "قَدْخَلَت" کی طرف ہے، یا "فَانْظُرُوْا" کے مفہوم کی طرف ہے یعنی یہ ہے کہ اے لوگو تم پہلے لوگوں کے حالات کو دیکھو گے تو یہ تمہارے لئے بیان ہوگا۔ ﴿بَيَانٌ لِّلنَّاس﴾ سے پتہ چلا کہ یہ حکم عام ہے مؤمنوں اور کافروں کو، ﴿هُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْن﴾ یہ ہدایت ہے اور نصیحت ہے پرہیزگاروں کیلئے۔ یہ حکم پرہیزگاروں کیلئے خاص کیا گیا، کیونکہ اس سے نفع پرہیزگاروں نے ہی حاصل کیا ہے۔

بیان وہدایت وموعظت میں فرق:

(۱) ایک وجۂ فرق یہ ہے کہ "بیان" اس دلالت وراہنمائی کو کہتے ہیں جو شبہات حاصل تھے ان کو زائل اس کے ذریعے زائل کردیا جائے۔

ہدایت: سیدھی راہ کا بیان ہے کہ اس راہ پر چل کر بھٹکنے سے بچ جائے۔

موعظت: اس کلام کو کہا جاتا ہے جس میں دین کے خلاف راہ پر چلنے سے زجر پائی جائے۔ یعنی کلام میں ڈانٹ ڈپٹ ہو، اور زور پایا جائے تا کہ وہ غیر شرعی راہ پر چلنے سے رک جائے۔

"فالحاصل ان البيان جنس جنس تحته نوعان، احدهما الكلام الهادى الى ماينبغى فى الدين وهو الهدى، الثانى الكلام الزاجر عما لاينبغى فى الدين وهو الموعظة"

حاصل یہ ہے کہ بیشک بیان جنس (عام) ہے۔اور اس کے نیچے دو نوعیں ہیں۔ایک وہ کلام ہے جو ہدایت ہے دے اس راہ پر چلنے کی جو دین میں پسندیدہ ہے اسے ہدایت کہتے ہیں۔اور دوسری قسم وہ کلام ہے کہ جس سے روکا جائے ایسی راہ سے جو دین میں پسندیدہ نہیں۔اسے موعظت کہا جاتا ہے۔

(۲) دوسری وجہ فرق یہ ہے کہ "ان البیان هو الدلالة، واما الهدی فهو الدلالة بشرط کونها مفضية الی الاهتداء" بیان مطلقا دلالت (راہنمائی) کو کہتے ہیں۔لیکن ہدایت وہ دلالت ہے جو اس ہدایت کو قبول کرنے کی طرف پہنچاتے۔

مقام توجہ: ایک وجہ تو تفسیر مظہری سے بیان کی جا چکی ہے کہ "بیان عام ہے لوگوں کیلئے" اور ہدایت اور موعظت خاص ہیں متقین کیلئے۔کیونکہ ہدایت کا جب مطلب ہی یہ ہے کہ جسے ہدایت دی جائے وہ اسے قبول کر لے،اور موعظت کا جب مطلب ہی یہ ہے کہ جب کسی کو غیر شرعی کاموں سے روکا جائے تو وہ رک جائے یہ حاصل ہی صرف متقین کو ہے۔

"لیکن دوسری وجہ" یہ بیان کی گئی کہ بیان، ہدایت اور موعظت سب کا تعلق متقین سے ہے ﴿لِلنَّاسِ﴾ میں بھی الف لام عہد خارجی ہے،جس سے مراد وہی لوگ ہیں جو اللہ تعالی سے ڈرتے ہیں۔یعنی یہ قرآن بیان ہے خاص لوگوں کیلئے یعنی وہی خاص لوگ پرہیزگار ہیں جو قرآن پاک کے بیان سے ہدایت اور موعظت حاصل کرتے ہیں۔یہی مفہوم ﴿اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ﴾ آپ ڈرائیں ان کو جو جو تمہاری نصیحت کو قبول کریں۔

اور آیۃ ﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ "بیشک اللہ سے اس کے بندوں میں سے علماء ہی ڈرتے ہیں" بھی اسی مضمون کو واضح کر رہی ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ (آیۃ نمبر ۱۳۹)

(۱) اور نہ سستی کرو اور نہ غم کھاؤ تم غالب آؤ گے اگر ایمان رکھتے ہو۔ (کنزالایمان)

(۲) اور نہ کمزوردل ہوجاؤ، اور نہ غم کرو، حالانکہ تم ہی غالب ہوگے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ (نجوم الفرقان)

مختصر تفسیر لیکن جامع:

(وَلَا تَهِنُوْا)ای ولا تضعفوا فی انفسکم لتنفتقروا الی اتخاذھم بطانة ومنشاھذا الضعف الحزن من اذیاتھم (وَلَا تَحْزَنُوْا)اذلا تصل اذیاتھم الی اتلافکم بل ھم التالفون (وانتم الاعلون)ای الاغلبون لکن انما تغلبون(ان کنتم مؤمنین)مخلصین لانه انما وعد النصر للمؤمنین" (تفسیر تبصیر الرحمن)

اور نہ کمزوردل ہوجاؤ کہ تمہیں محتاجی حاصل ہو کافروں کو راز دار بنانے کی، اس کمزوردلی کی وجہ ان کی طرف سے اذیتیں (تکالیف) حاصل ہونا جو غم میں ڈالنے کا سبب بنتی ہیں، اور غم نہ کرو اس لئے کہ ان کی طرف سے کوئی اذیت (تکلیف) تمہیں نہیں پہنچے گی جو تمہیں ہلاکت میں ڈالے، بلکہ وہ ہی مٹ جائیں گے، اور تم ہی غالب رہو گے لیکن تمہیں غلبہ اسی وقت حاصل رہے گا جب تم مخلص مؤمن ہوگے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ مخلص مؤمن کو ہی امداد پہنچانے کا ہے، **راقم** نے "وَلَا تَهِنُوْا" کا ترجمہ (اور نہ کمزوردل ہوجاؤ) یہ تفسیر تبصیر الرحمٰن کے ان تفسیری الفاظ سے لیا ہے "ولا تضعفوا فی انفسکم" اور "وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ" کا ترجمہ **راقم** نے کیا ہے، حالانکہ تم ہی غالب ہوگے، یہ ترجمہ تفسیر ابی السعود کے ان الفاظ سے لیا ہے (وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ)جملة حالیة من فاعل الفعلین ای والحال انکم الاعلون الغالبون" یعنی "وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ" جملہ حالیہ ہے، جو دونوں فعلوں یعنی "وَلَا تَهِنُوْا" اور "وَلَا تَحْزَنُوْا" کے فاعل سے، اب معنی یہ ہوگیا "اور نہ کمزوردل ہوجاؤ اور نہ غم کرو حالانکہ تم ہی غالب ہوگے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

ماقبل سے تعلق:

اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے ایک آیۃ کریمہ میں ﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ﴾ ذکر فرمایا، اور دوسری آیۃ کریمہ میں بیان فرمایا ﴿هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ﴾ تو پچھلی دونوں آیتیں، اس آیۃ کریمہ ﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا﴾ کیلئے مقدمہ کی حیثیت رکھتی ہیں، اب ان تینوں آیتوں کا مفہوم ہوگیا۔

"اذا بحثتم عن احوال القرون الماضية علمتم ان اهل الباطل وان اتفقت لهم الصولة لكن كان مآل الامر الى الضعف والفتور، وصارت دولة اهل الحق عالية وصولة اهل الباطل مندرسة"

جب تم پہلے گذرے ہوئے لوگوں کے حالات کی تفتیش کرلو گے تو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ بیشک باطل راہ پر چلنے والوں کو اگر چہ وقتی طور پر دبدبہ بھی حاصل ہو، لیکن انجام ان کا بزدلی اور ان کا نقصان اور تباہی ہے، حق راہ پر چلنے والوں کو بلندی حاصل ہوتی ہے اور باطل راہ پر چلنے والے مٹ کر رہتے ہیں لہذا اے مومنو احد کے مقام پر وقتی طور پر جو دبدبہ حاصل ہوگیا وہ تمہارے دلوں کو کمزور نہ کرے، اور تمہیں بزدل نہ بنادے، اور تمہیں عاجز نہ کردے، بلکہ ضروری ہے کہ جس طرح تمہارے دل پہلے سے مضبوط اور قوی آرہے ہیں، اب بھی اسی طرح تم قوی دل اور مضبوط دل ہوکر رہو "فان الاستعلاء سيحصل لكم والقوة والدولة راجعة اليكم" بیشک غلبہ تمہیں ہی حاصل ہونا ہے، قوت ومضبوطی اور بلند بخت تمہاری طرف ہی لوٹ کر آنے ہیں۔ (کبیر)

شان نزول کے متعلق روایات:

❁ اخرج ابن جرير عن الزهری قال كثر فی اصحاب محمد ﷺ القتل والجرح حتى خلص الى كل امرئ منهم الباس فانزل الله القرآن فآسى فيه بين المؤمنين باحسن ما آسى به قوما كانوا قبلهم من الامم الماضية فقال ولا تهنوا ولا تحزنوا الى قوله لبرز الذين كتب عليهم القتل الى مضاجعهم"

ابن جریر کی زہری سے روایت ہے کہ احد کے مقام میں کثیر تعداد میں صحابہ کرام شہید ہوگئے اور زخمی ہو گئے، مسلمانوں کے دل پر ایک عجیب پریشانی کی کیفیت طاری ہوگئی تو رب تعالی نے ان کے دلوں کو تسلی دی جو بنسبت پہلی تسلی یعنی گذرے ہوئے لوگوں کے حالات کو دیکھنے کی رغبت دلانے سے بھی زیادہ اچھی تسلی ہے، یعنی تسلی دینے کیلئے ہی اللہ تعالی نے ﴿وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا﴾ سے لے کر ﴿لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ﴾ آیات نازل فرمائیں۔ (منقول از درمنثور)

❁ واخرج ابن جرير من طريق العوفی عن ابن عباس قال اقبل خالد بن الوليد يريد ان يعلو عليهم الجبل فقال النبی ﷺ اللهم لايعلون علينا فانزل الله وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ"

ابن جریر نے حضرت ابن عباس ﷺ کی روایت کو نقل کیا کہ خالد بن ولید (جو احد میں کافر تھا) پہاڑ پر

چڑھ کر مسلمانوں پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے دعاء کی اے اللہ ان کو ہم پر غلبہ نہ دے، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۂ کریمہ کو نازل فرمایا۔ (منقول از در منثور)

☆ واخرج ابن جرير وابن المنذر وابن ابی حاتم عن ابن جريج قال انهزم اصحاب رسول الله ﷺ فی الشعب يوم احد فسألوا مافعل النبی ﷺ وما فعل فلان فنعی بعضهم لبعض وتحدثوا ان النبی ﷺ قتل فكانوا فی هم وحزن فبينماهم كذلک علاخالد ابن الوليد بخيل المشركين فوقهم على الجبل وكان على احدمجبتی المشركين وهم اسفل من الشعب فلمارأوا النبی ﷺ فرحوافقال النبی ﷺ اللهم لا قوة لنا الابک وليس احد يعبدک بهذا البلد غيرهؤلاء النفر فلاتهلكهم وثاب نفرمن المسلمين رماة فصعدوا فرموا خيل المشركين حتى هزمهم الله وعلا المسلمون الجبل فذلک قوله وانتم الاعلون ان كنتم مؤمنين"

ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے ابن جریج کی روایت کو نقل کیا کہ صحابہ کرام احد میں وقتی طور پر پسپا ہو گئے، نشیبی وادیوں میں چلے گئے، ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے، نبی کریم ﷺ کا کیا حال ہے، فلاں صحابی کا کیا حال ہے، فلاں کا کیا حال ہے، تو بعض صحابہ نے دوسرے بعض صحابہ کرام کے شہید ہو جانے کی خبر دی اور یہ خبر بھی ملی کہ نبی کریم ﷺ بھی شہید ہو گئے، تو صحابہ کرام بہت زیادہ غم اور حزن میں مبتلاء ہو گئے، صحابہ کرام اسی پر پریشانی کے حال میں تھے، خالد بن ولید مشرکین کے لشکر کے ایک جانب دائیں یا بائیں (یعنی میمنہ یا میسرہ) پر امیر مقرر تھا، اس نے مشرکین کی ایک جماعت کو ساتھ لیا پہاڑ کے اوپر چڑھنے کا ارادہ کیا جبکہ صحابہ کرام وادیوں کے نشیبی علاقہ میں تھے، صحابہ کرام نے جب نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ صحیح سلامت ہیں تو وہ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے، غم جاتا رہا، ادھر نبی کریم ﷺ دعاء فرما رہے تھے "اے اللہ تیرے بغیر ہمیں کوئی قوت حاصل نہیں، اس شہر میں اے اللہ ان چند لوگوں کے بغیر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہیں، اس لئے اے اللہ تو ان کو ہلاکت میں نہ ڈال (صحابہ کرام نبی کریم ﷺ کو صحیح سلامت دیکھ کر خوش ہوئے تو ان کے جنگی جذبات ابھر گئے، ادھر مصطفیٰ ﷺ کی دعاء کو شرف قبولیت حاصل ہو گیا) تو صحابہ کرام کے تیر اندازوں کی ایک جماعت واپس لوٹ آئی، انہوں نے ایک بلند مقام سے مشرکوں پر تیر اندازی شروع کر دی، اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کو شکست دے دی، مشرک بھاگ پڑے، اور مسلمانوں نے پہاڑ پر قبضہ کر لیا، رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (اور تم ہی غالب ہو گے اگر تم ایمان رکھتے ہو) آب و تاب سے جگمگانے لگا۔ (منقول از در منثور)

کچھ ذکر احد کا تیسرے پارہ میں گذر گیا اور کچھ آنے والی آیات میں (انشاء اللہ) آجائے گا۔

تنبیہ: روایات میں تطبیق دینے کیلئے راقم نے "علا خالد ابن الولید" کا ترجمہ کیا ہے خالد بن ولید نے پہاڑ پر چڑھنے کا ارادہ کیا، اور اگر ظاہری الفاظ کو دیکھ کر یوں معنی کیا جائے کہ "خالد بن ولید اپنے ساتھ مشرکوں کی ایک جماعت کو لے کر پہاڑ کے اوپر چڑھ گیا" اب مطلب یہ ہوگیا کہ مسلمانوں نے مشرکین کو بلند مقام سے تیراندازی کر کے پہاڑ سے نیچے دھکیل دیا، اور خود پہاڑ پر قابض ہوگئے۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"اعلون" اصل میں "اعلوون" ہے واؤ تیسری جگہ سے چوتھی جگہ آگئی، ماقبل کی حرکت مخالف ہے، واؤ کو یاء سے تبدیل کیا، یاء متحرک ماقبل مفتوح یاء کو الف سے تبدیل کیا، الف اور واؤ کے درمیان التقاء ساکنین ہوگیا، الف کو حذف کر دیا "اعلون" ہوگیا۔

﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ﴾ میں چند وجوہ:

(۱) ان میں سے پہلی وجہ یہ ہے بیشک تمہارا حال اعلیٰ ہے ان کے حال سے قتل میں، یعنی احد میں بظاہر جو تمہیں تکلیف پہنچی (حقیقت میں کوئی تکلیف نہ تھی کیونکہ شہادت سے حیات جاودانی حاصل ہوگئی) کافروں کو بدر میں اس کی بنسبت دوگنی تکلیف پہنچی، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا﴾ کیا جب پہنچی تمہیں کچھ مصیبت حالانکہ تم پہنچا چکے ہو (دشمن کو اس سے دوگنی) (اس آیۃ کی تفصیل اسی کی وضاحت میں ان شاء اللہ آجائے گی)

(۲) اولان قتالکم اللہ وقتالھم للشیطان" مؤمنوں کے غلبہ کی اور وجہ یہ ہے کہ ان کا قتال یعنی جہاد اللہ تعالیٰ کیلئے ہے اور کافروں کی جنگ شیطان کیلئے ہے، یہی وجہ ہے کہ مؤمن جنگ میں قتل کر دیا جائے تو وہ شہید ہے اسے جاودانی زندگی حاصل ہوگئی، اسے مردہ کہنا بلکہ اسے مردہ گمان کرنا بھی ناجائز ہے، اور کافر جنگ میں قتل کر دیا جائے تو مردود مر گیا، نیست و نابود ہوگیا، اسے کچھ منصب حاصل نہ ہوا۔

(۳) اولان قتالھم للدین الباطل وقتالکم الدین الحق" اور وجہ تمہارے بلند ہونے کی یہ ہے کہ کافروں کا دین باطل ہے وہ اسی کیلئے لڑائی کرتے ہیں، اور تمہارا دین حق ہے، تمہاری لڑائی دین حق کیلئے ہے، دین حق کیلئے

لڑائی حقیقت میں بلندی ہی ہے۔

(۴) "والمراد وانتم الاعلون بالحجة والتمسک بالدین والعاقبة الحمیدة"

اور مراد یہ ہے کہ تمہیں دلائل اور دین کے ساتھ تمسک (یعنی دین حق پر قائم رہنے) اور اچھا انجام حاصل ہونے کی وجہ سے بلندی حاصل ہے۔

(۵) یعنی ان یکون المعنی وانتم الاعلون من حیث انکم فی العاقبة تظفرون بهم وتستولون علیهم"

اور مطلب یہ ہے کہ تمہیں آخرت میں کافروں پر بلندی حاصل ہوگی، اس لئے کہ تمہیں ان پر غلبہ حاصل ہوگا، اور تمہیں کامیابی حاصل ہوگی، وہ خسارے میں ہوں گے۔

﴿إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ﴾ "اگر تم ایمان رکھتے ہو"

اس میں بھی چند وجوہ ہیں۔

(۱) الاول وانتم الاعلون ان بقیتم علی ایمانکم، والمقصود بیان ان الله تعالی انما تکفل باعلاء درجتهم لأجل تمسکهم بدین الاسلام"

ایک وجہ ان میں سے یہ ہے کہ تم ہی بلند رہو گے اگر تم اپنے ایمان پر قائم رہے، سب سے مقصود وجہ ہی یہ ہے باقی وجوہ ضمنی ہیں، یعنی اللہ تعالی تمہیں بلند درجات اسی لئے عطاء فرمائے گا کہ تم دین اسلام پر قائم رہو، یعنی دین اسلام پر قائم رہنا تمہاری بلندی کا سبب ہے۔

(۲) والثانی وانتم الاعلون فکونوا مصدقین لهذه البشارة ان کنتم مصدقین بما یعدکم الله ویبشرکم به من الغلبة"

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ تم ہی بلند ہو گے تم اس بشارت کی تصدیق کرنے والے رہو، یعنی اگر تمہیں اللہ تعالی کے وعدہ اور اس کی بشارت پر یقین رہا اور اس کی تمہیں تصدیق رہی تو تمہیں غلبہ بھی حاصل رہے گا، اصل اس وجہ کی دارومدار بھی تصدیق پر ہے، اور تصدیق ہی ایمان ہے۔

(۳) والثالث التقدیر "وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ" فان الله تعالی وعد بنصرة هذا الدین فان کنتم من المؤمنین علمتم ان هذه الواقعة لاتبقی بحالها، وان الدولة تصیر للمسلمین والاستیلاء علی العدو یحصل لهم"

اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی نے جو یہ ارشاد فرمایا کہ (تم کمزور دل نہ ہو جاؤ، اور نہ ہی غم کرو، اور بلند تم ہی ہو اگر تم ایمان رکھتے ہو) یعنی اللہ تعالی نے اس دین کی امداد کرنے کا وعدہ فرمایا کہ اگر تم ایمان پر قائم

رہے تو اللہ تعالی کی امداد تمہیں حاصل رہے گی، لہذا تم اس پر بھی یقین کرلو کہ احد میں جو وقتی طور پر کفار کو غلبہ حاصل ہوا، اس نے ہمیشہ قائم تو نہیں رہنا، کامیابی اور دشمن پر غلبہ تو مسلمانوں کو ہی حاصل رہنا ہے۔
(ماخوذ از کبیر)

اس آخری وجہ کو نظر میں رکھتے ہوئے احد کا نقشہ پھر سے ذہن میں لائیے تو مسئلہ نکھر کو سامنے آجائے گا، کہ احد میں ابتدائی طور پر مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا، یہاں تک کہ مال غنیمت جمع کرنا صحابہ کرام نے شروع کر دیا، پہاڑ کے درہ پر پچاس صحابہ کرام کو کھڑا کیا گیا تھا، ان کے اجتہاد میں خطاء ہوگئی کہ وہ مسلمانوں کی کامیابی کو دیکھ کر درہ کو چھوڑ کر مال غنیمت کو جمع کرنے میں شریک ہوگئے، نبی کریم ﷺ نے تو انہیں کھڑا ہونے کا حکم دیا تھا، آپ کے حکم کی انتظار کیے بغیر آپ یہاں سے ہٹ جانے کا حکم کب فرماتے ہیں، ان کا درہ کو چھوڑنا ان کے اجتہاد میں خطاء ہوئی۔

رب تعالی نے ان کو تھوڑی دیر کیلئے آزمائش میں ڈال دیا، کفار اس درہ سے پہاڑ کی پچھلی جانب سے آکر مسلمانوں پر یکبارگی حملہ آور ہوگئے تو مسلمان ستر کی تعداد میں شہید ہوگئے، اور کچھ زخمی ہوگئے، لیکن جب مسلمانوں نے پہاڑ سے تیر اندازی کی تو کفار احد کے مقام کو چھوڑ کر بھاگ گئے، کفار کو شکست ہوئی، مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا، اور اللہ تعالی کے ارشاد گرامی ﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ﴾ کی جلوہ گری واضح ہوگئی۔ (راقم)

فائدہ جلیلہ:

حضور ﷺ کے عہد مبارک میں اور اس کے بعد جب بھی باطل سے صحابہ کرام کی جنگ ہوئی صحابہ ہی فتح یاب ہوئے، حتی کہ ہر وہ لشکر جس میں ایک صحابی بھی شامل ہوا اس نے کبھی شکست نہیں کھائی، اور یہ صحابہ کرام کے مؤمن کامل ہونے کی دلیل ہے۔ (ضیاء القرآن)

ایمان کے بغیر مادی وسائل بے کار ہیں:

نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ایمان کو قوت دنیا کی ساری مادی قوتوں سے زیادہ توانا ہے، جس قوم کے افراد کے دلوں میں ایمان اور یقین کی شمع روشن ہوتی ہے دنیا کی کوئی طاقت ان کو شکست نہیں دے سکتی، مادی وسائل بھی اسی وقت کارگر ثابت ہوتے ہیں جب ان کو استعمال کرنے والا اپنے مقصد حیات پر محکم یقین رکھتا ہو۔ (ضیاء القرآن)

حالیہ دور میں افغانستان اور عراق میں مسلمان جانوں کے نذرانے پیش کر رہے ہیں، امریکہ جیسے سرمست ہاتھی سے ٹکر لگائے ہوئے ہیں، (ان شاء اللہ) عیسائی بھاگنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

شہید ہونے والے مہاجرین صحابہ کرام کے اسماء گرامی:

احد میں جو صحابہ کرام شہید ہوئے ستر کی تعداد میں ان میں اکثریت انصار کی تھی مہاجرین پانچ تھے، حمزہ بن عبدالمطلب، مصعب بن عمیر نبی کریم ﷺ کے علمبردار، عبداللہ بن جحش نبی کریم ﷺ کے پھوپھی کے بیٹے، عثمان بن شماس اور سعد جو کہ عتبہ کے غلام تھے۔ (تفسیر ابی السعود رحمہ اللہ)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ○ (آیۃ نمبر ۱۴۰)

(1) اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچی تو وہ لوگ بھی ویسی ہی تکلیف پا چکے ہیں، اور یہ دن ہیں جن میں ہم نے لوگوں کیلئے باریاں رکھی ہیں، اور اس لئے کہ اللہ پہچان کرا دے ایمان والوں کی اور تم میں سے کچھ لوگوں کو شہادت کا مرتبہ دے اور اللہ دوست نہیں رکھتا ظالموں کو۔ (کنزالایمان)

(2) اگر پہنچی تمہیں کوئی تکلیف تو تحقیق پہنچ چکی ہے قوم کو تکلیف اسی کی مثل، اور یہ دن ہیں پھیرتے ہیں ہم ان کو لوگوں کے درمیان، اور (اس لئے) تا کہ پہچان کرا دے اللہ ایمان والوں کی، اور بنائے تم میں سے بعض کو شہید اور اللہ نہیں محبت رکھتا ظالموں سے۔ (نجوم الفرقان)

﴿اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ﴾

القرح (بفتح القاف) زخم، پھوڑا، شدید خارش جو اونٹ کے بچوں کیلئے مہلک ہو، جمع قروح، القوح (بضم القاف) ہر چیز کا اول حصہ، کنواں کھودتے وقت پہلی مرتبہ جو پانی نکالا جائے، ہر مہینہ کے ابتداء کی تین راتیں، القرح بفتح القاف و الراء اونٹ کو خارش ہونے کی حالت، قرحه قرحا (ف) زخمی کرنا، قرح البئر، اسی جگہ کنواں کھودنا جہاں پہلے نہ کھودا گیا ہو قرحه بالحق، حق کے ساتھ استقبال کرنا، قرح قروحا (ف) قرح قرحا (س) الفرس، گھوڑے کے چاروں دانت نکلنا، اقترح الخطبة "فی البدیہ" خطبہ دینا۔ (المنجد)

آیۃ کریمہ میں دونوں قراءتیں ہیں، القرح بالفتح والضم لغتان کالضعف وقد قرئ بھما" "القرح" میں قاف کی زبر اور پیش دونوں لغتیں استعمال ہیں، جیسے ضعف میں ضاد پر زبر اور پیش دونوں طرح استعمال ہے، اسی طرح "قرح" میں قاف پر زبر اور پیش دونوں جائز ہیں، معنی دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے "وقیل ھو بالفتح الجراح وبالضم المھا" اور فرق بھی بیان کیا گیا ہے، کہ جب زبر کے ساتھ استعمال ہو تو معنی ہوگا "زخمی کرنا" اور جب پیش سے استعمال ہوگا تو معنی ہوگا زخم کا درد اسی طرح تیسری قراءت قاف اور راء دونوں کی زبر سے بھی پڑھا گیا ہے۔ (تفسیر ابی السعود)

قرح، نکرہ ہے اسی لئے اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے "کوئی تکلیف" **راقم** نے بھی وہی نقل کیا ہے۔

﴿اِنۡ یَّمۡسَسۡکُمۡ قَرۡحٌ فَقَدۡ مَسَّ الۡقَوۡمَ قَرۡحٌ مِّثۡلُهٗ﴾

"اگر پہنچی تمہیں کوئی تکلیف تو تحقیق پہنچ چکی ہے قوم کو تکلیف اسی کی مثل۔"

"القوم" معرفہ ہے، الف لام عہد خارجی ہے، قوم سے مراد کفار مکہ ہیں، یعنی اے مسلمانو اگر تمہیں احد میں کوئی تکلیف پہنچی ہے تو قریش کی قوم کفار کو بھی اس سے پہلے اسی طرح تکلیف پہنچ چکی، اس میں مسلمانوں کو تسلی بھی دی گئی اور جہاد پر قائم رہنے کا بھی گویا کہ حکم دیا گیا ہے، اور مومنو کو جہاد پر برانگیختہ بھی کیا گیا ہے، اس لئے کہ اگر قوم کی تکلیف سے مراد بدر کی تکلیف ہو تو مطلب یوں ہوگا۔

"والمعنی ان نالوا منکم یوم احد فقد نلتھم منھم قبلہ یوم بدر ثم لم یضعف ذلک قلوبھم ولم یثبطھم عن معاودتکم بالقتال فانتم احق بان لاتضعفوا فانکم ترجون من اللہ مالا یرجون"

اگر احد کے دن کفار کو تم پر کچھ دیر کیلئے برتری حاصل ہوئی تو تحقیق تم بدر کے دن ان پر مکمل طور پر برتری حاصل کر چکے ہو، وہ کافر نہ کمزور دل ہوئے اور نہ ہی تمہارے ساتھ دشمنی کی وجہ سے جنگ سے رکے ہیں لہذا تم زیادہ حق رکھتے ہو کہ نہ ہی تم کمزور دل ہو جاؤ (اور نہ ہی جہاد سے دور ہونا) کیونکہ تم اللہ تعالیٰ سے اس کی رحمت کی امید رکھتے ہو، وہ کافر اس کی کوئی امید نہیں رکھتے۔ (تفسیر ابی السعود)

اور دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ مسلمانوں کو خطاب کیا گیا کہ اگر تمہیں احد میں تکلیف پہنچی ہے تو کافروں کو

اس سے پہلے احد میں تکلیف پہنچ چکی ہے، کیونکہ بیس سے زائد کفار احد میں قتل ہو چکے تھے، ان کے علمبردار طلحہ بن ابی طلحہ کو بھی حضرت علی المرتضی ﷛ نے قتل کر دیا تھا۔ (ماخوذ از تفسیر ابی السعود)

اعتراض: کفار تو بیس پچیس کی تعداد میں مرے تھے، لیکن صحابہ کرام تو ستر کی تعداد میں شہید ہوئے تو "قَرْحٌ مِّثْلُهٗ" (کفار کو اسی کی مثل تکلیف پہنچی) کہنا کس طرح صحیح ہے۔

جواب: یجب ان یفسر القرح فی ھذا التاویل بمجرد الانھزام لا بکثرۃ القتلی"

اس صورت میں "قَرْحٌ مِّثْلُهٗ" کا مطلب یہ ہوگا کہ تمہیں تکلیف پہنچی تو تم وقتی طور پر پسپا ہو گئے، ان کو تو پہلے بھی شکست ہوئی اور بعد میں بھی مکمل شکست ان کو ہی ہوئی کہ وہی میدان کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔

(ماخوذ از کبیر)

﴿وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ﴾ "اور یہ دن ہیں پھیرتے ہیں ہم ان کو لوگوں کیلئے۔"

المداولۃ: نقل الشیء من واحد الی آخر" ایک چیز کو ایک سے دوسرے کی طرف منتقل کر دینے کو مداولۃ کہا جاتا ہے، رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿لِكَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ﴾ (سورۃ الحشر، آیہ نمبر ۸)

(تا کہ (مال) نہ پھیرتا رہے تمہارے غنیوں کے درمیان) ای تتداولونھا ولا تجعلون للفقراء منھا نصیبا" ایسا نہ ہوا ے اغنیاء کہ تم آپس میں ہی ایک دوسرے کی طرف مال منتقل کرتے رہو کہ فقراء کا حصہ ہی اس میں مقرر نہ کرو، اسی طرح کہا جاتا ہے "الدنیا دول" دنیا ایک قوم سے دوسری کی طرف پھرتی رہتی ہے اب اس لغوی معنی کو سمجھنے کے بعد آیۃ کریمہ کا معنی واضح ہو گیا۔

"والمعنی ان ایام الدنیا ھی دول بین الناس لا یدوم مسارھا ولا مضارھا فیوم یحصل فیہ السرور لہ والغم لعدوہ ویوم آخر بالعکس من ذلک ولا یبقی شئی من احوالھا ولا یستقر اثر من آثارھا"

کہ دنیا کے دن لوگوں میں پھرتے رہتے ہیں، نہ ہی ہمیشہ خوشی کے دن ہوتے ہیں، اور نہ ہی ہمیشہ غم کے کبھی ایک شخص کو خوشی حاصل ہوتی ہے اور اس کے دشمن کو غم لاحق ہوتا ہے، کبھی معاملہ اس کے الٹ ہوتا ہے کہ اسے غم لاحق ہوتا ہے اور اس کے دشمن کو خوشی حاصل ہوتی ہے، یعنی دنیا کے دنوں کے حالات میں بقاء نہیں اور نہ ہی ان کے اثرات میں قرار ہے۔ (کبیر)

انتباہ شدید: واعلم انہ لیس المراد من ھذہ المداولۃ ان اللہ تعالی تارۃ ینصر المؤمنین واخری ینصر الکافرین وذلک لان نصرۃ اللہ منصب شریف واعزاز عظیم فلا یلیق بالکافر بل المراد

من هذه المداولة انه تارة يشدد المحنة على الكفار واخرى على المؤمنين"

آیۃ کریمہ کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کبھی مؤمنوں کی امداد کرتا ہے اور کبھی کافروں کی امداد کرتا ہے، اس لئے کہ رب تعالیٰ کا امداد کرنا منصب شریف اور بہت بڑا اعزاز ہے، رب تعالیٰ اعلیٰ منصب اور بڑا اعزاز کافروں کو نہیں عطاء کرتا، ہاں مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے درمیان دن پھیرتا رہتا ہے کہ کبھی کفار کو مشقت میں ڈال دیا جاتا ہے اور ان کو تکلیف دی جاتی ہے، اور کبھی مؤمنوں کو تکلیف دی جاتی ہے۔ (کبیر)

لوگوں میں دنوں کے پھیرنے کا فائدہ کیا ہے؟

اس میں چند وجوہ ہیں فائدہ کی۔

(۱) اگر ہمیشہ کافروں کو مشقت اور تکلیف میں ڈالا جاتا، اور مؤمنوں پر کوئی شدت نہ آتی، اور نہ ہی انہیں کوئی تکلیف دی جاتی۔

"لحصل العلم الاضطراری بان الایمان حق وما سواه باطل ولو کان کذلک لیبطل التکلیف والثواب والعقاب"

تو اس صورت میں اضطراری طور پر (بغیر سوچنے اور فکر کرنے کے) ایمان حاصل ہوتا کہ ایمان حق ہے، اور اس کے علاوہ سب کچھ باطل ہے، اضطراری ایمان کا نہ انسان کو مکلف بنایا جاتا ہے، اور نہ ہی اسے ثواب اور عذاب دیا جاتا ہے، اسی وجہ سے کبھی محنت ومشقت مؤمنوں پر مسلط کی جاتی ہے اور کبھی کافروں پر

"لتکون الشبهات باقية والمكلف يدفعها بواسطة النظر فی الدلائل الدالة علی صحة الاسلام فيعظم ثوابه عند الله"

تا کہ شبہات باقی رہیں، اور عاقل بالغ انسان اسلام کے حق ہونے کے دلائل میں غور وفکر کرلے اور مشکوک وشبہات کو زائل کرلے تا کہ اسے اللہ تعالیٰ کے ہاں ثواب دیا جائے۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ مؤمن کی کبھی لغزشیں اور گناہ بھی ہوتے ہیں، اسلئے اسے مشقت وتکالیف میں مبتلاء کیا جاتا "فیکون عندالله تشدید المحنة علیه فی الدنیا ادباله" تا کہ دنیا میں ہی اس کے بعض گناہوں کا کفارہ بن جائے اور اسے آخرت میں عذاب سے بچالیا جائے، مؤمن کا یہ اعزاز ہے اور اس کے ادب کا لحاظ کیا گیا ہے۔

سبحان الله! اے مؤمن ذرا تو اپنا مقام دیکھ کہ اللہ تعالیٰ بھی تیرے ادب کا لحاظ کرتا ہے۔"واما

تشدید المحنة علی الکافر فانه یکون غضبا من الله علیه" لیکن کافروں کو محنت و مشقت میں ڈالنا ان کو ذلت میں ڈالنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ان پر غضب مسلط ہے۔

(۳) دنیا کی لذتیں اور دنیا کی تکالیف اور درد ہمیشہ قائم نہیں رہتے بلکہ بدلتے رہتے ہیں اور اخروی نعمتیں اور سعادت (اجر و ثواب) ہمیشہ کیلئے قائم رہنے والے ہیں، انسان کو اس پر سوچنے اور فکر کرنے کی گویا کہ دعوت دی گئی کہ توذرا غور تو کر "فان الله یمیت بعد الاحیاء ویسقم بعد الصحة فاذا حسن ذلک فلم لایحسن ان یبدل السراء بالضراء" کہ اللہ تعالیٰ زندگی کے بعد موت عطاء کرتا ہے اور صحت کے بعد بیماری عطاء کرتا ہے جب یہ سب کچھ اچھا ہے تو یہ کیوں نہیں اچھا کہ وہ خوشی کو پریشانی سے بدل دے۔ (ماخوذ از کبیر)

دنوں کے پھیرنے اور کافروں کی ابتدائی شکست پر حدیث پاک:

اسی آیۃ کریمہ کی تفسیر میں علامہ بغوی رحمہ اللہ نے معالم التنزیل میں اور علامہ علاؤ الدین علی بن محمد المعروف بالخازن نے تفسیر خازن میں بخاری کی یہ حدیث نقل فرمائی۔

❁ حدثنا عبید الله بن موسی عن اسرائیل عن ابی اسحاق عن البراء ﷺقال لقینا المشرکین یومئذ واجلس النبی ﷺجیشا من الرماة وامر علیهم عبد الله وقال لاتبرحوا ان رأیتمونا ظهرنا علیهم فلا تبرحوا وان رأیتموهم ظهروا علینا فلاتعینونا فلما لقینا هربوا حتی رأیت النساء یشتددن فی الجبل رفعن عن سوقهن قدبدت خلاخلهن فاخذوا یقولون الغنیمة الغنیمة فقال عبدالله بن جبیر عهد الی النبی ﷺان لاتبرحوا فابوا فلما ابوا صرف وجوههم فاصیب سبعون قتیلا واشرف ابو سفیان فقال افی القوم محمد فقال لاتجیبوه فقال افی القوم ابن ابی قحافة قال لا تجیبوه فقال افی القوم ابن الخطاب فقال ان هؤلاء قتلوا فلو کانوا احیاء لأجابوا فلم یملک عمر نفسه فقال کذبت یا عدوالله ابقی الله علیک ما یحزنک قال ابو سفیان اعل هبل،فقال النبی ﷺاجیبوه قالوا مانقول؟قال قولوا "الله اعلی واجل" قال ابو سفیان لناالعزی ولاعزی لکم فقال النبی ﷺاجیبوه قالوا ما نقول؟قال قولوا "الله مولنا ولا مولی لکم" قال ابو سفیان یوم بیوم بدر والحرب سجال وتجدون مثلة لم آمربها ولم تسؤنی" (بخاری جلد کتاب المغازی ،باب غزوه احد)

ترجمہ بمع تشریح:

براء بن عازب ؓ فرماتے ہیں ہم اس دن (احد کے دن) مشرکوں سے ملے یعنی ان سے ہمارا مقابلہ کیلئے آمنا سامنا ہوا، نبی کریم ﷺ نے (پہاڑ کے درہ میں) تیر اندازوں کا ایک لشکر بٹھایا، اور ان پر حضرت عبداللہ بن جبیر ؓ کو امیر مقرر فرمایا یہ خوات بن جبیر بن نعمان کے بھائی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم نے یہاں سے ہٹنا نہیں، اگر تم ہمیں دیکھو کہ ہم ان پر غالب ہو گئے تو پھر بھی تم نے ہٹنا نہیں، اور اگر تم ان (کافروں) کو دیکھو کہ وہ ہم پر غالب آگئے ہیں تو تم نے ہماری امداد نہیں کرنی، زہیر کی ایک روایت میں یوں مذکور ہے "وان رأیتمونا تخطفنا الطیر" اگر تم ہمیں اس حال میں دیکھو کہ ہمیں پرندے نوچ رہے ہیں تو پھر بھی تم نے اپنی جگہ سے ہٹنا نہیں، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت جو مسند احمد اور طبرانی اور مستدرک حاکم میں ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں۔

"ان النبی ﷺ اقامهم فی موضع ثم قال لهم احموا ظهورنا فان رأیتمونا نقتل فلاتنصرونا فان رأیتمونا قد غنمنا فلا تشرکونا"

بیشک نبی کریم ﷺ نے ان کو ایک جگہ پر کھڑا کیا، پھر ان کو فرمایا کہ تم ہماری پیٹھوں کی امداد کرنا یعنی ہم میدان جنگ میں کافروں کے مقابل ہوں گے اور تم یہاں ہی ہمارے پیچھے کھڑے رہنا، حضرت براء کہتے ہیں کہ جب ہمارا مقابلہ کافروں سے ہوا تو وہ شکست کھا کر بھاگ گئے، یہاں تک کہ میں نے ان کی عورتوں کو شدید بھاگتے ہوئے دیکھا جو پہاڑوں کی وادیوں کی طرف جا رہی ہیں، دوڑتے ہوئے ان کی پازیبیں اور پنڈلیاں نظر آ رہی تھیں، ایک روایت میں ہے

"یسندن" بضم اوله وسکون السین المهملة بعدهانون مکسورة ودال مهملة ای یصعدن یقال اسند فی الجبل یسند اذا صعد"

"یسندن" جس کا معنی ہے کہ وہ عورتیں بھاگ بھاگ کر پہاڑ پر چڑھ رہی تھیں ادھر پہاڑ کے درے میں کھڑے صحابہ کرام مسلمانوں کی فتح کو دیکھ کر "الغنیمة الغنیمة" (اس پر زبر ہے) یعنی غنیمت کو حاصل کرو، جب تمہارے اصحاب غالب آ چکے ہیں تو تم کس چیز کی انتظار کر رہے ہو، زہیر کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں

"فقال عبدالله انسیتم ما قال لکم رسول اللها؟ قالوا والله لنأتین الناس فلنصیبن من الغنیمة"

حضرت عبداللہ بن جبیر نے ان لوگوں کو کہا "کیا تم رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کو بھول گئے ہو، جو آپ نے تمہیں

فرمایا تھا، لیکن وہ کہنے لگے قسم ہے اللہ تعالیٰ کی ہم ضرور برضرور لوگوں کو ملیں گے اور مال غنیمت ضرور ہی حاصل کریں گے، حضرت عبداللہ بن جبیر نے کہا نبی کریم ﷺ نے مجھ سے وعدہ لیا ہے کہ تم نے یہاں سے ہٹنا نہیں، لیکن لوگوں نے انکار کیا "فلما ابوا صرف وجوههم" جب انہوں نے انکار کیا تو ان کے چہرے پھر گئے، یعنی "تحیروا فلم یدروا این یذهبون واین یتوجهون" وہ حیران ہو گئے ان کو پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور کس طرف متوجہ ہو رہے ہیں، تو اس حال میں ستر صحابہ کرام کو شہید کر دیا گیا۔

ابوسفیان بن حرب جو اس وقت رئیس المشرکین تھا، ایک بلندی پر چڑھ کر کہنے لگا کیا اس قوم میں محمد ہیں؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اسے کوئی جواب نہ دو، پھر وہ کہنے لگا کیا اس قوم میں ابن ابی قحافہ (یعنی ابوبکر) ہیں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے کوئی جواب نہ دو، پھر وہ کہنے لگا کیا اس قوم میں ابن خطاب (یعنی عمر) ہیں، پھر وہ خود ہی کہنے لگا یہ سب قتل کر دیئے گئے اگر زندہ ہوتے تو جواب دیتے، ابھی رسول اللہ ﷺ نے کوئی ارشاد نہیں فرمایا تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کی بات کو سن کو صبر نہ کر سکے، آپ نے فرمایا اے اللہ کے دشمن تو نے جھوٹ کہا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان تمام کو تجھ پر زندہ رکھا ہوا ہے جو تجھے پریشان کرتے رہیں گے۔

ابوسفیان نے کہا "اعل هبل" "اعل" علا یعلو سے امر کا صیغہ ہے "هبل" (بضم الهاء وتخفيف الباء الموحدة) ان کے بت کا نام ہے، جو انہوں نے کعبہ میں رکھا ہوا تھا، حرف نداء اس میں محذوف ہے یعنی "یاهبل" ہے اصل معنی اس کا یہ ہے "اے ہبل بلند رہ" مرادی معانی مختلف بیان کئے گئے ہیں، اے ہبل تیرا دین غالب رہے، اے ہبل تیرا امر بلند رہے اور تیرا دین غالب رہے، اس کے اس قول پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا "اس کو جواب دو" صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ ہم اسے کیا جواب دیں؟ آپ نے فرمایا تم اسے کہو "الله اعلى واجل" اللہ سب سے بلند اور سب سے بزرگ ہے۔

ابوسفیان نے کہا ہمارا عزی ہے، تمہارا کوئی عزی نہیں (عزی بھی ان کے بت کا نام تھا کہ یہ ہمیں نفع پہنچاتا ہے) تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اسے جواب دو، صحابہ کرام نے عرض کیا "ہم کیا کہیں؟ آپ نے فرمایا تم کہو "الله مولنا ولا مولى لكم" اللہ ہمارا مولی ہے اور تمہارا کوئی مولی نہیں پھر ابوسفیان نے کہا "آج کا دن بدر کے دن کا بدل ہے" اور لڑائی اس طرح ہے جس طرح ڈول کے مقابل ڈول نکالا جائے، یعنی لڑائی میں دن پھرتے رہتے ہیں، بدر میں ہمارے ستر آدمی قتل ہو گئے تھے، اور آج احد میں تمہارے ستر آدمی قتل (شہید) ہو گئے، اور ابوسفیان کہنے لگا، اگر تم اپنے کسی شخص کو مثلہ پاؤ تو میں نے اسے حکم نہیں دیا، اس نے مجھے غم میں نہیں ڈالا۔ **مثلہ** اسے کہا جاتا ہے جس کے

اعضاء کاٹ دئے جائیں، جیسا کہ حضرت حمزہ ﷺ کی شہادت کی بعد جگر کو کاٹ کر دیا چبایا "فلم تستطع ان تسیغھا فلفظتھا"، لیکن وہ اسے نگل نہ سکی بلکہ اس نے آپ کے جگر کو پھینک دیا، ابن اسحاق کی ایک روایت میں ہے کہ ابوسفیان نے کہا "واللہ ما رضیت وما سخطت وما نھیت وما امرت"، قسم اللہ کی میں مثلہ بنانے پر نہ راضی ہوا اور نہ ہی ناراض ہوا، اور نہ ہی میں نے حکم دیا اور نہ ہی میں منع کیا اور حضرت ابن عباس ﷺ کی روایت میں ہے۔

"ولم یکن ذلک عن رای سراتنا، ثم ادرکتہ حمیۃ الجاھلیۃ اما انہ اذا کان لم یکرھہ"

کہ ابوسفیان نے کہا مثلہ بنانے میں ہمارے کسی بڑے آدمی (کسی سردار) کی رائے شامل نہیں، حضرت ابن عباس ﷺ فرماتے ہیں کہ پھر اسے جاہلیت کی حمیت لاحق ہوگئی، جاہلیت کی حمیت یہ تھی کہ اپنے خاندان کی ہی حمایت کرنی ہے، خواہ وہ باطل راہ پر ہی کیوں نہ ہوں، حضرت حمزہ ﷺ کو مثلہ بنانے والی ابوسفیان کی زوجہ ھندہ تھی، یہی وجہ ہے کہ اس نے کہا

"ولم تسؤنی "ای والحال ان المثلۃ التی فعلوھا لم تسؤنی وان کنت ماامرت"

مجھے اس سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی، یعنی مثلہ بنانے کا اگرچہ میں نے کوئی حکم نہیں دیا، لیکن جو مثلہ بنایا گیا ہے اس نے مجھے کوئی غمزدہ نہیں کیا، اور نہ ہی مجھے کوئی برا لگا۔

(تشریح ماخوذ از عمدۃ القاری المعروف بالعینی ج ۱۷ صفحہ نمبر ۱۴۲)

صحابہ کرام کے پسپا ہونے اور ستر کی تعداد میں شہید ہونے کی وجہ:

اس کی ایک وجہ تو یہی ہے جو اس حدیث پاک سے واضح ہو رہی ہے کہ جب وہ درہ کو چھوڑ کر مال غنیمت جمع کرنے کیلئے وہاں سے ہٹے ہی تھے تو رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی کی بظاہر مخالفت ہوگئی جس کی وجہ سے وہ متحیر ہو کر پھرنے لگے، انہیں معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کدھر جا رہے ہیں اور کدھر متوجہ ہیں، صحابہ کرام کی اس لغزش کی وجہ ان کی بے اختیار غلطی (جسے خطاء کہا جاتا ہے) بھی ہوسکتی ہے، اور ان کی اجتہادی خطاء بھی ہوسکتی ہے، اور شیطان کا وسوسہ بھی ہوسکتا ہے، اور سب سے بڑی وجہ رب تعالیٰ کی طرف سے آزمائش تھی جس کے اسباب بے اختیار غلطی اور اجتہادی خطاء اور شیطانی وسوسہ وغیرہ تھے۔ لیکن دوسری وجہ بھی حدیث پاک سے دیکھئے۔

❁ روی عن ابن ابی طالب علی ﷺ، قال جاء جبریل الی النبی ﷺ یوم بدر فقال لہ خیر اصحابک فی الاساری ان شاء والقتل، وان شاء والفداء علی ان یقتل منھم عام المقبل مثلھم فقالوا الفداء ویقتل منا" (اخرجہ الترمذی وقال حدیث حسن)

حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جبریل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ اپنے صحابہ کو بدر میں قید ہونے والے کفار کے بارے میں اختیار دے دیں، اگر وہ قتل کرنا چاہیں تو قتل کر دیں، اور اگر فدیہ لینا چاہیں تو فدیہ لے کر چھوڑ دیں، لیکن اگر انہوں نے فدیہ لیا تو آنے والے سال میں ان کے اتنے آدمی ہی شہید کردئے جائیں گے (چونکہ قیدی کفار بھی ستر تھے تو ستر صحابہ کرام ہی شہید کردئے گئے) تو صحابہ کرام نے (جبریل کے اس پیغام کو سن کر) کہا کہ ہم ان کا فدیہ لیتے ہیں تا کہ آنے والے سال ہمارے اتنے آدمی ہی شہید ہو جائیں (ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے) سبحان اللہ صحابہ کرام کے دل میں شہادت کی کتنی ہی زیادہ تمنا تھی، رب تعالی نے ان کی اس تمنا کو پورا کرتے ہوئے "فانجز اللہ وعدہ بشہادۃ اولیائۃ بعد ان خیرھم فاختار والقتل" ان سے وعدہ لیا کہ اگر تم فدیہ لینا چاہتے ہو تو تمہیں آنے والے سال میں کفار قیدیوں کی تعداد میں شہید کر دیا جائے گا، تو صحابہ کرام نے فدیہ لینا پسند کر لیا کہ ٹھیک ہے "ہمیں اتنی ہی تعداد میں شہید کر دیا جائے، تو اللہ تعالی نے اپنا وعدہ پورا کر دیا اپنے پیاروں کو شہید کرادیا" اسی آیۃ کریمہ میں قریب ہی آنے والے الفاظ مبارکہ ﴿وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ﴾ اس پر روشن دلیل ہیں۔ (منقول از قرطبی)

﴿وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ "اور (اس لئے) تا کہ پہچان کرادے اللہ ایمان والوں کی۔"

راقم نے یہ ترجمہ اعلی حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کے ترجمہ سے نقل کیا، آپ کے ترجمہ کنزالایمان کی خوبی کو دیکھنے کیلئے پہلے **راقم** کی تسکین الجنان فی محاسن کنزالایمان کو دیکھئے۔

﴿وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا﴾

اور اس لئے کہ معلوم کرے اللہ جن کو ایمان ہے۔	(محمود الحسن صاحب)
تا کہ اللہ ایمان والوں کو جان لے۔	(عبدالماجد دریا آبادی)
تا کہ اللہ تعالی ایمان والوں کو جان لیویں۔	(اشرف علی صاحب)
اور اس واسطے کہ معلوم کرے جن کو ایمان ہے۔	(شاہ عبدالقادر صاحب)
اور اس لئے کہ اللہ پہچان کرادے ایمان والوں کی۔	(اعلی حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ)

جنگ احد کا ذکر ہو رہا تھا کہ اے مسلمانو اگر تمہیں احد میں تکلیف پہنچی تو کفار کو بدر میں اسی طرح تکلیف پہنچی، یہ دن ہم لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں، اس کے بعد ذکر ہے ﴿وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ اس پر جلالین نے "علم

ظہور" سے تفسیر کی، اس پر حاشیہ یہ ہے "علم ظهور ای علم وجود ای علمنا متعلقا بالوجود الخارجی" یعنی یہاں علم کا تعلق وجود خارجی سے کہ جس کو اللہ تعالیٰ پہلے ہی سے جانتا ہے تاکہ اس کو خارج میں ظاہر فرمائے۔

"والعلم فيه مجاز عن التميز من باب اطلاق اسم السبب على المسبب اى ليميز الثابتين على الايمان من غيرهم" (روح المعانی)

یہاں علم کا مجازی معنی "جدا کرنا، تمیز پیدا کرنا" ہے، یعنی سبب کا نام مسبب پر اطلاق ہے (مجاز مرسل ہے) یعنی معنی یہ ہوا کہ ایمان پر ثابت رہنے والوں کو ان کے غیروں سے ممتاز کر دے، اب اس تفسیر (یعنی روح المعانی کی تفسیر) کے مطابق اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کے ترجمہ پر غور کریں "اللہ پہچان کرا دے ایمان والوں کی" کہ یہ نفیس ترجمہ ہے جس میں کوئی سطحی ذہن والا بھی وہم و گمان نہیں کر سکتا کہ شاید اللہ تعالیٰ نے ان کو آزمائش میں ڈال کر جانا پہلے علم نہیں تھا۔ (تسکین الجنان صفحہ نمبر ۸۹، ۹۰)

مزید وضاحت:

تفسیر صاوی اور تفسیر کبیر سے دیکھئے۔

"قوله علم ظهور" جواب عن سؤال مقدر حاصله ان علم الله قديم لايتجدد فكيف ذلک؟ فاجاب بأن المراد ليظهر متعلق علمه بتميز المؤمن غيره، والمعنى ان نصرة الكافر تارة ليست لمحبة الله بل ليتميز المؤمن من المنافق"

(وليعلم الله) علم ظهور" جلالین میں یہ تفسیر اس لئے کی گئی کہ ایک سؤال کا جواب دیا گیا ہے، سؤال یہ کہ اللہ تعالیٰ کا علم قدیم ہے، وہ کوئی نیا نیا حاصل ہونے والا نہیں تو رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ کا کیا مطلب ہے؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہاں معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو ظاہر کر دے (یا یوں کہہ لیں اللہ تعالیٰ ایمان والوں کی پہچان کرا دے، مطلب ایک ہی ہے) اور مؤمن اور غیر مؤمن کو ایک دوسرے سے جدا کر دے، کیونکہ کافر کی ظاہری برتری اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے نہیں، بلکہ مؤمن اور منافق کو ایک دوسرے سے ممتاز کرنا مقصود ہے۔ (صاوی)

جب دلائل عقلیہ اس پر دلالت کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حوادثات کو ان کے واقع ہونے سے پہلے جانتا ہے، تو واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تغیر محال ہے۔ ہاں البتہ علم سے مراد معلومات لئے جائیں اور قدرت سے مقدورات مراد لئے جائیں تو ان میں تغیر واقع ہوتا رہتا ہے، جہاں بھی بظاہر جب یہ نظر آئے کہ علم میں تجدد ہے تو اس سے مراد معلومات میں ہی تجدد ہوگا۔

آیۃ کریمہ کے چند مطالب:

(۱) لیظهر الاخلاص من النفاق والمؤمن عن الکافر" ایک مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤمن کے اخلاص کو ظاہر کردے، جس سے پتہ چل جائے کہ منافق اور کافر میں اخلاص نہیں۔

(۲) والثانی لیعلم اولیاء الله فاضاف الی نفسه تفخیما" دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہاں حذف مضاف ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کے علم کو اپنی ذات کی طرف منسوب کر کے اولیاء کرام کی عظمت وشان کو بیان کیا، ہوسکتا ہے کہ مقصد بیان یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ولی جان لیں ایمان والوں کو۔

(۳) وثالثها لیحکم بالامتیاز فوضع العلم مکان الحکم بالامتیاز لان الحکم بالامتیاز لایحصل الابعد العلم"
اس کا تیسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ (مؤمن اور کافر کے درمیان) امتیاز کا حکم نافذ کردے علم کو امتیاز کے فیصلہ کی جگہ رکھ دیا جائے، کیونکہ امتیاز کا حکم علم کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔

(۴) ورابعها لیعلم ذلک واقعامنهم کماکان لیعلم انه سیقع لان المجازاة تقع علی الواقع دون المعلوم الذی لم یوجد"
اس کا چوتھا مطلب یہ ہے کہ یہاں علم کے حاصل ہونے کی بات نہیں بلکہ علم کے تعلق کی بات ہے یعنی ایک علم ازلی ہے وہ کام کے واقع ہونے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ اور دوسرے علم کا تعلق جو معلوم سے ہوتا ہے وہ تعلق تب ہی ہوتا ہے جب معلوم معرض وجود میں آئے کیونکہ جزاء واقع پر مرتب ہوتی ہے نہ کہ معلوم پر۔ (کبیر)

اسی چوتھے معنی کہ مطابق حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ نے ترجمہ یوں کیا "اور یہ اس لئے کہ دیکھ لے اللہ تعالیٰ ان کو جو ایمان لائے۔ آپ نے تفسیر میں ذکر فرمایا" جمہور کا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم دو طرح کا ہے، ایک یہ کہ مستقبل میں یوں واقع ہوگا یہ علم تو ازل سے حاصل ہے، اس علم پر کوئی جزاء یا سزا، مدح یا ذم مرتب نہیں ہوتی، لیکن جب کوئی معلوم چیز علم باری کے مطابق خارج میں موجود ہو جاتی ہے تو اس وقت یہ علم حاصل ہوتا ہے کہ اب یہ چیز عدم سے وجود میں آگئی اور اسی پر جزاء وسزا مرتب ہوتی ہے، یہاں آیۃ میں علم کا یہی معنی مراد ہے جسے علم ظہور کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے "قول الجمهور ان المراد بالعلم علم الظهور" (المنار) جمہور کا قول یہی ہے کہ علم سے مراد علم ظہور ہے۔ (ضیاء القرآن)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

"علم" کا کبھی ایک مفعول ہوتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے "علمت زیدا" میں نے زید کو جان لیا" یعنی ذات زید کو جانا اور اسے پہچانا اور "علم" کبھی دو مفعولوں کا محتاج ہوتا ہے، جسے کہا جاتا ہے "علمت زیدا کریما" میں نے زید کے کریم ہونے کا یقین کرلیا آیۃ کریمہ میں "علم" کہ دو مفعول ہیں ایک مفعول محذوف ہے، معنوی لحاظ پر عبارت یوں ہوگی "وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا متميزين بالايمان من غيرهم" تا کہ اللہ تعالی پہچان کرادے ایمان والوں کی کہ وہ ایمان کی وجہ سے غیروں سے ممتاز ہیں۔ یعنی لوگوں کے درمیان دنوں کے پھیرنے کی حکمت ہی یہ ہے کہ اللہ تعالی خالص ایمان والوں کو "جو صبر سے کام لینے والے ہیں اور اسلام پر ثابت قدم ہیں" ممتاز کردے ان لوگوں سے جو صرف ایمان کا دعوی کرتے ہیں اور حقیقت میں ایمان سے دور ہیں، یعنی منافق ہیں۔ دوسرے احتمال کا پایا جانا بھی ممکن کہ "علم" کا ایک مفعول ہو، اب معنوی طور پر عبارت یوں ہوگی "وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا لما يظهر من صبرهم على جهاد عدوهم" تا کہ اللہ تعالی ایمان والوں کی ذاتوں کی پہچان کرادے جب ان کا صبر دشمن کے خلاف جہاد کرتے ہوئے ظاہر ہو جائے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ﴾ "اور بنائے تم میں سے بعض کو شہید۔"

یہاں سے دنوں کے پھیرنے کی دوسری حکمت بیان کی جارہی ہے کہ تمہیں شہداء بنائے، شہداء جمع شاہد کی ہے یا شہید کی ہے۔ دونوں احتمال پائے جاسکتے ہیں اگر شاہد کی جمع ہو تو مطلب یہ ہوگا۔

"وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ بماصدر منهم من الذنوب والمعاصی، فان كونهم لهم شهداء على الناس منصب عال ودرجة عالية"

کہ اللہ تعالی تمہیں لوگوں کے گناہ اور معاصی کرنے پر گواہ بنادے، اس لئے کہ ایمان والے مخلصین کو لوگوں پر گواہ بنانے سے ان کا منصب بلند اور درجہ ثابت ہوگا۔

دوسرا احتمال: دوسرا احتمال کہ شہداء جمع شہید کی ہو، زیادہ مفسرین کرام نے یہی معنی لیا ہے، اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ بھی اسی کے مطابق ہے اور **راقم** نے بھی آپکے ترجمہ کو ہی نقل کیا ہے۔

"والثانی المراد منه ولیکرم قوما بالشهادة" جب شہداء جمع شہید کی ہو تو مطلب یہ ہوگا تا کہ بنائے تم میں سے بعض کو شہید اور شہادت کی وجہ سے ان کو مکرم بنائے۔ مسلمان بدر میں خود ہی شہادت کی تمنا کررہے تھے، ان کی دعاء کو

شرف قبولیت بخشا تو ان کو احد میں ستر کی تعداد میں شہادت نصیب ہوگئی۔

"القرآن مملوء من تعظیم حال الشهداء" قرآن شہیدوں کی تعظیم کے بیان سے بھرا ہوا ہے، ارشاد باری تعالی ہے

﴿وَلَاتَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ﴾

اور ہرگز نہ گمان کرو "ان لوگوں کو جو شہید کر دیئے اللہ کی راہ میں" مردہ بلکہ وہ زندہ ہیں ان کے رب کے ہاں ان کو رزق دیا جاتا ہے۔

اور ارشاد فرمایا:

﴿فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصّٰلِحِيْنَ﴾

پس وہ ان کیساتھ ہوں گے جن پر اللہ کا انعام ہے وہ انبیاء ہیں اور صدیقین ہیں اور شہداء ہیں اور صالحین ہیں۔

اس آیہ کریمہ میں انبیاء کرام کے بعد صدیقین کا ذکر فرمایا، صدیقین کے بعد شہیدوں کا ذکر فرمایا۔

"فكانت هذه المنزلة هي المنزلة الثالثة للنبوة" تو اس سے اسی طرف ارشاد فرمایا کہ شہیدوں کا انبیاء کرام کے بعد تیسرا عظیم درجہ ہے۔ (کبیر)

اسی سے یہ فائدہ بھی حاصل ہوا کہ انبیاء کرام کے بعد دوسرا مرتبہ صدیقین کو حاصل ہے، جن میں رئیس الصدیقین حضرت ابوبکر صدیق ﷺ ہیں جو انبیاء کرام کے بعد سب شہیدوں سے افضل ہیں۔

شہید کو شہید کہنے کہ وجہ:

نبی کریم ﷺ کی امت قیامت کے دن پہلی امتوں پر اور انبیاء کرام کے حق میں گواہی دے گی ان میں خصوصی درجہ اللہ کی راہ میں قتل کئے جانے والے کو ہوگا، اسی وجہ سے کہ وہ رب تعالی کے حضور لوگوں پر گواہی دینے کیلئے حاضر ہوں گے تو ان کو شہید کہا جاتا۔ "وقيل سمي شهيدا لانه مشهود له بالجنة" اور وجہ یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں قتل ہونے والے کو جنت میں حاضر کر دیا جاتا ہے لھذا اسے شہید کہا جاتا ہے۔

"وقيل سمي شهيدا لان ارواحهم احتضرت دار السلام لانهم احياء عند ربهم وارواح غيرهم لاتصل الى الجنة"

شہید کو شہید کہنے کی اور وجہ یہ ہے کہ ان کی روحوں کو جنت میں حاضر کر دیا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے رب کے

ہاں زندہ ہوتے ہیں، اوران کے بغیر دوسرے لوگوں کی روحوں کو جنت میں اسی وقت نہیں پہنچایا جاتا بلکہ حساب وکتاب کے بعد دوسرے لوگوں کی روحوں کو جنت میں داخل کیا جائے گا۔شہیدوں کوعظیم مرتبہ حاصل ہوگا،ان کے عظیم مراتب کوقرآن پاک کی ان آیات میں دیکھئے۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَیْہِ حَقًّا فِی التَّوْرٰاۃِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ وَمَنْ اَوْفٰی بِعَھْدِہٖ مِنَ اللّٰہِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِکُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِہٖ وَذٰلِکَ ھُوَالْفَوْزُ الْعَظِیْمُ﴾ (سورۃ التوبۃ،آیۃ نمبر ۱۱۱)

''بیشک اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سےان کے مال اور جان خرید لئے ہیں اس بدلے پر ان کیلئے جنت ہے اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑیں تو ماریں اور مریں،اس کے ذمہ کرم سچا وعدہ توراۃ اور انجیل اور قرآن میں،اور اللہ سے زیادہ قول کا پورا کون؟ تو خوشیاں مناؤ اپنے سودے کی جوتم نے اس سے کیا ہے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔''

﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنْجِیْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍO تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَO یَغْفِرْلَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَیُدْخِلْکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ وَمَسٰکِنَ طَیِّبَۃً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ﴾ (سورۃ الصف آیات نمبر ۱۰ تا ۱۲)

''اے ایمان والو کیا میں بتادوں وہ تجارت جو تمہیں دردناک عذاب سے بچائے۔ایمان رکھو اللہ اور اس کے رسول پر اور اللہ کی راہ میں اپنے مال وجان سے جہاد کرو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہیں باغوں میں لے جائے گا جن کے نیچے نہریں رواں،اور پاکیزہ محلوں میں جو بسنے کے باغوں میں ہیں یہی بڑی کامیابی ہے۔''

❁ وفی صحیح البستی عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ مایجد الشھید من القتل الا کما یجد احدکم من القرحۃ''

صحیح بستی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی گئی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شہید قتل سے نہیں پاتا مگر وہ جو تم میں سے کوئی ایک زخم کی خراش سے پاتا ہے۔یعنی جس طرح خراش سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی اسی طرح شہید کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔

❁ وروی النسائی عن راشد بن سعد عن رجل من اصحاب النبی ﷺ ان رجلا قال یارسول اللہ ﷺ مابال المؤمنین یفتنون فی قبورھم الا الشھید قال کفی ببارقۃ السیوف علی راسہ فتنۃ''

نسائی نے راشد بن سعد سے روایت بیان کی جو نبی کریم ﷺ کے ایک صحابی سے مروی ہے کہ ایک شخص نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ کیا وجہ ہے کہ سب مؤمنوں کو قبر کے سؤال وجواب میں مبتلاء ہونا ہے لیکن شہید کو نہیں؟ تو آپ نے فرمایا اس کے سر پر بجلی کی طرح چمکتی تلوار چلا کر ہی اسے آزمالیا گیا۔

❁ حدثنا انس بن مالک انه قتل منهم یوم احد سبعون ویوم بئر معونة وسبعون ویوم الیمامة سبعون قال بئر معونة علی عهد رسول الله ﷺ ویوم الیمامة علی عهد ابی بکر یوم مسیلمة الکذاب" (بخاری کتاب المغازی باب من قتل من المسلمین یوم احد)

حضرت انس بن مالک ؓ فرماتے ہیں احد کے دن ستر صحابہ کرام شہید کردئے گئے اور بئر معونہ کے دن ستر صحابہ کرام شہید کردئے گئے اور یمامہ کے دن ستر صحابہ کرام شہید کردئے گئے۔ بئر معونہ کا واقعہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں ثابت ہوا، اور یمامہ کا واقعہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے زمانہ میں ہوا جبکہ آپ نے مسیلمہ کذاب سے جنگ کی۔ (منقول از قرطبی)

بئر معونہ کا ذکر تو پہلے تفصیلی طور پر کردیا گیا ہے، جو صحابہ کرام کو تبلیغ کی غرض سے دھوکہ سے بلا کر شہید کردیا گیا۔ یمامہ کا واقعہ مختصر یہ ہے کہ جھوٹے مدعی نبوت مسیلمہ کذاب (جس نے نبی کریم ﷺ کے آخری ایام میں ہی نبوت کا دعوی کردیا تھا) کے مقابلے کیلئے حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے خالد بن ولید کو جنگ کا امیر مقرر کیا، دونوں فریقوں کا ایک دوسرے سے آمنا سامنا ہوا، یہ جنگ بہت مشکل اس لئے تھی کہ مرتدین کا لشکر بہت بڑی تعداد میں تھا، نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد ایک لاکھ سے زائد جاہل لوگ اس کے اردگرد جمع ہو چکے تھے، جنگ یمامہ میں مسیلمہ کذاب کے ساتھ چالیس ہزار آدمی تھے اور حضرت خالد بن ولید ؓ کے ساتھ چوبیس ہزار آدمی تھے، ابتدائی طور پر مسلمانوں کے قدم ڈگمگائے تھے، مگر آخر میں بحکم "الاسلام یعلو ولا یعلی" (اسلام غالب ہے اور مغلوب نہیں) کے حکم کے تحت دشمنوں نے شکست کھائی مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔

"وولی الکفار الادبار ودخل اکثرهم الحدیقة واحاط بهم الصحابة لم دخلوها من حیطانها وابوابها فقتلوا من فیها من المرتد من اهل الیمامة"

اور کفار پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے، جان بچانے کی خاطر ایک باغ میں گھس گئے اور صحابہ کرام نے ان کو گھیرے میں لے لیا اور دیواروں پھلانگ کر باغ کے اندر پہنچ گئے، کوئی دروازوں سے اندر چلے گئے، وہاں مرتدین یمامہ کو قتل کردیا، یہاں تک کہ مسلمانوں نے مسیلمہ کا پیچھا کیا، حضرت وحشی بن حرب ؓ آگے نیزہ اس کے سینے پر مارا جو اس کی پیٹھ سے نکل گیا، پھر جلدی ابودجانہ سماک بن حرب آگے بڑھے جنہوں نے تلوار سے اسے قتل کردیا۔

"وکان جملة من قتلوا فی الحدیقة وفی المعرکة قریبامن عشر آلاف مقاتل وقیل احدو عشرون الفا"

مرتدین جو باغ میں قتل کر دیے گئے اور میدان جنگ میں جوان کی لڑائی کرنے والے قتل کر دیے گئے وہ دس ہزار تھے، بلکہ ایک روایت میں یہ ذکر ہے کہ اکیس ہزار کی تعداد میں مرتدین قتل کر دیے گئے۔

"وقتل من المسلمین ستمائة وقیل خمس مائة والله اعلم وفیهم من الصحابة سبعون رجلا"

مسلمان اس جنگ میں پانچ سو اور چھ سو کے درمیان شہید ہوئے جن میں ستر صحابہ کرام تھے اور باقی تابعین تھے۔ (ماخوذ مدارج النبوۃ جلد دوم، وعمدۃ القاری شرح بخاری ج ۱۷ صفحہ نمبر ۱۶۳)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

اس آیۃ کریمہ سے یہ واضح ہوا کہ "ان جمیع الحوادث بارادۃ الله تعالی" کہ تمام حوادث اللہ تعالی کے ارادہ سے پائے جاتے ہیں، اسلئے کہ منصب شہادت ایک عظیم درجہ ہے، اور شہادت کے اصول کے لئے کفار کا مؤمنوں پر مسلط ہونا ضروری ہے اس کے بغیر شہادت کا اصول نہیں جب شہادت کفار کے تسلط کے بغیر حاصل نہیں ہوتی "فحینئذ یکون قتل الکفار للمؤمنین من لوازم تلک الشهادة" تو پتہ چلا کہ کافروں کا مؤمنوں کو قتل کرنا شہادت کے لوازمات سے ہے۔

"فاذا کان تحصیل تلک الشهادة العبدمطلوبالله تعالی وجب ان یکون ذلک القتل مطلوبالله تعالی"

جب بندے کا شہادت کو حاصل کرنا اللہ تعالی کو مطلوب، اور شہادت کافر کے قتل کرنے کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے تو کافر کا مسلمان کو قتل کرنا بھی مطلوب ہوا۔ ﴿وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ﴾ سے اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ جب شہادت رب تعالی کی طرف سے حاصل ہوتی ہے۔

"وذلک یدل علی ان فعل العبدخلق الله" تو اسی سے پتہ چل گیا کہ بندے کا فعل اللہ تعالی کی تخلیق کی وجہ سے ہے، یعنی بندوں کے افعال اللہ تعالی کی مخلوق ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ﴾ "اور اللہ تعالی نہیں محبت کرتا ظالموں سے۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول یہ ہے کہ اس آیۃ کریمہ میں "ظالمون" سے مراد مشرکین ہیں، یعنی اللہ تعالی

مشرکوں سے محبت نہیں کرتا۔ یعنی جو لوگ جہاد پر صبر نہ کر کے ایمان پر ثابت نہیں رہتے رب تعالیٰ ان کو پسند نہیں کرتا، اور اسی سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ کافروں کو اگر بظاہر کبھی برتری دے دے تو اس میں بھی مؤمنین کا ہی فائدہ ہوتا ہے کہ ان کو منصب شہادت حاصل ہو جاتا ہے "لا لانہ یحبھم" اس کی وجہ یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کافروں سے محبت رکھتا ہے وہ تو کافروں سے محبت رکھتا ہی نہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ۝ (آیۃ نمبر ۱۴۱)

(1) اور اس لئے کہ اللہ مسلمانوں کا نکھار کر دے اور کافروں کو مٹا دے۔ (کنز الایمان)

(2) اور اس لئے کہ نکھار دے اللہ تعالیٰ انہیں جنہوں نے ایمان لایا اور مٹا دے کافروں کو۔ (نجوم الفرقان)

محص: (ف) محصا. الظبی فی عدوہ" تیز دوڑنا "المذبوح برجلہ" مذبوح کا تڑپنا "بفلان العرض" کسی کو زمین پر پھینکنا فلان من فلان، بھاگنا "البرق" بجلی کا چمکنا "اللہ مابک" زائل کرنا، الشیٔ ہر عیب سے پاک کرنا" السنان " بھالے کو صیقل کرنا "الذھب بالنار" سونے کو صاف کرنا یعنی سونے کو آگ کی بھٹی میں ڈال کر صاف کر کے نکھار دیا جائے۔

آیۃ کریمہ میں یہی معنی لیا گیا ہے:

المحص الورم، ورم کا کم ہونا، المحص والممحص والمحیص والممحوص من الخیل مضبوط ساخت کا گھوڑا، المحاص، چمکنے والی بجلی "الامحص" ہر جھوٹے، سچے کا عذر قبول کرنے والا۔ (المنجد)

محق: (ف) محقا الشیٔ، باطل کرنا، مٹانا، اللہ الشیٔ گھٹانا، برکت کھونا، الحرُّ الشیٔ جلانا "المحق" کھجور کے قریب قریب لگے ہوئے پودے "ماحق الصیف" موسم گرما کی شدت "الامحق" بے برکت۔ (المنجد)

اس آیۃ کریمہ میں تیری حکمت بیان کی جارہی ہے، اور درمیان میں ﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ﴾ جملہ معترضہ ہے۔

دونوں آیات کا مختصر مطلب:

اگر تمہیں احد میں کوئی تکلیف پہنچی ہے تو کافروں کو اسی کی مثل بدر میں تکلیف پہنچ چکی ہے، بلکہ احد میں بھی کافروں کے بیس سے زائد آدمی قتل کردئے گئے تو اس لحاظ پر مطلب یہ ہوگا کہ کافروں کی قوم کو احد میں تم سے پہلے تکلیف پہنچ چکی ہے۔ یہ دن ہم لوگوں میں پھیرتے رہتے ہیں کبھی مسلمانوں کو فتح عطاء کردی اور کبھی کفار کو بظاہر وقتی طور پر برتری دے دی تاکہ اللہ تعالیٰ مؤمنوں کو کفار سے ممتاز کر کے ان کی پہچان کرادے، اور بعض مؤمنوں کو شہادت کا درجہ عطاء کردے، اور مؤمن جب اس مشکل میں ایمان پر ثابت رہیں گے تو ان کو گناہوں سے پاک وصاف کر کے سونے کی طرح صاف وشفاف کر کے ان میں نکھار پیدا کردے اور کافروں کو مٹادے، وجہ اس کی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں فرماتا۔ (ماخوذ از صاوی)

اعتراض: لوگوں میں دنوں کے پھیرنے پر کافروں کے مٹانے کا ذکر اس آیۃ کریمہ میں کیسے صحیح ہے؟ جبکہ احد میں تو کافروں کو بظاہر برتری حاصل ہوئی تھی۔

جواب: قولہ تعالیٰ (ویمحق الکافرین) ای فانھم اذاظفروا بغوا وبطروا، فیکون ذلک سبب دمارھم وھلاکھم ومحقھم وفنائھم"

اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَیَمۡحَقَ الۡکٰفِرِیۡنَ﴾ (اور کافروں کو مٹادے) کا مطلب یہ ہے کہ جب ان کو ظاہری طور پر کامیابی حاصل ہوتی ہے تو بغاوت وسرکشی کرتے ہیں، جو ان کی تباہی اور ہلاکت اور ان کے مٹ جانے اور ان کے فناء ہوجانے کا سبب بنتی ہے۔ (از ابن کثیر وصابونی)

تین معانی میں سے جو چاہیں مراد لے لیں:

یمحص یختبر" اور اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو آزمائے کہ کون ایمان پر قائم رہتے ہیں اور ڈگمگاتے ہیں "یمحص ای یطھر" اور اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو گناہوں سے پاک کرے، یعنی جب وہ ایمان پر ثابت رہیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو گناہوں سے پاک وصاف وشفاف کردے گا، اور ان کو نکھاردے۔ "یمحص ای یخلص" اور اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کے گناہوں کو مٹادے اور انہیں معاف کردے۔ یہ اسی طرح جس طرح کہا جاتا ہے "اللھم محص عنا ذنوبنا" اے اللہ ہمارے گناہوں کو مٹادے۔ اس آیۃ کریمہ میں ﴿وَلِیُمَحِّصَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا﴾ کا معنی یہ ہوگیا "فالمعنی علیه لیبتلی المؤمنین لیثیبھم ویخلصھم من ذنوبھم" کہ اللہ

تعالیٰ مؤمنوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے تاکہ ان کو ثواب عطاء کرے اور ان کے گناہوں کو مٹا دے۔ (ماخوذ از قرطبی)

❁ واخرج ابن ابی حاتم عن عکرمة قال لما ابطا علی النساء الخبر خرجن یستخبرن فاذا رجلان مقتولان علی دابة او علی بعیر فقالت امرأة من الانصار من هذان قالوا فلان وفلان اخوها وزوجها وابنها فقالت مافعل رسول الله ﷺ؟"قالوا حي" قالت فلا ابالي یتخذ الله من عباده الشهداء ونزل القرآن علی ما قالت"

ابن ابی حاتم نے حضرت عکرمہ سے ایک روایت بیان کی، کہ جب عورتوں پر خبر کے پہنچنے میں تاخیر ہوگئی، تو وہ خبر طلب کرنے کیلئے نکلیں، تو شہیدوں کو ایک سواری پر لایا جارہا تھا، تو اس عورت نے پوچھا کہ یہ دو شہید کون ہیں؟ تو اسے بتایا گیا کہ یہ فلاں اور فلاں دو شخص ہیں، ایک اس عورت کا خاوند اور ایک بھائی تھا یا ایک خاوند اور ایک بیٹا تھا، اس عورت نے پوچھا نبی کریم ﷺ کیسے ہیں؟ تو اسے بتایا گیا کہ آپ صحیح زندہ اور سلامت ہیں، تو اس عورت نے کہا کہ اب مجھے کوئی پروہ نہیں کہ آپ زندہ اور سلامت ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے بعض کو شہادت کا مرتبہ عطاء کردیا، تو اسی وقت یہ الفاظ مبارکہ نازل ہوئے ﴿وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ﴾ کہ تم میں سے بعض کو شہید بنائے۔ (منقول از در منثور)

سبحان اللہ! صحابہ اور صحابیات کا کتنا صبر تھا، کہ اپنے بھائی اور خاوند، یا کہ اپنے خاوند اور اپنے بیٹے کی پرواہ نہیں، بلکہ خوشی ہوئی کہ ان کو شہادت کا مرتبہ حاصل ہوگیا، فکر صرف نبی کریم ﷺ کی لاحق ہوئی، آپ کی حیات کی خبر سن کر اس کے دل کو اطمینان حاصل ہوگیا۔

محص اور محق میں فرق:

دونوں لفظوں میں مطابقت پائی گئی کہ ہر ایک کا معنی "ازالہ" ہے البتہ محص کا معنی یہ ہے "فی الاول ازالة الآثار وازاحة الاوضار" کہ آثار کو زائل کردینا یعنی علامات اور نشانات مٹا دینا، اور میل کچیل کو دور کردینا "وفی الثانی ازالة العین واهلاک النفس" دوسرے یعنی "محق" کا معنی ہے عین چیز کو مٹا دینا اور نفس کو ہلاک کردینا "واصل المحق تنقیص الشیٔ قلیلا قلیلا" اصل میں محق کا معنی ہے کسی چیز کو آہستہ آہستہ مٹا دینا۔ (روح المعانی)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَ يَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ○ (آیۃ نمبر ۱۴۲)

(1) کیا اس گمان میں ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے اور ابھی اللہ نے تمہارے غازیوں کا امتحان نہ لیا اور نہ صبر والوں کی آزمائش کی۔ (کنز الایمان)

(2) کیا تم نے گمان کیا کہ ابتداً داخل ہو جاؤ گے جنت میں، حالانکہ نہیں آزمایا اللہ نے انہیں جنہوں نے جہاد کیا تم میں سے، اور نہیں آزمایا صبر کرنے والوں کو۔ (نجوم الفرقان)

یعنی جنت میں ابتدائی طور پر جانے کی یوں ہی امید نہ کرے، بلکہ اللہ تعالی کی طرف سے امتحانوں میں کامیابی حاصل کرے، جہاد کرنے کی آزمائش میں پورا اترے، اور رب تعالی کی طرف سے دی ہوئی تکالیف پر صابر رہے، تو اللہ تعالی اسے جنت عطاء فرمائے گا۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

جلالین میں ﴿اَمْ حَسِبْتُمْ﴾ کی تفسیر "بَلْ اَحَسِبْتُمْ" سے کی گئی، اس پر صاوی نے لکھا "ام" منقطعہ ہے اسی وجہ سے مفسر رحمہ اللہ نے "بل" سے تفسیر کی جو اضراب انتقالی پر دلالت کر رہا ہے، اور مفسر رحمہ اللہ نے ہمزہ مقدر نکالا ہے، جو استفہام انکاری پر دلالت کر رہا ہے

"والمعنی لا تظنوا یاایھاالمؤمنون الکم تدخلون الجنة مع السابقین بمجرد الایمان من غیر جهاد وصبر بل مع الجهاد والصبر"

معنی یہ ہے کہ اے مؤمنو تم گمان نہ کرو کہ تم جنت میں ابتدائی طور پر داخل ہونے والوں کے ساتھ بغیر جہاد اور صبر کے صرف ایمان کے ساتھ ہی چلے جاؤ گے، بلکہ جہاد اور صبر سے جنت میں السابقون الاولون کے ساتھ داخل ہو گے۔

طلباء کرام ایک اور مسئلہ کی طرف توجہ کریں:

"لما" نافیہ ہے "یعلم" مجزوم ہے، التقاء ساکنین کی وجہ سے کسرہ دیا گیا۔ (صاوی)

تسکین الجنان فی محاسن کنزالایمان سے اقتباس:

﴿وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَ يَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ﴾

''ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو جانا ہی نہیں جنہوں نے جہاد کیا اور صبر نہ کرنے والوں کو جانا'' (عبدالماجد صاحب)

''حالانکہ ابھی خدا نے تم میں سے جہاد کرنے والوں کو تو اچھی طرح معلوم نہیں کیا اور یہ مقصود ہے کہ وہ ثابت قدم رہنے والوں کو معلوم کرے۔ (فتح محمد صاحب)

اور ابھی تک معلوم نہیں کیا اللہ نے جو لڑنے والے ہیں تم میں سے اور معلوم نہیں کیا ثابت رہنے والوں کو'' (محمود الحسن صاحب)

اور ابھی معلوم نہیں کیا اللہ نے جو لڑنے والے تم میں سے اور معلوم کرے ثابت رہنے والے۔ (شاہ عبدالقادر صاحب)

''اور ابھی اللہ نے تمھارے غازیوں کا امتحان نہ لیا اور صبر کرنے والوں کی آزمائش کی''

(اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ)

اس مقام پر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے مفسرین کی بحث بآسانی سمجھ میں آتی ہے، کہ یہاں اللہ کے علم کی کیسے نفی ہے؟ یہ تو ممکن نہیں کہ کہا جائے ابھی تک اللہ نے معلوم نہیں کیا۔

ای ولما تجاهدوا لان العلم متعلق بالمعلوم فتدل نفی العلم بمنزلة نفی متعلقه لانه منتف بانتفائه تقول ماعلم الله فی فلان خيرا ای مافيه خير حتی يعلمه'' (مدارک)

یعنی یہاں مقصد نفی جہاد ہے، نفی علم نہیں اس لئے کہ علم کا تعلق معلوم سے ہے، نفی معلوم کی جگہ نفی علم کو رکھا گیا ہے، کیونکہ معلوم کہ انتفاء سے علم کا انتفاء ہوتا ہے، جیسے تم کہو ''ما علم الله فی فلان خيرا'' اس کا یہ معنی نہیں کہ اللہ نے فلاں میں خیر کو جانا نہیں، بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ فلاں میں خیر ہے ہی نہیں جو اللہ تعالیٰ کے علم سے متعلق ہو، مقصود بھی یہی ہے کیونکہ ماقبل آرہا ہے کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، ابھی تو اللہ نے تمہیں جہاد میں آزمایا بھی نہیں اور نہ صبر کرنے والوں کی آزمائش کی۔

فان رجاء الاجرمن غير عمل ممن يعلم انه منوط به مستبعدعندالعقول ولهذاقيل :

ترجو النجاة ولم تسلک مسالكها ان السفينة لاتجری علی اليبس

وورد عن شهر بن حوشب طلب الجنة من غير عمل ذنب من الذنوب وانتظار الشفاعة بلا سبب نوع من الغرور وارتجاء الرحمة ممن لا يطاع حمق وجهالة''

(روح المعانی)

اجر کی امید بغیر عمل کئے یہ جانتے ہوئے کہ اس کی دارومدار بھی اسی پر ہے یہ عقل سے بعید ہے، اسی وجہ سے یہ کہا گیا "نجات کی امید اس راہ پر چلنے کے بغیر کشتی کو خشکی پر چلانے کے مترادف ہے، شہر بن حوشب کہتے ہیں بغیر عمل کے طلب جنت گناہ ہے، انتظار شفاعت بلا سبب دھوکہ میں مبتلاء ہونا ہے، اور رحمت کی امید بغیر اطاعت کے جہالت و بے وقوفی ہے، اس تقریر سے واضح ہوا کہ یہاں نفی آزمائش جہاد و صبر ہے نہ کہ نفی علم۔

نفی اللازم نفی الملزوم و کثیرا مایقال ما علم اللہ تعالی فی فلان خیرا ویراد ما فیه خیر حتی یعلمه" (روح المعانی)

اس عبارت کا مفہوم وہی ہے جو پہلے مدارک کے حوالہ سے گزر چکا ہے۔

"ام حسبتم ان تدخلوا الجنة و الحال انه لم یتحقق منکم الجهاد و الصبر" (روح المعانی)

کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ تم سے جہاد اور صبر ثابت ہی نہیں ہوا، اس عبارت سے بھی واضح ہو رہا ہے کہ "نفی جہاد و صبر ہے، نہ کہ نفئ علم۔ (تسکین الجنان صفحہ ۹۱،۹۲)

"ظاهرا لآیة یدل علی وقوع النفی علی العلم ،والمراد وقوعه علی نفی المعلوم ،والتقدیر ،ام حسبتم ان تدخلوا الجنة ولما یصدر الجهاد عنکم ،وتقریره ان العلم متعلق بالمعلوم کما هو علیه ،فلما حصلت هذه المطابقة لا جرم حسن اقامة کل واحد منها مقام الآخر "

آیۂ کریمہ سے ظاہری طور پر معنی یہ سمجھ آ رہا ہے کہ علم کی نفی ہو رہی ہے، لیکن مراد معلوم کی نفی ہے علم کی نہیں ،آیۂ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ، کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ تم سے جہاد صادر ہی نہیں ہوا واضح ہوا کہ علم معلوم سے متعلق ہوتا ہے، جس طرح معلوم ہو، جب مطابقت ضروری ہے تو یقیناً علم کو معلوم کے درجہ میں ،اور معلوم کو علم کے درجہ میں رکھنا جائز ہے۔ (کبیر)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

"قال الزجاج اذا قیل فعل فلان فجوابه انه لم یفعل، واذا قیل قد فعل فلان فجوابه لم یفعل، لانه لما اکد وفی جانب الثبوت بقد لاجرم اکدفی جانب النفی بکلمة لما"

زجاج نے کہا ہے کہ جب کہا جائے فلاں نے یہ کام کیا ہے، تو اس کی نفی مقصود ہو تو کہا جائے گا۔ "انہ لم یفعل" اس نے یہ کام نہیں کیا، اور اگر ثبوت کی جانب تاکید لگائی جائے لفظ قد سے، تو نفی کی جانب لفظ"

لــمـــا " سے تاکید آئے گی "قــد فــعــل" تحقیق اس نے یہ کام کیا تو اس کے جواب میں کہا جائے گا "لما یفعل" تحقیق اس نے نہیں کیا۔ (کبیر)

کیا خوب نتیجہ پیش کیا گیا:

"واعلم ان حاصل الکلام ان حب الدنیا لا یجتمع مع سعادة الآخرة" آیۃ کریمہ سے نتیجہ یہ حاصل ہوا کہ دنیا کی محبت، آخرت کی نیک بختی کے ساتھ جمع نہیں ہوتی، جتنی قدر ایک بڑھے گی اتنی مقدار میں دوسری میں کمی آئے گی، اگر دنیا کی محبت بڑی تو آخرت کی سعادت میں کمی آئے گی، اور اگر آخرت کی محبت بڑھی تو دنیا کی محبت میں کمی آجائے گی، اس کی وجہ اصل میں یہ ہے کہ دنیاوی کمال اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک دنیا کی طرف دل نہ لگایا جائے، اسی طرح اخروی سعادت اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب دل اللہ تعالیٰ کے سوا تمام، چیزوں سے ہٹا کر اللہ تعالیٰ کی محبت کی طرف لگا دے، اسی محبت الٰہیہ سے اس کا دل پر رہے۔

"وھذان الا مران لا یجتمعان ،فلھذا السر وقع الاستبعاد الشدید فی ھذہ الآیة من اجتماعھما"

یہ دونوں امر آپس میں جمع نہیں ہوتے، اسی راز کے پیش نظر ان دونوں چیزوں یعنی محبت دنیا اور سعادت اخرویہ کے اجتماع سے دور رہنے کا حکم دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کی محبت اور آخرت کی محبت صرف زبانی دعوی سے حاصل نہیں ہوتی، یہ کوئی ضروری نہیں کہ جو بھی اللہ تعالیٰ کے دین کا اقرار کرے وہ سچا بھی ہو، بلکہ محبوب اور مکروہ چیزوں کے مسلط کرنے سے اصلی محبت کا پتہ چلتا ہے، اگر محبوب سے منافع حاصل ہو تو محبت برقرار رہے اور محبوب کی طرف سے آزمائش کیلئے بے رخی پائی جائے تو محبت زائل ہو جائے تو یہ حقیقت میں محبت ہی نہیں۔

"فـان الـحـب لا یـنـقـص بالجفاء و لا یزداد بالوفاء، فان بقی الحب عند تسلیط اسباب البلاء ظھر ان ذلک الحب کان حقیقیا"

بیشک محبت جفاء سے کم نہیں ہوتی اور وفاء سے بڑھتی نہیں، اگر محبت اس وقت بھی باقی رہے جب آزمائش کے اسباب اس پر مسلط کئے جائیں تو یہی حقیقی اور کامل محبت ہے "اَلسّٰـابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ" کے ساتھ ہی فلھذا الحکمة قال ﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ﴾ کیا تم گمان کرتے ہو کہ جنت میں "اَلسّٰابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ" کے ساتھ ہی داخل ہو جاؤ گے، صرف رسول اللہ ﷺ کی تصدیق سے بغیر جہاد اور صبر میں مبتلاء ہونے سے پہلے؟ نہیں ایسا نہیں، بلکہ پہلے تمہیں جہاد سے آزمایا جائے گا، اور شدید محنت میں مبتلاء کر کے تمہارے صبر کی دوسرے لوگوں کو پہچان

کرائی جائے گی، جب تم اس معیار میں پورے اترو گے تو رب تعالیٰ کے محبوب بن جاؤ گے، پھر پہلے ہی مرحلہ میں تم جنت میں داخل کر دیئے جاؤ گے۔ (ماخوذ از کبیر)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

﴿وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ میں "میم" کے کسرہ والی ایک قرأت ہے، وہ واضح ہے کہ اس میں پہلے "لما" بواسطہ عطف ساتھ مل جائے گا، اور ایک قرأت میں "میم" پر رفع بھی پڑھا گیا ہے، اس صورت میں واؤ استینافیہ ہے یا حالیہ ہے "کانہ قیل ولما تجاھدوا وانتم صابرون" اس قرأت کے مطابق معنی یہ ہے، اور تم نے جہاد ہی نہیں کیا تمہارا صبر سامنے آتا تو رب تعالیٰ اس کی پہچان کرا دیتا، لیکن مشہور قرأت روایۃ ابی حفص کے مطابق ہمارے سامنے "نصب" والی ہے، اس صورت میں "ان" مقدر ہوگا یا واؤ صرف ہوگی، اور کلام اس طرح ہوگی جیسے "لاتاکل السمک وتشرب اللبن" میں ہے، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مچھلی کھانے اور دودھ کے پینے کو جمع نہ کرو، اب اس قانون کے مطابق آیۃ کریمہ کا مطلب یوں ہوگا ﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ﴾ والحال انہ لم یتحقق منکم الجھاد والصبر ای الجمع بینھما" کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم (ابتداء) جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ تم سے جہاد اور صبر ثابت ہی نہیں ہوئے۔ (روح المعانی)

﴿وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ ذکر فرمایا ﴿وَيَعْلَمَ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا﴾ نہیں ذکر فرمایا کہ دوام واستمرار بھی حاصل ہو جائے اور آیات کے آخری الفاظ "**عاملین، مکذبین، متقین** اور **صابرین** ایک جیسے ہو جائیں۔

ابتدائی کلاسوں کے دینی طلباء اسے نہ بھولیں:

آپ صرف کی کتب میں ثلاثی مجرد کے ابواب میں "حسب یحسب" ماضی اور مضارع مکسور العین پڑھ رہے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ مادہ، یہ الفاظ کسی اور باب پر نہیں آتے، بلکہ قرآن پاک میں ماضی مکسور العین اور مضارع مفتوح العین ہی استعمال ہے، اس کی تفصیل یہ ہے "حسبہ" (ن) حسبا، حسابا، حسبانا، حسبانا، حسبۃ، حسابۃ، گننا شمار کرنا حسبہ (س ح) حسبانا، محسبۃ، گمان کرنا، خیال کرنا "حسبۃ" "شریف الاصل ہونا" (المنجد)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ O (آیۃ نمبر ۱۴۳)

(1) اور تم تو موت کی تمنا کیا کرتے تھے اس کے ملنے سے پہلے تو اب وہ تمہیں نظر آئی آنکھوں کے سامنے۔ (کنزالایمان)

(2) اور تحقیق تم تمنا کرتے تھے موت کی پہلے اس کے پالینے کے، تو تحقیق (اب) تم نے اسے دیکھ لیا، اس حال میں کہ تم اسے (اپنی آنکھوں سے) دیکھ رہے ہو۔ (نجوم الفرقان)

شان نزول:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی نے جب نبی کریم ﷺ کے ذریعے صحابہ کرام کے سامنے بدر والے شہداء کی شان بیان کی اور ان کا اپنے ہاں مقام تکریم وعزت بیان کیا تو جو لوگ بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے ان کے دل میں تمنا پیدا ہوئی کہ ہمیں بھی شہادت حاصل ہو اور ہم اپنے بھائیوں سے جا ملیں، تو اللہ تعالی نے ان کے سامنے موت کے اسباب ظاہر کر دیئے وہ کچھ دیر کیلئے پسپا ہو گئے تو اللہ تعالی نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا کہ تم تو موت کو طلب کر رہے تھے جب موت کے اسباب تمہاری آنکھوں کے سامنے آگئے تو تم پسپا (کیوں) ہو گئے۔ (خازن)

﴿وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ﴾ "اور تحقیق تم تمنا کر رہے تھے موت کی"۔

موت کی طلب کا مطلب یہ ہے کہ تم جنگ کر رہے تھے کہ ہمیں پھر جنگ کا موقع ملے، یا مراد یہ ہے کہ تم شہادت طلب کر رہے تھے، جب مراد اسباب موت لیا جائے کہ تم اسباب موت طلب کر رہے تھے تو بیان کردہ دونوں صورتوں کو یہ شامل ہے۔

﴿مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ﴾ "پہلے اس کے پالینے کے"۔

"من قبل ان تشاهدوه وتعرفوا شدته" یعنی موت کے اسباب کا مشاہدہ کرنے سے پہلے اور موت کی شدت کی پہچان سے پہلے تم موت کی تمنا کر رہے تھے۔

﴿فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ﴾ "تحقیق (اب) تم نے اسے دیکھ لیا ہے"۔

"فقد رايتموه معاينين له حين قتل دونكم من قتل من اخوانكم" تحقیق اب تم نے اس کا معاینہ کرلیا ہے

کہ تمہارے بھائی تمہارے سامنے شہید کردیئے گئے

"رایتم" اس مقام میں بمعنی "ابصرتم" کے ہے، اس کا ایک مفعول ہے، جس کا معنی ہے دیکھنا، کبھی "رأیت" یقین کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اس وقت اس کے دو مفعول ہوتے ہیں، لیکن یہاں وہ معنی مراد نہیں۔

﴿وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ﴾ "اس حال میں کہ تم اسے (اپنی آنکھوں سے) دیکھ رہے ہو"۔

یہ جملہ تاکید کیلئے ہے، جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ "رأیت" کا حقیقی معنی دیکھنا معتبر ہے، مجازی معنی نہیں لیا گیا، کیونکہ کبھی دل کی توجہ کو بھی رؤیۃ سے تعبیر کرلیا جاتا ہے۔

مختصر مطلب:

تقریبا شان نزول سے ہی پتہ چل گیا کہ صحابہ کرام شہادت کی طلب کی دعاء کررہے تھے، احد میں ان کے سامنے اسباب شہادت آگئے، لیکن وہ وقتی طور پر پسپا ہوگئے، تو رب تعالی نے فرمایا تم تو موت (شہادت) کی تمنا کر رہے تھے جب تک تمہارے سامنے اسباب موت نہیں آئے، لیکن اسباب موت تمہارے سامنے جب آئے تو تم اس کا معاینہ کررہے تھے، ضمناً اس میں توبیخ بھی پائی گئی کہ تم خود ہی پہلے شہادت طلب کررہے تھے اور جب تمہارے سامنے اسباب شہادت آگئے تو تم وقتی طور پر کچھ دیر کیلئے پسپا ہوگئے گئے، اگرچہ بعد میں تم لوٹ آئے اور کفار کو تم نے شکست بھی دے دی، لیکن تمہارا کچھ دیر کیلئے پسپا ہونا بھی تمہاری شان کے لائق نہیں تھا۔ (ماخوذ از بیضاوی وشیخ زادہ)

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ۝ (آیۃ نمبر ۱۴۴)

(1) اور محمد تو ایک رسول ہیں، ان سے پہلے اور رسول ہو چکے تو کیا اگر وہ انتقال فرمائیں یا شہید ہوں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے اور جو الٹے پاؤں پھرے گا اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا، اور عنقریب اللہ شکر والوں کو صلہ دے گا۔ (کنز الایمان)

(2) اور نہیں ہیں محمد مگر رسول، تحقیق گذر چکے ہیں اس سے پہلے رسول، تو کیا وہ انتقال فرمائیں، یا شہید کر دیئے جائیں تو تم پھر جاؤ گے الٹے پاؤں، اور جو الٹے پاؤں پھرے گا، تو ہر گز نہیں نقصان کرے گا اللہ کا کچھ (بھی) اور عنقریب جزاء دے گا اللہ شکر کرنے والوں کو۔ (نجوم الفرقان)

اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضاء خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ بہت ہی انبیاء کرام کے ادب واحترام کے عین مطابق ہے، **راقم** نے لفظی ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے، کافی حد تک کوشش کی گئی کہ کوئی لفظ بھی ایسا نہ ہو جو ادب کے خلاف ہو، واللہ اعلم بالتبیان۔

راقم کی کتاب تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان کو دیکھئے، مترجمین نے کس طرح تراجم کئے۔

﴿اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ﴾

پھر اگر وہ مر گیا یا مارا گیا۔	(محمود الحسن صاحب)
پھر کیا وہ اگر مر جائیں یا قتل کر دیئے جائیں۔	(مودودی صاحب)
سو اگر یہ وفات پا جائیں یا قتل ہو جائیں۔	(عبد الماجد دریا آبادی صاحب)
پھر کیا اگر وہ مر گیا یا مارا گیا۔	(شاہ عبد القادر صاحب)
بھلا اگر یہ مر جائیں یا مارے جائیں۔	(فتح محمد صاحب)
تو کیا اگر وہ انتقال فرمائیں یا شہید ہوں۔	(اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضاء خان بریلوی رحمہ اللہ)

نبی کریم ﷺ کے متعلق ذکر کیا جا رہا ہے، جنگ احد میں جب شیطان نے نبی کریم ﷺ کے شہید ہو جانے کی افواہ پھیلا دی، صحابہ بہت زیادہ پریشان ہو گئے، اس وقت رب تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ سے پہلے روگردانی کر جاؤ گے، اب توجہ طلب بات یہ ہے کہ کون سا معنی نبی کریم ﷺ کی شان کے لائق ہے، ادب واحترام پر دلالت کر رہا ہے، جس میں شہید ہونے اور انتقال فرمانے کا ذکر ہے یا وہ تراجم اچھے ہیں جن میں ”مر گیا یا مارا گیا“ ذکر ہے، یا ذکر ہے ”مر جائیں یا قتل ہو جائیں“ یا ذکر ہے وفات پا جائیں یا مارے جائیں، یا جس میں یہ ذکر ہے (مر جائیں یا مارے جائیں) تراجم کو دیکھنے کے بعد یقیناً یہ کہنا پڑے گا کہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ہی بہتر ہے، اہل دانش (سمجھدار لوگوں) پر یہ مخفی نہیں۔ (تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان صفحہ ۹۲)

شان نزول:

درمنثور میں کئی روایات نقل کی گئی ہیں، تقریباً مطلب سب کا ایک ہی ہے، الفاظ مختلف ہیں، تفسیر خازن سے شان نزول نقل کیا جا رہا ہے، تاکہ اختصار رہے، درمنثور کی تمام روایات کو نقل کرنے میں بہت طوالت پائی جاتی ہے۔

❁ عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ اشتد غضب الله علی من قتله نبی فی سبیل الله اشتد غضب الله علی قوم ادموا وجه نبی الله قالوا وفشا فی الناس ان محمدا ﷺ قد قتل فقال بعض المسلمین لیت لنا رسولا الی عبد الله بن أبی فیأخذ لنا امانا من ابی سفیان و جلس بعض الصحابة و القوا بایدیهم وقال الناس من المنافقین ان کان محمد قد قتل فالحقوا بدینکم الاول ،وقال انس بن النضر عم انس بن مالک یا قوم ان کان محمد قد قتل فان رب محمد لم یقتل وما تصنعون بالحیاة بعد رسول الله فقاتلوا علی ما قاتل علیه ،وموتوا علی ما مات علیه،ثم قال اللهم انی اعتذر الیک مما یقول هؤلاء یعنی المسلمین وابرأ الیک مما جاء به هؤلاء یعنی المشرکین ثم شد بسیفه فقاتل حتی قتل ثم ان رسول الله ﷺ انطلق الی الصخرة وهو یدعوالناس،فاول من عرف رسول الله ﷺ کعب بن مالک قال قد عرفت عینیه تزهران تحت المغفر فنادیت باعلی صوتی یا معشر المسلمین ابشروا هذا رسول الله ﷺ فاشار الی ان اسکت فانحازت الیه طائفة من اصحابه فلامهم النبی ﷺ علی الفرار فقالوا یا رسول الله فدیناک بآبائنا وامهاتنا اتانا الخبر بانک قد قتلت فرعبت قلوبنا فولینا مدبرین،فانزل الله عزوجل وما محمدالا رسول قد خلت من قبله الرسل "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا شدید غضب اس شخص پر ہوتا ہے جسے

اللہ کے نبی اللہ کی راہ میں قتل کر دیں، اور اس قوم پر بھی اللہ تعالی کا شدید غضب ہے جس نے اللہ کے نبی چہرے کو خون آلود کر دیا، صحابہ کرام نے بیان کیا کہ لوگوں میں یہ خبر پھیل گئی کہ حضرت محمد ﷺ شہید ہو گئے ہیں، بعض مسلمانوں نے کہا (جنہوں نے نیا نیا اسلام قبول کیا تھا) کاش کہ ہمیں کوئی قاصد ملتا جس کو ہم عبد اللہ بن ابی (یہ منافقوں کا سردار تھا) کے پاس بھیجتے، وہ ہمیں ابوسفیان سے پناہ لے کر دیتا، اور بعض صحابہ کرام (ایمان میں پختہ، مخلصین) بھی ہتھیار ڈال کر بیٹھ گئے، منافقین کہنے لگے اگر محمد (ﷺ) شہید ہو گئے تو تم اپنے پہلے دین کی طرف لوٹ آؤ (یعنی دین اسلام کو چھوڑ دو) حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ جو حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے چچا تھے، کہنے لگے اے میری قوم اگر محمد ﷺ شہید ہو گئے تو آپ کا رب تو زندہ ہے وہ تو شہید نہیں ہوا رسول اللہ ﷺ کے بعد تم زندہ رہ کر کیا کرو گے، اسی راہ پر (اللہ کی راہ میں) تم بھی جنگ کرو جس پر رسول اللہ ﷺ نے جنگ کی، اور تم بھی اسی طرح شہید ہو جاؤ جس میں آپ شہید ہوئے، پھر آپ نے اللہ تعالی کے حضور عرض کیا اے اللہ میں تیرے حضور عذر پیش کرتا ہوں (معافی طلب کرتا ہوں) اس سے جو یہ (نئے نئے اسلام قبول کرنے والے) مسلمان کہہ رہے ہیں، اور اے اللہ مشرکوں سے جو فعل سرزد ہوا (کہ نبی کریم ﷺ کو زخمی کیا) اس سے میں براءت طلب کرتا ہوں، پھر آپ نے تلوار سے کفار پر شدید حملہ کیا قتال کرتے ہوئے شہید ہو گئے، پھر بیشک رسول اللہ ﷺ ایک پتھر کی چٹان کی طرف چلے، اور لوگوں کو بلانے لگے، سب سے پہلے جس شخص نے رسول اللہ ﷺ کو پہچانا وہ کعب ابن مالک رضی اللہ عنہ تھے، وہ کہتے ہیں میں نے آپ کی نورانی آنکھوں کی چمک کو خود کے نیچے دیکھا، تو میں نے بلند آواز سے نداء دی، اے مسلمانوں کی جماعت خوش ہو جاؤ رسول اللہ ﷺ یہ ہیں، آپ نے مجھے خاموش رہنے کا حکم دیا، لیکن صحابہ کرام کا ایک گروہ آپ کے پاس پہنچ گیا، نبی کریم ﷺ نے ان کو ملامت کی کہ تم لوگ کیونکہ پسپا ہو گئے تھے؟ انہوں نے عرض کیا ہمارے ماں باپ آپ پر قربان ہوں ہم نے جب یہ خبر سنی کہ آپ شہید ہو گئے تو ہمارے دلوں پر رعب طاری ہو گیا، تو ہم پسپا ہو گئے، اس وقت یہ آیۃ کریمہ ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلِ﴾ نازل ہوئی۔ (منقول از خازن)

نبی کریم ﷺ کی شہادت کی خبر شیطان نے اڑائی:

❁ رمی عبد الله بن قمیئة الحارثی رسول الله ﷺ بحجر فکسر رباعیته و شج وجهه واقبل یرید قتله فذب عنه مصعب بن عمیر وهو صاحب الرایة یوم بدر ویوم احد حتی قتله ابن قمیئة فظن انه قتل رسول الله ﷺ فقال قد قتلت محمدا وصرخ صارخ الا ان محمدا قد قتل و کان الصارخ الشیطان ففشافی الناس خبر قتله" (رواه مجاهد و ضحاک)

مجاہد اور ضحاک سے مروی ہے کہ عبداللہ بن قمیئہ حارثی نے رسول اللہ ﷺ کو پتھر مارا آپ کا رباعیہ دانت مبارک کا کچھ حصہ ٹوٹ گیا، اور آپ کا چہرا مبارک زخمی ہو گیا، وہ آپ کو شہید کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، لیکن نبی کریم ﷺ کے لشکر کے علمبردار حضرت مصعب بن عمیر ﷺ نے آپ کی طرف سے دفاع کیا، یہ بدر میں بھی علمبردار تھے اور احد میں بھی، یہ دفاع کرتے ہوئے شہید ہو گئے، ابن قمیئہ کافر نے سمجھا کہ اس نے نبی کریم ﷺ کو شہید کر دیا، اس نے کہا میں نے محمد (ﷺ) کو شہید کر دیا، ادھر کوئی چلا چلا کر کہہ رہا ہے خبردار بیشک محمد کو شہید کر دیا گیا، وہ چلا چلا کر اعلان کرنے والا شیطان تھا، اس طرح نبی کریم ﷺ کی شہادت کی خبر پھیل گئی۔ (منقول از کبیر)

❁ حدثنا اسحاق بن نصر حدثنا عبدالرزاق عن معمر بن همام سمع ابا هريرة ﷺ قال قال رسول الله ﷺ اشتد غضب الله على قوم فعلوا بنبيه يشير الى رباعيته اشتد غضب الله على رجل يقتله رسول الله ﷺ في سبيل الله.

(بخاری کتاب المغازی باب ما اصاب النبی ﷺ یوم احد)

معمر بن ہمام فرماتے ہیں میں نے ابوھریرہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کا غضب شدید ہے اس قوم پر جنہوں نے اپنے نبی سے یہ کام کیا، آپ اپنے رباعیہ دانت مبارک کی طرف اشارہ فرما رہے تھے، اور شدید اللہ کا غضب اس شخص پر ہوگا جسے اللہ کے نبی نے اللہ کی راہ میں قتل کر دیا گیا۔

وضاحت حدیث:

"ان النبی ﷺ لما جرح یوم احد وشج وجهه وكلمت شفته وكسرت رباعيته"
احد کے دن نبی کریم ﷺ کو جب زخمی کیا گیا تو آپ کا چہرا زخمی کر دیا گیا، اور آپ کے ہونٹ زخمی کر دیئے گئے، اور آپ کا رباعیہ دانت مبارک ٹوٹ گیا۔

"رباعيته" بفتح الراء وبتخفيف الباء الموحدة وتخفيف الباء آخر الحروف وهي السن التي تلي الثنية من كل جانب وللانسان اربع رباعيات"
انسان کے سامنے والے دو دانت نیچے ثنایا سفلی اور سامنے والے اوپر کے دو دانت ثنایا علیا کہلاتے ہیں، نیچے یا اوپر ثنایا کے ساتھ دائیں طرف اور بائیں طرف ایک ایک دانت رباعیہ کہلاتے ہے، اس طرح ہر انسان کے چار چار دانت رباعیہ ہیں۔ (ماخوذ از عمدۃ القاری للعینی ج ۷ اصفحہ نمبر ۱۶۰)

ابن ہشام نے حضرت ابو سعید خدری ﷺ کی حدیث نقل فرمائی کہ بیشک عتبہ بن ابی وقاص فرماتے ہیں "وهو الذی كسر رباعيته النبی ﷺ السفلى وجرح شفته السفلى" نبی کریم ﷺ کا نیچے والا رباعیہ دانت مبارک ٹوٹ گیا تھا، اور آپ کا نیچے والا ہونٹ زخمی ہو گیا تھا۔ (عمدۃ القاری للعینی شرح بخاری ۷ اصفحہ نمبر ۱۵۵)

نبی کریم ﷺ کے ہاتھوں قتل ہونے والا بد بخت:

اقبل ابی ابن خلف الجمحی وقد حلف لیقتلن محمدا فقال بل انااقتله یاکذاب این تفر فحمل علیه فطعنه فی جیب الدرع یخور خوار الثور فاحتملوه فلم یلبث الابعض یوم حتی راحت روحه الی الهاویة"

ابی بن خلف جمحی نے قسم اٹھائی کہ وہ ضرور بر ضرور محمد کو قتل کر دے گا، تو آپ نے فرمایا بلکہ میں ہی اسے قتل کروں گا، پھر آپ نے فرمایا اے کذاب (بڑے جھوٹے) کہاں بھاگ رہا ہے یہی کہتے ہوئے آپ نے اس پر حملہ کر دیا تو اس کی زرہ کے گریبان میں نیزہ مار دیا، وہ بیل کی طرح ڈکارنے لگ گیا، دوسرے کفار اسے اٹھا کر لے گئے کچھ دیر کے بعد ہی وہ مر گیا، اور اس کی روح جہنم کے مقام ہاویہ میں پہنچ گئی۔

اللہ کے شدید غضب کی وجہ:

"اشتد غضب الله" معناه ان ذلک من اعظم السیآت عنده ویجازی علیه"

اللہ تعالیٰ کا اس قوم پر شدید غضب ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اللہ کا نبی قتل کر دے اور اس قوم پر بھی اللہ تعالیٰ کا سخت غضب ہوتا ہے جو اللہ کے نبی کو زخمی کر دے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان بد بختوں کا گناہ بہت بڑا ہوتا ہے اس لئے اس کی سزا بھی بہت بڑی ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کے شدید غضب سے بڑھ کر اور کیا سزا ہوگی؟

❁ حدثنا قتیبة بن سعید حدثنا یعقوب عن ابی حازم انه سمع سهل بن سعد وهو یسأل عن جرح رسول الله ﷺ فقال اما والله انی لا عرف من کان یغسل جرح رسول الله ﷺ ومن کان یسکب الماء وبما دووی قال کانت فاطمة علیها السلام بنت رسول الله ﷺ تغسله وعلی رضی الله عنه یسکب الماء بالمجن فلما رأت فاطمة ان الماء لا یزید الدم الا کثرة اخذت قطعة من حصیر فاحرقتها والصقتها فاستمسک الدم وکسرت رباعیته یومئذ وجرح وجهه وکسرت البیضة علی رأسه"

(بخاری کتاب المغازی باب ما اصاب النبی من الروح یوم احد)

ابوحازم کہتے ہیں میں نے سہل بن سعدؓ سے سنا جب ان سے رسول اللہ ﷺ کے زخموں کے متعلق پوچھا جا رہا تھا، تو وہ فرما رہے تھے، خبردار قسم ہے اللہ تعالیٰ کی بیشک میں جانتا ہوں کون نبی کریم ﷺ کے زخم کو دھو رہا تھا اور کون پانی بہا رہا تھا اس پر کیا دوا لگائی گئی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ زخموں کو دھو رہی تھیں اور حضرت علی اس پر ڈھال سے پانی بہا رہے تھے جب حضرت فاطمہ نے دیکھا کہ دھونے سے

خون زیادہ ہی بہہ رہا ہے (بند نہیں ہو رہا) تو آپ نے چٹائی کا ایک ٹکڑا جلا کر کر اس کی راکھ زخم پر اسے چپکا دیا تو خون رک گیا اور اس دن آپ کا ایک رباعیہ دانت ٹوٹ گیا تھا دانت ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ آپ کا سر بھی زخمی ہو گیا تھا۔

❁ عن معمر عن الزهری قال ضرب وجه النبی ﷺ یومئذ بالسیف سبعین ضربة وقاه الله شرها کلها" (رواه عبدالرزاق)

زهری رحمہ اللہ فرماتے ہیں احد کے دن نبی کریم ﷺ کے چہرے پر تلوار کی ستر ضربیں لگائی گئیں، لیکن اللہ تعالی نے آپ کو تمام کی شر سے محفوظ رکھا "قیل یحتمل ارادة حقیقة السبعین و المبالغة فی الکثرة " حدیث شریف میں جو ستر ضربوں کا ذکر ہے، اس میں دو احتمال ہیں، ایک تو یہ کہ ستر کی تعداد ہی معتبر ہو، اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ کثرت معتبر ہو، کیونکہ اہل عرب ستر کو کثرت کے معنی میں بھی عام طور پر استعمال کرتے ہیں، اس صورت میں معنی ہوگا آپ کو کثیر ضربیں، تلوار کی لگائی گئیں، لیکن اللہ تعالی نے آپ کو تمام کی شر سے محفوظ رکھا۔ (عمدة القاری شرح بخاری ج ۱۷ صفحہ نمبر ۱۶۱)

روی عبد الرزاق مرسلا عن الزهری قال ضرب وجه رسول الله ﷺ سبعون ضربة بالسیف وقاه الله شرها کلها ورمی عتبة بن وقاص لعنه الله رسول الله ﷺ باربعة احجار فکسر منها رباعیته الیمنی السفلی وجرح شفته السفلی"

نبی کریم ﷺ کو عتبہ بن وقاص لعنہ اللہ نے چار پتھر مارے جس سے آپ کا نیچے والا دایاں ایک رباعیہ دانت مبارک ٹوٹ گیا، اور آپ کا نیچے والا ہونٹ مبارک زخمی ہو گیا۔ (منقول از مظہری)

خیال رہے کہ روایات میں کوئی تعارض نہیں، کیونکہ آپ پر پتھراؤ کرنے والا عبداللہ بن قمیئہ بھی تھا اور عتبہ بن وقاص بھی تھا۔

نبی کریم ﷺ اور پندرہ صحابہ کرام کی ثابت قدمی:

روی البیهقی عن المقداد والذی بعثه بالحق ما زال رسول الله ﷺ من مکانه شبرا واحدا وانه لقی وجه العدو وتفئی الیه طائفة من اصحابه وتفترق مرة فربما رأیته قائما یرمی عن قوسه ویرمی بالحجر وثبت مع رسول الله ﷺ خمسه عشر رجلا ثمانیة من المهاجرین ابو بکر وعمر وعلی وطلحة وزبیر وعبدالرحمن بن عوف وسعد بن ابی وقاص وابوعبیدة بن الجراح وسبعة من الانصار الحباب بن المنذر وابودجانة وعاصم بن ثابت والحارث بن صمة وسهل بن حنیف وسعد بن معاذ و قیل سعد بن عبادة ومحمد بن مسلمة ﷺ اجمعین"

بیہقی نے حضرت مقداد ﷺ سے روایت نقل کی وہ فرماتے ہیں قسم اس ذات کی جس نے نبی کریم ﷺ کو حق سے مبعوث فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ اپنی جگہ سے ایک بالشت بھی نہیں ہٹے، بیشک آپ دشمن کے سامنے جم کر کھڑے رہے، صحابہ کرام کا ایک گروہ لوٹ کر آتا، پھر وہاں سے ہٹ جاتا، (یعنی عجیب حیرانگی چھائی ہوئی تھی، صحابہ کرام کو معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ کیا کیا جائے) میں نے کئی مرتبہ رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ کھڑے ہیں اپنی قوس سے تیر چلا رہے ہیں، میں نے کئی مرتبہ آپ کو پتھر پھینکتے ہوئے دیکھا، آپ کے ساتھ پندرہ صحابہ کرام جم کر کھڑے رہے، آٹھ مہاجرین میں سے تھے، حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص اور ابوعبیدہ بن جراح، اور سات انصار سے تھے حضرت حباب بن منذر، حضرت ابودجانہ، حضرت عاصم بن ثابت، حضرت حارث بن صمہ، حضرت سہل بن بن حنیف، حضرت سعد بن معاذ، حضرت سعد بن عبادہ اور حضرت محمد بن مسلمہ ﷺ اجمعین۔ (منقول از مظہری)

تنبیہ: یہ پندرہ صحابہ کرام جم کر کھڑے ہونے والے وہ ہیں جو ظاہری حیات میں قائم رہے، ورنہ شہید ہونے والوں کی اکثریت جم کر کھڑے ہونے والوں کو ہی تھی، حضرت مصعب بن عمیر ﷺ کا پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ آپ نبی کریم ﷺ کا دفاع کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ﴾ (سورہ الاحزاب آیۃ نمبر ۲۳)

''مسلمانوں میں کچھ وہ مرد ہیں جنہوں نے سچا کر دیا جو عہد اللہ سے کیا تھا تو ان میں اپنی منت پوری کر چکا'' اس آیہ کریمہ میں ان صحابہ کرام کا ذکر ہے جو جم کر کھڑے رہے اور شہید ہو گئے، اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے چچا انس بن نضر جن کا ذکر پہلے شان نزول میں ہو چکا ہے، انہوں نے رب تعالیٰ سے کیا ہوا عہد اور مانی ہوئی منت کو کیسے پورا کیا، آیئے ذرا اس کی ایک جھلک دیکھئے۔

❁ اخبرنا حسان بن حسان حد ثنا محمد بن طلحة حد ثنا حميد عن انس رضى الله عنه ان عمه غاب عن بدر فقال غبت عن اول قتال النبى ﷺ لئن اشهدنى الله مع النبى ﷺ ليرين الله مااجد فلقى يوم احد فهزم الناس فقال اللهم انى اعتذر اليک مما صنع هؤلاء يعنى المسلمين و ابرأ اليک مما جاء به المشر كون فتقدم بسيفه فلقى سعد بن معاذ فقال اين يا سعد انى اجد ريح الجنة دون احد فمضى فقتل فما عرف

حتی عرفته اخته بشامة اوببنانه وبه بضع وثمانون من طعنة وضربة ورمية بسهم"
(بخاری ج ۲ کتاب المغازی باب غزوة احد)

حضرت انس بن مالک ﷜ فرماتے ہیں میرے چچا (انس بن نضر) بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے، آپ کہتے ہیں میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ آپ کے پہلے غزوہ میں شریک نہیں ہو سکا، اگر اللہ تعالی نے مجھے نبی کریم ﷺ کے ساتھ کسی غزوہ میں حاضر ہونے کی توفیق عطاء فرمادی تو ضرور بر ضرور اللہ تعالی دیکھے گا کہ میں کیا کوشش کرتا ہوں، غزوہ احد میں یہ شریک ہوئے لیکن لوگوں (مسلمانوں) کو وقتی طور پر کچھ پسپائی حاصل ہوگئی، انہوں نے عرض کیا اے اللہ بیشک میں تیرے حضور عذر پیش کرتا ہوں جو کام مسلمانوں سے سرزد ہوا، اور میں اس سے بری ہوں جو مشرکوں نے کیا، پھر آپ تلوار لے کر آگے بڑھے، حضرت سعد بن معاذ ﷜ سے ملاقات ہوگئی، اے سعد تم کہاں جا رہے ہو؟ میں تو احد کے قریب جنت کی بو پا رہا ہوں، پھر آپ نے دشمن سے مقابلہ کیا یہاں تک کہ شہید ہو گئے، آپ کو کوئی پہچان نہیں رہا تھا کہ یہ شہید ہونے والا کون ہے، یہاں تک کہ آپ کی بہن نے آپ کو نقوش اور انگلیوں کے پوروں سے پہچانا، اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کو اسی سے زائد زخم تلوار اور نیزے اور پتھروں کے آئے تھے۔

❁ رمی سعد بن وقاص حتی اندقت ستة قوسه ونثر رسول الله ﷺ كنانته فقال له ارم فداک ابی وامی" (رواه البخاری)

حضرت سعد بن ابی وقاص ﷜ نے احد کے دن اس ثابت قدمی سے تیراندازی کی کہ آپ کی چھ کمانیں ٹوٹ گئیں تھیں، نبی کریم ﷺ نے اپنی ترکش کے تمام تیر ان کے سامنے پھیلا دیئے، آپ نے فرمایا میرے ماں باپ تم پر قربان تیر مارو (یعنی اسی طرح بہادری سے دشمن کو تاک تاک کر تیر مارو)

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ﴾ "اور نہیں محمد ہیں مگر رسول۔"

"یعنی لیس هو ربا یستحیل علیه الفنا والموت وماهو یدعوا الناس الی عبادته"

یعنی وہ رب نہیں کہ ان کا انتقال نہ ہو سکے، وہ تو صرف رب تعالی کی ذات ہے جو "حی قیوم" ہمیشہ کیلئے زندہ اور قائم دائم ہے وہ "حی لا یموت" وہ ہمیشہ کیلئے زندہ ہے اس پر موت نہیں آتی، نبی کریم ﷺ تو اللہ تعالی کے بندہ ہیں، اللہ تعالی کی عبادت کی طرف لوگوں کو دعوت دینے والے ہیں، اسی لئے آپ کا انتقال ہو سکتا ہے۔

قد خلت مضت ومالت من قبله الرسل فیسموت هو ایضا"

آپ سے پہلے رسول گذر چکے ہیں، یعنی ان کا وصال ہو گیا تو آپ کا وصال بھی ہو سکتا ہے۔

﴿اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ﴾

"کیا اگر آپ انتقال فرمائیں یا شہید کر دیے جائیں تو تم پھر جاؤ گے الٹے پاؤں"

یہ سوال "استفہام انکاری" قانون کے مطابق ہے، یعنی اگر آپ انتقال فرما جائیں یا شہید ہو جائیں تو کیا تم پہلے کفریہ دین کی طرف پھر جاؤ گے، جبکہ تمہیں معلوم ہے کہ آپ سے پہلے انبیاء کرام دنیا سے تشریف لے گئے، تو تمہیں ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیے بلکہ دین اسلام پر تمہیں قائم رہنا ضروری ہے۔

﴿وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا﴾

"اور جو شخص الٹے پاؤں پھرے وہ ہرگز نہیں نقصان پہنچا سکے گا اللہ کو کچھ بھی"

یعنی کسی کے دین سے پھر جانے، العیاذ باللہ مرتد ہونے سے اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں، بلکہ اس شخص کا اپنا ہی نقصان ہے۔

﴿وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ﴾ "اور عنقریب جزاء دے گا اللہ شکر کرنے والوں کو۔"

جو اللہ تعالیٰ کی نعمت یعنی اسلام پر ثابت قدم رہ کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو اجر و ثواب عطاء فرمائے گا۔
(تفسیر ماخوذ از مظہری)

اسم گرامی سے متعلق بحث:

الحمد الشکر و الرضاء و الجزاء وقضاء الحق و التحمید حمدالله مرة بعد مرة ومنه محمد کانه حمد مرة بعد مرة" (القاموس)

شکر اور رضاء اور جزاء اور قضاء حق (حق کی ادائیگی) پر لفظ "الحمد" بولا جاتا ہے اور تحمید کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بار بار تعریف کی جائے، اسی سے لفظ محمد لیا ہوا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی بار بار تعریف کیے جانے کی کوئی انتہا نہیں۔ (مظہری)

محمد هو المستغرق لجميع المحامد لان الحمد لا يستوجبه الا الكامل، والتحميد فوق الحمد، فلا يستحقه الا المستولى على الا مرفى الكمال واكرم الله نبيه وصفيه باسمين مشتقين من اسمه جل جلاله "محمد واحمد"

حضرت محمد ﷺ تمام محامد (تعریفوں) کے جامع ہیں، کیونکہ حمد وہی معتبر ہے جو کامل ہو، اور تحمید حمد سے بھی اوپر درجہ رکھتی ہے، لفظ محمد تحمید سے لیا ہوا ہے، جب تحمید کیلئے ضروری ہے کہ وہ کامل امور پر مشتمل ہو تو لفظ محمد جو آپ کا

اسم گرامی ہے وہی آپ کے کمالات کو واضح کر رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو دو نام وہ عطاء فرمائے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے اسم گرامی محمود سے مشتق فرمائے ہیں، آپ کے وہ دو اسم گرامی محمد اور احمد (ﷺ) ہیں۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے کیا خوب فرمایا:

الم تر ان اللہ ارسل عبدہ ببرھانہ واللہ اعلیٰ وامجد

وشق لہ من اسمہ لیجلہ فذوالعرش محمود وھذا محمد"

کیا تم نے دیکھا نہیں بیشک اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ کو بھیجا۔ برہان (دلائل ومعجزات) عطاء کر کے اللہ بلند اور بزرگ ہے اور اس نے اپنے نام سے آپ کا نام مشتق کیا ہے تاکہ آپ کو بزرگی عطاء کرے، صاحب عرش محمود ہے اور یہ محمد ہیں۔
(ماخوذ از معالم التنزیل للبغوی)

نبی کریم ﷺ کے باپ تو آپ کی ولادت سے پہلے ہی انتقال فرما گئے تھے، آپ کی ولادت کے ساتویں روز آپ کے دادا عبدالمطلب نے آپ کا نام محمد رکھا "ولما سئل عن ذلک قال لرؤیۃ رآھا رجوت ان یحمد فی السماء والارض" جب آپ سے سوال کیا گیا کہ آپ نے اپنے پوتے کا یہ نام کیوں رکھا تو آپ نے فرمایا کہ میں نے خواب میں یہی دیکھا کہ میں اپنے پوتے کا یہ نام رکھوں، مجھے امید ہے کہ اس کی تعریف زمین و آسماں میں زیادہ سے زیادہ ہوتی رہے گی "محمد" کا معنی جب یہ ہے کہ جس کی بار بار تعریف کی جائے، زیادہ سے زیادہ تعریف کی جائے اور وہ تعریف کبھی ختم نہ ہو، لفظ محمد کی ضد لفظ مذمم ہے، قریش کے کافر لوگ نبی کریم ﷺ کو "معاذ اللہ گالیاں دیتے تھے لیکن مذمم کہہ کر گالیاں دیتے تھے، وہ اپنی زبان کو تو سمجھتے تھے، انہیں یہ معلوم تھا کہ محمد کہہ کر گالیاں نہیں دی جاسکتیں، میرے پیارے مصطفیٰ ﷺ نے رب تعالیٰ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کیا خوب فرمایا "الم تروا کیف صرف اللہ تعالیٰ عنی لعن قریش وشتمھم یشتمون مذمما وانا محمد" کیا تم دیکھتے نہیں ہو اللہ تعالیٰ نے مجھ سے قریش کی گالیوں کو کس طرح پھیرا ہوا ہے، وہ گالیاں دیتے ہیں مذمم کو میں تو محمد ہوں (یعنی میں مذمم نہیں کہ ان گالیوں کی زد میں آؤں) (روح المعانی)

❁ وعن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ الا تعجبون کیف یصرف اللہ عنی شتم قریش ولعنھم یشتمون مذمما ویلعنون مذمما وانا محمد" (رواہ البخاری، مشکوۃ باب اسماء النبی ﷺ)

"وقد جمع ھذا الاسم الکریم من الا سرار مالا یحصی" یہ اسم گرامی اتنے راز اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے جو شمار میں نہیں آسکتے، یہ اسم گرامی نبی کریم ﷺ کے سید الانبیاء ہونے پر بھی دلالت کر رہا ہے، آپ کے متعلق یہ بھی کلام قدیم یعنی قرآن پاک میں بیان کیا گیا ﴿اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ﴾ بیشک آپ مرسلین سے ہیں، پھر آپ کا نام بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی آپ کے دادا کو القاء کیا گیا یعنی آپ کے دل میں ڈالا گیا

کہ آپ کا نام محمد رکھا جائے تو اسی سے واضح کر دیا کہ جس کا نام ہی محمد (ﷺ) ہے وہ سب انبیاء کرام سے افضل ہے اور سب کا سردار ہے کیونکہ زمین و آسمان میں اس کی سب سے زیادہ تعریف ہو رہی ہے، اس کی تعریف خود انبیاء کرام بھی کر رہے ہیں، پھر آپ کا افضل الانبیاء ہونا اور سید الانبیاء ہونا واضح ہو گیا۔

"وعبر عنه ﷺ بهذا الاسم هنا لانه اول اسمائه واشهر وبه صرخ الصارخ"

یہاں زیر بحث آیہ کریمہ میں بھی تمام رسولوں کا ذکر فرمایا ﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ اور آپ کا اسم گرامی بھی ذکر فرمایا ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ﴾ میں یہ نام آپ کا سب سے پہلے رکھا گیا، آپ کے اسماء میں سے بھی پہلا ہے اور تمام ناموں میں سے بھی آپ کا نام پہلا ہے کیونکہ اس سے پہلے کسی شخص کا نام محمد نہیں تھا، آپ کا نام تو غیبی آواز دینے والے نے آپ کے دادا کو آواز دے کر بلکہ چلا چلا کر کہا کہ اس بچے کا نام محمد (ﷺ) رکھا جائے، اس سے واضح ہو رہا ہے کہ آپ افضل الانبیاء ہیں۔ (ماخوذ از روح المعانی)

تنبیہ: روح المعانی نے ایک جگہ ذکر فرمایا "**ولما سئل عن ذلک قال لرؤية رآها**" آپ کے دادا سے پوچھا گیا کہ آپ نے یہ نام اپنے پوتے کا کیوں رکھا؟ تو آپ نے فرمایا کہ مجھے خواب میں یہی حکم دیا گیا کہ میں یہی نام رکھوں، اور دوسری جگہ یہ فرمایا "**وبه صرخ الصارخ**" یہی نام غیبی طور آواز سے رکھنے کا حکم دیا گیا، ان دونوں میں تطبیق بظاہر نظر نہیں آتی، تو اس کا ایک جواب یہ ہے کہ حقیقت میں خواب میں ہی آپ کو یہ نام رکھنے حکم دیا گیا تھا "**وبه صرخ الصارخ**" کا مطلب یہ ہے کہ غزوہ احد میں آواز دینے والا، چلانے والا چلا کر یہ کہہ رہا تھا "**قد قتل محمد**" محمد شہید کر دیئے گئے، اب دونوں جملوں کا علیحدہ علیحدہ مطلب بیان کر دیا گیا، لیکن **راقم** کا موقف "شروح احادیث میں مختلف الفاظ کو دیکھ کر" یہ ہے کہ آپ کے دادا کو خواب میں بھی یہ نام رکھنے کا حکم دیا گیا، اور آپ کے دل میں القاء بھی کیا گیا، اور غیبی آواز دینے والے نے بھی یہ کہا کہ یہ نام رکھا جائے، اسی وجہ سے "**وبه صرخ الصارخ**" کا **راقم** نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔

قال عباس بن مرداس:

اخاتم الانبياء انک مرسل بالخير كل هدى السبيل هدا كا
ان الاله نبی علیک محبة فی خلقه ومحمدا اسما کا

عباس بن مرداس نے کہا، اے خاتم الانبیاء بیشک آپ کو بھیجا گیا، خیر عطاء کر کے اور آپ کو تمام سیدھے راستوں کا ہادی بنایا گیا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے آپ کی محبت ڈال دی تمام مخلوق میں اور آپ کا نام محمد رکھا۔ (ماخوذ از قرطبی)

عن جبیر بن مطعم قال سمعت النبیﷺان لی اسماء انا محمدوانا احمد وانا الماحی الذی یمحو الله بی الکفر وانا الحاشر الذی یحشر الناس علی قدمی وانا العاقب والعاقب الذی لیس بعده نبی" (بخاری ومسلم ؛مشکوۃ باب اسماء النبیﷺ)

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا بیشک میرے کئی نام ہیں، میں محمد ہوں اور میں احمد ہوں، اور ماحی ہوں کہ میرے ذریعے اللہ تعالی کفر کو مٹاتا ہے، اور میں حاشر ہوں کہ لوگ میرے قدموں پر (میرے پیچھے تابع ہو کر) جمع کئے جائیں گے، اور میں عاقب (آخری نبی) ہوں کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔

"وسیحمده الاولون والآخرون فی المقام المحمود تحت اللواء الممدود"

نبی کریم ﷺ کی تعریف سب اولین وآخرین مقام محمود میں لواء الحمد کے نیچے کریں گے۔ (مرقاۃ ج ا صفحہ نمبر ا ے)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

﴿وَمَامُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ﴾ میں قصر قلب پایا گیا ہے، اس میں منافقین کا رد پایا گیا ہے، کیونکہ انہوں نے ضعیف الاعتقاد نئے اسلام قبول کرنے والوں کو کہا "ان کان محمد قتل فارجعوا الی دینکم ودین آباء کم" اگر محمد شہید ہو گئے ہیں تو اپنے پہلے دین کی طرف لوٹ جاؤ جو تمہارے آباء اجداد کا دین ہے، تو رب تعالی نے ان کا اس آیۃ کریمہ کے ذریعے رد فرمایا کہ تم محمد ﷺ کو معبود سمجھ رہے ہو کہ ان کا وصال نہیں ہونا یہ غلط ہے بلکہ وہ تو اللہ تعالی کے عبد (بندہ ہیں) ان پر وفات آسکتی ہے، (اسی کو قصر قلب کہا جاتا ہے) (صاوی)

فافادان محمدا عبد مرسل یجوز علیه الموت لا رب معبود حتی تترک عبادة الله عنه اجل موته لان المقصود من وجوده تبلیغ رسالة ربه ولذلک نزل قرب وفاته الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا ولکن یجب علینا تعظیمه واحترامه حیا ومیتا واعتقاد ان معجزاته باقیة واتباعه وطاعته قال تعالی من یطع الرسول فقد اطاع الله ولم یقل وهو حی وقال تعالی(وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ) ولم یقل لاصحابک وقال علیه الصلوة والسلام حیاتی خیر لکم ومماتی خیرلکم ممن اعتقد ان النبیﷺ لا نفع به بعد الموت بل هو کاحادالناس فهوالضال المضل" (صاوی)

اسی سے یہ فائدہ بھی حاصل ہوگیا کہ بیشک حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ کے بندہ اور رسول ہیں، آپ رب اور

معبود نہیں کہ آپ کے وصال کی وجہ سے اللہ تعالی کی عبادت کو ہی چھوڑ دیا جائے، آپ کو موجود کرنے یعنی آپ کو دنیا میں مبعوث کرنے (رسول بنا کر بھیجنے) میں مقصود یہ تھا کہ آپ اپنے رب تعالی کے پیغامات بندوں تک پہنچائیں، اسی وجہ سے آپ کے وصال کے قریب رب تعالی نے ارشاد فرمایا''آج میں نے مکمل کر دیا تمہارے لئے تمہارا دین، اور میں نے پسند کرلیا ہے تمہارے لئے اسلام کو دین، لیکن ہم پر لازم ہے کہ آپ کی ہم تعظیم کریں، آپ کی ظاہری حیات میں جن خوش بخت مسلمانوں نے آپ کو پایا ان پر اپنی تمام زندگی میں لازم تھا آپ کی تعظیم واحترام کرنا، آپ کے وصال کے بعد بھی مؤمنین پر لازم ہے کہ وہ زندگی بھر آپ کی تعظیم واحترام کریں، اور کہ عقیدہ رکھیں کہ آپ کے معجزات باقی ہیں اور آپ کی اتباع اور اطاعت کرنا ہمیشہ کیلئے باقی ہے، اس لئے کہ اللہ تعالی نے فرمایا ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ جس شخص نے (اللہ کے) رسول کی اطاعت کی تحقیق وہ اللہ کا مطیع (فرمانبردار) ہوا''

اس ارشاد گرامی کو زندگی کی حالت سے مقید نہیں کیا کہ جس نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ان کی ظاہری حیات میں کی وہ اللہ کا مطیع ہوا، بلکہ اللہ تعالی نے یہ ارشاد مطلق فرمایا کہ جس نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی وہ اللہ کا مطیع ہوا، یعنی خواہ آپ کی ظاہری حیات میں آپ کی اطاعت کی یا وصال کے بعد آپ کی طاعت کی اور رب تعالی نے فرمایا ﴿وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ اور ہم نے تمہیں نہ بھیجا مگر رحمت سارے جہان کیلئے'' اس آیۃ کریمہ میں بھی یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے تمہیں نہیں بھیجا مگر تم اپنے اصحاب کیلئے رحمت ہو، جب یہ نہیں کہا، بلکہ یہ فرمایا کہ آپ تمام جہانوں کیلئے رحمت ہیں، جب آپ تمام جہانوں کیلئے رحمت ہیں تو تمام جہانوں پر لازم ہے کہ وہ آپ کی فرمانبرداری کریں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا''حیاتی خیر لکم و مماتی خیر لکم'' میری حیات تمہارے لئے بہتر ہے اور میری وفات تمہارے لئے بہتر ہے، اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ نبی کریم ﷺ اپنے وصال کے بعد نفع نہیں پہنچا سکتے، بلکہ آپ عام لوگوں کی طرح ہی ایک فرد ہیں تو وہ شخص خود بھی گمراہ ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے والا ہے۔

(صاوی)

قصر افراد کا قول صاحب مفتاح نے کیا ہے کہ یہ خلاف مقتضی ظاہر ہے کہ جب انہوں نے آپ کی عدم بقاء کو بعید سمجھا تو گویا کہ انہوں نے آپ کے وصال کو بعید سمجھتے ہوئے انکار کا درجہ حاصل کیا، جیسے کوئی انکار کردے کہ یہ نہیں ہو سکتا''کانهم اعتقدوا فيه وصفين الرسالة والبعد عن الهلاک فقصر على الرسالة نفيا للبعد عن الهلاک'' گویا کہ انہوں نے یہ اعتقاد رکھا تھا کہ آپ کو دو وصف حاصل ہیں، ایک رسالت اور دوسرا وصال کا نہ ہونا، تو ایک وصف پر اسے بند کردیا کہ آپ تو صرف رسول ہیں، آپ کے وصال نہ ہونیکی بات درست نہیں، یہ قصر افراد ہے۔

(روح المعانی)

طلباء کرام خلاصہ کلام یوں یاد کریں:

جب یہ عقیدہ رکھا جائے کہ آپ کا وصال نہیں ہوسکتا تو اس کے جواب میں یہ کہا جائے ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ﴾ یعنی جب آپ رب نہیں بلکہ آپ رسول ہیں آپ پر وفات آسکتی ہے تو یہ قصر قلب ہے، خیال رہے کہ اس قول میں نفی رسالت نہیں، بلکہ عقیدہ آپ کے وصال کے نہ ہونے کا تھا، جب آپ کے وصال کو ثابت کیا گیا تو قصر قلب ہوا، اس میں یہ اعتراض لغو ہوگا کہ قصر قلب میں تو نفی رسالت کا عقیدہ لازم آئے گا۔

اور اگر عقیدہ یہ ہو کہ آپ رسول بھی ہیں لیکن پھر بھی آپ کے وصال کے نہ ہونے کا اعتقاد باطل ہے اس مشکل مسئلہ کو طلباء آسان لفظوں میں یوں سمجھیں کہ جب کوئی کہے کہ میرا یہ کام حامد نے کیا ہے تو زاہد یہ کہے کہ یہ کام تو میں نے ہی کیا ہے (حامد نے نہیں کیا) یہ قصر قلب ہے، اور اگر کوئی یہ کہے کہ میرا یہ کام حامد اور زاہد نے مل کر کیا ہے تو اس کے جواب میں جب حامد یہ کہے کہ یہ کام تو صرف میں نے کیا ہے میرے ساتھ زائد شریک نہیں تھا تو یہ قصر افراد ہے۔

نبی کریم ﷺ کے وصال کے وقت اسی آیہ کریمہ سے حضرت ابو بکر ؓ کا استدلال:

نبی کریم ﷺ کا جب وصال ہوا تو کچھ لوگ کہنے لگے آپ پر وفات طاری نہیں ہوئی، حضرت عمر ؓ بھی یہی کہہ رہے تھے اور حضرت عثمان ؓ گم سم ہو گئے، کچھ کہہ نہیں رہے تھے، اور حضرت علی ؓ لوگوں سے مخفی ہو گئے، جب صحابہ کرام کی پریشانی کا یہ عالم تھا تو حضرت ابو بکر ؓ مقام سُنخ سے یعنی مدینہ طیبہ کے باہر مقام میں تھے وہاں سے آئے تو آپ نے اسی آیہ کریمہ سے دلیل پیش کی کہ آپ کا وصال ہو گیا، بخاری میں یہ حدیث اختصار سے پیش کی گئی، ابن ماجہ میں تفصیلاً ذکر ہے، دیکھئے۔

❁ عن عائشہ رضی اللہ عنہما قالت لما قبض رسول اللہ ﷺ وابوبکر عندامرأته ابنة خارجة بالعوالی فجعلوا یقولون لم یمت النبی ﷺ انما هو ببعض ما کان یاخذ عندالوحی ،فجاء ابو بکر فکشف عن وجهه وقبل بین عینیه وقال انت اکرم علی الله من ان یمیتک مرتین،قد والله مات رسول الله ﷺ وعمر فی ناحیة المسجد یقول والله مامات رسول الله ﷺ ولا یموت حتی یقطع ایدی اناس من المنافقین کثیر وارجلهم،فقام ابوبکر فصعد المنبر فقال:من کان یعبدالله فان الله حی لم یمت ومن کان یعبد محمدافان محمدا(وَمَامُحَمَّدٌ اِلَّارَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ

شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ) قال عمر فلکانی لم اقرأها الا یومئذ" (رواه ابن ماجة)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں جب نبی کریم ﷺ کی روح قبض ہوگئی، تو اس وقت حضرت ابوبکر صدیق ﷺ مدینہ طیبہ کے باہر اطراف میں اپنی زوجہ بنت خارجہ کے پاس موجود تھے، لوگ کہہ رہے تھے کہ نبی کریم ﷺ پر وفات طاری نہیں ہوئی، بلکہ آپ پر وحی کی کیفیت طاری ہے (کیونکہ وحی کی صورت میں آپ پر کبھی غنودگی طاری ہوتی جو بیہوشی کی طرح ہوتی) حضرت ابوبکر ﷺ آئے تو آپ نے نبی کریم ﷺ کے چہرے سے کپڑا ہٹایا، اور آپ کی آنکھوں کے درمیان بوسہ کیا، اور عرض کیا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے ہاں مکرم ہیں کہ وہ آپ کو دو مرتبہ وفات عطاء فرمائے (یعنی آپ پر فقط آن کی آن میں وفات طاری ہوئی پھر آپ ہمیشہ زندہ ہو گئے) آپ نے فرمایا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی رسول اللہ ﷺ کا وصال ہو چکا ہے، ادھر حضرت عمر ﷺ مسجد کی ایک طرف کہہ رہے تھے قسم ہے اللہ تعالیٰ کی رسول اللہ ﷺ پر وفات طاری نہیں ہوئی، اور نہ ہی آپ کو فوت کیا جائے گا، اگر منافقین نے یہ کہا کہ آپ فوت ہو گئے تو ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں گے (حضرت ابوبکر ﷺ مسجد میں آ گئے) آپ کھڑے ہوئے، پھر منبر پر تشریف لے آئے، اور فرمایا جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے تو بیشک اللہ تعالیٰ زندہ ہے، وہ فوت ہونے سے پاک ہے، اور جو شخص محمد ﷺ کی عبادت کرتا ہے تو وہ فوت ہو چکے ہیں، پھر آپ نے یہی آیۃ کریمہ بطور دلیل پیش کی ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ﴾ حضرت عمر ﷺ فرماتے ہیں (میری پریشانی کا یہ عالم تھا) کہ میں نے گویا کہ یہ آیۃ کریمہ پڑھی ہی نہیں، اب حضرت ابوبکر ﷺ سے سن رہا ہوں۔

وائلی ابونصر عبیداللہ نے اپنی کتاب "الابانۃ" میں ذکر کیا "ورجع عن مقالته التی قالها" حضرت عمر ﷺ جو یہ فرما رہے تھے کہ نبی کریم ﷺ کا نہ وصال ہوا اور نہ ہوگا، اس قول سے آپ نے رجوع فرما لیا، وائلی کی مکمل روایت دیکھئے۔

❁ عن انس بن مالک انه سمع عمر بن الخطاب حين بويع ابو بكر فی مسجد رسول الله ﷺ واستولى على منبر رسول الله ﷺ تشهد قبل ابی بكر فقال اما بعد فانی قلت لكم امس مقالة وانها لم تكن كما قلت، وانی والله ما وجدت المقالة التی قلت لكم فی كتاب انزله الله ولا فی عهد عهده الیّ رسول الله ﷺ ولكنی كنت ارجو ان يعيش رسول الله ﷺ حتى يدبرنا، يريدان يقول حتى يكون آخرنا موتا، فاختار الله عزوجل رسوله الذی عنده على الذی عندكم، وهذا الكتاب الذی هدى الله به رسوله

فخذوا به تهتدوا لما هدی له رسول اللهﷺ"

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے سنا، جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نبی کریم ﷺ کی مسجد میں بیعت کی گئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پہلے شہادتین پڑھیں، پھر آپ نے کہا "اما بعد" بیشک میں نے کل تمہیں کہا تھا، لیکن ایسے نہیں تھا جیسے میں نے کہا، بیشک میں نے اپنی بات کو کتاب اللہ میں نہیں پایا، اور نہ ہی میرے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے اس قسم کا کوئی وعدہ فرمایا تھا، لیکن میں امید رکھتا تھا کہ آپ ظاہری حیات میں ہم میں موجود رہیں گے، لیکن آپ ہمیں پیچھے چھوڑ کر تشریف لے گئے، ہمارے ارادہ میں یہ تھا کہ آپ ہم سب کے بعد تشریف لے جائیں گے، لیکن وہ ذات کریم جو ہم میں موجود تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے ہاں پسند کرلیا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب جو کہ رسول اللہ ﷺ کیلئے بھی ہدایت تھی اسی کے مطابق تم عمل کروتا کہ رسول اللہ ﷺ کی ہدایت پر تم قائم رہو۔

یعنی صحابہ کرام اتنی پریشانی میں مبتلاء ہوگئے تھے کہ ان کو یہ آیۃ کریمہ، اور دوسری آیات جن میں وفات کا ذکر ہے ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾ اور ﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُم مَّيِّتُونَ﴾ گویا کہ ان کو بھول ہی گئی تھیں، یوں سمجھ آرہا تھا کہ وہ پہلی مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے سن رہے ہیں "وخرج الناس يتلونها في سكك المدينة كأنها لم تنزل قط الا ذلك اليوم" لوگ مدینہ طیبہ کی گلیوں میں ان آیات کو یوں پڑھ رہے تھے کہ پتہ چل رہا تھا کہ یہ آج ہی نازل ہوئی ہیں ایسے وقت میں جب کہ تمام صحابہ کرام کے حوصلہ پست ہوگئے تھے، اس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بہادری اور علم سے کام لیتے ہوئے یہ آیۃ کریمہ پڑھ کر تمام کو مطمئن کردیا "هذا الآية ادل دليل على شجاعة الصديق وجرأته" تو یہ آیۃ کریمہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شجاعت اور جرأت پر دلالت کررہی ہے، کامل شجاعت و جرأت وہی ہوتی ہے جو مصائب کے وقت دل مطمئن رہے، نبی کریم ﷺ کے وصال سے بڑھ کر اور بڑی مصیبت کیا ہوسکتی تھی، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اپنے دل کو مطمئن رکھنا آپ کی شجاعت جرأت کی وجہ سے ہی تھا۔ (ماخوذ از قرطبی)

نبی کریم ﷺ کو موت وحیات میں اختیار دیا گیا، آنے والی احادیث مبارکہ مشکوۃ کے باب الکرامات کے بعد باب سے ذکر کی جارہی ہیں مشکوۃ میں صرف ''باب'' لکھا گیا ہے عنوان قائم نہیں کیا گیا البتہ مرقاۃ میں بیان کیا گیا ہے "فقيل المعنى هذا باب في بيان هجرة اصحابه من مكة وبيان وفاته ﷺ" اور بعض نسخوں میں باب کا یہ عنوان قائم کیا گیا "باب ما يتعلق بموته ﷺ من المقدمات"

❁ عن ابی السعید الخدری رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ جلس علی المنبر فقال ان عبدا خيره الله بين ان يؤتيه من زهرة الدنيا ماشاء وبين ما عنده فاختار ما عنده فبكى ابو بكر قال

فدیناک بآبائنا وامھاتنا فعجبناله فقال الناس انظروا الی ھذا الشیخ یخبر رسول اللہﷺ عن عبد خیرہ اللہ بین ان یؤتیہ من زھرۃ الدنیا وبین ما عندہ وھو یقول فدیناک بآبائنا وامھاتنا فکان رسول اللہﷺ ھوالمخیر وکان ابو بکر اعلمنا" متفق علیہ"

حضرت ابوسعیدؓ فرماتے ہیں، بیشک رسول اللہﷺ منبر پر تشریف فرما ہوئے، تو آپ نے فرمایا "ایک بندے کو اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا ہے کہ وہ دنیا کے منافع حاصل کرلے جب تک چاہے، یا اسے پسند کرلے بندے کو اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا ہے کہ وہ دنیا کے منافع حاصل کرلے جب تک چاہے، یا اسے پسند کرلے جو اس کیلئے (مدارج اور نعمتیں) اللہ تعالیٰ کے ہاں ہیں، تو اللہ کے بندے نے اللہ تعالیٰ کے ہاں نعمتوں کو پسند کرلیا ہے، تو حضرت ابوبکرؓ رونے لگے، عرض کرنے لگے "ہمارے ماں باپ آپ پر قربان" ہمیں ان پر تعجب ہوا، لوگ کہنے لگے، اس شیخ کی طرف دیکھئے، نبی کریمﷺ ایک بندے کی خبر دے رہے ہیں کہ رب تعالیٰ نے اسے اختیار دیا ہے کہ چاہے تو وہ دنیا کی نعمتوں کو پسند کرلے اور چاہے تو آخرت کی نعمتوں کو پسند کرلے، اور یہ (شیخ رو رہے ہیں اور) کہہ رہے ہیں کہ ہمارے ماں باپ آپ پر قربان، حالانکہ نبی کریمﷺ نے اپنے متعلق ہی خبر دی تھی کہ آپ کو اختیار دیا گیا، حضرت ابوبکرؓ ہم سے زیادہ علم رکھنے والے تھے۔

حدیث پاک کی مختصر وضاحت:

حضرت ابوبکرؓ کے رونے کی وجہ آپ کی کامل سمجھ اور کامل علم تھا کہ آپ کو پتہ چل گیا تھا کہ اس مرض کی حالت میں نبی کریمﷺ کا یہ ارشاد گرامی آپ کے اپنے متعلق ہی ہے کہ آپ ہم سے جدا ہو رہے ہیں، نبی کریمﷺ کا یہ ارشاد مقدمات مراتب اولیاء سے تھا، کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو خصوصی مراتب سے نوازتا ہے، صرف اپنے وصال کی خبر اشارہ سے دینی مقصود نہیں تھی، بلکہ نبی کیلئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ خبر واضح طور پر دے، راوی نے کہا کہ تعجب کر رہے تھے کہ یہ شیخ کہہ رہے ہیں "ہمارے ماں باپ آپ پر قربان" اور یہ کیوں رو رہے ہیں، یہ درحقیقت دوسرے لوگوں کا نبی کریمﷺ کے اشارہ کو نہ سمجھنا تھا، حضرت ابوبکرؓ کو شیخ کہنے کی دو وجہ تھیں، ایک آپ کی عمر کی زیادتی کہ آپ اس وقت اکاسٹھ سال کے تھے، اور دوسری وجہ آپ کی عقل اور فہم (سمجھ) کی زیادتی تھی "ان کبرہ المقتضی لو قارہ وزیادۃ عقلہ وفھمہ" آپ کی عمر کی زیادتی اور آپ علم وعقل کی زیادتی کا یہی تقاضا تھا کہ آپ کی عزت کرتے ہوئے آپ کیلئے لفظ شیخ (بزرگ) کا استعمال کیا جائے، آپ کے اس ارشاد گرامی کے بعد جلدی ہی آپ کا وصال ہوگیا تو لوگوں کو پتہ چل گیا کہ آپ کا ارشاد اپنے متعلق ہی تھا، حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے کامل علم کی وجہ سے اسے سمجھ رہے تھے جسے ہم نہیں سمجھ سکے۔ (مرقاۃ ج ۱۱ صفحہ نمبر ۲۳۶، ۲۳۷)

تمام انبیاء کرام موت وحیات میں مختار تھے:

وعن عائشة قالت سمعت رسول الله ﷺ يقول ما من نبی يمرض الا خير بين الدنيا والآخرة وكان فی شكواه الذی قبض فيه اخذته بحة شديدة فسمعته يقول مع الذين انعمت عليهم من النبيين والصديقين والشهداء الصالحين فعلمت انه خير" (متفق عليه)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کوئی نبی نہیں کہ وہ مریض ہوں مگر یہ کہ انہیں دنیا اور آخرت (میں سے ایک) کا اختیار دیا جاتا ہے، جب آپ مریض ہو گئے جس مرض میں آپ کا وصال ہوگیا، اور آپ کو سانس کی شدید تکلیف ہوئی، تو میں نے آپ سے سنا کہ آپ فرما رہے تھے (ان لوگوں کے ساتھ جن پر تیرا انعام ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین) تو میں نے سمجھ لیا کہ آپ کو بھی اختیار دے دیا گیا ہے۔

(فعلمت انه خير) "الی بين البقاء فی الدنيا وما عند الله فی الاخری من لقاء المولی"

تو مجھے معلوم ہوگیا کہ آپ کو اختیار دے دیا گیا ہے یعنی چاہیں تو دنیا میں باقی رہیں، اور چاہیں تو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کریں، اور آخرت میں اس کے ہاں نعمتوں کی طرف تشریف لے جائیں۔ (مرقاۃ ج ۱۱ صفحہ نمبر ۲۴۰)

حدیث پاک میں استعمال الفاظ کی وضاحت:

(شكواه ای فی مرضه) کان فی شکواه کا معنی یہ ہے آپ اپنی مرض میں تھے۔

(بُحّة) کا معنی "غلظ الصوت وخشونته" آواز کو موٹا ہو جانا اور آواز کی سختی کا پیدا ہونا۔

علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا "هی شئی يغوص فی الحلق فيغير له الصوت فيغلظ" کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ کوئی چیز گلے میں رک جائے جس کی وجہ سے اس کی آواز بدل جائے اور موٹی ہو جائے۔

"وقيل المراد هنا سعلة، ففی القاموس السعال والسعلة بضمهما وهی حركة تدفع بها الطبيعة اذی عن الرئة والا عضاء التی تتصل بها"

بعض حضرت نے کہا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ پھیپھڑوں کی تکلیف کی وجہ سے جو کھانسی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ (مرقاۃ ج ۱۱ صفحہ نمبر ۳۴۰)

مطلب سب کا وہی ہے جو **راقم** نے اپنے ترجمہ میں سب اقوال کو جمع کر لیا "آپ کو سانس کی تکلیف ہوئی"

مرض وصال میں نبی کریم ﷺ کی بے قراری کی وجہ:

❁ وعن عائشة قالت ان من نعم الله علی ان رسول الله ﷺ توفی فی بیتی وفی یومی وبین سحری ونحری وان الله جمع بین ریقی وریقه عند موته دخل علی عبدالرحمن ابن ابی بکروبیده سواک وانا مسندة رسول الله ﷺ فرأیته ینظر الیه وعرفت من طبعه انه یحب السواک فقلت آخذه لک فاشار برأسه ان نعم فتناوله فاشتد علیه وقلت الینه لک فاشار برأسه ان نعم فلینته فامره وبین یدیه رکوة فیهاماء فجعل یدخل یدیه فی الماء فیمسح بهما وجهه وهویقول لا اله الا الله ان للموت سکرات ثم نصب یده فجعل یقول فی الرفیق الاعلی حتی قبض ومالت یده" (رواہ البخاری)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں بیشک اللہ کی نعمتوں میں سے مجھ پر یہ (عظیم) نعمت تھی کہ نبی کریم ﷺ کا وصال میرے حجرہ میں ہوا، اور میرے دن (میری باری کے دن) میں ہوا، اور میرے سینہ اور میرے سینہ کے اوپر گلے کے ساتھ ہڈیوں کے درمیان آپ کا سر تھا اس حال میں آپ کا وصال ہوا (یعنی آپ نے میرے سینہ کے ساتھ سہارا لگایا ہوا تھا) اور آپ کی وفات کے وقت اللہ تعالیٰ نے میرے اور آپ کے لعاب کو جمع فرمایا، میرے پاس (میرے بھائی) عبدالرحمٰن بن ابی بکر آئے ان کے ہاتھ میں مسواک تھی، میں نے نبی کریم ﷺ کو سہارا دیا ہوا تھا، میں نے آپ کو دیکھا کہ آپ میری طرف دیکھ رہے ہیں مجھے آپ کی طبیعت کے بارے میں علم تھا کہ آپ مسواک کو پسند کرتے ہیں، میں نے عرض کیا، میں آپ کیلئے کیا یہ مسواک لے لوں؟ آپ نے اپنے سر مبارک سے اشارہ فرمایا ہاں لے لو، آپ نے اسے اپنے منہ میں لیا لیکن وہ سخت تھی (اسے چبانا مشکل تھا) تو میں نے کہا کیا میں آپ کو نرم کردوں؟ آپ نے سر کے اشارہ سے فرمایا کہ ہاں لے لو، میں نے اس مسواک کو اپنے دانتوں سے نرم کیا اور آپ کے دانتوں پر اسے میں پھیرنے لگی (اس طرح میرا اور آپ کا لعاب جمع ہوگیا) آپ کے سامنے پانی کا ایک پیالہ تھا، آپ اپنے ہاتھوں کو پانی میں داخل کرتے، پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے چہرے پر پھیرتے، اور آپ یہ فرمارہے تھے "لا الٰہ الا اللہ ان للموت سکرات" اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں، بیشک موت کے سکرات ہیں پھر آپ نے اپنا ہاتھ اٹھایا، اور آپ کے ہاتھ ڈھلک گئے (آپ کی برقراری کی وجہ یہی تھی کہ آپ رفیق اعلیٰ یعنی اللہ تعالیٰ سے ملنے کو بے قرار و بے تاب تھے۔

مختصر وضاحت حدیث:

جامع الاصول میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کو ابتدائی تکلیف سر کے درد سے شروع ہوئی، جبکہ آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

کے حجرہ میں تھے، پھر آپ کی تکلیف بڑھ گئی جب آپ کا وصال ربیع الاول میں پیر کے دن تھا، وقت چاشت کا تھا، آپ کا وصال دو ربیع الاول کو ہوا، یا بارہ ربیع الاول کو ہوا اگرچہ بارہ ربیع الاول والا قول زیادہ مشہور ہے، اور زیادہ حضرات کا بھی یہی قول ہے۔ لیکن تحقیق کی نظر سے پہلا قول زیادہ معتبر ہے کہ آپ کا وصال دو ربیع الاول کو ہوا، کیونکہ دو مسائل میں اتفاق ہے کہ آپ نے حج الوداع جب فرمایا تو ذی الحج جمعہ کا دن تھا، اور آپ کا جب وصال ہوا تو پیر کا دن تھا، ذی الحج کے بیس یا اکیس دن محرم اور صفر کے تیس تیس دن اور ربیع الاول کے اگر بارہ دن لئے جائیں تو کل دن ترانوے بنتے ہیں جب تمام چاند تیس تیس دن کے شمار ہوں لیکن ان میں ایک یا دو چاند انتیس کے ہیں اس طرح کل دن اکانوے ہوئے، جب نو ذی الحج جمعہ ہو تو اکانوے دنوں کے بعد بارہ ربیع الاول جمعرات کو بنتی ہے لہذا بارہ ربیع الاول کو پیر کے دن وصال والا قول تحقیق کے طور پر صادق نہیں آتا، اور دو ربیع الاول تک اکاسی دن بنتے ہیں، جب نو ذی الحج جمعہ ہو اور اس کے اکاسی دن بعد دو ربیع الاول پیر بنتا ہے لہذا تحقیقی قول آپ کے وصال کا دو ربیع الاول والا ہی ہے یہی وجہ ہے کہ چشتی اولیاء کرام کے درباروں میں آپ کا یوم وصال دو ربیع الاول کو منایا جاتا ہے، دربار عالیہ گولڑہ شریف "جو **راقم** کا پیر خانہ ہے" میں سید الاولیاء حضرت پیر مہر علی شاہ رحمہ اللہ کے دور سے لے کر آج تک اسی پر عمل ہو رہا ہے۔ (راقم)

"**سکرات الموت**"**ای شدائد ومشقات عظیمة**" سکرات موت کا معنی موت کے شدائد اور عظیم مشقت مراد ہے، ترمذی شریف "**منکرات الموت او سکرات الموت**" مذکور ہے، جو راوی کو شک ہے تاہم دونوں کا معنی ایک ہے "**ثم نصب یدہ**" پھر آپ نے اپنا ہاتھ دعاء کیلئے اٹھایا، یا آسمانوں کی طرف اشارہ کرنے کیلئے اٹھایا، پھر آپ نے دعاء فرمائی "**بالرفیق الاعلی**" اے اللہ مجھے رفیق اعلی سے ملا دے، رفیق اعلی سے مراد کیا ہے ؟اس کے کئی مطالب بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) اے اللہ مجھے انبیاء کرام سے ملا دے۔ (۲) دوسرا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ مجھے مقام محمود میں پہنچا دے۔

(۳) تیسرا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ مجھے جنت میں پہنچا دے۔ (۴) چوتھا مطلب یہ ہے کہ "**رفیق اعلی**" سے مراد اللہ تعالی ہے کہ اے اللہ مجھے اپنے آپ سے ملا لے اس پر کچھ بحث ہے "**وقیل الرفیق الاعلی من اسمائه تعالی من الرفق**" یہ بیان کیا گیا ہے کہ "**الرفیق الاعلی**" اللہ تعالی کے اسماء گرامی سے ہے، اور رفق سے ماخوذ ہے

"**ثم رایت التور بشتی قال قد ذھب بعضھم فی الرفیق الاعلی انه اسم من اسماء اللہ تعالی**"

تورپشتی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ بعض حضرات نے یہ بیان کیا ہے کہ رفیق اعلی اللہ تعالی کے اسماء گرامی سے ہے۔

"قال الازهری غلط قائل وقوله ان الله رفیق لم یوجب اطلاق هذا الاسم علیه" ازہری نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالی کا نام رفیق نہیں، اس لئے اس پر رفیق کا اطلاق صحیح نہیں

"قال الفاضل الطیبی لم لا یجوز ان یستدل بهذا الحدیث علی اطلاق هذا الا سم علیه وما المانع"
علامہ طیبی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ اس حدیث پاک سے اس پر دلیل پائی جاتی ہے کہ اللہ تعالی پر اس کا اطلاق صحیح ہے کوئی مانع موجود نہیں۔ (از مرقاۃ ج ۱۱ صفحہ نمبر ۲۳۹)

راقم نے اللہ تعالی کی صفات اور اسماء کے توقیفی ہونے یا غیر توقیفی ہونے کی بحث بہت تفصیل سے نجوم الفرقان کی جلد اول میں بیان کی ہے، ارباب ذوق وہیں دیکھیں، مسئلہ کو سمجھانے کیلئے صرف ایک فیصلہ کن بحث کو دوبارہ ذکر کر رہا ہوں۔

نکتہ: علامہ غزالی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ اسم اور چیز ہے، صفت اور، آپ نے فرمایا۔
"اسمی ومحمد واسمک ابو بکر فهذا من باب الا سماء واما الصفات فمثل هذا الانسان بکونه طویلا فقیها کذا وکذا"
میرا نام محمد ہے اور تمہارا نام ابو بکر ہے، اسے اسم کہا جاتا ہے، لیکن جب کہا جائے کہ یہ انسان لمبا ہے، یہ فقیہ ہے، زائد ہے، متقی ہے، سخی ہے وغیرہ یہ صفات ہیں۔
اذاعرفت هذاالفرق فیقال امااطلاق الاسم علی الله قال یجوزالا عندوروده فی القرآن والخبرواماالصفات فانه لا یتوقف علی التوقیف" (از تفسیر کبیر)
جب تمہیں اسم اور صفت میں فرق کا پتہ چل گیا تو اب یہ کہا جائے گا کہ اللہ تعالی کے اسماء تو وہی ہوں گے، جن کا ذکر قرآن پاک اور احادیث میں ہوگا، البتہ صفات اللہ تعالی کی بے حد ہیں، وہ توفیقیہ نہیں۔

اس بحث کے بعد واضح ہوگیا کہ اللہ تعالی پر بطور صفت "رفیق اعلی" کا اطلاق صحیح ہے، اب مسئلہ نکھر کر واضح ہوگیا کہ حقیقت میں بے قراری کی وجہ رب تعالی سے ملاقات تھی، کہ ملاقات میں تاخیر نہ ہو، بلکہ ملاقات جلدی ہو، اگرچہ بظاہر تکلیف، سردرد، اور کبھی کبھی بیہوشی کا طاری ہوجانا بھی تھا، جہاں تک آپ کی دعاء میں "اللهم اعنی علی منکرات الموت" یا "اللهم اعنی علی سکرات الموت" کے الفاظ ہیں، کہ اے اللہ میری امداد فرما منکرات موت پر اور سکرات موت پر، یہ تعلیم امت کیلئے دعاء تھی، اور رب تعالی کی قدرت اور اپنے عجز کا اظہار تھا۔ (راقم)

نبی کریم ﷺ کو اپنی وفات کا وقت معلوم تھا:

❁ وعن انس قال لما ثقل النبی ﷺ جعل یتغشاه الکرب فقالت فاطمة واکرب اباه فقال

لیس علی ابیک کرب بعد الیوم فلما مات قالت یا ابتاه اجاب ربادعاه،یا ابتاه من جنة الفردوس ماواه،یا ابتاه الی جبریل ننعاه فلما دفن قالت فاطمة یا انس اطابت انفسکم ان تحثوا علی رسول اللهﷺ التراب" (رواہ البخاری)

حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں، جب نبی کریم ﷺ پر بیماری شدید ہوگئی،تو آپ کو تکالیف نے ڈھانپ لیا،تو حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہما نے کہا،ابا جان پر کتنی ہی بڑی مصیبت آئی ہوئی ہے،تو آپ نے فرمایا کل تمہارے باپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی، جب آپ کا (دوسرے دن ہی) وصال ہوگیا تو حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا نے کہا''اے ابا جان آپ نے اپنے رب کے بلانے کو قبول کرلیا ہے''اے ابا جان جنة الفردوس آپ نے اپنا ٹھکانا بنالیا،اے ابا جان،ہم جبریل سے آپ کی وفات کا تذکرہ کرتے ہیں، جب آپ کو دفن کردیا گیا،تو آپ نے کہا''اے انس کیا تم لوگوں نے نبی کریم ﷺ پر مٹی ڈالنی پسند کرلی تھی۔

حدیث پاک کی مختصر وضاحت:

فقال لها لیس علی ابیک کرب بعد الیوم" یعنی ان الکرب کان بسبب شدة الالم ،وصعوبة الوجع وبعد هذا الیوم لا یکون ذلک لان الکرب کان بسبب العلائق الجسمانیة وبعد الیوم ینقطع العلائق الصوریة"

آپ کے ارشادگرامی کہ''آپ کے باپ پرآج کے بعد کوئی مصیبت نہیں رہے گی''کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اپنے وصال کی خبردے دی کہ آج ہی میرا وصال ہورہا ہے،اس تکلیف کا تعلق درد کی شدت،اور مرض کی وجہ سے مشکل تکلیف ہے، جب وصال ہو جائے گا تو تکالیف خود بخود اٹھ جائیں گی ،یعنی صوری تکالیف ختم ہو جائیں گی،حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے نبی کریم ﷺ وصال پر الفاظ گرامی''یا ابتاه اجاب ربا دعاه، الخ''سے پتہ چلا کہ کسی کی وفات پر نوحہ کرنا تو منع ہے لیکن اظہار غم کی وجہ سے اس قسم کے الفاظ ذکر کرنا جائز ہے،جو آپ کے اظہار غم سے واضح ہورہا ہے۔

(یا ابتاه الی جبریل ننعاه)ای نظهر خبر موته الیه من النعی،وفی الا زهار ای نبکی الیه وقیل نعزیه وقیل نخبره"

''ننعاه''النعی سے لیا ہوا ہے،جس کا معنی ہوتا''موت کی خبردینا''یعنی بے قراری میں آپ یوں کہہ رہی تھیں کہ ہم آپ کی وفات کی خبر کا اظہار جبریل سے کریں گے،کہ اے جبریل اب تمہارا وحی لانا ختم ہو چکا ہے،اور معنی

یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہم اپنا رونا جبریل کو دکھائیں گے،اور معنی یہ بیان کیا گیا کہ ہم جبریل سے تعزیت کریں گے،اور معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہم جبریل کو آپ ﷺ کی وفات کی خبر دیں گے، یہ وہی معنی جو سب سے پہلے بیان کیا گیا ہے اس لحاظ پر کل تین معانی بیان ہوئے،ان تین میں سے بہتر کون سا معنی ہے،اس کے متعلق علامہ ملاعلی قاری رحمہ اللہ نے یوں بیان کیا "اقول واوسطها اعلاها" میں کہتا ہوں ان تین معانی میں سے جو درمیان میں مذکور ہے وہی مراد لینا زیادہ بہتر ہے،وہ تعزیت ہے،خیال رہے کہ تعزیت کا معنی "کسی کو صبر دلانا" یعنی ہم خود بھی صبر سے کام لیں گے اور جبریل کو بھی صبر دلائیں گے،حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا نے آپ کے وصال پر مرثیہ کہا۔

ماذا علی من شم تربة احمد ان لا یشم مدی الزمان غوالیا

کیا ہے اس پر جس نے نبی کریم ﷺ کی تربت کو سونگھا وہ نہیں سونگھے گا طویل زمانہ مصائب وآلام

صبت علی مصائب لو انها صبت علی الایام صرن لیالیا

مجھ پر اتنی مصیبتیں ڈال دی گئیں اگر وہ دنوں پر ڈال دی جاتیں تو یقیناً وہ راتیں بن جاتیں

❁ **عن عائشه قالت لما قبض رسول اللهﷺ اختلفوا فی دفنه فقال ابو بکر سمعت من رسول اللهﷺ شیئا قال ما قبض الله نبیا الا فی الموضع الذی یحب ان یدفن فیه ادفنوه فی موضع فراشه"** (رواه الترمذی)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہو گیا،تو صحابہ کرام کا آپ کے دفن کے بارے میں اختلاف ہوا،تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق کچھ سنا ہے،آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی نبی کی روح کو قبض نہیں فرماتا مگر اسی جگہ پر جہاں وہ اپنے نبی کے دفن ہونے کو پسند کرتا ہے،اسلئے آپ کو وہیں دفن کرو جہاں آپ روح کے قبض ہونے کے وقت تشریف فرما تھے۔

مختصر وضاحت حدیث:

"**اختلفوا فی دفنه ای فی موضع دفنه**" صحابہ کرام کا آپ کے دفن میں اختلاف ہوا کہ کس جگہ آپ کو دفن کیا جائے،بعض نے کہا آپ کو مکہ مکرمہ میں دفن کیا جائے،اور بعض نے کہا آپ کو اپنے جد امجد ابراہیم علیہ السلام کے پاس دفن کیا جائے"**او فی نفس الدفن**" اسی طرح صحابہ کرام پریشانی کی وجہ سے یہ فیصلہ بھی نہیں کر پا رہے تھے کہ آپ کو دفن بھی کرنا ہے یا نہیں۔

کما روی الترمذی فی الشمائل عن سالم بن عبید و کانت له صحبة قالوا لابی بکر یا

صاحب رسول الله ﷺ اید فن رسول الله ﷺ؟قال نعم "قالوا این؟قال فی المکان الذی قبض الله فیه روحه فان الله لم یقبض روحه الا فی مکان طیب فعلموا انه قد صدق"

ترمذی نے شمائل (باب) میں سالم بن عبید کی روایت نقل کی کہ وہ صحابی تھے، صحابہ کرام نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کیا نبی کریم ﷺ کو دفن کیا جائے گا؟ آپ نے فرمایا ہاں دفن کیا جائے گا، پھر صحابہ کرام نے پوچھا آپ کو کہاں دفن کیا جائے گا؟ آپ نے فرمایا اسی جگہ میں جہاں اللہ تعالیٰ نے آپ کی روح کو قبض کیا، بیشک اللہ تعالیٰ نے آپ کی روح کو نہیں قبض کیا مگر اسی جگہ میں جو پاکیزہ ہے، صحابہ کرام نے معلوم کرلیا، بیشک آپ نے سچ کہا ہے **(فقال ابو بکر سمعت من رسول الله ﷺ شیئا)ای ما نسیته)** حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے کچھ سنا ہے، یعنی میں اسے بھولا نہیں "ما نسیته" کے الفاظ شمائل ترمذی میں موجود ہیں۔

(فقال ای رسول الله(ما قبض الله نبیا الا فی الموضع الذی یجب)ای النبی اویرید الله (ان یدفن)ای ذلک النبی فیه الی فی ذلک المکان"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نہیں قبض کرتا کسی نبی کی روح کو مگر اسی جگہ میں جسے وہ پسند کرتا ہو دفن کئے جانے کو، اس میں دو احتمال ہیں، ایک یہ وہ نبی جس جگہ دفن ہونے کو پسند کریں وہاں ان کی روح کو قبض کیا جاتا ہے، اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے کہ اس نبی کو یہاں دفن کیا جانا چاہیے وہاں روح کو قبض کیا جاتا ہے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث بیان کرنے کے بعد صحابہ کرام کو کہا **"ادفنوه فی موضع فراشه"** نبی کریم ﷺ کو وہاں ہی دفن کرو جہاں آپ کی چارپائی اور بستر تھے۔

اللہ تعالیٰ کا نبی جہاں فوت ہوتا ہے، وہاں ہی دفن کرنے کی حکمت یہ ہے کہ **"لیکون شرف المکان بالمکین ویتشرف به اهل التمکن"** اس جگہ کو اللہ کے نبی "جنہوں نے وہاں مکین ہونا ہے" سے شرف حاصل ہو جائے پھر مکان کی شرافت و برکت سے اس بستی کے تمام باشندوں کو برکت حاصل ہوتی ہے۔

اللہ کے نبی وصال سے پہلے اپنا مکان جنت میں دیکھ لیتے ہیں:

عن عائشه قالت کان رسول الله ﷺ یقول وهو صحیح انه لن یقبض نبی حتی یری مقعده من الجنة ثم یخیر" الحدیث (منفوق علیه)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی کریم ﷺ حالت صحت میں فرماتے تھے کہ ہرگز کسی نبی کی روح قبض نہیں کی جاتی یہاں تک کہ وہ اپنا مکان جنت میں دیکھ لیتے ہیں، پھر انہیں اختیار دے دیا جاتا ہے

(کہ جنت میں آنا چاہتے ہو یا دنیا میں رہنا چاہتے ہو، جسے چاہتے ہو پسند کرلو)

وعن عائشه قالت کان رسول الله ﷺ یقول فی مرضه الذی مات فیه یا عائشه ما ازال اجد الم الطعام الذی اکلت بخیبر وهذا اوان وجدت انقطاع ابهری من ذلک السم"

(رواه البخاری)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ اپنی اس مرض میں ارشاد فرماتے تھے جس میں آپ کا وصال ہوگیا کہ اے عائشہ میں ہمیشہ اس طعام کا درد پاتا رہا جو میں نے خیبر میں کھایا تھا میں اس وقت یہ سمجھتا ہوں کہ میرے دل کی رگیں س زہر کی وجہ سے کٹ رہی ہیں۔

مختصر وضاحت:

خیبر میں ایک یہودیہ عورت نے آپ کو بکری کا زہر آلود گوشت دیا تھا، جو آپ نے معمولی یعنی ایک لقمہ تناول کرنے پر ہاتھ پیچھے کھینچ لیا تھا کہ اس گوشت نے میرے ساتھ کلام کیا ہے کہ میں زہر آلود ہوں، وہ جو ایک لقمہ گوشت کھایا تھا اس کا اثر لگا تار جاری رہا کہ آپ کو درد محسوس ہوتا رہا، یہاں تک کہ وصال کے وقت اس کا اثر زیادہ مقدار میں لوٹ کر آگیا، جس کی وجہ سے آپ کا وصال ہوگیا، اس طرح آپ کو درجہ شہادت حاصل ہوگیا۔ (از مرقاۃ باب صلوۃ النبی ﷺ)

(ابھری) بفتح الهمزة والهاء بینهما موحدة وهو عرق یتعلق به القلب" دل کے ساتھ رگ کو "ابھری" کہا جاتا ہے یہ رگ کٹ جائے تو انسان پر وفات طاری ہو جاتی ہے (السم) سین پر تینوں حرکتیں پڑھی جا سکتی ہیں ضمہ، فتحہ، کسرہ "والضم اشهر" پیش زیادہ مشہور ہے "والفتح اکثر" لیکن اب تلفظ زیادہ زبر سے ہی ہو رہا ہے۔

(مرقاۃ ج ۱۱ صفحہ نمبر ۲۴۳)

نبی کریم ﷺ کی نماز جنازہ میں کوئی امام نہیں تھا:

یعنی آپ کی نماز جنازہ ہماری نماز جنازہ کی طرح نہیں تھی، بلکہ صحابہ کرام تھوڑی تعداد میں آتے اور آپ پر درود پاک اور دعاء پڑھ کر چلے جاتے۔

قد خرج ابن ماجة باسناد حسن بل صحیح من حدیث ابن عباس وفیه فلما فرغوا من جهازه یوم الثلثاء وضع علی سریره فی بیته، ثم دخل الناس علی رسول الله ﷺ ارسالا یصلون علیه حتی اذا فرغوا ادخلوا النساء حتی اذا فرغن ادخلوا الصبیان ولم یؤم الناس علی رسول الله ﷺ"

حضرت ابن عباس ﷺ کی حدیث جو ابن ماجہ نے سند حسن بلکہ سند صحیح سے تخریج کی اس میں یہ ذکر ہے کہ جب لوگ نبی کریم ﷺ کے کفن و دفن سے منگل کے دن فارغ ہوئے، تو آپ کو اپنے گھر چار پائی پر رکھ دیا گیا، لوگ تھوڑی تھوڑی تعداد میں آگے پیچھے آتے رہے اور درود پاک پڑھ کر واپس ہو جاتے، یہاں تک کہ جب سب مرد فارغ ہو گئے تو عورتوں کو اجازت دی گئی، جب وہ سب فارغ ہو گئیں تو بچوں کو اجازت دی گئی، رسول اللہ ﷺ پر (نماز جنازہ میں) کوئی امام نہیں تھا۔ (منقول از قرطبی)

امیر المؤمنین سیدنا علی المرتضی ﷺ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے جنازہ شریف پر کسی نے امامت نہیں کی کیونکہ آپ ایام حیات اور ممات میں سب کے امام ہیں، نبی کریم ﷺ کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ پر متعدد نمازیں پڑھی گئیں، اور تنہا تنہا لوگوں نے پڑھیں، ورنہ عام لوگوں کی ایک ہی نماز جنازہ ہے، اور وہ بھی جماعت سے یہ بھی خیال رہے کہ نبی کریم ﷺ کی خصوصیات پر دوسروں کو قیاس نہیں کیا جا سکتا، لوگوں کو معلوم نہیں تھا کہ نبی کریم ﷺ پر کون سی دعاء پڑھی جائے تو حضرت عبد اللہ بن مسعود ﷺ نے مشورہ دیا کہ حضرت علی ﷺ سے پوچھو، جب لوگوں نے آپ سے پوچھا، تو آپ نے فرمایا تم یہ دعاء پڑھو۔

"ان اللہ و ملائکتہ یصلون علی النبی یاایھا الذین امنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما، اللھم ربنا لبیک وسعدیک صلوات اللہ البرا لرحیم والملائکۃ المقربین والنبیین والصدیقین والشھداء والصالحین واسبح لک من شئی یا رب العالمین علی محمد بن عبد اللہ خاتم النبیین وسید المرسلین وامام المتقین ورسول رب العالمین الشاھدالبشیر الداعی باذنک السراج المنیر وعلیہ السلام"

اس دعاء کو شیخ زین الدین مراغی نے اپنی کتاب تحقیق النصرۃ میں بیان کیا ہے۔ (مدارج النبوۃ ج۲ حالات وصال)

نبی کریم ﷺ کی تدفین میں تاخیر:

نبی کریم ﷺ کا وصال دوشنبہ (پیر) کو ہوا اور سہ شنبہ (منگل) پورا دن گذر گیا، اور آپ کا تخت شریف آپ کے گھر میں رہا آپ کو چہار شنبہ (بدھ) کی رات کو دفن کر دیا گیا، وجہ اس کی یہ تھی کہ تمام لوگ آپ کی نماز جنازہ ادا کر لیں، یہاں تک کہ سب لوگ جب نماز ادا کر چکے تو پھر آپ کو دفنایا گیا۔

شیعہ کا اعتراض باطل ہے:

اہل تشیع کا یہ کہنا کہ صحابہ کرام نے حضور ﷺ کی نماز جنازہ ادا نہیں کی یہ بالکل لغو قول ہے، اور حقیقت سے دور

ہے، یہ ان کا قول باطل ہے اور کذب بیانی ہے، بلکہ آج کے شیعہ حضرات اپنی کتابوں سے ناواقف ہیں، آیئے شیعہ حضرات کی حدیث کی کتاب اصول کافی کو دیکھئے۔

عن ابی جعفر علیہ السلام قال قلت له کیف کانت الصلوة علی النبی ﷺ وانه قال لما غسله امیر المؤمنین علیہ السلام و کفنه سجاه لم ادکل علیه عشرة تدارواحوله ثم وقف امیر المؤمنین علیہ السلام فی وسطهم وقال (اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا)فیقول القول کما یقول حتی صلی علیه وسلم اهل المدینة واهل العوالی" (اصول کافی)

حضرت جعفر علیہ السلام سے مروی ہے کہ میں نے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ کی نماز جنازہ کیسے ادا کی گئی تھی؟ تو انہیں بتایا گیا کہ جب امیر المؤمنین علیہ السلام نے آپ کو غسل دیا اور کفن پہنا دیا اور ڈھانپ دیا تو دس آدمی آپ کے جسد مبارک کے پاس آئے اور ارد گرد پھرے، پھر امیر المؤمنین علیہ السلام ان کے درمیان کھڑے ہوئے اور پڑھا۔﴿اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾قوم نے بھی یہی پڑھا جو امیر المؤمنین پڑھ رہے تھے یہاں تک کہ تمام اہل مدینہ نے پڑھا اور ارد گرد تمام دیہات والوں نے پڑھا۔

اہل تشیع کی اپنی ہی حدیث نے واضح کر دیا کہ حضور ﷺ کی نماز جنازہ تمام صحابہ کرام نے ادا کی۔

نبی کریم ﷺ کے وصال پر تغیر احوال:

عن انس قال لما قدم رسول الله ﷺ المدینة لعبت الحشبة بحرابهم فرحا لقد ومه رواه ابو داود،وفی ردایة الدرمی قال ما رأیت یوما قط کان احسن ولا رضوأ من یوم دخل علینا فیه رسول الله ﷺ وما رأیت یوما کان اقبح ولا اظلم من یوم مات فیه المدینة اضاء منها کل شئی فلما کان الیوم الذی مات فیه اظلم منها کل شئی وما نفضنا ایدیناعن التراب وانا لفی دفنه حتی انکرنا قلوبنا"

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ میں آئے تو حبشہ کے لوگوں نے آپ کے تشریف لانے کی خوشی میں نیزہ بازی کا کھیل پیش کیا۔ (رواہ ابوداود)

دارمی کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا میں نے آج تک کوئی دن اتنا زیادہ حسین نہیں دیکھا، اتنا زیادہ روشن دن کوئی نہیں دیکھا اس دن سے جس دن سے ہمارے پاس (مدینہ طیبہ میں) تشریف لائے اور میں نے

کوئی دن اتنا برنہیں دیکھا اور نہ ہی اتنا تاریک دن کوئی دیکھا اس دن سے جس دن رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا، اور ترمذی کی روایت میں ہے کہ حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں جس دن نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ میں تشریف لائے ہر چیز روشن ہوگئی، اور جس دن آپ کا وصال ہوا ہر چیز تاریک ہوگئی، اور ابھی ہم نے (آپ کے دفن کی) مٹی سے ہاتھ بھی نہیں جھاڑے تھے بلکہ ابھی آپ کے دفن میں مشغول تھے یہاں تک کہ ہمارے دلوں نے انکار کیا۔

نبی کریم ﷺ جس دن مدینہ طیبہ میں تشریف لائے وہ دن بہت حسین تھا "ای ازھر فی الخاطر" جو دل کو بہت زیادہ خوش کرنے والا تھا، اور بہت ہی زیادہ روشن تھا "ای فی نور الظاھر" اس سے مراد ظاہری نور ہے جس نور نے مدینہ طیبہ کی ہر چیز کو روشن کر دیا تھا "وھذا یدل علی ان الاضاءۃ کانت محسوسۃ" اس سے واضح طور پر پتہ چل رہا ہے کہ وہ روشنی محسوس ہو رہی تھی، اور جس دن آپ کا وصال ہوا وہ دن بڑا قبیح تھا "الی اسوأ واحزن فی القلب" یعنی وہ دن دلوں کو غم میں ڈالنے والا اور بدحال کرنے والا تھا، اور اس دن مدینہ طیبہ کی ہر چیز تاریک ہو گئی، اس کی وجہ یہ تھی "فان نورہ شمس العالم الصوری والمعنوی" کہ نبی کریم ﷺ کا نور عالم صوری اور عالم معنوی کیلئے سورج کی حیثیت رکھتا تھا، جب وہ سورج ہی غروب ہوگیا تو ہر چیز نے تاریک ہونا ہی تھا۔

اعتراض: جب نبی کریم ﷺ کا نور عالم صوری اور عالم معنوی کیلئے سورج تھا، تو آپ کے وصال سے کل جہان کو تاریک ہو جانا چاہئے تھا، صرف مدینہ طیبہ کے تاریک ہونیکی تخصیص کیوں؟

جواب: "وتخصیص المدینۃ لکونھا اقرب لنسبۃ رؤیۃ الراوی انسب" مدینہ طیبہ کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ وہ قریب تھا، راوی نے اپنے دیکھنے کے لحاظ پر بیان کیا ہے، ورنہ حقیقت یہی ہے کہ آپ کے وصال سے کل جہاں غم اور پریشانی کی وجہ سے ظاہر طور پر تاریک ہوگیا تھا "حتی انکرنا قلوبنا" ابھی ہم نے نبی کریم ﷺ کے دفن کی مٹی سے ہاتھ بھی نہیں جھاڑے تھے کہ ہمارے دلوں نے انکار کیا۔

ای تغیرت حالنا بوفاۃ رسول اللہ ﷺ وظھور انواع الظلمۃ علینا ولم نجد قلوبنا علی کانت علیہ من انوار الصفاء الرقۃ والالفۃ فیما بیننا لا نقطاع مادۃ الوحی وفقد ان برکۃ صحبتہ والراکسیر حضور حضرتہ"

آپ کے وصال سے ہمارے حالات بدل گئے، اور ہم پر تاریکی کی انواع کا ظہور ہوا، ہمارے دلوں میں صفائی اور نرمی اور الفت کے انوار باقی نہ رہے، یعنی جو ہمارے درمیان الفت تھی وہ وحی کے آنے کے اختتام کی وجہ سے جاتی رہی، اور اس کی وجہ آپ کی صحبت کی برکت کا ختم ہو جانا تھا، آپ کے حضور

ہماری موجودگی کیلئے آپ کی برکت اکسیر اعظم کی حیثیت رکھتی تھی جو ختم ہوگئی۔

دینی طلباء کرام:

"حتی انکرنا قلوبنا" حدیث پاک میں ایسا جملہ وارد ہے کہ اگر اسے نہ سمجھا جائے تو ایمان کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔

"قال التور بشتی یرید انهم لم یجدوا قلوبهم علی ما کانت علیه من الصفاء و الالفة لا نقطاع مادة الوحی وفقد ان ما کان یمدهم من الرسول الله ﷺ من التائید و التعلیم ولم یرد انهم لم یجدوها علی ما کانت من التصدیق"

تورپشتی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ "حتی انکرنا قلوبنا" (یہاں تک کہ ہمارے دلوں نے انکار کر دیا) کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دلوں میں جو صفائی اور الفت تھی وہ وحی کے ختم ہو جانے کی وجہ اس طرح نہ رہی جو پہلے تھی، کیونکہ پہلے نبی کریم ﷺ کی تائید سے اور آپ کی تعلیم سے صفائی قلب اور الفت بڑھتی رہتی تھی، آپ کے تشریف لے جانے سے اس کی کیفیت پہلے والی نہ رہی۔

ہاں ضرور توجہ کیجئے، اس کا مفہوم یہ نہیں کہ ہمارے دلوں میں اللہ تعالی کی وحدانیت اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی تصدیق ہی ختم ہوگئی' میرے عزیز طلباء کرام! اگر یہ معنی کرو گے تو صحابہ کرام کی طرف کفر منسوب کرو گے (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) اس سے تو اپنے ایمان سے ہاتھ دھونے لازم آئیں گے۔ (مرقاۃ ج ۱۱ صفحہ نمبر ۲۴۱ مع نصیحت طلباء از راقم)

❁ **وعن عائشه قالت ما ترک رسول الله ﷺ دینارا ولا درهما ولا شاة ولا بعیرا ولا وصی بشئی"** (رواہ مسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے نہ کوئی دینار چھوڑا اور نہ درہم اور نہ بکری اور نہ اونٹ اور نہ ہی کسی چیز کی آپ نے وصیت کی، دوسری روایت یہ ہے۔

"ذکروا عند عائشة رضی الله عنهاان علیا ﷺ کان وصیا فقالت متی اوصی الیه وقد کنت مسندله حتی مات"

صحابہ کرام نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما سے سوال کیا کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی ﷺ کو خلیفہ مقرر کرنے کی کوئی وصیت فرمائی؟ تو آپ نے فرمایا کہ آپ نے کب وصیت فرمائی، میں نے آپ کو سہارا دیا ہوا تھا (یعنی آپ میرے سینہ سے سہارا لگائے ہوئے تھے) تو آپ کا وصال ہوگیا۔

علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "متی اوصی" اور "لااوصی بشی" کا یہ ہے۔

"لااوصی بثلث ما له ولا وغیره اذلم یکن له مال ولااوصی الی علی ولا الی غیره خلاف ما یزعمه الشیعة"

کہ آپ نے تہائی حصہ مال وغیرہ کی کوئی وصیت نہیں کی کیونکہ آپ کا مال ہی نہیں تھا، اور نہ ہی آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کیلئے کوئی وصیت کی اور نہ ہی کسی اور کیلئے آپ نے کوئی وصیت کی "ولا اوصی بشئی" کا جب مطلب واضح ہوگیا، اب یہ سمجھنا آسان ہوگیا۔

"واما الا حادیث الصیحة فی وصیته ﷺ بکتاب الله ووصیته لاهل البیت واخراج الیهود من جزیرة العرب واجازة الوفد فلیست مرادة بقولها ولا اوصی"

لیکن احادیث صیحہ میں جو نبی کریم ﷺ کی وصیت کا ذکر ہے کہ آپ نے کتاب اللہ کو لازم پکڑنے یعنی قرآن پاک کے مطابق عمل کرنے کی وصیت کی، اور اہل بیت کے ساتھ محبت کرنے اور ان کے نقش قدم پر چلنے اور یہود کو جزیرہ عرب سے نکال دینے اور باہر سے آنے والے وفود سے اچھا سلوک کرنے کی آپ نے جو وصیت کی وہ "لااوصی بشئی" میں نہیں آتی کہ اس میں تو نفی مال کی وصیت کرنے اور خلیفہ نامزد کرنے کی ہے۔

"واما الا رض التی کانت له ﷺ بخیبر وفدک فقد سلبها ﷺ فی حیاته وجعلها صدقة للمسمین"

لیکن وہ زمین جو نبی کریم ﷺ کی خیبر میں یا فدک کی زمین وہ آپ نے اپنی ظاہری حیات میں ہی مسلمانوں کیلئے وقف کی دی تھی۔

اعتراض: اہل سیر نے بیان کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے کثیر تعداد میں اونٹ اور بیس اونٹنیاں تھیں جن کی صحابہ کرام مدینہ طیبہ کے باہر اطراف میں حفاظت کرتے تھے، اور ان کا دودھ رات کو آتا تھا، اور سات بکریوں اور سات بھیڑوں کا دودھ آتا تو "یشربون من البانها" وہ دودھ پیتے تو یہ کہنا کس طرح صحیح ہے کہ آپ کے وصال کے وقت آپ کے پاس کوئی مال نہیں تھا؟

جواب: "فلا یصلح لمعارضة هذا الحدیث الصحیح ولو صح لحمل علی انها کانت من ابل الصدقة وکان اصحابه الفقراء من اهل الصفة وغیرهم یشربون من البانها"

اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ جن احادیث میں مال کی نفی کا ذکر ہے وہ سند صحیح سے ثابت ہیں، جو اہل سیر نے بیان کیا ہے یہ احادیث صیحہ نہیں، اگر ان کا صحیح ہونا ثابت بھی ہوجائے تو پھر بھی نبی کریم ﷺ کی ملکیت ثابت نہیں ہوسکتی، بلکہ وہ مال فقراء صحابہ کرام کے نفع حاصل کرنے کیلئے رکھا ہوا تھا، وہ دودھ پینے والے اہل صفہ تھے جو فقراء صحابہ کرام

تھے، جن کا کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا بلکہ وہ فقط دین کے حاصل کرنے والے طلباء کرام تھے۔ (مرقاۃ ج۱۱صفحہ نمبر۲۵۴، ۲۵۵)

اب اس کے بعد بخاری کی ایک حدیث دیکھئے جو ماقبل بحث کی وجہ سے آسانی سے سمجھ آئیگی۔

عن عمرو بن الحارث (خی جویریة قال ما ترک رسول الله ﷺ عند موته دینارا ولا درهما ولا عبدا ولا امة ولا شیئا الا بغلته البیضاء وسلاحه وارضا جعلها صدقة" (رواہ بخاری)

عمرو بن حارث الخزاعی جو ام المؤمنین حضرت جویریہ رضی اللہ عنہما کے بھائی ہیں فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ اپنے وصال کے وقت نہ کوئی دینار چھوڑا اور نہ درہم اور نہ غلام اور نہ کنیز اور نہ کوئی اور چیز مگر سفید خچر اور ہتھیار اور زمین جن کو آپ نے صدقہ کر دیا، یعنی فقیر مسلمانوں کیلئے وقف کر دیا۔

مختصر وضاحت حدیث:

باقی روایات میں غلاموں اور کنیزوں کا ذکر نہیں تھا، اس میں وہ وضاحت بھی موجود ہے "**فـفـیه دلالة علی ان ماذکر من رقیق النبی ﷺ فی جمیع الاخبار کان اما مات واما اعتقه**" نبی کریم ﷺ کی ظاہری حیات میں آپ کے جن غلاموں اور کنیزوں کا ذکر ہے، ان میں سے کوئی پہلے ہی فوت ہو چکے تھے اور کچھ کو آپ نے وصال سے پہلے ہی آزاد کر دیا تھا۔

(جعلها صدقة) وضمیر جعلها راجع الی کل الثلاثة لا الی الارض فقط فانه ﷺ قال نحن معشر الانبیاء لا نورث ماترکنا صدقة"

"جعلها" کی ضمیر تینوں کی طرف لوٹ رہی ہے، صرف "ارض" کی طرف نہیں لوٹ رہی، کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشادگرامی ہے ہم انبیاء کرام کا گروہ جو مال چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا، ہماری کوئی وراثت تقسیم نہیں کی جاتی، مطلب یہ ہوا کہ آپ کی سفید خچر اور آپ کا اسلحہ اور زمین سبھی صدقہ کر دیا گیا۔

"**قال العسقلانی ای تصدق بمنفعة الارض فصار حکمها حکم الوقف**" علامہ عسقلانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ صدقہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ زمین کی منفعت صدقہ کی گئی، زمین کا وقف کا حکم رہا کہ اس کا کوئی مالک نہیں تھا، البتہ خاندان نبوت کو اس کا متولی بنا دیا گیا تھا۔

قبر کے سامنے سجدہ کرنے کی ممانعت:

نبی کریم ﷺ نے وفات سے پانچ دن پہلے فرمایا "جان لو اور آگاہ ہو جاؤ کہ تم سے پہلے ایسے لوگ گذرے ہیں

جنہوں نے انبیاء وصلحاء کی قبروں کو مساجد یعنی سجدہ گاہ بنالیا تھا، تمہیں لازم ہے کہ ایسا نہ کرنا، ایک روایت میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا "لعن الله اليهود والنصارى اتخذوا قبور انبيائهم مساجد" اللہ تعالی کی لعنت ہو یہود ونصاری پر کہ انہوں نے انبیاء کرام کی قبور کو سجدہ گاہ بنالیا، ایک روایت میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا، اے اللہ میری قبر کو میرے بعد بت نہ بنانا، خدا کا غضب اور اس کا قہران لوگوں پر زیادہ ہو جنہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا، بلاشبہ اے مسلمانو میں تمہیں اس سے منع کرتا ہوں اور فرمایا " الاهل بلغت اللهم اشهد اللهم اشهد" خبردار میں نے تمہیں خبردار کر دیا، اے اللہ گواہ رہ اے اللہ گواہ رہ۔ خیال رہے کہ صاحب قبر کو معبود سمجھ کر سجدہ کیا جائے تو یہ شرک ہے، اور اگر معبود تو اللہ تعالی کو مانا جائے لیکن پھر بھی قبر کو سجدہ کرلیا جائے تو یہ حرام ہے، اگر چہ شرک نہیں۔

❁ نبی کریم ﷺ کے پاس سات دینار کہیں سے آئے تھے جن کو آپ خرچ نہیں کر سکے تھے، بیمار ہو گئے، شدید بیماری کی حالت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا ان سونے کے ٹکڑوں کو کہیں بھیج دو کہ وہ فقراء پر خرچ ہو جائیں، آپ کے یہ ارشاد فرمانے کے ساتھ ہی آپ کی بیماری میں شدت آ گئی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کی خدمت میں لگ گئیں، آپ کو جب ہوش آیا تو پوچھا کہ وہ دینار خرچ ہو گئے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا، ابھی نہیں خرچ ہوئے، نبی کریم ﷺ پر معمولی افاقہ سے بیماری میں اور زیادہ شدت آ جاتی، پھر آپ پوچھتے کہ سونے کے ٹکڑے خرچ ہو گئے؟ تین مرتبہ کچھ افاقہ ہوا، اور پھر بیماری کی شدت ہو جاتی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپکی خدمت کی وجہ سے اور شدید اضطراب و پریشانی کی وجہ سے وہ دینار فقراء پر تقسیم نہ کرا سکیں اس کے بعد کچھ افاقہ ہوا تو وہ حضرت علی ﷺ کے پاس بھیج دیئے گئے تا کہ یہ مستحقین میں خرچ کر دیئے جائیں۔

سبحان الله! مال سارا اللہ کی راہ میں خرچ کرا دیا اور خود دنیا سے تشریف لے جا رہے تو گھر کے چراغ میں تیل نہیں تھا جب دوشنبہ (پیر) کی شام ہوئی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کسی انصاری عورت کے گھر چراغ بھیجا کہ اگر تمہارے گھر تیل ہو تو اس میں چند قطرے ڈال دیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نزع کے عالم میں ہیں یعنی نزع کی حالت میں گھر میں چراغ میں تیل نہیں، رات اسی حال میں گذر گئی، صبح چاشت کے وقت آپکا وصال ہو گیا "اللهم ارفع درجاته و اغفرلنا بحرمته ﷺ" (ماخوذ از مدارج النبوۃ جلد دوم ذکر وصال النبی ﷺ)

اعلی حضرت عظیم البرکۃ مولنا الشاہ احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے کیا خوب فرمایا۔

مالک کونین ہیں گو پاس کچھ رکھتے نہیں
دو جہاں کی نعمتیں ہیں ان کے خالی ہاتھ میں

نبی کریم ﷺ کی قبر انور کا مقام عرش اعلی سے بلند:

اس مسئلہ میں اہل علم کا اختلاف ہے کہ مکہ مکرمہ افضل ہے یا مدینہ طیبہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور بعض صحابہ کرام اور اکثر اہل مدینہ اور امام مالک رحمہ اللہ مدینہ طیبہ کی افضلیت کے قائل ہیں، لیکن نبی کریم ﷺ کی قبر انور کے مقام کی افضلیت میں کوئی اختلاف نہیں۔

"ونقل القاضی عیاض وغیرہ الاجماع علی تفضیل ما ضم الاعضاء الشریفة حتی علی الکعبة المنیفة و ان الخلاف فیما عداہ ونقل عن ابی عقیل االحنبلی ان تلک البقعة افضل من العرش وصرح الفا کھانی بتفضیلها علی السماوات قال بل الظاھر المتعین تفضیل جمیع الارض علی السماء لحلوله علیه الصلوۃ والسلام بها وحکاہ بعضهم عن الاکثرین لخلق الانبیاء منها ودفنهم فیها"

قاضی عیاض رحمہ اللہ اور دوسرے اہل علم سے یہ منقول ہے کہ اس پر امت کا اجماع ہے کہ زمین کا وہ حصہ جس سے نبی کریم ﷺ کے اعضاء شریفہ کا تعلق ہے وہ کعبہ مکرمہ سے افضل ہے، اختلاف اس مقام کے غیر میں ہے کہ مکہ مکرمہ افضل ہے یا مدینہ طیبہ، فاکہانی رحمہ اللہ نے تصریح فرمائی ہے کہ اس مقام کو تمام آسمانوں پر افضلیت حاصل ہے، اور انہوں نے کہا کہ ظاہر بات یہ ہے کہ تمام زمین کو تمام آسمانوں پر افضلیت حاصل ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ زمین میں تشریف فرما ہیں، اکثر اہل علم نے تو زمین کی افضلیت پر یہی دلیل قائم کی ہے، کچھ اور حضرات نے یہ کہا ہے کہ تمام انبیاء کرام زمین سے پیدا ہوئے اور زمین میں مدفون ہیں، اس لحاظ پر بھی زمین کو آسمانوں پر فضیلت حاصل ہے۔

"وقال النووی والجمهور علی تفضیل السماء علی الارض ای ما عدا ما ضم الاعضاء الشریفة ومحل الخلاف فیما عداالکعبة فهی افضل من بقیة المدینة اتفاقا ما عدا موضع قبرہ المقدس"

علامہ نووی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جمہور علماء کرام اس طرف ہیں کہ آسمانوں کو زمین پر افضلیت حاصل ہے، سوائے اس مقام کے جس سے حضور ﷺ کے اعضاء شریفہ کا تعلق ہے، لیکن یہ بھی خیال رہے کہ نبی کریم ﷺ کی قبر انور کے بغیر باقی مدینہ طیبہ پر کعبہ شریف کو فضیلت حاصل ہے۔ (مرقاۃ جلد۲ صفحہ نمبر ۱۹۰)

یہ مسائل ایمان کی سلامتی اور نبی کریم ﷺ کی محبت سے حاصل ہوتے ہیں، جن لوگوں کے دل نبی کریم ﷺ کی محبت سے خالی ہوتے ہیں، وہ ان مسائل کو سن کر جل جاتے ہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حضور ﷺ کی قبر شریف کعبہ شریف اور مکہ مکرمہ سے افضل ہے، یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی، ان لوگوں کیلئے دعاء ہے کہ اللہ تعالی ان کے دلوں میں محبت رسول اللہ ﷺ اور عظمت رسول اللہ ﷺ پیدا کر دے تو ان شاء اللہ یہ مسائل خود بخود سمجھ آ جائیں گے۔ (راقم)

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ
مِنْهَا وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ O (آیۃ ۱۴۵)

(1) اور کوئی جان بے حکم خدا مر نہیں سکتی سب کا وقت لکھا رکھا ہے، اور جو دنیا کا انعام چاہے ہم اس میں سے اسے دیں اور جو آخرت کا انعام چاہے ہم اس میں سے اس دیں اور قریب ہے کہ ہم شکر والوں کو صلہ عطاء کریں۔ (کنزالایمان)

(2) اور نہیں ہے کسی نفس کو مرنا سوائے اللہ کے حکم کے، (موت کا وقت) لکھا ہوا، مقرر ہے اور جو ارادہ رکھتا ہے دنیا کے فائدہ کا ہم دیتے ہیں اس کو اس سے، اور جو شخص ارادہ رکھتا ہے آخرت کے فائدہ کا ہم دیتے ہیں اس کو اس سے، اور جلدی ہم جزاء (بدلہ) دیں گے شکر کرنے والوں کو۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق کی چند وجوہ:

(۱) "منافقین" نے جب غزوۂ احد میں یہ خبر اڑائی کہ محمد ﷺ قتل ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرما کر ان کا رد کیا کہ ہر ذی روح چیز کی موت اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے، اس کے حکم اور اس کی قضاء وتقدیر کے بغیر کسی پر موت نہیں آسکتی قتل یا موت وقت معین میں آتے ہیں، وقت سے پہلے نہیں آتے، منافقین کا اصل مقصد نئے نئے اسلام لانے والے ضعیف الاعتقاد لوگوں کو دین سے پھیرنا تھا کہ جب محمد (ﷺ) قتل ہو گئے تو تم اس دین سے پھر جاؤ، تو رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ سے ان کا رد کیا۔

"فکما انہ لومات فی دارہ لم یدل ذلک علی فساد دینہ فکذا اذاقتل وجب ان لایؤثر ذلک فی فساد دینہ"

یعنی موت کا وقت مقرر ہے، اگر آپ کی وفات اپنے گھر میں آگئی تو دین میں کوئی فساد اور خرابی لازم نہیں آئے گی، اگر آپ کو شہید کر دیا گیا تو پھر بھی دین میں کوئی خلل لازم نہیں آئے گا۔

(۲) "آیۃ کریمہ" کے نزول سے مسلمانوں کو جہاد پر ابھارا گیا ہے، اور انہیں یہ بتایا گیا ہے کہ "ان الحذر لایدفع القدر" بیشک ڈرنے سے تقدیر ٹل نہیں سکتی، اس لئے کہ موت وقت سے پہلے نہیں آتی، اور وقت آجائے تو موت کو کوئی

چیز ٹال بھی نہیں سکتی "فلافائدة فی الجبن والخوف" بزدلی اور خوف میں کوئی فائدہ نہیں۔

(۳) "اس آیۃ کریمہ" کو نازل فرما کر یہ بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی حفاظت فرمائی اور آپ کو اس خوفناک معرکہ سے بچایا، "فان تلک الواقعة مابقی سبب من اسباب الهلاک الاوقد حصل فیها" غزوہ احد میں کفار کی یلغار اور گھیر اڈالنے کی وجہ سے بظاہر ہلاکت کے اسباب میں سے کوئی سبب باقی نہیں رہا تھا۔

"ولکن لما کان الله حافظا وناصرا ماضره شیٔ من ذلک، وفیه تنبیه علی ان اصحابه قصروا فی الذب عنه"

لیکن اللہ تعالیٰ نے جب آپ کی حفاظت اور امداد فرمائی تو کوئی چیز بھی آپ کو نقصان نہ پہنچا سکی، اس میں اس پر تنبیہ کی گئی غزوہ احد میں صحابہ کرام سے آپ سے کفار کے دفاع میں کوتاہی واقع ہو گئی تھی، اگرچہ اجتہادی خطاء تھی۔

(۴) "منافقین" نے جب مؤمنین کے متعلق یہ کہا ﴿لَوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا﴾ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ ان پر موت واقع ہوتی اور نہ وہ شہید کئے جاتے۔

"فاخبر الله تعالی ان الموت والقتل کلاهما لایکونان الاباذن الله وحضور الدجل"
(واللہ اعلم بالصواب)

تو اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ بیشک موت اور قتل دونوں ہی اللہ کے حکم کے بغیر نہیں پائے جائے سکتے، اور موت کے وقت سے پہلے موت نہیں آتی۔ (ماخوذ از کبیر)

"اِذن" کے کئی معانی بیان کئے گئے ہیں:

(۱) "الاذن هو الامر" "اذن کا ایک معنیٰ" "امر" بیان کیا گیا ہے "والمعنی ان الله تعالی یأمر ملک الموت بقبض الارواح فلایموت احد الابهذا الأمر" اب مطلب یہ ہوا کہ بیشک اللہ تعالیٰ ملک الموت (عزرائیل) کو روحوں کے قبض کرنے کا حکم دیتا ہے، کسی ایک کی موت سوائے اس کے امر کے نہیں آتی۔

(۲) "الاذن هو التکوین والتخلیق والایجاد" "اذن کا معنیٰ ہے "تکوین، تخلیق، ایجاد" سب کا مطلب ایک ہی مراد لیا گیا ہے یعنی موت وحیات کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، کہ موت وحیات پر اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی قادر نہیں "فاذن المراد ان نفسا لن تموت الابما اماتها الله تعالی" اب مطلب یہ ہو گیا کہ کسی نفس پر موت نہیں واقع ہوتی سوائے اس کے کہ جسے اللہ تعالیٰ موت عطاء کرے۔

(۴) "الاذن" بمعنی العلم" اذن کا معنی "علم" ہے۔یعنی موت اس وقت سے پہلے نہیں آتی جو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے،"واذا جاء ذلک الوقت لزم الموت" جب وہ وقت آتا ہے تو موت کا آنا لازم ہو جاتا ہے۔یہی مضمون رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی سے زیادہ واضح ہو رہا ہے۔﴿فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ﴾"جب موت کا وقت آجاتا ہے تو ایک گھڑی اس میں نہ دیر ہوتی ہے،اور نہ ہی جلدی۔"

(۵) "الخامس"قال ابن عباس الاذن هو قضاء الله وقدره"پانچواں معنی جو حضرت ابن عباس ﷛ سے ثابت ہے کہ اذن کا معنی قضاء وتقدیر ہے،"فانه لايحدث شيء الابمشيته وارادته"یعنی اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور مشیت کے بغیر کوئی چیز واقع نہیں ہو سکتی۔اسلئے موت صرف اس کے ارادہ اور مشیت سے واقع ہو سکتی ہے۔ (ماخوذ از کبیر ج۹ ص۲۳)

﴿كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا﴾ (موت کا وقت) لکھا ہوا،مقرر ہے۔"

ایک احتمال (کتابا)

"مصدر مؤكد لماقبله اذالمعنى كتب الموت كتابا (مُؤَجَّلًا) موقتا بوقت معلوم لايتقدم ولايتاخر ولوساعة"

"کتابا" مصدر ہے،جو فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے اور تاکید کا معنی دے رہا ہے۔اب معنی واضح ہو گیا کہ "موت کا وقت لکھا ہوا ہے،اس کا وقت مقرر ہے،اس میں ایک گھڑی بھی جلدی نہیں،اور نہ ہی دیر ہے۔ (روح البیان ج ۲ ص ۱۰۵)

دوسرا احتمال: یہ ہے کہ کتابا" مصدر نہ ہو بلکہ اسم ہو،"المراد بالكتاب المؤجل الكتاب المشتمل على الآجال" اس صورت میں مطلب یہ ہوگا،کہ ہر ایک کی موت کا وقت "کتاب مؤجل" میں مذکور ہے،یعنی وہ کتاب جس میں لوگوں کی اموات کا ذکر موجود ہے۔"کتاب مؤجل" سے مراد لوح محفوظ ہے،جیسا کہ احادیث میں مذکور ہے اللہ تعالیٰ نے قلم کو حکم دیا "اکتب" لکھ۔"فكتب ماهو كائن الى يوم القيامة" تو اس نے قیامت تک ہونے والے واقعات کو لکھ دیا۔

واعلم ان جميع الحوادث لابد ان تكون معلومة لله تعالى وجميع حوادث هذا العالم من الخلق والرزق والاجل والسعادة والشقاوة لابد وان تكون مكتوبة في اللوح المحفوظ فلووقعت بخلاف علم الله لانقلب علمه جهلا ولانقلب ذلك الكتاب كذبا وكل ذلك محال،واذا كان الأمر كذلك ثبت ان الكل بقضاء الله وقدره" (کبیر ج۹ ص ۲۴)

یقینی بات ہے کہ تمام حوادث اللہ تعالیٰ کو معلوم ہیں۔اور اس جہان کے تمام حوادث خلق، رزق، اجل، نیک بختی اور بدبختی سب ہی لوح محفوظ میں لکھے ہوئے ہیں۔سب چیزیں اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں، اس کے خلاف نہیں ہوسکتیں، اگر اس کے خلاف ہوں تو اللہ تعالیٰ کے علم کا جہل ہونا لازم آئے گا، اور اس کی کتاب یعنی لوح محفوظ کا جھوٹا ہونا لازم آئے گا، یہ محال ہے، تو اسی سے یہ واضح ہوگیا کہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر میں ہیں تقدیر کی مناسب حد تک بحث نجوم الفرقان جلد دوم پہلے پارہ میں گذر چکی ہے۔

مقتول کی موت وقت مقرر پر ہے:

وظاهر الآية يؤيد مذهب اهل السنة القائلين ان المقتول ميت بأجله اى بوقته المقدر له"

جب آیۃ کریمہ میں یہ واضح کردیا گیا کہ ہر نفس کی موت وقت مقرر پر آتی ہے، وہ وقت لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے، تو اسی آیۃ کریمہ سے یہ مسئلہ بھی سمجھ میں آگیا کہ "مقتول" (جسے قتل کردیا گیا ہو) کی موت اپنے وقت مقرر پر آتی ہے، اس کی موت کا وقت یہی مقرر تھا، اگر قاتل اسے نہ قتل کرتا تب بھی اس نے اسی وقت میں مرنا تھا جس وقت میں قتل ہوا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے موت کے وقت کے مقرر ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ اس کی موت کا سبب قتل ہوگا۔

معتزلہ کا مذہب:

اس مسئلہ میں یہ ہے کہ مقتول کی موت قاتل کی وجہ سے آتی ہے، اگر قاتل اسے قتل نہ کرتا تو اس نے اس وقت نہیں مرنا تھا، اس لئے ان کا قول یہ ہے۔

"ان للمقتول اجلين احدهما القتل و الآخر الموت وانه لولم يقتل لعاش الى اجله الذى هو الموت"

کہ مقتول کی موت کے دو وقت مقرر کئے گئے، ایک قتل اور دوسرا موت کا وقت، اگر قتل نہ کیا جاتا تو اس وقت اس پر موت نہ آتی بلکہ اس پر موت دوسرے وقت میں آتی، معتزلہ نے اپنے موقف پر ان احادیث کو پیش کیا جن میں طاعات کی وجہ سے عمر کے زیادہ ہونے کا ذکر ہے۔

اہلسنت نے ان کا جواب یہ دیا ہے:

کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ﴾ جب موت کا وقت آتا ہے تو اس میں تقدیم وتاخیر (جلدی، دیر) نہیں۔ جہاں تک احادیث میں طاعات کی وجہ سے عمر کی

زیادتی کا ذکر ہے ان سے مراد یہ ہے۔

"ان الطاعة تزید فی العمر انها تزید فیما هو المقصود الاهم منه وهو اکتساب الکمالات والخیرات والبرکات"

کہ بیشک طاعت سے عمر کی مقصود چیزوں میں زیادتی ہوتی ہے، یعنی اسے کمالات کے حاصل کرنے اور خیرات وبرکات کے حاصل کرنے کی زیادہ توفیق حاصل ہوتی ہے۔ اگر عمر کی زیادتی مراد ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تقدیر میں ذکر ہوگا کہ اگر اس نے یہ طاعت نہ کی اس کی عمر چالیس سال ہوگی۔ اور اگر اس نے طاعت کی تو اس کی عمر ستر سال ہوگی، لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا گیا ہے کہ اس نے یہ طاعت ضرور کرنی ہے لھذا اس کی عمر ستر سال ہی ہونی ہے۔
(ماخوذ از روح المعانی ج ۳ ص ۷۶، ۷۷)

﴿وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا﴾

''اور جو ارادہ رکھتا ہے دنیا کے فائدہ کا ہم دیتے ہیں اس کو اس سے، اور جو شخص ارادہ رکھتا ہے آخرت کے فائدہ کا ہم دیتے ہیں اس کو اس سے۔''

غزوہ احد میں منافقین بھی شریک ہوئے تھے جن کا مقصد مال غنیمت حاصل کرنا اور شہرت حاصل کرنا تھا، اور مخلصین مؤمنین بھی شریک ہوئے تھے جن کا مقصد رب تعالی کی رضاء مندی اور خوشنودی حاصل کرنا تھا۔ ان دونوں فریقوں کا تذکرہ فرمادیا کہ جو دنیا کا نفع حاصل کرنے کیلئے حاضر ہوتے ہیں، ان کو صرف دنیا کا مال ہی دیا جاتا ہے وہ آخرت کے ثواب سے محروم ہوجاتے ہیں۔ اور جو آخرت کے ثواب کیلئے حاضر ہوتے ہیں ان کو آخرت کا ثواب دیا جاتا ہے، درحقیقت وہی لوگ کامیاب ہیں۔

۞ وعن انس بن مالک ان النبی ﷺ قال من کانت نیته طلب الآخرة جعل الله غناه فی قلبه وجمع له شمله واتته الدنیا وهی راغمة ومن کانت نیته طلب الدنیا جعل الله الفقر بین عینیه وشتت علیه امره ولایأتیها منها الاما کتب الله له،،
(رواہ ابوداود فی کتاب الزکوۃ، معالم التنزیل للبغوی ج ۱ ص ۳۵۹)

حضرت انس بن مالک ﷺ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص کی نیت آخرت کو طلب کرنے کی ہو تو اللہ تعالی اس کے دل میں غناء پیدا کر دیتا ہے، اور اسے ہمت عطاء کر دیتا ہے، اور دنیا اس کے پاس خود بخود آجاتی ہے اگر چہ وہ اس کے نزدیک حقیر ہوتی ہے، اور جس شخص کی نیت آخرت کو طلب کی ہو اللہ تعالی اس کی آنکھوں میں احتیاجی

رکھ دیتا ہے، اس کا معاملہ بکھر جاتا ہے، اسے کچھ میسر نہیں ہوتا سوائے اس کہ اللہ تعالیٰ نے اس کیلئے جو لکھ دیا ہے۔
(ماخوذ از بغوی مع حاشیہ)

❁ **عن عمر بن الخطاب ﷺ قال قال رسول الله ﷺ انما الاعمال بالنیات و انما لکل امرئی ما نوی فمن کانت ھجرته الی الله ورسوله فھجرته الی الله ورسوله ومن کانت ھجرته الی دنیا یصیبھا أو أمرأة یتزوجھا فھجرته الی ماھاجر الیه"**
(بخاری و مسلم)

حضرت عمر بن خطاب ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اعمال کا دارومدار نیات پر ہے، بیشک ہر شخص کیلئے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی، جس شخص نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی (رضامندی) کے لئے ہجرت کی، تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف ہی ہجرت ہے، اور جس شخص نے دنیا کی طرف ہجرت کی وہ اسے پائے گا یا کہ عورت کیلئے جس نے ہجرت کیلئے وہ اس سے نکاح کرلے گا، جس غرض سے وہ ہجرت کرے گا وہ اس غرض کو پائے گا۔

"فعلی السالک ان یھاجر الی الله ورسوله ویجاھد من غیر ان یخاف لومة لائم حتی یصل الی الله ویتخلص من الاضطرار"

راہ سلوک پر چلنے والوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف ہی ہجرت کریں، اور اللہ کی راہ میں جہاد کریں، کسی ملامت کرنے والے سے نہ ڈریں، تاکہ وہ اس خالص عمل کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرلیں اور اضطرار سے چھٹکارا حاصل کرلیں۔ (روح البیان ج ۲ ص ۱۰۶)

﴿وَسَنَجۡزِي ٱلشَّٰكِرِينَ﴾ اور جلدی ہی ہم جزا (بدلہ) دیں گے شکر کرنے والوں کو۔

"سنعطیھم من فضلنا ورحمتنا فی الدنیا والآخرة بحسب شکرھم وعملھم"

یعنی جلدی ہی ہم اپنے فضل اور رحمت سے ان کو ان کے شکر اور عمل کے مطابق نوازیں گے دنیا اور آخرت میں۔

خلاصہ تفسیر:

ہر انسان کی موت کا وقت مقرر ہے۔ موت وقت سے پہلے نہیں آتی، اور نہ ہی وقت مقرر سے آگے جاتی ہے، انسان اپنے اعمال میں جو نیت کرتا ہے اسی کے مطابق اسے جزاء حاصل ہوتی ہے، دنیا حاصل کرنے کی غرض سے اگر کوئی عمل کرتا ہے تو وہ دنیا کو ہی حاصل کرتا ہے، آخرت کے ثواب سے محروم ہو جاتا ہے، اور جو شخص اللہ کی رضاء کیلئے عمل کرتا ہے اور اخروی ثواب حاصل کرنے کیلئے تو اللہ تعالیٰ اسے آخرت میں ثواب عطاء فرمائے گا، کیونکہ حقیقت میں وہی اللہ

تعالیٰ کے شکر گذار ہیں۔اعمال کی دارومدار نیت پر ہے،ایک ہی عمل دومختلف نیتوں سے مختلف حیثیت اختیار کرلیتا ہے۔

"من وضع الجبهة على الارض فى صلوة الظهر والشمس قدامه فان قصد بذلك السجود عبارة الله كان ذلك من الشرف دعائم الاسلام وان قصد به عبادة الشمس كان ذلك من اعظم دعائم الكفر"

ایک شخص نے ظہر کی نماز ادا کرتے ہوئے سجدہ کیا، پیشانی کو زمین پر رکھا،سورج سامنے تھا،اگر سجدہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی نیت تو اس نے اسلام کے اعلیٰ ستون کا سہارا لیا۔اور اگر اس نے سورج کی عبادت کی نیت کی تو اس نے کفر کیا۔

اس سے واضح ہوا "ان المؤثر فى طلب الثواب والعقاب المقصود والدواعى لاظواهر الاعمال" بیشک ثواب وعذاب کے حصول میں اصل مؤثر مقصود اور حقیقی اسباب ہیں۔ظاہری اسباب حقیقی مؤثر نہیں۔
(ماخوذ از روح البیان ج۲ ص۱۰۵،۱۰۶)

خصوص مورد کالحاظ نہیں،عموم الفاظ کالحاظ ہے:

واعلم ان هذه الآية وان وردت فى الجهاد خاصة،لكنها عامة فى جميع الاعمال"

جان کہ بیشک یہ آیۃ اگرچہ جہاد کے متعلق نازل ہوئی ہے،لیکن تمام اعمال کو شامل ہے۔یعنی ہر عمل میں خصوص نیت کا اعتبار ہے ظاہری اسباب کالحاظ نہیں۔لھذا انسان کو چاہیے ہر عمل میں اللہ تعالیٰ کی رضاء ہی مدنظر ہو۔
(ماخوذ از کبیر ج۹ ص۲۵)

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ۝ (آیة ۱۴۶)

(1) اور کتنے ہی انبیاء نے جہاد کیا ان کے ساتھ بہت خدا والے تھے تو نہ سست پڑے ان مصیبتوں سے جو اللہ کی راہ میں ان پہنچیں اور نہ کمزور ہوئے اور نہ دبے اور صبر والے اللہ کو محبوب ہیں۔ (کنز الایمان)

(2) اور کتنے ہی نبیوں نے جہاد کیا، جبکہ ان کے ساتھ اللہ والے بہت تھے، تو نہ سست پڑے وہ جوان کو مصیبتیں پہنچیں اللہ کی راہ میں، اور نہ کمزور ہوئے، اور نہ وہ دبے، اور اللہ محبت کرتا ہے صبر کرنے والوں سے۔ (نجوم الفرقان)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"کَاَیِّنْ" مرکب ہے کاف مثلیہ اور ایّ سے، اس میں کثرت والا معنیٰ آ گیا، یہ کم خبریہ کے معنیٰ کو متضمن ہو گیا، کم خبریہ کی تمیز غالباً مکسور ہوتی ہے اور اس سے پہلے من آتا، لیکن کبھی من کا حذف کرنا جائز بھی ہوتا ہے، اس وقت وہ منصوب ہوتا ہے لیکن "کَاَیِّنْ" کے آخر میں نون تنوین ہوتا ہے، اس کے ہوتے ہوئے "مِنْ" کو حذف کرنا اور اضافت کی وجہ سے جر دینا جائز نہیں "ولم یجیٔ فی التنزیل الا کذا" قرآن پاک میں صرف اس ایک صورت میں استعمال ہے۔

"قاتل معه ربیون کثیر" خبر لقوله کاین لانها مبتدأ والفعل مسند الی ظاهره"

(کَاَیِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ) مبتدا ہے، اور "قاتل معه ربیون کثیر" خبر ہے۔ "قاتل" فعل کا فاعل اسم ظاہر یعنی "ربیون" ہے۔ اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا" کتنے ہی نبی (گذر گئے) کہ ان کے ساتھ ملکر جہاد کیا بہت اللہ والوں نے۔ (ضیاء القرآن میں تقریباً یہی ترجمہ بیان کیا گیا) (روح البیان بالوضاحت ج ۲ ص ۱۰۷)

لیکن اس ترجمہ میں اللہ والوں کا جہاد کرنا صراحۃً سمجھ آئے گا، اور انبیاء کرام کا ضمناً، دوسری ترکیب یہ ہے کہ قاتل کا فاعل ھو ضمیر ہو، اور حرف عطف محذوف ہو "رِبِّيُّوْنَ" معطوف ہو، "مَعَهٗ" ظرف ہو اور خبر مقدم ہو اور "كَثِيْرٌ" مبتداء مؤخر ہو، یہ جملہ مفعول فیہ ہو۔ اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا، کتنے ہی انبیاء نے جہاد کیا اور بہت تعداد میں ان کے ساتھ ملکر اللہ والوں نے (بھی) جہاد کیا۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ اسی ترکیب کے مطابق ہے، راقم نے بھی یہی نقل کیا، یہی زیادہ بہتر نظر آیا کہ اس

میں انبیاء کرام اوران کے ساتھ ملکر اللہ والوں کا جہاد کرنا "بالاصالۃ" سمجھ آئے گا، انبیاء کرام کا جہاد ضمناً نہیں بلکہ صراحۃً سمجھ آئے گا۔ ایک اور ترکیب یہ بیان کی گئی کہ "قَاتَلَ" کا فاعل ضمیر ہے، جو "مبنی" کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور "مَعَهُ رِبِّيُّونَ" حال ہے فاعل سے، اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کتنے ہی نبیوں نے جہاد کیا اس حال میں کے ان کے ساتھ اللہ والے بہت تھے۔ (بیضاوی)

"رِبِّيُّونَ" کا مطلب ہے "ربانی" "رب والے" "ربی" "راء پر تینوں حرکتیں پڑھی گئی ہیں، فتحہ، ضمہ، کسرہ۔ فتحہ اصل ہے اور کسرہ یا ضمہ تغیرات نسبیہ سے ہے، کیونکہ عرب جب کسی کلمہ کی نسبت کرتے اور آخر میں یاء نسبت لگاتے ہیں تو اس کلمہ کی حرکات کو بدل دیتے ہیں، جیسے بصری کو باء کے کسرہ سے پڑھتے ہیں۔ اور "دھری" کی دال میں تینوں حرکتیں پڑھ لیتے ہیں۔

ایک نئے فتنہ نے جنم لیا:

آجکل فتنہ باز جہلاء نے ہزاروں بزرگان دین کو جاہل بنانے کیلئے یہ شوشہ چھوڑ ہوا ہے کہ "خدا حافظ" نہ کہو بلکہ اللہ حافظ کہو، کیونکہ "خدا" اللہ تعالی کا نام نہیں۔ جب یہ لوگ یوں کہیں گے کہ "خدا" اللہ کا نام نہیں تو ان کی بات کو سننے والے یہ کہیں گے کہ سعدی، رومی، شیرازی اور اعلی حضرت رحمہ اللہ (معاذ اللہ) جاہل تھے، نہیں نہیں ایسی بات نہیں بلکہ یہ لوگ خود جاہل ہیں، کتب کو پڑھنا اور سمجھنا ان کی قسمت میں نہیں، صرف فتنہ کھڑا کرنا ان کا وتیرہ ہے، اسماء باری تعالی کی بحث نجوم الفرقان کے پہلے حصہ میں گذر چکی ہے۔ یہاں تو مختصر طور پر صرف اتنا ذکر کیا جا رہا ہے۔ کہ لفظ "خدا" کا اطلاق اللہ تعالی پر صحیح ہے۔

"فان قيل كيف صح اطلاق الموجود والواجب والقديم ونحوذلک کلفظ خدا بالفارسية ممالم يرد به الشرع"

اعتراض یہ کیا گیا کہ اللہ تعالی پر موجود، واجب اور قدیم، اور فارسی میں لفظ خدا کا اطلاق کس طرح صحیح ہے؟

قلنا بالاجماع، وقد يقال كلمة التوحيد يصح اطلاق الموجود وهو من الادلة الشرعية لانه قد ثبت بالقرآن والحديث ان الاجماع حجة اما القرآن فقوله تعالى كنتم خيرامة اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر، ولواجتمعوا على الخطاء لامروا بالمنكرونهوا عن المعروف، واما الحديث فقوله عليه السلام لاتجتمع امتى على الضلالة"

اس اعتراض کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ کہنا ہی غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ''واجب اور قدیم اور خدا'' کا اطلاق شریعت میں نہیں۔ جب ان الفاظ کا اطلاق اجماع امت سے ثابت ہے تو شریعت سے ہی ثابت ہے، کیونکہ اجماع امت شرعی دلائل اربعہ (چار) میں سے ایک دلیل ہے۔ اجماع کا دلیل شرعی ہونا قرآن پاک اور حدیث پاک سے ثابت ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾

تم بہتر ہو ان سب امتوں میں جو لوگوں میں ظاہر ہوئیں بھلائی کا حکم دیتے ہو، اور برائی سے منع کرتے ہو۔
(کنز الایمان)

اگر آپ کے علماء مجتہدین کسی خطاء پر مجتمع ہو جائیں تو وہ (معاذ اللہ) برے کاموں کا حکم دینے والے ہوں گے، اور اچھے کاموں سے منع کرنے والے ہوں گے، ایسا ہو نہیں سکتا کیونکہ یہ رب تعالیٰ کے ارشاد کے مخالف ہوگا۔ حدیث پاک میں بھی رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی واضح ہے کہ میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہوگی۔ واضح ہوا کہ لفظ ''خدا'' جس کا معنی ہے واجب الوجود'' کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر شرعی دلیل اجماع امت سے ثابت ہے۔ خیال رہے کہ لفظ خدا اصل میں خود آئی ہے'' جس کا معنی یہ ہے کہ وہ خود بخود قائم ہے، اسے کوئی قائم کرنے والا نہیں۔ (شرح عقائد مع نبراس ص ۱۷۲، ۱۷۳)

''ربیون'' کا ایک اور معنی بیان کیا گیا ہے کہ یہ ماخوذ ہے ''ربۃ'' راء کے کسرہ اور با، کی تشدید سے، اس کا معنی ہے ''جماعت'' اب معنی یہ ہوگا کتنے نبیوں نے جہاد کیا ان کے ساتھ کثیر جماعتیں تھیں۔ (روح البیان ج ۲ ص ۱۰۷)

﴿فَمَا وَهَنُوْا لِمَا أَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا﴾

''تو نہ سست ہوئے وہ جو پہنچی ہیں مصیبتیں ان کو اللہ کی راہ میں، اور نہ وہ کمزور ہوئے اور نہ وہ دبے۔''

''فَمَا وَهَنُوْا'' میں فاء عاطفہ ہے، اس کا عطف ہے، قاتل پر۔ اور اس کا معنی ہے ''فما افتروا وما انکسرت همتهم'' تو وہ نہ سست ہوئے اور نہ ان کی ہمت ٹوٹی ﴿لِمَا أَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ جو پہنچی ہیں مصیبتیں ان کو اللہ کی راہ میں'' یعنی جہاد میں جو ان کو زخم پہنچے یا اور تکالیف پہنچیں تو وہ ان کی وجہ سے سست نہیں ہوئے۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

یہ مطلب جو ابھی بیان کیا ہے یہ اس وقت ہوگا جب ''فَمَا وَهَنُوْا'' اور ''لِمَا أَصَابَهُم'' کی ضمیریں تمام ''رِبِّيُّوْنَ'' کی طرف لوٹیں، اور اگر جہاد میں شریک ہونے والے جو شہید ہو گئے ان کے بغیر جو باقی رہنے والے ہیں

ان کی طرف ضمیریں لوٹائیں تو معنی یہ ہوگا"مااعتراهم من قتل اخوانهم والخوف والحزن وغیر ذلک" تو وہ اپنے بھائیوں کی شہادت کی وجہ سے نہ سست ہوئے اور نہ ہی ان کو کوئی خوف وحزن لاحق ہوا۔ "وَمَاضَعُفُوْا"اور نہ وہ کمزور ہوئے، یعنی دشمن کے سامنے انہوں نے کوئی کمزوری نہیں دکھائی، اورنہ ہی وہ جہاد سے کمزوری دکھا کر پیچھے ہوئے، اورنہ ہی وہ دشمن سے دبے۔

"واصله استكن يستكن(باب افتعال)من السكون لان الخاضع يسكن لصاحبه ليفعل به مايريده"والالف لاشباع الفتحة"

"استکن" یستکن" باب افتعال ہے، سکون سے لیا ہوا ہے الف فتحہ کو لمبا کر کے اشباع کیلئے بنایا گیا ہے۔اس کا معنی یہ ہے کہ اپنے صاحب یعنی مدمقابل سے یوں دب کر سر جھکا کر رہے کہ وہ جو چاہے کرتا پھرے۔

اللہ والوں کی شان بیان فرمائی کہ وہ انبیا اکرام سے مل کر دشمن سے جہاد کرتے ہوئے دشمن سے کبھی دبے نہیں، دشمن کے سامنے کبھی سر جھکا کر نہیں رہے، بلکہ حقیقت یہی ہے کہ وہ سر اٹھا کر رہے، دشمن ان سے دبا رہا، دوسرا احتمال یہ ہے کہ "استکان"کون سے لیا ہوا ہو، اصل میں" استکون" تھا، اورواؤ کو الف سے تبدیل کیا گیا، معنی اس صورت میں بھی وہی ہوگا۔ جو پہلی صورت میں بیان کیا گیا۔

آیۃ کریمہ کا اشارۃً مفہوم یہ ہوا:

وهذا تعريض بما اصابهم من الوهن والانكسار عند استيلاء الكفرة عليهم والارجاف بقتل النبى ﷺ وبضعفهم عند ذلک عن مجاهدة المشركين واستكانتهم لهم حين ارادوا ان يعتضدوا بابن ابى المنافق فى طلب الامان من ابى سفيان"

"اس آیۃ کریمہ" میں جب یہ بیان کیا گیا کہ کتنے ہی اللہ والوں نے کثیر انبیاء سے ملکر جہاد کیا لیکن وہ نہ سست ہوئے، اورنہ ہی وہ کمزور ہوئے اورنہ ہی وہ دبے، تو اشارۃً صحابہ کرام کو سمجھایا گیا(کہ غزوہ احد میں کفار کے اچانک حملہ سے اوراس خبر سے کہ نبی کریم ﷺ شہید ہو گئے، تمہارے حوصلے پست ہو گئے، دشمن سے جہاد میں تم نے وقتی طور پر کمزوری دکھائی، اورتم میں منافقین اور کچھ ضعیف الاعتقاد کفار سے دب گئے جب انہوں نے یہ ارادہ کرلیا کہ وہ ابن ابی منافق سے امداد طلب کریں کہ وہ ابی سفیان سے ان کو پناہ لے کر دے) کہ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔

﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ﴾ ''اور اللہ پسند کرتا ہے صبر کرنے والوں کو۔''

یعنی جو لوگ جہاد میں دشمن کی سختیوں اور ان کی طرف سے لاحق ہونے والی مصیبتوں کو برداشت کرتے ہیں اللہ تعالی ان سے محبت کرتا ہے، انہیں پسند کرتا ہے، یعنی ان کی امداد فرماتا ہے اور ان کی قدر و منزلت کو بلند فرماتا ہے۔ (ماخوذ از روح البیان ج۲ ص ۱۰۷)

اولیاء محبوب اللہ است دان کس نیازارد حبیبش درجہان

جان لو اللہ کے ولی اللہ کے محبوب ہیں کوئی بھی ستاتا نہیں اپنے محبوب کو جہان میں۔

دینی طلباء کرام کیلئے:

''کَاَیِّنْ'' میں چار لغات ہیں:-

(۱) **ایک** تو یہی جو مشہور ہے اور اصل ہے کہ ای پر کاف داخل ہے، البتہ نون سے یہ کلمہ لکھا جاتا ہے جس سے اشارہ کیا جاتا ہے کہ یہ کلمہ دو لفظوں سے مرکب ہے، اسلئے ای کے معنی میں بھی تبدیلی ہے، یعنی کم خبریہ کے معنی کو متضمن ہے، جو کثرت کا معنی دے رہا ہے، یعنی کتنے ہی کثیر انبیاء کرام نے جہاد کیا'' خیال رہے کہ معنی سب صورتوں میں یہی رہے گا، صرف تلفظ میں تین صورتیں اور ہیں۔

(۲) **دوسری** صورت یہ ہے کہ یہ لفظ ''کَآئِنْ'' بروزن فاعل ہے۔ اصل کیئی ہے، یاء کو الف سے تبدیل کیا گیا جیسا کو ییاس میں دوسری یاء کو الف سے تبدیل کر کے یاء س بھی پڑھا جاتا ہے۔

(۳) **تیسری** صورت یہ ہے کہ یہ لفظ ''کئن'' بروزن کعن پڑھا جاتا ہے، کائن میں سے ہی تخفیف کیلئے الف حذف کر دیا جاتا ہے، باقی کئن رہ گیا۔

(۴) **چوتھی** صورت یہ ہے کہ یہ لفظ ''کَاْیِنْ'' پڑھا جاتا ہے اس کا وزن کعین ہے، جو اصل میں کیئی ہے اس میں قاعدہ تقلیب جاری کیا گیا، ہمزہ کو یاء کی جگہ اور یاء کو ہمزہ کی جگہ رکھا۔ ''وَهَنُوْا'' میں بھی تین طرح کا تلفظ ہے۔ ھا ء کے فتحہ سے، کسرہ سے اور ضمہ سے ''الوھن انکسار الجد بالخوف'' خوف کی وجہ سے کوشش میں سستی پڑ جائے تو اسے ''الوہن'' کہا جاتا ہے ''وھن الشیٔ'' سست ہونا، کمزور ہونا، اوھن باب افعال، وھن باب تفصیل کا معنی ہے ضعفتہ (عین مشدد) میں نے اسے ذرا کر سست کر دیا، کمزور کر دیا ''الواھنۃ'' ''القصیری وھی اسفل الاضلاع'' پسلیوں کے نیچے حصہ کو ''واھنۃ الاضلاع'' یا ''قصار الاضلاع'' کہا جاتا ہے۔ جب کوئی اونٹ سست

تار ہوجائے تو کہا جاتا "الوھن" یعنی "ھذا الابل وھن" یعنی یہ اونٹ سست رفتار ہو گیا۔ "الوھن ساعة تمضی من اللیل" رات کی ایک گھڑی گذر جائے تو اسے بھی "وھن" کہا جاتا ہے۔ او ھنا صرنا فی تلک الساعة (اوھنا میں نون مشدد ہے) یعنی ہم رات کی فلاں گھڑی میں گذرے۔ (القرطبی)

فائدہ جلیلہ: قال الحسن البصری وجماعة من العظماء لم یقتل نبی فی حرب قط"

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ اور دوسرے عظیم اہل علم نے یہ بیان کیا ہے کہ کوئی نبی بھی جنگ میں شہید نہیں ہوئے (تفسیر ابی السعود) وجہ اس کی یہ تھی کہ کفار انبیاء کرام کی مسلمانوں کے سامنے تذلیل نہ کریں کہ مسلمانوں کے حوصلے پست ہوجائیں۔ بنی اسرائیل کے متعلق جو ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَيَقْتُلُونَ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ﴾ وہ انبیاء کو ناحق شہید کرتے ہیں، اس سے مراد ان کا جنگ میں شہید کرنا نہیں بلکہ آگے پیچھے داؤ لگا کر شہید کرنا مراد ہے۔

فائدہ جلیلہ: رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی میں ﴿فِي سَبِيلِ اللّٰهِ﴾ کہ کثیر انبیاء کرام اور ان کے ساتھ کثیر تعداد میں اللہ والے جہاد کرتے ہیں اللہ کی راہ میں "فان کون فی سبیله عزوجل بمایقوی قلوبھم ویزیل وھنھم" اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے خود بخود دل قوی ہوجاتے ہیں اور ان کی کمزوری زائل ہوجاتی ہے۔ (تفسیر ابی السعود)

اللہ تعالیٰ کا صابرین سے محبت کرنے کا کیا مطلب؟

﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ﴾ ای علی مقاساة الشدائد ومعاناة المکارہ فی سبیل اللہ فینصرھم ویعظم قدرھم"

اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے، یعنی جو جہاد میں سختیاں برداشت کرتے ہیں، اور کفار کی طرف سے مصائب پہنچائے جانے پر اللہ کی راہ میں صبر کرتے ہیں تو اللہ ان سے محبت کرتا ہے۔ یعنی ان کی امداد کرتا ہے ان قدر و منزلت کو بڑھاتا ہے۔ محبت کا یہاں یہی معنی ہے۔

نکتہ: " والاظھار فی موضع الاضمار للثناء علیھم بحسن الصبر والاشعار بعلة الحکم"

پہلے ذکر آرہا ہے ﴿مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ﴾ اب بظاہر عقل کا تقاضا یہ ہے کہ ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّهُمْ﴾ ذکر کیا جاتا تو کافی تھا، لیکن " الصَّابِرِينَ " اسم ظاہر ذکر کیا گیا، اس کی دو وجہ ہیں ایک تو یہ کہ ان کے حسن صبر کی تعریف کرنی مقصود تھی، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ان سے محبت کرنے کی بظاہر علت سمجھ آجائے اگرچہ اللہ تعالیٰ کے افعال کسی علت سے نہ محتاج ہیں اور نہ ہی کسی علت کے تابع ہیں۔ (تفسیر ابی السعود مع الوضاحۃ)

" رِبِّيُّونَ " امعنی بیان کیا گیا ہے "اللہ والے" اللہ والے کون سے لوگ مراد ہیں، اس میں تین احتمال بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) "واخرج ابن جریر من طریق سعید بن جبیرعن ابن عباس فی قولہ ربیون کثیر قال علماء کثیرون"
ابن جریر نے حضرت ابن عباس ﷺ سے روایت ذکر کی کہ اللہ والوں سے مراد' علماء ہیں، کہ کثیر علماء انبیاء کرام کے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے، یہی مطلب عبد بن حمید، اور ابن المنذر راور ابن ابی حاتم کی روایات ''جوحضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے ہیں'' میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

(۲) "واخرج ابن جریر عن ابن زید قال الربیون الاتباع والربانیون الولاۃ" ابن جریر نے ابن زید سے روایت بیان کی کہ "رِبِّیُّوْنَ" سے مراد حکام کے متبعین ہیں، اور ربانیون سے مراد حکام ہیں۔

(۳) تیسرا احتمال جو پہلے بیان کیا گیا ہے کہ "رِبِّیُّوْنَ" کا ایک معنی کثیر جماعتیں ہیں۔ واخرج (ابن جریر) عن طریق العوفی عن ابن عباس فی قولہ "رِبِّیُّوْنَ کَثِیْرٌ" قال الربیوھم الجمیع الکثیرۃ" جریر نے ایک روایت حضرت ابن عباس ﷺ سے بیان کی کہ "رِبِّیُّوْن کَثِیْرٌ" کا مطلب بہت جماعتیں ہے۔ (درمنثور)

راقم کے نزدیک روایات میں کوئی تعارض نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ کتنے ہی کثیر تعداد میں انبیاء کرام نے جہاد کیا، ان کے ساتھ بہت اللہ والوں کی جماعتوں نے بھی جہاد کیا وہ اللہ والے علماء صلحاء اور انبیاء کی طرف مقرر کئے ہوئے عاملین (حکام) اوران کے متبعین تھے۔

خلاصہ کلام: اس آیۃ کریمہ میں مسلمانوں کو جہاد پر برانگیختہ کیا گیا۔ کہ اے مسلمانو! تم بھی اللہ کی راہ میں جہاد کرو کیونکہ کثیر تعداد میں پہلے انبیاء کرام نے جہاد کیا اوران کی معیت میں کثیر اللہ والوں نے جہاد کیا، ان کو اللہ کی راہ میں کفار کے ہاتھوں جو تکالیف پہنچیں وہ ان کی وجہ سے نہ ہی سست ہوئے اور نہ ہی کمزور اور نہ ہی کفار سے وہ دبے۔ بلکہ صبر سے کام لیا، اللہ تعالی کی محبت ان کو حاصل ہوئی کہ اللہ تعالی نے ان کی امداد فرمائی اور ان کے مدارج کو بلند کیا۔ لھذا تمیں بھی چاہئے کہ تم سست نہ پڑو، کوئی کمزوری نہ دکھاؤ، کفار سے نہ دبو، بلکہ صبر سے کام لو اللہ تعالی تمہارے ساتھ محبت کرے گا، تمیں اپنی نصرت عطاء کرے گا۔

مقام افسوس: آجکل مسلمان کفار کے سامنے سر جھکا کر وقت گذار رہے ہیں، کفار سے دبے ہوئے، کفار کے سامنے سراٹھانے کی طاقت نہیں۔ نصرانیوں کے یار بنے ہوئے ہیں، یہودیوں کے فلسطین پر ناجائز قبضہ کو ماننے کیلئے بے تاب ہیں، صحیح چچہ یہود ونصاری کومل گیا جو ہنود کا غمخوار بھی ہے اور قادیانیوں کا طرفدار بھی۔

اللھم انا نعوذبک من الیھود والنصاری وملاعقھم، اللھم اھد المؤمنین الذین یقتلون المسلمین"

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِیْۤ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ۝ (آیۃ ص ۱۴۷)

(1) اور کچھ بھی نہ کہتے تھے سوا اس دعاء کے کہ اے رب ہمارے بخش دے ہمارے گناہ اور جو زیادتیاں ہم نے اپنے کام میں کیں اور ہمارے قدم جمادے اور ہمیں ان کافر پر مدد دے۔ (کنز الایمان)

(2) اور نہیں تھا ان کا کوئی قول سوائے اس کے کہ انہوں نے کہا اے ہمارے رب بخش دے ہمارے گناہوں کو اور ہماری زیادتیوں کو جو ہمارے کاموں میں ہوئیں، اور ثابت رکھ ہمارے قدموں کو اور امداد فرما ہماری کافروں کی قوم پر۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

پچھلی آیۃ کریمہ میں اللہ والوں کی بہادری اور صبر اور سستی میں نہ پڑنے، اور کفار سے نہ دبنے کا ذکر کیا، یہ تمام چیزیں ظاہری اعضاء سے تعلق رکھتی ہیں۔ اب اس آیۃ کریمہ میں ان کا دل سے اللہ تعالی کی طرف رجوع کرنے، دعاء کرنے، رب تعالی سے بخشش طلب کرنے اور رب تعالی کی طرف جھکنے کا ذکر کیا جارہا ہے۔ (البحر المحیط)

﴿اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا﴾ عام اشیاء سے مستثنی مفرغ ہے، یعنی دشمن سے ملاقات کے وقت اور جنگ کی تنگیوں میں اور مختلف قسم کی مصیبتوں کے پہنچنے میں، اور ہر قسم کے شدائد اور ہولناکیوں میں اللہ والے لوگوں کی صرف یہی دعاء تھی اے ہمارے رب! ہماری مغفرت فرما۔ (روح البیان ج۲ص۱۰۷)

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا﴾ ''اے ہمارے رب بخش دے ہمارے گناہوں کو''

''ذُنُوْبَنَا'' الصغائر منها و الکبائر ''ذُنُوْبَنَا'' تمام صغائر اور کبائر گناہوں کو شامل ہے۔ یعنی اے ہمارے رب ہمارے تمام صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کو بخش دے۔

﴿وَاِسْرَافَنَا فِیْۤ اَمْرِنَا﴾ ''اور (بخش دے) جو زیادتیاں ہم نے اپنے کام میں کیں''

''یعنی ما اسرفنا فیه فتخطینا الی العظام من الذنوب لان الاسراف الافراط فی الشیء و مجاوزه الحدفیه''

یعنی اے ہمارے رب جو ہم نے زیادتیاں کی ہیں اپنے کاموں میں ان کو بخش دے، اس سے مراد گناہ کبیرہ ہیں کیوں کہ کسی چیز میں افراط (زیادتی) کی جائے، اور حد سے تجاوز کیا جائے تو اسے اسراف کہا جاتا ہے۔ یہ تخصیص بعد از تعمیم ہے۔ یعنی ''ذُنُوبَنَا'' میں اگرچہ تمام صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کا ذکر آچکا ہے۔ لیکن پھر ''اِسْرَافَنَا'' کہہ کر خصوصی طور پر کبیرہ گناہوں کی بخشش طلب کی۔ (ماخوذ از خازن ج ا ص ۲۹۱)

دعاء میں عجز پایا گیا ہے:

اضافوا الذنوب والاسراف الی انفسهم مع کونهم ربانیین براء من التفریط فی جنب الله هضما لها واستقصارا لهم واسنادا لما اصابهم الی اعمالهم"

اللہ والے اگرچہ گناہوں سے پاک تھے، لیکن انہوں نے چھوٹے اور بڑے گناہوں کو اپنی طرف منسوب کیا اور رب تعالیٰ سے بخشش طلب کی، جس سے اپنی عاجزی کا اظہار کیا، اور کفار کے ہاتھوں پہنچنے والی مشکلات کو اپنے اعمال کی طرف منسوب کیا۔ (روح البیان ج ا ص ۱۰۷)

پہلے مغفرت کی دعاء کی تا کہ گناہوں کے معاف ہونے کے بعد زبان پاک وصاف ہوجائے، اور اس میں مقام قبولیت آجائے، اس کے بعد دعاء کی ﴿وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا﴾ اور ثابت رکھ ہمارے قدموں کو۔

﴿وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ﴾ ''اور امداد فرما ہماری کافروں کی قوم پر''

یہ تمام دعاء مقام قبولیت میں واقع ہوئی، کیونکہ دعاء میں عجز پایا گیا ہے، پاکیزہ لوگوں کی پاکیزہ زبانوں سے دعاء نکلی جو قبولیت کے قریب تھی۔ وہ اللہ والے یہ دعاء ہمیشہ کرتے ہی رہے حالانکہ ان کی زبانوں سے کوئی ایسا جملہ نہیں صادر ہوا جس میں ان کے متزلزل ہونے اور جزع وفزع کا کوئی شائبہ بھی نہیں پایا گیا۔ ان کی یہ دعاء ہی ان کے عجز پر اور اپنے تمام امور کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنے پر دلالت کر رہی ہے۔ (روح البیان ج ۲ ص ۱۰۷)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

﴿وَمَا کَانَ قَوْلَهُمْ﴾ قول پر نصب ہے یہ ''کَانَ'' کی خبر مقدم اور ﴿اِلَّا اَنْ قَالُوْا﴾ میں ''اَنْ'' کی وجہ سے فعل مصدر کی تاویل میں ہے اسلئے وہ اسم کان ہے جو مؤخر ہے۔ اور اعم الاشیاء سے مستثنیٰ مفرغ ہے۔ (روح المعانی ج ۳ ص ۱۷۴)

تمام مترجمین نے ترجمہ میں اختصار کیا ہے، راقم نے بھی اختصار سے ہی کام لیا ہے، ورنہ روح المعانی کی ترکیب کے مطابق

مکمل ترجمہ ﴿وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا﴾کا یہ ہے۔"اور نہیں تھی کوئی چیز سوائے ان کے یہ بات کہنے کے"

دوسری قراءت: ابن کثیر اور عاصم کی روایت میں "قَوْلُهُمْ" کو مرفوع پڑھا گیا ہے کہ وہ اسم کان ہے، اور ﴿اِلَّآ اَنْ قَالُوْا﴾ خبر ہے۔اس صورت میں معنی یہ ہوا" وما كان قولهم شيئا من الاشياء الاهذا القول المبنى عن احساسن المحاسن" اور نہیں تھا ان کا قول چیزوں میں سے کوئی چیز سوائے اس قول کے جو ان کے محاسن کے کمالات کی خبر دے رہا ہے"یعنی ان کی دعاء اور ان کا عجز کتنا ہی مستحسن امر تھا۔ (ماخوذ از روح المعانی ۴ص ۷۴،۷۵)

ثابت قدمی کا ایک اور مطلب:

ایک مطلب تو پہلے بیان کر دیا گیا ہے کہ ان کی دعاء کا مطلب یہ تھا کہ اے اللہ ہمیں جنگ میں ثابت قدم رکھنا، ہم پسپا نہ ہوں، پیچھے نہ بھاگیں، اور دوسرا مطلب یہ ہے "ثبتنا على دينك الحق"ہمیں اپنے دین حق پر ثابت رکھنا۔ (روح المعانی ج۴ص ۷۵)

دعاء کیسی ہو؟ نبی کریم ﷺ کی تعلیم امت کیلئے دعاء دیکھئے، کوئی کتنا بڑا ہی کیوں نہ ہو، رب تعالی سے عجز وانکساری سے دعاء کرے۔

❁ وفی صحيح المسلم"عن ابی موسى الأشعرى عن النبى ﷺ انه كان يدعو بهذا الدعاء.﴿اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِىْ خَطِيْئَتِىْ وَجَهْلِىْ وَاِسْرَافِىْ فِىْ اَمْرِىْ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّىْ﴾
مسلم شریف میں حضرت ابو موسیٰ اشعری ﷺ نے نبی کریم ﷺ کی دعاء کا ذکر فرمایا، جو نقل کر دی گئی۔

"فعل الانسان ان يستعمل ما فى كتاب الله وصحيح السنة من الدعاء ويدع ماسواه ولايقول أختار كذا فان الله تعالى قداختار لنبيه واوليائه وعلمهم كيف يدعون"

انسان کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ قرآن پاک اور حدیث پاک میں مذکور دعاؤں میں سے کوئی دعاء کرے یہ نہ کہے کہ میرے نزدیک یہ دعاء زیادہ مختار ہے، اسلئے کہ وہی دعائیں زیادہ مختار ہیں جو اللہ تعالی نے اپنے نبی کریم ﷺ کو اور اپنے اولیاء کو سکھائی ہیں کہ یہ دعائیں تم کرو۔ (قرطبی ج۴ص ۲۳۰)

میدان جنگ میں وہی دعاء کرے جو اللہ والوں نے کی:

وفى هذا دليل على مشروعية الدعاء عندلقاء العدو وان يدعو بهذا الدعاء المعين وقدجاء فى القرآن ادعية اعقب الله بالاجابة فيها"

قرآن پاک کی زیر بحث آیۃ کریمہ سے یہ واضح ہوگیا کہ دشمن کی ملاقات پر دعاء کرنا مشروع ہے، اور دعاء بھی یہ خاص معین دعاء کرے جو اللہ والے کرتے رہے۔

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِیْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ۝﴾

اگرچہ قرآن پاک میں اور دعاؤں کا بھی ذکر ملتا ہے، لیکن جہاد کے دوران یہ خصوصی دعاء کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے بعد آنے والی آیۃ کریمہ میں اس دعاء کی قبولیت کا ذکر فرمایا گیا۔ (البحر المحیط ج ۳ ص ۱۱۱)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۝ (آیۃ نمبر ۱۴۸)

(1) تو اللہ نے ان کو دنیا کا انعام دیا اور آخرت کے ثواب کی خوبی اور نیکی والے اللہ کو پیارے ہیں۔ (کنز الایمان)

(2) تو دیا ان کو اللہ نے دنیا کا ثواب، اور آخرت کے ثواب کی خوبی، اور اللہ پسند فرماتا ہے احسان کرنے والوں کو۔ (نجوم الفرقان)

﴿فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ﴾ "تو دیا ان کو اللہ نے"

(فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ) "ای بسبب "قولهم ذلک کما تؤذن به الفاء" 'فاء سے آیۃ کریمہ کو شروع کیا گیا، فاء دلالت کرتی ہے "تعقیب مع الوصل" پر یعنی ایک کام کے اوپر دوسرا کام ساتھ ہی مرتب ہو جائے، اس لئے مطلب یہ ہوا کہ ان کی دعاء کے بعد جلدی ہی اللہ تعالیٰ نے ان کی دعاء کو قبول کر لیا۔

﴿ثَوَابَ الدُّنْيَا﴾ "دنیا کا ثواب"

ان کی دعاء کو قبول کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا کا ثواب عطاء فرما دیا، دنیا کے ثواب سے کیا مراد ہے؟ "وقال قتادة الفتح والظهور والتمكن والنصر" قتادہ نے بیان کیا ہے کہ دنیا کے ثواب کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو فتح عطاء کی، اور ان کو کفار پر غلبہ عطاء کیا، ان کو کفار پر طاقت دی اور ان کی امداد کی۔ (ثَوَابَ الدُّنْيَا) ای النصر والغنیمة قاله ابن جریج" دنیا کے ثواب کا مطلب امداد کرنا اور مال غنیمت دینا۔ (روح المعانی ج ۳ ص ۸۶)

اعتراض: ابن جریج کی تفسیر کس طرح صحیح ہے؟ جبکہ بخاری شریف میں حدیث پاک ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا"واحلت لی الغنائم ولم تحل لأحد قبلی" مال غنیمت صرف میرے لئے ہی حلال کیا گیا ہے، مجھ سے پہلے کسی ایک کیلئے حلال نہیں کیا گیا۔ پہلی امتوں میں مال غنیمت کو ایک جگہ رکھ دیا جاتا تھا، قدرتی طور پر آگ آتی اسے کھا جاتی تھی، وہ مال غنیمت جہاد میں شرکاء حضرات خود استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ ابن جریج کی تفسیر میں (ثَوَابَ الدُّنْيَا) سے مراد مال غنیمت بھی بیان کیا گیا، جبکہ ذکر پہلے انبیاء کرام کی امتوں میں سے "رِبِّيُّوْنَ"(اللہ والوں) کا ہو رہا ہے، ان کو مال غنیمت دینے کا کیا مقصد؟

جواب: واجیب بأن المال الذی فاخذه النار غیر الحیوان واما الحیوان فکان یبقی للغانمین دون الانبیاء علیهم السلام"

مال غنیمت کو آگ کھا جاتی تھی لیکن اس مال سے مراد حیوانوں کے بغیر اور مال ہے۔ حیوانوں کو آگ نہیں کھاتی تھی حیوان جہاد میں شرکاء حضرات کو بطور مال غنیمت مل جاتے تھے، اگر چہ انبیاء کرام وہ حیوان بھی حاصل نہیں کرتے تھے۔ (ماخوذ از روح المعانی ج ۳ ص ۸۶ و از البحر المحیط ج ۳ ص ۱۱۲)

﴿وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ﴾ "اور آخرت کے ثواب کی خوبی"

یعنی اللہ تعالی نے ان کی دعاء کے بعد ان کو آخرت کے ثواب کی خوبی (بھی) عطاء کی۔

"ثواب الآخرة الحسن وهو عند ابی جریج" رضوان الله تعالی ورحمته" وعند قتاده هی الجنة، وتخصیص الحسن بهذاالثواب للایذان بفضله ومزیته وانه المعتدبه عنده تعالی"

آخرت کے ثواب کے" حسن (خوبی)" سے مراد ابن جریج کے نزدیک اللہ تعالی کی رضاء مندی اور اس کی رحمت ہے۔ اور ابن قتادہ کے نزدیک اس سے مراد جنت ہے۔ البتہ آخرت کے ثواب کے ساتھ "حسن"(خوبی) کے ذکر کرنے کا یہ فائدہ ہے کہ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ ثواب ہی اللہ کے ہاں زیادہ معتبر ہے، اور اسی میں اللہ تعالی کا خصوصی فضل پایا گیا ہے، اور اسی کے ذریعے رب تعالی نے بندے کو خصوصی فوقیت عطاء کی ہے۔ (روح المعانی ج ۳ ص ۸۶)

"وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ" ای الجنة وحسنه التفضل فوق الاستحقاق" (جلالین)

ثواب آخرت سے مراد جنت ہے، اور حسن سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالی اپنے خصوصی فضل سے انہیں ان کے استحقاق سے زیادہ انعام عطاء کرے گا۔

"یعنی ان ثواب الآخرة هوالجنة وهو حسن واحسن الزیادة لهم فوق مایستحقون"

آخرت کے ثواب سے مراد جنت ہے، وہ خود ہی حسین ہے کیونکہ اس میں " حســـــن " (خوبی) موجود ہے، البتہ اللہ والوں کو ان کی دعاء کے ذریعے ان کے استحقاق سے زیادہ عطاء فرماتا جو "احسن" (بہت خوبی) ہے۔ (صاوی ج ۱ ص ۱۶۲)

فائدہ: ثواب آخرت تمام ہی حسین ہے "فما خصه الله بانه حسن من هذا الجنس فانظر كيف يكون حسنه" جس کو اللہ تعالیٰ نے حسن سے خاص کیا ہے وہ کتنا ہی زیادہ حسین ہوگا۔ ثواب دنیا کے ساتھ حسن کی قید نہیں لگائی گئی کیونکہ یہ قلیل ہے، اور دنیا میں ضرر و نقصان بھی پایا جاتا ہے، اور دنیا کا ثواب ختم بھی ہو جاتا ہے۔

دینی طلباء کے فائدہ کیلئے:

حسن جب حاء پر ضمہ ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے "خوبصورتی" اور اگر فتحہ ہو تو اس کا معنی ہوتا "خوبصورت" یعنی جس میں خوبصورتی پائی جائے۔

قال القفال رحمه الله يحتمل ان يكون الحسن (بالضمة) هو الحسن (بالفتحة) كقوله تعالى (وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا) اى حسنا"

قفال رحمہ اللہ" نے بیان کیا ہے کہ آیۃ کریمہ میں "حسن" (حاء کی پیش سے) جو ذکر ہے، معنوی لحاظ پر "حسن" (حاء کی زبر سے ہو) جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ میں "حسن" (پیش سے) "حسن" (زبر والی صورت میں) کے معنی میں ہے۔ اس میں مبالغہ پایا گیا ہے کہ آخرت کا ثواب اتنا زیادہ حسین ہے گویا کہ عین حسن بن گیا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے "فلان جود و كرم اذا كان فى غاية الجود والكرم" فلاں جود و کرم ہے۔ یعنی بہت زیادہ جود و کرم اسے حاصل ہے۔

فائدہ جلیلہ: اس سے پہلے رب تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی بیان ہو چکا ہے۔

﴿وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا﴾

"جو شخص ارادہ رکھتا ہے دنیا کے ثواب کا ہم اسے دیتے ہیں اس میں سے، اور جو شخص آخرت کے ثواب کا ارادہ رکھتا ہے ہم اسے دیتے ہیں اس میں سے۔"

اس آیۃ میں دونوں جگہ "منها" ذکر ہے۔ "من" تبعیض کیلئے ہے۔ یعنی دنیا کا بعض ثواب دیتے ہیں اور آخرت کا بعض ثواب دیتے ہیں۔ لیکن زیر بحث آیۃ کریمہ میں "مـــن" مذکور نہیں۔ وجہ فرق کیا ہے؟ وجہ فرق یہ ہے کہ جو لوگ

آخرت کے ثواب کا ارادہ رکھتے ہیں۔
"انما اشتغلوا بالعبودیة لطلب الثواب فکانت مرتبتهم نازلة" وہ عبودیت میں ثواب کی طلب کیلئے مشغول ہوتے ہیں، ان کا مرتبہ گھٹیا ہے۔ لیکن اس زیر بحث میں جن اللہ والوں کا ذکر ہے۔
"فانهم لم یذکروا فی انفسهم الا الذنب والقصور" انہوں نے اپنے نفسوں کا سوائے گناہوں اور قصور کے ذکر نہیں کیا، یہی مراد ان کی اس دعاء میں ہے۔

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا﴾
"اے ہمارے رب ہمارے گناہوں اور ہمارے کاموں میں ہمارے حد سے تجاوز کی بخشش فرما۔"

"ولم یروا التدبیر والنصرة والاعانة الا من ربهم" اور انہوں نے تدبیر اور نصرت و اعانت کو صرف اپنے رب سے طلب کیا، ان کی دعاء، ﴿وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ﴾ کا یہی مطلب ہے۔
"فکان مقام هؤلاء فی العبودیة فی غایة الکمال" لہذا ان لوگوں کو مقام عبودیت میں بہت کمال حاصل ہے۔
"فلا جرم اولئک فازوا ببعض الثواب وهؤلاء فازوا بالکل" اسی وجہ سے یقیناً وہ لوگ جن کا ذکر پچھلی آیۃ کریمہ میں ہے وہ بعض ثواب حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے، وہ جن لوگوں کا ذکر اس آیۃ کریمہ میں ہے وہ کل ثواب حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے یعنی ان کو اللہ تعالیٰ کی مکمل رضاء مندی اور رحمت حاصل ہوگئی۔

"وایضا اولئک ارادوا الثواب وهؤلاء ماارادوا الثواب وانما ارادوا خدمة مولاهم فلاجرم اولئک حرموا وهؤلاء اعطوا لیعلم ان کل من اقبل علی خدمة الله اقبل علی خدمته کل ماسوی الله"

اور وجہ فرق یہ ہے کہ جن لوگوں کا پچھلی آیۃ کریمہ میں ذکر ہے انہوں نے ثواب کا ارادہ کیا اس لئے وہ مکمل ثواب حاصل کرنے سے محروم رہے، اور جن لوگوں کا اس آیۃ کریمہ میں ذکر ہے انہوں نے ثواب کا ارادہ نہیں کیا، بلکہ اپنے مولی کی خدمت کا ارادہ کیا اس لئے ان کو مکمل ثواب عطاء کیا گیا تا کہ معلوم ہو جائے کہ ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کی خدمت (عبادت) میں مشغول ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کے سواء تمام مخلوق اس کی خدمت میں مشغول ہوتی ہے۔ (کبیر ج۹ ص۲۹)

﴿وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ "اور اللہ محبت کرتا ہے احسان کرنے والوں پر"
نبی کریم ﷺ نے احسان کی وضاحت فرمائی جبکہ جبریل نے آپ سے پوچھا "ما الاحسان یارسول

اللہ" یارسول اللہ احسان کیا ہے؟ تو آپ نے اسے جواب دیا"ان تعبد الله کانک تراہ" تم اللہ کی عبادت کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو۔اس مقام میں مفسر بن کرام نے دو معنی بیان کئے ہیں ایک بندے اور رب تعالیٰ کے درمیان جو طاعت پائی جاتی ہے یہ اسے لازم پکڑتا ہے، یعنی کامل مطیع اور کامل عبادت گذار ہوتا ہے، اور دوسرا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے نبی کے ساتھ ثابت قدم رہے کہ یا تو ہم شہید ہو جائیں گے یا غالب ہو جائیں گے، اس سے پہلے ہم نبی کا ساتھ چھوڑ کر کہیں بھاگ کر نہیں جائیں گے، میدان جنگ سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ (البحر المحیط ج ۳ ص ۱۱۲)

دقیقہ لطیفہ: جب بندے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں اور رب تعالیٰ کے حضور عرض کرتے ہیں۔

﴿رَبَّنَا اغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَاِسۡرَافَنَا فِیۡۤ اَمۡرِنَا﴾ تو اللہ تعالیٰ ان کا نام محسن رکھ دیتا ہے کہ یہ محسن ہیں۔گویا کہ رب تعالیٰ کی طرف سے اس بندے کو یوں نداء دی جاتی ہے

"اذااعترفت باساء تک وعجزک فانا اصفک بالاحسان واجعلک حبیبا لنفسی حتی تعلم انه لاسبیل للعبد الی الوصول الی حضرة الله الاباظهار الذلة والمسکنتو العجز"

کہ اے میرے بندے جب تو نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا ہے اور اپنے عجز کا تو نے اظہار کر دیا ہے تو میں تجھے احسان کا وصف عطاء کر رہا ہوں، اور تجھے اپنا حبیب بنا رہا ہوں، تا کہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور مقبولیت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب انسان اپنے آپ کو کمتر سمجھے اور مسکینی اختیار کرے اور عجز اختیار کرے، اور وجہ ان کو محسنین کہنے کی یہ ہے کہ جب انہوں نے جہاد میں ثابت قدم رہنے کی اور دشمن کے خلاف امداد حاصل کرنے کی دعاء رب تعالیٰ سے کی تو ان کو اللہ تعالیٰ نے صفت احسان عطاء کی۔

"وهذا يدل على ان العبد لايمكنه الاتيان بالفعل الحسن الااذا اعطاه الله ذلك الفعل واعانه عليه"

تو اسی سے واضح ہو گیا کہ بندہ کو اچھا فعل عمل میں نہیں لاسکتا جب تک اللہ تعالیٰ اسے وہ فعل عطاء نہ کرے اور اس کی امداد نہ کرے۔جب اللہ تعالیٰ نے ان کو محسن ہونا قرار دیا تو اس پر جزاء یہ مرتب فرمائی کہ اے میرے بندو جب تم احسان کرنے والے ہو یعنی میری طاعت وعبادت کو لازم پکڑنے والے ہو تو میں تمہیں اپنی محبت سے نواز رہا ہوں کہ تم میرے محبوب ہو، یعنی بندوں کو جب احسان حاصل ہوتا ہے تو رب تعالیٰ بھی ان پر احسان فرماتا ہے۔رب تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ کرم پر یہ لازم کیا۔

﴿هَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ﴾ " کہ احسان کی جزاء نہیں سوائے احسان کے۔"

"وکل ذلک یدل علی انه سبحانه هو الذی یعطی الفعل الحسن للعبد ثم انه یثیبه علیه لیعلم العبد ان الکل من الله وباعانة الله"

اس تمام بحث سے یہ پتہ چلا کہ اللہ تعالی بندے کو فعل حسن عطاء کرتا ہے، پھر اس اچھے فعل پر اسے اللہ تعالی جزاء عطاء فرتا ہے، تا کہ بندے کو معلوم ہو جائے کہ سب کچھ اللہ تعالی کی توفیق اور اس کی امداد سے حاصل ہے۔ (کبیر ج۹ ص ۲۹،۳۰)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ "وضع المظهر موضع المضمر للاشعار بانهم هم المحسنون"

یہاں اسم ظاہر "مُحْسِنِيْنَ" ذکر کیا، ضمیر نہیں ذکر کی یوں نہیں کیا "وَاللّٰهُ يُحِبُّهُمْ" کہ اللہ ان سے محبت کرتا ہے، اس لئے کہ ضمیر لانے کی صورت میں اتنا تو پتہ چل جاتا کہ اللہ تعالی نے "رِبِّيُّوْنَ" (اللہ والوں) کو دنیا کا ثواب اور آخرت کے ثواب کی خوبی عطاء کی اور اللہ ان سے محبت کرتا ہے، لیکن اس سے یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ وہ احسان کرنے والے بھی ہیں۔ لیکن جب اسم ظاہر ذکر کیا تو یہ بہت واضح ہو گیا کہ وہ اللہ والے محسن ہیں اور اللہ تعالی محسنین سے محبت کرتا ہے۔ (تفسیر مظہری ج۲ ص ۱۵۳)

محبت کے حاصل ہونے سے تمام نیک بختیاں حاصل ہو جاتی ہیں:

"ومحبة الله للعبد عبارة عن رضاء عنه و اراد الخیریة فهی مبدأ لکل سعادة"

اللہ تعالی کی محبت بندے کو حاصل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بندے کو رب تعالی کی رضاء حاصل ہو جاتی ہے اور اللہ تعالی اسے خیر و بھلائی عطاء فرماتا ہے، اللہ تعالی کی رضاء و محبت اور اس کی طرف سے ارادہ خیر سے ہر طرح کی سعادت حاصل ہو جاتی ہے۔

والصبر والاحسان من صفات الله تعالی والله تعالی یحب صفاته ویحب من تخلق بصفاته ولهذا قال "﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ،وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾

صبر و احسان حقیقت میں اللہ تعالی کی صفات ہیں، اللہ تعالی اپنی صفات کو پسند فرماتا ہے، اسی طرح جو شخص اللہ تعالی کی صفات سے متصف ہو اسے بھی اللہ تعالی پسند فرماتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالی نے فرمایا ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ اور اللہ محبت رکھتا ہے احسان کرنے والے سے۔

لما زاد لخواص عباده کرامة التخلق باخلاقه ابتلاهم بقتال العدو ولبتهم عند الملاقاة فاستخرج من معادن ذواتهم جواهر صفاته المکنونة فیها المکرمة بهابنو آدم"
جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خاص نعموں سے نوازنے کا ارادہ فرماتا ہے یعنی ان کو اپنی صفات سے متصف کرنا چاہتا ہے تو ان کو میدان جنگ میں آزماتا ہے جب وہ وہاں ثابت قدم رہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو اسطرح نکھار کر مکرم بنادیتا ہے جیسے معدنیات سے جواہر کو نکھار کر نکالا جائے۔ (ماخوذ از روح البیان ج ۲ ص ۱۰۷)

❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِیْعُوا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یَرُدُّوْكُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِیْنَ ۝ (آیۃ نمبر ۱۴۹)

(1) اے ایمان والو اگر تم کافروں کے کہے پر چلے تو وہ تمہیں الٹے پاؤں لوٹادیں گے پھر ٹوٹا کھا کے پلٹ جاؤ گے۔ (کنز الایمان)

(2) اے ایمان والو اگر تم نے اطاعت کی کافروں کی وہ لوٹا دیں گے تمہیں الٹے پاؤں تو تم پھروگے نقصان اٹھاتے ہوئے۔ (نجوم الفرقان)

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِیْعُوا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾
"اے ایمان والو اگر تم نے اطاعت کی کافروں کی۔"

شانِ نزول میں چند احتمال ہیں:

(۱) ابن جریر اور ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے ابن جریج سے روایت کی کہ یہ آیۃ نازل ہوئی کہ" لاتنتصحوا الیهود والنصاری عن دینکم ولاتصدقوهم بشیئ فی دینکم" اے ایمان والو تم یہود و نصاری سے اپنے دین کے متعلق کوئی نصیحت قبول نہ کرو، اور نہ ہی اپنے دین کے متعلق ان کی کسی چیز میں تصدیق کرو ورنہ وہ تمہیں دین سے پھیر دیں گے۔ (درمنثور ج ۷ ص ۸۳)

(۲) وقال علی رضی الله عنه یعنی المنافقین قولهم للمؤمنین عندالهزیمة ارجعوا الی اخوانکم وادخلوا فی دینهم" (معالم التنزیل للبغوی ج ۱ ص ۳۶۰، مظهری ج ۲ ص ۱۵۳)

شان نزول:

کے متعلق دوسرا قول حضرت علی ﷛ کا ہے کہ منافقین نے جب ایمان والوں کو کہا کہ تم پسپا ہو گئے، کفار نے اچانک تم پر حملہ کر کے تمہیں بہت بڑا نقصان پہنچادیا ہے، لھذا تم اپنے بھائیوں (کفار قریش) کی طرف لوٹ جاؤ، اور ان کے دین میں داخل ہو جاؤ، اگر محمد نبی ہوتے تو شہید نہ ہوتے، یہ اس وقت کی بات ہے جب شیطان نے یہ خبر اڑائی تھی کہ محمد شہید کر دیئے گئے۔ منافقین مشورہ دے رہے تھے کہ عبداللہ بن ابی کے پاس چلو تا کہ وہ سفارش کر کے ابوسفیان سے تمہیں امان لے کر دے، تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

﴿يَرُدُّوكُم عَلَى أَعْقَابِكُم﴾ "وہ لوٹا دیں گے تمہیں الٹے پاؤں۔"

حقیقت میں لغوی معنی یہ ہے کہ وہ لوٹا دیں گے تمہیں ایڑیوں کے بل، مرادی ترجمہ وہی ہے جو ذکر کر دیا گیا۔ مطلب اس کا یہ ہے "یرجعوکم الی ماکنتم علیه قبل الاسلام عن الشرک" کہ وہ تمہیں شرک کی طرف لوٹا دیں گے، جہاں تم اسلام سے پہلے تھے۔

﴿فَتَنقَلِبُوا خَاسِرِينَ﴾ "تو تم پھرو گے نقصان اٹھاتے ہوئے۔"

یعنی اگر (بالفرض) تم نے کافروں کی اطاعت کر لی، ابوسفیان سے پناہ حاصل کر لی تو تم دنیا اور آخرت میں نقصان اٹھانے والے ہو گے، اس طرح تم نقصان اٹھاتے ہوئے دین اسلام سے کفر و شرک کی طرف پھر جاؤ گے۔
(تفسیر مظہری ج ۲ ص ۱۵۳، ۱۵۴)

تنبیہ: واعلم ان اللفظ لما کان عاما وجب ان یدخل فیه خسران الدنیا والآخرة" (کبیر ج ۹ ص ۳۱)

﴿فَتَنقَلِبُوا خَاسِرِينَ﴾ میں لفظ خاسرین عام ہے، لھذا اس کی عمومیت (عام ہونے) کو دیکھتے ہوئے ضروری ہے کہ اس سے مراد دنیا اور آخرت کا خسارا مراد لیا جائے کہ تم لوٹو گے دنیا اور آخرت کا خسارا اٹھاتے ہوئے۔

دنیا و آخرت کا خسارا کتنا عظیم ہے:

اما خسران الدنیا فلأن اشق الاشیاء علی العقلاء فی الدنیا الانقیاد للعدد والتذلل له واظهار الحاجة الیه، واما خسران الآخرة فالحرمان عن الثواب

المؤبد والوقوع فی العقاب المخلد" (کبیر ج ۹ ص ۳۱)

اگر تم نے کفار کی تابعداری کی تو تم دین اسلام سے کفر کی طرف پھر جاؤ گے اور بہت نقصان اٹھاتے ہوئے پھرو گے اس لئے کہ تم اپنے دشمن کے سامنے سر جھکاؤ گے، اس کے سامنے عجز کا اظہار کر کے اپنے آپ کو ذلیل کرو گے۔ اور اپنی حاجات کا ذکر اپنے دشمن سے کرو گے، اس سے اپنی حاجات طلب کرو گے تو اس سے بڑھ کر دنیا میں تمہیں خسارا کیا حاصل ہوگا؟ ہر عقلمند شخص اسے اپنے لئے بہت بڑا نقصان سمجھتا ہے۔ اور آخرت کا خسارا تمہیں یہ حاصل ہوگا کہ تم دائمی ثواب سے محروم ہو جاؤ گے اور ہمیشہ کے عذاب میں مبتلاء ہوگا۔

فائدہ: آیۃ کریمہ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ کفار، یہود و نصاری سے اپنی حاجات طلب کرنا، ان کے سامنے سر جھکانا، ان کے سامنے عاجز ہو کر رہنا، ان سے ڈرنا سوائے دنیا اور آخرت کے خسارا کے کچھ نہیں۔ کبھی ان کو کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ کاش کہ اسلامی ممالک کے حکمرانوں کے قرآن پاک کی یہ آیۃ کریمہ سمجھ آجائے، اور کفار سے دوستی قائم کر کے جو خسارا حاصل کر رہے ہیں اس سے بچ سکیں، لیکن افسوس یہ سر جھکاتے ہی چلے جا رہے ہیں، یہود و نصاری سے بڑھ کر ان کے پیچھے اسلام کو نقصان پہنچانے کیلئے پیش پیش ہیں، لیکن جس چیز کی رب تعالی حفاظت کر رہا ہو اسے کون مٹا سکتا ہے۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰكُمْ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ (آیۃ نمبر ۱۵۰)

(1) بلکہ اللہ تمہارا مولی ہے وہ سب سے بہتر مددگار ہے۔ (کنز الایمان)

(2) بلکہ اللہ مددگار ہے تمہارا اور وہ سب سے بہتر مدد فرمانے والا ہے۔ (نجوم الفرقان)

اعلی حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ نے "**مَوْلٰكُمْ**" کا ترجمہ تمہارا مولا" کیا تا کہ مفسرین کرام کے بیان کئے ہوئے تمام معانی کو شامل ہو جائے۔

(بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰكُمْ) محبکم وناصرکم وحافظکم علی دینه فلاتتولوا غیره تعالی"

(مظہری ج۲ ص ۱۵۵)

بلکہ اللہ تمہارا مولی ہے، یعنی وہ تمہارے ساتھ محبت رکھتا ہے۔ وہ تمہارا مددگار ہے، وہ تمہاری حفاظت کرنے والا ہے تمہیں اپنے دین پر قائم رکھ کر، لھذا تم اللہ تعالی سے اس کے غیروں کی طرف نہ پھرو یعنی دین اسلام پر قائم

رہو۔"والمعنی لیس الکفار اولیاء فیطاعوا فی شئ بل الله مولاکم" مطلب یہ ہے کہ کافر تمہارے ولی، مددگار، حامی وناصر نہیں کہ تم ان کی اطاعت کرو، ان کی اطاعت نہ کرو، بلکہ تمہارا مولی اللہ ہے تم اس کی اطاعت کرو۔

"وقرأ الحسن بنصب الجلالة علی معنی بل اطیعوا الله لأن الشرط السابق یتضمن معنی النهی ای لاتطیعوا الکفار فتکفروا بل اطیعوا الله مولاکم"

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے لفظ "الله" پر نصب (زبر) پڑھی ہے، اور فعل "اَطِیْعُوْا" کو محذوف مانا ہے کہ پہلے مذکور شرط ﴿اِنْ تُطِیْعُوا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَرُدُّوْکُمْ عَلٰی اَعْقَابِکُمْ﴾ سے یہ سمجھ آرہا ہے کہ یہاں بھی نہی پائی گئی ہے معنی یہ ہے کہ کافروں کی اطاعت نہ کرو، ان کی اطاعت کرنے سے کافر ہو جاؤ گے، بلکہ اللہ تعالی کی اطاعت کرو وہی تمہارا مولی ہے۔ (البحر المحیط ج۳ ص۱۱۲)

﴿وَھُوَ خَیْرُ النّٰصِرِیْنَ﴾ "وہ سب سے بہتر مدد فرمانے والا ہے۔"

اللہ تعالی سب سے بہتر مددگار کیوں ہے؟ اسلئے کہ "انه تعالی هو القادر علی نصرتک فی کل ماترید" اللہ تعالی قادر ہے، تم اس سے جو مدد طلب کرو وہ تمہاری امداد فرماتا ہے، کیونکہ وہ تمہاری امداد فرمانے پر قادر ہے، اس کی قدرت سے کوئی بعید نہیں۔ سب سے بہتر مددگار ہونے کی اور وجہ یہ ہے "وهو العالم الذی لایخفی علیه دعاؤک وتضرعک" کہ اللہ تعالی ہر ظاہر وباطن کو جانتا ہے، اس لئے تمہاری دعاء اور تمہاری عاجزی اس سے چھپی ہوئی نہیں، تم جو دعا کرتے ہو اور اپنی عاجزی پیش کرتے ہو اللہ تعالیٰ، سے جانتا ہے اور وہ تمہاری امداد فرماتا ہے۔

سب سے بہتر مددگار ہونے کی اور وجہ یہ ہے "هو الکریم الذی لایبخل فی جوده" کہ اللہ تعالی کریم ہے، وہ جواد ہے اسے بخل حاصل نہیں، وہ جتنا چاہے عطاء کرے اس کے خزانہ میں کوئی کمی نہیں۔ بعض انسان اگرچہ دوسروں کی امداد کرتے ہیں لیکن ان کی امداد کو اللہ تعالی کی امداد سے کیا نسبت ہو سکتی ہے ان کی قدرت وعلم وسخاوت کو جب رب تعالی کی قدرت وعلم وجود کے مقابل کچھ نسبت حاصل نہیں تو یقیناً بندوں کی مدد دوسرے بندوں کی بنسبت رب تعالی کی امداد کے کمترین رہتی ہے۔

اور وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالی دنیا اور آخرت میں امداد فرماتا ہے، بندوں کو ذاتی طور پر خود بخود یہ طاقت حاصل نہیں۔ (اگرچہ انبیاء کرام اور صلحاء کو شفاعت کرنے کا حق یوم آخرت کو دیا جائے گا لیکن وہاں بھی حقیقی امداد رب تعالی کی طرف سے حاصل ہوتی ہے۔ اور وجہ یہ ہے کہ رب تعالی بندوں کی حاجات کو جانتا ہے وہ ان کو سوال سے پہلے ہی عطاء کر دیتا ہے، بندوں کو یہ طاقت حاصل نہیں۔ (ماخوذ از کبیر ج۹ ص۳۱)

لھذا اے انسان تو اپنے گناہوں کی معافی صرف اللہ تعالی سے ہی طلب کر، معاف کرنے کی صرف اسے ہی طاقت حاصل ہے۔

کنوں بایدت عذر تقصیر گفت | نہ چوں نفس ناطق زگفتن بخفت

اب تجھے چاہئے کہ تو اپنے گناہوں کا عذر پیش کر | اس وقت (کوئی فائدہ) نہیں کہ تیری زبان بولنے سے بند ہو جائے

تو پیش از عقوبت در عفو کوب | کہ سودے ندارد فغان زیر چوب

تو سزا سے پہلے معافی کا دروازہ کھٹکا | اس وقت شور کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا جب ڈنڈہ تیرے سر پر پڑ رہا ہوگا

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَالَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّمَاْوٰىهُمُ النَّارُ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ○ (آیۃ نمبر ۱۵۱)

(1) کوئی دم جاتا ہے کہ ہم کافروں کے دلوں میں رعب ڈالیں گے کہ انہوں نے اللہ کا شریک ٹھہرایا جس پر اس نے کوئی سمجھ نہ اتاری اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور کیا برا ٹھکانا ناانصافوں کا۔ (کنزالایمان)

(2) عنقریب ہم ڈالیں گے کافروں کے دلوں میں رعب اس وجہ سے کہ انہوں نے شریک ٹھہرایا اللہ سے (اسے) کہ نہیں نازل ہوئی اس (کے شریک ہونے) پر کوئی حجت، اور ان کا ٹھکانا آگ ہے، اور کتنا ہی برا ٹھکانا ہے ناانصافوں کا (نجوم الفرقان)

شان نزول:

❁ واخرج ابن ابی حاتم عن ابن عباس فی هذه الآیة قال قذف الله فی قلب ابی سفیان الرعب فرجع الی مکة فقال النبی ﷺ ان اباسفیان قداصاب منکم طرفا وقد رجع وقذف الله فی قلبه الرعب"

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس آیۃ کریمہ کا شان نزول یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالی نے ابوسفیان کے دل میں رعب ڈال دیا ہے، نبی کریم ﷺ صحابہ کرام کو بتایا کہ ابوسفیان کو تمہارا خوف لاحق ہوگیا

اور اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں رعب ڈال دیا، اسی لئے وہ مکہ کی طرف لوٹ گیا۔ (درمنثور ج۲ص۸۳)

ابن جریر نے سدی سے تفصیلی روایت ذکر کی ہے:

❁ "اخرج ابن جریر عن السدی قال لما ارتحل ابو سفیان والمشرکون یوم احد متوجھین نحو مکة انطلق ابو سفیان حتی بلغ بعض الطریق ثم انھم ندموا فقالوا بئسما صنعتم انکم قتلتموھم حتی لم یبق الا الشرید ترکتموھم ارجعوا فاستأصلوا فقذف اللہ فی قلوبھم الرعب فانھزموا فلقوا اعرابیا فجعلوا له جعلا فقالوا له ان لقیت محمد افاخبرھم بماقد جمعنالھم، فاخبر اللہ رسوله ﷺ فطلبھم حتی بلغ حمراء الاسد فانزل اللہ فی قلوب الذین کفروا الرعب الآیة" (درمنثور ج۲ ص۸۳)

"ابن جریر" نے سدی روایت ذکر ہے کہ جب ابوسفیان اور دوسرے مشرکین غزوہ احد سے مکہ کی طرف لوٹے، ابوسفیان نے راستہ میں چلتے ہوئے کہا اور۔ تھ ہی دوسرے مشرکین بھی کہنے لگے، وہ سب بظاہر پشیمان ہو رہے تھے، اور ایک دوسرے کو کہہ رہے تھے، تم نے بہت ہی برا کیا ہے کہ مسلمانوں کو تم نے قتل تو کیا ہے لیکن بہت ان میں سے بکھرے ہوئے تھے جن کو تم نے قتل نہیں کیا وہ باقی رہ گئے ہیں، اس لئے واپس چلو ان کا مکمل صفایا کردو، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا وہ بھاگ گئے، اس طرح حقیقت میں شکست انہیں ہی ہوئی، حالانکہ وہ پہلے ایک اعرابی کو کہہ رہے تھے کہ محمد کو مل کر بتاؤ کہ ہم ایک مرتبہ پھر تم پر جمع ہو کر مقابلہ کر رہے ہیں۔ ادھر رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو خبر دے دی آپ نے بھی اپنے ان صحابہ کو جو غزوہ احد میں شریک ہوئے تھے اور زخمی بھی تھے، ساتھ لیا کفار کا پیچھا کیا، جب نبی کریم ﷺ مقام حمراء میں پہنچے تو یہ آیۃ کریمہ ﴿سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ﴾ نازل ہوئی۔ تو وہ رعب میں آ گر ڈر کے مارے بھاگ گئے۔ خیال رہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو اس خاص موقع پر نازل کیا، لیکن یہ اپنے مضمون کے لحاظ پر عام ہے، یعنی کافر ہمیشہ ہی مسلمانوں سے ڈرتے ہی رہیں گے۔ (خازن)
البتہ یہ ضروری ہے کہ مسلمان ان کے مقابلہ کیلئے نکلیں، تو ان شاءاللہ کافر ہر میدان سے دم دبا کر بھاگ جائیں گے۔

❁ واخرج مسلم عن ابی ھریرة ان رسول اللہ ﷺ قال نصرت بالرعب علی العدد" (درمنثور ج۲ص۸۳)

مسلم شریف میں حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دشمن پر رعب ڈال کر میری امداد فرمائی گئی۔

❁ واخرج احمد والترمذی وصححه وابن المنذر وابن مردویه والبیھقی فی سننه عن

ابی امامة ان رسول الله ﷺ قال فضلت علی الانبیاء باربع ارسلت الی الناس کافة وجعلت لی الارض کلها ولأمتی مسجدا وطهورا فاینما رجل أدرکه من أمتی الصلوة فعنده مسجده وعنده طهوره ونصرت بالرعب مسیرة شهر یقذفه فی قلوب اعدائی واحل لنا الغنائم" (درمنثور ج ۲ ص ۸۳)

''ابوامامہ'' فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے انبیاء پر چار چیزوں سے فضیلت دی گئی مجھے تمام لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا، اور میرے لئے اور میری امت کیلئے تمام زمین کو مسجد اور مطہر (پاکیزہ کرنے والی) بنا دیا گیا، میری امت میں سے جہاں بھی کسی شخص نے نماز کے وقت کو پالیا وہاں ہی (وہ زمین) اس کیلئے مسجد ہے۔ اور وہاں ہی اس کیلئے پاکیزہ کرنے والی چیز (یعنی مٹی موجود ہے) اور ایک مہینہ کی راہ سے میرے دشمنوں کے دلوں میں رعب ڈال کر میری امداد کی گئی، اور مال غنیمت میرے لئے حلال کر دیا گیا۔

ان دونوں روایات سے بھی عموم سمجھ آتا ہے، کیا یہ عموم صرف نبی کریم ﷺ کیلئے تھا یا آپ کی امت کو بھی یہ شرف حاصل ہے کہ کافروں کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈال دیا گیا؟ راقم کے نزدیک یہ حکم عام ہے جو امت مصطفیٰ کریم ﷺ کو بھی حاصل ہے۔ ''الرعب'' عین کے سکون سے ہے، البتہ عامر اور کسائی کی قراءت میں عین کے پیش سے پڑھا گیا ہے۔

''وھما لغتان'' یہ دونوں لغتیں ہیں جو جائز ہیں۔ ''رعب'' میں مصدری معنی بھی پایا جاتا ہے ''رعبتہ رعبا'' میں نے اس پر رعب ڈالا۔ اس طرح جو رعب میں آجائے اسے مرعوب کہا جاتا، اور ''رعب'' میں اسمی معنی بھی پایا جاتا ہے، یعنی ''خوف'' کو رعب کہا جاتا ہے۔ ''والرعب الاسم واصله من الملء'' رعب کا اصل میں معنی ہے بھر دینا۔ کہا جاتا ہے ''سیل راعب یملأ الوادی'' ندی وادی کو بھر رہی ہے۔ ''رعبت الحوض، ملأته'' میں نے حوض کو بھر دیا ہے۔ خوف اور فزع کو اس لئے رعب کہا جاتا ہے کہ یہ مشرکین کے دلوں کو خوف سے بھر دیتا ہے۔

اب ﴿سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ﴾ کا معنی ہوگیا ''سنملأ قلوب المشرکین خوفا وفزعا'' ہم عنقریب مشرکوں کے دلوں کو خوف اور فزع سے بھر دیں گے۔ (قرطبی ج ۴ ص ۲۳۲)

تنبیہ: القاء حقیقی معنی کے لحاظ پر اجسام سے متعلق ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشادات گرامی میں ہے ''والقی الالواح'' (اور ڈال دیا تختیوں کو) اور ارشادات باری تعالیٰ ہے ﴿فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِیَّهُمْ﴾ (تو انہوں نے اپنی رسیاں اور عصاء ڈالے) اور ذکر ہے ﴿فَاَلْقٰی مُوْسٰی عَصَاهُ﴾ (تو ڈالا موسیٰ نے اپنا عصا) القاء کا مجازی معنی دلوں

میں کسی چیز کو ڈال دینا جیسا کہ اسی زیر بحث میں ہے ﴿سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ﴾ عنقریب ہم ڈال دیں گے کافروں کے دلوں میں رعب" اسی طرح اور ارشاد باری تعالی ﴿وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ﴾ میں نے تجھ پر اپنی طرف کی محبت ڈالی، یعنی موسی علیہ السلام کی محبت لوگوں کے دلوں میں ڈالی، یہی وجہ تھی کہ فرعون نے موسی علیہ السلام کی وجہ سے بنی اسرائیل کے ہزاروں بچوں کو قتل کر دیا، لیکن موسی علیہ السلام کو اپنے گھر پالا، کیونکہ فرعون کے دل میں بھی آپ کی محبت کو ڈال دیا گیا تھا۔

﴿بِمَا اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ﴾ "اس وجہ سے کہ انہوں نے شریک ٹھہرایا اللہ سے۔"

﴿مَالَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ﴾ "ای باشراكه وقيل بعـدته" یعنی کفار جسے اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں اس کے شریک ہونے اور اس کے معبود ہونے پر کوئی دلیل) اللہ تعالی نے نہیں اتاری (روح المعانی) یعنی مشرکین نے کئی معبود بنا رکھے ہوتے ہیں، وہ اس میں حیران ہوتے ہیں کہ کسی کی عبادت کریں اور کسی کی عبادت نہ کریں، ان کے معبودوں پر ان کے پاس کوئی عقلی اور نقلی دلیل موجود نہیں تھی، ان کا حال تو یہ تھا کہ ایک پتھر خوبصورت دیکھا تو اس کی پوجا شروع کر دی اور جب اس سے زیادہ خوبصورت اور کوئی پتھر نظر آیا تو پہلے بت کو پھینک کر نئے بت کی پوجا کرنے لگ گئے۔

(سلطانا) "حجة وبيانا وعذرا وبرهانا" یعنی نہیں نازل ہوئی اس کے شریک ہونے اور معبود ہونے پر کوئی حجت و دلیل، اور نہ ہی نازل ہوا اس پر کوئی بیان، اور نہ ہی نازل ہوا ان پر کوئی عذر اور نہ ہی برھان۔ "انه حجة الله عزوجل" کہ وہ اللہ تعالی کی حجت دلیل ہے زمین میں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے "انه ذو الحجة" کہ بادشاہ صاحب حجت و دلیل ہے کہ وہ اپنے فیصلے دلائل سے کرتا ہے، اسی لئے اسے سلطان کہا جاتا ہے۔ "قال الزجاج انه من السليط الذی يضاء به السراج وهو دهن السمسم" زجاج نے کہا ہے کہ "سلطان" ماخوذ ہے سلیط سے، سلیط اس چیز کو کہتے ہیں جس سے چراغ روشن کیا جاتا ہے۔ اگرچہ چراغ میں استعمال ہونے والا کوئی تیل بھی ہو اسے سلیط کہا جاتا ہے۔ تاہم زیادہ طور پر اس کا اطلاق تلوں کے تیل پر ہے۔ جیسا کہ امرؤ القیس نے کہا ہے" اما السليط بالذبال المفتل "اس نے بٹی ہوئی بتی پر تیل انڈیلا" فالسلطان يستضاء به فی اظهار الحق وقمع الباطل" اس معنی کے لحاظ پر بادشاہ کو سلطان کہنے کی وجہ یہ ہے کہ بادشاہ کے ذریعے حق کے اظہار اور باطل کے مٹانے کی روشنی حاصل کی جاتی ہے۔ "وقيل للامراء سلاطين لانهم الذين بهم يتوصل الناس الى تحصيل الحقوق" اس معنی کے لحاظ پر بادشاہوں کو سلاطین کہنے کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح چراغ سے راہ کو تلاش کیا جاتا ہے اسی طرح بادشاہوں کے ذریعے لوگ اپنے حقوق حاصل کرتے ہیں۔

قال الليث "السلطان القدرة لأن اصل بنائه من التسليط، وعلى هذا سلطان الملك قوته وقدرته"

لیث نے بیان کیا ہے کہ سلطان کا معنی قدرت ہے، یہ لیا ہوا ہے تسلیط سے جس کا معنی ہے قدرت، اس معنی کے لحاظ پر بادشاہ کی قوت وقدرت کو بھی سلطان کہا جاتا ہے۔" قال ابن درید السلیط الحدید، والسلاطة "لو ہے کو سلیط کہا جاتا ہے۔اور آلات کی تیزی کو حدة کہا جاتا ہے۔اسی معنی کی مناسبت سے یوں کہا جا سکتا ہے" السلطان یقهر بالسلطان علی السلطان" بادشاہ طاقت سے دوسرے بادشاہ پر قہر کرتا ہے اور دبدبہ ڈالتا ہے۔" والسلیطة المراة الصخابة والسلیط الرجل الفصیح اللسان" چلانیوالی عورت کو سلیطہ کہا جاتا ہے۔اور فصیح اللسان شخص کو سلیط کہا جاتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر ج۹ ص۳۳، قرطبی ج۴ ص۲۳۲)

اعتراض: رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا﴾ نہیں نازل کی اس پر کوئی حجت، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حجت نہ ہو، ہوسکتا ہے کہ حجت تو ہو لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے اتارا نہ ہو اور ظاہر نہ کیا ہو۔

جواب: "لو کان لانزل الله به سلطانا فلما لم ینزل به سلطانا وجب عدمه"

اگر دلیل ہوتی تو اللہ تعالیٰ ضرور نازل فرماتا، جب اس نے کوئی دلیل نازل نہیں کی تو اس کا مطلب واضح ہے کہ کافروں کے معبودوں اور ان کے شریک ٹھہرانے پر حقیقت میں کوئی دلیل ہی نہیں۔

وحاصل الکلام فیه مایقوله المتکلمون ان هذا ممالادلیل علیه فلم یجز اثباته ومنهم من یبالغ فیقول لادلیل علیه فیجب نفیه"

حاصل کلام اس میں جو متکلمین نے بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس پر کوئی دلیل نہیں لھذا اسے ثابت کرنا جائز نہیں۔بعض حضرات نے اس پر زیادہ مبالغہ کرتے ہوئے یوں کہا ہے کہ جس پر دلیل نہیں اس کی نفی واجب ہے۔ (کبیر ج۹ ص۳۳)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

قضیہ سالبہ وجود موضوع کو نہیں چاہتا، یعنی ضروری نہیں کہ موضوع موجود ہو پھر اس سے نفی کی جائے، موضوع موجود نہ ہو اور اس سے نفی کرنا صحیح ہے، جیسا کہا جائے "شریک الباری لیس بمستحق العبادة" شریک باری تعالیٰ مستحق عبادت نہیں، اس جملہ کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی شریک باری تعالیٰ ہے کہ ہم اس کی عبادت نہیں کرسکتے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کی کوئی رب تعالیٰ کا نہ شریک ہے اور نہ ہی عبادت کے مستحق ہے۔اسی طرح کہا جاتا ہے "ولاتری الضب بها ینحجر" تو گوہ کو بل میں گھستے ہوئے نہیں دیکھ رہا "فالمراد نفیهما جمیعا" یہاں مراد دونوں چیزوں کی نفی ہے، یعنی نہ گوہ ہے اور نہ ہی وہاں بل (سوراخ) ہے۔

"وذکر عدم انزال الحجة مع استحالة تحققها من باب انتفاء المقید لانتفاء قیده اللازم ای لاحجة حتی ینزلها"

یہاں آیۃ کریمہ میں جو حجت کے نازل نہ کرنے کا ذکر ہے اس سے حجت کے پائے جانے کی بھی نفی کی جارہی ہے، یہ اسی طرح ہے جیسا کہ قید بھی "منتفی" ہو اور قید بھی "منتفی" ہو۔لھذا یہاں مطلب یہ ہے کہ حجت ہے ہی نہیں کہ اسے اتارا جائے۔ (ماخوذ از روح المعانی ج۳ص۸۸)

رب تعالیٰ کی شرکت پر حجت کا پایا جانا محال ہے:

یہ دین کا مسئلہ بدیہی ہے کہ رب تعالیٰ کا نہ ہی کوئی شریک ہی اور نہ ہی اس کی شرکت پر کوئی دلیل قائم ہے۔شرکت پر دلیل کا پایا جانا محال ہے۔

"امافی الاشراک بالربوبیة وظاهر اذکیف یأمر الله سبحانه باعتقاد ان خالق العالم اثنان مشترکان فی وجوب الوجود والاتصاف بکل کمال"

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی ربوبیت میں شرکت کی اجازت دی جائے یہ محال ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ہی حکم دے کہ تم عقیدہ رکھو کہ جہان کے خالق دو ہیں اور واجب الوجود ہونے میں اور تمام کامل صفات کے حاصل کرنے میں وہ برابر شریک ہیں۔واضح ہوا کہ رب تعالیٰ کی شرکت پر کوئی حجت نہیں تھی کہ اسے نازل کیا جاتا۔

واما الاشراک فی الالوهیة الذی علیه اکثر المشرکین فی عهد رسول الله ﷺ فلانه یفضی الی الأمر باعتقاد اشیاء خلاف الواقع مما کان المشرکون یعتقدونهم فی اصنامهم"

رب تعالیٰ کی الوہیت (اس کے معبود ہونے) میں شرکت محال ہے، کیونکہ مشرکین کا بتوں کی پوجا کرنا خلاف واقع چیز کا اعتقاد تھا جو باطل ہے۔واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے شریک ہونے کے تمام احتمالات باطل ہیں۔لھذا شرکت پر نہ کوئی حجت تھی نہ ہی اسے نازل کیا گیا۔ (ماخوذ از روح المعانی ج۳ص۸۸)

صانع صرف ایک ہے:

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر یہ دلیل قائم کی گئی "لا سبیل الی اثبات الصانع الا باحتیاج المحدثات الیه" صانع وہی ہو سکتا ہے کہ تمام محدثات (تمام مخلوق) اس کے محتاج ہو، جب ساری کائنات محتاج صرف رب تعالیٰ کی ہے تو اسی سے پتہ چل گیا کہ صانع صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، (ماخوذ از کبیر ج۹ص۳۳)

کاش کہ جہلاء علامہ رازی رحمہ اللہ کے قول کو سمجھتے:

ھذہ الآیۃ دالۃ علی فساد التقلید وذلک لان الآیۃ دالۃ علی ان الشرک لادلیل علیہ فوجب ان یکون القول بہ باطلا"

اس آیۃ کریمہ سے پتہ چلا کہ تقلید کا قول فاسد ہے۔ کیونکہ آیۃ کریمہ سے واضح ہورہا ہے کہ رب تعالی کے شریک کے پائے جانے پر کوئی دلیل نہیں، اس لئے ضروری ہے کہ شریک ٹھہرانے پر دلیل کے قائم ہونے کا اگر کوئی دعوی کرے تو اس کا قول باطل ہوگا اور اس کی تقلید بھی باطل ہوگی۔ (کبیر ج۹ ص۳۳)

علامہ رازی رحمہ اللہ کے اس قول سے بعض لوگ مطلقا تقلید کی نفی کرتے ہیں، اور کہتے یہ ہیں کہ علامہ رازی رحمہ اللہ بھی تقلید کی نفی کرتے ہیں۔ یہ قول ان لوگوں کا باطل ہے، کیونکہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے تقلید کی نفی کے دو قول مختلف جگہ پر بیان کئے ہیں، ایک یہ کہ اعتقادیات میں تقلید نہیں۔ اور دوسرا قول جو یہاں بیان کیا ہے کہ جس چیز کا باطل ہونا صریح ہو اس کی تقلید نہیں، جیسا کہ رب تعالی کا شریک ٹھہرانا باطل ہے اور اس پر کوئی دلیل قائم کرنا بھی باطل ہے، لھذا اس کی تقلید بھی نہیں کی جاسکتی، تیسرا قول جو نجوم الفرقان" میں پہلے ہی بیان کیا جاچکا ہے کہ فروع میں تقلید ہے۔ یہی تین قول بفضلہ تعالی ہمارا مسلک ہے۔ لھذا ضروری ہے کہ اہل علم کے اقوال کو سمجھا جائے۔ (راقم)

﴿وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ﴾ "اور ان کا ٹھکانا آگ ہے۔"

یعنی مشرک جہنم کی آگ میں رہیں گے، یہی ان کا ٹھکانا ہوگا، اس سے پہلے اللہ تعالی نے مشرکوں کے دنیا کے حال کو بیان کیا، ﴿سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ﴾ (کہ ہم عنقریب کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے) اب ان کے اخروی حال کو بیان کیا جارہا ہے، "وھی ان ماواھم ومسکنھم النار" کہ ان کا ٹھکانا، ان کا مسکن جہنم کی آگ ہوگا۔

﴿وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ﴾ "کتنا ہی برا ٹھکانا ہے ظالموں کا۔"

یہاں مخصوص بالذم محذوف ہے، اور وہ نار (آگ) ہے، یعنی" آگ ظالموں کا کتنا ہی برا ٹھکانا ہے۔ یہاں اسم ظاہر کو لایا اسم ضمیر کو نہیں۔ تاکہ ان کا ظالم ہونا واضح طور پر ذکر ہوجائے اور ان کا مستحق آگ ہونے کا سبب بھی معلوم ہو جائے، کہ آگ ان کا ٹھکانا ہوگی، جو بہت برا ٹھکانا ہوگا ان کا، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ظالم ہیں، ظالم کا حق یہی ہے کہ ان کو سخت عذاب دیا جائے۔

(ماخوذ از مظہری ج۳ ص۱۵۴)

﴿مَأْوٰی﴾ اور ﴿مَثْوٰی﴾ میں فرق:

(مَـأْوٰی) لیا ہے اوی یأ وی اویا واواء (ض) گھر میں اترنا، اور گھر میں ٹھکانا لیا'' کبھی اس کا معنی'' کسی پر رحم کرنا، نرم دل ہونا، ترس کھانا'' بھی آتا رہتا ہے، لیکن اس وقت مصدر ''اویۃ'' آتا ہے۔ (مَثْوٰی) لیا ہوا ہے، ثوی یثوی ثواء (ض) سے، اس کا معنی کسی جگہ ٹھہرنا، آباد ہونا اور کسی آدمی کا مرنا ''اثوی'' ٹھہرنا، کسی کی مہمانی کرنا ''اثواہ'' کسی کو ٹھہرانا۔ (مثوی ظرف مکان ہے) اب فرق واضح ہوگیا کہ ماوی میں آباد ہونا، اور مستقل ٹھہرنا لازم نہیں، بلکہ صرف گھر میں اترنا اور گھر میں ٹھکانا لینا مراد ہے، لیکن مثوی میں ٹھکانا بنانا لازم ہے، یہی وجہ ہے کہ (مَـأْوٰی) کو پہلے ذکر کیا، وہ عام ہے اور (مَثْوٰی) کو بعد میں ذکر کیا وہ خاص ہے۔ (ماخوذ از المنجد، والبحر المحیط ج ۳ ص ۱۱۵)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ حَتّٰى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (آیۃ نمبر ۱۵۲)

(1) اور بیشک اللہ نے تمہیں سچ کر دکھایا اپنا وعدہ جبکہ تم اس کے حکم سے کافروں کو قتل کرتے تھے یہاں تک کہ جب تم نے بزدلی کی اور حکم میں جھگڑا ڈالا اور نافرمانی کی بعد اس کے کہ اللہ تمہیں دکھا چکا تمہاری خوشی کی بات تم میں کوئی دنیا چاہتا تھا اور تم میں کوئی آخرت چاہتا تھا پھر تمہارا منہ ان سے پھیر دیا کہ تمہیں آزمائے اور بے شک اس نے تمہیں معاف کر دیا اور اللہ مسلمانوں پر فضل کرتا ہے۔ (کنز الایمان)

(2) اور تحقیق سچ کر دکھایا تمہیں اللہ نے اپنا وعدہ جب تم قتل کر رہے تھے ان کو اس کے حکم سے یہاں تک کہ تمہاری رائے ضعیف ہوگئی اور تم نے جھگڑا کیا امر میں، اور نافرمانی کی تم نے اس کے بعد کہ اس نے دکھایا تمہیں جو تم پسند کرتے تھے، تم میں بعض وہ ہیں جو دنیا کا ارادہ رکھتے تھے اور تم میں سے

بعض وہ ہیں جو آخرت کا ارادہ رکھتے تھے، پھر اس نے پھیر دیا تمہیں ان سے تا کہ تمہیں آزمائے اور تحقیق معاف کر دیا اس نے تمہیں اور اللہ فضل فرمانے والا ہے مومنوں پر۔ (نجوم الفرقان)

مختصر مطلب:

اللہ تعالیٰ کا ایمان والوں سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے یہ وعدہ ہے۔

﴿وَلَاتَهِنُوْا وَلَاتَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (سورۃ آل عمران، آیۃ نمبر ۱۳۹)

''اور نہ سستی کرو اور نہ غم کھاؤ تمہیں غالب آؤ گے اگر ایمان رکھتے ہو۔'' (کنز الایمان)

اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ غزوہ احد میں بھی سچا کر دیا کہ مؤمنین کافروں کو رب تعالیٰ کے حکم اور اس کے فضل سے قتل کر رہے تھے، جسے وہ پسند کرتے تھے یعنی فتح کو وہ ابتدائی طور پر مکمل کامیابی حاصل کر لی یہاں تک کہ مال غنیمت جمع کرنے لگے، لیکن صحابہ کرام سے اجتہادی خطاء ہوگئی کہ نبی کریم ﷺ سے کئے ہوئے وعدہ میں اور آپ کے اس حکم میں کہ تم نے اس درہ کو نہیں چھوڑنا خواہ ہمیں فتح حاصل ہو یا نہ ہو، اس میں صحابہ کرام اختلاف کرنے لگے کچھ نے کہا اب فتح ہو چکی ہے مال غنیمت جمع کیا جا رہا ہے اس لئے ہمیں بھی مال غنیمت جمع کرنے میں شریک ہو جانا چاہئے۔ وہ مال غنیمت جمع کرنے کیلئے درہ چھوڑ آئے، لیکن کچھ حضرات نے کہا ہم درہ نہیں چھوڑیں گے کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں درہ نہ چھوڑنے کا حکم دیا ہے۔ اس اختلاف پر اور درہ کے خالی ہونے پر کفار کو اچانک حملہ کرنے کا موقع مل گیا، جس سے صحابہ کرام ادھر ادھر بکھر گئے گویا کہ ان سے ضعف رائے واقع ہوئی۔

اس کی وجہ یہی تھی کہ درہ میں کھڑے ہوئے تیر اندازوں نے دنیا کا مال حاصل کرنے کا ارادہ کر لیا، کہ وہ مال غنیمت جمع کرنے کی غرض سے درہ کو چھوڑ آئے، اگرچہ حضرت عبداللہ بن جبیر اور ان کے دس ساتھی (رضی اللہ عنہم) آخرت کے ثواب کا ارادہ رکھتے ہوئے اپنی جگہ جمے رہے اور شہید ہو گئے، لیکن انتالیس حضرات کے درہ چھوڑنے کی وجہ معاملہ الٹ ہو گیا۔ رب تعالیٰ نے ایمان والوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ نے تمہیں کفار سے پھیر دیا کہ پہلے تم ان پر غالب آ رہے تھے لیکن اب وہ تم پر چھا رہے تھے جس کی وجہ سے رب تعالیٰ نے تمہیں ان سے پھیر دیا یعنی تم ادھر ادھر بکھر گئے، یہ درحقیقت تمہاری آزمائش تھی کہ اس حال میں ایمان پر کون قائم رہتا ہے اور کون نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد تمہیں معاف کر دیا کہ تم ایمان پر قائم رہے، اللہ تعالیٰ ایمان والوں پر فضل فرمانے والا ہے۔

اس آیۃ کا ماقبل سے تعلق اور شان نزول:

اس میں چند وجوہ پائی گئی ہی۔

(۱) جب نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام غزوہ احد سے مدینہ طیبہ کی طرف لوٹے حال یہ تھا کہ ستر صحابہ کرام شہید ہو چکے تھے اور کثیر تعداد میں شدید زخمی تھے، اس کیفیت کو دیکھتے ہوئے راستہ میں "قال ناس من اصحابه من این اصابنا هذا وقد وعدنا الله النصر فانزل الله هذه الآية" بعض صحابہ کرام نے یہ کہا کہ ہمیں یہ مصیبت کہاں سے پہنچ گئی حالانکہ رب تعالیٰ نے ہمارے ساتھ امداد کا وعدہ فرمایا تھا، تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی، کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی امداد کا وعدہ سچا کر دیا تھا، تمہیں کامیابی عطاء کر دی تھی لیکن تم اپنی غلطی کی وجہ سے آزمائش میں مبتلاء ہو گئے۔

(۲) بعض حضرات نے اور وجہ یہ بیان کی کہ نبی کریم ﷺ نے خواب دیکھا کہ ایک دنبہ ذبح کیا جا رہا ہے، "فصدق الله رؤياه بقتل طلحة بن عثمان صاحب لواء المشركين يوم احد وقتل بعده تسعة نفر على اللواء" تو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے اس خواب کو سچا کر دیا کہ مشرکوں کا علمبردار طلحہ بن عثمان احد کے دن قتل ہو گیا، اور اس کے بعد مشرکوں کے نو شخص قتل ہو گئے جو ان کے علمبردار تھے، نبی کریم ﷺ کے اس خواب کے سچا ہونے کے متعلق نازل فرمایا ﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ﴾ تحقیق سچ کر دیا اللہ نے جو تمہارے ساتھ وعدہ کیا تھا۔

(۳) جائز ہے کہ اس وعدے سے مراد، اللہ تعالیٰ کا قول ہو ﴿وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ﴾ البتہ ضرور بر ضرور اللہ تعالیٰ اس کی امداد کرے گا جو اس کے دین کی امداد کرے گا۔ رب قدوس نے اپنے وعدہ کو مشروط کر دیا کہ جو اس کے دین یا اس کے رسول ﷺ کی امداد کرے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی امداد کرے گا، رب تعالیٰ نے اپنے اس وعدہ کو سچا کر دیا کہ جب تک تم رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق درہ میں کھڑے رہے تم ہی کافروں کو قتل کرتے رہے، لیکن جب آپ کے حکم خلاف تم درہ سے ہٹ گئے تو تم پسپا ہو گئے۔

(۴) اور اس سے مراد وہ وعدہ ہے جو ساتھ ہی پہلی آیۃ کریمہ میں بیان کیا گیا ﴿سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ﴾ عنقریب ہم ڈال دیں گے کافروں کے دلوں میں رعب" اب اس آیۃ کریمہ کو نازل کر کے یہ بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ سچا کر دیا کہ کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دیا کہ وہ بھاگ کر چلے گئے۔ (ماخوذ از کبیر ج ۲ ص ۳۴)

"صدق" دومفعولوں کی طرف متعدی ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے "صدقتہ الوعد والوعید" میں نے فلاں سے کئے ہوئے وعدہ یا وعید کو سچا کر دیا۔ آیۃ کریمہ میں ایک مفعول "کم" ضمیر ہے، اور دوسرا مفعول "وعدہ" ہے۔ اصل میں ﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ﴾ کا یہ ہے کہ تحقیق سچا کر دیا تمہارے ساتھ اللہ نے اپنا وعدہ"

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ اور پیر محمد کرم شاہ بھیروی الازہری رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے "سچ کر دکھایا" **راقم** نے بھی یہی نقل کیا، یہ صرف اردو محاورہ ہے ورنہ دکھایا کسی لفظ کا معنیٰ نہیں۔ ﴿اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ﴾ جب تم قتل کر رہے تھے ان کو اس (رب تعالیٰ) کے حکم سے "حسہ" (ن) حسا (بالفتحہ) قتل کرنا، جڑ سے اکھیڑ دینا۔ آیۃ کریمہ میں یہی معنیٰ لیا گیا ہے، اس کے اور بھی کئی معانی ہیں "حس البرد الزرع" سردی کا کھیتی کو مار دینا، جلا دینا "حسّ" (ض) حسا (بالفتحۃ) الشئ، معلوم کرنا۔ حس (س ض) حسا (بالفتحہ و بالکسر) بالخبر یقین کرنا، معلوم کرنا۔ (المنجد بالاختصار)

(بِاِذْنِهٖ) ای بعلمه" اللہ کے علم سے۔ (ای بتیسیرہ و توفیقه" اللہ کے آسان کرنے سے اور اس کی توفیق سے۔

(روح المعانی)

﴿اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ﴾ ای تقتلونهم ذریعا بقضاء الله" جب تم ان کو قتل کر رہے تھے اللہ کے حکم سے۔

(معالم التنزیل للبغوی)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ بغوی رحمہ اللہ کے مطابق ہے، **راقم** نے بھی یہی معنیٰ نقل کیا ہے۔ مختصر مطلب جو بیان کیا گیا ہے۔ اس سے مسئلہ کافی حد تک سمجھ آ چکا ہے، تاہم کچھ وضاحت کی جا رہی ہے۔

وصدق الوعد هو انهم هزموا المشركين اولا وكان المشركون فى ثلاثة آلاف ومعهم مائتا فرس والمسلمون فی سبعمائة رجل"

اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں سے امداد کا کیا ہوا وعدہ سچا کر دیا کہ شروع میں مشرکوں کو مسلمانوں نے شکست دی حالانکہ مشرکین کی تعداد تین ہزار تھی، ان کے پاس دو سو گھوڑے تھے، لیکن مؤمنین کی تعداد سات سو تھی، کیونکہ تین سو کی تعداد میں منافقین بھاگ آئے تھے۔

"ومعنى تحسونهم" تقتلونهم وكانوا قتلوا من المشركين اثنين وعشرين رجلا"

﴿اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ جب تم قتل کر رہے تھے، ابتدائی طور پر صحابہ کرام نے بائیس مشرکین کو قتل کر دیا تھا۔ (البحر المحیط ج ۳ ص ۱۱۵)

﴿حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ﴾ "یہاں تک کہ تمہاری رائے جب ضعیف ہو گئی۔"

﴿حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ﴾ ای جبنتم وضعفتم وقيل معناه ضعف رايكم وملتم الى الغنيمة

فان الحرص من ضعف العقل"

ایک معنی ﴿حَتّٰى اِذَا فَشِلْتُمْ﴾ کا وہی علامہ قاضی مظہری رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے جو اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے کنز الایمان سے نقل کیا جا چکا ہے یہاں تک کہ تم بزدل ہو گئے، ضعیف ہو گئے۔ لیکن دوسرا معنی جو بیان کیا گیا راقم کو اس سے زیادہ اتفاق ہو رہا ہے، شان صحابہ کے مطابق بہت خوب ہے، وہ یہ ہے "یہاں تک کہ تمہاری رائے ضعیف ہو گئی اور تم غنیمت کی طرف مائل ہو گئے، بیشک عقل کے ضعف کی وجہ سے ہی حرص و لالچ آتی ہے۔ (مظہری ج ۲ ص ۱۵۴)

﴿وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ﴾ "اور جھگڑا کیا تم نے حکم میں۔"

(فِى الْاَمْرِ) ای امر النبی ﷺ بالمقام فی سفح الجبل للرمی فقال بعضکم نذهب فقد نصر اصحابنا، وبعضکم لانخالف امر النبی"

اور تم نے جھگڑا کیا امر میں' اس امر سے مراد نبی کریم ﷺ کا پچاس تیر اندازوں کو پہاڑ کے درہ میں کھڑا کر کے یہ ارشاد فرمانا تم نے یہاں سے ہٹنا نہیں، نبی کریم ﷺ کے اس امر میں انہوں نے اختلاف کیا جب مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی تو بعض حضرات نے کہا کہ ہمارے اصحاب کو فتح حاصل ہو چکی ہے، اب ہمیں ان کے ساتھ مل کر مال غنیمت جمع کرنا چاہئے، اور بعض حضرات نے کہا کہ ہم تو نبی کریم ﷺ کے امر کی مخالفت نہیں کر سکتے، ہم تو یہاں ہی کھڑے رہیں گے۔

﴿وَعَصَيْتُمْ﴾ "اور تم نے نافرمانی کی۔"

"وَعَصَيْتُمْ" امرہ ﷺ فترکتم المرکز لطلب الغنيمة" اور تم نے نبی کریم ﷺ کے حکم کی نافرمانی کی کہ مرکز کو چھوڑ دیا، مال غنیمت حاصل کرنے لگے۔ یہاں مرکز سے مراد پہاڑ کا درہ جس پر نبی کریم ﷺ نے تیر انداز لوگوں کو کھڑا کیا تھا، نبی کریم ﷺ نے اپنے لشکر کو پانچ حصوں میں تقسیم فرمایا، ایک کو آگے کھڑا کیا، اور ایک کو پیچھے، اور ایک کو بائیں، اور ایک کو درمیان میں، یہی جو درمیان میں تھے ان کو ہی پہاڑ کے درہ میں کھڑا کیا تھا اور ان کو وہاں سے نہ ہٹنے کا حکم دیا تھا۔

﴿مِنْ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ﴾ "اس کے بعد کہ اس نے دکھایا تمہیں وہ جسے تم پسند کرتے تھے۔"

یعنی تمہیں پسند تھا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری امداد کرے اور تمہیں کامیابی عطاء کرے، ابتدائی طور پر اللہ تعالیٰ نے تمہیں کامیابی عطاء کر دی اور تمہاری امداد فرما دی، لیکن تم نے نبی کریم ﷺ کے امر میں اختلاف کر کے اور اس کی نافرمانی کر کے اپنے آپ میں ضعف رائے قائم کر دیا جس کی وجہ سے معاملہ الٹ ہو گیا۔ (ماخوذ از جلالین وصاوی ج ۱ ص ۱۶۳)

واقعہ احد کی ابتداء میں احادیث بیان کی جا چکی ہیں، تاہم اس مقام میں دوبارہ درمنثور اور ابن کثیر میں بخاری اور مسند امام احمد سے کچھ روایات بیان کی گئی ہیں، انہیں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے یہاں بخاری کی ایک روایات کو دوبارہ ذکر کیا جا رہا ہے۔

❁ عن البراء قال لقينا المشركين يومئذ واجلس النبی ﷺ جيشا من الرماة وامر عليهم (عبد الله بن جبير) وقال لا تبرحوا ان رأيتمونا ظهرنا عليهم فلاتبرحوا، وان رايتموهم ظهروا علينا فلاتعينونا، فلما لقيناهم هربوا حتى رأيت النساء يشتددن فى الجبل رفعن عن سوقهن قدبدت خلاخلهن فاخذوا يقولون الغنيمة الغنيمة فقال عبدالله بن جبير عهد الى النبی ﷺ ان لاتبرحوا فأبوا فلما أبوا صرف وجوههم فاصيب سبعون قتيلا فأشرف ابو سفيان فقال أفى القوم محمد فقال لاتجيبوه، فقال أفى القوم ابن ابى قحافة قال لاتجيبوه فقال أفى القوم ابن الخطاب، فقال ان هؤلاء قتلوا فلو كانوا احياء لأجابوا، فلم يملك عمر نفسه فقال له كذبت ياعدو الله ابقى الله لك مايحزنک، قال أبو سفيان اعلى هبل، فقال النبی ﷺ أجيبوه، قالوا ماتقول؟ قال قولوا "الله اعلى وأجل" قال ابو سفيان لنا العزى ولاعزى لكم، فقال النبی ﷺ أجيبوه، قالوا ما نقول؟ قال قولوا الله مولنا ولا مولى لكم، قال ابو سفيان يوم بيوم بدر والحرب سجال، وستجدون مثلة لم آمر بها ولم تسؤنى" (بخاری غزوۂ احد)

حضرت براء ﷺ فرماتے ہیں ہمارا مشرکوں سے آمنا سامنا ہوا اس دن (یعنی غزوہ احد کے دن) اور نبی کریم ﷺ نے تیراندزوں کو ایک جگہ پر بٹھا دیا (یعنی پہاڑ کے درہ میں ان کو قائم کر دیا) اور ان پر ایک شخص (عبداللہ بن جبیر) کو امیر مقرر دیا، اور ان کو ارشاد فرمایا یہاں سے ہٹنا نہیں۔ اگر تم ہمیں دیکھو کہ ہم ان پر غالب آ رہے ہیں تو یہاں سے نہ ہٹنا، اگر تم انہیں ہم پر غالب ہوتے ہوئے دیکھو تو ہماری امداد نہ کرنا۔ (راوی کہتے ہیں) جب ہم ان سے ملے تو وہ (کفار) بھاگ گئے، یہاں تک کہ میں نے ان کی عورتوں کے اپنی پنڈلیوں سے کپڑے چڑھا کر ان کو پہاڑ کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا، ان کی پازیبیں نظر آ رہی تھیں، (اب انہوں نے درے پر کھڑے صحابہ کرام نے) کہنا شروع کیا غنیمت، غنیمت (یعنی مال غنیمت جمع کرنے میں شریک ہو جاؤ) تو حضرت عبداللہ بن جبیر نے کہا مجھ سے نبی کریم ﷺ نے وعدہ لیا ہوا ہے تم یہاں سے نہ ہٹنا، تو ان حضرات نے انکار کر دیا، جب انہوں نے (وہاں قائم رہنے سے) انکار کر دیا، تو ان کو اللہ نے ان کافروں سے پھیر دیا، یعنی وہ ادھر ادھر بکھر گئے، اور ستر صحابہ کرام شہید ہو گئے، ابوسفیان نظریں اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگا اور کہنے لگا کیا اس قوم میں محمد ہیں؟ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اسے کوئی جواب نہ دو پھر اس نے کہا کیا اس قوم میں

ابن ابی قحافہ (ابوبکر) ہیں، تو آپ نے فرمایا اسے کوئی جواب نہ دو، پھر کہنے لگا کیا اس قوم میں عمر ہیں۔ پھر خود ہی کہنے لگا بیشک یہ سب لوگ قتل ہو گئے، اگر زندہ ہوتے تو جواب دیتے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کی بات سن کر صبر نہ رکھ سکے، آپ نے فرمایا اے اللہ کے دشمن ان سب کو اللہ تعالیٰ نے زندہ رکھا ہوا ہے جو تجھے غم میں ڈالتے رہیں گے، ابوسفیان نے کہا اے ہبل بلند ہے (ہبل ان کے بت کا نام تھا، یعنی ہبل کو بلندی حاصل رہے) تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اب اسے جواب دو، صحابہ کرام نے پوچھا اسے کیا جواب دیں، تو آپ نے فرمایا تم اسے یہ کہو "الله اعلی و اجل" اللہ ہی بلند اور بزرگ ہے۔ پھر ابوسفیان نے کہا ہمارا (معبود) عزیٰ ہے، تمہارا کوئی عزیٰ نہیں۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم اسے جواب دو، صحابہ کرام نے پوچھا ہم اسے کیا جواب دیں؟ تو آپ نے فرمایا یہ کہو "الله مولنا ولا مولی لکم" اللہ ہمارا مولیٰ ہے، تمہارا کوئی مولیٰ نہیں۔ ابوسفیان نے کہا آج کا دن بدر کے دن کا بدلہ ہے، لڑائی باری باری ہے، تم (اپنے مقتولوں میں) مثلہ پاؤ گے (حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اس نے مراد لیا) میں نے یہ حکم نہیں دیا اور تم مجھے برا نہ کہنا، اس حدیث پاک میں غزوہ احد کا مکمل نقشہ پیش کر دیا گیا، اور زیر بحث آیہ کریمہ کا مکمل مفہوم بھی سمجھ آ گیا۔

﴿مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ الْآخِرَةَ﴾

"تم میں سے بعض وہ ہیں جو دنیا کا ارادہ رکھتے تھے، اور بعض وہ ہیں جو آخرت کا ارادہ رکھتے تھے۔"

﴿مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا﴾ یعنی الغنیمة قال ابن مسعود ماشعرنا ان احدا من اصحاب النبی ﷺ یرید الدنیا وعرضها حتی کان یوم احد"

"تم میں سے بعض وہ ہیں جو دنیا کا ارادہ رکھتے تھے" یعنی مال غنیمت کا ارادہ رکھتے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہمیں یہ معلوم نہیں کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام نے بھی دنیا کے مال کا ارادہ کیا ہو، یہاں تک کہ غزوہ احد کے بعد اس آیہ کریمہ کے نزول سے پتہ چلا۔

﴿وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ الْآخِرَةَ﴾ وهم الذین ثبتوا فی مرکزهم ولم یخالفوا امر نبیهم" اور تم میں سے بعض وہ ہیں جو آخرت کا ارادہ رکھتے تھے، یہ وہ لوگ ہیں جو مرکز میں ثابت قدم رہے، یعنی جہاں پہاڑ کے درہ میں نبی کریم ﷺ نے کو ان کھڑا کیا تھا وہیں قائم رہے، اور نبی کریم ﷺ کے حکم کی انہوں نے کوئی مخالفت نہیں کی۔ یہ عبداللہ بن جبیر اور ان کے ساتھی تھے، خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابی جہل جو اس وقت کافر تھے انہوں نے درہ میں ثابت قدم رہنے والوں پر حملہ کر کے ان کو شہید کر دیا۔ (قرطبی ج۴ص۲۳۷)

فائدہ جلیلہ: والعتاب مع من انهزم لامع من ثبت، فان من ثبت فاز بالثواب، وهذا کماانه

اذاحل بقوم عقوبة عامة فأهل الصلاح والصبيان يهلكون ولكن لايكون ماحل بهم عقوبة بل هو سبب المثوبة" "واللہ اعلم" (قرطبی ۴ ص ۲۴۷)

اس آیۂ کریمہ میں ان حضرات کو عتاب کیا گیا (یعنی ان کی سرزنش کی گئی) جو مرکز سے ہٹ گئے تھے اور پسپا ہو گئے تھے۔ ان کو عتاب نہیں کیا گیا جو ثابت قدم رہے تھے، ثابت قدم رہنے والے اگرچہ شہید ہو گئے تھے لیکن انہوں نے منصب شہادت جیسا عظیم مرتبہ اور ثواب عظیم حاصل کیا، یہ اسی طرح ہے جیسا کہ کسی قوم پر عذاب آئے تو بدکاروں کیلئے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے باغیوں کیلئے، حدود سے تجاوز کرنے والوں کیلئے تو وہ عذاب ہے، لیکن جو نیک لوگ اور بچے اس کی گرفت میں آتے ہیں تو ان کیلئے وہ ذریعہ ثواب ہوتا ہے۔

﴿ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ﴾ "پھر اس نے پھیر دیا تمہیں ان سے۔"

﴿ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ﴾ ايها المسلمون صرفكم الله بشئوم عصيانكم عن الكفار بالهزيمة حتى حالت الحالة فغلبوكم (ليبتليكم) اى ليمتحنكم حتى يظهر المؤمنين من المنافقين او المعنى لينزل البلاء عليكم بما صنعتم"

"پھر اس نے تمہیں ان سے پھیرا" یعنی اے مسلمانو اللہ تعالیٰ نے تمہیں کفار سے پھیرا یعنی پسپا کر دیا، وجہ اس کی یہ تھی کہ تم نے نبی کریم ﷺ کے حکم کو بجا نہیں لایا، یہاں تک جنگ کی حالت بدل گئی، پہلے تم فتح حاصل کر رہے تھے اب کفار کو بظاہر غلبہ حاصل ہو گیا۔ رب تعالیٰ نے تمہیں کفار سے جو پسپا کیا اس میں تمہاری آزمائش تھی کہ مؤمنین منافقین سے ممتاز ہو جائیں۔ **یا دوسری** وجہ "لِيَبْتَلِيَكُمْ" (میں یہ ہے کہ وہ تمہیں مصیبت میں مبتلا کرے بوجہ اس کے جو تم نے کیا) یعنی تمہیں کفار سے پھیر کر اور ان کو ظاہری طور پر غلبہ دے کر رب تعالیٰ نے تمہیں مصیبت میں مبتلاء کر دیا۔

(مظہری ج ۳ ص ۱۵۵)

(لِيَبْتَلِيَكُمْ) "اى ليمتحن صبر كم على المصائب وثباتكم على الايمان عندهما"

"تاکہ تمہیں آزمائے" یعنی تمہارا امتحان لے کہ تم مصیبتوں کے پہنچنے پر کتنا صبر کرتے ہو، اور کتنا ایمان پر ثابت رہتے ہو۔

(البحر المحیط ج ۳ ص ۱۱۷)

اعتراض: امتحان تو وہ لیتا ہے جسے پتہ نہ ہو کہ یہ کس درجہ کا ہے، رب تعالیٰ علیم وخبیر ہے اس کے امتحان لینے کا کیا مطلب۔

جواب: (لِيَبْتَلِيَكُمْ) اى يعاملكم معاملة من يمتحنكم ليظهر ثباتكم على الايمان عندها"

(روح البیان ج ۲ ص ۱۱۰)

امتحان لینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمہارے ساتھ وہ معاملہ کرتا ہے جو اس شخص سے معاملہ کیا جاتا ہے جس کا امتحان لیا جاتا ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ تمہیں لوگوں کے سامنے نکھارنا مقصود ہے، کہ بعض تو ثابت قدم رہے لیکن پسپا ہونے والے بھی اللہ تعالی کی طرف رجوع کرنے کی وجہ سے رب تعالی کے عفو وکرم کے مستحق ہوگئے،

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

یہاں چند بحثیں وہ ہیں جن کا تعلق اصطلاحات سے جن کو طلباء کرام تو جانتے ہیں لیکن عوام نہیں جاتے، ان میں اسے ایک بحث یہ ہے ﴿حَتّٰی اِذَافَشِلْتُمْ﴾ شرط ہے، جہاں شرط ہو وہاں جزاء کا پایا جانا ضروری ہے، اس شرط کی جزاء کیا ہے؟ تو اس کا ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ شرط نہیں بلکہ "حتـی" "الـی" کی طرح غایت کیلئے استعمال ہوا ہے، اب مطلب یہ ہوگیا ﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ حَتّٰی اِذَافَشِلْتُمْ﴾ تحقیق تمہارے ساتھ اللہ نے اپنا وعدہ سچ کردیا یہاں تک کہ تمہاری رائے میں ضعف آگیا، یہ نصرت کی انتہاء بیان کی گئی۔

اگر اسے شرط تسلیم کیا جائے تو اس صورت میں بصریوں نے یہ جواب دیا ہے کہ اس کی جزاء محذوف ہے، وہ یہ ہے "مـنـعـكـم الله نصره" کہ جب تم بزدل ہوگئے تو اللہ تعالی نے تم سے اپنی امداد کو روک لیا۔ کوفی حضرات نے جواب دیا "وَعَصَيْتُمْ" میں واؤ زائد ہے جیسا کہ "وتـلـه لـلـجبين ونـادينـاه" میں "ونـادينـاه" میں واؤ زائد ہے۔ اب تقدیر عبارت کی یہ ہوگئی ﴿حَتّٰی اِذَافَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ﴾ یہاں تک کہ جب تمہاری رائے ضعیف ہوگئی اور تم نے جھگڑا کیا امر میں تو تم نافرمان ہوگئے، یعنی "وَعَصَيْتُمْ" جزاء ہے۔

اعتراض: یہ توجیہ کیسے درست ہے جبکہ ضعف اور جھگڑا معصیت ہے، اور جزاء بھی معصیت ہو جائے تو ایک ہی چیز شرط اور وہی جزاء ہوگی "لـزم كـون الشـئ علة وذلك فاسد" اس صورت میں ایک چیز اپنے آپ کی علت بن جائے گی، یہ فاسد ہے، درست نہیں۔

جواب: ضعف اور جھگڑا سبب بنے ہیں اس جگہ سے ہٹنے کا جہاں نبی کریم ﷺ نے کھڑا کیا تھا۔ جب اس جگہ سے وہ ہٹ گئے تو اس پر عصیان مرتب ہوا، لھذا شرط اور ہے، جزاء اور ہے۔ "فـلـم يـلـزم تـعـلـيـل الشئ بنفسه" کوئی چیز اپنی ذات کیلئے علت نہیں بنی۔ یہ بھی خیال رہے کہ بصریوں کے نزدیک واؤ زائد نہیں۔ لھذا ان پر نہ کوئی اعتراض اور نہ اس کا جواب۔ (ماخوذ از کبیر ج۹ ص۳۶)

تـنـبـیـه: قيل الفشل هو الضعف وقيل الفشل هو الجبن وهذا باطل بدليل قوله

تعالی ﴿وَلَاتَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا﴾ای فتضعفوا لانه لایلیق به ان یکون المعنی فتجبنوا"
بعض حضرات نے "فشل " کا معنی ضعف رائے بیان کیا،اور بعض نے اس کا معنی بزدلی مراد لیا،لیکن یہ باطل ہے کیونکہ اللہ تعالی کے ارشادگرامی ﴿وَلَاتَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا﴾ کا مطلب یہی ہے کہ جھگڑا نہ کرو،ورنہ ضعیف رائے والے ہوجاؤ گے،"بزدل ہوجاؤ گے"معنی لینا مناسب نہیں۔ (ماخوذ از کبیر ج۹ص۳۶)

مقام توجہ: ﴿مِنْ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ﴾ زیادہ متنبہ کیا گیا،یا زیادہ عتاب پایا گیا،اس کی وجہ یہ ہے کہ
" انهم لما شاهدوا ان الله تعالی اکرمهم بانجاز الوعد کان من حقهم ان یمتنعوا عن المعصیة فلما اقدموا علیها لاجرم سلبهم الله ذلک الاکرام واذاقهم وبال امرهم"
جب انہوں نے یہ مشاہدہ کرلیا تھا کہ اللہ تعالی نے ان کی امداد کر کے ان کو مکرم بنا دیا تو ان کا حق یہ تھا کہ وہ امر کی مخالفت نہ کرتے ،لیکن جب ان سے مخالفت سرزد ہوئی اللہ تعالی نے ان سے پہلے والا اکرام واپس لے لیا۔

امر میں اختلاف کا کیا مطلب:

ایک وجہ تو پہلے بیان کی جاچکی ہے کہ امر سے مراد نبی کریم ﷺ کا امر ہے یہ امر ضد ہے نہی کی۔یعنی نبی کریم ﷺ نے جہاں کھڑے رہنے کا حکم دیا وہاں کھڑے رہنے میں صحابہ کرام کا اختلاف ہوگیا،اس طرح نبی کریم ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی ہوئی۔اور مطلب اس کا یہ بیان کیا گیا ہے "ان الأمر ههنا بمعنی الشان والقصة ای تنازعتم فیما کنتم فیه من الشان" کہ بیشک امر یہاں شان اور قصہ کے معنی میں ہے،اب مطلب یہ ہوا کہ تم جس حال میں تھے اس میں تم نے اختلاف کیا کہ یہاں کھڑے رہیں یا نہ رہیں۔یہ معنی بھی عجیب بھلا معلوم ہوتا ہے کہ براہ راست نبی کریم ﷺ کے امر کی طرف مخالفت کی نسبت نہیں کی گئی بلکہ ان کے اپنے حال کی طرف مخالفت کی نسبت کی گئی جو ضمنی طور پر نبی کریم ﷺ کے امر کی طرف منسوب ہے۔

﴿وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾

"اور تحقیق معاف کر دیا اس نے تمہیں اور اللہ فضل فرمانے والا مومنوں پر۔"

سبحان اللہ !صحابہ کرام کے درہ کو چھوڑنے کی وجہ سے اور پسپا ہونے کی وجہ سے جو کیفیت انہیں لاحق ہوئی جسے عصیان سے تعبیر کیا گیا رب تعالی نے اس معاف فرمادیا،اس معاف فرمانے کا تذکرہ بہت تاکید سے

فرمایا۔ایک لام سے تاکید کی گئی کہ وہ "مؤطا للقسم" ہے۔کیونکہ ماضی پر قد داخل ہوا اور اس پر لام تاکید آئے تو وہاں پتہ چلتا ہے کہ یہاں قسم پائی گئی، پھر "قد" بھی تحقیق کا معنی دے رہا ہے۔گرائمر کے اس ضابطہ کے مطابق مکمل معنی یوں ہو گیا۔اور قسم ہے اللہ کی تحقیق اس نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔اللہ تعالیٰ تمام ایمان والوں پر اپنا فضل فرماتا ہے، جب اس کی مہربانیاں اور رحمتیں تمام ایمان والوں پر ہیں تو صحابہ کرام پر تو یقیناً اور زیادہ رحمت پائی گئی ہے۔اگر غزوہ احد میں صحابہ کرام کے درہ کو چھوڑنے اور پسپا ہونے کو کوئی شخص آڑ بنا کر صحابہ کرام کی شان میں گستاخی کرے تو وہ بدقسمت ہے کہ رب تعالیٰ جب معافی کرنے کا اعلان کر رہا ہے تو وہ صحابہ کرام پر تبرا بازی کر رہا ہے، آیئے ایسے شخص کا منہ بند کرنے کیلئے، ایک حدیث پاک کو دیکھئے۔

❁ حدثنا عبدان اخبرنا ابوحمزة عن عثمان بن موهب قال جاء رجل حج البيت فرأى قوما جلوسا فقال من هؤلاء القعود قالوا هؤلاء قريش قال من الشيخ قالوا ابن عمر فأتاه فقال انى سائلك عن شئ اتحدثنى قال انشدك بحرمة هذاالبيت اتعلم ان عثمان بن عفان فريوم احد قال نعم قال فتعلمه تغيب عن بدر فلم يشهدها قال نعم قال فتعلم انه تخلف عن بيعة الرضوان فلم يشهدها قال نعم قال فكبر،قال ابن عمر تعال لأخبرك ولأبين لك عما سألتنى عنه اما فراره يوم احدفاشهد ان الله عفاعنه واما تغيبه عن بدر فانه كان تحته بنت رسول الله ﷺ وكانت مريضة فقال له النبى ﷺ ان لك اجر رجل ممن شهد بدرا وسهمه واما تغيبه عن بيعة الرضوان فانه لو كان احد اعز ببطن مكة من عثمان بن عفان لبعثه مكانه فبعث عثمان وكانت بيعة الرضوان بعد ماذهب عثمان الى مكة فقال النبى ﷺ بيده اليمنى هذه يدعثمان فضرب بها على يده فقال هذه لعثمان اذهب بهذاالآن معك"

(بخاری ج۲ کتاب المغازی باب قول الله تعالى ان الذين تولوا منكم الخ)

عثمان بن موہب فرماتے ہیں ایک شخص بیت اللہ شریف کا حج کرنے کیلئے آیا، اس نے ایک قوم کو بیٹھے ہوئے دیکھا، تو اس نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں جو بیٹھے ہوئے ہیں؟ تو اسے بتایا گیا یہ قریش ہیں، اس نے پوچھا یہ بزرگ کون ہیں؟ تو اسے بتایا گیا یہ ابن عمر رضی اللہ عنہ ہیں، تو وہ ان کے پاس آیا، تو کہنے لگا میں آپ سے کچھ سوال کرنا چاہتا ہوں، کیا آپ مجھے ان کا جواب دو گے، اس بیت اللہ شریف کی حرمت کی قسم دلا کر پوچھتا ہوں کیا تم جانتے ہو کہ بیشک عثمان بن عفان احد کے دن پسپا ہو گئے تھے؟ تو آپ نے فرمایا، ہاں۔پھر اس نے پوچھا کیا تم جانتے ہو وہ بدر سے غائب تھے، وہاں حاضر نہیں ہوئے تھے، آپ نے فرمایا، ہاں۔پھر اس نے پوچھا کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ بیعت رضوان سے پیچھے رہے

اس امر میں حاضر نہیں تھے آپ نے فرمایاہاں تو اس نے (خوشی سے) اللہ اکبر کہا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا آؤ میں تمہیں خبر دوں اور تمہیں ان سوالوں کو وضاحت سے بیان کروں جو تم نے مجھ سے سوال کئے، غزوہ احد میں حضرت عثمان ﷛ کا پسپا ہونا، میدان چھوڑ کر ہٹ جانا، اس کے متعلق میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کردیا، (اس لئے کہ) رب تعالیٰ نے اعلان فرمایا ﴿وَلَقَدْ عَفَا عَنكُمْ﴾ تحقیق اس نے تمہیں معاف کردیا ہے) لیکن بدر میں حاضر نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی زوجیت میں نبی کریم ﷺ کی بیٹی تھی جو شدید مریض تھیں (تو نبی کریم ﷺ نے خود ہی ان کو مدینہ طیبہ میں چھوڑا) نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمہیں اجر وثواب بدر میں شریک ہونے والے کا حاصل ہے اور تمہارا حصہ بھی بدر والے کا ہے۔ بیعت رضوان میں غائب ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اگر کوئی اور شخص ان سے مکہ والوں کو زیادہ عزیز ہوتا تو نبی کریم ﷺ اس کو بھیجتے، آپ نے حضرت عثمان ﷛ کو مکہ میں لوگوں سے بات چیت کیلئے بھیج دیا۔ بیعت رضوان آپ کے مکہ میں جانے کے بعد ہوئی، نبی کریم ﷺ نے اپنے دائیں ہاتھ کو دوسرے ہاتھ میں لیا اور فرمایا یہ عثمان کی بیعت ہے۔ پھر حضرت ابن عمر ﷛ نے اس شخص کو فرمایا یہ میری باتیں ساتھ لے جا۔

یہ حدیث بخاری نے مناقب عثمان میں بھی ذکر کی ہے، وہاں شیخ علامہ بدرالدین ابومحمد محمود بن احمد عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"والذی یظهر انه کان متعصبا علی عثمان ص فلذلک قال الله اکبر مستحسنا"

وہ سوال کرنے والا شخص حضرت عثمان ﷛ سے تعصب رکھتا تھا، اسی وجہ سے جب تک حضرت ابن عمر ﷛ اس کے سوالوں کے جوابوں میں ہاں کہتے رہے۔ ہاں اسی طرح ہوا، تو وہ خوش ہو رہا تھا، اسی خوشی پر اس نے اللہ اکبر کہا۔

اسی سے راقم کو یہ بھی سمجھ آیا کہ کسی سے تعصب کے وقت، کسی ناجائز کام پر خوش ہو کر اللہ اکبر کہنا منافقین اور رافض کا کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس متعصب کے نظریات فاسدہ کو دیکھ کر حضرت ابن عمر ﷛ نے ہر سوال کا جواب مستحسن طریقہ سے واضح کر دیا کہ اس کی حقیقت اور وجہ کیا ہے۔ حضرت عثمان ﷛ کی جو زوجہ بیمار تھی جن کی وجہ سے نبی کریم ﷺ ان کو بدر میں ساتھ نہ لیا بلکہ مدینہ طیبہ میں ہی ان کو چھوڑا وہ حضرت رقیہ ﷞ تھیں جو رسول اللہ ﷺ کی بیٹی تھیں۔

"اذهب بها الآن معک" کے دو مطلب ہیں ایک یہ "اقرن هذا العذر بالجواب حتی لایبقی لک فیما اجبتک به حجة علی ما کنت تعتقده من غیبة عثمان ﷛" میں نے تمہیں مختصر جواب صرف "نعم" (ہاں) سے دیتے تھے ان کے ساتھ یہ وضاحتیں اور وجوہ بھی ساتھ ملاؤ، اب تم جو اپنا باطل عقیدہ رکھتے تھے وہ ان

جوابات کی وجوہ کے بعد رد ہو جائے گا، تمہارے پاس کوئی حجت نہیں رہے گی۔

جواب کی دوسری وجہ "قال الطیبی قاله ابن عمر تهکما به ای توجه بما تمسکت به فانه لا ینفعک بعد مابینت لک" علامہ طیبی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اس شخص سے بات بطور تہکم کی، مطلب اس کا یہ ہے کہ آپ نے گویا کہ یہ کہا کہ بیشک تو نے جو سوال اپنے تعصب پر دلیل بنانے کیلئے کئے میری وضاحت کے بعد تجھے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ (عینی ج ۱۶ ص ۲۰۷)

غزوہ احد میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ ثابت رہنے والے حضرات:

بلاذری رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ مہاجرین میں سے ثابت رہنے والے حضرات یہ تھے، ابوبکر، عمر، عبدالرحمن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، طلحہ بن عبیداللہ، زبیر بن عوام اور ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہم اور انصار میں سے یہ تھے حباب بن منذر، ابودجانہ، عاصم بن ثابت بن ابی الافلح، حارث بن الصمۃ، اسید بن حضیر، سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور بعض حضرات نے کہا کہ سہل بن حنیف بھی ثابت رہنے والے انصار میں تھے۔ (عینی ج ۱۶ ص ۲۰۷)

فائدہ جلیلہ: اللہ تعالیٰ نے جو ارشاد فرمایا ہے۔

﴿وَاللّٰهُ ذُوْفَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ "اور اللہ فضل فرمانے والا ہے ایمان والوں پر۔"

"ان ذلک العفو بطریق التفضل والاحسان لابطریق الوجوب علیه ای شانه ان یتفضل علیهم بالعفو"

اللہ تعالیٰ نے جو پسپا ہونے والے صحابہ کرام کو معاف کیا یہ اس کا فضل وکرم اور اس کا احسان تھا، رب تعالیٰ پر کوئی واجب نہیں تھا، لیکن اس کی شان ہی یہ ہے کہ وہ مؤمنوں کو توبہ پر معاف فرماتا ہے اور ان پر فضل وکرم فرماتا ہے۔ (تفسیر ابی السعود)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا شاندار استدلال:

❁ واخرج الامام احمد وجماعة عن ابن عباس رضی الله عنهما انه قال مانصر الله تعالی نبیه فی موطن کمانصره یوم احد فانکروا ذلک فقال ابن عباس رضی الله عنه بینی وبین من أنکر ذلک کتاب الله ان الله تعالی یقول یوم احد "وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ" ای تقتلونهم" وهو التفسیر المالور واستشهد علیه الحبر بقوله عتبة اللیثی"

"تحسهم (ای نقتلهم) بالبیض حتی کاننا نفلق منهم بالجماجم حنظلا"

وبقوله ومنا الذی لاقی بسیف محمد فحس (ای قتل)به الاعداء عرض العساکر"

امام احمد رحمہ اللہ اور حضرات نے بھی ابن عباس ﷺ سے روایت ذکر کہ آپ فرماتے ہیں اللہ تعالی نے اپنے نبی کریم ﷺ کی اتنی امداد کہیں نہیں فرمائی جتنی احد میں فرمائی، آپ کے اس قول پر بعض لوگوں نے انکار کیا، تو حضرت ابن عباس ﷺ نے فرمایا کہ میرے اور انکار کرنے والوں کے درمیان کتاب اللہ فیصلہ کرنے کیلئے کافی ہے۔ جب رب تعالی نے احد والوں کے متعلق فرمایا ﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ﴾ تحقیق اللہ نے اپنا وعدہ سچا کردیا جب تم ان کو قتل کررہے تھے' ایمان والوں کا مشرکین کو قتل کرنا اللہ تعالی کی امداد کی وجہ سے ہی تھا۔ جب آپ سے نافع بن ازرق نے پوچھا کیا عرب حضرات نے "حس" کا معنی قتل لیا ہے۔ آپ نے دو شعر بطور دلیل پیش کئے جن میں ایک جگہ "نحسہم" استعمال ہوا ہے، جس کا معنی ہے" ہم ان کو سفید تلواروں کے ذریعے قتل کررہے تھے، ان کی کھوپڑیوں کو ہم تے کی طرح ازار ہے تھے۔

دوسرے شعر کا معنی:

ہم میں سے وہ جس نے محمد ﷺ کی تلوار سے ملاقات کی، اس نے دشمن کو قتل کیا لشکروں میں گھس گیا۔ (ماخوذ از درمنثور ج۲ ص۸۹)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓی اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ یَدْعُوْکُمْ فِیْٓ اُخْرٰکُمْ فَاَثَابَکُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّکَیْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا مَآ اَصَابَکُمْ وَاللّٰہُ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ○ (آیۃ نمبر ۱۵۳)

(1) جب تم منہ اٹھائے چلے جاتے تھے اور پیٹھ پھیر کر کسی کو نہ دیکھتے اور دوسری جماعت میں ہمارے رسول تمہیں پکار رہے تھے تو تمہیں غم کا بدلہ غم دیا اور معافی اس نے سنائی کہ جو ہاتھ سے کیا اور جو افتاد پڑی اس کا رنج نہ کرو اور اللہ کو تمہارے کاموں کی خبر ہے۔ (کنزالایمان)

(2) یاد کرو جب تم دور ہو رہے تھے، اور پیچھے توجہ نہیں کر رہے تھے کسی ایک پر، اور رسول بلا رہے تھے تمہیں دوسری جماعت میں، تو پہنچایا تمہیں غم پر غم تاکہ تم غمگین نہ ہو اس پر جو تم سے ضائع ہو گئی، اور نہ اس پر جو پہنچی ہے تمہیں، اور اللہ خبر رکھنے والا ہے جو تم کرتے ہو۔ (نجوم الفرقان)

﴿اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓی اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ یَدْعُوْکُمْ فِیْٓ اُخْرٰکُمْ﴾

''جب تم دور ہو رہے تھے اور پیچھے توجہ نہیں کر رہے تھے کسی ایک پر اور رسول بلا رہے تھے تمہیں دوسری جماعت میں''

آیۃ کریمہ کا ماقبل سے تعلق ہے یا استیناف پایا گیا:

اس میں ایک احتمال یہ ہے کہ ''انہ ابتداء کلام لاتعلق لہ بماقبلہ والتقدیر اذکر اذ تصعدون'' اس کا تعلق ماقبل سے نہیں بلکہ جملہ استینافیہ ہے، اور اذکر مقدر ہے۔ یعنی یاد کرو جب تم دور ہو رہے تھے، (راقم نے یہی ترجمہ کیا ہے) ایک اور اس میں احتمال یہ ہے کہ اس کا تعلق ماقبل سے ہے، ماقبل سے تعلق میں پھر تین احتمال ہیں، ایک یہ کہ اس کا تعلق ﴿وَلَقَدْ عَفَا عَنْکُمْ﴾ سے ہو، اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ تحقیق اس (اللہ) نے معاف کر دیا تمہیں جب تم دوری کی طرف جا رہے تھے۔ **دوسرا احتمال** یہ ہے کہ اس کا تعلق ﴿ثُمَّ صَرَفَکُمْ عَنْھُمْ﴾ سے ہو، اس صورت میں معنی یہ ہوگا ''پھر تمہیں پھیرا ان سے تاکہ تمہیں آزمائے جب تم دور ہوئے جا رہے تھے۔ (کبیر ج۹ ص۳۹)

تیسرا احتمال یہ ہے کہ اس کا تعلق '' لِيَبْتَلِيَكُمْ '' سے ہو، اس صورت میں معنی یہ ہوگا '' پھر تمہیں پھیرا ان سے جب تم دور ہوئے جا رہے تھے۔ (کبیر ج۹ص۳۹)

مختصر مطلب:

جب کفار نے اچانک حملہ کیا تو صحابہ کرام پریشان ہو گئے، دائیں، بائیں بکھر گئے، کوئی پہاڑ پر چڑھ رہا تھا اور کوئی وادیوں میں جا رہا تھا، اور کوئی کھلی زمین میں دور دوڑ کر جا رہا تھا، ہر شخص اپنی پریشان میں مبتلاء تھا کوئی کسی کی طرف توجہ نہیں کر رہا تھا، پیچھے مڑ کر کوئی نہیں دیکھ رہا تھا، حالانکہ رسول اللہ ﷺ پیچھے ثابت رہنے والی جماعت میں بکھر جانے والوں کو بلا رہے تھے، اللہ تعالی نے صحابہ کرام کو غم کے بدلے غم پہنچایا تا کہ وہ غمگین نہ ہوں جو ان سے نعمتیں فوت ہوئیں ان پر، اور نہ ہی مصیبتوں کے پہنچنے پر غمگین ہوں۔ اللہ تعالی تمام اعمال پر خبر رکھنے والا ہے، یہی مضمون صحابہ کرام کو خطاب کرتے ہوئے رب تعالی نے بیان فرمایا ''اِذْ تُصْعِدُوْنَ''

عبدالرحمٰن سلمی اور حسن اور قتادہ رحمھم اللہ کی قراءت میں تاء اور عین کے فتحہ سے پڑھا گیا، صعود سے ماخوذ ہے۔ ''والصعود ای الارتفاع علی الجبال والسطوح'' اس قراءت کے مطابق پہاڑ پر چڑھنا مراد ہوگا، کیونکہ ''صعود'' کا معنی پہاڑ پر اور چھت پر چڑھنا ہے۔ اور مشہور قرأت میں تا پر ضمہ اور عین کے نیچے کسرہ ''اصعاد'' (باب افعال) سے لیا ہوا ہے، اس کا معنی ہے ''السیر فی مستوی الارض'' ہموار زمین میں چلنا ''وقال المبرد اصعد اذا ابعد فی الذهاب'' مبرد نے کہا ہے کہ اصعد کا معنی دور چلے جانا۔

راقم نے یہی معنی ذکر کیا ہے۔ ''وقال المفضل صعد واصعد بمعنی واحد'' مفضل رحمہ اللہ'' نے بیان کیا ہے ''صعد اور اصعد'' کا ایک ہی معنی ہے ''قال ابو حاتم یقال اصعدت اذا مضیت حیال وجهک'' ابو حاتم کہتے ہیں، جب کہا جائے ''اصعدت'' تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے، تو منہ اٹھائے چل رہا تھا، یعنی بغیر سوچے سمجھے جدھر منہ آ رہا تھا ادھر ہی چل رہا تھا، اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ بعینہ اسی کے مطابق ہے '' جب تم منہ اٹھائے چلے جاتے تھے'' (ماخوذ از معالم التنزیل ج اص ۳۶۲)

راقم نے مختصر مطلب میں یہ لکھا ہے بعض حضرات پہاڑ پر چڑھ رہے تھے، بعض وادی میں جا رہے تھے، بعض کھلی زمین میں دوڑ کر جا رہے تھے، یہ مطلب درحقیقت تمام قراءتوں کا جامع ہے، اگرچہ ہمارے پاس روایت حفص کے مطابق اصعاد سے ماخود ہے، اسلئے راقم نے ترجمہ اسی کے مطابق کیا ہے۔ ﴿وَلَا تَلْوُوْنَ عَلٰٓى اَحَدٍ﴾ ای

لاتلتفتون الی احد من شدة الهرب" تم کسی ایک کی طرف شدید دوڑنے کی وجہ سے توجہ نہیں کر رہے تھے۔
(کبیرج۹ص۴۰)

"لایلوی" وہ گردن پھیر کر کسی کی طرف توجہ نہیں کرتا "لوی" اللی فتل الحبل. لویته لیا، لوی بلوی لیا" کا معنی رسی کا بٹنا، "لوی یده ولوی راسه وبراسه اماله" جب اس کے ساتھ ید یا رأس کا تعلق ہو تو ہاتھ کو مائل، سر کو مائل کرنا، "لووارووسهم" انہوں نے اپنے سروں کو پھیرا، "لوی لسانه" اس نے اپنی زبان کو پھیرا، اس کا معنی یہ بھی آتا ہے، اس نے جھوٹ بولا" تخمینہ سے بات کی، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿یَلْوُوْنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتَابِ﴾ "وہ اپنی زبانوں کو کتاب میں پھیرتے ہیں۔ فلان لایلون علی احد اذا امعن فی الهزیمة" فلاں شخص اپنی شکست میں غور و فکر کی وجہ سے کسی اور کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا، "اللواء الراية" جھنڈے کو "لواء" کہتے ہیں کیونکہ ہوا اسے ادھر ادھر مائل کرتی ہے، "الـلـوية" (واؤ کے نیچے کسرہ اور یاء مشدد) طعام کو دوسرے طعام سے ہٹا کر، پھیر کر ذخیرہ بنانا، (مفردات راغب) ﴿وَلَاتَلْوٗنَ عَلٰی اَحَدٍ﴾ تم کسی ایک کے طرف گردن پھیر کر مڑ کر نہیں توجہ کر رہے تھے۔

﴿وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ﴾ "اور رسول بلا رہے تھے تمہیں دوسری جماعت میں۔"

(فی اخراکم) فی ساقتکم وجماعتکم الاخری، والمعنی انه علیه الصلوة والسلام کان یدعوهم وهوواقف فی اخراهم لان القوم بسبب الهزیمة قدتقدموه"

قوم پسپا ہو کر دوڑ کر آگے چلی گئی، نبی کریم ﷺ اور آپ کے ساتھ قائم رہنے والے اپنی جگہ پر قائم رہے، یہ لوگ ان آگے جانے والوں سے پیچھے رہ گئے، اب مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ تمہیں پیچھے دوسرے جماعت میں آواز دے رہے تھے، بلا رہے تھے، (روح البیان ج۲ص۱۱۱)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا یہی ترجمہ ہے، "اور دوسری جماعت میں ہمارے رسول تمہیں پکار رہے تھے" (کنز الایمان)

راقم نے بھی یہی ترجمہ نقل کیا:

"والرسول یدعوکم فی اخراکم" ای فی اخراکم ومن ورائکم الی عبادالله انا رسول الله من یکرفله الجنة" (معالم التنزیل للبغوی ج ۱ ص ۳۶۲)

﴿فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ﴾ کا معنی ہے ﴿مِنْ وَّرَآئِكُمْ﴾ تمہارے پیچھے ہے۔

حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ نے یہی ترجمہ کیا "اور رسول کریم بلا رہے تھے تمہیں پیچھے سے (ضیاء القرآن) یعنی آپ

فرمارہے تھے" میں اللہ کا رسول ہوں جو شخص لوٹے گا اس کیلئے جنت ہے۔ خیال رہے کہ حضرت مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے بہت خوبصورت انداز میں دونوں تراجم کو یکجا جمع کیا، آپ کا ترجمہ یہ ہے، حالانکہ رسول بلا رہے تھے تم کو تمہاری پچھلی جماعت میں۔ (نعیمی ج۴ص ۲۵۸)

﴿ فَاَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ ﴾ تو پہنچایا تمہیں غم پر غم۔

﴿ فَـاَثَـابَـكُـم ﴾ (تو پہنچایا تمہیں) "اثـاب" ماخوذ ہے لفظ ثواب سے، اس کا غالبا استعمال سوائے خیر سے نہیں۔ اور شر میں بھی اس کا استعمال جائز ہے۔ لغوی معنی کے لحاظ پر اس کا مطلب ہے لوٹنا، "ثاب الیه عقله" ای رجع الیه" اس کی عقل اس کی طرف لوٹ آئی، یہی معنی اللہ تعالی کے اس ارشاد گرامی میں پایا گیا ہے۔ ﴿وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ﴾ اور جب بنایا ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لوٹنے کی جگہ" "والمرأة تسمی ثیبا" "لان الواطئ عائد الیها" عورت کو ثیبہ کہا جاتا ہے کہ وطی کرنے والا اس کی طرف لوٹ کر آتا ہے،

"واصل الثواب کل مایعود الی الفاعل من جزاء فعله سواء کان خیرا أو شرا الا انه بحسب العرف اختص لفظ الثواب بالخیر"

ثواب کا معنی جب لوٹنا ہے تو اس معنی کے لحاظ پر فعل کی جزاء جو اس پر عمل کرنے والے کی طرف لوٹتی ہے اسے ثواب ہی کہا جاتا ہے خواہ فعل خیر پر جزاء خیر ہو، یا فعل شر کا بدلہ ہو، لیکن اب عرف میں جزاء خیر کو ہی ثواب کہا جاتا ہے، جزاء شر کو ثواب نہیں کہا جاتا۔

اگر لغوی معنی لیں تو یہاں ﴿ فَاَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ ﴾ میں استعمال درست ہے کہ ان کو غم پر غم پہنچایا۔ اور اگر عرفی معنی لیں تو تہکم ہے، یعنی ان کو مصیبت کے پہنچنے کو ثواب سے تعبیر کر دیا گیا، (کبیر ج۹ص ۴۰)

﴿ غَمًّا بِغَمٍّ ﴾ "یحتمل ان تکون بمعنی المعاوضة کما یقال هذا بهذا ای هذا عوض عن ذاک" ایک احتمال یہاں یہ پایا گیا ہے کہ "باء" بدلیت کیلئے ہو، جیسے کہا جاتا ہے "هذا بهذا" یہ بدل ہے اس کا" اعلی حضرت رحمہ اللہ نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے "تو تمہیں غم کا بدلہ غم دیا (کنزالایمان)

ویحتمل ان تکون" بمعنی "مع"" و التقدیر الابهم غمامع غم"

اور احتمال یہ ہے کہ "بـاء" "مـع" کے معنی میں ہو، اب اس صورت میں مطلب ہو غموں کے ساتھ غم، حضرت مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے یہی ترجمہ کیا ہے "تو پہنچائے تمہیں غم پر غم" (نعیمی) راقم نے بھی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے یہی ترجمہ نقل کیا تاکہ انہیں دونوں احتمال ذہن نشین ہو جائیں، (ماخوذ از کبیر ج۹ص ۱۴۰)

پہلے معنی میں چند صورتیں:

جب معنی یہ کیا جائے ''تو تمہیں پہنچایا غم کے بدلہ غم'' تو اس کی چند وجوہ بیان کی گئی ہیں،

(۱) زجاج نے اس کی وضاحت یوں کی کہ تم نے جب رسول اللہ ﷺ کے امر پر عمل نہیں کیا تو تم نے اپنے آپ کو غم پہنچایا، اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے تمہیں غم پہنچایا کہ پسپا ہو گئے اور تمہارے احباب شہید ہو گئے ''والمعنی جازاکم من ذلک الغم بهذا الغم'' یعنی رسول اللہ ﷺ کو غم پہنچانے کے بدلے تمہیں غم پہنچایا گیا۔

(۲) حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے اس کی وضاحت یوں کی ''یرید غم یوم احد للمسلمین بغم یوم بدر للمشرکین'' کہ اس سے مراد یہ ہے کہ آج احد کو تمہیں غم پہنچایا جا رہا ہے تو کل بدر میں مشرکین کو غم پہنچایا جا چکا ہے۔ مقصد اس میں یہ تھا کہ تمہارے دل میں دنیا کی طرف توجہ نہ رہے، نہ تم دنیا کے حاصل ہونے کی وجہ سے خوش ہو، اور نہ ہی تم دنیا کے جانے پر غمناک ہو، یہی مطلب ہے ﴿لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ﴾ ''تا کہ تم غمگین نہ ہو اس پر جو تم سے ضائع ہو گئی اور نہ خوش ہو اس پر جو تمہیں عطاء کیا''

(۳) یجوز ان یکون الضمیر فی قوله ﴿فَاَثَابَكُمْ﴾ یعود للرسول وا؛ معنی ان الصحابة لما راوا ان النبی ﷺ شج وجهه و کسرت رباعیته وقتل عمه اغتموا لأجله والرسول ﷺ لما رأی انهم عصوا ربهم لطلب الغنیمة لم یقوا محرومین من الغنیمة وقتل اقاربهم اغتم لأجلهم''

اس میں ایک اور صورت یہ پائی گئی ہے کہ ضمیر ﴿فَاَثَابَكُمْ﴾ کی ہو سکتا ہے کہا ﴿الرَّسُوْلُ﴾ کی طرف لوٹ رہی ہو، مطلب یہ ہے کہ جب صحابہ کرام نے دیکھا کہ بیشک نبی کریم ﷺ کا چہرا زخمی ہو گیا، دانت مبارک ٹوٹ گیا، اور آپ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے تو صحابہ کرام کو اس وجہ سے غم لاحق ہوا ہو، اور رسول اللہ ﷺ نے جب دیکھا کہ ان لوگوں نے مال غنیمت کی وجہ سے رب تعالیٰ کا حکم ٹال دیا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے امر میں اختلاف در حقیقت رب تعالیٰ کے امر میں اختلاف تھا، تو وہ مال غنیمت سے بھی محروم ہو گئے، ان کے اقرباء بھی شہید ہو گئے تو نبی کریم ﷺ کو صحابہ کرام کا غم لاحق ہوا، اس صورت میں گویا کہ مفہوم یہ ہو گیا ﴿فَاَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ﴾ تو پہنچایا تمہیں اے رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ نے غم صحابہ کرام کے غم کے بدلے۔

دوسرے معنی میں چند صورتیں:

جب ''غما بغم'' میں باء کو ''مع'' کے معنی میں کریں، مطلب یوں ہو ﴿فَاَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ﴾ تو پہنچائے

تمہیں غموں کے ساتھ غم، یا "باء" "علی" کا معنی دے تو اس صورت میں مطلب یوں ہوگا ﴿ فَاَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ ﴾ تو پہنچائے تمہیں غموں پر غم،

اس معنی کے لحاظ پر چند صورتیں پائی گئی ہیں، لیکن اس سے پہلے دو مثالیں دیکھیں جن میں ایک جگہ "باء" "مع" کا معنی دے رہی ہے، اور دوسری جگہ "باء" "علی" کا معنی دے رہی ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے "مازلت به حتی فعل" ای مازلت معه حتی فعل" میں ہمیشہ اس کے ساتھ رہا یہاں تک کہ اس نے یہ کیا، یہاں "باء" "مع" کے معنی میں استعمال ہے۔ اور کہا جاتا ہے "نزلت ببنی فلان" ای علی بنی فلان" میں بنی فلاں پر اترا، اس میں باء "علی" کے معنی میں استعمال ہے۔

(۱) غموں پر غم پہنچانے کا مطلب یہ ہے کہ کثیر غم پہنچائے گئے، دشمن کی طرف سے ان کے مالوں اور جانوں میں نقصان پہنچانے کا غم انہیں لاحق ہوا، پھر احد میں صحابہ کرام کی تکالیف پر تمام مسلمانوں کو غم لاحق ہوا، پھر نبی کریم ﷺ کے زخمی ہونے، اور آپ کے دانت مبارک کے ٹوٹنے کا غم انہیں لاحق ہوا، پھر رسول اللہ ﷺ کے شہید ہو جانے کی خبر اڑانے کی وجہ سے غم انہیں لاحق ہوا، پھر ان سے جو نبی کریم ﷺ کے حکم کی بجا آوری (پورا کرنے) میں کوتاہی ہوئی اس کے عذاب کا خوف کا غم انہیں لاحق ہوا،

(۲) ان الغم الاول مااصابهم عندالفشل والتنازع والغم الثانی ماحصل عندالهزيمة"
بیشک پہلا غم جو ان کو ضعف رائے حاصل ہونے پر اور نبی کریم ﷺ کے امر میں تنازع کی وجہ سے حاصل ہوا۔ اور دوسرا غم انہیں پسپا ہونے، میدان میں جم کر کفار کو قتل نہ کرنے کی وجہ سے لاحق ہوا،

(۳) ان الغم الاول ماحصل بسبب فوت الغنائم والغم الثانی ماحصل بسبب ان اباسفیان وخالدبن الوليد اطلعا على المسلمين فحملوا عليهم وقتلوا منهم جمعا عظيما"
پہلا غم انہیں غنیمت کے فوت ہونے کی وجہ سے لاحق ہوا، اور دوسرا غم انہیں حاصل ہوا جب کہ ابوسفیان اور خالد بن ولید نے مسلمانوں کے درہ سے ہٹ جانے پر مطلع ہو کر ان پر چڑھائی کر دی اور ان پر حملہ کر دیا اور ان میں سے ایک بڑی جماعت یعنی ستر صحابہ کرام کو شہید کر دیا۔ (ماخوذ از کبیر ج۹ ص۴۱)

﴿لِكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَاۤ اَصَابَكُمْ﴾

تا کہ تم غمگین نہ ہو اس پر جو تم سے ضائع ہو گئی اور اس پر جو پہنچی ہے تمہیں۔

یہاں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ اس کا تعلق ہو ﴿وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ﴾ سے، اب مطلب یہ ہوگا کہ تحقیق اس نے تمہیں معاف کر دیا تا کہ تم کسی چیز کے کھو جانے پر غم نہ کرو اور کسی مصیبت کے آنے پر غم نہ کرو، اس کی وجہ یہ ہے

کہ "ان فی عفوہ تعالی مایزیل کل غم وحزن" بیشک اللہ تعالی جب کسی کو معاف فرما دے تو اس کے تمام غم اور پریشانیاں دور ہو جاتی ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس کا تعلق ﴿فَاَثَابَکُمْ﴾ سے ہو۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اس نے تمہیں غم کے بدلے غم پہنچایا تا کہ تمہیں کسی چیز کے ضائع ہونے پر اور کسی مصیبت کے پہنچنے پر کوئی غم نہ ہو۔ یعنی نبی کریم ﷺ کے امر کو پورا نہ کرنے کی وجہ سے اور آپ کو غم پہنچانے کی وجہ سے جو تمہیں پسپا ہونے کا غم رب تعالی نے پہنچایا اس کی وجہ سے باقی تمام غم تمہارے جاتے رہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ

"وذلک لان الغم الحاصل بسبب الاقدام علی المعصیة ینسی الغم الحاصل بسبب مصائب الدنیا"

جب ان کو ظاہری عصیان و نافرمانی پر غم حاصل ہوا تو اس نے باقی دنیا کی مصیبتوں کے غم بھلا دئے، یہ حقیقت ہے کہ بہت بڑے غموں کی وجہ سے چھوٹے غموں کی طرف توجہ ہی نہیں رہتی،" جب دوسرا معنی مراد ہو کہ تمہیں پہنچائے غموں پر غم" تو اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ رب تعالی نے جب تمہیں پہلے کثیر غم پہنچا دئے ہیں جن کی وجہ سے تم بہت زیادہ غمگین ہو چکے ہو تو اس کے بعد کسی غم کو تم دل میں نہیں لاؤ گے، (ماخوذ از کبیر ج۹ص۴۲)

اور غموں پر غم پہنچا دینے کی وجہ یہ تھی کہ "لتمرنوا علی الصبر فی الشدائد وتعتا دوا تجرع الغموم فلاتحزنوا علی نفع فات اوضرات" تمہیں مشکلات پر صبر کرنے کی مشق حاصل ہو جائے اور غموں کا گھونٹ پی لینے کی عادت ہو جائے، پھر تمہیں کسی نفع کے فوت ہونے اور ضرر کے پہنچنے پر کوئی غم لاحق نہ ہو، (روح البیان ج۲ص۱۱۱)

﴿وَاللّٰهُ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ اور اللہ خبر رکھنے والا ہے جو تم عمل کرتے ہو،

"ای عالم باعمالکم وبما قصدتم بها"، یعنی اللہ تعالی تمہارے اعمال اور تمہارے دلی ارادوں کو جانتا ہے۔

فائدہ: صبر، یقین، اور اللہ تعالی پر توکل، اور دنیا، اور دنیا کے حسن مناظر سے بچ کر رہنا، اور رسول اللہ ﷺ کی مخالفت سے بچ کر رہنا، رب تعالی کی طرف سے امداد، کامیابی کے حاصل ہونے کے ذرائع ہیں۔ اور ضعف رائے اور تنازع اور دنیا کی طرف توجہ کرنا اور رسول اللہ ﷺ کے امر کو نہ بجالانا یہ مصائب میں مبتلاء ہونے کی اسباب ہیں، اور دشمن سے پسپا ہونے کا سبب ہے۔

"فمن اراد النصرة علی الاعداء الظاهرة والباطنة لایسلک طریقا غیر ماعینه الشارع"

جو شخص ظاہری اور باطنی دشمن پر کامیابی حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اسے چاہئے کہ جو راستہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ نے معین کیا ہے اس سے نہ ہٹے، اور کوئی راہ اختیار نہ کرے، آزمائشوں پر راضی رہے، آخرت کا بھی کوئی غم نہ کرے بلکہ صرف رب تعالیٰ کی طلب کا غم کرے۔

"فطلب الحق الذ من نعيم الدنيا والآخرة" اللہ تعالیٰ کی طلب کا غم دنیا اور آخرت کی نعمتوں سے زیادہ لذیذ ہے۔ دین کے معاملات میں جتنی بھی مصیبتیں آئیں ان پر صبر کرے،

صبر آرد آرزو را نی شتاب　　　　صبر کن واللہ اعلم بالصواب

صبر جلدی ہی آرزوؤں پورا کرتا ہے　　　　صبر کر، اللہ تعالیٰ زیادہ درست جانتا ہے۔ (روح البیان ج ۲ ص ۱۱۱)

حضرت ذوالنون بصری رحمہ اللہ کا ارشاد:

قال ذوالنون قدس سره العزيز ان ادنى منازل المريد ان الله تعالى لو ادخله النار واحاط به عذابه مع هذه الارادة لم يزد دقلبه الاحباله وانسابه وشوقا اليه وكانت الجنة عنده اصغر في جنب ارادته من خردلقبين السماء والارض فعلي السالک ان يذيق نفسه مرارة الطاعة ويدخلها في باب التسليم ليكون عندالله مماله قدروسبق"

حضرت ذوالنون بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بیشک اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کا ارادہ رکھنے والے کا ادنی درجہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اسے آگ میں داخل کر دے اور عذاب کے ذریعے اس کا احاطہ کر لے تو اس کے ارادہ میں کوئی فرق نہ آئے بلکہ اس کی محبت اللہ تعالیٰ سے بڑھتی چلی جائے، اللہ تعالیٰ سے اس کا انس اور شوق اور زیادہ ہو۔ جنت اسے رائی کے دانے سے بھی چھوٹی نظر آئے، سالک وہی ہے جو طاعت کی مشکلات کو برداشت کرے اور تسلیم کے دروازہ میں داخل ہو جائے تا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اسے قدر و منزلت حاصل ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے حضور اسے سبقت حاصل ہو۔
(روح البیان ج ۲ ص ۱۱۱)

حکمت آموز قول:

روح البیان میں ذکر کیا گیا ہے (سند مذکور نہیں اسلئے سند کی صحت وغیر صحت علامہ اسمٰعیل حقی رحمہ اللہ پر ہے) حضرت علی ﷺ نے فرمایا میں نے ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق ﷺ سے پوچھا کہ اے خلیفۂ رسول اللہ ﷺ کس وجہ سے اس مرتبہ تک پہنچے ہو کہ ہم سے تم سبقت لے گئے؟ آپ نے فرمایا پانچ چیزوں کی وجہ سے:

(۱) **اولها وجدت الناس صنفين مريدالدنيا ومريد العقبى فكنت انا مريد المولى** "ان میں سے پہلی وجہ یہ ہے کہ میں نے لوگ دو قسم کے پائے، ان میں سے بعض دنیا کا ارادہ کر رہے تھے، اور بعض آخرت کا ارادہ کر رہے، لیکن

میں نے (دنیاو آخرت کا ارادہ نہیں بلکہ) صرف رب تعالیٰ کی رضاء کا ارادہ کیا،

(۲) والثانی مذدخلت فی الاسلام ماشبعت من طعام الدنیا لان لذۃ معرفۃ اللہ شغلتنی عن لذائذطعام الدنیا" ان میں دوسری وجہ یہ ہے کہ میں جب سے اسلام میں داخل ہوا، میں نے سیر ہو کر دنیا کا طعام نہیں کھایا، اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی معرفت کی لذت نے دنیا کے طعام کی لذت سے پھیر دیا۔

(۳) والثالث مذدخلت فی الاسلام مارویت من شراب الدنیا لان محبۃ اللہ شغلتنی عن شراب الدنیا" ان میں سے تیسری وجہ یہ ہے کہ میں جب سے اسلام میں داخل ہوا میں نے دنیا کا مشروب نہیں پیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی محبت نے مجھے دنیا کے شراب سے پھیر دیا، خیال رہے کہ اس مقام میں شراب سے مراد زیادہ بہتر یہ ہے کہ تشبیہ ثابت کی جائے کہ آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں نے جب سے اسلام قبول کیا مجھے اللہ تعالیٰ کی محبت نے یوں مست کر دیا کہ دنیا کی محبت کا کوئی مشروب میں نے نہیں پیا۔

(۴) والرابع کلما استقبلنی عملان عمل الدنیا وعمل الآخرۃ اخترت عمل الآخرۃ علی عمل الدنیا" ان میں سے چوتھی وجہ یہ ہے کہ جب بھی میرے سامنے دو عمل آئے ایک دنیا کا عمل اور ایک آخرت کا عمل تو میں نے آخرت کے عمل کو دنیا کے عمل پر ترجیح دی،

(۵) والخامس صحبت النبی ﷺ فاحسنت صحبتہ" پانچویں وجہ یہ ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کی صحبت کو جب سے اختیار کیا تو میں نے احسن طریقہ سے صحبت کو قائم رکھا، علامہ اسمٰعیل حقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں آپ نبی کریم ﷺ کی صحبت سے کبھی بھی ایک گھڑی سے زیادہ جدا نہیں رہے، یہاں تک کہ آپ نبی کریم ﷺ سے ساتھ غار میں داخل ہوئے طرح طرح کی مشکلات کو آپ نے برداشت کیا لیکن نہ ہی کبھی حضور ﷺ سے آپ نے جدا ہونے کا خیال کیا اور نہ ہی آپ نے کبھی حضور ﷺ کے حکم کو ٹالا۔ (روح البیان ج ۲ ص ۱۱۱)

تنبیہ: نبی کریم ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی غزوہ احد میں صرف چالیس صحابہ کرام سے ہوئی، اور آپ کے ساتھ ثابت رہنے والے اور آپ کی حفاظت کرنے والے چودہ صحابہ کرام تھے جن کے نام ذکر کر دیئے گئے، شہید ہونے والے ستر صحابہ کرام سب ہی ثابت قدم رہنے والے تھے، اور جو شہید نہیں ہوئے ان میں بعض میدان کارزار میں قائم رہے کچھ بکھر گئے۔ لیکن رب تعالیٰ نے بکھر جانے والوں کے نادم ہونے پر ان کو معاف کر دیا، اللہ تعالیٰ سمجھنے کی توفیق عطاء فرمائے، صحابہ کرام اور اہل بیت کے گستاخ اپنی عاقبت برباد کر رہے ہیں۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے مخالفین اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے مخالفین دونوں ایک درجہ کے ہیں۔ رب تعالیٰ ان دونوں فرقوں سے بچائے، کاش کہ حق راہ سادات اور پیروں کو بھی سمجھ آئے۔

ثُمَّ اَنۡزَلَ عَلَیۡکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ الۡغَمِّ اَمَنَۃً نُّعَاسًا یَّغۡشٰی طَآئِفَۃً مِّنۡکُمۡ ۙ وَ طَآئِفَۃٌ قَدۡ اَہَمَّتۡہُمۡ اَنۡفُسُہُمۡ یَظُنُّوۡنَ بِاللّٰہِ غَیۡرَ الۡحَقِّ ظَنَّ الۡجَاہِلِیَّۃِ ؕ یَقُوۡلُوۡنَ ہَلۡ لَّنَا مِنَ الۡاَمۡرِ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ قُلۡ اِنَّ الۡاَمۡرَ کُلَّہٗ لِلّٰہِ ؕ یُخۡفُوۡنَ فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ مَّا لَا یُبۡدُوۡنَ لَکَ ؕ یَقُوۡلُوۡنَ لَوۡ کَانَ لَنَا مِنَ الۡاَمۡرِ شَیۡءٌ مَّا قُتِلۡنَا ہٰہُنَا ؕ قُلۡ لَّوۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ بُیُوۡتِکُمۡ لَبَرَزَ الَّذِیۡنَ کُتِبَ عَلَیۡہِمُ الۡقَتۡلُ اِلٰی مَضَاجِعِہِمۡ ۚ وَ لِیَبۡتَلِیَ اللّٰہُ مَا فِیۡ صُدُوۡرِکُمۡ وَ لِیُمَحِّصَ مَا فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ۝ (آیۃ نمبر ۱۵۴)

(1) پھر تم پر غم کے بعد چین کی نیند اتاری کہ تمہاری ایک جماعت کو گھیرے تھی اور ایک گروہ کو اپنی جان کی پڑی تھی اللہ پر بے جا گمان کرتے تھے جاہلیت کے سے گمان کہتے کیا اس کام میں کچھ ہمارا بھی اختیار ہے، تم فرمادو کہ اختیار تو سارا اللہ کا ہے اپنے دلوں میں چھپاتے ہیں جو تم پر ظاہر نہیں کرتے کہتے ہیں ہمارا کچھ بس ہوتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے تم فرمادو کہ اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے جب بھی جن کو مارا جانا لکھا جا چکا تھا اپنی قتل گاہوں تک نکل کر آتے اور اس لئے کہ اللہ تمہارے سینوں کی بات آزمائے اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اسے کھول دے اور اللہ دلوں کی بات جانتا ہے۔ (کنز الایمان)

(2) پھر اتاری تم پر غم کے بعد چین کی نیند جو چھا رہی تھی ایک گروہ پر تم میں سے، اور ایک گروہ کو تحقیق غم میں ڈالا ان کی جانوں نے، وہ گمان کرنے لگے اللہ پر بے جا جاہلیت کا گمان "وہ کہنے لگے کیا ہمیں (اختیار) ہے اس کام میں کچھ، تم فرمادو کہ بیشک کام) میں اختیار) تو سارا اللہ کا ہے، وہ پوشیدہ رکھتے ہیں اپنے نفسوں میں جو ظاہر نہیں کرتے آپ پر وہ کہتے ہیں اگر ہمیں اس کام میں کچھ (اختیار) حاصل ہوتا تو ہم نہ قتل کئے جاتے یہاں۔ فرمادیجئے اگر ہوتے تم اپنے گھروں میں البتہ نکل آتے "وہ کہ لکھا گیا ان کیلئے قتل ہونا" اپنے قتل کی جگہ تک، تاکہ آزمائے اللہ جو تمہارے سینوں میں ہے، تاکہ کھول کر نکھار دے اسے جو تمہارے دلوں میں ہے، اللہ جانتا ہے سینوں کی باتوں کو۔ (نجوم الفرقان)

مختصر مطلب:

اللہ تعالی نے مؤمنوں سے نصرت کا وعدہ فرمایا کہ تمہیں کافروں پر مدد دی جائے گی، انسان نصرت کو اسی وقت نصرت اعتبار کرتا ہے جب اس کا خوف زائل ہو جائے، اس آیۃ کریمہ میں اللہ تعالی نے ان سے خوف زائل کرنے کا ذکر کیا، تا کہ ان کے دل مطمئن ہو جائیں کہ اللہ تعالی کی امداد کا وعدہ مزید پورا ہوگا۔ اللہ تعالی نے پہلے اپنی امداد کا ذکر فرمایا ﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ﴾ اور تحقیق سچا کر دیا تمہارے ساتھ اللہ نے اپنا وعدہ جب تم ان کو (کافروں کو) قتل کر رہے تھے، لیکن صحابہ کرام سے نبی کریم ﷺ کے حکم کو ماننے میں غلطی ہوئی تو ان پر خوف مسلط کر دیا گیا، پھر ان سے خوف کو ہٹا لیا گیا۔ غزوہ احد میں شریک ہونے والے دو قسم کے لوگ تھے، ایک مخلصین مؤمنین صحابہ کرام اور دوسرے منافقین، ان دونوں فریقوں کا تذکرہ اس آیۃ کریمہ میں فرمایا، مؤمنوں کو خطاب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالی نے تمہیں جو غم پہنچایا اور خوف مسلط کیا اس کے بعد تمہیں چین کی نیند عطا فرما دی جس سے تمہارا خوف جاتا رہا، یہ ایک فریق یعنی مخلصین مؤمنین پر نیند چھا گئی، اور دوسرا فریق منافقین کا تھا جن کو جان کی فکر کھائے جا رہی تھی، وہ جاہلیت کی طرح اللہ تعالی پر بلا وجہ بدگمانی کر رہے تھے، وہ کہہ رہے تھے کاش ہمیں بھی کوئی اختیار ہوتا۔

اللہ تعالی نے نبی کریم ﷺ کو خطاب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ آپ فرما دیں کہ بیشک تمام اختیار تو اللہ تعالی کو حاصل ہے، وہ جو چاہے کرتا ہے، انہوں نے اپنی بدگمانیوں کو دلوں میں چھپا رکھا تھا، اسے ظاہر نہیں کر رہے تھے، وہ کہہ رہے تھے کاش کہ ہمیں کوئی اختیار ہوتا اور ہمارے سردار عبداللہ بن ابی کی بات کو مان کر مدینہ میں رہ کر مدافعانہ (دفاعی) جنگ لڑی جاتی تو یہاں ہمارے بھائی قتل نہ ہوتے، اللہ تعالی نے نبی کریم ﷺ کو فرمایا کہ آپ ان کو فرما دیں کہ جس کی موت لکھی ہوئی تھی اسے اپنی قتل کی جگہ پہنچنا ہی تھا جہاں وہ پہنچ گیا، احد کے واقعہ کی اصل وجہ یہ بھی تھی کہ اللہ تعالی ان کے سینوں میں چھپی ہوئی باتوں کا امتحان لے لے، مومنوں کے دلوں سے خوف کو ہٹا دے، مومنوں کے دلوں کو نکھار دے، اور مؤمنوں اور منافقوں میں تمیز کر دے تا کہ آنے والی نسلوں کو مخلصین اور منافقین کا کردار اور ان کے نظریات سمجھ آتے رہیں۔ اللہ تعالی تو لوگوں کے سینوں میں چھپے ہوئے راز جانتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا﴾ "پھر اتاری تم پر چین کی نیند۔"

﴿ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ﴾ یہ خطاب ایمان والوں کو ہے کہ اے ایمان والو پھر اتاری تم پر، ﴿مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ﴾ غم کے بعد، یعنی جو تمہیں غزوہ احد میں مصیبت پہنچی اور وقتی طور پر شدید خوف لاحق ہوا، اس کے بعد "امنۃ نعاسا" چین کی

نیند"الامن والامنة واحد" امن اور امنۃ کا ایک ہی معنی ہے، ہاں بعض حضرات نے فرق بھی کیا ہے، وہ یہ کہ "الامن یکون مع زوال الخوف" امن اس وقت حاصل ہوتا ہے جب خوف بھی زائل ہو جائے "والأمنة مع بقاء سبب الخوف" امنۃ اس آرام کو کہتے ہیں جو بظاہر آرام بھی حاصل ہو، لیکن خوف باقی رہے، "والنعاس اخف من النوم" ہلکی نیند کو نعاس کہا جاتا ہے،

"والمعنى اعقبكم بمانالكم من الخوف والرعب ان امنكم أمناتنامون معه لان الخائف لايكاد ينام فآمنهم بعد خوفهم"

مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے ایمان والوں کا امتحان لے لیا، ان کو مصیبت پہنچا کر ان پر خوف اور رعب مسلط کر دیا، اس کے بعد ان کو امن، چین دے دیا جس کی وجہ سے ان کو نیند آنے لگی، اسی سے واضح ہو گیا کہ ان کے دلوں میں کوئی خوف نہیں رہا تھا کیونکہ جو ڈر رہا ہو نیند تو اس کے قریب بھی نہیں آتی، یہاں سے ایک اور بات نکھر کر سامنے آ گئی کہ اس مقام "امنة" بغیر خوف کے امن حاصل ہونے کے معنی میں استعمال ہے وہ امن مراد نہیں جس میں خوف باقی رہے۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

قوله"نعاسا"بدل اشتمال من امنة وجاز ان يكون مفعولا لانزل"وامنة"حال منه مقدم عليه"

(مظہری ج ۲ ص ۱۵۷)

یہاں دو ترکیبیں پائی گئی ہیں ایک یہ کہ "نعاسا" بدل اشتمال ہو "امنة" سے، اسی ترکیب کے مطابق حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے "پھر اتاری اللہ تعالیٰ نے تم پر غم واندوہ کے بعد "راحت (یعنی) غنودگی۔

(ضیاء القرآن ج ۱ ص ۲۷۶)

اور دوسری ترکیب یہ ہے کہ "نعاسا" مفعول ہے "انزل" کا، اور "امنة" اس سے حال مقدم ہے، اس کا تفصیلی معنی تو یوں ہوگا "پھر اتاری تم پر نیند حال یہ ہے کہ وہ امن وچین تھی" لیکن اتنے لمبے معنی کو اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان رحمہ اللہ نے مختصر اور خوبصورت انداز میں یوں بیان کیا "پھر تم پر غم کے بعد چین کی نیند اتاری"۔ (کنز الایمان)

راقم نے بھی یہی ترجمہ نقل کیا لیکن لفظی ترتیب کے مطابق "پھر اتاری تم پر چین کی نیند" (نجوم الفرقان)

﴿يَغْشَى طَائِفَةً مِّنكُمْ﴾ جو چھا رہی تھی ایک گروہ پر تم میں سے" اس گروہ سے مراد کون سا گروہ ہے؟

﴿وَهُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا﴾ اس سے مراد یقیناً ایمان والے لوگ ہیں۔ (مظہری ج ۲ ص ۱۵۸)

❁ عن انس عن ابی طلحة قال كنت فيمن تغشاهم النعاس يوم احد حتى سقط سيفي

من یدی مرارا یسقط و آخذہ ویسقط فآخذہ. (بخاری)

حضرت انس ﷺ حضرت ابوطلحہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ فرماتے ہیں میں بھی ان لوگوں میں تھا جن پر احد کے دن نیند چھارہی تھی، یہاں تک کہ میرے ہاتھ سے کئی مرتبہ تلوار گرگئی، تلوار گرجاتی میں اسے پکڑلیتا، پھر گرجاتی پھر پکڑتا۔

❁ واخرجه الترمذی عنه قال غشینا النعاس ونحن فی مصافنا یوم احد"
حضرت ابوطلحہ کہتے ہیں ہم پر احد کے دن نیند چھارہی تھی حالانکہ ہم صفوں میں تھے، (منقول از خازن ج۱ص ۲۶۴)

❁ وقال ثابت عن انس عن ابی طلحة قال رفعت راسی یوم احد فجعلت ماأری احدا من القوم الاوهویمیل تحت جحفة من النعاس"
ابوطلحہ فرماتے ہیں میں نے احد کے دن اپنا سر اٹھا کر دیکھا، میں اپنی قوم کو دیکھ رہا تھا کہ غنودگی کی وجہ سے ڈھالوں کے نیچے ان کے سر مائل ہو رہے تھے (منقول مظہری ج۲ص ۱۵۹)

❁ عن ابن مسعود النعاس فی القتال امنة والنعاس فی الصلوة من الشیطان"
حضرت ابن مسعود ﷺ فرماتے ہیں جنگ میں غنودگی امن ہے اور نماز میں غنودگی شیطان کی طرف سے ہے

❁ "وذلک لأنه فی القتال لایکون الامن غایة الولوق باللہ والفراغ عن الدنیا ولایکون الصلوة الامن غایة البعد عن اللہ"
وجہ اس کی یہ ہے کہ جنگ میں غنودگی تب ہی آتی ہے جب اللہ تعالی پر کامل بھروسہ ہو، اور دنیا کی طرف اس کی توجہ نہ ہو، اور نماز میں غنودگی کا آنا علامت ہے اس کی کہ یہ شخص اللہ تعالی سے بہت دور ہے، اگر اسے اللہ تعالی کا قرب حاصل ہوتا، اور رب تعالی کا خوف لاحق ہوتا تو اسے غنودگی نہ آتی۔ (کبیر ج۹ص ۴۵)

غنودگی میں فوائد:

(۱) مؤمنوں کی جماعت کو دوران جہاد عام عادت کے خلاف زیادہ ہی ہلکی نیند آگئی، جس کی وجہ سے ان کے ہاتھوں سے تلوار گرتی وہ اٹھاتے پھر گرجاتی "فکان ذلک معجزة ظاھرة للنبی ﷺ" یہ نبی کریم ﷺ کا واضح معجزہ ہے۔ صحابہ کرام نے جب نبی کریم ﷺ کا یہ نیا معجزہ دیکھا تو ان کے ایمان میں اور زیادہ پختگی آگئی،

"ومتی صاروا کذلک ازداد جدھم فی محاربة العدو ووثوقھم بان اللہ تعالی منجز وعدہ"
جب ان کے دل میں اور زیادہ ایمان میں پختگی آگئی تو دشمن کے ساتھ ان کی جنگ میں کوشش اور بڑھ گئی۔ اور بہت زیادہ وثوق ان کو حاصل ہوگیا کہ اللہ تعالی نے ان کے ساتھ وعدہ کو ضرور ہی پورا کرنا ہے،

(۲) نیند کے نہ آنے، بیدار رہنے کی وجہ سے ضعف اور سستی آجاتی ہے۔ جب سو جائے، آرام کرلے تو اس کے

بعد چستی اور قدرت وطاقت بڑھ جاتی ہے۔

(۳) صحابہ کرام کو دوران جہاد اس وجہ سے بھی نیند عطاء کی تاکہ وہ اپنے شہید اقرباء کو نہ دیکھیں تاکہ دیکھنے میں انہیں خوف نہ حاصل ہو۔

(۴) دشمن جبکہ بہت تمنا رکھتے تھے کہ باقی بچ جانے والے حضرات کو بھی شہید کر دیں تو اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو نیند عطاء کر دی اور ان کو سلامت رکھا، "هذا أدل الدلائل على ان حفظ الله وعصمته معهم" یہ اس پر بہت بڑی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی حفاظت کرنے والا ہے، اور وہی بچانے والا ہے۔ جب یہ بات سمجھ میں آجائے تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ بڑھ جاتا ہے اور دل سے خوف جاتا رہتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر ج۹ ص۴۵)

﴿وَطَائِفَةٌ قَدْاَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ﴾ "اور ایک گروہ کو غم میں ڈالا ان کی جانوں نے۔"

"هم يهم هما" الحزن الذى يذيب الانسان" يقال هممت الشحم"

وہ غم جو انسان کو پگھلا دے اسے "هم" کہا جاتا ہے اسی طرح کہا جاتا ہے 'هممت الشحم' میں نے چربی کو پگھلایا۔"والهم ماهممت به فى نفسک" اسی طرح "هم" کا معنی ارادہ کرنا بھی آتا ہے۔ یہ معنی قرآن پاک کی بہت آیات میں استعمال ہے۔

"اِذْهَمَّتْ طَّائِفَتَانِ مِنْكُمْ" "وَهَمُّوْابِمَالَمْ يَنَالُوْا" "وَهَمُّوْابِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ"

اس مقام میں کونسا معنی معتبر ہے؟ دونوں معنی لئے جاسکتے ہیں لیکن مراد دونوں سے غم میں ڈالنا ہی ہے۔"وطائفة قداهمتهم انفسهم" یعنی

حملتهم انفسهم على الهم لان اسباب الخوف وهى قصد الاعداء كانت حاصلة عندهم"

یعنی ان کی جانوں نے ان کو غم پر برانگیختہ کیا یعنی غم پر ابھارا، کیونکہ ان کو اسباب خوف حاصل تھے کہ ہائے دشمن ہم پر حملہ کر کے ہمیں قتل کر دے گا۔ (خازن ج۱ ص۲۹۴)

راقم نے یہی معنی کیا ہے ظاہر الفاظ کے مطابق چونکہ "انفسهم" مرفوع ہے اور فاعل ہے۔ (اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے مرادی معنی پیش کیا ہے، مختصر اور خوب' اور ایک گروہ کو اپنی جان کی پڑی ہوئی تھی' (کنز الایمان)

اور یہی ڈرنے والا معنی ابو مسلم نے بھی بیان کیا:

"قال ابومسلم من عادة العرب ان يقولوا لمن خاف "قداهمته نفسه"

ابو مسلم کہتے ہیں عرب کی یہ عادت ہے کہ جب کوئی ڈر رکھتا ہو تو کہا جاتا ہے "قداهمته نفسه "تحقیق اس کے نفس نے اسے غم میں ڈال دیا ہے، یعنی اسے اپنی جان کی پڑی ہوئی ہے۔" ارادہ والا معنیٰ" بھی آتا رہتا ہے "همنی الشئ "فلاں چیز نے مجھے یہ ارادہ کرایا۔" یعنی عن همی وقصدی "یعنی میرا ارادہ یہ تھا۔ (کبیر ج۹ ص۴۶)

اسی معنی کے لحاظ پر ترجمہ یوں ہوگا" ایک گروہ کو ان کے نفسوں نے ارادہ کرایا (ڈرنے کا) لیکن اس معنی میں تکلف پایا جائے جو مستحسن نہیں۔

"وهؤ لاء المنافقون لشدة خوفهم من القتل طار النوم عنهم"

منافقوں کی شدت خوف کی وجہ نیند اڑ گئی تھی،

مومنوں اور منافقوں کے غم میں فرق:

قیل المؤمنون کان همهم النبی ﷺ واخوانهم من المؤمنین، والمنافقون کان همهم انفسهم"

مؤمنوں کو بھی اگر چہ خوف تھا لیکن وہ نبی کریم ﷺ اور اپنے مؤمن بھائیوں کا ان کو اپنی جانوں کا کوئی خوف نہ تھا اسی وجہ سے رب تعالی نے ان پر نیند کو مسلط کر کے اس خوف کو ان سے دور کر دیا جو انہیں لاحق تھا۔ لیکن منافقوں کو اپنی جان کا خوف تھا، اسلئے وہ خوف سے پگھلے جا رہے تھے، تحقیق قول کی یہ ہے کہ انسان جس چیز میں مشغول ہو اور متفرق ہو دوسری چیز اسے بھول جاتی ہے، اسلئے مومنوں کی توجہ صرف اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ کی طرف تھی لھذا ان کو جانوں کا خوف نہیں دیا۔ منافقین اپنی جانوں میں مشغول تھے اور اللہ تعالی اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کرتے تھے اس وجہ سے انہیں خوف اپنی جانوں کا تھا، (ماخوذ از کبیر ج۹ ص۴۶)

﴿يَظُنُّونَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ﴾ وہ گمان کرتے ہیں اللہ پر بے جا جاہلیت کا گمان۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

﴿غَيْرَ الْحَقِّ﴾ "مصدر کے حکم میں ہے، معنی اس کا یہ ہے "یظنون بالله غیر الظن الحق الذی یجب ان یظن به" وہ اللہ پر گمان کرتے ہیں "ظن، حق کا غیر ہے" حالانکہ ان پر واجب تھا کہ وہ حق گمان کرتے، "ظن الجاهلية" بدل عنه "ظن الحاهلية" بدل ہے "غیر الحق" سے، اس ترکیب کا فائدہ یہ ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ کثیر تعداد میں دین ناحق ہیں، ان سب میں سے اہل جاہلیت کے اقوال زیادہ برے ہیں، پہلے

ذکر کیا "انھم یظنون باللہ غیر الظن الحق" کہ وہ بیشک اللہ تعالی پر بے جا، ناحق گمان کرتے ہیں۔اس کے بعد بیان کیا کہ انہوں نے ناحق دینوں میں سے وہ پسند کیا "ھو اکثرھا بطلانا وھو ظن اھل الجاھلیۃ" جو اکثر باطل ہے، وہ اہل جاہلیت کا گمان ہے۔ (کبیرج ۹ص ۴۷)

﴿یَظُنُّوْنَ بِاللّٰہِ﴾ میں دو قول ہیں، ایک قول یہ ہے کہ "ظن" خاص درجۂ علم میں ہو اور اس کا استعمال اسطرح ہو جیسا کہ "حاتم الجود" اور "عمر العدل" کا استعمال ہے، مراد وہ ظن ہو جو دین جاہلیت کے ساتھ خاص ہو۔"اب ترجمہ یہ ہوگا" وہ گمان کرتے ہیں اللہ پر بے جا دین جاہلیت کا گمان" راقم نے ظاہری الفاظ کے مطابق یہی ترجمہ کیا ہے،

دوسرا قول ہے "المراد ظن اھل الجاھلیۃ" اس صورت میں معنی یہ ہوگا وہ گمان کرتے ہیں اللہ پر بے جا جاہلیت والوں کے گمان کی طرح، اعلی حضرت رحمہ اللہ نے اسی کے مطابق ذرا مختصر ترجمہ کیا" اللہ پر بے جا گمان کرتے تھے جاہلیت کے سے گمان۔

جاہلیت کا گمان کیا تھا:

اس کے دو احتمال ہیں۔ایک ان میں سے زیادہ ظاہر ہے وہ یہ کہ

"انھم کانوا یقولون فی انفسھم لو کان محمد محقا فی دعواہ لما سلط الکفار علیہ وھو ظن فاسد"

وہ کہ وہ اپنے دل میں یہ کہتے تھے کہ اگر محمد اپنے دعوی میں حق پر ہوتے تو کافران پر مسلط نہ ہوتے، یہ دعوی ان کا باطل تھا، کیونکہ اللہ تعالی نے نبی کریم ﷺ کو نبوت کا تاج پہنایا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ رب تعالی آپ کو آزمائش میں نہیں ڈال سکتا، "ان اللہ تعالی یفعل مایرید ویحکم مایرید" بیشک اللہ تعالی جو چاہے وہ کرتا ہے اور جو چاہے وہ حکم فرماتا ہے، رب تعالی پر کوئی اعتراض نہیں کرسکتا کہ وہ اپنے بندوں کو آزمائش میں کیوں ڈالتا ہے۔اگر غور کیا جائے تو بندے کی آزمائش بھی اس کے مدارج کو بلند کرنے کیلئے کی جاتی ہے کہ وہ اس آزمائش میں پورا اتر کر قرب الٰہی حاصل کرلے۔

ظن جاہلیت میں دوسرا احتمال یہ ہے کہ "انھم کانوا ینکرون الہ العالم بکل المعلومات القادر علی کل المقدورات" کہ وہ رب تعالی جو معبود حقیقی ہے اس کے متعلق یہ گمان کرتے تھے کہ وہ تمام معلومات کا عالم نہیں

اور تمام مقدورات پر قادر نہیں، ان کا یہ گمان باطل تھا،

"وینکرون النبوة والبعث فلاجرم ماولقوا بقول النبیا فی ان الله یقویهم وینصرهم"

وہ نبوت اور قیامت کا انکار کرتے تھے اور نبی کریم ﷺ کے اس قول پر وثوق نہیں کرتے تھے کہ اللہ تعالی ان کو قوت دے گا، ان کی امداد کرے گا، ان کا یہ انکار بھی جاہلیت کا گمان تھا، (ماخوذ از کبیر بالاختصار ج۹ص۴۶)

﴿وَیَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ﴾ "وہ کہنے لگے کیا ہمیں اس کام میں اختیار ہے کچھ"

منافقین کی یہ ایک اور صفت بیان کی جا رہی ہے۔ان کا کلام استفہام انکاری کے طور پر ہے، مطلب یہ ہوا کہ وہ منافقین کہہ رہے تھے کیا ہمیں اس کام میں کوئی اختیار ہے کچھ، یعنی ہمیں تو اس میں کوئی اختیار ہی نہیں تھا، اگر ہمارا کوئی اختیار ہوتا اور ہماری بات کو مانا جاتا تو اس طرح مسلمان قتل نہ ہوتے۔

شان نزول:

غزوۂ احد کیلئے نبی کریم ﷺ نے منافقوں کے سردار عبداللہ بن ابی بن سلول سے مشورہ کیا تو اس نے کہا کہ آپ مدینہ طیبہ میں ہی رہیں، یہاں سے ہی کفار کا دفاع کریں، لیکن نبی کریم ﷺ نے اس کی بات کو نہ مانا آپ احد میں تشریف لے گئے، "وقتل من قتل" تو اس میں کئی حضرات شہید ہو گئے۔

"قیل لعبد الله بن ابی قد قتل بنو الخزرج" قال "هل لنا من الامر شیء" وهو استفهام علی سبیل الانکار ای مالنا امر یطاع"

تو عبداللہ بن ابی کو کہا گیا بنوخزرج کے لوگ شہید ہو گئے، وہ کہنے لگا کیا ہمیں اس کام میں کوئی اختیار تھا؟ یعنی ہمیں تو کوئی اختیار نہیں تھا ہماری بات کو تو تسلیم ہی نہیں کیا گیا۔

یعنی ان محمدا لم یقبل قولی حین امرته بان یسکن فی المدینة ولایخرج منها، ونظیره ماحکاه الله عنهم انهم قالوا "لو اطاعونا ماقتلوا"

یعنی عبداللہ بن ابی کہنے لگا میری بات کو تسلیم نہیں کیا گیا میں نے تو کہا تھا مدینہ میں ہی رہیں باہر نہ نکلیں، رب تعالی نے ان لوگوں قول کو یوں بیان فرمایا کہ وہ کہہ رہے تھے ﴿لَوْ اَطَاعُوْنَا مَاقُتِلُوْا﴾ اگر یہ (مسلمان) ہماری اطاعت کرتے تو قتل نہ کیئے جاتے۔

دوسری وجہ یہ بیان کی گئی کہ منافقین کا یہ کہنا:

"هل لنا من الامرشئ"ای هل لنا من الشئ الذی کان یعدنا به محمد وهو النصرة والقوة شئ وهذا استفهام علی سبیل الانکار"

"کیا ہمیں اس کام میں اختیار ہے کچھ" اس میں ان کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں تو اس میں کچھ اختیار ہی نہیں تھا جو محمد (ﷺ) ہمارے ساتھ نصرت اور غلبہ کا وعدہ کرتے تھے۔ بلکہ (معاذ اللہ) وہ استدلال یہ پیش کررہے تھے

"ان محمدا کان کاذبافی ادعاء النصرة والعصمة من الله تعالی لامته"

بیشک محمد (ﷺ) اپنے اس دعوی میں جھوٹے تھے جو وہ اپنی امت کو کہتے تھے کہ تمہیں امداد حاصل ہوگئی۔ (معاذ اللہ) ان منافقین کا استدلال باطل تھا۔ (کبیر ج۹ ص ۴۷)

عبداللہ بن ابی کی طرح معتب بن قشیر اور اس کے ساتھی بھی یہی کہہ رہے تھے "وکانوا خرجوا طمعافی الغنیمة" وہ نکلے ہی تھے مال غنیمت حاصل کرنے کیلئے، جب ان کو غنودگی بھی نہ آئی "وجعلوا یتأسفون علی الحضور ویقولون الأقاویل" خوف ان کو حاصل ہوا تو وہ احد میں اپنے حاضر ہونے پر افسوس کررہے تھے، اور اس قسم کے باطل اقوال پیش کررہے تھے۔

"قال ازبیر ارسل علینا النوم ذلک الیوم وانی لأسمع قول معتب بن قشیر والنعاس یغشانی یقول لو کان لنا من الأمر شئ ماقتلنا ههنا"

حضرت زبیر ﷺ فرماتے ہیں، ہمیں اس دن غزوہ احد میں نیند عطاء کردی گئی، باوجود اس کے کہ نیند مجھ پر چھا رہی تھی لیکن میں معتب بن قشیر کی آواز سن رہا تھا، وہ کہہ رہا تھا "اگر ہمیں اس امر میں کچھ اختیار ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ کئے جاتے، (قرطبی ج۴ ص ۶۴۲)

﴿قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ﴾

"تم فرمادو بیشک کام (میں اختیار) سارا اللہ کا ہے۔"

(قل) یامحمد لهؤلاء المنافقین (ان الأمر کله لله) یعنی النصر والظفر والقضاء والقدر کله لله وبیده یصرفه کیف یشاء ویدبره کیف احب"

مطلب ان الفاظ مبارکہ کا یہ ہوا کہ اے محمد (ﷺ) آپ ان منافقوں کو فرمادو کہ بیشک سارا امر اللہ کیلئے ہے یعنی نصرت اور کامیابی عطاء کرنا، قضاء وقدر (تمام فیصلے اور تقدیر) سب اللہ تعالی کے قبضہ قدرت میں ہیں وہ پھیرتا ہے جس طرح چاہے، اور تدبیر فرماتا ہے جسطرح پسند کرتا ہے۔ (خازن ج۱ ص ۲۶۴)

تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر میں ہیں:

اس آیۃ کریمہ سے اہل سنت نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ جب منافقین نے یہ کہا "ان محمدالوقبل منارأینا ونصحنا لما وقع فی ھذہ المحنة" بیشک محمد اگر ہماری رائے کو مانتے اور ہماری نصیحت پر عمل کرتے تو اس مشقت میں نہ پڑتے "فاجاب اللہ عنه بان الأمر كله لله" تو اللہ تعالیٰ نے یہ جواب دیا کہ امر (کام) سارا اللہ کا ہے، اس جواب سے ہی یہ پتہ چل گیا کہ بندوں کے تمام افعال اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر میں ہیں، اگر اس کی مشیئت سے خارج ہوتے تو منافقین کے شبہ کا ازالہ نہ ہوتا۔

آیۃ کریمہ اور برہان عقلی کا تطابق:

آیۃ کریمہ سے جس طرح ثابت ہوا کہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر میں ہیں اسی طرح عقلی دلیل سے بھی یہی ثابت ہو رہا ہے کہ موجود یا واجب لذاتہ ہوگا یا ممکن لذاتہ ہوگا، ممکن لذاتہ کے وجود کو عدم پر اس وقت تک راجح نہیں کر سکتے جب تک اس کی انتہاء واجب الوجود کی طرف نہ ہو، یعنی ممکن اسی وقت موجود ہوتا ہے جب واجب الوجود اسے موجود کرے "فثبت ان كل ماسوى الله تعالى مستند الى ايجاده وتكوينه" تو ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا سب مخلوق اللہ تعالیٰ کے موجود کرنے سے موجود ہوتی ہے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ بعض محدثات اور بعض ممکنات تو اللہ تعالیٰ کے موجود کرنے اور پیدا کرنے سے ہی موجود ہوتے ہیں۔ اور بعض خود بخود ہو جاتے ہیں۔

"فتدخل فيه افعال العباد وحركاتهم وسكناتهم وذلك هو المراد بقوله "قل ان الامر كله لله"

بلکہ یہ ثابت ہے کہ تمام بندوں کی حرکات وسکنات اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں، اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ﴾ کا یہی مطلب ہے کہ سارا کام اللہ تعالیٰ کا ہے، یعنی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ "ھذا كلام فى غاية الظهور لمن وفقه الله للانصاف" یہ مسئلہ بہت زیادہ واضح ہے لیکن سمجھا اسے ہی آ سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ انصاف کی توفیق عطاء کرے۔ (کبیر ج ۹ ص ۴۸)

﴿يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ﴾ وہ پوشیدہ رکھتے ہیں اپنے نفسوں میں جو نہیں ظاہر کرتے آپ پر یعنی وہ کفر کو اپنے نفسوں میں پوشیدہ رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ میں شک کرتے ہیں، اور مسلمانوں کے ساتھ نکلنے میں اپنی ندامت کو پوشیدہ رکھتے ہیں (خازن)

والفائدة فی ھذا التنبیه ان یکون النبی ﷺ متحرزا عن مکرھم وکیدھم" (کبیر ج ۹ ص ۴۸)

اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ وہ دل میں مخفی رکھتے ہیں جو ظاہر نہیں کرتے، اس سے نبی کریم ﷺ کو خبردار کرنا

مقصود ہے کہ آپ ان کے مکروفریب سے بچ کر رہیں۔

﴿یَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا﴾

''وہ کہتے ہیں اگر ہمیں اس کام میں کچھ (اختیار) حاصل ہوتا تو ہم نہ مارے جاتے یہاں۔''

سؤال: پہلے جو گذر گیا ﴿یَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ﴾ اور اب جو بیان کیا جا رہا ہے ﴿یَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ﴾ ان میں کیا فرق ہے بظاہر تو تکرار نظر آتا ہے۔

پہلا جواب: اللہ تعالیٰ نے جب ان کے قول کو بیان فرمایا ﴿یَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ﴾ (وہ کہتے ہیں کیا ہمیں اس امر میں (اختیار) تھا کچھ) تو رب تعالیٰ نے اس کا جواب دے دیا ﴿قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ﴾ آپ فرمادیں بیشک امر سارا اللہ کا ہے۔ تو اس جواب پر گویا کہ انہوں نے اعتراض کے طور پر کہا ﴿لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا﴾ اگر ہمیں کوئی اس امر میں اختیار ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ کئے جاتے، یعنی مدینہ میں ہی رہتے اور وہاں سے نہ نکلتے، ''فهذا يدل على انه ليس الامر كما قلتم من ان الامر كله لله'' یعنی ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ تمہارا یہ کہنا کہ تمام امور رب تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں یہ درست نہیں۔ تم تو ہماری بات نہ مان کر، مدینہ سے نکل کر یہاں آنے کی وجہ سے قتل کئے گئے ہو۔

ان کا یہ جوب اسی طرح کا تھا جیسے اہل سنت کہتے ہیں رب تعالیٰ نے بندے کو افعال کے کرنے اور نہ کرنے کا اگرچہ اختیار تو دیا ہے لیکن بندہ اپنے افعال کا خالق نہیں۔ اور حقیقت میں ''الامر كله فى الطاعة والمعصية والايمان والكفر بيدالله'' تمام امور اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں، خواہ طاعت ہو یا معصیت، خواہ ایمان ہو یا کفر۔ معتزلہ کہتے ہیں بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے، اللہ تعالیٰ نے بندے کو جب کامل مختار بنا دیا تو اب بندے کے افعال اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں نہ رہے۔

اسی طرح منافقین کے کلام میں کوئی مستقل شبہ نہیں پایا گیا بلکہ ''بل يكون الغرض منه الطعن فيما جعله الله تعالى جوابا عن الشبهة الاول'' صرف ان کی غرض پہلے شبہ کے جواب پر طعن کرنا تھا۔ خلاصہ جواب یہ ہے کہ ان کا پہلا قول ایک شبہ تھا، اس کا جواب دیا گیا، پھر ان کا دوسرا قول مستقل شبہ نہیں تھا بلکہ پہلے شبہ کے جواب پر طعن تھا۔

دوسرا جواب: ان کے پہلے قول ﴿هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہ کہہ رہے تھے ''هل لنا من النصرة التى وعدنا بها محمد شئ'' کیا ہمیں اس امداد میں سے کچھ امداد

حاصل ہوگی جس کا وعدہ ہمارے ساتھ محمد (ﷺ) نے کیا۔اور دوسرا قول عبداللہ بن ابی کا ہے جمع کا صیغہ اس لئے ذکر کیا گیا کہ اس کے متبعین بھی اس کے ہمنوا تھے، اسی کا راگ الاپ رہے تھے، وہ یہ کہہ رہا تھا "ان محمدا لو اطاعنی وماخرج من المدینة ماقتلنا ھھنا" بیشک محمد (ﷺ) اگر میری اطاعت کرتے اور مدینہ سے نہ نکلتے تو یہاں ہمارے اتنے حضرات قتل نہ کئے جاتے۔(ماخوذ از کبیر ج۹ ص۴۹)

﴿قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ﴾ فرمایئے اگر ہوتے تم اپنے گھروں میں البتہ نکل آتے "وہ کہ لکھا گیا ان کیلئے قتل ہونا" اپنے قتل کی جگہ تک۔"

یہ الفاظ مبارکہ جن کا ترجمہ ابھی نقل کیا گیا، اور آنے والے دو جملے اللہ تعالی نے ان کے اس قول کے جواب میں ارشاد فرمائے جو انہوں نے کہا ﴿لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا﴾ (اگر ہمیں اس امر میں کچھ (اختیار) حاصل ہوتا تو ہم قتل نہ کئے جاتے یہاں)

"البراز" فضاء، برز حصل فی برازای فضاء، جب کوئی کھلی فضاء میں جائے تو کہا جاتا ہے "برز" پھر کبھی یہ خود بخود ظاہر ہونے پر بولا جاتا، اور کبھی ظاہر کرنے کھولنے پر بولا جاتا۔اور کبھی اللہ کے فضل سے ظاہر ہونے پر، خود بخود ظاہر ہو جیسے "وتری الارض بارزة" اور تم دیکھو گے زمین کو کھلا، یعنی اس میں مکانات اور رہنے والے نہیں ہوں گے، اسی معنی کے مناسب "المبارزة" ہے، جس کا معنی ہے جنگ کیلئے صف سے باہر نکلنا اور دشمن کے سامنے ظاہر ہونا، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے ﴿وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ﴾ جب وہ (ایمان والے قوم طالوت) نکلے جالوت اور اس کے لشکر کیلئے۔"ظاہر کرنا، کھولنا" معنی لینا، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے ﴿وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ وہ ظاہر ہوں گے اللہ واحد وقہار کیلئے۔مراد یہ ہے کہ اللہ تعالی جو مستور و محجوب ہے وہ قیامت کے دن منکشف (ظاہر) ہوگا۔یعنی اللہ تعالی اپنے فضل سے لوگوں کو اپنا جلوہ دکھائے گا۔اب اس میں دو صورتیں ہیں کہ مومنوں کا رب تعالی کو دیکھنا محمود ہوگا کہ وہ اس پر خوش ہوں گے کہ ہمیں سب نعمت عظمی رب تعالی کی جلوہ گری حاصل ہوگی۔اور رب تعالی کا اپنے آپ کو کافروں پر منکشف کا کرنا ان کیلئے غیر محمود ہوگا کیونکہ رب تعالی کا ان پر قہر و غضب ہوگا۔اور ان پر ناراض ہوگا۔"تبرز" اس نے پاخانہ کیا، یہ مجازی معنی ہے اصل معنی ہے وہ فضاء میں گیا۔"امراة برزة" (بسکون الراء) پاکدامن عورت، یعنی پاکدامنی نے اسے رفعت عطاء کی جو رفعت کی وجہ سے ظاہر

جلوہ گر ہوگئی۔(ماخوذ از مفردات راغب)

﴿مَضَاجِعِهِم﴾ ضجع(ف۔) ضجعا، ضجوعا" پہلو کے بل لیٹنا۔ اضجعه پہلو کے بل لٹانا، پست کرنا۔ "ضجعت الشمس" سورج کا ڈوبنے کیلئے مائل ہونا تضجع فی الامر کام میں کوتاہی کرنا۔ "ضاجعه" ساتھ لیٹنا مضاجع لیٹنے کی جگہ (المنجد) آیہ کریمہ میں مراد قتل ہونے کی جگہ۔

مطلب: ان کو جواب واضح ہے کہ تم جہاں بھی اپنے گھروں میں ہو جن کی تقدیر میں قتل ہونا لکھا گیا ہے انہوں نے اپنے قتل کی جگہ ضرور بر ضرور پہنچ جانا ہے۔

"ان الحذر لایدفع القدر و التدبیر لایقاوم التقدیر فالذین قدر الله علیهم القتل لابد وان یقتلوا علی جمیع التقدیرات"

واضح ہوا کہ بچاؤ کرنا تقدیر ٹال نہیں سکتا۔ کوئی تدبیر تقدیر کا مقابلہ نہیں کر سکتی، اللہ تعالی کی تقدیر میں جن کا قتل ہونا لکھ دیا گیا ہے انہوں نے ضرور ہی قتل ہونا ہے، لھذا وہی خوش قسمت شہید ہوئے جن کی تقدیر میں شہادت لکھ دی گئی تھی۔

"ان الله تعالی لما اخبر انه یقتل فلو لم یقتل لانقلب علمه جهلا"

بیشک اللہ تعالی نے جن لوگوں کے قتل ہوجانے کی خبر دے دی، اگر وہ قتل نہ ہوں تو اللہ تعالی کا علم جہل سے بدل جائے گا، ایسا کبھی ہو نہیں سکتا کہ معاذ اللہ رب تعالی کو جاہل کہا جائے۔ یہ بھی خیال رہے کہ کسی کا قتل ہوجانا یہ ممکنات میں داخل ہے، ابھی پہلے ثابت کیا جاچکا ہے کہ تمام ممکنات کی انتہاء اللہ تعالی کے موجود کرنے پر ہے "فلو لم یوجد لانقلبت قدرته عجزا و کل ذلک محال" اگر اللہ تعالی کا فیصلہ کسی کے قتل ہونے کا ہوجائے اور وہ قتل نہ ہو تو اللہ تعالی کی قدرت کا عجز بننا لازم آئے گا، یہ محال ہے۔

تنبیہ: کلمہ "کُتِبَ" وجوب کا فائدہ دیتا ہے، جیسا کہ "کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ" اور "کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ" میں "تفید وجوب الفعل" وجوب کا فائدہ دیتا ہے، جیسا کہ "کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ" اور "کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ" میں "تفید وجوب الفعل" وجوب فعل کا فائدہ دے رہا ہے۔

"وههنا لایمکن حملها علی وجوب الفعل فوجب حملها علی وجوب الوجود"

یہاں اس آیہ کریمہ میں "کُتِبَ" کا معنی وجوب فعل تو نہیں لیا جاسکتا، البتہ وجوب وجود معنی لیا جائے گا۔

(کبیر ج۹ ص۴۹)

یہ بھی خیال رہے کہ یہاں "کُتِبَ" کا معنی فرض کرنا نہیں بلکہ "لکھنا" مراد ہے، لیکن لکھنا جو اللہ تعالی کی طرف سے

ہوگا اس کا پایا جانا لازم ہوگا۔

﴿قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِیْ بُیُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِیْنَ كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ﴾ کے مفسرین کرام نے دو مطلب بیان کئے ہیں:

"الاول "لو جلستم فی بیوتکم لخرج منکم من کتب الله علیهم القتل الی مضاجعهم ومصارعهم حتی یوجد ماعلم الله انه یوجد"

ان میں سے ایک مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ منافقین کو یہ کہا گیا ہے" اگر تم اپنے گھروں میں بیٹھ رہو تو پھر بھی جن لوگوں کا قتل ہو جانا لکھا جا چکا ہے وہ تم میں سے ضرور اپنے قتل کی جگہ پہنچ جائیں گے، اللہ تعالی کے علم میں جس چیز کا پایا جانا لکھا جا چکا ہے اس نے ضرور واقع ہونا ہے۔

"والثانی" کانه قیل للمنافقین لو جلستم فی بیوتکم وتخلفتم عن الجهاد لخرج المؤمنون الذین کتب علیهم قتال الکفار الی مضاجعهم ولم یتخلفوا عن هذه الطاعة بسبب تخلفکم"

ان میں سے دوسرا مطلب یہ ہے کہ منافقین کو کہا گیا ہے کہ اگر تم اپنے گھروں میں بیٹھے رہو اور جہاد سے پیچھے رہ جاؤ تو مومن جن کی قسمت میں کافروں سے جہاد کرنا اور شہید لکھا جا چکا ہے وہ ضرور اپنے مقام شہادت میں پہنچ جائیں گے، تمہارے پیچھے رہنے کی وجہ سے وہ کبھی اس طاعت سے پیچھے نہیں رہیں گے۔ (کبیر ج۹ ص۴۹)

﴿وَلِیَبْتَلِیَ اللّٰهُ مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ﴾ "تا کہ آزمائے اللہ جو تمہارے سینوں میں ہے"

اللہ تعالی نے ان کے قول ﴿لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا﴾ کا دوسرا جواب ہے۔ قوم نے جب یہ گمان کیا کہ جہاد کی طرف نکلنا باعث فساد ہے تو اللہ تعالی نے بیان فرمایا کہ اس میں تو امتحان لینا مقصود تھا،

"فهذه المقاتلة مشتملة علی نوعین من المصلحة ان یتمیز الموافق من المنافق، وفی المثل المشهور لاتکرهوا الفتن فانها حصاد المنافقین"

اس جہاد یعنی غزوہ احد میں دو قسم کی مصلحتیں رکھ دی گئی تھیں۔ ایک یہ کہ خالص مومن رب تعالی کے حکم کے مطابق عمل کرنے والے اور منافقین میں امتیاز ہو جائے، یعنی مؤمنین میں اور زیادہ نکھار آجائے، دوسری مصلحت اس مثال مشہور کے مطابق تھی

"لاتکرھوا الفتن فانها حصاد المنافقین" فتنوں کو ناپسند نہ سمجھو یہ تو منافقوں کو کاٹ دینے والی تلواریں ہیں۔ (کبیر ج۹ ص۴۹)

اعتراض: جب پہلے ذکر ہو چکا ہے ﴿ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ﴾ (پھر پھیرا تمہیں ان سے تاکہ تمہیں آزمائے) اس کے بعد ﴿وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَافِي صُدُوْرِكُمْ﴾ (تاکہ آزمائے اللہ جو تمہارے سینوں میں ہے) کے ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے اس میں تو تکرار نظر آتا ہے۔ تکرار غیر مستحسن ہے۔ اس کے دو جواب دیے گئے ہیں۔

پہلا جواب: "الاول لما طال الکلام اعادذکرہ" جب کلام لمبا ہو جائے تو دوبارہ ذکر کرنا مستحسن ہے۔

دوسرا جواب: "والثانی الابتلاء الأول هزیمة المؤمنین والثانی سائر الاحوال" پہلی آزمائش جس کا ذکر ہے وہ مؤمنین کا کافروں سے پھر جانا اور پسپا ہو جانے کا ذکر ہے، اور دوسری آزمائش عام احوال میں امتحان لینے کا ذکر ہے۔

﴿وَلِيُمَحِّصَ مَافِي قُلُوْبِكُمْ﴾ تاکہ کھول کر نکھار دے جو تمہارے دلوں میں ہے۔

"**محص**" (ف) محصا. الظبی فی عدوہ "تیز دوڑنا،" "المذبوح برجلہ" مذبوح کا تڑپنا، بفلان الارض، کسی کا زمین پر پٹکنا۔ "فلان من فلان" بھاگنا"

"**البرق**" بجلی کا چمکنا "اللہ مابك" زائل کرنا، "محص الشیٔ" ہر عیب سے پاک کرنا۔ محص (تفعیل) الشیٔ، کم کرنا۔

"**اللحم**" گوشت کو پٹھے سے صاف کرنا۔ محص الرجل (بنصب اللام) کسی کو آزمانا (المنجد) آیۃ کریمہ میں ایک معنی تو یہی ہے جو راقم نے ذکر کیا، البتہ مرادی مطلب یوں بھی بیان کیا گیا ہے، ﴿وَلِيُمَحِّصَ مَافِي قُلُوْبِكُمْ﴾ "فالتمجیص ھھنا کالتزکیة والتطھیر، تمحیص" کا یہاں معنی پاک کرنا، صاف کرنا۔ اب ترجمہ یوں ہوگا تاکہ پاک کرے، صاف کرے اسے جو تمہارے دلوں میں ہے۔ (مفردات راغب)

یہاں دو وجہ ذکر کی گئیں ہیں۔

"احدھما ان ھذہ الواقعة تمحص قلوبکم عن الوساوس والشبھات"

ایک یہ کہ واقعہ غزوہ احد کا اس لئے پیش آیا تاکہ تمہارے دلوں کو وسوسوں اور شبہات سے پاک وصاف کردے، تاکہ تم میں نکھار آجائے۔

"والثانی انها تصیر کفارۃ لذنوبکم فتمحصکم عن تبعات المعاصی والسیآت"

اور دوسری وجہ یہ ہے غزوہ احد میں تمہیں مصائب سے آزمایا گیا تاکہ وہ تمہاری لغزشوں کا کفارہ بن جائے اور تمہیں معاصی اور خطاؤں کے پیچھے پڑنے سے ہٹا کر صاف وستھرا کر دے۔ (کبیر ج۹ص۵۰)

﴿وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ "اور اللہ جانتا ہے سینوں کی باتوں کو۔"

ایک چیز جب دوسری مصاحب ہو اور مذکر ہو تو اس کیلئے بولتے ہیں "ذو الشیء" اور جب مؤنث ہو تو اس کیلئے بولتے ہیں ﴿بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ سے مراد وہ اشیاء ہیں جو سینوں میں موجود ہیں۔ "وھی الاسرار والضمائر" یہ اسرار اور دل میں چھپی چیزیں ہیں۔ رب تعالیٰ نے یہ ذکر فرما کر ﴿وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ (اور اللہ جانتا ہے سینوں کی باتوں کو یعنی سینوں میں بند راز اور چھپی ہوئی باتوں کو وہ جانتا ہے) یہ واضح کر دیا کہ

"ان ابتلائہ لم یکن لأنہ یخفی علیہ مافی الصدور اوغیر ذلک لأنہ عالم بجمیع المعلومات وانما ابتلاء ھم اما لمحض الالھیۃ اوللا ستصلاح"

رب تعالیٰ نے بندوں کا امتحان اس لئے نہیں لیا کہ وہ ان کے سینوں کی چھپی باتوں کو نہیں جانتا، یا اس پر کوئی راز وغیرہ چھپے ہوئے ہیں۔ وہ تو تمام معلومات کو جانتا ہے، اس کے امتحان لینے کی وجہ یہ تھی کہ لوگ اسی کو خالص معبود سمجھیں، اور لوگ اپنی اصلاح کر لیں، اور ان کا آزمائش میں پورا اترنا دوسروں پر بھی واضح ہو جائے، ان کا کمال اور ان کے مدارج کی بلندی نکھر کر سامنے آجائے۔ (کبیر بمع وضاحت ج۹ص۵۰)

"سبحان اللہ" کیا شان ہے صحابہ کرام کی جن کو رب تعالیٰ نے آزمائش میں کامیاب کر کے ان کے درجات کی بلندی کو واضح کر دیا۔

فائدہ: "وَلِیَبْتَلِیَ" اور "وَلِیُمَحِّصَ" ذکر فرما کر یہ واضح کر دیا "ان اللہ فرض علیکم القتال ولم ینصر کم یوم اُحد لیختبر صبر کم ولیمحص عنکم سیآتکم ان تبتم واخلصتم" (البحر المحیط ج۳ص۱۳۲)

کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر جہاد فرض کیا، ایک مرتبہ امداد فرمانے کے بعد دوبارہ امداد نہیں فرمائی تاکہ تمہارے صبر کی آزمائش ہو جائے، اور اگر تم رب تعالیٰ کی طرف رجوع کر لو اور خلوص پیدا کر لو تو اللہ تعالیٰ تمہاری لغزشوں کو دور فرما دے۔

موت کی جگہ کو مرنے والا ضرور پہنچ جاتا ہے:

روایت بیان کی گئی کہ بیشک ملک الموت (موت کا فرشتہ عزرائیل) حضرت سلیمان علیہ السلام کی مجلس میں حاضر ہوا، مجلس میں ایک شخص کو ڈراؤنی نظر سے دیکھا، جب ملک الموت اٹھ کر چلا گیا، تو اس شخص نے پوچھا یہ کون تھا؟ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بتایا کہ یہ ملک الموت تھا۔

"قال ارسلنی مع الریح الی عالم آخرفانی رایت منه مرأی هائلا" تو اس شخص نے کہا کہ آپ ہوا کو حکم دیں جو مجھے کہیں دور علاقہ میں پہنچا دے کیونکہ میں نے اس کی بڑی ڈراؤنی نظر کو دیکھا، یعنی وہ مجھے بہت گھور گھور کر دیکھ رہا تھا، حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہوا کو حکم دیا کہ اس شخص کو کہیں دور جگہ میں پہنچا دو ہوا نے آپ کے حکم کے مطابق اسے دور پہنچا دیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گذرا کہ ملک الموت فرشتہ پھر حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس حاضر ہوا، اور کہنے لگا کہ مجھے رب تعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ فلاں جگہ فلاں وقت اس شخص کا روح قبض کرلو، میں نے اسے آپ کے پاس بیٹھے خیال کیا کہ یہ شخص وہاں اتنا جلدی کیسے پہنچے گا۔

"وقدارسلته بالریح الی ذلک المکان فوجدته هناک قضی امر الله عزوجل فی زمانه ومکانه من غیرا خلال بشیء من ذلک"

تحقیق ہوا نے اسے اس مقرر جگہ پر پہنچا دیا، میں نے اسے وہاں پایا تو اس کے روح کو قبض کرلیا، اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق وقت مقرر اور مکان مقرر میں اسے پورا کرلیا گیا، اس میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا۔

(تفسیر ابی السعود ج ص ۱۰۲)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

اِنَّ الَّذِیۡنَ تَوَلَّوۡا مِنۡکُمۡ یَوۡمَ الۡتَقَی الۡجَمۡعٰنِ اِنَّمَا اسۡتَزَلَّهُمُ الشَّیۡطٰنُ بِبَعۡضِ مَا کَسَبُوۡا وَلَقَدۡ عَفَا اللّٰهُ عَنۡهُمۡ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ حَلِیۡمٌ O (آیۃ نمبر ۱۵۵)

(1) بیشک وہ جو تم میں سے پھر گئے جس دن دونوں فوجیں ملی تھیں انہیں شیطان نے ہی لغزش دی ان کے بعض اعمال کے باعث اور بیشک اللہ نے انہیں معاف فرمادیا، بے شک اللہ بخشنے والا حلم والا ہے۔ (کنزالایمان)

(2) بیشک وہ جو پھر گئے تم میں سے بعض جس دن ملے دولشکر، بیشک پھسلایا ان کو شیطان نے ہی، بوجہ بعض ان کے کسب کے، اور البتہ تحقیق معاف کردیا اللہ نے ان کو، بیشک اللہ بخشنے والا، بردبار ہے۔ (نجوم الفرقان)

''تسکین الجنان فی محاسن کنزالایمان'' کاایک ورق:

راقم نے تراجم کا جو تقابل جائزہ پیش کیا اسے دیکھئے

﴿بِبَعۡضِ مَا کَسَبُوۡا﴾

ان کے گناہ کی شامت سے	(محمود الحسن صاحب)
ان کے بعض کرتوتوں کے سبب	(عبدالماجد صاحب)
کچھ ان کے گناہ کی شامت سے	(شاہ عبدالقادر صاحب)
ان کے بعض اعمال کے باعث	(اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضاء خان بریلوی رحمہ اللہ)

جنگ احد میں نبی کریم ﷺ نے ایک درہ میں صحابہ کرام کی ایک جماعت کو کھڑا کیا کہ تم نے یہاں ہی کھڑے رہنا ہے، جب صحابہ کرام کو فتح حاصل ہوئی تو وہ جماعت بھی اس جگہ کو چھوڑ کر مال غنیمت جمع کرنے کیلئے دوسرے صحابہ کرام کے ساتھ شریک ہوگئے، یہ صحابہ کرام کی اجتہادی خطا تھی، ان کا خیال یہ تھا کہ شاید فتح تک ٹھہرنے کا ہمیں حکم دیا گیا، نبی کریم ﷺ کی اجازت کا انتظار نہ کرنے کی وجہ سے آزمائش میں آگئے، اسی درہ سے کفار نے حملہ کردیا، صحابہ کرام کو تکلیف پہنچی، اسی درہ کو چھوڑنے کا ذکر رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿بِبَعۡضِ مَا کَسَبُوۡا﴾ ان کے بعض اعمال کی وجہ سے

شیطان نے انہیں پھسلا دیا، پھر بیشک اللہ تعالی نے انہیں معاف فرما دیا، اسی مقصد کو اعلی حضرت رحمہ اللہ نے صحابہ کرام کے ادب کا لحاظ کرتے ہوئے ''ان کے بعض اعمال کے باعث'' ترجمہ کیا۔

راقم نے لفظی ترجمہ کیا ''بوجہ بعض ان کے کسب کے'' ''ان کے بعض اعمال کی سامت سے'' اعلی حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ نہیں کیا جس میں گناہ کی نسبت صراحۃ صحابہ کرام کی طرف ہو، لطف کی بات یہ ہے کہ اعلی حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ پر اعتراض کرنا کہ ''اے محبوب'' کس عربی لفظ کا ترجمہ ہے، تو یہاں "گناہ" کس عربی لفظ کا ترجمہ ہے۔

(تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان ص۹۳)

یہ بھی خیال رہے کہ عبدالماجد صاحب کا ترجمہ ''ان کے بعض کرتوتوں کے سبب'' اور ہی زیادہ سنگین ہے۔ مختصر مطلب تسکین الجنان کی عبارت سے واضح ہو رہا ہے، دوبارہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ﴾

''بیشک وہ جو پھر گئے تم میں سے بعض جس دن ملے دو لشکر''

"ھذا خطاب للمومنین خاصة یعنی الذین انھزموا یوم احد" یہ خطاب ہے مؤمنین کو خاص کر کے یعنی وہ حضرات جو احد کے دن پسپا ہو گئے تھے۔ ''منکم'' میں ''من'' تبعیضیہ ہے۔ جس کا معنی ہے بعض ''یعنی وہ جو تم میں سے پھر گئے بعض جس دن دو لشکر ملے ایک لشکر نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھا اور ایک لشکر ابوسفیان کے ساتھ تھا، نبی کریم ﷺ کا لشکر سات سو افراد پر مشتمل تھا۔ اور ابوسفیان کا لشکر تین ہزار افراد پر مشتمل تھا۔

"فذکر محمد بن اسحاق ان ثلث الناس کانوا مجروحین وثلثھم انھزموا وثلثھم ثبتوا"

محمد بن اسحاق نے بیان فرمایا ہے کہ مؤمنین کا تیسرا حصہ زخمی ہو گیا، یقیناً یہ لوگ وہی تھے جا ثابت قدم رہے اور تیسرا حصہ پسپا ہو گئے یعنی ادھر ادھر بکھر گئے، اور تیسرا حصہ ثابت قدم رہے، یہ وہ تھے جو زخمی نہیں تھے۔

قال القفال والذی تدل علیه الاخبار فی الجملة ان نفرا منھم تولوا وابعدوا فمنھم من دخل المدینة ومنھم من ذھب الی سائر الجوانب واما الاکثرون فانھم نزلوا عندالجبل واجتمعوا ھناک"

قفال کہتے ہیں کہ مختلف اخبار سے مسئلہ یوں واضح ہوا کہ جو لوگ پسپا ہونے والے یعنی ادھر ادھر بکھر جانے والے تھے ان میں سے بعض وہ تھے جو دور چلے گئے تھے، اور بعض وہ تھے جو مدینہ میں داخل ہو گئے تھے، یہ بھی خیال رہے کہ احد اس وقت مدینہ طیبہ سے صرف دو میل کے فاصلہ پر تھا، اب مکانات اور سڑکوں کی وجہ سے مسافت زیادہ

نظر آتی ہے۔مدینہ طیبہ میں سب سے پہلے جانے والے سعد بن عثمان تھے۔بعد میں کچھ اور حضرات بھی مدینہ طیبہ میں داخل ہوگئے۔اور بعض ان میں سے وہ تھے جو میدان کی اطراف میں ادھر ادھر بکھر گئے لیکن وہ زیادہ دور نہیں گئے۔اور ان میں اکثر حضرات وہ تھے جو میدان سے تو اگرچہ ہٹ گئے تھے لیکن وہاں ہی پہاڑ کے دامن میں جمع ہوگئے تھے۔جو لوگ میدان جنگ میں ثابت رہنے والے تھے،ان میں سے وہ لوگ جو نبی کریم ﷺ کی حفاظت کرنے والے اور آپ کے اردگرد جمع ہونے اور ثابت قدر ہنے والے چودہ تھے جن کے اسماء گرامی پہلے ذکر کیے جاچکے ہیں۔

"ومن المنهزمين عمر،الا انه لم يكن في اوائل المنهزمين ولم يعد بل ثبت على الجبل الى ان صعد النبیﷺ

"جو لوگ میدان سے ہٹ جانے والے تھے،ان میں حضرت عمرؓ بھی تھے،لیکن آپ جلدی میدان سے نہیں ہٹے تھے بلکہ کچھ دیر کے بعد میدان سے ہٹ کر پہاڑ پر چڑھ گئے تھے،یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ بھی پہاڑ پر چڑھ گئے۔ (ماخوذ از کبیر ج۹ص۵۹)

مقام توجہ: کل تعداد احد میں صحابہ کرام کی سات سو تھی۔کل شہید ستر تھے۔جن میں دس درہ میں قائم رہنے والے،ساتھ اور ثابت قدم رہنے والے بھی تھے۔باقی چھ سو تیس میں سے دو سو دس تقریبا ثابت قدم رہنے والے،اور دو سو دس ثابت قدم رہنے کی وجہ سے زخمی ہوگئے،کل ثابت رہنے والے چار سو نوے تھے اور ثابت قدم نہ رہنے والے،دائیں بائیں بکھر جانے والے دو سو دس تھے،ان میں سے بھی زیادہ پہاڑ کے پاس اپنا بچاؤ کر رہے تھے اور وہیں جمع تھے،اور ان میں ہی چالیس حضرات وہ تھے جو درہ چھوڑ کر مال غنیمت جمع کرنے میں شریک ہوگئے تھے۔ (راقم)

"ومن المهزومين كان عثمان انهزم مع رجلين من الانصار يقال لهما سعد وعقبة" جو لوگ ادھر ادھر بکھر جانے والے تھے ان میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی تھے جو انصار میں سے دو حضرات،سعد اور عقبہ رضی اللہ عنہما کے ساتھ کچھ دور ہی چلے گئے تھے۔ (کبیر ج۹ص۵۰)

تنبیہ: حضرت عثمانؓ سے تعصب رکھنے والے شخص کو خاموش کرا دینے والا جواب حضرت ابن عمرؓ کا پہلے بخاری کے حوالہ سے تعبیر کیا جاچکا ہے،شائد ان کا جواب حضرت عثمانؓ کے اپنے جواب سے ہی ماخوذ تھا،آیئے حضرت عثمانؓ کا حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو جواب دیکھئے۔

❁ ذكر ابو الليث سمرقندی بالاسناد عن جرير ان عثمان كان بينه وبين عبد الرحمن كلام فقال له عبدالرحمن بن عوف اتسبنی وقد شهدت بدرا ولم تشهد وقد بايعت تحت الشجرة ولم تبايع وقد كنت تولى مع تولى يوم الجمع يعنی يوم احد،فرد عليه

عثمان فقال اما قولک انا شهدت بدرا ولم تشهد فانی لم اغب عن شیء شهده رسول اللهﷺ الاان بنت رسول اللهﷺ کانت مریضة وکنت معها امرضها فضرب لی رسول اللهﷺ سهمافی سهام المسلمین واما بیعة الشجرة فان رسول اللهﷺ بعثنی ربیئة علی المشرکین بمکة(الربیئة هو الناظر)فضرب رسول اللهﷺ یمینه علی شماله فقال هذه لعثمان فیمین رسول اللهﷺ یمینه علی شماله فقال هذه لعثمان فیمین رسول اللهﷺ وشماله خیرلی من یمینی وشمالی،واما یوم الجمع فقال الله تعالی "ولقد عفاالله عنهم"فکنت فیمن عفا الله عنهم فحج عثمان عبدالرحمن"
(قرطبی ج ۴ ص ۲۴۴)

جریر روایت کرتے ہیں کہ حضرت عثمان اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے درمیان سخت کلامی ہوگئی تو ان کو عبدالرحمٰن بن عوف کہنے لگے تم میرے ساتھ سخت کلام کرتے ہو حالانکہ میں بدر میں موجود تھا تم نہیں تھے، پھر میں نے (کیکر کے) درخت کے نیچے بیعت کی تم نے نہیں کی، اور تم اس دن پھر گئے تھے جس دن دو لشکر جمع ہوئے، حضرت عثمان ﷺ نے ان کو جواب دیا، کہ جو تم نے میرے بدر میں حاضر نہ ہونے کی بات کی اس کے متعلق بات یہ ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ سے کسی غزوہ میں پیچھے نہیں رہا، مگر بدر میں مجھے رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی کی بیماری پر ان کی دیکھ بھال کیلئے مدینہ طیبہ میں چھوڑ دیا تھا، میں ان کی دیکھ بھال کرتا رہا، نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کے مال غنیمت کے حصہ میں میرا حصہ بھی رکھا، جہاں تک درخت کے نیچے بیعت کے متعلق تم نے جو بیان کیا ہے کہ میں اس میں حاضر نہیں ہوا، اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے نبی کریم ﷺ نے مکہ میں کفار کے ساتھ گفت شنید کیلئے بھیجا "ربیئة کا اصل معنی ہے" جاسوس دشمن کے حالات کو دیکھنے والا" (لیکن یہاں معنی گفت وشنید ہے) تو نبی کریم ﷺ نے اپنے ہی دائیں ہاتھ کو بائیں پر مارا پھر فرمایا یہ عثمان کا ہاتھ ہے، (یعنی اپنے ہی ہاتھ کو میرا ہاتھ قرار دیا) میرے اپنے دائیں اور بائیں ہاتھ سے میرے لئے نبی کریم ﷺ کا دایاں اور بائیاں ہاتھ بہتر ہیں۔ جہاں تک دو لشکروں کے جمع ہونے کے دن تم نے ہمارے پسپا ہونے کا ذکر کیا ہے، وہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں معاف کر دینے کا اعلان فرمادیا۔ ﴿وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ﴾ "اور تحقیق اللہ نے ان کو معاف کر دیا ہے۔" وحضرت عثمان ﷺ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ﷺ پر غالب آگئے اور ان کو خاموش کرادیا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ﴾ "بیشک اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔"

﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ﴾للذنوب صغائرها وکبائرها(حلیم)لایعاجل بعقوبة المذنب" بیشک اللہ تعالیٰ صغائر اور کبائر گناہوں کو بخشنے والا ہے۔ اسلئے وہ غفور ہے۔ اور کسی گنہگار کو جلدی عذاب نہیں دیتا بلکہ توبہ کا موقع

دیتا ہے، اسلئے وہ حلیم ہے۔ "وقد جاءت هذه الجملة كالتعليل للعفو عن هؤلاء المتولين" اور تحقیق یہ جملہ علت وسبب کے درجہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پھر جانے والوں کو معاف فرمادیا ہے کیونکہ وہ "غَفُوْرٌ" ہے، اور "حَلِيْمٌ" ہے۔ (روح المعانی ج۳ ص۹۹)

فائدہ جلیلہ: "لاتعيير بعد عفو الله تعالى عن الجميع، ونحن لاندعي العصمة فى الصحابة ﷺ ولانشترطها فى الخلافة"

اللہ تعالیٰ نے جب پھر جانے والے تمام صحابہ کرام کو معاف کردیا تو اب کسی صاحب کے فعل کو عار بنانا جائز نہیں۔ اور ہمارا یہ دعویٰ ہی نہیں کہ تمام صحابہ کرام معصوم تھے، اور نہ ہی ہمارے نزدیک کسی صحابی کے خلیفہ بننے کیلئے معصوم ہونا شرط ہے۔ (روح المعانی ج۳ ص۹۹)

حضرت عمر ﷺ کے پہاڑ میں چڑھ جانے میں تو کئی احتمال ہیں، ایک احتمال یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو پہاڑ پر چڑھ جانے کی ترغیب دلانی مقصود ہو کہ آپ بھی پہاڑ پر آجائیں، یہاں سے کفار پر حملہ بھی آسان ہے اور دفاع بھی آسان، اگر یہ احتمال ہو تو یہ ثابت قدمی کی اعلیٰ مثال ہے، راقم کے نزدیک یہی احتمال قوی ہے اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ آپ بھی پسپا ہونے والوں میں تھے اس لئے پہاڑ پر چڑھ گئے تھے، یا بالفرض شیعہ کی بات کو تسلیم کیا جائے کہ آپ دور چلے گئے تھے، کسی صورت میں بھی آپ پر اعتراض کرنا اور عار دلانا جائز نہیں، اسلئے کہ رب تعالیٰ نے جب معاف کردیا تو دوسرے کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اس میں اعتراض کرتا ہے، اور یہ وجہ آپ کے خلافت کے حقدار نہ ہونے پر کوئی دلیل نہیں۔ (راقم)

صحابہ کرام کا پھر جانا کون سا گناہ تھا؟

بعض حضرات نے تو یہ بیان کیا ہے کہ کبیرہ گناہ تھا، صحابہ کرام نے توبہ کرلی تھی اسلئے رب تعالیٰ نے انہیں معاف کردیا۔ لیکن راقم کو قرطبی رحمہ اللہ کی بحث پسند آئی کہ صحابہ کرام کا پھرنا گناہ نہیں تھا، لیکن نبی کریم ﷺ کے ثابت قدم رہنے کے باوجود آپ کو چھوڑنا بہت بڑی غلطی تھی، آیئے عجیب بحث آپ بھی دیکھیں، "وقيل لم يكن الانهزام معصية لانهم ارادوا التحصن بالمدينة" ایک قول یہ ہے کہ صحابہ کرام کا میدان کو چھوڑنا کوئی گناہ نہیں تھا کیونکہ انہوں نے ارادہ یہ کیا تھا کہ مدینہ طیبہ میں قلعہ بند ہو کر دشمن کے ارادوں کو خاک میں ملادیں گے، دشمن کو تہس نہس کر دیں گے، اصل وجہ ان کی احد کے مقام کو چھوڑنے کی وجہ یہ تھی کہ نبی کریم ﷺ کی شہادت کی خبر نے ان کے ہوش اڑادئے تھے، وہ یہ سمجھنے لگے کہ اب یہاں ٹھہرنے کا کیا مقصد، دشمن کے ارادوں کو ختم کرنا ضروری ہے کیونکہ وہ چاہتا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ شہید ہو گئے تو یہ لوگ اسلام سے پھر جائیں گے۔ "ويجوز ان يقال لم يسمعوا

دعاء النبی ﷺ للهول الذی کانوا فیہ" بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ تو صحابہ کرام کو بلا رہے تھے تو انہوں نے آپ کی شہادت کی خبر پر کیسے اعتبار کر لیا تھا؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ شدید ہولنا کی چھا گئی تھی، کیونکہ جب درہ والے حضرات نے درہ کو چھوڑا اور کافروں نے اچانک حملہ کیا تو اس وقت صحابہ کرام اس شدت میں نبی کریم ﷺ کی آواز نہ سن سکے۔"ویجوز ان یقال زاد عدد العدو علی الضعف لانھم کانوا سبعمائة و العدد ثلاۃ آلاف" اس عبارت کو سمجھنے سے پہلے یہ سمجھا جائے کہ ابتدائی دور میں صحابہ کرام پر ایک کو دس سے جنگ کرنا لازم تھا، بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس میں آسانی پیدا کرنے کیلئے ارشاد فرمایا۔

﴿اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ﴾

(الانفال آیۃ نمبر ٦٦)

''اب اللہ نے تم پر سے تخفیف فرمائی اور اسے معلوم ہے کہ تم کمزور ہو تو اگر تم میں سو صبر والے ہوں دو سو پر غالب آئیں گے'' اس تخفیف کے بعد ایک صحابی کا دو کافروں کے مقابل ثابت قدم رہنا ضروری ہو گیا، اس سے زیادہ مقدار کے سامنے کھڑا ہونا لازم نہیں تھا، غزوہ احد اسی وقت درپیش آیا جب یہ آیۃ کریمہ نازل ہو چکی تھی، اس میں دشمن کی تعداد چار گنا سے بھی زائد تھی کیونکہ صحابہ کرام سات سو تھے اور کافر تین ہزار تھے، یہ تعداد دوگنا ہوتی تو پھر صحابہ کرام پر طعن ممکن تھا، جب رب تعالیٰ نے خود تخفیف فرمائی تو صحابہ کرام کا چار گنا سے زائد کے مقابل ثابت قدم نہ رہنا جائز تھا،

تنبیہ شدید:

لکن الانھزام عن النبی ﷺ خطأ لایجوز ولعلھم توھموا ان النبی ﷺ انحاز الی الجبل ایضا"

(قرطبی ج ۴ ص ۲۴۴)

نبی کریم ﷺ کے متعلق یہ کہنا کہ آپ بھی اپنی جگہ کو چھوڑ کر پسپا ہو گئے تھے یہ جائز نہیں۔ نبی کریم ﷺ کا پہاڑ پر چڑھنا بھی وہم ہی ہو سکتا ہے حقیقت نہیں، اگرچہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے پہاڑ پر چڑھنا ثابت کیا ہے اگر وہ ثابت ہو جائے تو اس کا وہی مطلب ہو سکتا ہے جو راقم نے بیان کیا ہے کہ زیادہ دفاع مقصود تھا، لیکن علامہ قرطبی رحمہ اللہ کا قول زیادہ راجح نظر آتا ہے کیونکہ احادیث کی شروح سے یہی ثابت کہ آپ اپنی جگہ سے نہیں ہٹے، (واللہ اعلم بالصواب)

❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِی الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَ مَا قُتِلُوْا لِیَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ وَ اللّٰهُ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ○ (آیۃ نمبر ۱۵۶)

(1) اے ایمان والو! ان کافروں کی طرح نہ ہونا جنہوں نے کہا نے اپنے بھائیوں کی نسبت جب وہ سفر یا جہاد کو گئے کہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے اس لئے کہ اللہ ان کے دلوں میں اس کا افسوس رکھے اور اللہ جلاتا اور مارتا ہے اور تمہارے کام دیکھ رہا ہے۔ (کنزالایمان)

(2) اے ایمان والو نہ ہو جاؤ ان کی طرح جنہوں نے کفر کیا، اور انہوں نے کہا اپنے بھائیوں کے متعلق جب سفر کیا انہوں نے زمین میں، یا وہ ہوئے جہاد کرنے والے، اگر وہ ہوتے ہمارے پاس نہ مرتے اور نہ قتل کئے جاتے، تاکہ بنائے اللہ اسے حسرت ان کے دلوں میں، اور اللہ ہی زندہ کرتا ہے، اور مارتا ہے، اور اللہ جو تم عمل کرتے ہو دیکھ رہا ہے۔ (نجوم الفرقان)

شانِ نزول و مختصر مطلب:

منافقین ایمان والوں کو کافروں کے ساتھ جہاد کرنے پر عار دلاتے اور شہید ہونے والوں کے متعلق کہتے ﴿لَوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَ مَا قُتِلُوْا﴾ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل کئے جاتے'' ان کے اس کہنے پر بعض نئے نئے ایمان قبول کرنے والوں کے دلوں میں سستی آجاتی اور ان کے دلوں میں ضعف آجاتا احد میں جب ستر صحابہ کرام شہید ہو گئے تو مؤمنوں کو منع کیا کہ کہیں تم بھی یہ نہ کہتے رہنا کہ وہ جہاد میں شریک نہ ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل کئے جاتے، کافروں کے اس قول اور باطل گمان کو رب تعالیٰ نے ان کے دلوں میں حسرت بنا دیا ہے، حالانکہ موت کا وقت مقرر ہے رب تعالیٰ ہی زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، موت کے وقت آنے پر موت نے ضرور آنا ہے خواہ جنگ میں ہو یا گھر میں اور جب تک اس کی زندگی ہے اس نے ضرور زندہ رہنا ہے خواہ گھر میں ہو یا میدان جنگ میں۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ اے ایمان والو! نہ ہو ان کی طرح جنہوں نے کفر کیا۔

یہاں کافروں سے مراد کون لوگ ہیں؟ اس میں مفسرین کرام کے دو قول ہیں، زیادہ مفسرین کرام نے ﴿اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ سے مراد منافقین لیا ہے کہ یہ قول عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کا ہے۔ دوسرا قول علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے یہ ذکر کیا ہے:

"وقیل المراد بالذین کفروا سائر الکفار علی العموم ای لاتکونوا کالکفرة فی نفس الامر" (روح المعانی ج ۳ ص ۹۹)

کہ اس سے مراد تمام کافر ہیں علی العموم یعنی جو لوگ حقیقت میں کافر ہیں، ان کی طرح نہ ہو، اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے "اَلَّذِیْنَ" موصول کو عہد خارجی کے درجہ میں رکھ کر خاص منافقین مراد لئے ہیں، اسی لئے آپ نے ترجمہ کیا "اے ایمان والو ان کافروں کی طرح نہ ہونا"۔ (کنزالایمان)

لیکن راقم نے طلباء کرام کے فائدہ کیلئے دوسرے قول کے مطابق ترجمہ کیا ہے تا کہ طلباء کرام کو دوسری شق کا بھی پتہ چل جائے، راقم نے ترجمہ کیا اے ایمان والو! نہ ہو ان کی طرح جنہوں نے کفر کیا۔ (نجوم الفرقان)

یہ ترجمہ تو لفظوں کے مطابق ہے، اگر مختصر کر کے بامحاورہ ترجمہ کریں تو راقم کا ترجمہ یوں ہوگا "اے ایمان والو نہ ہو کافروں کی طرح"

﴿وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِی الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا﴾

"اور انہوں نے کہا اپنے بھائیوں کے متعلق، جب سفر کیا انہوں نے یا ہوئے جہاد کرنے والے، اگر وہ ہوتے ہمارے پاس تو وہ نہ مرتے اور نہ قتل کئے جاتے۔"

﴿وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ﴾ "فی النفاق و الکفر وقیل فی النسب" ان کے بھائیوں سے مراد ان کے ہم عقیدہ لوگ ہیں جو منافقت اور کفر میں ان کے مشابہ تھے، یا ان کے نسبی بھائی تھے۔

تنبیہ: اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے، جنہوں کہا اپنے بھائیوں کی نسبت (کنزالایمان)

راقم نے بھی اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے اور انہوں نے کہا اپنے بھائیوں کے متعلق، اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ روح المعانی کی اس عبارت کے مطابق ہے "واللام تعليلة اى قالوا لأجلهم وجعلها ابن حاجب بمعنى "عن" "لاخوانهم" میں لام تعلیلیہ ہے، یعنی انہوں نے اپنے بھائیوں کے قتل (شہید) ہونے کی وجہ سے یہ کہا۔ اور علامہ ابن حاجب نے کہا ہے کہ لام بمعنی عن ہے۔ اس کے مطابق بھی یہی ترجمہ ہوگا" اور انہوں نے اپنے بھائیوں کے متعلق کہا" طلباء کرام خصوصی توجہ اس بات کی طرف رکھیں کہ یہ بحث لام کے متعلق جو ابھی تک بیان کی ہے اس کے مطابق یہ ضروری ہے کہ ان کے بھائی نسبی مراد ہیں، ہم عقیدہ نہیں۔ ان کے نسبی بھائی یعنی ان کے خاندان کے لوگ جو خلوص سے ایمان لے آئے تھے اور شہید ہو گئے تھے، ان کے متعلق انہوں نے یہ کہا کہ اگر وہ ہمارے ساتھ ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے۔ کیونکہ ان کے ہم عقیدہ منافقین شہید نہیں ہوئے۔

اور جب لا کو زائد مانا جائے جیسے "ردف لکم" میں لام زائد ہے اس کا مطلب ہے "ردفکم" اسی طرح جب یہاں معنی یوں کیا جائے ﴿وَقَالُوا لِاِخْوَانِهِمْ﴾ "اور کہا انہوں نے اپنے بھائیوں کو" اس صورت میں ان کے نسبی بھائی اور ہم عقیدہ بھائی دونوں ہی مراد ہو سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنے نسبی اور اپنے ہم عقیدہ بھائیوں کو یہ کہا وہ زمین میں سفر کرنے والے اور غزوہ میں جانے والے اگر ہمارے ساتھ ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے۔

دینی طلباء کرام کی خصوصی توجہ کیلئے:

- "فان واذاللشرط فی الاستقبال لكن اصل ان علم الجزم بو قوع الشرط واصل اذا الجزم" ان اور اذا دونوں ہی مستقبل میں شرط کیلئے آتے ہیں۔ لیکن "ان" اصل میں یہ ہے کہ اس میں جزم نہیں پایا جاتا بلکہ شک پایا جاتا ہے۔ یہ اس کا حقیقی معنیٰ ہے، لیکن مجازی معنی کے لحاظ پر بھی جزم کیلئے بھی آتا ہے۔ اس میں کافی تفصیل ہے۔
- "ولان اصل اذا الجزم بالوقوع غلب لفظ الماضى لدلالته على الوقوع قطعانظرا الى نفس اللفظ وان نقل ههنا الى معنى الاستقبال مع اذا"
  اور "اذا" میں اصل میں جزم پایا جاتا ہے کہ اس نے واقع ہونا ہی ہے۔ پھر اذا کے ساتھ غالباً لفظ ماضی ذکر کیا جاتا ہے تاکہ یقینی وقوع پر دلالت کرے۔
- "واذا جئ بها اى بان فى مقام التاكيد بعد واو الحال لمجرد الوصل والربط دون الشرط نحو زيد وان كثر ماله بخيل وفى غير ذلك اى غير المستقبل قليلا مع كونها للشرط"

اوراذا مقام تاکید میں واؤ حالیہ کے بعد صرف وصل اور ربط کیلئے آتا ہے اس میں شرط کا معنی نہیں پایا جاتا، جیسے کہا جاتا ہے "زید وان کثر ماله بخیل" زید اگرچہ کثیر مال رکھتا ہے لیکن بخیل ہے۔ اوراذا کا استعمال مستقبل کے بغیر بھی قلیل طور پر آتا رہتا ہے۔ (ماخوذ از تلخیص المفتاح وروح المعانی وتجرید)

اب اس تمہید کے بعد زیر بحث آیہ کریمہ میں دیکھیں کہ " اِذَا ضَـرَبُـوْا " میں اذا استعمال ہے، یہاں کون سا معنی لیا جائے، اس مقام پر تفسیر مظہری میں زیادہ زور اس پر دیا گیا کہ یہ حال کے معنی میں استعمال ہے، مطلب یہ ہوا کہ اے ایمان والو نہ ہو کافروں کی طرح جب وہ اپنے بھائیوں کو کہتے جب وہ سفر کرتے یا غزوہ کیلئے جاتے کہ وہ جو پہلے سفر میں اور غزوہ میں گئے وہ مر گئے یا مارے گئے اگر وہ نہ جاتے اور ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے، اس مقام پر روح المعانی میں اذا کے متعلق بہت طویل بحث کی گئی ہے، لیکن تفسیر ابی السعود نے مختصر اور خوبصورت انداز پر مسئلہ کا حل پیش کیا،

❁ "وایثار اذا المفیدة لمعنی الاستقبال علی اذاالمفیدة لمعنی المضی لحکایة الحال الماضیة قال الزجاج اذاهھنا تنوب عما مضی من الزمان ومایستقبل یعنی انها لمجرد الوقت اویقصدبها الاستمرار"

یہاں "اذا" کا استعمال کیا گیا ہے حالانکہ "اذا" ماضی کیلئے آتا ہے، "اذ" پر "اذا" کو ترجیح اسلئے دی گئی ہے کہ یہ حال ماضیہ کی حکایت کیلئے آیا ہوا ہے زجاج نے بیان کیا ہے کہ یہ ماضی کے معنی کیلئے ہو یا استقبال کیلئے ہو یہاں مطلقا وقت کیلئے استعمال ہے۔ یا استمرار کا ارادہ کیا گیا ہے، اس تفصیل کے بعد مندرجہ ذیل معانی کئے جاسکتے ہیں۔ "جب ماضی میں وہ کہتے رہے" جب ماضی میں انہوں نے کہا۔ ہمیشہ ان کا بھائیوں کو یہی کہنا رہا۔

﴿ اِذَا ضَرَبُوْا فِی الْاَرْضِ ﴾ "جب انہوں نے سفر کیا زمین میں۔"

(ای سافروا فیها للتجارة اوطلب معاش فماتوا) یعنی تجارت کیلئے یا اور مقاصد کیلئے وہ گھر سے دوسرے علاقہ میں سفر کر کے گئے، اور فوت ہو گئے، "اصل الضرب ایقاع شئ علی شئ" ضرب کا حقیقی معنی ایک چیز کا دوسری چیز پر واقع ہونا۔ زمین پر چلنے پر بھی "ضـــرب" کا اطلاق اسی لئے ہے کہ انسان اپنا پاؤں زمین پر مارتا ہے، "ثم صار حقیقة فیه" پھر اس معنی کو بھی بطور حقیقت سمجھ لیا گیا۔ زمین کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ اکثر سفر ان کے خشکی کے ہوتے تھے، "وقیل المراد من الارض مایشمل البر والبحر" بعض حضرات نے بیان کیا کہ زمین سے مراد عام ہے جو خشکی اور تری دونوں کو شامل ہے۔ (راقم کو یہی معنی بہتر نظر آتا ہے)

(روح المعانی ج ۳ ص ۹۹)

﴿اَوْ كَانُوْا غُزًّى﴾ "یا ہوئے جہاد کرنے والے۔"

"غزی جمع غاز كالقول والركع والسجد جمع قائل وراكع وساجد" غزی جمع ہے غازی کی جسطرح قول جمع ہے قائل کی، اور رکع جمع ہے راکع کی اور سجد جمع ہے ساجد کی۔ غازی کی جمع غزاۃ بھی آتی ہے، جسطرح قاضی کی قضاۃ اور رامی کی رماۃ جمع آتی ہے۔ "الغزو" کا کلام عرب میں اطلاق "دشمن کے قصد کرنے پر ہوتا ہے۔ مغزی کا معنی مقصد۔
(کبیر ج۹ ص۵۵)

"غزی" بتشديد الزاء وقرأ الحسن والزهرى بتخفيف الزاى" (البحر المحیط ج۳ ص۱۳۶)

"غزی" میں زاء پر شد ہے، البتہ حسن بصری رحمہ اللہ علیہ اور زہری رحمہ اللہ نے زاء کو مخفف کر کے پڑھا ہے۔

﴿لَوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَامَاتُوْا وَمَاقُتِلُوْا﴾

"اگر وہ ہوتے ہمارے پاس تو نہ مرتے اور نہ قتل کئے جاتے۔"

کافروں کا یہ کلام کن لوگوں کے متعلق تھا؟ جمہور حضرات نے تو یہ کہا کہ انہوں نے یہ کلام احد کے شھداء کے متعلق کیا، لیکن بکر بن سہل دمیاطی نے بیان کیا ہے کہ ان کا یہ قول "سریہ بیر معونۃ" میں ستر قراء شہید ہونے والوں کے متعلق تھا۔ "وماقتلوا" میں تاء مخفف ہے۔ البتہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے تشدید سے پڑھا ہے البتہ کثرت والا معنی کثیر مقامات کے لحاظ پر ہوگا، کثیر مقامات میں کثیر لوگ مرنے والے اگر ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے، ایک محل میں مرنے والوں کے متعلق ان کا کلام نہیں تھا "لانه لايمكن التكثير فيه" کیونکہ ایک محل میں کثرت کا اس وقت پایا جانا ممکن نہیں۔ (البحر المحیط ج۳ ص۱۳۶)

تفسیر کبیر کی عظمت دینی طلباء کیلئے:

اذا کے متعلق مختصر بحث جو پہلے ذکر کی ہے اس کے متعلق ایک اور رخ سے انہوں نے ایک اعتراض اور اس کے تین جواب دیئے ہیں، جس سے تفسیر کبیر کی عظمت سمجھ آئیگی، باقی آپ کے خوشہ چین ہیں۔

اعتراض: "وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ" ماضی پر دلالت کر رہا ہے "اِذَاضَرَبُوْا" مستقبل پر دلالت کر رہا ہے (کیونکہ) "اذا" استقبال کیلئے آتا ہے) "فكيف الجمع بينهما" ان دونوں کو ایک جگہ جمع کرنا کیسے صحیح ہے؟ اگر "اِذَا" کی جگہ "اِذْ" آتا تو کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ "اِذْ" ماضی کیلئے آتا رہتا ہے۔

پہلا جواب: "قَالُوْا" مجازی طور پر مستقبل کیلئے استعمال ہے، گویا کہ عبارت کا مطلب یوں ہو گیا

"لاتکونوا کالذین کفروا ویقولون لاخوانھم کذا و کذا" نہ ہو جاؤان کافروں کی طرح جو اپنے بھائیوں کو اس طرح کہیں گے۔ مستقبل کو ماضی سے تعبیر کرنے کے دو فائدے ہیں ایک یہ کہ جب کسی چیز کا مستقبل میں پایا جانا لازمی ہو اس وقت اسے ماضی سے تعبیر کر دیا جاتا ہے جیسا کہ "اتی امر اللہ" فصعق من فی السماوات" ان دونوں جگہ ماضی کے صیغے استقبال کیلئے استعمال ہیں۔ اگر مستقبل کا صیغہ استعمال کیا جاتا تو مبالغہ نہیں پایا جا سکتا تھا۔ مبالغہ ماضی کے صیغہ سے ہی حاصل ہو رہا ہے۔

❁ "دل ذلک علی ان جدھم واجتھادھم فی تقریر الشبھة قدبلغ الغایة وصار بسبب ذلک الجد ھذاالمستقبل کالکائن الواقع"

اس کلام سے یہ پتہ چل رہا ہے کہ ان کی کوشش اور اجتہاد شبہ کو ثابت کرنے میں اس انتہاء درجہ کو پہنچا ہوا تھا کہ ان کی اس کوشش سے یوں سمجھ آتا کہ مستقبل میر ان کا کہنا گویا کہ ابھی واقع ہو چکا ہے۔ مستقبل کو ماضی سے تعبیر کرنے کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے یہ پتہ چل رہا ہے کہ

❁ "انہ لیس المقصود الاخیار عن صدور ھذاالکلام بل المقصود الاخبارعن جدھم واجتھادھم فی تقریر ھذہ الشبھة"

مقصد بیان کرنے کا صرف یہ نہیں کہ یہ بتایا جائے وہ اسطرح کلام کرتے تھے، بلکہ بتانا یہ مقصود ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں شبہات ڈالنے کی کتنی بڑی کوشش کرتے تھے۔ اگرچہ اس جواب کے متعلق علامہ رازی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں "فھذاھو الجواب المعتمد عندی (واللہ اعلم) یہ جواب میرے نزدیک معتمد ہے"، (واللہ اعلم بالصواب)، لیکن راقم کے عنوان کا تعلق تیسرے جواب سے ہے جو قریب ہی ان شاء اللہ آ رہا ہے۔

دوسرا جواب: "ان الکلام خرج علی سبیل حکایة الحال الماضیة" کہ یہ کلام حال ماضیہ کی حکایت ہے۔ "فالکافرون یقولون لو کانوا عندما ماتوا وماقتلوا فمن اخبر عنھم بعد ذلک لابد وان یقول قالوا" یعنی کافر لوگ ماضی میں یہ کہتے رہے اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل کئے جاتے، اس کے بعد جب ان کی خبر دی گئی تو ماضی کا صیغہ ذکر کیا گیا۔

تیسرا جواب: قال قطرب کلمة "اِذْ" و "اِذَا" یجوز اقامة کل واحدة منھما مقام الأخری قطرب" بیان کرتے ہیں، "اِذْ" اور "اِذَا" ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے رہتے ہیں۔ لھذا آیۃ کریمہ میں "اذا" کا استعمال مجازی طور پر "اذ" کی جگہ ہوا ہے، لھذا دونوں جملے "وَقَالُوْا لِاِخْوَانِھِم" اور "اِذَاضَرَبُوْا" ماضی پر ہی دلالت کر رہے ہیں۔ اس

جواب کے متعلق علامہ رازی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے "واقول هذاالذی قاله قطرب کلام حسن" اور میں کہتا ہوں کہ جو قطرب نے بیان کیا ہے یہ جواب بہت حسین ہے۔

اس پر مزید آپ نے تبصرہ یہ فرمایا ہے کہ جب عربی لغت کو ایک مجہول شعراور مجہول شاعر سے منقول ہونے کے باوجود ثابت کرتے ہیں "فلان یجوز اثباتها بالقرآن العظیم کان ذلک اولی" تو زیادہ ضروری یہ ہے کہ عربی لغت کو ہم قرآن پاک کے ذریعے ثابت کریں، زیادہ سے زیادہ یہاں کہا جاسکتا ہے کہ "اذا حقیقی معنی کے لحاظ سے استقبال کیلئے آتا ہے، لیکن اس سے یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ مجازی معنی کے لحاظ سے ماضی کیلئے نہیں آتا کیونکہ "اِذْ" اور "اِذَا" دونوں میں بہت شدید مشابہت پائی جاتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں میں کثیر نحویوں کو دیکھتا ہوں وہ جب قرآن پاک کے الفاظ میں حیران ہوتے ہیں تو کسی نہ کسی شعر کو دلیل بناتے ہیں، جب ان کو کوئی شعر بطور دلیل مل جائے "فرحوابه" اس پر وہ خوش ہوتے ہیں۔

❁ "وانا شدید التعجب منهم فانهم اذا جعلوا ورود ذلک البیت المجهول علی وفقه دلیلا علی صحته فلان یجعلوا ورود القرآن به دلیلا علی صحته کان اَولی"

مجھے اس پر شدید تعجب ہوتا ہے کہ جب وہ ایک مجہول شعر سے قرآن پاک کے الفاظ صحت پر دلیل مانتے ہیں کتنا ہی اچھا ہوتا کہ وہ خود قرآن پاک کو ہی عربی لغت کی صحت وفصاحت وبلاغت کی دلیل بنائیں۔ (کبیر ج۹ ص۵۵)

راقم کے نزدیک تو عربی کی فصاحت وبلاغت کا اعلیٰ معیار ہی قرآن پاک کے نزول پر ہوا۔ ورنہ فصاحت وبلاغت کے دعویدار ایمان نہ لانے والے قرآن پاک جیسی کوئی صورت بنا کر دکھاتے، لیکن انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ حقیقی فصاحت وبلاغت تو اب سامنے آئی ہے ہم تو اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہیں۔

❁ "قال الواحدی فی الآیة محذوف یدل علیه الکلام والتقدیر اذا ضربوا فی الارض فماتوا أو کانوا غزاة فقتلوا لو کانوا عندنا ماماتوا وماقتلوا فقوله "وماماتوا وماقتلوا" یدل علی موتهم وقتلهم"

واحدی فرماتے ہیں آیۂ کریمہ کا مفہوم یہ سمجھ آرہا ہے کہ جب انہوں نے زمین میں سفر کیا اور وہ مر گئے یا غزوہ میں گئے تو قتل کردئے گئے تو انہوں نے کہا "اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل کئے جاتے،" "وماماتوا اور وماقتلوا" کے الفاظ مبارکہ اس پر دلالت کررہے ہیں کہ ان لوگوں کے متعلق کلام ہے جو مر گئے تھے اور قتل کردئے گئے تھے۔ (کبیر ج۹ ص۵۵)

﴿لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ﴾

"تا کہ بنائے اللہ اسے حسرت ان کے دلوں میں"

اس کی تفسیر میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ تقدیر عبارت کی یہ ہے "انهم قالوا ذلک الكلام ليجعل الله ذلک الكلام حسرة في قلوبهم" بیشک انہوں نے یہ کلام کیا تا کہ اللہ تعالیٰ یہ کلام ان کے دلوں میں حسرت بنا دے، یہ اسی طرح ہے جس طرح کہا جاتا ہے "ربيته ليؤذيني" "ونصرته ليقهرني" میں نے اس کی تربیت کی تا کہ وہ مجھے ایذاء پہنچائے، اور میں نے اس کی امداد کی تا کہ وہ مجھ پر قہر کرے۔ اسی طرح رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿فَالْتَقَطَهٗ آلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا﴾ تو اسے اٹھا لیا فرعون کے گھر والوں نے کہ وہ ان کا دشمن اور ان پر غم ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا چیز حسرت بنی اور کن لوگوں کیلئے حسرت بنی؟ اس میں چند وجوہ بیان کی گئی ہیں۔

(۱) ایک ان میں سے یہ ہے کہ مرنے والے اور قتل ہونے والے حضرات کے اقارب نے جب سنا تو ان کے دلوں میں حسرت بڑھ گئی

"لان احدهم يعتقد انه لو بالغ في منعه عن ذلک السفر وعن ذلک الغزو لبقي"

اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کو اس کا اعتقاد ہو گیا کہ اگر وہ ان لوگوں کو اس سفر یا اس غزوہ سے زبردستی روکتے تو وہ رک جاتے اور بچ جاتے، وہ شخص مر گیا یا قتل ہو گیا تو ہماری کمزوری کی وجہ سے کہ ہم اسے روک نہیں سکے۔ ان کے اس کلام کو سننے والے کا بھی عقیدہ یہ ہو جاتا کہ اس شخص کی موت یا قتل ہونے کا سبب ان لوگوں کا اسے نہ روکنا ہے، "ومتى اعتقد في نفسه ذلک فلاشک انه تزداد حسرته وتلهفه" جب عقیدہ ہی ان لوگوں کا یہ ہو گیا تو یقیناً ان کی حسرت اور اس پر افسوس بڑھ گیا۔

"اما المسلم المعتقد في ان الحياة والموت لايكون الابتقدير الله وقضائه، لم يحصل البتة في قلبه شئ من هذا النوع من الحسرة"

لیکن مسلمان کا عقیدہ یہ ہے کہ بیشک حیات زندگی اور موت صرف اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور اس کے فیصلہ پر موقوف ہے، اسی وجہ سے مومن کے دل میں اس قسم کی کوئی حسرت نہیں پائی جاتی۔

(۲) دوسری وجہ یہ تھی کہ

"انهم متى القوا هذه الشبهة على اقوياء المسلمين لم يلتفتوا اليهم فيضيع سعيهم ويبطل كيدهم فتحصل الحسرة في قلوهم"

کہ جب منافقین نے قوی مسلمانوں پر اس قسم کے شبہات ڈالے تو انہوں نے ان کی باتوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی تو منافقین کی ساری کوشش ضائع ہوگئی، ان کا مکروفریب برباد ہو گیا، ان کے دلوں میں حسرت پیدا ہوگئی۔

(۳) "ان جدھم و اجتھادھم فی تکثیر الشبھات و القاء الضلالات یعمی قلوبھم فیقعون عندذلک فی الحیرۃ و الخیبۃ وضیق الصدر وھوالمراد بالحسرۃ کقولہ"ومن یرد ان یضلہ یجعل صدرہ ضیقا حرجا"

منافقین کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ زیادہ سے شبہات مسلمانوں کے دلوں میں ڈالے جائیں اور ان کو گمراہ کرنے والی باتوں سے پھیرا جائے یعنی ان کے دل اندھے ہوجائیں، اسی سوچ میں وہ ہر وقت حیران رہتے اور ان کا دل تنگ رہتا اور خاص کر کے مسلمانوں کے ان کی باتوں کو نہ ماننے سے ان کو رسوائی حاصل ہوتی، اسی چیز کو رب تعالی نے "حسرت" سے تعبیر فرمایا، دوسرے مقام پر رب تعالی کا ارشاد اس کی تائید کررہا ہے۔﴿وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا﴾ جس شخص کو وہ گمراہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو اس کے سینہ کو تنگ کردیتا ہے۔

(۴) چوتھی وجہ اس میں یہ ہے کہ منافقین نے جب نئے نئے اسلام قبول کرنے والوں کے دلوں میں شبہات ڈالے تو وہ ان کی باتوں میں آگئے اور سمجھنے لگے کہ یہ ٹھیک کہتے ہیں تو یہ بڑے خوش ہوئے کہ ہمارا داؤ چل گیا، رب تعالی نے فرمایا﴿لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ﴾ اس کا مطلب یہ ہوگیا"سیصیر ذلک حسرۃ فی قلوبھم اذاعلموا انھم کانوا علی الباطل فی تقریر ھذہ الشبھۃ" کہ جب ضعیف اعتقاد والے مؤمنین کے دلوں میں بھی ایمان راسخ (پختہ) ہوجائے گا تو وہ بھی سمجھ جائیں گے کہ یہ جھوٹے ہیں، ان کے شبہات باطل ہیں، تو ان کو بڑی حسرت ہوگی کہ ہائے جو کوشش اثر انداز ہوتی نظر آرہی تھی وہ بھی ضائع ہوگئی۔

(۵) پانچویں وجہ یہ ہے منافقین نے جب شبہات ڈالے کہ یہ لوگ جہاد چھوڑ دیں، لیکن مسلمانوں نے ان کے روکنے کے باوجود جہاد جاری رکھا، غزوات میں بلاخوف شریک ہوتے رہے،

"ووصلوا بسببہ الی الغنائم العظیمۃ و الاستیلاء علی الاعداء و الفوز بالأمانی بقی ذلک المتخلف عندذلک فی الخیبۃ و الحسرۃ"

جب مسلمان کامیاب ہوجاتے، دشمن پر غلبہ حاصل کرلیتے اور مال غنیمت حاصل کرلیتے تو منافقین پیچھے رہ جانے کی وجہ سے محروم ہوجاتے تو ان کو اس پر حسرت ہوتی۔

(۶) "ان ھذہ الحسرۃ انما تحصل یوم القیامۃ فی قلوب المنافقین اذرأوا تخصیص اللہ المجاھدین بمزید الکرامات و اعلاء الدرجات وتخصیص ھؤلاء المنافقین بمزید

الخزی و العقاب"

منافقین کو قیامت کے دن حسرت حاصل ہوگی جب وہ دیکھیں گے کہ اللہ تعالی نے جہاد کرنے والوں کو بہت بڑی کرامات اور بلندی درجات سے مختص کر دیا ہے، اور ہمیں رسوائی اور عذاب حاصل ہو رہا ہے تو ان کو حسرت ہوگی۔ وہ حسرت ان کی روز بروز بڑھتی چلی جائے گی۔

آیۃ کریمہ کی تفسیر میں دوسرا قول یہ ہے:

کہ اللہ تعالی کے ارشاد گرامی ﴿لِيَجْعَلَ اللّٰهُ﴾ میں لام کا متعلق اس نہی سے ہے جو سابقہ جملہ میں ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوگا

"لاتکونوا مثلهم حتى يجعل الله انتفاء كونكم مثلهم حسرة في قلوبهم لان مخالفتهم فيما يقولون ويعتقدون ومضادتهم مما يغيظهم"

اے ایمان والو تم ان کی مثل نہ ہو جاؤ تا کہ تمہارے ان کی طرح نہ ہونے سے ان کے دلوں میں رب تعالی حسرت بنادے، اس لئے کہ جب ان کے قول اور اعتقاد کی مخالفت کرو گے تو تمہاری مخالفت کی وجہ سے ان کو غصہ آئے گا وہی ان کو حسرت دلائے گا۔ (ماخوذ از تفسیر کبیر بتقدیم وتاخیر ج۹ ص ۵۵،۵۶)

﴿وَاللّٰهُ يُحْيِىْ وَيُمِيْتُ﴾ "اور اللہ زندہ کرتا ہے، اور مارتا ہے۔"

اس کی تفسیر میں دو وجہ بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ ان الفاظ مبارکہ سے منافقین کے شبہ کا جواب دیا گیا ہے" اس جواب کی تقریر یہ ہے" کہ زندہ کرنے اور مارنے والا صرف اللہ تعالی ہے، کسی اور چیز کو حیات اور موت میں کوئی تاثیر نہیں

"وان علم الله لايتغير وان حكمه لاينقلب، وان قضاء ه لايتبدل، فكيف ينفع الجلوس في البيت من الموت"

بیشک اللہ تعالی کا علم بدلتا نہیں، اور بیشک اس کا حکم نہیں بدلتا، اور بیشک اس کی تقدیر نہیں بدلتی، لھذا گھر میں بیٹھنا کسی کو موت سے بچانے کا نفع نہیں دے سکتا۔

اعتراض: اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالی کی تقدیر نہیں بدلتی لھذا اپنے آپ کو موت اور قتل سے بچانے کی کوشش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ کوئی اپنے آپ کو آخرت کے عذاب سے بچانے کی کوشش نہ کرے اور نہ ہی اچھے عمل کرے اور نہ ہی برے اعمال سے رکے، اسطرح تو انسان کا مکلف ہونا ہی ختم ہو جائے گا۔

جواب: **"ان حسن التكليف عندنا غير معلل بعلة ورعاية مصلحة بل عندنا انه يفعل مايشاء ويحكم مايريد"**

اللہ تعالیٰ بندوں پر جو احکام نافذ فرماتا ہے، یا جن کاموں سے روکتا ہے، ان کا نام ہی تکلیف ہے، ان سے ہی انسان کو مکلف بنایا جاتا ہے، لیکن تکلیف کی دارومدار کسی علت اور کسی مصلحت کی رعایت پر موقوف نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے ﴿اِنَّ اللّٰـهَ يَفْعَلُ مَايَشَاءُ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ جو چاہے وہ کرتا ہے ﴿اِنَّ اللّٰـهَ يَحْكُمُ مَايُرِيْدُ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے جو ارادہ رکھتا ہے، ﴿لَايُسْئَلُ عَمَّايَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ﴾ اس سے نہیں پوچھا جائے گا وہ کیا کرتا رہا، ہاں البتہ بندوں سے پوچھا جائے گا وہ کیا کرتے رہے۔ ہاں البتہ اتنی بات یاد رکھی جائے، اللہ تعالیٰ حکیم ہے۔ "فان الحکیم لایامر بالقبائح ولاینھی عن المحاسن" بیشک حکیم برے کاموں کا حکم نہیں دیتا اور اچھے کاموں سے روکتا نہیں۔

دوسری وجۂ تفسیر:

یہ ہے کہ ﴿وَاللّٰهُ يُحْيِي وَيُمِيْتُ﴾ ان کے شبہ کے ازالہ کیلئے نہ ہو کیونکہ شبہ کا ازالہ تو پہلے ہی ﴿لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ﴾ سے کیا جا چکا ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب منافقوں کی طرح کلام کرنے سے منع کیا تو ساتھ ہی ارشاد فرمایا ﴿وَاللّٰهُ يُحْيِي وَيُمِيْتُ﴾ "بريد يحيى قلوب اوليائه واهل طاعته بالنور والفرقان ويميت قلوب اعدائه من المنافقين" یعنی ان الفاظ مبارکہ سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء اور اس کی طاعت کرنے والوں کے دلوں کو نور اور فرقان سے زندہ رکھتا ہے، اور اپنے دشمنوں یعنی منافقین کے دلوں کو مردہ کر دیتا ہے۔ (تفسیر کبیر بالوضاحت ج۹ ص۵۶، ۵۷)

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ "اللہ جو تم عمل کرتے ہو دیکھ رہا ہے۔"

"المقصود منه الترغيب والترهيب" م قصد اس سے مؤمنین کو نیک اعمال کی، جہاد کی رغبت دلانا ہے کہ موت سے نہ ڈرو موت وحیات تو رب تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے، اور ساتھ ہی منافقوں کو ڈرایا گیا کہ تم اپنی جتنی حفاظتی تدابیر کر سکتے ہو کر لو، اللہ کی گرفت سے نہیں بچ سکو گے وہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

ابن کثیر اور حمزہ کی قراءت میں ﴿يَعْمَلُوْنَ﴾ پڑھا گیا ﴿فِيْ قُلُوْبِهِمْ﴾ کی مناسب سے، اور باقی حضرات نے تاء سے پڑھا ہے ﴿وَلَاتَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ کی مناسبت سے۔ (ماخوذ از کبیر ج۹ ص۵۷)

وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْمُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ O

(آیۃ نمبر ۱۵۷)

(1) اور بیشک اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا مر جاؤ تو اللہ کی بخشش اور رحمت ان کے سارے دھن و دولت سے بہتر ہے (کنز الایمان)

(2) اور بیشک اگر تمہیں قتل کر دیا جائے اللہ کی راہ میں یا تم مر جاؤ، تو البتہ تھوڑی بخشش اللہ کی طرف سے اور تھوڑی رحمت بہت بہتر ہے اس سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔ (نجوم الفرقان)

اس آیۃ کریمہ میں منافقین کے شبہ کا دوسرا جواب دیا جا رہا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ موت نے ضرور واقع ہونا ہے، اگر انسان نے قتل ہونا ہے یا مرنا ہے تو ضرور اس نے قتل ہونا ہے یا اس پر موت واقع ہونی ہے۔ اس سے اسے چھٹکارا حاصل نہیں۔ جب موت یا قتل اللہ تعالیٰ کی راہ میں واقع ہوں اور اس کی رضاء مندی حاصل کرنی مقصود ہو تو وہی بہتر ہے اس سے کہ دنیا کی طلب میں انسان اپنا سارا وقت لگا دے، جس کا موت کے بعد اسے کوئی فائدہ نہ ہو۔ "وهذا جواب في غاية الحسن و القوه" یہ جواب بہت ہی حسین اور قوی ہے۔

مقصد عظیم:

وذلک لان الانسان اذا توجه الى الجهاد اعرض قلبه عن الدنيا و اقبل على الآخرة ،فاذامات،فكانه تخلص عن العدو دوصل الى المحبوب ،واذاجلس في بيته خائفامن الموت حريصا على جمع الدنيا،فاذامات فكانه حجب عن المعشوق و القى في دار الغربة،ولاشک في كمال سعادة الأول و كمال شقاوة الثانى (کبیر ج ۹ ص ۵۷)

انسان کیلئے یہ ضروری ہے کہ جب جہاد کی طرف متوجہ ہو تو وہ دل دنیا سے ہٹالے، اور آخرت کی طرف متوجہ ہو جائے، اس حال میں جب اس پر موت آجائے تو اس نے اپنے آپ کو دشمن سے چھڑا لیا ہے، اور وہ محبوب تک پہنچ گیا، یعنی رب تعالیٰ کا مقرب ہو گیا۔ اور جب موت سے ڈر کر گھر میں بیٹھ گیا اور دنیا کا مال جمع کرنے میں حریص ہو گیا تو اس کی موت جب اس حالت میں آئے تو اس نے اپنے آپ کو اپنے محبوب یعنی اللہ تعالیٰ سے دور کر لیا اور اپنے آپ کو اجنبی کر لیا۔ یقیناً پہلا مقام انتہائی سعادت کا مقام ہے اور دوسرا مقام انتہائی بدبختی ہے۔ "متم" میم کے پیش سے استعمال ہوا ہے جس طرح قال، یقول کا استعمال ہے "قلتم" کاف کے پیش سے، آتا ہے جمہور قراء نے اس مقام پر میم کے پیش سے ہی پڑھا ہے۔

اور دوسرا استعمال اس کا "خاف یخاف" اور "ھاب یھاب" کی طرح ہے، "خفتم او ھبتم" میں خاء اور ھاء کے نیچے زیر ہے۔ اسی طرح مبرد کی قراءت میں "متم" میں بھی میم کے نیچے زیر ہے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ یہاں تو اختلاف ہے، پیش والی قراءت کو زیادہ پسند کیا گیا ہے کہ یہ "مات یموت" سے لیا ہوا ہے، لیکن "مات یمات" سے "متنا" میم کے کسرہ سے قرآن پاک میں کئی جگہ استعمال ہے۔ (ماخوذ از کبیر بالوضاحت ج۹ ص۵۷)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

﴿وَلَئِنۡ قُتِلۡتُمۡ﴾ میں لام موطأ للقسم ہے۔ تقدیر عبارت کی یہ ہے "واللہ لئن قتلتم" "لمغفرة من اللہ ورحمة" میں لام ابتدائیہ ہے جو دلالت کررہا ہے کہ یہ جواب قسم ہے، اور اس میں تاکید والا معنی بھی پایا گیا ہے۔ "مغفرة" مبتداء ہے اور "رحمة" کا اس پر عطف ہے۔ اور خبر اس کی "خیر" ہے۔ "من اللہ" صفت ہے "مغفرة" کی اور عربی قاعدہ کے مطابق جب معطوف علیہ کی صفت ساتھ ذکر کردی گئی تو معطوف کی صفت بھی خود بخود سیاق وسباق سے سمجھ آگئی یعنی معنوی لحاظ پر عبارت یوں ہوگئی "لمغفرة من اللہ ورحمة من اللہ" پھر یہ بھی خیال رہے کہ دونوں الفاظ مبارکہ پر تنوین تقلیل کیلئے ہے۔ اب اس ترکیب مذکور کے لحاظ پر مکمل معنی یہ ہوگیا۔ اور قسم ہے اللہ کی اگر تم قتل کردئے جاؤ اللہ کی راہ میں یا مرجاؤ تو یقیناً اللہ کی تھوڑی بخشش اور اللہ کی تھوڑی رحمت بہت بہتر ہے اس سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر ج۹ ص۵۸۔ وتفسیر ابی السعود ج۲ ص۱۰۴)

﴿خَيۡرٌ مِّمَّا يَجۡمَعُوۡنَ﴾ حفص نے عاصم (رحمھما اللہ) کی روایت کے مطابق یاء سے غیب کے صیغہ سے پڑھا ہے، اس قراءت کے مطابق معنی یہ ہے

"ان مغفرة اللہ خیر مما یجمعه ھؤلاء المنافقون من الحطام الفانی"

بیشک اللہ کی بخشش اور رحمت بہتر ہے اس سے جو یہ منافقین دنیا کا فانی مال جمع کررہے ہیں۔

لیکن بعض قراءتوں میں تاء سے خطاب کا صیغہ ﴿تَجۡمَعُوۡنَ﴾ ہے، اس صورت میں خطاب مؤمنین کو ہوگا۔

"فالمعنی انه تعالی کأنه یخاطب المؤمنین فیقول لھم مغفرة من اللہ خیر لکم من الأموال التی تجمعونھا فی الدنیا"

اب اس کا معنی یہ ہوگا، اے مومنو اللہ کی بخشش تمہارے لئے تمہارے ان مالوں سے بہتر ہے جو تم جمع کرتے ہو۔ (کبیر ج۹ ص۵۸)

مغفرت ورحمت کے بہتر ہونے پر چند وجوہ:

(۱) جو شخص دنیا کا مال طلب کرتا ہے وہ طلب کے وقت اپنے آپ کو مشقت میں ڈالے ہوتا ہے اور اس کے حاصل کرنے میں تھکن میں ہوتا ہے "ولعله لاینتفع به غدا لأنه یموت قبل الغد" ہو سکتا ہے کل اس سے وہ فائدہ نہ حاصل کر سکے اور اس کی موت کل سے پہلے ہی آجائے۔

"واماطلب الرحمة والمغفرة فانه لابدوان ینتفع به لأن الله لایخلف وعده"

لیکن رحمت اور بخشش کی طلب میں نفع ضرور حاصل ہوتا ہے، اسلئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں فرماتا۔

اور رب تعالیٰ نے وعدہ یہ فرمایا ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ﴾ تو جو ایک ذرہ بھر بھلائی کرے اسے دیکھے گا،

(۲) اللہ تعالیٰ کی عطاء یعنی اس کی بخشش اور رحمت کل تک باقی رہیں گی، لیکن ہو سکتا ہے مال کل تک باقی نہ رہے۔ "فکم من انسان اصبح امیرا وامسی اسیرا" کتنے ہی انسان صبح امیر ہوتے ہیں اور شام کو قیدی ہوتے ہیں۔

"وخیرات الآخرة لاتزول لقوله" وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّکَ" ولقوله تعالی" ﴿مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ﴾

نیکیاں باقی رہنے والی بہتر ہیں تمہارے رب کے ہاں۔ اور فرمایا، جو تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا، اور جو رب تعالیٰ کے ہاں ہے وہ ختم نہیں ہوگا۔

(۳) کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مال کچھ دیر کیلئے باقی تو رہ جاتا ہے، لیکن حوادثات اس سے فائدہ حاصل نہیں کرنے دیتے کوئی شخص مریض ہو گیا اور اسے درد لاحق ہو گیا تو وہ اس سے نفع نہ حاصل کر سکا، "ومنافع الآخرة لیست کذلک" لیکن آخرت کے منافع یوں نہیں، بلکہ وہ ہمیشہ کیلئے نفع مند ہیں۔

(۴) بعض اوقات انسان اپنے مال سے کل نفع بھی حاصل کر لے گا لیکن دنیا کی لذات کے ساتھ تکالیف بھی پائی جاتی ہیں اور منافع نقصانات کے ساتھ ملے جلے ہوتے ہیں، یہ بہت واضح ہے، کوئی پوشیدہ بات نہیں لیکن اخروی منافع تکالیف اور نقصانات سے پاک ہیں۔

(۵) اگر کسی شخص کو منافع حاصل ہوں لیکن اسے تکالیف نہ حاصل ہوں، ایسا بہت کم ہے لیکن اگر ایسا ہو جائے تو پھر اس کے منافع بھی ختم ہو جائیں گے اور اس کی اپنی زندگی بھی ختم ہونے والی ہے، پھر اسے جب کوئی نعمت حاصل ہوتی ہے تو وہ جتنی دیر نعمت حاصل نہیں رہی اس پر افسوس کرتا ہے، لیکن اخروی نعمتیں دائمی (ہمیشہ رہنے والی) ہیں، اور انسان کی زندگی بھی آخرت میں ختم ہونے والی نہیں۔ اور نہ ہی کوئی وہاں افسوس حاصل ہوتا ہے۔

(۶) دنیاوی منافع حسی ہیں، اخروی منافع عقلی ہیں۔ حسی منافع گھٹیا ہیں، اور عقلی منافع اعلیٰ ہیں۔ لھذا اخروی منافع کو فوقیت (بلندی) حاصل ہے۔

ان چھ وجوہ سے ہی آنے والے الفاظ مبارکہ کا مطلب آسانی سے سمجھ آسکتا ہے۔

﴿ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴾

''البتہ تھوڑی بخشش اللہ کی طرف سے اور تھوڑی رحمت بہت بہتر ہے اس سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔''

اعتراض: ﴿ خَيْرٌ ﴾ اسم تفضیل ہے جو زیادہ بہتری پر دلالت کرتا ہے تو اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دنیاوی مال جمع کرنا اچھا ہے، لیکن اللہ کی بخشش اور اس کی رحمت زیادہ بہتر ہیں۔ حالانکہ دنیاوی مال جمع کرنا تو اچھا ہی نہیں۔ تو یہاں ﴿ خَيْرٌ ﴾ کا استعمال کس طرح صحیح ہے؟

جواب: ''ھذا وارد علی حسب قولھم ومعتقدھم ان تلک الأموال خیرات فقیل المغفرة خیر من ھذہ الاشیاء التی تظنونھا خیرات''

یہاں ﴿ خَيْرٌ ﴾ کا استعمال ان لوگوں کے اعتقاد کے مطابق ہے۔ وہ دنیاوی مال کو بہت نعمت سمجھتے تھے، اور اسے بہتر قرار دیتے تھے، لھذا آیۃ کریمہ میں بیان کا مقصد یہ ہے کہ اگرچہ یہ لوگ دنیا کے مال کے جمع کرنے کو اپنے اعتقاد کے مطابق بہتر قرار دیتے ہیں لیکن انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی بخشش اور رحمت دنیا کے مال جمع کرنے سے زیادہ بہتر ہے۔ بلکہ اس میں ان کو تنبیہ بھی کردی گئی کہ تم منافقت کو چھوڑ کر مخلص مؤمن بن جاؤ۔

تنبیہ: اگر ﴿ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴾ والی قراءت ہو اور خطاب مؤمنین کو ہو تو اس صورت میں مسئلہ واضح ہے کہ اے مؤمنو تمہارا حلال مال جمع کرنا اگرچہ بہتر ہے کیونکہ اس سے تم حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کرتے ہو لیکن اس دنیاوی مال پر ہی بھروسہ نہ رکھو بلکہ زیادہ توجہ اللہ تعالیٰ کی بخشش اور رحمت حاصل کرنے کی طرف کرو کیونکہ وہ زیادہ ہی بہتر ہے۔ (ماخوذ از کبیر بالوضاحت والتصرف ج۹ ص ۵۸،۵۹)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ O (آیۃ نمبر ۱۵۸)

(1) اور اگر تم مرو یا مارے جاؤ تو اللہ کی طرف اٹھنا ہے۔ (کنز الایمان)

(2) اور اگر تم مر جاؤ یا قتل کر دیے جاؤ تو اللہ کی طرف ہی تمہیں اٹھایا جانا ہے۔ (نجوم الفرقان)

مقام توجہ:

عام طور پر قرآن پاک کے نسخوں میں ﴿لَاۡاِلَى اللّٰهِ﴾ رسم الخط ہے۔ پھر بعض اوقات ﴿لَاۡ﴾ پر گول نشان لگا دیا جاتا ہے کہ یہ الف پڑھنے میں نہیں آ رہا، تفسیر کبیر کے متن میں، ﴿لَاۡاِلَى﴾ نہیں لکھا گیا، بلکہ صرف ﴿لِاِلَى﴾ لکھا گیا ہے، الف نہیں لکھا گیا۔ (راقم)

مختصر مطلب:

اس آیۂ کریمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے "ان ترکتم الجهاد واحترزتم عن القتل والموت بقيتم اياما قليلة فى الدنيا مع تلك اللذات الخسيسة ثم تتركونها لامحالة فتكون لذاتها لغيركم وتبعاتها عليكم" کہ اگر تم نے جہاد چھوڑ دیا اور تم نے اپنے گمان کے مطابق یہ سمجھا کہ تم نے اپنے آپ کو قتل ہونے اور مرنے سے بچا لیا حالانکہ حقیقت میں تمہاری موت کا وقت ہی نہیں آیا تھا، تو پھر بھی یہ یقین کر لو کہ تم نے دنیا میں تھوڑا وقت رہنا ہے اور یہ گھٹیا دنیاوی لذتیں تھوڑا عرصہ تمہیں حاصل رہیں گی، پھر یقیناً تم نے دنیا اور اس کی نعمتوں کو چھوڑ جانا ہے، اور تمہارے پیچھے آنے والوں کو وہ حاصل ہو جائیں گی،

"اما لو اعرضتم عن الذات الدنيا وطيباتها، وبذلتم النفس والمال للمولى يكون حشركم الى الله ووقوفكم على عتبة رحمة الله وتلذذكم بذكر الله"

اور اگر تم نے دنیا کی لذات کو چھوڑا اور دنیا کے رزق حلال کو بھی چھوڑ کر تم نے اپنے مال اور اپنی جانوں کو اللہ کی راہ میں قربان کر دیا تو تمہیں اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو گیا، اللہ کی رحمت کے دروازے کی دہلیز پر تمہیں کھڑا ہونا نصیب ہو گا، اور تمہیں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے لذت حاصل ہو گی۔ اب خود بخود سمجھ لیا جائے کہ دونوں مقامات میں کتنا بڑا فرق ہے۔ (ماخوذ از کبیر ج۹ ص۵۹)

چند دقائق:

(۱) یہاں ارشاد ہوا ﴿لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ﴾ اور یہ نہیں فرمایا ﴿تُحْشَرُوْنَ لَاِلَى اللّٰهِ﴾ اس لئے کہ

﴿لَاِلَی اللّٰہِ﴾ کو پہلے ذکر کرنے سے حصر کا فائدہ حاصل ہو رہا ہے، معنی یہ حاصل ہو گیا کہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہی تمہیں اٹھایا جاتا ہے، کسی اور کی طرف نہیں "وهذا يدل على انه لاحاكم فى ذلك اليوم ولاضار ولانافع الاهو" اور یہ دلالت کرتا ہے اس پر کہ قیامت کے دن کوئی اور حاکم نہیں ہوگا، کوئی ضرر دینے والا، کوئی نفع پہنچانے والا سوائے اللہ تعالیٰ کے نہیں ہوگا۔ خود رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی اسی پر دلالت کر رہا ہے۔ ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ (سورة المؤمن، آية نمبر ١٦) آج کس کی بادشاہی ہے؟ ایک اللہ سب پر غالب کی، (کنز الایمان)

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ﴾ اور امر اس دن اللہ ہی کیلئے ہے۔

(۲) اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنا اسم گرامی "اللہ" ذکر کیا "وهذاالاسم اعظم الاسماء" یہ اسم گرامی رب تعالیٰ کے باقی تمام ناموں سے بہت عظیم نام ہے۔ یہ کمال رحمت اور کمال قہر پر دلالت کر رہا ہے۔

"فهو لدلالته على كمال الرحمة اعظم انواع الوعد ولدلالته على كمال القهر اشد انواع الوعيد"

جب اس اسم گرامی کی دلالت رب تعالیٰ کی کمال رحمت پر ہے تو اس میں وعد کی بہت عظیم قسموں پر دلالت پائی گئی ہے اور کمال قہر پر دلالت کرنے کی وجہ سے اس میں رب کی تعالیٰ کی بہت شدید وعید کی قسموں کی دلالت بھی پائی گئی ہے۔

(۳) اس آیۃ کریمہ میں اسم "اللہ" پر لام تاکید کو داخل کیا گیا، ارشاد فرمایا ﴿لَاِلَی اللّٰہِ﴾ "وهذا ينبهك على ان الالهية تقتضى هذاالحشر والنشر" یہ اس پر متنبہ (خبردار) کر رہا ہے کہ رب تعالیٰ کی "الھیۃ" (اس کا معبود ہونا) اس حشر و نشر کا تقاضا کر رہا ہے۔ جس طرح رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى﴾ (سورۃ طہٰ، آیۃ نمبر ۱۵) بیشک قیامت آنی والی ہے قریب تھا کہ میں اسے سب سے چھپاؤں کہ ہر جان اپنی کوشش کا بدلہ پائے۔ (کنز الایمان)

(۴) ﴿تُحْشَرُوْنَ﴾ مضارع مجہول کا صیغہ ہے، جس میں فاعل صراحۃ (ظاہر طور پر) ذکر نہیں کیا گیا، جس سے یہ ثابت کیا گیا ہے "ان فاعل ذلك الحشر هو الله" اس حشر کا فاعل وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ ظاہر طور پر ذکر نہ کرنا ہی اس پر دلالت کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ عظیم اور کبیر ہے "شهدت العقول بانه هو الله الذى يبدئ ويعيد، جس کی عظمت اور کبریائی پر عقلیں شاہد ہیں کہ وہ اللہ ہی ہے جو پیدا کرتا ہے اور اسی نے پھر اپنی طرف لوٹانا ہے۔ اس مقام پر ﴿تُحْشَرُوْنَ﴾ کا فاعل ظاہر نہ ذکر کرنا اس کی عظمت پر دلالت کر رہا ہے۔ اس کی نظیر اس آیۃ کریمہ میں بھی پائی گئی ہے۔

﴿وَقِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ﴾ (سورۃ ھود، آیۃ نمبر ۴۴)

(اور حکم فرمایا گیا اے زمین اپنا پانی نگل لے) یہ حکم بھی صرف رب تعالیٰ ہی کا ہے جو اس کی عظمت پر دلالت کر رہا ہے۔

(۵) تمام کے اٹھائے جانے کو اٹھانے والے کی طرف منسوب کیا گیا، تو یقیناً وہ مخلوق سے تو نہیں، کوئی اور ہی ہے، وہ "اللہ" ہے۔ خود بخود عقل اس پر دلالت کر رہا ہے کہ تمام مخلوق رب تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں، اور اسی کی مشیت میں ہے، "فھم سواء کانوا احیاء وامواتا لایخرجون عن قھرالربوبیۃ و کبریاء الالھیۃ" اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے قہر اور اس کی الھیۃ کی کبریائی سے کوئی باہر نہیں، سب ہی زندہ اور مردہ اس میں برابر ہیں۔

(۶) ﴿تُحْشَرُوْنَ﴾ جمع کا صیغہ ہے، جس میں تمام کو خطاب کیا گیا ہے، یہ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ تمام جہان والوں کو اٹھایا جائے گا، میدان قیامت میں کھڑا کر دیا جائے گا، اور عدل وانصاف کیا جائے گا۔

فیجتمع المظلوم مع الظالم والمقتول مع القاتل والحق سبحانہ وتعالی یحکم بین عبیدہ بالعدل المبرأ عن الجور، کما قال ﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ اور ہم عدل کی ترازوئیں رکھیں گے قیامت کے دن' یہ جو اس آیۃ کریمہ کے چند دقائق وفوائد ذکر کئے ہیں یہ تو سمندر میں سے ایک قطرہ کی حیثیت رکھتے ہیں جو اس آیۃ کریمہ میں راز رکھے ہوئے ہیں۔

(کبیر ج۹ ص۶۰)

ہاں ہاں یہ تو قرآن پاک کی عظمت ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ میں اسرار وکمالات کے موجزن دریا موجود ہیں۔

فائدہ جلیلہ: اللہ تعالیٰ کے کلام میں کتنی حسین اور مفید ترتیب رکھی گئی ہے، جس کی مثال نہیں ملتی،

"فانہ قال فی الآیۃ الأولی ﴿لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ﴾ وھو اشارۃ الی من یعبدہ خوفا من عقابہ، ثم قال (ورحمۃ) وھو اشارۃ الی من یعبدہ لطلب ثوابہ، ثم قال فی خاتمۃ الآیۃ ﴿لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ﴾ وھو اشارۃ الی من یعبداللہ لمجرد الربوبیۃ والعبودیۃ"

اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے حضرات کی تین قسمیں ہیں۔ بعض وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈر کر اس کی عبادت کرتے ہیں، ان کا تذکرہ پہلی آیۃ ﴿لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (البتہ بخشش ہے اللہ کی طرف) میں کیا گیا ہے۔ اور وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی عبادت ثواب اور جنت حاصل کرنے کیلئے کرتے ہیں ان کا تذکرہ "ورحمۃ" میں کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو رحمت حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی عبادت اس کی ربوبیت کی وجہ سے کرتے ہیں کہ وہ معبود حقیقی ہے اور ہم اس کے بندے ہیں ہمیں اس کی عبادت سے اس کا تقرب حاصل ہو جائے، ان

کا تذکرہ ﴿ لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ﴾ میں کردیا گیا ہے کہ ''البتہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہی تمہیں اٹھایا جائے گا''

''وھذا اعلی المقامات وابعد النهايات فی العبودية فی علو الدرجة،الاترى انه لما شرف الملائكة قال ومن عنده لايستكبرون عن عبادته،وقال للمقربين من اهل الثواب عند مليک مقتدر''

جب عبادت صرف رب تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کیلئے ہو تو عابد کو اعلیٰ مقام حاصل ہوگا،عبودیت کی حد تک جو سب سے اعلیٰ درجہ ہے،اس تک وہ پہنچ جائے گا۔رب تعالیٰ نے جب اپنے فرشتوں کو ان کے ذکر سے مشرف فرمایا تو یوں'' ارشاد فرمایا:

''وَمَنْ عِنْدَهٗ لَايَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَايَسْتَحْسِرُوْنَ o يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَايَفْتُرُوْنَ o (سورة الانبياء آية ۱۹،۲۰)

اور اس کے پاس والے اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے اور نہ تھکیں،رات دن اس کی پاکی بولتے ہیں اور سستی نہیں کرتے۔ (کنز الایمان)

(**ومن عنده**) اس کے پاس والے'' یہ کون ہیں؟ ان کے متعلق صدر الافاضل حضرت مولنا نعیم الدین مراد آبادی رحمہ اللہ تفسیر خزائن العرفان میں فرماتے ہیں،یہ ''اس کے مقربین میں جنہیں اس کے کرم سے اس کے حضور قرب ومنزلت حاصل ہے۔اور رب تعالیٰ نے اپنے اہل ثواب مقربین کا ذکر یوں فرمایا''

﴿اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ o فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ o

بیشک پرہیزگار باغوں اور نہر میں ہیں،سچ کی مجلس میں عظیم قدرت والے بادشاہ کے حضور، (کنز الایمان،سورۃ القمر،آیہ نمبر ۵۴،۵۵)

یعنی جو عبادت صرف رب تعالیٰ کی رضاء کیلئے کرتے ہیں'' عذاب کے ڈر یا ثواب کی امید کیلئے نہیں کرتے،ان کو اپنے رب تعالیٰ کے ہاں قرب حاصل ہوتا ہے،وہ بادشاہ اور قدرت والا رب ہے۔

''فبين ان هؤلاء الذين بذلوا انفسهم وابدانهم فی طاعته ومجاهدة عدوه يكون حشرهم اليه واستئناسهم بكرمه وتمتعهم بشروق نور ربوبيته''

تو اسی سے واضح ہوگیا کہ بیشک وہ لوگ جنہوں نے اپنے نفسوں اور بدنوں کو صرف رب تعالیٰ کی طاعت کیلئے اور اس کے دشمن (نفس وشیطان) سے مقابلہ ومجاہدہ کیا،تو ان کا حشر رب تعالیٰ کی طرف ہی ہوتا ہے،اور ان کو اس کے کرم سے انس حاصل ہوتا ہے،اور انہیں نور ربانی سے منور ہونے کا نفع حاصل ہوتا ہے۔یہ مسئلہ بہت بڑی وسعت کا تقاضا کرتا ہے،لیکن مختصر طور پر اتنی مقدار ذکر کردیا جس سے بصیرت حاصل ہوجائے۔ (کبیر ج۹ ص۵۹)

اسی آیہ کی تشریح میں علامہ رازی رحمہ اللہ نے بغیر سند کے ایک روایت ذکر کی ہے "واللہ اعلم بالصواب"

یروی ان عیسی بن مریم صلوات الله علیه وسلامه مرباقوام نحفت ابدانهم واصفرت وجوههم ورأی علیهم آثار العبادة فقال ماذا تطلبون؟ فقالوا نخشی عذاب الله، فقال هو اکرم من ان لا یخلصکم من عذابه، ثم مربقوم آخرین فرأی علیهم تلک الآثار فسألهم فقالوا نطلب الجنة والرحمة، فقال هو اکرم من ان یمنعکم رحمته ثم مربقوم ثالث ورأی آثار العبودیة علیهم اکثر فسألهم فقالوا نعبده لأنه الهنا ونحن عبیده لا لرغبة ولا لرهبة، فقال انتم العبید المخلصون والمتعبدون المحقون'

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کچھ لوگوں سے گذر ہوا، دیکھا کہ ان کے بدن کمزور ہو چکے ہیں اور چہرے زرد ہو چکے ہیں، اور ان پر عبادت کے آثار نمایاں ہیں، آپ نے ان سے پوچھا، تم کیا چیز طلب کرر ہے ہو، انہوں نے کہا ہم اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرر ہے ہیں۔ یعنی اس کے عذاب سے بچنے کا مطالبہ کرر ہے ہیں آپ نے فرمایا وہ تو مکرم ذات ہے، ہو سکتا ہے تمہارا یہ مطالبہ نہ قبول فرمائے، پھر آپ کا کچھ اور لوگوں سے گذر ہوا، ان پر آثار عبادت کو دیکھ کر ان سے پوچھا، تم کس لئے عبادت کرر ہے ہو؟ کہنے لگے کہ ہم جنت اور رحمت طلب کرر ہے ہیں، آپ نے فرمایا کہ وہ مکرم ہے ہوسکتا ہے تمہیں جنت ورحمت نہ عطاء کرے۔ (آپ کا مطلب اصل میں یہ تھا کہ یہ ضروری نہیں کہ جو مطالبہ کیا جائے وہ مل بھی جائے، کبھی خلوص میں کمی ہوتی ہے، کبھی ریاء کاری دخل انداز ہوتی ہے، جس کی وجہ سے طلب کی ہوئی چیز نہ ملے، دعاء میں قبولیت کسی اور وجہ سے ہو جائے) پھر آپ کا گذر ایک اور قوم سے ہوا، ان پر آثار عبادت دیکھ کر ان سے پوچھا کہ تم عبادت کیوں کرر ہے ہو؟ انہوں نے کہا ہم اس کی عبادت اس لئے کرر ہے کہ وہ ہمارا الہ ہے، ہم اس کے بندے ہیں، ہم کسی چیز کی رغبت یا کسی چیز کے ڈر کی وجہ سے اس کی عبادت نہیں کرر ہے۔ تو آپ نے فرمایا تم اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے ہو، تم عبادت کا حق ادا کرر ہے ہو۔ (کبیر ج۹ص ۵۹)

طلباء کرام کے یاد کرنے کیلئے خوبصورت عبارت:

جس عبارت کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ عبارت تو علامہ اسمٰعیل حقی رحمہ اللہ کی ہے۔ البتہ اس کا مفہوم تفسیر کبیر سے ہی لیا ہے۔ اس لئے علامہ حقی رحمہ اللہ نے اس کا اعتراف کرتے ہوئے یوں بیان کیا،

قال الامام فی تفسیره "الانسان اذا توجه الی الجهاد اعرض قلبه عن الدنیا واقبل علی الآخرة فاذا مات فکانه تخلص من العدو ووصل الی المحبوب واذا جلس فی

بیته خائفا من الموت حریصا علی جمیع الدنیا فاذامات فکانه حجب عن المعشوق والقی فی دار الغربة ولاشک فی کمال سعادة الاول وکمال شقاوة الثانی" انتهی "فحشر الغافلین بالحجاب وحشر الواصلین باظهار الجناب فمن کان فی هذه الدنیا اعمی بحب المال والمنال کان فی الآخرة محجوبا عن مشاهدة الجمال" (روح البیان ج ۲ ص ۱۱۵)

انسان جب جہاد کی طرف متوجہ ہوتو اس کا دل دنیا سے اعراض کرلے، اور آخرت کی طرف متوجہ ہو جائے تو جب اس کی موت آئے گی تو دشمن سے اسے چھٹکارا حاصل ہوگا اور وہ اپنے محبوب حقیقی تک پہنچ جائے گا، یعنی اسے قرب الہی حاصل ہوگا، یقیناً اس میں اسے کامل سعادت حاصل ہوگی، اور اگر وہ موت سے ڈر کر گھر میں ہی بیٹھ رہا، اور دنیا کی زندگی اور دنیا کے مال ودولت پر حریص رہا تو جب اس کی موت آئے گی تو اپنے محبوب حقیقی سے دور ہوگا، اور گویا کہ اس نے اپنے آپ کو دارغربت میں ڈال دیا ہوگا، یہ اس کی بہت بڑی بدبختی ہوگی۔ لهذا پتہ چلا کہ واصلین کا حشر رب تعالی کا قرب ہوگا۔ اور غافلین جو کہ دنیا کے مال واسباب سے اندھادھند محبت کرتے رہے اور تقرب الہی حاصل کرنے میں ناکام رہے وہ آخرت میں رب کریم جو معبود حقیقی ہے اس کے جمال یعنی اس کے انوار کی تجلیات کے مشاہدہ سے دور رہیں گے۔

جاناز درتو دور نتوانم بود   قانع بہشت وحور نتوانم بود

اے محبوب حقیقی تیرے در سے دور میں نہیں ہوسکتا   میں بہشت وحور پر قناعت نہیں کرسکتا

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ٥ (آیۃ نمبر ۱۵۹)

(1) تو کیسی کچھ اللہ کی مہربانی ہے کہ اے محبوب تم ان کیلئے نرم دل ہوئے اور اگر تند مزاج سخت دل ہوتے تو وہ ضرور تمہارے گرد سے پریشان ہو جاتے تو تم انہیں معاف فرماؤ اور ان کی شفاعت کرو اور کاموں میں ان سے مشورہ لو اور جو کسی بات کو ارادہ پکا کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو بیشک توکل والے اللہ کو پیارے ہیں۔ (کنزالایمان)

(2) تو اللہ کی رحمت سے نرم ہوئے آپ ان کیلئے، اور اگر ہوتے آپ سخت مزاج، (اور) سخت دل البتہ ہٹ جاتے وہ آپ کے ارد گرد سے، تو آپ در گزر رکھیں ان سے، اور بخشش طلب کرو ان کیلئے، اور آپ مشورہ کر لیں ان سے کاموں میں، تو جب آپ پکا ارادہ کر لو تو توکل (بھروسہ) رکھو اللہ پر، بیشک اللہ محبت رکھتا ہے توکل رکھنے والوں سے۔ (نجوم الفرقان)

مختصر مطلب:

احد میں جب بعض صحابہ کرام سے درہ چھوڑنے کی اجتہادی خطاء ہوئی، اور کفار کے اچانک درہ سے حملہ کرنے کی صورت میں بعض صحابہ کرام جو پسپا ہو گئے تھے۔

"ثم عادوالم یخاطبھم الرسول اللہ ﷺ بالتغلیظ والتشدید وانما خاطبھم بالکلام اللین"

پھر جب وہ لوٹ کر آ گئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے سخت کلام نہیں فرمایا، ان پر شدید غصہ نہیں کیا، بلکہ ان سے نرم کلام فرمایا، رب تعالی نے اسی کی تعریف فرمائی کہ اللہ تعالی کی رحمت سے آپ ان پر نرم مزاج اور نرم دل واقع ہوئے، اگر آپ سخت مزاج ہوتے اور سخت دل ہوتے تو وہ آپ کو چھوڑ کر دور ہو جاتے، آپ کے پاس جمع نہ رہتے، پہلی آیات میں اللہ تعالی نے صحابہ کرام کے دنیا اور آخرت میں نفع کی راہنمائی فرمادی اس کی وجہ بھی حقیقت میں

نبی کریم ﷺ کا ان کو معاف کر دینا تھا، پھر اللہ تعالی نے نبی کریم ﷺ کو مزید ان سے درگزر جاری رکھنے کا حکم دیا، اور ان کیلئے بخشش طلب کرنے کا ارشاد فرمایا، صحابہ کرام کی مزید دل جوئی اور ان سے محبت قائم رکھنے کیلئے ان سے مشورہ کرنے کا حکم دیا، پھر ساتھ ہی حکم فرمایا کہ آپ جب کوئی کام کرنے کا پختہ ارادہ کرلیں تو پھر اللہ تعالی پر ہی کامل بھروسہ رکھو، جولوگ اللہ تعالی پر بھروسہ رکھتے ہیں اللہ تعالی ان سے محبت رکھتا ہے۔ (کبیر جلد ۹ صفحہ نمبر ۴۰، ۴۱ (مع وضاحت)

﴿فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ﴾ ''تو اللہ کی رحمت سے نرم ہوئے آپ ان کیلئے''

''فبما'' میں ''ما'' زائد ہے، جیسا کہ ''عما قلیل'' اور ''وجند ما ھنالک'' اور فبما نقضھم، مما خطایاھم'' میں ''ما'' زائد ہے، البتہ عرب حضرات بعض اوقات ''زائد لفظ کو تاکید کیلئے بھی استعمال کر لیتے ہیں اگر چہ وہاں تاکید کی اتنی ضرورت نہ بھی ہو، جیسا کہ اللہ تعالی کے ارشاد گرامی ﴿فَلَمَّاۤ اَنۡ جَآءَ الۡبَشِيۡرُ﴾ میں ''ان'' زائد ہے اور تاکید کیلئے استعمال ہے۔

''وقال المحققون دخول اللفظ المھمل الضائع فی کلام احکم الحاکمین غیر جائز، وھھنا یجوز ان تکون (ما) استفھاما للتعجب''

محققین حضرات کا قول یہ ہے کہ اللہ تعالی احکم الحاکمین کے کلام میں کسی لفظ کو مہمل، ضائع ماننا جائز نہیں، بہتر اور جائز صورت یہ ہے کہ ''ما'' استفہام تعجب کیلئے ہو، اسلئے کہ نبی کریم ﷺ نے جب صحابہ کرام کو پریشان کر دینے والی اجتہادی خطاء کر معاف کر دیا، کوئی سخت کلام نہیں فرمایا، ان کی کوئی سرزش نہیں کی تو ان کو بھی معلوم ہو گیا تھا ''ھذا لایاتی الا بتایید ربانی وتسدید الھی'' کہ یہ صرف تائید ربانی سے ہی حاصل ہوا، اور اسی نے اپنے محبوب ﷺ کو درست فیصلہ کرنے کی راہنمائی کی، یہ مقام تعجب تھا اس لئے ''فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ'' کا معنی یہ ہو گا ''فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ'' تعجب ہے اس پر کہ کتنی ہی اللہ کی رحمت ہے آپ پر جس کی وجہ سے آپ ان پر نرم دل ہو گئے، اس معنی کے متعلق علامہ رازی رحمہ اللہ نے فرمایا ''ھذا ھو الا صوب عندی'' یہ معنی میرے نزدیک بہت درست ہے۔ (کبیر جلد ۹ صفحہ نمبر ۶۲، ۶۳)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

''باء'' اور ''عن'' اور ''من'' اور ''کاف'' کے ساتھ اکثر طور پر ''ما'' زائد ہوتا ہے۔ (البحر المحیط جلد ۳ صفحہ نمبر ۱۴۰)

راقم کے نزدیک زائد تحسین کلام کیلئے یا تاکید کیلئے ہو تو وہ زائد ضائع نہیں، بلکہ مقصد کیلئے ہے۔

﴿وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ﴾

''اور اگر ہوتے آپ سخت مزاج اور سخت دل تو البتہ وہ آپ کے اردگرد سے ہٹ جاتے۔''

''بین تعالی ان ثمرة اللین هی المحبة والاجتماع علیه وان خلافها من الجفوة والخشونة مؤد الی التفرق''

اللہ تعالی کے ارشاد سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ نرم دل اور نرم مزاج ہونا محبت اور لوگوں کے اپنے ساتھ اجتماع کا ذریعہ ہے، اور اس کے خلاف سخت مزاجی اور سخت دلی محبت کے توڑنے اور جدا ہونے کا سبب ہے، مطلب تقریباً واضح ہوگیا کہ نبی کریم ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے یہ واضح کر دیا کہ اگر آپ صحابہ کرام کو ملامت کرتے، ڈانٹتے، جھڑکتے تو وہ بھی آپ کی مخالفت کرتے آپ سے دور بھاگتے اس کی وجہ یا ان کا ڈر ہوتا، یا حیاء کی وجہ سے آپ کے قریب نہ آتے، یہ کلمۂ اسلام میں بٹ جانے کا سبب بنتا، اس طرح اسلام کی بنیادیں ضعیف ہو جاتیں، اور دشمن دلیر ہو جاتے، لیکن آپ نے نرمی فرمائی، معاف کر دیا تو مسلمانوں میں اجتماعیت برقرار رہی، اور حقوق اللہ پر عمل قائم ودائم رہا، ان کو چھوڑنے کا کوئی ذریعہ نہ بنا۔ (البحر المحیط جلد ۳ صفحہ نمبر ۱۴۱)

''الفظ'' ''الغلیظ الجانب السیئ الخلق'' جس کا مزاج سخت ہو، یا بد مزاج ہو اس پر ''فظ'' کا اطلاق ہوتا ہے اصل میں ''فظظ'' ہے، پہلے ظاء کے نیچے زیر ہے، جیسے ''حذر'' ڈرنے والا اور ''فرق'' جدا ہونے والا اور ڈرنے والا، لیکن دو حرف ایک جنس کے ہوں تو ان میں ادغام ہوتا ہے، جیسے ''صب'' اصل میں ''صبب'' ہے اسی وجہ ''فظ'' اور ''صب'' ہوگیا ''لَانْفَضُّوْا'' اصل مادہ اس کا ''ف ض ض'' ہے، باب انفعال ہے، لام ابتدائیہ تاکید یہ استعمال ہے اصل میں ''فض'' کا معنی ہے متفرق ہو جانا، کہا جاتا ہے ''انفض القوم'' قوم متفرق ہوگئی۔

ارشاد باری تعالی ہے ﴿وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا﴾ اور جب انہوں نے کوئی تجارت یا کھیل دیکھا اس کی طرف چل دیئے اور تمہیں خطبے میں کھڑا چھوڑ گئے، یعنی اس آیۃ میں بھی ''اِنْفَضُّوْا'' قوم کا دوران خطبہ حضور ﷺ سے ہٹ جانا اور تجارتی وفد کی طرف چلے جانے کا ذکر ہے اس طرح کہا جاتا ہے ''فضضت الکتاب'' میں نے کتاب کھولی ''لا یفضض اللہ فاک'' اللہ تمہارے منہ کو نہ کھولے ''فظ'' اور ''غَلِيْظَ الْقَلْبِ'' میں فرق ''الفظ الذی یکون سیئی الخلق'' ''فظ'' کا معنی ہے بد خلق ہونا، تیز مزاج ہونا ''غَلِيْظَ الْقَلْبِ هو الذی لایتاثر قلبه عن شئی'' جس شخص کا دل کسی چیز کے اثر کو قبول نہ کرے اسے ''غَلِيْظَ الْقَلْبِ'' کہا جاتا ہے۔

خیال رہے کہ بعض اوقات انسان تیز مزاج نہیں ہوتا اور کسی کو ایذاء بھی نہیں دیتا لیکن وہ کسی پر رحم نہیں کرتا اور کسی پر نرم بھی نہیں ہوتا، اسی وجہ سے دونوں چیزوں کا ذکر کیا کہ نبی کریم ﷺ تند مزاج بھی نہیں تھے اور سخت دل بھی نہیں تھے بلکہ نرم دل تھے اور رحم فرمانے والے تھے۔ (ماخوذ از کبیر جلد۹ صفحہ نمبر ۶۳،۶۲)

نبی کریم ﷺ کی نرم دلی اور حسن اخلاق:

﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (سورۃ الحجر، آیۃ نمبر ۸۸)

''اور مسلمانوں کو اپنے رحمت کے پروں میں لے لو۔'' (کنز الایمان)

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ﴾ (سورۃ الاعراف، آیۃ نمبر ۱۹۹)

اے محبوب معاف کرنا اختیار کرو، اور بھلائی کا حکم دو، اور جاہلوں سے منہ پھیر لو۔ (کنز الایمان)

﴿اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ (سورۃ القلم، آیۃ نمبر ۴)

اور بیشک تمہاری خو بو بڑی شان کی ہے۔ (کنز الایمان)

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ (سورۃ التوبۃ، آیۃ نمبر ۱۲۸)

بے شک تمہارے پاس تشریف لائے تم میں سے وہ رسول جن پر تمہارا مشقت میں پڑنا گراں ہے، تمہاری بھلائی کے نہایت چاہنے والے مسلمانوں پر کمال مہربان۔ (کنز الایمان) (منقول از کبیر جلد۹ صفحہ۶۱)

❁ عن عطاء بن یسار قال لقیت عبداللہ بن عمرو بن العاص قلت اخبرنی عن صفة رسول اللہ ﷺ فی التوراة قال اجل واللہ انه لموصوف فی التورة ببعض صفته فی القرآن یاایھا النبی انا ارسلناک شاھدا ومبشرا ونذیرا وحرزا للامیین انت عبدی ورسولی سمیتک المتوکل لیس بفظ ولا غلیظ ولا سخاب فی الاسواق ولا یدفع بالسیئة السیئة ولکن یعفو ویغفر ولن یقبضه اللہ حتی یقیم به الملة العوجاء بان یقولوا لا اله الا اللہ ویفتح بھا اعینا عمیا وآذانا صما وقلوبا غلفا''
(رواه البخاری، مشکوة باب فضائل سید المرسلین)

عطاء بن یسار کہتے ہیں، میں نے عبداللہ بن عمرو بن العاص کو کہا کہ تم مجھے خبر دو رسول اللہ ﷺ کی کسی صفت کے متعلق جس کا ذکر توراۃ میں ہو، انہوں نے کہا ہاں (میں بتاتا ہوں) توراۃ میں آپ کی بعض وہ صفات بھی ذکر ہیں، جو قرآن پاک میں ہیں، یعنی قرآن پاک میں ہے ﴿یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّا اَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا

﴿وَنَذِيرًا﴾ اور یہ تمام صفات توراۃ میں بھی ہیں، کہ آپ کو رب نے فرمایا اے نبی ہم نے آپ کو بھیجا شاہد بنا کر اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا'' اور آپ کو امیین کا محافظ بنایا، اور رب تعالیٰ نے یوں فرمایا تو میرا بندہ ہے اور میرا رسول ہے، میں نے تمہارا نام متوکل رکھ دیا، آپ سخت مزاج نہیں، اور نہ ہی آپ سخت دل ہیں، اور نہ ہی آپ بازاروں میں چلانے والے ہیں، اور نہ ہی آپ برائی کو برائی سے دور کرنے والے ہیں، بلکہ معاف کر دیتے ہیں اور بخش دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کی روح کو اس وقت تک ہرگز قبض نہیں فرمائے گا یہاں تک کہ آپ کے ذریعے ٹیڑھی ملت کو درست کر دے، کہ وہ کہیں ''لا الہ الا اللہ'' اور آپ کے ذریعے اندھی آنکھوں کو کھول دیا جائے، اور بہروں کو کان عطاء کر دیئے جائیں، اور بندوں کو کھول دیا جائے۔

وضاحت حدیث:

اگر چہ حدیث پاک میں سے دولفظوں ''لیس بفظ و غلیظ'' کو ذکر کرنا مقصد تھا، لیکن طلباء کرام کے فائدہ کیلئے مکمل حدیث نقل کر دی اور تمام کی تشریح بھی کی جا رہی ہے، جب عطاء بن یسار نے حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص سے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ کے اوصاف توراۃ میں بھی ہیں؟ تو انہوں نے جواب میں ''اجل'' کہا پہلے دولفظوں پر زبر اور تیسرا حرف ساکن ہے، اس کا معنی ہے ''ہاں'' یعنی آپ کے اوصاف توراۃ میں بھی مذکور ہیں۔ ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا﴾ اے نبی ہم نے آپ کو شاہد بنا کر بھیجا ''شاھدا'' حال مقدرہ ہے فاعل سے یا مفعول سے، معنی یہ ہے کہ اے نبی آپ کو جن لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہے خواہ آ چکے ہیں یا ابھی انہوں نے آنا ہے آپ ان کی تصدیق و تکذیب پر شاہد ہیں

''مقبولا قولک عند الله لهم وعليهم كما يقبل الشاهد العدل فی الحكم''

اس حال میں کہ آپ کا قول اللہ تعالیٰ کے ہاں تصدیق کرنے والوں کیلئے جزاء خیر اور تکذیب کرنے والوں کیلئے عذاب میں مقبول ہوگا جیسا کہ عادل گواہ کا قول فیصلہ کرنے میں مقبول ہوتا ہے

''او شاهدا لافعال امتک يوم القيامة'' یا اس کا معنی یہ ہے کہ آپ کو قیامت کے دن آپ کی امت کے افعال پر گواہ بنایا جائے گا

''او لجميع الانبياء فی تبليغهم كما قال الله تعالى'' ﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَى هَؤُلَاءِ شَهِيدًا﴾ (سورة النساء آية نمبر ۴۱)

''یا اس کا معنی یہ ہے کہ آپ کو تمام انبیاء کرام کی تبلیغ پر شاہد بنایا جائے گا'' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا (ترجمہ) تو کیسی

ہوگی جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں اور اے محبوب تمہیں ان سب کو گواہ۔ (کنزالایمان)

"اومزکیا لأمتک فی شهادتهم علی الامم تبلیغ رسالة الانبیاء الیهم کما قال الله تعالی ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (سورة البقرة آیة نمبر ۱۴۳)

اور بات یوں ہی ہے کہ ہم نے تمہیں کیا سب امتوں میں افضل کہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ۔

یا آپ کو اپنی امت کا شاہد بنایا گیا، کہ آپ کی امت جب انبیاء کرام کی تبلیغ پر گواہی دے گی کہ اے اللہ یہ کافر جو انبیاء کرام کی تبلیغ کا انکار کر رہے ہیں جھوٹے ہیں، تو وہ کفار نبی کریم ﷺ کی امت پر اعتراض کریں گے کہ یہ گواہی کیسے دے رہے ہیں یہ تو بعد میں آئے ہیں، مؤمنین بتائیں گے کہ ہمیں تو ہمارے نبی کریم ﷺ نے بتایا ہے، تو اس وقت نبی کریم ﷺ اپنی امت کی سچائی کی گواہی دیں گے۔

"او معناه شاهدا لقدرتنا وارادتنا فی الخلق کمایشیر الیه قوله (ومبشرا) ای للمؤمنین بالثوبة (ونذیرا) ای منذرا ومحفوفا للکافرین بالعقوبة"

اور آپ کے شاہد ہونے کا اور مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ مخلوق میں وہ ہمارے قدرت اور ارادہ کی گواہی دیں گے، اسی کی طرف آنے والے الفاظ (مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا) اشارہ کر رہے ہیں کہ آپ مؤمنوں کو بشارت دیں گے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال پر ثواب دینے کا ارادہ رکھتا ہے اور وہ اس پر قادر بھی ہے، اور آپ کافروں کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرائیں گے کہ وہ تمہیں عذاب دینے کا ارادہ رکھتا ہے، تم اس کی پکڑ سے بچ نہیں سکو گے کہ وہ اس پر قادر ہے۔

تنبیہ: نبی کریم ﷺ کی گواہی میں جو احتمال بیان کئے گئے ہیں وہ تمام ہی آپ کو حاصل رہیں گے، اس لئے مرقاۃ میں ہے جہاں جہاں "او" آرہا ہے اسے "واؤ" کے معنی میں لیا جائے تو زیادہ مناسب ہے، اگرچہ میں نے معنی ظاہر کے مطابق "یا" کیا ہے لیکن پسند یہی ہے کہ معنی "اور" کیا جائے۔ (راقم)

حرزا للامیین: آپ امی لوگوں کیلئے محافظ ہیں "حرز" حاء کے نیچے زیر ہے اور راء ساکن ہے "امیین" سے مراد عرب لوگ ہیں "وانما وسمعوا امیین لأن اغلبهم لا یقرؤن ولا یکون" ان کو امی کہا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے زیادہ لوگ لکھتے، پڑھتے نہیں تھے "اولانهم ینسبون الی ام القری وهی مکة" یا ان کو امی اس وجہ سے کہا گیا کہ وہ مکہ مکرمہ کی طرف منسوب تھے "او یکون نبیهم امیا" یہ اس وجہ سے ان کو امی کہا گیا کہ ان کے نبی امی ہیں، اس وجہ کے متعلق علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں "ولعل هذاالوجه فی هذا المقام اوجه

لیشمل جمیع الامة" یہ وجہ سب سے بہتر ہے کہ یہ نبی کریم ﷺ کی تمام امت کو شامل ہے، یہاں سے یہود کا یہ دعوی بھی رد ہو جائے گا کہ آپ صرف عرب کے نبی ہیں، نبی کریم ﷺ کی رسالت عامہ کا ذکر رب قدوس نے یوں فرمایا۔

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ (سورة النساء آیة نمبر)

"اور نہیں بھیجا ہم نے آپکو مگر تمام لوگوں کی طرف خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا۔" اور نبی کریم ﷺ نے اپنی رسالت عامہ کا یوں ذکر فرمایا "قال ﷺ لو کان موسی حیا لماوسعه الا اتباعی " اگر موسی (علیہ السلام) زندہ ہوتے تو ان کو میری اتباع کے بغیر کوئی چارۂ کار نہ ہوتا۔ "قال ابن الملک ویجوز ان یکون المرادبالخرز حفظ قومه من عذاب الاستقبال" ابن الملک رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کی صفت "حرز" کا مطلب یہ بھی ہے کہ آپ کی وجہ سے اللہ تعالی نے آپ کی امت کو تباہ و برباد کر دینے کے عذاب سے بچایا ہوا ہے۔ "او الحفظ لهم من العذاب مادام فيهم" اور یہ بھی مراد ہے کہ آپ کیوجہ سے اللہ تعالی آپ کی امت کو عذاب سے اس وقت تک بچائے رکھتا ہے جب تک ان میں موجود ہیں۔ جیسا کہ رب تعالی نے ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ﴾ (الانفال آیة نمبر ۳۳)

اور نہیں کہ اللہ ان کو عذاب کرے جب تک اے محبوب آپ ان میں تشریف فرما ہیں۔

انت عبدی: توراۃ میں نبی کریم ﷺ کا اور وصف بیان کیا گیا "تم میرے عبد (بندۂ خاص) ہو یہ "عبد خاص" والا معنی اضافت سے سمجھ آیا، اور اضافت تشریفی ہے۔

ورسولی: اور آپ میرے خاص رسول ہیں، یہاں بھی اضافت تخصیص و تشریف پر دلالت کر رہی ہے جیسا کہ رب تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ﴾ (سورة الفتح، آیة نمبر ۲۸)

وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا۔ (کنز الایمان)

یعنی "رسولہ" میں بھی اضافت تشریفی ہے، مراد خاص رسول یعنی ہمارے نبی کریم ﷺ ہیں، طلباء کرام پر یہ بات مخفی نہیں کہ اضافت جب عہد کیلئے ہو تو مضاف خود بخود معین ہو جاتا ہے، اور خصوصی طور پر "اذا اطلق اسم الجنس فالمراد به الفرد الاکمل" جب اسم جنس کو مطلقا ذکر کیا جائے تو اس سے مراد فرد اکمل ہوتا ہے۔

سمیتک المتوکل: رب تعالی نے نبی کریم ﷺ کا وصف توراۃ میں بیان کیا "نام رکھا میں نے آپ کا متوکل۔

"ای خصصتک بهذا الوصف لکمال توکلک علی وتفویضک الی وتسلیمک لدی عملا بما فی القرآن" (وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ)(وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ)

یعنی میں نے آپ کو اس وصف سے خاص کر دیا ہے کہ آپ نے مجھ پر کامل بھروسہ کیا، اور تمام امور آپ نے میرے سپرد کیے، اور تمام کام آپ نے میرے ذمہ کر دیئے، اس کی وجہ یہی ہے کہ آپ نے قرآن پاک پر کامل عمل فرمایا، کیونکہ آپ کو حکم دیا گیا (اور آپ بھروسہ کریں اللہ پر) اور آپ کو حکم دیا گیا ﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ﴾ اور بھروسہ کریں اس پر جو زندہ ہے جس پر موت نہیں آئے گی، تو آپ نے ان ارشادات پر عمل کرتے ہوئے کامل بھروسہ اللہ تعالیٰ پر کیا تو رب تعالیٰ نے آپ کا نام "متوکل" رکھ دیا۔

لیس بفظ: والمعنی لیس بسئی الخلق او القول" معنی یہ ہے کہ آپ تند مزاج نہیں، آپ کے قول میں سختی نہیں۔

ولا غلیظ: "ای ضخم کریه المنظر او سیئ الفعل او غلیظ القلب وهو الاظهر لقوله تعالیٰ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ"

آپ میں بدنما موٹاپہ نہیں، آپ کے افعال برے نہیں، آپ کا دل سخت نہیں، اس معنی کو علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے زیادہ بہتر قرار دیا، کہ یہ معنی رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ﴾ کے مناسب ہے۔

"**ولا سخاب:** بتشد الخاء فی الاسواق" آپ بازاروں میں چلانے والے نہیں۔

"قال الطیبی ای هو لین الجانب تشریف النفس لا یرفع الصوت علی الناس لسوء خلقه ولا یکثر الصیاح علیهم فی السوق لدنائته بل یلین جانبه لهم ویرفق بهم"

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نرم مزاج ہیں، شریف النفس ہیں، اور آپ سخت مزاج نہیں کہ لوگوں پر آواز بلند کریں، اور آپ میں گھٹیا پن نہیں پایا گیا کہ آپ بازاروں میں چیخیں چلائیں بلکہ آپ نرم مزاج ہیں اور مہربانی فرمانے والے ہیں "ولا یدفع بالسیئة السیئة" اور آپ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے، حالانکہ برائی کا بدلہ برائی سے دینا جائز ہے، لیکن معاف کر دینا زیادہ ہی بہتر ہے۔ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ﴾ (سورة الشوریٰ، آیة نمبر ٤٠)

اور برائی کا بدلہ اسی کے برابر برائی ہے تو جس نے معاف کیا اور کام سنوارا تو اس کا اجر اللہ پر ہے۔ (کنز الایمان)

"اطلاق السیئة علی جزائها للمشاکلة" برائی کے بدلہ پر برائی کا اطلاق مشاکلت کیلئے ہے یا یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ بظاہر شکلاً بدلہ بھی برا نظر آتا ہو۔

"ولکن یعفو ای عن المسئی ویغفر ای یستر او یدعو له بالمغفرة لقوله تعالیٰ فاعف

عنهم و استغفر لهم"

لیکن آپ برائی سے درپیش آنے والوں کو معاف کر دیتے ہیں، اور ان کو بخش دیتے ہیں، یعنی ان کی پردہ پوشی فرماتے اور رب تعالی سے بھی ان کی بخشش کی دعاء کرتے ہیں، رب تعالی نے بھی آپ کو یہی ارشاد فرمایا ''آپ ان کو معاف کر دیں، اور ان کیلئے بخشش طلب کریں'' وهذا اقرب مراتب معاملته مع المسيئين'' نبی کریم ﷺ کا برائی سے درپیش آنے والوں کو معاف کر دینا یہ زیادہ قریب مرتبہ تھا، لیکن اس سے بھی بڑھ کر'' وكان قديقا بلهم بالاحسان'' نبی کریم ﷺ کا وصف یہ تھا کہ آپ برائی سے درپیش آنے والوں پر احسان بھی فرماتے تھے۔

ولن يقبضه الله حتى يقيم به الملة العوجاء بان يقولوا لااله الاالله"

اور آپ کا وصف یہ بیان کیا گیا کہ اللہ تعالی آپ کی روح کو قبض نہیں کرے گا یہاں تک کہ آپ کے ذریعے اللہ تعالی ٹیڑھی ملت کو سیدھا کر دے گا، کہ وہ کہیں گے ''لا الہ الا اللہ''

اس سے مراد ملت ابراہیمی ہے کہ ایام فترت میں اس پر عمل چھوڑ دیا گیا تھا کیونکہ اس میں کہیں زیادتیاں کر دی گئی تھیں، اور کہیں کمی کر دی گئی تھی'' حتى قام الرسول ﷺ فاقامها الله و ادامها'' یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو آپ کے ذریعے ملت ابراہیمی کو پھر قائم و دائم کر دیا گیا، اور آپ کے ذریعے پھر'' لا الہ الا اللہ'' کا دور شروع ہو گیا'' ويفتح بها اعينا عميا و آذانا صما وقلوبا غلفا'' اور اس کلمہ کے ذریعے دین کے اندھوں کو حق راہ دیکھنی نصیب ہو گئی، اور بہرے کانوں کو سننے کی طاقت مل گئی، اور جن دلوں پر پردہ چھایا ہوا تھا ان سے پردے ہٹ گئے۔

(مکمل تشریح حدیث ماخوذ از مرقاۃ جلد ۱۱ صفحہ نمبر ۵۳، ۵۴)

﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ﴾ ''تو آپ درگذر رکھیں ان سے۔''

جس آیۃ کریمہ کی وضاحت جاری ہے، اسی کا یہ حصہ بھی ہے، پہلے بیان فرمایا ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ﴾ جس کا مطلب بیان کیا جا چکا ہے کہ آپ نے احد میں صحابہ کرام کی اجتہادی خطاء کو معاف کر دیا وہ آپ کی نرم طبیعت، حسن اخلاق کا ذریعہ تھا، اب دوبارہ پھر ''فَاعْفُ عَنْهُمْ'' ارشاد فرمایا، اسی وجہ سے **راقم** نے ترجمہ کیا ہے'' تو آپ درگذر رکھیں ان سے'' یعنی جس طرح آپ نے پہلے ہی معاف فرما دیا ہے اسی طرح معافی کو ہمیشہ کیلئے جاری رکھئے، راقم کا ترجمہ تقریبا تفسیر ابی السعود کی اس عبارت میں دیکھئے۔

(فاعف عنهم) لترتيب العفو او الأمر به على ما قبله اى اذا كان الأمر كما ذكر فاعف عنهم فيما يتعلق بحقوقك كما عفا الله عنهم"

"فـاء" ترتیب کیلئے "عفـو" یا عفو کے امر کو ماقبل پر مرتب کیا، یعنی جب معاملہ اس طرح ہے جو ذکر کیا جاچکا ہے۔ یعنی آپ ان کیلئے نرم دلی کا مظاہرہ کر چکے ہیں، تو اس کے بعد بھی آپ کے اپنے حقوق جو ان پر ہیں ان میں بھی معافی جاری رکھیں اسی طرح جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا ہے۔

﴿وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ﴾ "اور بخشش طلب ان کیلئے"

"(وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ) الله فيما يتعلق بحقوقه تعالى اتماما للشفقة عليهم واكما لاللبر بهم"
اور آپ ان کیلئے حقوق اللہ کے ساتھ متعلق تمام چیزوں میں ان کیلئے بخشش طلب کریں کہ اے اللہ اگر ان سے حقوق اللہ میں کوئی کوتائی ہو جائے تو ان کو معاف فرمادے، آپ کی دعاء ان کیلئے کامل شفقت ہو گیا اور ان کیلئے آپ کی یہ دعاء مکمل ان پر احسان ہوگا۔ (تفسیر ابی السعود)

تنبیہ: بعض حضرات نے احد میں صحابہ کرام کے پسپا ہونے کو اجتہادی خطاء تک محدود کیا، بعض حضرات نے اجتہادی خطاء کو بھی صرف درے سے ہٹنے والوں پر محدود کیا ہے، اور بعض حضرات نے گناہ کبیرہ قرار دیا ہے، جن حضرات نے گناہ کبیرہ قرار دیا ہے، انہوں نے اس آیۃ کریمہ سے یہ دلیل پکڑی ہے۔

"في هذه الآية دلالة قوية على انه تعالى يعفو عن اصحاب الكبائر، وذلك لان الانهزام في وقت المحاربة كبيرة لقوله تعالى "وَمَنْ يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ" (الى قوله) فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِنَ اللهِ" فثبت ان انهزام اهل احد كان من الكبائر ثم انه تعالى نص في الآية المتقدمة على انه عفاعنهم وامر رسوله ﷺ في هذا الآية بالعفو عنهم ثم امره بالاستغفار لهم"

اس آیۃ کریمہ میں قوی دلالت اس پر پائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کبیرہ گناہ والے لوگوں کو بھی معاف فرمادیتا ہے، کیونکہ احد میں صحابہ کرام کا لڑائی سے پسپا ہونا گناہ کبیرہ تھا، اس پر دلیل ان حضرات نے قریب ہی آنے والی آیۃ ﴿وَمَنْ يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ﴾ سے پکڑی ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف فرمادیا، اور نبی کریم ﷺ کو بھی معاف کر دینے اور ان کیلئے بخشش طلب کرنے کا حکم دیا، خیال رہے کہ علامہ رازی رحمہ اللہ کا موقف بھی یہی ہے اسی لئے آخر میں ذکر کیا "وذلك من ادل الدلائل على ما ذكرنا" یہ دلیل ہماری بہت قوی دلیل ہے جو ہم نے احد سے پسپا ہونے والوں کو گناہ کبیرہ کا مرتکب قرار دیا ہے۔ (کبیر جلد ۹ صفحہ نمبر ۶۵)

اگر چہ **راقم** کا ذہن اسکے خلاف ہے جو سابقہ اوراق میں سمجھ آسکتا ہے، لیکن **راقم** سلف صالحین کی تحقیق

بحثوں پر بیخ پا بھی نہیں ہوتا، کہاں علامہ رازی رحمہ اللہ کہاں میرے جیسا ہیچمدان ناقل جو آپ کے ارشادات کو کما حقہ ادا بھی نہ کر سکے، اللہ تعالیٰ سلف صالحین کے خلاف لب کشائی سے محفوظ رکھے۔ (راقم)

فائدہ جلیلہ:

فدلت هذه الآية على انه تعالى يشفع محمدا ﷺ في الدنيا في حق اصحاب الكبائر فبان يشفعه في حقهم في القيامة كان أولى"

یہ آیۃ کریمہ اس پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو آپ کی امت کیلئے دنیا میں شفاعت کرنے والا بنایا، اسی لئے فرمایا "وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ" اور آپ ان کیلئے بخشش طلب کریں، تو اسی سے واضح ہو گیا کہ قیامت کے دن اور بھی زیادہ آپ کو شفاعت کا حق حاصل ہوگا۔ (ماخوذ از کبیر جلد ۹ صفحہ نمبر ۶۵)

ترتیب عجیب:

پہلے اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کرنے کا ذکر ان الفاظ مبارکہ سے ﴿وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ﴾ اور تحقیق اللہ نے ان کو معاف کر دیا، پھر نبی کریم ﷺ کو ان کیلئے بخشش طلب کرنے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا "وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ" ان کیلئے بخشش طلب کرو۔

كأنه قيل له يا محمد استغفر لهم فاني قد غفرت لهم قبل ان تستغفر لهم واعف عنهم فاني قد عفوت عنهم قبل عفوك عنهم" وهذا يدل على كمال رحمة الله لهذه الامة وثالثها قوله تعالى وشاورهم في الأمر"

گویا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا اے محمد ﷺ آپ ان کیلئے بخشش طلب کرو، بیشک میں نے ان کی بخشش آپ کی ان کیلئے بخشش طلب کرنے سے پہلے ہی کر دی، اور آپ ان کو معاف کر دو، میں نے ان کو آپ کے معاف کرنے سے پہلے ہی معاف کر دیا، اس کے بعد تیسرے مرتبہ میں مشورہ کرنے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ﴾ ان سے امور میں مشورہ کرو، مشورہ کرنے کے ذکر سے پہلے ایک اہم ذکر ضروری ہے۔ (ماخوذ از کبیر جلد ۹ صفحہ نمبر ۶۵)

نرمی کر کے حقوق اللہ کو ضائع کرنا جائز نہیں:

العين والرفق انما يجوز اذالم يفض الى اهمال حق من حقوق الله فاما اذا أدى الى ذلك لم يجز"

دین میں اس طرح نرمی کرنا حرام ہے جس سے اللہ تعالیٰ کے حقوق کو چھوڑنا لازم آئے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

﴿یَاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْکُفَّارَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ وَمَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمَصِیْرُ﴾

اے غیب بتانے والے (نبی) کافروں پر اور منافقوں پر جہاد کرو اور ان پر سختی فرماؤ اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے، اور کیا ہی برا انجام۔ (سورۃ التحریم، آیۃ نمبر ۹)

رب تعالیٰ نے اور ارشاد فرمایا:

﴿اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَاْخُذْکُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَلْیَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾

(سورۃ النور، آیۃ نمبر ۲)

جو عورت بدکار ہو اور جو مرد تو ان میں ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ اور تمہیں ان پر ترس نہ آئے اللہ کے دین میں اگر تم ایمان لاتے ہو اللہ اور پچھلے دن پر اور چاہیے کہ ان کو سزا کے وقت مسلمانوں کا ایک گروہ حاضر ہو۔

(منقول از کبیر جلد ۹ صفحہ نمبر ۶۴)

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ﴾ ''اور آپ مشورہ کریں ان سے کاموں میں۔''

''شَاوِرْهُمْ یشاور مشاروة شوارا'' اس کا معنیٰ ماخوذ ہے ''شرت العسل'' سے اس کا مطلب ہے میں نے شہد نکالا، اسی کے مطابق اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ ہے ''اور کاموں میں ان سے مشورہ لو'' اور کبھی اس کا معنیٰ لیا جاتا ہے ''شــرت الـدابة شــوارا'' جب تم چوپائے کو کسی جگہ پیش کرو، تو اس وقت کہا جاتا ہے ''کـانه بالعرض یعلم خیره وشره'' یعنی جب چوپائے کو کسی جگہ لے جاؤ (چرانے وغیرہ کیلئے) تو اس جگہ کا اچھا ہونا یا اچھا نہ ہونا پتہ چل جاتا ہے اسی طرح

''فکذلک بالمشاورة یعلم خیر الأمور وشرها''

مشورہ کرنے سے کاموں کی اچھائی اور برائی کا پتہ چلتا ہے۔

راقم نے اسی کے مناسب ترجمہ کیا ہے ''اور آپ مشورہ کریں ان سے کاموں میں۔

مشورہ نہ کرنے والے حاکم کو معزول کردیا جائے:

قـال ابن عـطیة والشـوری من قـواعد الشریعة وعزائم الا حکام من لایستبشر اهل العلم والدین فعزله واجب ،هذا مالا خلاف فیه''

ابن عطیہ رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ مشورہ کرنا شرعی قوانین سے ہے اور احکام میں پختہ ارادہ کرنے کا ذریعہ ہے جو شخص علماء اور دیندار لوگوں سے مشورہ نہیں کرتا ایسے شخص کو معزول کر دینا واجب ہے، اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں رب تعالی نے مومنین کی مدح اپنے اس قول سے فرمائی:

﴿وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾ (سورة الشورى آية نمبر ۳۸)

اور وہ جنہوں نے اپنے رب کا حکم مانا اور نماز قائم رکھی اور ان کا کام ان کے آپس کے مشورہ سے ہے، اور ہمارے دیئے سے کچھ ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

مشورہ کرنے کی اہمیت سورۃ پاک کے نام سے ہی سمجھ آ رہی ہے، کہ اس ایک مضمون کی وجہ سے پوری سورۃ کا نام ہی الشوری رکھ دیا گیا۔ (راقم)

ایک اعرابی کہہ رہا تھا "ما غبنت قط حتی یغبن قومی" مجھے غبن نہیں کیا جائے گا جب تک میری قوم کو غبن نہ کیا گیا، یعنی مجھے بھٹکایا نہیں جا سکے گا جب تک میری قوم نہ بھٹک گئی، اس اعرابی سے پوچھا گیا اس کی وجہ کیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا "قال لا افعل شیئا حتی اشاورھم" میں اس وقت تک کوئی کام نہیں کرتا یہاں تک کہ اپنی قوم سے میں مشورہ کر لیتا ہوں۔ (قرطبی جلد ۴ صفحہ نمبر ۲۵۰)

مشاورات کا عظیم قانون:

وقال ابن خویز منداد واجب علی الولاة مشاورة العلماء فیما لا یعلمون، وفیما اشکل علیهم من امور الدین، ووجوه الجیش فیما یتعلق بالحرب، ووجوه الناس فیما یتعلق بالمصالح، ووجوه الکتاب والوزراء والعمال فیما یتعلق بمصالح البلاد وعمارتها" (قرطبی جلد ۴ صفحہ نمبر ۲۵۰)

ابن خویز منداد رحمہ اللہ نے فرمایا حکام کو جب مسائل کا علم نہ ہو، اور دینی مسائل کو سمجھنے میں انہیں مشکل درپیش آ رہی ہو تو ان پر واجب ہو جاتا ہے کہ وہ علماء کرام سے مشورہ کریں، اور جنگی امور کا مشورہ جنگ کرنے کے ماہرین سے کریں، اور نیکی کے کاموں اور ملک کے بہتری کے کاموں میں ملک کے سرکردہ نیک قبائل کے سردار آدمیوں سے مشورہ کرلے، اور ملک کو سنوارنے اور اس کی تعمیر و ترقی میں نیک عقلمند محررین اور عقلمند اور نیک وزراء اور نیک اور عقلمند حکومت میں کام کرنے والے عہدہ داروں سے مشورہ کر لے، بہت بڑا قانون سمجھ آ گیا کہ ماہر تعلیم سے تعلیمی امور کا مشورہ کر

لے، لیکن وہ تعلیم جو دین سے برگشتہ نہ کرے، دین سے دور صرف انگلش کے دلدادہ لوگوں نے آج ملک کو تباہی کے کنارہ پر کھڑا کر دیا، دین سے ناواقف لوگ آج یوں کہہ رہے ہیں، ہنود، یہود، قادیانی وعیسائی اور مسلم، سب ہی تو ہیں آپس میں بھائی بھائی، کاش کہ یہ لوگ سمجھیں کہ نبی کریم ﷺ نے صرف ایمان لانے والے اپنے دو چچا حضرت حمزہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو اپنے قریب کیا اور باقی کفار چچاؤں میں سے کسی کو اپنے قریب نہیں کیا، ہاں ہاں بات صرف یہی ہے۔

لپٹا جو دامن مصطفیٰ سے وہ یگانہ ہو گیا　　　جس کے حضور ہو گئے اس کا زمانہ ہو گیا

آیئے دیکھئے اسی کا دوسرا رخ یہ ہے۔

جو تجھ سے یار پھرتے ہیں　　　وہ یوں ہی در بدر خوار پھرتے ہیں

غرضیکہ ہر ماہر فن سے اس کے نیک تجربہ کار سے مشورہ لے (راقم) اور مشورہ دینے والا بھی نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی "المستشار مؤتمن" (جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ امین ہے) کے مطابق مشورہ دینے کو امانت سمجھ کر اپنی سمجھ اور صوابدید کے مطابق ہی مشورہ دے "ماندم من استشار (رواہ الطبرانی) جس شخص نے مشورہ طلب کیا وہ اپنے فعل میں نادم (پشیمان) نہیں ہوتا، اور بیان کیا جاتا ہے "من اعجب برأیہ ضل" جس نے صرف اپنی رائے پر ہی تعجب کیا وہ بھٹک گیا

"قال العلماء وصفة المستشاران کان فی الاحکام ان یکون عالمادیّناو قلمایکون ذلک الا فی عاقل"

علماء نے بیان فرمایا کہ جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ عالم ہو اور دیندار ہو، یہ تب ہی ہو سکتا ہے جب وہ عقلمند ہو۔

"قال الحسن ما کمل دین امرئی مالم یکمل عقله" حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس وقت تک کسی انسان کا دین مکمل نہیں ہوتا جب تک اس کا عقل کامل نہ ہو۔　(قرطبی جلد ۴ صفحہ نمبر ۲۵۰)

مشورہ میں خطاء کے واقع ہونے پر کوئی پکڑ نہیں:

فاذا استشیر من هذا صفته واجتهد فی الصلاح وبذل جهده فوقعت الاشارة خطاء فلا غرامة علیه قاله الخطابی وغیره.

علامہ خطابی وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ جس سے مشورہ طلب کیا گیا اگر اس میں صفات مذکور پائی گئیں، اس نے مشورہ دینے میں پوری جد وجہد کی لیکن اس سے غلطی واقع ہو گئی تو اسے کسی قسم کا کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا۔

دنیاوی کاموں میں مشیر کیسا ہو؟

دنیاوی کام ہوں یا دینی ہوں جس سے مشورہ طلب کیا جائے اس کیلئے نیک ہونا دیندار ہونا ضروری ہے "وصفة المتشار فی امور الدنیا ان یکون عاقلا مجربا" دنیاوی کاموں کیلئے جس شخص سے مشورہ طلب کیا جائے اس کا عقلمند ہونا اور اس کام میں اسے تجربہ حاصل ہونا ضروری ہے جس کی کچھ مثالیں بیان کی جا چکی ہیں "وقال بعضهم شاور من جرب الامور فانه یعطیک من رأیه ما وقع علیه غالبا و انت تأخذه مجانا" بعض حضرات نے بیان کیا ہے جن کاموں کا کسی کو تجربہ ہو اسی سے مشورہ لیا جائے، اسلئے کہ وہ اپنے تجربات سے تمہیں اچھی رائے دے گا اور تم اس سے مفت ہی اس کی اچھی رائے سے فائدہ حاصل کرلو گے "شاور صدیقک فی الخفی المشکل واقبل نصیحتناصح مخضل" اگر کسی کام میں خفاء پائی جائے یا تمہیں مشکل درپیش آئے تو اپنے دوست سے مشورہ کرلو اور فضیلت رکھنے والے صاحب کی نصیحت کو قبول کرلو

"وان باب امر علیک التوی فشاور لبیبا ولا تعصه"

اگر کسی کام کا دروازہ تم پر اٹک جائے، تو عقلمند شخص سے مشورہ کرو اور اس کی نافرمانی نہ کرو۔ (ماخوذ از قرطبی جلد صفحہ نمبر ۲۵۱)

مشاورات میں عظیم برکت ہے:

- قال ﷺ ماندم من استشار ولا خاب من استخار" نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس نے مشورہ کیا وہ پشیمان نہیں ہوا، اور جس نے استخارہ کیا وہ رسوا نہیں ہوا۔
- وروی سهل بن سعد الساعدی عن رسول الله ﷺ ما شقی قط عبد بمشورة وما سعد باستغناء رأی"
  سہل بن ساعدی ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مشورہ کرنے والا شخص بد بخت نہیں ہوتا، اور اپنی رائے سے عمل کرنے والا (مشورہ نہ کرنے والا) نیک بخت نہیں ہوتا۔
- وقد جعل عمر بن الخطاب ؓ الخلافة وهی اعظم النوازل شوری"
  حضرت عمر ؓ کے کارناموں سے عظیم کارنامہ یہ ہے کہ اپنی شہادت سے پہلے شدید زخمی حالت میں مشاورتی کمیٹی قائم کردی کہ یہ خلافت کا معاملہ آپ لوگ باہمی مشورہ سے طے کرلو، اس مشاورتی کمیٹی میں آپ نے اپنے بیٹے کو نہیں رکھا تا کہ یہ سلسلہ موروثی نہ ہو جائے، بادشاہت قائم نہ ہو جائے۔
- قال البخاری وکانت الائمة بعد النبی یستشیرون الأمنا من اهل العلم فی الامور

المباحة لیاخذوا باسهلها"
بخاری رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ائمہ کرام حکام، خلفاء کرام مباح کاموں میں امین علماء کرام سے مشورہ کرتے تھے تا کہ آسان پر عمل کریں اور مشکل کو چھوڑ دیں۔

❁ وقال سفیان الثوری لیکن اهل مشورتک اهل التقوی والامانة ومن یخشی الله تعالیٰ"
حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ نے فرمایا تم اپنے مشورہ کیلئے متقی، پرہیز گار، امانت دار اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کا انتخاب کرو۔

❁ وقال الحسن والله ما تشاور قوم بینهم الا هداهم لأفضل ما یحضربهم"
حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں قسم ہے اللہ تعالیٰ کی کہ مشورہ کرنے والی قوم کو اللہ تعالیٰ نے ضرور ہدایت سے نوازا مشورہ کرنے سے ان کی رائے سے زیادہ فضیلت والا کام کرنے کی توفیق حاصل ہوئی۔

❁ روی عن علی بن ابی طالب ﷺ قال قال رسول الله ﷺ ما من قوم کانت لهم مشورة فحضر معهم عن اسمه احمد او محمد فادخلوه فی مشورتهم الاخیر لهم"
حضرت علی بن طالب ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب بھی کوئی قوم مشورہ کیلئے جمع ہوں تو اس میں ان لوگوں کو ضرور شامل کر لیا کرو جن کے ناموں میں محمد، احمد آئے تو اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اس مشورہ میں ضرور ہی خیر و برکت عطاء فرمائے گا۔ (ماخوذ از قرطبی جلد ۴ صفحہ نمبر ۲۵۱)

نبی کریم ﷺ کو مشورہ کرنے کا حکم دینے میں حکمت:

اگر چہ اس میں کئی حکمتیں پائی گئی ہیں، لیکن ان میں سے عظیم حکمت یہ ہے۔

(۱) قال الحسن وسفیان بن عینة انما امر بذلک لیقتدی به وغیره فی المشاورة ویصیر سنة فی امة"
ان تمام وجوہ سے راقم کو یہ وجہ عظیم نظر آئی جو حضرت حسن بصری اور سفیان بن عیینہ رضی اللہ عنہما نے ذکر فرمائی کہ آپ کو صحابہ کرام سے مشورہ کرنے کا حکم دیا کہ آپ کی اقتداء اور لوگ بھی کریں، اور آپ کی امت کیلئے مشورہ کرنا سنت بن جائے، یعنی آپ کو مشورہ کرنے کا حکم تعلیم امت کیلئے تھا۔

(۲) ان مشاورة الرسول ﷺ ایاهم توجب علو شانهم ورفعة درجتهم وذلک یقتضی شدة محبتهم له وخلوصهم فی طاعتهم"
نبی کریم ﷺ کو صحابہ کرام سے مشورہ کرنے کا حکم دے کر یہ واضح کر دیا کہ صحابہ کرام کو عظمت شان حاصل

ہے ان کے درجات میں بلندی پائی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کو نبی کریم ﷺ سے شدید محبت حاصل تھی، اور وہ آپ کی فرمانبرداری بہت خلوص و محبت سے کرتے تھے۔

(۳) نبی کریم ﷺ کو سب لوگوں سے کامل عقل حاصل تھی، مگر یہ کہ مخلوق کے علوم متناہی ہیں، ہوسکتا ہے کہ آپ کو امت کے فائدے کیلئے یہ حکم دیا گیا تھا کہ جب آپ کو اعلیٰ عقل حاصل ہے تو جن سے مشاورت کا حکم دیا گیا ہے ہوسکتا ہے کسی کو زیادہ تجربہ ہو، وہ اس تجربہ کی وجہ سے جو رائے دے اس میں دوسروں کا فائدہ ہو، تو آپ بھی بہتر سمجھیں تو تجربہ کار کی رائے کو تسلیم کرلیں۔

(۴) نبی کریم ﷺ نے غزوہ احد کا مشورہ کیا تو نوجوان صحابہ کرام اور شہادت سے سرشار حضرات نے میدان جنگ میں نکلنے کا مشورہ دیا، خود نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ میں رہ کر دفاعی جنگ کرنا چاہتے تھے "فلما خرج وقع ما وقع" جب آپ صحابہ کرام کے مشورہ سے میدان جنگ میں تشریف لے گئے وہاں نبی کریم ﷺ کا زخمی ہونا، ستر صحابہ کرام کا شہید ہونا، اور بہت صحابہ کرام کا زخمی ہونا جیسے واقعات درپیش آگئے، تو اس کے بعد اگر آپ صحابہ کرام سے مشورہ چھوڑ دیتے تو ان کے دلوں میں یہ بات آتی کہ غزوہ احد میں جو ہم نے مشورہ دیا تھا وہ نبی کریم ﷺ کی رائے کے خلاف تھا، اسی وجہ سے آپ نے ہم سے مشورہ کرنا چھوڑ دیا، اس طرح ان کے دل پریشان ہوئے۔

"فامره الله تعالى بعد تلك الواقعة بان يشاورهم ليدل على انه لم يبق في قلبه اثر من تلك الواقعة"

تو اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کے بعد نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ آپ اپنے صحابہ کرام سے مشورہ جاری رکھیں تا کہ ان کے دل سے یہ اثر ختم ہوجائے کہ شائد آپ ان سے اس کے بعد کبھی مشورہ نہیں کریں گے۔

(۵) "وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ" لا لتستفيد منهم رأيا وعلما لكن لكي تعلم مقادير عقولهم وافهامهم ومقادير حبهم لك واخلاصهم في طاعتك فحينئذ يتميز عندك الفاضل من المفضول فبين لهم على قدر منازلهم"

نبی کریم ﷺ کو جو مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ان کی رائے اور علم سے فائدہ حاصل کرنے کے محتاج تھے، بلکہ آپ کو اس لئے حکم دیا گیا کہ آپ اپنے صحابہ کرام کی عقلوں اور سمجھوں کا اندازہ کریں وہ بھی ایک دوسرے کی عقل و فہم کا اندازہ کرلیں، پھر آپ یہ بھی دیکھیں کہ وہ آپ سے کتنی قدر محبت کرتے ہیں، اور آپ کی اطاعت میں کتنے مخلص ہیں، اس طرح صحابہ کرام کے مدارج و مراتب واضح ہوجائیں گے کہ زیادہ مرتبہ والا کون ہے اور کم مرتبہ والا کون ہے۔

(۶) وشاورهم في الامر لا لأنك محتاج اليهم ولكن لأجل انك اذا شاورتهم في الأمر

اجتهد كل واحد منهم فی استخراج الوجه الا صلح فی تلک الواقعة فتصير الارواح متطابقة متوافقة علی تحصيل اصلح الوجوه فيها وتطابق الارواح الظاهرة علی الشئی الواحد مما يعين علی حصوله وهذا هوالسر عند الاجتماع فی الصلوات وهو السر فی ان صلوة الجماعة افضل من صلوة المنفرد"

آپ کو مشورہ دینے کا حکم اس لئے نہیں دیا گیا کہ آپ کو ان کے مشورہ کی کوئی محتاجی تھی، بلکہ وجہ یہ تھی کہ آپ جب ان سے مشورہ طلب کرو گے تو ہر ایک اپنی رائے پیش کرنے میں مکمل اجتہاد کرے گا، پوری کوشش سے اس کام کیلئے بہتر رائے دے گا، اس طرح تمام روحوں، تمام شخصوں کا ایک کام کرنے میں اتفاق ہو جائے گا، جب نیک روحیں ایک کام میں متفق ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان نیک لوگوں کے اتفاق کی وجہ سے اس کام میں خیر و برکت حاصل ہو گی، یہی راز پایا گیا ہے اس میں کہ نمازوں کو سب مجتمع ہو کر ادا کرو، اور یہی راز یہی فائدہ اس سے حاصل ہوا کہ اکیلے نماز ادا کرنے سے جماعت سے نماز ادا کرنا زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔

(۷) لما امر الله محمدا عليه السلام بمشاورتهم دل ذلک علی ان لهم عند الله قدرا وقيمة فهذايفيدان لهم قدراعندالله وقدراعندالرسول وقدراعندالخلق"

جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ آپ اپنے صحابہ کرام سے مشورہ کریں تو اسی سے پتہ چل گیا کہ صحابہ کرام کو اللہ تعالیٰ کے ہاں خصوصی قدر و منزلت پائی جاتی ہے، اور اسی سے یہ عظیم فائدہ حاصل ہو گیا کہ جن کی قدر و منزلت اللہ تعالیٰ کے حضور ہے، ان کو رسول اللہ ﷺ کے ہاں بھی خصوصی قدر و منزلت حاصل ہے ان کی قدر و منزلت مخلوق کے دلوں میں بھی راسخ ہو چکی ہے۔

راقم کہتا ہے اے طلباء کرام! "الـخـلـق" پر الف لام عہد خارجی ہے، جس سے مراد نیک مخلوق، علم والی مخلوق، طاہر روح والی مخلوق، پاک اصل مخلوق ہے۔ بدطینت، جہلاء مراد نہیں، اے بد بخت انسان! خدارا خدا اور رسول سے مقابلہ کر کے اپنی عاقبت برباد نہ کر، صحابہ کرام کی گستاخی سے اپنی قبر انگاروں سے نہ بھر۔

(۸) عظیم بادشاہ بڑے بڑے اہم کاموں میں مشورہ صرف اپنے خواص اور مقربین سے کرتا ہے، صحابہ کرام سے اگرچہ اجتہادی خطاء ہوئی، وقتی طور پر پسپا بھی ہوئے لیکن جب انہوں نے رب تعالیٰ کی طرف رجوع کیا تو رب تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا، معاف کرنے کے بعد یہ بات ان کے دلوں میں آ سکتی تھی کہ اگرچہ ہمیں معاف تو کر دیا گیا ہے لیکن ہمارا وہ مرتبہ اور درجات پہلے حاصل تھے، وہ تمام ختم ہو چکے ہوں گے، تو رب تعالیٰ نے ان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ میں نے تمہیں معاف کر دیا کیونکہ تم نے میری طرف رجوع کر لیا تو تمہارے مراتب کم نہیں کئے بلکہ اور زیادہ کر دیئے ہیں۔

"وذلک ان قبل هذه الواقعة ماامرت رسولی بمشاورتکم وبعد هذا الواقعة امرته بمشاورتکم لتعلموا الکم الآن اعظم حالا مما کنتم قبل ذلک والسبب فیه الکم قبل هذه الواقعة کنتم تعولون علی اعمالکم وطاعتکم والآن تعولون علی فضلی وعفوی فیجب ان تصیر درجتکم ومنزلتکم الآن اعظم مما کان قبل ذلک لتعلموا ان عفوی اعظم من عملکم و کرمی اکثر من طاعتکم"

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس واقعہ سے پہلے میں نے اپنے رسول (ﷺ) کو تمہارے ساتھ مشورہ کرنے کا حکم نہیں دیا تھا لیکن اس واقعہ کے بعد آپ کو تمہارے ساتھ مشورہ کرنے کا حکم دے دیا ہے، تا کہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ اب تمہارا حال اور مرتبہ پہلے سے بڑھ گیا ہے، کیونکہ پہلے تم اپنے اعمال اور اپنی طاعت پر اعتماد کرتے تھے، اب تمہیں میرے فضل اور میرے معاف کرنے پر اعتماد ہو گیا ہے، جس کی وجہ سے اب تمہارے درجات اور مراتب پہلے سے بڑھ چکے ہیں، تمہیں یقین آنا چاہیے کہ میرا معاف کرنا تمہارے اعمال سے بہت عظیم ہے، اور میرا اکرم تمہاری طاعت سے زیادہ ہے۔
(ماخوذ از کبیر جلد ۹ صفحہ نمبر ۶۷)

نبی کریم ﷺ کو امت سے مشاورت کب منع تھی؟

اتفقوا علی ان کل مانزل فیه وحی من عندالله لم یجز للرسول ان یشاور فیه الامة لأنه اذا جاء النص بطل الرأی و القیاس"

اس مسئلہ میں اہل علم کا اتفاق ہے، کسی کا کوئی اختلاف نہیں کہ جن احکام کو وحی کے ذریعے بیان فرما دیا ان میں رسول اللہ ﷺ کو امت کے حضرات سے مشورہ کرنا جائز نہیں تھا، کیونکہ نص (وحی کے ذریعے حکم قرآنی) کے آجانے کے بعد رائے، قیاس مشاورت باطل ہو جاتے ہیں۔ (کبیر جلد ۹ صفحہ نمبر ۶۷)

مقام توجہ: اس حکم سے پہلے بدر میں نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا، یقیناً وہ مشورہ بھی رب تعالیٰ کے مرضی کے مطابق ہی تھا، کیونکہ ﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْىٌ يُّوْحٰى﴾ کا وصف آپ کو حاصل تھا، خندق میں غطفان قبیلے سے صلح نہ کرنے کا مشورہ سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما کا نبی کریم ﷺ کا قبول فرمایا ﴿فَاعْتَبِرُوْا يَآ اُولِى الْاَبْصَارِ﴾ ارشاد باری تعالیٰ، قیاس کرنے کا حکم دیتا ہے "و کان علیه الصلوة والسلام اولی الابصار" جب نبی کریم ﷺ بصیرت رکھنے والوں کے سردار ہیں تو یہ حکم آپ کیلئے بھی تھا، پھر استنباط کرنے والوں کی شان رب تعالیٰ نے بیان فرمائی۔

﴿لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ﴾ وکان اکثر الناس عقلا و ذکاء وهذا یدل علی انه

کان ماموزا بالاجتهاد اذا لم ینزل علیه الوحی"

نبی کریم ﷺ سب لوگوں سے جب زیادہ عقلمند اور ذکی وذہین تھے تو یقیناً آپ کو بھی قیاس، استنباط واجتہاد کرنے کا حکم تھا، البتہ شرط یہی تھی کہ اس میں وحی نازل نہ ہوئی ہو، وحی کے نازل ہونے کے بعد قیاس یا مشاورت جائز نہیں تھا۔ (ماخوذ از کبیر جلد ۹ صفحہ نمبر ۶۷)

علماء کرام اور طلباء کرام کیلئے لمحہ فکریہ:

قوله تعالی (وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ) يدل على وجوب استعمال اللين والرفق وترك الفظاظة والغلظة في الدعاء الى الله تعالى كما قال الله تعالى (ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ) وقوله تعالى لموسى وهارون "فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا" "لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ"

رب تعالی کا ارشاد گرامی: ﴿وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ﴾ (اگر آپ سخت مزاج اور سخت دل ہوتے تو وہ آپ کے اردگرد سے ہٹ جاتے) اس پر دلالت کررہا ہے کہ اللہ تعالی کے دین کی طرف جب کسی کو بلایا جائے تو اس شخص کیلئے واجب ہے کہ وہ نرم لہجہ، نرم رویہ، نرم طبیعت رکھتے ہوئے دعوت دین اسلام دیں، سخت مزاجی، سخت دلی کو چھوڑ دیں، اللہ تعالی نے خود ہی اپنی راہ کی طرف بلانے کا طریقہ بتادیا، (ترجمہ) اپنے رب کی راہ کی طرف بلاؤ پکی تدبیر اور اچھی نصیحت سے اور ان سے اس طریقہ پر بحث کرو جو سب سے بہتر ہو اور رب تعالی نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرمایا (ترجمہ) تو اس سے نرم بات کہنا اس امید پر کہ وہ دھیان کرے یا کچھ ڈرے۔

جب رب تعالی نے دین اسلام کی تبلیغ کو نرمی اور اچھی نصیحت سے مشروط کردیا ہے تو آئے دن مسائل میں جنگ وجدال کیوں؟ غلیظ زبانوں کا استعمال کیوں؟ جہلاء سے تقاریر کرانے کا رواج کیوں؟ (احکام القرآن للجصاص جلد ۲ صفحہ نمبر ۴۰)

علماء کرام! خدارا سوچئے تمہیں خریدنے والے یہود ونصاری کے ایجنٹ ہیں، جو تمہیں لڑا رہے ہیں، وہ عقلمند ہیں جو اپنے مقاصد حاصل کررہے ہیں، مجھے معاف کرتے ہوئے یوں کہنے دیجئے کہ بے وقوف وہی علماء وطلباء ہیں جو اغیار کے ہاتھوں کھلونا بنے ہوئے ہیں، ان کے ہاتھوں بک رہے ہیں جو ان کے بک بک کا ذریعہ بن رہا ہے، معمولی بات پر پورے پاکستان کے درودیوار چاکنگ کرکے علماء کو لڑا کر قتل کرنے کا بہانہ بنایا جاتا ہے، علماء علماء کو نہیں قتل کررہے بلکہ یہودیوں کے آلہ کار قتل کرکے ایک فرقہ کے مقتولوں کو دوسرے فرقہ کے ذمہ ڈال دیتے ہیں حالانکہ قاتل وہ خود ہوتے ہیں، علماء کرام اور طلباء کرام کی خدمت میں بصد ادب واحترام عرض ہے سمجھئے خدارا سمجھئے، اگر نہ سمجھے تو نیست

ونابود ہو جاؤ گے، قادیانیت چھاجائیگی، قادیانی دندنارہے ہیں۔ (راقم)

مسئلہ عظیمہ:

فجائز حینئذ ان توافق آراؤھم رأی النبی وجائز ان یوافق رأی بعضھم رأیہ وجائز ان یخالف رأی جمیعھم فیعمل ﷺ حینئذ برأیہ یکون فیہ دلالۃ علی انھم لم یکونوا معتقین فی اجتھادھم بل کانوا مأمورین فیہ لفعلھم ما امروا بہ ویکون علیھم حینئذ ترک آرائھم واتباع رأی النبی ﷺ"

نبی کریم ﷺ جب صحابہ کرام سے مشورہ کرلیں تو ہوسکتا ہے کہ اس میں تمام صحابہ کرام کی بھی وہی رائے ہو اور بعض کی رائے آپ کی رائے کے موافق ہو، اور یہ احتمال بھی تھا کہ بعض کی رائے آپ کی رائے کے مخالف ہو اور بعض کی رائے آپ کی رائے کے موافق ہو، اور یہ احتمال بھی تھا کہ تمام کی رائے آپ کی رائے کے مخالف ہو، ان تمام صورتوں میں نبی کریم ﷺ کی رائے پر عمل کرنا ہی ضروری تھا، آپ کی رائے کو تائید ربانی حاصل تھی، صحابہ کرام اپنی رائے اور اجتہاد میں مکمل آزاد نہیں تھے، ان سے مشورہ کرنا اور ان کا اجتہاد کرنا ان کے اجر و ثواب کیلئے تھا، اسی لئے صحابہ کرام کیلئے ضروری تھا کہ وہ اپنی آراء کو چھوڑ دیں اور نبی کریم ﷺ کی رائے کا احترام کریں اور اسی کی تابعداری کریں۔

(احکام القرآن للجصاص صفحہ نمبر ۴۱، جلد ۲)

دو حدیثوں میں تطبیق:

اخرجہ الامام احمد من قولہ ﷺ للعمرین رضی اللہ عنھما لو اجتمعتما علی مشورۃ ما خالفتکما"

نبی کریم ﷺ نے حضرت عمر اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو فرمایا اگر تم کسی مشورہ پر متفق ہو جاؤ تو میں اس کی مخالفت نہیں کروں گا۔

"واخرجہ ابن عدی والبیھقی من قولہ علیہ الصلوۃ والسلام عند نزول الآیۃ" اما ان اللہ ورسولہ یغنیان عنھا ولکن جعلھا اللہ تعالی رحمۃ لامتی"

جب اس آیۃ کریمہ میں نبی کریم ﷺ کو حکم دیا گیا ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ (آپ ان سے مشورہ کرو کاموں میں) تو اس کے نازل ہونے پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا "خبردار اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ دونوں ہی لوگوں سے مشاورت سے مستغنی ہیں، وہ محتاج نہیں، لیکن اللہ تعالی نے میری امت پر رحمت فرمائی کہ ان سے مشورہ کرنے کا

حکم دیا۔ بظاہران دونوں حدیثوں میں تعارض نظر آتا ہے کیونکہ پہلی حدیث پاک سے یہ سمجھ آرہا ہے کہ جب کسی مسئلہ میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما متفق ہوجائیں تو نبی کریم ﷺ اس مشورہ کو ضرور مانتے، دوسری حدیث سے سمجھ آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کسی کے مشورہ کے نہ محتاج تھے اور نہ پابند تھے، ان میں تطبیق یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اگرچہ کسی کے مشورہ کو قبول کرنے کے پابند نہ تھے، لیکن

"یحمل خبر عدم مخالفتهما لو اجتمعا علی الاشارة الی رفعة قدرهما و علو شانهما وان اجتماعهما علی امر لایکون الاموافقا لما عندالله تعالی وهو الذی علیه المعول وبه العمل"

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی قدر و منزلت کی بلندی اور رفعت شان کا یہ عالم تھا کہ اگر وہ کسی کام پر اتفاقی رائے قائم کر لیتے تو وہ اللہ تعالی کے ہاں مقبول ہوتا، اسی پر اعتماد کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے ان کے اتفاقی فیصلے کو قبول کیا، اور کبھی مخالفت نہیں کی۔ (ماخوذ از روح المعانی جلد ۳ صفحہ نمبر ۱۰۷)

خیال رہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے اجتماعی مشورے کو قبول کرنا غزوۂ احد میں واقع نہیں ہوا، یہی رائے علامہ رازی رحمہ اللہ نے کبیر میں بیان کی ہے، آپ رقمطراز ہیں۔

"روی الواحدی فی الوسیط عن عمرو بن دینار عن ابن عباس انه قال الذی امر النبی ﷺ بمشاورتهم فی هذه الآیة هم الذین أمره بأن یعفو عنهم ویستغفرلهم وهم المنهزمون فهذا باطل ان عمر کان من المنهزمین فدخل تحت الآیة الاان ابابکر ماکان منهم فکیف یدخل تحت هذه الآیة، والله اعلم" (کبیر جلد ۹ صفحه نمبر ۶۷)

علامہ واحدی رحمہ اللہ نے وسیط میں عمرو بن دینار کی روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے کہ اس آیۂ کریمہ میں اللہ تعالی نے نبی کریم ﷺ کو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر ﷺ سے مشورہ کرنے کا حکم دیا، لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں میرے نزدیک اس میں اشکال ہے، اسلئے کہ اس آیۂ کریمہ میں اللہ تعالی نے ان حضرات سے مشورہ کرنے کا حکم دیا جن کو معاف کرنے کا حکم دیا اور ان کیلئے بخشش طلب کرنے کا حکم دیا، یہ وہ لوگ تھے جو پسپا ہونے والے تھے، حضرت ابوبکر ﷺ تو ثابت رہنے والوں میں سے تھے اور حضرت عمر ﷺ قریب پہاڑ پر چڑھ گئے تھے، کیا آپ دفاع کی خاطر گئے تھے، یا کہ پسپا ہونے والوں میں تھے، اگر پسپا ہونے والوں میں تھے تو آپ بھی ان لوگوں میں داخل تھے جن سے مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا۔

❁ وعن ابن عمر کتب ابو بکر ان رسول الله ﷺ کان یشاور فی الحرب فعلیک به" (مظہری جلد ۲ صفحہ نمبر ۱۶۱)

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عمرؓ کی طرف لکھا کہ نبی کریم ﷺ جنگوں میں تمہارے ساتھ مشورہ کرتے تھے، اس لئے تم بھی اپنے کاموں میں مشورہ جاری رکھو۔

❁ عن عائشہ رضی اللہ عنہا انہا قالت ما رأیت رجلا اکثر استشارة للرجال من رسول اللہ ﷺ" (معالم التنزیل للبغوی بالاسناد جلد ۱ صفحہ نمبر ۳۶۶)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر کوئی اور شخص نہیں دیکھا جس نے اپنے معاملات میں دوسروں سے مشورہ کیا ہو، یعنی سب لوگوں سے زیادہ اپنے معاملات میں رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کرام سے زیادہ سے زیادہ مشورہ فرماتے تھے۔

﴿فَاِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ﴾

"تو جب آپ پکا ارادہ کرلو تو توکل (بھروسہ) رکھو اللہ پر۔"

(فَاِذَا عَزَمۡتَ) فاذا قطعت الرای علی شئی بعد الشوری (فتوکل علی اللہ) فی امضاء امرک علی الارشد لا علی المشورة" (مدارک التنزیل للسنفی)

مشورہ کے بعد جب کسی کام پر تمہاری رائے پختہ ہو جائے اور وہ کام کرنے کا تم پختہ ارادہ کرلو تو اس کام کے کرنے پر صرف مشورہ پر کامل اعتماد نہ رکھنا، بلکہ اللہ تعالیٰ پر ہی بھروسہ رکھنا کہ وہی تمہاری راہنمائی فرمائے گا، اور تمہارے کاموں کو بخوبی سرانجام دے گا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُتَوَكِّلِيۡنَ﴾ "بیشک اللہ محبت رکھتا ہے توکل کرنے والے سے۔"

اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنے کا مطلب:

"فوض امرک الیه واعتمد علیه" یعنی اپنے معاملات اللہ تعالیٰ کے سپرد کردو اور اس پر اعتماد رکھو، یہی وجہ ہے کہ غزوہ احد کے متعلق صحابہ کرام سے جب آپ نے مشورہ کیا تو صحابہ کرام نے احد میں جانے کا مشورہ دیا، آپ مدینہ طیبہ میں رہ کر دفاعی جنگ کرنا چاہتے تھے، لیکن آپ نے ہتھیار جب زیب تن کر لئے یعنی اپنے جسم مبارک کے ساتھ ہتھیار لگا لئے تو صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ مدینہ طیبہ میں رہ کر دفاعی جنگ کریں لیکن آپ نے فرمایا "لاینبغی لنبی ان یلبس لامته فیضعها" کسی نبی کی شان کے لائق نہیں کہ وہ اپنے ہتھیار زیب تن کر لے تو پھر ان کو اتار دے، آپ کے اس ارشاد کی تائید میں ہی رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿فَاِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ﴾ جب آپ کام کرنے کا پختہ ارادہ کرلو تو اللہ پر بھروسہ رکھو، یعنی اعتماد صرف رب تعالیٰ پر ہو، نہ اپنی رائے پر ہو اور نہ ہی مشورہ پر کامل

بھروسہ ہو، اسلئے کہ مشورہ دینے والے اس کے انجام کونہیں جانتے وہ صرف اپنے خیال کے مطابق بہتر مشورہ دیتے ہیں۔

"وقد یتخبط العقل فی النظر وقد یفعل اللہ تعالی علی خرق العادۃ فلاوجہ للاعتماد علی الاراء"

انسانی عقل بعض اوقات نظر وفکر میں پھسل جاتی ہے کہ اللہ تعالی کی عادات کے خلاف کام کردیتا ہے، اس لئے انسان کو چاہئے کہ وہ اپنی آراء پر کامل بھروسہ رکھے، بلکہ صرف اللہ تعالی پر توکل رکھے۔ (تفسیر مظہری جلد۲ صفحہ نمبر۱۶۲)

توکل بمعنی التجاء الی اللہ:

"والتوکل ان یلتجئی الی اللہ خاصۃ ویطلب منہ ان یجعل عاقبتہ سعیہ خیرا ویحسن الظن بہ فی ذلک"

توکل یہ ہے کہ صرف اللہ تعالی کو ملجأ (جائے پناہ) بنائے، اور اسی سے اپنی کوشش، اپنے اعمال کی جزاء طلب کرے، اور اسی پر کمال حسن ظن رکھے کہ وہی معطی ہے۔

توکل بمعنی عدم معصیت:

قیل التوکل ان لاتعصی اللہ من اجل رزقک" بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ توکل یہ ہے کہ رزق حاصل کرنے کیلئے اللہ تعالی کی نافرمانی نہ کرو، یعنی رزق حلال طلب کرنا توکل ہے، اور حرام طریقہ سے رزق حاصل کرنا رب تعالی پر بھروسہ نہ ہونے کے مترادف ہے۔

توکل بمعنی صرف اللہ تعالی سے طلب:

قیل معناہ ان لایطلب لنفسک ناصرا غیر اللہ ولا لرزقک خازنا غیرہ ولا لعملک شاھدا غیرہ"

توکل کا اور معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالی کے بغیر اپنا کوئی ناصر نہ بنایا جائے، اپنا رزق حاصل کرنے میں کسی اور کو خازن نہ سمجھا جائے، اپنے اعمال کا کسی اور کو کوئی شاہد نہ بنایا جائے۔

❁ **عن ابن عباس قال قال رسول اللہ ﷺ یدخلون الجنۃ سبعون الفامن امتی بغیر حساب ،قیل یا رسول اللہ من ھم قال ھم الذین لا یکتوون ولا یسترقون ولا یتطیرون وعلی ربھم یتوکلون"** (بخاری ومسلم) کذاروی البغوی عن عمران بن حصین)

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں سے ستر ہزار لوگ جنت میں بغیر حساب کے داخل ہونگے۔ آپ سے پوچھا گیا یا رسول اللہ ﷺ وہ کون لوگ ہوں گے آپ نے

فرمایا یہ وہ لوگ ہوں گے جو جانوروں کو داغ نہیں دیں گے، جنتر منتر نہیں کریں گے فال نہیں نکالیں گے اپنے رب پر بھروسہ ہی رکھیں گے۔

رعن عمر بن الخطاب قال قال رسول الله ﷺ لوانک تتوکلون علی حق توکله لرزقکم کم یرزق الطیر تغدواخماصاوتروح بطانا" (رواه الترمذی وابن ماجه)

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم اللہ تعالیٰ پر کامل توکل (بھروسہ) رکھو تو اللہ تعالیٰ تمہیں رزق دے گا جس طرح پرندوں کو رزق دیا جاتا ہے صبح وہ بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر واپس لوٹتے ہیں۔

سوال: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سے تو پتہ چلتا ہے کہ ظاہری اسباب چھوڑ دینے کا نام توکل ہے حالانکہ ہم کتنے ہی اسباب کا سہارا لیتے ہیں تو کس طرح ان میں تطبیق ہے؟

جواب: "قلت لا بل ترک الاعتماد علی الاسباب الاتری ان الاستیشار من باب التشبت بالاسباب فالله سبحانه امر بالاستشارة ثم امر ترک الاعتماد"

ظاہری اسباب سے مطلقاً منع نہیں فرمایا گیا بلکہ اسباب پر مکمل اعتماد سے منع کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ پہلے مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا، پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کا حکم دیا، تو کہ مکمل اعتماد مشورہ پر ہی نہ کیا جائے۔

"وقوله علیه الصلوة والسلام فی الحدیث وعلی ربهم یتوکلون لیس تفسیرا لقوله لایکتوون ولا یسترقون فان العطف یقتضی المغائرة"

اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ﴿وَعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ﴾ "لا یکتوون ولا یسترقون" کی تفسیر نہیں کیونکہ عطف مغائرۃ کو چاہتا ہے، حدیث شریف میں جن ستر ہزار کا ذکر ہے اس سے مراد بھی "لاتشبثون غالبا" وہ لوگ ہیں جو اسباب پر مکمل اعتماد نہیں کرتے ہوں گے، اسباب کے بغیر تو حیات ہی ممکن نہیں، کھانا، پینا حیات کے اسباب ہیں، نماز روزہ جنت کے اسباب ہیں۔ (مظہری جلد ۲، ۱۶۲)

"دلت الآیة علی انه لیسا التوکل ان یهمل الانسان نفسه کما یقول بعض الجهال والا لکان الأمر بالمشاورة منافیا للأمر بالتوکل بل التوکل هو ان یراعی الانسان الاسباب الظاهرة ولکن لا یعول بقلبه علیها بل یعول علی عصمة الحق" (کبیر جلد ۹ صفحہ نمبر ۶۸)

یہ آیۃ کریمہ اس پر دلالت کر رہی ہے کہ اسے توکل نہیں کہا جاتا کہ انسان یونہی اپنے آپ کو بیکار چھوڑ دے جیسا کہ بعض جاہلوں کا کہنا ہے، مشورہ کرنے کا حکم ہی بتا رہا ہے کہ توکل اسے نہیں کہا جاتا کہ انسان ظاہری اسباب کو اختیار ہی نہ کرے بلکہ ظاہری اسباب کو اختیار کر کے ان پر مکمل اعتماد نہ کرے، محافظ کارساز اللہ تعالیٰ کو سمجھے۔

اِنۡ يَّنۡصُرۡكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمۡ وَاِنۡ يَّخۡذُلۡكُمۡ فَمَنۡ ذَا الَّذِىۡ يَنۡصُرُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِهٖ وَعَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ O (آیۃ نمبر ۱۶۰)

(1) اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا، اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دے تو ایسا کون ہے جو پھر تمہاری مدد کرے اور مسلمانوں کو اللہ ہی کا بھروسہ چاہیے۔ (کنز الایمان)

(2) اگر مدد کرے تمہاری اللہ تو کوئی نہیں غالب آ سکتا تم پر، اور اگر چھوڑ دے تمہیں تو کون شخص ہوگا وہ جو امداد کرے گا تمہاری اس کے بعد، اور اللہ پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے ایمان والوں کو۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ رب تعالیٰ نے مؤمنین کو بدر اور احد کی یاد دلائی کہ اللہ تعالیٰ نے بدر میں تمہاری امداد فرمائی تو کافر تم پر غالب نہیں آ سکے، اسی طرح رب تعالیٰ کی طرف سے جب بھی تمہیں امداد حاصل ہوگی تم پر کوئی غالب نہیں آ سکے گا، لیکن احد میں تمہاری اپنی کوتاہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا تھا تو تم پر بظاہر کچھ دیر کیلئے کفار کا غلبہ ہوگیا، اسی طرح جب بھی رب تعالیٰ کا ساتھ تمہیں حاصل نہ رہا تو تمہاری امداد کرنے والا اور کوئی نہیں ہوگا۔ (کبیر بالوضاحۃ جلد ۹، صفحہ نمبر ۶۸)

آیۃ کریمہ میں ترغیب وترہیب پائی گئی:

یعنی نیکیوں کی طرف رغبت دلائی گئی، اور معصیت سے ڈرایا گیا۔ رب تعالیٰ نے بدر کی امداد کو صبر اور تقویٰ پر موقوف فرمایا، تقویٰ گناہوں سے بچنا ہے۔

رب تعالیٰ نے حکم فرمایا:

﴿بَلٰۤى اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا وَيَاۡتُوۡكُمۡ مِّنۡ فَوۡرِهِمۡ هٰذَا يُمۡدِدۡكُمۡ رَبُّكُمۡ بِخَمۡسَةِ اٰلَافٍ مِّنَ الۡمَلٰٓئِكَةِ﴾ (سورۃ آل عمران، آیۃ نمبر ۴۵)

کیوں نہیں اگر تم صبر کرو تقویٰ کرو اور کافر اسی دم تم پر آ پڑیں تو تمہارا رب تمہاری مدد کو پانچ ہزار فرشتے۔

اب اس زیر بحث آیۃ کریمہ میں بیان کیا ﴿مَنۡ نَصَرَهُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَهٗ﴾ جس کی اللہ تعالیٰ امداد فرمائے اس پر کوئی غالب نہیں آ سکتا" اب اس دونوں مقدموں سے نتیجہ یہ حاصل ہوا۔

"ان من اتقی اللہ فقد فاز بسعادة الدنیا والآخرة فانہ یفوز بسعادة لاشقاوة معها وبعز لاذل معه ویصیر غالبا لایغلبه احد"

جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے، یعنی گناہوں کو چھوڑتا ہے وہ دنیا و آخرت میں سعادت حاصل کر لیتا ہے، وہ نیک بختی میں اس طرح کامیاب ہوتا ہے کہ اسے بدبختی حاصل نہیں ہوتی، اور اس طرح کی عزت حاصل ہوتی ہے کہ وہ ذلیل نہیں ہوتا۔ اسے اللہ تعالیٰ ایسا غلبہ عطاء کر دیتا ہے کہ کوئی اس پر غالب نہیں آسکتا۔

"واما من اتی بالمعصیة فان اللہ یخذله ومن خذله اللہ فقد وقع فی شقاوة لاسعادة معها وذل لاعز معه"

لیکن جو شخص گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے تو بیشک اللہ تعالیٰ اسے رسوا کر دیتا ہے، جس کو اللہ تعالیٰ رسوا کرتا ہے وہ بدبختی میں مبتلاء ہو جاتا ہے، اسے سعادت حاصل نہیں ہوتا، اور اللہ تعالیٰ اسے ذلت عطاء کر دیتا ہے اسے کوئی عزت حاصل نہیں ہوتی۔ (کبیر ج۹ ص ۶۸)

"وان یخذلکم" خذل (ن) خذلا، خذلانا" مدد چھوڑنا۔ خذل (تفعیل) عنه اصحابه، کسی کو مدد نہ دینے کی ترغیب دینا، کسی کو پسپائی اور جنگ بند کرنے آمادہ کرنا۔ "خاذل مخاذلة" مدد چھوڑنا "تخاذل القوم" بعض کا بعض کی مدد چھوڑنا۔ (المنجد)

مسئلہ: اسی آیہ کریمہ سے اہل علم نے یہ دلیل پکڑی ہے۔

" ان الایمان لایحصل الاباعانة اللہ والکفر لایحصل الابخذلانه، والوجه فیه ظاهر لانها دالة علی ان الامر کله اللہ " (کبیر ج ۹ ص ۶۹)

ایمان صرف اللہ تعالیٰ کی امداد سے حاصل ہوتا ہے، اور جب رب تعالیٰ اس کی امداد نہ فرمائے تو اسے کفر حاصل ہوتا ہے۔ اسلئے کہ تمام امور، تمام کام اللہ تعالیٰ کے ہی قبضۂ قدرت میں ہیں۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

(فمن ذاالذی ینصرکم من بعده) ای بعد خذلانه ای فلاناصر لکم (جلالین) "قوله ای بعد خذلانه" اشار بذلک الی ان الاستفهام انکاری بمعنی النفی ولم یقل فلاناصر لکم اشارة لعدم تقنیطهم من النصر تلطفابهم ای فارجعوا الیه ینصرکم قال تعالی (وکان حقاعلینا نصر المؤمنین) (صاوی ج ۱ ص ۱۶۶)

اگر اللہ تعالی نے تمہاری امداد چھوڑ دی جیسے احد میں کچھ دیر کیلئے چھوڑ دیں تھی تو کون امداد کرے گا تمہاری اسکے بعد، یعنی اس کی امداد چھوڑ دینے کے بعد تمہاری امداد کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ مفسر رحمہ اللہ "مِنْ بَعْدِهٖ" کی تفسیر "بعد خذلانہ" سے کر کے اس طرف اشارہ کیا کہ یہاں حذف مضاف ہے۔ اور ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُكُمْ﴾ کی تفسیر "فلاناصر لکم" سے کر کے یہ بتایا کہ "یہ استفہام انکاری ہے نفی کے معنی میں ہے، البتہ یہ نہیں فرمایا "فلاناصر لکم" "تمہاری امداد کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ یہ درحقیقت اپنے بندوں پر مہربانی فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تم یہ خیال نہ کرنا کہ ہم کسی اور سے امداد طلب کرتے شائد کوئی امداد کر دیتا، نہیں نہیں بات اصل میں یوں ہے کہ جب رب تعالی نے تمہاری امداد چھوڑ دی تو پھر کوئی اور امداد کر سکے گا ہی نہیں۔ لھذا تم رب تعالی کی طرف ہی رجوع کرو وہی تمہاری امداد فرمائے گا، اس نے خود ہی ارشاد فرمایا ﴿وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ہم نے ثابت کر رکھا ہے اپنے ذمہ کرم پر ایمان والوں کی امداد کرنا۔

﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾

"اور اللہ پر ہی بھروسہ کرنا چاہئے ایمان والوں کو۔"

یعنی جب یہ ثابت ہوگیا کہ تمام امور اللہ تعالی کے قبضہ قدرت میں ہیں، اور بیشک جو وہ ارادہ فرماتا ہے اسی کے مطابق فیصلہ فرماتا ہے "ولادافع لحکمہ" "اللہ تعالی کے حکم اور فیصلہ کو کوئی ٹالنے والا نہیں" "وجب ان لایتوکل المؤمن الاعلیہ" تو ایمان والوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ صرف اللہ تعالی پر توکل رکھیں۔

دینی طلباء کرام یہ مسئلہ بھی ذہن میں رکھیں:

وقولہ "وعلی اللہ فلیتوکل المؤمنون" یفید الحصر ای علی اللہ فلیتوکل المؤمنون لاعلی غیرہ" (کبیر ج ۹ ص ۶۹)

رب تعالی کے ارشاد گرامی میں (وَعَلَى اللّٰهِ) ظرف پہلے ذکر کی گئی، اور فعل "فَلْيَتَوَكَّلْ" بعد میں، اس لئے تقدیم ظرف حصر کا فائدہ دے رہی ہے۔ اسی لئے اعلی حضرت رحمہ اللہ نے حصر کا ہی ترجمہ کیا ہے، راقم نے بھی وہی نقل کیا ہے اور اللہ پر ہی بھروسہ کرنا چاہئے ایمان والوں کو۔

❁ وعن صیب قال قال رسول اللہ ﷺ عجبا لأمر المؤمن ان امرہ کلہ لہ خیر ولیس ذلک لاحد الا المؤمن ان اصابتہ سراء شکر فکان خیرا لہ وان اصابتہ ضراء صبر

فکان خیر اله" (رواہ مسلم،مشکوۃ باب التوکل والصبر)

حضرت صہیب فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مؤمن کے کاموں پر تعجب ہے کہ بیشک اس کا ہر کام ہی بہتر ہے، سوائے مؤمن کے کسی اور کو یہ مقام حاصل نہیں، اس لئے کہ اگر اسے خوشی پہنچے تو وہ شکر کرتا ہے جو اس کیلئے بہتر ہوتا ہے، اور اگر اسے تکلیف پہنچے تو وہ صبر کرتا ہے جو اس کیلئے خیر ہے۔

❀ **وعن ابی ذران رسول اللہ ﷺ قال انی لاعلم آیة لواخذالناس بها لکفتهم ومن یتق اللہ یجعل له مخرجا ویرزقه من حیث لایحتسب"**

(رواہ احمد وابن ماجة والدارمی)مشکوۃ باب التوکل والصبر)

حضرت ابوذر ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک میں ایک آیۃ جانتا ہوں، اگر لوگ اس پر عمل کریں تو وہ ان کو کافی ہو جائے۔

وہ آیۃ کریمہ یہ ہے:

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَهٗ مَخْرَجًاo وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ (سورۃ الطلاق، آیۃنمبر ۳)

"اور جو اللہ سے ڈرے اللہ اس کیلئے نجات کی راہ نکال دے گا، اور اسے وہاں سے روزی دے گا جہاں اس کا گمان نہ ہو۔"

❀ **وعن عمروبن العاص قال قال رسول اللہ ﷺ ان قلب ابن آدم بکل وادشعبة فمن اتبع قلبه الشعب کلها لم یباک اللہ بای واداهلکه ومن توکل علی اللہ کفاه الشعب"**

(رواہ ابن ماجه،مشکوۃ باب التوکل والصبر)

حضرت عمرو بن العاص فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک انسان کا دل (غموں کی) ہر وادی سے معلق رہتا ہے، کسی شخص کا تمام وادیوں سے معلق رہے وہ کسی وادی میں ہلاک ہو جائے رب تعالیٰ کو کوئی برواہ نہیں، جو اللہ پر توکل رکھے اللہ تعالیٰ اسے ان (غموں کی) وادیوں سے کفایت کر جائے گا"

❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ (آیۃ نمبر ۱۶۱)

(1) اور کسی نبی پر یہ گمان نہیں ہوسکتا کہ وہ کچھ چھپار کھے اور جو چھپار کھے وہ قیامت کے دن اپنی چھپائی چیز لے کر آئے گا پھر ہر جان کو ان کی کمائی بھرپور دی جائے گی اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔ (کنز الایمان)

(2) نہیں کسی نبی کیلئے کہ وہ خیانت کرے، اور جو خیانت کرے لے آئے گا" وہ چیز جو خیانت کی اس نے" قیامت کے دن پھر پورا پورا دیا جائے گا ہر شخص کو جو اس نے کسب کیا اور ان پر کچھ ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (نجوم الفرقان)

آسان اور مختصر مطلب:

"ای ماصح و لااستقام لنبی من الانبیاء ان یخون فی المغنم لان الخیانة تنافی النبوة"

یعنی تمام انبیاء کرام میں سے کسی نبی کی شان کے لائق غنیمت حاصل ہے، اس لئے نبوت اور خیانت ایک شخص میں جمع نہیں ہوسکتیں۔ اگر بالفرض کسی نے امر نبوت کے احکام پہنچانے میں کوتاہی کی جسے خیانت سے تعبیر کردیا گیا تو قیامت کے دن اس سے پوچھا جائے گا کہ تو نے احکام خداوندی کیونکہ بجانہیں لائے، پھر ہر نفس کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کسب کیا، کسی پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (ماخوذ از روح المعانی وکبیر)

اس آیۃ کریمہ کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں:

﴿وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ﴾ "نہیں کسی نبی کیلئے کہ وہ خیانت کرے۔"

"الغلول هو الخيانة" غلول کا معنی ہے خیانت کرنا۔ اصل میں اس کا معنی یہ ہے کہ کسی چیز کو مخفی طور پر پکڑنا۔ جو کینہ سینہ میں چھپا ہوا سے بھی "غــــل" (غین کی زیر سے) کہا جاتا ہے۔ غلالہ اس کپڑے کو کہا جاتا ہے جو کپڑوں کے نیچے پہنا جاتا ہے۔ اور وہ پانی جو درختوں کی جڑوں میں جاری ہوتا ہے وہ درختوں میں پوشیدہ ہوتا ہے اسے "غلل" کہا جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے "تغلل الشئ اذا تخلل و خفی" جب کسی چیز میں خلل واقع ہو اور مخفی ہو اس کیلئے بولتے ہیں "تغلل الشئ"

۞ قال النبیﷺ"من بعثناہ علی عمل فغل شیئا جاء یوم القیامة یحملہ علی عنقہ"

نبی کریمﷺ نے فرمایا جس شخص کو ہم نے کسی عمل کیلئے (صدقات کی وصول کیلئے) بھیجا تو اس نے خیانت کی تو قیامت کے دن وہ چیز اپنی گردن پر اٹھا کر لائے گا۔اور ارشاد فرمایا"ھدایاالولاۃ غلول" حکام اگر عطیات کو اپنے ذاتی ہدیئے سمجھیں تو یہ خیانت ہے۔اور ارشاد فرمایا"لیس علی المستعیر غیر المغل ضمان" بغیر خیانت کے جو چیز مانگ کر لی جائے اس پر کوئی ضمان نہیں۔

مختلف قرأتوں کے لحاظ پر مختلف معانی:

ابن کثیر اور عاصم اور ابو عمر کی قراءت میں"یغل" میں یاء پر فتحہ اور غین پر ضمہ ہے،اس قراءت کے مطابق معنی یہ ہے"ماکان للنبی ان یخون" نبی کی شان کے لائق نہیں کہ وہ خیانت کرے۔اور باقی حضرات نے"یغل"کو یاء کے ضمہ اور غین کے فتحہ سے پڑھا ہے،اس صورت میں معنی یہ ہے"ماکان للنبی ان یخان" نبی کی شان کے لائق نہیں کہ نبی کی خیانت کی جائے۔(وہ خاموش ہو کر حق بیان نہ کریں) شان نزول میں مختلف قول ہیں،بعض پہلی قراءت کے مطابق ہیں اور بعض دوسری قراءت کے مطابق ہیں۔

پہلی قراءت کے مطابق چند روایات:

(۱) نبی کریمﷺ کو بعض غزوات میں مال غنیمت حاصل ہوا،وہ مال غنیمت جمع کر لیا گیا۔لیکن کچھ موانع کی وجہ سے تقسیم میں تاخیر ہوگئی،تو کچھ لوگ کہنے لگے کہ آپ مال غنیمت کیوں تقسیم نہیں کرتے،تو آپ نے فرمایا"لوکان لکم مثل احد ذھبا ماحبست عنکم منہ درھما اتحسبون انی اغلکم مغنمکم" اگر تمہارا احد پہاڑ کی طرح سونا ہو تو میں اس سے ایک درہم بھی نہیں روکوں گا،کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ میں تمہاری امانت میں خیانت کروں گا،تو اس پہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ اداء وحی کے متعلق نازل ہوئی،نبی کریمﷺ قرآن پاک پڑھتے تھے اور اس میں کافروں کے دین اور ان کے مذہب کو باطل قرار دیا گیا،فسالوہ ان یترک ذلک فنزلت ھذہ الآیۃ" تو انہوں نے مطالبہ کیا کہ ہمارے دین اور ہمارے معبودوں کو باطل نہ کہا جائے،تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی کہ نبی کریمﷺ تبلیغ دین میں کوئی خیانت نہیں کرتے۔

(۳) حضرت عکرمہ ﷺ کا قول یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی کہ بدر میں ایک سرخ رنگ کی چادر گم ہوگئی "فقال بعض الجهال لعل النبی ﷺ اخذها فنزلت هذه الآیة" بعض جاہلوں نے کہا کہ ہوسکتا ہے وہ نبی کریم ﷺ نے لے لی ہو، تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی، کہ نبی کی شان کے لائق نہیں کہ وہ غنیمت میں خیانت کریں۔

(۴) حضرت ابن عباس ﷺ نے ایک اور وجہ شان نزول کی یہ بیان کی۔

"ان اشراف الناس طمعوا ان یخصهم النبی علیه الصلوة والسلام من الغنائم بشیٔ زائد فنزلت هذه الآیة"

کہ بعض بڑے لوگوں نے لالچ کی کہ ہمیں مال غنیمت میں سے نبی کریم ﷺ زیادہ حصہ دیں، تو اس وقت یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی کہ نبی بے انصافی کر کے مال غنیمت میں خیانت کا ارتکاب نہیں کر سکتے۔

(۵) روی انه علیه الصلوة والسلام بعث طلائق فغنموا غنائم فقسمها ولم یقسم للطلائع فنزلت هذه الآیة"

اس آیۃ کریمہ کے نزول کا تعلق بدر کے واقعہ سے ہے کہ جن لوگوں کو دشمن کے حالات کا جائزہ لینے کیلئے بھیجا ہوا تھا وہ واپس جنگ میں شریک نہ ہوسکے، ان کیلئے ابتدائی طور مال غنیمت مقرر نہیں کیا گیا تھا تو رب تعالیٰ نے یہ آیۃ کریمہ نازل فرما کر ان کا حصہ مقرر کرنے کے متعلق ارشاد فرمایا تا کہ ان کے معاملہ میں خیانت نہ ہو۔

(۶) احد میں جن حضرات کو درہ میں کھڑا کیا تھا، فتح حاصل ہونے پر وہ مال غنیمت جمع کرنے میں شریک ہوگئے تھے۔

"وقالوا نخشی ان یقول النبی ﷺ من اخذ شیئا فهو له وان لایقسم الغنائم کما لم یقسمها یوم بدر فقال علیه الصلوة والسلام ظننتم انا نغل فلانقسم لکم فنزلت هذه الآیة"

اور ساتھ ہی یہ کہنے لگے ایسا نہ ہو کہ نبی کریم ﷺ نے بدر میں جو اعلان فرمایا تھا "من قتل قتیلا فله سلبه" جس نے کسی (کافر شخص) کو قتل کیا اس کا سامان اسی کے لئے ہے، وہی اعلان یہاں بھی فرمائیں، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمہارا کیا گمان تھا کہ ہم تمہارے معاملہ میں خیانت کریں گے اور مال غنیمت تقسیم نہیں کریں گے، آپ کے اس ارشاد گرامی کے مطابق نازل ہوئی کہ نبی غنیمت کے معاملہ میں خیانت نہیں کرتے۔ (کبیر ج۹ ص۷۰)

دوسری قراءت کے مطابق معانی:

یعنی نبی کی شان کے لائق نہیں کہ ان کے مال غنیمت کی خیانت کی جائے وہ یوں ہی خاموش رہیں اور ان کو

منع نہ کریں۔اس پر چند احادیث دیکھیں۔

❁ قال الامام احمد عن ابی مالک الاشجعی عن النبی ﷺ قال اعظم الغلول عندالله ذراع فی الارض تجدون الرجلین جارین فی الارض اوفی الدار فیقطع احدهما من حظ صاحبه ذراعا فاذاقطعه طوقه من سبع ارضین یوم القیامة"

مسند امام احمد میں حضرت ابو مالک اشجعی کی روایت بیان کی گئی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا زمین کے ایک ذراع (ڈیڑھ فٹ) کی خیانت بھی اللہ تعالی کے ہاں بہت بڑا جرم ہے،تم دو شخصوں کو پاؤ گے کہ وہ زمین یا مکان میں ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں،ایک نے دوسرے کے حصہ سے ایک ذراع کاٹ لیا،جب اس نے دوسرے کا حصہ کاٹ لیا تو قیامت کے دن اس کے گلے میں سات زمینوں کا طوق ڈال دیا جائے گا۔

❁ قال الامام احمد عن عبدالرحمن بن جبیر قال سمعت المستوردؓ بن شداد یقول سمعت رسول الله ﷺ یقول من ولی لنا عملا ولیس له منزل فلیتخذ منزلا،اولیست له زوجة فلیتزوج ،اولیس له خادم فلیتخذ خادما،اولیس له دابة فلیتخذ دابة،ومن اصاب شیئا سوی ذلک فهو غال"

حضرت امام احمد رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں حضرت عبدالرحمن بن جبیر ؓ سے روایت کی ،وہ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جسے ہم عامل بنائیں (اور جتنا حق ہم اسے دیں) کہ وہ (اپنے عمل اور مزدورں سے) اپنا گھر بنالے جب کہ اس کے پاس گھر نہ ہو،یا اس کی زوجہ نہ ہو تو شادی کرلے،یا اس کا خادم نہ ہو تو خادم حاصل کرلے،یا اس کے پاس سواری نہ ہو تو وہ سواری لے لے (یہ تو اسے حق حاصل ہے کہ ہم نے اسے اجازت دے دی) جس نے اس کے سوا اور کوئی چیز لے لی تو وہ خیانت کرنے والا ہوگا۔

❁ قال ابن جریر عن عکرمة عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ لأعرفن احدکم یاتی یوم القیامة یحمل شاة لها ثغاء ینادی یامحمد یامحمد فاقول لااملک لک من الله شیئا قد بلغتک،ولأعرفن احدکم یاتی یوم القیامة یحمل جملا له رغاء یقول یامحمد یامحمد فاقول لااملک لک من الله شیئا قد بلغتک،ولأعرفن احدکم یاتی یوم القیامة یحمل فرساله حمحمة ینادی یامحمد یامحمد فاقول لاأملک لک من الله شیئا قد بلغتک"

ابن جریر نے عکرمہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس (ؓ) سے روایت کی ،رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں

ضرور بر ضرور تم میں سے قیامت کے دن اس شخص کو پہچانوں گا، جس نے (مال غنیمت میں خیانت کی) بکری اٹھا رکھی ہوگی وہ بکری اپنی آواز دے رہی ہوگی (میں میں کر رہی ہوگی) وہ شخص پکار رہا ہوگا اے محمد، اے محمد، تو میں کہوں گا آج میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے نہیں چھڑا سکتا کیونکہ میں نے تمہیں اس کے احکام پہنچا دیئے تھے، اور میں ضرور بر ضرور پہچانوں گا تم میں سے اس شخص کو قیامت کے دن آئے گا اس نے اونٹ اٹھایا ہوگا وہ اونٹ اپنی آواز دے رہا ہوگا، (یعنی بڑ بڑا رہا ہوگا) وہ شخص کہے گا یا محمد یا محمد تو میں کہوں گا میں اللہ تعالیٰ سے تمہیں نہیں چھڑاؤں گا کیونکہ میں نے اس کے احکام تمہیں اللہ تعالیٰ سے نہیں چھڑاؤں گا کیونکہ میں نے تمہیں اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچا دیئے تھے۔

❁ قال الامام احمد استعمل رسول الله ﷺ رجلا من الأزد يقال له ابن اللتبية على الصدقة فجاء فقال هذا لكم وهذا اهدى لى فقام رسول الله ﷺ على المنبر فقال مابال العامل نبعثه على عمل فيقول هذا لكم وهذا اهدى لى أفلا جلس فى بيت ابيه وامه فينظر ايهدى اليه ام لا؟ والذى نفس محمد بيده لا يأتى احدكم منها بشئ الا جاء به يوم القيامة على رقبته ان كان بعيرا له رغاء اوبقرة لها خوار، اوشاة تيعر، ثم رفع يديه حتى رأينا عفرة ابطيه ثم قال اللهم هل بلغت؟ ثلاثا"

حضرت امام احمد رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں حدیث ذکر کی کہ رسول اللہ ﷺ نے ازد قبیلہ سے ایک شخص کو صدقہ وصول کرنے پر عامل بنایا اسے ابن لتبیہ کہا جاتا تھا۔ تو وہ آیا اس نے کہا یہ تمہارا (مال) ہے، اور یہ مجھے ہدیہ دیا گیا، تو نبی کریم ﷺ منبر پر کھڑے ہوئے تو آپ نے فرمایا اس عامل کا کیا حال ہے کہ ہم اس کو عمل پر بھیجتے ہیں تو وہ کہتا ہے یہ (مال) تمہارا ہے اور یہ مجھے ہدیہ دیا گیا ہے، وہ اپنے ماں، باپ کے گھر کیوں نہیں بیٹھا تھا کہ وہ دیکھتا اسے ہدیہ دیا جاتا یا نہ دیا جاتا، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم میں سے کوئی ایک بھی قیامت کے دن نہیں آئے گا مگر یہ کہ (خیانت کا) اس کی گردن پر اونٹ ہوگا جو اپنی آواز دے رہا ہوگا، یا گائے اٹھائے ہوگا جو اپنی آواز دے رہی ہوگی، یا بکری کو اٹھائے ہوگا وہ بکری آواز دے رہی ہوگی، پھر آپ نے اپنے ہاتھ اٹھائے یہاں تک کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی، آپ نے تین مرتبہ یہ کہا، اے اللہ کیا میں نے احکام پہنچا دیئے ہیں۔

❁ قال ابو عيسى الترمذى عن معاذ بن جبل قال بعثنى رسول الله ﷺ الى اليمن فلما سرت ارسل فى أثرى فرددت فقال اتدرى لم بعثت اليك؟ لاتصيبن شيئا بغير اذنى فانه غلول (ومن يغلل يأت بما غل يوم القيامة) لهذا دعوتك فامض لعملك"

حضرت معاذ بن جبل ؓ فرماتے ہیں مجھے رسول اللہ ﷺ نے یمن کی طرف بھیجا، جب میں چلا تو میرے

پیچھے ایک شخص کو بھیجا مجھے واپس بلایا گیا، پھر آپ نے فرمایا کیا تمہیں معلوم ہے کہ آپ کو واپس کیوں بلایا گیا؟ (اس کی وجہ یہ بتانا مقصود تھا) کہ میری اجازت کے بغیر ہرگز کوئی چیز نہ لینا کیونکہ وہ خیانت ہوگی۔ (پھر آپ نے بطور دلیل یہی زیر بحث آیۃ کریمہ پڑھی) ﴿وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ (اور جس نے خیانت کی وہ لے آئے گا وہ چیز جو اس نے خیانت کی قیامت کے دن) میں نے اسی وجہ سے تمہیں بلایا تھا، اب تم اپنے کام کیلئے چلے جاؤ (جس کیلئے تمہیں بھیجا تھا)

❁ **قال الامام احمد عن ابی هریرة قال قام فینا رسول الله ﷺ یوما فذکر الغلول فعظمه وعظم امره ثم قال لاألفین احدکم یجیئ یوم القیامة علی رقبته بعیر له رغاء فیقول یارسول الله اغثنی فاقول لاأملک لک من الله شیئا قد بلغتک لاألفین احدکم یجیئ یوم القیامة علی رقبته فرس لها حمحمة فیقول یارسول الله اغثنی فاقول لااملک لک من الله شیئا قد بلغتک، لاألفین احدکم یجیئ یوم القیامة علی رقبته صامت فیقول یارسول الله اغثنی فاقول لااملک لک من الله شیئا قد بلغتک"** (بخاری ومسلم)

امام احمد رحمہ اللہ نے حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے روایت ذکر کی جو بخاری ومسلم نے بھی ذکر کی، آپ فرماتے ہیں ایک دن رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے آپ نے مال غنیمت کی خیانت کا ذکر کیا، اس نے اس کی عظمت اور اس کے معاملہ (خیانت) کی عظمت کو ذکر کیا، پھر فرمایا ہرگز میں سے کسی ایک کو قیامت کے دن نہ پاؤں کہ اس کی گردن پر اونٹ آواز دے رہا ہو (بربڑا رہا ہو) وہ شخص کہے یارسول اللہ میری فریاد کو پہنچو، میں کہوں گا میں تمہارے لئے کسی چیز کا آج اللہ تعالی سے مالک نہیں بیشک میں نے اس کے احکام تمہیں پہنچا دیئے تھے، ہرگز میں تم میں سے کسی ایک کو قیامت کے دن نہ پاؤں کہ اس کی گردن پر گھوڑا ہنہنا رہا ہو، وہ کہے یارسول اللہ میری فریاد کو پہنچو، میں کہوں گا آج میں تمہاری کوئی امداد نہیں کروں گا کیونکہ میں نے تمہیں رب تعالی کے احکام پہنچا دیئے تھے، ہرگز میں تم میں سے کسی ایک کو قیامت کے دن نہ پاؤں کہ اس کی گردن پر مال (سونا، چاندی) ہو، وہ کہے یارسول اللہ میری فریاد کو پہنچو، میں کہوں گا میں اللہ تعالی سے آج تمہیں نہیں چھڑاؤں گا کیونکہ میں نے تمہیں اس کے احکام پہنچا دیئے تھے۔ (احادیث مذکورہ منقول ابن کثیر وصابونی)

❁ **روی ان النبی ﷺ لما وقعت غنائم هوازن فی یده یوم حنین، غل رجل بمخیط فنزلت هذه الآیة"**

روایت کی گئی کہ نبی کریم ﷺ نے حنین کے دن جب ہوازن قبیلہ سے مال غنیمت حاصل کیا، تو ایک شخص نے مال غنیمت میں سے ایک سوئی جمع نہیں کرائی تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

❁ واعلم ان النبی ﷺ عظم امر الغلول وجعله من الکبائر "یقین کرلو کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے خیانت کو بہت عظیم اور گناہ کبیرہ قرار دیا۔

❁ عن ثوبان عن رسول اللہ ﷺ انہ قال "من فارق روحہ جسدہ ھو بریٔ من ثلاث دخل الجنۃ الکبر والغلول والدین"

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کا روح اس کے جسم سے جدا ہو جائے (فوت ہو جائے) وہ تین چیزوں سے بچا رہا تو جنت میں داخل ہوگا، وہ تین چیزیں یہ ہیں تکبر، خیانت اور قرضی"

❁ عن عبداللہ بن عمرو ان رجلا کان علی ثقل النبی ﷺ یقال لہ کرکرۃ فمات فقال النبی ﷺ ھو فی النار فذھبوا ینظرون فوجدوا علیہ کساء وعباءۃ قدغلھما"

عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ایک شخص کو نبی کریم ﷺ کے مال غنیمت پر مقرر کیا ہوا تھا، اسے کرکرہ کہا جاتا تھا وہ مرگیا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا وہ آگ میں جائے گا۔لوگ اسے دیکھنے کیلئے گئے تو دیکھا کہ اس نے ایک چادر اور ایک اونی کپڑا خیانت کرلیا تھا۔ (منقول از کبیر ج ۹ ص ۷۰)

❁ واخرج الطبرانی عن کثیر بن عبداللہ عن ابیہ عن جدہ ان النبی ﷺ قال لا اسلال ولا اغلول "ومن یغلل یات بما غل یوم القیامۃ"

طبرانی نے کثیر بن عبداللہ سے روایت ذکر کی جو انہوں نے اپنے باپ، دادا سے بیان کی کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا کوئی شخص مال غنیمت میں چپکے سے کوئی نہ کھسکالے اور نہ ہی خیانت کرے، (اور جو شخص خیانت کرے گا وہ خیانت کی ہوئی چیز قیامت کے دن لائے گا۔

❁ واخرج عبدالرزاق المصنف وابن جریر وابن المنذر عن قتادۃ قال...... ذکر لنا ان نبی اللہ ﷺ کان یقول اجتنبوا الغلول فانہ عار وشنار ونار"

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا مال غنیمت کی خیانت سے بچ جاؤ کیونکہ یہ عار اور آگ میں جھلس جانے کا ذریعہ ہے۔ (منقول از درمنثور)

❁ واخرج ابن ابی شیبۃ واحمد ومسلم وابوداود عن عدی بن عمیرۃ الکندی قال قال رسول اللہ ﷺ یاایھاالناس من عمل منکم لنا فی عمل فکتمنا منہ مخیطا فما فوقہ فھو غل وفی لفظ فانہ غلول یاتی یوم القیامۃ"

عدی بن عمیرہ کندی فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے لوگو جس شخص نے تم میں سے کوئی عمل کیا (یعنی جسے ہم نے عامل بنایا) تو اس نے ہم سے ایک سوئی یا اس سے زائد کوئی چیز چھپائی تو وہ

خیانت ہوگی وہ خیانت کی ہوئی چیز وہ قیامت کے دن لائے گا۔ (منقول از درمنثور)

مسئلہ: مال غنیمت کی تقسیم سے پہلے کھانے کی اشیاء اور چوپاؤں کا چارا بقدر ضرورت استعمال کرنا جائز ہے۔

"قال عبد الله بن ابی اوفی اصبنا طعاما یوم حنین فکان الرجل یاتی فیاخذ منه قدر الکفایة ثم ینصر"

عبداللہ بن ابی اوفی کہتے ہیں حنین کے دن ہم نے طعام پایا، جس شخص کو جتنا طعام ضرورت ہوتا وہ بقدر ضرورت لے لیتا، پھر واپس ہو جاتا۔

❁ وعن سلمان انه اصاب یوم المدائن ارغفة وجبنا وسکینا فجعل یقطع من الجبن ویقول کلوا علی اسم الله"

حضرت سلمان فارسی ﷺ فرماتے ہیں مدائن کے دن ہم نے روٹیاں اور پنیر اور چھری پائی، وہ پنیر کو چھری سے کاٹتے ہوئے فرمانے لگے، اللہ کا نام لے کر کھاؤ۔ (کبیر ج۹ص۱۷)

کافر کے ہتھیار سے کافر کو قتل کرنا جائز ہے:

"روی عن البراء بن مالک انه ضرب رجلا من المشرکین یوم الیمامة فوقع علی قفاه فاخذ سیفه وقتله به"

براء بن مالک ﷺ فرماتے ہیں کہ انہوں نے یمامہ کے دن مشرکوں کے ایک شخص کو گردن کے پچھلے حصہ پر مارا اور اسی کی تلوار لے کر اسے قتل کر دیا۔ (کبیر ج۹ص۱۷)

نبوت اور خیانت کا اجتماع ممکن نہیں:

اس کی وجہ یہ ہے کہ خیانت دنیا میں عار کا سبب ہے، اور آخرت میں نار (آگ) کا سبب ہے، جو نفس خیانت کی طرف رغبت کرتا ہے وہ بہت ہی گھٹیا ہوتا ہے، اور نبوت انسانیت کا بہت ہی اعلیٰ منصب ہے "فلا تلیق الا بالنفس التی تکون فی غایة الجلالة والشرف" یہ عظیم منصب تو صرف اسے حاصل ہوگا جسے بہت بڑی بزرگی اور شرافت حاصل ہوگی۔

"والجمع بین الصفتین فی النفس الواحدة ممتنع فثبت ان النبوة والخیانة لاتجتمعان"

ایک ہی شخص میں نبوت اور خیانت کبھی جمع نہیں ہوسکتیں، یہ حکم ایسا ہی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے

فرمایا﴿مَا كَانَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ﴾ اللہ تعالی کی شان کے لائق نہیں کہ وہ اپنی اولاد بنائے۔"يعنى الالهية والاتخاذ الولد لا يجتمعان" یعنی وہ ذات جو معبود حقیقی ہے اس کے ساتھ اولاد کے جمع ہونا ممکن نہیں۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

علامہ رازی رحمہ اللہ علیہ نے بہت خوبصورت انداز پر لام کے زائد ہونے کا تذکرہ کیا، لیکن لفظ زائد کی جگہ منقول کا لفظ ذکر فرمایا، عبارت ملاحظہ ہو۔

"وقيل اللام منقولة والتقدير وماكان النبى ليغل، كقوله(ماكان الله ان يتخذ من ولد)اى ماكان الله ليتخذ ولدا"

بعض حضرات نے کہا"للبنی" میں لام منقول ہے، اصل عبارت یوں ہے"وما كان النبى لليغل" نبی خیانت نہیں کرتا۔ یہ اسی طرح ہے جیسا کہ ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ﴾ میں لام منقول ہے، یہ بھی معنوی لحاظ پر یوں ہے۔

﴿مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَتَّخِذَ وَلَدًا﴾"اللہ تعالی اپنی اولاد نہیں بناتا۔ (کبیر ج ۹ ص ۷۱)

غلول کا اطلاق کس چیز پر:

"ان الغلول هو الخيانة الا انه فى عرف الاستعمال صار مخصوصا بالخانة فى الغنيمة وقد جاء هذا ايضا فى غير الغنيمة"

غلول کا معنی خیانت ہے، لیکن عام طور پر عرف میں مال غنیمت میں خیانت کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن غنیمت کے بغیر مطلقا خیانت کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ (کبیر ج۹ ص۷۲)

﴿وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾

"اور جو خیانت کرے لے آئے گا وہ چیز" جو خیانت کی اس نے" قیامت کے دن"

اس کے دو مطلب بیان کیے گئے ہیں، ایک یہ کہ وہی چیز جو اس نے خیانت کی تھی قیامت کے دن وہی اس کی گردن پر سوار ہوگی تا کہ اس کی رسوائی زیادہ ہو، جیسا کہ پہلے احادیث میں مذکور ہے کہ اس پر بکری، اونٹ، گھوڑا سوار ہوں گے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اسے خیانت کا گناہ حاصل ہوگا۔ (خازن ج۱ ص۲۹۷)

﴿ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ﴾

"پھر پورا پورا دیا جائے گا ہر شخص کو جو اس نے کسب کیا"

یعنی جیسا عمل اس نے کیا ایسا ہی اسے بدلہ دیا جائے گا، اگر اس نے نیک عمل کیا تو اسے اجر وثواب عطاء کیا جائے گا، اور اگر اس نے برا عمل کیا تو اسے عذاب دیا جائے گا۔ (خازن)

﴿وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ "اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔"

یعنی قیامت کے دن عدل وانصاف کیا جائے گا، کسی پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا، ایسا بھی نہیں ہوگا کہ کسی کے اعمال کا اسے بدلہ ہی نہ دیا جائے یا اسے کم بدلہ دیا جائے۔

❁ عن زيد بن خالد الجهني قال ان رجلا من اصحاب رسول الله ﷺ تو في يوم خيبر فذكر لرسول الله ﷺ قال صلوا على صاحبكم فتغيرت وجوه الناس لذلك فزعم زيد ان رسول الله ﷺ قال "ان صاحبكم قد غل في سبيل الله، قال ففتشنا متاعه فوجدنا حرزا من حرز اليهود لايساوي درهمين"

زید بن خالد جہنی فرماتے ہیں کہ بیشک رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام میں سے ایک شخص خیبر کے دن فوت ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ سے ان کا تذکرہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا تم اپنے صاحب پر نماز جنازہ پڑھو، لوگوں کے چہروں کے رنگ آپ کے اس ارشاد پر بدل گئے (یعنی پریشان ہو گئے کہ آپ خود جنازہ کیوں نہیں بڑھ رہے) زید (راوی) کا گمان یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا کہ تمہارے اس صاحب نے اللہ کی راہ میں خیانت کر لی ہے، وہ کہتے ہیں ہم نے ان کے سامان کی تفتیش کی تو اس میں یہود کے منکوں میں سے کچھ منکے پائے گئے جو دو درہم کے برابر بھی نہیں تھے یعنی اتنی مقدار خیانت کرنے پر نبی کریم ﷺ نے خود نماز جنازہ ادا کرنے سے انکار فرما دیا، البتہ صحابہ کرام کو اجازت دے دی۔

(معالم التنزیل للبغوی ج ۱ ص ۳۶۶)

اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ○

(آیہ نمبر ۱۶۲)

(1) تو کیا جو اللہ کی مرضی پر چلا وہ اس جیسا ہوگا جس نے اللہ کا غضب اوڑھا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور کیا بری جگہ پلٹنے کی۔ (کنزالایمان)

(2) تو کیا جس نے تابعداری کی اللہ کی رضاء کی وہ اس جیسا ہوگا جو لوٹا اللہ کی ناراضگی سے، اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے، اور کتنی بری جگہ ہے اس کے پلٹنے کی۔ (نجوم الفرقان)

﴿اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ﴾ ''تو کیا جس نے تابعداری کی اللہ کی مرضی کی۔''

یعنی اللہ تعالیٰ کی طاعت کر کے اسے راضی کیا، اس سے مراد مہاجرین وانصار صحابہ کرام ہیں۔

﴿كَمَنْ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾

''وہ اس جیسا ہوگا جو لوٹا اللہ کی ناراضگی سے۔''

"(كَمَنْ بَآءَ) "رجع" (بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ) بالمعاصی و الغلول وهم المنافقون وبعض الفساق"

وہ اس جیسا ہوگا جو لوٹا اللہ کی ناراضگی سے گناہوں اور خیانت کی وجہ سے، یعنی منافقین اور بعض فاسق لوگ یہ استفہام انکاری ہے، یعنی ایسا نہیں ہوسکتا کہ اللہ کی طاعت کرنے والے، اس کی مرضی کے مطابق کام کرنے والے اور اس کے نافرمان، خیانت کرنے والے، یعنی منافقین اور فاسق لوگ برابر ہو جائیں۔

﴿وَمَاْوٰهُ جَهَنَّمُ﴾ ''اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔''

یعنی اللہ تعالیٰ کے نافرمان اور معصیت کے مرتکب کا ٹھکانا جہنم ہے۔

﴿وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ﴾ ''اور کتنی بری جگہ ہے اس کے پلٹنے کی۔''

یعنی نافرمان اور خیانت کرنے والے فاسقوں نے جہنم کی طرف پلٹ کر جانا ہے، یہ ان کا ٹھکانا اور پلٹنے کی جگہ بہت ہی بری ہے۔ (ماخوذ از مظہری)

آیہ کریمہ کا حکم عام ہے:

اگرچہ بظاہر نزول کے لحاظ سے خاص ہے، لیکن حکم کے لحاظ پر عام ہے جو تا قیامت آنے والے لوگوں کو شامل ہے۔
جس شخص نے خیانت کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی رضاء کی تابعداری کی وہ اس جیسا نہیں ہو سکتا جس نے خیانت کی، جس نے ایمان لا کر اور طاعت کا عمل کر کے اللہ کو راضی کیا وہ اس شخص جیسا نہیں جس نے کفر و شرک کر کے اور معصیت یعنی گناہوں کا ارتکاب کر کے رب تعالیٰ کو ناراض کیا۔ مہاجرین وانصار جنہوں نے رب تعالیٰ کی رضاء کیلئے کام کئے وہ منافقین کی طرح نہیں ہو سکتے جنہوں نے رب تعالیٰ کو ناراض کیا، اسی طرح وہ لوگ جنہوں نے مشرکوں پر حملہ کیا اور ثابت قدم رہے، ان کا یہ فعل اللہ تعالیٰ کی رضاء کیلئے تھا، وہ ان حضرات کی طرح نہیں جو وقتی طور پر پسپا ہو گئے وہ بظاہر اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے کا ذریعہ بنے۔

یہ آیہ کریمہ عام ہے:

لان كل من اقدم على الطاعة فهو داخل تحت قوله (افمن اتبع رضوان الله) وكل من اخلد الى متابعة النفس والشهوة فهو داخل تحت قوله (كمن باء بسخط من الله)

یعنی ہر وہ شخص جس نے اللہ تعالیٰ کی طاعت کی وہ ﴿اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ﴾ میں داخل ہے، اور ہر وہ شخص جس نے اپنے نفس اور خواہشات کی تابعداری کی، رب تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کی وہ ﴿كَمَنْ بَاءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ میں داخل ہے۔ (کبیر ج۹ ص۷۴)

ضابطہ: **ان الآية نازلة في واقعة معينة لكنك تعلم ان عموم اللفظ لايبطل لأجل خصوص السبب"**

بیشک آیہ کریمہ اگرچہ ایک خاص واقعہ کے حق میں نازل ہوئی، لیکن یہ ضابطہ یاد رکھو کہ خصوصی اسباب کی وجہ سے عموم الفاظ باطل نہیں ہوتے۔ (کبیر ج۹ ص۷۴)

اعلیٰ حضرت اور علامہ رازی رحمہما اللہ:

علامہ رازی رحمہ اللہ نے "باء" کا معنی "احتمل، رجع" تحریر کیا ہے، یعنی جس نے اللہ کے غضب کو اٹھایا، اور اللہ کے غضب سے لوٹا، اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ "احتمل" کے مطابق ہے "اوڑھا" راقم کا ترجمہ ہے "لوٹا" جو "رجع" کا ترجمہ ہے، طلباء کرام دونوں معانی ذہن میں رکھیں۔

هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ٥ (آیۃ نمبر ۱۶۳)

(1) وہ اللہ کے یہاں درجہ درجہ ہیں، اور اللہ ان کے کام دیکھتا ہے۔ (کنزالایمان)

(2) وہ درجہ بدرجہ ہیں اللہ کے ہاں، اور اللہ دیکھنے والا ہے جو وہ عمل کرتے ہیں۔ (نجوم الفرقان)

﴿هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ ''وہ درجہ بدرجہ ہیں اللہ کے ہاں۔''

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا، اس سے مراد عام ہے، ''یعنی اھل الخیر واھل الشر درجات ''یعنی نیک لوگوں اور برے لوگوں کیلئے مختلف درجات ہیں۔ ابوعبیدہ اور کسائی رحمہما اللہ نے ''دَرَجٰتٌ'' کا معنیٰ ''منازل'' بیان کیا ہے کہ لوگوں کے آخرت میں مختلف درجہ کے مقامات ہوں گے، نیک لوگوں کے کسی کے اعلیٰ مقامات ہوں گے، کسی کے کم درجہ کے، اسی طرح برے لوگوں میں سے کسی کا مقام شدید عذاب والا ہوگا، اور کسی کا کم عذاب والا ہوگا۔ ''درجاتھم فی الجنة ودرکاتھم فی النار'' جنت میں لوگوں کے مراتب اور منازل کیلئے لفظ ''دَرَجٰتٌ'' استعمال ہوتا ہے، اور جہنم میں مختلف مراتب ومنازل کیلئے لفظ ''درکات'' استعمال ہوتا ہے۔ اور رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا﴾ (اور ہر ایک کیلئے درجات ہیں جو انہوں نے عمل کیا) کا بھی یہی مطلب ہے۔

﴿وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ﴾ ''اور اللہ دیکھنے والا ہے جو وہ عمل کرتے ہیں۔''

یعنی ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق پورا پورا بدلہ دیا جائے گا ''لایظلمھم خیرا ولایزید ھم شرا بل یجازی کل عامل بعمله'' کسی کی نیکی کو ضائع کر کے کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا، اور نہ ہی کسی کے شر کو بڑھا کر کسی پر ظلم کیا جائے گا، ہر عمل کرنے والے کو اس کے عمل کے مطابق بدلہ دیا جائے گا۔ (ماخوذ از ابن کثیر (وصابونی ج ا ص ۳۳۳)

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ ''ھم'' ضمیر ﴿اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ﴾ کی طرف فقط لوٹ رہی ہے، انہوں نے دلیل یہی پیش کی ہے۔

''ان الغالب فی العرف استعمال الدرجات لاھل الثواب والدرکات لاھل النار''

عام عرف میں ثواب والوں کیلئے درجات کا استعمال کیا جاتا ہے، اور جہنم والوں کیلئے درکات کا استعمال کیا جاتا ہے۔ (خازن ج ا ص ۲۹۹)

جنتی لوگوں کی چار قسمیں ہیں:

(۱) انبیاء کرام اور اللہ کے رسول، (۲) اولیاء کرام جو انبیاء کرام کے متبعین ہیں ان کو رب تعالیٰ کی طرف سے بصیرت اور دلائل حاصل ہیں۔

(۳) مؤمنین جو اللہ تعالیٰ پر صدق دل سے ایمان لانے والے ہیں اور انبیاء کرام کی تصدیق کرنے والے ہیں۔

(۴) علماء کرام جو دلائل عقلیہ سے رب تعالیٰ پر ایمان لانے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے پہلے طبقہ کی شان بیان کی ﴿يَرْفَعُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ﴾ یہ چار طبقہ کے لوگ قیامت کے دن جنات عدن میں ہوں گے، ایک سفید بلند مقام پر رب تعالیٰ کی زیارت کریں گے، ان کے علیحدہ علیحدہ چار مقام ہوں گے۔ "طائفة منهم اصحاب منابر وهي الطبقة العلياء الرسل والانبياء" ایک گروہ ان میں سے نورانی منبروں پر ہوں گے، یہ طبقہ وہ ہوگا جو بلند مقام رکھتے ہوں گے، یعنی اللہ کے رسول اور انبیاء کرام ہوں گے۔

"والطائفة الثانية هم الاولياء ورثة الانبياء قولا وعملا وحالا وهم اصحاب الاسرة والعرش"

دوسرا طبقہ اولیاء کرام کا ہے جو انبیاء کرام کے اقوال واعمال وحالات میں وارث ہیں، یہ نورانی تخت پر جلوہ گر ہوں گے۔

"والطبقة الثالثة العلماء بالله من طريق النظر البرهاني العقلي وهم اصحاب الكرسي"

تیسرہ طبقہ علماء جو نظر وفکر کر کے دلائل عقلیہ سے حق راہ کو بیان کرتے ہیں، خود بھی حق راہ پر قائم رہتے ہیں، ان کو قیامت کے دن نورانی کرسیاں عطاء کی جائیں گی، جن پر وہ جلوہ افروز ہوں گے۔

"والطبقة الرابعة هم المؤمنون المقلدون في توحيدهم ولهم المراتب وهم في المحشر مقدمون على اصحاب النظر العقلي وهم في الكثيب يتقدمون على المقلدين"

چوتھا طبقہ ان مؤمنین کا ہوگا جو خود تو اصحاب علم نہیں ہوں گے، لیکن علم والوں کے مقلد اور تابع ہو کر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ان کا ایمان ہوگا، یہ محشر میں عقلی دلائل سے رب تعالیٰ کو ماننے والے لیکن حق راہ پر چلنے والوں سے نورانی بلند مقام پر مقدم ہوں گے، جن کا تذکرہ پہلے تیسرے درجہ میں کیا جا چکا ہے۔

قیامت کہ نیکاں باعلی رسند | زقعر ثرا بر ثریا رسند

قیامت کے دن نیک لوگ بلند مقام تک پہنچیں گے یعنی زمین سے ثریا ستاروں تک پہنچیں گے۔

اس لئے اے انسان تو کچھ اچھے عمل کرلے، تاکہ قیامت کے دن تجھے اپنے برے اعمال پر ندامت نہ ہو۔

ترا خود بماند سر از ننگ پیش   کہ گردت بر آید عملہای خویش

تیرا سر خود ہی شرم سے جھک جائے گا   جب تیرے عمل تیرے سامنے آجائیں گے۔

مخلوق کے مختلف درجات کی وجوہ:

(۱) فمنها بالسن ولكن في الطاعة والاسلام فيفضل الكبير السن على الصغير السن اذا كانا على مرتبة واحدة من العمل"

کبھی عمر کے لحاظ پر زیادہ مرتبہ حاصل ہو جاتا، اسلئے کہ کم عمر والا اور زیادہ عمر والا جب ایک جیسی رب تعالی کی طاعت کرتے ہیں، اور ایک جیسا ہی اسلام کے احکام پر عمل کرتے ہیں، تو یقیناً جب ان کے اعمال ایک مرتبہ کے ہوں گے تو زیادہ عمر والا اپنے زیادہ اعمال کی وجہ سے بلند درجہ رکھتا ہوگا۔

(۲) ومنها بالزمان فان العمل في رمضان وفي يوم الجمعة وفي ليلة القدر وفي عشر ذي الحجة وفي عاشوراء اعظم من سائر الايام والازمان"

اور وجہ بلندی درجات کی یہ ہوگی کہ بعض لوگ وہ ہوں گے جنہوں نے مبارک دنوں اور مبارک اوقات میں عبادات کی ہوں گی، جن کی وجہ سے ان کے درجات بلند ہوں گے، یقیناً رمضان شریف میں غیر رمضان کی بنسبت عبادت افضل ہے، جمعہ کے دن اور دنوں سے عبادت افضل ہے، لیلۃ القدر کی عبادت ہزار مہینہ سے بہتر ہے، اور ذی الحج کے دس دنوں کی عبادت افضل ہے، عاشوراء کے دن ورات کی عبادت بہت افضل ہے۔ اس طرح کے فضیلت والے دنوں اور فضیلت والے وقتوں میں رب تعالی کو یاد کرنے والوں کو بلند درجات حاصل ہوں گے۔

(۳) ومنها بالمكان فالصلوة في المسجد الحرام افضل منها في مسجد المدينة وهي من الصلوة في المسجد الاقصى وهي منها في سائر المساجد"

کبھی مکان کی شرافت و بلندی عبادات میں کمال پیدا کر دیتی ہے جس کی وجہ سے انسان کو بلند درجہ حاصل ہو جاتا ہے، مسجد حرام میں نماز افضل ہے، کیونکہ ایک لاکھ کا ثواب حاصل ہوتا ہے، پھر مسجد نبوی میں نماز ادا کرنا افضل ہے کیونکہ وہاں ایک نماز کا ثواب پچاس ہزار نمازوں کا ثواب حاصل ہوتا ہے پچاس ہزار والی روایت ترمذی شریف میں

موجود ہے، پھر مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کرنا افضل ہے، مسجد حرام، مسجد نبوی، مسجد اقصیٰ کے بعد دوسری مساجد کا مقام ہے۔

محبت کی بات:

جواہر البحار جلد رابع ص ۸ پر یوں تحریر کیا گیا کہ مسجد نبوی میں نماز ادا کرنا تعداد کے لحاظ پر ثواب اس میں کم ہے بنسبت مسجد حرام کے، لیکن نبی کریم ﷺ کے قرب کی وجہ سے مسجد نبوی میں ادا کی ہوئی نماز ''پچاس ہزار کا درجہ رکھنے کے باوجود مسجد حرام میں نماز ادا کرنے پر جب کہ وہ ایک لاکھ کا درجہ رکھتی ہے'' بلند درجہ رکھتی ہے جیسا کہ منی میں آٹھ ذی الحج کی نمازیں حاجیوں کیلئے مسجد حرام میں ادا کرنے سے افضل ہیں، حالانکہ منی میں ادا کی ہوئی ایک نماز کا ثواب ایک کا ہی حاصل ہوگا، لیکن وہ ایک کا ثواب اس دن ایک لاکھ کے ثواب پر بھاری ہوگا۔

(۴) **ومنها بالاحوال فان الصلوة بالجماعة افضل من صلوة الشخص وحده"**

بلند درجہ حاصل ہونے کی اور وجہ یہ ہے کہ بعض احوال فضیلت کا سبب ہوتے ہیں، کیونکہ جماعت سے نماز ادا کرنا کیلئے نماز ادا کرنے سے افضل ہے۔

(۵) **ومنها بنفس الاعمال فان الصلوة افضل من اماطة الاذی"**

کبھی اعمال بعض دوسرے بعض پر فضیلت رکھتے ہیں، جن کی وجہ سے درجات کی بلندی حاصل ہوتی ہے، جیسا کہ نماز ادا کرنا افضل ہے بنسبت اس کے کہ ایذاء پہنچانے والی چیز کو راستہ سے ہٹا دیا جائے۔

(۶) **ومنها فی العمل الواحد فالمتصدق علی رحمه صاحب صلة رحم رصدقة، وكذا من اهدی هدية لشريف من اهل البيت افضل من ان يهدی لغيره واحسن اليه"**

بعض اوقات ایک ہی عمل ہوتا ہے، لیکن وہ مختلف حیثیات سے مختلف درجات رکھتا ہے، جیسا کہ صدقہ کرنا اپنے ذی رحم پر زیادہ فضیلت رکھتا ہے بنسبت غیر کو صدقہ ادا کرنے سے، اسی طرح ہدیہ دینا اپنے اقرباء اور اپنے گھر والوں کو افضل ہے اوروں کو دینے سے، کیونکہ اپنوں پر احسان کرنا افضل ہے غیروں سے۔

خوش قسمت انسان:

ومن الناس من يجمع فی الزمن الواحد اعمالا كثيرة فيصرف سمعه وبصره ويده فيما ينبغی فی زمان صومه وصدقته بل فی زمان صلوته فی زمان ذكره فی زمان نيته من فعل وترک فيؤجر فی الزمان الواحد من وجوه كثيرة فيفضل غيره ممن ليس كذلک"

بعض خوش قسمت انسان ہوتے ہیں جو ایک ہی زمانے میں کثیر اعمال جمع کر لیتے ہیں، کان ان کے نیکی کی

باتوں کو سنتے ہیں، نظران کی نیکی کے کاموں کی طرف اٹھتی ہے، وہ اپنے ہاتھوں سے بھی نیک کام کرتے ہیں، روزہ بھی رکھتے ہیں اور صدقہ بھی کرتے ہیں، نماز بھی ادا کرتے ہیں، رب تعالیٰ کا ذکر بھی کرتے ہیں، وہ ایک ہی وقت میں بہت ہی زیادہ نیکیاں حاصل کر لیتے ہیں، لیکن جن کو یہ مقام حاصل نہیں وہ اس سے محروم رہتے ہیں۔

بضاعت بچند اکہ آری بری　　　اگر مفلسی شرمساری بری

جتنا نیکیوں کا سرمایہ لائے گا اتنا ہی بلند مقام حاصل کرے گا　　اگر نیکیوں کے سرمایہ سے خالی رہا تو شرمندگی اٹھائے گا۔

❁ قال رسول الله ﷺ لیس من یوم یأتی علی ابن آدم الاینادی فیه یاابن آدم اناخلق جدید وانا فیما نعمل علیک غدا شهید، فاعمل فی خیر اشهدلک به غدافانی لو قدمضیت لم ترنی ابداویقول الله مثل ذلک"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، انسان کو ہر دن اور ہر رات پکارا جاتا ہے، اے ابن آدم ہم نئی خلق میں ہوتے ہیں، ہم تجھ پر کل گواہ ہوں گے جو تو عمل کرتا رہا، میری رضاء کیلئے اچھے عمل کر، تاکہ میں کل ان کو تجھ پر گواہ بناؤں، اگر تو میری رحمت سے محروم رہا تو وہ رحمت تجھے کبھی نظر نہیں آئے گی۔

پیاری نصیحت:

فاعمل یااخی عمل من یعلم انه راجع الی الله وقادم علیه یجازی علی الصغیر والکبیر والقلیل والکثیر"

اے میرے بھائی اس دنیا میں اچھے عمل کرلے، جب تو جانتا بھی ہے کہ تیرے اعمال تیرے رب کے حضور پیش ہونے ہیں، اس لئے نیکی کے اعمال کی طرف پیش پیش ہو کہ رب تعالیٰ کی طرف سے ہر چھوٹے اور بڑے، تھوڑے اعمال اور زیادہ اعمال پر تجھے جزا دی جائے گی۔ (روح البیان ج ۲ ص ۱۱۹، ۱۲۰)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ○(آیۃ نمبر ۱۶۴)

(1) بیشک اللہ کا بڑا احسان ہوا مسلمانوں پر کہ ان میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے، اور انہیں کتاب وحکمت سکھاتا ہے اور وہ ضرور اس سے پہلے گمراہی میں تھے۔ (کنزالایمان)

(2) تحقیق قسم ہے بڑا احسان کیا اللہ نے ایمان والوں پر، جب ان میں، ایک رسول معظم بھیجا ان کی جانوں میں سے، وہ تلاوت کرتا ہے ان پر اس کی آیتیں، اور پاک کرتا ہے ان کو، اور سکھاتا ہے ان کو کتاب وحکمت، اور بیشک وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔ (نجوم الفرقان)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ کا ترجمہ راقم نے کیا ہے "تحقیق قسم ہے بڑا احسان کیا اللہ نے ایمان والوں پر۔" یہ ترجمہ روح المعانی سے لیا گیا ہے اور طلباء کرام یہ بھی یاد رکھیں کہ "لَقَدْ" میں لام موطأ للقسم ہے

"والجملة جواب قسم محذوف ای واللہ "لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ"

یہاں قسم محذوف ہے، اور " مَنَّ اللّٰهُ" جملہ جواب قسم ہے" معنوی طور پر عبارت یوں ہوگی ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ قسم ہے اللہ کی تحقیق بڑا احسان کیا اللہ نے ایمان والوں پر۔ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ فرمایا "بڑا احسان ہوا" یہ ترجمہ قرطبی کے ان الفاظ سے لیا گیا۔ "بین اللہ تعالی عظیم منة علیهم ببعثه محمدا" کو مبعوث فرما کر بہت بڑا احسان کیا" اور " رَسُوْلً" کا ترجمہ "راقم" نے کیا "ایک رسول معظم" کیونکہ "رَسُوْلً" پر تنوین تعظیم کیلئے ہے۔ یہ ترجمہ روح المعانی کے ان الفاظ میں دیکھئے" رَسُوْلًا "عظیم القدر، جلیل الشان" عظیم قدر والے اور جلیل شان والے رسول کو بھیجا۔ اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ﴿ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴾ کا ترجمہ کیا ہے۔ "اور وہ ضرور اس سے پہلے گمراہی میں تھے" "راقم" نے بھی تقریباً یہی ترجمہ نقل کیا ہے، یہ ترجمہ بھی روح المعانی کی اس عبارت میں دیکھئے۔

"(وان)هی المخففة واللام هی الفارقة، والمعنی ان الشان کانوا من قبل الخ" والی

هذا ذهب بعض المحققین و ذکر مثله مکی الا انه قال "التقدیر و انهم کانوا من قبل فجعل اسمها ضمیرا عائدا علی المؤمنین"

یعنی "ان "حقیقت میں حرف مشبہ بالفعل ہے،اوراس میں"نون"مشدد ہے،لیکن مخفف کرکے ساکن کردیا ہےاسی وجہ سےاس کے بعد"لام "لفی" پرداخل کیا گیا ہے،تاکہ اس سے پتہ چل جائے کہ یہ "ان"مخففة من المثقلة" ہے۔ مقفین کا یہی قول ہے۔کہ "ان " کا اسم ضمیر شان ہے،اصل میں "انھم" تحقیق" بے شک"ضرور وہ اس پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔ (روح المعانی ج ۳ص ۱۱۲)

طلباء کرام یہ بھی خیال رکھیں کہ ایک ترکیب میں اس جملہ کو" حالیہ" بنایا گیا ہے،اس کے مطابق ترجمہ یہ ہوگا "حالانکہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔ (روح المعانی) ج ۳ص ۱۱۵)

اور قرطبی میں ایک ترکیب اور بھی بیان کی گئی ہے کہ"ان" نافیہ ہے،"ما" کے معنی میں،اور"الا" محذوف ہے،اس صورت میں معنی یہ ہوگا﴿مَا كَانُوْا مِنْ قَبْلُ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴾ نہیں تھے اس سے پہلے مگر وہ کھلی گمراہی میں۔ (قرطبی ج ۴ص ۲۶۵)

ماقبل سے تعلق:

چند وجوہ سے ماقبل سے رابطہ قائم کیا گیا ہے۔

(۱) اس سے پہلی آیہ کریمہ میں ایک قول بیان کیا گیا کہ بعض جہال ومنافقین نے ایک چادر کے گم ہونے پر (معاذ اللہ)اس خیانت کی نسبت نبی کریم ﷺ کی طرف کردی،تورب تعالی اس کارد کیا کہ نبی کی شان کے لائق نہیں کہ وہ خیانت کریں۔تو اس آیہ کریمہ میں اس کی مزید تاکید کی،کہ یہ رسول معظم تمہارے شہر میں پیدا ہوئے،تم میں آپ نے جوانی گزاری

"ولم یظهر منه طول عمره الا الصدق والامانة والدعوة الی الله والا عراض عن الدنیا فکیف یلیق بمن هذا حاله الخیانة"

اتنی عمر میں یعنی چالیس سال کے بعد اعلان نبوت فرمایا کیا ان چالیس سالوں میں تم نے ان میں سوائے سچائی اور امانت کے کچھ دیکھا،ہاں ہاں آپ نے تو اللہ تعالی کی وحدانیت اوراس کی عبادت کی دعوت دی خود دنیا سے اعراض کیا مقصد دنیا کا مال ودولت جمع کرنا نہیں تھا بلکہ اللہ تعالی کی رضاء کی خاطر اس کی عبادت میں مشغولیت تھی،جس ذات کے یہ اوصاف تھے بھلا اس سے خیانت ہوسکتی ہے؟نہیں نہیں وہ تو امین ہے،(معاذ اللہ) خائن نہیں۔

(۲) اللہ تعالی نے جب ان لوگوں کی خطاء کو بیان کیا کہ تم نے میرے نبی کی طرف خیانت کو منسوب کیا،یہ تمہارا

قول باطل ہے، اس میں یا جہالت کا دخل ہے یا منافقت کا۔ اس کے بعد گویا کہ رب تعالیٰ نے یوں فرمایا''

لا اقطع بذلک ولا اکتفی فی حقه بان ابین براء ته عن الخیانة والغلول ولکنی اقول ان وجوده فیکم من اعظم نعمتی علیکم فانه یزکیکم عن الطریق الباطلة ویعلمکم العلوم النافعة لکم فی دنیا کم وفی دینکم فای عاقل یخضر بباله ان ینسب مثل هذاالانسان الی الخیانة"

میں صرف اسی پر قناعت نہیں کرتا اور نہ ہی صرف اسے کافی سمجھتا ہوں کہ صرف اتنا ہی بیان کردوں کہ آپ خیانت سے پاک تھے، بلکہ میں تمہیں یہ بتاتا ہوں کہ میرے معظم نبی کا تم میں پایا جانا میرا تم پر بہت بڑا احسان ہے، تم پر میرا بڑا انعام ہے، کیونکہ میرے نبی تمہیں باطل طریقہ سے پاک کرتے ہیں۔ اور تمہیں وہ علوم سکھاتے ہیں جو تمہارے لئے دین اور دنیا میں نفع مند ہیں، تو کون سادہ شخص ہوگا جو عقل رکھنے والا ہو وہ اتنے بڑا عظیم انسان کامل، نبی محتشم کی نسبت خیانت کی طرف کرے گا؟ ہاں حقیقت یہ ہے کہ کوئی ایسا جملہ زبان پر لانا جس سے مصطفیٰ کریم ﷺ کی شان میں حرف آئے، اس سے اپنی عاقبت کو ہی برباد کرنا ہے، آپ کی شان کو تو رب قدوس بیان کرتا ہے، دنیا والا آپ کی شان کو بیان کرے تو وہ خوش قسمت ہے، اور نہ بیان کرے تو وہ بدقسمت ہے۔ بات تو اتنی ہی ہے۔ (راقم)

(۳) **کأنه تعالیٰ یقول انه منکم ومن اهل بلدکم ومن اقاربکم وانتم ارباب الخمول والدناء ة فاذا شرفه الله تعالیٰ وخصه بمزایا الفضل والاحسان من جمیع العالمین حصل لکم شرف عظیم بسبب کونه فیکم فطعنکم فیه واجتهاد کم فی نسبة القبائح الیه علی خلاف العقل"**

رب تعالیٰ نے گویا کہ یوں بیان فرمایا کہ میرے نبی تم میں سے ہیں۔ اے عربیو میرے نبی تمہارے شہر تمہارے علاقہ کے ہیں۔ میرے نبی تمہارے رشتہ دار ہیں۔ لیکن تم گمنام تھے تم گھٹیا تھے، یعنی خاندانی بلندی بیشک تمہیں حاصل تھی لیکن کفر نے تمہیں گھٹیا بنا رکھا تھا، تمہارا اسلامی چرچا نہیں تھا، کافر خواہ مشہور بھی ہو وہ اللہ کے ہاں گمنام ہوتا ہے، سب جہان والوں پر جب اللہ تعالیٰ نے تمہارے ہی خاندان سے ایک فرد عظیم کو مشرف بنایا، بہت بڑے فضل سے نوازا، اور اس ذات کو اپنے خصوصی انعام واحسان سے نواز، تو اس محسن انسانیت کی وجہ سے تمہیں بھی بڑی شرافت مل گئی، تمہارا مرتبہ بھی بلند ہوگیا، اسلام میں تمہارا چرچا ہوگیا، کیونکہ وہ میرے معظم نبی تم میں موجود ہیں، تمہارے خاندان سے ہیں۔ لھذا کوئی مسلمان آپ کی شان میں نازیبا الفاظ بول کر اپنے آپ کو جہنم کا ایندھن نہ بنائے ہاں منافق تو منافق ہے، اسلام کا لبادہ اوڑھ کر، شان مصطفیٰ کریم ﷺ میں ایسے الفاظ ذکر کرے، جن میں گستاخی کا پہلو نکلے اور آپ کی

شان میں بلند وبالا الفاظ استعمال کرنے سے وہ آگ بگولا ہو جائے تو اس کا طریقہ ہی یہی ہے، وہ ہے ہی منافق، مؤمن اور منافق میں فرق کو پہچانئے۔ (راقم)

(۴) جب نبی کریم ﷺ کو رب تعالی نے شرافت ومنقبت عطاء فرمائی، اور آپ کی وجہ سے آپ کی امت کو شرافت ومنقبت حاصل ہوگئی "وجب علی کل عاقل ان بعینه باقصی مایقدر علیه" تو ضروری ہے ہر عقلمند شخص کیلئے کہ وہ نبی کریم ﷺ کی اپنی قدرت وسعت کے مطابق زیادہ سے زیادہ امداد کرے۔

"فوجب علیکم ان تحاربوا اعداء ہ وان تکونوا معه بالید واللسان والسیف والسنان والمقصود منه العود الی ترغیب المسلمین فی مجاهدة الکفار"

لھذا تم پر واجب ہے کہ تم نبی کریم ﷺ کے دشمنوں یعنی کفار سے لڑائی کرو، اور نبی کریم ﷺ کا ہاتھ اور زبان اور تلوار اور نیزے سے ساتھ دو، آیۃ کریمہ کے مقاصد میں سے ایک یہ مقصد بیان کرنا بھی مقصود ہے کہ مسلمانوں کو کفار سے جہاد کرنے کی رغبت دلائی جائے۔ (کبیر ج۹ ص ۷۷، ۷۸)

لفظ "مَنٌّ" کے معانی:

"واصل المن القطع" اصل میں "من" جو بنی اسرائیل پر آسمانوں سے نازل ہوا ﴿وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى﴾ (اور ہم نے نازل کیا تم پر من اور سلوی)

(۲) "وثانیها ان تمن بما اعطیت" دوسرا معنی ہے کسی پر احسان کر کے جتلانا، رب تعالی نے ارشاد فرمایا، "لاتبطلوا صدقاتکم بالمن والاذی" (نہ باطل کرو تم اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور ایذاء پہنچا کر)

(۳) وثالثها القطع تیسرا معنی ہے قطع کرنا، ارشاد باری تعالی ہے ﴿فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ﴾ (سورۃ التین، آیۃ نمبر ۶) انہیں بے حد ثواب ہے، (سورۃ القلم، آیۃ نمبر ۳) اور ضرور تمہارے لئے بے انتہاء ثواب ہے) یعنی آپ کیلئے منقطع نہ ہونے والا اجر ہے۔

(۴) "ورابعها الانعام والاحسان الی من لاتطلب الجزاء منه" چوتھا معنی "من" کا یہ لیا گیا ہے کہ انعام واحسان کرنا جس کی جزاء نہ طلب کی جائے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (سورۃ ص، آیۃ نمبر ۲۹)

یہ ہماری عطاء ہے اب تو چاہے تو احسان کر یا روک رکھ تجھ پر کچھ حساب نہیں۔ (کنز الایمان)

اور ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ﴾ اور زیادہ لینے کی نیت سے کسی پر احسان نہ کرو۔

فائدہ: یہاں چوتھا معنی معتبر ہے یعنی رب تعالیٰ کا مومنین پر بہت بڑا انعام، بہت بڑا فضل واحسان ہے کہ اس نے ان میں اپنے رسول معظم کو مبعوث فرمایا، جس پر اس نے کوئی اجر طلب نہیں کیا، بھلا اتنے بڑے انعام پر کوئی اجر دے بھی سکتا ہے، نہیں نہیں کسی کے بس کی بات ہی نہیں کہ وہ اس احسان عظیم کا بدلہ دے سکے۔ (راقم)

بعثت رسول کل جہانوں پر احسان ہے:

"ان بعثة الرسول احسان الی کل العالمین" بیشک رسول اللہ ﷺ کو رب تعالیٰ کا بھیجنا تمام جہانوں پر احسان عظیم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو اس لئے مبعوث فرمایا گیا کہ آپ ان کو اس راہ حق کی دعوت دیں جو ان کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے چھڑائے اور ثواب تک پہنچائے۔

وهذا عام فی حق العالمین لأنه مبعوث الی کل العالمین، کما قال الله تعالی ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ﴾

یہ احسان عظیم سب جہانوں کی مخلوق پر ہے، کیونکہ آپ کو تمام جہانوں کا رسول بنا کر بھیجا گیا۔

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾ (سورۃ سبا، آیۃ نمبر ۲۸)

اور اے محبوب ہم نے تم کو نہ بھیجا مگر ایسی رسالت سے جو تمام آدمیوں کو گھیرنے والی ہے، خوشخبری دیتا اور ڈر سناتا، لیکن بہت لوگ نہیں جانتے۔ (کنز الایمان)

اس آیہ کریمہ کے ﴿وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾ سے ہی مسئلہ کھل کر واضح ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ تمام مخلوق کے رسول ہیں کیونکہ انسان اشرف المخلوقات ہے، جب آپ تمام انسانوں کے رسول ہیں تو یقیناً تمام مخلوق کے رسول ہیں، اسلئے آپ کا تشریف لانا تمام انسانوں پر احسان عظیم ہے

"لما لم ینتفع بهذا الانعام الا اهل الاسلام فلهذا التاویل خص تعالی هذا المنة بالمؤمنین"

لیکن اس عظیم انعام سے نفع اہل اسلام نے حاصل کیا، اکثر لوگوں نے آپ کو نہ جانا کہ آپ سید الکائنات ہیں، آپ محسن عظیم ہیں تو وہ اپنی اس غفلت کی وجہ سے آپ کے انعام واحسان سے کامل فائدہ حاصل نہ کر سکے اسی وجہ سے ایمان والوں کا خصوصی ذکر کیا گیا، یہ اسی طرح ہے جیسا کہ قرآن پاک کے متعلق فرمایا "هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ" مع انه هدى للکل، کما قال الله تعالی "هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ" یہ ہدایت ہے پرہیزگاروں کیلئے، حالانکہ قرآن پاک تمام لوگوں کیلئے ہدایت ہے، کیونکہ رب تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا "هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ" کہ قرآن پاک تمام لوگوں کیلئے ہدایت

ہے، لیکن اس ہدایت کو قبول کرنے والے متقین تھے، اس لئے ان کا خصوصی ذکر "هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" سے کر دیا۔

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا﴾ (سورۃ النازعات، آیہ نمبر ۴۵)

تم تو فقط اسے ڈرانے والے ہو جو اس سے ڈرے، حالانکہ ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ تمام لوگوں کیلئے نذیر (ڈرانے والے) کا ذکر ہے، لیکن اس ڈر سے فائدہ ان لوگوں نے ہی حاصل کیا جن کو خوف خدا حاصل ہوا۔

(ماخوذ از کبیر ج۹ ص ۷۸)

تمام رسولوں کی بعثت احسان ہے لیکن احسان عظیم بعثت مصطفیٰ ﷺ ہے:

اعلم ان بعثة الرسول احسان من الله الى الخلق ثم انه لما كان الانتفاع بالرسول اكثر كان وجه الانعام فى بعثة الرسل اكثر"

تمام رسولوں کا بھیجنا اللہ تعالیٰ کا مخلوق پر احسان ہے لیکن ہمارے رسول اللہ ﷺ احسان عظیم ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ رسولوں کی وجہ سے لوگوں کو نفع حاصل ہوا جس کی وجہ سے وہ ان کے محسن ٹھہرے، جب سب سے زیادہ نفع زیادہ انسانوں کو نبی کریم ﷺ سے حاصل ہوا تو آپ کا محسن عظیم ہونا بھی روز روشن کی طرح واضح ہو گیا۔ (کبیر ج۹ ص ۷۸)

آپ کی بعثت کے احسان عظیم ہونے پر دو وجہ سے دلیل:

"احدهما المنافع الحاصلة من اصل البعثة" ایک دلیل یہ ہے کہ آپ کو بھیجنے میں ہی منافع حاصل ہیں، یعنی آپ کی اصل بعثت میں منافع پائے گئے۔ "والثانى المنافع الحاصلة بسبب مافيه من الخصال التى ماكانت موجودة فى غيره" دوسری دلیل یہ ہے کہ آپ کی صفات خصوصیہ وہ ہیں جو دوسروں کو حاصل نہیں، ان صفات کی وجہ سے مخلوق کو منافع حاصل ہیں۔

اصل بعثت کی وجہ سے منافع:

''رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا'' ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ (سورۃ النساء، آیہ نمبر ۱۶۵) رسول بشارت دیتے اور ڈر سناتے تا کہ لوگوں کو اللہ کے ہاں رسولوں کے بعد حجت نہ رہے۔

بعثت رسول سے انتفاع کی چند وجوہ:

(۱) مخلوق پیدائشی طور پر صفت نقصان میں ہوتی ہے، اور اس میں سمجھ کی کمی ہوتی ہے۔ بلکہ عقل ابتدائی طور پر نہ

ہونے کے برابر ہوتی ہے

"فهو صلوات الله علیه والسلام اورد علیهم وجوه الدلائل ونقحها و کلما خطربیا لهم شک اوشبهة ازالها واجاب عنها"

تو اللہ تعالی کے رسول ﷺ ان پر دلائل قائم کرتے ہیں۔خالص اور پختہ دلائل ہوتے ہیں، جب بھی ان کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہیں تو وہ ان کو زائل کرتے ہیں۔

(۲) مخلوق کو اگر چہ معلوم ہوتا ہے کہ مولی کی خدمت کرنی چاہیے، لیکن وہ خدمت کی کیفیت کو نہیں جانتے کہ خدمت کا حق کسی طرح بجالایا جائے،

"فهو ﷺ شرح تلک الکیفیة لهم حتی یقدموا علی الخدمة آمنین من الغلط و من الاقدام علی مالاینبغی"

تو نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالی نے مبعوث فرمایا جنہوں نے اس کیفیت کی ان کیلئے وضاحت فرمائی، تاکہ وہ اپنے مولی کی خدمت کا حق اس طرح بجالانے کا حق ہے۔اور وہ اس خدمت کی غلطی سے محفوظ رہیں۔اور نامناسب طریقہ کی طرف قدم نہ بڑھائیں۔

(۳) مخلوق میں سستی، غفلت، کسی کام میں تاخیر اور ملال پیدائشی طور پر پائے جاتے ہیں۔

"فهو ﷺ یورد علیهم انواع الترغیبات والترهیبات حتی انه کلما عرض لهما کسل اوفتور نشطهم للطاعة ورغبهم فیها"

تو اللہ تعالی نے نبی کریم ﷺ کو مبعوث فرمایا، جنہوں نے ان کو نیکی کے کاموں کی رغبت دلائی، اور گناہوں سے ڈرایا ، یہاں تک کہ جب ان کو سستی یا فتور عارضی ہوئے تو نبی کریم ﷺ نے ان کو طاعت کیلئے چست کیا، اور ان کو ان کاموں کی رغبت دلائی۔

(۴) مخلوق کے عقل کے انوار بصر کے انوار کے قائم مقام ہوتے ہیں۔نظر کے نور سے انسان اس وقت تک فائدہ حاصل نہیں کرسکتا جب تک سورج کی روشنی نہ ہو۔

"ونوره ﷺ عقلی الهی یجری مجری طلوع الشمس فبقوی العقول بنور عقله ویظهر لهم من لوائح الغیب ماکان مستترا عنهم قبل ظهوره فهذا اشارة حقیقیة الی فوائد اصل البعثة"

نبی کریم ﷺ کا نور عقل الہی ہے جو دنیا میں روشنی بکھیر رہا ہے جیسا کہ سورج سے روشنی سے دن روشن ہو جاتا ہے، اسی

طرح نبی کریم ﷺ جو عقل الٰہی ہیں آپ کے نور سے لوگوں کی عقلوں کو قوت حاصل ہوتی ہے۔ آپ کی تشریف آوری سے پہلے جو چیزیں لوگوں پر غائب تھیں وہ آپ کے آنے سے ان پر ظاہر ہو گئیں۔ یہ آپ کی اصل بعثت کے فوائد اسی آیۃ کریمہ سے حاصل ہوئے۔ (کبیر ج۹ص ۷۸، ۷۹،)

سبحان اللہ! کیا خوب علامہ رازی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ آپ کے آنے سے لوگوں پر غیبی چیزوں کو ظاہر کر دیا، یعنی آپ کے وسیلہ جلیلہ سے آپ کی امت کو بھی بعض علوم غیبیہ عطاء کر دئے گئے، عجیب ہیں ان لوگوں کے نظریات جو نبی کریم ﷺ کے علوم غیبیہ میں شک میں مبتلاء رہ کر اپنی عاقبت کو برباد کرتے رہتے ہیں۔

آپ کی صفات سے حاصل ہونے والے فوائد:

(۱) اس آیۃ کریمہ میں بیان فرمایا "مِنْ اَنْفُسِهِمْ" (کہ آپ ان سے ہی تشریف لائے) جب نبی کریم ﷺ ان کے شہر میں پیدا ہوئے اور ان لوگوں میں ہی آپ نے پرورش پائی وہ آپ کے تمام افعال واقوال (آپ کے کاموں، آپ کی باتوں) پر مطلع تھے، انہوں نے نبی کریم ﷺ کی اول عمر سے لے کر آخر عمر تک سوائے سچائی اور درگذر کے کسی چیز کا مشاہدہ نہیں کیا، کیونکہ آپ کو دنیا سے کوئی محبت نہ تھی، آپ دنیا سے دور رہتے تھے، اور جھوٹ آپ کے قریب نہیں آسکتا تھا، اور سچائی ہی آپ کا شیوہ تھی۔

"ومن عرف من احواله من اول العمر الی آخره ملازمته الصدق والامانة وبعده عن الخيانة والكذب يغلب علی ظن كل احد انه صادقه فی هذا الدعوی"

جب نبی کریم ﷺ نے نبوت کا دعویٰ فرمایا تو لوگوں کو یقین ہو گیا، بعض کو غالب گمان حاصل ہو گیا کہ آپ اپنے اس دعویٰ میں سچے ہیں کیونکہ وہ لوگ آپ کی ساری زندگی کا مطالعہ کر چکے تھے ان کو معلوم تھا کہ آپ نے ہمیشہ ہمیشہ سچ بولا، آپ نے ہمیشہ امانت کا پاس کیا، آپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، آپ نے کبھی امانت میں خیانت نہیں کی، تو آپ اپنی نبوت کے دعویٰ میں بھی یقیناً سچے ہیں۔

(۲) "مِنْ اَنْفُسِهِمْ" سے ہی اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ وہ لوگ جانتے تھے کہ آپ نے نہ ہی کسی کی شاگردی حاصل کی، اور نہ ہی کسی سے کوئی کتاب پڑھی، اور نہ ہی کسی درس میں داخلہ لیا، اور نہ ہی کسی سے اسباق کا تکرار کیا، اور بیشک آپ نے چالیس سال تک کوئی نبوت ورسالت کی بات نہیں کی، پھر چالیس کے بعد آپ نے نبوت کا دعویٰ کیا، اور آپ نے اپنی زبان مبارک سے وہ علوم ظاہر فرمائے جو جہان والوں میں سے کسی ایک نے بھی ظاہر نہیں کئے، پھر آپ نے متقدمین کے واقعات بیان فرمائے، اور پہلے انبیاء کرام کے واقعات اس طرح بیان فرمائے جیسے

ان کی کتب میں موجود تھے، ہر وہ شخص جو عقل سلیم رکھتا تھا اسے پتہ چل گیا "ان هذا لايتاتی الابالوحی السماوی والالهام الالهی" کہ بیشک آپ کو یہ علوم صرف آسمانی وحی اور الہام الٰہی سے حاصل ہوئے ہیں۔

(۳) "انه بعدا دعاء النبوة عرضوا عليه الاموال الكثيرة والازواج ليترک هذه الدعوی فلم يلتفت الی شیء عن ذلک"

آپ نے نبوت کا دعویٰ کیا تو آپ کو بہت بڑے مال کی پیشکش کی گئی، اور آپ کو یہ کہا گیا جس خاندان کی اور جس گھر کی آپ لڑکی پسند کریں آپ کو اسی سے شادی کرادی جائے گی۔ لیکن آپ یہ دعویٰ نبوت چھوڑ دیں، آپ نے ان کی ہر قسم کی پیشکش کو ٹھکرا دیا، رب تعالیٰ کے احکام لوگوں تک پہنچانے کا سلسلہ جاری رکھا، آپ نے فقر پر قناعت کی یعنی آپ نے غریبانہ زندگی بسر کرنے کو ترجیح دی، اور آپ نے ہر قسم کی مشقت پر صبر کیا۔

❁ "ولما علا امره وعظم شانه واخذ البلاد وعظمت الغنائم لم يغير طريقه فی البعد عن الدنيا والدعوة الی الله والكاذب انما يقدم علی الكذب ليجد الدنيا فاذا وجدها تمتع بها وتوسع فيها فلما لم يفعل شيئا من ذلک علم انه كان صادقا"

جب آپ کے معاملات بڑھتے چلے گئے، آپ کی عظمت شان نکھرتی چلی گئی، اور آپ نے مختلف شہروں کو فتح کرلیا، آپ کے پاس کثیر مال غنیمت آگیا، لیکن آپ جس طرح پہلے دنیا سے دور تھے اسی طرح دور رہے، اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت کا سلسلہ جاری رکھا، آپ کے طور طریقہ نہیں بدلے، جھوٹا شخص دنیا کا مال بٹورنے کیلئے مختلف جھوٹے ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے، جب وہ دنیا کا مال پالیتا ہے اور اسے مالی وسعت مل جاتی ہے، تو وہ اپنے طور طریقے بدل لیتا ہے۔ تو اسی سے واضح ہو گیا کہ میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے نبی ہیں۔

(۴) ان الكتاب الذی جاء به ليس فيه الاتقرير التوحيد والتنزيه والعدل والنبوة والبات المعاد وشرح العبادات وتقرير الطاعات ومعلوم ان كمال الانسان فی ان يعرف الحق لذاته والخير لأجل العمل به ولما كان كتابه ليس الافی تقرير هذين الامرين علم كل عاقل انه صادق فيما يقوله"

بیشک آپ نے جو کتاب رب تعالیٰ کی طرف سے پیش کی اس میں توحید اور اللہ تعالیٰ کا ہر نقص سے پاک ہونے کا تذکرہ ہے۔ عدل اور نبوت کا ذکر اس میں موجود ہے، قیامت کا ذکر اس میں پایا گیا ہے۔ عبادات کی وضاحت اور طاعات کا بیان اس میں ہے۔ اور یہ بات یقینی طور پر معلوم ہے کہ انسان کو کمال اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ حق کو لذاتہ پہچانے، اور خیر کو اس پر عمل کرنے کیلئے

پہچانے، جب اللہ تعالی کی کتاب میں ان دونوں چیزوں کا ذکر ہے یعنی حق اور خیر کا تو ہر عقلمند شخص کو معلوم ہو گیا کہ آپ اپنے دعوی نبوت میں سچے ہیں۔

(۵) نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے سے پہلے عرب حضرات کا دین سب سے گھٹیا دین تھا، کیونکہ وہ بت پرست تھے، ان کے اخلاق بڑے پست اور رذیل تھے، لوٹ مار کرنا، قتل وغارت ان کا عمل تھا، اور ردی طعام، ناپاک یعنی حرام طعام کھانا ان کا طریقہ تھا۔

"ثم لما بعث الله محمد ﷺ نقلهم الله ببركة مقدمة من تلك الدرجة التى هى اخس الدرجات الى ان صاروا افضل الأمم فى العلم والزهد والعبادة وعدم الالتفات الى الدنيا وطيباتها ولاشك ان فيه اعظم المنة"

جب اللہ تعالی نے اپنے پیارے نبی محمد رسول اللہ ﷺ کو بھیجا، تو آپ کے آنے کی برکت کی وجہ سے ان کے گھٹیا درجات جاتے رہے وہ علم وزہد اور عبادت میں تمام امتوں سے افضل ہو گئے، ان کی دنیا کی طرف توجہ ختم ہو گئی، صرف اور صرف حلال مال پر گزر اوقات کی، خواہ وہ حلال مال ان کو کم ہی حاصل ہوا ، اس میں کوئی شک نہیں، یہ یقین کے درجہ تک پہنچی ہوئی بات ہے کہ آپ کا تشریف لانا مومنوں کیلئے بہت بڑا احسان ہے۔

جب تمام وجوہ مذکورہ کا تمہیں پتہ چل گیا کہ بیشک نبی کریم ﷺ ان میں پیدا ہوئے، انہیں میں پرورش پائی، ان لوگوں نے آپ کے احوال کا مشاہدہ کیا، ان دلائل پر مطلع ہو گئے، تو ان کو آپ کے احوال کے مشاہدہ سے ایمان لانا آسان ہو گیا، اگر وہ لوگ آپ کے احوال کو نہ جانتے تو شائد ایمان لانے میں وہ مضطرب وپریشان ہوتے

"فلهذه المعانى من الله عليهم بكونه مبعوثا، فقال" "اِذْبَعَثَ فِيهِمْ رَسُوْلًا مِنْ اَنْفُسِهِمْ"

ان اسباب کی وجہ سے اللہ تعالی کا مومنوں پر بہت بڑا احسان ہے کہ اپنے رسول معظم کو ان کے نفوس سے ہی بھیجا۔

"فيه وجه آخر من المنة وذلك لانه صار شرفا للعرب وفخرا لهم، كما قال الله تعالى وانه لذكر لك ولقومك"

آپ کے تشریف لانے سے مومنوں پر اور بڑا احسان یہ بھی تھا کہ ان کو عرب میں ایک خاص شرافت حاصل ہو گئی۔ اور آپ کی وجہ سے ان کو مقام افتخار (فخر کرنے کا ذریعہ) حاصل ہو گیا۔ جیسا کہ رب تعالی نے فرمایا ﴿وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ﴾ یہ افتخار اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وجہ سے بھی حاصل تھا، لیکن وہ مومنین کے ساتھ خاص نہ تھا، بلکہ عرب اور یہود ونصاری اس میں مشترک تھے۔ پھر یہود موسی علیہ السلام اور توراۃ پر فخر کرتے تھے، اور نصرانی

عیسی علیہ السلام اور انجیل پر فخر کرتے تھے، لیکن عرب حضرات کو ان کے مقابل کوئی مقام فخر حاصل نہ تھا۔

"فلما بعث الله محمدا ﷺ وانزل القرآن صار شرف العرب بذلک زائدا علی شرف جمیع الأمم"

جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو مبعوث فرمایا اور قرآن پاک نازل فرمایا تو تمام عرب حضرات کو دوسری تمام امتوں پر شرف حاصل ہو گیا۔ یہ تمام فوائد جو ابھی تک ذکر کئے گئے ہیں یہ "مِنْ اَنْفُسِهِمْ" (انہیں سے (آپ تشریف لائے) سے حاصل ہوئے۔

ابھی بیان کیا گیا ہے کہ انسان کا کمال دو چیزوں میں ہے۔ ایک حق کو لذاتہ پہچانتے ہیں، اور دوسرا بھلائی کا حصول کہ وہ بھلائی نیکی کے کام کرے۔ اسی مسئلہ کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے "للنفس الانسانیة قوتان نظریة وعملیة" نفس انسانیت کو دو قوتیں حاصل ہیں، ایک قوت نظریہ، اور دوسری قوت عملیہ، تو اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب نازل فرما کر دونوں قوتوں کی تکمیل فرما دی۔

۞ "فقوله تعالی(يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ)اشارة ای کونه مبلغا لذلک الوحی من عند الله الی الخلق،وقوله(وَيُزَكِّيْهِمْ)اشارة تکمیل القوة النظریة بحصول المعارف الالهیة والکتاب اشارة الی محاسن الشریعة واسرارها وعللها ومنافعها"

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی: ﴿يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ﴾ "آپ تلاوت کرتے ہیں ان پر اس کی آیتیں" اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی وحی کو مخلوق تک پہنچاتے ہیں۔ یہ درحقیقت مخلوق کی قوت عملیہ کی تکمیل ہے کہ وہ کتاب اللہ کے احکام پر عمل کریں۔

اور(وَيُزَكِّيْهِمْ)(اور پاک کرتا ہے ان کو) سے اس طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ ان لوگوں کو آپ معارف الٰہیہ عطاء فرما کر ان کی قوت نظریہ کی تکمیل فرماتے ہیں۔ اور "وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ" (اور وہ سکھاتا ہے ان کو کتاب) سے اشارہ ہے معرفت تاویل کی طرف۔

"وبعبارة اخری (الْكِتٰبَ)اشارة الی ظواهر الشریعة(والحکمة)اشارة الی محاسن الشریعة واسرارها عللها ومنافعها"

اسے یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ "وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ" سے اشارہ ظاہر شریعت کی طرف ہے کہ آپ ان کو شریعت کے احکام سکھاتے ہیں، اور "وَالْحِكْمَةَ" سے اس طرف اشارہ پایا گیا ہے کہ آپ ان کو شریعت کے محاسن اور اس کے راز اور اس کی علتیں اور منافع سکھاتے ہیں۔ ان تمام نعمتوں کی تکمیل اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد گرامی سے

فرمائی ''وَاِنۡ كَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ" اور بیشک وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

"ان النعمة اذا وردت بعد المحنة كان توقعا اعظم،فاذا كان وجه النعمة العلم والاعلام وورداعقيب الجهل والذهاب عن الدين كان اعظم"

قانون یہی ہے کہ جب نعمت کا حصول محنت کے بعد ہوتو اس پر عظیم توقع مرتب ہوتی ہے،اور عظیم فوائد اس پر مرتب ہوتے ہیں، جب جہالت اور دین کے جانے کے بعد رب تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک ﷺ کے ذریعے ان کو علم عطاء فرمایا اور ان کو معلم بنایا تو یقیناً آپ ایمان والوں کیلئے بہت بڑی نعمت ثابت ہوئے۔ (ماخوذ از کبیر ج ص ۷۸تا۸۰)

میلادالنبی ﷺ کے متعلق کچھ ذکر خیر:

سب سے بڑی بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ آجکل مختلف عنوانات سے ربیع الاول میں جلسے ہو رہے ہیں، کسی کا نام ''پیغمبر انقلاب کانفرنس'' کسی کا نام ذکر'' ولادت مصطفیٰ ﷺ کانفرنس''اور کسی کا نام ''سیرت النبی ﷺ کانفرنس'' کسی کا نام، حسن قراءۃ وحمد ونعت کانفرنس یہ عنوانات ان حضرات نے قائم کر رکھے ہیں جو بات بات پر بدعت کا فتوی دیتے ہیں،اور ''میلادالنبی ﷺ'' کے نام سے کئے جانے والے جلسہ سے پتہ نہیں کیوں ناراض ہوتے ہیں، جب ان کا کوئی عنوان کسی حدیث پاک سے ثابت نہیں۔لیکن میلادالنبی ﷺ کا عنوان تو صحاح ستہ میں سے ترمذی رحمہ اللہ نے خود قائم کیا ہے۔"باب میلاد النبی ﷺ"اسی باب میں یہ حدیث ذکر کی:

"عن المطلب ابن عبد الله بن قيس بن مخرمة عن ابيه عن جده قال ولدت انا ورسول الله اعام الفيل قال وسأل عثمان بن عفان قباث بن اشيم اخابني يعمر بن ليث انت اكبرام رسول الله ﷺ فقال رسوال الله ﷺ اكبر مني وانا اقدم منه في الميلاد وقال ورأيت خذق اخضر محيل" (ترمذی ج ۲ ص ۲۰۲)

عبدالمطلب بن عبداللہ بن قیس بن مخرمہ اپنے باپ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ میری اور رسول اللہ ﷺ کی ولادت عام الفیل ابرہیہ کے ہاتھیوں پر حملہ کرنیوالے سال میں ہوئی وہ کہتے ہیں عثمان بن عفان نے بنی یعمر بن لیث کے بھائی قباث بن اشیم سے پوچھا کیا تم بڑے ہو یا رسول اللہ ﷺ بڑے ہیں؟ انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ مجھ سے بڑے ہیں۔لیکن ولادت میری آپ سے پہلے ہوئی''میں نے ابابیل پرندوں کی سبز رنگ کی بیٹ (فضلہ) متغیر (بدلی ہوئی) دیکھی۔

راقم نے کبھی کسی عنوان پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ خیال یہ ہوتا ہے کے میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ کا

ذکر ہوتا رہے خواہ کسی نام سے بھی ہوتا رہے۔ میلاد النبی ﷺ کے محافل و مجالس میں آپ کے فضائل کو ذکر کیا جاتا ہے ۔ابھی جو آیہ کریمہ زیر بحث ہے اس میں نبی کریم ﷺ کی فضیلت کا ہی ذکر تو موجود ہے، قرآن پاک نبی کریم ﷺ کے اوصاف کے ذکر سے بھرا ہوا ہے، اس کا نام میلاد النبی ﷺ کا ذکر ہی تو ہے۔

میلاد النبی ﷺ کا جلسہ جو رب تعالی نے قائم کیا:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ O (سورة آل عمران ،آیة نمبر ۸۱)

اور یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا جو میں تم کو کتاب اور حکمت دوں، پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول کہ تمہاری کتابوں کی تصدیق فرمائے تو تم ضرور بر ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور ضرور اس کی مدد کرنا فرمایا کیوں تم نے اقرار کیا اور اس پر بھاری ذمہ اٹھایا سب نے عرض کی ہم نے اقرار کیا فرمایا تو ایک دوسرے پر گواہ ہو جاؤ اور میں آپ تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں۔ (کنزالایمان)

حضرت علی ﷛ فرماتے ہیں کہ اللہ نے حضرت آدم اور ان کے بعد جس کسی کو نبوت عطاء فرمائی ان سے سید انبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ کی نسبت عہد لیا اور ان انبیاء نے اپنی قوموں سے عہد لیا کہ اگر ان کی حیات میں سید عالم ﷺ مبعوث ہوں تو آپ پر ایمان لائیں اور آپ کی نصرت کریں اس سے ثابت ہوا کہ حضور تمام انبیاء میں سب سے افضل ہیں۔ "ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ" سے مراد سید عالم ﷺ ہیں۔ "لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ" تو تم ضرور بر ضرور اس پر ایمان لانا" یعنی اس طرح ایمان لانا کہ ان کے صفات و احوال کو یوں تسلیم کرنا جو آپ کے مطابق ہوں اور کتب انبیاء کرام میں موجود ہوں۔ قرآن و حدیث میں ان کا تذکرہ ہو۔ (ماخوذ از خزائن العرفان)

آیۃ کریمہ کی مکمل تفسیر اپنے محل میں بیان ہو چکی ہے، یہ جلسہ ارواح انبیاء کرام میں کیا گیا۔

نبی ﷺ کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے:

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (سورۃ النساء، آیۃ نمبر ۸۰) "جس نے رسول کا حکم مانا بیشک اس نے اللہ کا حکم مانا"

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو راضی کیا جائے:

﴿يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾ (سورۃ التوبۃ، آیۃ نمبر ۶۲)

تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں اٹھاتے ہیں کہ تمہیں راضی کرلیں اور اللہ ورسول کا حق زائد تھا کہ اسے راضی کرتے اگر ایمان رکھتے تھے۔ (کنزالایمان)

منافقین اپنی مجالس میں سید عالم ﷺ پر طعن کیا کرتے تھے اور مسلمانوں کے پاس آکر اس سے مکر جاتے تھے اور قسمیں قسمیں اٹھا اٹھا کر اپنی بریت ثابت کرتے تھے، اس پر یہ آیۃ نازل ہوئی اور فرمایا گیا کہ مسلمانوں کو راضی کرنے کیلئے قسمیں اٹھانے سے زیادہ اہم اللہ اور اس کے رسول کو راضی کرنا تھا اگر ایمان رکھتے تھے تو ایسی حرکتیں کیوں کیں جو خدا اور رسول کی ناراض کا سبب ہوں۔

فائدہ: اس آیۃ کریمہ سے یہ پتہ چلا کہ اس وقت جلسے دو قسم کے ہوتے تھے ایک وہ جس میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف بیان ہوتے تھے، وہ جلسہ اللہ نے منعقد فرمایا، انبیاء کرام نے آپ کے اوصاف بیان کئے، صحابہ کرام نے آپ کے اوصاف کا تذکرہ کیا، خود نبی کریم ﷺ نے اپنے اوصاف اور اپنی ولادت کا ذکر کیا، محدثین کرام نے آپ کی ولادت کا ذکر کیا، جیسا کہ ترمذی کی حدیث بیان کی جا چکی ہے۔

اور دوسرا جلسہ منافقین کا ہوتا تھا جو نبی کریم ﷺ کے خلاف ان کا کلام ہوتا تھا، پھر اس کا انکار بھی کرتے تھے کہ نہیں ہم تو نبی کریم ﷺ کے اوصاف بیان کررہے تھے، آج کل بھی یہی طریقہ چلا آرہا ہے، ربیع الاول میں جلسے دو قسم کے ہی ہورہے ہیں، ایک اہل سنت وجماعت کا جس میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف وفضائل بیان ہوتے ہیں، اور کچھ حضرات کی مجالس میں کفر وشرک وبدعات کا ذکر ہوتا ہے، بتوں کے حق میں نازل ہونے والی آیات انبیاء کرام اور اولیاء کرام پر چسپاں کی جاتی ہیں، اور کافروں اور مشرکوں کے حق میں نازل ہونے والی آیات کی لپیٹ میں مسلمانوں کو لیا جاتا ہے۔ یہ ظلم عظیم نہیں تو اور کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کے میلاد کا ذکر کیا:

مجموعی طور پر تمام انبیاء کرام کا ذکر اس آیۃ کریمہ میں کیا ﴿تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ﴾ (سورۃ البقرۃ، آیۃ ۲۵۳) ''یہ رسول ہیں ہم نے فضیلت دی بعض کو بعض پر۔''

آدم کا تذکرہ آپ کی تخلیق سے پہلے یوں کیا:

﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ (سورۃ البقرۃ آیۃ نمبر ۳۰)

''آپ کی تخلیق کے بعد آپ کا ذکر رب قدوس نے یوں کیا''

﴿قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ (سورة ص ، آية نمبر ۷۵)

فرمایا اے ابلیس تجھے کس چیز نے روکا سجدہ کرنے سے اسے جسے میں نے دست قدرت سے بنایا۔

حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر فرماتے ہوئے یوں فرمایا:

﴿اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ (سورۃ نوح، آیۃ نمبر۱)

بیشک ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا کہ ان کو ڈرا اس سے پہلے کہ ان پر دردناک عذاب آئے۔ (کنز الایمان)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر یوں فرمایا:

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا﴾ (سورة مريم، آية نمبر ۴۱)

''اور کتاب میں ابراہیم کو یاد کرو بیشک وہ صدیق تھا (اور) نبی'' (کنز الایمان)

حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ﴾ (سورة هود، آية نمبر ۷۱)

''اور اس کی بی بی کھڑی تھی وہ ہنسنے لگی تو ہم نے اسے اسحاق کی خوشخبری دی اور اسحاق کے پیچھے یعقوب کی۔''

اس پہلے آیۃ نمبر ۶۹ میں یوں ذکر کیا ﴿وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ﴾ اور بیشک ہمارے فرشتے ابراہیم کے پاس مژدہ لے کر آئے، انہوں نے سلام کہا، آپ نے (بھی) سلام کہا۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا تذکرہ یوں کیا:

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا﴾ (سورۃ مریم، آیۃ نمبر۵۴)

''اور کتاب میں اسمٰعیل کو یاد کرو بیشک وہ وعدے کا سچا تھا اور رسول تھا غیب کی خبریں بتاتا'' (کنز الایمان)

حضرت ادریس علیہ السلام کا ذکر یوں فرمایا:

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ۝﴾ (سورۃ مریم، آیۃ نمبر ۵۷،۵۶)

اور کتاب میں ادریس کو یاد کرو بیشک وہ صدیق تھا غیب کی خبریں دیتا، اور ہم نے اسے بلند مکان پر اٹھالیا۔

حضرت اسمعیل، حضرت ادریس اور حضرت ذوالکفل علیهم السلام کا تذکرہ یوں کیا:

﴿وَاِسۡمٰعِیۡلَ وَاِدۡرِیۡسَ وَذَاالۡکِفۡلِ کُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِیۡنَ O وَاَدۡخَلۡنٰهُمۡ فِیۡ رَحۡمَتِنَا اِنَّهُمۡ مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ﴾ (سورة الانبياء، آية نمبر ۸۵، ۸۶)

اور اسماعیل اور ادریس اور ذوالکفل کو یاد کرو وہ سب صبر والے تھے، اور انہیں ہم نے اپنی رحمت میں داخل کیا بیشک وہ ہمارے قرب خاص کے سزاواروں میں ہیں۔ (کنزالایمان)

حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیهم السلام کا ذکر یوں کیا:

﴿وَزَکَرِیَّا اِذۡ نَادٰی رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرۡنِیۡ فَرۡدًا وَّاَنۡتَ خَیۡرُ الۡوٰرِثِیۡنَ O فَاسۡتَجَبۡنَا لَهٗ وَوَهَبۡنَا لَهٗ یَحۡیٰی﴾ (سورة الانبياء، آية نمبر ۸۹، ۹۰)

''اور (یاد کرو) زکریا کو جب اس نے اپنے رب کو پکارا اے میرے رب! مجھے اکیلے نہ چھوڑ اور تو سب سے بہتر وارث ہے، تو ہم نے اس کی دعاء قبول کی اور اسے یحییٰ عطاء فرمایا۔''

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیهم السلام کا ذکر یوں فرمایا:

﴿وَاذۡکُرۡ فِی الۡکِتٰبِ مُوۡسٰۤی اِنَّهٗ کَانَ مُخۡلَصًا وَّکَانَ رَسُوۡلًا نَّبِیًّا O وَنَادَیۡنٰهُ مِنۡ جَانِبِ الطُّوۡرِ الۡاَیۡمَنِ وَقَرَّبۡنٰهُ نَجِیًّا O وَوَهَبۡنَا لَهٗ مِنۡ رَّحۡمَتِنَاۤ اَخَاهُ هٰرُوۡنَ نَبِیًّا﴾

اور کتاب میں موسیٰ کو یاد کرو بیشک وہ چنا ہوا تھا اور رسول تھا غیب کی خبریں بتانے والا، اور اسے ہم نے طور کی داہنی جانب سے ندا فرمائی اور اسے اپنے راز کہنے کو قریب کیا، اور اپنی رحمت سے اس کا بھائی ہارون عطاء کیا غیب کی خبریں بتانے والا نبی۔ (کنزالایمان، سورۃ مریم آیہ نمبر ۵۱ تا ۵۳)

حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر یوں فرمایا:

﴿وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَا دَاوٗدَ وَسُلَیۡمٰنَ عِلۡمًا وَقَالَا الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡ فَضَّلَنَا عَلٰی کَثِیۡرٍ مِّنۡ عِبَادِهِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ O وَوَرِثَ سُلَیۡمٰنُ دَاوٗدَ﴾ (سورة النمل آیة نمبر ۱۵، ۱۶)

''اور بیشک ہم نے داود اور سلیمان کو بڑا علم عطاء کیا اور دونوں نے کہا سب خوبیاں اللہ کو جس نے ہمیں اپنے بہت سے ایمان والے بندوں پر فضیلت بخشی، اور سلیمان داود کا جانشین ہوا۔''

حضرت ایوب علیہ السلام کا ذکر فرمایا:

﴿وَاذۡکُرۡ عَبۡدَنَاۤ اَیُّوۡبَ اِذۡ نَادٰی رَبَّهٗۤ اَنِّیۡ مَسَّنِیَ الشَّیۡطٰنُ بِنُصۡبٍ وَّعَذَابٍ﴾ (سورۃ ص آیہ نمبر ۴۱)

''اور یاد کرو ہمارے بندہ ایوب کو جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے شیطان نے اور ایذ الگادی''

حضرت یسع علیہ السلام کا ذکر یوں فرمایا:

﴿وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَاالْكِفْلِ وَكُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ○﴾ (سورۃ ص آیۃ نمبر ۴۸)

اور یاد کرو اسماعیل اور یسع اور ذوالکفل کو اور سب اچھے ہیں۔

حضرت عیسی، حضرت الیاس، حضرت یونس اور انبیاء کرام کا تذکرہ یوں کیا:

"وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ○ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ كُلًّا هَدَيْنَا وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ○ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ○ (سورۃ الانعام، آیۃ نمبر ۸۳ تا ۸۶)

''اور یہ ہماری دلیل ہے کہ ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم پر عطاء فرمائی، ہم جسے چاہیں درجوں بلند کریں، بے شک تمہارا رب علم و حکمت والا ہے، اور ہم نے انہیں اسحاق اور یعقوب عطاء کئے ان سب کو ہم نے راہ دکھائی، اور ان سے پہلے نوح کو راہ دکھائی اور اس کی اولاد میں سے داود اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو اور ہم ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔ اور زکریا اور یحیی اور عیسی اور الیاس کو یہ سب ہمارے قرب کے لائق ہیں۔ اور اسماعیل اور یسع اور یونس اور لوط کو اور ہم نے ہر ایک کو اس کے وقت میں سب پر فضیلت دی۔''

تمام انبیاء کرام کا ذکر یوں فرمایا:

"وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ○" (سورۃ النساء آیۃ نمبر ۱۶۴)

اور کچھ رسولوں کا ذکر ہم نے آپ سے کر دیا، اور کچھ رسولوں کا ذکر ہم نے آپ سے نہیں کیا، اور موسیٰ سے حقیقی طور پر کلام فرمایا۔

اور ذکر یوں کیا:

﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ (سورۃ الانعام، آیۃ نمبر ۱۲۴)

''اللہ خوب جانتا ہے جہاں اپنی رسالت رکھے،

محافل میلاد النبی ﷺ میں کیا ہوتا ہے؟:

نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت کی مجالس میں آپ کے اوصاف کا ذکر ہوتا ہے، آپ کے معجزات کا ذکر ہوتا ہے، آپ کی نعت خوانی اور صلوۃ وسلام ہوتا ہے۔ ابھی تک جن آیات کو ذکر کیا ان میں انبیاء کرام کا ذکر خیر موجود ہے، صرف ایک ایک مثال پیش کی گئی، ورنہ ذکر انبیاء کرام میں کئی کئی آیات کریمہ کا ذکر ہے۔ راقم کی کتاب **''تذکرۃ الانبیاء''** کا مطالعہ کرو تو آپ کو پتہ چل جائے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کے کتنے کتنے اوصاف ذکر فرمائے جو ایک جزء ہے محفل میلاد النبی ﷺ کا۔

آیئے ذرا دیکھئے:

رب تعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کا ذکر اس انداز پر کیا کہ جس سے محفل میلاد النبی ﷺ کا سارا نقشہ نظر آجاتا ہے۔ ﴿یٰزَکَرِیَّا اِنَّا نُبَشِّرُکَ بِغُلٰمِ اسْمُهٗ یَحْیٰی لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِیًّا﴾ '' اے زکریا ہم تجھے خوشی سناتے ہیں ایک لڑکے کی جن کا نام یحییٰ ہے اس کے پہلے ہم نے اس نام کا کوئی نہ کیا۔ ﴿قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّکَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْکِبَرِ عِتِیًّا﴾ عرض کی اے میرے رب میرے لڑکا کہاں سے ہوگا میری عورت تو بانجھ ہے اور میں بڑھاپے سے سوکھ جانے کی حالت کو پہنچ گیا۔ ﴿قَالَ کَذٰلِکَ قَالَ رَبُّکَ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُکَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَکُ شَیْئًا﴾ فرمایا ایسا ہی ہے، تیرے رب نے فرمایا وہ مجھے آسان ہے، اور میں نے تو اس پہلے تجھے اس وقت بنایا جب تو کچھ بھی نہ تھا۔ ﴿قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْ اٰیَةً قَالَ اٰیَتُکَ اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا﴾ عرض کی اے میرے رب مجھے کوئی نشانی دیدے فرمایا تیری نشانی یہ ہے کہ تو تین رات دن لوگ سے کلام نہ کرے بھلا چنگا ہوکر۔ ﴿فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰی اِلَیْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُکْرَةً وَّعَشِیًّا﴾ تو اپنی قوم پر مسجد سے باہر آیا تو انہیں اشارہ سے کہا کہ صبح وشام تسبیح کرتے رہو۔ ﴿یٰیَحْیٰی خُذِ الْکِتٰبَ بِقُوَّةٍ وَّاٰتَیْنٰهُ الْحُکْمَ صَبِیًّا﴾ اے یحییٰ کتاب مضبوط تھام، اور ہم نے اسے بچپن ہی میں نبوت دی ﴿وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَکٰوةً وَّکَانَ تَقِیًّا﴾ اور اپنی طرف سے مہربانی اور ستھرائی اور کمال ڈر والا تھا۔ ﴿وَّبَرًّا بِوَالِدَیْهِ وَلَمْ یَکُنْ جَبَّارًا عَصِیًّا﴾ اور اپنے ماں باپ سے اچھا سلوک کرنے والا تھا زبردست ونافرمان نہ تھا ﴿وَسَلٰمٌ عَلَیْهِ یَوْمَ وُلِدَ وَیَوْمَ یَمُوْتُ وَیَوْمَ یُبْعَثُ حَیًّا﴾ اور سلامتی ہو اس پر جس دن پیدا ہوا اور

جس دن مرے گا اور جس دن مردہ اٹھایا جائے گا۔ (سورۃ مریم، آیہ نمبر ۷ تا ۱۵) (ترجمہ کنزالایمان)

ان آیات کریمہ کو پڑھیے، بار بار پڑھیے، انصاف کی نگاہ سے دیکھیے، کیا رب تعالی نے حضرت زکریاؑ کو ان کے بیٹے حضرت یحییٰؑ کی پیدائش کی خبر نہیں دی؟ یقیناً خبر دی ہے۔ پھر خود ہی رب تعالی نے نام بھی رکھا اور بتایا کہ اس سے پہلے کوئی یحییٰ نہیں تھا، یہ پہلا نام ہی یحییٰ آپ کے سامنے آیا ہے۔ جب حضرت زکریاؑ نے بیٹے کی پیدائش پر خوشخبری پر تعجب کرتے ہوئے رب تعالی کے حضور عرض کیا اے رب کائنات بیٹا کیسے پیدا ہوگا جبکہ میری عورت بانجھ ہے میں خود بڑھاپے کی اس عمر میں ہوں کہ بیٹے کا پیدا ہونا تصور میں نہیں آسکتا۔ تو رب تعالی نے فرمایا میری قدرت سے کچھ بعید نہیں۔ جب تم کچھ بھی نہیں تھے تو تمہیں بھی تو میں نے ہی پیدا کیا ہے۔

اللہ تعالی کے اس ارشاد پر کہ بیٹا تمہارا ضرور پیدا ہونا ہے تو خوش ہو کر حضرت زکریاؑ نے عرض کیا کہ اللہ تعالی مجھے کوئی نشانی بتادے کہ میرے بیٹے کا حمل ماں کے شکم میں قرار پکڑ گیا۔ تو رب تعالی نے فرمایا کہ تم قدرتی طور پر تین دن، تین رات کوئی بات نہیں کرسکو گے حالانکہ تم اچھے بھلے ہوگے، لیکن اللہ تعالی کی تم عبادت کرسکو گے، آپ نے اشارہ سے لوگوں کو بھی اللہ تعالی کی صبح وشام تسبیح بیان کرنے کا حکم دیا۔ پھر حضرت یحییٰؑ کو حکم دیا کہ کتاب پر مضبوطی سے عمل کرو، پھر رب تعالی نے فرمایا نے ان کو بچپن میں نبوت عطاء کی، اور پھر ارشاد فرمایا کہ ہم نے ان کے دل میں رقت ورحمت اور مہربانی رکھی۔ اور پھر ارشاد فرمایا کہ ہم نے ان کو ماں باپ کا فرمانبردار بنایا، سرکش اور نافرمان نہیں بنایا۔ پھر اللہ تعالی نے آپ ولادت کے دن سلام بھیجا، اور فرمایا وفات کے دن آپ پر سلام ہو۔ اور جس دن آپ کو اٹھایا جائے اس دن آپ پر سلام ہو۔

خدارا انصاف کیجیے! کیا آجکل علماء کرام میلاد النبی ﷺ کے مجالس میں وہی کچھ نہیں بیان کرتے جو اللہ تعالی نے حضرت یحییٰؑ کی ولادت میں ذکر کیا؟ یقیناً وہی کچھ بیان کرتے ہیں جو رب تعالی نے بیان فرمایا۔

حضرت عیسیٰؑ اپنا یوم ولادت یوں بیان کرتے ہیں:

"قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا o وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا o وَّبَرًّا بِوَالِدَتِیْ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا o وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا o (سورۃ مریم، آیۃ نمبر ۳۰ تا ۳۳)

آپ نے کہا بیشک میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا۔ اور اس نے مجھے

برکت والا بنایا جہاں بھی میں ہوں، اور مجھے نماز اور زکوۃ کی تاکید فرمائی جب تک زندہ رہوں، اور مجھے اپنی ماں سے اچھا سلوک کرنے والا بنایا، اور مجھے زبردست، بدبخت نہ کیا۔ اور وہی سلامتی مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن مروں اور جس دن زندہ اٹھایا جاؤں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی پیدائش کے ذکر میں اپنے اوصاف ذکر فرمائے، اور اپنی پیدائش اور وفات اور اٹھائے جانے پر سلام کا ذکر فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کا نوح علیہ السلام پر سلام:

﴿سَلٰمٌ عَلٰی نُوۡحٍ فِی الۡعٰلَمِیۡنَ ○ اِنَّا کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ ○ اِنَّہٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ○﴾ (سورۃ الصافات، آیۃ نمبر ۷۹ تا ۸۱)

''نوح پر سلام ہو جہان والوں میں، بیشک ہم ایسا ہی صلہ دیتے ہیں نیکوں کو، بیشک وہ ہمارے اعلیٰ درجہ کے کامل الایمان بندوں میں ہے۔''

اللہ تعالیٰ کا ابراہیم علیہ السلام پر سلام:

﴿سَلٰمٌ عَلٰۤی اِبۡرٰہِیۡمَ ○ کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ ○ اِنَّہٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ○﴾ (سورۃ الصافات، آیۃ نمبر ۱۰۹ تا ۱۱۱)

سلام ہو ابراہیم پر، ہم ایسا ہی صلہ دیتے ہیں نیکوں کو، بیشک وہ ہمارے اعلیٰ درجہ کے کامل الایمان بندوں میں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام پر سلام:

﴿سَلٰمٌ عَلٰی مُوۡسٰی وَ ہٰرُوۡنَ ○ اِنَّا کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ ○ اِنَّہُمَا مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ○﴾ (سورۃ الصافات آیۃ نمبر ۱۲۰ تا ۱۲۲)

سلام ہو موسیٰ اور ہارون پر، بیشک ہم ایسا ہی صلہ دیتے ہیں نیکوں کو بیشک وہ دونوں ہمارے اعلیٰ درجہ کے کامل الایمان بندوں میں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا حضرت الیاس علیہ السلام پر سلام:

﴿سَلٰمٌ عَلٰۤی اِلۡ یَاسِیۡنَ ○ اِنَّا کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ ○ اِنَّہٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ○﴾ (سورۃ الصافات، آیۃ نمبر ۱۳۰ تا ۱۳۲)

"سلام ہوالیاس پر، بیشک ہم ایسا ہی صلہ دیتے ہیں نیکوں کو، بیشک وہ ہمارے اعلیٰ درجہ کے کامل الایمان بندوں میں ہے۔"

اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کا صلوۃ وسلام نبی کریم ﷺ پر اور بندوں کو حکم:

﴿اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ (سورۃ الاحزاب، آیہ نمبر ۵۶)

بیشک اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں نبی پر، اے ایمان والو آپ پر درود اور خوب سلام بھیجو۔

بحث مذکور سے نتیجہ واضح ہوا:

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کی ولادت باسعادت کا تذکرہ کیا اور انبیاء کرام پر سلام بھیجا، اور نبی کریم ﷺ پر صلوۃ وسلام بھیجا، اور اس کے فرشتوں نے بھی آپ پر صلوۃ وسلام بھیجا، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو بھی حکم دیا کہ تم بھی میرے نبی پر صلوۃ وسلام بھیجو۔

صحابہ کرام کا ذکر انبیاء کرام:

❁ "عن ابن عباس ﷺ قال جلس ناس عن اصحاب النبی ﷺ ینتظرونہ قال فخرج حتی اذادنا منھم سمعھم یتذاکرون فسمع حدیثھم فقال بعضھم عجبا ان اللہ اتخذابراھیم من خلقہ خلیلا وقال آخر ماذا باعجب من کلام موسی کلمہ اللہ تکلیما وقال آخر فعیسی کلمۃ اللہ وروحہ وقال آخر آدم اصطفاہ اللہ فخرج علیھم فسلم وقال قد سمعت کلامکم وعجبکم بان اللہ اتخذابراھیم خلیلا وھو کذلک وموسی نجی اللہ وھو کذلک وعیسی روح اللہ وھو کذلک وآدم اصطفاہ اللہ وھو کذلک الاوانا حبیب اللہ ولافخر وانا حامل لواء الحمد یوم القیامۃ ولافخر وانا اول من یحرک حلق الجنۃ فیفتح اللہ لی فیدخلنیھا ومعنی فقراء المؤمنین ولافخر وانا اکرم الاولین والآخرین ولافخر۔" (دارمی ترمذی)

حضرت ابن عباس ﷺ فرماتے ہے:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی کریم ﷺ کی انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ تشریف لے آئے

،جب آپ صحابہ کرام کے قریب ہوئے تو آپ نے ان کو مذاکرہ کرتے ہوئے سنا،آپ نے ان کے کلام کو سنا ان میں سے بعض حضرات نے تعجب کرتے ہوئے یہ کہا بیشک اللہ تعالی نے اپنی مخلوق میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا ،دوسرے کہنے لگے یہ کوئی اس سے زیادہ متعجب نہیں کہ اللہ تعالی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے (بلاوسطہ) کلام فرمایا،دوسرے کہنے لگے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے کلمۃ اللہ اور روح اللہ بنایا، کچھ اور حضرات کہنے لگے حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے صفی اللہ بنایا۔

اتنے میں نبی کریم ﷺ ان کے سامنے جلوہ گر ہوئے ،سلام کہنے کے بعد ارشاد فرمایا میں نے تمہارا کلام سنا،اور تمہارے اظہار تعجب کو سنا (جو تم نے کہا) بیشک اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنایا یقیناً ایسا ہی ہے ،اور موسیٰ علیہ السلام نجی اللہ ہیں یقیناً ایسا ہی ہے،اور عیسیٰ علیہ السلام روح اللہ ہیں یقینی طور پر یہ درست ہے کہ آپ اسی طرح ہیں، اور آدم علیہ السلام صفی اللہ ہیں۔ محقق بات ہے کہ آپ صفی اللہ ہیں۔خبردار (غور سے سنو آگاہ رہو) میں اللہ کا حبیب ہوں، مجھے اس پر کوئی فخر نہیں، قیامت کے دن لواء حمد میرے ہاتھ میں ہوگا مجھے اس پر کوئی فخر نہیں، سب سے پہلے شفاعت کرنے والا میں ہی ہوں گا، اور سب سے پہلے میری شفاعت کو ہی قبول کیا جائے گا، اس پر مجھے کوئی فخر نہیں، سب سے پہلے جنت کے دروازوں کے حلقوں کو میں ہی حرکت دینے والا ہوں گا، اللہ تعالیٰ میرے لئے جنت کے دروازے کھول دے گا، اور جنت میں داخل کرے گا کہ میرے ساتھ غریب ایمان دار لوگ ہوں گے، مجھے اس پر کوئی فخر نہیں، میں تمام پہلے آنے والے اور بعد میں آنے والوں میں مکرم ہوں گا مجھے اس پر کوئی فخر نہیں۔

حدیث پاک کی مکمل تفصیل **راقم** کی کتاب'' **شمع ھدایت** '' میں دیکھئے، حدیث پاک سے اتنا واضح ہو گیا کہ صحابہ کرام نے ذکر انبیاء کرام ایک مجلس میں کیا جو محفل میلاد النبی ﷺ کا حصہ ہے۔ نبی کریم ﷺ نے سن کر منع نہیں فرمایا، بلکہ اپنے اوصاف حمیدہ بیان کر کے اپنے منصب کی حقیقت کو بیان فرمادیا۔

اعتراض: نبی کریم ﷺ نے تو انبیاء کرام کو ایک دوسرے پر فضیلت دینے سے منع فرمایا آپ نے ارشاد فرمایا" لا تفضلو ابین الانبیاء" مجھے انبیاء کرام کو ایک دوسرے پر فضیلت نہ دو۔ (مسلم شریف ج ۲ کتاب الفضائل)

جواب: آپ کا یہ کلام عجز و انکسار پر مبنی ہے، لیکن دوسرے حدیث پاک میں آپ نے اپنی حقیقت کو یوں بیان فرمایا

❁ عن ابی سعید قال قال رسول اللہ ﷺ انا سید ولد آدم یوم القیامۃ ولا فخر و بیدی لواء الحمد ولا فخر ومامن یومئذ آدم فمن سواہ الا تحت لوائی۔

(مشکوۃ شریف باب فضائل سید المرسلین)

حضرت ابو سعید (خدری) ﷺ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں تمام انسانوں کا قیامت کے دن سردار ہوں گا، اس بات پر کوئی فخر نہیں، اس دن تمام آدم علیہ السلام اور ان کے سوا میرے جھنڈے کے نیچے ہی ہوں گے۔

تشریح: جو تمام قوم سے فضیلت وخیریت میں برتر ہو اسے "سید" کہتے ہیں، یہ معنی علامہ ہروی رحمۃ اللہ نے بیان فرمایا، اور سید کا مطلب یوں بیان کیا گیا۔

" هو الذی یفزع الیه جی النوائب و الشدائد فیقوم بامرنم ویتحمل عنهم مکار ههم وید فعها عنهم. (نووی شرح مسلم کتاب الفضائل ج ۲)

"سید اسے کہتے ہیں جس کی طرف قوم اپنے مصائب وآلام میں پناہ پکڑے، وہ ان کی حاجات کو پورا کرے، خود مشقتیں برداشت کر کے ان کی تکالیف کو دور کرے"

اعتراض: حدیث شریف میں "ولــد آدم" ذکر ہے، جس کا مطلب ہے "مجھے اولاد آدم پر فضیلت حاصل ہے" اس حدیث پاک سے نبی کریم ﷺ کی فضیلت حضرت آدم علیہ السلام پر ثابت نہیں، اگر چہ دوسرے انبیاء کرام پر فضیلت ثابت ہے۔

پہلا جواب: "فانهم یستعملون ولد آدم بمعی نوع الانسان" (نبراس)

بیشک عرب حضرات "ولــد آدم" نوع انسان، کے معنی میں لیتے ہیں، یعنی عام محاورہ کے مطابق صرف اولاد آدم معنی نہیں، بلکہ تمام انسان مراد ہیں، جس میں آدم علیہ السلام بھی ہیں، اس طرح اب معنی یہ ہو گا کہ "مجھے تمام انسانوں پر فضیلت حاصل ہے"

دوسرا جواب: "ان للحدیث تتمته موضحة للمطلوب و هو قوله علیہ السلام و مامن نبی یومئذ آدم فمن سواه الاتحت لوائی" (نبراس)

مطلب کو واضح کرنے کیلئے حدیث پاک کے آخری الفاظ سے تکمیل ہو رہی ہے کہ آدم علیہ السلام اور ان کے سوا تمام ہی میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے، یعنی تمام انسان بمع انبیاء کرام کے میرے جھنڈے کے نیچے پناہ لینے پر مجبور ہوں گے، (اس سے حضرت آدم علیہ السلام پر آپ کی فضیلت ثابت ہو گئی)

﴿یَوْمَ الْقِیَامَة﴾ حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ نے قیامت کے دن کا ذکر فرمایا کہ مجھے قیامت کے دن سرداری حاصل ہو گی، حالانکہ آپ کو دنیا میں بھی تمام پر سیادت حاصل ہے، پھر قیامت کے دن کے ذکر کرنے کا کیا مطلب؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قیامت میں آپ کی فضیلت تمام پر ظاہر ہو جائے گی۔

" ان فی یوم القیامة یظهر سودده لکل احد ولا یبقی منازع ولامعاند " (نووی)
بیشک قیامت کے دن آپ کی سرداری ظاہر ہو جائے گی، کوئی جھگڑا کرنے والا جھگڑا نہیں کرے گا، اور کوئی شخص عناد نہیں کرے گا، کیونکہ دنیا میں کفار، مشرکین نے آپ کی فضیلت کو تسلیم نہیں کیا۔

دنیا میں اگرچہ بہت لوگ آپ کے وسیلہ جلیلہ کے بغیر براہ راست خدا تک رسائی حاصل کرنے کے دعویدار ہیں لیکن قیامت کے دن تمام کو ہی میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ کا وسیلہ تلاش کرنا پڑے گا، جب تمام امتوں کو ان کے انبیاء کرام فرمائیں گے " اذهبوا الی غیری " میرے بغیر کسی اور کا وسیلہ تلاش کرو، اس وقت میرے حبیب پاک ﷺ کی زبان پر ہوگا " انــا لهــا " کہ اس شفاعت کا میں ہی حقدار ہوں، آپ ہی شفاعت فرمائیں گے، اس وقت آپ کی شان رسالت کی فوقیت واضح ہو جائے گی، کسی کو انکار کی گنجائش نہیں ہوگی۔

" خلیل ونجی، کلیم ومسیح سبھی سے کہیں سے نہ بنی یہ بے خبری کہ خلق پھری کہاں سے کہاں تمہارے لئے "

نبی کریم ﷺ کی سرداری کا قیامت کے دن ذکر کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ رب تعالیٰ اپنے متعلق قیامت کے دن فرمائے گا " لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ " آج کسی کی بادشاہی ہے؟ اللہ واحد وقہار کی، اگرچہ آج بھی ہر قسم کی بادشاہی اسی کو حاصل ہے، اور تمام چیزیں اسی کی ملکیت میں ہیں، لیکن دنیا میں لوگ دعویدار موجود ہیں کہ اس زمین کا میں مالک ہوں، اس مکان کا میں مالک ہوں، اس بادشاہی کا میں مالک ہوں۔ لیکن قیامت کے دن سب دعوے ختم ہو جائیں گے وہاں صرف رب ذوالجلال کی بادشاہی ہوگی، مجازی طور پر بھی کوئی اپنی ملکیت اور بادشاہی کا ذکر نہیں کرے گا۔

" ولافخر " ای ولا اقوله تفاخرا بل اعتدادا بفضله وتحدثا بنعمته وتبلیغالما امرت به "
یعنی نبی کریم ﷺ نے اپنی سیادت کو دو وجہ کے پیش نظر بیان کیا،

پہلی وجہ: آپ پر اپنے مراتب بیان کرنے ضروری ہوتے ہیں تا کہ آپ کی امت آپ کو پہچان لے، اور آپ پر اعتقاد رکھے، اور آپ کی عزت وتکریم کرنے کا جس طرح اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا اسی طرح اس پر عمل کر سکے۔

دوسری وجہ: " امتثالا لامر اللہ تعالیٰ " " وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ " (نووی) آپ نے اپنے مراتب اللہ تعالیٰ کے حکم کی تابعداری کرتے ہوئے بیان فرمائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا " وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ " اپنے رب کی نعمتوں کو خوب بیان کرو۔

نبی کریم ﷺ کی ولادت پر خوشی منانا:

''حصول نعمت پر تعریف کرنا باعث شکر ہے''

❁ عن جابر بن عبداللہ مرفوعا من اعطی عطاء فوجد فلیجز به فان لم یجد فلیثن به فمن اثنی به فقد شکر و من کتمه فقد کفر''

حضرت جابر بن عبداللہ ﷺ سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ جس شخص کو کوئی عطیہ دیا جائے وہ اگر بدلہ دینے کی صلاحیت رکھتا ہو تو اس کا بدلہ دے، اگر بدلہ دینے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اس کی تعریف کرے، یہ تعریف کرنا شکریہ ادا کرنا ہوگا، جس شخص نے اسے چھپایا اس نے ناشکری کی۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ حصول نعمت پر تعریف کرنا ذریعہ شکر ہے، اور شکر کرنے سے حصول نعمت میں زیادتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ﴾ اور یاد کرو جب تمہارے رب نے سنا دیا کہ اگر احسان مانو گے (شکریہ ادا کرو گے) تو میں تمہیں اور دوں گا۔

اس آیۃ سے معلوم ہوا کہ شکر سے نعمت زیادہ ہوتی ہے، شکر کی اصل یہ ہے کہ آدمی نعمت کا تصور اور اس کا اظہار کرے اور حقیقت شکر یہ ہے کہ منعم کی نعمت کا اس کی تعظیم کے ساتھ اعتراف کرے، اور نفس کو اس کا خوگر بنائے، یہاں ایک باریکی ہے وہ یہ کہ بندہ جب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کے طرح طرح کے فضل و کرم و احسان کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کے شکر میں مشغول ہوتا ہے، اس سے نعمتیں زیادہ ہوتی ہیں، اور بندے کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت بڑھتی چلی جاتی ہے یہ مقام بہت برتر ہے اور اس سے اعلیٰ مقام یہ ہے کہ منعم کی محبت یہاں تک غالب ہو کر قلب کی نعمتوں کی طرف التفات باقی نہ رہے، یہ مقام صدیقوں کا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہمیں شکر کی توفیق عطاء فرمائے۔ (خزائن العرفان)

نبی کریم ﷺ کی آمد باسعادت بھی نعمت ہے:

﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا﴾ (سورة آل عمران، آیة نمبر ۱۰۳)

اور یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہے، جب تم (آپس میں ایک دوسرے کے) دشمن تھے، تو الفت ڈال دی اس نے تمہارے دلوں کے درمیان، تو ہو گئے تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی۔

یعنی اسلام کی بدولت عداوت دور ہو گئی، آپس میں دینی محبت پیدا ہو گئی، حتیٰ کہ اوس اور خزرج کی وہ مشہور لڑائی جو ایک سو بیس سال سے جاری تھی اور اس کے سبب رات دن قتل و غارت کی گرم بازاری رہتی تھی، سید عالم ﷺ کے ذریعہ

اللہ تعالیٰ نے منادی اور جنگ کی آگ ٹھنڈی کردی، اور جنگجو قبیلوں میں الفت ومحبت کے جذبات پیدا کر دیئے۔
(خزائن العرفان)

اس آیہ کریمہ سے پتہ چلا کہ نبی کریم ﷺ کا تشریف لانا بہت بڑی نعمت ہے جس کی وجہ سے صدیوں پرانی عداوتیں، رنجشیں ختم ہوگئیں۔ نعمت کے حصول پر تذکرہ کرنا اور نعمت دینے والے کی تعریف کرنا ضروری ہے تاکہ شکریہ ادا ہو سکے اور نعمتوں کی زیادتی ہو سکے۔ واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ کی آمد باسعادت کا تذکرہ کرنا اور اللہ تعالیٰ کی تعریف کرنا اس عظیم نعمت کا شکریہ ادا کرنا ہے جو یقیناً اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی خوشنودی اور رضامندی کا سبب ہے۔

دوسری دلیل: (اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا)

﴿قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْاهُوَخَيْرٌمِّمَّايَجْمَعُوْنَ۝﴾ (سورۃ یونس آیہ نمبر ۵۸)

تم فرماؤ اللہ ہی کے فضل اور اسی کی رحمت اور اسی پر چاہئے کہ خوشی کریں، وہ ان کے سب دھن دولت سے بہتر ہے۔ (کنزالایمان)

اس آیہ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے رحمت پر خوشی کرنے کا حکم فرمایا، رحمت سے مراد نبی کریم ﷺ ہیں، جیسا کہ روح المعانی میں ہے "واخرج ابوالشیخ عن ابن عباس ﷺ ان الفضل العلم والرحمة محمد ﷺ" آیہ کریمہ میں فضل سے مراد علم اور رحمت سے مراد حضرت محمد ﷺ ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے علم کے حصول اور رحمت کے حصول پر خوشی منانے کا خود حکم دیا ہے۔

آپ تمام جہانوں کیلئے رحمت ہیں:

دوسرے مقام پر اور زیادہ طور پر آپ کو خطاب فرماتے ہوئے رب کریم نے آپ کو رحمت کائنات کہا ہے۔

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۝﴾ (سورة الانبياء، آية نمبر ١٠٧)

اور ہم نے تمہیں نہ بھیجا مگر رحمت سارے جہانوں کیلئے۔ (کنزالایمان)

تفسیر روح المعانی میں اس آیہ کریمہ کی تفسیر اس طرح بیان کی گئی:

"والذی اختاره انه ﷺ انما بعث لکل فرد فرد من العالمين ملائكتهم انسهم وجنهم ولا فرق بين المؤمن والكافر من الانس والجن في ذلك"

مختار مذہب اس میں یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو جہان کے ہر فرد کیلئے رحمت بنا کر مبعوث کیا، ملائکہ ہوں یا

انسان ہوں یا جن سب کیلئے آپ رحمت ہیں، بلکہ انسانوں اور جنوں میں مومنوں اور کافروں سب کیلئے آپ رحمت ہیں۔

بلکہ روح المعانی میں آپ کی رحمت کی وسعت کو یوں بیان کیا گیا ''کل خیر فی العالم فمن آثار النبوة وکل شر وقع فی العالم او سیقع فسبب خفاء آثار النبوة ودروسها فالعالم جسد وروحه النبوة ولا قیام للجسد بلدون روحه'' جہاں میں جو بھی ہے وہ آثار نبوت کی وجہ سے ہے، اور جہاں میں جو شر بھی واقع ہوا یا واقع ہوگا وہ آثار نبوت کے مخفی ہونے اور مٹ جانے کی وجہ سے، کیونکہ تمام جہان جسم ہے اور نبوت اس کی روح ہے، اسی لئے کہ جسم بغیر روح کے قائم نہیں رہ سکتا۔

سؤال: نبی کریم ﷺ کافروں کیلئے کیسے رحمت ہیں؟

جواب: پہلے کفار کو طرح طرح کے عذاب دیئے گئے، کسی قوم کو بندر بنا دیا گیا، کسی قوم کو خنزیر بنا دیا گیا، کئی قوموں کو تباہ و برباد کر دیا گیا، لیکن نبی کریم ﷺ کی قوم کے کفار عذاب کا مطالبہ بھی کرتے رہے، لیکن آپ کی رحمت سے رب تعالیٰ نے ان کی شکلوں کو تبدیل نہیں کیا اور ان کو تباہ و برباد نہیں کیا۔

﴿وَإِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ إِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ○ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ﴾(سورة الانفال ،آية نمبر ۳۲،۳۳)

اور جب بولے کہ اے اللہ اگر یہی (قرآن) تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا، یا کوئی دردناک عذاب ہم پر لا، اور اللہ کا کام نہیں کہ انہیں عذاب کرے جب تک اے محبوب تم ان میں تشریف فرما ہو۔ (کنز الایمان)

یعنی آپ رحمۃ للعلمین ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے ہم ان کے مطالبہ کے باوجود ان کو عذاب نہیں دیں گے۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

کہ مجھ سے سوال یہ کیا گیا کہ ربیع الاول میں نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت کے سلسلہ میں کئے جانے والے اعمال کا شرع میں کیا حکم ہے؟ اچھا ہے یا برا، اس کے کرنے والے کو ثواب حاصل ہوگا یا نہیں؟ آپ نے اس کا جواب یہ دیا کہ نبی کریم ﷺ کی ولادت کے متعلق ابتدائی واقعات کو بیان کرنا اور آپ کی ولادت پاک پر ظاہر شدہ علامات کو بیان کرنا، پھر کھانے کیلئے دستر خوان بچھانا، یعنی کھانے کی اشیاء تقسیم کرنا اور غیر شرع حرکات کئے بغیر واپس لوٹ جانا اچھا کام ہے۔

''هو من البدع الحسنة التی یثاب علیها صاحبها من تعظیم قدر النبی ﷺ واظهار

الفرح و الا ستبشار بمولده الشریف" (الحاوی للفتاوی جلد اول صفحه نمبر ۱۸۹)
یہ تمام جن کا ذکر کیا ہے یہ اچھی بدعات سے ہیں، ان پر عمل کرنے والے کو ثواب حاصل ہوتا ہے، کیونکہ اس میں نبی کریم ﷺ کی قدر و منزلت کی تعظیم پائی جاتی ہے، اور آپ پر فرحت و خوشی کا اظہار ہے، فرحت و خوشی کا اظہار زیادہ نعمتوں کے حصول کا سبب ہے۔

ساتویں صدی ہجری میں نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت کے واقعات پر مشتمل شیخ ابو الخطاب بن وحید نے ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام "التنویر فی مولد البشیر و النذیر" رکھا اس پر اس کے وقت کے بادشاہ مظفر ابو سعید میلاد النبی ﷺ کی محافل منعقد کرتا اور بہت مٹھائی، مکھن، مرغ اور بکرے کا گوشت اس کے دستر خوان پر ہوتا، جس میں تیس ہزار طشت مٹھائیوں کے ہوتے۔

"وکان یحضر عندہ فی المولد اعیان العلماء و الصوفیة" (الحاوی للفتاوی ج اول ص ۱۹۰)

''اس کی محافل میلاد میں بڑے جلیل القدر علماء کرام اور صوفیاء عظام شریک ہوتے۔''

علماء و مشائخ کا شریک ہونا ہی جواز کی علامت ہے، ناجائز کام اتنے جلیل القدر علماء اور مشائخ کا شریک ہونا عقل سے دور ہے۔

یہودیوں کے آلہ کار لوگوں کی کذب بیانی:

ہر سال کسی نہ کسی جگہ سے عید میلاد النبی ﷺ کی مخالفت میں کوئی نہ کوئی اشتہار، کتابچہ چھاپ کر لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، عام طور پر فتنہ یوں پھیلایا جاتا ہے ''امام الانبیاء کی ہجرت کے ۶۰۴ سال بعد عیسائیوں کی دیکھا دیکھی عراق کے اربل بادشاہ ملک مظفر ابو سعید جو ایک نہایت بے دین، بڑا عیاش، فضول خرچ اور عیاش طبع تھا، اس نے اپنے دنیا پرست کذاب مولوی عمر بن حسن بن دحیہ کے ساتھ مل کر عید میلاد النبی ﷺ کی اس رسم کو ایجاد کیا (بحوالہ تاریخ ابن خلکان) اور لالچی مولوی نے ایک ہزار دینار لے کر عید میلاد النبی ﷺ کے حق میں فتوی دیا، اس طرح یہ عید رفتہ رفتہ مسلمانوں کے گھر گھر میں گھس گئی اور سادہ دل لوگوں نے عقیدت احترام اور پیار محبت میں غلو کر کے اس کو دین کا حصہ بدعت بنا لیا، یہ اس پمفلٹ کی عبارت تھی جو ہر سال میلاد النبی ﷺ کے موقع پر تقسیم کیا جاتا ہے۔

آیئے دیکھئے یہ کتنا بڑا جھوٹ ہے:

﴿لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ﴾ ''جھوٹوں پر اللہ تعالی کی لعنت ہو۔''

"الکذب مقراض الایمان" "جھوٹ ایمان کی قینچی ہے۔"

آیئے اس جھوٹ کو علامہ حافظ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ کی کتاب الحاوی للفتاوی میں دیکھئے:

"حسن المقصد فی علم المولد صاحب اربل الملک المظفر ابو سعید کو کبری بن زین الدین علی بن بکتکین احد الملوک الامجاد والکبراء الاجواد وکان له آثار حسنته"

نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت کے موقع پر خوشی کا اظہار کر کے اچھا عمل کرنے والا اربل بادشاہ مظفر ابوسعید کوکبری بن زین الدین علی بن بکتکین تھا جو بزرگ اور بڑے اور سخی بادشاہوں سے تھا، اس کے بہت اچھے اعمال تھے۔ (الحاوی للفتاوی ج اول ص ۱۸۹)

اور یہ بھی بہت واضح بات ہے کہ کرکٹ کا شائق کرکٹ گراؤنڈ تعمیر کراتا ہے، کلب کا دلدار کلب تعمیر کراتا ہے، یعنی جس کو کسی کام سے محبت ہو وہی کام کرتا ہے، یقیناً نیک شخص ہی نیک کام کرتا ہے اور مساجد تعمیر کراتا ہے۔

"وهو الذی عمر الجامع الظفری بسفح قاسیون"

بادشاہ مظفر نے قاسیون کے پہلو میں جامع مسجد تعمیر کرائی، جس کا نام جامع مسجد ظفری رکھا گیا۔

(الحاوی للفتاوی حوالہ مذکور)

آیئے ابن جوزی اور ابن تیمیہ کے شاگرد حافظ ابن کثیر کا قول علامہ سیوطی رحمہ اللہ سے ہی سنئے۔

قال ابن کثیر فی تاریخه کان یعمل المولد الشریف فی ربیع الاول ویحتصل به احتفالا هائلا وکان شهما شجاعا بطلا عاقلا عالما عادلا رحمه الله واکرم مثواه، قال وصف له الشیخ ابوالخطاب بن دحیة مخلدا فی المولدالنبوی سماه التنویر فی مولدالبشیر النذیر فاجازه علی ذلک بالف دینار وقدطالت مدته فی الملک الی ان مات وهو محاسر للفرنج بمدینة عکا سنة ثلاثین وستمائه محمود السیرة والسریرة" (الحاوی للفتاوی ج اول ص ۱۸۹)

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں، بادشاہ مظفر ربیع الاول میں میلاد النبی ﷺ کی بڑی بڑی محفلیں قائم کرتا تھا جو بہت ذہین تیز فہم، بہادر، بطل حریت، عقلمند، عالم، عادل تھا اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے اور اس کا اچھا ٹھکانا بنائے، حافظ ابن کثیر نے ہی یہ بھی بیان کیا ہے کہ شیخ ابوالخطاب بن دحیہ رحمہ اللہ نے ولادت نبوی میں ایک بڑی مجلد کتاب تحریر کی جسکا نام "التنویر فی مولد البشیر النذیر" رکھا۔ جس پر بادشاہ مظفر نے ایک ہزار دینار انعام دیا، وہ بہت دیر بادشاہی کرنے کے بعد فوت ہوئے، یعنی ان کی بادشاہی کی مدت لمبی تھی، اس نیک بادشاہ نے عکا شہر میں انگریزوں کا

محاصرہ جاری رکھا۔اس کی وفات چھ سوتیس ہجری میں ہوئی، جس کی سیرت بھی اچھی تھی، اوراس کی بادشاہت بھی قابل تعریف تھی۔ خدرا انصاف کیجئے کہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ اور حافظ ابن کثیر کی بات معتبر ہے کہ وہ بادشاہ نیک تھا یا آجکل کے یہودیوں کے آلہ کار لوگوں کی بات معتبر ہے کہ وہ براتھا اور عیاش تھا، آجکل تو کتابوں سے اوراق نکال دینے کو رواج دے دیا گیا کیا ایسے ہتھکنڈوں سے دین اسلام مٹ جائے گا، اے مسلمانوں ہوشیار رہیں ایک قرآن پاک القدس سے چھاپا گیا ہے جس میں کئی سورتوں کو نکال دیا گیا ہے، جس قرآن کا محافظ رب تعالی ہو اس کی سورتوں کو نکال کر یہودی اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے؟ نہیں نہیں کبھی کامیاب نہیں ہوں گے، اوران کے آلہ کار بھی شان مصطفیٰ کریم ﷺ کو کم کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔

تاریخ ابن خلکان کی طرف منسوب کرنا بھی جھوٹ ہے:

ہاں ہوسکتا ہے تاریخ ابن خلکان کی عبارات کو بدل کر اپنا الوسیدھا کرنے کی کوشش کی گئی ہو تو کچھ کہہ نہیں سکتا ورنہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ تاریخ ابن خلکان کے متعلق یوں رقمطراز ہیں۔

❁ "قال ابن خلكان في ترجمة الحافظ ابى الخطاب بن دحية كان من اعيان العلماء ومشاهيرا لفضلاء قدم من المغرب داخل الشام والعراق واجتاز باربل سنة اربع وستمائة فوجد ملكها المعظم مظفرالدين بن زين الدين يعنى بالمولدالنبوى فعمل كتاب التنوير في مولد البشير النذير وقرأ عليه بنفسه فأجازه بالف دينارقال وقد سمعناه على السلطان مجالس ستة في سنة خمس وعشرين وست مائة"

(الحاوی للفتاوی جلد اول ۱۹۰)

ابن خلکان نے اپنی تاریخ میں حافظ ابوالخطاب بن دحیہ کے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ بڑے عظیم علماء میں سے تھے اور مشہور فضلاء میں سے تھے، وہ مغربی علاقہ سے آئے اور شام وعراق میں داخل ہوئے چھ سو چار ہجری میں ان کا اربل بادشاہ پر گذر ہو، تو انہوں نے اس عظیم بادشاہ کو نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت پر عظیم اہتمام کرتے ہوئے پایا تو عظیم عالم حضرت علامہ حافظ ابوالخطاب نے ایک کتاب میلا دالنبی ﷺ کے موضوع پر لکھی جو خود ہی بادشاہ مظفرالدین بن زین الدین کو پڑھ کر سنائی ،اس کتاب کا نام رکھا "التنوير في مولد البشير النذير" بادشاہ نے اس کتاب پر ایک ہزار دینار انعام دیا، ہم نے چھ سو پچیس ہجری میں بادشاہ کے پاس چھ مجالس میں اس کتاب کو سنا۔

اعتراض: میلا دالنبی ﷺ کی محافل اور خوشی ومسرت بدعت ہے، بدعت پر عمل کرنا گمراہی ہے یہ کام تو دین دار

علماء کرام کا نہیں بلکہ جاہل اور باطل راہ پر چلنے والے عوام کا ہے۔

جواب: ہر بدعت کو ضلالت و گمراہی سے تعبیر کرنا کسی طرح بھی درست نہیں، بلکہ بدعت پانچ قسم کی ہے۔

نمبر 1 واجب: جس طرح قرآن پاک اور حدیث پاک سمجھنے کیلئے علم نحو کا پڑھنا۔

نمبر 2 حرام: اللہ تعالیٰ کا بندوں کی طرح جسم ثابت کرنا، بندے کو پتھر کی طرح غیر مختار سمجھنا وغیرہ۔

نمبر 3 مستحب: دینی مدارس قائم کرنا، مساجد بنانا، سرائے بنانا اور ہر بہتر کام جو نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے زمانہ میں نہیں تھا۔

نمبر 4 مکروہ: ہر ایسا کام جس سے سنت کی ترک لازم آئے تو اگر سنت غیر مؤکدہ کی ترک لازم آئے تو مکروہ تنزیہی اور اگر سنت مؤکدہ کی ترک لازم آئے تو مکروہ تحریمی۔

نمبر 5 مباح: جیسے صبح کی نماز یا عصر کے بعد مصافحہ کرنا، لیکن بغیر سلام کے، اگر سلام بھی کرے تو مستحب ہوگا،

(ماخوذ از حاشیہ مشکوۃ صفحہ نمبر ۲۸ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ بحوالہ مرقاۃ)

بیہقی نے مناقب امام شافعی رحمہ اللہ میں امام شافعی رحمہ اللہ کا قول نقل کیا:

المحدثات من الامور ضربان احدھما ما احدث ممایخالف کتابا او سنة او اثرا او اجماعا فھذا البدعة الضلالة و الثانی ما احدث من الخیر لا خلاف فیه لو احد من ھذا محدثة غیر مذمومة. (الحاوی للفتاوی جلد اول صفحه نمبر ۱۹۲)

نئے امور یعنی بدعات کی دو قسمیں ہیں، ایک ان میں سے یہ ہے کہ ایسا نیا کام جو قرآن یا حدیث پاک یا آثار صحابہ یا اجماع امت کے مخالف ہو، یہ بدعت گمراہی ہے، یعنی ناجائز ہے، اس سے اجتناب ضروری ہے۔

دوسری قسم ان میں سے یہ ہے کہ کوئی نیا کام ہو لیکن نیکی کا کام ہو، اس کے جائز ہونے میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں، بلکہ بالاتفاق جائز ہے اور مستحسن ہے، اس پر عمل کرنا باعث ثواب ہے، اور یہ بدعت کسی طرح بھی بری نہیں۔

❁ **عن ابن عباس قال کان اھل الجاھلية یاکلون اشیاء و یترکون اشیاء تقذرا فبعث الله نبیه و انزل کتابه و احل حلاله و حرم حرامه فما احل فھو حلال و ما حرم فھو حرام و ما سکت عنه فھو عفو و تلا قل لا اجد فیما اوحی ای محرما علی طاعم یطعمه الا ان یکون میتة الآیة.** (رواہ ابو داؤد، مشکوۃ باب مایحل اکله و ما یحرم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں زمانہ جاہلیت میں لوگ بعض چیزوں کو کھاتے تھے، اور بعض چیزوں کو ناپسند سمجھ کر چھوڑ دیتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو مبعوث فرمایا، اور اپنی کتاب کو نازل

کیا، اور کچھ چیزوں کو حلال کیا اور کچھ چیزوں کو حرام کیا، جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا وہ حلال ہیں، اور جن چیزوں کو رب تعالیٰ نے حرام کیا ہے وہ حرام ہیں، اور جن چیزوں سے رب تعالیٰ نے سکوت اختیار کیا (نہ حلال کیا اور نہ حرام) وہ معاف ہیں، یعنی وہ مباح ہیں نہ حلال ہیں اور نہ حرام ہیں، پھر آپ نے بطور دلیل یہ آیۃ کریمہ تلاوت کی۔

"قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ○ (الانعام، آیۃ نمبر ۱۴۵)

فرما دو میں نہیں پاتا اس میں جو میری طرف وحی کی گئی کسی کھانے والے پر کوئی کھانا حرام ہو، سوائے مردہ جانور کے یا بہنے والے خون، یا خنزیر کے گوشت کے تو بیشک وہ ناپاک ہے یا فسق ہے جس پر ذبح کے وقت اللہ کے غیر کا نام لیا گیا ہو، جو شخص مجبور ہو گیا وہ خود خواہش نہ کرے اور نہ حد سے تجاوز کرے تو بیشک تمہارا رب بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

۞ ابن ماجہ اور ترمذی کی حدیث جو، مشکوۃ میں حضرت سلمان ﷺ سے مروی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں

"فقال الحلال ما احل الله فی کتابه والحرام ما حرم الله فی کتابه وما سکت عنه فهو مما عفی عنه" (مشکوة کتاب الاطعمة)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا حلال وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال کیا، اور حرام وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام کیا ہے، اور جس سے سکوت اختیار کیا ہے وہ معاف ہے۔

نئے کاموں کے ایجاد کیلئے نبی کریم ﷺ نے ضابطہ بیان فرمایا:

قال رسول الله ﷺ من سن فی الاسلام سنة حسنة فله اجرها و اجر من عمل بها من بعده من غیر ان ینقص من اجورهم شیٔ ومن سن فی الاسلام سیئة کان علیه وزرها ووزر من عمل بها من بعده من غیر ان ینقص من اوزارهم شئی.

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص اسلام میں اچھا طریقہ ایجاد کرتا ہے، اسے اس کا ثواب ملے گا۔ اور اس کے بعد جتنے آدمی اس پر عمل کریں گے ان کے مطابق بھی اس کا ثواب ملے گا، اور ان عمل کرنے والوں کے ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوگی، اور جو شخص اسلام میں برا طریقہ رائج کرتا ہے، اس کو اس برے طریقہ کے رواج دینے کا گناہ ہوگا، اور جتنے آدمی اس پر عمل کریں گے ان کے عمل کے مطابق بھی اسے گناہ ہوگا اور ان عمل کرنے والوں کے گناہوں میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ (مشکوۃ شریف کتاب العلم)

اس حدیث پاک سے یہ واضح ہوا کہ اسلام میں اچھا طریقہ رائج کرنا منع نہیں بلکہ نیکیوں کا سبب ہے اور براطریقہ رائج کرنا گناہوں کا سبب ہے، اس سے بچنا ضروری ہے۔ یہ سوال نہایت لغو اور بے حقیقت ہے کہ اسلام کیا اس وقت مکمل نہیں تھا؟ ہاں ہاں اسلام مکمل ہی تھا اسی لئے تو نبی کریم ﷺ نے خود اپنی امت کیلئے ایک ضابطہ وقانون پیش فرمادیا، تا کہ اسی قانون پر عمل کرنے والوں کو کوئی شخص غیر اسلامی شعار پر عمل کرنے کا طعنہ نہ دے سکے، بلکہ ایسا اعتراض علم شریعت سے بے خبری کی علامت ہے۔

میلاد النبی ﷺ پر انعقاد محافل اور ہر جائز خوشی مستحب ہے:

علامہ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ان الطلب فی المندوب تارة یکون بالنص وتارة یکون بالقیاس وھذا وان لم یرد فیه نص ففیه القیاس علی الاصلین" (الحاوی للفتاوی ج اول ص ۱۹۲)

مستحب کبھی نص سے ثابت ہوتا ہے اور کبھی قیاس سے، اس میں اگرچہ نص تو وارد نہیں، لیکن دو اصل یعنی دو علتیں اور وجہ موجود ہیں جن سے استحباب ثابت ہوتا ہے۔

پہلی وجہ یہ بیان فرمائی:

"ان النبی ﷺ قدم المدینة فوجد الیھود یصومون یوم عاشوراء فسألھم فقالوا ھو یوم اغرق الله فیه فرعون ونجی موسی علیه السلام فنحن نصومه شکر الله تعالی. (الحاوی للفتاوی ج اول ص ۱۹۴)

بیشک نبی کریم ﷺ جب مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو یہود کو عاشوراء کے دن روزہ رکھتے ہوئے پایا آپ نے ان سے روزہ رکھنے کی وجہ پوچھی انہوں نے کہا یہ وہ دن ہے کہ اس میں اللہ تعالی نے فرعون کو غرق کیا اور موسی علیہ السلام کو نجات دی اس لئے ہم اللہ تعالی کا شکر ادا کرنے کیلئے روزہ رکھتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے ان کے اس قول کو رد نہیں کیا، بلکہ دوسرے مقامات پر ذکر ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ہم زیادہ حق رکھتے ہیں کہ ہم بھی روزہ رکھیں یہ ایک روزہ رکھتے ہیں ہم دو روزے رکھیں گے۔

مقرر دن میں اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا:

مندرجہ بالا بحث ذکر کرنے کے بعد علامہ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "فیستفاد منه فعل الشکر لله علی ما من به فی یوم معین من اسداء نعمة او دفع نعمة" (الحاوی للفتاوی ج اول ص ۱۹۶)

اس سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں واحسانات کی تکمیل اور مصائب کے مندفع کرنے کا معین دن میں شکریہ ادا کرنا جائز ہے، کیونکہ معین دن میں ہی روزہ رکھا جاتا تھا جو حصول نعمت اور اندفاع مصائب کا شکریہ تھا۔اس کے بعد مزید فرماتے ہیں۔

"ای نعمة اعظم من النعمة ببروزهذاالنبی نبی الرحمة فی ذلک الیوم وعلی هذافینبغی ان یتحری الیوم بعینه حتی یطابق قصة موسی فی یوم عاشوراء"

(الحاوی للفتاوی ج اول ص ۱۹۶)

نبی کریم ﷺ جو سراپا رحمت ہیں اس دن میں آپ کی تشریف آوری جو نعمت عظمی ہے، اس نعمت سے بڑھ کر اور کیا عظیم نعمت ہو سکتی ہے، لہذا ضروری ہے کہ اس دن زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کی جائے تا کہ یوم عاشوراء میں موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ سے مطابقت ہو جائے۔

نبی کریم ﷺ نے ہر پیر کے دن اپنا یوم ولادت منایا:

وان کان النبی ﷺ لم یزدفیه علی غیره من الشهور شیئا من العبادات وماذاک الالرحمته ﷺ بامته ورفقه بهم لأنه علیه الصلوة والسلام کان یترک العمل خشیة ان یفرض علی امته رحمة منه بهم لکن اشار علیه السلام الی فضیلة هذا الشهر العظیم بقوله للسائل الذی سأله عن صوم یوم الاثنین ذاک یوم ولدت فیه" (الحاوی للفتاوی ج اول ص ۱۹۴)

اگر چہ نبی کریم ﷺ نے اس ماہ میں بنسبت اور مہینوں کے زیادہ عبادات نہیں کہیں، صرف اپنی امت پر رحمت اور مہربانی کرتے ہوئے کیونکہ نبی کریم ﷺ امت پر رحمت فرماتے ہوئے ان پر فرض ہو جانے کے ڈر سے کئی اعمال ترک فرمادیتے تھے، لیکن آپ نے اس ماہ کی فضیلت کی طرف اشارہ فرمادیا، جب آپ سے ایک شخص نے سؤال کیا کہ آپ پیر کو روزہ کیوں رکھتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ یہ میری پیدائش کا دن ہے، یعنی آپ نے پیر کو اپنی پیدائش کا شکریہ ادا کرنے کیلئے روزہ رکھا اور اس طرح اظہار مسرت کیا۔

آیئے حدیث مسلم کے اصل الفاظ مبارکہ دیکھئے:۔

❁ عن ابی قتادة ان رسول الله ﷺ سئل عن صوم الاثنین فقال فیه ولدت وفیه انزل علی'' (اخرجہ مسلم بالاسناد ج اص ۳۶۸ باب استحباب صیام ثلاثۃ ایام من کل شھر الخ۔ مشکوۃ باب صیام التطوع)

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ سے پیر کے دن روزہ رکھنے کے متعلق سؤال کیا گیا آپ نے فرمایا، اس دن میں میری پیدائش ہے، اور اسی دن مجھ پر قرآن نازل کیا گیا۔) یعنی اس دن ابتداء نزول قرآن ہوا)

جائز کاموں سے اظہار مسرت کرے:

فینبغی ان یقتصر فیه علی مایفهم الشکر لله تعالی من التلاوة والاطعام والصدقة وانشادالشعر من المدائح النبوية. (الحاوی للفتاوی ج اول ص ۱۹۴)

ضروری ہے کہ صرف ان کاموں پر ہی اکتفاء کرے جن سے اللہ تعالی کا شکر یہ ادا کرنا سمجھا جاسکے، تلاوت قرآن پاک کرے، طعام کھلائے، صدقہ وخیرات کرے، نبی کریم ﷺ کی مدح وتوصیف نعت خوانی کی صورت میں کی جائے۔

مباح کام کرنے میں کوئی حرج نہیں:

"فینبغی ان یقال ماکان من ذلک مباحا بحیث یقتضی السرور بذلک الیوم لاباس بالحاقه" (الحاوی للفتاوی ج اول ص ۱۹۶)

ضروری ہے کہ یہ بیان کیا جائے کہ جوکام مباح ہیں یعنی ان کاموں کے کرنے میں شرعا ممانعت نہیں، لیکن ان کے کرنے سے خوشی ومسرت حاصل ہوتی ہو، ایسے کام میلاد النبی ﷺ کے دن کرنے میں کوئی حرج نہیں،

حرام، مکروہ، خلاف اولی کاموں سے بچنا ضروری ہے:

وماکان حرام اومکروها فیمنع وکذا ماکان خلاف الاولی (الحاوی للفتاوی ج ۱ ص ۱۹۶)

جو کام حرام، مکروہ، یاخلاف اولی ہوں (یعنی بہتر نہ ہوں) وہ میلاد النبی ﷺ کے دن منع ہیں۔ مثلا ناچ، گانا، ڈھول، باجا، خوشی کے اظہار میں نمازوں کو ضائع کرنا، یہ سب کام میلاد النبی ﷺ کے دن ناجائز ہیں۔

خرابی کو دور کیا جائے، اچھائی کو ختم نہ کیا جائے:

خدرا! انصاف کریں کہ اگر نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت کی خوشی میں جلوس نکالا جائے، جس میں نعت خوانی ہو اور تلاوت قرآن پاک ہو اور تقاریر ہوں، نمازیں بھی قضاء نہ ہونے دی جائیں اس میں کیا خرابی ہے۔ اگر کوئی غیر شرعی حرکت ان نیک محافل یا جلوسوں میں شامل ہو جائے۔ تو صرف اسی کو ختم کرنے پر زور دیا جائے نہ کہ استحبابی کاموں کو بھی حرام بنانے پر زور دیا جائے، جھوٹے خداؤں کی وجہ سے حقیقی خدا کو چھوڑ دینا، اور جھوٹے نبیوں کی وجہ سے حقیقی انبیاء کرام کو نہ ماننا اور ان پر ایمان نہ لانا عقل ودانش کا کام نہیں، بلکہ جہالت وحماقت ہے۔

دوسری وجہ جس پر میلاد النبی ﷺ کی خوشی کا مستحب ہونا قیاس کیا گیا:

اخرجه البیهقی عن انس ان النبی ﷺ عق عن نفسه بعد النبوة مع انه قد ورد ان جده عبد المطلب عق عنه فی سابع ولادته والعقیقة لاتعاد مرة ثانیة فیحمل ذلک علی ان الذی فعله النبی ﷺ اظهارا للشکر علی ایجاد الله ایاه رحمة للعالمین وتشریع لامته کما کان یصلی علی نفسه لذلک فیستحب لنا ایضا اظهار الشکر بمولده بالاجتماع واطعام الطعام ونحوذلک من وجوه القربات واظهار المسرات.
(الحاوی للفتاوی ج ص۱۹۶)

بیہقی نے حضرت انس ﷺ سے روایت بیان کی کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے بعد از اعلان نبوت اپنا عقیقہ خود کیا حالانکہ یہ بھی ثابت ہے کہ آپ کے دادا حضرت عبد المطلب نے آپ کا عقیقہ آپ کی ولادت کے ساتویں دن کر دیا تھا، عقیقہ ایک مرتبہ ہی ہوتا ہے۔ دوبارہ نہیں ہوتا، نبی کریم ﷺ کے اس فعل کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو رحمۃ للعلمین بنایا، اس لئے آپ نے اس کا شکریہ ادا کیا اور نیز اپنی امت کیلئے مشروع فرمایا جیسا کہ آپ خود اپنی ذات پر درود پاک پڑھتے تھے تاکہ امت کو سنت کا ثواب بھی حاصل ہو جائے، اس وجہ سے اب ہمارے لئے بھی مستحب ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کی ولادت کے دن اجتماعات منعقد کر کے اور طعام کھلا کر اور ہر قسم کی نیکی کے کام کر کے اور مسرت کا اظہار کر کے شکریہ ادا کریں۔

نبی کریم ﷺ کی ولادت پر اللہ تعالیٰ نے قوم کو لڑکے عطاء کئے:

نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے سے پہلے قوم طرح طرح کی برائیوں میں مبتلاء تھی، ان برائیوں میں سے ایک بیٹیوں کو زندہ دفن کرنا تھا، کئی اعلیٰ خاندان اپنی بیٹیوں کو عار کے پیش نظر زندہ درگور کر دیتے، ایک شخص ان میں ایسا تھا کہ اگر اپنی کسی بیٹی کو زندہ رکھنا چاہتا تو اسے اون یا بکری کے بالوں کا جبہ (کوٹ) پہنا دیتا اور اپنے ساتھ جنگل میں اونٹ چرانے پر اسے مقرر کر دیتا، تاکہ کوئی شخص اس کو دیکھ نہ سکے اور یہ نہ کہے کہ اس کی بیٹی زندہ ہے۔ اور اگر وہ کسی بیٹی کو قتل کرنے کا ارادہ کرتا تو اسے چھ سال تک مہلت دیتا، جب چھ سال کی ہو جاتی تو اس کی ماں کو کہتا اسے غسل کراؤ، خوشبو لگاؤ، اچھا لباس پہناؤ، مزین کرو، پھر اسے اپنے ساتھ جنگل میں لے جاتا، اس کیلئے ایک گڑھا کھودتا اور اسے کہتا اس میں دیکھو اس طرح اس کو دھکا دے کر نیچے گڑھے میں گرا دیتا اور مٹی اس پر ڈال کر یعنی سطح زمین کے برابر کر کے واپس آ جاتا۔ (روح المعانی ج ص۳۰)

جاء قیس بن عاصم التمیمی الی رسول الله ﷺ فقال انی وأدت ثمان بنات لی فی الجاهلیة" (روح المعانی ج ص۳۰)

قیس بن عاصم تمیمی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے عرض کیا کہ میں نے زمانہ جاہلیت میں اپنی آٹھ بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیا۔

معاشرہ کی یہ حالت تھی کہ عورت کا چوپاؤں سے بھی کم مرتبہ تھا، لیکن نبی کریم ﷺ نے عورت کو اسلام میں عزت عطاء فرمائی، بیٹی ہونے کی حیثیت سے، زوجہ ہونے کی حیثیت سے، ماں ہونے کی حیثیت سے جن حقوق کی مالک ہے۔ وہ حقوق نبی کریم ﷺ نے بیان فرما کر عورت کو بلند مقام دیا۔ لیکن افسوس آج مسلمان عورت غیر مسلموں کو دیکھ کر اسلامی شعار کو چھوڑ کر پھر حیوانیت کی طرف جانا پسند کر رہی ہے، بے حیائی اور عریانی، اور مردوں سے آزادانہ میل جول فیشن بن چکا ہے۔ جس معاشرہ سے غیر مسلم جو اس فیشن کے موجد ہیں وہ بیزار ہو چکے ہیں، وہ آج مسلمانوں کو پسند ہے، اللہ تعالیٰ ان بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہ راست پر لائے، آمین۔

عرض کر رہا تھا کہ اہل عرب اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کرتے تھے گویا ان کے گھر بیٹی کے پیدا ہونے پر صف ماتم بچھ جاتی، ان کو خوشی نہ حاصل ہوتی بلکہ غم لاحق ہوتا۔ لیکن جس سال نبی کریم ﷺ کی ولادت ہوئی وہ تو ہر طرف خوشی منانے کا سال تھا، اور آپ کی پیدائش پر ہی قوم آپ کی شان کو مکمل طور پر سمجھ لیتی یہ بھی مشکل تھا، نیز آپ رحمۃ للعالمین بن کر تشریف لائے آپ کی آمد کے سال بیٹیوں کا پیدا ہونا قوم کیلئے غم کا سبب بنتا اور ان کا زندہ دفن کیا جانا آپ کی شان رحمت کے خلاف تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس سال جن لوگوں کو اولاد عطاء کی ان کو بیٹے دیئے بیٹیاں نہیں دیں۔

"وکان قداذن الله تعالى تلك السنة لنساء الدنيا ان يحملن ذكورا كرامة لمحمد ﷺ

اب واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی شان الوہیت کے مطابق نبی کریم ﷺ کی ولادت پر لوگوں میں بیٹے تقسیم فرمائے، کیونکہ اپنی اپنی استطاعت کے مطابق ہی کسی چیز کو تقسیم کیا جاتا ہے، انسان کو یہ استطاعت نہیں وہ اپنی استطاعت کے مطابق مٹھائی اور کھانے تقسیم کرتا ہے۔ (انوار محمدیہ، مواہب لدنیہ)

نیکی کے کاموں میں خرچ کرنا اسراف نہیں:

اعتراض: میلاد النبی ﷺ کی خوشی میں چراغاں کیا جاتا ہے، جھنڈیاں لگائی جاتی ہیں، ان پر پیسے خرچ ہوتے ہیں جو اسراف ہے اور اسراف شرعاً ناجائز ہے۔

جواب: جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ میلاد النبی ﷺ پر جائز طریقہ سے اظہار مسرت مستحب ہے، تو یقیناً مستحب کام پر خرچ ہونے والے پیسے بھی مستحب ہوں گے، ثواب کا ذریعہ ہوں گے۔

نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں مسجد نبوی کی دیواریں کچی تھیں، اور کھجور کی شاخوں کا چھت تھا جو بارش میں ٹپکتا تھا، نبی

کریم ﷺ ایک مرتبہ اعتکاف میں تھے، بارش کی وجہ سے چھت ٹپکنا شروع ہوگیا۔ نبی کریم ﷺ کی پیشانی پر سجدہ کرنے کی وجہ سے کیچڑ ظاہر ہورہا تھا لیکن آج مسجد کی تزیین پر لاکھوں روپے خرچ ہورہے ہیں لیکن تمام مکاتب فکر کے علماء یہی کہتے ہیں کہ جس نے جنت میں گھر بنانا ہے وہ مسجد پر پیسے خرچ کرے، کسی نے کبھی نہیں کہا چپس، رنگ وروغن، شیشے، شیشہ نگاری، قالین، ہیٹر، پنکھے ضرورت سے زائد چیزیں ہیں، ان پر پیسے خرچ کرنا اسراف ہے، لیکن حقیقت بھی یہی ہے ان کو اسراف کہنا نادانی ہوگی، کیونکہ مساجد کی شان وشوکت اپنے گھروں سے بڑھ کر ہونی چاہئے، جب مکان کچے اور سادہ ہوتے تھے اس وقت مساجد بھی اسی طرح ہوتی تھیں، جیسے مکانات بلند وبالا، پختہ، مزین بننے لگے تو ضروری ہوگیا کہ اسی طرح مساجد کو خوبصورت بنایا جائے تاکہ اپنے مکانات سے خانہ خدا کی حالت کم نظر نہ آئے، اسی طرح خوشی منانے کے ہر زمانہ میں طور وطریقے مختلف ہوتے ہیں۔ اب جبکہ بڑے بڑے مبلغین کو دیکھتے ہیں کہ اپنے بیٹوں کی پیدائش اور ان کی سالگرہ پر اور بیٹوں، بیٹیوں کی شادی پر، حج پر جاتے وقت، اور حج سے واپسی پر، اور کسی عزیز کی بیرون ملک سے واپسی پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں، چراغاں کرتے ہیں، گلے میں ہار ڈالتے ہیں اور ان کو جائز بھی سمجھتے ہیں، اسراف نہیں کہتے تو نبی کریم ﷺ کی ولادت پر زیادہ سے زیادہ خوشی کیوں نہ منائی جائے۔ کیونکہ یہ خوشی اسی کی کی جاتی ہے جس سے محبت ہوتی ہے، نبی کریم ﷺ تو آپ کے اپنے ہی ارشاد کے مطابق سب سے زیادہ محبت کی جائے، آپ فرماتے ہیں۔

﴿لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ﴾

”کوئی آدمی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک اپنے والد اور اولاد اور تمام لوگوں سے مجھے زیادہ محبوب نہ سمجھے۔“

اپنی اولاد سے بڑھ کر نبی کریم ﷺ سے محبت اور اولاد کی پیدائش پر خوشی کرنے سے زیادہ خوشی نبی کریم ﷺ کی ولادت پر کرنا ہی ایمان ہے، ورنہ روح ایمان کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے،

وہیچ کس جود وانفاق فی سبیل اللہ را اسراف نہ گفتہ لاسرف فی الخیر

کسی صاحب علم نے یہ نہیں کہا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنا اسراف ہے۔ (تحفہ اثنا عشریہ ص ۳۱۱)

”قیل لاخیر فی سرف ولاسرف فی خیر“ بیان کیا گیا ہے اسراف میں کوئی بھلائی نہیں۔ اور نیکی میں خرچ کرنا اسراف نہیں۔ (مرقاۃ ج ۸ ص ۲۶۸)

راقم کو اس وقت حوالہ تو یاد نہیں لیکن مسئلہ سو فیصد یاد ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے سامنے کسی نے کہا ”لاخیر فی الاسراف“ اسراف میں کوئی نیکی نہیں۔ تو آپ نے فی البدیہ جواب دیا ”لااسراف فی

الخیر" نیکی کے کام میں اسراف نہیں۔

اعتراض: نبی کریم ﷺ کی ولادت بارہ ربیع الاول کو منائی جاتی ہے۔ حالانکہ علم تقویم کے لحاظ سے آپ کی ولادت کی تاریخ ۹ ربیع الاول بنتی ہے، بارہ کو میلاد النبی منانا درست نہیں۔

پہلا جواب: جب کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو جمہور کے قول کو ترجیح دی جاتی ہے۔

"والاکثرون انه ولد عام الفیل و انه بعد الفیل بخمسین یوم و انه فی شهر ربیع الاول یوم الاثنین لثنتی عشرة خلت منه عند طلوع الفجر"

اکثر حضرت یعنی جمہور کا قول یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ عام الفیل (ہاتھی والے سال) میں واقعہ فیل کے پچاس دن بعد پیدا ہوئے، بیشک آپ ربیع الاول کے مہینہ میں پیر کے دن بارہ ربیع الاول صبح صادق کے وقت پیدا ہوئے۔

وعن ابن عباس رضی الله عنهما قال ولد ﷺ یوم الاثنین واستنبئ یوم الاثنین وخرج مهاجرا من مکة الی المدینة یوم الاثنین ودخل المدینة یوم الاثنین ورفع الحجر یوم الاثنین وکذافتح مکة ونزول سورة المائدة یوم الاثنین"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ پیر کے دن پیدا ہوئے۔ آپ نے اعلان نبوت پیر کے دن کیا، اور مکہ سے مدینہ طیبہ ہجرت پیر کے دن کی، اور مدینہ طیبہ میں آپ پیر کے دن پہنچے، آپ نے حجر اسود کو چادر میں لے کر قریش کے سرکردہ سرداروں کو چادر پکڑنے کی دعوت دی اور خود حجر اسود کو کعبہ شریف کی دیوار میں نصب کر کے ان کے نزاع کو ختم کیا وہ بھی پیر کا دن تھا۔ آپ نے مکہ شریف کو فتح کیا وہ بھی پیر کا دن تھا، اور آپ پر سورۃ مائدہ بھی پیر کے دن نازل ہوئی۔

دوسرا جواب: علم تقویم کی وجہ سے حساب درست نہیں ہو رہا اس کی وجہ کیا ہے' علامہ رازی رحمہ اللہ نے اور قرطبی رحمہ اللہ نے ﴿اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَاللّٰهِ اثْنَاعَشَرَ شَهْرًا "الآیة﴾ (سورۃ توبہ، آیۃ نمبر ۳۶،۳۷) کے تحت لکھا وہ ضیاء القرآن کے الفاظ میں دیکھئے:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے سال کے یہ چار مہینے (رجب، ذیقعد، ذی الحجہ، محرم) حرمت اور عزت والے شمار ہوتے تھے، اور ان میں لڑائی کرنے کی سخت ممانعت کر دی گئی تھی، نیز فریضہ حج کی ادائیگی کیلئے ماہ ذی الحجہ کی تاریخیں مقرر تھیں، کچھ عرصہ بعد اہل عرب پر اس حکم کی پابندی گراں گذرنے لگی ان کا پیشہ قزاقی، رہزنی اور مار دھاڑ بن کر رہ گیا تھا، تین ماہ تک متواتر (ذی قعد، ذی الحجہ محرم) ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنا ان کیلئے ناقابل برداشت تھا اس لئے انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ان مہینوں میں سے جس کو چاہا حلال کر لیا اور اس میں جی بھر کر قتل و غارت کی اور

اس کی جگہ سال کے کسی دوسرے مہینہ کو حرام کر دیا۔ حرمت والے مہینوں کی تعداد بھی چار رہی اور ان کا کام بھی بن گیا، نیز حج علاوہ ایک عبادت کے ان کیلئے ایک بہت بڑا تجارتی میلہ بھی تھا، دور ودراز سے تجارتی قافلے آتے جس سے انہیں بہت نفع ہوتا لیکن حج کا فریضہ کیونکہ قمری سال کے ذی الحجہ کے مہینہ میں ادا کیا جاتا تھا، اس لئے یہ ایسے موسم میں بھی آجاتا، جبکہ سخت سردی یا گرمی ہوتی اور موسم اس ناسازگاری کی وجہ سے ان کا کاروبار ماند پڑ جاتا، اور انہیں دل خواہ نفع نہ ہوتا، اس مشکل کا حل انہوں نے یہ تجویز کیا کہ حج ہمیشہ معتدل موسم میں ادا کیا جائے، اس کیلئے انہوں نے حج کی مقررہ تاریخوں کو بدل دیا اور قمری سال کے بارہ مہینوں میں کبیسہ کا ایک مہینہ بڑھا دیا۔ اس طرح تینتیس سال کے بعد صرف ایک بار حج اپنی صحیح تاریخوں ۹، ۱۰، ذی الحجہ کو ادا کیا جاتا۔ ان دونوں صورتوں میں چونکہ صرف اپنی ذاتی سہولتوں اور مالی منفعتوں کیلئے، وہ اللہ تعالیٰ کے اٹل اور محکم احکام رد وبدل کرلیا کرتے تھے، اس ان کے اس فعل کو "زیادۃ فی الکفر" کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔

۱۰ھ میں جب رحمت عالمیان ﷺ حجۃ الوداع کیلئے مکہ تشریف لے گئے تو اس سال ان کے دستور کے مطابق بھی حج ۹۔۱۰۔ ذی الحجہ کو ادا ہونا قرار پایا تھا، اس لئے حضور ﷺ نے فرمایا "ان الزمان قد استدار کھیئۃ یوم خلق السماوات والارض" (بخاری کتاب التفسیر ج ۲) یعنی اس سال بھی حج انہی تاریخوں میں ادا کیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے علم ازلی میں اس کیلئے مقرر فرمائی تھیں، اس میں مسلمانوں کیلئے درس عبرت ہے کہ وہ اپنی ذاتی مصلحتوں اور دوسرے وجوہ کیلئے احکام الٰہی رد وبدل نہ کریں۔ (ضیاء القرآن ج ۲ ص ۲۰۳)

خلاصہ جواب:

نبی کریم ﷺ نے جب حجۃ الوداع فرمایا اس وقت قدرتی طور پر صحیح تاریخ ۹ ذی الحج جمعہ کے دن مقام عرفات پر کھڑے ہونے کا دن تھا، اسی طرح جب آپ پیدا ہوئے قدرتی طور پر صحیح تاریخ ۱۲ ربیع الاول تھی۔ درمیان میں کوئی مستقل کیلنڈر نہیں تھا، ہر سال ایک مہینہ بڑھایا جاتا جس کا نام کبیسہ رکھا جاتا۔ نبی کریم ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے دور میں یہ موجودہ کیلنڈر نہیں تھا، بلکہ بعض لوگ حساب ولادت نبوی کے سال سے کرتے، اور بعض لوگ آپ کی بعثت کے سال (یعنی آپ کے اعلان نبوت کے سال) سے کرتے، اور بعض لوگ عام فیل سے حساب کرتے، اور بعض ہجرت کے سال سے حساب کرتے۔ یہ موجود کیلنڈر حضرت عمر ؓ کے زمانہ میں جاری کیا گیا۔ اس لئے علم تقویم سے حساب درست نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن پھر بھی راقم کا موقف یہ ہے کہ اگر کوئی ۹ ربیع الاول آپ کی

پیدائش کا دن مان کر خوشی کا اظہار کرے تو مجھے اس سے بھی اتفاق ہوگا، اگر کسی کو ۹ ربیع الاول بھی اور ۱۲ ربیع الاول بھی غم ہی لاحق ہو تو وہ شیطان کا ساتھی ہے۔ علامہ ابوالقاسم سہیلی لکھتے ہیں۔

❁ "ان ابلیس لعنه الله رن اربع رنات انة حين لعن انه حين احبط ورنة حين ولد رسول الله ﷺ ورنة حين انزلت فاتحة الكتاب قال والرنين والنحاء من عمل الشيطان"

ابلیس ملعون زندگی میں چار مرتبہ چیخ مار کر رویا، پہلی مرتبہ جب اس کو ملعون قرار دیا گیا، دوسری مرتبہ جب اسے بلندی سے پستی کی طرف دھکیلا گیا، تیسری مرتبہ سے جب سرکار دوعالم کی ولادت باسعادت ہوئی، چوتھی مرتبہ جب سورۃ فاتحہ نازل ہوئی۔ (روضی الانف جلد اول ص ۱۸۱)

علامہ ابن کثیر نے بھی علامہ سہیلی کی اس عبارت کو "السیرة النبویه ص ۲۱۲ ج ۱" میں جوں کا توں نقل کیا، اور ابن سید الناس نے "عیون الاثر" ص ۲۷ ج ۱ میں بھی اس روایت کو بعینہ درج کیا ہے۔ (ضیاء النبی ج ۲ ص ۵۶)

علم کے بحر بیکراں مفکر اسلام، مفسر قرآن کی تحقیق:

حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمہ اللہ ضیاء النبی میں یوں رقمطراز ہیں:

"اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ محسن انسانیت ﷺ کو یوم میلاد دوشنبہ کا دن تھا، اس پر بھی علماء امت کا تقریبا اتفاق ہے کہ ربیع الاول کا بابرکت مہینہ تھا، ماہ رمضان اور ماہ محرم کے اقوال کو اہل تحقیق نے درخور اعتنا ہی نہیں سمجھا، البتہ ماہ ربیع الاول کی کون سی تاریخ تھی جب مہتاب رشد وہدایت نے جلوہ بار ہو کر ظلمت کدہ عالم کو منور فرمایا اس بارے میں علماء کرام کے متعدد اقوال ہیں، ہم یہاں علماء محققین کی آراء ناظرین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں، جن کے مطالعہ سے وہ بآسانی صحیح نتیجہ اخذ کر سکیں گے۔

(۱) امام ابن جریر طبری جو فقید المثال مفسر، بالغ نظر مؤرخ بھی ہیں، وہ اس بارے میں لکھتے ہیں،
"ولد رسول الله ﷺ يوم الاثنين عام الفيل لاثنتى عشرة ليلة مضت من شهر ربيع الاول"
رسول کریم ﷺ کی ولادت سوموار کے دن ربیع الاول شریف کی بارھویں تاریخ کو عام الفیل میں ہوئی
(تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۲۵)

(۲) علامہ ابن خلدون جو علم تاریخ اور فلسفہ تاریخ میں امام تسلیم کئے جاتے ہیں بلکہ فلسفہ تاریخ کے موجد بھی ہیں وہ لکھتے ہیں۔ "ولد رسول الله ﷺ عام الفيل لاثنتى عشرة ليلة خلت من ربيع الاول لاربعين سنة من ملك كسرى انوشيروان"
رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت عام الفیل کو ماہ ربیع الاول کی بارہ تاریخ کو ہوئی، نوشیروان کی حکمرانی

کا چالیسواں سال تھا۔ (تاریخ ابن خلدون ج ۲ص۷۱۰)

(۳) مشہور سیرت نگار علامہ ابن ہشام متوفی ۲۱۳ھ عالم اسلام کے سب سے پہلے سیرت نگار امام محمد بن اسحاق سے اپنی السیرۃ النبوۃ میں رقمطراز ہیں۔

"ولد رسول اللہ ﷺ یوم الاثنین عشرة لیلة خلت من شھر ربیع الاول عام الفیل"

رسول کریم ﷺ سوموار بارہ ربیع الاول کو عام الفیل میں پیدا ہوئے۔ (السیرۃ النبویۃ لابن ہشام)

(۴) علامہ ابوالحسن علی بن محمد الماوردی جو علم سیاست اسلامیہ کے ماہرین میں سے ہیں اور جن کی کتاب "الاحکام السلطانیہ" آج بھی علم سیاست کے طلبہ کیلئے بہترین ماخذ ہے، اپنی کتاب اعلام النبوۃ میں ارشاد فرماتے ہیں، واقعہ اصحاب فیل کے پچاس روز بعد اور آپ کے والد کے انتقال کے بعد حضور علیہ الصلوۃ والسلام بروز سوموار بارہ ربیع الاول کو پیدا ہوئے۔ (اعلام النبوۃ ص۱۹۲)

علوم قرآن وسنت اور فن تاریخ کے یہ وہ جلیل القدر علماء ہیں جنہوں نے بارہ ربیع الاول کو یوم میلاد مصطفیٰ علیہ اطیب التحیۃ والثناء تحریر کیا ہے اور دیگر اقوال کا ذکر تک نہیں کیا جو اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے نزدیک صحیح اور معتمد علیہ قول یہی ہے اور حاضر کے سیرت نگار محمد الصادق ابراہیم عرجون جو جامعہ ازہر مصر کے کلیۃ اصول الدین کے عمید رہے ہیں اپنی کتاب محمد رسول اللہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

❁ وقد صح عن طرق کثیرة ان محمد ﷺ ولد یوم الاثنین الاثنی عشرة مضت من شھر ربیع الاول عام الفیل فی زمن کسری انوشیروان ویقول اصحاب التوفیقات التاریخیة ان ذلک یوافق الیوم المکمل للعشرین عن شھر اغسطس ۵۷۰ بعد میلاد المسیح علیہ السلام"

کثیر تعداد ذرائع سے یہ بات صحیح ثابت ہو چکی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ بروز دوشنبہ بارہ ربیع الاول عام الفیل کسری نوشیروان کے عہد حکومت میں تولد ہوئے، اور ان علماء کے نزدیک جو مختلف سمتوں کی آپس میں تطبیق کرتے ہیں انہوں نے عیسوی تاریخ میں ۲۰ اگست ۵۷۰ء بیان کی ہے۔ (محمد رسول اللہ ج۱ ص۱۰۲)

ان کے علاوہ علامہ محمد رضا جو قاہرہ یونیورسٹی کی لائبریری کے امین تھے انہوں نے اپنی کتاب محمد رسول اللہ میں لکھا ہے۔

❁ ولد النبی ﷺ فی فجر یوم الاثنین لاثنتی عشرة لیلة مضت من ربیع الاول عشرین اغسطس ۵۷۰ء واھل مکة یزورون موضع مولدہ فی ھذا الوقت"

حضور نبی کریم ﷺ سوموار کے دن فجر کے وقت ربیع الاول کی بارہ تاریخ کو بمطابق بیں اگست ۵۷۰) پیدا ہوئے، اہل مکہ سرکار دو عالم ﷺ کے مقام ولادت کی زیارت کیلئے اسی تاریخ کو جایا کرتے ہیں۔

(محمد رسول اللہ ج۲ ص۱۹)

اب ہم چند دوسرے حوالے قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں ۔علامہ ابن جوزی میلاد مصطفیٰ علیہ اطیب التحیۃ والثناء کی تاریخ کے بارے میں اپنی تحقیق یوں قلمبند فرماتے ہیں۔

❁ ولدﷺ یوم الاثنین لعشر خلون من ربیع الاول عام الفیل وقیل للیلتین خلتا منه قال ابن اسحاق ولدرسول اللهﷺ یوم الاثنین عام الفیل لاثنتی عشرة لیلة مضت من شهر ربیع الاول"

حضور نبی کریمﷺ کی ولادت باسعادت بروز سوموار دس ربیع الاول کو عام الفیل میں ہوئی، یہ بھی کہا گیا ہے کہ ربیع الاول کی دوسری تاریخ تھی اور امام ابن اسحاق فرماتے ہیں رسول اللہﷺ کی ولادت مبارکہ روز دوشنبہ بارہ ربیع الاول عام الفیل کو ہوئی۔ (الوفالا بن جوزی ص ۹۰)

امام الحافظ ابوالفتح محمد بن محمد بن عبداللہ بن محمد بن یحیی بن سیدالناس الشافعی الاندلسی اپنی سیرت کی کتاب "عیون الاثر" میں تحریر فرماتے ہیں

❁ "ولد سیدنا ونبینا محمد رسول الله ﷺ یوم الاثنین لاثنتی عشرة لیلة مضت من شهر ربیع الاول عام الفیل قیل بعد الفیل بخمسین یوما"

ہمارے آقا اور ہمارے نبی محمد رسول اللہ سوموار کے روز بارہ ربیع الاول شریف کو عام الفیل میں پیدا ہوئے،بعض نے کہا ہے کہ واقعہ فیل کے پچاس روز بعد حضور کی ولادت ہوئی۔(عیون الاثر جلد اول ص ۲۶)

اس کے بعد انہوں نے ربیع الاول کی دو اور آٹھ تاریخ کے قول نقل کئے ہیں،ابن ابی شیبہ نے اپنی تصنیف میں یہی تاریخ روایت کی ہے۔

❁ "رواه ابن ابی شیبة فی مصنفه عن عفان عن سعیدبن میناء عن جابر وابن عباس انهماقالا ولد رسول اللهﷺ عام الفیل یوم الاثنین الثانی عشرمن شهر ربیع الاول وفیه بعث فیه عرج به الی السماء وفیه هاجر وفیه مات وهذا هوالمشهور عند الجمهور"

حضرت جابر اور ابن عباس دونوں سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا رسول اللہﷺ عام الفیل روز دوشنبہ بارہ ربیع الاول کو پیدا ہوئے،اور اسی روز حضور کی بعثت ہوئی،اسی روز معراج ہوا،اور اسی روز ہجرت کی ،اور جمہور اہل اسلام کے نزدیک یہی تاریخ بارہ ربیع الاول مشہور ہے (واللہ اعلم بالصواب)

(سیرت ابن کثیر ج اص ۱۹۹)

اس حدیث کے پہلے راوی ابوبکر بن ابی شیبہ ہیں،ان کے بارے میں ابوزرعہ رازی متوفی ۲۶۴ھ کہتے ہیں کہ میں نے ابوبکر بن ابی شیبہ سے بڑھ کر حافظ حدیث نہیں دیکھا،محدث ابن حبان فرماتے ہیں ابوبکر عظیم حافظ حدیث

تھے، دوسرے راوی عفان ہیں ان کے بارے میں محدثین کی رائے ہے کہ عفان ایک بلند پایہ امام ثقہ صاحب ضبط واتقان ہیں، تیسرے راوی سعید بن میناء ہیں، ان کا شمار بھی ثقہ راویوں میں ہوتا ہے، یہ صحیح الاسناد روایت دو جلیل القدر صحابہ حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ مرفوع روایت کی موجودگی میں کسی مؤرخ یا ماہر فلکیات کا یہ کہنا کہ بارہ ربیع الاول تاریخ ولادت نہیں، ہرگز قابل تسلیم نہیں۔ مولنا سید عبدالقدوس ہاشمی عالم دین ہونے کے علاوہ فن تقویم میں بھی یدطولی رکھتے تھے، انہوں نے اس فن پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام تقویم تاریخی ہے، ان کے نزدیک بھی صحیح تاریخ ولادت بارہ ربیع لاول ہے، اہل حدیث کے مشہور عالم نواب سید محمد صدیق حسن خان لکھتے ہیں کہ ولادت شریف مکہ مکرمہ میں وقت طلوع فجر روز دوشنبہ شب دواز دہم ربیع الاول عام الفیل کو ہوئی جمہور علماء کا یہی قول ہے، ابن جوزی نے اس سے اتفاق کیا ہے۔ (الشمامۃ العنبریہ حوار خیر البریہ ص ۷)

علماء دیوبند کے مفتی اعظم مفتی محمد شفیع سیرت خاتم الانبیاء میں رقمطراز ہیں۔ الغرض جس سال اصحاب فیل کا حملہ ہوا اس کے ماہ ربیع الاول کی بارھویں تاریخ کے انقلاب کی اصل غرض آدم واولاد آدم کا فخر، کشتی نوح کی حفاظت کا راز، ابراہیم کی دعاء موسی وعیسی کی پیش گوئیوں کا مصداق یعنی ہمارے آقائے نامدار محمد رسول اللہ ﷺ رونق افزائے عالم ہوتے ہیں۔ (سیرت خاتم الانبیاء ص ۱۸ بحوالہ ضیاء النبی ج ۲ بحذف ص ۳۳ تا ۳۸)

دو سیرت نگاروں کی غلط فہمی کی وجہ سے سکولی طبقہ غلط فہمی کا شکار رہا:

برصغیر پاک وہند کے بعض سیرت نگاروں نے محمود پاشا فلکی کے حوالے سے لکھا کہ بارہ ربیع الاول کو پیر کا دن نہیں تھا، بلکہ پیر کا دن نو ربیع الاول کو بنتا ہے لھذا نو تاریخ صحیح ہے، لیکن دلچسپ صورت حال یہ ہے کہ ان لوگوں کو محمود پاشا کے اصلی وطن کا بھی حتمی علم نہیں۔ علامہ شبلی نعمانی اور قاضی سلیمان منصور پوری نے محمود پاشا کو مصر کا باشندہ لکھا ہے ان دو سیرت نگاروں پر ہی زیادہ سکولی طبقہ ان کی سیرتوں پر انحصار کئے ہوئے ہیں حالانکہ یہ خود جابجا ٹھوکریں کھاتے رہے۔ مفتی محمد شفیع صاحب انہیں ملکی لکھتے ہیں، مولنا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے قسطنطنیہ کا مشہور ہیت دان اور منجم بتایا ہے۔ مجھے بڑی کوشش کے باوجود محمود پاشا فلکی کی کتاب یا رسالہ نہیں مل سکا، البتہ معلوم ہوا کہ پاشا فلکی کا اصل مقالہ فرانسیسی زبان میں تھا، جس کا ترجمہ سب سے پہلے احمد زکی آفندی نے نتائج الافہام کے نام سے عربی میں کیا اس کو مولوی سید محی الدین خان جج ہائی کورٹ حیدر آباد نے اردو کا جامہ پہنایا، اور ۱۸۹۸ میں نولکشور پریس نے شائع کیا لیکن اب یہ ترجمہ نہیں ملتا۔ محمود پاشا فلکی نے اگر علم فلکیات کی مدد سے کچھ تحقیقات کی بھی ہیں، صحابہ کرام، تابعین اور

دیگر قدماء کی روایات کو جھٹلانے کیلئے ان پر انحصار کرنا کسی طرح مناسب نہیں، کیونکہ سائنسی علوم کی طرح فلکیات کی کوئی بات قطعی نہیں ہوتی۔ (ضیاء النبی ج۲ص ۳۸،۳۹)

مقام توجہ: اس سلسلہ میں غور طلب امر یہ ہے کہ سن ھجری کا استعمال حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں شروع ہوا اور پہلی مرتبہ یوم الخمیس (جمعرات کے دن) ۲۰ جمادی الاول ۱۷ھ ۱۲ جولائی ۲۳۸ء کو مملکت اسلام میں اس کا نفاذ ہوا، اس کے بعد کا تاریخی ریکارڈ ملتا ہے، لیکن اس سے پہلے کا تقویمی ریکارڈ دستیاب نہیں، اور بعثت نبوی سے قبل عرب میں کوئی باقاعدہ کیلنڈر رائج نہیں تھا، عرب اپنی مرضی سے مہینوں میں ردو بدل کرلیا کرتے تھے (راقم نے ضیاء القرآن کے حوالہ سے پہلے ہی ذکر کردیا ہے) (ضیاء النبی ج۲ص ۳۹)

محمود پاشا سے قبل بھی کچھ لوگوں نے نجوم کے حسابات سے یوم ولادت معلوم کرنے کی کوشش کی، علامہ قسطلانی لکھتے ہیں، اہل زیچ کا اس قول پر اجماع ہے کہ آٹھ ربیع الاول کو پیر کا دن تھا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو شخص بھی علوم نجوم اور ریاضی کے ذریعہ حساب لگا کر تاریخ نکالے گا مختلف ہوگی، پس ہمیں قدیم سیرت نگاروں، محدثین، مفسرین، تابعین اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیھم کی بات ماننا پڑے گی۔

مندرجہ بالا بحث سے ثابت ہوگیا:

کہ حضور پاک صاحب لولاک محمد مصطفیٰ احمد مجتبی علیہ التحیۃ والثناء ۱۲ ربیع الاول عام الفیل پیر کے دن صبح کے وقت اس جہان ہست و بود میں اپنے وجود عنصری کے ساتھ تشریف لائے۔ (ضیاء النبی ج۲ص ۳۹)

مزید بحث ضیاء النبی میں دیکھیں، اور مدارج النبوۃ میں دیکھیں، راقم نے تذکرۃ الانبیاء میں کچھ احوال ذکر کئے۔ یہاں مختصر بحث کی جارہی ہے۔

میلاد النبی ﷺ کو عید کہنے کی وجہ:

عام طور پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسلام میں صرف دو عیدیں ہیں یہ تیسری عید کہاں سے آئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کہنا کہ عیدیں صرف دو ہیں یہ احادیث اور کتب فقہ کی کی توجہ نہ کرنے وجہ سے وہ لوگ غلطی کا شکار ہوئے کاش کہ وہ کتب کا مطالعہ کریں، یوں ہی تخریب کاری ان کا وطیرہ ہے۔ درمختار باب العیدین میں عید کی وجہ بیان کرتے ہوئے اس طرح ذکر کیا گیا ہے۔

"سمی به لان الله فیه عوائد الاحسان ولعوده بالسرور غالبا اوتفاؤلا ویستعمل فی کل یوم فیه مسرة ولذاقیل عید وعید وعید صرن مجتمعة.وبجه الحبیب ویوم العید والجمعة"

عید کواس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے احسانات لوٹ کر آتے ہیں اور ان کے آنے سے سرور بھی غالبا لوٹ آتا ہے۔یا نیک شگونی کی وجہ سے عید کہا جاتا ہے، یعنی اللہ کرے خوشی لوٹ آئے، کیونکہ عید کا معنی ہی "لوٹنا" ہے، ہر مسرت کے موقع پر لفظ عید کا استعمال کیا جاسکتا ہے، کسی شاعر نے کیا خوب کہا: آج تو تین عیدیں جمع ہوگئیں حبیب کے چہرہ کا دیدار، اور عید کا دن اور جمعہ۔

جب ہر مسرت کے دن کو عید کہا جاسکتا ہے تو نبی کریم ﷺ کی ولادت کے دن سے بڑھ کر مسرت کا دن اور کونسا ہوسکتا ہے؟ جب اس سے زیادہ قدر و منزلت والا اور کوئی دن نہیں تو اس دن سے بڑھ کر کسی دن میں مسرت بھی زیادہ نہیں ہوسکتی تو اس طرح اس دن کے عید ہونے سے، اور کوئی بڑی عید بھی نہیں ہوسکتی، البتہ نبی کریم ﷺ کی ولادت پر فرحت اور سرور حاصل ہو تو عید کہا جاسکتا ہے، نہ ہو تو عید کہنا بھی مشکل ہی نظر آتا ہے، اصل اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔

جسے چاہا در پہ بلالیا جسے چاہا اپنا بنا لیا۔
یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے یہ بڑے نصیب کی بات ہے۔

عن ابن عباس انه قرأ "الیوم اکملت لکم دینکم" الآیة وعنده یهودی فقال لونزلت هذه الآیة علینا لاتخذناها عیدا فقال ابن عباس فانها نزلت فی یوم عیدین فی یوم جمعة ویوم عرفة" (رواه الترمذی، مشکوة باب الجمعة)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ بیشک یہ آیۃ ہم پر بھی اس دن نازل ہوئی جس دن دو عیدیں تھیں۔ایک جمعہ کا دن اور ایک ذی الحج کی نو تاریخ تھی۔یعنی ہم ہر ذوالحج کی نو تاریخ کو عید مانتے ہیں۔اور یہ آیۃ بھی حجۃ الوداع کے موقع پر یوم عرفہ کو نازل ہوئی، اور وہ دن جمعہ کا دن تھا جبکہ ہم ہر جمعہ کے دن کو بھی عید مانتے ہیں۔

بخاری ج ۲ کتاب التفسیر میں یہی حدیث طارق بن شہاب ﷺ سے مروی ہے کہ یہود نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہی بات کہی اور آپ نے وہی جواب دیا جو حضرت ابن عباس ﷺ نے جواب دیا۔واضح ہوا کہ ہر مسرت کا دن عید کا دن ہے، حبیب کے چہرہ کی زیارت کا دن، جمعہ کا دن، عرفہ کا دن، عید الفطر کا دن عید الاضحیٰ کا دن سب عید کے دن ہیں، اس لئے ولادۃ النبی ﷺ کا دن مسرت کا دن ہے، لھذا ایمان والوں کیلئے عید کا دن ہے۔

اعتراض: جب ایک ہی دن ولادت اور وفات کا ہے تو خوشی منائی جاتی ہے، غم نہیں کیا جاتا، اس کی کیا وجہ

ہے؟ ویسے یہ اعتراض میں نے سنجیدہ الفاظ میں نقل کیا ہے ورنہ جہلاء عام لوگوں کو ان الفاظ سے ورغلاتے ہیں آپ نے کبھی یہ بھی سنا کہ ایک گھر سے میت کا جنازہ نکل رہا ہو اور لوگ خوشیاں منا رہے ہوں۔

پہلا جواب: تحقیق کی رو سے آپ کا وصال ۱۲ ربیع الاول کو نہیں بنتا۔ اس لئے کہ اس مسئلہ میں اتفاق ہے کہ آپ نے حجۃ الوداع کیا اس وقت حقیقی طور پر ذی الحج کی ۹ تاریخ جمعہ کو تھی۔ اور اس مسئلہ میں بھی اتفاق ہے کہ نبی کریم ﷺ کا حجۃ الوداع کے بعد آنے والے ربیع الاول میں وصال ہوا، اور یہ بات بھی اتفاقی ہے کہ آپ کا وصال سوموار کو ہوا۔

آیئے! اب آپ حساب کریں کہ حجۃ الوداع کی آٹھ تاریخ جمعرات تھی، اور انتیس تاریخ بھی جمعرات تھی، اگر چاند انتیس کا تھا تو محرم کی پہلی تاریخ جمعہ تھا اور انتیس تاریخ بھی جمعہ تھا، اگر مہینہ انتیس دنوں کا تھا تو صفر کی پہلی تاریخ ہفتہ کا دن تھا اور انتیس تاریخ بھی ہفتہ کا دن تھا۔ اس لحاظ پر ربیع الاول کی پہلی تاریخ اتوار کا دن تھا۔ لیکن تین چاند لگا تار انتیس کے نہیں ہوتے، اگر ان میں سے ایک مہینہ آپ تیس کا مانیں تو ربیع الاول کی پہلی تاریخ پیر کو ہوگی، اس طرح بارہ ربیع الاول جمعہ کے دن بنتی ہے۔ اگر آپ تین چاندوں میں سے دو چاند تیس کے بناتے ہیں تو ربیع الاول کی پہلی تاریخ منگل کو ہوگی، اس صورت میں ہفتہ کے دن بارہ ربیع الاول بنتی ہے۔ اگر تینوں چاند انتیس کے ہی مانیں تو بارہ ربیع الاول جمعرات کو ہوگی۔ لیکن چشتیائے کرام بزرگان دین تینوں چاند انتیس کے لے کر دو ربیع الاول پیر کا دن آپ کا یوم وصال مانتے ہیں۔

گولڑہ شریف میں سید الاولیاء حضرت پیر مہر علی شاہ رحمہ اللہ دو ربیع الاول کو ہی آپ کا یوم وصال مناتے رہے، جس پر آج تک عمل جاری ساری ہے۔

دوسرا جواب: اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ آپ کی پیدائش اور وصال کا دن ایک ہی ہے تو خوشی منانے اور غم نہ کرنے کی وجہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ یوں بیان فرماتے ہیں۔

والشریعة حثت علی اظهار شکر النعم والصبر والسکون والکتم عندالمصائب وقد امر الشرع بالعقیقة عندالولادة وهی اظهار شکر وفرح بالمولود ولم یأمر عندالموت بذبح ولا بغیره بل نهی عن النیاحة واظهار الجزع فدلت قواعد الشریعة علی انه یحسن فی هذا الشهر اظهار الفرح بولادته ﷺ دون اظهار الحزن فیه بوفاته"

(الحاوی للفتاوی ج ا ص ۱۹۳)

شریعت نے نعمتوں کے شکریہ کو ظاہر کرنے پر برانگیختہ کیا ہے، اور مصائب وآلام کے چھپانے اور ان پر

صبر و سکون کا حکم دیا ہے اور بچے کی ولادت پر خوشی منانے اور شکر کو ظاہر کرنے کیلئے شریعت نے عقیقہ کرنے کا حکم دیا ہے حالانکہ موت کے وقت ذبح وغیرہ کرنے کا کوئی حکم نہیں دیا گیا، بلکہ نوحہ کرنے اور جزع کرنے سے منع کیا گیا ہے، یہ قوانین شریعت اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی ولادت پر خوشی کا اظہار کرنا مستحسن طریقہ ہے لیکن آپ کی وفات پر غم کا اظہار اچھا نہیں۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ نے فرمایا "اولم ولو بشاۃ" ولیمہ کرو اگرچہ ایک بکری (ذبح کرنے) سے ہو، اس سے بھی پتہ چلا کہ نعمت کے حصول پر شکریہ ادا کرنا شرعاً اچھا طریقہ ہے۔

تیسرا جواب: وفات پر غم نہ کرنے کی یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو قبر شریف میں دنیاوی زندگی سے بھی اعلیٰ زندگی حاصل ہے جب آپ زندہ ہیں تو غم کا کیا مقصد۔ انبیاء کرام کی مکمل زندگی کی بحث **"نجوم الفرقان جلد چہارم"** میں دیکھئے، یہاں صرف معترضین کے عالم اعزاز علی دیوبندی صاحب کی حاشیہ نور الایضاح کی عبارت دوبارہ تحریر کر رہا ہوں تا کہ مسئلہ سمجھنا آسان ہو۔

❁ **"مثله ﷺ بعد وفاته كمثل شمع في حجرة اغلق بابها فهو مستور عمن هو خارج الحجرة ولكن نوره كما كان بل ازيد وهذا حرم نكاح ازواجه بعده ﷺ لم يجر احكام الميراث فيما تركه لانهما من احكام الموت"**

نبی کریم ﷺ کی مثال دنیا سے رخصت ہو جانے نے بعد اس طرح ہے جس طرح ایک شمع کو باہر سے کمرہ میں لے جائیں اور اس کا دروازہ بند کر دیا جائے اگرچہ وہ شمع کمرے سے باہر والوں سے چھپ گئی لیکن اس کی روشنی اسی طرح ہے بلکہ پہلے سے بھی زیادہ کیونکہ باہر روشنی کم تھی اندر جا کر زیادہ ہوگئی (اسی طرح نبی کریم ﷺ قبر شریف میں اگرچہ باہر والے لوگوں سے مستور ہیں لیکن آپ کی زندگی پہلے سے بھی زیادہ ارفع و بلند ہے) اسی وجہ سے آپ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے باوجود آپ کی ازواج مطہرات سے نکاح کرنا حرام ہے، اور آپ کے ترکہ پر وراثت کے احکام جاری نہیں ہوئے، کیونکہ یہ دونوں کام مردوں سے تعلق رکھتے ہیں آپ تو زندہ ہیں۔

اہل سنت و جماعت سے دردمندانہ اپیل:

میلاد النبی ﷺ کے جلوس میں نمازوں کو ضائع نہ ہونے دیں۔ ناچ، گانا، ڈھول، باجے بھنگڑا وغیرہ نہ پایا جائے۔ مساجد کے قریب سے گزرتے ہوئے نمازوں کے اوقات میں لاؤڈ سپیکرز کا آواز پست رکھا جائے۔ نعت خوانی، ذکر، تقاریر، پر مشتمل جلوس، حدود سے تجاوز کر کے اغیار کو اعتراضات کا موقع نہ دیا جائے۔ تمام رات محافل نعت

منعقد کر کے صبح نماز کو قضاء کرنا حماقت ہے، عقل ودانش کا کام نہیں۔ محفل نعت کا انعقاد اتنی دیر ہو کہ صبح کی نماز باجماعت ادا کی جائے۔ محفل نعت میں پیسے دینے والوں کے صرف نام شامل کر کے قرعہ اندازی کر کے کسی ایک کو عمرہ کا ٹکٹ دینا **خالص جوأبازی** ہے، اس سے بچنا ضروری ہے، ہاں سب شرکاء محفل کے نام شامل کر کے قرعہ اندازی کے ذریعے کسی کو عمرہ کیلئے بھیجنا جائز ہے۔

لمحات فکر:

کبھی آپ نے یہ بھی سوچا آپ کے اغیار اپنا تمام پیسہ دینی مدارس پر خرچ کر رہے ہیں، آپ ایک رات کی محفل نعت پر لاکھوں روپے خرچ کر ڈالتے ہیں، آپ کی توجہ دینی مدارس کی طرف جب تک نہیں ہوگی آپ کے اغیار آپ سے بازی لے جاتے رہیں گے۔ پیسے مقرر کر کے نعت خوانوں اور مقررین کا محافل میں جانا بہت برا طریقہ ہے، ایسے پیشہ وردین کے ڈاکوؤں سے بچ کر رہیں، صحیح علماء سے تقاریر کرائیں، نعت خوانوں کو بلائیں ،فن کاروں اور مداریوں کو نہ بلائیں۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ (آیة نمبر ۱۶۵)

(1) کیا جب تمہیں کوئی مصیبت پہنچے کہ اس سے دونی تم پہنچا چکے ہو تو کہنے لگو کہ یہ کہاں سے آئی تم فرمادو کہ وہ تمہاری ہی طرف سے آئی بیشک اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ (کنزالایمان)

(2) کیا جب پہنچی تمہیں کوئی مصیبت، تحقیق پہنچا چکے ہو تم اس کی دو مثل، تم نے کہا، کہاں سے آئی ہے یہ؟ آپ فرمادیں وہ تمہارے اپنے نفسوں کی طرف سے ہی آئی ہے، بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (نجوم الفرقان)

مقام توجہ:

اس آیہ کریمہ میں مودودی صاحب نے "قل " کا ترجمہ کیا "اے نبی ان سے کہو" یعنی "قل " میں خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے، اس ترجمہ پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں، ہم تو حق بات کو حق کہنے کے عادی ہیں بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ یہاں بہت اچھا ترجمہ "قـــل " کا کیا گیا ہے، لیکن تعجب یہ ہے کہ اس ترجمہ پر کسی نے بھی اعتراض نہیں کیا، لیکن اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ جب "قل " اے محبوب آپ فرمادیں" تو معترضین سیخ پا ہو جاتے ہیں کہ یہ ترجمہ مولوی بریلوی کا خود ساختہ ہے، کتنی بیہودگی، کتنی دیوانگی۔

شان نزول:

جب احد میں صحابہ کرام کو کچھ تکالیف اٹھانی پڑیں تو وہ تعجب سے ایک دوسرے سے سوال کرنے لگے کہ ہم اسلام کے خدمت گذار ہیں جو دین حق ہے اور ہمارے ساتھ رسول اللہ ﷺ بھی ہیں، جبکہ ہمارے مقابل لوگ اللہ تعالیٰ سے شریک ٹھہرانے والے دین کے مددگار ہیں تو ان لوگوں کی طرف سے ہمیں کیسے تکالیف پہنچائی گئیں، جبکہ ہمارے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا وعدہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری امداد فرمائے گا۔ تو اس وقت یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی کہ تم نے ان کو

دوگنی شکست دی ہے بدر میں تم نے کافروں کے سرکردہ ستر لوگ قتل کردئے تھے اور ستر قیدی بنالئے تھے، پھر احد میں بھی ابتدائی طور پر کامیابی تم کو ہی حاصل رہی، بعد میں تم اپنی غلطی کی وجہ سے ہی تکالیف میں آگئے۔

"فلماهزمتموهم مرتين فأى استبعاد فى ان يهزموكم مرة واحدة"

جب تم نے کافروں کو دو مرتبہ شکست دی تو کون سی بات ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے تمہیں نیچا کردیا۔

(ماخوذ از کبیر جلد ۹ صفحہ نمبر ۸۱)

زجاج کی غلطی علامہ واحدی کی گرفت:

زجاج نے کہا کہ مسلمانوں نے کافروں کو بدر میں شکست دی، پھر احد میں بھی ایک مرتبہ شکست دی

"ثم لماعصوا اهزمهم المشركون"

پھر جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کی تو کافروں نے ان کو شکست دے دی۔

"فانهزام المشركين حصل مرتين وانهزام المسلمين حصل مرة واحدة وهذااختيار الزجاج"

مشرکوں کو دو مرتبہ شکست حاصل ہوئی اور مسلمانوں کو ایک مرتبہ شکست حاصل ہوئی۔

زجاج کا یہ قول دو وجہ سے سنگین ہے ایک تو صحابہ کرام کی اجتہادی خطا کو اس نے رسول اللہ ﷺ کی دیدہ دانستہ نافرمانی قرار دیا ہے، اور **دوسری وجہ** اس اس کے قول کے سنگین ہونے کی یہ ہے کہ اس نے کہا کہ مسلمانوں کو شکست ہوئی، اس دوسری غلطی پر علامہ واحدی نے یوں گرفت فرمائی۔

وطعن الواحدى فى هذاالوجه فقال كماان المسلمين نالوا من المشركين يوم بدرفكذلك المشركون نالوامن المسلمين يوم احدولكنهم ماهزمواالمسلمين البتة،امايوم احدفالمسلمون هزمواالمشركين اولاثم انقلب الامر"

کہ زجاج نے جو یہ کہا ہے کہ احد میں مسلمانوں کو شکست حاصل ہوئی یہ غلط ہے، صرف یوں کہا جاسکتا ہے کہ بدر میں کافروں کو مسلمانوں کی طرف سے تکلیف پہنچی اور احد میں مسلمانوں کو مشرکین کی طرف سے تکلیف پہنچی، لیکن مسلمانوں کو شکست بالکل نہیں ہوئی، میدان میں جم کر رہنا مسلمانوں کو ہی حاصل رہا، ابتدائی طور پر مسلمانوں کو ہی برتری حاصل رہی، بعد میں معاملہ الٹ ہوگیا کہ وقتی طور پر مشرکین کو کچھ برتری حاصل ہوگئی، اس کی وجہ بھی صحابہ کرام کی اجتہادی خطاء تھی کہ انہوں نے درے کو چھوڑ

دیا تھا۔ (ماخوذ از کبیر بوضاحت جلد صفحہ نمبر ۸۱)

﴿قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ﴾ ''اے محبوب آپ فرما دیجئے وہ تمہارے نفسوں کی طرف سے۔''

یعنی احد میں جو تمہیں مصیبت پہنچی وہ تمہاری اپنی جانب سے کہ تم نے اجتہادی خطاء کی، ایک دوسرے سے نزاع کیا بعض نے کہا یہیں رک جاؤ، بعض نے کہا اب رکنے کی ضرورت نہیں ہمیں فتح حاصل ہو چکی ہے، بس یہی وجہ تھی تمہیں مصیبت پہنچنے کی، اس میں رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کو سمجھنے میں تم نے غلطی کی وہ تمہاری غلطی تمہیں تکالیف پہنچنے کا ذریعہ بن گئی۔

ایک اور وجہ عظیم:

ماروی عن علی ؓ انه قال جاء جبریل ؑ الی النبی ﷺ یوم بدر فقال یامحمدان الله قدکره ماصنع قومک فی اخذهم الفداء من الاساری وقدامرک ان تخیرهم بین ان یقدموا الاساری فیضربوا اعناقهم، وبین ان یاخذوا الفداء علی ان تقتل منهم عدتهم فذکر رسول الله ﷺ ذلک لقومه، فقالوا یارسول الله ﷺ عشائرنا واخواننا ناخذ الفداء منهم، فنتقوی به علی قتال العدو ونرضی ان یتشهد منا بعددهم فقتل یوم احد سبعون رجلا عدد اساری اهل بدر فهو معنی قوله قل هومن عندانفسکم ای باخذ الفداء واختیارکم القتل"

حضرت علی ؓ سے مروی ہے، بیشک آپ نے فرمایا کہ جبریل ؑ نبی کریم ﷺ کے پاس بدر کے دن آئے، تو کہنے لگے اے محمد (ﷺ) بیشک اللہ تعالی نے آپ کی قوم کا قیدیوں سے فدیہ لینا ناپسند کیا ہے، اور تحقیق وہ تمہیں حکم دیتا ہے آپ اپنی قوم کو اختیار دے دیں یا تو وہ قیدیوں کی گردنیں اڑا دیں، یا ان سے فدیہ لے لیں لیکن ان کو قیدیوں کی تعداد میں شہید ہونا پڑے گا، نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کرام کو رب تعالی کا یہ پیغام سنا دیا، تو انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ ہمارے قبیلہ کے لوگ ہیں، ہمارے خاندانی بھائی ہیں، ہم ان سے فدیہ لے لیتے ہیں، اور دشمن سے ہم جنگ کرنے کی بھی طاقت رکھتے ہیں، اور ہم اس پر راضی ہیں یعنی ہم اسے خوشی سے قبول کرتے ہیں کہ ان قیدیوں کی تعداد میں ہم شہید ہو جائیں، ان کے اسی فیصلہ کے مطابق احد کے دن ستر صحابہ کرام شہید ہو گئے کیونکہ بدر میں ستر قیدیوں

سے فدیہ لیا گیا تھا، یہی مطلب ہے رب تعالی کے ارشاد گرامی کا ﴿قُلْ هُوَمِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ﴾ کہ یہ تمہارا اپنا ہی فیصلہ تھا کہ اب ہم ستر قیدیوں کا فدیہ لے لیتے ہیں، اور بخوشی ہم میں ستر آدمی شہید ہونے کو قبول کرتے ہیں۔ (تفسیر کبیر جلد نمبر ۹ صفحہ نمبر ۸۲ رواہ البیہقی، قرطبی)

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ ''بیشک اللہ تعالی ہر چیز پر قادر ہے۔''

یعنی بیشک وہ قادر ہے تمہاری امداد پر اگر تم ثابت رہتے اور صبر کرتے جیسے وہ قادر ہے تمہاری امداد کے چھوڑ دینے پر جب تم نے رسول اللہ ﷺ کے حکم کے خلاف درے کو چھوڑ دیا۔

واجتح اصحابنابهذاعلى ان فعل العبدمخلوق لله تعالى قالواان فعل العبدشيء فيكون مخلوقاالله تعالى قادراعليه"

اسی سے علماء اہل سنت نے یہ دلیل پکڑی ہے کہ بیشک بندے کا فعل اللہ تعالی کی مخلوق ہے، کیونکہ بندے کا فعل بھی شی ہے، وہ اللہ تعالی کی مخلوق ہے اور اللہ تعالی اس پر قادر ہے۔

اسی سے یہ بھی فائدہ حاصل ہوا کہ جب اللہ تعالی بندوں کے افعال کو پیدا کرنے پر قادر ہے تو معتزلہ کا مذہب خود بخود باطل ہو گیا کہ بندہ اپنے افعال کا خالق ہے، کیونکہ بندے کو اگر اپنے افعال کا خالق مانا جائے تو رب تعالی کا خالق نہ ہونا ثابت ہوگا کیونکہ ایک چیز کی خلق کے بعد دوبارہ خلق نہیں، بندہ جب خود اللہ تعالی کی مخلوق ہے تو اللہ تعالی ہی اس کے افعال کا بھی خالق ہے۔ (کبیر جلد نمبر ۹ صفحہ نمبر ۸۲)

نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن

فخر اہلسنت استاذ الاساتذہ حضرت علامہ مولانا عبدالرزاق بھترالوی، حطاروی کی علمی شاہکار

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن (جلد اول)	200/=	اذان کے ساتھ درود شریف مستحب ہے	21/=
نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن (جلد دوم)	200/=	سبز عمامہ کی برکات سے کذاب جل اٹھے	24/=
نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن (جلد سوم)	200/=	انگوٹھے چومنا مستحب ہے	21/=
نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن (جلد چہارم)	200/=	نماز کے بعد ذکر و دعا مستحب ہے	40/=
نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن (جلد پنجم)	200/=	تکریم والدین مصطفیٰ ﷺ	20/=
نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن (جلد ششم)	200/=	احکام مساجد	24/=
نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن (جلد ہفتم)	200/=	نماز حبیب کبریاء	150/=
نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن (جلد ہشتم)	200/=	نور الایضاح (عربی حاشیہ)	69/=
نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن (جلد نہم)		تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان	120/=
نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن (جلد دہم)		السراجی فی المیراث (اردو)	33/=
شمع ہدایت	120/=	تلخیص المفتاح (عربی حاشیہ)	45/=
مراح الارواح (اردو حاشیہ)	36/=	کنز الدقائق (عربی حاشیہ)	270/=
تذکرۃ الانبیاء (مجلد خاص)	360/=	المظہر النوری علی المختصر القدوری	150/=
موت کا منظر مع احوال حشر ونشر	210/=	ایصال ثواب مستحب ہے	27/=
اقامت بیٹھ کر سننا مستحب ہے	21/=	جواہر السنایہ فی شرح ھدایہ جلد اول	200/=
اسلام میں عورت کا مقام	150/=	جواہر السنایہ فی شرح ھدایہ جلد دوم (زیر ترتیب)	